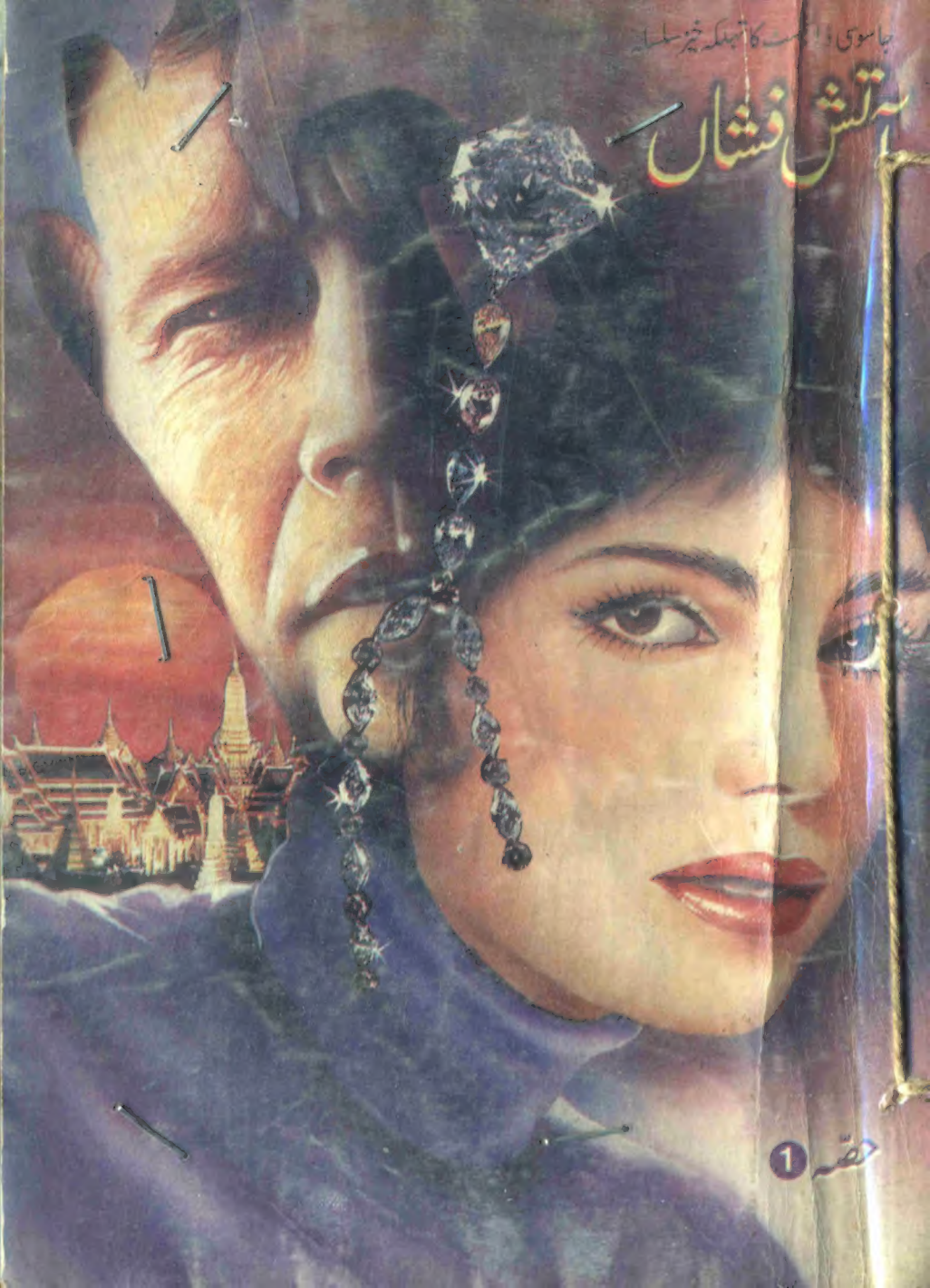


جاسوسی داستان کا تہلکہ خیز سلسلہ

# ہتک فشان



حصہ 1



# آتش فشان

ظلم و جور کے شعلوں میں جلتے والے ایک محصور ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت  
وہ اپنے مار باپ کے لاشوں کے ساتھ ایک محصور ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت  
میں ایک مار باپ کے لاشوں کے ساتھ ایک محصور ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت  
طرح پر ایک مار باپ کے لاشوں کے ساتھ ایک محصور ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت  
ہستی سے منہ پھیر رہی تھی۔ اس کے شب و روز کی ہر حرکت اس کے بھی صفحہ  
پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا  
اتنا کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو  
بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک  
نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔  
اس ٹھٹھے چراغ کا احوال جو اچانک ہی آنکھوں کی زد سے آگیا تھا

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اس کی پیوی ٹگفتہ اسے دیکھ کر  
پریشان ہو گئی۔

”کیا بات ہے عابد! تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو۔ خیریت  
تو ہے نا؟“ ٹگفتہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے طبیعت  
خراب ہو گئی تھی۔“ عابد علی نے جواب دیا اور بیٹے کی ط: متوجہ  
ہو گیا جو اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آگیا تھا۔

عابد علی رات کو گھر آتے ہوئے عام طور پر کوئی پھل وغیرہ نہ  
تیا کرتا تھا لیکن آج وہ خالی ہاتھ تھا۔ کس وجہ ان نے بھی تاویلا  
تھا کہ اس کا باپ کچھ پریشان ہے۔ اس لیے اس نے یہ پوچھا بھی  
نہیں کہ وہ خالی ہاتھ کیوں آیا ہے۔

”چھاتم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔  
وہ ان نے بھی آج ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“ ٹگفتہ کہتے ہوئے  
کچن کی طرف چلی گئی۔

عابد علی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ چند لمحے کمرے میں کھڑا رہا  
اور پھر ہاتھ دھو کر کپڑے بدل گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ باہر نکلا تو  
ٹگفتہ میز پر کھانا لگا چکی تھی۔ وہ جانے کی سی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔  
”لگتا ہے آج تمہیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ عابد علی اس  
کے قریب دو سرے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔  
”ہی ابو۔ آج آپ نے بہت دیر کر دی۔“ وجدان نے جواب

دیا۔

”آج تو میں نے دکان بھی جلدی بند کر دی تھی لیکن راستے  
میں کام پڑ گیا جس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ اچھا! چلو۔ آگیا کھانا  
شروع کرو۔“

ٹگفتہ بھی عابد علی کے سامنے اپنی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ وہ  
لوگ کھانا کھانے لگے۔ عابد علی نے ابھی چند ہی لمحے کھائے تھے کہ  
لاؤنج میں رکے ہوئے ٹیلی فون کی ٹھنٹی بجی۔ عابد علی نے اپنی جگہ  
سے اٹھنا چاہا۔ ٹگفتہ اس سے پہلے ہی اٹھ گئی۔

”آپ کھانا کھا لیتے۔ میں دیکھتی ہوں۔“ ٹگفتہ اٹھ کر لاؤنج  
میں آگئی۔ فون کی ٹھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور  
اٹھایا۔ ”ہیلو۔“ وہ ڈاکوٹھ پیس میں بولی لیکن جواب میں ایسی آواز سنائی  
دی۔ اس نے دو سرے کرسی پر مڑ کر دیکھا تو جواب میں ایسی آواز سنائی  
دی جیسے کوئی گھسیٹا اس لے رہا ہو ”کون بد تمیز ہے۔“ ٹگفتہ  
قدرے درشت لہجے میں بولی۔ اس مرتبہ ریسیور پر گھرے سانسوں  
کی آواز سنائی دی۔ ٹگفتہ نے ریسیور بچ دیا اور دوبارہ کھانے کی میز  
پر آگئی۔

”کون تھا؟“ عابد علی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف  
دیکھا۔

”ہاں نہیں کون بد تمیز تھا۔“ ٹگفتہ نے جواب دیا ”میں نے  
پوچھا کون ہے تو جواب میں گھرے گھرے سانسوں کی آواز سنائی

دینے لگی۔

وہ ابھی باتیں کر رہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔  
گھنٹہ نے دوبارہ اٹھنا چاہا لیکن اس مرتبہ عابد علی پہلے اٹھ گیا اور  
لاؤنج میں آکر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو!“ وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ جواب میں گمرے گمرے  
سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے کتا  
غرا رہا ہو۔ عابد علی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔  
اس کے دل کی صفحہ صفر تک ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا  
رہا پھر کھانے کی میز پر آیا۔

”کیا ہوا... کون تھا۔ تم ایک دم پریشان کیسے ہو گئے ہو؟“  
گھنٹہ نے پوچھا۔ عابد علی کے چہرے کے اثرات دیکھ کر اسے سمجھنے  
میں دیر نہیں لگی کہ کوئی گزیر ضرور ہے۔  
”کچھ نہیں۔“ عابد علی اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی  
کوشش کرتے ہوئے بولا ”پتا نہیں کون بد تیز ہے۔ سہر حال تم کھانا  
کھاؤ۔“

اس کے بعد فون کی گھنٹی نہیں بجی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ  
لاؤنج میں آگئے۔ وجدان بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ کچھ دار پینے  
کا۔ اپنے سانپ باپ کو پریشان دیکھ کر وہ الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔  
”جاؤ بیٹا۔ جاؤ تم گھر سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے۔“ عابد علی نے  
وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وجدان نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی  
سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”کیا بات ہے عابد!“ گھنٹہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے  
ہوئے بولی ”بب سے تم کمرے میں داخل ہوئے ہو تمہیں پریشان دیکھ  
رہا ہوں۔ اس فون کال کے بعد تو تمہارے چہرے پر عجیب سے  
تجربات ابھر آئے تھے۔ تم نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں چھپایا  
لیکن آج کوئی ایسی بات ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش  
کر رہے ہو۔“

”نہیں گھنٹہ۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔“  
عابد علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر بتاؤ کیا بات ہے؟“ گھنٹہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس  
کی طرف دیکھا۔

”تمہیں ملک نوازش علی یاد ہے؟“ عابد علی نے پوچھا۔  
”اس شیطان کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔“ گھنٹہ نے گہرا  
سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”اس غیبت کی وجہ سے ہی تو ہمیں نہ  
صرف اپنا گھر بلکہ اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد  
ہے۔ وجدان اس وقت صرف دو میزوں کا تھا۔ ہم اس موصوم پینے  
کو لیے کس طرح اس شیطان سے چھینٹے پھر رہے تھے۔ اس شیطان  
کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ لیکن آج تمہیں ملک نوازش علی کیسے  
یاد آیا؟“

”جس طرح بارہ سال گزرنے کے بعد ہم ملک نوازش علی کو  
نہیں بھولے اسی طرح شاید وہ بھی ہمیں نہیں بھولا۔“ عابد علی نے  
کہا۔

”کیا مطلب! کیا کہنا چاہتے ہو؟“ گھنٹہ کا چہرہ ایک دم دھواں  
ہو گیا۔

”اگر تم ملک نوازش علی کو نہیں بھولی ہو تو پھر جس دارا بھی یاد  
ہو گا۔“ عابد علی بولا۔

”دارا!“ گھنٹہ کے چہرے کے اثرات جگمگائے ”وہ تو انسان  
نہیں درندہ ہے۔ اسے تو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس نے ہمارے  
گھر کو آگ لگا کر ہمیں زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔ ہم آگ میں  
گھرے ہوئے تھے اور وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے شیطانی قہقہے تو  
آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس روز اگر پولیس  
بروقت نہ پہنچ جاتی تو ہم بھی اس مکان کے ساتھ جل کر راکھ ہو چکے  
ہوتے۔“

”میں اسی دارا کی بات کر رہا ہوں۔“ عابد علی نے کتا ”آج وہ  
میری دکان پر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جسے میں  
نہیں جانتا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا  
کیونکہ اس کے دکان میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے اسے  
دیکھ لیا تھا اور گاؤں سے اٹھ کر دکان کے پچھلے کمرے میں چلا گیا  
تھا۔ دارا پانچ چار منٹ تک دکان میں رہا تھا اور اسٹین ایکسپریس کا  
ڈبا خرید کر واپس چلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا میری دکان پر آنا  
محض اتفاق تھا اور اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ ٹیلی فون  
کال... مجھے یقین ہے کہ فون اس نے کیا تھا۔ اگرچہ اس نے زبان  
سے کچھ نہیں کہا لیکن اس نے مجھے سنگا پور میں اپنی موجودگی کا  
احساس دلایا ہے۔“

”اب کیا ہو گا؟“ گھنٹہ کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا ”کیا ہمیں  
یہاں سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ وجدان کو یہ سب کچھ معلوم ہو گا تو وہ  
کیا سوچے گا۔ بارہ سال پہلے جب ہم پاکستان سے بھاگے تھے تو وہ  
صرف دو میز کا تھا۔ کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن  
اب وہ بارہ سال کا بوجھ کا ہے۔ سمجھ دار ہے۔ وہ صورت حال کو سمجھ  
سکتا ہے۔ کیا سوچے گا۔ کیا ہو گا۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔“ عابد علی نے اس کی بات کاٹ دی ”یہ  
لاہور نہیں ہے۔ سنگا پور ہے۔ یہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ دارا  
اگر ہماری سی تلاش میں یہاں آیا ہے تو یہاں اسے کچھ کرنے کا  
موقع نہیں ملے گا۔“

”یہ مت بھولو کہ دارا ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور ایسے  
لوگ ہر جگہ اپنا کام کر گزرتے ہیں۔“ گھنٹہ نے کماؤ چند لکھوں کی  
خاموشی کے بعد بولی ”میری ماں تو سردار پر تاب سنگھ سے بات کرو۔  
وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ اسے علم ہے کہ ہم یہاں  
کن حالات میں آئے تھے۔ سب سے پہلے ہماری ملاقات اسی سے

ہوئی تھی۔ ہمیں یہاں میٹل ہونے میں اس نے مدد دی تھی۔ اس  
کے یہاں کے بڑے لوگوں سے قریبی تعلقات ہیں۔ اس سے بات  
کرو۔ وہ یقیناً اس معاملے میں بھی ہماری مدد کرے گا۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“ عابد علی نے کہا ”پر تاب سنگھ سے  
بات کرنی ہی پڑے گی۔“

وہ ابھی باتیں کر رہی رہے تھے کہ دروازے کی کال بیل بجی۔  
خاموشی میں گھنٹی کی آواز ان دونوں کے لیے بم کے دھماکے سے کم  
نہیں تھی۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ جس قسم کی صورت حال سے وہ  
دوچار تھے، اس کے پیش نظر ان کا خوف زدہ ہو جانا فطری بات  
تھی۔ گھنٹہ کو یوں لگا تھا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔  
عابد علی کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر  
کھڑے ہو گئے تھے۔

”تم ہمیں روکو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ عابد علی دروازے کی طرف  
برہا۔

گھنٹہ اتنی جگہ پر کھڑی رہی۔ وہ جیسے ہی کمرے کے دروازے  
سے باہر نکلا، گھنٹہ نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر ڈرننگ روم کی  
سب سے نیچے والی دروازہ کھولی اور اس میں رکھا ہوا پتول نکال لیا۔  
یہ جرم لوگر پتول انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا۔  
اس کے استعمال کی نوبت اگرچہ کبھی نہیں آئی تھی مگر عابد علی وقتاً  
وقتاً اس کی صفائی کرتا رہتا تھا۔ گھنٹہ پتول لے کر کمرے سے باہر  
آئی اور جب قدموں چلتی ہوئی لاؤنج کے دروازے پر پہنچے کھڑی  
ہو گئی۔

عابد علی کپڑوں میں قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب  
پہنچ چکا تھا اس دوران میں کال بیل ایک مرتبہ اور بج چکی تھی۔  
”کون ہے۔ باہر کون ہے؟“ عابد علی نے دروازے کے قریب  
رک کر پوچھا۔

”میں ہوں یار۔“ باہر سے سردار پر تاب سنگھ کی آواز سنائی  
دی ”دروازہ کھولو۔ سو گئے تھے کیا؟“  
”اوہ!“ عابد علی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔  
اس نے دروازہ کھول دیا۔

پر تاب سنگھ کے اندر آنے کے بعد عابد علی نے دروازہ بند  
کر دیا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر کی طرف آئے گئے۔  
گھنٹہ نے بھی پر تاب سنگھ کی آواز سن لی تھی۔ اس کے منہ سے بے  
اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگے کھڑی  
رہی۔ پتول اس کے ہاتھ میں تھا۔

دروازے میں داخل ہونے کے بعد سردار پر تاب سنگھ ادھر  
ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ خاموشی کیسی ہے۔ پابھو سو گئی ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔  
”نہیں۔“ گھنٹہ بھی باگ رہی ہے۔ ”عابد علی نے جواب دیا۔  
”آج تم میرے ہاں نہیں آئے۔ سوچا میں ہی پتھر لگالوں۔“

پر تاب سنگھ نے کہا اور پھر کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر اس نے پیچھے  
مڑ کر دیکھا۔ گھنٹہ کے ہاتھ میں پتول دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ  
سکا تھا۔

”کیا کل ہے پابھو۔“ پر تاب سنگھ بولا ”آج یہ اسلحہ کیوں  
اٹھا ہوا ہے۔“

”اوہ! کچھ نہیں بھائی جی۔“ گھنٹہ مسکراتے کی کوشش کرتے  
ہوئے بولی ”ایسے ہی۔ میں نے سوچا کوئی چور ڈاکو نہ بھولس لیے میں  
نے۔۔۔۔۔“

”واہ پابھو واہ۔“ پر تاب سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی  
”ہمیں ہی چور ڈاکو کچھ لیا۔“

”نہیں بھائی جی یہ بات نہیں ہے۔“ گھنٹہ جلدی سے بولی  
”صورت حال ہی ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ ہمیں احتیاط سے کام لینا پڑ  
رہا ہے۔“

”کیا بات ہے بھائی عابد علی؟“ پر تاب سنگھ عابد علی کی طرف  
گھوم گیا۔ اس کے لیے میں ایک دم خبیث کی آنکھیں تھیں ”کیا مسئلہ  
ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے اپنے یار کو۔ اگر کوئی ایسی دیکھی بات ہے تو  
جلدی بتاؤ۔ سون رہی رہی۔۔۔۔۔“

”ایک کنبیہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔“ عابد علی اس کی بات کاٹتے  
ہوئے بولا ”میں کچھ دیر میں تمہاری طرف آئے ہی والا تھا۔ آؤ۔  
ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ گھنٹہ تم چائے بنا کر وہاں آ جاؤ۔“

گھنٹہ کچن کی طرف چلی گئی اور وہ دونوں ڈرائنگ روم میں  
آگئے۔ پر تاب سنگھ ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔  
ڈرائنگ روم دیکھ کر عابد علی کی مالی حیثیت کا اندازہ لگا یا جاسکتا تھا۔  
اس نے یہ گھر بنانے میں بڑی محنت کی تھی لیکن اب اسے یہ چھوٹا  
سا آشیانہ بھی بکلیوں کی زد میں نظر آ رہا تھا۔

”ہاں بھی عابد علی۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟“ پر تاب سنگھ نے  
پوچھا۔

”پر تاب سنگھ۔“ عابد علی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا  
”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں یہاں کب اور کن حالات  
میں آیا تھا۔ یہاں اگر تم میری مدد نہ کرتے تو مجھے پھر کیا بیت  
چکی ہوتی۔ میری کوئی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میں نے  
تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے بچے کو لے کر  
پاکستان سے بھاگ کر یہاں کیوں آیا تھا“ اگر میں اپنے ایک دوست  
کی مدد سے پاکستان سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوتا تو ملک  
نوازش علی ہم تینوں کو ختم کروا دیتا۔“ عابد علی چند لکھوں کا خاموش  
ہو گیا۔ اسی دوران میں گھنٹہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔  
اس نے ایک ایک کپ ان دونوں کے سامنے رکھ دیا اور ایک کپ  
خود لے کر بیٹھ گئی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ پر تاب سنگھ نے عابد علی کی طرف دیکھتے  
ہوئے کہا ”تم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور میں



تہماری چٹائی ہی سے متاثر ہوا تھا لیکن یہ تو اپنی بات ہو چکی ہے۔ اب کیا معاملہ ہے؟

”اگرچہ بارہ سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے لیکن جس طرح ہم ملک نوازش علی کو نہیں بھولے اسی طرح ملک نوازش علی نے بھی ہمیں فراموش نہیں کیا۔“ عابد علی بولا۔

”کیا وہ ملک یہاں آگیا ہے؟“ پر تاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ملک نوازش علی نہیں مگر اس کے آدمی یہاں پہنچ گئے ہیں۔“ عابد علی نے کہا اور پھر اسے دارا کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا ”میرا خیال تھا کہ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن اب میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے نہ صرف مجھے دیکھا ہے بلکہ میرے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کر چکا ہے۔۔۔ اس نے میرا فون نمبر معلوم کر لیا ہے اور شاید وہ کبھی دیکھ چکا ہے۔“ عابد علی نے کہا اور فون کا کال کے بارے میں بتانے لگا۔

”ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔“ پر تاب سنگھ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”میرا مطلب ہے اس نے واقعی تمہیں نہ دیکھا ہو اور وہ فون کا کال بھی کسی کی شرارت ہو۔“

”نہیں پر تاب سنگھ۔“ عابد علی نے کہا ”میں کسی خوش فہمی میں جھکا نہیں رہتا چاہتا۔ میں نے تمہیں یہ سب کچھ اس لیے بتایا ہے کہ میں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا سنگا پر چھوڑ دوں؟“

”میرے خیال میں تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پر تاب سنگھ نے کہا ”آج یہاں سے بھاگ جاؤ گے تو کل نہیں اور سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ اگر دارا نے واقعی تمہیں دیکھ لیا ہے تو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چھپنے یا بھاگنے کے بجائے صورت حال کا مقابلہ کرو۔ یہ پاکستان نہیں سنگا پر ہے۔ یہاں اگر کوئی جرم کرنا ہے تو اسے پہلے دس مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ اتنے عرصے میں تم بھی دیکھ چکے ہو کہ یہاں قانون کی گرفت بڑی سخت ہے۔ دارا ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا کہ قانون کے جال میں پھنس جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں تصویر کے دوسرے رخ کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔ اگر تمہیں اس سے اپنی جان کا خطرہ ہے تو تمہاری حفاظت کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ میں صبح ہی اپنے دو بندے تمہاری حفاظت کے لیے مقرر کر دیتا ہوں۔ وہ دونوں آدمی مسلح ہوں گے اور چوہیں گئے تمہارے ساتھ ہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے دوست چینگا شکو کو صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ چینگا شکو کو تم جانتے ہو۔ وہ ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہے۔ وہ تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دے گا۔“

”لیکن۔۔۔ یہ حفاظتی انتظامات کب تک رہیں گے؟“ عابد علی نے کہا ”میں ساری زندگی تو پولیس اور باڈی گارڈز کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔“

”گھبراؤ نہیں یار۔“ پر تاب سنگھ بولا ”ہمارے روز کی بات ہے۔ دارا جب تمہارے گرد حفاظتی انتظامات دیکھے گا تو خاموشی سے واپس چلا جائے گا۔ وہ جب تک یہاں رہے گا تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اگر اس نے کوئی ایسی حرکت کی تو میں رب بدی وہ زندہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔“

پر تاب سنگھ کی باتوں سے عابد علی اور گفتگو کو بڑا حوصلہ ملا تھا۔ ”تم غریبی نہ کرنا بھو۔“ پر تاب سنگھ گفتگو کی طرف ہنسنے ہوئے بولا ”دارا تم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور بھائی عابد علی۔“ وہ اس کی طرف مڑ گیا ”تم بھی اپنے دل سے خوف نہال کر سچ اپنی دکان پر جاؤ اور تسلی سے اپنا کاروبار کرو۔ کسی خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔“

وہ تینوں چائے کی چکیاں لیتے ہوئے اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور پھر رات ایک بجے کے قریب پر تاب سنگھ انہیں تسلیاں دیتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد عابد علی نے خود تمام دروازے لاک کر کے اور گفتگو کے ساتھ بیڈ روم میں آگیا۔ وہ بستر پر لیٹے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ خندہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔ پر تاب سنگھ نے اگرچہ انہیں بھرپور تسلی دی تھی اور ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کر دیا تھا لیکن عابد علی مطمئن نہیں تھا۔ وہ ملک نوازش علی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے درندہ صفت کارندوں سے بھی واقف تھا۔ دارا اس کا سب سے قابل اعتماد اور معتبر ساتھی تھا۔ انتہائی سفاک اور بے رحم انسان بلکہ اسے تو انسان کہنا ہی انسانیت کی توہین تھی۔ انسانی زندگی اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ بارہ سال پہلے عابد علی اس سے بچ نکلا تھا۔ سنگا پر آنے کے بعد عابد علی مطمئن تھا کہ ملک نوازش علی اور اس کے کارندے اس کا سراپا نہیں لگا سکیں گے لیکن بارہ سال بعد یہ انہوں نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ دارا جتنا بے رحم تھا اتنا ہی عیار بھی تھا۔ اس نے عابد علی کو دیکھ لیا تھا مگر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اسے نہیں ڈرنا پڑے لیکن رات ہی کو خاموش فون کا کال نے عابد علی کو یقین دلا دیا تھا کہ دارا نے اسے دیکھ لیا ہے۔

عابد علی رات بھر سوچتا رہا اور بالآخر اس نے پر تاب سنگھ کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پر تاب سنگھ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ بارہ سال پہلے وہ ان سے ڈر کر پاکستان سے بھاگا تھا۔ آج ان کے خوف سے سنگا پر چھوڑ دے گا۔ کل اسے کسی اور جگہ سے بھی بھاگنا پڑے گا کیونکہ وہ ان کے خوف سے زندگی بھر بھاگتا رہے گا۔

”نہیں۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔“ عابد علی بڑبڑایا۔ ”ڈر اور خوف کے سامنے میں زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ اسے یہ خوف دل سے نکالنا ہوگا۔ نڈر ہو کر صورت حال کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ وہ یہاں سے نہیں بھاگے گا۔“

ایک حتی فیصلہ پر پہنچنے کے بعد عابد علی کو یوں محسوس ہوا جیسے

اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو پھر سکون محسوس کرنے لگا۔ اس کی پچاسی نیند کے بوجھ سے جھٹکنے لگیں اور وہ نیند کی پھر سکون وادی میں پہنچ گیا۔

صبح ناشتے کے دوران میں اس نے گفتگو کو بھی اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ وہ ملک نوازش علی اور دارا کے خوف سے یہاں سے بھاگنے کے بجائے یہیں رہ کر صورت حال کا مقابلہ کرے گا۔ ناشتے کے بعد وہ دکان پر جانے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ عابد علی قریب کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسپونڈ کر لیا۔

”ہیلو۔“ وہ پھر سکون لیے میں مانتہ نہیں میں بولا۔ جواب میں پہلے کمری کمری سانسوں اور پھر کہنے کے غرائے جیسی آواز سنائی دی۔ عابد علی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وارا ہی تھا۔ عابد علی کا دل چاہا کہ وہ فون پر ہی دارا کو کھری کھری سنا دے اور اس پر واضح کر دے کہ اب وہ اس سے ڈر کر بھاگے گا۔ نہیں مگر یہ سب کچھ کہنے کے بجائے اس نے ریسپونڈ کر دیا۔

”کون تھا؟“ گفتگو نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہی بد تمیز۔“ عابد علی نے جواب دیا ”لیکن تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی پر تاب سنگھ سے بات کرنا ہوں۔ وہ چینگا شکو فون کر کے ایک دو پولیس والوں کو یہاں بلائے گا۔ وہ پولیس والے تمہاری حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پر تاب سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ دارا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ احتجاج میں چتا ہوں۔“

”پنا خیال رکھنا۔“ گفتگو نے اس کے ساتھ بیوی کی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

عابد علی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ ساتھ والا مکان پر تاب سنگھ کا تھا۔ عابد علی نے کال بتل جانے کی فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور پر تاب سنگھ اندر کی طرف کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اونچی سی دھوئی باندھ رکھی تھی۔ اوپر بنیان تھی اور سر کے بال ایک بالی دار ٹوپی میں لپیٹ رکھے تھے۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا بھائی عابد علی۔“ پر تاب سنگھ بولا ”میں نے تو اچھا سمجھا پہلے چینگا شکو فون کر دیتا ہے۔ اس کے پیچھے ہوئے دو کاشییل یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم اطمینان سے دکان پر جاؤ۔ میرے دو آدمی تمہاری دکان پر پہنچ جائیں گے۔ سوتے سنگھ کو تم جانتے ہو۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوگا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ شیریں کر جیو۔“

”باب۔ اب میں نے شیریں کر رہی جیسے کا فیصلہ کیا ہے۔“ عابد علی نے کہا۔

”خوش کیٹا ای۔“ واہ گردوی قہہ۔ تم نے دل خوش کر دیا۔ جاؤ۔ اب دکان پر جاؤ۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔

عابد علی اس سے ہاتھ ملا کر مکان سے باہر نکل آیا۔ گلی سے نکلتے ہی اسے ٹرٹلٹل گیا اور وہ اپنے معمول کے وقت سے صرف پانچ منٹ کی تاخیر سے دکان پر پہنچ گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد سوتے سنگھ اور اس کا ایک ساتھی بھی آگیا۔ وہ دونوں اونٹنے لیے جو ان تھے۔ ان میں سے ایک دکان کے باہر کھڑا ہوا اور دوسرا اندر۔

اس روز عابد علی دکان پر سہا سہا سا بیٹھا ہوا اس کے دل میں خوف تھا۔ وہ بار بار اپنی سیٹ پر بے چینی سے پہلو دہا رہا۔ دکان کے سامنے سے گزرتے والا ہر شخص اسے مشتبہ نظر آتا۔

اگلے دو تین دن بھی اسی خوف کی کیفیت میں گزرے۔ اس دوران میں نہ تو دارا نظر آیا تھا اور نہ ہی اس کا وہ اجنبی ساتھی اور اس دوران میں اس کے گھر پر وہاں سراہ خاموش فون کال بھی نہیں آئی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے دل سے خوف بے حد بڑھ رہا تھا۔ وہ آگیا۔ اب عابد علی کو یقین ہو گیا تھا کہ دکان پر دارا کی آمد شخص ایک اتفاق تھی اور اس نے عابد علی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموش پڑا سراہ فون کا کال بھی کسی کی شرارت تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ چینگا شکو کے فراہم کردہ دو پولیس والے بدستور عابد علی کے مکان کی حفاظت کر رہے تھے۔ پر تاب سنگھ کے آدمی اس کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اس دوران میں اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جسے غیر معمولی قرار دیا جاسکتا۔ بالآخر عابد علی اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے کوئی خطرہ نہیں ہے اور اس لیے اسے اپنی اپنی کھری کھری حفاظت کے لیے پولیس اور باڈی گارڈز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خوف اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ اس رات اس نے گفتگو سے مشورہ کیا اور پھر اگلے روز پر تاب سنگھ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے پولیس اور باڈی گارڈز کو بٹھایا۔

عابد علی اب پہلے کی طرح معمول کے مطابق اپنا وقت گزارنے لگا۔ اس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا۔ پہلے چند روز کی کیفیت کو بھیماک خواب سمجھ کر اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور اتفاق سے اس روز دھان کی سالگرہ تھی۔ وہ پورے بارہ سال کا ہو چکا تھا اور اس کی زندگی کا تیرھواں سال شروع ہونے والا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی سالگرہ بڑی باقاعدگی سے مناتے تھے لیکن انہوں نے سالگرہ کا پچانگہ کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ یا تو گھر بڑی سادگی سے ایک کٹ لیتے یا کسی ہوٹل میں جا کر ڈنر کر لیتے۔ انہوں نے کبھی کسی مہمان کو سالگرہ پر مدعو نہیں کیا تھا۔

اب اب سنگھ عابد علی کا بہترین دوست تھا لیکن عابد علی نے اسے بھی کسی دھان کی سالگرہ پر مدعو نہیں کیا تھا۔ اس روز وہ صبح سویرے ہی سنتوشا جزیرے پر چلے گئے۔ دن بھر اس خوب صورت جزیرے پر چلک منائی تھی۔ شام کو واپس آکر کچھ دیر آرام کیا اور پھر ہوٹل رائل ہالی ڈسے ران میں ڈنر کا پروگرام بنایا۔

اسکالیں روڑ پر واقع رائل ہائی ڈی لے ان ہوٹل تک جانے میں تو انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گھر سے کچھ ہی دور جا کر ٹیکسی لے لی تھی لیکن رات گیارہ بجے جب وہ ہوٹل سے باہر نکلے تو اتفاق سے اسٹینڈ پر یا اس پاس کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔ انہیں آجروڈ روڈ کے چوراہے تک پیدل آنا پڑا۔ ڈیوٹیا سنی ہوٹل کے سامنے انہیں ٹیکسی مل گئی۔

اپنے بچکے کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر عابد علی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا کہ ایک کار تیزی سے اس گلی میں مڑی اور ان کی ٹیکسی کے قریب آکر رکی۔ سیاہ رنگ کی اس کار کے دروازے کھلے اور چار آدمی کار سے اتر کر عابد علی، ٹگنڈے اور وجدان کی طرف بڑھے۔ ان میں سب سے آگے والے آدمی کو دیکھ کر عابد علی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور اسے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ دارا تھا!

موت کے ان فرشتوں کو اپنے سامنے دیکھ کر عابد علی اور ٹگنڈے کی حالت غیر ہو گئی۔ وجدان کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا۔ اسے صورت حال کا اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کار کستے دیکھ کر پہلے تو وہ سمجھا تھا کہ شاید اس کے ڈیڑی کے دوست آئے ہیں لیکن وہ لوگ جس طرح جلت میں کار سے اترے تھے، وہ انداز دوستانہ نہیں تھا پھر دوستوں کے ہاتھوں میں اسلحہ نہیں ہوتا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بھی صورت حال سمجھ لی تھی۔ ٹیکسی کا انجن اشارت تھا اور اس نے ابھی تک کرایہ نہیں لیا تھا لیکن کار سے اترنے والے ان لوگوں کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور اس نے کرایہ لیے بغیر بڑی بھرتی سے گاڑی کو گیسٹر میں ڈالا اور اسے زبردست جتن سے آگے بڑھا دیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر عابد علی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے جن لوگوں سے چھپنے کی کوشش کرتا رہا تھا، آج بالآخر انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

ان کی تعداد پانچ تھی۔ ایک کار کے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کار کا انجن اشارت تھا۔ چار آدمی کار سے اترے تھے۔ ان میں سب سے آگے دارا تھا جس کے ہاتھ میں ریوالتھ تھا۔ اس کے ساتھ کار سے اترنے والے تین آدمیوں میں سے دو تو چھپی تھے اور ایک غالباً یورپی تھیں۔ ان سب کے ہاتھوں میں چاقو اور خنجر تھے اور چروں پر بے پناہ غماخی تھی۔ عابد علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کرائے کے غنڈے تھے اور دارا نے ہماری معاوضہ

دے کر ان کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

عابد علی کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گردن سمجھا کر ٹگنڈے اور وجدان کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے جیچ اٹھا۔

”بھاگ جاؤ۔ تم لوگ بھاگ جاؤ۔“

”بھاگ کے کہاں جاؤ گے۔“ دارا نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ چہرے کی طرح اس کے لمبے میں بے پناہ سفاکی تھی۔ ”اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے تھے لیکن بالآخر ہم نے تمہیں تلاش کر لی لیا۔ تمہیں دینا کے کسی کو نہ میں ہم سے پناہ نہیں مل سکتی۔ تم اگر پاگلیاں میں بھی جیسے ہوتے تو ہم تمہیں ڈھونڈ نکالتے۔“

”تھ... تھ... کیا چاہتے ہو دارا۔“ عابد علی ہلکا سا۔

”یہ بھی کوئی چھپنے کی بات ہے۔“ دارا نے کہا ”تم نے ملک نوازش علی کے ساتھ غداری کی تھی۔ اسے دھوکا دیا تھا۔ اسے کروڑوں کا نقصان پہنچایا تھا۔ تم اگرچہ ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے مگر ملک نوازش علی تمہیں نہیں بھولا تھا۔ تمہاری تلاش جاری رہی اور بالآخر ہم نے تمہیں ڈھونڈ لی لیا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ عابد علی۔“

”مجھ مار کر تم لوگوں کو کیا ملے گا۔“ عابد علی نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں تم لوگوں سے بالکل لا تعلق ہو چکا ہوں۔ مجھ سے تم لوگوں کو اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میرا اب پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں....“

”تم ہمارے لیے خطرہ بن سکتے ہو۔“ دارا نے اس کی بات کاٹ دی ”ہم نے آسٹریلیا میں اپنے مال کی کھپت کے لیے ایک نئی منڈی تلاش کی ہے۔ سگاپور کو ہم علاقائی بیڈ کوارڈر کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور تم جیسے لوگ یہاں ہمارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ ویسے بھی تم سے تو پرانا حساب پکنا ہے۔ تمہیں زندہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔ چچی فاکٹ“ وہ ایک چھٹی غنڈے کی طرف مڑ گیا ”ختم کرو اسے۔“

”نہیں....“ ٹگنڈے چیختے ہوئے آگے آگئی۔

دارا پتول لیے کھڑا ہوا اور تین غنڈوں نے خنجروں سے عابد علی پر حملہ کر دیا۔ ٹگنڈے اپنے شوہر کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خنجر کے کئی وار اس کے جسم پر بھی لگے۔ ٹگنڈے اور عابد علی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن خنجر کا ہر وار انہیں چھیننے پر مجبور کر دیتا۔ ان کی چیخوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

وجدان ایک طرف کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف و ہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک غنڈے نے اس پر بھی حملہ کرنا چاہا مگر عابد علی وقت پر عابد علی سامنے آ گیا۔

”بھاگ جاؤ۔ وجدان۔ بھاگ جاؤ۔“ عابد علی چیخا۔

وجدان چیخا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن وہ زیادہ دور

نہیں گیا۔ ایک بچکے کے سامنے لان کی باڑھ میں چھپ گیا اور اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ تین غنڈے عابد علی اور ٹگنڈے پر خنجروں سے وار کر رہے تھے اور وہ دونوں بھی طعنہ جی رہے تھے۔

ان کی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں لیکن کوئی ان کی مدد کے لیے باہر نہیں آیا۔ قریب کھڑا ہوا دارا وقفے وقفے سے پتول سے فائرنگ کرتا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے ہی لوگوں کو اپنے گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔

چچی فاکٹنگائی چینی غنڈا ٹگنڈے کو پکڑے ہوئے تھا۔ ٹگنڈے کا جسم لولہمان ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر کئی گز زخم آچکے تھے۔ جن سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر ایک طرف دوڑی۔ چچی فاکٹنگائی خنجر لے کر اس کے پیچھے لگا۔ ٹگنڈے پر تاب سگھ والے بچکے کے سامنے لان کی باڑھ سے اٹھ کر گری۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن چچی فاکٹنگائی اس پر چھلانگ لگی اور اس کے سینے پر پے در پے وار کرنے لگا۔

عابد علی زخموں سے چڑھنے کے باوجود اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اسے بھی موقع مل گیا اور وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن زخموں سے چڑھنے کے باعث زیادہ دور نہیں جا سکا اور لڑکھڑا کر سامنے والے بچکے کے لان کے قریب گر گیا۔ ایک حملہ آور خنجر تانے اس کی طرف لڑکھڑا لیکن ٹھیک اسی وقت پچھلے موڑ سے ایک گاڑی گلی میں مڑی۔

”بھاگو! دارا چچی فاکٹنگ بھاگو! گاڑی میں۔“

وہ سب اپنی کار کی طرف لپکے۔ کار حرکت میں آئی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے کار میں کھس گئے اور کار تیز رفتاری سے اٹھا موڑ گھوم کر نکلا۔ وہاں سے اوجھل ہو گئی۔ دوسری کار گلی میں چند قدم آگے آچکی تھی۔

وجدان ہماڑیوں سے نکل کر اپنی ماں کی طرف دوڑا۔ ”ممی.... ممی....“ وہ ٹگنڈے کو بھونچوڑے ہوئے جیچ رہا تھا مگر ٹگنڈے اس کی پکار کا جواب دینے کے لیے زندہ نہیں رہی تھی۔

وجدان باپ کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ کر چیخنے لگا۔ عابد علی کے جسم پر کئی زخم تھے۔ سینے پر بھی کئی جگہوں سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔

”وجدان۔“ عابد علی کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی ”بھاگ جاؤ۔ یہ لوگ تمہیں بھی مار ڈالیں گے.... اپنی ماں کو.... لے کر بھاگ.... جاؤ۔“

گلی میں داخل ہونے والی کار قریب آکر رکی گئی۔ دو آدمی نیچے اترے۔ ان میں ایک پر تاب سگھ اور دوسرا اس کا دوست نریش کار تھا۔ کار کے بیڈ لیٹس کی روشنی میں وہ منظر دیکھ کر پر تاب سگھ کانپ اٹھا اور چیخا ہوا وجدان کی طرف دوڑا۔

”وے کیا ہوا کا۔“ یہ سب کیا ہوا؟“ پر تاب سگھ نے

وجدان کو عابد علی سے الگ کرتے ہوئے جیچ کر کہا۔ ”چاچا!“ وجدان جیچ کر اس سے لپٹ گیا ”انہوں نے میرے ابو کو مار دیا۔ میری ممی کو بھی مار ڈالا۔“

پر تاب سگھ اپنے بچکے کی طرف دوڑا۔ گیت کے ساتھ ہی لان کی باڑھ میں ٹگنڈے چھپی ہوئی تھی۔ پر تاب سگھ اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ ختم ہو چکی تھی۔ وہ دوڑ کر دوبارہ عابد علی کے قریب آیا۔ ”او بھائی عابد علی۔“ یہ سب کیا ہوا۔ کون تھے وہ لوگ.... وہ

عابد علی کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔ ”پر تاب سگھ۔“ عابد علی کر رہا ”مجھے اسے اٹھاؤ.... مم.... مجھے کہیں لے جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے جسم پر اتنے زخم لگے ہیں کہ میرا زندہ بچنا ممکن نہیں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میری بات.... غور سے.... سنو....“

”تم جیچ جاؤ گے عابد علی.... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم جیچ جاؤ گے۔“ پر تاب سگھ نے کہا اور اپنے دوست کی طرف دیکھ کر چیخا ”نریش کمار! ڈاکٹر کو بلاؤ۔ پولیس کو فون کرو۔ جلدی کرو۔ میرے بار کو بچاؤ۔“

”ڈاکٹر کو بلائے گا کوئی فائدہ نہیں ہوگا پر تاب سگھ۔“ عابد علی نے کراہتے ہوئے کہا ”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میری بات غور سے سن لو۔“

”ہاں ہاں۔ بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“ پر تاب سگھ نے کہا۔ اس نے عابد علی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”انہوں نے ٹگنڈے کو مار ڈالا۔ میں بھی مر رہا ہوں۔“ عابد علی رک رک کر کہہ رہا تھا ”میرا بیٹا اکیلا رہ جائے گا۔ اس کا خیال رکھنا۔“

”تم فکرت کو عابد علی۔“ پر تاب سگھ بولا ”وجدان میرا بڑا

ہے۔ میں اسے اپنے پتر کی طرح پالوں گا۔ سو رب دی۔“ ”ایک بات اور سن لو۔“ عابد علی نے کہا ”ملک نوازش علی اپنے کالے دھندے کے لیے سگاپور میں قدم بٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یہاں میری موجودگی کا پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے دارا جیسے درندے کو یہاں بھیج دیا۔ ہم اس کے بارے میں شش و پنج کا شکار رہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ....“

عابد علی خاموش ہو گیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی رنگت بالکل پھلی پڑ گئی تھی اور بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

”سوں رب دی۔“ پر تاب سگھ بولا ”میں ان درندوں سے تمہارے اور باپ بھوکے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

”تم نہیں۔“ عابد علی بولا ”انتقام میرا بیٹا لے گا۔ اس کی پرورش اس طرح کرنا کہ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہے۔“

”تم گھر ہی مت کرو۔“ پر تاب سگھ بولا ”میں اسے انتقام کا شعلہ بنا دوں گا۔ لاوا بھر دوں گا اس کے جسم میں۔ آتش فشاں بنا دوں گا اسے۔ جب مجھے گاؤں کا توبہ جلا کر رکھ کر دے گا۔ وہ تمہارا



انتقام ضرور لے گا۔

”میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں۔“ عابد علی نے کہا۔ اس کی آواز کچھ اور کمزور سی ہو گئی تھی ”وہ جان کی پرورش کے لیے تمہیں.... دولت کی کمی نہیں ہوگی۔ میں اس کے لیے اتنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اسے ساری زندگی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”میرا سب کچھ بھی تو ہی کا ہے عابد علی۔“ پر تاب نگہ بولا۔ ”میں تمہیں جو بات بتانا چاہتا ہوں وہ غور سے سنو پر تاب نگہ۔“ عابد علی رک رک کر بولا ”لگ نواز علی جی بظاہر تو ایک زمین دار ہے لیکن دراصل وہ ایک بہت بڑا بین الاقوامی اسمگلر ہے۔ بارہ سال پہلے اس کے اسٹگل شدہ سونے کی ایک کھپ میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ میں نے پانچ کروڑ مالیت کا وہ سونا غائب کر دیا تھا اور اسے یہ اثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ سونا میں نے راوی کے پل سے دریا میں پھینک دیا تھا۔ وہ میرا بدترین دشمن بن گیا۔ اس نے میرے گھر کو آگ لگا کر بجھنے، میری بیوی اور میرے بچے کو زندہ جانے کی کوشش کی لیکن میں بچ نکلا اور چوری چھپے پاکستان سے فرار ہو کر یہاں آیا۔ مجھے بعد میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پتا چلا کہ اس نے غالباً میری اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ پانچ کروڑ روپے مالیت کا وہ سونا میں نے دریا میں پھینک دیا تھا۔ وہ سونے کی تلاش کے ساتھ مجھے بھی ڈھونڈتا رہا اور بالآخر اس کے

آوی مجھ تک پہنچ گئے اور اپنا وار کر گزرے۔ مم.... میں.... میں نے وہ سونا دریا میں نہیں پھینکا تھا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ وہ سونا کہاں ہے۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جب بولا تو اس کی آواز کچھ اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔

اس دوران میں آہٹ سن کر پر تاب نگہ نے چیخے مڑ کر دیکھا۔ زلیش کمار اس کے قریب کھڑا تھا۔

”میں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ اسپتال بھی فون کر دیا ہے۔ ایمرٹنس بھی آنے والی ہے۔“ زلیش کمار نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔

”پانی لاؤ تھو وار۔ جلدی کرو۔“ پر تاب نگہ بولا۔ اس دوران میں آس پاس کے بنگلوں سے کچھ لوگ بھی نکل آئے تھے لیکن آگے کوئی نہیں آیا تھا۔ سب اپنے اپنے دروازوں کے سامنے کھڑے تھے۔ زلیش کمار ایک گھر سے پانی مانگ لایا۔ پر تاب نگہ، عابد علی کے حلق میں پانی پینے لگا۔ گربانی اس کے ہونٹوں سے باہر برہم رہا تھا۔ عابد علی نے قریب بیٹھ بٹھ بٹھ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا گیا اور پھر وہ حس و حرکت ہو گیا۔

پر تاب نگہ اس کی نبض ٹوٹنے لگا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا لیکن عابد علی کی روح قفسِ عمری سے پرواز کر چکی تھی۔ پر تاب

نگہ کی آنکھوں سے آنسو برس نکلا۔ اس نے عابد علی کی آنکھیں بند کر دیں اور اس کا سر بڑی آہستگی سے زمین پر ٹکا دیا اور وہ جان کو سینے سے لپٹا لیا۔ وہ جان دھڑکیں مار مار کر رونے لگا اور پھر پر تاب نگہ کی ہانسیوں میں جھول گیا۔

وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس کی جیپ اس کھلی میں مڑی۔ اس کے پیچھے بی ایمرٹنس بھی تھی۔ دونوں گاڑیاں جائے وقوعہ سے چند کڑے فاصلے پر رکتیں۔ جیپ رکتے ہی نصف درجن پولیس والے اتر کر ادھر ادھر پھیل گئے۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج پر تاب نگہ کا دوست چیانگ تھا۔ لوگ پولیس کو دیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔

”چیانگ شو!“ پر تاب نگہ اسے دیکھتے ہی پوچھا ”یہ.... یہ دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے میرے یادگار پانچھو مار ڈالا۔“ ”وہ لوگ کچ کر نہیں جاتیں گے۔“ چیانگ شو نے کہا ”ہم کو بتاؤ۔ یہ سب کیا ہوا۔ تم نے ان لوگ کو کیا کیا؟“

”نہیں۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا ”میں اپنے دوست زلیش کمار کے ساتھ آیا تھا۔ ہماری کار پیچھے ہی اس گلی میں مڑی وہ لوگ ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے لیکن میں جانتا ہوں وہ دارا تھا۔ عابد علی کو اس سے جان کا خطرہ تھا۔“

چیانگ شو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پر تاب نگہ ابھی تک عابد علی کی لاش کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ بے ہوش وجدان اس کی گود میں تھا۔ ”اس بچے کو کیا ہوا؟“ چیانگ شو نے پوچھا ”کیا یہ بھی....“

”نہیں۔ یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا ”یہ عابد علی کا بیٹا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماں باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکا۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔ اگر اسے ہوش میں نہ لایا گیا تو اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔“

اسی وقت سامنے والے گھر سے ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک عورت نکل کر پر تاب نگہ کے قریب آگئے۔ پر تاب نگہ نے وجدان کو ان کے حوالے کر دیا۔ وہ آدمی وجدان کو گود میں اٹھا کر اپنے بچکے میں لے گیا۔ پردوس کی دو تین عورتیں ان کے پیچھے ہی بچکے میں داخل ہو گئی تھیں۔

انسپیکٹر چیانگ شو عابد علی کی لاش کا معائنہ کر رہا تھا پھر وہ گفتگو کی لاش کے قریب چلا گیا۔ کچھ دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا پھر اپنی جیپ کے پاس آیا اور ریڈیو ٹرانسمیٹر پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے فونو گرافر اور دیگر ماہرین کو جائے وقوعہ پر بھیجے کی درخواست کی اور ریڈیو آن کر کے اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے جائے واردات کا جائزہ لینے لگا۔ آس پاس کے بنگلوں میں رہنے والے کچھ

لوگ اب پھر گھروں سے نکل آئے تھے۔ عابد علی اور گفتگو کی لاشیں دیکھ کر سب ہی لوگ افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ انسپیکٹر چیانگ شو گفتگو کی لاش سے چند قدم آگے رک گیا۔ جمادوں کے قریب ہاتھی دانت کے دسے والا ایک خنجر ہوا تھا۔ خنجر کا بلیڈ خون آلود تھا۔ کچھ خون دسے پر بھی لگا ہوا تھا۔ چیانگ شو نے غیب سے رومال نکالا اور اس کی مدد سے بڑی احتیاط سے خنجر اٹھا کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ خنجر کے بلیڈ پر لگا ہوا خون ابھی پوری طرح تازہ تھا۔

”یہ خنجر احتیاط سے رکھ لو۔“ چیانگ شو نے خنجر اپنے ایک ہاتھ کے حوالے کر دیا اور ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ کچھ اور آگے آگئے تھے۔ ان میں ہندوستانی بھی تھے جینی بھی اور دوسری قوموں کے باشندے بھی۔ ”آپ لوگوں میں کوئی اس واردات کے بارے میں کچھ جانتا ہو تو بتاؤ۔“ آگے آکر ہمیں بتائے تاکہ ہم قاتلوں کو آسانی سے تلاش کر سکیں۔“ چیانگ شو نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ سب لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے رہے۔

”دیکھیے!“ چیانگ شو ایک بار پھر لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”قاتلوں کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں کچھ نشانیاں درکار ہیں۔ اگر کوئی کچھ جانتا ہو تو ہماری مدد کرے۔“

اس مرتبہ عابد علی کے سامنے والے بچکے میں رہنے والا تائی شی نامی ایک ادھیڑ عمر چینی آگے آیا۔ ”میں مسٹر!“ چیانگ شو اس کی طرف متوجہ ہو گیا ”آپ کچھ جانتے ہیں؟“

”میں اس وقت بچن میں تھا۔“ تائی شی نے کہا ”پہلے میں نے ایک گاڑی کے رکنے کی آواز سنی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک اور گاڑی بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ ہمارے بچکے کے سامنے رکی اور پھر شور کی آواز سنائی دینے لگی۔ ان میں ایک آواز عابد علی کی تھی جو چیخ کر اپنی بیوی اور بیٹے سے کچھ کہہ رہا تھا پھر اس کی بیوی اور بیٹے کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں بچن سے نکل کر باہر کے گیٹ کے پاس آیا۔ گیٹ کھولنے سے پہلے میں نے گھر میں سے باہر تھانک کر دیکھا تو کاتب کر رہ گیا۔ تین چار آدمی عابد علی اور اس کی بیوی پر خنجروں سے حملے کر رہے تھے۔ لیے قد کا ایک آدمی کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے ہاتھ اور اٹھا کر ہوائی فائر کیا اور پھر وہ وقتے وقتے سے فائر کرتا رہا۔ میرے خیال میں اس طرح اس کی فائرنگ کا مقصد یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکے۔“ تائی شی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”حملہ آور بے دردی سے عابد علی اور اس کی بیوی پر خنجروں سے حملے کر رہے تھے۔ ان کا بیٹا بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔“

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

# احساس کمتری

اسباب تدارک علاج

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔

قیمت 25 روپے  
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذیلہ  
تنگی ٹی آرڈر مار سال کریں

مکتبہ نفسیات  
پتہ: 944، مین سٹریٹ، لاہور۔ فون: 5802552-5805313  
کتابیں کی قیمتیں اور دیگر معلومات کے لیے رشتہ جلیل سٹور، 1-4-2001  
kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

میں دو ڈکرائنڈر لگایا۔ میں ان لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں دوڑتا ہوا اپنے گھر سے میں لگایا۔ میں نے پولیس کو اطلاع دینے کے لیے فون کا ریسور اٹھا لیا تو پتا چلا کہ فون ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سے بند ہو چکا تھا۔

”میں دوبارہ گیت کے پاس لگایا۔ اس وقت حملہ آور سیاہ رنگ کی ایک کار میں فرار ہو رہے تھے۔ میں نے ان میں سے صرف ایک آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ لمبے قد کا درے بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ہندوستانی یا شاید پاکستانی تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس شخص کا حلیہ بتاتے لگا۔

”اس کے ساتھی کون تھے؟“ انسپکٹر چینگ شونے پوچھا۔

”چینی تھے لیکن میں ان کی شکلیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔“ تائی شی نے کہا۔

”تم نے اس کار کا نمبر دیکھا تھا مسٹر تائی شی؟“ چینگ شونے پوچھا۔

”نہیں۔ میں نمبر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ سیاہ رنگ کی ٹویوٹا تھی۔“ تائی شی نے بتایا۔

”اگر دوبارہ اس آدمی کو دیکھ لو تو پہچان لو گے؟“ چینگ شونے پوچھا۔

”شاید۔“ تائی شی نے مختصر سا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ چینگ شونے بولا ”میں آپ کا تحریری بیان لینے کے لیے آپ کو دوبارہ زحمت دوں گا۔ کسی کو کوئی اور بات معلوم ہو تو پلیز ہماری مدد کرے۔“

لیکن کوئی آگے نہیں آیا۔ اسی دوران میں پولیس کی ایک اور گاڑی گلی میں آکر رکی۔ اس میں سے تین آدمی نیچے اترے۔ ایک تو پولیس کا فوٹو گرافر تھا اور دو ہوی سائیڈ کے ماہرین۔ فوٹو گرافر چینگ شونے کی ہدایت پر جانے واردات اور لاٹوں کی تصویریں کھینچنے لگا جبکہ ہوی سائیڈ کے ماہرین نے اپنے طور پر تحقیق شروع کر دی تھی۔

مختلف لوگوں کے بیانات لیے گئے۔ واردات کا چشم دید گواہ کوئی نہیں تھا۔ تائی شی کے علاوہ سب ہی نے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے چھپنے اور فارتگ کی آوازیں سنی تھیں لیکن خوف کی وجہ سے کوئی بھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ البتہ یہ بیان سب نے دیا تھا کہ عابد علی ایک شریف آدمی تھا۔ اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ مکان اس نے تقریباً چھ سال پہلے خریدا تھا۔ تمام پڑوسیوں سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ چھ سال کے اس عرصے میں کسی سے اس کا کوئی معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی بیوی شگفتہ بھی بہت خوش اخلاق اور لمٹار عورت تھی۔ بڑوں میں سب گھروں میں اس کا آنا جانا تھا اور اس گلی میں رہنے والی تمام خواتین سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ پولیس آفیسر گلی کے لوگوں کے بیانات لے رہا تھا کہ کسی نے

اگر بتایا کہ وجدان ہوش میں لگیا ہے۔

”وجدان کون ہے؟“ ہوی سائیڈ کے ایک آفیسر نے چینگ شونے کی طرف دیکھا۔

”مقتولین کا بارہ سالہ بیٹا اور اس واردات کا واحد چشم دید گواہ۔“ انسپکٹر چینگ شونے بتایا۔

”اوہ!“ ہوی سائیڈ آفیسر چونک گیا ”اس کا بیان بہت ضروری ہے۔ وہ ہمیں قاتلوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔“

وہ لوگ اس جگہ میں آگئے جہاں وجدان ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل پیلا ہوا تھا۔ جیسے جسم کا سارا خون نچر گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دیرانی جھلک رہی تھی اور وہ پلک پلپتہ بغیر سامنے والی دیوار کو کھور رہا تھا۔

”کا کا۔“ پر تاب نگہ اس کے قریب پلگ پر بیٹھ گیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھرنے لگا ”اب کیسے ہو بیٹا۔“

”چاچا۔“ وجدان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ”میری ماما میرے ابو۔۔۔۔۔“

”حوصلہ کر بیٹا۔“ پر تاب نگہ نے اسے اٹھا کر گلے سے لگالیا۔

”وجدان ڈیر!“ ہوی سائیڈ آفیسر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے ان لوگوں کو اپنے ڈیڑھ اور مہرے پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بتا سکتے ہو وہ کون لوگ تھے؟“

”را۔۔۔۔۔ دارا۔۔۔۔۔“ وجدان روتے ہوئے بولا ”ابو نے اسے دارا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی آ رہے تھے۔“

”وہ تین آدمی کون تھے؟“ آفیسر نے پوچھا۔

وجدان جواب دینے کے بجائے چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔

”آفیسر!“ پر تاب نگہ ہوی سائیڈ آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یہ بچہ ابھی اس قابل نہیں ہے کہ تفصیل سے کوئی بیان دے سکے۔ اس وقت اس سے کوئی سوال نہ کریں۔ یہ صدمے سے بڑھ چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے مسٹر پر تاب نگہ۔“ ہوی سائیڈ آفیسر نے کہا ”آپ ان کے پڑوسی ہیں۔ یہ بچہ آپ کی تحویل میں رہے گا۔ ان کے کوئی اور رشتے دار ہوں تو انہیں بھی اطلاع دے دیں۔ اس بچے کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے اور حفاظت بھی۔“ ہوی سائیڈ آفیسر چینگ شونے کی طرف مڑ گیا ”انسپکٹر! یہ بچہ اس واردات کا واحد چشم دید گواہ ہے۔ اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اگر مسٹر پر تاب نگہ کی گاڑی اس وقت گلی میں نہ مڑتی تو شاید وہ لوگ اسے بھی مار دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ لوگ اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کریں گے اس لیے اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔“

”فکر مت کرو آفیسر۔“ چینگ شونے جواب دیا ”میں اس مکان پر دو مسلح کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔“

وہ لوگ مکان سے باہر آگئے۔ لاشیں اٹھانے سے پہلے عابد علی کے لباس کی تلاشی کی گئی تھی اور بیویوں سے برآمد ہونے والی تمام اشیاء کی فہرست بنا کر مشیر نامہ تیار کیا گیا۔ مکان کی چابیاں پر تاب نگہ کے حوالے کر دی گئیں اور کچھ دیر بعد جب لاشیں اٹھا کر اسپتال لے گئیں تو وجدان دھڑلے مار مار کر رونے لگا۔ وہ پر تاب نگہ سے سنبھالنے نہیں سنبھل رہا تھا۔ یہ اندوہناک منظر دیکھ کر وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بھی جھجک گئی تھیں۔

وجدان ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ پر تاب نگہ اسے اپنے گھر میں لے آیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وجدان ہوش میں لگایا لیکن پر تاب نگہ کو خضرہ تھا کہ اس کا بیٹی تو زندہ بچ جائے۔ اس معصوم بچے پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماں باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ تو بچہ تھا۔ کوئی بڑا بھی ہو تو شاید اپنے آپ کو نہ سنبھال پاتا۔

پر تاب نگہ کے مکان میں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں جو وجدان کو سینے سے لپٹا لپٹا کر اسے دلاسا دے رہی تھیں۔ گلی کے تمام گھروں میں وجدان کا آنا جانا تھا۔ وہ ان تمام خواتین سے مانوس تھا۔ ہر ایک سے لپٹ لپٹ کر رو رہا تھا۔

”نریش کمار۔“ پر تاب نگہ اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ڈاکٹر رحمن کو فون کر دو۔ مجھے ڈر ہے کہ وجدان کو کچھ ہونے جائے۔ سون رہ دی۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں۔۔۔۔۔ تم ڈاکٹر رحمن کو فون کر دو۔“

نریش کمار لاڑ پوچھ میں رکھے ہوئے فون کے قریب آیا اور ریسور اٹھا کر ڈاکٹر رحمن کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ کال کافی دیر بعد ریسپو کی گئی تھی۔ ڈاکٹر رحمن پر تاب نگہ اور عابد علی کا مشترکہ دوست تھا بلکہ پہلے اس کی دوستی عابد علی سے ہوئی تھی اور اس کے بعد پر تاب نگہ سے متعارف ہوا تھا۔ ان تینوں میں بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ نریش کمار کی بھی کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

”ڈاکٹر رحمن۔“ نریش کمار لاش لٹے ہوئے بولا ”عابد علی اور اس کی بیوی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کے بیٹے کی حالت تشویش ناک ہے۔“

”عابد علی اور شگفتہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔“ ڈاکٹر رحمن کی آواز سے نیر کا شمار غائب ہو گیا۔ اس نے نریش کمار کی آواز بھی پہچان لی تھی ”تم کہاں سے بول رہے ہو نریش۔ انہیں کس نے قتل کیا ہے۔ کہاں۔۔۔۔۔“

”ان دونوں کو ان کے گھر کے سامنے قتل کیا گیا ہے۔“ نریش کمار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”میں پر تاب نگہ کے گھر سے بول رہا ہوں۔ تم یہیں آ جاؤ۔“

”وجدان زیادہ زخمی ہے کیا؟“ ڈاکٹر رحمن نے پوچھا۔

”وہ زخمی نہیں ہے۔“ نریش کمار نے جواب دیا ”جب اس کے ماں باپ کو قتل کیا جا رہا تھا تو وہ چھپ گیا تھا جس وجہ سے وہ بچ گیا لیکن صدمے سے وہ بار بار بے ہوش ہو رہا ہے۔ خدشہ ہے کہ اس کے دماغ پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں آ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر رحمن نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نریش کمار نے ریسور رکھ دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر رحمن پہنچ گیا۔ وجدان کی حالت اس وقت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اب وہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی باتیں کرنے لگا تھا جو دوسروں کی سمجھ سے بالاتر تھیں ڈاکٹر رحمن نے اسے انجکشن لگا دیا۔

”چھایا کیا جو تم نے مجھے بالایا پر تاب نگہ۔“ ڈاکٹر رحمن نے کہا ”یہ صدمہ اس کے لیے بہت شدید ہے۔ باہت لڑکا ہے جو اب تک سب کچھ برداشت کر لیا۔ اس کا ذہن متاثر ہو سکتا ہے۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ سو جائے گا۔ اسے سکون اور آرام کی بہت ضرورت ہے۔“

”میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا سون رہ دی۔“ پر تاب نگہ بولا۔

”فکر یہ سب کچھ ہو کیسے؟“ ڈاکٹر رحمن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں معلوم ہے چند روز پہلے عابد علی کو اپنا ایک پرانا دشمن نظر آیا تھا۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا ”میں ان لوگوں کے خوف سے یہ بارہ سال پہلے اپنا وطن۔۔۔ چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ اس روز دارا کو دیکھ کر عابد علی ڈر گیا تھا۔ میں نے اس کی حفاظت کا بندوبست کر دیا تھا۔ دو باڈی گارڈ رکھ دیے تھے لیکن دس بارہ دن تک کوئی بات نہیں ہوئی۔ عابد علی یہی سمجھا کہ شاید دارا نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ شخص سیدو تفریح کے لیے یا کسی اور کام سے سگھ پور آیا ہو اور اتفاقاً عابد علی کی نظروں میں آیا ہو اور عابد علی یہ سمجھا ہو کہ وہ اسی کی تلاش میں آیا ہے۔ بہر حال جب کچھ نہیں ہوا تو عابد علی نے باڈی گارڈز ہٹا دیے۔ وہ سمجھا ہو گا کہ شاید دارا واپس چاچا کے لیے لیکن اس کے سارے اندازے غلط نکلے۔ دارا اس کی تاک میں تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔“ پر تاب نگہ چند لمحوں کو خاموشی ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کنگے لٹے ”کل وجدان کی سالگرہ تھی۔ وہ بارہ سال کا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ سارا دن ستوشا میں پلنگ مانتے رہے۔ رات کو شاید ڈنر کے لیے کسی ہوٹل میں گئے تھے اور مجھے یقین ہے کہ دارا اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کی تاک میں ہو گا۔“

”اتفاق۔۔۔۔۔ میں بھی نریش کمار کے ساتھ ڈنر پر گیا ہوا تھا۔ واپس پر ہماری کار جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی یہاں پہلے ہی سے



کالے رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ میں نے اپنی کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تین چار آدمیوں کو دو ڈرکار کالے رنگ کی اس کار میں بیٹھے دیکھا۔ وہ کار تیزی سے آگے روانہ ہوگی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ کون لوگ تھے اور اس طرح کیوں بھاگے تھے مگر جب ہم نے اپنی کار روکی تو خون خرابا نظر آیا۔ یا بھو شگفتہ ختم ہو چکی تھی۔ عابد علی شدید زخمی تھا۔ اس نے میری گود میں دم توڑا تھا۔ میں وہ سب کچھ نہیں بھول سکتا یا رہ۔ یہ معصوم بچہ جس طرح ہلک ہلک کر رہا تھا۔ اس نے میرے دھنکے کھڑے کر دیے تھے۔ تم خود سوچو یا رہ۔ جس بچے کے سامنے اس کے ماں باپ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو....

"اسے کچھ نہیں ہو گا پر تاب سنگھ۔" ڈاکٹر رحمن نے وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے زیادہ سے زیادہ تندر اور آرام کی ضرورت ہے۔ دو چار دن اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اس کے بعد بتدریج صدمہ کم ہوتا چلا جائے گا اور یہ اپنے آپ کو سنبھال لے گا۔"

"اور اس کے بعد؟" پر تاب سنگھ بولا "کیا وجدان یہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے اسے فراموش کر دے گا؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر رحمن نے کہا "وجدان یہ سب کچھ کبھی نہیں بھول سکے گا۔ یہ واقعہ بھیاںک یا دین کر اس کے دماغ میں پکار رہے گا اور شاید یہی بھیاںک یا داس کی زندگی کا راستہ بدل دے۔"

"اسے اپنی زندگی کا راستہ بدانا ہو گا۔" پر تاب سنگھ نے کہتے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ انجکشن اپنا اثر دکھا رہا تھا اور وہ تندر کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔ نیند میں بھی وہ سکیاں جھرجھرا رہا تھا۔

○☆☆○

صدے کا اثر کم ہو جائے اور اس میں حوصلہ پیدا ہو۔ وجدان ایک باہمت لڑاکا تھا۔ اس کے ذہن نے بہت جلد صورت حال کو قبول کر لیا۔ پر تاب سنگھ کی باتوں نے بھی اسے سنبھلنے میں مدد دی تھی۔

اس دوران میں اخبارات... بڑی باقاعدگی سے نمایاں طور پر اس واقعے کو کوریج دیتے رہے تھے۔ جزیرے پر یوں تو وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اخبارات میں جرائم کی خبریں بھی چھپی رہتی تھیں لیکن دہرے قتل کی ایسی خوفناک واردات کبھی نہیں ہوئی تھی اس لیے اخبارات بھی اسے اچھی خاصی اہمیت دے رہے تھے اور لوگ بھی دلچسپی سے یہ خبریں پڑھتے تھے۔ ہر شخص یہ جاننا چاہتا تھا کہ قاتلوں کا سراغ ملا یا نہیں۔

اخبارات کے نمائندے اور فوٹو گرافرز بار بار پر تاب سنگھ کے گھر کے چکر لگا رہے تھے۔ وہ لوگ وجدان کا انٹرویو چھاپنا چاہتے تھے لیکن پر تاب سنگھ نے کسی کو بھی وجدان کے قریب نہیں جھٹکنے دیا۔ پولیس بھی وجدان کا بیان لینا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر رحمن نے اجازت نہیں دی۔ اس نے پولیس پر واضح کر دیا تھا کہ وجدان ابھی ذہنی طور پر اس قابل نہیں ہے کہ پولیس کے سوالات کے جواب دے سکے۔

اخبارات نے یہ بھی لکھا تھا کہ وجدان اس لڑخیز واردات کا واحد چشم دید گواہ ہے۔ وہ ایک طرف اگر پولیس کے لیے اہم تھا تو دوسری طرف قاتلوں کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اخبارات نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ عابد علی اور شگفتہ کے قاتل وجدان کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے اس لیے اس کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے۔ پولیس نے اس کی حفاظت کے لیے صرف دو کانٹینبل تعینات کیے تھے اور اخبارات نے اس پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

○☆☆○

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صورت حال کسی قدر نارمل ہو گئی تھی اور ڈاکٹر رحمن کے خیال میں وجدان بھی اب اس قابل تھا کہ پولیس کا سامنا کر سکے اس لیے اس نے پولیس کو اس کا بیان لینے کی اجازت دے دی۔

انجکشن جیالک شو اور ہوئی سائینڈ آفیسر وجدان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور وجدان انہیں بتا رہا تھا کہ اس روز یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔

"تم نے کہا ہے کہ تمہارے ڈیڑی نے اس شخص کو دارا کے نام سے مخاطب کیا تھا۔" ہوئی سائینڈ آفیسر نے کہا "کیا تم بتا سکتے ہو یہ دارا کون ہے۔ اس سے پہلے تم نے اسے دیکھا تھا۔ وہ تمہارے ڈیڑی سے ملے تو آتا ہو گا۔"

"نہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" وجدان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "وہ بھی میرے ڈیڑی سے

ملنے کے لیے نہیں آیا۔"

"اپنے ڈیڑی اور ممی کی باتوں میں تم نے کبھی اس کا نام نہ لیا۔" آفیسر نے پوچھا۔

"ہاں۔" وجدان نے جواب دیا "قتل سے چند روز پہلے ایک رات ڈیڑی جب گھر آئے تو بہت خوف زدہ تھے۔ اس رات میں نے ممی اور ڈیڑی کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ ڈیڑی کہہ رہے تھے کہ ملک نواز ش علی ہمیں نہیں بھولا اور دارا میرا آیا ہے۔"

"ملک نواز ش علی کون ہے؟" ہوئی سائینڈ آفیسر نے پوچھا۔

"یہ بچہ اسے نہیں جانتا۔ میں بعد میں آپ کو بتاؤں گا کہ ملک نواز ش علی کون ہے اور دارا کون ہے۔" پر تاب سنگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"اس رات تم نے دارا کو دیکھا تھا۔ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" آفیسر نے وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وجدان چند لمحوں خاموش رہا پھر وہ دارا کا حلیہ بتانے لگا۔ دارا اور اس کے آدمیوں نے کار سے اتر کر جب ان لوگوں کو گھیرا تھا تو اس وقت وجدان اگرچہ خوف زدہ تھا لیکن دارا کا حلیہ اسے یاد تھا۔ اس خونی کار چہوہ تو اس کے ذہن کی لوح پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے کبھی بھول سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ہوئی سائینڈ آفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا "اب تم آرام کرو لیٹا اور دل و دماغ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ تم جوان اور باہمت لڑکے ہو۔ تم نے جس طرح یہ صدمہ برداشت کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ ہم تمہارے ڈیڑی اور ممی کے قاتلوں کو ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ کر نہیں جاسکتے۔"

"اگر قانون انہیں نہ ڈھونڈ سکا تو میں اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو تلاش کروں گا۔" وجدان نے کہا۔

ان سب نے چونک کر وجدان کی طرف دیکھا۔ اس کے لیے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"دل خوش کیٹا ای پتر!" پر تاب سنگھ، وجدان کا کندھا تپتے تپتے ہوئے بولا "اگر قانون تمہارے ماں باپ کے قاتلوں کا سراغ نہ لگا سکا تو تم انہیں تلاش کر کے کیفر کردار کو پہنچاؤ گے۔ ان کی تلاش میں، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ وہ یہاں نہ ملے تو ہم پاکستان جائیں گے۔ وہاں بھی نہ ملے تو پوری دنیا میں انہیں تلاش کریں گے۔ ہم انہیں چھوڑیں گے نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"دونوں پولیس آفیسر گھور کر پر تاب سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ رخصت ہونے سے پہلے جب وہ پر تاب سنگھ سے ہاتھ مار رہے تھے تو انجکشن جیالک شوئے گا۔

"پر تاب سنگھ! تم ہم سے ملنا۔ تم سے بات کرے گا۔"

"ضرور ملوں گا انجکٹر۔" پر تاب سنگھ نے جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر رحمن کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر

وہ بھی چلا گیا۔ پر تاب سنگھ اسے چھوڑنے کے لیے باہر کے دروازے تک آیا تو ایک فوٹو گرافر دروازے پر متعین پولیس والوں سے بحث کر رہا تھا۔ وہ اندر جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا تاکہ وجدان کی تصویریں کھینچ سکے۔

"کیا بات ہے بھائی۔ کیوں بحث کر رہے ہو ان سے۔" پر تاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"ایک تصویر۔ صرف ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ پر تاب سنگھ جی۔" فوٹو گرافر نے کہا۔ وہ اسٹریش میں مائل تھا۔ "فوٹو گرافر تھوڑا قریب پر تاب سنگھ کو جانتا تھا۔

"کیا ایک۔ تم جتنی تصویریں بنا لو میرے بار۔ پورا رول کھینچ والو۔ میں تیار ہوں۔" پر تاب سنگھ اپنی چٹری درست کرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آپ کی تصویر نہیں سردار جی۔ اس بچے کی تصویر۔" فوٹو گرافر نے کہا۔

"کیوں۔ میرا چوکھٹا پنڈ نہیں آیا۔" پر تاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"آپ کی ایک تصویر تو میں چھاپ چکا ہوں سردار جی۔ اگر آپ مجھے اس بچے کی صرف ایک تصویر کھینچنے دیں تو میرا کیمرہ خراب ہو جائے گا۔" فوٹو گرافر بولا۔

"اور اس بچے کا کیمرہ بلکہ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔" پر تاب سنگھ نے اسے گھورتے ہوئے کہا "قتل سے کام لو تم لوگ۔ تم جانتے ہو وہ اس واردات کا واحد چشم دید گواہ ہے اور قاتل اسے نہیں پہچانتے۔ اگر اس کی تصویر اخبار میں چھپ گئی تو وہ آسانی سے شناخت کر لیا جائے گا اور شاید اس کے بعد وہ دو چار دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ جا میرے بار۔ بچہ چلا جا۔ وہاں کسی جتنی چٹری والی میم کی تصویر کھینچ کر اخبار میں چھاپ دیتا۔"

"سردار جی..."

"نہیں بھائی۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ تو بہتر ہے۔" پر تاب سنگھ نے سرد مہری سے جواب دیا اور دروازہ بند کر کے اندر آیا۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے اور گھر میں پر تاب سنگھ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کمرے میں آکر کچھ دیر تک وجدان سے باتیں کرنا رہا پھر جین میں آکر چائے پینے لگا۔

پر تاب سنگھ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی عمر اگرچہ پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن صحت قابل رشک تھی۔ اچھی صحت کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگتا تھا۔

پر تاب سنگھ جب اپنے ماں باپ کے ساتھ سگا رہا تو آیا تھا تو اس کی عمر چند سال تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے اپنے باپ کے ساتھ بڑی محنت کی تھی۔ اس کے باپ گورکھ سنگھ کی جائیداد میں کرپا نے ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔

لیکن دکان اتنی نہیں چلتی تھی۔ سرائے کی کمی کی وجہ سے دکان کا سامان پورا نہیں تھا۔ اکثر گاہک مطلوبہ چیز نہ ملنے کے باعث واپس چلے جاتے تھے۔

انہی دنوں گورکھ سنگھ کا ایک رشتہ دار دو سال سنگ پور میں رہنے کے بعد واپس آیا تو اسے دیکھ کر گورکھ سنگھ کی آنکھیں ٹپکی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ شخص جب جاندھر سے گیا تھا تو اس کے پاس صرف تن کے کپڑے تھے اور دو سال بعد واپس آیا تو تھلے والے بھی اسے دیکھ کر ادنیوں میں اٹھیاں داب کر رہ گئے تھے۔ وہ اتنا پیسہ اور سامان لے کر آیا تھا کہ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے صرف دو سال میں کمایا ہے۔ حالانکہ دو سال کے اس عرصے کے دوران میں بھی وہ اپنے گھروالوں کو پرہیز پیسے بھیجتا رہتا تھا۔

اسے دیکھ کر گورکھ سنگھ بھی سمجھا کہ سنگ پور میں جہن برستا ہے۔ جاندھر میں رہ کر خدمت اور اغلاسی کی چٹکی میں پس رہا تھا۔ کتنے کو وہ دکان دار تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ دکان کی کمائی سے اس کا اپنے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ ان کا کتبہ صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ وہ خود اس کی بیوی اور دو بچے ایک پر تاب سنگھ اور دوسری اس کی بہن سریندر کور۔

گورکھ سنگھ نے بھی سنگ پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دکان اور مکان بیچ دیا اور زیدہ ماہ کے اندر اندر سنگ پور پہنچ گیا۔ یہاں آکر اسے پتا چلا کہ سنگ پور میں بھی جائزہ خرچ سے دولت کمانا آسان نہیں ہے۔ وہ کچھ عرصہ محنت مزدوری کر تا رہا پھر اسے ایک پرانی ٹیکسی سٹے دماون ٹی ٹی اور وہ ٹیکسی چلانے لگا۔

پر تاب سنگھ کو پڑھنے کا شوق تھا۔ اسے تاریخ سے دلچسپی تھی۔ اس خوب صورت جزیرے کی بیرونی سیاحت کے دوران میں اسے احساس ہوا کہ جزیرے کی تاریخ پر ایک دلچسپ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اس نے محکمہ سیاحت سے رابطہ قائم کیا تو اسے یہ جان کر بڑی مایوس ہوئی کہ محکمہ سیاحت پہلے ہی ایسی ایک نہیں کئی کتابیں چھاپ چکا ہے مگر پر تاب سنگھ نے بہت نہیں ہاری اور بالآخر ایک مردانہ کے توسط سے سنگ پور کے ایک پرنٹنگ ہاؤس سے اس کا معاہدہ ہو گیا۔

ہوٹل نے مختلف ممالک میں اپنی پبلیٹی کے لیے پہلے ہی سے ایک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس منصوبے کے تحت مختلف زبانوں میں کئی کتابیں چھپ چکے تھے۔ پر تاب سنگھ سے ہندی زبان میں کتابچہ لکھنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ پر تاب سنگھ ہندی زبان بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یہ مختصر سا کتابچہ لکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس کا لکھا ہوا کتابچہ بہت پسند کیا گیا تھا۔ خوب صورت تصاویر نے اس میں اور بھی خوب صورتی پیدا کر دی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اپنے طور پر سنگ پور کی تاریخ مرتب کرنے میں پر تاب سنگھ

نے بڑی محنت کی تھی اور اس میں کئی مہینے لگے تھے۔

۱۷۷۷ء میں کلکتہ میں پہلے ہوئے اس جزیرے کو جنوبی ایشیا کا دروازہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں ایشیا کی تمام تہذیبیں موجود ہیں۔ یہ جھوٹا سا خوب صورت جزیرہ ملائیشیا کے قدیموں میں واقع ہے اور ایک ٹنگ سی سمندری بی بی سے ملائیشیا کے مین لینڈ سے الگ کرتی ہے۔ ڈبل ایسٹ، جنوبی ایشیا اور..... چین کے سمندری راستوں کے سنگم پر ہونے کی وجہ سے سیاحت اور تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

سنگ پور میں ہندوستانی باشندوں کی آمد ۱۸۰۰ء میں شروع ہوئی۔ ایک تجارتی معاہدے کے تحت کلکتہ میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے برطانوی افسروں نے سنگ پور میں کام لینے کے لیے ہندوستانی قیدیوں کو وہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ وہاں انہیں جیلوں میں رکھنے کے بجائے محکمہ آزادی دے دی گئی اور وہ اپنی پسند کے کاروبار کرنے لگے۔

ہندوستانی باشندے جس علاقے میں آباد ہیں اسے "مٹل انڈیا" کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ مٹل گون روڈ پر واقع ہے۔ یہاں بیچ کر بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے کسی قدیم علاقے میں آگے ہوں۔ یہاں ہر قسم کی دکانیں ہیں اور ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہے۔

پر تاب سنگھ کا مرتب کیا ہوا ہندی زبان میں چھاپا ہوا یہ کتابچہ اس پرنٹنگ ہاؤس کی طرف سے ہندوستان میں تقسیم کیا گیا تھا اور پر تاب سنگھ کو اس کتابچے کی تیار کی سلسلے میں ایک ہزار ڈالر ملے تھے۔ اس کام کا یہ معاوضہ اگرچہ بہت کم تھا لیکن پر تاب سنگھ نے اسے بھی غنیمت سمجھا تھا۔ اس آمدنی کے علاوہ اسے کتابچے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ سنگ پور کی تاریخ سے آگاہی کے علاوہ اسے اس جزیرے کے بچے بچتے سے واقفیت ہو گئی تھی۔

پر تاب سنگھ کالج کے آخری سال میں تھا۔ فاضل ایجوکیشنر ہونے میں تقریباً دو مہینے باقی تھے۔ اس روز وہ کالج سے واپسی پر اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ سارا دن اس کا باب گورکھ سنگھ ٹیکسی چلا آتا تھا رات آٹھ بجے کے بعد پر تاب سنگھ ٹیکسی چلا کر آتا تھا۔ ان دنوں اس کی رہائشی ٹھکانہ انڈیا میں واقع ایک ٹنگ سی ٹنگی کے چھوٹے مکان میں تھی۔ ٹیکسی باہر مین روڈ پر کرائے کے ایک کیراج میں کھڑی کی جاتی تھی۔ اس روز گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے کیراج کے سامنے ٹیکسی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اسے اس وقت ٹیکسی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ عام طور پر اس کا باب شام سات بجے واپس آتا کرتا تھا۔

"کی گھل ہے بابو۔ آج تم جلدی آگے۔" اس نے گھر میں داخل ہو کر باب کا سامنا ہوتے ہی پوچھا۔

"آہو پو پو، گورکھ سنگھ نے جواب دیا "پاکستان سے ایک ٹیلی

سیرو تقریب کے لیے آئی ہے۔ انہوں نے مجھے رات بھر کے لیے چمک کر لیا ہے۔ سات بجے جانا ہے۔ میں نے سوچا کہ ٹیکسی کو کچھ آرام کرا دوں۔"

"مجھے جانا ہو گا؟" پر تاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے باب کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ میں ہی جاؤں گا۔" گورکھ سنگھ نے جواب دیا "تمہاری ماں اور بہن کھار سنگھ کے گھر جا رہی ہیں۔ میں انہیں چھوڑنا ہوا چلا جاؤں گا۔ تم رات دس بجے کے قریب انہیں جا کر لے آؤ۔"

"ٹنگی ہے بابو۔ اس دوران میں تمہارا پڑھ لوں گا۔" پر تاب سنگھ نے کہا۔

پانچ دس منٹ بعد پر تاب سنگھ کے گھر والے چلے گئے اور وہ دھنسنے کے لیے بیٹھ گیا اور پھر اس کے بعد اسے اپنی بہن اور ماں باب کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ نوبے کے قریب اسے اطلاع ملی کہ اس کے گھروالوں کو حادثہ پیش آیا ہے۔ اطلاع لانے والا بھی ایک ٹیکسی ڈرائیور ہی تھا۔ پر تاب سنگھ اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔ برکت نام کا وہ ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور مسلمان تھا۔ پر تاب سنگھ بھی اسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ برکت راستے میں اسے بتا رہا تھا کہ گورکھ سنگھ کی ٹیکسی کو حادثہ ڈرائے کاٹ لایو میٹر ٹیکسنگ کلب کے قریب پیش آیا تھا۔ پر تاب سنگھ کے دل میں طرح طرح کے دوسرے آ رہے تھے۔ اس کے باب کا دوست کھار سنگھ ٹیکسنگ کلب میں کام کرتا تھا اور اس کی رہائش بھی کلب کے قریب ہی تھی۔ پر تاب سنگھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ٹیکسی کو حادثہ کلب کی طرف جاتے ہوئے پیش آیا تھا یا واپسی پر۔

"بابو ٹیکسی میں اٹھ گیا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔" پر تاب سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے برکت سے پوچھا "میرا مطلب ہے میری بہن اور بے بے بھی گاڑی میں تھیں یا نہیں۔" وہ انہیں کھار سنگھ کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ اس کے بعد بابو کو کہیں اور جانا تھا۔ پاکستان سے آنے والی کسی فیملی نے رات بھر کے لیے اس کی ٹیکسی بک کر دی تھی۔

"اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں اور وہ یقیناً تمہاری ماں اور بہن ہوں گی۔" برکت نے ٹیکسی کو ایک دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ حادثہ کیسے پیش آیا۔ تم نے دیکھا ہے انہیں۔ وہ کیسے ہیں؟" پر تاب سنگھ نے پوچھا۔ اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"ڈرائے کاٹ لایو میٹر پر ایک موٹر کاٹے ہوئے پٹرول کا ایک تیز رفتار ٹینکر ٹیکسی سے ٹکرا گیا تھا۔" برکت نے جواب دیا۔ وہ پوری بات گول کر گیا تھا۔

پر تاب سنگھ کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ٹیکسی کے

پٹرول ٹینکر سے ٹکرائے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ اپنے سوال کا جواب سننے کی اپنے اندر بہت نہیں پا رہا تھا۔ "جوصلہ رکھ پار۔" برکت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایسے حادثے تو زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ زندگی حادثوں ہی کا تو نام ہے۔"

پر تاب سنگھ خاموش بیٹھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا۔ تقریباً چالیس منٹ بعد وہ ڈرائے کاٹ لایو میٹر پہنچ گئے۔ کچھ آگے جا کر برکت کو ٹیکسی روک لینی پڑی۔ آگے ٹریفک جام تھا اور اس سے کچھ آگے لوگوں کا جھوم نظر آ رہا تھا۔

پر تاب سنگھ ٹیکسی سے اتر کر دوڑنے لگا۔ جھوم کے قریب پہنچ کر وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا لیکن آگے نکلنے ہی اسے ایک جھٹکے سے رک جانا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں اٹھیا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

بڑا ہی خوف ناک منظر تھا اس کے سامنے۔ پوری سڑک پر تیل بکھرا ہوا تھا۔ سڑک کے عین وسط میں پٹرول کا ٹینکر الٹا پڑا تھا۔ ٹینکر چلا ہوا تھا۔ اس کی آگ غالباً کچھ دیر پہلے ہی بجھ چکی تھی۔ کہیں کہیں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ ٹینکر سے تقریباً دس گز آگے اس کے باب کی ٹیکسی بھی الٹی پڑی تھی۔ ٹیکسی بھی جل کر کھلا ہو چکی تھی۔ پچھلی طرف کا کچھ حصہ جلنے سے محفوظ رہ گیا تھا اور لائسنس پلیٹ کا نمبر صاف نظر آ رہا تھا۔ چار پانچ پولیس والے جلی ہوئی ٹیکسی کے قریب کھڑے تھے۔

پولیس والوں نے لوگوں کو دور رکھنے کے لیے سڑک کو گھیر رکھا تھا۔ پر تاب سنگھ لوگوں کو ہٹاتا ہوا پیسے ہی آگے بڑھا، دو پولیس والوں نے اسے روک لیا۔

"اسے سردار! رک جاؤ۔ تم آگے نہیں جاسکتے۔ پیچھے ہٹو۔"

ایک پولیس والے نے پیچ کر کہا۔

"د..... د..... ہماری ٹیکسی ہے۔ اس میں میرا بابو اور...." پر تاب سنگھ ہلکا کر رہ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پولیس والا عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے نہ صرف پر تاب سنگھ کو آگے جانے کی اجازت دے دی بلکہ خود بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ قریب پہنچ کر اس نے ایک آئینہ فرکو پر تاب سنگھ کے بارے میں بتایا۔

پر تاب سنگھ ایک پولیس آفسر کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر اسے پولیس محسوس ہوا جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ٹیکسی بری طرح چلی ہوئی تھی۔ پٹرول کا ٹینکر ٹانگا اسے دور تک گھمٹتا ہوا لایا تھا۔ ٹیکسی کے دروازے اندر کو دھن کر پھنک گئے تھے اور ٹیکسی میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ جلی ہوئی لاشیں۔ اس کے پچھلے پاؤں اور بہن کی لاشیں جل کر کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

پر تاب سنگھ اس اندھونک منظر کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھرا چھا گیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے لہرایا



اور پھر دھڑام سے نیچے گر گیا۔

پر تاب گھگہ کی روز بعد اپنے آپ کو سنبھال سکا تھا۔ اس کی بہن اور ماں باپ ختم ہو چکے تھے۔ دنیا میں ان کا کوئی بدل نہیں تھا لیکن حکومت کی طرف سے اسے اتنا معاوضہ مل گیا کہ اسے اپنے بیروں پر کھڑے ہونے کا سہارا مل گیا۔ اگر وہ بیرویل فیکٹری گورنمنٹ کا نہ ہوتا تو اسے کچھ بھی نہ ملتا۔

امتحان سے فارغ ہوتے ہی اس نے کسی کام دھندے کے بارے میں سوچا۔ وہ کیسی چلا سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ ایک نہیں چار ٹیکسیاں خرید سکتا لیکن کیسی چلانے کا خیال اس نے ذہن سے نکال دیا۔ سنگ پور کی تمام مارکیٹوں میں گھومنے اور جائزہ لینے کے بعد اس نے وہ کام شروع کر دیا جس میں نقصان کا اندیشہ کم تھا۔ وہ بڑے بیویا بیویوں سے مال لے کر چھوٹے دکان داروں کو پلائی کرتے لگا۔ اس میں اگرچہ محنت زیادہ تھی لیکن چار پیسے بچ جاتے تھے۔

کئی سال تک پر تاب گھگہ بھی کام کرتا رہا پھر اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خود اسپورٹ کا کام شروع کر دیا۔ وہ ہندوستان سے مرجع سالے سنگھو کا سنگ پور میں پلائی کرتے لگا۔ یہاں مسالا جات کے تین امپورر اور بھی تھے مگر پر تاب گھگہ کو اس فیلڈ میں قدم بٹانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

ٹٹل انڈیا والا مکان چھوڑ کر فورٹ کیننگ روڈ والے مکان میں منتقل ہو گیا۔ ٹٹل انڈیا والا مکان اس کے باپ نے کرائے پر لیا تھا۔ ماں باپ کے... انتقال کے بعد جب اس کے پاس پیسے آئے تو اس نے وہ مکان خرید لیا اور اب جبکہ وہ فورٹ کیننگ روڈ والے مکان میں منتقل ہو چکا تھا تو اس نے وہ مکان بھی نہیں چھوڑا تھا۔

آج سے بارہ سال پہلے اس کی ملاقات عابد علی سے ہوئی تھی۔ عابد علی اور اس کی بیوی شگفتہ چند روز پہلے ہی پاکستان سے آئے تھے اور ٹٹل انڈیا میں واقع ایک گھنٹیا سے رست ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی روز ان کا سامان چوری ہو گیا تھا۔ شگفتہ کی گود میں دو ماہ کا بچہ تھا اور وہ دونوں میاں بیوی کام کی تلاش میں در در کی ٹھوکریاں کھا رہے تھے۔

پر تاب گھگہ کے پاس بھی عابد علی کی تلاش ہی میں آیا تھا۔ اس وقت شگفتہ بھی اس کے ساتھ تھی جس نے دو ماہ کے بچے کو اپنے سینے سے لپٹا رکھا تھا۔ پر تاب گھگہ کو نجانبے عابد علی میں ایسی کیا بات نظر آئی کہ اس نے عابد علی کو نہ صرف اپنے پاس ملازم رکھ لیا بلکہ رہائش کے لیے اپنا ٹٹل انڈیا والا مکان بھی دے دیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک مینے کا راشن بھی ڈلوایا اور دو مینے کی تنخواہ بھی ایڈوانس دے دی۔

چھ مہینے بعد پر تاب گھگہ نے عابد علی کو سنٹر پوائنٹ میں ملازمت دلوا دی۔ سنٹر پوائنٹ سنگھو پور کا سب سے بڑا شاہجگ

آرکیڈ تھا۔ یہاں تنخواہ بھی زیادہ تھی اور کمیشن بھی اچھا خاصا مل جاتا تھا۔

پر تاب گھگہ اور عابد علی دوستی کے گہرے رشتے میں منسلک ہو چکے تھے۔ وہ شگفتہ کو بامعوضہ لگتا۔ شگفتہ بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ لگتا تھا جیسے پر تاب گھگہ بھی اسی شخص سے کہنے کا ایک رک رک ہو۔

وجدان پر تاب گھگہ کی گود میں پلا بڑھا تھا۔ وہ اسے چاہتا تھا تو پر تاب گھگہ جھوم اٹھتا۔ عابد علی نے چند سال نوکری کی۔ اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ اس نے نوکری چھوڑ کر چائنا ٹاؤن میں جہل اسٹور کھول لیا۔ اس سے پہلے اس نے پر تاب گھگہ کے بیویوں میں وہ مکان خرید لیا تھا۔ مکان کی خرید اور اسٹور کھولنے کے سلسلے میں پر تاب گھگہ نے عابد علی کی مالی مدد بھی کی تھی۔

پر تاب گھگہ کی شادی چھ سال پہلے ہوئی تھی لیکن شادی کے ایک سال بعد زچنگ کے دوران میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے جس بچی کو جنم دیا تھا وہ بھی زندہ نہیں بچ سکی تھی۔ اس کے بعد پر تاب گھگہ کے کئی دوستوں نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا لیکن پر تاب گھگہ نے اب شادی کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا۔ اس موضوع پر ایک روز عابد علی سے بھی بڑی کرارم بحث ہوئی تھی لیکن پر تاب گھگہ نے دوسری شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ان سب کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی اور پھر اچانک ہی عابد علی کی زندگی میں بھونچال آیا۔ دارا کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ پر تاب گھگہ نے اگرچہ اسے تسلی دی تھی کہ ذہن کی ضرورت نہیں۔ ان کی حفاظت کا بھی مقتول انتظام کر دیا گیا تھا لیکن انہیں کیا معلوم کہ موت گھاٹ لگائے بیٹھی ہے اور پھر موقع پاتے ہی موت ان پر بھج پڑی تھی۔

وجدان کے ساتھ جو کچھ بیت رہی تھی پر تاب گھگہ کو اس کا احساس تھا۔ وہ بھی اس کرب سے گزر چکا تھا۔ وہ بھی چشم زدن میں اپنے ماں باپ سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ صدمہ برداشت کیا تھا۔ اس نے اپنی بہن اور ماں باپ کی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں۔ انہیں چھیننے اور ترپے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ وجدان نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو چھیننے ترپے اور مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بڑا باہمت لڑکا تھا جو یہ سب کچھ صدمہ گیا تھا۔ ماں باپ کے معاملے میں دونوں بد قسمت ثابت ہوئے تھے۔

پر تاب گھگہ اور وجدان میں یہ فرق تھا کہ پر تاب گھگہ کے ماں باپ ایک حادثے کا شکار ہوئے تھے اور حکومت نے اسے معاوضہ بھی دے دیا تھا جس سے اپنے بیویوں پر کھڑے ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ جبکہ وجدان ایک مختلف صورت حال کا شکار تھا اس کے ماں باپ قتل ہوئے تھے اور وہ اس دہرے قتل کا چشم دید گواہ تھا۔

اس نے قاتلوں کو دیکھا تھا۔ انہیں پہچان سکتا تھا۔ قاتلوں کو بھی احساس تھا کہ وجدان انہیں چھانسی کے خنجر پر بھینچ سکتا ہے۔ وہ یقیناً اس کی تک میں ہوں گے۔ اس طرح وجدان کی زندگی کو بھی خطرہ تھا۔ اگرچہ اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا تھا لیکن پر تاب گھگہ جانتا تھا کہ اس کے دشمن موقع ملے ہی اس پر وار کریں گے۔

پر تاب گھگہ گھر میں بھی سائے کی طرح وجدان کے ساتھ لگا رہتا۔ ایک لمحے کو بھی اسے اپنی نگاہوں سے ادھملا نہ ہونے دیتا۔ وہ اگر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا تو بھی پر تاب گھگہ اس کے پیچھے پہنچ جاتا۔ باہر دو مسلح پولیس والے چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ پر تاب گھگہ کے اپنے دو گن میں تھے جو ہر وقت مکان کے آس پاس چلتے رہتے تھے اور کبھی سے گزرنے والے ہر شخص پر نگاہ رکھتے تھے۔

پر تاب گھگہ کو اپنے کاروبار کی فکر نہیں تھی۔ کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اس کے قابل اعتماد ملازمین موجود تھے۔ وہ خود بھی ٹٹل فون پر اپنی باتوں سے بات کرتا رہتا تھا۔ اسے صرف وجدان کی فکر تھی۔ وہ اسے نہ صرف دشمنوں سے بچانا چاہتا تھا بلکہ اس کی پرورش اس انداز سے کرنا چاہتا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام لے سکے اور اپنے دشمنوں کو خاک و خون میں لوٹا سکے۔

پر تاب گھگہ نے کالج کی تعلیم کے دوران میں مارشل آرٹ سیکھا تھا۔ وہ بلیک بیٹ تھا اور مزید آگے جانا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں اس کے ماں باپ کو وہ حادثہ پیش آیا۔ وہ اپنے بیویوں پر کھڑا ہونے کے جتن کرنے لگا۔ مارشل آرٹ سے اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن اب اس کے پاس وقت نہیں تھا اور اب اس صورت حال میں ایک بار پھر اس نے دل میں مارشل آرٹ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ وہ وجدان کو بھی مارشل آرٹ کا پھر پانا چاہتا تھا کہ آئندہ زندگی میں اپنا دفاع کر سکے۔

اس شام وہ کئی روز بعد وجدان کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلا۔ دونوں پولیس کا کنٹینل بھی ان کے ساتھ تھے اور پر تاب گھگہ کے اپنے باڈی گارڈ بھی۔ اس رات پر تاب گھگہ نے چنری پارک شیرن ہوٹل میں دنز کارڈرگرام بنایا تھا۔ یہ ہوٹل اس کے مکان سے خاصا دور تھا اور پر تاب گھگہ نے اس کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا۔ وہ اندازہ لگاتا چاہتا تھا کہ کسی کی نظروں میں آتے ہیں یا نہیں۔

ایک کار میں پر تاب گھگہ اور وجدان سوار تھے۔ پچھلی سیٹ پر دونوں کانٹینل بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری گاڑی پر تاب گھگہ کے دونوں باڈی گارڈ تھے۔ دونوں گاڑیاں فورٹ کیننگ روڈ سے نکل کر کھلی سینی ایویٹ پر گئیں اور توڑا اسی فاصلے طے کرنے کے بعد چٹانگ روڈ پر ٹرن گئیں۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان تقریباً تین گز کا فاصلہ تھا۔

ایشیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے پر تاب گھگہ کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ سامنے گئے ہوئے آئینے میں پیچھے آنے والی باڈی گارڈ کی گاڑی پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

کار سرسٹ روڈ پر امرین ایکسپریس سنٹر کے سامنے سے گزرتی ہوئی آچر ڈبے وارڈ کی طرف مڑی۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اس کشادہ سڑک پر ٹریفک کا جھوم تھا۔ پر تاب گھگہ بڑے خطا انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔

ایک طویل فاصلے طے کرنے کے بعد کار ٹائمن سن روڈ پر مڑی اور کچھ آگے جا کر ایک اور موڑ کاٹتے ہوئے سینٹ مارٹن ڈرائیو کی طرف گھوم گئی۔ چنری پارک شیرن ہوٹل اس سڑک کے اختتام پر تھا۔

دبچ و عریض پارکنگ لائٹ پر گاڑی روکنے کے بعد وہ نیچے اتر آئے۔ دوسری گاڑی بھی ان سے کچھ فاصلے پر رک گئی تھی۔ دونوں پولیس والے باہر ہی رک گئے لیکن پر تاب گھگہ باڈی گارڈ جو سادہ لباس میں تھے ان کے ساتھ اندر آ گئے۔ پر تاب گھگہ نے پہلے ہی میز پر قبضہ کر رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی ڈائنگ ہال میں داخل ہوئے ہیڈ ویئر نے انہیں ان کی میز پر بچھا دیا۔

وجدان اپنے ماں باپ کے ساتھ اکثر ہوٹلوں میں جاتا رہا تھا لیکن یہاں وہ پہلی بار آیا تھا۔ اس کے لیے ہر چیز نئی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ٹھوڑی سی دیر بعد ان کی میز پر کھانا سرو کر دیا گیا۔ کھانا سرو کرنے والی حسین ویٹریس نے بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا اور اس کے گال پر ہلکی سی چمکی کاٹی۔

کھانے کے بعد وہ تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر ہوٹل کے شاہجگ آرکیڈ میں گھومنے لگے۔ ایک گفت شاپ سے پر تاب گھگہ نے وجدان کو دو تین چیزیں خرید کر دیں اور پھر ہوٹل سے باہر آ گئے۔

دونوں کار میں ہوٹل کی حدود سے نکل کر سڑک پر آ گئیں۔ سینٹ مارٹن ڈرائیو کے اختتام پر پر تاب گھگہ نے کار آچر ڈبے وارڈ کے بجائے ٹیکسٹ روڈ پر موڑ لی اور کچھ ہی فاصلے طے کرنے کے بعد وہ آچر ڈبے روڈ پر آ گئے۔

یہ شہر کی سب سے بڑی اور باوقوف سڑک تھی۔ تمام بڑے بڑے ہوٹل، شاہجگ سینٹر، بڑی بڑی عمارتیں، ٹائٹ کلب اور کاروباری دفاتر اس سڑک پر اور اس کے آس پاس واقع تھے۔ یہ علاقہ شہر کا دل کہلاتا تھا۔ آٹھ بجے تک بڑے بڑے شاہجگ سینٹر کھلے رہتے تھے۔ دوسری دکانیں اور ہوٹل وغیرہ دیر تک کھلے رہتے تھے اور اسی طرح تقریباً آدھی رات تک یہاں رونق رہتی تھی۔ لیڈو میجر سے ذرا پہلے ایک ٹریفک سگنل پر پر تاب گھگہ کو گاڑی روک لی گئی۔ اس سے آگے دو گاڑیاں اور تھیں۔ پہلے ہی گاڑیوں کی قطار لگ گئی تھی۔ وجدان اپنی سیٹ پر بیٹھا ادھر ادھر

دیکھ رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل کار کے قریب ہی آکر رکی۔ موٹر سائیکل پر دو آدمی سوار تھے۔ وجدان ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں چپٹی تھے۔ آگے والے آدمی کے ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر تھے۔ دوسرے آدمی کے ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر تھے۔ وہ بڑے تھے اور وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جیسے ہی وجدان کی نظروں میں آیا وہ چیخ اٹھا۔

”چاچا... یہ ہے وہ غنڈہ! اس نے مارا خاموشی کی کو۔“  
پر تاب سگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ موٹر سائیکل سوار چپٹی نے بھی وجدان کی چیخ کی آواز سن لی تھی۔ اس نے وجدان کی طرف دیکھا اور پھر دو سرے ہی لئے وہ سیدھا ہو گیا۔ موٹر سائیکل اچھل کر آگے بڑھ گئی۔

پر تاب سگھ اور پولیس والے بڑی پھرتی سے کار سے اتر آئے لیکن موٹر سائیکل چور اپنے ہتھیار بڑی تیزی سے گھٹل توڑی ہوئی سامنے والے ٹریفک کے جھرم میں غائب ہو چکی تھی۔

پر تاب سگھ اور دونوں کاٹھنیل دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انجن اشارت دی تھی۔ پر تاب نے گاڑی کو گیسٹر میں ڈال کر کچھ پر پیر رکھ دیا۔ گھٹل ایک منٹ بعد کھلا تھا۔ آگے والی دونوں گاڑیاں جیسے ہی حرکت میں آئیں پر تاب سگھ نے اسٹیرنگ موڑتے ہوئے کچھ چھوڑ دیا۔ گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے اچھل کر آگے بڑھی۔ پر تاب سگھ نے ایک سیکنڈ پر پیر کا دباؤ ڈال دیا۔ گاڑی طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی۔

اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا پر تاب سگھ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے اس موٹر سائیکل کی تلاش تھی۔ کراؤن پر پیرس ہوٹل کے موڑ پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک لی اور گھرے گھرے سانس لیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیڈو جیسے کراؤن پر پیرس ہوٹل تک راستے میں آئیں بائیں کی پہلی بڑی سڑک پر پہنچی تھیں۔ وہ موٹر سائیکل نہانے کس طرف نکل گئی ہوگی۔

”نکل گئے۔“ پر تاب سگھ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر ہاتھ مارے ہوئے بولا ”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے حملہ کیا تھا؟“

”ہاں چاچا۔“ وجدان بولا ”موٹر سائیکل پر جو شخص آگے بیٹھا ہوا تھا اس نے مجی کو قتل کیا تھا۔ دوسرے کو میں نہیں جانتا لیکن ان چوروں کو تو میں بھی نہیں بھول سکتا جنہوں نے میرے ماں باپ کو مارا ہے۔“

”نظر نہ کر پتر۔“ پر تاب سگھ نے کہا ”یہ لوگ بچ کر نہیں جائیں گے۔ سوں رب دی میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور بولا ”میرا خیال ہے کہ وہ ہمارا پیچھا نہیں کر رہے تھے محض اتفاق سے سامنے آگئے تھے۔ تم انہیں پہچان کر پیچھے تو رہ دو حواس ہو کر بھاگ کئے۔“

اسی دوران میں دوسری گاڑی بھی ان کے پیچھے آکر رک گئی۔

سوٹر سگھ نامی گاڑی اپنی گاڑی سے اتر کر ان کے قریب گیا اور پر تاب سگھ کی طرف کھڑکی پر جھپٹے ہوئے بولا۔

”کیا گل ہے جی۔ آپ اتنی تیزی سے وہاں سے کیوں نکلے تھے۔ ہم تو پریشان ہو گئے تھے۔“

”ایک بندہ نظر آیا تھا۔“ پر تاب سگھ نے کہا ”وجدان نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے چیخ کر مجھے اس کے بارے میں بتایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ تو اپنی پٹ پٹ پٹنی نکال لے گیا لیکن میرے آگے دو گاڑیاں تھیں۔ مجھے گھٹل کھلنے کا انتظار کرنا پڑا۔ گھٹل کھلنے ہی میں نے گاڑی دوڑا دی لیکن وہ پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے۔“

سوٹر سگھ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک موٹر سائیکل وہاں آکر رکی۔ وہ پولیس کا سارجنٹ تھا۔ اسے دیکھ کر پر تاب سگھ کا داغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ سڑک پر اس طرح گاڑی کھڑی کرنا خلاف قانون ہے۔ اس نے جلدی سے انجن اشارت کر دیا لیکن اس دوران میں سارجنٹ موٹر سائیکل سے اتر کر اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ چپٹی تھا۔

”تم کو معلوم اس طرح گاڑی کھڑی کرنا جرم ہے!“  
”معلوم ہی معلوم۔“ پر تاب سگھ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”غلطی ہو گئی سرکار۔ اس مرتبہ معاف کر دو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”معاف کر دیا۔“ چپٹی سارجنٹ بولا ”ہم تم کو وارنٹ دیتا۔ آئندہ دیا غلطی مت کرنا نکلتا۔“

”نہیں مانگتا سرکار۔“ پر تاب سگھ نے کہتے ہوئے گاڑی کو گیسٹر میں ڈال دیا اور اسے چلنے سے روک دیا۔ اس دوران میں سوٹر سگھ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی گاڑی بھی حرکت میں آچکی تھی۔

پر تاب سگھ کی کاری رفتار بکلی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید وہ موٹر سائیکل سوار کہیں نظر آجائیں مگر وہ بھی اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ پہچان لیے جانے کے بعد بھی اسی علاقے میں گھومتے رہتے۔

گھر پہنچنے کے بعد پر تاب سگھ دیر تک سوچتا رہا کہ عابد علی اور شگفتہ کے قاتلوں نے انہی تک نابالغی بات نہیں سوچی تھی کہ اس واردات میں زندہ بچ جانے والا بچہ ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن اب جبکہ وجدان نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا تھا، انہیں خطرے کا احساس ہو جائے گا اور وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔

وجدان کے لیے اب خطرہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ماں باپ کے قتل کے بعد سے وجدان اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ وہ پر تاب سگھ کے گھر ہی رہ رہا تھا لیکن آج اچانک ہی اسے گھر کی یاد آئی۔

”چاچا۔“ وہ پر تاب سگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔ بے پلوتا مجھے۔“

”میں نے تمہارے مکان کی چابیاں پتا نہیں کہاں رکھ دی ہیں۔“

”پر تاب سگھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا ”میں صبح تھیں لے چلوں گا۔“

چابیاں پر تاب سگھ کے کتے کے پیچھے رکھی ہوئی تھیں۔ گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ساتھ والا دروازہ تو تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر ٹال دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک ایک چیز کو دیکھ کر وجدان کو اپنے ماں باپ کی یاد آجائے گی تو وہ رونا شروع کر دے گا۔ اس کی طبیعت خراب ہو جائے گی اور اس کی رات بے چینی میں گزرے گی۔

وہ وجدان کو بھلانے کے لیے دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس چپٹی کے بارے میں بھی اس نے کئی سوال کیے تھے۔

”اس کی شکل میں بھی نہیں بھول سکتا چاچا۔“ وجدان نے اس کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”اسے تو میں جہاں بھی دیکھ لوں گا پچھان لوں گا اور ہاں... مجھے یاد آ رہا ہے کہ دارا نے اسے نام سے بھی مخاطب کیا تھا۔ وہ نام کیا تھا...“ وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا لیکن نام اسے یاد نہیں آیا ”مجی یاد نہیں تو ہاں۔“ اس کے لیے میں بے بسی تھی ”لیکن یاد آجائے گا۔ میں رات بھر سوچوں گا۔“

”مجھے یقین ہے کہ دارا نے تمہارے ماں باپ پر حملہ کرانے کے لیے کرائے کے قاتلوں کی خدمات حاصل کی ہوں گی اور وہ بھی ان میں سے ایک ہوگا۔ اگر اس کا نام معلوم ہو جائے تو اسے آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ زیر زمین دنیا میں میرے بھی کچھ جاننے والے ہیں۔ کسی نے کسی سے اس کا پتہ چل جائے گا۔“

”فکرت کو چاچا۔“ وجدان نے پراعتاد لیے میں کہا ”میں نے اسے صورت سے پہچان لیا ہے تو اس کا نام بھی مجھے یاد آجائے گا۔“

”چھاپتر۔“ پر تاب سگھ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”اب تم سو جاؤ۔ صبحات کریں گے۔“

”میں کب تک گھر میں بند رہوں گا چاچا۔“ وجدان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میرے اسکول کا کیا ہوگا۔ میری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔“

”مجی چند روز تک تو تمہیں اسکول سے چھٹی کرنی پڑے گی۔ جب تک یہ لوگ پکڑے نہیں جاتے، آزادی سے گھومنا پھرنا تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جہاں تک تمہاری پڑھائی کا تعلق ہے تو ایسا کرو۔ کل سے میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔“

”فیک ہے چاچا لیکن اگر وہ لوگ نہ پکڑے گئے تو کیا میں کبھی گھر سے نہیں نکل سکوں گا پتر وجدان نے کہا۔

”وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔ ضرور پکڑے جائیں گے۔“ پر تاب سگھ نے جواب دیا ”اگر قانون ان کا سراغ نہ لگا۔ پتا تو میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ تمہارے ماں باپ کے قاتلوں کی تلاش کو میں نے اپنا مشن بنایا ہے۔ جب تک ان سے انتقام نہیں لے لوں گا، مجھے بھی چین نہیں آئے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں زندہ ہوں۔ نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے دوں گا اور نہ ہی عابد علی اور پاجو شگفتہ کے قاتلوں کو معاف کروں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا چاچا۔“ وجدان نے پھر اعتماد سے میں کہا۔

”ہاں پتر۔“ پر تاب سگھ نے جواب دیا ”انتقام ہم دونوں کا مشن ہے اور ہم اسے پایہ تکمیل تک ضرور پہنچائیں گے۔“

وجدان جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے چھت کو گھورتا رہا۔ پر تاب سگھ بھی خاموش رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وجدان تو سو گیا مگر پر تاب سگھ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو وجدان پہلے ہی جاگ چکا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ناشتے سے نمٹ کر پر تاب سگھ نے چابیاں اٹھائیں اور وجدان کو لے کر مکان سے باہر آیا۔ پکڑے دیر تک وہ کھلی میں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں گلی میں رہنے والا کیتھوا نامی ایک باری اپنے گھر سے نکل کر وہاں آیا۔ وہ لوگ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر کیتھوا کے جانے کے بعد پر تاب سگھ نے جیب سے چابیاں کا گچھا نکالا اور عابد علی کے مکان کے گیٹ کا آلا کھولنے لگا۔

دو تین منٹ بعد وہ مکان کے اندر موجود تھے۔ مکان کا دروازہ کھلی دھڑ بھڑ بھڑ بھڑ تھا۔ ہر چیز گرد آلود تھی۔ اسے یاد تھا شگفتہ صفائی کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گھر کی ہر چیز سنبھلتے اپنی جگہ رکھی ہوئی اور صاف ستھری نظر آتی گراں ہر چیز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ پر تاب سگھ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ سکیوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وجدان لاؤنج میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سکیوں کی آواز بیڑہ دوم سے آ رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بیڑہ دوم میں داخل ہو گیا۔

وجدان آتش دان کے سامنے کھڑا تھا۔ کارنس پر اسٹین لیس اسٹیل کے خوب صورت فریم میں عابد علی اور شگفتہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ شگفتہ کی گود میں وجدان تھا۔ جس وقت یہ تصویر کھینچی گئی تھی اس وقت وجدان کی عمر ایک سال یا اس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

وجدان نے دونوں ہاتھوں سے فریم کو قدام رکھا تھا اور تصویر کو دیکھ کر سسکایا بھر رہا تھا۔ پر تاب سگھ نے اس کے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔

”وجدان پتر! وہ نرم لمبے میں بولا ”مجھے معلوم ہے تمہارے دل پر گھر سے زخم لگے ہیں۔ میرے ساتھ مجی بھی پکڑے ایسا ہی ہوا تھا۔

میں نے بھی اپنے باپ کی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں تو اپنے  
میراں کو بھینٹا تھا لیکن تم نے جس حوصلے سے یہ صدمہ بھیا ہے وہ  
قابلِ تعریف ہے۔ اب ممبر کو پتہ چاہئے والے واپس نہیں آتے  
مگر اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ تم جس اذیت اور کرب سے گزر  
رہے ہو اس کا مجھے اندازہ ہے مگر اب ممبر کو حوصلہ اور مہربانی  
اس دکھ کا علاج ہے۔ حوصلے سے کام لو پتہ! ”  
”اتنا حوصلہ کہاں سے لاؤں چاہا۔“ وجدان کہتے ہوئے اس  
سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

پر تاب سنگھ اس کا دکھنا جھپٹتا رہا اور اس کے سر پر ہاتھ  
پھیرتا رہا۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی ٹپک ٹپک نہ تھیں۔ کتنی دیر بعد  
وجدان اپنی کیفیت پر قابو پا سکا تھا۔ وجدان پورے گھر میں گھوم رہا  
تھا اور ایک ایک چیز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پر تاب  
سنگھ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر بندہ دوم میں  
آ گئے۔

بندہ دوم میں ایک دیوار کے ساتھ تقریباً چھ فٹ چوڑی اور  
آٹھ فٹ اونچی کھڑکی کی الماری بنی ہوئی تھی۔ جس کے تین  
دروازے تھے۔ ایک دروازے میں چابیوں کا کچھا بھی لٹکا ہوا تھا۔  
وجدان نے چابی گھما کر وہ دروازہ کھول دیا۔ الماری کے اس حصے  
میں گھنٹے کے پڑے بیگنوں پر ٹنگے ہوئے تھے۔ زیادہ تر ساریاں  
تھیں۔ نچلے حصے میں شیٹوں پر پتہ شدہ کپڑے رکھے ہوئے تھے۔  
اس نے دروازہ بند کر کے الماری کا دوسرا حصہ کھول لیا۔ اس  
الماری میں عاید علی کے کپڑے تھے۔ وجدان کچھ دیر ان کپڑوں کو  
دیکھتا رہا پھر اس نے الماری کا تیسرا دروازہ کھول لیا۔

الماری کے اس حصے میں اور نیچے کی شیٹ بنے ہوئے تھے۔  
جس میں فائیں اور رجز وغیرہ شیٹیں سے رکھے ہوئے تھے۔ سب  
سے نیچے ایک دروازہ تھی۔ وجدان نے جبکہ کہ وہ دروازہ کھول لی۔  
پر تاب سنگھ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وجدان جب سیدھا ہوا تو اس  
گتے ہاتھ میں پستول دیکھ کر پر تاب سنگھ چونک گیا۔

”ارے بیٹا! یہ کیا۔ لاؤ یہ پستول مجھے دے دو۔“ پر تاب سنگھ  
بولتا۔

”نہیں چاہا۔“ وجدان نے پستول پر مضبوطی سے گرفت  
جما تے ہوئے کہا ”یہ پستول میرے پاس ہی رہے گا۔ میں اس پستول  
کی گولیوں سے ان لوگوں کے سینے چھلنی کروں گا جنہوں نے میرے  
ماں باپ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“

پر تاب سنگھ کو یوں لگا جیسے وجدان ایک دم جوان ہو گیا ہو۔  
”نہیں پتہ!“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ابھی یہ پستول  
تمہارے پاس رہتا مناسب نہیں ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں خود  
پستول تمہارے ہاتھ میں دوں گا۔ لاؤ۔ اس وقت یہ مجھے دے دو۔“  
اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

”وعدہ چاہا؟“ وجدان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف  
دیکھا۔  
”ہاں۔ وعدہ۔“ پر تاب سنگھ مسکرایا۔

وجدان نے پستول اس کے ہاتھ میں دے دیا اور مڑ کر دروازے  
میں رہی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پر تاب سنگھ قریب  
ہی کھڑا تھا۔ اس دروازے میں اور بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ نیچے  
ایک پرانی سی ڈائری بھی رکھی ہوئی تھی۔ وجدان نے وہ ڈائری نکال  
لی اور وہ اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ پر تاب سنگھ نے آگے بڑھ کر اس  
کے ہاتھ سے ڈائری لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

ڈائری بہت پرانی تھی۔ اس کے کاغذ پیلے پڑ چکے تھے۔ پہلے  
صفے پر عاید علی کا نام اور اس کے ساتھ لکھی ہوئی تاریخ دیکھ کر  
پر تاب سنگھ چونک گیا۔ بارہ سال پہلے کی تاریخ تھی۔ پر تاب سنگھ کا  
خیال تھا کہ عاید علی چونکہ کاروباری آدمی تھا اس لیے اس ڈائری  
میں بھی حساب کتاب ہی ہو گا لیکن جب اس نے اوراق پلٹے تو

اسے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ اس ڈائری میں حساب کتاب نہیں  
تھا بلکہ مختلف تاریخوں میں یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں۔  
”اس ڈائری میں تمہارے ڈیڑی کی یادداشتیں ہیں۔“ پر تاب  
سنگھ بولا ”اگر تم اجازت دو تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں۔ پڑھنے  
کے بعد تمہیں لوٹا دوں گا۔“

”مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے چاہا۔“ وجدان نے کہا۔  
پر تاب سنگھ نے ڈائری بند کر کے بٹل میں دبالی اور وجدان کے  
ساتھ ساتھ ایک بار پھر مکان میں گھومنے لگا۔ وہ تین چار گھنٹوں  
تک اس مکان میں رہے اور جب باہر نکلے گئے تو وجدان نے اپنا  
بستہ بھی اٹھایا تھا۔

اپنے گھر میں آکر پر تاب سنگھ نے ڈائری میز کی دراز میں رکھ  
دی اور سو تر سنگھ کو بلا کر دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات  
دینے لگا۔ گھر میں صرف صبح کا ناشتا تیار ہوتا تھا یا چائے بنتی تھی۔  
کھانا ہوئی ہی سے آتا تھا۔

ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے  
بعد وجدان قارئین پر اپنی کتابیں بچھا کر بیٹھ گیا اور پر تاب سنگھ ٹیلی  
فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب پر تاب  
سنگھ وجدان والے کمرے میں آیا تو وہ قارئین پر سو رہا تھا۔ اور اس  
کے چاروں طرف کتابیں اور کاپیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

پر تاب سنگھ کو ایک ضروری کام سے باہر جانا تھا۔ اس نے  
سو تر سنگھ کو بلا کر گھر میں بیٹھادیا۔ کچھ ہدایات دیں اور باہر چلا گیا۔  
اس کا اپنا دفتر مثل انڈیا میں سیران گلنڈو کی ٹیبل میں واقع ایک  
تنگ سی ٹیبل میں تھا۔ اس علاقے میں اکثر بیک لگتا تھا جیسے کوئی  
ہندوستان کے قدیم علاقے میں اٹھیا ہو۔ تنگ اور بڑے بھوم گلیاں  
سامان سے بھری ہوئی رکائیں۔ پر تاب سنگھ کا دفتر جس گلی میں تھا  
وہ بھی خاصی تنگ تھی۔ اس طرف زیادہ تر صرغ سالوں اور

کریا نے کی دکائیں تھیں۔ ایک خستہ سے دو منزلہ مکان کے گراؤنڈ  
فلور پر دکائیں تھیں۔ پہلی منزل پر پر تاب سنگھ کا دفتر تھا اور اس  
سے اوپر والی منزل پر ایک ہندو قبیلے رہائش پذیر تھی۔

پر تاب سنگھ کی روزید اپنے دفتر آیا تھا۔ وہ کام میں اس قدر  
مصروف ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔ جب سر  
افغا کر سامنے دیکھا تو دروازہ کھڑکی آٹھ بج رہی تھی۔ وہ کھاتے بند  
کرنا ہوا ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اچھا بھئی اور اتار سنگھ۔“ وہ اپنے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے  
بولا ”صبح سب سے پہلے تم کل آنے والا نکسا ٹنٹ کیئر کروالینا۔  
میں دوپہر کے بعد جاکر گاؤں آؤں گا۔“

وہ دفتر سے نکل کر تنگ سی گلیوں میں چلتا ہوا سیران گلنڈو پر  
اس پارکنگ لاٹ پر اٹھیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے  
جب سے چالی نکال کر دروازہ کھولا اور اینٹرننگ کے سامنے بیٹھ  
گیا۔ اس نے انجین اسٹارٹ کیا یہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز سن کر  
اچھل پڑا۔

”میں اسے تم سیدھا چائنا ٹاؤن چلو گے۔ نہیں.... اپنی جگہ  
سے حرکت کرنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے بیٹھے رہو اور گاڑی  
آگے بڑھاؤ۔“

پر تاب سنگھ کے منہ سے بے اختیار مگر سانس نکل گیا۔  
”گوں ہو بھی تم؟ تم میری گاڑی میں....“

”بولو۔ گاڑی چلاؤ۔“ غراتی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ وہ جو  
کوئی بھی تھا بات اگرچہ اردو میں کر رہا تھا لیکن لہجہ چینی تھا۔  
پر تاب سنگھ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پارکنگ لاٹ سے نکل  
کر سڑک پر آئے ہوئے اس نے سامنے لگے ہوئے آئینے کا زاویہ  
دورست کرنے کی کوشش کی مگر پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے پستول کی  
ٹال اس کے ہاتھ پر باری۔ پر تاب سنگھ کے منہ سے اودھ کی آواز نکلی  
اور وہ زور زور سے ہاتھ بھینکتے لگا۔

”آرام سے بیٹھا جانور دیا پتہ۔“ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر  
بولتا۔

”گاڑی چلاتے رہو۔ خاموشی سے۔“ وہ شخص غرایا اور اس  
کے ساتھ ہی پستول کی ٹال پر تاب سنگھ کی گردن سے لگ گئی۔  
پر تاب سنگھ ایک بار پھر کمر سانس لے کر رہ گیا اور گاڑی کی  
دفتار بڑھا دی۔ سڑکوں پر ٹریفک تھا۔ پر تاب سنگھ کا ڈرامیو کرتے  
ہوئے لہر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کر رہا تھا کہ  
اس شخص کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کر سکے لیکن کوئی ایسا  
موقع نہیں مل سکا۔

چائنا ٹاؤن کی طرف آنے کے لیے اسے ایک طویل پیکر کاٹنا  
پڑا تھا۔ کار اس وقت کیرن ہل روڈ پر تھی۔ یہ زیادہ تر رہائشی علاقہ  
تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ پر تاب سنگھ نے کار کی دفتار  
بڑھا دی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا وہ شخص آگے کو بھاگ رہا تھا اور

پستول کی ٹال اس نے پر تاب سنگھ کی گردن سے لگا رکھی تھی۔  
”اے۔ کیا کرتا ہے۔ گاڑی آہستہ چلاؤ۔“ وہ شخص غرایا۔  
دفتار بتانے والی موٹی اس وقت چین اور سانچہ کے درمیان  
تھکر رہی تھی۔ پر تاب سنگھ نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے  
اینٹرننگ پر بتا دیے اور پوری قوت سے بریک لگا دیا۔

بریکوں کی تیز چڑچڑاہٹ کی آواز فضا میں گونجی۔ کار سڑک پر  
لٹکی طرح گھوم گئی۔ زوردار جھٹکے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا وہ  
شخص اچھل کر اگلی سیٹ کی پشت سے نکل گیا۔

پر تاب سنگھ بڑی بھرتی سے اپنی سیٹ پر گھوم گیا۔ اس نے  
گھومتے ہی اس شخص کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس شخص کا  
ہاتھ دروازے پر لگا۔ اتفاق سے اس کا ہاتھ پنڈل پر پڑا تھا۔ اس  
نے دو انگلیاں اندر ڈال کر پنڈل اٹھادیا۔ ایک ہینڈل سے دروازہ  
کھل گیا۔ وہ شخص پچھلی کی طرح پر تاب سنگھ کے ہاتھوں سے پھسل  
کر دروازے سے باہر گرا۔ پر تاب سنگھ تیزی سے پلٹا۔ اس نے  
بھی دروازہ کھول کر باہر چھانک لگا دی۔

زمین پر گرا ہوا وہ شخص سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے  
پر تاب سنگھ کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا تو فائر کر دیا۔ گولی پر تاب  
سنگھ کی پکڑی کو چھوئی ہوئی گر گئی۔ پر تاب سنگھ بڑی تیزی سے نیچے  
جھکا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لات بھجادی تھی۔ پیکر ٹھوکر اس  
شخص کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل  
کر ہوا میں اڑتا ہوا دور جاگرا۔ پر تاب سنگھ نے دوسری ٹھوکر مارنا  
چاہی مگر اس شخص نے دونوں ہاتھوں سے اس کا پیچ پکڑ کر زوردار  
جھٹکا دیا۔ پر تاب سنگھ لڑکھڑاتا ہوا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل  
سکتا اس شخص نے پر تاب سنگھ پر چھانک لگا دی۔

وہ شخص اگرچہ موبلا پٹا تھا مگر اس میں ہلاک طاقت بھری ہوئی  
تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پر تاب سنگھ کا گلا دبوچ رکھا تھا۔  
پر تاب سنگھ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا گلا کسی آہنی شیٹلے میں  
جکھن گیا ہو۔ اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس  
نے دونوں ہاتھ اس شخص کی کلائیوں پر بتا دیے اور اپنے گلے پر  
سے گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس  
نے اپنی ایک ٹانگ موڑ کر پیر اس شخص کے پیٹ پر رکھا اور پوری  
قوت سے اسے اوپر اٹھانے لگا۔ وہ شخص پر تاب سنگھ کے اوپر سے  
ہوتا ہوا پشت کے بل پیچھے گرا۔

پر تاب سنگھ بڑی بھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے  
بھی اٹھنے میں بڑی بھرتی دکھائی تھی۔ پر تاب سنگھ نے سنبھلنے کا موقع  
دے بغیر کھڑی سنبھلی سے وار کیا۔ چوہ اس شخص کے کندھے سے  
ڈرا نیچے بازو پر لگا۔ پر تاب سنگھ نے دوسرا وار کیا مگر اس شخص نے  
بڑی تیزی سے ایک ہاتھ سے ہلاک کیا اور دوسرے ہاتھ سے وار  
کر دیا۔ کھڑی سنبھلی کا وار پر تاب سنگھ کے بائیں کندھے پر لگا۔ اسے  
یوں محسوس ہوا جیسے وزنی بھٹوٹے سے ضرب لگی گئی ہو۔

تکلیف سے وہ نیچے جھک گیا تھا لیکن فوراً ہی منہ پھیل گیا۔

اطلاع دیں۔

”پولیس میں رپورٹ کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔“ پر تاب سنگھ کپڑے بھاڑتے ہوئے بولا ”ایسے لوگوں کو تلاش کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ہی اس کی شکل اچھی طرح نہیں دیکھی تھی۔ پولیس کیسے تلاش کرے گی اسے۔ بہر حال آپ لوگوں کا بہت بہت شکر ہے۔ آپ لوگوں کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔“

وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ پر تاب سنگھ ادھر ادھر گھوم کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ بالآخر اسے حملہ آور کا وہ پستول مل گیا جو اس کا سرے چند گز دور پڑا تھا۔ اس نے پستول اٹھا کر چیک کیا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

”بھرتی! اب تمہارے اسی پستول کی گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا کار میں بیٹھ گیا اور انجین اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ اس وقت کیرن مل روڈ پر تھا۔ اگلے موڑ پر اس نے گاڑی بائیں فورڈ موڑ پر موڑی اور اس سڑک پر ہوتا ہوا آرچ روڈ پر پہنچ گیا۔

پر تاب سنگھ کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ آدمی پہلے سے اس کی کار میں چھپا ہوا تھا۔ جس سے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق دارا کرپ سے تھا۔ دارا یقیناً اس بات سے باخبر ہو گا کہ وجدان اس کی تحویل میں ہے۔ وجدان اس لرزہ خیز واردات کا واحد چشم دید گواہ تھا اور دارا کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ اسے یقیناً اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔

مکان پر پولیس کا پیرا تھا۔ وہ پرائیویٹ گاڑی بھی موجود تھی۔ وہاں وہ حملہ کرنے کی حافیت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے غالباً یہی سوچا ہو گا کہ پر تاب سنگھ کو قابو میں کیا جائے اور پھر اس کے ذریعے وجدان کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا جائے لیکن اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دارا نے پر تاب سنگھ کو پکڑنے کے لیے جو آدمی بھیجا تھا اسے خود ہی اپنی جان چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔

وہ آدمی پر تاب سنگھ کا پیچھے نہیں لگا سکا تھا لیکن اب پر تاب سنگھ کو وجدان کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دارا نے ایک طرف اسے اغوا کرنے کی کوشش کی ہو اور دوسری طرف وجدان کو اٹھانے کے لیے اس کے مکان پر حملہ کر دیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

جب وہ اسے مکان والی نگلی میں داخل ہوا تو اسے اطمینان سا ہوا۔ نگلی میں کسی گڑبگ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے کار اپنے پتے کے سامنے روک لی اور انجین بند کر کے نیچے اتر آیا۔ ایک پولیس والا کیٹ کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا انٹل کنڈھے پر لٹکائے اس کے آس پاس ہی شل رہا تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

”خبریت ہے نا۔ یہاں کوئی گڑبگ تو نہیں ہوئی؟“ پر تاب سنگھ نے پوچھا۔

”نہیں سر! ایک پولیس والے نے جواب دیا، کوئی گڑبگ نہیں ہو۔ آپ کے ٹھکانے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ محسن سے محروم ہوئے اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کا ایک پاؤں گارڈ چھت پر منڈیر کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

وجدان اور سوت سنگھ لاؤنج میں قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وجدان کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ ایک کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔

”اے سوت سنگھ۔“ پر تاب سنگھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”پڑھ لے اے تو بھی پڑھ لے۔ اس بچے سے ہی کچھ پڑھ لے۔“

”سرورسٹی!“ سوت سنگھ مسکراتے ہوئے بولا ”میرے تو پیونے نہیں پڑھا تو میں پڑھ کر کیا کروں گا۔“

”تم کھوٹے کھوٹے ہی رہو گے۔“ پر تاب سنگھ بولا ”اچھا جا۔ چائے بنا کر لا۔“

وہ وجدان کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ پر تاب سنگھ کو بہر حال اس بات کی خوشی تھی کہ پڑھائی شروع کر دینے سے وجدان کا احوال اب ٹھیک ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد سوت سنگھ چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے ان دونوں کے سامنے ایک ایک کپ رکھ دیا۔ اور تیسرا کپ خود لے لیا۔ ”سرورسٹی۔“ وہ پر تاب سنگھ کی طرف دیکھے ہوئے بولا ”لگتا ہے کپڑوں سمیت کسی سے منشی لڑکے آ رہے ہو۔“

”ہاں۔“ پر تاب سنگھ نے جواب دیا ”راستے میں ایک گاڑی پھولان ل ل گیا تھا۔ اس نے منشی کے لیے پیچھے کر دیا اور مجھے کپڑے اتارنے کا موقع نہیں مل سکا۔“

”منشی کا فیصلہ کیا ہو اسرار سرتی؟“ سوت سنگھ نے پوچھا۔ ”فیصلہ کیا ہوا تھا۔“ پر تاب سنگھ بولا ”وہ گاڑی پھولان بھاگ گیا اور میں سڑک پر کھڑا کپڑے بھاڑتا رہا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔“

خود ہی لے آیا کرتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد وجدان اور پر تاب سنگھ باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ وجدان سو گیا۔ پر تاب سنگھ کو عابد علی کی ڈائری کا خیال آ گیا۔ اس نے میز کی دراز سے ڈائری نکال لی اور پینک پر نیم دراز پر کھڑے ہو کر پڑھنے لگا۔

بارہ سال پہلے جب عابد علی منگا پور آیا تھا تو پر تاب سنگھ نے اسے یہاں سیشن ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔ عابد علی نے اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن اب عابد علی کی ڈائری پڑھتے ہوئے پر تاب سنگھ اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ عابد علی نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا وہ سب کچھ سچ تھا لیکن اس ڈائری سے اسے ایسے ایسے سنسنی خیز انکشافات ہو رہے تھے کہ پر تاب سنگھ دنگ رہ گیا۔ عابد علی کی ڈائری کی تحریر ایک طرح کی سرگزشت تھی۔

اس تحریر کے مطابق عابد علی لاہور کے ایک نواحی گاؤں کھال والی کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں پاک بھارت سرحد پر واقع تھا۔ سرحد کے دوسری طرف خلع امرتسر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

تقسیم ہند سے پہلے ان دونوں بستیوں کے لوگوں میں بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور یہ تعلقات ملک تقسیم ہونے کے بعد بھی قائم رہے تھے۔

عابد علی کا باپ چوہدری حاکم علی ایک چھوٹا زمین دار تھا۔ اس کی زمین سرحد پر تھی۔ بعض کھیت تو سرحد سے ملے ہوئے تھے۔ ملک رمضان اس گاؤں کا سب سے بڑا زمین دار تھا۔ اس کی زمینیں اگرچہ گاؤں کے دوسری طرف تھیں لیکن وہ سرحد کے ساتھ والی کچھ زمین بھی خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ چوہدری حاکم علی سے بات کی تھی کہ وہ سرحد سے ملے ہوئے چند کھیت اس کے ہاتھ فروخت کر دے لیکن چوہدری حاکم علی اس بات پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ملک رمضان سرحد سے ملی ہوئی وہ زمین کیوں خریدنا چاہتا ہے۔

ملک رمضان کے سرحد کے دوسری طرف واقع بھارتی گاؤں رام پور کے چوہدری کرم داس سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں چوری چھپے سرحد پار کر کے ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے تھے۔

ملک تقسیم ہونے کے بعد سرحد کے دونوں طرف بہت سے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ اس صورت حال کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا تھا۔ جنہیں صرف اور صرف اپنا فائدہ عزیز تھا اپنے ذاتی مفاد کے لیے وہ دوسروں کو ناقابل ثباتی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ سرحد کی پٹی قائم ہونے کے بعد ایسے ہی لوگوں نے فائدہ اٹھایا تھا۔

ملک رمضان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ نقصان کسی فرد کو پہنچ رہا ہے یا

وہ شخص بھی منہ پھیل چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے نکال لیے تھے۔ اس کے انداز کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھی مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔ وہ پر تاب سنگھ پر ہٹنے کے لیے پر تزلزلا رہا تھا لیکن پر تاب سنگھ نے موقع سے بغیر اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے دائیں ٹانگ کو اس طرح حرکت دی تھی جیسے اسٹریٹ لگ لگاتا چاہتا ہو۔ دوسرے شخص نے اسٹریٹ لگ سے بچنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی مگر پر تاب سنگھ اسٹریٹ لگ لگانے کے بجائے بڑی تیزی سے اپنی جگہ پر محکم کیا۔ اس کی اسپن لگ اس شخص کی پسلیوں پر لگی۔ وہ ہلکا کر لکڑا ہوا گیا۔ پر تاب سنگھ نے ایک اور اسپن لگ لگائی، وہ شخص نیچے گرا۔ پر تاب سنگھ کو تیسرا وار کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ شخص کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس نے بڑی قوت سے پر تاب سنگھ کے سینے پر فلائنگ لگ لگائی تھی۔ پر تاب سنگھ لکڑا ہوا پائپٹ کے بل گرا۔

وہ شخص پر تاب سنگھ پر حملہ کرنے کے لیے پھر آگے بڑھا لیکن ٹھیک اسی وقت ایک کار اس سڑک پر مڑی۔ وہ دونوں کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ٹکرائے۔ وہ شخص ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے کار کی طرف دیکھا اور پھر پر تاب سنگھ پر حملہ کرنے کے بجائے ایک طرف چھلانگ لگادی۔ وہ ایک بیٹنگ کی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

کار بریکوں کی تیز چرچر ہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ تین آدمی نیچے اتر کر پر تاب سنگھ کی طرف دوڑے جو اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک آدمی نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ وہ تینوں ہندوستانی تھے۔

”کیا ہوا۔ کون ہو تم اور وہ کون تھا؟“ ایک آدمی نے پوچھا۔ ”شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“ پر تاب سنگھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ اس لڑائی میں اس کی پگڑی سرے سے گر گئی تھی اور لمبے بال شانوں پر ٹکڑے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر سر کے اوپر جوڑا بنایا اور زمین پر پڑی ہوئی پگڑی سر بھالی۔

”لیکن ہوا کیا۔ یہ آدمی کون تھا جو تمہیں مار رہا تھا۔“ ایک آدمی نے پوچھا۔ ”وہ تو بتا رہا ہوں بھائی جی کہ شرافت کا زمانہ ہی نہیں رہا۔“

پر تاب سنگھ نے جواب دیا ”اس بندے نے لفٹ مائیگی تھی۔ میں نے اسے کار میں بٹھالیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سڑک سنسان دیکھی تو پستول نکال لیا۔ وہ مجھے لوٹنا چاہتا تھا لیکن بھائی جی! اپنی محنت کی کمائی کوئی آسانی سے تو کسی کے حوالے نہیں کرنا۔ میں نے اسے زیر کر لیا ہوا لیکن آپ لوگوں کی گاڑی اس طرف مڑے دیکھ کر بھاگ گیا۔“

”اچھا ہوا بھگ گیا ورنہ ہو سکتا ہے وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا دیتا۔“ ایک آدمی نے کہا ”آپ کو چاہیے کہ فوراً پولیس کو



اجتماعی طور پر پوری قوم یا پورا ملک اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ ملک تقسیم ہونے کے بعد دونوں طرف جو گھبر ساسل پیدا ہوئے تھے ان کا فائدہ انہی لوگوں نے اٹھایا تھا۔ ملک رمضان اور کرم داس نے سرحد پر کاروبار شروع کر دیا تھا۔ غیر قانونی طور پر مال سرحد کے ادھر ادھر لے جانے کو وہ لوگ برنس ہی کہتے تھے۔ ان کا یہ برنس پہلے محدود پیمانے پر تھا پھر اس میں اضافہ ہوا آیا۔ ملک رمضان پہلے سرحد پر کرنے کے لیے دوسروں کی زمین استعمال کرتا تھا۔ اس جنگ کا بعد ازاں ترقی کر گیا تو اس نے چوہدری حاکم علی کی زمین خریدنے کی کوشش شروع کر دی۔ پہلے وہ دوستانہ انداز میں بات کرتا تھا پھر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس نے گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ذریعے بھی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ اگرچہ اصل سے دینی قیت دے رہا تھا مگر چوہدری حاکم علی کی قیت پر بھی اپنی زمین بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ اپنی ان کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد ملک رمضان اوجھے جھنڈوں پر اتار آیا۔ دھمکیاں تو وہ دیتا ہی رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے حاکم علی کا کلیان جلا دیا۔

عابد علی ان دنوں لاہور کے اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ لاہور میں بھی ان کا ایک گھر تھا۔ عابد علی فاضل کاسٹرو تھا۔ وہ اگرچہ ہفتے میں ایک بار گاؤں آ جاتا کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ امتحان دینے کے بعد مستقل طور پر گاؤں آجائے گا اور کھیتی باڑی سنبھال لے گا۔

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ گاؤں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے وہ اندوہناک اطلاع ملی جس نے اس کی دنیا اندھیر کر دی۔ اس کے باپ کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اطلاع دینے والے نے بتایا تھا کہ چوہدری حاکم علی صبح سویرے اپنے کھیتوں پر کام کر رہا تھا کہ چند گھوڑا سوار وہاں آ گئے۔ انہوں نے چوہدری پر دھانے باندھ رکھے تھے۔ انہوں نے آتے ہی فائرنگ شروع کر دی جس سے چوہدری حاکم علی اور دو مزاحم موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔

عابد علی بھگم بھگم وہاں پہنچ گیا۔ چوہدری حاکم علی کی لاش شر کے اسپتال جھوٹائی جا چکی تھی لیکن پولیس گاؤں میں موجود تھی۔ عابد علی پولیس نے اٹھا رہا پھر شام کو اسپتال سے لاش وصول کر کے لے آیا اور تدفین ہو گئی۔

گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ یہ کس کے اشارے پر ہوا تھا لیکن کوئی بھی شخص وہاں پر ملک رمضان اور اس کے بیٹے نواز علی کا نام لینے کو تیار نہیں تھا۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔

عابد علی بھی جانتا تھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے لیکن اس کے پاس ملک رمضان اور اس کے بیٹے نواز علی کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ پولیس نے اگرچہ ملک رمضان اور اس کے بیٹے کو بھی تحقیق میں شامل کیا تھا لیکن ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ واردات کے وقت وہ شہر میں تھے اور پھر یہی نہ بھی بہت کام دکھایا تھا اس لیے وہ دونوں صاف نکل گئے تھے۔

چھ مہینے گزر گئے۔ پولیس چوہدری حاکم علی نے ہاتھ سراج نہیں لگا سکی تھی۔ اس دوران میں ایک اور واقعہ ہوا۔ رمضان گھوڑی جو سوار ایک دوسرے گاؤں سے اپنے گاؤں تھا کہ اچانک ہی گھوڑی کسی چیز سے بدک کر سریت آگئی۔ ملک رمضان نے اسے سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی مگر گھوڑا ہوسکا۔ گھوڑی سریت دوڑ رہی تھی۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ملک رمضان جانتا تھا کہ اگر گھوڑی کو قابو نہ کیا گیا تو اس کا بہت خطرناک نکلے گا۔ وہ گھوڑی کو قابو کرنے کی بھرپور کوشش رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ نہریا نکل قریب آچکی تھی۔ ملک رمضان بدحواس ہو رہا تھا۔ گھوڑی نے چھلانگ لگا کر نہریا کر کے کی کمراس کے اگلے دونوں پیر میر کے دوسرے کنارے پر لگا۔ اور پھر آگے چلی جاتی۔ ملک نواز علی پیسے والا تھا۔ زمینوں الٹ کر نہیں گزرتی۔

ملک رمضان گھوڑی سے گر گیا تھا مگر اس کا پیر رکاب تھا۔ اس کے تعلقات پولیس سے بھی تھے اور دوسرے بڑے بڑے چھٹا رہا۔ وہ گھوڑی کے پیچھے نہ گیا۔ گھوڑی نہر سے نکل لوگوں سے بھی جو اسٹنگل پیسے گناؤں نے کاروبار میں اس کی پشت دوڑنے لگی۔ ملک رمضان کا پیر رکاب میں چھٹا ہوا تھا۔ وہ نہریا کر رہے تھے۔ علاقے کے اسمبلی کے ممبر اس پر مہربان تھے۔ ہر بل تقریباً ایک فرائنگ تک گھوڑی کے ساتھ گھسٹتا رہا۔ ایکشن کے موقع پر نواز علی ان کی انتہائی قسم چلاتا جس پر اس کا کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا اور اس کا فائدہ وہ کروڑوں کی صورت میں ملک رمضان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ملک رمضان کا پیر رکاب تھا۔ اس طرح اسے اسٹنگل میں بارسوخ لوگوں کی بھی سے نکل گیا۔ وہ وہیں گر گیا اور گھوڑی اسے کچلتی ہوئی آگے بھر رہی تھی۔

گئی۔ لوگ دوڑ دوڑاں پہنچ گئے۔ لیکن ملک رمضان میں ہتھیار تھا۔ مسلسل زمین پر گھسٹنے اور گھوڑی کے پیچھے سے اسے کھڑکی پاش پاش ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح بکڑا تھا کہ مشکل ہو گیا تھا۔

ملک رمضان کی اس عبرت ناک موت پر گاؤں میں بیگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر شخص دے لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ ملک رمضان سے قدرت نے چوہدری حاکم علی کے قتل کا انتقام لیا۔ اس واقعے کے تین مہینے بعد ایک اور شوخا اٹھ کھڑا۔

ملک رمضان کے بیٹے ملک نواز علی نے عابد علی کی ان زمینیں قبضہ کر لیا جو سرحد کے ساتھ واقع تھیں۔ اس نے اپنے زمین پر بٹھا دیے تھے اور لوگوں سے یہ کہا تھا کہ یہ زمین چوہدری حاکم علی نے اس کے باپ کے پاس بیچی تھی۔ اس نے اپنے زمین پر بٹھا دیے تھے۔

گواہ دستخط بھی موجود تھے۔ وہ دونوں آدمی ملک نواز علی کی زمین سے اسے ہٹ نہیں ہاری۔ اس مقدمے پچھری میں کچھ نئے نمک خوار تھے۔

عابد علی کے لیے یہ انکشاف مزید سنسنی خیز ثابت ہوا کہ ایک زمین دار چوہدری برکت علی بھی تھا۔ وہ پیسے والا آدمی تھا۔ رمضان نے چوہدری کو پیسہ کھار کر سرکاری کاندہات میں بھیج دیے۔ اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔ زمین فروخت کرنے اور ملک رمضان کے نام اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔ زمین فروخت کرنے اور ملک رمضان کے نام اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔ زمین فروخت کرنے اور ملک رمضان کے نام اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔

چوہدری حاکم علی نے ہاتھ سراج نہیں لگا سکی تھی۔ اس دوران میں ایک اور واقعہ ہوا۔ رمضان گھوڑی جو سوار ایک دوسرے گاؤں سے اپنے گاؤں تھا کہ اچانک ہی گھوڑی کسی چیز سے بدک کر سریت آگئی۔ ملک رمضان نے اسے سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی مگر گھوڑا ہوسکا۔ گھوڑی سریت دوڑ رہی تھی۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ملک رمضان جانتا تھا کہ اگر گھوڑی کو قابو نہ کیا گیا تو اس کا بہت خطرناک نکلے گا۔ وہ گھوڑی کو قابو کرنے کی بھرپور کوشش رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ نہریا نکل قریب آچکی تھی۔ ملک رمضان بدحواس ہو رہا تھا۔ گھوڑی نے چھلانگ لگا کر نہریا کر کے کی کمراس کے اگلے دونوں پیر میر کے دوسرے کنارے پر لگا۔ اور پھر آگے چلی جاتی۔ ملک نواز علی پیسے والا تھا۔ زمینوں الٹ کر نہیں گزرتی۔

ملک رمضان گھوڑی سے گر گیا تھا مگر اس کا پیر رکاب تھا۔ اس کے تعلقات پولیس سے بھی تھے اور دوسرے بڑے بڑے چھٹا رہا۔ وہ گھوڑی کے پیچھے نہ گیا۔ گھوڑی نہر سے نکل لوگوں سے بھی جو اسٹنگل پیسے گناؤں نے کاروبار میں اس کی پشت دوڑنے لگی۔ ملک رمضان کا پیر رکاب میں چھٹا ہوا تھا۔ وہ نہریا کر رہے تھے۔ علاقے کے اسمبلی کے ممبر اس پر مہربان تھے۔ ہر بل تقریباً ایک فرائنگ تک گھوڑی کے ساتھ گھسٹتا رہا۔ ایکشن کے موقع پر نواز علی ان کی انتہائی قسم چلاتا جس پر اس کا کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا اور اس کا فائدہ وہ کروڑوں کی صورت میں ملک رمضان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ملک رمضان کا پیر رکاب تھا۔ اس طرح اسے اسٹنگل میں بارسوخ لوگوں کی بھی سے نکل گیا۔ وہ وہیں گر گیا اور گھوڑی اسے کچلتی ہوئی آگے بھر رہی تھی۔

گئی۔ لوگ دوڑ دوڑاں پہنچ گئے۔ لیکن ملک رمضان میں ہتھیار تھا۔ مسلسل زمین پر گھسٹنے اور گھوڑی کے پیچھے سے اسے کھڑکی پاش پاش ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح بکڑا تھا کہ مشکل ہو گیا تھا۔

ملک رمضان کی اس عبرت ناک موت پر گاؤں میں بیگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر شخص دے لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ ملک رمضان سے قدرت نے چوہدری حاکم علی کے قتل کا انتقام لیا۔ اس واقعے کے تین مہینے بعد ایک اور شوخا اٹھ کھڑا۔

ملک رمضان کے بیٹے ملک نواز علی نے عابد علی کی ان زمینیں قبضہ کر لیا جو سرحد کے ساتھ واقع تھیں۔ اس نے اپنے زمین پر بٹھا دیے تھے اور لوگوں سے یہ کہا تھا کہ یہ زمین چوہدری حاکم علی نے اس کے باپ کے پاس بیچی تھی۔ اس نے اپنے زمین پر بٹھا دیے تھے۔

گواہ دستخط بھی موجود تھے۔ وہ دونوں آدمی ملک نواز علی کی زمین سے اسے ہٹ نہیں ہاری۔ اس مقدمے پچھری میں کچھ نئے نمک خوار تھے۔

عابد علی کے لیے یہ انکشاف مزید سنسنی خیز ثابت ہوا کہ ایک زمین دار چوہدری برکت علی بھی تھا۔ وہ پیسے والا آدمی تھا۔ رمضان نے چوہدری کو پیسہ کھار کر سرکاری کاندہات میں بھیج دیے۔ اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔ زمین فروخت کرنے اور ملک رمضان کے نام اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔ زمین فروخت کرنے اور ملک رمضان کے نام اس کی تعلیم صرف انھوں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا کھانا تھا۔

جو اس کی مٹھی میں رہے۔ چوہدری برکت علی کو یہ مشورہ پسند آیا تھا اور اس کی نظر انتخاب عابد علی پر پڑی تھی۔ ایکشن آنے والے تھے۔ چوہدری برکت علی نے عابد علی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ صوبائی اسمبلی کی سیٹ پر اس علاقے سے ملک عبدالرحمن کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔ عابد علی تعلیم یافتہ تھا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن چوہدری برکت علی نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر کامیاب ہو گیا تو وہ نہ صرف اپنے باپ کی زمین واپس حاصل کرے گا بلکہ مزید اراضی بھی خرید سکے گا۔ عابد علی کو مزید اراضی کا لالچ نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے باپ کی زمین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دیے بھی ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ زندہ رہنے اور اپنا حق لینے کے لیے طاقت ضروری ہے۔ اسے ایک موقع مل رہا تھا چوہدری برکت علی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایکشن کے تمام تر اخراجات خود برداشت کرے گا۔ اس کے عوض اسے یہ تحریر لکھ کر دینا ہو گی کہ کامیابی کے بعد چوہدری برکت علی کے کیا کیا مطالبات پورے کرے گا۔

عابد علی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے تحریر لکھ کر دے دی اور چوہدری برکت علی نے اسے اپنے امیدوار کی حیثیت سے متعارف کرانا شروع کر دیا۔ یہ خبر ملک نواز علی کے لیے تشویش ناک تھی۔ پہلے وہ ملک عبدالرحمن کے لیے انتخابی قسم چلاتا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ اس نے خود ایکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرتا تھا اور پھر بھی ان کا محتاج رہتا تھا۔ اگر وہ خود کامیاب ہو گیا تو تمام فائدے خود ہی اٹھائے گا اور عابد علی جیسے لوگوں سے بھی منٹ لے گا۔

کچھ ہی عرصہ بعد ایکشن کی گہما گہمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ہر علاقے میں انتخابی قسم دوزوروں پر تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں توپیلوں کا سماں تھا۔ عابد علی کے حلقے سے چار امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اس روز پولنگ ہوئی اور رات تک رزلٹ بھی سامنے آگیا۔ عابد علی کو اگرچہ ملک نواز علی سے زیادہ ووٹ ملے تھے لیکن کامیاب وہ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تیسرے نمبر پر رہا تھا۔ دوسرے نمبر پر ملک عبدالرحمن کو ووٹ ملے تھے اور عبدالرشید نامی ایک ایسا امیدوار چند سو ووٹوں کی اکثریت سے جیت گیا تھا جس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

ووٹ ہٹ جانے کی وجہ سے ملک عبدالرحمن پہلی مرتبہ ایکشن ہارا تھا۔ وہ اس کا ذمے دار نواز علی کو ٹھہرا رہا تھا اور ملک نواز علی اپنی شکست کا باعث عابد علی کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں اگر عابد علی اس کے مقابلے پر کھڑا نہ ہوتا تو وہ ضرور کامیاب ہو جاتا۔ ہارا عابد علی بھی تھا لیکن اسے اپنی شکست کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ سیاست کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے اپنی شکست کو اتنا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ وہ تو ایک خاص مقصد کے لیے کسی کے اکٹھے پر ایکشن میں کھڑا ہوا تھا۔

جیت جاتا تو اس کا مقصد پورا ہو جاتا۔ ہارنے اسے کوئی غم نہیں ہوا تھا لیکن ملک نوازش علی نے اس شکست کو اپنی اپنا کامستد بنالیا تھا۔

نوازش علی اور عابد علی میں دشمنی کی جڑیں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ عابد علی کو صرف اپنے باپ دادا کی اراضی کے حصول سے دلچسپی تھی۔ جبکہ نوازش علی نے ایکشن لانے کا فیصلہ کر کے اپنا ہت کچھ واؤ پر لگا دیا تھا اور وہ ہت کچھ ہار گیا تھا۔ ملک عبدالرحمن نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا تھا کیونکہ وہ اسی کے حلقے میں اس کے مقابلے میں کھڑا ہوا تھا۔

ملک نوازش علی کا بہر حال اپنا ایک حلقہ تھا۔ اس کا اسمگلنگ کا بزنس اس شکست سے متاثر ضرور ہوا تھا لیکن رکنا نہیں تھا۔ اسمگلنگ کے حوالے سے اسے اب بھی ان لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی جو پہلے بھی اس کے سرپرست تھے۔

ایکشن سے پہلے تو ملک نوازش علی اور عابد علی کی دشمنی صرف مقدمے بازی تک محدود تھی مگر اس سیاست کے کھیل نے انہیں ایک دوسرے کی جان کا دشمن بنا دیا تھا۔ عابد علی بھی اب سر اٹھانے لگا تھا۔ سلطان پور کا چوہدری برکت علی اس کی پشت پر تھا جس سے اس کا حوصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔

رکھال والی کا علاقہ چوہدری برکت علی کے لیے بھی اہمیت رکھتا تھا اور اسی لیے وہ عابد علی کی پشت پناہی بھی کر رہا تھا۔ ایکشن میں عابد علی کی شکست پر اسے بھی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے جس حساب سے دوٹ لیے تھے۔ اس سے چوہدری برکت علی کو یقین تھا کہ اگلے ایکشن میں عابد علی ضرور کامیاب ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عابد علی کو اپنے قریب رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عابد علی کو مزید قریب لانے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی تھی۔

حلقہ اس کے ایک دور کے رشتہ دار کی بیٹی تھی۔ اس نے سلطان پوری کے ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر رکھا تھا۔ وہ نہ صرف حسین تھی بلکہ بڑی۔ خوش اخلاق اور سلیجے ہوئے مزاج کی لڑکی تھی۔ چوہدری برکت علی نے عابد علی کو اس سے رشتے پر آمادہ کر لیا اور چند میٹوں کے اندر اندر ان کی شادی بھی ہو گئی۔

والدین کے انتقال کے بعد عابد علی اکیلا ہی رہتا تھا۔ حلقہ کے آجانے سے گھر میں روٹنی سی آگئی لیکن دوسری طرف عابد علی کے لیے انجمنیں بڑھ رہی تھیں۔ ملک نوازش علی بھی اپنے باپ کی طرح اوجھے چمکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

ان دنوں دارا کو عابد علی نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اونچا لبا ہٹا ہٹا آدمی تھا۔ ملک نوازش علی نے سب سے پہلے اسے لے کر آیا تھا لیکن رکھال والی میں آتے ہی دارا نے ایک طوفان بدتمیزی اٹھا دیا تھا۔ وہ گاڑی میں اور زمینوں پر دھناتا پھرتا۔ گاؤں والوں اور مزارعوں سے مارپیٹ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ لوگ ملک

نوازش علی کے پاس اس کی شکایت لے کر جاتے اور ملک مرنہ جاتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر دارا نے گاؤں کے لوگوں غنڈا گردی کا رعب بٹالیا تھا۔ اب کسی کو اس کے سامنے اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

دوسرے مہینے دارا نے عابد علی کے ایک مزارع کی گاڑی دی۔ پولیس میں دارا کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی۔ پولیس اور ملک نوازش علی کی حویلی میں دعوت اڑانے کے بعد مزارع اس کے بھائی اور باپ کو گرفتار کر کے لے گیا۔ باہر تھملا کر رہ گیا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکا تھا۔

عابد علی کی شادی کو دس مہینے ہو گئے تھے۔ حلقہ ہاں بٹے تھی۔ گاؤں میں شہر جیسی سولتیں نہیں تھیں۔ عابد علی کے لاہور شہر والے مکان میں لے گیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے اب ایک عورت بھی ساتھ آگئی تھی۔

حلقہ نے بیٹے کو جنم دیا تو ان کی زندگی میں بہار آگئی۔ بے کشن کا پہلا پھول تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد حلقہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ گاؤں نہیں جا رہے بلکہ مستقل طور پر شہر میں رہے گی۔ عابد علی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

عابد علی بھی شہر میں رہنے لگا۔ وقتاً فوقتاً وہ گاؤں کو رہتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل لے لی تھی جس سے آمدورفت کے لیے سولت ہو گئی تھی۔

اس روز وہ دوسرے کچھ دن بعد گاؤں آیا تھا۔ حلقہ نے کہہ کر دیا تھا کہ وہ رات کو واپس آجائے گا۔ وہ سیدھا گاؤں داخل ہونے کے بجائے کھیتوں کی طرف نکل گیا جہاں اس کا چھوٹا سا ڈیرا تھا۔ موٹی بھی یہیں بندھے ہوئے تھے اور ایک آدمی یہاں رہتا تھا۔ عابد علی گڈنڈی پر موٹر سائیکل چلا اس ڈیرے پر آیا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھا مزارع اکبر سے باتیں کرتا رہا پھر موٹر سائیکل ڈیرے پر چڑھا گاؤں آگیا۔

رات کا کھانا اس نے گاؤں ہی میں کھایا تھا۔ وہ دایاں کے لیے دوبارہ ڈیرے پر آگیا۔ اس وقت اکبر نے اسے ایک بات بتائی تھی کہ سن کر عابد علی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اکبر نے کہ اسے بڑے خفیہ طریقے سے یہ بتایا ہے کہ ملک نوازش کی آدمی آج سوئے کی ایک بھاری کیپ لے کر سرحد پار کر کے طرف جانے والے ہیں۔ اکبر کو یہ اطلاع کیسے ملی تھی؟ اس سے پتا نہ چلا۔ کو کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ ملک نوازش آج سوئے کی اسمگلنگ کر رہا ہے۔ عابد علی نے رات وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ آج وہ ان کی اسمگلنگ کوشش ناکام بنادے گا۔

وہ ڈیرے کے آس پاس ٹھٹھکا رہا۔ وہ ایک پرانے

پاس رک گیا۔ اس کٹھن پر پہلے رہٹ لگا ہوا تھا لیکن ایک سال پہلے کچھ فاصلے پر پورنگ کر کے ٹیوب ویل لگوا لیا تھا جس وجہ سے یہ جوان متروک ہو گیا تھا۔ کٹھن پر بہر حال رہٹ کے باقیات اب بھی موجود تھے۔ عابد علی رہٹ کی لکڑی پر بیٹھ گیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اکبر نے اسے بتایا تھا کہ وہ لوگ آدھی رات کے بعد اس طرف سے گزریں گے۔

عابد علی انتظار کرتا رہا۔ رات تین بجے کے لگ بھگ اسے کسی گاڑی کے ہیڈ لمپس کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ کوئی کار تھی جو سوک سے بہت کھیتوں کی طرف آ رہی تھی۔ عابد علی اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف دوڑنے لگا اور تقریباً دو سو گز دور کھیتوں کے درمیان اس کیے راستے پر رک گیا جہاں سے اس گاڑی کو گزرنا تھا۔ وہ راستے کے قریب ہی پودوں میں چھپ گیا۔ اس نے جب سے ہسٹل نکال لیا اور گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ ہسٹل اس نے چند مہینے پہلے اپنی حفاظت کے لیے خریدا تھا اور اس کے پاس اس کا لائسنس بھی موجود تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا تھا ہسٹل کو اپنی جیب میں ڈالتا نہیں بھولتا تھا۔

وہ گاڑی تھی۔ ہیڈ لمپس کی روشنیاں بچھ گئیں۔ عابد علی پودوں میں چھپا کار کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا پھر جیسے ہی کار اس کے سامنے پہنچی اس نے فائر کر دیا۔ اس کی گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی اور کار کا اکھٹا ٹاز ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ کار لہرا کر ایک گھٹ میں گھس کر رک گئی۔

تین آدمی کار سے اتر کر ایک طرف دوڑے۔ قدامت کی وجہ سے عابد علی نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ دارا تھا۔ "تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو۔ ہتھیار پھینک دو۔" عابد علی چیخا۔

عابد علی کا خیال تھا کہ وہ لوگ ٹرپ میں آجائیں گے لیکن وہ لوگ اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے کھیتوں میں ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ عابد علی نے بھی ایک دو فائر کر دیے۔

عابد علی دوڑ کر کار کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جھاک کر اندر دیکھا۔ کار کی بچھلی سیٹ پر دو کیڑوں کے بڑے بڑے تھیلے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دارا اور اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے وہاں سے بہت دور جا چکے تھے۔ عابد علی دوڑا تو کھول کر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور آفنجی اشارت کر کے اسے کھیتوں میں موڑ دیا۔ ایک ٹائمر برٹ ہونے کی وجہ سے کار گھٹ کر چل رہی تھی۔

اکبر ڈیرے پر نہیں تھا۔ وہ فائرنگ کی آوازیں کر کہیں بھاگ رہا تھا۔ عابد علی نے کار کی بچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے کیڑوں کے تھیلے کھول کر دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ دونوں تھیلوں میں سوئے کے بکٹ بھرے ہوئے تھے۔ عابد علی نے کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر دونوں تھیلے

باہر نکال لیے جو خامت ورنی تھے۔ اس وقت ایک بار پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں کچھ بہت قریب آتی جارہی تھیں۔ غالباً دارا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وہ فائرنگ کرتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ عابد علی نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان تھیلوں کو کہاں چھپایا جائے اور بالآخر ایک جگہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے دونوں تھیلوں کے زپ انجھی طرح بند کر دیے اور انہیں رہٹ والے کٹھن میں پھینک دیا۔

دارا اور اس کے ساتھی قریب آ رہے تھے۔ عابد علی اپنی موٹر سائیکل کی طرف دوڑا۔ دارا نے اسے دوڑتے ہوئے دیکھ لیا اور اس پر فائرنگ شروع کر دی۔ عابد علی نے لگ بھگ گھر موٹر سائیکل کا انجن اشارت کیا اور اسے گھنٹوں میں ڈال کر ایک سیلر مگر پپر دی طرح تھمادی۔ موٹر سائیکل اچھل کر آگے نکلی تھی۔

دارا اور اس کے ساتھی پیچھے دوڑتے ہوئے فائرنگ کر رہے تھے۔ گویاں عابد علی کے آس پاس سے گزری تھیں لیکن عابد علی ان سے محفوظ رہا۔ موٹر سائیکل اچھلتی ہوئی کھیتوں میں دوڑتی رہی۔ سوک پر آکر اس نے موٹر سائیکل دائیں طرف موڑ دی۔ یہ سوک سیدھی راوی کی کپڑی تک چلی گئی تھی۔

شہر میں اپنے گھر پہنچنے کے لیے عابد علی کو ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو صبح کے پانچ بجتے والے تھے۔ بدحواسی اور تھکانا سا خوف عابد علی کے چہرے پر نمایاں تھا۔ حلقہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن عابد علی نے اسے ٹال دیا۔

اس کے تین دن بعد دارا اور اس کے ایک ساتھی نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ آدھی رات کے قریب اس کے گھر میں گھس آئے تھے۔ ان دونوں کے پاس ہسٹل تھے۔ وہ عابد علی سے سونے کے ان دو تھیلوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو اس نے غائب کیے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق کار میں سونے کے کچھ تھیلے تھے۔ چار ڈکی میں ۱۰۰ بچھلی سیٹ پر ۱۰۰ بچھلی سیٹ والے تھیلے غائب تھے۔ دارا نے اسے یہاں ان دو تھیلوں میں تقریباً پانچ کروڑ روپے مالیت کا سونا تھا۔ اگر عابد علی وہ تھیلے ان کے حوالے کر دے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن عابد علی نے اعلیٰ کا اظہار کر دیا۔ اسے تو اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اسے ڈکی کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ اس وقت اسے ڈکی کا خیال آجائے تو وہ باقی چار تھیلے بھی کٹھن میں پھینک دیتا۔

دارا انسان نہیں درندہ ثابت ہوا تھا۔ اس نے عابد علی کو مار مار کر ادھر موٹا کر دیا۔ حلقہ کو بھی اس نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ عابد علی اور حلقہ کی جینیں فضا میں گونجتی رہیں لیکن کوئی ان کی مدد کو نہیں آیا۔ کشن راوی ان دنوں نیا نیا آباد ہوا تھا۔ بہت سے مکان زیر تعمیر تھے۔ آباد مکان ایک دوسرے سے خاصے دور تھے۔

عابد علی کا مکان بھی کسی قدر اگ تھا۔ اس لیے کوئی ان کی مدد کو نہ آسکا۔ ان کی بیٹیوں کی آوازیں یقیناً سنائی تھیں لیکن کسی کو پڑی تھی کہ آج رات کو اپنے گھر سے نکلتا۔

عابد علی کی بہت جواب دہی تھی۔ بالآخر جہان بچانے کے لیے اس نے دارا کو بتایا کہ دونوں بھیلے اس نے راوی میں پہل کے دوسرے ستون کے قریب پھینک دیے تھے۔ دارا نے اسے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر اس جگہ دریا میں پھیلے نہ لے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

عابد علی نے صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مکان چھوڑ دیا۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے بچے کو لے کر فیروز پور روڈ پر اچھڑے ایک مکان میں آگیا لیکن تین دن بعد دارا نے انہیں یہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔ اس رات عابد علی نافل نہیں تھا۔ اس نے دارا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ دارا اور اس کے ساتھی مکان میں داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہوں نے مکان کو آگ لگا دی۔

مکان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ دارا اور اس کے ساتھی باہر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس کے آجانے سے دارا اور اس کے ساتھی بھاگ نکلے اور لوگوں نے پولیس کی مدد سے عابد علی، اس کی بیوی اور بچے کو توجہ کیا تھا۔ گھر وہ مکان جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

عابد علی کو اپنے ایک دوست کے ہاں پناہ ملی تھی۔ اس کی وجہ سے ملک نواز شلی کو پانچ کروڑ روپے کا نقصان پہنچا تھا۔ وہ اسے کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ یہاں کوئی جگہ اس کے لیے محفوظ نہیں تھی۔ فیصل آباد میں اس کے رہنے دار تھے۔ اس نے سوچا وہاں چلا جائے لیکن اسے یقین تھا کہ ملک نواز شلی کے آدمی اسے وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس کے دوست نے اسے ملک چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ وہ خود انہیں لے کر کراچی پہنچ گیا۔ یہیں سے انہوں نے ہاپورٹ ہوائے اور سنگا پور آگئے۔

پر تاب سنگھ نے ڈائری بند کر دی۔ اس کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا تھا۔ عابد علی جب سنگا پور آیا تھا تو اس نے پر تاب سنگھ کو اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن پانچ کروڑ روپے مالیت کے سونے والی بات نہیں بتائی تھی۔ البتہ چند سو پہلے مرنے سے تھوڑی دیر قبل اس نے سونے کے بارے میں افکشاف کیا تھا۔ ڈائری پڑھنے کے بعد پر تاب سنگھ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا اسے تلاش کرتا ہوا یہاں ہی لیے آیا ہے کہ سونے کے بارے میں معلوم کر سکے۔

اچانک پر تاب سنگھ کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ہو سکتا ہے ملک نواز شلی علی سب کچھ بھول چکا ہو اور دارا اپنے طور پر سونا حاصل کرنا چاہتا ہو اور وہ عابد علی کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا اور ملک نواز شلی کو اس کا پتا بھی نہ ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا۔

دارا کے بارے میں عابد علی نے جو کچھ بھی بتایا تھا اور ڈائری میں جو کچھ بھی پڑھا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دارا جیسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔

عابد علی کی ڈائری پڑھنے کے بعد پورا جس منظر پر تاب سنگھ کے سامنے آگیا۔ عابد علی اور اس کی بیوی شگفتہ ایک اسمگلر کی نفرت اور انتقام کا شکار ہو گئی تھی لیکن افسوس کی بات تو یہ تھی کہ یہ قصہ بیس پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ وجدان عابد علی کا بیٹا تھا اور یہ قصہ سے اپنے ماں باپ کے قتل کا واحد چشم دید گواہ تھا۔ مزید قسمتی یہ تھی کہ قاتل وہی لوگ تھے جنہوں نے وجدان کے ماں باپ کو اپنی ہی سر زمین پر چین سے نہیں رہنے دیا تھا اور بارہ سال پہلے انہیں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور بالآخر موت کا شکار ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ بیس پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ مزید دراز ہو گیا تھا۔

وجدان نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو بے دردی سے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ دارا کے بارے میں اس نے اپنے ماں باپ کو باتیں کرتے ہوئے بھی سنا تھا اور جب وہ اپنے باپ کی ڈائری پڑھے گا تو اس کی نفرت دو چند ہو جائے گی اور وہ جسم انتقام بن جائے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں روک سکے گی۔

پر تاب سنگھ نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ڈائری بند کر کے نکلنے کے بجائے رکھ دی اور سامنے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ دو بج چکے تھے۔ اس نے گردن اٹھا کر وجدان کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

پر تاب بھی سینہ ہا ہو کر بستر پر لیٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے چونک جانا پڑا۔ جہت پر ابی آوازیں آ رہی تھیں جیسے اٹھنا ہو رہی ہو۔ اس نے نکلنے کے بیچے سے پستول نکالا اور پچھلے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ لاؤنج میں پہنچ کر جہت پر اٹھنچکی آوازیں زیادہ واضح سنائی دینے لگیں۔

”سوتر سنگھ... اے سوتر سنگھ! کیا ہو رہا ہے۔ کہاں ہو تم؟“

اس نے دو تین مرتبہ سوتر سنگھ کو پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ تیز حیرت دم اٹھاتا ہوا لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آگیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دائیں طرف چھلانگ لگا دی۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کا جسم گولہوں سے چھلنی ہو جاتا۔

سامنے سے اس پر گولوں کی ہوجار کڑی گئی تھی۔ اگر اسے موت پر تاب سنگھ کے بہت قریب سے گزری تھی۔ اگر اسے چھلانگ لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کا جسم گولوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ لاؤنج والے اس دروازے کے سامنے کشادہ ہر آمدہ تھامس کے فرش اور سیڑھیوں پر ماربل کے کتبے لگے ہوئے تھے۔ پر تاب سنگھ کی چھت کو سمارا دینے کے لیے دو ستون تھے۔ ان پر بھی سفید سنگ مرمر کے کھڑے لگے ہوئے تھے۔

برآمدے میں دیواروں کے ساتھ اور فرش کے کناروں پر موزائک سے بنے ہوئے بڑے بڑے کتبے رکھے ہوئے تھے جن میں پھولوں کے پودے تھے۔ ستونوں کے ساتھ لگے ہوئے دو گلوں میں باریک چوٹیوں والی پیلین تھیں جو ستون پر بل کھاتی ہوئی اوپر جہت تک چلی جاتی تھیں۔ پر تاب سنگھ روزانہ صبح سویرے اٹھ کر ان گلوں میں پانی ڈالا کرتا تھا اور اب یہی کتبے اس کی زندگی کے خاتمہ بن گئے تھے۔

گولوں کی ہوجار ہوتے ہی اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی تھی اور فرش پر گرے ہی ان بڑے بڑے گلوں کی آڑ میں لیٹ گیا تھا۔ یہ نیت تھا کہ برآمدے کی بتی نہیں جل رہی تھی اگر روشنی ہوتی تو اسے دیکھ لیا جاتا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ حملہ آوروں کی نظروں سے محفوظ ہو گیا تھا۔ چھلانگ لگتے ہوئے اس کا پستول بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن یہ پستول تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سامنے سے فائرنگ ہو رہی تھی اور گولیاں برآمدے والے دروازے کے سامنے والی دیوار اور ستونوں پر لگ رہی تھیں۔ آٹونیک رائفل یا سب مشین گن سے ہونے والی فائرنگ بہت شدید تھی۔ پر تاب سنگھ گلوں کے پیچھے سے جس و حرکت لینا وجدان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گولوں کی تیز آہٹ کی آواز سے اس کی بھی آنکھ کھل گئی ہوگی اور پر تاب سنگھ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ کس دہستہ سے اٹھ کر باہر آنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسی صورت میں اس کا پتا مشکل ہو جاتا۔

فائرنگ بند ہو گئی۔ پر تاب سنگھ نے ایک لمحے کو انتظار کیا اور پھر بڑی احتیاط سے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس پر فرش کو ٹٹولے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ پستول اسے قریب ہی فرش پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے بیٹھی بیچ بتایا اور سامنے دیکھنے لگا۔ اب تک اس کی آنکھیں کسی حد تک تاریکی سے مافوس ہو چکی تھیں۔ کچھ میں اگرچہ اسٹریٹ لائٹ جل رہی تھی لیکن چھان شاخوں والے ایک درخت کی وجہ سے وہ روشنی پر تاب سنگھ کے مکان کے مہن تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھور رہا تھا۔

پر تاب سنگھ کو حملہ آوروں کے بارے میں اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً دارا کے آدمی تھے جو ہر قیمت پر وجدان کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے تاکہ ان کے جرم کا واحد بخئی گواہ اس دنیا میں موجود نہ رہے لیکن اسے حیرت تو

اس بات پر تھی کہ وہ دونوں پولیس والے کہاں گئے تھے جنہیں مکان کی حفاظت پر تعینات کیا گیا تھا۔ سوتر سنگھ اور دوسرا باڈی گارڈ دیوار سنگھ مکان کی چھت پر ڈھونڈ رہا تھا۔ جہت پر سے کسی قسم کی آوازیں سن کر ہی وہ چونک اٹھا۔ اس نے پر تاب سنگھ والے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوتر سنگھ کو آوازیں دی تھیں۔ اس

کی طرف سے تو کوئی جواب نہیں ملا تھا البتہ اس پر فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ گیت کی بتیاں کیوں بجھتی ہوئی تھیں۔

اس پر فائرنگ سامنے سے کی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ فائرنگ کرنے والا سامنے ہی کسی جگہ موجود تھا لیکن تاریکی میں وہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ پر تاب سنگھ دیدے گھماتا ہوا تاریکی میں گھور رہا تھا اور پھر اچانک وہ چونک گیا۔ ایک سیاہ بھولا سا تالی دیوار کے قریب حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ پر تاب سنگھ نے بڑی احتیاط سے پستول والا ہاتھ گلوں کے بیچ میں سے آگے نکالا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ گولی کیا نہ لگی دیوار میں گئی۔ سیاہ بھولا پھر رفتاری سے اچھل کر دروازے کی آڑ میں چلا گیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے پر تاب سنگھ پر گولوں کی بارش ہونے لگی۔ گولیاں گلوں پر اور برآمدے کے ستون پر لگ رہی تھیں۔ پر تاب سنگھ گلوں کے پیچھے دھکا ہوا تھا۔

فائرنگ ایک لمحے کو رک گئی اور اس ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پر تاب سنگھ نے ایک بار پھر ستر اٹھا کر گلوں کے اوپر سے دیکھا۔ درخت کے پیچھے دھکا ہوا سیاہ بھولا اب آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ سرک رہا تھا۔ پر تاب سنگھ نے فوراً ہی ٹریگر دبا دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ گونج اٹھی اور پھر وہ بھولا اس طرح اچھل کر دیوار پر چڑھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ پر تاب سنگھ نے ایک بار پھر ٹریگر دبا دیا۔ وہ دیوار کے دوسری طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ کوئی دیوار پر لگی تھی۔

پر تاب سنگھ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ وہ اسے سیاہ بھولے کے پیچھے کھلی میں جانا چاہتا تھا لیکن مکان کے اندر سے وجدان کی چیخ سن کر چونک گیا۔ اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور پلٹ کر برآمدے کے دروازے کی طرف لگا۔

وجدان اس کے بند دوم میں سویا کرتا تھا۔ پر تاب سنگھ کا خیال تھا کہ فائرنگ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ڈر کر چپٹا تھا۔ وہ اپنے بند دوم کی طرف دوڑا۔ وجدان کے چپٹنے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پر تاب جیسے ہی اپنے بند دوم کے دروازے پر پہنچا اس طرح ٹھک کر رک گیا۔ جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔

ایک جھلپا پٹا سا چپٹنی کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے وجدان کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ پر تاب سنگھ نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن گولی نہیں چلائی۔ وجدان اس چپٹنی کے قبضے میں تھا۔

”تم پستول بیکم دو پر تاب سنگھ۔“ چپٹنی نے اپنے پستول کی نال وجدان کی کپٹی سے لگاتے ہوئے کہا ”اگر کوئی چلائی دکھایا تو ہم اس لڑکے کا کھوپڑی اڑا دے گا۔“

صورتحال انتہائی نازک تھی۔ لڑکے کی زندگی خطرے میں تھی۔ پر تاب نگہ اس وقت کوئی چلائی نہیں دکھاسکتا تھا۔ اس چینی کی انگلی کی معمولی سی حرکت وجدان کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ اس نے ہسپتال پہنچا دیا۔

”تم بچ کر نہیں جاسکو گے“ وہ چینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تمہارا ایک ساتھی میرے ہاتھوں زخمی ہو کر بھاگ گیا ہے۔ باہر دو پولیس والے اور میرے دو گارڈ مکان کی چھت پر موجود ہیں۔ تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بہتر ہے اس لڑکے کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔“

”میرا لڑکا اس وقت میرا زندگی کا ضمانت ہے۔“ چینی نے کہا ”میرا زندگی کا ضمانت بھی اور دس ہزار ڈالر کا چیک بھی۔ میں اس لڑکے کو زندہ لے جائے گا تو میرے کو دس ہزار ڈالر ملنے کا ہے اور تمہارے گارڈز۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر بولا ”ہمارے جانے کا بعد تم چھت سے ان کالاشیں اٹھا لیتا۔“

پر تاب نگہ چونک گیا۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا سون رب دی۔“ پر تاب نگہ بولا ”اس لڑکے کو چھوڑ دو۔“

”ابھی تم میرا راستے سے ہٹ جاؤ۔“ چینی نے ہسپتال سے اشارہ کیا ”اس طرف آ جاؤ۔ کرے کے اندر۔“

پر تاب نگہ ابھی تک دروازے ہی میں کھڑا تھا۔ وہ اندر گیا۔ چینی وجدان کو گردن سے پکڑے اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہسپتال سے اس نے پر تاب نگہ کو زدیں لے رکھا تھا۔ خوف کی شدت سے وجدان کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا لگتا تھا اس کے جسم کا سارا خون نچر گیا ہو۔ چینی اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ پر تاب نگہ بھی محتاط انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے باہر گیا تھا۔

چینی وجدان کو گردن میں لیے راہداری میں اٹلے قدموں چلتا ہوا عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مکان کے پچھلی طرف وسیع لان تھا۔ کوئی کپاؤ بند وال نہیں تھی بلکہ دوسرے مکانوں کے لان ساتھ لے ہوئے تھے۔ پر تاب نگہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جب وہ مکان کے سامنے والے رخ پر دوسرے حملہ آور سے ٹبرو

آزما تھا اس وقت یہ چینی کسی طرح عقبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ حملہ آور صرف وہی تھے۔ ایک وہ جو پر تاب نگہ کے ہاتھوں زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور ایک یہ جو چھت پر اس کے دونوں محافظوں سے ٹھنسنے کے بعد عقبی دروازے سے اندر داخل

ہوا تھا اور اب اسی راستے سے واپس جا رہا تھا۔ چینی وجدان کو گردن میں لیے آہستہ آہستہ اٹلے قدموں پیچھے

ہٹ رہا تھا۔ اس کے ہسپتال کا رخ اب بھی پر تاب نگہ کی طرف تھا اور پر تاب نگہ بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ بریتیت پر

اس چینی کو روکنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک کوئی بات اس کی نگہ میں نہیں آئی تھی اور پھر وہ چینی کے پیچھے دیکھتے ہوئے اچانک سنبھلا۔ ”میں آفسیروں کی موت چلاؤ۔“

اس کا یہ نفسیاتی حربہ سو فی صد کامیاب رہا تھا۔ چینی ہیرے تیزی سے پیچھے ہٹا تھا۔ پر تاب نگہ کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور وہاں اس نے چینی کے اوپر جا کر اسے چینی بد خواص ہو گیا۔ وجدان کی گردن پر اپنی گرفت چھوٹ گئی البتہ دوسرے ہاتھ میں ہسپتال موجود تھا۔

پر تاب نگہ اسے لے ہوئے ساتھ گرا تھا۔ اس نے سر سے پہلے چینی کے ہسپتال والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس نے ہیرے کی کٹائی اس طرح موڑ دی کہ ہسپتال کا رخ دیواری کی طرف ہو گیا۔ ہاتھ پر دباؤ پڑنے سے ٹیکہ بند ہو گیا۔ گولی دیوار میں بیوست ہو گئی۔ ”وجدان بھاگ جاؤ۔ کرے میں جا کر دروازہ بند کر دو۔“

پر تاب نگہ ہٹا۔

وجدان بھی اس چینی کے ساتھ ہی فرش پر گرا تھا۔ وہ اٹھ کرے کی طرف دوڑا اور اندر گھس کر دروازہ بند کر دیا۔ پر تاب نگہ کے پیچھے دبا ہوا چینی اپنی کٹائی چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پر تاب نگہ کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس کٹائی کو موڑنا چلا گیا۔ ہسپتال کا رخ اب چینی کے سر کی طرف ہو گیا تھا اور بالآخر ہسپتال کی نال اس کی کپٹی سے لگ گئی۔ چینی آنکھوں میں وحشت سی ابھرتی۔ وہ ٹیکہ سے اٹھی بنائے کوشش کرنے لگا لیکن پر تاب نگہ نے اس کے ہاتھ کو اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ پر تاب نگہ نے اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے دروازہ دیا۔ ڈز کی آواز ابھری اور ہسپتال کی نال سے نکلنے والی گولی اس کی کپٹی میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ خون۔ چھینے پر تاب نگہ کے چہرے پر پڑے۔

”تمہارا ستیاناس۔“ پر تاب نگہ نے بڑبڑاتے ہوئے اکہر ہاتھ کو ایک اور جھٹکا دیا۔ چینی کے جسم میں پیدا ہونے والے سے ٹیکہ ایک مرتبہ پھر دب گیا۔ یہ گولی بھی کھوپڑی ہی میں بیوست ہو گئی۔

پر تاب نگہ اسے چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس نے گردن کے دامن سے اپنے چہرے سے خون کے چھینے پچھلے چینی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی کھوپڑی سے بہنے والا خون راہداری کے فرش پر پھیلے ہوئے تھیں۔ چینی کی گردن پر تاب نگہ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

پر تاب نگہ مڑ کر بیرونی رخ کی طرف دوڑا۔

”وجدان پتر۔ دروازہ کھول۔“ وہ دروازہ کھٹکاتے ہوئے

چند سیکنڈ کے بعد دروازہ کھل گیا۔ وجدان سامنے کھڑا

سے قمر قمر کاٹ رہا تھا۔ پر تاب نگہ نے اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”پ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ وجدان کا کندھا پھینکتے ہوئے بولا۔ ”ختم ہو گیا وہ۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ ہو سکتا ہے۔ تو تو بڑا باور لڑا کا ہے۔“ اس نے تائین پر دبا ہوا اپنا ہسپتال اٹھا کر اس کے ہاتھ میں ٹھسٹا دیا۔ ”اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تو اندر سے دروازہ بند کر لے اور اگر کوئی آجائے تو آواز دینا اسے گولی سے دیے آئے گا کوئی نہیں۔ ایک بھاگ گیا۔ ایک مر گیا۔ ڈرامت۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو چاچا۔“ وجدان بولا۔ اس کے لیے میں ابھی سی قمر قمر اٹھ گئی۔

”میں چھت پر سوتر نگہ کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ دروازہ بند کر لے۔“ پر تاب نگہ نے کہا۔ اس کے باہر نکلنے ہی وجدان نے کرے کا دروازہ بند کر لیا۔

پر تاب نگہ برآمدے میں گیا۔ اس نے بلب چلا دیا اور اندر اتر کر دیکھنے لگا۔ دیواروں پر گولیوں کے کئی نشان تھے۔ ایک دو گولے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ وہ برآمدے سے اٹھ کر باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ دونوں پولیس والوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ وہ دروازہ بند کر کے اوپر جانے والی بیڑیوں کی طرف لپکا۔

اس کے دونوں گارڈز چھت پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں کو ہلاک کر دیکھا۔ دیوار نگہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی گردن کی بڑی توڑی گئی تھی۔ البتہ سوتر نگہ زندہ تھا لیکن بے ہوش پڑا تھا۔ پر تاب نگہ دوڑتا ہوا اپنے اٹھیا اور لاؤنچ میں رگے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

پولیس کو وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اسے بتایا گیا کہ کئی میں رہنے والے ایک اور شخص نے پولیس کو فون پر فائرنگ کی اطلاع دے دی تھی اور پولیس پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی۔

پر تاب نگہ فون کا ریسیور رکھ کر باہر گیا۔ پولیس پاٹی کا انچارج انسپکٹر جیاگ شتھا۔ اس نے آتے ہی چند پولیس والوں کو کئی میں بھجوا دیا۔ تین پولیس والوں کو اس نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔

پر تاب نگہ اسے بتا رہا تھا کہ کس طرح وہ مکان کی چھت پر اٹھا۔ چینی تو اسی سن کر کرے سے باہر نکلا تھا اور جب وہ اپنے باڑی گاڑ سوتر نگہ کو آواز دیتا ہوا برآمدے والے دروازے سے

باہر آیا تو اس پر زبردست فائرنگ شروع کر دی گئی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا تھا۔ اگر وہ بدوقت ملکوں کے پیچھے چھلا گتا تو وہ زندہ نہ رہتا۔

”حملہ آور وجدان کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔“ پر تاب نگہ انسپکٹر کو بتا رہا تھا ”اگر اسے قتل کرنا مقصود ہوتا تو وہ چینی اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے کے بجائے گولی مار کر ہلاک کر دیتا جس کا اسے موقع بھی حاصل تھا لیکن وہ اسے زندہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے بدلے اسے دس ہزار ڈالر ملنے کی توقع تھی۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ اسے دس ہزار ڈالر ملنے والے تھے۔“ انسپکٹر جیاگ شتھا اسے گھورا۔

”اس نے خود کہا تھا۔“ پر تاب نگہ بولا ”مجھے اس کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ لڑکا نہ صرف یہاں سے نکلنے کے لیے اس کی زندگی کی ضمانت ہے بلکہ دس ہزار ڈالر کے چیک کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ وہ زندہ اسے ساتھ لے جائے گا تو اسے دس ہزار ڈالر ملیں گے۔“

”تمہارے خیال میں حملہ آور کون ہو سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کا تعلق کس سے ہو گا؟“ انسپکٹر جیاگ شتھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دارا۔“ پر تاب نگہ نے بلا جھجک جواب دیا ”اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ وجدان اپنے والدین کے قتل کا چشم دید گواہ ہے۔ دارا اسے بریتیت پر ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہو گا کہ وجدان کو اس کے سامنے قتل کیا جائے تاکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ اب اس کے جرم کا چشم دید گواہ زندہ نہیں رہا اور غالباً اسی لیے اس نے وجدان کو اغوا کرانے کے لیے ان چینی طاقتوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن اس کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”بات سمجھ میں آتی ہے۔“ انسپکٹر جیاگ شتھا نے گردن ہلانے کی ”تم نے بتایا تھا کہ تم نے چھت پر دھجکا شتی کی آوازیں دو بجے کے قریب سنی تھیں کیا تم اس وقت سوچتے تھے جاگ رہے تھے؟“

”میں اس وقت سونے کی تیاری کر رہا تھا۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا ”بات دراصل یہ ہے کہ رات دس بجے کے قریب ہم نے ہوٹل سے کھانا منگو کر کھا لیا تھا۔۔۔۔۔ پھر وجدان تو تھوڑی دیر بعد سو گیا تھا لیکن میں اپنے بستر پر لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ کتاب خاصی دلچسپ تھی۔ میں نے اسے ختم کر کے ہی چھوڑا۔ کتاب رکھ کر میں نے گھڑی دیکھی تھی اس وقت دو بج چکے تھے۔“ پر تاب نگہ خاموش ہو کر باہر والے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ عابد علی کی ڈائری کا تذکرہ وہ دانستہ طور پر گول کر گیا تھا ”اور ہاں۔“ وہ چند

تقت فی حدہ

50 روپے

## طالوت

(مکمل)

تقت فی حدہ

23 روپے

(3) حصوں میں (مکمل)

**کتابیات پبلی کیشنز**

مدیریت: محمد علی محمد

فون: 022682-022682

74200 کراچی

لحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ایک اور اہم بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔"

"وہ کیا؟" انسپکٹر بولا "کیا اس بات کا اس واقعے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے انسپکٹر۔" پر تاب سگھ نے کہا "گذشتہ روز ہم ہوٹل سے لکھا تھا کہ راولپنڈی آ رہے تھے تو ٹرنیک سگھل کی وجہ سے ہمیں ایک چوراہے پر گاڑی روکنی پڑی تھی۔ وہ جان میرے ساتھ کار کی آگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک موٹر سائیکل ہماری کار کے قریب آکر رکی جس پر دو چینی سوار تھے۔ وہ جانے ان میں سے ایک کو پچان لیا۔ وہ اس کے مال باپ کے قاتلوں میں سے ایک تھا۔ اس نے پامپو پر خنجر سے وار کر کے اسے ہلاک کیا تھا۔ وہ جان نے چنچ کر مجھے اس کے بارے میں بتایا تو میں جلدی سے گاڑی سے اتر آیا۔ ان چینیوں نے بھی وہ جان کے چلانے کی آواز سن لی تھی اور غالباً اس شخص نے بھی وہ جان کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھادی اور سگھل توڑتے ہوئے نکل گئے۔ ہم نے ان کا پچپنا کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"کیا تم نے ان کے چہرے دیکھے تھے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔  
"میں ان میں سے کسی کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا لیکن لڑکے نے انہیں پچان لیا تھا۔" پر تاب سگھ نے جواب دیا۔  
"لڑکا کہاں ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"اندر کمرے میں۔" پر تاب سگھ نے اشارہ کیا۔  
"ٹھیک ہے۔ میں اس سے ملتا ہوں لیکن پہلے ادھر کا معائنہ کر لیں۔" انسپکٹر جیٹنگ شوٹے کہا۔  
وہ سب سے پہلے زینے پر سے ہوتے ہوئے چھت پر آگئے۔ دو کانسٹیبل انسپکٹر کے ساتھ تھے۔ انسپکٹر نے جھک کر رات کی روشنی میں پہلے ربار سگھ کو دیکھا، وہ ختم ہو چکا تھا، وہ سوتر سگھ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ زندہ ہے۔" وہ بڑبڑایا پھر کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسے نیچے لے چلو اور ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔" دونوں کانسٹیبلوں نے جھک کر سوتر سگھ کو اٹھایا اور نیچے لے آئے۔ انسپکٹر اور پر تاب سگھ بھی نیچے آگئے اور اندر داخل ہو کر راولپنڈی میں اس چینی کی لاش کے قریب رک گئے جس کی کھوپڑی کے پرچے اڑ چکے تھے۔ چہرہ خون سے تر ہو رہا تھا۔

"یہ کیسے مرنا تھا؟ کیا تم نے..."  
"میں بادشاہوں۔" پر تاب سگھ نے اس کی بات کاٹ دی "یہ اپنے ہی ہسپتال سے اپنے ہی ہاتھوں مرا ہے۔ ہسپتال ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔"

انسپکٹر جیٹنگ شوٹ جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے لباس کی تلاش بھی کی تھی۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ "لائٹنر" اور کچھ رقم

پر آمد ہوئی تھی۔ ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔

پر تاب سگھ نے دستک دے کر بیڈ روم کا دروازہ کھولا، اندر وہ جان ہسپتال ہاتھ میں لے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے سائے قریب کر رہے تھے۔

"پولیس آگئی ہے۔ اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لاڈ ہسپتال مجھے دے دو۔" پر تاب سگھ نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ جان نے ہسپتال اس کے حوالے کر دیا اور خود بھی اس سے لپٹ گیا۔ پر تاب سگھ اس کا کندھا چھتے پانے لگا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ وہ جان سے پوچھ گچھ کرنے لگا اور پر تاب سگھ بڑی چادر اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے چادر راولپنڈی میں پڑی ہوئی چینی کی لاش پر ڈال دی تھی۔

انسپکٹر جیٹنگ شوٹ اس چینی کے بارے میں وہ جان سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ وہ جان اب بڑی حد تک اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تھا اور بڑے مچ آگے تھے۔ اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس دوران میں پر تاب سگھ دوبارہ کمرے میں آگیا۔  
"نیل فون کہاں ہے؟" انسپکٹر نے پر تاب سگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دوسرے کمرے میں۔ میرے ساتھ آؤ۔" پر تاب سگھ نے کہا۔

ان کے ساتھ وہ جان بھی لاؤنج میں آگیا۔ انسپکٹر نے فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈال کیے اور ایسی پولیس فون کر افر کو بھیجی کہ برائیت دے کر فون بند کر دیا۔  
"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آگئی انسپکٹر۔" پر تاب سگھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں ڈیوٹی دینے والے ہمارے دونوں کانسٹیبل کہاں غائب ہو گئے۔"

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آگئی۔" انسپکٹر نے جواب دیا "میں سختی سے بدایت بھی کر وہ ڈیوٹی کے دوران میں غفلت نہ برتیں۔ اگر وہ ڈیوٹی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں تو اس بے پروائی پر انہیں سخت ترین سزا دی جائے گی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان سے اس قسم کی کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ ضرور کوئی گزربوٹی ہے۔" اور پھر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ پر تاب سگھ کچھ کھانا چاہتا تھا کہ فون کی کھنٹی بجی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ ایک لمحہ بات کی پھر ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

"تمہارے لیے کال ہے۔"  
"میں۔" انسپکٹر جیٹنگ شوٹ۔ انسپکٹر ریسیور کان میں لگاتے ہوئے بولا۔

فون پر بات کرتے ہوئے انسپکٹر جیٹنگ شوٹ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ پر تاب سگھ کمری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ انسپکٹر تقریباً پانچ منٹ تک چینی زبان میں بات کرتا رہا

پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پر تاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
"میرا اندازہ درست نکلا۔ گزربوٹی کی تصدیق ہو گئی ہے۔ وہ دونوں کانسٹیبل ڈھیلن روڈ پر بے ہوش پڑے پائے گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں وہ یہاں آجائیں گے ان سے صورت حال کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"میں نے فون پر تمہاری باتوں سے کچھ اندازہ لگایا تھا۔" پر تاب سگھ نے جواب دیا۔ وہ طویل عرصے سے سگھ پریشان رہ رہا تھا۔ چینی زبان اگرچہ وہ روانی سے نہیں بول سکتا تھا لیکن سمجھتا اچھی طرح تھا۔

سوتر سگھ ابھی تک ہوش میں نہیں آسکا تھا۔ پر تاب سگھ کو اس کے بارے میں بھی تشویش تھی کہ وہ کیسے بے ہوشی کی حالت میں ہی اگلے جہاں کو نہ سدھار جائے۔ اس نے انسپکٹر جیٹنگ شوٹ سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو انسپکٹر نے سوتر سگھ کو اپنی جیب میں ڈال کر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اسپتال بھجوا دیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد لیو پولیس آگئی اور فونو گراف پر بھیج دیا۔ رات کا۔ اگرچہ پچھلا پھر تھا لیکن کچھ لوگ گھروں سے نکل کر کھلی میں آگئے تھے۔ کچھ لوگ فائرنگ کی آوازیں سن کر جاگ گئے تھے لیکن اس وقت بارے ڈرے کوئی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا اور اب پولیس کے آنے کے بعد کچھ لوگ صورت حال معلوم کرنے کے لیے گھروں سے باہر آگئے تھے۔

انسپکٹر جیٹنگ شوٹ اپنی نگرانی میں مختلف زاویوں سے لاشوں کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ چینی کی لاش کی تصویریں کھینچنے کے بعد اس نے لاش کے ہاتھ میں دبا ہوا ہسپتال نکال لیا اور اسے رومال میں لپیٹ کر ایک کانسٹیبل کے حوالے کر دیا اور لاشیں اٹھانے کا حکم دے دیا۔ تقریباً اسی وقت پولیس کی ایک جیب ان دونوں کانسٹیبلوں کو بھی لے کر آگئی۔

ان کانسٹیبلوں کا بیان بڑا دلچسپ تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق ڈیڑھ بجے کے قریب ایک کاروائی آکر رکی تھی جس میں تین پولیس والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آرجے روڈ پر کھلی پلازہ کے قریب ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ پولیس نفری کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہم ان کے ساتھ چلیں۔ چنگ نامی کانسٹیبل نے کہا "میں نے انہیں کہا تھا کہ ہماری ڈیوٹی یہاں لگائی گئی ہے۔ ہم کہیں نہیں جاسکتے لیکن ان میں سے ایک نے کہا کہ انسپکٹر جیٹنگ شوٹ انہیں فوری طور پر طلب کیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو نیل فون پر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ تھا۔ سمجھا۔ سردار صاحب شاید سوچتے تھے۔ چھت پر ان کے باڈی گارڈ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بھی شاید اگلے گئے تھے۔ یہاں سے نیل فون کرنے کے لیے سردار صاحب کو کچا بڑا تانت میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ کار میں آنے والی پولیس پائی کی سربراہ نے کہا کہ ہم چوراہے پر گئے۔ وہ نیل فون ہاتھ سے بات کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے مشورہ کیا اور

کار میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرے ساتھی کو بھی کار میں بٹھالیا۔ ان میں سے ایک تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور دو دیگر سیٹ پر ہمارے دائیں بائیں۔ ہم ان دونوں کے درمیان دب کر رہ گئے۔ "کار اشارت ہوتے ہی ان میں سے ایک آدمی نے ہمیں سگریٹ دیے۔ ہم سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں باتوں میں لگائے رکھا اور ہمیں احساس بھی نہیں ہوا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ شاید اس سگریٹ میں کوئی نشہ آور چیز ملی ہوئی تھی کیونکہ میرا دماغ بول بول رہا تھا۔ اعضا ڈھیلے پڑ رہے تھے اور ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

"میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے میری رائفل لینا چاہی تو ایک لمحے کو میں چونک سا گیا۔ اس وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں نے اس وقت مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو اس شخص نے جیب سے ہسپتال نکال کر میرے سر پر دے سے ضرب لگائی۔ سگریٹ کا نشہ پہلے ہی اپنا کام دکھا رہا تھا۔ ہسپتال کی ضرب سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

"مجھے ہوش آیا تو میں پولیس اسٹیشن میں تھا اور ایک پولیس والا منگ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہمیں یہاں لے آیا گیا۔"

"مسٹر پر تاب سگھ۔" انسپکٹر نے کانسٹیبل چنگ کے خاموش ہونے پر پر تاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارروائی باقاعدہ پلاننگ کے تحت کی گئی تھی اور ان کی تعداد پانچ تھی۔ تین آدمی دھوکے سے میرے کانسٹیبلوں کو یہاں سے ہٹانے گئے اور دو نے اس لڑکے کو اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک زخمی ہو کر بھاگ گیا اور دوسرا موت کا شکار ہو گیا۔"

"میرا ایک بندہ مارا گیا اور دوسرے کے بارے میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" سردار پر تاب سگھ نے کہا "لیکن کیا تمہارے آدمی اتنے بے وقوف ہیں کہ تصدیق کیے بغیر ان لوگوں کے ساتھ چل پڑے جو پولیس کی دروازا پر آئے تھے۔ کیا یہ لوگ اپنے اسٹیشن کے پولیس والوں کو نہیں پہچانتے؟"

"اس سلسلے میں انکاراوی ہوگی اور ان دونوں کے خلاف حکمانہ کارروائی کی جائے گی۔ بہرحال۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میں دوسرے کانسٹیبل یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور ہاں۔" وہ وہ جان کی طرف متوجہ ہو گیا "بٹالہ یہ وہی آدمی تو نہیں تھا جس نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟" اس کا اشارہ اس چینی کی طرف تھا جس کی لاش اب اٹھائی جا چکی تھی۔

"نہیں۔ یہ وہ نہیں تھا۔" وہ جان نے نفی میں سر ہلا دیا۔  
"ٹھیک ہے۔ پر تاب سگھ۔" انسپکٹر نے کہا "امید ہے مضمون کا سراغ مل جائے گا اور ہم بہت جلد انہیں گرفتار کر لیں گے۔"



”دیکھیں جی۔ کیا ہوتا ہے۔“ پر تاب نگہ بولا ”ویسے سوں رب دی۔ اگر وہ میرے ہاتھ لگ گئے تو انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”بہتر طریقہ یہ ہو گا کہ اگر ان میں سے کوئی نظر آجائے تو خود کوئی کارروائی کرنے کے بجائے پولیس کو مطلع کرونا۔“ انیسکیز چیانگ شونے کہا۔

پولیس رخصت ہو گئی۔ اس وقت صبح کے چار بجنے والے تھے۔ پولیس کے جاتے ہی کل می کھڑے ہوئے کچھ لوگ پر تاب نگہ کے پاس آگئے اور حملہ آوروں کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔

”اگر اتنا پتا ہو کہ وہ کون لوگ تھے تو اب تک ان سب کو چن چن کر ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا۔

آدھا گھنٹا لوگوں کے سوال و جواب میں گزر گیا۔ لوگ ہمدردی جتا رہے تھے اور پر تاب نگہ کو ابھن ہو رہی تھی۔ اس کا ایک بندہ مہر چکا تھا اور دوسرا اسپتال میں تھا۔ اس کے بارے میں اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ ہوش میں آیا تھا یا نہیں۔ وہ وجدان کو اکیلے چھوڑ کر کس جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی جان کے دشمن موقع کی تاک میں تھے اور پر تاب نگہ نہیں چاہتا تھا کہ وجدان کو کوئی نقصان پہنچے۔

سکڑے میں آکر اس کی نظریہ ساؤنڈ نیبل پر رکھی ہوئی مابعد علی کی ڈائری پر پڑ گئی۔ اس نے ڈائری اٹھا کر میز کی سب سے چلی درواز میں بھرے ہوئے کاغذوں کے نیچے رکھ دی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے چاچا۔“  
پر تاب نگہ وجدان کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

”ڈر کس بات کا بچہ۔“ پر تاب نگہ نے کہا ”چلو اب تم اپنے بستر پر لیٹ کر سو جاؤ۔ مجھے ابھی کچھ کام کرنے ہیں۔“ ڈننے کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے پاس ہوں۔“

وجدان اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے لیکن بہر حال تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔ پلنگ کی پٹی پر بیٹھا ہوا پر تاب نگہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں وہ کتنے سنگین اور خوفناک حالات سے گزر رہا ہے۔ پہلے اس نے اپنے ماں باپ کا خون ہوتے دیکھا اور اب اس کے سامنے دو خون اور ہوئے تھے۔ پر تاب سوچ رہا تھا کہ جب وجدان کی کینٹی پر ہسپتال رکھا گیا تھا تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس نے مرکز ایک بار پھر وجدان کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر لاؤنج میں گیا۔ بندہ دم کا دروازہ اس نے کھلیا ہی چھوڑ دیا تھا۔

فون کا ریسور اٹھا کر اس نے اپنے ایک دوست کا نمبر لایا۔ کال تقریباً ایک منٹ بعد ریسپو کی گئی تھی۔ ایک آدمی کی خوابیدہ آواز اس کی سماعت سے نکلانی۔

”رب بھلا کرے۔ کون ہے بھی تم کے ترکے کے؟“  
”میں پر تاب نگہ بول رہا ہوں دلدار۔“ پر تاب نگہ نے کہا ”یہ سونے کا پلاٹا نہیں ہے۔ تم جلدی سے بستر سے اٹھو اور میرے گھر آ جاؤ۔ یا پھر کو بھی ساتھ لیجئے آنا۔ یہاں اس کی ضرورت بھی پڑے گی۔“

”پر ہوا کیا ہے؟“ دلدار نگہ نے پوچھا ”سرندر کو رکھ ضرورت کیوں پڑے گی۔ ترکے کے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”یہ اسی غصہ ہو گیا ہے یار۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا ”مجھنی غصہ عابد علی کے پتر وجدان کو اغوا کرنے آئے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے مگر دربار نگہ ان کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ سوتر نگہ کی حالت بھی نازک ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔ تم دونوں جلدی سے یہاں آ جاؤ۔“

”تم تو ٹھیک ہو نا۔“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔  
”او میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بتاؤ نا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس تم لوگ آ جاؤ۔“ پر تاب نگہ نے کہا۔

”ہم آ رہے ہیں تھوڑی دیر میں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر لائن بے جان ہو گئی۔

پر تاب نگہ نے کمر بیل دبا کر اسپتال کا نمبر لایا اور سوتر نگہ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

”وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آ سکا۔“ ایک ڈاکٹر نے جواب دیا ”ہوش میں آنے کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی بات کی جاسکتی ہے۔“

”ویسے وہ بچ تو جائے گا ڈاکٹر صاحب۔“ پر تاب نگہ نے پوچھا۔ اس کے لیے یہ تشریحات نمایاں تھیں۔

”میں نے کہا نا کہ ہوش میں آنے کے بعد ہی کوئی بات کی جاسکتی ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پر تاب نگہ نے ریسور رکھ دیا اور لاؤنج سے نکل کر برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اور گھر سے گھرے سامنے لینے لگا۔ کئی میں رہنے والے جو لوگ صورت حال معلوم کرنے آئے تھے وہ اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ گیٹ کے باہر وہ پولیس والے کھڑے تھے جنہی زبان میں باتیں کر رہے تھے جنہیں انیسکیز چیانگ شون چھوڑ گیا تھا۔

پر تاب نگہ ان چھنی غصوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ ان میں سے تین دھوکے سے پولیس والوں کو لے گئے تھے اور دونے مکان پر بند بول رہا تھا۔ ان میں سے ایک زخمی ہو کر ہاتھ لگا گیا تھا اور دوسرا مارا گیا تھا لیکن پر تاب کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ سوتر نگہ اور دربار نگہ اتنی آسانی سے ان کے قابو میں کیے آ گئے تھے۔ وہ دونوں چھ چوٹ کے گھوڑا جو ان تھے۔ لڑائی میں تو وہ چار آدمیوں کے قابو میں نہیں آسکتے تھے لیکن دربار نگہ کی قدر خاموشی سے اپنی گردن تروا بیٹھا تھا اور سوتر نگہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

غالباً یہ ان چھنی غصوں کی خدمات کرائے پر حاصل کی گئی تھیں اور ان کی پشت پر دارا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ دارا۔ جو اس کے لیے ابھی تھا۔ اس کی دشمنی عابد علی سے تھی اور وہ عابد علی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ اس نے عابد علی اور اس کی بیوی کو ختم کر دیا تھا اور اب ان کے بیٹے کو ختم کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ صرف وجدان ہی اسے شناخت کر سکتا تھا اور وجدان کی گواہی اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی تھی۔ وہ بہر صورت میں وجدان کو ختم کرنا چاہتا تھا اور اس پیکر میں اس نے پر تاب نگہ سے بھی دشمنی مول لی تھی۔ پر تاب نگہ کا ایک بندہ مارا گیا تھا اور دوسرا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

”تمہیں میری دشمنی منگل پڑے گی دارا۔“ وہ مٹھیاں بھیجنے کر پڑھایا ”میں دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔“

پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“  
دارا کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ دانت کلچا پانے لگا۔ جہڑوں کے سسل ابھر آئے تھے۔ پہلے تو وہ اپنے بگڑی دوست عابد علی اور اس کی بیوی کے قتل کا انتقام لینا چاہتا تھا لیکن اب اس میں ذاتی انتقام کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اور اب اس نے واقعی طے کر لیا تھا کہ وہ دارا کا پیچھا دنیا کے آخری کونے تک کرے گا۔

باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سن کر اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اس نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ بند تھا لیکن اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دلدار نگہ آیا ہو گا۔ دلدار نگہ کی رہائش پر روڈ پر روڈ پر تھی۔ عام حالات میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچا جاسکتا تھا لیکن اسے سو سے بڑھا گیا۔ تیار ہونے میں کچھ وقت لگا رہا ہو گا۔ اب میں جیپس منٹ ہو چکے تھے۔ انہی کی گاڑی ہوگی اور پھر دلدار نگہ کی آواز سن کر اس کی تصدیق ہو گئی۔ گیٹ پر تھیں پولیس والے اسے روک کر سوال و جواب کر رہے تھے۔ پر تاب نگہ نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔

”نہیں اندر آؤ نہ کانٹیل۔“ اس نے ایک کانٹیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ پر تاب نگہ نے گیٹ بند کر دیا۔

”نیکیا ہو گیا بھایا۔“ دلدار نگہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔  
”ہونا کیا ہے۔ وہ شیطان ہاتھ دھو کر اس معصوم کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“ پر تاب نگہ نے ان کے ساتھ چلے ہوئے کہا ”آج بھی وہ اسے اٹھانے آئے تھے لیکن جب تک پر تاب نگہ زندہ ہے، وہ اس بچے کو غرے پر آج نہیں آنے دے گا۔“

”گمال ہے وہ؟“ سرندر کو رہے پوچھا۔  
”غدر کرے میں سو رہا ہے۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا ”مکتا معصوم سا بچہ ہے یار۔ اس پر کیسے ظلم کے باز توڑے جا رہے ہیں۔ اس روز اس کی نظروں کے سامنے اس کے ماں باپ

کو بے دردی سے قتل کر دیا اور آج اس کی کینٹی پر ہسپتال رکھ دیا۔ کیا حالت ہوئی ہوگی اس معصوم کی۔“  
”اور دربار نگہ کیسے مر رہا۔ سوتر نگہ کیسا ہے؟“ دلدار نگہ نے پوچھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے لاؤنج میں آ گئے تھے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی گردن کی بڑی کیسے تروا بیٹھا۔ سوتر نگہ بھی ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ میں اسپتال جانا چاہتا تھا لیکن اس لڑکے کو تو یہاں اکیلے چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی ساتھ لے جاسکتا تھا اسی لیے میں نے تم لوگوں کو بلوایا ہے یا پھر۔“ وہ سرندر کو رکھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم بچن میں جا کر چائے بناؤ۔ آٹھوں میں جلن اور دماغ میں دھماکے سے ہو رہے ہیں۔ ایک کپ چائے پی لوں تو پھر اسپتال جا کر سوتر نگہ کا پتا کر دوں۔ ساری چیزیں بچن میں موجود ہیں۔ دودھ کی بوتل بھی فریج میں رکھی ہوئی ہے۔“

سرندر کو رکھن میں چلی گئی۔ وہ تینتیس چونتیس سال کی ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ قد لانا اور حسن بھی ڈھانے اسے جی بھر کے دیا تھا۔ وہ اس وقت شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔  
دلدار نگہ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ وہ بھی صحت مند جسم اور لمبے قد کا مالک تھا۔ وہ سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر بگڑی نہیں تھی۔ بال سفید نیٹ میں کھڑی پڑے جوڑے کی طرح بچھتے ہوئے تھے۔ سیاہ گول داڑھی اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

دلدار نگہ سے پر تاب کی دوستی بڑی پرانی تھی۔ شہر میں چلنے والی تین درجن نیکیاں اور تقریباً چالیس ٹریٹا اس کی ملکیت تھیں۔ وہ یہ گاڑیاں کرائے پر چلاتا تھا۔ تقریباً بیس سال پہلے جب وہ سنگاپور آیا تھا تو اس نے کرائے پر ٹریٹا لے کر چلانا شروع کیا تھا۔ وہ اس وقت اٹھارہ سال کا نوجوان تھا۔ کام اور محنت کا جذبہ تھا۔ وہ یہ آڈولے کر سنگاپور آیا تھا کہ محنت کرے گا اور کرائے گا۔ اس نے واقعی محنت کی اور کیا۔ ایک سال کی محنت سے اس نے ایک سینکڑہین ٹریٹا خرید لیا پھر دوسرا پھر تیسرا۔ ٹریٹا کے ساتھ اس نے نیکیاں پر بھی ہاتھ ڈال دیں اور اب بیس سال گزرنے کے بعد وہ ٹریٹا اور نیکیاں کے حوالے سے سنگاپور کی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ دوسرے ممالک خاص طور پر ہندوستان سے روزگار کی تلاش میں آنے والے لوگ جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے تو دلدار نگہ کے پاس آ جاتے۔ وہ انہیں بغیر کسی ضمانت یا سیکیورٹی کے نیکیاں ٹریٹا کرائے پر دے دیتا۔ ویسے اس کے زیادہ تر ڈرائیور مستقل ہی تھے۔ دلدار نگہ کی روزانہ کی آمدنی ہزاروں میں تھی۔ اس نے رو روڈ پر ایک شاندار بنگلا بنا رکھا تھا۔

اس کی شادی بھی سنگاپور میں رہنے والی ایک سنگھ فیملی میں ہوئی تھی اور یہ رشتہ کرانے میں پر تاب نگہ کا بھی ہاتھ تھا۔ سرندر کو حسین ہونے کے ساتھ بڑی سمجھ اور تعلیم یافتہ بھی لیکن خدا

نے ان دونوں کو ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم ہی رکھا تھا مگر وہ باپس نہیں تھے۔ دلدار سگھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن خدا ان کی جموں بھی بھروسہ گا۔

سرندر کو چاہئے بنا کر لے آئی۔ ایک کپ اس نے پر تاب سگھ کے ہاتھ میں تمباکو۔ دوسرا اپنے شوہر کو دیا اور تیسرا خود سنبھال کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے کی چکیاں لیتے ہوئے وہ ہاتھیں بھی کر رہی تھی۔

”یہ پتا نہیں چلا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ انہوں نے عابد علی اور اس کی بیوی کو قتل کیا اور وہ ان کے بیٹے کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟“ دلدار سگھ نے پر تاب سگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی پرانی دشمنی ہے۔“ پر تاب سگھ نے چائے کی چکی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”انہوں نے عابد علی اور اس کی بیوی اور بیٹے کو لاہور میں بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھاگ کر یہاں آ گیا۔ یہ بارہ سال پہلے کی بات ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر عابد علی کی کمائی خانے لگا۔ سونے والی بات وہ گول کر گیا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا ”بارہ سال تو سکون سے گزر گئے۔ عابد علی کا خیال تھا کہ وہ لوگ اسے بھول گئے ہوں گے لیکن موت کسی کو نہیں بھولتی۔ وہ دونوں تو ختم ہو گئے لیکن میں اس معصوم کو ان درندوں کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔ انہوں نے میرے گھر پر حملہ کر کے اور میرے بندے کو مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔“ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا ”اپنی گاڑی کی چابی مجھے دو۔ میں اسپتال جا رہا ہوں اور پاپو۔ تم ذرا کاکے کا خیال رکھنا۔ میں نے تڑکے تڑکے تمہیں بھی تکلیف دی۔“

”میں بھائی۔“ سرندر کو رنے جواب دیا ”تکلیف کیسی۔ بندہ ہی تو بندے کے کام آتا ہے۔“

دلدار سگھ بھی سلیپنگ سوٹ کی شرٹ سے چابیوں کا گچھا نکالتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چابیوں کا گچھا پر تاب سگھ کی طرف بڑھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

پر تاب سگھ اس کی سرسبز کار میں بیٹھ کر نصرت ہو گیا تو اس نے گیٹ بند کر دیا اور اندر آ گیا۔

یہ کچھ وقت بھی ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر اسپتال پہنچا جاتا تھا لیکن اس نے گاڑی کی رفتار قابو میں رکھی تھی۔

”میں گھن گھن روڈ پر واقع اسپتال پہنچنے میں اسے پندرہ بیس منٹ زیادہ نہیں لگے تھے۔ انکارزی کاؤنٹر سے پتا چلا کہ سوتھ سگھ تیسری منزل پر ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔ پر تاب سگھ کمرے کا نمبر دریافت کر کے تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ وہ جیسے ہی ایک راہداری میں ”مرا“ چاندز آگے دو پولیس والوں کو دیکھ کر کچھ ہکا اس کا مطلوب کمرہ دہی ہے جس کے سامنے پولیس والے کھڑے تھے اور ان پولیس والوں نے اسے کمرے میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔“

”اوئے وہ میرا حشر ہے۔ تم مجھے اندر جانے سے کیسے روک سکتے ہو۔“ پر تاب سگھ نے پولیس والے کو گھورتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر چینگ شو کی اجازت کے بغیر تم اندر نہیں جا سکتے۔“ کانٹیل نے جواب دیا۔

”کہاں ہے انسپکٹر چینگ شو۔ اسے تباہ سردار پر تاب سگھ ہے۔“ ”پر تاب نے کہا۔“ کانٹیل نے پہلے اسے گھور کر دیکھا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس کی واپسی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے پر تاب سگھ کو اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔

”کمرے میں انسپکٹر چینگ شو کے علاوہ سادہ لباس میں ہونے والے ایک آفیسر بھی موجود تھا۔ بیڈ کے دوسری طرف ایک ڈاکٹر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔“

سوتھ سگھ بیڈ پر بڑا ہوا تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ اسے دیکھ کر پر تاب سگھ جلدی سے آگے بڑھا مگر انسپکٹر چینگ شو نے اسے روک لیا اور ہونٹوں پر اٹھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”پر تاب سگھ کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے۔ پر تاب سگھ نے اسے بڑی طرح تجھوڑ ڈالا تھا۔ اس نے پر تاب سگھ کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں انہیت تھی۔ اس کے ہونٹوں کو بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔“

انسپکٹر چینگ شو نے آگے بڑھ کر پر تاب سگھ کو بازو سے پکڑ کر پچھلایا۔ اب پر تاب سگھ سوتھ سگھ کو اس طرح خاموشی سے دیکھ رہا تھا جسے اس کی اپنی قوت گویائی سب ہو گئی ہو۔ سوتھ سگھ کے بارے میں ڈاکٹر کے منہ سے خیر اکتشاف سے اس کے حواس پر بجلی سی کر رہی تھی۔

”مسٹر پر تاب سگھ۔“ انسپکٹر چینگ شو نے اسے بازو سے پکڑ کر تجھوڑ دیا ”ہوش میں آؤ پر تاب سگھ۔ ہو سکتا ہے شدید صدمہ کی وجہ سے وقتی طور پر اس کے حواس متزل ہو گئے ہوں اور بولنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر!۔“ پر تاب سگھ نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ”انسپکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے؟“

”ہاں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہم یہی بات کر رہے تھے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا ”یہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ہوش میں آیا ہے۔ میں ممکن ہے کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کی قوت گویائی اور یادداشت بحال ہو جائے۔ بہر حال چند منٹ ہوں گے۔ اس کے بعد کوئی حتمی بات بتائی جا سکتی گی۔“

”اس کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں؟“ پر تاب سگھ نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کی زندگی محفوظ ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”لیکن اس زندگی کا کیا فائدہ؟“ پر تاب سگھ بولا ”نہ یہ پول سگھ کا کسی کو بچانے کا۔ اسے تو اپنی پہچان بھی نہیں رہے گی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں ہو گا کہ یہ خود کون ہے۔“

”پاپو! نہ ہوں مسٹر پر تاب۔“ ڈاکٹر نے کہا ”ہم پوری کوشش کریں گے کہ اس کی قوت گویائی اور یادداشت لوٹ آئے۔“

”میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ڈاکٹر۔ میں اپنی ساری دولت لٹا دوں گا۔ اسے۔۔۔۔۔“

”موصطو مگر مسٹر پر تاب۔“ انسپکٹر چینگ شو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ”میں ان کفرے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آؤ جا رہے ہیں۔“

ہوئی سائینڈ آفیسر بھی ان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

”کوئی امیروں سے ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا ڈاکٹر۔“ انسپکٹر چینگ شو نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پر تاب سگھ کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔ اس نے دروازے پر حتمی پولیس کانٹیل کو سختی سے ہدایت کی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی بھی غیر متعلق شخص کو کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔

وہ اسپتال کی عمارت سے باہر آکر لان میں کھڑے دہر تک باقیں کرتے رہے۔ اس وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ پر تاب سگھ کی آنکھوں میں جیسے مریض کی بھرتی تھیں اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔

”اب تم گھر جاؤ پر تاب سگھ۔“ انسپکٹر چینگ شو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے دربار سگھ کی آخری رسومات بھی تمہیں ہی ادا کرنی ہوں گی اور اس سلسلے میں تمہیں انتظامات بھی کرنے ہیں۔“

”میرے سوا ان کا یہاں سے بھی کون۔“ پر تاب سگھ مگر سانس لیتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولا ”ان دونوں کے خاندان تو ہندوستان میں ہیں۔ میں ٹیلی فون پر دربار سگھ کے گھر والوں کو اطلاع دے دیتا ہوں۔ اس کی ڈیڈ باڈی اسے ترسرتی بھڑوانی دوگی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پولیس کی طرف سے کاغذات تیار کر کے کسی کانٹیل کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔ تم اسپتال سے ڈیڈ باڈی منگوا لیتا اور اپنا خیال رکھنا۔ تم پر بہت سی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ تمہیں اس بچے کا بھی خیال رکھنا ہو گا جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ میں اس کی حفاظت کے لیے مزید انتظامات کروں گا۔ جاؤ۔“

اب تم گھر جاؤ۔“

• پر تاب سگھ چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”اب کوئی باقی کال لے کر آئے۔“

وہ انسپکٹر چینگ شو سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اشارت کر دیا۔

○●○

شہر کے مرکز سے دور صوفی روڈ کی ایک بنگلہ گلی میں واقع اس خوب صورت بنگلے کے ایک کمرے میں تین آدمی بیٹھ ہوئے تھے۔ وہ تینوں چینی تھے۔ ان میں ایک تو بہت بڑا بڑا تھا۔ قد بھی چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ انڈے کے چھلکے کی طرح بالکل صاف اور چمکا سر، موٹی آنکھیں جس میں بھی سی پٹلا ہٹ تھی۔ ہونٹ گہری خمدار اور درمیان میں آہیں ملی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً شیو تھا بلکہ یہ کم از کم زیادہ مناسب رہے گا کہ اس کے چہرے پر قدرتی طور پر بال تھے ہی نہیں اور اسے کبھی شیو بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ بہت دھلے پٹلے اور انکھیاں لمبی اور مخروطی تھیں۔ ناک بھی کھڑی اور پتلی سی تھی۔ ہونٹوں پر سرخی نظر آ رہی تھی۔ وہ شخص اس قدر بڑا پتا تھا کہ گمان ہوتا تھا جیسے بانس پر کھال منڈھ دی گئی ہو۔

دوسرے دونوں آدمی متوسط قد و قامت کے مالک تھے۔ ان میں ایک تو قدرے بھاری بھر کم تھا اور دوسرا پہلے آدمی کی طرح ڈھلا پٹلا۔ ان کے نقوش بھی عام چینیوں جیسے ہی تھے۔ بھاری بھر کم آدمی کے سر کے بال قدرے لمبے تھے اور گردن پر کھڑے ہوئے تھے۔ اچھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کبھی شکھا کر ناصیب نہ ہوا

ہو۔ ان دونوں نے جینز اور سینڈ وٹ دھاری دار ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کا تیسرا ساتھی جو پانس کی طرح قد اور تھوڑا اون چڑے کی جینٹ پنہ ہوتے تھے جس کے بدن کھلے ہوئے تھے اور اس کا بالوں سے بے نیاز سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ اس نے براؤن رنگی سی کی جینٹ پہن رکھی تھی جس کے ٹک پائینچے خٹوں سے چند انچ اوپر پنڈلیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں اسٹین لیس اسٹیل کا ایک کڑا نظر آ رہا تھا۔

اس وقت رات کے دھاتی رخ رہے تھے۔ چڑے کی جینٹ والا دروازہ قامت چھٹی بار بار دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ "ایک گھنٹا ہو چکا ہے۔ اب تک انھیں آجاتا چاہیے تھا۔" وہ شخص اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ انداز پر اترنے والا تھا۔

"کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو مسٹر مک۔" فریہ اندام چھٹی نے کہا۔ "تم لوگوں نے ان کا سنبھالو کماں چھوڑا تھا؟" دراز قامت کم بولا "وہ بے ہوش بھی ہوئے تھے یا نہیں؟"

"بے ہوش تو وہ ایسے ہوئے تھے کہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آسکیں گے۔" اس شخص نے جواب دیا "انہیں ہم نے ڈیٹین روڈ پر ایک خالی پلاٹ پر جھانپوں میں پھینک دیا تھا اور میرا خیال ہے وہ صبح سے پہلے کسی کی نظروں میں بھی نہیں آسکیں گے۔ ان کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔"

"پولیس کی وردیوں کا کیا کیا تم نے؟" مسٹر کم نے پوچھا۔ "وردیوں اتار کر ہم نے گاڑی میں بیٹھ ڈالی تھیں۔" اس شخص نے جواب دیا "وہ گاڑی ہم نے پلازا سٹاک پور کے قریب سے چوری کی تھی۔ ہوا فنگ وہ گاڑی چھوڑنے گیا ہے۔ وہ گاڑی کسی بھی ویران جگہ پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا جائے گا۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ وہ تو ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہی نہیں تھا لیکن بیوی کے علاج کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت ہے اس لیے وہ آمادہ ہو گیا تھا۔"

"ہمارے خیال میں اگر سب ٹھیک ہے تو چانگ اور تھاگ چو ابھی کھنکھن نہیں گئے۔" کم بولا۔

"ایسے کاموں میں تھوڑی بہت تاخیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ مسٹر کم۔" اس شخص نے جواب دیا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی "میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے۔" ڈوئے تھاگ نامی وہ ہماری بھرم شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا "میں دیکھتا ہوں۔"

ڈوئے تھاگ کمرے سے نکل کر رابڈاری میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدہ والا دروازہ کھول کر باہر گیا۔ باہر کسی گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ڈوئے تھاگ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے چوک جانا پڑا۔ کار سے اترنے والا جینیٹو لکڑیا تھا جو ابھی

کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بائیں کندھے پر ڈرا نیچے رکھا ہوا تھا۔ "اے چانگ کیا ہوا۔" تھاگ چو کہاں ہے اور وہ لڑکا کھل ہے۔" ڈوئے تھاگ تیزی سے آگے بڑھا۔ "گڑبڑ ہوگئی۔" چانگ نے کراہتے ہوئے جواب دیا "مجھے کوئی گلی ہے۔ شاید ہینلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

ڈوئے تھاگ 'چانگ کو سہارا دے کر اندر لے آیا۔ روشنی میں اس نے چانگ کی طرف دیکھا تو بری طرح بدحواس ہو گیا۔ چانگ کے کپڑے خون سے تر ہو رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بھی خون سے لٹھرا ہوا تھا۔ خون زیادہ بہر جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر مرونی کے آثار تھے۔ ڈوئے تھاگ اسے سہارا دے کر کمرے کے اندر لے آیا۔ سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا مسٹر کم اسے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ہوا فنگ بھی ایک جیسے سے اٹھ گیا تھا۔ چانگ کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دھشت سی ابھر آئی تھی۔

"ہوں۔" دراز قامت مسٹر کم 'چانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی بھوس سکر گئی تھیں "ہماری حالت تم لوگوں کی نکالی کی داستان ساری ہے۔" تھاگ چو کہاں ہے؟"

"اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں مسٹر کم۔" چانگ نے کراہے ہوئے جواب دیا "ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ مکان کے اندر تین چار آدمی تھے جنہوں نے ہم پر فائر کھول دیا۔ مجھے پتا نہیں تھا فنگ چو زہر ہے یا مارا گیا۔ مجھے گولی لگی ہے۔ پیلر! ڈاکٹر کو بلاؤ مسٹر کم۔"

"ڈاکٹر کو بلائے کی ضرورت نہیں۔" ہمارا علاج تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ میں بھی ایک کوالیفائڈ فرینش اور سرجن ہوں۔ ایک غیر قانونی آپریشن کی وجہ سے مجھے اسپتال کی ملازمت سے نکال دیا گیا لیکن اسپتال سے نکالے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے اندر وہ تمام صلاحیتیں ختم ہو چکی ہوں۔ ہمارا علاج میں زیادہ بہتر طور پر کر سکتا ہوں لیکن پہلے مجھے تشہیہ سے بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" مسٹر کم نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔

"ہم پروگرام کے مطابق ڈوئے تھاگ وغیرہ کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچے تھے۔" چانگ نے کراہتے ہوئے جواب دیا "پولیس والوں کو اگرچہ وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ پر تاب ٹکے کے دو گاڑز چھت پر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں مکان کے سامنے والے رخ سے آگے بڑھا اور تھاگ چو مکان کے کچیل طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے مجھے مکان کی چھت پر سے نکل دیا۔ وہ گاڑز پر قابو پا چکا تھا۔ میں دیوار پر چڑھ کر گپاؤنڈ کے اندر پہنچ گیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے سامنے والے رخ سے اور تھاگ چو کو مکان کے عقبی دروازے سے اندر داخل

ہونا تھا۔ ہمارے خیال میں اب مکان کے اندر پر تاب ٹکے اور اس کے سوا کسی کو نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن ہمارا اندازہ غلط لڑکے کے اندر پر تاب ٹکے کے علاوہ کم از کم دو آدمی اور نکلا۔ مکان کی طرح ہماری موجودگی کی خبر ہوگئی۔ ایک آدمی نے آہٹیں کسی طرح ہماری موجودگی کی خبر ہوگئی۔ ایک آدمی نے برآمدے والے دروازے سے فائرنگ شروع کر دی جو اب میں میں نے بھی فائر کھول دیا۔ میں اس وقت درخت کی آڑ میں تھا۔ اپنی پوزیشن بدلنے کے لیے درخت کی آڑ سے نکلا تو ایک گولی کی زد میں آ گیا۔ شاید ہینلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکل سکا ہوں۔"

"تم صرف اپنی جان بچا کر بھاگے۔" مسٹر کم نے اسے گھورا اور کمرے میں رکھی ہوئی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا "تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہمارا ساتھی کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے تو اسے ہمارا مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے فریٹ پر وہ لڑکا چاہیے لیکن تم اپنے دشمن میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور بزدلوں کی طرح وہاں سے بھاگ آئے اور اب ایک جھوٹی کمانی بنا کر مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ جانتے ہو مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ میں ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا جو اپنی کمزوریاں چھپانے کے لیے اپنے ساتھیوں کو بھی دھوکے میں رکھنے کی کوشش کریں۔"

"نہیں۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا مسٹر کم!" چانگ کا چہرہ دھواں ہو گیا "وہاں واقعی تین چار آدمی تھے جن کی وجہ سے مجھے دشمنی ہو کر پستی اختیار کرنی پڑی۔"

"تم جانتے ہو میں پلاننگ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔" مسٹر کم نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا "میں نے آپ کو جان دن ان لوگوں کی عمرانی کرانی تھی۔ وہ لڑکا گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک آدمی پر تاب ٹکے کی عمرانی کر رہا تھا۔ اس سے ایک حفاظت ہوگئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ میں پر تاب ٹکے کو اغوا نہ چاہتا ہوں۔ وہ موقع پا کر پر تاب ٹکے کی گاڑی میں چھپ گیا اور اس نے پستول کے زور پر پر تاب ٹکے کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور اسے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد پر تاب ٹکے سیدھا اپنے گھر گیا تھا۔ انہوں نے کھانا بھی ہوٹل سے منگو کر گھر ہی میں کھایا تھا۔ اس کے بعد نہ ان میں سے کوئی گھر سے باہر گیا تھا اور نہ ہی کوئی ان کے ہاں آیا تھا اور تم بتا رہے ہو کہ مکان کے اندر پر تاب ٹکے کے علاوہ بھی دو تین آدمی موجود تھے۔ تم جھوٹ بول کر اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے مسٹر چانگ۔"

مسٹر کم نے خاموش ہو کر میز کی دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا پستول نکال لیا۔ پستول کی نال پر سائنس لکھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر چانگ کانپ اٹھا۔ "کس۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں مسٹر کم۔" چانگ گلہ بیا "تم تھاگ چو سے پوچھ لینا۔ وہ میری بات کی تصدیق کر دے گا۔" "مسٹر کم وہ زندہ ہو گا تو ہمارا بات کی تصدیق کرے گا۔" مسٹر کم

نے کہا "اگر وہ زندہ ہوتا تو تم سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ پر تاب ٹکے اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے تھاگ چو کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہو گا اور تم۔۔۔ ہمارے لیے اب میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ تم جیسے جھوٹے اور بزدل آدمی کی تو اس دنیا ہی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"مجھے معاف کرو مسٹر کم۔" چانگ گڑگڑایا "ڈاکٹر کو بلاؤ پیلر میں ٹھیک ہو جاؤں تو اپنی اس کو نامی کی تلافی کروں گا۔" "میں نے کہا تھا کہ میں تمہارا علاج کسی اور ڈاکٹر سے بہتر کر سکتا ہوں۔" مسٹر کم کا اندر ہوا تبہ اور اٹھا دیا۔

چانگ اب بھی گڑگڑا رہا تھا۔ مسٹر کم نے ٹھنک دیا۔ سبک کی ہلکی سی آواز ابھری اور پستول سے نکلنے والی گولی چانگ کی پیشانی میں پیوست ہوگئی۔ چانگ کے منہ سے نکلنے والی پچ بڑی خوف ناک دھمکی۔ وہ کھڑے کھڑے لہرایا اور پھر دھڑم سے پیچھے گر گیا۔ اس کی پیشانی سے بننے والی خون کی دھارا اس کے چہرے اور گردن کو تر کرتی ہوئی قاتلین میں جذب ہونے لگی۔

"نہیں اس جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا مسٹر کم۔" ڈوئے تھاگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ چانگ کا انجام دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے "تھاگ چو سے اس کی بات کی تصدیق تو کر لیتے۔"

"کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔" مسٹر کم نے اسے گھورا "میری اس بات کا یقین کر لو کہ تھاگ چو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اگر تم چاہو تو خود وہاں جا کر اس امر کی تصدیق کر سکتے ہو اور ہاں۔۔۔ اس کی لاش کو اٹھا کر یہاں سے دور کسی دیرانے میں پھینک دو۔ لاش اٹھانے سے پہلے اس کے لباس کی تلاشی لے لینا۔ بیویوں میں ایسی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے جس سے اس کی شناخت ہو سکے اور تم لوگ بھی اپنے اپنے ٹھکانوں تک محدود رہو گے۔ مجھے کسی وقت تم لوگوں کی ضرورت نہ پڑے گی۔" اس نے پستول میز کی دراز میں رکھ دیا اور اندرونی دروازے میں داخل ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ڈوئے تھاگ نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا پھر دونوں نے جھک کر چانگ کی لاش اٹھائی اور باہر چلے گئے۔

مسٹر کم دوسرے کمرے میں آکر ایک صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جھٹکن اور بیزارگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ اس نے دارا سے اس لڑکے کو اغوا کرانے کے پچاس ہزار ڈالر لیے تھے لیکن چانگ اور تھاگ چو کی کسی حماقت کی وجہ سے اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ نجانے اسے یہ یقین کیوں تھا کہ تھاگ چو مجھ سے بھی نہیں بچا ہو گا۔

مسٹر کم سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا ہوتا تو اس کے لیے آگے کے راستے کھل جتے تھے۔ دارا سے اس کی

ملاقات اگرچہ چند روز سے زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن ان چند دنوں میں ہی اس نے دارا کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ دارا میاں کی ایک اور پارٹی سے مل کر پاکستان سے منسلک اور کے راستے سفید پاؤں کی اسمگلنگ کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ پارٹی کی طرح دولت بھرا پارٹی تھا۔ دوسری پارٹی مقامی سی تھی۔ کم مشروٹے کوٹے کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بظاہر ایک نائٹ کلب کا مالک تھا لیکن اس کا اصل برسرِ منشیات کی اسمگلنگ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک گولڈن ٹرائی اسٹریٹ کی ایک دو پارٹیوں سے اس کے تعلقات تھے جن کی شرارت سے اس نے بہت کمایا تھا لیکن چند مہینے پہلے وہ دوسری پارٹی کے ایک ایجنٹ کے ہمراہ پکاک میں پولیس کے ترسے میں آ گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس تقریباً دو ملین ڈالر کا مال تھا۔ دوسری پارٹی کا ایجنٹ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ کم مال بیل بچا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔ اسے دو ملین ڈالر کا وہ مال بھر حال چھوڑنا پڑا تھا۔

اس واقعے کے بعد دوسری پارٹی کے سربراہ سے اس کے تعلقات گلے جڑے تھے۔ وہ امریکن ڈرگ بافیا کا ایک بہت بڑا ڈان تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم نے مال ہضم کرنے کے لیے یہ ڈرا کھلیا تھا۔ کم خود بھی بے حد خطرناک اور سفاک آدمی تھا لیکن ڈان کے خوف سے وہ چھپتا پھر رہا تھا۔ اس نے ایک اور آدمی کو بیچ میں ڈالا جس نے امریکی ڈان کو یہ یقین دلائی کہ وہ اس معاملے میں کم بالکل بے قصور تھا۔ وہ خود بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگتا تھا۔ امریکی بافیا کے ڈان نے اپنے طور پر بھی اس معاملے کی تحقیقات کرائی تھیں۔ یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ کم نے اس کے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اسے دو ملین ڈالر کا یہ نقصان کم کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے کم کو معاف تو کر دیا لیکن اس سے کاروباری تعلقات ختم کر لیے تھے۔

اس واقعے کے بعد کم اکیلا رہ گیا۔ اس کی سادھ ختم ہو گئی تھی۔ اس پر لوگوں کا اعتماد ڈانوں ڈول ہو گیا۔ بڑی پارٹیاں اس سے دور ہی رہنے لگیں۔ چھوٹی پارٹیوں سے اتنا پیسہ نہیں مل رہا تھا۔ کم جرائم کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے لگا اور پھر اسے ایک مڈل مین کے ذریعے دارا کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ مڈل مین بمبئی کا ایک ہندو نارائن پرکاش تھا۔ کم اسے بہت عرصے سے جانتا تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر اگرچہ بمبئی ہی تھا لیکن وہ اکثر ویسٹرن سٹارگورڈ آ رہتا تھا۔ تقریباً تین ہفتے پہلے کم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے اسے دارا سے ملاقات کیا۔

دارا کی باتوں سے کم کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے لیے اوپر چڑھنے کا ایک زینہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دارا آسٹریلیا کو مال بھاری کرنے کے لیے سٹارگورڈ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانا چاہتا تھا اور میاں اسے کم جیسے آدمیوں کی ضرورت تھی۔

”لیکن اس سے پہلے میں تم سے ایک اور نام لینا چاہتا ہوں۔“ دارا نے کہا تھا۔  
”وہ کیا ہے؟“ کم نے سوال کیا۔  
”ہمارا ایک برادر دشمن ہے جو آج کل سٹارگورڈ میں مقیم ہے۔“ دارا نے کہا۔ ”وہ سال پہلے وہ پاکستان سے بھاگ کر آ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمیں کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ ہم اسے تلاش کرتے رہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ سٹارگورڈ میں موجود ہے۔ اس کی موجودگی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اس لیے کام شروع کرنے سے پہلے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہے اور یہ کام تم کر سکتے ہو۔“

”وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟“ کم نے پوچھا۔  
دارا نے اسے عابد علی اس کی بیوی اور بیٹے کے بارے میں بتا دیا پھر بولا ”ان تینوں کا ختم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی بچ گیا تو ہمارے لیے مستقبل خطرناک رہے گا۔“  
”ٹھیک ہے۔“ کم نے کہا۔ ”تم چند روز میں ان کے بارے میں سن لو گے کہ اب اس دنیا میں ان کا وجود نہیں رہا۔“  
اور پھر کم نے دو چار آدمی جمع کر لیے۔ ایک آدمی کے ذریعے وہ عابد علی کی گھرانی کرا رہا۔ اس کے معمولات کا جائزہ لینے کے بعد وہ موقع کی تاک میں رہنے لگا اور پھر اس موڑوہ دارا کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ عابد علی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ہوٹل ہالی ڈے لائن میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ کم فوراً ہی اٹھ گیا۔

”میں تمہاری جگہ ہمارے ساتھ چلوں گا۔“ دارا بھی تیار ہو گیا۔ ”میں اپنے پرانے دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اور پھر وہ لوگ ایک کار میں بیٹھ کر ہوٹل ہالی ڈے لائن کی طرف روانہ ہو گئے۔ کار میں ایک آدمی پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ یوریشین تھا۔

وہ لوگ ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھے انتظار کرتے رہے اور جب عابد علی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک نجی میں بیٹھا تو ان کی کار اس کے قریب تک گئی اور جب عابد علی اپنے مکان کے سامنے نجی سے اتر کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا تو ان کی کار وہاں پہنچ گئی۔ دارا سب سے پہلے کار سے اتر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑا تھا۔ کم اس وقت ڈرائیور تک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ البتہ اس کے سامنے نیچے اتر کر عابد علی اور اس کی بیوی پر جھپٹ پڑے تھے۔

اور جب ایک اور کار گلی میں داخل ہوئی تو وہ لوگ انہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ کم اور دارا کا خیال تھا کہ ان کے آگے بڑھنے عابد علی اور اس کی بیوی کے ساتھ ان کے بچے کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔

لیکن روز اخبار میں خبر پڑ کہ کم سٹائن میں آ گیا۔ عابد علی کا بیٹا بچ گیا تھا۔ وہ اس داردار کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ اس میں سے کسی کو شہادت بھی کر سکتا تھا۔ اس لڑکے نے پولیس کو دارا کا نام بھی بتایا تھا۔

دارا انہیں برس چلا۔  
”اس نے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔“ وہ چیخا۔ ”وہ لڑکا میرے لیے مستقل خطرہ بنا رہے گا۔ اس نے پولیس کو میرا نام بھی بتا دیا ہے۔ اگر میرا چہرہ دیکھا ہو تو توجہ بھی دینا پڑے گا۔“

”وہ لڑکا صرف ہمارے لیے نہیں میرے لیے بھی خطرہ ہے۔“ کم نے جواب دیا۔ ”میں تو گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن اس نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ جس چینی نے اس کی بال بھر خیرے دار کیے تھے اسے دوبارہ دیکھ گا تو پچان لے گا۔ اگر اس نے جی ٹانگ کو نہیں دیکھ کر پچان لیا تو پولیس اس کے ذریعے پچھ تک بھی آسانی سے پہنچ جائے گی۔“

”تو پھر ختم کرو اس سنبولے کو۔“ دارا چیخا۔ ”اس کی زندگی ہماری موت کا پیغام ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے ہم یہاں اپنا کام بھی شروع نہیں کر سکتے۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے ختم کرو اسے۔“

اور کم کو دیدن کا موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک بار پھر موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ پولیس نے اس کی حفاظت کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دسٹل کانسٹیبل چوہیں گھنٹے اس کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ پر تاب گھٹے کے دو گاڑو بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ کم کو کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔

اور پھر اس نے وہ منصوبہ بنایا لیکن اس کے آدمی ہی بوئے نکلے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ احتیاط اور عقل مندی سے کام لیتے تو یہ منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ جاگ زخمی ہونے کے بعد بڑوں کی طرح بھاگ کر میاں آ گیا تھا اور اس نے ایک جھولی کمانی سنا کر کم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کم جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اسے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنا آدمی تو اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ جبکہ قاتل چوہے کے بارے میں بھی اسے یقین تھا کہ وہ مارا جا چکا ہے۔

کم اس وقت میں سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شان دار مستقبل کا دودھ دار اس بات پر تھا کہ وہ عابد علی کے بیٹے کو ختم کرے۔ بات اس لڑکے کو ختم کرنے کی ہوتی تو اسے دور سے بھی گولی ماری جاسکتی تھی یا اس مکان کو بم سے اڑایا جاسکتا تھا لیکن مرکزہ رات دارا نے کہا تھا کہ وہ اس لڑکے کو زندہ اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے اور آج کا منصوبہ وجدان کو اغوا کرنے کے لیے ہی بنایا گیا تھا تو کام رہا تھا۔

کم کی ساری زندگی جرائم کے اندھروں میں گزری تھی۔ ابتدا میں اس نے چھوٹے چھوٹے جرائم کیے تھے۔ اس میدان میں اس کے قدم بچنے چلے گئے۔ اس نے کرائے کے قاتل کی حیثیت سے

بھی کام کیا تھا۔ اسے اب یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس کا نام دہشت کی علامت بن گیا تھا پھر وہ منشیات کی اسمگلنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس دھندے میں اس نے خوب کمایا تھا۔ بعض انٹرنیشنل گروہوں سے تعلقات بھی استوار ہو گئے تھے لیکن پکاک میں پیش آنے والے واقعے کے بعد اس کی سادھ ختم ہو گئی تھی۔ وہ چاہی کے ہاتھ پر بیٹھا تھا اور اب اسے دوبارہ اپنے بیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل رہا تھا۔

کم اچھی طرح جانتا تھا کہ گولڈن ٹرائی اسٹریٹ کے بعد منشیات کی پیداوار کے حوالے سے پاکستان دوسرے نمبر پر تھا۔ میاں منشیات کے چند ایسے اسمگلر تھے جو امریکا کی ڈرگ ایفیا سے بھی زیادہ طاقتور تھے۔ ان کا مال دنیا کے کوٹے کوٹے میں پہنچ رہا تھا۔ بعض نام تو ایسے تھے جنہوں نے امریکا جیسی مہربان اور کبھی بیخود کر رکھ دیا تھا۔ امریکا کی بعض ایجنسیوں کے ایجنٹ ان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ امریکا انہیں گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن امریکی ایجنٹ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کی طاقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ پاکستان کی حکومت بھی ان کے سامنے بے بس تھی۔

نارائن پرکاش کے بارے میں تو کم بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھی ایک انٹرنیشنل گروہ کا آدمی تھا اور اس کی باتوں سے بھی کم نے اندازہ لگایا تھا کہ دارا کا تعلق بھی کسی بہت بڑی پارٹی سے ہے۔ جو لوگ سٹارگورڈ کو نہیں بنا کر آسٹریلیا کی منڈی تک اپنا مال پھیلاتا چاہتے ہوں وہ کوئی معمولی پارٹی نہیں ہو سکتی تھی اور کم ہر صورت میں اس پارٹی میں اپنی جگہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو وہ ایک بار پھر اندھروں میں بھٹکتا رہے گا۔

کم جیسے جیسے سوچ رہا تھا اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر الماری کھولی اور اس کے نچلے خانے میں سے پلاسٹک کا ایک ڈبا نکال کر اپنے سامنے کالی ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ چند لمبے لمبی نظروں سے اس ڈبے کو دیکھتا رہا پھر دھلتا انکار ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں پلاسٹک کی ایک لمبی سی ٹکلی فورٹل کے چند چھوٹے چھوٹے ٹرے، بڑے ہاتھ کی پیمپل سے زیادہ بڑے نہیں تھے، اسٹیل راز کی تین ٹانگوں والا ایک چھوٹا سا اسٹینڈ اور ایک پلاسٹک کی ٹیبل رکھی ہوئی تھی جس میں سفید پاؤں نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لائسنس بھی تھا۔

کم چند لمبے ان چیزوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے تین ٹانگوں والا اسٹینڈ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ یہ اسٹینڈ ایک بانٹ سے زیادہ اونچا نہیں تھا لیکن ساخت میں یہ اس اسٹینڈ جیسا تھا جو فوٹو گرافر کیمرہ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ البتہ اس کے اوپر کی جگہ خالی تھی۔ کم نے فورٹل کی ایک ٹرے ڈبے میں سے نکال کر اسٹینڈ پر رکھ دی۔ وہ اس جگہ بالکل فٹ آگئی تھی۔ اس نے پلاسٹک کی ٹیبل

میں سے چٹکی بھر سفید پاؤڈر نوٹل کی ٹرے کے عین وسط میں رکھ دیا اور پلاسٹک کی لمبی سے نکلی انھا کر میز کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نے لائٹر جلا کر اس کا شعلہ نوٹل کی ٹرے کے نیچے کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد ٹرے میں رنگ ہوئے پاؤڈر سے دھواں اٹھنے لگا۔ کم سے پلاسٹک کی نکلی کا ایک سرانھتوں سے لگایا اور دوسرا سردھواں چھوڑتے ہوئے پاؤڈر سے ذرا اوپر رکھ کر سانس باندھ رکھتے تھے۔ پاؤڈر سے اٹھنے والا سارا دھواں اس نکلی کے ذریعے کم کے پچھڑوں میں منتقل ہوتا رہا۔ کم اس وقت تک سانس کھینچتا رہا جب تک اس کے پچھڑوں کی قوت نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم سرفی بھرتی تھی اور پانی بہہ نکلتا تھا۔ کم نے لائٹر میز پر ڈال دیا۔ پلاسٹک کی نکلی بھی ہاتھ سے چھوڑ دی اور بے مدد سا ہو کر قالین پر رواڑ ہو گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

منشیات فروخت کرنے والے خود منشیات استعمال نہیں کرتے۔ یہ زہر تو وہ دوسروں کے خون میں منتقل کرتے ہیں لیکن کم منشیات کے دھندے میں آنے سے پہلے منشیات استعمال کرنے کا عادی بن گیا تھا لیکن اسے جلد ہی عقل آگئی اور اس نے اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ وہ اس سے مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کر سکا تھا۔ تین چار مہینے بعد ہی اس سے بھی طویل عرصے بعد جب وہ کسی ذہنی کرب میں مبتلا ہوا تو اس طرح ایک کش لگایا کرتا تھا۔ آج بھی وہ کچھ ایسے ہی ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ اس ایک کش سے اسے بڑا سکون ملا تھا۔ وہ تقریباً بیس منٹ تک قالین پر پڑا رہا پھر اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ یہ سرفی صبح تک برقرار رہے گی۔ اس نے سانسے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ وہ ڈوٹے تھا کہ بارے میں سوچنے لگا۔ اس سے کیا تھا کہ چانگ کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد صورت حال معلوم کر کے اسے اطلاع دے مگر ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

اور پھر سو چار بجے کے قریب صوفے کے قریب ساؤنڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کر صوفے کے دوسرے کنارے پر اٹھا اور فون کر میسرور اٹھا لیا۔

”ڈوٹے تھا کہ بول رہا ہوں مسٹر کم“ اس کی بیلو کے جواب میں دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

”لیں۔ کیا رپورٹ ہے۔ کیا معلوم کیا تم نے؟“ کم نے پوچھا۔ ”تھا کہ چور مڑکا ہے۔ اس کے سر میں دو گولیاں لگی ہیں۔ میں نے اسپتال میں اس کی لاش دیکھی ہے۔ پر تاب سگھ کا ایک گارڈ بھی مارا گیا ہے اور دوسرا گارڈ اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ زندہ ہے

جائے گا وہ بھی ختم ہو جائے گا۔“ ڈوٹے تھا کہ نے بتایا۔ ”تھا کہ چو کی موت کا مجھے پہلی یقین ہو چکا تھا۔ میں مزید ایک بات جانتا چاہتا ہوں۔“ کم چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر فرمایا ”ان دو گارڈز کے علاوہ پر تاب سگھ کے بیٹے میں کتنے آدمی تھے۔“ کوئی نہیں۔ بیٹے کے اندر پر تاب سگھ اکیلا تھا۔“ ڈوٹے تھا کہ نے جواب دیا ”تھا کہ چو پھت پر دونوں گارڈز سے تھے۔ کے بعد عقبی دروازے سے بیٹے میں داخل ہوئے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی لاش راپارڈی میں ملی تھی۔ وہ غالباً پر تاب سگھ کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔“ چانگ زخمی ہونے کے بعد فرار نہ ہو سکا۔ مشن کامیاب ہو سکتا تھا۔“

”کامیاب ہو سکتا تھا۔“ کم نے اس کے الفاظ مہرے ”چو“ چانگ بزدل نکلا گولی گتے کے بعد وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور پتا اس کے فرار ہی کی وجہ سے تھا کہ چو کو بھی اپنی جان سے ڈر دھونے پڑے۔ اگر وہ دونوں ہوتے تو اس وقت وہ لڑا جاتا ہے۔ فون میں ہوتا اور ہم اپنی کامیابی کا جشن منا رہے ہوتے۔ بہر حال ہم نے چانگ سے نجات حاصل کرنے کا جو فیصلہ کیا، وہ غلط نہیں تھا۔ ایسے بزدلوں کی میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”ہاں واقعی تمہارا وہ فیصلہ درست تھا مسٹر کم۔“ ڈوٹے تھا کہ کی آواز سنائی دی ”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ ”تم اپنے ٹھکانے پر چلے جاؤ۔ ضرورت پڑی تو فون کراؤ گا۔“ کم نے کہتے ہوئے کر میسرور رکھ دیا اور صوفے کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس وقت چانگ کو زخمی حالت میں اپنے سانسے دیکھ کر ام نے صورت حال کا جائزہ لگایا تھا ”وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ چانگ کی بزدلی کی وجہ سے تھا کہ چو کو بھی اپنی جان سے ڈر دھونے پڑے تھے لیکن اسے ان دونوں کی موت کا کوئی افواہ نہیں تھا۔ اسے افسوس تو اس بات کا تھا کہ اس کا شکار اس ہاتھ نہیں لگ سکا تھا اور پر تاب سگھ سے دشمنی الگ ہو گئی۔ پر تاب سگھ کو جانتا تھا۔ وہ ایک برٹس میں تھا۔ اس کے تعلقاً بہت اوپر تک تھے۔ کئی پولیس آفیسروں سے تو اس کی ذاتی دوستی تھی اور یہ اتفاق تھا کہ اس کیس کو چانگ شو پیڈل کر رہا تھا اور پر تاب سگھ کی چنانگ شو سے بڑی گری دوستی تھی۔ چنانچہ شو کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت لمبا لگا پولیس آفیسر تھا۔ جس کے پیچھے لگ جاتا۔ اسے سلاخوں کے پیچھے پھنسا کر بغیر جہد سے نہیں بیٹھتا تھا۔

لیکن اس وقت کم کے لیے مسئلہ نہ تو پر تاب سگھ تھا اور نہ ان پکڑ چنانگ شو۔ سب سے بڑا مسئلہ تو دارا کا تھا۔ وہ اس کے جواب دے گا مگر کس نامی سے دارا اس سے بدل ہو سکتا اور دارا کے بدل ہونے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کا مستقبل تاریک ہو جائے۔

سب کچھ سوچتے ہوئے کم کا ذہن ایک بار پھر الجھنے لگا۔ وہ یہ سب کچھ سوچتا تھا۔ اب آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ کچھ بج چکے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

دیر بعد وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ لیکن فون کی گھنٹی کی آواز سے وہ جاگ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے منہ پر بھر چھیں آنکھوں میں کھولنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے منہ پر بھر چھیں اس نے بڑی مشکل جھوک دی ہوں۔ بڑی شدید جلن ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات بج رہے تھے۔ وہ صرف دو گھنٹے سویا تھا۔ دل چاہ رہا تھا دوبارہ آنکھیں بند کر لے اور صوفے پر لیٹ کر سو جائے لیکن فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے بادل ناخواست ہاتھ بڑھا کر کر میسرور اٹھا لیا۔

”جی ٹاگ کم“ اس کی بیلو کے جواب میں ایک بھاری آواز اس کے کانوں سے گزرائی۔ ”جی ٹاگ کم“ کم کے دماغ کو جھٹکا سا لگا ”کیا بات ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو اور فون کیوں کیا ہے۔“ ”میں کلب میں ہوں۔“ جی ٹاگ نے جواب دیا ”مسٹر دارا اس وقت یہاں موجود ہے اور وہ فوری طور پر تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”دارا۔“ کم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دارا کا نام سن کر اس کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ بالا خوار کو بھی اس کی نامی کی اطلاع ملی تھی اور وہ اس کے ٹائٹ کلب پہنچ گیا تھا۔ دارا سے اب تک جتنی ملاقاتیں ہوئی تھیں، وہ اس کے ٹائٹ کلب والے دفتر میں ہی ہوتی تھیں ”کیا وہ دفتر میں بیٹھا ہوا ہے؟“

”نہیں۔ میں نے اسے نیچے استیلائے روم میں بھیجا دیا ہے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں ہو۔“ جی ٹاگ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اس سے کوئی انتظار کرنے میں آ رہا ہوں۔“ کم نے کہتے ہوئے کر میسرور رکھ دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سو جائے لیکن وہ دارا کو ملاقات سے انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چند لمبے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر بیٹھے روم میں گھس گیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے حواس کچھ بحال ہوئے۔ دوسرے کمرے میں آکر وہ ایک لمبے روکا بھر میز کے دروازے سے سانسٹر گائیڈ ٹھکانے کی جیب میں ڈال لیا اور باہر آکر دروازہ بند کر دیا۔ اس کی کار کمانڈر میں گھڑی تھی۔ اس نے پہلے باہر کا ٹیکٹ کھولا۔ کار اشارت کر کے اسے باہر نکالا اور پھر آکر ٹیکٹ بند کرنے لگا۔

اسے اپنے ٹائٹ کلب تک پہنچنے میں چالیس منٹ لگے تھے۔ رات۔ بیٹھے تھیں تین بجے تک تو کلب میں زندگی کے جھنگے جا رہے تھے لیکن اس وقت یہاں اوبول رہے تھے۔ وہ کار سے

اتر کر اندر آیا۔

دارا کلب کے استیلائے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سانسے دوسرے صوفے پر چلی ٹاگ بھی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہ کلب ہی میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ رات تین بجے بند ہونے کے بعد نوکروں کے ذریعے کام سمیٹے ہوئے چار بج جاتے۔ اس کے بعد وہ سونے کے لیے چلا جاتا اور دن کے گیارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں اٹھا تھا اور آج دارا نے اسے صبح سویرے ہی جگا دیا تھا۔

دارا کے چہرے پر بھی بیزاری کے اثرات تھے اور آنکھوں میں سرفی بھی تیر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی رات بھر نہیں سویا تھا۔

”مسٹر کم!“ دارا خشکیں لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں نے تمہاری آواز نسل کے لیے تھیں ایک کام دیا تھا لیکن تم ابھی تک کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”کچھ کیوں نہیں کر سکتا۔“ کم نے جواب دیا ”تمہاری خاطر میں نے دو عذر دیے۔ میرا اپنا ایک آدمی گزشتہ رات مارا گیا اور دوسرا لاپتہ ہے اور تم کہتے ہو میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔“

”تم نے کہا تھا کہ آج اس لڑکے کو میرے حوالے کر دو گے لیکن وہ لڑکا تو اب گھنٹے میں سکون کی نیند سو رہا ہے۔ البتہ تمہارے دو آدمی مارے گئے۔ ایک پر تاب سگھ کے گھر میں اور دوسرے کی لاش بھی پولیس کو مل گئی ہے۔ گزشتہ رات کے واقعے سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تم نے ایتھوں کی فوج پال رکھی ہے۔“ دارا چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے کہا تھا کہ پر تاب سگھ کو نہیں بھیجنا تاہم تم نے اس کا ایک بندہ مار دیا اور دوسرا زندگی اور موت کی نگاہ میں مبتلا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس موقع پر کسی کی دشمنی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ وجہ ان پر تاب سگھ کا بیٹا نہیں ہے۔ اسے اغوا کر لیا جائے یا مار دیا جائے تو اس کی صحت پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔ وہ چار دن بیچ چلا کر خاموش ہو جاتا لیکن اپنے آدمیوں کے قتل پر وہ جین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس طرح ہمارے لیے نئے مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔ جبکہ اس لڑکے کی صورت میں خطرہ اپنی جگہ موجود ہے۔“

کم خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جیب سے ہتھول نکالے اور دارا کی کھوپڑی کے پرچے اڑا دے لیکن وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا اور جب دارا خاموش ہوا تو اس کے چہرے پر نظرسنبتاے ہوئے بولا۔

”مسٹر دارا۔ گزشتہ رات میرے آدمیوں سے واقعی مناعت ہو گئی۔ یہ سب کچھ دارا اصل ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر وہ غلط فہمی نہ ہوتی تو وہ لڑکا اس وقت ہمارے قبضے میں ہوتا۔“

”اگر تم یہ کام نہیں کر سکتے تو اب بھی منہ کر دو۔ میں یہ زے دارا الیٹ کو سونپ دوں گا۔“ دارا نے کہا۔ الیٹ کے نام پر کچھ نئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ دو غلی نسل کا



تھا۔ باپ انگریز اور ماں چینی۔ باپ بھی جرائم پیشہ آدمی تھا جو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا اور اب الہرت جرائم کی دنیا میں قدم بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کام الہرت کو سوچ دینے کا مطلب یہ ہوا کہ کم کے لیے جالس ختم ہو جائے۔

”مجھے ایک موقع اور دو مشورہ۔“ کم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تین دن کے اندر اندر وہ لڑکا تمہارے پاس ہوگا۔“  
 ”وہ لڑکا اب مجھے نہیں چاہیے۔“ دارا نے کہا ”میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں۔ ختم کر دو اسے۔ اگر وہ تین دن کے اندر ختم نہ ہو تو میرا اور تمہارا معاہدہ ختم۔ اب میں چتا ہوں۔ تین دن بعد تم سے ملاقات کروں گا۔“  
 دارا کہنے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا اور کم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا دروازے کو گھورتا رہ گیا۔

○●○

دربار نگہ کی میت اگرچہ امر تر بھیج دی گئی تھی مگر پر تاب نگہ نے اپنے ہاں بھی اس کے نتیجے کی رسم ادا کر دی تھی۔ اب اسے سو تر نگہ کی فکر تھی۔ تین دن گزرنے کے بعد بھی اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کے کئی ٹیسٹ کیے تھے اور ڈاکٹر اسکاٹ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کی یہ کیفیت چند روز تک اور برقرار رہ سکتی تھی۔ وہ تین دن مزید انتظار کریں گے اور اگر اس دوران میں کوئی فرق نہ پڑا تو دماغ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔

پر تاب نگہ زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا تھا۔ سو تر نگہ اس کے پاس پندرہ سال سے ملازم تھا۔ وہ اسے ملازم ہی نہیں اپنا ایک قابل اعتماد دوست بھی سمجھتا تھا۔ وہ بارنگھ کی موت اور سو تر نگہ کی حالت پر وہ خون کے آنسو بہا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ بہر حال اس نے بے طے کر لیا تھا کہ سو تر نگہ کے علاج کے لیے وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔

دوسری طرف اسے وجدان کی بھی فکر تھی۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ وجدان بچ گیا تھا۔ اگر وہ چینی اسے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو یقیناً اسے مار دیا تھا۔ لیکن عین وقت پر عقل نے اس کا ساتھ دیا اور اس کا نفسیاتی حربہ کامیاب ہو گیا۔ اگر اس کے چپنے پر وہ چینی بیچے مڑ کر نہ دیکھتا تو وہ بھی وجدان کو نہیں بچا سکتا تھا۔

ان کے خلاف یہ کارروائی باقاعدہ بلائنگ کے تحت کی گئی تھی۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے بیچے دارا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دارا نے ہتھی چینی خنڈوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور وہ خود چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔

پر تاب نگہ نے سبیل تو یہی پروگرام بنا رکھا تھا کہ وہ وجدان کو دارا سے بچانے کی کوشش کرنا ہے گا اور بڑا وراثت کسی تصادم سے گریز کرنے کا لیکن اب اس نے اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ دارا

نے براہ راست اس پر حملہ کیا تھا۔ اس کا ایک آدمی مارا گیا تھا دوسرا مفلوج ہو گیا تھا۔ اب خاموش بیٹھے رہتا اس نے نہیں رہا تھا۔

اس کے بیٹلے میں مرنے والے چینی کی شناخت ہو گئی تھی ایک تھرو رٹ غذا تھا۔ عرب اسٹریٹ اور ٹل انڈیا بیچے ہزار میں دادا گیری کر کے لوگوں سے چار پیسے اٹھ لیتا تھا۔ ہندوستانی، پاکستانی اور ملائیشین باشندے اس کا شکار بننے لگے تھے۔ چھوٹی دکانوں سے اس نے ہفتہ بھی باندھ رکھا تھا لیکن وہ کئی لوگوں سے پتہ بھی چکا تھا۔ کبھی وہ اپنے ایک دوست سیمپل کے مل کر رجنی اور لوٹ مار کی وارداتیں بھی کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان سے آنے والے چینی بڑی آسانی سے اس کا کافر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ چڑا گیا تھا اور اسے تین مہینے کی محنت تھی۔ کسی کو سزا عام طور پر اصلاح کے لیے دی جاتی ہے لیکن یہ پیشہ لوگ جب کوئی سزا کاٹ کر بیل سے نکلے ہیں تو پست سے خطرناک ہو جاتے ہیں۔

یہ کیس انپکٹر جیناگ شے کے پاس تھا۔ اس کی تحقیقات انکشاف ہوا تھا کہ تھانگ چو نامی اس چینی خنڈے کے پاس سے اچانک ہی کوئی بڑی رقم اٹھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں دیکھی گئی تھی۔ کوئی لڑکی اسے لفٹ ہی نہیں کرائی تھی؟ گزشتہ دنوں اسے ایک یوریشین لڑکی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ جیناگ شے اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ لڑکی کون تھی۔ نہ ہی اسے ابھی یہ معلوم ہوا تھا کہ تھانگ شے کے پاس رقم کہاں سے آئی تھی اور وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا۔ انپکٹر جیناگ بھی جانتا تھا کہ ان سارے بچکوں کے پیچھے ہاتھ تھا۔ لیکن دارا اس قسم کے تھرو رٹ خنڈوں سے براہِ رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یقیناً کسی ایسے آدمی سے رام ہو گا جو تھانگ چو جیسے خنڈوں کا بندوبست کر سکا ہو اور ان جیناگ شے کو اس کی تلاش تھی۔ اگر وہ شخص مل جائے تو اب ذریعہ دارا تک پہنچا جاسکتا تھا۔

پر تاب نگہ نے انپکٹر جیناگ شے سے رابطہ رکھا۔ وہ اتنا تمام معلومات اسے جیناگ شے ہی سے حاصل ہوئی تھیں۔ جیناگ شے اس وقت بھی اس کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دراصل خا انتظامات کا بازو لینے آیا تھا۔ سب سے دو کانٹیلہ تینبات تھے؟ اب ان کی تعداد پانچ کر دی گئی تھی۔ دو بیٹلے کے ساتھ دو بیچے ایک چھت پر۔ تمام بیٹلے ایک جیسے تھے اور ایک دوسرے ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے۔ کئی کے ایک کارڈز والے بیٹلے چھت پر چڑھ کر آسانی سے آخری بیٹلے کی چھت تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ایک آدمی کی چھت پر موجودگی ضروری تھی۔ ”یار جیناگ۔“ پر تاب نگہ سامنے بیٹھ بولے ”انپکٹر جیناگ شے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں تو سمجھ ہوں۔ ہمارے بارے

میں مشورہ ہے کہ ہم عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔ لیکن تم تو عقل مند آدمی ہو یا۔ تمہارے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟“  
 ”اگر سادہ سادہ بات ہے؟“ جیناگ شے نے سوالیہ لہجہ سے اس کی طرف دیکھا۔

”دارا پاسپورٹ پر ہی یہاں آیا ہوگا۔“ پر تاب نگہ بولا ”تم ایجنٹ آفس سے معلوم کیوں نہیں کرتے کہ دارا کون ہے۔ اس طرح اسے آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔“  
 ”یہ بات میرے ذہن میں اسی روز آئی تھی جب عابد علی اور اس کی بیوی کو قتل کیا گیا تھا۔“ انپکٹر جیناگ شے نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں یاد ہو گا کہ وجدان نے اپنے بیان میں دارا کا ذکر کیا تھا اور پھر تم نے بھی مجھے دارا کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے دوسرے ہی روز ایجنٹیشن سے رابطہ کر کے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی تھیں لیکن اس نام کا کوئی شخص پچھلے دو مہینوں کے دوران میں پاکستان سے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں نے ہٹوں اور پرائیویٹ گیت ہاؤسز میں مقیم پاکستانیوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں جو اس عرصے کے دوران میں پاکستان سے یہاں آئے تھے لیکن دارا نام کے کسی شخص کا سراغ نہیں ملا۔“  
 ”اس کا مطلب ہے وہ کسی اور نام سے یہاں آیا ہوگا۔“

پر تاب نگہ بولا۔  
 ”وہ کسی نام سے بھی آیا ہو قانون سے بچ کر نہیں جاسکے گا۔“  
 انپکٹر جیناگ شے نے کہا ”میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے نہیں بیٹھا ہوں۔ میرے آدمی اس کی تلاش میں ہیں۔ ایک نہ ایک دن اس کا پتہ چل ہی جائے گا۔ اچھا۔ اب میں چتا ہوں۔ کوئی غیر معمولی بات اپنے آپس محسوس کرو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔“

انپکٹر جیناگ شے چلا گیا اور پر تاب نگہ بیدار موم میں اٹھیا۔ وجدان اپنے بید پر کتابیں پھیلانے بیٹھا تھا۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور پر تاب نگہ بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ وہ روزانہ رات کے کھانے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹا اسے پڑھاتا تھا لیکن گزشتہ تین دنوں کے دوران میں پر تاب نگہ نے محسوس کیا تھا کہ حالات وجدان کے ذہن کو متاثر کرنے لگے تھے۔ کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی لیکن اس کی نظریں کہیں اور ہوتی جیسے خلا میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ اکثر ذہنی طور پر بھی غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ پر تاب نگہ اس سے کوئی سوال پوچھتا تو وہ اس طرح چونک جاتا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہو۔

آٹھ دن بعد وہ اپنا بے کھول کر بیٹھا تھا۔ پر تاب نگہ بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔  
 ”یار کاکے“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے تو افسوس ہوتا ہے کہ تمہاری پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ میں بھی تمہیں زیادہ وقت نہیں دے پاتا۔ تمہارے لیے میٹر نہ رکھ دیا جائے۔“

”مجھے اب لوگوں سے ڈر لگنے لگا ہے چاچا۔“ تانیں میٹر نوکون ہو، کیا ہو؟“ وجدان نے جواب دیا۔

پر تاب نگہ چونک گیا۔ اب واقعی حالات اس منہ پر پہنچ گئے تھے کہ وہ اپنے سامنے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ وہ بارنگھ کے قتل کے بعد سمجھ برادری کے کئی لوگ چمے کے لیے پر تاب نگہ کے پاس آتے رہے تھے اور کل اس کے بیچے کے سلسلے میں بھی گھر میں کچھ غیرہ کار پروگرام تھا۔ بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے اور پر تاب نگہ نے محسوس کیا تھا کہ وجدان لوگوں سے الگ تھلک ہی رہا تھا اور زیادہ تر اسے کمرے میں بند رہا تھا۔

پر تاب نگہ کے خیال میں یہ صورت حال اچھی نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وجدان خوف زدہ تھا لیکن اگر خوف اس کے دل اور دماغ میں بیٹھ گیا تو وہ زندگی بھر سارے گاہ بزدل بن جائے گا۔ کسی اجنبی کا سامنا نہیں کر سکے گا جبکہ وہ اس کے سینے میں انتقام کا لاوا بھرا جانتا تھا اور انتقام لینے کے لیے حوصلے اور بہت کی ضرورت تھی۔ وہ اسے بے حوصلہ نہیں ہونے دے گا۔ اسے بزدل نہیں بننے دے گا کہ مارے خوف کے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرے۔

”کسی اجنبی کا گھر میں آنا تو میں بھی پسند نہیں کروں گا لیکن مس ازائیل کیسی رہے گی۔ وہی جو سائنس والی لین کے کونے والے بیٹلے میں رہتی ہے۔“ پر تاب نگہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”فکر وہ تو رنڈاڑ ہو چکی ہیں چاچا۔ وہ مجھے کیسے پرھائیں گی۔“ وجدان نے کہا۔

”رنڈاڑ ہو چکی ہے تو اچھی بات ہے نا۔“ پر تاب نگہ نے کہا ”اب تو وہ فارغ ہے تمہارے لیے زیادہ وقت نکال سکے گی۔ میں صبح ہی اس سے بات کروں گا۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں نا!“

”میں چاچا۔“ وجدان نے جواب دیا ”میں ازائیل بہت اچھی خاتون ہیں وہ امی کے پاس بھی آتی تھیں۔ اگر وہ راضی ہو جائیں تو میں ان سے ضرور پڑھوں گا۔ ویسے وہ بہت اچھا پڑھائی ہیں۔“

”فیک ہے۔ میں کل ہی اس سے بات کرتا ہوں۔“ پر تاب نگہ نے کہا۔

مس ازائیل کو بھی کئی کے اس بیٹلے میں رہتے ہوئے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ پر تاب نگہ کی بیوی جب زندہ تھی تو اس کا آنا جانا تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کا آنا جانا بند ہو گیا۔ البتہ راستے میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

مس ازائیل کالونیٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ اس کی عمر اگرچہ پچاس سال ہو چکی تھی لیکن شادی نہیں کی تھی۔ اس کی ماں کا انتقال تو اس وقت ہو گیا تھا جب وہ تیارہ برس کی تھی۔ باپ نے کچھ عرصہ تھائی کالی پھر دوسری شادی کر لی۔ ازائیل کی سوتیلی ماں بھی



کی ضرورت نہیں۔ میں سی آئی ڈی کے کچھ آدمی تمہارے مکان

کھینچے میں دیر نہیں گئی کہ وہ سی آئی ڈی آفیسر آنگ کانگ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسور دھکا دیا اور آنگ کانگ کی طرف بڑھا۔

آنگ کانگ نے بڑی بھرتی سے پستول کا رخ اس کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ سگ کی تراز ابھری اور گولی پر تآب سگ کے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے جھکا تھا۔ جب سیدھا ہوا تو پستول کی زد میں تھا۔

”یہ گولی تمہاری کھوپڑی کے پرچے بھی اڑا سکتی تھی۔“ آنگ کانگ غرایا ”میں نے تمہیں صرف وارننگ دی ہے۔ اب اگر تم نے کوئی حرکت کی تو اگلی خاموش گولی تمہاری کھوپڑی یا سینے میں پوسٹ ہو جائے گی۔“

”تم کون ہو؟“ پر تآب سگ نے اسے گھورا۔

”میں تمہیں اپنا نام اور پتہ نہیں بتاؤں گا۔“ آنگ کانگ نے جواب دیا ”آج صبح جب میرے پاس نے تمہیں فون کیا تھا تو اسے یقین تھا کہ تروپیس کو اس کی اطلاع دو گے اور رات کو آنے والی ٹیلی فون کال ٹریس کرنے کے لیے ٹیلی فون کے ساتھ کوئی حرکت کی جائے گی۔ ہمارا پاس بھی کچی گولیاں نہیں کھلا اور پھر ٹیلی فون کے ناموں سے جھپٹ چھا کرنا ہم بھی جانتے ہیں۔ ہم نے آج صبح ہی یہاں سے نصف میل دور ڈسٹری یوشن کیمپن میں تمہارے فون کی لائن ٹریس کر کے یہاں سے چھٹی گئی تھی۔ ہم دو آدمی صبح سے اس پتے میں موجود تھے اور تمہاری لائن کو ٹریس کر رہے تھے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”ہمیں زیادہ خطرہ انپیکٹر چینگ شو کی طرف سے تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ نو بجے وہ بھی یہاں موجود ہوگا۔ اسے یہاں آنے سے روکنے کے لیے ہم نے نو مل میٹروں کے عقب میں ایک راہ گیر کو قتل کر دیا اور پولیس اسٹیشن اطلاع کر دی۔ ہماری توقع کے عین مطابق انپیکٹر چینگ شو جانے والی رات پر گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے تمہیں فون پر اطلاع دے دی کہ وہ آنگ کانگ نامی سی آئی ڈی آفیسر کو بھیج رہا ہے۔ آنگ کانگ ہمارے لیے انجینی نہیں تھا۔ ہم نے اسے راستے ہی میں اپک لیا اور اسے اسی پتے میں پہنچا دیا جہاں ہم نے ٹیلی فون والا سیٹ اپ کر رکھا ہے۔ آنگ کانگ اس پتے کے ایک کمرے میں بندھا ہوا ہے اور میرا ساتھی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ تم واقعی کچھ ہو۔“ آنگ کانگ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہہ رہا تھا ”اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہو تو میرا شناختی کارڈ طلب کرتے۔ ایسی صورت میں میرے لیے خطرہ ہو سکتا تھا لیکن تم آنگ کانگ کا نام سن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے۔“

”ہاں۔ یہ حماقت واقعی مجھ سے ہو گئی تھی کہ میں نے تمہارا شناختی کارڈ چیک نہیں کیا تھا لیکن کیا تم یہاں سے زندہ واپس جا سکو گے؟“ پر تآب سگ بولا۔

”مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔“ آنگ کانگ نے سگرا کر جواب دیا ”یہاں آتے ہی میں نے حفاظتی انتظامات کرائے ہیں۔ آج تھا اور یہ بات میرے لیے باعث اطمینان تھی کہ کچھ کے ہاتھ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ باہر کے حفاظت جیسے نہیں سوار کیس گئے۔“

”یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ یہاں سے زندہ واپس چلے گئے۔“ پر تآب سگ نے اس کے پستول والے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ آنگ کانگ خاصا محتاط واقع ہوا تھا۔ وہ بھی اس کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتے ہوئے تھا۔

”مجھے اس لڑکے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔“ آنگ کانگ کہہ رہا تھا ”میں اس وقت بڑی آسانی سے اسے گولی مار سکتا ہوں لیکن میں اسے یہاں قتل نہیں کروں گا۔ اگر اسے یہاں قتل کر دیا پھر میرا اکلنا واقعی ممکن نہیں رہے گا۔ یہ لڑکا اس وقت میری زندگی کی حماقت ہے۔ میں اسے ڈھال بنا کر یہاں سے باہر نکالوں گا اور ابھی میرے ساتھ چلو گے۔ باہر قتل میں تمہاری گاڑی کھڑی ہے۔ آنگ کانگ نے اسے دیکھا کہ اسے یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اگر باہر گئے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میرے پستول کی خاموش گولی اس لڑکے کی زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ چلو۔ اب باہر نکلو۔“

آنگ کانگ نے بڑی بھرتی سے پوزیشن بدل کر سونے پر پٹ ہوئے وجدان کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ خوف و ہست سے وجدان کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ آنگ کانگ نے ایک ہاتھ سے اسے گرفت میں لیے رکھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی کینٹی سے لگا دیا۔

پر تآب سگ چند لمحوں میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اس نے دوسری قدم اٹھائے تھے کہ فون کی گھنچا گئی۔ اس کے قدم رگے گئے اور وہ فون کی طرف بھاگے۔

”نہیں۔ تم کال ریسور نہیں کر سکتے۔“ آنگ کانگ کے دہریے نے بھی غراہٹ نکلی ”باہر چلو۔“

پر تآب سگ پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ راہداری میں ڈکرا اس نے مرکز آنگ کانگ کی طرف دیکھا۔ کوئی موقع نہیں تھا۔ پستول کی نال وجدان کی کینٹی سے گئی ہوئی تھی۔ اور اس کی کالی بھی حرکت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ ایک بار پھر دیکھا۔

”گت اور چھت پر کھڑے ہوئے خاموشوں سے کہہ دو کہ اس نے کسی طرح کی بھی حماقت کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکے کو گولی مار دی جائے گی۔ چلو۔ آگے بڑھو۔“ آنگ کانگ نے کہا۔

پر تآب سگ کانپناؤ میں آکر اوپر اُدھر دیکھنے لگا۔ چھت پر پولیس کانسٹیبل منڈر کے قریب کھڑا تھا۔ پر تآب سگ نے آنگ کانگ کو دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ گیت کے باہر دونوں پولیس دانے

بائیں کر رہے تھے۔

”ان سے کوئی رائٹل نہیں ہو چکا۔ میں اور دو ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔“ آنگ کانگ نے پر تآب سگ سے کہا۔

کانسٹیبل اس کی توازن کر چکے تھے۔ انہوں نے مرکز اندر کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے فوراً ہی صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی رائٹل سیدھی کرنے کی کوشش کی تو پر تآب سگ نے بچ کر کہا۔

”نہیں۔ تم میں سے کوئی بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جو وجدان کی زندگی کے لیے خطرے کا باعث بن سکے۔ اپنی رائٹل چھت وادار ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے چھت پر کھڑے ہوئے حفاظت وادار بھی رائٹل اور پھوڑ کر نیچے بلا لیا۔

آنگ کانگ وجدان کو گرفت میں لیے کھڑا تھا۔ اس نے پستول کی نال اس کی کینٹی سے لگا رکھی تھی۔ تین پولیس والے نیچے ہو کر ایک طرف ہٹ گئے تو وہ وجدان کو لے کر گیت سے باہر آیا۔ گلی میں پر تآب سگ کی سرسبز پھڑکی تھی۔

”چلو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ تمہاری کوئی غلط حرکت اس لڑکے کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔“ آنگ کانگ نے کہا۔

پر تآب سگ اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولنے لگا۔ آنگ کانگ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول لیا۔ پہلے وجدان کو اندر دھکیلا پھر خود بھی اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران میں پر تآب سگ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارت کر رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ تین پولیس والے دیوار کے قریب کھڑے وحشت زدہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”گاڑی آگے بڑھاؤ۔“ آنگ کانگ غرایا ”اس گلی سے ٹکڑو میں تمہیں راستہ بتا دوں گا۔“

پر تآب سگ نے ایک جھگڑے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گلی کے موڑ پر سادہ لباس میں سی آئی ڈی کا ایک آدمی سامنے آیا۔ اس نے اسٹیرنگ کے سامنے پر تآب سگ اور پچھلی سیٹ پر وجدان کو ایک انجینی کے ساتھ بیٹھ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن ہی تھ گئی۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ لوگ گھوم پھر کر مکان کی نگرانی کریں گے اور مشتبہ شخص پر نگاہ رکھیں گے۔ انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وجدان کو کیسی اور بھی قتل کیا جائے گا۔

سرسبز پھڑکی کا موڑ گھوم کر دوسری طرف نکل گئی۔ سی آئی ڈی کا وہ آدمی چند لمحوں کا رک جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر پر تآب سگ کے پچھلے کی طرف دوڑا۔

”گاڑی تیز چلاؤ۔“ آنگ کانگ غرایا۔ اس نے سی آئی ڈی کے اس آدمی کو پچھلے کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فوراً ہی پر تآب سگ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور آنگ کانگ کی ہدایات پر عمل کرنا ہوا گاڑی کو اوکے لائنز کی طرف لے آیا۔

”اگلے موڑ پر گاڑی کو اوکے لائنز پر دوڑاؤ اور وہاں سے لائنز روڈ کی طرف موڑ لیتا۔ رفتار بڑھاؤ۔“ آنگ کانگ ہدایا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اب اس پر گھبراہٹ سی طاری ہوئے گئی تھی۔ اس نے پستول کی نال وجدان کے پستول سے پستول سے لگا رکھی تھی۔

پر تآب سگ نے سرسبز پھڑکی کی رفتار بڑھا دی اور پھر رفتار کم کیے بغیر اس نے اگلے موڑ پر گاڑی کو اوکے لائنز روڈ کی طرف گھمادی۔ اس نے موڑ پر ٹرنک کے ایک سارنیکل سے موڑ سائیکل دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر پر تآب سگ نے گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی تھی تاکہ ٹرنک سارنیکل اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

ابھی تو ساڑھے نو بجے تھے۔ مرکز پر ٹرنک کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ پر تآب سگ بڑی مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ٹرنک سارنیکل کی موڑ سائیکل بھی بڑی تیز رفتاری سے اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ آنگ کانگ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

”اس موڑ سائیکل سے پیچھا چھڑاؤ۔“ آنگ کانگ چیخا ”گاڑی کو لائنز گاڑن کی طرف موڑ لو۔“

اس نے پیچھے مرکز دیکھا۔ موڑ سائیکل قریب آ رہی تھی اور پھر موڑ سائیکل سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر نیچر دیا۔ گولی عقبی وڈ اسکرین توڑتی ہوئی موڑ سائیکل سوار سارنیکل کے پیچ پر لگی تھی۔ موڑ سائیکل بے قابو ہو کر مرکز پر لڑکھ گئی۔

وجدان خوف زدہ تھا لیکن آنگ کانگ نے جیسے ہی اس کے پستول سے پستول بنایا۔ اس کے داغ میں جھماکا سا ہوا اور اس نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

موڑ سائیکل سوار پر گولی چلا کر آنگ کانگ ابھی پیچھے کی طرف ہی جھکا ہوا تھا کہ وجدان نے دونوں ہاتھوں سے اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی اور دانت اس کے بازو میں گاڑ دیے۔ آنگ کانگ بلبلاتا تھا۔ وہ بازو کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ انگلی سے پستول کا ٹریڈر دب گیا۔ پستول کا رخ چھت کی طرف تھا۔ گولی چھت میں سوراخ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

پر تآب سگ نے یہ صورت حال دیکھی تو لمحہ بھر کو بدحواس ہو گیا۔ اسی بدحواسی میں کارے قابو ہو گئی۔ اس نے بریک پڈل دیا دیا اور اسٹیرنگ چھوڑ کر گیت کے اوپر سے پیچھے جھک گیا اور آنگ کانگ کی گردن میں بازو ڈال کر اسے پوری قوت سے پیچھے کی طرف کھینچنے لگا۔ پستول سے ایک اور گولی نکلی۔ یہ گولی عقبی اسکرین توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

وجدان نے دانتوں سے آنگ کانگ کا بازو بھینچوٹ ڈالا۔ پستول آنگ کانگ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وجدان اسے بری طرح دانتوں سے بھینچوٹ رہا تھا۔ دوسری طرف پر تآب سگ نے اس کی گردن کو بازو کی پیٹ میں لے کر رکھا تھا۔ اسے سانس گھٹتا ہوا احساس ہونے لگا۔

مرید پر سڑک پر لہرا رہی تھی۔ وہ سامنے سے آنے والے ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور لہرائی ہوئی سڑک سے اتر کر ایک درخت سے ٹکرائی۔

آنگ لائک نے تکلیف کے باوجود بازو کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ وجدان نے ایک مرتبہ پھر دوسرے جھنجھوڑا اور پھر اس کے بازو سے دانت ہٹا لیے۔ اس کے منہ میں خون بھر گیا تھا اور وہ جلی جی محسوس کرنے لگا تھا۔ آنگ لائک کے بازو سے ہونی لگتی تھی اور خون کی دھار بہنے لگی تھی۔ وہ اب اپنے آپ کو پر تاب غم کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

پر تاب غم نے اس کی گردن کو آہنی خٹکے کی طرح اپنی پیٹ میں لے رکھا تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ پیچھے سے ایک کار بڑی تیز رفتاری سے اس طرف آ رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز بھی پر تاب غم کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ پولیس نہیں ہو سکتی تھی۔ پولیس گولیاں نہیں چلاتی۔ سازن بھائی ہے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آنگ لائک کے سامنے تھے۔

”کاکے!“ وہ چیخا ”گامڑی سے اتر کر بھاگ جا۔ وہ لوگ آ رہے ہیں۔“

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا چاچا۔“ وجدان بولا۔ ”میری پروا مت کر۔ بھاگ جا یہاں سے۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ بھاگ جا یہاں سے۔ کسی بھی محفوظ جگہ پر چلا جا۔ میں تمہیں تلاش کروں گا۔ بھاگ جا۔ وہ لوگ آگے تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بھاگ جا کاکے۔ جلدی کر۔“ پر تاب چیخا۔

وجدان نے ایک لمحے کو سوچا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ آنگ لائک نے ٹانگ آگے کر کے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر وجدان نے اس کی ٹانگ پر بھی دانتوں سے کاٹ لیا اور کار سے اتر کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اس نے ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا۔ گولیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ تیز رفتاری سے مریڈ پر سے چند کر پیچھے رک گئی۔ وجدان مڑ کر تاریکی میں دوڑنے لگا۔ اس کا رخ لائڈ گارڈن کی طرف تھا۔

○●○

وجدان تاریکی میں اندھا دھند دوڑا جا رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ وہ رک گیا اور پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے منہ میں اب بھی خون کا ذائقہ بھرا ہوا تھا اور پھر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے خون کا کوئی ٹھکانہ اس کے حلق میں بچھن گیا ہو۔ اسے حلق محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ کرنے لگا۔

اس کے پورے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ بڑی شدید جلن ہو رہی تھی۔ پیٹ میں آنتیں جیسے کئی جابری تھیں۔ وہ چیخ پڑا کہ ”وہا ہوا جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ بہت بڑی لہرائی کرچکا تھا۔ کیا یہاں

کچھ نکل چکا تھا مگر لگتا جیسے اب بھی حلق میں کچھ اڑکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔“

اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی بہنے لگا تھا۔ مریڈ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس لمبی چوڑی لہرائی نے وہ مڑھال سا ہو گیا تھا۔ وہ پانی پینا چاہتا تھا مگر پانی کہاں سے ملے گا۔ گھاس پر بیٹھ گیا اور سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اُدھر دیکھ رہا تھا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اگر دن کا وقت ہو تو شاید اس علاقے کو پہچان لیتا مگر رات کے اندھیرے میں اس کی کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا اس سے آس پاس قد آدم بھائیاں تھیں اور دائیں طرف تقریباً دوسو گز کے فاصلے پر درختوں کے تاریک پیولے نظر آ رہے تھے دوسری طرف بہت فاصلے پر کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

اچانک ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں کر رہے چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کافی فاصلے پر دو انسانی پیولے دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انہماک خوف اس کے دماغ کو اپنی گرفت میں لینے لگا۔ اس نے لڑھکڑم دیکھا۔ اگر وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو ان کی نظروں پر آ سکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لڑھکڑ دیکھا اور رہنمائی ہوا۔

بھائیوں میں گھس گیا اور ایک جگہ دب کر بیٹھ گیا۔ بھائیوں خاصی گھنجان تھیں۔ وہ انہیں دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ قریب آ رہے تھے۔ وجدان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ آنگ لائک کے ساتھی تھے جو اس کی تلاش میں اس طرف آئے تھے۔ وہ اسے لگ کرنا چاہتے تھے۔ اس سارے شیطانی کھیل کے پیچھے دارا کا ہتھ اور وہ دارا کے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ دارا کسی قیمت پر اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے کرائے کے فنڈوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں جو اسے ٹھکانے لگانے کے لیے موقع کی ٹانگ میں تھے اور اس کی قسمت اچھی تھی کہ ہر مرتبہ وہ بچتا رہا تھا۔

قسمت نے آج پھر اس کا ساتھ دیا تھا۔

اس کے ذہن میں پر تاب غم کا خیال ابھر آیا۔ وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا ہوا ہوگا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اس سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی پھر ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ وہ چینی زبان میں بات کر رہا تھا۔ وجدان کی پرورش اس جزیرے پر ہوئی تھی جہاں کی آبادی میں چینیوں کی اکثریت تھی۔ وہ میٹروپولیٹن زبان بولتے تھے وجدان اگرچہ روایتی سے یہ زبان نہیں بول سکتا تھا لیکن سمجھ لیتا تھا۔ وہ مختصر کمرہ تھا۔

”وہ اسی طرف آیا تھا۔ یہاں تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ ممکن ہے

وہ پارک کی طرف نکل گیا ہو۔ وہاں جینے کی بہت سی جگہیں ہیں۔“ جینے کی جگہیں تو اس طرف بھی بہت ہیں۔ ان بھائیوں میں پوری فوج چھپ سکتی ہے۔ لیکن جیلو پارک ہی کی طرف چلے جی۔ وہ اس طرف گیا ہوگا۔ اسے وہاں کسی سے مدد ملنے کی توقع بھی ہوگی۔ دوسرے نے کہا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد وجدان نے قدموں کی آواز کر دیکھا۔ وہ دونوں دائیں طرف والے جمادیوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار کھرا درختوں کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے منہ سے بے اختیار کھرا سانس نکل گیا۔ موت ایک بار پھر اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ چلنے لپانے کی جگہ پر بھٹا رہا مگر جمادیوں سے باہر نکلنے کے بجائے اس طرف چلے گا جہاں روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

وجدان کا دل خوف سے کانپ رہا تھا لیکن وہ اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تیز تیز چلتا رہا۔ سانے میں جمادیوں کی سرسراہٹ کی آواز دور تک جاسکتی تھی لیکن اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی تھی۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

تقریباً دوسو گز دور جمادیوں سے نکل کر وہ کھلی جگہ پر آ گیا۔ تیز چلے ہوئے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر لڑھکڑ دیکھنے لگا۔ وہ جمادیوں میں غلط سمت میں نکل آیا تھا۔ وہ روشنیاں اب دائیں طرف رہ گئی تھیں۔ آگے ایک ٹیلا سا تھا اور دبیز تھاس تھی۔ وہ نیلے پر چڑھنے لگا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک بار پھر رک گیا۔ نیلے کے دوسری طرف خثیب میں بھی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ لڑھکڑ دیکھتے ہوئے وہ پیچھے مڑا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دو انسانی پیولے جمادیوں سے نکل کر اسی طرف آ رہے تھے۔ یہ یقیناً وہ تھے جو پارک کی طرف گئے تھے لیکن اس طرف اس کی تلاش میں ناکام ہو کر اس طرف آ گئے تھے۔

ان کے درمیان فاصلہ اگرچہ تین سو گز کے قریب تھا لیکن وجدان ہلندی پر ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں خثیب سے اسے آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا اور پھر ایک چینی ہوئی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔

”وہا۔۔۔ بھاگ۔۔۔ بچ کر جانے پنا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی نفخا فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ وجدان نے دوسری طرف خثیب میں دوڑ لگا دی۔ ایک موقع پر اس کا پیرو ہٹ گیا۔ وہ لڑھکڑا کر کہا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور کئی گز تک دھلان پر لڑھکڑا گیا۔ بالآخر وہ سنبھل گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ لوگ ابھی نیلے کی چوٹی پر نہیں پہنچے تھے۔ وہ ایک بار پھر دوڑنے لگا۔

فائز کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وجدان دوڑتا رہا۔ وہ روشنیاں اب بھی تقریباً تین سو گز دور تھیں۔ وجدان سوچ رہا تھا

کہ اگر کسی طرح وہاں تک پہنچ جائے تو موت کے ان فرشتوں سے بچ سکتا تھا۔

وہ پوری قوت سے دوڑتا رہا اور بالآخر ایک درخت کی آڑ میں رک گیا۔ سامنے شاہینک آ رہا تھا۔ ایک غارت پر بیٹھا تھا ہوا ایک جانا بچکانیوں سانس دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ ریورولی روڈ پر آ گیا ہے۔ یہ علاقہ اس کا جانا بچکانا تھا۔ سائیکل پر کئی مرتبہ اس طرف آچکا تھا۔ اس علاقے میں چند بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز تھے اور بھی بہت سی دکانیں تھیں۔ چند فاسٹ فوڈ کے اسٹالز اور تین چار اسٹیک بارز تھے۔

وجدان ایک بار پھر دوڑنے لگا اور بالآخر ریورولی روڈ پر پہنچ گیا۔ بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور بند ہو چکے تھے۔ البتہ چند چھوٹی دکانیں ’ریسٹورنٹ اور فاسٹ فوڈ کے اسٹالز کھلے ہوئے تھے اور اس علاقے کی طرف زیادہ رونق تھی۔

وجدان ایک ریسٹورنٹ سے کچھ فاصلے پر ایک کاری آڑ میں رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں آدمی بھی نظر آ گئے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر وجدان چونک گیا۔ یہ وہی چینی تھا جس نے خثیبوں کے وار کر کے اس کی ماں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کا نام اب بھی اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر وہ کانپ اٹھا تھا۔ اس کی سفاکی کا مظاہرہ وہ دیکھ چکا تھا۔

وہ دونوں ایک جگہ پر کھڑے لڑھکڑ دیکھتے رہے پھر آگے بڑھنے لگے۔ وجدان متحش لگا ہوں سے لڑھکڑ دیکھ رہا تھا۔ یہ جگہ اس کے لیے محفوظ نہیں تھی۔ کسی بھی وقت وہ ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ وہ کاروں کے پیچھے چھپتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں سے گزر کر اس طرف آ گیا جہاں فاسٹ فوڈ کی دکانیں تھیں۔ سڑک اور دکانوں کے درمیان وسیع لان تھے جہاں میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ بیٹھ ہوئے تھے۔

اس طرف تیز روشنیاں تھیں۔ وجدان سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کاروں کے پیچھے چھپتا ہوا ایک بائبل کی دکان کی طرف آ گیا۔ یہ سیمان ملی نامی ایک پاکستانی کا بائبل کیو تھا۔ وجدان اپنے والدین کے ساتھ کئی مرتبہ یہاں آچکا تھا۔

سامنے کے رخ پر بڑے بڑے کتاب دان تھے اور کئی کتابچی دیکھتے ہوئے کونوں پر کتاب اور چکن کے وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ اشتہار انگیز خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

پچھلی طرف ایک دیوار کے ساتھ کونے کی بوریوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ وجدان ایک کاری آڑ سے نکلتا تھا جہاں تھا کہ اس نے ان دونوں خثیبوں کو دیکھ لیا جو ایک جگہ کھڑے تجسس نظروں سے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی دوسری طرف ٹوٹے وجدان نے کاری آڑ سے نکل کر کونے کی بوریوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ دیوار اور بوریوں کے درمیان تنگ سی جگہ تھی۔ وہ ٹھسٹا ہوا اندر



مکس گیا۔ اس کے خیال میں یہ جگہ اگرچہ محفوظ تھی لیکن اگر انہیں شبہ ہو گیا تو پھر اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

دیوار اور دیوڑھیوں کے درمیان جگہ بہت تنگ تھی۔ وہ پھنس کر کھڑا ہوا تھا۔ دو تین منٹ گزر گئے اور پھر باتوں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ ایک چینی ٹولی چوٹی اردو میں کسی سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے کسی لڑکے کو ادھر آتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ دوسرے آدمی کا جواب وہ نہیں سن سکا تھا لیکن ہر حال اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ آس پاس ہی نہیں موجود تھے اور اسے تلاش کر رہے تھے۔

جگہ اگرچہ بہت تنگ تھی مگر وہ جان بوجھ کر اپنے بڑے بھائی کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا ہنم یو یو سے رگڑا رہا تھا۔ پانچ دو یو یو لپٹے اور رکھی ہوئی تھیں۔ ایک یو یو غالباً کچھ آڑی تھی۔ اس کا بیٹھن درست نہیں تھا۔ اپنی جگہ بنانے کے لیے وہ جانے دھکا دیا تو اوپر والی یو یو دھڑام سے دوسری طرف گر گئیں۔ یو یو لپٹنے کی آواز سن کر لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔

ہوئی کے ایک ملازم نے وہ جان کو یو یو کے پیچھے دیکھ لیا۔

”وے کون ہو تم یہاں گئے ہوئے کیا کر رہے تھے۔“ وہ ملازم اس کی طرف بڑھتے ہوئے چیخا ”ساری یو یو لپٹ کر آئیں۔ تمہارا باپ اٹھائے گا انہیں۔“

وہ جان کا چہرہ دھواں ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ ہی نظروں سے اڑھ اڑھ کر دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک آواز سن کر اس کا دل اچھل کر قلع میں گیا۔

”وہ رہا۔ یو یو کے پیچھے۔ پکڑو۔“

وہ جان کو ایک لمحے کو سینے میں سانس رکھا ہوا محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے یو یو کے پیچھے سے نکل کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں چینی اس سے تقریباً چالیس گز دور تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکے۔

اور پھر اچانک ہی فضا فز کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ جان ٹھیک اسی وقت ایک فاسٹ فوڈ کی دکان کے ساتھ مڑ گیا تھا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گوشتی اس کے جسم کے کسی حصے میں پوست ہو جاتی۔

وہ اندھا دھند ایک طرف دوڑتا رہا۔ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ گوشتی چلنے سے اس علاقے میں خوف و ہراس ماحول میں گھبراہٹ پیدا کیا تھا۔ فاسٹ فوڈ کی دکانوں کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر محفوظ جگہوں کی طرف دوڑنے لگے تھے۔

وہ جان دوبارہ بلند عمارتوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی میں دوڑتا ہوا پھر کھلی جگہ پر نکل آیا۔ یہ پارکنگ ایریا تھا۔ وہ جان نے سوچنا ان کاروں کے درمیان کہیں چھپ جائے کسی کار کا دروازہ کھول کر اندر گھس جائے لیکن وہ لوگ اسے ڈھونڈ لیتے۔ وہ پارکنگ ایریا کے پیچھے دیوار کی طرف دوڑا۔

دیوار تقریباً پانچ فٹ اونچی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا دیوار پر پہنچا۔ دوسری طرف کونے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک تنگ گلی میں دوڑتا ہوا آہٹا تھا جہاں سے وہ گزر کر آیا تھا۔ نے فائر کر دیا۔ اس دوران میں وہ جان دیوار سے تھلا گیا تھا۔ گوشتی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اس مرتبہ بھی وہ بال بال بچ گیا تھا۔

دوسری طرف کچی زمین تھی۔ اس نے سنبھل کر اوپر دیکھا۔ سامنے پودے تھے۔ لگاؤ کا درخت بھی تھے اور ان کے آگے گھاس کا قطعہ تھا جس کے دوسری طرف ایک بہت لمبی دیوار تھی۔

وہ جان نے اس عمارت کو بچان لیا۔ وہ ایک بائی اسکول کی عمارت تھی۔ وہ اٹھ کر پودوں کو پھلانگتا ہوا درختوں کی طرف دوڑا۔ درختوں کے قریب پہنچ کر بھی وہ رکنا نہیں بلکہ عمارت کی طرف دوڑتا رہا۔

عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کشادہ برآمدے میں کچھ وہ رک گیا اور متوجہ ہوئے۔ اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے بڑا مرکزی دروازہ تھا جو بند تھا۔ برآمدے میں ایک کمرہ دار کی طرف تھا اور ایک بائیں طرف۔ دائیں طرف والا کمرہ استیلا روم تھا اور بائیں طرف کا کمرہ واشنگ روم تھا۔ بچوں کے والے، نیچر ڈیمو وغیرہ ملنے یا کسی اور وجہ سے آتے تو انہیں اسی واشنگ روم میں بٹھایا جاتا تھا۔

دھب کی آواز سن کر وہ جان کو چنک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک چینی غنڈا کپاؤڈ وال سے کوٹ گیا تھا۔ وہ جان نے اُدھر اُدھر دیکھا اور پھر استیلا روم کی طرف بڑھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر کے کھڑا لگا دیا۔

باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ جان چند لمحوں کے دروازے کے قریب ہی کھڑا تاریکی میں گھورتا رہا۔ برآمدے کے بالکل سامنے تقریباً بیس گز دور مین گیٹ کے ساتھ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے پر تیز روشنی والا مرکزی بلب لگا رہا تھا۔ اس کی نہایت مدھم روشنی کھڑکی کے راستے اس کی تک بھی پہنچ رہی تھی۔ روشنی اتنی تھیں تھیں کہ صاف طور پر ہر نظر آسکتا۔ اندھا صیارے پر روشنی کا گمان سا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ جان کی آنکھیں اس اندھا صیارے سے مائل ہوئیں تو وہ ہلکا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ سلیقے سے کچھ کریاں آرائش تھیں اور درمیان میں ایک سینئر ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ وہ جان ہلکا ہوا کریوں کے پیچھے ایک دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا۔

دوسری طرف ایک کشادہ اور طویل راہداری تھی جس کے

دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ بائیں طرف آخری سرے پر دو درختوں کا ایک بلب جل رہا تھا۔ وہ جان نے دائیں طرف مدھم مدھم دیکھا۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ ابھی اس نے دیکھا اور بائیں طرف کھڑا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز جیسی بیڑی کی طرح گونج گئی۔ وہ دونوں برآمدے میں پہنچ گئے تھے۔ برآمدے میں کچھ کمرے تھے۔

اور مرکزی دروازے کو مڑھڑا رہے تھے۔

وہ جان کے دل کی دھڑکن سے قابو ہوئی باری تھی۔ دوڑتے دوڑتے کچھ شل ہو چکی تھیں۔ وہ پناہ کی تلاش میں بھاگا پھر رہا تھا لیکن اسے کبھی بھی پناہ نہیں مل رہی تھی۔ موت کے فرشتے اس کے قریب ہی گئے ہوئے تھے۔

اس کے قریب چمکے کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ ان لوگوں نے اچانک چمکے کی آواز سے کھینچ لیا تھا۔ اب وہ دروازہ کھول کر آگے والے دروازے کا شیشہ توڑ دیا تھا۔ اب وہ دروازہ کھول کر آگے والے دروازے کے طرف پکڑا جائے گا۔ نہیں وہ کمرہ آگے نہیں جاسکتا۔ وہ اسے دیکھنے کی گولی مار دیں گے۔

وہ جان نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور پھر دوپے قدموں میں چھلچھلا رہا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ زینے کے اختتام پر کشادہ راہداریاں تھیں۔ ایک دائیں طرف ایک بائیں طرف اور ایک بالکل سامنے۔

لمحے سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ اسے نیچے تلاش کر رہے تھے۔ وہ جان نے اُدھر اُدھر دیکھا اور پھر دائیں طرف کی راہداری میں چلے لگا۔ لاکھ اڑھائی گئے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر ڈیمک لگے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ اسکول کی اس عمارت کا چوکی دار کہاں چلا گیا۔ اگر وہ عمارت میں موجود تھا تو اس نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی ہوگی۔ اب تک چوکی دار کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ صدمہ میں ڈوبا ہوا معلوم کرنے کے لیے کیوں نہیں آیا۔

وہ جان ابھی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اُدھر اُدھر کی راہداری کے دونوں طرف کلاس رومز تھے۔ وہ لوگ نیچے کی تلاش مکمل کرنے کے بعد اوپر آجائیں گے اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اوپر آکر غلطی کی تھی۔ اگر نیچے کی کلاس روم میں چھپ جاتا تو کھڑکی کے راستے بھاگنے کا موقع مل سکتا تھا۔

وہ راہداری کے آخر میں پہنچ کر رک گیا۔ سامنے تقریباً تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار کے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ نہیں۔ وہ یہاں سے چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔ اسکول کی کپاؤڈ وال کے دوسری طرف وہی علاقہ تھا جہاں سے وہ بھاگ کر آیا تھا۔ وہاں اب پہلے جیسی موقع نظر آ رہی تھی اور کوئی افزائش تھی نہیں تھی۔

قدموں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں قالین بیڑیوں پر دوڑتے ہوئے اوپر آ رہے تھے۔

اس کے دل کی دھڑکن ایک بار تیز ہو گئی۔ وہ کسی بھی لمحے پکڑا جاسکتا تھا۔ نہیں۔ ان میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر راہداری کا آخری دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

دروازہ کھلنے ہی گاوار سی ہو گا زبردست بھکا اس کے منتھوں سے نکلایا اور اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس دروازے کے اندر چھوٹے چھوٹے بیت اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ دیوار کے سامنے ٹوٹا ہوا آگے بڑھنے لگا اور بائیں طرف والے آخری بیت اٹھا کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اسے تنگ والا دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور وہ دروازے کے پیچھے دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ آخری بیت اٹھا تھا اور اس میں باہر والی دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی۔ کھڑکی اگرچہ کھلی ہوئی تھی اور وہ بھی اندر آ رہی تھی لیکن بدلو سے اس کا دماغ بھٹا جا رہا تھا۔

اس کی تمام تر توجہ آوازوں پر مرکوز تھی۔ وہ دونوں اس راہداری میں تھے اور کلاس رومز کے دروازے کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بیت اٹھا والے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کی آواز اس کی سماعت سے نکل گئی۔

”غلط ہو۔ یہ تو لیٹرین ہے۔“

”دیکھو۔ اندر جا کر دیکھو۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں چھپا ہوا ہو۔“ دوسری آواز نے کہا۔

اور پھر بیت اٹھا کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ جان کو سینے میں سانس رکھا ہوا محسوس ہونے لگا۔ موت اور اس کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ خوف کی شدت سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ اس کے منہ سے چیخ نہ نکل جائے اس نے اپنے منہ پر پٹی سے ہاتھ رکھ لیا۔

اور پھر اس نے ہاتھ روم کا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ منہ کو ہاتھ سے دبائے سانس روکے دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کان کسی بھی لمحے گولی کی آواز سننے کے منتظر تھے مگر کوئی نہیں چل۔ دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی اور وہ باہر نکل گیا۔ جب باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تو وہ جان نے آنکھیں کھول دیں لیکن منہ کو ہاتھ سے دبائے رکھا۔

”وہ بیٹھا اسی عمارت میں کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔“ باہر سے ایک آواز سنائی دی ”تم سامنے والی راہداری میں تلاش کرو چلی فائنگ میں دوسری راہداری میں دیکھنا ہوں۔“

وہ جان کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ جی فائنگ۔ یہی نام

تھا اس جینی کا جس نے اس کی ماں کو اس کی نظروں کے سامنے  
خجروں کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جی  
فانگ کو اس نے اگرچہ دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور اب اس کا نام بھی  
یاد آ گیا تھا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ وجدان نے اپنے منہ  
سے ہاتھ ہٹایا اور سرے سرے سانس لینے لگا۔ بدلو سے اس کا  
دماغ ہٹا جا رہا تھا لیکن اس بدبو ہی کی وجہ سے وہ جیگیا تھا۔ موت  
ایک بار پھر اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔

دوسری راہ راہوں میں کلاس دوم کے دروازے زور زور سے  
کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے خیال  
میں راہ راہی میں کھانا مناسب نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ روم کی کھڑکی  
سے باہر بھاگ کر دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں جھکی سی آنکھ  
آئی۔

کھڑکی سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ ڈریں  
پائپ تھا۔ وہ عمارت کی چھت سے لے کر نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ  
کھڑکی کے فریم پر چڑھ گیا۔ ایک ہاتھ سے کھڑکی کی چوٹ کو  
مضبوطی سے تھام لیا ایک پیروں پر چڑھ کر چوٹ پر رکھا اور ڈریں پائپ  
کی طرف جھٹکے لگا۔

فاصلہ تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ آسانی سے  
پائپ تک پہنچ گیا۔ اس نے پائپ پر گرفت جمالی اور کھڑکی کو چھوڑ  
دیا۔ دوسرا ہاتھ بھی بڑی چھٹی سے پائپ پر تھاپا اور پھر آہستہ  
آہستہ نیچے چھلنے لگا۔

ڈریں پر قدم تھلنے ہی وہ کیا ڈنڈ وال کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔  
اسے دیوار پر چڑھنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور پھر  
کسی کے چہنچے کی آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جی فانگ یا  
اس کے ساتھی نے کسی کلاس روم کی کھڑکی سے اسے دیکھ لیا تھا۔

وجدان نے دوسری طرف جھلاٹک لگا دی۔ اس وقت شاید  
بارہ بج چکے تھے لیکن اس علاقے کی روٹن میں کوئی فرق نہیں آیا  
تھا۔ یہاں کے بشپریسٹورٹ اور فاسٹ فوڈ کی دکانیں رات بھر کھلی  
رہتی تھیں۔ اتفاق سے وجدان جس جگہ دیوار سے کودا تھا اس سے  
چند گز کے فاصلے پر باہلی کیو کی ویسی دکان بھی جہاں وہ کوئلے کی  
بویوں کے پیچھے چھپا تھا۔ اس وقت بھی دکان کے اس ملازم نے  
اسے دیوار سے کودتے ہوئے دیکھ لیا۔

”اوئے کون ہے تو۔ بھاگ جا یہاں سے۔ وہ جینی تجھے مار  
دیں گے۔“ دکان کا ملازم چنپا۔

وجدان نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ گوڑے سے لدا ہوا ایک  
ٹرک گلی سے نکل کر بائیں طرف مڑا تھا۔ وجدان دوڑ کر اس ٹرک  
پر چڑھ گیا اور گوڑے کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ اس نے ان دونوں  
چنبیوں کو بھی اسکول کی دیوار پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹرک کی  
رفتار تیز ہو گئی۔ وہ دونوں دور رہ گئے اور وجدان کے منہ سے بے

اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔

وجدان ٹرک میں بھرے ہوئے گوڑے کے کنارے  
اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ٹرک اس ٹرک پر جا رہا تھا جس  
اوپر اسے امپریل واقع تھا۔ ہوٹل کا تینوں سامان دور ہونے لگا  
تھا۔

جھٹکے ابھی ہوئے تھے۔ دوسری تھا کہ ایک ٹرک ساڑھے  
کی موڑ سا نیل تیز رفتار سے اس کے برابر آئی۔ سارا جھٹکے  
ٹرک کے ڈرائیور کو گاڑی ساڈ میں روک لینے کا اشارہ کیا۔  
طرح کھلے ٹرک پر گوڑے لے جانا جرم تھا اور سارا جھٹکے اس  
اسے روکا تھا۔

ٹرک کی رفتار جیسے ہی تم ہوئی وجدان نے جھٹکے لگا دی۔  
ٹرک پر گرا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر ہوٹل کی طرف دوڑ  
لگا۔ ہوٹل کے سامنے کچھ روٹن نظر آ رہی تھی۔ اور وجدان کی گت  
تھا کہ وہاں اسے پناہ مل جائے گی۔

وجدان کی ٹانگیں دوڑتے دوڑتے شل ہو چکی تھیں  
بھیڑے پیچھے جا رہے تھے۔ سامنے فٹ پاتھ پر پچھلے لوگ تھے۔  
وجدان کا رخ انہی کی طرف تھا۔ قریب پہنچ کر اسے کتے  
سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا ہوا سامنے سے آنے والے ایک کتے  
کے قدموں میں گر گیا۔

وجدان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ منہ سے کف برہا ہوا  
اس کے دونوں ہاتھ سامنے کھڑے ہوئے شخص کے پیروں  
قریب تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اسے  
میں اپنا سانس رکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ ارا تھا!  
وہ انسان نہیں موت کا فرشتہ تھا جسے دیکھ کر وجدان کی اند  
تک کانپ اٹھی تھی۔

دارا گردن کو ذرا سا خم کئے اپنے قدموں پر گرے ہوئے  
لوک کو دیکھ رہا تھا جس کی تلاش میں اس نے جینی خنڈوں  
خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور اب تک ہزاروں وار خنڈوں کے  
تھا۔ وجدان اس کے جرم کا چشمہ دیکھ رہا تھا اور وہ اسے فریٹ  
موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا لیکن اسے قدم قدم پر ہانکا  
سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور اس وقت وہ کہے ہوئے جھل کی طرح  
کے قدموں میں آں گرا تھا۔ دارا اپنی خوش بختی پر دل ہی دل  
مکرا اٹھا۔ ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وجدان اس طرح  
بھی اس کے سامنے آجائے گا۔

وجدان اس کے لئے ڈیوٹ وارنٹ کی حیثیت رکھتا تھا!  
کا دل چاہا تھا کہ ذرا سا نیچے جھکے اور اس لوک کی گردن موڑ  
فٹ پاتھ کے ساتھ کیاری میں لگے ہوئے پودوں کے پیچھے  
وے لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو نہ پاسکا تھا۔  
جگہ ویران اور سنسان نہیں تھی۔ ایک باورچی بے دارڈ

اگرچہ اس وقت باہر سے اور کا وقت تھا لیکن سڑک پر اڑا جاتا  
ماڑیوں کی آندوٹ بھی جاری تھی اور فٹ پاتھ پر لوگ بھی آ  
جا رہے تھے۔ اس وقت کوئی معمولی سی غلطی بھی اس کے لئے  
خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

دارا نے گردن مٹھا کر اُدھر اُدھر دیکھا۔ دیو رہیں عورتیں اور  
ایک اوچر عمر مردوٹے والے انداز میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔  
انہوں نے بھی اپنے سامنے ایک لڑکے کو دوڑتے ہوئے اور پھر  
مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قریب  
پہنچے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے دارا کے ہونٹوں پر خنیف سی  
مکراہٹ آئی۔

”یہ بچہ شاید کسی سے ڈر کر بھاگ رہا تھا۔ دارا نے قریب  
کھڑکی ہوئی اوچر عمر بوری عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“ اسے  
ہماری مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں دیکھا ہوں یہ کون ہے؟“ وہ آہستہ  
آہستہ نیچے جھٹکے لگا جیسے وجدان کو بانوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہتا ہو۔  
”پھلو پوائے“ وہ وجدان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔  
”کیا پتا ہے۔ کس سے ڈر کر بھاگ رہے ہو۔ کیا کوئی بد معاش  
جس پکڑنا چاہتا ہے؟“

وجدان کا اٹھا سا دل خراب رسیدہ ہونے کی طرح کانپ رہا تھا۔  
دارا کے ہونٹوں پر اگرچہ مکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں  
بے پناہ نرمی اور اداسی تھی۔ وجدان موت کو ٹھانے کے بھاگ  
تھا اور موت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ محسوس  
ہوا جیسے اس کا دل بھی من ہو گیا ہو۔ اس نے سر کو ایک ہانکا سا  
جھٹکا دیا اور ذرا سی گردن مٹھا کر قریب کھڑے ہوئے اس یورپین مرد  
اور عورتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سامنے کافی فاصلے پر تین چار

عورتوں پر مشعل ایک اور ٹولی اس طرف آ رہی تھی۔ وجدان کے  
ذہن میں ایک چمک سی ایک خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کی موجودگی سے  
کاٹھ اٹھا سکتا تھا۔ اس نے سوچا وہ شور مچا دے کہ یہ شخص اس  
خدمات حاصل کر رہی تھیں اور اب تک ہزاروں وار خنڈوں کے  
تھا۔ وجدان اس کے جرم کا چشمہ دیکھ رہا تھا اور وہ اسے فریٹ  
موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا لیکن اسے قدم قدم پر ہانکا  
سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور اس وقت وہ کہے ہوئے جھل کی طرح  
کے قدموں میں آں گرا تھا۔ دارا اپنی خوش بختی پر دل ہی دل  
مکرا اٹھا۔ ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وجدان اس طرح  
بھی اس کے سامنے آجائے گا۔

”آؤ جینا، میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ اور بتاؤ کون بد معاش  
تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے  
کر دیں گے۔“ دارا نے کہا۔

وجدان چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھ رہا پھر اس نے اپنے  
آپ اس طرح حرکت دی جیسے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے  
دونوں ہاتھ دارا کے چپکے ہوئے جوتوں پر رکھ دیے اور دونوں  
ٹانگوں پر ٹک سیلے۔ وہ تینوں یورپین بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ

اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اوچر عمر عورت نے آگے جھٹکتے ہوئے  
اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔  
”تم بہت دلیر لڑکے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہم تمہیں  
تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔“

وجدان نے اپنے آپ کو کچھ اور حرکت دی۔ اس نے دونوں ہاتھ  
جوتوں سے ہٹا کر دارا کے کھنڈ کے پیچھے رکھ دیے اور پھر اس نے  
وہ حرکت کی جس کے بارے میں دارا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔  
وجدان نے دارا کے دونوں پیروں سے پکڑ کر اپنے جسم کی  
پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ دارا لڑکھڑا  
کر ٹھٹ کے بل فٹ پاتھ پر گرا۔ اس کے منہ سے گندی کالی نکل  
گئی تھی۔

وجدان ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دارا کی  
طرف دیکھتے ہوئے زور سے ٹھوکا اور فٹ پاتھ کے ساتھ کیاری میں  
لگے ہوئے پودوں کے پیچھے جھلاٹک لگا دی۔ یورپین مرد اور عورتیں  
بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ فٹ پاتھ پر آنے والی  
عورتوں کی ٹولی بھی قریب آ گئی تھی۔ انہوں نے بھی یہ دلچسپ منظر  
دیکھا تھا۔ یہ بھی یورپین عورتیں تھیں جو ہوٹل اوپر اسے امپریل  
میں قیام پزیر تھیں اور غالباً ٹھٹکے کے لئے نکلی ہوئی تھیں۔

وجدان نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ پودوں میں جھلاٹکیں  
لگا تا ہوا بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا اور پھر اچانک فضا کا زکی آواز  
سے گونج اٹھی۔ گولی اس کے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر  
گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پودوں میں گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی دیر  
نہیں لگائی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یورپین عورتیں پیچھے ہوئی  
اُدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں اور دارا دوڑتا ہوا پودوں کی طرف آ رہا  
تھا۔ وجدان نے اُدھر اُدھر دیکھا۔ دائیں طرف عمارتوں کے  
درمیان کچھ تاریکی تھی۔ وہ اسی طرف بھاگ اٹھا۔ وہ عمارتوں کے  
درمیان دوڑتا ہوا ہوٹل اوپر اسے کی پچھلی طرف نکل آیا۔ ہوٹل  
کی عمارت سے ذرا لمبی ہوئی دو کمروں پر مشعل ایک چھوٹی سی  
عمارت تھی۔ وہ اس عمارت کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ عمارت کے  
اندر کسی بھاری مشین کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ  
دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس چھوٹی سی عمارت کے  
سامنے گھاس پر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی اور ایک آدمی مخالف  
سمت میں جا رہا تھا۔ وجدان بڑی آہستگی سے دیوار کی آڑ سے نکلا  
اور تیزی سے چلا ہوا اس چھوٹی سی عمارت کے کھلے ہوئے  
دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ ہوٹل کا انٹرکٹیشننگ پلانٹ تھا۔ اگرچہ وہاں بڑی بڑی  
مشینیں چل رہی تھیں مگر آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس نے رک  
کر اُدھر اُدھر دیکھا اور پھر ان مشینوں کے درمیان چلا ہوا پچھلی  
طرف پہنچ گیا۔  
مشینوں کے شور کے باوجود ایسے باہر سے دوڑتے ہوئے

قدموں کی آواز سنائی دے گی تھی پھر ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے دو آدمی جھگڑنے والے انداز میں چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہوں اور بھگول پلٹے آواز کسی کے چپنے کی آواز سنائی دی۔

وجدان کے دل و دماغ پر بخاری خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جی فانگ اور اس کے خونخوار ساتھی سے جان بچا کر بھاگتا تو دارا کے قدموں میں گرنا تھا۔ اور اب دارا خونخوار بھیڑیے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ باہر کوئی کی آواز سن کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ کوئی کس نے چلائی تھی اور وہ چیخ کس کی تھی۔ وجدان ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر چونک گیا۔ قدموں کی وہ آواز اس مشین روم کے سامنے آکر رک گئی۔ وجدان پر کچھ سی بخاری ہو گئی۔

قدموں کی آواز اب مشین روم کے اندر سنائی دے رہی تھی۔ وجدان نے ادھر ادھر دیکھا۔ مشینوں کی پچھلی طرف ایک ڈوم اونچا ہوا تھا۔ اس ڈوم کے سوا چھپنے کی کوئی اور جگہ نہیں تھی۔

”وجدان! مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔“ یہ آواز یقیناً دارا کی تھی۔ اس کے لیے میں بھی اس کی آنکھوں جیسی سفاکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہونگا۔“

وجدان کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ موت پھر اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کی انگلیں کاپ بڑی رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بڑی آہستگی سے مشین کے پیچھے پڑے ہوئے ڈوم میں گھس گیا۔ اگر دارا نے اس ڈوم میں جھانکنے کی کوشش نہ کی تو وہ بچ جائے گا۔ دوسری صورت میں وہ

اسے ڈوم سے نکلنے کا موقع دے بغیر گولیوں سے چھلنی کر دے گا۔ مشینوں کے شور میں قدموں کی ہلکی سی آواز سنائی دیتی رہی جو بالآخر ڈوم کے قریب آکر رک گئی۔ وجدان نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور سانس بند کر لیا۔ اس کے اوپر بے رحم موت کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا اور اس کی معمولی سی حرکت اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔

چند سیکنڈ بعد قدموں کی آواز دور ہو گئی ہوئی محسوس ہونے لگی اور پھر مشینوں کی آواز میں معدوم ہو گئی۔ اب صرف مشینوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وجدان نے کچھ دیر اور انتظار کیا اور پھر بڑی آہستگی سے ڈوم سے باہر نکل آیا۔ وہ غالباً تھل کا خالی ڈوم تھا۔ اس کے ہاتھ پر چوہا اور کپڑے تیل سے کالے ہو رہے تھے۔ وہ مشینوں کے درمیان محتاط انداز میں چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور باہر جھانک لگا۔ چند گز آگے ایک آدمی گھاس پر بے حس و حرکت اونچا ہوا تھا۔ وجدان نے کپڑوں سے بچاؤ لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جسے اس نے مخالف سمت میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور

غالباً اسے دارا نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

وجدان کا دل کاپ رہا تھا اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اس کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس کا دل کانپ کانپ کر زور زور سے چیخا شروع کر دے۔ پہلے اس نے سوسا کپڑے سے نکل کر کسی طرح ہوٹل میں پہنچ جائے لیکن اس نے اپنے آپ کو ترک کر دیا۔ اگر دارا باہر کسی جگہ موجود ہوا تو اسے دیکھنے کی مار دے گا۔ اس نے سرگودھرا دھر دیکھا۔ اندر چند قدم کے پھر ایک چھوٹی میز پر بیٹھ ہوئی تھی اور اس کے پیچھے دیوار پر ایک فون سیٹ لگا ہوا تھا۔

ٹیلی فون دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا میز کے قریب پہنچا اور کپڑے ہٹا کر رسیوں پر لپکا لیکن اچانک ہی اس کا ذہن الجھ کر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ کس فون کرے۔ اسے اپنے والد کے کئی دو سہولت نمبر یاد تھے لیکن اس وقت کسی کا نمبر یاد نہیں آیا تھا پھر اسے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ زندگی اور موت کی اس آنکھ پھلکی میں پر تپ سکھ کو تو بھول ہی گیا تھا۔ اب اسے یاد آیا تھا کہ جب وہاں سے اتر کر بھاگا تھا تو پر تپ سکھ اس شخص کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو سی آئی ڈی آفیسر کے ہمیں میں ہسپتال کے زور پر انہیں کہیں لے جاتا چاہتا تھا اور پھر دوسری کار پر چلی فانگ اور اسے ساتھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جی فانگ اور اس کا ایک ساتھی ڈوم کے پیچھے لپک گئے تھے اور اگر ان کے ساتھ کچھ اور افراد تھے تو پر تپ سکھ سے الجھ گئے ہوں گے۔ پر تپ سکھ پر تپ سکھ پر تپ سکھ میں ہو گا۔ وہ زندہ بھی ہے یا اسے ختم کر دیا گیا ہے۔ وجدان اس امید پر پر تپ سکھ کا نمبر لانے لگا کہ اگر وہ زندہ ہوا تو شاید اب تک گھر پہنچ گیا ہو۔ وہ پورے نمبر نہیں ملا پایا تھا کہ ایک لمبا آواز سنائی دی۔

”جو جو.....“ ہمیں معلوم ہے، تمہاری لائن ڈائریکٹ نمبر ہے۔ اس وقت کے فون کرنا چاہتے ہو؟“ اس عورت نے اگرچہ میں بات کی تھی لیکن لہجہ چینی تھا۔

”میں جو جو.....“ نہیں ہوں۔ میں چاہا پر تپ سکھ کا نمبر لے چاہتا ہوں۔ تم کون ہو؟“ وجدان نے جواب دیا۔ اس کے لیے نمبر کچھ بٹ نایاں تھیں۔

”میں ہوٹل کی آریئر ہوں۔ تم کون ہو؟ جو جو.....“ کمال ہے؟“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”مجھے پتا نہیں جو جو لیکن کون ہے۔“ وجدان نے جواب دیا۔ ”دارا مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں اس سے بچنے کے لیے اسے مشین روم میں آکر چھپ گیا تھا۔ وہ توڑی دیے پہلے یہاں سے نکل کر گیا ہے۔ پلڑا چاہا پر تپ سکھ کو بتا دو میں یہاں ہوں۔ وہ مجھے آکر لے جائے۔“

”دوسری طرف سے کہا گیا۔“ تم ٹیلی فون رکھ دو اور وہاں کمرے رہو۔ میں سیکورٹی گاؤڈ کو بھیجتی ہوں۔ مشین روم سے باہر ت نکلتا۔“

”جلدی سے آجاؤ آئی۔ اگر دارا آگیا تو مجھے مار دے گا۔“ وجدان نے کہا۔

”دو نہیں۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔ تم فون کا رسیور رکھ دو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

وجدان نے رسیور رک پر ٹانگ دیا۔ ایک بار پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ نیلے کپڑوں میں ملبوس وہ آدمی اب بھی اسی طرح بے حس و حرکت گھاس پر پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ یہ شخص جو جو..... تو نہیں جس کے بارے میں آپریٹر نے پوچھا تھا۔

”وہ دروازے سے ہٹ کر ایک مشین کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تقریباً دو منٹ بعد باہر سے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر ایک آدمی کی بھاری آواز اس کی سماعت سے گزری۔“

”میلو ہوائے کہاں ہو تم؟“ وجدان جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے وہ کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ فون پر آپریٹر نے کہا تھا کہ وہ لوگ آ رہے ہیں لیکن بین ٹھن کا اس سے پہلے دارا دیا ہوا ہلکا ہلکا چیخ تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے بہت آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے مشین کی آڑ سے جھانک کر دیکھا اور پھر اس کے منہ سے اٹھیاں کا سانس نکل گیا۔

وہ ایک ادیز عمر چینی عورت تھی۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا فائنٹ سپروائزر اور دو سیکیورٹی گاؤڈ تھے۔ وہ چاروں تجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

”میلو ہوائے میں ہوٹل کی وی آریئر ہوں جس نے فون پر تم سے بات کی تھی۔ کہاں ہو تم؟“

یہ وہی آواز تھی جو وجدان نے فون پر سنی تھی۔ وہ مشین کی آڑ سے نکل کر سامنے آیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے اثرات نمایاں تھے۔

”سو ماؤ گی۔“ عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے آگے بڑھ کر وجدان کو دو فون بازوں سے پکڑ لیا۔ ”یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔ کہاں پیچھے ہوئے تھے تم۔ اور جو جو کہاں ہے؟“

”میں دارا سے بچنے کے لیے ڈوم میں چھپ گیا تھا۔“ وجدان نے جواب دیا۔ ”مجھے پتا نہیں جو جو کہاں ہے۔ باہر گھاس پر ایک آدمی اونچا ہوا ہے۔ وہ شاید مر گیا ہے۔ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔“

وہ عورت ایک جھکے سے سیدھی ہو گئی۔ ہوٹل کا فائنٹ

سپروائزر اور دونوں گاؤڈ بھی چونک گئے۔

”کہاں..... کہاں ہے وہ؟“ سپروائزر جلدی سے بولا۔

”میں نے گولی ماری ہے؟“

”دارا نے۔“ وجدان نے جواب دیا۔ ”نیلے کپڑوں والا وہ آدمی اس طرف گھاس پر پڑا ہے۔“ وجدان نے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

سپروائزر اور دونوں گاؤڈ تیزی سے باہر آگئے اور پھر انہوں نے وہ لاش دیکھی جو دائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ چینی عورت بھی وجدان کو لے کر مشین روم سے باہر آگئی تھی۔ وہ لاش کے قریب نہیں گئی بلکہ دور کھڑی ہو کر اس طرف دیکھتی رہی۔ اس نے وجدان کا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے اثرات ابھر آئے تھے۔

”مس کاشی۔“ سپروائزر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ”تم ہوٹل میں جا کر پولیس کو فون کر دو۔ جو جو ختم ہو چکا ہے اور اس لڑکے کا خیال رکھنا۔ یہ اس سلسلے میں بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔“

”پولیس کو ہوٹل کے سامنے فائرنگ کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ انہیں اب تک آ جانا چاہیے۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔“ مس کاشی نے کہا۔

”میں خود دیکھتا ہوں۔“ سپروائزر کہتے ہوئے خود آگے بڑھ گیا۔ اس چھوٹی عمارت کے ساتھ ہی دائیں طرف ہوٹل کی عمارت میں ایک دروازہ تھا۔ سپروائزر اس دروازے میں داخل ہو گیا۔ مس کاشی بھی وجدان کا بازو پکڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پیچھے چلی پڑی تھی۔ دو تین راپداریوں سے گزر کر وہ ہوٹل کی استقبالیہ لابی میں پہنچ گئے۔ سپروائزر استقبالیہ کاؤنٹر پر رکنے ہوئے فون کا رسیور اٹھا کر غالباً پولیس اسٹیشن کا نمبر ملا رہا تھا۔ مس کاشی وجدان کو استقبالیہ کاؤنٹر کے ساتھ بنے ہوئے سپروائزر کے دفتر میں لے آئی۔

”دس پندرہ منٹ پہلے ہوٹل کے سامنے سڑک پر فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم نے پولیس کو فون پر اطلاع دی تھی مگر پولیس ابھی تک نہیں پہنچی۔“ مس کاشی کہہ رہی تھی۔ ”تم کون ہو بوائے اور دارا کون ہے۔ وہ نہیں کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟“

”ہوٹل کے سامنے بھی دارا نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی مگر میں بھاگ گیا تھا۔“ وجدان نے بتایا۔ ”اس نے میرے می ڈیوی کی قتل کر دیا تھا۔ اب وہ مجھے بھی مارنا چاہتا ہے۔ چاہا پر تپ سکھ کو لگا دو آئی پلیر۔“

”مس کاشی اس کی بات سن کر چوہے کے بغیر نہیں بے سکی تھی۔ دہرے قتل کی، سیانہ، واردات زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔ اس واردات کے حوالے سے اخبارات کئی روز تک فزٹ پیج پر خبریں چھاپتے رہے تھے۔ ان خبروں میں وجدان نام کے ایک لڑکے کا

خاص طور پر تذکرہ رہا تھا۔ وہ متولین کا بیٹا تھا جو بیچ گیا تھا اور وہ اس واردات کا جنم دید گواہ تھا۔ وہ کانٹوں کو بچاتا تھا اور قاتل اسے بھی ختم کرنے کے لئے کسی بارکو شش کر چکے تھے۔ اخبارات ایسی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کرتے رہے جنہیں لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھتے۔ کسی نے اس لڑکے کو نہیں دیکھا تھا مگر سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ مس کاشی بھی اخباروں میں یہ خبریں پڑھتی رہی تھی اور اسے بھی اس لڑکے سے ہمدردی ہوگئی تھی جو ان خونخوار بھیڑیوں سے بچتا رہا تھا اور اب وہی لڑکا اس کے سامنے تھا۔ اسے واقعی وجدان پر ترس آ رہا تھا۔ کتنا معصوم سالہکا تھا جو موت سے آنکھ پھولی کھیل رہا تھا۔

”ڈرو نہیں۔ اب تم بالکل محفوظ ہو۔“ مس کاشی نے وجدان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ خوف سے وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ”تم تو بہت بہادر لڑکے ہو۔ اب وہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کچھ دیر میں پولیس آنے ہی والی ہوگی۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”چاچا پر تآب سنگھ کو بلا دو آئی۔“ وجدان نے کہا۔  
”پولیس آجائے تو پر تآب سنگھ کو بھی بلا دیں گے۔“ مس کاشی نے کہا۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور پروانز راند رافل ہوا۔  
”پولیس روانہ ہو چکی ہے۔ وہ لوگ چند منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اس لڑکے نے اپنے بارے میں کچھ بتایا۔ یہ یوں ہے اور اسے کوئل کرنا چاہتا تھا؟“

”یہ وہی بچہ ہے جس کے والدین کو کچھ عرصہ پہلے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔“ مس کاشی نے کہا اور پھر اسے وجدان کے بارے میں بتانے لگی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد پولیس پہنچی گئی۔ اس پولیس باڈی کا انچارج نچلے درجے کا آفیسر تھا۔ صورت حال کی تکفنی کا اندازہ لگاتے ہی اس نے فون پر انسپکٹر جیناگ شو کو اطلاع دے دی۔ انسپکٹر جیناگ شو کو وہاں پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے آتے ہی وجدان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

دارا کے کھاتے میں ایک اور قتل کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس واردات کا گواہ بھی وجدان ہی تھا۔ وجدان نے اگرچہ اپنی آنکھوں سے دارا کو جو بڑے گولی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ طے شدہ بات تھی کہ جو جو کو اسی نے قتل کیا تھا۔ جو جو ہوئیں گے ان کے شینگ پلانٹ کا آپہڑ تھا۔ وہ غالباً ہوئیں گے سامنے والی سڑک پر فلائنگ کی آواز سن کر صورت حال معلوم کرنے کے لئے اس طرف جا رہا ہو گا کہ دارا سے ملے بھیڑ ہو گئی۔ اس نے شاید دارا کو اس طرف آنے سے روکنے کی کوشش کی ہوگی جس پر دارا نے اسے گولی مار دی بعد ازاں وہ وجدان کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔

انسپکٹر جیناگ شو نے تحقیقات کی ذمہ داری اپنے ایک ماتحت آفیسر کو سونپ دی اور وجدان کو لے کر پولیس اسٹیشن گیا۔  
”چاچا پر تآب سنگھ کہاں ہے۔ مجھے ان کے پاس لے چلیں نا۔ انکل۔“ وجدان نے جیناگ شو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پر تآب سنگھ اسپتال میں ہے۔ اسے ٹانگ میں گولی لگی تھی لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں۔ معمولی زخم ہے۔ دو چار روزیں ٹھیک ہو جائے گا۔“ انسپکٹر جیناگ شو نے اس کے چہرے پر نظر کر جاتے ہوئے کہا۔ ”پر تآب سنگھ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا کہ کس طرح تم دونوں کو ہسپتال کی زد پر لے جانے کی کوشش کی جارہی تھی مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور دارا سے تمہارا سامنا کیسے ہوا؟“

”ہمارے رکھنے ہی چاچا پر تآب سنگھ نے مجھے بھاگ جانے کو کہا تھا۔“ وجدان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر مشین دوم میں وہ خالی ڈرم نہ پڑا ہوتا تو دارا مجھے ہلاک کر دیتا۔“

”اس کے ہاتھوں ایک اور آدمی قتل ہو گیا ہے۔“ انسپکٹر جیناگ شو بولا۔ ”وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو جو کے قتل کے وقت تم آس پاس ہی کیس موجود تھے اور تم اس قتل کے بارے میں بھی اس کے خلاف گواہی دو گے۔ تم نہ صرف ہمارے لئے بلکہ اس کے لئے بھی پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہو۔ تم نے بتایا ہے کہ وہ آدمی تمہارے تعاقب میں تھے کیا تم ان میں سے کسی کو پہچان سکتے ہو۔ تمہارے بتائے ہوئے طے سے تصویریں خاک تیار کر کے انہیں تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔“

”..... لیس انکل۔“ وجدان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ”ان میں ایک آدمی وہی تھا جس نے میری ممی کو قتل کیا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا ہے۔ وہ جی ٹانگ ہے۔“ وجدان ایک بار پھر اس کا طعنے دہرائے لگا۔

”جی ٹانگ۔“ انسپکٹر جیناگ شو اچھل پڑا۔ ”یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہوا ہے۔“ وہ چند لمحوں کے سوچتا رہا پھر اپنے ایک ماتحت کو بلا کر ہدایت کی کہ پولیس ریکارڈ میں جی ٹانگ کا نام تلاش کر پھر ایک اور کانسٹیبل کو بلا کر کہا۔ ”اسے ہاتھ دوم لے جاؤ اور نہ ہاتھ دھلا کر ہوئیں سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔ پر تآب سنگھ نے بتایا تھا کہ انہوں نے اسی رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“

کانسٹیبل وجدان کو دواش دوم میں لے گیا۔ وجدان کے جم اور کپڑوں پر تھیل کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ منہ ہاتھ تو اس نے دھو لیا لیکن کپڑوں کی مجبوری تھی۔ کانسٹیبل اسے انسپکٹر کے کمرے میں چھوڑ کر کھانا وغیرہ لینے کے لئے چلا گیا۔

وجدان اب اپنے آپ پر عمل طور پر قابو پا چکا تھا۔ پولیس کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھ رہا تھا اور اس کے ذہن سے خوف نکل گیا تھا۔ آوے کھتے بعد انسپکٹر کا ماتحت ایک

بہت بڑا فوٹو اہم لے کر آیا۔  
”ہمارے ریکارڈ میں جی ٹانگ نام کے دو آدمی ہیں۔ ان کی تصویریں بھی موجود ہیں۔“ ماتحت نے کہتے ہوئے اہم اس کے سامنے بیٹھ رکھ دیا۔

جی ٹانگ نام کے وہ دونوں آدمی مختلف جرائم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ ان میں سے ایک پر قتل کا الزام بھی تھا اور ایک سالہ پرائی پولیس رپورٹ کے مطابق وہ ملائیشیا کی طرف فرار ہو گیا تھا۔

وجدان نے ان دونوں کی تصویریں دیکھیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔ ”ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ پورا اہم دیکھو۔ شاید ان میں کوئی ایسا چوہ ہو جسے تم شناخت کر سکو۔“ انسپکٹر جیناگ شو نے کہا۔

وجدان اہم کا ایک ایک ورق پلٹ کر ان پر لگی ہوئی تصویریں کو دیکھنے لگا۔ یہ سب جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ان میں مقامی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ وہ سب کسی نہ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ بعض تو چورے سے بہت شریف اور بھولے بھالے لگتے تھے۔ ایسی تصویریں دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ یہ لوگ بھی کسی جرم میں ملوث ہوں گے۔ بعض چوروں پر بے پناہ شکاکی تھی اور انہیں دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔

”نہیں انکل۔ میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔“ وجدان نے اہم بند کر دیا۔

انسپکٹر جیناگ شو نے اہم اپنے ماتحت کے حوالے کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دوسرا کانسٹیبل وجدان کے لئے کھانا لے آیا۔ وجدان واقعی بھوکا تھا۔ جب وہ جعلی آئی ڈی آفیسر ان کے گھر آیا تھا تو اس وقت تک انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور اس کے بعد تو اس کا تمام وقت بھاگ دوڑ ہی میں گزرا تھا۔ اس کے کتے اپنی جان کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ کھانے کا تو اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ انسپکٹر جیناگ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وجدان کا کیا کرے۔ پر تآب سنگھ اسپتال میں تھا۔ وہ وجدان کو اس کے گھر پر اکلیا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کسی ایسے ذمے دار شخص کا نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا تھا جسے وجدان کا عمار مقرر کیا جائے۔ بلا آخر اس نے وجدان کو اپنے گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”آؤ ٹھیک۔“ وہ کری سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”کمال۔“ وجدان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”گھر۔“ جیناگ شو نے کہا۔ ”تم رات بھر یہاں تو نہیں بیٹھے ہو۔ چلیں تمہیں اپنے گھر چھوڑ دوں۔“  
”مجھے پر تآب سنگھ کے پاس لے چلیں نا۔“ وجدان نے کہا۔

”وہ اسپتال میں ہے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ میں تمہیں اسپتال نہیں لے جا سکتا اور نہ ہی تمہیں پر تآب سنگھ کے مکان پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ آج کی رات میرے گھر رہو۔ کل صبح تمہیں پر تآب سنگھ کے پاس لے چلوں گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔

وجدان بادل ناخوش اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ ہی تھے کہ لیٹل فون کی کھنٹی بجی۔ انسپکٹر جیناگ شو نے پلٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

”لیس۔ انسپکٹر جیناگ شو اسپیکنگ۔“

”پر تآب سنگھ بول رہا ہوں بھائی۔“ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ”میں پوچھ رہا ہوں۔ وجدان کا کوئی پتا چلا۔“

”..... لیس۔ پر تآب سنگھ۔“ انسپکٹر جیناگ شو بولا۔ ”لڑکا مل گیا ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔“

”شکر ہے سوچنے پر کب۔“ پر تآب سنگھ کی آواز سنائی دی۔

”میں نے دو آدمیوں کو اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ وہ ٹھک تو ہے نا؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکرت کرو۔“ جیناگ شو بولا۔ ”وہ بڑے خوفناک حالات سے گزرا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ تم اپنی تسلی کے لئے اس سے مختصر بات کرلو۔ میں اسے اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ کل دن میں تمہاری ملاقات کراؤں گا۔“ اس نے ریسیور وجدان کی طرف بڑھا دیا۔

وجدان کچھ دیر تک پر تآب سنگھ سے بات کرتا رہا پھر اس نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ انسپکٹر نے اس مرتبہ بہت مختصری بات کی پھر ریسیور رکھ دیا اور وجدان کو اشارہ کرتا ہوا ہر گیا۔

دو مسلح کانسٹیبل بھی جیب میں ان کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ انسپکٹر جیناگ شو کی رائٹس آرہڈ روڈ کی دوسری طرف ابراہانڈیل روڈ پر واقع ایک سات منزلہ بلازاک تیسری منزل پر تھی۔ سڑکوں پر اکا دکا گاڑیوں کی آمدورفت تھی۔ ڈرائیونگ انسپکٹر جیناگ شو ہی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر وجدان تھا اور دونوں کانسٹیبل پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

آرہڈ روڈ کراس کر کے انسپکٹر جیب کو کیم ہل روڈ پر لے آیا۔ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد اسے ہیوٹ روڈ پر موڑ دیا۔ اگلے موڑ پر اس نے جیب کو کیم ہل ابراہانڈیل روڈ پر موڑنا چاہا۔ دائیں طرف سے آنے والی ایک تیز رفتار کار بریک کی تیز چرچا امٹ کی آواز کے ساتھ جیب سے چنکر آگے رک گئی۔

انسپکٹر جیناگ شو نے بڑی پھرتی سے بریک پڈل دیا تھا۔

جیب ایک زوردار جھٹکے سے رک گئی۔ وجدان اچھل کر وڈ اسٹریٹ سے نکل آیا اور پھر بعد سے اپنی سیٹ پر گر کر۔ اس کے منہ سے ہلکی سی جھج جھج گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی اچانک جھٹکا لگنے سے لڑکھ گئے تھے۔

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1

آتش فشاں 63 حصہ 1





ڈھیر ہو گیا۔ کار بندوق سے نکل ہوئی گلی کی طرف تیزی سے آگے چلی گئی۔

انسپکٹر چانگ شونچند لمے جھاڑیوں میں دھکا رہا پھر اٹھ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ دو انسانی ہونے سڑک پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر دیوار آتے آتے سمجھا انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ ان دونوں بیویوں میں سے کسی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ انسپکٹر چانگ شو کے منہ سے گمراہی نکل گیا۔ وہ اپنے کانٹیلوں کے نام لے کر پکارنے لگا۔ ایک کانٹیل ٹھٹھکی کر آنا نکل سنبھالے جھاڑیوں میں سے نکل کر دوڑتا ہوا سامنے آگیا مگر دوسرے کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

”شین کہاں ہے؟“ انسپکٹر نے کانٹیل سے پوچھا۔

”جپ سے کودتے ہوئے اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بے ہوش ہے۔ میں نے اسے جھاڑیوں میں کھینچ لیا تھا۔“ کانٹیل نے جواب دیا۔

”تم یہیں روکو۔ میں جپ لے کر آتا ہوں۔“ انسپکٹر نے کہا اور وجدان کو آواز دیتا ہوا جپ کی طرف چل پڑا۔

وہ جپ اشارت کر کے سڑک پر لے آیا لیکن وجدان جھاڑیوں سے نہیں نکلا۔ انسپکٹر نے اسے دو تین مرتبہ پکارا پھر جپ سے اتر کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔

وجدان کو ایک جگہ جھاڑیوں میں بے حس و حرکت دیکھ کر انسپکٹر چانگ شو کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے جھک کر پچلے وجدان کے جسم کو فوٹا پھر اسے اٹھا کر سڑک پر لے آیا۔ جپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے ایک بار پھر وجدان کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ وہ بے پناہ خوف اور دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

”تم انہیں دیکھو۔ میں وائرلیس پر پولیس ماسٹین اطلاع دیتا ہوں۔“ انسپکٹر یہ کہتے ہوئے جپ کے پلس آگیا اور ڈیش بوڈ پر لگے ہوئے ریڈیو کا مائیک اٹھا کر کال نشر کرنے لگا۔

دس منٹ کے اندر اندر وہاں پولیس کی کئی گاڑیاں پہنچ گئی تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس دوران میں کوئی پرائیوٹ گاڑی اس سڑک پر نہیں آئی تھی اور شاید اگر کوئی آئی بھی ہوگی تو فائرنگ کی آواز سن کر گروہی سے کسی اور طرف مڑ گئی ہوگی۔

پولیس کی گاڑیوں کے ساتھ دو ایسولنس گاڑیاں بھی پہنچ گئی تھیں۔ ایک ایسولنس میں بے ہوش وجدان اور کانٹیل کو ڈال دیا گیا اور دوسری ایسولنس میں ان دونوں چیزیں کو۔ ایک چینی کی لاش کیوں سے چھلکی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو ٹکڑا ہوا کار کے پیچھے دوڑا تھا اور کار والے نے فائرنگ کر کے اسے زخمی کر دیا تھا اور دوسرا وہ تھا جو جپ سے ٹکرا کر گر اٹھا اور جپ کا اٹکا پیا اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔

ظاہر ہے، مگر جانے کا اب انسپکٹر چانگ شو کا کوئی پروگرام

نہیں تھا۔ وہ بھی ایسولنس گاڑیوں کے ساتھ ہی اسپتال پہنچا۔ وجدان کو تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش آگیا تھا۔ خوف اس کے چہرے کی رنگت بالکل سفید ہو رہی تھی۔ ایک ہی رات میں پے در پے تین ایسے خوفناک واقعات پیش آئے تھے جنہوں نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ واقعی باہت لڑکا تھا۔ باہر سے گردے والا تھا جو سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ اگر کوئی جوان فوجی ہوتا تو شاید اس کا ہارٹ ٹیل ہو چکا ہوتا۔

وجدان کی طرف سے مطمئن ہو کر انسپکٹر چانگ شو اس کمرے میں آیا جہاں بے ہوش چینی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن ڈاکٹر اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور وہ ہوش میں آئے بغیر ہی دم توڑ گیا۔

وجدان کے ہوش میں آنے کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگایا اور وہ سو گیا تھا۔

اس وقت اسپتال میں درجنوں پولیس والے موجود تھے سکیورٹی کے ان انتظامات سے مطمئن ہو کر انسپکٹر چانگ شو پولیس اسٹیشن آکر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

○●○

وجدان کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا سر جو جھل ہوا تھا اور آنکھوں کے سامنے وحشیانہ چیل ہوئی تھی۔ سر کو ہولے ہولے جھٹکنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے ہلکی کراہی سی خارج ہو رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں۔ نظروں کے سامنے اس وقت بھی وہند پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی پھر ایک وہند میں لپٹا ہوا ایک چوہا اس پر جھک گیا۔ اس چہرے کے نقش واضح نہیں تھے۔ وجدان سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس جگہ کا ہوا حند لاچوک کس کا ہے۔ وہ ایک بار پھر سر کو جھٹکنے دینے لگا۔ اور پھر اسے سب کچھ یاد آنا چلا گیا۔ وہ چنی فانگ اور اس کے ساتھی سے بچ کر بھٹک اڑا تھا۔ اس کی طرف آگیا تھا جہاں داراے سامنا ہو گیا۔ داراے بچ کر نکلا تو انسپکٹر چانگ شو کے ساتھ اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے مسلح چینی فٹنڈوں نے ان کی جپ روک لی تھی۔ اس نے جپ سے چھانک لادی تھی اور جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا اور پھر فضا زبردست فائرنگ سے گونج اٹھی تھی۔ اس وقت اسے اپنا دل بیٹے میں ڈھٹا ہوا محسوس ہوا تھا۔ دماغ غما دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اسے اپنے چاروں طرف ہر چیز کو دیکھنی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کا ذہن تاریکی میں ڈھٹا چلا گیا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو آرام دہ بستر پر پا رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس دوران میں ایک مرتبہ اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔ اس وقت انسپکٹر چانگ شو اس کے پاس موجود تھا اور پھر اسے اپنے بازو میں ہونٹ لپیٹ کر محسوس ہوئی تھی اور اس کے بعد اس کا ذہن ایک بار پھر

تاریکی میں ڈھٹا چلا گیا تھا اور اب اس کے چاروں طرف وحند کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ وحند میں لپٹا ہوا وہ چوہا اب اس پر جھکا ہوا تھا۔

”ایک مانوس اور پیار بھری آواز اس کی ساعت سے کرائی۔“ اب تجھے ہو کا کسے؟“

”ہا۔۔۔“ وجدان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ سر کو ایک بار پھر زور زور سے جھٹکنے دینے لگا۔ آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی وحند پھینکے گئی اور اس نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ وہ پر تاب عظم تھا جو اس کے بچہ کی بی بی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”چاچا۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ اٹھ کر پر تاب عظم سے لپٹ گیا۔

”میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا چڑ۔“ پر تاب عظم نے اسے سینے سے لگا کر سمجھایا۔ اس کی آواز گلوگرت تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”شکر ہے، تو مجھے مل گیا ورنہ میں رب کو کیا منہ دکھاتا۔“ وہ وجدان کی پیشانی پر ہاتھ دینے لگا۔

”چاچا، تم دو رہے ہو؟“ وجدان نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”میں چڑ۔ پر تاب عظم آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”ایسے ہی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔ اب تو کوئی خوشی بھی برداشت نہیں ہوتی نا۔ اچھا اب تو آرام سے لیٹ جا۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ تجھے تیز بخار ہو رہا ہے۔“

پر تاب عظم نے بید کے پیچھے دیوار پر لگا ہوا کال ٹیل کا ٹخن دبا دیا اور اس وقت وجدان نے دیکھا تھا کہ پر تاب عظم پٹنگ سے اٹھ کر کلاخی کے سارے ٹکڑا ہوا دیوار تک گیا تھا۔

”سہاری فانگ کو کیا ہوا چاچا؟“ وجدان نے پوچھا۔

”کچھ نہیں چڑ۔“ پر تاب عظم نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کل رات کو گولی لگی تھی۔ معمولی سا زخم ہے۔ دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ جھنڈے خاموشی رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بھاگ گئے۔ ورنہ حوں رب دی، ایک آٹھ کی گردن مروڑ دیتا۔ مجھے خوشی تو اس بات کی ہے کہ تو مجھے زندہ سلامت واپس مل گیا ہے۔ دو تین دن کی بات ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں تو ان سے بھی نیڑ (منٹ) لوں گا۔“

”چاچا، تمہیں کیا چلا کہ میں یہاں ہوں؟“ وجدان بولا۔

”میں بھی تو اسی اسپتال میں ہوں۔“ پر تاب عظم نے جواب دیا۔ ”جنگ ایک نرس نے بتایا تھا کہ انسپکٹر چانگ شو کچھ لاشوں اور زخمیوں کو لے کر آیا ہے اور ان میں ایک لڑکا بھی شامل ہے۔ اوسے لڑکے کا سر کمری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ نرس کے منع کرنے کے باوجود میں اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آگیا۔ تجھے زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ معمولی بخار ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے پھر ہم نیرلیس گئے ان سے۔“

اسی وقت دروازہ کھلا اور ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے

ساتھ نرس بھی تھی۔

”ہیلو بوائے۔“ ڈاکٹر وجدان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

وجدان کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

نرس نے وجدان کا نمبر پچر لے لیا تو ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے لگا۔

ساتھ ساتھ وہ نرس کو ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔

”تشویش کی کوئی بات نہیں۔“ وہ پر تاب عظم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمکلن اور خوف سے بخار چڑھ گیا ہے۔ ایک دو دن میں اتر جائے گا۔“ اس نے نرس کو کچھ مزید ہدایات دیں اور چلا گیا۔

نرس کچھ دیر کمرے میں رہی پھر وہ بھی چلی گئی۔ پر تاب عظم پھر پٹنگ کی بی بی پر بیٹھ گیا تھا۔

”چاچا۔۔۔ مجھے اس آدمی کا نام یاد آگیا ہے جس نے می کو فوجی بارے تھے۔“ وجدان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے چانگ اٹکل کو بتا دیا تھا۔ اس کا نام چنی فانگ ہے۔ کل رات کو جب میں کار سے اتر کر بھاگا تھا تو وہی میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔“

”چنی فانگ۔۔۔“ نام کچھ سنا ہوا ہے۔“ پر تاب عظم بڑبڑایا۔

”اگر یہ بندہ تھو آجائے تو اس سے دارا کا پتا لگ سکتا ہے۔“

”کل رات دارا نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

وجدان نے کہا اور پھر اسے تمام واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔

”مجھ میں نہیں آتا کہ رب نے تمہیں کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔“ پر تاب عظم گمراہی سے بولے ہوئے بولا۔ وہ کچھ اور بھی کہتا چاہتا تھا کہ انسپکٹر چانگ شو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے وجدان کو دس لیا اور پر تاب عظم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ بوائے بہت بہادر ہے۔ اس نے بہت بہت سے حالات کا مقابلہ کیا۔ کل رات موت اس کے پیچھے لگا رہا اور اس نے بڑی بہادری سے موت کو ٹھکٹ دیا۔“

”آں۔۔۔ یہ واقعی بہت بہادر ہے۔“ پر تاب عظم بولا۔ ”اس نے اس آدمی کو بھی پہچان لیا ہے جس نے اس کی می گئی۔“

”اس نے ہم کو بتایا۔“ چانگ شو نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہمارا پولیس ریکارڈ میں دو چنی فانگ ہے۔ ہم نے اس کو ان کا تصویریں دکھایا۔ وہ چنی فانگ ان میں نہیں ہے۔ یہ کوئی تیسرا چنی فانگ ہے۔“

”رات کو جو دو آدمی مرے ہیں ان کی شناخت نہیں ہو سکی؟“

پر تاب عظم نے پوچھا۔

”میں میں ایک کا شناخت ہو گیا ہے۔ ہم اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رات کو ایک اور نام کا بھی پتا چلا ہے۔ اس کے بارے میں بھی معلوم کر رہے ہیں۔“

”کیا نام ہے وہ؟“ پر تاب عظم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کھ“ چیاگ شونے جواب دیا۔  
 ”کھ“ پر تاب نگہ بڑانے والے انداز میں بولا۔ ”ایک کم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ اس کا ایک چھوٹا سا نائٹ کلب ہے۔ نائٹ کلب کیا ہے؟ جوئے شراب اور طوائفوں کا ڈانچہ۔“  
 ”اس کم کے بارے میں میں بھی جانتا ہوں۔“ چیاگ شو بولا۔ ”میں نے معلوم کیا، وہ پچھلے کئی روز سے غائب ہے۔ میرے آدمی اس کے کلب کا نگہ رانی کر رہا ہے۔“  
 ”اب میں یہ بات دہرے سے کہہ سکتا ہوں کہ چیاگ بھی اسی کلب میں ملے گا۔“ پر تاب نگہ بولا۔  
 ”میں اس کو جلدی تلاش کرے گا۔ ویسے تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔  
 ”وہ کیا؟“ پر تاب نگہ بولا۔  
 ”تمہارا آدمی سوتنگھ اب اچھا ہو رہا ہے۔“ انسپکٹر چیاگ شونے بتایا۔ ”ہم ادھر گیا تھا۔ سوتنگھ کو بھی دیکھا۔ ڈاکٹر نے بھی ملا۔ ڈاکٹر نے ہم کو بتایا کہ اس کی یادداشت بحال ہو رہی ہے۔ تھوڑا تھوڑا بولنے بھی لگا ہے۔ ایک دو روز میں وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 ”شکر ہے رب کا۔“ پر تاب نگہ بولا۔ ”میں آج ہی اسے دیکھنے جاؤں گا۔“  
 ”تم کیسے دو دن ادھر نہیں جانے کا۔“ چیاگ شونے کہا۔  
 ”تمہارا ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہے اور ڈاکٹر لوگ نے بھی منع کیا ہے ایک دو دن تک کوئی آدمی سوتنگھ سے نہیں ملے گا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ چیاگ نے کہا۔ ”پر تاب نگہ گمراہ سانس لیتے ہوئے بولا۔  
 ”ایک دو دن اور انتظار کر لیں گے۔“  
 ”اب میں چلتا ہوں۔“ انسپکٹر چیاگ شونے اٹھتے ہوئے بولا۔  
 ”وجدان کو اب ادھر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اپنا بھی خیال رکھو۔“ انسپکٹر چیاگ شو کے جانے کے بعد پر تاب نگہ وجدان سے باتیں کرنے لگا۔ سوتنگھ دوسرے اسپتال میں تھا۔ پر تاب نگہ تو فوراً ہی اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن انسپکٹر نے اسے منع کر دیا تھا۔  
 تین چار روز گزر گئے۔ پر تاب نگہ کے شب و روز وجدان ہی کے کمرے میں گزر رہے تھے۔ وجدان کا بخار اتر گیا تھا۔ کمزوری باقی تھی۔ اسے اتنی الجھال اسپتال میں رہنے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ یہاں جگہ اس کے لئے محفوظ بھی تھی۔ پر تاب نگہ کی ٹانگ کا زخم بھی بہتر ہو رہا تھا اور وہ سارے کے بغیر آہستہ آہستہ چلنے پھرنے بھی لگا تھا۔

اخبارات میں ان کے بارے میں مسلسل خبریں چھپ رہی تھیں۔ دو دن پہلے سوتنگھ کے بارے میں بھی خبر چھپی تھی کہ اس کی قوت گویائی اور یادداشت لوٹ رہی ہے اور وہ ایک دو روز میں پولیس کو بیان دینے کے قابل ہو جائے گا۔  
 وہ دوسرے دن وقت تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وجدان کو نگہ رہا تھا۔

”لے بھی کاکے“ پر تاب نگہ کمرے سے اٹھتے ہوئے بولا۔  
 تھوڑا آرام کر لو اور میں سوتنگھ کو دیکھ آؤں۔“  
 اسپتال کی عمارت سے باہر آکر پر تاب نگہ ٹیکسی اسٹینڈ طرف بڑھ گیا اور پھر ٹیکسی پر دوسرے اسپتال پہنچنے میں اسٹینڈ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ رہا دار میں تین چار پولیس افسر کھڑے تھے۔ ان میں سے دو پر تاب نگہ کو پہچانتے تھے اس کی کسی لے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سوتنگھ والے کمرے سے چند قدم دور ہی تھا کہ ایک نرس اس کمرے سے نکل کر ہاتھ میں کٹڑی شیب ٹرے تھی جس میں ایک سرنگ، ایک ہینڈ بول، ایک انجکشن کا خالی امپھیول رکھا ہوا تھا۔ وہ نرس پر تاب نگہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔  
 ”ہیلو۔“ پر تاب نگہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا راز؟“  
 ”اچھا ہے۔“ نرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وقت سو رہا ہے۔ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“  
 ”پاکل ڈسٹرب نہیں کروں گا۔“ پر تاب نگہ نے جواب دیا۔  
 دو دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے کانشیل نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ پر تاب نگہ دو دروازے کھول کر داخل ہو گیا۔  
 سوتنگھ دوسری طرف کمرے کے سامنے کھڑے ہوئے۔ پر تاب نگہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ نرس نے اگرچہ اسے منع کیا تھا کہ مریض ڈسٹرب نہ کیا جائے مگر پر تاب نگہ اس سے بات کے بغیر بے ہوش ہو گیا تھا۔  
 ”سوتنگھ۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”سوتنگھ۔“ انھوں نے دیکھو میں آیا ہوں۔ پر تاب نگہ۔“  
 اس نے تین چار مرتبہ پکارا لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ پر تاب نگہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلایا۔ اس کے بازو کے دباؤ سے سوتنگھ سیدھا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی پر تاب نگہ کا دل الجھل کر قلع میں گیا۔  
 سوتنگھ کی ٹانگ اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔  
 اسپتال میں ایک ہنگامہ مچا دیا گیا۔ یہ اکتشاف بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ سوتنگھ کو پوائزن انجیکٹ کیا گیا تھا جس سے فوری طور پر اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

اس نرس کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ پر تاب نگہ نے کمرے سے نکلے ہوئے دیکھا تھا۔ پر تاب نگہ اور کمرے کے دروازے؛ متعین پولیس کانشیل نے نرس کا جو حلیہ بتایا تھا، پورے اسپتال میں اس ملے کی کوئی نرس نہیں تھی۔ لہذا قہرے کے نقوش بد ہندوستانی رنگ نمایاں تھا۔ ہر تلی جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور نیچے ہونٹ کے دائیں کونے پر سیاہ رنگ کا مسور کے دانے کے برابر

”ن۔“ پر تاب نگہ نے جب اسے دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ یہ دوغلی نسل کی ہے۔ ہو سکتا ہے ماں چینی اور باپ ہندوستانی ہو۔  
 انسپکٹر چیاگ شو کا نہیں تھا لیکن چونکہ سوتنگھ اس کے ایک ٹیکس کا اہم کردار تھا اس لئے اطلاع یا کردہ بھی ہوا تھا جبکہ انکو اتنی مقامی پولیس آفیسری کر رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود اسپتال کی تمام نرسوں کو جمع کر لیا گیا۔ پر تاب نگہ اور پولیس کانشیل ایک ایک نرس کو غور سے دیکھتے رہے لیکن وہ نرس ان میں نہیں تھی جسے پر تاب نگہ نے کمرے سے نکلے ہوئے دیکھا تھا۔ پہلے سے سوچا گیا تھا کہ شاید ڈیوٹی نرس نے سوتنگھ کو غلط انجکشن لگا دیا تھا لیکن اس نئی صورت حال سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا۔ سوتنگھ ایک ٹیکس کا اہم گواہ تھا۔ جب تک اس کی یادداشت اور قوت گویائی سلب نہ رہی، وہ محفوظ رہا تاہم اخبارات میں یہ خبر چھپنے کے بعد کہ اس کی قوت گویائی اور یادداشت واپس لوٹ رہی ہے اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ پولیس کی موجودگی میں سوتنگھ پر حملہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسے راستے سے ہٹانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس کے لئے کسی ایسی لڑائی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو تہیت یافتہ نرس تھی کیونکہ انجکشن نرس میں لگایا جاتا تھا اور نرس میں انجکشن لگانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی اور یہ کام بڑے اطمینان سے کیا گیا تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ پلاننگ کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ پہلے ہی سے دیکھ لیا گیا تھا کہ ڈاکٹر کس وقت وڈٹ پر آتا ہے اور نرس کس وقت مریض کو دیکھنے آتی ہے۔

پولیس کو مشن کے باوجود اس نرس کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ وہ لڑی جو کوئی بھی تھی اسے اپنا کام کر کے اسپتال سے نکلنے کے لئے کافی وقت لے گیا تھا۔  
 اس روز پر تاب نگہ کی حالت دینی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی کی لاش اٹھائی تھی اور وہ اس کا ذمہ دار وہ صرف اور صرف دارا کو سمجھتا تھا۔ کاش! وہ دارا کا سراغ پاسکتا لیکن دارا بھی کئی گویاں نہیں کھلا تھا۔ وہ خود ہی پردہ کر رہی تھی۔ سب کچھ کر رہا تھا۔ اس کے پاس غالباً پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس نے مقامی غفلت کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور وہ مذہب پر پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ اب تک کسی قتل ہو چکے تھے۔ وہ ہندو ہے۔ پر تاب نگہ کے سامنے جانے تھے اور پر تاب نگہ جانتا تھا کہ یہ کھیل اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک دارا وجدان کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیتا۔ وجدان ہی وہ واحد ہستی تھی جو دارا کو پہچانتا تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد دارا اطمینان سے اپنے دوسرے کام کرتا رہے گا لیکن پر تاب نگہ نے بھی ملے کر لیا تھا کہ وہ دارا کے آدمیوں کو

کبھی بھی وجدان تک نہیں پہنچے دے گا۔ اسے حیرت تو اس بات پر تھی کہ پولیس اب تک دارا کا سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ پولیس ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ پر تاب نگہ جانتا تھا کہ پولیس محظموں کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن بد قسمتی سے اس انجی ہوئی ڈور کا کوئی سراہا نہیں آ رہا تھا۔  
 دوسرے اسپتال میں سوتنگھ کے قتل کے بعد اس اسپتال میں سکونتی بڑھا دی گئی تھی جہاں وجدان زیر علاج تھا۔ وجدان اگرچہ اب ٹھیک ہو چکا تھا مگر ایک منصوبے کے تحت اسے اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ وہ اتنی الجھال یہاں زیادہ محفوظ ہے۔ پولیس کو یقینی سے ہدایت کردی گئی تھی کہ کسی غیر متعلق شخص کو اس راہدار میں بھی داخل نہ ہونے دیں جہاں وجدان والا کمرہ تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کے بارے میں بھی یقینی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی۔ وجدان کو دیکھنے کے لئے اب صرف ان دو ڈاکٹروں اور دو نرسوں کو آنے کی اجازت تھی جنہوں نے شروع میں وجدان کو انڈیا کیا تھا۔ کسی دوسرے ڈاکٹر یا نرس کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔  
 پر تاب نگہ بھی اسی کے کمرے میں تھا۔ وہ اپنی ٹانگ کا زخم چیک کرانے کے لئے دن میں ایک بار اپنے متعلقہ ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا اور پھر وجدان کے کمرے میں آ جاتا۔  
 وجدان کو پر تاب نگہ کی وجہ سے بڑا حوصلہ تھا۔ ماں باپ کے قتل کے بعد اگر پر تاب نگہ جیسا ہمدرد اور غم گسار شخص نہ ہوتا تو نہ جانے اس کا انجام کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ ”دل پاور“ بھی تھی جو اسے سارا دیے ہوئے تھی اور دراصل یہ اس کی قوت ارادی ہی تھی جس سے وہ ایسے سنگین حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ بے در ہے کا ظاہر نہ تھیں کہ بعد اس کا صحیح العلاج رہتا بھی ایک مجروح ہی تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ اس عمر میں مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود خوف کے سامنے بھی اسے ٹھہرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو اس پر اس قدر بے زاری طاری ہوتی کہ اپنے ہی بال بونچ لینے کو دل چاہنے لگتا تھا۔  
 اس اسپتال میں اسے دس دن ہو چکے تھے۔ اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ بہترین خوراک اور دیکھ بھال سے اس کی کمزوری بھی بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ باہر نکلے، گھومے پھرے، اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلے لیکن وہ تو ایک سی کمرے میں محصور ہو کر رہا گیا تھا۔ زیادہ وقت پر تاب نگہ سے باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ پر تاب نگہ نے ہوتا تو نرس آجاتی جو دیر تک اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔  
 اس روز وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ پر تاب نگہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کہیں گیا تھا۔ اس کے بعد نرس آنی تھی اور تھوڑی دیر کمرے میں رہنے کے بعد چلی گئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے کام سے

فارغ ہوتے ہی واپس آجائے گی۔

وجدان بینہ سے اتر کر کھڑکی کے سامنے آگیا۔ دھوپ کی وجہ سے کھڑکی پر پڑنے لگا ہوا پردہ ہٹ گیا تھا۔ اس نے پردہ ایک طرف ہٹا دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ یہ کمرائٹ کی چوٹی منزل پر امن گیت کے رخ پر تھا۔ یہاں سے نہ صرف اسپتال میں آنے جانے والے لوگ بلکہ سامنے والی سڑک کا منظر بھی نظر آتا تھا۔ سڑک کی دوسری طرف بلند عمارتیں تھیں۔

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وجدان کو کھڑکی میں کھڑے ہوئے تقریباً پردہ منٹ ہو چکے تھے۔ اس کی نظریں اسپتال کے گیٹ کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک ٹیکسی پر جمی ہوئی تھیں جو چند سیکنڈ پہلے ہی وہاں آکر رکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ٹیکسی کا دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ایک دروازہ قامت آدمی نیچے اترتا۔ اس نے سفید پینٹ اور نیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ آدمی آتھن کی تھی اور اس کے ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو گردن میں پڑی ہوئی سلنگ میں لٹکا ہوا تھا۔

ٹیکسی آگے نکل گئی۔ وہ شخص جیسے ہی اس طرف مڑا وجدان اس کا چہرہ دیکھ کر اچھل پڑا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو جلی سی آئی ڈی آفیسر بن کر پرتاب سنگھ کے کمرے میں آیا تھا اور ان دونوں کو ہسپتال کی زد پر وہاں سے لے گیا تھا اور وجدان نے اس کے بازو پر دانٹوں سے کاٹ لیا تھا اور تقریباً بازو کے اسی ڈھم پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ شخص سڑک پار کر کے اسپتال کے گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ وہ شخص جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوا وجدان کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا اور دروازے کی طرف لپک لپک ٹھیک اسی وقت نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ وجدان اس سے ٹکرایا۔ وہ دونوں دھڑام سے نیچے گرے۔ نرس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وجدان اٹھ کر پھر دروازے کی طرف دوڑا۔

”اے کیا ہوا۔ کہاں بھاگ رہے ہو؟ رک جاؤ۔“ نرس مینڈرن زبان (ایسی چینی زبان جو تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے میں بولی جاتی ہو۔ اسے مینڈرن ”MANDARIN“ کہتے ہیں جسے گھنٹریا ملی بولی بولنے والی نسلیاتی اروو زبان) میں چینی اور اس کے پیچھے لپکی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلی تو رابدری میں کھڑا ہوا کانسٹیبل حیرت سے وجدان کی طرف دیکھ رہا تھا جو رابدری میں ایک طرف دوڑا جا رہا تھا پھر اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ معاملہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”میری طرف لپک دیکھ رہے ہو؟“ نرس اس مرتبہ بھی مینڈرن زبان میں چینی۔ ”اسے روکو۔ وہ کہاں جا رہا ہے۔“ کانسٹیبل جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے چیخ کر رابدری کے اگلے موڑ پر کھڑے ہوئے دو کانسٹیبل کو حکم دیا کہ وہ اس لڑکے کو

کھڑکیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود بھی اس طرف دوڑ پڑا۔

رابدری کے موڑ پر کھڑے ہوئے دونوں کانسٹیبل وجدان کو پکڑ لیا۔

”چھوڑ دیجئے۔“ وجدان اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بچا۔ ”میں مجھے قتل کرنے کی کوشش کی؟ میں اسے پکڑنے جا رہا ہوں۔“

چند قدم دور کھڑا ہوا سادہ لباس میں چھوٹے رنگ اور پولیس آفیسر تیزی سے ان کے قریب آگیا۔ اس کے بازو وجدان نے اسے تھام لیا کہ جس شخص نے اسے پرتاب سنگھ ساتھ اغوا کیا تھا وہ ابھی ابھی اسپتال میں داخل ہوا ہے۔

سادہ لباس پولیس آفیسر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ روز جلی اس لڑکے پر ایک ہی رات میں تین مرتبہ کاغذ ہونچکا تھا۔ دشمنوں سے بچانے کے لئے اس کے لئے حفاظت انتظامات اس طرح کئے گئے تھے کہ اس وقت بھی اسپتال میں کم ایک درجن پولیس والے موجود تھے۔ کچھ یونیفارم میں اور سادہ لباس میں۔ اس لڑکے نے اس شخص کو دیکھ لیا تھا جس نے روز پہلے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ اس سے بچنے کے بجائے اسے پکڑنے کے لئے دوڑا جا رہا تھا۔ ”تم اس شخص کا جلد پتا کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہم اسے لیں گے۔“ سادہ لباس آفیسر نے کہا۔

”تم لوگ اسے نہیں پہچان سکو۔ وہ بھاگ جائے گا۔ ساتھ چلنا ہوں۔“ وجدان نے کہا۔

سادہ لباس آفیسر کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی اور پھر نے اپنے طور پر قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آہستہ موجود دو تین سادہ لباس پولیس والوں کو اشارہ کیا اور وہ وجدان ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے لفٹ کی طرف چل پڑے۔

انہیں نیچے بیچنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وجدان لفٹ سے نکلے ہی اسپتال کی فرنٹ لابی کی طرف بھاگا۔ لباس پولیس والے اس کے پیچھے ہی تھے۔ وجدان ایک جگہ رک کر تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”وہ جگہ کہاں ہے جہاں زخموں پر ڈرنسنگ کی جاتی ہے؟“ لے سادہ لباس آفیسر سے پوچھا۔ ”اس کا بازو زخمی ہے اور وہ یہاں بیٹھ لگوانے آیا ہے۔ وہ اسی طرف گیا ہو گا۔“

”اس طرف آؤ۔“ سادہ لباس آفیسر نے کہا اور وہ لپکے ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

اس طرف بھی ایک بہت کشادہ لابی تھی۔ جہاں مگر فاصلوں پر لوگوں کے بیٹھنے کے لئے صوفے نما میٹھیں بیٹھتی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے گولے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف دروازے کا بہت لمبا چوڑا کاونٹر تھا جہاں لوگوں کی رہنمائی کے لئے پانچ اینڈز میں موجود تھیں۔ کاونٹر پر ٹیلی فون سیٹ بھی رکھے

تھے اور پچھلی دروازے پر مختلف چارٹس لگے ہوئے تھے۔ کاونٹر کے سامنے بھی کچھ لوگ کھڑے تھے اور ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کا بازو زخمی سلنگ میں لٹکا ہوا تھا۔ وہ ایک اینڈز سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

”وہاں۔“ وجدان اس کی طرف اشارہ کر کے بچتا۔ سادہ لباس والوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وجدان کے ساتھ آنے والے آفیسر نے ہسپتال نکال لیا اور تیزی سے اس آدمی کی طرف لپک لپک وجدان نے کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھائی تھی۔ وہ آفیسر سے پہلے ہی دوڑنا ہوا کاونٹر کے قریب پہنچ گیا اور اس شخص کے زخمی بازو کو گرفت میں لے کر بیٹھنے لگا۔

”پکڑو۔ پکڑو۔ پکڑو۔“ بکڑوا رہا۔ ”قاتل ہے۔“ وجدان کی یہ حرکت واقعی پکڑنا تھی یا پھر اس کے اندر اچانک آیا بچا۔ ابھر آیا تھا جس سے اس کے دل دوام ہے ہر قسم کا خوف مٹ گیا تھا۔

وہ شخص بری طرح بدحواس ہو گیا اور جب اس نے وجدان کو دیکھا تو اس کا چہرہ دھماکا ہو گیا۔ وجدان اس کے زخمی بازو کو جھٹکے دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے لیکن زیادہ تکلیف دہات یہ تھی کہ وجدان کے شوہر جانے پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس نے ان دو سادہ لباس پولیس والوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو ہسپتال تالے تیزی سے اس کی طرف آ رہے تھے۔

اس شخص نے بڑی پھرتی سے تندرست ہاتھ اپنی جیب میں ڈال کر ہسپتال نکال لیا اور وہ آئی فائر کر دیا۔

گولی کی آواز کو سمجھنے ہی لابی میں ہنگامہ مچ گئی۔ اینڈز لڑکیاں چیخیں ہوئی کاونٹر کے پیچھے چھپ گئیں۔ لابی میں موجود لوگ بھی بیٹھنے ہوئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ دائیں طرف سے ایک وارڈ بوائے ایک اسٹریچر لڑائی کو دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔ اسٹریچر پر ہوا مریض بے ہوش تھا۔ وارڈ بوائے لڑائی چھوڑ کر چیخا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وجدان اب بھی اس شخص کے زخمی بازو کو جھٹکے دیتے ہوئے بیٹھ رہا تھا۔ اس شخص نے ایک اور ہوائی فائر کر دیا اور اپنا بازو چھڑا کر وجدان کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن ٹھیک اسی لمحے وہ لڑائی اس سے ٹکرائی۔ وہ کراہے ہوئے لٹکڑا کر گر اور اس کے پہلے کمرہ سے نکل سکا۔ تین سادہ لباس پولیس والے اس کے سر پر چھینچے تھے۔ ان تینوں نے اسے ہسپتالوں کی زد پر لے لیا۔

وہ شخص پچھلے فرش پر پشت کے بل پڑا تھا۔ ہاتھ میں ہسپتال ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ایک گولی چلائی تو ان گنت گولیاں اس کے جسم میں بوست ہو جائیں گی۔ اس نے ہسپتال ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ دو پولیس والوں نے بڑی پھرتی سے اسے گرفت میں لے لیا اور تیسرا

وجدان کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً کھینچتا ہوا وہاں سے نکال لے گیا۔ اس کے دو گھنٹے بعد انسپکٹر چیانگ شو اسپتال میں وجدان والے کمرے میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پر تاب سنگھ بھی آگیا تھا۔ پر تاب سنگھ یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آگیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

”یہ واقعی شہر دا پتر ہے۔“ وہ وجدان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ”جو کام پولیس نہیں کر سکی وہ اس نے کر دکھایا۔“

”یہ شہر دا پتر اگر اس کی گولی کا نشانہ بن جاتا تو تم سارا الزام پولیس پر رکھ دیتے۔“ انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔ ”ہم اس کی جان کی حفاظت کے لئے پریشان ہیں اور یہ قاتلوں کے پیچھے دوڑنا پھرنا ہے۔ کوئی بڑا بھڑکی ہو تا تو اتنا بڑا رسک کبھی نہیں لیتا۔“

”یہ بچہ ہے مگر ڈر پوک اور بزدل نہیں۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔ ”میں اسے سمجھا دوں گا کہ آئندہ اس طرح اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ ہر حال اس آدمی سے کچھ معلوم ہوا؟“

”وہ کم کے لئے کام کرتا ہے۔“ انسپکٹر نے بتایا۔ ”یہ وہی کم ہے جس کے بارے میں تمہیں اور مجھے پہلے ہی سے شبہ ہے۔ اب ہم بہت جلد کم کے خلاف کارروائی کرنے والے ہیں۔“

”اس بے وقوف کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وجدان کی حفاظت کے لئے سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ کیا اسے اپنی جان پیاری نہیں تھی کہ یہاں چلا آئے۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔

”وہ وجدان کے پیچھے یہاں نہیں آیا تھا۔ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ وجدان کو یہاں رکھا گیا ہے۔“ انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔ ”اس کی بیوی اس اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ ڈیوڑی ہوئے والی ہے۔ کیس کچھ پیچیدہ ہے۔ ڈاکٹر نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔

وہ کاونٹر پر ڈاکٹر کے بارے میں ہی دریافت کر رہا تھا کہ وجدان آکر اس سے لپٹ گیا۔ یہ تو شکر کابات ہے کہ اس نے گولی وجدان پر نہیں چلائی تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اسپتال میں وجدان کی سکیورٹی بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اسے زیادہ دن یہاں بھی رکھا نہیں جاسکتا۔ ویسے میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔“

”وہ کیا؟“ پر تاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم اس کو چند روز کے لئے لازارس آئی لینڈ پر لے جاؤ۔ وہ جگہ اس کے لئے زیادہ محفوظ ہے۔ ہمارا دو آدمی تمہارا ساتھ جائے گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”لازارس آئی لینڈ۔“ پر تاب سنگھ بڑبڑایا۔ سنگ پور ستان چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ملک ہے۔ زیادہ تر جزائر غیر آباد ہیں اور وہاں گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ قابل ذکر جزائر میں سنٹوشاہ الینس کی جان اور کو سو ہیں۔ سنٹوشاب سے زیادہ قریب اور سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ سنگ پور کی سب سے



گا لیکن وہ کم سن لڑکا تو اس کے لئے لوہے کا چننا ثابت ہو رہا تھا۔ کم محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ غیر محسوس انداز میں ایک خوف ناک دلدل میں دھنستا جا رہا ہو۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہ کی تو یہ دلدل اسے نگل جائے گی اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

اس نے بڑی محنت سے وہ نائٹ کلب بنایا تھا لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ لڑکا ہاتھ نہ لگا تو یہ نائٹ کلب بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ سڑکوں پر بھیک مانگنا ہوا نظر آئے گا۔ وہ اپنا یہ انجام سوچ کر ہی کاٹا اٹھا تھا۔

ان ہنگاموں میں اب تک اس کے تین چار آدمی مارے جا چکے تھے اور کوئی نیا آدمی اس کے لئے کام کرنے کو تیار نہیں تھا اور جو کام کرنے کو تیار تھے وہ چار گنا زیادہ معاوضہ مانگ رہے تھے اور کم کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔

فون پر اپنے آدمی سے بات کے ہوئے اوجھا دھنسا ہو چکا تھا۔ اس دوران میں وہ یہ بھی اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وجدان کو کہاں سے لایا گیا ہو گا لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں مائے فانگ کا خیال آ گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور مائے فانگ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال ریسیور ہونے میں پورا ایک منٹ لگا تھا۔

”فانگ کہاں تھیں تم؟ کال ریسیور کرنے میں اتنی دیر؟“ کم نے ریسیور پر بیلوکی آواز سننے ہی کہا۔

”میں سو رہی تھی۔“ فانگ کی خوابیدہ سی آواز سنائی دی۔  
”تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“ کم نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

”میں تمہیں یہ بتانے کی مانند نہیں ہوں کہ میرے پاس اور کون ہے۔“ فانگ نے بھی خشک سیے میں جواب دیا۔

”جو کوئی بھی ہے اسے جلد سے جلد رخصت کر کے میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے اور مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ کم نے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”دیکھو فانگ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ اگر تمہیں میرا لہجہ برا لگا ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ تم صورت حال کا اندازہ لگا سکتی ہو اور۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔“

کم کچھ کنا چاہتا تھا مگر اس کی گت نہ تھی۔ اس نے بھی ریسیور ختم کر دیا اور دانت کچا کچا لے لگا۔ فانگ اسی کے ٹکڑوں پر چلتی رہی تھی اور اب وہ بھی اس لہجے میں بات کرنے لگی تھی کہ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر بیچن میں گیا اور اپنے لیے کالی بنانے لگا۔ صبح ہی صبح اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

وہ برآمدے میں بیٹھا کافی کی چمکیاں لیتا رہا اور صورت ہوا غور کرتا رہا۔ صورت حال سنگین سے سنگین تر ہو رہی تھی لیکن اس سے بیخود آزما ہونے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ بار بار ریگٹ کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ فانگ نے ایک بار کہا تھا اور اب دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ بالا خرہ وہ اندھ کر کرے گا اور فون کا ریسیور اٹھا کر فانگ کا نمبر مانے لگا۔ دوسری طرف سے بجتی رہی لیکن کال ریسیور نہیں کی گئی جس کا مطلب تھا کہ کال پر نہیں تھی۔ اس نے ریسیور ختم کر دیا اور ایک بار پھر برآمدے پر کمرے پر بیٹھ گیا۔

کم کی یہ نئی پناہ گاہ ایک خوبصورت کینج تھی جو کم اندازہ ذرا بہت کرواق تھی۔ اس علاقے میں ایک دوسرے سے فائز اسی قسم کے خوبصورت کینج بنے ہوئے تھے۔ کینج کے گرد پڑ وسیع لان تھا۔ گیٹ برآمدے سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر پودوں کی اونچی باغی ہوئی تھی۔ پام کے علاوہ بھی دوسرے شاخوں والے درختوں کی بہتات تھی۔ کھلی جگہ پر بیٹھے ہوئے کم کو یہ اطمینان تھا کہ اسے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ مائے فانگ تین گھنٹے بعد آئی تھی۔ اس نے اپنی کار پارک کر دی اور گیٹ میں داخل ہو کر بڑے اطمینان سے کچلے اندر آئی تھی۔

”تم دو گھنٹے لیٹ ہو۔“ کم نے اپنی اندرونی کیفیت پر قافیا کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری پابند تو نہیں ہوں مسٹر کم۔“ فانگ نے خشک سے جواب دیا۔ کم کا خون کھول اٹھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے پر قابو پا سکا تھا۔

”ہاں۔ تم میری پابند تو نہیں ہو لیکن میں نے سوچا کہ تمہیں کچھ رقم کی ضرورت ہو۔ یہ معمولی سا کام میں کسی اور بھی لے سکتا تھا لیکن ظاہر ہے تمہارے پرانے تعلقات تمہارے لئے سب سے پہلے مجھے تمہارا ہی خیال آیا تھا۔“ وہ اندر آ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ ”کم کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔

”کچھ چیو گی؟“ کم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں۔“ فانگ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”گزشہ رات تو لی کہ ابھی کینے میں جلن ہو رہی ہے۔ تم مطلب کی بات نہ کر کے لے بلایا ہے مجھے؟“

”تم اچھی طرح جانتی ہو میں آج کل کس ابھیں میں ہوں کم کہنے لگا۔ ”وہ لڑکا کم بہت میرے لئے عذاب بن گیا ہے۔ مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔ جب تک اس کا قصہ تمام نہیں ہوگا میں اپنے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کل تک وہ اسپتال میں تھا لیکن گزشہ رات وہ پراسرار طور پر

ہو گیا۔“ فانگ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اسے نہایت خفیہ طور پر کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی علم نہیں ہے کہ اسے کس وقت وہاں سے لے جایا گیا تھا۔ میرا ایک دوست اسپتال میں موجود ہے لیکن اسے بھی پتا نہیں چل سکا کہ اس کے کس وقت وہاں سے نکالا گیا تھا۔“

”مجھے یہ کیا چاہیے ہو؟“ فانگ نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کے کو تلاش کرو۔“ کم نے کہا اور الماری میں سے کئی فونوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینک دی۔ ”یہ پانچ ہزار ڈالر ہیں۔ ان کے ٹھکانے کا سراغ لگالو تو اتنی ہی رقم اور دل گا۔“

”میں آج کل بہت سنجوس ہو گئے ہوں۔“ فانگ نے یہ کہتے ہوئے فونوں کی گڈی اٹھالی۔ ”پر آپ سمجھ کے ایک آدمی کو ٹھکانے لگانے کا معاوضہ بھی تم نے صرف پانچ ہزاری ہی دیا تھا حالانکہ وہ کم سے کم پچاس ہزار ڈالر کا کام تھا۔“

”میں نہیں کر سکتی۔“ کم نے کہا۔ ”لیکن ایک بات شاید تمہارے ذہن میں نہیں آئی۔“ فانگ نے کہا۔ ”جب میں پر آپ سمجھ کے آدمی کو پانچ ہزار ڈالر کی بجائے ایک لاکھ دے کر اس کے بعد کمرے سے نکل رہی تھی تو پر آپ سمجھ بھی وہاں آیا تھا۔ اس نے رک کر مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے میرا چہرہ اچھی طرح دیکھا تھا۔ اگر اس نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا تو۔۔۔؟“

”اس دن سے تم آواز نہ سناؤ۔“ کم نے جواب دیا۔ ”میں ابھی تک کسی نے شناخت نہیں کیا۔“ کم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اس روز تم ہمیں سے تیار ہو کر گئی تھیں۔ تمہارے نیچے ہونٹ کے دائیں کونے پر ایک تھک تھا۔ تمہارے بال گولڈن تھے اور اس وقت تم نیچاٹار میں تھیں۔ تمہارے زرد والے مٹلے اور اس مٹلے میں بڑا فرق ہے۔ تمہیں شناخت کرنا آسان نہیں ہو گا اور پھر تمہیں پر آپ سمجھ کے قریب تو نہیں جانا۔ صرف ان کا ٹھکانا معلوم کرنا ہے۔ دور رہ کر۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔“ فانگ گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ کام اگرچہ بہت خطرناک سا مشکل ہے لیکن تمہارے لئے یہ بھی سہی۔“ ”اگر تم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئیں تو مالا مال کروں گا تمہیں۔“ کم نے جواب دیا۔

مائے فانگ کے جانے کے بعد کم نے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور اپنے ایک آدمی کا نمبر لکرا کر اسے فانگ کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

”میرا خیال ہے وہ میاں سے سیدھی اپنے فلیٹ پر جائے

گی۔“ کم کہہ رہا تھا۔ ”تم نے دور رہ کر اس کی نگرانی کرنی ہے۔ اسے ایک لمحے کو بھی تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اسے یہ بھی سمجھ دینا کہ اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ مائے فانگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب اچھے دن تھے تو وہ پالتو کتیا کی طرح اس کے قدموں پر لوٹا کرتی تھی اور اب وہ نہ صرف برابری پر اتر آئی تھی بلکہ اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھنے لگی تھی۔

وہ دن گزر گیا اور پھر دوسرا دن زیادہ بے چینی میں گزرا تھا۔ اس دوران میں اس نے تو مائے فانگ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ تھی اور نہ ہی اس کی نگرانی کرنے والے آدمی کی طرف سے۔ اس روز شام کو اس نے جی فانگ کے ٹھکانے پر فون کے ذریعے اس سے رابطہ کیا۔

”صورت حال بہت سنگین ہے مسٹر کم۔“ جی فانگ نے بتایا۔ ”پولیس نے شوق سے سب کچھ اگلو لایا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بتادیے ہیں بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ لوگ تمہارے لئے کام کر رہے ہیں۔ پولیس نے ایک آدمی کو عرب اسٹریٹ کے علاقے سے گرفتار کر لیا ہے اور تمہارے نائٹ کلب کی بڑی سخت نگرانی کی جارہی ہے۔ سی آئی ڈی کے کم از کم تین آدمی ہماری نظروں میں آچکے ہیں اس لیے تم نائٹ کلب کی طرف جانے کا خیال بھی ذہن میں مت لانا۔“

”اور دارا کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ کم نے دریافت کیا۔

”وہ بھی تمہاری تلاش میں ہے۔“ جی فانگ نے بتایا۔ ”اسے بھی پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے کلب کی نگرانی ہو رہی ہے اور تمہارے لئے ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ مسٹر دارا البرٹ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ البرٹ آج کل سنگاپور میں نہیں ہے۔ وہ کوالالمپور گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی تقریباً ایک ہفتے بعد ہوگی۔ اگر ہم اس کے واپس آنے سے پہلے اس کے لئے کو ٹھکانے لگا دیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر سب کچھ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور ہمارے کھاتے میں وہ سنگین جرائمزدہ جاعین گے جو ہمیں پھانسی کے تختے پر پھانسی دیں گے۔“

”یہ دارا میری توقع سے زیادہ چالاک نکلا۔“ کم نے کہا۔ ”خود صرف ایک مرتبہ سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل پس منظر میں ہے۔ اس نے ہمیں آگے کر رکھا ہے لیکن پچ کر وہ بھی نہیں جائے گا۔ بہر حال، البرٹ کی عدم موجودگی سے ہمیں کچھ اور مصلحت مل گئی ہے۔ اب ہمیں ہر صورت میں وجدان کو تلاش کر کے ٹھکانے لگانا ہے اور تمہاری اہمال ذرا غماز رہنا۔“

”میری فکرت کو مسٹر کم۔“ جی فانگ نے جواب دیا۔ ”میں بالکل محفوظ جگہ پر ہوں۔ نہ صرف محفوظ ہوں بلکہ صورت حال پر بھی نگاہ رکھ رہے ہوں۔“

”میری حفاظت کے لیے! میری عمرانی کر کے وہ میری سرگرمیوں پر نگاہ رکھ سکے تاکہ اگر میں اس لڑکے کا سراغ لگاؤں تو مجھے دودھ میں سے کبھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے؟“ قانگ

”یہ سوچنا اب تمہارا کام ہے کہ انہیں تلاش کس اور

دیکھتے ہوئے بول۔  
”میرے گھدے کس کے لئے بنا رہے ہو؟“ وہ وجدان کی طرف

”ہاں واقعی بہت اچھا لگ رہا ہے اور یہ جگہ تو بہت ہی اچھی ہے۔“ پرآب گنگہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ جگہ قدرے بلندی پر تھی اور بائیں طرف ساحل کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔ ساحل پر چند ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ”آج مجھے ایک بات کا خیال آیا ہے۔“ پرآب گنگہ نے دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تکلیف نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور تمہاری ٹریننگ شروع کر دی جائے۔“



طرف دیکھا۔  
 "مارشل آرٹ کی ٹریننگ" پر تاب عکھ بولا۔ "مارشل  
 آرٹ ایک ایسا فن ہے جس سے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی دشمن  
 کو زیر کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ہمیں ایک مرتبہ بتایا تھا کہ میں  
 خود بھی بلک بیلٹ ہوں اور ایک موقع پر میں نے تمہاری ٹریننگ  
 شروع بھی کی تھی لیکن ہمیں یہ پروگرام اور چھوڑنا پڑا تھا اور  
 اب موقع ہے کہ اس پروگرام پر دوبارہ عمل شروع کر دیا جائے۔"  
 "لیکن چاہا۔ تمہاری تو اپنی ٹانگ زخمی ہے۔ تم مجھے ٹریننگ  
 کیسے دو گے؟" وہ جان -

”میری ٹانگ اب ٹھیک ہے اور تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔ تمہاری جو آنتی ہے نا۔“ اس نے حارہ کاشی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔ سیکنڈ ڈان ہے یہ۔ اس کی موجودگی سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو۔“

”کیا واقعی؟“ وجہ ان نے مڑ کر حامہ کاشی کی طرف دیکھا۔  
حامہ کاشی نے منکرا تے ہوئے انہات میں سر ہلادیا۔ وہ پولیس  
میں تھی اور جرائڈ پشہ لوگوں سے منٹنے کے لئے پولیس والوں کو بھی  
خاص طور پر مارشل آرٹ کی تربیت دی جاتی تھی۔

”ٹھیک ہے چاچا۔“ وجدان بولا۔ ”لیکن آج میرا موڈ تباہ لکل نہیں ہو رہا۔ کیونکہ اس پروگرام پر کل عمل شروع کیا جائے۔ میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لوں گا۔“

”وہ ان ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ حارہ کاشی نے کہا۔ ”ہم فی ج سویرے اس پروگرام پر عمل شروع کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، بھئی۔“ پر تاب سنگھ کہتے ہوئے حارہ کاشی کے قریب ایک پتھر بیٹھ گیا۔

وہ دیکھ کر ہنس پڑا۔ اس نے گلدستہ مکمل کر کے پرتاب سنگھ کو دے دیا اور مزید بھول توڑنے لگا۔

اُجانا۔ ”پر اب سٹک لیتے ہوئے کالج کی طرف چل پڑا۔  
تھوڑی دیر بعد وجدان بھی حارہ کاشی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔  
حارہ کاشی چند لمحے اوہر اوہر دیکھتی رہی پھر وجدان کی طرف دیکھنے  
ہوئے بولی۔

”تم پاکستان میں اپنے فادر کے دشمنوں کے بارے میں کیا بتا رہے تھے۔ یہ بات شاید پانچ کوڑ کے سونے کی ہو رہی تھی۔ وہ کیا قصہ تھا؟“

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ میں ہند میں آپ کو تباہ کر گا۔“  
وہ ان کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”آئیے اس طرف سے گھومتے  
ہوئے کراچی کی طرف چلے ہیں۔“  
حارہ کاٹھیا بھرا اٹھ گئی اور وہ دونوں ایک جگہ پہنچ گئے۔

چلے گئے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پر رک گئے۔ یہ کسی چشمے کا پانی تھا جو بندی کی طرف سے

آہا تھا۔ وجد انانی میں پیر لٹکا کر بیٹھا۔ حامد لاکھی نے اسے  
کنارے پر بیٹھ کر دونوں پیرانی میں ڈال دیے اور پیراں کو  
ہتھرت حرکت دیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے حجاب  
عقب میں ایک آواز سن کر وہ چمک گئی۔ اس نے حجاب  
ایک بہت حسین عورت درختوں سے نکل کر ان کی طرف  
آئی۔ وجد ان نے بھی اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔

”ہیلو۔“ وہ عورت حارہ کاشی اور وجدان کی طرف  
مکرائی۔

”ہیلو۔“ حارہ کاشی نے بھی مسکراتے ہوئے گردن ہلا کر  
گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ عورت جینز اور اوپن شرٹ پہنے ہوئے قلم اٹھ  
چہرے کے نقوش بتا رہے تھے کہ اس کے ماں باپ مملائے  
ایک کا تعلق ہندوستان سے ضرور ہے۔

”ہم آج صبح ہی لوٹ پر یہاں آئے تھے۔“ اس عمر نے  
خود ہی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھی چاہنے  
طرف نکل گئے ہیں۔ انکی کو تلاش کرنی پھر رہی ہوں۔“  
”ہو سکتا ہے وہ ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔“

کاشی نے کہا۔  
 ”ہو سکتا ہے“ عورت نے کہا اور پھر وجہ ان کی طرف  
 ہوئے بولی۔ ”بڑا پیارا بچہ ہے تمہارا بیٹا ہے؟“

”ہاں“ حاتمہ کا بچپن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس محسوس کیا تھا کہ وہ عیسٰی عورت وجدان میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ باتیں تو وہ حاتمہ بھی سے کر رہی تھی لیکن اس کی توجہ وجدان تھا۔

حارہ کاشی نے ایک اور بات خاص طور سے نوٹ کی  
اس عورت کے انداز میں ایک طرح کی بے چینی تھی اور وہ  
ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ حارہ کاشی کی چمچی حس نے اسے کہ

”وعد ابن“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو۔“

وہاں چلیں۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔“

وجدان بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسری عورت کی طرف کر ہاتھ بلایا اور حارہ کاشی کے ساتھ چل پڑا۔ حارہ کاشی

وہ دونوں خبان درختوں میں کھس گئے۔ تنگ سی گلی پر  
جسے بعض جگہوں پر چھانپوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چارہ کھانے

جانب سے اس نے کئی مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا لیکن گنجان درخت

اگر کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا اور پھر ایک موقع پر پہنچ کر زور دے کہ آؤ  
 مجاہدوں میں تیرے سرسراہٹ کی آواز سن کر وہ بڑی پھرتی سے نیچے  
 جھکی اور جب اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ مجاہدوں  
 دیر سے اُسے اُٹھنے کا اپنا آواز تھا۔

”دو“ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ ”حارہ کاشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل اس طرف ایک عورت سے  
 طرف دیکھتا تھا۔“ ”نہے اس پر کچھ شبہ سا ہوا تھا۔“

”میں نے سنا ہے کہ اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اسی لئے میں درختوں اور جھاڑیوں میں چھپ کر تم لوگوں کی نگرانی کرتا ہوا آ رہا تھا۔ تم اس لڑکے کو لے کر چلی جاؤ۔“

میں میں کھڑا ہوں۔“

جان کاٹھی وجدان کو لے کر کراچی میں آگئی۔ پر تاب سنگھ کا منج کے سامنے کھلی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دونوں بھی اس کے پاس بیٹھ کر چارہ کاٹھانے اس عورت کے بارے میں بتایا تو پر تاب سنگھ

”اس کا علیہ ہوا۔ اس میں ہر جموعہ سائل تو نہیں تھا؟“  
اب غمگنہ آنکھوں کے گوشے پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ حامد کاشی نے نفی میں سر ہلادیا اور اس عورت کا  
لورا حلہ بتانے لگی۔

میں نے اپتال میں سوترنگ کے کمرے سے جس عورت کو لکھے ہوئے دیکھا تھا اس کا ملبہ بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشے پر سیاہ قہقہ اور بال گولڈن تھے لیکن تم نے اس کے قد کا مت اور چہرے کے جو نقش بنائے ہیں اس پر مجھے شبہ

ہو رہا ہے کہاں دیکھا تھا تم نے اسے؟“ پر تآب نگھ نے پوچھا۔  
 ”اس طرف“ ہندی کے قریب۔“ عارہ کا کاشی نے اشارے سے  
 بتایا۔

”تم لوگ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ پر تپ سنگھ اٹھ کر اسی طرف چل پڑا۔ اس کی واپسی تقریباً دو گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ کافی دور تک کا چکر لگا کر آیا تھا لیکن وہ عورت اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔

حانہ کاشی کے علاوہ پر تاب سنگھ کو بھی شبہ ہو چکا تھا کہ کوئی گمراہ ہونے والی ہے۔ رات کو زیادہ خطرہ ہو سکتا تھا۔ پر تاب سنگھ کو شبہ تھا کہ اگر دارا کے آدمی اس جزیرے پر پہنچ گئے ہیں تو وہ رات کو کھوکھوتہ کلا بچو جا رہا ہے۔

وقت کا بچ کر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ حارہ کاشی کے ساتھ مل کر چینی سازنے اسے کے ۳۰ سب مشین گنیں نکال لی تھیں اور وہ رات بھر کالج کے آس پاس گھومتے ہوئے پرا دیتے رہے۔ معمولی سی آہستہ آہستہ زلزلہ کا ہوا، اس سے اس کا بھی ہوا۔

چونکہ بڑے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ رات خیریت سے گز گئی۔  
صبح ہوتے ہی پر تاب سنگھ نے اپنے پورے کام پر عمل شروع

کر دیا۔ وہ وجدان کو لے کر کالج سے نکل گیا۔ حارہ کاشی بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ کالج کے آس پاس جو ٹنگ کرتے رہے پھر ایک جگہ رک کر ایک سرائز شروع کر دی۔ وجدان نے ٹھیک تھا کہا کہ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے پرآب سٹح زیادہ نہیں دوڑ سکے گا۔ زخم اوپر سے اگرچہ ٹھیک ہو چکا تھا لیکن اسے تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ ایک سرائز کی دے داری حارہ کاشی نے سنبھال لی۔ پرآب سٹح ایک طرف بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

ناٹھے کے قریب ایک کھینچے بعد مارشل آرٹ کی کلاس شروع ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قدرے کھلی جگہ کا انتخاب کیا تھا جو کالج سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ چارہ کاشی وچان کو سامنے کھڑا کر کے اس حلی فن کے بارے میں لیکچر دے رہی تھی اور رتبہ ایک چتر بٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔

دعوت نکل ہوئی تھی۔ پر تاب سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر ادھر ٹٹلے لگا۔ مغرب کی طرف بڑے سے ڈھکی ہوئی ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے اس پہاڑی پر کچھ نقل و حرکت محسوس کی تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس جزیرے پر بھی سیاہوں کی آمد و رفت تھی اور وہ سیر کے لئے کسی بھی طرف جاسکتے تھے۔

حارہ کاشی اب وجدان کو اسٹرینجنگ (پٹھوں کے پھیلاؤ) کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اسٹرینجنگ کو مارشل آرٹس میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جسم میں جتنی زیادہ پلک ہوگی۔ نہ صرف

یہ کہ یہ فن سیکھنے میں آسانی ہوئی بلکہ حریف پر حملہ آور ہونے کی قوت میں بھی اضافہ ہوگا۔ وجدان زمین پر بیٹھا اپنی دونوں ٹانگوں کو دائیں بائیں پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پوزیشن میں بیٹھی ہوئی حارہ کاشی اسے بتا رہی تھی کہ ٹانگوں کو کس

طرح زیادہ سے زیادہ اس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی ٹانگیں نوے کے زاویے پر پھیلا رکھی تھیں۔ پر تاب سنگھ دلچسپ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فضا چنانک ہی فائر کی آواز سے کونج اٹھی۔ وجدان کے پیچھے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر ایک پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

حارہ کاٹی اور پر تاب سنگھ ایک وقت وجدان کی طرف لپکے  
تھے حارہ کاٹی زیادہ پھرتلی عادت ہوئی تھی۔ وہ ایک سینڈ سے بھی  
کم وقت میں وجدان کے قریب پہنچ گئی اور اسے بازو سے پکڑ کر

کھینچی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی ٹھیک اسی جگہ پر لگی تھی جہاں ایک سیکنڈ پہلے وجدان بیٹھا ہوا تھا۔

دو دنوں اسے ٹھہرتے ہوئے ایک پتھر کے پیچھے جا کر رہ گولیاں اب اس پتھر پر لگی رہیں اور پتھر کے کلوے اڑا کر نفا میں بکھر

رہے تھے۔

فائرنگ ایک لمحے کو ختم ہو گئی۔ برتاب ٹکڑے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسے پہاڑی پر ایک جگہ چبک سی نظر آئی۔ وہ غالباً کسی راتھل کی ٹال تھی جو دوپٹ میں چبکی تھی۔ اسی لمحے فضا ایک بار بھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ برتاب ٹکڑے اگر پھرتی ہے نیچے نہ جھک جاتا تو اس کی کھوپڑی کے پٹے اڑ جاتے۔ گولی اس کے اوپر سے ہوتی ہوئی پیچھے ایک درخت کے تن میں پھرتی ہوئی تھی۔

برتاب ٹکڑے نے گردن کھما کر دیکھا۔ حادہ کاشی نے وجدان کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی نظر آ رہا تھا۔ برتاب نے غیر ارادی طور پر قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھالیا۔ حادہ کاشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ان کی فائرنگ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے ہو؟“ وہ برتاب ٹکڑے کی طرف دیکھ کر بولی۔

برتاب ٹکڑے نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر کو گھور کر دیکھا اور اسے ایک طرف اٹھا لیا اور ٹھک اسے لمی ایک اور فائر ہوا۔ گولی زمین پر اسی جگہ گئی تھی جہاں پتھر گر رہا تھا۔ ”بڑے بکے لٹا پٹی ہیں بھئی یہ تو۔“ برتاب ٹکڑے بولا۔ ”ہم تو یہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتے۔ پر ہمارے بندے کہاں چلے گئے ہیں؟“

اس کا ہنسل مکمل ہوتے ہی کالج کے قریب بھی دو مختلف جگہوں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ان کے محافظوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

پہاڑی سے فائرنگ کا رخ اب بدل گیا تھا۔ برتاب ٹکڑے نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر سر اٹھا کر پہاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ پہاڑی تین چار سو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہاں درختوں میں ایک جگہ سے فائر ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ فائرنگ کرنے والا اکیلا تھا جبکہ نیچے سے تین مختلف جگہوں سے جواب دیا جا رہا تھا۔

پہاڑی سے فائرنگ رک گئی۔ حادہ کاشی وجدان کے اوپر سے ہٹ گئی۔ اس نے وجدان کا ہاتھ پکڑا اور اٹھ کر تیزی سے چٹان درختوں کی طرف دوڑی۔ اس مرتبہ ان پر فائرنگ نہیں کی گئی۔ چند سیکنڈ بعد برتاب ٹکڑے بھی دوڑنا ہوا ان کے قریب گیا اور وہ کہیں رکے بغیر چٹان درختوں میں کالج کی طرف دوڑنے لگے۔

جزیرے پر تقریباً آدھے گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ دو محافظ واپس آ گئے جبکہ تیسرا جنگل میں گھوم پھر کر فائرنگ کرنے والے کو تلاش کرتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد اس نے واپس آ کر بتایا کہ ایک عورت اور دو آدمیوں کو ایک موٹر بوٹ پر وہاں سے پکڑ کر ایک اور چھوٹے جزیرے کی طرف فرار ہوتے دیکھا گیا ہے۔

اس نئی صورت حال نے برتاب ٹکڑے کو پریشان کر دیا۔ اسے

سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا کو یہاں ان کی موجودگی کا پتہ چلا تھا اور اس نے وجدان کو ختم کرنے کے لئے اپنے کمرے کے خفیہ سے یہاں بھی بھیج دیے تھے۔ حادہ کاشی نے کل چھ گھنٹے کے بارے میں بتایا تھا۔ برتاب ٹکڑے کو اب یقین ہو چکا تھا کہ عورت تھی جس نے نس کے مجیس میں سو ترنگہ کو زیر کر دیا تھا۔ لگایا تھا۔ اس نے کل صبح ان لوگوں کا سراغ لگانے کے لئے کئی ساتھیوں کو اطلاع دے دی تھی۔ برتاب ٹکڑے کو توقع تھی کہ رات ہی گزیر ہوگی لیکن وہ لوگ شاید کسی بہتر موقع کی تلاش میں تھے اور آج انہیں موقع مل گیا تھا۔ پہاڑی سے فائرنگ کرنے ایک ہی آدمی تھا۔ اس نے وجدان کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن قسمت اچھی تھی کہ وجدان اس مرتبہ بھی بال بال بچا ہوا تھا۔ وائیلنس پر انیسٹر چیاگ شو کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایک گھنٹہ بعد تین موٹر بوٹس جزیرے کی طرف آتی ہوئی آئیں۔ تین بوٹس پر پولیس کے جہنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک تو اسی طرف آئی اور دو بوٹس اس جزیرے کی طرف چلی گئیں۔ کے بارے میں انیسٹر چیاگ شو کو اطلاع دی گئی تھی کہ ایک موٹر بوٹ اس طرف گئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد انیسٹر چیاگ شو درجن بھر سپاہیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا کالج کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے ایک بار برتاب ٹکڑے اور اپنے آدمیوں سے صورت حال معلوم کی اور اس کے سلسلہ جاری پورے جزیرے پر پھیل گئے۔

اس جزیرے پر سپاہیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ جبکہ فائرنگ ہوئی تھی تو یہاں اپنی تقریبی سرگرمیوں میں مصروف بعض لوگ ساحل پر پیرائی میں مشغول تھے اور بعض ریت پر تن باٹھ لے رہے تھے۔ فائرنگ سے خوفزدہ ہو کر وہ لوگ گہرے بازوئیں میں جمع ہو گئے تھے۔

پولیس نے پورے جزیرے کو چھان مارا۔ کوئی مشتبہ نہیں ملا۔ دو سرا جزیرہ وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر اسی طرف سے ہوا کے دوش پر آنے والی فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں پولیس اور ان لوگوں میں تصادم ہو گیا تھا۔ بلاخر فائرنگ کی یہ آوازیں بند ہو گئیں۔ اس کے تقریباً پندرہ بعد پولیس کی دو موٹر بوٹس اس طرف آتی ہوئی نظر آئیں۔ مزید آگے بڑھتے ہوئے پولیس والے کالج میں پہنچ گئے۔

پولیس والے نے کندھے پر کسی عورت کو لاد رکھا تھا۔ وہ ڈی اور اس کے ختم سے بننے والے خون سے پولیس والے کی رو بہی تر ہو رہی تھی۔ اس نے عورت کو کالج کے برآمدے میں پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش تھی۔

اس عورت کا چہرہ دیکھ کر حادہ کاشی وجدان اور برتاب ٹکڑے اچھل پڑے۔ یہ وہی خبیث صورت عورت تھی جو کل صبح حادہ کاشی اور وجدان کو جنگل میں ملی تھی۔

”وہی ہے۔ رب دی سون دی ہے۔“ برتاب ٹکڑے چنچا۔ ”یہ وہی ہے جس نے سو ترنگہ کو زیر کر لیا تھا۔ اس نے ختم کر دیا۔ وہاں سے اور ہونٹ کے گوشے پر کل تھا لیکن وقت اس کے بال تبدیل ہونے اور قل کے نہ ہونے سے اس کی ہاتھوں کی رنگت تبدیل ہو گئی۔ یہ وہی ہے۔“

اصلیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہی تھی اور شاید خون زیادہ بہہ اس عورت کی ٹانگ میں گولی کی تھی۔ حادہ کاشی دو ڈکڑا اندر جانے کی وجہ سے آئی اور ختم صاف کر کے ڈرنک کرنے سے فرٹ اپنے پاس لے آئی اور ختم صاف کر کے ڈرنک کرنے لگی۔ فوری طور پر یہی کیا جاسکتا تھا کہ مزید خون نہ بہنے پائے مزید پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آگئی۔ خون بہہ جانے اور خوف کی وجہ سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اپنے اوپر دو پولیس والوں اور خاص طور پر برتاب ٹکڑے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشت چھلک چلی تھی۔ وجدان بھی اس کے سگنے کھڑا تھا۔

”کل صبح تو ختم مزے مزے کی باتیں کر رہی تھیں آخری تین تو بہت خدشاگ نکلیں۔“ وجدان نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

وہ مائے ٹانگ تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور وحشت زدہ سی نظریں سے اپنے ارد گرد گھومنے لگی۔ پولیس والوں کو دیکھنے لگی اور پھر چیاگ اس کی آنکھوں میں چبک سی ابھر آئی۔ اس کی نظریں ایک پولیس والے کے ہولسٹر میں گئے ہوئے ریوالور پر جم کر رہ گئیں۔ ”دوسرے ہی لمحے وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ اٹھی اور پولیس والے کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ وہ عجب ہاتھ سے اس نے وجدان کو پکڑ کر اپنی گود میں گرا لیا تھا۔“

”دور ہٹ جاؤ۔ تم لوگ دور ہٹ جاؤ ورنہ میں اس کو مار دوں گی۔“ اس صورت حال سے مائل پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔

برتاب ٹکڑے کا دل اچھل کر قلع میں اٹھ گیا۔ اس کے خیال میں مائے ٹانگ کے اس اقدام میں جرأت اور بہادری کو دخل نہیں تھا۔ وہ چاروں طرف سے پولیس میں گھری ہوئی تھی۔ اس پر سو ترنگہ کے کل کا الزام تھا وہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم میں ملوث تھی۔ اسے اپنے سامنے موت نظر آ رہی تھی اور اس نے یہ قدم انتہائی ہلکی سی کیفیت میں اٹھایا تھا کہ شاید اس طرح نیچے کا موقع مل جائے۔

پولیس والوں نے ان نظریں سیدھی کرنا چاہیں مگر انیسٹر چیاگ شو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اس کی عقابلی نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مائے ٹانگ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کا سینٹر لیج لگا ہوا تھا۔ وہ شاید ہسپتال یا ریوالور کا استعمال نہیں جانتی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ پھل ڈیکڑا دینے سے گولی چل جائے گی۔ اگر وہ ریوالور کے استعمال سے واقف ہوئی تو ریوالور ہاتھ میں آئے ہی سب سے پہلے سینٹر لیج چیک کرتی۔

”دیکھو۔“ انیسٹر چیاگ شو نے کہا۔ ”تم اپنے لئے مزید مشکلات پیدا کر رہی ہو۔ تم گولی نہیں چلا سکتیں۔ تمہارا صرف ہاتھ ہی نہیں پورا جسم کانپ رہا ہے۔ اس لڑکے کو چھوڑ دو اور ریوالور مجھے دے دو۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”مصلحت کے ناخن لولڑی۔“ اس مرتبہ برتاب ٹکڑے بولا۔ ”اگر تم نے اس لڑکے کو گولی ماری تو درجنوں گولیاں تمہارے جسم میں پیوست ہو جائیں گی۔ زندگی ہر حال میں موت سے بہتر ہوتی ہے۔ ریوالور چیک کر دو۔“

”دور ہٹ جاؤ مجھ سے۔ کوئی آگے نہ آئے۔“ مائے ٹانگ چنچی۔

لیکن انیسٹر چیاگ شو مزید ایک قدم آگے آیا۔ مائے ٹانگ کو خود غلامی کی طرح غرائی اور زیر کر پرائی کا دباؤ ڈال دیا مگر نہ تو زیر کیا اور نہ ہی گولی چلی۔ وہ زیر کر پڑا دباؤ لے لگی اور پھر انیسٹر چیاگ شو اس پر بھج پڑا۔

قریب کھڑی ہوئی حادہ کاشی نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر وجدان کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے لے کر دوڑتی ہوئی کالج میں گھس گئی۔

مائے ٹانگ کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ انیسٹر نے اس سے ریوالور چھین لیا اور دو پولیس والوں کو اشارہ کیا۔ وہ مائے ٹانگ پر بھج پڑے اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر تھک کر پیٹا دی۔

برتاب ٹکڑے اندر دوڑ گیا۔ حادہ کاشی وجدان کو سینے سے لپٹائے کھڑی تھی۔ پر تب ٹکڑے نے وجدان کو اس سے لے کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ دوسری مرتبہ موت کے منہ سے نکلا تھا اور پھر پھر کانپ رہا تھا۔

○☆☆○

”لگتا ہے“ سنگ پور سے اب اپنا دانہ بانی ختم ہو چکا ہے اور ہمیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔“ برتاب ٹکڑے نے انیسٹر چیاگ شو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”تم یہاں سے کدھر جائے گا؟“ انیسٹر چیاگ شو نے اسے گھورا۔ ”وجدان کے لئے سب سے محفوظ جگہ سنگ پور ہے۔ یہاں پولیس اس کی حفاظت تو کرتی ہے۔ کسی دوسری جگہ جانے کا تو وہ آسانی سے مارا جائے گا۔“

”پولیس خاک حفاظت کر رہی ہے اس کی۔“ برتاب ٹکڑے بولا۔ ”پولیس کی موجودگی میں بھی اس پر بار بار حملے ہو رہے ہیں۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی ہے کہ اب تک بچتا رہا ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ پولیس اب تک دارا کا سراغ نہیں لگا سکی۔ وہ ایک پراسرار طاقت بن گیا ہے۔ اس کے آدمی ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔“

”تم جانے ہو کہ پولیس بیٹھے سے مستعد رہی ہے۔“ جیٹا لنگ شو نے جواب دیا۔ ”کل لازماً اس آئی لینڈ پر پکڑے جانے کے بعد مائے فانگ نے کچھ سنسنی خیز انکشافات کئے تھے۔ دارا کو ان لوگوں میں سے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کا نقل کس سے ہے اور یہ لوگ کم کے لئے کام کر رہے ہیں۔ مائے فانگ کی نشان دہی پر گزشتہ رات ہم نے کم کے خفیہ اڈے پر چھاپا مارا تھا لیکن وہ وہاں سے فرار ہوئے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ رات کے پچھلے پراس کے ٹائٹ کلب پر بھی چھاپا مارا گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں ملا۔ پولیس اسے تلاش کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔“

اس لئے وہ خاصا محتاط تھا۔ اس کی جیب میں ہر وقت پتھل سوچو رہتا تھا لیکن لاوارس تجربے پر پائے ٹانگ کے پکڑے جانے کے بعد پولیس واقعی کچھ زیادہ مستعد ہو گئی تھی۔ کئی جگہوں پر چھاپے مارے جاتے تھے۔ درجنوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ پولیس کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے عام جرائم پیشہ لوگ بھی محتاط ہو گئے تھے اور وہ بھی اپنی سرگرمیاں مضطر کرنے اور پوش عطا ہوئے۔ پولیس نے ویسے تو کئی مشتبہ لوگوں کو پکڑا تھا لیکن اصل ہونے والے جو گئے تھے کہ گروہ کے ایک دو آدمی پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے کم کے بارے میں تو بتایا تھا لیکن بدلے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہ آپ گنگ سڑک پر چلے ہوئے سوچا تھا کہ اگر کم پکڑا جائے گا تو دارا بنگ پچھتاوا زیادہ مشکل نہیں ہو گا لیکن اصل مسئلہ تو کم کے پکڑے جانے کا تھا۔ وہ تو گروہ کے سرے بیٹھوں کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد آپ گنگ ایک لکشی میں بیٹھ کر ڈرائے گاٹ الینو پر واقع بینک لے کب آیا۔

محنت تھی اور رہائش کے لئے وہ کوارٹر بھی جہاں پہلے سے ان کی رہائش تھی۔

جب دارا کا معاملہ منٹ جائے گا تو وجدان کو واپس لے آئے گا۔ پولیس ابھی تک کوئی خاطر خواہ کارکردگی نہیں دکھا سکی تھی۔ پر تاب سنگھ خود کوئی جوالی کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن وجدان اس کے پاؤں کی تیزی بنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے بھی وہ کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ وجدان یہاں نہیں ہو گا تو اسے کھل کر کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آیا۔ نماہو کر کپڑے بدلے اور فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملانے لگا۔ رابطہ قائم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

”بھائی خشونت سنگھ“ میں پر تاب بول رہا ہوں۔ ”وہ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سن کر بولا۔ ”آج رات تم لوگوں کا کہیں جانے کا پروگرام تو نہیں؟“

”نہیں۔ لی الحال تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”میں آج رات کا کھانا تمہارے ہاں کھاؤں گا۔ اسی وقت باتیں بھی ہوں گی۔ اچھا۔ رب راکھا۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

اس نے الماری میں رکھا ہوا براؤن رنگ کا ایک بریف کیس نکالا اور مختلف جگہوں سے اپنے اہم اور ضروری کاغذات نکال کر بریف کیس میں رکھنے لگا۔ عابد علی کی ڈائری بھی اس نے بریف کیس میں رکھی اور پھر وہ مختلف جگہوں پر فون کرنے لگا۔

جب وہ گھر سے باہر نکلا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گلی میں ایک دو آدمیوں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک اس سے کپ شپ کرتا رہا پھر گلی سے نکل کر پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔ وہ فورٹ کیننگ روڈ سے ہوتا ہوا چٹانگ لین پر گیا جہاں ریڈ کراس ہاؤس کے سامنے سے اسے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ڈرائیور ایک اوجیر عمر مسلمان تھا۔ پر تاب سنگھ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے ہوئے اسے صوفیہ روڈ چلنے کو کہہ دیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر انھیں بند کر لیں۔

”کس طرف جانا ہے سرواڑی؟“

ڈرائیور کی آواز سن کر پر تاب سنگھ نے انھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ صوفیہ روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ ایک بلند عمارت کو دیکھ کر اس نے ڈرائیور کو عمارت کے ساتھ بائیں طرف والی سڑک پر گاڑی موڑنے کو کہہ دیا۔

سڑک پر آئے بلند عمارتیں تھیں اور ان کی پچھلی طرف بنگلے تھے۔ دو تین سڑکوں پر مڑنے کے بعد اس نے ایک گلی میں ٹیکسی رکوائی اور کرایہ دے کر پیچے اتر آیا۔ اس وقت ایک اور کار گلی میں مڑی تھی۔ وہ کار بھی رفتار سے چلتی ہوئی قریب سے گزر گئی۔ پر تاب سنگھ نے اس پر توجہ نہیں دی اور چند کڑے آگے بڑھ کر ایک بنگلے کے گیٹ پر گئی ہوئی کال بیل کاغذ دبا دیا۔

یہاں تمام بنگلوں کے سامنے کشادہ لان تھے۔ بعض لوگوں نے

اپنے بنگلوں کے لان کے آگے کھڑکی کی چٹائی کی جالی لگا کر تھی اور بعض نے غاردار تاروں کے جھنگے بچھ کر رکھے تھے۔ سنگھ نے جس بنگلے کی ڈور بیل بجائی تھی اس کے سامنے باغیچہ ہوئی تھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد ایک جوان اور خوبصورت لڑکھن دروازہ کھولا۔ وہ خشونت سنگھ کی بیٹی ارطا کو رکھی۔

پر تاب سنگھ اس کے ساتھ اندر گیا۔ خشونت سنگھ کی بہو سے گیا ہوا تھا لیکن ٹھوڑی دیر بعد وہ بھی آیا اور پھر اس نے ٹھوڑی ہی دیر بعد میرے کھانا کھا دیا گیا۔

خشونت سنگھ ایک برنس مین تھا۔ ارطا کو اس کی انگلی اور تھی۔ اس کی عمر انیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی راجتی بھی صحت مند خوبصورت عورت تھی۔ وہ چاروں کھانے کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کا موضوع وجدان ہی تھا۔

”اب مجھے پولیس پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔“ پر تاب سنگھ کہہ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں اسے کچھ عرصے کے لئے قحطی دلاؤں گا۔“ بنگالہ میں میرے کچھ جاننے والے ہیں۔ وجدان ان کے پاس چھوڑ کر واپس آجائوں گا اور دارا وغیرہ سے حساب باز کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”اس وقت وہ لڑکا کہاں ہے؟“ راجتی نے پوچھا۔

”او تار سنگھ کے پاس۔“ پر تاب سنگھ نے جواب دیا۔ ”اس دو کمروں کا چھوٹا سا کوارٹر ہے۔ وہاں وہ گھر آیا ہے اور ان لوگوں کی بھی پریشان کر رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے ایک دو دن کے لئے یہاں لے آؤں، تمہارے پاس۔ میں اس دوران میں تیاری کرنا گا اور پھر اسے لے کر چلا جاؤں گا۔“

راجتی اور خشونت سنگھ جانتے تھے کہ وجدان کو اپنے گھر میں دینا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر راجتی پر تاب سنگھ کی طرف دیکھنے ہوئی۔

”ہم اتنے سنگ دل نہیں ہیں جیسے جی۔ وہ دن ہاں باپ“ معصوم بچہ ہے۔ معصیتوں میں گھرا ہوا ہے۔ اگر ہماری وجہ سے اسے کچھ تکلیف پہنچ سکتا ہے تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔“

”خش کیتا اہی پامو۔“ پر تاب سنگھ بولا۔ ”رب تین ڈنڈ رکھے۔ میں آدھی رات کے بعد کسی وقت اسے لے آؤں گا۔ دارا کے ساتھ اس کا دل لگا رہے گا۔ بس ایک دو دن کی بات ہے۔“

”جتنے دن مرضی رہے گی۔ رب اسے سلامت رکھے۔“ راجتی نے کہا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ لوگ لان میں آکر بیٹھ گئے اور ایک تک باتیں کرتے رہے۔ سو بارہ بجے کے قریب پر تاب سنگھ اٹھ گیا۔

”میں تمہاری گاڑی لے کر جا رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں واپس آجائوں گا۔“ اس نے خشونت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ خشونت سنگھ کی گاڑی باہر ہی کھڑی تھی۔ اس نے چابی پر تاب سنگھ کے حوالے کر دی اور پر تاب سنگھ کے ساتھ ہی وہ بھی باہر آیا۔

قحط سنگھ تقریباً چالیس منٹ بعد ٹینک لن کلب پہنچا تھا۔ پر تاب سنگھ کی پچھلی طرف ایک تنگی سی سڑک پر روکی اور اس نے گاڑی کلب کی پچھلی طرف والے کیاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔ وہ تقریباً پچھترہ سو فٹ کی گلی پر روک دیا اور پھر وجدان کو لے کر باہر آیا۔

دو منٹ وہاں رہا قحط اور پھر وجدان کو لے کر باہر آیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم پچھلی سیٹ پر لٹ جاؤ۔“ پر تاب سنگھ بولا۔ ”ہو سکتا ہے۔“ راجتی نے اس کی نظر میں پڑ جائے اس لئے احتیاط ضروری ہے۔“ وجدان پچھلی سیٹ پر لٹ گیا اور پر تاب سنگھ انہیں اشارت کر کے گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ہائونڈ روڈ پر پہنچی۔ وہاں سے اس نے گاڑی کو پیسے سی

کیمبل سڑک کی طرف موڑا اور وجدان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ سڑک تو سنسان پڑی ہے چاچا۔ یہاں مجھے کون دیکھے گا۔“ بولا۔

پر تاب سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن چند لمحوں بعد ہی وہ قحطی پیش نظر کرنے والے آئینے میں کسی گاڑی کی ہینڈل نہیں دیکھ کر چونک گیا۔ وہ گاڑی بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

”سیٹ پر لٹ جاؤ گا کہ جلدی کرو اور اٹھنے کی کوشش مت کرو۔“ پر تاب سنگھ نے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پھلون کی جیب سے ہتھول بھی نکال آیا تھا۔

وہ گاڑی بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ پر تاب سنگھ نے گردن گھما کر دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا ہیلو اچھل کر طعن میں آیا۔ گاڑی کی کھڑکی میں اسے راکفل کی ٹال نظر آئی تھی۔ اسے سمجھنے میں نہیں لگی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے ہائی بھرتی سے نیچے جھک کر پوری قوت سے بریک پڈل دیا دیا۔

کار بریک کی تیز چرچرائٹ کی آواز سے لڑائی ہوئی سڑک کے کنارے کی طرف مڑ گئی۔ یہاں اسی لمحے نفا فائرنگ سے کونج انھی لیکن یہاں میں قسمت نے پر تاب سنگھ اور وجدان کا ساتھ دیا وہ گاڑی جیسے ہی برابر پہنچی تھی اس کا اٹھا ایک سپا سڑک پر پڑے ہوئے ایک پھر بڑا قحط جس نے گاڑی اچھل گئی اور اس کا رستہ چلائی جانے والی گولیاں پر تاب کی گاڑی کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔

پر تاب سنگھ نے بڑی بھرتی سے اپنی گاڑی سنبھال لی۔ اسی دوران میں دوسری کار پھر سے اچھل کر ٹال ڈرائیور سے بے قابو ہو گئی اور وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کھوسڑ سڑک کے کنارے ایک پھولنی کی پلایا کی رینگ سے ٹکرا کر گھوم گئی۔

پر تاب سنگھ نے اپنی گاڑی سنبھالنے ہی پھولن والا ہاتھ باہر نکال کر ٹکرا دیا۔ گولی دوسری کار کے آگے والے پینے پر لگی۔

تاہم پہنچنے کا زور دار دھماکا ہوا تھا۔

”کاک سیٹ پر لیے رہنا۔ اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔“ پر تاب سنگھ نے جتنے ہوئے کہا اور اسٹیئرنگ گھما دیا۔

کار کو جھٹکنے لگئے سے وجدان سیٹ سے لڑھک کر آگے گر گیا تھا۔ ایک زوردار جھٹکا تو اس کا سر اگلی سیٹ کے میں سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا کاک؟“ پر تاب سنگھ چنپا۔

”کچھ نہیں چاچا۔ چٹ لگ گئی ہے۔“ وجدان نے جواب دیا۔

پر تاب سنگھ گاڑی کو گھما کر سڑک پر لے آیا۔ گاڑی کا رخ اس طرف تھا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ پر تاب سنگھ نے ہاتھ پیچھے گھما کر دوسری کار کی طرف ایک اور فائر کر دیا اور اسٹیئرنگ سنبھال کر ایکسیلریشن پر کار بڑھا ڈال دیا۔

گاڑی بددقت سے نکل ہوئی گولی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی اور پھر اسی لمحے عقب سے فائرنگ ہونے لگی مگر ان کی کار فائرنگ کی رینج سے بہت دور نکل چکی تھی۔ اگلے موڑ پر پر تاب سنگھ نے کار سائڈ روڈ پر گھمائی اور ایک اور سڑک پر ہوتا ہوا کو تھوڑے دیر نکل آیا۔

”اب میں اٹھ جاؤں چاچا؟“ پچھلی سیٹ کے سامنے پر پڑے

ہوئے وجدان نے کہا۔

”اٹھ جایا۔ جو ہوتا تھا وہ ہو چکا۔“ پر تاب سنگھ نے جواب دیا۔ وجدان اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور سر ہلکے والی چٹ سسلانے لگا۔ پر تاب سنگھ گاڑی کو ٹھکی سینی اونیوسے گھماتا ہوا صوفیہ روڈ کی طرف لے آیا اور پھر خشونت سنگھ کے بنگلے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

خشونت سنگھ اس کی بیوی اور بیٹی ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ راجتی نے وجدان کو سینے سے لپٹا لیا۔

”بیٹھو۔ کیا بات ہے۔ لڑا کچھ سا ہوا سا لگ رہا ہے۔“ راجتی نے پر تاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بہت بھاری لڑاکا ہے پامو۔“ پر تاب سنگھ نے جواب دیا۔

”ابھی ابھی موت سے مقابلہ کر کے آیا ہے۔ اس نے اتنی ہی عمر میں اور اتنے مختصر عرصے میں موت کو اتنی بار شکست دی ہے کہ اس کا نام تو تیرکیم آف ریکارڈ میں آنا چاہیے۔“

خشونت سنگھ چونک گیا۔ وہ اس واقعے کی تفصیل پوچھنے لگا۔

”چائیں۔ ان کم بختوں کو کیسے پتا چل گیا کہ میں اسے وہاں سے لے کر نکل رہا ہوں۔“ پر تاب سنگھ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ کار ٹینک لن کلب سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ بھلا وہ اس پتھر کا جوہین وقت پر کار کے پینے کے نیچے آیا تھا اور کار اچھل گئی تھی۔ ورنہ ہم دونوں کے ساتھ تمہاری کار بھی چھٹی ہو چکی ہوتی۔“

”کار پر لعنت جیجی جی۔ تم دونوں کی جان بچ گئی۔ رب کا شکر



وہ نہ صرف کپارٹمنٹ کے دروازے پر بلکہ سامنے والے برقعہ پر بھی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ وہ ملائی باشندہ کچھ دیر سفاری سوٹ والے کے پاس کھڑا سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا پھر راہداری میں نکل کر ٹرین کی آگے والی بوگی کی طرف چلا گیا۔

سات گھنٹے کا سفر تھا۔ مینج بیچے کے قریب ٹرین سیرمیان اسٹیشن پر رکی تو وہی ملائی باشندہ اس کپارٹمنٹ میں آگیا۔ اس نے سفاری سوٹ والے سے کچھ سرگوشیاں کیں۔ سفاری سوٹ والے نے کپارٹمنٹ میں سوئی ہوئی پچی کو بگاڑا۔ پچی آنکھیں ملتی ہوئی اس ملائیشین کے ساتھ چلی گئی۔

ٹرین یہاں تقریباً دس منٹ رکنے کے بعد آگے روانہ ہوئی تھی۔ کوالا لہور اب زیادہ دور نہیں تھا۔ دن کی طلوع ہوئی ہوئی روشنی میں کوالا لہور کارپولے اسٹیشن بہت خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا۔ لنگوئوں والی عمارتیں اور لاتعداد جینارے لگتا تھا جیسے وہ ریلوے اسٹیشن نہیں بہت بڑی مسجد ہو۔

ٹرین رکنے ہی سفاری سوٹ والا اپنا سوٹ کیس اٹھا لے کر ٹرین سے اتر آیا۔ رات بھر جاگنے سے اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں سرفی تھری تھی۔ وہ مسافروں کی بھینچ میں چلا ہوا ریلوے اسٹیشن سے باہر آگیا اور ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ ملائیشین بھی اس لڑکی کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔

”ذیل مسٹرنگھ۔“ وہ شخص لڑکی کو سفاری سوٹ والے کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہارا امانت۔ اب تم ہوٹل جاکر آرام کرو۔ مجھے ابھی تمہارے اگلے سفر کے انتظامات کرنے ہیں۔ میں رات گیارہ بجے تمہارے پاس ہوٹل میں پہنچ جائیگا۔ اگر آج سارے انتظامات ہو گئے تو ہم رات دو بجے والی ٹرین سے روانہ ہو جائیں گے۔ بصورت دیگر کل کسی ٹرین سے روانہ ہی ہوگی۔“

”شکریہ مسٹر عمر۔“ سفاری سوٹ والا ملائیشین سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا اور پھر جیب سے سو سو والے امریکی ڈالر کے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ رکھ لو۔ اخراجات کے لئے کام آئیں گے۔“

عمر نے نوٹ لے کر جیب میں رکھے۔ لڑکی کے گال پر ہلکی سی چٹکی مالتی اور ہاتھ ملتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد سفاری سوٹ والا اس لڑکی کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔

میکسم ہوٹل میں ان کے لئے کراہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے ہی سفاری سوٹ والے نے دروازہ بند کر دیا اور دم سے ایک کرسی پر گر گیا۔

”چاچا۔ اب میں یہ کپڑے اتار دوں۔ مجھے بڑی ابھین ہو رہی ہے۔“ لڑکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میری ناک

اور کان بھی چھوا دیے ہیں۔ بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔“ یہ تو معمولی سی تکلیف ہے۔ پتر انسان کو زندہ رہنے کے لئے چاہیے کہ کچھ کچھ بڑا ہے۔“ وہ شخص بولا۔ ”میری طرف سے تیری خاطر میں نے اپنے دھرم سے بناتو کر دی۔ کپڑے داڑھی منڈوا دی۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں بیکار و ناگوار کار ہوں؟“

وہ شخص پر تآب نگہ تھا اور وہ لڑکی وجدان۔ ”ویسے اب تم پہلے سے اچھے لگ رہے ہو چاچا۔“ وہ نے کہا۔

”ہاں۔ اب میری کھوپڑی میں تھوڑی سی گھل بھی ہے۔“ پر تآب نگہ بولا۔ ”چھا۔ اب ایسا ہے کہ میں دھرم کا ناشتا منگواتا ہوں۔ ناشتا کر کے سو جانا۔ آج کا دن آرام کرو۔ ایک لمبا سفر ہے۔ بیکار بیچنے کے بعد ہی تمہارا طبع تبدیل ہو جائے گا۔ جب تک ہم ملائیشیا میں ہیں۔ تمہارا لڑکی بنے رہنے ہمارے مفاد میں ہے۔“

”ٹھیک ہے چاچا۔“ وجدان بولا۔ ”اب جلدی سے ناشتا لو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔“ وہ منگ سے سو بھی نہیں سکا تھا۔

پر تآب نگہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور سروس بوائے کے لئے کہہ کر واپس آگیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے لے کر آیا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ دن بھر سوئے رہے اور پھر شام سے پہلے پر تآب نگہ کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد دوبارہ بھی جاگ گیا۔

رات کو ٹھیک گیارہ بجے عمر پہنچ گیا۔ ”دو بجے کی ٹرین سے تم لوگوں کی روانگی ہے۔ اس بتایا۔“ لیکن میں ایک اور بات سے آگاہ کر دینا ضروری ہو۔ وہ یہ کہ فخرہ تمہارے تعاقب میں یہاں بھی آگیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ پر تآب نگہ نے اسے گھورا۔

”آج شام کم اورچی فائنگ کی یہاں دیکھا گیا ہے۔“ عمر بتایا۔ ”وہ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز سے تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی آئے ہوں لیکن یہ کراؤ تمہارے نام سے۔“

”نہیں ہے۔“ عمر نے اس لئے انہیں یہاں سے کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ بہر حال، ٹرین ٹھیک دو بجے روانہ ہوگی۔ تم وقت سے چند منٹ پہلے اسٹیشن پر پہنچ جانا۔ میں تمہیں ٹیکسی کے قریب ملوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم پہنچ جائیں گے۔“ پر تآب نگہ نے جواب دیا۔

”کم یہاں بھی پہنچ گیا۔ اب کیا ہوگا چاچا؟“ وجدان نے اسے جاننے کے بعد کہا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ وہ بولا۔ ”اس نے ہوٹل سے تمہارے بارے میں معلوم کیا ہوگا۔ اسے جب بتایا گیا ہوگا کہ ایک آدمی اور لڑکا تو نہیں بلکہ ایک آدمی اور بارہ تیرہ سال کی ایک لڑکی یہاں آکر ٹھہرے ہوئے تھے تو اسے شبہ ہو جائے گا۔ اس نے تم لوگوں کو ہوٹل سے نکلے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ بے ہوش ہوئے کچھ سے وہ تم لوگوں کو نہیں پہچان سکا لیکن شبہ ہوتا ہے وہ اسی طرف دوڑ لگا دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے پیچھے ہی آ رہا ہو۔“

”تو پھر۔“ پر تآب نگہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آج کا سفر تھکی کر گیا ہے اور کوئی اور موقع تلاش کیا جائے۔ یا بس پکڑی جائے۔“

”نہیں کے روانہ ہوں میں ابھی چند منٹ باقی ہیں۔ ایک ٹرکب ہے میرے ذہن میں کہ کم سے بھی بچا جائے اور اسی ٹرین پر تمہارا سفر بھی جاری نہ سکے۔“

”وہ کیا۔۔۔؟“ پر تآب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم ٹیکسی پر ٹرین سے پہلے تائی بنگ جائیں اور وہاں سے ٹرین پر سوار ہوا جائے۔“ عمر نے کہا۔ ”تقریباً سو میل کا فاصلہ ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دھاتی گھٹنے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔“

”تو پھر سوچ لیا کہ یہ ہو۔ پکڑ کوئی ٹیکسی۔“ پر تآب نگہ بولا۔

”ٹیکسی یہاں سے نہیں پکڑی جائے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔“ عمر نے اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔

پر تآب نگہ بھی ٹھیک وجدان کا ہاتھ پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

تقریباً پانچ سو گز دور وہ ایک اور ٹیکسی اسٹینڈ پر رک گئے۔ عمر نے ایک ٹیکسی والے سے کچھ بات کی اور پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ پر تآب اور وجدان بچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور عمر آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر۔ وجدان نے سیٹ پر نیم دراز ہو کر پر تآب کی گود میں سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

عمر کا خیال درست نکلا تھا۔ ان کی ٹیکسی جیسے ہی ایک موڑ گھوی، پر تآب نگہ نے دائیں طرف سے ایک ٹیکسی تیز رفتاری سے آتے ہوئے دیکھی۔ اس نے کم اورچی فائنگ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹیکسی تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔ ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی بارہ منٹ باقی تھے اور پر تآب کو یقین تھا کہ کم اورچی فائنگ ٹرین کا کوئی اچھا نہیں ماریں گے۔

ان کی ٹیکسی شری حدود سے نکل کر تیز رفتاری سے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

فاصلہ سو میل سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ ٹرین سے پندرہ منٹ پہلے تائی بنگ اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ ٹرین یہاں تقریباً پانچ منٹ

پر تآب نگہ نے ٹیکسی اس جگہ رکوا لی تھی جہاں عمر نے ملاقات کے لئے کہا تھا۔ عمر سب دھند اس جگہ موجود تھا۔ پر تآب نگہ نے جب اسے کم اورچی فائنگ کے بارے میں بتایا تو عمر جتنے

بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ وہ بولا۔ ”اس نے ہوٹل سے تمہارے بارے میں معلوم کیا ہوگا۔ اسے جب بتایا گیا ہوگا کہ ایک آدمی اور لڑکا تو نہیں بلکہ ایک آدمی اور بارہ تیرہ سال کی ایک لڑکی یہاں آکر ٹھہرے ہوئے تھے تو اسے شبہ ہو جائے گا۔ اس نے تم لوگوں کو ہوٹل سے نکلے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ بے ہوش ہوئے کچھ سے وہ تم لوگوں کو نہیں پہچان سکا لیکن شبہ ہوتا ہے وہ اسی طرف دوڑ لگا دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے پیچھے ہی آ رہا ہو۔“

”تو پھر۔“ پر تآب نگہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آج کا سفر تھکی کر گیا ہے اور کوئی اور موقع تلاش کیا جائے۔ یا بس پکڑی جائے۔“

”نہیں کے روانہ ہوں میں ابھی چند منٹ باقی ہیں۔ ایک ٹرکب ہے میرے ذہن میں کہ کم سے بھی بچا جائے اور اسی ٹرین پر تمہارا سفر بھی جاری نہ سکے۔“

”وہ کیا۔۔۔؟“ پر تآب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم ٹیکسی پر ٹرین سے پہلے تائی بنگ جائیں اور وہاں سے ٹرین پر سوار ہوا جائے۔“ عمر نے کہا۔ ”تقریباً سو میل کا فاصلہ ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دھاتی گھٹنے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔“

”تو پھر سوچ لیا کہ یہ ہو۔ پکڑ کوئی ٹیکسی۔“ پر تآب نگہ بولا۔

”ٹیکسی یہاں سے نہیں پکڑی جائے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔“ عمر نے اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔

پر تآب نگہ بھی ٹھیک وجدان کا ہاتھ پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

تقریباً پانچ سو گز دور وہ ایک اور ٹیکسی اسٹینڈ پر رک گئے۔ عمر نے ایک ٹیکسی والے سے کچھ بات کی اور پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ پر تآب اور وجدان بچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور عمر آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر۔ وجدان نے سیٹ پر نیم دراز ہو کر پر تآب کی گود میں سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

عمر کا خیال درست نکلا تھا۔ ان کی ٹیکسی جیسے ہی ایک موڑ گھوی، پر تآب نگہ نے دائیں طرف سے ایک ٹیکسی تیز رفتاری سے آتے ہوئے دیکھی۔ اس نے کم اورچی فائنگ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹیکسی تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔ ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی بارہ منٹ باقی تھے اور پر تآب کو یقین تھا کہ کم اورچی فائنگ ٹرین کا کوئی اچھا نہیں ماریں گے۔

ان کی ٹیکسی شری حدود سے نکل کر تیز رفتاری سے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

فاصلہ سو میل سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ ٹرین سے پندرہ منٹ پہلے تائی بنگ اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ ٹرین یہاں تقریباً پانچ منٹ



رکتی تھی۔ وہ پلیٹ فارم کے ایک کونے میں بیٹھ ہوئے تھے۔ عمر پلیٹ فارم پر محکم کر نرین کو چپک کر رہا تھا اور جب اطمینان ہو گیا کہ کیا جی فانک اس نرین پر نہیں ہیں تو وہ نرین چلنے سے ایک منٹ پہلے اس بوگی میں سوار ہو گئے جہاں ان کی سٹیش ریرو تھیں۔

سنزخیت سے گزر گیا۔ نرین دوسرے دن شام چھ بجے کے قریب ہنگام پہنچی تھی۔ نرین سے اتنے ہی وہ یکسی میں بیٹھ کر رامادون روڈ اور پھلن چٹ روڈ سے ہوتے ہوئے سوکھ روٹ روڈ پر آگئے۔ یہ شہر کاسب سے بڑا اور باوق شاہک اریا تھا۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف بلند ویلا عمارتیں تھیں۔ لگتا جیسے رنگ برنگی موشیوں کے سیلاب نے اس علاقے کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا ہو۔ ابھی شام کی ابتدا ہوئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام بھی تھا اور پیدل چلنے والوں کا جھوم بھی۔ کشادہ مرکزی سڑک کے دائیں بائیں لاتعداد چھوٹی سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ زیادہ تر رہائشی ہوٹل اور ریستوران اس علاقے میں تھے۔

ان کی یکسی سوئے تو نئی فرسٹ اسوک روڈ کی طرف مڑ گئی اور تھوڑی فاصلے طے کر کے ایک اور ذیلی سڑک پر مڑ کر ہوٹل شئی لانج کے سامنے رکتی۔

ان کے لئے تیسری منزل پر کرا پہلے سے بک تھا۔ عمر عبدالرحمن پر تاپ سٹکھ کے لئے بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے تمام انتظامات بڑی خوش اسلوبی سے کئے تھے۔ آج کے دور میں پاسپورٹ ویزے کے بغیر ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہونا آسان نہیں ہوتا لیکن ان لوگوں نے سٹکھ پور سے تھائی لینڈ تک کا سفر کیا تھا۔ وہ ملک کی سرحد پار کی تھی لیکن راستے میں کسی نے ان سے پوچھا تک نہیں تھا۔

اس رات خوشنیت سٹکھ کے مکان پر کم کے آدمیوں کے چلنے کے بعد پر تاپ سٹکھ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ وقت ضائع کے بغیر وجدان کو لے کر سٹکھ پور سے نکل جائے گا۔ اس سلسلے میں کم کے دو آدمی مارے گئے تھے۔ اگلا سارا دن پولیس کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے گزرا تھا اور اس سے اگلے روز پر تاپ سٹکھ نے سٹکھ پور سے نکلنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ سیدھے سارے طریقے سے جائے گا تو دارا اور کم کے آدمی اسے سٹکھ پور سے نکلے بھی نہیں دیں گے۔ وہ دو دن تک معلومات حاصل کرتا رہا اور پھر اپنے ایک پرانے جاننے والے کے ذریعے اسے عمر عبدالرحمن کے پاس میں چلا گیا۔ عمر سے ملاقات ایک ریستورنٹ میں ہوئی تھی۔ پر تاپ کو اسے پوری بات بتائی پڑی تھی کہ وہ اس طرح چوری کیے چھپے سٹکھ پور کیوں چھوڑنا چاہتا ہے اور اس طرح بھینس بدلنے کا مشورہ عمری نے دیا تھا۔

پر تاپ سٹکھ اس مشورے پر ہنسنے لگا کہ وہ کیا تھا۔ واڈھی اور کیس اس کے دھرم کا حصہ تھا لیکن جب ٹھنڈے دل سے سوچا تو

اسے یہ مشورہ ماننا ہی پڑا تھا۔ وجدان کی جان بچانے کے لئے یہ قربانی دینی پڑی اور پھر عمری کے مشورے پر اس نے سٹکھ پور بھی چلے بدل ڈالا۔ اس کی ناک اور کان چند دوائے گئے تھے۔ بہت شیشیا تھا۔ لڑکیوں والا لباس پہننے کے بعد تو وہ بالکل فراموش لگ رہا تھا۔

کم کو بھی کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ وہ سٹکھ پور فرار ہوئے ہیں۔ اس نے کوالا پور میں ان کا پیچھا کیا۔ پر تاپ سٹکھ سوچنا ہوا کہ اگر وہ لوگ ان بدلے ہوئے حلیوں میں نہ ہوتے تو کم اور جی فانک انہیں دیکھتے ہی گولیوں سے بھون ڈالتے لیکن وہ انہیں گولی نہیں سکے تھے اور کم نے تو میزبانیوں پر نہ صرف وجدان کو سوار دے کر اٹھایا تھا بلکہ اس کا گال بھی چتھپایا تھا۔ وہ اس وقت انہیں نہیں پہچان سکا تھا لیکن ہوٹل سے جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ سٹکھ پور سے آئے والا ایک آدمی اور بارہ تہ سال کی لڑکی یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ ابھی ابھی ریلوے اسٹیشن پر ہیں تو اسے شبہ ہوا اور اس نے ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑا۔ وہی تھی کراس موقع پر بھی عمر عبدالرحمن کی ذہانت کام آئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر بچ نکلے تھے لیکن پر تاپ سٹکھ کو یقین تھا کہ اگر جی فانک ان کے پیچھے ہنگام بھی ضرور آئیں گے۔

عمر عبدالرحمن ایک ذریعہ ٹھنڈا ان کے پاس کرے میں رہا تھا۔ اس نے سان پھو نامی ایک شخص کا فون نمبر دیا تھا کہ اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو اس سے رابطہ کر لیا جائے۔ عمر عبدالرحمن کے جانے کے بعد پر تاپ سٹکھ نے کم کے دروازہ بند کر دیا اور سوٹ کیس میں سے اپنے کپڑے اور شیشیہ کٹ نکال کر باغد میں دم کھس گیا۔ وہ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد اپنے دوم سے نکلا تو اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔

”چل جی کاکے تو بھی ناکر کپڑے بدل لے پھر کھانا کھا چلیں گے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے وجدان کو کڑی سے اٹھا کر باغد دوم کی طرف دھکیل دیا۔

”میں ناکر اپنے کپڑے پہنوں گا چاہا۔“ وجدان بولا۔

”نہیں۔ ایک دو دن جیسے ایسے ہی کپڑے پہننے پڑیں گے میں بندوبست کر رہا ہوں۔ اس کے بعد تو جو کپڑے مرضی آئے ہوں۔“ پر تاپ سٹکھ نے یہ کہتے ہوئے سوٹ کیس میں سے ایک اد خوبصورت فرما کٹھن کر بیڑ پر پیچیک دی۔

وہ تقریباً نو بجے ہوٹل سے نکلے۔ قرب وجوار میں واقع ایک ریستورنٹ میں بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور پھر ریستورنٹ سے نکل کر وہ ایک طرف چلے گئے۔ پر تاپ نے وجدان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس وقت بھی ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور سڑکوں کا خاصی رونق تھی۔

وہ مختلف ذیلی سڑکوں پر گھومتے ہوئے ایون چالی پانچ آگئے۔ اس سڑک پر بھی بڑے بڑے اسٹور اور شاہک سٹور

رک گیا۔ سڑک کی دوسری طرف ریڈی میڈ پر تاپ ایک جگہ رک گیا۔ ایک بہت بڑی دکان تھی۔ اس دکان کا شخص اور ٹریفک کی ایک بہت بڑی سال پہلے سٹکھ پور میں ہوا کرتا تھا۔ ایک ایک سٹکھ کی ٹریفک کی دکان کھول کر تھی مگر اسے زیادہ کامیابی دہاں بھی اس نے ٹریفک کی دکان کھول کر تھی مگر اس نے ایک چھوٹی سی دکان کھول کر تھی اور اب ایک بہت بڑے گارشن اسٹور کا مالک تھا۔ ٹریفک کے خوالے سے بھی وہ ہنگام میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ پر تاپ سٹکھ اپنے بڑے سلسلے میں جب بھی ہنگام آتا تھا سٹکھ سے ضرور ملتا تھا۔ اس وقت بھی اتم سٹکھ اس سے بڑے پناک سے ملے۔

”تم تو مجھے تمہاری کوئی اولاد نہیں۔ یہ لڑکی کون ہے؟“

اتم سٹکھ نے پوچھا۔

”یہ لڑکی مجھے اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز ہے۔“ پر تاپ سٹکھ نے جواب دیا۔ ”تم نے ابھی مجھ پر کھڑا کیا تھا کہ میں نے واڈھی اور کیس کیوں منڈوا دیے ہیں۔ تو یہ سب کچھ اسی کی خاطر ہے اور یہی لڑکی تھی۔“

پر تاپ سٹکھ اچھل پڑا۔

پر تاپ سٹکھ چند لمبے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے بتانے لگا کہ اس نے اپنی واڈھی اور کیس کی قربانی کیوں دی تھی اور اس کے کاٹے تبدیل کیوں کیا تھا اور یہ کہ وہ سٹکھ پور سے ہنگام کر رہا تھا۔

”وہ؟“ اتم سٹکھ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ ہنگام میں صرف ایک ایسا شخص ہے جو اس سلسلے میں تھائی بند کر سکتا ہے۔“

”وہ کون؟“ پر تاپ سٹکھ نے پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مہاراج داگم دنگ یا ہے۔“ اتم سٹکھ نے جواب دیا۔ ”وہ ایک بھکشو ہے لیکن اسے تھائی لینڈ میں مومے تھائی لک بانگ پر اٹھائی سمجھا جاتا ہے اور اس کی عمر اس وقت اگرچہ ستر برس کے قریب ہے لیکن وہ جوانوں سے زیادہ دھیر پٹلا اور طاقتور ہے۔ بیک وقت لڑنے والے دو چار آدمیوں کو تو وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ کئی سال پہلے میں نے بھی مومے تھائی لک بانگ کا فون اس سے سیکھا تھا لیکن آج کل اس سے ملنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔“

”کیوں؟“ پر تاپ سٹکھ نے اسے گھورا۔

کھل گیا۔ ”پر تاپ سٹکھ نے کہا۔

”ہولام پھوگم ریلوے اسٹیشن سے ذرا آگے ٹرمیٹ ٹرین ہے۔“ اتم سٹکھ نے بتایا۔ ”بہت بڑا ٹرین ہے۔ دوڑانہ بڑا اور اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ رات کو کوشش کی جاسکتی ہے۔ تم آگے بڑھ کر مکمل اسی وقت میرے پاس آجانا۔ میں اس کے ایک شاگرد ماسٹر پھوگم سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے کچھ آسانی ہو جائے۔“

”تو ٹریفک ہے۔ میں کل آؤں گا۔“ پر تاپ سٹکھ نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اتم سٹکھ کی دکان سے نکل آئے۔ وجدان تھکا ہوا تھا اور سونا چاہتا تھا۔ پر تاپ سٹکھ اسے لے کر ہوٹل واپس آیا۔

دوسرے دن وہ پھر اتم سٹکھ کی دکان پر پہنچ گیا لیکن اسے مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اتم سٹکھ نے بتایا کہ ماسٹر پھوگم مومے تھائی کے ایک مقابلے میں حصہ لینے کے لئے چینگائی مانی گیا ہوا ہے اور اس کی واپس تین دن بعد ہوگی۔

پر تاپ سٹکھ وجدان کو لے کر دکان سے نکل آیا۔ کچھ ہی فاصلے طے کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ خطا انداز میں اطراف میں دیکھا تھا لیکن تین تینوں لوگوں کی موجودگی میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ان کا تعاقب کون کر رہا تھا۔ پر تاپ سٹکھ کی چھٹی حس اسے کسی قسم کے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ وجدان کو لے کر ہوٹل واپس آیا۔

وہ کمرے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ ہو سکتا ہے اس کا وہم ہو لیکن رات ایک بجے تصدیق ہو گئی کہ یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ کمرے میں ایک طرف رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا تھا۔ یہاں اسے کون فون کر سکتا ہے پھر خیال آیا کہ شاید اتم سٹکھ نے داگم دنگ سے ملاقات کا بندوبست کر لیا ہو اور اسے اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہو۔ اس نے بیڈ پر سوئے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

”آپ کے لئے کال ہے مسٹر سٹکھ۔“ یہ ہوٹل کی آپ بٹری کی آواز تھی۔

چند لمبے خاموشی رہی اور پھر ایک اور آواز سنائی دی۔ ”میں دارا بول رہا ہوں پر تاپ سٹکھ۔ تم میری نظروں سے چھپ کر کیس نہیں جاسکتے۔ کوالا پور میں کم سے حفاظت ہو گئی تھی۔ وہ تمہیں اور وجدان کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔ تم نے اس لڑکے کی خاطر اپنے دھرم کے اصولوں کی خلاف ورزی کر کے واقعی بہت بڑی قربانی دی ہے اور تم نے اس کا طبع بھی خوب بدلا ہے۔ کم جیسا ہنگام آدمی دھوکا کھا گیا لیکن دیکھ لو، ہم نے تمہیں ہنگام بچنے کے دوسرے ہی دن تلاش کر لیا۔“

مارشل آرٹ

کراٹے

ابتدا سے بلیک بیلٹ  
تک کی مشقیں

ان لوگوں کے لئے جو تنہا یا کسی  
ایک ساتھی کے ساتھ کراٹے سیکھنا  
چاہتے ہیں۔

اردو میں پہلی بار کراٹے سکھانے  
کی ایک مکمل اور آسان کتاب

قیمت 40 روپے  
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ پندرہ  
گلی میٹرو اور سال کریں

مکتبہ تنسیات  
ہندوستان 1990ء میں زکوٰۃ اور خیرات کی رقمیں جمع کروائی گئیں  
7420991  
0902552-0902513  
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ پندرہ  
گلی میٹرو اور سال کریں  
14-2001  
kitablat@hotmail.com  
kitablat1970@yahoo.com

سانے بہت وسیع و عریض تھیں۔ دائیں طرف میکوڈا کی  
طرز کی ایک مختصر عمارت تھی اور سامنے صحن کے اس پار ایک  
بہت بڑی عمارت تھی۔ پر تاب ویدان کو کھینچتا ہوا پہلے دائیں  
طرف والی عمارت کی طرف دوڑا۔ ٹھیک اسی لمحے تعاقب کرنے  
والی وہ کار گیسٹ کے سامنے رکی اور دو آدمی اتر کر گیسٹ کی طرف  
دوڑے۔ پر تاب غصہ مگر مرکزی عمارت کی طرف دوڑا۔  
بھاگ دوڑ کر آوازیں سن کر پہلو والی چھوٹی عمارت کا ایک  
دروازہ کھلا اور ایک ہلکھو متابی زبان میں چیخے لگے۔ پر تاب غصہ  
اس کے چیخنے کی پروا کے بغیر مرکزی عمارت کی طرف دوڑا رہا اور  
پھر فضا ہنگامی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں  
پر تاب غصہ اور ویدان کے آس پاس سے گزر گئیں۔

مرکزی عمارت کا شیشہ والا بلند دروازہ کھل گیا۔ شاید کوئی  
ہلکھو پر آتا چاہتا تھا کہ فائرنگ کی آواز نے اسے اندر ہی رہنے پر  
مجبور کر دیا۔ پر تاب غصہ ویدان کو کھینچتا ہوا دروازے میں داخل  
ہو گیا۔ سامنے چوتھے پر فائرنگ بندھا دھا کا بہت بڑا ہجمہ تھا۔

فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں  
پر تاب غصہ کی پشت میں بوسٹ ہو گئیں۔ اس کے منہ سے نکلنے  
والی نیچری خوفناک چی۔ وہ لڑکھڑکیا۔ اس نے ویدان کو اپنے  
سامنے کھینچ لیا اور پھر اس طرح گرا کہ ویدان اس کے نیچے دب  
گیا۔ ویدان کے منہ سے بھی ایک خوفناک چی نکلی تھی۔  
فائرنگ رک گئی۔ صحن میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں  
سنائی دیں اور پھر بڑی جگت میں کار کے روانہ ہونے کی آواز سنائی  
دی۔

ویدان پر تاب غصہ کی لاش کے نیچے دبا ہوا چی رہا تھا۔ اس  
نے ایک بار پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اس کا  
دماغ لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر چیخنے کی کوشش کی مگر آواز اس  
کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی  
پھیلنے لگی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ویدان کو جب دوبارہ ہوش آیا تو اس کا سر ایک بوڑھے آدمی  
کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ بوڑھے آدمی کی طرح کی داڑھی، مونچھوں کی  
جگہ بے زخمی سے ٹھکے ہوئے چند بال، رخساروں کی بڑیاں  
ایک ہی آدمی کی اور اس بوڑھے شخص کی آنکھوں میں عجیب سی شیش  
تھی۔

وہ سماراج وانگ دھنگیائے تھا۔

وانگ دھنگ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس  
نے ویدان کو گود میں اٹھالیا اور دھا کے ہتھکے کے سامنے سے ہونا  
ہو ایک طرف پلٹے لگا۔ ویدان عجیب سی نظروں سے اس کے  
چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

پر تاب کی طرف بڑھا دیا۔ ”جھپٹی گلی میں سفید رنگ کی ایک  
کھڑکی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہیں یہاں سے جانے کے لئے  
کی ضرورت پڑے گی۔ میں یہ چابی چرا کر لایا ہوں۔ کار تمہیں  
پھوڑ دینا اور۔“

”خوش کیٹا ای۔“ پر تاب غصہ نے چابی لے لی اور اس  
مطلب سمجھتے ہوئے میں ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال کر اس  
ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ اینڈنٹ کھتا ہوا باہر نکل گیا۔  
پر تاب غصہ بھی ویدان کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکلا۔  
اس اینڈنٹ کے پیچھے دے قدموں مختلف راہداریوں میں  
رہے اور بالا خرہ عقیقی زینے سے نیچے آگئے۔ اینڈنٹ نے  
آہستگی سے دروازہ کھول دیا اور گلی میں آکر چند گز دور کھڑی ہوئی  
سفید کار کی طرف اشارہ کر دیا۔ گلی میں کچھ اور بھی کاریں کھڑی  
تھیں۔ پر تاب غصہ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ویدان کو  
تقریباً گھینٹتا ہوا لے گیا اور کار کا دروازہ کھول کر ویدان کو کچھ  
سیٹ پر لٹا دیا اور خود اسٹرک کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ  
کر دیا۔

کار گلی سے نکل کر سو سم وٹ روڈ پر مڑی سی تھی کہ تقریباً  
پچاس گز دور کھڑی ہوئی ایک اور کار کا انجن اسٹارٹ ہوا اور  
پر تاب غصہ کی کار کے پیچھے لگ گئی۔

پر تاب غصہ نے اس کار کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی کار کی رفتار  
بڑھاتا چلا گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے ایکسپریس دے ہو کر لگا  
پھلن چٹ روڈ پر نکل آیا اور پھر کڑھ روز ریلوے اسٹیشن سے  
تیسری بجن راستوں سے آیا تھا۔ کار کو انہی راستوں پر گھمانا  
اگرچہ رات کے دو بج چکے تھے لیکن بعض سڑکوں پر اکاد کا گاڑوں  
کی آمد رفت جاری تھی اور پر تاب غصہ کم از کم دو مرتبہ جاہل  
شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔

فاصلہ اگرچہ بڑھ گیا تھا لیکن وہ کار بدستور تعاقب میں لگ  
ہوئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے آگے نکل کر اس نے کار بڑھاتے  
روڈ پر موڑ دی اور پھر بڑی تیزی سے اسے ایک تنگ سی گلی میں گھر  
دیا۔ اس طرح وہ وقتی طور پر تعاقب میں آنے والی کار کو جھٹکا  
دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

وہ کار کو کھما کر ایک اور گلی میں لے آیا۔ اس طرف بھی  
ٹریفک شل کا ایک گیٹ تھا۔ اس نے کار روک کر کھینچ بیٹھ  
ویدان کو اتار دیا اور اس کا بازو پکڑ کر گیسٹ کی طرف دوڑا۔

وہ موٹی موٹی آہنی سلاخوں والا بہت بڑا گیٹ تھا جو اس وقت  
بند تھا۔ گیٹ کے اوپر تیرہ روشنی کا مرکزی بلب جل رہا تھا۔ گیٹ  
بائیں طرف لوہے کی سلاخوں سے ایک تنگ سارا راستہ بنا ہوا  
جس سے یہ مشکل دو آدمی پہلو پہلو گزر سکتے تھے۔ پر تاب غصہ  
ویدان کو کھینچتا ہوا اس راستے سے اندر داخل ہو گیا۔

”تم جو کچھ بھی کرو لیکن جب تک میں زندہ ہوں، تم اس  
لوہے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن مجھے واقعی حیرت ہے تم نے نہیں  
تلاش کیے کر لیا۔“ پر تاب غصہ بولا۔

”بنا کا جیسے شہر میں جہاں انسانوں کا جنگل آباد ہے، کسی کو  
تلاش کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“ دارا نے جواب دیا۔  
”مجھے یقین تھا کہ تم یہاں اپنی ہی برادری کے کسی آدمی سے رابطہ  
کرنے کی کوشش کرو گے۔ یہاں کم کے تعلقات کام آئے اور اس  
نے اپنے مقامی دوستوں کی مدد سے بعض سیکور کی فکرائی شروع  
کر دی اور اس طرح تم ہماری نظروں میں آگئے۔“ چند لمحے خاموشی  
رہی پھر کہا گیا۔ ”میں تمہیں صبح دس بجے کا وقت دے رہا ہوں۔  
اگر تم اس لوہے کو میرے حوالے کر دو تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے  
گا۔ بصورت دیگر تم دونوں کو کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔“

”تم جو کچھ بھی کرو۔ میری لاش پر سے گزر کر ہی تم لوہے  
تک پہنچ سکو گے۔“ پر تاب غصہ نے جواب دیا اور مزید کچھ سے بغیر  
ریسیور رکھ دیا۔

اس نے سوچنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ  
دروازے سے باہر نکل کر ادھر ادھر جھانکنے لگا اور محتاط انداز میں  
چتا ہوا راہداری کے موڑ پر پہنچ گیا جہاں ٹائٹ سروس کا ایک  
اینڈنٹ کرسی پر بیٹھا اور کچھ رہا تھا۔ پر تاب غصہ نے اسے کندھے  
سے ہلایا۔ ہونٹوں پر اٹکی رکھ کر اسے خاموش رہنے اور اپنے ساتھ  
آنے کا اشارہ کیا۔

”کچھ نامعلوم لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی  
ابھی فون پر دھمکی دی ہے۔ مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت  
ہے۔“ پر تاب غصہ نے یہ کہتے ہوئے جیب سے بیس امریکی ڈالر کا  
نوٹ نکال لیا۔

”میں ٹائٹ سپروائزر کو بتاتا ہوں۔ وہ پولیس کو بلا لے گا۔“  
اینڈنٹ نے کہا۔

”پولیس میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“ پر تاب غصہ نے کہا۔  
”وہ لوگ سنگا پور سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم میری مدد اس  
طرح کر سکتے ہو کہ مجھے کسی کی نظروں میں آنے کے بغیر یہاں سے نکلنے کا  
کوئی راستہ بنا دو۔ یہ بیس امریکی ڈالر تمہارا انعام ہو جس کے بدلے  
کی فکرت نہ کرو۔ ایک ہفتے کا ایڈوانس دیا ہوا ہے۔“

اینڈنٹ کچھ دیر ہچکچایا پھر اس نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ  
لیا اور اسے وہیں رکھنے کا اشارہ کر کے کمرے سے نکل گیا۔ پر تاب  
غصہ نے ویدان کو جگا دیا۔ وہ اس طرح جگائے جانے پر کچھ بدحواس  
سا ہو گیا تھا۔

”مرمت کے ان فرشتوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔“ پر تاب  
غصہ نے کہا۔ ”ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ ایک محفوظ جگہ پر۔“  
وہ اینڈنٹ تقریباً پندرہ منٹ بعد واپس آیا تھا۔  
”میرے ساتھ آؤ اور یہ چابی رکھ لو۔“ اس نے ایک کی رنگ



مارنا چاہتے ہیں۔ "وجدان نے گلو گرفتہ آواز میں کہا۔

”کون ہیں وہ لوگ؟ تم نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟“ مہاراجہ پوچھا۔

ان لوگ ہیں۔ انہوں نے میرے ماں باپ کو بھی مارا قتل  
 مجھے بھی مارا تو چاہتے ہیں۔ چاچا پر تاب لگے تھے جس نے اسے  
 رہا۔ انہوں نے سڑکا پور میں کسی آدمیوں کو قتل کر دیا۔  
 پولیس بھی میری حفاظت نہیں کر سکی۔ میں جہاں جاتا، وہاں  
 ڈھونڈ لیتے۔ چاچا پر تاب مجھے یہاں لے آیا، نگاہ میں۔  
 مدارج وانگ دنگ بائے کے پاس لے جاتا چاہتا تھا لیکن اس نے  
 پہلے کہ ہم مدارج تک پہنچے، دشمنوں نے ہمارا سر مارا  
 اور... وہاں پوری نہیں کر سکا۔ بچیاں لینے لگا۔  
 مدارج وانگ دنگ بائے اس کی بات سن کر کہنے لگا:

”اس کا خیال تھا کہ سماراج ہی ایک ایسا آدمی ہے جو  
 اس کے لیے سب سے بہتر ہے۔“

ایک دوست کے ذریعے کوشش کی تھی لیکن پتا چلا کہ ہمارا نام

ملنا بہت مشکل ہے۔ اس نے ہمارا جے ایک تارو پھول  
سے ملنے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ بھی بنکا ک سے باہر گیا ہوا ہے۔

”دلچسپ“ مہاراج وانگ وانگ یائے کی آنکھوں میں  
ابھر آئی۔ وہ مات حاری رکھتے ہوئے بولا ”برتاب سنگھ کی توہان

سے ملاقات کی خواہش پوری نہ ہو سکی مگر تم خوش قسمت ہو۔

یائے اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔“

وجدان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی پتلیاں  
گئیں۔ اسے یہ بوڑھا پہلے سے زیادہ پراسرار نظر آ رہا تھا۔

”ملا رُجھ جانے بھائی چارے اور امن و آشتی کا دور رس ہو گا۔“  
لوگ ان کی تعلیمات کو بھول گئے۔ شیطان کے جال میں آئے۔

اچھائی کو بھول کر برائی کی دلدل میں دھستے جا رہے ہیں۔

خون کی نڈیاں برسہا برسہا رہی ہیں اور محبوت کا ہوں میں کیا۔  
 کے خون کے چھینٹے اچھالے جا رہے ہیں۔ ”مہاراج بات“

کرتے رک کیا پھر وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

باتوں میں سچائی کی ہرک محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے تفصیل ہے۔

سب کچھ۔ وہ لوگ کون ہیں اور تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟  
اگر تم، انک، جنگ بائے کی نظر دو، میرے گناہ ہوئے تو بدیہ!

سے بڑی قوت کا ہاتھ بھی تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ نہ

و بعد ان چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا کہ

میں فرشتے کی رو سے پاتھم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
 "سہائی ڈی ریو" میں بوجھا تھا کہ اب وہ کیا ہے یا کیا

و بعد ان کے ساتھ واپس رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے بچے کو بھوکے اور تھکے ہوئے دیکھا۔

سمت تھا۔ اس وقت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ پانچنگ نے

وہ جان اس مرتبہ بھی ہونفوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہا۔  
 ذراک حملہ اور کہا۔ وہ جان اس مرتبہ بھی کچھ نہیں سمجھ

اس نے جلدی سے اٹھ کر دیوارہ کھول دیا۔ وہی بوڑھا تھا جو

ہمارا راج واپس آئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے محال  
زبان میں کچھ کہا لیکن وجد ان کے کوئی جواب نہیں دیا۔

مہاراج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ اور اندازِ مخاطب بہت مہربانہ تھا۔

”اے لیس!“ وجدان جلدی سے بولا ”چاچا پر تاب کیا

بات جواب دینے کے بجائے کہا پھر پتہ تک سے تعالیٰ زبان میں  
کہہ کہا اور نوازے کی طرف مڑ گیا۔

میں اور بعض ننگ ایک موقع پر وہ پانچ چھ بیڑیاں بھی اترے  
تھے اور پھر ایک رابا، کا مٹک، جوتہ، کھانا، لٹیرے

آتش فشاں

کون سی جگہ تھی۔ یہ خانے اور راہداریاں۔۔۔ اسے اگرچہ ان راہداریوں اور یہ خانے سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اس

اس کے ساتھ بڑے ہمدردانہ طریقے سے پیش آئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے سلا تا تھا اور اس کا لباس تبدیل کرتا تھا۔

اسی ایک چپوڑے پر بڑھ کر ایک چپوڑا سا اسے سب سے ایک طرف دیوار کے ساتھ سیاہ پتھروں کا ایک لمبا سا چوڑا تھا جس کے

دوسری طرف ریک تھے جو کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ بوڑھے نے وجدان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سیدھی تھی۔ معمولی سا جھاڑ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہوا تھا؟" مہاراج داگم وگم یائے نے پوچھا۔

کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا  
لڑکے تمہارا چاہا اب اس دن نام نہ نہیں ہے اس کا جسم گولوں

پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔ وہ بھٹی بھٹی سی نظروں سے بوڑھے کی

میں۔ پورے مہاراج وانگ دنگ یائے نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا اور بڑی آہستگی سے فرش پر لٹا کر اس کے چہرے پر پانی

رنگت ایک دم بدل گئی تھی۔ سہارا ج نے الماری میں سے ایک

لیا جاتا ہے اور یہی ہوتی ہے۔  
حصہ 1

”جب سگا پور میں رہنا مشکل ہو گیا تو چاچا پر تاب ٹھکے جس بدل کرنتے میاں لے آئے۔ پہلے ہم کو الالہ پور آئے تھے کہ ہماری تلاش میں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ہم بال بال پہنچے تھے۔ اسی رات ہم چوری چھپے کو الالہ پور سے نکل آئے تھے اور آج رات...“ میں خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مہاراج داگ ونگ یاے کو دیکھتا ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”آج رات میں گہری نرسو ہوا تھا کہ چاچا پر تاب ٹھکے نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس نے بتایا کہ دارا نے ہمارا سراغ لگالیا ہے اور ٹیلی فون پر دھمکی دی ہے کہ صبح دس بجے سے پہلے پہلے مجھے اس کے حوالے کر دیا جائے بصورت دیگر وہ چاچا پر تاب کو بھی ہلاک کر دے گا۔ چاچا پر تاب نے ہوٹل کے دیگر کچھ رقومے کے ایک گاڑی کا انتظام کر لیا تھا۔ ہم چور چھپے ہوئے تھے۔ فرار دے تھے مگر انہیں پتا چل گیا اور ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ چاچا پر تاب کا خیال تھا کہ اس خفاخہ میں داخل ہو کر ہم ان سے بچ جائیں گے لیکن موت نے چاچا پر تاب سگہ کو جھٹ لیا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ میرے ڈیڑی سے کیا ہوا وعدہ بھانے کے لیے اس نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اپنے مذہب تک سے بغاوت کر ڈالی تھی۔ اس نے داڑھی اور کیس منڈوا دیے تھے۔ مجھے د راس سے بچانے کے لیے بالآخر اس نے اپنی جان بھی دے دی۔ اس نے میرے مرتے ہوئے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہے گا مجھ پر آج نہیں آئے دے گا۔ وہ واقعی مجھ پر زندگی کا سایہ بن کر رہا اور اب...“ میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ لگے تھے اور پھر میں نکلیں سے رونے لگا۔

مہاراج داگ ونگ ونگ یاے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”زندگی نامی نشیب و فراز کا ہے۔ اچھے برے وقت انسان پر آتے ہی رہتے ہیں۔ دشواریوں پر قابو پانا ہی حوصلہ مندی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ تم کم عمری میں ہی مشکلات کے بھنور میں پھنس گئے ہو اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تم ایک حوصلہ مند بچے ہو۔ نہیں۔ میں تمہیں سچے نہیں کہوں گا۔ تم تو ایک بہادر اور دلیر نوجوان ہو۔ اب تم میری پناہ میں آگے ہو۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کا سایہ بھی تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ میں تمہاری ان باتوں میں فلاح بردوں گا۔“

”لیکن مہاراج...“ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”دارا جنگ میں موجود ہے۔ اگر اس نے مجھے تلاش کر لیا تو...؟“

”نہیں۔ وہ اب تمہیں تلاش نہیں کر سکے گا۔“ مہاراج نے جواب دیا ”وہ تمہیں اس وقت تک تلاش نہیں کر سکے گا جب تک میں نہیں جا ہوں گا۔“

”کیا میں پر تاب چاچا کو دیکھ سکتا ہوں مہاراج؟“ میں نے کہا

”اس کا میاں کوئی نہیں ہے۔ اس کی آخری رسومات کر کے گئے۔“

”اس کا انتظام ہو جائے گا۔“ مہاراج نے کہا ”میں بہت ہو چکی ہے۔ پولیس نے پر تاب ٹھکے کی لاش اسپتال لائی تھی۔ صبح میں تحسین اسپتال لے جاؤں گا۔ آخری وارڈنگ کو۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔“

وہاں سونے کے لیے فرش ہی تھا جس پر چادر بھی نہ تھی۔ مہاراج داگ ونگ ونگ تو اٹھ کر اس چوڑے پر لیٹ گیا تھا۔ دیکھتے ہی بندہ تصور کر لیا تھا۔ میں فرش پر بھی ہوئی چادر پر لیٹ کر سونے کے لیے ایک موٹی سی کتاب اٹھا کر سر کے پیچھے رکھ لی۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن تین منٹ بھی آخر سے کوسوں دور تھی۔

دارا کا فون آنے کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکلے تھے تو وقت رات کا ڈیڑھ بجے والا تھا اور اب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بچا ہو گا۔ کمرے میں نہ تو کوئی گھڑی تھی اور نہ ہی کوئی یادداشت دان جس سے باہر کی فضا دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گردن گھر۔ مہاراج کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے چوڑے پر لیٹے سو گیا تھا۔ اس کے گھبروں بھرے چہرے پر غمایت سی گئی تھی بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پوچھا شخص کس طرح اطمینان سے پڑے سو گیا تھا۔ مجھے نیند نہ آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ کرنی لگے چھ رہا تھا۔

میں بڑے تازہ دم میں پڑا تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے مجھے ماں باپ کی تماشہ توجہ حاصل تھی۔ انہوں نے میری آرام اور آرام کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ میری ہر خواہش پوری جاتی۔ مجھے ذرا سی تکلیف ہوتی تو وہ دونوں تپ اٹھتے تھے اچھے طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ گلی میں سناٹا چلائے ہوئے میں گڑے تھا۔ میرے بازو اور گھٹنوں میں رگڑ لگتے۔ خوف دے لگا تھا۔ حالانکہ زیادہ تکلیف نہیں تھی لیکن می بدحواس تھیں۔ ڈانٹے فوراً ہی ڈانٹ کر پاس۔ گئی تھیں۔ ڈانٹنے میری رگڑ لگائی تھی کمال پرال۔ دو الگ الگ کمرے کی تسلی دی تھی کہ معمولی بات ہے ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور مجھے بھی یاد ہے کہ اس کے کئی دنوں تک ہی اپنے ہاتھ سے میرا منہ ہاتھ دھلائی اور اپنے ہاتھ سے لکھا کھلائی دی تھیں۔

میں باپ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اولاد کی معمولی سی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ میرے ماں باپ نے میرے بڑے تازہ دم اٹھائے تھے اور اب میں ننگے فرش پر پڑا کوئی بدلے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے نیند نہ آنے کی ایک بڑی وجہ تھی کہ میرا داغ اس وقت منتشر خیالات کی آماجگ بنا ہوا تھا۔ بات بھی دھمکے سے نہیں سوچ پایا تھا۔ پر تاب ٹھکے کا خیال

سے بیاں بھرنے پر مجبور رہا تھا اور جب دارا اور کم کا خیال آتا تو سب کاپ آتی۔ میرے خیال میں وہ دنیا کے سفاک ترین مداح تھے۔ انہوں نے جس طرح میرے ماں باپ کو قتل کیا تھا وہ انسان تھے۔ میرا دل کاپ اٹھتا تھا۔ اور اس کے بعد تو وہ موت بھڑک کر کے میرا دل پیچھے لگ گئے تھے۔ کتنے کتنے ہوئے تھے کہ فرشتے کی طرح میرے سامنے آتے تھے مگر میں ہر مرتبہ پچتا رہا تھا۔ مجھ پر کتنے بے گناہ داسے کئے تھے مگر میں ہر مرتبہ پچتا رہا تھا۔

پر تاب ٹھکے واقعی مجھ پر زندگی کا سایہ بنا ہوا تھا اور اب وہ سایہ بہت کم تھا۔

پر تاب ٹھکے مجھے سگا پور سے بھا کر لے آیا تھا اور یہاں اس کے دوست اتم ٹھکے نے اسے مہاراج داگ ونگ یاے سے ملنے کو کہا تھا۔ اس کے خیال میں مہاراج واحد شخص تھا جو ہمیں دارا اور کم سے بیڑوں سے نجات دلا سکتا تھا۔ پر تاب اپنی زندگی میں تو مہاراج تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی موت نے مجھے مہاراج داگ ونگ یاے کو سونپ دیا تھا۔

چاچا پر تاب ٹھکے میرا ساتھ چھوڑ چکا تھا اور اب میں مہاراج داگ ونگ یاے کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ پوچھا ابتدا ہی میں میرے لیے ہر اسرار ثابت ہوا تھا۔ اس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ وہ تو خدائے کدور سالگ رہا تھا وہ شاید خود دو برسوں کی مدد کا محتاج تھا۔ میری حفاظت کیا کرے گا لیکن وہ جس طرح پتھر کے چوڑے پر اطمینان سے سو رہا تھا اس پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

میری آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔ داغ میں غبار سا بھرتا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تمام خیالات کو ذہن سے جھٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور بالآخر وقت کو بچھ پر رحم آگیا اور میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

اور پھر مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے اوپر جھکا ہوا ہو۔ سانس میرے چہرے سے گھرا رہی تھی اور بڑی سمجھو کن سی محک میرے تنھوں سے گھرا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اس چہرے کو فور سے دیکھ لگا جو میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ نیند کا شمار بہت آہستہ آہستہ لگا اور میں نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ وہ پاتونگ تھی۔ پڑا حسین چہرہ تھا اس کا اور بڑی دل قریب مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ کسی قدر پیچھے ہٹ گئی۔

”اباں جاؤ...“

میں اس کی بات کا مطلب تو نہیں سمجھا لیکن جب سیدھے ہاتھ کو ایک مخصوص انداز میں حرکت دی تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ناشتے یا کھانے کو کہہ رہی ہے۔

”نام کیا ہوا ہے؟“ میں نے کلائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”پاتونگ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عجیب عورت تھی۔ میں نے وقت پوچھا تھا اور وہ مجھے گانے

کہہ رہی تھی۔ میں نے پھر کلائی کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ایک بار پھر ”گانے“ کہا اور اس مرتبہ اس نے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اور دوسرے ہاتھ کی چار انگلیاں میرے سامنے کر دیں۔ میرے منہ سے بے اختیار گھبراہٹ سا سانس نکل گیا۔ وہ مجھے گانے کو نہیں کہہ رہی تھی بلکہ وقت بتا رہی تھی۔ نو بجے تھے پھر اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا اور اس کمرے سے باہر لے گئی اور مختلف راہروں میں گھومتے ہوئے مجھے اس ہاتھ روم میں لے آئی جہاں پہلے میں غسل کر چکا تھا۔

میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے اسی خوشبودار سیال کے چند قطرے پانی میں پکا دیے اور مجھے اشارہ کیا۔ اس مرتبہ اس کے سامنے کپڑے آگے آگے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوئی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر دو دروازے کے قریب لے گیا اور باہر دھکیل دیا دروازہ بند کرتے ہوئے مجھے اس کے پیچھے سے قہقہے کی آواز سنائی دی تھی۔

میں نے جسم پر ساری کی طرح لیٹی ہوئی چادر اتار کر ایک طرف ٹانگ دی اور بپ میں گھس گیا۔ ٹھنڈے اور خوشبودار پانی میں غسل سے میری ساری کسل مندی دور ہو گئی۔

میں نے نکل کر میں نے تو لیے سے جسم خشک کیا اور بڑی چادر دھوئی کی طرح لیٹ کر باہر آگیا۔ پاتونگ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی اور میری وہ چادر تبدیل کر دی۔ دوسری چادر پہلے جیسے مخصوص انداز میں لیٹی گئی تھی۔

وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آئی۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا جہاں تقریباً دو فٹ چوڑی لمبی لمبی لاندھامیزیں چھپی ہوئی تھیں۔ میزوں کے دونوں طرف کھڑکی کے پیچھے رکھے ہوئے تھے۔ چند بکشتوں پر بکشتوں پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ یہ اس واٹ (خفاخہ) کا ڈانٹنگ ہال تھا جہاں اس واٹ کے بکشتوں کھانا کھاتے تھے۔ ان میزوں کی تعداد اور لمبائی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس خفاخہ میں کتنے بکشتوں ہوں گے۔

پاتونگ نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور پچھلے سے میرے لیے ناشتا لے آئی۔ دو تین چیزیں تھیں جو میری کچھ میں نہیں آسکتیں۔ میں نے سمجھا جیسی ایک چیز اٹھا کر کھائی۔ اس کا ذائقہ بھی سمو سے جیسا تھا۔ میں نے اس سمو سے اور ایک پیالی چائے پر کشا کیا اور پاتونگ کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ گیا۔

میرے لیے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ یہ ڈانٹنگ ہال نہ خالے میں نہیں تھا بلکہ خفاخہ کی پہلی طرف واقع تھا۔ اس کی کھلی کھڑکیاں غائب کسی گلی میں کھلتی تھیں۔ پاتونگ برتن کچن میں رکھنے گئی تو میں موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس طرف گلی میں چھوٹی دکانوں پر مشتعل ٹنگ سا بازار تھا۔ بیشتر دکانوں پر ایسی چیزیں نظر آ رہی تھیں جو کسی مزار پر نذرانے کے طور پر چڑھائی جاسکتی ہیں یا تحائف کے طور پر لے جانی جاسکتی ہیں۔ بدھ کے چھوٹے بڑے مختلف نمبتے ہر دکان میں بھرے ہوئے تھے۔ اس

مجھے دہاں کمرے ہوئے دو منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ پانچ بجے قریب آکر میرا ہاتھ کپڑا اور مجھے دوا تنگ ہال سے باہر لے آئی۔ اس حرجہ دو مجھے اپنے کمرے میں لے جانے کے بجائے ایک اور کمرے میں لے آئی اور یہاں میں مہاراج و ایک تنگ دہاں کے ساتھ ایک پولیس آفیسر کو کچھ کرچے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ایک لمبے کو تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ پوچھا کہیں مجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا یہ حد ہے بنیاد رکھا۔ پانچ بجے اس کمرے میں چوڑا کمرے میں محمد مہاراج نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پولیس آفیسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ انیکڑ پھوٹ ہے۔ قتل کیس کا انچارج۔ یہ کم اور دارا کے بارے میں جانا جاتا ہے۔ وہ کون ہیں اور تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔“

مجھے ایک بار پھر اپنے والدین کے قتل سے اب تک کے واقعات تفصیل سے بیان کرنا پڑے۔ میں نے سنگاپور کے اسپنر چینگ شو کے بارے میں بھی بتایا کہ سنگاپور میں وہ اس کيس کو ذیل کر رہا تھا۔

ہم لوگوں میں مفصلو انگریزی میں ہوری تھی۔ انگریز پھوکت کی  
انگریزی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ انک انک کر بول رہا تھا۔ بیچ میں  
تھائی زبان کے الفاظ بھی بول جاتا تھا جس کی وضاحت مہاراج کو  
کرنی پڑی۔

ہمارے مینٹل سیشن تقریباً دو گھنٹوں تک جاری رہا پھر مجھے بتایا گیا کہ اب مجھے اسپتال جانا ہو گا تاکہ میں آخری مرتبہ پر تاب لگھ کر دیکھ سکوں۔ مہاراج دانگ دانگ گائیے نے دواؤں کی طرف رخ کر کے کسی کو آزادی۔ فوراً ایک بکثرت دواؤں کھول کر اندر اٹھایا اور دونوں ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے جک گیا۔ مہاراج نے اس سے کچھ کہا اور دبا ہر نکل گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد انکسپر پھوٹ کر تو خاخہ کے سامنے والے دروازے سے چلا گیا اور ہمارا جھلے کر رہا۔ اسی لمحے میں گھوٹا ہوا سائڈ اسکرٹ کے ایک دروازے سے باہر اُٹھا۔ کل میں ایک اسٹیشن دیکھ کر کھڑی تھی۔ ایک بکھڑے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور ہم دونوں اندر بیٹھ گئے۔ دین کے ٹیشے تاریک تھے۔ تو اندر سے باہر دیکھا جاسکتا تھا اور نہ باہر سے اندر۔ ڈرائیور اور بچھلی سیٹوں کے درمیان بھی سیاہ رنگ کا ایک پردہ لٹا ہوا تھا۔ ہمارے پیٹنے کے فوراً ہی بعد اسٹیشن دیکھ کر حرکت میں آئے۔

اسٹیشن دیکھ کر چند منٹ بعد ہی سوبا باؤڈرواع ایک اسپتال کی عمارت کے سامنے رک گئی۔ ہم جب وہیں سے اترے تو اسپتال کے مرکزی دروازے پر انفلکس چھوٹ اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ موجود تھا۔ ہر پولیس والے کے ہیلن میں رولر لٹکا ہوا تھا۔

اور وہ سب بہت جفا نظر آ رہے تھے۔ ہم انپکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئے۔ راستے میں لٹے والا ہر شخص مہاراج وانگ سنگھ بایاے کو دیکھ کر جبک رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں مہاراج کا کتنا احترام ہے۔

ہم اسپتال کی مختلف اہداریوں میں چلے ہوئے مردہ خانے میں آجکے صبح و سچ کا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے ہر خانے میں آگیا ہوں۔ کمرے میں ہلکی سی دھند بھی تھی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ میز کی درازوں کی طرف بڑے بڑے کینٹ بنے ہوئے تھے۔ ہر دراز پر نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ کمرے میں پہلے سے موجود ایک آدمی نے اپنے انگوٹھ پھونک کر اشارہ کیا کہ ایک دراز کو تیار کر سنبھال لیا۔ مہاراج نے مجھے اشارہ کیا تو میں دراز کے قریب آگیا اور چور چاکا پر آب ٹھکے کا چھو دوں کہ میرے ہونٹوں سے کڑھ سی خارج ہو گئی۔ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ میرا کھنسی پیرا مہلی، جس نے قدم قدم پر کھنسی سارا دیا تھا میری حفاظت کی تھی۔ وہ میرے سامنے مردہ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہوا تھا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہا ہو، ”دیکھا میں نے اپنی زندگی میں کسی دشمن کو تمہارے قریب نہیں آئے۔ نہ اس میں نے تمہارے آب سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ رب راکھا۔“

میں سسکیاں بھرنے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے یہ آنسو اس شخص کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے جس نے مجھے دشمنوں سے بچانے کے لیے اپنے دھرم سے بھی ہنادت کر ڈالی تھی۔

مہاراج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دہاں سے بچنے  
 پھیلایا۔ اینڈنٹ نے روزانہ بند کردی اور ہم مردہ خانے سے باہر  
 آگئے کچھ جذبات کی شدت اور کچھ کرے کی خوشحالی کی وجہ سے  
 میں اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ انکیز چھوٹ نہیں لے کر  
 ایک دفتر نما گھر میں آگیا۔

”پر تاب نگہ اور تم غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے“ ایئر پورٹ چوکت میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”پر تاب نگہ“ تو اب اس دماغ میں نہیں رہا۔ اور ہمیں سہارا بننے کی بجائے پناہ ملنے لیا ہے لیکن تم اس بات کو ذہن نشین رکھو گے کہ لا ایئر فورسز کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ ہم اپنی تفتیش جاری رکھیں گے اور پر تاب نگہ کے دکھوں کی گرفتاری کے لیے کوئی کمر نہیں چھوڑیں گے اور۔۔۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ پر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پر تاب نگہ سکھ تھا۔ یہاں سکھ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ میں نے اس کی آخری رسومات کے لیے ان کی ویلیر سو سرائی سے رابطہ کیا ہے لیکن تم نے بتایا تھا کہ پر تاب نگہ کا کوئی دوست یہاں بھی رہا ہے اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

ٹیلرنگ اور ریڈی میڈ گارمنٹس کی بہت بڑی دکان ہے لیکن میں

دکان کا پانی نہیں تھا تلوکن گ۔“  
 ”پانی تلوکن کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا۔ اتم کھنک کو شہر کا  
 پانی نہیں چاہتا ہے۔ جو اتم کھنک کے پینے کا پانی ہے۔“ ان کی ہنسی بھونک  
 ہر دو شخص چاہتا ہے کہ طرف مڑ گیا۔ ”آپ کو جو زحمت ہوئی اس  
 کے لئے اور جو مہارتیں ہوں مہارتیں۔“ وہ مہارت کے سامنے  
 کے لئے ضرورت چاہتا ہوں مہارتیں۔“

جنگ کیا۔ انہوں نے اپنے ساتھ اسپتال سے باہر آگئے اور انٹینشن وینگ میں بیٹھ گئے۔ ایک پھونک اور اس کے ماتحت گیٹ کے پاس رک

میں نے اپنے دل سے یہ بات کہہ دی تھی کہ میں صرف چند منٹ لگے تھیں کہ غافلہ سے اچٹال جائے میں صرف چند منٹ لگے تھیں کہ وہاں پر دو بیگن تقریباً بڑھ چکے ہوں۔ میں نے ایک دو مرتبہ ابھی ہوئی ٹھوس سے مہاراج کی طرف دیکھا بھی تھا اور مہاراج نے ہر مرتبہ صرف مسکرائے ہی انکشاف کیا تھا اور بالآخر اسٹین دیکھ کر ایک جگہ رک گئی۔ میرا خیال تھا کہ مہاراج دروازہ کھلا کر اترے گا لیکن وہ اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

وہیں گھر آئے۔ میں کچھ ہی عرصے کے لئے گھر آئی۔ چند عرصے بعد انہیں پھر کی اور گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ چند عرصے بعد انہیں دیکھ کر دواؤں لگا۔ سامنے تین چار بکٹوں کڑے تھے۔ وہ سب ہماراج کو دیکھتے ہی جھک گئے۔ ہماراج نے تیز لمبے میں ان سے کچھ کہا اور پھر ایک بکٹوں نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور وہیں سے نکل آ رہا۔

چاند طرف درانہ تھا۔ دور دور تک کوئی آبادی تو کیا، کسی  
 ذی صلاح بادشاہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک کی دوسری  
 طرف بھی ایک چھوٹی بندوبست نہ تھی۔ اس کی کھڑکیں کے شیشے  
 بھی اسی تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں کے پینچے جسے میں کوئی  
 پتہ نہ تھا، میں لیکن اسٹیجنگ کے سامنے ایک خوف ناک  
 مثل والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر بھی ہتھکڑیاں جیسا  
 کہ وہ لوگ کالاس تھا۔ جن ہتھکڑیوں نے مجھے اسٹیشن دیکھنے  
 سے انکارا تھا ان میں سے دو کی خلیں تو بہت ہی خوف ناک تھیں۔  
 ان سب کے سر پہ تھے گٹا تھے کچھ دیر پہلے ہی سروں پر استرا  
 بھرا کر اُٹے ہوں۔ دھوپ میں ان کے سر پہ رک دے تھے۔

یہ صورت حال دیکھ کر میرے دل پر خوف سا طاری ہونے لگا۔ میں خاموشی کھڑا محسوس نظروں سے اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان مجتہدین کے حوالے کرتے ہوئے ہمارا راج واک ونگ یا پائے نے مجھے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ایک مجتہد اب بھی وین کے دروازے کے سامنے کھڑے موبیل فون پر اس سے باتیں کر رہا تھا پھر وہ بھی پیچھے ہٹ گیا اور انشٹین وین کا دروازہ بند کر دیا۔ انشٹین وین حرکت میں آئی اور پورن لیبی ہوئی اس طرف چلی گئی جس طرف سے آئی تھی۔

ایک بگشتوں نے ابھی تک مجھے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ اسے شاید

خدا شہسوار کے ہاتھوں میں کبھی بھاگ نہ جاؤں لیکن میرا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس دورے میں کہاں جاسکتا تھا۔ دوسرے بھٹکے ہوئے یونین کا بیچنا دروازہ کھول دیا اور مجھے آگے دھکیلے ہوئے وہ سب یونین میں بیٹھ گئے۔ وہ حرکت میں آگئی اور یونین جی ہوئی مخالف سمت میں روانہ ہو گئی۔

میرا خیال تھا، ہم اس وقت شر سے ملیں دور تھے اور کسی آبادی سے ہمارا فاصلہ مزید بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے دل پر طاری خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ ہمارا جانے بیچے ان کے حوالے کیوں کیا تھا اور یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ ایک انجانا سا خوف اور دوسرے بڑھ رہے تھے لیکن پھر میں نے ان منطقی خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ہمارا ج وگانگ دنگ یا نے میرے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔ اس نے تو مجھے دشمنوں سے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے کسی دشمن کے حوالے کیسے کر سکتا تھا۔

دین تقریباً آدھا گھنٹا ایسی سڑک پر چلتی رہی۔ اس دوران میں کسی گاڑی کی آواز سنائی نہیں دی تھی اور پھر وہیں دایم طرف مڑ گئی۔ یہ غالباً جینی یا چترپلی سڑک تھی۔ بہت بڑی طرح سے جھٹکے لگے رہے تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں بھکشو غالباً حیرا دل بھلانے کے لیے ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہے تھے لیکن جیسے ہی ان کے چہرے کچھ اور خوف ناک ہو رہے تھے۔ ان کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی اور میں خاموش بیٹھا سمجھتی ہوئی نظروں سے ماری ماری ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بالا خروین ایک جگہ رک گئی۔ ایک بجھٹونے مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے اتار۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے کی طرح میرا بازو پکڑے رکھے گا لیکن اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے قریب کھڑا ہوا تو سب نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جس جگہ دین رکی تھی وہ ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس سے تقریباً گز آگے ایک نیلے پتھر پر ایک خانقاہ نظر آ رہی تھی۔ عمارت کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ عرصے سے ویران پڑی تھی۔ چاروں طرف تاحہ نگاہ سے پرانہ تھا۔ تیز ہوا سے جھانڑیوں کی سرسراہٹ کی آواز ایک عجیب سا اثر پیدا کر رہی تھی۔

دین اس میدان سے گزر کر خانقاہ والے ٹیلے کی پچھلی طرف  
 پہنچی مگر پھر وہاں سے لے کر خانقاہ میں آگئے۔ خانقاہ دو حصوں پر  
 مشتمل تھی۔ ایک حصہ بارہ دہری کی طرح کھلا تھا۔ کئی ستون تھے  
 جن کا پلستر جگہ جگہ سے اڑھا ہوا تھا۔ دوسرا حصہ ایک بڑے ہال  
 پر مشتمل تھا۔ اس میں بھی کئی ستون تھے۔ بڑی بڑی کھڑکیوں سے  
 سوپ اندر آ رہی تھی۔ اس خانقاہ کی پچھلی طرف بھی کوئی عمارت  
 تھی۔

ہال میں پہلے ہی سے دو بھکشو موجود تھے۔ میرے ساتھ آنے والا ایک بھکشو ان سے باتیں کرنے لگا اور پھر وہ بھکشو مجھے لے کر



خافہ کی بچھلی طرف آگئے۔ اس طرف قصب میں چند چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک اکھاڑا سا بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف موٹے موٹے رستے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں دو بدھ راہبہ عورتیں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ کمرے کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ کھانا پکانے والے برتن بھی کالے ہو چکے تھے۔ ان عورتوں میں ایک اچھڑ عمر تھی اور دوسری جوان عورت تھی۔ میرے خیال میں اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان دونوں عورتوں نے اسی طرح کالہاس پن رکھا تھا جیسا میں نے شروالی خافہ میں پاؤنگ کے جسم پر دیکھا تھا۔ ایک چادر لٹکی کی طرح بندھی ہوئی تھی اور دوسری چادر نے جسم کا بالائی حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ دونوں ہنسنے لگیں اور عورتوں کے حوالے کر کے چلے گئے۔ جوان عورت مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ یہ رہائشی کمرہ تھا۔ فرش پر درزی پچھی ہوئی تھی اور کچھ اور چیزیں بھی بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

”تم بہت تنگھے ہوئے لگتے ہو۔ یہاں آرام کرو۔ میں اپنے کام سے فارغ ہو کر آؤں گی تو تم سے باتیں کروں گی۔“ اس عورت نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

”یہ کون سی جگہ ہے۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دو نہیں۔ تم دو دستوں میں ہو۔“ عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں حفاظت کے خیال سے یہاں بھیجا گیا ہے اور یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اگر چاہو تو اوپر اوپر گھوم پھر بھی سکتے ہو۔ ویسے میرا نام بھی پچھی ہے۔ تم بے تکلفی سے مجھے اس نام سے پکار سکتے ہو۔ اچھا۔ اب تم بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گی۔“

پچھی بھی مجھے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد پچھی بھی مجھے آکر لے گئی۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم بیگمڈو کی بارہ درزی میں آگئے جہاں ایک بہت بڑی چادر پچھی ہوئی تھی اور تمام ہتھکڑا ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے سامنے مٹی کا ایک پالہ اور ایک پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ پلیٹ ڈرامر کی تھی اور مٹی کی کٹی ہوئی تھی۔ پالوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ درمیان میں چادر پر ایک پتلا رکھا ہوا تھا جو عورتوں سے کالا ہوا تھا۔ پتیلے میں دہلے سے ملتی جلتی کوئی چیز بھری ہوئی تھی جس سے بھاپ اڑ رہی تھی۔

پچھی بھی مجھے ساتھ لے کر بیٹھ گئی اور دوسری عورت ہتھکڑوں کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹوں میں دلایا ڈالنے لگی۔ میری پلیٹ بھی بھری ہوئی تھی۔

دوسرے ہتھکڑے بڑے بڑے لے کر دلایا کھاتے رہے اور میں اپنی پلیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ پچھی بھی مجھے اشارہ کیا تو میں نے انگلی سے پہلے تو اس دہلے کو چکھنا۔ وہ غالباً چاول تھے جس میں

معالے اور کچھ اور چیزیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر اجاڑا تھا۔ ویسے اگر بھوک لگی ہو تو ڈاکٹر کی پروا کون کرتا ہے۔ آج بچھانے کے لیے ہر چیز انڈیل لی جاتی ہے۔ میں بھی ہنسنے لگا۔

کھانے کے بعد کمرے میں آکر پچھی بھی مجھے شربت پلا دیا۔ وہ شربت اگرچہ بیٹھا تھا مگر اس کا ذائقہ کچھ مختلف تھا۔ شربت پینے کے فوراً ہی بندھ پڑے۔ غنودگی کی طاری ہوئی۔ میں وہیں درزی پر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد میری نیند سوجھانے لگی۔ آٹھ گھنٹے تو کمرے میں اندھیرا سا تھا لیکن کچھ بعد دروازے سے باہر بھی ایک دھوپ نظر آ رہی تھی۔ سورج چلنا۔ کاسٹر کھل کر کے خوب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ میں کچھ عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ شربت میں شاید کوئی نشہ آور چیز تھی جس سے میں اتنی کمزور ہوا تھا اور سر میں دھکھن اور بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ نے سر پر ہاتھ رکھا تو اچھڑ پڑا۔ سر پر ہاتھ رکھنے سے مجھے پتہ چل گیا کہ میں اپنے آپ میں کیا تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ دیوار پر ایک چھوٹا سا آئینہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے آئینہ دیکھا۔ آئینہ پر نظر پڑنے ہی میرا داغ بھگ سے اڑ گیا۔ میں میرا سر اور ہاتھیں سوئچ گئی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر نہ حرکت کھڑا آئینے میں اپنے بدن پر نظر ملے کو دیکھتا ہوں۔



اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ مجھے شرے لٹھو ورنے میں واقع اس خافہ میں کیوں بھیجا گیا تھا۔ ایک درزی تھی کہ مجھے دشمن کی نگاہوں سے اوچھل رکھا جائے اور نہ وہ مجھے یہاں مارشل آرٹ کی ٹریننگ دی جانے والی تھی۔ کھانا قابل ہو سکوں کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے کسی دوسرے کی ضرورت نہ پڑے اور میں اپنی قوت بازو پر بھروسہ کر کے مقابلہ کر سکوں۔

یوں تو مارشل آرٹس کے بہت سے اسٹائل ہیں۔ ہر ایک کسی خاص علاقے سے منسوب ہے اور ہر اسٹائل کا اپنا انداز ہے۔ تھائی لینڈ میں کلک بائنگ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اسے قوی ٹھیکل کا درجہ بھی حاصل ہے۔ یہاں دوسرے ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

موتے تھائی کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی ابتدا پندرہویں صدی کے اختتام یا سولہویں صدی کے وسط میں اس وقت ہوئی جب تھائی لینڈ اور بھارت کے درمیان پیکار تھی۔ تھائی فوج کا ایک سپاہی بری فوج کی قید میں چلا گیا۔ فوجی کو بارہ بری فوجیوں کی حفاظت میں ایک ایسی جگہ قید کیا جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ تھائی سپاہی نے

فرار کا منصوبہ بنایا اور وہ خالی ہاتھ بارہ بری فوجیوں کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دے کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

کھانے کا ٹوم نامی وہ تھائی سپاہی وطن واپس پہنچا تو بہت جلد اس کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔ اسے قوی بہادر کا درجہ دیا گیا اور شیشہ ہارے سو آن کے حکم سے نائے کھانوں ٹوم کے خانی ہاتھ لڑائی کے فن کو فوجی تربیت کا ایک لازمی حصہ قرار دیا گیا اور پھر دیکھنے کی دیکھنے سے جلدی فن پورے ملک میں پھیل گیا اور اسے ایک باقاعدہ قومی ٹھیکل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

موتے تھائی میں حرف ایک دوسرے پر آزادانہ حملہ کرتے ہیں۔ ہاتھ یا جوتے جسم کے کسی بھی حصے پر ضرب لگائی جاسکتی ہے۔ جب ٹھیکل کے دوران میں سر پر ضرب لگنا فائل سمجھا جاتا ہے لیکن نام لڑائی میں اس بات کی پروا نہیں کی جاتی کہ حرف کے جسم کے کسی حصے پر ضرب لگتی ہے یا نہیں۔ ٹھیکل واقعی خالی ہاتھ کھیلنا جانا تھا لیکن اب اس میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ کوئی خطراتک ہتھیار اگرچہ اب بھی استعمال نہیں ہوتا لیکن اس قسم کے دستانے خاص طور پر تیار کرائے جاتے ہیں جن سے حرف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔

اس خافہ میں آنے کے دوسرے دن میری ٹریننگ شروع کر دی گئی۔ مجھے صبح پانچ بجے جگا دیا گیا۔ پچھی بھی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اس خافہ میں صرف ان ہتھکڑوں کے لیے کھانا پکانے کے لیے آئی ہوئی ہے لیکن یہ انکشاف میرے لیے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ وہ بھی موتے تھائی کی ماہر تھی۔ وہ صبح سویرے مجھے اٹھا کر جوگنگ کے لیے لے گئی۔

میں نے پھر پہلی زمین پر دوڑنا میرے لیے عذاب بن گیا تھا۔ میرا جسم بھر بھر کے شرے لٹھو پر بھی نہیں چلا تھا اور یہاں مجھے پتھروں پر دوڑنا پڑا تھا۔ میں زیادہ دور تک اس سے ساتھ نہیں دے سکا اور ایک جگہ رک کر پھانپنے لگا۔ پچھی بھی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے دوڑنے لگی لیکن اس مرتبہ بھی میں زیادہ دور تک نہیں جاسکا۔

ہم ایک ٹیلے کی دوسری طرف نکل گئے تھے۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پچھی بھی بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور مجھے بتانے لگی کہ کسی بھی ٹھیکل کے لیے اطمینان ضروری ہوتا ہے جو ٹھیکل کو کسی اور لوگ کا بھی ایک سرساز سے اطمینان کو مضبوط بنایا جاسکے۔

جس جس جگہ بیٹھتے ہوئے تھے اس سے آگے قصب میں آدھ نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور فضا دھان کی مکے سے مٹی ہوئی تھی۔ چند من بعد پچھی بھی نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑا اور بہت آہستہ دوڑنے لگی۔

پچھی بھی کے بارے میں میرا اندازہ دور تھا۔ وہ دھڑکی

لکھی خاتون تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی ابتدا درس و تدریس سے کی تھی۔ اسکول میں بچہ کی ملازمت شروع کرنے کے ساتھ ہی اس نے موتے تھائی کی ٹریننگ بھی شروع کر دی تھی۔ پہلا اس نے ایک اور استاد سے تربیت حاصل کی اور پھر مہاراج وانگ وانگ پائے کی شاگردی میں آئی۔ اس کا شمار وانگ وانگ کے ان چند شاگردوں میں ہوتا تھا جو اس کے بہت قریب تھے۔

وانگ وانگ پائے کا بہت شہرت تھا۔ اسے پورے ملک میں گرینڈ ماسٹر کا درجہ حاصل تھا۔ موتے تھائی سیکھنے کا شوقین ہر کوئی اس کی شاگردی میں آتا چاہتا تھا لیکن پھر ایک مہاراج وانگ وانگ پائے کے اطوار بدل گئے اور وہ مذہب کی طرف مائل ہوتا چلا گیا اور بالآخر وہ شرکی ایک بڑی خافہ سے وابستہ ہو گیا۔ وہ خافہ سے بہت کم باہر نکلتا تھا لیکن شاگردوں سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ اس نے اپنا بیچہ (تربیت گاہ) اپنے جیسے شاگرد چھو پھو جگہ کو سونپ دیا تھا۔

مہاراج وانگ وانگ پائے خافہ سے وابستہ ہوا تو بھی پچھی اسکول کی ملازمت چھوڑ کر وہاں میں آئی اور راہبہ بن گئی۔ وہ کئی سال تک خافہ میں آنے والے بڈھا کے زائرین کی خدمت کرتی رہی۔ ڈیڑھ دو سال تک وہ دینی علاقوں میں گھوم کر پھر کب دھا کی تعلیمات کی تبلیغ کرتی رہی۔ ان تبلیغی دوروں کے دوران میں اسے مارشل آرٹ کی آزمائش کا موقع بھی ملا۔

تبلیغی پاریوں سے وابستہ بدھ ہتھکڑوں اور دیناؤں میں مہلوں پیدل چل کر بہتوں تک پہنچتے تھے۔ کئی کئی روز تک فاقوں سے آنا رہتا اور دوران سفر میں لیٹروں اور ریزروں سے بھی واسطہ رہتا۔ ان تبلیغی پاریوں سے وابستہ ہتھکڑوں کو خاص طور پر مارشل آرٹ کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ دوران سفر میں وہ خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی شیطانی قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

کچھ عرصہ بعد پچھی بھی کو ورنے میں واقع اس خافہ میں بھیج دیا گیا جہاں ہتھکڑوں کو موتے تھائی کی تربیت دی جاتی تھی۔ پچھی بھی کو یہاں آئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اور ان دوروں میں وہ صرف دوا میں مرتبہ شریک تھی۔ ان دو عورتوں کے علاوہ وہ چھ ہتھکڑے تھے جو اس خافہ سے وابستہ تھے۔ وہ سب کے سب اپنے فن کے ماسٹر تھے اور میری سب مل کر یہاں آنے والے ہتھکڑوں کو موتے تھائی کی تربیت دیتے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے ایک گروپ ٹریننگ مکمل کر کے گیا تھا اور آج کل یہ لوگ فارغ تھے لیکن فارغ اوقات میں بھی ان کا اپنا ٹریننگ کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور ان کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

میری اہلیکس کو اور جوگنگ کی تربیت پچھی بھی کے ذمے تھی جبکہ اسٹرینجنگ اور ابتدائی ٹریننگ کا ذمہ سامولی نامی ایک اور ہتھکڑے نے لیا تھا۔ سامولی وہی ہتھکڑا جس نے دین میں مہاراج وانگ وانگ پائے کی تھی۔

مجھے اہم، خافہ میں رہتے ہوئے تین مہینے ہو گئے۔ میری

نزنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ روزانہ شام کو یہ تمام ہیکشو رنگ میں آپس میں بھی مقابلے کرتے تھے۔ وہ سب اپنے فن کے ماسٹر تھے۔ میں رنگ کے بارہریضا بڑی دلچسپی سے ان کے مقابلے دیکھتا۔ بڑا مزہ آتا تھا۔

ان تین مہینوں میں روزانہ باقاعدگی سے میرا سر مونڈا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے احتجاج بھی کیا کہ میرے سر پر بال تو ہیں نہیں! "استرا چلانے کا کیا فائدہ مگر سامولی نے مجھے بری طرح ڈانٹ دیا تھا کہ ان معاملات میں مجھے احتجاج کا کوئی حق نہیں ہے۔

مجھے جسم پر چادر لپیٹنا بھی اگیا تھا۔ گھبرا سڑک مڑی ہوئی بھوس اور گھرو لپاس۔ میں چھوٹا سا ہیکشو ہی لگتا تھا۔ اس عرصے میں میں نے ان ہیکشوز سے قحالی زبان کے چند الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔

ایک روز صبح جو رنگ کے بعد میں بھی بھی کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ فضا چاک ہی فاکڑی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی ہم سے چند فٹ دور ایک پتھر پر گئی۔ پتھر کی چٹیاں اڑ کر بکھر گئیں۔ ایک گولا بھی بھی کی پیشانی پر لگا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے بازو سے پکڑ کر ڈھلان میں چلا گیا کہ گولی اور ہم دونوں دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ اس دوران میں دونوں مزہ ہو چکے تھے۔

نزنگ کے دوران میں بھی بھی تھے یہ بھی بتاتی رہتی تھی کہ قوت فیصلہ پر مکمل کنٹرول ہونا چاہیے۔ حریف کسی بھی لمحے کوئی بھی چیز بدل کر وار کر سکتا ہے۔ دماغ اس قدر حاضر ہو کہ نہ صرف بروقت حملہ روکا جائے بلکہ اس دوران میں یہ بھی فیصلہ کر لیا جائے کہ جوابی کارروائی کس طرح کی جانی چاہیے اور اس وقت بھی بھی نے تو قوت فیصلہ کی ایک بہترین مثال پیش کی تھی۔ سیلا فائر ہوتے ہی اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ گولی کس طرف سے آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگلی گولی سے بچنے کے لیے اسے کس طرف چلا گیا لگانی چاہیے۔ اس طرح دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی وہ مجھے ساتھ لیتی ہوئی دوسری گولی سے محفوظ ہو گئی تھی۔

ہم ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں چپٹیں منٹ تک ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے آگے گھمان گھاناں تھیں جنہوں نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ گھاناں خاصی اونچی تھیں۔ وہ مجھے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی گھاناں میں گھس گئی اور سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔ ڈھلان پر لڑھکتے سے میرے جسم پر کئی جگہ پتھروں سے زکوگی تھی۔ بعض جگہوں سے کھال مچھل گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرنے کے لیے میں نے ہونٹ ہنچھنچ رکھے تھے۔ میں نے بھی بھی کی طرف دیکھا۔ اسے بھی کئی جگہ زکوگی تھی اور پیشانی پر جس جگہ پتھر کا گولا تھا وہاں سے خون رسنے لگا تھا۔

"فائرنگ اس طرف سے ہوئی تھی۔" وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اور وہ لوگ اس ٹیلے کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ہماری طرف آنے کی کوشش کریں گے لہذا انہیں اس طرف سے

لگنا چاہیے۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں اٹھو۔ ہری آپ۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میرا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم اونٹن جھانپوں میں دوڑنے لگے۔ کاٹنے دار جھانپوں میں دوڑنے سے دونوں کے ہسولوں پر لپٹی ہوئی چادریں پھٹ گئی تھیں۔ جسم پر مزید خراشیں آ رہی تھیں مگر ہم رکے بغیر دوڑتے رہے۔

دو منٹ میں ہم ٹیلے کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے کافی نکل گئے اور پھر اوپر چڑھنے لگے۔ چاک ہی فاکڑی بھی بھی کا پتھر پڑ گیا اور وہ ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس لیے میں بھی اس کے ساتھ لڑھکتا رہا۔ بھی بھی کے ساتھ بھی کی چیخ بھی نکل گئی تھی۔

جب ہم سہیلے تو میں نے اسے سارا دے کر اٹھائے۔ کوشش کی مگر اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کے چہرے کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دایاں پیر قہام لیا تھا۔ ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے پیر میں موچا تھی اور چھتا تو درد کنارہ وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

"تم ہمیں بیٹھی روک رہی ہو اور جا کر سامولی یا کسی اور کو ماراؤ۔" میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ اگر تم کوئی کاٹنا نہ بن گئے تو۔۔۔"

"میں اس طرف سے جاؤں گا۔" میں نے اس کی بات کٹ کر ہوئے ایک طرف اشارہ کیا اور اس سے ہاتھ پھڑا کر بھاڑا۔ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈھلان پر چڑھتے ہوئے میں نے اوپر دیکھا۔ بھی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً جھانپوں میں چھپ بیٹھ گئی تھی تاکہ اگر فائرنگ کرنے والے تلاش میں اس طرف آئیں تو وہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکے۔

میں گھائی پر دوڑ رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی توانائی سنائی دینے لگی۔ فائرنگ دو طرفہ تھی جس کا مطلب تھا کہ اب پارٹوں میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ دوسری پارٹی ہو سکتی ہے کیونکہ خافہ میں رہنے والے ہیکشوز کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ ان تین مہینوں کے دوران میں میں نے بڑے کاٹنے والی چھری کے سوا یہاں کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔

میں جب ٹیلے پر پہنچا تو ٹھنک کر رک گیا۔ خافہ وہاں تقریباً چپاس مرکز کے فاصلے پر تھی اور وہ ہیکشو آؤٹریک رائے اٹھائے فائرنگ کرتے ہوئے اس طرف دوڑے جا رہے تھے۔ سے پہلے ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔

مجھے اس وقت کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ تین مہینے کی نزنگ کا نتیجہ تھا کہ میں کسی قدر بڑھ چکا تھا۔ ہیکشو کو متوجہ کرنے کے لیے چپٹا ہوا دوڑتا رہا اور پھر

سامولی کو ایک آڑو سے نکلے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں آؤٹریک رائے تھی۔ آواز سن کر وہ مڑا اور پھر بری طرف دوڑنے لگا۔ دوسرے ٹیلے سے بے خاشاکو لیاں برساتی جا رہی تھیں۔ وہ مجھے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ایک پتھر کی آؤٹریک رائے میں سے لپکا۔ اس نے چیخ کر مگر رک رک کر پوچھا کہ بھی بھی کہاں ہے؟

میں نے گھائی کی طرف اشارہ کر دیا اور رک رک کر قحالی زبان کے الفاظ میں اسے بتائے لگا کہ بھی بھی کے پیر میں چوٹ لگی ہے اور وہ چل نہیں سکتی۔ سامولی نے آواز دے کر ایک اور ہیکشو کو پکڑ لیا۔ چیخ کر اس سے پتھہ کہا اور مجھے اس کے حوالے کر کے گھائی کی طرف دوڑا چلا گیا۔ دوسرا ہیکشو مجھے ہاتھ سے پکڑے چھری کی آؤٹریک خافہ کی طرف چلے گئے۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں آؤٹریک رائے تھی اور اس کی نظریں سرخ لائٹ کی طرح چادروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

وہ مجھے خافہ کی بارہوری میں لے آیا اور پھر ہم دوڑتے ہوئے ہال میں پہنچ گئے۔ وہاں بھی کھڑی کے قریب ایک ہیکشو آؤٹریک رائے لے کر تھا۔ سیلا ہیکشو مجھے گھسیٹتا ہوا ہال کے ایک کونے میں لے گیا جہاں فرش پر چار مربع فٹ کا ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ اندر بیڑیاں تھیں۔ ہم تیزی سے بیڑیاں اترتے ہوئے نیچے چلے گئے جہاں سوانا بھالے نام کی دوسری ادویہ عمر عورت موجود تھی۔ مجھے سوانا کے سپرد کر کے وہ ہیکشو دوبارہ بیڑیوں کی طرف بھاگ گیا۔

سوانا نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور بھی بھی کے بازو میں پچھنے لگی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

میرے جسم پر جگہ جگہ خراشوں سے خون رس رہا تھا مگر میں اپنی تکلیف بھول کر حیرت سے اوپر اُٹھ دیکھنے لگا۔ خافہ کے نیچے اس وسیع دھریوں سے خافے کی موجودگی میرے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مٹھل جل رہی تھی اور اوپر اُٹھ کر کچھ الٹا چپٹیں پڑی تھیں جنہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ خافے کے آخری سرے پر کھڑی کا ایک بھاری دروازہ تھوڑا بند تھا۔

تقریباً چوبیس منٹ بعد سامولی بیڑیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے کندھے پر بھی بھی کو لا د رکھا تھا۔ اندر آکر اس نے بھی بھی کو فرش پر لٹا دیا اور سوانا سے پتھہ کتا ہوا باہر چلا گیا۔ سوانا بھی بھی کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے پیر کو ٹھونک کر دیکھنے لگی۔ بھی بھی کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے۔

باہر سے فائرنگ کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی پھر وہ آوازیں معدوم ہوئی جلی گئیں اور بالآخر خاموش چھا گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد سامولی ایک اور ہیکشو کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے

مجھے اور بھی بھی کو بغور دیکھا اور دوسرے ہیکشو کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔ وہ ہیکشو یہ خافے سے باہر چلا گیا اور دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کرم کی دو شیشیاں تھیں۔ اس نے دونوں شیشیاں فرش پر رکھ دیں۔

سامولی نے ایک شیشی اٹھا کر دیکھی پھر اسے رکھ کر دوسری اٹھالی اور اس میں سے گھائی رنگ کی کرم اٹھائی سے نکال کر بھی بھی کے پیر پر پٹنے لگا۔ بھی بھی کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اس طرح ہالش کرنے سے بھی اسے تکلیف ہو رہی تھی اور پھر سامولی نے اس کے پیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ بھی بھی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سامولی بڑبڑاتے ہوئے پیر کی ہالش کرتا رہا اور پھر اس کے پیر پر کپڑا لپیٹ دیا۔ بھی بھی بتدریج پرمکون ہوئی چلی گئی۔

اس دوران میں سوانا کرم کی دوسری شیشی اٹھا کر میری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ میرے جسم پر لا تعداد خراشیں تھیں۔ کئی جگہوں سے کھال مچھل گئی تھی۔ شدید بطن ہوری تھی لیکن میں اپنی تکلیف ضبط کیے بیٹھا تھا۔ سوانا میرے جسم کے متاثرہ حصوں پر کرم مل رہی تھی۔ جس جگہ کرم لگتی وہاں عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا اور پھر میں بھی پرمکون ہونا چلا گیا۔ میرے جسم پر بطن اور دو جراثیم انگیز طور پر غائب ہو گیا تھا۔ سوانا اب وہی کرم بھی بھی کے جسم کی خراشوں پر لگانے لگی تھی۔

سامولی وہاں سے اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا تھا جہاں ایک چھوٹی میز پر بیڈیوں کی شکل سے ملتا جلتا ایک بکس رکھا ہوا تھا۔ وہ میز کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے اس بکس میں سے انیٹا کھینچ کر باہر نکالا اور پھر بکس پر لگے ہوئے مختلف ڈائلز کو حرکت دینے لگا۔

وہ ٹرانسٹر تھا۔ سامولی کسی سے رابطہ کر رہا تھا پھر وہ تقریباً دس منٹ تک ٹرانسٹر پر کسی سے باتیں کرتا رہا اور بالآخر ٹرانسٹر بند کر کے ہمارے پاس آ گیا۔ سوانا اور بھی بھی سے چند جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد وہ میری طرف دیکھتا ہوا یہ خافے سے باہر نکل گیا۔ دوسرا ہیکشو بھی اسی کے ساتھ ہی تھا۔

میں بھی بھی کے قریب ہی فرش پر دوڑا ہوا کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا لباس بھی میری طرح جھانپوں میں الجھ کر پھٹ گیا تھا اور سامنے سے اس کا جسم دو تین جگہوں سے برہنہ ہوا تھا۔ بھی بھی نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا یہ سب کچھ بھی بھی بھ کی تعلیمات میں شامل ہے؟" میں نے خافے میں پڑی ہوئی رائیوں اور دوسری چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھ نے امن و آشتی اور بھائی ہمارے کا درس دیا ہے۔" بھی بھی نے بتدریج مسکراتے ہوئے جواب دیا "مچل" صبر اور

برداشت بھی بدھ کی تعلیمات میں شامل ہیں لیکن یہ بالکل نہیں کہا کہ اپنے آپ کو ظالم کے سامنے زنج ہونے کے لیے پیش کر دو۔ اپنے دفاع کا حق تو دنیا کے ہر مذہب نے دیا ہے۔ جب پانی سر سے گزر جائے تو قوت برداشت بھی جواب دے جاتی ہے۔ مگر کامیابی چھوٹ جاتا ہے اور پھر اپنے آپ کو بچانے اور انسانیت کو شیطانی قوتوں سے بچانے کے لیے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینی پڑتی ہے۔ یہ ہتھیار ایک طرف انسانیت کی تباہی کا باعث بنتے ہیں تو دوسری طرف تحفظ کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس اپنے تحفظ کے لیے ہتھیار نہ ہوتے تو وہ لوگ ہم سب کو گولیوں سے بھون دیتے۔

”وہ کون لوگ تھے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔“ پچی بھی نے جواب دیا ”ہم سے کوئی دشمنی ہوتی تو خاقانہ پر حملہ کیا جاتا لیکن پہلی گولی وہاں چلائی گئی تھی جہاں تیرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔“

میں کانپ کر گیا۔ اس خاقانہ میں رہتے ہوئے میں اپنے دشمنوں کو تو بھول ہی گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کاک میں میری تلاش میں ناکام ہو کر وہ لوگ میرا خیال ذہن سے نکال کر وہاں چلے گئے ہوں گے۔ ان کے تصور کے بغیر یہ دن نکلنے سکون سے گزرے تھے لیکن شاید میری قسمت میں سکون نہیں لکھا تھا اور انہوں نے بالآخر مجھے ڈھونڈ لیا۔ نکلا تھا۔ پچی بھی کا کنا درست تھا۔ یہ حملہ میرے اوپر ہی کیا گیا تھا۔ ان کی چلائی ہوئی پہلی گولی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر لگی تھی اور دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی پچی بھی نے مجھے دھکا دے کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو یقیناً وہ مجھے گولیوں سے بھون دیتے۔ بہر حال، ٹھیک دو بارہ شروع ہو چکا تھا۔

اس صورت حال سے مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ حملہ کرنے سے پہلے وہ لوگ یا ان کا کوئی آدمی میری گرائی کر رہا تھا۔ میرے معمولات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ مجھ پر حملہ کرنے کا بہترین وقت وہ ہو گا جب ہم صوبیر سے جو گنگ کے بعد اس جگہ بیٹھ کر کچرہ دیر آرام کیا کرتے تھے لیکن خوش بختی ایک بار پھر میری ڈھال بن گئی تھی۔

”ساموئل اس ریڈیو پر کس سے بات کر رہا تھا؟“ میں نے میز پر رکھے ہوئے بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ماسٹر پھوپھا جگ سے۔“ پچی بھی نے جواب دیا ”ہمارا ہیڈ کوارٹر بنکا جگ میں ہے اور ماسٹر پھوپھا اس کا انچارج ہے۔ اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ہیڈ کوارٹر سے کچھ آدمی یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

ہم میں یہ گفتگو جاری تھی کہ ساموئل نے خانے میں آگیا۔ وہ پہلے سوانا اور پھر پچی سے کچھ باتیں کر رہا تھا پھر اس نے بیک کر بھی پچی کو گود میں اٹھالیا اور نہ خانے کی میز میوں کی طرف بڑھ

گیا۔ سوانا اور میں بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ اوپر راہ میں کھڑکی کے قریب ایک بدھ بھکشو اب بھی رات کی لائٹ میں تھا۔ اس کھڑکی سے نیلیوں کی طرف کا دور دور کا علاقہ نظر آتا تھا۔ ایک بھکشو رہائشی کوارٹرز کے قریب ایک جگہ پر بیٹھ گیا تھا اور تین بھکشو حملہ آوروں کی تلاش میں نیلیوں کی طرف گھوم رہے تھے۔

پچی بھی کو کمرے میں درمی پر لٹا دیا گیا اور ساموئل نے ہدایات دیتے ہوئے باہر چلا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس طرح کے آٹھ بیچے ہوں گے۔ ہم لوگ سات بیچے ہاتھ کر رہے تھے لیکن آج اس گڑبڑ کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ سوانا ہاتھ کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ناشا کو دوہرا ہار کا ٹھکانا چاول ہی استعمال ہوتے تھے۔ البتہ ہر مرتبہ ذائقہ نظر ہوتا تھا۔

دس بیچے کے قریب دو گاڑیاں وہاں پہنچ گئیں۔ ایک میں تھی جس سے تین آدمی اترے تھے اور دوسری بیک اپ ٹیم کے پیچھے حصے میں بیچوں کی طرح آئے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ اس بیک اپ میں پچی آئی تھے۔ وہ سب بیچے اترنے میں کوئی بھی بھکشو نہیں لپاس میں نہیں تھا۔ کسی نے پچی شرت پہنی ہوئی تھی، کسی نے صرف ٹیکر۔ سب کے بال بڑے بڑے ہوئے تھے۔ ان حیلوں میں وہ چھپے ہوئے بے معاش بن گئے۔ وہ سب مسلح تھے۔ کسی کے پاس رائفل تھی کسی کے پاس پستول اور کسی کے پاس ریو لور۔

میں خاقانہ کی یادہ درمی میں کھڑا ان لوگوں کو دیکھ کر ہانا ساموئل اور دو بھکشو ان کے استقبال کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ ساموئل بندو بکس سے اترنے والے ایک دروازے پر قیامت کوئی گولی رہا تھا۔ اس شخص نے نیلی جینز اور ڈسٹم کی اوپن شرت پہنی تھی جس کے شین سامنے سے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بال اگرچہ لمبے تھے لیکن پیچھے کی طرف سلپے سے بنے ہوئے تھے۔ ہمارے باریک موچیں ہمیں اور ٹھوڑی پر چند بال تھے۔ وہی ایک تھا۔ جو ان سب میں مقتول دکھائی دے رہا تھا۔

وہ لوگ خاقانہ کی طرف آئے گئے تو میں دوڑنا ہوا۔ ہمارے والے کمرے میں پہنچ گیا اور اسے ان لوگوں کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے دروازے پر قیامت اور نسبتاً معقول طے والے کمرے کے بارے میں بتایا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔  
 ”وہ ماسٹر پھوپھا جگ ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسے۔  
 ”ہمارا جگ وانگ وانگ وانگ یائے کا نائب اور سب سے زیادہ قابل آدمی۔ وہ ہیڈ کوارٹر کا انچارج ہے۔“

پچی بھی نے پہلے پھیپھو جگ جگ کے بارے میں بتایا۔ اب مجھے یاد آگیا کہ جب میں اور پراب سنگھ ”تم سنگھ“ کے پیچھے تو اس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اگر ہمارے علاقے

سے پہلے اس کے نائب پھوپھا جگ سے ملا جائے لیکن پھوپھا جگ ان دنوں جگ مانا گیا ہوا تھا اور اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔

چند منٹ بعد باہر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور پھر ماسٹر پھوپھا اور ساموئل اندر داخل ہوئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ان دونوں کو پوچھا۔ ”تھائی، چائینی اور چینی باشندے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو تعظیماً جھک جاتے ہیں۔ مارشل آرٹ میں تو اسے ایک بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ کھڑکی جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو بOW کرتے ہیں۔“

ماسٹر پھوپھا ایک بار عرصہ شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے میرا کندھا پتہ لایا اور پھر پچی بھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماسٹر پھوپھا نے کچھ کہا اور وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ ماسٹر پھوپھا اس سے باتیں کرتا رہا اور میں دونوں ہاتھ بائیں اور آئینا ایک طرف کھڑا رہا۔ ایک بھکشو اور ماسٹر پھوپھا کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمی باہر نکلتے تھے۔ تقریباً تین منٹ بعد ماسٹر پھوپھا ہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے بھکشو نے اندر آکر پچی بھی کو گود میں اٹھالیا اور کمرے سے باہر آگیا۔ پچی بھی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ ہم لوگ شہر جا رہے ہیں۔

پچی بھی کو بندو بکس کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹھوڑی دیر بعد ماسٹر پھوپھا اور ایک آدمی دنگن میں بیٹھ کر ڈرائیو پر چلے سے موجود تھا۔

ہمارے اوپن کے پیچھے دو بیک اپ بھی تھی اور اس میں صرف تین آدمی تھے۔ باقی تین آدمیوں کو اس خاقانہ میں پھوڑ دیا گیا تھا۔ دین چھپرے راستے پر چلتی ہوئی سڑک پر آگئی اور تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑنے لگی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ دین مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی واٹ ٹریٹ سے ذرا آگے چائنا ٹاؤن کی طرف گھوم گئی اور ایک تنگ سی گلی میں مڑ کر رک گئی۔ پک اپ بھی چند گھنٹے پہلے جگ بھی تھی۔

وہ گلی گلی تھی جس مکان کے سامنے دین رکی تھی۔ اس کا دروازہ گلی کے دوسرے مکانوں کی نسبت زیادہ کشادہ تھا۔ دروازے کے اوپر ایک بوڑھا لوگ تھا جس پر تھائی اور انگریزی میں مہاراج وانگ وانگ یائے جتنا جیم ایڈموس نے تھائی اسٹیڈیم لکھا ہوا تھا اس کے نیچے انگریز جیل ہیڈ کوارٹر کے الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے۔

ماسٹر پھوپھا دین سے اتر گیا۔ دین رکے ہی دو آدمی جتنا جیم کے دروازے سے باہر آگئے تھے۔ ماسٹر پھوپھا نے ان سے کچھ کہا اور وہ دونوں تیزی سے دین کے قریب آگئے۔ ان میں سے ایک نے جھک کر پچی کو گود میں اٹھالیا اور دوسرے نے میرا بازو پکڑ کر نیچے

اتار لیا۔

باہر سے مختصر نظر آنے والا یہ مکان اندر سے بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کا ایک حصہ جتنا جیم پر مشتمل تھا اور دوسرا اسٹیڈیم پر۔ جتنا جیم کے پچھلی طرف رہائشی کمرے تھے۔ اسٹیڈیم میں دائرے کی شکل میں میز میوں کی طرح بیٹھیں بنی ہوئی تھیں جہاں تقریباً دو ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ درمیان میں کھڑکی کے چٹخوں کا چھوڑا تھا جس کے چاروں طرف موٹے موٹے رے تھے ہوئے تھے۔ یہ رنگ تھا جہاں مقابلے ہوتے تھے۔

ہمیں جتنا جیم کے پچھلی طرف ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک کھڑکی کا تخت تھا جس پر موٹی سی درمی بھی ہوئی تھی۔ دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ پچی بھی کو اس تخت پر لٹا دیا گیا اور میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں آدمی کچھ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد ماسٹر پھوپھا کے کمرے میں آگیا۔ وہ دیر تک پچی بھی سے باتیں کرتا رہا۔ ان کی گفتگو میں کئی مرتبہ میرا نام بھی آیا تھا۔ میں ان کی ساری باتیں تو نہیں سمجھ سکا لیکن مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ماسٹر پھوپھا کے جانے کے بعد پچی بھی نے مجھے بتا بھی دیا کہ وہ میری اب تک کی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

یہ رہائشی کمرے جتنا جیم کے پچھلی طرف تھے۔ گلی کمرے تھے اور یہاں کچھ اور لوگ بھی رہائش پذیر تھے۔ ان کمروں کے آگے وسیع صحن تھا اور اس کے بعد عقیبی دیوار خاصی اونچی تھی۔ عقیبی گلی میں آمدورفت کے لیے دروازہ بھی تھا جو ہمارے آنے کے بعد لاک کر دیا گیا تھا۔

یہاں دو تین دن ہمیں رست کا موقع دیا گیا۔ اس دوران میں میرے جسم کی خراشوں پر باقاعدگی سے دوا لگائی جاتی رہی اور پچی بھی کے ختنے کی باتیں بھی ہوتی رہی۔ تین چار دن بعد میں تو ٹھیک ہو گیا لیکن پچی بھی ابھی چلنے کے قابل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اس پیر پر دباؤ ڈال کر کمزوری نہیں ہو سکتی تھی۔

یہاں آنے کے بعد میرا لباس بدل دیا گیا جس کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ میری ناک سے بعضی والا کالا دھوا کا تو شروع ہی سے نکال دیا گیا تھا۔ البتہ ایک کان میں سونے کی بالی میں نے خود ہی رہنے دی تھی۔ وہ بالی مجھے ابھی لگتی تھی اور ویسے بھی میں اس بالی کو کچا پھر آب سنگھ کی یادگار سمجھ کر اپنے کان میں رکھنا چاہتا تھا۔

ایک ہفتے بعد میری زندگی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ مجھے ہونج نامی ایک ماسٹر کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ چینی انسل تھا اور ماسٹر پھوپھا کا معتد خاص سمجھا جاتا تھا۔ یوں وہ بہت طبعی، ہمدرد اور ہنس کھ آدمی تھا لیکن زندگی کے دوران میں وہ بالکل ایک مختلف آدمی نظر آتا تھا۔ چہرے پر کراختی اور لمبے میں

وہ تو مجھے کوئی بھی لباس پہننے کی اجازت تھی لیکن ٹرننگ کے دوران میں لیٹریننگ تھا اور جسم کے بالائی حصے پر کوئی کپڑا نہیں ہوتا تھا حالانکہ مجھے بنیان پہننے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ میرے سر پر اب بھی روانہ باقاعدگی سے اُسٹرا پچھرا ہوا تھا اور مجھ میں بھی پرہیز روزہ روح صاف کر دی جاتی تھیں۔ ٹرننگ میں شامل میرے ہم عمر کے بھی سمجھے تھے یہ تو مجھے بعد میں بتایا گیا کہ ان سمجھے لڑکوں کا تعلق کسی نہ کسی خفاہ سے تھا جنہیں موئے تھائی کی ٹرننگ کے لیے یہاں بھیجا جاتا تھا۔

اس نے مسلسل میری طرف بڑھتے ہوئے ایک جملہ کہانہ  
 کانپ اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں سے مجھے کوئی نہیں بچائے  
 گا۔ اس کی بات کسی حد تک درست تھی۔ اگر میں قلعہ خانہ  
 کرچینا بھی شروع کر دیتا تو شاید میری آواز اسلینڈم کے باہر  
 کانوں تک نہ پہنچ سکتی۔ ویسے میں اس شخص کی بہت پروا نہ  
 تھی نہیں وہ سا تھا۔ مہاراج وانگ وانگ کے کایہ جنازمہ

میں موبج باکرہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ شخص کئی  
پہلوں سے نیچے جا کر سنبھلا تاہم اسے غالباً بھیجی خاصی چوس چکی تھی  
میں اور اب چاقو بھی اس کے ہاتھ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ  
بڑھیل پر اس گیت کی طرف دوڑتا چلا گیا جہاں سے میں اندر  
داخل ہوا تھا اور اب وہ شخص میرا راستے کانٹے کی کوشش کر رہا تھا  
لیکن میں اس سے پہلوں سے بچنے لگا اور گیت کھول کر باہر نکل آیا۔  
باہر آتے ہی چلنے پھرنے کے لیے اس شخص میں اتنی ہمت کیسے  
پیدا ہوئی کہ وہ اگلا شیروں کی کھچار میں گھس آیا تھا۔ وہ اگلا  
شخص تھا۔ اس کے نصف بدن سانسی اور تھے اور یہاں معرکہ

پولیس نے پھوکیٹ کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ مجھے بھی

اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے تھے لیکن ماسٹر بوجھ اڑ گیا تھا کہ مہاراج کی اجازت کے بغیر وہ مجھے لے جانے کی اجازت نہیں دے گا اور مہاراج وانگ وانگ دنگ یا نے اسے الٹھا پولیس کے چھوٹے افسروں کے کسکیات نہیں تھی۔

بہر حال یہ بات مہاراج وانگ وانگ دنگ یا نے تک پہنچی تھی کہ مجھے جتنا زیم سے اغوا یا قتل کی کوشش کی گئی تھی۔ پہلے شہر سے باہر واقع خانقاہ پر حملہ کیا گیا تھا اور اب جتنا زیم میں گھس کر کوئی کارروائی کرنا گیا اس کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بہر حال پتا چل گیا تھا کہ ان حملہ آوروں کی پشت پر بلیک بائیکر تھا۔ بلیک بائیکر کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

بلیک بائیکر بہت اونچا بد معاش تھا۔ اس کا ایک باقاعدہ گروہ تھا جو مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس نے یہاں امریکی ہائی اسٹیم اپنا رکھا تھا۔ ایک گروہ منشآت کے پرنس کو کنٹرول کرتا تھا اور دوسرا طوائفوں کے کاروبار کی نگرانی کرتا۔ اس طرح تمام شے بے ہوتے تھے۔

اس معاملے میں بلیک بائیکر کے لوٹ ہونے پر مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا نے اس سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس کے ذریعے مجھے پتا چلا کہ دارا اپنا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

بلیک بائیکر کا گروہ اگرچہ بہت طاقت ور تھا لیکن مہاراج وانگ وانگ دنگ یا نے اسے اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے عام شہریوں کی اخلاقی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس کے شاگردوں کی تعداد ان گنت تھی۔ اس کے معمولی سے اشارے پر لوگ کٹ مرنے کو بھی تیار ہو جاتے۔ لیکن مہاراج خون خرابا نہیں چاہتا تھا اس نے بلیک بائیکر کو بیٹھ بھجا دیا کہ وہ دارا یا کم کی حمایت سے ہاتھ بچھنے لے اور اس شہر کا امن و امان برقرار کرے لیکن بلیک بائیکر شرافت کی زبان سمجھنے والا نہیں تھا۔ جو آدمی مہاراج کا پیغام لے کر گیا تھا اس کی واپسی ایسی نہیں ہوئی تھی۔

مہاراج وانگ وانگ دنگ یا نے ماسٹر بھو کو سٹنل دے دیا۔ ماسٹر بھو بھی اگرچہ مہاراج کی طرح دغا فساد نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے بھی ایک کوشش ضرور کی تھی کہ یہ معاملہ خیر و عافیت سے طے ہو جائے لیکن پھر اسے اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ لاقوں کے بحوث باتوں سے نہیں مانتے اور اس طرح بلیک بائیکر اور ماسٹر بھو میں ایک خوف ناک جنگ چھڑ گئی اور یہ جنگ میری وجہ سے شروع ہوئی تھی۔

جتنا زیم میں روزانہ سیکڑوں لوگ آتے۔ ہر سٹوڈنٹ ٹائٹ کو اسٹڈیم میں ملک بائیکنگ کے مقابلے ہوتے تھے جنہیں دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ آتے تھے اور کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ اس واقعے کے بعد جتنا زیم میرے لیے غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ اس لیے مجھے وہاں سے فیلا نیلا چلائی روڈ کے پہلو میں واقع ایک عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ عجیب آبادی والا علاقہ تھا۔

میاں کی آبادی اگرچہ ملی جلی تھی لیکن اکثریت ہندو تھی۔ اس علاقے میں ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔

مجھے ملو ترہ پیشین نام کی جس چوڑی عمارت میں ایک بھی ایک ہندو کی ملکیت تھی۔ وہ دو اور تین تین کھلیں۔ فلیٹ تھے۔ فلیٹ کیا مرغیوں کے ڈھبے تھے جن میں انسان بھی چھوڑ تھے۔ آمدورفت کے لیے دو ٹنگ سے زینے اور ایک تھی۔ لفٹ اکثر خراب رہتی تھی۔ زینوں پر اس قدر غلاطت بکھری رہتی تھی کہ آتے جاتے انکائیاں آنے لگتی تھیں۔ ہمارا تین کمروں پر مشتمل فلیٹ دوسری منزل پر مندر کے سامنے کے رخ پر تو ٹنگ سی گئی تھی اور پچھلی طرف۔ جہاں صبح سے رات تک ایک ہنگامہ سا رہتا تھا۔ مجھے جیڑ اس پڑ ہنگامے علاقے میں لوگ کسی طرح زندگی گزارتے تھے۔ میرے ساتھ دو آدمیوں کو بھیجا گیا تھا۔ مجھے فلیٹ کے بعد ایک آدمی واپس چلا گیا اور دوسرے کو وہیں رہنا تو فلیٹ میں دو ہندو عورتیں رہ رہی تھیں۔ ایک اور عورت دو دوسری جوان۔ وہ دونوں ہمیں تھیں۔ جوان عورت کی ایک کے لگ بھگ دہائی ہوئی۔ میں اسے مہاراج کے جتنا زیم پر ایک دو مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اس روز باتوں میں انکشاف ہوا کہ نام کی وہ خوب صورت عورت ماسٹر بھو کی شاگرد تھی اور علاقے میں ٹریننگ سینٹر چلا رہی تھی۔ اس کی بڑی بہن ٹائیٹ وٹ روڈ کے ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر ملازم تھیں۔ اور واپسی رات کو ہوتی لیکن میرے آنے کے بعد وہ اپنے جاننے والے کے ہاں منتقل ہو گئی تھی۔

تین دن نہایت سکون سے گزرے۔ کوٹلیا کا بڑا گھر بری گزر رہا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی۔ سٹاک اور بے بعد مجھے پہلی مرتبہ یہاں انٹرن کھانے کھانے کو لے کر کوٹلیا خود گوشت نہیں کھاتی تھی لیکن اس روز اس نے میرے لیے طور پر گوشت کا ساں تیار کیا تھا جو بہت لذیذ تھا۔

دن میں دو تین مرتبہ ماسٹر بھو ٹی فون پر صورت حال کر لیا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے بھی اس سے بات کی تھی۔ میں نے اسے یہ بتایا کہ میں یہاں ہو رہا ہوں تو اس نے کہا کہ دو چار روز میں بھی کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔

میرے کمرے کی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی کے سامنے دھڑ بڑھتا رہتا لیکن شام کا اندھیرا بعد میں کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا اور اندھیرا دیکھتا رہتا۔

کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا اور دوسری طرف ہاتھ دھو آنے کے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں رات کو میں سوٹا تھا اور دوسرے میں کوٹلیا۔ میرے کمرے میں ایک چھوٹا سا ہاتھ دھو آنے کا کمرہ تھا۔

رات کو سوتے وقت دونوں کمروں کے دروازے اندر سے بند کر لے جاتے تھے۔ ان دونوں کمروں کے بیچ میں ایک دروازہ تھا جو کھلا رہتا تھا۔

اس رات کوٹلیا دیر تک میرے کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہی اور جب بیڈ سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں بہتر پریٹ گیا۔ فوراً ہی نیند کی آغوش میں چھٹی گئی۔

میں شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک حسین اور جوان عورت نے لمبی جاری تھی۔ کبھی میری پیشانی پر بوسے دیتی اور کبھی گالوں پر اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے۔ میرے ہونے جسم میں نفسی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ ایک لفٹ سے اٹھانے مجھے اپنی پیٹ میں لے کر رکھا تھا۔ ایسا احساس میں نے زندگی میں پہلے کسی محسوس نہیں کیا تھا اور پھر اس حسین عورت نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر جمادے اور مجھے سمجھنے لگی۔ میرا ماسٹ لٹھ لگا۔ میں اپنے آپ کو اس عورت کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کے لیے کھسکانے لگا لیکن اس نے بڑی سختی سے مجھے روک رکھا تھا۔

اپنے آپ کو اس عورت کے شکم سے چھڑانے کی جدوجہد میں میری آنکھ مل گئی اور پھر میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ ایک خوف ناک حقیقت تھی۔ کوٹلیا مجھ سے لمبی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اے۔۔۔ رام سے لیٹ جاؤ۔“ کوٹلیا نے سرگوشی کی۔ ”جیسے یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔“ میں ہٹکایا ”میری نظروں میں آپ کا بہت احترام ہے میں تو۔۔۔“ ”مجھے اپنی بات سنائی دیتی تھی۔ یہی کہنا چاہے ہوتا۔“ اس نے میری گات کاٹی ”یہ سب دھوکے ہیں۔ رہنے صرف خون کے ہوتے ہیں۔ باقی سب فریب ہے جس شخص نے سب سے پہلے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ عمریں مجھ سے تین سال بڑا تھا اور مجھے بھی کتنا تھا۔ میں کسی رشتہ کو نہیں مانتی۔ تم مجھے آئی کو میا دیو لکھن میں جیسے صرف اور صرف ایک مرد سمجھتے ہو جو خوں خوں پوری کر سکا ہے اب تم خاموشی سے وہ کرتے رہو۔“

”نہیں نہیں۔“ آواز میرے حلق میں اٹک رہی تھی ”پلیز! مجھے چھوڑ دو۔“ مجھے کسی ایسے کام کے لیے مت کوہنے میں برا سمجھتا ہوں اور جس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔“

”تم بچے نہیں ہو۔ پھر پور تو جوان ہو۔“ کوٹلیا نے کہا۔ اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں ”تم کچھ نہیں جانتے۔ میں تو تین سال بڑا ہوں کہ زندگی کیا ہے۔ زندگی کی اصل رنگینیاں اب تک تمہاری نگاہوں سے اوچھل رہی ہیں اور میں جسیں ان سے محافف کرنا چاہتی ہوں۔ آؤ۔۔۔ مجھ سے دور مت بڑو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔۔۔“

”نہیں۔“ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا اور بیڈ سے اتر کر کھڑکی کے قریب آ گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے بھر رہے تھے۔

کوٹلیا بھی میرے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں کے اوپر سے آگے لٹکا دیے اور میری پشت سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔

”تم زندگی کی ایک بہت بڑی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے انکار کیا تو اس کا نتیجہ۔۔۔“ ”پلیز! میں نے اس کی بات کاٹ دی۔“ آپ میرے پاس سے ہٹ جائے ورنہ میں رومیو کو آواز دے کر بلا دوں گا۔“ رومیو اس محافف کا نام تھا جو باہر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر الگ ہو گئی۔ اس نے مجھے ہانپوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ کسی کی نظروں میں ایسی سرد مہری میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”تم اپنی زبان بند رکھو گے۔“ اس کی سرکشی میں بھی دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرے بازو چھوڑ دیے اور پھر بچھنے ہوئے اندرونی دروازے سے گزر کر اپنے کمرے میں بیڈ پر جا گری۔

میں بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ میری عجیب کیفیت تھی۔ دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور پورے بدن میں منشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ جسم کے مسام پیسہ اگل رہے تھے اور سانس تیز ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا اور آواز ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

میں نے اپنے بارے میں پہلے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اب کوٹلیا کے اس طرز عمل نے میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ کیا میں واقعی اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ عورتیں مجھ سے اس قسم کی توقعات وابستہ کر سکیں؟ میں تو اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھتا تھا اور کبھی ایسی کوئی بات نہیں سوچتی تھی۔ میں نے کئی عورتوں کو نیم پر بند بھی دیکھا تھا۔ سنگاپور میں تو حارہ کا شی کے ساتھ لپٹ کر سوتا رہا تھا لیکن میرا ذہن کبھی پرانگندہ نہیں ہوا تھا۔ حارہ کا کافی کی آغوش میں مجھے ہمیشہ سکون ملا تھا۔ اس کے سینے سے لپٹ کر میں نے ہمیشہ ماسٹ کی گرمی محسوس کی تھی۔ کئی میٹوں تک خانقاہ میں بھی بھی کے ساتھ رہا تھا۔ وہ کوٹلیا سے زیادہ جوان اور حسین تھی اور رات کو میں اکثر

اسی کے ساتھ لپٹ کر سویا کرتا تھا لیکن میرے ذہن میں کبھی کوئی شیطانی خیال نہیں آیا تھا۔ کوٹلیا کے ساتھ رہتے ہوئے بھی دل میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی لیکن آج کوٹلیا نے جو حرکت کی تھی اس نے مجھے اپنے بارے میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میری کپٹیاں سٹلنے لگی تھیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کوٹلیا اپنے بیڈ پر بے لباس آڈی ترحمی لٹتی ہوئی تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اس کے کپڑے میرے بیڈ پر پڑے ہوئے تھے۔ میں چند لمبے کچھ سوچتا رہا پھر اس کے کپڑے اٹھا کر بے قدموں اس کے کمرے میں گیا۔ کپڑے اس کے بیڈ پر رکھ دیے، چادر اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دی اور دوبارہ کھڑکی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

عمارت کے پیچھے کی وہ سڑک جہاں دن بھر زندگی کے ہنگامے جاری رہتے تھے اور لوگوں کی باہو میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اس وقت سنسان پڑی تھی۔ میری آنکھوں میں مریض سی لگ رہی تھی۔ دور کسی کلاک نے تین بجے کا اعلان کیا تو میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوٹلیا اسی پوزیشن میں اپنے بستر پر پڑی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بیڈ پر گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند آنکھوں سے کبھی دور نہ گئی۔ دماغ میں اب بھی کچھ بکھل سی ہوئی تھی۔ بستر پر کھسب بدلے ہوئے میں نے کسی کلاک ٹاور سے چار بجتے کے گھنٹے کی آواز بھی سنی تھی اور پھر نجانے کب میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کوٹلیا میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ میرے گتے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے بڑے پیار سے مجھے جگا رہی تھی۔

”اٹھ جاؤ۔ دس بج چکے ہیں۔ تمہاری وجہ سے میں نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

اس نے مزید جبکہ کمری پریشانی پر سو رہا تو میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں دیکھا تھا کہ کبھی وہ اس سے آگے نہ بڑھ جائے لیکن پھر کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر کینے اطمینان سا ہوا۔

”رات کو جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔“ کوٹلیا نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگرمی کی ”نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو ذرا اور بھول جاؤ۔“ کچھ۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرو گے۔“

”میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔“ میں کہتے ہوئے اٹھ کر باہر روم میں گھس گیا۔

کوٹلیا بظاہر اپنے کمرے پر نام تھی لیکن میں محتاط رہنے لگا تھا۔ جبکہ اس کے دوسرے سے لگتا تھا جیسے میری چال چلی کر رہی ہو۔

دونوں اور مڑ گئے۔ اس دوران میں کوئی غیر معمولی بات

نہیں ہوئی۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ اس رات میں اور کوٹلیا نے باتیں کر رہے تھے کہ میزبوں کی طرف سے شور مچا رہا تھا۔ دونوں چونک گئے۔ شور کی آواز پیچھے سے آ رہی تھی۔ کوٹلیا اشارے پر رو میو دروازہ کھول کر فلیٹ سے باہر نکل گیا اور روم میں حال معلوم کرنے کے لیے میزبیاں اتارنے لگیں۔ لیکن کچھ دیر سے مڑ کر وہ دوڑتا ہوا میزبیاں پر گئے۔ وہ دھواں کی سی تھیں۔ کچھ کچھ بھی رہا تھا۔ کوٹلیا دوڑ کر دروازے کے قریب پہنچے۔ اسی لمحے رو میو اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا اور چونچ پڑے۔ کتنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر کے کمرے پر دھڑکا اور وہ دونوں ہماری فرخ پھر کھینچ کر دروازے کے سامنے رہ گئے۔

”وجدان۔ وہ لوگ آگئے۔ کسی جگہ چھپ جاؤ۔“ کوٹلیا نے اور اس نے دیوار پر چھپی ہوئی ایک کھوار آٹلیک اس کو اشارے سے بلا ت بھڑوڑا تھا اور اندر کی طرف سے تم کھٹکے پتھر پتھر چوڑائی کم ہوتی چلی گئی تھی۔

یہ سمورائی تھی۔ زمانہ قدیم میں یہ دہلی کھوار جنگ کی لڑائی کے لیے بہت کارگر اور اہم ہتھیار سمجھی جاتی تھی لیکن اب تو یہ ہتھیار نفاش و آرائش کے لیے رہ گئی تھی۔ تاہم بارش آرائش کے لیے کھیلوں میں کھوار اور سائی قسم کے کچھ اور قدیم ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ رو میو نے بھی ہوسٹرس اپنا رول اور نکال لیا تھا۔ میرے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اس جوش و خروش میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہاتھ روم میں گیا کی پناہ لینے چھپنے کی کوشش کرنا ایسا ہی تھا جیسے کبوتر کی کوکھ پر آکھیں کر لے اور گتے کمرے میں محفوظ ہوں۔

بھاگ دوڑ اور شور کی آوازیں اب اوپر آتی جا رہی تھیں۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ اگر کوئی ہمارے فلیٹ پر حملہ کرنے آیا تو ہمیں نیچے روکنے والے کون تھے اور پھر کوٹلیا نے مجھے یہ سوال کا جواب مل گیا۔ ہاشم بھو کے دو آدمی ہر وقت نیچے گئے مگر موجود رہتے تھے اور حملہ آوروں کا انہی سے تقاضا ہو گیا تھا۔ ہنگامہ اب ہماری میزبیاں سے نیچے والی لینڈنگ پر ہوا تھا۔ اچانک دو فائر ہوئے اور اس کے ساتھ ہی ایک بھیاک بانی خالی دی گئی۔

”تم اپنے کمرے کے ہاتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لو۔“ کوٹلیا چپچی۔ وہ کھوار کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالے دروازے کے ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی اور رو میو نے سنبھالے دوسری طرف دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ اوپر پہنچ گئے تھے۔ بلڈنگ میں رہنے والے ہیں۔ عورتوں کے چپچنے کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے فلیٹ کا دروازہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ساتھ ہی خالی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہا جا رہا تھا۔

”بھگ جان۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔“ کوٹلیا میری طرف دیکھ کر

چپچی۔ فائر کی آواز سنائی دی۔ گولی دروازے کے تالے پر پڑی تھی اور پھر اس کا پیچھے دروازہ توڑنے کی کوشش جاری چلائی تھی۔ کمرے میں آگیا اور ہاتھ روم میں گھس گئے تھے۔ وہیں بھاگ کر اپنے کمرے میں آگیا اور ہاتھ روم میں گھس گئے تھے۔ رک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا اور پھر لپک کر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے کھڑکی سے بھاگ کر دیکھا۔ ہاتھ روم والی سائڈ پر دروازے کے ساتھ ڈرین پائپ تھا جو بلڈنگ کے اوپر سے نیچے تک چلا رہا تھا۔ میں ایک لمحے خفا کے بغیر کھڑکی کی چو کھٹ پر چڑھا اور بائیں طرف لپک کر ایک ہاتھ سے اس ڈرین پائپ کو پکڑ لیا اور کھڑکی کی چو کھٹ سے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے ڈرین پائپ کو پکڑے تھری سے نیچے جھٹکتے لگا۔ فلیٹ کے دروازے پر زور آنا پائی کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

پہلی منزل کی کھڑکی سے ذرا نیچے چلنے کے بارے میں۔ میں بڑی احتیاط سے ان نالوں سے بچتا ہوا نیچے آیا اور پھر لڑک کی ہلکی آواز سن کر مجھے سینے میں دل دھڑکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس جگہ ڈرین پائپ کا ایک جوڑا تھا اور پائپ کو دیوار کے ساتھ سارا دینے والا بڑا ٹکڑا ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے بوجھ سے دوسرے ٹکڑا کی ہلکی ہلکی دھڑکی رہی تھی اور پائپ آہستہ آہستہ دیوار سے پیچھے ہٹا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر نیچے دیکھا۔ اس وقت اگرچہ سوایا ہوا بیج رہے تھے مگر باز میں اب بھی دھڑکی۔ دوشیزوں سے بازار جھکا ہوا تھا۔ بہت سی دکانوں کے اوپر دھوپ اور بارش سے نیچے کے لیے کیوس کے سامناں تھے ہوئے تھے۔ میرے نیچے والی دکانوں پر بھی سامناں تھے ہوئے تھے۔

اسی دوران میں سڑک پر ایک راہ گبر نے مجھے دیکھ لیا اور وہ اور اٹھا کر گتے ہوئے شور مچانے لگا۔ فلیٹ سے دو گولیاں چلنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں نے پھر نیچے دیکھا اور اس سے پہلے کہ پائپ پوری طرح اپنی جگہ چھوڑ دیتا میں نے پائپ کو چھوڑ دیا۔

میں کھال کے سامناں کو ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔ سامناں میں لگا سناؤ ہونے کی وجہ سے مجھے چوٹ نہیں گئی تھی البتہ اس دکان کے سامنے کھڑے ہوئے دو تین آدمی سامناں کی پلٹ میں آگئے تھے۔ راہ گبر میری طرف دیکھ کر شور مچا رہے تھے۔ میں سنبھلتے ہی اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹھیک اسی لمحے فلیٹ کی کھڑکی سے فائر ہوا۔ گولی سڑک پر کھڑی ہوئی ایک کار کی دینڈا سکرین پر گئی۔ ٹھیک میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دوڑتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔ میں فوراً گھس گیا۔ گلیوں میں گھولیں میں دوڑتا رہا۔ ایک تاریک گلی میں ٹھیک کھڑا کر لگا۔ میرے گتے پر چوٹ لگی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑا کھٹا سلاٹا اور کراہتا رہا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا

کہ وہاں اس بار بار کر دوتے لگوں۔ میں اس شہر میں بالکل اجنبی تھا۔ مجھے جہاں بھی لے جایا گیا تھا ہند کا ڈیو میں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بکا و تھارو بے سارا محسوس کر کے میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کیا مجھ جیسا کوئی بد قسمت اس دنیا میں ہو گا جس کے ماں باپ کو اس کی آنکھوں کے سامنے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو اور وہ موت کے فرشتوں سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا ہو۔

میں کچھ دیر دیوار کے ساتھ کھڑا مضروب کھٹا سلاٹا رہا اور پھر لنگھتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ میں اس سڑک سے ابھی زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے ان گلیوں میں بھی آنکھیں گے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ رو میو اور کوٹلیا کا کیا حشر ہو گا۔ لیکن اتنا جانتا تھا کہ اگر میں ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میں ایک گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔ بائیں طرف کی گلی سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ میں پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کو دھڑک دیکھنے لگا۔ اوپر پھر چند کچھ جاکر ایک مکان کے سامنے ٹھہرے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس طرف دکانوں کے ساتھ ساتھ ایک گندی ٹالی تھی۔ گھروں کا کتہہ پانی اس ٹالی میں گر رہا تھا اور بعض گھروں کے دروازوں کے سامنے اس طرح کے سینٹ کے چوتے بے ہوئے تھے کہ ٹالی بھی ان کے نیچے سے رواں تھی اور گھروں میں اندورفت کے لیے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

میں اس چوتے کے پیچھے دیک کر قدموں کی آوازیں سننے لگا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے بھاگ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ شخص مجھ سے صرف بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے کالی پتلون اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی جس کے بن کٹے ہوئے تھے۔ بال گردن تک لمبے تھے اور سر پر سرخ بینڈ لگا ہوا تھا۔ اس وقت میری کیفیت واقعی اس کبوتر جیسی تھی جس نے بلی کو کھد کر آنکھیں بند کر لی ہوں۔

میرے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ جسم پسینے میں تر ہونے لگا۔ یہ بھی غیبت تھا کہ وہ گلی سنسان تھی۔ اگر آمدورفت ہوتی تو یقیناً کسی نہ کسی کی نظروں میں آ جاتا۔ چند سینکڑے بعد قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پھر گردن نکال کر دیکھا۔ وہ آدمی دوسری طرف جا رہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر وہ اس گلی میں آ جاتا تو میں پکڑا جاتا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میں چوتے کی آواز سے نکل کر بے قدموں چلتا ہوا موڑ پر آ گیا اور بھاگ کر دیکھنے لگا۔ بائیں طرف تقریباً پچاس گز آگے وہ ایک آدمی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ دونوں سامنے والی گلی کی طرف مڑ گئے۔ میں بھی اس گلی سے نکل کر دوسری گلی کی طرف دوڑا۔ اسی لمحے مجھے چپچنے کی آواز سنائی



دی۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ دونوں چیختے ہوئے میرے پیچھے دوڑ پڑے۔

میں جان توڑ کر اس گلی میں دوڑ رہا تھا۔ جو گنگ اور ایرو بکس کی ٹریننگ میرے کام آگئی تھی۔ مجھے دوڑتے ہوئے ذرا بھی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ پہلے جانے کا خوف مجھے مزید تیز دوڑنے پر اکس رہا تھا۔

دو تین گلیوں میں دوڑتا ہوا میں ایک اور کشادہ بازار میں گیا اور سڑک عبور کر کے ایک اور گلی میں داخل ہو گیا۔ چند گز آگے ایک ٹائٹ کلب تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرا تعاقب کرنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں کلب میں گھس گیا۔

دروازے میں ٹھہرتے ہی ایک آڑ میں کڑے ہو کر میں اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا اور پھر مختصری ڈیوڑھی گھوم کر میں مرکزی ہال کی طرف گیا۔

ہال کی ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔ فضا میں تمباکو کی بو رچی ہوئی تھی۔ سامنے اسٹیج پر عورتوں کی باکسنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ مختصرے لباس میں دو جوان لڑکیاں تھیں جو ایک دوسرے پر تباہ توڑ حملے کر رہی تھیں اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ شور مچا رہے تھے۔

کوشلیا نے مجھے بتایا تھا کہ بنگال میں خواتین میں بھی کنگ باکسنگ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ٹائٹ کلبوں میں بھی خواتین کے ان مقابلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ نچلے درجے کے ٹائٹ کلبوں کا بزنس عورتوں کے ان باکسنگ کے مقابلوں پر چلتا ہے۔

یہ بھی کوئی ایسا ہی نچلے درجے کا کلب تھا لیکن میں اس ہال میں نہیں رکنا۔ دیوار کے ساتھ تیز تیز چلتا ہوا ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ آگے ایک تنگ سی راہداری تھی۔ جس کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا۔ میں وہ دروازہ کھول کر پیچھے ہی اندر داخل ہوا، میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ بڑی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے حسی سی ہونے لگی۔ اس ہال کے ایک کونے میں کم روشنی کا صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ پورا ماحول نیم تاریک تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی تھی۔ شہیلے کی کوشش کرتے ہوئے میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ فرش پر کئی لوگ آؤے تریچے بڑے ہوئے تھے۔ ہال میں پھیلی ہوئی شدید ناگوار بو کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ وہ سب لوگ نشہ کر کے اوندھے بڑے ہوئے تھے۔ نیم تاریک ماحول میں کہیں کہیں مدھم سی چنگاریاں بھی ملکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ حشیش کے سکرینٹ پی رہے تھے۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا اور پھر اپنے عقب میں وہی دروازے کی آواز سن کر چوک گیا۔ جس سے گزر کر میں یہاں تک آیا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں بڑی پھرتی سے فرش پر ایک ایسے آدمی کے قریب لیٹ گیا جس

کے نہ صرف منہ سے بلکہ لباس سے بھی بڑی ناگوار سی بو تھی۔ میں نے فرش پر گر کر عقل مندی کی تھی کیونکہ اسی نے پینٹ اور سفید شرٹ والا وہ آدمی ہال میں داخل ہوا جس نے سرخ رنگ کا بنڈ لینا ہوا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ چٹون کی جڑ پر تھا۔ غالباً اس نے بتول جیب میں ڈال لیا تھا۔

وہ چند لمبے دروازے کے قریب کھڑا رہا اور پھر آگے نشتے میں دھت لوگوں کو ٹھوکر سن مارنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کچھ بھی رہا تھا۔ ایک آدمی کو ٹھوکر لگی تو اس نے بڑی غلطی کر دی۔ وہ غذا ابھی کالیاں بکھا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر وہاں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دو تین منٹ تک فرش پر اڑ رہا۔ فرش پر اس طرح پڑے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ ہر ایک چٹولی گیلی ہو رہی ہے۔ شاید فرش پر پانی گرا ہوا تھا۔ ہاتھ ٹھنڈ کر دیکھا تو مجھے انکال سی آگئی۔ میرے ساتھ جو آدمی نے ہوش پڑا تھا، اس کی چٹون گیلی ہو رہی تھی۔ مجھے کراہیت آنے لگی۔ میں نے اپنی شیکرے ہاتھ صاف کیا اور ٹھنڈے رہنے لگا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرف غمی گڑ نکلے گا کوئی راستہ ضرور ہو گا۔

ہال کے اختتام پر ایک تنگ سی راہداری تھی۔ میں راہداری میں گھستا چلا گیا۔ آگے یہ راہداری دائیں طرف مڑی تھی۔ جبکہ بائیں طرف اوپر جانے کے لیے کھڑی کا ایک خانہ زمین تھا۔ میں راہداری میں مڑنا ہی چاہتا تھا کہ اس طرف ڈبہ کی آواز سن کر بڑی پھرتی سے زمین کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک نرا راہداری میں مڑ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

”پہلے وہ لوگ آئیں جنہیں سکرینٹ چاہئیں۔ اس کے بعد انجکشن والے آئیں۔ رقم ہر ایک کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ ایک بھات بھی کم ہوا تو کچھ نہیں ملے گا۔“

میں بڑی آہستگی سے زمین کے پیچھے سے نکلا۔ ٹھیک اسی ہال کی طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے سارے سولائی ہی مرتبہ اس آدمی پر بھجٹ پڑے ہوں۔ میں زمین کے پیچھے نکل کر سامنے راہداری میں جانے کے بجائے غیر ارادی طور پر کھڑی کے زینے پر پڑھتا چلا گیا۔ زمین کے اختتام پر ایک غصہ راہداری تھی۔ اس راہداری میں آئے سامنے ایک ایک کمرہ اور ایک دروازہ بالکل سامنے تھا۔ سامنے والا دروازہ کسی کے نہیں تھا کیونکہ اوپر کھلا آسمان نظر آ رہا تھا۔

دائیں بائیں دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے بائیں طرف والے کمرے میں تار کی تھی جبکہ دائیں طرف کمرے میں روشنی تھی۔ سامنے نیلے رنگ کا دیوار پڑھتا ہوا اندر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں دے نہ دے ہوا اس دروازے کے قریب پہنچ گیا اور ذرا سا پردہ سرکھا

میں نے کٹہرے کو ایک زور وار ہموکا دیا۔ کھٹ کی گواز سے بولٹ کھل گیا۔ آواز پھر زیادہ ہی ابھری تھی۔ روکا دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ دوسری طرف نیچے جانے کے لیے بیڑیاں تھیں۔ ان بیڑیوں کے اختتام پر بھی ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے مرکز درگھا تو بیڑیوں پر بچھے اس آٹھ ڈاگ کی کوہڑی نظر آئی۔ اگلی بیڑھی پر قدم رکھتے ہی دروازہ کھلا ہوا کہ ایک سگستا تھا میں مرکز بڑی تیزی سے بیڑیاں اترنے لگا۔ اور سے مجھے چنچنے کی

اور دوسری طرف لم فینی باکنگ اسٹیڈیم۔ اس وقت رات تھی۔ بجے والا تھا اور پارک سنسان پڑا تھا۔ اسٹیڈیم والی سائٹ پر۔

داخل ہو کر اس عورت نے بیابانِ حلائی میں اور مجھے ایک کمرے میں بے آگاہی میں بچھا ہوا تھا۔ ایک کارنر پر بیدار کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں پر خوب صورت فرسٹوں میں کچھ رنگین تصویریں بھی

میں نے جسم کو پچھ کر تو لیا اچھی طرح پلٹ لیا۔ پہلا دروازہ  
تھوڑا سا کھول کر جھانکا اور پھر باہر آ گیا۔ تھائی وانگ کمرے میں  
نہیں تھی۔ ہاتھ دوسرے سے نکلتے ہوئے میں اپنے کپڑے بھی اٹھا لیا  
تھا۔ اور نیکر بیٹھنے لگا تھا کہ تھائی وانگ کمرے میں داخل ہوئی۔

”مکندے کپڑے دو بارہ بن رہے ہو۔ ایک طرف ڈال دو انہیں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی ”مکندے ایسا حال یہ بن لو۔ صبح کوئی بندوبست کروں گی۔“ اس نے ایک نیکر اور بنیان بند پر ڈال دی۔ میں نے نیکر اٹھالی اور اس کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نیکر اور بنیان اٹھا کر ہاتھ دھو دم میں گھس گیا۔ اور جب باہر نکلا تو تھائی وانگ اس وقت بھی کمرے میں کھڑی تھی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تمہارے لیے کافی بنائی ہے۔ آؤ۔ دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھے ہیں۔“ وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ہم نشست گاہ میں آگئے۔ کافی ٹیبل پر دو گھر رکھے ہوئے تھے جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں اس وقت واقعی کافی یا چائے جیسی چیز کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے صوفے پر بیٹھ کر ایک کپ اٹھایا اور گرم گرم کافی کی چٹکیاں لینے لگا۔ تھائی وانگ بھی کافی کی چٹکیاں لیتے ہوئے کمری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم نے بتایا تھا کہ کچھ غنڈوں نے تمہارے فلیٹ پر حملہ کیا تھا اور وہ تمہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔“ تھائی وانگ نے کافی کی چٹکی لیتے ہوئے کہا ”ان غنڈوں کی تم سے کیا دشمنی ہے اور وہ تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ سوچ رہا تھا کہ اسے اصل بات بتاؤں یا کوئی فرضی کہانی بنا دوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصیبت کے وقت یہ میرے کام آئی تھی۔ مجھے اپنی کار میں وہاں سے نکال لائی تھی۔ اب تک میرے ساتھ اس کا سلوک ہمدردانہ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

”مجھے اپنا دوست سمجھو۔“ مجھے خاموش پا کر وہ میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولی ”تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ میں تمہاری ہر غمن مدد کروں گی۔“

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا رہا پھر اسے شروع سے سب کچھ بتا دیا۔ میں اس شہر میں انہی تھا۔ مجھے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ مجھے رہنے کے لیے ٹھکانا بھی چاہیے تھا اور تحفظ بھی۔ مہاراج وانگ وانگ یائے نے اگرچہ میری حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور دشمنوں سے بیڑہ آزا ہونے کے لیے میری تربیت بھی شروع کر رکھی تھی لیکن میرے دشمنوں کو پتا چل گیا تھا کہ میں اس کی تحویل میں ہوں اور مجھ پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ دارا کو اور بہن نانگ اس شہر میں موجود تھے۔ انہوں نے شہر کے سب سے بڑے بدوش کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ مہاراج اور بلک ٹانگیر کے گروہ میں فتن گئی تھی۔ بلک ٹانگیر کے غنڈے تین مرتبہ مجھ پر قحطانہ حملے کر چکے تھے اور تینوں

مرتبہ میں بال بال بچا تھا۔ آج رات تو میں پوری طرح اس کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اگر میں کمری کے راستے فلیٹ سے نکل کر کامیاب نہ ہو پاتا تو یقیناً مارا جاتا۔ کوشلیا اور روسیو کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ ان کا کیشرو ہوا تھا۔ فلیٹ سے فرار ہونے کے بعد میں پناہ لینے کے لیے ایک ٹائٹ کلب میں گھس گیا تھا اور وہاں جی فانگ کو دیکھ کر میری روح تازہ ہو گئی تھی۔ اس ٹائٹ کلب میں جی فانگ کی موجودگی سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس ٹائٹ کلب سے اس کا کوئی تعلق ضرور ہے۔

ان حالات میں میں مہاراج کے جہاززم کا رخ نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے قتل و غارت ہوئی رہے اور یہ نگاہ مارے جاتے رہیں۔ میں چند روز کے لیے کسی ایسی جگہ رہنا چاہتا تھا جہاں کسی کو میرے بارے میں اطلاع ہو سکے اور اتفاق سے مجھے تھائی وانگ مل گئی تھی۔ اس لیے میں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

”بلک ٹانگیر بہت بڑا بدعاش ہے۔“ وہ میرے خاموش ہونے پر بولی ”تھائی لینڈ کے سفاک ترین آدمی اس کے گروہ میں شامل ہیں۔ کسی انسان کی زندگی ان کے لیے کوئی مٹتی نہیں رہتی۔ ان کی وجہ سے آئے دن شہر میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ پولیس بھی ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مہاراج وانگ وانگ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے اپنی کی اخلاقی حمایت بھی حاصل ہے۔ لوگ اس کے اشارے پر گھرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ مہاراج کے پاس بھی دنیا کے کچھ فائز نہیں مگر مہاراج نے انہیں بیشہ امن و آسختی اور عدم تشویش کا تعلیم دی ہے۔ مہاراج لاڈ بڑھا کا سچا بیڑہ کار ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ مہاراج کے آدمی قتل و غارت گری کر سکیں گے۔“

”میں بھی قتل و غارت نہیں چاہتا۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں یہاں بالکل انہی ہوں۔ کسی کو نہیں جانتا۔ میرا پاس تو رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔“

”تم اپنے آپ کو بیادو روڈ گارٹ سمجھو۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری ہر ممکن مدد کرے گی۔ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ کچھ عرصہ بیٹھ رہو اور جب حالات کچھ بہتر ہو جائیں تو خاموشی سے اس شہر سے نکل جاؤ۔ میں اس سلسلے میں بھی تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ بہت سے اس دوران میں تمہارے دشمن بھی مایوس ہو کر یہاں سے چلے جائیں۔“

”میرا خیال ہے انہوں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میں اپنے والدین کے قتل کا واہ دیکھ گیا ہوں۔ ان لوگوں کو شناخت کر سکتا ہوں۔ اگر معاملہ منہ قتل کا ہو تو وہ لوگ خود کہیں غائب ہو جاتے اور میرا پیچھا

کرتے ہیں۔ چاہا پر آب تک نے مجھے بتایا تھا کہ دارا دراصل اپنے ایک سینڈ کینٹ قائم کرنا چاہتا ہے۔ آسٹریلیا کی طرف ہجرت کر کے لے دے گا اور کو اپنا بیڑہ کو آسٹریلیا چاہتا ہے۔ میری ایک شکایت کے لیے مستقل خطرہ بنا رہوں گا اور میں جب تک مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اگر اس کے لیے ہر قیمت پر مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اس بات صرف قتل ہی ہو سکتی تو وہ یہاں تک میرا پیچھا نہ کرتا۔ اس کے علاوہ“

”اس کے علاوہ کیا؟“ مجھے خاموش پا کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”میرے والد جب پاکستان میں تھے تو انہوں نے دارا کے پاس کا باغ کوڑھ دینے بابت کا سوچا چھپا دیا تھا۔ وہ سکا ہے دارا کو کسی طرح تک مل گئی ہو کہ وہ سونا ایسی تک محفوظ ہے۔ اس وقت اس سونے کی بابت دیکھی ہو چکی ہوگی اور وہ اس سونے کا پتا بھی چلانا چاہتا ہوگا۔“

سولے والی بات سن کر تھائی وانگ کی آنکھوں میں عجیب سی ہلک ابر آئی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”میرے مسزودہ ان۔ تم اطمینان سے یہاں رہو۔ یہاں جس کوئی ڈسٹر نہیں کرے گا اور میں کو شش کروں گی کہ تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچا کر کہیں دور بھیج دوں جہاں وہ تم تک نہ پہنچ سکیں اور میرا خیال ہے اب سوچنا چاہیے۔“

میں نے دارا کی فکر لاک کی طرف دیکھا۔ تین بیٹے والے تھے۔ مجھے ایک بیٹہ دوام میں لے آئی۔

”اتج سے یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ اس نے کہا ”کسی خوف و دشمنی کے بغیر آرام سے سو جاؤ۔“ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے بیٹہ دوام میں چلی گئی اور میں بستر پر لیٹ گیا لیکن مجھے در تک خیز نہیں آئی۔ میں کوشلیا اور روسیو کے بارے میں سوچتا رہا۔ مہاراج اور ہاشرو کو بھی یقیناً فلیٹ پر حملے کا پتا چل گیا ہوگا۔ مجھے غائب پا کر وہ لوگ پریشان تو ضرور ہوئے ہوں گے اور مجھے تلاش بھی کر رہے ہوں گے۔

میں دہلے رکے بغیر اپنے کمرے میں آکر ہاتھ دھو دم میں گھس گیا اور بیڈ میں منت بعد جب باہر نکلا تو وہ لاؤنج میں کافی ٹیبل پر ناشتا کر رہی تھی۔ پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ لیکن سے برتنوں کی آواز سن کر میں اس طرف چلا آیا۔ وہ ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتی ہی بولی۔ ”چھا ہوا تم جاگ گئے۔ میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔ تم بھی جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔“

اپنے کی جا بجا دم قسم کی کوئی چیز پہنے ہوئے تھی۔ اوپر اوپن شرٹ تھی جس کے اوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ میرے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور جب ناول منہ میں ڈالنے کو آگے جھکی تو میری نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جائیں۔

ناشتے میں خالی یاڈ سائی اور ڈبل روٹی تھی۔ یہ انڈے کا آلیٹ تھا جس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، پیاز، سبز شامل تھے۔ شاید شہر بھی ڈالی گئی تھی کیونکہ ڈالنے میں ہلکی سی مٹھاس تھی۔ یہ ڈش یقیناً مزے دار تھی لیکن میری توجہ بٹ گئی تھی اور میں ناشتے سے بڑی طرح لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تھائی وانگ نے جان بوجھ کر قہیوں کے بٹن کھول رکھے تھے کیونکہ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ بھی بار بار کن انکھیں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

خدا خدا کر کے ناشتا ختم ہو۔ تھائی وانگ اپنے کمرے میں چلی گئی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد تیار ہو کر باہر نکلے۔

”میں اپنے آفس جا رہی ہوں۔ میری دانیسی چھ بجے ہوگی۔“ وہ میری طرف دیکھ کر رک رک کر کہنے لگی ”تم بیچے میں آزادی سے محوم پھر سکتے ہو۔ اگر ٹیلی فون کی گھنٹی بجے تو تم کال ریسیو نہیں کرو گے۔ ذاتی طور پر مجھ سے ملنے کے لیے کوئی نہیں آتا اس لیے کسی کے آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ میں آؤں گی کوئیٹ کا ٹالا اپنی چالی سے کھول لوں گی۔ فرنیچ میں انڈے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ ڈبل روٹی بھی موجود ہے۔ اپنی ہینڈ کا کھانا بنا کر کھا لیا۔“ وہ مجھے کافی دیر تک ہدایات دیتی رہی اور پھر میرے سے اپنا دینی بیگ اور چابیوں کا کچھا اٹھا کر باہر چلی گئی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر کار کا انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ تھائی وانگ نے کار سے اتر کر خود ہی گیٹ کھولا اور کار باہر لے جا کر بند بھی کر دیا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں تقریباً رات بھر جاگتا تھا۔ صبح جلدی اٹھ گیا تھا۔ بیڈ پر لیٹنے کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں جاگ گیا۔ میں بیڈ سے اتر کر لاؤنج کی طرف لگا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں پک پک کر گیا۔ مجھے تھائی وانگ کی ہدایت یاد آئی تھی کہ ”تم کال ریسیو نہیں کرو گے۔“ فون کی گھنٹی بجتی رہی اور میں دیکھتا رہا پھر فون خاموش ہو گیا۔ میں نے کھڑے کھڑے کندھے اچکا دیے۔

صبح میں نے ذہن کے ناشتا نہیں کیا تھا اور اب بھوک لگ رہی تھی حالانکہ ابھی صرف بارہ بجے تھے۔ میں کچن میں گیا۔ صبح کا تھوڑا سا خالی یاڈ سائی بچا ہوا تھا۔ میں نے انڈے کا یہ آلیٹ گیس بیڑہ گرم کر لیا اور ڈبل روٹی کے ساتھ کھا لیا۔ بیٹھ کر آگ بجھانے کے بعد میں محوم پھر کر بیچنے کا جائزہ لینے

لگا۔ وسیع و عریض ڈرائنگ روم اور لاؤنج کے علاوہ پانچ بیڈ رومز تھے۔ ہر بیڈ روم ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ لستریت آرام دہ تھے اور ہر کمرے کے فرش پر دھیرے قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک اور بات بھی میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہر بیڈ روم میں حسین تھائی لڑکیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے تھائی عورتوں کو دیکھا تھا۔ وہ عام طور پر ایسا لباس پہنتی تھیں جس سے جسم کا اوپر کا حصہ پوری طرح ڈھک جاتا تھا لیکن ان تصویریں میں ان لڑکیوں نے جو لباس پہن رکھے تھے، وہ شرم ناک تھے۔ یہاں بنگالک میں اور سنگاپور میں بھی میں نے بہت سی عورتوں کو اس قسم کے لباس پہنے دیکھا تھا کہ مرد انہیں گھورتے رہتے تھے۔

میں گھومتا ہوا تھائی وانگ کے بیڈ روم میں گیا۔ یہ کمرہ بھی قیمتی اور شان دار ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ ڈرائنگ ٹیبل پر میک اپ میں استعمال ہونے والی چیزوں کے علاوہ دو موئے سونے الہم بھی رکھے ہوئے تھے اور دو تین رسالے بھی تھے۔ پہلے میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ رسالہ انگریزی زبان میں تھا۔ اس میں مضامین کم اور اشتہار زیادہ تھے۔ ٹائٹ کلبوں اور ریستورانوں کے علاوہ اشتہارات کی زیادہ تعداد ایسے اداروں کی تھی جو سیاحوں کے لیے گائیڈز اور انٹر ٹینمنٹ کی خدمات فراہم کرتے تھے۔ ایسے ہر اشتہار میں ساج، مالش پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ہر اشتہار کے ساتھ کسی خوب صورت لڑکی کی نیم عریاں تصویر تھی اور ہر اشتہار کا مضمون بھی تقریباً ایک ہی جیسا تھا۔ "تھائی لینڈ کی روایتی مالش کے لیے جو ان دو حسین ماڈلز خواتین اور نو عمر خوب صورت لڑکی کی خدمات حاضر ہیں۔ آپ کی تسکین کی ضمانت کے ساتھ۔ کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ۔ جو ہیں گھٹنے خروس۔" ہر اشتہار کے ساتھ ایڈریس کے علاوہ ٹیلی فون اور ٹیکس نمبر بھی دیے ہوئے تھے۔

ایسے اشتہار دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کیا یہاں کے لوگ مالش ہی کرواتے رہتے تھے۔ میں نے کتنی کی تو ایک رسالے میں سب سے زیادہ اشتہار مالش کی خدمات کے تھے۔ اس کے بعد ٹائٹ کلبوں اور آخر میں ریستورانوں کا نمبر تھا۔ میں نے وہ رسالہ رکھ کر ایک الہم اٹھایا جو عظیم تھا۔ اس الہم کو دیکھ کر بھی میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ نیم عریاں لباس میں خوب صورت لڑکیوں کی رنگین تصویریں تھیں۔ ہر تصویر کے نیچے ایک نام اور نمبر لکھا ہوا تھا۔ ان میں تھائی لڑکیاں بھی تھیں، یورپین اور غیر ملکی بھی۔ دوسرے الہم میں نو عمر اور جوان لڑکیوں کی تصویریں تھیں۔

میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ تھائی وانگ نے ان لڑکیوں اور لڑکوں کی تصویریں کیوں بن کر رکھی تھیں؟ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن الجھتا گیا لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ میں اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹپک لگائے اور ناخن پھیلائے بیٹھا تھا۔ پھر غیر ارادی طور پر لڑکیوں کی تصویریں دلا والا الہم

اٹھا کر دیکھنے لگا۔

ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے میرے دماغ میں سسخت ہونے لگی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں بہت جھکا ہوا ہوں۔ غورنگی سی طاری ہو رہی تھی۔ جسم ایک دم دھیرا پڑ گیا۔ کچھ کے پوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ کوشش کے باوجود میں کھڑے نہ رکھ سکا اور اسی طرح نیم دراز خند کی آغوش میں پھنسا گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سوچا تھا۔ آہستہ آہستہ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ تھائی وانگ میری گود میں الہم اٹھا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے آپ سے اس شرمندگی محسوس کرنے لگا جیسے چوری کرتے ہوئے رنگ تھوڑے ہو گیا ہوں۔ میری گود میں لڑکیوں کی تصویریں دلا والا الہم دیکھ کر سوچ رہی ہوگی۔

"میں وقت سے پہلے آگئی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے "سو جاؤ۔ میں تو تمہیں چادر اوڑھانے لگی تھی۔"

"وہ نہیں۔" میں بیڈ سے اتر گیا "مٹھے بیٹھے یہ الہم کو ہاتھ کر آکھ لگ گئی۔ تم نے مجھے آزادی سے گھومتے بھرے کی جان دی تھی لیکن شاید مجھے اس کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی "میں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔" وہ چند لمحوں خاموش رہی بولی "آؤ۔ دیکھو۔ میں تمہارے لیے کیا لاتی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ لاؤنج میں گیا۔ موئے پر دو تین بیڈ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بنڈل اٹھا کر کھولا تو چتر کی ایک پینٹ اور ذہن کی شرت تھی۔ دوسرے پیکٹ میں بھی پڑنے لگے۔ البتہ تیسرا پیکٹ اس نے نہیں کھولا۔

"یہ کپڑے پہن کر دیکھو۔ میں اندازے سے لاتی ہوں۔" مجھے امید ہے کہ تمہیں فٹ آئیں گے۔" تھائی وانگ نے کہا۔ میں کپڑے اٹھا کر اپنے کمرے میں آیا اور دو واؤڈنگ باری باری پہن کر دیکھنے لگا۔ مجھے تھائی وانگ کے انداز کی داد دینی پڑی۔ چلوں بالکل فٹ تھیں۔

میں نے ایک پینٹ شرت پہنی اور باقی کپڑے بیڈ پر چھوڑ دیے۔ باہر گیا۔ لاؤنج میں لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا تو ساڑھے چار بجے تھے۔

"کیسا گزرا آج کا دن؟" تھائی وانگ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"تقریباً سوئے ہوئے۔" میں نے جواب دیا۔ "بہت اسارت لگ رہے ہو۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

میں سمجھتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم لان میں آئے۔ گارڈن چیزز رکھی ہوئی تھیں۔

"تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بولی۔

"کہا کیا؟" میں نے سوال دیکھا۔ اس کی طرف دیکھا۔ "جڑی رات تم نے مجھے اپنے بارے میں جو کمانی سنائی تھی، پھر مجھے یقین آ گیا تھا لیکن میں اپنے طور پر بھی تصدیق اس پر کر چکا تھا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے آج کرنا چاہا تھا۔" وہ میری کالیں میں اس کا کام اپنی اسٹنٹ کو سوپ اپنے دفتر میں کئی کالیں میں کیا۔ سارا کام اپنی اسٹنٹ کو سوپ دیا اور خود تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی۔ میں ڈائریکٹ بھی گئی تھی۔ وہاں سے تمہارے اس بیان کی تصدیق ہوئی کہ چند پہلے رات کے وقت ایک آدمی کو گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں بت چلا کہ وہ سنگاپور کا ایک سکھ بزنس میں تھا جو غیر قانونی طور پر بنگال آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی تھی جو جھوٹے طور پر اس فائرنگ سے بچ گئی تھی لیکن بعد میں اس لڑکی کے بارے میں مجھ نہیں سنایا تھا لیکن تم نے مجھے بتایا تھا کہ۔"

"وہ لڑکی میں تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "چھا چا رہا اب عکس مجھے لڑکی کے ہمیں میں سنگاپور سے لے کر آیا تھا۔ میرے کان میں اس بلی کو دیکھ رہی ہو۔" میں نے دائیں کان میں ہاتھ رکھا "یہ اس وقت کی یاد دہا رہے اور میں اسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تم کو کئی شبہ نہیں کیا۔" وہ مسکراتی "ہمارا راج وانگ ہنگ بایے کے ٹیپ سے قتل کر کے والے ایک آدمی سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ وہ لڑکی دراصل ایک لڑکا تھا جیسے چند دواؤں نہایت میں رکھے کے بعد شرت سے باہر ایک خانقاہ میں بیچ دیا گیا تھا جہاں بھکشوؤں کو موئے تھائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ سارے ہنگے اس لڑکے کے لیے ہو رہے ہیں۔ کل رات بلیک ہانگ کے پانچ آدمیوں نے فیلا فیلا چائی روڈ کے اس فلیٹ پر حملہ کیا تھا جہاں تم بچے ہوئے تھے۔ تم دوہاں سے بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گئے مگر وہاں دو آدمی مارے گئے۔ ایک آدمی بلیک ہانگ کا اور دوسرا ہمارا راج کا جو اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ تمہاری حفاظت کے لیے لگی کی عمرانی کر رہا تھا۔"

"دو عورت؟" میرا مطلب ہے کوشیا؟" میں نے پوچھا۔ "سے بلیک ہانگ کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہ فرما لیا کہ ہمارا راج بلیک میل کریں گے اور تمہیں اپنی تحویل میں لینے کا مطالبہ کریں گے۔" اس نے کہا۔

"کیا تمہارے خیال میں ہمارا راج ان کے دباؤ میں آسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں۔" تھائی وانگ نے نفی میں سر ہلایا "ہمارا راج ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اس نے سچائی کو جان کر تمہیں اپنی پناہ میں لیا تھا۔ وہ اپنی کرن کو اسے لگا کر کسی کے دباؤ میں نہیں آئے گا اور

مجھے یقین ہے کہ وہ کوشیا نام کی اس عورت کو بھی ان کے چنگل سے چھڑا لے گا۔ ویسے میری معلومات کے مطابق گزشتہ رات کے واقعے کے بعد آج صبح ماسٹر پھو نے خانقاہ میں جا کر مہاراج سے ملاقات کی تھی اور اس سے تمام تر اختیارات کے ساتھ بلیک ہانگ کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہے اور میرا خیال ہے کہ ایک دو دن میں ان دونوں پارٹوں کے درمیان خوف ناک جنگ چھڑنے والی ہے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ اس میں زیادہ نقصان بلیک ہانگ کا ہوگا۔"

"اور میرا خیال ہے تم نے اس ٹائٹ کلب کے بارے میں بھی معلوم کیا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ فطری بات ہے بلکہ سب سے پہلے میں اسی طرف گئی تھی۔" تھائی وانگ نے بتایا "وہ ایک ٹھیکڑا کلاس ٹائٹ کلب ہے جہاں نئے بایوں کو منشیات فراہم کی جاتی ہے اور نیم عریاں عورتوں میں کلب بائنگ کے مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ لوگ دراصل بائنگ کے مقابلے نہیں ان عورتوں کی فحش حرکتیں دیکھنے کے لیے ایسے کلبوں میں جاتے ہیں۔ تماشا بیوں کا حلق بھی نیچے طبقے سے ہوتا ہے۔ ایسے ٹائٹ کلبوں میں آئے دن اس قسم کے ہنگامے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن گزشتہ رات والے ہنگامے کی بنیاد تم تھے۔ تمہارا تعاقب کرنے والوں نے تمہیں کلب میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پہلے انہوں نے اس ہال کو چیک کیا جہاں بائنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا پھر وہ اس ہال میں آ گئے جہاں موالی نے میں وصت پڑے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تم انہی میں گھس کر کہیں چھپ گئے ہو۔ پہلے انہوں نے دو ہوائی فائر کیے تھے تاکہ وہاں پڑے ہوئے فحش اٹھ کر خارجی دروازے کی طرف بھاگیں اور ہمیں تلاش کر کے پکڑیں لیکن فرش پر پڑے ہوئے ایک نشی نے اس غصے کو گولی مار دی جس نے ہوائی فائر کیے تھے اور اس طرح وہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا جس میں دو آدمی مارے گئے تھے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم کلب کے عقبی راتے سے بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"اور اس سے زیادہ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہاں سے نکلنے ہی مجھے قتل نہیں گئی تھی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھائی وانگ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ہم شام کا اندھیرا پھیلنے تک لان میں بیٹھے رہے اور پھر اندر آ گئے۔ لاؤنج میں ٹیلی فون کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اچانک ہی ایک خیال آیا اور میں نے کہا۔ "کیا ٹیلی فون پر مہاراج سے رابطہ ہو سکتا ہے؟"

"ہمارا راج سے تو نہیں البتہ ماسٹر پھو سے بات کی جاسکتی ہے۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں میں جتنا زیم کا نمبر موجود ہوگا۔" تھائی وانگ نے کہا "لیکن تم اس سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں خیریت سے ہوں اور محفوظ جگہ پر ہوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جی

فانگ کو کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ کل رات میں نے اسے ٹائٹ کلب کے دفینٹر دیکھا تھا۔ میں نے کہا۔  
وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر نمبر تلاش کرنے لگی۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے ایک نمبر لاگ کاغذ پر لکھ لیا اور ڈائریکٹری بند کر کے فون کا ریسیور اٹھایا۔ میں نے وہ نمبر دینے کی کوشش کی مگر وہ تھاں تھاں بندوں میں تھا۔  
تھاں وانگ نے وہ نمبر ملایا۔ کال غالباً فوراً ہی ریسیور مٹی گئی تھی۔ وہ تھاں زبان میں کسی سے باتیں کرتی رہی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بات پر خند کر رہی ہو پھر خاموش ہو گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ پھر بولنے لگی۔ اس مرتبہ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنے مخاطب کے لیے سے مرعوب ہو گئی ہو۔ اس کی باتوں میں ایک مرتبہ میرا نام بھی آیا تھا اور پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھادیا۔

”ماسٹر پھو سے بات کرو۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔  
فون پر میری آواز سنتے ہی ماسٹر پھو جیسے چونک گیا تھا۔ وہ مجھے مزید کہہ کئے کا موقع دینے بغیر بولا۔

”ایک نمبر نوٹ کرو اور دو منٹ بعد اس نمبر پر رینگ کرنا۔“  
وہ انگریزی میں نمبر لکھوانے لگا۔ ریسیور پر کچھ اور آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہ غالباً جنازیم کے دفتر کا نمبر تھا اور دفینٹر میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور ماسٹر پھو ان کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کاغذ پر وہ نمبر نوٹ کر کے ریسیور رکھ دیا اور تھاں وانگ کو بتانے لگا۔

ٹھیک دو منٹ بعد تھاں وانگ نے ریسیور اٹھا کر وہ نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی فال ریسیور مٹی گئی۔ تھاں وانگ نے ایک جملہ کہا اور ریسیور میری طرف بڑھادیا۔  
”ہم تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ تم کہاں ہو؟“ ماسٹر پھو نے میری آواز سن کر کہا۔

”میں بالکل محفوظ جگہ پر ہوں۔“ میں نے کہا اور گزشتہ رات کے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں میں نے کہا ”فلٹھ سے فرار ہونے کے بعد میں نے جس ٹائٹ کلب میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی“ اس کے دفینٹر میں جی فانگ کو دیکھ کر مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن جب میں وہاں سے فرار ہوا تو اس مل وانگ کی شکل والے آدمی نے مجھ پر گولی چلائی تھی لیکن میری شکل وہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ میں دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔“

”بہت اہم خبر ہے۔“ ماسٹر پھو نے کہا ”اس ٹائٹ کلب کا نام بتاؤ اور جی فانگ کا طیلہ بھی۔“  
میں نے تھاں وانگ سے کلب کا نام پوچھ کر بتا دیا اور جی فانگ کا طیلہ بتانے لگا۔ ہم تقریباً آٹھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ ماسٹر پھو بار بار پوچھ رہا تھا کہ میں یہاں محفوظ ہوں یا نہیں۔

میں نے اسے بتا دیا کہ تھاں وانگ ایک بالکل غیر متعلق شخص ہے۔ کسی نے مجھے اس کے ساتھ آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔  
لے کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں ہوں اور یہاں کی باتیں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔  
اس کے بعد ماسٹر پھو، تھاں وانگ سے بھی کافی دیر تک بات کرتا رہا پھر تھاں وانگ نے ریسیور رکھ دیا۔  
”تم نے اسے یہاں کا پتا یا فون نمبر تو نہیں بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بے وقوف نہیں ہوں۔“ تھاں وانگ مسکرائی اور پوچھ کر کہیں کی طرف چلی گئی۔  
میں اپنی جگہ پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا ماسٹر پھو جی فانگ، دارا اور کم تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا؟



مجھے تھاں وانگ کے اس بیچلے میں رہتے ہوئے تین دن گزر گئے۔ اس دوران میں دو مرتبہ ماسٹر پھو سے فون پر میری بات بات تھی اور تین دنوں کے دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ البتہ ماسٹر پھو نے یہ بتایا تھا کہ کوشیا کی رہائی کے لیے کوشش جاری ہے اور روز کلب کی گمرانی بھی کی جا رہی ہے۔ جی فانگ کے ملنے کا کوئی شخص ابھی تک نظروں میں نہیں آیا۔  
تھاں وانگ معمول کے مطابق صبح ناشتے کے بعد باہر جاتی۔ اس کی واپسی پانچ اور چھ بجے کے درمیان ہوتی تھی۔ اس نے اب تک اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کرنی کیا ہے اور نہ ہی نے ابہم میں لگی ہوئی ان تصویروں کے بارے میں کچھ پوچھا تھا۔  
ایک بات کا اندازہ تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ عالی شان بنگلا، قیمتی اور شان دار فرنیچر اور شان دار کار۔ اس نے گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا اور نہ ہی کسی کی آمد و رفت تھی۔  
اس کے سارے کام وہ خود کرتی تھی اور ممکن ہے میری وجہ سے اس نے اپنے ملنے والوں کو یہاں آنے سے منع کر دیا ہو۔

وہ چوتھا دن تھا۔ شام کے چھ بج گئے تھے اور خلاف مل تھاں وانگ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ چھ بجے سے پہلے پہنچ جایا کرتی تھی۔ میں نے کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔ کسی کام کے لیے نہ ہو گئی ہوگی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، میری پریشانی بڑھتی رہی۔

آٹھ بج گئے میرے ذہن میں طرح طرح کے دوسے اہمارے لگے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بلیک ٹائگر کے قیدی کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ اس رات جب میں ٹائٹ کلب سے بھاگتا تھا اس کی کاریں سوار ہوا تھا تو تقریباً پچاس گز آگے ایک کھلی گلی کی دکان کھلی ہوئی تھی اور کار اسی دکان کے سامنے سے گزرتی تھی۔ جبکہ میرے تعاقب میں آنے والا ایک آدمی ایک کھلی گلی

مڑک پر روک کر مخالف سمت میں ایک ریٹورنٹ کی طرف دوڑ گیا تھا۔  
ان لوگوں نے میری تلاش تو جاری رکھی ہوگی اور اب میں سوچا تھا کہ ممکن ہے ان لوگوں نے اس گل فروش سے بعد میں سوچا ہو کہ اس نے تھاں وانگ کی کار کے بارے میں بتا دیا ہو اور انہوں نے کار ان کی نظروں میں آگئی ہو اور اس طرح تھاں وانگ ان کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ ایسی صورت میں میرے لیے بھی خطرہ ہو سکتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آرام خالص میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آرام سے بیٹھا تھاں وانگ کی واپسی کا انتظار کرتا رہوں یا بھاگنے کی پٹری شروع کر دوں۔

ایک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ماسٹر پھو کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اس کا فون نمبر تو میرے پاس موجود تھا۔ خیال آتے ہی میں اٹھ کر ٹیلی فون والے کمرے میں آ گیا اور پھر میں نے فون کا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ گیٹ کے باہر کسی گاڑی کے رینگنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور کڑکی سے باہر جانے لگا۔ ایک منٹ بعد گیٹ کھلا اور تھاں وانگ کو دیکھ کر میرے چہرے پر حیرانگی آ گئی۔

تھاں وانگ اندر داخل ہوئی تو اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہا۔ کاغذ اس کا چھوٹا معمولی سا لکھا ہوا تھا جیسے ممکن سے چور ہو۔

”ہا ہوا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔ ٹھیک ہوں۔ پریشانی کی بات نہیں۔“ تھاں وانگ نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے پریشانی تو تھی۔ وہ جب بھی باہر سے آتی کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی لیکن آج میری بات کا مختصر سا جواب دے کر اپنے کمرے میں گھر گئی تھی اور تقریباً آٹھ گھنٹے بعد لباس تبدیل کر کے باہر نکلی تھی۔ کچلے پانچوں کا پاجامہ اور اوپن شرٹ۔ گھر میں ہی لباس بدلتی تھی۔

اس وقت فون بج رہے تھے۔ وہ کسی ریٹورنٹ سے کھانے کے آئی تھی۔ ہنر کھول کر اس نے کھانا پیٹروں میں نکال لیا۔ اس نے بے سختی سے ایک دو ٹولے لیے تھے اور پھر اٹھ گئی تھی۔  
”کچلے ہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”جسم نوٹ رہا ہے۔“ اس نے مرہ سے لمبے میں جواب دیا۔  
”کچلے میرے کمرے میں آ جانا۔“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تقریباً دس منٹ بعد میں اس کے کمرے میں آیا تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھنے کی اٹھ گئی اور دیوار کے ساتھ اسٹاؤ ایک الماری کو دیکھنے لگی۔ الماری کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ وہ دروازہ کھل کر کچھ اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

میں کئی مرتبہ تھاں وانگ کے بیڈ روم میں آیا تھا مگر الماری کے پیچھے اس دروازے کا انکشاف پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش پر دو تیز قالین بچھا ہوا تھا اور ایک دیوار کے ساتھ سٹیکل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ سامنے والی دیوار میں ایک ہتھی الماری تھی کوئی کڑکی یا روشنی دان نہیں تھا۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، تھاں وانگ نے دروازہ بند کر دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ چہرہ مضطرب ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی تھی جیسے شکار کو گھیرنے کے بعد شکار کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے۔ تھاں وانگ کے یہ طور دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی کچلے کو شکیلا یاد آگئی جس نے رات کو سوئے میں میرے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا یہ بات تو میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ تھاں وانگ جب گھر میں ہوتی تو عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے مجھے چوکنہ ہونا پڑا لیکن اس وقت میں کچلے کو گڑاسا گیا تھا۔

تھاں وانگ نے الماری کھول کر ہنر نکالا تو میرے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔ میں وحشت زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دباغ میں سنسنیٹ سی ہونے لگی۔ میں نے کمرے سے نکل جانے کا ارادہ کیا لیکن میری نیت کو بھانپتے ہوئے وہ دروازے کے سامنے آگئی اور ہنر کو مخصوص انداز میں پکڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”قیس امارو۔“ اس کی آواز میں عجیب سی سرسراہٹ تھی۔  
”ممہ۔ میں سمجھا نہیں۔“ میں ہٹا کر رہ گیا۔

”میں کہتی ہوں قیس امارو۔“ اس مرتبہ اس کی آواز میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہنر والے ہاتھ کو اس طرح جھٹکا دیا کہ کمرہ اسراک کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور خاموشی سے قیس امارو کی طرف سے نظر لے کر لیا تھا کہ اس کے لیے کھولنا نہیں بنوں گا اور اگر اس نے حد سے بڑھنے کی کوشش کی تو مزاحمت کروں گا اور اگر زیادہ ہی گڑبڑ ہوئی تو یہاں سے بھاگ نکلں گا۔

میں نے قیس امارو کی قالین پر پیچ بیک دی۔ تھاں وانگ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے ہنر میرے سامنے پھینک دیا۔

”ہنر اٹھاؤ اور مجھے مارو۔“ اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی۔ ”میں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے بازوؤں میں بڑی طاقت ہے۔ مجھ پر اس وقت تک ہنر نہ سارے رو جو جب تک تم خود بڑھال نہ ہو جاؤ۔“

میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ مجھے جو خدشات تھے۔ وہ بے بنیاد نکلے یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اس کی یہ فرمائش سن کر میرا

ذہن بری طرح الجھ گیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوا تھا کہ میں اس کی پٹائی کیوں کرتا۔ اس نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو میری محسن تھی۔ اس نے مجھے موت کے منہ سے بچایا تھا۔ میں اس پر ہاتھ کیسے اٹھا سکتا تھا۔ چہ جائیکہ وہ مجھے ہنترے پیتے کو کہہ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”میری قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔“ اس کی آواز بدلی ہوئی تھی ”جلدی کرو۔ ہنتر اٹھو اور میری کھال اوچھڑو۔“ میں اب بھی خاموش کھڑا خوش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے اس کا داغ خراب ہو گیا تھا۔ کوئی ذی ہوش انسان یہ خواہش نہیں کر سکتا تھا کہ ہنتر سے اس کی کھال اوچھڑی جائے۔

”میرا خیال ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے قتائی وانگ۔“ بالآخر میں نے دم لے کر کہا ”ہنتر کو غم و ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔ یا مجھے نہ ہٹاؤ۔ میں فون کر کے ڈاکٹر کو بلا دیتا ہوں۔“ ”میرا علاج ڈاکٹر نہیں، تمہارے یہ مضبوط بازو ہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں بازو پکڑ لیے پھر اس نے جبکہ کر قالین پر پڑا ہوا ہنتر اٹھا کر میرے سیدھے ہاتھ میں تھما دیا ”اب دیر مت کرو۔ شروع ہو جاؤ۔“

اس نے اپنی قمیض بھی اتار کر پھینک دی اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکالے تھے۔ میں اس کی طرف دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اس کی پیٹھ پر لاتعداد سرخ دھاریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ میں ہنتر ہاتھ میں لیے بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر میری طرف کھڑ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں چاک لگی سی سرخی ابھر آئی۔ میرے داغ میں آنسو چھلنے لگیں۔ میں نے عورت کو ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھا تھا لیکن اس رات کوشلیا نے اپنی بے ہودہ حرکت سے میرے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی تھی کہ عورت ماں کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی لیکن میرا ذہن پر انگہ ہو گیا تھا اور اب قتائی وانگ کو اس حالت میں سامنے کھڑے دیکھ کر میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

قتائی وانگ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر چاک لگی سی آنکھوں میں سے میرے منہ پر چھڑا دیا۔ پھر اس قدر زوردار تھا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

”میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔“ وہ غرائی ”تم مرد نہیں ہو۔ تمہیں شاید کسی کہی گئی ہے کہ تم نے ہنتر کو ہلاک کر دیا۔“ ”میرا داغ کھو گیا۔“ اس نے اگر صرف چھڑا مارنے پر اکتفا کیا ہوتا تو میں چپ رہتا لیکن اس نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ میں اپنی ماں کو دنیا کی عظیم ترین ہستی سمجھتا تھا اور اس گالی نے میرے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے تھے۔ قتائی وانگ نے دو سرا چھینر

مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن میں نے بائیں ہاتھ سے کٹائی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیٹھ پر گرا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر بڑبڑاتی کھال پر مرتبہ میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔

چڑے کی پتلی خیل کا بنا ہوا ہنتر سڑا کہ اس نے کانپ لگا۔ وہ کراہ اٹھی۔ میں نے دو سرا وار کیا۔ اس مرتبہ بڑبڑا پٹ پر لگا۔ اس نے ایک سسکاری سی بھری اور اپنے منہ سے رسی جس سے میرا اشتعال بڑھتا رہا اور میں نے جس میں سنبھلنے اس پر ہنتر سنا آ رہا۔ وہ قالین پر لوتی رہی اور میں اسے تھپتھپاتا رہا۔ اس کی پشت اور پیٹ پر لاتعداد آبی سرخ دھاریاں آئی تھیں۔ وہ قالین پر لوتی رہی اور میں اس پر ہنتر سنا آ رہا۔ ضرب پر وہ اس طرح سسکاریاں بھر رہی تھی جیسے اس نے اندھ زور سے ہوا اور بالآخر وہ لوتی ہوئی میرے قدموں میں اس کے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر تھے۔ وہ اب بھی سسکاریاں دے رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ ہنتر بیچک دایاں میں پڑ پڑتا ہوا اس کمرے سے نکل گیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں بند پر گر گیا۔ میرا جسم ہولے کانپ رہا تھا اور داغ میں آنسو چھلنے لگی سی سرخی ابھر آئی۔ قتائی وانگ نے جب ماں کی گالی دی تھی تو اس وقت میرا دل تھپتھپاتا تھا۔ میں اسے موت کے کھٹاتاتار دوں لیکن میں نے اپنے ہنتر کی طرح اتارنا تھا کہ اس کی کھال اوچھڑ کر وہ دی تھی۔

میں اپنے ہنتر پر لیٹا ہوا سب کچھ سوچتا رہا۔ میں قتائی وانگ بہت احترام کرتا تھا۔ وہ میری نظروں میں ایک ایسا مقام تھا جس کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہو سکتا تھا لیکن اپنی اپنی حرکت سے میری نظروں سے گر گئی تھی۔ میرے دل سے اس کا احترام ختم تھا اور اسے ابھی میں کوشلیا جیسی عورتوں کے ذمے میں شمار لگا تھا۔ ”خون، خوب بد اور صحت مند مردوں کو دیکھ کر کہیں نہ کہنے لگتی ہے اور اپنے شہوانی جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی۔“ وانگ کی اس سچ حرکت کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب یہ نہیں رہوں گا۔

ایک ایک میرے ذہن میں آیا کہ ماسٹر میو کو صورت حال کے اسے بتا دینا چاہیے کہ اب میں یہاں نہیں رہتا۔ سوچتے ہوئے اٹھ کر لڑاؤ میں آ گیا اور پتلی فون کا بیڑا ہنتر والے بن رہا۔ میں نے کانپ لگا کر آگے بڑھایا۔ ہاتھ لگایا۔ ریسپور میں فون کی مخصوص آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے گریڈل کو دو تین مرتبہ دیا۔ تار کو ہلا کر دیکھا۔ فون ڈیڑھ رہا۔ میں نے ریسپور سچ دیا اور دوبارہ اسے کچل دیا۔

میرے داغ میں اب بھی کئی سناٹا تھا۔ ہوری تھی اور کھال کھل رہی تھی۔ میں کڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا اور آواز دے رہا تھا۔

لے سانس لینے لگا۔ اس وقت دور کسیں لاکھ کھانڈے مارنے لگے۔ بے سانس کی گھبراہٹ کی آواز دیر تک فضا میں گونجتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

میں جب سے قتائی وانگ کے ہاں آیا تھا عام طور پر گریہا بچے کی سوچا تھا اور صبح میری آنکھ میں جلدی کھل جاتی تھی لیکن آج کے اس واقعے کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک کھڑی کے سامنے کھڑا رہا پھر کھڑی کھڑی چھوڑ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے کمرے کی پتی بھجادی تھی اور اس کو کشش میں تھا کہ کسی طرح نیند آجائے تو اس ذہنی کرب سے نجات لے لی۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ذہنی

الٹ پھرتی جاری تھی۔ میں اس وقت کھڑکی کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا کہ اپنے کمرے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے چمک گیا۔ ظاہر ہے وہ قتائی وانگ کے علاوہ اور کوں ہو سکتا تھا۔ میں نے توجہ نہیں دی اور خاموش لیٹا رہا۔

”میرا مرض ہو؟“ قتائی وانگ کی مدھم سی آواز میری سماعت سے گزرائی۔ ”تم نے یہ باتنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میں نے ایسا کیا کیا؟“ ”مجھے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اپنے کمرے پر سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ”تم نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ میں صبح سے اس کا ہاتھ جھٹک رہا ہوں۔“

”وہ میری غلطی تھی اور میں تم سے اس غلطی کی معافی مانگتے آئی ہوں۔“ قتائی وانگ نے جواب دیا ”تم جیسے نوجوان کو جنم دینے والی کوئی معمولی عورت نہیں ہو سکتی۔“ اس کا رتبہ بہت عظیم ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے قابل اعتراض الفاظ استعمال کر کے تمہیں دکھ پہنچایا اور تمہارے جذبات کو تمہیں پہنچائی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں وہ سب کچھ نہ کہتی تو تمہیں غصہ نہ آتا اور تم میری پٹائی نہ کرتے۔“

”کیا؟“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تمہارا کردار تمہاری ماں کی حریت کی دلائل کرتا ہے۔“ قتائی وانگ نے کہا ”اگر کوئی اور نوجوان ہوتا تو مجھے ہرنس دیکھ کر بھوکے پیٹ کے لیے اس طرح مجھے بھیج دیتا۔“ ”مگر تمہارے ذہن میں وہ سب کچھ نہیں تھا جو دوسرے نوجوان ایسے موقعوں پر سوچتے ہیں۔“ ”نہی میرے ذہن میں کوئی ایسا گندہ خیال تھا۔ تمہاری شرافت اور کردار کی عظمت کا اندازہ تو میں نے پہلے ہی روز لگایا تھا جب تم مجھ سے فخر پر رہے تھے۔ تمہاری ماں کی شان میں وہ گستاخانہ الفاظ میں اس لیے کہتے تھے کہ تم میں اشتعال پیدا ہو اور تم اس ہنتر سے میری کھال اوچھڑو۔“

”کیا یہ آخر کیوں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہنے کی حق اگرچہ مجھی تھی لیکن راجداری سے آنے والی

دوستی اتنی کافی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو با آسانی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے جسم پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔

”اب پوچھا ہے تم نے کہ میں نے ایسا کیا کیا؟“ اس کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ آگئی ”تو؟“ میں تمہیں بتائی ہوں کہ میں نے ایسا کیا کیا۔ مجھے امید ہے کہ میری بات سننے کے بعد تمہارے دل میں میرے خلاف پیدا ہونے والی نفرت ختم ہو جائے گی۔“ وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر لڑاؤ لڑنے والے کمرے میں لے آئی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ غیابانہ پن سے ہوئے تھا اور قیصر قیصر میں اسی کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔

”یہ بازو واقعی بہت مضبوط اور طاقت ور ہیں۔“ وہ میرے دونوں بازو تھپتھپاتے ہوئے پتلی ”اور مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں فولاد بھرتا جائے گا اور تمہارا کوئی دشمن ایک ہاتھ کی مار بھی نہیں سہہ سکے گا۔“

”تم مجھے کچھ اور بتانے کے لیے یہاں لائی تھیں۔“ میں نے کہنے ہوئے پورا گیر لاکھ کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھے والے تھے۔

”وہی بتاتے جا رہی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے سے کمرے کی ایک شیشی اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دی ”پہلے یہ کمرے میرے جسم پر لگاؤ۔ جب تم ہنتر سے میری پٹائی کر رہے تھے تو بہت مزہ آ رہا تھا۔ اب تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ کمرے لگانے سے تکلیف کچھ کم ہو جائے گی۔“

وہ جسم سے چادر اتار کر قالین پر اوڑھ لیٹ گئی۔ اس کا بدن دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ ہنتر کی ضرورتوں کے لاتعداد نشان تھے۔ بعض سے خون رہا تھا اور بعض جگہ پتلی بڑھ چکے تھے۔ میں اس کے زخموں پر کمرے لگنے لگا۔ اس کے منہ سے بھی سسکاری سی نکل جاتی اور مجھ کو کراہ اٹھی۔ وہ اس وقت بھی میرے سامنے ہرنس تھی۔ لیکن میرے ذہن میں کوئی شیطانی خیال نہیں تھا۔

وہ اٹھ کر قالین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور جسم پر چادر لپیٹ لی۔ میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”جب میرے والدین کا انتقال ہوا تو میں چودہ سال کی تھی اور ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھی۔“ قتائی وانگ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی ”میرا باپ مرتے وقت مجھے میرے چچا کے چرو کر گیا تھا۔ وہ ایک دراصل میرے والد کا سوتلا بھائی تھا۔ اس نے مجھے اپنی سرپرستی میں تو لے لیا لیکن اس کی نظرس میرے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد پر تھیں۔ شہر کی تکیان آبادی میں ایک ظلیف اور تقریباً تین لاکھ بھات کا چیک بنائیں، میرا باپ ایک سو تھانک انجینئر تھا۔ اس کی موت ٹیکسز میں ڈیوٹی کے دوران میں ایک حادثے میں ہوئی تھی اور کبھی نے بھی اس کے مرنے کے بعد گراں قدر معاوضہ دیا تھا۔“

”میرا چچا ہوا ایک ایک غریب آدمی تھا۔ اس کی غربت میں اس کا اپنا ہاتھ تھا۔ اس نے بھی تک کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کی





پلا موقع تھا کہ وہ اس طرح بے مددہ پڑی رہی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میں نے قوت بازو کچھ زیادہ ہی استعمال کر ڈالی تھی۔ اس روز وہ اپنے دفتر نہیں گئی۔ سترہ اونڈ کی پڑی رہی۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ جاتا اور بھی دوا کھڑکھڑھونے لگتا۔ دوسرے روز وہ دفتر کی توسل کے مطابق چوبیس بجے سے پہلے ہی واپس آگئی۔ اس نے آتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ ہم آج رات کا کھانا کھرے باہر کی ہوٹل میں کھا سکیں گے۔ جب ہم کھرے نکلے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے میرے دل میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو! لیکن قحالی وانگ نے مجھے تسلی دی کہ ہر شخص تو مجھے نہیں پہچانتا۔ دو چار آدمی بھی مجھے پہچانتے ہوں گے اور ضروری نہیں تھا کہ جنال ہم جائیں وہاں ان میں سے کوئی موجود ہو۔

کار متوسط رفتار سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی اور میں تمام نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پورا شہر دو شینوں سے جھگڑا رہا تھا۔ ہمارے سڑکا اختتام راجہ پراپ سڑک پر واقع عالی شان اندرا ریخت ہوٹل کے پارکنگ لائٹ پر ہوا۔ اس ہوٹل کا سلا قحالی ریسٹورنٹ روایتی قحالی کھانوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا یہاں گاہکوں کا دل بھلانے کا بھی مقول بندوبست تھا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے کے بعد اچانچ پر وگرام شروع ہو جاتا تھا جس میں سیام کے قدیم روایتی رقص پیش کیے جاتے تھے۔ اس ہوٹل میں صرف وہی لوگ آسکتے تھے جن کی جیبیں کئی نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں۔ عام آدمی کا اس طرف سے گزر نہیں تھا۔

ہم دیر تک کھانے، مشروبات اور رقص سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس دوران میں، میں واقعی بھول گیا تھا کہ میری جان کے دشمن پورے شہر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ ہم گیارہ بجے ریسٹورنٹ سے نکلے اور جیسے ہی پارکنگ میں کار کے قریب پہنچے قحالی وانگ ٹھک گئی۔ کار کے دائیں طرف کے دونوں ٹائر فلیٹ تھے۔ ہم کار کے سامنے سے گھوم کر دوسری طرف آگئے۔ اس طرف کے دونوں ٹائر بھی فلیٹ تھے۔ مجھے اپنی کروں پر چیو خیال ہی رہتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ کار کے چاروں ٹائر فلیٹ ہونا محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ یہوں کی ہوا جان بوجھ کر نکالی گئی تھی۔ میری چمٹی جس نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔

میری طرح قحالی وانگ بھی حوش نظروں سے اوجھڑا اور دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم دونوں نے یکے وقت ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر دوسری طرف اس شخص کو دیکھ لیا تھا جو بجلی کے کھمبے سے ٹھک لگنے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے سفید چنٹ اور سفید بی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر سامنے کے سب پر کوئی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ گلے میں سرخ اسکارف بندھا ہوا تھا۔ ”مسٹر وجدان۔“ قحالی وانگ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی ”اندرا چلو۔ ہم اس طرف سے نہیں جاسکتے۔“

”میں نے بھی سرخ اسکارف والے اس آدمی کو دیکھا ہے۔“ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا ”لیکن عمر گزرتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ قحالی وانگ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ ”مگھ! تم واقعی دلیر فوجیو! اگر تم میں واقعی ایسا جذبہ پیدا ہوتا تو وہ لوگ واقعی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“ اس نے اگرچہ میری حوصلہ افزائی کی تھی لیکن میں مجبور گیا۔ میں نے اس سے ساتھ ہونے والی بات ایسے کہہ دی کہ مجھے خلوص محسوس نہیں اسے ہے اور میں اس کی حفاظت کے لیے مامور آیا ہوں۔

ہم دونوں دوبارہ ریسٹورنٹ میں گھس گئے لیکن وہاں کے نہیں۔ یہوں کے درمیان چکراتے ہوئے دوسرے روزانہ اسے ہوٹل کے اندرونی حصے کی طرف نکل گئے۔ قحالی وانگ چھپا رہے تھے۔ اس نے اپنی جیب سے اسے ہوٹل کے راستے معلوم کرنے پر مختلف راستوں سے گھومتے ہوئے پچھل طرف آگئے۔ ہوٹل کا ایک دروازہ سونے اندرا والی سائڈ پر بھی قحالی وانگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس طرف بھی کسی گلی میں چند کڑے لٹے۔ اس طرف سے ملتا جلتا ایک آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے گلاب اسکارف نہیں تھا بلکہ سر پر پیلے رنگ کا ایک الٹا کپڑا تھا۔ قحالی وانگ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے پیچھے مڑ گئی۔

مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کا کمرہ تھا۔ سوچا ہوا اسے سامنے دو خب صورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک تو فون پر سے بات کر رہی تھی اور دوسری نے بات ختم کر کے سوچا ہوا کپڑا پہن لیا تھا۔ وہ گردن گھما کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ ”مجھے ایک فون کرنا ہے۔ امیر جیسی ہے۔“ قحالی وانگ نے بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

”گلابی میں پبلک بوتھ لگے ہوئے ہیں اور اس وقت وہاں فون نہیں ہے۔“ لڑکی نے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”امیر جیسی ہے پلےز۔“ قحالی وانگ نے کہا ”میں جان کاٹتا ہے۔ ہم لابی میں نہیں جاسکتے۔“

”پولیس کو فون کرنا ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔ ”نہیں۔ پلےز۔ مجھے فون کر لینے دو۔ وہ لوگ ہماری تلاش میں آگئے تو۔“

”یہ ڈائریکٹ لائن ہے۔“ لڑکی نے اس کی بات کاٹے ہوئے ایک ٹیلی فون سینٹ آگے سرکا دیا ”فون کر کے تم لوگ فوراً یہ سہلے جاؤ۔“ قحالی وانگ نے ریسپورڈ اٹھایا اور نمبر پریس کرنے لگا۔ ریسپو ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس کی باتوں سے

اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ماسٹر پھو کو اس صورت حال سے اچھا کر رہی تھی پھر اس نے ریسپورڈ رکھ دیا اور یہی طرف پیچھے ہوئے بولی۔ ”ماسٹر پھو چند منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا۔ اس وقت تک یہاں ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ کر سکیں کیوں وقت گزارنا ہے۔ تو میرے ساتھ آؤ۔“

اس نے ٹیلی فون آپریٹر کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں اس کمرے سے نکل آئے۔ دو رپارڈیوں میں گھوم کر کم لابی کی طرف نکل آئے لیکن قحالی وانگ فوراً ہی پیچھے مڑ گئی اور ایک اور رپارڈی میں ہوتے ہوئے ایک زینے پر چڑھ گئی۔ زینے کے اختتام پر ایک غور تھا۔ قحالی وانگ نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دوڑنے ہوئے کار کے ایک کمرے میں گھس گئے۔ اندر داخل ہوئے ہی قحالی وانگ نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”خفا! دو سچ و عریض کرا تھا۔ کسی لائبریری کی طرح بڑے بڑے رکس بنے ہوئے تھے لیکن ان رکس میں کتابوں کے بجائے بکے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ چادرین، پردے، تولے، ٹاف، مین پوش اور اسی قسم کی چیزیں تھیں۔ قحالی وانگ نے کمرے کی قی بجا دی اور ہم ان رکس کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک کونے کی قریب آکر رک گئے۔

یہ کونہ میں روڈ کی طرف تھی اور یہاں سے نہ صرف ہوٹل کا مین بلکہ اس کے سامنے کی سڑک بھی نظر آ رہی تھی۔ سرخ اسکارف والا وہ بد معاش اب بھی سڑک کے دوسری طرف بجلی کے کھمبے سے ٹھک لگنے کھڑا تھا۔

پھر ہمیں منت گزر گئے۔ میں کونہ کے ایک طرف کھڑا بیٹھنے سے بھانک کر دیکھ رہا تھا اور پھر دو کابین مخالف سمت سے آکر ایک وقت گھٹ کے سامنے رکی تھیں ایک کار سے ماسٹر پھو کو اترتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی لیکن دوسرے ہی لمحے دوسری کار سے قحالی وانگ کو اترتے دیکھ کر میرا دل الجھ کر قحالی وانگ اس کے ساتھ دو آدمی تھے ماسٹر پھو کی کار سے بھی دو آدمی اتر آئے تھے۔

اور پھر وہاں جبکہ میں بھی ”ا“ میں جنگ کا نام ہی دوں گا۔ ماسٹر پھو اور قحالی وانگ پہلے ایک دوسرے کو نگاہ کرتے رہے اور پھر مجھ کو اس طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ ان دونوں کے ساتھ آئے والے بھی آپس میں بھڑکے تھے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے کیٹ بند کر دیا تھا۔ لان میں جو لوگ بیٹھے تھے وہ بھی اچھ کر اندر چلے گئے تھے۔ ریسٹورنٹ وغیرہ کے دروازے بند ہو گئے تھے۔

میں دم بخود کھڑا سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر پھو اور قحالی وانگ کو دیکھ کر گلتا تھا جیسے دو بھانڈا آپس میں ٹکرائے ہوں۔ وہ چنچنے چمکاتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ قحالی وانگ

کو میں نے پہلے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب اس نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔ وہ جس بے رحمی سے میری ماں پر خنجر سے وار کر رہا تھا وہ منظر میں آج تک نہیں بھول سکا پھر وہ موت کا سایہ بن کر میرے قاتل میں لگا تھا اور آج میں اسے لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بھی اپنے قحالی وانگ کا ماسٹر تھا۔

قحالی وانگ کی طاقت وراپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ وہ ماسٹر پھو کو فلاٹنگ لگ مارا جاتا تھا۔ ماسٹر پھو نے اس کے دونوں پیروں پر پکڑ کر پیچھے اچھال دیا۔ قحالی وانگ فلاٹنگ لگاتا ہوا یہوں کے بل گرا اور فوراً ہی سنبھل گیا لیکن ماسٹر پھو نے اسے مزید سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے یوں حرکت کی جیسے پچھ مارا جاتا ہو لیکن اس کی فیٹ لگ پوری قوت سے قحالی وانگ کی ٹھوڑی کے نیچے زخم سے رہ گئی اور وہ ڈگڑا ہوا پیچھے الٹ گیا اور پھر ماسٹر پھو نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسپین، رائڈ ہاؤس اور بیک گھس قحالی وانگ پر رہتی تھی لیکن ایک موقع پر قحالی وانگ نے ماسٹر کی لگ روک لی اور اسے پیچھے اچھال دیا۔ ماسٹر پھو اٹ کر پیچھے کر اگراس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

قحالی وانگ نے بڑی چھٹی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھلن کا پانچہ اوپر اٹھایا اور پھلن پر چڑھنے سے پہلے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر دھریں، اگراس کی آنکھوں میں دھشت سی ابھر آئی۔

ماسٹر پھو نے قحالی وانگ کے خنجر والے ہاتھ پر لگ لگانے کی کوشش کی مگر قحالی وانگ اس کا دھک پھانک دیا۔ اس نے جوابی وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ ماسٹر پھو نے اپنے آپ کو بھالیا مگراس کے ساتھ ہی اس کا پیروں پر پھلن اور وہ پست کے بل کر گیا۔ ماسٹر پھو نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن عین اس وقت قحالی وانگ کا ایک آدمی ماسٹر پھو کے ایک آڈی کا کچھ لگا ماسٹر پھو کے اوپر گرا اور اس نے موقع ملنے ہی ماسٹر پھو کے دونوں بازو گرفت میں لے لیے۔

قحالی وانگ بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور پکڑھاڑتے ہوئے خنجر پوری قوت سے ماسٹر پھو کے سینے میں اتار دیا۔ قحالی وانگ نے خنجر کا دوسرا وار کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ماسٹر پھو کے بازو اس بد معاش کی گرفت میں تھے۔ اس نے دونوں پیروں پر ناکا پوری قوت استعمال کرتے ہوئے برج بنایا اور اس طرح اچھلا کہ وہ بد معاش اچھل کر دو در جاگرا۔ ماسٹر پھو اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے قحالی وانگ کا دو سرا وار روکنے کی کوشش کی مگر لگا کھڑا گیا۔ خنجر دوسری مرتبہ اس کے سینے میں بہت سی ہو گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ناگھیں ہولے ہولے کانپنے لگیں۔ ماسٹر پھو زخمی ہونے کے باوجود قحالی وانگ کی طرف بڑھ رہا تھا اور قحالی وانگ بے پردہ اس پر خنجر کے

دار کر رہا تھا اور پھر میں نے ماسٹر چوک مرز پر گرتے ہوئے دیکھا۔ اسی لمحے وہاں ایک اور کار آکر رکی اور چار پانچ آدمی نیچے اترے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ جی ٹاکس کے آدمی تھے یا ماسٹر چوک کے۔

قحانی وانگ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے دروازے کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ہاتھ بھی کاتب رہا تھا۔ ہم اس کمرے سے نکل کر راداری میں دوڑنے لگے۔ راداری میں کچھ لوگوں سے آتا سامنا بھی ہوا۔ وہ سب خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ ہم اسی تنگ سے زینے سے اتر کر راداریوں میں ہوتے ہوئے ہوٹل کے پچھلے دروازے کی طرف آگئے۔ میں نے باہر بھاگ کر دیکھا۔ مرزک سنسان پڑی تھی۔ اس طرف ہوٹل کی گھمرائی کرنے والا بد معاش بھی غالباً ہوٹل کے سامنے والے رخ پر چلا گیا تھا۔

میں قحانی وانگ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا اور ہم دوڑتے ہوئے سوئک فور کی طرف مڑ گئے اور دوسری طرف کے تین روڈ پر آگئے۔ سامنے ہی ایک تنگ تنگ کھڑا تھا۔ ہم دونوں رکنے سے ملتی جلتی اس سواری میں بیٹھ گئے۔

”رامادون روڈ۔ ہری اپ!“ قحانی وانگ چیخیں۔ تنگ تنگ فوراً ہی حرکت میں آیا۔ قحانی وانگ بار بار جیسے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ رامادون روڈ پر تنگ تنگ چھوڑ کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ سیام اسکو اڑنے کے قریب وہ ٹیکسی چھوڑ کر ہم ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور اس طرح ٹیکسیاں بدلتے ہوئے ہم ٹاکس برج پر پہنچ گئے۔ آخری ٹیکسی ہم نے پوری روڈ پر چھوڑ دی تھی اور وہاں سے آگے پہلے ہی آئے تھے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی قحانی وانگ نے دروازے اس طرح لاک کر لیے جیسے وہ ہمارے خاقاب میں آ رہے ہوں۔

قحانی وانگ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دروازے ہسٹل نکال لیا تھا۔

ہماری وہ رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ خوف زدہ میں بھی قحانی ماسٹر چوک کے انجام نے میری روح تنگ کرنا کر رکھا تھا۔ وہ میری وجہ سے جی ٹاکس جیسے سفاک آدمی کی ہیبت چڑھ گیا تھا۔

قحانی وانگ کی کار اندر رینجٹ ہوٹل کے پارکنگ میں کھڑی تھی لیکن دوسرے دن صبح بھی وہ گھر سے نہیں نکلی۔ اس نے تمام دروازوں کو تالے لگا رکھے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اور قحانی وانگ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ قحانی وانگ اٹھ کر فون کے قریب پہلی گئی اور ریسورسٹا کرکان سے لگا لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

”تم کو ہو؟ تمہارا میری کار سے کیا تعلق ہے۔ جب چاہوں گی، لے آؤں گی۔“

میں نے قحانی وانگ کو بازو تھپیں میں سے کھانے اور پینے کی طرف سے جو کچھ بھی کیا تھا۔ اسے سن کر قحانی وانگ نے دھواں ہو گیا تھا۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا ہوا... کس کا فون تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”انہوں نے کار کے نمبر سے میرا ایڈریس معلوم کر لیا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم یہاں ہو۔“ قحانی وانگ نے لالچ کی آواز ملحق میں انگ رسی تھی ”وہ... وہ لوگ کسی بھی گشت پہنچ سکتے ہیں۔“

مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ہمارے دھماکے سے ہو رہے تھے میں کچھ کتنا چاہتا تھا کہ میری زبان سے چپک کر رہی تھی۔

○☆☆○

میں سکتے ہی کیفیت میں کھڑا تھا قحانی وانگ کی طرف تھا۔ وہ بھی ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب اس طرح کھڑی تھی جیسے ہو گئی ہو۔ اسٹینڈ سے نیچے لٹکا ہوا ٹیلی فون کار سیرور کا کھانے کی طرح جمبول رہا تھا۔ ریسورسٹا کوئی آواز ابھر رہی تھی۔ صرف آواز تھی۔ میرے لیے ان الفاظ کے معنی یا معلوم نہ تھا۔ وہ صرف آواز تھی۔ جیسے موت کی چاب! قحانی وانگ کی آنکھیں خوف سے پھٹی پھٹی تھیں۔

چہو اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے اس کے جسم میں گردش کرنے والے خون کے سرخ تیل اچھاگ ہی تپاؤ ہو گئے ہوں۔ اس زبان تنگ ہو گئی تھی۔ قوت کو باقی تو میری بھی سلب ہو چکی تھی تو یوں لگا تھا جیسے ایک لمحے کو زمین کی گردش رک گئی۔ کائنات پر سکوت طاری ہو گیا ہو اور زندگی گہیرے میں لپٹی ہو گئی ہو اور پھر اچھاگ ہی سکوت اور سناٹا ٹوٹ گیا۔

”سہہ... سہہ... دانہ...“ قحانی وانگ کے رزٹے ہوئے۔ کپکپاتی ہوئی سی آواز نکلتی تو میں بھی جیسے ہوش میں آیا تھا۔ لوگ... کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ ایک ایک کو... لے جیتی ہے۔ ہری اپ!“

مجھے اس کی بہت سی یاد دہانی پڑی۔ یہ فون کال کو بہت کال تھی جس نے ایک لمحے کو ہم دونوں کو دھلا کر رکھا تھا۔ قحانی وانگ نے بڑی سرعت سے اپنے حواس پر قابو پانے کو شش کی تھی۔ وہ ایک دم حرکت میں آ گئی تھی۔

میں بھی تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ بیٹھ رہا تھا۔ اس نے الماری کھول کر کئی ٹوٹوں کے کچھ ہینڈل اپنے ہاتھ میں ڈالے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ نمایاں طور پر رہے تھے۔ الماری میں یہ درجہ رکھے ہوئے کپڑے اور وہ کپڑے ہی چیزیں تھیں لیکن شاید اسے اس بات کی پروا نہ تھی۔ الماری سے بہت کچھ ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آگیا اور

پانی ہمارے دروازہ پر کھینچ لیے لیکن شاید اسے مطلوبہ چیز نہیں مل رہی تھی۔ اس خوف کے ساتھ اب جھنجھلاہٹ بھی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے بیٹھ رکھا تھا۔ پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ وہ...

”پس چڑ کی تلاش ہے؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی تو ایش میں بھی کئی کپکپاہٹ تھی۔“

”ہسٹل!“ وہ بولی ”میں نے چپک کر کے یہیں رکھا تھا۔ کسی دراز میں...“

”ہسٹل تمہارے کچن کے نیچے ہے۔“ میں نے کہا۔ قحانی وانگ نے تھیرا اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور جھپٹ کر ہسٹل اٹھا لیا۔

”اب نکل چلیاں۔“ وہ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔“ وہ کہنے ہوئے تھی۔ دروازے کی طرف گھوم گئی۔ بیڈروم سے نکل کر میں نے لاؤنج کی طرف قدم بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ حرام کیا۔

”اگر نہیں...“ اس کا لہجہ اب سرگوشیاں تھا ”ہو سکتا ہے کوئی کوئی جگہ کی گھمرائی کر رہا ہو۔ اس طرف... ہم پچھلے دروازے سے نکل گئے۔“

میں اس کے ساتھ دوسری طرف مڑ گیا اور پھر راداری میں گھوم کر ہم قحانی وانگ کے قریب آگئے۔ اس نے ایک میرے والے کونے میں نے کندھے پر لٹکایا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں ہاتھ سے وہ بڑی آہستگی سے دروازے کا پورٹ گرا دی تھی۔ گھر کی تمام تکیاں مکلی چھوڑ دی تھیں تاکہ اندھیرا ہو جائے کہ کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔

پہلی احتیاط سے دروازہ کھول کر ہم باہر آگئے۔ اس طرف مکلی جگہ پر چڑھ کر درخت تھے اور ان سے آگے تقریباً سات فٹ اونچائی کی بڑھری والی تھی۔ میں دن میں ایک دم مرجھاس کر رہ گیا تھا۔ اس دیوار کے دوسری طرف ایک کشادہ کلی تھی لیکن اس جگہ کے مینا سامنے کوئی نگاہ فریو نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قحانی وانگ کے جھنگے کے پھلو سے گزرنے والی نہیں اس جگہ کسی قدر غم تھا۔

ہم دونوں قحانی وانگ سے نکل کر درختوں میں باؤنڈری والی کی طرف چلے گئے۔ موت کے فرشتے جب خاقاب میں لگے ہوئے ہیں تو معمولی سی آہٹ بھی دہلا دیتی ہے۔ درختوں کے نیچے تنگ پتے ٹھکے ہوئے تھے۔ بیڑوں کے نیچے رہنے سے جڑا ہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ قحانی وانگ بہت محتاط انداز میں قدم اٹھا رہی تھی اور باہر پہنچ کر کچھ دیر بیٹھ رہی تھی۔

دیوار تقریباً سات فٹ اونچی تھی۔ قحانی وانگ کے لیے اوپر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ پہلے میں دیوار پر چڑھ گیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ ابھی ہم دیوار کے دوسری طرف کودنے کے لیے پر تلی ہی رہے تھے کہ جھنگے کی گٹھ کی طرف سے دھب کی آواز سن کر میرا دل اچھل کر قحانی وانگ کے قحانی وانگ کے لیے منہ پر ہاتھ لٹک لیا تھا۔ اس کا یہ خیال بالکل درست نکلا تھا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔ دھب کی اس آواز کا مطلب تھا کہ کوئی آدمی جھنگے کی سامنے والی دیوار سے اندر کودا تھا۔

”جلدی کرو غلیبہ۔ وہ لوگ آگئے ہیں۔“ قحانی وانگ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

خوف سے میری بھی ٹھکی بندھی ہوئی تھی لیکن میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے قحانی وانگ کا ایک ہاتھ پکڑ کر اسے دیوار کی دوسری طرف لٹکا دیا اور پھر خود بھی دونوں ہاتھ

**ڈاکٹر سجاد امجد کی تھنکس اور تحقیر چار عظیم شاعروں کی کتابیاں**

مضبوط جلد

خوبصورت سرورق

# خدا لیاں جن

نیر

عالم

مومن

اور داغ

\* ان چار ”خدا لیاں جن“ کی زندگی سے وابستہ چوںکا لےنے والے راز!

320 صفحات

قیمت 200 روپے

\* ڈاک خرچ 25 روپے

طلبہ اور شائقین ادب کے لئے

بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب

کتابیات پبلی کیشنز

5802552-5895313 فون

5802551 فیکس

kitabiat1970@yahoo.com

33

74200

دوار پر جگا کر بچے لٹک گیا اور بڑی آہستگی سے بچے اتر گیا۔ اگر میں چلا گیا تو وہ بک آواز کسی کو متوجہ کر سکتی تھی۔ اس وقت اگرچہ آٹھ بجے تھے لیکن اس طرف کسی کی کوئی نہیں تھا۔ بنگلوں میں درویشیاں زندگی کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ ایک دو بنگلوں کے سامنے کارس بھی کھڑی تھیں۔ ہم دونوں نے دوار سے اتر کر ادھر ادھر دکھا اور پھر سامنے کی طرف دوڑنے لگے۔

”اس طرف“ تھائی وانگ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اس طرف پیدل آمدورفت کے لیے سر پر لٹکی کا ایک ٹیل ہے۔ وہ ٹیل بار کر کے چاؤ سے ناخن موڈ کی طرف نکلتے ہیں۔“ ہم دونوں سر کی طرف مڑ گئے۔ بنگلوں اور سر کے درمیان تقریباً چھ فٹ چوڑی پٹی تھی۔ اس کے رستے پر عام طور پر پیدل یا سائیکل سوار لوگ ہی آیا جاتا کرتے تھے۔ یا کبھی کبھار موٹر سائیکل والے بھی یہ راستہ استعمال کرتے تھے۔ ذرا آگے سر پر لٹکی کے تھکوں کا ایک ٹیل تھا جس کی چوڑائی چار فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے دونوں طرف نیچے اوپر بائیں کے دو دو ڈبڑوں کی رنگت بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ ٹیل دراصل پیدل آمدورفت کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ تاکہ سر کے دوسری طرف جانے کے لیے سرک والے ٹیل کا طویل فاصلہ طے نہ کرنا پڑے۔

کچے راستے پر دوڑتے ہوئے ہمیں وہب وہب کی آوازیں سنائی دیں۔

”تیز بھاگو۔“ تھائی وانگ چیخی ”وہ لوگ بچکے کی دیوار کو در باہر آگئے ہیں۔“

میں تو تیز بھاگ رہا تھا لیکن خود تھائی وانگ ہی پیچھے تھی۔ میں نے مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے بھی اپنے ساتھ تیز دوڑانے لگا۔ ہم دونوں نکلے پیر تھے ”اس لیے کچے زمین پر دوڑنے سے زیادہ آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔“

ہم لٹکڑی والے ٹیل کے قریب پہنچ گئے پیچھے سے شرکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک آدمی تھائی زبان میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔ ان بنگلوں میں دیکھو اور تم سر کی طرف جاؤ۔ جلدی کرو۔ اگر وہ نکل گئے تو تاخیر ہمیں تم سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”تھائی وانگ۔“ میں ٹیل کے قریب رک گیا۔ ”اگر ہم دوڑتے رہے تو پکڑے جائیں گے۔ اس وقت ہمارے لیے محفوظ ترین جگہ یہ ٹیل ہے۔ اس کے نیچے چھپ کر ہم ان کی نظروں سے بچ سکتے ہیں۔“

اپنے ساتھ لیتا ہوا ٹیل کے نیچے پہنچ گیا۔ میں نے ایک کارڈ گردن میں لپیٹ کر اسے کندھے پر لٹکا لیا تھا۔ تھائی وانگ نے ہسٹل والا ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم ٹیل کے نیچے پہنچے وہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر گردن کھائی تو ایک لمحے کے لیے راستے پر دوڑتا ہوا نظر آیا۔

ہم دونوں سر کے کنارے کے ساتھ ٹیل کے نیچے ٹپ رہے۔ اس جگہ پانی میرے پیٹے کے برابر پہنچ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹیل کے تھکوں کے نیچے ایک لٹکڑی کو پکڑ رکھا تھا اور ہاتھ تھائی وانگ کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ رکھ رکھا۔ اس نے بھی ایک ہاتھ سے آگے والی لٹکڑی کو تھام رکھا تھا۔ چند سینکڑے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

لحہ بہ لحہ قریب آتی جاری تھی اور پھر وہ آدمی ٹیل پر پہنچ گیا۔ دھڑکی آواز ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔

ٹیل کے نیچے کھڑی آ رہی تھی۔ اگر وہ ٹھنڈی تھی تو جھانکنے کی کوشش بھی کرنا تو شاید ہم تباہی میں اسے نظر نہ آسکتے۔ لیکن ہم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت سانس روکے کھڑے رہے۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ آدمی ٹیل پر دوڑتا ہوا بنگلوں کی طرف واپس چلا گیا۔ کچے راستے پر اس کے قدموں کی ہلکی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تھائی وانگ کانٹے کی دیوار پھر اس کے منہ سے عجیب ڈری ڈری سی آوازیں بھی نکلتے لگیں۔

”کیا ہو؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا ”سروئی لگ رہی ہے کیا؟“

”اس۔۔۔ اسٹیک۔۔۔“ اس کے منہ سے بمشکل آواز نکل کر ”مم۔۔۔ میری گردن پر۔۔۔ اسٹیک۔۔۔ (سانپ) لپٹ گیا ہے۔“

میں نے ایک جھٹکے سے اس کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا اور پھر وہاں ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر بڑھانے لگا۔ میرا دل بھی خوف سے کھپ کھپا تھا۔ اس کی گردن پر لپٹے ہوئے سانپ نے مجھے ڈس لیا تو اس نے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا۔ ڈیڑی سے ایک مرتبہ سنا تھا کہ ٹیل کے سانپ زیادہ خطرناک اور زہریلے ہوتے ہیں۔

اپنے ساتھ لیتا ہوا ٹیل کے نیچے پہنچ گیا۔ میں نے ایک کارڈ گردن میں لپیٹ کر اسے کندھے پر لٹکا لیا تھا۔ تھائی وانگ نے ہسٹل والا ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم ٹیل کے نیچے پہنچے وہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر گردن کھائی تو ایک لمحے کے لیے راستے پر دوڑتا ہوا نظر آیا۔

ہم دونوں سر کے کنارے کے ساتھ ٹیل کے نیچے ٹپ رہے۔ اس جگہ پانی میرے پیٹے کے برابر پہنچ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹیل کے تھکوں کے نیچے ایک لٹکڑی کو پکڑ رکھا تھا اور ہاتھ تھائی وانگ کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ رکھ رکھا۔ اس نے بھی ایک ہاتھ سے آگے والی لٹکڑی کو تھام رکھا تھا۔ چند سینکڑے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

لحہ بہ لحہ قریب آتی جاری تھی اور پھر وہ آدمی ٹیل پر پہنچ گیا۔ دھڑکی آواز ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔

ٹیل کے نیچے کھڑی آ رہی تھی۔ اگر وہ ٹھنڈی تھی تو جھانکنے کی کوشش بھی کرنا تو شاید ہم تباہی میں اسے نظر نہ آسکتے۔ لیکن ہم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت سانس روکے کھڑے رہے۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ آدمی ٹیل پر دوڑتا ہوا بنگلوں کی طرف واپس چلا گیا۔ کچے راستے پر اس کے قدموں کی ہلکی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تھائی وانگ کانٹے کی دیوار پھر اس کے منہ سے عجیب ڈری ڈری سی آوازیں بھی نکلتے لگیں۔

”کیا ہو؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا ”سروئی لگ رہی ہے کیا؟“

”اس۔۔۔ اسٹیک۔۔۔“ اس کے منہ سے بمشکل آواز نکل کر ”مم۔۔۔ میری گردن پر۔۔۔ اسٹیک۔۔۔ (سانپ) لپٹ گیا ہے۔“

میں نے ایک جھٹکے سے اس کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا اور پھر وہاں ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر بڑھانے لگا۔ میرا دل بھی خوف سے کھپ کھپا تھا۔ اس کی گردن پر لپٹے ہوئے سانپ نے مجھے ڈس لیا تو اس نے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا۔ ڈیڑی سے ایک مرتبہ سنا تھا کہ ٹیل کے سانپ زیادہ خطرناک اور زہریلے ہوتے ہیں۔

خاموشی سے اس طرف دوڑا لگا دو۔ اگر تمہارے منہ سے کوئی آواز نکلی تو بگلی مار دوں گی۔“

موٹر سائیکل سوار دھڑلا چلا سا ادھر سے آ رہی تھی۔ ہسٹل دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے نیچے اتر کر موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر دی اور منہ سے آواز نکالے بغیر جھاڑیوں میں دوڑنا چلا گیا۔

میں جھاڑیوں سے نکل کر سرک پر آ گیا۔ تھائی وانگ نے ہسٹل دیکھا جسے کی جیب میں ٹھونس لیا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نکل گئے تھی۔ میں اس دوران میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور پھر مجھے ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

نفا اچانک ہی روشن ہو گئی تھی۔ میں نے چوک کر دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ سر کے دوسری طرف تھائی وانگ کی کوٹھی سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ غالباً بیڑول چمڑک کر آگ لگادی گئی تھی۔ تھائی وانگ ایک لمحے کو کھٹکی کی کیفیت میں بے حس و حرکت موٹر سائیکل پر بیٹھی رہی پھر وہ موٹر سائیکل سے اتر گئی اور جیب سے ہسٹل نکال لیا۔

”میں۔۔۔ میں اسٹینڈ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ایک ایک کو ختم کر دوں گی۔“ اس کے منہ سے خوفناک غراہٹ نکلی۔

میں چوک گیا اور دوسرے ہی لمحے میں بھی سیٹ سے اتر گیا۔ موٹر سائیکل دوسری طرف الٹ گئی۔ تھائی وانگ ٹیل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ میں اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

”انہوں نے میرا گھر جلا دیا۔۔۔ سب کچھ راکھ کر ڈالا۔ میں ان سب کو ختم کر دوں گی۔“ وہ چیخی۔

”باگلی مت۔۔۔ جو تھائی وانگ۔ ہوش کے ناخن لو۔“ میں نے بھی چیخ کر کہا ”وہ تمہیں دیکھتے ہی گولیوں سے بھون دیں گے۔ یا تمہیں اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیں گے۔“

تھائی وانگ چیختے ہوئے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنا ہاتھ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں دیکھ کر اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار اور تھمڑا سید کر دیا۔ وہ لٹکڑا کر رہ گئی۔

تین چار آدمی بھٹوں کے ساتھ سر کے کچے راستے پر دوڑتے ہوئے محل کے طرف آرہے تھے۔ قحالی وائے نے ہتھول پھر جب میں ڈال لیا اور موٹر سائیکل سیدھی میں اس کی اور کھٹکا کر اسے اسطارت کر دیا۔ میں بھجلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گھر میں سے ڈال کر موٹر سائیکل کو واپس بوڑا اور اس کی رفتار بڑھانی چلی گئی۔ میں نے پیچھے سرگردمکا۔ بچکے سے اٹھنے والے شعلے اب آسمان سے پانچیں کر رہے تھے اور لوگوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

چاروئے نامکن روڈ تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہاں سے اس نے موٹر سائیکل کو لنگر تھپہ برج کی طرف موڑ لیا۔ دیر کے قبل پر اس وقت ٹریک زیادہ ٹھنک چھائی واک بڑی مہارت سے موٹر سائیکل کو گاڑیوں کے سچے سے گھمائی ہوئی نکال رہی تھی۔

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ کٹھن گلی میں کچھ بچے کھیل رہے تھے لیکن کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ وہ سب اپنے کھیل میں مشغول رہے۔ تھائی وائمنگ نے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا اور پھر اتر کر ایک مکان کی تیلی بجا دی۔ میں موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دونوں طرف زمین پر نکالے تھے۔ تھائی وائمنگ کا لٹن کا پایا جامہ تو تھوک سے گھما گیا تھا لیکن میری جینز کی چلوں کے انجنوں نے ابھی تک پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

آتش فشان ۱۳۴ حصہ

دروازہ کھولنے والی ایک پوڑھی ہندو عورت  
سفید کاشن کی سائزی پن رکھی تھی۔ وہ دوسری طرف  
آواز دے رہی تھی۔

ہمارے اندر آنے کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک کمرہ کھل گیا اور اس کمرے سے برآمد ہونے والی عورت نجانے کیوں میں کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگی۔

اس کی ہر ہر جیسی سیاہ آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک

میں اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر

دور میان میں کشادہ محن تھا اور اطراف میں کمرے بے پایاں ہو پوار کے ساتھ اوپر جانے کے لیے بیڑھیاں تھیں۔ اور طرح کے کمرے تھے لیکن محن نہیں تھا۔ کمروں کے

پر مشتمل تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت ان لوگوں نے یہاں اور کوئی نہیں تھا۔

”کیا ہوا؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اور یہ کون ہے؟“  
طرف دیکھنے لگی۔

کہ یہ باہر ہے۔ اور اگر نہ کرے۔ یہ سمجھ لو کہ یہاں کیا آیا۔ ”تھالی“ نامی نے آخری الفاظ اس بوڑھی عورت کے

اس کی تم فکر مت کرو۔ اس نے تو کچھ دیکھا ہے۔  
اس خوب صورت عورت نے کہا ”آؤ۔ اوپر چل کر بیٹھنے۔“

ایزی چیئر کی طرح ایک لمبی سی کری بھی تھی جس پر لایا تھا۔

ہوئے والی مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے لیے زیادہ حیرت کی بات وہ تصویریں تھیں جو دیواروں پر لگی تھیں۔

مرد بھی تھا۔ دونوں نیم عریاں لباس میں تھے۔

تھی کہ گھروں میں ایسی گندی تصویریں کیوں لگائی جاتی تھیں۔

اچھی طرح یاد تھا کہ ایک مرتبہ ڈیڈی ایک میگزین لے کر آئے  
تھے۔ اس میگزین میں بھی ایسی ہی تصویریں تھیں۔ اس روز میں وہ  
خود اس میگزین کو دیکھ کر مئی نے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کے

میں نے تو کمر میں وہ میجرین دکھائی دیا اور نہ ہی ڈیڑی بھی اور

اس کمرے میں آنے کے بعد تمہاری دانک نے ہمارا تعارف  
 بھی کر دیا۔ وہ خوب صورت عورت جاگزی دیوی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر  
 کے علاوہ میں اس کا ایک کلینک بھی تھا۔

میرا خیال ہے پہلے تم لوگوں کو اپنے حقے درست کرنے  
 "جاگتی دیوی" نے کہا اور الماری میں سے ایک انگلی اور کرتے  
 "یہ باتھ روم ہے تم نماز  
 طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ باتھ روم ہے تم نماز

وہ دونوں اس کمرے سے چلی گئیں۔ میں نے کندھے پر لٹکا ہوا  
ایک اڈار کیڑہ پر ڈال دیا اور دو اڑہ بند کر کے ہاتھ دوم میں گھس

تو مجھے بعد ہاتھ روم سے نکلا تو اپنے آپ کو بالکل تروتازہ  
محسوس کر رہا تھا۔ لنگی اور کڑی بھی مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل

میں نہیں جانتا تھا کہ جاگتی دیوی سے تھائی دامن کا کیا تعلق ہے۔

کی ایسی جگہ کی ضرورت تھی۔ جہاں کم سے کم دو تین دن تک  
مکان سے نہ سکیں اور آئندہ کے بارے سوچ سکیں۔ تھائی وائیگ  
مجھے لاکھ مال آیا، پھر جسے کام ملا۔ تو ایک سال

میں کرسی پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہم واقعی موت کے جہاز سے نکلے تھے اگر ہمیں بنگلہ سے نکلنا تھا۔

لوگوں کی بھی آخر ہو جاتی تو اس وقت وہاں ہماری لاشیں پڑی  
 تھیں۔ ہم تو ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے تمھاری  
 دھمک کے پھلے کو اس گھر (گھر) میں بچلے ہوئے لاشوں کے ساتھ

جہاں آرام اور سکھ ملے گی۔ اس لیے اس کو سکھ نہیں کہتے۔

سب کچھ سوچتے ہوئے میرے آنکھوں پر کراہنے کی سی نظر آ رہی تھی۔

کے بچے کی وجہ سے مجھے اور عثمانی و امگ کو ہوٹل سے بھاگنے کا  
مہق ل کیا تھا لیکن انہوں نے دوسرے دن صبح ۱۱ بجے...

تھالی دانگ آج صبح سے گھر سے باہر نہیں گئی تھی۔ اس کے ہاں نہ تو خاںرا آتا تھا اور نہ ہی دن بھر کسی سے رابطہ ہوا تھا۔ اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ شرکی صورت حال کیا تھی۔ دیے سے بات تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ماسٹر پو کے قتل پر مہاراج دانگ ونگ یا نئے خاموش نہیں بیٹھا رہا ہوگا۔ ماسٹر پو اس کا صحت خاص آدمی تھا۔ میں یہ سب کچھ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کیا ہوا تھا۔

میں نے کرسی سے اٹھ کر باہر جانے کے لیے جیسے ہی دروازہ کھولا، ٹھنک کر روک گیا۔ پورے مہینے ہندو ساتھ والے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کوئی بھی اس کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

دو تین منٹ بعد میں نے دوبارہ دیوارِ دوازہ کھولا۔ اس مرتبہ جان بوجھ کر آواز پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور جب میں باہر نکلا تو ہندو بیڑھی کی طرف جاری تھی۔ میں نے ساتھ والے دیوارِ دوازے پر ہلکی سی دھک دی تو دیوارِ دوازہ کھل گیا۔

”آؤ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے“ جاگتی نے سکرٹاے ہوئے کہا لیکن پھر تھاکی واٹمک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے پہلے کہانا کھالیں پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے“

ہم لوگ بچے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ خیل زیادہ بڑی تھی۔ اس پر مچنا ہوا کھانا دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کھانا بازار سے منگوا یا گیا تھا اور اس میں گوشت بھی

تھا۔ ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ جینز کی پینٹ اور ٹرمی رگ کی ٹی شرٹ جس پر ہالی

آتش فشاں 135 حصہ 1

کلائی میں سیاہ چوڑے کا تقریباً تین انچ بڑا بیڑا تاجس پر ڈرا ننگ  
 بیڑوں میں اسٹیل کی کلیں لگی ہوئی تھیں۔ اسے اس لئے سے وہ  
 کوئی سڑک چھاپ غنڈا ہی لگتا تھا۔ تھائی وائک کو شاید وہ پہلے ہی  
 سے جانتا تھا۔ اس لیے اس پر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ البتہ  
 مجھے وہ بڑی کمری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میں اپنے آپ میں  
 عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

”سوز بائیک میں نے لم لیٹی بائیک اسٹیم کے پارکنگ ایریا  
 میں چھوڑ دی ہے دیدی۔“ بالآخر وہ جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا  
 ”پولیس خود ہی اس کے مالک کا سراغ لگا لے گی۔“  
 ”تھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ ضرورت ہو تو تمہیں بلاؤں  
 گی۔“ جاگتی نے کہا اور وہ میری طرف دیکھا ہوا باہر چلا گیا۔  
 کھانے کے بعد ہم اوپر آگئے۔ میں تو اسی کمرے میں گیا اور  
 وہ دونوں ساتھ والے کمرے میں چل گئیں۔ میں بستر پر لیٹا اس نئی  
 صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ بوڑھی بندو کے رویے نے میرے  
 دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے اور پھر  
 فنڈوں جیسے ملے والا وہ نوجوان۔ میرے ذہن میں الجھن بڑھتی  
 جا رہی تھی۔ یہ سنا میں اپنے آپ کو یوں غیر محفوظ کیوں سمجھ رہا  
 تھا۔ میں تھائی وائک سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کا موقع  
 ہی نہیں مل رہا تھا۔

میں جیسے جیسے سوچا اپنی میری الجھن بڑھتی گئی۔ داغ میں بیڑیاں  
 سی رہ گئی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک  
 اور خیال آیا۔ میں بیڑے اٹھ کر تالین پر دبے قدموں چلتا ہوا  
 دروازے کے قریب آیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر  
 جھانکا اور اس کے ساتھ ہی میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر  
 سی دوڑ گئی۔ بوڑھی بندو دوسرے کمرے کے دروازے سے کان  
 لگائے کھڑی تھی۔ اس کا رخ اس وقت بھی دوسری طرف تھا۔ میں  
 اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا ہوا اور پھر سوچا  
 کہ آگے بڑھ کر اسے گرفت میں لے لوں۔ اس طرح رنگے ہاتھوں  
 پکڑے جانے پر وہ تباہی دے گی کہ چھپ کر ان کی باتیں کیوں سن  
 رہی ہے اور میرے خدشات کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہناتا  
 بیڑیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا  
 اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا ہوا تھا۔ میں نے پورے کاناہہ سر کا  
 سامنے نیلے رنگ کا دھبہ پر دھرا ہوا تھا۔ میں نے پورے کاناہہ سر کا  
 کبرا ہر جھانکا۔ فنڈوں جیسے ملے والا وہی نوجوان سب سے اوپر والی  
 بیڑی پر کھڑا اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے چند سینکڑے بعد ہی بندو میرے  
 کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بیڑیوں کی طرف چلی گئی  
 اور پھر وہ دونوں میری حاضری نظر وں سے او بھل ہو گئے۔  
 میں نہیں جانتا تھا کہ اس بدبخت نوجوان اور بوڑھی بندو میں  
 کیا رشتہ تھا لیکن مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں ہمارے

خلاف کوئی سازش کر رہے تھے۔ میرے حوالے سے شہر  
 دنوں سے بنگارے ہو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی قبل  
 بندو کی موجودگی میں جاگتی دیوی کو میرے بارے میں کچھ  
 جب ہم یہاں آئے تھے تو بندو سمجھ گئی ہو کہ میں کون  
 نے وہ سوز بائیک بھی اسی نوجوان کے ہاتھ کچھ نہیں  
 یہ بات تو اس غنڈے نے میرے سامنے ہی بتائی تھی۔  
 بائیک لم لیٹی اسٹیم کے پارکنگ ایریا میں چھوڑ دیا تھا۔  
 میرے دل میں خدشات بڑھتے جا رہے تھے اور جب  
 کہ ہمیں یہاں رات گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ میں سوچتی  
 ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے لیکن اس  
 تھائی وائک سے بات کرنا ضروری تھا۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔  
 بج رہے تھے۔ مزید انتظار کرنا اب میرے لیے ممکن نہیں  
 اٹھ کر باہر گیا۔ ساتھ والے کمرے کے دروازے کی طرف  
 ہوئے میں نے بالکلنی کی رنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا  
 بندو اس وقت مکان کے دروازے سے باہر جا رہی تھی۔  
 کی سفید ساری کا پلو ہی دیکھ سکا تھا۔ میں نے سوز بائیک  
 دروازے پر بہت جلدی ہی دستک دی۔ چند سینکڑے بعد ہی  
 کھل گیا۔ وہ تھائی وائک تھی۔ اس نے جاگتی دیوی کا  
 خوابی کا لباس پہن رکھا تھا جو کچھ پانچ والے پانچ  
 ڈھائی ہشٹ پر مشتمل تھا۔ جاگتی دیوی بیڑی پر نیم دراز تھی اور  
 اس کی ٹانگوں پر سے اس طرح ہٹی ہوئی تھی کہ میں  
 اس کی طرف نظرس اٹھانے کی بہت نہ کر سکا لیکن جاگتی  
 پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”اوہو۔ تم تو کبھی تھی کہ تم سو گئے ہو۔“ تھائی وائک  
 میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”نہیں نہیں آری۔“ میں نے جواب دیا۔ اس نے  
 دیکھ کر مجھے اندازہ لگائے میں دوشاری پیش نہیں آئی کہ  
 باتیں کرتے ہوئے روٹی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرسبز  
 ہوئی تھیں۔

”شاید اکیلے جیسے پور ہو رہے ہو۔ آجاء۔ میں  
 ایسی باتیں نہیں کر رہے۔“ یہ الفاظ جاگتی دیوی نے  
 اب سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔  
 میں کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھائی وائک  
 جاگتی کے ساتھ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔  
 درست نکلا۔ وہ دونوں اسی موضوع پر باتیں کر رہی تھیں  
 ”میں سمجھتی ہوں تم نے اسے سارا دے کر  
 ہے۔“ جاگتی دیوی نے تھائی وائک کی طرف دیکھتے ہوئے  
 کا اشارہ میری طرف تھا ”میں جانتی ہوں تم نے  
 محنت سے بنایا تھا جو جل کر رکھ ہو گیا لیکن میں سارا

لے جاتی ہوں اور مجھے نہیں ہے کہ جب اسے پتا چلے گا کہ تم سارا  
 لے کر اس کے دل سے برباد ہوا ہے تو وہ تمہارا نقصان پورا  
 کرے گا۔“  
 ”مجھے اپنے نقصان کی پروا نہیں۔“ تھائی وائک نے کہا  
 ”جب میں اسے اپنے گھر لے کر آئی تھی تو مجھے اسی وقت اندازہ  
 ہوا تھا کہ اسے پتا دے کر میں نے دنیا کے سفاک ترین انسانوں  
 سے دشمنی مول لی ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن  
 مجھے بھی وہی دکھائیں گے لیکن میرے دل میں کوئی خوف نہیں  
 تھا۔“

”مجھے تم دونوں سے ہمدردی ہے۔“ جاگتی دیوی نے کہا ”بہت  
 اچانک یہ تم یہاں آگئیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم سارا زیادہ دن  
 یہاں رہا بھی ممکن نہیں ہے۔ آج کی رات تو گزار لو۔ کل شام کے  
 بعد میں تم لوگوں کو ناخوابوری والے مکان میں بھیج دوں گی۔ وہاں  
 تم لوگ کسی خوف و خدشے کے بغیر چند روز آرام سے رہ سکو گے۔  
 اچھا۔ اب میں چلتی ہوں۔ تم لوگ بھی سو جاؤ۔ اب صبح ملاقات  
 کی۔“

جاگتی دیوی اٹھ کر چلی گئی۔ ہم دونوں بھی اس کے ساتھ ہی  
 کمرے سے باہر آگئے اور بالکلنی کی رنگ کے قریب کمرے سے  
 دیکھتے رہے۔ نیچے آنگن میں بیچ کر اس نے ہماری طرف دیکھتے  
 ہوئے اٹھ ہلایا اور ایک کمرے میں چلی گئی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد  
 میں نے فنڈوں جیسے ملے والے اس نوجوان کو بھی دیکھا تھا جو ایک  
 کمرے سے نکل کر ہماری طرف دیکھا ہوا باہر چلا گیا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ میں نے تھائی وائک کی طرف دیکھتے ہوئے  
 دم پیچے میں پوچھا۔  
 ”یہ بندو کا نواسہ ہے۔“ تھائی وائک نے بتایا ”بندو کی بیٹی  
 اندر بہت بد قسمت واقع ہوئی تھی۔ اس کا شرابی شوہر اسے بہت  
 مارا تھا۔ وہ جو ابھی بہت کھلتا تھا۔ راجو کی پیدائش کے بعد ایک  
 روز وہ اپنی بیوی کو بھی جوئے میں ہار گیا۔ راجو اس وقت بہت چھوٹا  
 تھا پانچ مہینے کا۔ اس کی ماں نے گلے میں چند اڈال کر خودکشی  
 کر لیا۔ اس کے باپ کو پولیس نے پکڑ لیا لیکن وہ جیل سے بھاگنے کی  
 کوشش میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کر ختم ہو گیا۔ راجو کو اس کی  
 ٹائی بندو سے پالا ہے لیکن وہ اچھا لڑکا نہیں ہے آوازہ لوگوں کے  
 ساتھ بھرتا ہے۔“

”وہ بندو کون ہے؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔  
 ”جاگتی کی ملازمہ۔“ تھائی وائک نے جواب دیا ”اس نے  
 جاگتی کو گود میں لکھ لیا ہے۔ جاگتی راجو کو پسند نہیں کرتی مگر بندو کی  
 وجہ سے اسے رکھا ہوا ہے۔“  
 ”کیا تمہارے خیال میں یہ لوگ قابل اعتماد ہیں۔ جاگتی کو تم  
 کہتے جانتی ہو؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔  
 ”کئی خیال سے۔“ تھائی وائک نے جواب دیا۔ وہ چند لمبے

میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی ”یہاں کمرے ہو کر ایسی باتیں کرنا  
 ٹھیک نہیں۔ آؤ۔ اندر آؤ۔“ میں اس کے ساتھ کمرے میں  
 گیا۔ دروازہ میں نے جان بوجھ کر کھلا رہنے دیا تھا ”تمہیں ان کے  
 بارے میں کیا شہ ہے۔ جاگتی میری قابل اعتماد دوست ہے۔ وہ مجھے  
 دھوکا نہیں دے سکتی۔“

”لیکن بندو اور اس کا نواسہ راجو ہمیں دھوکا دینے کی کوشش  
 کر رہے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا  
 اور پھر اسے بوڑھی بندو کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کس طرح  
 چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اسے راجو کے بارے  
 میں بھی خدشات سے آگاہ کر دیا۔

”وہ اندر۔“ وہ اچانک ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی آواز  
 ایک دم بھرا گئی تھی۔ میں نے اس کا کندھا چھوتے ہوئے اسے  
 اپنے سے الگ کیا ”ہم کہاں جا سیں گے۔ وہ گلوگرنسی آواز میں بولی  
 ”جب ہم وہاں سے بھاگے تھے تو مجھے یہی ایک پناہ گاہ نظر آئی تھی۔  
 اس لیے میں یہاں آئی لیکن تم نے جو کچھ بتایا ہے، وہ بھی غلط نہیں  
 ہو سکتا۔ جاگتی دیوی کے غلط میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ہمیں دھوکا  
 نہیں دے سکتی لیکن راجو۔ اس پر واقعی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔  
 ہم جس حالت میں یہاں آئے تھے وہ سمجھ گیا ہو گا کہ ہم کسی افتاد  
 میں جلا ہیں۔ ہماری باتیں سن کر بندو نے اسے بتا دیا ہو گا کہ تم کون  
 ہو۔ راجو کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ نہ اپنی نانی کے کنٹرول  
 میں ہے اور نہ جاگتی دیوی کے ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس  
 وقت بھی کسی جوڑ توڑ میں مصروف ہو۔ اس کا بار بار باہر آنا جانا  
 مجھے بھی شبہات میں جلا کر رہا ہے۔ اس میں ایسی بے چینی اور ایسا  
 اضطراب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بہر حال، ہمیں آج رات تو  
 یہاں گزارنی ہی ہے۔ میں صبح ہی جاگتی سے بات کروں گی کہ ہمیں  
 کسی طرح ناخوابوری والے مکان میں بھیج دے اور ان دونوں کو  
 پتا نہ چلے دے کہ ہم کہاں گئے ہیں۔“

”کل صبح کیوں؟“ میں نے کہا ”آج رات ہی کیوں نہیں۔  
 ہمیں رات ہی میں کسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ راجو اور  
 بندو کی پراسرار سرگرمیوں نے مجھے شبہ ہے کہ آج رات ہی کچھ نہ  
 کچھ ضرور ہو گا۔“

”فکرت کرو۔“ وہ بولی ”حتی جلدی کچھ نہیں ہو گا۔ اگر کوئی  
 یہاں آیا تو۔“ اس نے جب کہ بستر پر ہوا نیکی اٹھا دیا اور پھر  
 ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی ”مم۔۔۔ میرا ہسپتال کہاں گیا؟ میں جب  
 نہانے گئی تھی تو تمہیں رکھا ہوا تھا اور جب ہم کھانا کھانے کے لیے  
 بیچے گئے تھے تو ہسپتال میں نے ہمیں چھوڑ دیا تھا۔ اس نکلنے کے  
 پیچھے۔“

”اس کا مطلب ہے میرے خدشات بے بنیاد نہیں ہیں۔“  
 میں نے کہا ”ہو سکتا ہے ہسپتال بندو یا راجو نے اس وقت غائب کیا  
 ہو جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔“



تشریف مار ۱۳۸ حصہ ۱

لرا تا رہا اور پھر تورا کر بیچے گرا۔ میں اس دوران میں اپنی جگہ پر بڑا دشت زدہ ہی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے خون کے کچھ چھینے میرے لباس اور چہرے پر بھی پڑے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور کرتے کی آستین سے چہرے کا خون پونچھ لیا۔ اس وقت مجھے بڑی کراہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نعمت تھا کہ نئی فون بوتھ سے نکلنے ہی تھا تو وانگ نے میرے ہاتھ سے ہتھول لے لیا تھا۔ اگر وہ ہتھول میرے پاس ہوتا تو شاید میں اسے پلٹنے سے استثناء نہ کیا تا کیونکہ یہ ہتھیار میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھ میں لیا تھا۔

تھائی وانگ میرا ہاتھ پکڑ کر آدھے کے بیڑیوں کی طرف دوڑی۔ ہم بیڑیاں اتر کر سڑک پر دوڑنے لگے اور اس کار کے پیچھے جا کر پچھلے محبے جو دکان کے شہر سے کرا کر رک گئی تھی۔ راجو کا ساتھی بھی فائز کی آواز سن کر پہلے مندر کے برآمدے میں گھسا تھا پھر اس نے ہمارے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔

ہم کار کے پیچھے کھڑے تھے اور وہ بد معاش ہمارے سامنے کار کے دوسری طرف۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس کی شکل دیکھنے ہی میں چونک گیا۔ یہ دی بد معاش تھا جسے ہم نے اندرا رنجیت ہوٹل کے گیٹ کے سامنے گھرائی کرتے دیکھا تھا۔

”لوگ کچھ نہیں سکتے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“ وہ خنجر والا ہاتھ لہراتے ہوئے غرایا۔

”بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“ تھائی وانگ نے ہتھول والا ہاتھ ابرا اٹھایا۔

لیکن لگتا تھا ہتھول کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اندر اُدھر دیکھا، کار کی پچھلی سیٹ پر ایک ہاکی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پھرتی سے جھک کر وہ ہاکی اٹھائی۔ تھائی وانگ کے ہاتھ سے ایک خون ہو چکا تھا اور میں سمجھ گیا کہ اب وہ کوئی چلانے میں ہچکچا رہی تھی لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ کوئی چلانے سے دریغ نہیں کرے گی۔

میں ہاکی پکڑ کر کار کے اوپر سے گھوم کر سامنے آگیا۔ اس بد معاش کے ہونٹوں پر طغریٰ سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے ہاکی سے اس پر حملہ کر دیا لیکن وہ نہ صرف اس حملے سے بچ گیا بلکہ اس نے بھی مجھ پر جو ہل دیا کہ تھا۔ خنجر نے میرے بازو سے کچھ چڑیا۔ میں محتاط ہو گیا۔ وہ تربیت یافتہ اسٹریٹ فائر تھا اور میں اناڑی بلکہ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ میں اس طرح کسی کے مقابلے پر آیا تھا اور یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

میں نے پھر اس پر حملہ کیا۔ وہ اس مرتبہ بھی بچ گیا لیکن میں نے سنبھلنے کا موقع دینے بغیر اس پر دوسرا حملہ کیا۔ اس مرتبہ مجھے باؤس نہیں ہوئی۔ ہاکی اس کے پاس نہیں کھسکے گی پڑی پر لگی۔ وہ ہلایا اٹھا لیکن میں نے اٹھا دیا تو اس نے بڑی پھرتی سے ایک ہاتھ سے ہاکی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے خنجر کار کر دیا۔ میں بڑی پھرتی

سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہاکی کو بھی زوردار ہتھ دیا تھا۔ وہ میرے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے لیے پیچھ کر گیا۔ میں اس سے پہلے ہی سنبھل گیا اور اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ بغیر اس پر پے در پے ہائی سے وار کرنے لگا۔ وہ زمین پر لٹ پڑا۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”امد۔۔۔ اور امد۔۔۔“ تھائی وانگ چلا رہی تھی ”امد۔۔۔ اسے ختم کر دو۔“ وہ ہاتھ میں ہتھول لے کر کسی ایک طرف ہوجا رہی تھی دوسری طرف۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں اس قسم کی لڑائی کا میری کیا فائدہ اور میں اس بد معاش سے زیادہ بیمار تھا۔ مجھے تو لڑنے کا ذہنی صدمہ نہیں آتا تھا لیکن جب موت تقاب میں ہو تو بہت سی باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ میرے اندر بھی اس وقت حوصلہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ جھجک دور ہو گئی تھی جو شریف لوگوں کو لڑائی میں جھجکوں سے دور رکھتی تھی۔

پہلے فائز اور پھر شوری آوازیں سن کر مندر کے دو تین پائالوں ذیلی دروازہ کھول کر باہر آ گئے تھے۔ اس گلی میں دکانوں کے اوپر ہائٹس مکان تھے۔ ان لوگوں نے بھی آوازیں سنی ہوں گی۔ لوگ خند سے بیدار ہو گئے ہوں گے لیکن باہر کوئی نہیں آیا تھا۔ البتہ بعض لوگ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔

اسی دوران میں کھلی چھت والی ایک جپ بریکوں کی تیز چڑچڑاہٹ کی آواز کے ساتھ وہاں آکر گری۔ ماسٹر بوجن اور اس کے ساتھ تین اور آدمی چلا گئے لگا کر چپ سے اترے۔ صورت حال دیکھ کر ماسٹر بوجن نے اپنے آدمیوں کو دوری روک لیا۔

”شاباش۔۔۔ ماسٹر بوجن چیخا ”امد۔۔۔ اور امد۔۔۔ سر۔۔۔ زور سے۔۔۔“ ماسٹر بوجن چیخا۔

اور پھر وہ سب چیخ چیخ کر میرا حوصلہ بڑھانے لگے۔ میں نے ونگ میں مقابلوں کے دوران میں کھلا ڈپوں کے حمایتیوں کو اس طرح پیچھے ہونے دیکھا تھا۔ رنگ کے باہر بیٹھے ہوئے قشاشانی اس طرح چیخ چیخ کر اپنے پسندیدہ کھلا ڈی کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور وہ جوش و خروش سے اپنے حریف پر حملے کرتا تھا۔

میں جوش کی حد پہنچا لگ کر جنون کی حدود میں داخل ہو گیا تھا اور پھر جب ماسٹر بوجن کے آدمیوں نے بڑی مشکل سے مجھے گرفت میں لے کر جپ میں ڈالا تو میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے رہا تھا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ ماسٹر بوجن کو مارنے والوں میں یہ بھی شامل تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

بوجن کے آدمی مجھے گرفت میں لے ہوئے تھے اور پھر تھائی وانگ نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ آواز میری سماعت سے کھرا رہی تھی۔ یہ بتدریج پھر سکون ہونا لگا گیا اور جب اپنے آپ کو سنبھال کر سیدھا ہوا تو جب خنجر فائرنگ سے ایک سنان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

○●○

”میرے ہاتھوں میں ہونے والا پہلا قتل تھا۔ اس میں شبہ نہیں رہتا تھا۔ جو کچھ بھی کیا تھا، اپنے دفاع میں کیا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ دنیا کا کوئی بھی قانون اور کوئی بھی معاشرہ پہلے کی ذاتی دفاع کا حق استعمال کرنے سے روک نہیں سکتا۔ یہ نیکو ذاتی دفاع میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب کوئی دوسرا جانور غارت ہو جائے تو پہلے کی زندگی میں آنے والا جانور نہ صرف اپنے ظہور ہونے سے کوشش کرتا ہے بلکہ حملہ آور کو نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ یہ اس کے شر سے محفوظ رہنے اور انسان تو پھر انسان ہے۔ اگر اس کے خلاف عدالت نے اس حقوق اشرف کو سوچنے کی بجائے اسے رعایت دی ہے اور اس نے اپنے آپ کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے لاکھوں پھنکڑے ایجاد کر رکھے۔ بلکہ لڑائی میں اشتعال اور لڑائی میں متعلقہ وجہ کے دوسرے پر غلبہ کرے۔۔۔ تو وہ جابر اور ظالم کھاتا ہے اور دوسرا فریق غلبہ جس کا ساتھ دوسرے لوگ بھی دیتے ہیں اور اس کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو مظلوم ہی سمجھتا تھا۔ میں نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن وہ لوگ میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ مجھے صفحہ ہستی سے مٹانا چاہیے تھے۔ میں مظلوم تھا اور اس لیے لوگ میرا ماتھ دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔

چاہا پر اب سمجھنے پر غم ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دے دی۔ مہاراج وانگ دیکھ جائے کو میری سچائی کا یقین آگیا۔ اس نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا اور میری تربیت کرنے لگا۔ لگا میں اپنے دشمنوں سے خود نہ ٹکوں۔ اس کا ایک بحزن آدمی ماسٹر بوجن میری حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا۔ تھائی وانگ نے مجھے اپنی پناہ میں لیا تھا۔ وہ ایک کورڈ روت تھی اور یہ جانتی تھی کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نے ہاتھ نہیں سمیٹا۔ اس کے ہنگامے کو راہ کر دیا گیا۔ اور میری جان بچانے کے لیے اسے ایک انسان کے خون سے ہاتھ دھوئے۔ ایک طرف اس کی قدر غلط اور چاہت تھی کہ کوئی میرے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے اور دوسری طرف لالچ اور ہوس نے کسی کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ وہ گھر آئے ہوئے مکان کو بھی دشمن کے حوالے کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔

یہ بھی مقام شکر تھا کہ مجھے راجو اور اس کی نانی ہندو پر شبہ ہو گیا تھا اور ہم بدعت وہاں سے نکل آئے تھے۔ اگر سوچیں میں کچھ دفعہ گزرا ہوا جاتا تو شاید میں یہ سب کچھ بھاننے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔

اب مجھے ہاتھوں راجو کے ساتھی کی موت میرے لیے بھی حیرت ہوئی۔ ایک تربیت یافتہ اسٹریٹ فائر تھا۔ میں نے اُسے اندرا راجو کے سامنے لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ وہ

میرے ہاتھوں کیسے مارا گیا تھا۔ کیا اس میں اس کی کوئی غلطی تھی یا میرے اندر اتنی طاقت آگئی تھی کہ میں اس پر حاوی ہو گیا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ زور اور خوف ہی انسان کو بڑول دیتا ہے۔ ہاتھوں کی طاقت سلب کر لیتا ہے اور مظلوم کر کے رکھ دیتا ہے۔ خوف زدہ آدمی چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر کسی میں حوصلہ پیدا ہو جائے اور وہ خوف پر غالب آجائے تو بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کا کچھ نہیں لگا سکتی۔

یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں جسمانی طور پر کمزور نہیں تھا لیکن خوف نے مجھے بڑول دیا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کا نام سننے ہی پر قہر کھانے لگتا تھا لیکن اس بد معاش کو موت کے گھاٹ اتار کر میں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس خوف سے چھٹکارا پانے اور میرے اندر حوصلہ پیدا کرنے میں تھائی وانگ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس غمزدگی سے لڑائی کے دوران میں تھائی وانگ چیخ چیخ کر جس طرح میرا حوصلہ بڑھاتی رہی تھی، وہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ بہر حال اس واقعے سے میرے اندر جو حوصلہ پیدا ہوا تھا، میں اسے ناقابل شکست بنا دیتا چاہتا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ زندہ رہنے کے لیے صرف جسمانی طاقت ہی نہیں، حوصلے اور عزم و ہمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے بڑول آدمی نہیں بن سکتا۔

اس رات ماسٹر بوجن مجھے جتنا زہم میں لے آیا تھا۔ یہاں آتے ہی اس نے فون پر مہاراج کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ماسٹر بوجن مجھے اور تھائی وانگ کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس بندوبست میں ہمارے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ دین بنگا کی حدود سے نکل کر نا تھا پوری کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

شہر سے تقریباً تین میل نکلنے کے بعد ماسٹر بوجن نے دین ایک کچی سڑک پر موڑ لی۔ اس سڑک پر پہلے تو دونوں طرف دھان کے کھیت تھے اور پھر جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنگل بتدریج کھنجان ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد دین ایک کھلی جگہ پر رک گئی۔

میں دین سے اتر کر حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں کھیتیں کھانڈوں طرف کھنجان کھنجان کے ایک طرف چند جمبو پڑے بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک جمبو پڑے میں مدھم مدھم روشنی نظر آ رہی تھی جبکہ باقی جمبو پڑے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دین رکنے کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک طرف سے غرائی ہوئی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس طرف جمباؤں میں کوئی آدمی چھپا ہوا تھا اور غرائی ہوئی آواز میں تھائی زبان میں کہہ رہا تھا۔

”تم سر۔۔۔“ میری رائفل کی زو پر ہو۔ اپنے ہاتھ اوپر



”نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”یہ تو محنت ہے۔ اگر میں محنت نہیں کروں گا تو یہ فن کیسے کیسوں گا۔ دشمن کا مقابلہ یہ کیوں گا۔“

”حمک کہتے ہو۔“ عاتق دانگ نے کہا ”کامیابی محنت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔“

چٹی ہوئی رت پر میری پریکٹس کئی روز تک جاری رہی اور اس کے بعد ایک اور مرحلہ آیا جو اس سے زیادہ خطرناک تھا۔ اب مجھے کانچ کے ٹکڑوں پر پینکٹ کرنی تھی۔ پیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ڈیمرگرم رت سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہانگ سو میرے قریب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ کانچ کے ٹکڑوں کے اس ڈیمر پرنچ کس طرح مارا جائے غلط پانچ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مونے تھائی میں زیادہ اہمیت پہنچوں اور کلنگ کو دی جاتی ہے۔ اس لیے ان دونوں چیزوں کی پریکٹس پر بھی زیادہ زور دیا جاتا۔..... اس پریکٹس سے یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ کس طرح کم سے کم طاقت استعمال کر کے حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔

موتے تھائی کے علاوہ مجھے ارشاد آئس کے بعض دوسرے  
انسانوں کے بھی مخصوص داڑھی بچ سکائے جا رہے تھے ہر ہفتے کسی  
نہ کسی مجھ کو کے ساتھ میری اسپرنگ بھی ہوتی جس میں مجھے بتایا  
جاتا کہ حرف پر کس طرح طوطا اور ہونا چاہیے اور حرف کے اصل  
سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ انسانی جسم میں  
کتنے اور کون کون سے پٹریز پوائنٹس ہوتے ہیں اور کس پٹریز  
پوائنٹ پر کس طرح وار کر کے کیا نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہاٹک سوتے تھے یہ بھی سمجھایا کہ اگر غالی ہاتھ کسی حرفت سے آہنا سامنا ہو جائے تو ہاٹک کسی بھی ایسی چیز کو ہتھیرا یا غالت کے سرچشہ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے جسے آہنا یا ممکن نہیں ہو۔ مثلاً آس پاس موجود کوئی درخت یا دیوار۔ مجھے اگر حرفت پر فلاٹنگ کھ لگائی ہے اور وہ مجھے اس کا موقع نہیں دے رہا تو ایسے موقع پر مجھے چاہیے کہ میں دوڑتا ہوں یا دیوار کی طرف جاؤں اور فلاٹنگ کھ کے انداز میں اچھل کر کم از کم چار فٹ اوپر دوڑوں پھر دیوار سے لگا کر دیوار کو پوری قوت سے دھکیلیں اور پلٹ کر اپنے حرفت پر فلاٹنگ کھ لگاؤں۔ اس ٹیکنیک سے میرے حملہ آور ہونے کی قوت دہنی ہو جائے گی اور حرفت کو ایسی کاری ضرب لگے گی کہ اس کے لیے آہنا ممکن نہیں رہے گا۔

اس روز میں دن بھر یہی پریکٹس کرتا رہا لیکن مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

اس رات میں گمری نیند سویا ہوا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے کندھے سے پکڑ کر کھلا رہا ہے۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کوٹ بدل لی لیکن دوسرے ہی لمحے پھر کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر کھلا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔

کمر میں سے... پلے آیا تھا۔ نثر زادہ مگر نہیں تھی۔ بچپے  
انجمن سے... دور ان میں اس نثر میں مجھے تیرا بھی سکھا گیا تھا۔ میں  
ہو چڑھ کر بار بار تھاکا کی داک کی طرف دیکھ رہا تھا وہ کنارے پر  
ٹھانے ہوئے...

اس روزِ داگ سوچے پلڑا رنگ لے کیا۔ جس میں چھوڑ کیا تھا۔  
 اے ان دونوں بھکشوؤں نے کچھ بتایا ہو گا لیکن بات کچھ اور نکل۔  
 ان دونوں بھکشوؤں نے اے کچھ نہیں بتایا حالِکے کیسپ کی عمرانی  
 کرنے والے حافظہ نے مجھے خالی داگ کی چٹائی کرتے ہوئے دیکھ  
 یا قادیانگ سو کے پیچھے ہرچھے ساری بات جانی پڑی۔  
 ”اوہ“ داگ سو کے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔<sup>۱۳</sup> تم کھر  
 مت کرد۔ میرے پاس اس کا علاج ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور  
 پلڑے چٹائی کی ضرورت نہیں دیں گی۔“

اس کی پریکٹس میں مجھے بارہ دن لگے اور تیرہویں دن میں  
بیس کے تمام لوگوں کے سامنے اس کا مظاہرہ کر کے داد و صل  
کہا تھا۔

ایک مکتوب کا اگلے سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے کندھوں پر دو سرا  
بجھ کر لگا ہو گیا۔ اس نے دستے کی طرف سے ایک خجندہ اتوں میں  
دار تھا۔ خجندہ کی نوک پر ایک نیب چسپا ہوا تھا۔ میں تقریباً پندرہ  
فٹ دور سے دوڑا ہوا آیا۔ مخصوص نشان اور پہنچ کر اچھا لگا ہوا

میرے اس کامیاب مظاہرے پر، چمکتیوں نے مجھے کھدوں پہ اٹھالیا۔ میں کامیابیوں کے راستے پر گامزن رہا۔ میری اس کامیابی کی سب سے زیادہ خوشی قاتل و داکو کو تھی۔ اگر کسی شخص مرے پر میں ہمت ہارنے لگتا تو وہ میری حوصلہ افزائی کرتی۔ مجھے آگے بڑھانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

روزانہ شام کو میری اپنی رنگ ہوتی۔ کبھی ایک، کبھی دو اور  
کبھی تین تین آدمیوں سے لڑاؤ جاتا۔ میری ٹینگ کا مقصد محض  
اسپورٹس مین کے طور پر فخر سیکھنا نہیں تھا بلکہ مجھے ایک مکمل  
جنگ جو بنایا جارہا تھا تاکہ میں عملی زندگی میں اپنے دشمنوں کا مقابلہ  
کر سکوں۔

میری زندگی کا تین مہینے ہو گئے تھے۔ ہانگ سو میری زندگی سے مطمئن تھا اب زیادہ زور اسپرٹنگ پر تھا۔ میرے مقابلے روزانہ باقاعدگی سے کرائے جا رہے تھے اور ہانگ سو میری اس ڈیٹا سٹریشن سے مطمئن تھا اور پھر ایک روز اطلاع ملی کہ مہاراج وانگ وانگ دیکھائے اگلے روز میلا آ رہا ہے۔

ہمارا ج دوسرے روز سے پہر چار بجے کے قریب کیپ میں پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ اسٹروجن اور دو آدمی بھی تھے۔ ایک سو نے ہمارا ج کے استقبال کی تمام تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ ہمارا ج کے آنے کے ٹھوڑی ہی دیر بعد کیپ میں ٹریننگ حاصل کرنے والوں کی کارکردگی کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ میری رہائی، مجھے آج بھی اسے فخر کے مظاہرے کا آتما آتا

سے شروع ہوا اور سرسالت پر ختم ہوا۔ کاآز دراصل وہ مختلف انسان ہوتے ہیں جنہیں فائٹ میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسائنمنٹس ہی کرانے کا حریف پر حملہ آور ہونے کی اگلی پوزیشن بناتا ہے۔

آخر میں مقابلے تھے۔ کھیل میں عام طور پر جیت کھراور وٹ کے حساب سے ہاؤٹ ہوتے ہیں لیکن اس یکپ میں جیت کھراور کوئی تصور نہیں تھا البتہ ٹینک کے دوران میں ایئر ٹینک میں وٹ کا کسی حد تک خیال رکھا جاتا تھا۔ مقابلے ہوتے رہے اور ان میں حصہ لینے والے دو سروں سے داد حاصل کرتے رہے۔ آخر میں میری باری تھی۔ میرے ہاؤٹ میں جس شخص کو میرے مقابلے پر لایا گیا ہے دیکھ کر سب ہی چونک گئے تھے۔

وہ تنگ چوہ تھا۔ اس یکپ کا سب سے طاقت ور اور خطرناک ہتھیار۔ اس کا قدر چوہ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ حرکتیں کے قریب رہی ہوگی۔ اس کا جسم اگرچہ دھلا تھا لیکن وہ جیتنے کی طرح طاقت ور اور بھرتلا تھا۔ ٹینک کے دوران میں بھی یکپ کے دوسرے لوگ عام طور پر اس سے دوری رہا کرتے تھے۔

نمائندگی مقابلوں میں عام طور پر بہترین استعمال کیے جاتے تھے تاکہ سر پر جوت نہ لگے لیکن میرے ہاؤٹ میں کچھ مختلف طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ ہم دونوں کو نہ تو بہترین گینز دیے گئے اور نہ ہی باکسنگ گلووز۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ میرے حریف تنگ چوہ نے ہاتھوں پر رسیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔ ہاں جیسی کھردری رسیوں پر چھوٹی چھوٹی گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ موئے تھائی کے مقابلوں میں حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے بوسے عجیب و غریب ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے۔ گلووز میں کوئی ایسی سخت چیز چھپائی جاتی جس سے حریف کو زیادہ جوت لگتی لیکن یہ سب کچھ چوری چھپے ہوتا تھا اور یہاں تو صورت حال مختلف تھی۔ تنگ چوہ نے ہاتھوں پر گرہوں والی جو رسیاں لپیٹ رکھی تھیں وہ سب کی نظروں میں تھیں جبکہ میں خالی ہاتھ تھا۔

میں نے ہمارا جگہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی الجھن کی نظر آ رہی تھی اور تھائی وانگ کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے لیکن میں خوف زدہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ تھا۔

رہنری کے فرائض ایک سینئر انجام دے رہا تھا۔ میں اپنے حریف کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کیا اور رہنری کا اشارہ ملنے ہی مقابلہ شروع ہو گیا۔ تنگ چوہ میرے سامنے الجھل رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی کلک لگانے کے لیے پیر اٹھایا۔ میں نے اگلے ہاتھ کی کلائی سے اس کی کلک روکی اور بڑی بھرتی سے اس کا بچھ دوکنے کے لیے سیدھا ہاتھ بھی اٹھا دیا۔ اس نے جیسے ہی ہاتھ اٹھا تھا میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اصل ڈاؤننگ نہیں ہوگا جو گھٹنے میں سے بڑی کامیابی سے روکا تھا۔

تنگ چوہ نے درپے درپے حملے کر رہا تھا اور میں زیادہ تر دفاعی کرتا رہا۔ کبھی کبھار ایک آدھ حملہ بھی کر دیتا تھا کہ کامیابی سے روک لیتا۔ میں اپنی طرف سے مدافعت کے ساتھ اسے استعمال بھی دلاتا تھا جتنا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔

ہمارا یہ مقابلہ پانچ راؤنڈز کا تھا۔ پہلے دو راؤنڈز میں وہ جی جیتا لیکن تیسرے راؤنڈ میں اس پر تنگ چوہ کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اب میں نے مدافعت کی پالیسی ترک کر کے بار بار انداز اختیار کر لیا۔

تنگ چوہ نے ایک حملہ کیا تو میں نے اس کا بچھ کلائی پر اور اس کے ساتھ ہی اپنی قلابازی کھائی۔ ایسا کرتے ہوئے میں کلک اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے پر لگی اور وہ پیچھے الٹا اور پھر تو میں نے اسے سینٹیلے کا موقع نہیں دیا۔ پھر وہ اپنے اس پر حملے کر رہا۔ اس راؤنڈ میں مجھے دو پوائنٹس ملے۔

یہ رنگ کوئی باقاعدہ رنگ نہیں تھا۔ اس کے اطراف میں رے بھی تھے ہوتے نہیں تھے۔ اکھاڑے کی طرح تاجی کے چاروں طرف سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے محسوس کیا تو کہ زیادہ ہمدردیاں تنگ چوہ کے ساتھ تھیں۔ میرے جی میں بھی چند آوازیں اٹھ رہی تھیں اور سب سے نمایاں آواز تھائی وانگ کی تھی۔

چوتھے راؤنڈ میں مجھے مزید دو پوائنٹس ملے۔ پانچویں راؤنڈ میں مقابلہ فوری اسٹاک میں تبدیل ہو گیا تھا۔ تنگ چوہ نے تمام قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میرے آپ تک مقابلے پر کھن رہنے سے وہ شاید اپنی توہین محسوس کرنے لگا تھا اور ہر تہمت پر ٹکست رہا تھا۔

یہ واقعی اسٹریٹ فائٹ تھی جس میں کوئی قاعدہ کچھ نہیں ہوتا۔ بس حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تنگ چوہ نے دائیں ہاتھ کا دھوکا دے کر بائیں ہاتھ کا کار کیا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر اس کا بچھ کھن سے میرے کندھے پر لگا۔ ہاتھ پر لپٹی ہوئی کھردری رسیوں اور گرہوں کی وجہ سے میرے کندھے کی کھال چھل گئی لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور اشتعال میں آنے کے بجائے ہوش و حواس میں رہے ہوئے مقابلہ جاری رکھا۔ تنگ چوہ مجھ پر دباؤ والے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بچھ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا تو میں طاقت ور اپڑتنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرے دائیں ہاتھ پر اس کی بغل کے نیچے لگا۔ وہ جیسے ہٹا تو میری فینٹ کلک اس کے اوپریں پھولیں گئی اور پھر تو میں نے اسے سینٹیلے کا موقع نہیں دیا۔

بچھ کلک۔ بچھ کلک۔ وہ بری طرح لاٹھڑا رہا تھا اور جب اس نے سینٹیلے کی کوشش کی تو میں ایک بار پھر وہاں اچھلا اور پھر تو میں نے فلائنگ کلک اس کے سینے پر باری۔ وہ لاٹھڑا کر رہا تھا لیکن میں نے اپنے جی میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ میں بجلی کی سی سرعت سے

بڑھ کر بھاگا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی گردن پر تھا اور دوسرا ہاتھ پیر میں نے پوری قوت استعمال کرتے ہوئے اسے اپنے سر پر لٹا دیا اور تنگ چوہ کی طرف اچھلا دیا۔ وہ تماشائیوں نے اٹھ کھڑے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے چیخ رہے تھے۔ میں اس کے قریب کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ تنگ چوہ اس کی کوشش کر رہا تھا۔ تنگ چوہ نے دو مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ رہنری نے چیخ کر دس کہا اور پھر براہ راست اٹھ دیا۔

میں نے مقابلہ جیت گیا تھا۔ ہمارا جگہ ایک جھکے سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ تھائی وانگ جیتی ہوئی اکھاڑے میں آگئی اور دو امانت اور ان میں مجھے پلٹ گئی۔ میرے مقابلے میں شور مچانے ہوئے مجھے کدھل پر اٹھایا اور پھر ہمارا جگہ کے سامنے لے جا کر زمین پر اڑا دیا۔ میں نے ہمارا ماسٹر ہو جن اور ہانگ سو کو بکیا۔

ہمارا جگہ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہانگ سو۔“ وہ میرے استاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ”ہم نے بہت خوش ہوئے۔ ایک سال کی ٹیننگ تین میٹوں میں۔“

”مجھے اپنے اس شاگرد پر فخر ہے ہمارا جگہ۔“ ہانگ سونے بو کرتے ہوئے کا یہ تہمت کی محنت کا نتیجہ ہے۔ میرا خیال تھا اتنی نظریات میں یہ کچھ بھی نہیں سیکھ پائے گا لیکن اس نے کی موش پر بھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ بڑی محنت کی ہے اس نے۔ ”وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”تنگ چوہ میرے یکپ کا سب سے سینئر اور سب سے خطرناک آدمی ہے۔ یہ اسٹریٹ فائٹنگ میں بھی عملی طور پر حد سے بچا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا چھ مہینے پہلے تو آپ ہی نے بعض غلطیوں کے ساتھ اسے یہاں بھیجا تھا۔ ان چھ مہینوں کے دوران میں اس نے یہاں بھی بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس نے جو ان کے تنگ چوہ کو جس طرح ٹاک آؤٹ کیا ہے وہ بھی آپ نے دیکھ لیا۔ اب یہ نوجوان کسی سے مار نہیں کھائے گا۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

الٹی ٹیننگ پر ہمارا جگہ کا تبصرہ سن کر میں پھولے نہیں سٹایا۔ غلہ یہ میری زندگی کی پہلی فائٹ تھی جس میں میں نے اپنے سے کمزور ٹھہر کر اور طاقت ور حریف کو ٹاک آؤٹ کر دیا تھا۔ میری ٹیننگ مکمل ہو گئی تھی اس لیے میرے وہاں رہنے کا کوئی غور نہیں تھا۔ میں اس رات ہمارا جگہ کے ساتھ ہی بھاگ واپس آیا اور ظاہر ہے تھائی وانگ میں ہمارے ساتھ تھی اور مجھے تھائی وانگ پر جیت دی۔ ان تین میٹوں کے دوران میں وہ صرف ایک ہی ڈھکڑا تھا۔ یہ تھی میری اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بہت سہولت ثابت ہوا تھا کہ مجھ سے تھائی وانگ کی حالت جاننے کے بعد ہانگ سو نے ایک مخصوص ایکسرسائز کرانا دیا تھا اور

ہمارے واپس آنے سے پہلے اس نے تھائی وانگ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ کچھ عرصے تک یہ ایکسرسائز جاری رکھے۔

میں رات کو بچے کے قریب شہر میں داخل ہوئے تھے اور پھر مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے واٹ ٹرنٹس پہنچ گئے۔ یہی وہی خانقاہ تھی جہاں پر آپ تنگ چوہ کو قتل کیا گیا تھا اور ہمارا جگہ وانگ ونگ یائے نے مجھے اپنی بنیاد میں لایا تھا۔ ہم مغربی راستے سے خانقاہ میں داخل ہوئے تھے لیکن خانقاہ میں موجود تمام بھکتوں کو پتا چل گیا کہ ہمارا جگہ واپس آ گئے ہیں۔ مجھے اور تھائی وانگ کو ہاتھوں کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہاتھ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے ساتھ حیرت کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم دہی ہو جسے چند مہینے پہلے نہایت خستہ حالت میں یہاں میرے پاس لایا گیا تھا۔ کیسا قدر نکلا ہے تم نے۔“ ہاتھ نے آگے بڑھ کر مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور پھر وہ چونک گئی۔ میرے بازو کے مسل ٹوٹے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر گئی۔ ”تم پر ہمارا جگہ کی محنت ضائع نہیں گئی اور مجھے لگتا ہے ہمارا جگہ بہت جلد تمہیں کوئی اہم ذمہ داری سونپ دیں گے۔“

”تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ ہمارا جگہ کوئی ذمہ داری سونپ دیں گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دونوں پہلے وہ ماسٹر ہو جن سے ہاتھ کر رہے تھے اور میں نے اس سے کچھ اندازہ لگا لیا تھا۔“ ہاتھ نے جواب دیا۔

”تمہیں یہاں کے حالات کا کچھ علم ہے۔ شہر میں کیا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت کچھ۔“ ہاتھ نے جواب دیا ”وہ ہندو لڑکی تھی تاکو شلیا جس کے فلیٹ میں تم چند روز رہے بھی تھے۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ کو شلیا کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ کیا اسے ٹائگر کی قید سے چھڑا لیا گیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ خود غار نکلے۔“ ہاتھ نے جواب دیا ”اس کے فلیٹ پر حملہ اس کی غار کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے کسی طرح ٹائگر تک یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ تم اس کے فلیٹ میں ہو اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمہاری حفاظت کے لیے کیا انتظام کیے گئے ہیں۔ ٹائگر کے آدمیوں نے موقع ملنے ہی اس کے فلیٹ پر حملہ کر دیا تھا۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ ٹائگر کے آدمیوں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بعد میں بھی تاثر دیا گیا کہ ٹائگر کے آدمی اسے اٹھا کر لے گئے ہیں اور اس کی رہائی کے بدلے تمہیں ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا تھا کہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہوا تھا۔“

”وہ اب کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے کو شلیا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ کو شلیا کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دماغ گھوم رہا

تھا۔ وہ رات مجھے اچھی طرح یاد تھی جب اس نے مجھ سے اپنی ہوس کی آگ بجھانے کی کوشش کی تھی اور میرا خیال ہے اس کے بعد ہی اس نے کسی طرح ٹائیگر کے آدمیوں سے رابطہ کر کے میرے چارے میں بتایا ہوگا۔ کوشلیا جو ان اور حسین عورت تھی۔ اگر وہ کسی مرد کو اشارہ بھی کر دے تو وہ اس کے قدموں پر لوٹنے لگے گا۔ میرے بارے میں بھی شاید اس نے یہی سوچ لیا تھا اور یہ لباس ہو کر میرے بستر پر چھٹی گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے ہر بندہ کچھ کر میں اپنے ہوش و حواس کو بچھوں گا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق مجھ سے اپنی خواہش پوری کرے گی لیکن میں نے اسے دھکا دیا تھا اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے اس نے ٹائیگر کے آدمیوں سے مل کر مجھے مروانے کی سازش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے میں تو قحط کیا تھا لیکن اس کا راز بھی بالآخر فاش ہو گیا تھا۔

”اس کا ٹرننگ سینٹر بند ہو چکا ہے۔“ پاٹونگ کہہ رہی تھی ”آج کل وہ ایک خنزیر کلاس ٹائٹ کلب میں ٹائٹ کے پروگرام کر رہی ہے۔ ماسٹر ہو جن تو اسے اٹھواں چاہتا تھا لیکن مہاراج نے منع کر دیا۔ وہ ایک غدار عورت کے لیے اپنے کسی آدمی کی زندگی داؤ پر لگا کر نہیں چاہتا۔ مہاراج کا خیال ہے کہ کوشلیا ایک روز خود ہی اس کے قدموں پر آکر گر جائے گی۔“

”ہوں۔“ میں ہکا بکا رہ کر کہہ گیا۔

”ایک بات اور۔“ پاٹونگ نے کہا ”ٹائیگر کے آدمی تم دونوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے دو آدمی تم دونوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اس نے مہاراج سے بھی مطالبہ کیا تھا کہ تم دونوں کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ تمہیں شاید ایک دو دن سے زیادہ اس قفس میں نہ رکھا جائے اس لیے جہاں بھی جاؤ ذرا محتاط رہنا۔“

”اور کچھ...؟“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اور یہ کہ اب تم تھکاو۔ عجیب حلیہ ہو رہا ہے تمہارا۔“

پاٹونگ نے کہا ”تمہیں ہاتھ دھو دھواؤں۔“ اس کے ہونٹوں پر شرعی مسکراہٹ چھٹی گئی۔

”میں... میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور اس وسیع و عریض کمرے سے باہر نکل گیا۔

پاٹونگ کا خیال درست نکلا تھا۔ دوسرے دن شام کے بعد مجھے اور قحطی دانگ کو کلاٹنگ روڈ کے قریب ایک بہت بڑے واٹ (خانقاہ) میں بھیج دیا گیا۔ اس خانقاہ سے متصل ایک بہت بڑا میدان تھا اور اس کے قریب ہی واپس نوٹوں کلب بائنگ اسٹڈیم تھا۔ یہ شہر کا دوسرا سب سے بڑا اسٹڈیم تھا۔ اس خانقاہ میں ہتھکڑوں اور راباؤں کے لیے الگ بائنگ کوارٹرز تھے اور وہاں کسی غیر متعلق شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بائنگ کوارٹرز کا ایک راستہ تو خانقاہ کے اندر سے تھا اور دوسرا پچھلی طرف ایک تنگ سی گلی میں۔ یہ دروازہ عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔

یہاں ہمیں الگ الگ دو کمرے دیے گئے تھے۔ ماسٹر ہونگ ہمارے ساتھ آیا تھا۔ میں بھی رابہوں اور راباؤں کو کلب بائنگ کی ٹرننگ دی جاتی تھی۔ مجھ سے پہلے جو ٹرننگ تھا۔ اس روز اور جگہ بھیج دیا گیا تھا اور سب ہتھکڑوں کو تار دیا گیا تھا کہ انہیں انہیں ٹرننگ میں دوں گا۔ ماسٹر ہونگ نے انہیں میرا نام یاد دلایا تھا۔

میرے خیال میں میرا تعارف کراتے وقت اس کے نام کوئی نام نہیں آسکا تھا اس لیے ہا ہی بتا دیا تھا اور یہ نام مجھے یاد آیا تھا۔ مجھے یہاں بھیجے کی ایک جگہ میری کچھ میں آگئی۔ اس خانقاہ میں ماسٹا بھ کا سونے کا ایک بہت بڑا حجرہ جس کے گرد لوہے کا مضبوط جنگلا ہوا تھا۔ دن میں دو مرتبہ اس جنگل کا دروازہ کھولا جاتا اور زائرین جیسے کہ چھوکر سکون قریب حاصل کرتے اور اپنے عقیدے کے مطابق دعا مانگتے۔ انہیں جیسے کی حفاظت کے خیال سے یہاں کے ہتھکڑوں کو سونے قحطی کی ٹرننگ دی جاتی تھی۔ یوں تو میں سمجھا تھا کہ یہاں کا ہتھکڑوں فائر قحط لیکن ماسٹر کے خیال میں انہیں ایکٹو رکھنے کے لیے کچھ آدمی کی ضرورت تھی۔

جنگل والے کیمپ سے آنے کے بعد میں نے آئیے میں اپنا حلیہ دیکھا تھا تو چونک گیا تھا۔ وہاں تین میٹروں میں صرف ایک مرتبہ قحطی کے ساتھ بڑی بے ترتیبی سے میرے بال کاٹے گئے تھے جو اب بڑھ کر گردن تک پہنچ گئے تھے۔ پہلے میں نے سواھا تھا قحطی ہی سے اپنے بال خود ہی کاٹ لوں لیکن پھر مجھ کو سوچ کر میں چھوڑ دیا تھا۔ ان بے تماشا بڑے ہوئے بالوں کی وجہ سے میرا بال بڑی حد تک بدل گیا تھا اور بدل ہوا حلیہ میرے لیے ضروری تھا۔ ایک دو دن تو میں خانقاہ تک محدود رہا پھر ایک روز کی کو تائے بغیر باہر نکل گیا۔ حفاظت کے لیے میں نے اپنے لباس میں ایک خنجر چھپالیا تھا۔ میں اس روز بہت دیر تک شر کے قحط علاقوں میں گھومتا رہا۔ میں پہلی مرتبہ اس شر میں اکیلا باہر نکلا تھا۔ راستوں کا علم نہیں تھا۔ میں نہ اٹھائے گھومتا رہا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ کچھ راستوں سے واقف ہو گئی اور پھر اکیلا بازار میں چلے میں ایک دکان کے سامنے رک گیا۔ دکان کے ٹوٹے میں ایکی جینس تھی ہوئی تھیں جو عام طور پر قحطیوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ نقلی بالوں کی دیکیں، نقلی سونچیں اور ماسٹر ہونگ میں دکان میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنے لیے ایک ٹرننگ ڈاڑھی پسند کی جسے دکان دار نے بڑی خفا سے میرے چہرے چپکا دیا۔ اس ڈاڑھی کو کسی اضافی چیز کے بغیر آسانی سے ہٹا دیا۔ چپکایا اور اتارنا جاسکتا تھا۔ دکان دار نے سیاہ شیٹوں والی ایک میز پر آٹھوں پر لگا دی اور جب میں نے اپنے آپ کو آئینے دیکھا تو اچھل پڑا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں نے قحطی دکان کی اور یہ دونوں چیزیں جب میں ڈال کر

باہر آیا۔ میں نے دو ڈائٹ کلب کے قریب اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر میں نے قحطی کے قریب سے میں قحطی دانگ کی گاڑی میں بیٹھا چلے گا۔ میں اس وقت بہت سے گاہک تھے اور ہو سکتا ہے یہاں ٹائیگر قحطی دانگ کی بھی موجود ہو لیکن کسی نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر میں ایک کلب میں بیٹھا اور گولڈن ہارس ہو گئی۔ سامنے اتر گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سے میں پیل ہی جاؤں گا۔ مجھے اس طرح آزادی سے گھومنا پھرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں کوئی ڈر خوف بھی نہیں تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا چھپا ہوا کارڈ ہے۔ توڑی دیر پہلے ایک فنڈے کو بھی میں نے ایک کلب سے اترنے کو دیکھا تھا۔ بڑی سڑک پار کر کے میں ایک تنگ سی گلی میں محسوس کیا اور بڑی پہلے سے ایک دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ دن کا وقت تھا لیکن اتفاق سے اس وقت وہ گلی سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی جیسے ہی گلی میں سڑا میں نے برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چلا گیا گاڑی اور اس کے منہ پر گھونسا مارنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی گلی دیکھ کر میرا ہاتھ رک گیا اور میرے منہ سے بے اختیار گرا سانس نکل گیا۔

وہ ماسٹر ہونگ کا آدمی تھا۔

یہ اگشت میرے لیے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ مہاراج کے بے ماسٹر ہونگ نے میری گھرائی شروع کر رکھی تھی۔ انہیں شاید پہلے سے یقین ہو گا کہ میں واٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کروں گا اس لیے میری گھرائی شروع کر دی تھی۔ کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت واٹ کے آس پاس موجود رہتا تھا اور اس شخص نے واٹ سے نکلنے ہی میرا تعاقب شروع کر دیا تھا لیکن میری نظروں میں اس وقت آیا جب میں محسوس ہو کر واپس آ رہا تھا اور میں نے موقع ملنے ہی اسے چھاپ لیا تھا۔

ایک جگہ بند ہو کر بیٹھ رہتا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ دیے میں اکثر رات کی قحطی میں سوچا کہ میں قحطی کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ میرے ہاں باپ کو سکا پور میں بھی نظروں کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا پھر وہ میری جان کے ہنگاموں ہو گئے۔ چاہا پر آب تنگ مجھے ان سے بچانے کے لیے لگا لگا لے آیا اور میری جان بچانے کی کوشش میں وہ خود مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد میں مہاراج دانگ ونگ بایٹ کے ہاتھ لگ گیا۔ مجھے بہت بڑا مارشل آرٹس بتانا چاہتا تھا کہ میں اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکوں۔ میرے وہ دشمن بھی شاید اپنی اعصاب کے ساتھ تھے جو اب تک میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جبکہ میرے خیال میں انہیں تو بہت پہلے میرا چھپا چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ انہیں تو بہت چاہیے تھا کہ میں تو خود اپنی جان کے خوف سے بھاگا پھر

رہا ہوں۔ انہیں کیا نقصان پہنچاؤں گا لیکن شاید صورت حال ایسی نہیں تھی جیسا میں سوچ رہا تھا۔ واقعات کا ایک ایسا تسلسل بن گیا جس سے وہ اپنے لیے خلوہ محسوس کرتے رہے۔ پہلے سکا پور کی پولیس میری حفاظت کے ساتھ ساتھ انہیں بھی تلاش کرتی رہی پھر برآب تنگ مجھے ہنگام لے آیا اور میں مہاراج کی تحویل میں آ گیا۔ مہاراج کے بارے میں وہ بھی جانتے ہوں گے۔ انہیں زیادہ خلوہ محسوس ہوا اور اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے انہوں نے ٹائیگر جیسے آدمی کی خدمات حاصل کر لیں جس کا اندر و لڈ پر ہولڈ تھا۔

اور پھر ان کے ہاتھوں مہاراج کا بہترین آدمی ماسٹر پھو مارا گیا۔ اس طرح دونوں پارٹیوں میں تصادم شروع ہو گیا۔ قحطی دانگ ایک بالکل غیر متعلق عورت تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے مجھے بتا دیا تھی۔ میری وجہ سے اس کا سب کچھ تباہ ہو گیا تھا اس کی اپنی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو مجھے چھوڑ کر کسی اور شر جاسکتی تھی لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں جب بھی قحطی دانگ کے بارے میں سوچتا مجھے بڑا افسوس ہوتا۔

مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ دارا اور کم دنیوہ واپس جا چکے تھے یا ابھی تک ہنگام ہی میں موجود تھے۔ میرے اصل دشمن تو وہی تھے اور مجھے ان سے انتقام لینا تھا۔ میرے ہاں باپ کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا اور میں وہ منظر بھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے ہر صورت میں دارا اور اپنی فائنگ وغیرہ سے انتقام لینا تھا۔ اس کے لیے مجھے دنیا کے آخری سرے تک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اب تو میں ان سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب یہ مجھ سے جھپٹے پھریں گے اور انہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس سے پہلے مجھے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرنا تھا۔ ہانگ سو کی تربیت نے اگرچہ مجھے ماسٹر بنا دیا تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ تربیت ہی کافی نہیں تھی۔ مجھے تجربے کی ضرورت تھی۔ ابھی اور کتنی مراحل سے گزرنا تھا۔ میں اپنے آپ کو ٹائیگر کے معاملات میں الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے گھبراہٹ بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے دو آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے اور وہ میری تلاش میں تھا اور کبھی تو میں سوچتا کہ اچھا ہے۔ اس طرح تجربہ بھی حاصل ہو گا۔

اس روز میں نے پھر بارہا جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں رات تقریباً آٹھ بجے اپنے کمرے میں تیاری کر رہا تھا۔ میرے بال اتنے لمبے تھے کہ میں نے انہیں پیچھے سمیٹ کر پٹیا باندھ لی اور ٹھوڑی پر فریج کٹ ڈاڑھی چپکا کر آئیے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ سیاہ شیٹوں والا چشمہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈاڑھی لگانے سے ہی میرا چہرہ بہت بدل گیا تھا۔ یوں بھی رات کے وقت سیاہ شیٹوں والا چشمہ ملھو کر بنا سکتا تھا۔



آتش فشان ۱۵۱ حصہ ۱

گھوڑا۔

پرس نہیں کی جاتی تھی اور انہیں کوئی روک ٹوک پیش نہیں آتی تھی۔ میری بات سن کر شالی دان کی آنکھوں میں چمک سی ابرہہ کی تھی۔

”ٹائگر کے ساتھ دو چینی کون ہیں؟“ میں نے کہا اور پھر ان دونوں کا علیہ بھی بتا دیا ”کیا ان میں سے ایک کا نام جی فائنگ اور دوسرے کا کم ہے؟“

”ہاں شاید یہی نام ہیں مگر تم انہیں کیسے جانتے ہو؟“ شالی دان نے کہا۔

”وہ دونوں سنگاپور سے بھاگے ہوئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”وہاں ان دونوں کے ہاتھوں کی بے گناہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں تھی۔ وہ دونوں بھاگ کر یہاں آ گئے۔“

”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ دو آدمیوں کے تعاقب میں یہاں آئے تھے۔ ان میں ایک مارا گیا اور دوسرا لپٹا ہے۔ ان چینیوں نے اس سلسلے میں ٹائگر سے رابطہ کیا تھا کیونکہ انہیں پتا چل گیا تھا کہ جس نوجوان کی انہیں تلاش ہے وہ مہاراج کی پناہ میں ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس نوجوان کی وجہ سے مہاراج کا خاص آدمی ماسٹر پھو بھی مارا گیا تھا اور پھر وہ نوجوان ٹائگر کے دو آدمیوں کو مار کر غائب ہو گیا۔ ٹائگر غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔ اسے اس نوجوان کی تلاش ہے مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تھائی لینڈ ان تین ممالک میں سے ہے جو گولڈن ٹرائی ایجنٹ

بناتے ہیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم جانتی ہو۔ دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئن اس خطے میں پیدا ہوتی ہے اور اسی حوالے سے تھائی لینڈ ہیروئن اور دیگر منشیات کے اسمگلروں کی جنت ہے۔ سنا ہے یہاں بہت سے انٹرنیشنل سینڈیکیشن کام کر رہے ہیں اور ہم بھی اسی ہستی گنگا میں ہاتھ دھونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تم مجھے میرے سینڈیکٹ کا نمائندہ کہہ سکتی ہو۔ میں یہاں صرف یہ جائزہ لینے آیا ہوں کہ ہمیں یہاں قدم چلانے کا موقع مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ میں آج ہی یہاں آیا ہوں اور سب سے پہلے مجھے ٹائگر ہی کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ سنا ہے انڈورولڈ پر اس کا کنٹرول ہے اور میرے خیال میں تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ میں نے تم پر بھروسہ کر کے یہ ساری باتیں کہی ہیں۔ اگر تم اس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو تو میں تمہیں معقول مالی فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔“ میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

منشیات کی اسمگلنگ اور گولڈن ٹرائی ایجنٹ کے بارے میں مجھے کیس کے مجسٹریٹس سے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ یہ مجسٹریٹس لوگ تھائی لینڈ، براؤن، لائوس، ویت نام، چین اور ہندوستان میں آزادی سے گھومتے رہتے تھے۔ سرحدیں ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ یہ لوگ بہت کچھ دیکھتے تھے۔ بہت کچھ سنتے تھے لیکن اپنی زبانیں اور آنکھیں بند رکھتے تھے۔ ان معاملات سے قطعی لا تعلقی تھے۔ یہ صرف بدھ کی تعلیمات کا پرچار کرتے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان علاقوں میں سفر کرتے ہوئے ان سے کوئی باز

”یہاں بہت ساری سینڈیکٹ کام کر رہی ہیں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”لیکن انہیں دوسرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف ٹائگر ایک ایسا آدمی ہے جس نے چاروں طرف ٹانگیں پھیلا رکھی ہیں۔ یہ ہیروئن اسمگل نہیں کرتا۔ اس نے ہیروئن اور دیگر منشیات کی سپلائی کے لیے شہر میں کئی ایسے قائم کر رکھے ہیں۔ منشیات کے علاوہ وہ دوسرے بھی بہت سے ناجائز دھندے کرتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو شہر بھر کے فٹنس اس کے کنٹرول میں تھے لیکن جب سے مہاراج سے ان بن شروع ہوئی ہے، کچھ لوگ اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ وہ مہاراج سے ڈرتے ہیں۔ اس کا ساتھ چھوڑنے والے اگرچہ مہاراج کے ساتھ بھی نہیں ملے۔ وہ لڑائی جھگڑوں میں دونوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ مہاراج سے ان بن کی وجہ سے ٹائگر کے کاروبار پر بھی برا اثر پڑا ہے لیکن وہ ضدی آدمی ہے۔ مہاراج کے سامنے کھٹے گا نہیں۔“

”ان دو چینیوں کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی آیا تھا۔“ میں نے اسے دارا کا علیہ بتایا ”کیا وہ بھی ٹائگر کے ساتھ ہے؟“

”وہ سنگاپور چلا گیا ہے لیکن سنا ہے ٹائگر کے ساتھ مل کر ایک الگ ریٹک بنا چاہتا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں سنگاپور ابھی چلا گیا ہے۔ چند روز میں آجائے گا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس نے ٹائگر کو اس نوجوان کی تلاش کے لیے ایک بڑی رقم دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک وہ نوجوان زندہ ہے یا اس کی گرفت میں نہیں آجاتا اس وقت تک وہ سکون سے کام نہیں کر سکتا۔“

”کم اور جی فائنگ میرا مطلب ہے وہ دونوں چینی کہاں ہوئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کم کا تو پتا نہیں لیکن جی فائنگ کو اکثر ٹائگر کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ پہلے اس نے روزگاہ کو اپنا اڈا بن رکھا تھا لیکن آج کل اس کا زیادہ وقت ٹائٹ بیون کلب میں گزرتا ہے۔“ شالی دان نے جواب دیا۔

”سنا ہے مہاراج کی ایک بہت قریبی شاگرد بھی ٹائگر سے مل گئی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”اوہ۔ تم شاید کو شلیا کی بات کر رہے ہو۔“ شالی دان نے کہا ”وہ ہندوستانی لڑکی آج کل اپنے آپ کو زہرہ رکھنے کے لیے ہاتھ مار رہی ہے۔ مہاراج سے غداری کر کے اس نے اپنے آپ کو بھگ کر لیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ٹائگر اسے بہت برا انجام دے گا لیکن اب وہ اسے منہ نہیں لگاتا۔ البتہ ٹائگر نے اسے اپنے ایک کلب میں لک بائسنگ کے مقابلوں کی اجازت دے دی ہے۔ اس

اپنے قریب نہیں چھکنے دیتیں۔ میں... میں تمہیں بالوں نہیں  
 کی۔ آؤ نا۔“  
 ”نہیں۔“ میں نے اس کے دونوں بازو جھکا

سے الگ کر دیا۔ مجھے چلنا چاہیے پر ملاقات ہو گئی تھی۔ وہب کی تواضع کر میں اور جاملہ اور حور نے گیلے۔ انہی تھی اور حائف کو تھا کہ کوئی دیوار سے کھڑا ہوا۔ دواڑے کی طرف دیکھا۔ پر آئے۔ والدہ دواڑہ پر جھڑپا کرنے لگی۔ دواڑے میں معمولی سی جھڑپا کر کے باہر جھڑپا کرنے اچھل کر قلع میں گیا۔

دو آدمی باہر کی دیوار پر کود کر اندر آئے تھے اور ان میں سے ایک تھا۔ میں نے دواڑہ بند کرے بولت چڑھا اور میں نے طرف دیکھنے لگا۔ اس کے وہوٹوں پر مٹی سے مسکراہٹ میں اب مجھے صورت حال کا اندازہ لگنے میں دشواری ہوئی۔ آئی۔ مجھے بڑی خوب صورتی سے وقف بنایا گیا تھا۔ میں داخل ہونے کے بعد غالباً مجھ پر کسی قسم کا شہرہ پڑا۔

وان ایک چلانک کے تحت میری سبز پر آئی تھی اور جب  
اسے ہلا کر لے گیا تھا شاید اسے کچھ دیاریات کی تھی مگر  
اگر شانی وان ٹانگیں کو گامیاں بٹکنے لگی تھی اور میں واقعی  
جو اس کے سامنے کھڑا چلا گیا اور پھر لے شدہ منسوبہ کے  
دو حصے یہاں لے آئی تھی اور میں اس سے باتوں میں نہ  
چلا گیا۔ میں نے اگرچہ صاف طور پر اپنے بارے میں شانی  
لیکن میں جس طرح ٹانگیں نہ مٹی جی فانک اور کوشلیا اور  
میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ اس سے شانی وان کو تعجب ہوا  
میں وہی ہوں جس کی ان لوگوں کو تلاش سے اور جب ان  
میں تھی تو وہ دن سننے کے لیے اٹھ کر اندر چلی گئی تھی تاہم  
فانک نے میرے بارے میں پوچھا ہو گا اور اس نے صورتی  
تھی کہیں وہی ہوں اور اب جی فانک اپنے ایک اور خوا

ساتھ میاں پہنچ چکا تھا۔  
میں جانتا تھا چچی فامک ایک بہت زبردست مارشل آرٹ  
تھی۔ وہ بہت سفاک آدمی تھا۔ میں نے اس کے انعام الہی  
قل ہوتے دیکھا تھا اور پھر اس نے جس طرح ماسٹر پر کونہ  
گھاٹ اُتارا تھا، وہ سب ایک منظر مجھے یاد تھا۔

میں نے شاہی وان کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند  
 فاصلے پر بڑے مطمئن انداز میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ  
 خیر مسکراہٹ تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھا اور پھر

پینٹ کے ہاتھ کے اندر بندلی پر چڑھ کے قتلے نے  
خبر نکال لیا۔ میرے ہاتھ میں خبر دیکھ کر اس کی  
حشتی ابھر آئی اور وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔  
”مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو جھوٹ  
اور دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔“ میں نے آگے بڑھے۔

”جیسا کہ تم نے کہا، وہ مسلسل پیچھے ہٹتے ہوئے  
 آ رہے ہیں۔ تم جب اس کلب میں داخل ہوئے  
 تو انہیں پہلے تو شہوہ ہو گیا۔ انہوں نے تمہاری اصلیت معلوم  
 کر لی۔ اب تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں۔“

”اور تم نے انہیں میری اصلیت بتا دی۔“ میں نے اسے  
 دیکھ کر ہلکے سے ہنسنے لگا۔

میں نے تجھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے  
 اس کا سامنا ہی دروازہ توڑنے کی کوشش کریں گے تو میں  
 زبان کو گرفت میں لے لیں گا اور اسے ڈھال بنا کر کہاں سے  
 لڑائی کوشش کریں گا لیکن ایسا مجھے نہیں ہوا۔ البتہ قہقروں کی  
 آواز سنائی دیتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کیا  
 کرنے لگے ہیں اور پھر ایک لمحہ میں کاپ اٹھا۔  
 چیل کی تیز دھڑکتی ہوئی سمجھتوں سے ٹکرائی تھی۔

ٹٹائی دان سے بھی صورت حال کا اندازہ لگایا تھا۔ اس کا چہرہ بال بال کھلے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر مٹی اور ہندوؤں کے اس طرف ہمیں لے کر دوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے ہٹ کر! دوڑنے کا اپنی طرف مچھپا لیا۔ دوڑا وہ زور نہیں کھلا۔ انہوں نے بہت دیر لے کر اندازہ لگایا تھا۔

مثالی وان مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ خوف سے اس کی  
 آنکھیں پھٹی پڑی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر پلوٹ دوبارہ لگا دیا  
 اور مثالی وان کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ تمہارا انعام ہے“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا ”۱۳۱ بھی وہ چمڑے کے ہوئے پیٹرول کو ماچس کی تیلی ٹپائی گئے اور تمہارا یہ مکان آگ کے شعلوں میں مگر جائے گا

پہلے ہی وہ بدبو تھمسی لاش راکھ کا ڈھیر بن جائے گی لیکن اس کے پہلے اس کے چہرہ منٹ کئے ازیت ناک ہوں گے، اس کا شاید چہرہ تھمیں۔ آگ کے فطی تھمیں اپنی لپٹ میں لے لیں گے۔ اور اگر کوئی جلتے اور کھنکے گا۔ جاں نکلنے سے پہلے وہ حالت کتے کی

بھول گئی۔ چلاؤ گی اپنے آپ کو جلتے ہوئے  
 بھول گئی کوئی تسمائی مدد کو نہیں آئے گا اور اٹل بجھنے کے بعد  
 بھول گئی کو تسمائی لاش ملے گی تو وہ لاش نہیں ہوگی۔ راکھ کا ڈھیر

”نہیں نہیں۔ ایسے مت کرو۔“ وہ چینی ”میں مرنا نہیں  
 چاہتا۔“ انہوں نے میرے ساتھ دھوکا کھا کر کہا۔

میں نے کہا۔ تمہیں تو میرا نام بھی معلوم ہے۔ حالانکہ میں نے

”نام مجھے انہوں نے بتایا تھا۔“ شامی وان نے جواب دیا۔  
 ”لیکن مجھے تم سے نام معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔  
 تمہاری باتوں سے ہر جگہ مل گیا تھا کہ تم وجدان ہو جسے وہ موت کے  
 گھاٹ اتار رہا ہے۔“

”میں تو مول کا تکیہ تم بھی میرے ساتھ مرو گی اور یہ اہمیت  
ناک موت تمہارا انعام ہو گا۔“ میں نے کہا۔

اور پھر ہوا جس کی توقع میں بہت دیر سے کر رہا تھا۔ باہر ایک دم شعلے بھڑک اٹھے تو آسمانوں نے سامنے والے پورے حصے پر برآمدے میں دیواروں پر اور ہر جگہ پینٹریل بھڑک رہا تھا۔

شالی دان چنچنی ہوئی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میں کمرٹی کے باہر شعلے اٹھتے ہوئے دکھتا رہا۔ جو بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے۔

آہل کے شعلے پھیل رہے تھے اور اب باہر سے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پھر دو تین فائر کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ چچی فائک اور اس کا ساسا بھی باہر موجود تھے۔ انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی ہوگی تاکہ کوئی اٹک بچانے کی کوشش نہ کرے۔

اب تک مجھ پر بیسیوں حملے ہو چکے تھے اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے تھے اور میں ہر مرتبہ جیتا نکلتا تھا۔ اس مرتبہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ شاید میں اس مرتبہ بھی جیت نکلوں۔ اس لیے انہوں نے چانس نہیں لیا تھا اور پیرول چمکر کر کالاباج کو آگ لگا دی تھی۔

”پلیز! کچھ کرو ورنہ ہم دونوں جل کر مرجائیں گے“ شانی  
 وان مجھے دونوں ہانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخی۔

”یہ کایا کچھ تمہارا ہے۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ کہاں سے نکلے گا کوئی دو سڑا راستہ ہے یا نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اگ کی پیش سے برآمدے والی کھڑکی کے پیشے ٹوٹ گئے تھے اور نہ صرف دھواں کمرے میں بھرا تھا بلکہ شعلے بھی اندر کی طرف لپک رہے تھے۔“

”یہ سچ میرا نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے جہاں دے کر نہیں لائے کو کہا تھا۔“ شانی وان نے جواب دیا۔

”پچھلی سی کی طرف کوئی دواڑہ تو ہوگا۔ آؤ، میرے ساتھ آؤ۔“ میں کہنے ہوئے تیزی سے اس کمرے میں کھس گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔

لیکن اس کمرے میں پچھلی طرف دروازہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں بھی کوئی عقیبی دروازہ نہیں تھا۔ میں جب دوبارہ نشست گاہ میں پہنچا تو چونک گیا۔

فونی ہوئی کھڑکی سے اندر آئے والے شعلوں سے پردوں نے  
 آگ پکڑ لی تھی۔ جلا ہوا درود نیچے گرا تو اس کے ساتھ ہی قاتلین  
 نے بھی فورا ہی آگ پکڑ لی اور اس طرف رکھی ہوئی کرسیاں بھی  
 شعلوں کی لپٹ میں آ رہی تھیں۔



ہے۔ اس کا اشارہ میرے سر کی طرف تھا ملاقات کے ساتھ کوہڑی بھی استعمال کرتی پتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محل سے بالکل عاری ہو گئے ہو۔ شہر میں گھومنے پھرنے کی حد تک تو معاملہ ٹھیک تھا لیکن شہر کی کچھار میں کھس کر تم نے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ میں نے شہر کی کچھار کے خلاف اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اپنے گھر میں بی بی بھی شہر بن جاتی ہے روز کلب بائیکر کا سب سے مضبوط گڑھ ہے اور تم اکیلے وہاں کھس گئے تھے۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ہمیں تمہارے جذبات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں دوست لیکن اس طرح کی حماقتیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اپنے دشمن کو بھی بھی کر دیا ہے وہ قوت سمجھو۔ ٹائیکر اور جی ٹاٹک جیسے دشمن پر وار کرنے سے پہلے پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہم نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمہارا انتقام ضرور لیں گے کیا مہاراج نے تم سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمہیں اس قاتل بنا دیں گے کہ تم خود اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکو۔ اس میں شبہ نہیں کہ تمہیں اس قاتل بنا دیا گیا ہے کہ تم کسی حرف کا مقابلہ کر سکو لیکن اس میں تجربے کی ضرورت ہے جو ابھی تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس طرح ان کا سامنا کر کے تم اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ جس میں شاید اندازہ نہیں ہے کہ مہاراج تمہارے بارے میں کس قدر فکر مند رہتے ہیں۔ اگر ہم سے ایسی غلطی ہوئی ہو تو مہاراج ہماری کھال کھینچا دیتے لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ مہاراج تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ بنانا چاہتے ہیں اس لیے تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو سمیٹ کر رکھو۔ جب مناسب وقت آئے گا تو ہم خود تمہیں آگے کریں گے۔ یہ مہاراج کا حکم ہے کہ اب تم اجازت کے بغیر اس واث سے باہر نہیں نکلو گے۔

میں خاموش کھڑا ماسٹر ہو جوں کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ اگر میں نے اس موقع پر اپنی من مانی شروع کر دی تو نقصان میرا ہی ہوگا۔ ان کا کچھ نہیں بڑے گا اور میرے بھی میں ممکن ہے کہ میری ان حرکتوں کی وجہ سے مہاراج اپنا ہاتھ کھینچ لے اور میں اکیلا رہ جاؤں۔ میں نے ماسٹر ہو جوں سے وعدہ کر لیا کہ آئندہ اجازت کے بغیر اس واث سے باہر نہیں نکلوں گا۔ ماسٹر ہو جوں نے دو روزے کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی فوراً ہی اندر گیا۔ ماسٹر نے تیرے لیے کچھ کاناہہ آوی گئے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے آیا اور گیلری میں فرش پر بٹھا کر قہقہے سے میرے بال کاٹنے لگا۔ میں گمراہ سا لے کر رہ گیا۔ وہ میرے سر پر اس طرح قہقہے چلاتا رہا جیسے گھنے کے بال اتار دے جاتے ہیں۔

ماسٹر ہو جوں مجھے مزید ہدایات دینے کے بعد چلا گیا۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو تھائی وائیک مجھے دیکھ کر بے اختیار قہقہے

لگائے گی اور میں نے جب آئینہ دیکھا تو میرا دل جھپکا کہ مجھ کو پھوٹ کر دونا شروع کر دوں۔ میرا سر ایسا تھا جیسے بھرنے میں پھل پلا دیا گیا ہو۔

اس دن کے بعد میں نے روز تک واث سے باہر نہیں نکلا۔ معمول کے مطابق دن گزرتے رہے لیکن اس دوران میں میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ تھائی وائیک روز بے روز کالہ اور ست ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی تو وہ بے جا ہی بڑی بڑی باتیں اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ ملتے بھی نظر آنے لگے تھے۔ جب نہ کیپ سے روانہ ہوتے تھے تو ماسٹر ہانگ سونے تھائی وائیک ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی ایکمر سائز جاری رکھے۔ یہاں آکر وہ روز تک تو یہ ایکمر سائز کرتی رہی تھی پھر اس میں تانے سے ہوتے تھے اور اب تو کئی روز سے اس نے ایکمر سائز نہیں کی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ سستی اور کالہ ایکمر سائز نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔ جب تک ایکمر سائز کرتی رہی تھی اس نے ایک باہر بھی اذیت پہنچانے کی بات نہیں کی تھی لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ کبھی وقت مجھ سے ایسی فرائض کر سکتی تھی۔

میں نے ایک بات خاص طور سے یہ بھی نوٹ کی تھی کہ روزانہ شام کے وقت غلافہ کے اسے میں چلی جاتی تھی جس زائینز آیا کرتے تھے میں اس وقت بھکشوں کو زینگ دیتے ہیں مصروف رہتا تھا اس لیے کبھی یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ اس طرف کیوں جاتی ہے۔ کبھی تو وائیں آنے کے بعد وہ پہلے کی طرف ہاتھ چوبند نظر آتے تھے اور کبھی اس کے چہرے پر بے پناہ ہوا کی لگن دیتی۔

اور پھر ایک روز وہ آدمی رات کو مجھے اپنے کمرے میں لگتی۔ اس نے دو روزہ بند کر دیا اور بستر کے نیچے چھائی ہوئی ایک لکڑی چھڑی میری طرف پھینک دی اور تھیں اٹار کر تھیں اندر ہی لٹ گئی۔ میرے پاس اس کی پٹائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ چٹنی ری اور سسکا یاں بھرتی رہی اور پھر میں اسے چھڑا اپنے کمرے میں لایا۔

چند روز اور گزر گئے۔ عام طور پر بچنے کے بعد تھائی وائیک روز تک ہشاش بشاش اور جاق و چھند رہتی تھی لیکن اس دن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر افسردہ اور مضمحل سی رہتی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ ملتے مزید گھرے ہوئے تھے اور گال پہنچتے سے محسوس ہونے لگے۔ میں اس کے لیے فکر نہ ہونے لگا۔ بڑی حسین عورت تھی لیکن اس کا حسن غارت ہونے لگا تھا۔ یہی سمجھ رہا تھا کہ اسے اپنا کڑا ہوا وقت یاد آ رہا ہے۔ وہ غم غمات بات کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی لیکن میری وجہ سے اس کا سب کچھ ختم ہو گیا اور اب وہ ایک وقت کے کھانے کے لیے دو سہول کی محتاج تھی۔ اس کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے گھر کے موت کے فرشتوں کی طرح اس کی ٹانگ میں تھیں۔

بہت باہر نکلی ماری جائے گی اور شاید یہی غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے کچھ پچھنے کی کوشش کی تو وہ بل گئی۔ اس سے اگلے روز میں نے اسے عجیب سی کیفیت میں بلوائے۔ مجھے اس میں کرتے ہوئے وہ بار بار اپنی انگلیاں منہ میں ڈال کر ہولے ہولے دانتوں میں چبا رہی تھی۔ کبھی وہ اپنے جسم پر ہاتھ لگاتے تھے۔

پہلے میں ٹھیک ہوں۔ سوئی لگ رہی ہے۔ تم جاؤ۔ میں ہمارا ڈوڑھ کر سواؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اس نے جواب دیا۔ میں اپنے کمرے میں گیا لیکن تھائی وائیک کا خیال ذہن سے نہیں نکال سکا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ میں نے ہوا کہ اس باہر کو ماسٹر ہو جوں آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔

اس روز شام کو جب میں رنگ میں اپنے شاگردوں کو پریکٹس کرا رہا تھا تو میں نے تھائی وائیک کو واث کی طرف جانے ہونے دیکھا۔ وہ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد وائیں آئی تھی اور میں نے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس نے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے اسے دوبارہ دیکھا تو وہ بڑی بدلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ تھائی وائیک کی اس تیزی پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس رات میں در تک اس کے کمرے میں رہا۔ وہ بہت چمک چمک کر باتیں کرتی رہی تھی۔

جب میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ موجود نہیں تھی۔ شاید وہ باہر دوام گئی ہوئی تھی۔ ہاتھ دوام لکیری کے آخر میں بنے ہوئے تھے۔

میں اس کے بیڈ پر غم دراز ہو گیا اور تکیہ اٹھا کر سر کے نیچے لیٹا۔ اس کے ساتھ ہی میں چوک گیا۔ تکیے کے نیچے پلاسٹک کی ڈھانچا رکھی ہوئی تھیں جس میں سفید رنگ کا کپڑا پانڈر تھا۔ ایک ڈھانچا رکھی تھی۔ دو دروہری تھیں۔ اس میں پاؤڈر کی مقدار دو ارام سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میں نے کھلی پڑا دیں رہنے دی اور ایک شہ پڑا اٹھا کر جب میں ڈال ڈال۔ تکیے کو اس کی جگہ پر رکھا اور بڑے اندھ کر کر پڑا پڑا گیا۔

میرا خیال تھا کہ کوئی دوا تھی جو تھائی وائیک استعمال کر رہی تھی جس سے اس نے مجھ سے ڈر تک نہیں کیا تھا کہ وہ کوئی دوا استعمال کر رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے بیہوشی دیکھی تھی نہیں تھی صرف نام تھا۔ جنگل خراب کی بے بھکشوں سے یہ بھی سنا تھا کہ بیہوشی کا نشہ بڑا اور نچڑ کر رہی ہے۔ یہ اچھے بھلے محت مند آدمی چند روز کے اندر فطرتاً سے بے ہوش نہیں لگتی۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور وہ

اپنے آپ کو نوچنے لگتا ہے۔ میرا داغ پکڑا نے لگا۔ کئی روز سے میں تھائی وائیک کو اسی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ کھانے سے اسے کوئی رغبت نہیں رہی تھی۔ اسے میں نے اکثر مردوں کی طرح بڑے دیکھا تھا۔ اس کے گال چمک چمکے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں۔ ایک روز پہلے میں نے اسے اپنی انگلیاں چبانے اور اپنے آپ کو نوچنے ہونے دیکھا تھا اور پھر شام کے بعد جب وہ باہر جا چکر لگاتی تھی تو اس کے ایک گھنٹے بعد وہ بڑی حد تک نارمل نظر آتی تھی۔

میرے داغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا تھائی وائیک بیہوشی استعمال کرنے لگی تھی۔ اسے یہ بیہوشی کون لا کر دیتا تھا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چند سینکڑے بعد ہی میں اسے کمرے میں لایا۔

تھائی وائیک سے میری ملاقات اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ میں نے ظاہر ہی نہیں کیا کہ اس کے کمرے میں کیا تھا اور پھر اس روز میں نے ایک بوڑھے بھکشو کو الگ لے جا کر وہ پڑا دکھائی تو یہ تصدیق ہو گئی کہ یہ بیہوشی ہی تھی۔

یہ تصدیق ہو جانے کے بعد میں اپنے جسم پر چھوٹا سا سی رینگتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ تھائی وائیک کو یہ عادت تھی کہ کئی دور وہ بیہوشی کھائے سے کبھی بھی پھر میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا۔ وہ روزانہ شام کو غلافہ کی طرف جاتی تھی۔ شاید اسی طرف وہ کسی سے بیہوشی لیتی تھی۔

شام کے بعد میں تھائی وائیک کے کمرے میں گیا تو عجیب صورت حال نظر آئی۔ کمرے کی ہر چیز بھری ہوئی نظر آئی۔ بستر اٹا ہوا تھا۔ تکیے کا غلافہ بھی الگ پڑا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا کر رہی ہو۔ کچھ کھو گیا ہے کیا؟“ میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ااا۔۔۔ نہیں۔۔۔ کک۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔“ وہ گڑبڑا سی گئی۔

”تو پھر یہ سب کیا ہے؟“ میں نے غمری ہوئی چڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

”او۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔“ وہ چڑیں اٹھا کر ادھر ادھر بھٹکتے لگی۔

میں اسے پکڑ کر باہر لے آیا۔ میرا خیال تھا تازہ ہوا میں اس کی کیفیت کچھ سنبھل جائے گی لیکن اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔

دوسرے روز شام کو وہ غلافہ کی طرف گئی تو میں نے اسی بوڑھے بھکشو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اٹھ کر تھائی وائیک کے پیچھے چل پڑا۔ تھائی وائیک آوے مجھے بعد وائیں آئی اور ادھر ادھر دیکھتے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے تھوڑی سی دیر بعد وہ بوڑھا بھکشو بھی واپس آیا۔

”تمک چو۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ”وہ گیت کے بھنگے کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس کے پاس کچھ اور لوگ بھی آ رہے

ہیں۔ قحانی وادگ نے اسی سے کوئی چیز لی تھی جسے وہ اپنے لباس میں چھپا کر اہل اس آگئی۔

میں اچھل پڑا۔ تنگ چو دی بھٹو تھانے میں نے جنگل والے کیپ کے مقابلے میں ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ میں تو اسی رات مہاراج کے ساتھ کیپ سے واپس گیا تھا اور بعد میں بتا چلا تھا کہ دوسرے روز تنگ چو نے بھی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کیپ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دو تین روز بعد میں نے اسے ایک مرتبہ اس خانقاہ میں بھی دیکھا تھا۔

”وہ بڑا کینہ پرور اور کینہ آوی ہے۔“ بوڑھا بھٹو کہہ رہا تھا مجھے یاد ہے۔ اسے کم از کم دو مرتبہ مہاراج سے سزا بھی مل چکی تھی۔ سنا ہے تم نے کیپ میں اسے بڑی عبرت ناک شکست دی تھی۔ قحانی وادگ بھی تو دباں تھی۔ ہو سکتا ہے یہ عادت اسے دیں سے پڑی ہو۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا معاملہ کیا ہے۔ اب تم ایک اور کام کرو۔ تم ابھی اور اسی وقت ماشروجن کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کوکو میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں اور ایک بات ذہن میں رکھنا۔ کسی کو اس بات کا پتا نہ چلے۔“

بھٹو چند لمبے سری طرف دیکھا رہا پھر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ تنگ چو واقعی بہت کینہ اور کینہ پرور ثابت ہوا تھا۔ وہ اپنی شکست کو نہیں بھولا تھا۔ میں تو اس مقابلے کو کھیل ہی سمجھا تھا لیکن اس نے مقابلے کے دوران میں بھی کچھ اس طرح سے مجھ پر حملے کیے تھے جیسے حقیقی لڑائی لڑ رہا ہو اور مجھے ہر قیمت پر شکست دینا چاہتا ہو اور جب میرے ہاتھوں ناک آؤٹ ہوا تو اسے اپنی توہین سمجھا۔ اس نے دوسرے ہی روز کیپ چھوڑ دیا۔ وہ شاید مجھ سے بدلہ لینے کے لیے موقع کی ناک میں تھا۔ مجھ پر وار کرنے کا تو موقع نہیں مل سکا البتہ قحانی وادگ اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے قحانی وادگ کو ہیروئن کا عادی بنا دیا۔ اس طرح وہ مجھ سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میں ذہنی طور پر اس قدر آپ سیٹ ہو چکا تھا کہ میں نے گلاس ڈس مس کر دی اور اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ قحانی وادگ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں رک گیا۔ دروازہ بند تھا اور اندر درجلی جلی رہی تھی۔ یہ دوپٹ کا دروازہ تھا۔ تختوں میں بہت معمولی سی جھری تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو کاب آٹھا۔ قحانی وادگ بیلبر مردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازو اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ سانس تیز ہونے کی وجہ سے اس کے سینے کا زبردست دور سے ہی ٹھہر رہا تھا۔ بند کے قریب پھوٹی میز پر چاندی جیسے کانڈہ کا ایک گولڑا پلاسٹک کی اسٹرا جیسی ایک تنگی ناچڑ اور سفید پلاسٹک کی ایک بڑیا پڑی ہوئی تھی۔





جاسکو گے۔ اب تمہاری لاش کا پوسٹ مارٹم اسی اسپتال میں ہوگا۔ اس نے خاموش ہو کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں اپنے کتے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھے۔

میں بالکل خوف زدہ نہیں تھا۔ اگر چند مہینے پہلے اس طرح کھربے میں آجاتا تو اتنی دیر میں میری چٹون قہقہہ لگتی ہو چکی ہوتی لیکن اب میں پیدل نہیں رہا تھا۔ میرے اندر حوصلہ، قوت اور خود اعتمادی تھی اور میں اس قسم کی صورت حال کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

وہ دونوں پیچھے ہوتے مجھ پر حملہ آور ہوئے میں ان سے زیادہ بلند آواز میں چیخا اور اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پوری قوت سے اچھلا۔ میں زمین سے تقریباً چھ فٹ اوپر اٹھا تھا اور پھر میرے پیر سامنے والی کار کی پھٹ پر گئے تھے۔ وہ دونوں اپنی جھونک میں تک ٹک سے کھرا گئے تھے۔ وہ سنبھل کر تیزی سے مڑے۔ اس دوران میں میں نے بل YELL کرتے ہوئے کار سے چھلانگ لگا دی۔ پیچھے آتے ہوئے میرا ایک پیر سفید شرٹ والے کے سینے پر اور دوسرا کالی شرٹ والے کے کندھے پر لگا تھا۔ وہ دونوں پیچھے ہوئے ڈھیر ہو گئے۔ ان میں ایک فوراً اٹھ گیا۔ میں اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ اس نے ہاتھ اور اٹھا رکھا تو سے وار کیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ہاتھیں کٹائی اس طرح آگے کر دی کہ اس کی کٹائی میری کٹائی سے کھرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بڑی پھرتی سے ایک پیر پر گھوم گیا۔ اسپننگ لک اس کے جڑے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس دوران میں کالی شرٹ والا اٹھ گیا تھا۔ وہ چاقو لہراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس نے حملہ کیا تو میں نے ہاتھیں ٹانگ سے اس کا وار دیا اور ساتھ ہی اس کے جڑے پر گھونسا رسید کر دیا چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ جڑے پر گھونسا لگنے سے وہ لڑکھانچا گیا تھا۔ سنبھلنے کا موقع دے بغیر میں نے اسے ایک اور اسپننگ لک رسید کر دی۔ وہ پست کے بل کر گیا۔ میں نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اس پر چھلانگ اس طرح لگائی تھی کہ میرا سر اس کے سینے پر لگا اور میں اپنی قلابازی کھاتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہ بری طرح چٹا تھا لیکن اس نے انھیں میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس وقت اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے بازو کندھوں کے قریب سے گرفت میں لے کر پیچھے کی طرف مروڑنے لگا۔ اس کی پشت میرے سینے سے ملی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے بازوؤں پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔ اس طرح اس کے کندھوں کے جوڑا کھڑکتے تھے۔

اچانک اپنے پیچھے دھانڑنے کی آواز سن کر میں اپنے حریف کو اسی طرح گرفت میں لیے ہوئے تیزی سے گھوم گیا۔ سفید شرٹ والا پیچھے ہوتے چاقو سے حملہ آور ہو رہا تھا۔ اس نے حملہ تو میری پشت پر ہی کیا تھا کہ میں نے گھوم کر گرفت میں لیے ہوئے حریف کو سامنے کر دیا تھا۔ سفید شرٹ والے کا چاقو دستے تک اس کے سینے میں بیوست ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چلی بڑی خوف ناک

تھی۔

میں نے اب بھی اسے گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ بری طرح ترپ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح ان لوگوں نے سامنے میرے ہاتھ پر خنجروں کے وار کیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کا اپنا ایک کوئی مارا گیا تھا۔

حملہ آور بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ وہ چند لمبے چوٹی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر چاقو اپنے ساتھی کے سینے میں بھروسہ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا سر بازو کے قریب سے باہر نکل گیا۔ کھڑی ہوئی اس سفید کار کی طرف تھا جس میں وہ مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔

کالی شرٹ والا ابھی تک میری گرفت میں ترپ رہا تھا۔ میں نے اسے نیچے پھینک دیا اور سفید شرٹ والے کے پیچھے دوڑا۔ ٹھیک اسی لمبے گاگ بیک میں چلتا ہوا اس کا کار کی طرف دوڑ رہا تھا۔ سفید شرٹ والا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ انجن اسٹارٹ کرنے میں بھی ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ میں ابھی چکر گردوڑ تھا لیکن کار حرکت میں آگئی تھی۔ گاگ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے چھلانگ لگا کر کار سے کھرا کر گیا۔ کار بڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور گاگ کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اسے زیادہ چرٹ نہیں لگی تھی۔

”بھاگ گیا۔“ گاگ اپنی سیدھی ٹانگ جھٹکتے ہوئے بولا ”ہاتھ میں آجاتا تو اس کی گردن موڑ دیتا۔“

”ایک بھاگ گیا کہ دو سارا دھڑا ہوا ہے۔“ میں نے بازو کے قریب اشارہ کیا اور پھر گاگ اس لاش کو دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

”نہیں۔“ میں نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے ان دونوں میں سے کوئی ایک میرے ہاتھوں مارا جانا کر اتفاق سے یہ اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا۔ چاقو سے وار تو مجھ پر ہی کیا گیا تھا مگر میری ذہن حال میں گیا اور میری موت کو اس نے اپنے سینے سے لگایا۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ جلدی۔“ گاگ نے کہا۔ ہم دونوں اسپتال میں گئے۔ استقبال کاؤنٹر والے لاؤنج میں موجود دو تین آدمیوں نے دروازوں کے شیشوں سے ہماری لڑائی کا منظر دیکھا ہو گا لیکن انہیں شاید یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ایک لاش گر چکی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کی طرف سے کوئی خاص مداخلت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ گاگ نے استقبال کاؤنٹر پر رکھا ہوا ٹیلی فون ایک طرف سرکایا اور ریمپور اٹھا کر خبردار کر کے لگا۔ لائن فوراً ہی مل گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تیز تیز لمبے ہاتھیں کرتا ہوا اور پھر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی اور جیڑ عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔

اس عورت نے میرے کپڑوں پر خون کے چھینٹے بھی دیکھ لیے

وہ کچھ بدحواس ہو گئی۔ وہ دیوار پر لگے ہوئے انٹر کام کا نمبر دیکھ کر تھوڑے لمبے میں کسی سے بات کرنے لگی پھر اس نے دھڑکھڑا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

”کچھ اٹھ کر آنا۔“ اشارہ کرتا ہوا لفت کی طرف دوڑا۔ یہاں تین لمبے لمبے اور اس وقت تینوں اوپر تھیں۔ ہم لفت کا انتظار کرنے میں نہیں بیٹھے کی طرف دوڑے۔

تین لمبے لمبے پیر پیر پیر تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور غالی وانگ بیٹھ کر پیر پیر دیکھ رہی تھی۔ دھڑ سے دروازہ زلزلہ کر رہا تھا۔ غالی وانگ نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ گاگ زلزلے پر خون دیکھ کر بدحواس ہی ہو گئی۔

”ہم خود آسا بیل چل سکتی ہو؟“ گاگ نے اسے کچھ کہنے کا موقع دے بغیر کہا۔

”ہاں۔“ میں پیدل چل سکتی ہوں۔“ غالی وانگ اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے غالی صورت حال کا اندازہ لگایا تھا ”یہ۔۔۔ کیا۔۔۔“

”اس نے میرے کپڑوں پر خون کے دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”یہ جگہ اب ہمارے لیے خود نہیں رہی اس لیے تمہیں یہاں سے لے جا رہے ہیں۔“ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے غالی وانگ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے لپک کر اسے کندھے پر لاد لیا اور دروازے کی طرف بڑھ کر تیس پچاسی سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہ گئی۔ ہم نے آگے آنے کے لیے بھی لفت کا انتظار نہیں کیا۔ گاگ اپنے ہاتھ سے آگے تھا۔

لالی میں بیٹھے ہوئے لوگ ہمیں دیکھ کر گڑبڑا سے گئے۔ وہ کچھ شاید وہ ٹکڑے کسی مریض کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ گاگ کے ہاتھ میں خنجر نے انہیں کچھ اور بھی ڈرا دیا تھا۔

گاگ نے مجھے دروازے کے اندر ہی رکھنے کا اشارہ کیا اور خود ڈوٹا ہوا ہائل پر لپک گیا۔ ڈھونڈ مٹ بعد اس کا تک تک گیت کے ماتھے پر لپک گیا۔ میں گیت سے نکل کر دوڑا ہوا سڑک پر گیا۔ پہلے غالی وانگ کوین پر ڈالا اور پھر خود بھی ایک کر سوار ہو گیا۔ اس دوران میں گاگ تک حرکت میں آچکا تھا۔

پہلے دروازہ اسی واٹ میں پھنسا دیا گیا۔ وہاں ہاسٹروجن پہلے سے موجود تھا۔ ہم اس کمرے میں جمع تھے جہاں غالی وانگ کو لٹایا گیا تھا۔ گاگ ہاسٹروجن کو اس واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

”دوبی کوف۔“ ہاسٹروجن میری طرف دیکھ کر مسکرایا ”یہ لاش غالی طرف سے ٹانگہ کے لیے دوسرا خنجر ہوگی اور اس لاش سے اسے پیغام بھی مل جائے گا کہ تم پر ہاتھ ڈالنا اب اتنا آسان نہیں ہے۔“ وہ پورٹل چلی ہوئی اور اس وقت وہ ہاتھوں کی طرح پٹیاں اٹھا رہا ہوگا۔

”ٹھیک ہے ہاسٹرو۔“ میں نے اس کی تعریف پر بڑبڑاتے ہوئے

کہا ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ جب میں اسپتال کے گیٹ سے باہر نکلا تھا تو میں نے اس پاس دو تین ایسے آدمی بھی دیکھے تھے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ ہمارے آدمی ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی میری مدد کو نہیں آیا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ ہاسٹروجن مسکرایا ”ہمارے آدمی وہاں موجود تھے لیکن انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ تم بہت خوبصورت سے اپنے حریفوں کا مقابلہ کر رہے ہو اس لیے وہ تم سے دور ہی رہے۔ اگر تمہیں کوئی خطرہ ہوتا تو وہ لوگ تم تک پہنچنے میں ایک لمبے کی تاخیر بھی نہیں کرتے۔ گاگ سے پہلے مجھے ان آدمیوں کی طرف سے رپورٹ مل چکی تھی۔ یہ تمہاری پہلی باقاعدہ فائٹ تھی۔ تمہاری کامیابی پر مجھے خوشی ہوئی اور مہاراج کو جب اطلاع ملے گی تو وہ بھی بہت خوش ہوگا۔“

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ چلے گئے اور میں دیر تک غالی وانگ سے باتیں کرتا رہا۔ صبح ایک جوان اور خوب صورت عورت غالی وانگ کے لیے دوامیں لے کر پہنچ گئی۔ وہ نرس تھی اور اسے اس وقت تک یہاں رہنا تھا جب تک غالی وانگ ٹھیک نہ ہو جائی۔

تین دن بعد رات نو بجے کے قریب ایک ہیکشو نے آکر بتایا کہ ایک عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ وہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ میں اس ہیکشو کے ساتھ رات کے اس حصے میں گیا جہاں ڈائرینگ کی آمدورفت ہا کرتی تھی لیکن اس وقت وہاں ڈاکٹر ڈاکٹر ہی تھے۔ مرکزی گیٹ کے باہر دونوں طرف نگہبان پورے اور دو درخت تھے۔ ہیکشو نے وائیں طرف اشارہ کیا۔ چند گردوڑ ایک درخت کے پچھلے تاریکی میں ایک عورت چادر لپیٹے کھڑی تھی۔

میرے ساتھ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اس عورت نے اپنا چو بھی چادر میں چھپا رکھا تھا لیکن میں جیسے ہی قریب پہنچا، اس نے چہرے سے چادر ہٹائی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر اچھل پڑا۔

وہ کوشلیا تھی۔ ”میں اپنے آپ کو خنجر سے ڈال کر یہاں آئی ہوں۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے سرگوشیا نہ لمبے میں کہا۔ ”کوئی بات ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں پوچھا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

”اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔“ وہ بولی ”مہاراج سے غداری کر کے میں نے واقعی حماقت کی تھی۔ میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ اگر مہاراج بھی مجھے معاف کر دیں تو میں انہیں ایک بہت بڑی سازش سے آگاہ کر سکتی ہوں۔“ کوشلیا نے کہا۔ ”کوئی نئی سازش؟“ میں نے اسے گھورا۔

”ہولڈ رکھو۔ میں دوسرے فون پر مہاراج سے بات کرتا

کو شلیا نے اشارہ کیا۔ وہ عورت اٹھ کر دوسرے طرف

یہ باتیں لکھ رہا تھا۔ درمیان میں چارپانچ چوڑی جگہ پر تھپائی رہ رہا تھا۔ اطراف میں چھوٹے چھوٹے فرش تھا۔ کسی نے ٹھیک تھا اور کسی کچھ سچی بات کے اس پر اسرار راہ کی باتیں کرنا لے کے اندر تک چلی گئی تھیں۔ انہیں باقاعدہ باتیں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لوہے کے موٹے موٹے سرے نالے یا بار بار کے ساتھ گے ہوئے تھے۔ ان آہنی بیڑیوں سے از

ان میں ایک ٹائیگر تھا۔ دوسرا چمک اور تیرا دارا!  
چمک اور تیرا دارا! ان دونوں کے

168 حصہ 1

کا منصوبہ غالباً یہی تھا کہ اندر سے سونا نکال کر بجھنے کو کھوکھلا کر دیا جائے لیکن ذہل مشین چلنے سے مجسمہ گرم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے بجھنے کے گرم ہو جانے کو لوگ لاڈ بڑھا کر مجبور ہی سمجھتے۔ وہ مارے عقیدت کے بجھنے کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہتے اور ٹانگہ وغیرہ بجھنے کے اندر کا سارا سونا نکال کر رو فیکر ہو جاتے لیکن میری ذہانت نے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ وہ خود سارا سونا لے جانے لگے۔ جو میرے خیال میں چند کلو سے زیادہ نہیں تھا۔ اگر وہ رات کو اپنے وقت 'جب واٹ زائرین کے لیے بند کر دیا جاتا ہے' اپنے منصوبے پر عمل کرتے تو یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ٹانگہ وغیرہ کے تعاقب میں جانے والے حافظہ واپس آ گئے تھے۔ پورے شہر کے بچے اس قسم کے سرنگ خانوں کا خیال بچھا ہوا تھا اور وہ لوگ کسی طرف غائب ہو گئے تھے۔ میرے حکم پر واپس آنے والے حافظوں نے بھی سرنگ میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹا جاسکے حافظوں نے ہار چوں و چرا میرے حکم کی قبول کی تھی۔ جس سے مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میرے بارے میں انہیں جو بدایات دی گئی تھیں وہ بہت واضح تھیں۔

یہ خبر زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکی۔ خانقاہ میں زائرین کا جھوم تھا۔ یہ خبر پہلے ہی کھلی سی چلی گئی۔ ایک کھٹے کے اندر اندر مہاراج بھی پہنچ گئے اور پولیس کی بھاری نفری بھی۔ پولیس نے فوراً ہی خانقاہ کو زائرین سے خالی کر دیا اور چاروں طرف پوزیشن سنہال لی۔ کچھ پولیس والوں نے نالے والی سرنگ میں پوزیشن سنہال لی تھی اور لاتعداد پولیس والے شہر کے نیچے سرنگوں کے اس جال میں پھیل گئے تھے اور میرے خیال میں یہ بیکار تھا۔ جی فانگ اور ٹانگہ جیسے لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اب تک کسی نالے میں چھپے ہوں گے جبکہ مجھے یقین تھا کہ وہ نالے سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکے ہوں گے۔

پولیس کے اعلیٰ ترین افسران نے بھی وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ہنگام میں واقع تمام بڑی بڑی خانقاہوں کے راہب بھی پہنچ چکے تھے اور اپنے اپنے انداز میں غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔

اخبار نویسوں اور فوٹوگرافروں کی بڑی تعداد بھی وہاں موجود تھی۔ سرنگ کے اندر فوٹوگرافر جمعت کے اس حصے کی تصویریں کھینچ رہے تھے جہاں ٹانگہ تھا۔ ان تمام چیزوں کی تصویریں بھی کھینچی گئیں جن سے جمعت کا نئے میں مدلی گئی تھی۔ میری بھی لاتعداد تصویریں کھینچی گئیں۔ مختلف پوز مختلف اسٹائلز میں۔ مہاراج کے ساتھ اور تمام بڑی بڑی خانقاہوں کے راہبوں کے ساتھ۔ بڑے بڑے راہب میرے ساتھ تصویر کھینچوانے میں فخر محسوس کر رہے تھے کیونکہ میں ہی وہ شخص تھا جس کی ذہانت سے ان کا لاڈ بڑھا جائے اور کھوکھلا ہونے سے بچ گیا تھا۔

مہاراج بڑے فخر سے اخبار نویسوں کو میرے بارے میں بتا رہا تھا۔ اخبار نویس مجھ سے بھی طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ یہ شہ کیسے ہوا؟ میں ان کے سوالات کے جواب دیتا اور تصویریں بھی بنوا رہا۔ میں نے انہیں ان چاروں کے بارے میں بتا دیا۔

اس سارے بچکے میں رات آدمی ہو گئی۔ واٹ کو فزین طور پر زائرین کے لیے بند کر دیا گیا تھا اور نالے والی سرنگ میں بھی پولیس کا بھاری پرا بھار کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ مہاراج کے بھی کچھ محافظ تھے۔

مہاراج مجھ سے بہت خوش تھا۔ خوش مجھے بھی تھی۔ میں ان کے کسی کام تو آیا۔ جن نمک تو ادا کیا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی بھی تھی کہ میں نے بدھ کے چودہ کاروں کو گمراہ ہونے سے بچا دیا تھا۔ اگر میری ذہانت کام نہ آتی تو وہ لوگ بجھنے کے گرم ہو کر مہاتما کا مجبور ہی سمجھتے اور اس طرح نئی بد منتیں پیدا ہو جیں اور شاید یہ انکشاف بھی نہ ہو سکتا کہ مجسمہ کھوکھلا ہو چکا ہے اور مہاتما میں پیدا ہونے والی گرمی چروں کی پیدا کردہ تھی۔

رات آدمی سے زیادہ بہت چلی تھی۔ مہاراج اور کئی بڑے بڑے بھکشو واٹ ہی میں تھے۔ البتہ مہاراج نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں خانقاہ والے حصے سے نکل کر باہر آئی تھی۔ میں داخل ہوا تو نیم تاریکی میں دو بولے دیکھ کر ٹھٹھکیا اور پھر میں نے انہیں پہچان لیا۔ ایک تھائی وانگ تھی اور اس کے ساتھ اس کی نرس۔

تھائی وانگ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر مجھ سے پٹ گئی۔ "تم نے ہم بہت بڑا احسان کیا ہے وجدان۔" وہ میری پیشانی پر ہوسہ دینے ہوئے بولی "تم شاید اسے کوئی معمولی بات سمجھتے ہو گے لیکن یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے ہماری قوم کبھی نہیں بھولے گی۔ کاش! میں وہ منظر دیکھ سکتی جب مہاراج اور ہنگام کے بڑے بڑے بھکشو تمہاری پیشانی پر ہوسہ دے رہے تھے۔"

"تو تمہاں آجائیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے آنے نہیں دیا گیا۔" تھائی وانگ نے باہر سانس لے لیا اور جواب دیا "میں تو کب سے یہاں کھڑی تھی کہ تم آؤ تو تمہیں اس کارنامے پر مبارکبادوں۔"

"مبارکباد میں نے وصول کر لی۔ اب کرے میں چلوں اگر تمہیں چڑھ گئی تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلی تھی۔ میری طرف چل پڑا۔ نرس بھی ہمارے ساتھ تھی۔ جب ہم روشنی میں پہنچے تو بہت سے بھکشوؤں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں وہاں کھڑے تھے اور سب بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دو تین بوزے بھکشوؤں نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پر ہوسہ دیے تھے۔

میں تھائی وانگ والے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ بجائے تب

میں انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر تمکین کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ "اب تمہاں تھائی وانگ؟" میں نے کہا "اگر تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو برا مسئلہ ہو جائے گا۔"

میں تم سے سب کچھ تفصیل سے سننا چاہتی ہوں۔ تم بھی میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ تھائی وانگ نے بیڈ پر لیٹنے ہوئے کہا۔ میرے بیڈ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرس بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ جب بدھ کے بیڈ میں آجائیں تو وہاں شورش مچاؤ مجھے اچانک ہی اس قسم کا خیال آیا تھا جو میں نے بہت عرصہ پہلے ہی اور ڈھٹی کے ساتھ بچا دیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے میں نے غاموش رہنے کے بعد میں انہیں بدھ کے واقعات کی تفصیل سنائے تھے۔

جانتے ہو تم نے اس قوم پر کیا احسان کیا ہے؟" تھائی وانگ نے میرے غاموش ہونے پر کہا اور میری عقیدت والے خدشے کا اظہار کیا جس کا خیال مجھے بھی آیا تھا "اس سے ایک نئی بدعت پیدا ہو جائے گی۔ طرح طرح کے شوشے چھوڑے جاتے اور لوگ لاڈ بڑھا کر اصل تعلیمات کو بھول کر ایک نئی راہ پر چل نکلے جس سے ناسمجھ اور انکساری کو ہوا ملتی۔"

"میں خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔" میں نے جواب دیا "لیکن سونے کی چوری کے انکشاف سے یہ طے ہو گیا کہ وہ کوئی مجبور نہیں تھا۔"

"تھائی وانگ نے کہا "اس واقعہ کے بعد ایک وقت تمہارے سامنے آگئے صورت حال نہایت تمکین ہونے کے باوجود تم نے بڑی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ وہ دینی فانگ پر تمہارا پہلا حملہ تھا جسے وہ بیحد یاد رکھے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اب تمہیں زیادہ دھمکا رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ اب مجھے واقعی محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا "میں دارا اور اپنی فانگ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ انہیں کوئی نہیں جانتا لیکن ٹانگہ کو ہنگام کا پچھ پچھا جانتا اور پچھتا رہا ہے۔ جہاں تک غمناک کردی اور بد معاشی کا معاملہ ہے لوگ اس سے ضرورت پر ہیں۔ ہر شریف آدمی غمناک اور بد معاشوں سے بدگما ہے لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔ بات مذہب کی ہے۔ کوئی شرابی؟ زانی اور کدو آدمی بھی لاڈ بڑھا کر توہین برداشت نہیں کرے گا۔ وہ ٹانگہ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس کے جسم کا ریڑھ ریڑھ کر ٹالیں گے۔" "کیا تم سمجھتی ہو کہ ٹانگہ کسی کے ہاتھ آگے گئے؟" میں نے کہا "میں بھی اس بات کا احساس ہو گا کہ اسے شاخت کر لیا گیا ہے۔ لاڈ بڑھا کر اس کا اور جب معاملہ غمناک پڑ جائے گا تو نکل آئے گا لیکن میں گواہ۔" میں چند لمحوں کو غاموش ہوا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تھائی وانگ! بات دراصل یہ ہے کہ اس بچے کے لوگ خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقے سے ہو"

نفرت میں بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کسی معمولی بات پر اس طرح بھڑک اٹھتے ہیں کہ قتل و غارت سے بھی باز نہیں آتے اور بعض اوقات بڑی سے بڑی بات بھی ان کے سر پر سے گزر جاتی ہے اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رہ سکتی۔ لوگ کسی بات پر اشتعال میں آکر اس طرح بھڑک اٹھتے ہیں جیسے پوری دنیا کو جلا کر رکھ کر اڑائیں گے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ان کا جوش و جذبہ باندھ پڑ جاتا ہے اور بالا خرہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ مذہب ایک ایسا شعبہ ہے جس کی آواز کے لوگوں کو قتل و غارت پر اکسایا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی واردات تھی۔ ان کا مقصد سونا حاصل کرنا تھا۔ لاڈ بڑھا کر توہین کا تو انہوں نے بھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگ اسے لاڈ بڑھا کر توہین سمجھیں گے اور کچھ کر پڑ پھیلانے کی کوشش بھی کریں گے۔ سیاست داں اور شہینہ لوگ اس موقع سے فائدہ بھی اٹھائیں گے لیکن میرا خیال ہے کہ مہاراج اور ہنگام کی دوسری خانقاہوں کے بڑے بڑے راہب اس گم کو زیادہ نہیں بھڑکنے دیں گے۔ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک محض چوری کی واردات تھی اور اس سے قانونی طریقوں سے ہی نمٹنا چاہئے گا۔"

"وہ لوگوں کے بھڑکے ہوئے جذبات کے آگے کیسے بند باندھ سکیں گے؟" تھائی وانگ نے کہا۔

"وہ سمجھ دار لوگ ہیں۔ روحانی پیشوا ہیں۔ لاڈ بڑھا کر تعلیمات کا چارہ کرتے ہیں۔ لوگ ان کی بہت سی باتیں مانتے ہیں۔ شاید یہ بات بھی مان لیں۔" میں نے کہا۔

"تو گویا تمہارے خیال میں اس معاملے کو مذہبی ایٹھ نہیں بنانا چاہیے۔" تھائی وانگ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا "یہ چاروں ایسے گڈی ہیں جن کا شاید کوئی مذہب نہیں ہے۔ دولت ہی ان کا دھرم ہے۔ یہ زر کی پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ انہوں نے میرے ماں باپ کو کیوں قتل کیا تھا۔ میرے باپ نے برسوں پہلے انہیں بھاری مالی نقصان پہنچایا تھا پھر دارا بہرہوں کی اس سنگت کا ریکٹ قائم کرنے کے لیے سنگاپور آیا تھا۔ وہاں اس نے میرے باپ کو دیکھ لیا۔ اس کے ذہن میں لازمی طور پر یہ بات آئی تھی کہ میرا باپ ان کے راستے کی رکاوٹ بنے گا۔ اس نے کرائے کے قاتلوں کے ذریعے میرے باپ کو راستے سے ہٹا دیا اور پھر میں ان کی نظروں میں آ گیا۔ میں ان کے جرم کا چشمہ دید گواہ تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا ان کے لیے خطرہ بنا رہوں گا۔ وہ مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے اور میں ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا۔ اصولی طور پر وہ میرے دشمن ہیں۔ انہوں نے یہ جو کچھ بھی کیا ہے میری دشمنی ہی میں کیا ہے لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان کا منصوبہ صرف سونا

چڑھتا نہیں تھا۔

”تو پھر؟“ تھائی وانگ نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”وہ اس کس میں مجھے بھنسانا چاہتے تھے۔“ میں نے کہا۔  
”کیا مطلب؟“ تمہیں کس طرح بھنسانا چاہتے تھے۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”وہ سمجھ گئے تھے کہ جب تک میں ہمارا رنگ کی پناہ میں ہوں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے ہمارا رنگ کی نظروں سے گرانے کے لیے انہوں نے یہ سازش تیار کی تھی۔ یہ سازش دراصل دارا کے ذہن کی پیروی اور تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کامیاب ہو گئے تو ایک طرف انہیں لاکھوں ڈالر مالیت کا سونا مل جائے گا اور دوسری طرف ہمارا رنگ مجھے دھکے دے کر نکال دے گا یا ہو سکتا ہے میرے لیے کوئی ایسی اذیت ناک سزا بھی تجویز کر دے جسے میں برداشت نہ کر سکو لیکن مجھے اس سازش کا بدوقت پتا چل گیا تھا اور میں نے ہمارا رنگ کو اس سے آگاہ کر دیا تھا؟“

”کیسی سازش؟“ تھائی وانگ کی آنکھوں کی الجھن بڑھ گئی تھی۔

”شینو۔“ میں نے زس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے آج رات کھانا نہیں کھایا تھا۔ جب میں اس وقت شاید کھانے کو تو کچھ نہ ملے۔ البتہ چائے کا سارا سامان وہاں موجود ہوگا۔ اگر تم میرے لیے ایک کپ چائے بنانے کی زحمت کرو تو میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔“

”چائے میں بھی پیوں گی۔ کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا تھا۔“ تھائی وانگ نے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں..... چائے کے بنانے زس کو وہاں سے ہٹا چاہتا تھا۔ زس کے جانے کے بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”ہاں۔ اب بتاؤ۔ وہ کیا سازش تھی؟“  
”تمہیں یاد ہے؟ ایک روز شام کے بعد کو شلیا خاتون کے باہر مجھ سے ملنے آئی تھی اور پھر رات کی گیارہ بجے میں اس سے ملنے کے لیے گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ تم نے واپس آکر بتایا تھا کہ وہ ہمارا رنگ سے معافی مانگتا چاہتی ہے اور اس کے لیے تمہیں وسیلہ بنا رہی تھی کیونکہ ہمارا رنگ تمہاری بات مان لیتے۔“ تھائی وانگ نے کہا۔

”ہاں۔ میں نے تمہیں یہی بتایا تھا اور یہ بات درست بھی تھی۔ ہمارا رنگ نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اصل بات تمہیں بھی بتا دوں۔“ میں نے کہا۔

”اور وہ اصل بات کیا تھی؟“ تھائی وانگ نے پوچھا۔  
”کو شلیا ان دنوں ٹائیگر کے رحم و کرم پر تھی اور اس کی اجازت سے کسی نائنٹ کلب میں کلب بالنگ کے شو کے دعویت کوئی دیکھ رہی تھی۔“ میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا ”پندرہ روز پہلے دارا نے کو شلیا کو دیکھ لیا۔ وہ ہندوستانی لڑکی بڑے تھیکے نقش کشی کا مالک ہے۔ مردوں کے لیے اس

میں بڑی چاشنی ہے۔“

”مگر تم تو اسے ٹھکرا کر بھاگے تھے۔“ تھائی وانگ مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ میں اسے نفیبات سمجھتا ہوں۔ بہر حال۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”دارا نے ٹائیگر سے اپنی خزانہ انکار کیا۔ ٹائیگر اس رات کو شلیا کو لے کر اس نیگے پر پہنچ گیا۔ دارا رات بھر بے خواب رہا۔ وہاں کم اور جی ٹائیگر میں موجود تھے۔ کو شلیا ان کے لیے غلو بن گئی۔ وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے شرباب پانی دی اور پھر اسی دوران میں دارا نے یہ منصوبہ اپنا دیا کہ اسے پیش کیا تھا۔ اس منصوبہ کے مطابق وہ میرے نام سے ایک نیگہ کرانے پر اپنے اور سونا چوری کر کے اس کا کچھ حصہ اس مکان میں بچھا دیتے پھر کسی ذریعے سے مجھے اس مکان تک لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے تھائی وانگ کی لڑکی کو استعمال کیا جانا پھر ہمارا رنگ اس دے دی جاتی کہ میں نے بعض لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھائے۔ سونا چھپا لیا ہے۔ ہمارا رنگ مجھے اس مکان میں اس لڑکی اور سونے کے ساتھ رکھتا تھا۔ وہاں ایک دو آدمی بھی ان کے ہاتھ آجاتے جو یہ گواہی دیتے کہ یہ سازش میں نے ہی کی تھی کیونکہ میں تھائی لینڈ سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد دارا و نیو کو مجھے رات سے ہٹانے کے لیے کچھ نہ کرنا پڑا۔ ہمارا رنگ میرا قہر نام کر دیتے۔“ میں خاموش ہو کر گمرے سانس لینے لگا۔ یہ تحلیل بتاتے ہوئے مجھے خود اپنے آپ میں شش کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔

”جب وہ لوگ یہ منصوبہ بنا رہے تھے تو کو شلیا انہیں باہر بھر کر پلا رہی تھی۔ ہمارا رنگ سے بخاری کر کے وہ بچتا رہی کیونکہ ٹائیگر سے اسے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ خاموشی سے یہ باتیں سن رہی۔ اس نے ظاہر نہیں ہونے والا کہ ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے۔ ویسے اس کے ذہن میں خیال ضرور آیا تھا کہ اگر وہ ہمارا رنگ کو اس سازش سے آگاہ کر دے تو اسے معافی مل سکتی ہے۔

”اگلے روز شام کے بعد وہ اس واٹ کے باہر چوری چھپے ملے لی اور کہا کہ اگر ہمارا رنگ اسے معاف کریں تو وہ انہیں اس واٹ کے خلاف ایک خوفناک سازش سے آگاہ کر سکتی ہے۔ ہمارا رنگ سے بات کرنے کے بعد رات گیارہ بجے ملنے لگی۔ ریسٹورنٹ کے اوپر ایک صحن جو روکے دفتر میں اس سے ملانے کو شلیا نے مجھے اس سازش سے آگاہ کیا۔ کو شلیا سے اس ملاقات کے بعد میں ہمارا رنگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے اس ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ کو شلیا نے نہیں بتا سکی تھی کہ حالت مجھے سونا چھپانے کا طریقہ دکھایا ہوگا۔ واٹ میں مجھے کی حالت کا بندوبست کر دیا گیا لیکن اس سرنگ کی طرف کسی کا حوالہ نہ کیا تھا۔ وہ تو اتفاق سے کہ میرے ذہن میں وہ بات ابھی تھی۔ اس طرح ان کی دونوں سازشیں ناکام ہو گئیں۔ سونا چھپانے کی بات مجھے بھنسانے کی تھی۔ ہمارا رنگ اور دوسرے لوگوں کا خیال یہ کہ

میں زیادہ سے زیادہ چار باغ کلو سونا نکالنے میں کامیاب ہو سکے تھے

میں اپنے ساتھ لے گئے۔“ تھائی وانگ نے گمراہ سانس لیا ”کو شلیا نے بات کہی۔“

”میں نے جواب دیا۔“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے اسے خطہ تھا کہ اگر ٹائیگر کو مار دیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے بعد اسے بچوں سے فون پر رابطہ کر لے۔ میں نہیں بڑا ایک بچہ تھا۔“

”نہ سناؤ۔ اس وقت کہاں تھی کہ زس شینو چائے لے کر تھائی وانگ کے کھانا چاہتی تھی کہ زس شینو چائے لے کر تھائی وانگ کے کھانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی ٹرے میں دو کپ رکھے ہوئے تھے ایک کپ مجھے دے دیا اور ٹرے تھائی وانگ کے سامنے بیٹھ کر

”مگر میری ضرورت نہ ہو تو میں جاؤں۔“ مجھے نیند آ رہی ہے۔“ تھائی وانگ اس وقت چھپ چکی کہ زس شینو چائے لے کر تھائی وانگ کے کھانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی ٹرے میں دو کپ رکھے ہوئے تھے ایک کپ مجھے دے دیا اور ٹرے تھائی وانگ کے سامنے بیٹھ کر

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ آرام کرو۔“ تھائی وانگ نے زس شینو کے جانے کے بعد ہم چائے کی چپکلیاں لیتے ہوئے کھانا کھا کر رہے۔ تھائی وانگ ہاتھیں لیتے گئے اور میرا ہاتھ پکڑنے سے بوجھل سا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا اور زس شینو لیتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

”تھائی وانگ نے مجھے بھجود کر بگاڑ دیا۔ اس وقت اٹھ بجے تھے۔ چار بجے کے لگ بھگ سویا تھا۔ چار گھنٹوں میں نیند پوری ہو گئی تھی۔ اس طرح بگائے جانے پر وارغ میں سناٹا ہی ہو گیا۔

”کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟“ میں تقریباً چیخ اٹھا تھا۔

”جو دیکھو یہ کیا ہے؟“ تھائی وانگ بولی۔ اس کے لیے میں فوراً اٹھ گیا۔

”میں نے دیکھا۔“ میں نے انہیں دکھایا۔ انہوں نے نظروں کے سامنے کچھ دھند سی دیکھا۔ تھائی وانگ کے ہاتھ میں دو اخبار تھے۔ ان اخباروں کی ہیڈ لائنیں پڑھ کر میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے والے

مناظرہ کے مجھے سے سونے کی چوری کی خبرات ہی کو دیکھ کر میں اس طرح پورے شرمیں پھیل گئی تھی۔ لوگوں کو یہ بھی پتا نہ چلا تھا کہ یہ وارڈا ٹائیگر نے اپنے بعض نامعلوم ساتھیوں کے ساتھ مل کر کی تھی۔ لوگوں نے رات ہی کو بنگلے شروع کیے تھے۔ اپنے تین نائنٹ کلب جلا دیے گئے تھے جن کے مالک تھے۔ یہ تھا کہ وہ ٹائیگر کی ملکیت ہیں۔ پولیس اور شہریندوں نے خبر پڑھ کر ہنس ماری تھی۔ جن میں تین آدمی مارے گئے

تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔

ہنگاموں کے علاوہ بدمعہ کے مجھے سے سونے کی چوری کی خبریں بھی نمایاں طور پر شائع کی گئی تھیں۔ میری..... تصویریں بھی چھپی تھیں۔ میں اپنی تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ اخبار نے میرے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ مجھے ہیرو قرار دیا گیا تھا۔ اگر میں ذہانت سے کام نہ لیتا تو ٹائیگر اور اس کے ساتھی مجھے سے سارا سونا نکال کر لے جاتے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق ٹائیگر اور اس کے ساتھی مجھے میں سے تقریباً دس کلو سونا نکال لے گئے تھے۔

”دیکھا۔ دیکھا۔ تم نے۔“ تھائی وانگ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”تم اسے چوری کی معمولی واردات سمجھتے تھے۔ رات کو ہنگاموں میں تین آدمی مارے گئے ہیں۔ یہ بنگلے اور بڑھیں گے اور لوگ مارے جائیں گے۔ لوگ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ٹائیگر اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیتے۔“

”اصل لوگ ہاتھ نہیں آئیں گے اور بے گناہ مارے جائیں گے۔“ میں نے کہتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور بستر سے اٹھ گیا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں تھائی وانگ کے ساتھ بیٹھا باشا کر رہا تھا۔ شش کے دوران میں بھی ہماری گفتگو کا موضوع یہی تھا۔ اسی دوران میں مجھے یہ اطلاع ملی کہ شرمیں اس وقت بھی بنگلے ہو رہے تھے۔ ہمارا رنگ اور دوسرے بڑے بڑے راہب لوگوں کو ہنگاموں سے روکنے کے لیے پورے شرمیں پھیل گئے تھے۔ ایک طرف شرمیں بنگلے ہو رہے تھے اور دوسری طرف ایک اور دلچسپ صورت حال دیکھنے میں آئی۔ میں اس وقت تھائی وانگ کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ واٹ کے مرکزی دروازے کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی۔ اس کے کچھ ہی دور بعد کروٹک دوڑتا ہوا ہمارے کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں آٹو بیگ داخل تھی اور چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

”کیا بات ہے۔ یہ شور کیا ہے؟“ میں نے کروٹک سے پوچھا۔  
”واٹ کے سامنے سیکور لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے اس عمن کو دیکھنا چاہتے ہیں جس نے لارڈز ہاؤس کو لٹے سے بنایا تھا۔“ کروٹک نے کہا ”میرے ساتھ چلو۔ تمہیں شرفا نگ نے بلایا ہے۔“

شرفا نگ اس واٹ کا متہم تھا۔ میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھائی وانگ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ ہم اندرونی دروازے سے ہوتے ہوئے شرفا نگ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ شرفا نگ کمرے میں ٹھل رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے چینی اور اضطراب نمایاں تھا۔ اس نے پہلے مجھے اور پھر تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے یہ صورت حال پسند



نہیں آئی تھی۔

”باہر کچھ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے دیوتا بننے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کچھ اور خرافات شروع ہو جائیں۔ تم صرف دو دن ان کے سامنے رکو گے اور واپس چلے آؤ گے اور ان کے سامنے کوئی بھاشن دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ امید ہے تم میری باتوں کا خیال رکھو گے۔“

شوفانگ کی یہ باتیں میرے لیے خلافت توقع نہیں تھیں۔ جب مجھے اس خانقاہ میں بھیجا گیا تھا، اس سے اگلے ہی روز میں نے شوفانگ کا رویہ محسوس کر لیا تھا۔ یہاں میری تقرری کو شاید وہ اپنے معاملات میں مداخلت سمجھتا تھا لیکن میں نے ان باتوں پر کبھی توجہ نہیں دی تھی اور میرے خیال میں شوفانگ کے دل میں میرے بارے میں کوئی خدشات تھے تو وہ بے بنیاد تھے۔ اتنا عرصہ خانقاہوں میں اور بخشوں کے ساتھ رہتے ہوئے ایک بات میری سمجھ میں آئی تھی کہ یہاں بھی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر شخص اپنا درجہ بڑھانے اور دوسرے کو گرانے کے چکر میں رہتا تھا لیکن میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نہ تو کوئی بخشہ تھا اور نہ ہی اس حیثیت سے کوئی مذہبی مقام حاصل کرنے کی خواہش تھی مگر شوفانگ شاید یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی جگہ لیتا چاہتا ہوں لیکن میرے دل میں ایسی کوئی تمنا نہیں تھی۔ میں تو ایک غریب الوطن اور بے سارا آدمی تھا جو اپنے آپ کو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ہمارا جیسے شخص کا سارا مل گیا تھا۔ میں صرف اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں نے تھائی وانگ کو اشارہ کیا اور کرونگ کے ساتھ شوفانگ کے کمرے سے نکل گیا۔ مختلف راہداریوں میں گھومتے ہوئے جب ہم مرکزی ہال سے نکل کر کیاؤنڈ میں آئے تو سامنے کا منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ کیاؤنڈ کے بڑے گیٹ کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی۔ پھولوں کے گلے سے ترقیا ہر ایک کے ہاتھ میں نظر آ رہے تھے۔ گیٹ کے اندر اور باہر بھی مسلح پولیس والے موجود تھے جو لوگوں کو گیٹ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کرونگ کے کمرے پر میں ذیلی دروازے سے نکل کر گیٹ کے سامنے ہجر کے ایک چوڑے پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ ان کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ میرے ساتھ تھائی وانگ بھی تھی اور پولیس والوں نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔ لیکن لوگ آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ قریب سے مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں میں عقیدت

تھی۔ اپنے لیے لوگوں کی یہ عقیدت اور یہ جوش و خروش میرا دل میرے دماغ میں سنسنی سی ہو رہی تھی۔ میں نے پھر کوئی معمولی سی واردات سمجھتا رہا تھا۔ وہ دراصل کوئی معمولی واردات نہیں تھی۔ وہ معمولی سی واردات دراصل لاڈلہ چاہنے والوں کا نام کا ہوتا تھا۔ میں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میں کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہوں لیکن اب اپنے سامنے یہ عجیب و غریب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ میں نے واقعی کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا مگر میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ میرا چھوٹا سا فرض ادا کیا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ جو کچھ میں نے کیا تھا، اس کا ذمہ دار میں تھا۔ نہ میں اس خانقاہ میں موجود ہوں نہ دار اور وغیرہ مجھے کے سونے کی چوری کا منصوبہ بناتے۔

میرے سامنے چوتھے درجے پر اور اس کے ارد گرد گھومنے والے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ مجھ پر عقیدت کے پھول پھلا رہے تھے۔ صرف پھول ہی نہیں قیمتی چیزیں بھی میرے قدموں میں پڑ کر رہے تھے۔ عورتوں نے اپنے زیورات اتار کر میرے قدموں میں ڈال دیے تھے۔ مرد اپنی کاپیوں پر ہنسی ہوئی گھڑیاں ڈال رہے تھے۔ انگوٹھیاں نذرانے کے طور پر مجھے پیش کر رہے تھے۔ یہ صورت حال میرے لیے دلچسپ بھی تھی اور سنسنی بھی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک معمولی سا کام انجام دے کر لاکھوں دلوں کا محبوب بن جاؤں گا۔

خانقاہ کے مستم شوفانگ نے مجھے صرف دو دن کا وقت دیا لیکن مجھے اس چوتھے درجے پر کھڑے ہونے کا ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ کچھ کا جوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تین چار بخشہ چوتھے درجے کے آدمی بن رہے تھے۔

میں نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو شوفانگ دو اور بخشوں کے ساتھ بڑھ چکے تھے۔ مجھے والے جنگلے کے قریب کھڑا ہادی طرف کی دیکھا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اثرات سے میں اس کی انہماکی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ میری اس سے کوئی پرکاش نہیں تھی۔ میں اسے کوئی دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس لیے اب میں اس سے بچنے کا فیصلہ کر لیا اور تھائی وانگ کی طرف دیکھنے سے روک لیا۔

”شوفانگ نے مجھے صرف دو دن دیے تھے۔ اب ایک دن سے زیادہ وقت ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چاہیے۔“

”میں بھی دیکھ رہی ہوں۔“ تھائی وانگ مسکرائی۔ ”خون جلا رہا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ کھڑے رہنے والے ہیں۔“ ”میرا خیال ہے یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شوفانگ کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں لاڈلہ چیزیں دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔“

﴿١﴾ حَقَّه ١

”شفافیت کا مجھ سے جو فرت پیدا ہو گئی ہے اس کی ایک جھلک میں نے آج صبح اس کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی اور آج شام کو تو اس نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اس واٹ میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا ذمہ وادار میں ہوں۔ وہ کل کو تو نہیں کہہ سکا لیکن اس کی خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد یہاں سے چلا جاؤں۔“

”شرفا ناک کہنے پر رآدی ہے“ ”مہاراج نے کہا ماراؤڑ بھا  
کی تعلیمات ہمیں ایک دوسرے سے محبت اور رواداری کا درس  
دیتی ہیں لیکن تم شاید یہی ان باتوں کو نہ سمجھ سکو۔ سیاست کی طرح  
مذہب میں بھی دھوکا، ریاکاری، فریب اور منافقت پیدا ہو چکی  
ہے۔ کسی ایک ہی فرقے کے مذہبی پیٹرو ایک دوسرے کو بچکا  
دکھانے کے لیے موقع کی ناک میں رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ  
ہمارے ہاں بھی ہوا ہے۔ بعض اندرونی سازشیں ہمارے اس  
مذہب کو کمزور کر رہی ہیں۔ اگر تم مطالعہ کرو گے تو ہمیں چار طرح کا  
کہ لاؤڑ بھانے ہندومت کو ترک کر کے اس مذہب کی بنیاد رکھی  
تھی جس کا مقصد سچائی اور رواداری کا پرچار ہے۔ لاؤڑ بھا کی  
تعلیمات عقل، چوری، زنا، جھوٹ، لٹ، پھیل و عشرت اور دنیاوی  
جاودہ ختم کی طلب سے روکتی ہیں لیکن آج یہ سب کچھ ہوا ہے۔  
ریاضت، فاقہ کشی اور رہبانیت ایک طرح سے اس مذہب کی بنیاد  
ہے لیکن آج نئے رابہ ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان  
تعلیمات کا درس دینے والے خود نکاحوں کی دلدل میں دھنسنے ہوئے  
ہیں۔ شرفا ناک کا شمار بھی ایسے ہی رابہوں میں ہوتا ہے۔ جھوٹ،  
کھو فریب اور ریاکاری کو اس نے اپنا دیوتا بنا لیا ہے۔ وہ بظاہر تو  
بجٹھ ہے لیکن ریسوں جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس نے اپنے  
کمرے کو عشرت کدہ بنا رکھا ہے۔ وہ سازشی ذہن کا مالک ہے۔ میں  
یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ خود تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا لیکن  
لاج میں آکر کسی کا آلہ کار بن سکتا ہے اس لیے میں نے تمہیں  
یہاں سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں رہتے  
ہوئے تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ دیے بھی تمہاری تربیت کا کچھ حصہ  
باقی ہے اور میں چاہتا ہوں اس دوران میں تم اپنی وہ تربیت بھی  
مکمل کر لو۔“

”اب مجھے کہاں جانا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میرے آدمی تمہیں لینے کے لیے آج رات کسی وقت پہنچ جائیں گے“ مہاراج کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

اور جب میں نے ان کے لیے کرے کا دروازہ کھولا تو پاجر گیلری میں دروازے کے قریب ہی ایک بجٹھ کو دیکھ کر چمک گیا۔  
نجانے مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ وہ چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ کسی کو چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کیا ضرورت تھی اور پھر یہ بجٹھ تو میرا شاگرد تھا، وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھ کر بڑبڑایا اور مڑوانے انداز میں اس طرف کھڑا ہو گیا۔

مہاراج کے جانے کے بعد میں دوبارہ تھائی لینڈ کے ایک شہر  
 میں آیا۔ نرس شینو اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ تھائی نرس  
 اپنے پڑے اور دو امیں وغیرہ ایک بیک میں بیک کر رہی تھیں۔  
 بھی اپنا بیک بیک کر کے اس کمرے میں لے آیا تھا۔ تھائی نرس  
 بعد نرس شینو بھی اپنا بیک لے کر اس کمرے میں آئی۔  
 ایک اگرچہ اب پہلے سے بہت برتر تھی۔ وہ دو امیں  
 استعمال کر رہی تھی۔ اب اگرچہ اسے نرس کی ضرورت تھی  
 لیکن چونکہ مہاراج نے اس سلسلے میں کوئی خاص پرواہ نہ  
 تھی اس لیے اگر شینو ہمارے ساتھ جاری تھی تو ہمیں کیا  
 ہو سکتا تھا۔

رات دو بجے ہماراج کے آدمی ہمیں لینے کے لیے پہنچے۔  
 میں اس ایک گانگ تھاوردسراچانگ۔ موخرانچلکے  
 تھا۔ گانگ کوکہہ کرمجھے اطمینان ہواکہ جان بچان کواڈنی ذوق  
 منجی کلیدالے دواڑے کے سامنے سیارہنگ کی کینہ  
 کھڑی تھی۔ ہم تینوں کو دین کے بجیلے حصے میں بٹھارہا گیا۔  
 ڈرنا توہنگ سیٹ سنبھال لی اور گانگ اس کے ساتھ پہنچے  
 بیٹھ گیا۔

شہر کی سڑکیں سناں تھیں۔ کسی سڑک پر کسی ایک گاڑی کا  
نظر آجاتا۔ چنانچہ وہ کن مختلف سڑکوں پر دوڑا۔ اماں، چنانچہ  
وہ اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ خاتونِ مہر  
ہو یا پھر مطمئن ہو کہ اس نے گاڑی ایک کساد سڑک پر ہوا۔  
یہی سڑک آگے جا کر ہائی وے تھری سے جاتی تھی۔ چنانچہ  
ہائی وے پر مشرق کی طرف سفر کرنے کے بعد وہیں جنوب کی طرف  
ایک اور ہائی وے پر مڑ گئی۔

مڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پائیاں تھیں۔  
بہزے اور درخوش کی بہتات تھی۔ تقریباً دو گھنٹے اسالی سہ  
سفر کرنے کے بعد وہ پائیاں میں ایک اور جگہ کی طرف  
مڑی۔ یہ کوئی باقاعدہ مڑک نہیں تھی۔ ایک عجیب سا جھروا  
تھا جو چھوٹی چھوٹی پائیاں میں مل کھاتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی سی  
بست بلی تھی اور پھر تقریباً چالیس منٹ بعد وہ ایک جگہ پر  
حاکم اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ شینو اور خانی داک اور گرو  
تھیں۔ میں نے سمجھو ذکر دونوں کو گھبرا دیا اور میں نے پچھلے  
وین کے قریب کھڑا دھڑ دھڑ دیکھنے لگا۔ اوپر کی جگہ  
روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ پناہی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اوپر چڑھنے کے لیے  
 تنگ سارا راستہ تھا جو چٹان کو کانٹ کر بنایا گیا تھا۔ چٹانوں  
 اس کے پیچھے سینو، تھالی، دانگ اور مٹی۔ آخر میں تنگ  
 نے کندھے پر آٹو لیکر داخل ہوا تھا۔ اس نے تنگ سے  
 کا اہتمام تقریباً دو سو فٹ اوپر ایک مسطح جگہ پر ہوا تھا۔  
 خاصا وسیع میدان تھا جس کے ایک طرف کوئی کانٹا نہ تھا۔

تجربہ کی آغوش میں۔ تب چلا کر گامگاہ اور چہرہ کا  
 ایک سال پہلے چھوڑنے کے تھوڑی دیر بعد واپس چلے گئے تھے۔  
 البتہ دوسرے کوئی دکھاہی رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی عمر بھی  
 تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک کلین شیو تھا۔ دوسرے کی  
 عمر چھبیس کی دم کی طرح ہونٹوں کے کناروں سے لٹکی ہوئی  
 تھی۔ دونوں کے بال بے تماشاً بڑے ہوئے تھے۔ ایک نے  
 تھوڑا سا بھرا رکھی اور دوسرے کے بال گردن پر پھٹے ہوئے  
 تھے۔ بیڑاں پہاڑوں کو روکنے کے لیے بیڑے چڑھ گیا ہوا تھا۔ دونوں  
 سواروں کی فرسٹ اور جینز پر رکھی تھیں۔ اپنے حلیوں  
 کے سوا کچھ پہننے سے لگتے تھے۔ جس دب سے سوارا ج کی  
 جہاز اٹھا رہی تھی ان لوگوں سے واسطہ نہ پڑا تھا اور میں جانتا تھا  
 کہ اس قسم کے لوگ برسے خطرناک ہوتے ہیں۔

مس بطرفانی کے ساتھ دوسری اوجیز عورت میں بھی بڑی کنش تھی۔ ہمارے لیے ناشتا اسی نے بنایا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ انہیں ہمارے بارے میں پہلے ہی سے یاد کیا تھا۔ باہر بیٹھے ہوئے ان دونوں آدمیوں کے بارے میں تو میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں ہماری حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن مس بطرفانی اور مس رمانا نے اپنے بارے میں بتانے سے گریز کیا تھا۔

وہ سلع میدان فٹ بال گراؤنڈ کے برابر تھا۔ وہ مکان بھی خاصا بڑا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر دو یا تین کمروں پر مشتمل ایک اور کالج تھا۔ اس میدان کے چاروں طرف تنجیان درخت تھے جو گویا چار دیواری کا کام دے رہے تھے۔ ایک راستہ وہ تھا جس طرف سے ہم آئے تھے اور دوسرا راستہ اس چٹان کے دوسری طرف تھا۔ یہ راستہ کھنکشاؤں کا تھا اور اس سے گاڑی بھی آسکتی تھی۔ اوپر لوہے کے پائپوں کا گائیٹ لگا ہوا تھا۔ اس قسم کا گائیٹ چٹان کے دامن میں بھی تھا تاکہ کوئی غیر متعلق گاڑی اس راستے پر نہ آسکے۔ چٹان کے دوسری طرف خشیب میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر دور در چٹان پوری شہر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سمندر کا ساحل تھا جو خم کھاتا ہوا اس چٹان کے دوسری طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے سے جنوب کی طرف چلا گیا تھا۔

بڑی خوب صورت جگہ تھی اور محفوظ بھی۔ سہارا ج نے اسی لیے صرف دو آدمیوں کو یہاں بھیجا تھا۔ بجلی کے علاوہ یہاں ٹیلی فون کی لائن بھی موجود تھی۔ اس روز ناستا کرنے کے بعد ہم اُدھر اُدھر گھومتے رہے۔ دونوں محافظ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ ان کی نظریں ہمارا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

پتی ہر جاندار کے اندر وہ پوشیدہ قوت ہے جسے اگر دریافت کر لیا جائے تو نازیہ قوت کا ایسا خزانہ حاصل کیا جاسکتا ہے جس کی

خواہش سب ہی لوگ کرتے ہیں۔ ایک کزور تریں آدمی اپنے سے کئی گنا طاقت ور آدمی کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔ آنکھوں میں وہ پراسرار قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظروں کے اشارے پر بڑی سے بڑی اور ذہنی چیز کو اس کی جگہ سے ہلایا جاسکتا ہے۔ دفاعی قوت ایسے ایسے کارنامے انجام دیتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن آج تک دنیا میں بہت کم لوگ اپنے اندر یہی کی یہ پراسرار قوت بیدار کر سکتے ہیں کیونکہ اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

بچی کی قوت کا اندازہ سانپ سے لگایا جاسکتا ہے۔ سانپ۔۔۔ زمین پر لیٹنے والا معمولی سا کڑوا۔ جس کا جسم اس قدر کزور ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے سلا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے اندر بھی کی یہ پراسرار قوت موجود ہے اور وہ اس سے کام لیتا ہے۔ سانپ کے زہر سے قطع نظر سانپ اگر ہماری بھر کم اور طاقت ور پہلوں کی جگہ سے لپٹ جائے تو ہانگ کی ہڈی توڑ دیتا ہے۔

انسان میں بھی بچی کی یہ پراسرار قوت بدرجہ اتم موجود ہے لیکن ننانے کی صد لوگ اس سے واقف ہی نہیں ہیں اور جو واقف ہیں وہ اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور جو کوشش کرتے ہیں ان میں لاکھوں میں ایک ایسا ہوگا جسے کامیابی نصیب ہوتی ہو۔

پکولہ مجھے بتا رہا تھا کہ بچی کی اس پراسرار قوت کو کس طرح اندر سے ابھارا جاتا ہے۔ اس نے مجھے یوگا کے ایک اشٹان میں بتلادیا۔ آہستہ پالشی مارکر۔ دونوں ہاتھ سامنے گھٹنوں پر اور کمر بالکل سیدھی گردن اڑی ہوئی۔ وہ خود بھی اسی پوجہ میں تھا اور مجھے مخصوص انداز میں سانس لینے کو بتا رہا تھا۔

مارشل آرٹس کی تربیت کے دوران میں بہت سی گھٹنیاں برداشت کرنا پڑی ہیں اس پوزیشن میں تو آدھے گھٹنے سے زیادہ نہیں بیٹھ سکا۔ میری نتھنے کی طرح اڑی ہوئی کزور خود بخود جھکنے لگی۔ ایک ہفتہ گزرا۔ ابھی میری یہی تربیت جاری تھی۔ ابھی میرا پوجہ ریکٹ نہیں ہو سکا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آگے چل کر یہ تربیت کس قدر کٹھن ثابت ہوگی۔

اس روز شام کو ٹریننگ ختم ہونے کے بعد میں نے ایک سوال کیا تو پکولہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آج کے دور میں تو میں کسی کے بارے میں نہیں جانتا۔ اٹھارہ میں سال پہلے امریکا کے جیمز لین ہائی فیس میں کیری نام کی ایک ایسی لڑکی موجود تھی جو اس قسم کی پراسرار قوتوں کی مالک تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کیری کے بارے میں بتانے لگا۔

کیری کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ باپ بڑا غم پیڑ۔ شرابی اور جوا ری تھا۔ ماں کفر تھم کی مذہبی عورت تھی۔ کیری کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ اس وقت صرف تین سال کی تھی۔

بد صورت ہونے کے ساتھ اسے دوسری محرومیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اسے چڑھنا پڑنا تھا۔ اس سے زیادہ بد مزاج اور چڑچڑی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر کڑی پینٹ کر رکھ دیتی۔

بچی کی یہ پراسرار قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے اسے حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ پراسرار قوت کیری میں بھی تھی لیکن کیری کو اس کے لیے کوئی محنت نہ تھی۔ اسے یہ قوت خود بخود حاصل ہو گئی تھی اور اس کا انوکھا رخ نفس انفاق سے ہوا تھا۔

اس روز وہ اپنی ماں کے ساتھ جمنی جاسے اپنی رہی تھی۔ اسے توڑی دیر پہلے وہ اپنی ماں کے ہاتھوں پر طبع پختہ ہو چکی تھی۔ جتنے ہوئے کیری کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش کہ ماں کے ہاتھ سے چائے کا پک بھوٹ جائے اور اس کے کپڑوں کا بیڑا غرق ہو جائے۔ اس نے کپ کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے چائے کا پک ماں کے ہاتھ سے بھوٹ گیا اور اس کے سنے کپڑوں کا ستیاناس ہو گیا۔

کیری چونک گئی۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتی ہے۔ وہ اس قوت کو ابھارنے کے لیے پریکٹس کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی قوت چلا ہو چکی تھی کہ وہ اپنی نظروں سے ہماری سے ہماری چیز کو اس کی جگہ سے حرکت دے سکتی تھی۔ وہ کھانے کی میز کو اس کی جگہ سے فٹ اور اٹھا دیتی۔ ہماری مسیروں کو ہاتھ لگاتے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی۔

اور پھر کیری کو اپنے اندر موجود ایک اور پراسرار قوت کا احساس ہوا۔ یہ قوت اس کے دماغ میں تھی۔ وہ اپنی سوچ سے ایسے کام لے سکتی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک روز ماں سے ڈانٹ پڑی تو اس نے اپنی سوچ سے کام لے کر اپنے مکان کی چھت پر پتھروں کی بارش کروادی۔ لطف کی بات تو یہ کہ بڑوس کے کسی مکان پر ایک چتر بھی نہیں گرا تھا۔

کیری کی یہ صورت حال لوگوں سے عجیب نہیں رہ سکتی تھی۔ کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں پھیلنے لگیں۔ نفسیات اور مختلف علوم کے ماہرین جیمز لین ہائی فیس میں جتنے جتنے کے طبی معائنے اور نفسیاتی تجزیے ہوتے رہے لیکن ماہرین کو نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

کیری جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، اس کی اس پراسرار قوت بھی اضافہ ہوتا گیا۔ بد صورت ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں اس کا مذاق اڑاتے۔ اسکول میں بھی وہ اس مذاق کا نشانہ بن جاتی تھی۔ اس کے دل میں دوسروں کے لیے نفرت بڑھتی رہتی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں اسکول کی سالانہ تقریب تھی۔ بہت بڑے سالانہ

لوگ جمع تھے۔ کیری اسٹیج پر تھی۔ اسے اسکول کی طرف بکھڑا دیکھنے والا تھا۔ دوست اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس نے ایک ٹوکے سے اس پر رنگ کی پانی انڈیل دی تو اس کی اور بیک ایک جواب دے گئی۔ کیری نے اپنے اندر کی اس نوجوان طاقت کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بار اس قوت کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ قہقہے کے لوگوں سے اپنی توجہ کا بدلہ لیا جائے۔

ماں بلالہ اور آرائشی برقی قمقمے لگے ہوئے تھے۔ کیری نے ماں میں داخلہ دیکھا۔ بجلی کے تار ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ فٹن اٹھا کر اور دیکھا۔ بجلی کو تو کھلی بج گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر ایک کونے میں آگ گئی تو کھلی بج گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر ایک کونے میں آگ گئی تو کھلی بج گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر ایک کونے میں آگ گئی تو کھلی بج گئی۔

کیری ایک دوواڑے کے سامنے پہنچی تو دوواڑہ خود بخود کھل گیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی باہر آگئے لیکن پھر فوراً ہی دوواڑہ بند ہو گیا۔ ماں میں آگ بجھتی جاری تھی۔ کیری نے غارت کو پوری طرح پلٹ میں لے لیا۔ لوگ دوواڑے اور کھلیاں توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں سائین بجاتی ہوئی اس کی طرف دوڑ رہی تھیں۔

کیری کی نفرت نقطہ موجود پر تھی۔ اس کی نظریں اور دماغی قوت پوری طرح کام کر رہی تھی۔ اسکول کی غارت کے آس پاس تمام پائڈنٹ ٹوٹ گئے تھے۔ پانی سڑکوں پر پھیل رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کو آگ بجھانے کے لیے پانی نہیں مل سکا۔ آگ دوسری غارتوں تک پھیل گئی تھی۔

پورے قہقہے میں بجلی کے تار ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پانی کی پائپ لائنیں پھٹ گئی تھیں۔ آگ اور پانی۔ قہقہے کی سڑکوں پر پانی کا غلغلہ آگ غارتوں کو پلٹ میں لے رہی تھی۔ قیامت مہترا کا منظر قلم چیتے چلاتے ہوئے لوگ پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ آس پاس کے قہقہوں میں فائر بریگیڈ کی گاڑیاں طلب کی گئی تھیں مگر آگ بجھتی گئی۔

جیمز لین قہقہہ راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ ساتھ افراد موت کا شکار ہوئے تھے اور بیکروں نے غمی ہوئے تھے۔ قہقہے سے کچھ دور ایک نیلے رنگ کی لاش بھی لی تھی۔ اس کی موت دماغ کی نہیں پھٹ جانے سے واقع ہوئی تھی۔

”بچی کی قوت بڑی خوف ناک ہے۔“ پکولہ ربا تھا۔ کیری نے قوت خود بخود ابھار کر تھی لیکن اس نے اسے متنی انداز میں استعمال کیا۔ جس نے ایک قہقہہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا لیکن اگر اس قوت کو جیت انداز میں استعمال کیا جائے تو اس سے بڑے بڑے کام لے جاسکتے ہیں۔“

بیٹھا تو بعض اوقات یوں لگتا جیسے پھپھڑے پھٹ جائیں گے۔ اب میں بیٹھیں چاہیں منٹ تک بالکل سیدھا بیٹھ سکتا تھا۔ اس دوران میں مجھے یہ بھی اطلاع ملی کہ شوفاک کو واٹ سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ اس واٹ کا منقسم تھا۔ یہاں لاکھوں ڈالر کے نذرانے جمع ہوتے تھے اور ان سب کا حساب رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ واٹ میں دونا دونا ہونے والے ان واقعات کے بعد واٹ کا حساب بھی چیک کیا گیا تو بڑی بے قاعدگیوں کا انکشاف ہوا۔ جس بنا پر اسے واٹ سے نکال دیا گیا تھا۔

مزید ایک ہفتہ گزرا۔ تھائی واک اب پوری طرح صحت یاب ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے بیسی چمک اور رخساروں پر سرخی اب گئی تھی۔

اس روز شام کے کچھ بعد ہم برآمدے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ گھانٹی والے راستے سے دو آدمی اوپر آگئے۔ ان کے چلنے بھی ہمارے ان دو آدمیوں سے مختلف نہیں تھے جو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ رنگوٹی تھا۔ اسے میں نے عرصہ پہلے ہمارا راج کے بتناؤں میں دیکھا تھا۔

”ہمارا راج نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا کر دوبارہ ہنگام پہنچا دیا جائے۔“ رنگوٹی نے مجھے بو کرتے ہوئے کہا۔

”آج صبح فون پر ہمارا راج سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے تو ایسا کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ پروگرام اچانک ہی بنا ہے۔“ رنگوٹی نے جواب دیا۔ ”دراصل ٹانگیر کو ہمارے اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ آج رات کسی وقت یہاں حملہ کر سکتے ہیں اس لیے تم لوگوں کو یہاں سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔ اگر تمہیں کچھ پر کوئی شبہ ہو تو فون پر ہمارا راج سے تصدیق کر سکتے ہو۔“

میں چند لمحے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کمرے میں آگیا جہاں فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسپور اٹھا کر نمبر طماننا تھا تو پتا چلا کہ فون ڈیڑھ ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ کریڈل ٹیپ کیا لیکن لائن میں جان پیدا نہیں ہوئی۔ میں ریسپور رکھ کر باہر آگیا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رنگوٹی کے ساتھ اس عک سے چٹائی راستے پر اتر رہے تھے۔

وہ نیلے رنگ کی بندوبست تھی جس کے شیشوں پر سیاہ شیش گلی ہوئی تھیں۔ دین کے اندر سے ہم تو باہر دیکھ سکتے تھے لیکن باہر سے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ ڈرائیو تک سیٹ پر ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ رنگوٹی کا سامنے ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھا تھا اور رنگوٹی پچھلے حصے میں ہمارے ساتھ۔

دین چان بوری شمرے ہوتے ہوئے ہائی وے پر ابھی اور پھر ہائی وے تھری پر مرکز تیز رفتاری سے ہنگام کی طرف دوڑنے لگی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہم بنگالک شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ دین وکرنی مونونٹ کے قریب سے ہوتی ہوئی دو گھنٹہ روڈ کی طرف مڑتی اور پھر کبھی ہی دیر بعد سوئے ابری دن پر گھوم کر ایک کالج کے سامنے رک گئی۔ بارن بجائے پر گیت کھل گیا اور دین اندر آکر پورے میں رک گئی۔

دین سے اترتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ رنگینی کے دونوں ساتھی باہری رک گئے تھے جبکہ رنگینی ہمیں لے کر ایک کمرے میں آگیا۔ یہ وسیع و عریض کراچی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر دیز کالین بچھا ہوا تھا۔ ایک دیوار پر بڑے سے فریم میں خیم عراں عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور جسم پر چوخیال سی رنگینی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ مہاراج کا تعلق کسی ایسی جگہ سے نہیں ہو سکتا تھا جس اس طرح کا پڑ آسانش و چیتی فرنیچر ہو اور کسی عورت کی ایسی عراں تصویر لگی ہوئی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی پسینہ آنے لگا۔

”تم لوگ آرام سے بیٹو۔“ رنگینی نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہائپر وچن یہاں موجود ہے میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔“

رنگینی کمرے سے نکل گیا۔ میں ”زس شینز اور تھائی وائنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ شینز کو تو شاید کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن تھائی وائنگ کی آنکھوں میں ابھرنے کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد راجداری میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ دو داڑھ کھلا اور تین آوی اندر داخل ہوئے۔ ایک رنگینی تھا دوسرا اس کا دی ساتھی تھا جو ہمارے ساتھ آیا تھا اور تیسرے کو دیکھ کر میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

وہ خاتہ کا معمول مستم۔۔۔ شرفانگ تھا۔



میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تھا بلکہ میں دھوکا کھایا تھا۔ رنگینی کو عرصہ پہلے میں نے مہاراج کے جنازہ میں دیکھا تھا اور پھاڑی والے مکان پر اسے دیکھ کر یہی سمجھا تھا کہ وہ اب بھی مہاراج کے کیمپ میں ہے لیکن یہ بھول گیا تھا کہ یہاں وفاداریاں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی پیسے کے لیے لوگ اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں۔

شرفانگ نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے ایک ایسے آدمی کو سمجھا تھا جس پر شبہ نہ کیا جاسکے اور اس سے پہلے ٹیلی فون کی لائن کبیس سے کاٹ دی گئی تھی۔ رنگینی نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر مہاراج سے تصدیق کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ٹیلی فون پر رابطہ نہیں ہو سکے گا۔

میں اپنے آپ میں اس وقت سے کچھ بے چینی سی محسوس

کرتے لگا تھا جب ہم ان کے ساتھ پھاڑی والے مکان سے روانہ ہوئے تھے اور تھائی وائنگ ہم غالباً کسی ایسی ہی کیفیت میں جھلکتی تھی اور اب شرفانگ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

اس کے جسم پر لباس تو دبی بکھڑوں والا تھا۔ پیچھے ہارے کے تین ٹکڑے۔ ایک جسم کا بچلا حصہ ڈھانپنے کے لیے دو سرادریائی حصے کے لیے۔ تیسرا جسم کے اوپر والے حصے کو بچانے کے لیے۔ وقت ضرورت سر کو بھی ڈھانپ سکے۔ بکھڑا عام طور پر بہت سنی قسم کا کپڑا استعمال کرتے ہیں لیکن شرفانگ اور بعض دوسرے بکھڑوں کے جسم پر میں نے پیش کشی کپڑا دیکھا تھا۔ جو آٹا چٹا وغیرہ استعمال کرنا بھی بکھڑوں کے لیے منہا تھا لیکن شرفانگ نے بیروں میں اس وقت سیاہ ٹھل کے خوب صورت سلیمہ نظر آ رہے تھے۔

اس کے ہونٹوں پر بڑی کھردری سی مسکراہٹ اور چہرے پر خفاہٹ تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شینز اور تھائی وائنگ نے بھی میری تھلید کی تھی۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ شینز کو بھی اب صورت حال کی گھنٹی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی ڈھری تھیں۔

”مہاراج کے چہرے!“ شرفانگ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لیے میں زہر بھرا ہوا تھا ”تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے تھے اور وہ مہاراج! وہ تو اپنے آپ کو واقعی مہاراج سمجھ بیٹا ہے۔ چند غٹھوں کو اپنے ارد گرد روج کر کے وہ اپنے آپ کو بہت طاقتور سمجھنے لگا ہے۔ شاید وہ بھول گیا ہے کہ ٹھلے پر دھاگی ہوتا ہے۔ لیکن آج کے بعد اس کا راج بات ختم ہو جائے گا۔ میں اسے اپنے سامنے ٹھٹھٹھ کرے پر مجبور کروں گا اور تم۔۔۔ تمہیں ایسی سزا ملے گی کہ نہ ہر سکوے اور نہ ہی سکوے گا۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے شرفانگ۔“ میں نے کہا ”تمہیں مجھے تھے کہ میں تمہاری جگہ لینا چاہتا ہوں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بکھڑو نہیں ہوں۔ میرا تو تمہارے مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسی صورت میں، میں تمہاری جگہ کیسے لے سکتا تھا۔ مجھے تو یہاں صرف بکھڑوں کی مارشل آرٹ کی ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میرا وائٹ کے معاملات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

”میری تو فاسر کی بات ہے کہ ایک ایسے شخص کو ہم پر مہلا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس کا ہمارے دھرم سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔“ شرفانگ نے کہا ”میں جانتا ہوں۔ مہاراج کو ہم اس دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ ہماری دھرمی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہمارے تاکہ بنگالک کی تمام خاتہا ہوں پر قبضہ کر سکے۔ یہ خاتہا بہت جلد ہمارے ہونے کی گاہیں ہیں۔ یہاں دو داڑھ کو داڑھ بھات کے خزانے چڑھائے جاتے ہیں اور مہاراج سوئے کی ان

تھل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اگر اس میں سے تھوڑا سا تھل کر لیا تو اسے ناگوار گزرا اور دھرمی کو تسلیم کے ذریعے سے وصول کر لیا۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔ اگر تم نہ مجھے بے طرف کر دیتا۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوتا جس پر مجھے تو میرا یہ سلسلہ چل رہا تھا اور وہ منصوبہ بھی ناکام نہ ہوتا جس پر میں نے اپنی محنت کی تھی مگر تمہاری مداخلت سے ساری محنت پر پانی پڑ گیا۔“

”کون سا منصوبہ؟“ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ”مہاراج پڑھا کے مجھے سے سونا چرانے کا منصوبہ۔“ شرفانگ نے کہا ”منصوبہ دراصل میرا ہی تھا۔ میں نے ہی ٹائیکر کو اس رات کے صفحے وغیرہ فراہم کیے تھے تاکہ انہیں نالے میں ٹھیک جگہ پر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ہم میں فحشی فحشی معاملہ لے رہا تھا۔ اگر وہ مجھے کے اندر کا سارو ناکال کر لے جاتے تو اس میں سے آٹھ گھنٹے ملنا لیکن کچھ اس کے آدمیوں کی حماقت اور کچھ تمہاری چالاکی کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور پھر دوسرے روز میں نے ہی ٹائیکر کو اطلاع بھجوائی تھی کہ تم وائٹ کے کیمپ کے سامنے کھڑے عقیدت مندوں کو درجن دے رہے ہو۔ وہ گورنر اس نے تمہیں بھجوا دیا تھا جس میں طاقتور و نام نہان نصب تھا۔ خیال ہی نہیں تھا کہ ہم پیسے کا تو تمہارے جسم کے پھولے اڑ جائیں گے مگر تمہیں کبھی اس طرح اس مرتبہ بھی نہ گئے اور اس کے دو تین دن بعد وائٹ کے حساب میں بے قاعدگیوں کی وجہ سے مجھے بھی بے طرف کر دیا گیا۔ میں مہاراج سے انتقام لینے کے لیے مروج کی تلاش میں تھا۔ اس نے پہلے بھی میرے ساتھ بڑی ناپائیداری کی تھی۔ مہاراج کو شاید یہ شبہ ہو گیا تھا کہ وائٹ میں رہتے ہوئے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے گی اس لیے تمہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا لیکن پورے باہر دن کی کوشش سے میں نے پتا چلایا کہ تم کہاں ہو اور اب دیکھ لو۔ تم میرے سامنے کھڑے ہو۔“

میرے دماغ میں سنسنہاٹ ہی ہو رہی تھی۔ مہاراج نے اس روز ٹھیک ہی کہا تھا کہ شرفانگ بہت کینہ پرور اور سازشی آدمی تھا۔ یہ انکشاف میرے لیے واقعی بڑا مشتعلی خیز تھا کہ بڑھاکے مجھے سے سونے کی چوری کا منصوبہ اس نے بنایا تھا۔ تھائی وائنگ کے ساتھ رہتے ہوئے میں بدھ مت اور خصوصاً بکھڑوں کے بارے میں غور و بات جان چکا تھا۔ بڑھاکا پیر وکار کوئی بھی شخص بکھڑو نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے ذات پات یا رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں۔ البتہ چند شرائط پر پورا اترنا اس کے لیے ضروری ہے۔ باپ کا قاتل نہ ہو اور چھت چھات کی کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ بکھڑو بن جانے کے بعد بھی اس کے لیے چند باتوں پر کاربند رہنا ضروری ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ محنت مزدوری یا کوئی اور کام دھندا نہ کرے۔ دوسروں کی کمائی پر عیش کرے یعنی کھانا مانگ کر کھائے۔ کی کو قتل نہ کرے۔ چوری نہ کرے۔ جھوٹ نہ بولے۔ زنا نہ کرے۔ بلکہ عورت کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ رقص و موسیقی سے دور

رہے۔ کوئی نشہ آور چیز استعمال نہ کرے اور دوسرے کے بعد کھانا نہیں کھائے۔ اگر انہی اور آرام وہ جگہ پر مت بیٹھے اور کسی سے بیک میں بھی سونا چاندی قبول نہ کرے۔

میں طویل عرصے سے بکھڑوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ بہت کم ایسے بکھڑو دیکھے تھے جو واقعی ان رہبانہ اصولوں پر عمل پیرا تھے۔ جبکہ اکثریت ایسے بکھڑوں کی دیکھنے میں آتی تھی جو بڑے دھڑلے سے ان اصولوں یا بڑھاکا تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ میں ٹریننگ کے دوران میں کبھیوں میں بکھڑوں کے ساتھ رہا تھا۔ وہاں بہت سے بکھڑو ایسے تھے جو دوسرے کے بعد رات کا کھانا بھی کھاتے تھے اور جھوٹ بھی بڑے دھڑلے سے بولتے تھے۔ اور شرفانگ۔ اس میں تو بدھ مت کے یہ تمام شرعی عیب موجود تھے۔

”مجھے حیرت ہے۔“ میں نے شرفانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم لاڈ پڑھا کے پیر وکار ہو رہا اب ہو۔ تمہیں تو تارک الدنیا ہونا چاہیے۔ ان سب چیزوں سے تمہارا کیا سروکار اور پھر بڑھاکے مجھے سے سونے کی چوری۔ کیا یہ گناہ نہیں؟“

”گناہ! شرفانگ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دوسرے لوگ تو عیش کریں۔ ان کے پاس دنیا کی ہر آسائش موجود ہو۔ وہ خوب صورت عورتوں سے دل بہلائیں اور ہم قاتلے کریں۔ ہم عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں تو اسے گناہ سمجھا جائے۔ اور پھر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ منوں کے حساب سے سونا اس طرح ضائع کر دیا جائے۔ لاڈ پڑھا کو سونے کی ضرورت نہیں۔ اس کی آتما یہ دیکھنے کے لیے نہیں آئے گی کہ اس کا جسم سونے میں ڈھالا گیا ہے یا کسی بقرے تر شاٹا گیا ہے۔ سونے کی ضرورت تو ہم جیسے لوگوں کو ہے تاکہ اس سے زندگی کی آسائش حاصل کی جاسکے۔ میں نے یہ سونا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کامیاب نہیں ہو سکا کوئی بات نہیں لیکن اب مجھے ایسا ایک اور موقع مل گیا ہے کہ اس سونے کی مالیت سے کئی گنا زیادہ رقم حاصل کر سکتا ہوں۔“

”کوئی اور شیطانی منصوبہ۔“ میں نے جھپٹی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اسے میری ذہانت کو۔“ شرفانگ نے کہا۔ ”شرفانگ کے ہونٹوں پر کھردہ سی مسکراہٹ آگئی۔ ”تمہاری وجہ سے ٹائیکر کو بھی بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے اور پھر اس کے دوستوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے ان کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ وہ دنیا کے ایک سرٹ سے تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ تم ان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہو۔ وہ تمہارے سر کی من مٹا علی قیمت دے سکتے ہیں۔ میں آج رات ہی ٹائیکر کو پیغام بھجوا دوں گا کہ تم میرے قبضے میں ہو۔ مجھے تمہاری من مٹا علی قیمت مل جائے گی۔ میں نے اتنی دولت جمع کر رکھی ہے کہ میری آنے والی

چار باج نلیں بھی کوئی کام کئے بغیر پیش کر سکتی ہیں۔ ہماری قوت وصول کرتے ہی میں ہندوستان چلا جاؤں گا۔ وہاں کے مندروں میں بھی بڑے بڑے جنگاری چنڈ بڑے ہیں۔ دو چار سے تو میرا رابا بھی ہے۔ میں نے یہاں سے نکلنے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔

”لیکن شاید تم ایسا نہ کر سکو۔“ میں نے کہا ”ہمارا ج کو اب تک پتا چل گیا ہو گا کہ ہمیں اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ ہمیں ہاتھ سے بھی ڈھونڈ نکالے گا اور پھر تم تا نگیر اور اس کے ساتھیوں کو نہیں جانتے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں وہ تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دیں گے۔“

”میں ایسا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ اسے دعوت دے کر یہاں بلا دوں۔“ شرفانگ نے کہا ”اس سے بات چیت دوسرے ذرائع سے ہوگی اور ہمیں اس کے حوالے اس وقت کیا جانے گا جب وہ مطلوبہ رقم میری بنائی ہوئی جگہ پر پہنچا دے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کہنے لگا ”مجھے تمہاری وجہ سے وقت سے پہلے یہاں سے بھاگنے کا پروگرام بنانا پڑا۔ مجھے واٹ کے مجھے کا سونا حاصل نہ کر سکتے کا افسوس رہے گا۔ اس وقت میرا دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ تمہارے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں لیکن میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا کیونکہ اس طرح تمہاری قیمت کم ہو جائے گی۔ البتہ تمہاری یہ دوست۔“ اس نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا ”اس دوران میں میرا دل بھلا سکتی ہے۔ اس کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل میں گد گد سی ہونے لگتی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ اس واٹ کے چند اور بھٹکوس کی نیت بھی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ اگر یہ ساری گڑبڑ نہ ہوتی تو ہم لوگ کسی رات واٹ کے خانے ہی میں اس کی دعوت اڑاتے لیکن آج یہ صرف میرا دل بھلائے گی۔“

تھائی وانگ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ ہمارے درمیان ٹیشے کے ٹاپ والی ایک کافی نیچل جاکر تھی۔ شرفانگ نے تلے قدم اٹھاتا ہوا تھائی وانگ کے سامنے پہنچ گیا۔ رنگونی اور اس کے سامنے بھی نہ راٹھلیں مان لیں۔

شرفانگ کی نظریں تھائی وانگ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور پھر اس نے اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر تھائی وانگ کے گردن کو زوردار جھکا دیا۔ قمیص کے سارے ٹخن ٹوٹ گئے اور وہ سامنے سے برہنہ ہو گئی۔

”نت۔ تم شیطان۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“ تھائی وانگ چیخی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شرفانگ کے منہ پر تموک دیا تھا۔

شرفانگ نے اچانک ہی اس کے منہ پر تھپہر مار دیا۔ تھپہر اس قدر زوردار تھا کہ تھائی وانگ چکر کر پش کے بل صوفے پر گر گئی۔ شرفانگ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ چہرے پر زورندگی سی آئی۔

وہ کپڑے کے پلو سے اپنے چہرے پر سے تموک صاف کرنے لگا۔ ”میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی ہیں۔ اپنے آپ کو بے پروا کرنے والی بھی اور تم جیسی خود سبھی لیکن کسی میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ میرے منہ پر تموک لگے۔ میں تمہارا وہ منہ کھول گا کہ تم میرے پیروں کے کونے چاٹنے پر مجبور ہو جاؤ گی لیکن میں تمہیں صاف نہیں کروں گا۔ کو مو۔“ اس نے آخری فقرہ رنگونی کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”رادھو کو بلاؤ اور اسے خانے والے کمرے میں پہنچا دو۔“

کو مو جس آدمی کا نام تھا۔ اس نے آواز دے کر رادھو کو اس آدمی کو بلا دیا جس نے ٹیٹ کھولا تھا۔ وہیں ہمیں یہاں پہنچنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ اس بات کا اندازہ لگاتے ہیں دشواری پیش نہیں آئی کہ شرفانگ کے علاوہ اس کالج میں صرف تین آدمی اور تھے۔ رنگونی کو مو اور رادھو۔

شینو ایک طرف کھڑی ہوئے ہوئے کاپ رہی تھی۔ صورت حال سے اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کے ساتھ میری بھی کچھ ہو گا جو تھائی وانگ کے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ وہ آنے والے لمحات کے تصور سے کانپ رہی تھی۔

کو مو اور رادھو نے تھائی وانگ کو ہاتھوں سے پکڑا اور اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگے۔ تھائی وانگ پوری طرح مزاحمت کر رہی تھی مگر ان مشنوں کے سامنے اس کی جیش نہیں لگی اور اسے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔

”اس کا کیا کرنا ہے؟“ رنگونی نے شینو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ آج رات بھر کے لیے تم تینوں کی ہے۔“ شرفانگ نے معنی خیز انداز میں سکرارتے ہوئے کہا ”لیکن پہلے اسے بھی خانے میں پہنچانا ہو گا۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا ”اس لڑکی کے ساتھ میں جو کچھ بھی کروں گا اس کی موجودگی میں کروں گا۔“ میں سچ واپس کھا کر گیا۔ وہ واقعی شیطان تھا۔ میں نے شینو کی طرف دیکھا۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ اس لحاظ سے بدلتا تھا جیسے جسم کا سارا خون چڑ گیا ہو۔ میں نے غماز لہو سے رادھو اور دیکھا۔ شرفانگ اور میرے پیچ میں کائی نیچل جاکر تھی۔ رنگونی بائیں طرف پانچ چھ قدم کے فاصلے پر راستہ آئے تھا۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو شاید مجھے بھی کارروائی کرنے کا موقع مل جاتا لیکن اس وقت جو صورت حال تھی اس کے پیش نظر میرے لیے کوئی موقع نہیں تھا۔

کو مو اور رادھو تھائی وانگ کو چھوڑ کر آگے شرفانگ کے اشارے پر ان دونوں نے شینو کو گرفت میں لے لیا اور رنگونی مجھے راستہ کی زد پر لے کر وہاں سے چلے گا اشارہ کیا۔ ہم اس کمرے سے نکل کر ایک شاندار بیڈ روم میں آئے۔

ایک لمبا ایسی جگہ سے آئی ہوئی تھی اور اس جگہ دیوار میں غلا ہوا دروازہ تھا۔ اس کی نظر آ رہی تھی۔

خانے کا وہ وسیع و عریض کمرہ بھی بہت شاندار تھا۔ دیز پتلی چھایا تھا۔ ایک طرف شاندار ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک دوسری طرف دو تین سیدھی پش والی کرسیاں تھیں۔ ایک دیکھ بھلی تھی اور دیواروں پر عیاں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں بھی ایسی تھیں کہ شیطان بھی دیکھ کر شرمایا جائے۔ اس رے میں چہرہ جو موجود تھی جو کسی عیاش آدمی کے کمرے میں ہونا چاہیے تھی۔

قلمی وانگ سیدھی پش والی ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ شرفانگ نے رنگونی سے راستہ لے کر مجھے زمین لے لیا اور رنگونی کا اشارہ کیا۔ اس نے مجھے دوسری کرسی پر بٹھا کر باندھ دیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ اس نے رنگونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ضرورت ہوئی تو ہمیں طلب کرلوں گا۔ میری اجازت کے بغیر نہ آنے کی کوشش مت کرنا۔“

رنگونی اور چلا گیا۔ خانے کا راستہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔ ”یہ کالج میں سے اپنی مرضی سے تھیر کر دیا تھا۔“ شرفانگ بولا ”چند وار کتوں کے سوا کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔ اس کالج میں ایسے ایسے کمالات ہیں کہ ہمیں دیکھ کر حیرت ہوگی لیکن ہمیں کالج دکھانے کے لیے نہیں لایا۔ اس وقت تو میں ایک ایسی جگہ دکھاؤں گا کہ تم دونوں کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔“ اس نے ڈسٹنگ نیچل کی اوپر والی دروازہ کھولی۔ اس میں رکھا ہوا بھل میرے علاوہ تھائی وانگ نے بھی دیکھ لیا تھا لیکن اس نے بھل نہیں نکالا۔ ریموٹ کنٹرول بھی کوئی چیز نکال کر اس نے اندازہ نہ کر سکی۔ ریموٹ کنٹرول کا رخ ایک دیوار کی طرف کر کے اس نے ٹخن دبا دیا۔ دیوار کا چار مربع فٹ کا ایک کھلا شری طرح اڑا اڑا گیا۔ اس خلا میں ایک خوب صورت لیڈی زالی رکھی ہوئی تھی۔ لیڈی کے ساتھ ہی ایک ٹیلی فون سینٹ بھی تھا۔ اس نے زالی پر زور دیا اور ٹیلی فون اٹھا کر قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور دیکھ بھلی کر نہر لے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

”شرفانگ بول رہا ہوں مسٹر تاگیر۔“ وہ ہاتھ پیٹ میں بولا ”مجھے افسوس ہے ہمارا وہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن اسے درمیان ایک اور ڈبل ہو سکتی ہے۔“ وہ چند لمحوں خاموش رہا۔ ”اس کی بات سننا بہت اچھا بھلا ہے۔“ ”گٹھ نہ دار ہو۔ میں یہ سوچ رہا ہوں۔ وہ اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ ٹھیک فٹائے گا۔ اس سے معاملہ ملے ہو جائے گا۔ وہ جو فیصلہ بھی سنا کاغذی ہو گا۔ گٹھ نہ تو پھر کل صبح گیارہ بجے میرے آدمی کا ہونے کو اس نے دیکھ کر دیا اور ہوتوں پر کمرہ سکرابٹ ہونے کو میری طرف دیکھ کر لگا۔“ ”تم آج کی رات میرے

سمان ہو۔“ وہ بولا ”مجھے امید ہے کہ کل یہ سودا ہو جائے گا اور ہمیں کل شام تک تمہارے ان دوستوں کے حوالے کر دیا جائے گا جو عرصے سے ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”اس میں شبہ نہیں کر میں اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں لیکن میں تمہیں یقین دلاؤں کہ تمہارا یہ شیطانی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔“ میں نے کہا۔ میں بالکل خوف زدہ نہیں تھا اور نہ جانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

میرے ہاتھ کر سی کی پش پر بندھے ہوئے تھے اور میں اپنی کلائیوں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہاتھوں کو اس طرح حرکت دینے سے نائیلون کی رسی ڈھیلی ہو جائے گی اور مجھے کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اس میں بھی شبہ نہیں کہ شرفانگ شیطان سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ جو شخص راہب بن کر اپنے دھرم کو دھوکا دے سکتا ہے اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس نے زالی کے نیچلے حصے میں رکھے ہوئے دی سی آر پر ایک ڈیڑی کیسٹ لگا کر ڈی آن کر دیا۔ اسکرین پر چند لمبے ڈزات سے جھلکتا رہے اور پھر فلم شروع ہو گئی۔

جذبات کو بھڑکانے والی نہایت شرمناک فلم تھی۔ مرد اور عورت شیطانی کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے ایک لمبے کو آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھائی وانگ کی کرسی کی پش پر پہنچ کر رک گیا اور پش پر بندھے ہوئے اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔

وہ تھائی وانگ کو ہاتھوں کے قبضے میں جکڑ کر آگے لے آیا اور وہ کادے کر بیڈ پر گر دیا۔ تھائی وانگ نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو شرفانگ نے اسے گرفت میں لے لیا۔ شرفانگ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا مگر تھائی وانگ مزاحمت کرتی رہی۔ اس مزاحمت میں اس کی قمیص پٹ کر جسم سے الگ ہو گئی۔ وہ اوپر سے بالکل برہنہ ہو گئی تھی۔

میں اپنے ہاتھوں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا لیکن رسی کی گرہیں کسی طرح ڈھیلی ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ رسی کی گرہ سے میری کلائیوں میں تکلیف ہونے لگی تھی لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میرا جسم پیسے میں تر ہو رہا تھا۔

تھائی وانگ شرفانگ کے ہاتھ تلے دلی ہوئی تھی۔ اس نے اچانک ہی شرفانگ کی ٹانگوں کے پیچ میں ضرب لگائی۔ شرفانگ ہلٹا ہوا آواز بنا کر الٹ گیا۔ تھائی وانگ اسے دھکیلے ہوئے انٹے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جیسے ہی بیڈ سے اتر کر شرفانگ کے پک کر اسے پکڑ لیا۔

میرے ہاتھ اگرچہ کرسی کی پش پر بندھے ہوئے تھے مگر پیر آزاد تھے اور یہ رنگونی کی بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے میرے پیر کرسی کے پاؤں کے ساتھ نہیں باندھے اور اب میں نے اس کی





وقت تھاانی دانگ بھی اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سب کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا۔

جاگنی دیوی اور تھاانی دانگ اس طرح پُرجوش انداز میں گلے ملی تھیں جیسے چھڑی ہوئی سکی بنیں طویل عرصے بعد ملی ہوں پھر جاگنی دیوی شینو کو دیکھ کر بھیچے گئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”اوسے شینو۔ تمہے تم ان کے ساتھ کیسے؟“ وہ کہتے ہوئے شینو سے لپٹ گئی۔

جاگنی دیوی ڈانکر تھی اور شینو نرس۔ ان دونوں کا تعلق ایک ہی شعبے سے تھا۔ ایک دوسرے کو اس طرح پہچان لینا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

”اس کی قسمت بھی پھوٹ گئی ہے۔“ تھاانی دانگ نے مسکراتے ہوئے کہا ”ہمارے ساتھ یہ بھی موت سے آنکھ پھٹی کھیل رہی ہے۔“

”آؤ۔ اندر کمرے میں آجاؤ۔“ جاگنی دیوی نے کہا ”گلتا ہے تم لوگ کسی بہت ہی سنگین قسم کی صورت حال سے نکل کر آ رہے ہو۔ تم لوگ کمرے میں بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں اور تم کیسے ہو مسزود جان۔“ آخری الفاظ اس نے میری طرف دیکھ کر کہے۔

میں نے سر ہلاتے ہی اتکنا کیا۔ جاگنی دیوی بچن کی طرف چلی گئی اور ہم تینوں اس کمرے میں آ گئے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دوشادہ پیش نہیں آئی تھی کہ جاگنی دیوی گھر میں ایسی ہی تھی لیکن مجھے ان کیسے میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ چند رہ میں منٹ بعد جاگنی دیوی چائے بنا کر لے آئی۔

”اس روز جو کچھ ہوا مجھے اس کا فوس ہے۔“ جاگنی دیوی نے تھاانی دانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”راجو کے بارے میں تو میں جانتی تھی کہ وہ بچاؤ اور اربابش ہے۔ اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا جن کا پیشہ سی رابڑی اور لوٹ مار تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے بھی راجو کو خانقاہ میں رہا کر دیا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ قتل و غارت جیسی وارداتوں میں بھی ملوث ہوگا۔ سب سے زیادہ دکھ تو مجھے بندو کے بارے میں جان کر ہوا تھا۔ وہ بڑھیا قبر میں پیر لگائے بیٹھی تھی لیکن لاچ میں آکر اس نے میری ساری نیکیاں بھی بھلا دیں۔ ایسے بے ضمیر لوگوں کا انجام تو یہی ہونا چاہیے تھا۔“

”اور تمہارے ساتھ کیا ہوا؟“ تھاانی دانگ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ”میرا مطلب ہے ہمارے جانے کے بعد جہیں ناٹیکر نے پویشان کیا ہوگا۔“

”ناٹیکر نے اور پولیس نے بھی۔“ جاگنی دیوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”ناٹیکر صُغر تھا کہ میں نے تم لوگوں کو پناہ دی تھی۔ کیونکہ اس رات راجو ناٹیکر کے ایک ٹائٹ کلب گیا تھا اور وہاں سے ایک آدمی کو لے کر واپس آیا تھا اور اس کے بعد وہ سب کچھ

ہوا تھا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ راجو نے وہاں ایک اور بھائی کو بتایا تھا کہ میرے گھر میں دو ایسے افراد بھیچے ہوئے ہیں جن کو ناٹیکر کو تلاش ہے اور ناٹیکر اس بات کو بنیاد رکھتے ہیں جن کو کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے میرے گھر کو تلاش بھیجی تھی لیکن یہاں سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ میرے تمام لوگوں کی موجودگی ثابت ہوئی۔ تم دونوں کے پاس سے میرے کراہے گھر نہیں بھاڑی تھی۔ وہ چند گھنٹوں کو خاموش رہے۔ میرے جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”پولیس کو بھی میں نے کیا بیان دیا کہ ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکا بندو کی میرے گھر میں آئے تھے۔ انہوں نے اسے کی زبردستی میں پرغال بنالیا تھا۔ قتلہ کسی طرح باہر نکلنے کا موقع مل گیا لیکن اس کے والدین اسے پہلے ہی ان لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ بندو نے اسے چاہا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بعد میں راجو اور اس کا بھائی بھی اسی کے ہاتھوں مارے گئے۔ تم لوگوں کو روکنے کی کوشش میں بھی زخمی ہوئی تھی۔ میری ٹانگ میں گولی ملی تھی۔“

”کیا۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”کیا ناٹیکر پولیس نے تمہارے اس جھوٹے بیان پر یقین کر لیا تھا۔“

”جھوٹ نہیں۔ یہ سچ تھا۔“ جاگنی دیوی نے کہا ”میں نے اپنے ہسپتال سے اپنی ٹانگ میں گولی ماری تھی اور ختم سے وہ گولی ہسپتال میں نکالی گئی تھی۔“ اس نے ساری اور چینی کوٹ دیا۔ ناٹیکر سے بنا دیا۔ ران پر زخم کا نشان موجود تھا جو زیادہ دیر نہیں تھا۔ جلد کے زخم والے حصے پر گھائی پن نمایاں تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر تھاانی دانگ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ میری طرف وہ بھی خاموشی میں ڈنڈا آ رہی تھی۔

”اپنے آپ کو گولی مار کر میں نے تم لوگوں پر کوئی انسان نہیں کیا تھا۔“ جاگنی دیوی کہہ رہی تھی ”اس کا سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی ہوا تھا۔ مجھے دونوں طرف سے پریشان تو کیا گیا تھا۔ بالآخر میری بات پر یقین کر کے میرا ویسا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اگر میں نے اپنے آپ کو گولی نہ ماری ہوئی تو نہ تو ناٹیکر اور نہ ہی پولیس بڑا بچھا چھوڑتی۔ ناٹیکر تو شاید مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔“ وہ چند گھنٹوں خاموش ہوئی پھر تھاانی دانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اب اس گھر میں تم لوگوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ اس گلی میں رہنے والا کوئی بچہ بھی تم لوگوں کا نہ دیکھ سکے اور یہ ذرا مشکل کام ہوگا۔“

”بس۔ ایک دو دن کی بات ہے۔“ تھاانی دانگ نے کہا ”پولیس اس کا سچ میں پتہ چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے آئی رات ناٹیکر کی تلاش میں بھی چھاپے مارے جائیں اور ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے پولیس ہمارا ج سے بھی رابطہ کرے۔ ایک دو دن بعد معاملہ ٹھنڈا ہو گا تو ہم ہمارا ج سے

کریں گے۔ وہ یقیناً ہمارے لیے کوئی مناسب بندوبست کریں گے۔“ لیکن اس مرتبہ میں ہمارا ج کے پاس نہیں جانا چاہتا۔“ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”ہمارا ج پھر کبھی کسی واث تک محدود رہے اور میں پھر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگوں گا۔ میرا خیال ہے اس دوران میں کوئی ایسا بندوبست کر لیں گے کہ محفوظ رہیں اور آزادی سے نقل و حرکت بھی کر سکیں۔“

”ایسی صورت میں میرے پاس ایک تجویز ہے۔“ جاگنی دیوی نے کہا ”دوڑا کے اس بار دانگ دنگ پائے روڈ پر میرا ایک مکان ہے جسے یاد ہے میں نے وہ مکان تقریباً چھ سال پہلے خریدا تھا۔ بلے تو میرا خیال تھا کہ میں خود وہاں منتقل ہو جاؤں گی لیکن پھر وہ کرائے پر دے دیا تھا۔ تقریباً ایک مہینہ پہلے وہ مکان خالی ہوا ہے کچھ مرمت اور رنگ و روغن وغیرہ کی وجہ سے وہ مکان خالی رہا ہے۔ اس مرتبہ میرا ارادہ یہ ہے کہ وہاں اپنی ایک اور دوست نے انٹرک سے بیوی پار لکھ لوں گی لیکن اگر تم لوگ جاہو تو اس مکان میں رہ سکتے ہو۔ وہ مکان محفوظ بھی ہوگا اور تم لوگوں کو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔“

”یہ تو اور اچھی بات ہے۔“ تھاانی دانگ بولی ”ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کل ہی وہاں منتقل ہو جائیں۔“

”کل شام کے بعد۔“ جاگنی دیوی نے کہا ”کل دن میں ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچا دیں گی۔ اور پھر شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد تم لوگوں کو لے چلوں گی لیکن ابھی تم نے کسی کا بیج پر پولیس کے چھاپے کی بات کی تھی۔ کیا قصہ ہے؟“

”ایسی اصل بات ہے جو میں تمہیں بتانا بھول گئی تھی۔“ تھاانی دانگ نے کہا اور پھر اسے اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی ”فون میں نے تمہیں وہیں سے کیا تھا لیکن اس وقت کچھ بتانے کا موقع نہیں تھا۔“

”بھگوان جانے اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔“ جاگنی دیوی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”یہ تو ایسا ہے کہ اسے دل میں پھیر کر رکھا جائے اور وہ کم بخت اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔“

”میں رہے ہو وہ جان۔“ تھاانی دانگ نے شون نگاہوں سے میری طرف دیکھا ”میں نے تو اپنے دل میں تمہارے لیے اتنی جگہ بڑا رکھی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ان کی محبت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ان کی باتوں سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”چلتا اب ایسا ہے کہ اس وقت تین بیٹے والے ہیں۔“ جاگنی دیوی دوبارہ لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اب ناٹیکر آرام کر رہا۔ باقی باقی صبح ہوں گی۔“

ہم لوگ اس کمرے سے نکل آئے۔ اس مکان کے گراؤنڈ فلور پر بھی جا رہا بیچ کمرے تھے اور ہر کمرہ بندو کے طور پر آراستہ تھا۔ پچھلی مرتبہ اوپر والے کمرے دیکھے تھے۔ وہ بھی تمام بندو میں تھے۔ جاگنی دیوی یہاں رہتی تو ایسی کچھ باتیں سارے آراستہ بندو میں لگتا تھا جیسے یہ کوئی بھول یا گیت ہاؤس ہو۔

ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ والا نرس شینو کو۔ تھاانی دانگ جاگنی دیوی کے کمرے میں پہلی گئی تھی۔ میں نے دو واہ بند کر کے ٹائٹ بلب جلا دیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں پچھلے چند مہینوں کے درمیان دوتا ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شوقانک نے کس ہو شکاری سے ہمیں جان بوری کے پناہی کا بیج سے اغوا کر لیا تھا۔ ہم ایک بار پھر موت کے جال میں پھنس گئے تھے شوقانک واقعی انسان نہیں شیطان تھا۔ وہ اپنے دھرم کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔ اگر ان کا بدھاکے مجھے سے سونا چرانے کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس میں کسی بخشش کا ہاتھ ہوگا۔

ہم لوگ ایک بار پھر موت کا حصار توڑ کر بھاگ نکلے تھے اور ہماری کامیابی تھاانی دانگ کی مرہون منت تھی۔ صورت حال نہایت سنگین ہونے کے باوجود اس نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے ایک اور بات واضح ہو گئی تھی کہ عورت کو تو بیشہ کمزور سمجھا گیا تھا لیکن جب اس کے اندر کی عورت جاگنی ہے تو وہ پھر بھی ہوئی شیری بن جاتی ہے اور پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے انتقام سے روک نہیں سکتی۔ تھاانی دانگ نے شوقانک سے اپنی توہین کا انتقام جس طرح لیا تھا وہ بہت ہی بھیاکتا تھا۔ اگر شوقانک پولیس کے آنے تک زندہ رہا ہوگا تو اس نے ضرور بتایا ہوگا کہ اس کی یہ حالت کس نے کی تھی۔

میرے ذہن میں ہمارا ج کا خیال ابھر آیا۔ اسے بھی ہمارے اغوا کا پتا چل ہی گیا ہوگا۔ اس کے آدمی ہمیں جان بوری اور ہنگام میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ہمارا ج نے میری خاطر ہمت سے لوگوں کو پناہ دینا شروع کیا تھا۔ میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ میرے اندر آخیری کیا بات تھی کہ ہمارا ج مجھ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مجھے کیا بنا جاتا تھا۔ میری حفاظت کے لیے تو وہ اب تک اسے کئی آدمی مروا چکا تھا اور پھر خانقاہ کے گیت پر ہم دھماکا۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بچ گیا تھا اور اس دھماکے میں گیارہ بے گناہ ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔

ہم دھماکے کا خیال آتے ہی اس لڑکی کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ کیسی چمک تھی اس کی آنکھوں میں اور کتنی معصومیت تھی اس کے چہرے پر لیکن اس کی معصومیت کتنے بے گناہوں کی موت کا باعث بنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس لڑکی سے سامنا ضرور ہوگا۔

آتش فشاں 190 حصہ 1

میں پتا چل گیا ہوگا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور میں زندگی بھر تم لوگوں کے ساتھ رہ نہیں سکتی۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔  
”کمال جادو کی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جیہاگ رائے“ شیونے جواب دیا ”تھائی لینڈ کے شمال میں براہی سرحد کے قریب یہ ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں سے تقریباً آٹھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع جیہاگ رائے جانے کے لیے بس تقریباً گیارہ گھنٹے کا وقت لیتا ہے۔ پون تو ہوائی جہاز سوار کھنٹے میں پہنچا دیتا ہے لیکن میں ٹرین سے جاؤں گی۔ اس میں اگرچہ وقت زیادہ لگتا ہے مگر کرایہ کم ہے۔ ہوائی جہاز یا ایئر کنڈیشنڈ بس کے کرائے کی میں محفل نہیں ہو سکتی۔“

”کرائے کی تم فکر مت کرو۔ ہم تمہیں ہوائی جہاز کا کرایہ بھی دے دیں گے لیکن کیا تم نے واقعی ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”تھائی وانگ پوری طرح صحت مند ہو چکی ہے۔ اسے اب میری ضرورت نہیں ہے۔ ویسے اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ اسے دوبارہ نشے کی لت نہ لگ جائے۔ بہر حال ایک ہفتہ کی مرہض صحت یاب ہونے کے بعد بھی دوبارہ راغب ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بات کا خیال اب تمہیں رکھنا ہے کہ وہ دوبارہ اس لغت کو اپنے قریب نہ آنے دے۔ وہ تمہارا بہت خیال کرتی ہے۔“

”ٹھیک ہے شیون۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”دیسے اگر تم چاہو تو مہاراج سے کہہ کر تمہارے لیے کوئی دوسرا بندوبست کیا جاسکتا ہے جہاں تمہیں مقول تنخواہ بھی ملے گی اور تحفظ بھی حاصل ہوگا۔“

”نہیں۔ اب مجھے جانا ہی ہوگا۔“ شیون نے کہا ”جیہاگ رائے میں میری پوزیشنیں ہاں رہیں میرے منی آرڈر کا انتظار کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی روز اسے منی آرڈر کے بجائے میری موت کی خبر ملے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”ہم کیس سیٹ ہو جائیں تو دو چار دن میں تمہارے جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بجنے والے تھے ”اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ کل دن میں بات کریں گے۔“

”مجھے اپنے کمرے میں ڈر لگ رہا ہے۔ میں تمہیں تمہارے بیڈ پر ایک طرف سو جاتی ہوں۔“ شیون نے کہا۔

”ڈر کیا۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ صبح کا دروازہ کھلا رہے۔“ میں نے کہا۔ دراصل مجھے شیون کو اپنے بیڈ پر سلائے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ شیون تھائی وانگ گیا جیہاگ پوری اسے میرے بستر پر دیکھیں اور انہیں میرے یا شیون کے بارے میں کوئی غلط بات سوچنے کا موقع ملے۔

وہ بادل ناخاستہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سچے والا دروازہ پوری طرح کھول دیا تھا۔

میں بستر لینا پہلے شیون اور پھر تھائی وانگ اور جاگی دیوی کے بارے میں سوچتا رہا۔ شیون نے ان دونوں کے بارے میں بہت دلچسپ افکاشات کیے تھے۔ جاگی دیوی کے بارے میں شیون کی باتوں سے مجھے یہ اطمینان ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی جھوٹا نہیں کرے گی اور تھائی وانگ کے بارے میں یہ افکشاف بھی بڑا دلچسپ تھا کہ اس رات وہ مجھے کس مقصد کے تحت اپنے کمرے کو لا کر آئی تھی اور اب میرے بارے میں کیا سوچتی تھی۔

دوسرے دن شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم دو باگی کے لیے تیار ہو گئے۔ جاگی دیوی نے ضرورت کی تمام چیزیں دوسرے مکان میں پکڑادی تھیں۔ اس کے پاس اپنی گاڑی تھی جسے وہ گھر سے دور کرائے کے گیارہ میں کھڑی کیا کرتی تھی۔ دن میں کئی بار لاکر ساری چیزیں اس نے اس گاڑی میں ڈھونڈی تھیں۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اس نے گاڑی کو دروازے کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔ گاڑی کے انڈر کی لائٹ ابھی ہوئی تھی۔ ہم تین بڑی احتیاط سے مکان سے نکل کر گاڑی کی کچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں شیون اور تھائی وانگ کے درمیان سینڈویچ بنا بیٹھا تھا۔ جاگی نے مکان کے دروازے کو تالا لگایا اور ڈرائیونگ میں سنبھال لی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی چار ڈریا ریو پر پار کر کے لانا روڈ پر آگئی اور کنگ کاسن کے انچھو والے چوراہے سے ہوتی ہوئی وانگ ونگ بایے روڈ پر آگئی۔ سڑک پر اس نام کا بورڈ پڑھ کر مجھے مہاراج یاد آ گئے۔ ان کا بھی یہی نام تھا۔

جاگی دیوی نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارا قاصد تو نہیں کیا جا رہا۔ اس سڑک پر تقریباً نصف میل کا فاصلہ ملے گا۔ بعد گاڑی وائیں طرف ایک اور سڑک پر مڑے گی۔ یہاں لپائی قدرے چھدری تھی۔ خوب صورت کا کچھ ہے جو ایک ”دوسرے“ سے فاصلے پر تھے۔ بالآخر جاگی دیوی نے ایک کالج کے سامنے گاڑی روک لی۔ پہلے نیچے اتر کر تھک بھولا اور پھر گاڑی کو اندر لے آئی۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ ایک بار پھر گیت کی طرف لپائی گیت بند کر کے واپس آگئی۔

کالج خاصا بڑا تھا۔ آٹھ دو تھک دو غن کی خوشبو سی ہوئی تھی۔ دو کمرے ایسے تھے جہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ سنک ڈام میں تین چار کرسیاں اور ایک بڑی کالی ٹیبل پڑی تھی۔ فرش پر قاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچن میں ایک چھوٹا فریج اور ضرورت کی چیزیں بھی تھیں۔ ہاتھ دوسری بھی ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ انتظامات آج دن میں جاگی دیوی نے کیے تھے اور اب کئی بڑی کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی تھی۔

جاگی دیوی نے آتے ہی کافی بنائی اور ہم شینگ ڈام میں بیٹھ

لیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔

”جاگی دیوی موجود ہے۔“ جاگی دیوی نے کمرے کے ایک کونے میں اٹھنڈ پر رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں زیادہ آتا جانا مناسب نہیں ہوگا لیکن اگر کوئی بات ہو تو میری چیز کی ضرورت نہ پڑے تو فون کر سکتا۔“

”ایک دو دن تک تو شاید کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے لیکن نہیں ایک اور کام کرنا ہوگا۔“ میں نے جاگی دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جاگی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ شیون ہمارے حالات سے خوف زدہ ہے۔“ میں نے جواب دیا ”جیہاگ رائے اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے برکت اور کچھ رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ کیا تم اتنی رقم کا بندوبست کر سکتی؟“

”رقم تو میرے پاس بہت ہے۔“ جاگی دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا ”جب تم لوگ میرے مکان سے بھاگے تھے تو بعد میں بندو کے مکان کی تلاش لینے پر اس کے سوٹ کیس میں سے کرنی نوٹوں کے بٹل لے گئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ بندو کے پاس اتنی بڑی رقم کمال سے آگئی۔ وہ رقم میں سے بچھا کر رکھی ہوئی ہے۔ پولیس کو ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”وہ رقم ہماری ہے۔“ تھائی وانگ جلدی سے بولی ”جب ہمارے کوئی میرے گھر پر آتے تھے تو وہاں سے بھاگتے ہوئے میں نے ہڈی میں کچھ رقم بیگ میں رکھ لی تھی اور تمہارے گھر میں وہ بیگ بھجانے کے کمرے میں تھا۔ اس رات ہم تینوں تمہارے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے بھان نے بندو کو چھپ کر ہماری باتیں سننے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بھان کو کسی گڑبڑ کا شہہ ہوا تھا اور پھر یہ سننے پر خفا کھٹکھٹا ہوا کہ میرے کمرے میں نیچے کے نیچے رکھا ہوا ہسٹل اور بھان کے کمرے میں میرے بیگ میں سے رقم غائب تھی۔ اس کے بعد ہی ہم نے جس تھانے بغیر وہاں سے بھاگنے کا فیصلہ کیا تھا اور بندو نے اٹھنا ہسٹل سے ہمیں پھت سے روکنے کی کوشش کی تھی۔“

”لہذا۔“ جاگی دیوی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا ”اس کا مطلب ہے کہ بندو شروع ہی سے اپنے نواسے کی سازش میں شریک تھی۔ بہر حال، وہ رقم میرے پاس جوں کی توں موجود ہے۔ تم نہیں لادو گی۔“

”ٹھیک جانا چاہتی ہو؟“ میں نے شیون سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ شیون نے کہا۔

”کل تو نہیں۔ میں پرسوں صبح کی فلائٹ سے تمہارے لیے پرواز کروا دوں گی۔ پہلی فلائٹ صبح سات بجے روانہ ہوتی ہے۔ آٹھ ماڑے پانچ بجے تیار رہنا۔ میں تمہیں لینے کے لیے پہنچ جائیگی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تیار طوں کی۔“ شیون نے جواب دیا۔

جاگی دیوی رات گیارہ بجے کے قریب واپس چلی گئی۔ دوسرا دن کالج ہی میں گزارا۔ دن کے وقت تو ہم کمرے سے بھی باہر نہیں نکلے تھے۔ شام کو میں نے ماسٹر ہوجن کو ٹیلی فون کیا۔

”میری آواز سن کر غائب اچھل پڑا تھا۔“

”مہاراج تمہارے لیے پریشان ہیں۔ کہاں ہو تم لوگ؟“ اس نے کہا۔

”ہم محفوظ ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”مہاراج کو بتا دیتا۔ ہم چند روز تک الگ ہی رہنا چاہتے ہیں۔“

”مہاراج تمہارے اس کارنامے پر بہت خوش ہیں اور تمہاری گشتی پر پریشان بھی۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”آج کے تمام اخبارات انہی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بمبھو شوفاگ زندہ بچ گیا ہے اور اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا ہے۔ تھائی وانگ نے اسے جو سزا دی ہے وہ اسے زندگی کے آخری لمحوں تک یاد رکھے گا۔“

”یہ کارنامہ دراصل تھائی وانگ ہی نے انجام دیا تھا۔“ میں نے کہا ”بہر حال، مہاراج کو بتا دینا کہ ہم خیریت سے ہیں۔ میں دو چار دن بعد رابطہ کروں گا اور وہاں ٹائیکر اور اس کے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟“

”پولیس ان کی تلاش میں بھی چھاپے مار رہی ہے لیکن وہ لوگ بھی مدد پویش ہیں۔“ ماسٹر ہوجن نے جواب دیا۔

”گوشلیا نے تم سے کوئی رابطہ کیا یا نہیں؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”نہیں۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”خانقاہ میں ہم دھماکے کے چند روز بعد اس نے فون کیا تھا لیکن میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ مزید چند روز تک اپنی پناہ گاہ سے باہر نہ نکلے۔ اس کے چند روز بعد میں نے خود اس کے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا تھا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا اور نہ ہی گوشلیا نے دوبارہ ہم سے رابطہ کیا ہے۔“

میں نے ماسٹر ہوجن سے گوشلیا کا وہ فون نمبر لے لیا اور فون بند کر دیا اور پھر تھائی وانگ کو ماسٹر ہوجن سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

اور پھر اس رات گیارہ بجے کے قریب جاگی دیوی کا فون آگیا کہ اس نے شیون کے لیے صبح سات بجے کی فلائٹ پر سیٹ بک کر دوالی ہے۔ وہ پانچ بجے اسے لینے کے لیے آئے گی۔ شیون کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

شیون کو اس رات نیند نہیں آئی تھی بلکہ ہم بھی جاگتے رہے تھے۔ میرے والے کمرے میں سنگل بیڈ تھا جبکہ دوسرے کمرے میں ڈبل بیڈ تھا۔ شیون اور تھائی وانگ اس بیڈ پر سویا کرتی تھیں اور اس رات ہم تینوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

جاگی دیوی صبح نیک پانچ بجے پہنچ گئی۔ کار کی ڈکی پر ایک بڑا سوت کیس بھی تھا جسے وہ اٹھا کر اندر لے آئی۔  
 ”یہ تمہارے لیے ہے شینو۔“ اس نے سوت کیس کھولتے ہوئے کہا ”میں نے اندازے سے تمہارے لیے کچھ پکڑنے خرید لیے ہیں اور کچھ تحائف ہیں۔ تمہارے لیے اور تمہاری والدہ کے لیے۔“

شینو بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ جاگی دیوی نے پکڑے کا ایک تحفہ تھائی وانگ کی طرف بڑھا دیا۔  
 ”وہ ساری رقم اس میں جوں کی توں موجود ہے۔“ اس نے کہا۔

تھائی وانگ نے تحفہ کھولا اور نوٹوں کے چند ہنڈل نکال کر شینو کے حوالے کر دیے۔  
 ”لو یہ رکھ لو۔“ وہ بولی ”یہ اتنی رقم ہے کہ تم کئی مہینے کام کیے بغیر آرام سے گزار سکتی ہو۔“

فرط ہنڈاتے سے شینو کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے یہاں سے اتنی محبت ملے گی۔ وہ تھائی وانگ سے لپٹ گئی۔

”میں تمہارے لیے ناشتا بنائی ہوں۔ ہم آخری بار اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کریں گے۔“ تھائی وانگ نے اس کا کندھا چھتھپاتے ہوئے اسے اپنے سے الگ کیا۔

شینو اب جاگی دیوی سے لپٹ گئی تھی اور پھر اس نے مجھے بھی گرفت میں لے کر میری پیشانی پر بوسے دیے۔

تھائی وانگ ناشتا بنا کر لے آئی۔ ہم سب نے بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر شینو جاگی دیوی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

ان کے جانے کے بعد میں جو سوچا ہوں تو دن کے ساڑھے گیارہ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں اپنے کمرے سے اٹھا تو تھائی وانگ بھی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ ہم دونوں ابھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ کس کا فون ہو سکتا تھا؟

”شاید جاگی کا فون ہو۔“ تھائی وانگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے ریسور اٹھایا اور پھر دوسری طرف کی آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔  
 ”شینو کا فون ہے۔ چنانچہ رائے ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر فون پر باتیں کرنے لگی۔

دو تین منٹ بعد اس نے فون بند کر دیا اور شینو سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگی۔

میں بھی تھائی وانگ کے ساتھ اس کے کمرے میں آگیا۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر تھائی وانگ کھانا تیار کرنے

کے لیے کچن میں چلی گئی۔

ہم تین دن اس کانچ میں محصور رہے۔ اس دوران میں باہر ہو چنے سے بھی ایک مرتبہ فون پر رابطہ ہوا تھا۔ اس تین دنوں کے دوران میں جاگی دیوی نے بھی اوپر کا رخ نہیں کیا تھا البتہ فون پر رابطہ رکھا تھا۔

اس شام مجھے اچانک ہی کوشیا کا خیال آگیا۔ میں نے باہر ہو چنے سے اس کا فون نمبر لے کر نوٹ کر رکھا تھا۔ میں نے اس فون پر فون کیا۔ دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر کال ریسپونس نہیں کی۔ کچھ فون کے قریب ہی وہ ڈائریکٹریاں بھی رکھی ہوئیں تھیں اور اتفاق سے ان میں ایک نمبر نیکل ڈائریکٹری تھی۔ تھائی وانگ اس ڈائریکٹری میں وہ نمبر تلاش کرنے لگا۔

وہ نمبر براتو نام ڈسٹرکٹ میں سوگ تھری اسٹریٹ پر واقع ایک فلیٹ کا تھا اور یہ ٹیلی فون کسی راجا دھمی کے نام پر تھا۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ راجا دھمی کوئی عورت تھی یا مرد۔ بہر حال تھائی وانگ نے وہ ایڈریس ایک کانڈ پر نوٹ کر لیا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔“ میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس طرح ہم کب تک بند ہو کر بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں کچھ نہ بیکہ کرنا ہوگا۔“

”لیکن اس حالت میں ہم باہر نہیں نکل سکتے۔ فوراً پہچان لے جائیں گے۔“ تھائی وانگ نے کہا ”وہیے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ میں جاگی دیوی کو فون کرتی ہوں۔ وہ کچھ چیزیں لے آئے تو ہم اپنا چیلہ تبدیل کر سکتے ہیں۔“

اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ فون کا ریسور اٹھا کر جاگی دیوی کا نمبر ملانے لگی۔

اس رات گیارہ بجے کے قریب جاگی دیوی مطلوبہ چیزیں لے کر آگئی۔ ان میں ہمارے لیے پکڑے تھے اور کچھ اور چیزیں جنہیں چیلہ تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

اس سے اگلے روز رات نو بجے کے قریب ہم اس کانچ سے باہر نکلے۔ ہمارے ملے ایسے تھے کہ ہمیں آسانی سے شناخت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں اسٹریٹ پر آتی ہی ہمیں ایک عیسائی لڑکی۔ جھپلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھائی وانگ نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے ہوٹل اندراجت کا نام لے دیا تھا۔

جیسی ہم نے سوئے اندراج کے موڈ پر چھوڑ دی اور جب ہم ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہونے لگے تو گیٹ پر کھڑا اور دبان بٹکا دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ ہم دونوں کے چیلے غیر ملکی نہیں جیسے تھے اور اس شرمیں مہیوں کی کمی نہیں تھی۔

کئی روز بعد ہم نے ڈسٹک کا کھانا کھایا اور شربیات چنے ہوٹل سے نکل کر کچھ آگے ایک سگریٹ فروش کی دکان تک غافل وانگ اس دکان میں داخل ہو گئی اور سگریٹ کا پیک خرید کر

کھانے پر نکلے ہوئے بجے کے نوٹوں کا ایک ہنڈل نکال لیا۔ دکان میں دو ادبائش قسم کے نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ تھائی وانگ کے جسم پر لباس بہت مختصر تھا۔ ٹیکسٹ ایڈجی تھی جس سے وانگ کا تھیں اور تک برہنہ ہو رہی تھیں۔ اور بلاؤز بھی بہت مختصر تھا۔ وہ دونوں ادبائش قسم کے نوجوان تھائی وانگ کی طرف دیکھتے رہے اور جب تھائی وانگ نے ٹیک میں سے نوٹوں کا ہنڈل نکالا تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرنے لگی تھی۔ ان دونوں نے سستی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جس کا مجھے سمجھ میں دیر نہیں لگی کہ ان کی بیٹیوں میں فتور آگیا ہے۔

ہم کان سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے سوگ تھری اسٹریٹ میں داخل ہو گئے۔ یہ کشادہ گلی تھی جس کے دونوں طرف بلند عمارتیں تھیں۔ ہمیں مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

عمارت کے گیٹ پر کوئی دربان وغیرہ نہیں تھا۔ ہم اندر داخل ہو کر دو پارہ لگے ہوئے اس بورڈ کو دیکھنے لگے جس پر طور وانز لپٹن کے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ بعض نمبروں کے سامنے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ ہمارا مطلوبہ فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس عمارت میں آف تو موجود تھی لیکن وہ خراب تھی۔ لوگ زخموں ہی سے تباہ رہتے تھے۔ زینے پر آتے جاتے لوگ عجیب سی نظروں سے گزاری طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ فلیٹ تیسری منزل کی راجا دھمی کے آخری سرے پر تھا۔ دروازے پر دو مرتبہ ڈسٹک دھک دھک کوئی جواب نہیں ملا۔ اس دوران میں سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکل کر ہالی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے جسم پر ساری دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہندو تھی۔

”کس سے ملنا ہے۔ یہ فلیٹ کئی روز سے خالی ہے۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔“ اس عورت نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کوشیا۔ اس نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ کئی روز پہلے۔“

تھائی وانگ نے پکڑے ہوئے لمبے میں کہا۔

”وہ کب کبائنگ والی لڑکی جو ٹائٹ کلبوں میں پروگرام کرتی تھی۔“ اس عورت نے کہا ”وہ چند روز میلا رہی تھی مگر کئی روز پہلائی بن کے ساتھ چلی گئی۔“

”میں کے نام پر میں جو تھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کوشیا کی ایک بڑی بہن بھی ہے جو سوگم وٹ روڈ پر واقع کسی تہہ اسٹور پر سیکڑ گلی کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ مجھے اس اسٹور کا نام یاد آگیا۔“

جب ہم اس عمارت سے باہر نکلے تو سگریٹ فروش کی دکان سے غائب ہونے والے وہ دونوں غنڈے گلی میں موجود تھے۔ میں ان کو کچھ دیکھا کہ وہ تھائی وانگ کے پاس ایک بڑی رقم دیکھ کر

ہمارے پیچھے لگے تھے۔ ان سے نمٹنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر میں کوئی بگاڑ نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تھائی وانگ سے سرکوشی کی ادھم دوبارہ اس عمارت میں داخل ہو گئے اور کچھ ہی دیر بعد ہم اس عمارت کے عقبی دروازے سے نکل رہے تھے۔ اس طرف چند کڑکا فاصلہ طے کرتے ہی ایک خالی ٹک ٹک مل گیا۔ ہم نے ٹک ٹک پر بیٹھے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہا مگر وہ غنڈے نظر نہیں آئے شاید وہ اب بھی عمارت کے سامنے والے رخ پر کھڑے تھے۔

سوگم وٹ روڈ کی ایک ذیلی اسٹریٹ سونے فانیو پر وہ اسٹور تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ شہر کا سب سے باوقف علاقہ تھا۔ بڑے بڑے اسٹورز اس علاقے میں تھے یہاں ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کی بھی بھرمار تھی۔ اسٹورز گیارہ بجے تک بند ہو جاتے تھے مگر ہوٹل اور ریسٹورانٹ رات بھر کھلے رہتے تھے۔ جن کی وجہ سے رات کے ٹک یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔

وہ اسٹور بند ہو رہا تھا لیکن کوشیا کی بہن شانتی سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی شکل بڑی حد تک کوشیا سے ملتی جلتی تھی لیکن عمر میں تقریباً دس سال کا فرق تھا۔

”تم لوگ کون ہو۔ کوشیا سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف گھورتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

”اس سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ تمہیں نہیں بتا سکتے۔“ میں نے کہا۔

”وہ اپنی جان بچانے کے خوف سے جھوٹی بھڑکی ہے۔ میں خود اس کے لیے پریشان ہوں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہوگی۔ ویسے تم لوگوں کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”دیکھو شانتی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”مجھے معلوم ہے کہ چند روز پہلے تم اسے سوگ تھری اسٹریٹ والے فلیٹ سے لے گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔“

”مکون ہو تم؟“ شانتی چو تک گئی۔

”اس کا دوست۔“ میں نے جواب دیا۔

”کل بھی ایک آدمی اسے پوچھتا ہوا آیا تھا۔ اس نے بھی اسے آپ کو کوشیا کا دوست کہا تھا لیکن میں اس کی باتوں ہی سے سمجھ گئی تھی کہ وہ دوست نہیں ہو سکتا۔ اسے بھی میں نے یہی جواب دیا تھا کہ میں کوشیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ شانتی نے کہا۔

”میں واقعی اس کا دوست ہوں۔ سماراج کا آدمی۔“ میں نے کہا ”اگر تم چاہو تو سماراج کے جتنا زہم میں باسٹرو ہونے کو فون کر کے میرے بارے میں تصدیق کر سکتی ہو۔ میرا نام ودان ہے۔“  
 ”وہ... ودان۔“ وہ ہلکا کر رہ گئی ”وہ تم ہو جس کی وجہ سے کوشیا بھی مصیبت میں مبتلا ہے۔ تمہاری وجہ سے...“

”اور میں ہی اسے اس معصیت سے نکالنا چاہتا ہوں۔ جس میں وہ خود پھنسی تھی۔ بہر حال، یہاں کھڑے ہو کر باتیں نہیں ہو سکتیں۔ اگر تم کو شلیا کے بارے میں جانتی ہو تو ہمیں بتا دو۔“ میں نے کہا۔

وہ چند لمبے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی ”مگر ہمیں کیسے پتا چلا کہ وہ سوگ قہری اسٹریٹ والے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔“

”چند روز پہلے اس نے اسٹریٹ پر چن کر اپنا فون نمبر لکھوایا تھا۔ بعد میں اسٹریٹ پر چننے والے فون کیا مگر کارڈ نہیں دیا۔ اس وقت ہم اسی فلیٹ میں گئے تھے۔ سامنے والی پر دوسرے تینا کا کہہ کر شلیا کو اس کی بننے والی تھی ہم اس لیے ہمارے پاس آئے ہیں۔ یقین کرو ہم اس کے دوست ہیں اور ہمارا جی بھی اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ہم اس وقت دکان کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم تینوں جھٹکا گھول سے اُدھر اُدھر کی بجلی گھر رہے تھے۔

شانتی چند لمبے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ہمارا ٹیکسی کا سفر سوئے نوئی ٹو پر ختم ہو گیا۔ ٹیکسی کا کرایہ تھائی وانگ نے ادا کیا۔

وہ بلڈنگ سات منزلہ تھی اور شانتی کا فلیٹ آخری منزل پر تھا۔ ہم لفٹ سے باہر نکل کر شانتی کے پیچھے چلے ہوئے ایک فلیٹ کے سامنے رک گئے۔ شانتی نے دو منزلہ تیل بجائی گردووازہ نہیں کھلا۔ اس نے اپنے بیک سے چابی نکال کر تالا کھولا اور دھکا دے کر دووازہ کھول دیا۔

”کو شلیا۔ کہاں ہو تم؟ دیکھو کون آیا ہے۔“ وہ آواز دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

تھائی وانگ اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی چل رہے تھے۔ مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی لڑ بڑو۔ شانتی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا اور جیسے ہی جی چلی گئی اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔

میں جلدی سے آگے بڑھا اور سامنے کا منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کو شلیا بیڈ پر اس طرح آڑی تر جمی ہوئی تھی کہ اس کا ایک ہر پیرچہ لٹکا ہوا تھا۔ شرر لگی ہوئی تھی اور ایک منجمد دستانے کی طرح تھی۔

کو شلیا کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ موت کے گھاٹ اُتارنے سے پہلے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہو گا۔ اس کی آنکھیں پٹی پڑی تھیں اور چہرے پر اذیت کے تاثرات نمودار ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں تھا۔ کو شلیا سوئے تھائی وانگ کی ماہر تھی۔ وہ ایک یاد تو میں نے آدھیں کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دو سے زیادہ آدمی تھے۔ افزائش کی کیفیت پر مشتمل اس کمرے میں تھی۔ میں نے کچھ چیزیں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں جیسے دھبے دھبے شقی ہوئی ہو۔

میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا جبکہ شانتی مسلسل چیخ رہی تھی۔ تھائی وانگ شانتی سے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کو شلیا سے بازو کو چھو کر دیکھا۔ بازو ٹھنڈا اور اکڑا ہوا تھا جس سے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اسے کی گئی ہے۔ پہلے قتل کیا گیا تھا۔ پھر پھر چادر پر بکھرا ہوا خون بھی جم کر سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا۔ شانتی کے چہرے کی آواز سن کر دووازے پر کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔ ایک عورت اور دو آدمی اندر آ گئے اور یہ منظر دیکھ کر کوئل بھی کانپ اٹھے۔

”آج دن میں یہاں کوئی آیا تھا؟“ میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ ”گھبراہٹ بچے کے قریب تین آدمی آئے تھے۔ میں اس وقت اپنے بچے کو لے کر دووازے میں کھڑی تھی۔“ اس عورت نے جواب دیا ”اُن میں سے ایک نے تیل بجائی تھی۔ کو شلیا نے دووازہ کھولا تو وہ چند لمبے کمرے میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے کے بعد اندر چلے گئے تھے۔ میں نے ان تینوں کو واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ آدھے گئے بعد میں بھی کسی کام سے چلی گئی تھی۔“

دو عورتیں اور اندر آ گئیں اور وہ سب شانتی کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں جو بری طرح بکھری جا رہی تھی۔ میرے خیال میں اب وہاں رکنا ہمارے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے تھائی وانگ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں خاموشی سے باہر آ گئے۔

کو شلیا کے قتل کی خبر نہ صرف پوری بلڈنگ میں بلکہ اس گلی میں بھی پھیل گئی تھی۔ لوگ بلڈنگ کے سامنے جمع ہو رہے تھے اور کچھ لوگ بلڈنگ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ بعض لوگوں نے ہماری طرف بھی دیکھا تھا مگر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں نے تھائی وانگ کو اشارہ کیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلے گئے۔ میں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا کہ ہم کی نا معصیت میں نہ پھنس جائیں۔

ہم سوئے نوئی ٹو سے نکل کر ایک اور گلی میں گھومے ہوئے سوئے سٹریٹ پر نکل آئے اور وہاں سے ہمیں ایک گلی تک لگ گیا۔

میں تک نکل کر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ ڈرائیور کے دائیں طرف باہر کی طرف لگا ہوا عین منظر پیش کرنے والا آئینہ چہرے سامنے تھا اور میں آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی سونہر سا نیلا

تھائی وانگ کی روشنی آئینے میں نظر آ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے تھائی وانگ کی جگہ پٹا چٹ موڈ پر پولیس سینٹرل اسپتال کے کمرے میں چکے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ اس دوران میں ہم کسی کمرے میں تھے اور اس سونہر سائیکل کا پیچھے لگے رہنا محض ہمت کا تھا۔

میں نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کرتے ہوئے ایک سونہر سائیکل ہمارے پیچھے آ رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ سوئے نوئی ٹو سے ہی وہاں ہے۔“

تھائی وانگ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہاں پہلے سے کچھ لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں نے ایک گلی چلی گئی۔ اس طرف تھائی وانگ کی آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ تین گلیوں کے علاوہ رات بھر کھلے رہنے والے کئی ریسٹورنٹ تھے۔ پہلی نے ایک موڈ پر تک رک رکوا لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ بائیں طرف تھائی وانگ کے گھر آ گئے۔ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے تھائی وانگ نے ایک موڈ پر دو آدمی تھے اور دونوں ہی چوہوں سے جھگڑا کر رہے تھے۔ تھائی وانگ نے تک نکلنے والے کو دیکھا اور ہم سڑک پار کر کے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے لیکن اس علاقے میں بائیں طرف سے ابھی شام اترتی ہو۔ اس علاقے میں عک و لک لک بھی تھیں۔ ایسے علاقے عام طور پر جرائم پیشہ لوگوں کے گھر ہیں۔ مرکز بنے رہتے ہیں۔ رہتی اور لوٹ مار کی باتیں ہوتی ہیں۔

رہتوں میں داخل ہوئے ہی ایک میز پر گانگ کو بیٹھے دیکھ کر ہم دونوں پر خفگی سی سرکھائی آ گئی۔ اس کے ساتھ دو ڈرائیور اور ان دونوں کا تعلق ہمارا ج کے جہاز میں تھا۔ ہانگ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

میں یہاں اسی لیے آئی تھی۔ ”وہ ایک میز کے سامنے کرسی بیٹھے کھڑے تھے۔ علاقہ جانا گاؤں سے متصل ہے بلکہ اسے بھی انجان کا ایک حصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ واٹ ڈرامٹ اور ان کے کپڑے گاؤں کی کوئی آدمی یہاں ضرور نظر آئے گا۔“

میں اس کی باتوں کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب ہم دونوں میں داخل ہوئے تھے تو گانگ کے سرسری سی نگاہوں سے ہم کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو ہمیں دی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کو نہیں پہچان سکا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ان دونوں شخصوں نے ہمیں کسی پہچان لیا تھا جو سوئے سٹریٹ کے پیچھے گئے تھے۔ پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ وہاں پہلے سے اس بلڈنگ کی گہرائی کر رہے ہوں۔ تھائی وانگ کی باتوں کے ساتھ تھے اس لیے ہمیں مشتبہ سمجھ کر

کہ کو شلیا کو کس طرح تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

تاہم کو کسی طرح پتا چل گیا ہو گا کہ اس کے منصوبے کی بخبری کو شلیا نے کی تھی۔ کو شلیا کے غائب ہوجانے سے اس کا شبہ یقین میں بدل گیا ہو گا۔ وہ اسے تلاش کر رہے تھے اور پھر کسی طرح انہوں نے کو شلیا کی بہن شانتی کا پتا چلا لیا۔۔۔۔۔ صرف ایک روز پہلے دو آدمی کو شلیا کے بارے میں پوچھنے شانتی کے پاس گئے تھے اور شانتی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور پھر شانتی کی گہرائی کر کے اس کے فلیٹ کا پتا چلا لیا گیا تھا اور آج جب شانتی اسٹریٹ پر تھیں تو تین آدمی فلیٹ پر پہنچ گئے۔ وہ سب کو شلیا کو دوست اور ہمدرد ظاہر کیا ہو جس پر کو شلیا نے انہیں اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی اور پھر انہوں نے کو شلیا کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو بدحاشوں کو ایک جوان اور حسین عورت کے ساتھ کرنا چاہیے تھا اور پھر انہوں نے نہایت بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کسی نے کو شلیا کے چہرے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے مزاحمت کی ہوگی۔ اس کے چہرے کی آواز شاید اس لیے نہیں سنی گئی تھی کہ اس کا منہ بند کر دیا گیا ہو گا۔

یقیناً سب کچھ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ میں نے سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔ تھائی وانگ نے کافی کا آؤر ڈرے دیا تھا۔ ویٹریس نے دو گلاس ہمارے سامنے رکھ دیے اور ہم دونوں اپنے اپنے گلاس اٹھا کر پہلی بکلی چسکیاں لینے لگے۔ اسی دوران میں ”میں نے ان دونوں کو ریسٹورنٹ کے دووازے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہماری میز کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے گانگ وغیرہ کی طرف دیکھا۔ گانگ کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ ان دونوں کا انداز دیکھ کر چونک گیا تھا۔

وہ دونوں ہماری میز پر کرسیاں چھین کر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک کے چہرے پر جھگی سی داڑھی تھی۔ دوسرا کلین شیو تھا۔ داڑھی والے نے اپنی کرسی تھائی وانگ کی طرف چھین لی اور بڑی بے تکلفی سے اس کی ران پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مکدھی سی مسکراہٹ تھی۔

تھائی وانگ کا چہرہ تھمسا اٹھا۔ اس میں غصہ بھی تھا اور کچھ خوف بھی شامل تھا۔ اس نے داڑھی والے کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”اگر یہاں بیٹھنا ہے تو شرافت سے بیٹھو ورنہ کسی اور میز پر چلے جاؤ۔“ تھائی وانگ نے ہولے سے غراتے ہوئے کہا۔

”شرافت؟“ اس شخص نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”اب تک تو ہم شرافت کا ثبوت ہی دیتے آئے ہیں ورنہ تم جیسے لوگوں کو تو پہلے ہی روز پکڑ دیتا ہے۔“

”کیا کہتے ہو؟“ تھائی وانگ نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف



دیکھا ”کیا سمجھتے ہو تم ہمیں۔ تمہارا ہم سے کیا تعلق ہے۔ کیا یہاں غیر ملکی مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ اگر بد تمیزی کی تو میں نہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

”پولیس کے پاس تو شاید تم خود بھی نہیں جانا چاہو گی۔ اس شخص نے کہا ”اس لیے کہ پولیس تو پہلے ہی تم لوگوں کی تلاش میں ہے۔ بھگتو شوقا کت موت کی دہلیز سے پلٹ کر آیا ہے۔“

قحالی دانگ کا چو متغیر ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو لیا۔

”اے مسٹر۔“ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”تم لوگ شرافت سے یہاں سے اٹھو گے۔۔۔ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہم فورٹ ہیں۔ ہمارا کسی بھگتو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

”اگر تم یہ ثابت کر دو کہ واقعی فورٹ ہو تو ہم خاموشی سے یہاں سے اٹھ کر چلے جائیں گے۔ بصورت دیگر ناگزیر تم لوگوں کو پارکٹ خوش ہو گا۔“ کلین شیو والے نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ہم کسی ٹائیکر کو نہیں جانتے تم لوگ شرافت سے اٹھ جاؤ یہاں سے۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کو شلیا کو تو تم ضرور جانتے ہو گے۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ”تم لوگ کو شلیا سے ملنے اس کی بہن کے ساتھ اس کے فلیٹ پر گئے تھے لیکن اس کی لاش دیکھ کر وہاں سے بھاگ نکلے لیکن اب تم بچ کر کیس نہیں جانتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ خاموشی سے اٹھ کر ہمارے ساتھ چل پڑو۔ اگر کوئی گزربوڑنے کی کوشش کی تو تم دونوں کا حشری کو شلیا سے مختلف نہیں ہو گا اور کو شلیا کی لاش تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔“

اب معاملہ مختلف ہو گیا تھا۔ ان کا تجویز بہت صحیح تھا۔ وہ ہمیں پہچان گئے تھے۔ کلین شیو والے نے ہنجر نکال لیا تھا۔ اس نے ہنجر کی نوک اس طرح میرے پہلو سے لگا دی کہ کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے۔

”مجھے معلوم ہے تم بہت اچھے فائٹرز ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم خود کشتی کرنا پسند نہیں کرو گے۔“ کلین شیو والے نے کہا۔

میرے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ ہنجر کی نوک میرے پہلو میں چبھ رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ میں کوئی گزربوڑ نہیں کروں گا لیکن میں نے نرسنگ کی تختیاں اس لیے نہیں اٹھائی تھیں کہ اپنے آپ کو اس طرح آسانی سے کسی کے حوالے کر دوں۔ میں نے دونوں ہینڈل فرسز پر جمائے اور پوری قوت سے اپنے آپ کو پیچھے دھکیلا۔ کرسی الٹ گئی۔ میں نے بھی کرسی کے ساتھ ہی فرش پر الٹی قلابازی کھائی تھی۔ کلین شیو والا بڑی پھرتی سے اٹھ گیا لیکن میں اس سے پہلے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس سے پہلے

کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا، میں نے اچھل کر اس کے سینے پر غلامی لگائی۔ وہ اچھل کر دوسری ہینڈل فرس پر گرا۔ دائیں والا بھی ٹوٹ کر اس وقت میں بھی فرش پر گرا ہوا تھا۔ دائیں والا بھی ٹوٹ کر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا، میں ہینچے ہی بیٹھے لیکن وہ گھوم گیا۔ میرا ایک ہینڈل فرس کے کھینچنے کے جوڑے کھینچ کر وہ اچھل کر پلٹ کے بل کر ا۔ اس دوران میں کلین شیو والا حملہ آور ہو چکا تھا، ہنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے روکا اور میرے اس کی بٹل میں زوردار ضرب لگائی۔

اوپر سے الٹ کر دوسری ہینڈل فرس نکلی۔ اس کا ہنجر والا ہینڈل فرس تک میری گرفت میں تھا۔ میں اس کا ہاتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور اس کے اس بازو پر کندھے کے قریب زوردار ٹکرائی وہ ہلکا اٹھا۔

دائیں والا پھر میری طرف ہلکا اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ میری پشت پر وار کرنا چاہتا تھا۔ میں بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا ایک اور ہینڈل فرس لے گیا۔

تین ہینڈل فرس الٹ چکی تھیں۔ گاؤں میں مروجہ ہیٹ اور کے ساتھ شکاری قسم کی عورتیں بھی۔ رائیونٹ میں بھگتو بھی گئی تھی۔ عورتیں بری طرح بچ رہی تھیں۔ قحالی دانگ کی طرف کھڑی چیچ کر میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

اب وہ دونوں مقابلے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ دائیں والا نے حملہ کر دیا۔ وہ بھی آگے لپکا میں بڑی پھرتی سے پلٹ کر فرش پر گر گیا اور دونوں ہینڈل فرس حملہ آور کے سینے پر جا کر تھوڑے قوت سے اچھال دیا۔ وہ قلابازی کھاتا ہوا ہینچے میں گرا اور سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ میں ابھی فرش پر ہی تھا کہ کلین شیو والا نے حملہ کر دیا۔ میں پھرتی سے لوٹ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ منہ کے بل پیچھ کر ا اور پھر میں نے حرکت کرنے کا ہوش دے بغیر اسے چھاپ لیا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر طرف دہری کر دیں۔ یوسٹن کپ کا یہ واڈو بڑے بڑے سہاواں پیچھے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ تو ایک معمولی سالا کا تھا۔ زبردستی پر ذرا سا باڈو پڑا تو ہلکا اٹھا۔

گائیک اور اس کے ساتھی ابھی تک میز پر بیٹھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس لڑائی میں مداخلت کوشش نہیں کی تھی۔

اس دوران میں دائیں والا بھی سنبھل چکا تھا اور وہ اسی وقت دو اور غنڈے ہاتھوں میں ہنجر لے بیٹھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہی کے ساتھی تھے جن سے میں پہلے ان سے آئے والوں کو دیکھ کر گائیک بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوا اٹھ گیا۔

”گائیک! میں چیخا “یہ ٹائیکر کے آؤی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہینڈل فرس بھی تھا۔ وہ آؤی کوئی گائیک نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”گائیک! میں چیخا “یہ ٹائیکر کے آؤی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہینڈل فرس بھی تھا۔ وہ آؤی کوئی گائیک نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”گائیک! میں چیخا “یہ ٹائیکر کے آؤی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہینڈل فرس بھی تھا۔ وہ آؤی کوئی گائیک نہیں دیکھ سکتا تھا۔

لیکن اب ان سنگین لحات کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس کے چہرے پر پیلٹا سی آگئی اور جسم ہولے ہولے کانپنے لگا جیسے سردی لگ رہی ہو۔

”کیا ہوا قحالی۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ میں نے پوچھا میرے لیے میں بھی تشویش تھی۔

”کو شلیا کی لاش۔۔۔ انہوں نے کس بے رحمی سے اسے قتل کیا تھا۔“ اس کے ہونٹوں پر بھی کپکپاہٹ تھی ”اور تمہیں کس طرح ان دونوں نے گھیر لیا تھا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔۔۔“ وہ خاموش ہو کر چند لمبے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اس نے اٹھ کر والمانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور میری پیشانی اور رخساروں پر بوسے دینے لگی۔

میں اس کی آغوش میں سٹ گیا۔ اس کی آغوش کی گرمی سے مجھے عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ عورت کسی بھی روپ میں ہو، محبوبہ ہو یا بیوی ہو، مرد کو اس میں ماسٹا کی جھلک نظر آ جاتی ہے اور اس کی آغوش میں سمار کر برا سکون سا محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ میرا قحالی دانگ سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ نہ وہ میری ماں تھی نہ بیوی اور نہ محبوبہ۔ وہ عورت تھی۔ اس میں ماسٹا تھی اور میں قحالی دانگ کی آغوش میں ماسٹا کی اس گمراہ کو محسوس کر رہا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے یا شاید کئی صدیاں بیت گئیں۔ قحالی دانگ نے مجھے اپنے سے الگ کر دیا۔ چند لمبے میرے چہرے کو دیکھتی رہی پھر میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

”تم میرے کون ہو وعدہ۔۔۔ میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنے دودھ کا حصہ کیوں سمجھنے لگی ہوں۔“

”انسانیت کا رشتہ سب سے مقدس اور عظیم ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”یہی رشتہ انسان کو انسان بناتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو انسان انسان نہیں رہتا۔ حیوان بن جاتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ قحالی دانگ گمراہ سانس لیتے ہوئے بولی ”انسانیت کا یہ رشتہ ہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھے ہوئے ہے۔“

میں جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک ابھر آئی تھی۔ شاید اس کے سر پر وہ جوجھ اتر گیا تھا۔ ذہن سے وہ دھند بھٹ گئی تھی جس نے اسے گھائی اور کھٹکھٹ میں مبتلا کر رکھا تھا۔

مجھے اس رات نرس شیون نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے وہ رات یاد تھی جب میں اپنی جان بچانے کے لیے روز کلب سے بھاگا تھا اور سڑک پر پہنچ کر اس کی کالیں پناہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور پھر کچھ دیر بیٹھے بغیر کا دوپاں سے بھاگے گئی تھی۔

اس نے کتنی چٹائی سے شیفو کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ مجھے کس نیت سے وہاں سے لے کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ رہنے ہوئے ایک دو دن تو میں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا کرتی تھی اور پھر وہ میرے سامنے برہنہ ہو جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں کوئی حرکت کروں گا۔ میرے سلفی جذبات مجھے کچھ کرنے پر مجبور کریں گے کہ میں اس کے جسم پر کوڑے برسا کر کرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا لیکن وہ موقع بھی نہیں آیا تھا جس کا شاید اسے انتظار تھا۔

تھائی وائنگ طویل عرصے سے شاید اسی ذہنی مکش میں تھی کہ میرے ساتھ کون سا رشتہ استوار کرے اور آج اس کے داغ پر چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی تھی۔ اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا۔ "تھائی!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج شاید تمہیں بھی سکون مل گیا ہے۔ تمہاری بے قراری میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ تمہارے چہرے کی طمانیت اور آنکھوں کی چمک تیری ہے کہ..."

"ہاں۔ مجھے واقعی قرار آگیا ہے۔" اس نے بات کا نغہ ہوئے میرے دونوں ہاتھ تھام لے "میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ آج میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگی ہوں۔" وہ چند لمبے خاموش ہوئی پھر اٹھتے ہوئے بولی "متم میں بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ہم چائے پیئیں گے اور دیر تک باتیں کریں گے۔ بہت ساری باتیں۔"

"تم چائے بناؤ۔ میں ذرا باسٹر ہو جانے کو فون کر کے معلوم کروں کہ ادھر کی صورت حال کیا ہے۔" میں بھی بیٹھ سے اٹھ گیا۔ تھائی بچن کی طرف چلی گئی اور میں پینٹنگ روم میں آگیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ اس وقت اگرچہ ڈیڑھ بجتے والا تھا مگر کال فوراً ریسیور کی گئی۔ وہ باسٹر ہو چکی تھی۔

"تم کہاں ہو۔" وہ میری آواز سنتے ہی چیخا "گھنگھنے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تمہیں ان دونوں بہداشتوں سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ کاش! میں بھی تمہاری وہ فائٹ دیکھ سکتا لیکن وجدان کیا یہ تمہاری حماقت نہیں۔ اس طرح تو تم اپنے آپ کو کسی مصیبت میں پھنسا لو گے۔"

"میں زندگی کے کچھ تجربات کرنا چاہتا ہوں باسٹر۔" میں نے جواب دیا "مئی الحال کی ایسی سنگین صورت حال سے میں خود بھی بچنا چاہتا ہوں لیکن یہ محض انتقال تھا کہ ان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ دراصل میں تھائی وائنگ کے ساتھ کوکشا کی تلاش میں نکلا تھا۔ ہم اس کے ٹھکانے تک پہنچ گئے تھے لیکن اسے قتل کیا جا چکا تھا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا "ان دونوں نے وہیں سے ہمارا تعاقب

کیا تھا۔ کوکشا کو شاید دن میں کسی وقت قتل کیا گیا تھا اور میرا خیال ہے اس وقت سے اس بلڈ ٹک کی نگرانی کی جا رہی ہو کہ کوکشا کی چوٹ نہ سونے کی چوری کے منصوبے کا راز مجھے بتا دیا۔ اس نے انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس کے قتل کی خبریں کر شاید میں نے آؤں گا۔ میرا وہاں پہنچنا محض ایک اتفاق تھا۔ وہ مجھے اپنا چہرہ پہچان نہیں سکے تھے۔ انہوں نے شخص شیفو کی بنا پر ہمارا تعاقب کیا تھا۔ تھائی مجھے اس ریسٹورنٹ میں لے گئی تھی۔ اس کا خیال تو یہ ہم وہاں سے انہیں دھوکا دے کر نکل سکیں گے۔ وہاں گانگ دو آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ ان کی موجودگی بھی اتفاق تھا۔ لیکن انہیں دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا تھا۔ ہم نے اس قدر بڑھو۔ طبع بدلا ہوا تھا کہ گانگ بھی مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ وہ اتنی آواز سن کر متوجہ ہوا تھا۔"

"اگر گانگ وغیرہ نہ ہوتے تو جانتے ہو کیا ہوتا۔" ہائپرٹینشن نے کہا۔ "اگر گانگ مجھے نظر نہ آتا تو ہم عقبنی دواؤں سے بھر جاتے اور کسی نہ کسی طرح ان سے چھپنا چھڑانے کی کوشش کرتے۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ دیر پہلے ہمارا جگ کو بھی تمہارے بارے میں رپورٹ مل چکی ہے۔ انہیں اگرچہ تمہاری قوت بازو پر پورا بھروسہ ہے لیکن تمہارے لیے برطانیہ ہیں کہ کہیں دھوکے میں نہ مارے جائے۔" ہائپرٹینشن نے کہا۔

"صرف چند روز اور باسٹر۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ "میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ "میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔

میں تھائی والے کمرے میں آیا۔ تھائی نے ٹرے بڑھو رکھا اور بیڈ کی پشت سے ٹک لگا بیٹھ گئی۔ ٹرے میں رکے ہوئے تھائی سے بڑی خوشگوار خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ چائے کے بجائے کلاہا کر لے آئی تھی۔

تھائی ابھی تک وہی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ مختصر بغیر نگار مختصر بلاؤز۔ وگ اس کے سر پر بھی تھی اور میرے سر پر وگ دراصل انہی وگوں نے ہمارے گلے اس حد تک بٹھے تھے کہ گانگ بھی ہمیں نہیں پہچان سکا تھا۔ میں نے اپنی وگ انڈر کراؤ پر پھینک دی۔ تھائی کو بھی وگ کا خیال آگیا۔ اس نے بھی وگ انڈر کراؤ اور اپنے بالوں میں اٹھایاں پھیرنے لگی۔

تھائی جس انداز میں میرے سامنے بیٹھی تھی وہ بڑا عجیب تھا۔ میرے دل میں اگرچہ بھی اس کے بارے میں ایسا ہی خیال نہیں آیا تھا لیکن نظروں کو قابو میں رکھنا میرے لیے دشوار تھا۔ اس نے شاید میری بے چینی کو محسوس کیا تھا۔ وہ آواز

ہم میں کس محسوس تھی اور چند منٹ بعد باہر نکل کر میرے منہ سے اٹھان کی سانس نکل گئی۔ اس نے سلیپنگ سوٹ پہن لیا تھا۔ ایک بار پھر میرے سامنے بیٹھ گئی اور اپنا گانگ اٹھا کر کافی کی پکپکائی لیتے لگی۔

ہم چند لمبے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھائی وائنگ اپنے بارے میں وہ باتیں بتاتے لگی جو اس نے پہلے بھی نہیں بتائی تھیں۔

میں نے زندہ رہنے کے لیے بڑے پازینیل۔ "وہ کہہ رہی تھی کہ میرے بچنے میں لڑکیوں کی نیم عریان تصویریں اور اہم دیکھے ہوں گے۔ دراصل پانچ سال پہلے میں نے شرمیں ایک مساج پارلر کھلا تھا۔ پہلے میں اپنی سخی پھر دو لڑکیاں اور رکھ لیں۔ کاروبار بڑھ گیا تو میرے پاس لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔

اپنی دونوں جاگی دوی نے بھی اپنی کسی دوست کے ساتھ مل کر اپنے مکان میں مساج پارلر کھول لیا تھا۔ میں نے اپنا ذاتی مساج پارلر بند کر دیا اور شکر کے دوسرے بڑے بڑے مساج پارلر کو لڑکے اور لڑکیاں چلائی کسے لگی۔ میں نے سو سم وٹ روڈ جیسے منگے علاقے میں اپنا دفتر کھول رکھا تھا۔ بڑی کمائی ہے اس بزنس میں۔ میں نے بھی خوب دولت کمائی۔ بنگاک کے ویٹرنری یونین بینک میں میرے آؤٹنٹ میں آج بھی خطیر رقم موجود ہے لیکن موجودہ حالات میں ہمارے اپنے بینک کا رخ نہیں کر سکتی۔

"اس بزنس میں کمائی ہے تو پریشانیاں بھی بہت ہیں۔ کبھی پولیس پریشان کرتی ہے کبھی سرپرہے گانگ اور کبھی کام کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں۔ میں بہت عرصے سے یہ کام چھوڑنے کا پروگرام رہی تھی لیکن کوئی اور کام میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چند سال پہلے جاگی دوی کا میڈیکل پریکٹس کا لائسنس بحال کر دیا گیا تو اس نے اپنا مساج پارلر بند کر کے دوبارہ کینک کھول لیا اور پھر اس کے کتنے پریشان نے بھی اپنا بزنس کی اور کو فروخت کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نزول ابجسٹی کوٹھوں گی۔ کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد میں نے اپنی ایک دوست کے اشتراک سے ٹریول ایجنسی کھول دی۔ دراصل اس کے پاس لائسنس موجود تھا اور سرمایہ میں نے لگایا تھا۔ مجھے اس دفتر میں جاتے ہوئے چند ہی بجتے ہوئے تھے کہ تم سے ملاقات ہو گئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے خاموشی کا اظہار کیا کیونکہ اس کا سب کچھ میری وجہ سے ختم ہوا تھا۔

"لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" تھائی وائنگ نے میرے چہرے پر نظریں پڑاتے ہوئے کہا "مجھے تم جیسا انسان مل گیا ہے۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں تو یہ شرارتوں کا جنگل ہے لیکن مجھے انسانیت کیسے نظر نہیں آتی۔ ہر شخص نے اپنے آپ پر زیب کا طوطا چڑھا رکھا ہے۔ جھوٹ، دھوکا اور باریکاری لوگوں کی نظر غلط ہے۔ میں جی بے دیانت، ظلم اور گناہ مجھے کسی میں نظر

نہیں آیا۔ میں نے بہت دھوکے کھائے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے کے باوجود میں اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے دور نہیں رکھ سکتی۔ میں نے اپنی دولت بھی لٹائی اور عزت بھی لیکن مجھے دھوکے اور غریب کے سوا کچھ نہیں ملا۔ جس مردے میں نے ذرا بے تکلفی سے بات کی اس نے پہلی فرصت میں مجھے اپنے بستر کی زینت بنانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ ایک اور عرصہ عمر باری میں نے ترس کھا کر کھانا کھانے کے لیے اپنے گھر میں بلایا تھا وہ بھی کھانے کو نظر انداز کر کے مجھ پر بجھت پڑا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید میں نے اپنے جنسی جذبات کی تسکین کے لیے اسے گھر میں بلایا ہے۔ ہر شخص کی نظروں میں ہوس ہے۔ دولت کی ہوس، جنس کی ہوس۔" وہ خاموش ہو کر کمرے کمرے سانس لینے لگی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "پھر تم مجھے ملے۔ میں تمہیں کسی اور نیت سے لائی تھی مگر تم دوسروں سے مختلف ثابت ہوئے۔ یقین کر میں ایسے شرمناک لباس بھی نہیں پہنتی لیکن تمہارے سامنے نہ صرف ڈھلے اور حوس لباس پہنے بلکہ برہنہ تک ہو کر شاید تمہارے اندر برف کی سل رکھی ہوئی ہے جو ذرا بھی نہیں پگھلی۔ ایسے موقعوں پر میں نے بیٹھ تمہاری آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں دیکھیں اور تمہاری یہ نفرت جسے میں ہی محسوس کر سکتی تھی مجھے کشاں کشاں تمہاری طرف کھینچتی چلی گئی۔ مجھے تمہارے اور قریب لے آئی اور یہ یقین ہو گیا کہ تم ہی وہ بہتی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں اپنا سب کچھ کھو کر بھی تمہیں کھانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرا ذہن شدید ابھن کا شکار تھا۔ مجھے نہیں پاری تھی کہ کس نام سے تمہیں اپنے ساتھ رکھوں یا کس رشتے کا سارا لے کر تمہارے ساتھ رہوں لیکن آج تم نے میری یہ ابھن حل کر دی۔ جو قسمی میں کئی بیٹیوں کے ذہنی کرب سے بھی نہ سلجھا سکی، وہ تم نے چند لمحوں میں سلجھا دی۔ انسانیت کا رشتہ۔ واقعی بہت عظیم ہے۔ یہ رشتہ قومیت مذہب رنگ و نسل کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔ اپنے اور تمہارے بیچ یہ رشتہ مجھے پسند آیا۔ اب مجھے واقعی کسی چیز کا افسوس نہیں ہے کہ کوئی دکھ ہے مجھے اپنے گھر کے راگہ ہو جانے کا۔ اب میں تم سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی لیکن اگر کبھی تم نے اپنا راستہ بدلنے کی کوشش کی تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

"نہیں تھائی۔" میں نے جواب دیا "میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ تم نے اس رات مجھے موت کے منہ سے بچایا۔ میری خاطر اپنا سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالا اور آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں بنایا۔ میری خاطر اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا رکھی ہے تم نے تم بہت عظیم ہو۔ تمہارے پاس وہ رکتو تھے ایسا سکون ملتا ہے جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں تم سے الگ کیسے رہ سکوں گا۔" تھائی میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی پلک بڑھ گئی تھی اور پھر وہ باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا۔ اس نے خالی گک اور



تو نہیں تھا لیکن اس کی عمرانی میں چل رہا تھا۔ یہاں عورتوں کے کلب بائٹنگ کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ یہ مقابلے شام آٹھ بجے ہی شروع ہو جاتے اور رات دو بجے تک جاری رہتے تھے۔

سوئے فائو پر فیڈل ہوٹل سے کچھ فاصلے پر واقع میری لینڈ بائٹ کلب میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ کئی میز خالی پڑی تھیں۔ اسٹیج پر کلب بائٹنگ کا مقابلہ جاری تھا۔ دو ادیمز عورتیں تھکی ہوئی لمبوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہی تھیں۔ ان کے جیسوں پر اگرچہ لباس برائے نام ہی تھے لیکن ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تو شاید ان سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک آدمی بڑی بے تکلفی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ کسی قدر دراز قامت، بال چڑیا کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے، کلین شیو، گلے میں سیاہ ڈوری اور سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا۔ اس نے جینز اور بغیر آستین کی دھاری دار بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور باڈوؤں کے مسل ابھرے ہوئے تھے۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

”ہیلو باس!“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”ہیلو۔“ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ پہلے تو میں اسے اپنی میز پر بیٹھے دیکھ کر چونکا تھا لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا کہ اس شخص سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔

”لگتا ہے تمہارا دھندا خوب چل رہا ہے۔“ وہ میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”یہاں دھندا تو سب کا ہی چل رہا ہے۔ ایک میں ہی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی بھی کام ملے کر سکتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا ”ویسے میں سونڈ کینیک ہوں۔ پتایا میں اچھا خاصا کام چل رہا تھا۔ ایک دوست کے بھانجے پر یہاں آگیا۔ وہ سالہا چوری کے جرم میں پکڑا گیا اور میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔“

”شاید تمہیں واپسی کا کرایہ چاہیے۔“ میں نے کہا۔ بہت سے ہڑ حرام قسم کے لوگ پیسے بٹورنے کے لیے دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو مظلوم بنا کر پیش کرتے ہیں۔

”نہیں۔“ اس نے لٹی میں سر ہلایا ”میں اپنے ساتھ ناکامی اور نامرادی کی داستان لے کر واپس نہیں جانا چاہتا۔“

”جائے یا کانی ہو گے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کل رات سے کھانا نہیں کھایا۔“ اس کے لیے میں ندامت بھی تھی اور افسردگی بھی۔

میں نے ایک بار پھر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی باتوں میں اور اس کے چہرے پر سچائی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ ”وٹریس آرہی ہے۔ جو کھانا چاہو، منگوالو۔“ میں نے کہا۔

”یہاں نہیں۔“ اس نے کہا ”یہ نائٹ کلب ہے تو قہر لگاؤں مگر یہاں کے رٹ زیادہ ہیں۔ ادھر ایک ریسٹورنٹ ہے سستا کھانا ملتا ہے۔“

میں ایک لمبے کو ٹھٹکا۔ وہ مجھے یہاں سے اٹھا کر کس اور لے جانا چاہتا تھا۔ کسی گڑبڑ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن میں نے سہرا لے رکھ لینے کا فیصلہ کر لیا اور ہم میری لینڈ بائٹ کلب سے نکل کر ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں آئے اور پھر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے نہایت سستہ قسم کے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ حالانکہ ایسے موقع پر جب بل دوسرے کی جیب سے ادا ہونا ہو اچھی سے اچھی اور سنگی چیز منگوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں نے وٹریس کو بلا کر اس کا آرڈر کینسل کروا دیا اور پھر اسی قسم کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔

کھانا کھانے کے بعد کافی بھی پی لی۔ وہ میرا بے حد احسان مند نظر آ رہا تھا۔

”میں تمہارا یہ احسان بھی نہیں بھول سکوں گا۔ اگر آج بھی مجھے کھانا ملتا تو شاید۔“

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”کسی کو ایک وقت کا کھانا کھلا دینا کوئی ایسی بات نہیں ہوتی۔“

”میں تو اسے احسان سمجھتا ہوں اور بہت ہوئی تو بھی اس بوجھ کو اتارنے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے کہا۔

رنگ سے باہر بھی مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو قاتل بھروسہ ہو اور باہت بھی اور مجھے یہ شخص پسند آیا تھا اور اس مختصر سی ملاقات میں، میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اگر اسے مناسب طریقے سے ڈیل کیا جائے تو یہ میرے لیے جان بچی دے سکتا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نام رامن پر سادو ہے اور ہارٹس فٹ پاتھر ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آئی تھی ”ایک مہینہ پہلے پتایا سے یہاں آیا تھا۔ دو چار دن ہوٹل میں جا بھرت پاتھر پر آگیا۔“

”دوستی کرو گے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں بتادیں۔

”دوستی۔“ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھرتی تھی ”اس کا مطلب سمجھتے ہو؟“

”اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ میں نے نہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ تم ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔“

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے بڑی گرجبوش سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”دوستی کے نام پر جان بھی چلی جائے تو مجھے افسوس نہیں

”اس نے کہا۔ رامن پر سادو کچھ کا بیڑو کار تھا۔ اسے دھرم چڑھا لگا تو نہیں تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا جس نے کچھ اصول وضع کر رکھے تھے۔ جن پر وہ عمل کرتا تھا۔

”میں نے جیب سے کئی نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں چھاپ دیے۔ ”آج کی رات کسی ہوٹل میں بسر نہ کی مجھے اسی جگہ پر لٹنا ہیں جس میں کچھ اور درمدم کا۔ اپنے بچے پر غریب اور کسی فلیٹ کا بھی بندوبست کر لیتا۔“ وہ بہت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”جس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“ میں نے اس کی کمر باندھ کر کہا ”تم تو دوستی میں جان بھی دینے کو تیار ہو اور میں تو نہیں کاٹے کے چند ٹکڑے دے رہا ہوں۔“

رامن پر سادو نے کچھ کھانا چاہا مگر اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”تو اب یہاں سے چلیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم ایک بار پھر میری لینڈ نائٹ کلب میں آ گئے۔ اس وقت ہمیں کی تھو او میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسٹیج پر فائٹنگ کا مظاہرہ کرنے والی لڑکیاں بھی دوسری تھیں۔

”یہاں کچھ نہیں ہے باس۔“ رامن پر سادو نے کہا ”آؤ۔“ میں ہم میری لینڈ سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ رامن پر سادو نے زور زور سے کواکسن برج کی طرف چلنے کو کہا اور پھر میری زبردستی ہوئے بولا۔

”جس میں پتایا سے یہاں آیا تھا تو میرا وہ دوست مجھے اس جگہ لے گیا تھا۔ وہاں ہمیں جیس جیس دیکھ کر ہمیں حیرت ہو گئی۔“

زور زور سے کواکسن برج سے وہ کالج زیادہ دور نہیں تھا جہاں ہم پہلے پہنچے تھے لیکن میں نے رامن پر سادو کو نہیں بتایا۔

ٹیکسی دیا کے کنارے سڑک پر رک گئی۔ ٹھٹکا اور درختوں میں لپکتے درمیان وہ ایک بہت بڑا رینوےٹ گیٹ ہاؤس تھا۔

گٹ پر گیٹ ہاؤس کے نام کا انیون سائن بھی روشن تھا۔ ایک بہت بڑا دروازہ چار دیواری سے گھیر رکھا تھا جہاں درختوں کی بہتات تھی۔

میں نے رامن پر سادو کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میری لینڈ جیسے گھٹیا ڈائٹ کلب میں میرا جانے کا مقصد کیا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں میں آئی تھی۔ پتایا تھا کہ میں اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

گیٹ ہاؤس کا بڑا ہال کچھ عجیب سی منظر پیش کر رہا تھا۔ گلتا تھا ٹیکسی کی پرستان میں آگیا ہوں۔ نوجوان اور خوب صورت وٹریس تھیں۔ ان کے جیسوں پر لباس برائے نام ہی تھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ یہ گیٹ ہاؤس کی کاشی کا بہت بڑا ڈھانچہ تھا۔ ایک لمبے کو میرے ذہن میں یہ ڈھانچہ آ گیا تھا کہ میں نے رامن پر سادو پر بھروسہ کر کے غلطی تو

نہیں کی۔ ایسا تو نہیں کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہو اور ایک فرضی کمانی بنا کر مجھے اعتماد میں لے کر دھوکے سے یہاں لے آیا ہو؟ لیکن سہرا لے اب تو میں یہاں آئی تھی۔ اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔ اب موصول کا انتظار تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ اندرونی دروازے سے ایک آدمی کو برآمد ہوتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ دروازہ تھا۔ میرا اصل دشمن جس نے ہنرمندی میں میرے پیچھے لگا رکھی تھیں۔ اس کے جسم پر بہترین سوٹ تھا۔ بائیں طرف بھٹل کے نیچے کچھ اٹھار سا نظر آ رہا تھا۔ مجھے سمجھے میں در نہیں مگی کہ وہ بھلی ہو ستر قاجو کوٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا اور رامن پر سادو نے میری بے چینی کو محسوس کر لیا تھا۔

”کیا بات ہے باس۔“ تم اس لیے آدمی کو دیکھ کر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ۔“ کچھ نہیں۔“ میں نے کہا پھر جڑا کھینے کا فیصلہ کر لیا۔

”اسے دیکھ کر کچھ پرانی یادیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔“

”مگر اس نے تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچایا ہو تو مجھے بتاؤ۔“

”باس۔ ابھی اس کی گردن کا اسکرپو ڈھیلا کرتا ہوں۔“ رامن پر سادو نے کہا۔

میں نے گہری نظروں سے رامن پر سادو کی طرف دیکھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور اس پر مکمل بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔

”یہ بہت خطرناک آدمی ہے پر سادو۔“ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”اس نے میرے ماں باپ کو قتل کیا تھا۔ یہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی بھی ہیں۔ وہ بھی دنیا کے سفاک ترین آدمی ہیں۔ یہ لوگ مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے بچنے کے لیے سنگھار سے بھاگ کر پہلے کولا پور اور پھر یہاں آگیا۔ یہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ٹائیگر سے باری کا گھم لے لی اور یہ سب لوگ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کئی بے گناہ بچک میں بھی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ آج میں ان کی تلاش میں نکلا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اچھا ہوا تم مجھے یہاں لے آئے اور یہ میری نظروں میں آگیا۔“

”اس نے بھی تمہیں دیکھا ہے لیکن حیرت ہے تمہاری طرف توجہ نہیں دی۔“ رامن پر سادو نے کہا۔

”میں نے اس وقت اپنا طیلہ بدل رکھا ہے اس لیے نہیں پہچان سکا۔“ میں نے کہا۔

”اب تم فکر مت کرو باس۔“ رامن پر سادو نے کہا ”میں ابھی اس کی گردن کا اسکرپو ڈھیلا کرتا ہوں۔“

”یہاں نہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”سب سے پہلے میں اس کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ہم دو ان کا کچھ نہیں لگاؤ

کہتے۔ یہاں اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ ہاں تم ایک بات یاد رکھو! اگر ہم یہاں سے پھڑکنے تو کل شام آٹھ بجے چاہنا ڈاکٹران میں ہمارا جنازہ کے قریب رہنمورث میں میرا انتظار کرنا۔  
 ”تا لبا انتظار کیوں باس۔ اچھی کیوں نہیں۔“ راسن پر سادہ نے کہا۔  
 ”اچھی وہ تمہاری گردن کا اسکرپو ڈھیلا کر دیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جاؤں۔“ میں نے کہا۔

راسن پر سادہ کندھے اچکا کر رہ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ایک بار پھر جو تک جانا پڑا۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ وہی خوب صورت لڑکی تھی جس نے اس روز خفا کے گیت پر مجھے وہ گلدستہ دیا تھا جس میں ناگم ہم تھا۔ وہ لڑکی چند لمحے دارا کے پاس رک کر باتیں کرتی رہی پھر اندرونی دوا دے میں چلی گئی۔ دارا بھی وہاں سے بہت کر ایک میز پر بیٹھ گیا جہاں دو خوب صورت لڑکیاں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔

”تم اس پر نگاہ رکھنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے راسن پر سادہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور اٹھ کر اس دوا دے کی طرف بڑھ گیا۔

دوا دے کے دوسری طرف ایک کشادہ راہداری تھی۔ بائیں طرف اوپر جانے کے لیے زینہ تھا۔ اس لڑکی کو میں نے اس طرف مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ زینے پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ میں اوپر چڑھتا چلا گیا۔

زینے کے اختتام پر وہ کشادہ راہداری بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔ آخر میں انگریزی کے حریف کی طرح دائیں بائیں مڑتی تھی۔ راہداری میں دونوں طرف کمرے تھے تمام کمروں کے دوا دے بند تھے۔ میں راہداری کے آخر پر پہنچ کر دک کر گیا۔

دائیں طرف آخری کمرے کا دوا دہ کھلا ہوا تھا۔ میں دیے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ اس راہداری کے دائیں بائیں کمرے تھے اور آخر میں کھلی جگہ تھی۔ صرف تین فٹ اونچی منڈیر تھی۔ اس کے دوسری طرف بچے لان تھا۔

دوا دے کے سامنے کمرے بنے رنگ کا پردہ پھیلا ہوا تھا۔ میں آؤں میں کمرے ہو کر اندر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا اور سامنے ایک صوفے پر کم ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور اس کے قریب کھڑی ہوئی وہ لڑکی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

میں ان لوگوں کی باتیں سننے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب کوئی میرے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ چونکا تو میں اس وقت جب کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میں نے سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ دارا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ دارا کچھ سمجھ سکتا، میں نے بڑی بھارتیہ مظاہرہ کرتے ہوئے اچھل کر اس کے جڑے پر گھونسا مار دیا۔ دارا کراہ کر پیچھے ہٹا۔ میں نے سنبھلے کاموئیں دیے بغیر اس کے پیچھے پر گھوکر رسید کر دی۔ اس مرتبہ وہ ہلکا اٹھا۔ وہ آگے کو بھٹک گیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے تھوڑے پر لگ کر رسید کر دی۔ وہ الٹ کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کا سر بڑی زور سے دیوار سے ٹکرایا تھا۔

میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے دک گیا۔ میں نے کمرے کے اندر کسی قسم کی نقل و حرکت محسوس کر لی تھی اور پھر دوسری طرف لے کر باہر آیا۔ اس کی تیز نظریں نے فوراً ہی صورت حال پر اندازہ لگا لیا لیکن اسے کمرے کا موقع دینے سے پہلے ہی میں اسے جگہ سے اچھلا۔ میری فلائنگ کلک اس کے سینے پر پڑی۔ وہ راکھ ہوا دوا دے کی چوٹ سے ٹکرا گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی اس کے پیٹ پر سر سے ٹکرا دی۔ کم نے سنبھلنے کی کوشش میں میرے بال پکڑ لیے۔ میں نے سر کو زوردار جھٹکا۔ میری دگم کے ہاتھوں میں وہ مٹی اور میں پیچھے ہٹ گیا۔

میری صورت دیکھ کر کم اچھل پڑا۔ دگم اتر جانے کے بعد مجھے پہچان لینا زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ دارا نے بھی میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ گوشت کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں راہداری کی طرف سے ایک سایہ ہوا میں اڑا ہوا آیا اور دارا پر گرا۔ دارا پیچ اٹھا۔

وہ راسن پر سادہ تھا۔

میں نے کم کو سنبھال رکھا تھا اور راسن پر سادے دارا کو سنبھال لیا تھا۔ وہ بھی ایک اچھا فائزر تھا اور دارا کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ کمرے کے اندر وہ لڑکی شاید ٹیلی فون پر چیخ کر کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسری راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔

”راسن... جاگ... اس طرف!“ میں نے چیخ کر کہا۔

راسن نے دارا کو زوردار دک لگا کر کچھ کر دیا اور منڈیر پر چڑھ کر پچھلے لان کی طرف چلا گیا۔ کم نے مجھ سے لپٹ کر کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں کھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ ہلکا اٹھا۔ کھٹنے کی دوسری ضرب اس کی ٹانگوں پر لگی تھی۔ وہ چیخا ہوا الٹ گیا اور پھر میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر منڈیر سے چلا نکلا۔

زم زمین پر گرتے ہی میں سنبھل گیا لیکن پھر میں گاہے گدھے سے ذرا نیچے اٹھا۔ اسے بھر گئے ہوں۔ فائز کی آواز ابھی دور تک بھیل گئی تھی۔ میں نے ایک طرف چلا گیا۔ گاہے گاہے پاؤں ڈری وال کی طرف دوڑنے لگا۔ ایک اور فائز ہوا۔ اس مرتبہ گلی میرے سر کے اوپر سے گزرتی۔ میں دوڑتا ہوا پاؤں ڈری وال

کو قریب پہنچ گیا۔ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ گاہے گاہے قریب ہی رہا تھا کہ دائیں ہڈی میں اٹھا۔ اسے بھر گئے پلے پلے دیوار کے دوسری طرف کرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی سیاہ چادر اٹھ چلی گئی۔ مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے لگی تھیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈھنسا چلا گیا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے۔ وہ آوازیں مجھے واضح طور پر سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ تھالی زبان میں چیخ کر کہہ رہے تھے۔ پھر کے بعد دھمکے دو گولیاں پٹنے کی آواز سنائی دے لگی۔ فائز کی یہ آواز میرے چاندوں طرف بھیل رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے چاندوں طرف اب بھی تاریکی تھی۔ اتنی تاریکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر مجھے احساس ہوا جیسے کسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہو۔ میں نے آپ کو چھاننے کے لیے کسمپلا تو میرے بائیں بازو اور دائیں ٹانگہ میں ٹھیسیں اٹھیں اور درد کی لہریں پورے جسم میں پھیل چکی تھیں۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہی نکلی گئی۔ اسی لمحے ایک ہاتھ نے میرا منہ دبا دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک نہایت نرم سرگوشی میری سماعت سے گزرائی۔

”آرام سے لیٹے رہو۔ منہ سے آواز مت نکالنا اور نہ ہی اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔ وہ ہمیں تلاش کر رہے ہیں اور ہمارے بہت قریب ہیں۔ کوئی معمولی سی آواز بھی انہیں ہماری طرف متوجہ کر لیتی ہے۔“

وہ آواز انجینی ہونے کے باوجود شناسا سی لگ رہی تھی۔ میرے حواس ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ داغ میں شناخت ہی ہو رہی تھی اور میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کون کی جگہ ہے اور میرے بدن میں ٹھیسیں کیوں اٹھ رہی ہیں۔ یہ کون کس قسم کے ہتھیار نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

فائز کی ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ آواز قدرے قریب سے آئی تھی۔ میرے گرد وہ گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ وہ جو کوئی بھی فائز نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔ میرے منہ پر کچھ لپٹا ہوا تھا۔ کون کی آواز نہ نکل سکے۔

میری آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور میں قریب ہی اس شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ سوج رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے میرے بازو اور ٹانگہ میں مسلسل ٹھیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے کچھ ہاتھ کو آگے بڑھانے سے حرکت دے کر بائیں بازو پر رکھا تو کئی لمحوں میں ہی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن نے فائز کی آواز سنائی اور میں یاد آگیا کہ کیا ہوا تھا۔

راسن پر سادہ مجھے ایک گیسٹ ہاؤس میں لے کر گیا تھا جہاں دارا اور کم سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ تاریکی میں گھومتے ہوئے وہ مناظر کسی فلم کی طرح میری نظریں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ ایک ایک لمحے کی یاد آواز ہو چلی گئی۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے میرے بازو میں گولی لگی تھی اور جب میں پاؤں ڈری وال پر سے کود رہا تھا تو دوسری گولی میری ٹانگہ میں لگی تھی

اور میں نیچے گر کر کسی نامہوار ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا تھا اور پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا مگر میرے چاندوں طرف بھری ہوئی کنبیر تاریکی بتا رہی تھی کہ یہ رات ہی کا کوئی حصہ تھا مگر یہ کون سی جگہ ہے اور یہ آوی کون ہے جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے؟ گرفت دوستانہ تھی اور بخوبی دیر پہلے اس نے میرے کان میں جو سرگوشی کی تھی اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرا کوئی ہم در ہے جو مجھے دشمنوں سے بچاتا

## جاسوسی ڈائجسٹ کا تذکرہ خیر سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستان عبرت  
 جو حالات کے جال میں پھنس کر جرائم

کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انکا ایڈیٹر مشہور مصنف جبار قویہ کا مندرجہ ذیل تحریر



کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز  
 3802552-3895313 فون  
 3802584 فیکس  
 74200 ریلنگی  
 kitabiat1970@yahoo.com

چاہتا ہے۔

اچانک میرے ذہن میں راسن پر ساد کا خیال ابھرا۔ میں اس کا نام لیتا چاہتا تھا مگر میرے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔  
 ”اے... اس طرف...“ ایک چیخ ہوئی آواز میری سماعت سے نکلا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ شخص مجھ سے صرف چند گز کے فاصلے پر موجود ہو۔  
 ”میں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس طرف چلو۔ دیا کے پل کی طرف۔ وہ ادھر سے نکلے گی کوکشی کریں گے۔“

میں اپنی اکثریتی ہوئی ٹانگ کو حرکت دینا چاہتا تھا لیکن یہ آواز سن کر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ تاریکی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر یہ آوازیں بتدریج مگھور اندھیرے میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔  
 میرے منہ سے ہاتھ ہٹایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گہرا سانس لینے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔  
 ”پراساد...“ میرے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔  
 ”ہاں۔ یہ میں ہوں باس۔“ جواب میں سرگوشی سنائی دی۔  
 ”ابھی خاموش رہو اور آرام سے پڑے رہو۔ وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے۔ پلٹ کر آتے دیکھتے ہیں۔“

اس مرتبہ میں نے بات نہیں کی البتہ دائیں ٹانگ کو سینے کی کوکشی کی تھی جو کھڑکی کے تختے کی طرح اکثریتی جاری تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہی نکل گئی۔  
 ”کیا ہوا؟“ راسن پر ساد نے پوچھا۔  
 ”بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“ میں پھر کرا رہا تھا۔ ”میرے بازو اور ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں۔ یہ اذیت اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔“

”برداشت کرو۔“ پر ساد نے کہا۔ ”تم ایک بہادر اور باہمت فوجی ہو۔ یہ تو معمولی سی تکلیف ہے۔ تھوڑی دیر برداشت کرو۔ وہ لوگ ابھی زیادہ دور نہیں ہیں۔ موقع دیکھ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”مجھے بھی معلوم نہیں۔“ پر ساد نے جواب دیا ”میں نے جنمیں چیخ کر دیوار سے گرتے اور ڈھٹان پر لڑکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جب میں تمہارے قریب پہنچا تو تم بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں جنمیں دہاں سے اٹھا کر بھاگ نکلا تھا۔ مجھے جیسے کے لیے یہی جگہ نظر آئی تھی۔ اب تک تو یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ ہی رہی ہے۔ وہ لوگ چند قدم کے فاصلے پر ہمارے قریب سے گزر گئے ہیں لیکن ہماری موجودگی کا پتا نہیں چلا۔ ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔ ہمیں کچھ دیر اور انتظار کرنا ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم خاموشی سے بیٹھے رہیں تاکہ اگر وہ دوبارہ اس طرف نکل آئیں

تو۔“

وہ لپٹا ایک خاموش ہو گیا۔ دور سے فائز کی ایک اور گواہ سنائی دی تھی۔  
 ”انہوں نے غالباً خامے پر سے علاقے کو گھیرے میں لے کر آئے ہیں۔“ پر ساد نے سرگوشی کی ”ہمیں یہاں سے نکلنے میں مشکل تو پیش آئے گی مگر خاطر ہے ہم رات بھر یہاں بیٹھے ہیں نہیں ہو سکتے۔ بہر حال ہمیں کچھ اور انتظار کرنا پڑے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی میرے ذہن کو ابھار رہی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میں اس سے نکل کر ہم جا سکتے ہیں؟“ راسن پر ساد نے کہا ”مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے باس۔ جنمیں طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر بروقت کوئی طبی امداد نہ ملے تو زخم بڑھانے کا اندیشہ ہے جس سے تمہاری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“  
 ”ہمیں یہاں آئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”تقریباً ایک گھنٹہ تو ہو چکا ہے۔“ اس نے جواب دیا ”ابھی تھوڑی دیر بعد میں یہاں سے نکل کر دیو کیوں گا کر کیا صورت حال ہے لیکن سوال پھر وہی ہے کہ یہاں سے نکل کر ہم جا سکتے ہیں؟“

”اس کی تم فکر مت کرو۔“ میں نے کہا ”ضرورت صرف یہاں سے بچ کر نکلنے کی ہے۔ دیا کے پار دو ٹانگ بیک بیک بے وزنی ایک ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں ہم چاہ لے سکتے ہیں اور مجھے بالکل اذیت بھی مل سکتی ہے لیکن ہم دیا کی دوسری طرف کیے جا سکتے ہیں ان کے آدی تو بربق پر بھی موجود ہوں گے اور کوئی شخص ان کی نظروں سے بچ کر نہیں جا پائے گا۔“

”صورت حال کا اندازہ لگاتے کے بعد میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔“ پر ساد نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”تم نہیں روکو۔ میں صورت حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“  
 میرا سر پر ساد کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے آہستہ سے اٹھایا۔ تاریکی میں اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری ہڈیوں میں آہا تھا کہ ہم زمین پر تھے یا آسمان میں۔ ایسی گہری اور دھند تاریکی! میں نے اندھوں کی طرح غنول کر دیکھا تو پتا چلا کہ ہم ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں تھے اور وہ جگہ کچھ زیادہ کشادہ بھی نہیں تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر چھت نما کوئی چیز بھی تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میرا ہاتھ چھت کو چھو گیا تھا۔

پر ساد رینگتا ہوا دہاں سے نکل گیا تھا۔ میں نے قہرے پلٹ دیکھا کہ فائز کی پھیلائی تھیں۔ بازو اور ٹانگ سے درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں اور یہ درد پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کھٹک کی شدت کو کم کرنے کے لیے میں نے بڑی سختی سے دانت بچھڑکے تھے۔

مجھے یہاں پڑے ہوئے ایک گھٹنا ہو چکا تھا اور اس ایک تھلے

میں میرے زخموں سے اچھا خاصا خون بہہ چکا تھا اور اب میں اپنے آپ کو ہلکے سے محسوس کرنے لگا تھا۔ پر ساد نے ٹھیک سی کام تھا کر مجھے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی ورنہ زخم بڑھ جائے گا اور میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

راسن پر ساد کو بھی پریشانی تھی کہ یہاں سے نکل کر ہم کہاں جا سکتے ہیں اور میں نے فوری طور پر اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہاں... وہ گہری تو تھا جہاں میں اور تھا لیکن دائیں وہ بہت حد پر ساد قابل اعتماد اور بھروسے کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے میری خاطر اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ ان لوگوں کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں وہ پر ساد کو بھی اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالیں گے۔ اس لیے میں نے اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اگر خود غرض ہو تو وہاں بھگڑا ٹھونہ ہونے کے بعد صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہی مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلتا لیکن اس نے اپنی جان کی پروا نہیں کی تھی اور مجھے ان دردوں سے بچایا تھا۔ اس جیسے وفادار اور جاں نثار کو اس طرح چھوڑنا نہیں جا سکتا تھا۔

تقریباً چند منٹ بعد سربراہ کی ایسی آواز سنائی دی جیسے کئی زمین پر رینگ رہا ہو۔ چند سیکنڈ بعد ہی پر ساد کی سرگوشی سنائی دی۔  
 ”ہاں!“

”میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ وہ رینگتا ہوا میرے قریب آیا۔

”ہمڑک یا کسی اور رستے سے نکلنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔“ ہاں۔ پر ساد نے کہا ”انہوں نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی بچا ہے۔“

”دو دروازے کون سا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”دیا!“ پر ساد نے جواب دیا ”کیا تم تیرا جاننے ہو یا نہیں؟“  
 اس کی بات سن کر میں کانپ اٹھا۔ میری آنکھیں آبی تھیں اور ہچکچاہٹ میں سے منہ پور کے ایک خونخوار کلب میں بیٹھی تھی۔ کلب سو ٹانگ پول اور دیا میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پول کے قریب سے ہونے والی میں تیرا دروازہ ہے اور دیا کے قریب سے ہونے والی میں تیرا دروازہ ہے۔ اور پھر اس وقت میری حالت؟ بازو اور ٹانگ میں گولیاں لگی تھیں۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے میں کھڑکی محسوس کر رہا تھا لیکن بجائیک موت نے چاروں طرف گہرا ڈال رکھا تھا اور موت کے اس حصار کو توڑنے کا وہی ایک راستہ تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”یہ رسک لینا ہی پڑے گا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ اس طرف چلو۔ لیکن کچھ دور تک رینگنا ہی ممکن ہے۔“ اس طرف ”کتے ہوئے اس نے ہاتھ سے کوئی

اشادہ بھی کیا ہو لیکن دیکھ اندھیرے میں تو میں اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا تھا اس کا ہاتھ کیا نظر آتا۔ پر ساد کے رینگنے سے... سربراہ کی جو بھی سی آواز پیدا ہو رہی تھی میں اسے فالو کرتے ہوئے اس کے پیچھے رینگتا رہا۔ میرے زخمی بازو اور ٹانگ میں تکلیف کی شدت بڑھ گئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چھینٹ رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد میں اس جگہ سی جگہ سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے۔ چرے سے گرانے والی نازہ ہوا بڑی خوشگوار لگی تھی۔ اس جگہ اگرچہ روشنی نہیں تھی لیکن سامنے دیا کے دوسرے کنارے پر روشنیوں جگمگا رہی تھیں اور ان سے اندھیرے کی گھٹن کا احساس بھی ختم ہو گیا تھا۔

راسن پر ساد اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ میری زخمی ٹانگ نے بوجھ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور معمولی سا بوجھ بڑھنے سے زخم سے جو ٹیس اٹھی تھی وہ میرے پورے وجود میں پھیلنے چلی گئی تھی۔

پر ساد فوری ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے میرا سیدھا بازو اپنی گردن میں محال کر لیا اور مجھے سارے دائرے میں گھومتے چلائے لگا۔ میرا دایاں بازو زمین پر گھس رہا تھا۔ گولی میری پنڈلی کی پچھلی طرف لگی تھی اور اندر ہی درستی تھی جس وجہ سے مجھے زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔ پوری ٹانگ میں شدید تپاؤ اور کھچاؤ تھا۔

چند قدم چلنے کے بعد ہم رک گئے بلکہ میں تو گر سا گیا تھا۔ میں نے تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اُدھر اُدھر دیکھا۔ وہ گیسٹ ہاؤس بائیں طرف تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس سے پرے ہو کر ٹھہرنا کا جھگڑا ہوا انہوں سائن نظر آ رہا تھا۔ میں نے گردن ہٹا کر اس طرف دیکھا جہاں سے ہم نکل کر آئے تھے۔ اس جگہ کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کیسی بڑی کابینہ کی حد تھا۔ ہو سکتا ہے پہلے یہاں دیا پر لپٹا ہونے کا منصوبہ بنا ہو لیکن فی وجوہات کی وجہ سے یہ منصوبہ ترک کر کے وہاں سے تقریباً ہزار گز آگے پہل تھیرا گیا تھا۔ اس جگہ زمین سے لپ کی بنیادیں اور سائڈ کی دیواریں اٹھا کر شروع کے حصے میں ٹھکرت کی بھرائی کی گئی تھی اور آگے کچھ حصے پر ٹھکرت کے دیو قامت گاؤں والی کچھت یا سرک کا کچھ حصہ بھی بنایا گیا تھا لیکن بعد میں اسے نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس چھت کے نیچے بڑے بڑے پتھر اور ہلے کے ڈھیر ایسے ہی پڑے رہ گئے تھے اور پر ساد مجھے اس کے آخری حصے میں ایک ایسے ہی بڑے پتھر کے پیچھے لے گیا تھا جس وجہ سے ہم تلاش کرنے والوں کی نظروں سے محفوظ رہے تھے۔

”میں رکتا خطرے سے خالی نہیں ہے باس۔“ پر ساد کی آواز نے مجھے چونکا دیا ”اگر وہ لوگ دوبارہ اس طرف نکل آئے تو ہمارے پاس چھپنے کی کوئی اور جگہ بھی نہیں ہے۔“



اس نے مجھے دوبارہ سارا دے کر اٹھا دیا اور میں اس کے ساتھ گھٹنے لگا۔ ہمارا رخ دریا کی طرف تھا۔ بنگال والوں نے شہر کے وسط میں بستے ہوئے اس دریا سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ کئی یاٹ کلب تھے۔ دریا کے ساتھ بڑے بڑے بوٹوں نے بھی کمانوں تک کی جگہ گھیر رکھی تھی جہاں چھوٹی چھوٹی بیٹیاں تھیں کر کے اپنے مسانوں کے لیے بوٹنگ کی سولیس فراہم کر رکھی تھیں۔ بعض لوگوں نے دیسے ہی جگہ گھیر کر چھوٹے چھوٹے ٹکٹ بٹا رکھے تھے جہاں دریا کی سریر کے لیے آنے والوں کو کرائے پر کشتیاں فراہم کی جاتی تھیں لیکن بہت سی جگہیں ایسی تھیں جو اب بھی دیران پڑی تھیں۔ ان جگہوں پر آس پاس بوٹے کھڑے تھے یا کسی اور وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

اس وقت ہم جس جگہ پر موجود تھے وہاں سے بائیں طرف تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر تو وہ ٹیٹ ہاؤس تھا اور دوسری طرف تقریباً پانچ سو گز تک دیران تھا۔ اس سے آگے دو نشان نظر آ رہے تھے۔ ”سیرا خیال ہے اس طرف کنارے پر ہمیں کوئی ایک جگہ مل جائے گی جہاں سے ہم دریا میں اتر سکیں۔“ رامن پر ساد نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مگر پر ساد۔“ میں کراہ اٹھا۔ ”مجھ سے تو قدم نہیں اٹھایا جا رہا۔ بازو بھی بڑی طرح اکڑا ہوا ہے۔ دلوں میں کیسے تیر سکوں گا؟“

”فکر نہ کرو پاس۔“ پر ساد بولا ”میں صرف موٹر کینک ہی نہیں ہوں۔ ایک بہت اچھا پیراک بھی ہوں۔ پٹاکے کرے ساحل پر پیراک کے کئی خزانے مقابلے جیت چکا ہوں۔ تم میری پشت پر سوار ہو جاؤ۔ میں تمہیں بڑی آسانی سے دوسرے کنارے تک لے جاؤں گا۔ راستے میں تمہارے کپڑے تک گتے نہیں ہونے دوں گا۔ بس ہمیں دریا میں اترنے کے لیے مناسب جگہ مل جائے۔“

رامن پر ساد مجھے سارا دے کر جھاڑیوں میں گھسنا رہا۔ اس طرح چلے سے میری ٹانگ کی تکلیف بدتر ہو جاتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ دارا اور کم کے آدمی شکاری کتوں کی طرح آس پاس کے علاقے میں ہماری بو سنھتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی لمحے اس طرف بھی آسکتے تھے۔

ہم اس جگہ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ آس پاس جھاڑیاں اگرچہ خاصی اونچی تھیں مگر زیادہ گنجان نہیں تھیں۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے آسانی سے راستہ مل رہا تھا اور پھر چاکا ہم ٹھک کر رہ گئے۔

ہم سے تقریباً پندرہ گز کے ایک شعلہ سا چکا تھا۔ میں نے غور سے اس طرف دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ وہاں قدرے اونچی جگہ پر ایک آدمی کھڑا تھا جس نے سرگٹ سلگنے کے لیے داہنی سلاخی چلائی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ داہنی سلاخی کی بو دھنی میں

اس کا چوتھو نظر نہیں آیا تھا لیکن بکھرے ہوئے بال اور دھاری دار ٹی شرٹ سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ یقیناً دارا ہی کا کوئی گرگ تھا جو گھرائی کے لیے وہاں کھڑا تھا۔

رامن پر ساد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے آہستگی سے جھاڑیوں کی آڑ میں زمین پر بٹھا دیا اور جھاڑیوں کی آڑ سے کرچک کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا۔ پر ساد میری نگاہوں سے اوچھل ہو گیا تھا مگر وہ آدمی اپنی جگہ پر کھڑا اٹھینان سے سرگٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سرگٹ ٹاپا بہت سی گھبراہٹ کا تھا۔ ہوا کا رخ ہونے کی وجہ سے اس کی ٹانگواری پوریاں تک آ رہی تھی۔

اور پھر اس شخص کے عقب میں چند قدم کے فاصلے پر پر ساد کو نمودار ہوتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میں دلی دل میں اس کی کامیابی کی دعا میں لگے۔ پر ساد بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور پھر شاید اس کا پیر کسی جھاڑی میں الجھ گیا تھا۔ وہ لاٹھڑا گیا۔

آواز سن کر وہ شخص تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس نے سرگٹ پیچھک دیا اور پر ساد کی طرف لپکا۔ پر ساد پھسل گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹھٹھک گئے۔ دونوں زمین پر گرے پھر اٹھ گئے۔ میں کسی قدر شبہ میں تھا اور وہ دونوں اونہی جگہ پر تھے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کے پس منظر میں مجھے ان دونوں کے پیروے تو نظر آ رہے تھے مگر یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ان میں پر ساد کون سا ہے اور وہ غنڈا کون سا۔

وہ ایک بار پھر زمین پر گرے۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جھاڑیوں کے چمکنے کی آوازیوں سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور پھر ایک خوف ناک چیخ فضا میں ابھری۔ یہ چیخ پر ساد کی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے کھٹکتا ہوا گنجان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ دو منٹ گزر گئے اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک ہیلا ٹھیک اس جگہ پر آکر رک گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں موجود تھا۔

”پاس!“ یہ پر ساد کی آواز تھی۔

”میں یہاں ہوں پر ساد۔“ میں نے اسے آواز دی۔ ”وہ ختم ہو گیا پاس۔“ پر ساد تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آیا۔ ”میں نے اس کی گردن مروڑ دی ہے۔ وہاں ایک طرف سی جیڑی پر دو کشتیاں بھی لٹکی ہیں پاس۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”اس مردود کی چیخ جانے میں دور تک پہنچی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ اس کا کوئی ساتھی اس طرف پہنچ جائے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”میں اٹھ نہیں سکتا۔ مجھے سارا دو پر ساد۔“ میں نے اپنا

جیروت ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ میں اس وقت کچھ زیادہ ہی خفا تھا کہ اس نے گناہ کیا۔

”پر ساد نیچے جھکا اور سارا دینے کے بجائے مجھے پشت پر دلا۔“ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ اس کا ایک ہاتھ ہائی ٹانگ کے زخم پر تھا۔

”پر ساد مجھے اٹھا کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگا۔ تقریباً پانچ سو گز کا فاصلہ طے کر کے اس نے مجھے جھپٹی پر اتار دیا۔ یہاں پر ساد نے کنارے پر ایک پختہ چوتہ بنا ہوا تھا اور ایک تنگ سی گاڑی اس چوتے کے ساتھ سی اندر کو نکلی ہوئی تھی۔ یہاں دو پہلی کشتیاں تھیں جن کی رسیاں ایک آہستہ پاپ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ یہ چوڑی والی کشتیاں تھیں۔ پر ساد نے مجھے اٹھا کر ایک کشتی میں ڈال دیا اور پاپ کے ساتھ بندھی ہوئی رسی کھول کر چڑھنے لگا۔ وہ کشتی کو کھاڑی سے نکال کر دریا میں لے آیا اور اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔

میں کشتی کے فرش پر بڑھال سا بیٹھا تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ کوئی بہت بڑھ گئی تھی۔ زخمی ٹانگ اور بازو کھینچنے کی طرح اکڑ گئے تھے اور دوڑنے کے بعد حال کر کھٹا تھا اور میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کس سکون کا لیاں گا۔

”اب پریشانی کی کوئی بات نہیں پاس۔“ پر ساد نے شاید برے خیالات پھیلنے سے ڈر کر پانی بہت پر سکون اور ہموار۔ ”چہ ہم زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گے وہاں سے ہمیں تھوڑا دور جانا ہوگا؟“

مجھے اس کی باتوں سے حوصلہ مل رہا تھا۔ وہ واقعی وفادار تھا۔ علی میری وجہ سے اس نے ایک انسان کے خون میں ہاتھ بھی رنگ لیے تھے۔ چن چن کھینچنے پہلے جب میں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا تو اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں دوستی کا مفہوم جانتا ہوں یا نہیں۔ اگرچہ ہماری دوستی کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے خودی مجھے دوستی کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔

”میری بات کا جواب نہیں دیا پاس۔“ پر ساد نے دوبارہ کہا ”میں کتنی دور جانا ہوگا؟“

”تقریباً ایک میل!“ میں نے سنبھل کر چمکنے کی روشنی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ٹھیک کے چمکنے سے ذرا آگے۔“

”واٹک دھک یا ئے رطوبے اسٹیشن کے قریب؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کی مخالف سمت۔“ میں نے جواب دیا اور ادھر اڑھائی گئے۔ دیر کا پانی واقعی پر سکون تھا اور اسے کشتی کھینچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ دریا کے دونوں طرف دور دور سے تھوڑے بڑے نشانیں بکھار رہی تھیں۔ اس وقت شاید باہر نیچے اٹھ سکیں گے۔ میں تھاکی واٹک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد گھر سے نکلا تھا اور تھاکی سے کہا تھا کہ دو تین گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔ اب مجھے تقریباً چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ یقیناً پریشان ہو رہی ہوگی۔ کہیں اس نے گھبرا کر سڑو ہو جی کو فون نہ کر دیا ہو۔

دوسرے کنارے تک پہنچنے میں تقریباً دس منٹ لگے تھے۔ رامن پر ساد نے کشتی ایک دیران جگہ پر روکی تھی۔ کشتی کو کنارے سے لگا کر اس نے مجھے اپنے اوپر لا دیا اور کشتی کے کنارے پر کھڑے ہو کر چھلانگ لگا دی۔

”مجھے نیچے آنا۔“ میں تمہارا سارا لے کر چلنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں پاس۔“ پر ساد نے جواب دیا ”ہو سکتا ہے ان کا کوئی آدمی اس طرف بھی موجود ہو اور کشتی کو آتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہو۔ کچھ دور تک تو تم میرے اوپر سی سوار کر کے رہو۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر کشتی میں آنا دوں گا۔“

رامن پر ساد کا خیال غلط نہیں ہو سکتا تھا لیکن ہمیں بڑی سڑک تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سڑک پار کر کے ہم ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ پر ساد نے مجھے نیچے اتار دیا۔ زمین پر بیدار کھینچ کر میرے ہونٹوں سے کراہی خارج ہو گئی۔

”پاس!“ پر ساد نے میرا ہاتھ دست بازو اپنی گردن پر ڈال لیا ”مجھے معلوم ہے تمہاری حالت بہت نازک ہو رہی ہے۔ تمہارا جسم بھی تھکے گا۔ تمہارے ذہنوں سے خون بہت بہر چکا ہے مگر تم واقعی ایک حوصلہ مند نوجوان ہو۔ کوئی اور ہوتا تو بہت بار چکا ہوتا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”تمہیں فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ مگر پہنچ کر کسی ڈاکٹر کو بلائے میں دیر لگے گی اور یہ بھی ممکن ہے وہ ڈاکٹر تمہاری حالت دیکھ کر کوئی ٹریٹ منٹ دینے سے انکار کر دے۔ میں نے میں روڈ کی طرف ایک اسپتال کا نیون سائن دیکھا ہے۔ اگر کو تو میں تمہیں اسپتال لے چلوں۔ ہم پولیس کو بھی ان لوگوں کے بارے میں اطلاع کر دیں گے۔“

”نہیں پر ساد۔“ میں نے کہا ”تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ انسان نہیں درندے ہیں۔ پورے بنگال کی پولیس آج تک ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ تم میری حالت کی پروا مت کرو۔ مجھے گھر لے

چلو۔ ڈاکٹر کا انتظام ہو جائے گا۔“

وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ چلنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے اوپر لا دیا اور تیزی سے چلنے لگا۔ میں اسے راستہ بتاتا رہا تھا اور بالآخر تقریباً آٹھ گھنٹے بعد ہم مطلوبہ گلی میں پہنچ گئے۔

گیت کے سامنے پہنچ کر اس نے مجھے نیچے اتار دیا۔ میں ستن

کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ برسات نے کال تیل کا بٹن دبا دیا۔ صرف ایک منٹ بعد گیت کا ڈبلی دروازہ کھل گیا۔ وہ تھائی وایک تھی اور نجانے کب سے میرے انتظار میں برآمدے میں بیٹھی تھی اور کال تیل کی آواز سنتے ہی گیت پر پہنچ گئی تھی لیکن دروازہ کھولنے ہی میرے بجائے ایک انجینی کو دیکھ کر وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔

”کون ہو تم میں جنہیں نہیں جانتی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔“ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔  
”میں ہوں تھائی۔ دروازہ کھولو۔“ میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

دروازہ ایک دم کھل گیا۔ تھائی نے گردن نکال کر باہر جھانکا اور پھر مجھے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہد حواس ہی ہو گئی۔  
”کیا ہوا تمہیں۔ اس طرح کیوں کھڑے ہو۔“

”میں زخمی ہوں تھائی۔ مجھے اندر لے چلو۔“ میں نے کہا۔  
”یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟“ تھائی بولی۔  
”میرا دوست ہے۔ گھبراؤ نہیں۔“ میں نے کہا۔

تھائی وایک راستے سے ہٹ گئی۔ برسات کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے گیت بند کر دیا اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ برآمدے کی تہی بھی ہوئی تھی لیکن کمرے میں داخل ہونے کے بعد میری حالت دیکھنے ہی تھائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا تمہیں! اس نے کی ہے تمہاری یہ حالت۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ تھائی وایک چیخ رہی تھی۔ اس دوران میں برسات نے مجھے کمرے میں لا کر بستر پر لٹا دیا تھا۔

”میں زندہ ہوں تھائی۔ میں زندہ ہوں۔ اپنے حواس قابو میں رکھو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے گولیاں لگی ہیں۔ خون بہت ضائع ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری حالت زیادہ بگڑ جائے“ جاگتی دیوی کو فون کر کے بلاؤ۔ اسے بتا دینا ”ایک گولی ابھی تک میری پٹلی کے اندر موجود ہے۔ جاؤ تھائی۔ دیر نہ کرو۔“

تھائی دوڑتی ہوئی ٹیلی فون کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ریسور اٹھایا اور نمبر لا کر جاگتی کا صورت حال سے آگاہ کرنے لگی پھر ریسور ختم کر لیا۔

”ہوا کیا۔“ جنہیں کہے گولی لگی اور یہ کون ہے؟“ تھائی نے کہا اور برسات کی طرف دیکھنے لگی۔  
”کچھ خطرناک لوگوں سے آمتا سامنا ہو گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”میرے“ میں نے برسات کی طرف دیکھا ”میں مجھے موت کے منہ سے نکال کر لایا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو تاج کی رات میری

زندگی کی آخری رات ثابت ہوتی۔ مجھے تو اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔“  
”اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ اس۔۔۔ میں نے تو حق دوستی ادا کیا ہے۔“ برسات نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”اب میں جاؤں یاں!“  
”نہیں۔ تم یہیں رہو گے۔“ میں نے مسکراتے کی کو شکل کرتے ہوئے کہا۔

تھائی وایک کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بھی میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ہونٹوں پر بڑا ہلکتی تھی۔ میرا خون کھلو لیاں دیکھ کر بار بار اس کی طعیاں پہنچ جاتیں۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

جاگتی دیوی تقریباً چالیس منٹ بعد وہاں پہنچی تھی۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی گڑ بڑا گئی۔ میری حالت اب غیر ہوسہ تھی۔ مسافر جب منزل پر پہنچتا ہے تو سٹیشن سے نڈھال ہو کر گر دیتا ہے میری بھی شاید کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ میں موت کو دھکے دیتا ہوا اپڈن میں پہنچ گیا تھا اور میرا حوصلہ پختہ ہو گیا تھا۔ بہت اور قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ قہارت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اب غصوں کی طاری ہونے لگی تھی اور میرے لیے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

تھائی وایک نے پہلے ہی پانی گرم کر رکھا تھا۔ جاگتی دیوی نے سب سے پہلے برسات کی مدد سے میرے کپڑے اتار کر خون سے لتھڑا ہوا جسم صاف کر دیا اور آپریشن کی تیاری شروع کر دی۔ پہلے میرے بازو کی ڈرننگ کی گئی۔ یہاں کوکٹ کو چپٹی ہوئی نکل گئی تھی۔ بازو کی ڈرننگ کھل کرنے کے بعد وہ میری ٹانگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ جاگتی نے ٹانگ پر لوکل انسٹیجیسا دے کر آپریشن شروع کر دیا۔ اس وقت تک میں مکمل طور پر غصوں کی لپیٹ میں آچکا تھا اور مجھے کچھ بات نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔

کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کمزری کے راستے آنے والی دھچ پھیلی ہوئی تھی۔ بچے کے قریب وائیں طرف تھائی وایک ایک کرسی پر بیٹھی آگے دھکی رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے ہلکی سی گراہ خارج ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ یہاں نظروں کے سامنے دھند سی پھیلی ہوئی تھی جو رفتہ رفتہ صاف ہوتی چلی گئی۔ میں نے پہلے تھائی وایک کی طرف دیکھا اور پھر ادرادھر

دیکھنے لگا۔ بچے کے ساتھ ہی ایک اسٹینڈر خون کی بوتل ٹنگی ہوئی تھی جس کا خون غیر محسوس رفتار سے میری گردن میں منتقل ہو رہا تھا۔ تھائی وایک میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور مجھ کے ہنر

میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ شہنشاہ بعد جاگتی دیوی بھی آگئی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور خون کی بوتل کو چپک کرنے لگی۔ اس نے تقریباً پندرہ منٹ میرے سامنے پر لگا دیے۔

”اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ تھائی وایک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”بیمار تیز ہے۔ اسے شام تک اتر جانا چاہیے۔“

وہ بھی قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت دن کے مہابھج رہے تھے۔ جاگتی دیوی رات کو یہاں آنے کے بعد کمرے واپس نہیں گئی تھی۔ میرے لیے خون کا بندوبست اسی نے کیا تھا۔ عورت رات میری ٹانگ سے گولی نکالنے کے بعد اس نے زخم کی ڈرننگ کو دسوی تھی لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ میرے لیے غاس پریشان تھی۔ اس نے تھائی کو دو نوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میرے لیے خون کا بندوبست ہو نا بہت ضروری تھا۔ اگر خون نہ ملتا تو میری زندگی خطرے میں پڑتی تھی اور پھر رات ہی کو وہ ایک سرخ میں میرا خون لے کر چلی گئی تھی۔ ایک پرائیویٹ اسپتال میں اس کی کچھ جان بچان تھی۔ اس نے خون کا گروپ ٹیسٹ کر دیا۔ اس گروپ کا خون اسے اسپتال ہی کے بلڈ بینک سے مل گیا تھا۔

اس نے اسپتال کے ڈرگ اسٹور سے کچھ ضروری ادویات بھی لے لی تھیں۔ دو گھنٹے بعد واپس آکر اس نے مجھے خون کی بوتل لگا دی تھی۔ یہ خون کی دوسری بوتل تھی جو تقریباً آدھا گھنٹا پہلے لگا گئی تھی۔ خون کی یہ بوتل جاگتی دیوی صبح اسپتال سے لے کر آئی تھی۔ ان تمام انتظامات کے لیے جہاں اسے بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی وہاں ابھی غاس پر فم بھی خرچ ہوئی تھی۔ بہر حال بدقت خون مل جانے سے میری جان بچ گئی تھی اور اب میری حالت خطرے سے باہر تھی۔

تھائی وایک کی آنکھوں میں حیرت ہوئے آنسو اور جاگتی دیوی کی اس بھاگ دوڑ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں مجھے کتنا جانتی تھیں لیکن ان سے میرا کیا رشتہ تھا؟ ہم تین کا خون الگ تھا۔ مذہب الگ تھا۔ کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ہمارے نفس نسل انسانی سے تھا۔ اس دنیا میں سب انسان ہی تو بنے ہیں۔ جو حیوانوں سے زیادہ بدتر اور درندوں سے زیادہ خوں خوار ہیں۔ ایک دوسرے کا گھٹا کانٹے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ یہی انسان ہی کلاتے ہیں، مجھے موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتے ہیں اور یہی انسان ہی ہیں جو میرے لیے اس قدر پریشان نہیں کر رہا تھا۔ کچھ واڈ پر لگا رکھا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تھائی

اور جاگتی نے اس رشتے کی شناخت کر لی ہے جس کے لیے مذہب اور خون کا ناتا ہونا ضروری نہیں۔ انسانیت ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو خون اور دھرم کی پروا کے بغیر ایک دوسرے کو قریب لاتا ہے۔

”اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ جاگتی دیوی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ”لیکن کئی روز تک تم بہتر سے نہیں اٹھ سکو گے۔“

”برسات کہاں ہے۔ کیا وہ چلا گیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں۔“ تھائی نے جواب دیا ”وہ تو رات بھر ہمارے ہنگ کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا ہے۔ ایک گھنٹا پہلے میں نے زبردستی اسے یہاں سے اٹھایا ہے۔ سو رہا ہے اس وقت لیکن یہ ہے کون؟ کیا تم نے اسے یہاں لا کر غلطی نہیں کی؟“

”نہیں۔“ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی ”یہ قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ اگر مجھے اس پر زرا سامجی شبہ ہوتا تو اسے یہاں بھی نہ لانا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر رک رک کر بتانے لگا کہ راسن برسات کون ہے اور اس سے میری ملاقات کیسے ہوئی تھی ”اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں اس گیسٹ ہاؤس سے زندہ لوٹ کر نہیں آسکتا تھا۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی ہے۔“

”اس نے گیسٹ ہاؤس میں ہونے والے ہنگے کی تفصیل بتا دی تھی لیکن وہ کون لوگ تھے۔ ٹائیگیا اس کے آدمی؟“ تھائی نے پوچھا۔

”کم اور دارا۔“ میں نے جواب دیا۔  
”کیا۔۔۔؟“ تھائی اچھل پڑی۔

”ہاں۔“ میں نے کہا ”زندگی میں پہلی بار براہِ راست ان دونوں سے سامنا ہوا تھا۔ وہ شاید اب بھی بچے پھر بھی سمجھ رہے تھے لیکن میں نے ان کی جو درگت بتائی ہے اسے شاید وہ عرصے تک نہیں بھول سکیں گے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو شاید کیا بلکہ یقیناً کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا تھا لیکن راسن برسات بدقت وہاں پہنچ گیا تھا۔“

”اسی لیے میں نے جنہیں منع کیا تھا کہ اکیلے باہر مت نکلو۔“ تھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ”اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔۔۔“  
”وہ اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔“ میں بھی کچھ کہنے کے بجائے گہری نظروں سے تھائی کی طرف دیکھتا رہا۔

اسی رات تھائی نے میرے کہنے پر ماسٹر ہو جن کو فون کیا تو یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ ان لوگوں کو گزشتہ رات ہی اس واقعے کا علم ہو گیا تھا اور ماسٹر ہو جن کے آدمی مجھے شہر بھر میں تلاش کر رہے تھے تاکہ میری حفاظت کا بندوبست کیا جاسکے۔

”میں بالکل محفوظ ہوا ماسٹر ہو جن!“ میں نے کہا ”اب میں نے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونا سیکھ لیا ہے۔ تم میری گھڑمت کرو۔“

”وہ نوگ شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں تمہیں تلاش

کرتے پھر رہے ہیں۔" ماسٹر ہوجن نے کہا "آج دوبارہ ہمارے آدمیوں سے بھی اچھڑے تھے۔ ہمارا ایک آدمی شدید زخمی ہوا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ رات کو گیسٹ ہاؤس میں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ تم ٹھیک تو ہونا۔ تمہاری آواز سے مجھے شبہ ہو رہا ہے۔"

"رات کو مجھے دو گولیاں لگی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ سڑک ایک کوئی شہم منہ لگی تھی جسے آپریشن کر کے نکال دیا گیا ہے۔ میں چند روز میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اگر تم اپنا ٹھکانا بتا دو تو تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دیا جائے۔" ماسٹر ہوجن نے کہا۔

معارف کے آدمیوں کو پہچانتے ہیں۔ میرا مطلب تھا کوئی ایسا آدمی جسے وہ نہ جانتے ہوں اور وہ ان کے بیچ میں نہ کران کی سرگرمیوں سے آگاہ ہو سکے۔"

"کیا کتنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔ ویسے میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

"باس! یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے ٹھیک آیا ہوں یا یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔" برسات نے کہا "مجھے وہ لوگ نہیں جانتے اگر میں ان کے اندر گھسنے کی کوشش کروں تو ان کی سرگرمیوں کا پتہ چل سکتا ہے۔"

"اس رات تم میرے ساتھ تھے۔ پہچان لے جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں باس۔" برسات مسکرایا "ہمارا ساتھ تو چند منٹ کا تھا۔ انہیں تو پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب میں نے اوپر آکر ان پر حملہ کیا تھا تو ان دونوں میں سے کسی کو آواز ہوش کہاں رہا ہو گا کہ میرا چوہا یاد رکھ سکیں۔" جس میں تو اس لیے پہچان لیا گیا کہ وہ جس پہلے سے جانتے تھے مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا اور اگر پہچان بھی لیا گیا تو وہ مجھ سے تمہارے بارے میں مجھ سے معلوم نہیں کر سکیں گے۔ وہ میری بوٹی بوٹی کڑواؤں تو میری زبان پر تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

میں نے ریسورٹر کو دیا اور تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ وقت کی رفتار جیسے ٹھم ٹھم تھی۔ ایک ایک دن برسوں پر محیط ہو رہا تھا۔ میرے ذہن اگرچہ تیزی سے مندرل ہو رہے تھے لیکن مجھے بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جاگی دیوی مجھے دیکھنے کے لیے دن میں دو مرتبہ ضرور آتی تھی اور تھائی دانگ۔ اس نے تو اپنے آپ کو میرے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ زیادہ تر میرے پاس ہی بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ وہ میرا منہ ہاتھ دھلاتی اپنے ہاتھ سے ناشتا اور کھانا کھاتی اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔

راسن برسات بھی قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود بھی مجھے چھوڑ کر جاتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی میرے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔

"باس۔" ایک روز وہ میرے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا "یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں اور تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے لیکن۔"

"لیکن کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ تو تمہاری تلاش میں ہوں گے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتے پھر رہے ہوں گے لیکن ہم ان کی سرگرمیوں سے قطعی لاعلم ہیں۔ کیا یہ بستر نہ ہو گا کہ ہم بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔" برسات نے کہا۔

"معارف کے آدمی ان کے پیچھے لے ہوئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"فکر مت کرو باس۔" برسات نے میری بات کا ردی "ملکی صورت میں ہمیں ادھر کاروبار نہیں کروں گا۔"

تھائی دانگ خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے برسات کی باتوں سے اتفاق کیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مناسب تجویز تھی۔ دارا وغیرہ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا ضروری تھی۔ اگلے روز صبح دس بجے کے قریب برسات میرے سامنے آیا تو میں اسے دیکھ کر چونک کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

ہوئے تھا اور اس کا چہرہ بھی بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔ کل رات تک اس کے بال گردن تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اب اس کے بال چھوٹے اور ہلکے سے تراشے ہوئے تھے۔

"یہ تھائی دانگ کے ہاتھوں کا کمال ہے۔" برسات نے مسکراتے ہوئے کہا "اس نے مجھے آدمی بنانے میں پورا ایک گھنٹا لگا ہے۔"

اسی لمحے تھائی دانگ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کا ایک ہینڈل برسات کے ہاتھ میں تھا دیا۔

"سب سے پہلے تمہیں مکان کا بندوبست کرنا ہے۔" وہ بولی "اور مکان ایسا ہو جو برسات سے ہمارے لیے محفوظ ہو۔ اس کے بعد تم کسی دوسرے کام پر توجہ دو گے۔"

جواب میں برسات نے صرف مسکراتے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

تھائی در بدر وہ رخصت ہو گیا۔ تھائی دانگ باہر کا گیٹ بند کر کے میرے پاس آئی۔

"صبح جاگنی کا فون آیا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے بولی "وہ کسی مصروفیت کی وجہ سے اس وقت نہیں آسکتی۔ شام کو پھر کال گئی۔" وہ نے اس نے کہا تھا کہ تمہیں اب اچھڑا کر تھوڑا بہت چلنا پڑے گا۔

"پندرہ دن ہو گئے بستر پر پڑے پڑے۔ میں خود بھی اکتا گیا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ابھی شروع ہو جائے۔" ایک سرسبز تھائی نے کہا۔

میں اس وقت نیم دراز تھا۔ اپنے آپ کو اوپر کھینچ کر بیٹھ گیا۔

ان چندہ دنوں میں شروع کے دو چار دن تو میں بالکل ہی بے حس و حرکت رہا تھا لیکن اب لپٹے ٹانگ اور بازو کو آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا تھا۔ دانگ میں زیادہ تکلیف تھی۔

تھائی دانگ نے مجھے سارا ارے کر فرس پر کھڑا کر دیا۔ میں نے اپنا تھوڑا سا بازو اس کی گردن پر ڈال دیا۔ تھائی نے بھی اپنا ایک بازو میری گردن کے گرد حائل کر دیا تھا۔ اس طرح میرا سارا بوجھ تھائی پر تھا۔

دائیں ٹانگ کی نسلوں میں تازہ تھا۔ شروع میں تو پیر زین پر رکھے ہوئے بھی تکلیف محسوس ہوتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ گھٹاؤ کم ہو گیا۔ تھائی مجھے سارا ارے پندرہ میں منٹ تک پورے گھومیں کھاتی رہی اور پھر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔

راسن برسات اس رات واپس نہیں آیا اور نہ ہی اگلے روز اس نے کوئی خبر دی حالانکہ اس کے پاس یہاں کا ٹیلی فون نمبر موجود تھا۔

"تم نے بتایا تھا کہ وہ موٹر کلوک ہے اور پیرہ کمانے کے لیے بلائے یہاں آیا تھا۔" تھائی دانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت میرے بستر پر بیٹھی اپنے ہاتھ سے مجھے سوپ پلا رہی تھی "میں ایسا تو نہیں کہ ایک بڑی رقم اس کے ہاتھ آئی تو وہ

رفو چکر ہو گیا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں نے جواب دیا "میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کسی وجہ سے وہ ہم سے رابطہ نہ کر سکا ہو لیکن یہ بات تو میں پورے دھوکے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔"

اور پھر ہم دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس روز جاگی دیوی بھی نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس نے فون کیا تھا۔

میں جب سے بیمار ہوا تھا، تھائی دانگ میرے ہی کمرے میں سوتی تھی۔ اس نے بستر کے قریب ہی سٹی ڈال لی تھی۔ وہ زیادہ تر تو کرسی پر ہی بیٹھی رہتی اور جب میں سو جاتا تو وہ بھی سٹی پر لیٹ کر اوتھ لگتی۔ سوتے میں کوٹ بدلتے ہوئے میرے منہ سے گراہ بھی نکلتی تو وہ اٹھ کر میرے پاس آ جاتی۔ وہ جس طرح میری دیکھ بھال کر رہی تھی میرے خیال میں اس کی کوئی مثال ملنا مشکل تھی۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ برسات کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اب مجھے بھی اس کی طرف سے پریشانی ہونے لگی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے وہ پیسے لے کر بھاگ گیا ہو گا بلکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔ اس دوران میں میری ایک سرسبز جاری تھی۔ پہلے میں تھائی کا سارا لے کر چلا تھا اب بغیر سارے کے چلنے لگا۔ جاگی بھی میرے علاج پر پوری توجہ مرکوز رکھے ہوئے تھے۔ ماسٹر ہوجن سے بھی رابطہ ہونا رہا تھا۔

برسات کو گئے ہوئے وہ گیارہواں دن تھا۔ میں بستر پر آٹھویں بند کیے لیٹا تھا۔ داغ پر کچھ غنودگی سی طاری تھی۔ شاید میں سو جاتا لیکن ٹیلی فون کی ٹھنکی کی آواز سے میں چونک گیا۔ گری خاموشی میں وہ آواز ہم کے دھماکے سے کم ثابت نہیں ہوئی تھی۔ سٹی پر اوٹھتی ہوئی تھائی بھی اچھل پڑی۔ کئی روز سے ٹیلی فون اسی کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ تھائی نے متوجہ نظروں سے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر سٹی کے سرانے کی طرف ایک سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس وقت۔۔۔ کس کا فون ہو سکتا ہے؟" وہ کچھ زور سے نظر آ رہی تھی۔

"شاید جاگی دیوی ہو۔ اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

تھائی دانگ نے ریسورٹر اٹھایا۔ وہ ریسورٹر کان سے لگائے خاموش رہی۔ اس نے ہیڈ فون نہیں کیا تھا اور جب دوسری طرف سے ہیڈ فون کیا تو وہ بولی۔

"ہیڈ فون کون ہو تم۔۔۔ کس سے بات کرنی ہے؟"

"اور پھر دوسری طرف کی آواز سن کر تھائی کے چہرے پر طمانیت سی آئی۔ اس نے راسن برسات کا نام لیتے ہوئے ریسورٹر میری طرف بڑھایا۔





والی ہے۔" میں نے جواب دیا۔  
 "کھا۔ تمہیں سب کچھ کسے معلوم ہوا؟" ماسٹر تو چرن نے

”را من پر ساد کی زبان کھلوانا آسان نہیں ہوتا۔“

شہنشاہِ مملکت محض اتفاقاً ہوئی ہے۔ تھائی واکنگ تمہارے شہر کی

”دارا نے جو مقصد حاصل کرنے کے لیے میرے ماں باپ کو



قتل کیا تھا اور مجھے بھی ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اس نے سٹگا پور میں اپنے اس منصوبے کی بنیاد رکھ دی ہے۔" میں نے کہا۔  
 "میں سمجھا نہیں۔ کل کرتاؤ۔" چیاک شولوا۔  
 "اس نے ہیروئن کی اسٹنگ کے لیے سٹگا پور میں ایک ریکٹ قائم کر لیا ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے اپنی معلومات سے آگاہ کر لگا۔ میں نے ان تینوں افراد کے نام اور نیل فون نمبر بھی لکھوا دیے۔ "ان فون نمبروں سے ان کے ایڈریس معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ میں کل رات دوبارہ فون کروں گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ میری اس اطلاع کا نتیجہ کیا نکلا۔"  
 "تم ابھی خبر سے گامائی سن۔" انسپکٹر چیاک شولوا نے کہا۔ "اپنا خیال رکھنا۔ وٹ پوڈنگ!"  
 "یہ سب کچھ مجھے وقت نے سکھایا ہے۔" میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور لمبے میں جمید کی آگئی۔ "اس وقت نے جس نے میرا سب کچھ جھین لیا اور مجھے وقت سے پہلے جوان کر دیا۔ میری عمر کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں، کھیلنے کو پسند ہے اور اپنی پسند سے وقت گزارتے ہیں۔ کرائے آج کا مقبول کھیل ہے۔ لڑکے اسے کھیل سمجھ کر ہی سیکھتے ہیں لیکن میں اسے اپنی زندگی کے بچاؤ کا وسیلہ بنا رہا ہوں۔ میری آزادی بچن کی ہے۔ میں چاروں طرف سے خوفی بھڑوں میں گھرا ہوا ہوں۔ اپنے آپ کو ان دندلوں سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ وہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاید کیا بلکہ یقیناً ان ساری تکلیفوں سے دور ہوتا۔"

میری آواز بھرا گئی۔ انسپکٹر چیاک شولوا سے فون پر باتوں کے دوران میں کچھ پرانے زخم چل گئے تھے۔ وہ زخم اتنے پرانے تھے کہ انہیں بھول جاتا۔ انہی یادوں کے سارے تو میں جی رہا تھا۔ وہی جذبہ تو مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ چیاک شولوا کی باتوں نے میرے ذہنوں میں ٹیس سی پیدا کر دی تھی اور میں بے چین ہو گیا تھا۔

قہائی دانگ نے فوراً ہی میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بیٹھ پر آگئی اور مجھے اپنے ساتھ لپٹالیا اور پھر ایک عجیب سے احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں پرسکون ہوتا چلا گیا اور قہائی دانگ کی گود میں سر رکھے سو گیا۔

اس رات میں کوئی دیر بعد پرسکون اور کمری نیند سویا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو میں اپنے آپ کو بے ہوش ہلکا چٹکا محسوس کر رہا تھا۔ قہائی دانگ اس وقت بکن میں تھی۔ برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں بھی اٹھ کر بکن میں آگیا۔ قہائی جانے باری تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ جاگی دیوی آگئی۔ اسے دیکھ کر میرا ہاتھ خشکا۔ ابھی ساڑھے سات بجے تھے اور اتنی صبح وہ کبھی نہیں آتی تھی۔ قہائی کی آنکھوں میں بھی انہیں سی تیر گئی

تھی۔  
 "کیا ہوا جاگی۔ تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟" قہائی نے کہا۔  
 "وہ لڑکی میرے گھر آگئی ہے۔ آج صبح پانچ بجے" جاگی نے کہا۔  
 "کون سی لڑکی؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 "وہی شانی وان!" جاگی نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ اسے میرے گھر کا پتہ کیا ہے لیکن اس نے جو انکشاف کیے ہیں وہ بڑے سنسی ٹیز ہیں۔"  
 "ایک منٹ!" قہائی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی "میں تمہارے لیے چائے بنا دوں۔ پھر بات کرتے ہیں۔"  
 "ہاں۔ اب بولو کیا قصہ ہے؟" وہ جاگی کی طرف کپ بڑھا کر ہونے لگی۔  
 "صبح پانچ بجے کال بیل کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔" جاگی دیوی کہنے لگی "میں ایک دم بدحواس سی ہو گئی۔ میرے ذہن میں اچانک ہی خیال ابھرا تھا کہ کیسے تم لوگوں پر تو کوئی افادہ آن نہیں پڑی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس وقت دن کی روشنی بھی پوری طرح نہیں بھیلی تھی۔ میں اس کا چوہی پوری طرح نہیں دیکھ سکی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ مجھے دکھاکے کراہ کر آگئی اور خود ہی دروازہ بند ہی کر دیا۔"

"میں اسے دیکھ کر چونک گئی اور وہ میرے قدموں پر گر گئی اور رو رو کر کہنے لگی کہ مجھے بچاؤ۔ میں اسے کمرے میں لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بتایا کہ ایک رات تم اسے جلتے ہوئے مکان سے بھاگ کر لے گئے تھے اور ایک کتاچ میں چھوڑ دیا تھا جہاں وہ آ رہی تھی۔"

"شانئی وان کے کہنے کے مطابق وہاں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کوئی باندی بھی نہیں تھی۔ آزادی سے پورے گھر میں گھومتی پھرتی تھی لیکن اس کے دل میں چور تھا۔ وہ جتنی بھی اس نے تمہیں پھنسا یا تھا اور تم وہاں آؤ گے تو اس سے باز پرس ضرور کر گے۔ اس کے لیے اگرچہ باہر بھی خطہ تھا لیکن تمہاری باز پرس کے خوف سے وہ ایک رات اس کتاچ سے نکل گئی۔"

"وہ وہیں دن تک ادھر ادھر گھومتی رہی اور پھر ایک روز تنگ جو کے ہاتھ لگ گئی۔ تنگ جو کو بھی کسی طرح ہاتھ پکڑا تھا کہ تم اسے جلتے ہوئے مکان سے نکال لے گئے تھے اور اس کا خیال تھا کہ تم نے ہی اسے پناہ دے رکھی تھی۔ وہ اسے ہلا چکا کہ اپنے ساتھ لے گیا اور شرم میں ایک مکان میں چھپا کر رہا۔ اس دوران وہ نہ صرف اس سے تمہارے بارے میں پوچھا رہا بلکہ اسے ہیروئن بھی استعمال کرنا رہا۔ ہیروئن کے نشے نے شانئی وان کو زیر کر دیا اور اس نے اس کتاچ کا پتہ بتا دیا جہاں تم اسے لے کر

چھ۔ تنگ جو نے اس کتاچ کی گھرائی شروع کر دی۔ کئی روز بعد اسے انکشاف ہوا کہ تمہارا اس کتاچ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم اسے دھوکے سے وہاں چھوڑ گئے تھے اور کتاچ میں رہتے رہا۔ وہ تمہیں کو ایک مقفل روم دے گئے تھے کہ دو چار دن بعد ان کی کوداں سے رخصت کر دیا جائے۔

"تنگ جو نے شانئی وان کو اذیت دینا شروع کر دیا۔ ہیروئن کی ایک وقت کی خوراک دوک لیتا ہی اس کے لیے سب سے بڑی اذیت تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہر بات بھی کرتا تھا۔ اصل وہ ہر بات پر تمہارا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ انڈر ورلڈ میں بازار اور بائیکر کا یہ اعلان گردش کر رہا ہے کہ جو شخص تمہیں ان کے حوالے کرے گا اسے ایک ملین بھات کا انعام دیا جائے گا۔ وہ اس لیے ضرورت میں تمہارا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہیں پکڑ کر ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح اسے انعام بھی مل جائے گا اور اس کا انتقام بھی پورا ہو جائے گا۔"

"خود پھر جاننے اسے کس طرح یہ شبہ ہو گیا کہ میرا تم سے کوئی تعلق ہے۔ شانئی وان جتنے دن تنگ جو کی قید میں رہی تھی وہ دن اس پر بھاری چلے کر رہا تھا اور بالآخر جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی تو تنگ جو نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اسی دوران اس کے ذہن میں اس لگے سر ابھارا اور اس کے شیطان ذہن میں وہ ترکب آگئی۔ اسے تھا کہ شانئی وان کے پیٹ میں اس کا گمانا ہل رہا ہے۔ وہ اسے پہلے منسوبے کے تحت قلیٹ میں لے آیا اور پڑوسیوں کو بھی بتا کر کھائی جاتی جو اس نے مجھے سنائی تھی۔ یعنی وہ شانئی وان کو بے غلامی گھر کر انسانی جھوڑی کے تحت اٹھا لیا تھا۔ اس نے شانئی وان کو دھکیل دی تھی کہ اگر اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نکالا تو اسے مار دیا جائے گا۔"

"پہلے روز شانئی وان کی حالت دیکھ کر میں نے اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کل رات تنگ جو پھر میرے ٹیکیک پر آگیا اور مجھے شانئی وان کے علاج کے لیے ایک بیماری روم کی طرف لے گیا۔ دراصل وہ اس کے علاج کے بہانے مجھے کسی پکڑ میں پھنسا رہا تھا کہ مجھ سے تمہارے بارے میں کچھ اگلا سکے۔ گزشتہ رات گیارہ بجے میں اس کے گھر پر تھی۔ مجھے چونکہ تم سے ملنے وان کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا سی لیے میں نے تنگ جو کو ایک انجینئر لینے کے بہانے قلیٹ سے باہر بھیج دیا اور اس نے پہلے اس کے جانے کے بعد میں شانئی وان سے کچھ پوچھتی تھی کہ مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ تنگ جو نے اس کی پکڑیں پھنسا کر ایک میل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد میں اس سے کوئی بات نہیں کی۔

گئی تو وہ اسے مار ڈالے گا۔ میں نہیں جانتی کہ اسے میرے گھر کا پتہ کیسے چلا تھا اور یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اب میں اس کا کیا کروں۔ اسے گھر میں بھی نہیں رکھا جاسکتا اور یہاں بھی نہیں لائکتی۔ وہ ہیروئن کی عادی ہے۔ ایسے لوگوں کا جب نشہ ٹوٹتا ہے تو وہ اپنے آپ کو نوپتے لگتے ہیں۔ پیچھے چلانے لگتے ہیں۔ گھر میں اس کی موجودگی کو راز میں نہیں رکھا جاسکتا۔"

"وہ اس وقت کس حالت میں ہے؟" میں نے جاگی دیوی کے خاموش ہونے پر پوچھا۔  
 "میں نے اسے وٹلمین فائیو کا انجکشن لگا دیا تھا۔" جاگی نے جواب دیا۔ "وہ کم از کم کتاچ چھ کھٹے سوئی رہے گی۔"

میں اور قہائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسئلہ واقعی خاصا کبیر تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا ضروری تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ تنگ جو کسی نہ کسی طرح ہم سے جاگی کی وابستگی کا پتہ چلاے اور ایسی گڑبڑ شروع ہو جائے جس پر نہ صرف ہمارے لیے قابو پانا مشکل ہو جائے بلکہ نقصان بھی اٹھانا پڑے۔

"اس سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔" قہائی دانگ نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم دہنے کی کوشش کر دیتی تو تنگ جو کے ٹک کو تقویت ملے گی اس لیے اس سے پہلے کہ وہ تمہارے خلاف قدم اٹھائے تم اس پر چڑھ دو۔"

"وہ کیسے؟" جاگی نے پوچھا۔  
 "پولیس کو اطلاع دے دو۔" قہائی نے جواب دیا۔ "تنگ جو پہلے ہی ہیروئن کے کیس میں لوٹے پر اور ضمانت پر ہے۔ اگر شانئی وان بھی اس کے خلاف بیان دے گی تو اس کے لیے پتہ مشکل ہو جائے گا۔"

قہائی کی تجویز مقفل تھی لیکن اب یہ سوچنا باقی تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اگر تنگ جو پولیس کے ہاتھ نہ لگ سکا یا شانئی وان نے اس کے خلاف بیان نہ دیا تو خود جاگی دیوی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ہم تین سرجو ڈکریٹھے سوچتے رہے اور پھر یہ طے پایا کہ جاگی دیوی پہلے شانئی وان کو مضبوط کرے اور اگر وہ تنگ جو کے خلاف بیان دے پر آمادہ ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ بصورت دیگر اسے رات کی تاریکی میں گھر سے کہیں دور چھوڑ دیا جائے۔ اس کا نشانہ جب ٹوٹے گا۔ وہ پیچھے کی چلائے گی اور کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دیے گا۔

"میرے ذہن میں ایک اور ترکب آئی ہے۔" جاگی نے کہا۔ "میں نے اسے رات تک اپنے گھر میں ہی رکھا جائے اور سمجھا بھا کر آدھی رات کے لگ بھگ اسے اکیلے ہی پولیس اسٹیشن بھیج دیا جائے۔ اسے یہ سمجھا دیا جائے کہ میں منظر میں رہ کر اس کی مدد کرتی رہوں گی لیکن اس معاملے میں میرا نام نہ آنے پائے۔"

”مگر یہ بات وہ ان جانے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن اسے تمہارے گھر سے پولیس اسٹیشن کون لے کر جائے گا۔“ میں نے کہا اور پھر میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا ”رامن پرساد“ میں۔۔۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ قحانی نے کہا ”اس کا ایک کونٹیکٹ نمبر ہمارے پاس موجود ہے ابھی دو دن پہلے ہی تو اس نے یہ نمبر دیا تھا۔ آج دوسرے نمبر پر اس کے لیے پیغام چھوڑ دو۔ وہ شام کو یہاں آجائے گا۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ میں نے جاگنی دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم معمول کے مطابق اپنے کینک پر جاؤ لیکن تمہیں اس بات کا یقین کرنا چاہیے کہ تمہاری عدم موجودگی میں شانی دان کو کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ کرے۔“

”میں اس بات کا خیال رکھوں گی۔“ جاگنی دیوی نے کہا۔ قحانی دانک بچن میں جا کر ناشتا تیار کرنے لگی اور پھر ساڑھے نو بجے کے قریب جاگنی ناشتا کر کے رخصت ہو گئی۔

میں نے گیارہ بجے کے قریب پرساد کے نمبر فون کیا جہاں میں نے ہاس کے حوالے سے پیغام چھوڑ دیا۔ وہ دراصل ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کا نمبر تھا جہاں پرساد اس وقت ناشتا کرتے آئے تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی پرساد کا فون آگیا۔ ظاہر ہے فون پر ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے یہاں آنے کے لیے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”صورت حال واقعی خوفناک ہو گئی ہے۔“ قحانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر تم تک چوکو لیکن ہو گیا کہ جاگنی دیوی کا ہم سے کوئی تعلق ہے تو وہ ہمارا سراغ لگالے گا اور ہمارے لیے خطرات برپا کئے ہیں۔“

”خطرات تو پہلے ہی ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ہم ان سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”ہو سکتا ہے ہمیں یہ پناہ گاہ بھی چھوڑنی پڑے لیکن میرا خیال ہے کہ پرساد چوہین کو ہینڈل کر لے گا۔ مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔ ہمیں بھی اپنے طور پر تیار رہنا چاہیے۔“

”ویسے میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔“ قحانی نے کہا ”میں نہ ہم کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر چلے جائیں۔ مثلاً چینگ رائے۔۔۔ وہاں شیون موجود ہے۔ وہ ہماری رہائش کا بندوبست کر سکتی ہے۔“

”شہر سے باہر تو رہائش کا بندوبست کیس بھی ہو سکتا ہے لیکن فی الحال میں ہنگام چھوڑنا نہیں چاہتا۔“ میں نے جواب دیا ”یہاں کی صورت حال ایسی ہے کہ ہمارے روافرا اختیار کرنے سے ان کے لیے راستہ مکمل جائے گا اور میں ان کے لیے آسانیاں پیدا نہیں کرنا چاہتا۔“

قحانی دانک جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھتی رہی پھر

وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ دوسرے دو بجے کے قریب رامن پرساد آگیا۔ اس سے تقریباً ایک گھنٹے تک اس موضوع پر بات ہوئی رہی۔

”ٹھیک ہے پاس۔“ پرساد نے کہا ”آج یہ کام ہو جائے گا اور اگر تم تک چوے راستے میں آنے کی کوشش کی تو اس کی کمائی بھی ختم کر دی جائے گی۔“

”تم کس وقت جاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرے خیال میں رات باہر بجے کے بعد کا وقت مناسب رہے گا۔“ پرساد نے جواب دیا۔ قحانی نے اسے جاگنی دیوی کے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا اور اس کے کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گیا۔ اس شام آٹھ بجے کے قریب جاگنی دیوی کا فون آگیا۔ وہ اس وقت اپنے کینک پر تھی۔

”سارا معاملہ طے ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا ”وہ ہمارے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے کو تیار ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ یہی منظر ہمہ کراس کی بھرپور مدد کر دے گا۔ اسے نہ صرف اس بھکسو سے نجات مل جائے گی بلکہ میں اس کا علاج بھی کروں گی۔“

”بھکسو کو یہ شبہ تو نہیں ہوا کہ وہ تمہارے پاس ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں۔“ جاگنی نے جواب دیا ”آج صبح بجے کے قریب کینک پر آیا تھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ شانی دان مجھ سے کوئی مشورہ کرنے یا دوا وغیرہ لینے کے لیے تو یہاں نہیں آئی تھی۔ بہر حال وہ تسلی کر کے چلا گیا تھا لیکن کہہ نہیں سکتی کہ اسے میری بات کا یقین آگیا تھا یا نہیں۔ میں آج دن بھر خاصی محتاط رہی ہوں۔ میں نے اپنے آس پاس کسی ایسے شخص کو بھی نہیں دیکھا جس پر شبہ ہو کہ میری گھرائی کر رہا ہے۔“

”گھڑ۔“ میں نے کہا ”پرساد آج رات باہر بجے کے بعد کی وقت تمہارے ہاں پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔“ جاگنی نے جواب دیا۔ میں نے فون بند کر دیا اور قحانی کو جاگنی دیوی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا اور پھر اسی رات گیارہ بجے کے قریب میں نے سنگ پور فون کیا۔ انسپکٹر چینگ شوا شاید یہی کال ختم تھا۔ وہ میری آواز سننے ہی بولا۔

”تمہاری اطلاع بالکل درست تھی مائی سن۔ میں نے کل رات ہی تمہارے بتائے ہوئے فون نمبروں سے ان تینوں کے ایڈریس معلوم کر کے دو گھنٹوں کے اندر اندر ان کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں اور آج صبح سویرے تین جگہوں پر بیک وقت چھاپے مارے گئے تھے۔ ان کو روک کر تیار ہو کر پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ البتہ اندازاً سے تھکنے والے پارنٹر بھولا تاہم اور پاکستانی پارنٹر جمال بکڑے گئے ہیں۔ حال دارا

آتش فشاں میں رہنے سے اور بھولا تاہم کے قبضے سے دس گلوگرام ہیروئن لہو آتے ہوئے ہے جسے وہ یو۔پ کے طرف اسمگل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان لوگوں سے ہم تحقیق کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ ہم مزید حسنی خیر انکشافات ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے چینگ انکل۔“ میں نے گھر سانس لیتے ہوئے کہا ”میرے سرے ایک بہتر پڑا ہوا ہے۔ ان گیارہ بجے کے خلاف میری کاپی جاگنی ہے۔ اب میں اسے یہاں بھی لکھنے نہیں دوں گا۔“ لوگ بہت خطرناک ہیں مائی سن۔ اپنا خیال رکھنا۔“

انسپکٹر چینگ شوا نے کہا ”۱۳ نمبر دو تاکہ مجھ سے رابطہ کر لیا جائے۔“

میں نے ماسٹر ہو جن کا نمبر بتا دیا ”کبھی کوئی بات ہو تو اس نمبر پر بلاؤ۔“ میں بعد میں خود ہی آپ کو فون کر لیا کروں گا۔

میں نے فون بند کر دیا اور قحانی دانک کو بتانے لگا کہ سنگ پور میں دارا کے تین خاص آدمیوں میں سے ایک پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور دوسرا گرفتار ہو گئے ہیں جن میں ایک دارا کا کزن ہے۔ پولیس نے ان سے بھاری مقدار میں ہیروئن بھی برآمد کی ہے۔ دارا کو یہاں اطلاع مل چکی ہوگی۔ وہ تو اپنے ہاں فوج مہیا کر کے قحانی نے سگراتے ہوئے کہا۔

”میں اسے اپنی بوئیاں نوچنے پر مجبور کروں گا۔“ میں نے کہا۔

دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب جاگنی دیوی نے فون پر اطلاع دی کہ پرساد تھوڑی دیر پہلے شانی دان کو لے جا چکا ہے۔ اب مجھے شانی دان کی طرف سے اطلاع کا انتظار تھا۔

دو بجے کے لگ بھگ رامن پرساد خود ہی آگیا۔ اس کے چہرے کے اثرات سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔

”ہاں۔ گڑبڑ ہوئی ہے۔“ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا ”میں نے شانی دان کو لے جانے کے لیے ایک ہوٹل کے پارکنگ پلاٹ سے ایک گاڑی چرائی تھی۔ میں شانی دان کو سینٹ لوئس اسٹریٹ پر واقع پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی میں میٹرو گاڑی پر پہنچا ایک کار میرے پیچھے لگ گئی۔ مجھے کسی گمنام گاڑی کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کیونکہ اس گاڑی کا ڈرائیور میٹرو گاڑی سے ایک آدمی کو بھکسو کی جیسے لباس پہن دیا تھا اور مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ وہ تم تک چوکے سو کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔“

”میرا شبہ درست نکلا۔ وہ تم تک چوکے ہی تھا جو ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گاڑی روک لی۔ شانی دان اسے اتر کر پولیس اسٹیشن کے گیٹ کی طرف جاری تھی کہ پیچھے

سے آتے والی کار ایک لمبے کو وہاں رکی۔ اس کار سے کچھ بعد دیکرے کئی گولیاں چلائی گئیں۔ شانی دان چکر بھری ہوئی۔ میں اس وقت اپنی کار ایک سائڈ اسٹریٹ پر موڑ رہا تھا۔ میں کار روک کر نیچے اتر آیا۔ دوسری کار تیز رفتاری سے سیدھی نکل گئی تھی لیکن اتفاق سے دو پولیس آفیسر موٹر سائیکلوں پر سوار اس طرف نکل آئے۔ انہوں نے کار کا تعاقب شروع کر دیا۔

”گائرننگ کے تادلے کے دوران میں کار بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ کر اٹھ گئی۔ پولیس نے تم تک چوکے شدید زخمی حالت میں حراست میں لے لیا ہے۔ شانی دان ختم ہو چکی ہے۔ اسے ایک گولی سر میں لگی تھی جس سے فوری طور پر اس کی موت واقع ہو گئی۔“

مجھے شانی دان کی موت کا افسوس ہوا تھا لیکن اس کی موت کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جو خطہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا وہ فی الحال ٹل گیا تھا۔

رامن پرساد نے وہ رات ہمارے پاس ہی گزار دی تھی۔ صبح ناشتا کر کے وہ چلا گیا۔

اور پھر اس رات ٹھیک دس بجے میں اور قحانی انڈین ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ قحانی کے اصرار پر ہم نے اپنے طے کسی حد تک تبدیل کر لیے تھے۔ رامن پرساد ایک لڑکی کے ساتھ کونے والی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے میں اچانک ہی پرساد کی میز کی طرف بڑھا۔

”اے پرساد۔ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ چینگ رائے سے کب آئے؟“ میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ رامن پرساد نے بھی ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر اس لڑکی کی شکل دیکھ کر میں چکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ظاہر ہے وہ پامیلا تھی اور یہ وہی لڑکی تھی جو خانقاہ کے گیٹ پر مجھے وہ گلدستہ دے کر گئی تھی جس میں ہم لگا ہوا تھا۔

رامن پرساد نے پامیلا کو یہی تاثر دیا کہ میں اس کا پرانا دوست ہوں اور میں اتفاقاً طور پر یہ ملاقات ہو گئی ہے۔ اس کی دعوت پر ہم بھی اس میز پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی غالباً تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں آئے تھے اور انہوں نے ابھی تک کوئی آرڈر نہیں دیا تھا۔ فضا بے ڈسے داری میں نے سنبھال لی۔

ہم آدھے گھنٹے بعد وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ رامن پرساد ہمیں چانگائوں کے علاقے میں واقع ایک فلیٹ میں لے آیا تھا۔ یہ فلیٹ اس نے اپنے لیے لے رکھا تھا اور یہاں ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔

پامیلا کچھ بھیجی بھیجی لگ رہی تھی اور اس کی باتوں سے بھی مایوسی بھنگ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے تمہیں کوئی ایسا صدمہ پہنچا ہے جس نے

تمہیں اپ سیٹ کر رکھا ہے۔" میں نے اس کے چرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "کوئی ایسی بات ہے تو ہمیں بتاؤ۔ شاید ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔"

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس کہنے سے میں اکیلی ہی نمٹوں گی۔" پامیلا نے کہا۔

"اوہ!" میں نے چونکنے والے انداز میں کہا "میرا خیال ہے تمہارے کسی بہت قریبی دوست نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔"

"ایسا ویسا دھوکا۔" پرسانچ میں بول پڑا "یہ ایک اجنبی کو چاہنے لگی تھی اور اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ اجنبی کچھ عرصے تک تو اسے باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ صرف اسی کا ہے۔ دراصل وہ یہاں اپنے قدم بٹانا چاہتا تھا اور جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اسے نظر انداز کرنے لگا۔ پامیلا کو اس بات کا دکھ ہے۔"

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا "اس کا نام پتا بتاؤ۔ ہم اسے پکڑ کر روک پر جوتے لگائیں گے۔"

"وہ بہت بڑا گینگ لیڈر ہے۔" پامیلا نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر دارا کے خلاف بولنے لگی۔

میں یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے کچھ اگلے۔ یہ زیر زمین دنیا بھی بڑی عجیب ہے۔ یہاں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں چلتی رہتی ہیں اور پامیلا جیسی حسین لڑکیاں ان سازشوں میں بڑے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کبھی تو وہ اپنے آقا کے لیے جان تک دینے کو تیار ہو جاتی ہیں اور کبھی کسی معمولی سی بات پر اس طرح جھگڑتی ہیں کہ اپنے آقا کو تباہی کے غار میں دھکیل دیتی ہیں۔ پامیلا کا شمار بھی ایسی ہی لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اس نے دارا اور ہائیگر کے کہنے پر مجھے ہم سے اڑانے کی کوشش کی تھی اور اب مجھے اپنا ہمدرد پاکر دارا کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"دارا سنگا پور سے آیا تھا۔" میں نے پامیلا کی طرف دیکھے ہوئے کہا "اور آج ہی مجھے پتا چلا ہے کہ سنگا پور میں اس کے کچھ آدمی پکڑے گئے ہیں اور بالی طور پر بھی اسے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"

"نہت۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟" پامیلا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ایسی خبریں جیسی نہیں رہتیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "انڈر ورلڈ میں تو سب ہی لوگ یہ بات جان چکے ہیں کہ سنگا پور میں پکڑے جانے والے دارا کے آدمی تھے۔"

"یہ سچ ہے۔" پامیلا نے کہا "اسے کل شام کو یہ اطلاع ملی تھی اور وہ بالکل ہوا پھر رہا ہے۔ سنگا پور میں اس کے آدمیوں کے پکڑے جانے کے حوالے سے یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ ان کی جبری وجدان نے کی تھی۔"

"لیکن وجدان تو یہاں ہنگام میں ہے۔ وہ سنگا پور میں کسی

منجری کیسے کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"دارا نے اپنے ذرائع سے تعقیب کر لیا ہے۔ سنگا پور کے

اخبارات میں اس کا نام چھپا ہے۔ اس نے یہاں سے سنگا پور کے کسی پولیس آفیسر کو فون کیا تھا۔ دارا پہلے ہی اس کی تلاش میں تھا۔

وہ اس پر کسی وار کر چکا ہے لیکن وہ ہر مرتبہ بیچ لگتا ہے اسے بکر عرصہ پہلے ہم سے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ پھر بھی لگاؤ۔

ایک مہینہ پہلے تو وہ گیٹ ہاؤس میں دارا اور کم کی پائی کر کے چلا گیا۔ دارا کو یقین ہے کہ گیٹ ہاؤس سے فرار ہوتے ہوئے

اسے کم سے کم دو گولیاں ضرور لگی تھیں۔ گیٹ ہاؤس میں لان سے دیوار تک خون کے دبے دیکھے گئے تھے۔ دارا اور ہائیگر کے

آدمیوں نے شہر کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ اسپتال چھان مارے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"اب دارا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا چاہتی ہو تم؟" میں نے اس کے چرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مجھ پر بھی شبہ کرنے لگا ہے اور مجھے دوسری عورتوں کے سامنے ذلیل کر رہتا ہے۔ میں اس سے ایسا انتقام لینا چاہتی ہوں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔" پامیلا نے کہا۔

"کیوں نہ ہم مل کر کام کریں۔ مجھے بھی اس سے کچھ پرانا حساب چکانا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا کیا؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"دارا نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے۔ تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تمہارے دل کو چور چور کر دیا ہے۔ اگر تم اس سے انتقام لینے میں واقعی شجیدہ ہو تو ہم تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ دینے تم پہلی لڑکی نہیں ہو جو دارا کے قریب کا شکار ہوئی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔"

"ہاں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "دارا ایک جرائم پیشہ آدمی اور پیشہ ور شکاری ہے۔" میں اس کی آتش افشانی کو بھرنے کی کوشش کر رہا تھا "سنگا پور کی باتوں پر شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن یہاں کی چند مثالیں دے دوں گا۔ میں جن لڑکیوں کے نام لے رہا ہوں انہیں تم بھی بہت قریب سے جانتی ہوگی۔ کو شلیا۔۔۔ وہ ہندو لڑکی جسے دارا نے اپنے جال میں پھانس کر پہلے اسے ہمارا ج کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اور اسے اپنے بستر کی زینت بنا لیا۔

جب اس کا مقصد پورا ہو گیا "اس سے طبیعت بھرنی تو اسے نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شانی دان۔ اس کے بارے میں تو تم نے آج ہی سنا ہو گا۔ اخباروں میں بھی چھپا ہے اس کے متعلق۔ گزشتہ رات دارا کے آدمیوں نے اسے اس دفت

گولیوں سے بھون ڈالا جب وہ دارا کے خلاف فریاد کر رہی تھی

اشیش جاری تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اسی شانی دان کو ایک مکان میں زندہ جلا دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ صرف یہی دو مثالیں نہیں

ہیں۔ میں تمہیں اور میری بہت سی لڑکیوں کے نام گنوا سکتا ہوں۔

آتش فشانی حصہ 1

دارا کے ظلم کا شکار ہوئی ہیں۔ ایک تازہ ترین مثال تو تم خود ہو۔۔۔" پامپا پوچی پوچی اس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کرتا جانتی تھی لیکن میں اسے موقع دینے بغیر ہوتا ہاں "تم نے دارا کے لیے ایک کچھ نہیں کیا۔ اسے اس وقت پناہ دی جب وہ یہاں اجنبی تھا اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ تم نے نہ صرف اسے پناہ دی بلکہ اپنے آپ کو بھی اس کی سرگردی میں دے دیا۔ اس کے قدم رفتہ رفتہ جیتے گئے۔ تم نے اسے ٹانگیں تک بھی پھینکا۔ وہ نہ صرف خود جہنم کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا بلکہ جہنم اپنے نئے دوستوں کے سامنے بھی پیش کرتا رہا جن سے وہ کوئی تازہ آغاثا چاہتا تھا۔ تم اس کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ تم نے ایک ایسے شخص کو بھی ہم سے اڑانے کی کوشش کی جسے تم جانتی تھی۔"

”اس نے بھی سچ کے ایک آدمی کو پیغام پہنچایا تھا۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ چنانک رائے سے کوئی آدمی یہاں آیا ہوا ہے۔“  
 ”اس کا مطلب ہے کہ ہم بعد میں اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

تھائی وانگ خاموشی سے اسٹرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پر سادہ بچے کے قریب ہمارے پاس آیا تھا۔ اس کے ساتھ پروگرام بنانے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ آج ہم اپنے اصلی چروں کے ساتھ اس مشن پر جائیں گے تاکہ دارو کو یہ بتائیں کہ ہم اس کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

پونے باہر بچے کے قریب پر سادہ سے اتر کر سڑک کی طرف چلا گیا۔ میں اور تھائی وانگ کار میں بیٹھے رہے۔ پر سادہ کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے کار میں رکھا ہوا ایک تھیلا اٹھا کر اس میں سے ایک دو چیز نکالیں اور مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

”وہ لوگ آگئے ہیں۔ کار میں ٹائیگر اور ایک بیماری بھرم آدمی کے علاوہ ایک لڑکی بھی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے دارا پہلے ہی سے کوئی میں موجود تھا۔ پامیلا بھی یہیں ہوگی۔“ میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”پتا خیال رکھنا تھائی۔ اگر کوئی گزریا محسوس کرو تو ہمارا انتظار کرنے کے بجائے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں سے نکل جاو۔“

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔“ تھائی نے سر ہلا دیا۔

میں اور پر سادہ اس تاریک گلی میں چلتے ہوئے کوئی کی دیوار کے قریب آگئے۔ یہ کوئی کی مٹی کی گلی تھی۔ سامنے والی کوئیں کے پھوڑاڑے بھی اس طرف تھے۔ اس طرح اس گلی میں رات کے وقت لوگوں کی آمد و رفت نہیں ہوتی تھی اور یہاں روشنی کا انتظام بھی نہیں تھا۔

دیوار کے ساتھ ایک جگہ کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں اس ڈھیر پر چڑھ گئے۔ دیوار کی بلندی اس طرح تین چار فٹ رہ گئی تھی اور اوپر خادرات آدموں تک بھی ہاتھ آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ پر سادہ نے جب سے الیکٹرک میٹر نکالا اور ایک ایک تار کو چیک کرنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ شاید رات کو ان آدموں میں ہتی رو چھوڑ دی جاتی ہو لیکن کسی تار میں کرنٹ نہیں تھا۔ اس نے میٹر جب میں رکھ لیا اور کڑے تار کاٹنے لگا۔ آٹھ آٹھ انچ کے فاصلے پر نیچے سے اوپر تک پانچ تار لگے ہوئے تھے۔ اس نے ایک طرف سے تمام تار کاٹ دیے۔

ہم دونوں دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے اندر کو گئے۔ درختوں کی وجہ سے اس جگہ اگرچہ اندھیرا تھا مگر کوئی کی کڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور الگ الگ کڑکیوں میں جھانکنے لگے۔ ایک کڑکی سے جھانکتے

ہی میں چونک گیا۔

وہ شان دار فرخچر سے آرام سے بہت کشادہ ہال نما کمرہ ایک صوفے پر دارا اس لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے آدمی کے ساتھ آٹھ مٹی کی آویں اور دوسرے صوفے پر پامیلا اس صوفے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیانے قدم کے اس آدمی کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر چھتیاں بھی مشابہت تھی۔ وہ نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا مگر کالی نہیں تھی۔ سفید قمیض کا کالر کوٹ کے کنارے کے اوپر تھا۔ ایک سامنے کا اوپر والا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔

پامیلا اور اس دوسری لڑکی کے جسم پر لباس برائے نام کی قد دراز قامت کی مالک وہ لڑکی بھی بڑی حسین تھی۔ ان کے سامنے شراب کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بائیں بھی کر رہے تھے مگر کڑی بند ہونے کی وجہ سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹائیگر اس کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

پر سادہ نے قدموں چٹا ہوا میرے قریب پہنچا اور آگے کی طرف چلے گا اشارہ کیا۔ چند قدم چل کر ہم رگ گئے۔

”ہم برآمدے سے یا عقیبی دروازے سے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ”ابہت چمت پرکھا جائیں تو زینے کے راستے راہداری میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرف آؤ۔“

ہم دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے دوسری طرف آگئے اور وہاں سے چمت پر پہنچنا ہمارے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ پر سادہ نے میزچوں والے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر احتیاط سے گھمایا تو دروازہ آواز پیدا کیے بغیر اٹھنے لگا۔ کھٹا چلا گیا۔ میزچوں کا یہ دروازہ اندر سے لاک کرنے کی ضرورت شاید اس لیے نہیں سمجھی گئی تھی کہ وہ اس جگہ کو محفوظ سمجھتے تھے اور کسی کے اندر داخل ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

میزچوں پر اور نیچے راہداری میں اندھیرا تھا کیونکہ راہداری سے ہال میں داخل ہونے والا دروازہ بند تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے خنجر نکال لیے اور وہ بند قدموں میں چھپا دیں اترنے لگے۔ اس راہداری کا دوسرا دروازہ باہر کی طرف کھلا تھا۔ میزچوں کے نیچے کی جگہ پر شاید ہاتھ دھما ہوا تھا اور دوسری طرف بھی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔

ہم دونوں ہال والے دروازے کے قریب رک گئے۔ میں نے نظر جگ کر کی ہول سے اٹھ لگا دی۔ ٹائیگر اب بھی کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس صوفے کی آویں نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دیا تھا۔ اس نے بلی ہو لشر پر رکھا تھا اور بائیں ہال کے نیچے راہداری کا۔ جھانک رہا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”ٹائیگر نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے پر سادہ کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

اندھیری ہوگا۔“ پر سادہ نے کہا ”ہوشیار۔ میں دروازہ کھولنے

”اب۔“ میں نے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے پینڈل گھمنا، پینٹ کی بلی کی آواز آئی اور راہداری میں تیز چلنے لگی۔ ہم دونوں بیک وقت محسوس ہوئے۔ راہداری میں طرف والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ٹائیگر راہداری پر ہاتھ میں لیے تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مٹی خیر مسکراہٹ تھی۔ راہداری کا رخ طرف تھا۔

خنجر پیک کر ہاتھ اور اٹھالو۔“ ٹائیگر کے حلق سے غراہٹ ”ملاقات سے میں نے تم لوگوں کو دیوار سے کودتے ہوئے دیکھ لیا۔ تو میں یہی سمجھا تھا کہ تم لوگوں کو چور ہو مگر یہ چوری کا وقت ہے اور چور اس گھر میں کبھی نہیں گھسے جہاں تمام بتیاں جل رہی ہیں۔“

اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم دونوں

خنجر پیک کر دیے۔ ”تمہیں تو شاید میں نے پہلے بھی دیکھا ہے مگر ٹائیگر بولا ”تمہیں تو شاید میں نے پہلے بھی دیکھا ہے مگر ابھی ابھی سالک رہا ہے۔“ اس نے آخری الفاظ میری دیکھ کر کہے تھے۔ ٹائیگر کا اور میرا آج تک آتنا سامنا نہیں غادر شاید اس لیے وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا ”بہر حال“ وہ کھول اور اندر داخل ہو جاؤ۔ ہم معلوم کر لیں گے کہ تم مالکوں ہو اور کس نیت سے یہاں آئے ہو۔ اے۔۔۔ تم ایک سے دروازہ کھولو۔ دوسرا ہاتھ سر سے اوپر ہی رہنا چاہیے۔“

پر سادہ کو اشارہ کیا۔

پر سادہ نے راہداری پر ہاتھ جھکا کر دروازے کے پینڈل پر رکھ دیا۔ دوران میں ٹائیگر بھی اس دروازے سے نکل کر راہداری میں پہنچے آچکا تھا۔ پر سادہ نے دروازہ کھول دیا۔

کمرے کا منظر ہماری شرم ناک تھا۔ دارا اس دروازے کی

راہداری میں آگئی تھی۔ دروازہ کھلنے پر دارا نے لڑکی کے چہرے پر جھکا ہوا

”میں ٹائیگر ابھی نہیں۔“ دارا نے ہاتھ اٹھا دیا ”اے یہاں لانے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔ بڑا لمبا چڑا جال پہلنا پڑا تھا۔ یہ اس قدر آسانی سے ہمارے ہاتھ نہیں آیا جتنا تم سمجھ رہے ہو اور ابھی تو اس سے کچھ حساب بھی کرنا ہے۔ بہت نقصان پہنچایا ہے اس نے مجھے۔ اے تو میں اس طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ دوسرے بھی عبرت حاصل کریں گے اور دارا کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے دارا۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ یہ اعتراف میرے لیے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ پامیلا کوئی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے ہمارے خلاف جال پھیلایا گیا تھا ”اب وقت بدل چکا ہے۔ پہلے تم ہی سے چچتا بھر رہا تھا اور اب بھاگنے کی تمہاری باری ہے۔ تم زندگی بھر اس لیے بھاگتے رہو گے کہ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

”چہرہ کی چہرہ کی کا شوربا۔“ دارا نے قہقہہ لگایا ”وہ بے اب تم پر بے ہو گئے ہو اور بڑی بڑی باتیں کرنا بھی سیکھ گئے ہو لیکن محض باتوں سے تو کوئی معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا۔ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟“ ”شاید تم بھول گئے ہو کہ صرف وہ دن پہلے سنگاپور میں تمہارے تین آدمی اور دس کلور گرام ہیروئن پکڑی گئی ہے۔ آپکڑ چکانک شو کو میں نے ہی یہاں سے فون کر کے تمہارے ان آدمیوں کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور ان تین میں تمہارا کزن جمال بھی شامل ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”تم نے میرے باپ کو صرف اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ تمہارے گھناؤنے مقاصد میں رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔ میرا باپ نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ میں تو ہوں۔۔۔ میں کہیں بھی جیس نکلتے نہیں دوں گا اور مجھے تم نے اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا انتقام بھی لینا ہے۔“ دارا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پہلے شاید وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ سنگاپور والے دانے میں میرا نام محض مہاندہ ہے لیکن میرے منہ سے اپنے کزن جمال کا نام سن کر وہ چنگے بغیر نہیں رہا تھا۔

ٹائیگر راہداری کے تیار کھڑا تھا۔ دوسرا آدمی بھی صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ پامیلا بھی اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مٹی خیر مسکراہٹ تھی۔

”میں تمہیں اس گندگی سے نکالنا چاہتا تھا۔“ میں نے پامیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لیکن اب پتا چلا کہ گندگی کے کیڑے

گندگی ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔“ ”تم مجھے بے وقوف سمجھتے تھے کہ بیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے تمہارے ساتھ جھپٹی پھرتی۔“ پامیلا نے کہا ”راس پر سادہ تو مجھے پہلے ہی دن شہ ہو گیا تھا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمہارا آدمی ہے تو صرف تین دن پہلے میں نے دارا کو تیار اور پھر وہ سارا ڈراما تمہیں پھسانے کے لیے کیا تھا۔ تم

واقعی ہے وقف ہو۔ کس قدر آسانی سے میرے جال میں پھنس گئے۔

”لیکن یہ جال بہت کچا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ ہمارا جگہ آدمی اس کو بھی کو گھیرے میں لے چکے ہوں گے تم لوگوں میں سے کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہیں جاسکے گا۔“

دارا کے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ اس نے جیب سے ہتھول نکال کر ہمیں اپنی زون میں لیا اور ٹائیکر کا اشارہ کیا۔ ٹائیکر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔

”باہر زور زور تک کوئی نہیں۔ یہ بلف کر رہا ہے ہمیں۔“ اس نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹائیکر۔“ دارا نے کہا ”مافی الحال ان دونوں کو باندھ کر ساتھ والے کمرے میں ڈال دو۔ ہم مسٹر شامک سے یونٹس کی بات کر لیں۔ بعد میں اس سے نسبت لیں گے۔“

پاسیلا اس وقت ہماری بھر کم شامک کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ جج سے تاثرات تھے اور پھر اس نے وہ حرکت کی جس کی کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔ اس نے بڑی بھرتی سے مسٹر شامک کے بغلی ہو لسنٹریں سے ریو اور ہینچ لیا اور پشت پر پینچ کر ریو اور کی نال شامک کی کپٹی سے لگاتے ہوئے غرائی۔

”نہیں ٹائیکر۔ تم اس کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔ ریو اور پھینک دو اور تم بھی مسٹر دارا۔ میں تم دونوں کو صرف تیس سینکڑ کا وقت دے رہی ہوں۔“

”یہ... یہ تم کیا کر رہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ دارا چیخا۔

”ہتھول پھینک دو۔“ پاسیلا غرائی ”میں صرف تین تک گنوں گی اور تین گنتے ہی اس کی کھوپڑی اڑا دوں گی۔“ اس نے گنتی شروع کر دی اور پھر اس نے جیسے ہی دو کما، دارا اور ٹائیکر نے ہتھیار پھینک دیے۔

”اس میں شبہ نہیں کہ تم بہت چالاک ہو لیکن حد سے زیادہ چالاک اور خود اعتماد بھی لے دو تھے۔“ پاسیلا دارا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں تمہاری غفلت سے واقف ہو چکی ہوں۔ اپنا مقصد پورا ہو جانے کے بعد تم اپنے دو قارروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے ہو۔ انسانی زندگی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تم صرف اور صرف اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہو۔ تمہارا منصوبہ یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا جائے کیونکہ اب میں تمہارے لیے اہم نہیں رہی۔ تمہیں شبہ تھا کہ سگا پور میں تمہارے آدمیوں کے نام اور پتے میں نے وجدان کو کو لیے تھے اس لیے تم نے پروگرام بنایا تھا کہ وجدان ہاتھ آجائے تو اس کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا جائے۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے پاسیلا۔“ دارا نے کہا۔

”مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں نے فون پر ٹائیکر سے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔“ پاسیلا نے کہا ”اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ وجدان نے تمہارے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور تم اس قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس کے بے گناہیوں کو قتل کیا تھا اور اسے بھی راستے سے ہٹا دیا تھا۔“

”تمہارے اس سنگین جرم کا چشم دید گواہ ہے۔“

”یہ کمانی تم کو اس نے سنائی ہوگی۔“ دارا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ بہت چالاک آدمی ہے۔ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی جھوٹی اور من گھڑت کہانیاں سناتا رہتا ہے اور اسی لیے اب تک بچا ہوا ہے۔“

”یہ درست ہے کہ یہ کمانی مجھے اس نے سنائی تھی لیکن۔“

پاسیلا کہہ رہی تھی ”کل کی رات کا باقی حصہ میں نے کم کے ساتھ گزارا تھا۔ کم کے ساتھ میں پہلی مرتبہ بستر پر بھی لی اور وہ اتنا خوش تھا کہ میری ہر بات کا جواب دیتا چلا گیا۔ اس نے اس کمانی کی تصدیق کر دی ہے۔ تم ہی نے کم اور پی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی کے ہاں باپ کو قتل کروایا تھا۔ تم ہی اس وقت وہاں موجود تھے اور پھر تم لوگ اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ تم نے کم سے وعدہ کیا تھا کہ اسے سگا پور رینک کا سربراہ بنا دو گے لیکن تمہارا اصل منصوبہ یہ ہے کہ وقت آنے پر کم اور پی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی سے ہٹا دیا جائے۔ اب تمہیں ٹائیکر مل گیا ہے اور ٹائیکر کے ذریعے تم کو ملنے والی اٹھل تک پہنچنا چاہتے ہو۔ لیکن تمہاری یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوگی۔ تم نے میرے ساتھ بھی دھوکا کیا ہے لیکن تم شاید یہ بھل گئے ہو کہ عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو دنیا کی ہڈی سے ہڈی طاقت کو بھی روند ڈالتی ہے۔“ پاسیلا کے لیے میں نے یہ بات غور سے کر لی۔

”زیر بھرا ہوا تھا۔ وہ چند گھنٹوں کو خاموش ہوئی پھر سادگی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”پر ساد۔ کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔“

ریو اور اور ہتھول اٹھا۔

”تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو پاسیلا۔“ دارا بولا ”میری باتیں اب بھی تمہارے لیے عملی ہوئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میرے دل میں میل آ گیا تھا لیکن میں تمہیں قتل ہرگز نہیں کر چکا تھا۔ یہ آدمی بہت خطرناک ہے اگر کچھ کر نکل گیا تو نہ صرف میں بلکہ تمہیں بھی ختم کر دے گا۔ بھول جاؤ۔ سب کچھ اب بھی وقت ہے۔“

”بند کر دو کپاس۔“ پاسیلا چیخا۔

پر ساد ہتھول اور ریو اور اٹھانے کے لیے آگے بھاڑا ہاتھ لے بڑی بھرتی سے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ پر ساد کو کپاس پاسیلا سے ٹکرایا۔ پاسیلا بھی لڑکھڑکی بچنے لگی۔

ہر ایک نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ٹائیکر نے قاتلین پر پڑے ہوئے ہتھول کی طرف چلائی مگر پر ساد نے سنبھل کر اسے چھاپ لیا۔ دارا بھی اپنے ریو اور

لف جھپٹا لیکن میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچلا۔ میرا ایک ہتھوڑا رے بائیں کندھے پر اور دوسرا پیشانی پر لگا تھا۔ وہ ہلچلا ہوا پیچھے اٹ گیا تھا۔ میں اس کے قریب کھڑی ہوئی لیکن سے ٹکرایا اور ہم دونوں صوفے پر گرے۔ صوفے پیچھے کی طرف اٹ گیا۔ اس لڑکی کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔

پاسیلا صوفے کے پچھلی طرف گری تھی۔ ریو اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر صوفے کے نیچے جا کر اٹھا۔ ہماری بھر کم شامک پہلے تو کچھ گڑ بڑایا پھر وہ پاسیلا کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ پاسیلا نے اس کی کلائی پر دانت کاڑ دیے اور میری طرف مہینے ہوئے نگاہیں پھلپھلا اٹھا۔

پر ساد ٹائیکر کی گرفت میں آ گیا لیکن پھر اچانک ہی اس نے ٹائیکر کے چہرے پر سر کی زوردار ٹھکرائی۔ اس کی ٹانگ سے خون بہ نکلا۔ پر ساد نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باؤں کی پلٹ دی۔ اب وہ ٹائیکر پر تیزی سے حملے کر رہا تھا۔ ٹائیکر جس طرح پر ساد کے ہاتھوں پٹ رہا تھا اس سے ایک اندازہ ہوا کہ اس میں جیسے بڑے بڑے پدمعاش خود اندر سے کھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ان کے رعب و دبدبے اور طاقت کا داندہ ان کے گرد گول رہتا ہے۔

دارا اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بھلا یہ بات اس کے لیے قابل برداشت کیسے ہو سکتی تھی کہ جو لونڈا اس کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا آج اس پر اس طرح بے خوف ہو کر حملہ آور ہو۔

مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی کہ وہ گیندے کی طرح طاقت ور تھا لیکن اس کا اندازہ بتا ہوا تھا کہ وہ لڑائی کے داؤ پیچ سے واقف نہیں تھا اور مجھے اس پر یہ برتری حاصل تھی کہ میں لڑائی کے فن سے واقف تھا۔

دارا نے مجھ پر حملہ کیا لیکن میں وار چھاپا۔ دوسرے حملے میں میرا ہاتھ اس کی گرفت میں آ گیا لیکن میں نے بازو چھڑانے کی کوشش کرنے کے بجائے کھڑے کھڑے اچھل کر اپنی فلا باؤں کے انداز میں اپنے جسم کو ہڑا کیا اور اس کی گردن کو دونوں ٹانگوں کی فیتھ میں سے گرا پنے آپ کو پیچھے کی طرف جھکا دیا۔ میں خود تو پیچھے گرا تھا لیکن دارا بھی سر کے بل پیچھے گرا اور فلا باؤں کی کھانٹا ہوا ہتھوڑا سے جا ٹکرایا۔ اس نے اٹھنے میں بھی بڑی بھرتی دکھائی تھی لیکن میں اس سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھونسا مارنے کے لیے حملہ کیا۔ میں نے بڑی بھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اچھل کر اس کی بغل میں زوردار دھک لگا دی۔ وہ ہلچلا اٹھا۔ اس کا بازو اچھل کر اس کی بغل میں تھا۔ میں نے اچھل کر ایک اور دھک لگائی اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اس کی کلائی پر گرا اور اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک فائز کی آواز سن کر میں پلٹا۔ ہماری بھر کم شامک نے نہ

صرف ریو اور پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ پاسیلا بھی اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے پاسیلا کو بازو کی پلٹ میں لے رکھا تھا۔ پاسیلا کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔

”اب اگر تم دونوں میں سے کسی نے حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔“ شامک چیخا۔

بازو پلٹ گئی تھی۔ ٹائیکر نے بھی بڑی بھرتی سے ریو اور اٹھا کر پر ساد کو زبردستی لے لیا تھا۔

دارا بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمبے میری طرف دیکھتا ہوا پھر اچانک ہی میری کپٹی پر زوردار گھونسا مار دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی گلوگرام دہلی بھٹوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ میں لڑکھڑا گیا۔

دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پتلی چنگیاں سی رقص کرتے لگیں۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

دارا نے آگے بڑھ کر پاسیلا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”کواہ کیا؟“ وہ اس کے بالوں کو جھٹکتے رہتا ہوا غرایا ”تمہارا خیال درست تھا۔ اب مجھے واقعی تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ پہلے تو شاید ایک سی گولی سے تمہارا خاتمہ کر دیا جاتا لیکن اب تمہاری موت اتنی آسان نہیں ہوگی۔ میں تمہارے اس خوب صورت جسم کو اس طرح کاٹوں گا کہ۔“

پاسیلا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ دارا نے اس کے بالوں کو جھٹکا دے کر سر اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر پتلی گھونٹے رسید کرے۔ پاسیلا پر ضرب پڑی اٹھتی۔ دارا نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے پیچھے گرا دیا اور ایک کر راہدار والے دھواڑے کے قریب پڑا ہوا خبردار اٹھا۔

ٹائیکر نے مجھے اور پر ساد کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے ریو اور کی زبردستی رکھا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع نہیں تھا۔

پاسیلا اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دارا نے پہلے اسے دو تین زوردار ٹھکرائیں مابین اور پھر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔

”میں تمہیں ایک وار میں نہیں، تینوں میں موت کے گھاٹ اتا دوں گا۔ پہلے یہ تمہارے خوب صورت ہونٹ پھر رخسار اور پھر تمہارے یہ... جنوں نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا تھا۔“

دارا اس کے سینے پر اس طرح بیضا تھا کہ پاسیلا کی دونوں بائیں بھی گھٹنوں کے نیچے جا رہی تھیں۔ پاسیلا سرخ رہی تھی۔ دارا نے بائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو گرفت میں لے لیا اور خنجر کی دھار اس کے ہونٹوں پر پھیر دی۔ پاسیلا کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ اس کا تھلا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ دارا نے ٹھوڑی تک گوشت کاٹ ڈالا تھا۔ خون کا فوارہ بہ نکلا۔

میں کانپ کر رہ گیا۔ دارا نے پاسیلا کا ایک رخسار بھی کاٹ دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر ٹائیکر نے



ریوالور کو اس طرح حرکت دی کہ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔  
دارا نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور پامیلا کے ملاؤ پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا سینہ بہت ہو گیا۔ دارا کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس کا خنجر والا ہاتھ حرکت میں آیا اور پامیلا کے سینے پر دائیں طرف سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اس نے خنجر کا دوسرا وار سینے کے بائیں طرف کیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میری بند آنکھوں کے سامنے وہ خوف ناک منظر ابھر آیا جبچی فانگ نے میری ماں پر اسی طرح خنجر سے وار کیے تھے۔ کروا بدل گئے تھے۔ منظور سی تھا۔ پامیلا کی چٹوڑی کے آواز سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دارا اب پامیلا کے پیٹ پر خنجر کی نوک سے ایک گہری لکیر کھینچ رہا تھا۔ پامیلا زنج ہوتے ہوئے بکے کی طرح جھل رہی تھی لیکن دارا نے اسے اپنے بوجھ تلے نیچے ہار رکھا تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے پر ساد کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے پھپھڑوں کی پوری قوت سے چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلا۔ ٹانگیں نے فائر کر دیا۔ گولی میرے پہلو کے قریب سے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری گولی چلاتا، میری لگ اس کی ٹھوڑی پر بیچے کی طرف گئی۔ وہ جھٹکا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دوڑ جا کر۔

پر ساد بھی اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کی ٹھوکروا دار کے سر پر لگی تھی۔ دارا الٹ کر صوفے سے ٹکرایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ پامیلا تالین پر تڑپ رہی تھی۔ اس کے زخموں سے خون فواروں کی طرح اچھل رہا تھا۔

شانگ کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں ایک دم نیچے گر گیا تھا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی بیش ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ یہ گولی کھڑکی کے باہر سے چلائی گئی تھی جو شانگ کے بازو میں گئی تھی اٹھ وہ بھی چیخا اٹھا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو مجھے تھائی وانگ کا چہرہ دکھائی دیا۔ دارا اور اس کا ساتھی یہ سمجھے کہ مہاراج کے آدمی آگئے ہیں۔ انہوں نے بیک وقت راہداری کی طرف دو ڈنگ دی۔ میں اور پر ساد بھی ایک ہی وقت میں اپنی اپنی جگہ سے اچھلے تھے اور پھر ہم دونوں نے ٹانگیں ہی کو گردن میں لیا تھا۔ میں ٹانگیں کو چھوڑ کر راہداری کی طرف ہلکا لیکن باہر نکلے ہوئے دارا نے دروازے کو دھکا دیا۔ میری پیشانی دروازے سے ٹکرائی۔ میں چیخ کر گر گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر پھر دروازے کی طرف پکا۔ بدحواسی میں مجھ سے دروازہ بھی نہیں کھل سکا اور جب میں دروازہ کھول کر راہداری میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو مجھے دیر ہو چکی تھی۔ دارا اور

شانگ باہر کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ چکے تھے اور کار تیزی سے گرتے باہر نکل رہی تھی۔  
اس دوران میں تھائی وانگ بھی دوڑتی ہوئی سامنے آگئی۔ دارا کا پیچھا کرنا بیکار تھا۔ میں اور تھائی وانگ اندر آگئے۔ پر ساد ٹانگیں کو برقی طرح رگڑ رہا تھا اور خوف سے چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ وہ پامیلا کی طرف دیکھتے سے گریز کر رہی تھی۔  
"اور یہ... کیا اسے یہیں چھوڑ دیا جائے؟" تھائی وانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پامیلا کی طرف اشارہ کیا۔  
"اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھائی۔" میں نے جواب دیا۔  
"یہ ہو سکتا ہے کہ باہر جا کر کہیں سے پولیس کو فون کر دیں۔ پولیس نے اسے اسپتال پہنچا بھی دیا تو... میرے خیال میں یہ اب دینا کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی گی۔"  
تھائی وانگ چند لمحوں پامیلا کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے باہر آگئی۔  
"پر ساد۔ تم اسٹیرنگ سنبھالو۔ ہمیں دو نمبر مکان میں جانا ہے۔" میں نے کار کے قریب پہنچ کر کہا۔

پر ساد نے ٹانگیں کو پھینک دیا۔ اس کے جسم کو اب بھی ہولے ہولے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کا چھللا ہوٹا اور نیچے کا گوشت ٹھوڑی تک غائب تھا۔ نیچے والے دانت، جڑوں تک اور سونے واضح نظر آ رہے تھے۔ ایک رخسار نکلا ہوا تھا۔ سینے کے دونوں طرف گوشت کے کٹے ہوئے ٹھوسے تھے اور پیٹ پر ناف تک تقریباً چھ انچ لمبی اور گہری دراڑ تھی جس سے اب بھی خون ابل رہا تھا۔ ایسی سفاکی کا یہ منظر ہمیں نے اپنی آنکھوں سے دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور ایک بات ہر حال سے تھی کہ ہم پامیلا کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اسے زندہ بچایا جاتا تو وہ میڈیکل سائنس کا ایک معجزہ ہی ہوتا۔

میں نے گردن جھکا کر دیکھا۔ پر ساد نے ٹانگیں کو فرش پر ادھار لٹا کر رکھنے سے اس کی کمر کو دبا رکھا تھا اور اس کے گلے سے ٹائی ٹکائے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ ٹانگیں کا چہرہ فرش سے چند انچ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے گلے سے ٹائی نکال کر پر ساد کے حوالے کر دی۔ پر ساد نے ٹانگیں کے دونوں ہاتھ پٹ پر سمیٹ کر ٹائی سے باندھ دیے اور اٹھ کر اس کی پسلیوں پر زوردار ٹھوک کر رید کر دی اور پلٹ کر پامیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میں نے اس کے چہرے پر عجیب سے اثرات دیکھے تھے۔ وہ پامیلا کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے چہرے کو دیکھنا پھر اس نے بائیں بائیں اس کی دونوں آنکھوں کو کھول کر دیکھا اور پھر گہرا سانس لینے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
"گاڑی کہاں ہے؟" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔  
"وہیں کھڑی ہے۔ گلی کے موڑ پر۔" تھائی وانگ نے جواب دیا۔

میں نے پر ساد کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے باہر دوڑ گیا۔  
صرف پانچ منٹ بعد پورج میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور اس کے چند سینکڑوں پر ساد اندر گیا۔ اس نے ٹانگیں کو ہاتھوں

فران نوک روڈ پر پہنچ گئے۔ پر ساد نے کاری رفتار اس وقت کم کی تھی جب سوئے نشتی سیوٹھ کی طرف مڑا تھا۔  
گلی میں سناٹا تھا۔ ایک بچکے کے سامنے اس نے کار روک لی۔ بڑی بھرتی سے نیچے اتر کر گیت کھولا اور پھر کار اندر لے گیا۔  
پر ساد مشتبی انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ ہمارے کار سے اترنے سے پہلے وہ باہر گاگٹ بند کر آیا تھا۔  
وہ بھٹکا تین کمرہ پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں تھ خانے کا راست تھا۔ پر ساد نے فرش پر بیٹھے ہوئے تالین کا کوٹا ہٹا کر چار مربع فٹ کا ایک تختہ ہٹا دیا جس کے نیچے تاریک میز تھیں۔ پر ساد نے دیوار پر لگے ہوئے سوچ بوڑ پر ایک سوچ آن کر دیا۔ میز میوں پر روشنی ہو گئی۔

میز میوں کے اختتام پر چند فٹ چوڑی لینڈنگ تھی اور ایک آہنی دروازہ تھا۔ پر ساد نے دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کر جی جلا دی۔ اس کے پیچھے ہی میں ٹانگیں کو لے کر اندر داخل ہوا تھا۔

تھ خانہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سیلن اور ایک ہانگوار سی بو کا احساس نمایاں تھا۔ اس سیلن ہی کی وجہ سے دیواروں کا پلٹر بھی جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ اس تھ خانے میں فریج پر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر بھی گر جی ہوئی تھی۔  
"ہاں تو مسٹر ٹانگیں۔ تم کچھ پر یہاں آرام کرو۔ ہم بعد میں تم سے بات کریں گے۔" پر ساد نے ٹانگیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

تھ خانے کا دروازہ بند کر کے ہم ادھر آگئے۔ تختہ فرش پر ڈال کر تالین برابر کر دیا گیا۔ دوسرے کمرے میں تھائی وانگ اس لڑکی کو ریوالور کی زور پر لے کھڑی تھی۔ وہ لڑکی ایک کمری پر بیٹھی ہوئی تھی۔ خوف و ہست سے اس کی آنکھیں میٹی پڑ رہی تھیں اور اس کا جسم اب ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اس ریوالور اتنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ نہ تو شور مچائے گی اور نہ ہی بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ یہ تو پہلے ہی نیم مردہ ہو رہی ہے۔ اسے مزید ہشت زدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"  
تھائی وانگ نے ریوالور ہٹا دیا اور ایک کمری پر بیٹھ گئی۔  
"میں کانپتا ہوں باس۔ اس کے بعد کوئی بات کریں گے۔" پر ساد یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

میں تھائی وانگ کو اس لڑکی کے پاس چھوڑ کر گھوم پھر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دراز سے دھڑا مکان تھا۔ ضرورت کی ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ کچن میں ایک چھوٹا فریج بھی تھا کچھ برتن اور مرہند خوراک کے کئی ڈبے بھی نظر آ رہے تھے۔

"میں ہر دوسرے تیسرے دن یہاں ہلکا کر لیتا تھا۔" پر ساد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے اندازہ تھا کہ ہمیں کئی ہفتا

بچ کر جھٹکا دیتے ہوئے اٹھا دیا اور ہلے جانے کے لیے اس کے کٹے پر زوردار کھٹک لگا دی۔ اس دوران میں میں اس بے ہوش لڑکی کو اٹھا چکا تھا۔ وہ ہوش میں آچکی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور خوف سے چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ وہ پامیلا کی طرف دیکھتے سے گریز کر رہی تھی۔  
"اور یہ... کیا اسے یہیں چھوڑ دیا جائے؟" تھائی وانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پامیلا کی طرف اشارہ کیا۔  
"اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھائی۔" میں نے جواب دیا۔  
"یہ ہو سکتا ہے کہ باہر جا کر کہیں سے پولیس کو فون کر دیں۔ پولیس نے اسے اسپتال پہنچا بھی دیا تو... میرے خیال میں یہ اب دینا کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی گی۔"  
تھائی وانگ چند لمحوں پامیلا کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے باہر آگئی۔  
"پر ساد۔ تم اسٹیرنگ سنبھالو۔ ہمیں دو نمبر مکان میں جانا ہے۔" میں نے کار کے قریب پہنچ کر کہا۔

پر ساد نے ٹانگیں کو پھینک دیا۔ اس کے جسم کو اب بھی ہولے ہولے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کا چھللا ہوٹا اور نیچے کا گوشت ٹھوڑی تک غائب تھا۔ نیچے والے دانت، جڑوں تک اور سونے واضح نظر آ رہے تھے۔ ایک رخسار نکلا ہوا تھا۔ سینے کے دونوں طرف گوشت کے کٹے ہوئے ٹھوسے تھے اور پیٹ پر ناف تک تقریباً چھ انچ لمبی اور گہری دراڑ تھی جس سے اب بھی خون ابل رہا تھا۔ ایسی سفاکی کا یہ منظر ہمیں نے اپنی آنکھوں سے دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور ایک بات ہر حال سے تھی کہ ہم پامیلا کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اسے زندہ بچایا جاتا تو وہ میڈیکل سائنس کا ایک معجزہ ہی ہوتا۔

میں نے گردن جھکا کر دیکھا۔ پر ساد نے ٹانگیں کو فرش پر ادھار لٹا کر رکھنے سے اس کی کمر کو دبا رکھا تھا اور اس کے گلے سے ٹائی ٹکائے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ ٹانگیں کا چہرہ فرش سے چند انچ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے گلے سے ٹائی نکال کر پر ساد کے حوالے کر دی۔ پر ساد نے ٹانگیں کے دونوں ہاتھ پٹ پر سمیٹ کر ٹائی سے باندھ دیے اور اٹھ کر اس کی پسلیوں پر زوردار ٹھوک کر رید کر دی اور پلٹ کر پامیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میں نے اس کے چہرے پر عجیب سے اثرات دیکھے تھے۔ وہ پامیلا کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے چہرے کو دیکھنا پھر اس نے بائیں بائیں اس کی دونوں آنکھوں کو کھول کر دیکھا اور پھر گہرا سانس لینے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
"گاڑی کہاں ہے؟" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔  
"وہیں کھڑی ہے۔ گلی کے موڑ پر۔" تھائی وانگ نے جواب دیا۔

میں نے پر ساد کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے باہر دوڑ گیا۔  
صرف پانچ منٹ بعد پورج میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور اس کے چند سینکڑوں پر ساد اندر گیا۔ اس نے ٹانگیں کو ہاتھوں

صورت حال میں ہی پناہ لینی پڑے گی اس لیے میں نے ضرورت کی ہرجیز یہاں جمع کر رکھی ہے۔

میں نے پسند کی کے انداز میں سرہلا دیا۔ وہ کافی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنا ک اٹھایا۔ پر سادے باقی تک ایک ٹرے میں رکھ لیے اور ہم پکن سے نکل کر کمرے میں آگئے۔ ایک ک اس لڑکی کو بھی دیا گیا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے ک سامنے چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

”تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کافی ہو۔ اس سے تمہیں اپنے حواس پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔“

ہم سب اس وقت کافی جیسی تلخ چیز کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ کافی کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد میں اپنے آپ کو کچھ پرسکون محسوس کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دارا کی زندگی دیکھ کر میں اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ اگر تھائی وائیک بروقت مداخلت نہ کرتی تو شاید میرا دماغ پلٹ جاتا۔

”تم وہاں اچانک کیسے پہنچ گئی تھیں؟“ میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے سوالیہ لہجہ میں تھائی وائیک کی طرف دیکھا۔

”تم لوگوں کو گھنے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔“ تھائی نے جواب دیا ”فائز کی آواز سنائی دی تو میں چونکے بغیر نہ سکی۔ نہانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم دونوں کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ میں نے ہینڈ بیگ میں سے ریو اور نکالا اور کار سے اتر کر اس طرف آئے تھی۔ جس وقت میں فونے ہوئے آؤں والے حصے سے دیوار چھان کر کمرے کی سامنے پہنچی تو اندر کا منظر دیکھ کر میرے دھچکنے کھڑے ہو گئے۔ اس سونے نے تم پر گولی چلائی تھی اور دوسرا فائز کرنے کا موقع دے بغیر میں نے اس پر گولی چلا دی۔ اگر میں وہاں نہ پہنچی تو وہ تم دونوں کو بھی ختم کر دیتے۔“

”اس وقت درپیش صورت حال کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ میری موت یقینی تھی لیکن تم نے ایک بار پھر میری زندگی بچالی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا ”تم بتاؤ۔ تم کون ہو؟“

”ہم... میں بے گناہ ہوں۔“ وہ لڑکی بھلائی ”میں کچھ نہیں جانتی۔ آج ہی شام کو شاگ کے ساتھ چینگ رائے سے آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں آکر کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔“

”شاگ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شگ... کچھ نہیں۔“ اس نے جواب دیا ”میں چینگ رائے کے ایک نائٹ کلب کی رقامہ ہوں۔ رقص میں شوقیہ طور پر سیکھا تھا لیکن حالات کی مجبوری مجھے نائٹ کلب تک لے گئی۔ مجھے کلب میں ڈانس کرتے ہوئے ابھی صرف تین ہی مہینے ہوئے ہیں۔ آج سے تقریباً بیس دن پہلے اس نائٹ کلب میں شاگ سے

ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت جلد میرے قریب آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بنگاک کے کسی بڑے نائٹ کلب میں اپنے فن کا مظاہرہ کر لوں۔ اس کا کہنا تھا کہ جو دولت اور شہرت مجھے بنگاک کے کسی بڑے نائٹ کلب میں صرف دو چار دن میں مل سکتی ہے وہ میں چینگ رائے میں رہتے ہوئے زندگی بھر نہیں کما سکتی۔ میں لالچ میں آگئی۔ دولت اور شہرت ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے۔ میں نے بھی کوئی غلط نہیں سوچا تھا۔

”اور پھر ایک روز شاگ نے بتایا کہ اس نے بنگاک کے کلب نوٹی سکس سے بات کر لی ہے۔ یہ بہت بڑا نائٹ کلب ہے۔ اس کی شہرت میں نے چینگ رائے میں بھی سنی تھی۔ میں نے شاگ سے پروگرام بنایا اور آج اس کے ساتھ یہاں پہنچ گئی۔ ہم نے راکس بیجا ہوٹل میں قیام کیا۔ اس ہوٹل میں ہمارے لیے پہلے ہی سے ڈبل بیڈ کا ایک نگڑی روم تھا تھا۔ میں تو اتنے بڑے ہوٹل میں قیام کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”ہم گیارہ بجے تک ہوٹل کے کمرے میں رہے۔ اس دوران میں شاگ بار بار کسی کو فون کرتا رہا پھر ایک آدمی ہمیں لینے کے لیے پہنچ گیا۔ بعد میں اس کا نام ٹائیگر معلوم ہوا۔ شاگ نے مجھے بتایا تھا کہ ہم نائٹ کلب کے مالک سے ملنے جا رہے ہیں۔ وہ مجھے اس بنگلے میں لے آیا۔ شاگ نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اگر میں نے کلب کے مالک کو خوش کر دیا تو مجھے کئی سے پروگرام ملنا شروع ہو جائیں گے۔

”لیکن اس بنگلے میں پہنچ کر ان کی باتوں سے اعجاب ہوا کہ شاگ بیرونی کی اسٹیلنگ کے کسی ریکٹ کا اجنٹ ہے اور وہ شخص بھی اسی پرنس سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے بہر حال اس کی پرا نہیں تھی۔ نائٹ کلبوں کی آؤں میں ایسے پرنس تو ہوتے ہی ہیں۔ مجھے تو اپنے کام سے کام تھا۔ میں تو بنگاک کے سب سے بڑے نائٹ کلب میں ڈانس کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ صرف ایک رات پروگرام پیش کر کے میں اسٹار بن جاؤں گی۔ ٹائیگر کے بارے میں مجھے بتا دیا گیا تھا کہ وہ بنگاک کی زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے۔ تمام چھوٹے بڑے نائٹ کلب اس کے کنٹرول میں ہیں۔ مجھے اس کو بھی خوش رکھنا پڑے گا۔ اس بنگلے میں بیٹھے ابھی کئی بائیں ہو رہی تھیں کہ تم لوگوں کی مداخلت سے وہاں خفیہ کیمبل شروع ہو گیا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں تو ایک معمولی سی رقامہ ہوں۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ اب مجھے یہ بھی یقین ہو گیا ہے کہ شاگ مجھے چھوٹے سے یہاں لایا تھا۔“ بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی اور تھوڑی سی دیر

بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”تمہارا نام کیا ہے اور چینگ رائے میں کون سے نائٹ کلب میں تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا نام نوبتا ہے اور میں وہاں کنزروی کلب میں تھی۔ اس

نے جواب دیا۔

میں نے پرساد کو اشارہ کیا کہ وہ ٹیلی فون پر معلوم کرے کہ راکس بیجا ہوٹل میں شاگ کے نام سے کوئی گرامر کب ہوا تھا یا نہیں۔ پرساد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

”اس ہوٹل میں مطر اور سسر شاگ کے نام سے ڈبل بیڈ نگڑی روم بک ہے۔ وہاں سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ یہ دونوں گیارہ بجے کے لگ بھگ باہر گئے تھے۔ ابھی تک وہاں نہیں آئے۔“

پرمانہ نہ بنایا۔

”اس حد تک تو تمہارا بیان درست ہے۔“ میں نے نوبتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کل دن میں ہم چینگ رائے سے بھی اس کی تصدیق کر لیں گے۔“

”مجھے کنزروی کلب کا فون نمبر معلوم ہے۔ ابھی تصدیق کر لوں۔“

زنا جلدی سے بولی۔

میں نے پرساد کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے کمرے سے فون اٹھالیا اور اس کا پلگ دیوار کے ساک میں لگا دیا۔ میں نے نوبتا سے پوچھ کر چینگ رائے میں کنزروی کلب کا نمبر لپٹا۔ اس سے پہلے مجھے اوریڈو زید کو فون پر تھری ملنا پڑا تھا۔

کنزروی کلب میں رات دو بجے تک پروگرام چلتا تھا اور ابھی دو نم بجے تھے۔ میری کال جلد ہی رسپونڈ کر گئی۔ جب میں نے نوبتا کے بارے میں دریافت کیا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

”وہ آج بنگاک جا چکا ہے۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سیرا اشارہ بنا جاتی ہے۔ اب ہمارے کلب سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔“

”نوبتا تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے کتے ہوئے ریسپونڈ کر کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ تقریباً دو منٹ تک رو رو کر فون پر بات کرتی رہی پھر میں نے اس سے ریسپونڈ لے لیا ”کیا تم اس کو آواز کو گھپاتے ہو؟“

”ہاں۔ یہ نوبتا ہے لیکن اگر یہ بنگاک میں کسی مصیبت میں پھنس گئی ہے تو ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ نوبتا کے بیان کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ محض دولت اور شہرت کے لالچ میں شاگ کے دغل خانے پر اس کے ساتھ چل آئی تھی اور شاگ اس سے کوئی اور کام لینا چاہتا تھا لیکن پہلی ہی رات لڑھو ہو گئی۔

”اب صورت حال یہ ہے۔“ میں نے نوبتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم ایک قتل کی چشم دید گواہ ہو۔ پولیس کو بھی تمہاری ضرورت ہے اور پولیس سے زیادہ دارا اور شاگ کو تمہاری ضرورت ہوگی۔ وہ بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ تم پولیس تک پہنچ

سکو۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم پولیس کی پناہ میں چلی جاؤ۔ ان حالات میں پولیس ہی تمہیں تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔“

”میں انہیں سمجھ گئی ہوں۔ وہ دندنہ ہیں۔ مجھے مار ڈالیں گے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ مجھے اس نے بتایا تھا کہ وہ بنگاک میں پہلی دفعہ آئی ہے۔ یہاں اس کا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔

”ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ میں یہ کتے ہوئے اٹھ گیا۔

میں اور پرساد خانے میں آگئے۔ ٹائیگر دیوار سے ٹیک لگے بیٹھا تھا۔ ہاتھ پت پر بندھے ہوئے کی وجہ سے اسے شاید اس طرح بیٹھنے میں بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

”ہاں تو سسر ٹائیگر۔“ میں اس کے قریب پہنچ کر بولا ”کیا تم ہمارے کچھ سوالوں کا جواب دینا پسند کر لو گے؟“

اور ٹائیگر نے جس طرح جواب دیا وہ ہمارے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کا گھوٹا میرے جڑے پر اور میری زوردار ٹھوکر پرساد کی پٹلی پر لگی تھی۔ ہم دونوں گراہ اٹھے۔ ٹائیگر نے اٹھ کر دوڑانے کی طرف چھلانگ لگا دی تھی لیکن اسے دوڑانے تک پہنچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے اور پرساد نے بیک وقت اس پر چھلانگ لگائی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ ٹائیگر نے پٹ پر بندھے ہوئے ہاتھ کس طرح کھول لیے تھے لیکن اب بہر حال وہ میرے اور پرساد کے بیچ میں فٹ بال بن گیا تھا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو ہمارے گھونٹوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہا ہو۔ اس کی ناک منہ اور کان سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

پرساد نے تو ہاتھ روک لیا تھا لیکن میرے جنون میں کمی نہیں آئی۔ بنگاک کی زیر زمین دنیا کا شیشہ جس کے نام سے ہی لوگ کانپتے تھے، مکمل طور پر بے بس تھا اور میرے رحم و کرم پر تھا۔ ہم دونوں زمین پر گرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ بڑبڑاتا تھا۔ اس وقت مجھے بکولا کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ سانپ اپنے اندر غصے کی جی کی قوت سے کام لے کر موٹے تازے پھولان کی ٹانگ کی ہڈی بھی توڑ دیتا ہے۔ میں نے اپنا بازو سانپ ہی کی طرح ٹائیگر کی گردن پر لپیٹ رکھا تھا اور میرے جسم کی تمام قوت اس بازو میں سمٹ آئی تھی اور پھر میں نے ایک زوردار جھکا دیا۔ ”کڑک“ کی آواز ابھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ٹائیگر بری طرح چل رہا تھا لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا جسم کے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔ اور جب یہ بلاش کو ٹھپتے ہوئے نہ خانے سے باہر

لے کر آئے تھے تو نوتا ایک بار پھر خوف کی شدت سے قہر قہر کانپنے لگی تھی۔

یہ پرساد کی تجویز تھی کہ رات ہی رات میں ٹائیگر کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔  
”فکر مت کرو پاس۔“ پرساد نے کہا تھا ”میں اسے اس طرح لے کر جاؤں گا کہ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو شبہ نہیں کرے گا۔“

پرساد ٹائیگر کی لاش کو کمار میں ڈال کر لے گیا۔ اس کی واپسی دو گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔  
”صبح تک وہ پھلیوں کی خوراک بن چکا ہو گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ٹائیگر کی لاش کو دیر میں پھینک آیا تھا۔

رات اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ میں وہ کہہ کر نوتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پولیس کے پاس بھیجے گا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ٹائیگر اور دارا وغیرہ کے خلاف پولیس کے پاس پہلے ہی سے بہت سارے ثبوت موجود تھے لیکن پولیس بھی شاید بے بس ہو گئی تھی کہ ان کے خلاف آج تک کوئی کارروائی نہیں ہو سکی تھی۔ اگر کوئی کارروائی ہوئی بھی تھی تو چھوٹی پھیلیاں ہی کھڑی گئی تھیں یہ گرجھے ہمیشہ محفوظ رہے تھے۔

نوتا پامیلا کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی چشم دید گواہ تھی۔ وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ دارا نے اس کی موجودگی میں پامیلا کو ذبح کیا تھا لیکن آگے کوئی کارروائی کرنا تو پولیس کا کام تھا۔ اور پولیس اب تک تقریباً بے بس ہی نظر آتی تھی اور مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ نوتا کو پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے گا۔ موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔ کوٹلیا، شانی وان اور اب پامیلا کی مثالیں میرے سامنے تھیں۔ انہیں بھی اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا کہ وہ ٹائیگر اور دارا کے خلاف زبان کھولنا چاہتی تھیں۔

ٹائیگر ختم ہو چکا تھا۔ ہنگام کی زیر زمین دنیا کا وہ بے تاج بادشاہ جس کے نام نے پورے شہر میں دہشت پھیلا رکھی تھی اس کی موت بالآخر میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ویسے وہ بہت بزدل نکلا تھا۔ نہ خانے سے بھاگنے کی معمولی سی کوشش کے سوا اس نے اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بالکل کھوکھلا ثابت ہوا تھا اور میرے خیال میں ایسے لوگوں کا مرجانا ہی بہتر تھا۔

اس رات نوتا کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا تاکہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم رات کے آخری پہر سوئے تھے اور تقریباً پورا دن سوئے رہے تھے۔ شام کو میں نے ماسٹر ہو جن کو فون کیا تو یہ سسٹنی خیز انکشاف ہوا کہ ٹائیگر کی لاش آج صبح سویرے ہی دریا سے مل گئی

تھی۔

”شہر کے چند نوجوان صبح سویرے دریا پر پھیلیاں پکڑنے گئے تھے۔“ ماسٹر ہو جن بتا رہا تھا ”ٹائیگر کی لاش کنارے کے قریب سی ڈی زہر آب جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کی قیاس ایک نوجوان کی پھیلیاں پکڑنے والی کنڈی میں پھنس گئی۔ پولیس کو اس لاش کے بارے میں اطلاع دی گئی اور جب لاش کی شناخت ہوئی تو پورے شہر میں سسٹنی کی لہر دوڑ گئی۔ دیکھنے دیکھتے آدھے سے زیادہ شہر بند ہو گیا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ ٹائیگر کے گرنے کے شہر میں پانی چا دیں گے۔ ٹائیگر کے زیر اثر علاقوں میں تو اب بھی شدید خوف و ہراس ہے۔ تمام ٹائٹ کلب اور شراب خانے بھی بند ہیں۔ چند بڑے ہوٹل کھلے ہیں جہاں پولیس کا زبردست پہرا ہے۔ سڑکوں پر بھی پولیس گشت کر رہی ہے۔ بعض علاقوں میں ان کا ٹوکا چھوٹے چنگاے تو ہوتے ہیں لیکن کوئی بڑا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔“

”حیرت ہے۔“ میں نے کہا ”میرا خیال تھا کہ لوگ ٹائیگر جیسے عنصر کی موت پر خوشیاں منائیں گے۔ مضامیناں پائیں گے لیکن مجھے یہ جان کر بری حیرت ہوئی کہ لوگ ڈر کے مارے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے ہیں۔“

”ٹائیگر جیسا کوئی آدمی مرتا ہے تو اس قسم کا رد عمل تو ہوتا ہی ہے لیکن لوگوں نے بہر حال اس کی موت پر سکھ کا سانس لیا ہے۔ بہر حال میں اس آدمی کی ہمت کی داد ضرور دوں گا جس نے ٹائیگر کی گردن مروڑ کر اس کی لاش دریا میں پھینک دی تھی۔“ ماسٹر ہو جن نے کہا۔

”یہ سعادت بھی تمہارے اس شاگرد کو حاصل ہوئی ہے ماسٹر۔“ میں نے کہا۔

”کیا؟“ ماسٹر ہو جن شاید اچھل پڑا تھا۔  
میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کی تفصیل بتادی اور آخر میں کہا ”وہ لڑکی نوتا اب میرے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں۔“

”اے ایک دو دن اپنے پاس ہی رکھو۔ بعد میں اس کے لیے کچھ سوچیں گے لیکن“ ماسٹر ہو جن ایک لمبے کو خاموش رہ کر بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تم تو ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر نکلتے اب مجھے یقین ہے کہ دارا تمہارے سامنے نہیں نکلتے گا۔ اسے بھاگتے ہی بن پڑے گی۔“

”وہ بھاگنے والا نہیں ہے ماسٹر۔ میں اس کی فطرت کو سمجھ گیا ہوں۔ وہ ایک دو دن تک اپنی چوٹی سسلانے گا اور پھر مجھ پر حملہ وار کرنے کی تیاری کرے گا اور میں اس کی طرف سے قافلہ نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”گڈ۔“ ماسٹر ہو جن یوں ۳۰ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنا دفاع کر سکتے ہو لیکن ہمیں تمہاری فکر رہتی ہے۔ ملاقات کب ہو رہی ہے؟“

”ہں۔ ایک دو دن میں ماسٹر۔“ میں نے کہا اور چند دیر ہی جہلوں کے تارے کے بعد فون بند کر دیا۔

دارا وغیرہ کے خلاف ایک دو کامیابیوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں بہت طاقت ور اور اس پر حاوی ہو گیا ہوں۔ وقت اور نجات نے اگرچہ مجھے زندہ رہنے کے چند کر سکھا دیے تھے لیکن ابھی تو اس راہِ خار زار پر میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا تھا اور مجھے ماسٹر ہو جن اور مہاراج جیسے لوگوں کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ میں اس وقت بھی جو کچھ تھا انہی کی بدلت تھا۔ اگر مہاراج مجھے اپنی بنیاد میں نہ لیتا تو آج میں اس طرح خود اعتمادی سے دشمن کے سامنے کھڑے ہونے کے بجائے اپنی جان بچانے کے خوف سے کہیں چھپا ہوا ہوتا۔ مجھے ماسٹر ہو جن اور مہاراج جیسے لوگوں کی ضرورت تھی۔ انہیں چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد تھائی وان لنگ نے جاگی دیوی کو فون کیا۔ وہ ہمارے لیے بہت پریشان تھی۔ صبح پہلے وہ خود بنگلے پر گئی تھی پھر دن میں کی مرتبہ فون کیا تھا۔ تھائی نے اسے بھی تمام واقعات سے آگاہ کر دیا اور بتایا کہ ہم محفوظ ہیں۔ ایک دو دن بعد اس کے بنگلے پر جائیں گے۔ تھائی نے اسے یہاں کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔

نوتا نے ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ ساری صورت حال اب اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ یہاں سے باہر نکلنے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس مکان کی چار دیواری ہی اس کے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ وہ اس پناہ گاہ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی اس لیے مجھے بھی اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اس پر ہم نے کوئی باندی نہیں لگائی تھی۔ اسے اگرچہ پورے گھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی لیکن وہ خود ہی ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو یکن کچل جاتی۔

نوتا پہلی مرتبہ ہنگام آئی تھی۔ اس کا باپ چیا نگ رائے میں ٹورٹ گاڑیا تھا۔ لیکن عرصہ پہلے ایک حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس وقت نوتا کی عمر یاہ سال تھی۔ اس نے ایک دہائی کی حیثیت سے ہوٹل میں ملازمت کر لی۔ نوتا بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ جڑو جی کام کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ رقص کی تربیت بھی حاصل کرتی رہی۔ سیام (تھائی لینڈ) کے رواجی رقص کے علاوہ اس نے ہندوستانی رقص بھی سیکھا تھا لیکن یہ شخص اس کا شوق تھا۔

ماس کی موت کے بعد وہ اکیلی رہ گئی۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ باہری نہ رہا اور اس نے ملازمت شروع کر دی۔ وہ اپنے ابا اور گرد کے ماحول سے بے خبر نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک تو بے قول رہے وہ قیامت بن گئی تھی اور پھر وہ لیاں بھی ایسے پہنچی کہ اس کے بدن کے شیب و فراز نمایاں ہو جاتے۔ مردوں کی ہوس بھری

نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ایسی باتوں سے محفوظ بھی ہوتی تھی جن سے مردوں کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہو۔ بعض اوقات تو وہ جان بوجھ کر بھی ایسی حرکتیں کرتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے آپ کو صاف بچالے جاتی تھی لیکن ایک روز بھری چھری کے نیچے آئی تھی۔

نوتا کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ مرد اس کے حسن و شباب کے شیدا بن جائیں۔ وہ اسے اپنے بستر کی زینت تو بنانا چاہتے ہیں لیکن نوتا کو کسی میں غلطی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ صرف اس کے جسم کے طلب کرتے اور نوتا اس طرح مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے رقص کو اپنا وسیلہ روزگار بنانے کا فیصلہ کر لیا اور تین مہینے پہلے اس نے راقصہ کی حیثیت سے کسری کلب میں پروگرام شروع کر دیے۔ یہاں شانگ سے ملاقات ہو گئی اور وہ اسے دھوکے سے بنکاک لے آئی۔ یہاں آکر وہ ایسی مصیبت میں پھنس گئی کہ اسے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس دوران میں نوتا میرے بارے میں تھوڑا بہت جان چکی تھی۔ اس پر موت کا خوف طاری تھا اور وہ جانتی تھی کہ میں ہی اس کی کوئی مدد کر سکوں گا اس لیے وہ اس قدر شرافت کا ثبوت دے رہی تھی اور اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دو تین دن گزر گئے تھے۔ نوتا سے باتوں میں انکشاف ہوا کہ پتا چلا اس کی رشتہ کی ایک خالہ رہتی ہے جو وہاں محکمہ سیاحت میں ٹورٹ گاڑیا ہے۔

”بنکاک میں تمہاری زندگی محفوظ نہیں۔ چیا نگ رائے تم واپس نہیں جانا چاہتیں۔ میرے خیال میں تم پتا چلی جاؤ۔ اپنی خالہ کے پاس۔ وہ جگہ تمہارے لیے محفوظ رہے گی۔“ میں نے نوتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ظاہر ہے ہم اسے زیادہ عرصے تک اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

نوتا بڑی مشکل سے آمادہ ہوئی تھی۔ دراصل وہ ہمارے ساتھ رہنے کو اپنے لیے محفوظ سمجھتی تھی اور ہمارا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

پامیلا کے قتل (دوسرے روز مجھے پامیلا کی موت کی خبر مل گئی تھی) کو الے واقعے کو پانچ دن ہو چکے تھے۔ پولیس۔ سرگرمیاں اگرچہ ماند پڑ گئی تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ ٹائیگر اور دارا کے آدمی شکاری تلوں کی طرح ہماری تلاش میں پورے شہر میں پھر رہے ہوں گے۔

پتایا۔ یہ خوب صورت ساحلی شہر بنکاک کے مشرق میں تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے یہاں بہت سی دلچسپیاں تھیں۔ حامی باشندے بھی بڑی تعداد میں اس طرف جاتے رہتے تھے۔ اپنی دے نہر میں سے ڈھائی تین گھنٹوں کا راستہ تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے علاوہ پرائیویٹ بسیں اور

کو چھوڑ چو ہیں کھلتے پھرتی تھیں۔

اس روز ہم صبح پانچ بجے کمرے سے نکلے تھے۔ اسٹریٹنگ کے سامنے حسب معمول پر سادہ تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر میں اور بیچھے تھائی وانگ اور نویتا بیٹھی ہوئی تھیں۔ شرفی بس ٹرینل تک پہنچنے کے لیے پورا شہر پار کرنے کی ضرورت تھی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ نویتا کو بتایا جائے والی بس پر بھاگ کر ہم جاگی دیوی والے بنگلے پر واپس چلے جائیں گے۔

اس وقت سڑکوں پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ پر سادہ کو تیز رفتاری سے کار چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ مختلف سڑکوں اور پھر سوکھ روٹ دوڑ پڑے ہوئے ہم چھ بجے سے پہلے ہی بس اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد کوئی نہ کوئی بس اڑے سے نکل رہی تھی۔

نویتا خوف زدہ تھی۔ میں بھی محتاط نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ نویتا ایک کوچ پر بیٹھ چکی تھی۔ تھائی وانگ نے اسے کچھ رقم بھی دے دی تھی۔ ہم اس وقت تک ٹرینل پر کھڑے رہے جب تک بس حرکت میں نہیں آئی۔

واپسی پر ہم ایک پریس وے سے ہوتے ہوئے تنگ ڈسٹرکٹ کی طرف نکل آئے اور مختلف چھوٹی سڑکوں پر ہوتے ہوئے ٹاکسن بزم پار کر کے تھان پوری ڈسٹرکٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے جاگی دیوی والے بنگلے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بنگلے میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تھائی وانگ ناشتا تیار کرنے کے لیے کچن میں کھس گئی۔ نائنے کے لیے کچھ چیزیں ہم راستے سے لیتے آئے تھے۔

جاگی دیوی کو ہم نے کل رات ہی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے نو بنگے کے قریب اس کا فون لگایا۔

کما۔

”میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے بتایا تھا کہ اس رات کے بنگلے میں شاگ تھائی وانگ کی گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔“ جاگی دیوی نے کہا ”میں نے اس چینی کا سراغ لگا لیا ہے؟“

”کیا۔“ میں اچھل پڑا۔ میں نے جاگی کو اس قسم کی کوئی نئے داری نہیں سونپی تھی کیونکہ میں اسے ان ہنگاموں سے دور رہی رکھنا چاہتا تھا ”میں نے تو تمہیں ایسا کی کام نہیں کہا تھا جاگی دیوی۔“ میں نے کہا۔

”محض اتفاق سے ہی اس کا پتا چلا ہے۔“ جاگی دیوی نے جواب دیا ”کل شام تمہارا فون آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میری ایک دوست سوناٹا مجھ سے ملنے آ گئی تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں سرجن ہے۔ اس نے بتایا کہ چند روز پہلے آدھی رات کے بعد اس کے گھر میں دو آدمی کھس آئے تھے۔ ایک بھاری بھر کم

چینی اور دو سرائیڈین تھا۔ وہ دونوں زخمی تھے۔ چینی کو ہانڈس گولی لگی تھی اور اس اسٹریٹنگ کی ناک اور منہ سے خون برہا تھا۔ میرا خیال ہے یہ اس رات کی بات ہے جب تمہاری دارا وغیرہ سے محظوب ہوئی تھی۔ انہوں نے سوناٹا کے چھ سالہ بیٹے کو قتل کر دیا اور سوناٹا سے اپنا علاج کروا کر رہے۔ وہ دونوں اب بھی اس کے گھر میں ہیں۔ انہوں نے سوناٹا کو محکمہ دی ہے کہ اگر اس نے ان کی موجودگی کے بارے میں کسی کو بتایا تو نہ صرف اس کے بیٹے کو بلکہ اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“

”وہ۔۔۔“ میں یہ بات سن کر اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شاگ کے ساتھ دو سرائیڈین دارا تھا۔ اس رات وہ میرے ہاتھوں میں طرے پڑا تھا ”کیا تم مجھے سوناٹا کے گھر کا پتا بتا سکتی ہو؟“

”اگر تمہارا کچھ کرنے کا ارادہ ہے تو اس طرح سوناٹا دارا اس کے بیٹے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔“ جاگی دیوی نے کہا۔ ”میں صرف اس مکان کی گھرانی کرنا چاہتا ہوں تاکہ جب لوگ وہاں سے نکلیں تو ان کا تعاقب کر کے ان کے گھرانے کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ یقین کرو جاگی۔ میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا نہیں تو اور کس کا یقین کروں گی۔“ جاگی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یوں ”سوناٹا کا مکان اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جہاں تھائی وانگ کا مکان تھا۔ ٹاکسن روڈ پر اسٹریٹ اینٹی فوس دایس طرف تیسرا مکان ہے۔“

”گڈ۔“ میں نے کہا ”اگر کوئی اور بات معلوم ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔“ میں نے فون بند کر دیا اور تھائی کو صورتحال سے آگاہ کرنے لگا۔

”ٹاکسن روڈ۔ اسٹریٹ اپنی ٹو۔“ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی ”میرا مکان اس کے سامنے سر کی طرف تھا۔ اسٹریٹ اپنی ٹو میں میری ایک دوست رہتی ہے۔ ایک منٹ مجھے سونے دو۔ میں اس کا فون بھرا دے کہ کسی کو شش کر دی ہوں۔“

یہ ایک دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ تھائی وانگ طویل عرصے سے اس علاقے میں رہائش پزیر تھے۔ کچھ لوگوں سے اس کے تعلقات ضرور ہوں گے اور اتفاق سے اسٹریٹ اپنی ٹو میں اس کی کوئی دوست بھی موجود تھی۔

”ایک منٹ!“ تھائی وانگ خوراک کی کے انداز میں ہلکی اور پھر کانٹہ اور بال چین اٹھا کر کچھ کھینے لگی ”یہ ہے اس کا کنبہ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“

وہ فون کا ریسورڈ اٹھا کر فہرلانے لگی۔ لائن ملنے میں زیادہ نہیں لگی تھی۔ دوسری طرف سے فوراً ریل کمرہ کھلی گئی۔ ”ہیلو مائے میں تھائی وانگ بول رہی ہوں۔“ تھائی وانگ بولی۔ کچھ دیر تک دوسری طرف کی آواز سنتی رہی پھر ہلکی

پوری ہے۔ میں فی الحال سامنے نہیں آسکتی۔ تمہاری گلی میں سوناٹا نام کی کوئی ڈاکٹر رہتی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنا۔“

”اس بے چاری کے ساتھ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا ”دو بدحاش پانچ چھ روز سے اس کے گھر میں کھسے ہوئے تھے۔ اسے دھکی دی تھی کہ اگر ان کے بارے میں کسی کو بتایا تو وہ اسے اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیں گے۔ آج صبح چار بجے وہ اس کے بیٹے کو قتل بنا کر اس کے گھر سے نکلتا ہوا تھا۔ سوناٹا نے مزاحمت کی تو انہوں نے نہ صرف اس کے بیٹے کو قتل کر دیا بلکہ سوناٹا بھی شدید زخمی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت زندگی اور موت کی نکلتش میں جلا اسپتال میں پڑی ہے۔ اس کے گھر پر پولیس کا کپڑا ہے۔ پولیس والے اس گلی میں رہنے والوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے مگر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھیں؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ سمجھ ملی تھی۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے میرا گھر جلایا تھا۔ میں سوناٹا کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن۔“

”تم پولیس کو بتا کر اب بھی اس کی مدد کر سکتی ہو۔“ سوناٹا نے میری بات کاٹنے ہوئے کہا ”مگر پولیس کو ان کے بارے میں بتا دیا جائے تو انہیں آسانی سے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ میں پولیس سے رابطہ کروں گی اور ایک دو روز بعد تم سے ملاقات کروں گی۔“ تھائی وانگ نے یہ کہتے ہوئے جواب کا انکار دیکر بغیر ریسورڈ رکھ دیا۔

”مائے گون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور ساری باتیں سن لی تھیں۔ مجھے اس انفوس ناک واقع پر انفوس ہوا تھا۔ دارا واقعی خور خور بھیڑتا تھا۔ آسانی زندگی کی اس کے نزدیک واقعی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ بیڑی بے رحمی سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔

”مائے کا سماج پار ہے۔ ہوس پلازما میں لیکن ہم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ تھائی وانگ نے سوال دیا۔ میں نے میری طرف دیکھا۔ ”مگر یہ قابلِ اعتماد ہو تو اس کے کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا ”دارا کے گھرانے کا پتا لگا کر ضروری ہے اور اس کا سراغ اسی گیسٹ ہاؤس سے ہی مل سکتا ہے جہاں پہلی بار میری اس سے فہم بھڑ ہوئی تھی۔ میں اور پر سادہاں جا نہیں سکتے تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ کام کسی ایسی ہستی سے لیا جاسکتا ہے جس پر کسی کم کا شہر نہ کیا جاسکے۔“

”ایسی صورت میں مجھے خود مائے کے پاس جانا پڑے گا تاکہ اسے بات سمجھائی جاسکے۔“ تھائی وانگ نے جواب دیا۔ اور پھر اسی رات بارہ بجے کے قریب ہم ٹاکسن روڈ کی اسٹریٹ اپنی ٹو پر واقع مائے کے گھر میں موجود تھے۔ اپنے مکان کے

سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے تھائی وانگ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ مکان کی جگہ پر لمبے کا ڈھیر ابھی تک پڑا ہوا تھا۔

مائے کی عربیتس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دروازہ قامت اور حسین عورت تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آ گیا کہ میں نے کسی بیگین کے ایک اشتہار میں اس کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن اس کا شوہر کئی سال پہلے پر لیا گیا تھا اور اس کے بعد لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں خیال تھا کہ مرچپ چکا ہے۔ زندہ ہونا تو اس کے بارے میں کوئی اطلاع ضرور ملتی۔

مائے کو اپنی باتیں سمجھانے میں آدھا گھٹنکا تھا اور بالآخر وہ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ مگر ہمارا سانس لیتے ہوئے بولی ”میں کل ہی سے اس مشن پر کام شروع کر دیتی ہوں۔“

مائے سے رخصت ہو کر ہم واپس بیچنے تو رات کے دو بج رہے تھے۔

اس کے تیسرے ہی دن مائے سے ایک دلچسپ رپورٹ مل گئی۔ تھائی وانگ نے اسے خود فون کیا تھا۔ مائے نے بتایا کہ شاگ کو تھانگ رائے واپس جا چکا ہے اور دارا واقعی طور پر سواری رکھتا ہے۔ آشرم میں ہانا ہے چکا ہے جبکہ کم اور بیٹی ٹانگ بھی شہر میں کسی جگہ بدوش ہیں۔

سواری رکھتا ہے آشرم کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ جیم خانے کی طرح کا بے سارا بچوں اور عورتوں کا کوئی ادارہ ہو گا لیکن تھائی وانگ میری یہ بات سن کر مسکرا دی تھی۔

”یہ اس طرح کا آشرم نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

”آشرم تو آشرم ہی ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی پورے بات سننے بغیر کہا۔ ”میرا خیال ہے جاگی دیوی یہ کام کر سکتی ہے۔ وہ ہندو ہے اور کسی ہندو عورت کے لیے آشرم میں داخل ہونا زیادہ مشکل نہیں۔“

”پہلے میری بات سمجھ لو پھر اپنی بات کرنا۔“ تھائی نے کہا ”تم نے رجسٹر دیوٹا کے بارے میں کچھ نہیں سنا ہوا ہے۔ یہ ہندوستان کا خیالی تھا۔ یہ غالباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس نے ہندوستان کے شہر پونا کے قریب ایک جھونے سے آشرم میں عجیب و غریب اور پراسرار قسم کے روحانی خیالات کا پرچار شروع کیا۔ وہ فطرتاً ایک عیاش آدمی تھا۔ عورت، شراب اور دولت اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی مگر وہ کل کر اپنی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا اس نے مذہب اور روحانیت کی آڑ لے کر ایسے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا جن میں بنیادی طور پر جنسی بے راہ روی کو آزادی کا نام دیا گیا۔ دولت مند گھروں کی آزادی پسند لڑکیاں اور لڑکے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کے چیلوں کی تعداد دس روز

بروز اضافہ ہوتا رہا۔ نشر اور جنسی بے راہ روی اس کے مذہب میں جائز تھی۔ وہ خود ایسی اخلاق سوز حرکتیں کرتا اور اپنے چیلوں کو بھی اس کی ترغیب دیتا۔ اس کے چیلوں میں ایسی غیر ملکی عورتیں اور مرد بھی شامل تھے جو روحانیت کی تلاش میں دنیا بھر میں بھٹکتے رہتے تھے۔

”ہندوستان میں رجنیش پر پابندیاں لگنے لگیں تو وہ امریکا منتقل ہو گیا۔ وہاں بھی لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے چیلوں کو روحانی آسودگی حاصل ہوئی یا نہیں؟ یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن رجنیش کی خواہشات پوری ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس عیاشی کا ہر سامان موجود تھا۔ سڑک کے لیے لاتعداد دولہا رازکارین، رہائش کے لیے عالی شان مکان، بڑھیا شرب اور جوان و حسین لڑکیاں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو روحانیت کی جستجو میں اس کے پاس آتی تھیں اور اس کے ایک اشارے پر بے لیاں ہو کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگتی تھیں۔ رجنیش دوس کے راسپونڈ میں سے زیادہ گندہ اور غلیظ آدمی تھا۔ وہ کچھ ایسی پر اسرار قوتوں کا مالک تھا کہ ایک مرتبہ اس سے نظریں ملانے والا بھی کوئی شخص اس کے جال سے نکل نہیں سکتا تھا۔

”۱۹۸۵ء میں جب امریکیوں نے محسوس کیا کہ اس کی تعلیمات نوجوانوں کو جنسی بے راہ روی اور گمراہی کی طرف لے جا رہی ہیں تو امریکی حکومت نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس پر لاتعداد مقدمات بھی قائم ہوئے پھر اسے ملک بدر کر دیا گیا اور بالآخر ۱۹۹۰ء میں بھارت میں اس کا انتقال ہو گیا۔“ تھانی وانگ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”یہ سوای رگناتھ بھی اسی قسم کا آدمی ہے جو چند سال پہلے بھارت ہی سے یہاں آیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ انڈین ٹیبل میں رہا لیکن اس کی غیر اخلاقی اور دنیا سوز حرکتوں کی وجہ سے اسے مندر سے نکال دیا گیا۔ اس نے بنگال کے مشرق میں قدیم شہر سے کچھ فاصلے پر ایک آشرم بنالیا تھا۔ جہاں وہ ایسی ہی تعلیمات دیتا ہے جس کا پرچار رجنیش بھگوان کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً اخبارات میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ بعض اخبارات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ آشرم منشیات اور جرائم کا بست بڑا ڈھل ہے۔ لوگ عقیم جرائم کرنے کے بعد یہاں پناہ دیتے ہیں لیکن قانون آج تک اس کے خلاف حرکت میں نہیں آیا کیونکہ اس کے چیلوں میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو حکومت میں اہم کیڑوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”دلچسپ۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”اس کا مطلب ہے“ مانے کی رپورٹ درست ہی معلوم ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ جاگتی دیوی کو مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں بھیجے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔“

”اگر وہ تیار نہیں ہوئی تو؟“ تھانی وانگ نے کہا۔

”تو پھر کوئی اور ترکیب سوچیں گے۔ بہر حال، میں جس خود جاگی سے بات کروں گا۔“ میں نے کہا۔

اگلے روز جاگتی دیوی سے بات ہوئی تو وہ فوراً ہی اس کے لیے تیار ہو گئی ”اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو وہاں سے نکلنے میں دیر مت کرنا۔“ میں نے کہا۔

”سناتا میں نے بھی یہی ہے کہ وہ آشرم جرائم کا بست بڑا ڈھل ہے اور جرائم پیشہ لوگ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہیں پناہ لینے ہیں اور جب ان کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو وہ آشرم سے نکل کر دوبارہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بہر حال، میں کوشش کروں گی کہ معاملہ الجھنے نہ پائے۔“ جاگتی دیوی نے کہا۔

جاگتی دیوی کے جانے کے بعد اس رات میں نے ماسٹر ہوجن سے بات کی۔ اس نے یہ دلچسپ خبر سنائی کہ ٹائیگر کی موت کے بعد پیڑروئے زیر زمین دنیا کی کمان سنبھال لی تھی اور اس نے اعلان کیا تھا کہ جب تک ٹائیگر کے قتل کا بدلہ نہیں لے گا۔ جہن سے نہیں پیٹھے گا۔ ٹائیگر نے میرے سر کی قیمت ایک ملین بھات مقرر کر رکھی تھی۔ پیڑروئے نے قیمت دو ملین بھات کر دی۔

پیڑروئے کے بارے میں معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کون ہے اور یہ معلومات صرف اور صرف رامن پر سادی حاصل کر سکتا تھا۔ رامن پر ساد کو یقین تھا کہ اسے ٹائیگر کے کسی آدمی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سات آٹھ دن پامیلا کے ساتھ رہا تھا اور اس دوران میں اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ کبھی کسی آدمی کو اپنی گھرانی کرتے ہوئے نہیں پایا تھا۔ لیکن پھر ٹائیگر نے ایک اور خیال آگیا۔ راسد نے بتایا تھا کہ شروع میں اسے پامیلا کے ساتھ دیکھ کر انہیں کسی قسم کا شبہ ہوا تھا اور اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ پر ساد کو ان کے کسی اوڑے پر بھیجتا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

”تم اس کی فکر مت کرو پاس۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔“ پر ساد نے کہا ”تمہیں یاد ہے جب میں یہاں سے گیا تھا تو میرے بال چھوٹے تھے اور لپاس سے بھی میں بندے کی طرح لگ رہا تھا اور ویسے بھی کئی روز ہو چکے ہیں۔ اگر بال بڑھا کر سوچیں رکھی جائیں تو ان کے فرشتے بھی مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔“

”لیکن اس میں کئی روز لگ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کئی روز۔“ پر ساد مسکرایا ”سوچیں اور بال تو جگنی جاتے ہیں آتے ہیں۔“ وہ الماری میں سے برائڈن بالوں والی ایک دگ اور مونچس نکال لایا۔

”یہ چیز کئی روز پہلے میں نے یہاں لا کر رکھی تھی اور اب ان کے استعمال کا وقت آگیا ہے۔“ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دگ سر پر جمائی اور تھوڑے برش ٹاپ کی مونچس ہونٹوں پر چسکائیں۔ اس طے میں واقعی اس کے چہرے میں ہلکی تبدیلی آگئی تھی۔

”میں ایسے ہی ذرا ان کے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔“

اگر کوئی گزیر نظر آئی تو پر ساد کو بدل دیں گے۔“

میں جانتا تھا کہ پر ساد میرے روکے نہیں رکھے گا اس لیے میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس کی دایسی تقریباً چار گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ نیتا کو کار سے اترتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اندر آ کر اس نے مجھے اور تھانی کو دیکھا تو اس کے چہرے کے انزات بدل گئے۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے پر ساد کی طرف دیکھنے لگی۔ پر ساد نے دگ اور مونچس اتار دیں تو نیتا کے منہ سے کمرہا سانس نکل گیا۔

”ہم نے تو جیس اس روز بتایا جانے والی کوچ پر ساد کر لیا تھا۔ تم دوبارہ یہاں کیوں آگئیں؟“ تھانی وانگ نے اسے ٹھوڑا۔

”یہ نہیں کہاں سے ملی؟“ میں نے نیتا کے بولنے سے پہلے برسات پوچھا۔

”میں سوئم واٹ روڈ کی طرف سے آ رہا تھا کہ یہ ہوٹل بلوارڈ کے سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ میں گاڑی روک کر اس کے پاس آگیا۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی تو یہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن ہے کہ مجھے کوئی غذا کچھ کر شرعاً چاہتی تھی لیکن میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کچھ پھیلی باتیں یاد دلائیں تو یہ خاموشی سے میرے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ تم لوگوں کو دیکھنے سے پہلے تک یہ ڈری ہوئی تھی اور شاید یہی سوچ رہی تھی کہ کسی غلط آدمی کے ہاتھ لگ گئی ہے۔“

”تم واپس کیوں آگئیں؟“ اس مرتبہ میں نے نیتا سے پوچھا۔

”جب میں بتایا پہنچی تو بڑی مشکل سے میں نے اپنی خالہ کا ایڈریس تلاش کیا لیکن پتا چلا کہ وہ چنانچہ رائے گئی ہوئی ہے اور ایک ہفتے بعد واپس آئے گی۔ وہاں مجھے خالہ کا ایک دوست مل گیا۔ وہ بھی ٹھیکہ سیاحت میں نورسٹ کا گاہک ہے۔ اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر میں رہنے کو جگہ دے دی۔ تین ہار روز تو فریٹ سے گزر گئے اور پھر ایک روز وہ شراب کے نئے ٹبل میرے کمرے میں گھس آیا۔ وہ اپنی ہمدردی کی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بجایا اور صبح ہوتے ہی وہاں سے نکل گئی۔ دو تین دن ایک ہوٹل میں گزارے۔ وہاں بھی میں ہر وقت اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی رہی۔ کل میں نے ٹھیکہ سیاحت کے دفتر سے خالہ کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس نے ایک ہفتے کی مزید چھٹی لے لی ہے۔ میں آج ڈیڑھ بج کر آئی اور یہاں تم لوگوں کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ اگر شاہک کے آدمیوں نے دیکھ لیا تو مجھے کوئی مار دیں گے۔“

”بنگال جیسے شہر میں ایڈریس کے بغیر کسی کو تلاش کر لینا جوئے

شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم پر ساد کی نظروں میں آگئیں اور وہ تمہیں یہاں لے آیا۔ ویسے مجھے ایک اور بات یاد آ رہی ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر لولا ”اس روز تم نے بتایا تھا کہ شاہک کے ساتھ شام کے وقت بنگال پہنچی تھیں اور رات گیارہ بجے تک ہوٹل کے کمرے میں رہی تھیں پھر ٹائیگر اور شاہک کے ساتھ اس کو شہر میں آگئی تھیں جہاں دارا تم لوگوں کا منتظر تھا۔ کیا اس دوران میں کسی اور آدمی سے بھی تم لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی؟“

”نہیں۔“ نیتا نے مختصر سا جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ٹائیگر، پامیلا، دارا اور شاہک کے سوا کوئی اور شخص نہیں پہچانتا۔“ میں نے کہا ”پامیلا اور ٹائیگر مر چکے ہیں۔ شاہک چنانچہ رائے واپس جا چکا ہے اور دارا ایک ایسی جگہ موپوش ہے جہاں سے کئی روز تک وہ باہر نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے اور تم آزادی سے گھر مہر سکتی ہو۔“

بات نیتا کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اور پھر اسی رات رامن پر ساد اپنے مشن پر روانہ ہوا تو نیتا بھی اس کے ساتھ تھی۔ میری باتوں سے نیتا کا خوف بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا اور اس کا اعتماد کسی حد تک بحال ہوا تھا۔ ان دونوں کی دایسی رات دو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ تشویش ناک خبر یہ تھی کہ پیڑروئے مجھے موت کے کھاتے اتارنے کے لیے ایک ڈھلے اسکوٹا تشکیل دیا تھا جس میں بنگال کے چار سٹاک ترین پیشہ ور قاتل شامل تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ مجھے جہاں بھی دیکھیں، پکڑنے کی کوشش کرنے کے، بجائے میرے کھلے کر دیں اور وہ کھلے ایک بوری میں بند کر کے ختے کے طور پر صدارت کو بھیج دیے جائیں۔

ماسٹر ہوجن نے کئی بار مجھے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کی ہر بات کو ٹال دیا تھا لیکن اب صورت حال سنگین تر ہو چکی تھی۔ میں بزدل تو نہیں تھا۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا تھا اس سے میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی لیکن حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں ایک دو دشمنوں کا مقابلہ تو کر سکتا تھا لیکن تانگوں کا ایک گروہ میرے پیچھے لگا گیا تھا۔ وہ شکاری کتوں کی طرح میری بو سوختے پھر رہے تھے۔

اگلے روز ایک اور تشویش آمیز خبر نے ٹلی۔ پیڑروئے کے آدمیوں نے فران نوک روڈ والے اس مکان کا سراغ لگایا تھا جہاں میں نے ٹائیگر کو ہلاک کیا تھا اور نہ خالے سے ٹائیگر کی گھڑی بھی انہیں مل گئی تھی جو لڑائی کے دوران میں اس کی کلائی سے نکل کر وہاں گر گئی تھی۔

یہ خبر بھی اس روز پر ساد ہی نے سنائی تھی۔ اس رات وہ

گیت ہاؤس کا چکر لگا کر آیا تھا اور جس میز پر وہ فوٹا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اس کے پیچھے والی میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمی یہ باتیں کر رہے تھے۔

”بیزد تو کچھ زیادہ سی تیز جا رہا ہے۔“ میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے فرائ نوک والے مکان کا سراغ لگایا ہے۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتا ہے۔ سب سے پہلے وہ لوگ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ مکان کس نے کرائے پر لیا تھا۔“ ”مکان کے ایکری منٹ کے ذریعے تو وہ میرا سراغ نہیں لگا سکتے۔ میں نے ایک فرضی نام اور پتا لکھوایا تھا اور جب نوٹ سامنے رکھے ہوئے ہوں تو اسٹینڈ انجٹ بھی کسی بات پر زیادہ اصرار نہیں کرتا۔ اسے اپنے کیشن سے مطلب ہوتا ہے۔ البتہ یہ کار ہمارے لیے کچھ الجھن پیدا کر سکتی ہے۔“ پرساد نے کہا۔ میں کچھ بولنے کے بجائے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کار کرائے پر لیتے وقت میں نے فلیٹ کا پتا لکھوایا تھا۔ اس فلیٹ سے وہ کچھ معلوم نہیں کر سکتے لیکن کار کی نمبر پلیٹ... یہ کار اس مکان میں بھی جاتی رہی ہے اور یہاں بھی۔ اس مکان کے پڑوسیوں سے وہ کار کے بارے میں بھی معلوم کر لیں گے اور پھر اگر وہ لوگ ادھر آئے، جیسا کہ مجھے توقع ہے، تو ان کے لیے یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا کہ اس کار کا تعلق اس ہنگلے سے بھی ہے۔“

”اور انہیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ یہ ہنگلے جاگی دیوی کا ہے۔ اس طرح جاگی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمارے پاس اس ایسا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم اسے خطرے سے آگاہ کر سکیں۔“ میں نے کہا۔

”ایک طریقہ ہے۔“ پرساد بولا۔ ”وہ کیا ہے؟“ میں نے پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم یہ ہنگلے فوری طور پر چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ پر منتقل ہو جائیں اور میں آج ہی رات سواری رگوتاہ کے آشرم پہنچ جاتا ہوں تاکہ جاگی دیوی کو اس خطرے سے بچایا جاسکے۔“ پرساد نے کہا۔

”تجربہ معقول ہے۔“ میں نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر ماسٹر ہوجن کا نمبر لگایا۔

کال ماسٹر ہوجن کے ایک شاگرد نے ریسیور کی تھی لیکن یہ انام سننے ہی اس نے ماسٹر ہوجن کو بلادیا۔

”تم کہاں ہو۔“ ماسٹر ہوجن میری آواز سننے ہی چنچا ”تم اس وقت سخت خطرے میں ہو۔“ ہمیں چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میری ایک اطلاع کے مطابق وہ ہمارے ایک ٹھکانے کا پتا لگ چکے ہیں۔ اس مکان کے یہ خانے سے انہیں

ٹائیکر کی گھڑی اور کچھ ایسی چیزیں ملی ہیں جو ہمارے نشان دہی کرتی ہیں۔ بیزد کو سوئی صدمین ہے کہ ٹائیکر کو تم نے ہی ہلاک کیا ہے۔ وہ ہمارے گورگھر انگ کر رہے ہیں۔“

”ہمیں یہ سب کیسے معلوم ہوا ماسٹر ہوجن! انہیں نے پچھا۔ ”ہم نے ہمارے طرف سے آنکھیں بند نہیں کر رکھی۔“ ماسٹر ہوجن نے جواب دیا ”ہمارے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور یہ خبر تو پورے اندر ورلڈ میں گردش کر رہی ہے کہ بیزد نے ہمارے ایک ٹھکانے کا پتا چلایا ہے اور وہ بہت جلد ہمیں چھاپنے والا ہے۔ ویسے تم ہو کہاں پر۔“ مجھے اپنی انوکھ بناؤ تاکہ میں اپنے آدمی بھیج دوں۔

”یہ تمام خبریں مجھے بھی مل چکی ہیں ماسٹر۔“ میں نے جواب دیا ”میں بھی اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میری یہ پناہ گاہ محفوظ نہیں رہی۔ میں اس وقت ٹاکسن روڈ کے قریب ہوں اور ہم یہاں سے لکھنا چاہتے ہیں۔“

”ہمارے ساتھ تھائی وانگ کے علاوہ اور کون ہے؟“ ماسٹر ہوجن نے پوچھا۔

”دو افراد اور ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ایک گھنٹے بعد ایک سیاہ دین جنس ٹنگ ٹاکسن کے انچو والے چورائے کے قریب کھڑی تھی۔ گاٹک کو تم پچان لو گے۔ ویسے میرے کچھ آدمی ریلوے اسٹیشن کی طرف بھی موجود ہیں۔ میں انہیں خبردار کر دیتا ہوں۔“

فون بند ہو گیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور ان لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے وہاں سے نکلنے کی تیاری شروع کر دی۔ ہم نے ہر وہ چیز سیٹھ لی جس سے وہاں ہماری موجودگی کا ثبوت مل سکتا تھا۔ ویسے میرے خیال میں یہ بیکاری تھا کیونکہ جب انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم یہاں تھے تو کسی موجودگی کا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ٹنگ ٹاکسن کے مجھے والا چوراپا وہاں سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جب ہم ہنگلے سے نکلے تو میاہ بنگ کر رہیں منٹ ہوئے تھے گاڑی میں سے ہنگلے ہی میں چھوڑ دی تھی۔ اسے اشتعال کرنا اب خطرناک ہو سکتا ہے۔ کٹ کو تالا لگا کر چاروں کا ہتھکڑیاں لے اپنے بیک میں ڈال لیا اور ہم چاروں اسٹینڈ ہی چورائے کی طرف پھلے گئے۔

ٹاکسن اسکوائر پر اس وقت خاصی رونق تھی۔ چورائے کے وسط میں بہت بڑا گول چوتہ بنا ہوا تھا۔ چوتے کے مین وسط میں ایک اور چوتے پر ٹنگ ٹاکسن کا مجسمہ تھا۔ اس کے مین چاروں طرف چار شیردوں کے مجسمے تھے۔ اس مین کے اطراف میں ایک حوض سا بنا ہوا تھا۔ چاروں شیردوں کے منہ میں فوارے تھے ہوئے تھے۔ شام کو یہ فوارے کھولے جاتے تھے تو پانی اس آلاب میں گرتا رہتا تھا۔ بڑے چوتے کے گرد تقریباً چار فٹ اونچا لوہا

کا ہنگلا تھا۔ آمدورفت کے لیے چار آہنی سلاخوں والے دروازے بھی تھے لیکن وہ دروازے نوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ہنگلے کی کئی سلاخیں بھی غائب تھیں اور کئی جگہوں پر کچھ سلاخیں مڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ہنگلے کے اندر والے چوتے اور اس کے اطراف میں گولاٹی میں بنے ہوئے فنٹ ہاتھ پر چڑھیں اور موالیوں کا قبضہ تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو فنٹ کے عادی تھے اور ان کے پاس سر چھپانے تک کو جگہ نہیں تھی۔ دن میں تو یہ لوگ ادھر ادھر گھومتے رہتے اور شام ہوتے ہی یہاں جمع ہونا شروع ہو جاتے۔

چورائے پر پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سیاہ دین کیس بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک سفید رنگ کی ایک کار اس گلی کے موڑ پر رکی۔ اس میں تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیو ٹنگ سیٹ پر اور دو پیچھے۔ وہ کار چند سیکنڈ وہاں رکی اور پھر گلی میں داخل ہو گئی۔

”وہ کار دیکھی تم نے؟“ پرساد نے میرے قریب آکر سرکوشی کی ”وہ تینوں ٹائیکر کے آدمی ہیں۔ جو شخص ڈرائیو ٹنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اسے تو میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“

صورت حال خطرناک ہو گئی۔ اگر وہ گلی میں مڑنے کے بجائے سیدھے ہماری طرف آجائے تو ہمیں دیکھ لیا جاتا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سیاہ دین کیس بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

”میں ان کو لے رہا تھا۔“ میں نے غالی نہیں ہے۔ میرے ساتھ ”آؤ۔“ میں نے انہیں اشارہ کیا ہم سڑک پار کر کے مجھے والے چوتے پر آ گئے۔ ہنگلے کے بیوی فنٹ ہاتھ پر بھی موالی قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ ہم ہنگلے کے اندر آ گئے۔ یہاں عجیب صورت حال تھی۔ کوئی لینا ہوا تھا کوئی مریض ہوا تھا اور کوئی ہونٹ کی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف تو زری سی جگہ نظر آئی تو ہم وہاں بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی دو آدمی بیٹھے شیش بھرے سرگٹ کے کش لگا رہے تھے۔ شیش کی بو سے داغ پھنا جا رہا تھا۔ تو زری دیر بعد ہی اعکشاف ہوا کہ ان دونوں میں ایک عورت تھی۔

ہم ان موالیوں کے درمیان اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ اگر سڑک پر سے کوئی اس طرف دیکھے تو ہم نظروں میں نہ آ سکیں۔ دس منٹ گزر گئے۔ سیاہ دین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میری تشریحات بڑھ رہی تھیں اور پھر اسی لمحے وہ سفید کار گلی سے نکل کر تیز رفتاری سے ایک طرف چلی گئی۔ اس میں صرف ڈرائیو تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ انہوں نے وہ ہنگلا تلاش کر لیا تھا۔ بیزد واقعی بہت تیزی دیکھا تھا۔

تین اور موالی ہمارے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک مرد تھا اور دو عورتیں۔ وہ بھی شیش بھرے سرگٹ لی رہے تھے۔ ایک عورت نے سکتا ہوا سرگٹ تھائی وانگ کی طرف بڑھا دیا۔ تھائی وانگ نے سرگٹ لے کر کش لگایا اور سرگٹ واپس کر دیا۔

لیکن سرگٹ کے ایک ہی کش نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ تھائی وانگ جڑی طرح کھانسنے لگی۔ اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی برس نکلا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکی تھی لیکن اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور پھر سیاہ رنگ کی ایک دین چورائے کی دوسری طرف سڑک کے کنارے پر رکی اور پھر میں نے گاٹک کو دین سے اترتے دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

”جلوس دین آگئی ہے۔ اس طرف۔“ میں نے سرکوشی کی۔ ہم چاروں اٹھ کر چوتے کی دوسری طرف چلے گئے۔ شیش بھرے سرگٹ کے ایک ہی کش نے تھائی وانگ کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ میں نے تمام رکھا تھا۔ آہنی ہنگلے سے نکل کر ہم سڑک پر آ گئے۔

ہم سڑک کے وسط میں تھے کہ وہ سفید کار بائیں طرف سے گھومتی ہوئی ہمارے سامنے سے گزری اور چند کڑ آگے جا کر برکیوں کی تیز چڑچڑاہٹ سے رک گئی۔ دروازہ کھلا اور ڈرائیو ٹنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا جس کا رخ ہماری طرف تھا۔ فوٹا کے منہ سے خوف ناک چیخ نکلی تھی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ آدمی گولی چلاتا آفسا فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ دین کے قریب کھڑے ہوئے گاٹک نے اسے دیکھ لیا تھا اور صورت حال کا اندازہ لگاتے ہی اس نے گولی چلا دی تھی۔

گولی اس شخص کے پیٹ میں لگی۔ وہ نیچے گرا۔ ریوالتور بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چند فٹ دور جا کر اٹھا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ شخص سڑک پر رہنکتا ہوا ریوالتور کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

”وہ دن بھاگو۔ دین میں... جلدی۔“ گاٹک چیخا۔ اس نے ایک اور گولی چلا دی تھی۔

دین کا پچھلا دروازہ کھلا۔ ایک اور آدمی نیچے اتر آیا۔ اس نے بھی فائزنگ شروع کر دی۔ میں نے پہلے تھائی اور فوٹا کو دین میں سوار کرایا پھر خود اوپر چڑھ گیا۔ پرساد میرے ساتھ ہی تھا۔ گاٹک نے چیخ کر کہا اور دین تیزی سے حرکت میں آگئی۔ گاٹک کا دوسرا ساتھی دوڑتا ہوا پچھلی دین پر سوار ہوا تھا۔

چورائے پر بھگدڑ بچ گئی تھی لیکن ہماری دین چند سیکنڈ میں ہی وہاں سے بہت دور نکل چکی تھی۔

ہماری منزل واٹ نہ سمجھت تھی۔ جسے مہاراج نے اپنا بیٹہ کو اٹھایا رکھا تھا۔ یہ وہ خانقاہ تھی جہاں فائزنگ بدھ کا خالص سونے کا زیبا کاسب سے بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

میں فوراً ہی مہاراج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہاں ماسٹر ہوجن بھی تھا۔ مہاراج نے خشک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کچھ نہیں پھر ماسٹر ہوجن کو اشارہ کر دیا۔



ہمیں ایک اور وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مہاراج کے رویے سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مجھ سے ناراض تھے۔

دوسرے دن بڑی مشکل سے میں مہاراج سے اجازت لے کر پرساد کے ساتھ سوای رگوناتھ کے آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔ مہاراج نے ہمیں ایک کار بھی سپرد کی تھی۔ آشرم کے سامنے ایک وسیع میدان میں لاتعداد کاریں کھڑی تھیں۔ آشرم کے گرد بہت اونچی چار دیواری تھی جس نے کئی ایکڑ زمین گھیر رکھی تھی۔ آمدورفت کے لیے صرف ایک ہی گیٹ تھا۔ گیٹ کے اندر ایک استقبالیہ کالونریا ہوا تھا جہاں شہم عوام لباس میں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ کالونریہ کی پیچھے ایک کمرہ تھا۔

سوای رگوناتھ کے حلقے میں داخل ہونے کے لیے دھرم کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ لڑکی نے سسکار کر ہماری طرف دیکھا اور ایک طرف رکھی ہوئی بڑی سی بیٹی کی طرف اشارہ کیا جس پر ڈنیشن لکھا ہوا تھا۔ میں نے اور پرساد نے کچھ نوٹ اس بیٹی میں ڈال دیے۔ لڑکی نے دو ہڈ کالونریہ کی پیچھے سے نکال کر ہماری طرف بڑھا دیے۔ کپڑے کے بے ہونے ہی ٹوپ پس لینے سے نہ صرف چشمالی بلکہ چہرے کا بہت سا حصہ بھی چھپ گیا تھا۔ ہم ٹوپ پہن کر ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔

اندر کی دنیا ہی نرالی تھی۔ ایک طرف آشرم کی عمارت تھی اور اس کے سامنے نکلریت کی چھت والا بہت بڑا شیڈ تھا۔ چھت کو سارا دینے کے لیے لاتعداد ستون تھے۔ نیچے پختہ فرش تھا۔ اس شیڈ کے نیچے ایک وقت پندرہ سولہ سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ تقریباً دو سو افراد اس وقت وہاں موجود تھے اور ہماری طرح بہت سے افراد آرہے تھے۔ شیڈ سے آگے تاریک ویرانہ تھا جہاں اونچے نیچے ٹیلے اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

اتنے لوگوں میں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں تھا جبکہ لوگوں کے چہرے ہڈ میں چھپے ہوئے تھے لیکن ڈیرہ گھنٹے کی جستجو کے بعد ہم نے جاگی دیوی کو تلاش کر لیا۔

”کیا دارا یہاں موجود ہے؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔  
”وہ آشرم کے اندر ہے۔ سوای کے ساتھ ہی باہر آئے گا۔“ جاگی نے جواب دیا۔

لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور پھر ٹھیک بارہ بجے لوگ اس وسیع و عریض شیڈ میں جمع ہو گئے۔ اس کے چند سینکڑ بعد ہی سوای آشرم سے برآمد ہو کر ایک چوڑے پر بیٹھ گیا۔ وہ عجیب بدبیت آدمی تھا۔ گنجا سر، بلیں جیسی چھوٹی آنکھیں، پھولے ہوئے گال، نوک دار غھوڑی اور بہت بھدے اور بھاری ہونٹ۔ اس کی گردن بہت مختصر تھی۔ لگتا تھا تو جیسا بڑا سر شاو بڑا سر شاو بڑا سر شاو۔ اس کے ساتھ چار پانچ لڑکیاں تھیں جن کے جسموں پر لباس برائے نام

ہی تھا۔ وہ لڑکیاں اس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔ ہڈ والے تین آدمی پیچھے کھڑے تھے۔

سوای رگوناتھ ہمیشہ دینے لگا۔ لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ سوای کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ زہر میں سمجھا ہوا تھا۔ اشتعال دلانے والا۔ اس کی باتوں کا رخ بدلتا جا رہا تھا۔ نگلی اور عوام باتیں۔ جیسی جذبات کو بھڑکانے والی باتیں۔ اس کے قدموں میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اب حرکت میں آگئی تھیں۔ کوئی اس کی ہانپوں سے اور کوئی ناگوں سے پٹ پٹ کر رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ شیڈ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی کسمائے لگے تھے۔ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھونے لگے تھے۔ شیڈ کی بتیاں اس طرح بجھ رہی تھیں جیسے آہستہ آہستہ شام ڈھل رہی ہو اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ سوای کی آواز اس اندھیرے میں پھیل رہی تھی۔ ”تم سب ایک دوسرے کے لیے ہو۔ مرادور عورت کو ایک دوسرے کے لیے بنایا گیا ہے۔ سانج معاشرہ ڈھونگ ہے۔ ایک دوسرے سے دور ہو گے تو کھانے میں رہو گے۔ قریب ہو جاؤ فاسل مٹا دو کہ فاسل ہی دوریاں پیدا کرتے ہیں۔“

لوگ ایک دوسرے کی طرف جھک رہے تھے۔ جاگی دیوی نے مجھے اپنی ہانپوں کی پلٹ میں لے لیا اور ہڈ کھسکا کر میرے چہرے پر بوسہ دینے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہو جاگی!“ میں نے سرگوشی کی۔  
”مجھے اپنی ہانپوں میں لے لو۔“ جاگی نے بھی سرگوشی کی۔  
”ورنہ کوئی اور مجھے لے جائے گا۔“

لوگ جو ڈول کی صورت میں اٹھ اٹھ کر اڑھ اڑھ جانے لگے تھے۔ شیڈ میں دور کس دم ہی روشنی کا ایک بلب جل گیا۔ جاگی دیوی مجھے اس طرف لے جا رہی تھی جہاں بہت دم ہی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ پرساد بھی ہمارے پیچھے ہی کسی عورت کو روکے ہوئے آ رہا تھا۔

”ہم پچھلے دروازے سے آشرم کی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔“ جاگی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

ہم لوگوں کے جھوم سے دور ہوتے جا رہے تھے اور پھر چاک ایک آدمی بے خیالی میں ہم سے ٹکرا گیا۔ اس کے ساتھ بھی ایک عورت تھی۔ ٹکرا اس طرح ہوئی تھی کہ ہم دونوں نیچے گرے تھے۔

میرے سر سے ہڈ گر گیا تھا۔ مجھ سے ٹکرانے والے شخص اور اس کی ساتھی عورت کے سر سے بھی ہڈ گر گئے تھے اور جب ہم دونوں سیدھے ہوئے تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

میرے سامنے دارا کھڑا تھا!  
وہاں روشنی بہت دم ہی تھی اور ایک دوسرے کی بان کے دشمن ہم دونوں صرف دو تین فٹ کے فاصلے پر آئے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

وہ صرف چند گزروں کی بات تھی۔ چند پل۔ لیکن لگتا تھا جیسے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے صدیاں بیت گئی ہوں۔ ہم دونوں میں سے کسی نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ جو کچھ ہونا چاہیے تھا۔

اور پھر سناپ جیسی وہ پھٹکار میری سماعت سے ٹکرائی تو میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بعد اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پایا۔

”تمہاری موت ہی تمہیں یہاں سمجھنے لائی ہے نادان چوک۔“ ناگ کی پھٹکار جیسی یہ سرسراہٹ ہوئی آواز دارا کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔ ”اس بیٹلے میں دھوکے سے ہمیں گھیر کر تم نے مجھے لیا تھا کہ بہت دیر تیار رہا ہے لیکن تم نے دیکھ لیا کہ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میں تو تمہارے جال سے بچ نکلا تھا مگر تم نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تم یہاں سے واپس نہیں جاسکو گے۔“

”یہ تمہاری بھول ہے دارا۔“ میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ”وہ جال میں سے نہیں، تم نے ہی بچایا تھا اور خود تمہیں ہی چوٹ کھا کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ تم صرف ان لوگوں پر حاوی ہو جو تمہارے سامنے آواز نہیں اٹھا سکتے۔ تم نے کسی بے وردی سے اپیل کو قتل کر دیا تھا، کتنی بھادری دکھائی تھی تم نے ایک کزور اور کتنی عورت کا گلا گانے میں لیکن میرے اوپر تم نے کتنے تلے کرائے ہیں۔ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آج بھی تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ میں اسی طرح اپنے قدموں پر چل کر واپس جاؤں گا جس طرح آیا ہوں۔ البتہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری واپسی کس حالت میں ہوگی۔ اس وقت تو میں تم سے صرف اس معصوم بچے کا حساب لوں گا جس نے تم نے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کی ماں سوٹائی اب بھی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا بگاڑا تھا انہوں نے تمہارا؟ تم نے ان کے گھر میں پناہ لی۔ اس عورت نے تمہارا اور تمہارے ساتھی کا علاج کیا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر کھلایا اور تم نے اس کی نیکیوں کا ایسا صلہ دیا؟ اس کے معصوم سینے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور وہ خود زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ تم جیسا کہ طرف بے حس اور بے ضمیر آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ تمہیں ایک ایک بات کا حساب دینا ہو گا۔ دارا۔ تم جی نہیں سکو گے۔“

”ایسے سکاٹے فلوں میں بولے جاتے ہیں۔“ دارا نے کہا۔  
”اور ہم کسی ظلم کی شوکت میں حصہ نہیں لے رہے۔ تم نے واقعی یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ سوای رگوناتھ کا آشرم ہے۔ یہاں صرف اس کا حکم چلتا ہے اس چار دیواری کے اندر لاشیں پھانسی جاتیں تو ہمیں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ قانون کی رکھشا کرنے والے اس کی طرف نیز محض آنکھ سے نہیں

دیکھ سکتے۔ وہ تو یہاں آکر سوای رگوناتھ کے کمرے چاہتے ہیں۔ تمہاری لاش بھی یہاں ہی سوٹی رہے گی اور کوئی پوچھے گا نہیں۔“  
”یہ تمہاری خوش فہمی ہے دارا۔“ میں نے جواب دیا۔  
”دوسروں پر بھروسہ کرنے والا بیشہ کھانے میں رہتا ہے۔ تمہیں تو ناہیکر بھی بڑا ناز تھا۔ اس کا حشر تم نے دیکھ لیا۔ وہ تو میرے ان ہاتھوں کا ایک ہلکا سا جھٹکا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اب یہ سوای۔۔۔“ میری نظریں اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی لیکن ہمارے درمیان مکالمات کے تبادلے سے اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے اثرات ابھرنے لگے اور آنکھوں میں دھندل سی پھیل رہی تھی اور پھر کسی خطرے کا احساس کر کے وہ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹنے لگی۔

فغا میں اب موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جذبات کو بھڑکانے والی بیجان خیر موسیقی کی مدد ہی آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سوای رگوناتھ نے روحانی تعلیمات کی آڑ میں اپنے چیلوں کی عیاشی کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا۔ وسیع و عریض شیڈ کے لاتعداد ستونوں میں اسپیکر پوشیدہ تھے جن سے بیجان خیر موسیقی کی یہ آواز پھوٹ رہی تھی اور یہ آواز ہر طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کن آنکھوں سے اُدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ کنوٹوں کھدروں میں جگہ تلاش کر رہے تھے۔ شاید ان لوگوں کے لیے اپنے شوالیہ جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

دارا کے ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کا ہاتھ غیر محسوس انداز میں پھلوں کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرنا، میرے قریب کھڑا ہوا راس پر ساد حرکت میں لگیا۔ وہ وہاں اڑتا ہوا دارا سے ٹکرایا۔ دارا اپنی ساتھی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں بیٹھتی ہوئی پیچھے مڑی۔ اس کی پیچ پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہوش ہی کے تھا۔ موسیقی کی آواز اب بھی لمحہ بے لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

دارا اپنے آپ کو پرساد سے پھار کھینٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں اسے گرفت میں لیتا جا رہا تھا لیکن وہ پھٹکی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گیا اور اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ بھاگ نکلا تھا۔

اس کی ساتھی لڑکی اب بھی زمین پر پڑی چڑ رہی تھی۔ میں اس کی طرف توجہ دے بغیر دارا کی طرف لگا لیکن وہ لوگوں کے جھوم میں غائب ہو گیا۔ شیڈ کے اس حصے میں کچھ کھلبلی ہی بچ گئی تھی اور دارا نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ ہڈ پہن کر ان لوگوں میں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اپنا چہرہ میں چھپایا تھا۔ جاگی اب بھی میرے ساتھ چلی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بازو سے

پکڑ کر ایک طرف کھینچ چلی گئی۔ کسی متوقع جوابی حملے سے بچنے کے لیے جگہ تبدیل کرنا ضروری تھا اور جاگتی دیوی نیچے دہاں سے کئی کڑ دور لے گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پرساد بھی ہمارے ساتھ تھا یا وہیں رہ گیا تھا۔

جگہ تبدیل کرنے کا جاگی کا فیصلہ بڑا سودمند ثابت ہوا تھا۔ چند منٹ بعد ہی وہاں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی جہاں دارا سے آنا سامنا ہوا تھا۔ دو لمبے ترنگے آویں دہاں لوگوں کے چروں سے بڑ نوج رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ عورتیں جیج رہی تھیں اور بعض مرد انہیں گالیاں دے رہے تھے لیکن وہ دونوں افراد عورتوں کی چیخوں اور گالیوں سے بے نیاز اپنی کارروائی میں مصروف رہے۔

جاگی دیوی میرا ہاتھ پکڑے دہاں سے مزید دور ہٹتی چلی گئی۔ مجھے پرساد کی فکر تھی۔ کہیں وہ ان کے ہاتھ نہ لگ جائے لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے قریب ایک سرگوشی مٹ کر سن کر اچھل پڑا۔ ”وہ آشرم کے اندر چلا گیا ہے۔ اس کے گرد گئے ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔“

میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ پرساد مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”اس طرف سے آؤ۔ ہم پچھلے دروازے سے آشرم میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔“ یہ جاگی دیوی کی آواز تھی۔

ہم تینوں لوگوں کو دھکیلے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔ وہاں عجیب صورت حال تھی۔ بھجان نیز موسیقی کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ لوگ منہ چھپا کر مائل اس لیے آتے تھے کہ سواہی کی روحانی تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر اپنے سطلی جذبات کو تسکین پہنچا سکیں اور کسی کی نظروں میں بھی نہ آئیں لیکن آج ان میں کچھ بے چینی پھیل رہی تھی۔ وہ دو لمبے ترنگے آوی بدستور لوگوں کے چروں سے بڑھتے پھر رہے تھے۔

ہم تینوں تیزی سے ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ جاگی دیوی سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے کچھ فاصلے پر راس پر ساد تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ لوگ شیڈ سے نکل کر کھلی جگہوں پر ادھر ادھر پھیل رہے تھے۔ اس چار دیواری کے اندر کی ایک رقبہ کھرا ہوا تھا۔ ایک حصے پر وہ آشرم اور وسیع درعیض شیڈ بنا ہوا تھا جبکہ باقی جگہ خالی تھی۔ چھوٹے چھوٹے نیلے اور گنجان جمادیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

ہم ایک طویل جگر کاٹ کر آشرم والی عمارت کے پچھلے طرف آگئے۔ اس طرف بھی عمارت کے سامنے ایک کشادہ برآمدہ تھا۔ سرخ چروں کی باج کشادہ میڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچا جاسکتا تھا۔ برآمدے کا ایک مرکزی دروازہ تھا۔ ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔ مرکزی دروازہ تو ہال میں داخلے کے لیے تھا اور یہ دونوں دروازے الگ الگ کمروں میں

کھلتے تھے۔

برآمدے میں تاریکی تھی لیکن اندر ہال میں بہت مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ جاگی دیوی پچھلے کئی روز سے یہاں تھی اور وہ اس آشرم کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر چکی تھی۔ اسے آشرم کی عمارت کے اندر آنے کا موقع بھی ملا تھا اور اسے معلوم تھا کون سا دروازہ کس کمرے میں کھلتا ہے۔

برآمدے کا مرکزی دروازہ بند تھا۔ اس نے دائیں طرف کا دروازہ آزمایا لیکن یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ وہ بائیں طرف والے دروازے کے سامنے آگئی اور پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ حرکت دینے لگی لیکن یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ میں اسی دوران میں دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر کوئی کے سامنے آگیا اور اندر چھانکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اندر تدریک تھی۔ کمزری کوئی کرل و فیو نہیں تھی۔ میں نے شیشے ہاتھ کا ہلکا سا دھواؤں والا توکڑی کھلتی چلی گئی۔ میں نے وہ کمزری پوری طرح کھول دی اور جاگی اور پرساد کو اشارہ کرتا ہوا چھ کھنچ کر آگئی سے اندر کو گیا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں بھی اندر آگئے۔

میں نے اپنے لباس میں چھپایا ہوا خنجر نکال لیا اور تاریکی میں زادھر ادھر گھومنے لگا۔

”اس طرف۔“ جاگی دیوی نے سرگوشی کی ”اس دروازے سے گزر کر ہم ہال میں داخل ہو سکتے ہیں۔“

ہم تاریکی میں دے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ ہال میں بہت مدھم سی روشنی تھی۔ کسی جگہ کوئی لمبے ہال کا جس پر شیڈ لگا ہوا تھا اور روشنی زیادہ نہیں پھیل رہی تھی۔ دائیں طرف اوپر جانے کے لیے ایک کشادہ زینہ تھا جس پر قائلین بٹھا ہوا تھا۔ ہال کے فرش پر بھی دیکھ قائلین بٹھے ہوئے تھے۔ ہم دے قدموں آگے بڑھنے لگے۔

”یہ تمام کمرے سواہی رگوتھا کے چیلوں کے ہیں۔“ جاگی دیوی نے سرگوشی کی ”اس کا کمرہ اوپر ہے اور دارا بھی اوپر ہی رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت بھی اوپر ہی ہو گا اور وہاں سے بچے شیڈ میں ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا ہو گا۔“

ہم زینے پر چڑھنے لگے۔ قائلین کی وجہ سے ہمارے قدموں کی بجلی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر ایک کشادہ میڑھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک دروازے کے نیچے روشنی دیکھ کر میں رک گیا۔ میں نے جھک کر کی ہول سے آٹھ لگا دی اور دوسرے ہی لمحے میرا داغ ملک سے اڑ گیا۔ بالکل سامنے دیوار کے ساتھ ایک چوڑا صلیب لگا ہوا تھا جو دائیں سے بائیں چلا گیا تھا۔ سامنے ہی چوڑی اسکرین والا ایک رنگین ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا اور اسکرین پر جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ بڑا شرمناک تھا۔ ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک نوجوان

مرد لڑکی۔۔۔ اس مرد کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا اور اسے داغ میں ایک اور دھماکا ہوا۔ وہ چہرے میں بے پچان لیا۔ ایک سیاسی لیڈر قسم کا آدمی تھا اور اس کی تصویریں ہر جگہ چھپی رہتی تھیں۔

لڑکی کے سامنے کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اور اسی کے لیے صلیب پر ریڈیو ٹیگ کے آلات رکھے ہوئے تھے اور وہ منہ کے منظر کی ویڈیو ریڈیو ٹیگ کر رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سیاسی لیڈر آشرم کے کسی کمرے میں تھا جہاں خفیہ باغی تھا اور اس کی شرمناک حرکتیں۔۔۔ ریڈیو کی جاری

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سواہی رگوتھا کی روحانی تعلیمات کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ بے شک یہاں اخبارات میں بھی کچھ نہ کچھ پھینک رہا تھا لیکن اس کے خلاف اب تک کوئی کارروائی کیوں نہیں ہو سکی تھی؟ اس کی دھمکی اب بھی میں آگئی تھی۔ اگرچہ تھائی وائٹ نے بڑی بات سے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا اور اب میں نے اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا تھا۔ سواہی رگوتھا جہاں آنے والے بڑے بڑے لوگوں کی ویڈیو فلمیں بناتا تھا اور پھر انہیں بلیک میل کرتا تھا۔ ان فلموں کے ذریعے وہ ان لوگوں سے نہ صرف بڑی بڑی رقمیں اکٹھا ہو گا بلکہ وہ اپنی زبان بند رکھنے پر بھی مجبور تھے اور اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے بھی قاصر نہ کہ اس طرح کی اپنا کچھ مکمل جاتا اور انہیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔

اور اس ایک کمرے کے علاوہ باقی سب کمرے خالی تھے اور انہیں اس وقت اس کمرے میں کھڑے تھے جسے سواہی رگوتھا کا آڈیٹوم کا مشن کمرہ کہا جاسکتا تھا۔ بہت شان دار کمرہ تھا۔ اس کی دیواروں کی ایک دیوار شیشے کی تھی۔ یہ شیشہ اگرچہ بظاہر ٹرانسپیرینٹ تھا لیکن اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے اندر سے باہر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا لیکن باہر سے اندر کا منظر نہیں آتا تھا۔ مزید

میں اس شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شیڈ اور آس پاس کا پورا پورا منظر اسے نظر آ رہا تھا۔ وہاں باج چھ آدمی لوگوں کے چروں سے کھینچنے پھرتے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ مزاحمت کرتے ہوئے اپنے اپنے جگہ بٹھا رہے تھے۔ بڑا تارنے والوں کا انداز تھا۔ ایک لوگ ان کی اس حرکت پر احتجاج کر رہے تھے۔ ایک

مرد بھی پھیل رہی تھی۔ یہ گمراہ ساؤنڈ پروف ہے۔“ جاگی نے میرے کان میں ہلکی سی ”عام حالات میں تو باہر کی آواز اندر آ سکتی ہے اور نہ تو باہر کی آواز باہر آ سکتی ہے لیکن سواہی رگوتھا نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ضرورت کے وقت باہر کی آواز بھی سن سکتا ہے۔“

”لیکن وہ کیا کہاں اور دارا کہاں غائب ہو گیا؟“ میں نے کہا۔ ”اوپر کے تو تمام کمرے خالی ہیں۔ وہ کسی نیچے والے کمرے میں تو نہیں؟“

”ہو سکتا ہے۔“ جاگی دیوی نے جواب دیا ”آؤ۔ نیچے دیکھتے ہیں۔“

ہم اس کمرے سے باہر آگئے لیکن اسی لمحے زیریں ہال میں ایک آدمی کو دیکھ کر ہم دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ وہ شخص غالباً عمارت کے سامنے والے دروازے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔ یاد دہراؤ دہراؤ دیکھے بغیر ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ”آؤ۔ ہو سکتا ہے وہ وہ لوگ اس کمرے میں ہوں۔“ میں نے سرگوشی کی اور پھر ہم تین جگہ تھم جاتے ہوئے زینے سے اتر کر زیریں ہال میں آگئے۔ یہاں ہمیں زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ ہال میں کسی قسم کا فخر نہیں تھا۔ فرش پر دیوار سے دیوار تک دیکھ قائلین بٹھے ہوئے تھے اور ایک طرف دیوار کے ساتھ چار فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا اور زمین سے دو فٹ اونچا تخت بٹھا ہوا تھا۔ جس پر آرام دہ قوم کا گدڑا پڑا تھا۔ اس پر سرخ پٹیل کی چادر بھی ہوئی تھی اور سرخ پٹیل کے گورو والا کٹن رکھا ہوا تھا۔

”یہاں دن کے وقت سواہی رگوتھا اپنی بے ہودہ تعلیمات کا پرچار کرتا ہے اور اس سیشن میں صرف منتخب لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب بھی وہ خود ہی کرتا ہے۔“ جاگی دیوی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

یہاں بھی چھینے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے ہمیں زیادہ محتاط ہونا پڑا تھا۔ پرساد نے بھی اپنا خنجر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ہم اس دروازے کے قریب پہنچے جہاں باہر سے آنے والا وہ شخص داخل ہوا تھا۔ میں نے جاگی اور پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں دائیں بائیں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔ میں آگے بڑھ کر ایک لمبے کوڑا اور پھر جھک کر دروازے کے ہول سے آنکھ لگا دی۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی، کمرے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن اندر سے کوئی معمولی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سیدھے ہو کر پرساد اور جاگی کی طرف دیکھا اور دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔ میں پینڈل چھوڑ کر بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر جاگی کے قریب دیوار کے ساتھ چپک گیا اور کسی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ خنجر کے دتے پر میری گرفت مضبوط تھی اور صرف میں ہی نہیں، جاگی اور پرساد بھی ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔

چند لمبے کڑ گئے۔ دروازہ کھلتے گا کوئی مددگار سامنے نہیں آتا۔ اندر سے نہ تو کوئی آہٹ سنائی دی تھی اور نہ ہی کوئی باہر آیا

تھا۔ میں نے دوسری طرف کھڑے ہوئے برسات کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو ابھنگی ہے۔ دھکیل کر پوری طرح کھول دیا اور ایک لمحے کے انتظار کے بعد پھل چھل کر اندر داخل ہو گیا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چھلانگ لگائی تھی لیکن کمرہ خالی تھا۔ یہ بند روم تھا لیکن یہاں کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے حالانکہ وہ شخص اسی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”کہاں گیا وہ؟“ میں اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کمرے میں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں کوئی چھپ سکتا۔ ہاتھ روم کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔ برسات نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

ہاتھ روم بھی خالی تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ شخص اس کمرے میں داخل ہو کر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ ہاتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ شخص کمرے میں آنے کے بعد ہاتھ روم میں داخل ہوا تھا اور یہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ یقیناً یہاں کوئی نہ خاندہ موجود تھا اور اس کا راستہ بھی اس ہاتھ روم میں ہو گا۔ میں نے برسات کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور پھر کم تینوں نے خائے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔

جاگتی دیوی ایک چھوٹے سے کالرس پر رکھی ہوئی گیش دیوتا کی مورتی کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کئی روز سے یہاں رہتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ سوامی رگو ناتھ تو کسی دیوی یا دیوتا کو نہیں مانتا تھا پھر گیش دیوتا کی مورتی کی موجودگی کا کیا جواز اور وہ بھی ہاتھ روم میں۔

وہ مورتی کو چھو کر دیکھنے لگی۔ میں بھی اس مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ ہندو اپنے دیوتاؤں کی مورتیاں اپنے اپنے انداز میں بناتے ہیں اور اس میں زیادہ سے زیادہ خوب صورتی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گیش دیوتا کی کسی مورتی میں ہاتھی دانت بنائے جاتے ہیں اور اس کی نہیں لیکن اس مورتی میں دانت موجود تھے۔

جاگتی تقریباً چھ انچ لمبے ایک دانت کو چھو کر دیکھنے لگی۔ وہ دانت کسی خاص انداز سے سرگیا تھا یا دیکھا گیا تھا لیکن اس کا نتیجہ بہت ہی حیرت انگیز نکلا۔ اسی دیوار کے قریب فرش پر رکھا ہوا پانی کی ٹب اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا۔ وہ ٹب سرکنا ہوا دوسری دیوار کے ساتھ جا لگا اور ٹب کی جگہ فرش میں خلا نظر آ رہا تھا جس میں میڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جاگتی نے ہاتھی کے دوسرے دانت کو حرکت دی۔ ٹب اپنی جگہ پر آگیا۔ اس نے دوبارہ پہلے والے دانت کو دوبارہ ہاتھ میں پھرا لی جگہ سے بہت گیا۔

”برسات۔“ میں نے اس کی طرف جھٹکے ہوئے سرگوشی کی ”تم یہیں روکو۔ میں اور جاگتی اندر جا رہے ہیں۔ اگر کوئی آجائے تو ہمیں بجھل دے دیتا۔“

”نہ خائے میں احتیاط نہ ہو سکتا ہے۔“ برسات نے جواب دیا ”کیا ہمارے لیے اتنا کافی نہیں کہ ہم دارا کے اس ٹھکانے کے بارے میں بھی اتنا کچھ معلوم کر چکے ہیں جو اسے دو حواس کو بے کمالی کے لیے کافی ہے۔ میرا خیال ہے نہ خائے میں اترنے کا خطرہ ہونے نہیں لیتا جا رہے۔ ہم تو پہلے ہی میڑھیاؤں کے بھٹ میں گھے ہوئے ہیں۔ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

”ادھکل میں سردے پکے ہیں تو سولوں سے اب کیا ڈرنا۔“ میں نے کہا ”اگر اندر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو ہم فوراً واپس آجائیں گے۔“

برسات کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ویسے میں سمجھتا تھا کہ مجھے نہ خائے میں جانے سے منع کر دے گی قسم کی بڑی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ بڑی ہوتا تو میرے ساتھ یہاں تک نہ آتا۔ وہ میری طرح گرم دماغ کا نہیں تھا۔ سوچ کچھ کر اگلا قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔“ برسات نے مجھے ہند پا کر کہا ”جاگتی دیوی۔ آپ یہیں رہیں۔ میرا خیال ہے اس الماری کے پیچھے کڑی ہو جائے۔ آپ فوری طور پر کسی کی نظروں میں نہیں آئیں گی اور یہ اپنے پاس رکھ لیں۔ میں باس کے ساتھ نہ خائے میں جاؤں گا۔ اس نے اپنا خنجر جاگتی دیوی کی طرف بڑھا دیا۔

جاگتی نے میری طرف دیکھا اور پھر برسات کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرے پاس اپنی حفاظت کا سامان موجود ہے۔“ اس نے اپنے لباس کے اندر سے ایک چھوٹا لیڈی آؤٹ فیک پتھول نکال کر دکھایا۔

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جاگتی نے مجھے ابھی تک پتھول کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن ہر حال ”وہ ہم سے پہلے یہاں آئی تھی اور اپنی حفاظت کا بندوبست کیے بغیر نہیں آسکتی تھی۔“

برسات نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اس خلا میں میڑھیاں پر اتر گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی میڑھی پر قدم رکھ دیا اور اس سے پیچھے والی میڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے مڑ کر دیکھا۔ جاگتی دیوی پتھول ہاتھ میں لیے الماری کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

وہ چند میڑھیاں تھیں جن کے اختتام پر ایک مختصر سیال تھا اور تین چار کمرے تھے۔ ایک طرف ایک کشادہ راہداری تھی اور اس راہداری میں بھی آئے سائے دو کمرے تھے۔ ہال میں دم روشنی ہو رہی تھی۔

ہم دونوں تمام کمروں کے دروازوں کے کی ہول میں جانچنے رہے۔ تمام کمرے اندر سے آریک تھے۔ ایک دو دروازوں کے پینڈلوں کو آڑا کر بھی دیکھا تھا۔ وہ لاک تھے۔ میں نے برسات کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ جو کچھ ”جا“ راہداری والے کمروں میں تھی تھا۔ ہم دے قدموں چلے ہوئے راہداری میں آ گئے۔

ایک دروازے کے کی ہول سے جھانک کر دیکھا۔ اندر روشنی تھی لیکن کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اگر کوئی خائبہ تو یہی ہوئی ہول کی درج میں نہیں تھا۔ میں نے برسات کو اشارہ کیا اور خود سائے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا مگر میں احتیاط کی ہول سے گھٹکے کی ہول سے آنکھ لگاتے ہی میں چونک گیا۔

اس کمرے میں تین آدمی تھے۔ دو تو سائے نظر آ رہے تھے ”برسات! برسات! میں کرسی پر بیٹھا ہوں۔ اس کی صرف ٹانگیں ڈھکی تھیں۔“

سائے جو دو آدمی نظر آ رہے تھے ان میں ایک سوامی ہاتھ تھا۔ میرے خیال میں وہ دنیا کا بدبیت ترین آدمی تھا۔ دیکھ کر ہی کراہت محسوس ہوتی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ ان اور حسین لڑکیاں نفرت کیے جانے کے لائق اس شخص سے کیسے بنی رہتی تھیں۔ کمرے میں دوسرا آدمی دارا تھا۔ جس کے ہاتھ ایک رنگین ٹیلی وژن سیٹ رکھا ہوا تھا اور وہ کسی ڈیوائس کو رکھ رہا تھا جس سے اسکرین کا منظر بدل رہا تھا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں شارٹ سرکٹ ٹی وی سسٹم نصب تھا اور دارا اس ڈیوائس کے ذریعے جاہر گے ہوئے کی کمرے کو مانیز کر رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر باہر کے میڈیا اور اس کے آپریٹس کا منظر تھا جو ہر لمحہ تبدیل ہو رہا تھا۔ ایک ایسا ہی منظر تھا جو حرکت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ باہر گرچہ آؤٹ گی لیکن ٹی وی اسکرین پر ہر منظر روشن نظر آ رہا تھا۔ جس کا صعب تھا کہ کمرے میں انفرادی شعاعوں والے لپنس لگے ہوئے تھے جو تاریکی میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دارا اسی کے مانیز کرتے ہوئے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

باہر خاصی آفراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ دارا کے پانچ چہرے گرے ہر منظر لوگوں کے سروں سے بڑھ کھینچ رہے تھے۔ ایک جگہ کچھ ہاتھ ہاتھ لگائے ہوئے دیکھائی دے رہا تھا۔

”حیرت ہے۔ وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے۔“ دارا کرسی پر بیٹھے ہوتے شخص کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کی آواز بہت بھگی تھی۔

”وہ باہر تو جا چکے تھے۔“ اس شخص کی آواز سنائی دی تھی جس کا چار دیواری کے اندر اس وقت ساڑھے تین چار سو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرح ان سب کو چپک کر اٹا آسمان نہیں۔ ایک لمحہ ہو سکتا ہے کہ سوامی آج کا سیشن ختم ہونے کا اعلان کر دے اور اس طرح جاہر جاتے ہوئے ان سب کو چپک کیا جاسکتا ہے۔“

”ہاں۔“ میرا خیال ہے یہی کرنا پڑے گا۔“ دارا نے کہا ”سوامی! میں تم کو اس کا اعلان کرنا ہی پڑے گا۔“

میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ”سوامی نے جواب دیا ”تمہارے نہیں نے پہلے ہی بہت گڑبگڑ پھیلادی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی کی بجائے نہیں آگے گا۔ اپنے آدمیوں سے گویہ تمہارا اب ختم

کر دیں۔ یہاں ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو معاشرے میں بہت باعزت مقام رکھتے ہیں۔ انہیں اس طرح دوسروں کے سامنے بے وقار کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ لوگ جتنے سے اگھڑے تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں کہ کس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“ دارا کے حلق سے غراہٹ سی نکلی ”مجھے وہ لڑکا چاہیے۔ ہر صورت میں۔ اگر آج وہ اس چار دیواری سے باہر نکل گیا تو میں اس کی نظروں میں ڈیل ہو جاؤں گا۔“

”وہ تو تم ہو ہی۔“ سوامی نے جواب دیا ”وہ یہاں سے بچ کر نہیں جائے گا۔ میں کوئی طریقہ سوچتا ہوں۔ پہلے تم اپنے آدمیوں سے کہو کہ تمہارا سب کچھ اندر ہی رہے اور مزید اشتعال نہ پھیلا دیں۔“

دارا نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا جسے میں نہیں سن سکا کیونکہ ٹھیک اسی لمحے دوسرے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا جس نے تیزی سے محوم کر دیکھا۔ رامن برسات ایک دروازے کی قیادت آدمی کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھچکا مشتکی کی آوازیں شاید دارا والے کمرے میں بھی سنائی گئی تھیں۔

”کہوں ہے باہر۔ کیا ہو رہا ہے؟“ دارا کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ دارا نیم وا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ایک دم سہا ہوا گیا اور بڑی پھرتی سے باہر سے دروازے کا کنڈا لگا دیا۔ اندر سے پہلے تو دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی اور پھر دروازہ زور زور سے دھڑھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دارا کے پیچھے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”دروازہ کھولو۔ کون ہو تم۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔ دروازہ کھولو۔“

”شردارا۔“ میں نے دروازے پر ہاتھ مارے ہوئے چلا کر کہا ”مجھے سزا دینے کی حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔ میں تمہیں یہ باور کراتا چاہتا تھا کہ باتال تک تمہارا بچہا کر سکتا ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اس آشرم کو آگ لگا کر تمہیں راکھ کر سکتا ہوں لیکن اس طرح بہت سے بے گناہ بھی مارے جائیں گے۔ میں جا رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد تمہارا دن نوون مقابلہ ہو گا اور میں تمہارا حساب بے باقی کروں گا۔“

”حرام زارے! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اندر سے دارا کی ہوا سنائی دی۔

برسات اس آدمی کو بڑی طرح رگید رہا تھا لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آدمی برسات پر حاوی ہو گیا۔ برسات زمین پر تھا اور وہ شخص اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا تو میں کانپ اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خنجر کا وار برسات کے سینے پر کرتا، میرا خنجر اس کی پشت میں بوسٹ ہو گیا۔ اس شخص کے منہ سے ایک خوف

ناک چنچ نکل گئی۔ میں نے خنجر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ پر سادے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور پھرتی اسے اٹھا گیا۔ اس نے زمین پر ہوا اور خنجر اٹھایا اور اس شخص کے سینے میں بیوست کردیا۔ اس کے منہ سے ایک اور صیاحک چنچ نکلے۔

دوسرے کمرے سے دارا کے دباڑے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی پھر ایک اور آواز سنائی دی۔

”دوسرا دروازہ۔۔۔“ یہ سواری کی آواز تھی ”اندروالا دروازہ کھولا اور مایک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو الارٹ کرو۔ جلدی کرو۔“ اگرچہ کمرے کے دروازے کو میں نے باہر سے لاک کر دیا تھا تاہم سواری رگوتا تھ اتنی تیز آواز میں احکامات صادر کر رہا تھا کہ میں انہیں بہ آسانی سن رہا تھا۔

”پرساد۔“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا ”بھاگو۔ وہ باہر آنے کے لیے کوئی اور راستہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے اگر مایک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو الارٹ کر دیا تو ہمارے لیے یہاں سے لگنا مشکل ہو جائے گا۔“

رامن پرساد نے اس شخص کے سینے سے اپنا خنجر کھینچ لیا اور ہال کی طرف دوڑا۔ اس مختصر سی راہداری سے نکل کر ہم ہال میں پہنچے ہی تھے کہ اوپر سے ایک نسواری چنچ کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد ایک فائر ہوا۔ یہ پستول یا ریوولور کے فائر کی آواز تھی۔ میرے ذہن میں جاگتی دیوی کا خیال ابھرا اور میں تیزی سے دوڑنا ہوا پرساد سے پہلے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ پرساد بھی میرے ساتھ سیڑھیوں پر دوڑ رہا تھا اور ہم دونوں بیک وقت ہی نہ خانے سے باہر آئے تھے۔

اوپر کا منظر دیکھ کر میرے دل میں ہلچل اڑ گئی۔ جاگتی دیوی ایک آدمی سے مستحکم تھی۔ جاگتی کا پستول گمڈ کے قریب پڑا ہوا تھا اور وہ آدمی جاگتی کو فرش پر رگید رہا تھا۔ مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم جب نہ خانے میں اترے تھے تو جاگتی دیوی اس الماری کے پیچھے چھپ گئی تھی جس میں کپڑے وغیرہ لٹکے ہوئے تھے۔ اس دوران میں یہ آدمی اس طرف آیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس شخص نے جاگتی کو دیکھ لیا ہو یا جاگتی نے اسے روکنے کی کوشش کی ہو۔ اس شخص نے جاگتی کو پکڑنے کی کوشش کی ہوگی اور اس دوران میں گولی بھی چلی ہوگی لیکن نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ پستول دور پڑا تھا اور وہ شخص جاگتی کو رگید رہا تھا۔ اس شخص کے مقابلے میں کمزور ہونے کے باوجود جاگتی دیوی بھرپور انداز میں مدافعت کر رہی تھی۔

میں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس شخص کے سر پر زور دار ٹھوکا رسید کر دی۔ وہ شخص ہلکا اٹھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی جاگتی دیوی اپنے آپ کو بچوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سب سے پہلے وہ پستول کی طرف بھینچی تھی۔ پرساد بھی تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ اس نے اس شخص پر ٹھوکوں کی بارش کر دی۔ وہ شخص

اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکا مار دی۔ وہ چیخا ہوا لڑکھار کر گمڈ پر گرا اور اس وقت تک پستول نہیں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

رامن پرساد نے جب کہ اس شخص کو دونوں ہاتھوں پر قابض کر لیا۔ اسی لمحے نہ خانے سے دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ چنچ کر کے کہہ کر ہاتھ اٹھا اور پھر سیڑھیوں پر دوڑنے سے نہ ہونے دیا۔

”رامن جلدی کرو۔ وہ اوپر آ رہے ہیں۔“ میں نے چنچ کر کہہ کر پرساد نے اس شخص کو سر کے اوپر سے چھڑکے خانے کے دروازے کی طرف دھکی دیا۔ دارا ایک اور آدمی کے ساتھ سیڑھیوں پر اٹھ رہا تھا۔ وہ شخص ان کے اوپر گرا۔ وہ دونوں چنچ اٹھے اور سیڑھیوں پر اڑنے ہوئے پیچھے چلے گئے تھے۔

”بھاگو۔“ اس طرف۔“ میں نے چنچ کر کہا اور جاگتی دیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہاتھ دوم سے باہر نکلتے ہوئے پرساد نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ بیڈ دوم سے نکلتے ہوئے جاگتی دیوی راستے میں بڑی تیزی سے ایک کمرے سے نکلتی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چنچ نکل گئی۔

باہر آکر میں نے بیڈ دوم کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ میں اس دروازے کا اندازہ لگا رہا تھا کہ پرساد کی چنچ سنائی دی۔

”باس بچو۔“ میں بڑی تیزی سے پیچھے جھک گیا۔ کچھ فی زن سے میرے سر کے اوپر سے گزر کر دروازے میں بیوست ہو گئی۔ میں نے ہتھلک پر دیکھا تو سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ترسول تھا۔ سامنے کے دروازے سے داخل ہونے والے ایک شخص نے ہتھلک پر ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ دوسرا وہ آدمی تھا جس نے مجھ پر ترسول پھینکا تھا۔ اس نے بھی اپنے لباس میں سے خنجر نکال لیا تھا اور پھینچا ہوا تھاری طرف دوڑ رہا تھا۔ پرساد نے اپنا خون آلود خنجر اس پر پھینک دیا۔ میں پرساد کے نشانے کی داو پے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ خنجر اس شخص کے منہ میں ترازو ہو گیا تھا اور وہ چیخا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ پرساد نے دروازے میں گڑا ہوا ترسول پھینچ لیا۔

میں سمجھ گیا کہ دارا نے مایک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو ہمارے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور یہ دو آدمی ہماری تلاش میں ہی اندر آئے تھے۔ ان میں سے ایک جاگتی دیوی کے ہاتھوں پر جاگتی دیوی نے آڑی دوسرا پرساد کے ہاتھوں میں۔ دونوں دارا کے کمرے کے آگے آ دی نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں ہی ہمارے فرائض

پورا کرنا شروع ہو جائیں گے۔ گیت سے تفرار کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہاں سے کوئی بھی شخص ان کی نظروں میں آئے تو ہتھلک پر جاگتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ آشرم کی اس عمارت کو ٹہرے میں لے لیا جائے ہمیں یہاں سے نکل کر کپاؤ بند میں پہنچنا پڑا ہے۔

”اس طرف۔ جلدی۔“ جاگتی دیوی جتنی برآمدے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چنچتی۔

ہم تینوں اس طرف دوڑے۔ شینے کا دروازہ اندر سے لاک کر پرساد نے اس شخص کو سر کے اوپر سے چھڑکے خانے کے دروازے کی طرف دھکی دیا۔ دارا ایک اور آدمی کے ساتھ سیڑھیوں پر اٹھ رہا تھا۔ وہ شخص ان کے اوپر گرا۔ وہ دونوں چنچ اٹھے اور سیڑھیوں پر اڑنے ہوئے پیچھے چلے گئے تھے۔

”بھاگو۔“ اس طرف۔“ میں نے چنچ کر کہا اور جاگتی دیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہاتھ دوم سے باہر نکلتے ہوئے پرساد نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ بیڈ دوم سے نکلتے ہوئے جاگتی دیوی راستے میں بڑی تیزی سے ایک کمرے سے نکلتی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چنچ نکل گئی۔

باہر آکر میں نے بیڈ دوم کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ میں اس دروازے کا اندازہ لگا رہا تھا کہ پرساد کی چنچ سنائی دی۔

”باس بچو۔“ میں بڑی تیزی سے پیچھے جھک گیا۔ کچھ فی زن سے میرے سر کے اوپر سے گزر کر دروازے میں بیوست ہو گئی۔ میں نے ہتھلک پر دیکھا تو سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ترسول تھا۔ سامنے کے دروازے سے داخل ہونے والے ایک شخص نے ہتھلک پر ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ دوسرا وہ آدمی تھا جس نے مجھ پر ترسول پھینکا تھا۔ اس نے بھی اپنے لباس میں سے خنجر نکال لیا تھا اور پھینچا ہوا تھاری طرف دوڑ رہا تھا۔ پرساد نے اپنا خون آلود خنجر اس پر پھینک دیا۔ میں پرساد کے نشانے کی داو پے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ خنجر اس شخص کے منہ میں ترازو ہو گیا تھا اور وہ چیخا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ پرساد نے دروازے میں گڑا ہوا ترسول پھینچ لیا۔

میں سمجھ گیا کہ دارا نے مایک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو ہمارے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور یہ دو آدمی ہماری تلاش میں ہی اندر آئے تھے۔ ان میں سے ایک جاگتی دیوی کے ہاتھوں پر جاگتی دیوی نے آڑی دوسرا پرساد کے ہاتھوں میں۔ دونوں دارا کے کمرے کے آگے آ دی نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں ہی ہمارے فرائض

خیال ابھرا۔ یہاں سے لگنا بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا لیکن اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور چنچ کر کہنے لگا۔

”لوگو! سو! سو! یہاں رگوتا تھ بہت بڑا فراڈ ہے۔ وہ تم سب کے ساتھ دھوکا کر رہا ہے۔ رازداری کی قیمت لے کر وہ تم سب کو دوسروں کے سامنے بے نقاب کر رہا ہے۔ تم لوگوں کو دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا کر رہا ہے اور اس کا فائدہ بھی وہ خود ہی اٹھائے گا۔ تم لوگوں کو بلیک میل کیا جا رہا ہے اگر تم لوگوں نے اس زیادتی کے خلاف مزاحمت نہ کی تو سواری رگوتا تھ تم لوگوں کو کیس منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ تم لوگ پیسے خرچ کر کے یہاں جذبات کی تسکین اور سکون کی تلاش میں آتے ہو لیکن اسے ساتھ یہ زیادتی کیسے برداشت کر رہے ہو تم لوگ؟“ میں ملی جلی انگریزی اور تھائی زبان میں چنچ کر لوگوں کو رگوتا تھ کے خلاف اکسا رہا تھا۔ پرساد کے خیال میں میں پوری طرح اپنا پانی انصاف بیان نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے یہ ڈنٹ داری اس نے سنبھال لی اور میری جگہ پر کھڑے ہو کر تھائی زبان میں چنچنے لگا۔ اس کے منہ سے گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔

”میں ہیں وہ اپرا دم۔“ اسپیکروں پر سواری رگوتا تھ کی چیخنی ہوئی آواز سنائی دی ”میں نے تم لوگوں کے چہرے بے نقاب کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے تین سیوکوں کی ہتھی (قتل کرنا) کر دی ہے۔ یہ قاتل ہیں۔ پکڑو انہیں۔ جانے نہ پائیں۔“ اور بھرا لگے فضا ترزاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ دارا کے کسی آدمی نے آؤٹریک رائفل سے فائرنگ کی تھی۔ کئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ انہوں نے فائرنگ شاید ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے کی تھی لیکن صورت حال بگڑ گئی۔ لوگ مشتعل تو تھے۔ فائرنگ سے مزید اشتعال پیدا ہوا اور وہاں جگمگ ڈھکی چنچ گئی۔

ہمارے آس پاس موجود کچھ لوگوں نے ہمیں بھی پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم صورت حال کا اندازہ لگا چکے تھے۔ میں نے جاگتی دیوی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ پرساد بھی جھکا کر اس کی طرف تنگ کیا تھا۔ جو لوگ ہمیں پکڑنا چاہتے تھے انہیں میں مستحکم تھا ہو گئے۔

سواری رگوتا تھ بار بار اپرا دم یعنی ہمارے بارے میں اطلاعات کر رہا تھا لیکن پرساد کی باتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ لوگ زیادہ مشتعل ہو گئے تھے اور پھر فائرنگ نے تو ان کے ممبر کا پیانو چھلکا دیا تھا۔ انہوں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جو ان کے چروں سے ہڈ نوج رہے تھے۔ ایسے مواقع پر ہوتا ہے کہ اصل آدمی تو ہاتھ نہیں آتے لوگ آپس ہی میں الجھ پڑتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں رہتا کہ

کون دوست ہے اور کون دشمن۔ اس وقت بھی کسی سب کچھ ہوا تھا۔ لوگ آپس میں الجھ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر گمراہی سے اور اب لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا رخ گیت کی طرف تھا۔ کچھ لوگ نیلوں اور جھاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے شاید وہ دیوار کو دربار جانا چاہتے تھے۔

”اس طرف پاس۔“ پر سادے چکر کرنا ٹھیک سے لکنا ممکن نہیں۔ دیوار کو درباری جانا پڑے گا۔“

اور پھر ہم جھاڑیوں کی طرف دوڑنے لگے۔ دیوار خاصی اونچی تھی۔ اوپر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے اور پھر ایک جگہ رک گئے۔ وہاں دیوار کا اوپر کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ پر سادہ دیوار کے ساتھ نیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ پہلے جاگی دیوی اس کے ہاتھوں پر کھڑی ہو کر دیوار پر چڑھی اور پھر میں دیوار پر پہنچ گیا۔ جاگی دیوی دوسری طرف چھلانگ لگا چکی تھی۔ میں پر سادہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچ رہا تھا کہ ہم تیز دوڑتی ہوئی نما گئے۔ آشرم کی عمارت پر لگی ہوئی سرخ لائٹیں روشن ہو گئی تھیں۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت نفا کوئیوں کی تڑپا ہٹ سے گونج اٹھی۔ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم کوئیوں کی زد سے محفوظ رہے۔ گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم دوسری باڑے بھی محفوظ رہتے۔ میں پوری قوت سے پر سادہ کو اوپر کھینچنے لگا۔

”پاس۔“ مجھے چھوڑ دو۔ تم دیوار سے کو کر گاڑی کے پاس پہنچ جاؤ۔ میں کسی اور طرف سے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ پر سادہ چیخا۔

”نہیں۔ پیر دیوار پر بھاگ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔

پر سادے دونوں پیر دیوار پر بھاگے اور میں نے اسے پوری قوت سے اوپر کھینچ لیا۔ اسی لمحے ایک اور بار باری ہوئی۔ اس مرتبہ گولیاں دیوار کے اس حصے پر لگیں جہاں چند سینکڑے پر سادہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی دیوار پر پہنچا ہم نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور اس کے ساتھ ہی پر سادہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

پاہر سے دیوار تقریباً پندرہ فٹ اونچی تھی۔ زمین بھی ہموار نہیں تھی اور تاریکی میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ نیچے کیا ہے۔ پر سادہ کا پیر ایک پتھر پر گر کر مڑ گیا تھا جس سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میں بھی نیچے گر کر ہموار زمین پر لٹکا گیا تھا۔ جاگی دیوی چند فٹ دور دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہ تیزی سے میری طرف دوڑی۔ میں اس کے پیچھے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے مڑ کر پر سادہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسی جگہ پڑا کراہ رہا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا ہوا پر سادہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے پیر میں موج اٹھی ہے پاس۔“ پر سادہ کراہا۔ ”مجھے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔“

میں نے اور جاگی دیوی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ پر سادہ کے پائیں تختے میں موج اٹھی تھی اور اس سے پیر زمین پر نہیں رکھا جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر دارا کا کوئی گمن میں دیوار پر چڑھ گیا تو ہم تینوں بڑی آسانی سے اس کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ وہ جگہ پھیل میدان جیسی تھی اور چھنے کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں اور جاگی دیوی پر سادہ کو ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچے رہے۔ آشرم کے گیت کے آس پاس بھی بنگالے کی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ لوگوں نے گیت توڑ دیا تھا اور سڑک کے دوسری طرف میدان میں دوڑ رہے تھے جہاں لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم پر سادہ کو کھینچے ہوئے اس میدان میں آ گئے۔

جب ہم وہاں آئے تھے تو پندرہ میں گاڑیاں نظر آئی تھیں لیکن اب وہاں لاتعداد گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور ہماری گاڑی ان میں کہیں پھنس گئی تھی۔ بدحواس لوگ اپنی اپنی گاڑیوں کی تلاش میں اُدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنی گاڑیوں تک پہنچ گئے تھے اور انجن اشعار کر کے آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔

”پاس!“ پر سادے اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا ”اپنی گاڑی تلاش کرنا مشکل ہے۔ کوئی اور گاڑی پکڑ لیں۔“

”وہ گاڑی سامراج نے فراہم کی تھی۔ اگر یہاں چھوڑ دی گئی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ چلو۔“ میرا خیال ہے ہم نے گاڑی اس طرف کھڑی کی تھی۔ اس دین کے پاس۔“ پر سادے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اور جاگی اسے سہارا دے کر کھینچے ہوئے اس سفید دین کے قریب پہنچ گئے۔ اس دین کے ساتھ ہی ہماری گاڑی کھڑی تھی لیکن اس کا اٹھایا ایک ٹائفلٹ ہو رہا تھا۔

”شت!“ میں نے منہ میں گاڑی پر ہاتھ مارا۔

”اب تو کوئی اور گاڑی ڈھونڈ پاس۔“ پر سادے کہا اور گاڑی کے ساتھ نیک لگا کر اُدھر اُدھر دیکھنے لگا ”پاس! وہ کہہ۔“

اپنی عورت ہے جو اس گاڑی میں بیٹھ رہی ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”دیوی نے اس عورت کو ہتھول کی زد پر لے رکھا تھا۔“

”شریف عورت ہمیں اپنی گاڑی میں لفت دینے کو تیار نہ ہوگی پیچھے بیٹھ جاؤ۔“ جاگی دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گیت کی طرف سے آنے والی دھمکی میں روشنی میں اس عورت کے چہرے پر خوف کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک تو ہنرمند کے بنگالے نے اسے خوف زدہ کر رکھا تھا اور مزید یہ کہ جاگی دیوی نے ہتھول اس کے پہلو سے لگا رکھا تھا۔

اس عورت کی عمر تیس بیس سال رہی ہوگی۔ وہ اسکرٹ اور ملیس بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ بال اٹھے ہوئے تھے۔ چہرے کا بک آپ بھی گولا ہوا تھا۔ اس کا لباس اور پھر یہ گاڑی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے تھا۔

میں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر پہلے پر سادہ کو اندر بیٹھنے کے لیے مدد دی اور پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ جاگی دیوی نے اس عورت کو ٹائفلٹ کیا۔ وہ ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ جاگی دیوی نے پیچھے بیٹھنے کی ہمت نہ کی۔

”ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ جاگی دیوی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور ہم بھی ہماری طرح اس جہنم سے نکل کر شہر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ہم سے کوئی فخر نہیں ہے لیکن۔۔۔“ اس نے سستی خیز انداز میں جملہ اُدھر اُدھر پھوڑا۔

”نہیں۔ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گی ڈاکٹر جاگی۔“ اس اورت نے کہا۔

اس عورت کے منہ سے جاگی کا نام سن کر نہ صرف جاگی بلکہ میں بھی پھل پڑا تھا۔

”جنت۔۔۔ تم مجھے جانتی ہو؟“ جاگی دیوی کسی قدر بدحواس ہو گئی تھی۔

”تم اس شہر کی ایک معروف فریٹن اور سرجن ہو۔“ اس اورت نے جواب دیا۔ اب اس کے چہرے سے خوف کے تاثرات بھی زائل ہو چکے تھے ”تو مجھے سے زیادہ شرم نہیں جانتا ہے۔“

”تم اس مشق سے نہیں آئے تھے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ جاگی نے کہا ”گاڑی آگے بڑھاؤ۔ وہ آگے والی گاڑی نکل رہی ہے۔“

اپنی صورت میں ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ بات اگر لوگوں کے چہروں سے پڑا آتے تھے تب تک محدود رہتی تو اتنی گڑبڑ نہ ہوتی لیکن فائزنگ سے صورت حال بگڑ گئی تھی اور لوگ بدحواس ہو کر دوڑ رہے تھے۔

سڑک پر بھی گاڑیاں بے ترتیبی سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہماری گاڑی ابھی سڑک پر نہیں پہنچ پائی تھی۔ میں گیت کی طرف دیکھ رہا تھا جو ٹوٹ چکا تھا اور لوگ اب بھی جھوم در جھوم ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ اور پھر اچانک گیت کے دوسری طرف آشرم کی عمارت میں ایک جگہ سے دھواں اٹھنے لگا دیکھ کر میں چونک گیا۔

”گاڑی جلدی نکلا۔ اب یہاں ایک اور بنگالہ شروع ہونے والا ہے۔“ جاگی نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی آشرم کی عمارت سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور غالباً کچھ دیر بعد پیش آنے والی صورت حال کا کچھ اندازہ بھی لگایا تھا۔

دھواں صرف ہم نے نہیں اور بھی بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا۔ اندر سے اب شور کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ کسی دل بٹلے نے آشرم کی عمارت کو آگ لگا دی تھی۔ دھوئیں کے ساتھ اب شعلے بھی بلند ہونے لگے تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت اب خاصی بدحواس ہو رہی تھی۔ سڑک پر اگر اس نے تین مرتبہ اپنی گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکرائی تھی۔ بنگالہ بڑھ گیا تھا اور لوگ اب جلد سے جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔

کپاؤٹ کے اندر سے ایک بار پھر فائزنگ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ کچھ جینیں بھی گونجی تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اسٹیرنگ فائزنگ کی گئی تھی یا ہوائی۔ لیکن سہرا حال ”اس فائزنگ سے لوگ مزید بدحواس ہو گئے تھے۔“

آشرم کی عمارت اور بیرونی گیت کے آس پاس دیواروں پر سرخ لائٹیں جلی رہی تھیں لیکن پھر ایک تاریکی چھا گئی۔ آشرم کی عمارت میں گئے والی آگ بجلی کے تاروں تک پہنچ گئی تھی اور اس طرح بجلی بھی ٹپل ہو گئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ اُدھر اُدھر لڑائی ہوئی گاڑیوں کی ہیل لائٹس عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔

آشرم کی عمارت سے اٹھنے والے شعلے اب بلند ہو رہے تھے۔ گیت کے سامنے سڑک پر گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائی رہی تھیں لیکن سہرا حال وہ عورت اپنی کار جھوم سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور کھلی جگہ پر آئے۔ تب ہی اس نے ایک سیٹریٹر پیر کا دباؤ پڑھایا۔ کار بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس سے آگے بھی کچھ گاڑیاں اسی تیز رفتاری سے جاری تھیں۔ غالباً ہر شخص جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا





مرتبہ میرے دونوں بھائیوں کے سینوں پر پڑے تھے۔

”شاباش باس۔“ دیری گڈ! ”پر سادھے دوادیسے ہوئے چچ ہا تھا اور پھر جاگ دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

اور پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا کہ پر سادہ کار کے کٹے ہوئے دواڑے سے کسی پرندے کی طرح اڑا اور دارا کے اوپر جا کر اچھو جاکر اس کے پکڑنے اس کے جسم پر ٹھوکریں برس رہا تھا۔

پر سادہ دارا کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت اس نے اپنی تکلیف کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ بھی دارا کو بری طرح رگیدہا تھا لیکن پھر دارا کا داڑھی چل گیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پر سادہ پر ٹھوکریں برسانے لگا۔ یہی تکلیف کی وجہ سے پر سادہ اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ زمین پر پڑے پڑے اپنا دفاع کرنے لگا۔

اور پھر آخرم والی سڑک سے دو کاروں کو آتے دیکھ کر دارا اور اس کے ساتھی کڑ بڑاے گئے۔ دارا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پر سادہ کو چھوڑ کر اپنی کار کی طرف دوڑا۔ ان دو غنڈوں میں سے ایک تو میری گرفت میں تھا مگر دوسرے نے دارا کے پیچھے دوڑا دیا۔ وہ جیسے ہی پر سادہ کے قریب پہنچا پر سادہ نے اچھل کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ غنڈا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر پر سادہ چونک کر اس کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔

دارا کی کار کا انجن اشارت ہو چکا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ کار ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے دارا نے راہ فرار اختیار کر لینے کی میں عافیت سمجھی اور وہ اپنے گروں کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا۔ ان میں ایک کو پر سادہ نے گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرا میرے قابو میں تھا۔ پہلے میرے مقابلے پر دو تھے لیکن اب ایک ہی رہ گیا تھا۔ یوں تو میں پہلے بھی ان کے سامنے کھڑا نہیں پڑا تھا لیکن اب دن نوں کی بات تھی۔ میں نے اپنے حریف کو پھر لگانے کا موقع نہیں دیا اور ٹھونسوں اور ٹھوکروں سے اس کی تواضع کرتا رہا۔

آخرم کی طرف سے آنے والی کاروں میں آگے والی کار کی رفتار بڑی تیز تھی۔ ہم اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں تھے اور پھر وہ کار بریک کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ دھڑ دھڑ کر کے کار کے دواڑے کھلے اور تین آدمی نیچے اتر آئے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بھی دارا کے گروں کے ہوں گے میں نے اپنے آپ کو ان سے ہنسنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ جاگ دیکھ کر نے کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک پر پڑا ہوا نہ صرف اپنا بلکہ دارا کا پتھول بھی اٹھایا تھا اور ہپ لیونگ کی کار کی آڑ میں پوزیشن لے کر کھڑی ہو گئی۔

وہ دارا کے نہیں بلکہ مہاراج کے آدمی تھے۔ ان میں ایک سب سے بڑا آدمی تھا۔ گانگ تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے ان غنڈوں کو سنبھالنے کی غمازی اور بڑی کامیابی سے بڑا کر دی۔ اور گانگ نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

”مجھے افسوس ہے ہمیں یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔“ گانگ نے کہا۔ ”درا اصل ہم لوگ نہیں اور دارا کو وہاں تلاش کرنے کے لیے ہم نے تمہیں ایک گاڑی میں وہاں سے نکالے ہوئے تھے۔ اس کے چند منٹ بعد ہی دارا کو بھی ایک کار میں وہاں سے نکال دیا گیا۔ ہم تو فوراً ہی اس کے پیچھے آنا چاہتے تھے لیکن ہماری کار میں تھی پھر بھی ہم وقت یہاں پہنچ گئے۔ دارا کہاں گیا؟“ ”وہ بھاگ گیا۔“ بڑا نے جواب دیا۔ ”مگر لوگ چلے یہاں سے۔“ ہم ان دونوں سے شک کرتے تھے۔ ”گانگ نے کہا۔

جاگ دیکھ کر میں نے پہلے گانگ کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت پھر اس کی صورت حال کو سمجھنے میں اس دیر نہیں لگی تھی۔ وہ کار کی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔ میں نے پر سادہ کو سارا دیکھ کر ہپ لیونگ کی کار میں ڈال دیا اور خود بھی اس کے ساتھ کچھل بیٹھ گیا۔ گانگ اپنی کار کی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ہپ لیونگ دھڑ دھڑ کی نظر سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور انجن اشارت کر کے کار کو ایک جھٹکے سے اٹھ بھاڑا۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ ہوئے ہونے کا پتہ رہا تھا۔ ”کچھ نہیں ہوا لیونگ۔“ جاگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مقتضا سے گاڑی چلاؤ۔ کوئی حاشہ نہ ہو جائے۔“ ”وہ آگے کیا ہے۔“ اگر۔۔۔

”اب وہ ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“ جاگ نے کہا۔ ”اب وہ کئی دہائیوں سے اس کی نظر ہمارے ساتھ ہے۔“

”جب سے یہ آدمی آخرم میں آیا تھا ہی وہ سب سے گزریا ہوا ہے۔“ ہپ لیونگ نے کہا۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ وہاں جاگ ہی تھا۔“

”اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔“ گانگ نے کہا۔ ”اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر جاگ دیکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے ساتھ ہے۔“ جاگ نے کہا۔ وہ جذبات سے ہوا ہے۔ یہ کیوں ہے؟“ اس نے پیچھے ہٹ کر طرف اشارہ کیا۔

”میں کمانی ہے۔“ جاگ نے جواب دیا۔ ”اس کی وجہ سے ہمارا سڑک پر لڑنے لگی۔“

”جیسے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ درست ہے کہ دارا کو اس کی تلاش تھی اور یہ تلاش بت عرصے سے ہے لیکن جب تم اس کی تلاش کی تو تمہیں اس سے ہمدردی اور دارا سے قربت ہو جائے۔“

”کی۔“ ”دارا وہی شخص ہے جو بھاگ گیا ہے؟“ ہپ لیونگ نے کہا۔ ”دارا وہی شخص ہے جو بھاگ گیا ہے؟“

”ہاں وہی۔“ جاگ نے گردن ہلائی۔ ”دیکھا کہ اب سے غائب ہو چکا۔“

”ہاں وہی۔“ جاگ نے گردن ہلائی۔ ”دیکھا کہ اب سے غائب ہو چکا۔“

”جی۔“ جاگ دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ہپ لیونگ آئینے میں مجھے دیکھنے لگی۔ شاید اسے جاگ کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ عام آدمی کے لیے میرے بارے میں ایسی بات کا یقین کرنا ممکن بھی نہیں تھا لیکن ہپ لیونگ چونکہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکی تھی اس لیے اسے یقین تو کرنا ہی پڑا تھا۔

ہم سے پہلے جو لوگ شہر پہنچ چکے تھے انہوں نے شاید پولیس کو آخرم میں ہونے والے واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور اب سامنے سے کچھ گاڑیاں آتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سائزن کی آوازیں بھی فضا میں گونج رہی تھیں۔ ان کی چٹوں پر لگی ہوئی لائٹوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں تھیں۔

ہپ لیونگ نے کار سڑک کے کنارے پر لگا کر روک لی۔ پولیس کی کئی گاڑیاں اور لائندہ گاڑیاں سائزن بجاتے ہوئے تیز رفتار سے آخرم کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد ہپ لیونگ نے گاڑی آگے بھاری لیکن اس نے رفتار بھی دیکھ کر سائزن سے اب بھی کچھ گاڑیاں بڑی تیز رفتار سے آ رہی تھیں۔ گریڈ ہوئی سے اس نے کار میں سوخم و موڈ پر موزی۔ اچھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ اس سڑک پر خاصی روٹ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ کسی ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب ہم کار روکا کر اتر جائیں گے اور وہاں سے کسی ٹیکسی پر بیٹھ کر واٹ ٹرمینل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اس سڑک پر کچھ آگے جا کر ہپ لیونگ نے کار ڈیلی سوخم وٹ کسٹی نو ایکاٹائے موڈ پر موزی تو میں چرے کے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ آگے بڑھتی ہوئی جاگ دیکھ کر میں نے بھی نوٹ کر لیا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔

”اس طرف کہاں جا رہی ہو؟“ وہ ہپ لیونگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں مین روڈ پر کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر ڈراپ کر دیتی ہوں۔“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم تینوں کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔“ ہپ لیونگ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تمہارا وہ تیسرا ساتھی تو تکلیف سے مسلسل کراہ رہا ہے۔ میرا کھریاں سے زیادہ دور نہیں۔ تم تینوں کو فرسٹ ایڈ مل سکتی ہے۔“

جاگ نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میرے خیال میں ہپ لیونگ پر اعتماد کیا جاسکتا تھا اور پھر میں اس حالت میں مہاراج کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔

”کیا تم پر اعتماد کر سکتے ہیں لیونگ؟“ جاگ نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مگر کیا پڑے گا۔“ ہپ لیونگ بلی مرتبہ مسکرائی۔ ”متم جانتی ہوں، میں نے تمہیں اپنی کار میں بیٹھنے کی پھان لیا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور تمہاری باتیں سن کر مجھے تم کو گول سے ہمدردی ہو گئی۔“

ہے۔ اگر تم لوگوں کے خلاف میرے دل میں کوئی بات ہوتی تو تم لوگوں کو کبھی ڈراپ کر دیتی اور پھر پولیس کو تمہارے بارے میں بتا دیتی لیکن.....

”شکر ہے لیونگ“ جاگی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

کار سوسے چارڈن سب روڈ پر مڑتی اور تھوڑی ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد سوسے قانگ لہر گھوم گئی۔ یہ سارا پڑ سکون ہانسی علاقہ تھا۔ سوسے قانگ لہر ایک کشادہ کلی تھی جس کے دونوں طرف بجلے بنے ہوئے تھے۔ ہپ لیونگ نے ایک بجلے کے سامنے کار روک لی۔ سامنے وید اسکرین کے قریب رکھے ہوئے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور انجین چلا چھوڑ کر نیچے اتر گئی۔ جاگی دیوی اپنی جگہ سے سرک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی اور جب ہپ لیونگ نے گیٹ کھولا تو کار آگے بڑھا دی۔ لیونگ مسکرا دی تھی۔ کار اندر جانے کے بعد اس نے گیٹ بند کر دیا۔

جاگی نے پورچ میں کار روک لی اور انجین بند کر دیا۔ اس دوران میں ہپ لیونگ بھی وہاں پہنچ گئی اور آہستہ آہستہ میں داخل کر دو واڑہ کھولنے لگی اور پھر اندر داخل ہو کر وہ بچیاں جلاتی چلی گئی۔ جاگی دیوی بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے اندر آئی۔ اور پھر ہپ لیونگ کا اشارہ پا کر باہر آگئی۔

میں نے اور جاگی نے ہر ساد کو سارا دے کر کار سے اتارا اور اسے اندر لے آئے۔ وہ برقی طرح گراہ رہا تھا۔ اندر آکر روشنی میں دیکھا تو اس اچھل پڑا۔ اس کا ہیر سوج کر لپٹا ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ موج آنے کے بعد اگر وہ آرام سے بیٹھا رہتا تو شاید اتنی زیادہ تکلیف نہ ہوتی لیکن دارا سے محکم تھا ہونے کے بعد تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اسے ہال نما کمرے میں ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ جاگی دیوی فوراً ہی چمک کر اس کے ہیر کا معائنہ کرنے لگی۔ اس نے جیسے ہی ہیر پر ہاتھ رکھا، وہ چیخ اٹھا۔

”تم لوگ اپنے چیلے درست کرلو۔ میں اس کا ہیر دیکھتی ہوں۔“ ہپ لیونگ نے کہا۔

”ہم ٹھیک ہیں لیکن پہلے اس کا ہیر دیکھو۔“ جاگی نے کہا پھر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”لیکن تم کیا کر سکتی ہو۔ کیا تم بھی ڈاکٹر ہو؟“

”ڈاکٹر تو تم ہو۔ میں مساجر ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس وقت اس کا علاج میں کسی ڈاکٹر سے بہتر طور پر کر سکتی ہوں۔“ ہپ لیونگ نے جواب دیا۔

جاگی دیوی مسکرا کر رہ گئی۔ ہپ لیونگ نے غلط نہیں کہا تھا۔ جوڑوں کی اس قسم کی تکلیف کا علاج پاکستان اور ہندوستان میں تو پلوکان قسم کے لوگ کیا کرتے تھے اور ہنگامہ میں بھی اس قسم کے لوگ موجود تھے۔ جبکہ ڈاکٹری علاج ایک لمبا پر دوس تھا۔ ہپ لیونگ مساجر تھی اور شاید اس نے مساج کی باقاعدہ ٹریننگ حاصل کی تھی۔ مساج کرنے والے بھی ایسے کاموں میں بڑے ماہر ہوتے

ہیں۔ وہ جسم کے ایک ایک جوڑا اور رگ پھوس سے واقف ہوتے ہیں۔ ہر ساد کے ننھے کا جوڑا مل گیا تھا اور اس وقت اسے ہپ لیونگ ہی بخانا سکتی تھی۔

ہپ لیونگ کچن میں چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ پانی گرم کر کے لے آئی۔ پلاسٹک کا ایک ٹب بھی تھا جو اس نے ہر سادوں کی کرسی کے قریب قانلین پر رکھ دیا اور نیلے رنگ کی چوڑے سروالی ایک ڈبیا لے آئی جس میں نیلے سے رنگ کی کریم بھری ہوئی تھی۔ وہ کرسی کے قریب قانلین پر بیٹھ گئی۔ ٹب کو ہر ساد کے ہیر سے نیچے رکھا اور کراہ رہا تھا اور جب وہ تولیے سے ہیر خشک کر رہی تھی تو ہر ساد نے بڑی بے بسی سے جاگی کی طرف دیکھا تھا۔

”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک حسین عورت تمہارے ہیر دھو رہی ہے۔“ جاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہپ لیونگ بھی اس کی بات سن کر مسکرا دی تھی۔ اب وہ کریم سے ہر ساد کے ہیر پر مالش کر رہی تھی۔ اس نے اگرچہ ہانسی ہاتھ رکھا تھا مگر ہر ساد سسکا دیاں بھرتے ہوئے ہار بار پلو بدل رہا تھا۔ ہپ لیونگ کا اشارہ پا کر میں کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ ہر ساد کے کندھوں پر رکھ دیے۔

ہپ لیونگ ہر ساد کے ہیر پر مالش کرتی رہی۔ ہیر برقی طرح موج گیا تھا۔ وہ ننھے کے آس پاس کی جگہ کو انگوٹھوں سے سلا رہی تھی۔ ہر ساد اب زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ ہپ لیونگ نے ایک ہاتھ پیچھے پر رکھا اور دوسرا ہیر پر اور پھر اس نے اچانک ہی ہیر کو زوردار جھکا دیا۔ ہر ساد برقی طرح چیخ اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرسی سے اچھلنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کے کندھوں کو بڑی سختی سے دبا رکھا تھا جبکہ جاگی نے قریب بیٹھ کر اس کی ٹانگ گرفت میں لے رکھی تھی۔ ہپ لیونگ نے ایک اور جھکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ ہر ساد اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے جھکا تھا۔ اگر میں نے اسے دبوچ نہ رکھا ہوتا تو وہ بیٹھ کر ہی سے گر پڑتا۔ اس نے چیخ نکالنے کے لیے سختی سے دانت بچھجے رکھے تھے۔

”بس... بس... بس... کام ہو گیا۔ اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی ڈیئر۔ بس... اب میں اپنی پیٹ دون کی۔ تمہیں آرام مل جائے گا۔“ ہپ لیونگ اس کے ہیر پر مالش کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ مالش کرنے کے بعد اس نے ہیر پر اسکرپ پیڈنگ پیٹ دی اور اپنی چیزیں سینے لگی ”اب تمہیں صرف آرام کی ضرورت ہے۔ ہیر کو زیادہ حرکت مت دینا۔“

ہپ لیونگ کے کہنے پر میں ہر ساد کو گود میں اٹھا کر ایک کمرے میں لے آیا اور بستر پر لٹا دیا۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنے آپ پر توجہ دی تھی۔ لڑائی کے دوران میں میرے جڑے پر گھونٹے تھکے ایک دانت مل گیا تھا جس میں تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے ماؤتھ

چند گھنٹیں کبھی مگر ظاہر ہے ماؤتھ واش سے دردمک نہیں تھا۔

ہپ لیونگ نے کافی پانی جس کی اس وقت ہم سب ہی بات محسوس کر رہے تھے۔ ہم ہر ساد والے کمرے میں بیٹھے کافی پیاں لینے اور باتیں کرتے رہے اور اس وقت ہی جاگی دیوی ہپ لیونگ کو میرے بارے میں بتا کر کہ میں کون ہوں اور دارا

میں نے دوران میں ”میں نے محسوس کیا کہ ہر ساد اوجھلے لگا ہوا ہے۔ اسے ایک خواب آ رہا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے ہیر پر غور کی سی طاری ہو رہی تھی۔ ہم اٹھ کر کمرے میں

”اس آوی کو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ آشرم میں آتے دیکھا تھا۔“ ہپ لیونگ کہہ رہی تھی ”بہت سے لوگوں نے محسوس کیا تھا دارا کا رویہ کچھ مختلف ہے۔ دوسروں کے سامنے تو وہ سوائی کے فرائض سے پیش آتا لیکن اس نے بھی سوائی کے ہاتھ نہیں ملے تھے اس کے سامنے کبھی نہیں جھکا تھا اور ایک مرتبہ تو میں نے فرائض کی غارت کے اندر اسے سوائی کے ساتھ بڑی بدتمیزی بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہندی یا اردو میں بات کر رہے تھے۔ میں نے سمجھ کر ہی سن لی۔ لیکن یہ اندازہ میرا حال لگایا تھا کہ ہاتھ لگا کر ہاتھ کی وجہ سے اس سے دبا ہوا ہے۔ پہلے سوائی کے ہاتھ مل چلے جو اس کے پاؤں کا روتھے اس کے آس پاس موجود جگہ تھے لیکن مجھ پر وہ آہستہ آہستہ قابو ہوتے گئے اور ان کی جگہ ان کے آویوں نے لے لی۔ ایک روز آشرم کے کچھیلی طرف ہاتھ لگا کر سوائی کے ایک پاؤں کا روتھے کی لاش لی تو آشرم میں حضور براس سا پھیل گیا۔ میری طرح بعض اور لوگوں کا بھی خیال ہوا کہ پاؤں کا روتھے کو دارا نے مودا دیا ہے اور غائب ہونے والے ہاتھ پاؤں کا روتھے کو بھی وہ مودا چکا ہے جن کی لاشیں غائب کر دی گئیں۔ سب لوگ سمجھ رہے تھے کہ اندر ہی اندر کوئی کڑ بڑ ضرور ہے۔ سوائی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ معمولات کی نمائندگی کرتے اور لوگوں سے نڈرانے وصول کرتا۔ وہ تبدیلی ضرور دیکھتے تھے مگر اس کی وجہ وہ اپنے پیچلوں کو ”ناتوا“ دارا اس کے سر پر ضرور موجود ہوتا۔ سوائی کو ملنے

ناتوا نڈرانے بھی دارا کے آوی ہی جمع کر لیتے تھے۔“ چند دن

لوگوں کو خاموش ہو کر پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”سوائی کے تمام چیلے اسے گرو اور نجات دہندہ مانتے تھے۔ وہ اس کے ہیر چاہتے تھے لیکن جب سے دارا وہاں آیا تھا، چیلوں میں کچھ بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ وہ سوائی کے معاملات میں مداخلت کرنے لگا تھا اور دوسروں کے ساتھ بھی اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ بعض لوگوں کے ساتھ تو وہ اس طرح پیش آتا جیسے وہ اس کے زرخیز غلام ہوں۔“

”چند روز پہلے تم لوگوں نے اخبار میں ڈول تائی نام کی ایک عورت کی خودکشی کی خبر پڑھی ہوگی۔ ڈول تائی ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھی اور وہ بھی سوائی رگونا تھ کے عقیدت مندوں میں شامل تھی۔ ایک روز رگونا تھ نے اسے خاص طور پر اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اس وقت وہاں دارا بھی موجود تھا۔ ڈول تائی جب وہاں گئی تو بہت غصے میں تھی۔ اس سے اگلے روز رات کو کھانا ڈنڈ میں ایک بڑی اسکرین پر ایک فلم دکھائی گئی۔ وہ فلم ڈول تائی کے بارے میں تھی جس میں اسے ایک اور آوی کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس سے اگلے روز اخباروں میں ڈول تائی کی خودکشی کی خبر چھپی تھی۔“

”ڈول تائی کی اس فلم کو دیکھ کر سوائی کے چیلوں میں کچھ بے چینی سی پھیل گئی۔ بعض لوگوں نے سوائی کے سامنے احتجاج کیا تو انہیں بری طرح لٹا ڈال دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد آشرم میں آنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی اور پھر لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگا ہوا بھی مشکل نہیں رہا کہ سوائی مکمل طور پر دارا کے قبضے میں تھا۔ وہ ہی کرتا جو دارا کرتا۔ دارا نے آشرم میں آنے والے بعض بڑے لوگوں کی ویڈیو فلمیں پھیلی تھیں جن سے وہ انہیں ہلکے سیل کر کے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا۔ یہ ہلکے سیلنگ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب ہی لوگ جانتے تھے لیکن کوئی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس حمام میں سب ہی ننگے تھے۔“

میں خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ مجھے یاد آ گیا کہ آشرم کے ایک کمرے میں لی وی پر میں نے ایسا ہی ایک سنسنی خیز منظر دیکھا تھا۔ وہ کوئی سیاست داں تھا جس کی فلم بنائی جا رہی تھی تاکہ بعد میں اسے ہلکے سیل کیا جاسکے۔ اب مجھے صورتحال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ سوائی رگونا تھ کا یہ آشرم عیاشی اور بدکاری کا اڈا تھا۔ روحانی تعلیمات کے ہر چار کی آڑ میں وہ نہ صرف لوگوں کو گمراہ کر رہا تھا بلکہ انہیں ہلکے سیل کر کے دولت بھی سیٹھ رہا تھا۔ بڑے بڑے معزز لوگ اس کے ہتلے میں شامل تھے اور یہی وجہ تھی کہ سوائی کے خلاف کبھی کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکی تھی۔ سوائی رگونا تھ بڑے عظیم طریقے سے یہ کام کر رہا تھا۔ اس نے ہلکے سیلنگ کی ہوا تک نہیں نکلنے دی تھی۔ لوگ خاموشی سے ہلکے سیل ہو رہے تھے لیکن دارا نے آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے لوگوں کو دوسروں کے سامنے بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا جس

سے لوگوں میں بے چینی پھیلنے لگی تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں لوگوں کی توجہ راں خالی کر دینا چاہتا تھا لیکن اس بات کو بھول گیا تھا کہ اس کا شدید رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔

سوامی رگوناتھ کے آشرم میں پناہ لے کر داراشاید یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ محفوظ ترین پناہ گاہ میں آگیا ہے اور اب کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسے شاید یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ہرنے پر دہلا بھی ہوتا ہے اور میں اب اس پر دہلا ثابت ہو رہا تھا۔

میں.... وہ جان علی۔ ایک معصوم اور بے سارا لڑکا جو اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا تھا۔ جو دارا کا نام سننے ہی خوف سے قہر قرا کر کانپنے لگتا تھا۔ اب مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے اس بزدل دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکوں اور دارا کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ زبردست ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے خوف سے ہانکتا رہوں یہاں تک کہ ممکن ہے چور ہو کر گر پڑوں اور وہ بڑے آرام سے میری گردن مروڑے لیکن میں تھک کر گرا نہیں تھا بلکہ اس کی توقعات کے برعکس مڑ کر اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ مہاراج جتنے اس قابل بنا دیا تھا کہ میں اس کے مقابلے میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔

دارا نے میرے خلاف کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا کیا پھنسنے استعمال نہیں کیے تھے۔ میں اس کے ایک جرم کا چشمہ گواہ تھا۔ مجھے ختم کرنے کے لیے اس نے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن میرا وہ اب تک مجھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ میں بے گناہ تھے اس کے لیے سناپ کے گلے میں چھو بند رہن گیا تھا جسے نہ وہ نگل سکتا تھا اور نہ اگل سکتا تھا۔ اب وہ اگر میرا چچا چھوڑ بھی دیتا تو میں اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

وہ خفیہ بھیلا تھا۔ مجھے اس سے اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا بدلہ تو لینا ہی تھا لیکن دوسرے واقعات نے میرے انتقام کی آگ کو کچھ اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ وہ منشیات کا زہر پھیلا کر آنے والی نسلوں کو مفلوج کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اسے روکنا تھا۔ اب تک کتنے بے گناہوں کو اس نے موت کی نیند سلا یا تھا۔ مجھے ان کا بھی انتقام لینا تھا۔ ماسٹر پھوٹو شلیا، شاہی دان، پامپلا اور وہ معصوم بچہ جسے اس نے پر غلٹ بنا کر بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں نے اس بچے کو دیکھا نہیں تھا لیکن نبھانے کیوں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے سینے میں ایک ہلکے سی اگلی تھی۔ دارا سمجھ گیا تھا کہ اب میں اس کی راہ پر لگ گیا تھا۔ وہ سوامی رگوناتھ کے آشرم میں پناہ گزین ہو گیا تھا لیکن میں نے یہاں بھی اس کا پچھا نہیں چھوڑا۔ وہ یہاں اپنے آپ کو بہت محفوظ سمجھتا تھا لیکن میں نے اسے یہاں بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی اپنی حرکتوں کی وجہ سے سوامی کے چیلے بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور پھر وہ سب کچھ ہوا تھا جس کی توقع نہ اسے تھی نہ مجھے۔

سوامی کا آشرم جل کر خاستہ ہو گیا تھا لیکن دارا کو وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ دارا کو سوامی رگوناتھ جیسے شخص پر قابو پانے کا موقع کیسے مل گیا تھا۔ وہ خود کائیاں آوی تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کو اس نے اپنی ٹمٹی میں لے رکھا تھا۔ کیا اس کا کوئی ایسا راز دارا کے قبضے میں آیا تھا جس کا انکشاف اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ایسا کیا راز ہو سکتا تھا اور اب تو سوال یہ تھا کہ سوامی رگوناتھ زندہ بچا بھی تھا یا اپنے آشرم کی آگ میں جل رہا تھا۔

”اب تو سہ سال سب کچھ ختم ہو گیا۔“ میں نے ہپ لیو تک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لوگوں کے خلاف بلیک میلنگ کے تمام ثبوت آشرم کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکے ہوں گے۔ دارا اگرچہ بھاگ گیا ہے لیکن وہ پھر سامنے آئے گا۔ ہمیں اس سے کوئی خفیہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہماری اور اس کی جنگ ہے لیکن اگر کوئی ایسی بات....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ اور حرا چھوڑ دیا۔

ہپ لیو تک میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔ گہرا سانس لینے ہوئے بولی ”بھول تمہارے“ سب کچھ آشرم کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکا ہے تو میرے لیے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہپ لیو تک بھی سوامی رگوناتھ کے قتلے میں شامل تھی اور سوامی کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ ان کے لیے دولت اور صرف دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اس نے یہ سارا ذرا مایا اس لیے شروع کیا تھا۔ روحانی تعلیمات کی آڑ میں بدکاری اور عیاشی کے اس اڈے میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس نے آشرم میں آنے والے ہر مودورت کا کوئی نہ کوئی راز ضرور اپنے قبضے میں رکھا ہو گا تاکہ ان کی بنیاد پر لوگوں کو بلیک میل کر کے دولت سمیٹی جاسکے۔ ہپ لیو تک کا بھی کوئی راز تھا جس کے ضائع ہوجانے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور نبھانے اب کتنے لوگ سکھ کا سانس لیں گے۔

”تم اس پیکر میں کیسے بھنس گئیں؟“ جاگی دیوی نے پوچھا۔ ”بد قسمتی۔“ ہپ لیو تک نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے میرے تین مساج پارڈر زجل رہے ہیں۔ تینوں پارڈر بڑے ہو گئے ہیں۔ روزانہ ہزاروں کی آمدنی ہے۔ ایک روز میرے دفتر میں مسز ڈول تائی نے روحانیت کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ وہ میری پرانی کسٹر تھی۔ مجھے بھی روحانیت سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی۔ میں نے اس موضوع پر کچھ کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ مسز ڈول تائی نے مجھے روحانیت کے بارے میں جاننے کے لیے سوامی کے آشرم جانے کا مشورہ دیا بلکہ اس سے اگلے روز مجھے خود ہی وہاں لے گئی اور سوامی سے میرا تعارف کرایا۔ اس کے انداز گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ڈول تائی سوامی کے اندر

قلعے میں شامل ہے۔ سوامی رگوناتھ سے ہونے والی اس پہلی ملاقات سے میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اس نے مجھے چند عورتوں اور مردوں پر مشتمل ایک گروہ میں شامل کر دیا۔ میں باقاعدگی سے وہاں جانے لگی۔ اس کے لیے مجھے روزانہ کچھ نہ کچھ نذرانہ پیش کرنا پڑتا۔ یہ نذرانہ اس وقت پیش کیا جاتا جب سوامی ہمیں ختم کرتا۔

”تقریباً دو مہینوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ رگوناتھ تو روحانیت کی ایچ سے بھی واقف نہیں۔ اس کے اپنے غی نظریات تھے۔ جن کا وہ پچہا کر رہا تھا اور ان نظریات سے تم لوگ بھی واقف ہو چکے ہو۔ بہرحال، وہ باتیں مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ شروع میں تو جب میں مردوں اور عورتوں کو آزادانہ طور پر ناشائستہ حرکتیں کرتے دیکھتی تو مجھے بہت برا لگتا تھا لیکن بعد میں میں خود بھی اس رنگ میں رنگی چلی گئی۔ سوامی کے بھانسن ”اس کے نظریات“ بھانسن خیر باتیں“ پچان خیر موسیقی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسنے لوگوں کی موجودگی میں بھی وہاں ایک دوسرے کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب کے چہرے بڑے ہی چھپے ہوتے تھے۔ کوئی ذور خوف نہیں تھا۔ کسی کو پتا نہیں ہوتا تھا کہ کون کس کے ساتھ ہے۔

”میں بھی اس پیکر میں بھنس گئی۔ یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ سوامی رگوناتھ کا مقصد یہ تھا کہ وہ ماوریا پر آزادی تلاش کی اجازت کوئی حاشا نہیں دے سکتا۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ اس حقیقت کو سمجھ گئے تھے لیکن کوئی بھی وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔

”اور پھر ایک رات سوامی رگوناتھ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ رگوناتھ کی بات کوئی بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس کا ہر حکم مانا جاتا تھا۔ اس نے مجھے جو حکم دیا وہ میں بھی نہیں ٹال سکتی۔ مجھے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک ایسا آدمی موجود تھا جسے بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ایک بہت بڑا سرکاری آفیسر تھا اور پھر دوسرے روز بھی مجھے آشرم کے اندر بلایا گیا۔ اس مرتبہ سوامی کا ایک خاص چیلنا مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور مجھے لی ڈی پر ایک ویڈیو فلم دکھائی۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ پچھلی رات میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب کچھ اس فلم میں موجود تھا۔ فلم دکھانے کے بعد مجھ سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دھمکی بھی دی گئی۔

”میں نے خاموشی سے وہ مطالبہ پورا کر دیا اور پھر ہر دو ہفتے بعد مجھ سے اتنی ہی رقم کا مطالبہ کیا جاتا رہا۔ دوسری طرف وہ اس شخص کو بھی بلیک میل کر رہے تھے جو میرے ساتھ تھا۔ اس سے زیادہ بڑی رقمیں ایسی ہی جاری تھیں۔ وہ لوگ شکار کی حیثیت کے مطابق مطالبہ کرتے تھے خاموشی سے پورا کر دیا جاتا تھا۔

”میں نے ایک روز مسز ڈول تائی سے بات کی تو انکشاف ہوا کہ وہ بھی اس جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ حکومت کے ایک اعلیٰ

عہدے پر فائز تھی۔ اس سے تو بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاتی تھیں اور پھر ایک روز اس نے رقم دینے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھ ہی سوامی کو یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ وہ اس کے خلاف کارروائی کرے گی اور پھر اسی رات آشرم کے کپاؤنڈ میں ایک بڑی اسکرین پر مسز ڈول تائی کی وہ فلم دکھادی گئی اور اسی رات مسز ڈول تائی نے خودکشی کر لی۔ اس نے کوئی نہ کوئی خطا ضرور چھوڑا ہو گا لیکن پولیس کو وہ خطا نہیں مل سکا ہو گا۔ کپاؤنڈ میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں مسز ڈول تائی کی اس فلم کی نمائش کا مقصد دوسروں کو داروغہ دینا تھا کہ اگر کسی کے ذہن میں بغاوت کا خیال ہو تو وہ اسے بھول جائے۔

”اور پھر دارا نے وہاں آکر لوگوں میں بے چینی پھیلا دی۔ وہ کل کر دھمکیاں دیتا اور لوگوں کو ہراساں کرتا اور آج جو کچھ بھی ہوا، وہ جس طرح میرے لیے باعث اطمینان ثابت ہوا ہے کل آشرم میں آتش زدگی کی خبر پڑھ کر دوسرے لوگ بھی اطمینان کا سانس لیں گے۔“

”کیا تمہارے شوہر نے وہاں جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟“ جاگی دیوی نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”اگر میرا شوہر ہوتا تو شاید میں اس طرف کا رخ بھی نہ کرتی۔“ ہپ لیو تک نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”دو سال پہلے میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔“

میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ تھائی وانگ مجھے سوامی رگوناتھ کے آشرم کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی لیکن ہپ لیو تک نے جو انکشافات کیے تھے وہ بہت سنسنی خیز تھے۔ میں نے ڈاکٹر جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کا تعلق زندگی کے ایک معزز طبقے سے تھا۔ معاشرے میں اس کی عزت تھی لیکن میرے کہنے پر وہ بیسیوں کے اس بحث میں جانے کو تیار ہو گئی تھی اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ صحیح سلامت وہاں سے نکل آئی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو شاید میں اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی ٹھکی کی طرف دیکھا۔ اس وقت رات کا ایک بجنے والا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ گانگ اور اس کے ساتھی مہاراج کے پاس... پہنچ چکے ہوں گے۔ ہمیں تو ان سے پہلے وہاں پہنچنا چاہیے تھا لیکن ہم اطمینان سے یہاں بیٹھے تھے اور مجھے یقین تھا کہ مہاراج پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں نے راجہ اور دھرم دیکھا۔ ایک طرف اسٹینڈر پر ٹیلی فون ڈیٹ رکھا ہوا تھا۔ ”کیا میں فون استعمال کر سکتا ہوں؟“ میں نے ہپ لیو تک سے پوچھا۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔“ ہپ لیو تک مجھ سے پہلے اٹھ گئی اور ٹیلی فون اٹھا کر میرے قریب صوفے پر رکھ دیا۔ اس کا نام خاصا لبا تھا۔

میں نے ریسور اٹھا کر واٹ ٹریٹ کا وہ نمبر لایا جس پر مہاراج سے بات ہو سکتی تھی۔ کال فوراً ہی ریسور کئی گنی لیکن وہ آواز مہاراج کی نہیں تھی۔

”میں وجدان بول رہا ہوں۔ مہاراج سے بات کرنی ہے۔“

میں نے کہا۔

”اودھ۔ وجدان۔۔۔ میں گانگ ہوں۔ کہاں غائب ہو گئے تھیں تو ہم سے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

”ہمیں ایک ہمدرد خاتون ملی تھی جو ہمیں اپنے گھر لے آئی۔“ میں نے جواب دیا ”دیسے رساد کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔“

”ایک منٹ۔ مہاراج سے بات کرو۔“ دوسری طرف سے کہا۔

”تقریباً ایک منٹ خاموشی رہی پھر مہاراج کی آواز سنائی دی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر میں نے گمراہی سے بولے فون رکھ دیا۔“

”کیا ہوا؟“ جاگتی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”مہاراج نے ہم دیا ہے کہ ہم فوراً اس کے پاس پہنچ جائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر رساد سو رہا ہے۔ اگر اسے اٹھا کر لے جایا گیا تو اس کی تکلیف بڑھ جائے گی۔“ یہ بات ہپ لیونگ نے کہی تھی۔

”اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو ہم اسے نہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ کل دن میں کسی وقت گانگ کو بھیج کر اسے ہوائیں گے۔ ویسے کل تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں؟“ میں نے کہا۔

”میں تو کم از کم ایک ہفتے تک یہاں سے باہر نہیں نکلوں گی۔“

ہپ لیونگ نے جواب دیا ”اور میرے خیال میں رساد کو یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ویسے بھی اسے دو چار دن آرام کی ضرورت ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”ہم تمہاری گاڑی لے جا رہے ہیں۔ صبح گانگ واپس پہنچا دے گا۔“

میں نے رساد والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ خواب آور دروازے زیر اثر شرمی نیند سو رہا تھا۔

گاڑی کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ چابی بھی اینٹیشن میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک ڈرائیونگ نہیں سیکھی تھی اس لیے ڈرائیونگ سیٹ ڈاکٹر جاگی کو ہی سنبھالنی پڑی۔ میں پنجرز سیٹ پر بیٹھنے لگا تو میری نظریں ڈیش بورڈ پر رگے ہوئے دوپٹوں کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک جاگی کا ہسپتال تھا اور دوسرا دارا کا تھا جو جاگی نے سڑک پر سے اٹھا لیا تھا۔ میں نے دارا والا ہسپتال اٹھا کر ہپ لیونگ کی طرف بڑھا دیا۔

”کہہ لو شاید کسی وقت اس کی ضرورت پڑ جائے۔“

ہپ لیونگ نے مسکراتے ہوئے وہ ہسپتال لے لیا۔ جاگی گاڑی کا انجن اشارت کر چکی تھی۔ ہپ لیونگ نے گیٹ کھول دیا

اور جاگی گاڑی کو گیٹ سے نکال کر ہارے آئی۔

ہمیں واٹ ٹریٹ پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ ہمیں فوراً ہی اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں فون اور تھائی وائک موجود تھیں۔ تھائی وائک گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی جیسے یقین کر لیتا ہا تھا یہی ہو کہ میری کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی۔

”مہاراج بہت غصے میں ہیں۔ دھم۔“ تھائی وائک کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن دروازے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ مہاراج ماسٹر ہو چکے اور گانگ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو چکے تھے میں نے جلدی سے انہیں پوچھا کہ کس تنظیم دیتا۔ خصوصاً مارشل آرٹس کا سلام کیا اور وہ بوند انداز میں کھڑا ہو گیا۔

مہاراج چند لمبے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔

”مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے تفصیل سنتا چاہتا ہوں۔“

میرے منہ سے گمراہی سے نکل گیا۔ وہ غصے میں ہوتے تو ان کا لہجہ مختلف ہوتا۔ میں چند لمبے خاموش رہا پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ میں نے مہاراج کو وہ باتیں بھی بتادیں جو ہپ لیونگ سے معلوم ہوئی تھیں۔

”یہ تو سب جانتے تھے کہ سوامی رگوناتھ کا آشرم میٹھی اور بدکاری کا اڈا ہے۔ وہ ایسے تعلیمات کا پرچار کر رہا ہے جو معاشرے کو تباہ کر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ حکومت کے بعض بڑے بڑے عہدے دار اس کے ملوثہ عقیدت میں شامل ہیں۔ میں نے شاید غلط کر دیا۔ وہ اس کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بلیک میل کر رہا تھا اس لیے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا تھا اور دارا نے اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا اور آشرم کا سارا نظام ایک طرح سے اس نے خراب کر دیا۔ وہ لوگوں کو کل کر دھمکیاں دے رہا تھا۔ آپ نے منزلوں تائی کسی عورت کے بارے میں سنا ہو گا جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھی۔ وہ بھی اس کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی تھی۔ دارا نے آشرم کے کمپائونڈ میں سیڑگوں لوگوں کو اس کی مخالفت دکھائی تھی اور اگلے روز منزلوں تائی نے خودکشی کر لی تھی۔ لوگوں میں دارا کے خلاف اشتعال پھیل رہا تھا۔ آج ان کے ہر کانٹہ لبرز ہو گیا اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی دل بے گنے نے آشرم کی عمارت کو آگ لگا دی اور وہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔“

”اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔“ مہاراج نے کہا۔

”شاید۔“ میں نے سر ہلایا ”سوامی رگوناتھ اس وقت خانے میں تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی میں گنہگار تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی میں گنہگار تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی میں گنہگار تھا۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تمہاری وجہ سے بدکاری کا وہ اڈا ختم ہو گیا جس کے لیے لوگ عرصے سے شوق پاتے رہے تھے لیکن حکام کے کانوں پر جوں تک نہیں ریگتی تھی اور اس کی وجہ میں پہلے بھی سمجھتا تھا اور اب اس کی تصدیق بھی ہو گئی ہے۔“ مہاراج چند لمحوں کو خاموش ہوتے پھر بولے ”بدکاری کا ابھی ایک اڈا ختم ہوا ہے۔ ابھی بہت سی برائیاں ہیں جن کا خاتمہ کرنا ہے میں نے تمہیں اس لیے اڈا بتایا تھا کہ تمہیں ان برائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر سکوں۔ تم خود ان برائیوں کا شکار ہو چکے ہو۔ اس لیے تم اس بات کا اندازہ زیادہ بہتر طور پر لگا سکتے ہو کہ کوئی برائی کی دوسرے کی زندگی کو کس طرح متاثر کر سکتی ہے۔“ وہ خاموش ہو کر تھائی وائک وغیرہ کی طرف دیکھنے لگا ”تم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جن کو بروئے کار لا کر تم بدکاری کا مقابلہ کر سکتے ہو لیکن ابھی تمہارے اندر کی ان صلاحیتوں کو مزید ابھارنے کی ضرورت ہے اور اندر کی ان صلاحیتوں کو اس فن سے اٹھار دیا جاسکتا ہے جو میں تمہیں سکھا رہا ہوں۔ مارشل آرٹ صرف ہاتھ چیر چلانے کا نام نہیں اس میں ذہن بھی بڑی طرح ملوث ہوتا ہے۔ تمہاری ٹریننگ ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی تو بڑی تپسیا کی ضرورت ہے تمہیں۔ ابھی تو تمہارا ابتدائی مرحلہ بھی مکمل نہیں ہوا لیکن اس مرحلے میں بھی تم نے جو کچھ کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ میں تمہیں چشمِ تصور سے بہت اوپر دیکھ رہا ہوں اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں ان جیسی ساخت ملی ہیں۔ جوان اور حسین عورتیں عام طور پر تم جیسے فوجیوں کو گناہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن ان سے تمہیں بچی اور بے لوث محبت ملی ہے۔ یہ تمہیں کتنا چاہتی ہیں میں اس کا اندازہ لگا چکا ہوں۔ ان کے دلوں میں تمہارے لیے کسی بھی طرح کا کھوٹ نہیں بنا رہا ہے۔ سچا اور کھرا بنا۔ اور تمہارا وہ دوست رامن پرساد۔“ مہاراج ایک بار پھر خاموش ہو گئے میں نے تھائی وائک اور ڈاکٹر جاگی دیوی کی طرف دیکھا۔ مہاراج کی اس تعریف سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے ”کیا ہوا اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی؟“ مہاراج نے اپنی بات مکمل کر دی۔

”اس کے فتنے میں سوچ آگئی تھی۔“ میں نے جواب دیا ”ہپ لیونگ نے جو ڈھنگا کر ڈرننگ کر دی تھی۔ وہ اس وقت پُکون نیند سو رہا تھا اس لیے میں نے اسے جگا دیا اور ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”ٹھیک ہے۔ گانگ صبح جا کر اسے دیکھ آئے گا اور اس کا بھی پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ ویسے۔“ مہاراج نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”کیا نام ہے اس عورت کا۔ ہپ لیونگ۔ ہاں۔ ہپ لیونگ۔ اس سے تمہارا تعلق کتنا پرانا ہے۔ چند گھنٹوں کا؟ وہ تمہارا ساتھ دینے پر تیار کیوں ہو گئی۔ تم لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ کیوں دی۔ اس نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ اگر

تمہارے اندر کی سچائی کو پہچان لیا تھا۔ اس جیسے لوگ سچائی کا ساتھ دینے کے لیے خفارت کی پروا نہیں کرتے تمہاری نیت میں فتنہ ہوتا۔ تم میں برائی ہوئی۔ سچائی کا فقدان ہوتا تو تمہیں یہ نہیں اور باتیں نہ بنتیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اپنے اندر کی اس پرت کو بیدار رکھو۔ کپڑا اٹ۔ ویسے تم اپنی پتی (انسان کے وجود میں پائی جانے والی ایک پوشیدہ وادیہ پراسرار قوت جس کے بل بوتے پر ہمیرا عقل کارنامے سرانجام دے جاسکتے ہیں) کی ٹریننگ کب شروع کر رہے ہو؟“ مہاراج نے کہا۔

”جب آپ حکم کریں مہاراج۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ دو چار دن بعد میں خود تمہاری ٹریننگ شروع کروں گا۔“ مہاراج نے کہا پھر محبت بھری نظروں سے تھائی وغیرہ کی طرف دیکھا اور رخصت ہو گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ماسٹر ہو چنے نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں آنکھ مار کر مسکرایا۔

ان کے جاتے ہی تھائی وائک نے دو ڈر دروازہ بند کر دیا اور مڑ کر چند لمبے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی نظروں کا مطلب سمجھ سکا وہ دو ڈر کچھ سے لپٹ گئی۔ میری پیشانی اور گالوں پر اس نے بوسوں کی بارش کر دی تھی۔ میں گڑ بڑا کر پیچھے ہٹا ہوا پشت کے بل بیٹھ کر گر گیا۔ تھائی وائک بھی میرے اوپر گر گئی تھی۔ اس نے مجھے چھوڑا نہیں۔ میرے چہرے پر بوسے ثبت کر گئی رہی اور ڈاکٹر جاگی دیوی اور نونیا ایک طرف کھڑی قہقہے لگاتی رہیں۔

”اودھ۔ ارے۔۔۔ تھائی۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ میں اس کے بوجھ تلے دباؤں پہنچ رہا تھا۔

”ہاں میں واقعی پاگل ہو گئی ہوں۔“ تھائی نے سر اٹھا کر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”سنا نہیں تم نے کیا کیا تھا مہاراج نے؟ مارشل آرٹ کی دنیا کا سب سے عظیم آدمی تمہاری کتنی تعریف کر رہا تھا۔ اگر مہاراج کا خیال نہ ہوتا تو میں اسی وقت تمہیں دیونگ لیتی۔“

”چھ۔ اب تو چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

تھائی وائک نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مہاراج نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں واقعی خوش قسمت تھا کہ مجھے تھائی وائک اور ڈاکٹر جاگی دیوی جیسی محبت کرنے والی خاتون ملی تھیں۔ ان کی محبت کھری تھی۔ یہ مجھے میلی آنکھ سے نہیں دیکھتی تھیں۔ میں عرصے سے تھائی وائک کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش یا حرکت نہیں کی تھی جس سے میں کوئی غلطی مطلب اغذہ کر۔ یہ اس کی محبت کی سچائی ہی تھی کہ مہاراج سے میری تعریف سن کر جاگی اور نونیا کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ سے

پت گئی تھی۔

میں بیٹہ سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جاگی دیوی اور نوتا بھی کرسیوں پر بیٹھ چکی تھیں۔ اگرچہ رات کے ڈھائی بج چکے تھے لیکن نیند ہم میں سے کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ آج کے واقعے کے بعد تو مجھے اور جاگی دیوی کو نیند نہیں آنی چاہیے تھی۔ ہم جتنی دیر آشرم میں رہے تھے، موت سے آنکھ پھولی کھیلنے رہے تھے۔ اگر وہاں پر موجود تین چار سو لوگ ہنگامہ نہ کھڑا کر دیتے تو ہمارے لیے وہاں سے لکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ تو ہمیں یہاں آکر پتا چلا کہ مجھے اور ہر سادہ کو آشرم میں جانے کی اجازت دینے کے بعد ہمارا جگہ کاٹنا اور اس کے ساتھ دو لڑکوں کو بھی وہاں بھیج دیا تھا تاکہ اگر ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو وہ ہماری مدد کر سکیں لیکن وہاں ہنگامہ ہوجانے کی وجہ سے وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور دیوے بھی وہاں سب لوگ بڑ پٹنے ہوئے تھے۔ ہمارے بھی چہرے چھپے ہوئے تھے۔ شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ آشرم سے نکلے وقت ہم نے ہڈا تار پیچنے کے لیے اور دو پار پھلا گدے کا ہار آگے تھے۔ گانگ وغیرہ نے ہمیں اس وقت دیکھا تھا جب ہم ہم یوگ کی کار میں وہاں سے نکل رہے تھے اور پھر دارا کو بھی ایک کار میں وہاں سے نکلے دیکھ کر انہیں خطرے کا احساس ہوا تھا۔

مجھے جاگی دیوی پر حیرت ہوئی تھی۔ وہاں پان سی یہ عورت اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر دارا جیسے بد معاش سے بھڑکی تھی اور اسے آخر وقت تک روک رکھا تھا۔

”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ دارا وہاں سے فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟“ تھانی واٹک کی آواز سن کر میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔

”پیڈرو کے پاس جانے کے سوا اور کہاں جاسکتا ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر میں خود ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

”ہاں۔ وہیں گیا ہوگا۔ اس کے سوا وہ اور کہیں نہیں جاسکتا۔ وہی اس کی آخری امید ہے۔“

”کاش! میں اسے دیکھ سکتی۔“ تھانی نے گھرا سانس لینے ہوئے کہا۔

”اس کی حالت قابل دیدہ ہوگی۔ وہ اپنی بیویاں نوچ رہا ہوگا۔“

”فکر مت کرو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے اس حالت میں ضرور دیکھو گی۔“

”کاش! وہ دن جلدی آجائے۔“ تھانی واٹک نے کہا۔

”تم یہاں بیٹھی اس دن کا انتظار کرتی رہو۔ میں تو سونے جا رہی ہوں۔ سر میں بہت شدت کا درد ہو رہا ہے۔“ ڈاکٹر جاگی دیوی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے سر میں درد تو ہوتا ہی چاہیے تھا۔ دارا نے اسے بالوں سے پکڑ کر خوب کھینچا تھا۔ اس کا اوپر کا ہونٹ بھی سوجا ہوا تھا۔

”اوہ۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ تم لوگ ایک بہت بڑا معرکہ سر کر کے آئے ہو۔“ تھانی واٹک نے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”یہاں کو، تم اور نوتا ساتھ والے کمرے میں جا کر سوجاؤ۔ میں ابھی دھان سے کچھ باتیں کروں گی۔“

”ابھی طرح چیک کر لیتا۔ کس ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی اس کی۔“ جاگی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”صرف بڑا سوجا ہوا ہے۔ شاید غلطی سے ان میں سے کسی کا ہاتھ لگ گیا تھا۔“

جاگی اور نوتا دوسرے کمرے میں چل گئیں۔ تھانی واٹک نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور میرے سامنے آکر ایک بار پھر گرمی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی جو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ وہ پوچھی۔

”نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”صرف جڑے پر ایک ہاتھ پڑ گیا تھا اس کے سوا مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔“

”آؤ۔ یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ تھانی نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس وقت واقعی مجھے ٹھنکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ تھانی واٹک میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور مجھے میرا دل کیوں چاہئے لگا کہ میں اس کی گود میں سر رکھ کر سوجاؤں۔

اور پھر میں اپنی اس خواہش پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے آگے جھک کر اپنا سر تھانی واٹک کی گود میں رکھ دیا اور ناگھیں بیڈ پر پھیلا لیں۔ تھانی نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی اور میرے بالوں میں انگلیاں بھرنے لگی۔ میں عجیب سا سکون محسوس کرنے لگا۔ تھانی واٹک کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی لیکن میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور پھر میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو کمرے سے آنے والی دھوپ کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں بہت گرمی نیند سو رہا تھا۔ آنکھ کھلنے پر چند سیکنڈ تک تو میں سمجھ نہیں سکا کہ کہاں ہوں۔ آہستہ آہستہ تو اس بحال ہونے تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چونک گیا۔ میرا سر تھانی واٹک کی گود میں رکھا تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگے سو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

یہ کیسی عورت تھی جو رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی کہ میرا سر اس کی گود سے ہٹ جائے گا یا میری نیند خراب ہوگی۔ میرے دل میں عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔ کئی بار ایسا ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو میرے لیے تکلیف میں ڈالا تھا لیکن میں اس کی محبت کو ابھی تک کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت چاہتی تھی۔ اگر اس کا بس چلنا تو ایک لمحے کو بھی مجھے اپنے سے الگ نہ ہونے دیتی۔ یہ بھی اس کی چاہت کا ایک انداز تھا کہ میرا سر اپنی گود میں رکھے رات بھر بیٹھی جاگتی رہی تھی اور میں گرمی نیند سو رہا تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹایا اور

مجھے یہ اپنا سر اس کی گود سے اٹھانا چاہا۔ وہ بڑا سی گئی اور میرے سر کو دوبارہ گود میں رکھ لیا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر میرے سینے پر ٹک گیا۔ یہ حرکت اس سے نیند میں سرزد ہوئی تھی۔

”تھانی۔“ میں نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ہولے سے پکارا۔

اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ ”اوہ۔ تم جاگ گئے۔ سوجاؤ۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔“

”رات تو گزر گئی۔ دن نکلا ہوا ہے۔ وہ دیکھو۔ دھوپ کمرے میں آ رہی ہے۔“ میں نے آہستگی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی ہو۔ سوئی کیوں نہیں؟“

”سو تو رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تھانی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟“

”اس سوال کا جواب تو میں بھی نہیں جانتی۔“ تھانی نے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، دروازے پر ہلکی سی دھمک ہوئی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے پاتونگ کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ واٹ (WAT) کی ویسی نوجوان اور نہیں راہبہ تھی جس سے سب سے پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔

”ہیلو شل اسٹریٹ۔“ وہ مسکراتی ”دس بج رہے ہیں۔ تم لوگ ناشتا نہیں کرو گے؟“

”مطل باسٹرا۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہیں۔“ پاتونگ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گرمی ہو گئی۔

”ہمارا جگہ کا حکم ہے کہ آئندہ تمہیں اسی نام سے پکارا جائے۔ بہر حال، تم لوگ دس بندہ منٹ میں کھانے کے کمرے میں آ جاؤ۔“

پاتونگ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے مڑ کر کمرے میں دیکھا۔ تھانی واٹک بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اور پھر تقریباً بیس منٹ بعد ہم سب کھانے کے کمرے میں موجود تھے۔ وہاں پانچ چھ بکشتو بھی ایک میز کے گرد بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ پاتونگ نے ہمارے سامنے ناشتا لاکر رکھ دیا اور خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔

وہ بکشتو کچھ دیر بعد چلنی صاف کر کے ڈکال دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں ان بکشتوں کی خوراک جانتا تھا۔ انہوں نے ڈٹ کر کھایا ہوگا اور دوسر کو اس سے بھی زیادہ ڈٹ کر کھائیں گے۔ یہ بکشتو لوگ صبح اور دوپہر کی گود میں کھانا کھاتے تھے۔ رات کا کھانا یہ لوگ نہیں کھاتے تھے۔ بد مذہب کا کوئی شخص اگر بکشتو بننا چاہتا تو اسے چند شرائط کی پابندی کرنی پڑتی تھی جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ دوسرے کھانے کے بعد وہ کوئی ایسی چیز نہیں کھائیں گے جس سے پیٹ بھرتا ہو لیکن میں نے بہت سے بکشتوں کو رات کو

بھی خوب ڈٹ کر کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب پہلی ٹیننگ کے لیے مجھے پانڈی والے واٹ (بہا جی عبادت گاہ) میں بھیجا گیا تھا تو وہاں میں نے تمام بکشتوں کو رات کا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور جنگل والے کیمپ میں بھی سارے ہی بکشتو کھانا کھاتے تھے۔

ناشتا کرنے کے بعد ہم نے کافی بھی وہیں بیٹھ کر پی۔

”میں ان کوئی اخبار لے گیا یا باہر سے مٹھونا پڑے گا؟“ میں نے پاتونگ سے پوچھا۔

”تم لوگ اپنے کمرے میں چلو۔ میں لے کر آتی ہوں۔“

پاتونگ نے جواب دیا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر تھانی واٹ کے کمرے میں آگئے۔ تقریباً دس منٹ بعد پاتونگ اخبار لے کر آئی۔ اخبار تھانی زبان کا تھا۔ یہ زبان میں بولے اور سمجھے تو گناہ کا تین پڑھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر تصویریں دیکھ کر میں اخبار کی ہیڈ لائن کا متن سمجھ گیا۔ ایک تصویر چلتے ہوئے آشرم کی تھی۔ کچھ تصویریں چلی ہوئی گاڑیوں کی تھیں اور تین تصویریں لاشوں کی تھیں۔ ایک مرد اور دو عورتوں کی لاشیں تھیں جن کے چہرے پچانے نہیں جا رہے تھے۔ میں نے اخبار پڑھ کر تھانی واٹک کو دے دیا۔

”بڑھ کر پڑاؤ۔ کیا لکھا ہے۔“

تھانی واٹک نے اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا۔ ڈاکٹر جاگی اور نوتا بھی اس پر بھی ہوئی تھیں۔ اخبار کی ہیڈ لائن تو تھی سی آشرم کی آتش زدگی کے بارے میں، صفحہ اول پر اور بھی چھوٹی بڑی لاتعداد خبریں اس حوالے سے تھیں۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ تھانی واٹک نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اخبار اس کے ہاتھ سے نوتانے لے لیا تھا۔

”اس ہنگامے میں تین افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے ہیں۔ یہ تینوں آشرم سے باہر نکلنے کی کوشش میں کچلے گئے تھے۔ ان میں ایک مرد اور دو عورتیں شامل ہیں۔ زخمی ہونے والوں میں دو کو گولیاں لگی تھیں جبکہ کچھ زخمی بیل میں زخمی ہوئے۔ آشرم میں لگے والی آگ رات گئے تک قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ خیال ہے کہ کچھ لوگ آگ میں جل کر بھی ہلاک ہوئے ہوں گے۔“ تھانی واٹک کے بغیر کے جاری تھی ”آشرم کے باہر کچھ گاڑیوں کو بھی ذبح آتش کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق آشرم میں یہ ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب سواری رگوتا تھ کے چند گروں نے وہاں آئے ہوئے لوگوں کے چروں سے بڑھنے شروع کیے۔ انہیں شاید کچھ خاص لوگوں کی تلاش تھی جن کے بارے میں سواری رگوتا تھ بار بار اعلان کر رہا تھا کہ کچھ جرائم پیشہ لوگ آشرم میں کھس آئے ہیں۔ جو یہاں کا گرو سکون ماحول برباد کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جیسے چند روز سے ایک اور آدمی آشرم پر قابض تھا اور سواری رگوتا تھ اس کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ اسے نہ تو کوئی شخص نام سے جانتا ہے اور نہ چہرے سے پہچانتا ہے۔

وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا چہرہ پیشہ بڑ میں چھپائے رہتا تھا۔ اس کے کمرے بھی اپنے چہرے بڑ میں چھپائے رکھے تھے۔ آشرم میں بنگاے اور آتش زدگی کی اطلاع ملتے ہی پولیس اور دیگر اعلیٰ حکام موقع پر پہنچ گئے تھے۔ اعلیٰ سطح پر تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے۔ عوام نے اس واقعے پر شدید تذلل کا اظہار کیا ہے۔ بعض سیاست دانوں کے بیانات بھی اخبار میں چھپے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی حکومت کو سوامی رگوناتھ کی ناپائیدار سرگرمیوں سے آگاہ کرتے رہے ہیں لیکن عیاش حکمرانوں نے کبھی اس کا نوٹس نہیں لیا جس کا نتیجہ آج اس بنگاے کی صورت میں نکلا۔

”اور سوامی رگوناتھ کے بارے میں کوئی اطلاع؟“ میں نے تھائی کے خاموش ہونے پر سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ لاپتا ہے۔“ تھائی نے جواب دیا ”لوگوں کے کہنے کے مطابق وہ بھارتی فحتم کر کے آشرم کی عمارت کے اندر چلا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے عمارت کے اندر سے شور اور گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ سوامی رگوناتھ کے بارے میں فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بھی اس آگ میں جل کر مر گیا ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بہر حال، اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اعلیٰ حکام نے یقین دلایا ہے کہ اس واقعے کی غیر جانب دارانہ تحقیق کی جائے گی اور اس کے ذمے داروں کو سخت ترین سزا دی جائے گی۔“ وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئی پھر حکمرانوں کو بے نقطہ خانے لگی ”راشی“ بے قصیدہ۔ جب ہر طرف سے سوامی اور اس کے آشرم کے خلاف آوازیں اٹھانی جاری تھیں تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رہتی تھی۔ اب معاملہ ہاتھ سے نکل گیا ہے اور کوئی لوگ مارے گئے ہیں تو انہیں قانون یاد آ رہا ہے۔“

تھائی وانگ دیر تک بیڑائی رہی اور میں اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے دارا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ یقیناً پیڑ روٹی کے پاس چلا گیا ہوگا۔ چند روز تک تو وہ دیکھا رہے گا اور اس کے بعد ہی کوئی کارروائی کرے گا۔ میں اگرچہ پوری طرح اس کے خلاف سرگرم نہیں ہوا تھا لیکن لاکڑا کا جو کارروائیاں کی تھیں ان سے بھی اسے خاصا نقصان ہوا تھا۔

سوامی رگوناتھ کا آشرم تو سونے کی کان تھا۔ تھانے کس طرح اس نے رگوناتھ کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ وہ اس آشرم سے کروڑوں بھات کما سکتا تھا اور یہ مستقل آمدنی تھی۔ کبھی فحتم نہ ہونے والی۔ سوامی رگوناتھ کی طرح وہ بھی میانہ روٹی سے کام لیتا تو لوگ خاموشی سے بلیک میل ہوتے رہتے لیکن وہ شاید ایک ہی مرتبہ ان کی تجویز خالی کر دینا چاہتا تھا جس سے لوگ اندر ہی اندر اس کے خلاف ہوتے جا رہے تھے اور پھر میں سے ملتی پرتیل کا کام کیا۔ میں درحقیقت سوامی رگوناتھ یا اس کے آشرم کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف دارا کے پکڑ میں دھنسا گیا تھا۔ صرف دارا کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا لیکن لوگ پہلے ہی سے بھرے

بیٹھے تھے۔ انہیں موقع مل گیا اور اس طرح آشرم کی کمانی فحتم ہو گئی۔ ہم لوگ اس صورت حال پر ہمو کر رہے تھے کہ گانگ بھی آیا۔ وہ صبح ہی ہپ لیونگ کی گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ صبح جانے سے پہلے اس نے جاگن دیوی کو چکا کر اس سے ہپ لیونگ کے گھر کا پتا سمجھ لیا تھا۔

”وہاں سب ٹھیک ہے، مثل ماسٹر۔“ گانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہپ لیونگ کا کافی اچل چل چند روز تک گھر سے باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ پر ساد کا پوری طرح خیال رکھے ہوئے ہے۔ وہاں اگرچہ انہیں کوئی خطرو نہیں ہے لیکن ہمارا راج کے حکم پر میں نے دو لڑکوں کو وہاں چھوڑ دیا ہے۔ ایک مکان کے اندر رہے گا اور دوسرا دورہ کر گھرائی کرے گا تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو اس کی اطلاع دے سکے۔ دیے وہ بگلا بالکل محفوظ ہے۔ وہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہو گانگ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گانگ تھوڑی دیر بیٹھے کے بعد چلا گیا۔ ہمیں فی الحال کوئی کام نہیں تھا اس لیے باتوں میں وقت گزارتے رہے۔ دوسرا مکان کھاناکر میں سو گیا اور جب آٹھ بجی تو شام واصل رہی تھی۔ تھائی وانگ نے بتایا کہ تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے پر ساد کا فون آیا تھا۔ اس نے اپنا نمبر نکھوڑا ہے۔ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر تھائی کا بتایا ہوا نمبر دیا۔ کال ہپ لیونگ نے ریسیور اٹھی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے ریسیور پر ساد کو دے دیا۔

”ہیلو پر ساد۔ کیسے ہو۔ تمہارے چہرے پر کی تکلیف کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں باس۔“ پر ساد نے جواب دیا ”ایک اہم اطلاع دینی تھی۔“

”کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے تو کبھی سوئے میں خواب نہیں دیکھا، مجھے میں کیا دیکھوں گا باس۔“ پر ساد نے کہا ”میں نے اپنے ایک بندے کو فون کیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے اسی نے دی ہے۔“

”کیسی اطلاع؟“ میں نے پوچھا۔

”دارا پیڈرو کے پاس پہنچ چکا ہے اور انہیں شبہ ہے کہ ہم چائنا ٹاؤن والے اس فلیٹ میں چھپے ہوئے ہیں جہاں سے کرائے پر لیا تھا۔ ان کے آدمی آج رات وہاں ریڈ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“ پر ساد نے کہا۔

”بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے کہا ”وہ فلیٹ چھوڑے ہوئے تو کئی روز ہو چکے ہیں۔ انہیں یہ شبہ کیسے ہوا کہ ہم وہاں جا سکتے ہیں؟“

”وہ فلیٹ ہے تو ابھی تک میرے ہی نام پر ہو سکتا ہے انہیں کسی طرح یہ شبہ ہو گیا ہو۔“ پر ساد نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر وہ لوگ اس فلیٹ پر ریڈ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے لیکن۔“ میں خاموش ہو گیا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا تھا ”وہ لوگ اس فلیٹ پر ریڈ کا جھانسا دے کر کوئی اور کارروائی تو نہیں کرنا چاہتے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ پر ساد نے کہا ”جس جگہ میں موجود ہوں اس کا انہیں پتا نہیں۔ ہمارا راج کے جنازیم پر حملہ کر کے وہ زندگی کی بات سے بڑی غلطی کریں گے اور وراثت کا رخ کرنے کی وہ بات نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”تم نے اپنے آدمی کو ہپ لیونگ کا نمبر تو نہیں دیا؟“

”نہیں باس۔ میں ایسی بے وقوفی نہیں کر سکتا۔“ پر ساد نے جواب دیا۔

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد تم دوبارہ اس آدمی کو فون کر کے معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ ان کا اصل منصوبہ کیا ہے اور دیے بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے اطلاع دینا۔“

”تیس باس۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور کمرے میں واپس آکر تھائی وانگ دیکھو کہ پر ساد کے فون کے بارے میں بتاے گا۔ میرے خیال میں ہمارا راج اور ماسٹر ہو جن کو بھی یہ اطلاع دینا ضروری تھا۔ گانگ چند لوگوں کے ساتھ آج کل ایسی بد عمارت گاہی میں رہ رہا تھا۔ میں نے اسے ہلکا کر صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”ٹھیک ہے مثل ماسٹر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں ہمارا راج اور ماسٹر ہو جن کو اطلاع کر دیتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو۔“

میں نے اگرچہ ہمارا راج اور ماسٹر ہو جن کو اطلاع بھیج دی تھی لیکن میرے دل میں ایک غلط تھی۔ ذہن میں ایک کلک سی تھی۔ مجھے میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے کو تیار کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا اور وہ گڑبڑ کیا ہو سکتی تھی۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

رات نو بجے کے قریب پر ساد کا فون آیا۔

”میرے خبر کو کی بات معلوم ہوئی تھی جو وہ پہلے ہی بتا چکا ہے۔“ اس نے کہا۔

”لیکن پر ساد۔“ میں نے کہا ”یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔“

”تو پھر خاموش بیٹھے رہو باس۔ اپنے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔“ پر ساد نے جواب دیا۔

میں کچھ دیر اور فون پر پر ساد سے باتیں کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا۔ پر ساد سے اس اطلاع کی تصدیق ہوجانے کے بعد میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اگرچہ یہ مشورہ دیا تھا کہ میں خاموش بیٹھا رہوں اور اپنے ذہن کو الجھانے کی کوشش نہ کروں لیکن میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

تھائی وانگ اور جاگن دیوی بھی میرے اس خیال سے متفق تھیں کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور دارا وغیرہ ہمیں دھوکے میں رکھ کر کوئی اور کارروائی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کارروائی کریں گے۔

”اوہ! میں ایک دم اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال آیا تھا۔“ تھائی۔ ”میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے جب میں اور تم ریجنٹ اندرا ہوٹل گئے تھے تو انہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ تھائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”اس واقعے کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ انہوں نے ماسٹر ہو کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔“

”اور اس کے دو دن بعد انہوں نے تمہارے بیٹے پر حملہ کر دیا تھا اور ہم بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ سکے تھے۔ انہوں نے بیٹے کو آگ لگا دی تھی اور تمہیں معلوم ہے تمہارے بیٹے کا پتا انہوں نے کیسے لگایا تھا؟“

”میری کار ریجنٹ اندرا ہوٹل میں رہ گئی تھی اور انہوں نے کار کے رجسٹریشن نمبر سے میرے گھر کا پتا معلوم کر لیا تھا اور۔۔۔ اور۔۔۔ تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ میری طرف دیکھتے لگی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرائے تھے۔

”گزشتہ رات ہم ہپ لیونگ کی کار میں تھے۔“ میں نے کہا۔ ”دارا نے راستے میں ہماری کار روک کر حملہ کیا تھا۔ جاگن اور دارا کار کے سامنے ایک دوسرے سے ٹھکڑا تھا اور ہے تھے۔ دارا بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے ہپ لیونگ کی کار کا نمبر دیکھ لیا ہوگا اور۔۔۔ میں جملہ کھل نہیں کر سکا۔ بدترین فحش بات میرے ذہن میں سر اُبھارنے لگی اور دارا میں آندھیاں ہی چلنے لگیں۔“

”تمہارا مطلب ہے دارا نے ہپ لیونگ کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا اور۔۔۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ اس شیطان سے کچھ بعید نہیں۔ ایک منصف میں ابھی آتا ہوں۔“ میں یہ کہتے ہوئے فون دانے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ یہاں آتے ہی میں نے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور ہپ لیونگ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال تیسری گھنٹی پر ریسیور لگی تھی۔ آواز ہپ لیونگ کی تھی۔

”ہیلو ہپ۔“ میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا ”پر ساد کو ریسیور دو۔“



”ایک منٹ ہولڈ کرو۔“ جواب ملا اور خاموشی چھا گئی پھر ٹھیک ایک منٹ بعد ہی رساوی آواز سنائی دی تھی۔  
”میں باس۔ کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
”پرساد۔ تم جس حالت میں بھی ہو ہپ لیونگ کو لے کر وہاں سے نکل لو۔“ میں نے کہا۔  
”کیا بات ہے باس۔ تم بہت گھبرائے ہوئے ہو؟“ پرساد نے پوچھا۔

”اراکہ حال کو میں سمجھ گیا ہوں پرساد۔“ میں نے کہا ”مجھے شہ ہے کہ اس نے ہپ لیونگ کی کار کے رجسٹریشن نمبر کے ذریعے اس جھگے کا پتا چلا لیا ہے اور مجھے یہ بھی شہ ہے کہ وہ آج رات کہیں اور نہیں بلکہ اسی جھگے پر ریڈ کرے گا۔ تم ابھی لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے نکلو اور اٹ ٹریسٹ پہنچ جاؤ۔ ہمارا ج کے دو آدمی تم لوگوں کی حفاظت کے لیے وہاں چھوڑے گئے تھے۔ وہ کہاں ہیں؟“

”ایک دھکی کے موڑ پر ہے اور دو سرا جھگے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔“ پرساد نے جواب دیا۔  
”ٹھیک ہے۔ تم لوگ فوراً وہاں سے نکلو اور ان دونوں کو بھی وہاں سے ہٹا دو۔“ میں نے کہا۔  
”تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے باس۔“ پرساد نے جواب دیا  
”ٹھیک ہے۔ ہم چند منٹ میں اس سے روانہ ہو رہے ہیں۔“  
میں نے فون رکھ دیا اور دوبارہ اسی کمرے میں آ گیا۔ میں نے تھائی واک اور جاگی دیوی کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پرساد اور ہپ لیونگ کو جھگے سے نکلنے اور یہاں تک پہنچنے میں چالیس پینتالیس منٹ ضرور لگیں گے۔ پرساد کو خبردار کر کے مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن نبانے کیا بات تھی کہ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور پھر گانگ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چمک گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں ہی اڑ رہی تھیں۔  
”کلیا ہوا گانگ؟“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔  
”گڈ بڑ ہو گئی باس۔“ گانگ نے جواب دیا ”ہمارے ایک لڑکے نے فون پر اطلاع دی ہے کہ پیڈرو کے آدمی ہپ لیونگ کے جھگے میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا ج نے سو حکم وٹ فنی غری پر واقع اپنے ایک شاگرد کو تو فون کر دیا ہے۔ وہ لوگ وہاں پہنچنے والے ہوں گے۔ ہم بھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔“  
میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ”غصو۔ میں بھی چلتا ہوں۔“  
میں نے کہا اور ٹیلی فون والے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر ہپ لیونگ کے جھگے کے نمبر ڈائل کئے۔  
دوسری طرف سے ٹیلی فون کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔

کبھی تھل جکتی ہوئی سنائی دیتی اور کبھی آنچل کی ٹون سنائی دینے لگتی۔ میں نے ریسیو ریخ دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹیلی فون کی لائن کاٹ دی گئی تھی۔

میں دووازے کی طرف مڑا تو تھائی اور جاگی دیوی وہاں کھڑی تھیں۔ جاگی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہسپتال میری طرف بڑھا دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہپ لیونگ کے گھر پہنچنے کے لیے اطلاع ملنے کے بعد میں یہاں رک نہیں سکوں گا اس لیے وہ اپنے کمرے سے ہسپتال نکال لائی تھی۔ میں نے ہسپتال لے کر جب میں ڈال لیا اور گانگ کے ساتھ واٹ کے عقبی گیٹ کی طرف بھاگنے لگا۔

گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف سیاہ رنگ کی دیوار کھڑی تھی جس میں چار آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس چینی ساختہ اس کے فورسین آٹومک رائفل تھی۔  
وین کا انجن اشارت تھا اور انہیں شاید ہماری انتظار تھا۔ ہمارے پیچھے ہی دین حرکت میں آئی اور گیٹ سے نکل کر تیز رفتاری سے رانا فور روڈ پر دوڑنے لگی۔ یہ سڑک بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔

ابھی رات کے دس بجے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک تھا۔ وین کے ڈرائیور کو ایسی پُرجوش سڑکوں پر گاڑی چلانے کی خاصی مہارت تھی۔ اس وقت بھی وہ رفتار کم کیے بغیر بڑی مہارت کا ثبوت دے رہا تھا۔ دو جگہ وہ سٹپل توڑا ہوا نکل گیا تھا۔ کھونٹوں کی ڈسٹرکٹ میں سونے ایک سو تیس سے ڈرا آگے اس نے وین سو حکم وٹ تھائی سکس پر موڑ لی اور تین سو حکم وٹ روڈ کراس کرتے ہوئے سو حکم وٹ تھائی سکس پر آگے اب راستہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

وین جیسے ہی تھاگ لو روڈ پر مڑی، فائزنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہوتو کے آدمی ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے اور پیڈرو کے آدمیوں سے ان کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔

میں ایک لڑکے کے ساتھ گلی کے موڑ پر اڑ گیا اور عقبی گلی کی طرف دوڑنا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں جھگے کے چھبلی طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ عقبی گلی سے وہ بگلا حاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دیوار تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ میں اپنے سامنے کا سارالے کر دیوار پر چڑھا اور پھر اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہسپتال بھی ہاتھ میں لے لیا تھا۔

دیوار پر چڑھتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ لڑائی جھگے کے اندر نہیں بلکہ دوسری طرف سامنے والی گلی میں ہو رہی تھی۔ میں دیوار سے کود کر عقبی برآمدے میں پہنچ گیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے کی ہول پر ہسپتال رکھ کر ڈنگر دیا۔ لاک ٹوٹ گیا۔ میں نے ہسپتال کو جھٹکا دے کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میرا سامنے بھی میرے ساتھ ہی اندر داخل ہوا تھا۔ وہ مجھے رکے کا

اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا لیکن میں اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔

تمام کمروں کی پتیاں جل رہی تھیں۔ ہال نما کمرے میں لٹا ہوا فرنیچر پتا ہوا تھا کہ یہاں اچھی خاصی دھینک ششی ہوئی تھی۔ میں پرساد والے کمرے کی طرف دوڑا اور جیسے ہی کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا، میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ پرساد کمرے میں موجود نہیں تھا۔ بستر کی چادر کے علاوہ وہ تین جگہوں پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ہر چیز اتنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں اس طرف لپکا مگر ہاتھ روم غالی تھا۔

”پرساد۔“ ہپ لیونگ۔ میں نے کمرے کے دروازے پر آکر پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

میرے ساتھ آنے والا دو سرا لڑکا بھی کمروں میں جھانکنے پھر رہا تھا۔ میں سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ہپ لیونگ کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ وہ ہاتھ روم کے دروازے کے قریب فرش پر پڑی تھی اور اس کے پیٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخم پر تھا۔

”ٹھیک۔“ لیونگ۔ آٹھیس کھولو۔ میں ہوں وجہ ان۔۔۔“

میں اس کے کال پیسٹا سے ہونے سے پکارنے لگا۔  
ہپ لیونگ نے آٹھیس کھول دیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ شاید مجھے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔  
”وہ۔۔۔ وہ لوگ۔۔۔ اسے لے۔۔۔ گئے۔“ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے قہر قہرائی ہوئی سی آواز نکلی ”مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں نے اسے بچانے کی۔۔۔ کوشش کی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آٹھیس بھی بند ہو گئی تھیں۔

میں اسے اٹھا کر ہال نما کمرے میں لے آیا اور ایک صوفے پر لٹا دیا۔ اس نے پیٹ کے زخم پر ہاتھ رکھا ہوا تھا لیکن خون رن رہا تھا۔ میرا دو سرا ساتھی برآمدے والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا اور پھر اس کی چیخ سن کر میں بھی دوڑنا ہوا برآمدے میں گیا۔ گانگ کا بیچا ہوا محافظ لڑکا ہپ لیونگ کی کار کے قریب نہیں پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر کئی جگہوں سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔

فائزنگ کی آوازیں اب گلی میں دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہوتو کے آدمی پیڈرو کے آدمیوں کا پیچھا کر رہے تھے۔  
”باہر نکلو اور ان کو اندر بلاؤ۔“ میں نے اپنے ساتھی سے چیخ کر کہا۔

وہ گیٹ سے نکل کر پہنچے۔ چند سیکنڈ بعد ہی دو آدمی اندر آگئے اور پھر کچھ دیر بعد گانگ بھی دوڑنا ہوا وہاں پہنچ گیا۔  
”وہ لوگ پرساد کو اٹھا کر لے گئے گانگ۔“ میں نے چیخ کر کہا۔  
”تمہاری آدمی اور ہپ لیونگ شدید زخمی ہیں۔“

گانگ نے اپنے آدمیوں سے چیخ کر کچھ کہا۔ ان میں سے ایک باہر دوڑ گیا۔ دو منٹ بعد وین گیٹ کے سامنے آکر رکی۔ ہپ لیونگ اور دوسرے زخمی کو اٹھا کر وین میں ڈال دیا گیا۔ گانگ نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا اور خود اسٹیشنرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے وین میں بیٹھ کر ہپ لیونگ کا سر اپنے کھٹے پر رکھ لیا۔ وہ آٹھیس کھول کر میری طرف دیکھنے لگی۔

”کھڑا نہیں۔“ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”ہم تمہیں اسپتال لے جا رہے ہیں۔ تھوڑا جاؤ گی۔“  
ہپ لیونگ کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ گانگ وین کو حرکت میں لے آیا تھا اور پھر کچھ اسی وقت کسی طرف سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ گانگ وین کو اوپر والی گلی میں گھما کر تھاگ لو روڈ پر لے آیا اور اس کی رفتار بڑھا دی۔ اس سڑک پر تقریباً ایک میل آگے جگہ دیش کے سفارت خانے کے قریب ایک بہت بڑا اسپتال تھا اور وہاں تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔

اسپتال کی انتظامیہ نے کیس لینے سے انکار کر دیا۔ پرائیویٹ اسپتال اس قسم کے کیس نہیں لینے تھے جن میں کسی بھی قسم کی قانونی کارروائی کا احتمال ہو۔

”اگر تم لوگوں نے فوری طور پر انہیں ٹریٹ منٹ نہ دیا تو ہمارا ج کے آدمی اس اسپتال کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“ گانگ نے چیخ کر کہا۔ اس کی یہ دھمکی کام کر گئی اور دونوں زخمیوں کو فوری طور پر آٹھیس پھیریں پٹپٹا دیا گیا۔  
گانگ استقبالیہ کاؤنٹر پر آ گیا اور ٹیلی فون پر ہمارا ج کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ گانگ نے مجھے اشارہ کر دیا۔ میں لالی میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ گانگ پولیس پابلی سے ٹھننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پولیس آفیسر اسے داؤ میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی وہ چیخنے لگتا اور کبھی گانگ پولیس آفیسر کچھ زیادہ سی اکڑھٹا تھا۔ اس نے گانگ کو ہاند سے پکڑ لیا اور اسے ایک طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگا مگر گانگ اڑ گیا۔ دو پولیس والے جا ہی سے آگے بڑھے۔ ایک پولیس والے نے گانگ کو گھونسا چھاپا مگر گانگ نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔  
”سنو آفیسر!“ وہ پولیس آفیسر کی طرف دیکھ کر چیخا ”تم اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہو۔ کوئی جرم ثابت ہونے سے پہلے تمہیں کسی پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارے خلاف اپنا قانونی حق استعمال کروں گا۔“ اس نے ایک جھٹکے سے دوسرے پولیس والے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

پولیس آفیسر کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ سڑک چھاپ ٹھنڈوں سے ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں تھا اور دن میں نبانے

آتش فشاں 272 حصہ 1

اس شخص کا نام سکدر تھا۔ سکدر کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ بازوؤں کے مسل ابھرے ہوئے تھے جس سے اس کی جسمانی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس کا تعلق مہاراج کے کسی جہازیم سے نہیں تھا۔ شکل و صورت اور لباس سے بھی وہ کچھ شریف ہی لگتا تھا اس لیے اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی اسے مہاراج کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔

مہاراج سے اجازت لیتے ہی ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گانگ عبادت گاہ میں استعمال ہونے والی ایک گاڑی پر گلی کے موڑ پر اتار کر واپس چلا گیا تھا۔ ہم بہت مختل انداز میں چلتے ہوئے جاگی والے بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔

پورچ میں وہ کار بھی کھڑی تھی جو ہر سائے ایک ریئل ایجنسی سے کرائے پر لے رکھی تھی اور بنگلے کے اندر بھی صورت حال معمول کے مطابق نظر آتی تھی۔ چڑوں پر گرد جی ہوئی تھی اور اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ہمارے بعد یہاں کسی نے مداخلت نہیں کی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ بنگلا ان کی نظروں سے محفوظ ہی رہا تھا۔ میں نے سکدر کو ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے بازار بھیج دیا اور تھائی کے ساتھ مل کر صفائی وغیرہ کرنے لگا۔ مچن میں بھی برتنوں پر دھول جی ہوئی تھی جنہیں تھائی نے دھو کر رکھ دیا۔ اس نے فریج بھی آن کر دیا تھا۔ میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر دیکھا اس میں نوٹ موجود تھی۔ میں نے ڈاکٹر جاگی کے گھر کا نمبر لپٹا۔ تیسری کھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

”ہیلو جاگی۔“ میں نے کہا ”وہاں بول رہا ہوں۔“  
”اوہ۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا“ دوسری طرف سے جاگی کی آواز سنائی دی۔

”ہم تمہارے بنگلے میں آگئے ہیں۔ تم لوگ واپس پر واٹ ٹرمیٹ جانے کے بجائے یہیں پر آ جاؤ۔ ویسے تم لوگ کب نکلو گی؟“ میں نے پوچھا۔

”تو بچے کے قریب۔“ جاگی نے جواب دیا۔  
”اوکے رات کو ملاقات ہوگی۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

”وہ دونوں نوبے کے قریب وہاں سے نکلیں گی۔ میرا خیال ہے ہم کبھی دس بجے یہاں سے نکل جائیں۔“ میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ“ تھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے ”اس لیے تم واٹ سے بھاگے ہو۔“

”ہاں۔ وہاں رہ کر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں کم از کم نقل و حرکت کے لیے تو آزاد ہوں گے۔“ میں نے جواب دیا۔  
تھوڑی ہی دیر بعد سکدر مطلوبہ چیزیں لے آیا تھا۔ تھائی بھی

میں تھس کر کافی بنانے لگی اور میں ایک میلا کپڑا لے کر باہر گیا اور کار صاف کرنے لگا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ یہ کار کرائے پر حاصل کی گئی تھی۔ پر سائے کئی روز سے کرائے کی ادائیگی کے لیے ایجنسی والوں سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے پر سائے کے لیے ہوئے ایڈریس پر رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو اور پتا چل گیا ہو کہ وہ ایڈریس جعلی تھا اور ایجنسی نے پولیس میں رپورٹ کھوڑا رکھی ہو یا ممکن ہے قرآن نوک روڈ والے مکان سے پیڑو کے آدمیوں کو اس کار کے بارے میں پتا چل گیا ہو اور وہ لوگ بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کار کی نمبر پلیٹیں اُتار دیں۔ بغیر نمبر پلیٹ کے کوئی گاڑی سڑکوں پر لانا اگرچہ جرم تھا لیکن اس شہر میں لا قانونیت کے ساتھ کرپشن بھی اپنی اتھکا کو بچتی ہوئی تھی۔ ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں کسی پولیس والے کی جیب میں سو پچاس بھات ڈال کر اسے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔

کانی پینے کے بعد کچھ دیر ہمیں تیار میں لگ گئی۔ میں نے ہر ممکن حد تک اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں کمرے سے نکلا تو سکدر ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”کیا اب کوشش ہے۔ فوری طور پر شناخت نہیں کیا جاسکتا۔“ اس نے کہا۔

اور پھر تقریباً اسی وقت تھائی واگ بھی اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر میں بھی چوٹے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ سکدر کی آنکھوں میں تو عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ تھائی واگ ایک بھر پور جوان عورت تھی۔ اس نے جو لباس پہنا تھا اس سے اس کے بدن کے خدو خال بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ اس نے بہت عرصے بعد اس قسم کا لباس پہنا تھا اور سکدر کو لپٹائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے پھر کچھ کہنے میں دیر نہیں لگی کہ تھائی کلب میں بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہے گی اور یہ بات ہمارے لیے خطرناک بھی ہو سکتی تھی لیکن بہر حال خطرے میں تو ہم کو ہی رہے تھے۔ میں نے اپنے لباس میں خنجر چھپالیا تھا اور ہسٹل تھائی کے حوالے کر دیا تھا جسے اس نے اپنے پر س میں رکھ لیا۔

کار کا انجن بدی مشکل سے اشارت ہوا۔ نیکی میں بیڑول بھی کم تھا۔ گلی سے نکل کر پچا چھک روڈ پر واقع ایک بیڑول پمپ سے نیکی فل کر دوائی اور پھر واٹ لکھایا اور واٹ اندن کے سامنے سے ہوتے ہوئے کار تھائی نے اس پر انیویٹ روڈ پر موڑ دی جو دریا کے کنارے پر واقع تھا ذرا فاصلے پر ریسنورٹ کلب بھی لگی تھی۔

دریا کے کنارے پر درود تک بہت دیر ایسا گھبراہٹ تھا۔ دستاؤد عریض باغ تھاجس میں وہ خوب صورت دو منزلہ عمارت تھی۔ اس مرکزی عمارت کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی عمارتیں تھیں ایک طرف وسیع پارک ایریا تھا جہاں بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔

تھائی نے کار ایک مناسب جگہ پر روک کر انجن بند کر دیا اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔

ہم درختوں کے چھ میں بجری والی روش پر چلتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف نکل گئے۔ وہ علاقہ پرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہم دوسری روش پر سڑگئے۔ عمارت کے وسیع و عریض برآمدے میں داخل ہوئے تو دریا بنے ہمیں دیکھ کر شیشے والا دروازہ کھول دیا۔ ہم دروازے میں داخل ہوئے ہی چاہتے تھے کہ اندر سے آنے والا ایک آدمی تھائی واگ سے کرا گیا۔ وہ شاید بہت جگت میں تھا۔ تھائی سے کرا کر وہ بھی لڑکھایا اور تھائی بھی لڑکھائی تھی اور پھر وہ دونوں بچنے فریض پر بھاگے۔ وہ دم سے نیچے کر گئے سفید سوٹ میں لمبوس وہ شخص بڑی بھرتی سے اٹھ گیا اور محذرت کرتے ہوئے تھائی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں چپختے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور پھر رک گیا۔ میری نظرس اس شخص کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ ہنسی ناگ تھا!

جی ناگ نے میری طرف دیکھا اور پھر ”سوری مسٹر“ کہتے ہوئے تھائی کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسے سارا دینے کے لیے پھر ہاتھ آگے بڑھا دیا ”سوری میڈم“ میں جلدی میں تھا۔ تمہیں دیکھ نہیں سکا۔ چوٹ تو نہیں لگی؟“

”نہیں۔“ تھائی نے نہ بڑھکتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جی ناگ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے پورے بدن میں مستثنیٰ کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔ یہ ہمارا بدترین دشمن تھا اور ہم سوچ بھی نہیں کھتے تھے کہ اس طرح ایک دوسرے کے آنے سامنے اور اتنا قریب آجائیں گے۔

جی ناگ نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور محذرت کرتا ہوا تیزی سے برآمدے کی بیڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ قریب کون تھا؟“ میں نے دریا بن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لوگوں کو ایسی جگہوں پر اٹھنے بیٹھنے کی تیز میں رہی۔ سب آداب بھول گئے ہیں۔“

”یہ مسٹری ناگ ہیں سر۔“ دریا بن نے جواب دیا ”اسٹریڈو کے دست راست سمجھے جاتے ہیں۔“  
”اور یہ اسٹریڈو کون ہے؟ کوئی بہت بڑا مارشل آرٹسٹ!“ میں نے دریا بن کو گھورا۔

”تیرت ہے آپ اسٹریڈو کو نہیں جانتے۔“ دریا بن نے کہا ”اسے بنگاک کا سب سے طاقت ور آدمی سمجھا جاتا ہے۔ شہر کے بڑے بڑے خزانے اور بد معاش اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اور پولیس کے اعلیٰ افسران اس کا نام سن کر ہی کانپنے لگتے ہیں۔“

”اوہ تم کتنا چاہتے ہو کہ پیڑو کوئی بہت بڑا بد معاش ہے۔“ میں نے کہا ”کیا یہ ریسنورٹ اس کی ملکیت ہے؟“

”اس کی ملکیت تو نہیں لیکن اس جیسے تمام بڑے ریسنورٹ“ ہوٹل اور ٹائٹ کلب اس کے کنٹرول میں ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی ہوٹل یا ٹائٹ کلب اپنا کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا۔“

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ ٹائیکر کو زہر زین دیا کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ٹائیکر تو اپنے ایک دشمن کے ہاتھوں مارا گیا سر۔ اب سارا نظام پیڑو نے سنبھال رکھا ہے۔“ دریا بن نے جواب دیا۔

”اوہ۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی اور شخص ہے جو ان سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔“ میں نے کہا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دریا بن سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔

”نیلے پر دھلا تو ضرور ہوتا ہے سر۔“ دریا بن نے جواب دیا ”پیڑو کو ٹائیکر کی موت کا بہت دکھ ہے۔ اس نے ٹائیکر کے قاتل کو پکڑنے کے لیے دو ملین بھات کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔“

”دو ملین بھات۔“ میں نے ہونٹوں پر زبان بھرتے ہوئے کہا ”اگر تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہم انعام کی رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔“

”اپنی اپنی قسمت کہاں سر۔“ دریا بن مسکرایا ”وہ تو سنا ہے چھلاوہ ہے۔ اسٹریڈو کا پورا ٹائیک اس کی تلاش میں ہے لیکن آج تک وہ اس پر قابو نہیں پاسکے۔ البتہ وہ آج اسٹریڈو ہر چند روز بعد انہیں کوئی نہ کوئی ایسی چپٹ لگا دیتا ہے جس سے انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ابھی چند روز پہلے اس نے آشرم تباہ کر دیا تھا جس سے انہیں کروڑوں بھات کا نقصان اٹھانا پڑا۔“

”وہ آشرم تو سواری رگونا تھ کا تھا۔ روحانیت کا مرکز۔ اس سے ان کا کیا تعلق؟“ میں نے پوچھا۔

”پیڑو کا ایک پارٹنر ہے دارا۔“ دریا بن نے جواب دیا ”وہ پاکستانی ہے۔ سنگاپور سے بھاگ کر آیا ہوا ہے۔ آشرم کا انتظام اس نے سنبھال رکھا تھا۔“

”دارا۔۔۔۔۔ ہاں یہ نام تو سنا ہے۔ وہ تو بڑا بد معاش آدمی ہے۔ کیا وہ بھی یہاں آتا ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں سب لوگ آتے ہیں سر۔“ دریا بن نے جواب دیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

میں نے حذر کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے برآمدے کے سامنے ذرا آگے کوئی شخص بڑی تیزی سے درخت کی آڑ میں چھپ گیا ہو۔ میں اس کے لباس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ اس طرف موٹے تھوں والے کئی درخت تھے جن کے پیچھے آسانی سے چھپا جاسکتا تھا۔

”اوکے مسٹر!“ میں نے جب سے دو تین نوٹ نکال کر دریا بن کی مٹھی میں دبائے ”ہم یہاں آتے رہیں گے اور تم سے ملاقات

ہوتی رہے گی۔“

دربان نے دروازہ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ درختوں میں چھپنے والا وہ آدمی کون تھا۔ کیا اسے ہم پر کوئی شبہ ہو گیا تھا؟

اس ریسٹورنٹ کا نام اگر پیراڈائز رکھا گیا تھا تو غلط نہیں تھا۔ یہ واقعی عیاش لوگوں کی جنت تھا۔ یہاں عیاشی کا ہر سامان موجود تھا۔ نیم عریاں حسین و جوان لڑکیاں، شراب، جوا، رقص اور کیا چیز نہیں تھی جس کی ایک عیاش آدمی خواہش کر سکتا تھا۔

میں تھائی کے ساتھ شملہ ہوا اس ہال میں اٹھیا جہاں اسٹیج پر ایک نیم عریاں رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ نیم عریاں لباس میں نوخیز حسین و عینک لڑکیاں میزوں کے گرد پکڑا رہی تھیں۔ ہم دونوں بھی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ تھائی نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک ویٹریس کو کافی کا آرڈر دے دیا۔

میں مجسم نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جاگی دیوی یا فونتا اب تک نظر نہیں آئی تھیں حالانکہ وہ نوبے یہاں بیٹھنے والی تھیں اور اب تو سوا دس بج رہے تھے۔ وہ کیا تو کسی وجہ سے ابھی تک پہنچی نہیں تھیں یا ریسٹورنٹ کے کسی دوسرے حصے میں تھیں جہاں ہم ابھی تک نہیں گئے تھے۔

کافی پیتے ہوئے بھی میں متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ تھائی وانگک کی نظریں بھی ان کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

گیمیا بچ گئے۔ اب مجھے پریشانی ہونے لگی تھی۔ ہال میں اب کسی میز پر کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ایک چینی رقاصہ کا خاص پروگرام پیش کیا جانے والا تھا اور لوگ وہ رقص دیکھنے کے لیے ریسٹورنٹ کے دوسرے حصوں سے اٹھ اٹھ کر اس ہال میں آ رہے تھے۔

”ان دونوں میں سے کوئی بھی ابھی تک نظر نہیں آئی۔“ تھائی وانگک نے میری طرف جھٹکتے ہوئے سرگوشی کی ”کوئی گزیرا تو نہیں ہو گیا؟“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی شبہ ہو رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”تم بیس بیٹھو۔ میں فون کے معلوم کرنا ہوں کہ وہ گھر سے نکلے بھی ہیں یا کسی وجہ سے ان کا پروگرام کیسل ہو گیا ہے۔“

میں ہال سے نکل کر اس لابی میں اٹھیا جہاں پبلک ٹیلی فون بوٹھ لگے ہوئے تھے۔ چار بوٹھ تھے اور چاروں میں اس وقت کوئی نہ کوئی موجود تھا۔ میں ایک طرف رک کر انتظار کرنے لگا اور پھر میں اس آدمی کو دیکھ کر چونک گیا جو میرے پیچھے ہی اس سے باہر نکلا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا، وہ تیزی سے سڑک ایک دروازے میں غائب ہو گیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور دروازے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ دوسری طرف ایک راہداری تھی لیکن وہ مختصر نظر نہیں آتا۔ میں واپس مڑ گیا۔

ایک بوٹھ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکل۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی دوسری طرف مڑی۔ میں نے بوٹھ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ایک برنگا ہوا ریسپو رافٹا کر سلاٹ میں سکے ڈالے اور جاگتی دیوی کے گھر کا نمبر مانے لگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسپو نہیں کی گئی۔ میں نے لائن کٹ کر دوبارہ نمبر مانے نتیجہ اس مرتبہ بھی منفی نکلا۔ ریسپو رک پر ٹانگتے ہی سلاٹ میں ڈالے ہوئے سکے گھر کا نمبر کی بجلی کی آواز کے ساتھ نچلے خانے سے باہر آ گئے۔ میں نے سکے اٹھا کر جب میں ڈالے اور باہر آ گیا۔

اسٹیج پر چینی رقاصہ کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ وہ چین کے ایک لوک رقص کے روایتی لباس میں تھی۔ اس خوب صورت نسلی لباس نے اس کا پورا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے کے سوا جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہ شریفانہ لباس اس کے جسم سے الگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ لوگ اتنے پیسے خرچ کر کے کپڑے کے تھان میں لپٹا ہوئی کسی گزیرا کو دیکھنے کے لیے تو ایسی جگہوں پر نہیں آتے تھے۔

”وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں۔“ میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھائی کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی ”اب مجھے بھی کسی گزیرا کا شبہ ہو رہا ہے۔“

ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ اسٹیج کی طرف متوجہ تھے۔ ویٹریس لڑکیاں اب بھی میزوں کے گرد چکرا رہی تھیں۔ ہماری میز پر کافی کے خالی گک ابھی تک پڑے ہوئے تھے اور پھر وہ ویٹریس گک اٹھانے کے لیے آئی۔ اس نے خالی گک ٹرے میں رکھے اور شیشے کی خوب صورت فطشری میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں بل رکھا ہوا تھا۔ دو گک کافی کا بل اتنا تھا کہ درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں چار آدمی بڑھاپا قسم کا کھانا پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔ میں نے وہ بل اٹھایا تو اس کے نیچے ایک اور کاغذ بھی رکھا ہوا تھا جس پر تھائی زبان میں کوئی مختصر سی تحریر تھی۔ میں نے ویٹریس کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکرا کر آنکھ وادی۔ میں نے بل کے ساتھ ہی وہ کاغذ بھی اٹھایا۔ میں نے ایک مقنول ٹپ بل کی رقم میں شامل کر کے فطشری میں رکھ دی۔ بل بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ کاغذ میری ٹیٹھی میں رہ گیا تھا۔

ویٹریس کے جانے کے بعد میں نے میز کے نیچے ہاتھ کر کے وہ کاغذ تھائی وانگک کے ہاتھ میں تمھادیا۔ وہ سرجہاں کا بڑبڑانے والے انداز میں اس تحریر کو پڑھنے لگی۔

”مسٹر وید انا۔ اپنے دوست رامین پر ساد کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو تو ریور سائڈ پر پام کے درختوں کے جھنڈ میں آ جاؤ۔“

تھائی نے کاغذ مردود کر مٹھی میں چھپایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

”بچے کوئی نام نہیں لکھا۔ کون ہو سکتا ہے؟“ وہ دم گم لمحے میں بولی۔

”کوئی ایسا شخص جو ہمیں پہچان چکا ہے اور میرا نام بھی جانتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا خیال ہے؟“ تھائی نے پوچھا۔

”وہ بڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”اگر کوئی دھوکا ہو اتنا؟“ تھائی کے لیے میں تشویش تھی۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے ہمارا ہمدرد ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر مخالف پارٹی کا کوئی آدمی ہو تو اس طرح خفیہ طور پر پیغام بھیج کر باہر نہ بلایا جاتا بلکہ بیس پر نہیں گولیوں سے ہموں دیا جاتا۔ وہ جو کوئی بھی ہے“ سامنے اس لیے نہیں آیا کہ خود بھی

نظروں میں نہ آجائے وہ جانتا ہے کہ جی فانگ بھی یہاں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یا دارا بھی موجود ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے“ اپنے

آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ کر ہمیں پر ساد کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے۔ تم نہیں سمجھو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ تھائی وانگ نے مجھ سے پہلے ہی سیٹ چھوڑ دی۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ظاہر ہے میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ ہم دونوں اس ہال سے نکل کر رابڈاری میں ہوتے ہوئے لابی میں آگئے۔ دروازے سے نکلے ہوئے میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ دربان وہ نہیں تھا جس سے اندر داخل ہوتے وقت میں نے کچھ گپ شپ کی تھی۔

وسیع درعیض پر آمد سے نکل کر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ایک روش پر مڑ گیا۔ تھائی بھی میرے ساتھ تھی اور محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ہم گھوم کر دریا کی طرف آگئے۔ یہاں

کی دنیا بھی زبانی ہی تھی۔ ایک طرف دریا کے کنارے پر چھٹی بنی ہوئی تھی جہاں دریا کی سر کے لیے مخصوص ساخت کی کشتیاں موجود تھیں۔ چھٹی کا علاقہ تیز روشنی میں نمایا ہوا تھا جبکہ اس سے آگے

کا ماحول نیم تاریک تھا اور درہم تنک میزوں و کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور غالباً کوئی بھی میز غائب نہیں تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

تھائی کو اشارہ کیا اور بائیں طرف مڑ گیا۔ تقریباً پچاس گز آگے دریا کے کنارے سے ذرا ہٹ کر پام کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس طرف

تاریکی تھی۔ میں مڑ کر اس طرف چلنے لگا۔ تھائی میرے ساتھ تھی۔ اس نے اپنے پرس سے ہتھول نکال لیا تھا۔

میں درختوں کے نیچے رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ صورت حال بڑی عجیب سی تھی۔ ایک لمبے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی

آیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا جا رہا۔ ایسا تو نہیں کہ ہمیں پہچان لیا گیا ہو اور ہال میں لوگوں کی موجودگی میں کچھ کرنے کے

بجائے دھوکے سے یہاں بلایا گیا تھا یا تو اس تاریکی میں ہمیں گولیوں سے ہموں دیا جائے گا یا حراست میں لینے کی کوشش کی

جائے گی۔ میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے سرگوشیاں آواز ابھری۔

”مسزود جان۔ دائیں طرف آجاؤ۔ میں یہاں موجود ہوں۔“

”تم آگے جاؤ۔ میں یہیں کھڑی ہوں تاکہ کوئی گزیر ہو تو“

تھائی وانگ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور اس طرف چلنے لگا جہاں سے آواز سنائی دی تھی اور پھر وہ آدمی میرے سامنے آیا۔

”ڈون نہیں مسزود جان۔ میں تمہارا دوست ہوں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب تم ہال میں داخل ہوئے تھے۔“

”کون ہو تم؟“ مجھے کہنے پہچانا اور پر ساد کے بارے میں کیا بتانا

چاہتے ہو؟“ میں نے بھی سرگوشیاں لیے میں پوچھا۔

”میں پر ساد کا دوست پاٹھم ہوں۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ میں نے تمہیں ایک دو مرتبہ اس کے ساتھ دیکھا بھی تھا اس لیے حلیہ بدلا ہوا ہونے کے باوجود میں

نے تمہیں پہچان لیا۔“

”وہ کیسے؟“ میرے لیے میں تجسس تھا۔

”تمہارے دائیں کان کی لوہر پیچھے کی طرف سیاہ رنگ کا ایک

قل ہے۔“ پاٹھم نے جواب دیا۔ ”جب ہال میں آکر بیٹھے تو میں

ساتھ والی میز پر موجود تھا۔ مجھے تم پر اور تمہاری ساٹھی پر شبہ ہوا

تھا اور پھر اتفاق سے تمہارے کان کا قل میری نظروں میں آ گیا۔

جب تم ہال سے اٹھ کر باہر گئے تو میں بھی تمہارے پیچھے ہی تھا۔

تم ٹیلی فون بوتھ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا

تھا لیکن پندرو کا ایک آدمی اس طرف آیا اور مجھے وہاں سے ہٹا

پڑا۔ میں نہیں خبردار کرنا چاہتا تھا کہ جی فانگ یہاں موجود ہے اور

اسے تم پر شبہ ہو گیا ہے۔ یہاں تو شاید تمہارے خلاف کچھ نہ کیا

جائے لیکن جیسے ہی باہر نکلے، تمہیں گھبرنے کی کوشش کی جائے

گی۔ یہاں کوئی کارروائی کر کے وہ آخر دم والے ولتے کو دہرائے

نہیں چاہیے۔“

”پر ساد کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور کس حال میں ہے؟“

”ہمیں اس طرح اطمینان سے بائیں کرتے دیکھ کر تھائی وانگ

بھی وہاں آگئی تھی۔“

”پر ساد دارا کے قبضے میں ہے۔“ پاٹھم نے جواب دیا۔ ”وہ اس

کے ذریعے ہمیں ہمارا ج کی پناہ گاہ سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ پر ساد

نے ابھی تک زبان نہیں کھولی اور مجھے یقین ہے وہ جان تو دے گا۔

مگر تمہارے خلاف کوئی سازش کا مایاب نہیں ہونے دے گا۔ اگر

تم اسے پہچاننا چاہتے ہو تو تمہیں تھوڑی مدت پرانی دینی ہوگی۔“

”میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا

کرنا ہو گا؟“ میں نے کہا۔

”شورانی واحد ہستی ہے جو یہ جانتی ہے کہ پر ساد کو کہاں رکھا گیا ہے۔“ پاٹھم نے جواب دیا۔

”شورانی کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہندو عورت ہے۔ بہت حسین۔ منوں میں کسی بھی مرد کو

اپنے لکھے چاننے پر مجبور کر سکتی ہے۔“ پاٹھم نے جواب دیا۔

”بہت لالچی عورت ہے۔ صرف دولت مند مردوں پر ہی ہاتھ ڈالتی

ہے اور یہ مرد بھی اسے اپنے ساتھ رکھنے پر فخر محسوس کرتے ہیں

لیکن دس پندرہ دن سے زیادہ کسی کو اپنے قریب نہیں ٹھکے دیتی۔

اسے نچوڑ کر چھوڑ دیتی ہے اور پھر کسی دوسرے کو چھاس لیتی ہے۔

بلکہ مرد خود ہی اس کے جال میں پھنسنے کے لیے اپنی باری کے انتظار

میں رہتے ہیں۔“

”یہ شورانی وہ تو نہیں جو کچھ عرصے پہلے سلیم روڈ پر ہالی ڈس

ان کر ان پلازا ہوٹل کے سامنے والی بلڈنگ میں مساج پارلر چلایا

کرتی تھی؟“ تھائی وانگ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے

کہا۔

”ہاں وہی ہے۔“ پاٹھم نے جواب دیا۔ ”سات آٹھ مہینے پہلے

اس نے مساج پارلر فروخت کر دیا تھا۔ ان دنوں شر کے ایک بہت

بڑے جوہری سے اس کے تعلقات استوار ہو گئے تھے اور اس

جوہری کو پسند نہیں تھا کہ اس کی محبوبہ مساج پارلر چلائے۔ اس

نے شورانی کو شر کے منگے ترین رہائشی علاقے میں ایک بنگلا بھی

خرید کر دیا تھا لیکن دو مہینے بعد ہی شورانی نے اس جوہری کو ہری

بھنڈی دکھا دی۔ اس جوہری کو شورانی سے کچھ ملایا نہیں، یہ الگ

مسئلہ ہے لیکن شورانی نے اس کی چند روزہ دوستی سے خوب فائدہ

اٹھایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں مود (MOVE) کرنے

لگی تھی اور جوہری سے کہیں زیادہ دولت مند لوگوں سے اس کے

تعلقات ہو گئے تھے۔ شورانی ان لوگوں سے دولت سمیٹتی رہی اور

بالآخر دارا سے گھر آئی۔ آج کل وہ اس کے ساتھ دیکھی جا رہی

ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ دارا پندرو کا آدمی ہے اس لیے کوئی

بھی شخص اب شورانی کے قریب جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ عام

خیال یہ ہے کہ شورانی اب خود دارا کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ وہ

اس سے بچنا نہیں چھڑا سکے گی۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس

کی طرف دیکھا۔

”شورانی کو معلوم ہوا ہے کہ پر ساد کو کہاں رکھا گیا ہے۔“

پاٹھم نے جواب دیا۔ ”اگر کوئی کوشش کی جائے تو اسے توڑا جاسکتا

ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک منصوبہ ہے میرے ذہن میں۔“ پاٹھم نے کہا اور پھر اپنا

منصوبہ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا ”اس طرح نہ صرف پر ساد

کی جان بچائی جاسکتی ہے بلکہ دارا اور پندرو کے بہت سے راز بھی

معلوم کیے جاسکتے ہیں۔“

”تمہاری بات سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس منصوبے پر عمل

ایک دو دن بعد ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کرنی پڑے گی۔ اس وقت

ہمیں جو پریشانی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری دو دوست یہاں آئی تھیں۔

وہ دکھائی نہیں دے رہیں۔ ان میں ایک کو تو شاید تم نے پر ساد کے

ساتھ بھی دیکھا ہو گا۔“

”وہ نریتا۔“ پاٹھم جلدی سے بولا۔ ”میں اسے اچھی طرح جانتا

ہوں۔ اس کے ساتھ ایک اور خوب صورت عورت بھی تھی لیکن

وہ تم لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی کے ساتھ

یہاں سے چلی گئی تھیں۔ وہ شاید نریتا کا دوست تھا۔“

”اوہ۔“ میں چونک گیا۔ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟“

”وہ قدرے ہماری بھر کم اور ادیفہ عمر کا آدمی تھا۔“ پاٹھم نے

کہا اور پھر اس نے جو حلیہ بتایا اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی

کہ وہ شاگ تھا جو اس رات کو سا روڈ والے بنگلے میں دارا اور

ٹائیگر سے ہیروئن کے پرس کے سلسلے میں کوئی ڈپل کرنے آئے تھا۔

بے چاری کا میلانا اسی رات دارا کے ہاتھوں باری تھی اور ٹائیگر

ہمارے قابو میں آیا تھا۔ مجھے ان دونوں کی خیریت خطرے میں نظر

آنے لگی۔

”تم مجھے اپنا فون نمبر دو۔ میں کل کسی وقت تم سے رابطہ کروں

گا۔“ میں نے کہا۔

پاٹھم نے جب سے ایک وزینگ کارڈ نکال کر مجھے دے دیا۔

”یہ میرے ورکشاپ کا فون نمبر ہے۔ میری رہائش بھی ورکشاپ

کے عقبی حصے میں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اب تم لوگ جانے کے

لیے گیٹ والا راستہ استعمال نہیں کرو گے۔ جی فانگ کو تم پر شبہ

ہو گیا تھا۔ جس دربان سے تم نے باتیں کی تھیں اسے بھی وہاں سے

ہٹا دیا گیا ہے۔ جی فانگ نے اس سے معلوم کر لیا ہو گا کہ تم نے اس

سے کیا باتیں کی تھیں۔ اس کا شبہ یقین میں بدل گیا ہو گا۔ جیسا کہ

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ وہ یہاں کچھ نہیں کریں گے۔ البتہ باہر

نکلتے ہی تمہیں گھیر لیا جائے گا۔ میں نے یہاں سے تمہاری واپسی

کے لیے ایک اور بندوبست کر رکھا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

ہم درختوں میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس طرف روشنی کا انتظام نہیں تھا لیکن چھٹی پر چلنے

والے بلوں کی مدد ہم سی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ کنارے

کے ساتھ ہی ایک چھوٹی موزیوٹ کھڑی تھی جس پر چار آدمی بیٹھ

سکے تھے۔ بوٹ کی ری کنارے پر گئے ہوئے ایک آہنی بک سے

بندھی ہوئی تھی۔

”بھٹو۔“ پاتھم نے رسی کھولنے ہوئے کہا کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہم واٹ اردن کے قریب بوٹ چھوڑ دیں گے۔ وہ محفوظ علاقہ ہے۔ وہاں سے کنارے پر جا کر تم لوگ بھی طرف جاسکتے ہو۔“

میرے ذہن میں ایک لمحے کو پھر یہ خیال آیا تھا کہ کبیں ہمیں کسی جال میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کی جادی۔ خشکی پر تو ہم اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ ادھر ادھر نکل سکتے تھے لیکن اگر دریا میں گھبر لے گئے تو ہمارے لیے بھاؤ کا کوئی راستہ نہیں رہے گا لیکن میں نے اس خدشے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پاتھم نے پر ساد کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو صرف اس کا دوست ہی جان سکتا تھا۔ میں نے پہلے تھائی واٹنگ کو سارا دے کر کشتی میں بیٹھنے میں مدد دی اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ پاتھم بھی رسی سمیٹ کر سب سے پیچھے والی سیٹ پر انجن کے قریب بیٹھ گیا اور پھر دبا کر انجن اشارت کر دیا۔ انجن کی آواز اگرچہ بہت ہلکی تھی لیکن سنانے میں دور تک سنی جاسکتی تھی۔

بوٹ حرکت میں آکر پہلے دریا کی گہرائی کی طرف بڑھی پھر دائیں طرف مڑ گئی۔ دریا کے دونوں کناروں پر بلڈ گولہ لگے ہوئے نیون سائنز کی روشنیوں پانی میں جھلما رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد ہی ایک اور آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا جہر سے آواز آتی تھی اور پھر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جیٹھی کے آس پاس بادیوں والی تین کشتیاں کھڑی تھیں اور ایک موٹر بوٹ ان کے گرد گھومتی ہوئی آگے نکل رہی تھی۔ وہاں تیز روشنیوں تھیں۔ موٹر بوٹ پر بیٹھا ہوا آدمی صاف نظر آ رہا تھا۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ اگرچہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن سفید سوٹ دیکھ کر مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔

”پاتھم!“ میں نے کہا ”وہ بوٹ ہماری طرف آ رہی ہے اور اس میں سوار وہ شخص۔۔۔۔“

”جی فانگ ہے۔“ پاتھم نے میرا جملہ عمل کر دیا۔ اس نے بھی اس بوٹ کو دیکھ لیا تھا ”تم حرکت کرو پاس۔ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔“

پاتھم نے تھوڑی سی پہنچ لیا۔ بوٹ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ دریا کی لہروں پر اچھلتی لگی۔ تھائی نے بڑی مضبوطی سے سیٹ کے کناروں کو پکڑ رکھا تھا۔

وہ بوٹ بڑی تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھی۔ پاتھم نے بھی رفتار بڑھا دی تھی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ ہماری بوٹ کی رفتار دوسری بوٹ سے زیادہ تیز نہیں تھی کیونکہ کچھ فاصلہ بڑی تیزی سے سمٹ رہا تھا۔

واٹ اردن زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر ہم کنارے پر چلے ہوئے

پیدل بھی آتے تو اس منٹ میں وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔ پاتھم نے بوٹ کا رخ کنارے کی طرف موڑ دیا۔ واٹ اردن سے پہلے کنارے پر تاریکی تھی۔ وہ جگہ خالی تھی اور پاتھم کشتی کو اسی کنارے پر لگا رہا تھا تاکہ تھان میں دیکھ رہا تھا کہ دوسری بوٹ بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر ہمارا راستہ کانٹے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کشتی بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ تھائی واٹنگ نے پرس میں سے ہتھول نکال لیا۔ وہ سیٹ پر ذرا سا مڑ کر بیٹھ گیا۔ دوسری بوٹ بالکل سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھائی نے گولی چلا دی۔ ٹھیک اسی لمحے ہماری بوٹ بڑی تیزی سے بائیں طرف مڑی۔ پاتھم نے بڑی بھرتی سے بوٹ کو گھمایا تھا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو دونوں کشتیوں میں تصادم ہو جاتا۔ تھائی کی چلائی ہوئی گولی کا شوق نہ جانے کیا ہوا تھا لیکن بوٹ کو جھٹکا گئے سے تھائی اپنی اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی گئی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں ہتھول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر گیا۔

پاتھم نے بڑی تیزی سے بوٹ کا رخ موڑا تھا۔ ہم ابھی کنارے سے چند کر دور ہی تھے کہ جی فانگ کی بوٹ ہماری بوٹ سے ٹکرائی ہوئی دریا کے کنارے پر چڑھ گئی۔ ہماری بوٹ پانی میں لٹو کی طرح کھوم گئی اور پھر کنارے پر چڑھ کر دور تک بچی زمین پر کھسکتی چلی گئی۔ تھائی واٹنگ بڑی طرح رنج رہی تھی۔ یہ فیصلہ تھا کہ کھر گئے کے بعد کیا کنارے پر چڑھ کر ہماری کشتی اٹلی تھی۔ تھائی اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکی تھی۔ کشتی رکتے ہی وہ جھٹکا گئے سے اچھل کر باہر گری۔ میں نے جلدی سے سارا دے کر تھائی کو اٹھایا اور دوسری بوٹ کی طرف دوڑا۔

جی فانگ کی کشتی ایک چھوٹی دیوار سے ٹکرا کر رہی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر باہر آ گیا اور پھر جہر حملہ کرنے کے لیے پڑتے لگا دیں۔ ہم اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے موقع تلاش کرنے لگے اور پھر پہلی جی فانگ یں نے کی تھی۔ اس نے فرنٹ کنگ لگانے کی کوشش کی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی کلائی سے اس کی کنگ روک لی اور اس کے ساتھ ہی بڑی بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر رائٹ فرنٹ کنگ لگانے کی کوشش کی مگر بالکل میری طرح جی فانگ نے بھی میرا یہ حملہ نام کام بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اچھل کر پوری قوت سے رائٹ ہاؤس کنگ لگا دی۔

رائٹ ہاؤس کنگ لگا مومے تھائی کی بڑی خطرناک کنگ کلائی ہے۔ اس سے عام طور پر حریف کی گردن یا سر کو نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن جی فانگ کی کنگ میرے بائیں کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑکیا۔ اس نے لیٹنگ کنگ لگائی لیکن میں نے اس کا یہ وار روک لیا اور بڑی تیزی سے گھوم کر اس کے سینے پر اسپین کنگ لگا دی۔ وہ لڑکھڑا کر کرا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے ایک اور اسپین کنگ لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر کرا کر

مارشل آرٹ میں کوئی بات حتی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ عام طور پر بادیوں میں رہنے والا اور پٹے والا حریف اچھا کنگ کوئی ایسی بھی چل سکتا ہے جس سے بازی پلٹ سکتی ہے۔ اس وقت بھی جی فانگ جی فانگ زمین پر گر گیا تھا اور مجھے توقع تھی کہ ایک دو لمحوں کے بعد وہ ہتھیار ڈال دے گا لیکن میں نے جیسے ہی کنگ لگا کر چاہی اس نے بڑی بھرتی سے میرا پیچ پکڑ کر زوردار غاصبہ میں ایک پیڑ لہرا گیا اور دوسرے ہی لمحے اچھل کر پلٹ چل گیا۔

میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی لیکن جی فانگ مجھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ ہم ایک باہر ایک دوسرے کے اردوں کا اندازہ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر اچھا کنگ جی فانگ نے لیٹنگ کنگ لگانے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی تیزی سے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی کو گرفت میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی نہ صرف اس کے منہ پر رائٹ ہاؤس کنگ لگا دیا بلکہ سیدھے پیر سے اس کی بائیں

ان کے اندر کی طرف کنگ بھی لگا دی۔ جی فانگ ہلکا اٹھا لیکن وہ کلائی نہیں تھکا کر ٹھکست جلیں لگاتے۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے نیچے بیٹھتا ہوا اور اس طرح میں اس کے اوپر سے غلابازی کھانا ہوا پلٹ کر کھینچنے کی طرف گرا لیکن میں نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ جی فانگ بھی سنبھل چکا تھا۔ اس مرتبہ اس کا انداز بڑا بدامنام تھا۔

اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ایک پیڑ پر گھوم کر اسپین کنگ لگا پائی گھمیں بڑی بھرتی سے اس کا یہ وار بچا گیا اور پھر دوسرے لمحے مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اسپین کنگ اس نے مجھے بچا دینے کے لیے لگائی تھی۔ اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ اس سے پہلے کہ اس نے اٹھتا اس کی فرنٹ کنگ ہاؤس کے نیچے کی ایسی ٹھوکروں پر چھلک کر دو کھیلنے کے لیے رسید کی جاتی ہے۔ یہ پیش کنگ بھی اٹلی ہے۔ اگر اپنے وار مگر پر بیٹھ جائے تو خاصی مشکل ثابت ہوتی ہے۔ میری فانگ کے پچھلی طرف کھٹنے کے جوڑ پر لگی اور میں لڑکھڑا کر دھڑکیا۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا اور جی فانگ کو موقع دے بغیر اس کے منہ سے حملے میں پہل کر دی۔ میں نے رائٹ ہاؤس کنگ لگانے سے پہلے اپنی دائیں فانگ کو مخصوص انداز میں حرکت دی تھی۔ پاتھم مارشل آرٹس وہی ہوتا ہے جو حریف کے جسم کے اعضاء کی حرکات سے یہ اندازہ لگائے کہ وہ کون سا وار کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جی فانگ بہت اچھا مارشل آرٹس تھا۔ اس نے میرے ارادے کو سمجھ لیا تھا لیکن اس سے بازو کے ذریعے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ میں اس کی رائٹ ہاؤس کنگ لگاؤں گا۔ اس نے اپنا سر بچانے کی کوشش کی لیکن میں نے کنگ اس کے کولے پر لگائی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اسے

سنبھلنے کا موقع دے بغیر میری دوسری کنگ اس کے بائیں کندھے اور کمر کے درمیان بازو پر پڑی۔ وہ ہلکا بانی کھانا ہوا نیچے گرا۔ اس کی گردن پر پڑی تھی۔ وہ غلابازی کھانا ہوا نیچے گرا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک اچھا مارشل آرٹس تھا اور اس نے اب تک بڑی مہارت سے میرا مقابلہ کیا تھا لیکن اس مرتبہ وہ مکمل بدعاشی پر اتر آیا تھا۔ اس نے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ میرے ہاتھوں پر خنجر کی سگراہٹ آئی۔ یہ اس کی ٹھکست خوردگی کا ثبوت تھا۔ شاید وہ مجھ کا تھا کہ مارشل آرٹ سے وہ مجھے ذرا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اس نے خنجر نکال لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ خنجر سے حملہ کرنا میں نے بائیں فانگ کو جھٹکا دے کر دائیں پیر سے اس کی کمر پر ٹھوکر رسید کر دی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا کر ا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکلی گئی تھی اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ کچھ اور کھس سے اس پر تباہ توڑ حملے کرنا ہوا اور پھر تھائی واٹنگ کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔

”وہ جان! ہوشیار۔ ایک موٹر بوٹ اسی طرف آ رہی ہے۔“ اور پھر میں نے چلی مرتبہ دریا کی طرف دیکھا۔ انجن کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور وہ موٹر بوٹ بڑی تیزی سے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ اس پر کم از کم تین آدمی نظر آ رہے تھے۔ پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ جی فانگ کو کسی طرح قابو کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن اب صورتحال بدل گئی تھی۔ اس نے بھی موٹر بوٹ کو دیکھ لیا تھا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا اور بے درپے اس پر حملے کر رہا۔

میں ایک مرتبہ پوری قوت سے اچھلا۔ اس مرتبہ میری اپ چاکی فرنٹ ہائی کنگ جی فانگ کی پیشانی پر لگی۔ وہ ہلکا ہوا ڈمیر ہو گیا اور پھر اس نے حرکت نہیں کی۔ میں تیزی سے تھائی واٹنگ کی طرف دوڑا۔

میں حیران تھا کہ پاتھم نے اب تک ہماری لڑائی میں مداخلت کیوں نہیں کی تھی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ کشتی کی ایک سیٹ نوٹ گئی تھی اور اس کی ایک فانگ سیٹ کے نیچے چھپتی ہوئی تھی جسے وہ کالے کی کوشش کر رہا تھا۔

بوٹ کھٹکے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر سیٹ کو جھٹکا دے کر اٹھا ڈیا۔ پاتھم اچھل کر کشتی سے باہر آ گیا۔

”تم نکل جاؤ یہاں سے۔ میں کل کسی وقت فون پر تم سے رابطہ کروں گا۔“ میں نے پاتھم سے کہا اور تھائی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

کنارے کی طرف آنے والی موٹر بوٹ سے ہتھول یا ربو اور سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ پاتھم تاریکی میں ایک طرف بھاگ گیا تھا۔ میں بھی تھائی کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا۔ کنارے سے



تقریباً پچاس گز آگے کسی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی تھی۔ ابھی صرف دیواریں اٹھائی جا رہی تھیں۔ شاید یہاں بھی کوئی ٹائٹ کلب بننے والا تھا۔ آنے والی بوٹ سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں تھائی کا ہاتھ پکڑے دیواروں کی آؤلیٹا ہوا دوڑتا رہا۔

سڑک پر پہنچنے پر بائیں طرف سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ تھائی سڑک کے بیچ میں کھڑا کر کے گاڑی اشارہ کرنے لگی۔ میں تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پتلون کا پانچہ اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا ہتھیار نکال لیا تھا۔

کار رگ گئی۔ اس میں ایک سی آوی تھا۔ تھائی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا اور خنجر کی نوک اس شخص کی گردن پر رکھ دی۔

”اچھی چٹا چھوڑ کر نیچے اتر آؤ۔“ میں نے غرا کر کہا۔

وہ دھڑپتا سا دھڑپتا کر آئی تھا۔ خوف سے قہر قہر کانپنے لگا۔

اس نے دہواڑہ کھولنے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

میں نے باہر سے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ایک جھٹکے سے دہواڑہ کھولا اور اس شخص کو بازو سے پکڑ کر نیچے سنبھال لیا۔

”اس طرف بھاگ جاؤ۔ شور مٹ جائے اور مڑ کر مت دیکھنا۔“ میں نے سڑک پر پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی تھی۔

ٹھیک اسی لمحے دریا کی طرف سے آنے والے راستے پر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ جو کوئی بھی تھے انہوں نے بوٹ سے اتر کر کچی فانگ کو پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ان میں سے کوئی فائرنگ کرتا ہوا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

”اسٹیشنرنگ سنبھالو تھائی۔ ہر پکاپ!“ میں نے چیخ کر کہا اور کار کے سامنے سے محووم کے ہتھیار ساڑ والے دہواڑے کی طرف آ گیا۔

تھائی اسٹیشنرنگ کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔ اچھی اشارت تھا۔ وہ گاڑی کو گھیر میں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کار اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فائرنگ کی آوازاں قریب آگئی تھیں۔ میری آنکھوں میں تشویش ابھر آئی اور پھر اچانک کار کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔ کار بندوق سے فٹلی ہوئی کوئی کی طرح آگے بڑھی تھی۔ اس سے پہلے کہ لہرائی ہوئی کار سڑک سے اتر جاتی، تھائی وانگ نے اسے سنبھال لیا۔

کار واٹ ایڈن کے سامنے سے گزر کر وانگ ڈوم روڈ پر آگئی اور پھر وہاں سے پچھا ٹھیک روڈ کے چوراہے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”کار کو کہاں چھوڑا جائے؟“ تھائی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کار کو یہاں چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا ”وہ لوگ پہلے بھی ان اطراف میں نہیں تلاش کرتے رہے ہیں۔ وہ

شخص یقیناً پولیس کو کار چھن جانے کی اطلاع دے گا اور پھر کار کو یہاں دیکھ کر وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ ہم آپس ہی کیس موجود ہیں۔ کار کو گھر تک لے چلو۔ سکھڑے سے کہیں گے وہ اسے کیس نکالنے لگا آئے۔“

بات تھائی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے اگلی سڑک پر کار وائیں طرف موڑ دی اور پھر جاگی والے پتنگے تک پہنچنے میں ہمیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اس وقت ساڑھے بارہ بجتے والے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید جاگی اور نوتا یہاں پہنچ چکی ہوں کی لیکن نہ تو وہ یہاں آئی تھیں اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ میں نے سب سے پہلے سکھڑے کو کار کو نکھانے لگانے کے لیے روانہ کر دیا۔

”اس کار کو یہاں سے کافی دور لے کر دیا کہ بار دوسری طرف کسی سڑک پر چھوڑ دینا اور وہاں سے سیدھے جتنا زیم چلے جانا۔

ماسٹر ہو جن کے پاس۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”میں ماسٹر ہو جن سے فون پر بات کر لیتا ہوں۔ کسی گاڑی کا بندوبست کرنا ہے جو بہت ضروری ہے۔“

سکھڑے نے میری بات سن کر سر ہلا دیا اور پھر تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں اس وقت بھی عجیب سی چمک ابھرتی تھی۔

سکھڑے کے جانے کے بعد ہم اندر آ گئے۔ میں نے سب سے پہلے ماسٹر ہو جن کو فون کیا۔ وہ موجود نہیں تھا لیکن اتفاق سے فانگ سے بات ہو گئی۔

”سنو فانگ۔“ میں نے کہا ”مجھے کسی گاڑی کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ سکھڑے وہاں آ رہا ہے اگر ممکن ہو تو اسی وقت کسی گاڑی کا بندوبست کرو۔“

”چنانچہ فون نہرتاؤ۔ چند منٹ بعد میں تمہیں اطلاع دیتا ہوں کہ فوری طور پر کسی گاڑی کا بندوبست ہو سکتا ہے یا نہیں۔“ فانگ نے کہا۔

اس پتنگے کو چھوڑنے سے پہلے میں نے یہ پناہ گاہ غنیمت ہی دیکھی تھی۔ ماسٹر ہو جن نے کئی مرتبہ اصرار کیا تھا مگر میں نے اسے بھی یہاں کا فون نہر نہیں بتایا تھا لیکن اب مہاراج کے کہنے پر ایک آوی سکھڑے یہاں پہنچ چکا تھا اس لیے اب یہاں کا فون نہر بھی بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے ٹیلی فون نمبر فانگ کو بتا دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری دیر بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔“ فانگ نے کہا۔

میں نے فون کا کریڈل شپ کر کے جاگی دیوی کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کھنٹی بجتی رہی۔ کال ریسپونڈ نہیں کی گئی۔ میں نے ریسپونڈ رکھ دیا۔ میری آنکھوں میں تشویش ابھرتی گئی۔ ”وہ دونوں یقیناً کسی مصیبت میں پھنس گئی تھیں۔“

تھائی دیکھ کر یہ تک کہہ کر میری طرف دیکھتی رہی اور پھر کمرے

میں کھس گئی۔ چند منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلی۔

”میں کانٹا بنانے جا رہی ہوں۔ تمہارے کپڑے تو بہت خراب ہو رہے ہیں۔ بدل لو۔“ وہ یہ کہتے ہوئے کچن میں کھس گئی۔

جی فانگ سے فائنٹ میں میرے کپڑے واقعی بہت خراب ہو گئے تھے۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ تھائی وانگ نے جو کپڑے انارے سے ڈھیلے پر کھڑے ہوئے تھے میں نے دائرہ دوب سے اپنے کپڑے نکال لیے۔

چند منٹ بعد میں باہر نکلا تو تھائی کافی بنا چکی تھی۔ ہم ہال میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ قریب ہی ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں کافی کی چمکیاں پیتے ہوئے برسات اور جاگی وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اب مجھے جاگی اور نوتا کی زیادہ خبر ہو رہی تھی۔ پلے پلے

نے اس شخص کا جو طبع بتایا تھا وہ سوئی صدمہ فانگ کا تھا۔ فانگ ہی نوتا کو دعوے کے ساتھ چنانک رائے سے لے کر آیا تھا لیکن پہلی ہی رات ہم نے اس پتنگے پر چھاپا مار دیا تھا۔ فانگ اور دارا تو بھاگ

نکلے تھے مگر ٹائگر ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا اور نوتا بھی ہمارے قبضے میں آگئی تھی۔ فانگ چنانک رائے واپس چلا گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ایک دور دراز

پہلے واپس آیا ہو اور آج اتفاق سے پیراڈائزر ریسٹورنٹ میں نوتا سے آہنا سامنا ہو گیا۔ پلے پلے بتایا تھا کہ نوتا یا جاگی کے چرے پر

کی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ دوستانہ ماحول میں باتیں کرتے رہے تھے اور فانگ کے ساتھ جاتے ہوئے بھی ان کے چہروں پر کوئی غیر معمولی اثرات نہیں تھے جس سے اندازہ لگا دیا جاسکتا کہ انہیں ان کی مرضی کے خلاف لے جایا جا رہا ہے۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے نوتا نے اس رات کے بارے میں فانگ کو کوئی فرضی داستان سنا دی ہو۔

ٹھٹھا ہے کہ انہیں بھی پتنگے سے بھاگنے کا موقع مل گیا تھا یا اسے بے ضرور کچھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی کھنٹی بجی۔ تھائی وانگ قریب تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسپونڈ اٹھایا اور پھر ”کمرے سے اچھل پڑی۔“

”اے جاگی۔ تم دونوں کہاں غائب ہو۔ ہم پریشان ہو رہے ہیں۔“ ہاں۔ ہاں۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ جی فانگ۔۔۔ اودھ۔۔۔

میں نے ریسپونڈ کر دیا۔ ایک منٹ۔۔۔ اودھ۔۔۔ لو جو دان سے بات کرو۔“ اس نے ریسپونڈ کر دیا۔

”یہلو جاگی۔ کہاں ہو تم۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم لوگ فانگ کے ساتھ گئی ہو اور مجھے بھی پریشانی ہو رہی تھی۔“ میں نے کہا۔

”فانگ اور دارا سے آہنا سامنا ہو گیا تھا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم دونوں کی کیا حالت ہوئی تھی لیکن تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دارا مجھے نہیں پہچان سکا تھا اور نوتا سے بھی انہوں نے کوئی

تقرض نہیں کیا تھا۔ نوتا نے انہیں فرضی کہانی سنا دی تھی کہ اس رات وہ بھی موقع پا کر پتنگے سے بھاگ نکلی تھی۔ فانگ اور دارا نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ پتنگے سے فرار ہوتے وقت

وہ اسے ساتھ نہیں لے جاسکے تھے۔“

”انہیں کوئی شہ تو نہیں ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ جاگی نے جواب دیا ”ان دونوں نے ہمیں ریسٹورنٹ میں بڑا بڑا ٹکف کھانا بھی کھلایا تھا اور پھر دارا تو شرابی کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔ تم خورانی کو نہیں جانتے تھائی جانتی

ہوگی۔ دارا کے جانے کے بعد ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے اور پھر فانگ ہمیں اپنے ساتھ لے آیا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ مال مفت

سمجھ کر ہمیں اپنے ساتھ لے جاتا چاہتا ہے۔ میں نے نوتا کو اشارہ کر دیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ دراصل میں برسات کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی اور ان کے ساتھ رہ کر ہی کچھ

معلوم ہو سکتا تھا اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ فانگ ہمیں جس پتنگے میں لے کر آیا ہے وہاں برسات بھی موجود ہے۔“

”اودھ! میرے منہ سے نکلا۔“ کیا ہے وہ۔۔۔ ٹھیک تو ہے؟“

”تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے اس پر کچھ تھوڑ تو کیا گیا ہے لیکن بہر حال اس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں۔“

جاگی نے جواب دیا۔

”پتنگے کا پتا بتاؤ۔ وہاں کتنے آوی ہیں۔ میں پہنچتا ہوں۔“

”اے کبھی بتاتی ہوں لیکن اس سے پہلے ایک اور بات بتانا چاہتی ہوں۔“ جاگی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے دارا بھی یہاں آیا تھا۔ وہ آیا تو کسی اور نیت سے تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک فون کال ملی۔ اسے کوئی اہم

اطلاع دی گئی تھی جس سے وہ پریشان ہو گیا تھا۔“

”اور کیا تمہیں اندازہ ہوا کہ وہ اہم اطلاع کیا ہو سکتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”فون بند کرنے کے بعد وہ فانگ کو پتا رہا تھا کہ تم تھائی وانگ کے ساتھ پیراڈائزر ریسٹورنٹ میں آئے تھے جہاں جی فانگ نے

تمہیں پہچان لیا۔ تم لوگوں نے مونروٹ کے ذریعے دریا کے راستے

فرار ہونے کی کوشش کی۔ جی فانگ نے تمہارا پیچھا کیا اور تم اسے

دھمکی کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جی فانگ کی کہنی کے

قریب سے بازو کی ہڈی کرک ہو گئی ہے۔ وہ اس وقت ایک

پرائیویٹ اسپتال میں پڑا ہے۔ دارا شاید وہیں گیا ہے۔ اس وقت

پتنگے میں فانگ کے علاوہ صرف ایک آوی ہے۔ نوتا نے فانگ کو

کمرے میں بند کر کے باتوں میں لگا رکھا ہے۔ وہ سہرا آوی باہر

آتش فشاں ۱۱۵ حصہ ۱

برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے اور میں موقع پا کر فون پر تم سے بات کر رہی ہوں۔ تھائی کو فون دو۔ میں اسے پتا سمجھائی ہوں۔“

میں نے ریسور تھائی کو دے دیا۔ وہ چند منٹ جاگتی ہے پتہ میں کرنی رہی پھر فون بند کر دیا اور اس بیٹلے کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ ہنگامہ دیا کہ دوسری طرف تھنک ہاؤس ڈسٹرکٹ میں ایک پریس دے کے قریب سوئے ہوئی پڑا ہوا تھا۔

میں نے ریسور تھائی اور ماسٹر ہو جن کا نمبر ملانے لگا۔ کال گانگ نے ہی ریسور کی تھی۔

”ماسٹر ہو جن واٹ ریٹیمت میں مہاراج کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ آج ہی رات گاڑی کا بندوبست ہو جائے گا۔“ اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

”گاڑی پر لعنت بھیجو۔ تم اپنا ٹک ٹک لے کر فوراً میاں چلے آؤ۔ سکھرو کو بھی لے آؤ۔ وقت بہت کم ہے۔ جلدی کرو۔“ میں نے کہا۔

”کیا بات ہے شل ماسٹر۔“ گانگ نے کہا۔ ”بہت بدحواس ہو؟“

”پراساد کا پتا چل گیا ہے۔ جاگتی دیوی اور نوتا بھی وہاں پھنسی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوکے ہاں۔ میں آ رہا ہوں۔“ گانگ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

میں نے ریسور رکھ دیا اور اٹھ کر بے چینی سے شلے لنگے۔ میں اعزاز لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ گانگ کو چاہتا ہوں سے میاں تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی۔

اور پھر پندرہ منٹ بعد گیت کے سامنے ٹک ٹک رکنے کی آواز سنائی دی۔ گیت تھائی وانگ نے کھولا تھا۔ گانگ اور سکھرا اندر آگئے تھائی بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اور گانگ نے اسے منع کر دیا۔ گانگ نے اس سے سوئے ہوئی کے بیٹلے کا پتا سمجھ لیا اور ہم تینوں گیت سے باہر نکل کر ٹک ٹک میں بیٹھ گئے۔ گانگ بڑی تیز رفتاری سے ٹک ٹک چلا رہا تھا۔ ٹک ٹک ہنس کے ہنسنے والے چوراہے سے آگے نکل کر وہ وانگ ونگ پائے ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف بھی ٹک ٹک روڑی تھا۔ ٹک ٹک بڑی تیز رفتاری سے اس سڑک پر دوڑتا رہا اور پھر ایک چوراہے سے پھسک روڑ پر مڑ گیا۔ کوئنگ ٹیپ ہرنج سے دریا پار کر کے ہم تھنک ہاؤس ڈسٹرکٹ میں داخل ہو چکے تھے اور پھر سوئے ہوئی ٹک ٹک بیٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

گانگ نے ٹک ٹک کی رفتار کم کر دی۔ میں اور سکھرا پچھلی سیٹ پر بیٹھے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی ہم نے وہ ہنگامی تلاش کر لیا۔ ٹک ٹک ٹکی کے موڑ پر چھوڑ دیا گیا۔ ہم تینوں چند لمبے صورت حال کا جائزہ لیتے رہے پھر سکھرا کو وہاں چھوڑ دیا۔ وہ ٹک ٹک کے پاس رک کر گلی میں بیٹلے کے گیت پر نگاہ رکھ سکتا تھا اور کسی ہنگامی صورت حال میں ہمیں مطلع دے دیتا۔

مجھے اور گانگ کو بیٹلے کی عقبی دیوار سے اندر کونے میں کوئی

مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ میرے پاس خنجر تھا اور گانگ کے ہاتھ میں پستول۔ ویسے اس کے پاس ایک خنجر بھی موجود تھا جسے اس نے لباس میں چھپا رکھا تھا۔

ہمیں عقبی دروازہ کھلا ہوا ملا تھا لیکن ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے دارا کے آدمی نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے مہاراج کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہم چاہتے تو اسے آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن بلاوجہ کسی کے خون سے ہاتھ رنگنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ گانگ نے اسے ہاتھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ میں جاگتی کو آواز دیتا ہوا ایک طرف دوڑا اور جیسے ہی ایک کمرے کا دروازہ کھولا، ٹک ٹک کرک گیا۔

شانگ نے بیٹے پر نوتا کو روک رکھا تھا۔ نوتا کے بدن پر لباس براے نام ہی رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مہاراج کر رہی تھی۔ نوتا کے ساتھ شانگ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ وہ نوتا کو چھوڑ کر ایک جھگٹے سے سیدھا ہو گیا اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف نکلا۔ اس نے دروازہ کھولی تھی کہ میں نے اس کے کولے پر زور دراز کر دیا۔ وہ سامنے آئینے سے ٹکرا گیا۔ اس کے سر کی گھرے آئینہ چٹا چور ہو گیا۔ اس کی پیشانی سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ میں نے اس کے پھلو پر ایک اور ٹک ٹک کر کے اسے ایک طرف گرا دیا اور میری دراز میں رکھا ہوا پستول اٹھالیا۔

”نوتا۔ باہر نکلو۔ جلدی۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ وہ اپنا بلاؤڈا کر پینے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے سے باہر دوڑ گیا۔ ”اور تم اوپر ہاتھ دو م میں۔“ میں نے شانگ کو اشارہ کیا۔ ”مگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو کھوپڑی میں سوراخ کھودوں گا۔“

شانگ کو ہاتھ دو م میں بند کر کے میں تیزی سے باہر نکلا۔ گانگ پراساد کو کندھے پر اٹھائے ایک کمرے سے باہر نکل رہا تھا جاگتی بھی اس کے ساتھ تھی۔ گانگ کا پستول جاگتی کے ہاتھ میں تھا۔ ہم ہال سے ہوتے ہوئے برآمدے میں آگئے۔ میں نے باہر آکر بیٹلے کا بھونٹ گیت کھول دیا۔ پہلے جھانک کر باہر دیکھا پھر گانگ اور جاگتی کو اشارہ کر دیا۔

اور پھر جیسے ہی ہم گیت سے نکل کر گلی میں پہنچے بائیں طرف سے ایک کار گلی میں داخل ہوئی۔ ہم ہیڈ لائٹس کی روشنی میں غائب ہو گئے۔ کار کی رفتار کم تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے زور سے اچھلی اور بریک کی تیز چرچر بھٹی کی آواز سے ہم سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔

کار کے دونوں طرف کے دروازے کھلے۔ دو آدمی باہر نکلے۔ پہلی سیٹ پر ایک عورت بھی موجود تھی۔ وہ کار میں بیٹھی رہی۔ وہ دونوں آدمی آگے بڑھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے اور ان میں ایک دارا تھا اور دوسرا پینڈو!۔

میری جان کے گانگ۔ میرے بدترین دشمن۔ دینا کے

سفاک ترین انسان نما بھیڑیے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ صورت حال بڑی خوف ناک تھی۔

موت ہمارے سامنے کھڑی تھی اور بچاؤ کا کوئی راستہ فی الحال نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہماری زندگی کی آخری گھڑیاں آن پہنچی ہوں۔ وہ سانس جو ہم لے رہے تھے آخری سانس تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں کی معمولی سی حرکت ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر دینے والی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قسم کی نازک صورت حال سے دوچار نہیں پایا تھا۔ میرے بائیں طرف گانگ نے زخمی پراساد کو اپنے بائیں کندھے پر لاد رکھا تھا۔ اس کی دوسری طرف جاگتی دیوی کھڑی تھی میرے دائیں طرف نوتا تھی۔ اس نے چٹون کٹ یا جامہ پہن رکھا تھا اور بلاؤڈا زور دے رہے تھے میرے ساتھ باہر نکلا تھی۔ وہ بلاؤڈا کے بیچے دو جھن بھر کھائی تھی۔

دارا اور پینڈو باری باری ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ پینڈو کا اور میرا پہلی مرتبہ آہنا سامنا ہوا تھا۔ میرے ساتھ اگرچہ گانگ بھی تھا مگر پینڈو کو اعزاز لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ہم دونوں میں وجدان کون ہے۔ اس نے پستول والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ پستول کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔

”تمہیں پینڈو۔“ دارا نے میری طرف سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”اگر اس طرح مار دیا تو ہمارا انتقام تو پورا ہو جائے گا لیکن بہت بڑی دولت بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔“

”کسی دولت؟“ پینڈو نے پوچھا۔

”اس کے باپ نے ہمارا پانچ کروڑ روپے کا سونا غائب کر دیا تھا۔“ دارا نے کہا۔ ”آج اس بات کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں دینے کی قیمت میں تین چار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ آج وہ سونا پندرہ فیس کروڑ روپے کا ضرور ہو گا۔ اس کا مطلب ہے تمہیں بیٹیس لاکھ امریکی ڈالر بے حساب میں ملے اپنے ملک کی کرنسی سے لگایا ہے۔ تمہاری کرنسی کے حساب سے کچھ ہی بیش ہو سکتی ہے۔ اس کے باپ نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھا تھا کہ وہ سونا اس نے کہاں چھپایا تھا۔ اس کا باپ مر گیا۔ وہ ڈائری اس کے ایک سرپرست کے ہاتھ لگ گئی جو وہ سگا پورے فرار ہوتے وقت ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا سرپرست یہاں بنگالک میں میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم نے ہوٹل میں اس کے سامان کی تلاش کی تھی لیکن وہ ڈائری نہیں ملی جس کا مطلب ہے کہ وہ ڈائری ڈاکو اس کے سرپرست سے نہیں چھپائی تھی جس کا اسے علم ہے۔۔۔ یا اس نے کبیں چھپا رکھی ہے۔ اب تم میری بات سمجھ گئے ہو گے کہ اس کی جان سے زیادہ قیمتی وہ ڈائری ہے جسے میں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ۔“ پینڈو بولا۔ ”پھر تو یہ واقعی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔“

میں دارا کے منہ سے اپنے ابو کی ڈائری کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس ڈائری کا راز میرے اور چاچا پر تاب سنگھ کے علاوہ صرف ایک اور شخص کو معلوم تھا اور وہ خشت خشت سنگھ۔ سگا پور میں جب آخری بار ہم پر حملہ ہوا تھا تو ہم خشت سنگھ کے مکان میں تھے۔ وہاں سے فرار ہوتے وقت چاچا پر تاب سنگھ نے وہ ڈائری خشت سنگھ کو دے دی تھی کہ یہ گانگ کی (میری) امانت ہے وہ اسے سنجال کر رکھے اور اب مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ دارا کو اس ڈائری کے بارے میں کیسے پتا چلا تھا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ مجھے حوالہ کیا نہیں چاہتا تھا۔ میں کچھ عرصے سے یہی سنتا آ رہا تھا کہ دارا مجھے زندہ پکڑنا چاہتا ہے۔

اس وقت صورت حال بڑی سنگین تھی۔ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ دارا مجھے زندہ پکڑنا چاہتا تھا اور پینڈو کا ٹیکر کی موت کا انتقام لینے کے لیے مجھے گولیوں سے بھون ڈالنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا بھی تھا مگر دارا نے پندرہ فیس کروڑ روپے یا نہیں بیٹیس لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کا شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی رقم تھی اور میں جان چاہتا تھا کہ دارا اور پینڈو جیسے لوگوں کا دین و دھرم ہی دولت ہو نا ہے اور وہ دولت کے لیے اپنی ماں بھنوں کو بھی سربام بیلام کروا دینے کو عار نہیں سمجھتے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں بیٹیس لاکھ ڈالر کا ذکر سن کر پینڈو کے چہرے کے اثرات بھی بدل گئے تھے اور ان کی باتوں میں جو وقت گزرا تھا اس سے مجھے بھی سمجھنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے اپنے خوف پر بڑی حد تک قابو پایا تھا۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ گانگ پراساد کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس حالت میں وہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے گردن ہٹا کر دوسری طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ نوتا بلاؤڈا کے لگے ہوئے شبنم بھی کھل چکی تھی۔ دارا نے۔۔۔۔۔

اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمکی سی ابر آئی۔ ”میں نے تمہیں بیڑا انٹرنیشنل ٹورٹ میں اس عورت کے ساتھ دیکھا تھا تو سمجھ گیا تھا کہ کوئی گزربز ضرور ہے۔“ اس نے نوتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس عورت“ سے مراد جاگتی تھی۔

”میں نے اس کیتا کو بھی پہچان لیا تھا۔ اس رات وجدان کے ساتھ ہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت کا ہاتھ میری گردن تک پہنچا تھا۔ اس رات یہ میرے ہاتھوں سے ہو گئی تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”مگر میں رینٹونٹ میں ظاہر کر دیتا کہ اسے پہچان گیا ہوں تو گزربز ہو جاتی۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ تم دونوں کے ذریعے ہی اپنے اصل شکار تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کی طرف سے تو میں بالکل ہی انجان بن گیا اور پھر



لے سکھانے کا کو بڑی تیزی سے بائیں طرف کو گلی میں موڑ دیا تھا۔

کار بڑی شاندار تھی اور اس کا انجن بھی بہترین حالت میں تھا۔ سکھدار کا کوسوے پوری سے نکال کر سوائے پھر اوائے کی طرف لے آیا اور پھر مختلف گھیرن میں ہوتے ہوئے ہم بنو روڈ پر آ گئے۔ سکھدار کا خیال تھا کہ ہمیں واٹ ٹریسٹ کی طرف نکل جانا چاہیے کیونکہ وہاں کا فاصلہ کم تھا لیکن میں نے اسے جاگتی کے بچنے کی طرف چلنے کی ہدایت کی کیونکہ گاؤں وغیرہ وہیں گئے تھے۔

اس وقت تین بج رہے تھے۔ رات کا آخری پر تھا۔ سڑکوں پر سنا تھا۔ کسی سڑک پر اکاؤنٹ کا گاڑی نظر آ جاتی تھی۔ سڑکیں خالی ہونے کی وجہ سے سکھدار بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

دو یا تین پارک کے ہم کرونگ تھاں پوری روڈ پر آ گئے لیکن اس سڑک پر تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرتے ہی میں چونک گیا۔ کچھ آگے سڑک کے کنارے پر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ تین پولیس والے سڑک پر کھڑے تھے۔ ایک نے ذرا آگے بڑھ کر کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سکھدار کی طرف دیکھا اور تیز لے جے میں سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

”پریشان مت ہو ملٹر، ہائبر۔“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ”ان لوگوں سے نمٹنا مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے۔“ اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور پھر کار ان پولیس والوں کے قریب رک گئی۔

”کیا بات ہے آفسر۔ ہم سے کوئی غلطی ہوئی؟“ سکھدار نے پوچھا۔

”سائنس اور گاڑی کے پیچھے؟“ پولیس آفسر نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

سکھدار نے بڑے مطمئن انداز میں ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کا غائبہ کھولا۔ خوش قسمتی سے اس میں کار کے کاغذات موجود تھے۔ سکھدار نے بک نکال کر آفسر کی طرف بڑھا دی۔ آفسر نے بک کھول کر دیکھی اور پھر ذرا نیوٹنگ لائنس طلب کیا۔

”سوری آفسر۔“ سکھدار نے جواب دیا ”ایک ایمرجنسی میں گھر سے کھٹا پڑا تھا۔ ڈرائیونگ لائنس جیب میں رکھنا بھول گیا۔“

”تم دونوں نیچے آ جاؤ۔“ پولیس آفسر نے سکھدار اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سکھدار نے میری طرف دیکھ کر آنکھ کا گوشہ دبا دیا۔ اس کا ایک ہاتھ انیسٹرنگ پر ہی تھا۔ دوسرا ہاتھ اس نے دروازے کے

ہینڈل پر رکھ کر دروازہ کھولا اور پھر اسے اس زور سے جھکا دیا کہ دروازے کے ساتھ کھڑا ہوا پولیس آفسر اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ دروازہ بڑے زور سے اس سے ٹکرایا تھا۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھاکر پیچھے ہٹا اور پھر دہرا ہو گیا۔ سکھدار نے گلی پیٹ پر سے بہرہ نایا۔ انجن سمیر میں تھا۔ کار ایک زور دار جھٹکے سے اچھل کر آگے بڑھی۔ سکھدار نے ایکسی لیٹر پٹر پٹر کا باؤ ڈال دیا۔ پکار بندوبست سے نکلی ہوئی گولی کی طرح دوڑی تھی۔

سکھدار نے کار چارواٹھں گھوموں روڈ پر موڑ لی۔ پولیس کی کار بھی ہمارے تعاقب میں اسی طرف مڑی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پولیس کار سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ ایک گولی کار کی دائیں طرف والی بیک لائٹ پر لگی اور وہ جی بھی ٹوٹ گئی۔ سکھدار نے کار کو بڑی تیزی سے لائٹ یا روڈ پر موڑ لیا۔ یہ سڑک سیدھی ٹاکسن انیچو والے چوراہے اور اس کے ساتھ واٹنگ ونگ یائے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔

ٹاکسن انیچو والے چوراہے اور اس کے قریب ریلوے اسٹیشن کے آس پاس پولیس کی کوئی نہ کوئی گاڑی ہر وقت موجود رہتی تھی اور ہمیں ذریعہ تھا کہ اگر ہمارے تعاقب میں آنے والی کار کے ریڈ پوزٹس میٹر ہمارے بارے میں رپورٹ نشر کر دی تو اس چوک یا ریلوے اسٹیشن کے آس پاس ہمیں گھبرنے کی کوشش کی جائے گی جبکہ پولیس کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیے تھا۔

کار ٹاکسن روڈ پار کرتی ہوئی ایک اور چھوٹی سڑک پر نکل آئی۔ یہ سڑک آگے جا کر ریلوے لائن سے گزرتی ہوئی دوسری طرف تھوڑی تھوڑی روڈ سے جاتی تھی۔ سکھدار نے کار ریلوے لائن کے قریب روک لی۔ چھانک بند تھا۔ شاید کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ ہم کار سے اتر کر ریلوے لائن کی طرف دوڑے اور چھانک سے گزر کر تھوڑی تھوڑی روڈ پر آ گئے اور رکے بغیر دائیں طرف دوڑنے چلے گئے۔

ایک طویل چکر کاٹ کر ہم ٹاکسن انیچو والے چوراہے پر پہنچ گئے۔ اس وقت پونے چار کا وقت تھا۔ ریلوے اسٹیشن قریب ہونے کی وجہ سے یہاں خاصی چل پھل تھی۔ چند چھوٹے ریل ٹھورنٹ بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہاں پولیس کی سرگرمی بھی دیکھنے میں آئی۔ ایک جگہ پر پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی ہچکچاہٹ پر لگے ہوئے فلیشر بیل بجھ رہے تھے۔ ان پولیس والوں کو یقیناً ہمارے بارے میں اطلاع مل چکی تھی اور شاید ہماری تلاش ہو رہی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

اڈا انجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

# آتش فشان



# آتش فشاں

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کڑواہٹ اس کے لئے نئے نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ یہ رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بنا سکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکانہ کر سکیں۔ بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

## اس ٹٹھارتے چراغ کا احوال جو چاکلک ہی آندھیوں کی زد پر آ گیا تھا

برآمدے میں ایک بھولا سا متحرک دکھائی دیا اور پھر وہ بھولا برآمدے سے نکل کر تیزی سے گیٹ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے چال سے پہچان لیا۔ وہ تھائی ونگ تھی۔ گیٹ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہو گئے۔ تھائی نے گیٹ بند کر دیا اور میرا بازو پکڑ لیا۔  
”میں ٹھیک ہوں تھائی۔“ میں نے سرکشی کی اور اس کے ساتھ ہی میں نے تھائی کے منہ سے نکلنے والا کمراسانس بھی سنا تھا۔ ہم اندر آ گئے۔ گانگ اور نوٹا ہال میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پر ساد اور جاگلی مجھے نظر نہیں آئے۔  
”پر ساد کہاں ہے؟“ میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔  
”اس کمرے میں۔“ گانگ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے اشارہ کیا۔

اور پھر وہ میرے ساتھ ہی اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ پر ساد بیٹھ کر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر لباس نام کی صرف ایک اندھونیر تھی۔ اس کا بہنہ جسم دکھ کر میں کانپ اٹھا۔ وہ کئی دن تک دارا اور پیڑو جیسے دنیا کے سفاک ترین انسان نما بھیڑیوں کی قید میں رہا تھا۔ انہوں نے اسے ممان بنا کر نہیں رکھا تھا۔ میرے بارے میں پوچھنے کے لیے اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں بتا دیتا تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی لیکن تشدد کے یہ نشان ظاہر کرتے تھے کہ اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کے پیٹ سینے اور بازوؤں پر جلنے کے بے شمار نشان تھے۔ لگتا تھا جیسے

یہ وہ علاقہ تھا جہاں جیسی موائی قسم کے لوگ بھرے رہتے تھے۔ ٹاکسن اینٹیچو والے چوک کے چوترے پر بھی تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ نئے کے عادی بے گھر موائی دنیا و مائیسے بے خبر ایک دوسرے پر لدے ہوئے سو رہے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس وقت بھی کوئی نہ کوئی نشہ کرنے میں مصروف تھے۔  
میں اور سکھد رچو راہا پار کر کے دوسری سڑک پر آ گئے۔ وہاں ایک پولیس والا کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ رہا اور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سرسری سے انداز میں ہماری طرف دیکھا اور پھر دائیں طرف سے آنے والی ایک سفید کار کی طرف متوجہ ہو گیا اور سڑک کے بیچ میں آکر کار کو روکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ہم دونوں قریب سے گزرتے ہوئے سڑک پار کر کے ایک سائڈ اسٹریٹ میں داخل ہو گئے اور پھر مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم اس گلی میں پہنچ گئے جہاں جاگلی کا بنگلا تھا۔

گلی میں بتایا تھا۔ ہمارے قدموں کی آواز بھی اس بتائے میں دور تک گونج رہی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اب تک ایک دوسرے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جاگلی والے بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ بنگلے کے اندر روشنی تھی لیکن برآمدے والی جی بھی ہوئی تھی۔ میں نے کال بیل کا بزن دبا کر گیٹ کے اوپر سے اندر بھانکا تو مجھے تاریک



دیکھتی ہوئی صلاح سے اس کے جسم کو داغایا ہو۔ اس کا پیر بھی خطرناک حد تک سوجا ہوا تھا۔

پرساد ہوش میں تھا اور جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ آگئی۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں چند لمحوں کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے جھک کر اس کی پیشانی پر ہوسہٹ کر دیا۔

”میں تمہارا انتقام لوں گا پرساد۔“ میں نے سرگوشی کی ”جس نے بھی تمہیں اس حالت کو پہنچایا ہے اس کے جسم پر اتنے نشانات لگاؤں گا کہ مجھے گھنی گھنی نہیں جاسکیں گے مجھے تاؤ کن تھا وہ... دارا یا...؟“ میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”پیڑو۔“ پرساد نے زور کی آواز میں جواب دیا ”اس کا خیال ہے کہ ہم دونوں نے مل کر ٹانگیں کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں مجھ سے پوچھتا رہا اور الیکٹرک سولڈرنگ آئرن (کاویں) سے میرے جسم کو داغ دیا لیکن میری زبان کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”پیڑو۔۔۔“ میرے حلق سے غراہٹ سی نکلی ”کاش! میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔“

”پیڑو۔۔۔“ میری پہلی اور آخری ملاقات نہیں تھی۔“ میرے قریب کھڑے ہوئے گاگ نے کہا ”بہت جلد ہمارا اور اس کا پھر آنا سامنا ہو گا اور اس مرتبہ وہ زندہ رہ کر نہیں جائے گا۔“ ”ابھی نہیں۔“ پرساد نے کہا ”مجھے ٹھیک ہو جانے دو۔ اپنا انتقام میں اس سے خود لوں گا۔“

پرساد کی اس بات پر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔ ”گاگ۔“ قریب کھڑی ہوئی جاگی نے کہا ”اب تم جاؤ۔ تمہیں واپسی میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”کہاں جا رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے کچھ دوا میں لکھ کر دی ہیں۔“ جاگی نے کہا ”یوں تو یہ دوا میں کسی بھی اسپتال سے مل سکتی ہیں لیکن اس وقت اسپتال والے کسی قسم کا شبہ کر سکتے ہیں۔ مشن اسپتال کا ڈرگ اسٹور میری ایک دوست کی ملکیت ہے۔ وہاں اس سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ گاگ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بید کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ جاگی بتا رہی تھی کہ یہاں آکر جب اس نے پرساد کو بندہ پر لٹایا تو اس کی قمیص کے کھلے ہوئے گریبان سے اس کے سینے پر داغے جانے کے ایک دو نشان دیکھ کر جب اس نے قمیص ہٹائی تو سینے اور پیٹ پر ایسے بے شمار داغ نظر آئے۔ اس نے قمیص اتار دی اور پھر انکشاف ہوا کہ پورا جسم اسی

طرح داغایا تھا۔ جاگی کے خیال میں ذمہ زیادہ مگرے نہیں تھے لیکن انہیں ٹھیک ہونے میں چند روز تو ضرور لگتے۔ ”اس کے پیر کا کیا ہو گا۔ یہ تو بہت زیادہ سوج گیا ہے۔“ میں نے پرساد کے پھولے ہوئے پیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تھائی۔“ وانگ بہت تجرہ کار سا جڑ ہے۔“ جاگی نے کہا ”وہ صبح اس کے پیر کا علاج بھی شروع کر دے گی۔“

میں کچھ دیر وہاں کھڑا پرساد سے باتیں کرتا رہا اور پھر کمرے سے باہر آیا۔ نوتا اس طرح صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور سکھدر سامنے والے صوفے پر بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔

سکھدر جب ہمارا ج کے حکم پر یہاں آیا تھا تو میں نے اسی روز محسوس کر لیا تھا کہ وہ تھائی کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا تھا اور اب وہ نوتا کو بھی ایسی ہی لکھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سکھدر پر اور معاملات میں تو اتحاد کیا جاسکتا تھا مگر عورت کے معاملے میں وہ مجھ سے کابل نہیں تھا۔

تھائی وانگ کچن میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں

کانی کے مکھ اٹھائے ہوئے لے آئی۔ اس نے ایک ایک مک ہم تینوں کو دیا۔ انا مک سینئر فیلڈ پر رکھا اور دو مک لے کر پرساد والے کمرے میں چلی گئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ جاگی کے ساتھ واپس آگئی۔ ایک مک جاگی کے ہاتھ میں تھا اور دو سرائے میں رکھا ہوا تھا۔

”پرساد سو گیا ہے۔“ جاگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ شاید تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر اسے تسلی ہوگئی اور وہ سو گیا۔“

وہ دونوں بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تھائی کو ابھی تک انہوں نے شاید کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ شہر قحطی کے میں اس واقعے کی تفصیل بتاؤں۔ میں نے اسے زیادہ انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے سارے واقعات تفصیل سے بتائے لگا۔

”اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ پیڑو نے پرساد کی یہ حالت کی تو میں اسے کبھی بھی زندہ نہ چھوڑتا۔“ میں نے آخر میں کہا ”لیکن بہر حال، اب سب سے پہلے اسی سے نمٹنا ہے۔ جب تک اس سے پرساد پر تشدد کا بدلہ نہیں لے لوں گا کسی اور کام پر توجہ نہیں دوں گا۔“

جاگی اور نوتا خاموش بیٹھی ہوئی تھیں اور میں دیکھ رہا تھا کہ سکھدر گھورتی ہوئی نظروں سے بادی بادی ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کانی ختم کر چکا تو میں نے اسے حکم دیا کہ وہ پرساد کے ساتھ دائیں طرف والے کمرے میں جا کر بیٹھ جائے۔ اس کمرے کا

ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا اور وہاں سے گیت پر نگاہ رکھنی جاسکتی تھی۔ سکھدر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ ”نوتا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم ایک خزانہ کا تجربے سے گزری ہو۔ جاؤ۔ تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“

”جانی ہوں۔“ نوتا نے کہا ”لیکن وہ پرساد۔“ ”وہ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”گاگ تھوڑی دیر میں آجائے ہو گا۔ اس کے زخموں پر دو لگا دی جائے گی تو وہ دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

مجھے نوتا کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب فیملی ممبروں کی طرح تھے۔ دلوں میں ایک دوسرے سے لگاؤ تھا لیکن نوتا کی یہ حالت دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ ان دونوں میں کوئی جذباتی لگاؤ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ وہ کئی روز سے اکٹھے گھوم پھر رہے تھے۔ اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ تو برآمد ہونا ہی تھا۔

پانچ بجے کے قریب گاگ ڈاکٹر جاگی کی لکھی ہوئی دوائیں لے کر آگیا۔ دواؤں کے ساتھ وہ ایک خیرہ بھی لایا تھا کہ اب پورے شہر میں ہماری تلاش ہو رہی تھی۔ گاڈوین کو روک کر چیک کیا جا رہا تھا۔ پولیس نے صرف مجھے اور سکھدر کو دیکھا تھا۔ میرا اور سکھدر کا ٹیبلٹ ریڈیو ٹرانس میٹر کے ذریعے نشر کر دیا گیا تھا اور شہر بھر کی پولیس ہمیں تلاش کر رہی تھی۔

میں پولیس سے کسی قسم کا پتہ نہیں لینا چاہتا تھا لیکن یہ اتفاق تھا کہ ہم پولیس کی نظروں میں آ گئے تھے۔ اس پر پولیس آفیسر کو ہم پر شبہ غالباً گاڈی کے کاغذات کی وجہ سے ہوا تھا اور پھر سکھدر کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ اگر ہم گاڈی سے اتر جاتے تو شاید سکھدر کسی طرح معاملات چلایا لیکن یہ امکان بھی تھا کہ پولیس آفیسر کی جرح سے معاملہ کچھ اور گہیر ہو جاتا اور ہم پھنس جاتے۔ بہر حال اب جو صورت حال تھی وہ کوئی زیادہ قابلِ حریف نہیں تھی۔ اب ہمیں پولیس سے بھی پتا تھا۔

جاگی گاگ کے ساتھ پرساد والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ نوتا بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ تھائی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ پیڑو سے لڑائی کے دوران میں ’میں زمین پر بھی لوٹا تھا۔ کپڑے گرد آلود تھے اور بال بھی الجھے ہوئے تھے۔ تھائی حسبِ معمول مجھے ٹوائل کر دیکھنے لگی کہ کوئی نوٹ چھوٹ تو نہیں ہوئی۔ اس نے جیسے ہی میرے بائیں بازو پر ہاتھ رکھا، میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

”کیا ہوا؟“ تھائی نے جھجک کر میری طرف دیکھا۔ ”پیڑو کی لک لگی تھی۔ معمولی سی تکلیف ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”معمولی سی تکلیف ہوتی تو تم اس طرح نہ کراہتے۔“ تھائی

مشہور ماہرین نفسیات کی آراء پر مشتمل کتاب

# احساس کمتری

اسباب تدارک علاج

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

● احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

● کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔

قیمت 25 روپے  
ذاتِ خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت میں ڈاک خرچہ بذریعہ  
پیشگی منی آرڈر اور سال گریس



kitablat@hotmail.com  
kitablat1970@yahoo.com

نے مجھے گھورا "انھوں نے چلو میرے ساتھ۔"

اس نے مجھے دوسرے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے آئی اور میری قمیض اتار دی۔ سب سے پہلے اس نے میرے بازو کا معائنہ کیا۔ بازو سوج گیا تھا۔ وہ اسے نٹول نٹول کر دیکھنے لگی۔ اس کے انگوٹھے کے بازو سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی اور میرے منہ سے ہلکی ہلکی سسکایاں نکل رہی تھیں۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور پانی کیم کا معائنہ کرنے لگی۔ وہ جسم کے ہر حصے کو نٹول کر دیکھ رہی تھی۔

"ہاں بھئیو۔ میں تمہارے بازو پر کیم لے دوں۔" اس نے مجھے پکڑ کر کیم کی پٹی پر بٹھایا اور الماری میں سے کیم کی ڈیبا نکال لائی۔

وہ میا لے رنگ کی کیم میرے مجروح بازو پر پختے لگی۔ اس نے اگرچہ ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا مگر میرے منہ سے سسکایاں نکل رہی تھیں۔

"اندرو سے گوشت پھٹ گیا ہے۔ اب تمہیں دو چار روز اس بازو کو آرام دینا ہوگا۔" تھانی نے کیم کی ڈیبا بند کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ ہاتھ دھونے کے لیے ہاتھ دوم میں چلی گئی۔

میں قمیض پہنے بغیر بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ اب مجھے بازو میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکا سا درد تھا جو بچپن کے ہوئے تھا۔ تھانی ہاتھ دوم سے لٹکی تو اس نے چادر میرے اوپر ڈال دی اور اس بازو کو ڈھکے رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں آنکھ بند کیے صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ ایک رات میں دو مہرے کے تھے اور دونوں مرتبہ میں موت کے جہزوں سے نکلا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں دونوں مرتبہ بلا دست ہی رہا تھا۔ پیراڈائز ریستورنٹ سے فرار کے بعد دویا کے کنارے چلی فائنگ سے ہونے والی جھڑپ میں بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ خبر یہ تھی کہ میں نے چلی فائنگ کی کوئی بڑی توڑ دی تھی اور وہ اسپتال میں رہا تھا۔

دوسری جھڑپ دارا اور پیڑو سے ہوئی تھی۔ دارا بڑی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگ نکلا تھا۔ شاید میں پہلے بھی کسی موقع پر اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں کہ دارا جیسے یہ بد معاشرین کی اصل قوت ان کے گروگوں میں ہوتی ہے۔ وہ خود لڑنے کے بجائے اپنے مہروس سے کام لیتے ہیں اور جب خود دشمنوں میں گھرجاتے ہیں تو فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ دن نوں مقابلے میں اگر حریف حاوی ہو جائے تو بھی مقابلہ کرنے کے بجائے ڈم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے دارا کو اس طرح راہ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ البتہ پیڑو دلیر آدمی ثابت ہوا تھا۔

اس نے آخر تک مقابلہ کیا تھا۔ اگر میں اور سکھرواں سے راہ فرار اختیار نہ کرتے تو پیڑو زندگی کے آخری لمحوں تک مقابلہ جاری رکھتا۔ وہ دیا تو مجھے ختم کر دیتا یا خود ختم ہو جاتا۔ اس کے لڑنے

کے انداز سے بھی مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کسی موقع پر بھی میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں تھا اور میں نے یہ بات بھی محسوس کر لی تھی کہ میں زیادہ دیر تک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس کا کیم (دارا شل آؤٹ) مجھ سے بہت زیادہ پیڑو تھا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے ابھی کچھ اور پریکٹس کی ضرورت تھی لیکن میرے پاس پریکٹس کے لیے وقت نہیں تھا۔ مجھے تو جلد سے جلد انتقام لینا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دوسرے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ تھانی کمرے میں نہیں تھی۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ تھانی اور جاگی دیوی ہال میں سوئوں پر آڑی تر جمی پڑی سو رہی تھیں۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا راہداری میں آیا۔ پر سادو لے کمرے میں بھاگ کر دیکھا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ نویتا کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔

پر سادو جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مسکرایا۔ میں بید کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر سر کو شیوں میں باہمی کرنا ہوا پھر نویتا کی طرف دیکھنا ہوا یا ہر گیا۔ پہلے تو میں نے یہ سوچا تھا کہ اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں بیچ دوں تاکہ وہ ہسپتال آرام سے سو جائے لیکن اس طرح اس کی نیند اچھا تو ہو جاتی اس لیے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر آیا۔

میرا بالیاں بازو اکڑا ہوا تھا۔ ہلکا سا درد بھی ہو رہا تھا لیکن بہر حال یہ تکلیف تو مجھے براہ راست کرنی تھی۔ میں اس وقت جائے یا کافی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ تھانی کو یا جاگی کو چکا نامناسب نہیں سمجھا اور بہن میں آکر میں خود ہی کافی بنا لے گا۔

اپنے کمرے میں آکر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کافی کا پیلا گھونٹ بھرتے ہی مجھے یوں لگا جیسے آنتوں میں لاوا انڈیل دیا گیا ہو۔ خالی پیٹ بلیک کافی نے میری آنتوں میں انکارے سے بھر دیے تھے۔ میں ابھی کافی پی رہا تھا کہ تھانی کمرے میں داخل ہوئی۔ مجھے کافی پیتے دیکھ کر اس کی توجہ پڑ چھ گئیں۔

"بڑے خود غرض ہو تم؟" اس نے مجھے گھورا "کیلے کی اکیلی کافی اڑا رہے ہو۔"

"تم لوگ تو سو رہے تھے۔" میں نے جواب دیا "بہر حال" آج میں تم لوگوں کو کافی بنا کر پلاؤں گا۔"

تھانی نے میرے ہاتھ سے کھ لے لیا۔ چند گھونٹ بھرے اور ک میری طرف بڑھا دیا۔

"تم تو کافی بھی بہت مزے کی بنا لیتے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ بنائی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب تم جا کر بہن سنبھالو۔ میں تو ڈی دیر میں آتی ہوں۔" تھانی یہ کہتے ہوئے ہاتھ دوم میں گھس گئی۔

اپنے کمرے سے کافی کی چسکیاں بھی لیتا رہا۔

جاگی اور نویتا بھی اٹھ گئی تھیں۔ میں نے سب کے لیے کافی بنائی تھی۔ سکھروا بھی اندر آیا تھا۔ نویتا دو کمرے کے پر سادو لے کر کرسی پر چلی گئی تھی۔ ہم ہال میں بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے گزشتہ رات کے واقعات پر تہہ بہ تہہ کہنے لگے۔ جاگی اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور دوسرے کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔

چار بجے کے قریب دوسرا کھانا کھایا گیا اور پھر تھانی اپنا سامان لے کر پر سادو کے کمرے میں آگئی۔ پر سادو کا رنگ فق ہو گیا۔ تھانی نے اس کے پیرو کو ہاتھ لگایا تو وہ سسک کر اٹھ بیٹھا۔ تھانی نے پروا کیے بغیر اس کے پیرو کو ہلا کر دیکھا۔

تھانی نے اس کے پیرو کو ہاتھ لگایا تو وہ سسک کر اٹھ بیٹھا۔ تھانی نے پروا کیے بغیر اس کے پیرو کو ہلا کر دیکھا۔

سوچن ختم ہو جائے گی۔" وہ بولی "دو چار دن ملکی بالٹ سے یہ ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا۔

ہم پھر ہال میں آگئے۔ فی الحال ہمارے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت صورتحال ایسی نہیں تھی کہ ہم پہلے کی طرح ٹائٹ کپڑوں یا ریستورانوں میں گھوم پھر سکیں۔ میرے تمام ساتھی دشمنوں کی نظروں میں آچکے تھے۔ نویتا ڈاکٹر جاگی اور گانگہ پر سادو ہی سے اس قابل نہیں تھا کہ چند روز تک ہسپتال

اٹھ سکے۔

مجھے زیادہ افسوس اس بات کا بھی تھا کہ نویتا اور ڈاکٹر جاگی دشمنوں کی نظروں میں آگئی تھیں۔ گزشتہ رات ان دونوں کو بڑی خوب صورتی سے جال میں پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی اور اگر یہیں وقت بھر دارا کو چلی فائنگ کے میرے ہاتھوں زخمی ہونے کی اطلاع نہ ملتی تو گزشتہ رات ان کے ساتھ نہ صرف "ڈرا" ہو چکا ہوتا بلکہ میرے بارے میں پوچھنے کے لیے انہیں شدید کاٹنا نہ بھی بنایا جاتا۔

بھنگ میں شائنگ کی موجودگی نے بھی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلی مرتبہ کو سادو روڈ والے بنگلے میں زخمی ہونے کے بعد وہ چینگ رائے بھاگ گیا تھا۔ اس کے دوبارہ بھنگ آنے کا مطلب یہ تھا کہ ان میں ابھی تک کوئی ذیل چل رہی تھی اور ظاہر ہے یہ ذیل بیرونی کے خوالے سے ہی ہو سکتی تھی۔ گزشتہ رات جب ہم پر سادو کو چھڑانے کے لیے اس بنگلے پر پہنچے تھے تو شائنگ نویتا کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف

ایڈریس تھا اور میں نے اسے ہاتھ دوم میں بند کر دیا تھا۔ شائنگ اور اس کے دوسرے ساتھی کو جیسے ہم نے باندھ دیا تھا پیڑو ہی نے نجات دلائی ہوگی کیونکہ دارا تو وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ دارا کہاں گیا تھا لیکن فی الحال

میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ معلوم کر سکوں دارا اور پیڑو کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ ماسٹر کے آدمیوں کو اب میں زیادہ

استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور نام ابھرا۔ پاٹھم۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے پر سادو کی دوستی کا

دعوئی کرتے ہوئے رات کو پیراڈائز ریستورنٹ سے فرار ہونے میں ہماری مدد کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ پاٹھم نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔ وہ کارڈ میں نے جنرل کی پچھلی جیب میں رکھا تھا اور اس وقت وہ جنرل میرے جسم پر نہیں تھی۔ میں نے ہاتھ دوم کا پر سادو کھول کر اندر جھانکا۔ وہ پتلون دروازے کے پیچھے کوئی پر لٹکی ہوئی تھی۔

پتلون کی جیب میں کچھ کرئی نوٹوں کے ساتھ پاٹھم کا وہ کارڈ بھی موجود تھا۔ میں کارڈ لے کر پر سادو والے کمرے میں آیا۔ نویتا اور جاگی بھی وہاں موجود تھیں۔

"تم پاٹھم نام کے کسی آدمی کو جانتے ہو؟" میں نے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے پر سادو کی طرف دیکھا۔

"پاٹھم!..." پر سادو کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"میری بات کا جواب دو۔" میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اس سے تمہاری دوستی کب سے ہے اور وہ کیسا آدمی ہے؟"

"وہ بیرو سے باس" بیرو۔" پر سادو نے جواب دیا "پتا میں ہم دونوں نے ایک ہی استاد سے موٹر کھینک کا کام سیکھا تھا۔ میں تو بیچ میں بھاگ گیا تھا لیکن اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ ایک سال کے بعد جب میں دوبارہ استاد کے پاس گیا تو پتا چلا کہ پاٹھم بھنگ

چاچا ہے۔ جب میں کام کی تلاش کے سلسلے میں میاں آیا تھا تو اسے بھی تلاش کرنا تھا لیکن اس کا پتا نہیں چلا اور پھر چند روز پہلے اتفاقاً اس سے سوکھوٹ روڈ کے ایک ریستورنٹ میں ملاقات ہو گئی تھی۔ سوکھوٹ روڈ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں باہر سے آنے والے ہر شخص سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس وقت نویتا بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے باس۔ دوستی کے لیے اپنی جان دے دینے والا۔ اس کے بعد بھی ایک دو مرتبہ ہماری ملاقات ہوئی تھی لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"کل رات اگر وہ پیراڈائز ریستورنٹ میں موجود نہ ہوتا تو شاید میں اور تھانی وہاں سے زندہ نہ نکل سکتے۔ دویا کے راستے ریستورنٹ سے فرار ہونے میں اس نے ہماری مدد کی تھی۔" میں نے کہا اور پھر اسے اس سارے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"وہ یادوں کا یار ہے باس۔" پر سادو نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ میں نہیں تھا تو میرا دوست پاٹھم تمہارے کام آیا۔"

"ہاں۔ میں واقعی اس کا بہت شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیا اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟"

"بھروسہ؟" پر سادو نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم جانتے ہو باس کہ پیڑو نے تمہارے لیے دو ملین بھتا کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ پاٹھم تمہیں اور تھانی کو بچان چکا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو بڑے اطمینان سے تم دونوں کو اس کے خوالے کے انعام کی خلیفہ رقم حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے دولت پر دوستی کو ترجیح دی۔

اس نے میری دوستی کا حق ادا کیا اور جس میں نہ صرف خطرے سے آگاہ کیا بلکہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر تم دونوں کو وہاں سے نکلنے میں مدد بھی دی۔

”اس کا مطلب ہے اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”بالکل یاس۔“ پر سادہ بولا ”میں نے تو سوچا تھا کہ کسی دہریہ سے اس کا ذکر کروں گا لیکن سچ میں معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ مجھے ٹھیک ہو لینے دو۔ میں اسے تمہارے پاس لے کر آؤں گا۔“  
 ”تمہارے ٹھکانے میں ابھی کئی روز لگیں گے اور میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔ تم ابھی اس سے بات کرو۔“ میں نے کہا۔  
 ”ابھی!“ پر سادہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے یاں؟“

”میرے پاس اس کا فون نمبر ہے۔“ میں نے اسے پاہم کا کارڈ دکھایا۔ ”یہ کارڈ اس نے کل رات مجھے دیا تھا۔ میں ابھی نمبر ملاتا ہوں۔“ میں نے فون کو اشارہ کیا۔ وہ ہال سے ٹیلی فون اٹھا لائی۔ اس نے پلگ دیوار میں لگے ہوئے ساکٹ میں لگا کر فون میرے سامنے بند کر رکھا۔

میں نے ریسپورڈر اٹھایا اور گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے نمبر ملانے لگا۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے اور میرے خیال میں پاہم کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ چیتے ہی ریسپورڈر پر ٹھنی جتنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ریسپورڈر پر سادہ کی طرف بڑھا دیا۔

دوسری طرف سے کال ریسپو ہوئے پر اس نے ایک منٹ کسی سے بات کی اور پھر خاموش ہو گیا۔ یہ خاموشی بھی ایک منٹ سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے کال شاید کسی اور نے ریسپو کی تھی اور اب وہ پاہم سے بات کر رہا تھا۔

”تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا ”گزشتہ رات تم نے باس اور اس کی دوستی کی مدد کر کے ان پر نہیں مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہارے اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کروں گا۔ ہاں ہاں۔ نہیں۔ گزشتہ رات ہی باس مجھے ان کی قید سے چھڑا لایا تھا۔ ہاں ہاں۔۔۔ باس بھی تم سے شکر ادا کرتا ہے۔ ایک منٹ ہولڈ رکھو۔“ اس نے ریسپورڈر پر ہاتھ رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”حالات کماں ہو گئے یاں؟“

”اسے میںیں بلالو۔ پتا سمجھا دو اسے۔“ میں نے کہا ”اس سے یہ بھی پوچھ لو کہ وہ کس وقت یہاں پہنچے گا۔“  
 ”پر سادہ نے ماؤتھ فیز پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور پاہم سے بات کرنے لگا پھر اس نے ریسپورڈر رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ ساڑھے نو بجے تک یہاں پہنچ جائے گا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہہ کر کمرے سے باہر آیا۔

اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آیا

اور بیڈ کی پشت گاہ سے ٹپک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ میری وجہ سے کتنے لوگ اس خنیں کھیل میں INVOLVE ہو چکے تھے۔ بنیادی طور پر ان میں سے کسی کا بھی اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے پتاہ تو ہمارا جاننے والی تھی۔ اس نے مجھے اس قابل بنایا تھا کہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکوں۔ یہ لوگ تو محض ہمدردی اور سچائی کی خاطر میرا ساتھ دے رہے تھے اور انہوں نے اپنا سب کچھ برباد کر لیا تھا۔ فوٹا اور ڈاکٹر جاگی بھی دشمنوں کی نظروں میں آچکی تھیں۔ جاگی کو انہوں نے ابھی صرف چرسے سے ہی بچانا تھا کہ وہ میرا ساتھ دے رہی ہے لیکن جب انہیں پتا چلے گا کہ وہ کون ہے تو وہ اسے بھی ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے جیسے انہوں نے تھانی کا بھگلا جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔

اور اب پاہم۔۔۔ پر سادہ کا دوست۔۔۔ جو ایک کینک تھا اور شاید ایک ورکشاپ کا مالک بھی۔ میں نے وہ ورکشاپ نہیں دیکھا تھا لیکن گزشتہ رات پاہم کو پیراڈاز میں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے اس ورکشاپ سے نہایت متعلق آمدنی ہوتی ہوگی۔ پیراڈاز جیسی جگہ اوپر صرف وہی لوگ جاسکتے ہیں جن کی آمدنی معقول بلکہ نہایت معقول ہو۔ پاہم میرا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ اگر پیڈو یا دارا کو اس کے بارے میں پتا چل گیا تو۔۔۔ میں اس سے آگے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے پہلے گلی میں کسی گاڑی کے رکنے کی اور پھر کال ٹیل کی آواز سنائی دی۔ میں پر آندے میں اٹھیا۔ سکھدر نے جا کر گیٹ کھولا۔ ہم اسے پاہم کے بارے میں بتانا بھول گئے تھے۔ پاہم شاید اس سے پر سادہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور سکھدر بڑے کثرت لہجے میں بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی پر سادہ نہیں رہتا۔ پاہم نے گیٹ کے اوپر سے مجھے پر آندے میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے بھی اس کی ایک بھٹک دیکھی اور سکھدر کو آواز دے کر کہا کہ وہ اسے اندر لے آئے۔

تین منٹ بعد پاہم ہمارے ساتھ پر سادہ والے کمرے میں موجود تھا۔ پر سادہ کی حالت دیکھ کر وہ اس قدر جذباتی ہو گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر اسی وقت انکشاف ہوا کہ وہ دونوں آپس میں دور کے رشتے دار بھی تھے۔

”تم نے پر سادہ کو ان دونوں سے بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے یاں۔“ پاہم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے مجھے بے مول خریدا یا ہے۔ پر سادہ نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اب میں پر سادہ کو بھی نہیں کچھ سکوں گا لیکن۔۔۔“

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا یا تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”پر سادہ میرا دوست ہے۔ میں نے تو صرف دوستی کا رشتہ نبھایا ہے۔ پر سادہ نے کئی مرتبہ اپنی جان کی بازی لگا کر میری جان بچائی تھی۔ اس مرتبہ میں اور میرے یہ دوست اس کے کام

آجائے۔“  
 پاہم پر ایک کچھ نہیں بول سکا۔ وہ باری باری سب کی طرف دیکھتا رہا۔ فوٹا کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ فوٹا کو کئی مرتبہ پر سادہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

پاہم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بھی پر سادہ کی طرح وفادار اور جان کی بازی لگانے والا ہے۔ اس کی ایک مثال میں گزشتہ رات بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے اور تھانی کو وہاں سے بھاگنے میں مدد دی تھی۔ اگر وہ بچا دیا جاتا یا گزشتہ رات دشمنوں کی نظروں میں آچکا ہوتا تو اب تک شاید وہ زندہ نہ ہوتا۔

”مجھے بتاؤ یاں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے کیا کرنا ہے۔ تم مجھے حکم دو تو میں پیڈو کے تمام اڈوں کو آگ لگا کر راکھ کر ڈالوں۔“

”ابھی نہیں۔“ میں نے کہا ”ابھی جس پیڈو کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ یہ سوچنا ہے کہ اسے کس طرح گھیرا جاسکتا ہے۔ میں چند فکروں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”دارا تو حسب معمول دو چار روز غائب رہے گا لیکن ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دارا اور شائیک کے درمیان کس قسم کی ذیل ہوئی ہے یا ہونے والی ہے۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ دارا اپنی فائیک اوپر کم کے ساتھ مل کر منشیات کی اسمگلنگ کا سینیڈ کیٹ قائم کرنا چاہتا تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ میرا باپ اس کے راستے کی رکاوٹ بنے گا۔ اس نے میرے باپ اور میری ماں کو قتل کر دیا اور اب میں نے یہ عمدہ کر رکھا ہے کہ دارا کو اس کے اس گھناؤنے شخصہ میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے سگا پور میں اس کے سینیڈ کیٹ کو ابتدائی مرحلے میں ہی اکھاڑ پیچکا تھا۔ یہ درست ہے کہ ہم دو چار آدمی پوری دنیا سے اس بڑائی کو ختم نہیں کر سکتے لیکن اسے ختم کرنے میں اپنا کردار تو ادا کر سکتے ہیں۔ یہ تھانی داگ۔“ میں نے تھانی کی طرف اشارہ کیا ”میرا ساتھ دینے کے چکر میں اپنا سب کچھ تباہ کر چکی ہے۔ اس کے بچنے کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ یہ جاگی دیوی ایک معزز پیشے سے وابستہ ہے۔ اس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا رکھا ہے اور یہ فوٹا۔ اسے مجھ سے کیا لالچ ہو سکتا ہے۔ یہ اگر چاہتی تو پہلے ہی روز چپاگ رائے دایس چلی جاتی اور اطمینان اور سکون کی زندگی گزارتی لیکن اب یہ بھی چاروں طرف سے خطرات میں گھر چکی ہے۔ ان سب کی زندگیوں کو داؤ پر لگی ہوئی ہیں لیکن یہ لوگ خوف زدہ نہیں ہیں۔ پر سادہ کی حالت تم دیکھ رہے ہو۔ یہ سب کچھ کس لیے ہوا۔ ٹانگیر دارا یا پیڈو سے تو اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ میری وجہ سے اس معاملے میں کودا اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اپنا یہ مشرب ہونے کے بعد تو اسے چاہیے تھا کہ میری طرف سے منہ پھیر لیتا اور کہیں اور

جا کر محفوظ زندگی گزارتا لیکن اس کے ارادے اب بھی وہی ہیں جو پہلے روز تھے۔ میں یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ میرا ساتھ دو گے تو تمہارے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں جس سوچنے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔“ میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”سوچنے کا موقع تو نکل چکا۔“ پاہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”مگر کوئی سوچنے والی بات ہوئی تو کل رات تمہیں جی فائیک کے خطرے سے آگاہ نہ کرنا اور تم دونوں کو وہاں سے نکلنے میں مدد نہ دینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”اب تم بتاؤ۔ تمہارے خیال میں پیڈو کو کیسے گھیرا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے میں پیڈو سے اس لیے بھی نمٹنا چاہتا ہوں کہ اس طرح دارا کا زور ٹوٹ جائے گا۔“  
 ”پیڈو کو گھیرنے کا ایک بہت آسان طریقہ ہے۔“ پاہم نے کہا ”اس کی ایک محبوبہ ہے۔ لی وان۔ بہت حسین بڑے غضب کی چیز ہے۔ اگر اسے اپنے قابو میں کر لیا جائے تو پیڈو بلا چون و چرا ہتھیار ڈال دے گا۔“

”نہیں۔“ میں نے فوراً ہی انکار کر دیا ”اس میں شبہ نہیں کہ وہ لوگ ایسی حرکتیں کر چکے ہیں لیکن میں ان تک پہنچنے کے لیے کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ پیڈو کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھو۔ اس کے معمولات کو چیک کرو اور یہ پتا چلاؤ کہ وہ اپنا زیادہ وقت کہاں گزارتا ہے۔ اس کے بعد ہم کوئی کارروائی کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ پاہم نے کہا ”میں یہ کام آج ہی سے شروع کر دیتا ہوں۔ پیراڈاز ریسٹورنٹ یہاں سے بہت قریب ہے۔ میں سیدھا وہیں جاؤں گا اور اگر پیڈو وہاں نہ ہوا تو یہ پتا چل جائے گا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔“

”یہاں کا فون نمبر ذہن نشین کرلو۔ کوئی غیر معمولی بات ہو تو فوراً اطلاع دے دینا۔ ایک بات اور۔۔۔۔۔“ میں نے کہا ”مجھے ایک گاڑی بھی چاہیے۔“

”گاڑی مل جائے گی۔ باہر کھڑی ہے۔“ پاہم نے جواب دیا ”یہ گاڑی دراصل ایک کپڑی کی تھی جو ایک حادثے کے بعد میرے ورکشاپ پہنچ گئی۔ لمبا خرچا تھا۔ گاڑی کئی مہینوں سے میرے ورکشاپ میں کھڑی رہی۔ اس دوران میں وہ کپڑی بھی ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اس گاڑی کو ٹھیک کر لیا۔ اس کا جرنیشن اب بھی اس لمپنی ہی کے نام پر ہے۔ تم لوگ اسے آزادی سے استعمال کر سکتے ہو۔ یہ چالی سنہنل لو۔ میں یہ گاڑی تمہیں چھوڑ دیا۔“  
 ”اس نے جیب سے ایک کی رنگ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس میں تین چابیاں تھیں۔ ایک انکیشن کی ”ایک دروازے کی اور ایک ڈکی کی۔“

ساڑھے دس بجے کے قریب پاہم چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد

میں نے محسوس کیا کہ وہ سارے غنودی طاری ہونے لگی تھی۔ جاگی  
نے اسے پٹنے کی جو دوا دی تھی اس میں نیند کا بھی اثر تھا اور وہ دوا  
پٹنے کے بعد سو جاتا تھا۔ ہم اس کے کمرے سے اٹھ کر بال میں  
آگئے۔ ابھی وہاں بیٹھے ہوئے دو عین منٹ ہی گزرے تھے کہ ٹیلی  
فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ قحانی دانگ نے ریسور اٹھایا۔ کچھ دیر  
”میس بس“ گنتی رہی پھر ایک دم اچھل پڑی۔  
”کیا...؟“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے مخاطب کی بات کا  
یقین نہ آیا ہو ”یہ کب کی بات ہے۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟“ وہ کچھ دیر  
ریسور سے کان لگائے رہی پھر اس نے ریسور میری طرف بڑھا دیا  
”گائنگ کے پاس ایک دلچسپ اطلاع ہے۔“  
”میس گائنگ“ میں نے ریسور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔  
”ایک اہم اطلاع ہے باس۔“ گائنگ نے کہا ”آج شام چھ  
بجے کے قریب شورانی نے دارا پر قاتلانہ حملہ کر کے اسے شدید  
زخمی کر دیا ہے۔ دارا روپوش ہو گیا ہے اور شورانی کو پولیس نے  
حراست میں لے لیا ہے۔“  
”کیا تم اس واقعے کی تفصیل بتانا پسند کرو گے گائنگ؟“ میں  
نے کہا۔

”دارا کل رات تمہارے ساتھ ہونے والی جھڑپ میں فرار  
ہونے کے بعد لیبل پانچ گیا تھا۔ یہ بت بڑا اہم ریسورٹ ہے  
اور یہاں خاص خاص لوگوں کے لیے رہائش کا بندوبست ہے۔ اس  
ریسورٹ کی مالک سیتا نام کی ایک ہندو عورت ہے۔ اس نے  
بنکاک، بنگال اور بنگالہ رائے میں بھی اس نام سے ریسورٹ کھول  
رکھے ہیں۔ ان ریسورتوں میں غیر ملکی مہمانوں کو ہندوستانی  
عورتیں بھی چلائی جاتی ہیں۔ دارا نے کسی طرح سیتا کو اپنے قبضے  
میں کر لیا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً یہاں آتا رہتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس  
کا خفیہ نمکنا تھا جس کا اس کے ساتھیوں کو علم نہیں تھا۔ کل رات  
بھی وہ بھاگ کر یہیں آتا تھا۔ آج شام اس نے فون کر کے شورانی  
کو یہاں بلایا۔ شورانی کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کمرے  
سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے وہ لڑ رہے ہوں پھر فائر کی  
آواز سنائی دی۔ دو گولیاں چلی گئیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد  
دارا کمرے سے نکل کر روٹا ہوا نظر آیا۔ وہ ریسورٹ کی عمارت  
کی عقبی سمت گیا تھا۔ اس کے بائیں بازو ایک گائنگ سے خون  
برہ رہا تھا۔ شورانی بھی کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔  
اس کے ہاتھ میں ہتھول تھا۔ ریسورٹ کی عمارت کی عقبی سمت  
سے بھی فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شورانی دو فون  
ہوئی واپس آئی۔ وہ شاید سامنے والے گیٹ سے باہر جانا چاہتی تھی  
جہاں سڑک پر اس کی کار کھڑی تھی لیکن ٹھیک اسی لمحے دو پولیس  
دالے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے شورانی پر ریولور  
نہاں لیے۔ شورانی نے مزاحمت کیے بغیر اپنے آپ کو ان کے  
حوالے کر دیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ آج رات ہی کسی وقت

پولیس کے چلنے سے چھوٹ جائے گی۔ اس کے چاہنے والے بہت  
ہیں اور ان کی پہنچ بھی بہت دور تک ہے۔“  
”تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے اس کے  
خاموش ہونے پر پوچھا۔  
”ایک دیشلیس ہے جو مہاراج کے جہنازیم سے بلیک ہیٹ  
حاصل کر چکی ہے۔“ گائنگ نے جواب دیا۔  
”تم نے یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ شورانی نے دارا پر گولی  
کیوں چلائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔  
”میس باس۔“ گائنگ نے جواب دیا ”شورانی کو اس بات پر  
غصہ تھا کہ دارا کل رات اسے زخمی حالت میں دیشلیس کے کمرے  
کرم پر چھوڑ کر بھاگ کر گیا تھا۔ پولیس والوں کے سامنے بھی وہ  
چنچ کر کہہ رہی تھی کہ وہ دارا کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ یہ بھی  
گتہ رہی تھی کہ دارا اس کے چالیس لاکھ بھات کھا گیا ہے۔ وہ اس  
سے ایک ایک بھات وصول کر لے گی۔ وہ بڑی خطرناک عورت ہے  
باس۔ اس نے بنکاک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو اپنی انگلیوں  
پر پھرا رکھا ہے۔ بہت حسین ہے اور وہ اپنے حسن و شباب سے پورا  
پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔“  
”تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”پولیس اسٹیشن کے سامنے ایک ریسورٹ ہے۔ وہیں پر  
پبلک ٹیلی فون تو تھ سے بول رہا ہوں۔ پولیس اسٹیشن میں اس وقت  
بڑی رونق ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے معزز اور باعزت لوگ شورانی  
کی مدد کے لیے آتا شروع ہو گئے ہیں۔ ابھی دو آدمی آئے ہیں۔ ان  
میں سے ایک کو تمہیں جانتا ہوں۔ وہ شہر کا بہت بڑا جوہری ہے۔  
ابھی اور لوگ بھی آئیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ شورانی بہت  
اوپر اٹھی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ قریب فال کس کے نام لکھا  
ہے اور کون خوش نصیب اسے اپنے ساتھ لے جائے میں کامیاب  
ہوتا ہے۔“  
”کیا تمہارے خیال میں پولیس اسے چھوڑ دے گی؟“ میں نے  
پوچھا۔  
”بڑے بڑے لوگ اس کی سفارش بن کر آئیں گے تو پولیس  
کو اسے چھوڑنا ہی پڑے گا۔ ویسے ہمارا قانون بڑا عجیب ہے۔ بڑی  
چلک ہے اس میں۔ یہ بظاہر اقدام قتل کا کیس ہے لیکن جس شخص  
پر قاتلانہ حملہ کیا گیا وہ موجود نہیں ہے۔ پولیس اپنے طور پر اقدام  
قتل کا کیس درج کر سکتی ہے لیکن اسے مستعززین کے ہوتے ہوئے یہ  
کیس درج نہیں ہو سکتا۔“  
”ٹھیک ہے گائنگ۔“ میں نے کہا ”وہاں کی صورت حال کا  
جائزہ لیتے رہو۔ کوئی اور اہم بات معلوم ہو تو مجھے بتانا۔“  
”ضرور اطلاع دوں گا ٹل سل باسٹر۔“ گائنگ نے کہا اور فون بند  
کر دیا۔  
میں نے بھی ریسورٹ رکھ دیا اور قحانی ڈیفور کو گائنگ سے ہونے

والی گفتگو کے بارے میں بتائے گا۔ آخر میں میں نے کہا۔  
”یہ ہمارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ دارا خود ہی اپنے دوستوں  
سے محروم ہو رہا ہے۔ گولڈن ٹرائی اچھلنے سے تعلقات استوار  
کرنے کے چکر میں وہ بھی ٹانگ اور کم کو بھی نظر انداز کر رہا ہے اور  
مجھے یقین ہے وہ پیڑو کو بھی دھوکا دے گا۔ پیڑو کل رات مجھے گولی  
مار دیتا مگر دارا نے تمہیں پینتیس لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کا لالچ  
دے کر اسے ڈانواں ڈھل کر دیا اور میرا خیال ہے اب ان دونوں  
میں بھی کھٹ پٹ ہونے والی ہے اور اس کھٹ پٹ کا فائدہ ہم  
اٹھائیں گے۔“  
”شورانی بہت حرافہ عورت ہے۔“ قحانی دانگ نے کہا ”اس  
کے بارے میں تمہیں پتا چھ نہ بتایا تھا اور میں نے بھی۔ اگر وہ  
پولیس کے چنگل سے نکل آئی تو واقعی دارا کو زندہ نہیں چھوڑے  
گی۔“  
”لیکن کیا اس طرح وہ پیڑو سے ٹکر نہیں لے لے گی؟“ میں  
نے کہا ”دارا پیڑو کا پارنر ہے۔ گولڈن ٹرائی اچھلنے والا منصوبہ  
ٹائیگر اور دارا نے بنایا تھا۔ ٹائیگر تو اپنے انجام کو پہنچ چکا۔ پیڑو  
اس کا جانشین ہے۔ کیا وہ اس منصوبے سے دست کش ہو جائے گا  
جبکہ دارا نے اسے تیس پینتیس لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کا لالچ بھی  
دیا ہے۔ اگرچہ دارا اس سونے تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا لیکن اس  
نے بہر حال پیڑو کو اس جال میں پھنسا تو لیا ہے اور میرا خیال ہے  
پیڑو بھی ہرگز یہ نہیں چاہے گا کہ دارا کو کوئی نقصان پہنچے۔ وہ ہر  
قیمت پر اس کی حفاظت کرے گا۔“  
”یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا صورت حال سامنے آتی ہے۔  
ہمیں تو صرف انتظار کرنا ہے۔ یہ بات جاگتی نہ لگی تھی۔“  
اس وقت سو گیا مدہ رخ رہے تھے۔ نوتا جہاں میں لیٹی ہوئی اٹھ  
کر کمرے میں چلی گئی۔ ڈاکٹر جاگتی بھی اٹھنے کی تیار نہ رہی تھی کہ  
فون کی گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ ریسورٹ میں نے ہی اٹھایا تھا۔ ہیلو  
جواب میں گائنگ کی آواز سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔  
یقیناً کوئی اہم بات تھی۔  
”گائنگ بول رہا ہوں ٹل سل باسٹر۔“  
”میں گائنگ کوئی خاص بات؟“ میں نے پوچھا۔  
”بہت ہی خاص بات ہے۔“ گائنگ نے کہا ”شورانی کو گولیوں  
سے چھتی کر دیا گیا ہے باس۔“  
”کیا...؟“ میں اچھل پڑا ”تفصیل بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیسے  
ہوا؟“ میں نے کہا اور سامنے بیٹھی ہوئی جاگی اور قحانی کی طرف  
دیکھنے لگا۔ میرے اس طرح اچھلنے پر ان دونوں کے چروں پر بھی  
چٹیس کے آثار ابھر آئے تھے۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ پر سفید رنگ  
کا وہ ٹیپن دبا دیا جس سے سیٹ میں گئے ہوئے اسپیکر کا سسٹم آن  
ہو گیا۔ اب اس فون پر ہونے والی دونوں طرف کی گفتگو کمرے میں  
بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی سن سکتے تھے۔

”یہ صرف چند منٹ پہلے کی بات ہے باس۔“ ٹیلی فون کے  
اسپیکر پر گائنگ کی آواز ابھری ”پہلے جب میں نے تمہیں فون کیا تھا“  
اس کے بعد شہر کے تین اور معززین شورانی کی سفارش بن کر  
پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ شورانی کی اہمیت کا اندازہ تم اس بات  
سے بھی لگا سکتے ہو کہ ان لوگوں کو آدھی رات کے وقت خود پولیس  
اسٹیشن آنا پڑا۔ حالانکہ ٹیلی فون پر بھی ان کی بات نہیں مٹی جا سکتی  
تھی۔ بہر حال چند منٹ پہلے وہ لوگ ایک ایک کر کے قحانی سے  
چلے گئے۔ آخر میں شورانی اس جوہری کے ساتھ پولیس اسٹیشن  
سے باہر نکلی جس کا ڈکڑ میں پہلے بھی کچھ ہوا۔ شورانی کے ہونٹوں  
پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی اور وہ جوہری بھی یوں گردن تانے  
چل رہا تھا جیسے اس نے بہت بڑا معرکہ کر لیا ہو۔ وہ دونوں پولیس  
اسٹیشن سے نکل کر گیٹ سے چند گز آگے جوہری کی کار کی طرف  
بڑھ گئے۔ ریسورٹ کے سامنے کھڑے ہوئے بہت سے لوگ یہ  
منظر دیکھ رہے تھے اور پھر لوگوں نے وہ خوف ناک اور دل ہلا دینے  
والا منظر بھی دیکھا۔ ”گائنگ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری  
رکھتے ہوئے گئے۔“ شورانی اور وہ جوہری کار میں بیٹھے ہی تھے کہ  
چپے سے آنے والی سیاہ رنگ کی کار ان کے قریب آکر رک گئی۔  
سیاہ رنگ کی اس کار سے دو آدمی اترے۔ ان دونوں کے چروں پر  
قحانے تھے اور ہاتھوں میں آئیٹھک راتھلیں۔ انہوں نے اپنی کار  
سے اترتے ہی جوہری کی کار پر فائر کھول دیا۔ حملہ آوروں نے  
شورانی اور وہ جوہری پر پورے میگزین خالی کر دیے اور اپنی کار میں  
پنہ کر فرار ہو گئے۔ یہ ساری کارروائی ایک منٹ میں مکمل ہو گئی  
تھی۔ ایک لمحے کو تو لوگ کچھ نہیں سمجھ سکے۔ کچھ تو بھی سننے کی سی  
کیفیت طاری ہو گئی تھی اور جب ہوش آیا تو سب سے پہلے  
دوسروں کی طرح میں بھی دوڑ کر جوہری کی کار کے قریب پہنچا تھا۔  
کار تو پھلتی ہوئی ہی تھی، وہ دونوں بھی پھلتی ہوئے تھے۔ شورانی  
کے جسم میں تو اتنے سوراخ ہوئے تھے کہ انہیں گنا بھی شاید ممکن  
نہ ہو۔“  
”وہ“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”تمہارے خیال میں  
حملہ آور کون ہو سکتے ہیں؟“  
”پیڑو کے آدمی۔“ گائنگ نے بلا جھجک جواب دیا ”شورانی  
نے علی بابا ریسورٹ میں کھل کر دھمکیاں دی تھیں کہ وہ دارا کو  
زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس نے پیڑو کو بھی گالیاں دی تھیں۔  
پیڑو اپنے کسی دشمن کو زندہ نہیں چھوڑتا اور ویسے بھی دارا آج  
کل اس کا دست راست بنا ہوا ہے۔ وہ دونوں آج کل کسی بہت  
بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ پیڑو کس طرح برداشت کر سکتا  
ہے کہ دارا کو کوئی نقصان پہنچے۔“  
گائنگ نے وہی بات کہی تھی جس پر ہم کچھ دیر پہلے تبصرہ  
کر رہے تھے۔  
”پولیس کا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا ”کیا پولیس بھی یہ

سمجھتے ہیں کہ قاتلوں کا تعقل پتھر کے گروپ سے ہے؟  
 ”پولیس نے ابھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔“ گانگ نے جواب دیا  
 ”میں تو ان دونوں کی لاشیں کار میں ہی دیکھی ہیں۔ پولیس اس علاقے  
 کو میرے میں لے رہی ہے۔ یہی حکمت عملی تھی ہوتی ہے۔ افسران اعلیٰ  
 کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ  
 ہی دن میں شریک ٹاکا بندی کر کے تمام سڑکوں پر چیکنگ شروع  
 ہو جائے گی۔“

”کیا پولیس ان لوگوں کو پکڑ سکے گی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ناممکن ہے۔“ گانگ نے جواب دیا ”مملہ آوروں نے جس  
 طرح یہ کارروائی کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تربیت یافتہ  
 تھے۔ ایسی کارروائیاں بڑی پلاننگ سے کی جاتی ہیں۔ پولیس اب  
 ان لوگوں کی گرد کو بھی نہیں پاسکے گی۔ اب تک تو وہ لوگ اپنے  
 محفوظ ٹھکانوں تک پہنچ چکے ہوں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ  
 پولیس اس دہرے قتل کا الزام دار اور پتھر دو لگانے میں دیر  
 نہیں لگے گی۔“

”ٹھیک ہے گانگ۔“ میں نے کہا ”اگر ہمیں کوئی دشواری  
 پیش نہ آئے تو مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اگر  
 کوئی پراہم ہو تو اس علاقے سے نکل جاؤ۔“  
 ”میں ہاں۔“ گانگ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور جاگلی اور قحالی کی طرف دیکھنے  
 لگا۔ انہوں نے بھی ساری باتیں سنی تھیں لیکن کوئی تبصرہ کرنے کے  
 بجائے خاموش بیٹھی میری شکل دیکھتی رہیں۔

مجھے شورانی یا اس کے شاہق جو ہری کے قتل کا کوئی افسوس  
 نہیں تھا۔ ایک رات پہلے ہی تو میں نے اس کے بارے میں سنا تھا۔  
 سب سے پہلے ناظم نے بتایا تھا کہ وہ ایک ساجر تھی۔ بے پناہ  
 حسین اور جوان تھی اور اس نے اپنے حسن و شباب سے بھرپور  
 فائدہ اٹھایا تھا اور بڑے بڑے لوگوں کے لیے حسن کے جال میں  
 پھنس کر دولت سمیٹنا شروع کر دی تھی۔ دولت مندوں میں وہ  
 جو ہری اس کا پشلا شکار تھی نے اسے بہت شان دار بنگلا بھی  
 خرید کر دیا تھا۔ اسی دوران میں شورانی کے دوسرے لوگوں سے بھی  
 تعلقات ہو گئے تھے اور اس نے جو ہری کو فیشنگ دکھا دیا تھا اور اب  
 وہی جو ہری اس کے ساتھ جہنم کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شورانی اور دارا میں اس حد تک  
 ان بن ہو گئی ہے کہ شورانی اسے موت کے گھاٹ اتارنے پر تیار  
 ہو گئی تھی میں نے ایک منصوبہ بھی بنایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس  
 صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں شورانی کو اپنے ساتھ  
 لانے کی کوشش کروں گا اور اس طرح دارا اور پیڑرو کے خلاف  
 ایک نیا محاذ بن جائے گا لیکن شورانی کے قتل سے میرا سارا منصوبہ  
 خاک میں مل گیا تھا۔

گانگ نے بتایا تھا کہ علی بابا ریسٹورنٹ میں دارا کو کم از کم دو

گولیاں لگی تھیں۔ ایک بازو میں اور ایک ٹانگ میں۔ وہ وہاں سے  
 بھاگ کر سیدھا پیڑرو کے پاس ہی پہنچا ہوگا۔ اس صورت حال نے  
 پیڑرو کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ شورانی کے بارے میں وہ بھی اچھی  
 طرح جانتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ شورانی نے پتھر چلا کر جو  
 دھمکیاں دی تھیں وہ محض دھمکیاں نہیں ہوں گی۔ ان دھمکیوں پر  
 عمل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس کے  
 لیے ایک اشارہ ہی کر دینا کافی ہوگا۔ پیڑرو نے ان دھمکیوں سے  
 صرف دارا کے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی خطہ محسوس کیا ہوگا۔ وہ  
 دارا کے ساتھ مل کر کسی بڑے پروڈیوٹ پر کام کر رہا تھا اور ویسے  
 بھی دارا نے اسے تیس بیٹھیں لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کی امید  
 دلائی تھی۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ دارا اس کے ہاتھ  
 سے نکل جائے۔ اس نے دارا کو شورانی کی کسی ٹکنہ انتہائی  
 کارروائی سے بچانے کے لیے شورانی کو ہی ٹھکانے لگا دیا تھا۔  
 شورانی کو قتل کرنے کے لیے وہ کسی اور وقت اور جگہ کا انتخاب بھی  
 کر سکتا تھا لیکن پولیس اسٹیشن کے سامنے اس نے یہ کارروائی اس  
 لیے کی تھی کہ شاید وہ پولیس کو بھی یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے  
 خلاف کوئی کارروائی برداشت نہیں کرے گا۔

”میرا خیال تھا کہ ہم شورانی کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش  
 کریں گے۔“ میں نے قحالی اور جاگلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا  
 ”لیکن سارا معاملہ ہی گریو ہو گیا۔“

”شورانی کا انجام تو یہی ہوتا تھا۔“ قحالی نے مگر سانس لینے  
 ہوئے کہا ”وہ بہت لالچی عورت تھی۔ اگر وہ عقل مند ہوتی تو اس  
 جو ہری کے ساتھ رہ کر ساری زندگی آرام و سکون سے گزار سکتی  
 تھی لیکن لالچ اور حرص نے بالآخر اسے بھیاک انجام تک پہنچا  
 دیا۔“

”شورانی بہت دنوں سے دارا کے ساتھ تھی۔ دارا اس کے  
 گھر بھی آتا رہا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے گھر سے بھی دارا  
 کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“ جاگلی نے کہا۔

”اس وقت شورانی کے گھر کا رخ کرنا خطرناک ہوگا۔“ میں  
 نے کہا ”ایک طرف پولیس نے گھر کا رخ کرنا خطرناک ہوگا۔“ میں  
 اور دوسری طرف پیڑرو اور دارا بھی اسی ٹاک میں ہوں گے۔ نہیں  
 جاگلی۔ فی الحال ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ خاموش  
 بیٹھے صورت حال کا جائزہ لیتے رہیں۔“

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا۔ میرے ہاتھ بازو میں اب  
 بھی تکلیف تھی۔ قحالی اگرچہ صبح و شام اپنی مخصوص دوا سے  
 میرے بازو کی مالش کیا کرتی تھی لیکن یہ بات بھی میں اچھی طرح  
 جانتا تھا کہ کوئی تکلیف فوری طور پر رفع نہیں ہو جائی۔ اس میں دو  
 چار دن تو لگتے ہی ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد قحالی بھی کمرے میں آئی۔ جاگلی اپنے  
 کمرے میں جا چکی تھی۔ قحالی نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند

کر کے بولٹ چڑھایا تو میں چونک کر بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ رات کو  
 سوئے وقت اگرچہ دروازہ بند کر دیا جاتا تھا لیکن بولٹ کبھی نہیں  
 چڑھایا جاتا تھا اور آج جب میں نے قحالی کو دیکھا تو مجھے یہ سمجھنے  
 میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔

قحالی کے چہرے پر اب بھی یہی سرفی تو میں صبح ہی سے دیکھ رہا تھا  
 اور اس کے چہرے کی سرفی اس بات کی علامت تھی کہ قحالی کی پیٹھ  
 سمجھانے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری شامت آنے والی  
 تھی۔

قحالی نے کھڑکیوں کے سامنے پردے بھی کھینچ دیے اور میرے  
 پاس آکر بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس نے  
 پشت پر سے قمیض اوڑھ لی۔

”ذرا میری پیٹھ سمجھاؤ۔ بہت جلن سی ہو رہی ہے۔“  
 مجھے قحالی کے ساتھ رہتے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ اسے میں  
 نے بالکل مزید حالت میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی  
 چاب نہیں رکھا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ میرے  
 سامنے ہی کھڑے ہو کر کپڑے بدلنے لگتی لیکن قحالی کے بارے میں  
 میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ اس کی طرف  
 دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں کبھی سیل نہیں آیا تھا۔ قحالی میرے  
 ساتھ سویا کرتی تھی۔ وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ لپٹایا کرتی تھی لیکن  
 میں نے بھی اسے آپے سے باہر ہونے نہیں دیکھا تھا اور اس روز  
 ہمارا ج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں واقعی بڑا خوش قسمت ہوں کہ  
 مجھے جاگلی اور قحالی جیسی عورتیں ملی تھیں جن کی نظروں میں سیل  
 نہیں جن کی بیٹوں میں شور نہیں جن کے دلوں میں ہوس نہیں ہے۔  
 جاگلی سے بھی اگرچہ بڑی حد تک بے تکلفی تھی لیکن ایسا کوئی  
 وقت نہیں آیا تھا کہ اسے پرکھنے کا موقع ملتا۔ البتہ آشرم والی وہ  
 رات مجھے اب بھی یاد تھی جب جاگلی نے مجھے اپنے ساتھ لپٹایا تھا  
 اور میرے رخساروں پر بوسے دینے لگی تھی۔ وہ سب کچھ ماحول اور  
 ضرورت کے تحت ہوا تھا۔ اس میں کسی سخی ارادے کو دخل نہیں  
 تھا۔ ویسے میں جاگلی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا  
 کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے۔

قحالی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اکثر اسے اس  
 سے بھی عجیب تر حالت میں دیکھا تھا لیکن کبھی کوئی ایسی بات ذہن  
 میں نہیں آتی تھی مگر اس وقت اس کا سرفی مائل گداز ذہن دیکھ کر  
 مجھے ان کی بیٹوں میں شور نہیں جن کے دلوں میں ہوس نہیں ہے۔  
 مجھے ان کی بیٹوں میں شور نہیں جن کے دلوں میں ہوس نہیں ہے۔  
 مجھے ان کی بیٹوں میں شور نہیں جن کے دلوں میں ہوس نہیں ہے۔  
 مجھے ان کی بیٹوں میں شور نہیں جن کے دلوں میں ہوس نہیں ہے۔

”قحالی نے کہا۔“  
 لیکن شاید اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی یا میں اس کا مفہوم  
 نہیں سمجھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ مسلاتا رہا۔ قحالی چند

لے تو اسی پوزیشن میں آگے کو جھکی بیٹھی رہی پھر اس نے پیچھے مڑ کر  
 دیکھا۔

”کیا بات ہے وجدان۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“  
 ”اوہ۔۔۔ کچھ نہیں۔“ میں چونک گیا۔ بلکہ یوں لگا جیسے نیند سے  
 بیدار ہوا ہوں ”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

میں واقعی گڑبگڑایا تھا اور پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں  
 نے ناخنوں سے اس کی گداز جلد کو نوچنا شروع کر دیا۔ قحالی کے منہ  
 سے ابھی کبھی سسکائیاں نکلتے تھیں۔ میرا ہاتھ تیزی سے اس کی جلد  
 کو نوچتا رہا۔ اس کے جسم پر میرے ناخنوں سے لمبی لمبی خراشیں سی  
 پڑ گئیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ قحالی کے منہ سے سسکائیوں  
 کے بجائے کراہیں خارج ہونے لگی تھیں۔ قحالی نے ایک بار پھر  
 گردن ٹھکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا بھی  
 تھا لیکن میرا ہاتھ نہیں رکا۔ قحالی ایک دم بیٹھ کر اونٹنی ہو گئی۔  
 میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ آنکھیں کھول  
 کر دیکھا۔ میرے ناخنوں سے اس کے جسم پر لمبی خراشیں پڑ چکی  
 تھیں جن سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ میری آنکھیاں بھی خون آلود  
 تھیں۔

میں ایک جھٹکے سے بیٹھ کر نیچے اتر گیا اور دروازہ کھول کر  
 کمرے سے نکل گیا اور ہال میں رکنے کے بجائے برآمدے والا  
 دروازہ کھول کر باہر آیا۔ چند سیکنڈ پر آمدے میں کھڑا رہا اور پھر ان  
 میں آیا۔ وہاں بائیں کی کھیمپوں کی ایک میز اور چند کارڈز ڈیپریز  
 پڑی ہوئی تھیں۔ میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور دونوں بڑے سامنے  
 میز پر پھیلا لیے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا سے میرے دماغ کی تپش کم  
 ہونے لگی اور میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے  
 تھے۔ میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور تاریکی میں اُدھر اُدھر  
 گھومنے لگا۔ برآمدے کے ساتھ والے کمرے کی تپتی جل رہی تھی  
 اور اندر کرسی پر بیٹھا ہوا سکندر میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں  
 اٹھ کر بیٹھ گیا ہوتی کھاس پر ٹپکنے لگا۔ میرے حواس اب پوری طرح  
 بحال ہو چکے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ نہ تو قحالی  
 میرے لیے ایجنسی تھی نہ ہی اس کا بدن۔ میں بیسیوں مرتبہ اسے  
 اپنے سامنے بے لباس دیکھ چکا تھا۔ اس سے لپٹ کر سویا تھا۔ کبھی  
 میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا لیکن آج کیا کچھ مجھ پر  
 وحشت کیوں طاری ہو گئی تھی؟ میرا ذہن پرانندہ نہیں تھا۔ کوئی  
 شیطانی خیال نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا تھا۔

میں دیر تک بیٹھ کر کھاس پر ٹپکتا رہا اور پھر کرسی پر بیٹھ  
 گیا۔ مجھے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ شاید رات کا آخری  
 پہر تھا۔ گرتی ہوئی شبنم سے میری قمیض بھگ گئی تھی۔ دماغ اس  
 طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا جیسے برف جم گئی ہو۔ میں نے کرسی کی پشت سے  
 ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے ذہن میں سکھر کا خیال ابھرا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ مجھے دیکھ کر باہر آیا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گیا۔ وہ تھالی ایک تھی۔

”ختم پڑی ہے۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ چلو۔ اندر آ جاؤ۔“

میں کچھ کے بغیر اٹھ گیا۔ باہر ٹھنڈ میں بیٹھے رہنے سے میرے بازو میں درد شروع ہو گیا تھا۔ تھالی مجھے کمرے میں لے آئی۔ میں نے سانس لے لی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ تھالی نے پھر دروازہ بند کر دیا۔ میری شرٹ بالکل بھیگی ہوئی تھی۔ تھالی نے بچوں کی طرح مجھے اپنے سانسے کھڑے کر کے میری قمیص اتار دی اور الماری سے دوسری قمیص نکال کر پہنائی اور چیت ہاتھ دوم میں لے جا کر ٹانگ دی۔

”تمہاری یہ چیت بھی بھیگی ہوئی ہے۔ جاؤ۔ بدل کر آؤ۔“ اس نے ہاتھ دوم کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ہاتھ دوم میں جا کر چیت تبدیل کی اور باہر آیا۔ تھالی میری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ میں نے تھالی کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہو کر اس سے پٹ گیا۔ میرے منہ سے سسکی نکل گئی تھی۔

تھالی مجھے لے کر بند پر لے گئی۔ میں اب بھی تھالی سے لپٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ تھالی کے سینے میں چھپایا۔ تھالی میرے بالوں میں انگلیاں بھیرنے لگی۔ میرے ذہن پر خودکشی طاری ہو رہی تھی اور پھر میں گہری نیند سو گیا۔

○☆☆○

صورت حال سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ دارا رد پوش تھا۔ شاید کسی پناہ گاہ میں دیکھا انا ملاج کر رہا ہوگا۔ پڑو نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ میرا سامعہ ہونے کے شک میں وہ اب تک کئی لوگوں کی ہڈیاں توڑ کر انہیں اپنا جانکا تھا۔ اس کے آوی بڑی سرگرمی سے مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

پڑو اپنے آپ کو زہر ذہن دنیا کا بے تاب بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس شہر کا کوئی بوسے سے بڑا بدعاش بھی اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتا تھا، اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ چہ جائیکہ کوئی اس کے سامنے غم ٹھوکر کھڑا ہو جائے اور اسے لٹکا رہے۔ اس کی حالت اس شیر جیسی تھی جس کے منہ سے اس کا شکار جھین لیا گیا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میں برساد کو اس کے ہنگامے سے اٹھا لیا تھا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا مقابلہ بھی کیا تھا اور اسے ایک دو ایک چوہ میں بھی لٹائی تھیں جنہیں وہ اب تک سلا رہا ہوگا۔

میرا بازو ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں باہر نکلتا جاتا تھا مگر تھالی مجھے

اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی باہر لکنا مناسب نہیں تھا۔ برساد کے زخم بھی مندمل ہو چکے تھے لیکن ابھی وہ بھی اس قابل نہیں تھا کہ دارا یا پڑو کے غنڈوں کا مقابلہ کر سکے۔ گانگ وقتاً فوقتاً مجھے باہر کی اطلاعات فراہم کرتا رہتا تھا لیکن وہ بھی پڑو کے اندرونی حلقوں میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر ایک روز گانگ نے مجھے جو اطلاع دی وہ بڑی تشویش ناک تھی۔ اس رات گانگ اور جاگی وغیرہ تو زخمی برساد کو تک ٹک میں لے کر گئے تھے جبکہ میں اور سکھر پڑو کی کار پر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ راستے میں ہمیں پولیس نے روکا تھا اور ہم پولیس کو بھی چاؤ دے کر بھاگ نکلے تھے۔ پولیس اگرچہ اس رات سے ہماری تلاش میں تھی لیکن انہیں ہمارے بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ہم کون ہیں۔ وہ پولیس آفیسر سکھر سے ہی باتیں کرتا رہا تھا اور اب گانگ کی طرف سے اطلاع یہ تھی کہ اس پولیس آفیسر نے سکھر کو ایک مفروضہ مجرم کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔ وہ تقریباً تین سال پہلے ایک قتل کر کے بھاگ تھا۔ پولیس ریکارڈ میں اس کی تصویر موجود تھی اور پولیس آفیسر نے اسے تصویر سے ہی پہچانا تھا۔ ہم جس گاڑی میں فرار ہوئے تھے وہ پڑو کی ملکیت تھی۔ بعد میں وہ گاڑی پولیس کو حوریت تھالی دوڑ پر لوہے لائن کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ اس سے اگلے ہی روز تو شرانی کو پولیس اسٹیشن سے نکلے ہوئے گولیوں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ پولیس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ شرانی کے قتل سے ایک رات پہلے سوئے ہوئی پر کوئی ہنگامہ ہوا تھا جس میں شرانی زخمی ہو گئی تھی۔ اس ساری صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس رات جو دو آدمی پڑو کی گاڑی لے کر بھاگے تھے انہوں نے ہی اگلے دن شرانی کو قتل کر دیا تھا انہیں ان دو آدمیوں کی تلاش تھی جو اس رات پولیس کو دھوکا دے کر بھاگے تھے۔ یہ صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔ اگر سکھر پکڑا گیا تو معاملہ گزربو سکتا تھا۔

”تمہیں پولیس نے شناخت کر لیا ہے سکھر۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری تصویر پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔ اب تمہیں تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”تین سال میں یہ پلا متوقع ہے کہ کسی پولیس والے نے مجھے شناخت کیا ہے۔ حالانکہ میں ان تین برسوں کے دوران میں پولیس والوں کے آس پاس پھرتا رہا ہوں لیکن ہر حال ”کل بج“ جب وہ پولیس آفیسر مجھے اپنے سامنے بھی دیکھے گا تو.... شناخت نہیں کر سکے گا۔“

”وہ کیسے....؟“ میں نے پوچھا۔

”تین سال پہلے مجھے بال بڑھانے اور داڑھی رکھنے کا شوق ہوا تھا لیکن میری محبوبہ کو میرا یہ شوق پسند نہیں آیا۔ اس بات پر

ایک روز ہم دونوں میں جھگڑا ہوا اور میں نے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس کے بعد میں چند ہفتوں کے لیے بنگال سے باہر چلا گیا تھا اور جب واپس آیا تو میں نے سر کے بال بھی منڈوا دیے تھے اور داڑھی بھی صاف کر دی تھی۔ اس کے بعد میں آزادی سے شہر میں گھومتا رہا۔ کوئی مجھے شناخت نہیں کر سکا۔ کئی مرتبہ ان پولیس والوں سے بھی آمناسامنا ہوا جو قتل کے اس کیس کی تحقیق کرتے رہے تھے لیکن وہ بھی مجھے نہیں پہچان سکے۔ چند سینے پہلے میں مدارج کے پاس گیا۔ مجھے پھر شوق ہوا اور میں نے داڑھی رکھ لی اور بال بڑھائے۔ میں زیادہ تر اوقات دوست میں رہا تھا اور باہر نکلنے کا موقع بھی بہت کم ملتا تھا پھر مدارج نے مجھے واٹ ٹریکٹ ملا لیا اور تمہارے ساتھ بیچ دیا۔ میرا خیال تھا پولیس مجھے بمول پکٹی ہوگی۔“

”پولیس کسی کو نہیں بھولتی۔ وہ تو اپنے مطلب کو قہر سے بھی نکال لیتی ہے۔“ میں نے کہا ”ہر حال“ اب چونکہ تم نظروں میں آ چکے ہو اس لیے تمہیں جتنا رہنے کی ضرورت ہے۔“

”وطنیتان رکھو ملش ماسٹر۔“ سکھر نے کہا ”اب پولیس مجھے نہیں پہچان سکے گی۔“

سکھر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے دن صبح جب وہ میرے سامنے آیا تو میں بھی اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ داڑھی کے ساتھ اس نے باریک موچیں بھی صاف کر دی تھیں اور سر کے بال بھی غائب تھے۔

وہ کئی روز سے میرے ساتھ تھا اور اس روز پہلی مرتبہ میں نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ عام تھالی باشندے بہت قامت یا درمیانے قد کے ہوتے ہیں لیکن سکھر کا قد چوٹ کے لگ بھگ تھا۔ کسری بدن اور بازوؤں کے مسل ابھرے ہوئے اس کا چہرہ بھی قدرے ہماری تھا۔ ٹھوڑی پر بائیں طرف جڑے تک پرانے زخم کا تقریباً تین انچ لمبا نشان تھا۔ زخم کا یہ نشان اب تک داڑھی میں چھپا رہا تھا۔ اس کی یہ ہیئت دیکھ کر کوئی بھی شریف آدمی اس کے قریب آنا پسند نہ کرتا۔

”مٹھ۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”اب واقعی تمہیں کوئی نہیں پہچان سیکے گا۔“

”ہاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا ہے ملش ماسٹر۔“ سکھر نے کہا۔

”تم پاٹھم کے پاس چلے جاؤ۔ وہ اس وقت اپنے درکشاپ میں ہوگا۔ اس سے کوئی مجھے شام چھ بجے فون کرے۔“ میں نے کہا۔

”تم اس سے یہ بات فون پر بھی کہہ سکتے ہو ملش ماسٹر لیکن میں سمجھ گیا کہ تم مجھے وہاں کیوں بھیجتا جا چکے ہو۔“ سکھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھالی نے اسے کچھ چیزیں لانے کے لیے بھیجی کہ دیا۔ سکھر پاٹھم والی گاڑی لے کر چلا گیا۔ پاٹھم اس روز یہی گاڑی یہاں چھوڑ گیا تھا لیکن آج اسے پہلی مرتبہ استعمال کے لیے باہر نکالا گیا تھا۔

پاٹھم کا درکشاپ شہر کے شمال میں واقع بس زسٹل کے قریب تھا۔ پورے شہر سے گزر کر وہاں تک جانا پڑتا تھا۔ میں نے سکھر کو وہاں بھیجا یہی اس لیے تھا کہ اس جیلے میں وہ کسی کی نظروں میں آسکتا ہے یا نہیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ریسپور میں نے ہی اٹھا لیا۔

”میں پاٹھم بول رہا ہوں باس۔“ میرے پہلو کے جواب میں آواز سنائی دی میرے پاس ٹھوڑی دیر پہلے ایک آدمی آیا ہے جس نے مجھے تمہارا پیغام دیا ہے۔ ایک تو مجھے اس پیغام پر حیرت ہو رہی ہے اور دوسرے وہ آدمی وہ نہیں جو وہ اپنے آپ کو بتا رہا ہے۔“

”اسے میں نے اس لیے بھیجا تھا کہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”وہ سکھر ہی ہے اور تمہاری ہی گاڑی لے کر آیا ہے۔“

”گاڑی تو میں نے دیکھ لی تھی۔“ پاٹھم نے کہا ”سکھر کو اس روز میں نے ایک ہی مرتبہ تمہارے گھر پر دیکھا تھا۔ داڑھی“ موچیں اور بڑے بال لیکن اب....“

”وہ سکھر ہی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”مزید تسلی کرنا چاہتے ہو تو اس سے میری بات کر دو اور اسے واپس بھیج دو۔“

”ہولڈ کرو۔“ میں اسے بلاتا ہوں۔“ پاٹھم نے کہا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسپور پر سکھر کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ واپسی پر شہر میں گھومتا پھرتا ہوا آئے پھر میں نے پاٹھم سے بات کی اور فون بند کر دیا۔

یہ میرے لیے بڑی خوش آئند بات تھی کہ سکھر کو بدلے ہوئے جیلے میں وہ شخص بھی نہیں پہچان سکا تھا جس نے صرف تین چار روز پہلے اسے دیکھا تھا۔

سکھر دوپہر دو بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے تین شائنگ بیک تھالی کے حوالے کر دیے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں حیرت ہوگی باس۔ آج دوپہر کا کھانا میں نے اس پولیس آفیسر کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا جس نے اس رات ہمیں روکا تھا۔“

”کیا....؟“ میں اچھل پڑا ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں باس۔“ سکھر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں کھس گیا۔ اتفاق سے جس ٹیبل پر مجھے بک لی وہاں وہ پولیس آفیسر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یونی فارم میں نہیں تھا۔ اس کا ایک دوست بھی اس کے ساتھ تھا کھانا کھاتے ہوئے ہم نے دو تین مرتبہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ اگر اس نے مجھے پہچان



لایا تو وہاں پر مجھے دھریلتا لیکن اس نے تو شاید سوچا بھی نہیں ہو گا کہ جس شخص کی اسے تلاش ہے وہ اس کے ساتھ میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔

”بست بڑا رگد لیا خاتمہ ہے۔“ میں نے اسے گھورا ”اگر تم دھریلے جاتے تو ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔“

”رگد تو تیرا ہی تھا پاس۔“ سکھہ نے جواب دیا ”بہر حال“ یہ اطمینان تو ہو گیا کہ اب نہ تو پولیس مجھے شناخت کر سکتی ہے اور نہ ہی پیڑرو کے آدمی۔

”چلو۔ یہ اطمینان تو ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

سکھہ رہائش تو مجھ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ہال میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تھائی بکین تھی۔ نوتا پر سادے پاس تھی اور جاگی اپنے کمرے میں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ سکھہ کی نظریں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ میز پر ہوا کہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تین بجے کے قریب تھائی نے میز پر کھانا لگا دیا۔ جاگی ”نوتا اور پر سادہ بھی وہیں آگئے۔ پر سادہ کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ سکھہ کو بھی کھانے کے لیے کھانیا لیکن اس نے منع کر دیا۔ وہ تو کھانا کسی ریستورنٹ سے کھا کر آیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد تھائی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ نوتا بھی پر سادہ کے ساتھ کمرے میں چل گئی تھی۔ جاگی میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ جاگی جب میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آتی تھی۔

”ٹھیک چھ بجے پانچ کا فون آیا۔“

”لیں پاس۔ کیا حکم ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پیڑرو دارا میں سے کسی کا پتا چلا۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟“

میں نے پوچھا۔

”دارا تو کسی بل میں گھسا ہوا ہے۔ پیڑرو پولیس سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو متحرک رکھے ہوئے ہے۔ ویسے آج کل وہ سیام اسکواڈ پر واقع سن شائن کلب میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا کسینو ہے جہاں بڑے پیانے پر جو ہوتا ہے۔ سنا ہے کوئی باہر کا آدمی یہاں سے بھی جیت کر نہیں گیا۔ وہاں حسین اور نو عمر لڑکیاں ہیں جو بازی بیٹنے میں برا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پیڑرو کو زیادہ آمدنی ایسے ہی آدمیوں سے ہوتی ہے اس لیے وہ ان آدمیوں کا وہہ کرتا رہتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ آج رات بھی وہاں آئے گا۔“ میں نے کہا۔

”نہ آتا چاہیے۔“ پانچم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم تو بچے سن شائن پہنچ جاؤ۔“ سکھہ بھی وہاں

ہو گا مگر تم دونوں ایک دوسرے سے شناسائی ظاہر نہیں کرو گے اور اب میری بات توجہ سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے سمجھانے لگا۔

میں نے فون بند کر دیا اور پھر ستر بجے کے قریب میں نے سکھہ کو بھی سب کچھ سمجھا کر سن شائن پہنچ دیا۔

رات دس بجے کے قریب ہم کھانا کھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ جاگی نے اٹھ کر ریڈیو اٹھایا۔ بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کے ہاتھ سے ریڈیو لے لیا۔ دوسری طرف پانچم تھا جو تیز تیز لمبے لمبے کچھ بتا رہا تھا۔

”پانچم میں وجدان بول رہا ہوں۔ شروع سے بتاؤ کیا بات ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“ میں نے کہا۔

”بست لڑ بڑ ہو گئی ہے پاس۔“ پانچم نے کہا ”ادھا گھنٹا پہلے پیڑرو کا چھوٹا بھائی سائی کسینو میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہی میں نے ہمارا جگہ کے ایک آدمی گانگ کو بھی اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اوپر والے ہال کی طرف چلا گیا۔“

”گانگ کو تم جانتے ہو؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”بست اچھی طرح۔ وہ ٹک ٹک چلاتا ہے۔“ پانچم نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”گانگ کے اوپر جانے کے تھوڑی سی دیر بعد اوپر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد گانگ کی لاش میز چوڑی پر لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک پیشانی میں اور دو سینے پر۔ وہ میز چوڑی سے نیچے پھینچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔“

”کیا...؟“ میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے ”کیا وہ گانگ ہی ہے؟“

”لیں پاس۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ دو سال پہلے میں نے جتنا زہم میں اس سے موئے تھائی کی زندگی بھی لگی تھی۔“ پانچم نے جواب دیا۔

”سکھہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”زینے پر گانگ کی لاش کرنے کے بعد وہ اوپر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔“ پانچم نے کہا ”فائرنگ سے کسینو میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے۔ چند منٹ میں ہی سناٹا چھا گیا۔ پورا بازار بند ہو چکا ہے۔ کسینو والی عمارت سے ملحق سیام شاپنگ سینٹر کے تمام گیٹ بھی بند کر دیے گئے ہیں۔ پولیس ابھی تک نہیں پہنچی۔ گانگ کی لاش اندر ہی پڑی ہے۔“

”تم کہاں سے بول رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سیام اسکواڈ سے آگے رامادون روڈ کے چوراہے پر ایک

بلیک فون بوتھ ہے۔“ پانچم نے جواب دیا۔

”تم وہیں آس پاس انتظار کرو۔ میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور کریڈل نیپ کر کے ماسٹر ہو جن کا نمبر لایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ کال ”ماسٹر کے ایک شاگرد نے ریسیو کی تھی۔“

جتنا زہم میں گانگ کے قتل کی اطلاع پہنچ گئی تھی اور ماسٹر ہو جن اپنے چند آدمیوں کے ساتھ سیام اسکواڈ کی طرف جا چکا تھا۔ میں نے ریڈیو رکھ دیا۔ تھائی اور جاگی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اندازہ لگاتے ہیں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ کوئی لڑ بڑ ضرور ہے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ گانگ کو قتل کر دیا گیا ہے تو ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔

”میں سیام اسکواڈ جا رہا ہوں۔ ماسٹر ہو جن بھی وہاں پہنچ چکا ہو گا۔“ میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ تھائی یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔

”میں تھائی۔ ہو سکتا ہے وہاں مزید کوئی لڑ بڑ ہو۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔“ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ ایسی نازک اور عظیم صورت حال میں تھائی مجھے اکیلے نہیں جانے دے گی۔ اس کی وجہ سے اگرچہ مجھے کچھ ابھمن پیش آ سکتی تھی لیکن میں اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

میں نے خنجر والا اسٹریپ اپنی دائیں پٹنڈی پر باندھ لیا اور جوتے پہننے لگا۔ جب میں تیار ہو کر اٹھا تو وہ مجھ سے پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ اس نے ہسپتال اپنی چلوں کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ہم دونوں کمرے سے نکل آئے۔ جاگی گیٹ تک ہمیں چھوڑنے آئی تھی۔ ہم چمپے سی باہر نکلے۔ اس نے گیٹ بند کر دیا۔

میں اور تھائی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ٹائسن روڈ والے چوراہے پر آگئے۔ جہاں سے ہمیں فوراً ہی ٹیکسی مل گئی۔ ہم جس انداز میں ٹیکسی میں بیٹھے، ڈرائیور سمجھ گیا کہ ہم جلدی میں ہیں۔ اس نے ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ میں نے اسے سیام اسکواڈ پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم تقریباً آٹھ بجے کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ پولیس نے اس علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہماری ٹیکسی کو بھی رامادون روڈ والے چوراہے پر روک لیا گیا۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور نیچے اتر گیا۔ تھائی بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔ چوراہے پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ پولیس انہیں سیام اسکواڈ کی طرف جانے سے روک رہی تھی۔ پولیس کو پتا چل گیا تھا کہ ہمارا جگہ کا ایک آدمی مارا گیا ہے اس لیے صورت حال کو مزید بگڑنے سے روکنے کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے تھے۔

لوگوں کے جھوم میں پانچم موجود تھا۔ وہ ہمارے پاس آیا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارا جگہ کے آدمی ابھی نہیں پہنچے تھے اور پھر ٹھیک اسی وقت دو چھوٹے ایک ایک ٹرک وہاں پہنچ گئے۔ ان دونوں میں ہمارا جگہ کے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ اگلے ٹرک پر ماسٹر ہو جن کھڑا تھا۔ پولیس نے دونوں ٹرکوں کو روک لیا۔ میں نے تھائی کو پانچم کے پاس رکھنے کو کہا اور دو ٹرک اگلے ٹرک پر سوار ہو گیا۔ ماسٹر ہو جن نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ چیخ چیخ کر پولیس والوں سے بحث کر رہا تھا لیکن پولیس والے رات دینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈوں سے ٹرک کو پیچھے لے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

ماسٹر ہو جن ٹرک سے نیچے کود گیا اور پھر اس نے دونوں ٹرکوں کے ڈرائیوروں سے چیخ کر ٹرک آگے لے جانے کو کہا۔ ٹرک ایک جھٹکے سے حرکت میں آئے۔ پولیس والے اچھل کر ایک طرف ہٹ گئے۔ ماسٹر ہو جن دو ٹرک ٹرک کے پائیدان پر سوار ہو گیا۔ پولیس والے بھی ٹرک کے پیچھے بھاگے۔

سیام اسکواڈ سے ملحق بلڈنگ کے سامنے بھی پولیس والے کھڑے تھے۔ ٹرک رکتے ہی لڑکے کود کر نیچے اتر آئے۔ کسی کے ہاتھ میں ہاکی تھی، کسی کے پاس کھوار کوئی خنجر بدست تھا اور کچھ لڑکوں کے پاس ریوایر یا ہسپتال وغیرہ بھی تھے۔ پولیس پانی کے انچارج انسپکٹر نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو ماسٹر ہو جن چیخ کر بولا۔

”آفسر! ہم پولیس سے نہیں اٹھتا چاہتے۔ ہم اپنے آدمی کی لاش لینے آئے ہیں۔ اگر ہمیں روکنے کی کوشش کی گئی تو ہم زبردستی کریں گے اور پورے شہر کی پولیس بھی ہمیں نہیں روک سکے گی۔“ پولیس آفیسر ماسٹر ہو جن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہمارا جگہ کی طاقت سے بھی واقف تھا لیکن اسے اپنی ڈیوٹی بھی دینی تھی۔ اس نے برائے نام مزاحمت کی۔ لڑکے پولیس والوں کو دھکے دیتے ہوئے کسینو کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں بھی ماسٹر ہو جن کے ساتھ عمارت میں گھس گیا۔

گانگ کی لاش اوپر والے ہال کو جانے والے زینے کے قریب فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے تر تھا۔ ایک گولی پیشانی میں اور دو سینے میں لگی تھیں۔ لاش کے قریب تالین پر خون تھا ہوا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں جھٹ کر گھور رہی تھیں۔ میں لاش پر جھک گیا۔ دو آنسو میری آنکھوں سے نکل کر لاش پر گرے۔

ماسٹر ہو جن اور بہت سے لڑکے لاش کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ کچھ لڑکے اوپر چلے گئے تھے۔ چند منٹ بعد ہی اوپر سے توڑ پھوڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نیچے کھڑے ہوئے لڑکوں نے بھی کارروائی شروع کر دی۔ فرنچیز اور رولٹ (جو اکیلے کے لیے استعمال ہونے والی مشین KOULETTE) پیشیں وغیرہ توڑی جانے لگیں۔ چند پولیس والے بھی اندر گھس آئے تھے جو ان لڑکوں کو توڑ پھوڑ سے روکنے کی کوشش کرنے لگے لیکن لڑکے

بھڑے ہوئے تھے۔ بعض لڑکوں کی پولیس والوں سے ہاتھ پائی بھی ہو رہی تھی۔ ماسٹر بوجن اور میں نے کانگ کی لاش اٹھائی اور باہر کی طرف لپکے۔ اس وقت چند اور پولیس والے اندر کھس رہے تھے۔

لاش کو ایک بک اپ ٹرک کے فرش پر لٹا دیا گیا۔ پولیس آفیسر چیچ کر ماسٹر بوجن سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے لڑکوں کو تحریک کاری سے روکے بصورت دیگر اسے بھی کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔ ماسٹر بوجن نے ہونٹوں میں انگلیاں دبا کر سنبھالی۔ عمارت میں موجود لڑکے دوڑتے اور چیختے چلاتے ہوئے باہر آگئے اور ٹرکوں پر چڑھنے لگے۔ میں بھی ایک ٹرک پر لٹک گیا۔ ماسٹر بوجن بھی اسی ٹرک پر تھا۔ دونوں ٹرک حرکت میں آگئے۔ موٹر پر پہنچ کر میں نے ماسٹر بوجن کو اشارہ کیا اور ٹرک سے اتر گیا۔ تھائی اور پاکستانی ہائی کورسے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔

”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“ میں نے پاتھم کی طرف دیکھتے دے پوچھا۔

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سیام اسکوڑے آگے بڑھ چلا۔ روڈ کی طرف سے شور مچا دیا۔ سرخ رنگ کا ایک بک اپ ٹرک اور تین کاریں اس گلی سے سیام اسکوڑے کی طرف مڑی تھیں۔ ان میں پیڑرو کے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ پولیس والے ان فنڈوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے تھائی اور پاتھم کو اشارہ کیا۔ پاتھم نے تھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ایک طرف بھیجنے لگا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس جگہ پر بہت جگمگاتے تھیں اب لوگ ادھر ادھر کھینٹنے لگے تھے۔

ہم بچایا تھائی روڈ پر ہوئی ایٹیا کی طرف جا رہے تھے۔ چند گز کا فاصلہ طے کر کے پاتھم ایک تنگ سی گلی میں مڑ گیا اور پھر کچھ دور کھڑی ہوئی۔ پہلے رنگ کی ایک ٹیکسی کے قریب رک گیا۔ اس نے تھائی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جب سے چالی نکال کر ٹیکسی کا دروازہ کھولنے لگا۔

ٹیکسی جس وقت حرکت میں آئی، اس وقت سیام اسکوڑے کی طرف سے چلی گئی۔ کچھ لمبے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ تک فضا پر سکوت سا طاری رہا اور پھر یوں لگے جیسے وہاں حملا کھل گیا ہو۔ یہ اندازہ لگا کا مشکل نہیں تھا کہ پیڑرو کے غنڈے پولیس والوں سے بھڑکتے تھے۔

وہ تنگ سی گلی تھی جس کے دونوں طرف اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کار اس گلی سے نکل کر کشادہ سڑک پر آئی۔ تقریباً ایک فرلانگ آگے نہ گئے کہ چالی تھاقور اس سے آگے یہ سڑک ہوئی ایٹیا کے سامنے سے گزرتی ہوئی یو پیٹ بوری روڈ سے جاتی تھی۔

”کہاں جانا ہے باس؟“ پاتھم نے میری طرف دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

”وٹ ٹریسٹ۔ وہ لوگ وہیں گئے ہوں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن ہم شاید مخالف سمت میں نکل آئے ہیں۔ میں ادھر ادھر کھینٹنے لگا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم سوئے بچایا نیک سے ہوتے ہوئے بتقادوڑ کی طرف نکل جائیں گے۔“ پاتھم نے جواب دیا۔

”یہ ٹیکسی کس کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مرمت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ کوئی اور گاڑی تھی نہیں۔

میں نے سوچا چلاؤ اس سے کام نکال لو۔“ پاتھم نے جواب دیا۔

ہماری ٹیکسی ابھی نہر کے پل سے چند گز دور تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار تیزی سے آگے نکل گئی اور پھر عین پل کے اوپر وہ کار سڑک پر اس طرح آڑی تھیں جو ہر کرک گئی کہ راستہ بند ہو گیا۔ پاتھم نے پوری قوت سے بیک لگا دیا۔ ٹیکسی بیک کی تیز۔

چچراہٹ کے ساتھ لڑائی ہوئی پل کی سطح سے ٹکرا کر رک گئی۔

اس سے پہلے کہ میں صورت حال سمجھ سکتا، دوسری کار سے دو آدمی اتر آئے۔ ان دونوں کے پاس آٹو بیگ رانٹھیں تھیں۔

انہوں نے ایک طرف سے مجھے اور دوسری طرف سے تھائی کو رانٹھوں کی زد پر لیا۔

”تم دونوں خاموشی سے نیچے اتر آؤ۔ اگر کوئی چلائی دکھانے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“ ایک نے غرا کر کہا۔

میں نے تھائی کی طرف دیکھا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ تھائی بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ وہ دونوں ہمیں اپنی کار کے قریب لے آئے۔ ان میں سے ایک نے ہم دونوں کے لباس چھتیا کر دیکھے اور تھائی کی چٹون کی جیب سے ہتھول نکال لیا۔ میرا لباس بھی اس نے چٹون کی جیبوں تک چھتیا لیا تھا۔ اگر وہ دیکھتا تو میرا خنجر بھی مجھ سے جدا ہو چکا ہو تاگر ہڈی سے بندھا ہوا خنجر محفوظ رہا تھا۔

پاتھم پر انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اسے ٹیکسی ڈرائیور ہی سمجھتے تھے اور ظاہر ہے کسی ٹیکسی ڈرائیور سے انہیں کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ پاتھم بھی اپنی سیٹ پر سنا ہوا سا بیٹھا رہا تھا۔

ہمیں اس کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ایک آدمی میرے ساتھ دروازے کی طرف بیٹھ گیا۔ اس نے رانٹھ اس طرح رکھی تھی کہ اس کی ٹال میری پھلیوں میں چھ رہی تھی۔ دوسرا آدمی تھائی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پاتھم کی طرف دیکھا اور رانٹھ انان کر ڈبڈبایا۔ ڈبڈبایا دیتے ہوئے اس نے رانٹھ کی ٹال ذرا نیچے کی طرف ہٹا لی تھی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ تھائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی۔ اس آدمی کو پاتھم پر رانٹھ اتارنے دیکھ کر میں نے بھی آٹھکس بند کر لی تھیں۔ پاتھم کی چیخ کے بجائے دھماکے کی

آواز سن کر میں نے آٹھکس کھول دیں اور میرے منہ سے بے اختیار گمز سانس نکل گیا۔ اس نے گولی پاتھم پر نہیں ٹیکسی کے اگلے باز پر چلائی تھی اور سارا ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔

کار کا انجن اشارت ہی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کار کا رخ سیدھا کر کے اسے ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ کار تیزی سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ میں اور تھائی ان دونوں آدمیوں کے پیچ میں دبے بیٹھے تھے۔ ایک رانٹھ میری پھلیوں سے لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف تھائی بھی رانٹھ کی زد میں تھی۔ ہم دونوں کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ صورت حال اگرچہ ہمارے لیے بدھعمین تھی لیکن میں ان لوگوں کی حماقت پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ پاتھم کو انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور میں مطمئن بھی تھا کہ پاتھم ہمارا سراں لگا لے گا۔

کار کو مومنو منٹ سے ڈن ڈانگ روڈ پر مڑ گئی اور ایک پھلیس دے عبور کرتی ہوئی اسوک روڈ پر آئی اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کشادہ گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے موڑ پر سوئے علاء عام کا پورڈ میں نے دیکھ لیا تھا۔ کار ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گئی۔

گیت کھلا اور کار اندر داخل ہو گئی۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں اغوا کرنے والوں کا تعلق پیڑرو یا دارا کے گروہ سے ہو گا اور ظاہر ہے ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ ہمیں کار سے اتار کر رکھے دیتے ہوئے اندر لے آیا گیا اور پھر پیچھے ہی ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے سامنے تخت پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ سوائی رگونا تھ تھا۔

وہ تخت پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی مہاراجا اپنی راج دھانی کے تختیاں پر براجمان ہو۔ اسے دیکھ کر میری گردن پر چوخیں سی رگھینے لگیں۔ اس رات آشرم میں ہمیں نے اسے دور سے دیکھا تھا لیکن آج میرے اور اس کے درمیان صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا۔

سوائی رگونا تھ کو آشرم میں دیکھ کر میں نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دنیا کا بدبخت ترین آدمی تھا اور اب تو اس کی بدبختی کچھ اور بھی بھیاکت ہو گئی تھی۔ چہرے پر دامن طرف رخسار کا گوشت جل گیا تھا جس سے اس کی آنکھ بھی کھینچی کھینچی سی لگ رہی تھی۔ سر کے بال بھی سامنے سے جل چکے تھے۔ کھوپڑی کے پیچھے کی طرف جو بال بچے تھے، ان کی اس نے پٹیا سی پٹائی تھی۔ ہندو پٹنوں اور سادھویوں میں عام طور پر کینے سر اس قسم کی چوٹیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس کا بایاں بازو بھی کندھے کے قریب سے جلا ہوا تھا اور ایک ٹانگ پر بھی جلنے کا نشان نظر آ رہا تھا۔ آشرم میں آنکھوں کی والے داغے کے بعد سے اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا گیا تھا۔ عام خیال تھا کہ وہ بھی اس ٹگ میں جل کر راکھ ہو چکا ہے۔

اخبارات نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

”مجھے بچانا بالک!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی سرخ آنکھیں غلوں میں سے ابھری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”تمہیں بچانے کے لیے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ تم جیسے شیطان تو کبھی ہی نظر میں بچان لے جاتے ہیں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اس آگ سے کیسے بچ گئے تھے!“ میں نے کہا۔

”شیطان بھی نہیں مڑتا اور بھلا آگ شیطان کو کیسے جلا سکتی ہے۔“ رگونا تھ نے کہا۔ اس رات اور اس کے بعد یہاں جو کچھ بھی ہوا اس کے پیش نظر مجھے یہ شہر تو کیا، یہ ملک ہی چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن میں اس شخص کو ترک میں بچانے بغیر یہاں سے کیسے جاسکتا تھا جس نے میرے سنار کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔

میں تو بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھا مگر وہ۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہیں ڈھونڈا ہے۔ اب میں تم سے اپنی بربادی کا انتقام لے سکوں گا۔“

”یہ بھول ہے تمہاری رگونا تھ۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے آدمی ایک ایسی غلطی کر چکے ہیں جس کا انجام تمہارے حق میں بہت بھیاکت ہو گا۔ پہلے تو تم بچ گئے تھے لیکن اب نہیں بچ سکو گے۔“

”میرے ان چیلوں نے تمہیں یہاں لانے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے تلاش تو تمہاری تھی لیکن تمہارے ساتھ یہ ناری۔۔۔۔۔

اسے میں بونس سمجھوں گا۔ میں تو بہت دنوں سے کسی خستین عورت کو دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ میرے چیلوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میں ان سے بہت خوش ہوں۔“

”جس شخص کو یہ ٹیکسی ڈرائیور سمجھ کر چھوڑ آئے ہیں وہ میرا ساتھی ہے۔ جو کسی بھی وقت یہاں آ سکتا ہے اور پھر تم لوگوں کو بھانگنے کا راستہ بھی نہیں لے گا۔“ میں نے کہا۔

رگونا تھ ایک لمحے کو چکا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا پھر ایک خوف ناک قسم لگاتے ہوئے بولا۔

”شاید تم مجھے بھگانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں کسی جھانے میں نہیں آؤں گا۔ آج یہاں ایسا کوئی میسکر نہیں ہو گا۔ نہیں بچانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ تمہیں تو میں ایسی بھیاکت سزاؤں کا دیکھنے والے بھی قہرا اٹھیں گے۔ تمہارے جسم کے ٹکڑے پورے شہر میں پھیلادے جائیں گے جنہیں سینٹا بھی مشکل ہو جائے گا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور بائیں کی طرف جھوٹا ہوا میری طرف بڑھا۔ ”دارا بے وقوف ہے۔ کم عقل اور بزدل بھی۔ اپنے ساتھ اتنی قہتی ہونے کے باوجود وہ اب تک تمہارا کچھ نہیں لگاؤ کا لیکن میری ٹھنکی دیکھیں تم؟“ تہی آسانی سے تم میرے قبضے میں آگئے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکتی گی۔ پہلے میں تمہارے کان کانوں کا پھر ناک پھر

ہونٹ۔ اس کے بعد ہاتھوں اور پوروں کی انگلیوں کی باری آئے گی۔ میں ایک ایک انگلی کانوں کا جس طرح تسائی کرے گا اس کا

چہرہ ہزوا آئے گا لیکن پہلے میں اس ناری کا کھونٹ تو بھر لوں۔

آتش و فتنہ 19 حصہ 2

بڑے دونوں سے پیاسا ہوں۔ آج میری پیاس بھی بجھ جائے گی۔ وہ  
تھائی کی طرف مڑ گیا۔  
فنائی کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں طور پر دیکھے  
جاسکتے تھے۔ جب سے وہ میرے ساتھ تھی، ہم بڑے بڑے گھس  
مراحل سے گزر رہے تھے۔ ہم نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں  
ڈال کر دیکھا تھا لیکن یہ صورت حال بڑی خوف ناک تھی۔ وہ آدمی  
ہم پر راتھیں ڈالتے کھڑے تھے۔ کچھ کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ  
کم از کم جیسے گولیوں سے بمون دیتے۔  
”یہ تو واقعی بہت سندر رہے۔“ رگو تاتھ دو اگلیوں سے تھائی کی  
ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے بولا۔ تھائی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔  
”اسے ہاتھ مت لگانا رکھیں۔“ میں چچا۔  
”اں! میں راتھیں ہوں اور کسی راتھیں کو برے کام سے  
نہیں روکا جاسکتا۔“ رگو تاتھ نے کہا اور ایک بار پھر تھائی کی طرف  
توجہ ہو گیا۔  
تھائی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ رگو تاتھ نے اچانک  
ہی اس کی قیاس پر ہاتھ ڈال کر زوردار بھٹکادیا۔ قیاس پھٹ گئی۔  
تھائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے آگے بڑھنے کی  
کوشش کی تو ایک گھن مین نے راتھ کی تال میرے پلو سے لگا  
دی۔  
”اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو بمون کر رکھ دوں گا۔“  
وہ غرایا۔  
میری مٹھیاں بھیج گئیں۔ رگو تاتھ نے تھائی کی پھٹی ہوئی قیاس  
کھینچ کر اس کے جسم سے الگ کر دی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
کمرہ ہونٹوں پر زبان بھیرنے لگا۔ تھائی پیچھے ہٹی ہوئی دیوار سے  
جا لگی تھی۔ رگو تاتھ آگے بڑھا اور تھائی کو روک لیا۔ تھائی اپنے  
آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی اور اسی جدوجہد میں اس نے  
رگو تاتھ کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ رگو تاتھ ہلکا اٹھا اور تھائی کو  
اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کا موقع مل گیا۔ رگو تاتھ  
پھر اس کی طرف ہلکا۔  
میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی  
مگر گھن مین نے راتھ سے میرے پلو میں کچوکا دیا۔ میں بے بس  
ہو کر رہ گیا۔ میری مٹھیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ ٹھننے کی شدت سے  
انت بھی اس طرح محسوس ہونے لگا تھا۔  
تھائی اپنے آپ کو بچانے کے لیے کمرے میں ادھر ادھر بھاگ  
رہی تھی اور رگو تاتھ دونوں ہاتھ پھیلائے اس طرح بار بار اس کی  
طرف لپک رہا تھا جسے مرغی پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں گھن  
مین قہقہے لگا رہے تھے اور میرا خون کھول رہا تھا۔  
بالآخر تھائی رگو تاتھ کی گرفت میں آئی۔ میں نے ایک مرتبہ  
پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو سامنے کھڑے ہوئے گھن مین نے  
راتھ کی تال بھٹک کر زبردیا دیا۔ ”کرا“ ”ترزاہٹ“ ”کی آواز سے

گوج اٹھا۔ کئی گولیاں میرے پیروں کے قریب فرش پر لگی تھیں۔  
میں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔  
”اب اگر کوئی حرکت کی تو گولیاں تمہارے جسم میں لگیں  
گی۔“ گھن مین غرایا۔  
میں ٹھننے میں کانپ رہا تھا۔ تھائی کی چیخیں میری سماعت سے  
ٹکرا رہی تھیں۔ میری قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ میں  
نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو قریب کھڑے ہوئے گھن مین نے  
میرے گولے پر اس زور سے لات ماری کہ میں لڑکھار کر رگو تاتھ  
کے قریب فرش پر گر گیا۔ میری دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ رگو تاتھ کسی  
خون خوار بھیڑیے کی طرح تھائی کو بھنھو رہا تھا اور تھائی چیخ رہی  
تھی۔  
فرش سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میری نظر اپنی مڑی  
ہوئی ٹانگ پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں روشنی کا  
بھماکا سا ہوا۔ میں نے اس طرح ہڈی پر ہاتھ رکھا کہ ایسے ٹانگ  
سیدھی کرنا چاہتا ہوں اور پھر بڑی مٹھائی۔۔۔ میں نے ہٹون کے  
پانچے میں ہاتھ ڈال کر ہڈی پر پیٹنے سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔  
خنجر ہاتھ میں آتے ہی میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح  
اچھل کر رگو تاتھ کی پشت پر چڑھ گیا اور بائیں بازو سے اسی کی گردن  
پر ٹیک لاک لگا کر خنجر اس کے نر خڑے پر رکھ دیا۔  
”اب اگر تم میں سے کسی نے حرکت کی تو اس کا گھلا کاٹ دوں  
گا۔“ میں چچا ”تم دونوں اپنی راتھیں پیچیک دو۔“  
یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ دونوں گھن مین کچھ بھی  
نہیں سمجھ سکے تھے۔ انہیں شاید اس کی توقع بھی نہیں تھی کہ وہ  
راتھوں کی زور پر ہونے کے باوجود میں کوئی ایسی خطرناک حرکت  
کروں گا لیکن رگو تاتھ کو میری گرفت میں دیکھ کر وہ دونوں بدحواس  
ہو گئے۔ ایک نے تو راتھ کا رخ میری کھوپڑی کی طرف کر دیا تھا۔  
”اں سے کوہتیار پیچیک دیں ورنہ میں تمہارا گھلا کاٹ دوں  
گا۔“ میں رگو تاتھ کے کان کے قریب چچا۔ اس کے ساتھ ہی میں  
نے خنجر کی نوک سے اس کے سینے پر تقریباً چار انچ لمبی لکیر کھینچ دی  
اور خنجر کی دھار دوبارہ اس کے نر خڑے پر رکھ دی۔ سینے پر اس کی  
موتی کمال پر صرف خراش آئی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ  
بڑی طرح چیخنے لگا۔  
”میں تمہارا گھلا کاٹ دوں گا۔ ان سے کوہتیار پیچیک  
دیں۔“ میں ایک بار پھر چچا۔  
”پیچیک دو۔ پیچیک دو۔“ بندھتیں پیچیک دو۔“ رگو تاتھ کے  
حلق سے گھن گھن سی آواز نکلی۔  
انہوں نے راتھیں پیچیک دیں۔  
”تم دونوں اس دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔  
دونوں ہاتھ سر سے اوپر دیوار پر ہونے پائیں لیکن اس سے پہلے تم  
اپنی قیاس آتار کر اس طرف پیچیک دو۔ جلدی کرو۔“ میں نے کہا۔

میں نے قیاس آتارنے کے لیے لمبے قدم ڈالے کو آنکھوں سے اشارہ  
کیا تھا۔  
میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے  
کھڑی تھی اس نے اپنے دونوں بازو برہنہ سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔  
لمبے قدم ڈالنے کے لیے آتار کر ایک طرف پیچیک دی۔ وہ دونوں  
دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ دیوار پر ٹکا  
لیے تھے۔ میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ اس نے اس آدمی کی قیاس  
اٹھا کر پسلی اور دونوں راتھیں اٹھائیں۔ ایک بار راتھ اس نے  
کندھے پر لٹکائی تھی اور دوسری دونوں ہاتھوں میں سنبھال لی تھی۔  
”اب کہاں گئی تمہاری قہقہی رگو تاتھ؟“ میں نے اس کی گردن  
پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔  
”تم یہ مت سمجھو کہ یہاں سے بچ کر جاسکو گے۔“ رگو تاتھ  
نے کہا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔  
میں نے خنجر اس کے گلے سے ہٹا لیا تھا۔ اسے چپکے دیکھ کر میں  
نے خنجر کی نوک اس کے دائیں بازو کے مسل پر کھینچ دی۔ اس  
مرتبہ میں نے پوری قوت استعمال کی تھی۔ تقریباً نصف انچ گھرے  
اور پانچ انچ لمبے گھماؤ نے اسے پیچھے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بڑی طرح  
چل رہا تھا۔ میں نے بائیں بازو اب بھی اس کی گردن میں لپیٹا ہوا  
تھا۔ میرے بازو کی تکلیف ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔  
قوت آزمائی سے بازو میں درد شروع ہو گیا تھا۔  
سوائی رگو تاتھ گھبراہٹ سے اس کی طرح طاقت ور تھا۔ اپنے بازو پر  
گھماؤ کی تکلیف سے وہ بری طرح اچھل رہا تھا اور ایک مرتبہ جب  
وہ آگے کو بھٹکا تو میں اس کے اوپر سے اپنی قلا بازی کھانا ہوا پشت  
کے تلے آگے کو جا کر۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا ”ترزاہٹ“  
”کی آواز سے گوج اٹھا۔  
رگو تاتھ مجھے گرفت میں لینے کے لیے لپکا تھا مگر تھائی نے فائر  
کھول دیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر کئی گولیاں لگیں اور وہ فرش  
پر مٹھ بٹھ کی طرح تر پڑنے لگا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس  
کی آنکھوں میں نفرت کا طوفان اٹھ رہا تھا۔  
”میں چاہوں تو تمہارا پورا جسم گولیوں سے چھلٹی کر دوں۔“  
تھائی کے لیے میں بھی بے پناہ نفرت تھی ”لیکن موت کے گھاٹ  
آنا دینا کڑا سزا نہیں۔ سزا تو ایسی ہو جسے آدمی زندگی بھر یاد رکھے  
اور میں تمہیں ایسی سزا دوں گی۔“ اس نے ایک بار پھر راتھ  
کا ٹھیکر دیا۔ اس مرتبہ گولیوں نے رگو تاتھ کا دایاں بازو چھلٹی  
کر دیا ”تم سو گئے نہیں۔“ وہ غرائی ”تمہارے یہ غلیظ ہاتھ آئندہ  
کسی عورت کو نہیں چھو سکیں گے۔“ اس نے دوسرا برٹ  
رگو تاتھ کے بائیں بازو پر مارا۔  
رگو تاتھ کی چیخوں سے کرا گوج رہا تھا۔ اس کے دونوں  
بازوؤں اور دونوں ٹانگوں سے خون کی دھاریاں برہنہ رہی تھیں۔  
فرش پر پھیا ہوا قاتلین اس کے خون سے تر ہو رہا تھا۔

اس وسیع و عریض کمرے میں تقریباً آٹھ سو گھنٹے سے ہنگامہ  
جاری تھا۔ پہلے تھائی چیخ رہی تھی۔ اس گھن مین نے میرے  
پیروں کے قریب راتھ کا برٹ مارا تھا۔ ان دونوں گھن مینوں  
کے قہقہے کو گونجتے رہے تھے پھر تھائی نے راتھ کے تین برٹ  
چلائے تھے اور اب رگو تاتھ کی چیخیں گوج رہی تھیں لیکن باہر سے  
کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق  
باہر کم از کم دو آدمی موجود تھے۔ ایک وہ جو ہمارے ساتھ کارڈرائیو  
کر کے یہاں لایا تھا اور دوسرا وہ جس نے ٹیکٹ کھولا تھا لیکن ان  
میں سے کسی نے بھی ردوازے سے بھاگ کر صورت حال معلوم  
کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ  
وہ لوگ غالباً مطمئن تھے کہ میں اور تھائی نیتے تھے اور کچھ نہیں  
کر سکتے تھے یا پھر یہ کمرہ ساڈا پروف تھا اور اندر کی کوئی آواز باہر  
نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو میرے دوسرے  
خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی  
دیکھ نہیں تھی صرف وہی ایک ردوازہ تھا جس سے ہم اندر آئے  
تھے اور وہ ردوازہ بند تھا۔  
وہ دونوں آدمی اب بھی دیوار پر ہاتھ نکالے کھڑے تھے لیکن  
وہ دونوں پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ سوائی رگو تاتھ کا شہر دیکھ کر ان  
کے چہرے دھماں ہو رہے تھے۔ میرا اشارہ پا کر وہ دونوں سیدھے  
ہو گئے۔  
”تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے، دارا کہاں چھپا ہوا ہے؟“ میں  
نے باہری بازوؤں کی طرف دیکھا۔  
”وہ پینڈو کے پاس ہے۔“ یہ جواب اس شخص نے دیا تھا  
جس کی شرت اب تھائی نے پن رگھی تھی ”سوائی جی اپنی تابی کا  
ذمہ دار اسی کو سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلے سارے معاملات ٹھیک  
ٹھاک چل رہے تھے۔ وہ لوگوں کو دھمکیاں دینے لگا تھا اور انہیں  
کھل کر بلیک میل کرنے لگا تھا۔ وہ تو شاید سوائی جی کو بھی بلیک میل  
کر رہا تھا۔ کیونکہ سوائی جی بلاچون وچرا اس کی ہر بات مانتے تھے۔  
آشرم میں بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ کسی نے بھی سوائی جی سے  
اوچی آواز میں بات نہیں کی تھی لیکن دارا تو سوائی جی کو کالیاں  
بھی دیتا تھا تو وہ خاموش رہتے تھے اور پھر اس رات تم لوگوں نے  
وہاں ہنگامہ کر دیا۔ سوائی جی کا خیال تھا کہ نہ دارا وہاں آنا اور نہ تم  
لوگ وہاں آکر ہنگامہ کرتے۔ ہم سوائی جی کو بڑی مشکل سے وہاں  
سے نکال لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کئی روز تک تو ہم لوگ  
وہاں سے آگے بہت دور قدم شہر کے کھنڈوں میں پڑے رہے اور  
پھر ہم یہاں آ گئے۔ ہم شہر میں تمہیں اور دارا کو تلاش کرتے  
رہے۔ دارا کو تو پینڈو نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ اور آج اتفاق سے  
ہم نے تمہیں اس تنگسی ذرائع کے ساتھ دیکھ لیا اور پھر تم لوگوں  
پر قابو پانے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔“  
”اور اب تم لوگ ہمارے قابو میں ہو۔“ میں نے کہا ”اب تم

دونوں ایک بار پھر اس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ ہم یہ دروازہ باہر سے بند کر دیں۔ بعد میں تمہارے سامنے ہمیں اس قید سے نجات دلا دیں گے۔

میں نے تھائی سے ایک رائل نقل لے لی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ رابرڈ اری میں کوئی نہیں تھا۔ میں اس دروازے سے باہر نکلا۔ وہی تھا کہ کمرے کے اندر سے ہسپتال کے سٹیکل شٹ کی آواز سنائی دی اور پھر دوسرے ہی لمحے تھائی کی رائل نقل شٹ اٹھنے لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی آدمی دھیر ہو چکا تھا جس کے بدن پر قمیص نہیں تھی۔ اس کے بدن پر کئی پتلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھائی کا ہسپتال تھا۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ان کی تلاش نہیں لی تھی اور موقع پا کر اس نے تھائی پر گولی چلا دی تھی۔ تھائی تو بے گنتی تھی لیکن وہ خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

دوسرا آدمی دیوار سے ٹک لگے کھڑا تھوڑے قریب تھا۔ تھائی نے دوڑ کر مرنے والے کے ہاتھ سے اپنا ہسپتال بچھا اور دروازے کی طرف بھاگی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس مرتبہ فائرنگ کی آواز باہر بھی سنائی دی تھی۔ ایک آدمی بال کی طرف سے دوڑتا ہوا رابرڈ اری کے سامنے آ گیا۔ وہی آدمی تھا جس نے کارڈرائیو کے فرائض انجام دیے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ہسپتال تھا۔ میں نے اس کے پیروں کے قریب زمین پر برست مارا۔ وہ چیخا ہوا اچھل پڑا۔ ہسپتال پیچیدگی دیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

تھائی نے کمرے سے باہر آکر دروازہ بند کر کے کڑا لگا دیا اور ہم دونوں اس آدمی کو رائل نقلوں کی زد میں لے کر ہال میں آ گئے۔ "تمہارے سامنے کون سا تھائی تھا جس نے ٹیٹ کھولا تھا۔" میں نے رائل نقل کی مال اس شخص کے سینے کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ ہمارے آنے کے تھوڑی دیر بعد چلا گیا تھا۔ یہاں اب میرے سوا اور کوئی نہیں ہے اور وہ لوگ۔" وہ رابرڈ اری کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

"ایک چوہا ہے۔ دوسرا زندہ ہے اور تمہارا سوا ہی ہے ہوش بڑا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد اسپتال پہنچا دیتا۔ وہ مرے گا نہیں لیکن اسے ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ گاڈی کی چالی کہاں ہے؟" میں نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ گاڈی پورج میں کھڑی نظر آ رہی تھی۔

"چالی گاڈی میں ہی تھی ہوئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "چلو۔ باہر کا ٹیٹ کھولو۔" میں نے حکم دیا۔

میں رائل نقل سنبھالے گیٹ کے قریب آ گیا تھا تاکہ وہ شخص کوئی شرارت نہ کر سکے۔ تھائی گاڈی کو دیواروں میں گھیریں گیٹ سے نکال کر گلی میں لے آئی۔ میں جلدی سے پیچڑ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور تھائی نے گاڈی کا رخ سیدھا کر کے اسے تیزی سے دوڑا دیا۔

ہم وائٹ ٹریٹمنٹ پہنچے تو وہاں سے پتا چلا کہ سب لوگ چائنا ٹائون والے جتنا زیم میں ہیں۔ مہاراج بھی وہیں گئے ہیں۔ یہ بدھ عبادت گاہ بھی چائنا ٹائون ہی کے علاقے میں تھی اور جتنا زیم وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اس وقت اگرچہ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اس کے باوجود جتنا زیم والی گلی میں بڑا جھوم لگا ہوا تھا۔ گانگ کے قتل کی خبر پھیلنے کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی تھی اور پورے شہر سے مہاراج کے کیمپ سے تعلق رکھنے والے لوگ وہاں جمع ہو رہے تھے۔ گاڈی کو جتنا زیم کے گیٹ تک لے جانا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے گاڈی ایک طرف روک لی اور رائل نقلیں اٹھا کر پیدل ہی آگے چلے گئے۔ لوگ ہمیں خود بخود راستہ دیتے جا رہے تھے۔

ماسٹر ہو جن ہمیں دیکھ کر اچھل پڑا۔ مجھے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے ہمارے انگو کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ مجھے فوراً ہی مہاراج کے پاس لے گیا۔ مہاراج بھی مجھے دیکھ کر چونک گئے۔ میں نے مہاراج کو بوجھ (بارش) آئرش میں تعظیم دینا کیا اور دونوں ہاتھ پہلوؤں میں لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی رائل نقل میں نے تھائی کو دے دی تھی۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں کو گلست دے کر آئے ہو۔ کون تھے وہ لوگ؟" مہاراج نے پوچھا۔

"سوا ایگوتا تھے کے آدمی تھے۔" میں نے جواب دیا "وہ لوگ ہمیں سوئے علاقہ کے ایک عالی شان بنگلے میں لے گئے تھے جہاں سوا ایگوتا تھے بھی موجود تھا۔ وہ مجھے اپنے آشرم کی تپائی اور اپنی بربادی کا ذمے دار سمجھتا تھا اور مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میرے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے تھائی پر دست دراز کی۔ اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں مجھے موقع مل گیا۔ تھائی نے رگوتا تھ کی ٹانگیں اور بازو پھینکیں کھینچے لیکن جب ہم وہاں سے نکلے تو وہ اس وقت تک زندہ تھا۔ تاہم ہم ایک لاش بھی وہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔"

"تمہارے انگو کی اطلاع ملنے ہی میں چار پادریاں تم لوگوں کی تلاش میں روانہ ہو گئی تھیں۔" جیسی ڈرائیور نے اس کا رد نہایت دیا تھا جس میں تم لوگوں کو انگو کر کے لے جایا گیا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ کارکنی روز تک سڑکوں پر نظر نہیں آئے گی۔" مہاراج نے کہا۔

"وہ کار اس وقت ہمارے قبضے میں ہے مہاراج۔" میں نے کہا۔

"وہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں یہی ایک سوا دی مل سکی تھی۔ وہ کار گلی کے موڑ پر کھڑی ہے۔"

"اوہ۔" مہاراج کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے پھر ماسٹر ہو جن کو اشارہ کیا۔ ماسٹر ہو جن نے ایک اور لڑکے کو اشارہ کر دیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"مجھے گانگ کی موت کا افسوس ہے مہاراج۔" میں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اسے پڑھو کے بھائی سائی نے قتل کیا ہے۔ میں جب تک سائی کو تڑپا تڑپا کر نہیں ماروں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"یہاں پر موجود ہر لڑکے نے یہی عہد کیا ہے کہ وہ گانگ کے قاتل کو کیڑ کر اور تک پہنچا کر ہی دم لے گا لیکن تمہیں کس نے بتایا کہ گانگ کو سائی نے قتل کیا ہے؟" مہاراج نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اسی جیسی ڈرائیور نے۔" میں نے جواب دیا "وہ جیسی ڈرائیور نہیں ہے مہاراج۔ وہ دراصل رامین پر ساد کا دوست ہے۔ اسی کی طرح قابل اعتماد اور وفادار۔ وہ میرے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ دارا اور پیڑو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کس کس شائیں کیسٹونگیا تھا۔ اس نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی اور میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ کھور بھی وہاں گیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ تمہارے بنگلے پر پہنچ چکا ہے۔ اب تم بھی جاؤ اور اپنا خیال رکھو۔ تمہارے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

مہاراج نے کہا۔

"گانگ کی آخری رسومات مہاراج۔" میں نے کہا "میں اس کی آخری رسومات میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری طرف سے پھول چڑھا دیے جائیں گے۔" مہاراج نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ مہاراج اب نہیں چاہتے تھے کہ میں زیادہ دیر وہاں رکوں۔ انہوں نے ماسٹر ہو جن کو اشارہ بھی کر دیا تھا۔ ماسٹر ہو جن نے میرے بازو کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میں نے مہاراج کو بوجھ لیا اور تھائی کو اشارہ کرتا ہوا ماسٹر ہو جن کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

جتنا زیم کے اندر اور باہر گلی میں جمع لڑکوں میں بڑا ہوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی چیز تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔

گلی کے موڑ پر کار موجود نہیں تھی۔ ماسٹر ہو جن ہمیں لے کر پینٹن گلی میں آ گیا۔ وہاں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں اور کئی لڑکے بھی موجود تھے۔ ماسٹر ہو جن نے ایک لڑکے کو بلا کر کچھ کہا اور میری طرف مڑ کر بولا۔

"دو تین دن ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم لوگ اپنے بنگلے سے باہر نہیں نکلو گے۔ تمہیں خبریں ملتی رہیں گی۔"

میں نے ماسٹر ہو جن کو بوجھ لیا اور اس لڑکے کے ساتھ ایک دین میں بیٹھ گیا۔ چار دوا لڑکے بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ دین حرکت میں آئی اور گلی سے نکل کر مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

دین نے پھر اپوک کلاڈینٹ سے دیرا پار کیا۔ دیرا کے دوسرے کنارے پر یہ سڑک میوویل برج والی سڑک سے مل گئی۔ یہاں دراصل دیرا پر دوپل تھے جو اس کنارے سے انگریزی کے حرف "وی" کی شکل میں دوسرے کنارے پر مختلف سمتوں کی طرف جانے والی سڑکوں سے مل جاتے تھے۔

ہمیں ٹانسن اسکواری کی طرف نہیں جانا پڑا اور پھر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دین ایک گلی میں داخل ہو کر ڈاکٹر جاکلی والے بنگلے کے سامنے رہی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ ہماری منزل یہ بنگالی ہے؟" میں نے دین ڈرائیور کرنے والے لڑکے سے پوچھا۔

"مہاراج نے تمہاری حفاظت کا بہت مقبول بندوبست کر رکھا ہے۔ ٹیٹل ماسٹر۔" لڑکے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہمارے کیمپ کی ایک مخصوص پادری کا کوئی نہ کوئی لڑکا چوہے میں سمجھنے بنگلے کے آس پاس موجود رہتا ہے۔"

یہ میرے لیے واقعی ایک دلچسپ انکشاف تھا۔

بنگلے کا ٹیٹ سکھڑے کھولا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ہماری آواز سن کر پر ساد نوٹیا اور جاکلی بھی پر آدے میں آ گئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں رائل نقلیں دیکھ کر ان تینوں کے چوہے پر عجیب سے اثرات ابھر آئے تھے۔

"تم لوگوں کے انگو کی خبر سن کر تو ہم پریشان ہو گئے تھے۔" جاکلی نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ہو جن نے خبریت کی اطلاع دی تو ہمیں سکون ملا۔"

"اوہ۔" میں نے کہا "تم لوگوں کو ہماری داپسی کی خبر مل گئی تھی اسی لیے اطمینان سے کھڑے ہو۔"

"واہ۔" جاکلی نے اٹھ کر کہا "اسی دیر تک جو سولی پر بٹھے رہے وہ کسی شام میں ہی نہیں۔ یہ پر ساد تو تم لوگوں کی تلاش میں نکل رہا تھا ہم نے بڑی مشکل سے اسے روکا تھا۔"

"اچھا۔ ہم سب سے پہلے تو کافی چٹا پند کر رہے تھے۔ اس کے بعد کوئی اور بات ہو گئی۔" میں نے ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

رائل نقل میں سے دیوار کے ساتھ نکادی تھی۔ تھائی وہاں رکے بغیر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ وہ تقریباً بیس منٹ بعد باہر نکلی۔ اس نے ناکر کیڑے بدل لیے تھے۔ جب سے رگوتا تھ نے اس کے بدن کو چھوا تھا وہ ایک عجیب سی تھن محسوس کرتی رہی تھی۔ اس بنگلے سے وائٹ ٹریٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ راستے میں کئی بار اس کراہت کا اظہار کر چکی تھی۔

اس دوران میں جاگی کافی بنا کر لے آئی اور تھائی داہم انہیں اغوا اور وہاں سے فرار کی تفصیل بتانے لگی۔ اس وقت سکدر بھی ہمارے پاس موجود تھا اور وہ بڑی توجہ سے باتیں سن رہا تھا۔ تھائی نے جب رگونا تھ کی دست درازی کا ذکر کیا تو اس کے چہرے پر عجیب سے اثرات ابھر آئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت رگونا تھ کیسے سامنے ہوتا تو سکدر اس کی گردن مروڑ دیتا۔

”وہ راکشس ابھی زندہ ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ شاید وہ اپنے آشرم کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا ہوگا۔“ جاگی تھائی کے خاموش ہونے پر بولی۔

”ایسے لوگ آسانی سے نہیں مرے۔“ تھائی نے جواب دیا۔

”وہ زندہ تو اب بھی رہے گا لیکن اب وہ کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگ سکے گا۔“

اور اس کی تفصیل میں نے بتائی تھی کہ رگونا تھ اب کسی عورت کو ہاتھ کیوں نہیں لگ سکے گا۔

”اوہ۔“ جاگی بولی ”تو کیا تم میں اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ کسی کو خاک و خون میں لوٹا سکو؟“

”میں بزدل کب تھی؟“ تھائی نے اسے گھورا۔

”ہاں۔ یہ بات تو درست ہے کہ اگر تم بزدل ہو تیں تو آج زندہ بھی نہ ہو تیں۔“ جاگی نے کہا۔

نوٹا اور پر سار بھی خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ جب تھائی اور جاگی کی نوک جھوک ختم ہو گئی تو پر سار نے سکدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”سکدر کے پاس ایک دلچسپ اطلاع ہے۔ میرا خیال ہے اگر ہم کئی طرح اس کی تصدیق کر لیں تو پرسوں یا اس سے اگلے روز ایکشن کر سکتے ہیں۔“

”اور وہ اطلاع شاید یہ ہے کہ گانگ کو پیڑوں کے بھائی سوامی نے قتل کیا ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے سوائے نگاہوں سے سکدر کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ سکدر نے اثبات میں سر ہلایا ”سن شائن کیسینو میں داخل ہونے کے چند منٹ بعد میں نے پیڑوں کے چھوٹے بھائی کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے دو منٹ بعد گانگ بھی کیسینو میں داخل ہوا اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اوپر والے ہال میں چلا گیا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں کسی جگہ سے کاختر تھا اور اپنے آپ کو صورت حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار کر لیا تھا۔ تقریباً تین منٹ بعد اوپر والے ہال سے گولیاں پلٹنے کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد کوئی شخص میزبوں پر لڑھکا ہوا نیچے آئے گا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں زینے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ زینے سے گرنے والے شخص کا چہرہ دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ وہ گانگ تھا۔

اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک پیشانی پر اور دو سینے پر۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میں نے فوراً ہی زینے کی طرف چلا تھ لگا دی اور اوپر والے ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں میں دولت مشینیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں لیکن اس وقت وہاں جھگڑا نہ ہوئی تھی۔ عورتیں ہی طرح طرح رہی تھیں۔ کچھ لوگ زمیں ہال کی طرف دوڑنے لگے اور کچھ عقبی زینے کی طرف۔

”اس ہال کے ایک حصے میں کیسینو کا دفتر بھی ہے۔ میں نے سائی کو دفتر والی راہداری کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گانگ کو اسی نے قتل کیا تھا۔ میں سائی کے پیچھے لگا لیکن اس دوران میں وہ نیچر کے دفتر میں گھس چکا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے لوٹ کر لیا تھا۔ میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور بالآخر میں نے کندھے سے ٹکریں مار کر دروازہ توڑا لیکن کراخالی تھا۔ دوسری طرف ایک اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس طرف لپکا۔

”وہ تنگ سائید تھا۔ میں میزبوں پر دوڑتا ہوا عقبی گلی میں پہنچ گیا۔ سائی تقریباً پچاس گز آگے ایک کار میں بیٹھ رہا تھا۔ میں کار کی طرف دوڑا لیکن وہ کار بڑی تیزی سے وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ میری کار دوسری طرف کھڑی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اپنی کار تک پہنچ گیا اور جب میں کار ڈرائیو کر رہا تھا تو اوپر سے گھوم کر میں دوڑ پر آیا تو سائی کی کار غائب ہو چکی تھی۔ مجھے ہر حال اندازہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔ میں نے اپنی کار سو سم واث روڈ کی طرف دوڑا دی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ سائی کی کار سو سم واث روڈ سوائے نوٹی سکس پر واقع کلب ٹوٹی سکس کے پار کنگ لاث پر موجود تھی۔ میں اپنی کار سے اتر کر کلب میں داخل ہو گیا۔ وہاں صورت حال معمول کے مطابق تھی۔ لوگ انجوائے کر رہے تھے لیکن تھوڑی سی دیر بعد وہاں کھلبلی مچ گئی۔ پیڑوں کے گڑے اور اوپر پڑین سنہال رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ پیڑوں بھی وہیں پر موجود تھا۔ سائی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور پیڑوں نے کسی ناخوشوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے انتظامات شروع کر دیے تھے۔

”میں تقریباً ایک گھنٹا وہاں رہا اور پھر مجھے پتا چلا کہ سائی کو پچھلے دروازے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نے کلب کے باہر ایک بلیک ٹیل فون بوتھ سے مہاراج کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں گانگ کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے تو دھڑکے سے دوری رہنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں نے یہاں فون کیا تو پتا چلا کہ تم بھی میڈم تھائی کے ساتھ سن شائن کیسینو کی طرف جا چکے ہو۔ میں نے کیسینو کی طرف دوڑ لگا دی اور پھر تھیں ماسٹر ہو جانے کے ساتھ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔ بعد میں میں نے تم دونوں کو پتا چم کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تو میں سمجھا گیا کہ اب تم

لوگ واپس گھری جاؤ گے۔ میں ایک مرتبہ پھر کلب ٹوٹی سکس پہنچ گیا لیکن وہاں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ میں تقریباً ایک گھنٹا وہاں رہا پھر واپس آگیا۔ یہاں آکر پتا چلا کہ تم دونوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ پاتھم نے میڈم جاگی کو فون پر تم لوگوں کے اغوا کی اطلاع دی تھی۔ میں نے مہاراج کو فون کیا۔ انہیں بھی پاتھم ہی سے تمہارے اغوا کی اطلاع مل گئی تھی۔ مہاراج نے بتایا کہ تین پارٹیاں تمہاری تلاش میں نکل چکی ہیں اور مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں پچھلے پر ہی رہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دقت میری ضرورت پر جائے۔ تمہارے آگے سے تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ہو جانے فون پر بتا دیا تھا کہ تم واپس آگے ہو اور تھوڑی دیر میں پچھلے پر پہنچنے والے ہو۔“

”تمہارے خیال میں سائی کہاں جا سکتا ہے؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”یہ معلوم کرنا بڑے کام۔“ سکدر نے جواب دیا۔

چند لمبے خاموشی رہی۔ میں پاتھم کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں مل تھی پھر میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر اس کا نمبر لایا۔ دوسری طرف ہمنوی جیتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے فون بند کر دیا۔

رات کا آخری پھر تھا۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ گانگ ہم سب کا دوست تھا۔ اس کے قتل سے ہم سب کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے تو اس کی کچھ زیادہ قوت تھی۔ ہم کئی مہینوں میں ساتھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

وہ رات میں نے آنکھوں میں کافی تھی۔ صبح باج بجے کے قریب میں بڑی آہستگی سے بیدار کمرے سے باہر گیا۔ ہال میں مدھم روشنی کالبج مل رہا تھا۔ پر آدے والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں چونک گیا۔ جاگی دیوی صوفے پر آڑی تڑپتی پڑی سو رہی تھی۔ اس کی ساڑی ٹانگوں پر ہے اور پٹھنک ہوئی تھی۔ پلچہ پیچھے کرا ہوا تھا، اس کا پیٹ اور سینہ بھی بڑبڑا رہا تھا۔ میں صوفے کے قریب رک گیا اور جاگی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بال چہرے پر ٹھکے ہوئے تھے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

میری کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ سینے میں گڑگڑاہٹ سی تھی جو پورے جسم میں پھیلی چلی گئی۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ میں بھی جاگی کے حسین چہرے کو دیکھتا، کبھی اس کے سینے کو اور کبھی میری نظریں اس کے پیٹ اور ٹانگوں پر رینگنے لگتیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں آگے بڑھ کر اس کے بدن کو چھوں۔

شاید میں اپنے اس ارادے پر عمل بھی کر دیتا کہ ایک جاگی کسمالی۔ اس نے کڑھ پیئے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور مجھے

اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ سی مسکراہٹ آگئی۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا پر آدے والے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

باہر کی ٹھنڈی اور تنگ فضا میں خنم آلود گھاس پر ملتے ہوئے بھی میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ میں بار بار دونوں کنپٹیوں سے کنپٹیاں سلگا رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ پچھلے چند روز سے میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میرے اندر کوئی لہجلی سی جگ رہی ہو۔ کوئی طوفان سر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسے موقع پر میری سانس بے قابو ہو جاتی۔ کنپٹیاں سلگنے لگتیں اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتیں اور پھر ایک ٹیٹھا سا درد میرے پورے جسم میں پھیل چلا جاتا۔

تھائی داہم جاگی اور نوٹا کو کئی مرتبہ میں نے ایسی حالت میں دیکھا تھا لیکن میرے سینے میں کوئی انگ نہیں چلی تھی۔ سانس بے قابو نہیں ہوئی تھی۔ سینے میں ایسا ٹیٹھا سا درد نہیں جاگا تھا لیکن چند روز سے یہ تبدیلی میرے لیے پریشان کن تھی۔

میں دیر تک لان میں ٹھٹکا رہا۔ اس دوران میں میں نے جاگی کے کمرے کی جتی چلنے ہوئے دیکھی۔ وہ ہال سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ باہر گلی میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ ایک دو گاڑیوں کے گزرنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں لان سے نکل کر پر آدے میں آگیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا سکدر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بولٹ کر دیا۔ راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے میری نظریں بے اختیار ہال کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ صوفہ خالی تھا جہاں ایک گھنٹا پہلے میں نے جاگی کو سوئے ہوئے دیکھا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آگیا۔ تھائی گہری نیند سو رہی تھی۔ میں پیڑ کے بجائے سینی پر لیٹ گیا اور پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگی تھی۔

میں سو کر اٹھا تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں صبح ناشتہ کیے بغیر سو گیا تھا اور اب جھوک کے پیٹ میں اینفین سی ہو رہی تھی اور میرا خیال ہے میری آنکھ بھی جھوک سی کی وجہ سے کھلی تھی۔ سر بھی بو بممل سا ہو رہا تھا۔ میں ہاتھ دھو کر کھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے اگرچہ میں اپنے آپ کو کھلکا محسوس کرنے لگا تھا لیکن پیٹ میں اینفین اپنی جگہ پر موجود تھی۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو میرے نعتوں سے کھرائی۔ جاگی اور نوٹا میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔ تھائی کچن میں تھی۔ ہال میں ایک صوفے پر پر سار اور پاتھم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”تم کہاں غائب تھے۔ کل رات میں نے فون بھی کیا تھا۔“  
میں نے ہاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور صوفے کے بجائے  
ڈانگنگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔  
”صبح میں نے فون کیا تھا تو تم سو رہے تھے۔“ ہاتھم نے جواب  
دیا۔

میں نے بچن کی طرف دیکھا۔ اس مرتبہ جاگی کے ساتھ تھائی  
بھی باہر آئی تھی اور پھر سب لوگ ڈانگنگ میز کے گرد جمع ہو گئے۔  
سکھدر کو بھی بلا لیا گیا۔

”کل رات۔“ ہاتھم نے بات شروع کرتے ہوئے کہا ”میں تم  
لوگوں کے بارے میں خاصا پریشان تھا لیکن ڈیڑھ بعد مجھے جب  
چا چل گیا کہ تم لوگ واپس آ گئے ہو تو میں کلب نوٹنی سکس کی  
طرف چلا گیا۔ اس وقت تک بھاگ دوڑے مجھے چا چل گیا تھا کہ  
پینڈو کلب نوٹنی سکس میں ہی ہے اور مجھے یقین تھا کہ سائی بھی  
وہیں پہنچا ہو گا۔“

”اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے گاڑی پارکنگ  
میں روکی تھی کہ پارکنگ کی قطعی سمت سے ایک کار نکلتی ہوئی  
نظر آئی۔ اس طرف اگرچہ روشنی بجلی تھی لیکن میں نے کار کی  
پونجز سیٹ پر سائی کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ  
بچھلی سیٹ پر دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے اور میرا خیال ہے وہ  
اس کے باڈی گارڈز تھے۔“

”میں نے اپنی گاڑی دوبارہ پارکنگ سے نکال لی اور ان کا  
عقاب شروع کر دیا۔ میرے پاس چونکہ کیسی تھی اس لیے انہیں  
کوئی شبہ نہیں ہو سکا تھا۔ ایک موقع پر میں اپنی کیسی اس کار کے  
برابر سے آگے نکال لے گیا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو پہچان لیا اور پھر  
اپنی گاڑی کو سائڈ پر لیتا چلا گیا اور انہیں آگے نکل جانے کا موقع  
دے دیا۔“

”میرا گریڈ ہوٹل والے چوراہے پر ایک حادثہ ہوا تھا جس  
کی وجہ سے دو ڈاک ہورہی تھی۔ سائی کی گاڑی تو نکل گئی لیکن  
میری گاڑی پھنس گئی۔ کئی منٹ بعد جب مجھے وہاں سے نکلنے کا  
موقع ملا تو سائی کی گاڑی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے مختلف سڑکوں  
پر اسے تلاش کیا لیکن کوئی سراغ نہیں ملا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ  
سوائی روگ ناتھ کے آشرم دیالی سڑک پر گئے ہوں گے۔“

”لیکن وہ آشرم تو جل کر راکھ ہو چکا ہے اور وہاں اب کچھ  
نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس طرف کا کچھ علاقہ پھاڑیوں پر مشتمل ہے اور ان  
پھاڑیوں میں ایسے غار ہیں جنہیں پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا  
جاسکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ پینڈو نے اپنے بھائی کو کسی ایسی ہی  
مخفی جگہ پر بھیجا ہے جس کے بارے میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔“  
ہاتھم نے بتایا۔

”لیکن ان پھاڑیوں میں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں

ہے۔“ سکھدر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”وہ علاقہ میرا دیکھا ہوا  
ہے۔ وہاں لاتعداد غار ہیں اور بعض غار تو ایسے ہیں جن کا سراغ  
نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر ہم انہیں پھاڑیوں میں تلاش کرنے کی  
کوشش بھی کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ  
اس کوشش میں ہم ان کی نظروں میں آجائیں۔ اس طرح وہ تو  
ہمیں آسانی سے ختم کر دیں گے لیکن ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں  
گے۔“

”سکھدر ٹھیک کہتا ہے۔“ میں نے کہا ”اس طرح جھٹکنے سے  
بہتر ہے کہ پہلے ان کا صحیح ٹھکانا معلوم کیا جائے۔ تم نے کہا تھا کہ تم  
نے سائی کے ڈرائیور کو پہچان لیا تھا۔ اگر وہ ہماری گرفت میں  
آجائے تو اس سے سائی کی خفیہ پناہ گاہ کا پتا معلوم کیا جاسکتا ہے۔“  
”وہ میری روکشاپ کے قریب ہی ایک اور روکشاپ میں دو  
تین مرتبہ اپنی گاڑی ٹھیک کرانے کے لیے آچکا ہے۔ اب یہ تو پتا  
چل گیا ہے کہ اس کا تعلق پینڈو کے گروہ سے ہے۔ میں ایک دو  
روز میں اس کا پتا چلاؤں گا اور پھر اس سے زبان کھلوانا زیادہ  
مشکل نہیں ہو گا۔“

”تم اسے تلاش کرلو۔ اس کی زبان میں کھلو لوں گا۔“ سکھدر  
نے کہا۔

”میں ایک دو دن میں اسے تلاش کر لوں گا۔“ ہاتھم نے کہا۔  
”ماسٹر ہو جن کی طرف سے کوئی اطلاع؟“ میں نے سوالیہ  
نگاہوں سے تھائی اور جاگی کی طرف دیکھا۔

”ماسٹر ہو جن کا فون آیا تھا۔“ تھائی نے جواب دیا ”کامنگ کی  
آخری رسومات آج صبح دس بجے انجام دی جا چکی ہیں۔ لوگ ہنگامہ  
کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مہاراج نے بڑی مشکل سے انہیں روکا  
تھا۔ وہ کوئی ہنگامہ نہیں چاہتے۔ وہ صرف اس شخص کو سزا دینا  
چاہتے ہیں جو گانگہ کے قتل کا ذمہ دار ہے۔“

”میرا خیال ہے مہاراج ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ میں نے گہرا  
سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کھانے کے بعد میں ہم دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔  
چوبچے کے قریب ہاتھم جانے لگا تو سکھدر بھی اس کے ساتھ ہوا۔  
”باس۔“ ہر سادے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جاگی دیوی  
کے علاج ’نوتکا‘ کی دیکھ بھال اور تم دونوں کی مددوں سے اب میں  
پاکل ٹھیک ہو گیا ہوں اور میرا خیال ہے اب میں مفت کی روٹیاں  
توڑ رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”اور اب وقت آگیا ہے  
کہ مجھے تمہاری ضرورت پر کتنی ہے لیکن اب تم اکیلے باہر نہیں  
نکل سکتے۔“

”نکل سکتا ہوں باس۔“ ہر سادے جواب دیا ”اتنے دن گھر  
میں قید ہو کر بیٹھا ہوں تو وہ میری بیجوری تھی لیکن اب چپ کر  
نہیں بیٹھ سکتا۔ میں آج رات ہی باہر نکلوں گا اور ان تمام جگہوں کا

چکر لگا کر آؤں گا جہاں پینڈو سے سامنا ہونے کی توقع کی  
جاتی ہے اور تم مجھے جانے سے نہیں روکو گے۔“  
میں چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر وہ  
میرا۔ میں ہر سادہ کو نہیں روک سکتا تھا۔ روکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔  
میرا بھی یہی خیال تھا کہ چپ کر بیٹھ رہے گا کوئی فائدہ نہیں تھا۔  
سوائے دقت صانع کرنے کے۔ میں نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ  
ضرورت پڑی تو میں بھی باہر ضرور نکلوں گا۔

رات آٹھ بجے کے قریب ہر سادہ چلا گیا۔ اس وقت تھائی اور  
نوتا لان میں بیٹھی ہوئی تھیں اور جاگی کی اندری مختلف کاموں میں  
مصروف تھی۔ وہ بھی کچن میں جاتی، کبھی اپنے کمرے میں اور کبھی  
میرے کمرے میں۔ اس دوران میں وہ کی مرتبہ میرے سامنے سے  
گزرتی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نظریں کچھ بدلی ہوئی  
ہی تھیں۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی  
مکراہٹ آجاتی۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بھی بے پروا نظر  
آ رہی تھی۔ اس کی ساڑی کا پلو ٹنگ لپکا ہوا تھا اور اس نے ایک  
مرتبہ بھی اسے درست کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جب  
تھائی اور نوتا اندر آئیں تو جاگی نے ساڑی کا پلو کھنکھنے پر ڈال لیا  
تھا۔

تین دن گزر گئے۔ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گویا  
ایک جھوٹا طاری تھا۔ پینڈو کے کیمپ میں بھی خاموشی تھی اور  
مہاراج کے کیمپ میں بھی لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ دونوں طرف  
اندری ہر اندر کوئی کمپوزی ضرور کر رہی تھی اور یہ خاموشی اپنے  
اندروں کوئی ایسا زبردست طوفان چھپائے ہوئے تھی جو کسی وقت  
اچانک سی پھٹ پڑے گا۔

چوتھے روز ایک معمولی سا ہنگامہ ہوا۔ ماسٹر ہو جن کے لڑکوں  
اور پینڈو کے غنڈوں میں تصادم ہو گیا تھا۔ دونوں طرف کے دودھ  
تین تین آدمی زخمی ہوئے تھے۔ پولیس اسٹیشن وہاں سے قریب ہی  
تھا۔ پولیس ہنگامے کی اطلاع ملتے ہی پہنچ گئی تھی۔ دونوں طرف کے  
لوگ بھاگ گئے تھے۔ اس طرح ہنگامہ زیادہ نہیں بڑھ سکا تھا لیکن  
مجھے یقین تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

اور پھر اسی رات گیارہ بجے کے قریب ہاتھم نے ٹیلی فون پر  
اطلاع دی کہ اس نے خطوط ہر ڈرائیور کا پتا چلا لیا ہے۔ ادیس فوراً ”والی  
ایم ی اے“ بلڈنگ کے سامنے پہنچ جاؤں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں  
تیار ہو گیا۔ اس وقت سکھدر بھی گھر پر موجود تھا۔ میں نے اسے بھی  
تیار ہونے کو کہا اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ تھائی نے میرے ساتھ  
جانے کے لیے خمد نہیں کی تھی اور پھر اس کی وجہ بھی میری سمجھ  
میں نہ آئی۔ وہ بار بار اپنی پیٹھ میجھ رہی تھی۔

میں نے اپنا پیچھے پھرتی سے باندھ لیا تھا اور تھائی کا پستول  
بھی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ ہر سادہ میں اس وقت گھر میں نہیں  
تھا۔ تھائی اور جاگی نے رات انہیں تیار کر کے رکھ لیں تاکہ ہماری عدم

موجودگی میں کوئی گڑبگ نہ ہو تو وہ اپنا دفاع کر سکیں۔  
ہاتھم والی گاڑی موجود تھی۔ سکھدر نے اسٹیرنگ سنبھال لیا  
اور میں پونجز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے بڑی شدت سے  
احساس ہوا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ سیکھ لینی چاہیے۔ میں اس  
ساحلے میں دوسروں کا متنازع تھا۔

دراپک دوڑ پڑوائی ایم ی اے“ تک پہنچے میں زیادہ دیر نہیں  
گئی تھی۔ عمارت سے ذرا آگے ایک گلی کے موڑ پر کیسی کے  
قریب ہی ہاتھم بھی موجود تھا۔ سکھدر نے کیسی کے قریب ہی گاڑی  
روک لی۔ اس نے انہیں بند کر دیا اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔  
”کہاں ہے وہ؟“ میں نے ہاتھم کا سامنا ہونے ہی پر پوچھا۔  
”وہ اس طرف ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں ہے۔“ ہاتھم نے

گلی کی طرف اشارہ کیا ”وہ گاڑی گیراج میں بند کر کے آیا ہے۔ اس  
کا مطلب ہے کہ اس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے اور وہ رات کو اس  
فلیٹ میں ہی رہے گا۔ اس کا نام تھونک ہے اور وہ فلیٹ میں اکیلا  
ہی ہے۔“

ہم تین گلی میں چل پڑے اور چند گز کے بعد دائیں طرف  
مڑ گئے۔ یہ تقریباً بیس فٹ چوڑی سڑک تھی۔ ایک طرف پارک تھا  
اور دوسری طرف ایک دوسرے سے ملی ہوئی بلند و بالا رہائشی  
عمارتیں تھیں۔ ہاتھم تیسری عمارت کے گیٹ میں ٹھکس گیا۔  
عمارت بہت پرانی تھی۔ لوہے کے ڈنگے والا گیٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ کوئی  
چوکیدار نہیں تھا۔ کالی کشادہ لالی تھی۔ ایک دیوار پر لاتعداد  
لیٹرٹس لگے ہوئے تھے۔ ہر لیٹرٹس پر متعلقہ فلیٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا  
اور ہر نمبر کے ساتھ کال بیل کا بجھن لگا ہوا تھا۔

سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی سی تھیں۔ لالی اور سیڑھیوں پر بکھری ہوئی  
گندگی اور کوڑے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ نہ تو اس عمارت کی  
مناسب دیکھ بھال ہوتی تھی اور نہ ہی کینوں کو صفائی وغیرہ سے کوئی  
دیکھی تھی۔ صرف لالی میں ایک بلب روشن تھا جبکہ سیڑھیوں پر  
تاریکی تھی۔

ہاتھم تیسری منزل کی راہداری میں مڑ گیا۔ راہداری کے  
آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ وہ ایک دروازے  
کے سامنے رک گیا۔ میں نے ہاتھم اور سکھدر کو اشارہ کیا۔ وہ  
دائیں بائیں دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ میں نے دروازے پر ہلکی  
سی دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک منٹ کے انتظار کے  
بعد میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے ایک مردانہ  
آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“  
”دروازہ کھولو تھونک۔ تمہارے لیے پینڈو کا ایک پیغام

ہے۔“ میں نے کہا۔  
”اندر سے کچھ بڑوانے کی آواز سنائی دی پھر لوٹ بنایا گیا اور  
دروازہ ایک بالشت کے قریب کھل گیا۔ کمرے میں بلب جل رہا



تھا۔ اس کی روشنی میرے چہرے پر پڑی تھی۔ درمیانے قد کے ہماری بھر کمزور ہوگئی تھی۔ اس شخص نے جسم کے نچلے حصے پر تویا لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ لباس نام کی کوئی چیز اس کے جسم پر نہیں تھی۔ توہم کی نظریں میرے چہرے پر نہیں اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے غالباً مجھے پہلا بھی دیکھا ہوا تھا اور وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر میں نے پیر پھسار دیا۔

”لگ... کون ہو تم اور... یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہ ہلکایا۔  
”تم سے ملنے“ میں نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر پھٹیلے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑکیا۔ پاؤں اور سکھڑ بھی اندر آ گئے۔ پاؤں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”یہاں اور کون ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ اس کے جسم پر صرف تویا اور دامیں گال پر لپ اسٹک سے بنا ہوا ہونٹوں کا نشان دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اندر اس کے علاوہ اور کون ہے اور وہ کیا کر رہا تھا۔  
”لگ... لگ... کوئی نہیں... اندر کوئی نہیں ہے۔ تم... تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہ خوف سے ہولے ہولے کانپنے لگا۔

”توہم... تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ باہر کون ہے؟“ اندر سے ایک نسوانی آواز سنا دی۔

میں نے توہم کے منہ پر زوردار گھونسا مار دیا۔ وہ چیخ کر گرا۔ اٹھتے ہوئے وہ ایک ہاتھ سے تویا سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ہونٹ پونچھ رہا تھا جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ چپے ہی اٹھا۔ میں نے ایک زوردار ٹھوک لگائی۔ وہ لڑکھڑکیا ہوا دامیں طرف کے ایک دروازے میں گرا اور میں پیسے ہی آگے بڑھا۔ میری نظریں لڑکی پر پڑی جو بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پہلے توہم کو اندر کی طرف گرتے اور پھر مجھے دروازے میں دیکھ کر اس لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بدحواسی میں بیڈ کے قریب کرسی پر پڑے ہوئے اپنے لباس کی طرف لپکی لیکن سکھڑ نے بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر اسے دبوچ لیا۔ لڑکی کے منہ سے نکلنے والی چیخ ادھوری رہ گئی۔ سکھڑ نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا تھا۔

”اسے چھوڑ دو اور اگر یہ دوبارہ چیخنے کی کوشش کرے تو بے شک اس کا گھٹا گھونٹ دیتا۔“ میں نے سکھڑ سے کہا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اس لباس پہن کر خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو یہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

سکھڑ نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے الٹا سیدھا لباس پہنا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اب بھی

خوف سے قہر قہر کانپ رہی تھی۔

”تم بھی کپڑے پہنو۔“ میں نے توہم کو ٹھوک مارتے ہوئے کہا۔

توہم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تویا اس کے جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ وہ بھی قہر قہر کانپ رہا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب فرش پر پڑی ہوئی پتلون اٹھا کر پہنے لگا۔ دراصل میں اس لڑکی کی موجودگی میں توہم سے ساری کے بارے میں کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی میں لڑکی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔

”بس۔ یہ پتلون ہی کافی ہے۔ تمہیں مزید لباس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا اور پھر سکھڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اس لڑکی کے ہاتھ پیرا نہ کر یہاں ڈال دو۔ صبح کوئی نہ کوئی غلیٹ میں آکر اسے کھول دے گا۔“

سکھڑ نے حکم کی قیامت میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ پیرا نہ کر اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھوس دیا تھا۔ میں نے جب سے ہسپتال نکال لیا اور توہم کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پاؤں نے باہر کا دروازہ کھول کر راپداری میں بھاگنا اور ہمیں اشارہ کر دیا۔ ہم غلیٹ سے باہر آ گئے۔ پاؤں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

پاؤں کے درکشاپ تک پہنچنے میں بھی ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پاؤں کی ٹیکسی آگے تھی اور میں دوسری گاڑی میں توہم کو ہسپتال کی زوہیں لیے بیٹھا تھا جبکہ سکھڑ ڈرائیو کر رہا تھا۔

توہم کو ہم درکشاپ کے پچھلے حصے میں ایک کمرے میں لے آئے۔ یہاں مددگار روشتی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ کمرے میں گاڑیوں کے ٹاکا پڑے پھرے ہوئے تھے۔

”تم تم سے صرف ایک بات پوچھنے کے لیے یہاں لائے ہیں۔“ میں نے توہم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہسپتال جب میں رکھ کر پنڈلی سے بندھا ہوا خبر نکال لیا ”پیڈو کا بھائی ساری کہاں ہے؟“

”مم... میں نہیں جانتا۔“ توہم ہلکایا ”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”تم اسے چار دن پہلے رات کے وقت کہیں چھوڑ کر آئے تھے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”کہاں لے کر گئے تھے اسے۔ کہاں چھپا ہوا ہے وہ؟“

”مم... مجھے نہیں معلوم۔“ خوف کی شدت سے اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے خبرجی نوک سے اس کے سینے پر ایک لمبی سی گیر کھینچ دی۔ وہ چیخنے لگا تو سکھڑ نے جلدی سے اس کا منہ دبا دیا۔

”میں تمہارے جسم پر اس طرح سرخ لکیوں کا جال بنا دوں گا۔ تمہارا سارا خون بر جائے گا اور تم ختم ہو جاؤ گے۔“ میں نے ایک اور گیر کھینچ دی۔

وہ بری طرح چلنے لگا۔ میرے اشارے پر سکھڑ نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”مم... میں نہیں جانتا۔“ پیڈو پیڈو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ توہم نے کہا۔

”زندہ تو ہمیں میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے سکھڑ کو اشارہ کیا اور اس مرتبہ میں نے توہم کے پیٹ پر ایک گہری لکیر کھینچ دی۔ وہ بری طرح زپا۔ میں نے دو تین لکیریں اور کھینچ دیں۔ وہ ناگہم جھٹک رہا تھا اور اس کے پیروں کی رگڑ سے مٹی اڑ رہی تھی۔ مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے گانگ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ توہم پر رحم کر کے میں گانگ کے قاتل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سکھڑ نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا لیکن اس مرتبہ بھی اس کا جواب دی تھا۔ میرے ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھ کر سکھڑ نے ایک بار پھر اس کا منہ دبا دیا اور اس مرتبہ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں پر سرخ لکیوں کے جال بنا دیے۔ اگر اس کا منہ بند نہ ہوتا تو اس کی چیخیں آسمان کی خبر لاری ہو تیں۔ توہڑی دیر بعد سکھڑ نے پھر اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”اب میں آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے توہم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب اگر تم نے جواب نہ دیا تو یہ خبر تمہارے زخروں سے پھلے گا۔“

”ہب... بتانا ہوں۔“ اس کے منہ سے آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی۔ ”س... سس... ساری قدیم شہر کے... کھنڈروں میں... واٹ... چیاگ... سین کے... خانے میں... چھپا ہوا ہے۔“

”اس کے ساتھ کہتے آدمی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”فلس... فلس... اس نے جواب دیا۔

میں نے سکھڑ کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر توہم کا منہ دبا دیا اور میں نے بڑی بے رحمی سے خبرجی دھاوار اس کے زخروں پر پھیر دی اور ہاتھ اس وقت تک نہیں روکا جب تک اس کی شرنگ کٹ نہیں گئی۔

سکھڑ نے اسے چھوڑ دیا۔ توہم کچے فرش پر تر پڑے لگا۔ اس کے منہ سے عجیب سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نے توہم کی لاش کلب ٹوٹی مسک کی عقیلی گلی میں پھینک دی۔ پاؤں ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اپنی ٹیکسی درکشاپ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

ہم جب نکلے پڑے توہم کو تھائی پڑے تھے۔

”کیا ہوا...؟“ کچھ معلوم ہوا۔“ تھائی نے پوچھا۔  
”بالہ... ساری کا پتا چل گیا ہے۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا اور تحصیل تانا مناسب نہیں سمجھا۔  
اس رات میں اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی کیفیت

محسوس کرتا رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کئی قتل ہوئے دیکھے تھے۔ خون میں لخت پت کی لاشیں دیکھی تھیں۔ پہلے میں ان لاشوں کو دیکھ کر ڈر رہا کرتا تھا۔ کسی کو قتل ہوتے دیکھ کر میرے اوپر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور پھر ایک مرتبہ میں نے پامیلا کو دارا کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے خوب صورت جسم پر خنجر چلاتے ہوئے کتنا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس وقت تو پامیلا کو خون میں لخت پت تر پڑے ہوئے دیکھ کر میں کانپ اٹھا تھا لیکن آج مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ توہم کے جسم پر خنجر کی نوک سے لکیریں کھینچتے ہوئے مجھے عجیب سا مزہ محسوس ہوتا رہا تھا۔ میں رات بھر عجیب سی کیفیت میں مبتلا رہا۔ ابھی پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگی تھیں اور میرا سیرا داغ بالکل سن ہو جاتا۔

پاؤں اور سکھڑ صبح باشتا کرتے ہی نکل گئے تھے۔ پاؤں کو تو اپنے درکشاپ کا وہ کرا صاف دیکھا تھا جہاں توہم کو ذبح کیا گیا تھا اور سکھڑ کو توہم کے قتل کا رد عمل معلوم کرنا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ شہر کے ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں رات دیر تک ہنگامے جاری رہتے تھے اور سڑکوں سے ٹانٹ کو ٹکڑیوں سے لوگوں کی واپسی رات کو آخری پہری ہو کر گئی تھی۔ سکھڑ تین گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ توہم کی لاش صبح چار بجے کے قریب مل گئی تھی۔ اس کے قتل کا انکشاف ہوتے ہی اس علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ کلب ٹوٹی سکس اور آس پاس کے ہوٹلوں سے نکلنے والے لوگ بڑی غلج میں وہاں سے چلے گئے تھے۔

پیڈو بھی اس وقت کلب میں موجود تھا۔ وہ زخمی ناگ کی طرح پھٹکا رہا پھر رہا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے توہم کی لاش غائب کر دی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ اس نے کھل کر کہا تھا کہ وہ توہم کے قاتل کو معاف نہیں کرے گا۔

اور پھر سہ ہفتے بعد کے قریب پاؤں بھی آیا اور ہم پیڈو کے بھائی ساری کو گھیرنے کا پروگرام بنانے لگے۔

قدیم شہر اب تو تھکا کے کھنڈر بن گیا۔ یہ شہر چار سو سال تک سیام تھائی کلونی کے قریب واقع تھا۔ یہ شہر چار صدیوں میں اس شہر نے بڑے لینڈ کا دارالحکومت رہا تھا۔ ان چار صدیوں میں اس شہر نے بڑے عروج و زوال دیکھے تھے۔ بڑے کے حکمران اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے۔ اب تو تھائی نے ہر مرتبہ ڈٹ کر بری حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا لیکن بالآخر ۱۷۷۷ء میں بری حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس خوب صورت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اب تو تھائی کی تباہی کے بعد شہنشاہی سمن نے دریا سے جاؤ فریا کے مغربی کنارے پر واقع تھان پوری نامی گاؤں کو اپنا دارالحکومت

بنا لیا اور اپنی بھری ہوئی قوت مجتمع کر کے نہ صرف برہمن کو ایو تھا یا سے مار بھگایا بلکہ لاؤس اور کمبوڈیا کے مت سے علاقے۔۔۔ اپنی سلطنت میں شامل کر لیے تھے لیکن صرف پندرہ سال بعد شہنشاہ ہماکن کا انتقال ہوتے ہی اس کے سب سے قریبی دوست اور فوج کے جنرل چاؤ نے ملک پر قبضہ کر لیا اور دارالحکومت کو دریائے چاؤ فرما کے دوسرے کنارے پر منتقل کر دیا۔ اس علاقے کو پہلے کرونگ قصبہ اور پھر چنگ کا نام دیا گیا جو ترقی کرنا ہوا دوا کے دونوں طرف میلوں دور تک پھیل چکا ہے۔

قدیم شہر ایو تھا یا کے میلوں دور تک پھیلے ہوئے کنڈرات آج بھی اپنے اندر ماضی کی غفلتوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ چنگ آئے والے غیر ملکی سیاح اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ یہ کنڈرات دیکھنے کے لیے ضرور جاتے ہیں۔ چھٹی کے روز وہاں کچھ زیادہ رونق ہوئی تھی اور میرا خیال تھا کہ ہم بھی شام سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں اور پھر موقع ملے ہی واٹ چینگ سین والے کنڈر کے رخسار پر بلرہ دیں۔

”مناسب خیال ہے“ پاٹھم نے کہا ”میں نے وہ کنڈرات دیکھے ہوئے ہیں۔ ہم کسی دشواری کے بغیر واٹ چینگ سین تک پہنچ جائیں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ روایتی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

پرساد بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ ایک آدمی کا یہاں خواتین کے پاس رہنا ضروری تھا۔ اپنی ”پرائم“ ہونے کے باوجود تھائی بھی ساتھ جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اگر وہاں عین وقت پر اس کی پیٹھ بھجائے لگی تو میں اسے سنبھالتا۔۔۔ یا صورت حال کا مقابلہ کرتا۔ ”کنڈرات کی سیر کو جانے والے ٹورسٹوں کی پابندی میں کوئی نہ کوئی عورت ضرور شامل ہوتی ہے۔“ قریب کھڑی ہوئی جا لگی نے کہا ”میرا خیال ہے اگر میں ساتھ جانا چاہوں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں کوئی پر اہم کیری ایٹ نہیں کروں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ میری وجہ سے کوئی آسانی پیدا ہو جائے۔“

چند لمحوں تک میں سوچتا رہا۔ اگر ساری کو چھانسنے کے لیے چارے کی ضرورت نہ جائے۔۔۔ تو ایسی صورت میں جا لگی اس جیسے عیاش شخص کے لیے بہترن چارہ ثابت ہو سکتی تھی۔ جا لگی اپنے کمرے میں کھس گئی اور چند منٹ میں تیار ہو کر بیٹھی۔ میں اسے دیکھ کر پلک بھپکانا بھول گیا۔ وہ نیلے رنگ کی مختصر سی نیکر اور سلیو لیس بلاؤز میں تھی۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر سر کے اوپر جوڑا بنا لیا تھا۔ ہلکے سے میک اپ سے اس کا حسن کچھ اور بھی ٹھہر آیا تھا۔ دایں کندھے پر گلابی کپڑے کا ایک تھملا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے وہاں ٹائٹ کپڑوں میں اور سڑکوں پر ٹھوکتے ہوئے غیر ملکی سیاحوں کو دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسکین اور جوان عورت

ضرور ہوتی تھی۔ وہ لوگ تھیلے کھدوں پر لٹکائے دنیا بھر کی سیاحت کرتے پھرتے تھے اور ان کے اخراجات وہی خوب صورت عورت پورے کرتی تھی جسے عام طور پر ”ہیرر چیک“ کہا جاتا تھا کہ جب چاہا کیش کروالیا۔

میں نے بھی اپنے طیلے میں توڑی بہت تبدیلی کر لی تھی اور دوا لگی سے پہلے ہم نے تھائی وغیرہ کو بتا دیا تھا کہ ہم رات کنڈروں ہی میں رہیں گے اس لیے ہم نے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی گاڑی میں رکھ لیا تھا۔

ہمیں زیادہ وقت شہر سے نکلنے میں لگا تھا۔ قدیم شہر ایو تھا یا کی طرف جانے والی سڑک پر اگاؤ کا گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہم پاٹھم کی ٹیکسی میں تھے۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ سکھدراں کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور میں جا لگی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس ٹیکسی کی وجہ سے ہم پر کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ہم جب قدیم شہر پہنچے تو سوا چھ بج رہے تھے۔ میلوں دور تک کنڈرات پھیلے ہوئے تھے اور ان کنڈرات کو دیکھ کر ماضی میں اس شہر کی خوب صورتی اور عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس شہر نے خوب ترقی کی تھی لیکن بالآخر اس کا عروج بھی زوال کی پستیوں میں گھونکا۔

پاٹھم نے ٹیکسی بینک پائٹن پلس سے ڈرا آگے لے لے جا کر دوک لی۔ اس محل کے کنڈرات کئی ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اور غالباً یہ اس تہا شدہ شہر کی واحد عمارت تھی جو اب بھی کسی حد تک اپنی شان و شوکت پر قرار رکھے ہوئے تھی۔ بینک پائٹن پلس دراصل کئی چھٹی بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا اور یہ عمارتیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس محل کے قریب ہی ایک اور عمارت میں بینک سائی آرٹ گیلری بھی قائم تھی اور زیادہ تر سیاحوں کی توجہ اسی محل اور آرٹ گیلری پر مرکوز تھی۔ اس طرف کھانے پینے کی اشیاء کے کچھ اسٹال وغیرہ بھی تھے۔

ہم لوگ ٹیکسی سے اتر کر بینک پائٹن پلس کے سامنے سے گزرتے ہوئے پچھلی طرف پلے گئے۔ کشادہ گلیوں اور سڑکوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اونچے نیچے میلوں پر یہ شہر بڑے پلینے سے آباد کیا گیا تھا۔

پاٹھم آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ ایک ماہر گائیڈ کی طرح ہمیں ان کنڈرات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آس پاس کچھ اور سیاح بھی گھوم رہے تھے۔ جا لگی میرے ساتھ تھی اور قریب سے گزرنے والے لوگ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پاٹھم ایک نیلے پر رک گیا۔ آس پاس کے علاقے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کی آبادی تنگناں تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے کنڈر چاروں طرف ٹھہرے ہوئے تھے۔ ”وہ واٹ چینگ سین کے کنڈر ہیں۔“ پاٹھم نے ایک طرف

اشارہ کیا۔ وہاں سے تقریباً نصف میل دور قصبہ میں مندروں سے ملتی جلتی دو بہت بڑی عمارتوں کے کنڈر نظر آ رہے تھے۔ دونوں عمارتیں ایک دوسرے سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھیں۔ ان میں سے ایک عمارت بڑی تھی۔ اس کی بلندی سو فٹ سے کم کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی اور وہ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری عمارت بلندی میں اس سے پندرہ بیس فٹ کم تھی۔ اس عمارت نے بھی بہت لمبا چوڑا رقبہ گھیر رکھا تھا۔ ان کے آس پاس اور بھی چھوٹی چھوٹی بہت سی عمارتیں تھیں جو مکمل طور پر تہا ہو چکی تھیں۔ ان دونوں بڑی عمارتوں کے سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک بہت بڑا چوڑا تھا جس کے اوپر قبر نما ایک اور کشادہ چوڑا بنا ہوا تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کسی زمانے میں اس اوپر والے چوڑے پر کوئی مجسمہ نصب رہا ہوگا۔

واٹ چینگ سین کے وہ کنڈرات ہم سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھے اور رخصت ہوتی ہوئی دھوپ براہ راست ان کنڈروں پر پڑ رہی تھی۔ پانچ چھ سیاحوں پر مشتمل ایک بائوٹل ان کنڈروں سے نکل کر ہماری طرف آ رہی تھی۔ ان میں دو عورتیں تھیں۔ ایک نے تو جا لگی کی طرح مختصر سی نیکر اور بغیر آستین کی دھاری دار ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیرا بھی تھا جبکہ دوسری عورت نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ حوٹوں کے طیلے بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ ان کے ساتھ ایک گائیڈ بھی تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ توڑی دیر کو رے کے اوپر پھر آگے بڑھ گئے۔

ہم چینگ سین کے کنڈروں میں پہنچ گئے۔ ان کنڈروں کو دیکھ کر اس عبادت گاہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ہم بڑی عمارت میں داخل ہو گئے۔ ایک بہت وسیع و عریض ہال تھا جس کے وسط میں تقریباً آٹھ فٹ اونچا ایک وسیع چوڑا بنا ہوا تھا۔ یہ چوڑا بھی ٹیٹ پھوٹ چکا تھا۔ ہال کے اطراف میں کئی راہداریاں اور کمرے تھے۔ کمروں کے دروازے اور چوکھٹیں غائب تھیں۔ دیواریں اوھڑی ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں سے اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔

تھوٹک نے بتایا تھا کہ سائی اور اس کے ساتھی اس واٹ (WAT) میں بدھ عبادت گاہ کے نیچے سے خانے میں چھپے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ یہ خانہ بہت پہلے سے استعمال میں تھا۔ میں نے واٹ ٹرمنٹ کا یہ خانہ دیکھا تھا۔ کسی اجنبی کے لیے اس قسم کے یہ خانوں کا سراغ لگانا آسان نہیں ہوتا۔

ہم سب راہرواھر پھیل کر یہ خانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ یہ بھی اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ خانے کا راستہ اسی عمارت میں تھا یا دوسری عمارت میں۔ ہم فرش اور دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھتے رہے۔ دوسری عمارت میں بھی جا کر دیکھا لیکن اس طرح

راستہ تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ یہ خانے میں موجود سامی اور اس کے ساتھیوں کو ہماری موجودگی کا پتا چل گیا تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔

”ایک طریقہ ہے۔“ جا لگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہم مختلف جگہوں پر چھپ کر انتظار کریں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رات کو کسی نہ کسی وقت باہر ضرور نکلیں گے اور اس وقت۔۔۔“ ”میرا خیال ہے یہی مناسب رہے گا۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فیصلہ سنایا۔

ہم واٹ کی عمارت سے باہر آگئے اور واپس جانے والے راستے پر کنڈروں کی آڑ میں چلتے ہوئے مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ پاٹھم مغرب کی طرف چلا گیا تھا اور سکھدرا دوسری طرف نکل گیا۔ پاٹھم کے پاس اپنا ہسٹول موجود تھا۔ راتقل میں نے سکھدرا کو دے دی تھی۔ تھائی والا ہسٹول جا لگی کے خیلے میں تھا جبکہ میری ہڈی سے خنجر بندھا ہوا تھا۔

میں اور جا لگی واٹ کی پچھلی طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک اور عمارت کے کنڈر میں آگئے۔ یہاں سے ہم واٹ کے کنڈروں پر پوری طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔

یہ عمارت بھی چوڑا قسم کی تھی جس کی چھت غائب تھی اور دیواریں بھی ٹیٹ پھوٹ چکی تھیں۔ ایک بہت بڑا ہال تھا اور اس کے اطراف میں کمرے بھی تھے۔ ہم ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں سے ہم تو چاروں طرف نگاہ رکھ سکتے تھے لیکن ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ تانے میں جھینگروں کی آوازیں بڑا خوف ناک تاثر دے رہی تھیں۔ ایسی جگہوں پر ساپوں، بچھوڑ اور زہریلے کیڑے کوڑوں کا بھی اندیشہ رہتا تھا۔ آدمی رات بہت چکی تھی۔ چاند بھی نکل آیا تھا۔ مدھم سی چاندنی میں کنڈرات کا منظر دل دلا دینے والا تھا۔ اچانک ہی ایک طرف سے کسی پتھر کے لڑکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور آنکھیں میاڑ میاڑ کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ جا لگی بھی میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ وہ بھی ادھر ادھر گھور رہی تھی اور پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس طرف دیکھتے ہی میرے منہ سے گھرا سانس نکل گیا۔ وہ شاید کوئی کتا تھا یا اسی قد و قامت کا کوئی اور جانور تھا جو واٹ والے کنڈروں سے نکل کر دایں طرف جا رہا تھا۔

میں ایک بار پھر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل رہی ہو۔ میں سمجھا شاید مجھے پکڑا رہا ہے۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن زمین تیزی سے میرے پیروں کے نیچے سے نکل رہی تھی اور میں نیچے ہی نیچے دھنستا جا رہا تھا۔ میں نے جا لگی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بھی میرے ساتھ زمین میں دھنستے لگی۔

ہم دونوں بڑی تیزی سے کسی ڈھلان پر لڑکھ رہے تھے۔

جاگی میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھر بھی ہمارے ساتھ لٹک رہے تھے اور بالآخر ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ میں نے اپنے آپ کو جاگی کی گرت سے چھڑایا اور دھڑکدھڑکے لگا۔ کمری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ جاگی ایک بار پھر میرے ساتھ لپٹ گئی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہم اس پگڑا کے کھنڈر کے زخاں میں پہنچ گئے تھے لیکن حیرت کی بات تھی کہ مجھے ٹھنک کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ کسی طرف سے تازہ ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تھی۔ میں نے سرائی کر اوپر دیکھا۔ ہمارے گرنے سے جو خلا سا بن گیا تھا وہاں سے آسمان پر مارے پھینکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ خلا کوئی پندرہ فٹ اونچا تھا اور اس تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

”یہ زخاں ہے۔ یہاں سے کسی اور طرف نکلنے کا راستہ بھی ہوگا۔ آؤ۔ اس طرف دیکھتے ہیں۔“ میں نے جاگی کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹٹول کر ایک طرف قدم اٹھانے لگا۔ جاگی میرے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

میں نے ایک ہاتھ سے جاگی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولتا ہوا چل رہا تھا۔ تقریباً پچیس منٹ کے بعد دیوار بائیں طرف مڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی میں چوک گیا۔ سامنے ہی ایک تنگ سے خلا سے بہت مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا، کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بہا۔ آگے مٹی کا ڈھیر کھڑا ہوا تھا جس نے جاگی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جبکہ کر دونوں ہاتھ ٹکاتے ہوئے مٹی کے اس ڈھیر پر چڑھنے لگا۔ جاگی میرے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔

وہ کوئی دیوار تھی جس سے چند انٹینس اکڑی ہوئی تھیں اور باہر چاند کی مدھم سی روشنی اس خلا سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس خلا سے جھانک کر دیکھا تو چمک گیا۔ چیاک سین عبادت گاہ کے کھنڈر کسی اور زاویے سے ہمارے سامنے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پگڑا کے زخاں میں گرنے کے بعد بھی ہم بچے نہیں تھے۔ جاگی بھی اسی خلا سے باہر دیکھ رہی تھی۔

دیوار کی پانچ تھ انٹینس اکڑی ہوئی تھیں اور وہ خلا اتنا بڑا نہیں تھا کہ میں یا جاگی اس میں سے گزر سکتے۔ میں خلا میں ہاتھ ڈال کر انٹینس اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیوار بہت موٹی تھی اور انٹینس بہت مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ جاگی بھی میرے ساتھ انٹینس اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ہم ایک اینٹ بھی نہیں اکھاڑ سکتے۔

میں نے کوشش ترک کر دی اور مٹی کے ڈھیر پر پٹ کے بل لیٹ کر کمرے کمرے سانس لینے لگا۔ میرے خیال میں یہاں سے بھی واٹ پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی لیکن ہمارے لیے ضروری تھا کہ ابرجیسی کے وقت باہر نکلنے کے لیے راستہ تیار رکھیں۔

میں مٹی کے ڈھیر پر پٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور جاگی ایک بار پھر کوئی اینٹ اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک اینٹ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ جھٹکا کھا کر میرے اوپر گر گئی۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا اور اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔

میں جاگی کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ پوری طرح میرے اوپر لد گئی اور پھر میں اس کے پیچھے ہونے لگا۔ کالمس اپنے ہونٹوں پر محسوس کرنے لگا۔ میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کپٹیاں سنگ آٹھیں اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ دیتے تھے میں نے جاگی کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا۔ وہ مٹی کے ڈھیر پر لڑختی چلی گئی۔ نیچے گرتے ہوئے میرا ہراس کی گرفت میں آ گیا اور میں بھی مٹی کے اس ڈھیر پر لڑختی لگا۔

ہم دوبارہ مٹی کے ڈھیر کے اوپر آ گئے۔ میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے دماغ میں سناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس رات جب میں نے جاگی کو صوفے پر سوئے دیکھا تھا تو اس وقت بھی میں نے اپنے اندر کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کی تھی اور اب تو معاملہ اس سے ایک قدم آگے کا تھا لیکن میں لڑکھانے سے پہلے ہی سنبھل گیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر اب کمرے کمرے سانس لے رہا تھا کہ جاگی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر بچھڑو دیا۔

”ودھان! وہ دیکھو۔ میرا خیال ہے ہم نے سائی کی خفیہ پناہ گاہ کا سراغ لگا لیا ہے۔“ جاگی کے لیے میں عجیب سی سنسنی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جاگی نے خلا سے ہاتھ باہر نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیاں لیجے لگا۔ ”وہ دیکھو۔ واٹ کی بڑی عمارت کے چوتھے میں نیچے کی طرف روشنی نظر آ رہی ہے۔“

میں غور سے اس طرف دیکھنے لگا۔ واٹ کی وہ عمارت ایک بہت وسیع و عریض چوتھے پر تعمیر کی گئی تھی یا عمارت بنانے کے بعد اس کے چاروں طرف یہ چوترا تعمیر کیا گیا تھا۔ زمین سے اس چوتھے کی بلندی تقریباً چھ فٹ تھی۔ چوتھے کے دائیں کونے کی طرف نیچے روشنی کی پانچ تھ ایسی ایک متوازی لکیری نظر آ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے،“ چاند کی روشنی میں کوئی چیز چمک رہی ہے۔ شاید کوئی شیشہ وغیرہ ہو۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”شیشے کی چمک ایسی نہیں ہوتی۔“ جاگی نے کہا ”وہ بلب کا بیڑو میکس کی روشنی ہے۔ اس چوتھے کے نیچے زخاں ہے۔ اب ہمیں زخاں کا راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن پہلے یہ انٹینس اکھاڑو۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ بناؤ۔“

سنبھل کر بیٹھ گیا اور دیوار کی ایک اینٹ اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اینٹ پر میں پہلے ہی زور آزمائی کر چکا تھا۔ بڑی مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔ اس واٹ کی تعمیر میں بجائے کون سا سال استعمال کیا گیا تھا کہ تقریباً چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی انٹینس اپنی جگہ پر جمی ہوئی تھیں۔

میں اینٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور آزمائی کرنے لگا۔ اس مرتبہ مجھے باؤسی نہیں ہوئی۔ اینٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ میں اسے جھٹکے دیتا رہا اور بالآخر ایک زوردار جھٹکا دیتے ہی وہ اینٹ اپنی جگہ سے اکٹھڑی اور میں اپنی محبوبک میں پیچھے کر جاگی سے ٹکرائی۔

فکرایا جو میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ اکٹھڑ جانے کے بعد کوئی مشکل نہیں رہی تھی۔ باقی انٹینس آسانی سے اکٹھڑی چلی گئیں۔ جاگی بھی میری مدد کر رہی تھی۔ آٹھ منٹ کے ایک کار کو کوشش کے بعد ہم اس خلا کو آگاہہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ایک آوی آسانی سے گزر سکتا تھا۔

پہلے جاگی اس ٹوٹی ہوئی دیوار سے باہر نکلے اور پھر میں بھی باہر آ گیا۔ چاند ہمارے دائیں طرف بہت نیچے جھک گیا تھا اور اس کی روشنی چوتھے پر زمین پر پڑی تھی جبکہ چوتھے میں روشنی کی وہ جلیبی متوازی لکیر بدستور نظر آ رہی تھی۔

جاگی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے گردن جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں اس کے چہرے کے آثارِ ثبوت بڑے عجیب سے تھے۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”ودھان۔“ اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز بجلی کی طرح توڑی دیر پہلے جو کہ ہوا اس کے لیے مجھے معاف کر دے۔ ”بہت دنوں سے شاید تم کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھیں جاگی لیکن میرا حال۔“ میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا ”جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

میں چوتھے کی طرف دیکھنے لگا۔ جاگی کا خیال ٹھیک ہی لگتا تھا۔ اس واٹ کے نیچے زخاں تھا۔ جس میں غالباً بیڑو میکس جل رہا تھا اور اس کی روشنی چوتھے کی اس دراڑ میں سے نظر آ رہی تھی ”تمہارا بہتول کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

جاگی نے کندھے پر ہاتھ پٹے ہوئے تھیلے میں سے پستول نکال لیا۔ ”ٹھیک ہے۔ اسے اپنے پاس ہی رکھو اور آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلیں۔ رو۔ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں دبے قدموں چلتے گئے۔ واٹ کی عمارت والا وہ چوترا تقریباً پچاس گز آگے تھا۔ میرے پیروں سے ایک پتھر ٹکرا کر دور تک لڑختا چلا گیا۔ تانے میں پتھر کے لڑختے کی آواز بھی دور تک جاسکتی تھی۔ میں مزید احتیاط سے چلتے لگا۔

چوتھے کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ جاگی پستول ہاتھ میں پکڑے تھا۔ نظروں سے اوجھڑا دھڑکتی رہی۔ چوتھے میں نصف

انچ چوڑی اور آٹھ دس انچ لمبی وہ متوازی دراڑ زمین کی سطح سے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی تھی۔ میں زمین پر اتر کر بیٹھ گیا اور اس دراڑ سے اندر جھانکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔

جاگی کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ واٹ کے اس چوتھے کے نیچے زخاں ہی تھا۔ بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ وسط میں فرش پر بیڑو میکس جل رہا تھا۔ اس کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھا ایک آدمی اوجھ رہا تھا۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا۔ گود میں راکٹل رکھی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ راکٹل پر تھے۔ اس شخص کا رخ دائیں طرف والی دیوار کی طرف تھا۔ گردن اوپر فرش پر اس دیوار تک قدموں کے نشان تھے لگتا تھا جیسے اس جگہ کو دیوار تک آنے جانے کے لیے راستے کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ قدموں کے نشان پورے ہال میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔

دائیں طرف ایک کرا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ اوپر چھٹ تو نہیں تھی لیکن قدموں کے نشان وہاں تک بھی تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کمرے میں بھی کوئی موجود تھا۔ تھوگ کے کتنے کے مطابق سائی کے ساتھ وہ محافظ تھے۔ ایک تو میری نظروں کے سامنے تھا البتہ سائی اور دوسرا محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ دونوں کمرے میں تھے۔

اچانک کرسی پر اوگھتا ہوا وہ محافظ بڑبا کر اٹھ گیا اور اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے کسی بات کا شبہ ہو گیا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ میں راکٹل سنبھالی اور کمرے کے دروازے پر رک کر اندر جھانکنے لگا پھر اس سے آگے ایک راہداری میں مڑ کر گھومنے لگے۔ او بھل ہو گیا مگر اس کی داہنی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ اس دیوار کے قریب جا کر رک گیا جہاں تک قدموں کے نشان تھے۔ اس نے دیوار کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ کر ٹٹولا یا داؤ ڈالا تو دائیں طرف تین فٹ کے فاصلے پر دیوار کا ایک حصہ شق ہو گیا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شق ہونے والی اس دیوار کی دوسری طرف اوپر جانے کے لیے بیڑو میکس تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر بیڑو میکس پر دیکھا اور پھر دیوار کے اس حصے کو دوبارہ دبا دیا۔ دیوار کے دونوں حصے آپس میں مل گئے۔

میں سیدھا ہو گیا۔ جاگی بھی اس وقت چوتھے کی اس دراڑ سے آگے لگائے۔ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی سیدھا ہو گئی۔ ”راستہ اس دیوار میں ہے۔“ جاگی نے سرگوشی کی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سیدھا ہو کر چوتھے کے اوپر واٹ کی عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل میں یہ اندازہ لگا رہا تھا تھا کہ زخاں میں بیڑو میکس کا راستہ عمارت کے کس حصے میں ہو سکتا تھا اور پھر میں نے دوبارہ چوتھے کی اس دراڑ سے جھانک کر دیکھا۔ زخاں میں وہ محافظ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید کمرے میں یا راہداری میں چلا گیا تھا۔

آہنی کنڈے کو حرکت دینے لگا۔

میں فرش پر گری ہوئی رانٹل انٹاکر رانڈاری کی طرف لپکا۔  
 س کے ساتھ ہی میں نے سکھرو کو اس کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

ٹھیک اسی لمحے دوسری طرف سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔  
پورا برٹ مارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کسی آدمی کے چپنے کی  
آواز بھی سنائی دی تھی۔

سای کا چہرہ خوف سے پیلا ہوا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی نظر آ رہا تھا۔  
 سے ہال میں بڑی ہوئی اپنے دونوں محافظوں کی لاشوں کو دیکھ کر ہاتھ تھا  
 میں سے سای کی گوسکھڑ اور باقی ختم کے حوالے کر دیا اور گھوم پھر کر  
 خانہ کا جائزہ لینے لگے۔ راہداری میں سای والے کمرے میں شا  
 وارینڈل ہوا تھا۔ دوار کے ساتھ ایک میز پر شراب کی بوتلیں  
 سرگرت کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے اور پھرینڈ پر زنانہ پڑے دیکھ  
 میں جو کھ گیا۔

”تم جو کوئی بھی ہو، باہر آ جاؤ۔۔۔ ورنہ بیڈ کے نیچے فائر کر دوں گا۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

”کپڑے پہنو۔“ میں نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

آتش فشاں

نکل گئی۔  
 پانچھم نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساسی کے ہاتھ  
 پست پر باندھ دیے تھے۔ اس لڑکی اور ساسی کو رات آنتوں کی ذر بذر لے  
 کر ہم نے خانے کے باہر آگئے۔ خانے کا راستہ بند کر دیا گیا۔ جاگی  
 چوہترے کی آؤسے نکل کر سامنے آ گئی۔

جیسی کھنڈروں سے نکل کر تیز رفتاری سے بنکاک کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ واپسی کے لیے دو سراسر راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ جب ہم شہری حدود میں داخل ہوئے تو دن طلوع ہو- والا تھا۔ اس لڑکی کو سوہم وٹ سکسٹی نو اور ایکسپریس وے کے انٹرکسچن پر گاڑی سے اتار دیا گیا۔ وہ بے چاری خوف سے تھرر کر کانپ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید اسے جی این او، ممانظہ کی طرح مار دیا جائے گا جن کی لاشیں وہ واث جیائیک سین کے خانے میں دیکھ چکی تھی۔

سامی کو ایک خالی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے نہ صرف

”یہ۔ تم دونوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جیسے مڑ لوٹتے رہے ہو۔“ تھائی نے یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر ہم دونوں

جاری ہوئی تھی۔ "میں نے اس کے ہاتھوں میں روک لیا تھا۔"

"اس کی چپاٹ میں سب سے زیادہ خطرہ ہے کہ وہ لوگوں کو بھڑکانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی طرف سے اس کا ہتھیار کی گمانی کر رہے تھے۔ مجھ سے جاگتی ہوئی پڑی تھی، ہم دونوں ایک جگہ مٹی کے ڈیم پر بیٹھے۔

35 حرف 2

جانی نے ٹھیک یہ کہا تھا۔ میں اور احمد دیرینے لگا اور پھر اس طرف چل پڑا جہاں پہلے میں نے پانچم کو جاتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ پر بیٹھا ہو گا جہاں سے واٹ پر نگاہ رکھ سکے میں واٹ کے سامنے کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر ایسی حرکتیں کرنے لگا کہ پانچم میری طرف متوجہ ہو سکے۔

”ہم نے یہ خانہ دریافت کر لیا ہے۔ اب صرف راستہ تلاش کرنا ہے۔“ میں نے سرگوشی میں ان دونوں کو بتایا اور پھر تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں، میں نے واٹ کی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ خانہ کا راستہ اس طرف ہوتا چاہئے۔“

”میرے خیال میں یہ خانے کا راستہ اسی کمرے میں ہونا چاہیے۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

آتش فشان: ۱۱۱

آشرفیاء 34 حصہ 2

# مقناطیسیت

اس گتھ کے مقناطیسیت  
سے اپنی شخصیت  
کس مقناطیسیت ثروت  
کو اجگر کریں اور  
کتابت کس مقناطیسیت

23 روپے



25 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ

کتابت کس مقناطیسیت

kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

مگھونا رسید کر دیا تھا۔  
مگھونا وہ دن بڑی بے چینی میں گزرا تھا۔ رات آٹھ بجے کے قریب باغ میں بھی گیا۔ اس کے پاس بڑی دلچسپ خبریں تھیں۔ پیڈرو کو آج صبح دس بجے کے قریب ساری کے اغوا کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ لڑکی جسے ہم نے رات کو چھوڑ دیا تھا پیڈرو کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس نے پیڈرو کو محاذوں کے قتل اور ساری کے اغوا کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے پیڈرو کو ہم سب کے ملے جتنے تھے اور پیڈرو نے مجھے بچان لیا تھا۔ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔  
رات دس بجے کے قریب میں نے فیصلہ کر لیا کہ ساری کا کیا کرنا ہے۔ راسد کو خود پیڈرو نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور کانگ کو ساری نے قتل کیا تھا۔ میں کانگ کی موت کو نہیں بھول سکتا تھا۔  
میں ٹیلی فون اٹھا کر ساری والے کمرے میں گیا۔ راسد بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے ساکت میں ٹیلی فون کا پلگ لگا کر ساری کی طرف دیکھا۔  
"پیڈرو اس وقت کہاں لے گا۔ نمبر بتاؤ؟" میں نے کہا۔  
ساری نے ایک نمبر بتایا۔ پیڈرو وہاں نہیں تھا پھر ساری کا بتایا ہوا دوسرا اور پھر تیسرا نمبر بھی لڑائی کیا گیا مگر کسی نمبر پر پیڈرو سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ بالآخر مجھے نمبر پر اس سے بات ہو گئی۔  
"تم اپنے بھائی کے لیے پریشان ہو رہے ہو۔ وہ ابھی تک تو محفوظ ہے لیکن..."  
"میں تیس دن زندہ نہیں چھوڑوں گا وعدہ ان۔" پیڈرو نے فرماتے ہوئے میری بات کاٹ دی "میں آج تک یہ بہت نہیں ہو سکی کہ پیڈرو کا رستہ کاٹ سکے۔ اگر ساری کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہارے گھرے کر دوں گا۔"  
"تمہاری یہ حسرت پوری نہیں ہو سکے گی۔" میں نے جواب دیا "میرے لیے ساری سے بات کرلو۔ تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ میرے ہی جیسے ہیں۔ میں اور ابھی تک زندہ ہے۔"  
میں نے فون کا ریسیور ساری کے کان سے لگا دیا۔  
"پیڈرو... مجھے بچالو پیڈرو۔" ساری نے ناؤتھ میں کہا "ان کا اگر کوئی مطالبہ ہے تو وہ مان لو۔ مجھے بچالو پیڈرو۔ پلیز..."  
میں نے ریسیور اس سے دور ہٹا لیا۔  
"تمہیں یقین کیا پیڈرو۔" میں نے کہا۔  
"کیا چاہتے ہو؟" پیڈرو بولا۔  
"کانگ... مجھے کانگ چاہیے جسے ساری نے قتل کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔  
"تمہارا داغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" پیڈرو چنچا۔  
میں نے کانگ کے لیے مگھونا سانس لینے ہوئے کہا "تم کانگ کو نہیں لٹا سکتے لیکن میں تمہارا بھائی تمہیں لٹا دوں گا۔ آج رات ایک اور دو بجے کے درمیان تمہارا بھائی تمہیں مل جائے گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور فون کا پلگ نکال لیا۔

تمہاگر تم برداشت نہیں کر سکو گے۔ پاس کی بات کا جواب دو روز تمہارا یہ بازو میاں سے کاٹ دوں گا۔" اس نے خنجر ساری کے دائیں بازو اور کندھے کے جوڑے پر رکھ دیا۔  
ساری نے پھر بھی زبان نہیں کھلی تو اس نے خنجر کو ذرا سی حرکت دی۔ کمال کٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ساری کے منہ سے خون نکل گئی۔ پر سادے نے خنجر بنا کر بائیں ہاتھ سے زوردار مگھونا اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔  
"اگر اب تمہارے منہ سے آواز نکلی تو گھاسی کاٹ دوں گا۔" پر سادہ بھڑکے کی طرح غریبا "جتاؤ۔ دارا کہاں ہے؟"  
"بب۔ جتا ہوں۔" ساری بھلا گیا۔  
وہ واقعی بزدل نکلا تھا۔ چند جاندار ہاتھ پڑے تھے اور وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔  
"کہاں ہے وہ؟" اس مرتبہ میں نے پوچھا۔  
"نچن پوری میں۔" ساری نے جواب دیا "دیوانے کو اپنے پر بنے ہوئے تاج پر دیل سے دیا کہ ہماؤ کی طرف ٹھیک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے پر ایک چھوٹا سا پکڑا ہے۔ اس پکڑا کی عقبی سمت میں تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر پانچویں میں ایک بہت بڑا بنگلا نما کالج ہے۔ دارا وہیں ہے۔ اس کے ساتھ ٹائٹ بھی ہے۔"  
"ٹائٹ پیڈرو اور دارا میں کیا ڈیل ہوئی ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔  
"ان میں ابھی تک کوئی بات فاصل نہیں ہوئی۔" ساری نے جواب دیا "تین دن پہلے انہیں ڈیل فائل کرنے کے لیے چائٹ رائے جانا تھا لیکن دارا کے زخمی ہونے کی وجہ سے یہ پروگرام ملتوی... ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی نئی تاریخ طے نہیں ہوئی۔"  
"ڈیل کیا ہے۔ وہ لوگ کیا منصوبہ بنا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔  
"منصوبہ دارا نے بنایا تھا۔" ساری نے جواب دیا "اس نے ٹائگر کے ساتھ ہیروئن کی اسٹاکنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ ٹائٹ کے ذریعے دس ہزار امریکی ڈالر ایڈوائس دیے جاتے ہیں۔ ان دونوں میں طے ہے ہوا تھا کہ سرمایہ ٹائگر لگائے گا اور باقی سارا کام دارا کرے گا۔ ٹائگر کے تمہارے ہاتھوں قتل کے بعد پیڈرو نے اس منصوبے کو جاری رکھا۔ وہ فائل ڈیل کے لیے گولڈن ٹرائی اینگل جانے والے تھے مگر میاں بھی تمہاری وجہ سے گزب ہو گئی۔ اب تم نے مجھے اغوا کیا ہے۔ پیڈرو تیس دن زندہ نہیں چھوڑے گا۔"  
"زندہ چھوڑنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہو گا جب وہ مجھے پکڑے گا۔ بہر حال۔" میں نے کہا "تمہارے بارے میں رات کو فیصلہ کیا جائے گا۔ تمہارا منہ بند نہیں کیا جائے گا لیکن اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہو گا۔ پر سادہ! میں نے اٹھ کر پر سادی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے ناشتا کروادو۔"  
پر سادے نے وہاں سے جتے ہوئے بھی ساری کو ایک زوردار

تھے۔ ڈھیر کی مٹی سر کی تہم بھی لڑھکتے چلے گئے۔  
میں نے جاگتی کی طرف دیکھا اور میری نظریں نمودار ہو چکی گئیں جبکہ جاگتی مسکرا رہی تھی۔  
میں اپنے کمرے میں آکر ہاتھ دھویم میں گھس گیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا تو میرا حلیہ واقعی بہت برا ہو رہا تھا۔ بال بھی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ میں نے نما کر پڑے تبدیل کیے اور باہر آیا۔  
پانچم ناشتا کر کے چلا گیا۔ میں اور پر سادہ اس کمرے میں آگئے جہاں ساری کو قید کیا گیا تھا۔ میں نے خنجر نکال لیا اور ساری کے ہونٹوں سے نیپا اتار دیا۔  
"اگر تم نے جینے چاہنے کی کوشش کی تو بلا دروغ تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔" میں نے ساری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم نے میرے بہترین دوست کانگ کو کس شائن کیسٹینوش گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ تم شاید یہ سمجھتے تھے کہ کوئی تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ پیڈرو کی وجہ سے کوئی تمہاری طرف آٹھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ پیڈرو نے تمہیں چھپانے کے لیے شہرے کتنا دور بھیج دیا تھا لیکن جو تیس گھنٹوں کے اندر اندر ہم نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔ اب تم مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہیں کانگ کے قتل کی سزا تو ملے گی لیکن اس سے پہلے تم میرے ایک دوسروں کے جواب دو گے۔ انکاری صورت میں تمہاری موت کیس زیادہ اذیت ناک ہوگی۔ دارا کہاں ہے؟"  
"میں نہیں جانتا دارا کہاں ہے۔" ساری نے جواب دیا "میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑ دو۔ پیڈرو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔"  
"پیڈرو بزدل ہے۔" میں نے کہا "اگر وہ مرد ہو تو پچھپ کر نہ بیٹھتا۔ وہ اب تک اپنے سے کمزور بھتیجے اور بے گناہ لوگوں کو ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اس ظلم کی بنا پر وہ انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ بن گیا ہے لیکن اب بہت جلد میں اسے سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دوں گا۔ پیڈرو کو تو میں تلاش کر لیوں گا لیکن تم اگر اپنی موت کو اٹھی بنانا چاہتے ہو تو دارا کا جتاؤ۔ وہ کہاں چھپا ہوا ہے؟"  
"میں نہیں جانتا۔" ساری نے جواب دیا۔  
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ہوں سادے اس کے منہ پر زوردار مگھونا رسید کر دیا۔ ساری چپتا ہوا پیچھے اٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ پر سادے اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے ساری کے بالوں کو مٹھی میں بکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی پھر اس نے میرے ہاتھ سے خنجر لے لیا۔  
"تمہارے بھائی نے میرے اوپر جو تشدد کیا تھا اس کے نشانات ہمیشہ کے لیے میرے جسم پر ثبت ہو گئے ہیں۔ میرا داغ دار جسم مجھے وہ رات یاد دلانے کا ہے گا۔ میں نے تو وہ تشدد برداشت کر لیا

سای کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات ابھرائے۔ اسے شاید یہ امید ہو رہی تھی کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں اور پر ساد ایک باہر پھر سائی والے کمرے میں موجود تھے۔ ہال میں پانچم نے ٹی وی فل آواز سے کھول دیا تھا۔ اشارہ چپورٹس پر کرکٹ کے کسی بیچ کی ریکارڈنگ دکھائی جا رہی تھی۔ تماشاخیوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پر ساد سائی کو گھنٹتا ہوا ہاتھ روم میں لے گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور ہاتھ روم کے دروازے پر گیا۔ سائی ہاتھ روم کے فرش پر چڑھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا اور پھر میرے ہاتھ میں پھول دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت بھری۔

”میرے دوست گانگ کے نام پر!“

میں نے یہ کہتے ہوئے ٹھیکہ دیا۔ پہلی گولی اس کی پیشانی میں لگی اور باقی دو گولیاں سینے پر۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ ٹی وی کے شور کی وجہ سے گولیوں کی آواز باہر نہیں سنائی گئی ہوگی۔

ایک بجے کے قریب سائی کی لاش کو بوری میں بند کر کے کار کی ڈکی میں ڈال دیا گیا۔ کار میں میرے ساتھ پر ساد اور پانچم بھی تھے۔ پانچم نے تو ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔ میں اور پر ساد پیچھے بیٹھ گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ہم سائی کی لاش کو چاؤ فریا پیراڈائزر ریسٹورنٹ کے آس پاس کسی جگہ پر ڈال دیں گے تاکہ وہ کلب میں آئے جانے والے لوگوں میں سے کسی کی نظروں میں آجائے اور پیڑو کو بھی اس کی اطلاع مل جائے۔

کار سڑک پر متوسط رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ پانچم نے کار وائٹ ڈنگ روڈ پر موڑ لی۔ وہاں سے پچھلے آگے ہمیں اردن مارنڈوڈ کی طرف مڑنا تھا۔

کار وائٹ ڈنگ روڈ پر سڑک پر چھائی ہوئی ایک چاکلیٹ مارنڈوڈ کی طرف سے ایک تیز رفتار کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ ہماری کار سڑک کے وسط میں تھی اور مخالف سمت سے آنے والی کار بھی سڑک کے وسط میں آ رہی تھی۔ پانچم نے اپنی کار کو سائنڈ میں لیتے ہوئے پوری قوت سے بریک لگائی۔ دوسری کار کے ڈرائیور نے بھی بریک لگائی تھی لیکن وہ کار ٹائروں کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ لہرائی ہوئی ہماری کار سے ٹکرائی۔

تصادم اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھا لیکن سنسنی خیز ثابت یہ تھی کہ وہ پولیس کی کار تھی۔ چھت پر فلیشر چمک رہا تھا۔ تصادم ہوتے ہی تین پولیس والے کار سے اتر کر بڑی تیزی سے ہماری کار کی طرف بڑھے تھے۔ میرے ہونٹے کھڑے ہو گئے اور میں گردن ہٹا کر پر ساد کی طرف دیکھنے لگا۔ ان تینوں پولیس والوں نے ہماری کار کو گھیر لیا تھا۔

میرا دماغ سن ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے حواس خمد میرا ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ میں پتھر کے بے جان بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا اس پولیس والے کی طرف۔ کچھ رہا تھا جو کار کے میری طرف والے دروازے سے دوٹک کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہیٹ پولسٹریں ریوالر تھا اور اس کا سیدھا ہاتھ ریوالر کے دتے پر پہنچ چکا تھا۔

اپنے ہاتھ کی پشت پر چھین سی محسوس کر کے میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے پر ساد نے میرے ہاتھ پر ہنگامی کالی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور گردن گھما کر دوسرے پولیس والے کی طرف دیکھنے لگا جو پر ساد کی طرف کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ریوالر کے دتے پر تھا جبکہ تیسرا پولیس والا ڈرائیونگ سائنڈ وڈ پر بیٹھ ہوئے تیز لمبے میں پانچم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میرا ذہن اس وقت بھی ماؤف تھا۔ اب میں اگرچہ تھائی زبان بہت اچھی طرح سمجھ اور بول لیتا تھا لیکن اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ پولیس والا پانچم سے کیا کہہ رہا تھا۔ تاہم اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی تیزی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پانچم کو سرزنش کر رہا تھا۔ جواب میں پانچم نے کچھ کہا تو اس پولیس والے نے بڑی پھرتی سے ریوالر نکال لیا اور بائیں ہاتھ سے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول دیا۔

صورت حال خاصی عجیب تھی۔ وہ حادثہ بہت معمولی تھا۔ پولیس کار کا دائیں طرف کا ہیڈ لیمپ ٹوٹا تھا جبکہ ہماری کار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ پانچم اگر ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی کار کو سائنڈ میں لیتے ہوئے بریک نہ لگا تا تو حادثہ عجیب ہو سکتا تھا۔ اس معمولی ٹکرائے میں بھی قصور پولیس کار کے ڈرائیور کا تھا مگر یہ پولیس والے اتنا ہم پر ہی چڑھ دوڑے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید پولیس والے بھی کوئی غلطی نہیں کرتے۔ وہ اپنا کتاہم پر تعصب کی کوشش کر رہے تھے اور ہمارے لیے صورت حال اس طرح عجیب ہو گئی تھی کہ ہماری کار کی ڈکی میں ایک عدد اداش موجود تھی۔ پیڑو کے بھائی سائی کی لاش جس کی تلاش میں اس کے آدمی پورے شہر میں پاؤں لٹکوں کی طرح بھر رہے تھے اور ستم ظریفی تو یہ تھی کہ پیراڈائزر ریسٹورنٹ وہاں سے صرف ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور یہ ریسٹورنٹ پیڑو کے چند اہم ترین اڈوں میں سے ایک تھا۔ اگر پیڑو کا کوئی آدمی اس طرف آگیا تو مجھے یا پر ساد کو شناخت کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔

اس سے پہلے کہ وہ پولیس والا پانچم کے گریبان پر ہاتھ ڈالا پانچم خود ہی کار سے اتر آیا۔ وہ اس پولیس والے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ قصور خود اس کا ہے لیکن وہ پولیس والا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں بھی کار کا دروازہ کھول کر

نیچے اتر آیا۔ میری طرف کھڑے ہوئے پولیس والے نے بھی ریوالر نکال لیا۔ میں کار کے اوپر سے محسوس کر ڈرائیونگ سائنڈ پر پانچم اور اس پولیس والے کے قریب پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے پر ساد بھی اتر آیا۔ وہ بھی اس پولیس والے کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ غلطی اسی کی تھی لیکن اس کے باوجود ہم ان کی گاڑی کا نقصان پورا کرنے کو تیار ہیں مگر وہ پولیس والا بغول ٹھنٹے پھوں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا جبکہ دوسرے پولیس والے خاموش ٹھکے تھے البتہ انہوں نے اپنے ریوالر تیار رکھے تھے تاکہ اگر ہم کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں سبق سکھائیں۔

وہ ضدی پولیس والا غالباً اس پانی کا اچھا نچر تھا۔ اس نے غالباً یہ مان لیا تھا کہ غلطی اسی کی تھی لیکن وہ ہر صورت میں ہمیں کسی پتھر میں پھنسانا چاہتا تھا۔

”پولیس والوں کے ساتھ میں ماری کر کے تم لوگ اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا رہے ہو۔“ وہ پانچم کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔ ”اور میں تم لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔ اے جیک۔“ اس نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا ”تلاشی لو ان کی گاڑی کی اور ہر جگہ چیک کرو۔ ان کی گاڑی میں پتھیا کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہوگی جو انہیں سلاخوں کے پیچھے بند کرانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔“

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے کن آنکھوں سے پر ساد اور پانچم کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر بھی عجیب سے تاثرات ابھرائے تھے۔ جیک نامی وہ پولیس والا پہلے دروازے میں جھک کر گاڑی کی پیچلی سیٹ اور اس کے نیچے فٹ سیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ ضدی پولیس والا خود بھی گاڑی کو چیک کرنے کے لیے ڈرائیونگ سیٹ کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر جھٹکے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا چو میرے چہرے کے بالکل قریب آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا۔ اس کے منہ سے شراب کی بھگی یو آ رہی تھی۔

”آفسر!“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ اس وقت میرے لیے میں کسی قدور دشمنی تھی ”تم شراب کے نشے میں ہو اور تم جانتے ہو شراب پی کر گاڑی چلانا عجیب جرم ہے اور تم تو ویسے بھی ڈیوٹی پر ہو۔ اس طرح تمہارا جرم مزید عجیب ہو جاتا ہے۔ تم نے شراب کے نشے میں گاڑی چلائے ہوئے ہماری گاڑی کو ٹکرائے ماری اور اتنا ہمیں پریشان کر رہے ہو۔ ہم تمہارے خلاف رپورٹ کر کے اسے اور تم جانتے ہو اس طرح نہ صرف تمہاری نوکری ختم ہو جائے گی بلکہ تمہیں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑے گی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا ”تم اس بات کی گواہی دو گے کہ یہ ڈیوٹی پر شراب پی کر گاڑی چلا رہا تھا اور اس نے ہماری گاڑی کو ٹکرائی تھی۔“

ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔ وہ ہوش و حواس میں تھے اور بات کی نہ تک پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں پہلے آپس میں تیز

لمبے میں باتیں کرتے رہے پھر اپنے ضدی ساتھی کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور اسے صورت حال سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی باتوں میں کتنی صاف محسوس ہو رہی تھی پھر جیک نامی پولیس والا ہمارے قریب آیا۔

”سواری سر!“ وہ پانچم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ہمارا ساتھی آفیسر اپنی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر تادم ہے۔ آپ کو جو ذمت ہوئی اس کے لیے یہ معذرت خواہ ہیں۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں اور پلیز۔ اس واقعے کو بھول جائیے۔“

”اور ہمارا جو نقصان ہوا ہے۔“ اس مرتبہ پانچم اکر گویا ”یہ دیکھو۔ ہماری گاڑی کا فینڈر ٹھیسڑا ہو گیا ہے۔ اس کی مرمت کے پیسے کون دے گا؟“

”میں آپ کا نقصان پورا کروں گا سر۔“ جیک نے پتلون کی جیب سے والٹ نکالا اور چند نوٹ نکال کر پانچم کی منی میں دبا دیے۔

پانچم نے نوٹ گنے پھر گاڑی کے فینڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اتنی رقم میں تو کوئی ڈسٹر اس کی مرمت نہیں کرے گا۔۔۔۔۔“

اب مجھے پانچم پر غصہ آ رہا تھا۔ ایک مصیبت ٹل رہی تھی لیکن وہ خود اسے گلے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیک والٹ (WALLET) میں سے کچھ اور نوٹ نکالنے لگا۔ میں نے پانچم کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کی طرف کھینچا۔

”اب رہنے بھی دو۔ اس کی جیب خالی کراؤ گے کیا؟“ میں نے پانچم کو گھورتے ہوئے کہا۔ یہاں کھڑے کھڑے خاصا وقت گزر گیا تھا اور مجھے دھڑکا کہ کوئی تیسری پانی اس طرف نہ اٹکے۔ اس طرح ہم پھر مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

پانچم نے جیک نامی پولیس والے سے نوٹ لے کر پتلون کی جیب میں ٹھونسنے اور اسٹیشنرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ میں اور پر ساد بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پانچم گاڑی کو چند کچھ پیچھے ہٹا لیا اور پھر اسے پولیس کار کے قریب سے نکالنا ہوا آگے لے جانے لگا۔ وہ تینوں پولیس والے وہاں کھڑے حسرت بھری نظروں سے ہماری گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ انہوں نے ہماری گاڑی کا ٹھہر ضرور دیکھ لیا ہوگا اور یہ بات ہمارے لیے آگے چل کر خطرناک ہو سکتی تھی۔

پانچم نے وہاں سے نکلتے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پیراڈائزر ریسٹورنٹ اب وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگلے سوڑے پستلی اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور پھر اسے اس سڑک پر موڑ دیا جو دیا کے کنارے پر واقع ریسٹورنٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ سڑک کافی کشادہ تھی۔ اس کے دونوں طرف پھولوں کی کیماریاں اور ان کے ساتھ ساتھ پام کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ سامنے ہی



پہلے از ریٹورنٹ کا گیت نظر آ رہا تھا۔

”کیا کر رہے ہو تب کہاں جا رہے ہو؟“ پرساد نے ہاتھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہم لاش کو ایسی جگہ چھوڑیں گے جہاں سے ان لوگوں کی نظروں میں تو آجائے۔“ ہاتھم نے جواب دیا اور گاڑی کو گیت میں لے جا کر پارکنگ ایریا کی طرف موڑ دیا۔

اس وقت اگرچہ وہ دہشتے والے تھے لیکن پارکنگ میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں جس کا مطلب تھا کہ ریٹورنٹ کی رونق میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پارکنگ لائن میں سامنے کے رخ پر جگہ نہیں تھی۔ ہاتھم گاڑی کو پچھلی طرف لے گیا اور ایک خالی جگہ پر روک دیا۔

ہاتھم کی یہ حرکت خود کشی کے مترادف تھی۔ ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ سائی کی لاش کو ریٹورنٹ والی سڑک کے آس پاس کسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں وہ کسی کی نظروں میں آجائے گی۔ ہم صرف یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ہم بزدل نہیں ہیں لیکن ہاتھم کچھ زیادہ ہی فری ہو گیا تھا۔ وہ گاڑی کو ریٹورنٹ کے پارکنگ لائن پر لے آیا تھا۔ یہ ریٹورنٹ پیڑوں کے چند بڑے اڈوں میں سے ایک تھا۔ وہ خود نہیں تو اس کے آدے تو ہر وقت یہاں موجود رہتے ہوں گے اس کے کچھ آدے بھی تھے بھی پچھلتے تھے اور پروسا کو بھی۔ اگر ہمیں دیکھ لیا جاتا تو وہ لوگ ہمیں یہاں سے زندہ واپس نہیں جانے دیتے۔ میں بزدل نہیں تھا لیکن بے موقع ہماری کا مظاہرہ ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر سکتا تھا ہمیں ناقابلِ خطائی نقصان پہنچا سکتا تھا جبکہ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ پیڑوں اس وقت پاگل ہوا پھر رہا تھا اور اس کے بھائی کی لاش ہماری کار کی ڈی میں رکھی ہوئی تھی۔ اس صورت حال میں کوئی فائر انکسٹریکشن محض ہی جان بوجھ کر اس قسم کی کوئی حرکت کر سکتا تھا۔

”پرساد۔“ ہاتھم نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا ”تم پاس کے ساتھ مل کر بوری کو ڈکی میں سے نکلنا اور اسے اس نیلی کار کے قریب ڈال دو۔ یہ سڑک ٹھٹ کی کار ہے۔ ایک دو مرتبہ میرے درکشاپ میں مرمت کے لیے آچکی ہے۔ تین بجے کے لگ بھگ لوگ واپس جانا شروع ہوں گے تو یہ بوری ان کی نظروں میں آجائے گی۔“

میں اور پرساد کا رے اتر آئے۔ ہاتھم نے اندر سے ایک بنن دبا کر ڈکی کا لاک کھول دیا۔ میں جیسے ہی پچھلی طرف ڈکی کے قریب پہنچا تو چونک گیا۔ ڈکی کے ایک کونے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ہمیں یہاں کھڑے ہوئے زیادہ سے زیادہ دھنٹ ہوئے تھے لیکن اتنی ہی دیر میں ہی ڈکی کے نیچے پختہ فرش پر تقریباً تین انچ چوڑا خون کا ایک ٹالاب سا بن گیا تھا جو ڈکی سے گرنے والے خون کے قطرے کے ساتھ پھیل رہا تھا۔

سائی کو تقریباً تین پہلے گھنٹے کوئی ماری گئی تھی اور اس کی لاش

دو گھنٹوں تک ہاتھم دوم میں پڑی رہی لیکن وہ صحت مند آدمی تھا اور گولیاں گرنے کے تین گھنٹوں بعد بھی اس کی لاش سے خون ٹپک رہا تھا۔

اچانک ایک اور خیال ذہن میں آتے ہی میں کانپ اٹھا۔ پولیس کار سے تصادم کے بعد ہم دس باہر منٹ تک وہاں کھڑے رہے تھے اور یقیناً وہاں بھی خون پکا ہو گا۔ جس انداز سے خون ٹپک رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس جگہ سڑک پر خون کا کتنا بڑا ٹالاب بن گیا ہو گا اور اگر ان پولیس والوں نے وہ خون دیکھ لیا ہو گا تو اس سے قطع نظر کہ ان کا ایک ساتھی زبونی پر اور ڈرائیو تک کرتے ہوئے شراب نوشی کے جرم کا مرتکب ہوا تھا وہ ہماری تلاش شروع کر رہے تھے۔

پرساد نے بھی ڈکی سے نپٹا ہوا خون دیکھ لیا تھا اور پھر اس نے جیسے ہی ڈکی کا ڈھکنا اوپر اٹھایا، ہم دونوں چونک گئے۔ ڈکی میں بچھا ہوا میٹ خون سے تر ہو رہا تھا۔

”بوری اٹھاؤ اور یہ میٹ بھی اٹھا کر نیچے ڈال دو۔“ میں نے بوری کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرساد نے بھی بوری کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک کار گیت میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔

”یہ پیڑوں کی کار ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔

میں نے گردن ہٹا کر دیکھا۔ سفید رنگ کی وہ لمبی سی کار پارکنگ لائن کی طرف آنے کے بجائے ریٹورنٹ کی مرکزی عمارت کے پورچ میں رک گئی۔ کار سے تین آدمی اترے تھے۔ ان میں ایک پیڑوں تھا اور دو اس کے محافظ۔ ان دونوں کے پاس آٹو بیگ رائلٹیں تھیں۔ پیڑوں کی کار رکتے ہی عمارت کے اندر سے تین آدمی اور بھی برآمدے میں آ گئے تھے۔ پیڑوں پھرا ہوا تھا۔ ان لوگوں سے تیز تیز لمبے میں بائیں کر رہا تھا۔

پیڑوں کو دیکھ کر پرساد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ اس کے جڑے ہاتھ گئے۔

”اے حواس قابو میں رکھو پرساد۔“ میں نے سرگوشی کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ جذبات میں آکر وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر کرے جو ہم سب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔

ہم دونوں نیچے جھک گئے تھے۔ کاروں کی آڑ کی وجہ سے وہ لوگ تو ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ چند منٹ وہیں کھڑے رہے پھر اندر چلے گئے۔

”بوری نکالو۔ جلدی۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔“ میں نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

ہم دونوں مختار انداز میں اوپر اُٹھ دیکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بوری کو اٹھا کر باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ سائی کی لاش خاصی وزن کی تھی۔ بوری نکالتے ہوئے پرساد کی گرفت چھوٹ

مچی اور لاش ”بھد“ کی آواز سے نیچے پختہ فرش پر گری۔ ہم دونوں نے بوری کو کھینچ کر سڑک ٹھٹ کی نیلی کار کے قریب پہنچا دیا۔ پرساد نے ڈکی کے فرش پر پڑا ہوا ریت میں بھی اٹھا کر بوری کے قریب ڈال دیا۔ اس نے اگرچہ میٹ اٹھانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن میٹ پر بیٹھ ہونے والا خون فرش پر پھیل گیا تھا۔

ہم دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہاتھم نے کار کا انجن بند کر رکھا تھا اور اب اس نے جیسے ہی انجن اشارت کیا، ایک اور کار گیت میں داخل ہوئی اور اس کار کی جھٹ پر نیلی اور سرخ روشنی چمکتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ اس پولیس کار کا ایک ہیڈ لیمپ ٹوٹا ہوا تھا اور یہ وہی کار تھی جس سے ہماری کار کی ٹکر ہوئی تھی۔

ہاتھم نے انجن بند کر دیا اور ہماری طرف گھوم گیا۔

”ہم بڑھو گئی باس۔“ اس کے لمبے میں تشویش نمایاں تھی۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔ اب ہم باہر بھی نہیں نکل سکتے پولیس کار گیت کے قریب ہی رکی ہے۔“

”ہمیں باہر نکلنے سے تو کوئی طاقت نہیں روک سکتی البتہ اب اس کار سے ہاتھ دھوئے نہیں گے۔“ ہاتھم نے جواب دیا۔

”جو کچھ کرنا ہے“ جلدی کرو۔ ایک پولیس والا کار سے اُتر کر اندر جا رہا ہے۔“ میں نے کہا ”راستے میں بھی خون پھینکا رہا ہے اور وہ لوگ یقیناً سڑک پر خون کے دھبے دیکھتے ہوئے اس طرف آئے ہیں۔ وہ پارکنگ میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو چیک کریں گے اور پھر۔۔۔“

بہر حال ”اب اترو اس کار سے۔“ ہم تینوں کار سے اُتر آئے۔ کھڑے ہونے کی عمارت نہیں کر سکتے تھے۔ جنک کر چلے ہوئے پارکنگ کے پچھلی طرف جانے لگے۔ جہاں چند گز کے گھمان درخت تھے اور ان کے نیچے باؤنڈری وال تھی۔

ہم ابھی درختوں میں بیٹھے ہی تھے کہ وہ پولیس والا عمارت سے باہر گیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ان میں ایک ریٹورنٹ کا اسٹنٹ نیچر تھا۔ ان کا رخ پارکنگ لائن کی طرف تھا۔ پولیس کار کے قریب کھڑے ہوئے دوسرے پولیس والے بھی اب پارکنگ کی طرف آ رہے تھے۔

درختوں کے نیچے باؤنڈری وال تقریباً دس فٹ اونچی اور بالکل پائت تھی۔ اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ ہم درختوں کی آڑ میں چلے رہے۔ ہمیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے دیوار پر چڑھ سکیں۔

اور پھر میری توقع کے عین مطابق پولیس والوں نے پارکنگ میں وہ کار بھی تلاش کر لی اور بوری بھی۔ میں ایک درخت کے نیچے رک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ ایک پولیس والا جھکا ہوا تھا۔ غالباً ہماری کھول رہا تھا پھر دوسرا پولیس والا بھی جھک گیا۔ اس کے فوراً

ہی بعد میں نے اسٹنٹ نیچر کو بھی جھکتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اسٹنٹ نیچر چپٹا ہوا برآمدے کی طرف دوڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ لاش بوری سے نکال کر شناخت کر لی گئی تھی اور اسٹنٹ نیچر پیڑوں کو اطلاع دینے کے لیے دوڑا تھا۔

اب یہاں رک کر ایک بھی لمحہ ضائع کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے ہاتھم اور پروسا کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے اور بالآخر ایک درخت کے قریب رک گئے۔ اس درخت کی دو موٹی شاخیں دیوار کے اوپر سے باہر کی طرف چلی گئی تھیں۔

”اس درخت پر چڑھ کر دیوار کے باہر کود جاؤ۔ جلدی کرو۔“ میری آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

پہلے پروسا درخت پر چڑھا۔ اس کے بعد ہاتھم اور جب میں درخت پر چڑھ رہا تھا تو ٹھیک اسی وقت پیڑوں اور کئی افراد برآمدے والے دیوار سے نکل کر پارکنگ کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے۔

اور پھر وہاں اچھا خاصا ہنگامہ مچ گیا۔ سائی کی لاش ملنے کی اطلاع ریٹورنٹ کے اندر پہنچ چکی تھی اور سب ہی جانتے تھے کہ سائی پیڑوں کا بھائی تھا۔ پیڑوں کے بھائی کا قاتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لوگ وہاں سے بھاگنے کی سوچ رہے تھے لیکن پولیس والوں نے کسی کو بھی پارکنگ لائن کی طرف نہیں جانے دیا۔ ایک پولیس والا گیت کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”لوگوں بھی گھنٹ میٹ سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قاتلوں کو ہم پچھانتے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ آپ لوگ شانت رہیے۔ تھوڑی دیر بعد آپ لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔“

جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ چار فرما ادا از ریٹورنٹ عام ریٹورنٹوں سے بہت مختلف تھا۔ یہ بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور بہت بڑے باغ کے ساتھ تین چار عمارتوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے الگ اور فاصلے پر تھیں لیکن سائی کے قتل اور لاش کی دریافت کی خبر دیکھ کر ایک کی طرح پھیل گئی تھی۔ کیسینو کلب اور ریستوران کی تمام عمارتیں خالی ہو چکی تھیں اور لوگ باہر جمع ہو رہے تھے۔ پریشانی اور خوف ہر جگہ سے سترخ تھا۔

میں درخت کے تنے پر چڑھ کر اس موٹی شاخ پر پہنچ گیا جو دیوار کے اوپر سے ہوتی ہوئی باہر کی طرف چلی گئی تھی۔ ہاتھم مجھ سے آگے، ابھی اس شاخ پر ہی تھا۔ میں چند فٹ آگے بڑھا تو ہم دونوں کے بوجھ سے شاخ جھکنے لگی۔ مجھے معلوم نہیں وہ کون سا درخت تھا مگر یہ اندازہ فوراً ہی ہو گیا کہ اس کی ٹکڑی بھی تھی۔ ہم

دونوں کے ہوجہ سے شاخ نہ صرف جھکتی چلی بلکہ چرچاہٹ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی تھی۔

شاخ بدستور جھکتی جاری تھی۔ بھونکی ٹھنڈی آہیں میں ٹکرا رہی تھیں جس سے اچھی خاصی آواز پیدا ہو رہی تھی اور اس آواز نے پارکنگ میں کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

”اے کون ہے اور کون دیکھو کون ہے؟“ ایک آدمی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

”وہ لوگ کارلے کرچند منٹ پہلے ہی یہاں آئے ہوں گے۔“ یہ ایک پولیس والے کی آواز تھی ”بھلی۔ دیکھو۔ وہی لوگ ہوں گے جو بھٹکے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

میرا دل اچھل کر قلع میں اٹیا۔ شاخ دیوار سے تقریباً تین فٹ اوپر تھی جو جھک کر دیوار پر ٹک گئی تھی۔ پانچم دیوار پر ٹک گیا تھا۔ اس نے مجھے بھی ہاتھ پیر پڑھ کر بھیج دیا۔

”باہر چلا گئے گا۔“ میں نے سرگوشی کی ”ایک لمحے کی تاخیر بھی ہماری موت کا باعث بن سکتی ہے۔“ پراساد ہم سے پہلے ہی باہر پہنچ چکا تھا۔

پانچم دیوار کے ساتھ باہر کی طرف لٹک گیا اور دوسرے ہی لمحے بھد کی ٹکلی کی آواز سنائی دی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ دوسری طرف جکی زمین تھی۔ میں نیچے کودنے ہی سنبھل گیا۔

یہ تقریباً چالیس پچاس فٹ چڑا کھڑا تھا جہاں خود دو جمائیاں پھٹکی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے کسی اور عمارت کی باؤنڈری وال تھی۔ یہ کچا راستہ ایک طرف تو سڑک تک چلا گیا تھا اور دوسری طرف دریا کے کنارے تک۔

ریسٹورنٹ کی طرف سے شور سنائی دے رہا تھا۔ ہم نے دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے تھلون کی جیب سے تھائی ڈانگ کا دیا ہوا پھول نکال لیا تھا تاکہ کبھی بگامی صورت حال میں اسے فوری طور پر استعمال کیا جاسکے۔

صورت حال بڑی خوفناک تھی۔ پولیس والوں نے پڑد کو بتا دیا تھا کہ ہماری کارچند منٹ پہلے ہی یہاں آئی تھی۔ اس نے دیوار کے قریب درخت کی شاخ کے ٹوٹنے کی آواز بھی سنی تھی اور ممکن ہے ہمارے کودنے کی آوازیں بھی سنی ہوں۔ اسے یقین ہو گا کہ ہم زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ اپنے آدمیوں کے ذریعے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لے گا۔ بات اب صرف پڑد کی نہیں تھی۔ پولیس بھی پچ میں کود پڑی تھی۔ پولیس والے کار کے رینگے پورے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دیں گے اور چند منٹ کے اندر اندر اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا جائے گا۔

دریا کے کنارے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ دائیں طرف تو پیراڈائزر ریسٹورنٹ ہی کا حصہ تھا۔ البتہ بائیں طرف تناٹا تھا لیکن

میرے خیال میں اس طرف سے بھی ہمارے بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا اور جب میں نے پراساد اور پانچم کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا تو وہ دونوں اچھل پڑے۔

”موت کے منہ میں چلا گئے گی سوچ رہے ہو؟“ پراساد نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”اس میں اگرچہ رسک تو ہے لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ہم محفوظ رہیں گے۔“ میں نے کہا ”یہ ایک نفسیاتی چال بھی ہے اور ایسے حربے عام طور پر کامیاب رہتے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں اس علاقے کو دور دور تک گھیر لیں گے۔ پولیس بھی ان کے ساتھ ہماری تلاش میں شامل ہو جائے گی۔ تمام راستوں کی ناکا بندی کر دی جائے گی۔ ہو سکتا ہے آس پاس کی عمارتوں کی تلاشی بھی لی جائے لیکن یہ بات ان کے ذہن میں بھی نہیں آئے گی کہ ہم ان کے آس پاس ہی موجود ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ پانچم بولا ”تو پھر دیر مت کرو۔ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ جیتی ہے۔ میرا خیال ہے ان کے ایک دو آدمی دیوار سے کود چکے ہیں۔ وہ بھی کبھی وقت اس طرف آسکتے ہیں۔“

اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ میں نے پیچھے سرگرم کر دیکھا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ پانچم تھے آدمی تھے کچھ مخالف سمت میں دوڑ رہے تھے اور کچھ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔

ہم جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے دائیں طرف چلے گئے۔ پیراڈائزر ریسٹورنٹ کی باؤنڈری وال دریا کے کنارے سے دس بارہ فٹ پہلے ختم ہو گئی تھی۔ اس سے آگے دریا کے کنارے تک تالوں کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ تاریک اور تاریک تھے۔ اگرچہ قریب قریب تھے لیکن کچھ تاریک جگہیں ہو رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے بھی لوگ اس جنگلے سے گزرتے رہے ہیں۔

میں نے پہلے جھانک کر دوسری طرف دیکھا اور پھر جھک کر جنگلے میں سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ میرے پیچھے پانچم اور پراساد بھی آگے تقریباً پچاس گز آگے وہ بیٹنی تھی جہاں تیز روشنی ہو رہی تھی لیکن اس وقت وہاں سناٹا تھا اور کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ایک رات پانچم نے مجھے اور تھائی کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔

دوسری طرف بھی سناٹا تھا۔ غالباً سب لوگ پارکنگ ایریا کی طرف جمع تھے۔ پانچم نے اشارہ کیا اور ہم ان درختوں کے نیچے پہنچ گئے جہاں اس سے میری اور تھائی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

”اوپر رہائشی کمرے ہیں۔“ پانچم نے ریسٹورنٹ کی مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی ”تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ راستہ صاف ہوا تو میں ملی کی آواز

نکل کر منتقل ہوں گا۔ تم لوگ چلے آنا۔“

وہ ہمیں چھوڑ کر دیے قدموں چلتا ہوا عمارت کے عقبی دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہ دروازہ ملازمین کی آمدورفت کے لیے مخصوص تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اوپر جانے کے لیے ننگ سا زینہ تھا۔ اس رات پانچم کا پیغام ملنے کے بعد میں اور تھائی بھی اسی دروازے سے باہر آئے تھے۔

ہم دونوں دم سادے درختوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ میں پھول تھا اور پراساد نے بھی پھول نکال لیا تھا۔ ہم یہاں آ توئے تھے لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم واقعی موت کے حصار میں آگئے تھے اگر پڑد وغیرہ کو پتا چل جائے کہ ہم یہاں موجود ہیں تو ہمارے یہاں سے زندہ واپس چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پارکنگ والی طرف سے اب بھی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً اس ریسٹورنٹ میں موجود ہر شخص اس طرف چلا گیا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ گزرے اور پھر ملی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے پراساد کو اشارہ کیا اور ہم دونوں درختوں سے نکل کر دیے قدموں چلے ہوئے اس دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ ننگ سی راہداری تھی جس کا افتتاح ڈانگ نے ہی ہوا تھا۔ وہاں اگرچہ روشنی تھیں لیکن ہال میں کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے

رہے تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی اوپر جانے کے لیے ننگ سی بیڑیاں تھیں۔ پانچم اپنی بیڑیوں پر کھڑا تھا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے بیڑیوں پر چڑھنے لگے۔

اوپر کشادہ راہداری تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دونوں طرف کمرے تھے یہاں کی رہائش کسی طرح بھی ناخوشاںوار ہو سکتی تھی۔

”آخری کمرہ خالی ہے اور میرا خیال ہے وہی کمرہ ہمارے لیے محفوظ اور مناسب رہے گا۔“ پانچم نے سرگوشی کی۔

ہم چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ ایک ادیبز عمرورین عورت تھی جس نے شب خوابی کا باریک سالیاس پن رکھا تھا۔ بال بال مجھے ہونے اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ میرے خیال میں اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور وہ خاصی حسین عورت تھی۔ اس وقت رات کا آخری پرتھا۔ تین بجنے والے تھے اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ عورت اس وقت کمرے سے باہر کیوں نکلی تھی۔

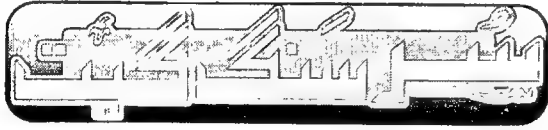
ہمارے ہاتھوں میں پھول دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں اور شاید اس نے چپکنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن پراساد بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس نے ایک ہاتھ سے عورت کا منہ دبا دیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا اور پھول اس کی کپٹنی سے لگا دیا۔

برصغیر کے نام و نگواروں

کے سدا بہار گیتوں کا

نوٹیشن

اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف ”دھن“ بھی ہر ساز پر بجائی جاسکتی ہے



موسیقی کے حوالے سے

ایجوکیشن

کے بعد ایچ اقبال کی دوسری کتاب

19 ستمبر 2007ء

2007ء

2007ء

موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد کتاب  
ایک طرف لکھی کتاب پہلے کسی شاعر نہیں ہوئی

کتابیات پہلی کیسٹن

پیسے میں 23 دھن بھرے بطور یا شوق آئی پھر نگہ رکھو اگر آپ 74200

فون: 5802562-5895313  
فیس: 5802551  
kitabiat1970@yahoo.com

"کوئی گزربڑی تو کھڑی اڑا دوں گا۔" پراساد غریبا اس کے ساتھ ہی وہ اس عورت کو دھکیلتا ہوا دروازے کے اندر لے گیا۔

میں اور باہم بھی اندر گھس گئے۔ باہم نے آنکھیں سے دروازہ بند کر دیا۔ میں تجسس نظروں سے اوپر اٹھ کر دیکھنے لگا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ فرش پر دھڑکے ہوئے تھیں۔ شان دار صوف سیٹ تھا اور ہر وہ چیز موجود تھی جو کسی فائو اشیا میں ہونی چاہیے تھی۔ سامنے کارس پر صاف ستارے کھڑکی کا ایک چھ اچھا اونچا جھمبہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی کارس پر کچھ کارڈز رکھے ہوئے تھے۔ یہ کارڈز کمرے کے دروازے پر لگانے کے لیے تھے۔ باہم نے "DO NOT DISTURB" کا کارڈ اٹھایا اور دروازہ کھول کر اسے باہر کے ہینڈل پر لٹکا کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نشست گاہ سے آگے بڑھتے ہوئے باہم نے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور اس دروازے سے جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بندہ خالی تھا۔ بندہ پر بھی ہوئی چادر پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور اوڑھنے والی چادر بھی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر اشارہ کیا۔ باہم اور پراساد اس عورت کو لے کر اندر آگئے۔ پراساد نے ابھی تک اس کا منہ دیا ہوا تھا۔

"میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو سمجھا اڑا دوں گا۔" پراساد کے حلق سے غراہٹ نکلی اور پھر اس نے عورت کو چھوڑ دیا۔

اس عورت کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں دہشت سی بھری ہوئی تھی اور وہ ہلے ہلے کانپ رہی تھی۔ "ڈرو نہیں۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔ "ابلی ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"اے... اے... ہوں۔" اس عورت کے حلق سے گھنی گھنی سی آواز نکلی اور پھر اس نے ایک ہاتھ سے اپنا منہ دیا۔ اسے شاید ڈر تھا کہ اس کے منہ سے کچھ نکل جائے گی۔

باہم اس دوران میں ہاتھ روم چیک کر چکا تھا۔ میں بھی کمرے میں اوپر اٹھ کر دیکھنے لگا۔ بہت شان دار کمرہ تھا۔ ایک طرف سے آوازیں سن کر میں چونک سا گیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچا۔ کھڑکی کے سامنے نیلے رنگ کا بیڈ پر ہوا ہوا تھا۔ میں نے پردے کا کونڈا سا سرکایا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ کھڑکی عمارت کے سامنے کے رخ پر تھی اور یہاں سے مرکزی گیٹ اور پارکنگ ایریا صاف نظر آ رہا تھا۔ پارکنگ اسٹ کے سامنے کچھ درخت حائل تھے تاہم وہاں نووں سر۔ یہاں دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے پردہ چھوڑ دیا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ شوری آواز سن کر اس عورت کی آنکھ کھل گئی ہوگی اور اس

نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا ہوگا اور شاید پھر صورت حال معلوم کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تھی کہ ہمارے ہاتھ لگ گئی اور اب یقیناً پچھتا رہی ہوگی کہ وہ کمرے سے باہر کیوں نکلی تھی۔

"ہم ڈاکو یا لیرے نہیں ہیں۔" میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آرام سے بیٹھو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" میں نے کرسی پر پڑا ہوا نائٹ گاؤن اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔ پارکنگ ٹائی میں وہ تقریباً عریاں نظر آ رہی تھی اور پھر خوف سے ہلکی سی ہلکی سی ہلکی سی "یہ پہن لو۔" میں نے کہا۔ "ہم صرف چند منٹ کے لیے یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے تو ہم چلے جائیں گے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کو تو تمہیں ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن اگر شور مچانے کی کوئی اور چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"تم لوگ کون ہو اوسو۔ یہ ہنگامہ کیا ہے؟" اس عورت نے گاؤن پہنتے ہوئے خوف زدہ سی آوازیں پوچھا۔

"اس ریٹورنٹ پر بدعاشوں کا قبضہ ہے اور یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہمارا تعلق چونکہ مخالف گروہ سے ہے اس لیے ہمیں شہر ہٹا کر ہمیں اس واقعے میں لپٹنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم اپنے آپ کو بچانے کے لیے اوپر آگئے تھے۔ اتفاق سے تم ہمارے ہاتھ لگ گئیں۔ لیکن کو ہم بہت شریف آدمی ہیں۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ جیسے ہی باہر کا ہنگامہ ختم ہوگا، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

میری باتوں سے اس عورت کو کچھ حوصلہ ملا اور وہ بتدریج اپنی کیفیت پر قابو پائی چلی گئی۔

"یہ ریٹورنٹ تو پیڑوں کی گھرائی میں ہے۔ یہاں کون ہنگامہ کر سکتا ہے؟" اس عورت نے کہا۔ اس بات سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ یہاں کے بارے میں کچھ معلومات بھی رکھتی ہے۔ "ویسے سنا ہے کہ کسی نے اس کے چھوٹے بھائی کو اغوا کر رکھا ہے۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"پیڑوں ہی سب سے بڑا بدعاش ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بھائی نے مخالف گروہ کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ متوکل کے ساتھیوں نے پیڑوں کے بھائی کو اغوا کر کے قتل کر دیا اور اس کی لاش یہاں لاکر پارکنگ میں پھینک دی۔ اتفاق سے پیڑوں بھی یہاں پہنچ گیا اور یہ سارا ہنگامہ اسی لاش کا ہے۔"

"اوہ۔" وہ عورت چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ "پیڑوں بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ تو پورے شہر میں قیامت برپا کرے گا۔"

"اس شہر میں اس سے بھی زیادہ خطرناک لوگ موجود ہیں جو خون کا بدلہ خون کے قاتل ہیں۔ اس میں شہر نہیں کہ پیڑوں اپنے بھائی کے قتل پر خاموش نہیں بیٹھے گا مگر وہ گمانے میں رہے گا۔ اس کے مخالفین اب خاموش بیٹھنے والے نہیں ہیں۔"

اسی لمحے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ میں نے پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ اس عورت کو پوتل کی زبردستی کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ایک بار پھر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ کمرے میں اگرچہ نائٹ بلب جل رہا تھا اور باہر سے ہمارے چہرے واضح طور پر نہیں دیکھے جاسکتے تھے لیکن میں کھڑکی کا پردہ پوری طرح ہٹا کر کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

پولیس کی تین گاڑیاں گیٹ میں داخل ہو کر رکیں اور کئی گاڑیاں اور آئیں۔ ان گاڑیوں میں پولیس کے دو بڑے افسران آئے تھے اور پھر کچھ سی ڈیر بعد پیڑوں کے جینٹے چلانے کی آواز سنائی دینے لگی۔

"اگرچہ میں گھنٹوں کے اندر اندر میرے بھائی کے قاتلوں کو گرفتار نہ کیا تو میں اس شہر کی اینڈ سے اینڈ بھاؤں گا۔" وہ ایک پولیس آفیسر کو دھکی دے رہا تھا۔ "میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ساری کوکس نے اغوا کیا ہے لیکن تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا۔ تم لوگ مہاراج سے ڈرتے ہو۔ تم لوگ میرے بھائی کو نہیں بچا سکتے اور اس کے قاتل پر بھی ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ اب میں خود۔"

وہ خاموش ہو گیا یا اسے خاموش کرا دیا گیا۔ پولیس نے پورا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ اس دوران میں ایک ایمرٹنس بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ چند منٹ بعد لوگوں کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ تینوں پولیس والے جن کی گاڑی سے ہمارا تصادم ہوا تھا گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ باہر جانے والی ہر گاڑی کو چیک کر رہے تھے۔ ہر شخص کے چہرے کو بخور دیکھ رہے تھے۔

بالآخر پورا کیا ڈیڑ خالی ہو گیا۔ اب صرف پولیس والے اور ریٹورنٹ کے ملازمین رہ گئے تھے۔ پیڑوں بھرا ہوا سا پھر رہا تھا۔ پولیس اپنی کارروائی مکمل کر چکی تھی اور اب لاش اٹھانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

سازمے چار بجے کے قریب لاش ایمرٹنس پر بھجوا دی گئی اور پولیس بھی رخصت ہو گئی۔ پیڑوں بھی اپنے خاندانوں کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد سناٹا چھا گیا۔ پارکنگ اسٹ پر اب بھی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں دو کاریں تھیں اور ایک اسٹیشن وگن۔ یہ غالباً وہ گاڑیاں تھیں جو ریٹورنٹ کے ملازمین کے استعمال میں رہتی تھیں۔

"کیا خیال ہے باس۔" پراساد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب چلا جائے کچھ اور انتظار کیا جائے؟"

"ابھی یہاں سے لکنا مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "پیڑوں کے آدمی پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم دن کی روشنی پھیلنے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔"

پراساد کی بات سن کر وہ عورت ضرور خوش ہوئی ہوگی لیکن

میرے جواب سے اس کے چہرے پر ایک بار پھر مایوسی چھا گئی۔ باہم نشست گاہ میں جا کر ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ میں پرساد کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے حواس پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔ اب تک اگرچہ ہم نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا لیکن اسے مطمئن نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے پیکے سے تاثرات اب بھی تھے۔ تین خطرناک آدمی انھوں میں پوتل لے ایک خفا عورت کے کمرے میں موجود تھے پھر وہ مطمئن کس طرح ہو سکتی تھی۔

اس عورت کا نام تقریباً تھا۔ وہ سلاوا گھر پر لیکن ہانگ کانگ کی رہنے والی تھی۔ اس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ ادویات تیار کرنے والی لندن کی ایک بین الاقوامی کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس کا بیڈ کارڈ اگرچہ ہانگ کانگ میں تھا مگر ایسٹ ایشیا اور ساؤتھ ایشیا کے کئی ممالک اس کے حلقے میں شامل تھے اور وہ ان ممالک کے دوروں پر جاتی رہتی تھی۔ دو دن پہلے ہانگ کانگ آئی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ ہانگ کانگ آئی رہتی تھی اور بیٹھ بیٹھ اڈاؤں میں قیام کرتی تھی اور یہیں سے اس نے ٹائیکر اور پیڑوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔

تقریباً سات بج کر تھے میں محسوس کر رہا تھا کہ اسے نیند آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن ہماری موجودگی میں وہ سوٹا نہیں جانتی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میں بار بار تھائی اور جاگی وغیرہ کے بارے میں سوچنے لگتا۔ میں نے تھائی سے کہا تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے لیکن ہمیں گھر سے نکلے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ ہم انہیں کوئی اطلاع بھی نہیں دے سکے تھے۔ یہ یقیناً پریشان ہو گی۔

رات بہت گئی۔ باہر دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کھڑکی کے پردے پر دھوپ بھی نظر آنے لگی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنا۔ سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن بیرواؤنٹز کے کپاڑوں میں سناٹا تھا۔ ایسی جگہوں پر دن کے وقت تو سناٹا ہی رہتا ہے البتہ رات میں جاگتی ہیں۔

اٹھ بیچے کے قریب میں نے باہم اور پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"میڈم تقریباً۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں تو روزی زحمت کرنی ہوگی۔"

"کیا مطلب! کیسی زحمت؟" اس کی سرخ آنکھوں میں خوف کے پیکے سے تاثرات ابھر آئے۔

"ہم تمہیں اس کمرے میں چھوڑ کر جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ہمارے ساتھ باہر سڑک تک جانا

اس کا خوف زدہ ہونا فطری بات تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہم اسے پرغال بنا کر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ ہم اسے صرف سڑک تک لے جائیں گے۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد ہم کمرے سے نکل آئے۔ اتفاق سے اس وقت رابڈاری میں کوئی نہیں تھا۔ زینے پر ایک عورت اور ایک مرد سے آٹنا سامنا ہوا۔ وہ نیچے سے اوپر آ رہے تھے لیکن ہم پر توجہ دے بغیر قریب سے گزر گئے۔

قریباً سیرے اور پر ساد کے بیچ میں تھی۔ ہم دونوں کے ہاتھ جیبوں میں رکھے ہوئے ہوتوں پر تھے۔ پانچم ہم سے دو قدم آگے تھا۔ لابی میں دو عورتیں اور ایک مرد بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی پوچھ رہے تھے اور غالباً یہاں قیام پذیر تھے۔ وہ مرد قریباً کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ جواب میں قریباً کے ہونٹوں پر بھی جیسی کی مسکراہٹ آگئی تھی۔

لابی میں واقع استقبالہ کاؤنٹر پر ایک خوب صورت تھالی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ قریباً کی طرف دیکھ کر مسکرا دی لیکن ہماری شکلیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی لیکن ہم اس کی طرف توجہ دے بغیر قریباً کے ساتھ تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازے سے باہر آ گئے۔

باہر والا گیٹ بند تھا۔ لوہے کے جنگلے کا بنا ہوا خوب صورت گیٹ تھا۔ بند ہونے کے بعد پیدل آمدورفت کے لیے اطراف میں راستے موجود تھے۔ باہر نکل کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گیٹ کے جنگلے پر ایک لٹکا ہوا تھا جس پر "CLOSED" لکھا ہوا تھا۔ مجھے سمجھنے میں آ رہی نہیں تھی کہ سڑک کے سوگ میں آنے پر یہ مسطور بند کر دیا گیا تھا۔

قریباً اب بھی ہمارے بیچ میں چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب خوف کے تاثرات بڑھ گئے تھے۔ ہم چند سی قدم چلے گئے کہ عقب سے آواز سن کر میں چوٹ کھ گیا۔ اسی لمحے پانچم کی آواز سنائی دی۔

"باس۔ ہو شیار۔ وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تین آدمی تھے جو برآمدے سے نکل کر ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں سواری کوار تھی، دوسرے کے ہاتھ میں خنجر اور تیسرے کے ہاتھ میں ہسٹل تھا۔ مجھے ایک دم استقبالہ کاؤنٹر والی لڑکی کا چہرہ یاد آ گیا۔ قریباً کے ساتھ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی لیکن ہم اس نے اندر جا کر ان لوگوں کو ہمارے بارے میں بتایا ہوگا۔

میں نے قریباً کا بازو پکڑ لیا اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ سڑک وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ پر ساد اور پانچم ہم سے پیچھے تھے۔ میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ سواری کوار والا سب سے آگے تھا۔ وہ کوار لہراتے ہوئے حلق پھاڑ پھاڑ کر جج جج کرتا تھا۔

ہمارے اور اس کے درمیان تقریباً چالیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس دوران میں اس کے دوسرے سامنے بھی گیٹ سے باہر آ گئے تھے۔ پتول والے نے فائر کیا۔

پانچم اور پر ساد دو زبردست خوشی کی آوازیں چلے گئے۔ میں قریباً کا ہاتھ پکڑے راستے کے عین بیچ میں دوڑ رہا تھا۔ فائر کی آواز سے قریباً جھنجھکی اٹھی تھی۔ وہ ہیل والی ہسٹل پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ایک ہسٹل مڑ گئی۔ وہ لڑکھائی۔ اگر میں اسے سنبھال نہ لیتا تو یقیناً مگر پڑتی۔

ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی ہم پر چلائی گئی تھی لیکن ہم دونوں چلے گئے۔ میں نے قریباً کا ہاتھ پکڑ کر راستے کے کنارے پام کے درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے ایک اور فائر ہوا اور اس کے ساتھ ہی قریباً کے حلق سے خوف ناک جج جج گئی۔ گولی اس کی گردن میں گئی تھی۔ وہ لڑا گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک درخت کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحے کے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور اس کے ساتھ ہی دو بھیاک چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ اس دوران میں میں بھی جب سے اپنا ہسٹل نکال چکا تھا لیکن اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

پانچم اور پر ساد کی فائرنگ سے دو حملہ آور ڈھیر ہو چکے تھے۔ ایک تو وہ تھا جس نے ہسٹل سے ہم پر فائرنگ کی تھی اور دوسرا سواری کوار لہراتا تھا۔ کوار اس کی لاش کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ تیسرا آدمی پچھتا ہوا وہاں بھاگ گیا تھا۔ پر ساد نے اس پر بھی دو گولیاں چلائی تھیں۔ گروہ بیچ نکلا تھا۔ میں نے قریباً کی طرف دیکھا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی گردن سے بننے والا خون کیاری کی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

پر ساد اور پانچم دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے اور پھر ہم تینوں نے سڑک کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک کار سڑک سے اس طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ کار کی رفتار بہت کم تھی۔ ڈرائیوگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کار میں اور کوئی نہیں تھا۔ پانچم ایک دم کار کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ہسٹل دیکھ کر عورت نے ایک دم کار روک لی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔

"ٹھک۔۔۔ کون ہو تم لوگ۔۔۔؟" وہ بھلا کر رہ گئی۔

"مجھ جتنا چھوڑ دو اور نیچے اتر آؤ۔" پانچم اسے ہسٹل کی زد پر لیتے ہوئے غرایا "جلدی کرو۔ نیچے اترو۔"

عورت دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ وہ خوف سے قہقہہ کانپ رہی تھی۔ پانچم بڑی پھرتی سے اسے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس دوران میں میں اور پر ساد بھی پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکے تھے۔ پانچم نے ایک زوردار جھکے سے کار آگے بڑھا دی۔

وہ کار ہم نے بٹکاک نوے ریلوے اسٹیشن کے قریب چھوڑ دی۔ وہاں سے ایک ٹک ٹک پر بیٹھ کر کلاؤڈ سے رہنما پارک کے اگلے

چوراہے پر ٹک ٹک چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر میموریل برج سے ذرا پہلے ٹک رانا دن اسٹیج والے چوراہے پر اتر گئے۔ وہاں "سی ٹرنی" روٹ کی بس لگی تھی جس نے ہمیں ٹک ٹکس اسٹیج والے چوراہے پر پہنچا دیا۔ اگر ہم پیراڈائزر سے سیدھا اس طرف آتے تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں پہنچ سکتے تھے لیکن کئی میل کا یہ طویل پیکر اس لیے کا تھا کہ ہمارا سران نہ لگایا جاسکے۔ ٹک ٹکس والے چوراہے سے پیدل چلتے ہوئے ہم جاگتی والے پتنگے پر پہنچے تو دن کے کیا ہوا رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی تھالی اور جاگتی نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا۔

میں بڑی مشکل سے ان دونوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میرے خیال میں ان کا غصہ بجا تھا۔ گزشتہ رات جب ہم سڑکی لاش لے کر نکلے تھے تو میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے ذرا بھگتے ٹک ٹکس وہاں آجائیں گے۔ ہمارا پروگرام یہی تھا کہ پوری میں بند لاش کو پیراڈائزر کے آس پاس کیس پیکیج کر وہاں آجائیں گے لیکن پانچم کی حماقت کی وجہ سے نہ صرف کار ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی بلکہ ہم خود بھی مصیبت میں پھنس گئے تھے اور بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچا کر وہاں سے نکلے تھے۔

"میں ہمارا جان سولی پر لٹکی رہی۔" میرے خاموش ہونے پر تھالی نے کہا "تج پانچم بچے سمندر تم لوگوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ چھ بجے اس نے فون پر اطلاع دی کہ پیراڈائزر کے پار ٹک میں جب سڑکی لاش دریافت ہوئی تو اس وقت پیڑو بھی وہاں موجود تھا۔ تم لوگ اگرچہ بروقت وہاں سے فرار ہوئے ہیں مگر کامیاب ہو گئے تھے لیکن پیڑو کے آدمی پورے شہر میں تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے فوراً ہی ماسٹر ہوجن کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ماسٹر کے کئی آدمی بھی اب تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں لیکن تم لوگ تھے کہاں؟"

"پیراڈائزر ریسٹورنٹ کے ایک کمرے میں۔ ہم صبح آنچہ بجے ٹک وہاں رہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟ تھالی اچھل پڑی۔

"مجم میں مردت حال سے دوچار تھے اس کے پیش نظر محفوظ ترین جگہ وہی تھی۔" میں نے کہا "مگر ہم کسی اور طرف نکلے کی کوٹھن کرتے تو شاید ہم میں سے کوئی ایک پکڑا جاتا یا نقصان اٹھاتا۔ یہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہاں سے فرار ہونے کے بعد ہم دوبارہ اسی عمارت میں آ گئے ہوں گے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے پورا واقعہ بتانے لگا۔ آخر میں ہم کہہ رہا تھا "مجم آنچہ بجے وہاں سے نکلے تو ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا جس میں قریباً نام کی دو عورت ماری گئی جس کے کمرے میں ہم نے پناہ لی تھی۔"

"ماسٹر ہوجن کو اپنی آدمی اطلاع دے دو۔ وہ پریشان ہوگا۔" جاگتی نے میری بات ختم ہونے پر کہا۔

میں نے قریب رکھے ہوئے فون کا ریسپونڈر اٹھا کر ماسٹر ہوجن کا نمبر مایا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بلاوا۔

"مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم تینوں خیریت سے پہنچ گئے ہو لیکن رات ایک بجے کے بعد سے اب تک جو کچھ بھی ہوا ۳۱ کی تفصیل جانا چاہتا ہوں۔ پیڑو کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ سڑکی لاش لے کے بعد اس نے جس رد عمل کا اظہار کیا ہے اس کا بھی مجھے بتا چل گیا ہے۔ میں صرف یہ جانا چاہتا ہوں کہ تم لوگ کہاں تھے؟"

"سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائیے کہ آپ کو ہماری واپسی کی اطلاع کیسے ملی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کئی آدمی صبح بجے سے تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے تھے جو ہر آدھے گھنٹے بعد مجھے صورت حال سے آگاہ کر رہے تھے۔" ماسٹر ہوجن نے جواب دیا "سازمے دس بجے کے قریب میرے ایک آدمی نے تم لوگوں کو ٹک ٹک رانا دن اسٹیج والے چوراہے پر بس میں سوار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اسی بس میں سوار ہو گیا اور تم لوگوں کے خیریت سے گھر پہنچ جانے کے بعد اس نے مجھے فون پر اطلاع دے دی۔ اب تم اپنی رام کمانی سناؤ۔"

میں اسے بتانے لگا کہ پیڑو کے آدمیوں سے پہنچے کے لیے ہم نے کہاں پناہ لی تھی۔

"اس میں شبہ نہیں کہ تم نے بہت ذہانت کا ثبوت دیا لیکن یہ بہت بڑا رسک تھا۔ اگر انہیں شبہ بھی ہو جاتا کہ تم لوگ پیراڈائزر کی حد دو میں موجود ہو تو تم لوگ زندہ وہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ماسٹر۔ ویسے اب مجھے خطرات سے کھیلنے ہوئے مزہ آنے لگا ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "رات کو تو میں پیڑو کی حالت دیکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں۔ اب کیا صورت حال ہے؟"

"ابھی تک تو خاموشی ہے۔ دو بجے سڑکی کی آخری رسومات ہونے والی ہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے بعد ہی ہوگا۔ ویسے پیڑو کے حلقے میں تمام ہوٹل، ٹائٹ کلب اور کیسینو سڑکی کے سوگ میں بند ہیں۔ دو بجے کے بعد ہنگاموں کی توقع ہے۔ تم تینوں کسی صورت بھی دو تین دن تک باہر نہیں نکلو گے پیڑو کے علاوہ پولیس بھی تم لوگوں کی تلاش میں ہے۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر، ہم محتاط رہیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے پھر میں نے فون بند کر دیا۔

نوٹا اس دوران میں کافی بنا کر لے آئی۔ گرم اور صبح کافی کا پتلا گھونٹ بھر کر پیئے تھے یوں لگا جیسے سینے میں آگ سی بھرنی ہو۔ اس وقت دوسرے کے بارے میں جاننے والے تھے ناشتا تو کیا ابھی تک پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا۔ خالی پیٹ صبح کافی سے سینے اور پیٹ میں شدید جلن پیدا کر دی تھی۔

"اگر تم گاڑی پیراڈائزر نہ لے جاتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

میں نے باہم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب نہ صرف ہمیں اس گاڑی سے ہاتھ دھوئے پڑے بلکہ پولیس اس گاڑی کے ذریعے تمہارے درکشاپ تک پہنچ جائے گی۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ پولیس سے پہلے پیڑو کے آدمی وہاں پہنچیں گے۔“

”گاڑی کی تم حرکت کرنا۔“ باہم نے جواب دیا۔ اس کے لیے میں نہ است بھی تھی ”میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ گاڑی کسی کنبی کی ملکیت تھی۔ جو ایک حادثے کے بعد درکشاپ لائی گئی تھی۔ یہ گاڑی کنبیوں تک درکشاپ میں پڑی رہی۔ اس دوران وہ کنبی بھی بند ہوئی۔ میں نے اس گاڑی کو حرکت کر کے استعمال کے قابل بنالیا۔ تقریباً دو سال سے تو اسے چلا رہا ہوں۔ ابھی چیکنگ کی زد میں بھی نہیں آئی اور مزید یہ بتاؤں کہ اس گاڑی کی نمبر پینٹیں بھی اصلی نہیں ہیں۔ اب اس گاڑی کے بارے میں تحقیقات ضرور کی جائیں گی لیکن پولیس یا پیڑو کے آدمی کسی طرح بھی میرے درکشاپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ نمبر پینٹیں کے ذریعے وہ نجانے کہاں پہنچیں۔ اگر چیپسز اور انجن نمبر سے چیک کیا گیا تو شاید وہ اس کنبی کے انڈرپس تک پہنچ جائیں مگر وہاں کے لوگ بھی اس بات کو بھول گئے ہوں گے کہ وہاں کوئی اس نام کی کنبی ہوا کرتی تھی۔ وہ اس گاڑی کے ذریعے تو ہمارا سراغ نہیں لگا سکتے البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ ایک سولت ختم ہوگئی لیکن اس کے لیے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی اور گاڑی کا بندوبست کروں گا۔“

”ہمیں سہرا حال عطاء دے رہا پڑے گا۔“ میں نے کہا اور پھر تھائی وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے تم میں سے کسی کو احساس نہیں ہے کہ ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس کافی نے تو بیت کی آگ کچھ اور بھی بھڑکا دی ہے۔“

”غیر ذمے داری کی توڑی بہت سزا تو ملنی چاہیے نا۔“ جاگی نے مسکراتے ہوئے کہا ”ہم تو رات بھر انتظار کی سولی پر لٹکے رہے اور تم لوگ توڑی دیر تک بھوک برداشت نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”تمہارے رحم و کرم پر ہیں جو پھر جو سزا دو۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک ایک کپ چائے کے علاوہ ہم لوگوں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا یا۔“ جاگی نے کہا ”سہرا حال کھانا تیار کرنے میں تو دیر لگے گی لیکن ابھی کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا جس سے انتظار کا حوصلہ پیدا ہو۔“

وہ مسکراتی ہوئی پکن کی طرف چلی گئی۔ تو باہم اس کے ساتھ ہی تھی۔ پر ساد اور باہم برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا تھائی سے باتیں کرنے لگا۔ تھائی کیرک کیرک مجھ سے سب کچھ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

چار بجے جب ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے تو سکھر دھمی آیا۔ وہ دہرہ ایک بجے ماسٹر ہوجن کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسے

وہاں سے ہماری باخیریت واپسی کی اطلاع مل گئی تھی اور اب وہ شہر کے حالات کا جائزہ لیتا ہوا آیا تھا۔

”بہت مگر بڑا ہے۔“ اس نے کہا ”مسا کی تدفین کے فوراً ہی بعد ان لوگوں نے ہنگامہ شروع کر دیا تھا۔ پولیس نے ہنگامے پر قابو پانے کی کوشش کی مگر پیڑو کے آدمی تو طے کر کے آئے تھے کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ انہوں نے توڑ پھوڑ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ جتاڑے کے جلوس کے راستے میں تمام دکانیں بند تھیں مگر ان لوگوں نے دکانوں کے شتر توڑ دیے اور سامان لوٹ لیا۔ ہنگامہ اب شہر کے بہت سے علاقوں میں پھیل چکا ہے اور میرا خیال ہے پولیس کے لیے فوری طور پر اس پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا ہجرات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”پیڑو انڈر دولڈ کالنگ ہے۔ اس کے بھائی کا قتل کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ تمام شہرینہ اور غنڈا عناصر اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔“

”اس قسم کے لوگوں کو تو مرنے دینا چاہیے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”لیکن میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ پیڑو کی یہ بادشاہت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔ وہ انہی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر عینک مانگے گا جو آج اس کے نام سے قہر قرا کاٹنے لگتے ہیں۔ سہرا حال کیا تمہارے پیڑو اس وقت کہاں ہوگا؟“ میں سوالیہ لہجہ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اسے پیراڈائزی میں ہونا چاہیے۔“ سکھر نے جواب دیا۔ ”مجھ جب تم لوگ ایک عورت کو پرغمال بنا کر لٹکے تھے تو اس وقت بھی ہنگامے میں تین افراد مارے گئے تھے۔ ایک وہ عورت جو پیڑو کے آدمیوں کے ہاتھوں مری تھی اور وہ پیڑو کے آدمی جو تم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پیڑو اس واقعے کی اطلاع ملنے کے فوراً ہی دیر بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ اس بات پر بھی بھڑکا تھا کہ تم لوگ رات بھر وہاں رہے اور کسی کو پتا نہیں چل سکا۔ اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو مارا پینا بھی تھا کہ وہ لوگ اتنے غیر محتاط اور بے پروا کیوں ہو گئے ہیں۔ ان واقعات کی تحقیق کے لیے پولیس کے بعض افسران بار بار وہاں جا رہے ہیں اور میرا خیال ہے مسائی کی تدفین کے بعد پیڑو بھی وہیں گیا ہوگا۔“

”میں سمجھ رہی ہوں کہ تم پیڑو کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔“ تھائی گھورتی ہوئی کہیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اس وقت اسے فون کر کے مزید طیش دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ہنگامے ختم ہو لینے دو۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

میں واقعی پیڑو کو فون کرنا چاہتا تھا لیکن تھائی کے کہنے پر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور باہم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا درکشاپ بند ہو گیا کسی اور نے کھولا ہوگا؟“

”میرے ایک اسٹنٹ کے پاس بھی چابیاں موجود ہیں۔ میں جب موجود نہیں ہوتا تو وہی درکشاپ کھولتا ہے۔“ باہم نے جواب دیا۔

”اسے فون کر کے بتا دو کہ تم اس وقت شہر سے باہر ہو اور دو تین دن تک وہاں نہیں آؤ گے۔ باتوں یا باتوں میں اس سے یہ بھی معلوم کر دو کہ صورت حال کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”پاسم نے فون کا ریسیور اٹھا کر درکشاپ کا نمبر دیا۔ اس کا اسٹنٹ شاید کسی کام میں مصروف تھا۔ کال چار گھنٹوں کے بعد ریسیور کی گئی تھی۔ باہم تقریباً دس منٹ تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے اسٹنٹ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ گزشتہ رات وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیرو تفریح کے لیے سارا پوری گیا ہے۔ اس کی واپسی دو روز بعد ہوگی۔ اس دوران میں وہ درکشاپ کی ذمے داریاں نبھائے رکھے پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی وہاں مجھے یا اس گاڑی کے بارے میں پوچھنے نہیں آیا اور میرا خیال ہے وہاں کوئی بچنے کا بھی نہیں۔ ہمیں کسی خوف کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔“

”ہم شام تک لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھائی نے کچھ چیزیں کھوانے کے لیے سکھر کو بازار بھیج دیا تھا۔ وہی ایک ایسا آدمی تھا جو فی الحال محفوظ تھا۔ ہم میں سے کوئی اور تو باہر نکل نہیں سکتا تھا۔

”آٹھ بجے کے قریب ماسٹر ہوجن کا فون آیا۔ اس نے ایک بار پھر ہمیں خبردار کیا تھا کہ گھر سے باہر نہ نکلیں کیونکہ ہنگامے پھیل گئے تھے۔ ان ہنگاموں میں اب تک ایک آدمی پولیس کا اور دو آدمی پیڑو کے مارے گئے تھے۔ پولیس کشتیوں نے فوس کو حکم دے دیا تھا کہ وہ شہرینہوں کو دیکھتے ہی گولی مار دے۔“

اور ہجرات گیارہ بجے ماسٹر ہوجن نے یہ ایک اور دلچسپ خبر سنائی۔ پولیس کی ہماری فزلی نے پیراڈائز کو گھرے میں لے کر پیڑو کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ دیا کے راستے فرار ہو گیا۔ البتہ اس کے کئی قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس ہنگامے میں ایک آدمی پیراڈائز میں بھی پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

رات گیارہ بجے تک اس قسم کی مزید خبریں ملتی رہیں۔ ہم سب اسی صورت حال پر تبصہ کر رہے تھے کہ فائزنگ کی آوازیں سن کر اچھل پڑے۔ فائزنگ کی یہ آوازیں ٹاکسن اسکواری کی طرف سے سنائی دی تھیں۔ سکھر صورت حال معلوم کرنے کے لیے باہر چلا گیا لیکن اس کی واپسی جلد ہی ہو گئی تھی۔

”ٹاکسن اسکواری اور واک واک دنگ لائے ریلوے اسٹیشن کے سامنے دو بیلوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ اسکواری پر کئی دکانوں کو بھی لوٹ لیا گیا ہے۔ پولیس اور شہرینہوں میں زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔“ سکھر نے بتایا۔

”اس کا اندازہ میاں تک پہنچنے والی آوازیوں سے بھی ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا ”اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی ذرا

محتاط رہیں۔ ہماری یہ کلی ٹاکسن اسکواری سے زیادہ دور نہیں۔ پولیس سے پٹنے کے بعد شہرینہ ان گلیوں کی گارج کریں گے۔“

ہمارے پاس سامی کے محافظوں سے جیسی ہوئی دو آؤنیک رائفلیں اور تین ہتھول تھے۔ سکھر ایک آؤنیک رائفل لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا اور دوسری رائفل باہم نے سنبھال لی تھی۔ وہ چھت پر چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ چھت سے کئی دو فٹوں طرف خاصی دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ دھڑا دھڑا دیکھتے ہوئے میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ اس گلی میں تمام ہی بنگلوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اسکواری کی طرف سے فائزنگ کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ تھا مگر حالات کا کوئی مجھڑا نہیں تھا۔ آس پاس کے علاقوں کے لوگ بتیاں بجھا کر گھروں میں بند ہو گئے تھے۔

میں باہم کو چھت پر چھوڑ کر بچے آیا۔ ایک ہتھول پر ساد کے پاس تھا۔ باہم والا ہتھول میں لے لیا تھا جو جاگی کے خوالے گرو گیا۔ تیسرا ہتھول میرے پاس تھا۔

فضا مسلسل فائزنگ کی آوازیوں سے گونج رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہاں کوئی محاذ کھل گیا ہو لیکن پھر بتدریج آوازیوں میں کمی آئی گئی اور بالآخر ایک بجے کے قریب سناٹا چھا گیا۔ فضا میں بارود کی بو کے ساتھ آؤنیکس کی آمیزش بھی تھی جس سے آنکھوں میں مرمیں لگ رہی تھیں۔

”بڑا بچے کے قریب تھائی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نوتا پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔“ میں جاگی اور پر سادہاں میں بیٹھے رہے پھر سادہاں بھی اٹھ کر باہر برآمدے میں سکھر کے پاس چلا گیا۔

میں اور جاگی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

تین بج گئے۔ جاگی بیٹھے بیٹھے اٹھ گئے کئی تھی۔ وہ پچھلی رات جاگتی رہی تھی۔ جاگتے تو ہم بھی رہے تھے لیکن اس وقت بھی ہمارے لیے جاگنا ہماری مجبوری تھی۔ جاگی کو صوفے پر اوٹھتے چھوڑ کر میں باہر گیا۔ سکھر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پر سادہ بھی برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں برآمدے سے نکل کر بیڑھیاں چڑھا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ باہم بھی مندر کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا احساس ذمے داری دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ حالانکہ سب ہی رات بھر جاگتے رہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید یہ صورت حال دیکھنے میں نہ آتی۔

میں نے نیچے آکر تھائی اور نوتا کے کمروں میں جھانکا۔ وہ دونوں کمری ٹینڈ سو رہی تھیں۔ میں دوبارہ لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جاگی سامنے والے صوفے پر آؤنیک ترجھی پڑی ہوئی تھی۔ سامی کی آمد و رفت سے اس کے سینے کا زرد بوم میرے سینے میں ارتعاش سا پیدا کر رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں۔ میرے قوی بھی اب مضمحل سے ہونے لگے تھے۔ آنکھوں

میں شدید جلن ہو رہی تھی اور پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور نیند مجھے پچھاننے کی کوشش میں تھی۔

میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں کہ قریب پڑنے ہوئے نیلی فون کی جھنکی بج اٹھی۔ میں اس طرح اچھلا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ سانسے میں نیلی فون کی جھنکی کی آواز ہم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ جاگتی بھی بڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اس نے صوفے پر پڑا ہوا پتہ تل فوراً ہی ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ شاید سبھی تھی کہ کسی نے مکان پر حملہ کر دیا ہے لیکن پھر بات اس کی سمجھ میں آئی اور وہ حوش نظروں سے نکلنے فون کی طرف دیکھنے لگی۔

نیلی فون کی جھنکی دو مرتبہ بج چکی تھی۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھایا لیکن خود کچھ بولنے کے بجائے دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا انتظار کرنے لگا اور میرا یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ صرف ایک سینکڑہ ماسٹر ہو جن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”بلو وید جان۔ میں ماسٹر ہو جن بول رہا ہوں۔“

”میں ماسٹر خیریت؟“ میں نے پوچھا۔ میرے دماغ میں سنسنات ہی ہونے لگی تھی۔ اس وقت ساڑھے تین بجے تھے اور مجھے کسی گزرباز کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

”خیریت ہوئی تو اس وقت تمہیں ذون نہ کرنا۔“ ماسٹر ہو جن کی آواز خالی دی ”تم لوگ اپنی ضروری چیزیں سمیٹو اور وہ بھگا چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ذون تم لوگوں کو لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔“

”معاذ کیا ہے ماسٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”پیزڈو کے آدمیوں نے ہمارا ج کے ہمنازیم پر حملہ کر دیا تھا۔“ ماسٹر ہو جن نے جواب دیا ”یہ تقریباً دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت ہمنازیم میں موجود نہیں تھا۔ جتنے بھی لڑکے وہاں موجود تھے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن پیزڈو کے آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ آتشیں اسلحے سے لیس تھے۔ ہمارا ایک لڑکا مارا گیا ہے اور تین زخمی ہوئے ہیں۔ میں اطلاع ملنے ہی کچھ اور لڑکوں کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ پیزڈو کے آدمی میرے پچھنے سے پہلے بھاگ چکے تھے اور وہ گرم گواٹھا کر لے گئے ہیں۔ گرم ان چند لڑکوں میں سے ایک ہے جو ہمارا موجودہ پناہ گاہ سے واقف ہیں۔ گرم بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہے لیکن پیزڈو ہندو کے ایسے طریقوں سے واقف ہے کہ پھر بھی بول اٹھتے ہیں۔ ممکن ہے گرم۔۔۔“

”میں سمجھ گیا ماسٹر۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”انتیاد کا تقاضا یہی ہے کہ تم لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔“ ماسٹر ہو جن نے کہا ”تیار رہو۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ذون پہنچ جائے گی۔“

”اوکے ماسٹر۔ تم تیار ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے ریسور رکھ دیا۔

دیا۔

میں ریسور رکھ کر جیسے ہی گواٹھا میری نظریں تھائی اور نوبت پر پڑ گئیں۔

وہ دونوں اگرچہ گرمی نیند سوری تھیں لیکن فون کی جھنکی کی آواز نے انہیں بھی جگا دیا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں ایک جھگڑے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری نیند کا فورہ پوچھ گئی۔

”پیزڈو کے آدمی ہمارا ج کے ہمنازیم پر حملہ کر کے گرم بائی ایک لڑکے کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ گرم ہماری اس پناہ گاہ سے واقف ہے۔ ماسٹر ہو جن کو اندیشہ ہے کہ وہ ہندو سے زبان نہ کھول دے۔ اس لیے ہمیں یہ بھگا چھوڑ دینے کو کہا گیا ہے۔ ایک گھنٹے میں ذون یہاں پہنچنے والی ہے۔ تم لوگ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لو اور روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جاگتی بھی ایک جھگڑے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

میں تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازہ کھول کر رآمدے میں آیا۔ سکھروں کو چھت پر پہنچ دیا کہ وہ پاٹھم کو بلا لے اور پھر رساو کو بھی اندر بلا لیا۔ دو منٹ بعد سکھروں اور پاٹھم بھی اندر آ گئے۔ میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں تھائی کچھ ضروری چیزیں اور میرے اور اپنے کپڑے کیوس کے ایک بڑے بیگ میں ٹھوس رہی تھی۔

جاگتی اور نوبت بھی اپنی ضروری چیزیں سمیٹنے میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اور پر ساد گھوم پھر کر کمروں کا جائزہ لیتے گئے۔ ہم لوگ کئی مینوں سے اس بنگلے میں رہ رہے تھے اور یہاں اپنی موجودگی کے نشان مٹانا آسان نہیں تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگر گرم نے پیزڈو کو ہماری اس پناہ گاہ کے بارے میں بتا بھی دیا تو سراغ مٹانا یا نہ مٹانے کی سعی نہیں رکھتا تھا۔ سیاہ ذون ایک گھنٹے سے بھی پہلے پہنچ گئی۔ ہم تیار ہی تھے۔ سکھروں نے گٹ پر جا کر اطمینان کر لیا کہ وہ ماسٹر ہو جن کے آدمی تھے۔ اس کا اشارہ پا کر ہم باہر آ گئے۔ جاگتی نے تمام بقیات بھاگ کر دروازے لاک کر دیے۔ ذون میں بیٹھنے سے پہلے اس نے باہر کا گھٹ بھی منتقل کر دیا اور چاہوں کا گچھا بیگ میں ڈال لیا۔

ہم سات آدمی تھے۔ دو گمن میں پہلے ہی سے ذون میں موجود تھے۔ ذون گھبراہٹ سے نکل کر جیسے ہی ٹاس اسکوڑ پر پہنچا، دھڑکنے کی طرف کھڑی ہوئی پولیس کی ایک مکلی جیب ہمارے تعاقب میں لگ گئی۔ جیب کے پچھلے حصے میں آئے سانسے کی سیٹوں پر تین تین مسلح پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ میں نے اپنے ساتھ ذون میں بیٹھے ہوئے ایک گمن میں کو پولیس جیب کی طرف متوجہ کیا تو اس کے ہوتوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”وہ ہمارے ہی آدمی ہیں نکل ماسٹر۔“ گمن میں نے جواب دیا

”رات ایک ڈیڑھ بجے تک پورا شہر بنگالوں کی ذون میں رہا ہے۔ پولیس ہر طرف گشت کر رہی ہے۔ گاڑیوں کو جگہ جگہ روک کر چیک کیا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں تم لوگوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کا بھی ایک محفوظ طریقہ تھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ پولیس کی اس جیب کی موجودگی سے کوئی اور پولیس پائی وین کو چیک کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔“

”یاد رہا وہ واقعی پولیس کے آدمی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس مرتبہ گمن میں نے مختصر سا جواب دیا۔ میں باہر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ سڑک کے مین وسط میں ایک بجلی ہوئی بس کھڑی تھی۔ چوراہے کے دوسری طرف پولیس کا ایک ٹرک کھڑا تھا اور متعدد مسلح پولیس والے اوپر اور پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک پر لاتعداد پتھر پھیرے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ لگا دیا جا سکتا تھا کہ ذون میں گھنے پہلے یہاں کیا ہوا ہوگا۔

ذون ٹاسک اسکوڑ اور واک ونگ ریلوے اسٹیشن کو کراس کرتی ہوئی ٹاسک روڈ پر آگئی اور کچھ فاصلے کے بائیں طرف موڑی۔ کروکدھ جھپ بھج سے دیا پار کر کے ذون ایک بار پھر بائیں طرف تیز روڈ پر موڑی۔ پولیس کی جیب بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ کروکدھ جھپ بھج پر ایک پولیس پائی وین ہماری ذون کو روکنا تھا لیکن ہمارے ساتھ آنے والی جیب کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انپکڑ کی دوری میں لباس ایک آدمی نے ان پولیس والوں سے سخت لپٹے میں کوئی بات کی اور اس کے فوراً ہی بعد ہماری ذون کو آگے جانے کا اشارہ کر دیا گیا تھا۔

تیز روڈ سے ذون ایک تنگ سی سڑک پر موڑی۔ یہ سڑک دریا تک چلی گئی تھی۔ اس کے دونوں طرف بھگتے نما رہائشی عمارتیں تھیں۔ سڑک کے اختتام پر دریا کے کنارے ایک خوب صورت بدھ عبادت گاہ بنی ہوئی تھی۔ اس عبادت گاہ کا کچھ حصہ کنارے پر تھا اور کچھ دریا کے اندر ستونوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ ذون عبادت گاہ کے مرکزی گیٹ کے سامنے سے دائیں طرف موڑی اور تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے سڑک پر گئے ہوئے ہیڑر کے سامنے رک گئی۔ اس ہیڑر کے ساتھ ہی ایک طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر ”بگ“ لکھا ہوا تھا۔

یہ بوٹ لینڈنگ تھی۔ دریا سے چار فریا پر جگہ جگہ اس قسم کی بوٹ لینڈنگ بنی ہوئی تھیں۔ دریا میں چلنے والی بوٹیں اور لالچ بھی کچھ توپرائیوٹ کمپنیوں کی ملکیت تھیں اور کچھ باہر اٹھائی کی گھرائی میں چلتی تھیں۔

ہم ذون سے اتر آئے۔ پولیس کی دوری میں لباس آدمی وہیں رک گئے اور ہم اپنے ساتھ ذون میں آنے والے دو گمن مینوں کے ساتھ ہیڑر (BARRIER.....) کے دوسری طرف آ گئے۔ آگے ایک پختہ پلیٹ فارم سامنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک میٹھی تھی جو دریا سے اندر کو نکلی ہوئی تھی۔ میٹھی سے ایک کشتی

اگلی ہوئی تھی جس پر تقریباً بیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ دو آدمی پہلے ہی سے کشتی پر موجود تھے۔ ہمارے ساتھ وہ دونوں گمن میں بھی کشتی پر سوار ہو گئے اور کشتی حرکت میں آئی۔

رات کے آخری پیر کی خاموشی میں چوڑوں کی ٹھنڈ ٹھنڈ کی آواز بڑا بڑا سراور آتا رہے رہی تھی۔ تقریباً تین گز کا فاصلہ طے کر کے کشتی دریا میں نظر انداز ایک لالچ کے قریب رک گئی۔ کشتی رکتے ہی اوپر سے کچھ پوچھا گیا اور پھر جواب ملنے پر اوپر سے رہی کی ایک سیڑھی لٹکا دی گئی۔ یہ سیڑھی خطرناک نہیں تھی۔ اس پر قدموں کی طرح ٹکڑی کے تختے لگے ہوئے تھے۔ پہلے تھائی، جاگتی اور نوبت اوپر بھجھا گیا اور پھر ہم بھی باری باری اوپر آ گئے۔ ہمارے بیگ گمن مینوں نے اوپر پہنچائے تھے اور پھر لالچ پر ایک آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ ماسٹر ہو جن تھا۔

”یہ لالچ تم لوگوں کے لیے محفوظ ہے۔“ ماسٹر ہو جن نے کہا۔ ”جب تک حالات سکون پزیر نہیں ہو جاتے، تم لوگ یہیں رہو گے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔“

یہ مسافروں کو سیر کرانے والی لالچ تھی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ پچاس مسافر بیٹھ سکتے تھے۔ عرشے پر بیٹھیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کپٹن کا کینین تھا اور اس کے ساتھ دو کینین اور تھے۔ تین چار کینین بچے بھی بنے ہوئے تھے۔ کپٹن کے علاوہ لالچ پر چلنے کے چار آدمی تھے۔

ماسٹر ہو جن کچھ دیر ہمارے پاس رہا پھر کشتی پر بیٹھ کر وہاں چلا گیا۔ وہ دونوں گمن میں لالچ پر ہی رہ گئے تھے۔ ماسٹر ہو جن کے جانے کے بعد ہم بے طے کرنے لگے کہ کس کو کہاں سونا ہے۔ نیچے والا ایک کینین جاگتی اور نوبت کو دے دیا گیا۔ دوسرے کینین پر تھائی نے قبضہ کر لیا۔ میں پر ساد وغیرہ اوپر آ گئے۔ اوپر بھی دو کینین تھے اور عرشے پر بیٹھیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس لالچ میں نیلی فون بھی موجود تھا۔

رات کا آخری پیر گزر رہا تھا۔ نیند ایک بار پھر غالب آنے لگی تھی۔ غافلانہ کی موجودگی میں اب ہمیں جاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پر ساد اور سکھرو وغیرہ اوپر والے کینینوں میں گھس کر سو گئے اور میں نیچے تھائی والے کینین میں آ گیا۔ اس کینین میں دو آرام دہ برتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک برتھ پر تھائی سو رہی تھی۔ میں دوسرے برتھ پر لیٹ گیا۔ نیند کے بوجھ سے میری پلکیں جھکی جا رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں بھی نیند کی آغوش میں چھٹ چکا تھا۔

☆○☆

تین دن گزر گئے۔ ہم لالچ کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ لالچ زیادہ تر دریا میں تھیتی رہتی تھی۔ کبھی کبھ دیر کے لیے کسی ایسی جگہ نظر انداز ہو جاتی کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو سکے۔ ان تین دنوں کے دوران میں یہ لالچ کناروں سے دوری رہی تھی اور ان تین دنوں میں اس لالچ نے اپنی لینڈنگ سے ساٹھی بوٹ لینڈنگ تک



درختوں پکڑ لگے تھے۔ ان دونوں بوٹ لینڈنگز کے درمیان کئی میل کا فاصلہ تھا اور دنیا انگریزی کے حرف ایس (S) کی طرح مل کھاتا ہوا پھیلا ہوا تھا۔

دنیا سے دونوں کناروں پر آباد شہر کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ شام کے بعد جب دونوں کناروں پر عمارتوں کی روشنیاں جھلکا اٹھیں تو یہ نظارہ کچھ اور بھی دل فریب ہو جاتا۔

دن کے وقت تو ہم اپنے کمپنوں تک ہی محدود رہتے البتہ رات کو عرشے پر آجاتے۔ ان تین دنوں کے دوران میں بائیں ہونچنے سے صرف ایک مرتبہ ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اور اس کے کئے کے مطابق صورت حال بتا رہا تھا۔

لاچ پر ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا۔ لاچ کا ایک لازمہ کک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ قحالی کھانوں کے علاوہ وہ انڈین اور یورپین کھانے بھی بہت اچھے پالتا تھا۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ہم فلوئنگ مارکیٹ سے خرید لیتے۔ بنکاک کی فلوئنگ مارکیٹ بھی ایک دلچسپ جگہ تھی۔ یہاں کشتیوں پر دکانیں بھی ہوتی تھیں۔ ان دکانوں پر ہر چیز دستیاب تھی۔ لوگ بھی کشتیوں پر بیٹھ کر خریداری کرتے تھے۔ کھانوں میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں یا ان لوگوں کی تھی جو قحالی لینڈ کے دوسرے شہروں سے آتے تھے۔ اس طرح کشتیوں پر بیٹھ کر خریداری بھی ہو جاتی اور تفریح بھی۔

وہ چوتھا دن تھا۔ قحالی دیکھو اتنا کئی تھیں۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھیں لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ ماسٹر ہونچے سے کلینر س لے بغیر ہم لاچ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہمیں تو ابھی تک یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ جاگے والا بنگلا اب بھی محفوظ تھا یا گرے پڑو کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ ٹیلی فون پر ماسٹر ہونچ اور مامار سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ لاچ اس وقت فلوئنگ مارکیٹ کے علاقے میں نظر انداز تھی۔ میں اور قحالی عرشے کی ریٹک پر بیٹھے دریا کی پُرسکون سطح پر بلکورے لیٹی ہوئی کشتیوں کو دیکھ رہے تھے اور کشتیوں پر بھی ہوئی ان دکانوں کے بارے میں تبصرے بھی کر رہے تھے۔ قحالی بات کرتے کرتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات اور آنکھوں میں دھندلی آنکھیں تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”کیا بات ہے۔ تم اس طرح سسم کیوں لے ہو؟“

”ایک دم سے مڑ کر ت دیکھا۔“ قحالی نے کہا ”انہیں طرف سرخ رنگ کی ریلوٹ پر بیٹھا ہوا آدمی۔۔۔ اسے میں نے ناگیک کے ساتھ دیکھا تھا۔ اندرا ریجنٹ ہوٹل میں۔ مجھے شبہ ہے اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور ہماری عمرانی کر رہا ہے۔ اس نے نیلی ڈیم کی شرت پہن رکھی ہے۔ اس طرح مڑ کر دیکھا کہ اسے شبہ نہ ہو۔“

میں قحالی سے باتیں کرتا رہا اور پھر غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر اس طرف دیکھنے لگا اور پھر اس شخص کو دیکھنے ہی میں چونک گیا۔ اس چہرے کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اندرا ریجنٹ ہوٹل کے سامنے ماسٹر پور کو اپنی گرفت میں لیا تھا اور جی ٹاگ نے انہیں کے وار کر کے ماسٹر کو قتل کر دیا تھا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے قحالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ وہی ہے۔ اپنی کئی حرکت سے یہ ظاہر ہوئے ہوئے دو کہ ہم نے اسے دیکھ لیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس نے محض اتفاق سے ہمیں لاچ پر دیکھ لیا ہے اور ہماری عمرانی کر رہا ہے کہ کہاں پر اتریں گے اگر اس نے واپس جا کر بتا دیا تو۔۔۔“

”یہ واپس نہیں جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔ اسی دوران میں جاگے بھی وہاں آگئی۔ اسے ہم نے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور پھر جاگے اور قحالی کو باتیں کرتے چھوڑ کر میں وہاں سے ہٹ گیا۔

یہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ اس لاچ کے ساتھ چار چھوٹی لائف سیونگ بولس بھی تھیں۔ اس دریا میں اگرچہ لاچ کو کسی خطرناک حادثے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن قانونی خانہ پر تو کتنی ہی تھی۔ دو بولس لاچ کے ایک طرف لگی ہوئی تھیں اور دو دوسری طرف۔

میں نے پراساد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے لاچ کے کمپن کو بلا لیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس کے آدمی لاچ کے دوسری طرف کی ایک بوٹ دریا میں اتار رہے تھے۔ بوٹ زیادہ دیر نہیں تھی۔ اس میں آدھ ڈس آؤٹی ہی آسکتے تھے۔ میں پراساد اور سکدر ری کی بیڑی سے کشتی میں آگئے۔ سکدر نے چوہنبہال لیے اور کشتی کو آہستہ آہستہ کھینچے لگا۔ لاچ کے اس طرف کوئی اور کشتی نہیں تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ کناروں پر عمارتوں کی بتیاں جل رہی تھیں لیکن اس جگہ اندازاً سا تھا۔

کشتی لاچ کے اوپر سے ایک لمبا پکڑ لگتی ہوئی دوسری طرف آگئی۔ دکانوں والی کشتیوں پر بھی اب بتیاں جل گئی تھیں۔ کسی کشتی پر جہیزغے بلب اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں اور کسی پر کابائیز اور پیڑو بیسکس لپ جل رہے تھے۔ خریداروں کی کئی کشتیاں بھی موجود تھیں۔ سرخ رنگ کی وہ بوٹ تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

سکدر نے کشتی روک لی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس شخص پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ ہم اس انتظار میں رہے کہ وہ اپنی کشتی وہاں سے ہٹائے تو ہم اس پر ہاتھ ڈالیں۔

دس منٹ گزر گئے اور پھر سرخ رنگ کی وہ بوٹ حرکت میں آگئی۔ اس شخص نے چوہ چلاتے ہوئے ایک بار پھر لاچ کی طرف دیکھا تھا۔ دوسری کشتیوں سے تقریباً بیس گز دور جہانے کے بعد۔

کشتی رک گئی اور کچھ ہی دیر بعد میں چوہ بفر نہیں رہ سکا۔ وہ دوا کی جاکے پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے سکدر کو اشارہ کیا۔ وہ بوڑی تیزی سے چوہ چلاتے ہوئے کشتی کو کھینچے لگا۔

سرخ کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص نے ہماری کشتی کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا لیکن چونکہ اندر جہیزغے میں وہ ہماری ٹھیکس نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے اس نے ہماری کشتی پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہماری کشتی اس کے برابر پہنچ گئی۔ تب وہ شخص اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔ اس نے دوا کی جاکے چھوڑ کر جب سے شاید ہسپتال وغیرہ نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اور پراساد چھلانگ لگا کر اس کی کشتی پر پہنچ گئے اور اسے حرکت کرنے کا موقع بغیر دیکھ دیوے لیا۔ میں نے بوڑی پھرتی سے اپنا پنجر نکال لیا تھا۔

”کس سے بات کر رہے تھے دوا کی جاکے پر؟“ میں نے پنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

”تم لوگ اب بچ نہیں سکو گے۔“ اس نے جھکاتے ہوئے جواب دیا ”پڈو کے آدمی جلد ہی ہمارے لاچ کو تلاش کر لیں گے اور پھر تم لوگوں کو سانس لینے کا موقع بغیر دیکھ دیوے لگا۔“

”اسے لاچ پر لے چلو پاس۔“ پراساد نے کہا ”وہیں چل کر اس سے سب کچھ پوچھیں گے۔“

اپنی کشتی پر منتقل کرتے ہوئے اس شخص نے دریا میں چھلانگ لگنے کی کوشش کی تھی لیکن پراساد نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ پر دو تین لمبرو پھیر بھی رسید کر دیے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔

سکدر کشتی کو کھینچا ہوا لاچ کے دوسری طرف لے آیا۔ اس شخص کو ری کی بیڑی سے ڈریلے لگا لیا۔ کچھ پہنچانے میں بھی خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ ہم اسے چپے کے ایک کین میں لے آئے۔ میری ہدایت پر کمپن نے نظر اٹھا دیا تھا اور لاچ حرکت میں آگئی تھی۔

میں اور پراساد اس شخص سے پوچھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس نے دوا کی جاکے پر پڈو یا اس کے آدمیوں کو ہمارے بارے میں کیا بتایا تھا لیکن وہ ہمیں کتا رہا کہ اب ہم بچ کر نہیں جا سکتے۔ میں نے اور پراساد نے اس کی اچھی خاصی ٹھکانی بھی کر ڈالی تھی لیکن وہ بہت سخت جان ثابت ہوا تھا اور میں جانتا تھا کہ ایسے لوگ آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔ میں نے پنجر کی نوک سے اس کے دائیں رخسار پر ایک لمبا چوک لگا دیا۔ اس کا چوہ خون سے تر ہو گیا لیکن وہ اب بھی زبان کھولنے کو تیار نہیں تھا۔ اس دوران میں ہمارا ایک کمن میں دوڑتا ہوا کین میں پہنچ گیا۔

”ماسٹر ہونچ کا فون ہے۔ اس نے فوراً ہمیں یہ لاچ چھوڑ دینے کو کہا ہے۔ تم خود اس سے بات کر لو۔ وہ لائن پر ہے۔“ کمن میں نے چیخے ہوئے کہا۔

میں نے کین کے فرش پر پڑے ہوئے اس شخص کی طرف

دیکھا۔ اس کی وجہ سے ہماری یہ پناہ گاہ بھی ہم سے چھن رہی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا پنجر اس کے سینے میں ٹھک دھل کے مقام پر بہت ہو چکا تھا۔ اس کے حلق سے بڑی بمیابک چیخ نکلی تھی۔ میں نے پنجر اس کے سینے سے نکال لیا۔ وہ بڑی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کی ڈیم کی شرت سے پنجر صاف کیا اور اسے بڑبٹا ہوا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ پراساد بھی میرے ساتھ ہی دوڑا تھا۔

ٹیلی فون کمپن کے کین میں تھا۔ کمپن فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ریسور میری طرف بڑھا دیا۔

”ہیں ماسٹر۔“ میں نے ریسور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”پڈو کو کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ تم لوگ ”جل پری“ نامی

اس لاچ پر ہو۔ وہ اس وقت ہیراڈانز ریسٹورنٹ میں موجود ہے اور اس کے آدمی خطرناک اسلحے سے لیس ہو کر جل پری کی تلاش میں نکلے والے ہیں۔ دو سوئٹ بولس ہیراڈانز کی بیڑی پر تیار کھڑی ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق ان کے پاس راکٹ بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تم لوگوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے کے بجائے لاچ کو راکٹوں سے اڑا دیں۔ اس لیے تم لوگ فوراً وہ لاچ چھوڑ دو۔“

”ہیں ماسٹر۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”جہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جس شخص نے پڈو کو لاچ پر ہماری موجودگی کے بارے میں اطلاع دی تھی اسے ہم نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کون تھا وہ؟ کیا لاچ کے عملے کا کوئی خدار؟“ ماسٹر نے چونک کر پوچھا۔

”تو ماسٹر۔“ میں نے کہا اور اسے اس شخص کے بارے میں بتانے لگا پھر بولا ”لیکن ہم کہاں جا سکتے؟ واٹ ٹریٹ یا کسی اور جگہ؟“

”جاگے کے بنگلے پر۔“ ماسٹر ہونچ نے جواب دیا ”وہ لوگ تم سے تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتے تھے اور ویسے بھی تقریباً دو گھنٹے بعد میرے آدمیوں نے تم کو ان کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ اس طرح وہ بنگلا اب بھی محفوظ ہے۔ ویسے تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟“

”فلوئنگ مارکیٹ کے قریب۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہیراڈانز وہاں سے کافی دور ہے۔ انہیں جل پری تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ تم لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور کنارے پر پہنچ کر جس طرح بھی ممکن ہو اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔“ ماسٹر نے کہا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ پڈو کو ہمارے بارے میں اطلاع مل گئی ہے اور اس کے آدمی ہماری تلاش میں نکلے والے ہیں؟“ میں نے آخری سوال کیا۔

”تمہارے لیے ہمارا پورا نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ تفصیل



”اس کا بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔  
 ”کیوں نہ ہمیں کچن بوری بھیج دیا جائے۔“ میرے قریب  
 بیٹھا ہوا پراسا، بول پڑا ”بڑی اچھی جگہ ہے۔ آج کل تو وہاں کا  
 موسم بھی بہت اچھا ہے۔ وہاں ہم کچھ ریسٹ کر سکتے ہیں۔“

”کچن بوری۔“ ماسٹر بوجھن بڑبڑایا ”وہاں واقعی تم لوگوں کے  
 لیے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میں مہاراج سے بات کروں  
 گا۔ اگر انہوں نے کچن بوری کے نام پر اتفاق کیا تو وہ چار دن بعد  
 تم لوگوں کو وہیں بھیج دیا جائے گا۔ بصورت دیگر تم لوگ وہاں جاؤ  
 گے جہاں مہاراج چاہیں گے۔“

ہم ہال میں بیٹھے بائیں کمرے پر تھے۔ جاگتی اور تھکی گئی تھیں  
 کھانا تیار کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کھانا میز پر لگا دیا۔  
 ماسٹر بوجھن نے کھانا کھانے کے بعد کافی بھی ہمارے ساتھ ہی  
 پلٹی تھی اور بالآخر جب وہ رخصت ہوا تو رات کا ایک بج چکا تھا۔

”تم نے کچن بوری کا نام کیوں لیا تھا؟“ ماسٹر بوجھن کے جانے  
 کے بعد میں نے پراسا کو گھورتے ہوئے کہا۔

”تم بھی تو وہاں جانا چاہتے ہو یا۔“ پراسا مسکرایا ”ہمارے  
 اصل شکار تو وہیں ہیں۔“

”اگر مہاراج یا ماسٹر بوجھن کو شبہ بھی ہو گیا کہ دارا اور کم  
 وغیرہ کچن بوری میں ہیں تو وہ ہمیں اس طرف جانے کی اجازت  
 ہرگز نہیں دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”تم لوگوں کا سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“ جاگتی نے گھڑی کی  
 طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بڑبڑنا چاہیے۔ مجھے تو تیند آ رہی ہے۔“  
 ”ہاں واقعی اب سو جانا چاہیے۔“ میں نے بھی اُٹھ جائے سے  
 اٹھتے ہوئے کہا۔

اب اگرچہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ہم پہرے  
 داری کے نظام کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ طے یہ ہوا کہ پراسا  
 اور پانچھم صبح پانچ بجے تک ڈیوٹی دیں گے۔ اس کے بعد میں اور  
 سکھدر جاگ جائیں گے۔ یہ طے ہوئے ہی ہم لوگ اٹھ کر اپنے  
 اپنے کمروں میں چلے گئے۔



تین چار دن اور گزر گئے۔ یوں تو حالات پرسکون تھے لیکن  
 پیڑو اب بھی سائیکل کی طرح چھڑا ہوا تھا۔ مجھے ماسٹر بوجھن سے اس  
 کے بارے میں اطلاعات مل رہی تھیں۔ سکھدر بھی باہر کے ایک  
 دو چکر لگاتا تھا۔ وہ بھی اکثر دلچسپ خبریں لے کر آتا تھا۔ پیڑو  
 میری تلاش میں تھا۔ اس کے ادنیٰ شکاری کتوں کی طرح پورے شہر  
 میں میری بوسختی پر چر رہے تھے۔

چوتھے روز پانچھم ایک دلچسپ خبر لے کر آیا کہ پولیس نے  
 تقریباً کے قتل کے الزام میں اب باقاعدہ مقدمہ درج کر لیا تھا اور  
 پیڑو کو بھی ایک طرم نامزد کر دیا گیا تھا۔ اس روز ہم پر حملہ کرنے  
 والوں میں سے ایک ادنیٰ زندہ بچ کر بھاگ نکلا تھا اور اب پولیس

نے اسے اسی کیس میں گرفتار کر لیا تھا جبکہ پیڑو کے دو آدمیوں کے  
 قتل کے الزام میں نامعلوم افراد کے خلاف اور سائی کے قتل کے  
 الزام میں بھی نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا تھا۔  
 پولیس نے ابھی تک پیڑو پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا شہر میں ہونے والے  
 ہنگاموں توڑ پھوڑ اور قتل و غارت کے الزام میں بھی اگرچہ پیڑو  
 کے خلاف مقدمہ درج ہو چکا تھا۔ ان مقدمات میں بھی پیڑو کے  
 کردہ کے کئی لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا لیکن وہ سب چھٹی پچھلیاں  
 تھیں جبکہ کمرچھ پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں پولیس مصلحت سے  
 کام لے رہی تھی۔ پیڑو کو کئی معمولی غذا تو میسر تھا۔ وہ زیر زمین  
 دینا کا بادشاہ تھا۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود اس کے تعلقات بھی  
 اور تک تھے اور اس پولیس فی الحال اس پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے  
 میں ہچکچا رہی تھی۔ دوسری طرف پیڑو نے یہ بھی شور مچا رکھا تھا کہ  
 اس نے سائی کے اغوا اور قتل کے حوالے سے پولیس کو میرا نام دیا  
 تھا مگر پولیس نے ایف آئی آر میں میرا نام شامل کرنے کے بجائے  
 نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا تھا۔

اسی شام ماسٹر بوجھن سے فون پر بات ہوئی۔ اس کی باتوں سے  
 انکشاف ہوا کہ مہاراج کی موبائی سے کسی رپورٹ میں میرا نام  
 نہیں آسکا۔

”اور وہاں جس مقدمہ کے لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے وہ  
 یہ ہے کہ صبح تم لوگ کچن بوری کے لیے روانہ ہو رہے ہو۔“ ماسٹر  
 بوجھن کہہ رہا تھا ”صبح چھ بجے گاڑی تم لوگوں کو لینے کے لیے پہنچ  
 جائے گی جو تم لوگوں کو بس اسٹیشن پر پہنچا دے گی۔ میرے دو ادنیٰ  
 عام مسافروں کے ہمیں میں اس بس میں موجود ہوں۔ جو ناخن  
 پانچھم تک تم لوگوں کے ساتھ جائیں گے۔ اگر انہوں نے کوئی گزیر  
 محسوس کی تو کچن بوری تک چلے جائیں گے اور وہاں بھی تم لوگوں  
 کے آس پاس ہی رہیں گے اور اگر صورت حال معمول کے مطابق  
 ہوئی تو وہ ناخن پانچھم سے واپس آجائیں گے۔ اس کے بعد اپنا  
 خیال تم لوگ خود رکھو گے۔“

”مجھ کیا ماسٹر۔“ میں نے کہا۔

”کچن بوری بس اسٹیشن پر ہی نام کا ایک ادنیٰ تم لوگوں کے  
 استقبال کے لیے موجود ہوگا۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس کے  
 دائیں رخسار پر اگٹھنے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبہ ہے۔ میرا  
 شاگرد ہے اور تم لوگوں کی رہائش کا بندوبست بھی وہی کرے گا اور  
 کوئی بھی ضرورت ہو تو تم لوگ بلا تکلف اس سے کہہ سکتے ہو۔  
 اوکے! ٹھیک چھ بجے گاڑی تمہارے دروازے پر پہنچ جائے گی۔“

”تیس ماسٹر۔“ میں نے کہا اور پھر دوسری طرف سے فون بند  
 ہونے کے بعد میں نے بھی ریسپورڈ کر دیا۔

ماسٹر بوجھن کے اس فون کے بعد میں درج پر گرام بناتے  
 رہے۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ نیتا ہمارے  
 ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں یہ طے ہوا کہ اسے

صبح وائٹ ٹریٹ بھیج دیا جائے گا یا میں خود ماسٹر بوجھن سے بات  
 کروں گا۔ وہ اسے چند روز کے لیے چنایا جانے والا تھا۔  
 سمدھ کو ہم ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے اسے اتار دیا  
 تھا کہ وہ صبح مہاراج کے پاس واپس چلا جائے۔ میرا تو خیال تھا کہ  
 پانچھم کو بھی ساتھ نہ لے جایا جائے لیکن وہ ہمارے ساتھ جانے پر  
 ہند تھا۔

تھکی اور جاگتی رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی دواگئی  
 کی تیار کر کے نکلیں۔ اس مرتبہ کوئی افزائش نہیں تھی۔ خاصا  
 وقت تھا۔ وہ اطمینان سے اپنی چیزیں پیک کرتی رہیں۔ بعض ایسی  
 چیزیں الماریوں میں منتقل کر دی تھیں جو ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے  
 تھے۔ ان میں سائی کے محافظوں سے چھٹی ہوئی راتھیں بھی شامل  
 تھیں۔

ہم رات کو تقریباً دو بجے تک جاگتے رہے تھے لیکن صبح پانچ  
 بجے تھکی نہ صرف خود اٹھ گئی بلکہ اس نے ہم سب کو بھی جگا دیا  
 اور بچوں میں تمس کرنا شیتا کر کے رکھی۔

پونے چھ بجے کے قریب میں نے ماسٹر بوجھن سے فون پر بات  
 کرتے ہوئے اسے نیتا کے بارے میں بتا دیا کہ اسے آج تک کل  
 چنایا جانے والا تھا۔

ٹھیک چھ بجے وہی سیاہ وین پہنچ گئی جو اس سے پہلے بھی کئی  
 مرتبہ ہمارے استعمال میں آچکی تھی۔ جاگتی نے احتیاط سے بیگ  
 کے تمام دروازے لاک کر دیے اور ہم وین میں سوار ہو گئے۔ وین  
 میں وہی دو گھنٹن بھی بیٹھے ہوئے تھے جو لاچ میں قیام کے دوران  
 میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک نے انٹرکنٹیننٹل بس کے  
 ٹکٹ ہمارے حوالے کر دیے۔ بس پر بیٹھیں کل ہی یک کر ادنیٰ گئی  
 تھیں۔ سکھدر اور نیتا کے ٹکٹ بھی تھے جو میں نے اسے واپس  
 کر دیے۔

بس پونے سات بجے روانہ ہونے والی تھی۔ ہم دواگئی سے  
 صرف پانچ منٹ پہلے پہنچے تھے اور پھر ٹھیک پونے سات بجے بس  
 حرکت میں آگئی۔ دواگئی سے پہلے میں نے نیتا کی طرف دیکھا۔ اس  
 کے چہرے پر اڑا سی تھی۔ شاید اسے ہمارے ساتھ نہ جانے کا  
 انوس ہو رہا تھا۔

ہم شہر کے مضافاتی علاقوں سے نکل کر شمال مغرب کی طرف  
 جانے والی ہائی وے تین سو تیس پر آگئی۔ چار لین کی یہ کشادہ ہائی  
 وے سمت شاندار تھی۔ ہائی وے کے دونوں طرف آتہ گاہ سبز  
 ی سبز دکھائی دے رہا تھا۔ دھان کے کیت تھے۔ سڑک کے قریب  
 کھیتوں میں کئی جگہوں پر کھجور کی چوڑے سیجے والی ٹیپاں پنے  
 کسان کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ان میں موہبی تھے اور غور میں  
 بھی۔

کچن بوری ہنگام سے ایک سو اسی کلومیٹر کے فاصلے پر رہا  
 کی سرحد پر واقع ہے۔ کچن بوری کے لیے اگرچہ ٹرین سروس بھی

موجود ہے لیکن میرے خیال میں جو موزوں وغیرہ سے سفر کرنے میں  
 ہے وہ ٹرین کے سفر میں نہیں۔

بس میں پانچھم ہم سے الگ بیٹھا تھا۔ ایک سیٹ پر جاگتی اور  
 پراسا بیٹھے ہوئے تھے اور ان سے پیچھے والی سیٹ پر میں اور تھکی۔  
 سکھدر اور نیتا کے ٹکٹ واپس کر دیے گئے تھے۔ ان کی بیٹھیں دو  
 پورچین ٹورسٹ لیزر کو دے دی گئی تھیں۔ بس کی تمام بیٹھیں بھری  
 ہوئی تھیں اور میں مسافروں کو گھورتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی  
 کوشش کر رہا تھا کہ وہ دو ادنیٰ کون ہو سکتے تھے جو ہماری حفاظت کے  
 لیے اس بس میں سفر کر رہے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کوئی شخص نظر  
 نہیں آیا جس پر اس قسم کا گمان ہو سکے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بس ناخن پانچھم کی حدود میں  
 داخل ہو گئی۔ یہ شہر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صاف ستھری کشادہ سڑکیں  
 خوب صورت عمارتیں۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔  
 سڑکوں پر بدق نظر آ رہی تھی۔ بازار پوری طرح کھل چکے تھے۔ ہر  
 طرف زندگی رواں دواں دکھائی دے رہی تھی۔

بس اپنے اسٹیشن پر رکی تو مختلف سیٹوں سے دو نوجوان اٹھ  
 گئے۔ ان کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان میں ایک  
 آگے والی سیٹ سے اٹھا تھا اور دو سرا پیچھے والی سیٹ سے۔ تھکی  
 باشندوں کی محروم کا اندازہ لگانا کافی دشوار ہوتا ہے لیکن میرے  
 خیال میں ان میں کوئی بھی میس سے کم اور تیس سے زیادہ کا نہیں  
 تھا۔ ان میں سے ایک نے بس کے آگے والے دروازے سے  
 اترتے ہوئے میری طرف دیکھا بھی تھا۔ یہاں صرف وہی دو مسافر  
 اترے تھے اس لیے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں  
 آئی کہ یہی دو ہمارے محافظ تھے۔ اگر وہ کوئی گزیر محسوس کرتے تو  
 آگے تک ہمارے ساتھ ہی جاتے لیکن وہ یہاں اتر گئے تھے جس کا  
 مطلب تھا کہ ان میں بس کوئی ایسا مشتبہ شخص نظر نہیں آیا تھا  
 جس سے ہمیں کوئی خطرہ ہو سکتا۔

بس وہاں صرف پانچ منٹ رکی تھی۔ خالی ہونے والی سیٹوں پر  
 دو نئے مسافر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی  
 تھی کہ وہ دونوں نوجوان اس وقت تک قریب ہی کھڑے رہے تھے  
 جب تک بس وہاں سے روانہ نہیں ہو گئی تھی۔

میدانی علاقہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ اس سے آگے  
 پہاڑی علاقہ شروع ہو رہا تھا۔ سڑک بہتور بلندی کی طرف جاری  
 تھی۔ میں مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ مجھے سربسز پہاڑی  
 مناظر بہت اچھے لگ رہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس سفر  
 سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اس طرح آزادی  
 سے سفر کرنے کا موقع ملا تھا اور میں بار بار اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی  
 تھکی کو بھی اطراف میں پھیلے ہوئے خوب صورت قدرتی مناظر کی  
 طرف متوجہ کر رہا تھا۔ مجھے خوش دیکھ کر تھکی بھی خوش ہو رہی  
 تھی۔

بس اب پہاڑوں کے بیچ میں مل کھاتی ہوئی سڑک پر سڑکری تھی۔ جبکہ جگہ خطرناک موڑ تھے۔ بعض موڑ تو اتنے خطرناک تھے کہ ڈرائیور کی ذرا سی غفلت مسافروں کی اندھکتا موت کا باعث بن سکتی تھی۔

بچن بوری واقعی خوب صورت شہر تھا۔ پہاڑوں طرف سبزہ اور پھول۔ آواز اور خوشگوار ہوا سے فضا مرکب رہی تھی۔

شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی بس سوا دس بجے کے قریب ڈسٹریکشن پر رکی تو مسافر سٹیشن چھوڑنے لگے۔ ہم اپنی سٹیشن پر بیٹھے رہے۔ تمام مسافروں کے اترنے کے بعد ہی ہم نے اپنی سٹیشن چھوڑ دی تھیں۔

بس سے اترتے ہی میں نے پری نامی ایک شخص کو پہچان لیا۔ اگر ماسٹر ہو جن اس کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہ بھی جانتا تو میں اسے پہچان لیتا۔ میں بنگالک میں مہاراج کے جہانگیر میں اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر انگوٹھے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبہ قدرتی تھا اور یہ سیاہ دھبہ ہی اس کی سب سے بڑی شناخت تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا اور سب سے پہلے اس نے مجھے پوچھا۔ ”جواب میں“ میں نے بھی اسے وہ (مارشل آرٹس میں جھک کر تعظیم دینا) کیا اور پھر ہم نے بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ اس نے قحطی جاگتی اور پر سادہ بھی ہاتھ ملایا۔ باغیچہ میں دوری رہا تھا۔ دراصل ہمارا پہلے ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ باغیچہ میں ہم سے الگ اور دور رہے گا۔ ایسا ہم نے اعتقاد کیا تھا تاکہ اگر ہم سب کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو وہ الگ رہ کر ہماری مدد کر سکے۔

بس ڈسٹریکشن کے باہر پبلک پارکنگ ایریا میں پری کی اسٹیشن دیکھ کر موجود تھی۔ دین میں بیٹھے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ باغیچہ ایک ٹک ٹک میں بیٹھ رہا تھا۔

بچن بوری سیاحت کا مرکز اور بڑا خوب صورت شہر ہے۔ پری اسٹیشن دیکھ کر چلاتے ہوئے ہمیں اس شہر کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔ یہ خوب صورت شہر کیلئے ایم فوڈ (ڈسٹرکٹ) میں تقسیم ہے جن میں سے پانچ ایم فوڈ سٹیشن قدرتی مناظر اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز تھے۔

اسٹیشن دیکھ کر ایم فوڈ پارکنگ سٹیشن بوری کے علاقے میں درختوں میں ڈھکے ہوئے ایک خوب صورت کالج کے سامنے رک گئی۔ میں بیچے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار کالج اور تھے۔ آس پاس سبزے سے ڈھکی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن کے پیچھے کی پہاڑیاں بتدریج بلند ہوتی چلی ن گئیں۔ پری نے ہماری رہائش کے لیے اس کالج کا انتظام خاص طور پر کیا تھا۔ اس میں شہر میں تھا کہ یہ بڑی خوب صورت جگہ تھی لیکن سیکورٹی کے نقطہ نگاہ سے قطعی مناسب نہیں تھی۔

میرا تو ہمیں نہایت آسانی سے چاروں طرف سے گھیرا جاسکتا تھا۔ پری نامی تھا کہ ریور کو اسے کا وہ تاریخی جیل بھی میرا ہے زیادہ دور نہیں ہے جو جاپانیوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بنایا تھا۔ جاپانی فوج کی عمرانی میں تعمیر ہونے والے اس جیل نے ہزاروں جنگی قیدیوں کی جانوں کی بھینٹ بنی تھی۔ اتحادی فوجیوں نے ہزاروں جنگی قیدیوں کو اس جیل کی تعمیر پر لگایا تھا جن میں بچو فو کے دوران میں ملے مگر کرہلاک ہوئے۔ کچھ جاپانی فوجیوں نے ظلم و تعدد کا شکار ہوئے اور بہت سے کالہ دھاتے والے قیدیوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا۔ پل پر سے گزرنے والی ریلوے لائن آج بھی ”تھوڑے ریلوے“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے ایک طرف وہ تاریخی قبرستان ہے جہاں پل کی تعمیر کے دوران ہلاک ہونے والے یا گولیوں سے اڑا دیے جانے والے ۷۷۷ جنگی قیدیوں کو دفن کیا گیا تھا۔ دوسرا تاریخی قبرستان چوگنگ کالی میں ہے جہاں پونے دو ہزار جنگی قیدیوں کی قبریں ہیں۔

میں بڑی دلچسپی سے پری کی باتیں سن رہا تھا۔ بلاخر ہم اندر آ گئے۔ یہ کالج چار کڑوں پر مشتمل تھا۔ بینہ دو مڑے اور ایک شنگ روپ اندر داخل ہونے کے بعد انکشاف ہوا کہ میرا ایک اویڑ عمر ملازمہ بھی موجود تھی جو بچن میں ہمارے لیے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔

پری سے بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد جب وہ واپس جانے لگا تو اس نے اسٹیشن دیکھ کر جاپانی میرے حوالے کر دی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم سرو تفریح کے لیے یہاں آئے ہیں اور ہمیں گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔

”یہ گاڑی صرف شہر کی سڑکوں پر چلانے کے لیے ہے۔ پہاڑوں میں تقریبی مقامات پر جانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ کل میں دوسری گاڑی کا بندوبست کروں گا اور۔۔۔“ اس نے جب سے اپنا کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا ”جب بھی میری ضرورت ہو“ فون کرو۔ تا۔ اس کارڈ پر میرے جہانگیر کا بھی نمبر ہے اور گھر کا بھی۔“

”کیا اس کالج میں ٹیلی فون بھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہاں۔ تم نے شاید دیکھا نہیں۔ لوگ روم میں صوفے کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”ہم تو ایک لمبا چکر لگا کر آئے ہیں لیکن بازار جانے کے لیے پیدل کا راستہ میرا ہے۔ بہت قریب ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

پری کے جانے کے بعد ہم پر آمدہ میں بھیج دی گئی۔ بچن بچے گئے۔ دوسرا کالج وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ دوسرے کالج بھی تقریباً زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ایک کالج کے برآمدہ میں کرسیوں پر ایک یورپی مرد اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تمام کالج کا طرز تعمیر ایک ہی جیسا تھا اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگا کہ

یہ کالج کسی ایک ہی شخص یا کئی کی ملکیت تھے جو سیاحوں کو کرائے پر دیتے تھے۔ ہمارے لیے یہ نائنچ بالکل مناسب نہیں ہے۔“ میں نے پرساد کی طرف دیکھا۔ ”وہ کیا؟ ہمیں کسی اور کالج کا بندوبست کرنا پڑے گا جو محفوظ ہو۔ میرا تو ہم آسانی سے گھیرے میں آسکتے ہیں۔“

”میرا ایک دوست بھی کچن بوری میں رہتا ہے۔ اسے تلاش کروں گا۔ اگر اس سے ملاقات ہوگئی تو شاید وہ کوئی بندوبست کر سکے۔“ پرساد نے جواب دیا۔

دارا اپنی فانگ کے بارے میں ہم نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ اس میں شہر نہیں کہ یہاں ہم انہی سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آئے تھے لیکن ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ ہم اطمینان سے بہت سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا چاہتے تھے۔

رات کو ہم نے صرف ڈھائی تین گھنٹوں کی نیند لی تھی اور اب میں کچھ سستی اور تھکن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ دوسروں کے چوں پر بھی کچھ ایسی ہی آثار نظر آ رہے تھے۔ پچھلے چند روز ہمارے لیے بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے تھے اور میرے خیال میں کم از کم آج کا دن اس پر سکون جگہ پر آرام کر لینا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر ایک بیڈ روم میں آیا اور جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ تین بجے دوسرے کھانے کے بعد ہم گھومنے کے لیے نکل گئے۔ ہم نے گاڑی ایک بہت بڑے شاہک سینٹر کے پارکنگ لائن پر چھوڑ دی اور پیدل ہی گھومنے لگے۔ دارا ہم اور بچن فانگ اس شہر میں موجود تھے۔ دارا اور بچن فانگ اگرچہ ڈھکی تھے لیکن کیا اس کے کسی آدمی سے آہنا سامنا ہونے کا امکان تھا اس لیے شہر کی سڑک تفریح کے لیے بھی ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا۔ میں اور قحطی الگ تھے اور جاگتی پرساد کے ساتھ ہم سے الگ تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھے۔ اس طرح دو پارٹنوں میں بیٹے کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک پارٹن نظروں میں آجائے تو دوسری محفوظ رہے اور پھر اچھے بھی تھا جو ہم سے بالکل الگ تھلک تھا۔ وہ بس سے اترتے ہی کسی دوسری جگہ پر چلا گیا تھا اور ابھی تک اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ہمارے گھر میں گھومتے پھرتے نہیں بل کہیں مل جائے گا۔

پانچ بجے کے قریب میں اور قحطی ایک کافی ہاؤس میں گھس گئے۔ ان دو گھنٹوں کے دوران میں قحطی نے کچھ شاہک بھی کر لی تھی۔ ہم کافی کی پکٹیاں لے رہے تھے کہ ایک فربہ اندام آدمی کو کافی ہاؤس میں داخل ہوتے دیکھ کر قحطی چوک سی گئی۔ اس شخص کی عمر پچاس تیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ قحطی کا شاہد تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاہک بیک تھا۔ وہ کافی ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد

ادھر ادھر دیکھے بغیر ٹیلی فون ہاتھ میں داخل ہو گیا جو اس وقت خالی رہا ہوا تھا۔ قحطی بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس شخص نے کب پر ہنگامہ ہوا ریسپورڈ اٹھایا اور جب سے نکل کر سلاٹ میں ڈالنے کے بعد نمبر ملانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے کب کو دبایا تو کسے نیچے والے خانے سے باہر آ گئے۔ اس نے دو تین مرتبہ گوشہ گوشہ کی مگر غالباً فون خراب تھا۔ کال نہیں ہو سکی۔

”کیا بات ہے۔ تم اس شخص کو دیکھ کر چوک سی گئی تھیں۔ یہ کون ہے؟“ میں نے قحطی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیاں کیے۔ میں پوچھا۔ ”ہم جس میز پر بیٹھے ہوئے تھے وہ کاؤنٹر کے بالکل ساتھ تھی لیکن کاؤنٹر کے ہمارے سامنے والے حصے پر ٹائی چوٹ گم“ جاگلیٹ اور اس قسم کی چیزوں سے بھرے ہوئے جارکے ہوئے تھے اور کاؤنٹر کے سامنے کھڑا ہوا شخص ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

”یہ شخص سرجن ہے اور بنگال کا رہنے والا ہے۔“ قحطی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا ”میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسے زیر زمین دنیا کا ڈاکٹر بھی کہا جاتا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ آپس کے لڑائی جھگڑوں یا پولیس مقابلوں میں زخمی ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ علاج کے لیے کسی اسپتال کا رخ نہیں کر سکتے۔ اس جیسے ڈاکٹر ہی ہماری رقم کے لالچ میں ان کا چوری چھپے علاج کرتے ہیں۔“ ”تم یہ سب کچھ کیسے جانتی ہو؟“ میں نے سوالیہ لٹا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بنگال کی جس گلی میں میرا ایک مساجد بار تھا اس گلی میں اس کا کلینک بھی تھا۔“ قحطی نے بتایا ”یہ بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ایک دو مرتبہ پولیس نے اس کے کلینک پر چھاپے بھی مارے تھے لیکن یہ ہر مرتبہ پچھتا رہا تھا اور بلاخر یہ وہاں سے کلینک فروخت کر کے کہیں اور چلا گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”تمہیں یاد ہے“ سائی نے بتایا تھا کہ دو ماہر ڈاکٹر بھی دارا اور بچن فانگ کے علاج کے لیے ان کے ساتھ موجود ہیں۔ کیا یہ ان دنوں میں سے ایک نہیں ہو سکتا۔ یہ پیسے کے لالچ میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کی تلاش کے لیے زیادہ ہنگامہ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کا پیچھا کر کے ہم آسانی سے ان کے ٹھکانے پر پہنچ سکتے ہیں۔“ وہ شخص اب بھی بار بار سلاٹ میں سے ڈال کر نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر اس نے جھجھکاتے ہوئے انداز میں ریسپورڈ پر کب پر لگا دیا اور بھتہ سے نکل کر کاؤنٹر کے سامنے آ گیا۔

”وہ ٹیلی فون خراب ہے۔ مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے بلین۔“ اس نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی لمبے میں کہا۔

کاؤنٹر میں نے ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف سرکا دیا۔ میں اپنے سامنے رکھے ہوئے بیٹھے کے مرتبوں کی آڑ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ قریب سے اس کا چہرہ کسی بلی ڈاک کی طرح کا لگ رہا تھا۔ وہ ریسورٹ گھر کا نمبر ملا رہا تھا۔

”اے... یس ہاں... میں ڈاکٹر فان بول رہا ہوں۔“ وہ لائن طے پر بولا ”تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے ڈاکٹر جاگی کو یہاں دیکھا ہے۔ ہاں ہاں۔ وہ کچھ بوری میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی ہے۔ نہیں ہاں۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ یہ وہی آدمی ہے جسے پیڑھو نے سولڈرنگ آئرن سے داغنا تھا۔ یس... یس ہاں۔ میں عطا رہوں گا۔ تم فکر مت کرو ہاں۔ وہ مجھے جانتے ہی نہیں تو مجھ پر شبہ کیسے کریں گے۔ میں ان کے ٹھکانے کا پتا لگا کر واپس آ جاؤں گا۔“ وہ خاموش ہو کر کچھ دیر دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر ”یس ہاں“ کہتے ہوئے ریسورٹ گھر دیا۔

میں اور تھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ تھائی کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ اس موٹے کا نام ڈاکٹر فان تھا اور اس کے بارے میں تھائی کا شبہ درست نکلا تھا۔ اس نے جاگی اور پراساد کو دیکھ کر پہچان لیا تھا اور فون پر دارا یا کم کو خبر کروی تھی اور غالباً اسے جاگی اور پراساد کی عمرانی کر کے ان کا ٹھکانا معلوم کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

جاگی اور پراساد کہاں تھے؟ وہ دونوں ہم سے زیادہ دور نہیں تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ہمیں کافی ہاؤس میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بھی کسی ریسورٹ یا کافی ہاؤس میں چلے گئے تھے اور ڈاکٹر فان نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

ڈاکٹر فان کافی ہاؤس سے باہر جا چکا تھا۔

”اسے اب واپس نہیں جانا چاہیے تھائی۔“ میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ”اگر یہ واپس چلا گیا تو ہمارے لیے یہاں ایک دن بھی ٹکنا مشکل ہو جائے گا۔“

ہم نے بھی فوراً ہی کرسیاں چھوڑ دیں۔ میں نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور باہر ہم آگئے۔

ڈاکٹر فان دائیں طرف فٹ پاتھ پر کھڑا سڑک کے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی سڑک کے دوسری طرف دیکھا تو بات میری سمجھ میں آگئی۔ سامنے بھی ایک کافی ہاؤس تھا۔ میں اور تھائی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند گز آگے ایک نیوز اسٹینڈ کے قریب رک گئے۔

”میرا خیال ہے وہ مجھے اور تمہیں نہیں جانتا۔ ورنہ ہمیں دیکھ کر چمک جاتا۔“ میں نے نیوز اسٹینڈ سے ایک میگزین اٹھا لیا

”میرا خیال ہے جاگی اور پراساد سامنے والے کافی ہاؤس میں

ہیں۔“ تھائی نے بھی سرگوشی میں کہا ”تم یہیں رکو۔ میں جا کر ادھر صورت حال سے آگاہ کر دیتی ہوں۔ اس کے بعد ہی اس شخص گھیرنے کی کوشش کریں گے۔“

”ان سے کوہہ بندہ منہ بعد کافی ہاؤس سے نکل کر شاہجی سینٹر کی طرف چلے رہیں جس کے سامنے والے پارک لائٹ پر ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ یہ یقیناً ان کے پیچھے جائے گا اور اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔“ میں نے کہا۔

تھائی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کر کے دوسری طرف گئی۔ میں بھی عطا دیکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندر تھا کہ دارا کا کوئی ایسا آدمی اس طرف نہ آجائے جو ہمیں پچھو۔

تھائی سامنے والے کافی ہاؤس کے سامنے رک کر اس طرف ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اسے کسی کی تلاش ہو پھر وہ کافی ہاؤس اندر گھس گئی لیکن اس کی واپسی میں تین منٹ سے زیادہ نہیں رہے تھے۔

”میں نے انہیں سمجھا دیا ہے۔“ اس نے میرے ہاتھ سے میگزین لیتے ہوئے سرگوشی کی ”وہ دونوں ٹھیک پندہ منہ بعد کافی ہاؤس سے نکل جائیں گے۔“

وہ کھڑے کھڑے میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اگرچہ زبان میں ہنگامے سے شائع ہونے والے اس میگزین میں مختلف موضوعات پر مضامین کے علاوہ عیاں تصاویر اور اشتہارات بھی تھے اور پھر ایک رنگین اشتہار دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ یہ کچھ بوری کے کسی مساج پارلر کا اشتہار تھا اور اس کے ساتھ ایک حسین لڑکی کی نیم عیاں تصویر بھی تھی۔

”اوہ! یہ تو لڑکا ہے۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہیڈاؤن؟“ میں نے پوچھا۔

”میری دوست۔“ تھائی نے کہا ”کچھ عرصہ پہلے ہنگامے میں تھی۔ اس نے مساج کا کام سمجھ سے ہی سیکھا تھا پھر اپنا پارلر کھول دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ پارلر بچ کر کہیں چلی گئی تھی۔ اس نے کچھ بوری میں مساج پارلر کھول رکھا ہے۔ یہ ہمارے کام آ سکتی ہے۔“ اس نے اسٹال والے کو میگزین کی قیمت ادا کر دی اور میگزین شاہجی بیگ میں ڈال لیا۔

”وہ لوگ کافی ہاؤس سے نکل رہے ہیں۔“ میں نے پراساد کو جاگی کو سامنے والے کافی ہاؤس سے نکلنے دیکھ کر سرگوشی کی۔

وہ دونوں کافی ہاؤس سے نکل کر ادھر ادھر دیکھے بغیر بائیں طرف مڑ گئے تھے۔ جاگی کے ہاتھ میں بھی ایک شاہجی بیگ تھا اور پراساد نے جو تے کے ڈبے کے برابر ایک ڈاگ اٹھا رکھا تھا۔

ڈاکٹر فان بھی ہمارے قریب سے گزر کر اس طرف چلے گا۔ کسی کا تعاقب یا عمرانی کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ جاگی اور پراساد کو اگر پتا نہ دیا جاتا تو انہیں شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی

عمرانی کی جارہی ہے۔ وہ سڑک کے ایک طرف تھے اور عمرانی کرنے والا سڑک کے دوسری طرف ان کے متوازی چل رہا تھا۔ جاگی اور پراساد سامنے میں کئی گھنٹہ توڑی دیر کے لیے رکے تھے۔ ان کی وجہ سے ڈاکٹر فان کو اور پھر ہمیں بھی رکتا رہا تھا۔ بالآخر دونوں شاہجی سینٹر کے سامنے والے اس پارک لائٹ کے قریب پہنچ گئے جہاں ہماری اسٹیشن دیگن کھڑی تھی۔

ڈاکٹر فان کو ابھی تک شبہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی بھی عمرانی ہو رہی ہے۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس وقت سوا چھ بج رہے تھے۔ سورج بلند پہاڑوں کے پیچھے چمک رہا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں سورج عام طور پر جلدی غروب ہو جاتا ہے۔ اسٹیشن لائٹیں اور دکانوں کی جگیاں جلی گئی تھیں۔ اس شاہجی سینٹر میں اور اس کے سامنے بڑی رونق تھی۔ زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی جو خریداری کر رہے تھے۔ لوگوں کے اس جھوم میں ایک آدمی کو دیکھ کر کسی پر شک کیا۔

وہ پھر تھا جو ایک دکان کے سامنے کھڑا پارک لائٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ لگا کہ میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس طرف سے گزرتے ہوئے اس نے ہماری گاڑی دیکھ لی تھی اور وہیں کھڑا ہماری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اور تھائی ملتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

”ہیلو ہاں۔“ میں نے پارک لائٹ میں وہ گاڑی۔“

”میں سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”ہمارے بائیں طرف فٹ پاتھ کے کنارے پر ایک موٹا گاڑی کھڑا ہے۔ نیلے سوٹ والا اس کے ہاتھ میں پیلے اور سرخ فرمیں والا شاہجی بیگ ہے۔ اسے لے کر پارک لائٹ میں گاڑی کے پاس پہنچ جاؤ۔ کسی کو شبہ نہ ہونے پائے کہ تم اسے زبردستی لے جا رہے ہو۔“

”توکن ہے وہ؟“ پاتھم نے کن انکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دارا اور جی فانگ کا معالج ڈاکٹر فان۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے جاگی اور پراساد کو پہچان لیا ہے اور ٹیلی فون پر دارا دغیو کو اطلاع بھی دے دی ہے اور اب یہ ان دونوں کا پیچھا کر کے ہمارا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا ہے۔“

”میں سمجھ گیا ہاں۔“ پاتھم نے کہا ”تم فکر مت کرو۔ اس کا بدولت ہو جائے گا۔“

میں تھائی کو اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور زہرا کرا سنگ سے سڑک پار کر کے ہم دونوں پارک لائٹ میں آگئے۔ جاگی اور پراساد بھی اسٹیشن دیگن کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جاگی پراسادی کے ڈاکٹر فان کے سامنے دو بڑی رک کر اشارہ کیا اور وہ گاڑی کا آلا کھولنے لگا۔ میں نے سڑک دوسری طرف دیکھا تو میرے ہونٹوں پر خوف کی مسکراہٹ آگئی۔ پاتھم ڈاکٹر فان کو لے کر آ رہا تھا۔ پاتھم ڈاکٹر فان کے بالکل ساتھ مل کر چل رہا تھا اس کا دایاں ہاتھ جیک

کی جیب میں تھا۔ ڈاکٹر فان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ پراساد ڈاکٹر فان کے ہاتھ پر اور جاگی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ پاتھم نے اسٹیشن دیگن کا پیچھا دواڑہ کھولا اور ڈاکٹر فان کو اندر دھکا دے دیا۔ ڈاکٹر فان کے منہ سے کراہ سی نکل گئی تھی۔ ان کے اندر بیٹھے ہی میں اور تھائی بھی اندر گھس گئے اور دواڑہ بند کر لیا۔ ہمیں دیکھ کر ڈاکٹر فان کا چہرہ خوف سے اس طرح چمکا پڑ گیا جیسے سارا خون خڑ گیا ہو۔ وہ راتے میں ہمیں دو تین مرتبہ دیکھ پکا لیکن اس وقت اسے ہم پر ذرا سامی شبہ نہیں ہوا تھا اور اب ہمیں دیکھ کر اس پر بدہشت سی طاری ہو گئی تھی۔

”ٹھک۔۔۔ کون ہو تم لوگ؟“ وہ باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے پھلکا ”لوگ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہو اور یہ ایک سنگین جرم ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے کہ ہم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔“ میں نے پراساد کو جواب دیا۔

”مم۔۔۔ میں ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔“ وہ پھر پھلکا۔ اب پاتھم کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس پر ہلکی سی کھپکی بھی طاری ہو رہی تھی۔ ”میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ اگر تم لوگ۔۔۔“

”ہمیں تمہاری رقم کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”اب تم خاموشی سے بیٹھے رہو اور اگر تم نے کوئی... گزرو گزرنے کی کوشش کی تو یہ ٹھیس تمہیں بلا دینگولی مار دے گا۔ اسے گولیاں چلانے کا بہت شوق ہے۔“ میں نے پاتھم کی طرف اشارہ کیا۔

”رقم کی ضرورت نہیں تو پھر مجھے اس طرح اغوا کر کے کیوں لے جا رہے ہو؟“ ڈاکٹر فان اب باقاعدہ کانپنے لگا تھا۔

”اس لیے کہ تم ڈاکٹر جاگی اور پراساد کا پیچھا کر رہے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کا تعاقب کرنا بھی ایک جرم ہے اور پھر تم نے دارا اور جی فانگ کو بھی ان کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔

ایسی صورت میں ہم تمہیں کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔“

”مم۔۔۔ میں کسی جاگی یا دارا کو نہیں جانتا۔“ ڈاکٹر فان کا چہرہ کچھ اور سفید پڑ گیا۔

”اب خاموش بیٹھے رہو۔ زبان کھولی تو دل میں سوراخ کر دوں گا۔“ پاتھم نے غراتے ہوئے پستول کی نال اس کے پھلو سے لگا دی۔

اس دوران میں اسٹیشن دیگن پارک لائٹ سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ یہ سیاحت کا بہترین تھا۔ شہر کی سڑک پر رونق اور چل پل تھی۔ اسٹیشن دیگن مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی اس راستے پر آگئی جو پہاڑوں کی طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد ہم اپنے کالج میں پہنچ گئے۔ دوسرے ایک کالج میں دو سنی نظر آ رہی تھی جبکہ باقی کالج تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر فان نے یہ اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی

مجھے چھوڑ دو۔ میں انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔  
 ”یہ کام تو تم پہلی بار کر رہے ہو۔“ میں نے اسے ٹھوکر مارنے  
 ہوئے کہا ”تم نے انہیں جاگایا اور ہر سادکے بارے میں اطلاع دی  
 دی تھی اور وہ لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ صورت حال  
 اندازہ نہ لگا سکیں۔ وہ خود بخود ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں بھی  
 گوری میں موجود ہوں اور ممکن ہے یہ اطلاع ملنے کے بعد انہیں  
 نے شہر میں میری تلاش شروع کر دی ہو۔ تم نے ہمیں جو نقصان  
 پہنچایا ہے اس کی جاتی ممکن نہیں اور تمہیں اس کی سزا ضرور  
 ملے گی۔“

میں نے ہر ساد کو اشارہ کیا۔ وہ ڈاکٹر خان کو گھسیٹتا ہوا چٹان  
 دوسرے کنارے پر لے گیا۔ اس طرف عمودی ڈھلان تھی جو ماہ

سُتَرَفِ بَیچے تک چلی گئی تھی۔

”تمہیں ایک شرط پر معاف کیا جا سکتا ہے“ پر ساد نے کہا:

”میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔“ ڈاکٹر خان جلدی سے بولا:

اس کی آنکھوں میں امید کی کرن ابھر آئی تھی۔  
 ”اس راستے سے اتر کر اس کالج تک جاؤ اور دارا کو بتا دو  
 وجدان نے اس کے ٹھکانے کا پتا چلایا ہے اور وہ بہت جلد ان  
 دو دودھ تھکے کرنے والا ہے۔“  
 ”مہمہ میں جانا ہوں۔ ابھی جاتا ہوں۔“ ڈاکٹر خان جلو  
 سے بولا۔  
 وہ عموماً راستے بہت خطرناک تھا۔ ذرا سی غلطی موت کے  
 میں پہنچا سکتی تھی۔ اگر وہ مرنے سے بچ سکیا تو یک دو دن یا

نوٹ ہی سکتی تھیں مگر ڈاکٹر خان نے اس شرط کو غنیمت سمجھا۔  
اس نے دھولان پر سلا قدم رکھا ہی تھا کہ پرساؤ نے اس کا نام  
کر پکارا۔ ڈاکٹر خان نے گردن کھما کر اس کی طرف دیکھا اور غم  
اسی لمحے پرساؤ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے شعلہ افکار

کی آواز کے ساتھ ہی خاموش فضا میں ڈالرفان کی جگہ بھی گڑ  
تھی۔ میں پرساد کے نشانے کی وادہ یہ بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تاراً

کے باوجود وہ ڈاکٹر کی پیشانی میں کھٹی تھی۔ وہ بچہ کرا اور غصہ ڈھلان پر لڑھک چلا گیا۔  
وہ کالج وہاں سے سو گز سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سناٹے فائر کی کواڑ وہاں ضرور سنی گئی ہوگی۔  
”چلو بس۔“ ہر سادے پتول جب میں ڈالتے ہوئے کام رات میں نہیں توجہ اٹھائیں ڈاکٹر کان کی لاش مل جائے گی اور لاش ہمارا بیٹا نام دار اک بچہ پھارے گی۔“  
ہم دونوں چٹان سے اترنے لگے مجھے ڈاکٹر کان کی موت کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ ہماری نگلوں میں آتا تو

دُعا کو ہمارے ٹھکانے کے بارے میں بتا دیا اور وہ ہمیں دُعا چھوڑتے۔ ڈاکٹر خان سے تو ہم نے نجات حاصل کر لی تھی لیکن اور اس کے ساتھیوں کو یہ خبر بحال مل چکی تھی کہ ہم سچے ہیں۔

”تم لوگ جاؤ باس۔“ اس نے کہا ”میں اس فائر کے بعد ان لوگوں کا رُی ایجنٹ دیکھنا چاہتا ہوں اور اب میں تمہاری طرف واپس نہیں آؤں گا۔“ صحابہ قات ہو گئی لیکن اگر کوئی ایمر بھی ہو گئی تو میں رابطہ کروں گا۔ میں نے تمہارا فون نمبر نوٹ کر لیا ہے۔“

لہذا واقعی بڑے کام کی عورت ثابت ہوئی تھی۔ سب کیا رہے تھے

لیڑاؤ والی داستان بڑی دلچسپ تھی۔ کئی سال پہلے جنگاک میں  
تھائی سے مساجد کی مرمتنگ حاصل کرنے کے بعد اس نے شہر کے  
ایک پوش علاقے میں اپنا مساجد پارلر کھول لیا تھا۔ اس کے حسن  
شباب کی وجہ سے پارلر خوب چل نکلا تھا۔ اپنی مدد کے لیے اس  
نے چند اور حسین لڑکیاں بھی رکھ لی تھیں۔

وہ علاقہ زیرِ فتنہ دینا کہ بے تاج بادشاہ ٹانگیر کے زیرِ اثر تھا۔ ٹانگیر کے آدمی اس علاقے میں دکانوں اور کاروباری لوگوں سے بہت موصول کرتے رہتے تھے۔ تقریباً ایک سال بعد لیزا بھی ان کی نظر میں آگئی۔ وہ مزید تو ٹانگیر کے آدمی بہتالینے آئے تھے۔

حقانی نے اسے اپنے پارلیمنٹ سے آگاہ کیا تو لیزا کی بچکانہ ہنست کے بغیر اپنا وہ کانج ہمارے حوالے کرنے کو تیار ہو گئی۔  
 ”تم جانتے ہو تو آج شام کو وہ کانج دیکھ لو۔“ اس نے کہا ”میں ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچا دوں گی۔ کل صبح تم لوگ وہاں منتقل ہو جاؤ۔“

”ساتھ نہیں۔“ کیزا نے جواب دیا ”میں ٹھیک سات بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم لوگ وہاں آ جاؤ۔ کالج تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ تم لوگ آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بتا سمجھانے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ ہم پہنچ جائیں گے۔“ اس مرتبہ حنائی کے بجائے میں نے جواب دیا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم جہے بجے شام نکل جائیں گے لیکن دوپہر کو اچانک ہی تھالی کو بخار ہو گیا۔ بخار کے ساتھ ہی وہ سردی سے



کے اوپر ڈال دیے گئے لیکن اس کے باوجود سردی سے غصہ کرتی رہی۔  
”لیٹو ہو گیا ہے۔“ جاگی نے اسے دیکھ کر بتایا ”دوا منگوانی ہوگی لیکن۔۔۔“

”تم لکھ کر دے دو۔ میں جا کر لے آتا ہوں۔“ میں بچ میں بول پڑا۔

”تم کیسے جاؤ گے۔“ جاگی نے کہا ”صبح فون پر پاتھم نے بتایا بھی تھا۔ دارا کے آدمی ہم سب کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی ان کی نظروں میں آگیا تو سب مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اگر لیزا کو فون پر دواؤں کے نام لکھوا دیے جائیں تو وہ پہنچا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سیر پر ہوا میگزین اٹھا کر دے دیے۔ ”شمار میں اس کا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ تم فون کر کے اسے بتا دینا۔“ میں نے میگزین کھول کر اشتہار والا صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

جاگی نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر لایا۔ کال کسی اور نے ریسیور کی تھی لیکن ایک منٹ بعد لیزا لائن پر آگئی۔ جاگی نے اسے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے دواؤں کے نام بتا دیے اور یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ کسی اور کو بھیجنے کے بجائے دواؤں کے لئے کر خود آئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد لیزا مطلوبہ دواؤں کے لئے آگئی۔ جاگی نے پہلی خوراک اپنے ہاتھ سے قحالی کو کھلا دی۔

”ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ قحالی کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

میں نے قحالی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ رگھو دواؤں کی بہت تیز تھا۔ پیشانی انکارے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی سُرخ مچھری تھی۔

لیزا سے بنا ہوا آج شام کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔

”اب ہم دو تین دن تک تو میسر رہیں گے۔“ میں نے لیزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہیے ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں کسی وقت جا کر میں تمہارا وہ کالج دیکھ آؤں۔“

”جب بھی جانا جاؤ، مجھے فون کر دینا۔“ لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گئی۔

پرساد برآمدے میں تھا اور میں اور جاگی قحالی والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد قحالی سو گئی تو ہم دونوں بھی اٹھ کر برآمدے میں آ گئے اور وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

لیٹو کا بخارا ایک دن میں بچھا نہیں چھوڑا۔ قحالی کو بھی تین چار دن بعد ہی بخار سے مکمل طور پر نجات مل گئی تھی لیکن بخار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمزوری کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں تھی کہ ہم کہیں آتا سکتے۔ قحالی کی وجہ سے ہم بھی کہیں نہیں نکلے تھے۔ اسی دوران میں لیزا بھی باقاعدگی سے چکر لگاتی رہی تھی اور

پری بھی آتا رہا تھا۔ کالج میں آنے کے تیسرے دن اس نے ہم ایک کاروبار دی تھی اور اسٹیشن دیکھ کر گیا تھا۔ اس نے دارا پر ضرورت کا خیال رکھا تھا۔ کالج کی ملازمت بھی مریج تھا۔ اس کے بعد ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے مارکٹ چلی جاتی تھی۔

میں ہم پر پاتھم ہی ایک ایسا آدمی تھا جسے دارا اور اس کے ساتھی نہیں پہچان سکتے تھے اور وہ آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا اس سے ہمیں رپورٹ ملتی رہتی تھی۔ دارا کے آدمی اب بھی باز تلاش کر رہے تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس روز میں اور پرساد برآمدے میں پڑے ہوئے تھے کہ پاتھم آیا۔ وہ کچھ کہہ گیا ہوا تھا۔

”کیا ہوا پاتھم تمہاری شکل پر بارہ کیوں رہے ہیں؟ پرساد نے پوچھا۔

”دارا کے آدمی پری کو اغوا کر لے گئے ہیں۔“ پاتھم جواب دیا ”وہ چونکہ ہمارے جیکب کا آدمی ہے اس لئے اگر شہ ہے کہ وہ ہمارے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں۔“

تشدد کے ہمارے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ”اور۔۔۔ میں اچھل پڑا۔ بڑی تشویش ناک خبر تھی۔

”ایک اور پریشان کن خبر یہ ہے کہ دارا اور اس کے ساتھی اٹھنا کھانا بل چکے ہیں۔ میں آج کو رہا ہوا اس طرف نکل گیا تو وہ دونوں کالج خالی پڑے ہیں۔ کل تک وہ لوگ وہیں تھے، خیال ہے رات کو کسی وقت کالج خالی کر کے گئے ہیں۔“

”یہ اور بھی زیادہ تشویش ناک خبر ہے۔“ میں نے کہا ”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پری پر اغوا کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اب نہیں کہ وہ زبان کھول دے۔ وہ تو کسی سمجھ رہا ہو گا کہ ہم یہاں تفرق کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اصل معاملے سے تو ہم نے انکار ہی نہیں کیا تھا۔“

”وہ ہمارا جاک آدمی ہے۔“ پرساد نے کہا ”اور ہمارا کے آدمیوں کا تجربہ ہمیں ہو چکا ہے۔ پری کو میں جانتا تو نہیں مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔ جس طرح اسے اٹھا گیا ہے اس سے معاملے کی یہ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی ہمت دے گا لیکن تمہارے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔“

”کیا تمہارے خیال میں ماسٹر ہو جن کو اس صورت حال آگاہ کر دینا چاہیے۔“ میں نے سوال لگا ہوں سے باری باری کی طرف دیکھا۔

”سوچ لو بیاس۔“ پرساد نے کہا ”اگر ماسٹر ہو جن کو پتا چڑے کہ ہم دارا وغیرہ کے پکڑ میں ہیں آئے تو وہ تو ہمارا رخ ہو گا۔ پری کو کس وقت اٹھا گیا تھا؟“ میں نے پاتھم سے پوچھا۔

”آج صبح پانچ بجے کے قریب۔“ پاتھم نے جواب دیا۔ ”وہ بچے اس کے جنازہ کی طرف گیا تھا۔ وہیں سے بتا چلا تھا۔“

”ہو سکتا ہے وہ دارا کے آدمی نہ ہوں کوئی اور ہو۔“

مطلب ہے اس کا کوئی ذاتی معاملہ ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میں بیاس۔“ پاتھم نے جواب دیا ”وہ صبح سویرے اپنے ایک شاگرد کے ساتھ جنازہ میں ایسے سائز کر رہا تھا کہ وہ آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ پہلے پری سے تمہارے اور جاگی دوی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پری نے اعلیٰ کا اظہار کرتا ہوا پھر وہ دونوں اسلئے کے زور پر اسے گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔“

”اس کا مطلب ہے پری کو اغوا کیے ہوئے تھے کہنے ہو چکے ہیں۔“ میں نے برآمدے والے کمرے میں پڑے دارا سے اسے اندر دوا پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ ”ظاہر ہے انہوں نے اسے مسموم بنا کر نہیں رکھا ہو گا۔ اس سے پوچھ چکے کی گئی ہوگی۔ تشدد بھی کیا کیا ہو گا۔ اگر وہ ہمارے بارے میں بتا دیتا تو دارا کے آدمی یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ ہر حال ہمیں آج کی رات محتاط رہنا پڑے گا اور میرے خیال میں کل ہمیں یہ ناکھانا لینا چاہیے۔“

”میں تم مناسب سمجھو بیاس۔“ پاتھم نے کہا ”ویسے میں آج رات ہمیں رہوں گا۔ تم لوگوں کے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے۔“ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم نے پری کی ڈیوٹیاں بانٹ لیں۔ طے یہ ہوا کہ رات ایک بجے تک پاتھم ڈیوٹی دے گا۔ ایک سے تین بجے تک پرساد اور تین بجے سے صبح تک میری ڈیوٹی ہوگی۔

رات کے کھانے کے تھوڑی سی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی تو جاگی نے ریسیور اٹھا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ لیزا کا فون ہو گا لیکن نچلے میرے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا کہ یہ پری کی کال ہوگی۔

”ہو سکتا ہے وہ ان کی قید سے بھاگ نکلا ہو اور ہمیں خبردار کرنے کے لئے فون کیا ہو لیکن جاگی نے جب ماسٹر ہو جن کا نام لیا تو میں اچھل پڑا اور لپک کر جاگی کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

”میں ماسٹر۔“ میں نے ٹھونڈا نہ کیے میں کہا ”آپ کو شاید یہاں کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔“

”ہاں۔ میں وہاں کے حالات سے پہلے ہی باخبر تھا اور اب بھی سب کچھ میرے علم میں ہے۔“ ماسٹر ہو جن نے جواب دیا ”مجھے پری کے اغوا کی اطلاع مل چکی ہے لیکن مطمئن رہو۔ وہ مر جائے گا۔ مگر تم لوگوں کے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔ پری کے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”مجھے افسوس ہے ماسٹر۔“ میں نے کہا ”یہ سب کچھ میری وجہ سے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

”ایک منٹ!“ ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کچھ بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کچھ بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا، جی ٹاک اور کم کو ان کے ملے سے نکالنا چاہتے تھے۔“

اور اس کے لئے ہمیں وہاں بھیجنا پڑا کہ پروگرام رہے تھے۔ تمہیں کہیں بھیجنے کی بات ہوئی تو تم نے بھی کچھ بوری ہی کا نام لیا۔ تمہاری اس خواہش سے ہمیں پتہ چل گیا کہ تم بھی واقف ہو کہ دارا وغیرہ کچھ بوری میں ہیں۔ اس لئے ہمارا جے جس میں وہاں جانے کی اجازت دے دی لیکن اس سے پہلے تمہاری حفاظت کے انتظامات کر لے گئے تھے لیکن تم نے وہاں جاتے ہی کارروائی شروع کر دی اور ان کے ایک آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جس سے وہ لوگ ہوشیار ہو گئے۔“

”وہ ڈاکٹر خان تھا بیاس۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے جاگی اور پرساد کو بازار میں دیکھ لیا تھا اور دارا کو نیلی فون پر ان کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ وہ ان دونوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اگر وہ واپس چلا جاتا تو دارا کو ہمارے ٹھکانے کا پتا چل جاتا۔ اس لئے ڈاکٹر خان کو ٹھکانے لگانا پڑا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ لوگ پری کا ہاتھ ڈال دیں گے۔“

”پری کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔“ ماسٹر ہو جن نے کہا ”اس کے آدمی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ تم لوگ اپنا خیال رکھنا۔“

”میں ماسٹر۔“ میں نے جواب دیا اور دوسری طرف سے لائن منقطع ہونے پر میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

اس وقت ماسٹر سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت پریشان تھا۔ میں اپنا جھوٹ پکڑے جانے پر بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ماسٹر اور ہمارا جے کا معاملہ پورا رام سے لاعلم رکھا تھا۔ اصل بات ان سے چھپانے کی کوشش تھی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ میرے استاد تھے اور اب اصلیت کھل جانے پر میں شرمندگی سے اپنے آپ میں کتا جا رہا تھا اور یہ شرمندگی ہی تھی کہ فون بند کرنے کے بعد دیر تک میں اپنے ساتھیوں سے بھی بات نہیں کر سکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ جاگی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا ”ماسٹر ہو جن نے کیا ایسی بات کہی کہ تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”ماسٹر ہو جن اور ہمارا جے کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دارا اور اس کے ساتھی یہاں موجود ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں نے انہیں لاعلم رکھ کر بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔“

”اور!“ قحالی کے منہ سے بے اختیار نکلا ”اسی لئے میں نے کہا تھا کہ انہیں اصل بات بتا دی جائے۔“

”جو ہونا تھا ہو چکا۔“ میں نے کہا ”ماسٹر ہو جن کو پری کے اغوا کا علم ہو چکا ہے۔ بقول اس کے ہمارے لئے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پری ہمارے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولے گا۔“

”اس کے باوجود ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔“ پرساد نے کہا۔

”پاتھم اپنی ڈیوٹی دینے کے لئے پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔ ایک بجے

آتش فشاں 65 حصہ 2

لیزالی گاڑی رنج کے قریب سے دائیں طرف مڑ گئی اور وار  
م کے سامنے سے ہوتی ہوئی کچھ آگے جا کر ایک اور ذیلی مرکز  
بنی۔ جاگی گاڑی چلاتی رہی اور میں مغنچس نظروں سے ادھر  
دیکھتا رہا۔ اس ذیلی مرکز پر دونوں طرف درختوں کی بہتات

جانی نے گاڑی کی چابی سخم کو دے دی۔ ان کے جانے کے  
 پس نے باہر کے گیٹ کا کنڈا لگا دیا اور دوبارہ کالج میں آ گیا۔ ہم  
 یک بار کچھ کر دلوں کو گھوم کر دیکھا اور کالج سے نکلا کہ آوار

جاگلی ہے حد حسین تھی، جوان تھی اور وہ مجھے اچھی بھی  
تھی لیکن میں اپنے آپ کو اس کی خواہشات کی بیعت نہیں چڑ  
ھاتا تھا۔ برادری کے راستے پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔ میں جانتا  
اس راستے پر پہلا قدم اٹھانے کے بعد واپس مشکل ہو جائے

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“ جاکی کی آواز میں عجیب سی سرخوشی تھی۔ وہ کچھ اور آگے جھک گئی اور اپنا رخسار میرے رخسار

پر رگزنے لگی "میرے لیے اب یہی بہت ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

اس وقت جاگی کے رخسار کا لہجہ بڑا نہیں لگا۔ نہ ہی میرے خون کی گردش تیز ہوئی اور نہ ہی میں نے اپنے جسم کے کسی حصے میں سناٹا محسوس کیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور وہ میری کمری کے پیچھے سے گھوم کر میرے سامنے والی کمری پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ بلاؤز پہن چکی تھی لیکن اوپر کے دو بٹن اب بھی کھلے ہوئے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس بند کر لیا۔

جاگی نے خود ہی منگھڑ کا موضوع بدل دیا۔ ہم ایک باہر چائس کالج کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بڑی والے راستے پر گاڑی کو آتے دیکھ کر میں نے آگے جا کر کھول کھول دیا۔



یہ کالج سب کو پسند آیا تھا۔ سیکورٹی کے نقطہ نگاہ سے بھی یہ ہماری حفاظت کے مطابق تھا۔

تھائی نے ایک ایسے کمرے پر قبضہ کر لیا تھا جس کی ایک کھڑکی پچھلی طرف تھی اور ایک سامنے کی طرف۔ یہاں آنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی اس نے ایک لپٹی چڑی لٹ تیار کر کے ستم کو تمنا دی تھی۔ ستم لست اور رقم لے کر سامان لینے کے لیے بار کھٹ چلا گیا۔ تھائی دو دوسرے کالج سے کچھ سامان بھی لے آئی تھی جس میں چائے اور کافی وغیرہ کی چیزیں شامل تھیں۔ یہ چیزیں کچن میں رکھوا دی گئی تھیں۔ تھائی خود کافی بنانا چاہتی تھی لیکن جاگی نے اسے روک دیا اور خود کچن میں کھس گئی۔

کافی پینے کے بعد پانچم چلا گیا۔ اس نے یہاں کا فون نمبر ذہن نشین کر لیا تھا تاکہ اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو ہمیں اطلاع دے سکے۔ ہم کالج کے سامنے والے چوترے پر کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ یہ جگہ اس حد تک محفوظ تھی کہ ہم دور دور تک کسی کی نظروں میں بھی نہیں آسکتے تھے۔

میں کچھ دیر بعد اٹھ کر کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ میں رات کو دیر تک جاگا تھا۔ بستر پر لیٹے ہی سو گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو تھائی کو اپنے ساتھ بستر پر دیکھ کر میں اٹھ گیا۔ وہ کمری نیچر سو رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر گیا۔ جاگی ستم کے ساتھ کچن میں کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اشتہا آمیز خوشبو سے میری بھوک چمک اٹھی۔ اس وقت دو بج رہے تھے اور جاگی نے بتایا کہ کھانا تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر لگی۔ میں برآمدے میں آکر پر سادے کے قریب ایک کمری پر بیٹھ گیا۔

ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا سوائے باتوں کے، یہاں جس مقصد کے لیے آئے تھے وہی اچال پورا ہوتا

نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ہماری بد قسمتی تھی کہ جاگی اور پر سادے پہلے ہی روز دارا کے ایک آدمی کی نظروں میں آگئے تھے۔ ڈاکٹر فان کو اگرچہ ہم نے ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ اس کا قصہ بھی ہم نے ہی تمام کیا ہے۔ وہ یقیناً ہمیں تلاش کرتے رہے ہوں گے لیکن ہم تک تو نہ پہنچ سکے۔ بستر پر ہی پرائیویٹ ہو گیا اور وہ اسے اٹھا کر لے گئے۔ پری کے بارے میں ابھی تک مزید کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اگرچہ ماسٹر ہوجن نے بھی یہی کہا تھا کہ پری قابل اعتماد اور مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ وہ مرحلے کا ٹھکانا ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ مجھے ماسٹر پر پورا بھروسہ تھا لیکن تجا نے کیا بات تھی کہ اس کالج میں مطمئن نہیں تھا اور اسے ساتھیوں کے ساتھ یہاں قفل ہو گیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ہم یہاں چمک مٹانے آئے ہیں۔ پانچم کے کتنے کے مطابق پری کو اغوا کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا ٹھکانا بدل لیا تھا اور اب ہمیں ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا لیکن کچن بوری جیسے شر میں انہیں تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ اگر شرمش ہوئے تو کسی طرح ان کا سراغ لگایا جاسکتا تھا مگر شرم کے اطراف میں پناہ نہیں پر لا تعداد کالج اور گیسٹ ہاؤسز بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں انہیں تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

میں اور پر سادہ اس وقت اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ پر سادہ کا خیال تھا کہ تھائی کو ایک دو دن اور آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے بعد ہم ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات کو بھی ہم دیر تک جاگتے رہے۔ پانچم نہ تو واپس آیا تھا اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی لیکن میں اس کے لیے زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ذہین آدمی تھا اور اپنی حفاظت کرنا جانتا تھا اور دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں انجمن بوری میں دارا اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا تھا۔

رات دو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ اس وقت میں اور پر سادہ لوگ دوم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جاگی اور تھائی اپنے اپنے کمروں میں سو رہی تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی دوسری مرتبہ بجی۔ میں نے اور پر سادہ کو ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹر اٹھایا مگر کچھ بولنے کے بجائے دوسری طرف سے کسی آواز کا ہتھکڑا رہا۔

"ہیلو۔ میں پانچم رہا ہوں۔"

"ہیلو پانچم!" میں اس کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی بات ہو گئی جو اس نے اس وقت فون کیا ہے۔ بتایا ہے پانچم۔ خیریت۔۔۔ تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل خیریت ہے پاس۔ ایک شکار ہاتھ لگ گیا ہے لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اسے کالج تک لاسکوں۔" پانچم نے

کہا۔ "اگون ہے وہ اور تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جو چمک کالی کے قریب پرانے جنگی قبرستان میں۔" پانچم نے

جواب دیا۔ "کیا یہاں قبرستان میں بھی ٹیلی فون لگے ہوئے ہیں؟" میرے لیے حیرت تھی۔

"نہیں پاس۔ میں قبرستان کے قریب سڑک پر ایک پبلک ٹیلی فون بوخ سے بات کر رہا ہوں۔ اس شکار کو میں نے ہاتھ کر قبروں میں ڈال رکھا ہے۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے لیکن اگر اس شکار کو کالج تک لے آیا جائے تو ہمارے بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔"

"جو کیشن بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"دوسری طرف چند لمبے خاموشی رہی پھر پانچم نے سمجھانے لگا۔ میں ریموٹر رکھ کر سڑا تو تھائی اور جاگی کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

"کھیل شروع ہونے والا ہے۔" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پانچم نے غالباً دارا کے کسی آدمی کو پکڑ رکھا ہے۔ ہم اسے لینے کے لیے جارہے ہیں۔ تم لوگ محتاط رہنا۔ یہ پتہ اسے اپنا پاس رکھ لو۔" میں نے جب سے پتہ توکل نکال کر تھائی کی طرف بڑھا دیا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد ہماری گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑی تھی۔ پر سادہ نے اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا دھڑا دھڑا کر رہا تھا۔ پر سادہ کو میں نے پانچم کا بتایا ہوا پتا سمجھا دیا تھا۔ سڑکوں پر اڑاؤ کا گاڑیوں کے سوا کوئی ٹریک نہیں تھا۔

جو چمک کالی کے قبرستان تک پہنچے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ قبرستان کے سامنے کی طرف کچھ کالج وغیرہ تھے لیکن اس وقت ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ پر سادہ نے کار قبرستان کے مرکزی گیٹ سے ذرا آگے نکال کر روک کر لیا۔

یہ وہ قبرستان تھا جہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں دیباے کو اپنے پریل کی تعمیر کے موقع پر جاپانی فوجوں کے ہاتھوں لا تعداد اتحادی جنگی قیدی ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں سے سترہ سو کے لگ بھگ لاشوں کو اس علاقے میں گڑھے کھود کر دبا دیا گیا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد اسے باقاعدہ قبرستان کی شکل دے کر اس کے اطراف میں باغیچہ والی تعمیر کردی گئی تھی۔ پچیس تیس سال تک تو اس قبرستان کی مناسبت دیکھ بھال ہوتی رہی پھر یہ وہاں پر مٹی چلنے لگی۔ چار دیواری کئی جگہوں سے مسمار ہو گئی تھی اور کئی قبریں بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

چند پکینڈ بعد ہی ایک ہیولا تاریکی سے نکل کر ہماری طرف آگیا۔ وہ پانچم تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک آٹومیک رائفل بھی

تھی۔

"پر سادہ۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا۔

پر سادہ کے ساتھ میں بھی کار سے اتر گیا۔ ہم تینوں قبرستان کے ٹوٹے ہوئے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں کمری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ پانچم چند گز کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ رک گیا۔ وہ ایک ٹولی ہوئی قبر تھی جس کے اندر ایک آدمی پڑا ہوا تھا۔ پر سادہ پانچم نے مل کر اسے قبر سے باہر نکالا۔

اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑے کا گولہ ٹھسا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ پانچم نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور اسے دکھا دیتے ہوئے غرایا۔

"چلو۔ تمہارے حساب کتاب کا وقت بھی آن پہنچا ہے۔ اگر کسی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو تمہاری ہی رائفل کی گولیوں سے بھون ڈالیں گا۔"

وہ محض ہڑکھاتا ہوا ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

کار کی پچھلی سیٹ پر وہ میرے اور پانچم کے درمیان سینڈویچ بنا بیٹھا تھا اور پر سادہ نے حسب معمول اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا۔ اگر قبرستان کے سامنے والے کالج کے پچھلی طرف پہاڑیوں میں کار کا راستہ ہوتا تو ہم صرف پانچ منٹ میں اپنے لیے والے کالج تک پہنچ سکتے تھے لیکن پہاڑیوں میں پیدل چلنے کے لیے تو پکڑ پکڑاؤں میں گھر کار وغیرہ کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے اس راستے سے ہوتے ہوئے اپنے کالج میں پہنچ گئے۔ راستے میں خاموشی ہی رہی تھی۔ پانچم نے بھی ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی کہ یہ محض کون ہے اور اسے کہاں سے پکڑا ہے۔

کالج کے لوگ دوم میں پہنچ کر اس شخص کے منہ سے کپڑا نکال دیا گیا۔ وہ وحوش نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ یہ کون ہے اور کہاں سے تمہارے ہاتھ لگا؟"

میں نے پانچم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پاس۔" پانچم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آج دن میں ہم نے وہ کالج چھوڑ دیا تھا۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو آج رات مارے گئے ہوتے۔"

"تفصیل بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"رات دس بجے کے قریب میں پری کے جنازیم چلا گیا تھا۔" پانچم کہنے لگا۔ "وہاں اس کے بہت سے شاگرد جمع تھے جو پری کے اب تک نہ ملنے پر پریشان تھے۔ یہ شخص بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے وہاں شاید کسی لڑکے سے کوئی بات کی تھی پھر باہر آکر یہ پبلک ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ ہاتھ کا دردازہ ٹوٹا ہوا تھا اور میں قریب ہی موجود تھا۔ میں نے اس کا صرف ایک جملہ سنا تھا۔

"لش ماسٹر کے ٹھکانے کا پتا چل گیا ہے۔" اس کے بعد میں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ غائب ہو گیا۔

”مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے جتنا زہیم ہی سے کسی طرح اس کا کچھ کا پتا معلوم کر لیا تھا جس کا بندوبست پر ہی نے کیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ لوگ آج رات اس کا کچھ پر لٹا ہوا دیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ تم لوگوں کو اطلاع دے سکے۔ میں اس کا کچھ کے پاس پہنچ گیا اور ایک جگہ چھپ کر ان لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔“

”میرا اندازہ درست نکلا۔ رات کیا ہونے کے قریب ان لوگوں نے کا کچھ پر حملہ کر دیا۔ یہ لوگ تقریباً آٹھ گھنٹے تک چاروں طرف سے کا کچھ پر گولیاں برساتے رہے اور پھر دروازے توڑ کر کا کچھ میں گھس گئے مگر انہیں بڑی باؤسی ہوئی تھی۔“

”قریب کے کسی کا کچھ سے غالباً فون پر پولیس کو غارتگی کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فضا میں سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی توکار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے مگر یہ کسی طرح نہ کیا اور پھر یہ اندرونی پناہوں کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے بھی اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ چونکہ کافی کی پناہوں میں پہنچ کر شاید اسے اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا۔“

”اس طرف کا تعداد کا کچھ اور پراپیٹی گیسٹ ہاؤسز ہیں اور میرا خیال ہے دارا وغیرہ بھی اسی طرف کسی کا کچھ میں پناہ لیے ہوئے ہیں لیکن اپنے تعاقب کا احساس ہونے کے بعد اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اگر یہ چاہتا تو مجھے کسی بھی وقت جگہ دے کر تعاقب ہو سکتا تھا لیکن یہ تو شاید مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ اسے غالباً یہ شبہ ہو گیا تھا کہ میں تم لوگوں کا ساتھی ہوں۔ اگر میں ان کے قبضے میں آ جاؤں تو میرے ذریعے تمہارے ٹھکانے کا پتا چلا یا جاسکتا ہے۔“

”تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے یہ چونکہ کافی کے جنگلی قبرستان کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے مجھ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن خود میرے قابو میں آ گیا۔ یہ دارا کے محافظوں میں سے ایک ہے لیکن بہت ہی بے وقوف اور بزدل۔ انویٹنگ گن ہونے کے باوجود یہ اپنی حفاظت تو کر نہیں سکا۔ دو مہروں کی حفاظت کیا کرے گا۔“

”پرساد۔“ میں نے کہا ”اس سے پوچھو وہ لوگ کہاں ہیں اور پری کے ساتھ انہوں نے کیا کیا ہے؟“

پرساد تو پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ میں پانچم کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکا کہ دارا کا یہ محافظ بے وقوف اور بزدل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو فوراً ہی زبان کھول دیتا لیکن مگر ہوں کی طرح دھمائی ہونے کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ پرساد نے اس کا سامنے والا ایک دانت بھی توڑ دیا لیکن اس کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی۔

”یہ ایسے نہیں بتائے گا باس۔“ پرساد نے کہا ”میرے پاس ایک طریقہ ہے۔ یہ چند منٹ میں زبان کھول دے گا۔“

پرساد نے اس شخص کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور دو ٹکے دتا ہوا

باہر لے گیا۔ میں اور پانچم بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ پرساد نے شخص کو پکڑ کر آٹھار کے قریب لے آیا اور دھکا دے کر پھر جھیل کے کنارے پر گرا دیا اور اس کی پشت پر سوار ہو کر وہاں سے اس کے بال جکڑ لے اور سر کو پانی میں ڈبو دیا۔ یہ سیکنڈ بعد وہ شخص مچلے لگا۔ پرساد نے اس کا سر پانی سے باہر لیا۔

”اب بھی زبان کھولو گے یا نہیں؟“ پرساد غصا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ اس شخص کے منہ سے ہلکا سا شکل ظاہر تھا۔

پرساد نے اس کا سر پھرنائی میں ڈبو دیا اور پھر وہ یہ حرکت بدھاتا رہا۔ وہ ہر مرتبہ اس سے ایک ہی سوال کرتا اور اس کا جواب لٹی میں ہوتا۔ آخری مرتبہ پرساد نے اس کا سر پانی میں تو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا جسم بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔

وہ ختم ہو چکا تھا۔ پرساد نے اسے ٹانگوں سے چھبٹ کر اُپ طرف ڈال دیا۔

”تم تو کہتے تھے یہ بہت بے وقوف اور بزدل ہے۔“ میں۔

پانچم کو گھورا ”یہ تو ایسا سخت جان نکلا کہ زبان کھولے بغیر مر گیا۔“

”مجھے حیرت ہے باس۔“ پانچم بولا ”لیکن یہ اس طرح آواز سے میرے قابو میں کیسے آ گیا تھا۔“

”اب اس لاش کو کہیں دور لے جا کر پھینک دو۔“ میں۔

اس طرح کہا مجھے وہ کوئی انسانی لاش نہیں مندر کی کا ڈھیر ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو میں گندہ کی اور غلط فہمی ڈھیری سمجھتا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے بے گناہوں کی زندگی سے کھیل رہے تھے۔ ان کے وجود کو اسی طرح مٹا دینا چاہیے تھا۔

پانچم لاش کو گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔ میں تو کافی کے ماز اپنے کمرے میں آ گیا اور پرساد اور جاگی لوگ روم میں بیٹھ کر بات کرنے لگے۔ مجھے نہیں معلوم پانچم اس لاش کو پھینک کر کب آ تھا اور کب واپس چلا گیا تھا۔ میں تو بستر پر لیٹنے ہی مری نیند مانگتا تھا۔



میری آنکھ صبح دس بجے کے قریب کھلی تھی اور سب سے پہلے جو خبر سننے کوئی وہ تھی کہ پری کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش آج صبح سویرے واٹ ٹائی کے گیٹ کے قریب سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔

”باس۔“ پرساد نے کہا ”میرا خیال ہے اب ہمارے لیے اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا ممکن نہیں ہے۔ تم مجھے اجازت دو تو میں آج باہر نکل کر انہیں تلاش کرنے کی کوشش کروں۔“

”تم کچھ کہتے ہو۔“ میں نے گمراہ سا سن لیتے ہوئے جواب دیا ”وہی ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“

پانچم کہاں ہے؟“

پانچم نے جتنا زہیم میں۔۔۔ پرساد نے جواب دیا ”وہاں بہت ہی جگہ ہے۔ پری کی لاش دریافت ہونے کی اطلاع اس نے دی تھی۔ پورے شہر میں پری کے شاکر دیکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور سنا ہے کہ وہ پری کے جنازے کے ساتھ جلوس نکالنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں بھی اس جلوس میں شریک ہونا چاہتا ہوں اور مجھے شبہ ہے کہ دارا کا کوئی نہ کوئی آدمی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ضرور آئے گا۔“

”اور تمہارے خیال میں مجھے کھینچے رہنا چاہیے۔“ میں نے

اسے گھورا۔

”ہاں۔۔۔ کم از کم آج کا دن۔“ پرساد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”کوئی کفر کی خاص بات ہوئی تو میں تمہیں فون کروں گا اور پھر تم ہی میدان میں اتر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گمراہ سا سن لیتے ہوئے کہا ”میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ تم گاڑی لے جاؤ۔“

”نہیں۔ میں یہاں سے پیدل ہی نکلوں گا۔ سڑک پر پہنچ کر مجھے کوئی نہ کوئی سوار مل جائے گی۔“ پرساد نے جواب دیا۔

دس منٹ بعد پرساد چلا گیا۔ اب میرے ساتھ جاگی اور تھاگی رہ گئی تھیں۔ لیزا کے ملازم سمکھ کو ہم نے پہلے ہی روز شام کو پھنسی دے دی تھی۔ میں کا کچھ سے نکل کر ایک درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھا بیٹھا اور صورت حال کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد ہمیں قتل ہو چکے تھے۔ ایک ہمارے گروپ کا آدمی مارا گیا تھا اور دو ان کے لیکن ہم اب بھی وہیں کھڑے تھے جہاں سے پہلے تھے۔ کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ نہ ہم دارا وغیرہ کے ٹھکانے کا پتا چلا سکتے تھے اور نہ ہی وہ ہمارا سراغ لگاتے تھے اور یہ دونوں طرف کی خاموشی مجھے بڑی طرح کھل رہی تھی۔ میں آرام سے بیٹھنے والا آدمی تو نہیں تھا لیکن دس دن سے زیادہ ہو چکے تھے اور میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ لیکن اب مجھے امید تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ پرساد باہر نکل گیا تھا۔ یا تو وہ ان کی نظروں میں آئے گا یا دارا کا کوئی آدمی سامنے آجائے گا اور اس طرح مکمل شروع ہونے کی توقع تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال اُبھر آیا۔ کیا ماسٹر ہو جن کو پری کے قتل کی خبر مل چکی ہوگی؟ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی بڑی بات ہو جائے اور ماسٹر ہو جن کو اس کی اطلاع نہ ہو۔ اسے تو یہ بھی اطلاع مل چکی ہوگی کہ گزشتہ رات ہمارے دوسرے کا کچھ پر حملہ کیا گیا تھا۔ اس نے یقیناً اس کا کچھ کے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہوگی اور وہ پریشان بھی ہوا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کر کا کچھ میں آ گیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر بنگالہ میں ماسٹر ہو جن کا نمبر لگاتے لگا۔ کال ماسٹر کے ایک شاکر دے ریسیور کی تھی۔ ماسٹر جتنا زہیم میں موجود نہیں تھا لیکن اسے پری کے بارے میں

اطلاع مل چکی تھی اور وہ آج شام سے پہلے کچھن بوری پہنچنے والا ہے۔

”صبح سویرے تمہارے کا کچھ پر حملے کی اطلاع بھی ملی تھی مٹل ماسٹر۔“ دوسری طرف سے کہا گیا ”ماسٹر تمہارے لیے زیادہ پریشان ہے۔“

”ماسٹر کو بتا دینا ہم ٹھکانا ہیں۔ ہم حملہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے اس کا کچھ سے نکل چکے تھے۔“ میں نے جواب دیا اور اپنا فون نمبر لکھوا کر فون بند کر دیا۔

میں فون بند کر کے جاگی اور تھاگی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن وہ دونوں کا کچھ میں نہیں تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں چلی گئیں حالانکہ جب میں اندر آیا تھا تو تھاگی کو اپنے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب دونوں غائب تھے۔ میں کا کچھ سے باہر آ گیا اور پھر نعلنی قہقروں کی آواز سن کر چونک گیا۔ یہ آوازیں آٹھار کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں چوتھرے سے اتر کر ٹھکانا وہاں اس طرف پہنچ گیا۔

اور پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دونوں آٹھار والی چھوٹی سی جھیل میں ایک دوسرے کو پانی میں غوطے دینے کی کوشش کرتے ہوئے قہقروں لگا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو پھونڈ دیا۔

”آؤ۔ تم بھی آ جاؤ۔“ جاگی نے میری طرف پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے کہا۔

”مجھے غوطے کھانے کا شوق نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

جاگی کے ہونٹوں پر بڑی مسخ مسکراہٹ تھی۔

میں کا کچھ میں آ گیا۔ لیکن میں گھس کر کافی بھائی اور کا کچھ کے سامنے والے چوتھرے پر کرسی پر بیٹھ کر آٹھار کی طرف دیکھتے ہوئے کافی کی پکیاں لینے لگا۔

جاگی اور تھاگی ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھیں۔

دو بجے دوسرے ساد کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ سیکڑوں لوگ پری کے جتنا زہیم کے سامنے جمع ہو چکے ہیں۔ کسی بنگالی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پولیس کی بھاری نفری بھی موجود ہے۔ شام سات بجے کے قریب ماسٹر ہو جن یہاں پہنچنے والا ہے۔ ماسٹر اس کے آنے کے بعد ہی ہوگی۔

پانچم بھی یہاں موجود ہے لیکن ابھی تک ہمیں کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا۔“ پرساد نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم دونوں وہیں رہو اور حالات پر نگاہ رکھو۔ ماسٹر ہو جن پہنچ جائے تو مجھے فون کروانا۔“ میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بنگالہ سے ماسٹر ہو جن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ساڑھے چھ اسی رات کے درمیان کچھن بوری پہنچ جائے گا اور یہاں آنے کے بعد دوبارہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔







# تحریر اور شخصیت



ان کے لئے ایک نادر کتاب جو اپنی  
شخصیت کو ابھارے، سنوارے اور  
نکھارے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

قیمت 25 روپے  
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ



kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

سے ہٹ کر درختوں کے نیچے تاریکی میں ایک کارکھڑی تھی۔  
اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ ہمیں ان کی آمد کا پتا  
کیوں نہیں چل سکا تھا۔ وہ کار کو دور چھوڑ کر مختلط انداز میں پیدل  
چلتے ہوئے کانچ تک پہنچے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ سڑک کی طرف سے آنے  
والے اس پتہ راستے کے دونوں طرف کا بجز تھے اور ہر کانچ کی  
طرف جانے والے راستے پر پرائیویٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سڑک  
کے دونوں طرف گنجان درخت بھی تھے۔ بعض جگہ پر تو دو طرف

کے درختوں کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ کانچ کا  
یہ سلسلہ آگے بھی جاری تھا۔

ابھی تو شاید ساڑھے سات ہی بجے تھے۔ کسی بھی وقت کوئی  
گاڑی اس طرف آسکتی تھی اس لیے کانچ والے راستے سے نکل کر  
اس کشادہ اور پتہ راستے پر آتے ہی ان کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور  
مجھے بھی دھکے دے دے کر تیز چلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

درختوں کے نیچے کھڑی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچ کر کم نے  
ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر دوسرے دروازوں  
کے لاک ٹاپ بھی ہٹا دیے۔ مجھے دھکا دے کر کچھلی سیٹ پر بٹھا دیا  
گیا۔ وہ دونوں فنڈے میرے دائیں بائیں اس طرح بیٹھ گئے کہ

میں ان کے پیچ میں دب کر رہ گیا۔ ہاتھ پست پر بندھے ہوئے کی دھج  
سے مجھے بیٹھے میں بھی تکلیف پوری تھی اور میں اس پوزیشن میں  
میں تھا کہ کوئی کڑا بڑکوں کو میرے بائیں طرف بیٹھے ہوئے  
فحص نے رائٹ کی ٹال میرے پھلو سے لگا رکھی تھی۔ دارا آگے  
پہنچزیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار حرکت میں آکر پتہ راستے پر آگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کار  
کو کھرا سڑک کی طرف لے جائیں گے اور وہاں سے کسی راستے  
کا تعین کریں گے لیکن میرے اندازے کے برعکس کار مخالف سمت  
میں چل پڑی تھی۔

آگے بھی اس پتہ راستے کے دونوں طرف کا بجز کے

پرائیویٹ راستے تھے اور یہ سڑک بدستور بلندی کی طرف جاری  
تھی۔ تقریباً نصف میل آگے کا بجز کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب پتہ  
سڑک بھی ختم ہو گئی تھی۔ آگے چھوڑا راستہ تھا جو اب نشیب کی  
طرف چلا گیا تھا۔

پہاڑیوں میں مل کھاتا ہوا یہ اونچا نیچا راستہ خاصا دشوار تھا۔  
کس تو یہ اس قدر خطرناک ہو گیا تھا کہ معمولی سی غفلت بھی موت  
کے من میں دھکیل سکتی تھی۔ پہاڑیوں میں اس طرح کے اور بھی  
کئی راستے تھے جو دن کے وقت سیاح ٹریکنگ کے لیے استعمال  
کرتے تھے۔ ان راستوں پر تو بعض اوقات دن کے وقت بھی چلنا  
مشکل ہوتا تھا۔ چاہے جانیگر رات کو گاڑی چلائی جائے لیکن کم جس

”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اسے تم چلک سمجھ رہے ہو کیا؟“ دارا  
نے اسے گھورا ”اب نکلیں یہاں سے۔ وقت ضائع مت کرو۔“

کانچ سے باہر آکر وہ مجھے دھکے دیتے ہوئے پھوٹی گیٹ کی  
طرف لے چلے۔ درختوں کی دھج سے تاریکی کچھ زیادہ تھی۔ ایک  
آوی نے رائٹ کی ٹال میری پست سے لگا رکھی تھی تاکہ اگر میں  
بھاگنے کی کوشش کروں تو مجھے گولیوں سے ہموں دیا جائے۔ ویسے  
بھاگنے کا خیال اب تک میرے دل میں نہیں آیا تھا۔ اگر میں  
بھاگنے کی کوشش کرتا تو ممکن ہے تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں  
اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن اس کا نتیجہ تھائی کے  
حق میں خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ تھائی کو زندہ چھوڑ آئے تھے۔

میرے فرار کے بعد یہ لوگ واپس جا کر تھائی کو اذیتیں دے دے کر  
ختم کر دیتے۔ میں تھائی کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا  
تھا۔ تھائی کے زندہ رہنے کی صورت میں ایک امید بھی تھی اور میں  
سمجھتا تھا کہ دارا نے تھائی کو ساتھ نہ لاکر یا اسے زندہ چھوڑ کر  
زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی تھی۔ کوئی عورت اس طرح رسوا  
ہونے کے بعد اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس سے  
پہلے جو کچھ بھی ہو رہا تھا اسے تھائی میری دھج سے جیسے تیسے  
برداشت کرتی رہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد تو وہ پھری ہوئی  
شیرنی بن جائے گی۔

ماسٹر ہو جن کچن بوری پہنچ چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پری کی  
آخری رسومات سے فارغ ہوتے ہی وہ مجھے ڈیڑھ گھنٹے تک بلا شاید  
اس سے پہلے ہی ہمارے کانچ پہنچ جائے گا۔ ٹیل فون پر رابطہ کرنے  
کی کوشش کرے گا۔ اس وقت تک تھائی ہوش میں آچکی ہوگی۔ وہ  
ماسٹر ہو جن کو سب کچھ بتا دے گی۔ تھائی نے بھی دارا کی باتیں سنی  
تھیں۔ اس نے جاگی اور لیڑا کے بارے میں بھی ایسے ہی کندے  
خیالات کا اظہار کیا تھا اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ تھائی ہوش میں  
آتے ہی سب سے پہلے جاگی اور لیڑا کی خبردار کرے گی۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا ان کے آگے آگے چلا رہا۔  
راستے میں کبھی ہوئی بجزی بیروں کے نیچے چڑچڑاہٹ کی سی  
آواز پیدا کر رہی تھی۔ میں اب تک اگرچہ بڑی شرافت سے ان  
کے آگے چلا رہا تھا مگر دارا کے وہ دونوں گرے مجھے ہار بار  
دھکے دے رہے تھے۔ کبھی کوئی میرے کولہوں پر ٹھوکریں رسید  
کر دیتا۔ اس طرح میں کئی مرتبہ گرے کرتے بچا تھا۔ پکڑے جانے  
سے پہلے میں نے ان دونوں کی ٹھیک ٹھاک دھماکی کی تھی اور اب  
وہ اس کا بدلہ لے رہے تھے۔

کانچ کی حدود سے نکل کر ہم اس راستے پر آگئے جو ایک طرف  
تو سڑک تک چلا گیا تھا اور دوسری طرف آگے پہاڑیوں کی طرف  
نکل جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سڑک کی طرف لے جائیں  
گے مگر دارا نے مجھے مخالف سمت میں مڑنے کا حکم دیا۔ یہ راستہ  
بدستور بلندی کی طرف چلا گیا تھا اور تقریباً پچاس گز آگے سڑک

گیا۔ میں لا کھڑا ہوا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔  
ممکن ہے میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن دارا  
کسی ارٹے بیٹے کی طرح ڈکرا آتا ہوا میری طرف پکا۔ میں نے اس  
سے بچنے کی کوشش کی مگر اس کے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر لگی۔ میں  
پست کے بل کافی نیل پر گر کر اور اپنی غلابازی کھاتا ہوا پیچھے الٹ گیا  
اور پھر مجھے سنبھالنے کا موقع نہ مل سکا۔ دارا کے پری کی ٹھوکر میرے سر  
پر لگی اور میرا دماغ جھجھکا اٹھا اور پھر وہ چاروں خونی بھیڑیوں کی  
طرح مجھ پر پل پڑے۔ ان کی لائیں اور گھوٹے میرے جسم کے ہر  
حصے کی خبر لے رہے تھے۔ میرے ہاتھ پست پر بندھے ہوئے تھے اور  
میں اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہونٹوں اور ناک سے  
خون کی دھاریاں بہہ نکلیں۔

”نارو اس حرام زادے کو۔“ دارا کی چیخ ہوئی آواز میری  
سماعت سے ٹکرائی ”اتنا مارو کہ یہ آئندہ کسی پر ہاتھ اٹھانا بھول  
جائے۔“

مجھے دارا کی طرف دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ہونٹوں سے  
بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ شکاری کی طرح ہانپ رہا تھا اور پھر  
دارا کی پست پر تھائی کو دیکھ کر میں چک گیا۔ تھائی کے جسم پر لباس  
برائے نام ہی تھا۔ وہ صوفے کے پیچھے سے نکل آئی تھی۔ اس کے  
ہاتھ میں لٹھ تھا۔ لٹھ دارا پر حملہ آور ہونے کے لیے پڑا  
رہی تھی۔

وہ شاید دارا کی چھٹی جگہ تھی جس نے اسے خطرے سے آگاہ  
کر دیا۔ وہ بڑی تیزی سے ٹھوم کیا۔ تھائی دونوں ہاتھوں میں پکڑے  
ہوئے لٹھ کو دارا کے سر پر دار کر کے کے لیے حرکت میں لا چکی تھی۔  
دارا نے بائیں ہاتھ سے لٹھ کو گرفت میں لے لیا اور دائیں ہاتھ کا  
گھونسا تھائی کی کٹھنی پر رسید کر دیا۔ تھائی کے منہ سے خوف ناک چیخ  
نکلی اور وہ کھٹے ہوئے درخت کی طرح لہرائی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔

”بس کرو۔“ دارا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا  
”اسے باہر گاڑی تک لے چلو اور اگر بھاگے گی کی کوشش کرے تو  
بے دریغ گولیاں برسائیں اس پر۔“

ان دونوں غنڈوں نے مجھے پکڑ کر اٹھایا اور مجھے دھکے دیتے  
ہوئے کانچ کے برآمدے والے دروازے کی طرف لے چلے۔ ان  
میں سے ایک نے وہ رائفل بھی اٹھائی تھی جو دراصل آگنی کے  
ایک ساتھی کی تھی جسے پانچم گزشتہ رات پکڑ کر لایا تھا اور پر ساو  
نے اسے پانی میں غوطے دے دے کر ہلاک کر دیا تھا۔

”اور اس کا کیا کرنا ہے؟“ کم نے قالین پر بے ہوش پڑی  
ہوئی تھائی کی طرف اشارہ کیا۔ کم خود بھی ہانپ رہا تھا۔  
”اسے مییں پڑے رہنے دو۔“ دارا نے جواب دیا ”ہو جن  
جلد یا بدیر یہاں پہنچ جائے گا۔ تھائی کو دیکھ کر اسے ہمارا پیغام مل  
جائے گا۔“

”کوئی گزبوت نہیں ہو جائے گی یا؟“ کم نے کہا۔

انداز سے کار چلا رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سارے راستے اس کے دیکھے بھالے ہوئے تھے اور وہ صرف انہی راستوں پر جا رہا تھا جن پر کار چل سکتی تھی۔

ان پہاڑوں پر سبزے اور درختوں کی بہتات تھی۔ سامنے پڑنے والی ہیلڈ لائٹس کی روشنی میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کار کسی سرنگ سے گزر رہی ہو۔ بعض جگہوں پر راستہ بہت ہی ناہموار تھا۔ کار اچلتی تو میرے پہلو سے لگی ہوئی رائل ٹنل کی ٹال جیسے لگتی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر کسی زوردار جھٹکے سے زنگربند گیا تو میرا کام تمام ہو جائے گا۔

تقریباً چالیس منٹ تک کار ان پہاڑوں میں اچلتی ہوئی چلتی رہی اور پھر ایک جگہ پر رک گئی۔ سامنے دوراں پستے تالیس ڈگری کا زاویہ بنائے ہوئے دو مختلف سمتوں میں جارہے تھے اور کم شاید بھول گیا تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ دارا بھی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور بالآخر آپس میں مشورہ کرنے کے بعد کم نے کار دائیں طرف والے راستے پر موڑ دی۔

اُدھا کھٹنا مزید گزر گیا اور بالآخر کہیں کہیں روشنیوں دکھائی دینے لگیں۔ یہ ان پہاڑوں میں واقع کا-بجڑ کی روشنیوں تھیں۔ چند منٹ بعد کار ایک کالج کے سامنے رک گئی۔ دوسرے کالج وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

وہ لوگ مجھے کار سے اتار کر دھکے دیتے ہوئے اس کالج کے اندر لے آئے اور ایک کرسی پر بٹھا کر مجھے رسی سے اس طرح جکڑ دیا گیا کہ میں معمولی سی حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی۔ رات کے وقت پہاڑوں میں اندازہ لگا دیا تھا۔ اگر مجھے چھوڑ بھی دیا جاتا تو میں اس راستے سے واپس اپنے کالج تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سامنے والی دیوار پر تھائی ہندسوں والی گھڑی تو یہاں تھی جس کی سوئیاں دس بج کر پانچ منٹ کا وقت بتا رہی تھیں۔ وہ لوگ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے کہ رے کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ گھڑیاں پہلے سے بند تھیں۔ میں بھی کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور ابھی گھڑی کو گھورنے لگا۔ پونے گیارہ بج رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے مجھے اس کمرے میں بند کر کے وہ لوگ کہیں اور چلے گئے ہیں یا مجھے بھول گئے ہیں لیکن پھر ان کی باتوں کی آواز سنائی دی۔

میں صورت حال پر غور کرنے لگا۔ ماسٹر ہو جن وغیرہ کو میرے اغوا کا پتا چل چکا ہوگا اور انہوں نے میری تلاش شروع کر دی ہوگی۔ میرے ذہن میں صرف ایک سوال تھا۔ کیا وہ لوگ مجھے تلاش کر لیں گے؟

بارہ بجے کے قریب دروازہ کھلا۔ کم اور دارا کے ساتھ جی فانگ بھی اندر داخل ہوا۔ ایک کمین گن دروازے کے باہر رک گیا تھا اور دوسرا اندر آ گیا تھا۔ دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ دنیا کے تین سفاک ترین آدمی میرے سامنے تھے ان تینوں

نے میری آنکھوں کے سامنے میرے ہاں باپ کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اس کے بعد بھی درختوں نے گناہ افرا دان کے ہاتھ موت کا شکار ہوئے تھے اور اب میں ان کے رحم و کرم پر تھا۔ ان سے کسی بے دردی یا رحم کی توقع نہیں تھی۔ اگر میں ان سے ہاتھوں مارا جاتا تو مجھے افسوس ہو تاکہ میں اپنے ہاں باپ کے قتل بدلے بغیر ختم ہو جاتا لیکن پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

کچھ عرصے پہلے تک دارا مجھے ہر قیمت پر قتل کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں اس کے جرم کا واحد چشم دید گواہ تھا۔ مجھ پر بار بار قاتلانہ حملے ہوئے تھے سنگ پور میں اسلحہ چھینا کر شرمجھنے ان سے بچاتا رہا تھا لیکن جب سنگ پور کی زمین میرے لیے تنگ ہو گئی تو چار پر آب سنگ مجھے ان سے بچانے کے لیے پہلے کوالا پور اور پھر بنکاک لے آیا۔ وہ مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا اور اس کے لیے اس نے اپنی جان بھی دے دی تھی لیکن مرنے سے پہلے اس نے مجھے اس جگہ پہنچا دیا تھا جہاں اس نے چھپنا چاہتا تھا۔

میں سہارا ج کی پناہ میں آ گیا اور دارا نے بنکاک کے ہتھ مار ترین بد معاش ٹائگر سے گتھ جوڑ کر کے یہاں بھی میرے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ ٹائگر میرے ہاتھوں مارا گیا تو پیڑوں آگے آ گیا۔ ان ہنگاموں میں پیڑوں کا بھائی میرے ہاتھوں ختم واصل ہو گیا اور پیڑوں میرا بدترین دشمن بن گیا۔ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا پیڑوں کو ایک موقع مل گیا تھا مگر اس وقت میں دارا ہی کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ دارا کو کسی طرح میرے ڈیڑی کی اس ڈانڑی کے بارے میں معلوم ہو گیا جس میں کروڑوں روپے مالیت کے سونے کا راز پوشیدہ تھا اور دارا مجھے مارنے سے پہلے وہ ڈانڑی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیڑوں بھی لالچ میں آ گیا اور اس طرح مجھے ٹائگر کا موقع مل گیا۔

تمام واقعات قلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے میں اب تک دارا کو بہت نقصان پہنچا چکا تھا۔ وہ بیرون کی اسمگلنگ کا سینڈ کیٹ بنانے کے لیے سنگ پور آیا تھا لیکن میں نے اسے نکلے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اپنی جان بچانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ میں نے سنگ پور میں اس کا سینڈ کیٹ کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ میری وجہ سے اسے نہ صرف کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ اس کا ایک کرنل ہتال بھی لمبی مدت کے لیے جیل چلا گیا تھا اور اب دارا بنکاک میں پہلے ٹائگر اور اس کے مرنے کے بعد پیڑوں کے ذریعے بیرون کی اسمگلنگ کا نیا ریکٹ بنانے کے لیے گولڈن ٹرائی اسٹل سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری وجہ سے اس کی ہر کوشش اب تک ناکام ہوئی رہی تھی۔

میں اس کے راستے کی راکوٹ بنا ہوا تھا اور وہ مجھے ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں اسے کسی طرح

میرے ڈیڑی کی ڈانڑی کا پتا چل گیا اور وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اپنے نقصان کی تلافی کے لیے وہ ڈانڑی حاصل کرنا چاہتا تھا اور اب وہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گا جب تک مجھے سے ڈانڑی حاصل نہ کرے اور اس مقصد کے لیے وہ لوگ مجھے جس طرح قتل کا نشانہ بنائیں گے اس کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ میرے بدترین دشمن تھے۔ دارا میرے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا چکا تھا۔ جی فانگ تو میرے ہاتھوں اس بڑی طرح بچا تھا کہ اس کی ایک پبلی نوٹ مٹی جی اور وہ ابھی تک علاج کروا رہا تھا۔ ان سے مجھے کسی نری کی توقع نہیں تھی۔

وہ تینوں میرے سامنے کھڑے تھے اور میں باری باری ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ یہ کتنا بھی مبالغہ ہو گا کہ میرے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ زندگی تو ہر ایک کو بیاد رہی ہوتی ہے۔ جسم کے کسی حصے میں گتھ والا معمولی سا زخم بھی بے چین کر دیتا ہے اور یہ تینوں تو میرے بدترین دشمن اور سفاک ترین انسان تھے۔ دارا جیسے شخص سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ واقعی میری بونیاں کاٹ کر میری نظروں کے سامنے کتوں کو کھلا دے۔

جی فانگ میرے سامنے کھڑا تھا۔ سفاکی اور بے رحمی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ اپنی پٹائی کا بدلہ لینے کے لیے مجھ پر پل دہی کرے گا۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس نے اچانک ہی میری پٹائی پر ایک زور دار ٹھوکریاں کر دی تھی۔ میں سکاڑی بھر کر گر گیا۔

”بالا خرچہ کرے ہی گئے۔“ جی فانگ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی ”اب بیکٹا ہے کہ تمہیں بچانے کے لیے کون آتا ہے۔“ ”میں تو تم لوگوں کو بہت ہمارا دھمکتا تھا مگر تم لوگ تو بہت بزدل نکلتے۔“ میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میرے ہاتھ بڑے پائندہ کہ حرا گئی کے جو ہر دکھا رہے ہو۔ میری یہ بدنشیں کھول دو پھر دیکھو تمہاری باقی بے لیاں بھی نہ توڑوں تو۔۔۔“

”اگر کوئی اور ہو تو تمہاری باتوں سے اشتعال میں آ کر تمہیں کھل بھی دیتا لیکن ہم یہ حماقت نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں تم کتنے خطرناک ہو۔“ جی فانگ نے کہا۔

”بزدل۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے منہ پر ٹھوک دیا۔

جی فانگ ایک دم آپرے سے باہر ہو گیا۔ اس نے میرے چہرے پر چھوڑا اور گونہ گونہ کی بارش کر دی۔ میرے ہونٹوں سے ایک بار پھر خون بہہ نکلا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دایاں جیزا اپنی جگہ سے ہل گیا ہو۔

”ہاتھ بڑا لڑکھو جی فانگ۔“ قریب کھڑے ہوئے دارا نے کہا ”اس سے پہلے اس کے باپ کی ڈانڑی کے بارے میں پوچھنا ہے اس کے بعد تو اس کے ساتھ جو چاہو کر لیتا۔“

جی فانگ مجھے ایک اور گھونسا رسید کرنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا۔ دارا نے کم اور دوسرے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں مجھے

کھولنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی اور حربہ استعمال کرنے جا رہے تھے۔

مجھے کرسی سے اٹھا کر بیٹھ پر لٹا دیا گیا۔ میرے ہاتھ کمرے کھول کر بیٹھ کی پشت پر پائپ سے باندھ دیے گئے تھے اور پھر بھی ایک دوسرے سے قائلے پر باندھ دیے گئے۔ میں نے اپنے آپ کو آنے والے اذیت ناک کھوں کے لیے تیار کر لیا۔ دارا درخت سے توڑی ہوئی ایک شاخ لے کر میرے پیروں کی طرف کھڑا ہو گیا۔ یہ شاخ تقریباً ایک انچ موٹی اور بید کی طرح پلک دار تھی۔

”تم اب تک مجھے جو نقصان پہنچا چکے ہو اس کا اندازہ تمہیں بھی ہے۔ ہمارے جو بندے مارے گئے وہ اس کے علاوہ ہیں لیکن میں یہ سب کچھ بھولنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم اپنے ہاں باپ کی ڈانڑی میرے حوالے کرو۔“ دارا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”وہ ڈانڑی تمہیں نہیں مل سکتی اس لیے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیکھو دھن ان۔“ دارا بولا ”وہ ڈانڑی تمہاری جان بچا سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ڈانڑی مل جانے کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں پاکستان واپس چلا جاؤں گا اور تم یہاں سہارا ج کے پاس رہ کر بمیش کرتے رہنا۔ پیڑوں وغیرہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ تم سے ڈرنے لگا ہے۔ اگر ہم تینوں اس کے ساتھ نہ ہوتے تو وہ سہارا ج جیسے آدمی سے پٹا لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد اس کا سارا جوش و خروش و خرابی جھاک کی طرح بجھ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں اپنا گرو تسلیم کر لے لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ تم وہ ڈانڑی میرے حوالے کرو اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ تمہیں بچانے کے لیے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تمہاری وہ ماسٹر ہو جن کو بتا دیا ہوگا کہ ہم تمہیں اٹھا کر لے گئے ہیں لیکن وہ زندگی بھر ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد بھی تمہارا جواب انکار میں ہو تو میں تمہارا وہ دشمنوں کا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”تمہیں ایک منٹ انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر لو۔“ میں نے جواب دیا۔

دارا چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی گھڑی میرے سیدھے پیروں کے کمرے پر اس زور سے ماری کہ میں تڑپ اٹھا۔ دارا پر خون سٹاری ہو رہا تھا۔ وہ میرے دونوں پیروں کے گھوٹوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں چیختے لگا۔

اسی دوران میں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ دارا کا ہاتھ رک گیا۔ وہ خون خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”اس چمڑی سے میں نہ صرف تمہارے پیروں کی بلکہ پورے جسم کی کھال اور ہڈیوں کا اور تم سے ڈانڑی حاصل کر کے ہی رہوں گا۔“ اس کی آواز بھیرے کی غرابٹ سے مشابہ تھی۔ وہ کم کی طرف گھوم گیا ”کم! دیکھو شاید شاگد وغیرہ آگئے ہیں۔ اگر وہ ان لڑکیوں کو لے آئے ہیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“

کم سر ہٹا تا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی اور اس کے پیچھے جاگتی اور لیزا کو دیکھ کر میرا دل اچھل کر طلق میں آگیا۔ ان دونوں کو سونے شاگد اور ایک دوسرے آدمی نے پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ جاگتی اور لیزا کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ دونوں کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لیزا کے چہرے پر دو تین خراشیں بھی نظر آ رہی تھیں جبکہ سونے شاگد کی گردن اور چہرے پر بھی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ جاگتی وغیرہ آسانی سے ان کے قبضے میں نہیں آتی تھیں۔

جاگتی اور لیزا کو دیکھ کر میری روح تک کانپ اٹھی تھی۔ میں فوراً ہی تھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ ہوش میں نہیں آئی تھی؟ کیا ماسٹر ہو جن وہاں نہیں پہنچا تھا؟ پوسا اور پانچم نے بھی کانچ کی خبر نہیں لی تھی اور پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ تھائی زندہ تھی یا۔۔۔ اس سے آگے سوچتے ہوئے میرا دل کانپنے لگا۔ تھائی کی کتنی پرکھنے والا دارا کا وہ گونا گونا زوردار تھا۔ جس سے وہ تورا کر کر کر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ کونسا جان لیوا ثابت ہو ہو۔

میرے دماغ میں اس وقت آنسو ہیاں سی چلنے لگی تھیں۔ تھائی نے کانچ میں دارا کی ساری باتیں سنی تھیں۔ دارا نے اس کے سامنے ہی جاگتی اور لیزا کے بارے میں بڑے گندے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اگر تھائی زندہ تھی اور ماسٹر ہو جن یا پوسا وغیرہ میں سے کسی نے اس سے رابطہ کیا تھا تو اس نے جاگتی وغیرہ کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟

مجھے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کے برعکس یہ خوفناک حقیقت میرے سامنے تھی کہ جاگتی اور لیزا بھی ان کے قبضے میں آگئی تھیں اور ان کے بارے میں بھی دارا کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ اب اس کی یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کا کام کس طرح آسان ہو جائے گا۔

”ہاں تو مسٹر زور دیا!“ دارا میری طرف متوجہ ہو گیا ”اپنی ایک چیٹنگ کا حشر تم اپنے کانچ میں دیکھ چکے ہو۔ اب ان کی باری ہے۔ اگر تم انہیں بچانا چاہتے ہو تو ڈانڑی کا پتا دے دو۔ تمہارا انکار ان دونوں کی اذیت ناک موت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔“

اس کے چہرے کی شناخت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ تھائی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

جاگتی اور لیزا مجھے دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی تھیں۔ انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ لیزا ان لوگوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن جاگتی تو ان برہت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا نے جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب کیا ہے۔ اس نے تھائی اور حشر نہیں دیکھا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو تا کہ تھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے تو شاید اس موقع پر وہ اپنی زبان بند رکھنا ہی پسند کرتی۔

”ویدان! ہماری پروا مت کرو۔“ وہ چیٹی ”تم اپنی زبان مزہ کھولنا۔ تمہارے لیے اگر میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔“ ”عاشقی تو تاملی۔“ دارا نے قہقہہ لگایا ”بڑا شوق ہے اپنا جان دینے کا لیکن ہم تمہاری جان نہیں لیں گے۔ جان نکل گئی تو قصہ ختم۔ جسم بیکار ہو گیا۔ ہم تو تمہاری جان سے بھی زیادہ قیمتی چیز لینے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تمہیں جب یہ پتا چلے گا کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو تم اپنے کسے ہوئے الفاظ پر پچھتاؤ گے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا تمہیں پر ہو گا۔ سب کے سامنے اس کے سامنے۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا ”تمہیں اس کے لیے اپنی جان دینے کا زیادہ شوق ہے نا۔ چلو پہلے تمہاری باری سی۔ سسر شاگد!“ وہ سونے شاگد کی طرف مڑ گیا ”کم کی بار اس کے حسن و شباب کا ذکر کر چکے ہو۔ آج موقع ہے۔ اپنی حسرت پوری کرلو۔“

اب جاگتی کو بھی احساس ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ وہ شاگد کی طرف دیکھنے لگی جس نے کوٹ اتار کر ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا تھا اور باجمیں نکالے جاگتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جاگتی خوف زدہ سے انداز میں پیچھے ہٹنے لگی مگر یہی شاگد نے اسے پہلے سے دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لے لیا۔

شاگد جاگتی کے سامنے رک گیا۔ اس نے جاگتی کے گردن پر ہاتھ ڈال کر ایک زوردار جھکا دیا۔ جاگتی کا ہلاؤ ڈھونڈ پھٹا اور پھر ٹھیک اسی لمحے جھٹکے کی زوردار آواز سنائی دی۔ عجبیہ کھڑکی کا شیش ٹوٹا تھا۔ شیشے کے کچھ ٹکڑے میرے اوپر بھی گرے تھے۔ جھٹکے کی آواز کے ساتھ ہی کھڑکی سے ایک غرائی ہوئی آواز بھی سنائی دی تھی۔

”تم سب لوگ میری رافتل کی زد پر ہو۔ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔ سب لوگ اپنے ہاتھ اٹھاؤ۔“

کم کے ہاتھ میں ہاتھل تھا۔ اس نے بڑی پرتی ۵۰۰ مار کرنے ہوئے کھڑکی کی طرف فائر کر دیا۔ ایک اور شیش ٹوٹا۔ اس کے ساتھ ہی کم اور دارا وغیرہ نے دروازے کی طرف بھاگ دیا۔ گدی تھی۔ ان کے گھٹن میں نے بڑی ہوشیارانہ جاگت۔ ایسے ہونے آؤنٹک رافتل سے کھڑکی کی طرف ایک برست مارا اور پھر رافتل کا مٹا

جھٹ کی طرف کر کے گولیاں برسادیں۔ بلب ٹوٹ گیا اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ لوگ بالگوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑے تھے۔ اسی دروازے میں لیزا کے چپٹے کی آواز سنائی دی۔ وہ ان کے راستے میں تھی اور ان میں سے کسی سے ٹکرا کر گر گئی تھی۔ بھاگ دوڑا اب اس کمرے کے باہر تھی اور پھر فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

باہر فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کمرے کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک جھٹکے سے ایک اور شیش ٹوٹا۔ اس کے فوراً ہی بعد کوئی میرے اوپر گر گیا۔ وہ جو کئی بھی تھا اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے اپنے جسم کی آڑ۔ میں لے کر بھاگتا ہوا تھا۔ وہ جاگتی یا لیزا میں سے کوئی تھی۔ ان کے سوا تیرا کوئی ایسا نہیں تھا جو اس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچانے کی کوشش کرنا۔

”کون ہے۔ میرے اوپر سے ہو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں نے کہا۔“ میرے کان میں سرگوشی سنائی دی ”دارا اور اس کے ساتھی اس طرف فائرنگ کر رہے ہیں۔ سامنے والی کھڑکی کے شیش ٹوٹ چکے ہیں اور گولیاں دیوار پر لگ رہی ہیں۔“ مجھے حیرت ہوئی۔ لیزا سے میری ملاقات کھنچ چند روزہ تھی۔ نواہ ہے تعلقی بھی نہیں تھی لیکن مجھے بچانے کے لیے اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ میں جس بیڑے پر بندھا ہوا تھا وہ دروازے کے عین سامنے تھا اور دروازے سے آنے والی کوئی سیدھی گولی میرے اوپر آوندھی پڑی ہوئی لیزا کا خاتمہ بھی کر سکتی تھی۔

”جاگتی۔ کہاں ہو تم؟“ میں نے گردن کھما کر تاریکی میں گھورتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں ہوں۔“ جاگتی کی آواز دائیں طرف سے سنائی دی پھر وہ میرے قریب آگئی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ لیزا مجھے بچانے کے لیے میرے اوپر لپٹ گئی ہے۔ لیزا۔ اس بنگلہ کو کھیت کر سائڈ میں لے چلا۔“ جاگتی نے جلدی سے کہا۔

لیزا میرے اوپر سے آگے گئی اور پھر ان دونوں نے بیڑے کو کھیت کر بائیں طرف والی دیوار کے قریب کر دیا۔ اب ہم فائرنگ کی زد میں آئے سے محفوظ ہو گئے تھے۔

بعد میں منٹ منٹ فائرنگ ہوئی رہی اور پھر بدتر رنج خاموشی چھا پٹی گئی۔ چند منٹ گزر گئے۔ کیمیرہ سنانے میں بھیجیروں کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں اور پھر بھیجیروں کی ان آوازوں میں خشک پتوں کے چر مارنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ کوئی غلط انداز میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا اور زمین پر گھرے ہوئے خشک پتے پیروں کے نیچے آکر چر مار رہے تھے۔

”ہاں!“ یہ آواز سن کر میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ پوسا کی آواز پہچاننے میں ہم میں سے کسی نے کوئی غلطی نہیں کی تھی ”ہاں۔ کہاں ہو تم!“

”ہم یہاں ہیں پوسا۔ اس کمرے میں۔“ جاگتی چیختی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔

چند منٹ بعد ہی پوسا دروازے کے سامنے آگیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ کمرے کے باہر برآمدے کا بلب بھی فائرنگ کی زد میں آکر ٹوٹ چکا تھا۔ پوسا جاگتی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور پھر اس نے ٹائچ چلائی۔

”تم ٹھیک تو ہو نا ہاں!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ویسے میری ناک اور ہونٹوں سے بننے والے خون نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

ٹائچ کی روشنی میں پہلے کی پشت پر پاپ سے بندھے ہوئے میرے ہاتھ کھولے گئے پھر پوسا میرے ہاتھ کھولے لگا اور آخر میں مجھے سارا دے کر بیڑے پر بٹھا دیا۔

”تم ٹھیک ہو نا ہاں۔ زیادہ گزرتو نہیں؟“ وہ بولا۔ ”نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا لیکن جب میں نے بیڑے سے اترنے کے لیے بیڑہ زمین پر رکھے تو میرے ہونٹوں سے کراہ سی نکل گئی۔

”کیا ہوا ہاں؟“ پوسا نے پوچھا۔ ”پیروں میں تکلیف ہے۔ اس کم بخت دارا نے۔۔۔“ میرا جملہ کھل ہونے سے پہلے ہی پوسا نیچے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے ٹائچ کی روشنی میں میرے پیروں کے ٹکڑوں کو دیکھا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”دارا ایک مرتبہ میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کے دونوں ہیر کاٹ کر پانچ یا دوں گا۔“ وہ دانت کچکاتے ہوئے بولا۔ اس نے ٹائچ لیزا کے ہاتھ میں تھامی اور مجھے گود میں اٹھالیا۔

دوسرے کمرے میں آکر اس نے مجھے ایک بیڑے پر بٹھا دیا اور ایک بار پھر میرے پیروں کا سناٹہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کچھ بڑبا بھی رہا تھا۔ میں نے انگلیں موز کر پیروں کی طرف دیکھا۔ ٹکڑوں کی کھال نہیں پھٹی تھی البتہ سرخ و عاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اگر شاگد وغیرہ جاگتی اور لیزا کو لے کر نہ پہنچ جاتے تو میرے پیروں پر چمڑی سے مڑنیں گتی رہتیں اور پھر یقیناً کھال بھی پھٹ جاتی۔ اس وقت بھی شدید تکلیف ہو رہی تھی جسے میں ضبط کیے ہوئے تھا۔

”ماسٹر کہاں ہے؟“ میں نے پوسا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ لوگ ان کے تعاقب میں گئے ہیں۔“ پوسا نے جواب دیا۔ پوسا کا ساتھی دروازے کے باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے اندر کی طرف جھانکتے ہوئے بتایا کہ کچھ لوگ

کے لیے وہ تمہیں اس قدر زیادہ تشدد کا نشانہ نہیں بناتا۔  
 سے تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے۔

چوتھی دیر بعد باہر سے چندہ آوازیں سنائی دیں اور پھر ہر ساد  
نے دروازہ کھول دیا۔ ماسٹر ہو جن اور پانچم اندر داخل ہوئے ان  
کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے جو باہری رک گئے تھے ماسٹر  
ہو جن جاگتی کا پتلا ہوا بلڈز اور لیزر کی حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ ان  
کے ساتھ کیا ہوئے والا تھا۔

”مجھے افسوس ہے ہمیں آنے میں دیر ہو گئی جس سے تم دونوں کو یہ تکلیف اٹھانی پڑی۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا ”تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تمہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔“

”ابھی ابتدا ہوئی تھی۔“ میں اپنے پیروں کی طرف اشارہ کر کے مسکرایا ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں اور جاںکی اور لیزا کو بھی یہاں لایا گیا ہے؟“

”میں رات آٹھ بجے پر ساد اور باجم کے ساتھ تلوگوں سے ملنے کے لیے اواز دے گا۔“ اسٹر ہوجن کہہ رہا تھا وہاں کی صورت حال دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چھوٹا مشکل نہیں تھا کہ میرے آنے سے پہلے وہاں کیا ہو چکا تھا۔ تھائی نے ہوش بڑی تھی۔ وہاں دو تین جیسوں پر خون کے دھبے بھی نظر آتے تھے۔ تھائی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے میں تھارے بارے میں سوچتا رہا۔ تھائی نے ہوش میں آنے کے بعد جو کچھ بھی بتایا وہ میرے لیے خاصا تشویش ناک تھا لیکن جاگنی اور لیزا کے بارے میں دارا کے عزائم جان کر مجھے کسی قدر اطمینان ہوا کہ امید کی ایک مہووم ی کرن ابھی باقی ہے۔

”میں نے جاگنی اور لڑا کو نہیں بتایا بلکہ لڑا کے مکان کی نگرانی شروع کرائی۔ میرا ایک آدمی لڑا کے بجٹے کے قریب چھپا بیٹھا تھا اور ہم دور ایک کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ وہ لوگ آج رات لڑا کی کوٹھی کی طرف نہ آئیں۔ ایسی صورت میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ رات بھر ہمیں تشدد کا نشانہ بناتے اور یہ بھی ممکن تھا ختم یہ کر دیتے لیکن ہمارے لیے انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمارے پاس ان کا کوئی سراغ بھی نہیں تھا۔ یہی ایک سوہوم ی امید تھی۔ میں دارا کی فطرت سے بھی کسی حد تک واقف ہو چکا ہوں۔ وہ نہایت گھٹیا ذہنیت کا مالک ہے۔ تمہارے سامنے اس نے تمہاری ساتھ جو کچھ کیا وہ اس کی ذہنی پستی کا ثبوت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آج ہی رات جاگنی اور لڑا کو بھی اٹھوانے کی کوشش کرے گا مگر ان کے ذریعے بھی تھرمز داؤد اڑا سکے۔

”تھائی نے بتایا تھا کہ وہ تم سے کوئی ڈائری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس بات سے مجھے امد تھی کہ ڈائری کا کیا معلوم کرنے

آتش فشاں (N2)

ایک دوپہر جس پر ماسٹر ہوجن اور پھر سادو بیٹھو آئے تھے۔ دو گانیاں  
دارا اور اس کے ساتھیوں کی تھیں۔ مجھے، جاکو اور لیزا کو ماسٹر  
ہو جن کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ مگر میں آگے ماسٹر  
کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ پھر سادو بیٹھوے دارا والی اس گاڑی پر قبضہ  
کر لیا۔ پھر مجھے کابجے سے انوار کے لئے تھے۔

گامزیاں اسٹارٹ ہو کر آگے پیچھے حرکت میں آئیں۔ ہمارے  
گامز آگے تھکی اور پسداد والی گامز تقریباً بیس گز پیچھے  
تارکک میں دشوار اور نامہوار راستے پر بغیر روشنی کے گامز چلا  
خلف سے خالی نہیں تھا۔

اس وقت رات کے دو بج چکے تھے سڑکوں پر سناٹا تھا۔ کلب اور کینسو فروغی عام طور پر ایک بجے بند ہو جاتے تھے۔ دونوں گاڑیاں مختلف سڑکوں پر دوڑ رہی ہوئی مارش ملانے کی آکٹاوا کھینچ رہی تھیں۔ وہاں پر ایک بچے کے سامنے رک تھیں۔ یہ دامن طرف تھیلی ہوئی لیزا اچھل پڑی۔ میرے لیے یہ اکثر خاصا دلچسپ تھا کہ مارش ہو جی ہمیں لیزا کے بچے کے لیے آتا تھا۔

پچھلی گاڑی بھی رک چکی تھی۔ پرساد اتر کر نیچے آگیا۔  
 نے ماسٹر کی بات سنی اور لیزا کی طرف دیکھنے لگا۔ لیزا دروازہ کھ

مجھے ہال نما کرے کے ایک صوفے پر لٹا دیا گیا۔ لیڑا اور جاسی فوراً ہی ایک کمرے میں گھس گئیں۔ چند منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آگئیں۔ لیڑا کے اشارے پر پر سادے مجھے صوفے سے اٹھا کر ایک بڑھرم میں آرام دہ بستر لٹا دیا۔

یہ کرم جڑی بوٹیوں کا حربہ تھی۔ اس میں بجائے لیا جائے  
تھی کہ میرے پیروں کی شدید جلن بتدریج کم ہونے لگی اور میرے  
مُحسُن ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگا۔

وہ کرے سے باہر چل گئی۔ ماسٹر وہاں کے کچھ نوجوانوں کے ساتھ  
برآمدے میں بیٹھ گئے تھے۔ ماسٹر کچھ دیر کے لیے باہر گئے  
وہاں کچھ مہینوں کے ساتھ گھوم پھر کر سیکورٹی کے پوائنٹ آف  
سے کھنکی کا اندر باہر سے جائزہ لیا اور دوبارہ میرے کمرے  
آگیا۔

کافی کی چکیوں کے ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔  
”ہم سات بچے کے قریب پر سی کی آخری رسومات سے

آتش فشان ۸۴ حصہ 2

اس ہائی دے پر چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ایک چتریلے راستے پر مڑی۔ اس کے ساتھ ہی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں لڑکے اٹھ کھڑے۔ انہوں نے سیٹ اٹھا کر نیچے بنے ہوئے لمبے سے بکس میں سے آؤٹیک رائفیں نکال کر آپس میں بانٹ لیں اور دوبارہ سیٹ درست کر کے بیٹھ گئے۔ ایک رائفل میرے حصے میں بھی آئی تھی۔

سامنے ایک جگہ روشنی نظر آ رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر انکشاف ہوا کہ وہ کسی کاشت کار کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ فضا میں ہمک سی رہی ہوئی تھی جو اطراف میں دھان کی فصل کی موجودگی کا اطلاع دے رہی تھی۔ جب اس مکان کے سامنے رک گئی۔

ماسٹر ہوجن کے ساتھ ہی سب لڑکے چلا تھیں لگا کر جب سے اتر گئے۔ جب تک آواز سن کر دو لڑکے مکان سے بھی باہر آ گئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفیں تھیں۔ ماسٹر نے بانی لڑکوں کو باہری کھڑے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں اور ماسٹر مکان کے اندر داخل ہو گئے۔

ایک کمرے میں کرسیوں پر دو آدمی بندھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو شاٹنگ ہی تھا اور دوسرے کو دیکھ کر میری رکوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کپٹانیں سلگنے لگیں۔ یہ دارا کا وہی گرگا تھا جس نے کانچ میں تھائی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ مڑھا ہوا گیا۔

”تم نے تو ایک آدمی کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ یہ دوسرا کون ہے؟“ ماسٹر ہوجن نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا۔

”یہ دراصل تین آدمی تھے۔ لڑکے نے بتایا۔“ یہ مونا تو اسی وقت ہمارے قابو ہو گیا تھا جب باقی دو بھاگ نکلے تھے۔ اس کا سبب ہو گئے تھے۔ بعد میں یہ بھی پکڑا گیا۔ البتہ تیسرا نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔“

”اسے کھول کر میرے حوالے کر دو۔“ میں نے کرسی پر بندھے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”جانتے ہو اسے؟“ ماسٹر ہوجن نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ اس رات تھائی کے ساتھ دست درازی کی تھی اور میں نے قسم کھائی تھی کہ یہ جب بھی مجھے لے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے کہا۔

ماسٹر ہوجن نے اپنے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے کرسی پر بندھے ہوئے خنڈے کی رسیاں کھول دیں۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ وہ خوف سے تھر تھرا کانپ رہا تھا۔

”تم تو بہت بہادر آدمی ہو۔ بدن پر رش کیوں طاری ہو رہا ہے۔“ میں نے اسے گھورا اور اسے کچھ سوچنے کا موقع دینے بغیر ہی اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پچھتاہٹا۔ میں

نے اپنی رائفل ماسٹر ہوجن کو تمھاری اور اس خنڈے پر گھونسل اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اس کی پٹائی میں بالکل مڑا نہیں آ رہا تھا۔ بس میں اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں تمھیں اتنا بڑول بھی نہیں سمجھتا تھا۔“ میں نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”اس رات اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں تم نے مجھ پر چند بڑے اچھے داؤ آڑائے تھے۔ اب میں تمھیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم مجھے دو ہاتھ بھی لگا دو تو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ ان میں سے کوئی بھی مداخلت نہیں کرے گا اور نہ ہی تمھیں کوئی روکے گا۔“

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے ماسٹر اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں غافل نہیں تھا۔ میں نے اس کا وارہا میں کلائی پر دھکا اور وارہا میں ہاتھ کی کھڑی تھیلی سے اس کے منہ پر وار کیا۔ ضرب اس کی ناک پر لگی۔ وہ ذہن ہوتے ہوئے بکے کی طرح ہلکا ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہنے لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ میں نے سینٹیلے کا موقع دینے بغیر ہی تیزی سے گھوم کر ساڑھ لگا دی۔ وہ چکر پیچے گرا۔

”ٹھہر۔۔۔“ میں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کیا لیکن میں نے اس کی کلائی پکڑ کر پوری قوت سے موڑ دی۔ وہ کراہتا ہوا گھوم گیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ بازو میری گرفت میں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بازو کو گرفت میں لے لے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کے جوڑ پر کھڑی تھیلی کا وارہا کر دیا۔ اس وارے میں چھ انچ موٹی ٹھوس ٹکڑی کی سلیب توڑ دیا کرتا تھا۔ وہ تو گوشت و پوست کا آدمی تھا۔ کڑک کی آواز کے ساتھ اس کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ ایک بار پھر ہلکا ہوا تھا۔ میں نے اس کے گلے پر کنگ لگاتے ہوئے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ چیخا ہوا منہ کے بل گرا۔

ماسٹر ہوجن اور دوسرے لڑکے دلچسپ نظروں سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ میرا حریف چند لمحوں میں زین پر چڑا ہوا پھر کراہتا ہوا اٹھ گیا۔ اس کا رایاں بازو پہلو میں بھول گیا تھا اور چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ شاید اس پر بخون طاری ہو گیا تھا۔ وہ لنگے ہوئے بازو کی پروا کیے بغیر اٹلے ہاتھ سے اوڑیاؤں کی ٹھوکروں سے حملے کر رہا تھا لیکن ایک تو وہ مارشل آرٹس نہیں تھا۔ اسٹریٹ فائٹر تھا اور اسٹریٹ فائٹنگ میں کوئی قاعدہ نہیں ہوتا۔ دوسرے اس لڑائی میں دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس پر بخون سا طاری ہو گیا تھا اور بخون میں ہوش و حواس کام میں کرتے۔

کرسی پر بندھا ہوا شاٹنگ بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ خوف

اس کا چہرہ بھی ہلکا ہوا تھا۔ میں اپنے حریف کو بیٹھا ہوا مکان سے باہر لے آیا۔ میں نے اسے ایک اور کنگ لگا دی تو وہ ایک بار پھر منہ کے بل گر گیا۔

”وہ درخت دیکھ رہے ہو؟“ میں نے تقریباً دس گز دور ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ ”زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے اور تم تو اس وقت زندگی کے لیے نچانے کیسی کیسی دغا میں مانگ رہے ہو گے۔ اگر تم دوڑتے ہوئے اس درخت تک پہنچ جاؤ تو تمھیں زندگی مل سکتی ہے اب اٹھ کر جتنا تیز دوڑ سکتے ہو دوڑ کر اس درخت تک پہنچ جاؤ۔“

وہ چند لمحوں میں زین پر چڑا ہوا پھر اٹھ کر میری طرف دیکھا۔ اس وقت وہ مجھ سے دو گز کے فاصلے پر تھا اور پھر اچانک ہی وہ درخت کی طرف دوڑ پڑا۔

اس نے ابھی تو حمار راستہ طے کیا تھا کہ میں نے قریب کھڑے ہوئے لڑکے سے رائفل چھپتی لی اور فائر کر دیا۔ آدھک اور خاموش فضا گریوں کی ترزا باٹ سے گونج اٹھی۔ فائرنگ کی آواز میں اس شخص کی آخری چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں نے پورا برست مارا تھا اور اس کا جسم پھٹتی ہو گیا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور رائفل اسی لڑکے کو تھما کر مکان کے اندر واپس آ گیا۔

کرسی پر بندھے ہوئے شاٹنگ کے چہرے پر مرونی سی چھائی ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے وہ اپنے ساتھی کا انجام سمجھ چکا تھا اور شاید اسے اپنا انجام بھی سامنے نظر آ رہا تھا۔

شاٹنگ سے اب تک کئی مرتبہ آتما سامنا ہو چکا تھا۔ وہ کئی مرتبہ جانتا تھا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا لیکن آج اس کے بھانجے کا کوئی چانس نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ آج اس کی خیر نہیں۔

ماسٹر ہوجن کے خیال میں دارا وغیرہ بھی اسی نواح میں کسی جگہ چھپے ہوئے تھے اور شاید انہیں بھی پتا چل گیا تھا کہ تمام راستوں کی گھرائی کی باری ہے اسی لیے کہیں ڈبکے بیٹھے تھے لیکن جب شاٹنگ سے پوچھ پچھ شروع ہوئی تو وہ کوئی اور سی کامیائی سامنے لگا۔

”دارا! تم اور چچا فائنگ دونوں پہلے سو گنگ بھائی کی طرف نکل گئے تھے۔ وہ اب تک بنگا بنگا پہنچ چکے ہوں گے۔“

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمھیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے اور تم تو دارا کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے۔ میں سچ جانتا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ کہاں ہیں؟“ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ تمھارے ساتھ کسی قسم کی رعایت رہتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمھارے ایک ساتھی کی لاش باہر پڑی ہے۔ اگر تم نے زبان نہ کھولی تو تمھارا بھی یہی حشر ہو گا اور تمھاری لاش کو بھی کتے

اور بھیرے کھا جائیں گے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ لوگ یہاں سے جا چکے ہیں۔“ شاٹنگ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور ماسٹر ہوجن کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ماسٹر! تم شاید اس کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتے۔ یہ وہ آدمی ہے جس کے ذریعے دارا گولڈن ٹرائی اینگل سے رابطہ برحانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا منصوبہ شاید گولڈن ٹرائی اینگل سے وسیع پیمانے پر ہیروئن کی اسمگلنگ کا ہے۔ پینڈو تو دارا کے کہنے پر دس ہزار ڈالر اس منصوبے کے ابتدائی مرحلے پر بطور ایڈوانس خرچ بھی کر چکا ہے لیکن ابھی ان کی بات فائل نہیں ہو سکی۔“

”اوں۔“ ماسٹر ہوجن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے ہیروئن کی اسمگلنگ کے علاوہ ان لوگوں کا ایک اور بھی منصوبہ ہے جو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے اسی لیے میں دارا کو اس کے بل سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اب یہ میرے دو سوالوں کے جواب دے گا۔ ایک تو یہ کہ دارا کہاں چھپا ہوا ہے اور نمبر دو اس دوسرے منصوبے میں اور کون کون لوگ شامل ہیں؟“

”مم۔۔۔ میں کسی دوسرے منصوبے کے بارے میں نہیں جانتا۔“ شاٹنگ کے چہرے پر وحشت سی پھیل گئی۔ ”میں صرف مل میں ہوں۔ دارا کو گولڈن ٹرائی اینگل لے جا کر جہاز کھوات سے ملواتا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے معاوضہ دینا پڑے گا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ انہوں نے ہیروئن کی اسمگلنگ کا کوئی منصوبہ بنا رکھا ہے۔“

ماسٹر ہوجن نے اچانک ہی اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا۔ شاٹنگ کراہ اٹھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی دھار بہنے لگی تھی۔

”میں سچ جانتا چاہتا ہوں۔“ ماسٹر ہوجن غرایا۔ ”ہیروئن کی ذیل کے علاوہ دوسرے منصوبے میں کون کون لوگ شامل ہیں؟“

”مم۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ شاٹنگ کا لہجہ روکنے والا تھا۔ ”میں بہت لمبی سلاخ کا آدمی ہوں۔ میں نے تو آج تک جہاز کھوات کو بھی نہیں دیکھا۔ مجھے میرے پاس سے حکم ملا تھا کہ دارا سے رابطہ کروں اور اسے گولڈن ٹرائی اینگل لے جاؤں جہاں جہاز کھوات سے اس کی ملاقات کروائی جائے گی۔“

”تمہارا پاس کون ہے؟“ ماسٹر نے پوچھا۔

”فائنگ بچہ۔“ شاٹنگ نے جواب دیا۔ ”اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جہاز کھوات تک اس کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اسے بھی کسی اور کے توسط سے یہ حکم ملا ہو گا۔“

”تم اب تک دارا کو گولڈن ٹرائی اینگل لے کر کیوں نہیں گئے حالانکہ تمھیں بنگا آئے ہوئے دو تین مہینے ہو چکے ہیں؟“



ماستر نے پوچھا۔

”دارا کی اپنی کچھ مصروفیات ہیں۔“ شاہک نے کہا ”میں تمہارے اس مثل ماسٹر نے اسے اٹھا کر رکھا ہے۔ دارا نہیں چاہتا کہ یہ اس کا بیچا کرتے ہوئے گولڈن ٹرائی اسٹل تک پہنچ جائے۔ پہلے وہ اس سے ٹھنڈا چاہتا ہے۔ پینڈو تو اسے بہت پہلے ختم کر چکا ہو تا مگر دارا کو اب کسی ڈانزی کی تلاش ہے جس میں لاکھوں امریکی ڈالر مالیت سونے کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ پہلے اس سے ڈانزی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اسے ختم کر دیا جائے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”چند روز پہلے یہ ہماری گرفت میں آگیا تھا۔ اس کی زبان کھلوانے کا بھی بندوبست کر لیا گیا تھا لیکن عین وقت پر تمہاری مداخلت سے یہ ایک باہر پھوٹ گیا۔“

”کیا تم لوگ اسے ایسا ہی ترنوالہ سمجھتے ہو جسے آسانی سے لٹکا جاسکے؟“ ماسٹر ہوجن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ لوگ اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیتے۔ پینڈو تو سب سے پہلے اسے ختم کرنا چاہتا تھا لیکن دارا نے بیچ میں اس ڈانزی کا غشوش چھوڑ دیا اور جب پینڈو کو یہ پتا چلے گا کہ یہ مکمل طور پر دارا کے قبضے میں آنے کے بعد نکل چکا ہے تو پینڈو پاگل ہو جائے گا۔ وہ سب کا ہے اسی بات پر دارا سے اس کا بھگڑا بھی ہو جائے۔ پینڈو اب کسی قیمت پر اسے معاف نہیں کرے گا۔ اس نے نہ صرف پینڈو کے دوست یا ٹیگر کو بلکہ اس کے بھائی سائی کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سائی کے قتل کے بعد سے تو وہ پاگل ہوا پھر رہا ہے۔“

”یہ تو تم اعتراف کرتے ہو کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے مسکراتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا ”اگر تمہیں اسی کے حوالے کر دیا جائے تو کیا کرے؟“

”نہیں۔ میں اس جیسے سفاک آدمی کے ہاتھوں مرنا پسند نہیں کروں گا۔“ شاہک نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اور خوف ابھر آیا تھا۔

”تو پھر۔ یہ بتاؤ دارا اور اس کے ساتھی کہاں چھپے ہوئے ہیں؟“ ماسٹر ہوجن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ تینوں دو عین دن پہلے سوگ چٹائی کی طرف نکل گئے تھے۔“ شاہک نے جواب دیا۔

”مثل ماسٹر۔“ ماسٹر ہوجن میری طرف مڑ گیا ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت دیر سے بے چین ہو رہے ہو۔ اب تمہیں میری طرف سے اجازت ہے۔“

میں وہ قدم آگے بڑھ آیا۔ میری طمیاں بھینچی ہوئی تھیں۔

شاہک کے سامنے پہنچ کر میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھول دی اور انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے شاہک کی طرف دیکھنے لگا اور پھر مجھے ہی میں نے ہاتھ دہرایا ”وہ چچا اٹھا۔“

”بہن۔“ نانا ہوں۔ رک جاؤ۔“

میرا ہاتھ پکڑا گیا۔ انداز میں رک گیا۔

”گڈ۔“ ماسٹر ہوجن بولا ”اب جلدی سے زبان کھول دو۔“

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”وہ تینوں ہائی کمانڈ آفیسر کے قریب ایک بڑے فیملی کالج میں چھپے ہوئے ہیں۔“ شاہک بتانے لگا ”اس کالج میں دو جوان لڑکیوں، ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھے موہ پر مشتمل یورپین فیملی رہا کر رہی ہے۔ یہ کالج انہوں نے عین دن کے لیے کرائے پر لے رکھا ہے۔ دارا وغیرہ اس یورپین فیملی کو یہ غمال بتایا ہے۔ ویسے ان یورپین لوگوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن انہیں جب بھی باہر جانا ہوتا ہے دارا اور اس کے ساتھی ان دو دوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کو اپنے قبضے میں رکھتے ہیں اور انہیں دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر ان کے بارے میں کسی کو بتایا گیا تو اس لڑکی کو قتل کر دیا جائے گا جو ان کے قبضے میں ہوگی۔ دارا وغیرہ یہ بھی جانتے ہیں کہ چاروں طرف ان کی تلاش ہو رہی ہے۔ جیسے ہی تلاش کا یہ سلسلہ ختم ہوگا، وہ لوگ وہاں سے نکل جائیں گے۔“

”تم وہاں سے کیسے نکل آئے؟ کیا تمہیں پکڑے جانے کا خوف نہیں تھا؟“ ماسٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”کل صبح دارا نے اس کالج کے فون سے چیانگ رائے میں میرے پاس فاکس چمن سے بات کی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ مجھے کسی طرح وہاں سے نکال دیا جائے کیونکہ مجھے کسی کام سے گولڈن ٹرائی اسٹیل بھیجا جانے والا ہے۔“ شاہک چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”دارا نے آج شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مجھے اپنے دو آدمیوں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ ہم کالج میں رہائش پذیر یورپین باشندوں کی گاڑی لے آئے تھے لیکن میں اسے تقریباً دو میل دور گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ دونوں گن میٹروں کا بھی یہی خیال تھا کہ ہم اس طرف سے شارٹ کٹ کر کے نکلیں تو دیر پا کر کے کسی اور محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ تمہارے آدمی قدم قدم پر گھمات لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم جیسے ہی اس طرف آئے، انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک آدمی تو بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا لیکن ہم دھڑلے ہو گئے۔“

”وہ کالج کہاں پر واقع ہے؟“ ماسٹر نے پوچھا۔

”آبشار کے شمال کی طرف تقریباً نصف میل کے فاصلے پر۔“ شاہک نے جواب دیا ”وہ ایک پراچین فیملی کالج ہے اور اس پر سترہ ستر لکھا ہوا ہے۔“

”فیک ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا اور اپنے دو لڑکوں کو اشارہ کیا۔

”وہ دونوں لڑکے شاہک کو کھول کر باہر لے جانے لگے تو وہ دھڑکتے ہوئے چلنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا مزاحمت ہے۔ پہلے وہ چچا کو معافی مانگتا رہا پھر مغلظات کہنے ہونے والا ہے۔ پہلے وہ چھپتے ہوئے مکان سے باہر لے گئے اور گڈ۔ وہ دونوں لڑکے اسے چھپتے ہوئے مکان سے باہر لے گئے اور کچھ ہی دیر بعد نفاذ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ شاہک اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔



دیرانے کوئے نوئے جسے عام طور پر چھوٹا ”کوائے ریور“ بھی کہا جاتا ہے، ایمنو سیک سے ہوتا ہوا ایمنو سائی سٹوٹ کی طرف بہتا ہے۔ پناہی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کے راستے میں لاتعداد چھوٹے بڑے آبشار ہیں جو ہلکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے دلچسپ تفریح فراہم کرتے ہیں۔ مقامی باشندوں نے اس دریا کے آس پاس خصوصاً آبشاروں کے قریب ہٹ اور کالج وغیرہ بنا رکھے ہیں جو سیاحت کے سیزن میں غیر ملکی سیاحوں کو کرائے پر دے دیے جاتے ہیں۔

ہائی کمانڈ آفیسر تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں۔ سڑک اور دریا۔ کشتیوں کی آمد رفت شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی بند ہو جاتی ہے جبکہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اس طرف آنے والی بسیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ دن کے وقت دریا کی راستہ عام طور پر چاہیں منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ رات کے وقت لوگ کشتیوں پر سفر نہیں کرتے لیکن بعض مہم جو لوگ تاریکی یا عین رات کے وقت بھی یہ قلعہ مول لے لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ فاصلہ طے کرنے میں کم از کم پندرہ گھنٹہ ضرور لگ جاتا ہے۔

اس کشتی میں میرے علاوہ چار آدمی اور تھے۔ ماسٹر ہوجن اور اس کے ساتھ تین گن مین۔ گن رشتہ رات شاہک نے بتایا تھا کہ دارا وغیرہ آبشار سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر سترہ ستر کالج میں چھپے ہوئے ہیں۔ ماسٹر ہوجن نے اپنا ایک آدمی آئن مچ سویرے ہی اس طرف بھیج دیا تھا جو بدھ عمارت کی طرف بھاگ کر وہاں پہنچا۔ اس کی رپورٹ نے شاہک کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ انہوں نے چار افراد پر مشتمل یورپین فیملی کو یہ غمال بتا رکھا تھا۔ ان میں سے کسی نے خود تو کبھی کالج کے باہر بھاگ کر بھی نہیں دیکھا تھا البتہ ان یورپین باشندوں کو باہر آتے جاتے دیکھا گیا تھا لیکن وہ بھی تمام افراد اکٹھے باہر بھی نہیں گئے تھے۔ ان کے ساتھ بھی ایک لڑکی کالج میں نہ جاتی اور کبھی دوسری جس کا مطلب تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک لڑکی کو یہ غمال بنا کر رکھا جاتا تھا جبکہ دوسرے لوگوں کو باہر لے جانے کی اجازت تھی۔

ماسٹر ہوجن کے آدمی کی رپورٹ کے مطابق وہ فراہمی تھے اور ہر وقت خوف زدہ سے رہتے تھے۔ کوئی اور ان کے خوف زدہ

ہونے کی وجہ سمجھا ہوا نہ سمجھا ہو لیکن ہم جانتے تھے کہ وہ خطرناک قاتلوں کے قبضے میں کے ہوئے تھے۔ ان کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ کس سمیت میں گرفتار ہیں۔ ان کی معمولی سی غلطی ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

ماسٹر کا جو آدمی دن بھر اس علاقہ کی نگرانی کرتا رہا تھا وہ بھی اس وقت ہمارے ساتھ کشتی پر سوار تھا۔ اسے کالج کی نشان دہی کے لیے ساتھ لے لیا گیا تھا۔ کشتی دریا کے بڑاؤ کے رخ پر بہہ رہی تھی اس لیے اسے کچھ میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

رات کی تاریکی میں اس دریا میں کشتی رانی خاصا خطرناک کام تھا۔ وہ دونوں آدمی جو چار سنبھالے ہوئے تھے، بڑی احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس احتیاط کی وجہ سے ہی ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اپنا سفر مکمل کر سکتے تھے۔ کشتی کو لینڈنگ پر چھوڑ کر ہم اپنے خبر کی رہنمائی میں پناہی راستوں پر چلے گئے۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کالج تھے اور تقریباً چار کالج میں دو کشتی نظر آ رہی تھی۔ اس علاقے میں سیاحوں کی سولت کے لیے دو تین ریسٹورنٹ بھی تھے اور تینوں ریسٹورنٹوں میں اس وقت خاصی رونق نظر آ رہی تھی۔

سب سے آگے ہمارا خبر تھا۔ اس کے پیچھے ایک گن مین پھر میں اور ماسٹر ہوجن اور سب سے پیچھے ایک اور گن مین تھا۔ ماسٹر کے تینوں آدمیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ میرے اور ماسٹر کے پاس پستول تھے۔ میری پندلی سے خبر بھی بندھا ہوا تھا۔ ہم ایک ریسٹورنٹ کی پچھلی طرف سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے لیکن ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔

”فائرنگ کی آوازیں اسی طرف سے آ رہی ہیں۔“ ہمارے خبر نے چخ کر کہا۔

فائرنگ کی آوازیں سے یوں لگتا تھا جیسے دوپائٹوں میں طعن مچی ہو۔ میں اور ماسٹر ہوجن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو ہاتھ دھکے دیے لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رک جانا پڑا۔

وہ کالج اب ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ باہر دو اطراف سے کالج پر فائرنگ کی جاری تھی اور کالج کی طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمارا آگے جانا بے کار تھا۔ ہم وہیں روک کر آؤ میں رک گئے۔

فائرنگ کے ساتھ عورتوں کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پھریوں لگا جیسے فائرنگ کی آوازیں کالج کی پچھلی طرف دور ہوتی جا رہی ہوں۔ یہ آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئیں۔ کچھ دیر تک اکاؤٹا آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر وہ بھی بند

ہو گئیں۔

ہم کچھ دیر درختوں ہی میں کھڑے رہے اور پھر جتنا انداز میں آگے بڑھنے لگے تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے ایک بار پھر رک گئے۔ وہاں سے وہ کالج صاف نظر آ رہا تھا۔ برآمدے میں جلنے والے بلب کی روشنی میں پولیس کی دودلیوں میں وہ آدمی دکھائی دیے تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

”تم لوگ واپس جاؤ اور کشتی پر ہمارا انتظار کرو۔“ ماسٹر ہوجن نے اپنے تئیں آدمیوں کو حکم دیا۔

یہ جگہ چونکہ آبشار سے کافی دور تھی اس لیے یہاں کالج بھی زیادہ نہیں تھے۔ دوسرے کالج میں رہائش پذیر لوگ اب آہستہ آہستہ اپنے کمروں سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ سب اسی طرف دیکھ رہے تھے لیکن آگے جانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

اس میں ماسٹر ہوجن اس کالج کے سامنے بیچ لگے تقریباً ڈیڑھ درجن پولیس والوں نے اس کالج کو گھیر رکھا تھا۔ اندر سے عورتوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم مزید آگے بڑھے تو دو پولیس والوں نے ہمیں رائفلوں کی زور پر لینے ہوئے رک جانے کا حکم دیا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک کانسٹیبل رائفل ہچکاتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔ اس نے رائفل زمین پر رکھ کر ماسٹر کو (BOW) مارشل آئرس کا مروجہ سلام یا تعظیم دینے کا انداز کیا پھر رائفل اٹھا کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

”سوری ماسٹر! لیکن مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔“

وہ کانسٹیبل ماسٹر ہوجن کا شاگرد تھا۔ تقریباً تین سال پہلے اس نے ہنگام میں ماسٹر ہوجن ہی سے موئے تھانی کی تربیت حاصل کی تھی اور پھر یہاں آکر پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔

”ہم شام سے کچھ پہلے تفریح کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ اور دوست مل گئے ان سے گپ شپ میں دیر ہو گئی۔ کشتی پر واپس جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ کیا قصہ ہے؟“ ماسٹر نے پوچھا۔

”انسپیکٹر سوچان کو خفیہ طور پر اطلاع ملی تھی کہ کچھ مسلح لوگوں نے اس کالج میں ایک فرانسیسی لیلی کو قتل بنا رکھا ہے۔“ کانسٹیبل نے بتایا۔ ”ہم نے بڑی احتیاط سے اس کالج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا۔ فائرنگ شروع کر دی۔ جو اب میں انسپیکٹر سوچان نے بھی فائرنگ کا حکم دے دیا۔“

”انسپیکٹر سوچان کون؟“ ماسٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ بھی پانچ سال پہلے ہنگام میں ماسٹر ہوچکا تھے کہ نرننگ لے چکا ہے۔ مسٹر بری کے جنازے پر اس نے آپ سے ملاقات بھی کی تھی۔“ کانسٹیبل نے بتایا۔

”وہن میں نہیں آ رہا۔ چودھویں گا تو پچپان لوں گا۔“ نے کہا۔

”میں انسپیکٹر کو اطلاع دیتا ہوں۔“ کانسٹیبل تیز تیز ہوا کا بیج میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد انسپیکٹر سوچان بھی اس کے ساتھ کالج آیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ماسٹر ہوجن نے اسے پہچان لیا۔ ہم پہلے ماسٹر کو بولیا اور پھر آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ماسٹر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بڑی جھجھکی ہوئی نظر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ماسٹر نے انسپیکٹر سوچان سے اس ریڈے کے بارے میں اس کی کیا اور پھر وہ ہمیں اندر لے گیا۔ صورت حال نہایت افسوسناک تھی۔ ایک کمرے میں اس لیلی کے سربراہ کی لاش پڑی تھی اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ تھی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں ایک گردن پر اور ایک سینے پر۔ زخموں سے بننے والا خون پھیل رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دو عورتیں بھی دے بائیں ہاں دو مرد تھیں۔ ایک کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اس مقتول بوڑھے کی بیوی بلکہ اب بیوہ تھی۔ دوسری ایک اور خوب صورت لڑکی تھی جس کی عمر کا اندازہ چوبیس پچیس لگ بھگ لگایا جاسکتا تھا۔ بے حد حسین تھی وہ۔ اس نے فیوڈی کلر کا مٹی اسکرٹ اور بلاؤڈ پین رکھا تھا۔ ان دونوں حالت خاصی اتر تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ دو کر اپنے آپ کو فخر کی۔

ان کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی افسوس ہوا رہا تھا۔ میں اُدھر دیکھنے لگا۔ شاگ نے بتایا تھا کہ یہ لیلی چار افراد پر تھی۔ میاں بیوی اور دو جوان لڑکیاں لیکن دوسری لڑکی نظر آ رہی تھی۔ انسپیکٹر سوچان ماسٹر کو اس ریڈے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ہماری اطلاع کے مطابق وہ تین آدمی تھے جنہوں نے لیلی کو قتل کیا تھا۔ ہم نے ریڈے کی منصوبہ بندی تو بڑی باخبر سے کی تھی لیکن انہیں شاید پہلے ہی سے شبہ ہو گیا تھا اور وہ۔“ تیار بیٹھے تھے۔

انسپیکٹر سوچان جس طرح اس واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا چنڈ تھا۔ اسے تھا کہ یہاں تین خیرات مسلح آدمی موجود ہیں اور وہ اس طرح دوڑا تھا جیسے وہ لوگ پولیس کو دیکھتے ہی ہتھیار پھینک کر باہر آجائے گے اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں گے۔

”اس بوڑھے کے سوا کوئی اور جانی نقصان تو نہیں ہوا۔“ ماسٹر نے پوچھا۔ اس کے ذہن میں بھی وہی بات تھی جو میں سوچ رہا تھا۔ وہ دوسری لڑکی کے بارے میں جانتا چاہتا تھا لیکن ایسا سوال براہ راست نہیں کیا جاسکتا تھا اور یہ گفتگو تھانی زبانانہ

بھری تھی کہ وہ عورتیں نہ سمجھ سکیں۔

”وہ لوگ ایک جوان لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“ انسپیکٹر سوچان نے جواب دیا۔ ”ہمارے نصف درجن آدمی ان کے قریب ہیں۔ امید ہے اس لڑکی کو زانیہ کر لیا جائے گا۔“

قرب میں ہیں۔ امید ہے اس لڑکی کو زانیہ کر لیا جائے گا۔“

میں انسپیکٹر سوچان کی اس سادہ پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہا تھا۔ مجھے تو اب اس لڑکی کی زندگی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔

ہم تقریباً دو گھنٹہ وہاں کھڑے رہے۔ انسپیکٹر نے ماسٹر کو بتایا تھا کہ اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر کو فون پر اطلاع دے دی ہے۔ کچھ دیر میں پولیس کی مزید نفری اور ایمریلنس بھیجے والی ہے۔ ہمارے لیے وہاں رک کر وقت ضائع کرنا ہے کار تھا۔ انسپیکٹر سوچان نے ہماری ساری محنت پر اپنی پیمبر دیا تھا اور اس کی حماقت کی وجہ سے دارا اور اس کے ساتھی ایک بار پھر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

”ایک منٹ ماسٹر۔“ کالج سے باہر آکر انسپیکٹر نے ہمیں روک لیا۔ ”یہاں دو نوجوان نہیں جس کی وجہ سے کچن بوری میں کئی روز سے بیٹھے ہو رہے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا اور ماسٹر کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ”اس وقت یہاں آپ دونوں کی موجودگی مجھے شہادت میں جلا کر رہی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق پڑھو کے آدمی بھی کچن بوری میں موجود ہیں اور آج صبح سوئگ چال کی طرف جانے والے راستے سے ہٹ کر ایک خالی فارم ہاؤس کے قریب دو آدمیوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں بھی ملی ہیں اور ان میں سے ایک لاش چننا کے رائے کے فائیک چمن کے آدمی کی ہے۔ فائیک چمن کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ طوفان اٹھا دے گا۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان دونوں کو ہم نے قتل کیا ہے اور یہاں بھی ہمارا تعلق اس کالج سے کچھ ہو سکتا ہے؟“ ماسٹر نے اسے گھورا۔

”بالکل نہیں ماسٹر۔“ انسپیکٹر سوچان نے کہا۔ ”میاں کئی روز سے اس قسم کے ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ماسٹر بری بھی غالباً اسی چکر میں مارا جا چکا ہے۔ ان ہنگاموں کے حوالے سے اخبارات برلا تمہارے اس نکل ماسٹر پڑھو اور اس کے ایک آدمی دارا کا نام لے رہے ہیں۔ آج صبح فائیک چمن کی لاش ملنے کے بعد پولیس کے افسران اعلیٰ کی ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ میں تو اس میٹنگ میں شریک نہیں تھا لیکن کارروائی سے بے خبر نہیں ہوں۔“

ماسٹر کو کچھ بولنے کے بجائے سوالیہ نگاہوں سے انسپیکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ انسپیکٹر نے کہا۔

”مسلح ماسٹر کے خلاف ان ہنگاموں میں ملوث ہونے کا اگرچہ کوئی ٹھوس ثبوت ابھی تک نہیں ملا لیکن میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ ماسٹر بری کے جنازہ اور اخبارات کے ذریعے مسلح ماسٹر کو یہ وارننگ دی جائے کہ وہ مزید کوئی ہنگامہ کیے بغیر کچن بوری سے نکل

جائے بصورت دیگر اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے جائیں اس لیے میری یہ درخواست ہے کہ نکل ماسٹر کچن بوری سے چلا جائے کیونکہ اب معاملہ ہوت پر تک پہنچ چکا ہے۔“

”اوکے“ ماسٹر ہوجن گمراہ سانس لینے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری بات پر غور کروں گا انسپیکٹر۔“

”انسپیکٹر نہیں ماسٹر سوچان۔“ انسپیکٹر جلدی سے بولا۔

”تھینک یو سوچان۔“ ماسٹر نے یہ کہتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تینوں آدمی کشتی میں ہمارے بکھرے بیٹھے ہی کشتی کی رسی کھول دی گئی اور دو لڑکے چپو چلانے لگے۔

راستے میں ماسٹر ہوجن اور میرے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ کچن بوری کی لینڈنگ پر ہم کشتی سے اتر کر اس کار میں سوار ہو گئے جو دہاں چھوڑ گئے تھے۔ ان تینوں لڑکوں کو پرسی کے جتنا زہیم پر چھوڑ کر ہم لیمز والی کو بھیجے گئے۔

دارا وغیرہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے لیکن ہمارے لیے صورت حال خاصی تشویش ناک ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں ہمارا جے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ماسٹر فون پر مہاراج سے باتیں کرنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

”مہاراج کا کہنا ہے کہ پولیس سے ابھینے کی ضرورت نہیں۔ ہم تین دن وہاں رہیں۔ اس دوران میں دارا اور اس کے ساتھیوں کو کبھی تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہیں اور پھر ناک واپس چلے جائیں۔“ ماسٹر نے کہا۔

”اوکے ماسٹر۔“ میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔

ماسٹر ہوجن چلا گیا اور میں پر ساد اور جاگتی وغیرہ کو کالج پر پولیس کے ریڈ اور دارا وغیرہ کے فرار کی تفصیل بتا کر انسپیکٹر سوچان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتائے لگا۔

”ہمیں پولیس سے ابھینے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میرے خاموش ہونے پر جاگتی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب دارا وغیرہ بھی یہاں نہیں ٹھہریں گے کیونکہ پولیس ان کے پیچھے لگ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آج رات ہی یہاں سے نکل جائیں۔“

”بہر حال“ ہمیں تین دن یہاں گزارنے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور موضوع تھا بھی نہیں۔

صبح اخبارات سننے خیر خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہیڈ لائن ہائی کاسین آبشار کے قریب اس کالج پر پولیس کے چھاپے کے حوالے سے تھی۔ بوڑھے فرانسیسی کی لاش اس کی بیوی اور بیٹی کی تصویریں بھی تھیں۔ اخبارات نے انسپیکٹر سوچان کا یہ بیان بھی نمایاں طور پر شائع کیا تھا کہ کالج میں اس فرانسیسی لیلی کو قتل

اس خبر سے مجھے اندازہ لگائے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ  
 را اور اس کے دونوں ساتھی رات ہی کو کچن بوری کی حدود سے  
 لگے تھے۔ جہاں سے لاش ملی تھی وہ جگہ کچن بوری سے تقریباً  
 نصف میل کے فاصلے پر تھی اور ظاہر ہے وہ لوگ رات ہی رات  
 اس اتنا طویل فاصلہ پیدل طے نہیں کر سکتے تھے جس کا مطلب تھا کہ  
 ان کے پاس سواری کا انتظام تھا۔ انہوں نے یا تو پہلے ہی سے کوئی  
 ڈیڑھ یا دو میل میں کہیں چھپا رکھی تھی یا کوئی گاڑی کسی سے چھپی  
 تھی۔ بہر حال، اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ دارا اور اس

شام آٹھ بجے کے قریب ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی۔  
 س نے باقلم کو شک کی بنا پر حراست میں لے لیا تھا۔ باقلم

پولیس بچہ زیادتی میں سرگرم نظر آ رہی ہے۔ برہنہ حال میں دیکھا ہوں کیا معاملہ ہے۔" ماسٹر ہوجنے کے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

میں باقی قسم کے لیے پریشان تھا۔ پولیس کے چھکنڈلوں سے کون واقف نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دے۔ میرا خیال تھا کہ پولیس کے سلسلے میں ماسٹر ایجنڈہ سوچاں سے کسی قسم کی

”میں نے کہا تھا تاکہ یہاں کی پولیس بہت تیزی سے کام کر رہی ہے۔“ ماسٹر ہو جن نے جواب دیا ”پولیس نے کیا حکم کو محض پوچھ گچھ کے لیے گیسٹ ہاؤس سے اٹھایا تھا۔ پانچم نے اپنے

بارے میں بتا دیا کہ وہ موٹر میکینک ہے اور سیو تفریح کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے اپنے ورکشاپ کا پتا بھی بتا دیا تھا۔ تفتیشی آفیسر نے اس کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے ہنگام میں اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کو فون کیا۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں اس کے خلاف کوئی کیس وغیرہ تو نہیں لیکن وہاں سے یہ سستی خیز انکشاف کیا گیا کہ پاٹھم نام کا موٹر میکینک پولیس کو ایک ایسی کار کی تفتیش کے سلسلے میں مطلوب ہے جس میں پیڑو کے بھائی سائی کی لاش چبکی گئی تھی۔ "ماسٹر ہو جن چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں نے کہا تھا کہ پولیس بعض اوقات کسی بہت معمولی سی بات سے بھی بڑے بڑے نتائج اخذ کرتی ہے۔ ہنگام پولیس نے بڑی محنت سے اس گاڑی کے بارے میں معلوم کر لیا تھا کہ وہ دراصل کس کی ملکیت تھی اور ان دنوں کس کے استعمال میں تھی۔ ہنگام پولیس نے...

سہری سے انداز میں پاٹھم کے اسسٹنٹ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا تاکہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔ اسسٹنٹ نے بتایا کہ پاٹھم سیو تفریح کے لیے دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ ہنگام پولیس ورکشاپ کی نگرانی کر رہی ہے تاکہ پاٹھم کے واپس آتے ہی اسے خبری میں گرفت میں لے لیا جائے اور میرا خیال ہے کہ پاٹھم جب تہاں آیا ہے اس نے اپنے اسسٹنٹ سے بھی فون پر رابطہ نہیں کیا۔ ورنہ اسے پولیس انگوٹھی کے بارے میں پتا چل جاتا۔"

میرے دماغ میں آمدہاں میں چلی رہی تھیں اور پورے جسم میں سستی کی لہر دوڑ رہی تھیں۔ پاٹھم اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس گاڑی کے بارے میں معلوم نہیں کیا جاسکتا اور اس حقیقت کو اس وقت بھی بھول گیا تھا کہ پولیس جب دیانت داری سے کام کرتی ہے تو گزے عرصے میں کھانڈی بھی ہے اور پھر وہ معاملہ تو پیڑو کے بھائی کے قتل کا تھا جس کی وجہ سے ہنگام میں شدید بے گناہ ہوئے تھے اور کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ ہنگام پولیس نے سائی کے قتل کے الزام میں ماٹھم کو قتل کے خلاف رپورٹ درج کی تھی اور مہاراج کی وجہ سے ایف آئی آر میں میرا نام نہیں آیا تھا لیکن اب معاملہ ایک نیا رخ اختیار کر گیا تھا۔ میرے اور پاٹھم کے درمیان تعلق تلاش کرنے میں پولیس کو اب زیادہ دھڑائی پیش نہیں آتی۔

"ماسٹر... ہاں آخر میں نے کہا "معاملہ واقعی بہت گہیر ہو گیا ہے۔ اگر پاٹھم اس کیس میں جھپٹ گیا تو مزید گڑبڑ ہوگی۔ پاٹھم کو اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" ماسٹر نے کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پاٹھم کے بارے میں ہم بالکل نہیں جانتے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"اس گاڑی سے پاٹھم کے قتل کے انکشاف کے بعد ہمارا کوئی خفیہ مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس گاڑی سے پیڑو کے بھائی کی لاش نکالی گئی تھی اور پیڑو تک یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ پاٹھم یہاں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں پہنچ جائے۔ پولیس کو یہ بھی شہ ہے کہ سائی ہمارے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور جب لاش پیراڈائز سے کپاؤڈ میں ڈالی گئی تھی تو اس وقت بھی اس گاڑی میں موجود تھے اور یہاں کی پولیس جانتی ہے کہ تم اس وقت تک نہیں بوری ہو، اس لیے حفظ الماتھم کے طور پر پاٹھم کو کسی خفیہ مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے جہاں اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور اس کے بعد اسے ہنگام پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"لیکن ماسٹر! کیا پاٹھم کو بے یار و مددگار چھوڑا جاسکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔" ماسٹر ہو جن نے جواب دیا "تفتیش کے دوران میں اگر پولیس نے پاٹھم سے ہمارا تعلق قائم کر لیا تو مہاراج کا وہ منصوبہ متاثر ہونے کا خطرہ بڑھ جائے گا جس کے لیے ہمیں تیار کیا جا رہا ہے۔"

"کیسا منصوبہ؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔" ماسٹر کی آواز سنائی دی "یہ بات شاید کل یا دو دن بعد میرے منہ سے نکل گئی ہے لیکن وقت آنے پر ہمیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ بہر حال، تم ریشان مت ہو۔ میں آج ہی معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ پاٹھم کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

"مجھے ضرور اطلاع دینا ماسٹر۔" میں نے کہا "پاٹھم نے میرے لیے کبھی اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اوکے میں تمہیں بتا دوں گا۔" ماسٹر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور مڑ کر دیکھا تو لیزا کے ساتھ جاگ رہی کھڑی تھی۔ میری باتوں سے جاگتی سمجھ گئی تھی کہ صورت حال خاصی سنگین ہے۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو اس کی آنکھوں میں تشویش ابھرتی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" جاگتی نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے اور پھر اس کے بعد ہی کچھ کیا جائے گا۔" میں نے جواب دیا اور لیزا کی طرف دیکھتے ہوئے چائے کی فرمائش کر دی۔ لیزا وہاں سے چلی۔ تو میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم بے گناہی سے کہا "ہنگام پولیس اس گاڑی کے ذریعے پاٹھم کے ورکشاپ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں کی پولیس نے بھی پاٹھم کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے ہنگام پولیس کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ ہنگام میں پاٹھم کے ورکشاپ کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ جیسے ہی واپس پہنچے گا اسے

مردار کر لیا جائے گا لیکن۔"

"معاذ میں بڑبڑا ہوا گیا۔" جاگتی نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں۔" میں نے کہا "اس معاملے کو آگے بڑھنے سے روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ پاٹھم کو پولیس کی تحویل سے نکالا جائے۔"

"ہاں۔ یہ بہت ضروری ہے۔" جاگتی نے کہا اور تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے چائے کے کپڑے سے نکل کر آنکھیں ملتی ہوئی آری تھی۔

اس سے پہلے کہ تھائی کچھ پوچھتی، میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیزا چائے لے کر آ رہی تھی۔ لیزا تھائی کے لیے بھی چائے بنا کر لے آئی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں پاٹھم ہی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ لیزا اگرچہ قابل اعتماد تھی۔ ہم نے اس پر عمل بھروسہ کیا تھا اور اس نے ابھی تک ہمارے اعتماد کو نہیں نہیں چھپائی تھی لیکن میں اسے ساری باتوں سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

شام سات بجے کے قریب ماسٹر ہو جن خود ہی پہنچ گیا۔

"پاٹھم کا پتا چلا ہے۔" اس نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی کہا "اسے سوئے تھا کہ پراویق ایک ہنگام میں رکھا گیا ہے۔ یہ ہنگام بظاہر ایک ریٹائرڈ پروفیسر کی رہائش گاہ ہے لیکن درحقیقت اس میں پولیس کے استعمال میں رہتا ہے۔ یہاں ایسے لوگوں سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے جو نہایت سنگین اور اہم معاملات میں ملوث ہوں۔ اسے تم خارجہ تعلیم بھی کہہ سکتے ہو۔ یہاں ایذا رسانی کے جدید ترین آلات موجود ہیں۔ یہ اسپیشل پولیس والے انحصار کے ایسے ایسے طریقوں سے واقف ہیں کہ چھری بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کو یہ باتیں..."

"چرمی کے ایک شاگرد سے معلوم ہوئی ہیں۔" ماسٹر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اس کا ایک کرن اسپیشل پولیس میں ہے۔ اس نے سب کچھ اسی سے معلوم کیا ہے۔"

"اور وہاں حفاظتی انتظامات؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں چار آدمی ہیں۔" ماسٹر نے جواب دیا "وہ چاروں مستقل اس ہنگام پر ڈیوٹی دیتے ہیں۔ آج ایک پانچواں آدمی بھی وہاں موجود ہے جو پاٹھم سے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ یہ اسپیشل پولیس کے انٹیلیجنس سیکل کا ایک اسپیکر ہے جسے نہایت سفاک اور ظالم سمجھا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پاٹھم کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسے لوگوں کو مارا نہیں جاتا۔" ماسٹر نے بتایا "پوچھ گچھ کے دوران میں ان پر تشدد تو کیا جاتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ انہیں کوئی ظاہری چوٹ نہ لگے اور وہ اپنی زبان بھی بند نہ کرے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا

لگا "میں نے وہ بھلا دیکھ لیا ہے اور میرا ارادہ ہے کہ آج ہی رات اس ہنگام پر ریڈ کر دیا جائے۔"

"نہیں ماسٹر۔" میں نے کہا "اب آپ اس معاملے میں ملوث نہیں ہوں گے۔ اگر ریڈ کے دوران میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو آپ نظروں میں آجائیں گے اس طرح گڑبڑ ہو جائے گی اور بات براہ راست مہاراج پر آئے گی۔"

"تو پھر کیا کہنا چاہتے ہو؟" ماسٹر نے چپھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ مجھے وہ بھلا دکھاؤ اور خود اس معاملے سے الگ رہیں۔" میں نے جواب دیا "اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے تو یہ کارروائی مجھے کرنے دیں ماسٹر۔ میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ کوئی یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ اس کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔"

ماسٹر چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

"چلو۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔"

ہم دونوں باہر آگئے۔ جہاں ماسٹر ہو جن کی گاڑی کھڑی تھی اور پچھلی سیٹ پر دو گھنٹے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر نے انٹیرنگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے ساتھ سپرزیوٹ پر بیٹھ گیا۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی شہر کے مشرقی نواح میں ایک کنگ ایجنسی "سب ڈسٹرکٹ کے علاقے میں آگئی۔ یہ سبائی صمد رہائشی علاقہ تھا تاہم کس کس دکانیں موجود تھیں۔ اوپری بیٹی سڑکوں کا ایک کشادہ تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف ہنگام تھے۔ ایک مارکیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے ماسٹر نے کار بائیں طرف ایک سڑک پر گھمائی اور تقریباً دو سو گز آگے جا کر اس نے کار بائیں طرف ہی ایک کشادہ گلی میں موڑ لی اور اس کے ساتھ ہی اندر کی جی پی بجادی اور کار کی رفتار کم کر دی۔

گلی کے دونوں طرف کشادہ ہنگام تھے لیکن بنگلوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے نیلیوں کی وجہ سے بہت سی جگہ چھٹی ہوئی تھیں۔ ان سرسبز نیلیوں پر پھولوں کے پودے تھے اور غالباً اس علاقے کو خوب صورت بنانے کے لیے ایسی جگہیں دانست چھوڑ گئی تھیں اور ان کی وجہ سے بنگلوں کے درمیان بھی فاصلہ حاصل ہو گیا تھا۔

ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ گلی میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ بعض بنگلوں کے سامنے گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ماسٹر ہو جن نے کار کی رفتار بہت کم کر رکھی تھی۔

"یہ وہ بھلا۔" اس نے سر سے بائیں طرف اشارہ کیا۔

اس ہنگام کے دونوں طرف سرسبز نیلے تھے ہنگام کی عمارت میں گیٹ سے تقریباً پچاس گز پہنچے بٹ کر کھلی لیکن گیٹ کے اندر کی طرف بالکل ساتھ ایک کراچی نظر آ رہا تھا۔ وہ غالباً چوکی دار کا کمرہ تھا جسے دوسرے الفاظ میں گاؤ روم بھی کہا جاسکتا تھا۔ پچھلی طرف سے بھی ہنگام کی دیوار ایک اونچے نیلے سے ملی ہوئی تھی۔

تھا! داغ اور جاگتی ہوئی کوئی کمری میں ہے سوئے بغیر نہ سکا کہ یہ بلباں جس آشیانے پر گریں گی اسے چشمِ زدن میں جلا کر راکھ کر ڈالیں گی۔ ان کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس وقت تو وہ دونوں واقعی قیامت ڈھا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو قیامت بنانے میں تمام تر صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔

پانچ منٹ اور گزر گئے۔ میرے خیال میں مزید انتظار خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے پرساد کو اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے دوبارہ پرچہ کر دوسری طرف کو دیا۔ نئے کچی زمین تھی۔ یہ

میں آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک گلاب میرے پاس  
 ٹکرا کر چنے کر کرٹ گیا۔ گلاب ٹوٹنے کی آواز سنائے میں دور  
 چلنے لگی تھی۔ میں ستون کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور یہی  
 قیاسی ملائی چند سیکنڈ بعد پر اُٹھے والا دروازہ کھلا اور  
 میں باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلنے سے پر اُٹھے  
 بھی مجھ سے پرہیز نہیں چلنے چلی تھی۔ اپنے آپ کو اس مختصر  
 نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے اپنی جگہ سے معمول  
 حرکت کی تو میرا ایک اور گلاب سے ٹکرا گیا۔ وہ گلاب کہہ کر تو  
 البتہ انہی گلاب سے مل کر گیا تھا۔ وہ مختصر پر ہڑتا ہوا آگے  
 اور ستون کے قریب سے گزر کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں  
 جیس میں نے یہی چاہتی تھی اس لیے جگہ سے حرکت کی۔ آہستہ  
 مختصر بھی چلتا چلتا نکلنے میں نے اسے موقع نہیں دیا۔  
 ایک اٹھ سے اس کا منہ دیا گیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے  
 چربی نکاس کی گدوں پر رکھ دی۔

کھڑی کاپٹ پوری طرح کھل گیا۔ پر ساداب آہستہ آہستہ  
 سے چوکت پر چڑھ رہا تھا۔ میں بھی ذرا آگے بڑھ گیا۔ پر  
 مجھے دیکھ لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پتول تھا۔ اس نے  
 طرف دیکھتے ہوئے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھایا اور محتاطانہ

کھڑی سے اُترنے لگے۔

وہ دونوں آدمی تھائی اور جاگتی میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں نہ تو اپنے ایک ساتھ کی عدم موجودگی کا احساس ہوسکا اور نہ ہی میری اور پراسادی کی موجودگی کا۔

کھڑی سے اُترتے ہوئے پراسادی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ اس نے ایک قریب قریب بڑی بوٹی کرسی پر رکھا لیکن پھر ٹھیک طرح نہیں پڑا تھا۔ کرسی الٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پراسادی بھی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ وہ بھی کرسی کے ساتھ ہی بیچنے لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی گراہ نکل گئی تھی۔

آواز سن کر وہ دونوں آدمی چونک گئے۔ انہوں نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اپنے بالے ثابت کو چھوڑ کر پراسادی کی طرف لپکے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا ان میں سے ایک آدمی کے اوپر جا کر اُڑا اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے قالین پر گر گیا۔ اس اچانک افتاد پر وہ آدمی بڑی طرح بدحواس ہو گیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

چھلانگ لگاتے ہوئے خنجر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن میں نے اس شخص کی گردن گرفت میں لے لی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے تھا، دوسرا کھوپڑی پر۔ میں اس کی گردن کو زور سے دھکے دیتے لگا۔ وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرے جڑے سے بیچ گئے اور میں اس کی گردن مروڑنے کے لیے پوری قوت استعمال کرنے لگا۔ اس کھیل کا ایک ہی اصول ہوتا ہے۔ حریف کی جان لے لو یا اپنی جان دے دو۔ درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ میں اپنی جان نہیں گوانا چاہتا تھا، حریف کو بے جان کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالآخر اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کڑک کی آواز ابھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مجھ پر خون سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دو اور دھکے دیے اور اسے تڑپا چھوڑ کر اٹھ گیا اور لپک کر اپنا خنجر اٹھالیا۔

پراسادو دوسرے آدمی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں اس طرف بڑھا اور پھر فائر کی آواز سن کر رک گیا۔ پراساد کے پستول کی گولی نے اس آدمی کے سینے میں سوراخ کر دیا تھا۔ پراساد اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ گیا۔ خون کے کچھ پھینپھینے پراسادی شرت پر بھی پڑے تھے۔ جاگتی اور تھائی اٹھ کر باپ کی درست کردہ تھیں۔ میں ایک بار پھر اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پاتھم اور دوسرے دو محافظوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ناجائز شاید میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ ایک راہداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چینی۔

”ادھر۔ اس طرف ایک کمرے میں یہ خانے کا راستہ ہے۔

پاتھم وہیں ہے۔“

میں خنجر ہاتھ میں لیے راہداری کی طرف لپکا۔ ٹھیک ایک آدمی ایک کمرے کے دروازے سے باہر نکلا۔ اس نے پستول تھا۔ ان لوگوں نے شاید فائر کی آواز سن لی کیونکہ محض غالباً صورت حال معلوم کرنے کے لیے باہر نکلا تھا۔

اس نے صورت حال کا اندازہ لگاتے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کر دیا۔ میں اسی وقت سے گھبرا کر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جانے کو اس کی چالانی ہوشیاری کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ اس شخص نے میرے پیچھے پراساد کو آتے دیکھ لیا تھا۔ دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ تیزی سے مڑ کر پستول میں گھس گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔ میں نے دروازے میں قدم رکھا تو وہ شخص کمرے کے آخری دروازے پر خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر پستول ہاتھ اوپر اٹھالیا لیکن اسے ٹھیک دبانے کا موقع نہیں مل سکا۔ میرے ہاتھ سے نکل کر پرنے کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا اس کے حلق میں ترازو ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چھانچ خنجر کا تھی۔ وہ میزبوں پر گرا اور اپنے لاشکلا چلا گیا۔

میں نے بڑی پھرتی سے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ اس دوران میں پراساد بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ دروازے سے پہلے یہ خانے کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی دوڑ لگا دی۔

بہت بڑا یہ خانہ تھا، جسے جدید ترین معیشت خانہ کہا جاتا تھا۔ دیواروں پر ایسے آلات لگے ہوئے تھے جو اذیت دینے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ الماریوں میں بھی اذیت رسائی کے جدید آلات سجے ہوئے تھے۔ دو دیواروں میں آہنی بک لگے ہوئے تھے جن کے ساتھ آہنی زنجیریں بھی منسلک تھیں۔ پھت پر بھی گئی جگہوں پر اس قسم کے بک نظر آ رہے تھے۔

پاتھم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھکڑوں پر اور پیر کرسی کے پایوں سے چری بیٹوں کی مدد سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر چڑے کی ایک عجیب قسم کی ٹوپی لگی ہوئی تھی جس سے اس کی کنپٹیاں اور کان بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ اس ٹوپی کے پچھلے حصے میں ہلکی کے دو دائرے جو کرسی سے ایک سے جڑے ہوئے تھے کرسی کی پچھلی طرف سے نکلنے والے ایک دائرے کے پلگ میں لگا ہوا تھا۔ پاتھم کا سر ایک طرف ڈھکا ہوا تھا۔ کرسی کے قریب ہی ایک دروازہ قامت بھاری پتھر کی آدمی کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ دیوار کے سوچے پر تھا۔ وہ اس کی پالیس کاہ انیسٹر تھا جسے پاتھم نے ہاتھ پکڑے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ مجھے سمجھے میں دیر نہ لگی کہ پاتھم کو ہلکی کے جھٹکے دے کر تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

میں دیکھتے ہی انیسٹر نے دیوار پر لگا ہوا سوچے ان کر دیا اور

تو پتھر پاتھم کی چوڑوں سے گونج رہا تھا۔ اس کی چھین بڑی خنجر کا تھی۔ میز پر دھل گیا۔ اس کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں نے اور پراساد نے بیک وقت ہی اپنی اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی تھی۔ پراساد انیسٹر کے اوپر جا کر اٹھا اور میں نے کرسی کے پیچھے چھپ کر نہ صرف سوچے آف کر دیا بلکہ پلگ بھی نکال کر پاتھم کے جسم کو جھٹکے لگانا بند ہو گئے۔ چھین بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ اس کا سر ایک بار پھر پینے پر جھک گیا۔ میں نے اس کے سر پر سے وہ عجیب و غریب چرمی ٹوپی اتار دی۔ اس کے اندر آہنی پلٹیں لگی ہوئی تھیں۔ میں وہ ٹوپی ایک طرف پھینک کر اس کے ہاتھ جو کھولے لگا۔

پاتھم۔ ہوش میں آؤ پاتھم۔ میری آواز سن رہے ہو؟ میں اس کا گلہ چھپاتا رہے ہوئے ہوں۔ پاتھم نے سر اٹھا کر بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں لیکن دوسرے لمحے اس کا سر پھر جھک گیا۔ میں اسے سنبھالنے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

پراساد انیسٹر سے نشتے میں مصروف تھا۔ وہ انیسٹر کسی پہلوان کی طرح خاصا طاقت ور تھا۔ اس کے رکس پر سادہ ڈنڈا لیکن اس سے زیادہ پھرتا تھا۔ پراساد نے میرے ساتھ رہتے ہوئے لڑائی کے واقعات سیکھ لیے تھے اور وہ اپنے حریف کے خلاف یہ داؤ بیچ بہت خوبی سے استعمال کر رہا تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ انیسٹر اس کے قاتلوں میں سے آئے گا۔ میں نے پاتھم کو کرسی سے اٹھا کر ایک میز پر لٹا دیا اور انیسٹر کی قاضی کرنے میں پراسادی مدد کرنے لگا۔ انیسٹر بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کھیل میں بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ ”مار دو یا مرادو“ کے اصول کو سمجھتا تھا لیکن اس کی پوزیشن بڑی آگ دوڑ (نازک) تھی۔

چند منٹ بعد ہی وہ ہماری گرفت میں آچکا تھا۔ ہم نے انیسٹر کو ای کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پیر چری بیٹوں سے باندھ دیے۔ اس نے مزاحمت تو بہت کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے اس کے سر پر آہنی بیٹوں والی چری ٹوپی بھی پہنا دی اور کرسی سے نکل کر ایک دیوار کے سائٹ میں لگا دیا۔ انیسٹر کے چہرے پر بے پناہ خوف ابھرا تھا۔

”تم نے تشدد کا یہ برقی حربہ بہت سے لوگوں پر آزمایا ہوگا۔ اس سے لوگ زبان تو کھول دیتے ہیں لیکن تمہیں یہ پتا نہیں ہوگا کہ انسانی جسم پر برقی جھکوں کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جن تمہیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ لوگ اس طرح زبان کھولنے پر مجبور کیوں ہو جاتے ہیں۔“

میں نے سوچے آن کر دیا۔ کرا انیسٹر کی خوف ناک چیڑوں کو اٹھا۔ میں نے سوچے آف کر دیا۔ انیسٹر کے چہرے پر بے پناہ

کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔

”اب پتا چلا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”مم۔ مجھے چھوڑ دو۔“ انیسٹر چینا ”تم جو کچھ کو گمے میں کرنے کو تیار ہو۔“

”گڈ۔“ میں مسکرا دیا۔ ”ایک بہت معمولی سے جھٹکے سے ساری بات تمہاری سمجھ میں آگئی لیکن میں تم سے کوئی کام نہیں لینا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم یہاں آرام کرو۔“

میں نے پراسادی کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ اس نے فرش پر پڑا ہوا اپنا پستول اٹھالیا اور پاتھم کو کندھے پر لاد لیا۔

میں نے سوچے آن کر دیا اور پراساد کے پیچھے میزبوں کی طرف لپکا۔ انیسٹر کی خوفناک چھینیں یہ خانے میں گونج رہی تھیں۔ میزبوں پر چڑھتے ہوئے میں رک گیا۔ وہاں اس شخص کی لاش پڑی تھی جو میرے خنجر کا شکار ہوا تھا۔ خنجر اس کے حلق میں بیوست تھا۔ شہ رگ کٹی گئی تھی اور خون اب بھی میزبوں پر نہیں دبا تھا۔ میں نے خنجر کو دستے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ خون آلود ہینڈ اس کے لباس سے صاف کیا اور یہ خانے سے باہر لیا۔

تھائی اور جاگتی ابھی تک ہال میں کھڑی تھیں۔ پراساد پاتھم کو کندھے پر لادے کھڑا تھا پھر اس نے پاتھم کو ایک صوفے پر ڈال دیا۔

”تم لوگ ہمیں روکنا۔“ میں گاڑی کو گیت کی طرف لے آتا ہوں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ بھی کرنا ہے“ جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

پراساد دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پولیس سائرن کی آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ اس ہنگامے سے بیڑوں کی آوازیں بھی گونجی تھیں اور دو تین فائر بھی ہوئے تھے اور میرا خیال تھا قریب کے کسی ہنگامے میں رہنے والے کسی شخص نے یہ آوازیں سن کر پولیس کو فون کر دیا تھا۔

میں نے مڑ کر راہداری کی طرف دیکھا۔ یہ خانے سے اب انیسٹر کی چیڑوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہلکی کے جھکوں نے نہ صرف اس کی زبان خاموش کر دی تھی بلکہ اس کی رگوں میں خون کو بھی جلا ڈالا ہوگا۔

پراساد نے بڑی پھرتی سے جھک کر پاتھم کو کندھے پر لاد لیا۔ ”جلدی کرو باس۔ ہم پچھلی طرف سے ہی جائیں گے۔“ اس نے کہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پاتھم کو سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔

ہم دروازے سے نکل کر آگے میں آگئے۔ پراساد ابھی ہم سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جاگتی تھائی اور آخر میں میں تھا۔ میں نے اپنا پستول تھائی کو دے دیا تھا۔



ہم جنگل کے عقبی ان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ پولیس سائرن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی لیکن پھر اچانک فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ سائرن کی آواز بند ہو گئی البتہ فائرنگ کی آوازیں بڑھتی گئیں۔ لگتا تھا جیسے پولیس کی اور پانی سے بھرتی

پاؤں بے ہوش تھا۔ اسے دیوار کی دوسری طرف پہنچانے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی پھر میں نے باری باری تھائی اور جاگی کو بھی دیوار پر پہنچ لیا۔ پراساؤ نے ایک بار پھر بے ہوش پاؤں کو کندھے پر لاد لیا تھا۔ ہم ماریکی میں اس نیلے پردوں نے گئے جس کی دوسری طرف ہماری کار کھڑی تھی۔

پاؤں کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا گیا اور جاگی و تھائی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ پراساؤ میرے پیچھے سے پہلے ہی اسٹرنگ سنبھال چکا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں میں اب شدت آگئی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ پولیس کی اور پانی سے بھرتی تھی جس کا فائدہ ہمیں پہنچا تھا۔ اگر پولیس کو راستے میں یہ رکاوٹ پیش نہ آتی تو ہمیں اس طرح آسانی سے اس جنگل سے فرار ہونے کا موقع نہ مل سکتا۔

پراساؤ کار کو مخالف سمت میں لے گیا تھا۔ اس وقت سڑکوں پر اگرچہ سناٹا تھا لیکن پراساؤ کار کو ایسے راستوں پر لے جا رہا تھا جہاں پولیس کی کسی گشتی پانی سے آہٹا سامنا ہونے کا خطرہ کم سے کم ہو۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد ہم کسی رکاوٹ کے بغیر لڑا کے جنگل پر پہنچ گئے۔ پاؤں کو فوراً ہی ایک کمرے میں لے جا کر بیڈ پر لاد لیا گیا۔ وہ بجلی کے جھکوں سے بے ہوش ہوا تھا۔ اتنا میں جانتا تھا کہ جو شخص بجلی کے جھکے یا کرنٹ لگنے سے بے ہوش ہوا ہو، اسے ہوش میں لانے کے لیے منہ میں پانی پکانا یا پانی کے چھینے دینا خطرناک ہوتا ہے۔ لیزا تھائی کے کتنے پرانی کاگلاس لے آئی تھی لیکن میں نے اسے روک دیا اور پانی کو پاؤں سے دور ہی رکھا گیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ہوش میں کس طرح لایا جائے۔ زیادہ لمبی بے ہوشی میں اس کے لیے خطرناک حالت ہو سکتی تھی۔

میں فون کا رسیور اٹھا کر ماسٹر بوجن کا نمبر مانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہو گا اور میری طرف سے کسی رپورٹ کا منتظر ہو گا۔ کال پہلی ہی گھنٹی پر رسیور کٹی گئی۔

”کامیابی مبارک ہو ش ماسٹر“ ماسٹر بوجن نے میری آواز سننے ہی کہا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں؟“ میرے لیے میں حیرت تھی۔

”مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔“ ماسٹر نے جواب دیا ”میرے آوی آس پاس موجود تھے۔ اگر وہ پولیس کو نہ ابھائیے تو تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے میں کچھ دشواری پیش آ سکتی تھی۔“

”اوہ“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تو وہ ماسٹر بوجن آوی تھے جنہوں نے پولیس کو ابھایا تھا اور ہمیں آسانی سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے ماسٹر بوجن کا پتہ ماسٹر بوجن میں بتایا تو اس نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ کوئی گارڈ جاسے۔ کچھ روز بعد وہ خودی ہوش میں آجائے گا۔

ماسٹر بوجن نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ تقریباً آٹھ گھنٹے ہوش میں آ گیا مگر وہ ہماری کسی بات کا جواب دینے میں ہفتوں کی طرح ہمارے چروں کو سکتا رہا۔ لگتا تھا جیسے اسے ساعت اور گویائی کی قوتیں سلب ہو چکی ہوں۔ اس وقت بھی وہ ہشت می طاری تھی جس کے تاثرات اس کے چہرے پر عیاں آ رہے تھے لیکن چند منٹ بعد اس کے چہرے کے تاثرات گئے۔ پیرا اندیش غلط نکلا۔ بجلی کے جھکوں نے اسے تھوڑا پہچانی تھی لیکن وقتی طور پر حواس زائل ہونے کے سوا اسے نقصان نہیں پہنچا تھا اور اب اس کے حواس بھی بحال ہو رہے۔ جس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

پراساؤ پاؤں والے کمرے میں رہ گیا۔ جاگی اور لیزا لے کرے میں چلی گئیں اور میں تھائی کے ساتھ اپنے کمرے آ گیا۔ تھائی اب بھی اسی لباس میں تھی اور میں اس کی طرف بے ہوشے جھک رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ لباس بڑا مشرقی لیکن جس مقصد کے لیے ہم جاگی اور تھائی کو ساتھ لے کر گئے اس کے لیے ایسا لباس پمناست ضروری تھا۔ اسی لباس نے اس کے حسن و شباب کو نمایاں کیا تھا اور جنگل کے محافظ اپنے فرائض اور ذمے داریاں بھول کر بڑی آسانی سے ان کے جال میں پھنس گئے تھے۔

تھائی نے ہاتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کر لیا۔ اب اس نے گھائی رنگ کا نئی پنل تھی اور میرے خیال میں اس کاٹھ خوابی کا یہ لباس بھی خاصا خطرناک تھا۔ ہم بیڈ کے سامنے کئی بیٹھا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”جنگل میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں طے ہوا تھا کہ یہ منٹ میں تم ہمیں سکتل دو گی لیکن سکتل نہیں ملا تو مجھے پریشان ہونے لگی اور۔۔۔“

”ان کم بختوں نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا تھا۔“ تھائی بات کاٹتے ہوئے کہا ”ہم نے گھٹ گھٹایا تو ایک آوی بارہ تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم سرو تفرق کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اس علاقے میں واقع ایک جنگل میں رہائش پذیر ہیں۔ اس وقت قلم دیکھ کر وہاں آ رہے ہیں لیکن اپنا بگلا بھول گئے ہیں۔ اگر وہ اجازت دے تو ہم یہاں سے فون کر لیں۔ وہ شخص چلے آئے۔ دیکھتا ہوا پھر اس نے اندر سے اپنے ایک ساتھی کو بلا لیا۔ تینوں سرگوشیوں میں کوئی بات کی اور وہ ہمیں اندر لے گئے۔ بال داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم نے بظاہر خوف

ہونے کی ادھار کی لیکن جب انہوں نے پھیر چھاڑ شروع کی تو ہم نے کوئی مداخلت بھی نہیں کی۔ اسی دوران میں ان کا ایک اور ساتھی بھی کہیں سے آ گیا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس عمارت میں کوئی بے خانہ بھی ہے اور پاؤں اسی بے خانے میں ہے اور سکا میں اس کی زبان کھولانے کی کوشش کی جا رہی اور سکا میں اس کی زبان کھولانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر تباہی جاری رکھتے ہوئے کتنے گلی ہمیں موقع دے رہے تھے۔ حوصلہ افزائی پر ان کی دست درازیاں بڑھتی گئیں اور اس طرح مجھے یا جاگی کو کوئی سکتل دینے کا موقع نہیں مل سکا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ وہ بوجن کے صورت میں تم لوگ اندر ضرور آؤ گے اور پھر یا ہر کسی چیز کے کرنے کی آواز سن کر میں سمجھ گئی کہ تم میں سے کوئی اس طرف پہنچ چکا ہے۔ ایک آوی یا ہر چلا گیا تھا۔ میں پوری توجہ یا ہر کی طرف مبذول رکھتے ہوئے تھی۔ میں نے کچھ آوازیں سنی تھیں پھر یوں لگا جیسے کسی کو گھسیٹا جا رہا ہو۔ ان دونوں آدمیوں میں سے کوئی بھی ان آوازیں پر توجہ نہیں دے سکا۔ ان کی ساری توجہ تو ہماری طرف تھی۔ لگتا تھا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں کسی عورت کے اتنا قریب ہونے کا موقع ملا ہو اور وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے پھر جب میں نے انہیں برآمدے والے دروازے سے بھاگتے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ بارہو آوازیں کیسی تھیں۔“

”اگر ہم اندر داخل نہ ہوتے تو جا جاتی ہو وہ لوگ تم دونوں کا کیا مشر کرتے؟“ میں نے تھائی کے خاموش ہونے پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج رات صورت حال وہ نہیں تھی جو اس رات کا بیچ میں پیش آئی تھی۔“ تھائی نے جواب دیا۔

میں چند لمبے خاموش رہا پھر ہم پاؤں کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورت حال پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ بنگال میں اس گاڑی کے ڈرائیو پولیس کا پاؤں کے درکشاف تک پہنچ جانا واقعی خطرناک تھا اور پھر یہاں کی پولیس کو بھی یہ تعین قریب ہو گئی تھی کہ پاؤں وہاں ہے جو بنگال پولیس کو پیڑرو کے بھائی کے قتل کے الزام میں مطلوب ہے۔ پاؤں میں پولیس کے تشدد کے سامنے زبان نہیں کھلی تھی۔ پولیس ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکی تھی کہ پاؤں سے میرا کوئی تعلق ہے لیکن میں سمجھتا تھا کہ پولیس اتنی بے وقوف بھی نہیں۔ اس لمحے میں بھی بڑے بڑے ذہین دماغ موجود ہیں۔ وہ دو تین دو کا نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے اور پھر آج یہاں جو کچھ ہوا تھا وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم پاؤں کو پولیس کے خفیہ محفوت خانے سے نکال لائے تھے اور پانچ پولیس والے ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے جن میں اسپیشل پولیس کا ایک انسپٹر بھی تھا۔

مقامی پولیس سے بھی جا جاتی تھی کہ میں اور ماسٹر بوجن ابھی کنج

پوری ہی میں موجود ہیں۔ مقامی پولیس اگرچہ پاؤں اور ہمارے درمیان کوئی تعلق تلاش نہیں کر سکی تھی لیکن بنگال پولیس سے تحقیقات حاصل ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے کہ اس کا ردوائی میں ہمارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

آج کے اس بنگالے میں پانچ آدمی مارے گئے تھے۔ ایک پراساؤ کے ہاتھوں کوئی کا نشانہ بنا تھا اور چار میرے ہاتھوں ختم ہوئے تھے۔ میرے ہاتھوں کسی کا مارا جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بعض اوقات مجھے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ میں اتنا ظالم کیوں ہو گیا تھا۔ میرے اندر اتنی سفاکی کیوں آگئی تھی۔ کسی کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے مجھ پر ایسا خون کیوں طاری ہو جاتا تھا؟ اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے شاید زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے ماں باپ کو میری نظروں کے سامنے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور پھر چاچا پر تاب بنگالے کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ قدم قدم پر مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کئی بے گناہوں کو میرے سامنے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان تمام عوامل نے میرے دل میں شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ میں ہراس انھیں کو مار دیتا جانتا تھا۔ وہ میری جان لینے کے ارادے سے میری طرف بڑھتا ہوا نظر آتے اور پھر میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بعض اوقات دوسروں کی زندگیوں کے چراغ کل کرنا پڑتے ہیں۔ راستہ بنانے کے لیے دوسروں کی لاشوں پر سے گزرن پڑتا ہے۔ زندگی کے اس سکیل کا اصول بڑا سیدھا سادہ تھا۔ دشمن کو ختم کر دو یا اس کے ہاتھوں خود ختم ہو جاؤ۔ بیچ کا کوئی راستہ نہیں ہے اور یہ بھی سیدھی بات ہے کہ زندگی ہر شخص کو پیاری ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی بچانے کے لیے دوسرے کا کھانا کھانے کی کوشش کرتا ہے۔

میں بھی ایسی ہی سنگین نوعیت کی صورت حال سے دوچار تھا۔ میرے بدترین دشمن میری ناک میں تھے۔ وہ قدم قدم پر گھاٹ لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی بار بار کوشش کی گئی تھی اور میں اپنے بچاؤ کے لیے دوسروں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ دشمن کے لیے رحم کا جذبہ میرے دل سے ختم ہو گیا تھا۔ دوسری طرف میں ان لوگوں کے لیے اپنی جان دینے کو تیار تھا جو مجھے چاہتے تھے۔ تھائی جاگی، پراساؤ اور پاؤں کی مثالیں موجود ہیں۔ تھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کو میں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ پاؤں کو تشدد کا نشانہ بنانے والے چار آدمی آج ہی میرے ہاتھوں جسم رسید ہو چکے تھے۔ پانچوں پراساؤ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا رہا اور رات دھیرے دھیرے بتیں رہی۔ تھائی سوچتی تھی لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ مختلف سوچنے لگا میرے دماغ کا گھبراؤ کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر تھائی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر خاموشی سے کمرے سے

باہر نکل آیا۔ سامنے ہی جاگی اور لڑا کا کرا تھا۔ دو واڑہ کھلا ہوا تھا۔ اندر نینکوں روشنی والا ٹانٹ بلب جل رہا تھا۔ میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ جاگی اور لڑا ایک دوسرے سے لپٹی مری نیند سو رہی تھیں۔ جاگی کے جسم پر اب بھی وہی لباس تھا۔

پورے گھر میں خاموشی طاری تھی۔ ہال میں بلب جل رہا تھا۔ برآمدے میں البتہ تاریکی تھی۔ میں نے دو واڑے کے ساتھ والی کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا تو برآمدے میں ایک طرف بہت ہلکی چنگاری سی چمکتی نظر آئی۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور گردن نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر بوجھ کے فراہم کردہ دونوں گھنٹین برآمدے میں آلتی پالتی مارے بیٹھے مگر کٹ کے کش لگا رہے تھے۔ برآمدے کی جتی انہوں نے ہی بھجوا رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگیا۔

”غیرت مثل باسرا!“ اس نے پوچھا۔  
”ہاں۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اٹھ کر باہر آگیا۔“ میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد میں کچن میں کافی بنا رہا تھا۔ میں نے دونوں گھنٹینوں کو بھی کافی کافی کا ایک ایک کپ دیا اور خود بھی کھڑکی میں کھڑا کافی کی چسکنا لیتے ہوئے دیکھنے لے رہا تھا۔ ان سے باتیں کرتا ہوا پھر کھڑکی بند کر کے ہال میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اچانک ہی میرے ذہن میں باسرا بوجھ کی کسی ہوئی کچھ باتیں ابھر آئیں۔

یہ بات تو میں کئی بار سن چکا تھا کہ مہاراج مجھ سے کوئی اہم کام لینا چاہتا ہے جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا تھا اور اب باسرا بوجھ نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ اس رات ویران فارم ہاؤس میں باسرا بوجھ نے شامک سے کسی دوسرے منصوبے کے بارے میں کئی سوال کیے تھے جن کے وہ جواب نہیں دے سکا تھا اور باسرا نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ کسی بڑے منصوبے پر چلنے والے لوگوں کے کام تو لیا جاتا ہے لیکن انہیں اصل بات سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔

بعد میں میں نے باسرا بوجھ سے اس دوسرے منصوبے کے بارے میں دریافت کیا تو باسرا بوجھ نے ہال گیا تھا اور کہا تھا کہ مناسب وقت پر مجھے اس سے آگاہ کر دیا جائے گا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ منصوبہ کیا تھا؟ کیا یہ وہی کام تھا جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا تھا اور کیا یہ تیار ہی اس طرح ہو رہی تھی کہ مجھے قتل و غارت گری میں ماہر بنا دیا جائے۔

میرا ذہن بڑی طرح الجھا ہوا تھا۔ بعض اوقات میں یہ بھی سوچنے لگتا جیسے قتل و غارت کے سوا میری زندگی کا کوئی مقصد نہ رہ گیا ہو۔ میں مہاراج کا بے حد شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے دارا جیسے لوگوں سے بچا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے زندہ رہ سکوں لیکن کبھی میں یہ بھی سوچنے لگتا کہ مہاراج نے

مجھے کس راستے پر ڈال دیا تھا اور اب اگر میں چاہتا ہوں تو وہ راستے سے واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔ واپس لوٹ کر میں جا بجا کہاں؟  
مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا اور پھر مری آنکھ بند ہونے لگیں۔

○●○

صورت حال عجیب سی تھی، بڑی خوفناک ہو گئی تھی۔ اسٹیشن پولیس کے ایک انسپکٹر سمیت پانچ پولیس اہلکاروں قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس روز تمام اخبارات ناشرین شائع ہوئے تھے اور ہر اخبار کی ہیڈ لائن یہی تھی۔

اخبارات کے مطابق کالج میں فرانسیسی سیاح کے قتل اور کی جی کے اغوا اور قتل کے بعد چیکنگ اور چھاپوں کے دوران میں باجم نامی ایک شخص کو حراست میں لیا گیا تھا جس سے پوچھ گچھ کے دوران میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ بنگال پولیس کو بھی بیڈو کے بھائی سائی کے قتل کیس میں مطلوب ہے۔ مقامی پولیس نے باجم نامی اس شخص کو اسٹیشن پولیس کے انسپکٹر گیشن اسکوڑا کے حوالے کر دیا تھا اور اسے بڑی رازداری سے خفیہ مقام پر منتقل کر کے اس سے پوچھ گچھ کی جارہی تھی کہ گزشتہ رات نا معلوم افراد نے اس پر حملے کر کے نہ صرف باجم نامی اس شخص کو رہا کر دیا بلکہ اسٹیشن پولیس کے ایک انسپکٹر سمیت پانچ پولیس اہلکاروں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس ہنگامے میں فائرنگ کی اطلاع ملنے پر پولیس کی ایک مشقی ٹیم اس طرف پہنچ گئی لیکن ہنگامے تک پہنچنے سے پہلے ہی پولیس پائل کا بعض مسلح لوگوں نے تصادم ہو گیا۔ آٹھ گھنٹے تک فائرنگ کے تبادلے کے بعد مسلح افراد دوا کی طرف فرار ہو گئے۔ خیال ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ہنگامے میں پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر کے باجم نامی اس شخص کو رہا کر دیا تھا۔

ہنگامے میں پانچ پولیس اہلکاروں کی ہلاکت کی اطلاع ملنے پر پورے شہر کی پولیس کو ریڈ الارٹ کر دیا گیا اور شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کے علاوہ رات ہی رات میں درختوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے کر ان سے پوچھ گچھ کی جارہی تھی۔

پولیس کے ایک ترجمان کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر میں اس شک کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ حملہ آوروں میں کوئی عورت بھی شامل تھی اور خاتون یہ سب کچھ بڑی پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ پولیس ترجمان کے مطابق وہ کوئی حسین عورت تھی جو پہلے ہنگامے میں داخل ہوئی تھی اور اس نے اپنے ساتھیوں کے لیے راستہ ہموار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہنگامے کے ہال کرے میں ایک صوفے پر سونے کی ایک انگوٹھی ملی تھی جس میں قیمتی ہیرا جڑا

ہوا ہے۔ ایسی انگوٹھیاں عام طور پر خواتین ہی پہنتی ہیں جس سے اس شک کو تقویت ملتی ہے کہ باجم کو چھڑانے اور پولیس اہلکاروں کو ہلاک کرنے والوں میں کوئی حسین عورت بھی شامل تھی۔ پولیس معیار بھی تک حل نہیں کر سکی تھی کہ یہ انگوٹھی وہاں کس طرح گر گئی تھی۔

بعض اخبارات نے دیکھے جیسے الفاظ میں میرا اور باسرا بوجھ کا نام بھی لیا تھا اور اس شک کا اظہار کیا تھا کہ اس سنگ رلاتہ کاروائی میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

جب میں یہ اخبار پڑھ رہا تھا اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ تھائی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ لیزا تو تھوڑی دیر پہلے بیدار ہوئی تھی اور کچن میں چائے بنا رہی تھی جبکہ جاگی ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر تھائی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ تھائی کی ایک کلائی میں سونے کا ایک کڑا تو تھا لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ اس کی کسی انگلی میں میں نے کبھی کوئی انگوٹھی بھی دیکھی تھی۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ تھائی نے پوچھا۔  
”کل رات تمہاری انگلی میں کوئی انگوٹھی بھی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ تم نے کبھی میری کسی انگلی میں کوئی انگوٹھی دیکھی ہے؟“ اس نے انا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”لیکن تمہیں کوئی انگوٹھی کیسے یاد آتی؟“

”اخبار میں لکھا ہے کہ اس ہنگامے میں پولیس کو ہیرے کے جڑاؤ والی ایک طلائی انگوٹھی بھی ملی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ کسی عورت ہی کی ہو سکتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”لوہہ۔“ تھائی چونک گئی۔ ”تم جانتے ہو میں نے کبھی کوئی انگوٹھی نہیں پہنی لیکن میرا خیال ہے جاگی انگوٹھی پہنتی ہے۔“  
”تم یہ اخبار دیکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ میں اخبار تھائی کے سامنے رکھ کر اٹھ گیا۔

جاگی بیڈ پر آڑی تر جمی ہوئی سو رہی تھی۔ ایک تو اس کا لباس تھا ہی کچھ ایسا اور پھر اس طرح لینے کی وجہ سے اپنی جگہ سے کھٹکا ہوا بھی تھا۔ کھڑکی کے پردے سے چھن کر آنے والی روشنی سے کمرے میں مدھم سا ابلال ہو رہا تھا۔ جاگی کوٹ کے ٹل لٹٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چہرے کے سامنے بستر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ سر کے نیچے تھا۔ جو ہاتھ سامنے تھا اس کی کسی انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر بڑی آہستگی سے سر کے نیچے سے کھینچنا چاہا تو تھائی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے غار آنکھ نکالوں سے میری طرف دیکھا پھر ہونٹوں پر خفیف سی تھکاوٹ آگئی۔ وہ اس طرح میری موجودگی کو نہ بخانے کیا سمجھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میں اس پر کسی قدر جھکا ہوا تھا۔ جھٹکا لگنے سے اس کے اوپر گر گیا۔ اس نے ایک لمحہ

ضائع کیے بغیر مجھے اپنی بانسوں کی لیٹ میں لے لیا اور میرے رخساروں پر بوسے دینے لگی۔

”ارے۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ دو واڑہ کھلا ہے، کوئی آجائے گا۔“ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تو دو واڑہ بند کر دو۔ کھلا کھینچو دیا تم نے۔ ویسے بھی اس وقت سب لوگ سو رہے ہیں۔ آدھی رات کو کون یہاں....“

”جاگی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ آدھی رات کا وقت نہیں۔ صبح کے نو بج چکے ہیں اور تم یہاں میری موجودگی کا غلط مطلب نہ لو؟“

”تو پھر کیوں آئے ہو؟ اس طرح میرے اوپر کیوں بیٹھے ہوئے تھے؟“ جاگی نے کہا۔ اس کے لیے میں اب نیند کا شمار تھا۔  
”تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ہیرے کی انگوٹھی جو کل تم نے پہنی ہوئی تھی۔ میں تمہاری انگلیوں میں وہ انگوٹھی ہی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”انگوٹھی!“ اس نے باری باری دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی طرف دیکھا پھر ایک ہتھکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بستر پر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔ اس نے کچھ بھی اٹھا کر دیکھا۔ ”وہ انگوٹھی میری انگلی میں ذرا ڈھیلی تھی۔ ہو سکتا ہے صوفے میں بستر پر گر گئی ہو اور لیزا نے اٹھا کر کھین رکھ دی ہو۔ میں ابھی اس سے پوچھتی ہوں۔“  
”لیزا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ انگوٹھی پولیس کے قبضے میں ہے۔“

”کیا....؟“ جاگی کی آنکھیں پھیل گئیں۔  
”خواس نکال کر کے باہر آؤ تو میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اسے حیران و پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔

میں ہال میں پہنچا تو لیزا میری تھائی کے پاس بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ سامنے کا ٹیبل پر چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کپ اٹھالیا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔ تھائی نے بھی اخبار چھوڑ کر ایک کپ اٹھالیا۔

”ہر ساد بھی نہیں اٹھا؟“ میں نے پوچھا۔  
”اٹھ گیا ہے۔ میں اسے اور باجم کو کمرے ہی میں چائے دے آئی ہوں۔“ لیزا نے جواب دیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی جاگی بھی کمرے سے نکل کر آگئی۔ وہ اب بھی کچھ بدحواس ہو رہی تھی۔ اس نے آتے ہی ایک کپ اٹھالیا۔ میرے قریب بیٹھ کر چند چسکیاں لیں اور پھر کپ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”کیا کہہ رہے تھے تہ میری انگوٹھی پولیس کے پاس کیسے پہنچی؟“

”اخبار میں لکھا ہے کہ پولیس کو اس ہنگامے سے ہیرے کی ایک طلائی انگوٹھی بھی ملی ہے جو زائد زائد سامنت کی ہے اور ظاہر ہے وہ انگوٹھی تمہاری ہی ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

جاگی چند لمبے خاموش رہی پھر بولی ”وہ انگوٹھی میری انگلی میں کسی نذر دھلی تھی۔ گزشتہ رات اس راکٹس کے ساتھ ہاتھابی میں انگلی سے نکل کر گر گئی ہوگی لیکن میرے خیال میں اس انگوٹھی سے کوئی سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔“

”پاتھم نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کی گاڑی کے ذریعے کوئی سراغ نہیں لگایا جاسکتا لیکن ہوا ہے کہ پولیس اس گاڑی کے ذریعے سراغ لگائی ہوئی پاتھم کے درکشاپ تک پہنچ گئی۔“ میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”یہ تو اچھا ہی ہوا کہ پاتھم یہاں پکڑا گیا تھا۔ اگر وہ ہنگام میں پولیس کی گرفت میں آجاتا تو نہ صرف یہ کہ ہم اسے چھڑا نہیں سکتے تھے بلکہ ہمارے لیے بہت سے مسئلے بھی پیدا ہو سکتے تھے۔ مسئلے تو اب بھی رہا ہوں گے لیکن۔“

”لیکن اس انگوٹھی کے ذریعے کوئی سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔“ جاگی نے میری بات کاٹ دی ”وہ انگوٹھی میں نے کئی سال پہلے ہنگام میں پل سینٹر سے خریدی تھی۔ اگر آڈر پر بنوائی ہوئی تو شاید وہ گاہک کو یاد رکھتے لیکن یہ انگوٹھی تو شیکس میں تھی ہوئی تھی جو میں نے خریدی اور دیے بھی پولیس کے لیے یہ معلوم کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگا کہ یہ انگوٹھی کب اور کہاں سے خریدی گئی تھی۔“

”پولیس کو اتنا بے وقوف مت سمجھو۔“ میں نے کہا ”یہ پولیس والے تو گڑے گڑے بھی اکھاڑتے ہیں۔ ہمیں پولیس کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگا کر اپنے آپ کو واؤ پر نہیں لگانا چاہیے۔“

جاگی اب واقعی پریشان دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اس حقیقت سے پہلے ہی واقف ہو چکی تھی کہ پولیس نے پاتھم کی اس گاڑی کے ذریعے اس کا پتا چلائی تھا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا اور اب وہ اپنی اس حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی سزا بھگت رہا تھا۔

”خود اعتمادی اچھی بات ہے۔“ میں نے جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لیکن حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی انسان کو ڈونڈتی ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟“ جاگی کے لیے میں تشویش نمایاں تھی۔ ”فوری طور پر تو کچھ ہوگا نہیں۔“ میں نے کہا ”جب ہوگا تب دیکھا جائے گا اور دوسرے بھی اب تم منظر عام پر تو ہو نہیں۔“

ہم ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ ماسٹر ہوجن کا فون آیا۔ کال لیزا نے ریسرو کی تھی۔ اس نے ریسرو میری طرف بڑھا دیا۔

”تم نے آج کے اخبارات دیکھ لیے ہوں گے؟“ ماسٹر نے میری آواز سننے کی کہا۔

”ہاں! ابھی ابھی میں اخبارات کا مطالعہ ہی کر رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن اخبارات میں ایک خبر جو نہیں چھپی وہ یہ ہے کہ رات

کو ہنگام میں جس شخص کو گولی لگی تھی وہ زندہ بچ گیا ہے۔ اس کی حالت اگرچہ بری تشویش ناک ہے مگر ڈاکٹر اسے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس بات کو بہت خیر رکھا جاتا ہے تاکہ خیر ہو شیار نہ ہو جائیں یا اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

”یہ تو واقعی تشویش ناک خبر ہے۔“ میں نے کہا ”اس کی زندگی ہماری موت کا باعث بن سکتی ہے مجھے اور ہر سادو کو شاید وہ شائبہ نہ کر سکے لیکن تمہاری اور جاگی ہمارے ہنگام میں داخل ہونے سے پہلے تقریباً بیستیس منٹ تک ان کے ساتھ رہی تھیں۔ زندہ بچ جانے والا جو بھی ہے وہ جاگی اور تمہاری کو شائبہ کر سکتا ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کے طے بھی پتا دیے تو انہیں آسانی سے تلاش کر لیا جائے گا۔“

”ایک دوسری خبر یہ ہے کہ پولیس کی ہماری نفی کچھ دیر پہلے ہنگام سے یہاں پہنچ چکی ہے۔ پورے شہر کی اس طرح نا باندی کر دی گئی ہے کہ ملی کا کچھ بھی نظروں میں آئے بغیر باہر نہیں جاسکتا۔ اس کے علاوہ شہر میں جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اب تک سیکڑوں افراد کو حراست میں لیا جا چکا ہے جن سے پوچھ پچھ کی جا رہی ہے۔ پولیس میں بھی کسی کالی میچ کو تلاش کیا جا رہا ہے کیونکہ پاتھم کو گامت خیر طور پر اس ہنگام میں منتقل کیا گیا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کو یہ بھی شبہ ہے کہ پولیس کے اندر ہی سے کسی نے مجرموں کو اس ہنگام کی نشان دہی کر دی ہو۔“

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ماسٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”تم لوگ اس ہنگام تک محدود رہو۔ باہر جھانک کر بھی مت دیکھنا اور لیزا سے کہو کہ وہ اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھے۔ اس کے معمولات میں بے قاعدگی بھی اسے شک کی ذمہ داری لاسکتی ہے۔“ ماسٹر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”ظاہر ہے ہم یہاں محدود ہو کر نہیں رہ سکتے۔ میں کوشش کروں گا کہ ایک آدھ دن میں ہم یہاں سے نکل جائیں۔ ویسے اب تم لوگ بڑی کے جنازیم والے لمبر فون مت کرنا۔ ہو سکتا ہے وہ فون ٹپ کیا جا رہا ہو۔“

”آپ کہاں سے بول رہے ہیں ماسٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس وقت پبلک بوتھ سے بات کر رہا ہوں۔ کوئی اہم بات ہوئی تو دوبارہ فون کروں گا۔ دوش پو گڈ لک!“ ماسٹر ہوجن نے یہ کہتے ہوئے فون رکھ دیا۔

میں نے بھی ریسرو رکھ دیا۔ تمہاری اور جاگی وغیرہ نے فون پر اگرچہ صرف میری ہی باتیں سنی تھیں لیکن میرے من سے نکلنے والے الفاظ اور چہرے کے تاثرات سے انہوں نے گڑبڑ کا اندازہ لگایا تھا اور پھر میں نے انہیں ماسٹر سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ ان کے چہروں پر تشویش کے تاثرات ابھر آئے۔

”اگر وہ زندہ بچ گیا تو ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔“ جاگی نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”کاش!

مجھے یہ معلوم ہوا کہ اسے کس اسپتال میں رکھا گیا ہے تو میں اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی اسے ذہن کا انجکشن لگا کر ختم کر دیتی۔“

میں نے چونک کر جاگی کی طرف دیکھا اور پھر میں نے سوچے بغیر نہ نہ سا کہ جاگی والا ہے۔ اگر یہ بتا چل جائے کہ اس شخص کو کہاں رکھا گیا ہے تو اس قسم کا رسک لیا جاسکتا تھا لیکن اب میں ماسٹر کو فون کر کے بھی یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے لیزا کو بھی ماسٹر کی ہدایت سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ناشتا کر کے اپنے سانچ پارلر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کی گاڑی سے اناری کھنی لائنس پلٹیں رات کو واپس آنے کے بعد دوبارہ لگا دی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد لیزا چلی گئی اور ہم پھر اس صورت حال پر متفکر کرنے لگے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہر سادو اب تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس نے اپنا اور پاتھم کا ناشتا بھی کر کے ہی میں گھولایا تھا۔ میں اٹھ کر ان کے کمرے میں آگیا۔ ہر سادو ہنگام کے قریب کوچ پر سوتا تھا البتہ پاتھم جاگ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا لیکن چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ اس کی نظروں میں بھی اجنبیت تھی۔ پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا۔ جب میں نے آگے بڑھ کر شیک پیڈ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ تو آگے بڑھا دیا لیکن نظروں میں اجنبیت بدستور تھی اور چوہکی تاثرات سے عاری تھا۔

”ہیلو۔ کیسے ہو؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ کیا ہوا ہے مجھے؟“ تم کون ہو اور یہ کون ہے؟“

پاتھم نے جواب دیا۔

اگر میرے اوپر آسمان ٹوٹ پڑتا تو شاید مجھے اتنا دکھ اور صدمہ نہ ہوتا جتنا پاتھم کے اس جواب سے ہوا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور بڑھ کی بڑی میں سنسنی کی ایک لمبی دھڑکن چلی گئی تھی۔ میں کمری نظروں سے پاتھم کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک ایسے تاثرات نہیں تھے جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ اس نے میرے ساتھ کسی قسم کا مذاق کیا ہوگا۔ اس کی نظروں میں میرے لیے خناسانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

ہماری آواز سن کر ہر سادو اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ سنا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ رات کا باقی حصہ بھی اس نے جاگ کر ہی گزارا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”ساتم نے۔“ میں نے ہر سادو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پاتھم میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے، تم کون ہو؟“

پاتھم مذاق نہیں کر رہا یا۔ وہ تو مجھے بھی نہیں پہچانتا۔ مجھ سے بھی بار بار یہی سوال کر رہا ہے کہ میں کون ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ واقف۔۔۔ ہر سادو مجھ سے لپٹ کر روئے لگا۔

میری عجیب سی کیفیت تھی۔ دماغ ایک دم سُت گیا تھا جیسے

برف جم گئی ہو۔ میرا ہاتھ اگرچہ ہر سادو کے کندھے پر تھا مگر میری نظریں پاتھم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

ہر سادو صبح سے اب تک کمرے سے کیوں نہیں نکلا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے شاید سوچا ہوگا کہ مجھے یہ خبر کیسے سنائے گا اور اب وہ مجھ سے لپٹ کر رہا تھا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر جاگی اور تمہاری بھی آنکھیں۔ ان دونوں سے پہلے پاتھم کی طرف دیکھا تھا پھر جاگی نے سوال کرنے میں پل کی۔

”کیا ہوا؟ ہر سادو کیوں رہا ہے؟“

میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر انہیں پاتھم کے بارے میں بتائے لگا۔ وہ دونوں سکتے ہیں آنکھیں اور اس طرح بے حس و حرکت کھڑی رہ گئیں جیسے پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہو گئی ہوں اور پھر تمہاری ہی سے پہلے زبان کھولی تھی۔

”یہ۔۔۔۔۔ کیسے ہو گیا؟“ اس کے لیے میں ہلکا ہٹ تھی۔

”خود۔“ میں نے جواب دیا ”اس کے دماغ کو کچل کے جھٹکے لگائے تھے مجھے اور کوئی ایسی ٹس ماسٹر ہوئی ہے جس سے شاید یہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔ یہی شہر ہے کہ ہم اسے برقت دہاں سے نکال لائے۔ ورنہ ہوتا یہ کہ وہ لوگ اس سے ہمارے بارے میں یا ساری کے قتل کے حوالے سے سوال پوچھتے رہتے۔ یہ انکار کرنا یا لاعلمی کا اظہار کرنا، اس پر تشدد جاری رکھا جاتا اور اس طرح یہ ختم ہو جاتا۔“

”کتنے بے رحم ہوتے ہیں یہ پولیس والے۔“ تمہاری بڑبڑائی۔

”میرا خیال ہے جاگی کچھ بتا سکے گی کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

جاگی میرے کہنے سے پہلے ہی آگے بڑھ کر پاتھم کا معائنہ کرنے لگی تھی۔ اس نے پاتھم کی آنکھوں کے پونے بھی لپٹ کر دیکھے اور اس سے چند سوالات بھی کیے۔ پاتھم عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے جاگی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کچھ دیر ہاتھ کی پشت سلانا رہا پھر اسے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا۔

”میں اب اپنا انتظام تو نہیں ہے کہ ٹھیک سے معائنہ کیا جاسکے۔“ جاگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ کیفیت وقتی بھی ہو سکتی ہے اور مستقبل بھی لیکن فوری طور پر ایک چالس لیا جاسکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک انجکشن دینا پڑے گا۔“ جاگی نے کہا ”ہو سکتا ہے اس سے کچھ فرق پڑ جائے۔“

جاگی نے ایک کانڈ پر انجکشن کا نام لکھ دیا۔ میں نے ایک گمن میں کو وہ پوچھ اور پیسے بڑے کراریٹ بھیج دیا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک لوٹ کر آیا۔ وہ سرخ اور انجکشن لے آیا تھا۔ جاگی جب انجکشن تیار کر رہی تھی تو اسے دیکھ کر پاتھم کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور جب جاگی اس کی قمیص کی آستین اوپر اٹھا رہی تھی

تو وہ وحشت زدہ سے لیے میں بولا۔

”یہ سوئی مجھے کیوں لگاری ہو۔ مجھے کیا ہوا ہے؟“

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جاگتی نہ کہ“ یہ انجکشن لگے گا تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ویسے تمہارا کام کیا ہے اور تم کام کیا کرتے ہو؟“

”مجھے نہیں معلوم مگر تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟“ پاتھم بولا۔

”میں تمہاری دوست ہوں۔ جاگتی.... اور یہ بھی تمہارے دوست ہیں۔“ جاگتی نے کہا اور اسے ہمارے نام بھی بتانے لگی۔

”اسنے سارے اور اسنے اچھے اچھے دوست۔“ پاتھم یہ کہنے ہوئے باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا اور آخر میں اس کی نظریں ایک بار پھر جاگتی کے چہرے پر جم گئیں۔

”اچھا۔ اب تم مچھی بند کرلو۔ ذرا سختی سے۔“ جاگتی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے بھی اشارہ کر دیا۔ میں نے کئی سے ذرا اوپر پاتھم کا بازو دبایا۔ اس طرح جاگتی کو اسی کے بازو پر مطلوبہ

نس تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے سوئی اس میں پوسٹ کی تو پاتھم کے منہ سے سکڑا رہی نکل گئی۔

انجکشن لگنے کے پندرہ منٹ بعد پاتھم پر خونریزی طاری ہونے لگی۔ ہم لوگ اس کے کمرے سے نکل کر ہال میں آگئے البتہ

پر سادہ وزن بٹیرا کیا تھا۔

”یادداشت واپس لانے کے لیے بجلی کے جھٹکے لگا ضروری ہے۔“ جاگتی نے میونسٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا ”لیکن سب سے پہلے یہ.... دیکھنا ہو گا کہ پاتھم پر جھٹکے براشت کر سکتا ہے یا نہیں۔ یہاں کوئی ایسی سہولت موجود نہیں۔ یہ سب کچھ کسی کلینک یا اسپتال ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔“

”کسی اسپتال یا کلینک کا رخ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو براہم ہے۔“ جاگتی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”فی الحال ہم اس کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ ایک بات بہر حال طے ہے کہ اگر اس کی یادداشت بحال ہو بھی گئی تو یہ نازل زندگی نہیں گزارا کرے گا۔“

”ہاں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی اندیشہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اب ہمارے پاس گفتگو کے لیے صرف یہی ایک موضوع تھا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فوری طور پر اس کے لیے کیا کیا جائے۔ ہم اسے کسی کلینک یا اسپتال میں لے جاسکتے تھے نہ ہی کسی ڈاکٹر کو یہاں بلایا جاسکتا تھا۔

دو بجے کے قریب لیزا بھی آگئی۔ وہ کھانے پینے کا بہت سا سامان لے کر آئی تھی۔ اسے جب پاتھم کے بارے میں بتایا گیا تو کچھ دیر کے لیے وہ بھی سکتے میں آگئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خبریں بھی

لائی تھی۔ اس کی اطلاع کے مطابق پورا شہر پولیس اسٹیشن تھا۔ چھاپے، پکڑا، محکوم، جک جک گاڑیوں کی بینکنگ لوگوں کو روک کر پوچھ چمچ.... لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ غیر ملکی اور ملکی دوسرے حصوں سے آنے والے سیاح خوف زدہ ہو کر شہر چھوڑ رہے تھے اور اس میں بھی انہیں بڑی پریشانیوں اور دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ معاملہ صرف پانچ پولیس (یا چھوٹا پولیس والا تو سر سے بچ گیا تھا) اس کے بارے میں رازداری برتی جا رہی تھی۔ غالباً یہی کیا جا رہا تھا کہ پانچوں پولیس والے ہلاک ہو چکے تھے۔ پولیس کے قتل کا یہی نہیں تھا۔ دو فرانسیسی سیاح یعنی ایک بوڑھا اور ایک بچی بھی مارے گئے تھے۔ فرانسیسی سفارت خانے نے قتل کی حکومت پر شدید دباؤ ڈال رکھا تھا۔ شاہک کے قتل سے ڈر کر باہر بھی حکومت کو مسلسل دھمکیاں دے رہی تھی۔ چاروں طرف سے

پڑنے والے اسی دباؤ کی وجہ سے حکومت کی مشینری پر پوری طعن حرکت میں آئی تھی اور پولیس غالباً کچھ مرتبہ اس قدر فعال ہوئی تھی۔

لیزائے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانے کو طبیعت کسی کی بھی نہیں چاہ رہی تھی لیکن روغن اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے بیٹ

میں کچھ نہ کچھ ڈالنا ضروری تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سب سے پہلی سے کھانا کھا رہے تھے۔ اسی دوران میں ماسٹر ہوجن کا فون آیا۔ وہ

اس وقت بھی کسی پبلک ہوتھ سے بات کر رہا تھا۔ میں نے جب اسے پاتھم کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔

”یہ تو واقعی بڑی تشویش ناک خبر ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”لیکن بہر حال“ میں نے تم لوگوں کے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ آج کا دن گزار لو اور پھر رات کے آخری پیر تم لوگ

یہاں سے نکل جاؤ گے۔“

”لیکن.... پاتھم.... کیا اسے ساتھ لے جانا ممکن ہو گا۔ اس کی تلاش میں تو پورے شہر کی تاباندی کی گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”پاتھم کی آڑ میں ہی ہم لوگ یہاں سے نکلیں گے اور اب کچھ اور آسانی ہو جائے گی۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”میں آج رات کسی وقت آؤں گا اور ہم

پروگرام فائل کر دیں گے۔“

”اور اس کے بارے میں کیا خبر ہے ماسٹر؟“ میں نے اشارتاً پوچھ لیا۔ میرا مطلب اس پولیس والے سے تھا جو ذمہ حالت میں

اسپتال میں پڑا تھا۔

”وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آسکا اور میرے آدمی کی اطلاع کے مطابق اس کے ہوش میں آنے کا امکان بھی نہیں کیونکہ جب

اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا اس وقت تک اس کا بہت زیادہ خون ضائع ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے ابھی گولی بھی نہیں نکالی گئی۔

ڈاکٹر اس کے بارے میں مایوسی کا اظہار کر چکے ہیں۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ماسٹر۔ رات کو آپ کا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

ہمارا وہ پورا دن بڑی بوسٹ میں گزارا۔ ماسٹر ہوجن رات آٹھ بجے کے قریب آیا تھا۔ اس نے کچھ بوری سے نکلنے کا جو منصوبہ

بتایا وہ پراسنسی خیر تھا۔

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”پولیس کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں اور میری اطلاع کے مطابق

بنکاک سے چند سراغ رساں بھی منگوائے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزر آجائے گا مشکلات بڑھتی جائیں گی۔“

”کیا اس طرح لکنا آسان ہو گا؟“ میں نے کہا ”قدم قدم پر بینکگ ہو رہی ہے، ہم سے کاغذات طلب کئے جائیں گے اور پھر ”میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے میری

بنت کا کافی رات دس بجے کے بعد تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ گے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے پاتھم کو سب سے آخر میں

میرے آدمی یہاں سے لے جائیں گے۔ تم لوگوں کے لیے بھی اس طرح تبدیل کر دیے جائیں گے کہ شناخت نہ کیا جاسکے۔ بہر حال،

اب میں چاہتا ہوں۔ ٹھیک دس بجے ایک گاڑی تم لوگوں کو لینے کے لیے بھیج جائے گی۔ پتے تمہاری، تمہاری جاگتی یہاں سے نکلے گے۔ دوسرے پیکرے میں پر سادہ اور پاتھم کو لے جایا جائے گا۔“

”اور لیزا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ہمیں سہی گ۔“ اسے یہاں کوئی غور نہیں ہے۔ ویسے اگر وہ چاہے تو بعد میں بنکاک آسکتی ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا اور

دواڑے کی طرف بڑھ گیا۔

ماسٹر ہوجن کے جانے کے بعد ہم بھی وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ جاگتی اور تمہاری نے اپنی ساری چیزیں سمیٹ کر ایک پیک کر کے اور پھر ٹھیک دس بجے ماسٹر ہوجن کی بھیجی ہوئی گاڑی پہنچ گئی۔ ہم لوگ لیزا سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ہماری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا۔ گاڑی میں دو ڈر پر آئے بغیر ہی گلیوں میں ہوتی ہوئی وہاں پہنچی تھی۔ ہمیں کلینک کے کچھلے دواڑے سے اوپر کی منزل پر واقع ایک کمرے میں پہنچایا گیا۔

گیاہہ بجے کے بعد پاتھم اور ہر سادہی پہنچ گئے۔ پاتھم کو پیچھے ہی کسی کمرے میں رکھا گیا تھا البتہ ہر سادہ پاس پہنچایا گیا تھا۔ اس کے تھوڑی سی دیر بعد ہمیں کھانا بھی اسی کمرے میں سرو کیا گیا تھا۔

اس کمرے میں دو اسپرنگ والے بیڈ اور تین چار کرسیاں تھیں۔ ٹکڑیوں کے سامنے ہرے رنگ کے دبیز پردے لگے ہوئے تھے۔ کرا کا کافی کشادہ تھا۔

رات ڈیڑھ بجے کے قریب دو اویز عمر عورتیں کمرے میں

داخل ہوئیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں میڈیکل کٹ جیسے بیک تھے۔ ان دونوں نے آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنے کام میں خاصی ماہر تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں نے اٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میرا چہرہ بالکل بدل گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا بھی دشوار تھا کہ چہرے پر کسی قسم کا میک اپ کیا گیا ہے۔ دوسروں کے لیے بھی کچھ ایسے ہی تبدیل ہوئے تھے کہ انہیں

شناخت کرنا آسان نہیں رہا تھا۔

پانچ بجے کے قریب ایک عورت ہمارے لیے کافی لے آئی۔ ہم رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اور اس وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کر رہے تھے۔ کافی ختم ہونے کے بعد ہمیں نیچے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ تابوت کے دھکنے پر

تقریباً ایک مربع فٹ شیشہ لگا ہوا تھا جس سے تابوت کے اندر دیکھنا جاسکتا تھا اور اس شیشے کے اندر دیکھتے ہی میں چمک گیا۔

ایک آدمی نے جو غالباً ڈاکٹر تھا، تابوت کا ڈھلکا اٹھا دیا۔ تھائی وغیرہ بھی اچھل پڑے۔ ایک لمبے کو تو میرا داغ سننا اٹھا تھا۔ پاتھم کا چہرہ لاش کی طرح زرد تھا۔ کفن میں پٹنا ہوا پاتھم لاش کی لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک فائل میری طرف بڑھادی۔

”اس میں تمام کاغذات“ دوڑو ہیں۔“ اس نے کہا ”مارسکم نامی یہ شخص میں روز پیلے اس کلینک میں داخل کرایا گیا تھا۔ اسے نمونہ تھا۔ یہاں اس کا علاج ہوتا رہا مگر یہ جانہ نہ ہو سکا اور گزشتہ رات اس کا انتقال ہو گیا۔ اس فائل میں مریض کو دے جانے والے ٹیسٹ منٹس کی تمام رپورٹس موجود ہیں اور یہ پولیس کے

کاغذات ہیں۔ ڈیڈ باڈی کو شہر سے باہر لے جانے کے لیے پولیس کا اجازت نامہ ہونا ضروری ہوتا ہے مگر یہ کہ تم ایک مرتبہ اس فائل کو دیکھ لو تاکہ بعد میں کوئی ٹر بزنہ ہو جائے۔“

میں فائل کھول کر کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ فائل ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

”پولیس کے یہ کاغذات....“

”اصلی ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا ”تمام کاغذات اصلی ہیں سوائے ڈیڈ باڈی کے۔ مجھے امید ہے رات میں تم لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں

ہوگی۔ مشن پاتھم کو ایسا انجکشن دیا گیا ہے کہ کم از کم چھ گھنٹوں تک یہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہے گا۔ چھ گھنٹے کے بعد انجکشن کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ پاتھم بڑھ جائے گا۔“

میں فائل کھول کر کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ فائل ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

”پولیس کے یہ کاغذات....“

”اصلی ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا ”تمام کاغذات اصلی ہیں سوائے ڈیڈ باڈی کے۔ مجھے امید ہے رات میں تم لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں

ہوگی۔ مشن پاتھم کو ایسا انجکشن دیا گیا ہے کہ کم از کم چھ گھنٹوں تک یہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہے گا۔ چھ گھنٹے کے بعد انجکشن کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ پاتھم بڑھ جائے گا۔“

میں فائل کھول کر کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ فائل ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

”پولیس کے یہ کاغذات....“

”اصلی ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا ”تمام کاغذات اصلی ہیں سوائے ڈیڈ باڈی کے۔ مجھے امید ہے رات میں تم لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں

اور وہ سرسری سے انداز میں کاغذات کو دیکھ رہی تھی۔  
”جاگنی بھی ڈاکٹر ہے۔“ میں نے اس ڈاکٹر سے جاگنی کا تعارف کرایا۔

”گنڈہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ یہ صورت حال کو آسانی سے سنبھال سکیں گی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

تقریباً اسی وقت چار آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر کا اشارہ پا کر تابوت کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ بھی کلینک سے باہر نکلے تو سامنے ہی ایک بڑی ایمریٹنس کھڑی تھی۔ تابوت ایمریٹنس کے فرش پر رکھا جا چکا تھا۔ اس کے دائیں بائیں لمبی سیٹیں تھیں۔ میں تھائی کے ساتھ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر جاگنی اور پر سادہ بیٹھ چکے تھے۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ کلینک کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔

جس وقت ایمریٹنس حرکت میں آئی اس وقت دن کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ ایمریٹنس شرکی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے بائی دے ۳۲۳ کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں پولیس نے ہمیں دو جگہ روکا لیکن تابوت دیکھ کر ہمیں فوراً ہی جانے کی اجازت دے دی۔ البتہ شرکی نواحی چوکی پر جہاں سے بنگال کی طرف جانے والی بائی دے ۳۲۳ شروع ہوتی تھی وہاں چینگنگ سخت تھی۔ پولیس کی ہماری نفوذ نے سڑک اس طرح بلاک کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر وہاں سے اٹھنا ممکن نہیں تھا۔

یہاں ہم لوگوں کو ایمریٹنس سے نیچے اتار دیا گیا۔ ایک آفیسر نے ایمریٹنس میں داخل ہو کر تابوت کا ڈھلکا اٹھا کر دیکھا اور پھر نیچے اتر آیا۔ دوسرا آفیسر کاغذات چیک کر رہا تھا اور ہم سوکار سے ایک طرف کھڑے تھے۔ کاغذات چیک کرنے کے بعد اس آفیسر نے ہم سے کچھ سوالات بھی کیے۔ تھائی نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بتایا کہ ہم لوگ تفریح کے لیے یہاں آئے تھے لیکن دوسرے ہی روز ہمارا یہ کرنل بیمار ہو گیا۔ اسے راسیویمت ہسپتال میں داخل کر دیا گیا لیکن گزشتہ رات اس کا انتقال ہو گیا۔

تقریباً چالیس منٹ گزر گئے۔ دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی بات ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا کوئی مرحلہ آتا تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک آفیسر فائل سے گردنفر کے اندر چلا گیا تھا اور درپے اس کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ وہ غالباً ٹیلی فون پر متعلقہ پولیس اسٹیشن سے اس امر کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہاں سے جاری کیے گئے کاغذات درست بھی ہیں یا نہیں اور پھر اس نے باہر آکر دوسرے آفیسر کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فائل جاگنی کی طرف بڑھادی اور اس کے ساتھ ہی ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس آفیسر نے اس تاخیر پر ہم سے معذرت بھی کی تھی اور ہمارے کرنل کی موت پر افسوس کا اظہار بھی۔

کچھ بوری سے تقریباً پینتالیس میل دور تاکن پاتھن کی چوکی پر بھی ان طرح چینگنگ ہوئی۔ انہوں نے بھی کچھ بوری ٹیلی فون

کر کے پولیس اسٹیشن سے کاغذات کی تصدیق کی تھی اور اس پر بعد ہی ہمیں آگے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔

اور بالاخر ہم بنگالک پہنچ گئے۔ شہر کے نواح میں داخل ہونے ہی ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ موت کے جہیزوں سے نکل کر آئے تھے۔ چینگنگ کے دوران میں کسی جگہ بھی کسی کو یہ شبہ ہو جانا کہ تابوت میں لاش نہیں لیکن زندہ آدمی ہے تو ہمیں وہاں سے زندہ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ شہر کے شمالی بس سٹیشن سے آگے نکل کر مورائے گاؤں پر ہوٹل کے قریب میں نے ایمریٹنس رکوا لی۔

”تم ایمریٹنس کے ساتھ مادام جیری کے کلینک چلے جاؤ۔ میں نے پر سادہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پاتھم کو کلینک پہنچا کر اطمینان کر لینے کے بعد تم جاگنی کے بنگلے پر آ جاؤ۔ کلینک میں چوڑی ہماری ضرورت نہیں ہوگی اس لیے ہم یہاں سے ٹیکسی وغیرہ پرے جاتے ہیں اور یہ خط مادام جیری کو دے دو۔“ میں نے بھونکنے کی جیب سے ڈاکٹر کا دیا ہوا لٹافڈ نکال کر پر سادہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”جب تک اسے ہوش نہیں آئے گا میں وہیں رہوں گا۔“

پر سادہ نے لٹافڈ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔  
ہم تینوں ایمریٹنس سے اتر آئے اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ساڑھے پانچ بجے کچن بوری کے کلینک سے روانہ ہوئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے تک یہاں بیٹھ جانا چاہیے تاہم راستے میں دو جگہ چینگنگ میں زیادہ وقت لگا تھا۔

اس وقت مجھے بڑی شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ تھائی اور جاگنی کی بھی غالباً ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک اچھا معیار کی اور پرسکون ریسٹورنٹ تھا اور اس وقت رشتہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے کارڈز کی ایک میز پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد تھائی ایک نو عمرو میٹرس کو ٹاٹھے کا آٹھ روپے رہی تھی اور جب ناشتا پزیر لگاؤ ہم تینوں اس طرح اس پر ٹوٹ پڑے جیسے کسی روز سے کھانے کی محل نہ دیکھی ہو۔



میں واٹ ٹرمٹ کے ایک کمرے میں مہاراج کے سامنے فرش پر اتنی بائیں مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ ماسٹر بوجن کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا جسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ لہا ترنگا شخص بڑی پر وقار شخصیت کا مالک تھا۔ چہرے پر بے نیجہ کی اور لمبے میں بردباری تھی۔ اس کی گفتگو اور شخصیت سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق ہمارے طبقے سے نہیں تھا۔ اس کا لباس بھی یہ تصدیق کر رہا تھا کہ وہ اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے۔

ہم دوسرا ہرماہ بجے کے قریب جاگنی کے بنگلے پر پہنچے تھے۔ دو گئے

مٹانی میں لگ گئے تھے اور پھر میں اپنے کمرے میں بستر پر گر کر سویا تو شام سات بجے سے پہلے آٹھ نہیں مکمل ہو سکی تھی۔ داغ میں سنٹاٹ سی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کے بعد ہی حواس بحال ہوئے تھے۔

جاگنی نے بتایا کہ چھ بجے کے قریب پر سادہ کا فون آیا تھا۔ پاتھم ہوش میں اچکا تھا لیکن اسے اگلا نہیں چھوڑا جاسکا اس لیے پر سادہ نے بھی بی بی المال وہیں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پاتھم کے لیے ایک الگ کمرے کا بندوبست کر دیا گیا تھا جس میں انٹینڈنٹ کے لیے بھی ایک بڑا لگا دیا گیا تھا۔

جاگنی نے لیڈر کو بھی ٹیلی فون پر اپنے بہ عافیت بنگال پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ یہاں پہنچ کر کھانے کیوں مجھے عجیب سی مہارت کا احساس ہوا تھا۔ جس طرح کوئی شخص دن بھر بھاک دوڑ کے بعد اپنے گھر پہنچ کر کھانے کا سانس لیتا ہے اسی طرح ہم نے بھی کھانے کا سانس لیا تھا۔ میرا گھر تو کوئی بھی نہیں تھا مگر جاگنی کے اس بنگلے کے دو دروازے اس ہو گیا تھا اور یہاں آئے کے بعد مجھے عیش گھر جیسا سکون ہی ملا تھا۔

صبح جب ہم ریسٹورنٹ سے ناشتا کر کے نکلے تھے تو ہم ایک مارکیٹ میں گھس گئے تھے جہاں سے جاگنی اور تھائی نے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی بہت سی چیزیں خرید لی تھیں۔ اس طرح ہم تقریباً بارہ بجے کے قریب گھر پہنچے تھے۔

رات آٹھ بجے کے قریب ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ماسٹر بوجن کا فون آ گیا۔  
”کچن بوری میں تم نے پوچھا تھا کہ مہاراج تم سے کیا اہم کام لینا چاہتے ہیں اور میں نے بات کو ٹال دیا تھا کہ وقت آنے پر بتا دیا جائے گا۔“ ماسٹر بوجن نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”۳ بجے وقت آ گیا ہے کہ تمہیں ایک اہم ذمے داری سونپی جائے۔ مہاراج آج رات تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ مہاراج یہاں آئیں گے؟“

”نہیں۔“ ماسٹر بوجن نے جواب دیا ”رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت میرے دو آدمی تمہارے بنگلے پر پہنچ جائیں گے۔ تم ان کے ساتھ چلے آنا۔ اکیلے۔۔۔“

”تھائی اور جاگنی آئیں گی؟“ میں نے پوچھا۔  
”کچھ دیر میں سکھر وہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔ وہ پہلے کی طرح ڈیوٹی دے گا۔ اس کی موجودگی میں کسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔“ ماسٹر نے کہا۔

”تمک ہے ماسٹر۔“ میں نے کہا ”دارا وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع ملی؟“

”ہاں۔“ تمہیں ساری تفصیل بعد میں بتا دی جائے گی۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔

میں نے اسے پاتھم کے بارے میں بتایا تو ماسٹر نے کہا۔  
”تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پاتھم اب مہاراج کی ذمے داری ہے اور تم جانتے ہو مہاراج اپنے وفاداروں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ پاتھم کا علاج کرایا جائے گا اور اس کی ہر ممکن دیکھ بھال کی جائے گی۔“

مزید چند لمحوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا گیا۔ میں تھائی اور جاگنی کو ماسٹر بوجن سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔ ان دونوں کی طرح میں بھی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ اہم ذمے داری کیا ہو سکتی ہے جو مہاراج مجھے سونپنے والے ہیں۔

نو بجے کے قریب سکھر پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ جاگنی نے اسے الماری سے ایک آٹو میٹک رائفل نکال کر دے دی تھی اور دوسری رائفل اپنے پاس رکھ لی تھی۔

ماسٹر کے آدمی رات ایک بجے کے قریب وہاں پہنچے تھے۔ جاگنی اور تھائی بھی اس وقت جاگ رہے تھے۔ میرے رخصت ہوتے ہی جاگنی نے برآمدے والا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سکھر باہر والے گیٹ تک میرے ساتھ آیا تھا۔

اور اب میں مہاراج کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جہاں ماسٹر بوجن اور پُر وقار شخصیت کا مالک وہ شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

”تمہیں شاید اس ملک کی سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ ہو لیکن اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمارے ہاں آئینی بادشاہت ہے۔“

مہاراج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا شروع کیا ”تھائی لینڈ کی تاریخ بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔ یہ علاقہ ہمیشہ ہی سے بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے لیکن اس خطے نے بڑی جرات سے اپنی سلامتی کا دفاع کیا۔ اگرچہ کئی مواقع ایسے بھی آئے کہ بیرونی حملہ آوروں نے دارا حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر اس سرزمین نے اپنا وجود نہیں کھوایا اور کسی حملہ آور طاقت کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ تھائی لینڈ نے ہمیشہ اپنی آزادی برقرار رکھی جبکہ آس پاس کی ریاستیں بیرونی حملہ آوروں کی کالونیان بن کر رہ گئیں۔“ مہاراج خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پہلے میں نے بھی اس موضوع پر سوچا تھا نہیں تھا۔ مجھے اس سے کیا غرض ہو سکتی تھی کہ تھائی لینڈ نامی کسی شخص مراصل سے گزر چکا ہے۔ میں پہلی مرتبہ ایسی باتیں سن رہا تھا اور مجھے ان میں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ مہاراج بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”۱۳۳۸ء میں دو قبائلی سرداروں کھون بانگ اور کھون پھانگ نے کھمیر کو ہکا بھکا کر یہاں کا قاعدہ حکومت کی بنیاد رکھی اور سوکھو تھائی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس خاندان کا آخری حکمران شیشنہا عاکسن تھا۔ اس وقت انہو تھایا اس ملک کا دارالحکومت تھا۔ کنگ عاکسن کے انتقال کے بعد فوج کے ایک

جنرل ٹاکسن فریاء نے حکومت سنبھال لی۔ حکمران خاندان میں آپس کی بغاوتوں کی وجہ سے برہا کو حملہ آور ہونے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے ایو تھاپا کی اینٹ سے اینٹ بنیادی۔ اس کے کئی سال بعد جنرل فریاء نے حکومت سنبھال لی اور برہا خاؤ فریاء کے کنارے پر آباد تھان پوری نامی قصبے کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ ۱۸۷۳ء میں چکری خاندان کے پہلے حکمران کنگ بودھا پوتا نے اٹان حکومت سنبھالی اور رامادون کے نام سے مشہور ہوا۔ رامادون نے دارالحکومت دریاء فریاء کے دوسرے کنارے کوئنگ تھیب نامی قصبے میں منتقل کر دیا۔ (موجودہ بھاک کو پرانے وقتوں میں کوئنگ تھیب کہا جاتا تھا)

بیٹھے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا "رتنا کو سن نے کئی سال پہلے  
 مجھے آگاہ کیا تھا کہ شہنشاہ کے خلاف ایک خوفناک سازش ختم  
 رہی ہے لیکن اس کا ابھی تک سراغ نہیں مل رہا۔ ان دنوں تم  
 میرے پاس آئے تھے اور میں نے تمہارے اندر جیسے ہوئے اس  
 آدمی کو دیکھ لیا تھا جو قوت آنے پر پھاڑے بھی کھرا سکتا ہے۔ اسی  
 لیے میں نے مخصوص انداز میں تمہاری تربیت شروع کی تھی۔ آج  
 میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑی سے بڑی قوت سے کھرا جانے کا حوصلہ  
 رکھتے ہو۔ تم نے جس طرح پیڑوں، دارا اور اس کے آدمیوں کو  
 اگلیوں پر بچھا رکھا ہے وہ قابلِ تحریف ہے۔ پیڑوں اور دارا جیسے  
 غنڈوں سے میرے آدمی بھی نمٹ سکتے تھے لیکن میں تمہیں ان سے  
 بڑے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمہارا حوصلہ دیکھنا چاہتا تھا اور اب  
 مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ کام صرف تم اور تم ہی کر سکتے ہو۔ کسی اور  
 میں اتنا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔"  
 "آپ حکم کیجئے ہمارا ج۔" میں نے کہا۔

۱۔ جہل کھوراٹ زیادہ سے زیادہ فراہم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ حکومت کا کوئی آدمی کوئلن ٹرائی اینگٹ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس سازش کا اصل سرخند کون ہے اور ان میں اور جہل کھوراٹ میں کیا معاہدہ ہوتا ہے۔" مبارج چند شخص کو خاموش ہوتے پھریات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے "میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ کوئلن ٹرائی اینگٹ میں قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور موت بھی بڑی اذیت ناک ... کوئی انجین اس علاقے میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکتا اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تمہارا اہلی ذرخن دارا اور پیڈرو بھی اسی طرف جا چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دولت کے لیے اپنی ماں کو بھی بیچ سکتے ہیں۔ سازشی گروہ نے نہایت خفیہ طور پر ان کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ یہ لوگ سازشی سرخند کے نمائندوں کو تحفظ فراہم کریں گے اور اس کے علاوہ .... فانگ جیج بھی چنانگ رائے میں موجود ہے۔ اسے یہ پتا چل گیا ہے کہ اس کا آدمی شانگ تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ گویا یہ سمجھ لو کہ تمہارے چادوں طرف موت ہوگی۔ ایسی صورت میں میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ میری طرف سے تم کو پرکھی پابندی نہیں۔ تم چاہو تو انکار کر سکتے ہو۔ میں تمہیں دو دن کا وقت دوں گا۔ اس دوران میں تم مجھی طرح سوچ لو۔"

اور پھر جس رازداری سے مجھے اس بنگے تک لے جایا گیا تھا۔  
اس طرح آدمی رات کے وقت مجھے دوبارہ مہاراج کے پاس پہنچا  
دیا گیا۔



وہ دن ہم نے گیٹ ہاؤس میں ہی گزارا۔ شام چھ بجے کے قریب میں نے فوٹو کھونکيا تو بال اسی نے ریسپو کی گئی۔  
 ”ٹیس ٹل ماسٹر۔“ وہ میری آواز سننے ہی بولی ”وہ دونوں بھی موجود ہیں اور ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“  
 ”مجھے اپنا انڈریس سمجھاؤ۔ ہم چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا اور توجہ سے دوسری طرف کی آواز سننے لگا۔

اس کے تقریباً دس منٹ بعد میں اور تھائی ایک ٹیکسی میں سواران کی طرف جا رہے تھے۔

نورسٹ پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت سے ذرا آگے پرانی طرز کے کچھ ولاز بنے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت کابینے نمایاں مکان ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ درمیان کی خالی جگہوں پر سرسبز لانا بنے ہوئے تھے۔ اس وقت اندھا راجیمل جکا تھا مگر مطلوبہ ولا تلاش کرنے میں، ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دو مرتبہ ٹیل بجائے کے بعد بھی اندر سے جواب نہیں ملا تو میں نے ابھی ہوئی نظروں سے تھائی کی طرف دیکھا اور پھر دروازے پر ہاتھ رکھ کر کھٹکا سا دواؤں والا۔ دروازہ آٹھسکی سے کھٹکا چلا گیا۔ میں نے نوبتا کا نام لے کر کہا لیکن اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا تو ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

دلا میں اندھیرا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے فوتے سے فون پر میری بات  
 دہلی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ جاگتی اور پرسہادی یہاں موجود ہیں  
 لیکن اب کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔  
 دہواڑے کی دوسری طرف راہداری تھی۔ میں نے دہوار پر  
 ڈول کو سوچ کر آن کوہیا۔ راہداری روشن ہوگئی۔ میں نے ایک بائیر  
 کیٹا کو پکارا لیکن اس مرتبہ بھی جواب نہیں ملا۔ میری چھٹی حس  
 کسی گریڈ کا احساس دلائی تھی۔ دائیں طرف ایک کمرے کا  
 دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دہواڑے میں داخل ہو کر دوڑاؤں لگائے۔

ہر ہاتھ سوچ بورڈ سے نکرایا۔ میں نے ایک سوچ دبا دیا۔ کچھ میں ہوا، دوسرا سوچ دبا تو کمرے میں روشنی بھگری اور اس کے ہاتھ ہی میرا دل اچھل کر طلق میں آگیا۔

سامنے ہی بیٹھ کر نوتا خون میں لیت پڑی تھی۔ ایک خنجر اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پھوست تھا۔ زخم سے ابھی خون بہہ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے مڑ کر قاتل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے پناہ ہشت تھی اور چیخ رونے کے لیے اس نے دائیں ہاتھ سے منہ کو تھامے دبا رکھا تھا۔

میں نے ایک بار پھر نوتا کی طرف دیکھا۔ اس کے سینے پر بہت سا زہر و بم تیار تھا کہ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ میں لپک کر کے قریب پہنچ گیا اور جھک کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

اس مرتبہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ نوٹا کے پوٹوں میں بہت معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

فوجتے کے ہونٹ بدستور چل رہے تھے۔ میں نے ایک بار بڑے کان اس کے ہونٹوں کے بہت قریب کر دیا۔ اس مرتبہ مجھے مایوس نہیں ہوئی۔ اس کی سرسرائی ہوئی آواز الفاظ کا روپ دھارنے کو کشش کر رہی تھی۔ میں نے اپنی پوری توجہ اس آواز پر مرکوز کر دی۔

”قوتہ... قوتہ...“ میں کمال تپتے پاتے ہوئے اسے پکار

بیک کی دوسری طرف کھڑی ہوئی تھا کی حقیقت کی یہ کو پہنچ  
تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ

تھی۔ میں نے جب کہ اس کی بیٹانی پر بوسہ دیا اور سیدھا ہو کر  
دیکھنے لگا۔ بہتر کی چادر کا بہت بڑا حصہ خون سے زور ہوا تھا اور خود  
غالباً چادر کے نیچے ٹریکس میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے سینے میں  
خنجر پیوست ہوئے تھے۔ کتنی درہم ہو چکی تھی اور پتا نہیں کہ وہ  
سے جاں کن کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ خنجر اس کے سینے میں ٹھیک  
کے مقام پر پیوست تھا اور اتنا زیادہ خون بہہ جانے کے بعد اتنی  
تک زندہ رہا جتنی بڑی حیرت کی بات تھی۔

جنگ آئی تھی۔ وہ ہر اشارہ بنا جاتی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ اسے لانے والا کون تھا۔ شاہک اسے اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی دوران میں شاہک اور ہائیگر سے ٹکرا گیا اور جب نیتا کو معلوم ہوا کہ وہ طرح طرح کے کھٹکار ہوئی تھی تو وہ شاہک وغیرہ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ آن لیں تھی۔ اسے خوف تھا کہ شاہک وغیرہ اسے قتل کر دے۔

شروع میں وہ اپنی جان ہی کے خوف سے ہمارے قریب  
تھی لیکن بعد میں وہ ہم میں سے ایک ہو گئی۔ میری خاطر اس  
مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی اور بالآخر آج اس  
جان دے دی۔ ہم سب کو اس سے انس ہو گیا تھا۔ ہم سب  
دوسرے پر جان چڑھتے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے ناپ  
تھے۔ میرے خیال میں نوبت کی موت ہمارے لیے ایک ایسا  
تھی جس کی آسانی سے تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔  
میں یہ سب کہہ سوچ رہا تھا کہ حقانی نے مجھے بازو سے  
جھنجھوڑ دیا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”اوہ! میں جیسے ہوش میں آیا“ میں پچی فانگ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”جب میں نے فوتیہ کو فون کیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ جاگتی اور پرساد بھی یہاں موجود ہیں لیکن اب ان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ دونوں بھی ان کے ہاتھ نہ لگ گئے ہوں۔“

تھائی نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بھی تشویش نمایاں تھی۔ میں چند لمبے دہان کھڑا رہا اور پھر کانچ کے دوسرے کمروں کو چیک کرنے لگا۔

یہ کانچ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ بیڑہ روم تھے اور ایک ڈرائنگ روم۔ ایک بیڑہ روم میں فوتیہ کی لاش تھی۔ دوسرے بیڑہ روم میں بھی آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ یہ بیڑہ شاید فوتیہ نے اپنے مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا لیکن اس کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کئی روز سے اس بستر پر کوئی سوا نہیں تھا۔

پورے کانچ میں جاگتی اور پرساد کا سراغ نہیں ملا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے دوسرے سراپا ہمارے تھے۔ میں نے فوتیہ کو شام چھ بجے فون کیا تھا۔ اس کے دس منٹ بعد ہی میں تھائی کے ساتھ روانہ ہو گیا تھا۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگا ہوا۔ چارڑی ملاخون میں سورج جلدی غروب ہو جاتا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اب یہ صورت حال میرے سامنے تھی۔ چھ بجے جاگتی اور پرساد وہاں موجود تھے۔ فوتیہ نے انہیں بتا دیا ہو گا کہ ہم آ رہے ہیں اس لیے یہ سوچنا محال تھا کہ ہمارا فون ملنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے چلے گئے ہوں گے اور ان کے جانے کے بعد پچی فانگ یہاں آیا ہو گا۔ شام نے نو بجے قتل کر دیا۔ پچی فانگ اکیلا نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ دارا اور کم بھی ہوں گے۔ انہیں کسی طرح چپاگے راستے میں جاگتی اور پرساد کی موجودگی کا پتا چل گیا ہو گا یا ممکن ہے انہیں صرف فوتیہ کے بارے میں پتا چلا ہو اور وہ لوگ اس سے پچھلا حساب چکانے کے لیے یہاں پہنچ گئے ہوں اور اتفاق سے اس وقت جاگتی اور پرساد بھی یہاں موجود تھے۔ انہوں نے فوتیہ کو قوت کے کھات امار دیا اور جاگتی اور پرساد کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔

یہ سب مفروضات تھے۔ ان میں سے کوئی بھی بات ہو سکتی تھی لیکن یہ طے تھا کہ جو کچھ بھی ہوا تھا، پچھلے آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہوا تھا۔

میں کانچ کی تلاش لینے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ پولیس سائرن کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ سائرن کی آواز چاکھی سی اور بہت قریب سے سنائی دی تھی۔ لگتا تھا جیسے پولیس کی گاڑی نے کانچ کے عین سامنے پہنچ کر سائرن بجایا ہو۔

تھائی کی آنکھوں میں بھی وحشت سی ابھرتی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تیزی سے اس کمرے سے باہر آ گئے۔ جب ہم فوتیہ والے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچے تو باہر کسی گاڑی کا دروازہ کھلے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ”اس طرف۔“ تھائی نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ ”اگر وہ پچھلی طرف بھی ایک دروازہ ہے۔“

میں نے ایک نظریہ پر پڑی ہوئی فوتیہ کی لاش کی طرف دیکھا اور تھائی کے ساتھ تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں عقبی دروازے کا پوٹ بٹار ہا تھا کہ کال بیل کی آواز گونج اٹھی۔ پولیس نے روایتی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے دروازہ کھلا ہونے کے باوجود براہ راست اندر داخل ہونے کے بجائے کال بیل بجاتا ضروری سمجھا تھا۔ جرائم پیشہ لوگ پولیس کی ایسی ہی حماقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس وقت ہم نے بھی اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور عقبی دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ اس طرف تاریکی تھی۔ کانچ کی پچھلی طرف بھی کشادہ لان تھا جسے پودوں کی باڈی گھیر رکھا تھا۔ تین چار گھنٹاں چوں والے اونچے درخت بھی تھے جن کی وجہ سے تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے فوتیہ کے کانچ کے دور ہوتے چلے گئے اور بالاخر دس منٹ بعد ایک سوڑے پر پہنچے جہاں ہمیں فوراً ہی ایک خالی عکس لگئی۔ میں نے تھائی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو کھاک ٹاور پلٹے کو کہہ دیا۔ ہم دونوں کا انداز اس وقت ایسا تھا جیسے گھر سے کھل قفر کے لیے نکلے ہوں۔

چند منٹ بعد ہماری عکسی اس راستے سے گزری جس طرف فوتیہ کا کانچ تھا۔ وہاں پولیس کی تین گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور آس پاس کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ڈرائیور نے پولیس کی گاڑیوں اور وہاں جمع لوگوں کی طرف دیکھا لیکن رکے بغیر عکسی آگے نکال لے گیا۔

کھاک ٹاور شر کا وسطی اور بہت باوقوف علاقہ تھا۔ کاروباری علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں دن کے وقت بھی بڑی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی اور رات کو بھی دیر تک چل پھل رہتی تھی۔ تمام بڑی تجارتی کمپنیوں کے دفاتر اور بینک اس علاقے میں واقع تھے۔ بینک دوپہر کے وقت اور دفاتر شام پانچ بجے بند ہو جاتے تھے جبکہ شاؤنگ بینگز اور ریسٹورنٹ وغیرہ رات کو دیر تک کھلے رہتے تھے۔ ڈسکو اور ٹانٹ کلب و رات کے آخری ہر تک کھلے رہتے تھے۔

وہ شام کا ابتدائی حصہ تھا۔ تمام شاؤنگ بینگز کھلے ہوئے تھے۔ پورا علاقہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے عکسی جیٹ یا رڈوڈ کے کارنر پر رکوالی۔ میٹرو دیکھ کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور تھائی کو اشارہ کرنا ہوا پھر اتر آیا۔ ہم دونوں اس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک عکسی

رکت میں آنکھوں میں پل گئی۔ رکت میں آگے اپنے گیٹ ہاؤس کی طرف کیوں نہیں گئے؟ تھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہاں سے سیدھا اپنے گیٹ ہاؤس کی طرف جانا مناسب نہیں تھا۔“ میں نے جواب دیا ”مگر عکسی ڈرائیور کو کسی قسم کا شبہ نہیں تھا۔“ میں نے ہمارے ٹھکانے کی نشاندہی کر رکھا تھا۔ ”ہاں۔“ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی لیکن اب کیا پروگرام ہے؟ کیا گیٹ ہاؤس جانا مناسب ہو گا۔ ایسا تو میں کہہ ہمارا گیٹ ہاؤس بھی ان کی نظروں میں آیا ہو؟“ تھائی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے، ایسا نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”مگر ہمارا ٹھکانہ ان کی نظروں میں آیا ہو تا تو وہ پلاوا درم پر ہی کرتے۔“ میں چند لمبے خاموش ہو کر ادر اور ادر دیکھتا رہا پھر بولا ”جیت تو اپنی جان سے گئی لیکن اس وقت مجھے سب سے زیادہ پریشانی جاگتی اور پرساد کی طرف ہے۔ وہ بھانے کہاں ہیں۔ محفوظ ہیں یا دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔“

”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم مزید پریشان ہونے سے پہلے ”وائی ایم سی اے“ گیٹ ہاؤس سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ جب وہ بنگاک سے روانہ ہوئے تھے تو یہی طے ہوا تھا کہ وائی ایم سی اے میں قیام کریں گے۔ ہمارے آنے کے بعد کوئی اور بندوبست کیا جائے گا۔“ تھائی نے کہا۔

”مجھے وہاں ان کے ملنے کی توقع نہیں لیکن بہر حال معلوم کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور ایک بار پھر ادر اور ادر دیکھنے لگا۔ کچھ آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے بلیک ٹیلی فون بوٹھ نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں اس طرف چل پڑے۔ وہ دراصل

ساتھ ساتھ ملے ہوئے دو ٹیلی فون بوٹھ تھے اور اس وقت دونوں مصروف تھے۔ ایک میں تو کوئی جوان عورت تھی جو فون پر بات کرتے ہوئے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے تحاشا ایک پتہ تھا ہوا تھا۔ وہ جس طرح اطمینان سے بات کر رہی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان کی احوال ریسپور سے اگے ہونے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوسرے بوٹھ میں ایک دراز قامت آدمی تھیں جس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

ہم دونوں سامنے کھڑے ہو گئے۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ آدمی بوٹھ سے نکلا تو میں اور تھائی اندر داخل ہو گئے۔ ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ ہی دروازے میں لگے ہوئے ایک شیٹ پر ایک مختصر ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی رکھی ہوئی تھی جس میں چپاگے رائے کے اہم مقامات کے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ تھائی ڈائریکٹری کھول کر وائی ایم سی اے کے نمبر تلاش کرنے لگی۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی لیکن وائی ایم سی اے کے نمبر سے کئی نمبر تھے۔ پلا نمبر وائی ایم سی اے کو لائن ڈرائیو اینٹل انٹر نیٹیل ہاؤس کا تھا جو اتر پوٹ کی طرف واقع تھا۔ یہاں جاگتی اور پرساد کی موجودگی کی توقع نہیں کی جاسکتی

تھی۔ بلی بات تو یہ کہ یہ فانیو اشار ہوٹل تھا اور دوسری بات یہ کہ شہر سے باہر تھا۔ ایک نمبر وائی ایم سی اے سینٹر تھا۔ اور بھی کئی نمبر تھے۔ ان میں ایک گیٹ ہاؤس کا نمبر بھی تھا۔

تھائی نے ریسپور اٹھا کر گیٹ ہاؤس کا نمبر لایا لیکن بڑی مایوسی ہوئی۔ اس گیٹ ہاؤس میں جاگتی اور پرساد کے نام سے یا ان دونوں کے ملنے جلتے پلیٹوں کے افراد نہیں ٹھہرے تھے۔ کل کی تاریخ میں بنگاک سے آنے والی ایک اڈیو عمر عورت اپنی چھ سالہ بیٹی کے ساتھ وہاں آکر ٹھہری تھی اور ظاہر ہے وہ جاگتی نہیں ہو سکتی تھی۔

ہم فون بوٹھ سے باہر آ گئے۔ اس وقت میرا دماغ بڑی طرح جکڑا رہا تھا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے چوراہے پر رک گئے۔ چوراہے کے وسط میں بہت بڑا کھاک ٹاور تھا جس کے چاروں طرف بڑے بڑے گھڑیاں لگے ہوئے تھے اور اس وقت آٹھ بج کر تیس منٹ ہو رہے تھے۔

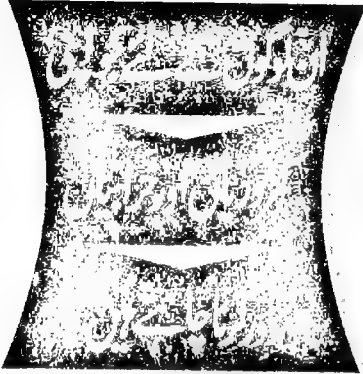
چوراہے پر بڑی بدوقت تھی۔ یہاں بھی سیاحت کا سینر تھا۔ دوسرے شہروں کے آئے ہوئے اور غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں سڑکوں پر کھومتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تھائی باشندے بھی ٹھل رہے تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو کسی نہ کسی کام سے بازار میں آئے تھے اور کچھ کھل آنکھیں سینکے کے لیے ادر اور ادر ٹھل رہے تھے۔ انہی لوگوں میں چوراہے اٹھائی گیرے اور ریزن بھی تھے جو شکار کی تلاش میں تھے۔

”چلو۔ توڑی دیر وہاں بیٹھے ہیں۔“ تھائی نے ایک کافی شاپ کی طرف اشارہ کیا ”دماغ ٹھوم رہا ہے۔ ایک کپ کافی پینے کو دل چاہ رہا ہے۔“

دماغ تو میرا بھی ٹھوم رہا تھا اور واقعی اس وقت کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ کافی ہاؤس قدرے پرسکون تھا۔ ہم کارنر کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ویٹریس فوراً ہی ہمارے سر پہنچ گئی۔ تھائی نے بلیک کافی کا آرڈر دے دیا۔ چند منٹ بعد ہی ویٹریس کافی لے کر آئی۔ اس لڑکی کی عمر چند سولہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ رنگت اگرچہ سانولی تھی لیکن چہرے کے نقش اور جسم کی ساخت میں بے پناہ کشش تھی۔ اس نے کافی ہاؤس کا مخصوص ڈریس پہن رکھا تھا اور لباس ایسا تھا کہ نظریں بے اختیار اس کی طرف کھینچ چلی جاتی تھیں۔ میرے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے وہ کسی قدر جھک گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مٹی خیر مسکرا ہٹ آئی تھی۔

”کچھ! دیکھیں! چاہے سر!“۔ یہ سہی خانی بوسہ پڑی۔ ”اور کچھ نہیں چاہیے۔ چل بھاگ یہاں سے۔“ اس کے لیے میں حتی حتی یوں کہ اس نے ویٹریس کی حرکت نوٹ کر لی تھی۔ ویٹریس نے مسکرا کر تھائی کی طرف دیکھا اور خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ ہم جس میز پر بیٹھے تھے اس کے ساتھ ہی بہت

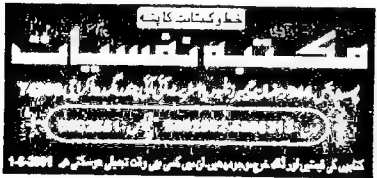
# ذاتی ہیپیٹائٹرم



قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے



کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ  
پیشگی سی آر ڈی وارنٹ مال کریں



kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

سے ہماری ہوئی بوش ایڈیل دی تھی۔ تیزاب جہرے کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ٹھوڑی دوا میں طرف سے ذرا جھلی تھی البتہ اپنے کانچے حصہ اور پیٹ بڑی طرح جھلسا تھا۔ اس واقعے کے بعد بھی رنگولی کو کئی روز اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

اسپتال سے نکل کر رنگولی ایک بار پھر دوسری ٹھوکریں کھانے لگی۔ یہ شہر جہاں اس نے بہت عرصے تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی تھی اس کے لیے اب بھی بن گیا تھا۔ وہ لوگ جو اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھ کر ہی غصے کے سانس بھرا کرتے تھے اب اس کے سامنے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ لوگ ٹانگیر سے ڈرتے تھے۔ اس ٹانٹ کلب کا حشر وہ دیکھ چکے تھے اس لیے اب کوئی بھی رنگولی کو مل لگانے کو تیار نہیں تھا۔

رنگولی کو ایک وقت کی روٹی کے بھی لالے پرچھے اس کی حالت بھاریوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ وہ اس شہر سے نکلنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس تو ایک وقت کی روٹی کھانے کے لیے پیسے نہیں تھے، کس جانے کے لیے کرایہ کہاں سے لاتی؟

اور پھر ایک روز رنگولی کی ملاقات کھوٹا ناٹ ایک اوجڑ عمر آدمی سے ہو گئی۔ وہ بہت بھرا اور بھاری بھر کم آدمی تھا۔ پیسے کے لحاظ سے وہ اسٹریٹ بڑا کر تھا۔ کاروبار اچھا ہوتا تو پیش کرتا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتا۔ بڑھیا شراب پیتا کوئی نہ کوئی حسین کال گرل بھی اس کی بھل میں ہوتی۔ کاروبار مند ہوتا تو شہر اپنے کے لیے بھی لوگوں سے چند بھات اوجھار نکالتا نظر آتا۔ ویسے عمومی طور پر وہ مندی ہی کا شکار رہتا تھا۔ تقریباً دو سال پہلے اس کے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں اور ٹانٹ کلبوں میں آتا جاتا تھا۔ انہی دنوں اس نے کئی مرتبہ رنگولی کو پر غارم کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا دل چلا کرتا تھا لیکن رنگولی اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔

اور پھر اس رات کھوٹا ناٹ نے رنگولی کو ایک قہر کا اس رہنمائی میں بیٹھ جانے پڑے ہوئے دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ اسے رنگولی کی یہ حالت دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ بے تعلقی سے رنگولی کی میز پر بیٹھ گیا۔ ان دنوں کھوٹا ناٹ کی مالی حالت بھی بہت ڈگر ہو گئی تھی۔ بس اسی قسم کے رہنمائیوں میں آمدورفت تھی جہاں کم سے کم پیسوں میں ہیٹ بھرا جاسکے۔

دو سال پہلے وہ بڑے بڑے ٹانٹ کلبوں میں رنگولی کو دوری سے دیکھ کر غصے کے سانس بھرا کرتا تھا لیکن اس وقت اس سے بے غلغہ ہوئے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے رنگولی کے جہرے میں صرف ایک تبدیلی دیکھی تھی۔ ٹھوڑی پر گہری براؤن رنگ کا داغ جو تیزاب کی وجہ سے پڑا تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ انہی گہری براؤن میں ہیٹ بھرا تھا۔

کھوٹا ناٹ نے رنگولی کو اپنے ساتھ ملنے کی پیشکش کی تو رنگولی نے ہلچل اس پیشکش کو قبول کر لیا اور کھوٹا ناٹ کے ساتھ اس کے

سے ایک تنگ بھی نہیں اٹھانے دیا گیا۔

شہر کی خبروں پر قاصر جمہ زدن میں قلاش ہو گئی تھی۔ وہ بڑے بڑے لوگ جو اس کے ایک اشارے پر اس کے قدموں پر دولت کے ڈھیر لگانے کو تیار تھے اس کے سامنے سے بھی دور بھاگتے لگے۔ وہ سب جانتے تھے کہ ٹانگیر اس سے ناراض ہو گیا ہے اور کوئی بھی شخص رنگولی کی مدد کرے گا ٹانگیر جیسے خطرناک آدمی کی دشمنی منال لینا پسند نہیں کر سکتا تھا۔

دو تین روز تک رنگولی دہر دہر پھرتی رہی اور بالآخر اسے شہر کے سب سے گھٹیا علاقے میں واقع ایک گھٹیا سے ٹانٹ کلب میں پروگرام مل گیا۔ اس ٹانٹ کلب میں نچلے طبقے کے لوگ ہی آتے تھے جن میں زیادہ تعداد غنڈوں اور بدعاشوں کی ہوتی تھی۔ کوئی راقصہ یہاں چند روز سے زیادہ نہیں ملتی تھی۔ رقص کے دوران میں بعض لوگ اسے پر آجاتے اور راقصہ کے ساتھ جھیز جھاز شروع کر دیتے۔ یہاں لڑکیوں کی بالنگ بھی ہوتی تھی اور ان پروگراموں میں بھی لڑبازی ہوتی رہتی تھی۔

اس ٹانٹ کلب میں رنگولی کا پہلے دن کا پروگرام اس کے لیے بڑا سستی خیر تجربہ ثابت ہوا تھا۔ شراب کے نشے میں دھند ہو آدی اسے پر چڑھ آئے تھے اور اسے اٹھا کر ہال میں لے گئے تھے۔ وہ بیروں کے درمیان پکراتی رہی۔ کوئی اسے چکی کا ٹافٹ کوئی بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا اور کوئی اسے گرفت میں لے کر کس کرنے کی کوشش کرتا۔

رنگولی یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ برداشت نہ کرتی تو دو وقت کی روٹی کے لیے پیسے کہاں سے ملنے۔ اگلی شب وہ پھر اسی کلب میں آئی تھی۔ لڑکیوں کی بالنگ کا پروگرام ختم ہوا تو ٹانگیر نے بچے کے قریب ایک اور راقصہ پہلے اسے پر اور پھر بیروں کے درمیان حرکت کئے ہوئے اپنے جسم کی نمائش کرنے لگی۔ اس کے بعد رنگولی کی باری تھی اور جب اس کا پروگرام شروع ہوا تو لڑبازی شروع ہو گئی۔ مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے چند غنڈوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ لگتا جیسے یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہو رہا ہو۔ میزوں اور کرسیاں الٹی جانے لگیں۔ کچھ قماشائیوں نے ان غنڈوں کو روکنا چاہا تو اچھا خاصا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ مار پیٹ میں فریج اور کرا کر کسی ٹونے کی آوازیں نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ چند غنڈے اسے پر آگئے۔ اسے بچنے کے لیے پھاڑ دے گئے۔ رنگولی نے خوف زدہ ہو کر بھاگنا چاہا تو کئی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ ہال میں ہنگامہ زوروں پر تھا۔ توڑ پھوڑ وری تھی اور پھر اچانک تاریکی چھا گئی۔ اسے ساتھ ہی رنگولی کی خوف ناک جج بھی سنائی دی تھی اور پھر وہ جھپٹی چلی گئی۔ تاریکی میں کسی نے رنگولی پر تیزاب پھینک دیا تھا۔

یہ سب کچھ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوا تھا۔ جب کلب کا مین سوچ آف کیا گیا تو اندھرا ہوتے ہی کسی نے رنگولی پر تیزاب

براڈ کاسٹ لگا ہوا تھا جس سے باہر کا منظر بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ کافی کی چکیاں لپٹے ہوئے میں اور تھائی مسلسل باہر ہی دیکھ رہے تھے۔ ایک موقع پر جبکہ میں تھائی کی طرف جھک کر کوئی بات کر رہا تھا، تھائی نے میرا ہاتھ دبا کر آٹھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گردن جھکا کر اس طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔

رنگولی کے بارے میں مختصر کچھ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ ایک راقصہ تھی اور ٹانگیر کی منظور نظر اور چینی بھی جاتی تھی۔ جن دنوں ٹانگیر سے میری نسل چل رہی تھی ان دنوں رنگولی کو اکثر ٹانگیر کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ وہ کلب نوٹی سکس اور اس جیسے بڑے کلبوں میں پروگرام کرتی تھی۔ یہ پروگرام اسے ٹانگیر کی وجہ سے ملنے تھے اور معاوضہ بھی دوسری اے کلاس راقصاؤں سے زیادہ ملتا تھا لیکن ٹانگیر کی میرے ہاتھوں موت سے تقریباً دو مہینے پہلے ٹانگیر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ اس رات وہ بچا ڈانز میوزک ہال، ڈسکو ٹھک میں پروگرام کرنے والی تھی۔ وہ اسے پر جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کا پروگرام شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے کہ ٹانگیر ڈسکو روم میں پہنچ گیا۔ وہ رنگولی کو اپنے ساتھ نہیں اور لے جانا چاہتا تھا مگر رنگولی نے انکار کر دیا۔ ٹانگیر اپنے کسی مطیع سے انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی زبردستی غلام سمجھتا تھا۔ رنگولی تو اس کی وجہ سے پیش کر رہی تھی۔ اس کے انکار پر ٹانگیر بھڑک اٹھا۔ رنگولی بھی برداشت نہیں کر سکی۔ اس نے کئی مرتبہ ٹانگیر کے سامنے زبان گھولی جس کا نتیجہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا کہ ٹانگیر نے کلب کے ڈسکو روم میں اسے دھک کر رکھ دیا۔ رنگولی کی چیخوں کی آواز سن کر کلب کا منیجر اور دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ رنگولی کو بڑی مشکل سے ٹانگیر کھینچنے سے چھڑا گیا لیکن اس وقت تک ٹانگیر اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر چکا تھا۔ اس کا بائیں طرف کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا اور ٹھوکروں اور گھونٹوں سے اسے کچھ اندرونی زخمیں بھی آئی تھیں۔

رنگولی کو کم از کم ایک ہفتہ اسپتال میں گزارنا پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی ہنگامہ میں راقصہ کی حیثیت سے اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔ اسپتال سے چھٹی ملنے پر جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچی تو وہاں کوئی اور حسینہ قابض تھی جس کے ساتھ وہ خطرناک صورتوں والے غنڈے بھی موجود تھے۔ رنگولی کو تو فلیٹ میں داخل ہونے یا کیا اور نہ ہی اسے اپنی ذاتی استعمال کی چیزیں اٹھانے کی اجازت دی گئی۔

شہر کے پوش علاقے میں یہ شان دار فلیٹ ٹانگیر نے اسے لے کر دیا تھا۔ اس کا سامان بھی بہت قیمتی تھا اور بہت سی قیمتی چیزیں تو رنگولی نے اپنے پیسوں سے خریدی تھیں لیکن اسے یہاں



دیا تھا کہ میں نے اس کی بات سن لی تھی۔

میں گیسٹ ہاؤس سے نکل کر بائیں طرف مڑ گیا اور تقریباً پچاس گز آگے جا کر ایک نیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ شام چھ بجے نوٹا کو بھیجی میں نے یہیں سے فون کیا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے بک پر منگا ہوا ریسپور اٹھایا۔ رنگلی نے اپنا جوفن نمبر تھا کی کو لکھ کر دیا تھا وہ میں نے بھی ایک نظر دیکھا تھا اور مجھے یاد ہو گیا تھا۔ میں نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف کھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسپو نہیں کی گئی۔ اچانک مجھے رنگلی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رات گیارہ بجے کے بعد گھر پر لے گئی۔ میں نے ریسپور بک پر لنگا دیا اور بوتھ سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گیسٹ ہاؤس کی طرف چلے گا۔

دس منٹ بعد میں اور تھا کی کرے سے نکل کر آفس والی نیل کے سامنے کوبے تھے تھا کی نے بیگ کدھر پر لنگا رکھا تھا۔ ”ہمیں والی ایم سی اے ہوٹل میں کرا ل گیا ہے۔ اس لیے ہم جا رہے ہیں۔“ میں نے اوڈیز عمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس عورت کے چہرے کے تاثرات بدل گئے جیسے اسے بڑی مایوسی ہوئی ہو۔ ”اگر تم لوگ چیک آؤت ہونا چاہتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن حساب تو مجھ ہی ہو سکتا ہے۔ کیشز ج آئے گی۔“ اس عورت نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں صبح آ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ اس اوڈیز عمر عورت نے رنجن کھول لیا۔ میں نے کمرانمبر والے خانے میں چیک آؤت ہونے کا وقت لکھا اور دستخط کر دیے۔ میں نے ایک ہفتے کا ایڈوانس کر دیا وہ تھا اور باقی رقم ملنے کی اب کوئی توقع نہیں تھی۔ باہر نکلے ہوئے میں نے سڑک دیکھا۔ وہ اوڈیز عمر عورت فون کا ریسپور اٹھائے پھر کوئی نمبر مل رہی تھی۔ گیسٹ ہاؤس سے نکلنے ہی تک تک مل گیا۔ میں نے ڈرائیور کو کلاک ٹاور چلنے کے لیے کہہ دیا۔ فوری طور پر یہی ایک نام میرے ذہن میں آ سکا تھا۔

کلاک ٹاور کے چوراہے پر تک تک سے اتر کر ہم پیدل ایک طرف چلے گئے تقریباً پچاس گز کا فاصلہ لے کر کے ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور کو سامت روڈ چلنے کو کہا۔ رنگلی نے بتایا تھا کہ اس طرف کوئی بہت بڑی مسجد ہے جس کے قریب ہی اس کا مکان ہے۔

سامت روڈ پر ایک مارکیٹ کے قریب میں نے ٹیکسی رکوا لی۔ بچے اتر کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور اوڈیز عمر دیکھنے لگا۔ اس وقت گیارہ بجے میں چند منٹ باقی تھے ہم ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ ہم باہر سے گزرنے

والوں کی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے۔ اس وقت ریسٹورنٹ میں بڑا زیادہ لوگ نہیں تھے۔ دیگر کوشیوں نے چائے کے لیے کہا تھا۔ صبح دیر بعد چائے آ گئی۔ بڑی ہی بڑا نقد چائے تھی۔ میں نے بک پر منگا ہونے کے بعد بک پر منگا ہوا اور اس کے بعد اسے اپنا نہیں لگایا تھا۔

”اچانک ہی گیسٹ ہاؤس چھوڑنے کی کوئی خاص وجہ ہو لیکن تم نے ابھی تک کچھ بتایا نہیں۔“ تھا کی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی ایک گھنٹہ بھر کے بعد کپ بک پر منگا ہوا تھا۔ چائے اسے بھی پسند نہیں آئی تھی۔

”میں لوگوں کو شاید ہمارے ٹھکانے کا پتا چل گیا تھا اور گریٹر ہاؤس کی وہ اوڈیز عمر عورت ہمیں پھنسانے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔“ میں نے کہا اور پھر تفصیل سے اسے ساری بات بتانے لگا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں ان میں سے کوئی گیسٹ ہاؤس آیا تھا اور ہمارے کمرے اور بیگ کی تلاش کر لی تھی۔“ تھا کی نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کا کوئی آدمی گیسٹ ہاؤس کی عمرانی کر رہا ہو۔“ تھا کی نے کہا۔

”شاید میں ہی ان سے غلطی ہو گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”خیال میرے ذہن میں بھی تھا سی لے پہلے میں نے کلاک ٹاور کی رخ کیا تھا۔ اس کے بعد اس طرف آئے ہیں۔ میں نے قاتل کا خیال رکھا تھا۔ کسی مشتبہ شخص یا گاڑی کو اپنے قاتل میں نہیں دیکھا۔“

”تم نے غالباً رنگلی کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے کیا اس پر اس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے؟“ تھا کی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں نے اسے پچانے میں غلطی نہیں کی۔ وہ پیڑو دنیو سے شاید غرت کرتی ہے اور ان لوگوں سے اپنی ذلت و روپادی کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ ہم اس صورت حال سے قانع اٹھا سکتے ہیں اور میرا خیال ہے اس کے ذریعے ہمیں جاگتی اور پرساد کی تلاش میں بھی مدد ملے گی۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ تھا کی نے کہا۔ ”عورت جب انتقام کی آگ میں جلتی ہے تو بالکل اندھی ہو جاتی ہے اور پھر کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

”سو گیارہ بج رہے ہیں۔“ میں نے کاؤنٹر کے اوپر دباؤ دیا۔ ”آؤ براں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“ رنگلی نے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے کے بعد گھر پر لے گئی۔ تم تمیں بیٹھو۔ میں باہر بیگ بوتھ سے فون کر کے آتا ہوں۔“ میں اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ چند گز آگے دائیں

طرف چلے پھر تھا اور اس وقت خالی ہی تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر بک پر منگا ہوا ریسپور اٹھایا اور مطلوبہ نمبر کے ڈال کر نمبر ملانے لگا۔ دوسری کھنٹی پر کال ریسپو کی گئی۔ تقریباً تین گھنٹے پہلے رنگلی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی آواز بھی پہلی مرتبہ سنی تھی اور اس وقت فون پر اس کی آواز شناخت کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ رنگلی نے بھی میری آواز پہچان لی۔ چند دہری جملوں کے تبادلے کے بعد میں اصل موضوع پر آ گیا۔

”ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے رنگلی۔“ ”میں شل ہاں!۔“ وہ بولی ”چند گھنٹے پہلے اگرچہ ہم زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے لیکن میں تم سے بے حد متاثر ہوئی ہوں۔“ ”کوئی تمہارے لیے کیا کر سکتی ہو؟“

”میں تو تفصیل نہیں بتا سکتا۔ ہمیں وقتی طور پر کسی ایسی جگہ کی ضرورت ہے جہاں ہم دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکیں۔“ ”میں سوچا کہ شاید تم ایسا ایسا بندوبست کر سکو۔“ میں نے کہا۔

”میں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔“ رنگلی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”اے جیٹ ہاؤس کا نام بتاؤ۔ تم تھوڑی دیر میں تم لوگوں کو لینے کے لیے بھیج جاؤں گی۔“

”ہم گیسٹ ہاؤس چھوڑ چکے ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور بوتھ کے پیسے سے باہر ریسٹورنٹ کے سامنے بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے پولا مسجد سے ڈرا آگے مارکیٹ کے باہر کی طرف ایک ریسٹورنٹ سے ہم اس وقت یہاں موجود ہیں۔“ میں نے ریسٹورنٹ کا نام بھی بتا دیا۔

”اوہ۔“ رنگلی نے کہا ”مارکیٹ میرے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“ ”ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے ریسپور رکھ دیا اور بوتھ سے باہر آ گیا۔

”کیا ہو؟“ تھا کی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ ”وہ پانچ منٹ میں یہاں پہنچ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا اور دھڑک دھڑک کر کھانے کا بل ادا کر دیا۔ دونوں کپ دیے ہی بھرے ہوئے رکے تھے۔ دھڑکے دھڑکے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کپ اٹھالنے کا اشارہ کیا۔

سات آٹھ منٹ بعد نیلے رنگ کی ایک کار ریسٹورنٹ کے سامنے رکی۔ میں نے ڈرائیور تک سیٹ پر رنگلی کو کھینچ لیا۔ وہ تجسس نگاہوں سے اوڈیز عمر دیکھ رہی تھی۔ میں نے تھا کی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر رنگلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ہمیں کار کی طرف آنے دیکھ کر اس نے پچھانست کا۔ روانہ کھول دیا۔ ”دیکھ! رنگلی نے مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور

ہمارے پیچھے ہی گاڑی آگے بڑھادی۔

”ہم چند روز تمہارے پاس رہیں گے۔ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی پرالیم تو نہیں ہوگی رنگلی؟“ میں نے اپنی سیٹ پر قدمے آگے جھٹکے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں باپ۔“ رنگلی نے جواب دیا ”تم لوگوں کے ہوتے ہوئے مجھے کیا پرالیم پیش آ سکتی ہے۔“ ”تھینک یو رنگلی۔“ میں نے کہا۔

کار ایک بار ایسی مسجد کے سامنے سے گزری۔ تھا کی لینڈ میں پہلی مرتبہ میں نے کوئی مسجد دیکھی تھی اور اس میں شہ نہیں کہ وہ بہت خوب صورت مسجد تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ چنانچہ رائے میں تھا کی مسلمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں چینی اور بری مسلمان بھی آباد تھے۔ انڈین اور پاکستانی مسلمان بھی ایک مستقل تعداد میں یہاں رہائش پذیر تھے۔ ان میں کچھ برٹس سے وابستہ تھے اور کچھ ملازمت پیش تھے۔ یہ مسجد ان تمام مسلمانوں نے مل کر بنائی تھی۔ یوں تو پانچوں نمازوں کے وقت یہاں نمازیوں کی ایک مستقل تعداد ہوتی تھی لیکن مجھے کی نماز کے وقت تو شہر کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمان بھی یہاں جمع ہوتے تھے۔

کار مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک کٹھادہ گلی میں رک گئی۔ رنگلی نے کار کا انجن چلتا چھوڑ دیا اور نیچے اتر کر گیسٹ کھول دیا اور دوبارہ کار میں بیٹھ گئی۔

پچھلے دو کاریں کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ ایک طرف مختصر سائش گرین لان بھی تھا۔ برآمدے کی بی بی جلی میں تھی جس کی روشنی میں لان کے بعض پودوں کے پتے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ رنگلی ہمیں اندر لے گئی۔ تین بیڑ روز تھے۔ ایک ڈرائیوگ دوم اور مختصر سالانچ بھی تھا۔ تھا کی نے بیگ کدھر سے لے کر ایک لاؤنج میں ایک صوفے پر رکھ دیا۔ رنگلی ہمیں کھوم پھر کر مکان دکھائی دی۔ دو کمروں میں تو بیڑو دنیو لگے ہوئے تھے۔ تیسرا بالکل خالی تھا۔ ڈرائیوگ دوم اور لاؤنج کا فرنیچر بھی اوسط درجے کا تھا جس سے رنگلی کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ آخر میں ہم لاؤنج میں آ گئے۔

”تم لوگ بیٹھو۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔“ رنگلی کہتے ہوئے کچن میں کھس گئی۔

کافی تیار کرنے میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ایک ایک کپ اس نے ہمارے سامنے رکھ دیا اور تیسرا خود سنبھال کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

رنگلی اگرچہ ہمارے یہاں آنے کی وجہ اور صورت حال کو کسی حد تک سمجھ رہی تھی لیکن وہ شاید خطر بھی کہ ہم خود کوئی بات شروع کریں۔

”تم نے اندازہ لگایا ہو گا کہ ہم گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر یہاں کیوں آئے ہیں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے رنگولی کی طرف دیکھا۔  
 ”لیس ماسٹر“ رنگولی نے کہا ”کلاک اور والے ریسٹورنٹ میں باتوں کے دوران میں ہی میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم لوگوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر یوں ”چند روز پہلے میں نے یہاں جی فانگ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک روز فوتیا سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دی تھی۔ کل پر ساد اور جاگی نظر آئے تھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں کوئی گزربو شروع ہونے والی ہے اور آج جب تم لوگوں سے ملاقات ہوئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ۔۔۔“  
 ”گزربو شروع ہو چکی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہ۔“ رنگولی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
 ”جاگی اور پر ساد کل یہاں آگئے تھے۔ ہم آج صبح پہنچے ہیں۔ شام چھ بجے میں نے فوتیا کو فون کیا تو وہ دونوں بھی وہاں موجود تھے اور آدھے گھنٹے بعد جب ہم وہاں پہنچے تو۔۔۔“ میں کہتے کہتے رک گیا۔  
 ”تو کیا ہوا ماسٹر؟“ رنگولی نے سوالیہ لہجہ میں میری طرف دیکھا۔

”فوتیا کو قتل کر دیا گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”کیا۔۔۔؟“ رنگولی اچھل پڑی۔  
 میں اسے تفصیل بتانے لگا۔ میں آخر میں بتا رہا تھا ”فوتیا میں کچھ جان بانی تھی۔ مرے سے پہلے اس نے جی فانگ کا کام بتا دیا تھا لیکن جاگی اور پر ساد کے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے ہی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ شبہ تھا کہ جاگی اور پر ساد بھی جی فانگ وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ ہم فوتیا کے مکان کو چیک کر رہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔ ہم یوں مشکل میں وہاں سے نکلے میں کامیاب ہو سکے تھے اور اتفاق سے کلاک اور پر ساد سے ہماری ملاقات ہوئی۔ تم نے بتایا تھا کہ تم نے ہم سے ملاقات سے پہلے جاگی اور پر ساد کو دیکھا تھا یہ کس وقت کی بات ہے؟“

”تقریباً ساڑھے سات بجے۔“ رنگولی نے جواب دیا ”میں اس وقت منگرا سے مہارت یکم کی طرف سے آ رہی تھی۔ ان کی ٹیکسی میرے بالکل سامنے سے گزری تھی اور اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ وہ دونوں کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ ٹیکسی کا پیچھا کر کے ان سے ملاقات کروں لیکن مجھے کلاک اور پر ساد کی طرف ایک بہت ضروری کام تھا۔ میں نے سوچا یہ شہزادہ بڑا تو نہیں ہے۔ ایک دو روز میں کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائے گی۔“

”اب میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ وہ دونوں محفوظ ہیں۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”لیکن تم سے ملاقات کے بعد جب ہم گیسٹ ہاؤس پہنچے تو یہ انکشاف ہوا کہ کمرے میں ہمارے

ایک کی تلاش لی گئی تھی اور پھر کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی عورت پر مجھ کو شبہ ہو گیا تھا۔ وہ فون پر کسی کو بتا رہی تھی کہ ہم دونوں آگئے ہیں۔ اس کے تھوڑی سی دیر بعد ہم نے وہ گیسٹ ہاؤس چھوڑ دیا۔“  
 ”بہت اچھا کیا ماسٹر۔“ رنگولی نے کہا ”میں ان فی الحال تم پر کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی وقت ایسی صورت حال ہو جائے تو رنگولی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گی بلکہ جی تو یہ ہے کہ تم لوگوں کے مل جانے سے مجھے برا حوصلہ ملا ہے۔ میری زندگی کسی بڑی خواہش تھی کہ میں ان لوگوں سے اپنی بربادی کا انتقام سکوں۔ اب شاید مجھے موقع مل جائے۔“  
 ”تمہیں ایسا موقع ضرور ملے گا۔“ میں نے کہا ”لیکن ہائیڈر سے تمہارا بھگڑا اس بات پر ہوا تھا؟“

”ہمارے بھگڑنے کی وجہ بھی اس کا ایک اوجاں دوست دارا تھا۔“ رنگولی نے بتایا ”میں اس رات کلب میں پروگرام پیش کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی تھی کہ ٹائگر آیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں وہ رات اس کے دوست دارا کے ساتھ بسر کروں۔ میں نے انکار کر دیا جس پر وہ بھڑک گیا اور میری پٹائی شروع کر دی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اپنی دو بھری آپ جینی سانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی ”ٹائگر کی مخالفت کی وجہ سے مجھے کیس کام نہیں مل رہا تھا۔ میں ناٹ شیز تک کو محتاج ہو گئی اور پھر ایک نہایت ہی گھٹیا سے کلب میں مجھے پروگرام مل گیا لیکن دوسرے ہی روز ٹائگر کے غنڈوں نے ہنگامہ کر دیا اور کلب میں توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ اسی دوران میں میں سوچ سوچ کر دیا گیا اور اندھیرے میں کسی نے میرے اوپر تیراب کی بوتل انڈیل دی۔ ٹائگر نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ میرا حسن عمارت کر کے مجھے سڑکوں پر بھینک گئے۔ مجبور کر دینا چاہتا تھا اور ان دنوں میری حالت واقعی بھکانیوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ ایک شرابی مجھے سہارا نہ دیتا تو میں واقعی ایک مانگنے پر مجبور ہو جاتی۔ وہ شرابی بھی مال غنیمت سمجھ کر پورے ایک ہفتے تک مجھے روغنا رہا اور بالآخر ایک روز مجھے وہاں سے بھانکے کا موقع مل گیا۔ اس دوران میں ایک روز مجھے یہ بھی بتا چل گیا تھا کہ ٹائگر تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس کی موت کی خبر سن کر مجھے جس قدر خوش ہوئی تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔“

”میں بھانک سے نکل کر شہر پر پھرتی رہی اور بالآخر کچھ عرصہ پہلے یہاں آئی۔“ شہر میرے لیے انجی تھا۔ یہاں کے لوگ انجی تھے لیکن یہاں کے لوگوں سے مجھے ہمدردی ملی۔ مجھے ہاک ریسٹورنٹ میں رقص کا پروگرام مل گیا جہاں میری ملاقات ایک قبائلی سردار سے ہو گئی۔ اس نے مجھے ایک اور بڑے ہوٹل میں پروگرام دلایا۔ وہ میری مانی مدد بھی کرتا رہا۔ میں نے یہ مکان رائے پر لے لیا۔ میری زندگی میں کسی قدر ٹھنڈا ہوا تھا لیکن چند روز پہلے جی فانگ کو دیکھا تو میری چھٹی جس نے خطرے کی گھنٹی بجائی

مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کوئی گزربو شروع ہونے والی ہے اور اس وقت کرنے میں بہترین خدمات کی تصدیق کر دی ہے۔ فوتیا بہت اچھی لڑکی تھی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد دکھ ہوا ہے۔“  
 ”متم ہائیڈر جیسے ہڈی کے نمائندوں کی آواز کا رنی رہی ہو۔“  
 ہمارے ساتھ جو شخص ہوا اس کے بعد ہمساری آنکھیں میل جانی چاہئیں۔ اپنی ذہین اور بربادی کا انتقام اپنی جگہ۔ لیکن ہمیں تو اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ برائی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کر دی۔“  
 ”رنگولی خاموش بیٹھی میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے کے اثرات برسرِ تبدل ہو رہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میری باتیں اس کے دل پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ میں خاموش ہوا تو وہ فوراً ہی بول پڑی۔

”ہمساری باتوں سے واقعی میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں ان لوگوں سے واقعی صرف اور صرف اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہتی تھی لیکن میں اپنی تھی۔ کمزور تھی۔ اپنے اندر حوصلہ نہیں پاری تھی۔ حوصلہ ہوا تو ان لوگوں کو چپا کر رائے میں دیکھنے کے بعد کچھ نہ کچھ کر گزری ہوئی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی لیکن تمہاری باتوں نے میرے اندر پہلی سی عیاری ہے۔ اب میں نہ تو اپنے آپ کو اکیلی سمجھتی ہوں اور نہ کمزور۔ میرے اندر ایک نیا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔ اب تو میں کسی بڑی سے بڑی قوت سے بھی گراؤنے کی بہت رکھتی ہوں۔ یوں۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہے ماسٹر؟“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ہلک انہری تھی اور چوتھمٹانے لگا تھا۔

”ٹھنڈ۔“ میں نے مسکراتی ہوئی گتوں سے اس کی طرف دیکھا ”ہندے اور حوصلے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اندھے کو نہیں میں چھٹاک لگا دی جائے۔ میرا معاملے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر یوں ”یہ تو ہمیں بتا چل گیا ہے کہ فوتیا کو کچی فانگ اور اس کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے اور ہمارے بیان کے مطابق قتل کی اس واردات کے تقریباً ایک گھنٹے بعد تم نے جاگی اور پر ساد کو بھی دیکھا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں محفوظ ہیں۔ اب سب سے پہلے ہمیں جاگی اور پر ساد کا سراغ لگانا ہے اور اس کے بعد دارا اور جی فانگ وغیرہ کی سرگرمیاں پر نگاہ رکھنی ہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ قیتا تمہیں بتائے ہوں گے۔“

”ممت ابھی طرح۔“ رنگولی نے جواب دیا ”مجھ پر وہ قیامت دار ای کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ ہو سکتا ہے دارا کے دل میں اب بھی میرے لیے خواہش ہو۔“

”ایسے لوگوں کی ہوس کبھی نہیں ٹپتی۔“ میں نے کہا ”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن دارا وغیرہ کے گرد کوئی جال بچانے سے پہلے ہمیں جاگی اور پر ساد کو تلاش کرنا ہے۔ ان لوگوں

کے مل جانے کے بعد ہی ہم کوئی اور منصوبہ بنائیں گے۔ دیے آج کل تم کیا کر رہی ہو؟“

”میں ہفتے میں چار پروگرام کرتی ہوں۔ ایک روم کاک ریسٹورنٹ کے میوزیکل ہال میں اور تین دوسرے کلبوں میں جن میں گولڈن ٹرائی اینجل ٹانٹ کلب بھی شامل ہے۔ یہاں میرا پروگرام منڈے ٹانٹ کو ہوتا ہے۔“  
 ”وہ آؤی کون ہے جس نے جس کی ٹانٹ کلب میں پروگرام دلایا ہے۔“ اسی نے تمہیں بتایا تھا نا کہ۔۔۔“

”تھالوب۔“ رنگولی نے مسکراتے ہوئے کہا ”وہ تھالی لینڈ اور براہی سرحد پر آباد کیرن قبیلے کے سردار کا بیٹا ہے۔ یہ قبیلہ صدیوں سے سرحدی قبضے مانے سائے اور اس کے قرب و جوار کی پہاڑیوں میں آباد ہے۔ تھالی لینڈ کا یہ شالی خطہ زیادہ تر پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ راستے نہایت دشوار گزار اور خطرناک ہیں۔ پہاڑیوں میں درختوں قبیلے آباد ہیں جن میں میو، یاد کیرن، ایکولا، یو لیر قبیلے قابل ذکر ہیں۔ کیرن اور میو قبیلوں کو سب سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو چھوٹی چھوٹی قبائلی قبائلیان ان خطرناک پہاڑیوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن بعض قبیلوں نے کسی نہ کسی ایک مقام کو اپنا گیارہ گوار بھی بنا رکھا ہے۔ اسے سائے کیرن قبیلے کا گیارہ گوار ہے۔ عرصہ پہلے یہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی ہوا کرتی تھی لیکن اب اسے ایک ترقی یافتہ قصبے کا درجہ حاصل ہے۔ یوں تو ان پہاڑیوں میں آباد بیشتر قبیلے جدید تہذیب سے قطعی نا آشنا ہیں۔ بہت سے قبیلے تو ایسے ہیں جو اب بھی غاروں اور پتھر کے دور کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن بعض قبیلے ایسے ہیں جو جدید تہذیب اور علم کی روشنی سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ کیرن قبیلے کا شمار بھی ایسے ہی ترقی یافتہ قبیلوں میں ہوتا ہے۔ اس قبیلے کی ترقی میں موجودہ سردار نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ تھالوب اس سردار کا اکلوتا بیٹا ہے جس نے چپانگ مانے یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور گزشتہ دو تین برسوں سے چپانگ رائے میں رہائش پذیر ہے۔ یہاں بعض کا دیہاتی کہیں میں اس کے باپ کے شہر باز ہیں۔ وہ ان کہیں کے کا دیہاتی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ منے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ گولڈن ٹرائی اینجل ہوٹل اور ٹانٹ کلب میں بھی اس کا شہر ضرورت بھی نہیں سمجھی۔

## مفرد

[6] حصہ (کمل)

قیمت فی حصہ 60 روپے ڈاک ٹیبل حصہ 23 روپے





”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”تمہارے ہاں اخبار نہیں آتا۔ اگر زحمت نہ ہو تو ریکٹ سے کوئی اخبار لا کر دے جاؤ۔“  
 رنگولی اپنی گاڑی پر چل گئی۔ جانے سے پہلے اس نے تھائی کو کہی کے بارے میں سمجھا دیا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اخبار بھی دے گئی تھی۔ اخبار کے صفحوں پر نمایاں سرخی کے ساتھ فوٹا کے قتل کی خبر چھپی تھی۔ اس کی لاش کے علاوہ باکس میں اس کا ایک پورٹریٹ بھی تھا۔ یہ تصویر گزشتہ رات میں نے کانچ کے ایک کمرے میں کارنس پر فریم میں لگی دیکھی تھی۔

اخبار کی اطلاع کے مطابق فوٹا کنڈی کلب میں واقعہ تھی۔ وہ کافی عرصہ غائب رہنے کے بعد چند ہفتے پہلے چینگ رائے واپس آئی تھی اور اسے کنڈی کلب میں کام مل گیا۔ گزشتہ رات بھی کلب میں اس کا پروگرام تھا لیکن اس نے شام ہی کو ٹیلی فون پر کلب کی انتظامیہ کو مطلع کر دیا تھا کہ بنگاک سے اس کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اس لیے آج وہ کلب نہیں آئے گی۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق کسی گمنام شخص نے اطلاع دی تھی کہ اس کانچ میں ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے۔ پولیس عام طور پر گمنام کاٹز پر کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ لیکن چند منٹ بعد اسی گمنام شخص نے پولیس کو دوبارہ فون کیا تو ایک چوڑنگ کار اس طرف روانہ کر دی گئی اور اس طرح فوٹا کے قتل کا انکشاف ہوا۔ اسے سینے میں خنجر مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ابھی تک نہ تو قتل کی وجہ معلوم ہو سکی تھی اور نہ ہی قاتل یا قاتلوں کا سراغ ملا تھا۔ پولیس کو مقتول کے ان مہمانوں کی بھی تلاش تھی جن کے بارے میں فوٹا نے کنڈی کلب کو بھی اطلاع دی تھی۔

فوٹا کے بارے میں چھوٹی چھوٹی خبروں کی صورت میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ کنڈی کلب کے منیجر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ فوٹا چند عرصہ پہلے کلب کی ملازمت چھوڑ کر بہتر مستقبل کی تلاش میں شاٹنگ ٹائی ایک شخص کے ساتھ بنگاک چلی گئی تھی جہاں تاہنگ اور پیڈرو جیسے دو معاشوں کے حوالے سے ہنگاموں میں بھی اچھی رہی اور بالآخر چند ہفتے پہلے چینگ رائے واپس آگئی۔ چند روز پہلے شاٹنگ ٹائی اس شخص کو خنجر بوری میں گولیوں سے چھللی کر دیا گیا جو فوٹا کو چینگ رائے سے بنگاک لے گیا تھا۔ شاٹنگ ڈرگ افافا کے ایک بہت بڑے ریکٹ کا سرگرم رکن تھا۔ باکس میں ایک اور چھوٹی خبر یہ تھی کہ بنگاک میں قیام کے دوران میں فوٹا ’مہاراج اور وجدان کے پاس بھی رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور باکس ’پڑا سراف شخصیت‘ کے عنوان سے میرے بارے میں بھی مختصر سا چپا ہوا تھا۔ یہ مختصری خبر بڑے تضادات کی حامل تھی۔ ایک طرف مجھے فرشتہ ثابت کیا گیا تھا جو برائیوں کے خلاف برسرِ کار تھا اور دوسری طرف مجھے دنیا کا خطرناک ترین آدمی ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اخبار فاکنگ یا دارا وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ البتہ ’پڑا سراف‘ مہمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ پولیس سے رابطہ تاکہ قاتل کا سراغ لگانے میں مدد مل سکے۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھائی میرے چہرے پر تاثرات نہایت سی ہو رہی تھی۔ ’رنگولی کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔‘ تھائی اتار چھاؤ سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اخبار اس کی طرف بڑھا دیا اور خود وہاں سے اٹھ کر باہر نکلی۔ ’جوتے بند۔‘ رنگولی گھر میں نہیں ہے۔ ہمیں کال ریسیو کرنے کی ضرورت ہے۔‘ میں نے کہا۔

’بوسکا ہے رنگولی سی فون کر رہی ہو اور کوئی اہم اطلاع دینا۔‘ تھائی نے کہا۔ ’اس میں شبہ نہیں کہ اخبار نے رات ہی رات میں مواد جمع کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے لیکن ان خبروں سے نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔‘ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت مدنی سی نظر لگائی تھی کہ کوئی کال ریسیو کی جائے یا نہیں لیکن ممکن ’ایک عام آدمی کے لیے نتیجہ اخذ کرنا واقعی بہت مشکل ہے۔‘ لیکن ہم تم سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ فوٹا نے فون رکھنے کے قریب ساؤنڈ نیبل پر رکھا ہوا تھا۔ قاتل کون ہے۔ ہمیں ان باتوں میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جن کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ ’شاٹنگ‘ تھائی نے سوال کیا کہ وہاں سے میری طرف دیکھا۔ ’شاٹنگ‘ یہ کہ فوٹا بنگاک میں ہونے والے کچھ ہنگاموں سے ملوث رہی ہے اور وہ ’مہاراج اور میرے ساتھ بھی رہی ہے۔‘ میں نے جواب دیا۔ ’اس کی تردید تو واقعی نہیں کی جاسکتی لیکن تمہاری باتیں سنا کر ہمارا دل چل گیا ہے۔ لیکن تمہارے لیے ایک اور اہم اطلاع بھی ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔‘ تھائی بولی۔

’وہ کیا؟‘ میں نے پوچھا۔ ’کیوں نہ گمنام کال کے ذریعے پولیس کو فوٹا کے قتل کی اطلاع دی جائے؟‘ تھائی نے کہا۔ ’میں نے پوچھا۔ ’کیوں نہ گمنام کال کے ذریعے پولیس کو فوٹا کے قتل کے الزام میں گرفتار کی اور ہمیں بھی ان سے سننے میں آسانی رہے گی۔‘ جب طرف سے گھر جائیں گے تو یقیناً بدحواس ہو جائیں گے۔‘ تھائی نے کہا۔

’وہ کیا؟‘ میں نے پوچھا۔ ان دونوں کے مل جانے پر میں نے ’کیوں نہ گمنام کال کے ذریعے پولیس کو فوٹا کے قتل کے الزام میں گرفتار کی اور ہمیں بھی ان سے سننے میں آسانی رہے گی۔‘ جب طرف سے گھر جائیں گے تو یقیناً بدحواس ہو جائیں گے۔‘ تھائی نے کہا۔

’وہ کیا؟‘ میں نے پوچھا۔ ان دونوں کے مل جانے پر میں نے ’کیوں نہ گمنام کال کے ذریعے پولیس کو فوٹا کے قتل کے الزام میں گرفتار کی اور ہمیں بھی ان سے سننے میں آسانی رہے گی۔‘ جب طرف سے گھر جائیں گے تو یقیناً بدحواس ہو جائیں گے۔‘ تھائی نے کہا۔

گھڑی کی طرف دیکھتا اور کبھی برآمدے میں آکر بار سڑک پر دیکھنے لگتا۔ تھائی کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ آٹھ بج چکے تھے اور پھر دفن گزارنا مشکل ہو گیا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر ہماری محسوس ہو رہا تھا۔ بالآخر ساڑھے آٹھ بجے رنگولی کی کار گیت کے سامنے رکی۔ اس وقت میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ تھائی نہیں جلاتی تھی۔ کار رکتے ہی میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر گیت کھول دیا۔ رنگولی گاڑی اندر لے آئی۔ اس کے ساتھ ہجڑ سیٹ پر جاگئی اور پچھلی سیٹ پر ساد بیٹھا ہوا تھا۔

جاگتی کار سے اتر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر تھائی کی طرف دوڑی جو برآمدے والے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ برسا بھی کار سے اتر کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ہمارا یہ ملاپ دیکھ کر رنگولی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرا تھے۔ اس نے یہ منظر دیکھ کر بہ آسانی اندازہ لگایا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔

رنگولی کھانے پینے کا بہت سادہ سا سامان بھی لائی تھی۔ برسا اور رنگولی کار سے سامان اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو ہم بھی اندر آ گئے۔ جاگتی اور برسا کی داستان بڑی دلچسپ تھی۔ بنگاک سے یہاں آکر وہ دونوں ’ڈوائی ایم سی اے‘ ہو سٹل میں ٹھہرے تھے لیکن وہ گھنٹے بعد ہی وہ چچی فاکنگ کی نظروں میں آ گئے جس کی وجہ سے انہیں ہو سٹل چھوڑ دینا پڑا۔ سامنے کوک ریور کے اس پار چینگ رائے تھانزن روڈ کے قریب سی ہندوؤں کی مختصر سی آبادی تھی۔ جاگتی دیوی کی ایک جاننے والی ہندو نرس گلاب دیوی بھی یہاں رہائش پزیر تھی۔ وہ عرصہ پہلے بنگاک کے ایک سرکاری اسپتال میں جاگتی کے پاس کام کیا کرتی تھی۔ تقریباً پانچ سال پہلے اس کا تبادلوہ چینگ رائے کے سرکاری اسپتال میں کر دیا گیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد بھی خطوط اور کبھی ٹیلی فون کے ذریعے جاگتی سے اس کا رابطہ رہا تھا۔



”ہم نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو کوئی مشکوک شخص ہمیں اپنے پیچھے نظر نہیں آیا۔ میں نے فوٹا سے وعدہ کیا تھا کہ دوسرے دن شام کو ہم اس کے گھر آئیں گے۔ دوسرے روز روانگی سے پہلے میں نے فون پر اس کے کالج کا پتا بھی طرح سمجھ لیا۔“

”وہاں پہنچنے کے تھوڑی سی دیر بعد ہمارا فون آگیا۔“ جاگی نے میری طرف دیکھا ”تمہاری فون کال کے تھوڑی سی دیر بعد فوٹا کو ایک فون کال اور ملی۔ پتا نہیں وہ کس کی کال تھی اور اس سے کیا کہا گیا تھا کہ فوٹا ایک دم بدحواس ہو گئی۔ اس نے کہا کہ ہم فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ میں نے پوچھنے کی کوشش کی کہ کس کا فون تھا لیکن اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے چلے جائیں۔ وہ بعد میں ہم سے رابطہ کر لے گی۔“

”ہم کالج سے نکل گئے لیکن میرے دل میں شبہ جڑ چکا تھا۔ کیس جانے کے بجائے ہم کچھ دور اندر میرے نچھان درختوں کے پیچھے چھپ گئے۔ اس کے صرف دس منٹ بعد ایک کار کالج کے سامنے آر کر رکی۔ کار سے دارا نکلا اور جی فانگ کو اترتے دیکھ کر میں اچھل پڑی۔ انہوں نے تیل بھا کر دو اندازہ کھلایا اور وہ تینوں فوٹا کو دھکیلے ہوئے اندر لے گئے۔ پراسانے ان کے پیچھے کالج میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے بڑی مشکل سے اسے روکے رکھا تھا۔ صرف سات آٹھ منٹ بعد دارا وغیرہ واپس چلے گئے اور اس کے کچھ دیر بعد جب ہم دونوں کالج میں داخل ہوئے تو بیڑ دوم کا منظر دیکھ کر میں کانپ اٹھی۔ فوٹا کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر بھجڑ پوسٹ تھا اور خون بہتی چادر کو تر کر رہا تھا۔“

”فوٹا کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ اسے فوری طبی امداد بھی فراہم نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں بڑی طرح بدحواس ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ تم لوگ بھی وہاں آئے والے ہو۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ وہ لوگ واپس نہ آجائیں۔ پراسانہاں رک کر انتظار کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس قدر بدحواس ہو گئی تھی کہ اسے ساتھ لے کر وہاں سے بھاگ نکل۔“

”ماتے نابین کے قریب ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پراسانے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے پولیس کو اطلاع دے دی کہ اس کالج میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ پراسانہ کا خیال تھا کہ قتل کے نام پر پولیس فوراً وہاں پہنچ جائے گی اور ہو سکتا ہے فوٹا کو پچایا جائے۔“

”ہم ٹک ٹک پر بیٹھ کر وہاں سے تھانزن روڈ (سرگرم روڈ) پہنچے۔ ایک اور ٹیلی فون بوتھ سے پراسانے پولیس کو دوبارہ وہی اطلاع دی اور اس کے بعد ہم گلاب دیوی کے کوارٹر میں آ گئے۔“

”میں رات بھر نہیں سو سکی۔ فوٹا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ صبح اخبار میں فوٹا کے قتل کی خبر پڑی تو میری حالت کچھ اور خیر ہو گئی۔ پورا دن اسی کیفیت میں گزر گیا۔ صبح میں

نے چائے کا صرف ایک کپ پیا تھا۔ پراسانہ بھی میری پریشان ہو رہا تھا۔“

”ہمارے بچے کے قریب میں کسی کو کچھ بتائے بغیر ہم نے پولیس کو یہ اطلاع دینے کا فیصلہ کیا تھا کہ فوٹا کے پاس ہیں۔ اتفاق سے مجھے کوئی ٹیلی فون بوتھ نظر نہیں آیا اور دیوی کے کوارٹر سے بہت دور دم کاکر ریسٹورنٹ تک چکر ریسٹورنٹ کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا شاہیگ سٹریٹ میرے ایک ٹیلی فون بوتھ نظر آگیا۔ اس طرف جاتے ہوئے نظریں ایک چھوٹے سے شراب خانے کے کھلے ہوئے طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل اٹھا۔“

”سامنے ہی ایک میز پر جی فانگ ایک لڑکی کے شراب پی رہا تھا۔ اسے اس طرح اطمینان سے شراب پیا کہ میرا خون کھول اٹھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ میں اندر جا کر گھونٹ دوں لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنی اس کڑک پالیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔“

”جی فانگ نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پوچھنا ہو کر پولیس کا اندر جھکی قبروں نائن ون ملایا اور نام اطلاع دی کہ فوٹا کا قاتل اس وقت مذکورہ شراب خانے میں ہے۔ میں نے شراب خانے کا نام اور جی فانگ کا محل نام لے لیا تھا کہ پولیس آسانی سے اسے شناخت کر سکے۔“

”میں بوتھ سے نکل کر ایک طرف آؤں کڑی ہوئی فانگ اگر شراب خانے سے نکلے تو چھپ کر اس کا پتہ دے دے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ جلد وہاں سے اٹھے گا۔“

”پندرہ منٹ بعد پولیس کی دو کالیں شراب خانے کی رکیں۔ جی فانگ نے پولیس کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے اسے دھریا۔ جی فانگ کی گرفتاری کے سکون ملا تھا۔ بڑی طمانیت سی محسوس ہوئی تھی۔“

”پولیس جی فانگ کو لے کر چلی گئی۔ میں اس کے ساتھ ایک دہائی دی پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر رہنے سے چائے پی اور جب میں واپس جاری تھی تو راستے میں گئی۔“

”اس نے مجھے ہمارے اور تھانی کے بارے میں مجھے اس پر شبہ ہوا لیکن اس نے ہمارے اور تھانی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں کہ مجھے اس پر اعتماد کرنا پڑا۔ میں دیوی کے کوارٹر میں لے آئی۔ پراسانہ اکیلا ہی تھا اور پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اسے جی فانگ کی گرفتاری کے بارے میں بتا دیا۔ رنگی ہمیں وہاں انتظار کرنے کا کہہ اس کی، ایسی تقریباً دو گھنٹے بعد ہوئی تھی اور ہمیں اس کی میاں آ گئے۔“

جاگی خاموش ہو گئی۔ جاگی اور پراسانہ کے چہروں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ پچھلے چوبیس گھنٹے انہوں نے کس اذیت میں گزارے ہوں گے۔“

”میں نے انہیں تلاش کر کے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔“ میں نے رنگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم نے بھی ٹالیا کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی؟“

”ہاں۔ اسی لیے دیر بھی ہو گئی۔“ رنگی نے جواب دیا ”جی فانگ کو تو پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔ اسے پولیس کے کھینچے سے چھڑانے کی کوشش شروع ہو چکی ہیں۔ میں نے فانگ جی کو بھی پولیس ہیڈ کوارٹر میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”فانگ جی! میں اچھل پڑا۔“

”ہاں۔“ رنگی نے اثبات میں سر ہلایا ”وہ ڈرگ ایفایا کا ایجنٹ ہے۔ تباہی جزل کھورٹ سے بھی اس کے تعلقات ہیں۔ بہت طاقتور ہے ان کا گروہ اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جی فانگ کو رات تھانے میں نہیں رہنے دیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ اب تک وہ لوگ اسے لے جا چکی ہوں۔“

”ہوں۔“ میں نے ہنسا کر بھرا ”ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔“

”میں معلوم کر لوں گی لیکن پہلے کھانا کھا لوں۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آنتیں بھل رہی ہیں۔ میں کچھ چیزیں لے کر آئی ہوں۔ ابھی میز پر لگائی ہوں۔“ رنگی نے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

اور پھر پندرہ منٹ کے اندر اندر رنگی اور تھانی نے ملی کر میز پر کھانا ڈال دیا۔ کھانے کے بعد رنگی نے لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر دس بجے کے قریب اپنی کار پر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ہم لاؤنج ہی میں بیٹھے موجودہ صورتحال اور فوٹا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ جاگی کو فوٹا کی موت کا بہت زیادہ دکھ ہوا تھا۔

رنگی کی واپسی رات ایک بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ہوا تھا۔ حشکن کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب اس کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔

”ہی ہاں جس کا اندیشہ تھا۔“ رنگی نے صوفے پر بیٹھے ہوئے مجھے ہنسنے سے لے کر کہا ”فانگ جی دس بجے کے قریب جی فانگ کو چھڑا کر لے گیا۔ اس کے لیے اسے ذخیرہ رقم بھی خرچ کرنا پڑی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق جی فانگ کو اس کے تھوڑی سی دیر بعد شہر سے باہر کسی خفیہ جگہ پر بھیج دیا گیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں پولیس دوبارہ بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ انہیں اس عورت کی بھی تلاش ہے جس نے پولیس کو شراب خانے میں جی فانگ کی موجودگی کی اطلاع دی تھی اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کا شبہ تم پر ہے۔“ اس نے خاموش ہو کر جاگی کی طرف دیکھا۔

جاگی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی ”اب میں نہیں ڈرتی۔ میرا ہیرو گھبرا گیا ہے۔“ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

”ایک اور بات!“ رنگی نے اپنی بات کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے کہا ”میں نے دارا اور کم کے ٹھکانے کا بھی پتا کیا ہے۔ وہ دونوں راج پوتھا روڈ کے قریب ایک عالی شان بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”یہ کہاں پر ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سمجھو کہ ہم اس وقت شہر کے شرقی حصے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ راج پوتھا روڈ شہر کے انتہائی مغرب میں واقع ہے۔ اس طرف رہائشی علاقہ ہے۔ وہاں سے یہ روڈ آگے مضافاتی علاقوں کی طرف نکل جاتی ہے۔“ رنگی نے بتایا۔

”تم تو واقعی بڑے کام کی ثابت ہوئی ہو رنگی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اگر دارا سے تمہارا آسنا سامنا ہو جائے تو وہ تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا؟“

”اس کی وجہ سے ٹانگیر سے میری ان بن ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ رات گزارنا چاہتا تھا مگر اس بھگڑے کی وجہ سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ میں ٹانگیر کے عتاب کے باعث در کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اس دوران میں دارا سے کبھی آسنا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن ہو سکتا ہے اب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے سینے میں دلی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے اور وہ پچھلی باتوں کو بھول کر میرے قریب آنے کی کوشش کرے۔ دیکھتے ہی ٹانگیر کو اب اس دنیا میں رہا نہیں جس کا اسے کچھ خیال ہو۔ ٹانگیر کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ دارا نہایت خود غرض لاچی اور کم ظرف قسم کا آدمی ہے۔ وہ دوستی کی قدروں کو نہیں سمجھتا۔ ضرورت پڑنے پر گھر سے کبھی باپ بنا سکتا ہے۔“

”دارا کے بارے میں تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے۔“ میں نے رنگی کے خاموش ہونے پر کہا ”جنہیں اس طرح دارا کے قریب جانا ہے کہ اسے تم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ چیاگ رائے میں کسی بڑے آدمی سے ملنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ملاقات نہایت خفیہ ہوگی لیکن ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ ملاقات کب اور کہاں ہونے والی ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ اگر دارا کو تم پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گی۔“

”مگر میری زندگی کسی کام آجائے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“ رنگی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں بھروسہ عزم تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ تم کل سے ہی اس مشن پر کام شروع کر دو لیکن کیا اب ہمارا رہنا ٹھیک ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ رنگی نے جواب دیا ”میں

اسے یہاں گھر تو نہیں لے کر آؤں گی۔ ویسے یہ اطمینان رکھو۔ اسے کبھی یہ شب بھی نہیں ہو سکے گا کہ میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق ہے۔

”تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو تھوڑی سی ہینڈ لے لی جائے؟“

”ہاں۔ ہینڈ تو مجھے بھی آ رہی ہے۔“ جاگی جمائی لینے لگی۔ میرے اور تھائی کے پاس کرا تو تھائی۔ جاگی رکھ لی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی اور پر سادہ لاؤنج میس صوفے پر لیٹ گیا۔

اگلے روز رکھ لی نے اپنے مشن پر کام شروع کر دیا۔ دو دن گزر گئے مجھے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بڑی محنت کر رہی تھی۔ دارا سے اس کا رابطہ دوسرے دن ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ بڑی حوصلہ افزا تھی۔ رکھ لی کے کہنے کے مطابق دارا سے اس کی ملاقات راج پور تھا روڈ پر واقع تیسرا ان ہوٹل کے بار دوم میں ہوئی تھی۔ دارا وہاں پہلے ہی سے موجود تھا اور رکھ لی اس سے کچھ فاصلے پر اس طرح بیٹھ گئی تھی جیسے دارا کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دارا نے اسے دیکھنے کے بعد خود ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔

یہ پہلی ملاقات زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ دارا اس سے نہ صرف اظہارِ ہمدردی کر رہا بلکہ اس نے ٹائیکر کے خلاف بھی کچھ باتیں کی تھیں۔ ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں دارا کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے محض اتفاق ہی سمجھ رہا تھا اور اس نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب بھی رکھ لی کو اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے۔

اس سے اگلے روز رکھ لی نے اس کے بیگلے پر کچھ وقت گزارا اور بہت سی کام کی باتیں معلوم کر لیں۔

”جی فانگ کو جیناگک سامین بھیج دیا گیا ہے اور چار دن بعد دارا اور میں بھی وہاں جانے والے ہیں۔ وہاں کسی اہم شخصیت سے ان کی ملاقات کا پروگرام ہے۔ اس کے بعد ان کا پروگرام مانے سامنے جانے کا ہے جہاں سے یہ لوگ کولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہوں گے۔“

”جیناگک سامین یہاں سے کتنی دور ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اٹنٹھ کل میٹر۔“ رکھ لی نے جواب دیا ”بڑا خوب صورت علاقہ ہے یہاں مہاتما بدھ کے دو قدیم واٹ اور ایک بہت بڑا میوزیم بھی ہے جہاں گیارہویں اور بارہویں صدی کے نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ اس قصبے سے صرف نو کلومیٹر آگے کولڈن ٹرائی اینگل ہے۔“

”اوہ!“ میں چونک گیا۔ ”فانگک کچن کہاں ہے؟“

”وہ بھی کل صبح جیناگک سامین جا رہا ہے۔“ رکھ لی نے جواب دیا۔

دیا۔

”میرا خیال ہے تم ہمارے اس مشن میں اہم کردار ادا ہو۔ میں اس سلسلے میں تم سے بعد میں بات کروں گا لیکن قبائلی سردار زادے تھالوب سے میری ملاقات کرانی ہے۔“

”اگر تم چاہو تو یہ ملاقات آج بھی ہو سکتی ہے۔“

جواب دیا ”آج بدھ کی شب ہے۔ میرا کتنی کلب میں رہتا ہوں لیکن میں یہ پروگرام چھوڑ سکتی ہوں۔ اگر تم کسو تو میں اس کے اس سے ملاقات ملے کر لوں۔“

”ہاں۔ کوشش کرو۔ اگر یہ ملاقات آج ہی ہو جائے۔“

میں نے کہا۔

رکھ لی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹیلی فون دینے پر تقریباً دس منٹ بعد واپس آئی۔

”اس وقت گیارہ بجے ہیں۔ تھالوب سے ہماری ملاقات ساڑھے گیارہ بجے شش ڈک ہوئی میں ہوئی۔ وہ جگہ یہاں زیادہ دور نہیں ہے۔ تم حیران ہو جاؤ تو ہم چلیں۔ کوئی اور جگہ جانے کا؟“

رکھ لی نے یہ کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں۔ میں تمہارے ساتھ اکیلا ہی جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔“

سوا گیارہ بجے میں اور رکھ لی گھر سے رخصت ہو گئے۔ مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ساٹھ سو روڈ پر آگئی اور کئی گیارہ گھنٹے کے بعد واک چائے کی طرف جانے والی سڑک پر چڑھیں۔ یہاں میں یہ بھی بتانا چاہوں کہ بنکاک کی طرح جیناگک رائے شہر بھی کئی ٹھنڈی ہے۔ دیوانے مانے کوک شہر کے گرد و اطراف صورت میں پھیلا ہوا ہے اور شہر اس دریا سے نکلتی ہیں۔ اور ان شہروں سے بھی خوب فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ پہرانی دے کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ سڑک شمال میں از پورٹ طرف سے شروع ہوتی ہے اور شہر سے گزر کر جنوبی علاقے میں انگریزی کے حرف ”یو“ کی شکل اختیار کرتی ہوئی واپس اسی طرف چلی جاتی ہے۔

پہرانی دے پر سری پورن ہسپتال کے قریب کارنیاں ملز۔ مڑگنی۔ شش ڈک ہوئی اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کاغذ ساٹھ سو دریا سے نظر آ رہا تھا۔

رکھ لی نے کار ہوٹل کے بارنگک لائٹ پر روک لی۔ اس وقت ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ گھر سے نکل کر یہاں تک کاغذ پورے پندرہ منٹ میں طے ہوا تھا۔ رکھ لی کا رے اتر کر اوپر اڑا دینے لگی۔

”تھالوب آچکا ہے۔ اس کی جب کھڑی ہے۔ وہاں میں ملز۔“

سرخ رنگ کی فورڈ نیل ڈرائیو۔ رکھ لی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

شش ڈک فائبر اشارہ تو نہیں لیکن بہت شان دار ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر سرخ می اور ہوٹل کی طرف سے وہاں بھی گاؤں کے لیے مناسب بندوبست کیا گیا تھا۔

”دوسرے بڑے ہوٹلوں کی طرح شش ڈک میں بھی گاؤں کے لیے پرائیویٹ سروس موزجے اور رکھ لی کو غالباً معلوم ہو گا کہ یہاں کھانے کا کچھ نیکہ ڈانگ ہال یا بار دوم کی طرف جانے کے بجائے وہ ایک راہداری میں مڑ گئی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے رک کر اس نے ہلکی سی دھک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں ایک کافی ٹیبل سائز کی میز پر آئے سامنے دو افراد کمرے میں آئے۔ ایک تو سالوں کی رعیت کی دراز قامت لڑکی تھی۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو نظراس کے چہرے کے نقش بڑے دلکش مانلی رعیت سے قطع نظر اس کے چہرے کے نقش بڑے دلکش تھے۔ ”درا ایک آدمی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تین تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دراز قامت مگوری جی رعیت تھیں جس کے لگ بھگ نقش۔ وہ خوب مد اور قابل رنگت صحت کا مالک تھا۔ جس خلاف کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔ وہ تھالوب تھا۔ وسیع کمر بہت شان دار طریقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جس کے دو حصے تھے۔۔۔۔۔ ایک حصہ بیڈ دوم کا منظر پیش کرتا تھا اور دوسرا حصہ ذرا رنگ دوم کا فرش پر دبیز قاتین بچھا ہوا تھا اور فریج بھی بڑا شان دار تھا۔

میں اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تھالوب نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنے قبائلی رواج کے مطابق میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی پر پورے بھی دیا تھا۔ غالباً رکھ لی اسے فون پر میرے بارے میں تھوڑا بہت بتا چکی تھی۔

”ہم دونوں میز کے گرد دوسری کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھالوب نے اپنی زبان میں سامی لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ اس لڑکی کے جانے کے بعد ہی رکھ لی نے میرا تعصیل خلاف کرایا۔

”تم نے مل کمرت خوشی ہوئی باشر۔“ تھالوب نے گرم جوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”کچھ عرصہ پہلے میں بنکاک گیا تھا۔ مہاراج سے بھی ملتا تھا۔ ان دنوں ساری کے قتل کا بیگانہ عروج پر تھا۔ مہاراج نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا لیکن تم سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ آج تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔“

میں نے بھی اپنے دل کی بیجا بات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ ہم اب بھی یہ اندازہ کھنگر رہے تھے کہ ہلکی سی دھک کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہی لڑکی ایک نو عمر ویتھیں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ویتھیں ایک سو سو ٹرائی دیکھتے ہوئے اندر آئی تھی جس پر ویتھیں شراب کی دو بوتلیں، گلاس، برف کی ٹکڑیوں سے بھرا ہوا

بائبل (پال) سوڈے کی بوتل اور کھانے پینے کے لوازمات تھے۔ ویتھیں نے بڑے سلیطے سے یہ ساری چیزیں میز پر لگا دیں۔ لگتا تھا کہ تھالوب نے ہماری تواضع کے لیے یہ انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا لیکن ظاہر ہے میں شراب نہیں پیتا تھا۔ ویتھیں جب واپس جانے لگی تو میں نے خود ہی اسے روک لیا۔

”میرے لیے ایک کپ کافی۔“

تھالوب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر غماز سی ابھرائی۔ اس نے ویتھیں سے اس پر سپرہ کافی کے لیے کہا اور پھر دوسری لڑکی سے کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں باہر چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد ویتھیں کافی سرو کر گئی۔ دوسری لڑکی دوبارہ نہیں آئی۔ تھالوب نے اپنے اور رکھ لی کے لیے شراب بنائی۔ میں کافی کی چکیاں لیتا رہا اور وہ دونوں شراب کے سبب لینے رہے۔ اس کے ساتھ ہی اوپر اوپر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تھالوب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک محب وطن شخص ہے اور شہنشاہ ہمو ی بول اور وطن کی سلامتی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ اندازہ لگانے کے بعد میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا۔

”پنڈرو کے کچھ غیر ملکی دوست یہاں ہیروئن کا ایک نیاریٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں اور ہماری ایک دوست نوتا بھی گزشتہ رات ان کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ لوگ چند روز میں جہز کھورات یا اس کے کسی خاص نمائندے سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں میں کوئی معاملہ طے نہ ہوئے پائے ہیروئن کی تباہ کاریوں سے تم واقف ہو۔ اس وقت پوری دنیا اس لعنت کی لپیٹ میں ہے۔ فوج ان نسل تباہ ہو رہی ہے۔ اب تو اسکول کے بچوں تک کو اس نئے کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ ہم پوری دنیا میں تو ہیروئن کی چلائی کو نہیں روک سکتے لیکن کسی نئے ریٹ کے لیے مشکلات تو پیدا کر سکتے ہیں۔ دنیا میں ہیروئن کی تباہی اور چلائی کا سب سے بڑا مرکز کولڈن ٹرائی اینگل ہے۔ جہز کھورات اس خطے کا بے تاج حکمران ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ آپ کو بھی ہو گا۔ ہیروئن کی چلائی کے اس کے اپنے ذرائع ہیں جن میں آج تک کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکی۔ میں کوئی بڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتا لیکن یہ کوشش ضروری جا سکتی ہے کہ ایسا کوئی نیاریٹ قائم نہ ہوئے دیا جائے اور اس نئے گروہ کا قلع قمع کر دیا جائے جو یہاں قدم بٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے تھالوب کو شہنشاہ کے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں بتاتی ان احوال مناسب نہیں سمجھا تھا۔ رکھ لی مجھے بتا چکی تھی کہ اسے منشیات کی کاشت اور اس کا بزنس کرنے والوں سے شدید نفرت تھی اس لیے میں نے اپنی گفتگو کا محور بھی منشیات ہی کو

بنایا تھا۔ یہ ایک طرح سے گویا اس کی دھمکی ہوئی رگ تھی جس پر میں نے انگلی رکھ دی تھی۔

”ہیروئن... ہیروئن... ہیروئن۔“ عقاب کے لیے میں شدید جھنجھلاہٹ تھی ”ہیرا بس نہیں چٹاکر منشیات کی کاشت اور کاروبار کرنے والوں کو پھانسی پر لٹکا دوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”منشیات کی روک تھام کے لیے ہر ملک نے قانون بنا رکھے ہیں۔ یہ گھنڈا کتا کاروبار کرنے والوں کے خلاف کارروائی کے لیے انجیل اسکو اڈا اور فورسز بھی قائم کر رکھی ہیں جن پر کڑوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لعنت ایڈز کی طرح پھیل رہی ہے۔ کوئی روک تھام نہیں ہو رہی اس کی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی سب سے بڑی وجہ ہر ملک کے قانون میں چٹک اور کرپشن ہے۔ ڈرگ مافیا کی طاقت کا اندازہ میں لگا سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر ملک کی حکومت پوری قوت کے ساتھ قانون پر عمل درآمد کی کوشش کرے تو منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو دنیا کے کسی کونے میں نہ ملے اور یہ برائی جڑ سے ہی ختم ہو جائے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والوں ہی میں بعض ایسے بے ضمیر اور بد کردار لوگ موجود ہیں جو ذاتی مفاد کے لیے موت کے ان بیو پاروں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ اپنے ملک کی مثال دوں گا۔ یہاں بھی منشیات کی روک تھام کے لیے الگ سے ایک حکمہ قائم ہے جس کے لیے ہر سال کڑوں ڈالر کے فنڈز مخصوص کیے جاتے ہیں۔ اس حکمے کے ملازمین کو بے پناہ سولہ سولہ بھی حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں ڈرگ مافیا کے خلاف کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

”سیاست میں بھی ڈرگ مافیا کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ آج ہر ملک میں بہت سے سیاست دان ایسے ہیں جو منشیات ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ ڈرگ مافیا کے ایجنٹ ہیں بلکہ ان کے شعبے میں سے ہوئے ہیں۔ یہ سیاست دان، اپنے ملک اور قوم کے لیے نہیں ڈرگ مافیا کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں بتا کر سب ہی لوگ کہتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں لیکن یا تو وہ بے بس ہیں۔ انہیں ہاتھ پیر ملانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی بہت کرنا بھی ہے تو اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ چند ہفتے پہلے یہاں چینگ رائے میں ایک ایسے بچ کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا جس نے ایک منشیات فروش کو جرم ثابت ہو جانے پر موت کی سزا سنائی تھی۔ جرم کرنے والے کو تو اس کے ساتھی پولیس کسٹڈی سے چھڑا کر لے گئے اور اس کے خلاف فیصلہ سنانے والے بچ اور دو گروہوں کو عدالت کے احاطے ہی میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ جب صورت حال ایسی ہو تو موت کے اس بیو پار پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ لوگ قابلِ تعریف ہیں جو ان حالات میں بھی جان کی بازی لگاتے ہوئے ہیں۔ ہر حال“

کم از کم اس معاملے میں میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔  
 بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

اس میں شبہ نہیں کہ میں عقاب کی باتوں سے بہت متاثر تھا۔ رنگوں مجھے بتا چکی تھی کہ اس کے باپ نے اپنے ملازمین کی کاشت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اب اس ملازمین کو کوئی بھی شخص پوست کی کاشت نہیں کرنا تھا۔ اس معاملے میں عقاب بھی باپ کے قہر میں دم پر چل رہا تھا۔ یہ بات مجھے بھی پتہ چلی تھی کہ دو دروازے کے رہنے والے ایک کاشت کار پناہوں میں پوست کی فصل اگادی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک یہ خبر نہیں پہنچ سکے گی مگر ایسی باتیں چھپی تو نہیں رہیں گی چینگ رائے میں عقاب کو کسی نے پوست کاشت کے بارے میں اطلاع دے دی۔ عقاب اپنے سارے کام چھوڑ کر اگلے ہی چند آدمیوں کو لے کر پناہوں میں پہنچ گیا اور نہ صرف پوست کھڑی فصل تباہ کر دی بلکہ اس کاشت کار کا مکان بھی جلا کر اڑا کر دیا تھا۔ اس کاشت کار کو دی جانے والی سزا کی یہ خبر علاقے میں پھیل گئی اور پھر کسی کاشت کار میں پوست کاشت کرنے کی بہت نہیں ہوئی تھی۔

”فی الحال تو ہمیں کچھ نہیں کرنا۔“ میں نے عقاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس گروہ کا ایک آدمی چچی فانگ جو نوتا کے قہر میں لوٹا ہے یہاں سے فراہم کر چینگ رائے میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے باقی ساتھی بھی تین چار روز بعد اسی طرف جانے والے ہیں۔ میں ان لوگوں کے جانے سے پہلے خود وہاں جا کر چچی فانگ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت تمہاری نہیں بلکہ تمہارے کسی ایسے آدمی کی ضرورت پڑے گی جو اس علاقے میں میری رہنمائی کر سکے اور چچی فانگ کو تلاش کرنے میں مدد کر سکے۔“

”جیسے آدمی چاہو تو ہمیں مل سکتے ہیں۔ ویسے چینگ رائے جیسے علاقے میں کسی اجنبی کو تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟“ عقاب نے پوچھا۔

”کل ہی بھی وقت۔“ میں نے جواب دیا۔

”کل صبح نو بجے میرا ایک آدمی گاڑی لے کر رنگوں کے دروازے پر پہنچ جائے گا تم لوگ تیار رہنا۔“ عقاب نے کہا۔

”کیا وہ آدمی بھروسے کا ہوگا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔“

”ہم قابلِ لوگ ہیں۔ دو گھنٹہ اور مکاری ہماری سرشت میں شامل نہیں۔ یوں تو قہر کا ہر شخص سردار کے حکم پر جان دے گا بھی فکر سمجھتا ہے لیکن جو شخص تمہارے ساتھ جائے گا۔ برا خاص آدمی ہے۔ تم اس پر عمل بھروسہ کر سکتے ہو اور اس سے کام چاہو لے سکتے ہو۔ وہ چون و چرا نہیں کرے گا۔“

”تمہیک جب میں کل صبح توجہ تیار ہوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ عقاب کی باتوں سے اندازہ

ہو کہ اسے کلی اور بین الاقوامی سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ اس موضوع پر روانی سے بولتا رہا اور میں سچ میں ”ہوں ہاں“ فاس مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ظاہر ہے میں نہ کوئی بحث کر سکتا تھا اور نہ ہی ان باتوں میں اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔

جب ہم جانے کے لیے اٹھے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ عقاب بار بار عداوت کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ میری کوئی خدمت نہیں کر سکا۔

”ہوئی کہ ہاٹ کلب کے پروگرام دو بجے تک ہی ہوتے تھے اور اس وقت لوگ وہاں جا رہے تھے وہ لڑکی نجانے کہاں سے آکر ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھی جسے شروع میں عقاب کے ساتھ دیکھا تھا۔ عقاب پہلے ہمیں رنگوں کی کار کے پاس پھر ڈاؤر پھر اس لڑکی کے ساتھ اپنی جیب کی طرف چلا گیا۔ رنگوں نے وہاں پہنچے پیٹھے تین بیگ پائے تھے اور مجھے شبہ تھا کہ اگر وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے ہم تک نہ ہی تو ہم تینوں کا انجام بہت خراب ہوگا لیکن رنگوں پوری طرح اسے خواہاں نہیں تھی۔ اس کے پاس میں میرے خدشات بے بنیاد لگے۔

میرا خیال تھا کہ برساؤ وغیرہ سونگے ہوں گے لیکن وہ سب باگ رہے۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے تک لاؤنج میں بیٹھے پروگرام دیکھتے رہے۔ میں نے رنگوں کو راستے میں بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں اسے کیا کرنا ہے۔ عقاب نے مجھے بتا دیا تھا کہ چینگ رائے میں مجھے کہاں ٹھہرنا ہے۔ اس نے وہاں کا فون نمبر بھی ایک کانڈر لکھ کر دے دیا تھا۔ میں نے وہ کانڈر تھامی کی طرف بڑھا دیا اور رنگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس دوران میں اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو اس نمبر پر مجھے اطلاع دے دینا اور جب دارا وغیرہ یہاں سے روانہ ہو جائیں تو تم لوگ بھی چینگ رائے میں پہنچ جانا۔“

”ہاں، تم اکیلے ہی جاؤ گے؟“ تھانی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ کل سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ چچی فانگ کو تلاش کرنے میں اچھی خاص بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی جبکہ دو تین دن تک یہاں رہ کر آرام کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”میں بالکل فٹ ہوں۔ بھاگ دوڑ میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔“ باجی جلدی سے بول پڑی۔

”تمہیک جب جا چکی تمہارے ساتھ جانے گی۔“ تھانی نے کہا۔

”جا چکی کے معنی تو خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی لیکن میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں جا چکی کو اپنی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ مجھے زیر کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی لیکن میں ہر طرح کی طرف سے ہرایسے موقع پر وہ وعدہ

تو کر لیتی تھی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گی مگر وہ اپنا وعدہ بھول جاتی تھی۔

صبح ٹھیک نو بجے گاڑی پہنچ گئی۔ وہ پہلے رنگ کی لینڈ کروزر فور وہیل ڈرائیو پر بیٹھ گئی۔ میں نے اور جا چکی نے اپنے کپڑے ایک ایک ٹیک میں رکھ رکھے تھے۔ ہم دونوں تھانی وغیرہ سے رخصت ہو کر جیب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت میں نے تھانی کے چہرے پر ہرچب سے تاثرات دیکھے تھے۔ اگر اسے یہ شبہ بھی ہوگا کہ جا چکی میرے پاس میں کیا خیالات رکھتی ہے تو وہ جا چکی کو ہرگز میرے ساتھ نہ جانے دیتی۔

ڈرائیو کا نام واک ڈن تھا۔ وہ درمیانے قد کا صحت مند آدمی تھا۔ عمر میں لگ بھگ تیس سال کی تھی۔ اس نے بھی میری طرح ہی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ بیروں میں جو گزرتے چینگ رائے میں اگرچہ صرف اسٹریٹ کھوپڑے کے فاصلے پر تھا مگر راستے پر پہنچ کر انہیں دشوار گزار ہونے کی وجہ سے یہ فاصلہ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ راستے میں ہم چند منٹ کے لیے ایک آبیٹر کے قریب رکے بھی تھے۔

قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سڑکیں کشادہ، صاف ستھری اور عمارتیں جدید طرز تعمیر کی حامل تھیں۔ بہت سی عمارتیں ایسی بھی تھیں جن سے مقامی تہذیب کا اظہار ہوتا تھا۔ سیاحت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں چند اچھے ہوٹل بھی تھے۔ گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹل تو بے شمار تھے۔ شہر زیادہ تر قصبے کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔

ہماری جیب میوزیم کے سامنے سے ہوتی ہوئی شال کی طرف جانے والی ایک سڑک پر مڑ گئی اور کچھ ہی فاصلے طے کرنے کے بعد ایک ذیلی راستے پر آگئی جو پندرہ منٹ کی پیدائی کی طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً پانچ سو گز آگے گاڑی پر ایک کانچ نما مکان تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف وسیع رقبہ خاردار ناموں سے کھرا ہوا تھا۔ مکان کے برآمدے میں ایک اجیڑا عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جیب کو آتے دیکھا تو دو دو کر گیت کھول دیا۔ وہ آدمی لباس اور طے ہی سے قابلِ نگاہ تھا۔ جیب مکان کے برآمدے کے سامنے رگ تھی۔

جیب سے اتر کر میں کچھ دیر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ سامنے خوب صورت لان تھا اور اطراف میں بہت وسیع رقبہ کھرا ہوا تھا۔ پھل دار درختوں کی بستان تھی۔ قریب دو چاروں کوئی اور مکان یا کانچ نظر نہیں آ رہا تھا۔

واک ڈن ہمیں اندر لے آیا اور کانچ دکھانے لگا۔ باہر سے یہ مکان جھوٹا لگتا تھا۔ لیکن اس میں پانچ بیڑے موزے علاوہ وسیع ڈرائنگ روم اور ہال بھی تھا۔ پورا مکان مکمل طور پر آراستہ تھا۔ ہر کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ جا چکی ایک کمرے میں بیڑے ڈھیر ہو گئی۔ سفر اگرچہ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن وہ تھک گئی

تھی۔

”یہ لہا ہے۔“ وانگ ڈن نے ادویہ عرق باغی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تھائی، بری اور انگریزی زبانیں سمجھتا ہے۔ تھائی اور پورچین کھانے بھی بہت اچھے بناتا ہے لیکن تم لوگوں کے لیے دوپہر کا کھانا ہوٹل سے آئے گا۔ میں ابھی مارکٹ جا رہا ہوں جو کھانا ہوتا ہے۔“

”چائیز کھانے مل جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔ وانگ ڈن نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے دو تین ایسے چائیز کھانوں کے نام بتا دیے جو ہم آسانی سے کھا سکتے تھے۔

وانگ ڈن کے جانے کے بعد میں نے لہا سے کافی کی فرمائش کی اور برآمدے کے سامنے درخت کے نیچے ایک گاڑن چیر کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جاگ بھی وہاں آئی اور چند منٹ بعد لہا بھی کافی بنا کر لے آیا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے دو بجے کھایا۔ وانگ ڈن کا خیال تھا کہ ہمیں گھر میں بیٹھے رہنے کے بجائے سیرو تفریح کرنی چاہیے لیکن اسے کیا معلوم کہ یہاں ہم سیرو تفریح کے لیے نہیں آئے تھے۔ جب تک ہمارا مشن پورا نہ ہو جائے ہمارے لیے لوگوں سے دور رہنا ہی بہتر تھا۔ میرے انکار پر وانگ ڈن نے اصرار نہیں کیا۔ البتہ میں نے پتی فانگ کا علیہ تیار کر اس کی تلاش کی ہدایت کر دی۔

”اس شخص کا علیہ بالکل واضح ہے۔ اسے آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اسے شہر نہ ہونے پائے کہ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اگر تم جاہو تو اس کام کے لیے اپنے بھروسے کے کچھ آدمیوں سے مدد لے سکتے ہو لیکن شرط وہی ہے۔ پتی فانگ کو شہر نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ اگر اسے شہر بھی ہو گیا تو پھر وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”آپ مطمئن رہیے بائیں! وانگ ڈن نے کہا۔“ اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ اس کے گرد کوئی جال بچھایا جا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں۔“ میں نے سر ہلایا۔ وانگ ڈن وہاں سے رخصت ہوا تو سودا وغیرہ لینے کے لیے لہا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ میں اور جاگ اکیلے رہ گئے۔ اس وقت ہم ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جاگ بائیں کرتے کرتے اوٹھ گئی اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ارادہ خیرہ کے آنے سے پہلے ہی فانگ ہاتھ آجائے تو اس سے بہت سی کامیابی بائیں معلوم ہو سکتی ہے۔

لہا پانچ بجے کے قریب واپس آیا تھا۔ جب بچے کے قریب اس نے ہمیں کافی بنا کر دے دی اور کہیں میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب وانگ ڈن بھی آیا۔ اس کی رپورٹ کسی طرح بھی امید افزا نہیں تھی۔ شہر میں واقع بیشتر ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کو چیک کر لیا گیا تھا۔ پتی فانگ کے پلے کے کسی آدمی

کا سراغ نہیں ملا تھا۔

”میں نے بھروسے کے کچھ آدمی اس کی تلاش پر لگا دیے ہیں۔“ وانگ ڈن کہہ رہا تھا۔ ”کل صبح سویرے ہی شہر کے علاقوں میں واقع گیسٹ ہاؤسز اور ہٹس میں اس کی تلاش شروع کر دی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ کل شام تک اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتا چل جائے گا۔“

اس رات کھانے کے بعد میں نے فون پر تھائی اور برساؤ کی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ رنجلی سے بھی بات ہوئی تھی۔ یہاں کی صورت حال بھی نارمل ہی تھی۔

دس بجے کے قریب وانگ ڈن نے چینی ساختہ اس کے سب مشین گن میرے سامنے رکھ دی۔ مجھے نہیں معلوم یہ آئوٹر رائل اس نے کہاں سے نکالی تھی۔

”یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے لیکن احتیاط اسے اپنے پاس رکھ لو۔ یہ لوڈ ہے۔“ اس نے کہا۔

میں رائل اٹھا کر دیکھنے لگا اور پھر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وانگ ڈن اور لہا بھی کانچ کے اندر ہی کسی کمرے میں سوئیں گے لیکن وانگ ڈن نے بتایا کہ وہ سردار کے اس کمرے کے اندر بھی کمرے میں سونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کانچ کی چھٹی طرف کوارٹر ہے۔ وہ دونوں وہاں سوئیں گے۔

”اگر رات کو کوئی مسئلہ ہو تو یہ عین دیا دیجیے۔“ لہا نے کہا۔ ”دو واڑے کے قریب دیوار پر لگے ہوئے ایک مین کی طرف اشارہ کیا۔“ تیل میرے کوارٹر میں ہے۔ تیل بجتے ہی میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

وہ دونوں کانچ سے باہر چلے گئے۔ میں نے اٹھ کر دو واڑے اندر سے لاک کر دیے اور مختلف کمروں میں جھانکنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں اور جاگ ایک الگ الگ کمروں میں سوئیں گے مگر جاگ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

”میں اس سٹیشن کانچ میں الگ کمرے میں نہیں سو سکتی۔ مجھے درگ رہا ہے۔“ جاگ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم بیڈ پر سو جاؤ۔ میں اس کوچ پر لیٹ جانا ہوں۔“ میں نے کہا اور جاگ کے جواب کا انتظار کیے بغیر کوچ پر لیٹ گیا۔

میرے حساب سے وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ رات کو چونکہ جلدی ہو گئی تھی اس لیے صبح آٹھ بجے جلدی کھل گئی۔ جاگ مجھے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں بھڑک کر نیند سوچا تھا اور اپنے آپ کو بہت ہلکا ہلکا اور فریض محسوس کر رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے ذہن پر طاری نیند کا تھوڑا سا غلبہ بھی جاتا رہا۔

جب میں کمرے سے نکلا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ جاگ برآمدے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی وہیں آیا اور اس

کے سامنے کرسی صحتیت کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر ہلکے بادل چھائے گئے تھے اور بڑی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی مجھے ہونے چاہیے ہی منٹ ہوئے تھے کہ لہا نے کہنے کی طرف دباؤ دینے پر کہا۔ ”کانچ میرے ہاتھ میں تھا۔“

”چائے پی لہو میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔“ جاگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ناشتا تم تیار کرو گی!“ میرے لیے میں حیرت تھی۔

”ہاں۔ آج میں ناشتا بناؤں گی۔ کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹنے نہ دے گا۔“ میں نے ضرورت کی چیزیں صبح سویرے ہی منگوائی تھیں۔ ”جاگ نے سسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وانگ ڈن کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے وہ جب بھی نظر نہیں آتی تھی جو رات کو برآمدے میں گھڑی کی گئی تھی۔

”وہ تو میرا خیال ہے صبح چھ بجے ہی چلا گیا تھا۔“ پتی فانگ کو تلاش کرنے ”جاگ نے جواب دیا۔ ”وہ بے قابو لوگ بھی بڑے جاب ہوتے ہیں۔ جس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں اسے کیے بغیر جین سے نہیں بیٹھتے۔ جب تک پتی فانگ کا پتا نہیں چل جائے گا وانگ ڈن اس وقت تک نہ خود جین سے بیٹھے گا نہ دوسروں کو بیٹھنے دے گا۔“

میں نے کپ خالی کر کے سامنے پڑی ہوئی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ جاگ کپ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی کہیں میں باکر دیکھوں کیا وہ کرا رہی ہے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میں اس سے ”دری رہتا چاہتا تھا۔“

تھوڑی ہی دیر بعد کہیں کی طرف سے اشتہا انگیز خوشبو آنے لگی۔ مجھے کچھ حلا جا رہا ہوا۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد لہا مجھے اندر بلا کر لے گیا۔

میز پر ناشتا لگ رہا تھا۔ پوریاں، آلو کی بھجیا اور چنے۔ یہ سب کچھ کچھ کر میری بھوک ایک دم چمک اٹھی۔ جاگ پہلے بھی کھانا بناتی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا لیکن آج کا ناشتا تو بہت ہی لذیذ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ سنگ پور میں چھٹی والے روز ڈیڑی بھی بازار سے یہ ناشتا لایا کرتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پاکستانی کی منڈائی کی دکان تھی۔ صبح کے وقت وہ طوا پڑی ہلا کر آتا تھا۔ اس کے کانچ بہت دور دور سے آیا کرتے تھے۔

بچپن کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ میں جیسے ماضی میں کودتا تھا۔

”اے۔“ جاگ نے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ”کہاں کہو گئے ہسٹاپنڈ نہیں آیا کیا؟“

”اے!“ میں چونک گیا۔ ”کچھ نہیں۔ کچھ پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔“

”کھا رہا ہوں۔“

ناشتے کے بعد بھی ہم دیر تک وہیں بیٹھے بائیں کرتے رہے اور پھر اٹھ کر باہر آ گئے۔ آسمان پر بادل کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ ہوا میں بھی کسی قدر تیزی آگئی تھی۔ میں کانچ کے اوپر سے گھومتا ہوا پچھلی طرف چلا گیا۔ کئی ایک زبردست خادرات آروں میں گھرا ہوا تھا جس میں پھل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ جاگ بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ درختوں سے ذرا ہٹ کر دو دو تین تین فٹ اونچے لہا لہا پودے لگے ہوئے تھے جن پر سرخ رنگ کے پھل لگے ہوئے تھے۔ دور سے وہ مردوں کے پودے لگ رہے تھے لیکن قریب پہنچ کر پتا چلا کہ وہ اسٹراہیری کے پودے تھے جو پھل سے لدے ہوئے تھے۔ جاگ اسٹراہیری تو ذکر کھانے لگی۔

ہم دور تک نکل گئے۔ اچانک ہی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں واپس جانا چاہتا تھا لیکن جاگ کی شرارت کے موذیوں میں بوندا باندی نے اچانک ہی تیز بارش کی صورت اختیار کر لی۔ میں منحن درختوں کے نیچے کھڑا تھا جبکہ دھلی جگہ۔ پر کھڑی بارش میں بیٹھیں رہی۔ اس نے بھی جینز کے اوپر کی شرٹ پن رنجی تھی جو بارش میں بیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ جاگ کی ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ سجائے میری طرف بڑھی تو میں کانچ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی قہقہے لگاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میں نے کانچ کے برآمدے میں پہنچ کر دم لیا تھا۔ تیز بارش میں میرے کپڑے بھی بیگ گئے تھے اور جاگ کے لباس سے تو پانی نچ رہا تھا۔ وہ برآمدے کے سامنے لان میں کھڑی بارش کے مزے لیتی رہی اور مجھے ترغیب دیتی رہی۔

بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسی طرح اچانک ہی ختم ہو گئی۔ پھاڑی علاقوں میں کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بارش بند ہونے کے بعد کچھ دیر تک آسمان پر گرجن چمک ہوتی رہی اور پھر بادل چھٹ گئے اور تیز دھوپ چمکنے لگی۔ مزہ آدھے گھنٹے بعد آسمان اس طرح صاف ہو گیا جیسے وہاں کبھی بادلوں کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

”ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کپڑے بدل لو۔ اگر سردی لگ گئی تو پیار بڑھاؤ گی۔“ میں نے جاگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر پیار بڑھ گئی تو کیا تم میری تھوڑا داری نہیں کرو گے؟“ جاگ مسکرائی۔

”بہت شوق ہے پیار بڑھانے کا؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”صرف تمہاری تھوڑا داری کی خاطر۔“ وہ ”عشاقی سے مسکرائی۔

”بائیں بنانے کے بجائے اندر جا کر کپڑے بدل لو۔“ میں نے کہا۔

جاگ چند لمبے میری طرف دیکھتی رہی پھر گری سانس لے کر اندر چلی گئی۔ میں برآمدے ہی میں بیٹھا رہا۔ پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ وانگ ڈن نہ تو خود واپس آیا تھا



اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ چنانچہ رات سے رگھوپتی تھائی کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہیں لی تھی۔  
شام کا اندھرا کھیل گیا۔ ہمارا یہ کانچ خاصی باندی پر واقع تھا وہاں سے شہر کے بعض علاقوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ چھوٹا سا شہر سرحد کے قریب واقع تھا۔ عام طور پر دو دروازے علاقوں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی لیکن سیاحت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں بھی وہ تمام سہولتیں موجود تھیں جو کسی بڑے تفریحی یا تفریحی شہر میں ہو سکتی ہیں۔ شہر کی کئی عمارتوں پر بڑے بڑے رنگ برنگے نئون سائن بج رہے تھے۔

میں اس وقت جاگتی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔  
واگنگ ڈن کی دی ہوئی آؤٹلیک رائل ٹیبل میز میرے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ دو روشنیاں کانچ کی طرف آتے ہوئے دیکھ کر میں نے رائل ٹیبل اٹھا کر گود میں رکھ لی۔ وہ کسی گاڑی کی بیٹلا نہیں تھی۔ وہ واگنگ ڈن کی جپ بھی ہو سکتی تھی لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا چاہتا تھا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی فضا میں ہارن کی آواز گونج اٹھی۔ لوہا کانچ سے نکل کر گیسٹ کی طرف دوڑ گیا۔  
وہ واگنگ ڈن تھا۔ اس کا چہرہ سا ہوا تھا۔ صاف لگا رہا تھا کہ اس کا پورا بدن ہنگامہ دوڑ میں گزرا ہے۔

”میرے تمہارے شکار کو تلاش کر لیا ہے ماسٹر۔“ اس نے میرے قریب آتے ہی کہا ”تمہارے بتائے ہوئے طبقے سے اس کو شناخت کرنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا اور پھر اس کے ساتھ فانگ چمن کی موجودگی سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی کہ تمہارا مطلوبہ آؤٹی وی ہے۔“

”گھڑ۔“ میں اچھل پڑا ”کیا تم فانگ چمن کو جانتے ہو؟“  
”اسے کون نہیں جانتا۔“ واگنگ ڈن نے جواب دیا ”وہ سین فونگ کا آؤٹی وی ہے اور سین فونگ جزل کھورٹ کا دست راست سمجھا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ میں کولڈن ٹرائی اٹھل کے معاملات سین فونگ ہی ذیل کرتا ہے۔“

”لیکن سنا ہے کہ وہ ٹومکولڈن ٹرائی اٹھل ہی میں رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ درست ہے۔“ واگنگ ڈن نے اثبات میں سر ہلایا ”لیکن کوئی اہم معاملہ ہو تو وہ خود بھی ادھر آ جاتا ہے۔ عام طور پر فانگ چمن جیسے لوگ سیاحتوں میں رہتے ہیں۔“

”بہر حال وہ لوگ کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے جی فانگ اور فانگ چمن؟“ میں نے سوالیہ لہجہ میں اس کی طرف دیکھا۔  
”میں روڈ کی دوسری طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ہٹ میں۔“ واگنگ ڈن نے جواب دیا ”میرے آؤٹی ویوں کی طرف اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ تقریباً پانچ بجے کے قریب میرے ایک آؤٹی وی نے فانگ چمن کو اس طرف جانے دیکھا تو تجھانے اسے کیوں شبہ ہو گیا۔ اس نے فانگ چمن کا تعاقب شروع کر دیا اور

درختوں میں گھسے ہوئے اس ہٹ تک پہنچ گیا جہاں اس نے فانگ کو دیکھ لیا۔ میرا آؤٹی وی تقریباً ایک گھنٹے تک درختوں میں ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں گھنٹے میں بھی ہے۔ مجھے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے اطلاع ملی تھی۔ آؤٹی وی اب بھی دور سے اس ہٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔“

”کیا ہم وہاں جا سکتے ہیں؟“ میں نے سوالیہ لہجہ میں اس کی طرف دیکھا۔  
”تمہارا مطلب ہے اس وقت؟“ واگنگ ڈن نے کہا ”میں نے اس کی خاموشی کے بعد خود ہی بولا ”اس وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ شام کا اندھرا لی حد ہے۔ وہ لوگ ہو شیار ہوں گے۔“

”بڑے کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے آؤٹی وی رات کے بعد کا وقت مناسب رہے گا۔“  
واگنگ ڈن کی بات مستعمل تھی اس لیے میں نے انتظار کیا ہی مناسب سمجھا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم نے کہا لیا۔ اس کے تقریباً دس منٹ بعد ٹیبل فون کی گھنٹی بجی۔  
واگنگ ڈن ہی نے ریسپونڈ کی۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک قیامی ہارن میں بات کرتا رہا تھا جس کا ایک لفظ بھی میرے لیے نہیں ہوا تھا اس نے ریسپونڈ کر دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے موبائل بڑی سنی فیز سکرین ہٹ تھی۔

”کوئی خاص بات؟“ میں نے سوالیہ لہجہ میں اس کی طرف دیکھا۔

”میرے اسی آؤٹی وی کا فون تھا جو ہٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ واگنگ ڈن نے کہا۔ اس نے کن انگریزوں سے جاگتی کی طرفوں پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا ”آدھا گھنٹہ پہلے شہر میں ایک چھوٹا سے ہوٹل کا مالک تین عورتوں کو لے کر وہاں پہنچا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے پہلے ہی سے رات کا کوئی پروگرام بنا رکھا تھا۔“

”گھڑ۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”اس سے ہمارے ہم میں آسانی ہو جائے گی۔ وہ غفلت میں ہوں گے اور ہم انہیں سمجھنے کا موقع نہیں دیں گے اور میرا خیال ہے کہ آؤٹی وی رات کا انتظار کرنے کے بجائے ہمیں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت محفل صحت پر ہوگی اور رنگ میں جھگڑا لڑنے کا یہ بہتر موقع ہو گا۔“

”میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا۔ ہم دس بجے ہال سے نکلیں گے۔“ واگنگ ڈن نے کہا ”میرا ایک آؤٹی وی پہلے ہی ہال موجود ہے۔ میں فون کر کے تمہارا وارڈ آؤٹی وی تیار کر لیتا ہوں۔“

”تین آؤٹی ویوں کی ضرورت نہیں۔ ایک وہاں موجود ہے ایک اور ہالوں۔ دو ہم ہیں۔ میرا خیال ہے ہم چار کال ہوں گے۔“

”جیسے تمہاری مرضی ماسٹر فانگ چمن بہت خطرناک آؤٹی

”واگنگ ڈن بولا۔“  
”پر اہمیت کو کہ کون کتنا خطرناک ہے۔ زیادہ آؤٹی ویوں کو لے جانا مناسب نہیں ہے۔ بہر حال ہم دس بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

”فانگ ہے ماسٹر۔“ واگنگ ڈن نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”میں اپنے کمرے میں آیا تو جاگتی بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا۔ میں نے ہاتھ روک میں جا کر کپڑے تبدیل کیے اور اپنا تجربہ بھی پہننے سے باز رہا۔ جب میں ہال میں آیا تو واگنگ ڈن وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ رات کے بعد آئے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

اور پھر فیک دس بجے ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے واگنگ ڈن نے ایک بھرا ہوا ہسپتال میرے ہاتھ میں تھا دیا تھا جسے میں نے جینز کی جپ میں رکھ لیا۔ جپ کانچ کی حدود سے روک پر آگئی اور تھوڑی ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک عمارت کے سامنے روک گئی۔ یہ شاید کوئی مارکیٹ وغیرہ تھی جو بند ہو چکی تھی۔ صرف کارنر کی ایک دکان کھلی ہوئی تھی۔ فیک ایک منٹ بعد ایک آؤٹی وی عمارت کی دوسری طرف سے نکل کر جپ کی طرف آیا اور پیجز سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور جپ حرکت میں آگئی۔

چہرے کے نقش سے وہ مجھ میں قیامی ہی لگتا تھا لیکن اس نے پیٹ شرت پہن رکھی تھی۔ میں روڈ پر تھوڑی ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد واگنگ ڈن نے جپ کو ایک ٹنگ سی ڈیلی روک پر اتار دیا۔ یہ روک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ کوئی دوسری جپ یا کار سی قریب سے گزر سکتی تھی۔ کسی بڑی گاڑی کے گزرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ روک کے دونوں طرف چٹائیں تھیں جن پر آگے ہوئے درختوں کی شاخیں روک کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ دائیں بائیں کی پہاڑیوں سے مختلف مقامات پر تین اور ٹنگ سے راستے اس روک سے آتے تھے۔ یہ دراصل پیڈل گھوڑے والوں کے لیے تھیں۔ تھے جو پہاڑیوں میں اندر روک تک پہنچنے کے لیے

تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد واگنگ ڈن نے جپ کی بجائے بجادیں اور اس کے ساتھ ہی رفتار بھی کم کر دی۔ کوئی تاریکی میں ایسے دشوار راستے پر گاڑی چلانا نہایت خطرناک تھا مگر واگنگ ڈن بڑے عمدہ انداز میں بہت جلدی رفتار سے جپ چلاتا رہا اور پھر اس نے جپ بائیں طرف ایک ایسے ہی راستے پر موڑ لی۔ دوسری روک سیدھی چلی گئی تھی۔

اس راستے پر تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے اس نے جپ روک کی اور انجین بند کر دیا۔ ہم تینوں جپ سے اتر آئے اور ایک چٹان پر چڑھنے لگے۔ وہ چٹان زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس کی دو کھلی طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر درختوں سے روشنی چھٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

”وہ روشنی ہماری منزل ہے۔“ واگنگ ڈن نے اشارہ کیا ”ہم اگر دوسری روک پر چلے رہے تو ہٹ کے سامنے والے رخ پر نکلے لیکن اس وقت ہم ہٹ کے عقبی رخ پر ہیں۔“

ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے اور پھر چٹان سے اترنے لگے۔ تاریکی میں چٹان بہت مشکل ہو رہا تھا۔ صبح کی بارش کی وجہ سے کہیں کہیں پتھروں بھی ہو رہی تھی۔ خلیب میں آنے کے بعد ہم دوسری چٹان پر چڑھنے لگے۔ یہ چٹان بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔ اوپر سے مسلح تھی جہاں وہ ہٹ بنا ہوا تھا۔ سامنے کے رخ پر تو کانچ کے آنے کے لیے باقاعدہ راستہ بنا ہوا تھا۔ کار بھی وہاں تک آ سکتی تھی۔ عقبی سمت میں چٹان کو کاٹ کر بیڑھیاں سی پٹائی تھی جس میں ہم ان بیڑھوں کے بجائے دوسرے راستے سے اوپر جا رہے تھے جو خاصا دشوار گزار تھا۔ واگنگ ڈن سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے میں اور آخر میں وہ قیامی تھا۔ چٹان پودوں کی وجہ سے چٹان پر چڑھنا کچھ اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ پودوں کی سرسراہٹ کی آواز سن نہ لی جائے۔

واگنگ ڈن ایک جگہ پر روک گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کوئی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چٹان درختوں کی وجہ سے ہٹ کی روشنی بھی ہماری نظروں سے مکمل طور پر اوجھل تھی۔ واگنگ ڈن اشارہ کرتا ہوا دائیں طرف بڑھنے لگا۔

ہٹ کی روشنی اب نظر آ رہی تھی۔ اس طرف دو کمروں کی کھڑکیاں تھیں اور دونوں میں روشنی ہو رہی تھی۔

”تمہارا وہ آؤٹی وی کہاں سے جو ہٹ کی نگرانی کر رہا تھا؟“ میں نے واگنگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”میں بھی معلوم کرتا ہوں۔“ واگنگ ڈن نے کہا اور چند منٹ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔

یہ آواز لومڑی سے ملنے جلتے ایک جانور کی تھی جو ان پہاڑیوں میں بکھرتا پایا جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دائیں طرف سے دسی سی آواز سنائی دی۔ واگنگ ڈن نے منہ سے ایک بار پھر وہ آواز نکالی اور اپنے سامنے کی طرف مڑ کر سرگوشی میں کچھ کہنے لگا۔ اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا اور دبے قدموں بائیں طرف چلتا ہوا لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اور واگنگ ڈن کچھ دیر تک وہاں کھڑے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے رہے پھر یہ طے ہوا کہ واگنگ ڈن اوپر سے چکر کاٹ کر کانچ کے سامنے والے رخ کی طرف چلا جائے اور میں من کو قابو کرنے کی کوشش کرے جو یقیناً اسی طرف ہو گا۔ میں نے کانچ کی عقبی سمت سے کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

واگنگ ڈن کے جانے کے دو منٹ بعد میں بھی دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ ان دونوں کمروں کی کھڑکیاں اب صاف نظر آ رہی تھیں۔ کھڑکیوں کے اندر کی طرف جھکے نیلے رنگ کے بارک ریڈی پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور ایک

کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گیا اور اندر جمائے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر دو سائے متحرک نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لیے یہ اندازہ لگا دشوار تھا کہ وہ مزاحیہ فانگ تھا یا کوئی اور۔

اچانک ہماری قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر تیزی سے چلتا ہوا پودوں کے پیچھے دھبک گیا۔ اس کے ٹھیک ایک سینکڑ بعد ایک دروازہ قامت آدمی کا بیچ کی دوسری طرف سے گھوم کر سامنے آیا۔ وہ سرگرمی کے شل لگا ہوا تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو کھڑکی سے آنے والی مدھم سی روشنی میں اس کے کندھے پر راتقل بھی نظر آئی۔ وہ محافظ تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اسے کسی بات کا شبہ ہوا تھا یا ویسے ہی پتھر لگا ہوا تھا۔ انہی تھیں کچھ ہی دیر بعد اس کے اس طرف آنے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ وہ ایک کھڑکی کے سامنے رک کر اندر جمائے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیابی ہوئی تھی۔ مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دوسری طرف سے ہوتا ہوا کالنج کے سامنے کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک منٹ اور انتظار کیا اور پھر اپنی کین گلاسے نکل کر دیسے قدموں پیتا ہوا اس مرتبہ دوسری کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہاں بھی کچھ دیکھی ہی صورت حال تھی۔ میں ابھی کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ کالنج کے سامنے کی طرف سے دھبکا مٹش کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا جیسے دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہوں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد فائز کی آواز سنائی دی۔

ان آوازوں سے مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وانگ ڈن اور محافظ کا کھڑا ہو گیا تھا لیکن وہ راتقل کے نہیں ہسپتال یا پورٹور کے فائز کی آواز تھی۔ فائز کی آواز کے ساتھ ہی کالنج کے اندر کھلبلی سی جھمکی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ دوسری طرف جا کر وانگ ڈن کی مدد کروں لیکن پھر میں نے دوسرے طریقے سے اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہسپتال میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دستے کی ضرب سے کھڑکی کا شیش توڑ دیا اور بڑی پھرتی سے اندر ہاتھ ڈال کر چٹنی کھول دی اور اس کے ساتھ ہی پردے کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے جھینچ دیا۔

کمرے میں ایک جوان عورت اور ایک آدمی تھا۔ عورت کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مرد بھی بے لباس تھا جو بڑی غلط میں چلتوں بیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے باہر فائز ہوا تھا اور اب میں نے کھڑکی توڑ دی تھی۔ عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بھی کرسی پر پڑے ہوئے پکڑوں کی طرف دوڑی تھی۔

فانگ چمن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے اندازہ

لگتا تھا کہ میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ فانگ چمن ہی تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور سہر پر پڑے ہوئے روالور کی طرف ایک طرف میں نے ہسپتال والا ہاتھ آگے بڑھا کر فائز کر دیا۔ کوئی فانگ چمن نہیں رہیوں کے قریب قائم رہ گئی اور وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھڑکی کی چوکت پر چڑھ گیا۔

”اوہ تم؟“ فانگ چمن نے مجھے پہچان لیا ”تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے کر آئی ہے۔“

”یہ تو آنے والے لمحات ہی بتا جس کے کہ موت کسی کی آتی ہے۔“ میں نے کہا اور کھڑکی کی چوکت پر کھڑے ہو کر اچانک ہی چلا نکلا گا دی۔

فانگ چمن نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ وہ غالباً مجھے باقوں پر روکنا چاہتا تھا لیکن میرا چلا نکلا گانے کا انداز بہت مختلف تھا۔ میں نے بائیں فانگ اندر کی طرف موڑ رکھی تھی۔ جبکہ دائیں فانگ بائیں سمت میں آگے کو نقل ہوئی تھی۔ میں نے چلا نکلا پورے قوت سے لگائی تھی۔ فانگ چمن کسی صورت میں بھی مجھے نہیں روک سکتا تھا۔ میری فلائنگ کلک پوری قوت سے اس کے کندھے پر لگی۔ اس کے منہ سے ”اوہ“ کی سی آواز نکلی اور وہ لڑکھانا ہوا اس لڑکی سے کھرا گیا جو کپڑے پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے خوف زدہ کی چیخ نکلی اور وہ دونوں صوفے پر گرے اور صوفہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

فانگ چمن کو کلک لگاتے ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور شیشے کے ٹاپ والی اس میز پر گرا جو کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور دو گلاس بھی رکے ہوئے تھے۔

چھانکے کی آواز سے میز کا شیش ٹوٹ گیا اور میں میز کے اندر اس طرح گرا کہ میری انگلیں اوپر تھیں اور سر بھی شیش ٹوٹنے کے بعد میز کے اندر ٹوٹ کر تارے سے گھرا گیا تھا۔ ایک لمحے کو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا گیا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ غفلت کا نتیجہ صرف موت ہی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔

شراب کی ایک بوتل میری گود میں گری تھی جس میں سے بنے والی شراب آگے سے میری جینز کو تر کر رہی تھی۔ شراب کی بوتلیں تنوں میں کھسکی جا رہی تھیں۔ میں نے جوتل اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور ٹوٹی ہوئی میز سے باہر نکل آیا۔ بائیں کرسی کے قریب شیش ٹکٹے سے کھال کٹ گئی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ کٹے پر بھی چوٹ لگی تھی لیکن یہ تکلیف قابل برداشت تھیں۔

ہسپتال میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ میں ہسپتال اٹھانے کے لیے بھاگی تھا کہ فانگ چمن گرے ہوئے صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔ میں ہسپتال کا خیال چھوڑ کر سیدھا رو ہوا تھا کہ فانگ چمن نے جوا نکلا گا دی۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے

باوجود اس کی کلک میرے بائیں بازو پر لگی اور میں کھڑے کھڑے پڑ گیا۔

فانگ چمن نے جس انداز سے کلک لگائی تھی اس سے مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ مارشل آرٹس کا ماہر تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے میں مزہ تو آتا لیکن مجھے محتاط رہنے کی ضرورت بھی تھی۔

باہر سے تو اٹھانے کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن دوسرے کمرے سے بھی کسی عورت کے چہنچہ اور دھبکا مٹش کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وانگ ڈن کا کوئی آدمی وہاں پہنچا تھا۔

فانگ چمن میرے سامنے اسٹائٹس میں کھڑا تھا۔ جبکہ صوفے کے پیچھے خرخر کا پتھر ہوئی وہ عورت ایک باہر چلا گیا پسپائی کی کوشش کر رہی تھی۔ فانگ چمن نے جھانکا دے کر سائڈ کلک لگنے کی کوشش کی جسے میں نے کالنج پر روکا اور پھر وہ بے درپے سائڈ کلک لگا رہا۔ میں نے اس کی ہر کلک کلائیوں پر روکی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس نے مجھے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور یہ پڑی ابھی ٹینک تھی کہ حریف کو اس طرح الجھائے رکھا جائے اور موقع پاتے ہی کاری ضرب لگا دی جائے۔ میں اس ٹینک کو سمجھ گیا تھا۔ میں اسے کوئی زوردار حملہ کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کرے، مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں دونوں پیروں پر اچھلا۔ اس کا خیال تھا کہ میں فلائنگ کلک لگاتے جا رہا ہوں لیکن میں نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع دینے کے بجائے ہر زینٹ پر نکلا دیا اور دوسرے چہرے زوردار اور ڈنڈاؤں سے کلک لگا دی۔ اس کا بائیں بازو اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ میری کلک اس کی بٹل میں لگی۔ وہ اس طرح اچھلا جسے بٹل بال کو کلک لگائی گئی ہو۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے بجائے ایک اور فرنٹ کلک لگا دیا۔ یہ کہ اس کی ناف سے ذرا نیچے لگی تھی۔ وہ ہلکا اٹھا۔

اسی دوران میں وہ لڑکی پاجامہ پہن چکی تھی۔ فلاؤز الٹا سیدھا پہنے ہوئے وہ باہر کی طرف دوڑی۔ اس لڑکی سے مجھے کوئی پر غاش نہیں تھی لیکن اس کا باہر نکلتا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اچھل کر اس کے راستے میں آیا۔ وہ ڈر کر رکتی ہوئی بیڑ پر جا گئی۔

باہر سے ایک باہر گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ راتقل کا فائز تھا اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ میں ایک لمحے کو اس طرف متوجہ ہوا تھا اور میری اس غفلت سے فانگ چمن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے کھڑکی پھیل کا دار کیا۔ یہ بڑے ٹینک ٹینک کا اسٹرائیک تھا۔ اس سے چھ اونچ مٹی کی گولٹ کی سلیب توڑی جا سکتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے آگے ہونے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں بڑی بھائی سے نیچے جھک گیا تھا۔ اس کا چوہ میرے کندھے پر لگا تو ضرور

لیکن ضرب زیادہ شدید ثابت نہیں ہوئی تھی۔ میں اگر نیچے نہ جھکا تو میرے کندھے کی ہڈی ٹوٹ سکتی تھی۔ نیچے بیٹھنے میں نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر نکالیں اور ایک فانگ آگے پھلار کر پھر کی طرح گھوم گیا۔ یہ ایک خطرناک سوئچ کلک تھی۔ اگر میرا پیر فانگ چمن کی فانگ کو چھو جاتا تو وہ پشت کے بل گرنا لگتا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل گیا تھا۔ میں نے اسی طرح تین بار سوئچ مار کر اسے گرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت پھرتلا ثابت ہوا تھا۔ ہر مرتبہ پچتا رہا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور فرنٹ کلک لگنے کی کوشش کی جسے فانگ چمن نے کالنج پر روکا اور اس کے ساتھ ہی گھوم کر ٹیک کلک لگا دی۔ ضرب میرے سینے پر لگی اور میں لڑکھانا پڑ گیا۔

فانگ چمن واقعی مارشل آرٹس تھا۔ اس کے ساتھ مقابلے میں مزہ آ رہا تھا اور میرے خیال میں وہ پہلا شخص تھا جو نہ صرف دھبکی سے برا مقابلہ کر رہا تھا بلکہ بہترین ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے چند کامیاب وار بھی کیے تھے لیکن اسے مزید موقع دینا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

فانگ چمن دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس نے فلائنگ کلک لگنے کے لیے چلا نکلا لگائی تھی۔ میں اس کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اس کے دونوں پیروں کو اسے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ہوا میں الٹی فلاؤز پکڑا کھاتا ہوا پشت کے بل بھدے سے اٹھنے پڑے صوفے پر گرا۔

فلائنگ کلک سے اس طرح پچتا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہزار میں کوئی ایک مارشل آرٹس ہی اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ میں نے فلائنگ کلک سے بچنے کی یہ ٹیکنیک اپنی ٹینک کے ابتدائی دنوں میں جنگل والے کیپ میں ماسٹر فانگ سو سے سیکھی تھی اور اپنے دفاع کے لیے کئی مرتبہ اسے استعمال کر چکا تھا۔

فانگ چمن صوفے سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا اور اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ بالآخر اسے بھی سنبھلنے کا موقع مل گیا لیکن اس مرتبہ میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔

باہر سے اب ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے نذر چج گیا ہو۔ دو عورتوں کی خوف زدہ چیخوں کے علاوہ اٹھانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وقت گزرنا جا رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کسی دوسرے کمرے میں موجود جی فانگ کو میرے ساتھیوں پر قابو پانے کا موقع نہ مل جائے۔ اس طرح بازی پلٹ سکتی تھی اس لیے میں اب جلد سے جلد فانگ چمن سے معاملہ طے کر لینا چاہتا تھا۔

فانگ چمن سے لڑائی میں اس مرتبہ میں اس لڑکی، بھول گیا تھا جو بیڑ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس دوران میں اس لڑکی کو موقع مل گیا۔ وہ بیڑ سے اٹھی اور جھپٹ کر بیڑ سائڈ ٹینک سے فانگ چمن کا

ریو اور اٹھا کر فائر کر دیا۔ اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن گولی میرے سر سے چند انچ اوپر سے گزرتی تھی۔ میں بڑی تیزی سے پلٹا اور وہاں اس آواز ہوا بند پر جا کر اس لڑکی کے منہ سے جھج نکلتی تھی۔ میرا ایک ہاتھ اس کے ریو اور والے ہاتھ پر پڑا تھا۔ جھٹکا لگنے ہی ریو اور اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر نیچے جا کر۔ میرا ہاتھ دوسری مرتبہ حرکت میں آیا۔ لڑکی کے منہ پر پڑنے والا تھپڑ اس قدر زور دار تھا کہ وہ دھج ہوئی ہوئی کبھی کی طرح بلبلاتا تھی۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔

میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فٹنگ چمن نے جھٹکا لگا دی۔ میں اس کے پیچھے دوڑ گیا۔ اتنی دیر کی لڑائی کے دوران میں وہ بری طرح جھجھکیا تھا اور اب وہ مارشل آرٹس کے قواعد و ضوابط اور تمام ٹیکنیکس کو بھول کر اوجھے جھجھکوں پر اتر آیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دوڑچ لیا اور انگوٹھوں سے میرا زخرا دبا لگا۔

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی کلا پیوں پر بٹا دیے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے خون نچک رہا تھا۔

اس لڑکی کا آنکھیں میرے کندھوں کے نیچے دہلی ہوئی تھیں اور وہ بھی اپنے آپ کو میرے پیچھے سے لٹکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنی ٹانگوں کو کھینچا تو مجھے بھی ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرے گلے پر فٹنگ چمن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹا دیے۔ اس کی دونوں کلا پیاں پکڑ کر اس کے سینے سے لگا دیں اور بازوؤں کی قوت سے اسے اوپر اٹھانے کے ساتھ ساتھ میں نے دونوں پیر بھی سمیٹ کر اس کے پیٹ پر جمادیاے اور اس طرح میں اسے سیدھا اوپر کی طرف اٹھا آ چلا گیا۔

میں نے فٹنگ چمن کو اپنے جسم سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھا لیا اور پھر پوری قوت سے اسے اچھال دیا۔ وہ وہاں تیرتا ہوا ٹوٹی ہوئی میز پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی خٹناک بھی چمی کر کے میں گونج گئی تھی۔

اپنے آپ کو فٹنگ چمن کی گرفت سے چھڑانے اور اسے اچھالنے میں مجھے دانتوں پسینہ آیا۔ اس کی چیخ سننے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔

کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی ٹیبل کا شیش میرے کرنے کی وجہ سے پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ فٹنگ چمن پیٹ کے بل اس میز پر گرا تھا۔ اس کے بوجھ سے میز کا چوکھا ایک طرف سے ٹوٹ گیا اور سامنے کی طرف چوکھنے میں پھنسا ہوا نوکدار شیش اس کے حلقوم

میں بیست ہو گیا اور خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ فٹنگ چمن بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے اس طرح تڑپنے سے شیش کی دھار سے اس کے زخروں کو کچھ اور بھی اوجھڑا۔

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ میں نے جھک کر فٹنگ چمن کو کندھوں سے پکڑ لیا اور پیچھے کھینچنے لگا کہ اس کا جسم میز کے ٹوٹے ہوئے چوکھنے میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

لڑکی چیختی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی۔ میں نے فٹنگ چمن کو چھوڑ دیا اور لڑکی کے پیچھے لپکا۔ دروازے کے قریب میں اسے پکڑ لیا لیکن وہ پھلکی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا۔

لڑکی باہر نکلتے ہی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکلتی تھی۔ میں بھی اس چیز سے ٹھوکر کھا کر گرے کرتے پھا تھا۔

وہ اس گمن میں کی لاش تھی جسے میں نے کانچ کے عقب میں کھڑی کے قریب دیکھا تھا۔ وہ غالباً واٹنگ ڈن کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

برآمدے کی دائیں طرف کچھ فاصلے پر دھینگا مشتکی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں اس طرف لپکا۔ برآمدے کے لبب کی مدد میں دو شنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ فٹنگ چمن فٹنگ اور ایک اور آدمی واٹنگ ڈن کی ٹھکانی کر رہے تھے۔ بری طرح پٹنے کے باوجود واٹنگ ڈن ان کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔

میں دوڑتا ہوا قریب پہنچ کر فضا میں اچھلا۔ میں جی فٹنگ پر فلائنگ کلک لگانا چاہتا تھا۔ جی فٹنگ نے میرے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بھی فضا میں اچھل گیا۔ ہم دونوں نے بیک وقت فلائنگ کلک لگائی تھی جس کے نتیجے میں ہم دونوں کے پیر آپس میں کھرا گئے اور دونوں ہی جھٹکا کھا کر ایک دوسرے سے دور جا گئے۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا جی فٹنگ نے اٹھ کر ایک طرف دوڑنا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا مگر وہ تاریکی میں درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میں اس کے قدموں کی آواز پر اس کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر اس کے قدموں کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔ میں تاریکی میں کھڑا دھرا دھرا ٹھوکر رہا لیکن نہ ہی جی فٹنگ کے قدموں کی آواز سنائی دی اور نہ ہی وہ نظر آیا۔

اور پھر کار کا آجین اشارت ہونے کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے اس طرف دوڑنا لگا دی۔ میں اس مطلع جگہ پر پہنچ گیا جہاں دو کاریں کھڑی تھیں۔ ایک کار کی۔ ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف لپکی۔ میں اگر اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو کچھ ناگہان کار پکڑ کاٹی ہوئی شیب کی طرف جانے والے راستے پر مزگنی اور بندھن سے ٹکرائی ہوئی گولی کی طرح دوڑتی ہوئی دور ہوئی چلی گئی۔ میں اس کی عقبی سرخ بنیاں دیکھتا

میں قریب ہی دوسری کار کھڑی تھی لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ ڈرائیونگ نہیں جانتا تھا۔ میں گمراہ سانس لے کر رہ گیا۔ جی فٹنگ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے ٹکرائی تھا۔

میں کانچ کی طرف آیا جہاں واٹنگ ڈن دوسرے محض کی پائی کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے دوچار ٹھوکریں رسید کر دیں اور اسے چھینے ہوئے کانچ کے برآمدے میں لے آئے۔

ایک کمرے میں نیم عرائس میں دو جوان اور خوب صورت لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹی ٹھوکر کھانے رہی تھیں۔ خوف سے ان کے چہرے بالکل سفید ہو رہے تھے۔ وہ میری لڑکی نظر نہیں آئی جو فٹنگ چمن والے کمرے سے بھاگی تھی۔ میں اس کمرے سے باہر گیا۔ واٹنگ ڈن برآمدے میں اس محض کو رسی باندھ رہا تھا۔

”وہ میری لڑکی کہاں گئی اور تمہارے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟“ میں نے واٹنگ ڈن سے پوچھا۔

”میرا ایک آدمی تو اس لڑکی کے پیچھے گیا ہے جو اس طرف بھاگی ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور پھر بولا ”اور میرا دوسرا آدمی۔“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے ایک کمرے میں کھس گیا۔

کمرے میں اتنی سی سلاخ تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں اچھی خاصی دھینگا مشتکی ہوئی تھی اور دائیں طرف واٹنگ ڈن کے اس ٹوٹی کی لاش پڑی ہوئی تھی جو شرے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات چمے جمے ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی گئی تھی۔

”یہ محض جی فٹنگ کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا اور۔“

واٹنگ ڈن جملہ کھل نہیں کر سکا۔ باہر سے ایک خوفناک نوازی جی سنائی دی جو بند دروازے میں سے دھنچتی چلی گئی۔

”وہ بعد واٹنگ ڈن کا آدمی بھی واپس آیا۔“ اس نے واٹنگ ڈن سے قہقہے زبان میں کہا کہ اور واٹنگ ڈن مجھے اس کا مطلب سمجھانے لگا۔

”وہ لڑکی یہاں سے بھاگی تھی اس طرف گمرے کھڈ میں گر پڑی۔ وہ چیخ اسی کی تھی۔ میرا خیال ہے وہ زندہ نہیں بچی ہوگی۔“

صورت حال بڑی سنگین تھی۔ یہاں تین لاشیں پڑی تھیں۔ ایک فٹنگ چمن کی دوسری ان کے گمن میں کی اور تیسری واٹنگ ڈن کے ساتھی کی۔ ایک آدمی اور دو عورتیں زندہ تھیں۔ یہ طوائفیں تھیں جنہیں جی فٹنگ وغیرہ کا بل بھلانے کے لیے لایا گیا تھا۔ ان کے لاشوں والا وہی آدمی تھا جو برآمدے میں بندھا ہوا تھا۔ تیسری لڑکی جان بچانے کے لیے بھاگ گئی تھی اور تاریکی میں کسی کھڈ میں

گر غالباً وہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ واٹنگ ڈن نے ان دونوں لڑکیوں کو بھی باندھ کر کمرے میں ڈال دیا جبکہ اس آدمی کو برآمدے میں پڑا رہنے دیا گیا۔ واٹنگ ڈن نے اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کر اس کار میں ڈال دی جو کانچ کے سامنے کھڑی تھی۔

اپنی جیب کے قریب پہنچ کر لاش کو جیب میں ڈال دیا گیا۔ واٹنگ ڈن اس کار کو چلا تا ہوا پلندے پر لے گیا۔ دوسری طرف گمرا کھڈ تھا۔ اس نے کار سے چھٹا لگا دی۔ کار چٹان کی دوسری طرف لڑھکتی چلی گئی اور پھر زوردار دھماکا سنائی دیا۔

ہم جیب میں بیٹھ گئے۔ واٹنگ ڈن نے جیب کا رخ موڑا۔ ہیڈ لائٹس روشن کیں اور اسے تیز رفتاری سے مین روڈ کی طرف دوڑا دیا۔



واٹنگ ڈن مجھے مین روڈ پر چھوڑنے کے بعد اپنے ساتھی کی لاش رات ہی کو شرے سے کٹی سیل دور ایک چھوٹی سی قبائلی بستی کی طرف لے گیا تھا۔ قتل و قہیلہ کیونکر چرہ بری سرحد کے قریب ہائے سامنے نامی قصبے اور اس کے اطراف میں آباد تھا لیکن اس قبیلے کے کئی چھوٹے چھوٹے گروہ مختلف علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ سائیں میں بھی کئی چھوٹی چھوٹی بشتیاں تھیں اور پٹی فٹنگ کے ہاتھوں مرنے والے کا تعلق چند گھنٹوں پر مشتمل ایسی ہی ایک چھوٹی سی بستی سے تھا۔ واٹنگ ڈن کی اپنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ لڑائی میں اس کی بھی خوب پٹائی ہوئی تھی لیکن وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا کہ فٹنگ چمن کے گروہ کے آدمی یا پولیس ہمارے کانچ کی طرف متوجہ ہو سکے اس لیے وہ مجھے مین روڈ پر ہی اتار کر جب کو سیدھا نواحی علاقے کی طرف نکال لے گیا تھا۔

حالت تو میری بھی اچھی نہیں تھی۔ فٹنگ چمن ہم بلہ دشمن ثابت ہوا تھا۔ اس کی عمر چونتیس کے لگ بھگ تھی۔ اس میں طاقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ اس طاقت کو استعمال کرنا بھی جانتا تھا۔ اس سے مقابلے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا اگر ٹوٹی ہوئی میز پر گرنے شیش اس کے حلق میں نہ بھی پھنس جاتا تو میں اسے بچھا ڈیتا۔ کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس پر تحسک اور جھجھکاہٹ سوار ہونے لگی تھی اور جب لڑائی میں کسی پر تحسک اور جھجھکاہٹ سوار ہو جائے تو وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتا۔

میرا اصل ٹارگٹ تو جی فٹنگ تھا لیکن اتفاق سے وہاں فٹنگ چمن بھی موجود تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہاتھ آجاتا تو میں اس سے بہت سی معلومات حاصل کر سکتا تھا لیکن جی فٹنگ حسب عادت جان بچا کر فرار ہو گیا تھا اور فٹنگ چمن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ فٹنگ چمن کی موت کا انکشاف ہوتے ہی یہاں ایک طوفان

انہ کھڑا ہوگا۔ فانگ پہن گولڈن ٹرائی اینگل کے بے تاج بادشاہ  
جنرل کھوراث کا آدمی تھا۔ ان کا ایک اور آدمی شانگ پہلے سی  
میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور اب میرے ہی ہاتھوں فانگ پہن کی  
سوت پر وہ لوگ خاموش نہیں بیٹھیں گے اور جب بازی بہت بڑی  
ہو تو کسی کے خاموش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ٹرائی کے دوران میں شیشے کے ٹاپ والی میز پر گرنے سے  
میرے ہاتھیں بازو پر کھینچے کے قریب سے کھال کٹ گئی تھی۔ اس  
وقت گرم جوئی میں تو کچھ زیادہ احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب  
تکلیف بڑھ گئی تھی۔ زخم اگرچہ بہت معمولی سا تھا لیکن آپ  
جانتے ہیں کہ چھوٹے زخم زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔ کندھے کی ہڈی  
میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

میری یہ حالت دیکھ کر لوانہ اور اسی میڈیکل کٹ نکال لایا تھا۔  
جاگتی نے میری شرٹ اتار دی۔ پہلے گرم پانی سے کھنک کا زخم صاف  
کر کے زرنک کردی اور پھر نیالے سے رنگ کی ایک کریم سے  
میرے کندھے پر مالش کرنے لگی۔ لوانہ نے بتایا تھا کہ یہ کریم بڑی  
بونیوں سے تیار کی گئی ہے اور اندرونی چوڑوں کے لیے اس کیمر کی  
حیثیت رکھتی ہے۔

جاگتی میرے کندھے پر مالش کر رہی تھی اور مجھ پر عجیب سی  
کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ تھانی نے بھی کئی مرتبہ اس طرح میری  
مالش کی تھی لیکن میں نے کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی  
لیکن جاگتی کے گداز ہاتھوں کا لمس میرے پورے بدن میں سنسنی  
سی پھیلا رہا تھا۔ دماغ پر غوغوی سی طاری ہونے لگی۔ جاگتی نے بھی  
شاید میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی پھیلنے  
لگی۔ کندھے پر مالش کرتے ہوئے وہ میرے اوپر ہلکی جاری تھی پھر  
مجھے اپنی گردن پر دائیں طرف انگار سا چھوٹا ہوا محسوس ہوا۔

جاگتی کے سکتے ہوئے ہونٹ میری گردن کو چھو رہے تھے۔ میں  
ایک دم جیسے ہوش میں آگیا اور ایک جھٹکے سے سیدھا ہونٹ گیا۔ جاگتی  
کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں میں سرخ  
ڈورے تیر رہے تھے۔

”اگر میرے کندھے کی مالش ہو چکی ہو تو میں شرٹ پہن  
لوں؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ یہ کہنے ہوئے جاگتی کے منہ سے بے اختیار گھرا  
سانس نکل گیا تھا۔

میں نے شرٹ پہنی اور کندھے کو آہستہ آہستہ حرکت دینے  
لگا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ چھ بج چکا تھا۔ لوانہ شاید صورت حال کا  
کسی حد تک اندازہ لگایا تھا اس لیے وہ سب مٹھیں گن سنبھالے  
ایک کرسی پر چوسک بیٹھا ہوا تھا۔ کسی گڑبڑ کا شبہ مجھے بھی تھا۔  
وانگ ڈن، تھالوب کا آدمی تھا اور تھالوب اس علاقے کی معروف  
شخصیت تھا۔ لوگ نہ صرف ایسی شخصیات کو اچھی طرح جانتے ہیں  
بلکہ ان کے خاص ملازمین کو بھی جانتے اور پہچانتے ہیں۔ فانگ

پہن بھی وانگ ڈن کو جانتا ہو گا لیکن فانگ پہن ختم ہو چکا تھا۔  
فانگ یہ نہیں جانتا تھا۔ محافظ بھی مارا گیا تھا لیکن وہ طواغیت  
اور ایک آدمی کو ہم نے باندھ کر وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے وانگ ڈن  
ہی نے بتایا تھا کہ وہ آدمی ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک ہے۔  
عیاش لوگوں کو لڑکیوں کی چلائی کا کمروہ دھندا بھی کرتا ہے۔  
مختص یقیناً وانگ ڈن کو پہچانتا ہو گا اور ہو سکتا ہے ان لڑکیوں میں  
سے بھی کوئی اسے جانتی ہو۔ ایسی صورت میں یہ راز فاش ہو کر  
تھا کہ حملہ آوروں میں وانگ ڈن بھی تھا اور اس طرح یہ کاپی  
پولیس یا فانگ پہن کے آدمیوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا لیکن  
یہ اطمینان تھا کہ کم از کم رات میں چھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوا  
ہے صبح ہی ہو گا لیکن احتیاط کا دامن بھر حال ہاتھ سے نہیں بھڑا  
جا سکتا تھا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ دن چڑھنے سے ذرا پہلے میں  
صوفے پر بیٹھے بیٹھے اور گھمکے۔ مجھے نہ تو جاگتی نے دکھایا اور نہ ہی لوانہ  
نے میں سے خبر سواتا اور پھر کسی قسم کی غرابہٹ کی آواز نہ سن  
میری آنکھ کھل گئی۔

وہ دراصل وانگ ڈن کی جپ کے انجن کی آواز تھی جو ابھی  
ابھی کانچ کے سامنے آکر رہی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف  
دیکھا۔ دن کے گیارہ بجتے والے تھے۔ تھوڑی سی دیر بعد وانگ ڈن  
اندرو داخل ہوا۔ میں اسے بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کر ہاتھ  
دوم میں گھس گیا اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے پھینٹے مارنے لگا۔ ہاتھیں  
بازو کو حرکت دیتے ہوئے کندھے میں معمولی سی تکلیف ہو رہی  
تھی۔

میں ہال میں واپس آیا تو وانگ ڈن کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا  
تھا۔ اس کے چہرے پر محض کے آثار نمایاں تھے۔ لوانہ نے چائے کا  
ایک کپ میرے سامنے بھی دکھ دیا۔ جاگتی اس وقت کمرے میں  
تھی۔

وانگ ڈن بتا رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش کے کمرات  
کے آخری پر قبر قبلی بستی میں پہنچ گیا تھا۔ صبح سویرے اس کی تدفین  
بھی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اسے کچھ دیر وہاں رکنا پڑا تھا۔ میں نے  
مناسب الفاظ میں قبائلی شخص کی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور  
اس کے بعد وانگ ڈن اصل موضوع پر آگیا۔

”میں صبح نو بجے شرٹ پہنچ گیا تھا اور اس وقت تمہارے لیے وہ  
اہم خبریں ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا ”جلی خیر تو یہ ہے کہ فانگ پہن کے  
قتل کی خبر نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا دیا ہے۔ کانچ سے  
پولیس کو اس کے گمن مین اور اس آدمی کی لاش بھی لی ہے جسے ہم  
نے باندھ کر برآمدے میں ڈال دیا تھا۔ کانچ سے کچھ دور ایک  
گھر کے کندھے سے اس لڑکی کی لاش بھی مل گئی جو جان بچانے کے لیے  
بھاگی تھی لیکن وہ دو لڑکیاں غائب ہیں جنہیں باندھ کر کمرے میں  
ڈال دیا گیا تھا۔“

میرے لیے یہ اطلاع واقعی حیران کن تھی۔ وہ لڑکیاں کہاں  
تھیں اور اس آدمی کو کس نے ہلاک کیا تھا۔

”جس آدمی کو ہم نے باندھ کر ڈالا تھا وہ خوف اور سوری سے  
غیر کمرہ ہے۔ اسے اچھی خاصی مار بھی لگائی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے  
کوئی اندرونی چوٹ بھی اس کی موت کا باعث بنی ہو۔ اس کی لاش تو  
دیے ہی بندھی ہوئی ملی ہے لیکن مجھے حیرت ہے وہ دونوں لڑکیاں  
کہاں غائب ہو گئیں۔“

”ہو سکتا ہے کسی لڑکی کو باندھنے میں رسی کی کوئی گرہ ڈھیلی رہ  
گئی ہو اور وہ اپنی بندش کھولنے میں کامیاب ہو گئی ہو اور اس نے  
”مری ہو“ کہی ہو کھول دیا ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے“ وانگ ڈن بولا ”لیکن حیرت اس بات پر ہے  
کہ وہ غائب کہاں ہو گئیں۔ مجھے شبہ ہے کہ یا تو صبح سویرے وہاں  
کوئی آیا تھا جو ان عورتوں کو چھڑا کر لے گیا یا پھر تمہاری بات  
درست ہو سکتی ہے کہ انہوں نے کسی طرح اپنی بندش کھول لی  
تھیں اور جان کے خوف سے کہیں روپوش ہو گئی ہیں۔ پولیس کو  
اس کانچ میں خواتین کے لباس کے کچھ حصے بھی ملے ہیں جس سے  
پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ رات کو یہاں خواتین کے علاوہ کچھ  
اور لوگ بھی رنگ ریلیاں مٹا رہے تھے۔ ان میں یا تو انہیں میں کسی  
بات پر مجبورا ہو گیا یا پھر سے کوئی اس کانچ پر حملہ آور ہوا۔  
بہر حال پولیس بھی ان عورتوں کی تلاش میں ہے۔ پولیس نے اس  
کانچ اور اس کے آس پاس کے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا  
ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے  
لگا ”فانگ پہن گولڈن ٹرائی اینگل کے حوالے سے اس علاقے میں  
بہت بڑا نام ہے۔ علاقے کا کچھ بچہ جانتا ہے کہ وہ کون تھا۔ اس کے  
قتل کی اطلاع صبح ہی شہر پہنچی تھی اور پورے شہر میں خوف و  
ہراس پھیل گیا ہے۔ شہر کی بیشتر کامیں بند ہیں کیونکہ لوگ جانتے  
ہیں کہ سین ٹونگ اور جنرل کھوراث اس قتل پر خاموش نہیں  
بیٹھیں گے اور ہنگامہ ضرور ہوگا۔“

”اور دوسری خبر؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف  
دیکھا۔

”جی فانگ گزشتہ رات جس کام میں فراہم ہوا تھا وہ شمال میں  
گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر  
ایک کھنڈ میں ہوئی ملی ہے۔“ وانگ ڈن نے کہا اور چند لمحوں کی  
غلامی کے بعد بولا ”گزشتہ رات میں اپنے دوسرے آدمی کو شہر  
میں ہی چھوڑ دیا تھا اور اسے ہدایت کر دی تھی کہ دوسرے آدمیوں  
کو ساتھ لے کر جی فانگ کو تلاش کریں۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ گولڈن  
ٹرائی اینگل کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے گا اس لیے میں  
نے اپنے آدمیوں کو اس طرف زیادہ توجہ دینے کی ہدایت کی تھی۔“  
”وہ گاڑی کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔“ میں نے پوچھا ”یہ  
کیہ یقین کر لیا گیا کہ وہ جی فانگ ہی کی گاڑی تھی؟“

”وہ گاڑی دراصل فانگ پہن کی ہے اور سب ہی لوگ اسے  
پہچانتے ہیں۔“ وانگ ڈن نے کہا ”اس گاڑی کا کھنڈ میں گرنا کسی  
حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ کار اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے  
لیکن کار کے اندر یا اس کے آس پاس کہیں بھی خون کے جھبے یا  
ایسے نشان نہیں ملے جس سے ثابت ہو کہ کار میں کوئی موجود تھا۔  
اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہمیں یا پولیس کو غلط راستے پر  
ڈالنے کے لیے کار کو کھنڈ میں دھکیل دیا گیا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جی فانگ اس کار کو کھنڈ میں دھکیل کر  
گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف فرار ہو چکا ہے۔ ویسے یہ بدنام زمانہ  
شہری گھون مہماں سے کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف نو گھو میٹر! وانگ ڈن نے جواب دیا ”یہاں سے  
تقریباً چار گھو میٹر آگے ایک دور راہ ہے جہاں سے ایک راستہ گولڈن  
ٹرائی اینگل اور دوسرا مائے سائے کی طرف جاتا ہے۔ اس  
دور راہ سے مائے سائے بھی تقریباً اتنا ہی ہے جتنا گولڈن ٹرائی  
اینگل۔ ویسے اوپر جا کر مائے سائے کی سرحد بھی سنری گھون سے  
ملتی ہے اور اس طرف کا سارا علاقہ سردار تھالوب کی راجہ صانی  
میں شامل ہے۔ اس کے قبیلے کے لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں کی  
صورت میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔“

”تو تمہارے خیال میں جی فانگ کسی جگہ سے بھی گولڈن ٹرائی  
اینگل میں داخل ہو سکتا ہے۔“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی  
طرف دیکھا۔

”وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔“ وانگ ڈن نے جواب دیا  
”یہ بڑا خطرناک علاقہ ہے۔ جنرل کھوراث کے آدمیوں نے جبکہ جبکہ  
خفیہ ٹھکانے بنا رکھے ہیں جہاں سے وہ ان راستوں کی نگرانی کرتے  
رہتے ہیں۔ اس طرح اکیلے شہری گھون میں داخل ہونے کی کوشش  
کرنے والوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ ان کے اپنے آدمیوں کی  
آمدورفت کے لیے چند خفیہ راستے مخصوص ہیں اور ان راستوں کی  
بھی نگرانی ہوتی ہے۔ کوئی اجنبی ان خفیہ راستوں کو تلاش نہیں  
کر سکتا۔“

”ایسی صورت حال میں ایک شبہ ذہن میں ابھرتا ہے۔“ میں  
نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”ہو سکتا ہے چنانچہ سائیں سے  
آگے ان کا کوئی خفیہ ٹھکانا بھی ہو جس کے بارے میں فانگ پہن  
نے جی فانگ کو بتایا ہو اور جی فانگ اسی طرف گیا ہو۔“  
”مجھے بھی یہی شبہ ہے۔“ وانگ ڈن نے کہا ”بہر حال میرے  
آدمی تلاش میں ہیں۔ جیسے ہی پتا چلا وہ فوراً اطلاع دیں گے۔“  
”تمہارے خیال میں فانگ پہن کے قتل کی خبر گولڈن ٹرائی  
اینگل پہنچی گئی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً۔“ وانگ ڈن نے کہا ”لیکن ابھی تک اس طرف سے  
کسی دور عمل کا اشارہ نہیں ملا۔ تاہم یہاں کی پولیس بڑی سرگرم نظر  
آ رہی ہے۔“



پر اس کا راز کھل گیا ہو اور دارا نے اس سے ہمارے بارے میں پوچھنے کی کوشش میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو یا ممکن ہے وہ رات کو واقعی دارا کے ساتھ ہو اور اسے تھائی وغیرہ کو فون کرنے کا موقع نہ مل سکا ہو۔ اور بھی کئی باتیں ہو سکتی تھیں۔

جاگتی بھی رگولی کے بارے میں سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ ہم دونوں اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ باہر کا دروازہ ٹھکناٹا گیا۔

وہ لوہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

”تم تیار ہو جاؤ ماسٹر۔ میں ناشتا بنا دیتا ہوں۔“ وانگ ڈن تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ناشتا کرتے ہی نکل جانا ہے۔“ لوہا نے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو جاگتی بھی میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ ”میں بھی چلوں گی تم لوگوں کے ساتھ۔“ جاگتی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔

اس وقت سات بج رہے تھے۔ جاگتی آگے جھکنے بعد تیار ہو کر باہر آئی تھی۔ اس نے اس وقت بھی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھیں۔ بیروں میں جو گرز تھے اسی وقت وانگ ڈن بھی پر آدھے والے دروازے سے اندر داخل ہوا اور بڑی گہری نظروں سے جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں انہیں جھوڑ کر کمرے میں گھس گیا۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلے تھے۔ وانگ ڈن نے جاگتی کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنا ہسٹل جاگتی کو دے دیا ہے۔ اس نے کمر پر چلون کی بیٹ میں اڑس لیا۔ میرے پاس اپنا خیر موجود تھا جو چری فیتے سے پڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ وانگ ڈن نے جینی سائنس آٹومٹک راٹھل بھی جیب میں رکھ لی تھی اور فانگ چن کا وہ رپوالور بھی رکھ لیا تھا جو گزشتہ رات ہم نے اس کا بیج سے اٹھایا تھا۔

شمال کی طرف جانے والی مین روڈ پر تقریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وانگ ڈن نے جیب سڑک سے اتار کر ایک چٹان کے پیچھے درختوں کے نیچے روک کر انجن بند کیا اور ہم نیچے اتر آئے۔

یہی سڑک آگے سیدھی گولڈن ٹرائی ایجنسی کی طرف چلی گئی تھی۔ بدنام زمانہ سنری ٹخنوں، پکینے کے لیے غیر فیکل سیاحوں کی گڈیاں بھی اس سڑک پر سڑکتے ہوئے دیکھی جاسکتی تھیں۔

وانگ ڈن نے راٹھل بند کر کے پر لٹائی اور رپوالور مجھے دے دیا۔ میں نے بھی رپوالور جاگتی کی طرح کمر پر چلون کی بیٹ میں اڑس لیا اور ہم سڑک سے اتر کر پہاڑیوں کی طرف جانے والے راستے پر چلے گئے۔

تنگ کی چمڈنڈی گھنٹی جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ قد آدم پودوں میں راستہ بنا دھواں ثابت ہو رہا تھا۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ

رہے تھے، راستہ مزید دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ وانگ ڈن نے ٹھیکس کہا تھا۔ رات کی تاریکی میں تو ایسے راستے پر سڑک موت کا دعوت دینے کے مترادف تھا۔

جنگل اس طرف گھٹا اور چھان تھا کہ سورج کی کرنیں نہیں تک پہنچتے تھیں کاسیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ اونچے نیچے راستوں پر چلے ہوئے جاگتی کو کئی مرتبہ ٹھوکر لگی تھی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر شیشیل سنبھل کر چل رہی تھی۔ وانگ ڈن ہم سے آگے تھا۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ ان پہاڑوں میں ایسے ایسے راستے ہیں کہ سرحد پار غیر قانونی آمدورفت کو روکنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

”اس کا بیج تک پہنچنے کا ایک آسان راستہ بھی ہے جس پر کار بھی چل سکتی ہے۔“ وانگ ڈن بتا رہا تھا۔ ”لیکن اس طرف سے جانا خطرناک ہو گا۔ ہم کسی کی بھی نظروں میں آسکتے تھے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ کانچ سے روٹھی سے پرل آٹھ بجے کے قریب میں نے ایک پار پھر تھائی کو فون کیا تھا۔ رگولی اس وقت تک بھی گھر نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ میں نے وانگ ڈن سے سردار خطاب کا پچانگ رائے کا فون نمبر پوچھ کر تھائی کو بتا دیا تھا کہ وہ میرے حوالے سے اس سے بات کرے۔ محالوب ان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

ہم تقریباً دو گھنٹوں تک اس چھان پہاڑی جنگل میں چلے رہے۔ میں نے کئی مرتبہ جاگتی کی طرف دیکھا تھا اور وہ ہر مرتبہ مسکرا کر یہ آؤ دینا جانتی تھی کہ وہ کھلی ہانک میں حلالہ اس کے چہرے پر چھٹن کے آثار نمایاں تھے۔

بالآخر ہم ایک اونچی جگہ پر روک گئے۔ وہاں سے زیب میں ایک خوب صورت کانچ کا ایک قطر نظر آ رہا تھا جبکہ اس کا شیئر حصہ گھنے درختوں میں چھپا ہوا تھا۔

اب ہم بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم تینوں نے اپنا اپنا اسلحہ ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ چھان اور قد آدم پودوں کی وجہ سے ہم کانچ میں موجود کسی شخص کی نظروں میں تو نہیں آسکتے تھے لیکن چلنے سے پودوں کی سرسراہٹ ہمارا راز کھول سکتی تھی اس لیے ہم بہت محتاط ہو کر چل رہے تھے۔

کانچ کے تقریباً مین گز قریب پہنچ کر ہم ایک بار پھر رک گئے۔ میں محتاط نظروں سے کانچ کی طرف دیکھنے لگا۔ کانچ کے سامنے کا رخ ہماری طرف تھا۔ پر آدھے میں دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ہی منٹ بعد میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

جی فانگ ایک آدمی اور آدمی کے ساتھ اندر سے نکل کر آدھے میں آیا۔ وہ آدمی غالباً اس کانچ کا مگران تھا۔ جی فانگ کے اشارے پر اس نے دونوں کرسیاں اٹھا کر کھلی جگہ گھاس پر رکھ دیں اور وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جی فانگ نے دوسرے آدمی کی کسی بات پر براؤ زوردار وقعر لگایا تھا۔

وانگ ڈن نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ ہم دونوں چند قدم بہت محتاط انداز میں چلتے رہے پھر پودوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئے۔ جی فانگ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا لیکن میں نے اسے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع نہیں دیا۔

دونوں ہمارے اسلحے کی زبردستی تھے۔

”اب تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں جی فانگ!“ میں نے اس کے چہرے پر نظرسن جاتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رپوالور کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔ ”میں نے کہا تھا کہ وہ دنیا کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ آج تم قاپو آہی گئے لیکن میں تمہیں گولی نہیں ماموں گا۔ تم سے تو بڑا لہجہ بڑا حساب کرنا ہے۔ میں تمہیں سکا سکا کارمادوں گا۔ تمہارے بعد کم اور دارا کی باری آئے گی۔“

”میں تمہارا پیچھا دو دو جہان!“ یہ گوئی ہوئی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ دارا کی آواز کو میں کس طرح بھول سکتا تھا۔ میں تیزی سے آواز کی سمت گھوم گیا۔ دارا نے جاگتی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہسٹل کی نال جاگتی کی کھنٹی سے لگی ہوئی تھی۔ جاگتی کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار تھے۔ ہم جاگتی کو پودوں میں چھوڑ کر آئے تھے تاکہ وہ کسی ابرہمنی میں ہمیں تحفظ فراہم کر سکے لیکن وہ خود ہی شکار ہو گئی تھی۔ یہاں دارا کی موجودگی بھی میرے لیے شدید جرت کا باعث بنی تھی۔

”رپوالور پیچھا دو اور اسے اس آدمی سے بھی کھوکھرا کر اٹھل پکڑ دے۔“ دارا کی کوئی بھی ہوئی آواز سنائی دی ”اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو اس لڑکی ڈاکٹر کا بھیجا تو اسی دن کا۔ تم دونوں بھی ہمارے طرف سے گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے یقیناً نہیں آتا تو اپنے اطراف میں دیکھ لو۔“

اور پھر میں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ایک طرف کم تھا جو اونچے پودوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رپوالور تھا۔ دوسری طرف ایک آدمی سامنے آیا تھا۔ وہ میرے لیے ابھنی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہسٹل تھا اور جو ہتھی کانچ کے اندر سے نکل کر آدھے میں آئی تھی اسے دیکھ کر تو میرا دل گھوم گیا تھا۔

وہ رگولی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ اور ہاتھوں میں آٹومٹک راٹھل تھی جس کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے وانگ ڈن کو اشارہ کیا۔ اس نے راٹھل نیچے پکڑ لیا۔ میں نے بھی رپوالور نیچے پکڑ لیا اور ٹھیک اسی وقت جی فانگ نے ہنسی تیزی سے آگے بڑھ کر میری کھنٹی پر گھونسا مار دیا۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ میرا دماغ سمجھتا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے نیلا سیل پڑ گیا۔ میں اس پر رقص کرنے لگیں۔

میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکا تھا لیکن اب ہم مکمل طور پر اس دشمن کے رحم و کرم پر تھے جو میرے خون کا

پیدا تھا اور اس سے رحم کی توقع بالکل نہیں کی جاسکتی تھی۔ موت۔ بھیاک موت مجھے اپنے چاروں طرف ناچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ موت کے ہر کارے ہی تھے جو ہمیں اسلحے کی زد میں لے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کی معمولی سی حرکت ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی تھی۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس کے بال اب بھی دارا کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور ہسٹل کی نال اس کی کھنٹی سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔

وانگ ڈن میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف بالکل نہیں تھا۔ اس کے برعکس آنکھوں میں جیب سی چٹک ابھر آئی تھی۔ وہ غالباً کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن ہم ایسی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہماری کوئی معمولی سی حرکت ہمارے جھسوں کو چھلکی کر سکتی تھی۔

میرے اور دارا کے بیچ لمبی چوہے کا یہ کھیل عرصے سے جاری

# باخبری

## اشعور میں دے ہوئے خوف

### احساسات اور محرکات کو لے نقاب

#### کرنے والی عجیب و غریب کتاب

**قیمت**

25 روپے

**ڈاک خرچ**

23 روپے

مکتب کی قیمت منہ ڈاک خرچ بند لکھیے

پتہ: منشی محمد رفیع وارہ مال گریں

طو کتات کاتب

کتابیں جنسیت

litabiat1970@yahoo.com



تھا۔ کبھی وہ جال میں پھنستا اور کبھی میں اور یہ عجیب بات تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی ابھی تک عمل طور پر اپنے حرف کی گرفت میں نہیں آیا تھا لیکن اس وقت صورت حال بالکل مختلف تھی۔ ہم مکمل طور پر ان کے نرنے میں تھے اور فرادی پناؤ کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود میں پاس نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ دھچکا رنگولی نے پہنچایا تھا۔ اسے رائفل تانے دیکھ کر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلیں تھیں۔ اس پر مجھوسا کر کے میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ کس مہارت اور چالاکی سے اس نے میری ہمدردیاں حاصل کی تھیں۔ ہم میں سے کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی لمبا لمبل کھیل رہی ہے۔

وہ پیشہ ور قاصد تھی۔ طوائف، شہرت اور دولت اس کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔ اس نے ٹائگر کے ساتھ ہر کرپڑش زندگی گزار دی تھی پھر ٹائگر سے اس کی ان بن ہو گئی اور وہ دروڑی ٹھوکریں کھانے لگی۔ ٹائگر کی موت کے بعد اس نے پیڑو کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی تھی مگر پیڑو نے بھی اسے دھتکار دیا تھا اور وہ دہر دہر ہوتی ہوئی چینگ رائے پہنچ گئی تھی جہاں اسے کلبوں میں کام مل گیا تھا اور اسی دوران میں اس کی ملاقات قحلو سے ہو گئی۔ قحلو ایک شریف آدمی تھا۔ رنگولی اسے بیڑی بنا کر اوپر جانا چاہتی تھی لیکن اس کے ذریعے مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ دراز کا تھا۔ قحلو اسے اپنی سفارش سے بڑے ٹائٹ کلبوں میں پروگرام دلوں گا لیکن جو پیش اس نے ٹائگر کے ساتھ نہ کر کے تھے یا پیڑو کے ساتھ ہو سکتے تھے وہ قحلو کے ساتھ نہیں ہو سکتے تھے اور پھر اس دوران میں وہ ہم سے ٹکرائی۔ رنگولی ابھی طرح جانتی تھی کہ میں پیڑو اور دارا دروڑیوں کے لیے سب سے زیادہ مطلوب ہوں۔ وہ ایک بار پھر پیڑو کے ٹینگ

میں آنا چاہتی تھی تاکہ پہلے کی طرح پیش و عشرت کی زندگی گزار سکے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ مجھے پیڑو یا دارا کے حوالے کر کے وہ ان کا اعتماد حاصل کر سکتی تھی اور اس کے سامنے بچھلے گناہ معاف ہو سکتے تھے۔

اس نے بڑی خوبصورتی اور مہارت سے ہمارا اعتماد حاصل کیا۔ دوسری طرف اس نے دارا سے ملاقات کر کے ہمارے بارے میں بتا دیا اور ہمیں چھاننے کے لیے جال تیار کیا جانے لگا۔ میں واقعی بے وقوف بن گیا تھا اور بڑی آسانی سے ان کے بچھائے ہوئے اس جال میں پھنس گیا تھا۔

گزشتہ رات میں نے بار بار ٹیلی فون پر چینگ رائے میں قحلوئی وغیرہ سے رابطہ کیا تھا۔ آخری مرتبہ ہماری بات صبح آٹھ بجے کے قریب ہوئی تھی اور اس وقت بھی یہی پتا چلا تھا کہ رنگولی رات بھر گھر نہیں آئی تھی اور بار ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ قحلو بچن کے میرے ہاتھوں مارے جانے کی اطلاع کل

چینگ رائے بھی پہنچ گئی تھی۔ دارا کو پتی قحلو کی فکر ہوئی ہوئی اور وہ رات ہی رات کو یہاں پہنچ گیا تھا۔ رنگولی بھی اس کے ساتھ تھی جو پوری طرح میرے خلاف اس سازش میں شریک تھی۔ اب مجھے قحلو اور رسا کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ وہ دونوں چینگ رائے میں تھے اور وہو سکتا ہے اب تک ان کے خلاف بھی کوئی کارروائی ہو چکی ہو۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ جاگی کی چیخ سن کر چونک گیا۔ دارا اس کے بالوں کو جھٹکے دیتا اور دیکھ دیتا ہوا پیڑوں سے نکل کر آگے آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے جاگی کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ لاٹھڑائی ہوئی منہ کے بل گر گئی۔ یہ قسمت تھا کہ وہ گھاس پر گر گئی تھی اور اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن اس کا ہاتھ گھاس میں پڑے ہوئے ایک چتر پر پڑ گیا۔

چتر زیادہ بڑا نہیں تھا اور جاگی اسے انگلیوں کی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے اور میرے خیال میں وہ بہت بڑا خطہ مول لے رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا اس نے پھر سے لوٹ لگائی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا چتر پوری قوت سے دارا کی طرف اچھال دیا۔

دارا اس صورت حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اسے توقع بھی نہیں تھی کہ جاگی ایسی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ پیڑوٹ کے برابر کھینچا پھراس کی پیشانی پر لگا۔ اس کے منہ سے جگی کی چیخ نکلی اور وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

پیشانی سے خون بہہ نکلا تھا۔ دارا کے منہ سے بدبو دار گھڑی طرح گندی گالیوں کا طوفان ابل پڑا۔ اس نے خون خوار نظروں سے جاگی کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی ہسٹول والا ہاتھ اٹھا کر پے در پے زخمی کر دیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تین گولیاں چلیں اور اس کے ساتھ ہی جاگی کی خوشنک جھپٹیں بھی سنائی دی تھیں۔ دارا کی غراہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا خیال تھا کہ جاگی خون میں لت پت گھاس پر لوٹ رہی ہو گی لیکن وہ منظر میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ جاگی دیکھ گھاس پر پست کے بل پڑی تھی اور دارا اس کے قریب کھڑا تھا۔

”یہ گولیاں تمہارے جسم میں سوراخ بھی کر سکتی تھیں۔“ دارا کسی بھیجے کی طرح غراٹے ہوئے کہہ رہا تھا۔ لیکن میں جمیں ایسی سزا نہیں دوں گا کہ تم ضائع ہو جاؤ۔ تمہارا یہ خوب صورت بدن اس لیے نہیں ہے کہ اس میں گولیاں سے سوراخ کیے جائیں۔ یہ تو تھینکے کے لیے ہے۔ پہلے میں اس سے کھلیں گا۔ اپنی پاس بجاؤں گا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس خوب صورت جسم کے ٹکڑے کر دوں گا۔ بڑے پیار سے۔ آہستہ۔ آہستہ۔“ اس

نے جاگی کی ہانک پر ٹھوک ماری اور کہا ”تم اسے میری رحم دلی مت سمجھا کہ میں نے اس وقت تمہیں کچھ نہیں کہا۔ میرا انتقام لینے کا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ میں نے کچھ بوری کے ہٹ میں قحلو کو روک کر اسے اس کا ایک نمونہ پیش کیا تھا۔ اس وقت میں نے دوسرے آدمیوں کو موقع دیا تھا کہ اب تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کرنا ہو گا میں خود کروں گا اور تمہارے اس بیڑو کے سامنے۔“

میرے جڑے پہنچ گئے۔ میں نے دارا کی طرف بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ فضا ”تڑتڑاہٹ“ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں میرے پیروں کے قریب گھاس میں لگی تھیں۔ میں نے مرکز دیکھا۔ یہ گولیاں برآمدے میں گھڑی ہوئی رنگولی نے چلائیں تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی طنز سی مسکراہٹ تھی۔

”تم آگے نہیں بڑھو گے بیڑو۔“ رنگولی نے رائفل کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی حرکت کیے بغیر اپنی جگہ پر کھڑے رہو اور جو کچھ بھی ہو جائے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہو۔“

میں دانت جیس کر رہ گیا۔ دارا نے اس آدمی کو قریب ملایا جو دوسری طرف ہسٹول لیے کھڑا تھا۔ وہ آدمی ہمارے لیے انتہی تھا۔ دارا نے اسے اشارہ کیا۔ اس شخص نے ہسٹول جب میں رکھ کر خنجر نکال لیا اور آہستہ آہستہ جاگی کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اس انداز میں آگے بڑھتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اس سے پہلے جاگی کے چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار تو نظر آتے تھے لیکن وہ خوف زدہ بالکل نہیں تھی مگر اب اس خنجر مدت آدمی کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

وہ شخص اس کے سامنے رک گیا۔ اس کے خنجر کی نوک آہستہ آہستہ جاگی کے سینے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جاگی کا چہرہ بیلا پڑ گیا۔ اس نے پیچے ہٹنا چاہا لیکن ٹھیک اسی لمحے اس شخص نے خنجر کی نوک اس کی دوی شپ گلے والی شرت کے گردن پر رکھ کر چنے کی طرف زوردار بھجوا دیا۔ اس کی ٹی شرت نیچے تک چرتی چلی گئی اور اس کے جسم کے سامنے کا حصہ برہنہ ہو گیا۔ ٹی شرت، اوہن شرت کی طرح مکمل گئی تھی۔ جاگی نے وہ قدم پیچھے ہٹ کر دونوں ہاتھ پیچھے پھینک لیے۔

”ٹھیک رہی ہو۔ ان میں کوئی خیر تو نہیں۔ یہ سب اپنے ہی ہونے۔ ان سے کیا شرابا۔“ دارا نے یہ کہتے ہوئے قہقہہ لگایا اور پھر پیشانی پر رستے والا خون صاف کرنے لگا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن قہقہہ لگانے سے شاید تکلیف بھی گئی تھی۔ اس کے تاثرات کو دیکھ کر دوسرے ہی لمحے وہ جاگی کے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے ڈبا ڈبا۔

”کھڑکے کیا دیکھ رہے ہو۔ اپنا کام جاری رکھو۔“ وہ شخص خنجر سنبھالے ایک بار پھر جاگی کی طرف بڑھا۔ اس

بار اس کے خنجر کی نوک کا سرخ جاگی کی جینز کی طرف تھا۔ میں کاپٹ اٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

”دارا!“ میں غصیاں پیچتے ہوئے چیخا ”تم بہت کھلیا اور ڈیل آدی ہو۔ تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کرو۔ مجھ سے اپنا انتقام لو۔ عورتوں کی اس طرح توہین کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”تم سے انتقام لینے کے لیے ضروری نہیں کہ تمہارے جسم پر ہی چھریاں چلائیں جائیں۔“ دارا نے کہا ”تم سے انتقام لینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جاگی کو۔“

دی۔ ”بند کرو یہ کواس!“ میں نے چیخے ہوئے اس کی بات کاٹ دیا۔ ”تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اپنا کام جاری رکھو۔“ دارا نے میرے پیچھے کی پردا کے بغیر اپنے آدمی کو حکم دیا۔ کم اور جی قحلو اس وقت کچھ زیادہ غصا دھو گئے تھے۔ انہیں شاید یہ غصہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں کسی شدید دھمکے کا اظہار کروں گا۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر خنجر کی نوک جاگی کی پیٹ کے بلیٹ پر رکھ دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دیتا فضا ایک بار پھر فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ سب ہی لوگ اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ فائز بھی رنگولی ہی نے کیا تھا اور رنگولی اس شخص کے پیروں کے قریب زمین میں دھنسن گئی تھی جو خنجر سے جاگی کی پیٹ کا بلیٹ کاٹنا چاہتا تھا۔ وہ شخص اچھل کر وہ قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ”جس مسٹر دارا۔“ رنگولی نے چیخ کر کہا ”بہت ہو چکا یہ کھیل۔ کوئی عورت کسی دوسری عورت کی ایسی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی میں جسے بہت دھمیل دے چکی ہوں۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا۔ ہسٹول پیچیک دو اور اپنے آدمیوں سے بھی کوا“

تھپا رہا پیٹ دین۔“ ”کیا کواس کر رہی ہو رنگولی۔“ دارا چیخا ”یہ زہریلا سانپ بڑی مشکل سے ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ تم اسے ہماگ لٹکے کا موقع دے رہی ہو۔“

”زہریلا سانپ وہ نہیں، تم ہو۔“ رنگولی نے جواب دیا ”جتنا زہر تم میں بھرا ہوا ہے اتنا شاید دنیا کے کسی سانپ میں نہ ہو۔ یہ تو ان لوگوں کی غلطی تھی کہ تمہیں اب تک زندہ چھوڑے رکھا۔ تم جیسے سانپ کا تو فوراً ہی سر کھل دینا چاہیے۔“

”اوہ تو تم بھی۔“ ”ہاں۔“ رنگولی نے اس کی بات کاٹ دی ”میں چینگ رائے میں تم سے ملی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم مجھے پسند آ گئے تھے۔ تم یہ وہ شخص ہو جس کی وجہ سے ٹائگر نے میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ تمہاری وجہ سے مجھے وہ ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑی تھی۔ میں نے جس طرح سکس سکس کر زندگی کے وہ دن گزارے ہیں انہیں میں کیسے بھلا سکتی ہوں۔ میں تو تم لوگوں سے انتقام لینے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی اور پھر یہ میری خوش قسمت تھی۔“

آتش فشاں 149 حصہ 2

چند روز پہلے میری ملاقات وجدان سے ہوئی۔ اس روز تمہاری یہ گرجا گنبد کو قتل کر چکا تھا۔ اس نے جی فانگ کی طرف اشارہ کیا "تو بتا لے کتنا تھی۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ چائی کے راستے پر وجدان کا ساتھ دے رہی تھی لیکن تیر لوگ تو تجھ نے تیرے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیے۔ ہرگز نہ دوزخ فانگ پہن کی موت کی خبر سن کر اگر تیر یہاں آنے کا پروگرام نہ بھی بناتے تو میں تم لوگوں کو یہاں لے کر آتی لیکن تم لوگوں کی موت۔" اے اس سے بھڑا اور کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں سے کبھی یہ فاصلے پر میکاگ بتاتا ہے۔ تمہاری لاشیں میکاگ کی پُر شور لہروں میں پیچیدگی دی جائیں گی۔ اس دنیا کی پچھلیوں کو کبھی کبھار ہی ایسی خوراک ملتی ہے۔ میں حیرت سے رنگولی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے چند منٹ پہلے اس کے بارے میں جو کچھ بھی سوچا تھا اب مجھے اس پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے ہماری طرف تھی اور چپاگک رائے سے ان کے ساتھ آئی بھی ای لے گی کہ کسی آڑے وقت میں ہماری مدد کر سکے۔ گزشتہ رات اس نے تھاکی کو فون بھی ای لے نہیں کیا تھا کہ ان لوگوں کو شبہ نہ ہو جائے اس نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کہ ان کی طرف راہی کرتے ہوئے ہم پر رات نکل جان لی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کا یہ ڈراما کچھ دور اور چٹا لیکن جاگنی کی توہین وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی اور کل کر سامنے آئی تھی۔

جاگنی کے سامنے کھڑے ہوتے آوی نے خبر پیچیدگی دیا تھا اور وہ اس سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن اس کا سیدھا ہاتھ غیر محسوس انداز میں چٹون کی جیب کی طرف رینگ رہا تھا جس سے ہسپتال کا دست بھٹکا رہا تھا اور پھر اس نے بڑی بھرتی سے ہسپتال نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ اسے ہسپتال استعمال کرنے کا موقع ملتا رنگولی کی رات نکل سے نکلی ہوئی گولی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ وہ منہ سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ کھوپڑی کے پرٹھے اڑ گئے تھے خون کے جھینٹے اور ہچکا دور تک بھڑک رہا تھا۔

"کسی اور نے ہمداری دکھانے کی حماقت کی تو اس کا بھی یہی انجام۔" رنگولی نے چیخ کر کہا "ہتھیار پیچیدگی دو! سب لوگ "دیکھو رنگولی۔" دارا چنچا "تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ تمہارے ساتھ زیادتی ٹائگر کے کی تھی اور میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ اب بھی وقت ہے۔ ہمارا ساتھ دو۔"

"ہند کو یہ بکواس اور ہسپتال پیچیدگی دو۔" رنگولی چیخی "اور تم لوگ بھی اپنے اپنے ہتھیار پیچیدگی دو۔" اس نے جی فانگ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

وانگ ڈن تو پہلے ہی کسی ایکشن کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے کہہ چلا نکلا گدی اور ایک ہی جھپٹے میں نہ صرف اس کے ہاتھ سے ریو اور جھین لیا بلکہ اس کے جڑے پر ایک گونسا بھی رسید کر دیا تھا۔

فانگ پھرا نیل بہ "یہ وانگ ڈن کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اسے

اس سے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کم کبھی کبھار ہیروئن استعمال کرنے کا عادی تھا۔ نہ تو زہری ہوتا ہے۔ خواہ تو موٹی مقدار میں استعمال کیا جائے یا زیادہ مقدار میں اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ ہیروئن کے کبھی کبھار استعمال نے کم کو اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ وہ زیادہ دیر تاب نہ لاسکا اور ہاتھ پیریزل جھپٹ چمڑ دیے۔ واجب ذن نے اسے جیکٹ سے پکڑ کر اٹھایا اور دھکے دیتا ہوا برآمدے کی طرف لے جانے لگا۔ میں نے سڑک رنگولی اور جاگلی کی طرف دیکھا۔ رنگولی نے رائل کئیسے پر لٹکا ہوا مٹی اور جاگلی کی مٹی ہوئی نل شرت کے دونوں کنارے پکڑ کر ان میں بھل لگا دی تھی۔ یہ بھل اس کے اپنے ہی لباس میں کہیں لگی ہوئی تھی جسے وہ اس وقت کام لیں لاری تھی۔ ہم لوگ برآمدے سے سامنے بڑی ہوئی کرسیوں کی طرف آئے۔ واجب ذن نے کم کو گھوما کر ایک کرسی پر بٹھادیا اور کانچ کے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ ایک رسی تلاش کر لایا۔

اس نے کہا کہ میں نے اس کو وہیں چھوڑ کر رکھ لی کے ساتھ کالج کے اندر  
میں اب سب کو وہیں چھوڑ کر نکلتی کے ساتھ کالج کے اندر  
آ جاؤ۔ چار کرے تھے۔ ایک نشست گاہ کے طور پر آراستہ حادور  
بالی بیہ رومز تھے۔ داگنڈن مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ یہ کالج عام  
طور پر غالی ہی رہتا ہے البتہ بھی کھار گولڈن سڑائی اینگل سے آنے  
والے اینڈ میاں دو چار روز کے لیے وہاں اختیار کر لیتے ہیں۔  
"وہ راستہ اختیار کرنا اب خطرناک ہو گا۔" اس نے کہا۔

یہاں پر بھی ٹون کی گاڑی اور ایک سڑک میں یہاں پر بھی ٹون کی گاڑی اور ایک سڑک میں یہاں پر بھی ٹون کی گاڑی اور ایک سڑک میں

ماڑو کا بس دیکھ کر میں چپکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس پر دو تین ڈاکٹر  
لگے ہوئے تھے اور ریڈیو اینٹینا کی طرح ایک تاریکی تھا۔ ایک  
ڈاکٹر میں ایک خاصا سرخ نقطہ روشن تھا۔

یہ ریڈیو ٹرانس میٹر تھا۔ قحاشی طور پر تو رابطے کے لیے یہ لوگ  
مٹی فون ہی استعمال کرتے تھے لیکن سرحد پار ٹیلی فون سے رابطہ  
نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے یہ ٹرانس میٹر تھا اور ظاہر  
ہے اس سے گولڈن ٹرائی اینٹن کی سے رابطہ کیا جاتا ہوگا۔

مجھے خیال میں ہمارے لیے یہ ٹرانس میٹر کار تھا لیکن ریموٹی  
کی بات سن کر میری آنکھوں میں چمک سی ابھرتی۔

”ویسے تو وہ لوگ ہمت چالاک ہیں لیکن اگر ہم اس ٹرانس میٹر  
کو اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کا بیج کو کھنگامیں تو وہ لوگ  
میری تمہیں گے کہ ٹرانس میٹر میں جلی چکا ہے۔ ہو سکتا ہے بعد میں  
کی بات یہ ٹرانس میٹر ہمارے کام آجائے“

ریموٹی کی بات موقوف تھی۔ اسی وقت وائٹ ڈی بی اندر  
داخل ہوا۔ اسی نے بھی ریموٹی کی تاریکی اور میرا اس نے خود ہی  
تسکے ہو کر ٹرانس میٹر اٹھایا۔ میں نے محو ہر کار پر لے کا بیج کا  
جائزہ لیا لیکن اور کئی کام کی چیز نظر نہیں آئی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا  
چاہیے“ وائٹ ڈی نے کہا ”وہ دونوں یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔

۳۳ نہیں معلوم ہے کہ ہم اسی طرف سے آئے تھے ممکن ہے وہ لوگ راستے میں کہیں گھات لگائے بیٹھے ہوں۔"

اور پھر ہم نے راستہ بدل دیا۔ یہ راستہ نہ صرف قدرے طویل بلکہ زیادہ دشوار بھی تھا۔ جاگتی بڑی مہارت سے کم کو ہتھول کی زد پر لے کسی جانور کی طرح ہانک رہی تھی۔ وہ ذرا رکتا تو جاگتی اس کے کولہوں پر لات رسید کر دیتی۔

میں نے رنگولی اور وانگ ڈن اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے مختار انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ٹیک کا یہ جنگل بہت عجیب تھا۔ مندر کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ان درختوں کی وجہ سے فضا میں مسک سی رہتی ہوئی تھی۔ مہاتما بدھ کے ماننے والوں میں مندر کو بہت مقدس ٹکڑی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی اس جتنی ٹکڑی کی تجارت سے قتالی لینڈ زیر مبادلہ کار ہوا تھا۔ ان درختوں کے نیچے دبیز گھاس اور قدر آدم جھاڑیاں تھیں جن میں راستہ بنا کر چلنا خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ چنی ٹانگ اور دارا وغیرہ کہیں ان عجیب جھاڑیوں میں گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں۔ ان کا حملہ ہمارے لیے بہت خطرناک ہو سکتا تھا لیکن مجھے ان کی طرف سے کسی ایسے دھمکی کی توقع نہیں تھی۔ اب تک کے تجربات یہی بتاتے تھے کہ کسی جھڑپ میں شکست کے آثار نظر آتے ہی، دارا دم دبا کر بھاگ نکلتا تھا اور اس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کانچ سے روانہ ہونے سے پہلے وانگ ڈن نے نشست گاہ والے کمرے کے فریج پر کیرود سین آئل چمڑ کر آگ لگا دی تھی اور میں بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک آگ کیوں نہیں بجھ گئی تھی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے رہے۔ راستہ خاصا طویل ہو گیا تھا۔ ایک جگہ ہمیں رک جانا پڑا۔ ہمارے سامنے تقریباً چھ فٹ چوڑی پھاڑی بنی تھی جس کے پٹائی کنارے بالکل عمودی تھے۔ ندی بہت گہری تھی اور پانی کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ہم ندی کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف کسی ایسی جگہ کی تلاش میں چلتے رہے جہاں سے ندی آسانی سے پار کی جاسکے لیکن ہم جیسے جیسے اوپر چلے گئے، ندی کا پانی کنارے سے تقریباً ایک فٹ نیچے تھا۔ ایک جگہ ندی کا پانی کنارے سے تقریباً ایک فٹ نیچے تھا۔ رنگولی اور جاگتی بڑی طرح ٹھک گئی تھی۔ رنگولی نے اپنی راتقل زین پر رکھ دی اور گھنٹوں کے مل بیٹھ کر چلو میں پانی پینے لگی۔

ہم سب کو پیاس لگ رہی تھی۔ ہم نے بھی پانی پیا۔

"اور شاید ہمیں بھی پیاس لگ رہی ہے؟" رنگولی نے کم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کم نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"ہاتھ کھول دو اس کے" وانگ ڈن نے کہا "یہ بھی پانی پانی لے"

رنگولی نے کم کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔ اس

کی کلائیوں پر رستی کے نشان گرہنے تھے۔ وہ کچھ دیر تک کمر کلائیوں کو سسلا رہا اور پھر گھنٹوں کے مل بیٹھ کر چلو میں پانی پینے لگا۔ ایک دو گھنٹے پہلے کے بعد وہ رنگولی اور دارا اور پھر رنگولی کی راتقل اب بھی زین پر پڑی تھی۔ رنگولی نے ہلکی سی آگے بڑھ کر راتقل اٹھالی۔ کم کے ہاتھوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ دونوں ہاتھوں کا پالہ بنا کر پھر پانی لینے کے لیے بچے تھا اور پھر وہ کچھ ہو گیا جس کی ہم میں سے کسی کو توقع نہیں تھی۔

کم بچے جھٹکا چلا گیا اور پھر اچانک ہی وہ قلابازی کھانچا اور پانی میں گر گیا۔ "چمپاک" کی آواز میرے حواس پر بجلی بن کر گر گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کم کا ندی میں گرنا اتفاق نہیں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر جھٹکا لگا رکھی تھی۔ اسے ایک موقع مل گیا تھا اور اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

"اے بھڑا اسے۔ دو کسے" میں نے بے اختیار چیخ اٹھا۔

رنگولی نے بڑی بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ندی میں راتقل کا پورا برسٹ مار دیا۔ پانی بہت گہرا اور بہت تیز تھا۔ اگر رنگولی کا خیال تھا کہ کم اس کی گھنٹوں کا نشانہ بن گیا ہو گا تو وہ غلطی پر تھی۔ میں اور وانگ ڈن ندی کے بہاؤ کی طرف دوڑنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ کم سانس لینے کے لیے کہیں نہ کہیں سریانی سے باہر نکالے گا لیکن تقریباً سو کر تک ندی کے کنارے پر دوڑنے کے باوجود وہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ کئی جھپوں پر جھاڑیاں پانی پر جھل ہو گئیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ پانی سے سر اٹھا رہا کر ان جھاڑیوں میں کہیں چھپا ہوا ہو گا لیکن کم اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس طرح کوئی کی حمایت کر کے دوبارہ ہمارے ہاتھ آجاتا۔

رنگولی اور جاگتی بھی دوڑتی ہوئی ہمارے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ہم سب ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کم کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بے سود۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اگر اس میں درخت کا ٹکا بھی بیٹھ گیا تو پتھر منٹ میں وہ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔

"تقریباً نصف میل آگے جا کر یہ ندی آبشار کی صورت میں تقریباً ڈیڑھ سو فٹ گہرائی میں گر رہی ہے۔" وانگ ڈن کہہ رہا تھا "اگر کم کو راستے میں کسی جگہ ندی سے نکلنے کا موقع نہیں ملا تو اس کا خاتمہ اسی آبشار پر ہو گا۔ ویسے مجھے افسوس ہے کہ اسے میری وجہ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اگر میں اس کے ہاتھ کھولنے کا مشورہ نہ دیتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔"

"اب افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا "اگر وہ زندہ نکلا تو اس کے ہمارا آسان سہارا بن ہو گا۔"

اسی وقت مجھے ٹکڑی کے چلنے کی بو کا احساس ہوا۔ میں تنہی سکود کر اوپر اوڑھ دیکھنے لگا اور پھر میں مسکرائے بغیر نہیں رہا تھا۔ کسی قدر بلندی پر درختوں میں سے سیاہ دھوئیں کا بادل اٹھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ کانچ ٹھک کی پشت میں آچکا

فٹ بہاؤ کی طرف ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور بالآخر ہم بہاؤ میں بند پار کرنے کی جگہ مل گئی۔ اس جگہ ندی کا پانی بہت بڑا تھا اور وہاں ایک کتے ہوئے درخت کا ٹکا رکھا ہوا تھا۔ پانی کا کام دے رہا تھا۔

ہم ندی پار کرنے کے جھاڑیوں میں چلتے رہے۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کانچ سے اٹھنے والے دھوئیں کا بادل اب بہت بڑھ چکا تھا۔

"دیکھ بھل گئے تھے۔" کانچ نے ہنسنے پر سڑک پر پہنچ گئے۔ گولڈن ٹرائی ان گھل چڑھ آئے۔ ہم سب کی آمدورفت جاری تھی۔ سب لوگ کی طرف گاڑیوں پر سیاہیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ سب لوگ اسی طرف دیکھ رہے تھے جس طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف چٹان کی آڑ میں درختوں کے نیچے گاڑی محفوظ تھی۔ گاڑی پر واپس جاتے ہوئے میں نے سڑک دیکھا۔ کانچ سے اٹھنے والے فٹلے اب بہت اوپر تک پہنچ رہے تھے۔ وانگ ڈن نے گاڑی روک لی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

"جنگل کی آگ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پھیل جائے تو اس پر قابو بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نہیں اٹھ چلے گی۔" وانگ ڈن نے کہا "اگر درخت سوکے ہوئے ہوں تو آگ کے پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اس علاقے میں بڑی سیڑھی ہے۔ دو درختوں کو کوٹ کر ہٹا دو اور درخت نظر نہیں آتے۔"

میں ابھی تک کہتا ہی تھا کہ کانچ پھاڑنے والا ایک دھماکا ہوا۔ دھماکا اس قدر زوردار تھا کہ سڑک پر گہری ہوئی ہماری جیب بھی لٹک کر رہ گئی۔ میری نظریں بے اختیار کانچ کی طرف اٹھ گئیں۔ یوں لگا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ کانچ کی جھٹ "دیواری" اور پھر آگ کے شعلوں کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

وانگ ڈن نے سنبھل کر جب کہ تیزی سے سڑک پر دوڑا دیا۔ ہم بار بار سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پہلے دھماکے کے بعد پھر دو سڑک کی طرف دھماکے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے بادلوں کے ذخیرے میں آگ لگ گئی ہو۔ رنگولی اور جاگتی بھی بار بار اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر عجیب سا خوف ابھرا تھا۔

وانگ ڈن جیب کی رفتار بڑھا آچکا گیا۔ قہر سے گولڈن ٹرائی ان گھل کی طرف جانے والی سیاہیوں کی گاڑیاں سڑک پر رک رہی تھیں اور سب لوگ اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض گاڑیوں کو میں نے پھٹنے کے بارے میں سنا۔ وہ بھی دیکھا تھا۔ وہ لوگ شاید آگے جانے کے لیے دوڑ رہے تھے۔

وانگ ڈن نے جیب اپنے کانچ کی طرف جانے والے راستے

پر موڑ لی اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم کانچ میں موجود تھے۔ جاگتی جیب سے اترتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے بدل کر بیٹھی۔ اس کے بال اسی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے لہو سے پانی منگوا کر ڈھیرن کی دو گولیاں کھائیں اور صوفے کی پشت سے نکل کر نیم دراز ہو گئی۔ رنگولی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

لہو حاصل مند آتی تھی۔ ہم سب کی حالت دیکھ کر اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی کہ ہم کس قسم کی صورت حال سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ وہ ہمارے لیے کافی بنا کر لے آیا اور اس وقت ہم واقعی بڑی شدت سے کافی کی طلب محسوس کر رہے تھے۔

کانچی پینے کے بعد وانگ ڈن نے اپنا حلیہ درست کیا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے" میں شام سے پہلے واپس نہ آسکوں۔ تم لوگ پریشان مت ہونا۔"

"اگر تم کہیں دیکھ لے گئے تو؟" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

"مجھے کون بچاتا ہے؟" وانگ ڈن نے جواب دیا "جو مجھے بچاتا ہے جس دن وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں گے۔"

وانگ ڈن چلا گیا۔ میں نے لہو سے اپنے لیے اور کافی بنوائی۔ لہو کافی لے کر آیا تو اس نے پہلی مرتبہ ان دھماکوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے لہو سے لہو کا اظہار کر دیا۔ اسے کچھ بتا کر میں مزید سوالات کی الجھن میں نہیں پھنسا چاہتا تھا۔

"میرے لیے کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟" میں نے لہو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں بالکل بھول گیا تھا بس۔" لہو اندامت کا اظہار کرتے ہوئے بولا "دوسرے جیب کا رائے سے فون آچکا ہے۔"

میں نے گھور کر لہو کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آگیا اور ریسیور اٹھا کر چیاں گ رائے میں رنگولی کے مکان کا نمبر لے لگا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے کریڈٹ ٹیپ کر کے ری ڈائل کا بٹن دبا دیا۔

اس مرتبہ بھی گھنٹی بجتی رہی۔ دوسرے کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی اور دوسری مرتبہ پوچھنے لگی تھی۔ بیٹھنا ہی پر سونوئیں ابھر آ گئیں۔ کال ریسیو نہ ہونے کا مطلب تو یہ تھا کہ قتالی یا ریسیور گھر پر نہیں تھے لیکن وہ کہاں جاسکتے تھے۔ رنگولی نے میری کیفیت کو آڑا لیا اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"کال ریسیو نہیں ہو رہی۔" میں نے جواب دیا "یا تو ہمارا فون خراب ہے یا قتالی اور ریسیور۔"

"لاؤ۔ مجھے دو۔ میں ملاتی ہوں۔" رنگولی نے ریسیور میرے

ہاتھ سے لے لیا اور نہر لانے لگی لیکن نتیجہ اس مرتبہ بھی منفی نکلا۔ کئی مرتبہ ٹرائی کرنے کے بعد اس نے ریسور رکھ دیا۔  
 "کوئی ٹریڈ نہ ہوگئی ہو!" وہ میری طرف دیکھ کر بڑبڑائی "ایک منٹ میں مقابلہ کو فون کرتی ہوں۔ اس سے پتا چل جائے گا کہ کیا معاملہ ہے۔" اس نے دوبارہ نہر لانے کے لیے ریسور کی طرف ہاتھ بڑھایا یہ تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔  
 میں نے لپک کر رگولی سے پہلے ریسور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے تھائی کی آواز سننے ہی میرے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔  
 "کمال غائب تھیں نہ میں پندرہ منٹ سے ٹرائی کر رہا ہوں؟" میں نے کہا۔  
 "ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے رگولی کا مکان چھوڑ دیا تھا۔" تھائی نے جواب دیا "آخری مرتبہ ہمیں وہیں سے فون کیا تھا۔ اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔"  
 "اوہ!" میں نے کہا "اس وقت کہاں ہو تمہارے رگولی کا مکان کیوں چھوڑا؟"

"اس وقت ہم مقابلہ کے ایک مکان میں ہیں۔" تھائی نے جواب دیا "ہم پیڑوں کے آدمیوں کی نظروں میں آگئے تھے جس کی وجہ سے ہمیں رگولی کا مکان چھوڑنا پڑا۔"  
 "پیڑوں کے آدمی؟" میرے لیے میں تشویش تھی۔  
 "ننگ" میں بہت گڑبڑ ہوگئی ہے وجہ ان۔" تھائی نے کہا۔  
 "پاتھم کو پیڑوں کے آدمیوں نے اپنی سال سے اغوا کر لیا ہے۔ پیڑو اور ماسٹر ہوجن کے آدمیوں میں آج کل خوب ٹھنی ہوئی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اعلیٰ سرکاری آفیسر بھی پیڑو کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ماسٹر ہوجن کے تین آدمیوں کو پولیس گرفتار کر چکی ہے۔ پیڑو کو تمہاری تلاش ہے۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی پاتھم کو ہسپتال سے اغوا کیا گیا ہے۔"  
 "لیکن پاتھم..."  
 "اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو چکی تھی۔" تھائی نے میری بات کاٹ دی "کل شام کو پرسا نے اپنے کسی جاننے والے کو فون کیا تھا۔ یہ ساری باتیں اسی سے معلوم ہوئی تھیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق پیڑو آج تک دقت چنانک رائے پہنچنے والا ہے۔ اسے شاید کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ تم یہاں ہو۔ اس مرتبہ وہ پوری قوت سے تم پر وار کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہارا قصہ ختم کر دیا جائے اور میرا خیال ہے، چنانک رائے کے بعض اعلیٰ پولیس افسران بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ دیں گے۔"  
 "لیکن تم لوگوں نے رگولی کا مکان کیوں چھوڑا؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے تاکہ ہم پیڑو کے آدمیوں کی نظروں میں آگئے تھے۔" تھائی نے جواب دیا "آج صبح سویرے میں ناشے کے لیے کچھ سامان لینے مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں واٹک سائی سے سامنا پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے تاکہ ہم پیڑو کے آدمیوں کی نظروں میں آگئے تھے۔" تھائی نے جواب دیا "آج صبح سویرے میں ناشے کے لیے کچھ سامان لینے مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں واٹک سائی سے سامنا

ہو گیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا کہ ایسا انداز اختیار کر لیا ہے۔ دیکھا ہی نہ ہو لیکن میں محتاط ہوگئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ کوشش کی تھی مگر میں اسے جکڑ دینے میں کامیاب ہوگئی۔ دوسرے دو مرتبہ ہمیں فون کیا مگر تمہارے نہیں تھے پھر میں نے قیاس فون کر کے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ ہمیں رگولی کے مکان سے نکال لایا۔ اس وقت اگرچہ ہم محفوظ ہیں لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ آدی پورے شہر میں ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

"مقابلہ کہاں ہے؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔  
 "وہ اس وقت اپنے دفتر میں ہوگا۔ میں تمہیں اس کا پتہ ہوں۔ تم اس سے بات کرو۔" تھائی نے کہا۔  
 میں نے تھائی کا بتایا ہوا نمبر فون کر لیا اور اسے مخاطب ہوا۔  
 "ہمیت دیتے ہوئے فون بند کر دیا اور جاگتی اور رگولی کو صورت ہا سے آگاہ کرنے لگا۔

"زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ پیڑو کو اب کچھ سزاوار حمایت حاصل ہوگئی ہے۔" جاگتی نے کہا "لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ چند روز پہلے جب جو شخص پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھا اسے اب قانون کا تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔" گویا اسے قیامت غارت کا لائنس دے دیا گیا ہے۔ پیڑو جیسے لوگوں کو جب اس طرح کا "فکری پنڈ" ملتا ہے تو وہ قیامت بن جاتے ہیں۔"

"سیاست بہت گندی چیز ہے۔" میں نے کہا "بعض اوقات اپنے ماں باپ کے کاٹوں کو بھی گلے لگایا جاتا ہے۔ مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں مگر میں اسے معاملات غامض سمجھتی ہوں۔ ایک بہت سی خوفناک سازش کا لالہ اندری ہی اندر کھول رہا ہے اور یہ ساری سرگرمیاں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ دارا اور پیڑو جیسے لوگ ملک کے اس دور دراز علاقے میں بیٹھ ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ محض تفریح کے لیے یہاں نہیں آئے انہیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں اس لیے وہ اپنے اصل کام سے ہٹے مجھے ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں گے تاکہ ان کے راستے میں گناہ رکاوٹ نہ رہے اور ہمارے لیے تشویش کی بات یہ ہے کہ اب پیڑو جیسے لوگوں کو یہاں پولیس کے بعض افسروں کی حمایت حاصل ہوگی۔"

"مقابلہ اس علاقے کا سرور ہے۔" رگولی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ پولیس اس سے بچنے لینے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

"بہر حال دیکھنا یہ ہے کہ حالات اب کیا رخ اختیار کرنے ہیں۔" میں نے گرا سانس لیتے ہوئے کہا "میرے خیال میں غالی اور پرساد کو اب چنانک رائے میں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تم مقابلہ سے بات کرو۔ اگر وہ ان دونوں کو آج کسی طرح میں

جواب دیتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہوگی۔"  
 رگولی نے مجھے کے بغیر فون کا ریسور اٹھالیا اور نہر لانے لگی۔ اس نے وہی نمبر لایا تھا جو تھائی نے مجھے فون کرایا تھا لیکن اس نے وہی نمبر موجود نہیں تھا۔ اس نے کوئی دوسرا نمبر لایا اور فون پر اس نمبر پر موجود نہیں تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک پھر نہیں مل سکے۔ مقابلہ سے رابطہ ہو سکا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک اس سے بات کرتی رہی پھر ریسور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔  
 "دونوں آج شام کو یہاں پہنچ جائیں گے۔"

ہم لوگ اس وقت تک ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر باہر ان میں گیا۔ رگولی بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ جاگتی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی چھپنے لگتی۔ میں ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے ادھر ادھر گھومنے لگا اور بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے چاروں طرف بہت دیر تک کا پانزواہا جا سکتا تھا۔

بہاڑوں میں ایک جگہ دھوئیں کے سیاہ دھول اٹھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ جگہ اگرچہ یہاں سے ملوں دور تھی لیکن دھوئیں کے دھول دیکھ کر گنگنا چھپے بہاڑوں میں کسی قریب ہی آگ لگی ہو۔ میں دیر تک اس طرف دیکھتا رہا اور پھر ان میں سے ایک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رگولی پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔

واٹک ڈن کے شام سے پہلے آنے کی توقع نہیں تھی۔ میں کانچ میں دھماکے کے بعد صورت حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے ہنگام میں بھی غاروں کو چلتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ایسے دھماکے نہیں سنے تھے لیکن یہاں تو ایسے لگا تھا جیسے بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی ہو۔

میں واپس آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ لہو کو صورت حال معلوم کرنے کے لیے شہر کی طرف بھیج دوں لیکن ٹھیک اس لیے لہو پر آندے والے دردناکے میں نمودار ہوا۔ "آپ کے لیے فون ہے ماسٹر۔" اس نے برآمدے ہی سے آواز لگائی۔

میں اٹھ کر تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال میں گیا اور میز پر الگ رکھا ہوا فون کا ریسور اٹھالیا۔ وہ واٹک ڈن کی کال تھی۔ "تمہارے لیے بڑی دلچسپ اطلاع ہے۔" واٹک ڈن نے کہا "اس کانچ کے خانے میں بڑی تعداد میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا جو آگ لگنے کے بعد دھماکے سے اڑ گیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا "کیا اتنی سی دیر میں یہ معلوم کر لیا گیا ہے کہ کانچ کے خانے میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا؟"

"دھماکے شہر میں بھی سنے گئے تھے۔ کانچ سے اٹھتا ہوا دھواں اب بھی نظر آ رہا ہے۔" واٹک ڈن کہہ رہا تھا "دھماکے ہوتے ہی

پولیس کی ایک ہائی پاور میں کی طرف روانہ ہوگئی تھی اور اب تو تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ پولیس اگرچہ ابھی تک اس کانچ کے قریب نہیں جا سکی لیکن انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ انہوں نے سبائل فون پر ہیڈ کوارٹر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ہیڈ کوارٹر کی پولیس نے بڑی تیزی سے اپنا کام دیکھا اور یہ معلوم کر لیا کہ وہ کانچ کس کا تھا۔ دو ایسے آدمی گرفتار کیے جا چکے ہیں جن کا قتل اسی کانچ سے ہے۔ ان میں سے ایک نے یہ انکشاف کیا ہے کہ کانچ کے خانے میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا جو ایک دو روز میں سرحد پار کوئلن ٹرائی اینٹل کی طرف اسٹول کیا جانے والا تھا۔"

"تمہیں یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔  
 "میں سردار مقابلہ کا آدمی ہوں اور ہر جگہ میرے قھوڑے بہت تعلقات ہیں۔" واٹک ڈن کہہ رہا تھا "میں ایک اینٹلر سے دوستی کی آؤ۔ میں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تھا۔ یہ ساری معلومات مجھے وہیں سے حاصل ہوئی ہیں۔ پولیس بہت سرگرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دھماکوں کے حوالے سے کچھ اور سنسنی خیز انکشافات بھی ہونے والے ہیں۔"

"تم تک واپس آؤ گے؟" میں نے پوچھا۔  
 "شام تک۔" واٹک ڈن نے جواب دیا "تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی محتاط رہنا۔"

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ دھماکے بارود کی تھے۔ ہم نے پتی ٹاگ کو پکڑنے کے لیے اس کانچ پر بیٹھ لیا تھا۔ ہمیں اپنے اس مقصد میں تو کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن انجانے میں ہم انہیں بہت بڑا نقصان پہنچا چکے تھے۔

واٹک ڈن شام سے پہلے ہی واپس آیا۔ اس کے پاس بڑی سنسنی خیز خبریں تھیں۔ کانچ کے خانے میں اسٹور کیا جانے والا کروڑوں ڈالر مالیت کا اسلحہ کوئلن ٹرائی اینٹل کر لیا جانے والا تھا۔ جزل کھورٹ نے کوئلن ٹرائی اینٹل میں اپنی فوج بنا رکھی تھی جو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھی اور یہ ہتھیار دوسرے ممالک سے اسٹول کیے جاتے تھے۔ یہ سنہری کھون تھائی لینڈ، براہ اولاد، اس کی سرحدوں میں گھری ہوئی تھی اور تین ممالک کی انتظامیہ میں ایسے کرپٹ لوگوں کی کی نہیں تھی جو اپنا منہ بچ کر جزل کھورٹ کو ہر قسم کی سوتیلی فراہم کر رہے تھے۔ اسلحہ اور ہر قسم کا گولہ بارود جزل کھورٹ کی اہم ترین ضرورت تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ گولہ بارود کی ترسیل میں بھی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوئی ہو اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا کروڑوں ڈالر مالیت کا گولہ بارود تباہ ہو گیا۔

"کوئلن ٹرائی اینٹل میں بھی کھلی ی چیج تھی ہے۔" واٹک

ذائقہ رہا تھا ”بہز ل کھوراٹ بہت بھنا یا ہوا ہے اس نے تھماری  
مگر قماری کے لیے پانچ لاکھ امریکی ڈالر کے انعام کا اعلان کر دیا  
ہے وہ ہر صورت میں تمہیں زندہ پکڑنا چاہتا ہے تمہارے  
باغیوں اب تک اس کے نہ صرف کسی آدمی مارے جا چکے ہیں بلکہ  
گولہ بارود کی تباہی نے اس کا داغ پلٹ کر رکھ دیا ہے اس نے  
تمہیں اپنا دشمن غیر ایک قرار دے دیا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو  
خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے لگنے لگے۔ ”بہز ل کھوراٹ  
کے اعلان نے میاں بھی کھلبلی پا چڑی ہے لیکن کسی شخص کو تمہاری  
مگر قمار سے دلچسپی نہیں۔ لوگ خوف زدہ ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے  
کہ میاں کو پہلی ایسی جنگ نہ چھڑ جائے جس میں بے گناہ افراد مارے  
جائیں۔“

”یہاں کی انتظامیہ کا کیا ردِ عمل ہے اور کیا جہل کھوراں اتنا طاقت ور ہے کہ تعالیٰ لینڈ کے خلاف اعلانِ جنگ کرے؟“ میں نے پوچھا۔

”جنگل کھوراتِ طاقت اور ضرور ہے اس کی اپنی فوج بھی ہے جس کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں لیکن وہ کسی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کی حماقت نہیں کرے گا۔ البتہ وہ گورٹلا جنگ شروع کر سکتا ہے۔ اس کے فوجی گورٹلا جنگ کے باہر ہیں۔ سرحد کے آس پاس کی بستیوں میں چھاپا مار بارودیاں کر کے وہ اپنے پردوس کی کسی بھی حکومت کو اپنے مطالبات ماننے پر مجبور کر سکتا ہے اور جہاں تک مقامی انتظامیہ کا سوال ہے تو توڑے سے زیادہ آئیس کرہٹ ہیں۔ اس کا اندازہ تم اس بات سے بھی لگائے ہو کہ کانچ میں دھماکوں کے بعد شہر سے جن دو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا، انہوں نے اگرچہ کچھ سنسنی خیز انکشافات کیے تھے مگر آج وہ پھر افسوس نہ صرف ہار گیا بلکہ دریائے میکانک عبور کرنے کے لیے ایک نشتی بھی مہیا کر دی گئی۔“

”عام لوگوں کے کیا تاثرات ہیں؟“ میں نے پوچھا ”کیا انہیں یہ اعتراض نہیں کہ جنرل کھوارٹ نے اس علاقے میں اپنے اڑے بنا رکھے ہیں؟“

”کسی کو اس نے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کس نے کہاں اڑے بنا رکھے ہیں۔“ اور انگ ڈن نے جواب دیا ”عام تہائی باشندے بہت سیدھے سادے اور محنت کش ہیں۔ وہ صرف دو وقت کی روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ کون کیا کر رہا ہے اس شہر کے باشندوں کی آہنی کا داوود اور سیاحت پر ہے اور یہ سیاحت کا یزین ہے۔ آج دوسرے بعد ازظہار نے کوئلہ نرائی انجیل کی طرف جانے والے راستے بند کر دیے ہیں۔ یہ خبر بوسے شرمیں پھیل چکی ہے کہ اس کا بیج میں جزل کھوراٹ کے گور کا بدو کا ذخیرہ تھا جو عمل طور پر تباہ ہو چکا ہے اور جزل کھوراٹ کی طرف سے کسی ممکنہ کارروائی کے پیش نظر اندون ملک اور غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح واپس جا رہے ہیں جس سے یہاں کے لوگوں کا کامیاب

"میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا،  
"یہ ایک کارروائی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہاں جیل کمرات کے  
بینی کی ایک مدت سے ایجنٹ موجود ہیں۔ اگر انہیں بتا چل گیا  
تو پتا نہیں چلے گا۔ وہ لوگ پہلی دکان میں گئے۔"  
پھر میں ان کی طرف سے کسی ممکنہ کارروائی کا قبل از وقت بتا  
دیا۔ "واک ڈن نے مسکراتے ہوئے کہا، "میں نے شہر  
چل جانے گا۔" بعد سے پتہ چلا کہ بد دوست کیا تھا۔ اس  
وقت تک جبکہ جاننے کے بعد سب سے پہلے یہی بد دوست کیا تھا۔ اس  
کا تھیں۔ چاروں طرف کم از کم میں حفاظہ موجود ہو، جو کسی بھی قسم  
کی صورت حال سے نمٹنے کو تیار ہیں۔"  
"میں مجھے تو کابج کے آپ پاس کوئی بھی نظر نہیں آیا؟" میں

”تمہارے دونوں ساتھی چنگاک رائے سے روانہ ہو چکے ہیں۔“ دونوں کاربورو رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پورا ”اے نہیں چنگاک رائے سے نکلے ہو ایک مٹھنا ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے اس میں مین پیسے میں مزید ایک مٹھنا لگے گا۔“ جنس معلوم ہی ہے راز نکال کر پتھر اور خطرناک ہے۔ اتنا وقت تو گز ہی جائے گا۔“

فوجیوں نے میز پر کھانا لگا دیا۔ ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ لہذا اسی طرف کھڑا تھا۔ اس نے پھر اٹھایا۔ یوزیہ دو دن تک بات کی پھر واپس ڈنک اٹھانے لگا۔ کیا لہو کے چہرے پر کچھ مجھ سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

میری چھٹی جس کسی گروہ کا احساس دلانے لگی۔  
 وانگ ڈن اٹھ کر ٹیبل فون کے پاس چلا گیا اور لوما کے ہاتھ سے  
 ریسیور لے کر بات کرنے لگا۔ وہ قبائلی زبان میں بات کر رہا تھا جس  
 کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن ایک دو منٹ بعد اس  
 کا چہرہ صدمان ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اب وہ چیخ  
 کر فون پر بات کر رہا تھا میرا اس نے ریسیور خراب اور تیرے لیے جس لوما  
 سے کچھ گئے تھے۔ بات ختم کر کے وہ میز کی طرف آنے کے بجائے  
 باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔

واٹک اُن اس دوران میں لان کے آخری سرے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے جنگل کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھوں کا بھونہہ بنا کر منہ پر رکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ غالباً کسی ایسے جانور کی آواز تھی جو اسی نواح میں پایا جاتا تھا۔ اس نے تین چار مرتبہ اس آواز کو دہرایا۔ جواب میں مختلف اطراف سے ایسی ہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"او۔ باس تمہیں۔"  
 "کیا بات ہے، دامک؟" میں نے اسے جملہ کھل نہیں کرنے  
 دیا "اس کا بیج پر پریس ریڈ کرنے والی چھاپا جنرل کھوراٹ کے آدمی  
 حملہ کرنے والے ہیں؟"

اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے شاید تم۔“ وہ خاموش ہو گیا۔  
 ”خاموش کیوں ہو گئے، بتاؤ کیا بات ہے؟“ میں نے اس کے  
 چہرے پر غطریں جمادیں۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک  
 بڑھتی جا رہی تھی۔

اور: ”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں ہتھوڑے برسنے لگے ”کہاں حملہ ہوا ہے کیا وہ لوگ؟“

رائے سے آنے والی سڑک پر اس قصبے کی پکی چیک پوسٹ نصف میل دور جب پروا طراف سے شدید فائرنگ کی گئی۔ حملہ آور فرار ہو چکے ہیں۔ چیک پوسٹ کے محافظ فائرنگ کی آواز سن کر اس طرف گئے تھے۔ انہوں نے ہماری جیب بھان لی اس لیے مجھے

فون کر گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔

”تم جھٹ بولتے ہو واٹنگ۔“ میں تقریباً بچا تھا۔

واٹنگ ڈن کے جواب دینے سے پہلے ہی باغ جمہوری تاریکی سے نکل کر ہماری طرف آگئے۔ وہ سب قابل تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آئوٹریک رائفلیں تھیں اور ہر ایک کے سینے پر دونوں طرف سے کراس کرتے ہوئے گولیوں سے بھرے ہوئے بیٹ تھے۔ واٹنگ ڈن نے تیز لمبے میں ان سے کچھ کہا اور وہ دوڑتے ہوئے کانچ کے اطراف میں پھیل گئے۔ واٹنگ ڈن بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ بھاگ دوڑ کی آواز سن کر رکھلی اور جاگتی کھانا چھوڑ کر برآمدے میں آگئی تھیں۔ ان کے قریب ہی لوہا بھی رائل فیل بے کھڑا تھا۔ واٹنگ ڈن نے اس کے ہاتھ سے رائفل لی اور جیب کی طرف بڑھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا واٹنگ۔“ میں نے اس کے ساتھ چلے ہوئے کہا۔

”تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے باس۔“ واٹنگ ڈن نے کہا۔ ”وہاں پولیس پہنچ چکی ہوگی۔ اگرچہ یہاں کوئی پولیس والا نہیں پچھاتا نہیں ہے لیکن تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر وہ ٹھیک جا میں گئے۔“

”جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا ”وہ لوگ تمہارے کس حال میں ہوں گے اور میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔“

واٹنگ ڈن نے میری طرف دیکھا پھر رائفل میرے ہاتھ میں تھما دی اور چپ کر لیا۔ کچھ کہہ کر کانچ کی طرف دوڑ گیا۔ رکھلی اور جاگتی دوڑتی ہوئی ہمارے قریب آئیں۔ انہیں کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ان دونوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”ہائی دے پر تمہارے اطلاع ملی ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں یہ کہتے ہوئے جیب کی طرف بڑھ گیا۔

لوہا دوسری رائفل لے آیا تھا۔ واٹنگ ڈن نے رائفل سنبھالی اور جیب کے اسٹینڈنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا اور پھر اس نے جیب اس تیزی سے گھمائی تھی کہ گاڑیوں کے نیچے سلب ہونے والی بجری مشین گرنے سے نکل ہوئی گولیوں کی طرح چاروں طرف اڑنے لگی۔

واٹنگ ڈن خطرناک حد تک تیز رفتاری سے جیب چلا رہا تھا۔ میں دوڑ پر پہنچ کر تو اس نے رفتار اور بھی بڑھا دی۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک تھا۔ کئی مرتبہ حادثے ہوتے ہوئے بچا تھا لیکن اس نے رفتار کم نہیں کی۔

جب سے نکل کر چانگ رائے کی طرف جانے والی ہائی وے پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ جیب کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کر رہا

ہو۔

چیک پوسٹ پر اسے جیب روکنی پڑی تھی۔ چیک پوسٹ پر حافظ اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس وقت وہاں صرف دو تھے۔ واٹنگ ڈن ان سے تیز لمبے میں بات کرنے لگا۔ ان میں ایک نے جلدی سے آگے بڑھ کر پیراٹھایا اور واٹنگ ڈن جیب ایک زوردار ہنگے سے آگے بڑھا دی۔ جائے واردات پہنچنے میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ واٹنگ ڈن نے زور سے بریک لگائے تھے کہ فضا ٹانگوں کی چرچر ہٹ کر آواز گونج اٹھی تھی۔

وہ ایک بند جیب تھی جو سڑک سے ہٹ کر آڑی ترمیم تھی۔ چیک پوسٹ کے دو حافظ رائفلیں لے جیب کے قریب کھڑے تھے۔ میں اور واٹنگ ڈن اپنی جیب سے اتر کر اس جیب کی طرف دوڑے۔ واٹنگ ڈن نے اپنی جیب کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں اور اس کی روشنی میں دوسری جیب کو دیکھ کر کہیں لگا تھا۔ جیب چاروں طرف سے پھلتی ہو چکی تھی۔ تمام پیشہ ہوتے تھے۔ جیب کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر اس طرح گرا ہوا تھا اس کی ٹانگیں اندر تھیں اور سر باہر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اور سینے پر کئی گولیاں لگی تھیں۔ خون آلود چہرہ بہت سیاہ تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر کین تھا۔ اس کا جسم بھی ٹھنڈا آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس کا سر ٹیبل بورڈ سے ٹکا ہوا تھا۔ رائے اس کے پیروں کے قریب پڑی تھی۔

بیچے کا دروازہ کھولنے ہی مجھے سینے میں دل ڈنکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شریانوں میں خون جیسے اچھلنے لگا۔ میں نے بت لاشیں دیکھی تھیں۔ کئی لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گماتا رہا تھا۔ انہیں اپنے سامنے ترپے اور دم توڑتے ہوئے دیکھے مگر ایسا روح فرسا منظر آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

جیب کے پچھلے حصے میں چار لاشیں بیٹھے اور پڑی ہوئی دو گرن میں تھے۔ ایک کا پچھلی جسم آٹھ سینٹ پر تھا اور دوسرا اس کے نیچے دو سرائیو میں دبا ہوا تھا اور اس کے نیچے پر لگا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ بیچھے تھی اور دوسرا پیراٹھ سے لٹکا ہوا تھا۔ سب سے نیچے تھا جی جس کی صرف ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں گرن میٹوں کے جسم پھلتی تھے۔ ہر سادے جسم کی سوراخ نظر آ رہے تھے۔ تھا جی ان سب کے نیچے ہی تھا۔ اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسے کتنی گولیاں لگی تھیں۔ میں نے واٹنگ ڈن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے قریب کھڑے ہوئے حافظ سے کہہ رہا تھا۔ وہ تھا جی زبان میں باتیں کر رہے تھے اس لیے میں بھی تھا۔

”فاز کی آواز سننے ہی ہم تین آدمی جیب پر اس طرف

”حافظ کہہ رہا تھا۔“ میں نے صورت حال دیکھی تو ایک حافظ کو دیکھا۔ ایک ہندو کوڑا کو اطلاع دی جا سکتے۔ ہم دونوں یہیں تھے۔ میرا خیال ہے کہ حملہ اور میرا سڑک کے دونوں طرف سے لگائے بیٹھے تھے۔ جیب جیسے ہی یہاں پہنچی۔ دونوں طرف سے ایک فائرنگ شروع کر دی۔ جیب میں موجود کسی گرن میں سے ایک کاروائی کا موقع نہیں مل سکا ہو گا۔ مجھے حیرت ہے کہ گولیاں کتنے کے بعد ڈرائیور نے جیب روک کیسے کی تھی۔

”فاز کی آواز سننے ہی اس نے بریک دبا دیا تھا اور اس کے بعد اس کا جسم پھلتی ہو گیا۔“ واٹنگ ڈن نے کہا۔ ہم اطلاع ملنے پر شرکی دو طرف سے یہاں آگئے تھے۔ جیب جت کی بات یہ تھی کہ پولیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ پولیس ہیڈ کوارٹر شہر کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں یہی بات کہتا تھا۔ ایک بار پھر جیب کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا اور سڑک باؤڑا دھر دیکھنے لگا۔

سڑک کا کئی کشادہ تھی۔ اس کے دونوں طرف پھولنے پھولنے کی طرح افغان خمری اور یہ نیلے بڑے سے ڈنگے ہوتے تھے۔ توپاؤں کو چھپے ان ٹیلوں میں ایک کٹاؤ سا تھا۔ میں اس کٹاؤ تک چلا گیا۔ ایک غیر ہمارا چڑھلا راستہ تھا جس پر ایک کاریا جیب آ رہی تھی۔

واٹنگ ڈن کی جیب کی ہیڈ لائٹس کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی اور پھر اس کٹاؤ کے قریب پڑی ہوئی کوئی چیز چمکتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ چیز اٹھالی۔

وہ اے کے فائبر سیون چینی رائفل کا ایک خالی کارتوس تھا۔ میں نے باؤڑا دھر دیکھا۔ اس جگہ گولیوں کے لاندہ داخل ٹکڑے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ حملہ کونوں نے ہمیں پرگھات لگا کر جیب پر فائرنگ کی ہوگی۔

جلدی مجھے سڑک کی دوسری طرف بھی ایسی ہی جگہ نظر آئی۔ وہاں بھی گولیوں کے لاندہ داخل ٹکڑے ہوئے تھے اور اس طرف بھی ایک ٹکڑا راستہ تھا جو ڈھلان کی طرف چلا گیا تھا۔ میں پھر پہلی جگہ پر گیا اور باؤڑا دھر دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ حملہ آور اسی راستے سے کاریا جیب پر فرار ہوئے تھے۔

میں دوبارہ جیب کے قریب گیا اور اس میں نیچے اور پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ ان لاشوں سے خون اتنا زیادہ بہ چکا تھا کہ جیب کے فرش سے ٹپک کر سڑک پر بھی جم رہا تھا۔

تھا جی اور ہر سادگی موت کا چھٹا تھا۔ دیکھ بیچتی تھا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ تھا جی میری محسوس تھی۔ میں وہ وقت نہیں بھلا سکتا تھا جب بنگال کے ایک بازار میں موت کے فرشتوں سے بچنے کے لیے میں اس کی گاڑی چھپ گیا تھا اور وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی۔ مجھے ہاتھ دے کر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

بلکہ سب کچھ لٹا دیا تھا اور وہ جس بے بسی کی موت مری تھی اس پر میرا دل دور ہوا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے اور نیچے نوپر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں جری طرح چونک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے تھا جی کے ایک پیر میں حرکت ہوئی ہو۔ پہلے تو میں اسے اپنا دہم سمجھا لیکن نہیں یہ میرا دہم نہیں تھا۔ تھا جی کے ایک پیر میں واقعی بہت آہستہ آہستہ حرکت ہو رہی تھی۔ میں نے واٹنگ ڈن کو آواز دی اور جیب پر چڑھ گیا۔

ہم دونوں نے دونوں حافظوں اور ہر سادگی لاشوں کو اٹھا کر سیٹوں پر ڈال دیا۔ تھا جی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا لباس اور چوہا خون سے تر تھا۔ میں نے تھا جی کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن محسوس ہو رہی تھی۔

”تھا جی۔۔۔ تھا جی۔۔۔ آٹھ گھنٹہ کھولو۔“ میں اس کا حال تجتہا کرتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔

میں نے واٹنگ ڈن کی مدد سے تھا جی کو جیب سے نکال کر سڑک کے کنارے گھاس پر لٹا دیا۔ میں تھا جی کے جسم کو ٹول کر دیکھنے لگا۔ اس کا لباس اگرچہ خون سے تر تھا لیکن جسم پر بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹھٹ اور بک اٹھا کر ہیٹ ڈھیروہ کو بھی دیکھا اور پھر اسے لپٹ دیا۔ اس کی پشت پر بھی کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ سیدھا کر دیا۔

دونوں حافظ بھی اس وقت ہمارے قریب ہی کھڑے تھے۔ میں نے واٹنگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

”تھا جی زندہ ہے۔ اسے کوئی گولی بھی نہیں لگی لیکن اس کا پولیس کے ہاتھ لگنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اسے یہاں سے لے جانے کا بندوبست کرو۔“

بات واٹنگ ڈن کی سمجھ میں آگئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چچا کر حافظوں سے کچھ کہنے کے پھر میں نے اور واٹنگ ڈن نے تھا جی کو اٹھا کر واٹنگ ڈن کی جیب کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ تھا جی کے لباس سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا۔ اس جیب کی سٹیش بھی آنے کے سامنے تھیں۔ تھا جی کو سیٹوں کے درمیان فرش پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں اس کے قریب سیٹ پر بیٹھ گیا۔ واٹنگ ڈن نے انجن اشارت کرتے ہوئے ایک بار پھر حافظوں سے چچا کر کچھ کہا اور جیب کو تیز رفتاری سے شرکی طرف دوڑا دیا۔

چیک پوسٹ کے پاس صرف ایک منٹ کو جیب روکنا پڑی تھی۔ واٹنگ ڈن کو دیکھتے ہی ایک حافظ نے یہیر اٹھا دیا تھا۔ دوسرا حافظ واٹنگ ڈن سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ واٹنگ ڈن نے تیز تیز لمبے میں کچھ کہا اور جیب آگے بڑھا دی۔

”پولیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ انہیں اسی وقت اطلاع دے دی گئی ہوگی۔“ میں نے واٹنگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں صورت حال کی عینگی کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔“ واٹنگ



ڈن نے جواب دیا "تمہاری دوست کو اسپتال لے کر چلیں یا۔۔۔؟"  
"کالج!" میں نے اسے بات عمل نہیں کرنے دی "تمہاری دشمنی  
نہیں ہے۔ اسے اسپتال لے جانا مناسب نہیں ہے۔ کالج ہی لے  
چلو۔"

شرکی سرکوں پر اب زیادہ تر ٹھیک نہیں تھا۔ وانگ ڈن کو تیز  
رفتاری سے جیب چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔  
کالج پہنچے تو تھائی اس وقت تک بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔  
جیب رکھنے ہی رنگولی اور جاگی بھی اندر سے نکل کر برآمدے میں  
آگئی تھیں۔ میں نے اور وانگ ڈن نے تھائی کو اٹھا کر جیب سے  
ٹکلا تو تھائی کو خون میں لت پت دیکھ کر جاگی اور رنگولی کے منہ سے  
چپیں نکل گئی تھیں۔

تھائی کو بال میں لے جا کر قالین پر لٹا دیا گیا۔ رنگولی اور جاگی  
کے چروں پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"ٹھیک۔ کیا ہوا اسے۔ پر ساد کماں ہے؟" جاگی نے چیخ کر  
پوچھا۔

"تھائی بالکل ٹھیک ہے لیکن پر ساد۔" میں نے جان بوجھ کر  
جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

جاگی چیخ اٹھی۔ وہ تھائی سے لپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
میرے اشارے پر رنگولی اسے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

وانگ ڈن فون پر بات کر رہا تھا اور میں ایک بار پھر تھائی کو  
لوٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے واقعی کوئی گولی نہیں لگی  
تھی اور یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی اور پھر ساری بات میری  
سمجھ میں آگئی۔

اس جیب کی پچھلی سٹیش بھی آٹنے سامنے تھیں۔ پہلی گولی  
چلتے ہی ڈرائیور نے بدحواس ہو کر بریک لگایا ہو گا تو تھائی جھٹکا گئے  
سے سیٹ سے پیچھے گر گئی ہوگی اور پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں مل  
سکا تھا۔ اسی دوران میں جیب پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی اور پر ساد  
اور دونوں محافظ چھلٹی ہو کر تھائی کے اوپر گرے اور وہ ان کے نیچے  
دب گئی اور شاید خوف کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

وانگ ڈن ٹیلی فون بند کر کے تھائی کو اب وہ لٹا سے ہاتھیں کر رہا  
تھا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"میں نے سردار تھالو کو اطلاع دے دی ہے۔" وہ میری  
طرف دیکھتے ہوئے بولا "سردار تین چار گھنٹوں میں یہاں پہنچ جائے  
گا۔ میں ہائی دے پر جا رہا ہوں۔ تم تھائی کو دیکھو۔ اگر اسے ڈاکٹر کی  
ضرورت ہو تو۔"

"وہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ صرف  
خوف اور مدد سے بے ہوش ہوئی ہے۔ رنگولی اور جاگی اسے  
ہوش میں لے آئیں گی۔ میں تمہارے ساتھ جملہ جا رہا ہوں۔"  
"نہیں باس۔" وانگ ڈن نے کہا "وہیں دوپہان پہنچ چکی ہوگی  
اور اب تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے معاف کرنا باس۔"

اس وقت ہمیں میری بات ماننی پڑے گی۔

میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ وانگ ڈن کے جانے کے بعد  
دوبارہ ہال میں آ گیا۔ رنگولی ایک کھیلے کپڑے سے تھائی کا چہرہ  
گردن وغیرہ صاف کر رہی تھی۔ ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش  
کرتے رہے۔

تقریباً بیس منٹ بعد تھائی نے کراچے ہوئے آنکھیں  
دیں۔ جاگی نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا اور رنگولی نے  
گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ تھائی نے ایک گھونٹ پانی  
کے بعد گلاس ہٹا دیا۔ اسی وقت لٹا ایک پیالہ لے کر آیا۔  
میں خشکی رنگ کا شربت تھا۔

"یہ شربت میڈم کو پلا دو باس۔ چند منٹ میں ٹھیک ہو جائے  
گی۔" اس نے پیالہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

شربت سے مندل بھی خوشبو اٹھ رہی تھی اور شاید تھائی  
بھی بہت اچھا تھا اسی لیے تھائی نے پی پی لیا۔ لٹا نے تھائی کے  
مندل میں کچھ اور بڑی بوتلیں کے رس کی آمیزش سے یہ شربت  
تیار کیا جاتا ہے۔ جو فرحت بخش ہونے کے ساتھ نہایت خوشبو  
ہے۔ تھائی کے لیے شربت کے چند گھونٹ واقعی اسے تازگی  
ہوئے چند منٹ بعد ہی اس کے حواس بحال ہونے لگے لیکن  
کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔

"جاگی۔" میں نے کہا "اسے باجھ دم میں لے جاؤ اور  
شمارا کپڑے تبدیل کرادو۔"

جاگی اور رنگولی تھائی کو سہارا دے کر کمرے میں لے گئے۔  
وہ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد باہر آئی تھیں۔ تھائی کی آنکھوں  
اب بھی وحشت بھری ہوئی تھی اور خوف تو پیچھے چہرے پر نمودار  
رہ گیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہماری شکلیں دیکھتی رہی۔

لٹا نے منسل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے کافی بٹالہ۔ ہم  
وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کر رہے تھے۔ کافی پینے کے  
تھائی نے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس  
ہونٹ پکڑ پکڑا کر رہ گئے اور پھر وہ مٹ مٹ پھوٹ کر رونے لگی۔  
قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تھائی کو اپنے ساتھ لپیٹا۔  
وہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ جاگی اور رنگولی کی آنکھوں سے  
آنسو بہ رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو  
ہوئے تھا۔

رو لینے سے تھائی کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ اور  
وہ بات کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا تھائی۔ کیا وہ لوگ شرمناک  
تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔  
"نہیں۔" تھائی نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا "میں نے  
یقین ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع بھی اور وہ  
پہلے ہی سے گمات لگے بیٹھے تھے۔"

"میں کیسے بتا چلا کہ تم لوگ آ رہے ہو؟" میں نے کہا۔  
"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چینگ رائے میں وانگ سائی نے  
میں دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ تھالو نے ہمیں ہمارے کوک  
روم کے کنارے ایک مکان میں منتقل کر دیا تھا اور ہماری حفاظت کا  
بارہ کے بارے میں سوچا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وانگ سائی یا  
میں ہی مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔

اس کے کوئی مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔  
"میں وہاں سے ہماری روانگی کا بھی پتا چل گیا تھا اور انہوں  
نے یہاں ہمارے بارے میں دارا وغیرہ کو فون پر اطلاع دے دی۔  
میں پھر تھانگ سے تقریباً چند منٹ پہلے پیچھے سے آنے والی ایک تیز  
پکار تھانگ سے اور تھانگ ایک تھا۔ اس کا میں ڈرائیور کے سوا  
دوسرا شخص نہیں تھا اور وہ ڈرائیور وانگ سائی تھا۔ وہ کار خطرناک حد  
اور تیزی میں تھائی کو اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع تک نہیں مل  
سکا تھا اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں اور کسی کار کا الجھن اشارت  
ہوئے اور اس کے روانہ ہونے کی آواز سنا دی۔ اس وقت تک  
میرے حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں کے  
سامنے تاریکی چھٹی چلی گئی لیکن وہ آواز جس نے چیخ کر کہا تھا "یہ  
ابھی زندہ ہے۔ ختم کر دو اسے" میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔  
وہ آواز تو اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

"لوگوں تھانگ کسی کی آواز تھی وہ؟" میں نے اس کے خاموش  
ہونے پر پوچھا۔  
"دارا۔" تھائی نے جواب دیا "وہ دارا کی آواز تھی۔ میں  
اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔"

میں اچھل پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا بیچ سے فرار کے  
بعد دارا نے کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لیا تھا اور وہاں سے چینگ  
رائے والوں سے بھی رابطہ کیا ہو گا اور وانگ سائی نے اسے تھائی  
اور پر ساد کے بارے میں بتایا ہو گا۔  
تھائی کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ چینگ رائے میں ان کی  
مسلحہ نگرانی کی جارہی تھی اور جب تھائی اور پر ساد محافظوں کے  
ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے تھے تو وانگ سائی سمجھ گیا تھا کہ یہ  
دونوں چینگ سائین آ رہے ہیں۔ اس نے فون پر دارا کو ان کی  
روانگی کی اطلاع دے دی۔ ان میں بیٹھنے کے لیے ہو گیا تھا کہ دارا  
اور اس کے ساتھی سرک پر کسی جگہ گمات لگا کر بیٹھیں گے۔

دارا کو اطلاع دینے کے بعد وانگ سائی نے بھی تھائی کی جیب  
کا تعاقب شروع کر دیا اور پھر ان سے آگے نکل کر طے شدہ جگہ پر  
گمات لگائے بیٹھے دارا اور اس کے ساتھیوں کو بتا دیا کہ اس کے  
بعد جو جیب آئے گی وہی ان کا مارگٹ ہوگی۔  
دارا اور اس کی بانی کو میں پچھلے کئی روز سے پے درپے  
نقصان پہنچا رہا تھا اور ظاہر ہے۔ وہ میرے یا میرے ساتھیوں کے  
خلاف کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنا اس  
کے لیے ذرا مشکل تھا۔ آج صبح تو میں اس کے قابو میں آ گیا تھا لیکن

کدیں گے میں ان لاشوں کے پیچھے جسے حرکت پڑی رہی۔  
"مقدموں کی وہ آوازیں جیب کے قریب رک گئیں۔ وہ کتنی  
آوی تھیں۔ ان میں سے شاید وہ جیب کے اوپر سے محسوس کر پھیل  
طرف آگئے تھے پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا گیا۔  
"میں جن لاشوں کے پیچھے بولی تھی ان میں سب سے اوپر  
والے محافظ کے جسم میں شاید زندگی کی رشتی باقی تھی۔ غالباً اس کے  
جسم کے کسی حصے میں کوئی حرکت پیدا ہوئی ہوگی کیونکہ اسی وقت باہر  
سے ایک چیخ بولی آواز سنا دی "یہ ابھی زندہ ہے۔ ختم کر دو  
اسے۔" پھر میرے سر کے عین اوپر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ اگر  
راکتوں کی نال کا رخ ذرا نیچے کی طرف ہوتا تو گولیاں مجھے بھی چاٹ  
جاتیں۔ یہ سب کچھ چند منٹ میں ہو گیا اور اس قدر اچانک ہوا تھا  
کہ ہمارے محافظ کو اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع تک نہیں مل  
سکا تھا اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں اور کسی کار کا الجھن اشارت  
ہوئے اور اس کے روانہ ہونے کی آواز سنا دی۔ اس وقت تک  
میرے حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں کے  
سامنے تاریکی چھٹی چلی گئی لیکن وہ آواز جس نے چیخ کر کہا تھا "یہ  
ابھی زندہ ہے۔ ختم کر دو اسے" میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔  
وہ آواز تو اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

رنگولی کی وجہ سے نہ صرف میں اور جاگی وغیرہ مجھے بلکہ دارا وغیرہ کو اپنی جائیں بھا کر بھانجا پڑا۔ کہ ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا لیکن بعد میں وہ بھی حیرت انگیز طور پر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ کم فرار ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے میں کامیاب ہو سکا تھا یا نہیں اور پناہ لیے ہوئے تھا۔ سر حال دارا کو تھا کی اور پر سادہ پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ برسات تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا لیکن تھائی کی ابھی زندگی باقی تھی۔ وہ جی

میرے خیال میں دارا نے اس جپ پر حملہ کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ وہ جپ اس علاقے کے سب سے بڑے قبیلے کیرن کے سردار کی تھی۔ تھائی اور پر سادہ اس کے مصلحتوں کی بنیاد رکھتے تھے۔ پر سادہ کے علاوہ اس کے تین گن میں اور ڈرائیور بھی مارا گیا تھا۔ تھالوب ایک با اثر سردار تھا۔ اس کی جپ پر حملہ اس کے چار آدمیوں اور ایک مہمان کی ہلاکت کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ واگ ڈن نے سردار تھالوب کو اس واقعے کی اطلاع دی وہ بھی اور وہ چنانچہ رائے میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر یہاں آنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

پر سادہ کی اندوہناک موت کا ہم سب کو افسوس تھا۔ تھائی کی حالت بھی بہت بُری تھی۔ اس نے صرف پر سادہ کو ہی نہیں چار اور آدمیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے گولیوں سے چھلنی ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ زندگی کے خوفناک ترین تجربے سے گزر رہی تھی اور اس کا اثر اب بھی اس نے ذہن پر تھا۔ کسی وقت بات کرتے کرتے وہ یک دم چونک جاتی اپنی جگہ سے اٹھ چلی پرتی۔ میرے خیال میں تھائی کو سکون کی ضرورت تھی اور نیند اس کے لیے بہترین مددگار ثابت ہو سکتی تھی لیکن وہ صوبے پر بیٹھی متوہش نظروں سے بھی نہیں اور کبھی ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ میں نے لوبا سے کسی ایسی چیز کے بارے میں دریافت کیا جس سے تھائی کو نیند آسکے۔

”افون۔“ لوبا نے کہا ”اسے تھوڑی سی افون کھلا دی جائے وہ آرام سے سو جائے گی۔“

لوبا کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ افون بھی لوبا ہی نے فراہم کی تھی۔ تھائی کو اگرچہ بہت کم مقدار میں افون دی گئی تھی مگر اس کے کمرے والے اس سے تھائی کے چہرے کے آثارات جڑ گئے مگر اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد تھائی پر خود بخود طاری ہونے لگی۔ میں نے جاگی کو اشارہ کیا۔ وہ اسے اٹھا کر کمرے میں لے گئی۔

اس وقت رات کے دو بجتے والے تھے مگر واگ ڈن کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں لی تھی۔ سردار تھالوب پہنچ چکا ہو گا لیکن میرے خیال میں وہ پولیس یا انتظامیہ کے دیگر حکام کے ساتھ

اس قدر مصروف ہوں گے کہ انہیں ہمیں فون کرنے کا موقع ملنا ہوگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں نے اٹھ کر کمرے میں بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کی خبر سونگئی تھی اور جاگی اپنی بیڈ کی پشت سے نکل نکلا۔ دروازہ کھلی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ پر سادہ کی موت نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک ایک کر کے چھڑ رہے تھے۔ پہلے کانگ ان کے باپ مارا گیا پھر باقی تمام ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اپنا ذہنی توازن بڑھاتا تھا اور پندرہ کے آدمیوں نے اسے اسپتال سے اٹھا کر لایا۔ اب اس کی زندگی کی بھی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی پھر فون جوں خوار بیٹھوں کی درندگی کا شکار ہوئی اور اب پر سادہ اس کے درپے مصدات لے جا چکی اور تھائی پر زیادہ اثر کیا تھا۔ اثر چھوڑ چکا تھا لیکن میں دور اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

جاگی نے میری طرف دیکھا۔۔۔ مگر میں کوئی بات کہنے کے بغیر دوڑنے سے ہی لوٹ آیا اور ہال میں رکنے کے بجائے باہر لان میں بیٹھ گیا۔ پر آدے کا بلب بجھا ہوا تھا۔ باہر تاریکی تھی۔ میں نے کالج کے اطراف میں کی ساتوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہ قبائلی گاؤں تھے جو واگ ڈن کا کالج کی حفاظت کے لیے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ قبائلی محافظان کے علاوہ تھے جو کالج سے دور جنگل میں پھیلے ہوئے تھے۔

مجھے اس وقت عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر لان میں ٹپٹنے لگا۔ میں چشم تصور سے باہر بارہ منظر دیکھنے لگا۔ تھالوب جپ اور اس میں پڑی ہوئی گولیوں سے چھلنی لگا۔ جپ اور ان لاشوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ فائرنگ کس قدر شدید تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ تھائی واقعی خوش قسمت تھی جسے معمولی سا زخم بھی نہیں پہنچا تھا۔

اور پھر دارا کا خیال میرے ذہن میں اُبھر آیا۔ عجیب غریب تھی کہ وہ جب بھی میرے ہاتھ آیا، جھٹکلا تھا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے بیٹھ دو سروں کو آگے کیا تھا۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اب کسی خاص حکمت عملی کی ضرورت تھی۔

میں دارا کے بارے میں سوچتا ہوا ماضی میں چلا گیا۔ بات میرے ماں باپ کے قتل سے شروع ہوئی تھی۔ اس وقت میں چھ ماہ تھا اور دارا بیٹھے دشمن سے جان بچانے کے لیے چھپتا چلا تھا۔ ہمارا جے مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکوں۔ اگرچہ میں نے بہت عرصے سے دارا کو کیس لئے نہیں دیا تھا۔ اس کے کئی ہندے میرے ہاتھوں مارے گئے تھے لیکن اسے ان آدمیوں کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ اس کے اپنے آدمی نہیں تھے۔ ہمارے گھر کے ٹوٹے۔ اس کی نظروں میں انسان اور کتے کا مرچا ایک برابر تھا لیکن میں دارا نہیں تھا۔ مجھے اپنے آدمیوں سے اس تھا پیار تھا اور دارا کی وجہ سے میرے خن

اس دن دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ میرے دل میں شروع ہی سے دارا کے خلاف انتقام کا جذبہ تھا۔ میں اب انتقام کے ساتھ ایک مقصد بھی شامل ہو گیا تھا۔ شہنشاہ کے خلاف ایک بہت خوفناک سازش ہو رہی تھی جس میں حکومت کے کچھ لوگ بھی شریک تھے۔ اس سازش کا کامیاب بنانے کے لیے دارا اور پندرہ سو مجھے لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس علاقے میں کسی جگہ کوئی ایسی خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی جس میں طاقتور حکومت کے سازشی افسروں کے علاوہ جرنل کھورات کی فانی بھی متوجہ تھی اور مہاراج نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی۔ شولٹ بھی متوجہ تھی اور مہاراج نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ میں نہ صرف اس میٹنگ میں ملے پانے والے منصوبے کا پتا لگائیں یہاں اگر معاملہ کچھ مختلف نوعیت اختیار کر گیا تھا۔

ٹائپک سمیت جرنل کھورات کے نہ صرف چار پانچ آدمی میرے ہاتھوں مارے جائے تھے بلکہ اس کا اسیلے کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تیار ہو گیا تھا اور جرنل کھورات نے ایک طرف تھائی حکومت کو دھمکی دی تھی اور دوسری طرف میری گرفتاری کے لیے پانچ لاکھ امریکی ڈالر کے انعام کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں جب تک زندہ ہوں ان کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا اور اسی دوران دارا وہ کارروائی کر رہا تھا جس سے پر سادہ کی موت کی صورت میں مجھے ناقابل ملانی نقصان پہنچا تھا لیکن مجھے یہ نقصان بہر کام پانا تھا جس کے لیے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اس رات ہنگام کے واٹ ٹریٹ میں مہاراج اور شہنشاہ کے کزن رتنا کو سن کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں ان دونوں نے مجھے واٹکاف الفاٹم میں بتا دیا تھا کہ اس مشن کے دوران میں مجھے ان لوگوں کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا، اپنے طور پر کرنا ہوگا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ چنانچہ رائے میں پہلے رنگولی اور پھر اس کے بڑے سے سردار تھالوب جیسے شخص سے ملاقات ہو گئی تھی۔ میں نے اگرچہ تھالوب کو اپنے اصل مشن کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن بیرون کی تجارت کے حوالے سے میرے نظریات سے وہ سو فیصد متفق تھا اور اس نے مجھے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی جس کے نتیجے میں ہم پچھلے میں چار روز سے اس کالج میں موجود تھے اور اس کا مستحق خاص واگ ڈن میرے ساتھ پوری طرح ان سرگرمیوں میں ملوث ہو گیا تھا اور آج دارا کی اس خوفناک کارروائی کے بعد تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جب میں تھالوب کو اپنے اصل مشن کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ پوری طرح میرا ساتھ دے گا۔ وہ ایک محب وطن آدمی تھا اور شہنشاہ کا خیر خواہ

بمقام۔

رنگولی صوبے پر آؤی ترجمانی پڑی سوری تھی۔ واٹنگ نے نیکل کے قریب کرسی پر لوبا بھی بیٹھا اور کھ رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ اٹھ گیا۔

”دو واٹ بند کرو۔ میں سونے جا رہا ہوں۔“ میں لوبا سے یہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا لیکن دو واٹ ہی میں ٹھیک کر رک گیا۔ تھائی اور جاگی بیڈ پر سوئی ہوئی تھیں۔ میں اس کمرے میں گیا جہاں رنگولی اور جاگی سوئے ہوئے تھے۔

بیڈ پر لیٹنے کے بعد بھی میں بہت دیر تک موجودہ صورتحال کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اس بات کی بھی تشویش تھی کہ واٹنگ ڈن نے کوئی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ میری آنکھ میچ آنکھ میچ مختلف آوازیں سن کر کھلی تھی۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر ہاتھ دوام میں مٹھس گیا اور منہ پر پھنڈے پانی کے چھینٹے دینے لگا۔ جب میں کمرے سے باہر نکلا تو واٹنگ ڈن کے ساتھ رنگولی اور جاگی بھی بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ میرے کرسی پر بیٹھنے کے چند منٹ بعد ہی لوبا نے میرے سامنے بھی چائے کا کپ رکھ دیا۔ باہر سے بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے گردن کھما کر دیکھا۔ لان میں گھاس پر سات آٹھ مسلح قبائلی بیٹھے ہوئے تھے۔ واٹنگ ڈن کی جپ کے پیچھے دو چھوٹے کپ اپ ڈک بھی کھڑے تھے۔ میں مڑ کر سوا لہ لگا ہوں سے واٹنگ ڈن کی طرف دیکھنے لگا۔

”محافظ ہیں۔“ واٹنگ ڈن نے میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا ”سردار تھالوب کی جپ پر فائرنگ اور اس کے بندوں کے مارے جانے کی اطلاع میچ سویرے آس پاس کی قبائلی بیٹیوں میں پھیل گئی تھی۔ اس وقت شہر میں کیڑوں مسلح قبائلی موجود ہیں جو تھالوب کے ایک اشارے کے منتظر ہیں مگر سردار تھالوب اس معاملے کو کوئی سیاسی ایٹو نہیں بنانا چاہتا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اس واقعے کی خبرات ہی کو ہنگام بھی پہنچ گئی تھی اور اب سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے چند اعلیٰ سرکاری حکام بھی نیلی کا پڑے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ سردار تھالوب حکومت کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کرے کیونکہ حکومت قبائلی بغاوت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آج دس بجے ان اعلیٰ حکام کی سردار تھالوب سے میٹنگ ہے۔ سردار نے تمہیں بھی بلایا ہے۔“

”مجھے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ سردار تھالوب کے خیال میں اس میٹنگ میں تمہاری شرکت بھی ضروری ہے۔ ہم ساڑھے نو بجے یہاں سے چلیں گے۔“ واٹنگ ڈن نے کہا۔

”رات کو کیا ہوا۔ کچھ پتا چلا کہ حملہ آور کون تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ واٹنگ ڈن نے نفی میں سر ہلایا ”پولیس کی کئی

پارٹیاں رات ہی کو حملہ آوروں کی تلاش میں روانہ ہو گئی تھیں۔  
شہر کے آس پاس کی بستوں کو بھی چیک کیا جا رہا ہے لیکن ابھی تک  
کوئی سراغ نہیں ملا۔

”پولیس حملہ آوروں کا سراغ نہیں لگا سکی لیکن مجھے پتا چل  
گیا ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟“

”کیا واقعی؟“ وانگ ڈن نے ابھی ہوئی نظروں سے میری  
طرف دیکھا۔ ”کون تھے وہ لوگ؟“

”دارا اور اس کے ساتھی۔“ میں نے جواب دیا۔  
”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ وانگ ڈن اچھل پڑا۔

”تم شاید بھول گئے ہو کہ قحالی اس محلے میں زندہ بچ گئی تھی  
اور ہم اسے یہاں لے آئے تھے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔“ وانگ ڈن کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”اسے تو  
واقعی میں بھولی ہی گیا تھا۔ کسی سے وہ؟“

”تمک ہے۔ اس وقت سوری ہے۔“ میں نے جواب دیا اور  
پھر جب پر حملے کے حوالے سے اسے وہ سب کچھ بتانے لگا جو قحالی  
مجھے بتا چکی تھی۔

”کیا قحالی کو یقین ہے کہ وہ دارا ہی کی آواز تھی؟“ میرے  
خاموش ہونے پر وانگ ڈن نے پوچھا۔

”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں زندگی بھر نہیں بھلایا  
جاسکتا۔ کسی کا کما ہوا کوئی جملہ، کوئی چوہا کوئی آواز۔“ میں نے

جواب دیا۔ ”کچھ ہی عرصہ پہلے کچھ بوری میں قحالی ایک ایسی ٹیپڈی  
سے دو چار ہو چکی ہے جس کی تمام تڑتے داری دارا پر عائد ہوتی

ہے۔ کچھ عرصہ پہلے قحالی کا گھر جلانے میں بھی دارا ہی کا ہاتھ تھا۔  
کئی برسوں سے دارا سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ قدم قدم پر اس کی

آواز ہمارے کانوں سے نکراتی رہی ہے۔ میں یا قحالی یا میرے  
ساتھیوں میں سے کوئی اور اس آواز کو کیسے بھول سکتا ہے۔ وہ یقیناً

دارا ہی تھا جس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے جیپ پر حملہ کیا تھا  
اور اسے قحالی اور پر ساد کی آمد کی اطلاع دینے والا وانگ سائی

تھا۔ جس کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس  
وقت بھی شہر میں آزادی سے گھوم رہا ہو گا۔“

”وانگ سائی کون؟“ وانگ ڈن نے ابھی ہوئی نظروں سے  
میری طرف دیکھا۔

”پیڈو کا ایک گرگا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک آدھ مرتبہ  
بنگاک میں اس سے بھی گراؤ ہو چکا ہے لیکن میں نے اسے زیادہ

اہمیت نہیں دی تھی مگر اب لگتا ہے کہ اسے ایک خاص مقررے کے  
طور پر آگے بڑھایا جا رہا ہے۔“

”حملہ آور کوئی بھی ہو چکا کہ نہیں جاسکے گا اور وانگ سائی کو  
بھی تلاش کر لیا جائے گا۔ بہر حال تم تیار ہو جاؤ۔ سردار قحالی

انتظار کر رہا ہو گا۔“ وانگ ڈن نے کہا۔  
میں اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا۔ قحالی اس وقت بھی سوری

تھی۔ میں ہاتھ دھو کر غسل کیا اور چندہ منٹ بعد جب تیار  
ہوا تو قحالی جاگ چکی تھی اور بستر پر لیٹی وہیں اس نے  
نظروں سے دھرا دھرا کر دی تھی۔ میں بیڈ کے قریب کھڑا  
کیا اور قحالی سے باتیں کرنے لگا۔

”آؤ مجھے بعد جب میں ہال میں پہنچا تو میرا ہاتھ پر  
قحالی نے جاگ کر قحالی کے بارے میں بتا دیا اور وانگ ڈن  
ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔

”تمک ساڑھے نو بجے ہم کالج سے نکل رہے تھے۔ میں نے  
ڈن کے ساتھ جیپ کی انٹی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دو گھنٹے میں کچھ  
پر بیٹھ گئے تھے۔ ایک پک اپ جیپ کے آگے تھی اور ایک بڑی

ان دونوں گاڑیوں میں قبائلی محافظ تھے جو برسے جو کس قدر  
تھے۔

سارا شہر بند تھا۔ کہیں بھی کوئی دکان کھلی ہوئی نظر نہیں  
آتی۔ سردار قحالی کے آدمیوں کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہ  
تھی۔ پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ کسی تک نہ

کے پیش نظر لوگوں نے اپنا کاروبار بند رکھا تھا۔ شہر کی مختلف جگہ  
پر مسلح قبائلی ٹولیوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ یہ آس پاس  
بستیوں کے رہنے والے قبائلی تھے جو قحالی کی جیپ پر مسلح

سن کر شہر میں جمع ہوا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں نہ صرف کون  
دوسرے قبائل کے لوگ بھی شامل تھے اور قبائلیوں کے ان  
اجتماع نے بھی لوگوں پر خوف و ہراس طاری کر دیا تھا۔

ہماری جیپ ایک کٹاؤدھ سڑک پر واقع ایک کوٹھی کے گرد  
میں داخل ہو گئی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر ٹیکڑوں مسلح قبائلی بیٹے  
ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والے محافظوں کی دونوں گاڑیاں

بھی گیٹ کے باہر سڑک پر ہی رک گئی تھیں۔  
کالج کی طرح اس کوٹھی کے گرد بھی وسیع رقبہ خاردار ناول  
میں گھرا ہوا تھا۔ کوٹھی بہت شاندار تھی۔ ہم جیپ سے اتر کر

ہی برآمدے میں پہنچے۔ سردار قحالی باہر گیا۔ اس نے بڑی گرم  
جوڑی سے میرا استقبال کیا اور مجھے بڑے احترام سے اندر لے گیا۔  
ذرا تنگ دھرم میں دو آدمی اور بھی تھے۔ وہ بھی مجھے کچھ

کھڑے ہو گئے۔ قحالی کی رسم کے بعد ہم صوفوں پر بیٹھ گئے  
وانگ ڈن صوفے کے قریب کھڑا رہا تھا۔

میں نے اور قحالی نے مناسب الفاظ میں ایک دوسرے سے  
تقریب کا اظہار کیا۔ قحالی کو اس بات پر شہرندگی تھی کہ اس کے  
آدمی مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے اور خود بھی موت کی

آغوش میں پہنچے تھے۔  
”اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ان  
گھات لگا کر حملہ کیا گیا تھا۔ اگر فوج کا دستہ بھی ہو تا تو شاید اس کا

بھی بیک مشہور ہوتا۔“  
”حملہ آور جو کوئی بھی ہیں بچ کر نہیں جاسکیں گے۔“ سردار

قحالی نے کہا۔ ”پولیس پارٹیاں اگرچہ ان کی تلاش میں ہیں لیکن  
میرے آدمی بھی چاروں طرف پھیل چکے ہیں۔ اس قسم کی چھاپا مار  
کارروایاں کرنے والے عام طور پر آس پاس کی پہاڑیوں میں  
پناہ لے لیتے ہیں اور کسی نہ کسی قبائلی بستی میں انہیں پناہ مل

جاتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو کسی بستی میں بھی پناہ نہیں مل سکے گی۔“  
”میرا خیال ہے،“ انہیں کسی بستی میں پناہ لینے کی ضرورت  
نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری اطلاع کے مطابق جنرل

کھوڑا نے بھی ان پہاڑیوں اور جنگلوں میں بہت سے خفیہ ڈے  
بارگے ہیں۔ انہیں کہیں بھی پناہ مل سکتی ہے اس لیے کہ حملہ  
آوروں کا اطلاق اسی گروپ سے ہے۔“

”کیا یہ بات محض اندازے کی بنا پر کہہ رہے ہو یا۔۔۔؟“  
”میں نے بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اس  
کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”حملہ آوروں کو دارالائزہ کر رہا تھا۔ اسے یہ

اطلاع ملی تھی کہ قحالی اور پر ساد ہمساری جیپ میں یہاں آ رہے  
ہیں۔ وہ گھات لگائے بیٹھے تھے اور جیسے ہی جیپ وہاں پہنچی اس پر  
سڑک کے دونوں طرف سے گولیوں کی بارش کر دی گئی۔“ میں چند

لوگوں کو خاموش ہوا پھر قحالی کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں  
اسے بتانے لگا کہ جیپ پر حملہ کس طرح ہوا تھا۔

سردار قحالی نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا پھر میری  
طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم دارا پیڈو اور جنرل کھوڑا کے حوالے  
سے گفتگو کرتے رہے۔ میں باتوں ہی باتوں میں قحالی کو تولنے کی

کوشش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے اصل مشن کے  
بارے میں آگاہ کرنا مناسب ہو گا کہ نہیں۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں  
کر سکا تھا کہ فون کی گفتگو ختم تھی۔ وانگ ڈن نے جلدی سے آگے

بڑھ کر پیڈو اٹھایا۔ ایک دو منٹ تک کسی سے بات کی اور پھر  
اٹھ کھڑے ہوئے۔ قحالی نے کچھ کہنے لگے۔ اس نے  
قحالی سے اپنی زبان میں بات کی تھی۔ قحالی نے بھی کچھ

جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں وانگ ڈن نے  
فون پر کچھ کہہ کر پیڈو پر دھک دیا تھا۔

”باتیں باتیں بدلیں ہوں گی۔“ قحالی نے میری طرف دیکھتے  
ہوئے کہا۔ ”اس وقت بینک میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔“

”کیا یہ بینک میں جانا ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں۔“ قحالی نے جواب دیا۔  
اس وقت ساڑھے دو بج رہے تھے حالانکہ بینک کے لیے

اکہ بجے کا وقت مقرر تھا۔ وہ دونوں آدمی بھی ہمارے ساتھ تھے۔  
میں نے قحالی کی سلور کلر کی شاندار مرسیڈز کار بھی کھڑی  
کئے۔ اسٹریٹ کے دونوں آدمی قحالی کے ساتھ اس کار میں بیٹھ

گئے۔ ہم دوبارہ قحالی کے سنبھال گیا تھا۔ وانگ ڈن اپنی جیپ  
میں دوبارہ گیا تھا۔

بینک پولیس چیف کے دفتر میں تھی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں چند

منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بینک دوم میں تانے قد والے  
پولیس چیف بنگاک سے آئے ہوئے اعلیٰ حکام اور مقامی انتظامیہ  
کے اعلیٰ عہدے داروں کے علاوہ شہر کے چند معززین بھی شامل تھے  
جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ قحالی کی جیپ پر حملہ کتنا غیر

معمولی واقعہ تھا۔  
ہم اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہی تھے کہ پیڈو کو دو آدمیوں کے ساتھ  
بینک دوم میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چونکا گیا۔ قحالی نے بھی

اسے دیکھ لیا اور بینک شروع ہونے سے پہلے مطالبہ کیا کہ پیڈو  
اور اس کے ساتھیوں کو بینک دوم سے نکال دیا جائے۔ بصورت  
دیگر وہ خود ادا آؤٹ کر جائے گا اور اس کے بعد کی صورت حال

کی ذمہ داری انتظامیہ پر ہوگی۔  
عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ پولیس چیف اور بنگاک  
سے آیا ہوا ایک افسر ایلی پیڈو کی حمایت کر رہا تھا لیکن سردار

قحالی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر پیڈو جیسے مجرم  
اس بینک میں شریک ہوں گے تو وہ یہاں نہیں بیٹھے گا۔ بالآخر  
پیڈو اور اس کے آدمیوں کو رخصت کر دیا گیا۔ باہر جاتے ہوئے

پیڈو نے قحالی اور میری طرف بڑی خوں خوار نظروں سے دیکھا  
تھا۔

اس بینک کا مقصد سردار قحالی کا غصہ ٹھنڈا کرنا اور کسی  
تک نہ بنگاک سے بچنے کے لیے کوئی سمجھوتہ کرنا تھا۔ سردار قحالی  
اس علاقے کا ایک بااثر آدمی تھا اور اسی لیے بعض اعلیٰ حکام بھی

بنگاک سے یہاں پہنچے تھے۔  
بڑی دیر تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ سردار قحالی کا مطالبہ  
تھا کہ نہ صرف مرنے والوں کا معاوضہ دیا جائے بلکہ حملہ آوروں کو

بھی گرفتار کر کے اس کے حوالے کیا جائے۔ اس نے دارا کو بھی  
فانگ اور پیڈو کے نام بھی دیے تھے اور بینک دوم میں پیڈو کی  
آہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے بڑے وثوق سے یہ بات بھی کہی کہ

پولیس چیف حملہ آوروں سے بخوبی واقف ہے۔  
پولیس چیف اس الزام پر ہلکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ  
صورت حال بگڑ جائے، بنگاک سے آیا ہوا ایک افسر ایلی اٹھ کر کھڑا

ہو گیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر نہانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ اس شخص کو  
پہلے ہی کہیں دیکھ چکا ہوں لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور  
کہاں دیکھا تھا۔

بات کرتے ہوئے اس نے گردن بائیں طرف گھمائی تو اس  
کے کان سے ذرا نیچے دائیں جڑے پر انگوٹھے کے ناخن کے برابر

سیاہ دھبہ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔  
اس رات بنگاک میں واٹ ٹریٹ میں بینک کے بعد شیشہ  
کا کزن رکا کو سن مجھے اپنے ساتھ ایک بیگلے میں لے گیا تھا جہاں

شیشہ کے خلاف ہونے والی اسی سازش کے بارے میں بریف  
کرتے ہوئے مجھے کچھ ایسے لوگوں کی تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں

جس میں ایک پولیس چیف کے دفتر میں تھی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں چند

منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بینک دوم میں تانے قد والے  
پولیس چیف بنگاک سے آئے ہوئے اعلیٰ حکام اور مقامی انتظامیہ  
کے اعلیٰ عہدے داروں کے علاوہ شہر کے چند معززین بھی شامل تھے

جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ قحالی کی جیپ پر حملہ کتنا غیر  
معمولی واقعہ تھا۔  
ہم اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہی تھے کہ پیڈو کو دو آدمیوں کے ساتھ

بینک دوم میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چونکا گیا۔ قحالی نے بھی  
اسے دیکھ لیا اور بینک شروع ہونے سے پہلے مطالبہ کیا کہ پیڈو  
اور اس کے ساتھیوں کو بینک دوم سے نکال دیا جائے۔ بصورت

دیگر وہ خود ادا آؤٹ کر جائے گا اور اس کے بعد کی صورت حال  
کی ذمہ داری انتظامیہ پر ہوگی۔  
عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ پولیس چیف اور بنگاک

جن کے بارے میں شبہ تھا کہ ان میں سے کوئی اس سازش میں شریک ہو سکتا ہے۔۔۔ انہی میں آنگ سانگ نامی اس شخص کی بھی تین تصویریں تھیں۔ ایک سامنے سے کھینچی ہوئی اور دوسرا پیٹھ پر ہونے والا ایک تصویر میں اس کی دائیں طرف کان کے نیچے جڑے پراگھوٹے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبہ تھا۔

اور اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ وزارت داخلہ کا سیکریٹری آنگ سانگ تھا۔

○☆☆○

اس مینگ میں سیکریٹری وزارت داخلہ آنگ سانگ نے سردار قنابل سے مطالبہ کیا تھا کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے مگر قنابل نے صاف انکار کر دیا۔

”ماشروعدان اور اس کے ساتھی میرے ممان ہیں اور تم جانتے ہو کہ ہم قبائلی ممانوں کا کس قدر احترام کر سکتے ہیں۔ ہم ان کے لیے اپنی جان تو دے سکتے ہیں مگر ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کر سکتے۔“ سردار قنابل نے کہا ”ماشروعدان اور اس کے ساتھی قانون شکن نہیں ہیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنے دفاع میں کیا ہے۔ اپنی جان بچانے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے اور پھر ان کے خلاف پورے ملک میں کیسی بھی ایسی کوئی باقاعدہ رپورٹ درج نہیں ہے جس کی بنا پر انہیں قانون کی گرفت میں لینے کی کوشش کی جائے۔“

”سردار قنابل۔“ پولیس چیف نے اس کے چہرے پر نظر سجاتے ہوئے کہا ”کل صبح جرنل کھورٹ کے ایک کالج کو آگ لگا کر کراہ کر کھو گیا جس میں اس کا نوٹوں ڈالر لیت کا اسلحہ بھی تاجہ ہو گیا اور تم جانتے ہو ہم اس سرحد تک جرنل کھورٹ جیسے شخص سے پٹنگ بازی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“

”جرنل کھورٹ۔“ قنابل غرایا ”اسے تم جیسے لوگ ہی میرا قدم بچانے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ اسے یہاں اپنے اڈے بنانے کی اجازت کس نے دی۔ کیا یہاں گولہ بارود جمع کرنے کے لیے اس نے قحالی حکومت سے اجازت لی تھی۔ یہ گولہ بارود قانون کے محافظوں کی نظروں میں آئے بغیر یہاں تک کیسے پہنچا؟ اور پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس ہٹ کی جانی میں میرے ممانوں کا ہاتھ ہے؟“

”اس سے ایک رات پہلے ایک کالج میں فنگ پھن اور اس کے دو ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“ پولیس چیف نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”فنگ پھن، جرنل کھورٹ کا آدمی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ۔۔۔“

”تم جانتے ہو کہ وہ جرنل کھورٹ کے آدمی تھے اور یہاں ان کی آمدورفت غیر قانونی تھی لیکن تم نے ان کے خلاف اب تک کوئی کارروائی کیوں نہیں کی تھی حالانکہ یہ تمہارا فرض تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تم نے بدنام زمانہ ٹھوس ثبوت پینڈو کو

اس مینگ میں مدعو کر لیا جو یہاں جرنل کھورٹ کے لکڑی حیثیت سے ہمارے ملک میں منشیات کا ذہر پھیلا رہا ہے۔ ہمارے اس کے خلاف نہایت سنگین نوذیت کے مقدمات درج تھے چند روز پہلے تک وہ قانون کو سوسٹ وائٹڈ آدمی تھا۔ اسے سلاخوں کے پیچھے بند ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے حیرت ہے کہ ہیک ایک اس قدر اہم کیوں ہو گیا کہ اسے اس اہم مینگ میں بلا لیا گیا۔“ سردار قنابل چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات رکتے ہوئے کہنے لگا ”اس مینگ ہال میں مجھے کچھ ایسے ہراساں نظر آ رہے ہیں جو کبھی بھی شیشٹاہ یا قحالی حکومت سے تعلق نہیں رکھتے۔“

اب تک جو بھی واقعات رونما ہوئے ہیں وہ اس سازش کا حصہ ہیں۔ میری جپ پر فائزنگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن میں آپ سب لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس خطے میں جب تک ایک بھی کیرن قبائلی زندہ ہے، شیشٹاہ یا قحالی حکومت کے قیام کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ صرف کیرن ہی نہیں یہاں بلکہ یاد آنکھلا ہو اور لیو جیسے وفادار اور ہمدرد قبیلے بھی آباد ہیں۔ ان قبائلیوں نے ماضی میں ہمیشہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں اور وہ آئندہ بھی کسی قحالی سے مدد نہیں کریں گے۔“ سردار قنابل ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ باری باری ان کے چہروں کو دیکھتا رہا پھر بولا ”اس وقت شری سرکوں پر جمع ہزاروں مسلح قبائلی میرے ایک اشارے کے خنجر ہیں لیکن میں یہاں کی پولیس اور انتظامیہ کے لیے مسئلے پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میرا صرف ایک مطالبہ ہے۔ حملہ آوروں اور قاتلوں کو چھین گھنٹوں کے اندر اندر گرفتار کیا جائے۔ میں نے ان میں سے کچھ نام بھی پولیس چیف کو دے دیے ہیں۔ ان میں دارودہ شخص ہے جس نے پہلے ٹائیگر اور اب پینڈو جیسے لوگوں کو اپنے مٹے بنا کر اس ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور اب میرے خیال میں اسے کچھ بد دیانت اور بے خمیر سرکاری افسروں کی بھی حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ میں نے ان کی گرفتاری کے لیے ہمیشہ سختی کی مصلحت دی ہے۔ میں دی ہوئی اس مصلحت کے آخری سیکڑے تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد میرے آدمی انہیں خود تلاش کریں گے اور اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا تو اس کی ذمہ داری انتظامیہ ہوگی۔“

سردار قنابل کی تقریر کے دوران میں، میں وہاں بیٹھنے والے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ قنابل نے جب شیشٹاہ کے خلاف کسی سازش کی بات کی تھی تو آنگ سانگ اور ایکی مائی کے چہروں کے رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوئے تھے۔ ایکی مائی بھی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھی اور آنگ سانگ وغیرہ کے ساتھ بکاک سے آئی تھی۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر سے

از کم دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ وہ بے حد حسین عورت تھی اور اسے دیکھ کر کما جاسکتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

پولیس چیف کی حالت تو قابل دید تھی۔ سردار قہالوب نے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں اس پر نگین نوعیت کے الزام لگائے تھے اور وہ آئیں بائیں شامیں کر کے رہ گیا تھا۔

یہ بینک تین کمٹوں ... تک جاری رہنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تھی۔ اعلیٰ حکام بینک سے اس لیے آئے تھے کہ یہ ایک بڑے قبائلی سردار کا معاملہ تھا۔ سرحدوں پر آباد قبائل چھوٹی چھوٹی باتوں پر بغاوت کر دینے کے عادی تھے اور قبائلیوں کی بغاوت کسی بیہوشی سے زیادہ خطرناک ہوتی تھی۔ ان علاقوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے بلاخر حکومت ہی کو کھٹے پکٹے دیتے تھے اور یہ معاملہ تو ایک بڑے قبیلے کا تھا اور حکومت جانتی تھی کہ اگر کوئی گزبڑ شروع ہوتی تو اس خطے میں آباد دوسرے چھوٹے قبائل بھی کین کا ساتھ دیں گے اس لیے سردار قہالوب کی جپ پر حملے کی اطلاع ملتے ہی اعلیٰ حکام بینک سے یہاں پہنچ گئے تھے۔

اسے اتفاق لگا جائے یا باقاعدہ پلاننگ کہ بینک سے آئے والے حکام میں وزارت داخلہ کا سیکریٹری آنگ سانگ بھی شامل تھا جس پر شیشہ کے خلاف سازش میں شریک ہونے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس جگہ سازشیوں کی جنرل کھوراث یا اس کے کسی خاص نمائندے سے خفیہ مینٹگ ہونے والی تھی اور پیڑو اور دارا وغیرہ جیسے خطرناک آدمیوں کی آمد بھی اسی سلسلے میں تھی۔

ہو سکتا ہے، آنگ سانگ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے باقاعدہ پلاننگ کے تحت حکام کے دند کے ساتھ یہاں آیا ہو کہ اس آڑ میں اس خفیہ مینٹگ میں بھی شریک ہو جائے گا لیکن سردار قہالوب کے ساتھ مقامی انتظامیہ کی اس مینٹگ میں سردار قہالوب کی تقریر نے اسے یقیناً پریشان کر دیا تھا۔

قہالوب کی شیشہ کے خلاف سازش والی بات نے مجھے بھی چڑکا دیا تھا۔ اس نے کچھ اور چروں کا بھی حوالہ دیا تھا۔ ان لوگوں پر قہالوب کی باتوں کا جو اثر ہوتا تھا وہ تو ایسا لیکن میرے لیے قہالوب کی یہ باتیں تاثیر فنی ثابت ہوتی تھیں۔ اب اس میں شک کی کوئی محفائش نہیں رہی تھی کہ سردار قہالوب شیشہ کا حامی اور محب وطن تھا اور میں اپنے مشن کے بارے میں مکمل کر اس سے بات کر سکتا تھا۔

واپسی پر سردار قہالوب نے مرسیڈز اپنی کو مٹی کے گیت میں لے جانے کے بجائے سڑک پر روک لی۔ اس کے دونوں آدمی وہاں اتر گئے اور قہالوب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس مرتبہ سڑک کا اہتمام ہمارے کانچ پر ہوا تھا۔

اندھ آکر سردار قہالوب نے سب سے پہلے قہالوب سے ملاقات کی۔ اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے قہالوب سے گزارش

رات والے افسرانک واقعے کی تفصیلات بھی معلوم کی تھیں۔ سردار قہالوب نے رگولی سے بھی ایسی طرح ملاحظہ کیا تھا کہ قہالوب نے قہالوب اور جاگتی سے ملاقات کی تھی لیکن یہ بات میں نے قہالوب پر نوٹ کی تھی کہ رگولی کو سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

جاگتی وغیرہ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ تو مجھے پتہ چلا کہ سردار قہالوب کا پہلے ہی یہاں آنے کا پروگرام تھا۔ وانگ ڈن نے فون پر لوہا کو دوسرے کھانے کے بارے میں پوچھا دے دی تھی۔ کھانا تھا کیا تھا۔

کھانے کے بعد میں سردار قہالوب کے ساتھ ایک انگلیز میں بیٹھا گیا اور اسے اپنے اصل مشن کے بارے میں بتانے لگا۔ ”تو میرا شبہ درست تھا۔“ وہ میرے خاموش ہونے پر ”میں کئی بہتوں سے چیٹنگ رائے میں اور یہاں کچھ پڑا امراتی سرکاری آفیسر کو چپاٹ کر رائے میں جنرل کھوراث کے ایک خاص آدمی سین فونگ سے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”اس رات گولڈن ڈرائی اینجیل ہوئی میں ایک بہ بڑی پائی تھی اور اس پائی میں بینک سے تعلق رکھنے والے اس سرکاری آفیسر کو دیکھ کر میں چوٹے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ سرکاری آفیسر ایک حسین لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر بعد سین فونگ بھی ان کی میز پر آیا۔ وہ لڑکی اٹھ کر کسی دوسری میز چلی گئی تھی۔ سین فونگ اور اس سرکاری آفیسر میں دیر تک سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ لڑکی دوبارہ ان کی میز پر آئی اور پھر پائی فتح ہونے سے پہلے ہی لڑکی سرکاری آفیسر کو کمرہ سے باہر چلی گئی تھی۔ تھوڑی سی دیر بعد میں نے ان دونوں کو پارکنگ میں کھڑی ایک کار میں بیٹھے دیکھا۔ کار کا انجن اشارت ہونے سے پہلے ہی سین فونگ بھی کسی طرف سے نمودار ہوا اور کار میں بیٹھ گیا اور اس کے بعد کار روانہ ہو گئی۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آئی تھی۔ کریش تو ہر طرف بجلی ہوئی ہے۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ شاید بیرونی کی اسٹیلنگ کے حوالے سے جنرل کھوراث کی طرف سے اس سرکاری آفیسر کو کوئی رشوت پیش کی گئی تھی۔

”اس کے ایک ہفتے بعد میں نے اسی سرکاری آفیسر کو میل بھی دیکھا اور پھر کچھ اور لوگ بھی پڑا امرات سرگرمیوں میں مصروف نظر آئے۔ اس وقت میرے ذہن میں شبہ پیدا ہوا تھا کہ شیشہ حکومت کے خلاف کسی سازش کے آئنے ہائے تو نہیں چاہے اور آج کی مینٹگ میں بھی میں نے اس سرکاری آفیسر کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی میرے ذہن میں کسی سازش کا خیال آیا تھا اور اب تم نے آنگ سانگ کے بارے میں بتایا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”میرے شبہات درست تھے لیکن تم کو

کہو۔ جب تک میرے قبیلے کا ایک فرد بھی زندہ ہے یہاں شیشہ کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

”میں ان لوگوں پر نگاہ رکھتی ہوگی۔“ میں نے کہا ”آنگ سانگ کی یہاں آمد خالی از سبب نہیں ہو سکتی لیکن میں نے نوٹ کیا تھا کہ تمہاری باتوں کے دوران میں وہ چوک سا گیا تھا۔ اب وہ لوگ بقیہ بیٹھا ہوا جاگتی کے لیکن مجھے شبہ ہے کہ ہماری توجہ کسی اور طرف ہٹا کر وہ لوگ اپنا کام کر گزریں گے۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ سر حال“ اب میں چپتا ہوں۔ کوئی خاص بات ہو گئی تو میں تمہیں خبر کروں گا۔“

سردار قہالوب چلا گیا۔ وانگ ڈن میں رہ گیا تھا۔

اور پھر اسی رات سردار قہالوب کا فون آ گیا۔ اس وقت گیا وہ بیٹے والے تھے اس نے بتایا کہ آنگ سانگ ”ایک مائی اور ان کا وہ ساتھی جسے قہالوب نے سین فونگ سے ملاقاتیں کرتے دیکھا تھا“ شام سے کچھ دیر بعد اس کے پاس آئے تھے اور بقل آنگ سانگ انہوں نے پیڑو کو حراست میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے مینٹگ ہال سے جانے کے بعد وہ ردپوش ہو گیا تھا۔ آنگ سانگ نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے ایک ہفتے کی سہلت مانگی ہے اور یہ وعدہ لیا ہے کہ میں اس دوران میں اپنے قبائلیوں کو قابو میں رکھوں گا اور کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہونے دوں گا جس سے اس نامان کا مسئلہ پیدا ہو جائے

”ایک اور خاص بات“ قہالوب کہہ رہا تھا ”آنگ سانگ نے فوری طور پر پولیس چیف کو معطل کر کے حراست میں لے لیا ہے۔ میں نے اس پر جو الزامات لگائے تھے ان کی بھی تحقیقات ہو گئی۔ الزامات ثابت ہو جانے کی صورت میں اسے بس مدت کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میں جانتا ہوں یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے ہے تاکہ میں مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر واقعی شیشہ کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے تو پولیس چیف بھی اس میں شریک ہو گا۔“

”معد فیصلہ کیا بات ہے“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”پولیس چیف نے جب پیڑو کی حمایت کی تھی تو مجھے اسی وقت اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ صرف تو پولیس چیف ہی نہیں میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پیڑو کو آنگ سانگ جیسے اعلیٰ حکام کی بھی ہتھیار حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس طرح آزادی سے اڈھٹا ہوا نہ کرتا۔“ اب وہ ردپوش ہو گیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہی لوگ اس کے ٹھکانے سے واقف ہیں۔“

”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں“ قہالوب نے جواب دیا ”میں انہیں ایک ہفتے کی سہلت دے چکا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس دوران میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔“

میرے قوی حرکت میں آگئے ہیں۔ وہ ان کی سرگرمیوں پر اب رکھیں گے اس کے ساتھ ہی پیڑو کی تلاش بھی شروع کر دی ہے۔

”میں اس سے کسی کا ملنا بہت ضروری ہے“ میں نے کہا۔ ”گھر مت کرو۔“ ہمیں جلدی کا یابی حاصل ہو گئی اور اب۔“ سردار قہالوب نے رک کر کہا ”میں نے اپنے قبیلے والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ اپنی اپنی بیٹیوں کو واپس لے جائیں۔ اب چونکہ ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے اس لیے میں اپنے قبیلے کو اس میں ملوث نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر ضرورت پڑی تو وہ لوگ چند منٹ کے نوٹس پر واپس بھی آسکتے ہیں۔ ایک بات اور۔۔۔ تم لوگ اگر چاہو تو شرمش آزادی سے محوم پھر سکتے ہو۔ میرے محافظ ہر وقت تمہارے آس پاس رہیں گے۔“

”تحقیق پر قہالوب“ میں نے جواب دیا اور چند رمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا۔

قہالوب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ درپردہ کوئی ہت اور نچا کھیل، کھلا جا رہا تھا اور اس کھیل میں کچھ ایسے کھلاڑی بھی شامل تھے جن کے ناموں کا انکشاف طوفان اٹھا سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب ہم پل مرتبہ کھونے کی نیت سے شرمش نکلنے کل کی طرح آج مجھے سڑکوں پر مسلح قبائلیوں کی ٹولیاں نظر نہیں آئیں۔ بازار بھی کھلے ہوئے تھے اور چل پل بھی تھی لیکن غیر ملکی ساحلوں کی تعداد کم تھی۔

میں جپ میں وانگ ڈن کے ساتھ آگے بڑھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹوں پر قہالوب، جاگتی اور رگولی کے ساتھ دو گن میں تھے۔ محافظوں کی ایک گاڑی ہمارے آگے تھی اور ایک پیچھے۔

وانگ ڈن نے شاید پہلے ہی سے پروگرام لے کر کہا تھا کہ ہمیں کہاں کہاں جانا ہے۔ محافظوں کی اگلی گاڑی ایک ایسی سڑک پر مڑ گئی تھی جو پندرہ بجے باندی کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ تقریباً پانچ سو فٹ اونچی پہاڑی تھی جو اوپر سے بالکل ہموار تھی اور یہاں بہت خوبصورت دو تین رہنموش بنے ہوئے تھے جن کے سامنے کھلی جگہ تھی اور چٹان کے کنارے پر آہنی پائپوں کا خاتمی جنگلا لگا ہوا تھا اور اس سے آگے عمودی ڈھلان تھی۔ خشیب میں بہت دور رائے کام رو پر نظر آیا تھا۔ یہی دریا آگے جا کر دیوانے میکانک سے مل جاتا تھا جہاں سے گولڈن ڈرائی اینجیل کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

بڑا خوبصورت منظر تھا۔ کھلی جگہ پر رنگین بڑی بڑی چھتروں کے نیچے میزوں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ناؤنٹس میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ خاتمی جنگل کے قریب کھڑے خشیب میں پہلے ہوئے سا کو ان کے جنگل اور اس سے آگے دھوپ میں چاند کی طرح چمکتے ہوئے دیا کا لہریں منظر دیکھ رہے تھے۔

ہم لوگ جیب سے اڑ کر پارکنگ سے دور حفاظتی جنگے کے پاس اس کی چھتری کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ محافظ پارکنگ میں اپنی گاڑیوں میں بیٹھے رہ گئے تھے۔ وانگ ڈن ہمیں یہاں فرانی فٹن کھلانے کے لیے لایا تھا۔ چند منٹ بعد ہی ایک خوبصورت ویٹریس آؤر لینے کے لیے پہنچ گئی۔ اس کی رنگت اگرچہ کسی قدر سائلی تھی لیکن چہرے کے نعوش بہت پرکشش تھے۔ وانگ ڈن نے نہ صرف ہم سب کے لیے بلکہ محافظوں کے لیے بھی فرانی فٹن کا آرڈر دے دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہماری باری آسکی تھی۔ مچھلی واقعی بے حد لذیذ تھی۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ مچھلی کا آخری ٹکڑا اس کے منہ میں تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے اور آنکھوں میں وحشت سی بھری تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ تب سمجھا۔ شاید اس کے حلق میں کانٹا اٹک گیا ہے۔

”وہ وہ اس طرف....“ تھائی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وانگ سائی۔ سرخ شرٹ والا۔ ریٹنگ کے ساتھ ٹپک لگائے کھڑا ہے۔

میں نے گردن گھما کر تھائی کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ ہم سے تقریباً چار گز دور حفاظتی ریٹنگ کے آخری سرے پر ایک شخص کھڑا ٹیپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازے قامت صحت مند آدمی تھا۔ اس نے سرخ شرٹ اور سفید پینٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر گولف کیپ تھی۔ اس کا چہرہ مجھے ساڈس سے نظر آ رہا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

”جیناگ رائے میں یہی ہماری گھرائی کر رہا تھا اور جب ہم روانہ ہوئے تھے تو ہماری جیب کا تعاقب بھی اسی نے کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی وہاں آکر کھڑا ہوا ہے“ تھائی نے کہا۔

ہمارے اور اس کے درمیان اگرچہ درجنوں میزس حائل تھیں، لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن جس طرح تھائی نے اسے دیکھا تھا وہ بھی ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم نے کرسیاں اس طرح موڑ لیں کہ اگر وہ اس طرف دیکھے بھی تو اس کی نظر ہمارے چہروں پر نہ پڑ سکے۔ وانگ سائی کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس نے ایک دو مرتبہ اس طرف بھی دیکھا تھا لیکن ہم اس کی نظروں سے محفوظ ہی رہے تھے۔ میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں میں اس پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ کیا تمہارے محافظوں میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تعاقب کر کے اس کے ٹھکانے کا پتہ چلا سکے؟“

”محافظ صرف گولی چلاتا جانتے ہیں۔ کسی میں اتنی عقل نہیں کہ اس کی گھرائی کر سکے۔ لیکن میں اس کا بندوبست کرتا ہوں“ وانگ ڈن نے کہا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس ویٹریس کو

اشارے سے بلایا جس نے ہمیں سرو کیا تھا۔ ”ہیں مسز وانگ!“ ویٹریس نے مسکرا کر پوچھا۔ نام سے پکارنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ وانگ ڈن کو جانتی تھی۔ وانگ ڈن نے جیب سے پانچ ہزار بھات کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادیا اور آٹھ سے وانگ سائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

”۳۳ ریڈ شرٹ والے کے قریب رہ کر اس کی گھرائی کر کے اس کے ٹھکانے کا پتہ چلاتا ہے۔ اس کے لیے تم پہنچ بھی کر سکتی ہو لیکن اسے شہ نہ ہونے پائے کہ تمہارا اصل مقصد کیا ہے۔ وہ کہیں چلنا چاہے۔ دو تین منٹ کے اندر اندر جہیں اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے۔ جاؤ۔ بل کی فکرت کرو۔ یہ پانچ ہزار بھات تمہارے ہیں۔ میں کانچ والے نمبر تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“

اس لڑکی کا نام مائے تھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس نے ذرا سی گردن گھما کر وانگ سائی کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔

مائے سائی واپسی میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو تو میں چلیں چھپکاں بھول گیا تھا۔ اس نے ریسٹورنٹ کا ڈریس انار کرنا پالاس پہن لیا تھا اور چہرے کا میک اپ بھی درست کر لیا تھا۔ مٹی اسکرٹ اور مٹی ملاؤں میں وہ قیامت ہی لگ رہی تھی۔ کندھے پر لومڑی کی کھال کا پرس بھی لٹکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند منٹ پہلے وہ ویٹریس کی حیثیت سے گاہکوں کو سرو کر رہی تھی۔ وہ حفاظتی ریٹنگ کی طرف جاری تھی اور اکیلے بیٹھے ہوئے مرد اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

مائے سا وانگ سائی سے تقریباً پندرہ گز دور ریٹنگ کے قریب اس جگہ کھڑی ہو گئی جہاں چند عورتیں اور مرد پتہ ہی کھڑے تھے۔ اس نے ایک عورت کو باتوں میں بھی الجھایا تھا۔ وہ انہی کی ساتھی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ ٹیپ میں دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے آگے کی طرف سرکتے جارہے تھے یا مائے سا انہیں سرکتے پر مجبور کر رہی تھی۔ بالآخر وہ لوگ ریٹنگ کے قریب سے ہٹ گئے۔ مائے سا وہاں اکیلی رہ گئی تھی۔ وانگ سائی نے اس کا فیصلہ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ ریٹنگ کے پائپ پر دونوں بازو ٹکائے دیر کا طرف دیکھ رہی تھی اور پھر میں نے وانگ سائی کو ریٹنگ کے ساتھ ساتھ اس کی طرف سرکتے ہوئے دیکھا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں مائے سائی کی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔

دس منٹ گزر گئے۔ ان دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ان میں پرانی شناسائی ہو۔ وانگ سائی اس سے چپک کر کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ریٹنگ کے پائپ پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس نے مائے سائی

کمر میں جامل کر رکھا تھا۔ وانگ سائی اس سے باتیں کرتے ہوئے ہر منٹ بعد مڑ کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیتا تھا۔ جس بڑی کمری نظروں سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اسے واقعی کسی کا انتظار تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد غیلے رنگ کی ایک کار پارکنگ میں آکر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اوجیز عمر عورت کے سوا اس کار میں کوئی نہیں تھا۔ عمر چالیس سے اوپر ہونے کے باوجود وہ خاصی حسین تھی۔ وہ کار میں بیٹھی ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر آخر کر پٹے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ریٹنگ کے قریب چلی گئی۔

وانگ سائی نے بھی اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔ وہ مائے سا کے ساتھ ریٹنگ کے ساتھ سرکنا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس عورت نے کوئی چیز وانگ سائی کے ہاتھ میں اس طرح تھمائی تھی کہ شاید قریب کھڑے ہوئے لوگ بھی نہ دیکھ سکے ہوں گے لیکن ہم چونکہ شروع ہی سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اس لیے یہ حرکت ہماری نظروں میں آگئی۔ وہ شاید کوئی کانڈ تھا جسے وانگ سائی نے چلون کی جیب میں ٹھوس لیا تھا۔ اس کے بعد وہ عورت وہاں سے سرکتی ہوئی دوسرے لوگوں کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے بعد وانگ سائی زیادہ دیر وہاں نہیں رکھا تھا۔ وہ پارکنگ کی طرف واپس آ رہا تھا تو مائے سا بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر وہاں نہیں رکے تھے۔

مائے سائی اب تک کی کارکردگی نہایت عمدہ رہی تھی۔ وہ وانگ سائی سے اس طرح ملی تھی کہ اسے شبہ تک نہیں ہو سکا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ وانگ سائی خود اس کے قریب آیا تھا اور اب مائے سا اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ پہلا مرحلہ تو بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کیا صورت حال پیش آئے گی اس کا اندازہ کتنا مشکل تھا۔

مائے سا کا حلق بھی کیرن فیلے سے تھا۔ وہ ہاربا کی سرحد پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے کی رہنے والی تھی لیکن کئی سال پہلے چنانک سائین آگئی تھی۔ ایک خوشحال گھرانے میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے حصول تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اس میں بچھن ہی سے بڑی کشش تھی۔ جیسے جیسے بڑی ہوئی گئی اس کے جسم کے ٹیپ و فراز بھی نمایاں ہوتے گئے اور پھر جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے اوجیز عمر آفا کی ہوس کا شکار ہو گئی۔ اس وقت اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ دوسری مرتبہ اس ہوس پرست بوڑھے نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو وہ اسے زخمی کر کے گھر سے بھاگ نکلی۔

وہ کئی روز تک اپنی ایک دوست کے گھر میں پڑی رہی لیکن یہاں بھی وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ ایک روز اس کی دوست کے باپ نے شراب کے نشے میں اس کے کپڑے چھڑا

دے دیے۔ مائے سا بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔

مائے سا بدردی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا تھا کہ اپنے گاؤں واپس چلی جائے لیکن اب گاؤں میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایک خالہ تھی جو بہا چلی گئی تھی۔ اس بہتی میں اب اس کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں تھا اور پھر دوں روز کا مسئلہ بھی تھا۔ وہاں کے بھتیوں کے سوا اور کہیں کام نہیں مل سکتا تھا۔ وہ چھپلائی دھوپ میں جلنا نہیں چاہتی تھی۔ یہاں شرمیں رہتے ہوئے تو اسے کئی کام مل سکتے تھے۔ وہ ابھی مستقبل کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی اور وقت گزارتی رہی۔

اب مائے سائی عمر اکیس سال تھی۔ وہ بے حد حسین اور پھر جوان لڑکی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں کام مل جاتا لیکن لوگوں کی نظروں اس کے کام سے زیادہ اس کے حسن و شباب پر ہوتیں۔ وہ کئی مرتبہ دھوکے میں آکر لوگوں کی ہوس کا شکار ہوئی تھی اور اب وہ سمجھ گئی تھی کہ زندگی اسی طرح گزارا جاسکتی ہے۔ درخشاں مستقبل ایک عذاب کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اور پھر ایک روز اس کی ملاقات وانگ ڈن سے ہو گئی۔ وانگ ڈن نے بھی ایک مرتبہ اس بہتی لڑکی میں ہاتھ دھولے تھے۔ اس کے بعد بھی کسی نہ کسی ریسٹورنٹ میں ان کا آمناسنا ہوا ہی جاتا تھا۔ مائے سا جان چکی تھی کہ وانگ ڈن سردار تھا۔ اب خاص آدمی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کی مادی مدد بھی کرتا رہا تھا۔ تقریباً چھ ہفتے پہلے اس ریسٹورنٹ میں ملازمت بھی اسے وانگ ڈن ہی نے دوائی تھی۔ یہاں نہ صرف تنخواہ معقول تھی بلکہ اوپر کی آمدنی بھی اچھی خاصی تھی۔

ہم لوگ جس ٹیبل پر بیٹھے تھے وہ مائے سائی سروس میں نہیں تھی لیکن وانگ ڈن کو دیکھ کر وہ اس طرف آگئی تھی اور جب وانگ ڈن نے اسے وانگ سائی کی گھرائی کے لیے کہا تو وہ انکار نہیں کر سکی تھی۔

ریسٹورنٹ سے اٹھ کر بازار کا ایک چکر لگاتے ہوئے ہم کانچ واپس آگئے۔ اس وقت تک مائے سائی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

چار بج گئے۔ اب مجھے مائے سائی طرف سے پریشانی ہونے لگی تھی۔ اگر اس کا راز فاش ہو گیا تو زندہ نہیں بچے گی۔ پینڈو جیسے سفاک لوگوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی۔

سردار تھا۔ اب اس پر اپنی شردالی کو کبھی میں موجود تھا مگر اس نے وانگ ڈن کی خدمات ہمارے لیے وقف کر دی تھیں اور وہ صبح سے ہمارے ساتھ ہی تھا اور اب تو اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

”کیس کوئی کڑبو نہیں ہوگی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے



اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا“ وانگ ڈن نے کہا ”وہی تو مائے ساذن اور ہوشیار لڑکی ہے اس نے دنیا کی اونچ نیچ دیکھی ہے لیکن اگر کسی چال میں آگئی ہو تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

ہماری پریشانی بوجھ جاری تھی اور پھر چوبیس کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو وانگ ڈن نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ وہ مائے ساذن کا لالہ تھی۔ وانگ ڈن نے اس کی آواز سنتے ہی ٹیلی فون کا سائڈ بسٹم والا بھن بھن دیا تھا۔ اس طرح دوسری طرف سے بات کرنے والے کی آواز کمرے میں موجود دوسرے لوگ بھی سن سکتے تھے۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مسٹر وانگ“ مائے ساذن نے دہرائی تھی۔۔۔۔۔ وانگ سائی شراب لینے کے لیے باہر گیا ہے اور میں موقع پا کر تھیں فون کر رہی ہوں۔“

”تم تو پریشان ہو رہے تھے اسے تم پر کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟“ وانگ ڈن نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی شبہ نہیں ہوا“ مائے ساذن نے جواب دیا ”وہ مجھے مال مفت سمجھ کر اپنے فلیٹ پر لے آیا تھا اور اس وقت سے اب تک اس نے ایک لٹے کو بھی مجھے چھین سے پیٹنے نہیں دیا۔“

”سوری ڈیئر“ میری وجہ سے تمہیں یہ زحمت اٹھانی پڑی“ وانگ ڈن نے کہا۔

”میں اس زحمت کی عادی ہو چکی ہوں“ مائے ساذن نے جواب دیا۔

”اس دوران میں اس سے کوئی ملے آیا تھا یا اس نے کسی سے رابطہ کیا ہو؟“ وانگ ڈن نے پوچھا۔

”میں اسے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے کسی کو فون کیا تھا اور اس کے ایک گھنٹے بعد ایک آدمی آیا تھا۔ وانگ ساذن نے اسے ایک کاغذ دیا تھا اور یہ کاغذ وانگ ساذن کو ایک عورت نے بڑی رازداری سے اس وقت دیا تھا جب ہم ریسیورنٹ کے سامنے رینک کے قریب کھڑے تھے۔“

”تم نے دیکھ لیا تھا“ وانگ ڈن نے جواب دیا۔

”اس آدمی کے بعد یہاں کوئی نہیں آیا۔ البتہ ایک فون آیا تھا اور وانگ ساذن نے فون کرنے والے کو مسٹر وانگ کے مخاطب کیا تھا۔ وہ فون پر سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا اس لیے میں مزید کچھ نہیں سن سکی۔ اس وقت وہ شراب پینے کے لیے باہر گیا ہے اور لگتا ہے کہ اس کے بعد رات بھر اس کا گھر سے نکلے گا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ مجھے جانے کی اجازت دے گا۔ ظاہر ہے“ مفت میں ہاتھ آئی ہوئی چیز کو آسانی سے کن جھوڑا ہے۔“

”تم اس وقت کہاں ہو۔ میرا مطلب ہے یہ مکان کہاں ہے جہاں سے تم بول رہی ہو؟“ وانگ ڈن نے پوچھا۔

”یہ مکان نہیں فلیٹ ہے“ مائے ساذن نے جواب دیا ”کوئی روڈ

پر رہائی ولا نام کی ایک بلڈنگ ہے۔ یہ فلیٹ اس بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ہے۔ خبر تو میں نہیں دیکھ سکی لیکن لفٹ سے نکلنے سے مائے ساذن والی راہداری میں بائیں طرف کا آخری فلیٹ ہے۔ اس راہداری میں چھ فلیٹ ہیں، تین ایک طرف، تین دوسری طرف۔ یہ بائیں طرف کا آخری کارنر والا فلیٹ ہے۔ کچھ گئے؟“

اس سے پہلے کہ وانگ ڈن کوئی جواب دے فون پر ایسی آواز سنائی دی جیسے کال بیل بجائی گئی ہو۔

”وہ آگیا ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں“ مائے ساذن سرگوشیاں آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وانگ ڈن نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

”کیا پروگرام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اسے اٹھانا ہے۔ آج ہی رات“ میں نے جواب دیا ”مائے ساذن سا کی رپورٹ سے یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ دارا وغیرہ سے اس کا رابطہ ہے۔ ہم اس سے ان کا ٹھکانا معلوم کر سکتے ہیں۔“

”وہ آج رات فلیٹ پر ہی رہے گا۔ ہم رات کو کسی بھی وقت ریڈ کریڈٹ گے“ وانگ ڈن نے جواب دیا۔

”رہائی ولا۔ معلوم ہے یہ بلڈنگ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری زندگی اسی شر میں گزری ہے“ وانگ ڈن نے جواب دیا ”میں ایک ایک عمارت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ کب بنی۔۔۔۔۔ کسی کی ملکیت ہے اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ رہائی ولا نام کی یہ بلڈنگ پولیس چیف کی ملکیت ہے جو اس کی بیوی کے نام پر ہے۔ رہائی اس کی بیوی کا نام ہے۔“

”اوہ“ میں واقعی چونک گیا ”اس طرح میری اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ پولیس چیف ان لوگوں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔“

”ظاہر ہے“ وانگ ڈن نے جواب دیا ”سیاحت کے یژن میں تو یہاں ایک چار پائی کی جگہ حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وانگ ساذن کو فلیٹ مل گیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دوسرے لوگوں کے ٹھکانے کا بندوبست بھی پولیس چیف ہی نے کیا ہو گا۔“

”راج رتا چل جائے گا کہ دارا کا ٹھکانا کہاں ہے اور اس کا بندوبست کس نے کیا تھا“ میں نے کہا۔

رات گیارہ بجے میں اور وانگ ڈن کا کچھ سے نکلے ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ میرے پاس حسب معمول چلون کے پائینے کے بیچے پٹلی سے بندھا ہوا خنجر اور جب میں ہتھول تھا۔ وانگ ڈن کے پاس بھی ہتھول تھا لیکن اس نے آؤٹریک داخل تھا جب میں رکھ لی تھی۔

کوئی روڈ شر کے مغرب کی طرف تھی۔ سیاحت کے یژن میں رات بارہ ایک بجے تک شر کی سڑکوں پر رونق رہتی تھی لیکن

پچھلے دنوں بے درپے پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے شر کی رونق اب کم تھی۔ بیشتر تیار واپس جا چکے تھے اور جو اس شر میں موجود تھے وہ رات آتھ دو بجے ہی اپنے ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز تک محدود ہو جاتے تھے۔ اس وقت تو بیشتر شاہک سینئر میجسٹریٹ البتہ ریسیورنٹ اور ٹائٹ کلب وغیرہ کھلے ہوئے تھے۔ شر اگرچہ زیادہ برا نہیں تھا لیکن ٹائٹ کلبوں کی تعداد پچاس سے بھی زیادہ تھی۔

کسی سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد وانگ ڈن نے جب ایک کشادہ سڑک کے کنارے واقع چھ منزلہ عمارت کے ساتھ ٹھکی میں موڑ کر تقریباً پچاس گز آگے روک لی۔ اس عمارت کا مرکزی دروازہ سڑک کی طرف تھا۔ البتہ پچھلی گلی میں بھی ایک دروازہ تھا جو زیادہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔

اس عمارت کی پچھلی طرف کوئی بڑی عمارت نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے کالونج تھے۔ انہی میں دو تین گیسٹ ہاؤس بھی تھے۔ بعض کالونج اور گیسٹ ہاؤسز میں روشناس نظر آ رہی تھیں۔ جب سے اتر کر وانگ ڈن نے دروازے کو لاک کر دیے اور مجھے اشارہ کرتا ہوا عمارت کے عقب میں تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ عمارت کے سامنے والے دروازے پر چوکیدار موجود تھا اس لیے اس طرف سے جانا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔

عقبی گلی میں دوسری طرف چھوٹے چھوٹے کالونج تھے جن میں سے بیشتر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وانگ ڈن اُدھر اُدھر دیکھتا ہوا عمارت کے عقبی دروازے پر روک گیا۔ اس نے جب سے چابیوں کا ٹھکانا نکالا، پہلے دروازے کے ہینڈل کو دیکھا پھر پچھے میں گئی ہوئی چابیاں ایک ایک کر کے آزمائے لگا۔ ساتویں چابی نے کام کر دکھایا۔ ٹھک کی بجلی کی آواز ابھری اور تالا کھل گیا۔

”اب دعا کرو“ اندر سے کوئی بولٹ نہ لگا ہوا ہو“ وانگ ڈن نے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

وہ ہینڈل کو آہستہ آہستہ گھما رہا تھا۔ دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

یہ ایک تنگ سی راہداری تھی جس کے آخری سرے پر ایک پوٹھن تھا۔ وہاں سے یہ راہداری بائیں سمت لائی کی طرف مڑتی تھی۔ اس طرف لفٹ بھی تھی اور اوپر جانے کے لیے کشادہ زینہ بھی لیکن ایک تنگ سائیز اس راہداری میں اس دروازے سے ذرا آگے تھا جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔

ہم دو تین سو فیڑمیاں چڑھتے چلے گئے اور چوتھی منزل پر آ کر کم پلے کو ڈرا کر گئے اور پھر اس راہداری میں مڑ گئے جس میں لفٹ تھی۔ اس لفٹ کے آگے اس عمارت میں رہائش پذیر تمام لوگوں کی آمد رفت کے لیے کشادہ زینہ بھی تھا۔ ہم لفٹ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ”کٹ“ سے لفٹ کا

دروازہ کھلا اور ایک عورت اور ایک مرد باہر نکلے۔ دونوں غیر ملکی سیاح تھا۔ غالباً کسی ہوٹل یا ٹائٹ کلب سے واپس آئے تھے۔ ہم انہیں لفٹ سے برآمد ہوتے دیکھ کر ٹھک گئے تھے اور وہ ہمیں دیکھ کر چونک سے گئے تھے۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ میں اس عورت کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ وہ عورت بھی مسکرا دی۔

دروازہ بند ہو چکا تھا اور لفٹ نیچے جاری تھی۔ اس عورت کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی جب کہ اس کا ساتھی چالیس کے لگ بھگ تھا۔ وہ دونوں اس راہداری میں چلتے ہوئے دائیں طرف دوسرے دروازے کے سامنے روک گئے۔ عورت نے اپنے ایک جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس عورت نے ایک بار پھر مسکرا کر ہماری طرف دیکھا تھا۔

میں اور وانگ ڈن آگے بڑھتے رہے۔ بائیں طرف آخری دروازے کے سامنے پہنچ کر ہم روک گئے۔ راہداری کے اختتام پر سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں تین فٹ اونچی منڈر تھی۔ اس کھلی جگہ سے باہر دوسرے کالونج دیکھا جاسکتا تھا۔ تاریکی میں کہیں کہیں چمکتی ہوئی روشناس بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

وانگ ڈن نے ہتھول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اندر پہنچنے والی تیل کی آواز ابھی تھی جیسے چڑیا چھڑیا رہی ہو۔ دوسرے طرف گھنٹی بجانے کے بعد اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

میں نے ہونٹوں پر اٹھ کر وانگ ڈن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف رخ کر کے سرگوشیاں کیے میں بولا۔

”میں ہوں جی فانگ۔ دروازہ کھولو وانگ ساذن۔“ میں نے پی فانگ کے لیے کی نقل اتارنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے اندر سے بولٹ ہٹانے جانے کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

”جی فانگ تم اس۔۔۔۔۔“

وانگ ساذن میرا چہرہ دیکھ کر جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا اور اس نے بڑی بھرتی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کندھے سے دروازے کو زوردار دھکا دیا اور اندر داخل ہوئے ہی اس کے جڑے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وانگ ساذن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے کراہ فارغ ہو گئی تھی۔

وانگ ڈن نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ وانگ ساذن کے جسم کے نچلے حصے پر ہار پڑے ہوئے تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو کے بجائے اظہر ہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کیا کر رہا ہو گا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہر تحریر پانچنے لگا۔

میرے پہلے ہی گھونے نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے گی۔  
 ”لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”اس۔۔۔ کمرے میں۔۔۔“ وہ اشارہ کرتے ہوئے پھلکایا ”میں نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔ وہ اپنی مرضی سے آئی تھی۔“

”چلو۔ تم بھی اسی طرف چلو۔“ میں نے اسے دھکا دیا۔  
 جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو مائے سا کپڑے پہن رہی تھی۔ کال بیل کی آواز سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ وانگ سائی کے کمرے سے نکلنے ہی اس نے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔

وانگ سائی کے کپڑے بھی ایک کرسی پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کرسی پر اس کا بھلی ہوئی لٹری ہوئی جھانک سے پھول کا دستہ جھانک رہا تھا۔ وانگ سائی نے کن اکھیں سے میری طرف دیکھا اور کرسی کی طرف پھلانگ لگا دی لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وانگ سائی مجھ سے پہلے ہی حرکت میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اگرچہ پھول موجود تھا لیکن اس نے کوئی چلانے کے بجائے اپنی ٹانگ کو حرکت دی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوک وانگ سائی کی پینڈی پر لگی اور وہ چیخا ہوا دھم دھم طرف پڑی ہوئی کرسی پر گر۔ اس کا منہ کرسی کے پائے پر لگا اور ہونٹوں سے خون برسنے لگا۔ وانگ سائی نے آگے بڑھ کر اسے ٹھوکوں پر رکھ لیا۔ وانگ سائی کے جسم پر لپٹی ہوئی چادر اتر گئی۔ وہ کمرے میں لوٹ رہا تھا۔ ہر ٹھوک پر وہ ابھلا اٹھتا۔

مائے سا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ اپنے دوسرے کپڑے اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔  
 ”مم۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس لڑکی کو زبردستی یہاں نہیں لایا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ خود۔۔۔“

”اس لڑکی کو ہم نے تمہارے ساتھ بھجوا تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”جب تم پہاڑی والے اس ریسورٹ میں آئے تھے تو تم بھی وہاں موجود تھے اور اس لڑکی کو ہم نے ہی تمہارے پیچھے لگایا تھا کہ تمہارا ٹھکانا معلوم کیا جاسکے شام کو جب تم شراب لینے گئے تھے تو اسے مائے سا نے فون پر ہمیں اس فلیٹ کا پتہ سمجھا دیا تھا اس لیے ہم جلدی آسانی سے یہاں پہنچ گئے لیکن اب تم یہ مت کہنا کہ مجھے نہیں جانتے اور یہ کہ اس وقت تمہارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔“

”اگر مجھے پتہ ہو گیا تو پتہ زور تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ وانگ سائی نے کہا ”بلڈنگ کے چوکیدار نے تم لوگوں کو یہاں آتے ہوئے ضرور دیکھا ہو گا۔ وہ۔۔۔“  
 ”چوکیدار کے فرشتوں کو بھی۔۔۔ معلوم نہیں کہ ہم اس وقت یہاں موجود ہیں۔“ میں نے کہا ”تم پہاڑی منٹ کے اندر اندر کپڑے

پہن لو تو ہم یہاں سے چلیں۔ یہاں تو محض پوری ہے۔ شراب بوجھیلی ہوئی ہے۔ دم گھٹنا جا رہا ہے۔ ہم کسی اور جگہ پر چل کر باہر کریں گے جہاں کا داخل بھی خوشگوار ہو۔“  
 ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ حالانکہ میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔“ وانگ سائی نے کہا۔

”تمہاری وجہ سے صرف دو دن پہلے ہمارے پانچ آدمی اور نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور تم پوچھتے ہو کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں؟“ وانگ سائی نے کہا۔  
 ”مم۔۔۔ میں سے کچھ نہیں کیا۔“ وانگ سائی بولا۔ وہ ایک بار پھر کانپنے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے اور سینے پر چمکا چار گھونے رسید کر دیے۔

”تم چپانک رائے میں تھائی اور ہر سادگی بھرائی کرتے رہے ہو۔ تم نے ہی دارا کو ان کی روائی کی اطلاع دی تھی اور تم نے ہی ہائی دے پر گھات لگائے پیٹھے دارا اور اس کے ساتھیوں کو پھانسا تھا کہ تھائی وغیرہ پھیل گئی تھی۔ تمہاری وجہ سے پانچ آدمی پلک بھینکے کی دیر میں چھلنی ہو گئے اور تم کہتے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟“

”یہ۔۔۔ یہ غلط ہے۔“ وہ پھلکایا ”مم۔۔۔ میں نے چپانک رائے میں تھائی کو دیکھا ضرور تھا لیکن اس کی عمرانی نہیں کی تھی کی کہ ان کے بارے میں اطلاع دی۔ اگر ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

میں نے اس کے جڑے پر ایک اور گھونسا رسید کیا۔ وہ ابھلا اٹھا۔ اس نے جب خون ٹھوکا تو اس میں اس کا ایک دانہ بھی موجود تھا۔

”تھائی زندہ ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا ”اس نے چپانک رائے میں تمہاری سرگرمیاں نوٹ کی تھیں اور جب وہ لوگ چپانک سائین کے لیے روانہ ہوئے تو تم نے نہ صرف فون پر دارا کو ان کے بارے میں بتا دیا بلکہ ان کا تعاقب بھی کیا اور پھر آگے نکل کر دارا وغیرہ کو بتا دیا جو سڑک پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔“

”تھ۔۔۔ تھائی زندہ ہے۔۔۔“ وانگ سائی کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا جیسے سارا خون خچ گیا ہو۔

”ہاں۔ تھائی زندہ ہے اور اس نے حملہ آوروں میں دارا کو پہچان بھی لیا تھا۔“ میں نے کہا ”دارا اور اس کے ساتھیوں کو پوچھا ہے۔ اتفاق سے آج تم نظر آ گئے اب تم بتاؤ گے کہ دارا کہاں چھپا ہوا ہے اور ابھی تو تم سے یہ بھی پوچھا ہے کہ وہ عورت کون تھی جس نے تمہیں ایک کانٹہ دیا تھا اور وہ کانٹہ تم نے کہاں پھینکا ہے لیکن۔۔۔ یہ باتیں یہاں نہیں ہوں گی۔ کپڑے پہن لو۔ اب میں تمہیں صرف تین منٹ دے سکتا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی پر ٹپکے ہوئے اس کے بھلی ہوئے سر پر پھول پھینکا۔

کپڑے پہنے ہوئے بھی وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکالا۔ مائے سا باہر والے کمرے میں موجود تھی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی اور اب اس کے ہونٹوں پر خفگی سی مسکراہٹ بھی تھی۔ وانگ سائی نے بھی وانگ سائی کو ہسپتال کی زد پر لے رکھا تھا۔ میں نے باہر کا دروازہ کھول کر راہداری میں جھانکا اور پھر باہر نکلی آیا۔

راہداری سنسان تھی۔ میں آگے تھا۔ میرے پیچھے وانگ سائی اور وانگ سائی تھے۔ وانگ سائی نے ہسپتال کی نال وانگ سائی کی کمر سے لگا رکھی تھی۔ مائے سا سب سے پیچھے تھی۔

میں چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ مائے سا والی دو دوسرے فلیٹ کا دروازہ چند رانچ کے قریب کھلا۔ وہی یورپین عورت جھانک رہی تھی جسے میں نے ایک دوسرے آدمی کے ساتھ لفٹ سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی لیکن میرے پیچھے وانگ سائی پر نظر پڑی اس کے چہرے پر خوف اور آنکھوں میں دھشت سی گہرائی۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ جتنی پسند عورت تھی اور جب سے ہم وانگ سائی کے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے۔

خالہ آج ہی وقت سے وہ اپنے فلیٹ کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ہم وانگ سائی کو عمارت کے عقبی دروازے سے باہر لے آئے اور پھر علی کے موٹر پر کھڑی جیب تک پہنچنے میں بھی ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وانگ سائی کو جیب کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے مائے سا والی سیٹ پر مائے سا اور میں بیٹھ گئے جبکہ وانگ سائی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

ہمپ کلائی روڈ سے ہوتی ہوئی سام لان روڈ پر مڑ گئی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس سڑک پر ایک ٹائٹ کلب سے کچھ لوگ نکل رہے تھے۔ وانگ سائی نے اچانک ہی اچھل کر مائے سا کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا ٹھونک کر دیا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے پیر پر گولی چلا دی۔ مائے سا بھی چیخ اٹھی۔ ہر حال ”وہ وانگ سائی کی گرفت سے نکل نہ سکی۔ میں نے وانگ سائی کو سیٹ پر گر لیا اور ہسپتال کے دستے سے اس کے چہرے، سر اور سینے پر ضرریں لگانے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ میں نے ہسپتال کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔

”اب اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو ہسپتال کی ساری کولیاں تمہارے سینے میں آتا رہیں گا۔“ میرے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی۔

وانگ سائی کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے اسے سیٹ سے اٹھنے دیکھا لیکن گردن کھما کر پیچھے ضرور دیکھا تھا۔ ٹائٹ کلب کے

سائے کھڑے ہوئے لوگ ہماری جیب ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک دو گاڑیاں اور ٹیکسیاں بھی کھڑی تھیں لیکن کسی نے ہمارے پیچھے آنے کی حماقت نہیں کی۔ یہ بھی قسمت تھا کہ اس پاس پولیس کی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی ورنہ ہمارے لیے پریشانی ہو جاتی۔

جب ہم کالج پہنچے تو ایک بچے والا تھا۔ وانگ سائی کے پیر سے بننے والے خون سے جیب کے فرش کا ستا تاس ہو گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی تاریکی میں چھپے ہوئے تھیں چار تباہی محافظ ہمارے قریب آ گئے۔

”اسے پیچھے کوارٹر میں لے جاؤ۔“ وانگ سائی نے قیدی کو ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا ”اگر یہ کوئی حرکت کرے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو آواز دینا۔“ پیر زخمی ہونے کی وجہ سے وانگ سائی کے لیے کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ محافظ اسے ہٹھینے ہوئے کالج کی پچھلی طرف لے گئے۔ وانگ سائی نے ایک اور محافظ کو جیب کے فرش پر پھیلا ہوا خون صاف کرنے کو کہا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ تھائی وغیرہ جاگ رہی تھیں۔ آوازیں سن کر وہ بھی برآمدے میں آ گئی تھیں۔

”وانگ سائی کو ہم لے آئے ہیں۔“ میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ابھی تھوڑی دیر میں اس سے معلوم کرتے ہیں کہ دارا وغیرہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔“

”میرا خیال ہے“ ایک سب کاٹلی ہو جائے اس کے بعد اس کا پوسٹ مارٹم کریں گے۔“ وانگ سائی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

مائے سا بھی ہمارے ساتھ اندر گئی۔ رنگولی اور جاگی اسے لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں اور تھائی نے مجھ پر سوالات کی بارش کر دی۔

لوما ہمیں دیکھتے ہی کچن میں گھس گیا تھا اور چند ہی منٹ بعد وہ ہم سب کے لیے کالی بنا کر لے آیا۔

کالی بننے کے بعد ہم بھی چند منٹ وہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے پھر میں اور وانگ سائی کا کالج سے نکل کر پچھلی طرف آ گئے۔

وہاں ایک طرف وانگ سائی اور لوما کے لیے کوارٹر تھے اور دوسری جانب گاڑیوں کے لیے پائت گراج بنے ہوئے تھے۔ ان گیران کی تعداد تین تھی جو ساتھ ساتھ بے ہوئے تھے۔ ایک گیران کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وانگ سائی گندے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس کے پائے پیر سے خون اب بھی رس رہا تھا۔ وانگ سائی کو بے کی ایک فولڈنگ کرسی کھول کر دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔

”یہ تمہارا شکار ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”جو کچھ پوچھا ہے، تم ہی پوچھو۔ میں آرام سے یہاں بیٹھ کر تماشا دیکھوں گا۔“

کچھ خوف اور کچھ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ مردوں کی طرح سفید ہو رہا تھا۔  
 ”شرافت سے کچھ اگلوں کے یا تمہاری زبان کھلوانے کے لیے مجھے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینی پڑے گی؟“ میں نے یہ کہتے ہوئے ایک طرف ہڑا ہوا چہرے کا ایک ٹکڑا اٹھالیا۔ یہ دراصل پرانے ٹاز کا ٹکڑا تھا جو تقریباً دو انچ چوڑا اور دو دو انچ فٹ لمبا تھا۔

”ہمم... مجھے نہیں معلوم وہ لوگ کہاں ہیں؟“ وانگ سائی ہلکایا۔ خوف سے اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔  
 ”وہ عورت کون تھی جس نے صبح تمہیں ایک کانڈہ یا تھا اور وہ کانڈہ تم نے کہاں پٹپٹایا تھا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”فد... عورت...“ وانگ سائی رک رک کر بولا ”وہ میری دوست ہے۔ ہماری ملاقات ایک دن پہلے ہی ہوئی تھی۔ صبح وہ مجھ سے ہی ملنے وہاں آئی تھی لیکن سائے کو میرے ساتھ دیکھ کر اس نے چپکے سے مجھے وہ خط دے دیا اور واپس چل گئی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے گر شاید زبان سے نہیں کہنا چاہتی تھی اس لیے پہلے ہی سے ایسا خط لکھ کر لے آئی تھی۔“

”تو وہ لویئر تھا؟“ میں نے اسے کھورا اور پھر میرا ہاتھ حرکت میں آلیا۔

ٹاز کا وہ ٹکڑا چاک کی طرح اس کے سینے پر پڑا اور وہ ہلجلا اٹھا۔ میرا ہاتھ رک نہیں۔ میں اس پر ہنسی کی طرح وار کرتا رہا۔ پشت سے اس کی ٹھیس پھٹ گئی اور کئی جگہوں سے خون رستے لگا۔ وانگ سائی کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں۔

”اس دیر نے میں تمہاری چیخیں کوئی نہیں سنے گا۔ جتنا چیخنا چاہو، جتنو۔“ میں نے فرماتے ہوئے کہا ”میں تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا لیکن اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ اس خط میں کس کے لیے کیا پیغام تھا اور دارا اور پی ٹی فانگ کہاں جیسے ہوئے ہیں۔“

”ہمم... میں کچھ نہیں جانتا۔“ وانگ سائی نے جواب دیا۔  
 میرا ہاتھ ایک بار پھر حرکت میں آ گیا۔ اتنی راکر چھڑ لگائی جاتی تو وہ بھی ٹوٹ کر ٹکڑے بن جاتا لیکن وہ بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس کی ضد سے مجھ پر بھی جنون سا طاری ہو گیا۔ میں اس پر کڑے برسنا رہا اور وہ چیخا ہوا کندے فرش پر لوٹا رہا۔ اس کے جسم سے رستے والے خون سے فرش پر بھی دھبے پڑ رہے تھے۔

میں نے ٹاز کا وہ ٹکڑا ایک طرف پھینک دیا اور دیر اور دھر دیکھنے لگا۔ گیراج کے آخری حصے میں ایک میز بڑی ہوئی تھی جس پر اوڑا وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ڈبل مشین بھی تھی۔ میں نے بک کر، ریل مشین اٹھائی اور اس پر لپٹا ہوا آکر کھولے لگا۔ وانگ ڈن اب تک واقعی تماشائی بنا خاموشی سے یہ سب کچھ

دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈبل مشین اٹھاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تھری گئی۔

میں نے ڈبل مشین کے تار کا پلگ گیراج کی دیوار میں نصب سوچ بوڑے کے ایک ساک میں لگا دیا اور اس کے ساتھ والا سوچ آن کر کے ڈبل مشین کا ٹیٹا دیا۔ ڈبل مشین کے آگے جہل جھٹی موٹی تین انچ لمبی ہٹ لگی ہوئی تھی۔

”اسے سیدھا لٹا دو اور اس طرح گرفت میں لے لو کہ پلٹے پائے۔“ میں نے قبا کی محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وانگ سائی کے ہاتھ اب بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے میرے اشارے پر ایک محافظ نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور اسے فرش پر چت لٹا کر دونوں بازو اور ٹانگیں اطراف میں پھیلا دیں۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر ایک ایک محافظ کھڑا ہو گیا۔ اب وانگ سائی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

گولی اس کے بائیں پیٹ میں لگی تھی۔ میں اس کی دائیں ٹانگ کے قریب بیٹھ گیا اور ڈبل مشین کی ہٹ اس کی ران پر رکھ دی اور جتن دیا کہ ڈبل مشین پر ہاتھ کا دباؤ ڈال دیا۔ تین انچ لمبی ہٹ گوشت میں سوراخ کرتی ہوئی اندر تک کھس گئی۔

باریک قتیے کی طرح گوشت کے ذرے اور خون کے جھینٹے میرے چہرے اور پکڑوں پر بھی پڑے۔ وانگ سائی کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بتی سی خوفناک تھیں۔ وہ مجھے کی کو شیش کر رہا تھا لیکن محافظوں نے اسے پوری طرح دبا رکھا تھا۔ میں نے چند سینکڑ ڈبل مشین کو دبانے رکھا اور پھر اسے باہر کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی قبا کی محافظوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ وانگ سائی کو چھوڑ کر الگ الگ ہٹ لگے۔ وانگ سائی ذبح ہوتے ہوئے میرے کی طرح فرش پر ڈرپنے لگا۔ اس کی ٹانگ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ وہ واقعی بہت سخت جان تھا۔ اتنی اذیت اٹھانے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

وانگ ڈن اور قبا کی محافظ دشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وانگ ڈن تو بہت ہی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ میں اس قدر سفاکی کا مظاہرہ کر دوں گا۔

مجھ پر اب بھی جنون سوار تھا۔ دو روز پہلے میں نے ہائیے، جو مختصر دیکھا تھا وہ اب بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ گولیوں سے چھلپی پانچ لاکھیں۔ انہیں اس قدر بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے والے دارا اور اس کے ساتھی تھے۔ ان کا سراغ لگانے کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔

”اب بھی زبان کھولنے کو تیار ہو یا نہیں۔“ میں نے وانگ سائی پر جھٹکتے ہوئے کہا ”میں تمہارے جسم میں اس ڈبل مشین سے اتنے سوراخ کر دوں گا کہ انہیں گنتا مشکل ہو جائے گا۔ آخری سوراخ تمہارے دل میں ہو گا۔ اس جگہ۔“ میں نے ڈبل مشین آگے بڑھائی۔

”ب... بتانا ہوں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا ”ہمم... میں مر رہا ہوں۔ میرا خون بہہ رہا ہے۔ ہمم... مجھے پانی دو۔“  
 ”ابھی تم نہیں مرو گے۔“ میں نے کہا اور محافظوں کو اشارہ کیا۔

وانگ سائی کو دیوار سے ٹک لگا کر بٹھا دیا گیا۔ ایک محافظ اسے پانی پلانے لگا۔ میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی عجیب سے تاثرات تھے اور میں اس کی طرف دیکھ کر سسکا رہا۔

”تمہارا یہ روپ دیکھ کر تو مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔“ وانگ ڈن نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر۔“

”بے رحم ہوں گا۔“ میں نے سسکا رہے ہوئے اس کی بات کاٹ دی ”مجھے یہ رات انہی لوگوں نے دکھایا ہے وانگ ڈن۔ میں وہ وقت بھی نہیں بھول سکتا جب میری آنکھوں کے سامنے میرے ماں باپ کو جنوروں کے وار کر کے اس سے بھی زیادہ بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بات وہیں ختم ہو جاتی تو آج میرے ہاتھوں میں پتول نہ ہوتا مگر دارا تو مجھے بھی قسم کھا رہا تھا۔ اس نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا کیا پھنسنے استعمال نہیں کیے لیکن میں بچتا رہا اور چھپتا رہا۔ انہوں نے مجھے ایک لمحے کو بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیا۔ اب میں انہیں چین سے نہیں بیٹھے دوں گا۔ اس رات جپ میں اپنے آدمیوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں تو تم نے بھی دیکھی تھیں۔ کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر رحم کیا جائے یا ترس لکھایا جائے؟“

وانگ ڈن لاجواب ہو گیا تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اسے اب تک یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ میں اتنا طاقتور اور بے رحم کیوں بن گیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ بیرونی کے برٹس کا کوئی چکر ہے لیکن اگر بات صرف بیرونی کی بھی ہوتی تو موت کے یہ ہر گز اس قابل نہیں تھے کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی جاتی۔ بیرونی کا زہر یہ پوری دنیا میں پھیلا رہے تھے۔ جو جان نسل تباہ ہو رہی تھی۔ اسکول کے نو عمر بچوں کو بھی اس کا عادی بنایا جا رہا تھا۔ یہ لوگ رحم کے مستحق کس طرح ہو سکتے تھے؟

میں وانگ سائی کی طرف متوجہ ہو گیا جو دیوار سے ٹک لگے بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ زخموں سے خون اب بھی رس رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مرنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ پیچھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ٹھوکر ماری تو اس نے چیخنے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

”دارا کہاں ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

”فد... وہ کھالائی کے ایک کالج میں ہیں۔“ اس نے رک

رک کر جواب دیا ”اس کے ساتھ پی فانگ اور کم کے علاوہ تین آدمی اور بھی ہیں۔“  
 ”فد...“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی ”تو وہ بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔“

”تم لوگوں سے جان بچانے کے لیے اس نے تیز روٹی میں چھلاٹ لگا دی تھی۔ اس کی قسمت ابھی مٹی کے دو ہتھکڑے میں کامیاب ہو گیا اور پھر اس نے کسی جگہ سے فون پر پولیس چیف سے رابطہ کیا تھا۔ پولیس چیف نے ہی اسے ایک کالج کا پتا بتا کر وہاں پہنچنے کو کہا تھا۔ دارا اور پی فانگ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے اس وقت میں بھی وہیں موجود تھا۔ کچھ دیر بعد چیف بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ دارا وغیرہ نے اسے بتایا کہ تم لوگ کس طرح وہاں پہنچے تھے اور کس طرح رعول کی غدار کی وجہ سے ان لوگوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ اس دوران میں کالج میں آگ لگ چکی تھی۔ دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور پھر دھماکے ہونا شروع ہو گئے۔ پولیس چیف نے ہم سب کو کالج سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کر دیا اور خود واپس چلا گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”مجھے دراصل چینگ رائے میں تھائی وغیرہ کی عمرانی کی ذمے داری سونپی گئی تھی اور میں اسی رات وہ ذمے داری کسی اور آدمی کے سپرد کر کے ایک ضروری کام سے یہاں آیا تھا۔ اس وقت دارا وغیرہ اسی کالج میں تھے جہاں تم لوگوں نے حملہ کیا تھا لیکن چیف نے مجھے ان لوگوں سے نہیں ملنے دیا تھا اس لیے مجھے الگ کالج میں رکھا گیا لیکن اس ہنگامے کے بعد دارا وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ پولیس چیف کے جانے کے بعد دارا نے ایک اور منصوبہ بنایا اور مجھے اسی وقت چینگ رائے واپس بھیج دیا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ میں چینگ رائے میں کچھ مقامی فنڈوں کی مدد سے تھائی اور برساد کو ختم کر دوں۔ اس طرح وہ تمہاری قوت کو کم کرنا چاہتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ اس رات اس مکان پر حملہ کر دیا جائے گا جہاں تھائی اور برساد نے پناہ لے رکھی تھی لیکن شام کے کچھ دیر بعد جب میں نے تھائی اور برساد کو مسلح محافظوں کے ساتھ جپ پر نکلنے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ میں نے فون پر دارا کو اطلاع دے دی اور پھر انہیں راستے ہی میں موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ دارا ہی نے بنایا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لوگ کس جگہ پر گھاٹ لگا کر بیٹھیں گے۔ میں نے تھائی کی جپ کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور پھر ان سے آگے نکل کر دارا وغیرہ کو تباہ کیا۔“

”پولیس چیف بھی اس منصوبے میں شریک تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وانگ سائی نے جواب دیا ”چیف کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سپرد جو بھی کام کیا گیا تھا وہ اسے خاموشی سے کرنا چاہتا تھا مگر دارا اس کے کنٹرول میں نہیں تھا۔ دارا آج تک کسی

کے کنٹرول میں بھی نہیں رہا۔ پہلے ٹائیکر نے اور پھر بیرونی سے بھی اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ خود سر تھا۔ وہی کرنا جو اس کے من میں ہوتا اور یہ حقیقت ہے کہ بنگامے بڑھانے میں دارا ہی کا ہاتھ ہے۔ اگر دارا نہ ہوتا تو ٹائیکر اور بیرونی اس قسم کے بنگامے بھی نہ کرتے۔ وہ خون ریزی سے پیش کر رہے تھے۔ وہ تو بس بنگامے کے ٹائٹ کپڑوں میں دادا گیری کر کے چگا ٹیکس وصول کرتے تھے یا بھریوں کا محدود بزنس تھا مگر دارا نے اگر سب کچھ بدل ڈالا۔

”یہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ ایک خاص موقع پر چند لوگوں کی حفاظت کرنی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ دارا اندری اندر کوئی اور چکر بھی چلا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ٹائیکر وغیرہ محدود چلانے پر بیرونی فروخت کرتے تھے اور یہ بزنس بھی بنگامے کے ہوٹوں اور ٹائٹ کپڑوں تک ہی محدود تھا مگر دارا نے اسے بڑے پیمانے پر بیرونی کی اسٹاکنگ پر آمادہ کر لیا اور اس سلسلے میں جزل کھوراٹ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ بظاہر جزل کھوراٹ کے نمائندوں سے بات چیت چل رہی تھی لیکن مجھے شبہ ہے کہ دارا کا جزل کھوراٹ سے براہ راست رابطہ ہو چکا ہے اور اس نے پیدرونیہ کو اس سے بے خبر رکھا ہے۔“

”ابھی تم نے کہا تھا کہ پولیس چیف کو کوئی خاص کام سونپا تھا جسے وہ خاموشی سے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ خاص کام کیا ہے اور کس نے اسے وہ کام سونپا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”مجھے نہیں معلوم۔“ وانگ سائی نے جواب دیا ”لیکن اسے بنگامے کے ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کی آشریاد حاصل ہے مگر اسی دوران میں جب پر فائزنگ والا واقعہ پیش آیا جس میں سردار قنابل کے آدمی بارے گئے۔ حکومت کو اندیشہ تھا کہ اس واقعے کو بنیاد بنا کر کیرن قبیلہ بغاوت نہ کر دے۔ سردار قنابل کا غصہ غصا کرنے کے لیے بظاہر چیف کو معطل کر دیا گیا ہے مگر اس کی پراسرار سرگرمیاں اب بھی جاری ہیں۔“

”وہ عورت کون تھی اور کس کے لیے کیا پیغام لے کر آئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ پولیس آفس میں کام کرتی ہے۔“ وانگ سائی نے جواب دیا ”چیف یہ چاہتا تھا کہ ہم سب لوگ اس کانچ تک محدود رہیں لیکن دارا کو اس پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے چیف کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے مجھے شریعہ دیا۔ اس کے اصرار پر ہی چیف نے اپنی بلڈنگ کا وہ فلیٹ خالی کر کے مجھے دے دیا تھا۔ مجھ سے پہلے اس فلیٹ میں دو غیر ملکی سیاح ٹھہرے ہوئے تھے جنہیں کسی ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ دارا نے پولیس چیف کو باور کرایا تھا کہ مجھے صرف سردار قنابل اور اس کے آدمیوں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے یہاں جھوڑا گیا ہے۔ دارا بہت چالاک آدمی ہے۔“

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ اتنی جلدی لوگوں کو اپنے لیے کام کرنے پر آمادہ کیسے کر لیتا ہے۔ وہ عورت پولیس آفس میں ملازم ہے لیکن دارا کے لیے کام کر رہی ہے اور چیف کی سرگرمیوں کے بارے میں اسے رپورٹ دیتی رہتی ہے۔ اس لفافے میں بندہ بھی کوئی ایسی ہی رپورٹ تھی جو میں نے ایک اور آدمی کے ذریعے دارا کو بھجوا دی تھی۔“

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر عقلمنوعیت کے سوالات کرتا رہا۔ وانگ سائی نے یہ تو اعتراف کر لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ اندری اندر کوئی کچھڑی پک رہی ہے لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا بڑی دلچسپی سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ یہ ساری باتیں اس کے لیے منطقی خیر انکشافات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ تو یہی سمجھتا رہا تھا کہ معاملہ بیرونی کی اسٹاکنگ کا ہے لیکن یہ نت نئے منطقی خیر انکشافات سن کر اس کے چہرے پر بھی منطقی سی پھیل گئی تھی۔

میں وانگ سائی سے بہت کچھ پوچھ چکا تھا اور میرے خیال میں کوئی اور اہم بات نہیں رہی تھی۔ میں نے جب سے ہسپتال نکال لیا۔ وانگ سائی کا چہرہ خوف کی شدت سے کچھ اور بھی سفید ہو گیا۔ اسے بولنے کا موقع دینے بغیر میں نے ہسپتال کا رخ اس کے پینے کی طرف کیا۔۔۔۔۔ اور نگر دبا آ چلا گیا۔ اس کے لیے ایک ہی گولی کافی تھی جو اس کے پینے پر ٹھیک دل کے مقام پر لگی تھی لیکن میں نے اس کے پینے میں تین گولیاں اتار دی تھیں۔

”اس کی لاش اٹھا کر پیچھے ندی میں پیچھک دو اور یہ فرش دھو کر صاف کر دو۔ یہاں کوئی نشان باقی نہیں رہنا چاہیے۔“ وانگ ڈن نے قبائلی محافظوں کو حکم دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہم دونوں گہرا سچے نکل کر کانچ کی طرف جانے لگے۔



سردار قنابل صبح ناشے کی میز پر ہمارے ساتھ موجود تھا۔ وانگ ڈن نے صبح سویرے ہی ٹیلی فون پر اسے رات والے واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور وہ اس صورت حال پر تباہ دل خیال کے لیے خودی یہاں چلا آیا تھا۔

وانگ ڈن کا خیال تھا کہ آج رات اس کانچ پر چھاپا مار دیا جائے جہاں دارا وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ میرے اصل دشمن تو دارا اور بی بی فانگ وغیرہ تھے لیکن اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا وہ ذاتی دشمنی سے زیادہ اہم تھا۔ ہمیں شیشہ کے خلاف سازش کا سراغ لگنا تھا اس لیے میں نے بڑی شدت سے وانگ ڈن کی اس تجویز کی مخالفت کی۔

”یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا ”وہ دوبارہ بھاگ گئے یا ہمارے ہاتھ بھی آگئے تو ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں تو شیشہ کے خلاف سازش کا سراغ لگانا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ

میں اور بنگامے میں الجھنے کے بجائے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں۔“ وانگ سائی کے غائب ہونے سے وہ لوگ ہوشیار ہو گئے ہوں گے اور ہو سکتا ہے وہ لوگ خود ہی کوئی بنگامہ شروع کر دیں۔“ وانگ ڈن نے کہا۔

”یہی صورت میں ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ فی الحال ہمیں خاموشی ہی رہنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”وہ دن ٹھیک لگتا ہے۔“ قنابل نے کہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ویسے تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ کوئی تجویز؟“

”ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔“ میں نے کہا ”پولیس آفس میں موجود عورت جو دارا کو اطلاعات فراہم کر رہی ہے۔ ہماری مدد بھی کر سکتی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ قنابل میری بات سن کر اچھل پڑا۔ ”وہ دارا کے لیے کام کر رہی ہے۔ ہمارے لیے کیسے۔۔۔۔۔“

”اس دن میں سب کچھ ممکن ہے۔ سردار قنابل۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”وہ ہمارے لیے بھی کام کرے گی۔“

”وی تو جانتا چاہتا ہوں، کیسے؟“ اس نے ابھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر اپنی تجویز کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں کبہ رہا تھا۔

”اس مشن میں آپ کا کوئی آدمی استعمال نہیں ہو گا کیونکہ اس طرح آپ کا کام بھی آگے اور پھر کوئی گریڈ بھی ہو سکتی ہے۔ آپ لوگوں کو صرف اتنا کرنا ہے کہ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلومات فراہم کر دی جائیں۔ آج شام سے پہلے پہلے۔ اور ایک ایسی گاڑی جسے آپ کی گاڑی کی حیثیت سے شناخت نہ کیا جاسکے۔“

”ٹھیک ہے۔“ قنابل نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”آج شام تک تمہیں مطلوبہ معلومات مل جائیں گی اور گاڑی بھی۔“

اس کے بعد بھی میں ہم دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور میرا بچے کے قریب قنابل والیں چلا گیا۔ مائے سا ابھی بیٹیں تھیں۔ اسے میں نے نہیں جانے دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وانگ سائی کی کشدگی کے حوالے سے کوئی بنگامہ ضرور ہوگا۔ اس عورت نے مائے سا کو وانگ سائی کے ساتھ دیکھا تھا اور ظاہر ہے اس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ وہ کون ہے؟ اسے تلاش بھی کیا جائے گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مائے سا کو کوئی نقصان پہنچے اس لیے میں نے اسے دو تین دن تک کانچ ہی میں روک لیا۔ قنابل البتہ قنابل کے جانے کے توڑی دیر بعد میں نے آدہ ترین صورت حال معلوم کرنے کے لیے اسے شریعہ دیا تھا۔

قنابل دو گھنٹوں بعد واپس آیا تھا۔ وانگ سائی کے حوالے سے شرمیں خاموشی تھی۔ البتہ روایتی دلا کے چوکیدار نے یہ

انکشاف کیا تھا کہ اس بلڈنگ میں رہنے والا ایک کرائے دار گزشتہ رات پُراسرار طور پر لاپتا ہو گیا ہے اور ایک آدمی اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے دو تین مرتبہ آچکا ہے۔ بلڈنگ کے چوکی دار نے وانگ سائی کے ساتھ آنے والی کسی لڑکی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور وہ یورپین عورت جس نے گزشتہ رات مجھے اور وانگ ڈن کو بلڈنگ میں دیکھا تھا اور پھر ہمیں وانگ سائی اور مائے سا کے ساتھ اس کے فلیٹ سے نکلے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس نے بھی اس سلسلے میں اپنی زبان بندی رکھی تھی۔ غیر ملکی سیاح عام طور پر ایسے معاملات سے دور رہتے ہیں جن میں ان کی اپنی کردن پھنسنے کا اندیشہ ہو۔

پولیس آفس میں البتہ کچھ پھل نظر آئی تھی۔ چیف اگرچہ معطل ہو چکا تھا لیکن اسے بھی سادہ لباس میں پولیس آفس میں دیکھا گیا تھا۔

شام چھ بجے قنابل کا ایک آدمی کار لے کر آیا۔ بنگامے کی لائنیں پلٹنے والی وہ کار دیکھنے میں اگرچہ پرانی سی لگتی تھی لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ چینگا سامین میں کوئی مقامی دیکھل رجسٹریشن آفس نہیں تھا۔ یہاں کی گاڑیوں کی رجسٹریشن بھی چینگا رائے ہی میں ہوتی تھی۔

اس کے توڑی ہی دیر بعد قنابل کا فون آگیا۔ اس سے پولیس آفس میں کام کرنے والی اس عورت کے بارے میں خاصی معلومات مل گئیں۔ اس کا نام رنگ سنت تھا اس کی ہائٹس، بگنا روڈ پر واقع ایک شان دار کالج میں تھی۔ اس کی ایک جوان بیٹی بھی تھی جو چینگا مائے بیوروٹی میں زیر تعلیم تھی اور ان دنوں یہاں آئی ہوئی تھی۔ صبح میں نے سردار قنابل سے کہا تھا کہ میں اس مشن میں اس کے آدمیوں کو استعمال نہیں کروں گا لیکن اس وقت مجھے ان کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

میں اور قنابل شام کا اندھیرا چھیلنے کے توڑی دیر بعد قنابل کی بھیجی ہوئی کار میں کانچ سے روانہ ہو گئے۔ ظاہر ہے ڈرائیونگ قنابل ہی کر رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم محافظوں کے بغیر اکیلے باہر نکلے تھے۔ کسی ناگہانی صورت حال کا سامنا بھی ہو سکتا تھا اس لیے میں خاصا محتاط تھا۔ ہسپتال میرے پاس بھی تھا اور قنابل کے پاس بھی۔

میں نے وانگ ڈن سے شہر کے راستے سمجھ لیے تھے اور ٹورسٹ مپ بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ کوئی راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

ہم نے کار بنگنا روڈ پر کھڑی کر دی اور رنگ سنت کے کانچ کے آس پاس تقریباً ایک گھنٹے تک کھوئے رہے۔ کانچ واقعی بہت شان دار تھا۔ یہاں کے پولیس والے بہت دولت مند تھے۔ رنگ سنت ایک معمولی سے عہدے پر فائز تھی لیکن یہ کانچ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔

کانچ کے سامنے سرک کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا جس کے ساتھ کافی ہاؤس بھی تھا۔ ہم اس کافی ہاؤس میں ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں سے کانچ پر بھی نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک کار کانچ کے سامنے آکر رکی۔ ڈرائیوگ سیٹ پر ایک اور میزمر آئی بیٹھا ہوا تھا جبکہ ساتھ والی سیٹ پر جو لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اس کے لیے میرے ذہن میں فوری طور پر قیامت ہی کا نام ابھرا تھا۔ وہ واقعی قیامت تھی۔ عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ جب وہ کار سے اتری تو اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے مختصر سی شارٹ اور بغیر آئین کی بنیان ٹاپ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کار آگے نکل گئی۔ لڑکی کے تیل بجانے پر دروازہ رنگ سنت ہی نہ کھولا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لڑکی رنگ سنت کی بیٹی تھی۔ ان دونوں میں بڑی شبہت تھی۔

اگلے روز شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میں اور تھائی پھر اس علاقے میں موجود تھے۔ آج ہمارا پروگرام کچھ اور تھا۔ کار بھی ہم نے کانچ کی پچھلی گلی میں کھڑی کی تھی۔ کانچ میں اندھیرا تھا۔ مجھے اور تھائی کو پچھلے دروازے سے کانچ میں داخل ہونے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں بڑے اطمینان سے ہال میں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اگرچہ گہرا اندھیرا تھا لیکن جی جلانے کی کوشش ہم میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً بیس منٹ بعد سامنے کا گیٹ کھلے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی پھر قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس آواز سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ قدموں کی آواز برآمدے میں رگ گئی اور پھر دروازے کے تالے میں چالی گھمائے جانے کی آواز سنائی دی۔ کانچ میں آنے والا کوئی بھی ہوتا۔ اسے برآمدے والا دروازہ کھول کر سب سے پہلے ہال ہی میں آتا ہوتا۔ سوچ بوز بھی برآمدے والے دروازے کے قریب ہی تھا۔

دروازہ کھلنے کے چند سیکنڈ بعد جٹ کی ہلکی سی آواز ابھری اور کمرہ دھوئی سے بھر گیا۔ ایک لمبے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں لیکن فوراً ہی صورت حال نارمل ہو گئی اور میں اس عورت کی طرف دیکھنے لگا جو سوچ بوز کے پاس کھڑی تھی۔ وہ رنگ سنت تھی۔

روشنی ہونے کے بعد رنگ سنت صرف ایک قدم آگے بڑھ سکی تھی اور پھر اس طرح بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی جیسی چیمے زمین نے اس کے زیر پکڑ لیے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیک کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ وہیں رگ گیا۔ ”ہم کوئی بیگم نہ نہیں کرنا چاہتے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا ہوئے کہا ”اگر تم اپنے حواس پر قابو پراں بیٹھ جاؤ تو ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔“

رنگ سنت کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ متحش تھا۔ ہاؤس کے کبھی ہم دونوں کی طرف اور کبھی اوپر اوڑھ دیکھ رہی تھی۔ تھائی نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے بیک لے لیا اور اس میں سے لیڈی آؤٹ جیک پستول نکال کر بیک سینٹر نیل پر رکھ دیا۔

”لگ بھگ کون ہو تم لوگ اور میری بیٹی کہاں ہے؟“ اس کے لمبے میں خوف نمایاں تھا۔ وہ ایک بار پھر اوڑھ دیکھنے لگی۔ ہم نے رنگ سنت کی بیٹی کو نمائندگی خفیہ طور پر اغوا کر لیا تھا۔

”تمہاری بیٹی خیریت سے ہے اور مجھے تم پچانے سے انکار نہیں کر سکتیں کیونکہ اس روز پولیس چیف کے دفتر میں ہونے والی میٹنگ میں تم بھی موجود تھیں اور تم نے مجھے اچھی طرح دیکھا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ ذمہ نہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“ میں نے پستول سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

رنگ سنت کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ وہ سامنے والے صوفے پر گر گئی۔

”سونیا کہاں ہے؟“ اس نے ایک بار پھر اوڑھ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری بیٹی بالکل خیریت سے ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن اگر تم نے انکار کیا تو۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر جملہ اوڑھا پھوڑا اور چند لکھوں کی خاموشی کے بعد بولا ”ایک منٹ۔ اطمینان کرو کہ لو کہ تمہاری بیٹی اب تک خیریت سے ہے۔“ میں نے کمرے میں اوڑھ اوڑھ دیکھا۔ سازو سامان بے حد قیمتی تھا۔ دائیں طرف خوب صورت ایشینڈ پر ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر دیں کھڑے کھڑے کانچ کا نمبر لایا۔ کال وانگ ڈن نے ریسیو کی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے ریسیور رنگ سنت کی بیٹی سونیا کو دے دیا میں نے فون اٹھا کر سینٹر نیل پر رکھا اور ریسیور رنگ سنت کے ہاتھ میں تھا دیا۔ اس نے فون پر چند جملے کے پھر میں نے فون کا ریٹیل دیا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر رکھ دیا۔ میں رنگ سنت کو صرف یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں ہے۔

”لگ بھگ کیا چاہتے ہو تم؟“ رنگ سنت نے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”تعاون!“ میں نے کہا ”تعاون کی صورت میں تمہاری بیٹی بھی خیریت سے رہے گی اور تمہیں معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“ میں چند لمبے خاموشی سے اس کے چہرے کو ٹکٹا رہا پھر بولا ”تم دارا کو پولیس چیف کی سرگرمیوں سے آگاہ کر رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ کچھ بھی ایسا ہی تعاون کرو۔“

”یہ غلط ہے۔ میں کسی دارا کو نہیں جانتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”جھوٹ بول کر اپنے لیے مشکلات پیدا کرو گی۔“ میں نے کہا۔ ”دو دن پہلے ریور دیو ریٹورنٹ کے سامنے تم نے وانگ سائی کو

ایک لفافہ دیا تھا۔ وانگ سائی نے بھی سب کچھ اگل دیا ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”وہ!“ رنگ سنت کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اور پھر شاید اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا ”وانگ سائی کہاں ہے دارا کے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔“

”وہ ایسی جگہ پہنچ چکا ہے جہاں اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ!“ رنگ سنت کے چہرے پر خوف کے سامنے گہرے ہو گئے۔

”اطمینان رکھو۔ تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا ہوئے کہا ”تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو اس میں تمہاری فائدہ ہے۔“

”مم۔۔۔ گم۔۔۔“ وہ بھلائی ”گر دارا کو پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ لوگ بہت سفاک اور بے رحم ہیں۔“

”وہ تم سے دارا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتے گا۔ وہ روپوش ہونے کے باوجود ہماری نگاہوں سے اوچھل نہیں ہے۔ میں اسے جب چاہوں پوچھنے کی طرح پکڑ سکتا ہوں۔“

”پھر کیا چاہتے ہو؟“ رنگ سنت بولی۔

”حکومت کے بعض اعلیٰ عہدے دار یہاں آئے ہوئے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا ہوئے کہا ”وہ بظاہر سردار قتال کی جیب پر فائرنگ اور اس کے آدمیوں کے بارے جاننے کی اطلاع پا کر یہاں آئے ہیں تاکہ سردار قتال کو کسی ممکنہ نادرستی سے روکا جاسکے لیکن۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں کی آمد کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔“

”میں سمجھتی نہیں؟“ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”تم سب کچھ جانتی ہو اور سمجھ رہی ہو۔“ میں نے کہا ”تم پولیس چیف کے دفتر میں ہو اور پولیس چیف اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ معطل کیے جانے کے باوجود وہ پراسرار سرگرمیوں میں مصروف ہے اور تم اس کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف ہو۔“

”مم۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ رک رک کر بولی۔

”دیکھو رنگ سنت۔“ میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا دیا ”تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔ وہ جوان بھی ہے اور بہت حسین بھی۔ میں نے اس کی سلامتی کا وعدہ کیا ہے مگر یہ وعدہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی۔“

”میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔“ اس کی آواز رو دینے والی تھی

”لگ بھگ کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”میں نے انکسائی کے اعلیٰ افسران گولڈن ٹرائی

میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا ہوئے کہا ”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون لوگ شریک ہوں گے۔ تم جو کچھ چیف کے بہت قریب ہو۔ وہ تم پر اعتبار بھی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پیسے کے لالچ میں تم اسے بھی دھوکا دے رہی ہو لیکن اب تو معاملہ تمہاری بیٹی کا ہے۔ اگر مطلوبہ معلومات دے دو تو سونیا کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کوئی خفیہ میٹنگ ہونے والی ہے۔“ رنگ سنت نے جواب دیا ”لیکن یہ ابھی طے نہیں ہوا کہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون لوگ شریک ہوگا۔“

”چیف نے مجھے سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے لیے کام کرتی رہوں تو وہ بہت جلد مجھے کسی بڑے عہدے پر پہنچا دے گا۔“

”تم اس کے لیے کام کرتی ہو۔“ میں نے کہا ”تم بہت ذہین عورت ہو۔ اسے شہ نہیں ہونے دو گی کہ تم کسی اور کے لیے بھی کام کر رہی ہو اور کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ کوئی اس کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھے تو تم کہہ سکتی ہو کہ وہ سیر تفریح کے لیے دوستوں کے ساتھ کس گلی ہوئی ہے۔ تمہاری بیٹی میں تین مرتبہ تم سے فون پر رابطہ کرے گی۔ اس کی آواز صرف تمہارے دفتر کی آپریشنز کی۔ اس کے بعد کی گفتگو مجھ سے ہوگی۔ اس سلسلے میں جب بھی کوئی بات ہو، تم مجھے اطلاع دو گی اور میرا خیال ہے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

”میری اطلاع کے مطابق میٹنگ ایک دو روز میں ہونے والی ہے۔ اس دوران میں تمہاری بیٹی ہماری ممان رہے گی۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ تمہارے اطمینان کے لیے یہی کافی ہوگا کہ تم دن میں دو تین مرتبہ اس کی آواز سن لیا کرو گی اور اگر تم نے اس کی فون نمبر کے بارے میں معلوم کر کے کسی بھی ذریعے سے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہمارا تو کچھ نہیں بولے گا مگر تمہیں اپنی بیٹی کی لاش ہی ملے گی۔“

”میں نہیں۔ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔“ رنگ سنت جلدی سے بولی۔

”دیکھو رنگ سنت۔“ میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا دیا ”تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔ وہ جوان بھی ہے اور بہت حسین بھی۔ میں نے اس کی سلامتی کا وعدہ کیا ہے مگر یہ وعدہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی۔“

”میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔“ اس کی آواز رو دینے والی تھی

”لگ بھگ کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”میں نے انکسائی کے اعلیٰ افسران گولڈن ٹرائی

میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا ہوئے کہا ”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون لوگ شریک ہوں گے۔ تم جو کچھ چیف کے بہت قریب ہو۔ وہ تم پر اعتبار بھی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پیسے کے لالچ میں تم اسے بھی دھوکا دے رہی ہو لیکن اب تو معاملہ تمہاری بیٹی کا ہے۔ اگر مطلوبہ معلومات دے دو تو سونیا کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کوئی خفیہ میٹنگ ہونے والی ہے۔“ رنگ سنت نے جواب دیا ”لیکن یہ ابھی طے نہیں ہوا کہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون لوگ شریک ہوگا۔“

”چیف نے مجھے سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے لیے کام کرتی رہوں تو وہ بہت جلد مجھے کسی بڑے عہدے پر پہنچا دے گا۔“

”تم اس کے لیے کام کرتی ہو۔“ میں نے کہا ”تم بہت ذہین عورت ہو۔ اسے شہ نہیں ہونے دو گی کہ تم کسی اور کے لیے بھی کام کر رہی ہو اور کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ کوئی اس کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھے تو تم کہہ سکتی ہو کہ وہ سیر تفریح کے لیے دوستوں کے ساتھ کس گلی ہوئی ہے۔ تمہاری بیٹی میں تین مرتبہ تم سے فون پر رابطہ کرے گی۔ اس کی آواز صرف تمہارے دفتر کی آپریشنز کی۔ اس کے بعد کی گفتگو مجھ سے ہوگی۔ اس سلسلے میں جب بھی کوئی بات ہو، تم مجھے اطلاع دو گی اور میرا خیال ہے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

”میری اطلاع کے مطابق میٹنگ ایک دو روز میں ہونے والی ہے۔ اس دوران میں تمہاری بیٹی ہماری ممان رہے گی۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ تمہارے اطمینان کے لیے یہی کافی ہوگا کہ تم دن میں دو تین مرتبہ اس کی آواز سن لیا کرو گی اور اگر تم نے اس کی فون نمبر کے بارے میں معلوم کر کے کسی بھی ذریعے سے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہمارا تو کچھ نہیں بولے گا مگر تمہیں اپنی بیٹی کی لاش ہی ملے گی۔“

”میں نہیں۔ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔“ رنگ سنت جلدی سے بولی۔

”دیکھو رنگ سنت۔“ میں نے اس کے چہرے پر نفرس مبتلا دیا ”تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔ وہ جوان بھی ہے اور بہت حسین بھی۔ میں نے اس کی سلامتی کا وعدہ کیا ہے مگر یہ وعدہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی۔“

”میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔“ اس کی آواز رو دینے والی تھی

”لگ بھگ کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”میں نے انکسائی کے اعلیٰ افسران گولڈن ٹرائی

کا ہسپتال بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم اس کالج میں بیچلے دروازے سے چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے۔ ہماری داہنی ہتھی اگرچہ بیچلے دروازے سے ہی ہوئی مگر مرکز سنت ہمیں رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئی تھی۔

○☆☆○

دو دن گزر گئے شہر میں نہ صرف سکون تھا بلکہ اس کی رونق میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ رائے کی طرف سے غیر ملکی سیاحوں کی آمد بھر شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ سائین آئے والے غیر ملکی سیاحوں کو سب سے زیادہ دلچسپی کولڈن ٹرائی ایٹنگل سے تھی۔ یہاں آنے والا ہر شخص وہ بدنام زمانہ خط دیکھنا چاہتا تھا جہاں دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئن تیار ہوتی تھی اور پوری دنیا کو یہاں سے زہر پہلائی کیا جاتا تھا۔ ایسے علاقوں کی مصیبت کا دوا دہار ہی سیاحت پر تھا۔ جس علاقے میں کوئی غیر معمولی دلچسپی نہ ہو سیاح ادھر کا رخ نہیں کرتے اس لیے دو دن بند رکھنے کے بعد کولڈن ٹرائی ایٹنگل کی طرف جانے والی سڑک بھی کھول دی گئی تھی۔ تیسرے دن شام کو رنگ سنت کے گھر والے نمبر فون کیا تو ایک دلچسپ اطلاع میری بکھر تھی۔ لائن حسب معمول سونپا ہی لے ملانی تھی۔ صرف دو جھلوں کے تبادلے کے بعد میں نے اس سے ریسپور لے لیا۔

”میں رنگ سنت۔“ میں نے کہا ”کوئی پیش رفت ہوئی یا نہیں؟“

”تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے لیکن میں فون پر بات نہیں کر سکتی۔“ رنگ سنت نے کہا ”تم ایک گھنٹے بعد مجھے میوزیم کے بیچلے گیٹ کے قریب ملو۔ میں تفصیل سے تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔“

”میوزیم کا گیٹ۔“ میں نے کہا ”اس وقت سات بجے ہیں اور میوزیم میں لوگوں کی آمدورفت۔۔۔“

”مجھ بجے میوزیم بند ہو جاتا ہے۔“ رنگ سنت نے میری بات کاٹ دی۔ ”آج دیسے بھی بیکر کا دن ہے۔ پیر اور منگل کو میوزیم بند رہتا ہے اس وقت سات بج رہے ہیں۔ میوزیم کی عقی سڑک پر سناٹا ہو گا۔ تمہیں گیٹ کے قریب ہی ملوں گی۔“

”کوئی چال تو نہیں چل رہی؟“ میں نے پوچھا۔

”میری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے۔ میں نہیں دھوکا کھیس دے سکتی ہوں۔ میں ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھ جاؤں گی۔“ رنگ سنت نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ میں نے ریسپور رکھ دیا اور تھائی وغیرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وانگ ڈن اس وقت موجود نہیں تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور بالآخر میں نے اور رگھو نے یہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم پورے آٹھ بجے کالج سے نکلے رگھو کا رڈز آئے کرتے ہوئے مجھے اس میوزیم کے بارے میں بتا رہی تھی جس میں

گیارھویں اور بارھویں صدی کے چنانچہ سائین بادشاہت دور کے نوادرات کے علاوہ بدھ کے قدیم تاریخی مجسمے بھی رکھے ہوئے تھے۔

میوزیم کی عقی سڑک پر سناٹا تھا۔ اس سڑک کی ایک طرف میوزیم اور دوسری طرف پارک تھا جو اس وقت سنسن پڑا تھا۔ کوئی لڑکا گاڈی اس سڑک پر سے گزر جاتی۔

رگھو نے گاڈی گیٹ سے دور ہی روک لی۔ میں نے پستل جب سے نکال لیا۔ چند منٹ بعد ہی میوزیم کے گیٹ کی طرف سے ایک بیولا سا آٹا ہوا دکھائی دیا۔

وہ رنگ سنت تھی۔ میں نے جھٹکا تھا ہوں سے اُدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہم دونوں کا رستہ اتر آئے رنگ سنت ہمیں لے کر پارک میں آگئی۔ ہم ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔

”پرسوں رات کو وہ بینگ ہونے والی ہے۔“ رنگ سنت نے میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر کہا ”اس کے لیے کولڈن ٹرائی ایٹنگل روڈ پر ہی ایک ایسے کالج کا انتخاب کیا گیا ہے جو عرصے سے خالی پڑا ہے۔ چیف نے مجھے یہ ڈیٹے داری سوچی ہے کہ اس کالج میں ضروری فرنیچر اور کھانے پینے کی اشیاء پٹاں ہوں۔“

”اوہ۔“ میرے لیے یہ اطلاع واقعی بڑی اہم تھی۔

”بینگ کب ہو رہی ہے؟ اور اس میں کون کون شریک ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”بدھ کی رات۔ یعنی پرسوں رات کو۔“ رنگ سنت نے جواب دیا ”پرسوں شام سے پہلے پہلے مجھے تمام انتظامات مکمل کر لینے ہیں۔ کل تو میں فرنیچر وغیرہ وہاں پہنچاؤں گی اور کھانے پینے کی اشیاء پرسوں دوپہر سے پہلے پہلے پہنچاؤں گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”یہاں سے وزارت داخلہ کا سیکریٹری آنگ سانگ اور ایک مائی کے علاوہ پولیس چیف ہو گا جبکہ دوسری طرف سے جرنل کھورات کا خاص آوی سین فونگ اور اس کے ساتھ دو مسلح محافظ ہوں گے۔ دارا بچی فانگ ہم اور بیڈو پرسوں دوپہر کو وہاں پہنچ جائیں گے تاکہ اس علاقے کا جائزہ لے سکیں۔ ان کے ساتھ دو آوی اور بھی ہوں گے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تقریباً ایک دو رجن آوی ہوں گے اور سب کے سب انتہائی خطرناک!“ میں نے کہا۔

”ہاں اور ان کی خدمت کے لیے چار پانچ لڑکیاں اس کے علاوہ ہوں گی۔“ رنگ سنت نے کہا۔

”وہ لڑکیاں کون ہوں گی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال کلبلانے لگا تھا۔

”ان کا انتخاب بھی میری ڈیٹے داری ہے لیکن میں نے ابھی ان کے بارے میں کچھ سوچا نہیں ہے لیکن ظاہر ہے وہ لڑکیاں۔“

”میں سمجھ سکتا ہوں وہ کس قسم کی ہوں گی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”ایک لڑکی تمہارے گروپ کی بھی اس اسکواڈ میں

شامل کر سکتی ہو؟“

”کیا مطلب!“ رنگ سنت اچھل پڑی اور گردن جھکا کر رگھو کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ نہیں۔“ میں نے کہا ”وہ لڑکی تم دیکھ چکی ہو۔ وہی جو اس روز وانگ سانگ کے ساتھ تھی۔ بہت حسین اور جوان ہے۔ ان لوگوں کو پاس نہیں ہوگی۔“

”اگر ان لوگوں کو شبہ ہو گیا تو مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔“ رنگ سنت نے کہا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

”کسی کو شبہ نہیں ہو گا۔ میں کل شام کو اسے تمہارے پاس بیٹھ دوں گا۔ اسے انجھی طرح دیکھ لیتا اور اس سے پوچھ گچھ کر لیتا۔“ میں نے کہا۔

”اور میری بیٹی کب واپس آئے گی؟“ رنگ سنت نے پوچھا۔

”اس بینگ کے اگلے روز وہ صحیح سلامت تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔“ میں نے بیچ سے اٹھتے ہوئے کہا ”یہ بات ذہن میں رکھنا۔ مائے سار صورت میں تمہارے اس اسکواڈ میں شامل ہونی چاہیے۔“

ہم رنگ سنت کو بیچ پر بیٹھا چھوڑ کر پارک سے باہر آ گئے۔ مائے سا کو ان لڑکیوں کے اسکواڈ میں شامل کرنے کا خیال اچھا لگا ہی میرے ذہن میں آیا تھا اور ابھی مجھے نہ صرف مائے سا کو اس پر آمادہ کرنا تھا بلکہ قہالوب سے بھی بات کرنی تھی۔ رنگ سنت ہی نے بتایا تھا کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کو بڑی سختی سے ان کے کالج تک محدود کر دیا گیا تھا ”اسی لیے فی الحال ان سے کسی تصادم کا اندیشہ نہیں تھا۔ پولیس، سردار قہالوب کی وجہ سے ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اس وقت کسی ایسے ہنگامے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے جس سے ان کا پروگرام متاثر ہو اس لیے ہم آزادی سے شہر میں گھوم پھر سکتے تھے۔“

ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر فرانی فٹ کھائی ”کافی پی اور قہالوب وغیرہ کے لیے بھی فرانی فٹ پیکی کروائی۔“

کالج پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں مائے سا کو لے کر لان میں آیا اور دم گھسے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی تھی کہ اس میں اس کی جان کا بھی خطروں سے اگر انہیں شبہ ہو گیا تو وہ زندہ نہیں بچے گی۔ پہلے تو وہ چٹپٹا کی بھر اس نے آنا کی غا پر کردی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں ہال کے ایک کونے میں بیٹھا فون پر سردار قہالوب سے باتیں کر رہا تھا۔

○☆☆○

رات کے دس بجے تھے۔ اگرچہ چاند کی ابتدائی آرائشیں تھیں مگر آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے فضا اس قدر تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں دیکھتا تھا۔ ہماری تعداد چھ تھی۔ میں، سردار قہالوب، وانگ ڈن اور میری ساتھی تینوں جاں باز خواتین۔ تھائی

جاگی اور رگھو۔ سردار قہالوب کا خیال تھا کہ اس سہم پر تین چار جنگ جو تباہیوں کو بھی ساتھ لے لیا جائے گا۔ اس نے خواتین کے ساتھ جانے کی مخالفت کی تھی لیکن وہ تینوں نہیں مانی تھیں اس لیے تباہیوں کے بجائے ان تینوں ہی کو ساتھ لیتا رہا تھا۔ ویسے کچھ قبائلی بھی تھے جنہوں نے دورے سے کالج کی طرف آنے والے راستوں کی ناک بندی کر رکھی تھی۔

مائے سا کی آمدگی کے بعد ہم نے اس منصوبے کی تازگی بڑی تیزی سے کی تھی۔ سردار قہالوب اس رات چنانچہ رائے چلا گیا تھا۔ اس کی داہنی بھی رات ہی رات میں ہوئی تھی۔ وہ کچھ ایسی چیزیں لے کر آیا تھا جن کی اس سہم میں اشد ضرورت تھی۔ مائے سا کے لیے مخصوص تراش کا ایک لباس جس کے اسکرٹ کی بیٹل میں گئے ہوئے دو ہنوں میں بہت چھوٹے لیکن نہایت طاقتور ورڈنا فون لگے ہوئے تھے۔ ایک ڈکٹا فون رنگ سنت کو بھی دیا گیا تھا جو اسے اس کمرے میں کسی جگہ لگنا تھا جہاں بینگ ہونے والی تھی۔ بینگ میں ہونے والی گفتگو ان تینوں ڈکٹا فونز کے ذریعے ہمارے کالج میں موجود ٹیپ ریکارڈرز پر الگ الگ ریکارڈ ہوتی تھی۔ وہاں ایک ایسے آدمی کو بٹھا دیا گیا تھا جو اس کام میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ وانگ ڈن، سردار قہالوب اور میرے کانوں پر بھی ہیڈ فونز لگے ہوئے تھے۔ اس طرح ہم بھی وہ گفتگو سن سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کے لیے ہم تینوں کے پاس والی ٹاکی بھی تھے۔

ہمارا ساتھ دے کر سردار قہالوب نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ اگر ہمارا مشن ناکام اور ان کی سازش کا سیلاب ہو گئی تو اس کا پورا قبیلہ زیرِ عتاب آجائے گا لیکن قہالوب نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ محسوس وطن آدمی تھا اور ملک کی سلامتی کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

ہم جانتے تھے کہ ہمارا مقابلہ بہت ہی خطرناک دشمنوں سے تھا۔ ان کی تعداد بھی ہم سے زیادہ تھی لیکن میری طرح سردار قہالوب بھی اس بات سے متشن تھا کہ پلاننگ درست ہو تو تین آدمی بھی انہیں شکست دینے کے لیے کافی تھے۔

ہم نو بجے اپنے کالج سے روانہ ہوئے تھے اور طویل پکر کاٹنے ہوئے اس کالج کے نواح میں پہنچے تھے۔ قدر آدم جھانپاں اور پودے ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو رہے تھے۔ ہم سب کے پاس سب مشین خنیں تھیں۔ گولیوں سے بھرے ہوئے بیٹل بھی ہمارے سینوں پر بچے ہوئے تھے۔ اس ایمریشن سے ہم رات بھر ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

ایک خاص مقام پر پہنچ کر ہم تین پارٹنوں میں تقسیم ہو گئے۔ میرے ساتھ تھائی تھی۔ رگھو، وانگ ڈن کے ساتھ اور جاگی سردار قہالوب کے ساتھ تھی۔ ہم تین اطراف سے کالج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ چوتھی سمت



وہ راستہ تھا جو کالج سے سرک کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طرف سردار قحطاب کے قبائلی محافظ موجود تھے۔

میں اور تھائی بہت متاثر انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ذرا سی بے اعتنائی ہمیں موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ ہم ایک جگہ رک گئے۔ تقریباً سو گز آگے درختوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ کالج کی کوئی کھڑکی تھی۔ میں نے دایہ کی طرف قحطاب اور وائیک ڈن سے رابطہ کیا۔ وہ بھی اپنی اپنی سمت سے اتنے ہی فاصلے پر پہنچ چکے تھے اور کالج کی روشنی دیکھ سکتے تھے۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر دم سادھے بیٹے رہے۔

اور پھر وہ بھی اٹھ گیا جس کا ہمیں انتظار تھا۔ میرے کانوں پر لگے ہوئے ہیڈ فونز پر مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں ان میں سے صرف ایک آواز پہچان سکا تھا اور وہ آواز وزارت داخلہ کے سیکریٹری آئیک سائیک کی تھی۔ اگر میں نے پولیس آفس کی میٹنگ میں اسے بولتے ہوئے نہ سنا ہوتا تو اس وقت اس کی آواز نہ پہچان سکتا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے پولیس چیف کی آواز بھی پہچان لی اور پھر ایک مانی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

ان کی میٹنگ شروع ہو گئی تھی اور جو باتیں ہو رہی تھیں انہیں سن کر میں کاب آٹھا۔ ایک ہماری آواز غالباً جزل کوراٹ کے نمائندے سین فونگ کی تھی۔ وہ شیشا کے خلاف سازش میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے اپنی شرائط پیش کر رہا تھا۔

میں نے دایہ کی ٹانگی پر سردار قحطاب سے رابطہ کیا۔

”یہ باتیں تم سن رہے ہو؟“ میں نے کہا۔

”سن رہا ہوں لیکن یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے“ سردار قحطاب نے جواب دیا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہیڈ فون پر سین فونگ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اے لڑکی۔ ادھر آؤ۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”مائے سائے! میرا نام مائے سا ہے سر۔“ یہ دوسری آواز سن کر میں اچھل پڑا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جسم کے تمام پسینہ اگلنے لگے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سین فونگ کو مائے سا پر شبہ ہو گیا تھا۔ وہ مائے سا سے مختلف سوالات کر رہا پھر کسی اور کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی تلاش لینے کا حکم دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر سین فونگ کی آواز سنائی دی۔

”اپنے کپڑے اتار دو مائے سا۔“

مائے سا نے شاید کپڑے اتار دیے تھے۔ وہ ڈنکا فون نہایت طاقتور تھے۔ میرے ہیڈ فونز پر کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سین فونگ کپڑوں کو چیک کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کی آواز سنائی دی۔

”یہ منٹ تو بہت خوب صورت ہیں اور ان میں لگے ہوئے ڈنکا

فون۔۔۔ تم کس کے لیے کام کر رہی ہو۔۔۔ میں تین تک گزوں کا دور اس کے بعد۔“

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سین فونگ نے کتنی شروع کردی تھی اور پھر تین کسے کے فوراً ہی بعد فائز اور مائے سا کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سین فونگ کی آواز بھی سنائی دی۔

”ہینٹلین! آج کی میٹنگ کینسل۔ ہم ایک دو دو بعد دوبارہ کسی اور جگہ پر ملاقات کریں گے۔ اب یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔“

”قحطاب! میں نے دایہ کی ٹانگی پر کہا۔ وہ لوگ جا رہے ہیں۔“

”انک! قحطاب کی غزائی ہوئی آواز سنائی دی۔“ ان میں سے کسی کو کچھ کر نہیں جانا ہے۔“

میں نے قحطاب کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹ کر آگے بڑھنے لگے اور پھر اچانک ہی فضا فز کی آواز سے کوئی اٹھی۔ مجھے شاید دیکھ لیا گیا تھا یا جمادیوں میں حرکت محسوس کر کے کوئی چلا دی گئی تھی۔ کوئی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی فائز کھول دیا۔

اور پھر یوں لگا جیسے جہنم کا دہانہ کھل گیا ہو۔ میرے سامنے چاروں طرف سے فائزنگ کر رہے تھے اور کالج سے بھی بڑی شدید فائزنگ ہو رہی تھی۔ قحطاب مجھے سے فاصلے پر تھی اور میں فائزنگ کرتا ہوا است آگے نکل گیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے تک دونوں طرف سے بڑی شدید فائزنگ ہوتی رہی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ جاگي کہاں ہے اور میرے دوسرے سامنے کس طرف ہیں۔ میں فائزنگ کرتا ہوا کالج کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے ایک محافظ کو کر کے دوڑانے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تو سب مشین گن کا رخ اس کی طرف کر کے فائزنگ کر دیا۔ کوئی گولیاں اس کی پشت میں بیوست ہو گئیں اور وہ لڑنا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

اور پھر اسی لمحے مجھے کالج کے بائیں طرف سے قحطاب کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے اس طرف دوڑا لیکن نہ مجھے قحطاب نظر آئی اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دی تھی۔

دوسری طرف سے فائزنگ دم توڑنے لگی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مجھے دایہ کی ٹانگی پر سردار قحطاب کی آواز سنائی دی اور پھر ہم نے چاروں طرف سے کالج پر بلاول دیا۔

وہ لوگ فرار ہو چکے تھے لیکن کئی لاشیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ تین محافظوں کی لاشیں تھیں۔ تین لڑکیاں جن میں مائے سا کی لاش بھی تھی۔ وہ بالکل بے ہوش تھی اور اس کی پیشانی میں سوراخ تھا۔ محافظ کی پچھلی لاش بھی ایک کر کے کے دوڑانے میں پڑی ہوئی تھی۔

ہر طرف خون پھلا ہوا تھا اور گولیوں کے لاتعداد داخل ہونے لگے تھے۔ اگر آئے سائے مقابلہ ہوتا تو شاید ان کی جگہ ہماری

لشیں پڑی ہوتیں لیکن ہمیں یہ ایذا پہنچ حاصل تھا کہ ہم نے کالج کو مجھے میں لے کر حملہ کیا تھا اور وہ لوگ ہماری رائفوں کی زد پر تھے۔

میرے تمام ساتھی محفوظ رہے تھے۔ اچانک مجھے قحطاب کا خیال آیا۔ وہ ان میں موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کی چیخ کی آواز سنی تھی۔

میں قحطاب کو آواز دیتا ہوا ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ قحطاب زخمی ہو گیا اسے تلاش کر رہے تھے۔ کالج سے کچھ فاصلے پر پولیس چیف اور رنگ سنت کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

ہم نے دور دور تک دیکھ لیا لیکن قحطاب کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اگر وہ گولی لگنے سے زخمی ہو جاتا یا مر چکا ہوتا تو میں نہ کہیں مل جاتی لیکن گلتا تھا جیسے اسے زمین نکل گئی ہو یا آسمان نے اچک لیا ہو۔

مجھے جیسے وقت گزر رہا تھا میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ سردار قحطاب کا خیال تھا کہ اب ہمیں واپس چلنا ہے۔ صبح اگر اسے تلاش کیا جائے گا لیکن میں یہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے قحطاب زخمی ہو کر کسی جگہ بے ہوش پڑی ہو۔ میں اسے ہر صورت۔۔۔ تلاش کرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ میں اس وقت کالج کے دروازے کے سامنے ہی تھا کہ اندر نئی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا خیال تھا کہ سین فونگ باہر نئی لوگوں میں سے کسی کے لیے فون ہوگا۔ جاگي اس وقت میرے قریب کھڑی تھی۔ میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور اندر جان کر فائزنگ کر دیا لیکن بولا کچھ نہیں کہیں چند سیکنڈ بعد ہی ریسیور درا کر آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے نہیں تھا کہ تم لوگ اب تک وہیں موجود ہو گے۔ تم جو کوئی بھی ہو اپنے اس حرام زادے شکل بائیں سے کہہ دو کہ اس کی جتنی قحطاب اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ جنگل میں اسے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”دارا تم۔۔۔ میں پچھتاؤں میں جس میں چھوڑ دوں گا۔“

”لو ہوسو۔۔۔“ دارا کی آواز سنائی دی۔ ”تم آج کی بازی جیت کر آگے بڑھو۔ تمہاری قحطاب میرے قبضے میں ہے۔ اب تم میرے سامنے کھڑے کھینچو۔“

دارا قحطاب کا تھا اور اس کی آواز پچھلے ہوئے سی کے طرح تھی۔ کانوں کو چبھتی ہوئی دماغ میں محسوس جاری تھی۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں دم سے اسے ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

میں دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تھا۔

پھر دماغ میں دباؤ کے سے ہو رہے تھے۔ رگوں میں خون کی تیز رفتاری سے بہاؤ تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دماغ کی ناکھانہ پھٹ جائیں۔ فون کا ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا

اور میں سر کو دووں ہاتھوں میں تھامتا ہوا قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دارا کے خوفناک قہقہوں کی آواز اب بھی میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔

سردار قحطاب وغیرہ اس وقت بھی باہر ہی کھڑے بائیں کر رہے تھے۔ جاگي کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے مجھے اس طرح سر پکڑ کر بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا اور وہ دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہو کر میرے قریب آگئی۔

”کیا ہوا وجدان۔۔۔ کس کا فون تھا؟“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ کو ڈوبا اور پھر بیک کر فون کا ریسیور پکڑ لیا جو اسٹینڈ سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ شاید دوسری طرف سے لائن منقطع ہو چکی تھی۔ اس نے ریسیور کر لیٹل پر رکھ دیا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔ ”کس کا فون تھا وجدان۔۔۔؟“

”دارا۔۔۔ میں نے سراٹھاتے ہوئے جواب دیا ”قحطاب اس وقت دارا کے قبضے میں ہے۔“

”کیا۔۔۔“ جاگي پچھلی۔

جاگي اس قدر زور سے جیٹی تھی کہ باہر کھڑے ہوئے قحطاب وغیرہ بھی مرکز اس طرف دیکھنے لگے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں آگئے۔

”کیا ہوا۔۔۔ تم کیوں جیٹی تھیں جاگي۔“ سردار قحطاب نے اسے گھورا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا ”تمہیں کیا ہوا وجدان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”وہ لوگ قحطاب کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور قحطاب اس وقت دارا جیسے دہندے کے قبضے میں ہے۔“ جاگي نے بتایا۔

”کیا۔۔۔!“ قحطاب اچھل پڑا ”تمہیں کیسے پتا چلا؟ ہم تو اسے۔۔۔“

”کچھ دیر پہلے فون کی گھنٹی بجی تھی۔“ اس مرتبہ جاگي کے بجائے میں نے جواب دیا ”میں سمجھا تھا کہ سین فونگ وغیرہ میں سے کسی کی کال ہوگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ قحطاب اس کے قبضے میں ہے اور اب وہ مجھے اپنے سامنے کھینچنے پر مجبور کر دے گا۔“

”وہ۔۔۔“ سردار قحطاب کے منہ سے بے اختیار نکلا ”کس دن وہ بلف تو نہیں کر رہا؟“

”نہیں۔ وہ اس معاملے میں بلف نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا ”ہم قحطاب کو دور دور تک تلاش کر چکے ہیں۔ اگر وہ زخمی ہو کر نہیں بے ہوش بھی پڑی ہوتی تو اب تک اسے ہوش آچکا ہوتا اور ہماری آواز سن کر جواب ضرور دیتی۔ اس کا مطلب ہے دارا جھوٹ نہیں بول رہا۔ یہاں سے ہاتھ ہٹے ہوئے قحطاب ان کے ہاتھ لگ گئی ہوگی اور اب وہ قحطاب کے ذریعے ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”لیکن ہم اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔“

مقابلہ نے کہا "اسے تھائی کو چھوڑنا ہوگا" بغیر کوئی نقصان پہنچائے۔

"تم ردار کو نہیں جانتے۔" میں نے کہا "وہ نہایت بے ضمیر اور دنیا کا کھلیا ترین آدمی ہے۔ انسان کے رویہ میں بھیڑیا۔ وہ تھائی کو پہلے بھی نقصان پہنچا چکا ہے اور اب مجھ کی ایسی حرکت سے باز نہیں آئے گا۔"

"تم فکر مت کرو۔" سردار مقابلہ نے کہا "اب اگر تھائی کو کوئی نقصان پہنچا تو میں دارا کو وہ حشر کروں گا کہ آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

رنگولی اور وانگ ڈن خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے تھے اور پھر رنگولی نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

"اب یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں واپس جا کر وطنان اور سکون سے کوئی پلاننگ کرنی ہوگی۔"

"رنگولی ٹھیک کہتی ہے ماسٹر۔" سردار مقابلہ نے کہا اور آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "مجھے تھائی سے تمہاری جذباتی وابستگی کا بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس طرح مایوس ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم ایک بہادر لڑکے ہو اور بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا جانے کا بھی حوصلہ رکھتے ہو۔ ویسے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تھائی کو کوئی نقصان پہنچا تو دارا کو پاگل کنوں سے نچوڑ دوں گا۔"

ہم کمرے سے باہر آگئے اور پھر چاک و وانگ ڈن کی بات نے ہم سب کو چھوڑ دیا۔

"پہلے ہم نے جس کا بیج کو ٹنگ لگائی تھی اس میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا بیج کے نیچے بھی کوئی بے غاۓ ہو جس میں۔۔۔"

وانگ ڈن کی بات میں خاصا وزن تھا۔ ہم ایک بار پھر کا بیج کے اندر آگئے اور گھوم پھر کر تلاشی لینے لگے۔ ایک کمرے سے۔۔۔

میں چائیز آؤٹنگ راختیں اور کئی مہرے ہوئے میزکون تو برآمد ہوئے مگر کسی بے غاۓ کا سراغ نہیں ملا۔ فرش اور دیواروں کے ایک ایک اچھے کو ٹھوک بجا کر دیکھا مگر کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جہاں بے غاۓ کے رائے کا شہ ہو تا۔

مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا بیٹوں چائیز رائلٹوں اور مہرے ہوئے میزکون پر قبضہ کر لیا کیا تھا۔ واپس جاتے ہوئے میں مائے سا کی لاش کے قریب رک گیا۔

گولی اس کی پیشانی پر ماری گئی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ خون سے تر تھا بلکہ یہ گنا مناسب ہو گا کہ پیشانی کے زخم سے بہنے والا خون ایک آنکھ اور آدھے چہرے پر پھیل کر جم گیا تھا۔ گردن اور اس کے نیچے

فرش پر بھی خون جما ہوا تھا جس کی رنگت سیاہ پڑ چلی تھی۔ جبکہ باقی آدھا چہرہ بالکل صاف تھا۔ اس کی ایک آنکھ پوری طرح کھلی ہوئی تھی۔ بے پناہ خوف اور کرب کے اثرات اس کی آنکھ میں اور

چہرے پر چھپے جم کر رہ گئے تھے۔

وہ بالکل رہنہ تھی۔ اس کا لباس قریب ہی فرش پر پڑا ہوا تھا۔

میں نے وہ لباس اٹھایا۔ بلاؤز اور اسکرٹ کی ٹیٹ سے وہ غائب تھے جس میں ڈکٹا فون لگائے گئے تھے اور ظاہر ہے یہ غائب فونک نے ہی نکالے ہوں گے۔ مجھے مائے سا کی موت کا

افسوس ہوا تھا۔

جب ہم کالج سے روانہ ہوئے تو سپیدہ مخرمو دار ہوسٹل اور جب ہم اپنے کالج پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ نرم گرم دھوپ پھیل رہی تھی۔

ہم سب ہال کمرے میں آگئے۔ ہم نے اگرچہ رات بھر اور بڑی سنگین صورت حال سے دوچار ہو کر گزارا ہی کیا تھا۔

تھکنے کے آثار مجھے کسی کے چہرے پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ اور رنگولی پر مجھے زیادہ حیرت ہو رہی تھی۔ وہ خواتین تھیں۔

کو عام طور پر صنف نازک سمجھا جاتا ہے اور اس میں کئی شے نہیں کہ مرد کے مقابلے میں عورت کبیں زیادہ نازک اعضاء ہوتی ہیں اور اس سے کڑی محنت اور مشقت کی توقع نہیں رکھی جاتی۔

لیکن میں نے بہت سی ایسی عورتیں بھی دیکھی ہیں جو حوصلہ زیادہ محنت کرتی ہیں اور رنگولی جاسی اور تھائی کے حوالے سے کچھ اور کہہ رہا تھا۔ یہ بڑی سخت جان اور دلیر ثابت ہوئی تھیں۔

اب تک تو انہوں نے بڑی کڑی سے کڑی صورت حال کا خفا بڑی حوصلہ مندی سے کیا تھا۔

دوسری طرف لوہا بھی بہت ڈسے وار اور فرض شناس آدمی ثابت ہوا تھا۔ ایسے ہر موقع پر وہ ڈکٹا کرتا تھا کہ ہمیں کچھ چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ہماری ضرورت کا اندازہ لگایا تھا اور چند منٹ بعد ہی اس نے گرم گرم کھانا ہاتھ

سائے رکھ دی۔

چائے یا کافی اس وقت ہماری اہم ترین ضرورت تھی اور اس میں شہ نہیں کہ کافی بہت خوش ذائقہ اور لذیذ تھی لیکن میری تھائی میں الجھا ہوا تھا اور میں اس کافی سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پا رہا تھا۔

"لوہا۔" سردار مقابلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے "جو کئی کہاں ہے۔ بلاؤ اسے۔"

"جو کئی" وانگ ڈن کے کوارٹر میں ہے۔ میں ابھی اسے ڈال رہی ہوں۔" لوہا کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

جو کئی وہ وائٹس آپریٹر تھا جسے ڈکٹا فون پر ہونے والی مشق دیکھا دیکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

چند منٹ بعد ہی جو کئی آیا۔ وہ ادھیڑ بھلا چلا ساتویں اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید اسے سوئے میں سے بچ گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نیپ دیکھا اور دوسرے میں آؤٹو کیسٹ۔

"تم نے کچھ کام بھی کیا یا سو گئے تھے؟" سردار مقابلہ نے "مگر۔"

"میں کی ساری گفتگو دیکھا کر لی ہے۔" سردار۔" جو کئی نے واپس دیا۔ جب اس لڑکی کے لباس میں ڈکٹا فون کا راز فاش ہو گیا تھا اور اس کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی تھی تو دیکھا کہ اس کے بعد بھی

مات در تک آن رہا تھا۔ اس کے بعد تو صرف فائرنگ اور چیخنے کی آوازیں ہی دیکھا کرتی رہیں۔ میں ابھی آپ کو نیپ سنا تھا۔" جو کئی نے نیپ دیکھا اور میز پر رکھ کر اس کا پلگ دیوار کے

پلگ میں لگا دیا اور کیسٹ لگا کر پلے کاٹن دیا۔ چند لمحوں تک ہر سرائی کی آواز سنائی دیتی رہی پھر رنگ سنت کی آواز سنائی

دی۔ وہ مائے سا اور تھائی دو سری لڑکیوں کو بھی مخاطب کرتے ہوئے انہیں ہدایات دے رہی تھی کہ انہیں ممانوں کو کس طرح خوش کرنا ہے۔

"یہ عام لوگ نہیں ہیں۔" رنگ سنت کہہ رہی تھی "جو چند بات پر تم لوگوں کو ٹرغا دیں گے۔ یہ بہت ہی خاص قسم کے لوگ ہیں۔" اس لیے تم لوگوں کا انتخاب بھی خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اگر وہ

لوگ تمہاری خدمات سے خوش ہو گئے تو تم سب کی قسمت بدل جائے گی۔"

اس کے بعد خاموشی چھا جاتی۔۔۔ کبھی مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں اور بالآخر وہ گفتگو بھی سامنے آئی جس کا انتظار تھا۔

سین ٹونگ "انگ سائنگ" ایک مانی پولیس چیف اور دوسرے لوگوں کی آوازیں صاف طور پر پہچانی جا رہی تھیں۔ ان کی گفتگو سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ خشنشاہ کے خلاف سازش طے پا چکی ہے اور ہر شخص اس سازش کی کامیابی کی صورت میں اپنے حصے۔۔۔ اور

مقامات کا حصہ کر رہا تھا۔ البتہ یہ بات ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی کہ اس سازش پر عمل کب اور کس طرح کیا جائے گا۔ کیونکہ

ایک اور مان میں ڈکٹا فون کا راز کھل گیا تھا اور آگے گفتگو ختم ہو گئی تھی۔ اور اس کے کچھ ہی دیر بعد شدید فائرنگ اور چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

سردار مقابلہ کے اشارے پر جو کئی نے نیپ دیکھا اور بند کر دیا۔

"میرا خیال ہے اس سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ ہدف مناسب ہے اس میں اس قدر بڑے لوگوں کے نام بھی آگئے ہیں جو سازش میں شریک ہیں۔ حکومت انہیں حراست میں لے کر

سب کو معلوم کر سکتی ہے۔"

میں نے نہیں جانتا کہ تمہارے ملک میں عدالت اس نیپ کو "میرا خیال ہے" کے لیے یا نہیں لیکن۔۔۔"

"میرا خیال ہے یہ کیس فوری طور پر عدالت میں نہیں جائے گا۔" سردار مقابلہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اس میں ان

تھائی ایجنٹ آوازیں شامل ہیں جو اس سازش کے تانے بانے میں

میں شامل ہیں۔ سب سے پہلے تو انہیں حراست میں لیا جائے گا اور اس کے بعد ہی بات آگے بڑھے گی۔ عدالت میں کیس جانا تو بہت

بعد کی بات ہے اور یہ بات بھی وقت سے نہیں کی جاسکتی کہ یہ کیس عدالت میں جائے گا یا سازشیوں کو فوری طور پر فائرنگ اسکوڑ کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات تو اب بالکل صاف ہے۔" سردار مقابلہ نے کہا "مماراج کو فون پر صورت حال سے آگاہ کرو۔ زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔ مہاراج خشنشاہ کے کزن رتنا کو سن کو بتادیں گے۔ وہ

جو فیصلہ کریں گے اسی پر عمل کیا جائے گا۔"

"یہی مناسب ہوگا۔" میں نے جواب دیا "تاخیر واقعی خطرناک بات ہو سکتی ہے۔ میں ابھی مہاراج کو فون کرتا ہوں۔"

سردار مقابلہ نے وانگ ڈن کو اشارہ کیا کہ فون اسٹینڈ سے اٹھا کر ہمارے سامنے سینٹر پھیل پر رکھ دیا جائے۔ وانگ ڈن نے

آگے بڑھ کر فون اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسپونڈ اٹھایا اور پھر فون پر بات کرتے ہوئے

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ وہ قبائلی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

لیکن چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کوئی اہم خبر ہے۔ اس نے اپنے مخاطب سے کچھ کہا اور پھر فون اٹھا کر سینٹر پھیل

پر رکھ دیا اور قبائلی زبان ہی میں کچھ کہتے ہوئے ریسپونڈ سردار مقابلہ کی طرف بڑھا دیا۔

سردار مقابلہ بھی تقریباً پانچ منٹ تک بات کرتا رہا پھر ریسپونڈ رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرے ایک آدمی ڈکٹا فون تھا جنہیں رات کو اس کا بیج کی ٹاکا بندی پر لگا رکھا تھا۔ انہوں نے ایک عورت کو زخمی حالت میں جنگل

سے پکڑا ہے لیکن وہ اسے یہاں نہیں لاسکتے کیونکہ پولیس اس علاقے میں جاووں طرف پھیل چکی ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس زخمی عورت کو تو وہ وہاں سے تقریباً چھ کلومیٹر دور چند گھنٹوں پر مشتمل ایک بستی میں لے گئے ہیں اور یہ آدمی گولڈن

ٹرائی اٹھیل روڈ پر لگے ہوئے ایک فون بوٹھ سے بات کر رہا تھا۔"

"انہوں نے معلوم نہیں کیا" وہ عورت کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنا نام نہیں بتایا البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ وہ ایک سرکاری آفیسر ہے۔

اگر۔۔۔ اسے حفاظت اور رازداری سے شہر پہنچا دیا جائے تو وہ ان قبائلیوں کو مزہ مانگا انعام دے گی۔"

”تمہارا اندازہ درست ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ ایسی مائی ہی ہو۔“ سردار قتالاب نے کہا ”رات کو اس کا بیچ میں رنگ سنت بھی موجود تھی جو باری گئی۔ ہو سکتا ہے کوئی اور مقامی خانہ آئینہ بھی ہو۔ ان دو طوائفوں میں سے بھی کوئی ہو سکتی ہے جو رات کو بیچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے قبائلیوں پر رعب جمانے کے لیے وہ اپنے آپ کو سرکاری آئینہ بتا رہی ہو۔ بہر حال“ میں اس بات میں جا رہا ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا سردار۔“ میں نے کہا۔  
سردار قاتلوں پر چند لمبے مری طرف دیکھا اور پھر ابات میں  
گردن ہلاتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے لیکن اس سے پہلے مہاراج کو  
صورت حال سے آگاہ کرو۔“  
میں نے فون کا ریسپونڈ اٹھایا اور بیک کا کوڈ نمبر ملا کرواٹ  
ٹریسٹ کا نمبر ملائے لگا۔

کال رسیو ہوئے میں زیادہ دیر نہیں گئی لیکن مہاراج اس وقت خانقاہ میں موجود نہیں تھے۔ میں نے ہمازیم کا نمبر ملایا۔ وہاں بھی نہ تو مہاراج تھے اور نہ ہی ماسٹر ہوجن۔ میں نے رسیور کر رکھ دیا اور سردار قتالپ کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ واپس آکر فون کر لیں گے اس دوران میں یہ بھی چل پڑ جائے گا کہ پکڑی جانے والی عورت کون ہے۔“ قتالپ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں ایک بار پھر گولڈن زائی اینگل روڈ کی طرف جانا پڑے گا لیکن جیب اس طرف جانے کے بجائے وائیں طرف مڑ گئی۔

میں خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا اور پھر اچانک پولیس سائرن  
 اور ایمبولینسز کے سائرن کی آواز سن کر چونک گیا۔ یہ آوازیں  
 چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

آتش فشاں ۱۸۸

”ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔“ مقالہ نے جواب دیا: ”ہو سکتا ہے پولیس کو یہ اطلاع آنگ سانگ ہی نے دی ہو۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے آپ کو پھنسانے کی کوشش کرے۔“ میں نے کہا۔

”آج سائیک ایک سرکاری عہدے پر فائز ہے۔“

”لیکن کیا اس طرح وہ اپنی گردن نہیں پھنسالے گا؟“ میں نے

2-

بپ بڑے سے دھکی ہوئی پاؤں میں بل لکھانے ہوئے  
نے کے خیب و فراز پر جھٹکنے کھائی ہوئی چلتی رہی اور پھر اچانک  
چپک گیا۔ وہ اسکرین پر پانی کی موتی ہوئی یونیس کرنے لگی  
میں مئے ذرا آئے تھک کر اوپر دیکھا آسمان بادلوں سے ڈھکا  
اقادور ہلی بارش ہونے لگی تھی۔ مینش کے مزاج کی طرح  
ہال کے موسم کا بھی کبھی بھروسا نہیں تھا۔ ہم کالج سے نکلے  
تو آدھے آدھے صاف تھا اور تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ اس پہاڑی  
استے کو دونوں طرف سے بلند اور نچھان درختوں نے ڈھانپ رکھا  
اور یہاں بھی نہیں چلا، اس کا تھا کہ مطلع کب اس آلودہ ہوا تھا۔

ہاتھ لڑک سے اترنے کے بعد ہم تقریباً بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرتے تھے اور صحیح اندازہ نہیں تھا کہ مزید کتنا سفر کرنا ہو گا۔ ایک گھنٹہ فاصلہ اور طے ہوا جو گا کہ سامنے دو آدمیوں کو دیکھ کر

میں نے کہا: ان دونوں کا انداز بہت ہی مؤیدانہ تھا اور پھر یہ کہ جو اس راستے سے اتار کر درختوں میں لے گیا۔  
 جبکہ اس کے جاکر روک دیا اور ابجی بند کر کے میری طرف

سگرٹ لڑائی پھر اُسے  
میں نے اُٹھادی ہے

قیمت
ذات الخرج

25 روپے
23 روپے

[illegible]

تمباکو نوشی اور دیگر بری عادات سے چھٹکارا حاصل کیجئے۔

[illegible]

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ ہزار  
پچیسویں مئی آٹھ ہزار سال کریں

[illegible]

”پولیس اس ہستی میں پہنچ چکی ہے مگر یہ لوگ پولیس کی آمد سے پہلے ہی اس زخمی عورت کو ہستی سے نکال کر اس طرف ایک پھاڑی غار میں لے آئے تھے۔ وہاں تک جیپ کا راستہ نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں سے پیدل ہی آگے جانا ہوگا۔“

”کوئی گزرتا تو ہمیں سردار۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ان لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ تم اس طرف سے آ رہے ہو؟“

”ہستی کی طرف آمدورفت کے تین راستے ہیں۔“ سردار قحالب نے بتایا ”اور تینوں راستوں پر قبیلے کے آدمی کھڑے ہیں۔ تاکہ ہستی تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اطلاع دے دی جائے۔“

میں قبائلیوں کے اس احتیاط پر اس قدر حیران ہوا کہ قحالب نے جنسین جاہل اور احمق سمجھا جاتا تھا بہت ذہین ثابت ہوئے تھے۔

میں بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھے آتا تھا۔ راستہ میں نے کندھے پر لٹکائی تھی۔ سردار جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک قبائلی سے کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ سردار اسے بارش سے بچنے کے لیے جیپ میں بیٹھ جانے کو کہہ رہا تھا لیکن وہ اس لیے انکار کر رہا تھا کہ سردار کی جگہ پر بیٹھنے کو بہت بڑی گستاخی سمجھتا تھا۔ اس نے درختوں کے نیچے کھڑے رہ کر جیپ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ قبیلے والوں کے دل میں اپنے سردار کا یہ احترام میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میرا تو کسی قبیلے سے واسطہ ہی پہلی مرتبہ پڑا تھا لیکن چند روز سے میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تمام قبائلی اپنے سرداروں کا اسی طرح احترام کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنی جان تک بچاؤ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

دوسرا قبائلی ہماری رہنمائی کے لیے آگے آگے چل پڑا تھا۔ میری طرح سردار قحالب نے بھی راستہ کندھے پر لٹکائی تھی۔ بدترتیب باندی کی طرف جانا ہوا راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ میرے پیروں میں جو گزرتے تھے اور ہینکے ہوئے پتھروں پر بار بار پھسل رہے تھے۔

بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک ہی بند بھی ہو گئی۔ بادل بھی پلٹ کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔ کبھی دھوپ چمکنے لگتی اور کبھی سورج بادل کے کسی کھڑے کے پیچھے چھپ جاتا۔ بارش بند ہونے کے باوجود پانی جھروں کی طرح پھاڑیوں سے بہہ رہا تھا۔

تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا راہبر ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو گیا۔ ہم اس طرف مڑے تو میں ایک دم ٹھنک کر رک گیا۔ دو قبائلی اس چٹان کے پیچھے درختوں سے ٹھک لگائے کھڑے تھے۔ راتھیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ تیسرا قبائلی ایک درخت کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ نگاہیں اتوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکے تھے مگر اس نے ہمیں آتے ہوئے دیکھ

لیا تھا۔

اس پہلی چٹان کے پیچھے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایک اونچی چٹان تھی جس میں زمین سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر ایک غار کا ٹھکانہ سا دہانہ نظر آ رہا تھا اور ایک راستہ براد قحالب کی ہڈی بھی کھڑا تھا۔ دونوں چٹانوں کی درمیانی جگہ پر ساکون کے درخت تھے اور دیر گھاس اور جھاڑیوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

یہ غار محفوظ ترین جگہ تھی۔ درختوں اور سائے والی چٹانوں کے درمیان سے دور سے اس غار کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

ہم ایک چتر پر چڑھ کر غار کے سامنے پہنچ گئے۔ دہانہ اگرچہ تنگ سا تھا مگر اندر سے یہ غار کافی کشادہ تھا اور اندر دو تین مضامین جل رہی تھیں۔ ان شعلوں میں غالباً کسی جانور کی چربی استعمال کی گئی تھی۔ ایک جاگڑا سی بو کا احساس ہو رہا تھا۔

غار میں ذرا آگے ایک عورت زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے چوہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے رنگ کا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا اور وہ کچھ اس طرح آڑی ترجمی پڑی ہوئی تھی کہ اس کا اسکرٹ اوپر تک سنبھل گیا تھا اور اس کی ایک ٹانگ پر کھٹنے سے ذرا اوپر پڑی بندھی ہوئی تھی۔ ہانگ لگا ہوا خون واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

میں اور سردار قحالب اس عورت کے قریب پہنچ کر روک گئے۔ ہمارے قدموں کی آواز سن کر بھی اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ سردار قحالب نے اپنے ساتھ آگے بڑھنے کا قبائلی کو اشارہ کیا۔ وہ اس عورت کے سر کی طرف سے گھوم سامنے کی طرف چلا گیا۔ پہلے اس نے کھڑے کھڑے ایک آواز سن دیں پھر جھک کر بیٹھ گیا۔ راستہ ایک ہاتھ میں اسے پکڑے رکھی اور دوسرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ اس کے ساتھ وہ اسے آوازیں بھی دے رہا تھا کہ عورت کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ قبائلی سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ کچھ کہنے لگا جس کی ہم میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔

اس عورت نے بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اس کی اہٹ سامنے آڑوں بیٹھے ہوئے قبائلی کے منہ پر لگی۔ وہ ہوا اچھے الٹ گیا لیکن اس کی راستہ اس عورت کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

قبائلی پشت کے بل پیچھے گرا تھا لیکن اس نے اٹھنے میں ہی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی طرح سنبھل سکتا اس عورت کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی راستہ سے ہٹا کر کئی گولیاں نکلیں اور قبائلی کے جسم میں پھرت ہو گئی۔ گولیوں کی ترخا ہٹ اور قبائلی کی بیچوں سے گونج اٹھا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ ہمیں کچھ سمجھنے کا وقت ہی نہیں مل سکا اور جب سمجھ کر وقت گزر چکا تھا۔ اس عورت

چٹان کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اور سردار قحالب کو راستہ میں لپکتی رہی۔

اس عورت کا چہرہ اب ہمارے سامنے تھا اور اسے دیکھ کر ہم نے کچھ نہیں رہ سکے تھے۔ وہ ایک مائی تھی۔ اس کی راتھیں کندھوں سے اتار کر پیچھے دو۔ ”ایک مائی کے ذمے کی جیسی خرابی نکلی۔ وہ بہت حسین عورت تھی لیکن اس نے اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی نظر آ رہی تھی۔

میں نے سردار قحالب کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں نے اپنی راتھیں کندھوں سے اتار کر پیچھے دے دیں۔

تھانگ اور قبائلی کے چپٹے کی آواز سن کر ہمارے کھڑے ہوئے دو قبائلی غار کے دہانے پر آگئے تھے اور یہ منظر ان کے لیے بڑا حیرت انگیز تھا۔ ان کا ایک ساتھی غار کے فرش پر مڑا ہوا تھا اور قیدی بننے لگا تھا۔ ان کے سر اور گردن کی طرف سے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے راستہ سیدھی کر لی لیکن سردار قحالب ایک دم چپ چاپ۔

”مائی مت چلا۔“

سردار کا حکم سن کر دونوں قبائلیوں نے راتھیں جھکا لیں اور اپنی مائی کی حکم پر اسی بھی راتھیں زمین پر پیچھے دے دیں۔ ایک قبائلی ہمارے ساتھ آیا تھا اور چار پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک مائی تھا۔ دو دھنکے کھائے تھے اور دو باہر تھیں۔ ان میں سے ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب بھی وہ درخت پر ہی ہوگا۔

”تم اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کر رہی ہو ایک مائی۔“ سردار قحالب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میرے ایک اشارے پر یہ میرے آدمی اب بھی تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتے ہیں لیکن میں تمہیں جاننا نہیں چاہتا۔ تمہاری لاش ہمارے لیے کسی کام کی نہیں ہوتی۔ تمہارا زندہ رہنا ہی ہمارے لیے اہم ہے۔“

”تمہارا زندہ رہنا ہی میری عمر ہے۔“ ایک مائی نے جواب دیا ”اس غار سے باہر نکلو اور باہر جو تمہارے آدمی موجود ہیں ان سے کہو کہ اگر انہوں نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ان کو پھانسی دیں۔“ چلو۔ آگے بڑھو۔“ اس نے راستہ میں اشارہ کیا۔

”تمہارا زندہ رہنا ہمارا کھانا ہے۔“ ایک مائی نے کہا ”میرے ہاتھوں میں مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے دوسری ٹانگ پر سنبھال کر رکھا تھا۔ ہم اس کے اشارے پر اپنے قدموں پیچھے ہٹے۔ دونوں قبائلی اب بھی غار کے دہانے کے قریب کھڑے تھے۔

”میرا چہرہ میرا ایک چتر پر ریت گیا۔ میں لڑکھا کر ہانگ لگا رہا۔“ سردار قحالب نے جھک کر میری طرف ہاتھ

”تم سیدھے کھڑے رہو مسٹر قحالب۔“ ایک مائی اسے راستہ کی زد پر لیتے ہوئے چینی اور پھر میری طرف دیکھ کر غرائی ”شرافت سے اٹھ کر کھڑے رہ جاؤ ورنہ گولیوں سے بھرن کر رکھ دوں گی۔“ ہمیں تو بہر حال زندہ چھوڑنا نہیں ہے۔ سامنے سناہ کی بڑ تو تم ہی ہو۔ تم ٹانگ نہ اڑاتے تو اب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ ہمیں تو بہر حال میں مرنا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہم بہت نقصان اٹھا چکے ہیں لیکن ہم اپنے اس منصوبے کو ناکام نہیں ہونے دیں گے۔“

بات تو وہ مجھ سے کر رہی تھی لیکن راستہ اس نے قحالب پر تان رکھی تھی۔ میں چونکہ زمین پر گرا ہوا تھا اس لیے شاید اسے میری طرف سے کوئی غلط محسوس نہیں ہو رہا تھا اور میں اس کی اسی حماقت پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے ایک مائی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنے آپ کو اس طرح حرکت دی جیسی دھبہ اٹھانا چاہ رہا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں زمین پر پڑے بڑے ٹوکے طرح گھوم گیا۔ میرے ایک پیر کی ٹھوکرا ایک مائی کی زخمی ٹانگ پر پڑی کی ہڈی پر لگی۔ وہ چپٹی ہوئی... دھڑکائی اور پشت کے بل گر گئی۔ پہلے اس کے دونوں ہاتھ راستہ پر تھے لیکن گرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ راستہ سے ہٹ گیا تھا۔ راستہ اب بھی دوسرے ہاتھ میں تھی۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راستہ کو ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیا لیکن اس سے پہلے کہ اسے راستہ سیدھی کرنے کا موقع ملتا ”میں سائب کی طرح پھٹکا رہا ہوا اس کے اوپر جا کر اور راستہ پر ہاتھ ڈال کر اس کا سر اوپر کی طرف کھینچا۔

ایک مائی کی انگلی نے ٹھیکہ دیا۔ غار ایک بار پھر ترخا ہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ گولیاں غار کی چھت پر لگیں۔ اگر راستہ کا رخ تبدیل ہونے میں ایک ہل کی بھی تاخیر ہو جاتی تو سامنے کھڑا ہوا سردار قحالب چھلکی ہو چکا ہوتا۔

میں ایک مائی کے سینے پر سوار تھا... میں نے اس کی کلائی پر اس طرح دباؤ ڈالا کہ راستہ جھکنے ہوئی زمین پر جا گئی اور اس کا رخ دیوار کی طرف ہو گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے راستہ کو دبائے رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کے گلے پر جمادیا۔ میرا انگوٹھا ایک مائی کے زخروں پر تھا۔ معمولی سے دباؤ سے ہی اس کی مزاحمت نے دم توڑ دیا۔ راستہ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے راستہ اس کے ہاتھ سے چھین کر دوسری پیر کی دیوار کی مائی کو پھونک دیا۔ ایک مائی دونوں ہاتھوں سے گھاسلائے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ زخمی ٹانگ پر رہی تھی۔ میں نے اس ٹانگ پر ایک زوردار ٹھوکرا سید کر دیا۔

”سردار قحالب نے ٹھوکہ لگا دیا کہ تم اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کر رہی ہو۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا ”سردار کے آدمیوں نے تمہارے زخم کی مرہم پٹی کی۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی

اور اس کا صلہ تم نے یہ دیا کہ نہ صرف ان کے ایک ساتھی کو مار ڈالا بلکہ ان کے سردار کو بھی پھنڈا پ کر دیا اور اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ تم شاید ان قبائلیوں کو نہیں جانتی۔ یہ اپنی جان تو دے سکتے ہیں لیکن اپنے سردار کی تو بہن برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ان کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت دیکھ رہی ہو؟ میں نے غار کے دہانے پر کھڑے ہوئے قبائلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان دونوں نے اپنی رائفلیں اٹھا کر ایک مانی پر تان لی تھیں۔ ”وہ تم سے اپنے ساتھی کے قتل اور سردار کی توہین کا بدلہ لینے کو بے چین ہو رہے ہیں لیکن میں انہیں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ تمہیں جان سے مار ڈالیں۔ البتہ انہیں اتنا موقع ضرور دیا جائے گا کہ وہ اپنے انتقام کی تھوڑی سی پیاس بجھالیں۔ تمہارے اس خوب صورت جسم سے۔“

میں نے خاموش ہو کر سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔  
”سردار تھالوب۔“ میں نے آنکھ کا گوشہ دباتے ہوئے کہا ”ہم دونوں باہر چلتے ہیں اور تم اپنے چاروں آدمیوں کو اندر بھیج دو تھوڑی دیر کے لیے۔ تاکہ وہ۔۔۔“

ایک مانی و دشت زدہ سی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی غار کے دہانے پر کھڑے ہوئے بچے کے دونوں قبائلیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
”شلو۔“ سردار نے ان میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے تھا کہ زبان میں کہا تھا کہ ایک مانی بھی سمجھ لے ”باہر سے اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی بلا دو۔ ہم تمہیں ایک گھنٹے کا وقت دے رہے ہیں اور اس ایک گھنٹے میں تم لوگوں نے کس طرح اس کی مزاج پر سی کرنی ہے یہ تم لوگ اچھی طرح سمجھتے ہو۔“

”نہیں نہیں۔ مجھے ان وحشیوں کے رحم و کرم پر مت چھوڑو۔ بیٹھے مار ڈالیں گے۔ رحم کرو مجھ پر۔۔۔“ ایک مانی بچہ جھجک کر کہہ رہی تھی ”معاف کر دو مجھے۔ تم جو کوگے میں کھڑی کی عمر تھی ان وحشیوں کے حوالے نہ کرو۔“  
سردار تھالوب نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے آدمیوں سے قبائلی زبان میں کچھ کہا۔ وہ دونوں وہیں رک گئے۔  
”چلو۔ اس وقت معاف کیا تمہیں لیکن تم سزا سے بچ نہیں سکو گی۔“ میں نے اپنی رائفل اٹھاتے ہوئے کہا ”اب اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ جلدی سے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“  
ایک مانی کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی سرخ ہو رہی تھی۔ زخم سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی لیکن پھر لوکڑا کر گر گئی اور بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔  
اس دوران میں ایک قبائلی نے زمین پر پڑی ہوئی دونوں

رائفلیں اٹھالی تھیں۔ سردار کی رائفل اس نے بڑے اجڑے اس کی خدمت میں پیش کر دی۔ دوسری رائفل اس نے اپنے کندھے پر لٹکائی۔  
”تم اٹھ کر چلو گی یا محبت کر لے جایا جائے۔“ میں نے اپنی مانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”م۔۔۔ میں۔۔۔ کھڑی نہیں۔۔۔ ہو سکتی۔ مجھ سے نہیں جاتا۔“ ایک مانی نے کہا۔ وہ اب باقاعدہ دوسری تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔  
میں نے تھالوب کی طرف دیکھا۔ وہ قبائلی زبان میں اپنے آدمیوں سے باتیں کرنے کا پھر وہ قبائلی جو ہمیں غار تک لانا آگے بڑھا۔ اس نے اپنی رائفل میرے حوالے کر دی اور ایک مانی کے قریب جا کر رک گیا۔ چند لمحوں میں اس کی طرف دیکھا ہوا پھر پڑی پڑی پھرتی سے ایک مانی کو اٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔ ایک مانی چاٹنی تھی۔ شلوانی اس قبائلی نے ایک مانی کو بڑی بھردی سے ہونٹوں طرح اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔  
ہم غار سے باہر آگئے۔ دوسرے قبائلیوں کو ہدایت کرتی تھی کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش ہستی میں لے جائیں اور ان کی آخری رسومات کا بندوبست کریں۔  
شلو، ایک مانی کو پوری سی طرح کندھے پر لادے گا۔ آگے آگے چل رہا تھا۔ ایک مانی ہونے والے ہوئے گرا رہی تھی کہ وقت ٹانگ کو زور کا جھٹکا لگا تو جھجکا اٹھی۔

جب تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگ گئے۔ جب کاٹھ قبائلی ایک دشت کے ستے سے ٹھیک لگے بھٹا گاڑی ٹھٹے ملتا جلتا مسکرتی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے مسکرت ہنسنے لگا اور ایک جھنگل سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
سردار تھالوب نے قریب پہنچ کر جب کے دروازے کھل دیے۔ شلوانے ایک مانی کو پچھلی سیٹ پر اس طرح بٹھا دیا کہ اختیار پہنچا اٹھی تھی۔ میں بھی جب کے پچھلے سے اس کی مانی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رائفل اپنی گود میں رکھ لی۔  
ہاتھ رائفل پر ہی تھا۔  
سردار تھالوب نے اسٹریچر کے سامنے بیٹھ کر اچھی اسٹن کیا اور جب کو ریورس گیر میں دس دھڑکنے سے نکال کر چھری سے پڑے آیا۔ اس نے دونوں قبائلیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ بٹھا دیے۔  
جب کو چھری سے راستے پر ڈال دیا۔  
واپسی پر کوئی غیر معمولی یا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم کا بچہ پہنچے تو دوسرا ایک بچہ تھا۔ ایک مانی کو جب سے ٹھٹے ہال کمرے کے قاتلین پر ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کی تاثرات نمایاں تھیں اور وہ متحوش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔  
واٹنگ ڈن کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
”واٹنگ ڈن سے معلوم کر دو کہ اگر فرسٹ لائیہ کا کئی سالانہ

وہ اس کے زخم کی ڈرننگ کر دو۔“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”ہاں ہر چیز موجود ہے۔ میں ابھی میڈیسن باکس لے کر آتا ہوں۔“ واٹنگ ڈن کہتا ہوا باہر نکل گیا۔  
چند منٹ بعد ہی وہ اپنے کوارٹر سے میڈیسن باکس لے آیا۔ جاگتی مانی کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگ پر پہلی ہوئی پٹی باندھنے لگی۔ یہ کوئی باقاعدہ ڈرننگ نہیں تھی۔ چارویں کسی ایسے ہی کپڑے کا ٹکڑا جاکر باندھ دیا گیا تھا۔ خون کے ساتھ اس پٹی پر برے سے رنگ کا کوئی گاڑھا سا مادہ بھی جما ہوا تھا۔ جاگتی اسی خون آلود کپڑے سے زخم اور اس کے آس پاس کی جگہ کو صاف کرنے لگی۔ اسی دوران میں واٹنگ ڈن دوڑ کر کان کا دواں بھی لے آیا تھا۔ جاگتی روٹی کے ٹکڑے اسٹین میں بھگو کر اس کا زخم صاف کرتی رہی۔ ایک مانی نے دانت میچھ کر رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔  
”یہ زخم کیسے آیا۔ گولی تھی گی؟“ جاگتی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں۔“ ایک مانی نے کہا ”جواب دیا“ میں دوڑتے ہوئے اونچی جگہ سے گری تھی اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ نیچے ایک درخت کا سوسکا ہوا تانہ پڑا تھا جس سے تقریباً ڈیڑھ انچ لمبا کاٹنے کی طرح ٹوک دار لکڑی کا ایک ٹکڑا باہر کو نکلا ہوا تھا جو میری ٹانگ میں پھنس چکا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹانگ کو الگ کھینچا تھا۔ زخم سے بے تحاشا خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اپنا اسٹارٹ زخم پر باندھ لیا لیکن خون بند نہیں ہوا اور اگر وہ لوگ نہ ملے تو شاید خون زیادہ بہہ جاتے سے میں وہاں جھنگل میں پڑے پڑے ہی ختم ہو جاتی۔“

جاگتی اس کے زخم کو دبا دیا کر دیکھتی رہی۔ اسے شبہ تھا کہ اگر کوئی چھاننا اندر نہ گئی ہو تو خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ لکڑی کا بہت معمولی سا ریشہ بھی پھول کر زخم کو کھینچ سکتا تھا۔ وہ زخم کو دبا دیا تو ایک مانی گراہ اٹھی۔ کئی مرتبہ بچہ دبانے کے لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔  
جاگتی نے اطمینان کر لیا تھا کہ زخم کے اندر کوئی چھاننا نہیں تھی۔ اس نے دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ خون زیادہ بہہ جانے اور تکلیف سے ایک مانی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس میں پھڑکے جانے کے خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔  
ایک مانی کو قاتلین سے اٹھا کر ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا گیا۔  
میں اور سردار تھالوب کمرے میں تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تو ایک مانی کے چہرے پر خوف کے تاثرات کچھ اور گہرے ہو گئے۔  
”اب تمہارے سامنے دوسری راستے ہیں ایک مانی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”یا تو تم خود بخود زبان

کھول دو یا مجھے تمہاری زبان کھولنی پڑے گی۔“  
”ٹھیک۔ کیا جانا چاہتے ہو؟“ ایک مانی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔  
”اس سازش میں اور کون کون شریک ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”کون سی سازش۔۔۔ میں۔۔۔ میں کسی سازش کے بارے میں نہیں جانتی۔“ وہ رک رک کر بولی۔  
میں نے بیب سے ہتھول نکال کر ٹال کی طرف سے پکڑ لیا اور اس کی ٹانگ پر زخم کے قریب دستانے سے ہلکی سی ضرب لگائی۔ ایک مانی بچہ اٹھی۔  
”اس غار میں تم نے کہا تھا کہ اگر میں بچ میں ٹانگ نہ اڑاتا تو تم لوگوں کا منصوبہ اب تک کامیاب ہو چکا ہوتا اور یہاں تم کہہ رہی ہو کہ کسی سازش کے بارے میں میں نہیں جانتی اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرے سامنے تم جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ اس کانچ میں ہونے والی تم لوگوں کی ساری گفتگو ہم ریکارڈ کر چکے ہیں۔ سین فونک کو اگر مائے سار شہ نہ ہو جاتا تو تم لوگوں کی میننگ جاری رہتی اور اس کے بعد کی گفتگو بھی ہم ریکارڈ کر لیتے۔“

”مائے سا کو؟“ ایک مانی نے کہا ”میں اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتی۔“  
”وہ لڑکی جسے سین فونک نے کانچ میں گولی ماری تھی۔ میں ایک اور بات تمہیں بتا دوں۔ میری دوست تھالی اس وقت دارا کے قبضے میں ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تم سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے بستر ہے کہ میرے غضب کو بوا دینے کے بجائے خود ہی زبان کھول دو اور جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دیتی رہو۔ بصورت دیگر تمہارے اس خوب صورت جسم کے اتنے ٹکڑے کر دوں گا کہ۔۔۔“

”ٹھیک۔ کیا جانا چاہتے ہو؟“ ایک مانی نے کہا۔ خوف سے اس کے چہرے کے تاثرات مگھڑ گئے تھے۔  
”ب سے پہلے یہ بتاؤ کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”م۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔“ ایک مانی نے جواب دیا ”وہ جھنگل میں کسی کانچ میں گھسے ہوئے تھے جس کے بارے میں پولیس چیف اور رنگ منت کے سوا ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں۔“  
”ٹھیک ہے۔ وہ میں معلوم کر لوں گا۔ اب شمشادہ کے خلاف اس سازش کے بارے میں بتاؤ۔ اس میں کون کون لوگ شریک ہیں اور اصل منصوبہ کیا ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔  
”ایک منٹ۔“ سردار تھالوب نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد وہ نیپ ریکارڈر لے آیا جسے اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر دیوار کے ساتھ میں پلگ لگا دیا۔  
آتش فشاد 193 حصہ 2

”ہاں۔ اب شروع ہو جاؤ۔“ قہار نے ریکارڈنگ والا مین پکڑ کرے ہوئے کہا۔

میں نے ایک مائی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

”میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔“ ایک مائی نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم اس سازش میں اور کون کون لوگ شریک ہیں۔ مجھے تو آج تک سانگ نے یہ لالچ دیا تھا کہ یہ منصوبہ کامیاب ہونے کے بعد مجھے نہ صرف کسی وزارت کا سیکرٹری بنایا جائے گا بلکہ پتایا جہاز میری پسند کی جگہ مجھے الٹ کر دی جائے گی اور مالی شان ہوگی کی تعمیر کے لیے تمام اخراجات بھی دیے جائیں گے۔“

”ہم ان لوگوں کے نام جانا چاہتے ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔“ یہ سوال سردار قہار نے کیا تھا۔ ”حکومت کے علاوہ فوج کے کچھ افسران بھی اس میں شریک ہوں گے۔ ان کے نام بتاؤ۔“

”میں تفصیل سے کچھ نہیں جانتی۔“ ایک مائی نے جواب دیا۔ ”ویسے میرا خیال ہے اس سازش میں فوج کا کوئی افسر ملوث نہیں ہے۔“

”اس قسم کی کوئی سازش فوج کو مائے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔“ سردار قہار نے اسے گھورا۔

”ہو سکتا ہے۔“ ایک مائی نے کہا۔ ”لیکن کچھ نہیں جانتی۔“

”اس سازش میں جہل کھوراک کا کیا کردار ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”سازش کی بنیاد واصل جہل کھوراک ہی نہ رکھی تھی۔“

ایک مائی نے جواب دیا۔ ”پچھلے چند برسوں کے دوران میں تھائی لینڈ میں منشیات کی اسٹورنگ کے پابندیوں اور سختی کی وجہ سے جہل کھوراک کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لاؤس اور برما کی سرحدوں پر اندرونی بغاوتوں کی وجہ سے ان ملکوں کی فوجیں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ سرحدیں جہل کھوراک کے لیے بالکل غیر محفوظ ہو چکی ہیں۔ اس کی نظر میں تھائی لینڈ پر ہیں لیکن پچھلے چند برسوں کے دوران میں اسے یہاں بھی کچھ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس لیے یہ منصوبہ اس نے بنایا تھا۔ تھائی لینڈ میں شہنشاہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے وہ اپنی پسند کے آدمی لانا چاہتا ہے۔ اس کے عوض اس کا صرف ایک مطالبہ ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تھائی لینڈ اور گولڈن ٹرائی اینگل کی سرحد پر کنٹرول کے علاوہ وہ تھائی لینڈ میں کنٹرول اور ناکوئیس کے مجھے عمل طور پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے۔“ ایک مائی نے کہا۔

میں اور سردار قہار سوال کرتے رہے اور ایک مائی جواب دیتی رہی اور یہ ساری گفتگو ریکارڈ ہوتی رہی۔ قہار کی طرح میرا بھی خیال یہ تھا کہ ایک مائی اب بھی بہت کچھ چھپا رہی ہے۔

”ٹھیک ہے ایک مائی۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”جو باتیں تم ہم سے معلوم نہیں کر سکتے وہ حکومت کے افسر معلوم کر لیں گے۔ اور ہمیں تو معلوم ہی ہو گا کہ سرکاری افسران کی زبان کھلانے کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں۔“

ایک مائی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ کچھ مٹی تھی کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ شہنشاہ کے خلاف سازش سب سے گھمناؤنا اور سنگین ترین جرم سمجھا جاتا تھا اور اس کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی تھی اور میں ممکن ہے ان لوگوں کو اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کیا جائے۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ دروازہ کھلا رہنے دیا گیا تھا۔ اس وقت سوا دو بج رہے تھے۔ صبح ایک کاپی کے سوا ہم نے کچھ بھی کھایا یا پین نہیں کیا۔ لونا کھانا تیار کر چکا تھا۔

”تم اپنا کھانا لے کر ایک مائی کے کمرے میں چلی جاؤ اور اسے بھی کچھ کھا دو۔“ میں نے بائیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور سوچا کہاں ہے؟“

”وہ کمرے سے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے۔“ جاگتی نے جواب دیا۔ ”مجھے بتا کہ شاید ہم جراثیم پیش ہیں اور اس کے ذریعے اس کی ماں کو بلیک میل کر کے کوئی کام نکلوانا چاہتے ہیں۔“

”اسے رنگ سنت کے بارے میں بتایا تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا گیا۔ اور یہ خبر مجھی اسے تم ہی بتاؤ گے کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ اس مرتبہ رنگولی نے جواب دیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اسے لے کر آؤ۔ ہم اسے بیڈ پر کھانا کھائیں گے۔“ میں نے کہا۔

اور پھر چند منٹ بعد ہم سب میز کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ سونیا کے چہرے پر بے پناہ اداسی تھی۔

کھانے کے بعد میں سونیا کو لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں اسے ٹولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس میں حب الوطنی کا کچھ مادہ ہے یا وہ بھی اپنی ماں کی طرح کرپشن اور ہر طرح کی ناجائز آمدنی پر یقین رکھتی ہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ماں کی غیر قانونی سرگرمیوں سے قطعی ناظم ہے۔ وہ اپنی ماں کو بدی کا درجہ دیتی ہے جس نے بڑی محنت سے اسے پر دان چڑھایا اور اسے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کرنے کے لیے شہر دوز گزنی محنت کرتی ہے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ماں کسی قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ خود حب وطن لڑی تھی۔ اسے اپنے ملک سے اور اپنے شہنشاہ سے محبت تھی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ تھائی لینڈ کی تہذیب اور خوش حالی شہنشاہ کی عوام سے دلچسپی کی مرہون منت تھی۔ منشیات

کے حوالے سے بھی اس کے خیالات بڑے واضح تھے۔ اس کا خیال تھا کہ منشیات پیدا کرنے والوں اور فروخت کرنے والوں کو گزلیں سے بھون دینا چاہیے۔ یہ لوگ انسان نہیں موت کے پرارے ہیں جو دنیا بھر میں فوج اور نو عمر نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔

”مگر تم مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ سونیا نے جپتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ تمہارے وطن اور شہنشاہ کو اس وقت تم جیسے وقارداروں کی ضرورت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جو شہنشاہ اور ملک کی سلامتی کے لیے اپنی جان کا فدا کرنا نہیں کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ سونیا بولی نکلیا شہنشاہ یا اس ملک پر کوئی آفت آنے والی ہے؟“

”میں سمجھ لو۔“ میں نے محنتاً الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم سے یہ کہا جائے کہ تمہاری ماں کے دل میں وطن کی وہ محبت نہیں جو ہونی چاہیے تو تم کیا کہو گی؟“

”کیا اس۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”میری ماں ایک محب وطن عورت ہے۔ اس نے ساری زندگی پولیس کے محکمے میں رہ کر اس ملک کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی ہے۔ اس کی وطن پرستی پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”تمہاری ماں کی سخاوت بہت معمولی تھی۔ کیا تمہارے خیال میں اس معمولی سخاوت میں اتنی جائیداد بٹائی جاسکتی ہے۔ اس طرح شاہزادہ اندر زمین زندگی گزارا جاسکتی ہے؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ سونیا نے مجھے گھورا۔ ”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میری ماں رشتہ لیتی ہے یا غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔“

”ہاں سونیا۔ کچھ ایسی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”جسوت بولتے ہو تم۔ کیوں؟“ سونیا چپچی ”میری ماں ایک شریف عورت ہے۔ اس نے محنت کر کے دولت کمائی ہے۔ جراثیم پیش نہ ہو گا۔ مجھے یہ غماں بنا کہ میری ماں سے کچھ ناجائز کام کروانا چاہتے ہو۔“

”سونیا۔“ میں نے بدستور پرسکون لہجے میں کہا۔ ”مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ تمہاری ماں تمہاری طرح محب وطن نہیں تھی۔ اسے شہنشاہ یا اس ملک سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اسے صرف اور صرف دولت کی حاجت تھی۔ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھی۔ وہ ایسے لوگوں کی آڑا کار بن گئی تھی جو اس ملک اور شہنشاہ کے خلاف بہت خوفناک سازشیں میں ملوث ہیں۔“

”تم میری ماں کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔“

”ہاں۔ یہ سچ ہے۔ تمہاری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ میں نے کہا۔

سونیا چند لمحے دہشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر چوٹ چوٹ کر رونے لگی۔ رنگولی اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے قریب آگئی اور سونیا کا ہاتھوں میں لے کر اسے تسلی دلانا دینے لگی۔

”نہیں۔ نہیں۔ میری ماں ایسی نہیں ہو سکتی۔“ سونیا روتے ہوئے کہہ رہی تھی ”اس پر الزام ہے اس کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔“

”حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے لیکن اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”دولت کی ہوس تو بڑے بڑوں کو جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تمہاری ماں کرپور تھی۔ دولت کے لالچ نے اسے جھکنے پر مجبور کر دیا اور وہ سازشیوں کا آلہ کار بن گئی۔ آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسی ہستی سے ملواتا ہوں جو میری بات کی تصدیق کر دے گی۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک ریکارڈ شدہ گفتگو سناتا چاہتا ہوں۔“

ان کو اڑوں میں تم اپنی ماں کی آواز پہچان لو گی۔“ میں نے اٹھ کر پانچا کیٹ لگا کر شپ ریکارڈ چلا دیا۔ یہ کالج میں ہونے والی میننگ کا ٹیپ تھا۔ اس میں کم از کم تین جگہوں پر رنگ سنت کی آواز موجود تھی۔ میں ریکارڈز بند کر کے سونیا کو اپنی ماں والے کمرے میں لے گیا۔ جاگتی اس وقت بھی ایک مائی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

”یہ ایک مائی ہے۔ حکومت کی ایک اعلیٰ آفیسر ہے۔ یہ بھی شہنشاہ کے خلاف اس گھمناؤنی سازش میں شریک ہے۔ یہ تمہیں بتائے گی کہ تمہاری ماں کا اس سازش میں کیا کردار تھا۔“ میں نے خاموش ہو کر ایک مائی کی طرف دیکھا۔ ”ایک مائی۔ بتاؤ اسے رنگ سنت کی اصلیت کیا تھی اور جب اسے گولی لگی تو وہ کہاں تھی، ریکارڈ کری تھی۔“

”رنگ سنت۔“ میں نے فونک کے ساتھ میننگ میں ہمارے ساتھ تھی۔ میننگ کے سارے انتظامات اسی نے کیے تھے اور جب کا بیج پر حملہ ہوا تو رنگ سنت نے دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہاں سے جان بھاگ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر دارا نے اسے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر رنگ سنت یا کوئی اور لڑکی تم لوگوں کے ہاتھ لگ گئی تو میننگ کا سارا راز فاش کر دے گی۔“

میں چونک گیا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا کہ رنگ سنت دارا کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کی گولیوں کا شکار ہوئی تھی۔

سونیا چوٹ چوٹ کر رہی تھی۔ نیپ شدہ آواز اور ایک مائی کی باتیں سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی ماں کے بارے میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔

جاگتی سونیا کو کمرے سے باہر لے آئی۔ رنگولی بھی اس کے پاس آگئی اور پھر میرے اشارے پر وہ دونوں اسے باہر نازہ دوا میں لے گئیں۔ میں نے سردار قہار کو بتا دیا کہ رنگ سنت ہم میں سے کسی کی گولی کا نشانہ نہیں بنی تھی بلکہ اسے دارا نے مارا تھا۔



ایک مائی کے اس انکشاف سے ہمارا کام آسان ہو گیا تھا۔ سوچنا یہ نہیں کہ سکتی تھی کہ اس کی ماں کو ہم نے مارا تھا۔ "میرا خیال ہے اب مہاراج کو صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔" میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سردار تھالوب نے جواب دینے کے بجائے ٹپٹی فون اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے ریسور اٹھایا اور بنگلہ کا نمبر ملانے لگا۔ اس مرتبہ مجھے باؤسی نہیں ہوئی۔ کال مہاراج ہی نے ریسور کی تھی۔ دو تین منٹ رسی جلوں کے تبادلے میں گزر گئے۔ پھر میں مہاراج کو کہتے ہوئے تمام واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا۔

"اگر سردار تھالوب میرا ساتھ نہ دیتا تو ہم اس مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمارے پاس ایسی ہی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ شمشادہ کے خلاف اس سازش کے ناسے ہانپے کب اور کیسے بنے تھے۔ آگے ساک اگرچہ فرا ہو گیا ہے لیکن ایک مائی میرے قبضے میں ہے۔ اس سے ان تمام لوگوں کے نام معلوم کیے جاسکتے ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔"

"میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں وجدان۔" مہاراج نے کہا۔ "تمہیں ایک مائی اور وہ کیسٹ لے کر فوراً بنگلہ آنا ہوگا۔ میں رتا کون سے بات کرتا ہوں۔ وہ تمہارے لیے ایک خصوصی حلیہ پر چینگ رائے بھیج دے گا۔ خصوصی جہاز دو ڈھائی گھنٹوں میں چینگ رائے ان پورٹ پر پہنچ جائے گا۔"

"میں بنگلہ نہیں آسکتا مہاراج۔" میں نے جواب دیا۔ "تھائی" دارا کے قبضے میں ہے۔ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ مجھے نہ صرف تھائی کو اس کے قبضے سے چھڑوانا ہے بلکہ آگے ساک اور سین فونک وغیرہ کو بھی تلاش کرنا ہے اس کے علاوہ اور ایسے بہت سے کام ہیں جن کے لیے یہاں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔ ایک مائی اور کیسٹ منکوانے کے لیے آپ کو کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔"

"فی الحال کسی اور پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔" مہاراج نے جواب دیا۔ "پنا فون نمبر دو۔ میں تمہاری دیر بعد تم سے بات کروں گا۔"

میں نے مہاراج کو فون نمبر لکھوا دیا اور پھر فون کا ریسور سردار تھالوب کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک مہاراج سے بات کرتا رہا پھر ریسور رکھ دیا۔

سوینا وغیرہ باہری نیچی ہوئی تھیں۔ ہم بھی باہر آگئے۔ آسمان پر ایک بار پھر بادل چھانکے تھے سوینا اب بھی دو ری تھی اور رگمئی اور جاگی اسے دلا سے دے رہی تھیں۔ میں اور سردار تھالوب بھی قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"سوینا۔" سردار تھالوب نے اپنی کرسی پر قدرے آگے جھکے

ہوئے کہا "اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ لوگ کیسے وطن فروش اور کتنے بے ضمیر ہیں۔ انہوں نے محض اس لیے تمہاری مال کو گولی مار دی کہ پکڑے جانے کی صورت میں وہ ان کا راز فاش نہ کر دے۔ اس سے کچھ سکتی ہو کہ انہیں صرف اور صرف اپنا نظارہ عزیز ہے۔ کسی دوسرے کی زندگی کی انہیں قطعی پروا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے وطن کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، انہیں دوسروں کی زندگیوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ وہ چاندیوں کو خاموش ہوا پھر مات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

"تمہاری ماں لاچ میں آگئی تھی۔ اس سے غلطی سرزد ہو گئی اور یہ غلطی اس کے نام پر بدنامی کا باعث بن گئی ہے۔ تم اپنی ماں کے نام سے اس داغ کو دھو سکتی ہو۔ تم محب وطن ہو۔ وقت بڑے پرم شمشادہ اور وطن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہو۔"

"میں... میں اپنی ماں کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ سوینا طعیاں بیچتے ہوئے بولی "شمشادہ اور اپنے وطن کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔ میں انہیں تلاش کروں گی اور جی جن کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ مجھے بتاؤ وہ کون لوگ ہیں اور یہ دارا کون ہے جس نے میری ماں کو گولی ماری تھی۔"

"دارا ایک خوں خوار دہشت گرد ہے۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "وہ اب تک درجنوں بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ چند روز پہلے میرے پانچ آدمی بھی اس کی درندگی کا شکار ہوئے۔ گزشتہ رات وہ ہماری ایک ساتھی کو اٹھا کر لے گیا ہے لیکن ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ وہ ہر مرتبہ پتہ پتا ہے لیکن اس مرتبہ وہ ہمارا گھیرا توڑ کر نہیں جاسکے گا۔ آج کی رات... آج رات اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

سوینا بھی میری طرف اور بھی سردار تھالوب کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ ہولے ہولے پتکیاں لے رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر وہ لینے سے اس کے دل کا غبار نکل گیا تھا لیکن ماں کی موت کا مصدمہ آسانی سے نہیں بھلایا جاسکتا تھا۔

ہم میں سے کوئی بھی صورت حال معلوم کرنے کے لیے شریک طرف نہیں گیا تھا۔ سردار تھالوب نے واٹک ڈن کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے شریک دیا۔ ہم ایک لان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ لوہا نے برآمدے میں نمودار ہو کر بتایا کہ بنگلہ کے میرے لیے کال آئی ہے۔ میں اٹھ کر تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آگیا۔ سردار تھالوب بھی میرے پیچھے ہی آیا تھا۔

وہ مہاراج کو فون تھا۔ میں نے تعظیمی جملے ادا کیے اور پھر مہاراج بھی جلد ہی اصل موضوع پر آگئے۔ "وجدان۔" مہاراج کہہ رہے تھے "رتا کون تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ذرا تفصیل سے سب کچھ بتا دو۔" چند لمحوں خاموشی رہی پھر ریسور پر رتا کون کی آواز سنائی

"ہیلو جی میں ایکسے ہو؟" "انگل ٹھیک ہوں باس۔ آپ نے مہاراج سے خوش خبری تو سنی۔" "ہاں۔ میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ تم نے بڑا کام انجام دیا ہے۔ حکومت تمہاری خدمات کو فراموش نہ کرے گی۔ سہرا جی میں تم سے تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رتا کون کو شروع سے سب بتانے لگا۔ میں نے اس مشن کی کامیابی میں سردار تھالوب کا بہت مناسب الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔

"مہاراج نے بتایا تھا کہ دارا نے تمہاری ایک ساتھی کو قہقے لے رکھا ہے۔" میرے... خاموش ہونے پر رتا کون نے

"میں باس۔" میں نے جواب دیا "اگر یہاں کی صورت حال لین نہ ہوئی تو اپنی مائی کو لے کر میں خود بنگلہ پہنچ جاتا۔ اب ب کو فوری طور پر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ تاخیر خطرناک بات ہو سکتی ہے۔"

"میں آج رات کسی وقت تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" رتا کون نے جواب دیا "ہماری آمد بالکل خفیہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اب تم کھل کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔ میں چینگ رائے میں پولیس کے انسپکٹر جنرل کو فون کر دیتا ہوں۔ اگر اس کی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو اسے فون کر دیتا۔ وہ تم سے ہر کام بخشنا دے گا۔"

"میں باس۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے مہاراج سے کچھ

"بات کی اور فون بند کر دیا۔

"رتا کون آج رات کسی وقت یہاں پہنچے والا ہے۔" میں

سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھالوب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

رگمئی اب بھی سوینا کے پاس باہر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جاگی

کے پاس ایک مائی کے پاس چلی گئی تھی۔ میں اور تھالوب ہال

کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دو بجے کے قریب واٹک ڈن واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے

مختصر میں شریک بنگامی صورت حال تھی۔ پولیس چیف اور ریگ

جنرل کوئی معمولی بات نہیں سمجھی۔ اس کے علاوہ جنرل

جنرل کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ کانچ سے تین لڑکیوں کی

شہید کی تھیں۔ ان میں ایک نے سا کی لاش بھی اور دوسری

"انہیں کو بھی شناخت کر لیا گیا تھا۔ وہ سوسائٹی گرلز تھیں اور

گھنچانگ رائے سے خاص طور پر لایا گیا تھا۔

ایک دلچسپ اطلاع یہ بھی تھی کہ سین فونک اور آگے

انہیں زخمی ہوئے تھے۔ سین فونک تو رتا ہی کو گولڈن ٹرائی

میں طرف نکل گیا تھا اور آگے ساک شہری میں کہیں مدد پو

تھا۔

"ہیلو جی میں ایکسے ہو؟"

"انگل ٹھیک ہوں باس۔ آپ نے مہاراج سے خوش خبری تو

سنی۔"

"ہاں۔ میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ تم نے

بڑا کام انجام دیا ہے۔ حکومت تمہاری خدمات کو فراموش

نہ کرے گی۔ سہرا جی میں تم سے تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رتا کون کو شروع سے سب

بتانے لگا۔ میں نے اس مشن کی کامیابی میں سردار تھالوب کا

بہت مناسب الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔

"مہاراج نے بتایا تھا کہ دارا نے تمہاری ایک ساتھی کو قہقے

لے رکھا ہے۔" میرے... خاموش ہونے پر رتا کون نے

"میں باس۔" میں نے جواب دیا "اگر یہاں کی صورت حال

لین نہ ہوئی تو اپنی مائی کو لے کر میں خود بنگلہ پہنچ جاتا۔ اب

ب کو فوری طور پر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ تاخیر خطرناک

بات ہو سکتی ہے۔"

"میں آج رات کسی وقت تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" رتا

کون نے جواب دیا "ہماری آمد بالکل خفیہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں

ہونا چاہیے۔ اب تم کھل کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔

میں چینگ رائے میں پولیس کے انسپکٹر جنرل کو فون کر دیتا ہوں۔

اگر اس کی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو اسے فون کر دیتا۔ وہ تم سے

ہر کام بخشنا دے گا۔"

"میں باس۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے مہاراج سے کچھ

"بات کی اور فون بند کر دیا۔

"رتا کون آج رات کسی وقت یہاں پہنچے والا ہے۔" میں

سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھالوب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

رگمئی اب بھی سوینا کے پاس باہر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جاگی

کے پاس ایک مائی کے پاس چلی گئی تھی۔ میں اور تھالوب ہال

کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دو بجے کے قریب واٹک ڈن واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے

مختصر میں شریک بنگامی صورت حال تھی۔ پولیس چیف اور ریگ

جنرل کوئی معمولی بات نہیں سمجھی۔ اس کے علاوہ جنرل

جنرل کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ کانچ سے تین لڑکیوں کی

شہید کی تھیں۔ ان میں ایک نے سا کی لاش بھی اور دوسری

"انہیں کو بھی شناخت کر لیا گیا تھا۔ وہ سوسائٹی گرلز تھیں اور

گھنچانگ رائے سے خاص طور پر لایا گیا تھا۔

ایک دلچسپ اطلاع یہ بھی تھی کہ سین فونک اور آگے

انہیں زخمی ہوئے تھے۔ سین فونک تو رتا ہی کو گولڈن ٹرائی

میں طرف نکل گیا تھا اور آگے ساک شہری میں کہیں مدد پو

تھا۔

"ہیلو جی میں ایکسے ہو؟"

"انگل ٹھیک ہوں باس۔ آپ نے مہاراج سے خوش خبری تو

سنی۔"

"ہاں۔ میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ تم نے

بڑا کام انجام دیا ہے۔ حکومت تمہاری خدمات کو فراموش

نہ کرے گی۔ سہرا جی میں تم سے تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رتا کون کو شروع سے سب

بتانے لگا۔ میں نے اس مشن کی کامیابی میں سردار تھالوب کا

بہت مناسب الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔

"مہاراج نے بتایا تھا کہ دارا نے تمہاری ایک ساتھی کو قہقے

لے رکھا ہے۔" میرے... خاموش ہونے پر رتا کون نے

"میں باس۔" میں نے جواب دیا "اگر یہاں کی صورت حال

لین نہ ہوئی تو اپنی مائی کو لے کر میں خود بنگلہ پہنچ جاتا۔ اب

ب کو فوری طور پر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ تاخیر خطرناک

بات ہو سکتی ہے۔"

"میں آج رات کسی وقت تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" رتا

کون نے جواب دیا "ہماری آمد بالکل خفیہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں

ہونا چاہیے۔ اب تم کھل کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔

میں چینگ رائے میں پولیس کے انسپکٹر جنرل کو فون کر دیتا ہوں۔

اگر اس کی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو اسے فون کر دیتا۔ وہ تم سے

ہر کام بخشنا دے گا۔"

"میں باس۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے مہاراج سے کچھ

"بات کی اور فون بند کر دیا۔

"رتا کون آج رات کسی وقت یہاں پہنچے والا ہے۔" میں

سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھالوب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

رگمئی اب بھی سوینا کے پاس باہر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جاگی

کے پاس ایک مائی کے پاس چلی گئی تھی۔ میں اور تھالوب ہال

کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دو بجے کے قریب واٹک ڈن واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے

مختصر میں شریک بنگامی صورت حال تھی۔ پولیس چیف اور ریگ

جنرل کوئی معمولی بات نہیں سمجھی۔ اس کے علاوہ جنرل

جنرل کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ کانچ سے تین لڑکیوں کی

شہید کی تھیں۔ ان میں ایک نے سا کی لاش بھی اور دوسری

"انہیں کو بھی شناخت کر لیا گیا تھا۔ وہ سوسائٹی گرلز تھیں اور

گھنچانگ رائے سے خاص طور پر لایا گیا تھا۔

ایک دلچسپ اطلاع یہ بھی تھی کہ سین فونک اور آگے

انہیں زخمی ہوئے تھے۔ سین فونک تو رتا ہی کو گولڈن ٹرائی

میں طرف نکل گیا تھا اور آگے ساک شہری میں کہیں مدد پو

تھا۔

"ہیلو جی میں ایکسے ہو؟"

"انگل ٹھیک ہوں باس۔ آپ نے مہاراج سے خوش خبری تو

سنی۔"

"ہاں۔ میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ تم نے

بڑا کام انجام دیا ہے۔ حکومت تمہاری خدمات کو فراموش

نہ کرے گی۔ سہرا جی میں تم سے تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رتا کون کو شروع سے سب

بتانے لگا۔ میں نے اس مشن کی کامیابی میں سردار تھالوب کا

بہت مناسب الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔

"مہاراج نے بتایا تھا کہ دارا نے تمہاری ایک ساتھی کو قہقے

لے رکھا ہے۔" میرے... خاموش ہونے پر رتا کون نے

"میں باس۔" میں نے جواب دیا "اگر یہاں کی صورت حال

لین نہ ہوئی تو اپنی مائی کو لے کر میں خود بنگلہ پہنچ جاتا۔ اب

ب کو فوری طور پر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ تاخیر خطرناک

بات ہو سکتی ہے۔"

"میں آج رات کسی وقت تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" رتا

کون نے جواب دیا "ہماری آمد بالکل خفیہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں

ہونا چاہیے۔ اب تم کھل کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔

میں چینگ رائے میں پولیس کے انسپکٹر جنرل کو فون کر دیتا ہوں۔

اگر اس کی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو اسے فون کر دیتا۔ وہ تم سے

ہر کام بخشنا دے گا۔"

"میں باس۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے مہاراج سے کچھ

"بات کی اور فون بند کر دیا۔

"رتا کون آج رات کسی وقت یہاں پہنچے والا ہے۔" میں

سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھالوب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

رگمئی اب بھی سوینا کے پاس باہر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جاگی

کے پاس ایک مائی کے پاس چلی گئی تھی۔ میں اور تھالوب ہال

کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دو بجے کے قریب واٹک ڈن واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے

مختصر میں شریک بنگامی صورت حال تھی۔ پولیس چیف اور ریگ

جنرل کوئی معمولی بات نہیں سمجھی۔ اس کے علاوہ جنرل

جنرل کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ کانچ سے تین لڑکیوں کی

شہید کی تھیں۔ ان میں ایک نے سا کی لاش بھی اور دوسری

"انہیں کو بھی شناخت کر لیا گیا تھا۔ وہ سوسائٹی گرلز تھیں اور

گھنچانگ رائے سے خاص طور پر لایا گیا تھا۔

ایک دلچسپ اطلاع یہ بھی تھی کہ سین فونک اور آگے

انہیں زخمی ہوئے تھے۔ سین فونک تو رتا ہی کو گولڈن ٹرائی

میں طرف نکل گیا تھا اور آگے ساک شہری میں کہیں مدد پو

تھا۔

"ہیلو جی میں ایکسے ہو؟"

"انگل ٹھیک ہوں باس۔ آپ نے مہاراج سے خوش خبری تو

سنی۔"

"ہاں۔ میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ تم نے

بڑا کام انجام دیا ہے۔ حکومت تمہاری خدمات کو فراموش

نہ کرے گی۔ سہرا جی میں تم سے تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رتا کون کو شروع سے سب

بتانے لگا۔ میں نے اس مشن کی کامیابی میں سردار تھالوب کا

بہت مناسب الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔

"مہاراج نے بتایا تھا کہ دارا نے تمہاری ایک ساتھی کو قہقے

لے رکھا ہے۔" میرے... خاموش ہونے پر رتا کون نے

"میں باس۔" میں نے جواب دیا "اگر یہاں کی صورت حال

لین نہ ہوئی تو اپنی مائی کو لے کر میں خود بنگلہ پہنچ جاتا۔ اب

ب کو فوری طور پر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ تاخیر خطرناک

بات ہو سکتی ہے۔"

"میں آج رات کسی وقت تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" رتا

کون نے جواب دیا "ہماری آمد بالکل خفیہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں

ہونا چاہیے۔ اب تم کھل کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔

میں چینگ رائے میں پولیس کے انسپکٹر جنرل کو فون کر دیتا ہوں۔

اگر اس کی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو اسے فون کر دیتا۔ وہ تم سے

ہر کام بخشنا دے گا۔"

"میں باس۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے مہاراج سے کچھ

واٹک ڈن نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر سردار قحلوب بیٹھا تھا۔ میں اور جاگی چیپ کی بچھی سیٹوں پر آئے سانسے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس لوڈز رانٹھیں تھیں اور فاضل میگزین بھی موجود تھے۔

اس روز واٹک سائی سے ہم نے کھلائی کے علاقے میں واقع اس کانچ کا پتا معلوم کر لیا تھا جہاں دارا اور اس کے ساتھی چھپے ہوئے تھے اور بعد میں رنگ سنت سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ دارا و فیروہ کے علاوہ آنگ سائک بھی وہیں ہوگا۔

کھلائی تک پہنچنے کا آسان راستہ تو یہ تھا کہ ہم گولڈن ٹرائی اسٹریٹ روڈ کی طرف نکلے اور وہاں سے کھلائی کا رخ کرتے لیکن گولڈن ٹرائی اسٹریٹ روڈ پر پولیس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اس طرف جیننگ کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لیے واٹک ڈن نے شرے نکلے ہی جیپ بھاڑوں میں ایک کپے اور غیر ہموار راستے پر موڑ لی تھی اور کچھ آگے جانے کے بعد اس نے ہینڈ بیکس بھی بجھا دیے تھے۔

نامواری پٹیچ پہاڑی راستے پر روشنی کے بغیر گاڑی چلانا کافی خطرناک تھا لیکن واٹک ڈن بہت احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ تقریباً چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد واٹک ڈن نے جیپ روک لی اور ہم نیچے اتر آئے۔ واٹک ڈن نے جیپ کے دواڑے لاک کر دیے اور ہم اپنی رانٹھیں سنبھالے ایک قطار میں ایک ٹھک سے راستے پر چلے گئے۔ راستہ بتدریج ہلکی کی طرف جا رہا تھا۔ سب سے آگے واٹک ڈن تھا۔ اس کے پیچھے میں پھر جاگی اور آخر میں سردار قحلوب تھا۔

نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رک گئے۔ سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں ایک کانچ کی کھڑکی سے روشنی جھلکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں اور جاگی ایک طرف ہو لیے اور واٹک ڈن اور قحلوب مختلف سمتوں سے اس کانچ کی طرف بڑھنے لگے۔ میں آگے تھا اور جاگی مجھ سے دو قدم پیچھے۔ راستہ خاصا دشوار تھا۔ تاریکی میں چلنا کچھ اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ہم بہت محتاط انداز میں قدم اٹھا رہے تھے۔

کانچ سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ہم رک گئے۔ جاگی میرے دائیں طرف تھی۔ میں نے جاگی کو اشارہ کیا اور خود قدرے دائیں طرف ہٹ کر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ میرا رخ اس کھڑکی کی طرف تھا جہاں روشنی پوری تھی۔

کمرے کے اندر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد دوسرے کمرے کی جی جلی اور تھوڑی دیر بعد مجھ کی۔ وہ سایہ ایک بار پھر پہلے کمرے میں نظر آیا اور پھر ایک طرف بہت رکتا ہوا تھا۔

میں کچھ اور آگے بڑھ کر رک گیا اور کھڑکی سے بجائے کوشش کرنے لگا۔ اندر کی طرف پردہ لٹکا ہوا تھا اس لیے کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میری اطلاع کے مطابق اس کانچ میں پانچ چھ آدمیاں تھیں۔ چاہیے تھا اور جہاں اتنے لوگ موجود ہوں وہاں ایسی قاتلانہ خیز تھی۔

میں کانچ کی جتنی سمت میں تھا۔ اچانک سامنے کے کمرے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اور اندر کے ساتھ ہی سردار قحلوب کی جینجی ہوئی آواز سنائی دی۔

”خبردار! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔“

میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور جاگی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں پوزیشن کے کرچھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی اور ہم کو کوشش کرے گا مگر کوئی افرا تفری نہیں پچی۔ کوئی شور نہیں مگر میں نے جاگی کو اشارہ کیا اور دوڑا ہوا کانچ کے سامنے اسے پریچنگ کیا۔ واٹک ڈن پر آمد کے سنتوں کی آواز۔ میں پوزیشن پر گھڑا تھا۔ پہلے تو اس نے ہمیں لٹکا لیکن میری آواز سن کر سامنے آ گیا۔ میں دوڑتا ہوا اس کمرے میں آیا جس میں دو آدمیاں تھیں۔ سردار قحلوب ایک بوڑھے آدمی کو راکٹل کی آواز لے کر اٹھا اور وہ بوڑھا خوف سے قمر قمر کانپ رہا تھا۔

اور پھر یہ انکشاف ہمارے لیے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ بوڑھا اس کانچ کا چوکی دار تھا اور دارا و فیروہ آج صبح میرے کانچ خالی کر گئے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے پتا چل گیا کہ آنگ سائک بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کی ٹانگ میں گولی کی کمی۔ میں نے آنگ سائک کا جو جلیہ بتایا بوڑھے نے اس کی تصدیق کی تھی۔

”ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور وہ بھی ڈھکی چھکی۔“

بوڑھے نے بتایا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بوڑھے نے اس کا ہونڈ بتایا تھا اس سے تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ قحلوب تھی۔ بوڑھے کے مطابق اس کے بازوؤں میں گولی لگی تھی۔

”یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟“ میں نے بوڑھے کو چیک دیا۔

”پوچھا۔“

”مہ... پتا نہیں۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میں اپنے گھر پر تھا۔ مالک نے حکم دیا کہ میں کانچ چلا جاؤں اور یہاں میاں آیا تو کانچ خالی تھا۔“

”اس کانچ کا مالک کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“

میں نے سردار قحلوب کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلادیا۔ میرا خیال ہے ہمیں پرے سے ان کے بارے میں پتا چل چکا ہوگا۔ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کانچ میں گھس کر دیکھا۔ وہاں ایک اور شخص تھا۔ وہ زمین میں گاڑی ہوئی تھی۔

”جانتے ہو یا نہیں؟“

”یہ بوڑھا بھلا کیا؟“ میں اپنی زبان بند کر رہا تھا۔

”جانتے ہو یا نہیں؟“ میں نے اس کو دیکھا۔ ”یہ بوڑھا دوسرے سے پتا ہوا ہے۔ اس نے صناعی وغیرہ کی ہوگی۔ میرا خیال ہے اس نے ہمیں کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ گھبراؤ نہیں۔“ اس نے بہت کدھر سے پتا دیا۔ ”دارا قحلوب کو اس وقت تک کوئی خطر نہیں پہنچاے گا جب تک وہ ہمارے سامنے کوئی مطالبہ نہیں کرتا اور تراسے رہ نہیں کر دیتے۔ ہم بہت جلد ان کا نشانہ بنیں گے۔ وہ شہر سے آج ہی رات... آؤ! اب چلیں۔“

سردار قحلوب نے ایک بار پھر بوڑھے کو چیک دیا کہ اپنی زبان بند کر کے تھیں۔ اور ہم دونوں کے لیے روانہ ہو گئے۔ سردار قحلوب میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ مجھے پرے سے کے راستے میں رہا تھا۔

پہلے ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا۔ اس نے ساری زندگی اس لیے میں گزار دی تھی۔ چنانچہ سائین اور آس پاس کی مبینوں میں رہنے والے ایک ایک شخص کو جانتا تھا۔ وہ منشیات کی انٹیکسٹ میں ملوث بھی رہا تھا لیکن ہر وقت پکڑے جانے کا خوف لگا رہا تھا۔ قانون سے بچنے کے لیے اس نے قانون کا سہارا لیا اور ہمیں اس کا ٹیبل بھینچا ہوا تھا۔ پولیس کی روٹی پس لینے کے بعد وہ اپنی آزادی اور دیہات سے منشیات کے اسمگلروں کے لیے ہمارے سنگ۔ صرف ایک ہی پتہ پر ہی گیا تھا۔ اس کے گھر پر دو گنا کا کانچ بنا ہوا تھا۔ ڈونڈن ٹرائی اسٹریٹ واقع سنسری کے گھر میں تھا۔ وہاں سوایا ہوا تھا۔ یہاں سے دنیا بھر کو منشیات سپلائی کی جاتی تھی۔ ایک ایسی جگہ تھی جس میں ہر بے ضمیر اور بے حسیت آدمی کو شیش کر رہا تھا۔

”یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟“ میں نے بوڑھے کو چیک دیا۔

”مہ... پتا نہیں۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میں اپنے گھر پر تھا۔ مالک نے حکم دیا کہ میں کانچ چلا جاؤں اور یہاں میاں آیا تو کانچ خالی تھا۔“

”اس کانچ کا مالک کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“

انٹار سال بعد پولیس چیف کے عہدے پر پہنچ گیا۔

پہلے اس عہدے پر سات سال رہا۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد ان پچیس برسوں میں اس نے بے حساب دولت بنائی تھی۔ پرے سے ہوئی شہر کا دوسرے نمبر سب سے بڑا ہو گیا تھا جس کا ایک حصہ ٹائٹ کلب اور جوئے خانے پر مشتمل تھا۔ پرے سے ہاؤس چھ منزلہ عالی شان بلڈنگ تھی جس میں ہارٹس فلیٹ تھے۔ اس بلڈنگ کے مینٹ ہاؤس میں پرے سے اپنی رہائش تھی۔ مینٹ ہاؤس کی نہ صرف لفٹ الگ تھی بلکہ عقبی گیت سے لفٹ تک جانے کا ایک راستہ بھی الگ تھا۔

ہوٹل اور پرے سے ہاؤس کے علاوہ پرے سے اور بھی بڑی لمبی چوڑی جائیداد بنائی تھی۔ شہر کے نواح میں خوب صورت مقامات پر اس کے کئی کانچ تھے جو بارہ مہینے پر کرائے پر اٹھے رہتے تھے۔ سیاحت کے سیزن کے علاوہ بھی گولڈن ٹرائی اسٹریٹ کے نام کی کشش لوگوں کو اس طرف کھینچ لیتی تھی۔ شہر میں بھی پرے سے کانچ لٹکا پٹکا چھوڑے ہوئے تھے جو مستقل طور پر کرائے پر اٹھے رہتے تھے۔ پرے سے کی بیوی کا عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس نے اس کی بھی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ اس کی ضرورت تو دینے ہی پوری ہو جاتی تھی۔ ہر رات کوئی نہ کوئی حسین عورت اس کے بستر پر سو رہی ہوتی تھی۔ صبح رخصت کر دیا جاتا۔ کوئی عورت بہت زیادہ پسند آتی تو وہ کئی روز تک اس کے ساتھ نظر آتی اور پھر اس کی جگہ کوئی اور عورت لے لیتی۔ ایسی عورتوں کے ہوتے ہوئے پرے سے بیویوں میں مستقل ذخیرہ لٹکے لٹکے نہیں سوچا تھا۔

”میں وہ بے ضمیر لوگ ہیں جو پتہ بھنت کے لیے اپنے ملک سے گھڑا کر کے دشمنوں کا گھر آئے نا راست ہموار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر اپنی ماں کی اچھی قیمت لے تو یہ اس کا بھی سودا کر دیتے ہیں۔“ آخر میں سردار قحلوب کہہ رہا تھا۔ ”اگر یہاں کی پولیس فرض شناس ہوئی تو جہل کھورات جیسے لوگوں کو کبھی اپنے گھٹاؤں سے متقاہد کے لیے ہماری زمین استعمال کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔“

”ٹھیک کہتے ہو سردار۔“ میں نے کہا۔ ”دشمن سینہ چاک کرے تو زیادہ دکھ نہیں ہوتا لیکن اگر زخم اپنوں سے لگے تو کھینچا پھٹ جاتا ہے۔“

ہم باہر میں کرتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچ گئے۔ پہلے کی طرح واٹک ڈن نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ سردار قحلوب پینچر سیٹ پر اور میں جاگی کے ساتھ جینجی سیٹ پر آ گیا۔ جیپ جنگل میں کیے راستے پر دوڑنے لگی۔ اب واٹک ڈن نے ہینڈ بیکس روشن کر لیے تھے۔ ہمارا آج کا یہ مشن طری ناکام رہا تھا۔ جس کا مجھے بے حد افسوس تھا۔ قحلوب اب بھی دارا کے قبضے میں تھی اور وہ لوگ اسے لے کر وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ دارا و فیروہ کو شاید شب ہو گیا تھا

کہ ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے اور اس نے فوراً ہی وہ جگہ چھوڑ دی تھی لیکن میرے ذہن میں یہ سوال کھلبلا رہا تھا کہ اسے یہ شبہ کیسے ہوا ہو گا؟ کیا کرشمہ رات بینک کے دوران میں بینک منت سے دارا کو بتایا ہو گا نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں تھی۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ ہم نے دانگ سائی کو اس کے قلیف سے اٹھایا تھا اور دارا کا پتا معلوم کرنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دانگ سائی دارا کا آدمی تھا جسے پولیس چیف کی سرگرمیوں پر غور رکھنے کے لیے شرمیں چھوڑ گیا تھا۔ دارا سے اس کا رابطہ رہتا تھا اور دانگ مائی کو اٹھانے کے بعد یہ رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ سکتا ہے بعد میں دارا نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہو اور کرشمہ رات جب بینک کے دوران میں ماٹے ساکے لباس میں لگے ہوئے بیٹوں میں ڈسٹا فونز کا انکشاف ہوا تھا تو دارا کو شبہ ہو گیا ہو گا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جو شخص اس خفیہ بینک میں اپنی ایجنٹ کو بھیج سکتا ہے۔ وہ اس کے ٹھکانے کا پتا بھی چلا سکتا ہے اس لیے وہ آج صبح سویرے ہی اس کا بچے سے فرار ہو گئے تھے۔ میں یہ سب کچھ سوچتا ہوں اور جیپ جنگل سے نکل کر پختہ سڑک پر آتی۔ جیپ ایک دو سرے راستے سے شہری حدود میں داخل ہوئی تھی اور جیپ جیسے ہی کوکوئی روڈ پر پہنچی، سردار تھالوب نے دانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سردار تحالوب نے جاگنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہم تین مل جل کر  
تر آئے۔

میں نے سردار تحالوب کی طرف دیکھا اور ہم دونوں اندر  
 داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم ہال میں آئے تھے۔

قاتل ایک ہی تھا اور اب تک کالج ہی میں موجود تھا۔  
 راہداری کے موڑ پر پہنچ کر میں رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔  
 سردار تھالاب بھی کمرے سے نکل کر راہداری میں آچکا تھا۔ میں  
 آگے کی راہداری میں دائیں طرف مڑ گیا۔ اس طرف اندھڑا تھا  
 اور وہ آہستہ آہستہ اس طرف سے سناٹی دی تھی۔ میں دبے قدموں  
 آگے بڑھنے لگا اور بالآخر ایک دروازے کے قریب رک گیا۔  
 دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے ایسی خوشبو آ رہی تھی جس سے مجھے  
 اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کھانہ تھا۔ راہداری  
 کچن سے آگے بائیں طرف گھوم گئی تھی۔

وہ کوئی عورت ہی تھی جو اب بھی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اسے اٹھا کر بچ دیا اور اس کے منہ پر دو چار پھرور طمانچے جڑ دیے۔ اس کے منہ سے صرف ایک مرتبہ ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔

”تم واقعی بہت ہمار ہو۔“ میں نے ایک اور طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے دو آدمیوں کو جس بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے“ اس پر میں تمہیں دو ضرور دوں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب تم یہاں سے بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔“ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن رو پٹی اور دوسرے ہاتھ سے قریب پڑی ہوئی اپنی رائفل اٹھائی ”اب خاموشی سے اندر چلو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایسی ہمار عورت کون ہے جس نے سین فونگ جیسے آدمی کی شہ رگ ادھیڑالی ہے اور، مجھے، اگر تم نے کوئی تکریر کرنے کی کوشش کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔“ میں نے رائفل کی ٹال اس کے پسٹو سے لگا دی۔

سردار تھالوب بھی آوازیں سن کر اس طرف اٹھ آیا تھا اور رائفل تانے دوڑا۔ اسے میں کھڑا تھا۔ ہمیں آگے آتے دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میں اس عورت کو رائفل کی زد پر لیے اندر داخل ہوا اور ہم ہال کمرے میں آگے اور پھر روشنی میں چھپتے سی میں اچھل پڑا۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی شدید حیرت کے تاثرات ابھرتے تھے۔ میں ایک بار پھر مڑ کر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ رنگ سنت کی بیٹی سونیا تھی!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

جب ہم بارے کا کچھ پر ریزہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو سونیا سردار تھالوب کے کالج میں تھی جہاں اس کی تحرائی کے لیے رنگینی اور لونا موجود تھیں۔ اس کے علاوہ کالج کی حفاظت کے لیے انہوں قیدی اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے باوجود سونیا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اگر وہ کس غائب ہو جاتی تو ایک مختلف بات ہوتی۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اسے ہم پر اعتماد نہیں تھا اور وہ بھاگ کر نہیں اور چلی گئی تھی لیکن جو صورت حال ہمارے سامنے تھی وہ نہایت حیرت انگیز اور ناقابل یقین سی تھی۔ دو بے گناہ آدمیوں کو قتل کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور ایک عورت کے حوالے سے تو یہ بات ناقابل یقین سی لگتی تھی لیکن جو حقیقت ہمارے سامنے تھی اسے بھٹایا نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے سونیا کی طرف دیکھا۔ اس کا لباس خون آلود تھا۔ ہاتھوں اور جسم کے مختلف حصوں پر بھی خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ سردار تھالوب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر وہ سونیا کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور ہاتھ روم کا دروازہ

کھولتے ہوئے بولا۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔“

میں بھی دروازے میں کھڑا سونیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر ہاتھ روم سے باہر نکل آئی۔

یہاں رکنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ ہم سونیا کو لے کر باہر آگئے۔ گلی میں ایک طرف تاریکی میں چھپا ہوا داگ ڈن بھی سامنے آگیا۔ ہمارے ساتھ سونیا کو دیکھ کر اس نے بھی شدید حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہاں۔۔۔“

”وقت ضائع مت کرو۔ جلدی سے جیپ تک پہنچو۔“ سردار تھالوب نے اس کی بات کاٹ دی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچ گئے۔ داگ ڈن اور تھالوب تو آگے بیڑہ گئے اور میں سونیا کو لے کر پچھلی طرف آگیا۔ جاگتی بھی سونیا کو دیکھ کر چلیں چھپنے لگی۔

سونیا اب تک خاموش تھی۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی جاگتی کی طرف اور کبھی سردار تھالوب کی طرف دیکھتی لگتی۔ جیپ حرکت میں آئی تھی اور سردار تھالوب ”واگ ڈن سے کہہ رہا تھا کہ جیپ کو شہر والے بنگلے کی طرف لے چلے۔“

”کالج کی طرف کیوں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”سونیا کوئی الجھل وہاں لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔“ سردار تھالوب نے کہا ”یہ چند روز میرے شہر والے بنگلے ہی میں رہے گی۔“

”سونیا۔“ میں نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ وہ سامنے والی سیٹ پر جاگتی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی ”تم کالج سے کیسے نکلی تھیں اور یہ سب کیا ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے۔۔۔“ ”میں اس سب کو ختم کر دوں گی۔“ سونیا نے دانت کچکا پاتے ہوئے جواب دیا ”انہوں نے پہلے میری ماں کو خداری پر مجبور کیا پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“ میں انہیں جہن جہن کر ختم کر دوں گی۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑ دوں گی۔ میری ماں خدار نہیں تھی۔ یہ لوگ خدار ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑ دوں گی جو میرے وطن کا سودا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اس زمین پر جہنم لیا ہے اور اس پر کسی کے تپاؤ کا قدم نہیں پڑنے دوں گی۔ میری ماں۔۔۔ یہ دھرتی بھی میری ماں ہے۔ میں اس کی خاموش پر حرف نہیں آنے دوں گی اور یہ بات کر دوں گی کہ میری ماں خدار نہیں تھی۔ اسے مجبور کیا گیا تھا۔“

سردار تھالوب بھی اپنی سیٹ پر پیچھے کی طرف مڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آج دوپہر میں نے

حب الوطنی کے حوالے سے سونیا سے جو باتیں کی تھیں ”اں کا ۱۱:۱۰“ ہوا تھا اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے سین فونگ جیسے آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دوسرا آدمی غالباً اس کا محافظ تھا۔ ”تم کالج سے نکل کر یہاں تک کیسے آئی تھیں۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ سین فونگ اس بنگلے میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آج شام میں نے تم لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔“ سونیا نے کہا ”واگ ڈن نے تم لوگوں کو بتایا تھا کہ سین فونگ کہاں چھپا ہوا ہے۔ میں جب تمہارے کالج سے نکل رہی تھی تو ایک قابل محافظ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے بتایا کہ تھوڑی دور تک ٹھٹھنے جا رہی ہوں جلدی والہ اس آجائو گی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں سردار تھالوب کی ممان ہوں اور مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے اس لیے وہ میرے راستے سے ہٹ گیا اور میں اطمینان سے باہر آگئی اور پھر یہ بنگلا تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔“

”لیکن وہ دونوں بے گناہ تھے۔ تم سے کیس زیادہ طاقت ور۔“ سردار تھالوب نے کہا ”چلو یہ بان لیا کہ سین فونگ زخمی تھا لیکن وہ دوسرا آدمی، جو شاید اس کا محافظ تھا، تم نے اس کے گلے پر اتنی آسانی سے چھری کیسے چلا دی؟ کیا تمہیں اس پر حملہ کرتے ہوئے ڈر نہیں لگا تھا؟“

”عورت جب کسی سے انتقام لینے کے لیے نکلتی ہے تو اس کے دل میں یہ خوف بالکل نہیں ہوتا کہ اس کا دشمن کتنا قہ آور اور اس سے کتنا زیادہ طاقت ور ہوگا۔ وہ نتائج سے بے نیاز اور انتقام میں اندھی ہو کر اپنے دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے۔“ سونیا نے جواب دیا۔

”لیکن تم اندر کیسے داخل ہوئی تھیں؟“ تھالوب نے پوچھا۔ ”عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور ان جیسے مرد تو عورت کو کچھ کر دیتے ہی بے قابو ہونے لگتے ہیں۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوئی پھر مسکراتے ہوئے بولی ”اور جب بات مجھ جیسی جوان اور حسین لڑکی کی ہو تو کسی ادبایش مرد کا پتا تو ویسے ہی پانی ہو جاتا ہے۔ وہ بھی مجھے دیکھتے ہی ریشہ خمی ہو گیا تھا۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”میں اپنی ایک فرضی دوست کی تلاش میں ساتھ والے کالج کا دروازہ کھٹکتا رہی تھی کہ سین فونگ کا وہ محافظ اپنے کالج سے باہر آگیا۔ وہ شاید کہیں جا رہا تھا لیکن مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں دوسرے کالج کے سامنے سے ہٹ کر اس کے قریب آگئی اور اپنی فرضی دوست کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں اس کے سامنے بالکل مسکین بن گئی تھی اور اسے بتایا کہ میں جیناگ کھونگ سے آئی ہوں۔ میری دوست نے اس علاقے کے کسی بنگلے کا پتا بتایا تھا اور بد قسمتی سے وہ کاندھ مجھ سے کہیں ہو گیا ہے۔ میں اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ رات کہاں گزاروں

گی۔ اس شہر میں تو میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔“ سونیا ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے چند لمبے لمبے سانس لیے پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”میں نے اس کی ہوس میں ڈوبی ہوئی نظروں کو تار دیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت شریف ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ رات کو بے گناہ کی کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا اور پھر میں غلط لوگوں کے ہاتھ بھی لگ سکتی ہوں۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو رات اس کالج میں گزار سکتی ہوں۔ یہاں اس کا پاس ہے جو زخمی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی پیشکش قبول کر لی۔ ”مگر آٹنے کے تھوڑی دیر بعد میں نے تعجب نہ کر لی کہ اس کا زخمی باس سین فونگ ہی ہے۔ سین فونگ کا محافظ ٹوٹ پھوٹ زیادہ سی ہے جہن ہو رہا تھا۔ اس کی بے چینی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اسے شراب پلانا شروع کر دی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے حواسوں سے باہر ہو گیا۔“

”مجھے یقین میں ایک خنجر مل گیا تھا جو میں نے صوفے کے کٹھن کے نیچے چھپا دیا اور جب ٹوٹے قابو ہو گیا تو میں نے خنجر اس کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ وہ چیخا اور تڑپا۔ میں نے اس کے پیٹ اور سینے پر متعدد وار کیے۔ اس کا ہکا پورٹی طرح نہیں لگا تھا۔ میں نے ایک بار پھر شہ رگ پر خنجر چلا دیا۔ اس کا زخرا پوری طرح گئی۔ وہ قالین پر تڑپنے لگا۔ وہ آخری مرتبہ اس طرح اچھلا تھا کہ اس کے دونوں پیر صوفے پر ٹپک گئے اور جسم کا باقی حصہ قالین پر پڑا اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔“

”راہداری والے کمرے سے سین فونگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ڈنڈو کو کار رہا تھا۔ میں خون آلود خنجر لیے اس کمرے میں پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر سین فونگ نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے دھکا دے کر بند پر گرا دیا۔ وہ تکیے کے پیچھے سے پستول نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔“ ”مجھ پر اس وقت خون ساطاری ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ یہ میری ماں کے قاتل اور میرے وطن کے دشمن ہیں۔ میں نے اس کے سینے پر بھروسہ دار وار کیا۔ وہ چیخ کر پست کے بل گرا اور پھر میں نے اسے پستول کا موقع نہیں دیا۔ خنجر کے ایک ہی وار سے اس کا زخرا ادھیڑ ڈالا اور پھر خنجر اس کے سینے میں پوسٹ کر دیا۔“

”میں دور کھڑی اسے بند پر تڑپتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر دھپ کی آوازیں کر چک گئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید ان کا کوئی تیسرا ساتھی آگیا ہے ہو سکتا ہے اس نے دروازہ کھٹکتا ہوا یا کال تیل بجائی ہو جو میں نے نہیں سنی اور پھر وہ دروازہ پر اچھڑ کر اندر آگیا ہو۔“

”میں سین فونگ کے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف دوڑی۔ مجھے کالج کے دونوں طرف بے قدموں پٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔“

میں تیار کیجی کہیں میں دیکھ رہی پھر تم دونوں اندر داخل ہوئے اور جب ہال سے نکل کر سین ٹونک والے کمرے کی طرف گئے تو میں کہیں سے نکل کر پچھلی راہدار میں آگئی اور دوواڑہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن بولٹ بہت ٹائٹ تھا اور جب بولٹ کھلا اور میں جیسے ہی باہر نکلی تو تم نے مجھے دبوچ لیا۔" اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"شکر کو میرا ہاتھ تمہاری گردن پر نہیں پڑا تھا ورنہ تمہارا دم نکل چکا ہوتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہیے اگر ملاحظے بجائے کوئی اور بوٹا تو جانتی ہو تمہارا انجام کیا ہوتا؟"

"میں اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر یہاں آئی تھی۔" سونیا نے جواب دیا "لیکن دوسرے شیطانوں کا انجام بھی میرے ہی ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے قدرت نے میری مدد کے لیے تم لوگوں کو بھیج دیا۔"

"تم جانتی ہو سین ٹونک جزل کھوراث کا خاص آدمی تھا۔ صبح تک اسے سین ٹونک کے قتل کا پتہ چل جائے گا۔ اس کے بعد جو طوفان اٹھے گا اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔" سردار قحلوب نے کہا۔

"کاش! میرے ہاتھ جزل کھوراث کی گردن تک پہنچ سکیں۔" سونیا نے گھبراہٹ سے کہنا "اس کا حشر تو ان سے بھی برا ہوگا۔"

میں نے مڑ کر سامنے دیکھا۔ جب بنگلہ روڈ سے ہوتی ہوئی اس سڑک پر ٹھوکر لگی جس طرف سردار قحلوب کا بنگلہ تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہم بنگلے کے سامنے پہنچ گئے گاڑی نے فوراً ہی بنگلے کا گیٹ کھول دیا۔ جب جیسے ہی اندر داخل ہوئی سامنے سرخ رنگ کی ایک کار کھڑی دیکھ کر سردار قحلوب چونک گیا۔

"یہ کس کی گاڑی ہے؟" اس نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی مہمان آیا ہو۔" وانگ ڈن نے سرخ رنگ کی اس گاڑی کے پیچھے جیپ کو روکتے ہوئے کہا۔

ٹھیک اسی وقت ایک قبائلی محافظ دوڑا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ "کون آیا ہے۔ یہ کس کی گاڑی ہے؟" سردار قحلوب نے پوچھا۔

"بنگالک سے مہمان آئے ہیں۔" محافظ نے جواب دیا "سواراج۔۔۔ ہاں سواراج نام بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ آپ کے مہمان ہیں۔"

"اوہ۔" سردار قحلوب چونک گیا۔

سواراج کا نام سن کر میں بھی اچھل پڑا اور پھر میں جیپ سے اتر کر تیز قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی طرف چل پڑے۔ سواراج اور رتا کون ہال کمرے میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے

تھے۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چاروں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے سواراج کے سامنے رک کر موئے تھائی کی روانہی تقسیم دی۔ مارشل آرٹ کی تقسیم کا یہ انداز ایک طرح کے تھائی رقص سے ملتا جلتا ہے۔ عام طور پر یہ طریقہ کار قدرے طویل ہوتا ہے لیکن بشر اوقات اسے مختصر کر دیا جاتا ہے۔ یہ روانہی رقص ختم کرنے میں نے سواراج کو اور پھر رتا کون اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی پوچھا۔ "سواراج نے آگے بڑھ کر مجھے پہچان لیا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا۔"

"یہ سردار قحلوب ہیں۔" میں نے ان سب کا تعارف کرایا۔ سردار قحلوب نے بڑی گرم جوشی سے ان سب سے ہاتھ ملایا۔ وہ اگرچہ خود بہت بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ اپنے آپ میں شہنشاہ تھا لیکن شہنشاہ کے کزن رتا کون کو اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

سواراج ہتھکڑیوں والے لباس میں تھے۔ گیروے رنگ کی ایک چادر جو سادی کی طرح لپی ہوئی تھی۔ دس پندرہ منٹ رہی گفتگو میں نکل گئے پھر ہم لوگ جلدی اصل موضوع پر آ گئے۔

"ہم لوگ ایک خصوصی طیارے سے جینگا رائے پہنچے تھے۔" سواراج بتا رہے تھے "ہاں سے کار کے ذریعے یہاں آ گئے۔ سردار قحلوب کا یہ بنگلہ تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہماری آمد کا علم صرف دو چار لوگوں کو ہے۔ جینگا رائے یا یہاں کی انتظامیہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ہم آج رات ہی واپس چلے جائیں گے اس لیے رتا کون کی بھی یہ خواہش ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر ہمیں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا جائے۔"

سواراج کے خاموش ہونے پر میں نے اور سردار قحلوب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بنگالک سے روانہ ہونے کے لیے اب تک پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات بتائے گا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا۔

"سواراج قحلوب نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مجھے ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس سازش کو بے نقاب کرنے میں بہت دشواریاں پیش آتیں۔"

"ہمیں سردار قحلوب جیسے لوگوں پر فخر ہے۔" رتا کون نے کہا "اس سرحدی علاقے میں منشیات کی پیداوار کے خاتمے کے لیے سردار قحلوب جو کھرا دوا کر رہے ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور اب اس سازش کو بے نقاب کرنے میں ہمارا ساتھ دے کر انہوں نے صرف شہنشاہ پر ہی نہیں پوری تھائی قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں شہنشاہ سے خاص طور پر سردار قحلوب کا ذکر کروں گا۔ شہنشاہ ان کی خدمات کا اعتراف۔"

"پھر رہائی نہیں!۔" سردار قحلوب نے بڑے متوجہانہ انداز میں

رتا کون کی بات کافی "میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، وہ کسی صلے یا مدد کے لیے نہیں کیا۔ ہر محب وطن شہری کی طرح مجھے بھی شہنشاہ اور اس سرزمین سے محبت ہے اور اس محبت میں ہم جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے لیکن۔۔۔" سردار چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "لیکن میرے خیال میں یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے پھر رہائی نہیں۔ اس سے پہلے کہ سازش عناصر کوئی اور قدم اٹھائیں ہمیں کارروائی شروع کرینی چاہیے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" رتا کون نے کہا "کیا مائی اور وہ کیسٹ کہاں ہیں؟"

"اس کے لیے آپ کو دوسری جگہ جانے کی زحمت کرنی پڑے گی پھر رہائی نہیں۔" سردار قحلوب نے کہا۔

"تو چلو۔ اب ہمارے پاس واقعی زیادہ وقت نہیں ہے۔" رتا کون نے کہا۔

ہم سب کانچ سے باہر آ گئے۔ سونیا برآمدے کے سامنے ہی لان میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"پھر رہائی نہیں۔" سردار قحلوب نے سونیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ وہ لڑکی جس کی ماں کو غداری پر مجبور کیا گیا تھا۔ وہ ان غداروں ہی کے ہاتھوں ماری گئی اور اس لڑکی نے اپنی ماں کے نام سے غداری کا دھماکا مٹانے کے لیے جزل کھوراث کے اہم ترین آدمی سین ٹونک کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس لڑکی کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو شہنشاہ اور وطن کی ناموس کے لیے اپنی جان بھینچنے پر تیار تھیں۔"

سونیا اس دوران میں اٹھ کر ہمارے قریب آگئی تھی۔ رتا کون کئی لمحوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ سونیا کے لباس پر اب بھی خون کے دھبے موجود تھے اور پھر رتا کون نے اس کے بہرے کو دونوں ہاتھوں میں قہقہہ کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

پہلے سردار قحلوب کا خیال تھا کہ سونیا کو چند روز کے لیے اس بنگلے میں چھوڑ دیا جائے گا لیکن اب ہم اسے بھی اپنے ساتھ کانچ لے جا رہے تھے۔

سواراج ہماری جیپ میں آ گئے تھے اور سردار قحلوب رتا کون والی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ ہماری جیپ آگے تھی۔ اس کے پیچھے رتا کون والی سرخ کار اور سب سے پیچھے ایک کھلی گاڑی میں سردار قحلوب کے سوا قبائلی محافظ بھرے ہوئے تھے۔

ہمیں کانچ پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جاگتی سواراج کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور پھر وہ مارے آواز کو نظر انداز کرتے "سواراج! یہ لپٹ گئی اور فوراً جذبات سے اس کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے۔" سواراج اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے "امانت دیتے رہے۔"

رتا کون کو سب سے پہلے کانچ میں ہونے والی میٹنگ کی گفتگو

پر مشتمل کیسٹ سنایا گیا پھر وہ کیسٹ سنایا گیا جو ایک مائی اور ہماری گفتگو پر مشتمل تھا۔ رتا کون اور اس کے دونوں ساتھیوں کے چہروں کے تاثرات ہر لمحہ بدل رہے تھے۔ رتا کون کے وہ دونوں ساتھی حکومت کے اعلیٰ عہدے دار تھے۔ آخر میں۔۔۔ انہیں لے کر ہم اس کمرے میں آ گئے جہاں ایک مائی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ رتا کون کو دیکھ کر ایک مائی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

رتا کون اور وہ دونوں آدمی تقریباً آدھے سنئے تک ایک مائی سے سوالات کرتے رہے۔ اس کانچ میں رتا کون کو دیکھ کر ایک مائی سمجھ گئی تھی کہ اب اس کے بچے کا کوئی راستہ نہیں ہے اس نے رعایت کے وعدے پر وہ سب کچھ اچھل دیا جو ہمیں بتانے سے انکار کرتی رہی تھی۔ اس نے اس سازش میں شریک کی بڑے نام بھی بتائے تھے اور ان میں شاہی محل کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔ ہال کمرے میں آکر رتا کون نے نیلی فون اپنے سامنے رکھ لیا اور تقریباً چالیس منٹ تک بنگالک میں مختلف لوگوں کو فون کرتا رہا اور ریسپورڈر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سردار قحلوب!۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں آپ کی میزبانی کو بیش بہا اور کھوں گا۔ اب سے تعویذ دیر بعد بنگالک میں کارروائی شروع ہو جائے گی۔ صبح سے پہلے پہلے میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔ یہ سارے معاملات طے ہو جائیں تو ہماری آپ سے ملاقات ہوگی۔"

"آپ ہمیں بیش بہا شہنشاہ اور اس سرزمین کا وفادار پائیں گے لیکن پھر رہائی نہیں۔ میزبانی کا تو آپ نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا۔" سردار قحلوب نے کہا۔

"آپ کی عدم موجودگی میں ہم آپ کے بچے پر بہت لذیذ کھانا کھا چکے ہیں۔" رتا کون نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک کپ کافی۔۔۔۔۔ ہماری طرف سے۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "تو بہت خوش ذائقہ کافی بنا ہے۔ آپ ہونٹ چاہتے رہ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر ہو جائے ایک کپ۔" رتا کون کہتے ہوئے پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

لونا کا چہرہ دکھ اٹھا تھا۔ شاہی خاندان کے ایک معزز ترین فرد کو کافی بگاڑ دیا اس کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

میں سواراج کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ سواراج میری اس کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ وہ بار بار میری تعریف کر رہے تھے تاہم تھائی کے لیے وہ بھی پریشان تھے۔

"مجھے امید ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم اسے بھی پانچاب کراؤ گے۔" سواراج کہہ رہے تھے "اس کے بعد بھی تھیں چند روز یہاں رہنا ہوگا۔ جزل کھوراث کے نئی آدمی مارے گئے ہیں۔ سین ٹونک تو اس کا اہم ترین آدمی تھا۔ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ دارا وغیرہ بھی نہیں ہیں اور اٹھک سائیک بھی ابھی تک

دوپوش ہے۔ ان لوگوں سے تم ہی کو نمٹنا ہے۔ بنگا میں آج ہی رات سے بنگاے شروع ہونے والے ہیں۔ ان پر قابو پانے میں دو چار دن لگ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہیں واپس بلایا جائے گا۔“

”ہو سکتا ہے میں واپس نہ آسکوں مہاراج۔“ میں نے مدغم لہجے میں کہا۔ ”میرے ماں باپ کے قاتل ابھی زندہ ہیں۔ تمہاری ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ میں جب تک انہیں کیفر کردار تک نہ پہنچاؤں گا اس وقت تک جہنم سے نہیں نبھوں گا۔“

”یہ معاملہ ختم ہو جائے تو تمہیں بھی فری ہینڈ دیا جائے گا۔“ مہاراج نے کہا۔ ”حکومت کی ساری مشینری بھی تمہارے ساتھ ہوگی اور پھر وہ لوگ بچ کر نہیں جائیں گے۔“

اس دوران میں لومنا نے کافی سرو کرنا شروع کر دی۔ میں جانتا تھا کہ مہاراج شام کے بعد کچھ نہیں کھاتے پیتے تھے لیکن میرے اصرار پر انہوں نے اس وقت کافی پینا قبول کر لیا۔

کافی واقعی بہت خوش ڈانٹہ تھی۔ رتنا کون اور مہاراج وغیرہ نے تعریف کی تو ڈانٹہ خوشی سے جموٹا اٹھا۔

اس دوران میں سردار تھالوب نے فون کر کے مسلح محافظوں کی ایک اور گاڑی منگوائی تھی۔ رات دو بجے کے قریب مہاراج اور رتنا کون رخصت ہو گئے۔ محافظوں کی ایک گاڑی آگے تھی۔ اس کے پیچھے مہاراج اور رتنا کون کی کار اور پیچھے مسلح محافظوں کی دوسری گاڑی۔ رتنا کون کا ایک ساتھی محافظوں کی اگلی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور کار میں پچھلی سیٹ پر رتنا کون کے دوسرے ساتھی اور مہاراج کے درمیان زخمی ایلی مائی کو بٹھا دیا گیا تھا۔

محافظوں کو چپانگ رائے تک ان لوگوں کے ساتھ جانا تھا۔ رتنا کون کی آمد کو اگرچہ خفیہ رکھا گیا تھا لیکن بعض اوقات ٹاپ سکیورٹ معاملات دوسروں کی نظروں میں آجاتے ہیں اور جب معاملہ اتنی بڑی سازش کا ہو تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ نجانے سردار تھالوب کو یہ شبہ کیوں تھا کہ نہایت رازداری کے باوجود رتنا کون کی آمد بھی راز میں نہیں رہی ہوگی اس لیے اس نے اپنے مسلح محافظہ بیٹانگ رائے تک ان کے ساتھ کر دیے تھے۔

”اب کیا خیال ہے۔“ ان کے جانے کے بعد سردار تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پریرے کی گردن ٹاپی جائے۔ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ دارالوگ کہاں ہیں؟“

”ہاں۔ چلو۔“ میں کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”زیادہ تاخیر تمہاری کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

اس مشن پر بھی ہم چاروں تھے۔ میں، سردار تھالوب، جاگی اور وانگ ڈن۔ سردار تھالوب بہت بڑے پھیلے کا سردار تھا لیکن وہ ایک معمولی آدمی کی طرح میرے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ ان سرکاریوں میں اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔ وہ واقعی بہت عظیم آدمی تھا۔

تمہک چارو روڈ پر واقع پریرے ہاؤس تک پہنچنے میں ہم زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ جب اس چھ منزلہ عمارت سے چند گز دور ہی رگ گئی۔ میں نے جاگی کو اشارہ کیا۔ وہ جب سے اتر کر عمارت کے مرکزی دروازے کی طرف چلے گئے۔

پریرے ہاؤس کا آہنی سلاخوں والا گیٹ بند تھا۔ جاگی گیٹ کے قریب رک کر چوکیدار کو آواز دیں دینے لگی۔ چند منٹ بعد ہی گیٹ کے دوسری طرف چوکیدار دکھائی دیا۔ ہماری جیب بلڈنگ کے سامنے والے رخ پر زور آگے کھڑی تھی۔ جیب کی تمام قبائل بھی ہوئی تھیں۔ ہم ٹوئٹ پر چوکیدار کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ ہمیں جیب میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جاگی چوکیدار سے باتیں کرتے ہوئے ہاتھ سے دائیں طرف کچھ اشارے بھی کر رہی تھی۔ چوکیدار نے سلاخوں ہی سے اس طرف دیکھنے کی کوشش کی پھر گیٹ کھول دیا اور جاگی کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے گیٹ بند بھی کر دیا۔

میں جیب کے بیٹھے سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک بہت کشادہ لابی تھی۔ چوکیدار جاگی کو لے کر دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفگی سی مسکراہٹ تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد جاگی اس کمرے سے نکل کر مین پر نمودار ہوئی۔ اس کا بلاؤڈ پینا ہوا تھا اور ایک طرف برہنہ پیرو تین خراشیں نظر آ رہی تھیں جیسے ناخنوں سے نوپنے کی کوشش کی گئی ہو۔

میں اور سردار تھالوب جیب سے اتر کر گیٹ کی طرف چلے۔ جاگی گیٹ کا ٹالا کھول رہی تھی اور پھر گیٹ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہو گئے۔

”یہ کیا ہوا؟“ میں نے اس کے سینے پر خراشوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اس خرابی کو گریبان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا تھا۔“ جاگی نے کہا۔ ”بہر حال تم لوگ جاؤ۔ اگر وہ ہوش میں آجھی کیا تو میں اسے سنبھال لوں گی۔“

جاگی گیٹ بند کر کے اس کمرے میں گھس گئی اور ہم دونوں اس لفٹ کی طرف لپکے جو صرف ہنٹ ہاؤس کے لیے مخصوص تھی۔

لفٹ کا دروازہ بند تھا۔ سردار تھالوب نے مین دیوار لیکن دروازہ نہیں کھلا اور نہ ہی دروازے کے اوپر بند سون والی پینٹ روشن ہوئی جس کا مطلب تھا کہ لفٹ اوپر چلی اور لاگ کر دی گئی تھی۔ ہم دوسری لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ یہ لفٹ گارڈز فلور پر تھی۔ مین دیوار ہی دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ دروازہ بند ہونے ہی تھالوب نے چھ کے ہنڈے والا مین بلایا۔ پھر رائٹلیں ہم نے جیب میں ہی چھوڑ دی تھیں۔ میرے پاس

خارجہ پتلون کے پانچنے کے اندر پینڈی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ہپ ہٹ میں ہسپتال بھی موجود تھا اور سردار تھالوب کے پاس بھی بھل تھا اور میرا خیال تھا کہ ہمیں اس کے سوا کسی اور اختیار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لفٹ چھ منزل پر کی تو ہم باہر نکل آئے۔ راہداری سنسان بن چکی۔ رات کا آخری پیر تھا اور لفٹوں کے کین خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ہم دے دے دھموں چلتے ہوئے اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔ زینے کا اوپر والا دروازہ بند تھا۔ سردار تھالوب چند لمبے پینڈل پر زور آزمائی کر رہا تھا پھر اس نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اس میں تین چابیوں کے علاوہ بغیر ہنڈے کا ایک چپنا سا تار بھی تھا۔ وہ تار کو کی ہول میں داخل کر کے مخصوص انداز میں حرکت دینے لگا۔ باپوسی نہیں ہوئی۔ ایک منٹ کے اندر اندر کلک کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور ٹالا کھل گیا۔ تھالوب نے پینڈل چھڑا کر آہٹلی سے دروازہ کھول دیا۔

دوسری طرف دروازے کے آگے ایک کشادہ سا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے پوری چھت کھلی ہوئی تھی لیکن اس چھت کو عمارت سے استحال میں لایا گیا تھا۔ چھت پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑا خوب صورت روف گاڑن بنا ہوا تھا۔

جی میں توڑے توڑے فاصلے پر تین مرکزی ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ لان کی گھاس بہت بدبو تھی۔ یہاں پھولوں کے وہ پتے لگائے گئے تھے جن کی جڑیں زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے اطراف میں پھیل جاتی ہیں۔ لان میں ایک طرف آرام وہ گاڑن بیڑے اور ان کے ساتھ بائیں کی کھچھپوں کی ایک کافی ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس روف گاڑن پر بلاشبہ لاکھوں بھات خریج کیے گئے تھے۔

پریرے ہاؤس شری کی دوسری سب سے اونچی عمارت تھی اور یہاں سے پریرے شہر اور اس کے اطراف میں دور دور تک کا نظارہ پایا جاسکتا تھا۔ چھت کے دائیں سرے پر ایک مختصر سا سرونٹ آواز تھا جس کی صرف ایک کھڑکی سے مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سردار تھالوب کو وہیں دیکھ کر اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھانا ہوا سرونٹ کو اڑتی کی طرف چل پڑا۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا دروازہ قامت آدمی بیٹھ رہا تھا۔ میں نے سرونٹ کو اڑنے کے دروازے کا باہر سے لٹکا لگا دیا اور سردار تھالوب کے پاس واپس آیا۔

بائیں طرف ہنٹ ہاؤس تھا۔ باہر سے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس پر بے دریغ رقم خرچ کی گئی تھی۔ مرکزی دروازے کے سامنے ایک خوب صورت برآمدہ تھا جس کی چھت پر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ دو تین کمروں کی کھڑکیوں میں بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔

میں اندازہ نہیں تھا کہ پریرے اکیلا ہو گیا اس کے کوئی

سمان بھی موجود ہوں گے لیکن سردار تھالوب نے پریرے کے بارے میں جو بتھوایا تھا اس سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنی عیاشی میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ اس کے ساتھ کوئی حسین عورت تو ضرور ہوگی لیکن کسی دوسرے آدمی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا لیکن سردار تھالوب کی طرح میں نے بھی احتیاطاً ہسپتال ہاتھ میں لے لیا تھا۔

برآمدے والا دروازہ لاک نہیں تھا۔ یہاں کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا اور شاید اسی لیے دروازے کو لاک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ ہم دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ ایک کشادہ لابی تھی جس سے ایک راستہ لفٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا مرکزی ہال کی طرف۔ ہال میں اگرچہ کوئی جی نہیں مل رہی تھی لیکن کسی اور طرف سے وہاں روشن پنچ رہی تھی۔ ہال میں پہنچ کر ہم ایک لمبے کو رسکے میں نے سردار تھالوب کو بائیں طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف مڑ گیا۔

ایک کمرے کا دروازہ آدھے کے قریب کھلا ہوا تھا۔ اندر جی جل رہی تھی۔ میں نے جھانک کر اندر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرا داغ گھوم گیا تھا۔ سانس ایک دم بے ربط ہو گیا تھا۔ اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد میں دروازے میں جھانکے لگا۔

کمرہ کافی کشادہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ٹھنکی کور والے چار پانچ بھاری کھنڈ اور پھر بڑے تھے۔ ایک طرف پورٹ اسیل آئس باکس اور اس کے قریب شراب کی کئی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ تین چار خالی بوتلیں اور گلاس ادھر ادھر بکھرتے ہوئے تھے اور کمرے کے وسط میں قالین پر سب سے زیادہ خوفناک منظر یہ تھا کہ درمیانے قد کا ایک بھاری مجسمہ آدمی پڑا ہوا تھا۔ اس کی توند ہمارے کی طرح پھول چپک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت جس نے اپنا سر آدمی کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں بند تھیں لیکن لڑکی کے جسم پر اس آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں متحرک تھیں۔ اس کے ہونٹ بھی حرکت کر رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اسی دوران میں تھالوب بھی دے دے دھموں چٹا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اندر کی طرف اشارہ کیا۔ سردار تھالوب نے اندر جھانکا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدید غرت کے اثرات ابھر آئے تھے۔

میں نے ہسپتال جیب میں ڈال کر پینڈی پر بندھا ہوا خبر نکال لیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا، سردار تھالوب نے دروازے پر زور دار ٹھوکر ماری۔ دروازہ دھڑکی آواز سے پوری طرح کھل گیا۔

پریرے اور وہ لڑکی گڑ بڑا کر اٹھ گئے۔ ہمیں دیکھ کر اس لڑکی



کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ دھواں ہو کر کمرے کے ایک کونے میں پڑے ہوئے اپنے کپڑوں کی طرف لپکی لیکن وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔ سردار قحلوب کے چیر کی ٹھوکر کھا کر وہ چیخ ہوئی چیچے الٹ گئی تھی۔

پیرے نے بھی ایک طرف لوٹ لگا دی تھی لیکن اسے میرے چیر کی ٹھوکر سے روک دیا۔ ٹھوکر اس کے شانے پر لگی تھی۔ وہ بلا ہلا اٹھا۔ میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ چیچے الٹ کر دیوار سے ٹکرایا۔

”کسک۔ کون ہو تم۔۔۔؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہلکایا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا ”تم یہاں آتے ہو لیکن واپس نہیں جاسکو گے“

”جس طرح ہمیں یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکا اسی طرح واپس جانے سے بھی کوئی نہیں روک سکے گا۔“ میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارا تو بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس نے خون خوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر سردار قحلوب کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”تھا۔۔۔ قحلوب تم۔۔۔“ اس کے منہ سے آواز بے شکل نکل رہی تھی ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیرن قبیلے کے سردار نے ڈاکا زنی بھی شروع کر دی ہے لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں گھریں زیادہ رقم نہیں رکھتا اس لیے تمہیں بڑی مایوسی ہوگی۔“ سردار قحلوب نے آگے بڑھ کر اسے دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں۔

”تم چیتے لوگوں کے پاس ہو بھی کیا سکتا ہے۔“ سردار قحلوب نے کہا ”میں تمہیں صرف دو منٹ دے رہا ہوں۔ کپڑے پہن لو اور تم بھی۔“ آخری الفاظ اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے جو ایک طرف بیٹھی تھوکر قحلوب رہی تھی۔ اس نے جھپٹ کر اپنے کپڑے اٹھا لیے۔ پیرے کے کپڑے میرے قریب پڑے ہوئے تھے جو میں نے پیرے کی طرف اچھال دیے۔

”دیکھو پیرے۔۔۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے جانتے نہیں لیکن میرا نام ضرور سنا ہو گا۔ میں وہ شخص ہوں جو اپنے دشمن کو بھی معاف نہیں کرتا۔ تم سے میری کوئی دشمنی تو نہیں ہے لیکن ایسا کرنے میں کوئی دیر بھی نہیں لگتی۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک جواب دے دو تو ہم جس طرح خاموشی سے یہاں آئے تھے اسی طرح خاموشی سے واپس چلے جائیں گے لیکن اگر تم اپنی کسی ضد پر قائم رہے تو میرا یہ خنجر بہت دنوں سے پاسا ہے۔ میں اس کی پیاس اس طرح بجھاؤں گا کہ وہ دھن دھن سے تمہارے جسم کی ہڈیاں کاٹ کر پھینکا رہوں گا۔ اور۔۔۔“

”اچھا بول لیتے ہو۔“ پیرے نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا

”لیکن تمہارا اب تک جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے وہ یقیناً بھل تھے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ تم جیسے کیڑوں جرموں کو سلاخوں کے پیچھے بند کر چکا ہوں۔ پولیس سے رشتہ ہو جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے ہاتھ بیرون کو زندہ لگ گیا ہے۔ تم جیسے قہر زورٹ خنڈوں کی گردن تو میں اب بھی موڑ سکتا ہوں۔ میں ان لوگوں کی طرح بھول نہیں کہ میرے ہاتھ تمہاری گردن تک نہیں پہنچ سکیں۔“

”وہ لوگ واقعی بزدل ہیں۔“ میں نے کہا ”اگر بزدل نہ ہوتے تو اس طرح جھپٹتے نہ بھرتے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ اس وقت کہاں چپے ہوئے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن تمہیں بتاؤں گا۔“ پیرے نے جواب دیا ”اگر تم جیسے غنڈوں سے ڈرنے والا ہوتا تو پولیس چیف کے عہدے تک نہ پہنچتا۔“

”مجھے معلوم ہے تم پولیس چیف کے عہدے تک کس طرح پہنچتے تھے لیکن۔۔۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا ”لیکن اگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں چپے ہوئے ہیں تو میں تمہیں کچھ اور اذیوار پہنچا دوں گا۔“

”کو شش کر دیکھو۔“ پیرے کا لہجہ طش دلانے والا تھا۔ ”سردار قحلوب۔ آپ ہمارے بیچ میں نہیں آئیں گے“ میں نے اپنا خنجر قحلوب کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر میں چپے ہی آگے بڑھا۔ پیرے نے حیرت انگیز بھرتی اپنی جگہ سے اچھا۔ اس نے مجھے فلائنگ کلک لگانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں بھی تو غافل نہیں تھا۔ میں نے صرف تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا بلکہ اس کی ٹانگ پکڑ کر ہوا میں زوردار ہٹا دیا۔ وہ منہ کے بل پیچھے گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کی اس ایک حرکت سے میں سمجھ گیا کہ وہ مارشل آرٹس میں بھی مہارت رکھتا ہے اور اس میں اب بھی اتنا دم ختم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو چیلنج کر سکے۔

وہ ابھی سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے ہینٹ کل مارنے کے لیے ہیر اٹھایا۔ پیرے نے بڑی بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ سے میری کلک کو روکا اور میں نے اس سے بھی زیادہ بھرتی سے کام لیتے ہوئے پوری قوت سے راتھ کلک لگا دی۔ ضرب اس کے پهلویں گڑھے کی جگہ پر لگی۔ وہ ہری طرح ہلا اٹھا اور پھر میں نے اسپین کلک لگائی۔ میرا بیرونی ہتھوڑے کی طرح اس کے منہ پر لگا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ چپے ہی سیدھا ہوا میری راؤنڈ ہاؤس کلک اس کی گردن پر لگی۔ وہ لڑکھڑکھ کر گر کر۔۔۔ سوئے تھا۔ قحلوب کی راؤنڈ ہاؤس کلک مارشل آرٹس کے تمام اسٹاکل میں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ پوری قوت سے آگے بڑھ کر یہ بڑی ٹوٹ جاتی ہے لیکن میں نے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی تھی۔ یہ کلک پوری قوت سے لگتی تو اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی

نہی۔

پیرے کا لین بڑا چیخ ہوا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھ لڑاکار غلطی کی تھی۔ وہ یقیناً بہت اچھا مارشل آرٹسٹ رہا ہو گا لیکن شراب اور عورت نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ میں نے سردار قحلوب کے ہاتھ سے اپنا خنجر لے لیا اور اس کی ٹوک پیرے کے پیٹ پر رکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں پتا چل گیا ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو اس لیے ضد پر قائم رہنا تمہارے لیے نقصان دہ ہو گا۔ بہتری ہے کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو۔“

”میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ پیرے نے کہا۔

”آج صبح تک وہ تمہارے ہی ایک کالج میں تھے۔“ میں نے کہا ”یقیناً اس وقت بھی وہ تمہارے ہی کسی کالج میں چپے ہوئے ہیں۔ بہتر ہے ان کا پتا بتا دو۔“

”نہیں۔“ پیرے نے جواب دیا۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور خنجر کی نوک سے اس کے پیٹ پر تقریباً دو انچ لمبا زخم لگا دیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے کمرے کی طرح ہلکانے لگا۔ زخم سے بننے والا خون اس کے پیٹ اور نیچے کا لین کو تر کر دیا۔

”تم بھول رہے ہو کہ ہم اس وقت چھ منزلہ عمارت کی چھت پر ہیں۔ اگر تم لاڈلا ہتیکر بھی کلاو تمہاری چھتیں کہیں بھی نہیں کی جاسکتی گی۔ میں تمہارے جسم پر چرے لگاتا رہوں گا۔ اس وقت تک جب تک تم زبان نہیں کھولتے۔“

”نہیں!“ پیرے نے چیخا ”تم چاہو تو مجھے مار ڈالو۔ کل۔۔۔ صرف کل کا دن۔ اس کے بعد تم بھی زندہ نہیں رہو گے۔ جہل کھوڑاٹ کے آدمی تمہیں اور دوشی قبیلے کے اس سردار کو کل شام سے پہلے پتلے جنم میں پھینکا دیں گے۔“

میں نے اس کے پیٹ پر ایک اور چرکا لگا دیا۔ وہ قاتلین پر زخم لگانے میں نے گردن کھمکھ کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی قہر قہر کانپ رہی تھی۔ سردار قحلوب بھی خاموش کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو پیرے۔۔۔“ میں اس کے قریب گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا ”تم نے زندگی بھر بے ایمانی کر کے یہ دولت جمع کی ہے۔ اگر ابھی میرے ہاتھوں مارے گئے تو کیا فائدہ اس دولت کا۔ تمہاری صحت خرابی ہے کہ اگر کوئی سنگین حادثہ پیش نہ آئے تو مزید کئی سال زندہ رہ سکتے ہو۔ یعنی کئی سال تک عیاشی کر سکتے ہو۔ بہتر ہے کہ اس وقت مرے تو زنج مت دو اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ اگر تم دارا وغیرہ کے بارے میں بتا دو تو۔۔۔“

”تمہیں بتاؤں گا۔“ پیرے نے جواب دیا ”تم مجھے مار نہیں سکتے کیونکہ ان کے بارے میں صرف اور صرف میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔“

”میں تمہیں ماروں گا نہیں۔ زندہ رکھوں گا مگر اس طرح کہ تم مرنے کی دعا مانگو گے اور تمہیں موت نہیں آئے گی۔“ میں نے کہتے ہوئے اس مرتبہ اس کے بازو پر چرکا لگا دیا۔ وہ ایک بار پھر ہلایا اٹھا۔

”پیرے کو چھوڑ کر الگ ہٹ جاؤ ماسٹر!“

دروازے کی طرف سے یہ نروائی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ وہ آواز لمبی کی غراہٹ جیسی تھی۔ میں نے تیزی سے مرکز اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ایک دروازہ قامت خوب صورت لڑکی تھی۔ منی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ بال بکھرے ہوئے اور میک اپ بگڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ تین آٹھ کا ڈونری ریو اور قحلب جس سے اس نے مجھے اور سردار قحلوب کو زد میں لے رکھا تھا۔

قاتلین پر پڑے ہوئے پیرے نے زخمی ہونے کے باوجود زور دار قہقہہ لگایا اور بڑی بھرتی سے میرے ہاتھ سے خنجر چھین لیا اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر حملہ بھی کر دیا۔ اگر میں تیزی سے ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو خنجر میرے پیٹے میں بیست ہو جاتا۔

”ہتھول پیچک دو سردار قحلوب!“ لڑکی نے ریو اور سے اشارہ کیا۔ سردار قحلوب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھ کا گوشہ دبا دیا۔ سردار قحلوب نے ہتھول پیچک دیا۔

”میں نے تم لوگوں کو برآمدے میں دیکھ لیا تھا اور اسی وقت مجھے گھڑ کا احساس ہو گیا تھا۔“ لڑکی نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے شراب ضرور پی تھی لیکن حواس نہیں کھوئے تھے۔ گھڑ کا احساس ہونے ہی میں یہاں سے نکل کر دو سرے کمرے کے ہاتھ روم میں گھس گئی تھی اور سردار قحلوب جب تم اس کمرے میں آئے تھے تو میں نے ہاتھ روم کے دروازے کی جھری سے جھپٹ دیکھ لیا تھا۔ تمہارے کمرے سے نکلنے کے بعد میں کافی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گی اور نیچے جا کر بلڈنگ کے چوکیدار کو بتا دوں گی۔ وہ پولیس کو اطلاع دے دے گا لیکن پھر بینہ پر تیکے کے نیچے رکھا ہوا یہ ریو اور دیکھ کر میں نے بھانسنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ پیرے اور دیا کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ جانا بزدلی ہوتی اس لیے میں نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے افسوس ہے مسٹر پیرے۔“ اس نے پیرے کی طرف دیکھا ”مجھے کچھ دیر ہو گئی اور تمہیں یہ زخم کھانے پڑے۔“

”میں ان زخموں سے بچنے والے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گا اس حرای سے۔“ پیرے نے میری طرف دیکھ کر غرایا۔

”تم واقعی بت رہا ہو ہے لی۔“ میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پُر سکون لہجے میں کہا ”لیکن یہ ریو اور پیچک دو۔ میں

وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

”تم زندہ بچے گئے تو مجھے کچھ کہو گے نا۔“ لڑکی نے جواب دیا اور پھر بربرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”مستر بربرے! تم دن پہلے جب میں دارا کے پاس تھی تو اس نے بتایا تھا کہ یہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس نے بنکاک میں بیڑو کے گردہ کو نچا کر رکھا تھا۔ بیڑو کا بھائی سائی اور ٹائیگر اسی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ یہ بہت سفاک آدمی ہے۔ اس کی موت بھی ایسی ہی ہونی چاہیے کہ اڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے اور یہ تھالوب۔۔۔ وہ سردار تھالوب کی طرف دیکھنے لگی ”میں تھالوب قتل و غارت میں اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا ہے۔ سین فونک کے کئی آدمی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اگر تھالوب اس کا ساتھ نہ دیتا تو یہ حرامی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مارا جاتا کسی کے ہاتھوں۔ تھالوب کی سرداری اب ختم ہو چکی۔ اس کی زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ سردار تھالوب۔“ اس نے آخری الفاظ تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے اس نے ریو اور دو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

بربرے اگرچہ زخمی تھا لیکن وہ خنجر والا ہاتھ آگے کو نکالے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں کن انھیں سے کبھی بربرے کی طرف دیکھتا اور بھی اس لڑکی کی طرف ٹریگر پر اس کی انگلی کا بڑا بڑھ رہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے بڑی بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہپ پانٹ سے ہسٹل نکال کر فائر کیا۔

بہت وقت دو فائر ہوئے تھے میرے ہسٹل سے نکلنے والی گولی اس لڑکی کے سینے میں لگی جو تھالوب پر گولی چلانے والی تھی۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی وہ لڑکھائی اور اس کے ساتھ ہی اس کی انگلی سے ٹریگر دب گیا۔ ریو اور سے نکلی ہوئی گولی سردار تھالوب سے چند فٹ دور کھڑی ہوئی دوسری لڑکی کے سر میں لگی اور وہ بھی چیختی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔

بربرے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ خوف و وحشت سے اس کا چہرہ حواں ہو رہا تھا۔ وہ جیسی جیسی نظروں سے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے قابو ہو کر مجھ پر حملہ کر دے گا لیکن میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دوسرے ہی لمحے بربرے نے دروازے کی طرف چھٹاک لگا دی۔

میں بھی اس کے پیچھے ہی لپکا۔ بربرے باہر نکل گیا تھا اور زینے کے دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک ہی خیال ابھرا ”وہ زینے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے فائر کیا۔ گولی بربرے کے پیروں کے قریب لگی۔ وہ مڑ کر بھت کے دوسرے سر پر واقع سردنٹ کو اڑھائی کی طرف دوڑنے لگا۔ ساتھ ہی وہ چیخ بھی رہا تھا۔ میں نے اس کے پیروں میں ایک اور فائر کیا۔ وہ

لڑکھائی کر گھاس پر گر ا۔

میں اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ سردنٹ کو اڑھائی کا دونوں اندر سے دھڑ دھڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بربرے ملازم فائزنگ اور اس کے پیچھے کی آوازوں سے جاگ گیا تھا اور چیخے ہوئے زور زور سے دو دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اگر گولی اس کی مکان کا دروازہ اس طرح دھڑ دھڑایا جاتا تو پورا محلہ جاگ اٹھتا ہوگا لیکن اچھے منزلہ غارت کی چھت پر ہونے والا یہ شور کن سن سکا تھا۔ رات کا آخری پر تھا۔ لوگ سو رہے تھے اگر کسی نے فائزنگ کی آواز سنی بھی ہوگی تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ آواز کس طرف سے آئی تھی۔

بربرے واقعی بہت سخت جان تھا اور اس میں شہ نہیں کر رہا۔ ہمارے بھی تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور میرے ہاتھ میں ہسٹل ہونے کے باوجود اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اگر چاہتا تھا تو ہسٹل کی گولی اس کے سینے میں اتار سکتا تھا لیکن میں اسے اس وقت تک نہیں مارنا چاہتا تھا جب تک اس سے دارا وغیرہ کا ٹھکانا معلوم کر لیتا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی خنجر والی کٹائی پکڑ لی۔ ہسٹل اپنی ہپ پانٹ میں گھونسا اور سیدھے ہاتھ سے اس کی ہٹل میں گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چیخا ہوا تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ میں نے دوسرا گھونسا اس کے کندھے کے قریب بازو کے جوڑ پر مارا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی کٹائی اب بھی میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی کٹائی پر ہٹا دیا اور اس کے بازو کو موڑتے ہوئے زور دیا۔ وہ الٹ کر پٹ سے مل کر ا۔

چند فٹ دور لان میں چلنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ دونوں لڑکیوں کی موت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا اور شاید وہ مجھ کو کیا تھا کہ میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

”اب بھی زبان کھولو گے یا نہیں؟“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ چھت کے کنارے کی تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی منڈیر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ مجھ سے دو تین گز آگے تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے گھاس پر سہل لگا کر اپنی ایک ٹانگ آگے کر دی۔ اس کا ایک میری ٹانگ میں اٹھ گیا۔ وہ لڑکھائی۔ سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھاتا ہوا منڈیر کے دوسری طرف کرا۔ مجھے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہوا۔ بربرے کی چیخ نے میرے حواس پر بجلی سی گرا دی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر تیزی سے منڈیر کی طرف لپکا۔

بربرے گرا نہیں تھا۔ اتفاق سے اس کے دونوں ہاتھ منڈیر پر جم گئے تھے۔ وہ باہر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ میں نے منڈیر کے قریب جگ کر باہر کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر سینے میں سانس رکنا ہوا غصہ ہونے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ نیچے سڑک پر کھڑی ہوئی وہ تین کاربیں کھلونوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ کھجور پلٹنے والے بیوں کی بدبختی بھی دم سمی نظر آ رہی تھی۔

میں نے تیزی سے منڈیر کے قریب بیٹھ کر بربرے کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ اب اس کی آنکھوں میں موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں جب اس کے جسم پر خنجر کی نوک سے جے لگا رہا تھا تو اسے یقین تھا کہ میں اسے جان سے نہیں لادوں گا لیکن اب اسے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔

”مجھے بچاؤ۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بھگایا۔

”بڑھ کے بیرو کار تو کسی خدا کو نہیں مانتے۔ تمہیں خدا کیسے یاد آیا۔“ میں نے کہا۔

”مم۔۔۔ میں بڑھ کا بیرو کار نہیں۔ کرائسٹ کا ماننے والا ہوں اور خدا پر یقین رکھتا ہوں۔ تم مسلمان ہو۔ تم بھی خدا کو مانتے ہو۔ مجھے بچاؤ۔ میں اپنی ساری دولت تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔“

”حیرت ہے۔“ میں نے کہا ”جو دولت جمع کرنے کے لیے تم نے اپنا خیر اور ایمان تک بیچ ڈالا۔ لوگوں پر ظلم کیسے۔ کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا۔ مزید دولت حاصل کرنے کے لیے وطن فروشوں کا ساتھ بھی دے رہے ہو۔ اس دولت سے تم اتنی آسانی سے دستبردار ہو رہے ہو؟“

”جان سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں۔ مجھے بچاؤ۔ میں اپنی مادی دولت تمہیں دے دوں گا اور تم جو کہو گے میں کروں گا۔“ اس کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف یہ بتا دو کہ دارا اور اس کے ماحکی کہاں ہیں؟“ میں نے کہا۔

”بتاؤں گا۔ بتاؤں گا۔ پہلے مجھے اوپر اٹھاؤ۔“

”نہیں۔ پہلے دارا کا ٹھکانا بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”وہ۔۔۔ وہ تھا تک سینگ میں ہیں۔ مائے کھام ریو کے کنارے۔ کالج نمبر نوٹش ناٹن۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ میرا ہی کالج ہے۔ دیکھو۔ دیکھو۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب اوپر اٹھاؤ۔“

”اور آگے ساگ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہے۔“ بربرے نے جواب دیا

”گاہ۔۔۔ اب مجھے اوپر اٹھاؤ۔“

”میرے ہاتھوں میں پینے آ رہا ہے۔ تمہارے بازو پھسل رہے۔“

”نہ۔۔۔ میری گرفت کمزور پڑ رہی ہے۔ سوری مسٹر بربرے۔ میں

تمہیں اوپر نہیں کھینچ سکتا۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کی دونوں کلاسیاں پھوڑ دیں۔

بربرے کی آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو دیر تک خاموش فضا میں گونجتی رہی اور پھر بھد کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کسی کمرے کو میں میں پتھر پھینکا گیا ہو۔

اپنے آدمی کا مرجانا ہی بہتر تھا۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد اس کے جسم کے کتنے ٹکڑے ہوئے تھے۔ میں چند سینکڑ منڈیر کے قریب بیٹھا رہا پھر سیدھا ہوتے ہوئے اٹھ گیا۔

سردار تھالوب چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے اپنا خنجر اٹھا کر گھاس سے رگڑ کر صاف کیا اور اسے پتلون کے نیچے پٹائی کے ہولسر میں اڑس لیا۔ سردنٹ کو اڑھائی کا دروازہ اب بھی دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت سڑک دیکھا اور ہنٹ ہاؤس میں آ گئے۔

”میرا خیال ہے تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں جو معلوم کرنا تھا وہ پتا چل گیا ہے اس لیے اب چلنا چاہیے۔“ میں نے کہا اور جھانک کر اس کمرے میں دیکھنے لگا جہاں دونوں لڑکیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں لفٹ کے قریب آ گئے۔ دائیں طرف پینل پر تین چار پش بٹن لگے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر لاک میں چابی لگی ہوئی تھی۔ سردار تھالوب نے چابی تھما دی۔ لاک کھلتی ہی پور بھی آن ہو گئی اور دروازہ بھی کھل گیا۔ ہم دونوں اندر آ گئے اور سردار تھالوب نے کراؤنڈ فورڈ والا شیٹن دا دیا۔

لفٹ خاصی تیز رفتار تھی۔ نیچے پہنچنے میں چند سینکڑ سے زیادہ نہیں لگے۔ لفٹ سے باہر نکلتے ہی میری نظر لاک میں چوکی دار والے کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اندر سے اٹھانچ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے تیزی سے جھک کر خنجر نکالا اور کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

میری ٹھوک سے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور اندر کا منظر دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جاگتی بند پڑی تھی اور جتا سنا گیند اٹھنا چکھار اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے جاگتی کا گھبراہٹ کر رکھا تھا۔ جاگتی کے دونوں ہاتھ اس کی کلاسیوں پر تھے۔ وہ اٹھنا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ٹانگیں بھی بڑی طرح بٹھ رہی تھیں۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کا بیچ چوکیداری کھوپڑی پر رسید کر دیا لیکن اس ضرب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سڑک میری طرف دیکھا ضرور لیکن جاگتی کے گلے پر اس کی

آتش فشاں 211 حصہ 2

گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی بلکہ وہ گھاموٹنے کے لیے اور زیادہ طاقت استعمال کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر خون کے سے تاثرات تھے۔ میں اگر جانتا تو نہایت آسانی سے اس کی پشت میں خنجر اتار سکتا تھا لیکن میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بے گناہ تھا اور میں نے آج تک کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے تھے لیکن اس وقت جاگتی کو بھی اس سے چھڑنا ضروری تھا۔ میں نے خنجر بایں ہاتھ میں پکڑ لیا اور دائیں ہاتھ سے ایک زوردار چپ چوکیدار کے کندھے پر رسید کر دیا۔

یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ وہ ہلبلا کر پیچھے الٹ گیا۔ میں نے ایک زوردار گھونسا اس کی کپٹی پر رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر بچ نکلی اور بڑے لڑاکہ کر فریٹ پر جاگرا اور اس کے ساتھ ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔ کپٹی پر لگنے والے گھونٹے نے اسے اپنا فضل کر دیا تھا۔

جاگتی بیڑ پر پڑی اپنا گھاسلاری تھی۔ اس کا بلاؤز بالکل پھٹ گیا تھا۔ سینے گردن اور کندھوں پر بے شمار خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ باہر نکلتے ہوئے جاگتی نے دروازے کے قریب چھوٹی میز پر پڑا ہوا چاقوں کا کچھا اٹھا لیا۔

سردار تھالوب باہر کھڑا تھا۔ اس نے کمرے میں نہ آکر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ چوکیدار اسے ایک نظر دیکھتے ہی پچان لیتا اور بعد میں اس کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ جاگتی نے ٹیٹ کا تالا کھول دیا۔ ہم تینوں باہر آگئے اور گیٹ کھلا چھوڑ کر بلڈنگ سے کچھ آگے سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی جیپ کی طرف دوڑے۔

واٹنگ ڈن نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہمارے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے انجن اشارت کر دیا اور ہمارے پیٹھے ہی جیپ حرکت میں آئی۔

جب ہم کانچ کے گیٹ میں داخل ہوئے تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور دن کا لکھا سا آجلا پھیلنے لگا تھا۔

قبائلی محافظ کانچ کے چاروں طرف موجود تھے۔ برآمدے کا دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی جاگتی اپنے کمرے میں دوڑ گئی۔ لوہا قالیں پر پڑا سوہا تھا۔ ہماری آوازیں سن کر وہ اندر گیا۔ سردار تھالوب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ واٹنگ ڈن صوفے پر گر گیا تھا۔ اسے بھی بری طرح نیند آ رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔

میں نے ایک کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے دوسرے کپڑے اٹھائے اور ہاتھ دھو کر کمرے میں گھس گیا۔ نہانے سے بڑا سکون ملا تھا۔ میں کپڑے بدل کر باہر نکلا تو جاگتی کو کمرے میں کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں جینز اور سفید فی شرٹ اٹھا رکھی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”میرے کمرے میں رہ گئی اور سونیا سو رہی ہیں۔ بیڑ پر میرا فردی گھنچا نہیں نہیں تھی اس لیے میں یہاں آگئی ہوں۔“ اس نے کہنے ہوئے پیٹ اور فی شرٹ کرسی کی پشت پر رکھ دی اور ہاتھ دھو کر کمرے میں گھس گئی۔

مجھے اپنی خیریت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر آیا اور پھر اسی آہستگی سے دروازہ بند کر کے بال میں آگیا۔ لوہا اور واٹنگ ڈن سوچتے تھے میں دوسرے صوفے پر لیٹ گیا۔

باہر دن طلوع ہو چکا تھا۔ کڑکیوں سے دوشنی جھلک رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک گزری رات کے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میں جب بیدار ہوا تو دوسرے سو رہی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ رہ گئی اور سونیا سامنے والے صوفے پر بیٹھی بائیں کرسی تھیں۔ جاگتی غالباً کمرے میں سو رہی تھی۔ واٹنگ ڈن نظر نہیں آیا اور میرا خیال تھا کہ سردار تھالوب بھی اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا۔ میں انگوڑی لیتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سونیا اور رہ گئی نے میری طرف دیکھا اور پھر آپس میں کھسک پھر گئیں۔

”کیا بات ہے۔ یہ کیا گپ چپ ہو رہی ہے؟“ میں نے ہارلی باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے سردار تھالوب کا پیغام ہے کہ جب تک وہ دن پر کوئی اطلاع نہ دے تم اس کانچ سے باہر نہیں نکل گئے۔“ رہ گئی نے کہا۔

”کیا مطلب ہے؟ تھالوب کہاں ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”سردار تھالوب اور واٹنگ ڈن صبح سات بجے چپانک رائے چلے گئے ہیں۔“ رہ گئی نے بتایا۔

”کیا...؟“ میں اچھل پڑا ”مجھے بتائے بغیر۔ کوئی غامض بات؟“

”مگر شہ رات چپانک رائے سے چند کلومیٹر پہلے مہاراج اور رتا کون کی گاڑی پر حملہ ہوا تھا۔ مہاراج اور رتا کون زخمی ہوئے ہیں جبکہ سردار تھالوب کے تین قبائلی محافظ مارے گئے ہیں اور چار زخمی ہوئے ہیں۔“

”اوہ!“ مجھے اپنے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ”وہ لوگ کہاں ہیں۔ چپانک رائے میں؟“

”مہاراج اور رتا کون کی حالت تشویش ناک نہیں تھی۔ انہیں مریم پی کر کے فارغ کر دیا گیا تھا اور وہ رات کے پچھلے پر جنازہ پر بننا چلے گئے تھے۔ زخمی قبائلی محافظ چپانک رائے کے اسپتال میں ہیں۔ لاشیں بھی وہیں ہیں۔“

”یہ اطلاع کب ملی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”صبح ساڑھے چھ بجے۔“ رہ گئی نے بتایا ”تم اس وقت سوچتے

تھے اس لیے سردار نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”حملہ آور کون تھے۔ کچھ بتا چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”فون پر زیادہ تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ ویسے حملہ آوروں کے بھی دو آدمی مارے گئے ہیں۔“ رہ گئی نے جواب دیا ”سردار کا فون آنے کا تو تفصیل معلوم ہو جائے گی۔“

اس دوران میں لوہا نے جائے کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سردار تھالوب نے مگر شہ رات مہاراج اور رتا کون کے ساتھ محافظوں کی دو گاڑیاں بھیج کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے بھی میری طرح کسی ایسی کارروائی کا شبہ ہوگا۔ اگر محافظ نہ ہوتے تو ان میں سے کسی کا بھی پتا مشکل ہوتا۔

مجھے مہاراج کی فکر تھی۔ ان کی عمر سترے اوپر تھی۔ اس عمر میں زخمی ہونا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں چائے کا کپ اٹھا کر ٹیبل فون کے قریب آگیا اور ریسور اٹھا کر بنکاک کا نمبر مانے لگا۔ کال ریسیو ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال واٹ ٹریسٹ کے منعم بھگتھو تھاگ نے ریسیو کی تھی۔

”مہاراج بالکل خیریت سے ہیں۔“ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا ”ان کی پٹنلی میں گولی لگی تھی۔ ابتدائی طبی امداد تو چپانک رائے ہی میں دے دی گئی تھی۔ یہاں انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم برطان مت ہونا۔ اچھا ہے اس ہمارے دو تین دن آرام کر لیں گے۔ یہ بندہ تو آرام سے بیٹھتا نہیں۔ اور میرے ہاتھ کا پھرنا ہے۔“

”اور رتا کون کیسے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے بازو میں گولی لگی تھی لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ انہیں اسپتال میں آدھ ڈرنک کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔ تم اپنا نمبر دے دو میں کسی وقت مہاراج سے فون کروا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے تم بہت بے چین ہو رہے ہو گے لیکن پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہے۔“

”سیاسی صورت حال کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا لیکن صورت حال کنٹرول میں ہے۔“ بھگتھو تھاگ نے جواب دیا۔

میں نے یہاں کا نمبر دے کر فون بند کر دیا۔ ابھی ریسور رکھا ہی تھا کہ کھنچی آنی لگی۔ میں نے ریسور اٹھا لیا۔ وہ چپانک رائے سے سردار تھالوب کی کال تھی۔

”کیا معاملہ تھا سردار۔ اب کیا صورت حال ہے؟“ میں نے اس کی آواز سنتے ہی پوچھا۔

”اب صورت حال قابو میں ہے مگر ہمارا اچھا خاصا نقصان ہو چکا ہے۔“ سردار تھالوب نے جواب دیا ”میرے تین بندے ہلاک ہو چکے ہیں۔ چار زخمی ہیں جن میں سے ایک کی حالت تشویش ناک ہے مگر مقام شکر ہے کہ مہاراج اور رتا کون وغیرہ کا

زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ مہاراج اور رتا کون کو گولیاں لگی تھیں مگر زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔“

”میری بنکاک میں واٹ ٹریسٹ کے متمم سے بات ہوئی تھی۔ وہ دونوں اگرچہ خیریت ہیں مگر دہان کی سیاسی صورت حال کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہاں کی صورت حال کیا ہے۔ حملہ آور کون تھے۔ کچھ بتا چلا؟“

”حملہ آوروں کے بھی دو آدمی مارے گئے ہیں۔ اگرچہ کچھ گرفتاریاں ہوئی ہیں مگر بات ابھی تک واضح نہیں ہو سکی لیکن ایک بات طے ہے کہ سازشی ٹولے کو کسی طرح رتا کون کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ انہیں یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ ایک مانی گرفت میں آگئی ہے اور اسے بنکاک لے جایا جا رہا ہے لیکن... یہ حملہ براہ راست شیشہ پر دار سمجھا جائے گا۔ رتا کون شیشہ کا کزن ہے اور حکومت میں نہایت اہم ذمے داریاں نبھا رہا ہے۔ حکومت کی مشینری پوری طرح حرکت میں آگئی ہے۔ اور ہر بنکاک میں سیاسی معلقوں میں زبردست کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہمیں یاد ہوگا کہ کل رات رتا کون نے ہمارے کانچ سے بنکاک میں کئی لوگوں کو فون کیے تھے۔ بنکاک میں رات تین بجے کے بعد سے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو۔ خون جاری ہے۔ کچھ بڑی پھیلیاں بھی پکڑی گئی ہیں اور کچھ لوگ رو پوٹ ہو گئے ہیں۔ سازش کو پوری طرح ناکام بنا دیا گیا ہے اور صورت حال مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا سردار تھالوب؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا ایک کزن پارلیمنٹ کا ممبر ہے۔“ سردار تھالوب نے جواب دیا ”تھوڑی دیر پہلے بنکاک میں فون پر میری اس بات ہوئی تھی۔ یہ ساری تفصیل اسی نے مجھے بتائی ہے۔“

”میرے لیے کیا ہدایت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اس سارے سیٹ اپ کے مرکزی کردار ہو۔“ سردار تھالوب نے کہا ”سب لوگ جان چکے ہیں کہ شیشہ کے خلاف اس سازش کو ناکام بنانے میں تم نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ وہ چند گھنٹوں کو خاموش ہو چکا ہے اور ہدایت جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس سارے ہنگامے میں سب سے زیادہ نقصان بڑل کھوڑا کو اٹھانا پڑا ہے۔ جانے جانی اور مالی بھی۔ زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ رات کو پریرے بھی وارنٹک دے چکا تھا کہ تمہیں چوس گھنٹوں کے اندر اندر شمع کر دیا جائے گا اس لیے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ صبح یہاں آنے سے پہلے میں نے کچھ اور آدمی کانچ کے اطراف میں دور دور تک پھیلا دیے تھے۔ ویسے میں خود بھی شام سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد ہی کوئی پروگرام نہیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے جواب دیا

اور چند اور رکی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا۔  
میں رنگی اور سونیا کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اس دوران میں جاگتی بھی آگئی۔ اس کی آنکھیں سمجھ بوری تھیں۔ شاید نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔  
تقریباً آدھے بجے تھے میں نے اور جاگتی نے اکٹھے ہی بیٹھ کر ناشتا کیا۔ ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا سوائے باتوں کے۔  
میں کالج سے نکل کر باہر آگیا۔ آسمان پر پھر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں قدرے خشکی تھی جو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔  
میں لان میں ایک کرسی پر بیٹھا پھاڑوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں جاگتی بھی وہاں آگئی۔  
”صبح تم کمرے سے کیوں بھاگ گئے تھے؟“ اس نے خشکی سے لگا ہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”تاکہ تم آرام سے سو سکو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تم۔۔۔“  
”سونیا آری ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔ جاگتی بھی مڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔  
سونیا بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی بہت واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اس سارے ہنگامے میں اور سین ٹونک کے قتل کے بعد بھی کیس سونیا کا نام نہیں آیا تھا۔ وہ اگر جانتی تو اطمینان سے اپنے گھر میں رہ سکتی تھی لیکن اس نے اپنے گھر جانے کے بجائے ہمارے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی بلکہ ایک موقع پر تو اس نے واضح لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

”مجھے اس گھبراہٹ میں اس کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اب تو میں نے اپنا مرنا جینا تم لوگوں کے ساتھ طے کر لیا ہے۔ یہ بات بھی اب میری سمجھ میں آگئی ہے کہ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اصل مزہ تو دوسروں کے لیے جیتے ہیں ہے۔ تم لوگ بھی تو دوسروں کے لیے جی رہے ہو۔ موت کے سوا اگر ان کے ساتھ جنگ کو میں نے بھی اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے اور ابھی تو میں نے اپنی ماں کے قتل کا بدلہ بھی لیتا ہے۔ دارا میرا اور تمہارا مشترکہ دشمن ہے۔ اس سے انتقام لینے کے لیے میں بھی تمہارے شانہ بشانہ چلوں گی۔ کسی بھی موقع پر تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔“  
”سین ٹونک کو جس طرح تم نے انجام کو پہنچایا ہے اس سے مجھے تمہارے بارے میں اندازہ ہو گیا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ کامیابی تمہارے قدم چومتی رہے۔“ میں نے کہا۔

”کامیابی اور ناکامی فتح و شکست کھیل کا ایک حصہ ہے۔“  
سونیا نے جواب دیا۔ ”میں جانتی ہوں کسی موقع پر ناکامی کی صورت میں زندگی سے محروم ہو سکتی ہوں لیکن اب زندگی کی پروا کے ہے۔“

سونیا اس موضوع پر جب بھی بات کرتی اس کے لیے میں ایک عزم ہوتا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر اداسی دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی تھی۔ میں اس سے کچھ پوچھتا جانتا تھا پھر ارادہ بدل دیا۔ سونیا کی اداسی کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کی ماں کو مرے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ نہ تو اس نے آخری مرتبہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آخری رسومات میں شریک ہوئی تھی اور ظاہر ہے ایسی صورت میں اس کی والدہ جیسا کہ ہم میں سے کوئی بھی سمجھ سکتے۔ اس کی شہر کی طرف نہیں گیا تھا۔ وانگ ڈن میاں پر تو اس نے سلاطین کا سلطہ کر لیا۔ میرا یا جاگتی وغیرہ کا باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ بازار تھا تو میں بھی خاص طور پر ہمیں باہر نکلنے سے منع کر دیتا۔ البتہ لونا ایک ایسا شخص تھا جس سے یہ کام لیا جاسکتا تھا۔

میرے کہنے پر لونا فوراً ہی تیار ہو گیا اور جب سونیا کو پتا چلا تو وہ بھی تیار ہو گئی۔  
”تمہیں کوئی خطہ تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”پرسوں رات تم نے سین ٹونک اور اس کے محافظ کو ان کے کالج میں کھس کر قتل کیا تھا۔ کسی نے تمہیں اس گلی میں یا کالج کے آس پاس دیکھا تو نہیں تھا؟“  
”بالکل نہیں۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔“

”شر کے بہت سے لوگ جانتے ہوں گے کہ تم رنگ سنت کی بیٹی ہو۔ کوئی نہ کوئی پچان لے گا۔ ایسی صورت میں کسی گڑبڑ کا اندیشہ تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر کوئی پچان بھی لے گا تو کیا ہوگا۔ میں کسی معاملے میں لوٹ تو نہیں۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”اور اتفاق سے اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تو اطمینان رکھو۔ تم لوگوں کی وجہ سے اب میرا اتنا حوصلہ بڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کر سکتی ہوں اور یہ بھی تسلی رکھو کہ میری وجہ سے تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

میں خاموشی سے سونیا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔  
سونیا اور لونا کی واپسی تقریباً دو گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔ بڑی دلچسپ خبریں تھیں۔ چینگا کے رائے سے پولیس کی بھاری نفری میاں چینگا کی گلی میں اور رتنا کو سن پر حملے کے حوالے سے میاں کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی تھیں اور پکڑ وھڑ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔

سین ٹونک کی لاش اس کے آوی گزشتہ رات اسپتال سے لے گئے تھے جسے رات ہی رات کو گولڈن ٹرائی ایجنٹ پہنچا دیا گیا تھا۔  
پریرے اور اس کے ہنٹ ہاؤس میں دو لڑکیوں کے قتل نے بھی شہر میں پھپھا خاص خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ پولیس نے پریرے ہاؤس کے چوکیدار کو حراست میں لے لیا تھا جس نے جاگتی کے بارے میں بیان دیا تھا کہ کس طرح وہ دھوکے سے بلنگہ میں داخل ہوئی تھی

اور کمرے میں لے جا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جاگتی پر قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت اسی کا ایک ساتھی کمرے میں کھس آیا تھا جس نے سر ضرب لگا کر اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا۔ وہ ظاہر ہے جاگتی کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن اس نے جو طلعہ بتایا تھا اس سے بھی جاگتی کو شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ پھت پر سرورٹ کارڈ میں رہنے والے۔۔۔  
ملازم نے بھی بیان دیا تھا کہ ہنٹ ہاؤس میں فائرنگ اور چپوں کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی گئی تھی۔ اس نے اپنے کارڈز سے باہر نکلنا چاہا تھا مگر کسی نے دروازے کو باہر سے بند کر رکھا تھا۔

پہلے اسے ذہنی کی واردات سمجھا گیا لیکن ہنٹ ہاؤس سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ کسی چیز کو چھوڑا تک نہیں گیا تھا۔  
پریرے کی خواب گاہ کی الماری میں لاکھوں بھات کی نقد رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قیمتی چیزیں تھیں مگر ہر چیز جو اس کی تون تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ جو لوگ بھی تھے، پریرے کو قتل کرنے کی نیت سے ہی بلنگہ میں داخل ہوئے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بڑی پلاننگ کی تھی۔ پریرے کی لاش پر زخموں کے نشان تھے۔ جس سے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ پہلے اس پر خنجر کے وار کر کے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن شاید وہ اپنے آپ کو چھڑا کر ہنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا تھا اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں وہ پھت سے گر گیا تھا یا اسے گرا دیا گیا تھا۔ بہر حال پولیس نے شر کے دوبارہ نام فٹنڈوں کو اس کے قتل کے شبے میں گرفتار بھی کر لیا تھا۔

سونیا کے کہنے کے مطابق شہر میں سنا تھا تھا۔ غیر ملکی سیاح اور سیو تقریباً کے لیے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگ وہاں جا رہے تھے۔ شر کی رونق اب گزرتی تھی۔ کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ قتل و غارت نے اس شہر کا سکون برباد کر دیا تھا۔ لوگوں کے خیال میں اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔

میں دیر تک اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ دارا وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور مجھے سب سے زیادہ پریشانی تھی کہ وہ زخمی بھی تھی اور نجانے ان درندوں نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

شام پانچ بجے کے قریب ہنگامے سے مہاراج کی کال آگئی۔ میں نے سب سے پہلے خدان کے بارے میں پوچھا تھا۔  
”میں بالکل ٹھیک ہوں وجدان۔“ مہاراج نے جواب دیا۔ ”گولی پٹنڈی کے گوشت کو چرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ معمولی زخم ہے۔ دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”اور دیگر حالات کیا ہیں مہاراج؟“ میں نے پوچھا۔  
”صورت حال کنٹرول میں ہے۔ سازش میں شریک تمام بڑے بوسے لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ کچھ لوگ روپوش ہو گئے ہیں لیکن وہ بھی جلد ہی گرفت میں آجائیں گے۔“ مہاراج نے کہا اور

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے ”رتنا کو سن نے تمہارا نام شنشہا تک پہنچا دیا ہے۔ وہ تم سے بہت خوش ہیں اور کسی مناسب موقع پر تمہیں ملاقات کا شرف بھی بخشیں گے اور تم بتاؤ۔ تھائی کا کچھ پتا چلا؟“

”گزشتہ رات میں نے دارا کے ٹھکانے کا پتا لگایا تھا لیکن صبح سویرے ہی چینگا کے رائے میں آپ لوگوں پر حملے کی اطلاع ملنے ہی سردار تھا تو چینگا کے رائے چلا گیا تھا۔ اس نے میرے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ اس کی واپسی تک میں کالج سے باہر نہ نکلوں۔ ویسے میاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ جنرل کھورات کا معتبر خاص سونیا کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے اور سین ٹونک کے آوی اس کی لاش کو گولڈن ٹرائی ایجنٹ لے گئے ہیں اور گزشتہ رات میاں کا ایک سابق پولیس چیف بھی میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ وہ بھی اس سازش میں شریک تھا اور دارا وغیرہ کو بھی اسی نے پناہ دے رکھی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ جنرل کھورات کے آوی میاں آئے والے ہیں۔“

”لیکن شاید اب وہ چینگا سائین میں کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔“ مہاراج نے جواب دیا۔ ”ابھی تو توڑی دیر پہلے رتنا کو سن سے میری بات ہوئی تھی۔ پولیس کی بھاری نفری چینگا سائین بھیجی جا چکی ہے۔ دیگر انتظامی امور سنبھالنے کے لیے کچھ آوی چینگا کے رائے اور ہنگامے سے بھی بھیجے گئے ہیں۔ ایک آدھ دن میں وہاں کے حالات بھی کنٹرول میں آجائیں گے لیکن بہر حال تم اپنا خیال رکھنا۔ تمہارا واسطہ نہایت مکار اور غصیلی قسم کے دشمن سے ہے جو کسی بھی وقت وار کر سکتا ہے اور تھائی کی تلاش جاری رکھو۔“

مہاراج سے تقریباً آدھا گھنٹا باتیں ہوئی رہیں اور پھر فون بند کر دیا گیا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہم لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ سردار تھا تو اور وانگ ڈن بھی پہنچ گئے۔ وہ دونوں بھی ہمارے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ میں نے پہلی مرتبہ تھا تو اس کے چہرے پر ٹھنکن کے آثار دیکھے تھے۔ لونا نے فوراً ہی ان کے سامنے چائے رکھ دی۔

”گیم جب اتار دیا ہو تو سو طرح کے خدشات ہوتے ہیں۔“  
تھوڑی دیر بعد سردار تھا تو نے چائے کی پٹکی لیتے ہوئے کہا۔  
”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوگی اسی لیے میں نے مہاراج اور رتنا کو سن کی حفاظت کے لیے محافظوں کی دو گایاں بھیج دی تھیں۔ میرا شبہ درست نکلا۔ چینگا کے رائے سے چند کلویٹر پہلے ان پر حملہ ہوا لیکن قسمت اچھی تھی کہ وہ لوگ بچ گئے۔“

”میرا خیال ہے وہ لوگ ابانی کو ختم کرنا چاہتے ہوں گے۔“  
اس کے خاموشی ہونے پر میں نے کہا۔  
”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ سردار تھا تو نے کہا۔ ”لیکن ظاہر

ہے رات کے اندر میرے میں حملہ کرنے کا مقصد صرف ایک باکی کا تو قتل کرنا نہیں تھا۔ مگر ماراج یا رتنا کو میں سے کوئی مارا جاتا میرا خیال ہے اس ملک میں قیامت ہی آجاتی۔ سہرا مال بلا مل گئی اور پورے ملک میں صورت حال اب مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے۔

”اور تمہارے تین آدمی۔۔۔“

”چار۔۔۔ سردار قہالوب نے میری بات کا ٹی دی ”چو تھا آدمی بھی چل بسا لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے قبیلے کے لوگوں کی قربانی رانگن نہیں گئی۔ ہم وہ لوگ ہیں جو شیشہ اور اس سر زمین کی سلامتی کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ ہم ہمیشہ ہر آزمائش میں پورے اترے ہیں۔ ہمیں اپنے اس کردار پر فخر ہے۔ میرے قبیلے کے لوگ آج سوگ نہیں جٹن مٹا رہے ہیں کہ ان کے چند آدمیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے شیشہ اور ملک کو ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہونے سے بچالیا۔“

سردار قہالوب کے جذبات قابل قدر تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہر ملک میں اس جیسے محب وطن موجود ہوں تو دشمن ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا لیکن دنیا میں دارا پڈو اور آنگ سانگ جیسے بے ضمیر لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو نہ صرف خود اپنے ملک کے لیے مسائل پیدا کرتے تھے بلکہ اغیار کو بھی اپنے ملک کی بڑیں کاٹنے کی دعوت دیتے تھے۔

سردار قہالوب رات کا کھانا کھا کر اپنے شروالے بچلے میں چلا گیا تھا۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ پہلے مائے کھام ریور کے کنارے واقع اس کانچ کی ٹھکانی کر کے تسلی کرنی جائے کہ دارا وغیرہ وہاں موجود ہیں یا نہیں۔ دارا بہت چالاک تھا۔ ہو سکتا ہے پریرے کے قتل سے وہ یہ سمجھ گیا ہو کہ یہ ہمارا کارنامہ ہو سکتا ہے اور ہم نے اس سے کانچ کے بارے میں معلوم کر لیا ہوگا اور انہوں نے اپنا ٹھکانا تبدیل کر لیا ہو۔

سردار قہالوب نے وانگ ڈن کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ صبح سویرے ہی دو تین آدمیوں کو قہانگ سینگ کی طرف بھیج دے تاکہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔

قہانگ سینگ وہاں سے تقریباً دس کلومیٹر دور لاؤس کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ اس جگہ دریائے میکانگ بھی مائے کھام ریور سے اس طرح ملتا تھا کہ اگر بڑی کے حرف ۷ کی شکل اختیار کر گیا تھا اور انہی دریائوں کی درمیانی ٹھکان میں کوئلن ٹرائی اینٹیل کا علاقہ واقع تھا۔ دونوں دریا ایک طرف لاؤس اور دوسری طرف بیا کی سرحد سے جا ملتے تھے۔ گویا یہ دونوں دریا تینوں ممالک کے درمیان سرحدوں کا کام دیتے تھے۔

وہ رات بڑی بے چینی میں گزری تھی۔ صبح دیر تک میں بہتر پر رہا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ سردار قہالوب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ شرمینہ چمے اور کاموں میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد وانگ ڈن

بھی چلا گیا۔

کانچ بچے کے قریب دو قبائلی لان میں آکر بیٹھ گئے۔ لہا نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ یہ وہی دونوں قبائلی ہیں جنہیں آج صبح سویرے قہانگ سینگ بھیجا گیا تھا۔ میں نے ان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ جواب دینے سے گریز کرتے رہے۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب سردار قہالوب واپس آیا تو وہ لوگ فرار ہو گئے۔

”میرا شہر درست نکلا۔۔۔“ سردار قہالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ لوگ دو پائٹوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک پائٹ تو اسی کانچ میں مقیم ہے جس کا پتا پریرے نے بتایا تھا۔ دوسری پائٹ وہاں سے تقریباً پانچ کلومیٹر آگے دریا کے ساتھ ایک اور کانچ میں منتقل ہو گئی ہے اور اتفاق سے دونوں پائٹوں میں ایک ایک عورت شامل ہے۔ میرے یہ آدمی چونکہ دارا وغیرہ میں سے کسی کو نہیں پہچانتے اس لیے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دارا اور قہانگ کس کانچ میں ہیں۔ البتہ انہوں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ دونوں پائٹوں میں دو دو آدمی اور ایک ایک عورت شامل ہے۔“

”ہمیں یہ تو پتا چل گیا تھا کہ قہانگ زخمی ہے۔ اس کے ہاڈوں میں گولی لگی تھی۔ اس کے ہاڈو پھینکا پٹی وغیرہ بندھی ہوئی۔ ان سے معلوم کرو کہ زخمی عورت کس پائٹ میں ہے۔“ میں نے کہا۔

سردار قہالوب ایک بار پھر اپنے آدمیوں سے بات کرنے لگا۔

دو منٹ بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جن دو عورتوں کو انہوں نے دیکھا ہے ان میں کوئی بھی زخمی نہیں ہے۔ میں نے انہیں قہانگ کا طبع بتایا ہے اور ان کے کہنے کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی بھی اس ملے سے ملتی جلتی نہیں ہے۔“

”چار آدمی دو عورتیں۔“ میں بڑبڑایا ”لیکن اگر آنگ سانگ بھی ان کے ساتھ ہے تو ان کی تعداد پانچ ہونی چاہیے۔ دارا پڈو، تم، قہانگ اور آنگ سانگ لیکن یہ چار آدمی ہیں۔“

”ہو سکتا ہے پانچوں آدمی ان کی نظروں میں نہ آیا ہو۔“ سردار قہالوب نے کہا ”سہرا مال، ہم صبح سویرے اس کانچ پر بیٹھ کریں گے جس کا پتا پریرے نے بتایا تھا۔“

”رات کو کیوں نہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم رات کو دو ڈھائی بجے یہاں سے نکلیں گے۔“ سردار قہالوب نے کہا ”یہ دونوں آدمی رہنمائی کے لیے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہمیں تقریباً چار کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا اس لیے ان تینوں میں سے کوئی ہمارے ساتھ نہیں جائے گی۔“ اس نے رگولی جاگی اور سونیا کی طرف اشارہ کیا۔

”ہمیں کزور دیکھتے ہو سردار قہالوب! سونیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”میں اپنی ماں کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں

ذمے کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کی ذمے کی طرف لوگوں پر نہیں ہوگی۔“

”سونیا ٹھیک کہتی ہے۔“ جاگی نے کہا ”ہم نہ تو کزور ہیں اور نہ ہی بڑا اس لیے یہ بیچنے نہیں نہیں سکتیں۔“

سردار قہالوب نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

”جس ملک کی عورتوں میں اس قدر حوصلہ ہو، کیا وہ ملک کسی لاش کا شکار ہو سکتا ہے؟“

سردار قہالوب کی اس بات پر میں نے بھی مسکرائے پری اکتفا کیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد سردار قہالوب اپنے کمرے میں گیا۔ میں نے جاگی وغیرہ سے بھی کہا کہ وہ تھوڑی سی نیند لے لیں۔ وہ تینوں ایک ہی کمرے میں چلی گئیں۔ اور میں بھی ایک کمرے پر لیٹ گیا لیکن ظاہر ہے نیند کے آئی۔ ہم میں سے کوئی بھی باہر نہیں جاتا اس وقت تک سکون کی نیند سو سکتا ہو جب تک اپنے دشمنوں کو ٹھکانے نہ لگائے۔ میں اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے دارا کے پیچھے تھا۔ سونیا اپنی ماں کے قاتلوں کو ہم داخل کرنا چاہتی تھی اور سردار قہالوب وطن دشمنوں کو لگانے لگا جاتا تھا۔ اس کے کئی آدمی بھی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ ایسی صورت میں نیند کے آسپی تھی۔

دو بجے کے قریب سردار قہالوب اپنے کمرے سے نکل آیا۔ ملے ہوئے جاگی ہاتھ تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد جاگی وغیرہ بھی تیار ہو کر کمرے سے باہر آئیں۔ ان تینوں نے جینز اور ٹی شرٹس پہن رکھے تھے۔ سونیا نے جاگی سے کپڑے لے کر پہنے تھے جو اس کے کپڑے بالکل آئے تھے۔

لہا بھی جاگ گیا تھا۔ اس نے فوری کاپی تیار کر کے ہمارے سامنے رکھ دی۔ کاپی پینے کے بعد پونے تین بجے کے قریب ہم اپنے کپڑے بدلے۔ سردار قہالوب، وانگ ڈن کے ساتھ آگے بڑھا اور دونوں قبائلی ہمارے ساتھ بیچھے بیٹھے تھے۔

شعلی حدود سے نکل کر جب پہاڑوں میں کچے راستے پر اترے۔ راستہ خاصا ناہوار اور خطرناک تھا۔ بری طرح دھچکے لگ رہے تھے۔

چار بجے کے قریب وانگ ڈن نے جب روک لی۔ آگے جب اترے نہیں تھا۔ ہم سب نیچے اتر آئے آگے پیدل جانے کے لیے ایک ٹریک بنایا ہوا تھا۔ ان دو قبائلیوں کی رہنمائی میں ہم کچھ دیر تک ٹریک پر چلتے رہے اور پھر دوسری طرف مڑ گئے کیونکہ اندھنوں میں اگر ہم ٹریک پر چلتے رہتے تو فاصلہ بڑھ جاتا۔

راستہ خاصا خطرناک تھا۔ ہم ایک قطار میں چلتے رہے۔ پانچ بجے قریب نضا اچانک ہی قہانگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ ہم سب نے کھڑکی سے پتھروں کی آڑ میں ہو گئے۔

ہم ایک پتھر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ نظروں سے اوجھڑا نہ ہو سکا۔

تھا۔ اس وقت رات کا اندھیرا رخصت ہو رہا تھا اور بہت لمکا سا اجالا چیلنا شروع ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دارا وغیرہ نے بھی پچھلے تجربات سے سبق سیکھا ہوگا۔ رات کو کانچ میں سے خبر سونے کے بجائے انہوں نے بھی پہلے داری کا نظام قائم کر لیا ہوگا اور اس وقت جو کوئی بھی پورا دے رہا ہوگا اس نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔

گولیوں کی آواز چاروں طرف گونجی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ قہانگ کس طرف سے ہوئی تھی۔ ایک بہت مار گیا تھا۔ اس کی بازو ٹھٹھ دیر تک سسٹوں میں سنائی دیتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں پتھروں کی آڑ میں سردار قہالوب کے قریب آیا جو سونیا کے ساتھ ایک تاور درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔

”قہانگ کس طرف سے ہوئی تھی سردار؟“ میں نے اس کے قریب دوسرے درخت کی آڑ میں کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے یہ قہانگ ہم پر نہیں کی گئی۔“ سردار قہالوب نے اوجھڑا کر دیکھتے ہوئے جواب دیا ”بازو ٹھٹھ ہے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ قہانگ ہوئی کس طرف سے تھی۔“

سردار قہالوب نے ابھی بات پوری کی تھی کہ پنا ایک بار پھر قہانگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ بھی یوں لگتی ہے پورا بہت مارا گیا ہو۔ آواز دیر تک پہاڑوں میں گونج رہی پھر خاموشی چھا گئی۔

”وہ کانچ اب یہاں سے کتنی دور ہے؟“ سردار قہالوب نے ایک قبائلی کو قریب بلا کر پوچھا۔

”اس چٹان کے دوسری طرف۔“ قبائلی نے نشیب کی طرف اشارہ کیا۔ سردار قہالوب کچھ دیر تک اس طرف دیکھتا ہوا پھر اشارہ کرتا ہوا ایک ناہوار راستے پر اترنے لگا۔

اس چٹان تک پہنچنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ سامنے نشیب میں بہت دور دریا مائے کھام بہ رہا تھا۔ درمیان میں دریا کا پانی سرسری ٹیکری طرح نظر آ رہا تھا۔

”وہ اس طرف۔“ ایک قبائلی نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا ”وہ کانچ درختوں کے اس جھنڈ کے دوسری طرف ہے۔“ ہم ڈھلان پر اترنے لگے کانچ تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے کانچ کا سامنے کا رخ دوسری طرف تھا جبکہ ہم عبثی رخ سے آئے تھے۔ ہم اگرچہ آڑ میں تھے مگر وہ کانچ پوری طرح ہماری نظروں میں تھا لیکن وہاں کسی قسم کی نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”تم لوگ ہمیں روک میں آگے جا کر دیکھنا ہوں۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں درختوں کی آڑ میں ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے رات نقل کو دونوں ہاتھوں میں اس طرح تھام رکھا تھا کہ وقت بڑھنے پر فوری طور





تھالوب تھا جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”وہ نکل گئے۔ ان کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ آؤ اب واپس چلیں یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ تھالوب کے لہجے میں بھرپور ہمدردی تھی۔

ایک ایک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے اپنی خالی رائفل نیچے پھینک دی اور سردار تھالوب سے اس کی رائفل چھین کر پتھروں پر چھلانگیں لگاتا ہوا دریا کی طرف دوڑا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کوئی چھوٹا سا گاؤں ہوگا اور کوئی اور کشتی ضرور ہونی چاہیے۔ اگر مجھے کوئی کشتی مل جاتی تو میں ان لوگوں کا تعاقب کر سکتا تھا۔

مجھے اس طرح بھگتے دیکھ کر تھالوب وغیرہ بھی میرے پیچھے لپکے۔

چھوٹی چھوٹی چٹانوں کی وجہ سے دریا میں کٹاؤ سے بنے ہوئے تھے۔ میں کسی کشتی کی تلاش میں ان چٹانوں پر اڑھرا اڑھرا دوڑتا رہا۔ میں نے دونوں طرف دور دور تک دیکھ لیا لیکن مجھے بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کوئی کشتی نہیں تھی۔ میں ایک چٹان پر کھڑے ہو کر پھر دریا کی طرف دیکھنے لگا۔ دارا کی موٹر بوٹ اب بہت دور جا چکی تھی۔

تھالوب اور جاگی وغیرہ بھی میرے قریب پہنچ گئے۔

”مجھے معلوم ہے تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔“ تھالوب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”انہوں نے خاص طور پر پہلے ہی سے اس موٹر بوٹ کا انتظام کر رکھا تھا۔ فرار ان کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ فی الحال ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کشتیوں کا گھٹا یہاں سے تقریباً دو میل دور ہے۔ کوئی کشتی حاصل کرنے کے لیے ہمیں وہاں جانا پڑے گا لیکن گولڈن ٹرائی ایسٹل میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اوس۔“

”ہم تو پہلے ہی جان بھرتی پر لے پھر رہے ہیں تھالوب۔ موت سے کون ڈرتا ہے۔ میں گولڈن ٹرائی ایسٹل میں ضرور داخل ہوں گا۔ تھائی کو ان دردوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

”نہیں س کے لیے ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑے گی۔“ سردار تھالوب نے کہا ”گولڈن ٹرائی ایسٹل انہیوں کے لیے موت کا حصار ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔“

میں چند لمبے دریا کی طرف دیکھتا رہا۔ دارا والی کشتی اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی دیرانی اور چہرے پر بے

ملاں تھا۔ اسے دکھ ہوتا ہی چاہیے تھا۔ تھائی اس کی پرانی اور گہری دوست تھی۔ تھائی ہی کی دوستی میں اگر ایسا گھبرایا لڑاؤ تھا اور جان بھرتی پر لے پھر رہی تھی۔ ڈاکٹر تھی۔ معاشرے میں اس کا ایک مقام تھا۔ اسے آزاد احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن سب کچھ اس سے بڑھ چکا تھا۔ اب تو میری طرح اس کی پیشانی پر بھی دمبشت لپٹ لپٹ لگ چکا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہم ایک نیک مقصد کے لیے رہے تھے۔ بدی کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ امن بڑا وطن پرست قومی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہمارا جواہر دہ یائے ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں شہنشاہ کی آشریاد حاصل تھی۔ ہم نے اس سر زمین اور شہنشاہ کے خلاف ایک بدی بھیانک سازش کو ناکام بنایا تھا۔ جس کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اگر وہ سازش کامیاب ہو جاتی تو ان وقت اس ملک میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہوتیں مگر ہم نے اس خوفناک سازش کو ناکام بنا کر ملک میں خون خرابہ کو روک لیا تھا مگر بعض طبقے ایسے بھی تھے جو ہمیں دمبشت کرادے رہے تھے۔

تھائی کا جرم بھی صرف یہ تھا کہ اس نے ایک بے گناہ اور معصوم بچے کو پناہ دی تھی اور سچائی کا ساتھ دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اس کا گھر جلا گیا۔ اس کا دروازہ چاہو اور وہ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر میرے ساتھ ویدرنی ٹھوکر میں کھانے پر مجبور ہو گئی۔ موت نے اس کا بھی تعاقب شروع کر دیا اور طویل عرصے کی آنکھ پھولی کے بعد بالآخر وہ خونی بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی اور مجھے اسے ہر صورت میں بچانا تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا تھالوب وغیرہ کے ساتھ چڑھ رہا اور بالآخر ہم اس جگہ تک گئے جہاں جھاڑیوں میں دانگ ڈن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی پورا پرست مارا گیا تھا۔ دانگ ڈن کی لاش دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا کچھ اور سچائی کا ساتھ دینے والے یہ شخص کا یہی انجام ہوتا ہے؟ یہ سوال میرے دماغ میں بے چارگی کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میں جب سے چنانک رائے کی دانگ ڈن نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ کئی بار جان کی بازی لگائی تھی اور بالآخر بدی کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔

جاگی، رنگولی اور سونیا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ سردار تھالوب کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے ہوئے تھا۔

ہم دانگ ڈن کی لاش اٹھا کر کالج میں لے آئے۔ سردار تھالوب اور اس کا قبائلی ساتھی دوسرے قبائلی کی لاش اٹھانے کے لیے چلے گئے جسے سب سے پہلے گولی لگی تھی۔ میں کچھ دیر آدھے میں دانگ ڈن کی لاش کے قریب کھڑا رہا پھر کالج کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی میں ٹھنک کر رک گیا۔ بائیں طرف دیوار کے قریب فرش پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اسے غالباً کسی تیز دھار آلے سے وار کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ سینے اور پیٹ پر زخموں کے کئی نشان تھے جن سے پتہ چلا کہ وہ لاخون جسم کی تیز دھار گولی کا نشانہ تھا۔ میں قریب پہنچ کر لاش کا جائزہ لے گا۔ وہ چہرے کے بالکل اچھے تھے۔

ایک نسوانی چیخ سن کر میں اچھل پڑا۔ چیخ کی یہ آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ میں مڑ کر تیزی سے اس طرف دوڑا۔ جاگی اور رنگولی بھی باہر سے دوڑتی ہوئی آ رہی تھیں لیکن اس کمرے میں پہلے ہی میں داخل ہوا تھا۔

سونیا دروازے سے چند قدم اندر کی طرف کھڑی تھی۔ یہی سبھی نظروں سے ہاتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی جگہ پر پہنچا تو ہاتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے میں بھی اچھل پڑا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

وہ ایک لڑکی کی لاش تھی۔ عمر جو میں پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ زندگی میں یقیناً بہت حسین رہی ہوگی لیکن اب اس کا حسن خون کی طرح چھڑ چکا تھا۔ وہ نیم عریاں تھی۔ اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا۔ سردار تھالوب کے جاسوس قباکین نے بتایا تھا کہ انہوں نے دارا اور جی فانگ وغیرہ کے ساتھ دو عورتوں کو دیکھا تھا۔ جن میں ایک کو تو میں نے دارا کے ساتھ موٹ بوٹ میں دیکھ لیا تھا اور دوسری یہ تھی جسے میں نے اپنے دروازے کے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ ان لوگوں کا منصوبہ گولڈن ٹرائی ایسٹل جانے کا تھا اور وہ سوسنا نے اس لڑکی نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہو۔ ظاہر ہے وہ لوگ یہاں ات زندہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ لہذا یہ موت سے گھٹا اتار دیا گیا۔

میں دروازے کے سامنے سے ہٹا تو سونیا وغیرہ بھی قریب آچکی تھیں۔

”سونیا۔“ میں اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”ہمارے ساتھ رہتے ہوئے دو چار دن میں تم کئی لاشیں دیکھ چکی ہو۔ سین فونک کو تو تم نے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیا تھا۔ یہاں تک پہنچتے۔ یہاں ایسی کیا بات تھی کہ تم اس نذر سے بچتی تھیں؟“

”یہ۔۔۔ یہ لی دانگ ہے۔“ سونیا نے کچکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”لی دانگ۔“ میں چونک گیا ”یہ کون تھی۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟“

”لی دانگ بائی اسکول تک میری کلاس فیلو تھی۔“ سونیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”بہت غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے پاس اکثر فیس کی ادائیگی اور کتابیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ہم چند دوست اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ لی دانگ مجھ سے زیادہ اچھی تھی۔ وہ اکثر میرے گھر میں آتی رہتی تھی۔ اس کی زیادہ مدد بھی میں ہی کرتی تھی۔ بہت اچھی لڑکی تھی۔ مئی بھی اسے پسند کر لیتی تھیں۔ میں تو ذاتی طور پر اپنے بیب خرچ سے اس کی مدد کرتی ہی رہتی تھی، مئی بھی اسے پسند کرتی اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید کر دیتی رہتی تھیں۔“

”اس کے ماں باپ نہیں تھے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تھے۔ بلکہ ماں تو اب بھی زندہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور باپ۔۔۔ ذہنی کی ایک واردات میں دو سال پہلے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”اس کا باپ شرابی تھا۔ کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا۔ ماں مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔ لی دانگ بھی حصول تعلیم کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کر کے تھوڑی بہت رقم کماتی تھی لیکن ماں بیٹی کی ساری کمائی شرابی باپ چھین لیتا۔ شراب نوشی کے ساتھ اسے جوا کھیلنے کی بھی عادت تھی اور پھر ایک روز اسی شرابی باپ نے اپنی معصوم بیٹی کو بھی داؤ پر لگا دیا اور ہار گیا۔ ماں کو جب پتا چلا تو وہ چیخ اٹھی۔ لی دانگ کو جوئے کی بازی میں جیتنے والا جواڑی بہت بڑا بدعاش تھا۔ وہ لی دانگ کو لینے کے لیے پہنچا تو ماں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ بدعاش دھمکی دے کر چلا گیا کہ اگر کل تک لی دانگ کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا۔“

”لی دانگ کی ماں اسے لے کر گھر سے بھاگ گئی۔ وہ تقریباً پندرہ دن تک چنانک تھوگ میں اپنے ایک رشتے دار کے ہاں چھپی رہی لیکن بالآخر وہ بدعاش وہاں بھی پہنچ گئے اور لی دانگ کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔“

”مجھ مہینے تک لی دانگ کا کچھ پتا نہیں چلا اور پھر جب وہ سامنے آئی تو پتا چلا کہ وہ کم از کم نصف درجن لوگوں کے ہاتھوں تک چلی ہے۔ اس دوران میں اس کا جو مشر ہو گا تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔“

”لی دانگ کا باپ پہلے تو شراب کا نشہ اور جوئے کی لت

پوری کرنے کے لیے بیوی اور بیٹی کی کمائی چھین لیا کرتا تھا لیکن بیٹی اس کے ہاتھ سے نکل کئی بھی اور بیوی بیار پڑ گئی تھی۔ وہ اس کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ لی وائنگ کا پاپ اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے چوریاں کرنے لگا۔ آخری مرتبہ اس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ہوٹل میں ڈکنی کا منصوبہ بنایا۔ ان تینوں کے پاس نفلی پستول تھے۔ وہ جیسے ہی واردات کر کے ہوٹل سے نکلے پولیس ان کے پیچھے لگ گئی اور وہ تینوں پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔

”لی وائنگ سے میری آخری ملاقات تقریباً ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں پیانگ رائے کے ایک دولت مند شخص کے پاس رہ رہی تھی اور ماں سے ملے میاں آئی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اس راستے پر چلی نکل ہے جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں اور اب۔“

سونیا بات کرتے کرتے رک گئی اور ہاتھ روم میں پڑی ہوئی لی وائنگ کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”وہ اگرچہ غلط راستے پر چل نکلے تھی لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا یہ انجام ہوگا۔“

”برے کام کا انجام تو برا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”لیکن اس میں لی وائنگ کا کیا قصور تھا۔“ سونیا بولی ”وہ تو بہت اچھی لڑکی تھی۔ اسے تعلیم سے عشق تھا۔ اس کے باپ کے جرم کی سزا اسے کیوں ملی؟“

”میں تو اُمید ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”مظلوم اور بے گناہ بچے کب تک اس ستم کا شکار ہوتے رہیں گے۔“

برآمدے کی طرف سے قدموں اور باتوں کی آوازیں کر میں باہر آگیا۔ سردار تھالوب اور قبائلی دوسری لاش لے آئے تھے اور اسے بھی برآمدے میں وائنگ ڈن کی لاش کے قریب رکھ دیا تھا۔

میں اور تھالوب کانچ لے اُٹھے اور تھالوب نے کہا ”ایک طرف ایسا راستہ تھا جہاں سے گاڑی اُسکتی تھی اور وہاں پتی زمین پر ٹانگوں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے۔ جس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ دارا وغیرہ کو کوئی گاڑی اس کانچ میں چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ ہم دونوں کانچ میں واپس آ گئے۔“

”میں اسے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ تھالوب نے اپنے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ لاشیں لے جانے کے لیے ہمیں گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔ واپسی کے لیے ہمیں طویل چکر لگانا پڑے گا۔ دو ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے۔ تم لوگ۔“

”ہماری فکر مت کرو تھالوب۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”تم جاؤ۔“ یہاں اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر کوئی بات ہوئی بھی تو منٹ لیں گے۔“

کچھ دیر بعد سردار تھالوب اور اس کا ساتھی ملے گئے میں سونیا وغیرہ کے ساتھ درختوں کے نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔ لی وائنگ کی تو شناخت ہو گئی تھی لیکن دوسرے آدمی کی لاش کو ہم میں سے کوئی بھی شناخت نہیں کر سکا تھا۔ اب ہمیں اس کے بارے میں زیادہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے کمائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو نو بجے تھے آسمان پر بادلوں کی وجہ سے بھی اندھیرا سا ہوا تھا اور کبھی تیز دھوپ چمکے لگتی۔

بارہ بج گئے۔ تھالوب کو گھٹے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ابھی واپسی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم لوگ رات ڈھائی بجے کے قریب اپنے کانچ سے روانہ ہوئے تھے تو کافی کا ایک ایک کپ پیا تھا اور اب سب کو بھوک لگ رہی تھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔ شاید کانچ میں کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔“ جاگتی کھتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ رنگولی بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔

سونیا میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں دو تین دنوں سے یہ بات خاص طور سے نوٹ کر رہا تھا کہ سونیا مجھ سے زیادہ اچھا ہو رہی تھی۔ اس کا زیادہ وقت میرے قریب رہ کر ہی گزرتا۔ اس کی وجہ میرے ذہن میں یہ آئی تھی کہ میں نے اس سے زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

چند منٹ بعد ہی رنگولی اور جاگتی مہرند خوراک کے پانچ چھ ڈبے اٹھائے کانچ سے باہر آ گئیں۔

”جہن میں اتنی خوراک موجود ہے کہ ہم ایک ہفتے تک کھا سکتے ہیں۔“ رنگولی نے من گھاس پر رکھتے ہوئے کہا۔ ان تمام ڈبوں میں تلا ہوا چکن تھا۔ رنگولی چکن سے کڑ بھی لے آئی تھی۔ اس نے ایک ایک ڈبا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ یہ تلا ہوا مرغی کا گوشت براؤنڈ تھا۔ اگر کرم کر کے کھایا جاتا تو کچھ اور مزے کا ہوتا لیکن کرم کرنے کا خیال کسے تھا۔ بھوک سے جان نکل جا رہی تھی۔ ہم سب مزے لے لے کر مرغی کی دو ٹانگیں اور چھڑے رہے۔ ایک ٹھنڈا اور گزر گیا۔ دو دو تک سردار تھالوب کی

دے کے ہمارا دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم نے جہاں چپ چھوڑی تھی وہ جگہ یہاں سے کم از کم سات کلومیٹر ضرور رہی ہوں۔ پیدل وہاں تک جانا اور پھر طویل چکر کاٹ کر راستہ تلاش کرنے اس طرف آنا اس میں اگرچہ خاصا وقت لگ سکتا تھا لیکن چار گھنٹے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات بہنے لے رہے تھے۔ انیس کوئی حادثہ تو پیش نہیں آئیگا؟

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فضا میں گر گر کر رہی ملکی سی تو آواز سنی دینے لگی۔ وہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ جو اگرچہ گونجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی لیکن لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے جاگتی وغیرہ کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی اپنی رانٹلیں لے کر درختوں کی آڑ میں چلی گئیں اور میں بھی اس ڈھلان پر آگیا جس طرف سے کسی گاڑی کے آنے کی توقع ہو سکتی تھی۔ میں احتیاط کا دارا من ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی پولیس یا کسی اور کی بھی ہو سکتی تھی لیکن میرے خدشات بے بنیاد نکلے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد سردار تھالوب کی چپ سائے آئی۔

کانچ بند ہی تھا۔ جب عمودی ڈھلان کے نیچے ہی رک گئی اور سردار تھالوب اور دو سراقا قبائلی چپ سے اتر کر اوپر آئے۔ میں بھی آؤںے نکل کر سامنے آگیا۔

”میرا خیال تھا ہم جلدی واپس آجائیں گے۔“ سردار تھالوب نے میرے قریب پہنچتے ہوئے کہا ”مگر یہ راستہ خاصا طویل ہے اور دشوار بھی۔“

ہم بائیں کرتے ہوئے درختوں کے نیچے گھاس پر آ گئے۔ رنگولی نے فوراً ہی چکن کے دو ڈبے کھول کر ان کی طرف بڑھا دیے۔

”آپ لوگوں کو بھی یقیناً بھوک لگ رہی ہوگی۔“ وہ بولی ”یہ کھائیں تو پھر چلیں۔“

”یہ کتنا نیک ہے۔ مل گیا۔“ تھالوب نے پوچھا۔ ”جہن جہاں اسے۔“ رنگولی نے جواب دیا ”میں جتنوں سے بڑے بھوکا مانا بن کر رہا تھا۔“

سردار تھالوب اور قبائلی گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے اور پھر تقریباً آٹھ گھنٹے بعد ہم لاٹھیں اٹھا کر چپ کے نیچے چلے گئے۔ سونیا نے وائنگ کی لاش بھی اٹھانا چاہتی تھی مگر تھالوب نے منع کر دیا۔

”ان دو لاشوں کو پولیس اٹھائے گی۔“ وہ سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یہاں جاتے ہی میں پولیس کو فون کروں گا۔“

اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ان لوگوں کے خلاف حکومت کے ہاتھ پیچہ اور مضبوط ہوں گے۔ حکومت اپنی عوام کو ہتھکے کے سازشی کس طرح قتل و غارت کرتی پھرتی ہے۔ بات سونیا کی سمجھ میں آئی تھی اس لیے اس نے اصرار نہیں کیا۔

واپس پر ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ وائنگ ڈن اور قبائلی محافظ کی آخری رسومات بڑی خاموشی سے ادا کی گئیں اور انہیں کانچ کے عقب میں تقریباً دو سو گز دور دفن کر دیا گیا۔ اس وقت تھالوب بھی اپنے آئسو ضبط نہیں کر سکا تھا۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ تھالوب صبح آنے کا وعدہ کر کے اپنے شہر والے چنگے پہنچا گیا۔ میں گھرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل اس وقت بڑی طرح بیکار ہوا تھا۔ وہ لوگ تھائی کو گولڈن ٹرائی اسٹیل لے گئے تھے اور سردار تھالوب کے کہنے کے مطابق گولڈن ٹرائی اسٹیل موت کا حصار تھا اور کوئی انجنی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب میری می اور ڈیڑی کو کھل کیا گیا تھا تو میں نے اس روز عہد کیا تھا کہ قاتلوں کا دنیا کے آخری کوئے تک پیچھا چڑھوں گا اور انہیں کیفر کر وار تک پہنچاؤں گا۔ دارا اور اس کے دونوں ساتھی اگرچہ میری پہنچت دور نکل گئے تھے لیکن میں نے بھی ملے کر لیا تھا کہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑنا اور پھر تھائی بھی ان کے قبضے میں تھی۔ تھائی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ میں اپنی زندگی کے لیے اس کا منمنون تھا۔ برسوں پہلے اگر وہ مجھے اپنی کار میں نہ بٹھاتی اور مجھے پناہ نہ دیتی تو میں ان بھڑیوں کے ہاتھوں اسی روز مارا گیا ہوتا۔ یہ تھائی ہی تھی جس نے مجھے ان سے بچایا تھا اور میری وجہ سے اس کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہوئے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا اور اب میں اسے ان درندوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

**صدیوں کا بیٹا**

[5] حصہ (میں)

تقریباً ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا

۲۳۱۲۳۱

کتابیات پبلیشنگ کمپنی

742000

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سونا کمرے میں داخل ہو کر بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے اور تھانی کے بارے میں جاگتی اسے سب کچھ بتا چکی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھی ہمدردی کا اظہار کرتی رہی اور حقیقت یہ ہے کہ میری اس کی باتوں سے بڑی دھارس بندھ گئی۔

”میں آج رات تو تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ سونیا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بالآخر اسے گھر کی یاد آئی تھی۔

”مجھے غلط مت سمجھنا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ ضروری چیزیں ہیں جو میں گھر سے لینا چاہتی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو باہر لکنا مناسب نہیں ہوگا۔ رات نو بجے کے بعد چلیں گے۔“

”ہم بائیں کمرے رہے تھے کہ جاگتی اور رگولی بھی آگئیں اور پھر باتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد رات نو بجے کے بجائے دس بجے کے قریب میں اور سونا کانچ سے نکلے تو جاگتی بڑی عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سڑک پر پہنچ کر ہم پیدل ہی ایک طرف چلتے رہے۔ سونا کا مکان وہاں سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ شہر میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ ہم ایسی سڑکوں پر چل رہے تھے جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی وقت سامنے سے کوئی گاڑی آجاتی تو ہیڈ لمپس کی روشنی سے بچنے کے لیے ہم رخ بدل لیتے کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ مجھے یا سونا کو پہچان نہ لیا جائے۔ جس رات پہاڑی کانچ پر ہمارے حملے کے دوران میں سابق پولیس چیف اور سونیا کی ماں رنگ سنت ماری گئی تھی“

اس کے بعد اکثر یہ باتیں سننے میں آتی رہی تھیں کہ رنگ سنت کی بیٹی سونا پڑا سراہ طور پر غائب ہو گئی ہے۔

سڑکوں پر چلنے والے کی وجہ سے فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس طرح ہم تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے مکان کے سامنے کے رخ سے اندر داخل ہوتا ممکن نہیں تھا کیونکہ کھلی کے موڑ کے سامنے وہ کافی شاپ اور چھوٹا سا شراب خانہ تھا جہاں بیٹھ کر پہلی مرتبہ میں نے اس کانچ کی گھرائی کی تھی۔ وہ کافی شاپ اور شراب خانہ کھلا ہوا تھا اور سونا نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے اپنے کانچ میں چوروں کی طرح داخل ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ ہم ایک طویل چکر کاٹ کر پچھلی گلی میں آگئے۔

اس گلی میں سناٹا تھا۔ سونا اپنے کانچ کے عقبی

ایک کمرے میں داخل ہو کر سونیا نے دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے قریب ہی دیوار ٹوٹنے ہوئے ایک سوچ آن کر دیا۔ کمرے میں ٹائٹ بلب کی بجلی کی روشنی پھیل گئی۔ اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ تیز روشنی کا بلب جلایا جاتا تو کھڑکی کے سامنے پردہ کھینچا ہونے کے باوجود روشنی باہر سے دیکھی جاسکتی تھی۔ اسے یقیناً یہ اندازہ تھا کہ کون سا سوچ دبانے سے کون سا بلب جلے گا۔ کمرے کی کھڑکی سے کشادہ برآمدے کی طرف کھلتی تھی۔ پردہ ایک طرف سے چٹانچ کے قریب ہٹا ہوا تھا۔ سونیا نے جلدی سے آگے بڑھ کر پردہ برابر کر دیا۔

میں کمرے میں راہر اُھر دیکھنے لگا۔ یہ بیڈ روم تھا۔ سونا

مجھے بڑھ کر ڈرننگ ٹیبل کی درازوں کی تلاش لینے لگی لیکن اندازے۔ منسوب چیز نہیں مل سکی تھی۔ بالآخر اس نے ایک رات سے ایک چابی نکال لی اور دائیں طرف دیوار کے ساتھ تھوڑے سا غبار کی مٹائی کھینچ لی۔

”ایسا ہی ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ بھی کی ڈائری ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میری باقاعدگی سے ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ اس ڈائری سے پتا چل جائے گا کہ مجھے کون سا سازش میں ملوث کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنے کمرے سے کچھ پڑے لینا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

اس بیڈ روم میں آکر اس نے ٹائٹ بلب جلا دیا۔ اس کمرے کی کھڑکی سامنے یا عقبی رخ پر نہیں بلکہ سائڈ میں گیارے کی طرف تھی۔ پردہ ہٹا ہوا تھا لیکن سونیا نے اسے باہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چند لمحے ٹائٹ بلب کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر آگے بڑھ کر الماری کے اوپر رکھا ہوا ایک آئینہ کر بیڈ پر رکھ دیا۔ ماں کی ڈائری میرے حوالے کر دی اور الماری کھول کر اس میں سے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینکے گئے۔

”تیلے۔۔۔“

دروازے کی طرف سے یہ آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے اور پھر مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دروازے میں سے ایک پولیس والا کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں جیک پکڑے ہوئے ریوالور کا رخ ہماری طرف تھا۔ ننگاؤں پر روشنی کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ بھی میرے چہرے کو صاف طور پر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں ریوالور کی زد پر لے کر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے دیوار ٹوٹ کر ایک سوچ دیا۔ چٹ کی بجلی کے ٹوکڑے کمرے میں روشنی بکھرتی۔ ایک دم تیز روشنی سے گھر کو میری آنکھیں چند ہی لمحوں میں

”تمہیں کس سونیا تم؟“ پولیس والے کے لمبے میں نہت تھی۔ ”میں تو سمجھا تھا شاید چور ہوں گے جنہیں آج میں سزا دے گا۔ تمہیں پکڑ لیا۔ یہ چور کئی دن سے کوئی واردات نہ کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ہی

چوروں کی طرح گھنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میں تو آج پہلی مرتبہ یہاں آئی ہوں آئیفر۔“ سونیا نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”چوروں کی طرح کیوں۔ میرے پاس چابیاں موجود ہیں۔ یہ میرا گھر ہے مجھے چوروں کی طرح اندر آنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”مگر سامنے والے دروازے پر تو لالگا ہوا تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے کھولا ہے۔“ کانیشیل نے جواب دیا۔ ”بڑھ دیر پہلے برآمدے کی ایک کھڑکی میں مجھے ایک طرف نیلی روشنی نظر آئی تھی لیکن پھر شاید پردہ برابر کر دیا گیا تھا لیکن چند منٹ پہلے پہاڑی کھڑکی سے بھی بجلی روشنی نظر آتی تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چور ہوں گے جو یہاں کوئی واردات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے میں بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔“

”تم نے کمرے میں روشنی کہاں سے دیکھی اور تمہارے پاس چابیاں کہاں سے آئیں؟“ سونیا نے پوچھا۔

”میں کافی شاپ میں بیٹھا ہوا تھا۔“ کانیشیل نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ چوروں کو جب معلوم ہو جائے کہ کسی مکان کے کمپن سبکس گئے ہوئے ہیں تو وہ اس گھر کا صفایا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور یہاں کے بارے میں تو سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ رنگ سنت قتل ہو چکی ہے اور اس کی بیٹی لاپتا ہے جسے پولیس بھی تلاش کر رہی ہے اس لیے پچھلے دو تین دن سے یہاں واردات کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رات کو اس مکان کی گھرائی پر میری ڈیوٹی ہوتی ہے اور مجھے مکان کی چابیاں بھی دے دی گئیں تاکہ اگر کوئی پچھلے دروازے سے اندر گھرے تو میں سامنے سے اندر داخل ہو کر اسے سٹاپ کر دوں۔“

”ہائی داؤتے پولیس کو میری تلاش کیوں ہے آئیفر؟“ سونیا نے پوچھا۔

”پولیس کے سٹے چیف کا خیال ہے کہ اپنی ماں کی طرح تم بھی بائیسوں سے سی ہوئی ہو اور سازش کا راز افشاں ہو جانے کے بعد پکڑے جانے کے خوف سے روپوش ہو گئی ہو۔ پولیس چیف تم سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اسی سازش کے حوالے سے قتل و غارت اب بھی جاری ہے۔ پولیس چیف سب سے پہلے تو تم سے یہ معلوم کرنا چاہے گا کہ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں اور یہ۔۔۔“ اس نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ ”پولیس کو معلوم ہوا ہے کہ ان سازشوں میں کوئی انڈین یا پاکستانی بھی شامل ہے اور یہ غالباً وہی ہے۔“

”نہیں آفسر“ سونیا نے جواب دیا ”میرا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی میری ماں تیار تھی۔ اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اگر میرا اس سازش سے کوئی تعلق ہوتا تو میں اس طرح بے دھڑک اپنے گھر میں نہ آتی اور یہ۔۔۔“

میں نے سونیا کو آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

”نہجک ہے مہم سونیا۔“ کانفیبل بولا ”یہ ساری باتیں تم نے پولیس چیف کو بتانا۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔“ وہ لڑھکھڑا دھڑکنے لگا پھر اس کی نظریں بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے نیلی فون پر ٹپک گئیں۔ یہ فون کا ایکس ٹینشن سیٹ تھا ”چیف اس وقت گھر پر ہوگا۔ وہ سوسنے کی تیاری کر رہا ہو لیکن جب اسے پتا چلے گا کہ میں نے تمہیں یہاں روک رکھا ہے تو بہت خوش ہوگا اور سارے کام چھوڑ کر بھاگا آئے گا یہاں اور تم دونوں سونو۔ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بلا درلج گولی مار دوں گا۔“

وہ محتاط انداز میں بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دیدے سرخ لائٹ کی طرح گھوم رہے تھے۔ کبھی وہ میری طرف دیکھتا اور کبھی سونیا کی طرف۔ دیدوں کے ساتھ اس نے ریوالور کی نالی بھی حرکت کر رہی تھی۔

بیڈ سائڈ ٹیبل تک پہنچنے کے لیے اسے میرے قریب سے گزرنا تھا۔ اس نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور کانفیبل نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، میری ایک ٹانگ اور ڈائری والا ہاتھ بہت وقت حرکت میں آ گیا۔

ڈائری اس کے ریوالور والے ہاتھ پر لگی اور میرے پیر کی ٹھوک اس کی پینڈی پر۔ ڈائری ٹگنے سے اس کی انگلی کو جھٹکا لگا اور ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ گولی الماری کے اوپر چھت کے قریب دیوار میں لگی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ پینڈی پر میرے پیر کی ٹھوک سے وہ چیخا اٹھا اور ایک پیر پر تاپنے لگا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے ڈائری بیڈ پر پینیک دی اور کانفیبل پر چلا گیا لگادی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ریوالور والی کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ ریوالور کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ گولی تالین پر لگی۔ میں نے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ٹھننے سے ٹھوک بھی لگا دی تھی۔ وہ بلبلاتا ہوا دہرا ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ میں نے ٹھننے کی ایک اور ٹھوک اس کے ٹھنکے ہوئے چہرے پر لگائی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس

”نہجک ہے مہم سونیا۔“ کانفیبل بولا ”یہ ساری باتیں تم نے پولیس چیف کو بتانا۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔“ وہ لڑھکھڑا دھڑکنے لگا پھر اس کی نظریں بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے نیلی فون پر ٹپک گئیں۔ یہ فون کا ایکس ٹینشن سیٹ تھا ”چیف اس وقت گھر پر ہوگا۔ وہ سوسنے کی تیاری کر رہا ہو لیکن جب اسے پتا چلے گا کہ میں نے تمہیں یہاں روک رکھا ہے تو بہت خوش ہوگا اور سارے کام چھوڑ کر بھاگا آئے گا یہاں اور تم دونوں سونو۔ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بلا درلج گولی مار دوں گا۔“

وہ محتاط انداز میں بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دیدے سرخ لائٹ کی طرح گھوم رہے تھے۔ کبھی وہ میری طرف دیکھتا اور کبھی سونیا کی طرف۔ دیدوں کے ساتھ اس نے ریوالور کی نالی بھی حرکت کر رہی تھی۔

بیڈ سائڈ ٹیبل تک پہنچنے کے لیے اسے میرے قریب سے گزرنا تھا۔ اس نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور کانفیبل نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، میری ایک ٹانگ اور ڈائری والا ہاتھ بہت وقت حرکت میں آ گیا۔

ڈائری اس کے ریوالور والے ہاتھ پر لگی اور میرے پیر کی ٹھوک اس کی پینڈی پر۔ ڈائری ٹگنے سے اس کی انگلی کو جھٹکا لگا اور ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ گولی الماری کے اوپر چھت کے قریب دیوار میں لگی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ پینڈی پر میرے پیر کی ٹھوک سے وہ چیخا اٹھا اور ایک پیر پر تاپنے لگا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے ڈائری بیڈ پر پینیک دی اور کانفیبل پر چلا گیا لگادی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ریوالور والی کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ ریوالور کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ گولی تالین پر لگی۔ میں نے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ٹھننے سے ٹھوک بھی لگا دی تھی۔ وہ بلبلاتا ہوا دہرا ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ میں نے ٹھننے کی ایک اور ٹھوک اس کے ٹھنکے ہوئے چہرے پر لگائی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس

میں نے کانفیبل کو دلوچ کر تالین پر مگرالیا اور اس کی پش پر سوار ہو گیا۔ دوسری طرف تالین پر بڑا ہوا ریوالور میری دسترس میں تھا۔ میں اگر چاہتا تو ریوالور اٹھا کر گولی اس کی کھوپڑی میں پھونک دیتا لیکن میں کسی سے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اسے دلوچے ہوئے تھا پھر میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔

شاید میں پہلے بھی پتا چکا ہوں کہ انسانی جسم میں کازر چالیں ایسے پریش پراپیش ہوتے ہیں جن پر ہلکی سی ضرب دیا تو بھی اسے بے بسی کر دیتا ہے۔ اگر ضرب زوردار لگے اس کی زندگی کا چراغ بج ہی ہو سکتا ہے۔

میں کان کے پیچھے گردن پر اس کی ایک نرس کو انگوٹھے سے مل رہا تھا۔ تیس سیکنڈ سے بھی کم ٹھننے میں اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اگلے دس سیکنڈ میں وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے کانفیبل کو چھوڑ کر سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ ڈائری بیگ میں رکھ چکی تھی اور کپڑے جلدی جلدی بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔

اس کانچ میں دو گولیاں چلی تھیں۔ کانفیبل مار کھا کر چیخا بھی تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ گولیوں کی آواز رات کے سنانے میں دور تک سنی گئی ہو گی۔ اس سے پہلے وہ کانفیبل کے سامنے والے کالی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کئی روز سے یہاں رات کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت باتوئی اور ڈینگیں مارنے والا تھا۔ اس نے کالی ہاؤس والوں کو یقیناً بتایا ہوگا کہ وہ اس کانچ کی نگرانی کر رہا ہے۔ کالی ہاؤس والوں میں سے کسی نے اسے کانچ میں آتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ گولیوں کی آواز سن کر اگر کسی نے پولیس اسٹیشن میں فون کر دیا ہو تو پولیس پہنچنے والی ہوگی۔

میں نے سونیا کو اشارہ کیا۔ اس نے آخری کپڑا ایک میں ٹھونس کر پینڈی اور ایک اٹھا کر دروازے کی طرف چل گیا۔ میں نے بھی کمرے سے نکلنے ہوئے اپنی ہپ پاکٹ سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

ابھی ہم راباداری ہی میں تھے کہ دو در کیں سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ کسی

پولیس کو اطلاع دے دی تھی اور پولیس حسب دستور جینڈ جاتے ہوئے آ رہی تھی۔

ہم عقبی دروازے کی طرف لپکے۔ ہال کمرے سے نکلے ہوئے میں ایک کمرے سے نکل گیا۔ کمری الٹ گئی۔

میں نے پستول کی چوٹ لگی تھی۔ میرے منہ سے کراہی خارج ہوئی اور میں نکلنا ہوا سونیا کے پیچھے عقبی دروازے کی طرف لپکا۔

میں نکل کر سونیا نے دروازے میں باہر سے بولٹ لگا دیا۔ ہم دونوں تیزی سے گلی میں ایک طرف چلے گئے۔ تقریباً پاس گزر آگے جا کر ہم دوسری گلی میں مڑ گئے اور تقریباً اس پتے پولیس کی گاڑی غالباً سونیا کے مکان کے سامنے رکی تھی۔

یونکہ اس وقت سائرن بھی بند ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ پولیس کو جھنگے میں داخل ہونے اور صورت حال کو سمجھنے میں پانچ سات منٹ ضرور لگیں گے اور اس دوران میں ہم زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتے تھے۔

میں سونیا کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگا۔ سونیا نے بیگ گلے میں ڈھکیا تھا اور ایک ہاتھ سے اس کا اسٹریپ تھام رکھا تھا۔

ہم گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور اسی وقت ہم ایک گاڑی کے بیڈ پینکس کی روختی میں نما گئے۔ بائیں طرف سے آنے والی اس گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ہم حرکت تیزی سے دوڑنے لگے۔ میرے خیال میں وہ پولیس کی گاڑی تھی۔ ہم چند قدم سے زیادہ دور نہیں جاسکے تھے۔ وہ گاڑی بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب کی۔ ہم دوڑیں بیڈ پینکس کی روختی کی زد میں تھے۔

تیز رفتاری میں میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

سونیا کے کانچ سے نکل کر گلی میں آتے ہی میں نے پستول جینڈ کی ہپ پاکٹ میں رکھ لیا تھا اور اب ہم جس نوع کی صورت حال سے دوچار تھے اس میں پستول کا استعمال نہانگام ہو سکتا تھا۔ میری ایک گولی کے جواب میں کسی آٹو بند راتفل کا پورا برسٹ ہمارے جسموں کو چھلکی کر سکتا تھا۔ میں اس کے باوجود میرا ایک ہاتھ غیر محسوس انداز میں مڑ کر ہپ پاکٹ کی طرف جا رہا تھا۔

نجانے کیا بات تھی کہ میرے ذہن کے کسی عین ترین گوشے میں یہ خیال سر ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ صورت حال وہ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے جلد بازی کا مظاہر کر کے کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

”تھیں چھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ گاڑی میں ٹھونک جلدی کرو۔“

یہ آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ ہپ پاکٹ کی طرف جاتا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ صورت حال واقعی وہ نہیں تھی جو میں سمجھ رہا تھا۔ یہ پولیس کی گاڑی نہیں تھی۔ پولیس کی گاڑی کی چھت پر تو فلیشر ہوتے ہیں لیکن اس گاڑی کی چھت پر فلیشر نہیں تھے اور یہ آواز بھی کسی پولیس والے کی نہیں ”سردار تھالوب کی تھی۔“

اسی وقت پولیس سائرن کی آواز سنائی دی اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ پیچھے بہت دور پولیس کی گاڑی ساؤنڈ اسٹریٹ سے نکل کر مین روڈ پر آ رہی تھی۔ اس گاڑی پر نیلی اور سرخ روشنی کے فلیشر دوسری سے نظر آ رہے تھے۔

”گاڑی میں بیٹھو۔ سوچ کیا رہے ہو۔ جلدی کرو۔“

سردار تھالوب کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ سونیا کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں تھا۔ میں تیزی سے کار کے پیچھے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر پہلے سونیا کو اندر دھکیلا پھر خود اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ پولیس کی گاڑی اسی طرف آ رہی تھی۔ سردار تھالوب نے کار آگے بڑھادی۔ اوپن کے ساتھ ہی اس نے ڈیش بورڈ پر گئے ہوئے دو تین پلچے مٹن دبا دیے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے تو پہلے ہی بند تھے لیکن اب سیاہ رنگ کی اسکرینز بھی اور آگئی تھیں۔ ایسی ہی ایک اسکرین سے پچھلی دند اسکرین بھی تاریک ہو گئی تھی۔

سردار تھالوب نے کار پیچھے آگے جا کر بائیں طرف ایک اور سڑک پر موڑ دی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد پولیس کی گاڑی بھی تیزی سے اس طرف مڑی اور نہایت تیز رفتاری سے ہماری کار سے آگے نکل کر بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ سڑک کے بیچ میں رک گئی۔ سردار تھالوب نے بھی پھرتی سے بریک لگا دیا۔ کار پولیس کی گاڑی سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ اس دوران میں پولیس وین سے تین مسلح پولیس والے اتر چکے تھے۔ ان میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جبکہ دونوں کانفیبلوں نے ہماری کار کی طرف راتفلیں اٹان لی تھیں۔

سردار تھالوب نے مٹن دبا کر اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے گر دیا۔

”کیا بات ہے انسپکٹر“ وہ کار کے سامنے کھڑے ہوئے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں بولا ”اس طرح میرا تعاقب کرنے اور کار روکنے کا کیا مطلب؟“

انجیکر سامنے سے بٹ کر کار کی ڈرائیونگ سائڈ پر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوولور ایکشن کے لیے تیار تھا مگر سردار تھالوب کی صورت دیکھتے ہی وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔

”سردار تھالوب۔“ اس کے منہ سے نکلا ”سوری سردار۔“

”قصہ کیا ہے؟“ سردار تھالوب نے پوچھا۔

”ڈاکو ایک کانچ میں گھس گئے تھے ہمارے ایک کانٹیل سے مداخلت کر کے پکڑنا چاہا تو وہ اسے بے ہوش کر کے فرار ہو گئے۔ ہم انہی کو تلاش کر رہے ہیں۔“ انجیکر نے بتایا۔

”یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟ کیا تمہارے خیال میں وہ ابھی اس علاقے میں موجود ہوں گے؟“ تھالوب نے کہا۔

”صرف چند منٹ پہلے کی بات ہے سردار۔ وہ لوگ ابھی اس علاقے سے باہر نہیں جاسکے ہوں گے۔ سوری سردار۔ آپ کو زحمت ہوئی۔“ انجیکر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں انجیکر۔ انہیں تلاش کرو۔“ سردار تھالوب نے کہتے ہوئے انجن اشارت کر دیا۔

انجیکر اور دونوں کانٹیل دوڑ کر وین میں بیٹھ گئے اور وین مڑ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔ سردار تھالوب نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ تھالوب سے باتیں کرتے ہوئے انجیکر نے کار کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ اگر جھانک لیتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ مجھے تو وہ نہیں ہو گا لیکن سونیا کو بچانے لیتا کہ وہ رنگ سنت کی بیٹی ہے۔ فی الوقت تو وہ سونیا کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن بعد میں جب وہ کانٹیل ہوش میں آکر سونیا کے بارے میں بتاتا تو انجیکر کو یقیناً سردار تھالوب پر بھی شبہ ہوتا۔

کار ایک اور سڑک پر مڑ گئی تھی۔ سردار تھالوب نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے ہی زبان کھولنی پڑی۔

”تم اس وقت اس طرف کیسے آ گئے تھے؟“ میں نے اپنی سیٹ پر آگے جھٹکتے ہوئے سردار تھالوب کو مخاطب کیا ”یہ محض اتفاق تھا یا۔“

”یہ اتفاق نہیں ہے۔“ سردار تھالوب نے میری بات کاٹ دی ”چچو دیر پہلے میں نے کانچ فون کیا تھا۔ رنگولی نے بتایا کہ تم سونیا کے ساتھ اس کے کانچ کی طرف گئے ہوئے ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ رنگ سنت کے کانچ کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ سوچ کر کہ تم لوگ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ میں نے اس طرف دوڑ لگا دی اور جب میں اس طرف پہنچا تو کانچ کے سامنے پولیس کی وین دیکھ کر میرا ہاتھ کاٹا لیکن مجھے جلد

ہی پتا چل گیا کہ کانچ میں داخل ہونے والے ڈاکو فرار ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً ہی گلیوں اور سڑکوں پر تم لوگوں کی تلاش شروع کر دی اور بروقت تم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب مجھ سے پہلے وہ پولیس وین تم لوگوں تک پہنچ جاتی تو مسئلہ گمبیز ہو سکتا تھا۔“ وہ چند محووں کو خاموش ہوا پھر بولا ”لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم نے یہ حماقت کیسے سرزد ہوئی؟“

”میں اسے واقعی حماقت ہی کہوں گا۔“ میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ”رنگ سنت ایک بڑی سازش میں ملوث تھی۔ مجھے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ اس کے کانچ کی نگرانی ہو رہی ہوگی۔“

”اور شہر میں یہ افواہیں بھی گردش کر رہی ہیں کہ رنگ سنت کی بیٹی سونیا بھی اس سازش میں شریک تھی جو پکڑ جانے کے خوف سے روپوش ہو چکی ہے۔ ایسی باتیں تم نے بھی سنی تھیں۔“ اگر سونیا کانچ میں پکڑی جاتی تو گریڈ پولیس تھی۔“ سردار تھالوب نے کہا۔

”لیکن ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ سونیا اس سازش میں شریک نہیں تھی۔“ میں نے کہا۔

”ثابت تو بعد میں کیا جاتا لیکن اس وقت تک پولیس سونیا کا جو حشر کر چکی ہوئی تم اس کا اندازہ نہیں لگ سکتے۔“ سردار تھالوب نے کہا ”اس کانٹیل نے سونیا کو بچانے کا فیصلہ جسے بعد میں تم لوگوں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ دوش میں آنے کے بعد وہ چپانے کا گھروں کی طرح کانچ میں داخل ہونے والی سونیا تھی تو اس پر کیے جانے والے سب کو تقویت ملے گی۔“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ میں نے سر ہلایا ”لیکن حالات ہوش تو ایسے نہیں ہیں گے۔ یہ حقیقت تو سامنے آئی جائے گی کہ سونیا بے گناہ ہے۔“

”اب یہی تو دیکھنا ہے کہ اوٹ کس کسٹ مینٹا ہے۔“ سردار تھالوب نے کہا۔

کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی کانچ والی سڑک پر آگئی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ سردار تھالوب ہمیں چھوڑ کر فوراً ہی واپس چلا گیا تھا۔ سونیا راستے بھر خاموش رہی تھی۔ کانچ میں آنے کے بعد بھی تھالوب کی موجودگی میں اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے سردار کی ڈانٹ کا خاصا اثر لیا تھا۔

”تمہیں شاید تھالوب کی باتیں بری لگی ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ سونیا نے جواب دیا ”سردار نے ٹھیک ہی کہا۔“

”ہمیں ایسی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اگر کوئی گریڈ پولیس تھی تو بات سردار پر آ جاتی۔“

”بہنہ ہم امتیاز کریں گے۔“ میں نے کہا ”غلطی میری تھی۔ مجھے ہی سونیا چاہیے تھا کہ اس طرف جانا مناسب ہوگا یا نہیں۔ بہر حال، بھول جاؤ اب اس بات کو۔“ میں نے کہتے ہوئے نکلے سے اس کا گال چھتیا دیا۔

سونیا نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر وہ ایک آنکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جاگکی سامنے والے مرنے پر بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔ سونیا کا گال چھتیا ناشاید ات اچھا نہیں لگا تھا۔

”بڑے مہمان ہو رہے ہو اس پر؟“ جاگکی کے بچے میں بکاسا طر تھا۔

”سونیا اچھی لڑکی ہے۔ معصوم اور۔“

”وہ یقیناً اچھی لڑکی ہے۔“ جاگکی نے میری بات کاٹ دی ”مجھ سے زیادہ حسین اور جوان ہے اور اس کی معصومیت۔ میں دو چار دن سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ ہر وقت تمہارے ساتھ چلی رہتی ہے۔“

”خلاصت سمجھو جاگکی۔“ میں نے اسے اٹھوڑا ”تم جانتی ہو چند روز پہلے ہی اس کی ماں کو بیدردی سے موت کے کھمبات آندوایا گیا تھا۔ اس پر خداری کا الزام تھا جبکہ سونیا محب وطن لڑکی ہے۔ وہ اپنی ماں کی پیشانی سے خداری کا داغ مٹانا چاہتی ہے اور وہ سین ٹوئنگ جیسے شخص کو بے رحمی سے قتل کر چکی ہے۔ اسے بھردری کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تم سب لوگ اس سے اپناتیت اور بھردری کا اظہار کر رہے ہو۔ لیکن اس کا جناح اگر میری طرف زیادہ ہے تو اس میں اچھے سے لگایا بات ہے۔ تم بلاوجہ اس پر شبہ کر رہی ہو جبکہ میرے دماغ میں بھی تم اچھی طرح جانتی ہو۔“

”ہاں جانتی ہوں۔“ جاگکی نے گھرا سانس لیا ”لیکن نہایت مجھے یہ ذہنیوں ہے کہ یہ لڑکی پتھر میں چونک لگانے میں کامیاب ہو جائے گی۔“

”وہ تم سے تمہارا۔“ میں نے کہا ”بڑھ بچنے والا ہے۔“

”جواب جانر سوچاؤ۔“

”اور تمہیں؟“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میں یہیں صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”بانی مجھے سمورٹی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ میں صوفے

کے کشن کو تکبہ بنا کر لیٹ گیا۔ میرا دھیان ایک بار پھر تھائی کی طرف چلا گیا۔ وہ نچانے کس حال میں ہوگی اور اس پر کیا ظلم ہو رہا ہوگا۔

تین بجے کے قریب جب مجھ پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی تو اپنے قریب آہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور پھر سونیا کو قریب کھڑے دیکھ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی کیا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ۔ یہ دیکھو۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لیے میں بکی سی ٹھر ٹھرا ہٹ تھی ”میں کہتی تھی جاگکی میری ماں بے گناہ ہے۔ وہ اپنی خوش سے ملک کے خلاف کسی سازش میں شریک نہیں ہوئی ہوگی۔“

”لو۔ یہ دیکھو۔۔۔“ میں نے اس میں سب کچھ دکھایا۔ ”بڑھ لو اس ڈائری کو۔“ وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور ڈائری میرے ہاتھ میں تھما دی۔

میں اس ڈائری کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ سونیا نے میرے ہاتھوں میں ڈائری کھول دی اور اوراق پلٹے دوئے ایک جگہ رک گئی اور انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

”اسے بڑھو۔ یہ میری ممی کی تحریر ہے۔ اس سے تمہیں پتا چل جائے گا کہ ممی کو کس طرح چھینا گیا تھا۔“

مجھے تھائی زبان کے ہندسوں کی تو شناخت تھی لیکن کوئی تحریر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس صفحے پر چھ صفحے پہلے کی تاریخ درج تھی۔

”سونیا۔“ میں نے کہا ”یہ تحریر تھائی زبان میں ہے اور میں تھائی زبان نہیں پڑھ سکتا۔“

سونیا نے چونک کر میری طرف دیکھا ”میں پڑھ کر سناتی ہوں۔“ اس نے کہا اور ڈائری میرے ہاتھ سے لے کر وہ تحریر پڑھنے لگی۔

وہ تحریر واقعی چونکا دینے والی تھی۔ رنگ سنت کی اس تحریر کے مطابق چھ مہینے پہلے پولیس چیف نے اسے استوا میں لے کر شہنشاہ کے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس سازش میں شریک لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ درحقیقت شہنشاہ کے خلاف اس سازش کے تانے بانے نئی برسوں سے بے جا رہے تھے اور ان دنوں گولڈن ٹرائی ایجنٹ کے جنرل کھوراث سے رابطے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ تاکہ اسے بھی اس سازش میں شریک کر لیا جائے۔ جنرل کھوراث کو سازش میں شریک کرنے کا ایک تصدیق بھی تھا کہ اگر سازش

ناکام ہو جائے تو سازشی گولڈن ٹرائی اینگل میں پناہ حاصل کر سکیں اور وہاں سے شہنشاہ کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک شروع کر دی جائے۔

پولیس چیف نے رنگ سنت کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ان لوگوں کے لیے کام نہ کیا تو نہ صرف اس کی بیٹی کو اغوا کر کے گولڈن ٹرائی اینگل پہنچا دیا جائے گا بلکہ خدا سے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دوسری طرف سازش کی کامیابی کی صورت میں اسے ایک بڑے عہدے کا لالچ دیا گیا تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ کوئی بھی شریف آدمی خوشی سے کسی برائی کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ اسے مجبور کیا جاتا ہے۔ بلیک میل کیا جاتا ہے۔ رنگ سنت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اپنی خوشی سے سازش میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ اسے مجبور کیا گیا تھا۔

سونیا ڈائری کے اگلے صفحات پڑھتی رہی۔ اس سازش کے حوالے سے مختلف تاریخوں میں اندراجات تھے اور کچھ ایسے نام بھی تھے جو حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔

ڈائری میں کانچ میں ہونے والی خفیہ میٹنگ سے ایک روز پہلے تک کی یادداشتیں درج تھیں۔ آخری صفحے پر اس میٹنگ میں شریک ہونے والوں کے نام اور رنگ سنت کی ذمہ داریاں بھی درج تھیں۔

”میں نہ کبھی تھی کہ میری ماں بے گناہ ہے۔“ وہ ڈائری بند کرتے ہوئے بولی ”یہ ڈائری میری ماں کی بے گناہی کا ثبوت ہے۔“

”اور میرا خیال ہے تم یہ ڈائری لینے کے لیے ہی اپنے کانچ گئی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں“ سونیا نے کہا ”مجھے معلوم تھا میری ماما قاعدگی سے ڈائری لکھتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس سازش کے بارے میں بھی اس نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ اب میں مطمئن ہوں۔ میری ماں غدار نہیں تھی۔ اسے غداری کے لیے مجبور کیا گیا تھا اور اب تو ان لوگوں سے میری نفرت کئی گنا بڑھ گئی ہے جو میری ماں کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ وہ لوگ گولڈن ٹرائی اینگل تو کیا جہنم میں بھی پناہ حاصل کر لیں تو میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک ان کی بولیاں کاٹ کر کتوں کو نہ ڈال دوں۔“

میں بڑی گہری نظروں سے سونیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ

محسوس کر کے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہ جاگتی تھی جو مری باؤں کا جوڑا بناتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس وقت سونیا میرے ساتھ چڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے میرے ساتھ اس طرح بیٹھنے دیکھا کہ جاگتی ٹھنک گئی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور گہری بوگی۔

”تو یہ بات ہے۔“ وہ باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے اردو میں بولی ”اس لیے تم یہاں لینے پر بضد تھے اگر پہلے سے کوئی پروگرام طے تھا تو کمرے میں چلے جاتے۔ میں یہاں صوفے پر سو جاتی۔“

”جاگتی!“ میرے حلق سے غراہٹ سی نکلی ”کوئی بات کرنے سے پہلے تمہیں سوچنا چاہیے کہ کیا کہہ رہی ہو۔ یہ یہ دیکھ رہی ہو۔“ میں نے سونیا کے ہاتھ سے ڈائری چھین کر جاگتی کو دکھائی ”یہ اس کی ماں کی ڈائری ہے جس کے لیے یہ آج اپنے کانچ گئی تھی۔ اسے شروع سے ہی یقین تھا کہ اس کی ماں بے گناہ ہے۔ اسے سازش میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔ پہلے یہ اپنے کمرے میں بیٹھی خود یہ ڈائری پڑھتی رہی اور پھر میرے پاس آگئی۔ یہ مجھے ڈائری میں لکھی ہوئی اپنی ماں کی یادداشتیں سن رہی تھی۔ اور تم۔ تمہارے دماغ میں صرف ایک ہی بات تھی ہوئی ہے۔ نجانے تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟“

میرے تیر دیکھ کر جاگتی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

”سواری وجدان۔“ وہ آگے بڑھ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی ”میں خود نہیں سمجھ پاتی کہ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں۔ بہر حال کیا ہے اس ڈائری میں؟“

”کوہ خودی پڑھ لو۔“ میں نے ڈائری اس کی طرف بھا دی۔

سونیا اگرچہ اردو نہیں سمجھتی تھی لیکن ہمارے لب ولہجے اور چہروں کے تاثرات سے وہ سمجھ گئی تھی کہ ہمارے درمیان کچھ کھلی اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ سرک کر مجھ سے کچھ دور ہٹ گئی۔

جاگتی ڈائری کے وہ صفحات پڑھ رہی تھی جو میں نے کھول کر اس کے سامنے کیے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد کچھ اقتباسات پڑھنے کے بعد اس نے ڈائری بند کر دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ڈائری پڑھنے کے بعد تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ صورتحال وہ نہیں جو ہم یاد دوسرے لوگ سمجھتے ہیں۔ ایسی حکمتیں دے کر تو کسی سے کوئی بھی کام کروایا جاسکتا ہے۔ بہر حال

اب کیا ارادہ ہے؟“ یہ ڈائری میں صبح تھالوب کے حوالے کر دوں گا اور ہماراج سے بھی اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تاکہ تحقیقات کرنے کے بعد رنگ سنت کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جاسکے۔ اس ڈائری میں کچھ ایسے نام بھی ہیں جن سے رنگ سنت کی اس تحریر کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ ویسے میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں کہ اس قسم کی دھمکیاں دے کر کسی سے کوئی بھی کام کروایا جاسکتا ہے۔ بہر حال مجھے بڑے زور کی فینڈ آ رہی ہے۔ تم سونیا کو ساتھ لے کر اس کے کمرے میں چلی جاؤ۔ اسے اس وقت ہماری ہمدردیوں کی ضرورت ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو رہا ہوں۔“ میں کہتے ہوئے اٹھ گیا اور وہ ڈائری بھی جاگتی کے ہاتھ سے لے لی۔

اپنے کمرے میں اگر ڈائری میں نے تنکے کے نیچے رکھی اور اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچنا ہوا ایٹ گیا۔ میں زیادہ دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکا۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں پڑ گیا۔

سردار تھالوب صبح نو بجے ہی پہنچ گیا تھا۔ مجھے بھی جگا دیا گیا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ دماغ میں بھی غبار سا بھرا ہوا تھا۔ تاہم ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے میں اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔

ناشتے میں سردار تھالوب بھی میرے ساتھ شریک تھا۔ میں نے رنگ سنت کی ڈائری کی بات چھیڑ دی۔ وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے وہ ڈائری بھی اپنے کمرے سے لا کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ میری بات ختم ہوئی تو وہ ڈائری کھول کر کہیں کہیں سے رنگ سنت کی تحریر پڑھنے لگا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اس ڈائری کا کیا کیا جائے؟“

”میں جاگتی کے ساتھ آج ہی کسی نہ کسی طرح گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ میں ہماراج سے بھی اپنی بات کہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد تم یہ ڈائری کئی ایسے ذمہ دار شخص کے حوالے کرو جو اسے ریتا کو سن یا حکومت کی کسی اور ذمہ دار شخصیت تک بحفاظت پہنچا سکے۔ اگر تحقیقات سے ثابت ہو جائے کہ رنگ سنت کی یہ تحریر درست ہے اور وہ واقعی بے گناہ تھی تو مجھے خوشی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔“ تھالوب بولا ”جس طرح ہم نے رنگ سنت کی بیٹی کو اپنے قبضے میں لے کر اس سے کانچ میں ہونے والی خفیہ میٹنگ کا پروگرام اور دوسری بہت سی باتیں معلوم کر لی تھیں اسی طرح رنگ سنت کو دھمکی دے کر کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہوگا۔ بہر حال اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گا لیکن۔ کیا تمہارے لیے گولڈن ٹرائی اینگل جانا ضروری ہے؟“ اس نے خاموش ہو کر میرے چہرے پر نظرسنجمادیں۔

”بات یہ ہے سردار تھالوب۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے اپنے ماں باپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا ہے۔ میں وہ منظر کس طرح بھول سکتا ہوں جب میری ماں کو خنجروں کے پے ور پے وار کر کے نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور میرے باپ کا پیٹ اور سینہ چاک کر دیا گیا تھا۔ ان کی جینیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں تو میری روح تک کانپ اٹھتی ہے اور پھر چاچا پر تاب نکلتے۔ اتنے بھی میری نظروں کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اس نے اپنی جان دے کر مجھے بچالیا۔“

”بات اگرچہ پرانی ہو چکی ہے لیکن سینے میں انتقام کا اوا پک رہا ہو تو کوئی بھی بات پرانی نہیں ہوتی۔ میری روح پر لگائے جانے والے برسوں پرانے یہ زخم آج بھی ہرے ہیں اور یہ گھاؤ اس وقت تک مندمل نہیں ہوں گے جب تک میرے اندر کا آتش فشاں چھٹ کر ان لوگوں کو جہنم نہیں کر ڈالے گا۔“ میں خاموش ہو گیا۔ تھالوب میرے چہرے پر نظرسنجمادے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے بات جاری رکھی ”تم اندازہ لگا چکے ہو کہ وہ کتنے سفاک اور بے رحم ہیں۔ کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کو معاف کیا جاسکتا ہے؟“

”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“ سردار تھالوب نے کہا ”یہ ایسے لوگوں کو معاف کر دینا واقعی انسانیت پر ظلم ہوگا لیکن گولڈن ٹرائی اینگل۔“

”میں اس بات کا شکوک ہی نہیں کرتا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ”میری تم سے صرف ایک درخواست ہے۔ سردار۔ رنگ سنت کے بارے میں تحقیقات کروانا اور سونیا کا خیال رکھنا۔ اسے اپنی سرپرستی میں لے لیتا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے صحیح راستہ مل جائے تو۔“

”میرا راستہ صرف اور صرف گولڈن ٹرائی اینگل کی



طرف جاتا ہے۔

اپنے مقب میں سونیا کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔  
"ماسٹر! وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "یہ الفاظ تو میں نے  
کئے تھے کہ میں اپنی ماں کے قاتلوں کی تلاش میں گولڈن  
ٹرائی ایشنل گھنٹہ تک جانے کو تیار ہوں اور میں نے اپنا  
فیصلہ بدلا نہیں ہے۔ وارا وغیرہ صرف تمہارے ماں باپ اور  
میری ماں ہی کے قاتل نہیں ہیں۔ وہ صرف ہمارے نہیں  
انسانیت کے بھی مجرم ہیں اور میں نے انہیں عبرت ناک سزا  
دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ  
گے تو میں ایسی ہی اس جہنم میں کود پڑوں گی۔"

میں اور سردار تھالوب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے  
لگے۔

"تو! یہاں بیٹھو میرے پاس۔" سردار تھالوب نے  
اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔  
سونیا کرسی پر بیٹھ گئی تو لومہ نے فوراً ہی اس کے ساتھ  
چائے کا کپ رکھ دیا۔

سردار تھالوب اور میں تقریباً ویڈھ گھنٹے تک سونیا کو  
سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔  
اس دوران میں رنگولی اور جاگی بھی آگئی تھیں۔ وہ بھی اسے  
سمجھانے کی کوشش کرتی رہیں مگر سونیا پر کسی کی بات کا اثر  
نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی بس ایک ہی ضد تھی کہ ہمارے ساتھ  
جائے گی۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر میں نے مکر اسانس لینے ہوئے کہا  
"اگر تمہیں چاہے ہو گیا تو مجھے افسوس ہوگا۔" میں سردار  
تھالوب کی طرف متوجہ ہو گیا "ہمارے جانے کا کیا طریقہ  
ہو سکتا ہے؟"

"ابھی تو وہی دیر بعد ہم چلتے ہیں۔" سردار تھالوب نے  
جواب دیا "اس علاقے کا جائزہ لے کر تم خود ہی فیصلہ کر لینا کہ  
کیا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔"

اور پھر اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں جاگی اور  
سردار تھالوب اس کی بیپ پر سوار گولڈن ٹرائی ایشنل کی  
طرف جا رہے تھے۔ سونیا کو اس لیے کانچ میں چھوڑ دیا گیا  
تھا کہ گزشتہ رات اس کا فیصلہ نے بوش میں آنے کے بعد  
بتا دیا تھا کہ چوروں کی طرح اپنے کانچ میں گھسنے والی سونیا  
تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کا حلیہ وہ  
ٹھیک سے نہیں بتا سکا تھا۔ پولیس نے رات ہی کو سونیا کی  
تلاش شروع کر دی تھی اور اب بھی اسے پورے شہر اور  
نواحی علاقوں میں تلاش کیا جا رہا تھا اس لیے اس وقت سونیا

کا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں تھا۔ رنگولی کو بھی سونیا کی  
وجہ سے کانچ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم دریا کے مائے کلم  
پر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں سیاہوں کے لیے ایک بہت بڑی  
تفریح گاہ بنی ہوئی تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ دریا کے  
میکاگ اور دریا کے مائے کلم اس علاقے میں اس طرح لے  
جیں کہ انگریزی کے حرف کی شکل بن جاتی ہے اور اس  
حرف کے دائیں طرف کی اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہوئی لہر  
دریا کے میکاگ ہے جو تھالی لینڈ اور لاؤس کے درمیان سرحد  
کا کام دیتا ہے جبکہ دوسری طرف مائے کلم ریور تھالی لینڈ کی  
حدود میں ٹامبل سینٹر کی طرف جا کر دو تین شاخوں میں تقسیم  
ہو جاتا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے مقام اتصال سے جو کنون  
بنتی ہے وہی دراصل گولڈن ٹرائی ایشنل ہے۔ جو آگے جا کر  
کشادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف برا اور دوسری طرف  
لاؤس کے کچھ سرحدی علاقے بھی اس کنون میں شامل  
ہو جاتے ہیں۔

مقامی انتظامیہ نے سیاہوں کی سہولت کے لیے دریا کے  
مائے کلم کے کنارے پر ایک بہت بڑی تفریح گاہ بنادی  
تھی۔ یہاں کئی اچھے ریسٹورانٹ اور کازینو بھی تھے۔ سیاح  
یہاں آ کر دریا کے دوسرے کنارے سے شروع ہونے والے  
گولڈن ٹرائی ایشنل کے علاقے کو دیکھتے اور تصویریں  
لیتے اور اس بات پر فخر محسوس کرتے کہ انہوں نے گولڈن ٹرائی  
ایشنل نام کے اس خطے کی جھلک دیکھی ہے جہاں سے دنیا بھر  
کو ہیروئن اور دیگر منشیات کا زہر پھیلائی کیا جاتا ہے۔

دو تین دن سے حالات چونکہ کچھ بہتر تھے اس لیے یہاں  
بھی کچھ رونق تھی۔ اندرون ملک اور غیر ممالک سے آئے  
ہوئے سیاح ادھر ادھر ملتے ہوئے سائے گولڈن ٹرائی ایشنل  
کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ ریسٹورانٹوں کے ساتھ وسیع  
عریشے چھوڑوں اور میز پر بیٹھے دور بیٹوں سے اس طرف  
دیکھ رہے تھے۔ یہاں دریا کے کنارے پر دو تین گھاٹ بھی  
تھے جہاں دریا کی سر کے لیے موٹر بوس دستیاب تھیں۔  
یہاں دریا کا باٹ ایک ہزار میٹر سے کسی طرح بھی نہ  
نہیں تھا۔ دریا خاصا گہرا اور بہاؤ بہت تیز تھا۔ بہاؤ کی طرف  
تقریباً پانچ کلومیٹر آگے جا کر یہ دریا میکاگ ریور سے ملا جلا  
میں جاگی اور سردار تھالوب بیپ سے اتر کر ادھر ادھر  
مشتلے رہے۔ ہمارا انداز ایسا تھا جیسے ہم سردار کے سہان  
ہوں اور وہ ہمیں سیر کرانے کے لیے یہاں لایا ہو۔  
ایک آدمی سردار تھالوب کو کچھ کر تیزی سے جاری

طرف لایا۔ وہ ایک ریسٹورانٹ کا مالک تھا اور اس نے سردار  
تھالوب کو پہچان لیا۔ وہ بڑے مؤدبانہ انداز میں سردار سے ملا  
اور پھر ہمیں اپنے ریسٹورانٹ میں لے آیا۔ اندر بیٹھنے کے  
بجائے ہم نے باہر میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ بوسل کا مالک  
ایک ویٹریس کے ساتھ مشروبات لے کر آیا۔ وہ سردار  
تھالوب کو اپنا سہمان بنا کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ مالک  
ریسٹورانٹ کے اندر چلا گیا تو سردار تھالوب سامنے کی طرف  
اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ سامنے پہاڑیاں اور گھٹا جنگل ہے۔ یہاں جزل  
کھرواٹ کے آدمی چوس رہے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے  
یہاں سے گولڈن ٹرائی ایشنل کی زمین پر قدم رکھنا ممکن  
نہیں۔ البتہ۔۔۔" وہ خاموشی ہو کر اس کشتی کی طرف دیکھنے لگا  
جو سیاہوں سے بھری ہوئی تھی۔

وہ بڑی کشتی تھی۔ اس میں انجن بھی لگا ہوا تھا اور رنگ  
برنگ بادیاں بھی تھے۔ کشتی میں تقریباً بیس افراد سوار تھے۔  
ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی۔ کچھ لوگوں  
کے ہاتھوں میں کیرے تھے۔ کچھ لوگ آنکھوں سے دور بینیں  
لگائے ہوئے تھے۔ دو جوان عورتیں ایسی تھیں جن کے پاس  
مردی کیرے تھے۔ وہ گولڈن ٹرائی ایشنل کی سمت بنا رہی  
تھیں۔ کوئی کشتی والا عام طور پر دریا کی نصف چوڑائی عبور  
نہیں کرتا مگر اس کشتی پر سوار سیاح شاید یوتھین کو دوسرے  
کنارے کے زیادہ سے زیادہ قریب جانے پر مجبور کر رہے تھے  
اگر گولڈن ٹرائی ایشنل کا زیادہ قریب سے نظارہ کر سکیں اور  
واضح تصویریں کھینچ سکیں۔

لیکن وہ کشتی جیسے ہی دریا کی نصف چوڑائی سے ذرا سی  
آگے بڑھی دوسرے کنارے پر گھٹے جنگل سے فائرنگ ہونے  
لگی۔ انٹ مشین گن سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ کوئی  
فائرنگ کرنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کلتا تھا جیسے درختوں کی  
شاخوں نے گولیاں اٹھ لی شروع کر دی ہوں۔  
گولیاں کشتی کے آس پاس دریا کے پانی میں گر رہی  
تھیں۔ کشتی میں مودود عورتیں اور بچے چیخنے پلانے لگے اور  
پھر کشتی کا رخ تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ وہ مختصر سا پلکار کاشی  
ہوئی بہاؤ کی سمت جا رہی تھی۔ اب وہ دریا کی نصف چوڑائی  
سے ابھر آئی تھی۔ جنگل سے فائرنگ بند ہو گئی۔

"یہ کشتی والوں کے لیے اور ٹھیک تھی۔" سردار  
تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر کشتی مزید آگے  
بڑھتی تو گولیاں پانی کے بجائے کشتی میں بھرے ہوئے لوگوں کو  
لٹا دیتیں۔"

"کیا چوبیس گھنٹے۔"  
"ہاں۔ چوبیس گھنٹے۔" سردار تھالوب نے مجھے بات  
پوری کرنے کا موقع دینے بغیر کہا "جزل کھرواٹ کے محافظ  
چوبیس گھنٹے دریا کی نگرانی کرتے ہیں۔ وہ رات کی تاریکی میں  
بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کئی طالع آزمائوں نے رات کی تاریکی میں  
بھی دریا پار کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی جان سے ہاتھ دھو  
بیٹھے۔ اس جگہ سے دریا پار کر کے گولڈن ٹرائی ایشنل میں  
داخل ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

"وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ؟" میں نے سوالیہ ٹکا ہوں  
سے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔  
"ہاں۔" تھالوب نے اثبات میں سر ہلایا "راستہ اگرچہ  
وہ بھی خطرناک ہے مگر ایک فیصد کا سیانی کا امکان ہے۔"  
"میں یہ رسک لینے کو تیار ہوں۔" میں نے کہا۔  
"تو پھر آؤ۔ میں تمہیں وہ جگہ دکھاتا ہوں۔" سردار رکتے  
ہوئے اٹھ گیا۔

میں نے اور جاگی نے بھی کرسیاں چھوڑ دیں۔ ہم  
پارکنگ ایریا میں آ گئے۔ میرا خیال تھا کہ تھالوب ہمیں دریا  
کے کنارے کے ساتھ ساتھ کسی جگہ لے جائے گا لیکن جب  
اس نے بیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں پوچھنے بغیر نہیں رہ  
سکا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"  
"بیٹھو۔ تپا چل جائے گا۔" سردار نے کہا۔  
ہم بیپ میں بیٹھ گئے۔ سردار تھالوب نے ایشیئرنگ  
سنبھال لیا۔ بیپ پارکنگ ایریا سے نکل کر شہر کی طرف جانے  
والی سڑک پر مڑی۔ میں اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ ہمیں  
کہاں لے جا رہا ہے۔ تقریباً ویڈھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے  
کے بعد بیپ سڑک سے ہٹ کر بائیں طرف ایک بے راستے  
پر مڑ گئی۔ یہ راستہ نہایت پُر پیچ اور خطرناک تھا۔ دونوں  
طرف گھٹیاں جہانیاں تھیں جس سے راستہ بچو اور نہت  
ہو گیا تھا۔ اوپر سے درختوں کی شاخیں بھی نیچے تک جمی ہوئی  
تھیں جو بیپ سے ٹکرا رہی تھیں۔ بعض جگہ تو درختوں کی  
جھکی ہوئی شاخیں اور جہانیاں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں  
جیسے راستہ بند ہو مگر سردار تھالوب بیپ کو آگے بڑھانے لے  
گیا۔

تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اس نے بیپ  
روک لی اور ہم نیچے اتر آئے اور تھالوب کے پیچھے چلتے  
رہے۔ یہاں پیدل چلنے کا بھی کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ہم  
درختوں کی جمی ہوئی شاخوں اور گھٹیاں جہانیاں میں راستہ

بناتے ہوئے چلے رہے اور پھر ایک جگہ رک گئے۔ تھالوب اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ ہم سے تقریباً دس فٹ آگے تھا۔ میری طرف گھومتے ہوئے اس نے اچانک ہی پتول نکال لیا۔ پتول کا رخ میری کھوپڑی کی طرف تھا۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“ تھالوب کے منہ سے سانپ جیسی چیخ نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوفناک سی مسکراہٹ تھی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن میں ہزاروں خیالات اور دوسو سے آئے تھے۔ تو یہ تھا سردار تھالوب کا اصل روپ۔ شاید وہ بھی جزل کھوراٹ کا ایجنٹ تھا۔ اب تک اس نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا، وہ سب ڈھونگ تھا اور جب میں نے گولڈن ٹرائی اے محل جانے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے بھی مجھے ختم کرنے کی غمان لی تھی۔ اس ویرانے میں مجھے اور جاگی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو ہمارے بارے میں کس کو پتا چلے گا۔ موت کو اتنا قریب دیکھ کر میرا جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا۔ میری جینز کی بیب پائٹ میں بھی پتول موجود تھا۔ اگر میں پتول نکالنے کی کوشش بھی کرتا تو میرا ہاتھ جب تک پتھنے سے پہلے ہی تھالوب مجھے گولی بار دیتا۔

میں نے آہستگی سے گردن گھما کر جاگی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں، ہلکی سی کپکپاہٹ واضح طور پر نظر آرہی تھی۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“

سردار تھالوب ایک بار پھر سانپ کی طرح پھنکارا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔

فائر کی آواز گونجی۔ میں سمجھنے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ یہ شاید مختصر فائر تھا۔ تھالوب نے پتول والا ہاتھ نیچے جھکا لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”پتھنے مڑ کر دیکھو۔“

میں تیزی سے پتھنے گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکلیں گیا۔ میرے پتھنے صرف ایک

فٹ کے فاصلے پر درخت کی جھکی ہوئی ایک موٹی شاخ پر ہنر رنگ کا ایک تقریباً چار فٹ لمبا سانپ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا سر تھالوب کی گولی نے اڑا دیا تھا۔ سانپ کی دم درخت کی شاخ سے مل کھا کر لپٹی ہوئی تھی اور باقی جسم بھی ایٹھٹھا ہوا سا ہوا میں مل کھا رہا تھا اور پھر شاخ سے اس کی دم کے بل کھلنے لگے اور وہ بھد کی آواز سے زمین پر گر گیا۔

”یہ سانپ اگر تمہیں ڈس لیتا تو تم ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں ختم ہو جاتے۔ اس کا زہر سانس ٹائٹ سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔“ سردار تھالوب اس سانپ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”یہ خطرناک سانپ اس علاقے میں بہت کم پایا جاتا ہے لیکن جب یہ اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے تو چھوڑنا نہیں۔ یہ ہوا میں اڑتا بھی ہے۔ زمین سے پانچ چھ فٹ اونچی اور تقریباً پندرہ فٹ لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔ یہ تم پر حملہ کرنے کی تیار کر رہی رہا تھا۔ اگر میں نہ دیکھ لیتا تو تم اس وقت ہم سے بہت دور جا چکے ہوتے۔“

تھالوب بولتا رہا اور میں سوچتا رہا۔ چند سیکنڈ پہلے میرے من میں اس کے بارے میں جو خیالات آئے تھے ان پر اب مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات تھے۔

ہم ایک بار پھر چل پڑے اور ایک بار پھر رک گئے۔ پانی کی لہروں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم دریا کے کنارے پر بھاڑیوں میں بیٹھے سامنے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں دونوں دریا انگریزی کے حرف Y کے نقطہ اتصال پر ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے اور یہیں سے نکون بن کر آگے کو پھیلتی چلی گئی تھی۔

بہت خوب صورت منظر تھا۔ دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے دونوں دریاؤں کے صحیح حد نگاہ تک پھیلا ہوا سبزہ بڑا حسین منظر پیش کر رہا تھا۔

یہاں دونوں دریاؤں کے ملنے کی وجہ سے پاٹ بہت زیادہ چوڑا ہو گیا تھا۔ بائیں طرف دریائے سائے کھام تھا اور دائیں طرف میکاگ جس کے دوسری طرف لاؤس کی سرحد تھی۔ زیریں علاقے کی طرف یہ دریا لاؤس اور تھائی لینڈ کے درمیان سرحدی لیکر بنا چلا گیا تھا۔

”وہ چھوٹا سا جزیرہ دیکھ رہے ہو۔“ سردار تھالوب نے میکاگ کے وسط میں ابھرے ہوئے ایک ٹاپو نما بھاری طرف اشارہ کیا۔ میں گردن گھما کر اس طرف دیکھنے لگا۔ اسے جزیرہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ جس کی لمبائی چوڑائی دو ڈھائی سو گز سے زیادہ نہیں تھی۔ وہاں قد آدم جھاڑیاں اور پھنجان

درخت نظر آرہے تھے۔ اس جزیرے سے گولڈن ٹرائی ایٹھٹھ تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے لیکن اصل مسئلہ اس جزیرے تک پہنچنے کا ہے۔

”کیوں؟“ میں نے جزیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو اس جزیرے تک پہنچنا بہت آسان لگ رہا ہے۔“ ”یہ تمہاری بھول ہے۔“ سردار تھالوب مسکرایا۔ ”میکاگ کے دوسرے کنارے پر لاؤس کے فوجی گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس جزیرے کی طرف جانے والوں کو دیکھتے ہی گولی باردی جاتی ہے۔“

”اور اگر اس طرف سے دریا پار کرنے کی کوشش کی جائے تو؟“ میں نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

”ناممکن۔“ تھالوب نے جواب دیا۔ ”جزل کھوراٹ تھائی سرحد پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس طرف اس کے مسلح آدمی موجود رہتے ہیں جبکہ لاؤس کی طرف سے اسے کوئی خطرہ نہیں۔ اس طرف گشت کا بھی زیادہ انتظام نہیں ہے۔ اس لیے میرے خیال میں اس جزیرے کی طرف سے ہی کوشش کی جانی چاہیے۔ اس طرف سے کامیابی کا ایک فی صد امکان ہو سکتا ہے۔“

میں دیر تک اس چھوٹے سے جزیرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ”ہو سکتا ہے اس جزیرے پر بھی لاؤس کے فوجی یا جزل کھوراٹ کے آدمی موجود ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“ سردار تھالوب نے جواب دیا۔ ”یہ جزیرہ دریا کے تین وسط میں ہے۔ کسی ملک کی سرحد میں شامل نہیں ہے۔ تھائی اور لاؤس کی حکومتوں میں یہ معاہدہ ہے کہ ان میں سے کسی ملک کے فوجی اس جزیرے کو کسی بھی قسم کے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ جزل کھوراٹ سے اگرچہ اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں لیکن وہ بھی اس معاہدے پر عمل کر رہا ہے البتہ کبھی کبھار اس کے آدمی اس جزیرے پر آجاتے ہیں۔“

میں ایک بار پھر جزیرے کی طرف دیکھتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں فاصلہ ٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے اس جزیرے کا فاصلہ ہزار میٹر سے کم نہیں تھا اور وہاں سے گولڈن ٹرائی ایٹھٹھ والا کنارہ پانچ چھ سو میٹر کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ میں دیر تک ادھر ادھر دیکھتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لیتا رہا پھر تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس جزیرے تک پہنچنے کے لیے ظاہر ہے کشتی کی

ضرورت ہوگی اور کشتی کا بندوبست کیسے ہوگا؟“ ”کشتی کا بندوبست ہو جائے گا۔“ سردار تھالوب نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا مشورہ ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلو۔“

”میں فیصلہ کر چکا ہوں سردار۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”دنیائی کوئی طاقت میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔“ ”تو پھر ٹھیک ہے۔ آؤ۔ اب واپس چلیں۔“ سردار تھالوب نے کہا۔ ہم جھاڑیوں سے نکل کر واپسی کے راستے پر چلنے لگے اور مجھے حیرت ہوئی کہ بیب تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

بھاڑیوں سے نکل کر پتھنہ سڑک پر آکر تھالوب نے بیب کا رخ شہر کی طرف موڑ دیا۔ سردار تھالوب بھی تقریباً ایک گھنٹے تک ہمارے ساتھ کا بیچ میں رہا۔

”ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم لوگوں کے لیے کشتی اور کچھ دوسری چیزوں کا بندوبست کرنا ہے۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔“

تھالوب چلا گیا۔ اس وقت رنگولی بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ اب ہم تینوں اس کا بیچ میں رہ گئے تھے۔ میں اور جاگی ایک بار پھر سونیا کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ بھی میری طرح ارادے کی پکی تھی۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھی کہ ہمارے ساتھ ضرور جائے گی۔ اگر ہم اسے ساتھ نہ لے گئے تو وہ ایک ہی گولڈن ٹرائی ایٹھٹھ میں داخل ہونے کی کوشش کرے گی خواہ اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ سونیا کی اس ضد کے سامنے مجھے ایک بار پھر ہتھیار ڈالنا پڑے۔

ہم نے کل رات دریا پار کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تھالوب نے کہا تھا کہ اس دوران میں وہ ہماری روانگی کے تمام انتظامات مکمل کر لے گا۔ میں مہاراج کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ مہاراج ہی نے مجھے اس قابل بنایا تھا کہ آج میرے دشمن مجھ سے چھپتے پھر رہے تھے اور مہاراج ہی نے میرے اندر اتنی خود اعتمادی پیدا کی تھی کہ میں اپنے طور پر بڑے سے بڑا فیصلہ کر سکتا تھا۔ مہاراج نے مجھے جو مشن سونپا تھا، میں اس میں سرخ رو ہوا تھا۔ اب میرے پاس صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے انتقام۔ گولڈن ٹرائی ایٹھٹھ تو ایسی جگہ تھی جہاں ہماری ہی طرح کے انسان بستے تھے۔ میں تو دارا اور جی فانگ کے تعاقب میں

جنم نیک جانے کو تیار تھا۔ یہ میرا اہل فیصلہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ مہاراج میرے اس فیصلے کی مخالفت نہیں کریں گے اور پھر مجھے مہاراج سے رنگ سنت کی دائری کے حوالے سے بھی بات کرنی تھی۔ اگر تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ رنگ سنت واقعی بے گناہ تھی تو سونیا کے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ جائے گا۔

میں ٹیلی فون کے قریب آکر بیٹھ گیا اور ریسپور اٹھا کر بنکاک میں وائٹ نمٹ کا نمبر ملائے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اتفاق سے کال خود مہاراج ہی نے ریسپو کی تھی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں فوراً ہی اصل موضوع پر آگیا اور مہاراج کو سونیا رنگ سنت اور اس کی دائری کے بارے میں بتائے لگا۔

”اس دائری میں کچھ ایسے نام موجود ہیں جن سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کر کے رنگ سنت کی تحریر کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ دائری میں نے سردار تھالوب کے حوالے کر دی ہے۔ وہ دو چار دن میں بنکاک آکر آپ سے ملاقات کرے گا اور دائری آپ کے حوالے کر دے گا۔“

”اور تم کیوں نہیں آ رہے۔“ مہاراج نے کہا ”تمہارا مشن مکمل ہو چکا ہے۔ وہاں اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ یہاں بنکاک میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔“

”مہاراج وہ... دارا اور اس کے ساتھی گولڈن زرائی اینگل کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔“ میں یہ بات بے تکلفی کہہ رہا تھا۔

”کیا تمنا چاہتے ہو؟“ مہاراج نے پوچھا۔

”مہاراج آپ جانتے ہیں دارا اور اس کے ساتھیوں نے میرے ماں باپ کو قتل کیا تھا اور جا چاہا ہے اب سگھ کو بھی آپ کی مبادت گاہ میں گولیوں سے چھلنی کر دیتا تھا۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے مجھے بچایا اور پناہ دی۔ میں نے آپ کے سامنے بھی قسم کھائی تھی کہ ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور ایسے لوگوں کو زندہ چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ لوگ لالچ اور بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ انہوں نے بنکاک میں جو قتل و غارت چھائی تھی اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہاں بھی یہ لوگ کئی روز تک آگ اور خون کا حیلہ چلے رہے ہیں۔ دارا نے تو ان لوگوں کو بھی نہیں بخش جو اس کی خاطر بیان پھیلنے پر لیے پھرتے رہے ہیں۔ دارا نے پھر کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں مہاراج۔ برا آدمی بھی برائی سے باز

نہیں آتا۔ ان کی سازش اگرچہ ناکام ہو چکی ہے لیکن یہ ایسے ہی کسی اور منصوبے پر کام شروع کر دیں گے۔ بیرون کی اسگٹنگ کا منصوبہ تو پہلے ہی سے ہے۔ دنیا بھر میں یہ ذہر پھیلا یا جا رہا ہے۔ ان جیسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں ہے ہم اس برائی کا مکمل طور پر خاتمہ تو نہیں کر سکتے لیکن دارا اپنے کچھ لوگوں کو تو روک سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ختم ہو جانا چاہیے ایسے لوگوں کو۔“

”میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ مہاراج نے کہا ”لیکن گولڈن زرائی اینگل خوں خوار مجھڑوں کا بھٹ ہے۔ وہاں جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“

”میں نے آپ سے تربیت حاصل کی ہے مہاراج۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے آپ کے آئینہ یاد چاہیے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تھائی ان خوں خوار مجھڑوں کے قتلے میں ہے اور اسے بلیا رو مددگار نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے سن۔“ مہاراج نے کہا ”تم کب جا رہے ہو؟“

”کل رات۔“ میں نے جواب دیا اور مہاراج کو یہ بھی بتا دیا کہ جاگنی بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ سونیا کا ذکر میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔

”میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“ مہاراج نے جواب دیا اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا۔

میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید مہاراج اس کی اجازت نہ دیں لیکن وہ میرے جذبات سے واقف تھے اور میں نے جس لب و لہجہ میں بات کی تھی اس سے بھی شاید انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ میں کوئی نصیحت ماننے کو تیار نہیں ہوں گا اس لیے انہوں نے مجھے اجازت دے دی تھی۔

میں تو جاگنی کو بھی ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن تھائی کا یہاں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ دارا وغیرہ فرار ہو چکے تھے۔ بڑو بھی مارا گیا تھا لیکن بڑو کا گروہ تو موجود تھا۔ اس گروہ کے بہت سے لوگ جاگنی کو ابھی طرح جانتے تھے۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور ویسے بھی میرا خیال تھا کہ اگر میں جاگنی کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتا تو وہ بھی میری نمانی۔ جاگنی کو بہر حال میرے ساتھ جانا تھا لیکن مجھے سونیا کا افسوس ہو رہا تھا۔ ہم پلنگ پر نہیں جا رہے تھے۔ وہاں قدم

قدم موت ہماری غنچہ ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سنہری کنون کی زمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں گولیوں سے بھون دیا جائے لیکن سونیا اس آگ میں کودنے کو تیار تھی۔ میری طرح وہ بھی انتقام کی آگ میں جل رہی تھی اور اسے روکنا ممکن نہیں تھا۔

وہ دن گزر گیا اور پھر رات کے تاریک سائے پر پھیلائے لگے۔ رات میرے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتی تھی۔ اس رات دو بجے تک تو جاگنی اور سونیا بھی جاگتی رہی تھیں اور پھر اپنے کمروں میں جانے کے بجائے وہیں قلابیں پر لیٹ کر سو گئیں اور میں صوفے پر نیم دراز سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی کھڑی کھوکھو رہا جس کی سونیاں غیر محسوس انداز میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھیں لیکن کوئی منزل نہیں اور شاید گھڑی کی ان سونیاں کی طرح میری بھی کوئی منزل نہیں تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے قتل کے انتقام کو زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا تھا نہ ہی کوئی منزل دکھائی دیتی تھی۔ قتل و غارت خون خرابا! یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے؟ میں نے تو اب تک یہی کچھ دیکھا تھا۔ محی اور ڈیڈی کے قتل کے بعد تو مجھے ہر طرف گولیاں ہی برسی نظر آتی تھیں۔ خون ہی خون دکھائی دیا تھا۔ ہر طرف انسانی خون ہی بہتا ہوا دیکھا تھا میں نے۔ میرے ہاتھ بھی خون سے رنگے ہوئے تھے لیکن... میں نے تو ان لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگتے تھے جو انسانیت کے دشمن تھے۔ بے گناہ کیوں مارے جا رہے تھے؟

میرا ذہن بڑی طرح الجھا ہوا تھا۔ مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا سر دھکنے لگا۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں اٹھ کر بیٹھ آیا۔ چند دیر قلابیں پر سوئی ہوئی جاگنی اور سونیا کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بے قدموں چلتا ہوا بیچ میں کھس گیا۔ کم سے کم آواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کالی بنائی اور کپ لے کر خاموشی سے باہر آکر لالہ میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور تاریکی میں لودھرا لودھرا گھورتے ہوئے کالی کی چسکیاں لینے لگا۔

مجھے وہاں بیٹھتے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ برآمدہ کی طرف سے آہٹ سن کر چوک گیا۔ گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ جاگنی برآمدہ میں کھڑی لودھرا لودھرا دیکھ رہی تھی اور پھر وہ برآمدہ سے نکل کر میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے۔“ نیند نہیں آ رہی؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ ذہن اب سیٹ ہو رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”سوچ سوچ کر سر دھکنے لگا تھا۔ میں نے اٹھ کر کالی بنائی۔“

”مجھے بگاڑ دیتے۔ میں بنا دیتی کالی۔“ جاگنی نے کہا۔

”اگر تم بھی چنا چاہو تو بولا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ موڑ نہیں ہو رہا۔“ جاگنی نے جواب دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہم گولڈن زرائی اینگل کے حوالے سے باتیں کرنے لگے کہ وہاں ہمیں کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔“ جاگنی نے کہا ”جنرل کھورات کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ چکے ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہاں ہمیں سنگین ترین صورت حال کا سامنا ہو گا اور شاید وہ ہماری زندگی کا سب سے ترسناک ترین دور ہو گا۔ قدم قدم پر موت گھاٹ لگے بیٹھی ہوگی۔ اگر ہم وہاں چند روز بھی زندہ رہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ مجھے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ کشتی سے اتر کر دریا کے کنارے پر قدم رکھتے ہی ہمیں گولیوں سے چھلنی لڑایا جائے گا۔“

”میں سب کچھ میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے جاگنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ان حالات کے پیش نظر کیا تم اپنے لیے وہاں جانا مناسب سمجھتی ہو؟ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم ہمیں رہ جاؤ۔ سردار تھالوب کے پاس۔ اگر تم رک جاؤ تو سونیا کو بھی روکا جاسکتا ہے۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوتا۔“ جاگنی کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں موت کے اس حصار میں اپنے جانے دوں گی۔“ وہ چند منوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”میں تم اور تھائی۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ مرنے جینے کا عہد کیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ چٹائی کے لیے لڑتے ہوئے جان دے دیں گے لیکن ہمارے قدم پیچھے نہیں نہیں گئے۔ ہم نے بیش ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ اب ہمارے راستے الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر تم تھائی کو بھول کر اپنا پروگرام بدل دو تو میں بھی بنکاک واپس جانے کو تیار ہوں۔ اگر بنکاک میں ہمارے لیے اب بھی خطرہ ہو تو ہم ہمیں اور چلے جائیں گے اور آرام سے زندگی گزار دیں گے۔“

”کیسے ہو سکتا ہے۔“ تھائی کا نام لے کر جانکی نے میری دھکتی دھکتی پر انگلی رکھ دی تھی ”میں تھائی کو بیسے بھول

سکتا ہوں۔ آج میں زندہ ہوں تو تھائی کی وجہ سے۔ میں تو اسے بھول جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تھائی کو بھول جاؤں گی یا تمہیں اکیلے موت کے منہ میں جانے دوں گی۔“ جاگتی نے مسکراتے ہوئے کہا ”بس۔ اب اس موضوع کو بیس ختم کر دو۔ آج کے بعد میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔“

میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔

رات کے آخری پہر تک ہم لان ہی میں بیٹھے رہے۔ اس وقت پوچھ رہی تھی جب ہم لان سے اٹھ کر کالج گئے اندر آگے۔ سونا قالین پر آزی ترچھی پڑی گری نیند سوری تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ میں اس کی طرف دیکھا ہوا صوفے پر لیٹ گیا اور جاگی، سونا کے قریب ہی قالین پر لیٹ گئی۔ میرا ذہن اگرچہ اب بھی الجھا ہوا تھا لیکن اس مرتبہ سونے کے لیے مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔

میری آنکھ دوپہر بارہ بجے کے قریب کھلی۔ سونا اور جاگتی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔

سردار تھالوب دو بجے کے قریب آیا تھا۔ وہ ہمارے لیے کچھ ایسی چیزیں لے کر آیا تھا جو اس مہم میں ہمارے کام آسکتی تھیں۔ ابھی دانت کے دستے والا ایک خوب صورت خنجر جس کے ایک طرف تیردھار بھی اور دوسری طرف دانتی کی طرح باریک دندا نے بنے ہوئے تھے اس نے سونا کی طرف بڑھا دیا۔

”میری تو خواہش تھی کہ تم ہمیں رہو لیکن تم بعد وہ تو ہم تمہیں روک نہیں سکتے۔ بہر حال، یہ خنجر میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔ کام آئے گا۔“

سونا کی آنکھوں میں چمک سی ابھرتی۔ وہ کچھ دیر تک خنجر کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر متحارنہ نگاہوں سے تھالوب کی طرف دیکھنے لگی۔ سردار تھالوب نے ایسا ہی ایک خنجر جاگتی کو بھی دیا تھا مگر اس کا دست ابھی دانت کا نہیں، آہوس کی لکڑی کا تھا۔

سونا اور جاگتی نے فوراً ہی تیاری شروع کر دی۔ رگولی ان کی مدد کر رہی تھی۔ ان دونوں نے اپنے اپنے بیگ میں دو تین جوڑے کپڑوں کے رکھ لیے تھے اور کچھ وہ چیزیں جو تھالوب لے کر آیا تھا۔ ان میں مہربند خوراک کے کچھ ڈبے بھی تھے۔ اگر ہم زندہ رہے تو یہ خوراک کم از کم ایک ہفتے ہمارا ساتھ دے سکتی تھی۔

سردار تھالوب اور میں ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور سردار تھالوب کہہ رہا تھا۔

”کشتی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ آج شام تک کشتی اسی جگہ پہنچ جائے گی جہاں ہم کل گئے تھے۔ میرا ایک آدمی تم لوگوں کے ساتھ جائے گا۔ وہ تم لوگوں کو دریا کے گولڈن ٹرائی اینٹھل والے کنارے پر اتار کر اس جزیرے پر واپس آجائے گا اور جو بیس گھنٹے وہاں رکے گا اس دوران میں اگر تم لوگ محسوس کرو کہ آگے نہیں جاسکتے تو اسے منسل دے دینا۔ وہ تم لوگوں کو واپس لے آئے گا۔“

”اس زمین پر قدم رکھنے کے بعد تو ابھی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ فیصلہ تو تم اس زمین پر قدم رکھنے کے بعد کرو گے بہر حال، اگر محسوس کرو کہ ہوا کا رخ ہمارے ساتھ نہیں ہے تو ایسی صورت میں میرا مشورہ ہے کہ۔“

”نہیں سردار۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”اب میں کوئی مشورہ نہیں سنوں گا البتہ کچھ باتیں جانا چاہتا ہوں جن سے مجھے آگے چل کر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔“

”مثلاً؟“ سردار تھالوب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”جہاز کھوراث کون ہے۔ اس نے اس علاقے پر کیسے قبضہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”جہاز کھوراث“ تھالوب نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”وہ خود ساختہ جہاز ہے۔ برسوں پہلے وہ چینی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ جیسے تیسے کر کے سیکنڈ نیشنٹ کے عہدے تک تو پہنچ گیا لیکن اس سے آگے نہیں جاسکا۔ وہ اپنے حلقے میں بہت بد تمیز آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اپنے سے سینئر آفیسروں کے ساتھ بھی بد تمیزی سے باز نہیں آتا تھا۔ حکم عدویٰ، ڈپلن کی خلاف ورزی پر اسے کئی بار سزا دی تھی پھر ایک مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک خفیہ تنظیم تریاڈ TRIAD کا سرگرم رکن ہے۔ یہ تنظیم ان دنوں حکومت کے خلاف سرگرم تھی۔ کھوراث نے ایک مختصر سا گروہ بنالیا تھا اور فوج میں بد نظمی پھیلا رہا تھا۔ یہ انکشاف ہوتے ہی کھوراث کو حراست میں لے لیا گیا۔ فوج کے قوانین کے مطابق اس پر مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے فوج کی حراست سے بھاگ نکلا۔ اس کے گروہ میں پندرہ سولہ آدمی تھے۔ کھوراث ان کا سرغنہ تھے۔ پکڑے جانے کے خوف سے وہ بھاگتے رہے۔ ان کا رخ کینٹن کی طرف تھا جہاں سے وہ ہانگ کانگ جانا چاہتے

تھے۔ ہانگ کانگ برطانیہ کے زیر اثر تھا اور کھوراث سمجھتا تھا کہ اسے صرف ہانگ کانگ ہی میں پناہ مل سکتی تھی لیکن اسے کینٹن ہی میں پناہ چل گیا کہ ہانگ کانگ میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنا رخ بدل دیا اور نان پنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ کھوراث نے اب دیت نام میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا تھا مگر اس طرف بھی رکاوٹیں تھیں۔

”کھوراث اور اس کے ساتھیوں کے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ ان کے پاس ایک وقت کی خوراک خریدنے کے لیے پھونی کوڑی تک نہیں تھی۔ خوراک کے حصول اور دیگر ضروریات کے لیے انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ جس بستی میں بھی جاتے ایک دو آدمیوں کو قتل کر کے دہشت پھیلا دیتے اور لوٹ مار کر آگے نکل جاتے۔“

”اسی دوران میں کچھ اور جرائم پیشہ لوگ بھی اس کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ لیویوں اور قاتلوں کا یہ خطرناک گروہ مار کر آتا اور راستے میں چھوٹی چھوٹی بستیاں اجاڑتا ہوا چین کے قریب دریائے میکاٹک کے کنارے پہنچ گیا۔ یہ دریا چین کے برف پوش پہاڑوں سے شروع ہو کر چین ہی کے وسیع و عریض علاقے کو سیراب کرتا ہوا چین کے قریب برما کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر سیام اور لاؤس کی سرحدوں کو چھوتا ہوا کمبوڈیا کا سفر کرتے ہوئے جنوبی تبتہ چین میں جا کر آتا ہے۔“

”کھوراث اور اس کے قریب چالیس مسلح آدمی ایک بڑی باہانی کشتی پر سوار تھے۔ یہ کشتی دریائے میکاٹک میں بہتی ہوئی برما کی سرحد سے نکل کر تھائی لینڈ کی سرحد میں داخل ہوئی۔ یہاں کھوراث نے اپنا سفر ختم کر دیا۔“

”دو دریائوں کے بیچ میں سیکڑوں مربع میل پر مشتمل یہ ٹکڑی زرخیز خطہ کھوراث کو پسند آ گیا۔ اس خطے میں تین چار چھوٹے چھوٹے قبائل آباد تھے۔ جو تھوڑی بہت قیمتی باڑی سے اپنی کڑاوقات کر رہے تھے۔ کھوراث اور اس کے ساتھیوں نے ان قبائلیوں کو برما کی طرف بھاگ دیا۔ جنہوں نے مزاحمت کی کوشش کی انہیں بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“

”اس علاقے میں پوست کے پودے دیکھ کر کھوراث نے ایک اور منصوبہ بنایا۔ پوست کی کاشت کے لیے یہ علاقہ تو بہت زرخیز تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے پوست کی باقاعدہ کاشت شروع کر دی۔ کچھ علاقے میں اپنی ضرورت کے لیے میناں، پھل اور اناج بھی پیدا کیا جانے لگا۔“

”وہ افیون کا دور تھا۔ کھوراث پوست کی پیداوار سے افیون تیار کر کے برما، چین کے سرحدی علاقوں، لاؤس اور تھائی لینڈ میں بڑی مقدار میں افیون سپلائی کرنے لگا۔ دو طرف دریا ہونے کی وجہ سے یہ ٹکڑی خطہ برما کے محفوظ تھا۔ کھوراث نے اپنے گروہ پر مکمل کنٹرول کر رکھا تھا۔ دو چار نے بعض معاملات میں سرانجام دینے کی کوشش کی تو کھوراث نے بڑی بے رحمی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ دوسرے سرانجام دینے کی جرأت نہ کر سکیں۔“

”کھوراث ہر وقت مسلح اور فوجی وردی میں رہتا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ جہاز کا اضافہ کر لیا۔ اس کی شہرت آہستہ آہستہ اس پاس کے علاقوں میں پھیلنے لگی۔ لاؤس، تھائی لینڈ، برما اور چین کے جرائم پیشہ لوگ فرار ہو کر اس طرف کا رخ کرنے لگے۔ جہاز کھوراث انہیں خوش آمدید کہتا۔ اس طرح اس کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے ان ممالک سے کچھ ایسے ماہرین کو بھی لا لایا دے کر بلالیا جو بنیادی طور پر بھارت، ذہنیت کے مالک تھے۔ اس طرح افیون کے علاوہ شیشی، مارفین اور دوسری منشیات بھی تیار ہونے لگیں جو بڑی مقدار میں سرحدی علاقوں اور دنیا کے مختلف ممالک کو اسٹل کی جانے لگیں۔ یہاں پوست نہیں سوتا پیدا ہوتا تھا اور اس لیے اس علاقے کو گولڈن ٹرائی اینٹھل کا نام دے دیا گیا۔“

”اس پاس کی حکومتوں کو جب جہاز کھوراث کی سرگرمیوں کا پتا چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ جہاز کھوراث بہت بڑی طاقت بن چکا تھا۔ اس نے پوری فوج بن کر لے لی جس کے پاس جدید ترین اسلحہ اور گولہ بارود موجود تھا۔ گولڈن ٹرائی اینٹھل آج ایک چھوٹی سی ایسی سلطنت ہے جس کا جہاز کھوراث بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی فوج میں حسین اور جوان لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ جو اس شہری عیون میں ڈیوٹی دینے کے علاوہ بیرون اور دیگر منشیات کی سپلائی اور سودے بازی کے سلسلے میں مختلف ممالک کے پکڑ لگاتی رہتی ہیں۔ گولڈن ٹرائی اینٹھل میں ایک باقاعدہ ہوائی اڈا ہے۔ جہاز کھوراث کے اپنے دو تین جہاز ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی منشیات کی تنظیموں کے ہوائی جہاز بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔“

”گولڈن ٹرائی اینٹھل میں بیرون اور دیگر منشیات تیار کرنے کی کئی ٹیکٹریاں ہیں۔ جن میں ہر وقت مال تیار ہوتا رہتا ہے اور جہاز کھوراث کے منشیات کے ماہرین ان منشیات کو زیادہ سے زیادہ نشہ آور بنانے کے لیے ریسرچ میں مصروف

رہتے ہیں۔

”جنرل کھورٹ تریاڈ TRIAD کا سربراہ ہے جس کا صدر دفتر ہانگ کانگ میں ہے۔ دنیا بھر میں منشیات کی سب سے بڑی منڈی بھی ہانگ کانگ ہی ہے۔ جنرل کھورٹ گونڈن زانیہ ایکٹ سے بہت کم باہر نکلتا ہے لیکن مینی میں ایک مرتبہ وہ ہانگ کانگ کا جیکر ضرور لگاتا ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کب آیا اور کب واپس چلا گیا۔“

سرور تھاوب خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی باتوں میں دو تین مرتبہ TRIAD کا نام لیا تھا۔ یہ نام میں نے ایک دو مرتبہ ہانگ کانگ میں بھی سنا تھا لیکن اب پہلی مرتبہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ کوئی تنظیم ہے۔

”یہ تریاڈ TRIAD کس قسم کی تنظیم ہے؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے تھاوب کی طرف دیکھا۔

”تریڈ“۔ تھاوب نے ایک بار پھر گمراہ سانس لیا ”تم نے امریکی زرگ افیا کا نام سنا ہوگا۔ تریڈ اس سے بھی زیادہ خوفناک تنظیم ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”تریڈ دراصل چین پرستوں کی تنظیم تھی جو ۳۰-۴۰ء میں معرض وجود میں آئی تھی۔“

”اس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس تنظیم کی بنیاد پانچ بدھ راہبوں نے چنگ کے شہنشاہ ٹانگ سے سی اپنی توہن کا بدلہ لینے کے لیے رکھی تھی۔ شہنشاہ ٹانگ سی کے دور میں ریاست سیلو SILU کے گورنر نے بغاوت کردی اور شہنشاہ کا تختہ الٹ دینے کی دھمکی دی تو شہنشاہ نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے حبیبن اور بددوں سے مدد طلب کر لی۔“

سابق شاہی منک خاندان سے تعلق رکھنے والے چینگ کو ان نانی ایک شخص نے شہنشاہ ٹانگ سی کی یہ اپیل سنی تو وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ چینگ دنیا کو تباہ کر رہا تھا اور ان دونوں شاولن فوجوں میں باکسنگ کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ صدیوں پہلے ہی اس عبادت گاہ میں بدھ بھکشوؤں اور راہبوں کو باکسنگ اور مارشل آرٹ کے مختلف حربی فن سکھائے جاتے تھے تاکہ سفر کے دوران میں لیسوں اور ریزنوں کا مقابلہ کر سکیں۔

”چینگ کو ان اپنے ایک سواغائیں راہب ساتھیوں کو لے کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یہ تمام راہب باکسنگ اور دیگر حربی فنون کے ماہر تھے۔ ہر ایک میں خالی ہاتھ ہونے کے باوجود اپنی ہی مسلح حربیوں سے مقابلے کی صلاحیت

موجود تھی۔

”چینگ کو ان اور اس کے ساتھی اس جرات بہادری اور دانش مندی سے لڑنے کے سیکو کا گورنر شہر کا خاصرہ انکار ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ شہنشاہ ٹانگ سی چینگ کو ان اور اس کے ساتھیوں کی بہادری اور خدمات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے چینگ اور اس کے ساتھیوں کو اعزازات سے نوازتے ہوئے حکومت میں کلیدی عہدوں کی پیشکش کی لیکن چینگ اور اس کے ساتھیوں کو عہدوں یا جاہ و چشم کی ہوس نہیں تھی۔ وہ شہنشاہ کا شکریہ ادا کر کے شاولن عبادت گاہ واپس چلے گئے۔“

”شہنشاہ نے چینگ اور اس کے ساتھیوں کو جو عزت بخشی تھی وہ حکومت کے بعض عہدے داروں سے برداشت نہیں ہو سکی۔ دو وزیر تو حسد و رقابت کی آگ میں اس طرح جل رہے تھے کہ انہوں نے ان راہبوں کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ انہوں نے شہنشاہ کو باور کرایا کہ سرکاری عہدے ٹھکرا کر ان راہبوں کا واپس چلے جانا بے معنی نہیں ہے۔ انہوں نے شہنشاہ کی کمزوریوں کا اندازہ لگایا ہے۔ اب وہ تیاری کر کے پہلے جنوب میں بغاوت کریں گے اور پھر دارالحکومت پر حملہ آور ہوں گے۔ اپنے وزیروں کی باتوں سے متاثر ہو کر شہنشاہ ٹانگ سی نے شاولن عبادت گاہ کو تباہ کر دینے اور چینگ کو ان اور اس کے ساتھیوں کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔“

”شہنشاہ کے ایک فوجی دستے نے شاولن فوج کو گھیرے میں لے کر آگ لگا دی۔ عبادت گاہ کے اندر عبادت میں مصروف ایک سو دس راہب جل کر راکھ ہو گئے۔ آٹھ راہبوں کی ایک ٹولی نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی مگر ان میں سے تین شہنشاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ پانچ راہب کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔“

”شاولن فوج سے فرار ہونے والے پانچوں راہب ایک دریا کے کنارے پہنچ گئے جہاں انہیں لوہان ساگائے والا تین ناگوں والا ایک ایسا بزم قلما جس پر ”چینگ کا تختہ الٹ دو۔ منک سلطنت بحال کرو“ کے الفاظ کندہ تھے۔ ان پانچوں راہبوں نے اس ”نعرے“ کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ ایک فوجی دستہ ان کے تعاقب میں تھا۔ وہ اس سے بچنے کے لیے ایک کشتی پر دریا پار کر کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ چند کوس آگے ایک اور دریا ان کے راستے میں حائل تھا۔ یہاں بھی ایک فوجی دستہ پہراؤں رہا تھا لیکن جس طرح یہی طوطے پہلے

دریا کے کنارے پر ایک کشتی مل گئی تھی اسی طرح انہیں یہاں بھی یہی امداد مل گئی اور وہ محافظوں کی نظروں میں آئے۔ بغیریل کے قریب سے پتھروں پر چلتے ہوئے دریا پار کر کے دوسری طرف پہنچ گئے اور طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ریاست فوئین کے ایک چھوٹے سے شہر پہنچ گئے۔ یہیں پر انہوں نے تریاڈ تنظیم کی بنیاد رکھی اور ”چینگ سلطنت کا تختہ الٹنے اور منک سلطنت کی بحالی“ کے مشن پر کام شروع کر دیا۔

”ان کا مشن کامیابی سے جاری تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ تریاڈ تنظیم میں شامل ہو رہے تھے۔ چنگ شہنشاہ کے خلاف غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پورے صوبے فوئین پر قبضہ کرنے کے بعد پانچ راہبوں نے اپنی تباہ کردہ فوج کے ساتھ چنگ پر حملہ کر دیا لیکن سرکاری فوجوں کے ہاتھوں ہزاروں لوگ مارے گئے۔“

”بغاوت ناکام ہونے کے بعد پانچوں راہب ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تاکہ لوگوں کو چنگ شہنشاہ کے خلاف بھڑکا کر اس قسم کی بغاوتیں کدوائی جائیں اور شہنشاہ کا تختہ الٹ دیا جائے۔“

سرور تھاوب خاموش ہو گیا۔ اس نے اشارے سے لوما کو کافی یا چائے لانے کے لیے کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

”تریڈ تنظیم کا سفر جاری رہا۔ یہ سوئی صد قوم پرستوں کی تنظیم تھی جو مختلف ادوار میں ظالم اور سفاک حکمرانوں کے خلاف ہر سر پر کار رہی۔ ہر خفیہ تنظیم کی طرح تریڈ کے بھی اپنے کچھ اصول تھے۔ ہر ممبر کو تنظیم کے وضع کردہ چھتیس اصولوں پر پابند رہنے کا حلف اٹھانا ہوا تھا۔ تنظیم سے نڈاری کی سزا موت تھی۔“

”یہ تنظیم کئی گروہوں میں منقسم تھی۔ ہر گروہ اپنے اپنے علاقے میں سرگرم تھا لیکن کسی نہ کسی طرح یہ سب کئی ایک مرکز کے تحت متحد بھی تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں بیرونی ممالک میں بھی اس تنظیم کی القاعدہ برائیاں قائم ہو چکی تھیں۔“

”ڈاکٹر سن یات سین بھی تریڈ کا ایک سرگرم رکن تھا۔“

۱۹۴۸ء میں اس نے چین میں عوامی جمہوریہ کے قیام کی جدوجہد شروع کی تو بیرونی ممالک میں تنظیم کی برائیاں نے دل کھول کر فتنہ فراہم کیے اور پھر چین میں شہنشاہیت کے خاتمے اور عوامی جمہوریہ کے قیام کے بعد تریڈ تنظیم کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تنظیم کی رکن سازی میں

اضافہ ہونے لگا۔ یہ تنظیم اس قدر طاقتور بن گئی کہ اسے پریشر گروپ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اعلیٰ سرکاری آفیسرز بھی اس کا ممبر بننے میں ہی اپنی ممانعت سمجھتے گئے۔ بڑے بڑے صنعت کار اور تاجر بھی اپنے تحفظات کے لیے تریڈ کے سامنے آ گئے۔

”اس طرح کی کسی تنظیم کو سیاسی پشت پناہی اور قوت مل جائے تو اس کے لیے اپنے اصل مقصد سے بہت کچھ جرائم کی طرف مائل ہونا پڑے گا۔ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ تریڈ کے پاس طاقت بھی تھی اور سیاسی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ اس کی سرگرمیوں کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ کاروباری لوگوں سے تحفظ فراہم کرنے کے نام پر بھتے ڈیکتیاں دہشت گردی اور قتل و غارت کی وارداتوں میں تریڈ کا نام آنے لگا۔ ری پبلکن انقلاب کے بعد تو تریڈ کے بعض دھڑے مست باہمی کی طرح بے قابو ہو گئے تھے۔ ان دھڑوں سے وابستہ لوگ کھلے عام عسکین جرائم کا ارتکاب کرنے لگے۔ قانون ان کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ تریڈ کا ہر دھڑ اپنی جگہ خود مختار اور پوری طرح جرائم میں ملوث ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی۔ ان کے سامنے لوٹ مار اور قتل و غارت کے سوا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ ایسی صورت حال میں کوئی بڑا سیاسی مقصد ہی انہیں ایک مرکز پر لٹا سکتا تھا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیان عرب میں ہانگ کانگ میں اپنی کیونٹ کاڑ کے نام پر تریڈ کے ان دھڑوں کو متحد کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ مختلف گروہوں میں بیٹے ہوئے اس تنظیم کے لوگ جرائم کے راستے پر اس قدر آگے نکل چکے تھے کہ ان کی واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔“

”ہانگ کانگ تریڈ کی جرائم پیشہ ذیلی تنظیموں کا گڑھ بن چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں یہاں تریڈ کے سات بڑے گروہ تھے جنہوں نے جرمانہ سرگرمیوں کے لیے حادثے بانٹ رکھے تھے۔ ان گروہوں کی برائیاں بھی تھیں جو حادثے میں پھیلی ہوئی تھیں اور انہیں اپنے اپنے ہیڈ کوارٹر سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ بعض گروہ ٹریڈ یونین، رفاہی و سماجی اداروں اور اسپورٹس کلبوں کی آڑ میں اپنی جرمانہ سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے تھے۔“

”یہ چین کا بدترین اقتصادی دور تھا۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ روزگار کے مسائل بھی بڑھ رہے تھے۔ ایک عام آدمی کو ایک دقت کی روٹی کمانے کے لیے کڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ روزگار کا حصول ایک عسکین مسئلہ

بن گیا تھا۔ ایک طرف عوام نان شبینہ تک کو محتاج تھے تو دوسری طرف سرکاری ملازمین کرپشن کی دلدل میں دھنس گئے تھے۔ وہ اپنے فرائض منصبی کو پس پشت ڈال کر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے لگے۔ زندگی کے عام شعبوں میں بھی کرپشن پھیلنے لگی۔

”صورتِ حال جب ایسی ہو تو جرائم پیشہ لوگوں کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے جین کے بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً ہانگ کانگ میں جی جرائم پیشہ تنظیمیں جنم لینے لگیں اور پرانی تنظیمیں اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے ان نئی تنظیموں کا راستہ روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک دوسرے کے علاقے میں مداخلت کے نتیجے میں خونی تصادم روزمرہ کا معمول بن گئے۔ تریاڈ کے بعض گروپ اب بھی پاور میں تھے۔ یہ گروپ لوگوں کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی زندگیوں، املاک اور کاروبار کے تحفظ کے لیے ان کے مجبر بنیں اور بھتا ادا کریں۔ انکار کی صورت میں ان کا کاروبار تباہ کر دیا جاتا، املاک کو نذر آتش کر دیا جاتا اور بعض لوگوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

”ہانگ کانگ میں جرائم میں سب سے زیادہ اضافہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ ۱۹۴۱ء سے پہلے ہانگ کانگ کی آٹھ یا نو فیصد آبادی تریاڈ سے وابستہ تھی۔ ۱۹۵۸ء میں یہ وابستگی پندرہ فی صد سے بھی بڑھ گئی۔

”تریاڈ کے بعض گروپ متحد ہو کر پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو گئے تھے۔ طوائفوں کے بزنس، جوئے، منشیات فروشی اور جرائم کے دیگر تمام شعبوں پر ان کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ جین کے اندرونی شہروں کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی عجب کساد بازاری کا دور تھا۔ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جاپانی فوجیں اگرچہ واپس جا چکی تھیں مگر جین میں کمیونسٹوں اور قوم پرستوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

بالآخر ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں نے قوم پرستوں کو عملی طور پر سمندر میں دھکیل دیا۔ قوم پرست مہاجروں کے قافلے ہانگ کانگ کا رخ کرنے لگے۔ ان میں جرائم پیشہ بھی تھے اور جو جرائم پیشہ نہیں تھے، وہ بھی ایک وقت کی روٹی کے لیے جرائم کا ارتکاب کرنے لگے۔

”افرائی کے اس دور میں ہانگ کانگ میں ریڈ ہانگ اور گرین ہانگ نام کی دو اور تنظیمیں سامنے آئیں۔ ریڈ ہانگ نے تو اپنی توجہ لیبر یونین، عورتوں کے کاروبار، جوئے اور منشیات کی فروخت تک محدود رکھی لیکن گرین ہانگ ہشت پانچ کی طرح ہر طرف پھیل رہی تھی۔ بہت مختصر عرصے میں

اس کے ممبروں کی تعداد اسی ہزار سے تجاوز کر گئی۔ گرین ہانگ کے ممبروں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مجرمانہ سرگرمیاں دوسری جرائم پیشہ تنظیموں خصوصاً تریاڈ گروپس کے لیے کھلی دھمکی تھی۔ گرین ہانگ ان کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ تریاڈ نے بھی اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے اپنے ممبروں کی تعداد بڑھانا شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرین ہانگ اور تریاڈ میں ٹٹل شروع ہو گئی۔ آٹے دن چھوٹے موٹے تصادم ہونے لگے اور بالآخر ۱۹۵۶ء میں وہ طوفان پھٹ پڑا جس کا لوگوں کو ایک عرصے سے خوف تھا۔ تریاڈ اور گرین ہانگ کے خونی تصادم میں سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ جزیرے کی پولیس بے بس تماشائی بنی رہی۔

”اس خونی تصادم میں فتح بالآخر تریاڈ ہی کی ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ طاقت ور بن گئے۔ اس کے مظالم اور جرائم کا دائرہ کچھ اور وسیع ہو گیا۔ ہر شخص ان سے خوف زدہ تھا۔ کوئی بھی شخص بھتا دیے بغیر کوئی معمولی سا کاروبار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک اسٹریٹ ہاکر کو بھی فٹ پاتھ پر اپنا ٹھکانا لگانے کے لیے چند فٹ جگہ کا کرایہ دینا پڑتا تھا اور اپنے سامان وغیرہ کی حفاظت کے لیے الگ بھتا دینا پڑتا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں تریاڈ کے غنڈے اس کا سامان کس کس نہس کر دیتے اور اس کی جگہ کسی اور کو دے دی جاتی۔ صرف اسٹریٹ ہاکروں سے تریاڈ کو روزانہ دو ہزار امریکی ڈالر کی آمدنی ہو رہی تھی۔ جوئے پالش کرنے والے لڑکوں، طوائفوں، ہوٹلوں میں ڈانس کرنے والی لڑکیوں، ریسٹورنس، چھپڑ اور اسپورٹس کلبوں کے فروخت ہونے والے مکینوں پر جگہ ٹیکس کی آمدنی الگ تھی۔ تاہم تریاڈ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ منشیات فروشی، جوئے، جرائم پیشہ لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا، رشوائی ٹیکس ڈرائیوروں اور عام مزدوروں سے بھتے کی وصولیائی کی صورت میں تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ہانگ کانگ کی آبادی تیس لاکھ تھی اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اس آبادی سے بھتوں کی صورت میں تریاڈ کی آمدنی ستر لاکھ امریکی ڈالر سے زیادہ تھی۔ تنہا دو اور دہشت گردی اس آمدنی کے حصول کے لیے تریاڈ کا موثر ترین ہتھیار تھی۔

”جزل کوراث ان دونوں گولڈن ٹرائی اینگل میں قدم جما رہا تھا۔ اس دوران میں وہ وقتاً فوقتاً ہانگ کانگ کے چکر لگاتا اور گہری نظروں سے حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ کئی سال بعد جب وہ گولڈن ٹرائی اینگل میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تو اس نے ہانگ کانگ میں تریاڈ کے چند گروپوں کو متحد کیا اور خود ان کا سربراہ بن گیا۔ ہانگ کانگ میں اگرچہ اس وقت اور



بھی بہت سے جراثیم پیشہ گروہ سرگرم ہیں مگر تریاڈ کو سب سے زیادہ طاقت ور گروہ سمجھا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ منشیات کی دنیا میں سب سے بڑی منڈی ہے اور یہاں اڑتالیس فی صد منشیات گولڈن ٹرائی اینٹیکل سے آتی ہیں۔ اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم جنرل کھوراث کی طاقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ”سردار تھالوب خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔“

سردار تھالوب کی باتوں نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے دماغ میں تیز سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں ہانگ کانگ میں دیکھ چکا تھا کہ منشیات فروشوں کے مختلف گروہ کسی ایک اڈے پر قبضہ جمانے کے لیے کس طرح آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ خون کی ندیاں بہا دی جاتی تھیں اور یہ سب کچھ صرف اور صرف دولت کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ اخلاق، شرافت، رواداری اور دوسری انسانی قدریں دم توڑ چکی ہیں۔ اہمیت صرف دولت کی رہ گئی ہے اور اس کے لیے دوسروں کو بڑی سبے رحمتی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

لوما بہت دیر پہلے ہمارے سامنے کافی رکھ گیا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے بھی سب نہیں اٹھایا تھا۔ نتیجتاً کافی ٹھنڈی ہوئی۔ سردار تھالوب کے اشارے پر لوما نے دونوں کپ اٹھ لیے اور تھوڑی دیر بعد تازہ کافی بنا کر لے آیا۔ کافی کی سپیکس لیتے ہوئے بھی ہم جنرل کھوراث اور تریاڈ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پانچ بجے کے قریب سردار تھالوب اٹھ گیا۔

”میں نو بجے تک آ جاؤں گا۔ تم اوگ تیار رہنا۔ ہم کھانا کھا لے، جی یہاں سے نکل چلیں گے۔“ تھالوب کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

رنگولی اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ تینوں کمرے میں بیٹھی بائیں کمرے تھیں، میں اٹھ کر لان میں آیا۔ سردار تھالوب ٹھیک نو بجے واپس آیا تھا۔ اس کے آتے ہی لوما نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانے کے بعد کافی بھی پی لی اور پھر دس بجے کے قریب ہم لوما سے رخصت ہو کر بیچ میں بیٹھ گئے۔ ہمیں رخصت کرتے وقت لوما کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پچھلے چند روز کے دوران میں سمجھتی تھی اس سے کچھ اس سا ہو گیا تھا۔ جب کانچ کے گیٹ سے نکل کر گولڈن ٹرائی اینٹیکل کی طرف جانے والی سڑک کے بجائے دوسری طرف مڑ گئی۔ دریا تک پہنچنے کے لیے اس مرتبہ سردار تھالوب نے ایک نئے

راستے کا انتخاب کیا تھا جو اگرچہ خاصا طویل مگر محفوظ تھا۔ جب پہاڑوں میں ایک جگہ چھوڑ دی پڑی اور ہمیں تقریباً دو گلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا۔ اگر سردار تھالوب کے پاس تارچ ہے تو کھری تاریکی میں اس خطرناک پہاڑی راستے پر چار قدم چلنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ تارچ بھی چھوٹی تھی۔ اس کی روشنی کا مختصر سا دائرہ ہمارے قدموں کے سامنے زمین پر پڑ رہا تھا اور پھر ایک جگہ تھالوب نے تارچ بھی بجھا دی، اس سے آگے تقریباً دو سو گز کا فاصلہ ہمیں تاریکی میں ہی طے کرنا پڑا تھا۔ پہلے ہم چھوٹی چھوٹی چٹانوں پر چڑھتے رہے پھر نشیب میں اترنے لگے۔ چٹانوں سے لہروں کے ٹکرانے کی آواز سے اندازہ ہو گیا کہ ہم دریا کے کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔

سردار تھالوب ایک جگہ کھڑا چند لمحوں تک تاریکی میں اُدھر اُدھر گھورتا رہا پھر اس کے منہ سے کسی جانور کی عجیب سی آواز نکلی۔ چند سیکنڈ سنا رہا ہوا پھر بائیں طرف تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایسی ہی ایک آواز ابھری۔ سردار کے ساتھ میں نے بھی اس طرف دیکھا۔ مجھے ایک لمحے کو ایسا لگا تھا جیسے اس طرف کوئی جگنو سا چمک کر غائب ہو گیا ہو۔

ہم اس طرف چلے گئے۔ تاریکی میں پتھروں پر چلنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ رنگولی اور جاگی نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے جبکہ سردار تھالوب ہم سب سے آگے تھا۔

ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے جھپٹا ہوا رُج جگہ پر چھ سات آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ قبائلی تھے۔ تھالوب ایک قبائلی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے جواب دیتے ہوئے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بھی سردار تھالوب کے ساتھ اس قبائلی کے ساتھ چلنا ہوا نیچے آیا۔

یہاں اونچی جھاڑیاں دریا کے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دریا کے کنارے پر بعض درختوں کی شاخیں بھی پانی پر جھکی ہوئی تھیں اور ان جھاڑیوں کی آڑ میں پانی میں ایک کشتی کھڑی تھی۔ اس کشتی میں کم از کم چھ آدمیوں کے بیٹھنے کی عینائش تھی۔ کشتی میں انجنیٹ تھا اور اس میں کچھ سامان بھی رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کشتی تفریح گاہ والے گھاٹ کی طرف سے لائی گئی ہوئی لیکن جب سردار تھالوب نے یہ بتایا کہ قبائلی وہ وزنی کشتی ان دشوار گزار پہاڑیوں میں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔

”کشتی میں آٹونیک رائفیں اور اتنا ایمونیشن موجود

ہے کہ تروگ آسانی سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جا سکو۔“ سردار تھالوب بتا رہا تھا اور پھر اس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ آدمی تم لوگوں کے ساتھ جائے گا اور گولڈن ٹرائی اینٹیکل والے کنارے پر اتار کر اڑتالیس گھنٹوں تک دریا کے وسط والے جزیرے پر تمہارا انتظار کرے گا۔“

میں نے کشتی میں اتر کر دیکھا۔ اس میں تین آٹونیک رائفوں کے ساتھ بھرے ہوئے کئی میگزین بھی موجود تھے اور پھر اپنے بازو پر پانی کے جھینے محسوس کر کے میں چونک گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر گہرے بادل توجہ یں تھے اور اس وقت بجلی بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔

”اجھا گھٹن ہے۔“ سردار تھالوب نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس طرف اگر گولڈن ٹرائی اینٹیکل کے محافظ آگتے ہیں تو تیارش سے پہنچنے کے لیے کسی پناہ گاہ میں دیک جائیں گے اور تم لوگوں کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔ اب زیادہ دیر مناسب نہیں ہوئی۔ تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔“

میں کشتی سے باہر آکر سردار تھالوب سے ہنسل گیر ہو گیا۔

”تمہاری صحبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا تھالوب۔ زندہ رہا تو پھر کبھی نہ بھی ملاقات ضرور ہوگی۔“ میں نے کہا۔

سردار تھالوب نے میرے گال پر بوسہ دیا اور زبردست ہتھ پڑوانے لگا۔ شاید وہ کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔ رنگولی، جاگی اور سونیا سے الوداعی ملاقات کرنے کے بعد مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے بھی میرے گال پر بوسہ دیا اور پھر ہم کشتی پر سوار ہو گئے۔

تھالوب کے آدمی نے کشتی پر اپنی سیٹ سنبھال لی اور مٹن دیا کر انجن اشارت کر دیا۔ انجن کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔

کشتی حرکت میں آگئی اور جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر دریا کے وسط پانی کی طرف بڑھنے لگی۔ سونیا، جاگی اور میں تھالوب اور رنگولی کی طرف ہاتھ مار رہے تھے۔ میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا اور یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ ہم زندگی سے دور اور موت کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔

○●○

بارش کی بوندیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ گرمی تاریکی میں دریا کے وسط میں وہ چھوٹا سا جزیرہ ایک

سیاہ دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہی تھی۔ میں کشتی کے کنارے کے ساتھ لگا بیٹھا سری نظروں سے بھی اس جزیرے کی طرف اور کبھی دریا کے اس تاریک کنارے کی طرف دیکھتے دیکھتے لگتا جیسا کہ گولڈن ٹرائی اینٹیکل کی سرحد شروع ہوئی تھی۔

میرے ہاتھ میں بھی رائفل تھی اور جاگی اور سونیا نے بھی رائفیں سنبھال رکھی تھیں۔ وہ دونوں اس طرح پوزیشن لیے بیٹھی تھیں کہ کسی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

کشتی تقریباً پانچ منٹ میں اس جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔ قبائلی کشتی کو کنارے کے بالکل قریب لے گیا مگر دور سے نظر نہ آ سکے۔ اسی وقت بارش بند ہو گئی۔ قبائلی کشتی کا انجن بند کر دیا تھا۔ وہ گرمی نظروں سے دریا کے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ موقع ہے باس۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ”نکل چلیں۔“

”ہاں چلو۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ انجن اشارت ہوا اور کشتی حرکت میں آئی۔ سونیا اور جاگی بھی سامنے کے رخ پر پوزیشن لے کر میڈن کھڑے تھیں۔ میں نے رائفل کی ٹال کشتی کے کنارے پر نکارھی تھی اور انکی ٹریگر پر تھی جبکہ نظروں سے تاریکی میں جھک رہی تھیں۔

بارش ایک بار پھر شروع ہوئی۔ اس وقت موٹی بوندوں کے بجائے بالکل ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں کنارے پر درختوں کے تاریک بیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کسی بھی قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ درختوں کے ہولے لہجے لہجہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔

کنارے سے ہمیں پچیس گز دور قبائلی نے انجن بند کر دیا۔ کشتی کنارے کی طرف بڑھتی رہی۔ اس کی رفتار خود بخود کم ہوئی چلی گئی تھی اور بالآخر کشتی کنارے پر بھی ہوئی جھاڑیوں میں پہنچ کر رک گئی۔

قبائلی نے تاریکی میں اُدھر اُدھر دیکھا۔ دائیں طرف دس بارہ فاصلے پر ایک بڑا سا پتھر تھا جس پر چھڑکنا رہے پر پہنچا جاسکتا تھا۔ قبائلی نے کشتی میں پڑی۔ دوئی ایک رسی اٹھائی جس کے سرے پر ایک آہنی آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے وہ آنکڑا پتھر کی طرف اٹھا دیا۔ کھٹاک کی آواز ابھری۔ آنکڑا پتھر کے دوسری طرف گرا تھا۔ قبائلی رسی کو پھینچنے لگا۔ آنکڑا پتھر میں انک کہا تھا۔ رسی ٹائٹ ہوئی تو کشتی آہستہ آہستہ پتھر کی طرف رینگنے لگی اور بالآخر پتھر کے ساتھ ٹک کر

رک گئی۔

پتھر در تک ہم نے جس حرکت کشتی میں بیٹھے رہے۔ میں کسی قسم کی آہٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر تیز ہوا میں جھانڑوں کی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے سونیا اور جاکلی کو اشارہ کیا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے بیک اسٹریپ کی مدد سے پشت پر لا دیے۔ انہوں نے کچھ فاضل میگزین بھی اپنے اپنے بیک میں ٹھونس لیے تھے۔ دو دو میگزین پتلون کی بیٹھ میں اڑس لیے تھے۔ میں نے بھی دو فاضل میگزین اپنی پتلون کی بیٹھ میں اڑس لیے اور کشتی سے نکل کر پتھر آگیا۔ اس وقت میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یہ موت کی وادی میں میرا پہلا قدم تھا۔ میں نے جاکلی اور سونیا کو بھی سہارا دے کر پتھر پہنچ لیا اور قبائلی کی طرف ہاتھ ملا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آنکڑے والی رسی اٹھا کر کشتی میں ڈال دی تھی۔

انجن اشارت ہوا اور کشتی حرکت میں آکر تیزی سے دریا کے کھلے پانی کی طرف تیرنے لگی۔ میں کشتی کی طرف دیکھتا رہا جو بالآخر دربوکر تیار کی میں دم ہو گئی۔

پھوار بدستور پڑی تھی۔ ہم تینوں رانٹھیں سنبھالے بے حس و حرکت اس پتھر پیٹھے رہے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ہماری آمد فاسکی کو پتا نہیں چل سکا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تاریکی میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اس سے آگے ایک اور پتھر تھا جو کنارے سے ملا ہوا تھا۔ ہم تینوں اس پتھر آگے اور پھر کنارے پر قدم رکھنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

جھانڈیاں کنارے کے اوپر کافی دور تک چلی گئی تھیں۔ ہم تینوں کمانڈوز کی طرح قطار میں چلتے ہوئے ان جھانڈیوں میں کافی دور تک چلے گئے۔ اس سے آگے جھانڈیاں اگرچہ کم ہوئی چلی گئی تھیں لیکن اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ہم رکے بغیر چلتے رہے۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور میں دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ محافظوں کا گشت رہتا ہو لیکن اس وقت ملکی بارش ہمارے لیے پناہ بن گئی تھی۔

ہم کنارے سے تقریباً پانچ سو گز اندر آچکے تھے ہمیں واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا ہے بتدریج بلندی کی طرف جارت ہوئے۔ سونیا میرے پیچھے تھی اور وہ ہانپنے لگی تھی۔

ہم نے چند ہی گز کا مزید فاصلہ طے کیا تھا کہ دائیں طرف خلیب میں بہت دور روشنی چمکتی دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ روشنی متحرک تھی جو چند سیکنڈ نظر آئی پھر غائب ہو گئی اور ایک منٹ بعد دوبارہ دکھائی دی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی گاڑی تھی جو ناہموار آڑے تر پتھروں سے راستے پر دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اسی طرف آ رہی تھی۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ کیا ان لوگوں کو پتا چل گیا ہے؟ اور کیا وہ گاڑی ہماری ہی تلاش میں اس طرف آ رہی ہے۔ سونیا اور جاکلی نے بھی گاڑی کی روشنی دیکھ لی تھی۔

”باس دھم“ سونیا نے سرگوشی میں غالباً اس گاڑی کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تھا مگر آواز اس کے حلق میں ایک ٹپ تھی۔

”میں نے دیکھ لیا ہے۔“ میں نے کہا اور مجھے نظر میں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر سونیا اور جاکلی کو اشارہ کرتا ہوا تیزی سے ایک درخت کی طرف لپکا جس کے اطراف میں گنجان اور قد آدم جھانڈیاں تھیں۔ ایسی جگہوں پر سانپ چھو یا دیگر زہریلے کینے کوڑوں کا خوف رہتا ہے لیکن جب اس سے زیادہ خوفناک موت سامنے ہو تو زہریلے کینے کوڑوں کی پروا کون کرتا ہے۔

ہم تینوں جھانڈیوں میں دیک کر بیٹھ گئے۔ رانٹھیں ہمارے ہاتھوں میں تیار تھیں اور نظریں اس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں پر تھیں۔ وہ درختوں کا بھی لہجہ تھا جس سے اوچھل ہو جاتی تھی اور ابھی سامنے آ جاتیں۔ ان روشنیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب ہمارے اور اس گاڑی کے بیچ کوئی ایسی رکاوٹ نہیں تھی البتہ جھانڈیاں اور درخت تھے لیکن روشنی مسلسل ہماری نگاہوں میں تھی۔

وہ گاڑی دریا کی طرف خلیب میں ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ ایک مرتبہ وہ ڈراما گویا تو تیز روشنی ٹھیک ان جھانڈیوں پر پڑی جہاں ہم چھپے ہوئے تھے لیکن ایک لمبے بعد ہی روشنی کا رخ بدل گیا۔

وہ ایک کھلی جیب تھی جس کی چھت پر بھی ایک چھوٹا بلب جل رہا تھا اور اس بلب کی روشنی میں چھت پر نصب مشین گن صاف نظر آ رہی تھی۔ ایک آدمی دونوں ہاتھ مشین گن پر رکھے چوکے کھڑا تھا اور تین آدمی آٹومیک رانٹھیں لیے جیب کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ محافظوں کی غشتی جیب تھی جو دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ گشت کر رہی تھی۔ وہ جیب ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزر گئی۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

”اگر یہ جیب میں پچھلی منٹ پہلے آ جاتی تو؟“ جاکلی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”جب ایسا ہوتا تو اس وقت سوچا جاتا۔“ میں نے جواب دیا ”مگر فی الحال خطرہ حل گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم تھوڑی دیر اور یہاں رہیں گے۔“

میں اب بھی اس جیب کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی دور دور ہوئی ہوئی عقبی سرخ تیاں بھی لگا ہوں میں آ جاتیں اور کبھی غائب ہو جاتیں اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد وہ روشنیوں بالکل غائب ہو گئیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”وہ جیب واپس ضرور آئے گی اور اس سے پہلے ہمیں یہاں سے کچھ دور نکل جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

وہ دونوں بھی کھڑی ہو چکی تھیں۔ ہم جھانڈیوں سے نکل کر تیزی سے بلندی کی طرف چلے گئے۔ تقریباً سو گز آگے جا کر ڈھلان شروع ہو گئی۔ اب اگرچہ پھوار بھی بند ہو چکی تھی لیکن ڈھلان پر پھسلنے بھی اور چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں خود کی مرتبہ کرتے کرتے بچا تھا۔

ہم دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے۔ جاکلی اور سونیا تھک گئی تھیں اور بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

”اب ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔“ جاکلی نے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”کوئی جگہ تلاش کرو جہاں کچھ دیر سستا جاسکے۔“

”وہ آگے چٹانیں نظر آ رہی ہیں۔ وہاں شاید کوئی جگہ مل جائے۔“ میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ چٹانیں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھیں۔ سونیا اور جاکلی جیسے تیسے وہاں تک پہنچ گئیں۔ یہ پہاڑیاں کانٹے دار جھانڈیوں اور اونچے درختوں سے لدی ہوئی تھیں۔ میں آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ مجھے ان پہاڑیوں میں ٹھک سی کھوہ نظر آئی۔ یہ دراڑ اس قدر تنگ تھی کہ ایک آدمی بٹھل گشت کر گزر سکتا تھا۔

میں اس تنگ سی دراڑ میں گھٹا چلا گیا۔ سونیا اور جاکلی بھی میرے پیچھے ہی آ رہی تھیں۔ تقریباً پندرہ فٹ آگے جا کر دراڑ کچھ کشادہ ہو گئی اور پھر میں اچانک یہ کھلی جگہ پر نکل آیا۔

تقریباً سو گز دور فٹ جگہ تھی اور اس کے اطراف میں بلند

عمودی چٹانیں تھیں جن کے اوپر فلک بوس درختوں نے سایہ کیا ہوا تھا۔ اس جگہ آمدرفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا یعنی وہ دراڑ جس سے ہم گزر کر آئے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بہت اوپر درختوں کی جھومتی ہوئی شاخیں اور ان سے اوپر بادلوں سے ڈھکا ہوا تاریک آسمان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی بہت گہرے کنوئیں کی تہ میں کھڑے ہوں۔

پیروں کے نیچے زمین کھلی تھی۔ کسی کسی جگہ پانی بھی کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اس جگہ کا ٹھیک سے جائزہ نہیں لیا جاسکتا تھا لیکن سونیا نے میری یہ مشکل حل کر دی۔

”میرے پاس ٹارچ موجود ہے۔ بیک میں رکھی ہوئی ہے۔ میں ابھی نکالتی ہوں۔“ سونیا نے کہتے ہوئے اپنی رائفل جاکلی کو تھما دی اور بیک کندھے سے اتار کر زپ کھولی اور اندر ہاتھ ڈال کر ٹھونکے لگی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دو سیل والی ایک ٹارچ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی۔

میرے خیال میں یہاں اگرچہ کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں نے ٹارچ جلانے سے پہلے احتیاطاً چٹانوں پر اوپر کی طرف دیکھ لیا تھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے ٹارچ بدلی اور اس کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بائیں طرف تین پینتیس فٹ کے فاصلے پر ایسی ہی ایک اور دراڑ نظر آئی جو نسبتاً کشادہ تھی۔ میں اس کے اندر گھٹتا چلا گیا۔ آٹھ دس فٹ آگے جا کر یہ دراڑ بائیں طرف مڑ گئی اور اس طرف ایک مختصر سا غار دیکھ کر میری آنکھیں تنک اٹھیں۔ یہ غار بٹھل دس فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا ہو گا لیکن ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ غار کا فرش اگرچہ ناہموار تھا مگر صاف تھا۔ کوئے میں تین پتھر چوڑے کی طرح رکھے ہوئے تھے جن کے بیچ میں پرکھ بڑی ہوئی تھی اور اوپر غار کی دیوار اور اوپر چھت کالی ہو رہی تھی۔

یہ یقیناً کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جسے خفیہ کہا جاسکتا۔ جزل کھودات کے آدمی اپنے اس خطے کی ایک ایک انچ زمین سے واقف ہوں گے اور پتھروں کا یہ چوہا اور اس میں پڑی ہوئی راکھ یہ ثابت کر رہی تھی کہ یہ غار پہلے بھی کسی کی رہائش کے لیے استعمال ہو چکا تھا۔ میں نے جھک کر چوڑے میں پڑے ہوئے کوئلوں اور راکھ کو دیکھا۔ ان پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی جس سے مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ یہ غار بہت عرصہ پہلے استعمال کیا گیا تھا۔ فرش پر بھی دھول جمی ہوئی تھی۔

باہر آکر میں نے سونیا اور جاکلی کو اس غار میں بٹھایا اور ٹارچ کی روشنی میں دوسری اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف چٹان کا ایک حصہ سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔

اس سامان کے نیچے اتنی جگہ تھی کہ چارپانچ آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔

اطراف میں چٹانیں بالکل عمودی اور چٹنی تھیں۔ بالکل کسی گہرے کنوئیں کی طرح۔ چٹانی سامان کے نیچے کی جگہ بھی اگرچہ ہمارے لیے محفوظ تھی لیکن ہم نے غار کے اندر بیٹھنے کو ترجیح دی اور کشادہ دراڑ میں سے ہوتے ہوئے غار میں آگئے۔ میں نے تارچ کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر غار کا جائزہ لیا اور دبانے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ باہر سے اس کنواں نما جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ یہاں آمدورفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا یعنی وہ تنگ سی دراڑ جس سے ہم اندر آئے تھے۔ یہاں ہم محفوظ تو تھے لیکن اگر کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہو جاتا تو ہمارے فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ ہوتا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جاگی اور سونا بھی سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکی تھیں۔ بارش کی وجہ سے میرے کپڑے بھیجے ہوئے تھے۔ قیصر بدن سے چپلی ہوئی تھی اور عجیب سی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے قیصر اتار کر دبانے کے قریب ہی ایک پتھر ڈال دی اور تارچ بجھا کر داخل کے قریب ہی رکھ لی۔ تارچ جلائے رکھنا مناسب نہیں تھا۔ بعد میں بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سیل ختم ہو جاتے تو تارچ ہمارے لیے بیکار ہو جاتی۔

پہاڑی راستوں پر پیدل سفر کرنا بڑا ناگھن ہوتا ہے۔ کشتی سے اترنے کے بعد ہم نے اگرچہ زیادہ سے زیادہ چار میل کا فاصلہ طے کیا تھا لیکن تھکن سے میری ٹانگیں ٹھل ہو گئی تھیں۔ سونا اور جاگی کی حالت تو شاید مجھ سے بھی بری تھی۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر جاگی کے خزانے سنائی دینے لگے۔ سونا اب بھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے شاید بیک میں سے کوئی کپڑا نکال کر نیچے بچھایا تھا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ مجھے کچھ دیر بعد بھی سنائی دیتی رہی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم میں سے کم از کم ایک فرد جاگتا رہتا لیکن تھکن تو ہم تینوں پر سوار تھی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ سونا میرے بعد کتنی دیر تک جا رہی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو دن کی مدھم سی روشنی غار کے دبانے اور کچھ اندر تک پہنچ رہی تھی۔ میرے دماغ میں اب بھی سنسانٹ ہو رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا۔ دراڑ کے باہر کی روشنی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ آسمان بادلوں سے صاف ہو گیا تھا اور سورج نکلا ہوا تھا۔

دھوپ اگرچہ اس کنوئیں تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اوپر درختوں کی شاخوں پر دھوپ کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دیکھا تو ایک گڑھے میں پانی نظر آیا۔ ایک چٹان کی طرف سے تھوڑا تھوڑا پانی انحراس گڑھے میں جمع ہو رہا تھا اور دوسری طرف سے برہا تھا۔ میں نے چند گھونٹ پئے۔ منہ ہاتھ دھویا اور اندر آیا۔ تھوڑی دیر بعد جاگی بھی منہ ہاتھ دھو کر آگئی اور سونیا نے اپنے بیک میں سے ایک ٹن نکال لیا۔ کڑے ڈھکنا کاٹا اور ڈپا سامنے رکھ دیا۔ چکن کے تیلے ہوئے نمکین بریڈت پس تھے۔ یہی ہمارا ناشتا تھا اور یہی کھانا بھی۔ ہمارے پاس خوراک زیادہ نہیں تھی اور ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک کوئی اور بندوبست نہ ہو جائے اس خوراک کو احتیاط سے استعمال کریں گے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم غار سے باہر آگئے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ درختوں کی شاخوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ میں راستہ سنبھالے اس تنگ سی دراڑ میں داخل ہو گیا جس سے گزشتہ رات ہم اندر آئے تھے۔ دراڑ سے باہر نکل کر میں نے چپے سی سامنے دیکھا، مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سامنے تاحہ نگاہ ہر طرف آتش لگانی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ وہ دراصل پوست کی فصل تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے جنہوں نے تاحہ نگاہ زمین پر شفق کا رنگ بھیر دیا تھا۔ دنیا کا حسین ترین پھول جس میں خوفناک ڈرہمرا ہوا تھا۔

سونا اور جاگی بھی دراڑ سے باہر آگئی تھیں اور وہ دونوں بھی یہ حسین منظر دیکھ کر انکشت بدندان رہ گئی تھیں۔ رات کی تاریکی میں ہم جنہیں جھاڑیاں سمجھتے رہے تھے وہ دراصل یکی پوست کے پورے تھے۔

”اے۔۔۔ وہ دیکھو۔“ جاگی نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ بہت دور ایک پہاڑی کے عقب سے دھوئیں کی ایک لکیر اٹھ رہی تھی۔ ”کیس آگ لگی ہے یا۔۔۔“

”آگ نہیں لگی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”میرا خیال ہے اس طرف کوئی بستی ہے اور ہمیں اس طرف کامخ کرنا چاہیے۔“

ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے۔ سونا اور جاگی غار میں سے اپنے بیک اٹھالیں اور ہم خیش میں اترنے لگے۔ دن کے وقت سفر کرنا اگرچہ خطرناک ہو سکتا تھا لیکن ہمیں خطرہ تو بہر حال مول لینا ہی تھا۔ پوست کے پورے اتارے تھے کہ ہم آسانی سے چھپ کر چل سکتے تھے۔ بعض بندوں پر

پودوں کی اونچی کیچھ کھڑی تھی۔ وہاں ہمیں محتاط رہنا پڑتا تھا۔ فضا میں عجیب محسوس کن سی منک پھیلی ہوئی تھی۔ پوست کے پودوں میں ابھی صرف پھول آئے تھے۔ ان کے نیچے ڈوٹے بنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کئی پودوں اور پھولوں کو چھو کر دیکھا تھا۔ کتنے خوش رنگ اور حسین پھول تھے مگر کتنے زہریلے۔ انہی سے وہ دونوں بھی بچتی تھیں جو انسانی زندگی بچانے کے کام آتی تھیں اور ایفون، مارفین اور ہیروئن جیسے زہریلے تیار ہوتے تھے جو دنیا بھر میں نوجوان نسل کو تباہی کے دبانے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

ہم پوست کے پھولوں میں تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ سر پر سورج چمک رہا تھا۔ اگرچہ ہوا بھی چل رہی تھی مگر تھوڑی دھوپ کی وجہ سے کھیتوں میں جس کی سی کیفیت تھی۔ ہم اپنے میں تہہ پورے تھے۔ گردن پر سینے کی دھاریں ہمہ ری تھیں۔ لگتا تھا جیسے کچھوے رینگ رہے ہوں۔ پاس سے چل بھی خشک ہونے لگا تھا۔ ہم سے بڑی حماقت ہوئی تھی۔ اس مہم کے لیے اور تو سارے انتظام کر لیے گئے تھے مگر پانی ساتھ لانے کا بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ ہم ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں چلتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ ان کھیتوں ہی میں کس نہ کس پانی ضرور مل جائے گا۔

یہ دراصل باقاعدہ کھیت نہیں تھا۔ خیش و فراز پر مشتمل پتھریلا علاقہ تھا جس میں بل چلا کر بیچ ڈال دیا گیا تھا۔ اس قسم کے علاقے پوست کی پیداوار کے لیے مثالی ہوتے ہیں۔ اس فصل کو زیادہ پانی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہاں تو پانی کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس فصل کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ پوست کی کاشت کے لیے یہ دنیا کا نادر ترین خطہ تھا۔

وہ پہاڑی ابھی بہت دور تھی جس کے چھپے سے دھواں اٹھنے ہوئے دیکھا گیا تھا لیکن کھیتوں میں تھوڑا اور فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں وہ چیز نظر آگئی تھی جس کی ہمیں تلاش تھی۔

وہ پتھروں میں ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ دو تین فٹ لمبا چوڑا اور ایک فٹ گہرا تالاب سا تھا جس کے اندر سے شفاف پانی پھوٹ رہا تھا۔ تالاب میں جمع ہونے والا یہ پانی ایک نالی کی صورت میں مخالف سمت میں بہہ رہا تھا۔ یہ چشمہ قدرتی تھوڑا گہرا نالی انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی تھی۔ جو ایک فٹ سے زیادہ گہری اور دو فٹ سے زیادہ چوڑی تھیں تھیں۔ ہم نے اپنا سامان ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے پہلے منہ پانی کے چھینے مارے اور پھر دونوں ہاتھوں کا پال سا بنا کر

پانی پینے لگا۔ پانی ٹھنڈا اور شیریں تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی نعمت جس کے بغیر انسانی حیات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ دیر سستانے کے بعد ہم آگے روانہ ہوئے۔ ہمارا رخ انہی پہاڑیوں کی طرف تھا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ میں تجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ دیکھا کہ کنارے کے ساتھ ساتھ تو وہ لوگ پڑو لگ کر رہتے تھے لیکن اندرونی علاقے میں شاید اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی اور پوست کی فصل بھی ایسی تھی کہ دوسری فصلوں کی طرح اس کی زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی اور شاید اسی لیے ہمیں کوئی آدمی نظر بھی نہیں آیا تھا۔

وہ پہاڑیاں بظاہر قریب نظر آتی تھیں لیکن درحقیقت بہت دور تھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ ہم سہ پہر کے قریب وہاں پہنچ پائے تھے۔ پہاڑیوں کے دامن میں، میں کھیت سے باہر نکلا ہی تھا کہ تیزی سے مرکز دور بارہ پودوں میں گھس گیا اور سونا اور جاگی کو بھی پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں بیٹھ گئے۔

میں ٹھنڈوں کے بل ریٹھا ہوا ایک بار پھر ذرا آگے نکل گیا اور پودوں میں جگہ بنا کر باہر دیکھنے لگا۔ تقریباً گز آگے پہاڑی کے دامن میں وہ کانچ میری نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کانچ کے سامنے کھلی جگہ پر دو آدمی بیٹھے مگر تپتی رہتے۔ دونوں نے کمانڈوز قسم کی فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں اور دونوں کے کندھوں پر رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

سونا اور جاگی بھی رہ گئی ہوئی میرے قریب آئیں اور سامنے دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر بعد ایسے ہی گورلا ڈرائس میں ایک قہرمان آدمی کانچ کے دروازے سے برآمد ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں کافی پائے جانے کے مک رکھے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے پر بھی آٹو بیک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ٹرے زمین پر رکھ دی اور ایک مک اٹھا کر ان دونوں سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر بیٹھ کر چپٹلایا لینے لگا۔

”یہ۔۔۔ یہ تو کوئی بڑی ہے۔۔۔“ جاگی کی آواز اس کرپلے میں نے اس کی طرف دیکھا پھر پتھر بیٹھے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جس کے بارے میں جاگی نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ جاگی نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی بڑی تھی۔

”اس طرف سے گھومتے ہوئے پہاڑی پر چل جائیں۔“

جاگتی نے سرگوشی میں بات کرتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔  
 ”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”یہ کچھ غالباً ان کی کوئی پوسٹ ہے اور یہ تینوں یہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں ہیں۔ اور یہ معلومات ہمیں انہی لوگوں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ جاگتی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی ”ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ تم جا کر ان سے معلوم کر آؤ پھر ہم آگے چلیں گے۔“  
 میں نے گھور کر جاگتی کی طرف دیکھا۔

”ہمیں شام ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ میں نے مدھم لہجے میں کہا ”اندھرا ہونے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھا سکیں گے۔ اس وقت تک ہمیں یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے علاوہ یہاں اور کون کون ہے۔“

جاگتی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک بار پھر سامنے دیکھا۔ کالج کے سامنے وہ تینوں بیٹھے چائے یا کافی پی رہے تھے۔ شام ہونے میں کم از کم ایک گھنٹا باقی تھا اور اس وقت تک ہمیں یسین بیٹھنا تھا۔ ہماری کوئی حرکت یہاں ہماری موجودگی کا راز کھول سکتی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سوچا اور جاگتی کو اشارہ کرتے ہوئے چیخے کی طرف رینگنے لگا۔ ہم تقریباً پانچ فٹ مزید پیچھے آگئے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سورج جیسے افق پر ایک کر رہ گیا تھا۔ غروب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کالج کی طرف سے باتوں اور کبھی کبھی قسموں کی آواز آرہی تھی۔ ایک دوسرے نسوانی قہقہے بھی سنائی دیے تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس لڑکی کی آواز بہت سڑکی تھی۔

سورج غروب ہونے میں اب چند ہی منٹ باقی تھی اور پھر اچانک کسی گاڑی کے انجن کی آوازیں کر میں چونک گیا۔ وہ گاڑی غالباً کالج کے سامنے آکر رکی تھی۔ میں نے سوچا اور جاگتی کو دہن رکنے کا اشارہ کیا اور بڑی احتیاط سے رینگتا ہوا کھیت کے کنارے کے قریب پہنچ گیا اور پودوں میں راستہ بنا کر کالج کی طرف دیکھنے لگا۔

جب میں تین آدمی تھے چھت پر ہلکی مشین گن نصب تھی۔ ایک آدمی جیسے اسے آکر کالج کی طرف چلا گیا۔ اس کے کندھے پر سب مشین گن اور ایک ہاتھ میں نقش تھا۔ وہ نقش لے کر کالج کے اندر چلا گیا جبکہ وہاں پہلے سے موجود وہ

لڑکی اور دونوں آدمی جیسے بیٹھ گئے اور جیسے حرکت میں آگئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈیوٹی تبدیل ہوئی تھی۔ وہ تینوں سطلے گئے تھے اور رات بھر کی ڈیوٹی کے لیے صرف ایک آدمی کو چھوڑا گیا تھا۔ میں جیسے کی طرف دیکھنے لگا۔ کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر چلتی ہوئی بہت دور پہاڑی کی طرف گھوم کر گناہوں سے اونچل ہوئی تھی۔

میں کالج کی طرف دیکھتا رہا۔ کالج کے ایک کمرے میں اب جی جیل گئی تھی۔ چند منٹ بعد کاندو ڈریس میں ملبوس وہ آدمی کمرے سے باہر آگیا۔ نقش وہ کمرے ہی میں چھوڑا تھا۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور جب سے ایک سگرنے نکال کر سلگا لیا۔ کچھ دیر تک وہ کھڑے کھڑے کس گناہار پھر برآمدے سے نکل کر اس پتھر پر بیٹھ گیا جہاں اس لڑکی نے بیٹھ کر چائے یا کافی پی تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کا ٹرمینی دھندلا اندھیرے میں تبدیل ہونے لگا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا کالج کی طرف دیکھتا رہا پھر سوچا اور جاگتی کے قریب آگیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ جاگتی نے کہا ”وہ اکیلا ہے اور ایک آدمی پر قابو پانے میں ہمیں آسانی رہے گی۔“  
 ”لیکن ہمیں تھوڑا اور انتظار کرنا پڑے گا کہ اندھرا اور گھبراہٹ ہو جائے۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم مزید ایک گھنٹا دووں میں دیکے رہے اور پھر رینگتے ہوئے ایک بار پھر کھیت کے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ حافظ اب برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے آنے والی روشنی میں حافظ کی سب مشین گن بھی اس کے قریب ہی برآمدے کے فرش پر بڑی نظر آرہی تھی۔ حافظ کا رخ اس طرف تھا جس طرف شام سے پہلے وہ جیسے گئی تھی۔

میں چند لمحوں کے بعد صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ کھیت سے باہر دائیں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہم ان پتھروں کی آڑے کر مختصر سا جگہ کاٹتے ہوئے کالج تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے جاگتی اور سوچا کو اشارہ کیا اور کھیت سے باہر نکل کر سینے کے بل رینگتا ہوا پہلے پتھر کی طرف بڑھنے لگا جو وہاں سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔

پتھر کی آڑ میں پہنچ کر میں نے جاگتی اور سوچا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں بھی رینگتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئیں۔

ہم اسی طرح رینگتے ہوئے پانچویں پتھر کے پیچھے پہنچ گئے۔ کالج کا فاصلہ بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے سرگوشی میں سوچا کہ اس مرتبہ دیں رکنے کو کہا اور جاگتی کو اشارہ کرنا ہوا آگے رینگنے لگا۔

جاگتی کو بھی ایک جگہ چھوڑ دیا اور میں خود آگے بڑھتا چلا گیا اور بالآخر اس پتھر کے پیچھے رک گیا جہاں سے کالج کا فاصلہ پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن کالج کا برآمدہ اب میرے بالکل سامنے نہیں تھا میں جانب تھا جبکہ میری پشت پر پہاڑی کا دارا سن تھا جو دھلان کی صورت میں بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔

میں گہری نظروں سے برآمدے میں بیٹھے ہوئے حافظ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن راتقل استعمال کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس دیرانے میں فائر کی آواز دور تک پھیل جاتی اور قرب و جوار میں کسی دوسری چونکی کے حافظ متوجہ ہو سکتے تھے جبکہ میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہتا تھا کہ حافظ کو بھی گولی چلانے کا موقع نہ مل سکے۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا حافظ کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے راتقل ایک طرف رکھ دی اور پتلون کے پانچے کے نیچے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے دائیں طرف اچھال دیا۔

وہ پتھر دھاتی تین سو گرام وزنی تھا۔ کھناک کی آواز سے گرا اور چھوٹے چھوٹے کچھ اور پتھر لڑھکنے لگے۔

حافظ اپنی سب مشین گن اٹھا کر بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھلانگ لگا کر برآمدے سے باہر آگیا۔

”کون ہے۔۔۔ اوھر کون ہے؟“ وہ چینی زبان میں پچھا۔ اس کی آواز سن کر میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

میں اپنی جگہ پر سینے کے بل بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ حافظ دو تین قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں راتقل تانے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک اور چھوٹا پتھر اٹھا کر اسے دائیں طرف اچھال دیا۔

”اسے۔۔۔ کون ہے؟“ حافظ پھر پچھا۔ اس کی آواز سن کر میرے کانوں میں ایک بار پھر سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔

اس مرتبہ حافظ راتقل تانے تقریباً دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور جیسے وہ سامنے پہنچا میں نے پتھر کی آڑ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔

حافظ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ راتقل اس کے ہاتھ سے پھوٹ کر گر گئی اور میں اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا پتھروں پر جا کر اڑا۔

یہ حملہ اس کے لیے یقیناً غیر متوقع رہا ہو گا لیکن اسے حواس پر قابو پانے میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو میرے شکنجے سے جھڑانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ وہ پوری طرح میرے نیچے دبوا تھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس کی آواز سن کر میرے کانوں میں سیٹیاں کیوں بجی تھیں وہ مرد نہیں عورت تھی۔

میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ ”اب اگر تم نے بہادری دکھانے کی کوشش کی تو گردن کاٹ دوں گا۔“ میں نے غراتے ہوئے تھائی زبان میں کہا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ تھائی زبان بھی سمجھتی ہوگی۔ اس کی مزاحمت ختم ہو گئی تو میں اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ خنجر کی نوک اس کی گردن سے لگائے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی شرت کا کارپڑا کراٹھا اور پھر اسی وقت جاگتی اور سوچا بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئیں۔ ان دونوں نے راتقل نال رکھی تھیں۔

”جاگتی۔“ میں نے کہا ”یہ سب مشین گن اٹھا اور اس پتھر کے پیچھے میری راتقل بھی پڑی ہے۔ میں اسے کالج میں لے کر جا رہا ہوں۔ تم لوگ بھی اس طرف آ جاؤ۔“

میں اس محافظ لڑکی کو دھکیلتا ہوا کالج کی طرف چلنے لگا۔ جاگتی زمین پر پڑی ہوئی اس کی سب مشین گن اٹھا رہی تھی جبکہ سوچا اس پتھر کی طرف لپکی تھی جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔

ہم کالج میں آگئے۔ سوچا باہری تاریکی میں رک گئی تھی تاکہ اگر کوئی اس طرف آئے تو ہمیں بروقت آگاہ کر سکے۔

کمرے میں آکر میں نے اس محافظ عورت کے سر سے ٹوپی اتار دی۔ ٹوپی میں سمٹے ہوئے بال کندھوں پر بکھر گئے۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ خاصی حسین تھی مگر خوف سے اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات کچھ بگڑے تھے۔

”مم۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ گولڈن ٹرائی ایٹنگل میں داخل ہوئے میں کامیاب کیسے ہوئے۔“ اس نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تھائی زبان میں کہا۔ میں نے چونکہ اس سے تھائی میں بات کی تھی اور شاید اس لیے اس نے بھی اسی زبان میں بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا ”لیکن تم لوگ جو کوئی بھی ہو زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے۔ بہتر

ہے اپنے آپ کو سرنڈر کر دو۔ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ کچھ رعایت برتی جائے اور تم لوگوں کو زندہ سلامت یہاں سے واپس جانے کا موقع مل جائے۔

”ہم جانتے ہیں کہ یہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے جینے سے لیکن ہم نے اپنے آپ کو سرنڈر کرنے کے لیے موت کی اس وادی میں قدم نہیں رکھا۔“ میں نے کہا اور چند محسوس کی خاموشی کے بعد بولا ”ہم ٹورنٹس بھی نہیں جو جھول کر اس طرف گئے ہیں۔ ہمیں کچھ لوگوں کی تلاش ہے جو تھائی لینڈ سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں؟“

”اوہ! وہ چونک سی گئی۔ ”اگر تم ان کی تلاش میں آئے ہو تو پھر تو تم لوگوں نے اپنے آپ کو موت کی وادی میں دھکیل دیا ہے۔ وہ جزل کھوراث کے مسمان ہیں۔ یہاں تو تم ان کی بھٹک بھی نہیں دیکھ سکتے چہ جائیکہ ان تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ مجھے قابو میں کر کے تم کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا۔ موت تم لوگوں کا مقدر رہن چکی ہے۔ اس سرزمین پر تمہیں بے آج کی رات تو تاریکی میں چسپ کر گزار لو لیکن صبح چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکو گے۔“

”یہ سوچنا ہمارا درد دہرے کہ ہم کتنے گھنٹے زندہ رہتے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”تم صرف اتنا بتا دو کہ کھوراث کے مسمان اس وقت کہاں ہیں۔“

”اس پہاڑی کے دوسری طرف ہستی میں۔“ اس نے احمینان سے جواب دیا ”وہ تقریباً ایک ہفتہ اس ہستی میں رہیں گے اور پھر انہیں جزل کھوراث کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔“

”اور جزل کھوراث کہاں پایا جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے تقریباً تیس میل دور اپنے بیڑ کو اتریں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

وہ میری باتوں کا جواب بڑے پرسکون لہجے میں دے رہی تھی۔ اسے شاید یہ یقین تھا کہ ہم چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے اور ان معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

”یہاں کتنے محافظ ڈیوٹی دیتے ہیں اور تمہاری ڈیوٹی کب تک ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پورے ٹرائی اےنگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس قسم کی چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہر چوکی پر دو تیس گھنٹے ایک

آدمی موجود ہوتا ہے لیکن دونوں طرف دریا کے کنارے چوکیوں میں تین چار محافظ موجود رہتے ہیں۔“

”لیکن شام کو یہاں تین محافظ تھے۔“ میں نے کہا۔

”دو قریبی چوکیوں سے آگئے تھے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”اب میں رات بھر یہاں اکیلی رہوں گی۔ صبح سات بجے دوسرا محافظ آئے گا تو میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔“

”لیکن جلد جگہ جگہ محافظوں کی ڈیوٹی کیوں کیا چوری کیانے کا فطرہ ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”یہ خانگی انتظامات پوست کی فصل کے دلوں میں ہوتے ہیں کیونکہ ان دنوں لاؤس اور تھائی لینڈ کی طرف سے مسلح فوجیں جو یہاں گھس آتے ہیں اور فصل برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پچھلے تین سال سے یہ خانگی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت سے کچھ سکون ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ یہاں تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔“

”اس لیے کہ ہم موت سے نہیں ڈرتے۔“ میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”میں تمہارے خون سے ہاتھ نہیں رکتا چاہتا لیکن اگر تم نے کوئی گزیر کر کے کی کوشش کی تو تمہارا گاناٹھے میں کوئی چٹپٹا ہٹ بھی محسوس نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ جب تک ہم یہاں ہیں تم شرافت کا ثبوت دو گی۔“

میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی رتی تلاش کرے۔ جاگتی کمرے میں دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ یہ کانچ دو کھروں پر مشتمل تھا اور جاگتی غالباً دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

سونیا نے محافظ لڑکی کو اپنی راتگلی کی زور لے رکھا تھا۔ میں نے خبر اس کی گردن سے بنالیا اور لودھرا دھریکھنے لگا۔ کمرے میں ایک طرف دیوار کے ساتھ تین فٹ اونچا ایک چھوٹا سا چوڑا بنا ہوا تھا جس پر ایک ٹیلی فون بیٹ رکھا ہوا تھا۔ لڑکی نے پوچھنے پر بتایا کہ تمام چوکیوں میں ٹیلی فون موجود ہیں۔ جزل کھوراث نے ٹرائی اےنگل میں اپنا مواصلاتی نظام قائم کر رکھا ہے اور ایک بجلی گھر بھی ہے جہاں سے پورے ٹرائی اےنگل کو بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ بیرونی دنیا سے رابطے کے لیے نہایت طاقت ور ٹرانسمیٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔

تھوڑی سی دیر بعد جاگتی رسی کا ایک ٹکڑا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے محافظ لڑکی کے ہاتھ پر باندھ کر فرش پر ڈال دیا۔ اس لڑکی کی زندگی اگرچہ ہمارے لیے خطرناک

اہت ہو سکتی تھی لیکن فی الحال میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ہم تینوں برآمدے میں آگئے۔ اس محافظ لڑکی نے بتایا خاکہ پانچ بجے سو فٹ بلند اس پہاڑی کے چپے وہ ہستی ہے جہاں تھائی لینڈ سے آنے والے جزل کھوراث کے مسمانوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ میں نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنالیا۔“

”اس لڑکی کے کہنے کے مطابق صبح سات بجے سے پہلے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم دونوں یہیں روکو۔ میں پہاڑی پر جا کر دوسری طرف اس ہستی کا جائزہ لے کر آتا ہوں اور پھر نیچ کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر ہمیں ہستی کے آس پاس کوئی چپے کی جگہ مل جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔“

”میں تمہیں اکیلے تو جانے نہیں دوں گی۔“ جاگتی جلدی سے بولی ”میں صبح تک کوئی نہیں آئے گا۔ اس لیے یہاں صرف ایک ہی فرد کی موجودگی کافی ہے یا تو سونیا کو اپنے ساتھ لے جاؤ یا میں تمہارے ساتھ چلوں بلکہ بہتر ہو گا کہ تم سونیا ہی کے ساتھ لے جاؤ۔“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں کمرے کی جتی بھاگ کر وہاں چھوڑ کے پاس اندر سے میں بیٹھ جاؤں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔“ جاگتی نے جواب دیا۔

پانچ منٹ بعد ہم کانچ کے چپے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ جاگتی لڑکی کے ساتھ چھوڑ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔

اندھیرے میں پہاڑی پر چڑھنا خاصا مشکل کام تھا۔ بار بار چھوڑوں سے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اپنے آپ کو سمجھانے کے ساتھ مجھے سونیا کو بھی سارا دینا پڑا۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے وہ بری طرح پانپنے لگی تھی۔ نصف بلندی طے کر کے ہم رک گئے۔ سونیا ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ دس منٹ بعد ہم پھر آگے روانہ ہو گئے۔

وہ پہاڑی پانچ بجے سونیس ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند تھا۔ اوپر فلک بوس درخت تھے جو تیز ہوا سے جھوم رہے تھے۔ ہوائے شاخوں سے ٹکرانے سے ”سائیں سائیں“ کی جھانپیں پیدا ہو رہی تھیں ان سے دل پر خوف سا طاری ہو رہا تھا۔

چوٹی پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ میرا سانس بھی پھول گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں سے دوسری

طرف کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

خشب میں بہت دور کچھ بکھری ہوئی روشنیاں عثمانی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ رات کے وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ہمارے اور ان روشنیوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا لیکن میرے اندازے کے مطابق وہ عثمانی ہوئی روشنیاں دو میل سے کم فاصلے پر کسی طرح نہیں ہو سکتی تھیں۔

میں سونیا کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان پر نیچے اترنے لگا۔ ابھی ہم نے تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ فضا فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ توازن چاروں طرف بازگشت سی پیدا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ فائرنگ کس طرف ہوئی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں جاگتی کا خیال ابھرا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ میں نے ہستی کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور سونیا کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

کچھ دیر تک فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر سناٹا چھا گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر میں نیچے دیکھنے لگا۔ گھبراہٹ میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ سونیا کو تقریباً گھٹیا ہوا اور اپنا لٹا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

”تم یہیں روکو۔ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔“ میں نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے شبہ ہے کہ فائرنگ اس کانچ میں یا آس پاس ہوئی تھی۔ جاگتی کسی مصیبت میں نہ پھنس گئی ہو۔“

”میں اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی۔ تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ سونیا نے کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ شاید خوف زدہ تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں راتنگلی تھی۔ دوسرا ہاتھ سونیا نے پکڑ رکھا تھا۔ میں ڈھلان پر تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ سونیا میرے ساتھ حساسی ڈوٹی سی چلی آ رہی تھی۔ اچانک اسے کسی پتھر سے ٹھوکر لگی۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی جیجنگلی اور وہ ڈھلان پر لڑکھٹی چلی گئی۔ میں بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اگر بروقت اسے نہ پکڑ لیتا تو وہ کھد میں گر جاتی۔ کھد زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گرنے سے اس کی موت تو واقع نہیں ہو سکتی تھی لیکن ایک آدھ بڑی ضرور ٹوٹ جاتی اور یہ نقصان زیادہ خطرناک ہو جاتا۔

میں نے سارا دے کر سونیا کو اٹھایا۔ وہ بولے بولے کراہ رہی تھی۔ اس کی راتنگلی کھینچ کر لیتی تھی۔ میں نے راتنگلی تلاش کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دی اور اسے

دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ وہ لنگڑا رہی تھی۔  
کھٹے اور کھٹے کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی۔

ایک جگہ میں رگ لگی۔ تقریباً دو سو گز نیچے تاریکی میں  
کانچ کا ہیولا سا نظارہ آ رہا تھا لیکن اس پاس کسی قسم کی سرگرمی  
دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے سونیا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ نیچے  
اترنے لگا۔ وہ بھی سنبھل سنبھل کر میرے ساتھ ساتھ چلی  
آ رہی تھی۔

کانچ کا ہیولا اب واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ فاصلہ  
پچیس تیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ میں چند قدم اور آگے بڑھ  
گیا۔ ایک پتھر میرے پیروں سے ٹکرایا اور پھر شور آواز سے  
ڈھلان پر لڑھکنا چلا گیا اس پتھر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اور  
پتھر بھی لڑھک رہے تھے۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑی پھرتی  
سے زمین پر گر گیا تھا۔

چند لمحوں گزر گئے لیکن کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔  
ایک بار پھر گھبرانا چھا گیا تھا۔ میں کچھ دیر تک اپنی جگہ پر  
بٹا رہا پھر سونیا کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور اٹھ  
کر ڈھلان پر اترنے لگا۔

کانچ اب صرف دس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ہم ایک  
بڑے پتھر کی آڑ میں دیکھ گئے۔ میں گہری نظروں سے کانچ اور  
اس کے آس پاس دیکھتا رہا لیکن نہ تو کوئی نسل و حرکت  
محسوس ہوئی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔ گہری تاریکی اور  
گھبرانا تھا۔

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے  
تھے تو جانکی کانچ کی بنی بھا کر کچھ دور تاریکی میں بیٹھ گئی تھی۔  
اس وقت بھی گہری تاریکی تھی اور کوئی سرگرمی دکھائی نہیں  
دے رہی تھی۔ ایک لمحوں کو میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید  
وہ فائزنگ یہاں نہیں ہوئی تھی۔ کہیں اور ہوئی ہوگی۔ اگر  
فائزنگ یہاں ہوئی ہوتی تو جانکی کے پکڑے جانے یا مارے  
جانے کی صورت میں بھی کانچ کے اندر یا اس کے آس پاس  
کسی نہ کسی قسم کی سرگرمی ضرور دکھائی دیتی۔ مسلسل خاموشی  
سے میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ فائزنگ یہاں نہیں ہوئی  
تھی۔

جانکی کو اتنی جلدی ہماری واپس کی توقع نہیں رہی  
ہوگی۔ اس نے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنی ہوگی اور وہ  
تاریکی میں کہیں گھبات لگائے جینی ہوگی۔ میں مزید کچھ دیر  
تک ادھر ادھر تاریکی میں گھورتا رہا پھر سرگوشیاں لے کر  
جانکی کو پکارنے لگا۔

”جانکی۔ جانکی۔ کہاں ہو تم۔“

میری ہی سرگوشیاں آواز بھی سامنے میں دور تک پہنچ  
چلی گئی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے  
قدرے بلند آواز میں پکارا۔ اس مرتبہ بھی جواب ہی  
خاموشی ہی رہی۔  
”کہیں سونہ گئی ہو۔“ سونیا نے میری طرف جھٹکے ہوئے  
سرگوشی کی۔

”یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا مگر  
پھر ہم اسے سونے کے لیے تو یہاں چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔  
”تھکنے نے ہم سب کو بڑھال کر رکھا ہے۔“ نند تو چٹائی  
کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی بیٹھے بیٹھے اوکو  
گئی ہو۔“ سونیا نے کہا۔

اس کی بات میں کچھ وزن تھا۔ ہم سارا دن اونچے نیچے  
پھاڑی راستوں پر چلتے رہے تھے۔ شام کا اندھیرا چھلنے سے  
ڈبھ دو ٹھکنوں کے لیے پست کے کھیت میں بیٹھے رہے  
لیکن یہ وقت بھی نیش میں گزرا تھا۔ جس سے اعصاب میں  
کچھ اور تازہ ساید ہو گیا تھا۔ حافظ لڑکی کانچ کے اندر بندھی  
ہوئی پڑی تھی۔ جانکی کو یہ اطمینان بھی ہو گا کہ کوئی دوسرا  
حافظ سچ سے پہلے اس طرف نہیں آئے گا اور عین ممکن ہے  
وہ کسی جگہ بیٹھے بیٹھے اوکھٹ گئی ہو۔

میں نے سونیا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں اٹھ کر مٹکا  
انداز میں کانچ کی طرف بڑھتے گئے۔ کسی بھی ناخوشگوار  
صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہم دونوں نے راتقلین تیار  
رکھی تھیں۔

کانچ کے سامنے پہنچ کر میں نے ایک بار پھر جانکی کو پکارا  
مگر اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اب میرا سکون  
رخصت ہوئے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور  
وسوسے سر ابھارنے لگے۔

برآمدے میں قدم رکھتے ہی کسی چیز کو میرے پیروں  
ٹھوکر لگی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ راتقل تھا۔ میرے  
دماغ میں سنسنابٹ سی ہونے لگی۔ یہ راتقل جانکی کے سوا  
کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ اپنی راتقل اس طرح  
برآمدے میں پہنچ کر کہاں جا سکتی تھی۔

کانچ کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔  
میں اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں حافظ لڑکی کو باندھ کر  
ڈالا گیا تھا۔ میں نے بائیں طرف دیوار منٹل کر سوچ  
کر دیا۔

کمرے میں روشنی پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا

پھیل کر حلق میں آگیا۔ کمرے میں ہر طرف خون ہی خون  
پھیلا ہوا تھا۔

سونیا بھی کمرے میں آگئی تھی۔ ہر طرف پھیلا ہوا خون  
میرے اس کے منہ سے ہلکی سی جھنجھکی گئی۔ وہ بھی وحشت  
زدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی  
بڑے کی شہ رگ پر پھری چلا کر چھوڑ دیا گیا ہو اور وہ تڑپتا  
ہوا برے کمرے میں لوٹنا رہا ہو۔ دو طرف کی دیواروں پر بھی  
خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔

اس حافظ لڑکی کو باندھ کر اسی کمرے میں ڈالا گیا تھا  
لیکن اب وہ غائب تھی۔ اسے جس رسی سے باندھا گیا تھا وہ  
یک طرف پڑی ہوئی تھی اور اس پر بھی خون کے دھبے نظر  
آ رہے تھے۔ جانکی کا ایک جو اس نے دیوار کے ساتھ  
بوتے پر رکھا تھا غائب تھا۔ برآمدے میں دروازے کے  
پن سامنے پڑی ہوئی راتقل جانکی کی تھی۔

دائیں طرف فرش پر کوئی چیز چسپی دیکھ کر سونیا اس  
طرف بڑھ گئی اور جھک کر وہ چیز اٹھالی۔ یہ بھی اس کے  
نہیں پہنچ گیا۔ وہ جانکی کا خنجر تھا اور یہ وہی خنجر تھا جو تھا وہاب  
نے اسے دیا تھا۔ قریب ہی جانکی کا میٹر کلب بھی پڑا ہوا تھا۔  
مجھے سمجھے میں دیر نہ لگی کہ جانکی کا انجام کیا ہوا ہوگا۔ کمرے  
کے کونے میں پڑی ہوئی رسی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ

حافظ لڑکی نے کسی طرح اپنی بندشیں کھولی ہوں گی اور پھر  
انہیں اور جانکی میں مھر کر ہوا ہو گا جس میں جانکی اپنی جان  
ساتھ دھو بیٹھی۔ اس کا خنجر میٹر کلب پر اور برآمدے میں  
پڑی ہوئی راتقل تو یہی کہانی سنار رہی تھی لیکن جانکی کی لاش  
میں کئی؟ اور پھر چوتھے پر پڑے ہوئے نیلی فون پر نظر  
پڑنے ہی ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ حافظ لڑکی نے نیلی  
فون کے کسی دوسری پوسٹ سے اپنے ساتھیوں کو بلایا ہو گا  
اور وہ جانکی کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ پھاڑی پر  
بٹ کا پروگرام میں نے اس لڑکی کے سامنے ہی بنایا تھا۔  
میں نے اپنے ساتھیوں کو ضرور بتایا ہو گا کہ ہم واپس آئیں  
میں یہ خیال آتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے  
لگا۔ وہ لوگ کسی بھی وقت واپس آ سکتے تھے۔ میں ابھی یہ  
سوچتا ہی رہا تھا کہ خاموشی فضا اچانک ہی فائز کی آواز  
سنائی دی۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے آنے  
والی لڑکی نے آواز سے میرے سر کے چند اچھ اور سے  
ٹوکی۔ میں نے سونیا کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے سوچ

کر دیا۔

بورڈ والی دیوار کی طرف چھلانگ لگا دی اور بڑی پھرتی سے  
سوچ آف کر دیا۔

میرا انداز درست نکلا تھا۔ وہ لوگ شاید ابھی ابھی پہنچے  
تھے۔ اگر پہلے سے کہیں اس پاس موجود ہوتے تو ہمیں کانچ  
میں داخل ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ پہلی کوئی جگہ کے بعد  
باہر سے شدید فائزنگ شروع ہو گئی تھی۔ گولیاں فرش پر اور  
سامنے دیوار پر لگ رہی تھیں۔ میں دروازے کے ایک  
طرف تھا اور سونیا دوسری طرف۔ برقی ہوئی گولیوں میں نہ وہ  
میری طرف آسکتی تھی اور نہ میں اس کی طرف جا سکتا تھا۔ ہم  
فائزنگ کا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے لیے  
دروازے کے سامنے آنا پڑا اور دروازے کے سامنے آنے  
کا مطلب تھا کہ اپنے جسم کو چھلنی بنالیا جائے۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا کر کے تاریکی میں  
گھورنے لگا۔ اچانک میرے دماغ میں جھپٹا سا ہوا۔ مجھے یاد  
آگیا کہ جس طرف سونیا تھی اس طرف دیوار میں ایک کھڑکی  
بھی تھی جو غالباً کانچ کے کچھنی طرف کھلتی تھی۔  
”سونیا۔“ میں نے سرگوشی کی ”تمہاری طرف دیوار میں  
ایک کھڑکی ہے۔ اگر اسے کھول کر باہر نکل سکو تو ہم اس  
آفت سے بچ سکتے ہیں۔“

”کو شش کرتی ہوں۔“ سونیا نے جواب دیا۔

باہر سے اب بھی فائزنگ بوری تھی۔ میں نے بھی ذرا  
سا آگے ریک کر اپنی راتقل کی نال کا رخ دروازے کی  
طرف کر کے ٹیکہ دیا۔ تڑپتی ہوئی کئی گولیاں باہر کی کھلی  
فضا میں گونج رہی تھیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ گولیاں حملہ  
آوروں کا کچھ نہیں لگا سکی تھیں۔

باہر سے ہونے والی فائزنگ سے میں نے اندازہ لگایا تھا  
کہ حملہ آوروں کی تعداد دو تھی اور مجھے دھڑکا کہ ان کے  
مزید ساتھی نہ پہنچ جائیں اس لیے میں کسی ایسی صورت حال  
سے پہلے ہی سونیا کو لے کر کہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

گولیوں کے شور میں چرچاہٹ کی ہلکی سی آواز سن کر  
میں چونک گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی  
کہ سونیا نے کھڑکی کھولی تھی۔

”میں باہر نکل رہی ہوں۔“ مجھے سونیا کی آواز سنائی دی  
”کو شش کرتی ہوں کہ ان کی توجہ بٹا سکوں مگر تمہیں بھی  
نکلنے کا موقع ملے۔“

میں اس طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کھلی ہوئی کھڑکی میں سونیا  
کا ہیولا دکھائی دیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ سے باہر کو نکلی۔  
ٹھیک ایک منٹ بعد کانچ کے دائیں طرف سے فائزنگ



کی آواز سنائی دینے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سونیا کالج کے اوپر سے فوم کراس طرف چلی گئی تھی اور اس نے حملہ آوروں پر فائر کھول دیا تھا۔

نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ دروازے کی طرف فائرنگ بند ہو گئی۔ فائرنگ کا رخ بدلنے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلا اور دوڑ کر کھڑکی پر چڑھ گیا اور پھر تیس سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں سونیا کے پاس پہنچ چکا تھا لیکن میں وہاں رکائیں۔ پتھوں کی ڈیڑھ تھوڑا سا کالج سے کچھ دور چلا گیا اور اس طرف سے حملہ آوروں پر فائر کھول دیا۔

مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ ہلاکت مار رہے ہی گولیوں کی آواز کے ساتھ ایک انسانی چیخ بھی فضا میں گونج اٹھی تھی۔ ان دونوں حملہ آوروں میں سے ایک یا تو ختم ہو گیا تھا یا زخمی ہو کر گر اٹھا کیونکہ جس جگہ سے چیخ سنائی دی تھی وہاں سے فائرنگ بند ہو گئی لیکن دوسرے نے اپنا تو فائرنگ جاری رکھی تھی۔

میں دوڑتا ہوا ایک بار پھر سونیا کے قریب آیا اور حملہ آور کی طرف ایک بھرپور برسٹ مار دیا۔ دوسری طرف سے فائرنگ رک گئی۔ حملہ آور یا تو دبک گیا تھا یا اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”سونیا تم“ میں کہتے کہتے رک گیا۔ میری نظر دائیں طرف متحرک روشنیوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ کوئی گاڑی تھی جو ناہموار راستے پر اچھلتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔

”اب ہم یہاں نہیں رک سکتے سونیا۔“ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا ”اس سے پہلے کہ اس گاڑی پر آنے والے محافظ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

میں نے سامنے کی طرف ایک اور برسٹ مار دیا اور سونیا کا ہاتھ پکڑ کر کالج کے پچھلی طرف دوڑ لگا دی۔ اس طرف پگھڑی کی طرح ایک کٹاؤ سا تھا جو پہاڑی پر اوپر تک چلا گیا تھا۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑے اس کٹاؤ میں اوپر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

تھے۔ جب کے بند لمبے کسی کی روشنی میں ان سب کے ہاتھوں میں سب شیشیں نظر آ رہی تھیں۔

اچانک سونیا کا پیروٹ گیا۔ وہ لڑکھا کر گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ کئی پھوٹے پھوٹے پتھر اس کے پیروٹ سے نکل کر ڈھلان پر لڑکھ رہے تھے۔

سونیا کی چیخ اور پتھوں کے لڑکنے کی آوازیں ”اس پگھڑی پر ہماری موجودگی سے آگاہ ہو گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے روشنی کی لاتعلو دیکھیں ہماری طرف لپکتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی فضا ترزاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ گولیاں ہمارے آس پاس گرنے لگیں۔ میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر گھٹیت لیا اور کٹاؤ کاموز گھوم کر دوڑنے لگا۔ یہ کٹاؤ کسی تنگ سے دوڑے کی طرح تھا۔ دونوں طرف دیواریں سی اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کٹاؤ میں ہم اگرچہ گولیوں سے محفوظ تھے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ وہ لوگ پہاڑی پر چڑھ کر ہمیں آگے سے گھیرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس لیے میں جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

ایک لمحے میں ہم دوسری مرتبہ اس پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ سونیا بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن وہ میرے ساتھ دوڑتی رہی۔ جب موت تعاقب میں لگی ہو تو رکے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے تعاقب میں پہاڑی پر چڑھتے ہوئے محافظ انہما دھند فائرنگ کر رہے تھے اور میرے خیال میں وہ اپنا ایمونیشن ضائع ہی کر رہے تھے کیونکہ جس طرف فائرنگ ہو رہی تھی ہم وہاں سے بہت دور تھے۔

ایک جگہ پر ہم اس دراز نما پگھڑی سے نکل آئے اور بائیں طرف مڑ کر درختوں کی طرف دوڑنے لگے۔ سونیا اب بار بار لڑکھا رہی تھی۔ اگر میں نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ بہت پہلے گر چکی ہوتی لیکن اب اس کی بہت بائیں جواب دے گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھائی اور میں کوشش کے باوجود اسے نہ سنبھال سکا۔ وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھوڑ کر زمین پر جمکتی چلی گئی۔

میرا بھی سانس پھول گیا تھا۔ میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ ہمارا تعاقب کرنے والے بہت دور رہ گئے تھے اور میرے خیال میں بہت منٹ یہاں رک کر سستا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑنا تو بھی آگے کو جیتی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا رکھے تھے۔ اس کے منہ سے کف بہ

رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

تین چار منٹ گزر گئے۔ سونیا اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پانے لگی تھی اور پھر اچانک شیش میں پتھوں کے لڑکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ایک دم راقط اٹھائی اور تاریکی میں کھوٹنے لگا۔ تقریباً سو گز نیچے جمائو میں دو بیولے سے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ وہ ہمارے تعاقب میں تو تھے ہی آگے سے بھی گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”سونیا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ”وہ لوگ اس طرف سے بھی آ رہے ہیں۔ آگے روا لگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

سونیا نے بھی راقط اٹھائی۔ پتھوں کے لڑکنے کی آواز اس نے بھی سن لی تھی اور غالباً ان ہیولوں کو دیکھ بھی لیا تھا۔ اس نے جیسے ہی راقط سیدھی کی میں نے اسے روک دیا۔ ”گولیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہٹ لیتا ہوں ان سے۔“

وہ دونوں بیولے جمائو میں تھے اور جیسے ہی ذرا اوپر آئے میں نے فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں سنسنائی ہوئی ان کی طرف لپکیں۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی خوفناک چغلیں بھی سنائی دی تھیں اور وہ دونوں بیولے ڈھلان پر لڑکھنے چلے گئے۔

سونیا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ فائرنگ سے دوسرے محافظوں کو یہ نشان دی ہو گئی تھی کہ ہم کہاں ہیں اس لیے میں وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ تاریکی میں اس طرح دوڑنے سے کوئی خوفناک حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔

ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ خیب میں ٹھناتی ہوئی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم اس طرف ڈھلان پر اترنے لگے۔ ہمارا تعاقب کرنے والے محافظ یقیناً یہ سوچیں گے کہ ہم آبادی کی طرف جانے کی طاقت نہیں کریں گے۔ ہمیں دوسرے نواح میں تلاش کرتے رہیں گے۔ وہ آبادی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ میں بائیں گھڑیاں سے اور روشنیوں سے چٹا چل رہا تھا کہ وہ گھر ایک دوسرے سے خاست فاصلے پر تھے اور انہی میں سے کسی ایک میں میں دارا وغیرہ بھی موجود تھے اور یقیناً تھاں میں ان کی قید کی گئی تھی۔

یہ پہاڑیاں سخت چٹانوں پر مشتمل نہیں تھیں۔ بھرپوری

زمین تھی اور کہیں بڑے بڑے پتھر تھے۔ یہاں جمائو کی بھی بہتات تھی۔ ہم کسی حادثے سے بے نیاز ہی تیزی سے نیچے جا رہے تھے۔ میں نے اب بھی سونیا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا لیکن ایک جگہ میرا پیروٹ گیا۔ سمجھنے کی کوشش میں سونیا کا ہاتھ میرے ہاتھ سے پھوٹ گیا۔ وہ بھی لڑکھا کر گری اور بڑی تیزی سے ڈھلان پر لڑکھتی چلی گئی۔ میں سنبھل کر اس کی طرف لپکا اور بروقت اسے پکڑ لیا۔ اگر تھوڑی دیر ہو جاتی تو وہ آگے بڑے ہوئے پتھر سے ٹکراتی۔

پہاڑی کی چوٹی پر سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تین چار بیولے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ میں سونیا کے ساتھ پتھر کے قریب دبک کر بیٹھ گیا۔ ہماری معمولی سی حرکت انہیں ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ سائے دوسری طرف چلے گئے۔ انہوں نے شاید سوچ لیا تھا کہ ہم بستی کا رخ نہیں کر سکتے۔

ہم چند منٹ اپنی جگہ پر بیٹھے رہے پھر مطلع صاف پاکر ڈھلان پر اترنے لگے۔ اس مرتبہ ہم ذرا محتاط ہو گئے تھے۔

ہمارا رخ ان روشنیوں کے دائیں طرف تھا۔ جہاں الگ تھلک صرف بلب کی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور وہ روشنی اب ہم سے تقریباً دو سو گز دور تھی۔ ہم اس کے دائیں طرف بڑھتے رہے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے ہاتھ زیاں اور درخت گنجان ہوتے جا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں امنی درختوں میں چھپنے کی کوئی جگہ مل جائے تو ہم کچھ دیر وہاں رک کر اپنا اگلے اقدام کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک ایسی جگہ مل گئی اور وہ جگہ بھی محض اتفاق سے ملی تھی۔ ہم گنجان جمائو کے ساتھ چل رہے تھے کہ سونیا کا پیروٹ چھل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور وہ جمائو میں لڑکھتی ہوئی دوسری طرف ڈھلان میں جا گری۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔

یہ تقریباً آٹھ فٹ گہری اور کشادہ سی گھاٹی تھی۔ ہمارے ایک طرف پہاڑی کی عمودی بلند دیوار سی تھی اور دوسری طرف آٹھ فٹ اونچی وہ جگہ جہاں سے ہم نیچے آئے تھے۔ ہم اس گھاٹی سے باہر نکلنے کے بجائے اس کے اندر رہی اندر چلے رہے۔

بائیں طرف والی بلندی نیلے کی طرح پتھر پر ڈھلان اختیار کرتی ہوئی زمین کی سطح کے برابر آتی تھی۔ وہاں سے اب بستی کی روشنیاں پھر صاف نظر آنے لگی تھیں۔ دائیں

طرف بھاڑی کے ساتھ ساتھ گھٹی شاخوں والے گنجان درخت تھے اور انہی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے وہ ٹھک سامان تھا جو اتفاق سے ہماری نظروں میں آگیا تھا۔ درخت زیادہ اونچے نہیں تھے۔ ان کی گھٹی شاخیں اس طرح ایک دوسرے میں الجھی اور جھیلی ہوئی تھیں کہ غار کا دہانہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

غار میں داخل ہو کر سونیا نے کندھے سے بیگ اتار کر نارچ نکال لی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے صرف ایک سیکنڈ کے لیے نارچ روشن کی اور جائزہ لیتے ہی سونیا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ نارچ کی روشنی میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ چند کڑ آگے وہ غار دائیں طرف مڑ گیا تھا۔

میں دیوار ٹوٹا ہوا اس طرف مڑا اور چند قدم آگے بڑھ کر نارچ بجائی۔ اب باہر سے روشنی دیکھنے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ میں نارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ لمبا تقریباً دس فٹ اور چوڑائی نہیں سے چھ فٹ اور نہیں سے آٹھ اور نو فٹ بھی تھی۔ چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں ہاتھ اٹھا کر اسے آسانی سے چھو سکتا تھا۔ فرش پر سنگریٹ پتھر وغیرہ نہیں تھے البتہ دھول تھی ہوئی تھی۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ غار بھی استعمال میں رہا ہو گا لیکن فرش پر جی ہوئی دھول بتا رہی تھی کہ کافی عرصت سے یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔

سونیا نے بیگ فرش پر رکھ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹانگیں پھار لی تھیں۔ میں بھی اس کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ جگہ مارے لیے محفوظ تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم بستی کے اتنا قریب کسی جگہ پناہ لیے ہوئے ہوں گے۔ میں نے ایک بار پھر نارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لیا۔ یہاں زہریلے کیزے کوڑوں کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر کیزے کوڑے ہوتے تو فرش پر پچھی ہوئی دھول پر آڑی ترچھی لکیریں ہی ضرور ہوتیں۔

اس جھانک دوڑنے نہیں بری طرح تھکا دیا تھا اور یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ ابھی تو کھیل شروع ہوا تھا۔ یہ ابتدائی راؤنڈ تھا اور میری دیرینہ سامھی جاگتی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ حالات و شواہد تو یہی بتاتے تھے کہ اسے ختم کر دیا گیا تھا لیکن تجانبے کیوں تھے اس کی موت کا یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

آدھا خنک کر آیا۔ غار کے باہر والے دہانے کی طرف سے شحات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اس کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔

”سونیا“ میں نے سرگوشیاںہ لیے میں کہا ”تمہیں

بھوک لگ رہی ہوگی۔ چاہو تو بیگ میں سے کچھ نکال کر کھاؤ۔“

”نہیں۔ بالکل دل نہیں چاہ رہا۔“ سونیا نے جواب دیا ”میں تو جاگتی کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔ مجھے بھی اس کے ساتھ کا بیج میں رہ جانا چاہیے تھا لیکن تجانبے کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔“

”دل تو میرا نہیں نہیں مان رہا لیکن برآمدے میں چڑی ہوئی جاگتی کی رائفل، کمرے میں بھرا ہوا خون اور جاگتی کا کلب۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہو گیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میرا اندازہ ہے کہ اس کا حافظہ لڑکی نے کسی طرح رتی کھول لی ہوگی اور جاگتی نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی تو خود اس کی گرفت میں آئی۔ وہ حافظہ لڑکی تربیت یافتہ ہوئی جبکہ جاگتی میں اس طرح دو بدولٹنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بے پاری مار کھا گئی۔“

سونیا گرا سانس لے کر رہ گئی۔ کچھ دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے پھر میں اپنی رائفل اٹھا کر غار کے باہر والے دہانے کے قریب آیا۔ دہانے کے سامنے گنجان شاخوں والے درخت تھے۔ جنہوں نے غار کے دہانے کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے درختوں کی شاخوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بستی کے کسی کا بیج کی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے رائفل کی ٹال سے شاخیں ایک طرف ہٹا کر تھوڑا سا خلا پیدا کیا تو وہ بھری ہوئی روشنیوں دکھائی دینے لگیں۔ قریب ترین روشنی غار سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ اور یہ غالباً اسی کا بیج کی روشنی تھی جو درختوں سے بہت اگے تھکتا تھا اور نہ میں نے شروع ہی سے نگاہ میں رکھا تھا۔ میں چند لمحوں شاخوں سے باہر جھانک رہا پھر واپس آیا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ یہ غار ہمارے لیے سب سے محفوظ جگہ تھی۔ میں واپس آکر سرگوشیوں میں سونیا کو صور حال سے آگاہ کرنے لگا۔

”اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔“ تھکن سے میرا بدن چور ہو رہا ہے مجھ سے اب بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں سو رہی ہوں۔“ سونیا نے کہا اور دیوار سے ذرا ہٹ کر لیٹ گئی اور جب اس نے اپنا سر میری گود میں رکھا تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑتی پئی تھی۔

سونیا لیٹے ہی سو گئی تھی۔ میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور پھر میرا ہاتھ بے اختیار حرکت میں آیا اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

سرور اور سنسنی کی مل جلنی سی کیفیت تھی جس نے مجھے

پوری طرح اپنی لیٹ میں لے رکھا تھا۔ مجھے بتا ہی نہیں چلا کہ میں کتنی دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا تھا۔ سونیا کسمائی اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کا ہلکا سا بوجھ محسوس کیا۔ اس نے میرا ہاتھ سر سے ہٹا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ میرا دل اچھل کر قلع میں آیا۔ سانس رکنے لگا اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سینے میں آگ سی بھری تھی۔ میں اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہتا تھا لیکن نیت میں ارادے کو دخل نہیں تھا۔

سونیا نے میری گود سے سر ہٹا لیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے پکڑ کر گرا دیا اور پھر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔

طوفان گزر گیا تو میں جیسے ہوش میں آگیا۔ وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عجیب سے جذبات کا طاعلم خیز سیلاب تھا جو مجھے تنگی کی طرح ہمالے لایا تھا۔ جاگتی بھی مجھے کسی ایسے ہی طوفان میں دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن جو کام وہ برسوں میں نہیں کر سکی تھی وہ کام سونیا پہلا موقع ملنے ہی کر گزری تھی۔ مجھے اپنے کردار پر برا فخر تھا۔ جاگتی کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ تھالی کئی مرتبہ میرے سامنے بے لیاں ہوئی تھی۔ کئی اور لڑکیاں میرے کردار کی پستی کو سر کرنے کی کوشش کر چکی تھیں مگر انہیں باؤسی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا اور سونیا نے مجھے چاروں خانے پت کر دیا تھا۔ میری انا کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ اگرچہ اس میں میری نیت اور میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن پھر بھی میں اپنے آپ کو بے قصور اور بے گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ سونیا نے جب میری گود میں سر رکھا تھا تو مجھے اس وقت مزاحمت کرنی چاہیے تھی لیکن وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور میرے دماغ میں آندھیاں ہی چلتی رہیں پھر تجانبے کب میں فینڈ کی آغوش میں پہنچ گیا۔ سونیا نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ غار میں تاریکی تھی۔ میرے خیال میں اب بھی رات ہی تھی لیکن سونیا نے نارچ جلا کر میری کھالی پر بندھی۔ کوئی گھڑی پر نظر ڈالی تو میں چونک گیا۔ دن کے نیارہ بج رہے تھے۔

میں نے غار سے نکل کر درختوں کی شاخوں سے جھانکا تو دائیں میں تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو روشنیاں دیکھ کر میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ دور دور تک بکھرے ہوئے کا بیج کی تعداد میں بائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ قریب ترین کا بیج وہی تھا جس کے بارے میں میں

پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ چند ایک کے علاوہ تمام کا بیج یہاں سے نظر آ رہے تھے اور وہ مذکورہ کا بیج تو میری نظروں کے بالکل سامنے تھا۔ اس کا قرنت دوسری طرف تھا اور جتنی حصہ ہماری طرف۔

میں دیر تک اس طرف دیکھتا رہا پھر واپس آیا۔ سونیا بیگ میں سے ایک ڈبا نکال کر کھول چکی تھی۔ نارچ کی روشنی میں ہم نے کھانا کھایا اور اس کے تھوڑی سی دیر بعد ہم اس اندرونی غار سے نکل کر باہر والے غار کے دہانے کے قریب بیٹھ گئے۔ باہر اگرچہ تیز دھوپ تھی لیکن غار کے سامنے گنجان درختوں کی وجہ سے اندر اندھیرا سا تھا۔

سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے ایک موقع پر سونیا نے اشارات رات والے واقعے کا ذکر بھی کیا۔ اس کے بونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن میں نے کچھ کہنے کے بجائے منہ پھیر لیا تھا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد درختوں کی شاخیں ہٹا کر باہر بھی جھانک لیتا تھا اور پھر ایک مرتبہ میں چونک گیا۔ ایک عورت بچے کو گود میں لیے اس کا بیج کے عقب میں سبز یوں کی کیاری میں گھوم رہی تھی۔ اس بچے کی عمر چھ مہینے سے زیادہ نہیں تھی۔

اس کے دو گھنٹوں بعد میں نے کمانڈو ڈریس میں ایک آدمی کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ سر پہ پیرایچ بیجے تک وہ دونوں کئی مرتبہ وہاں نظر آئے تھے۔ ہمیں کتنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں میاں بیوی تھے اور ان کے سوا کا بیج میں اور کوئی نہیں تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور سونیا اس غار سے نکل آئے۔ میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ناکامی کی صورت میں ازیت ناک موت ہی ہمارے حصے میں آتی لیکن کامیابی کی صورت میں ہم دارا اور اس کے ساتھیوں پر بھی ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

کا بیج کے سامنے والے رخ پر جی جی رہی تھی جبکہ پچھلی طرف اندھیرا تھا۔ ہم رائفلیں سنبھالے وہ قدموں آگے بڑھتے رہے۔ کا بیج کے عقب میں پہنچ کر ہم رک گئے۔ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ عورت اور صوبینہ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں بچہ بیٹھا ہوا تھا اور وہ دونوں بچے سے نہیں رہتے تھے۔ میں نے سونیا کو اشارہ کیا۔ وہ جتنی دروازے کے قریب پہنچ گئی اور بولے بولے دستک دینے لگی۔

بید پر لیٹے ہوئے اس آدمی نے چونک کر یوں کی طرف

دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔ اس آدمی نے بیٹے سے اٹھ کر دائیں طرف والی دیوار پر کپڑوں کے ساتھ ہنگے ہوئے بولسٹر سے ریو اور نکالا اور اس کمرے سے نکل کر دوسری طرف چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد عقبی دروازے پر اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔“ سونیا نے کھانسنے ہوئے جواب دیا۔

اس کوئی نے پتا نہیں کیا سمجھ کر دروازہ کھول دیا اور پھر روشنی میں سونیا کو دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ اس نے ریو اور والے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر رائل اس کی کھوپڑی سے لگا دی۔

”حرکت مت کرنا، کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ میرے حلق سے غراہٹ نکلی۔ وہ آدمی بری طرح بد خواص ہو گیا۔ سونیا نے بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے ریو اور لے لیا اور ہم دونوں اسے دھکیلے ہوئے اندر آگئے۔ سونیا نے دروازہ بند کر دیا۔

جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ عورت بھی نہیں دیکھ کر اچھل پڑی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے۔ اس نے جلدی سے بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

”ہم تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔“ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہمیں ایک دو روز کے لیے یہاں پناہ چاہیے۔ اگر تعاون کرو گے تو محفوظ رہو گے۔ بصورت دیگر۔“ میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوہ۔“ اس آدمی کے منہ سے بے اختیار نکلا ”تم دونوں شاید اسی عورت کے ساتھی ہو جو پہاڑی کے دوسری طرف کانچ میں ہمارے ایک گارڈ کو قتل کر کے فرار ہوئی ہے لیکن تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔ پورے رائل اینگل میں تم لوگوں کی تلاش ہو رہی ہے۔“

میں اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ وہ یقیناً جاگتی کی بات کر رہا تھا۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا تھا کہ جاگتی زندہ ہے اور اس کانچ میں محافظ لڑکی کو قتل کر کے بھاگ گئی تھی۔ کمرے کے فرش پر بکھرا ہوا خون اس کا نہیں تھا لیکن اس کی رائفل، خنجر اور میٹر کلپ۔ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اس آدمی سے سوالات کرتا رہا لیکن وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ محافظ لڑکی نے

فون پر بستی کے کنٹرول روم کو اطلاع دی تھی کہ تین افراد نے اسے قیدی بنالیا ہے جن میں ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ ایک عورت اور ایک آدمی تو کبھی چلے گئے ہیں اور تیسری عورت کانچ کی نگرانی کر رہی ہے اور وہ خود موقع پا کر کنٹرول روم کو اطلاع دے رہی ہے۔ اس آدمی کے کہنے کے مطابق جب قریبی پوسٹ سے دو محافظ وہاں پہنچے تو کانچ کی نگرانی کرنے والی عورت محافظ لڑکی کو قتل کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ محافظوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئی اور محافظ دہریک اندھیرے میں گولیاں چلاتے رہے اور بالآخر محافظ لڑکی کی برہنہ لاش لے کر واپس آگئے۔ بعد میں مزید محافظوں کو وہاں بھیجا گیا۔ وہ ٹھیک وقت پر وہاں پہنچے تھے۔ مفور عورت کے دوسرے دو ساتھی وہاں موجود تھے لیکن زبردست مقابلے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جاگتی زندہ ہے لیکن یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ مرد کا تعلق برما سے تھا اور عورت تھائی تھی۔ ان دونوں کا ماضی سنگین جرائم کی گندگی سے آلودہ تھا۔ قانون سے بچنے کی کوشش میں یہ اپنے اپنے ملک میں جہل کھوراٹ کے انجینئرز کے ہاتھ لگ گئے۔ جنہوں نے انہیں یہاں بھیج دیا۔ انہیں بڑے سبز باغ دکھائے گئے تھے مگر یہاں اگر یہ زندگی بھر کے لیے قیدی بن کر رہ گئے تھے گولڈن ٹرائی اینگل میں ایک ساتھ ڈیوٹی دیتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور دو سال پہلے شادی کر لی۔ شادی کی کوئی تہذیبی رسم ادا نہیں ہوئی تھی۔ دو چار ساتھیوں کی موجودگی میں انہوں نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ ٹرائی اینگل میں ایسی شادیوں کی کئی اور مثالیں بھی موجود تھیں۔

اس آدمی کا نام بوبا اور عمر چالیس کے لگ بھگ تھی جبکہ عورت کی عمر تیس بیس سال اور نام ہوا تھا۔ وہ خاصی حسین عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ بیوی اور بچے کو میری رائفل کی زد پر دیکھ کر بوبا ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ رات ہم نے جس طرح گزار دی تھی میں ہی جانتا ہوں۔ ان دونوں کی طرف سے خطرہ تو ہر حال تھا۔ اسی لیے میں اور سونیا رات کو باری باری جاگ کر ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

ہوفانے بچے کی وجہ سے لمبی رخصت لے رکھی تھی

لیکن بوبا کو ہر حال صبح ڈیوٹی پر جانا تھا۔

”اگر میں ڈیوٹی پر نہیں گیا تو میرے ساتھیوں کو شبہ ہو جائے گا اور کوئی نہ کوئی معلوم کرنے کے لیے اس طرف ضرور آئے گا۔ ایسی صورت میں۔“

”تم ڈیوٹی پر ضرور جاؤ گے۔“ میں نے کہا ”لیکن اگر کوئی عذر دینے کی کوشش کی تو ان دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔“ میں نے ہوفانے کی طرف اشارہ کیا ”اور تم ہمارا ایک کام بھی کرو گے۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تھائی لینڈ سے آنے والے جہل کھوراٹ کے مہمان کس کانچ میں مقیم ہیں۔ ان کی تعداد کیا ہے اور یہ کہ ان کے ساتھ تھائی نام کی عورت کس حال میں ہے۔“

ہوفانے اثبات میں سر ہلایا اور بیوی اور بچے کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ دن بھی ہم نے بڑی اذیت میں گزارا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ ہوفانے اگر ہمارے بارے میں بتا دیا تو ہمیں اس کانچ میں گھیر کر چوبیس کی طرح ختم کر دیا جائے گا لیکن بوبا واقعی بیوی اور بچے سے محبت کرتی تھی۔

وہ شام چھ بجے کے قریب واپس آیا۔ اس سے حاصل ہونے والی اطلاعات بڑی تشویش ناک تھیں۔ دارالعلم اور بیٹی فانگ کے ساتھ ایک جوان اور حسین عورت بھی تھیں۔ انہوں نے عیاشی کے لیے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے تھائی لینڈ ہی سے لے کر آئے تھے۔ تھائی کے بارے میں ہوفانے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ ہر وقت بڑی رہتی ہے۔ دوسری تشویش ناک اطلاع یہ تھی کہ ہمیں گولڈن ٹرائی اینگل میں دو روز تک تلاش کیا جا رہا تھا۔ دونوں طرف دریائوں کی منسلک طور پر ناکا بندی کر دی گئی تھی تاکہ ہم فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جہل کھوراٹ کو بھی اس سارے ہنگامے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ فون پر بستی میں اپنے نائب کو ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اس کی ہدایت پر دارالغیرہ کی حفاظت کے انتظامات بھی کر دیے گئے تھے۔

ہوباکے کانچ میں ہمیں پناہ لیے ہوئے تیرا دن تھا۔ کسی شبہ نہیں ہوا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لوگوں کو تلاش کیا جا رہا ہے وہ انہی کے گھر میں تھے بیٹھے ہیں۔

ہوبا اور ہوفانے ہمیں اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ اس بستی کے دوسری طرف بیرون اور دیگر منشیات تیار کرنے کی دو فیکٹریاں تھیں۔ ٹرائی اینگل میں ایسی کئی فیکٹریاں تھیں جن میں ہیروئن اور مارفین وغیرہ تیار ہوتی تھیں۔

وہ چوتھا روز تھا۔ شام چھ بجے کے قریب ہوبا واپس آیا تو اس کی چال میں لنگراہٹ تھی اور چہرے پر زردی کھنڈ رہی

تھی۔ اس کی پینڈی پر کسی زہریلے کبوتر نے کاٹ لیا تھا۔ پینڈی کا وہ حصہ سیاہ پڑ چکا تھا اور ٹانگ سوجتی جا رہی تھی۔ درد کی لہریں اسے بے چین کیے دے رہی تھیں۔ چہرے پر کرب نمایاں تھا۔

”اس کا صرف ایک علاج ہے۔“ ہوفانے ایک بوٹی کا نام لیتے ہوئے کہا ”اس کا رس تیار کرنا ہے۔ پر لگا دیا جائے تو زہر کا اثر ختم ہو جائے گا بصورت دیگر زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا اور یہ زندہ نہیں بچے گا۔“

ہوفانے بچے اور چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شہر کے لیے کتنی پریشان تھی۔

”یہ بوٹی کہاں سے ملے گی؟“ میں نے پوچھا۔

”کانچ کے پچھو اڑے تھوڑے ہی فاصلے پر مل جائے گی۔ اگر تم اجازت دو تو میں جا کر تلاش کروں۔“ ہوفانے کہا۔

”چلو۔“ میں بھی ہمارے ساتھ چلوں گا۔“ میں نے کہا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے سونیا کو مختاط رہنے کا اشارہ کیا اور ہوفانے کے ساتھ بچنے کے قریبی دروازے سے باہر نکلیا۔ میں نے اپنے رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔

کانچ کے عقب میں سبزیوں والی کھیتی سے نکل کر ہم تیس پینتیس گز اور آگے نکل گئے۔ ہوفانے درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں اپنی مطلوبہ بوٹی تلاش کر رہی تھی۔ وہ جبکہ کر چل رہی تھی اور مختلف بوٹیوں کے پتوں کو چھو چھو کر دیکھ رہی تھی۔

”مل گئی۔“ وہ پرجوش لہجے میں بولی اور بیٹھ کر اس بوٹی کی چٹیاں توڑنے لگی۔

میں قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر عقب میں آہٹ سن کر میں نے پیچھے مڑنا چاہا تو ایک خراتی بوٹی آواز سنائی دی۔

”خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔ رائفل پیٹک دو۔“

اس غراہٹ کے ساتھ ہی ایک رائفل کی ٹال میری پشت سے لگ گئی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی اور پورے جسم پر ذہنی خیالیں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

میں نے اپنی رائفل پیٹک دی اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔

میرے جسم میں پیدا ہونے والی سستی کسی خوف کا نتیجہ نہیں تھی۔ رانقل کی نال اگرچہ میری پشت سے لگی ہوئی تھی اور میں نے اپنی رانقل پیٹیک کر دونوں ہاتھ اوپر بھی اٹھالے تھے لیکن میرے دل میں خوف بالکل نہیں تھا۔ اپنے عقب میں آہٹ سن کر اور پشت پر رانقل کی نال کا باؤ محسوس کر کے جو خوف دل میں پیدا ہوا تھا، وہ اس غراہٹ کو سن کر ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ہوفا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی تھی اور اس نے بھی دونوں ہاتھ سرے اوپر اٹھالے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پودے سے توڑی ہوئی پتیاں موجود تھیں۔

”اب تم دونوں میری طرف گھوم جاؤ۔ اگر کسی نے گڑبڑ کی کو شش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“ میرے عقب میں وہ غراتی ہوئی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”چاہت کے دعوے کرنے کے بعد گولیوں سے بھون دینے کی دھمکی دے رہی ہو۔“ میں اردو میں یہ الفاظ کہتے ہوئے آہستگی سے پیچھے گھوم گیا۔

”تسب نہ۔“ وہ جاگتی تھی۔ اس کے حلق سے آواز رک رک کر نکل رہی تھی۔ وہ چند لمحوں میں مجھے گھورتی رہی پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رانقل اب بھی موجود تھی اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ بدستور اوپر اٹھا رکھے تھے ”جھکوان کا شکر ہے تم زندہ ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم بے خبری میں ان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہو۔“

”ہانچ کی حالت دیکھ کر میں نے بھی تم پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔“ میں نے جواب دیا اور ہاتھ نیچے کر کر اس کی پشت چھپتے لگا۔ وہ بڑی سختی سے میرے سینے سے لپٹی ہوئی تھی جس سے اس کے جوش اور جھجھ سے وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

”سونیا کہاں ہے کیا وہ بھی۔“

”زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔“ میں نے اس کی بات پوری کر دی اور گردن گھما کر ہوفا کی طرف دیکھنے لگا جو ہم سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑی حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ہماری گفتگو کا تو وہ ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکی ہوگی لیکن یہ صورت حال دیکھ کر وہ جان گئی ہوگی کہ جاگتی بھی ہماری سامھی ہے۔

ہوفا کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ جاگتی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میری رانقل ہوفا کے قریب زمین پر پڑی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو میری رانقل اٹھا کر ہم دونوں کو بے بس کر سکتی تھی

لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ بھی میں سمجھ رہا تھا۔ اس کا بچہ اور شوہر ہمارے قبضے میں تھے اور شوہر زندگی اور موت کی چمٹکاش میں جکڑا تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے وہ پتیاں اس وقت زیادہ ضروری تھیں جو وہ جھاڑی سے توڑ رہی تھی۔

اچانک کانچ کی طرف سے بچے کے رونے کی آواز سن کر ہوفا اچھل پڑی۔ میں نے بھی جاگتی کو اپنے آپ سے الگ کر کے زمین سے اپنی رانقل اٹھالی۔

”ہوفا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مزید پتوں کی ضرورت ہو تو جلدی سے توڑ لو۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے اور تمہارا بچہ بھی رو رہا ہے۔“

ہوفا ایک بار پھر جھک کر جھاڑی سے جلدی پتیاں توڑنے لگی۔ وہ بار بار کانچ کی طرف مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی۔ بچے کے مسلسل رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”یہ عورت کون ہے اور تم لوگ۔“

”یہاں نہیں۔“ میں نے جاگتی کی بات کاٹ دی۔ وہ ہمارے بارے میں جاننا چاہتی تھی اور میں بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن یہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا مناسب نہیں تھا۔ بچہ رو رہا تھا۔ اس کی آواز کہیں اور بھی سنائی جاسکتی تھی اور عین ممکن ہے اس بکھری ہوئی بستی کا کوئی آدمی صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف آگیا اور پھر ہوفا کے شوہر بوما کی حالت خراب تھی۔ اسے فوری طور پر ان پتوں کی ضرورت تھی جن کی تلاش میں ہوفا اس طرف آئی تھی۔

”بس کافی ہیں۔“ ہوفا سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پتیاں بھر رکھی تھیں۔ میرے کچھ کئے سے پہلے ہی وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی کانچ کی طرف چلنے لگی۔ میں اور جاگتی بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑے۔ ابھی ہم آدھے ہی راستے میں تھے کہ بچے کے رونے کی آواز بند ہو گئی لیکن ہوفا کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ہم سے دو تین قدم آگے بھی لیکن جب وہ کانچ کے دروازے کے سامنے پہنچی تو ہم اس کے برابر پہنچ چکے تھے۔

میں بھی ہوفا کے ساتھ ہی دروازے میں داخل ہوا تھا اور جاگتی کو دروازہ بولٹ کر لینے کی ہدایت دیتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا اور جب میں ہوفا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو وہ لچپ لچکھٹ کر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ سی آگئی۔

سونیا نے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ معصوم اس کے

سینے سے لپٹا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے بار بار اس کے سینے پر منہ مار رہا تھا مگر اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ اسے نہیں مل رہی تھی۔ سونیا کی رانقل ایک کرسی پر پڑی تھی اور بیٹہ پڑا ہوا بوما تکلف میں ہونے کے باوجود لچپ نظروں سے سونیا اور اس کی گود میں بچے کو دیکھ رہا تھا۔

ہوفا نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی پتیاں میز پر رکھ دیں اور کبھی شوہر اور کبھی سونیا کے سینے سے لپٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ شاید کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ پہلے کس پر توجہ دے اور پھر اس نے شوہر پر توجہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بچہ خاموش تھا۔ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔

وہ میز پر پڑی ہوئی پتیاں سمیٹنے لگی۔ اس نے اپنے شوہر سے کچھ کہا اور کمرے سے نکل کر کچن کی طرف چلی گئی اور اس وقت دوسرے دروازے سے جاگتی اندر داخل ہوئی۔ جاگتی کو دیکھ کر سونیا اچھل پڑی۔ جاگتی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے گالوں پر کس کیا اور ایک دوسرے کو زندہ دیکھ کر اپنی اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔

وہ بچہ اب بھی سونیا کے سینے پر منہ مار رہا تھا۔ اسے شاید بھوک لگی تھی لیکن اس معصوم کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ ان تلوں میں ابھی تیل نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر ایک بار پھر رونے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ہی ہوفا کمرے میں آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلیٹ میں دھلی ہوئی پتیاں رکھی ہوئی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں سفید سرامک کا پکٹا اور چمکا ہوا ہاون دستہ تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اب تیز ہو گئی تھی۔

”ہمیں بتاؤ کیا کرنا ہے ان پتوں کا۔“ میں نے ہوفا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم بچے کو سنبھالو۔ اسے شاید بھوک لگ رہی ہے۔“

ہوفا نے پتوں والی پلیٹ اور ہاون دستہ میز پر رکھ دیا اور سونیا کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”ان پتوں کو کوٹ کر رس نکالنا ہے اور بس۔ باقی کام میں خود کروں گی۔“

اس نے مفکرانہ نگاہوں سے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے بچے کو اس سے لے لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔

یہاں کی صورت حال ابھی تک جاگتی کی سمجھ میں نہیں

آئی تھی اور شاید اس نے بیڈ پر بڑے ہوئے بوما کو بھی پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔

”ارے۔ یہ کون ہے کیا ہوا اسے؟“ اس نے بوما کی سوجی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہوفا کہتی ہے کہ ان پتوں کا رس نکال کر پیاجا جائے تو زہر کا اثر زائل ہو سکتا ہے بصورت دیگر پورے جسم میں پھیل جائے گا اور اس کی زندگی کا چراغ بجھ جائے گا۔ ہم وہ پتیاں تلاش کرنے ہی باہر گئے تھے کہ ڈرامائی انداز میں تم سے ملاقات ہو گئی۔“

جاگتی ڈاکٹر تھی۔ ایسی چیزوں کا علاج بھی جانتی تھی۔ اس نے دو تین چیزوں کا نام لے کر ہوفا سے پوچھا کہ ان میں کوئی چیز گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ ہوفا نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ان پتوں کو پیستی ہوں۔“ جاگتی نے رانقل ایک طرف رکھ دی اور پتوں والی پلیٹ اور ہاون دستہ لے کر فرش پر بیٹھ گئی ”ان جڑی بوٹیوں کی تاثیر میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کا مشاہدہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ سردار تھالوب والے کانچ میں لوما نہ۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی اور ہاون میں پتیاں ڈال کر دستے سے ہولے ہولے کوٹنے لگی۔

جاگتی نے اگرچہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ سردار تھالوب کا نام سن کر بوما کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ جاگتی کھل میں پتیاں کو کتنی رہی۔ ہوفا بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ کبھی وہ ہماری طرف دیکھتی اور کبھی بچے کو۔ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آتے۔ ایسے میں اس کے چہرے پر ماما کا نور سا کھج جاتا اور جب ہماری طرف دیکھتی تو آنکھوں میں خوف سا جھلکے لگتا۔ میں اور سونیا خاموش کھڑے تھے میرے ہاتھ میں رانقل تھی لیکن اس کی نال فرش کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ ایسی صورت حال میں ان دونوں میاں بیوی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

بوما بار اپنی ٹانگ کو جھٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات بڑھتے جا رہے تھے لیکن میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ جب وہ ہم تینوں میں سے کسی کی طرف دیکھتا تو اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات کے باوجود آنکھوں میں چمک سی ابھر آتی تھی۔

جاگتی پتوں کو کوٹ چکی تھی۔ اس نے کھل میں جمع پتوں کا رس پلیٹ میں انڈیل دیا۔ کھل میں اب کئی ہوتی پتوں کا پیسٹ سا رہ گیا تھا۔

ہوفا کی گود میں بچے کا پیسٹ بھر گیا تھا اور وہ سو گیا تھا۔ ہوفا نے اپنا بلاؤز درست کر لیا اور اوپر دیکھنے لگی۔ وہ بچے کو لٹانے کے لیے شاید جگہ تلاش کر رہی تھی۔ بند پر ہوا بڑا ہوا تھا۔ سونیا اس کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر بچے کو لے لیا۔ ہوفا نے ایک بار پھر متشکرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئی۔ سونیا اس کرسی پر بیٹھ گئی اور بچے کو گود میں لٹالیا۔ اس کا ایک بازو بچے کی گردن کے نیچے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ بچے کے گھٹے گولڈن بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس وقت میں نے سونیا کے چہرے پر بھی کچھ عجیب سے اثرات دیکھے تھے۔

ہوفا تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار والی نوک دار چھری تھی۔ وہ پٹنگ پر چڑھ گئی اور یوما کی ٹانگ کو ٹوٹنے لگی۔

میں بھی پٹنگ کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہوفا کیا کرنے جا رہی ہے۔ میں نے یوما کی ٹانگ کو پکڑ لیا۔ ہوفا نے ہینڈل پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے شوہر سے کچھ پوچھا۔ ہومانے اثبات میں سر ہلایا۔ ہوفا نے انگلی ہٹائی۔ اس جگہ پیپرین کے سر کے برابر تھسا سا سرخ دھبہ تھا جبکہ آس پاس کی جلد نیلی ہو رہی تھی۔

ہوفا نے چھری کی تیز نوک اس سرخ دھبے پر رکھ کر تقریباً آدھا انچ لبا چرو لگا دیا۔ دوسرا چروہ اس نے کراس کی صورت میں لگایا تھا۔ ہینڈل کے زخم سے سیاہی مائل گاڑھا سا خون بہہ نکلا۔ یوما ٹانگ کو جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے مضبوطی سے دبا رکھا تھا۔ اس نے تکلیف ضبط کرنے کے لیے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔

ہوفا زخم کے آس پاس کی جگہ کو انگوٹھے سے دباتی رہی اور سیاہی مائل گاڑھا خون رستا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے ایک کپڑے سے زخم صاف کیا اور پتوں کا رس قطرہ قطرہ کر کے زخم پر ڈالتی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد زخم سے بننے والے خون کی مقدار کم ہونے لگی۔ ہوفا نے پتوں کا پیسٹ اس کے زخم پر رکھ دیا اور بچا ہوا رس اس کی ٹانگ پر ملنے لگی۔ زخم پر پتی باندھ کر اس نے یوما کی طرف دیکھا۔ اس نے اب بھی دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی۔ اب وہ پیر نہیں جھک رہا تھا۔ ہوفا ہاون دستہ اور پلیٹ لے کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس دوران میں بچن میں سے برتنوں وغیرہ کی توازن آتی رہی تھیں اس لیے میں بھی اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا تھا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو دیر سے اس کی واپسی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرسے اٹھا رکھی تھی جس میں چائے کے پانچ مک رکھے ہوئے تھے۔ ان چار دونوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ از خود چائے بنا کر لائی۔ اس نے اس سے پہلے چائے کھانا یا کوئی اور چیز طلب کرنے کے لیے اسے حکم دینا چاہا تھا۔

میں نے اور جاگتی نے ٹرسے میں سے ایک ایک مک اٹھالیا۔ سونیا کا مک اس نے کرسی کے قریب میز پر رکھ دیا تھا اور دوسرے دونوں مک بھی قریب ہی رکھ کر خالی ٹرسے دیوار کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کر دی تھی۔ اس نے مڑ کر ہومانے کچھ کہا۔ ہومانے اثبات میں سر ہلایا۔

میں یوما کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار کچھ کم ہو گئے تھے۔ ہوفا بند پر چڑھ گئی اور یوما کو سارا دے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پیچھے اتر کر چائے کا ایک مک اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر سونیا کی طرف مڑ کر دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بچے کو لینے کے لیے جھکی تو سونیا نے سکرانے ہوئے تھائی زبان میں کہا۔

”اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ اچھا لگ رہا ہے۔ بہت پیارا بچہ ہے۔“

ہوفا چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یوما کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ اگر تم لوگ یہاں نہ ہوتے تو آج مجھ پر قیامت گزر چکی ہوتی۔ میرے پاس تم لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔“

”اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہمارا فرض تھا۔“ میں نے جواب میں کہا ”ویسے تم لوگوں سے ہماری دشمنی تو نہیں۔ ہمارے اصل دشمن تو وہ لوگ ہیں جن کا تعاقب کرتے ہوئے ہم موت کی اس وادی میں چلے آئے ہیں۔ ویسے شغریہ تو ہمیں تم لوگوں کا ادا کرنا چاہیے۔ مرضی کے خلاف اور جان کے خوف سے ہی سہی، تم لوگوں نے ہمیں پناہ تو دے رکھی ہے۔ اگر ہمیں اس کا بیج میں پناہ نہ ملتی

تو موت کی اس وادی میں ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہو سکتا ہے کہ اب تک ہم میں سے کوئی ایک یا سب ہی مارے جا چکے ہوتے۔ ہم نے یوما کو بچانے میں تمہاری تھوڑی سی مدد کر کے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا۔“

”میرا خیال ہے یہ تمہاری وہی ساتھی ہے جس نے ہراڈی کے دوسری طرف والے پوسٹ کا بیج میں ہماری ایک محافظ لڑکی کو قتل کر دیا تھا؟“ ہوفا نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہ وہی ہے۔ ہم اسے مردہ سمجھ چکے تھے۔ وہاں ہماری عدم موجودگی میں کیا صورت حال پیش آئی تھی اور یہ چار دن تک کہاں چھپی رہی؟ یہ ابھی اس سے معلوم کرنا ہے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے چائے کی چمکیاں بھی لے رہے تھے۔ ہوفا بار بار کبھی سونیا کی گود میں سوتے ہوئے بچے کو اور کبھی سونیا کے چہرے کو دیکھنے لگتی۔

یوما کی حالت اب کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب پہلے کی طرح تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے چائے کی چمکیاں لے رہا تھا۔ دونوں ٹانگیں اس نے آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ جنگلی جڑی بوٹیوں کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں۔ بعض بوٹیاں تو خطرناک زہر کے لیے بھی تریاق کا اثر رکھتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ جب میں بیکاک میں زخمی ہوا تھا تو تھائی نے جڑی بوٹیوں ہی سے تیار کردہ کوئی کریم میرے زخم پر لگائی تھی جس سے مجھے فوراً ہی فائدہ ہوا تھا۔ تھائی خود بھی وہ کریم استعمال کرتی تھی۔

میں نے خود کئی مرتبہ اس کے بدن پر کوڑے برسائے کے بعد زخموں پر وہ کریم لگائی تھی اور اس کے زخم دو چار دن میں ہی ٹھیک ہو جاتے تھے اور اب ایک اور مثال ہمارے سامنے تھی۔ ہوفا نے کہا تھا کہ اگر فوراً ہی مخصوص بوٹی کی پتوں کا رس زہر لے کر کپڑے کے کاٹے کی جگہ پر نہ لگایا گیا تو یوما چند گھنٹوں کے اندر اندر زخم ختم ہو جائے گا۔ میں نے اس وقت یوما کی حالت بھی دیکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ بچے کا نہیں لیکن زخم پر پتوں کا رس پٹکانے اور ان کا پیسٹ لگانے کے بعد آرمے کھینچنے کے اندر اندر وہ زندگی کا مژدہ اٹھا رہا تھا۔

”کیا میں تم سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“ ہومانے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ دیر پہلے تمہاری اس ساتھی نے سردار تھالوب کا نام لیا تھا۔ تم لوگ جنرل کھوراث کے مسمانوں کا تعاقب کرتے ہوئے تھائی لینڈ سے آئے ہو۔ سردار تھالوب بھی تھائی لینڈ کا رہنے والا ہے بلکہ اس کا قبیلہ تو سرحد کے ساتھ ساتھ وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ تم لوگ سردار تھالوب کو کیسے جانتے ہو اور جہاں تک میرا خیال ہے تم دونوں کا تعلق تھائی لینڈ سے بھی نہیں ہے۔“ اس کا اشارہ جاگتی اور میری طرف تھا۔

”جنرل کھوراث کے مسمانوں کو جانتے ہو، وہ کون لوگ ہیں؟“ میں نے اناس سے سوال کر دیا۔

”نہیں۔“ ہومانے نفی میں سر ہلایا ”ہم تو معمولی کارندے ہیں ہمیں صرف اپنی ذیوبی سے سروکار ہوتا ہے۔ زیادہ باتیں ہم نہیں جانتے اور ہمیں ایسی باتیں بتانی بھی نہیں جاتیں۔ ویسے پچھلے دنوں یہ سننے میں آیا تھا کہ چیانگ سائین میں جنرل کھوراث کے آدمیوں اور سردار تھالوب میں کچھ جھڑپیں ہوئی تھیں جن میں جنرل کھوراث کا ایک خاص آدمی سین ٹونگ بھی مارا گیا تھا اور یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ دارا نامی کوئی شخص تھائی لینڈ میں جنرل کھوراث کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ دارا وہی شخص ہے جو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے چیانگ سائین میں جنرل کھوراث کے کئی آدمیوں کو سردار تھالوب کے ہاتھوں مارنے سے بچالیا تھا۔ سردار تھالوب سے اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوا تو جنرل کھوراث نے اسے ٹرائی ایجنٹ میں آنے کی اجازت دے دی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”یہاں سردار تھالوب کے ساتھ ایک اور نام بھی لیا جا رہا ہے۔ عجیب سا نام ہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا لیکن سنا ہے کہ وہ دارا کا ہم وطن ہے اور دارا کے خون کا پیاسا ہے۔ دارا دارا اصل سردار تھالوب سے نہیں اس کے خوف سے بھاگ کر یہاں آیا ہے۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”سب سے پہلے تو میں یہ وضاحت کروں کہ جنرل کھوراث کے آدمیوں کو ہومانے میں دارا ہی کا ہاتھ ہے۔ اس کے ہاتھ کی بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ سردار تھالوب تو اسے جانتا بھی نہیں تھا اس لیے اس سے دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سردار تھالوب سے دشمنی کی ابتدا دارا ہی نے کی تھی۔ اس رات سردار تھالوب کے آوی اس کے مسمانوں کو چیانگ رائے سے لے کر چیانگ سائین آ رہے تھے کہ دارا اور اس کے آدمیوں نے راستے میں ان کی گاڑی

پرانی نہیں لیکن وہ ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔“  
 ”میں نے سردار تھالوب کو دیکھا نہیں لیکن یہاں اور  
 برما میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ تمہیں  
 یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں بھی اس کے قبیلے سے تعلق رکھتا  
 ہوں۔“

”کیا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے  
 اپنی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ اب ہمارے لیے راستہ  
 خود بخود ہوا رہا تھا۔

”میں برما کے سرحدی شہر ٹانگیل کا رہنے والا ہوں۔“  
 بوما کہہ رہا تھا ”کیون قبیلے کا بنیادی تعلق دراصل برما ہی سے  
 ہے۔ تقریباً دو سو سال پہلے اس قبیلے کچھ لوگ برما سے ہجرت  
 کر کے تھائی لینڈ کی سرحد پر آباد ہو گئے۔ وقت گزرنے کے  
 ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ درحک  
 پھیلنے چلے گئے۔ آج کیون قبیلے کو تھائی لینڈ کے اس شمالی خطے کا  
 سب سے بڑا اور طاقت ور قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔

”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ برما سے کیون قبیلے  
 کے کچھ اور لوگ بھی بڑی تعداد میں تھائی لینڈ کا رخ کرتے  
 رہے لیکن کیون آج بھی بڑی تعداد میں برما کے سرحدی  
 علاقوں میں آباد ہیں اور میرا تعلق بھی اس قبیلے کے ایک معزز  
 گھرانے سے ہے۔ بلکہ تھا۔“

”کیون قبیلے کے لوگ تو بڑے مخفی، بھانسن اور رزق  
 حلال کے خوگر ہیں لیکن تمہے۔“ میں نے جان بوجھ کر جملہ  
 ادھورا چھوڑ دیا۔ میرے حساب سے لوہا پوری طرح گرم  
 ہو چکا تھا اور میں اسے اپنے ڈھب پر لانے کے لیے جلی جلی  
 چوٹیں لگا رہا تھا۔ زیادہ زور دار ضرب نقصان دہ بھی ہو سکتی  
 تھی۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ بوما نے ہلکے سے پہلو ہلاتے  
 ہوئے جواب دیا ”جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق برما  
 کے سرحدی شہر ٹانگیل سے ہے یہ شہر زیادہ بڑا نہیں ہے  
 لیکن یہاں زندہ رہنے کے تمام مواقع میسر ہیں۔ میرا باپ شہر  
 کا ایک معزز بزنس مین تھا۔ میں نے باپ اسکول تک تعلیم  
 حاصل کی۔ میرا باپ مجھے بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا لیکن بائیس  
 سال کی عمر میں مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوئی جس کی سزا میں  
 آج تک بھگت رہا ہوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ ایک  
 نظر ہونکا کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا  
 ”مجھے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ نیٹلی ایک پولیس آفیسر کی  
 بیٹی تھی۔ ہم میں بے تکلفی و برحقہ گی اور پھر ایک روز میں نے  
 اس کی مرضی کے خلاف وہ سب کچھ کر ڈالا جو مجھے نہیں کرنا

پر حملہ کر دیا اور سردار تھالوب کے پانچ آدمی اس حملے میں  
 مارے گئے۔ ایسی صورت میں سردار تھالوب کیسے خاموش رہ  
 سکتا تھا۔“ میں ایک بار پھر خاموش ہو کر بوما اور ہونکا کے  
 چہروں کو کتنے لگا۔ ہم نے چاروں سے انہیں اپنا بنائی بنا رکھا  
 تھا۔ اس دوران میں اگر انہیں موقع ملتا تو ہمیں موت کے  
 گھاٹ اتارنے سے نہ چوکتے۔ اب ہم نے ان کی ذرا سی مدد  
 کی تھی تو وہ ہمارے بے حد شکر گزار اور احسان مند نظر  
 آ رہے تھے اور میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا  
 تھا۔ اتفاق سے سردار تھالوب اور دارا کا تذکرہ نکل آیا تھا۔  
 دارا نے اپنے آپ کو مظلوم اور مجھے اور سردار تھالوب کو  
 انتہائی ظالم اور بے رحم بتایا ہوگا۔ جزل کھوراث کو بھی اس  
 قسم کی اطلاعات دی ہوں گی کہ وہ دارا کا بھدرا اور میرا اور  
 تھالوب کا دشمن بن جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جزل  
 کھوراث کے کئی آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے لیکن  
 میرے خیال میں اس وقت دارا کے مظالم کی مختصری داستان  
 سنا کر بوما اور ہونکا کے دلوں میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کیا  
 جاسکتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ میری باتیں ان پر اثر  
 انداز ہونے لگی تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا  
 ”بات وہیں پر ختم نہیں ہوگی۔ دارا اور اس کے ساتھی بے  
 گناہوں کا قتل عام کرتے رہے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے جزل  
 کھوراث کے آدمیوں کو آگے کر کے مروانا رہا۔ وہ انسان  
 نہیں خونی بھیڑیا ہے۔ اس کا دامن لاتعداد بے گناہوں کے  
 خون سے تر ہے۔ وہ سونیا کی ماں کا قاتل ہے۔ اس نے میرے  
 ماں باپ کو میری نظروں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا  
 تھا۔ جاگتی ایک معزز ڈاکٹر تھی۔ یہ آج میرے ساتھ ٹھوکریں  
 کھا رہی ہے۔ تھائی کا گھر جلا دیا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس  
 نے مجھے پناہ دی تھی۔ ہاں میں ہی وہ شخص ہوں جو دارا کے  
 خون کا پکچاسا ہے۔ اگر مجھ پر ظلم نہ ہوا ہوتا تو آج میں ڈاکٹر  
 ہوتا، انجینیر یا سائنس دان ہوتا لیکن آج میں قاتل ہوں،  
 خونی ہوں اور اس کا ذمہ وار صرف اور صرف دارا ہے اور  
 میں دارا کا قاتل دنیا کے آخری سرے تک کروں گا۔“

ان دونوں کے چہروں پر گویا سناٹا سا تھا۔ عجیب سے  
 تاثرات تھے جنہیں میں کوئی نام نہیں دے سکتا لیکن ایک  
 بات طے تھی کہ وہ پوری طرح میری باتوں کے سر میں آ گئے  
 تھے۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر بوما نے لب کشائی کی۔

”تو تم سردار تھالوب کے وہی دوست ہو جو۔“  
 ”ہاں۔ میں وہی ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی  
 ”سردار تھالوب سے میری دوستی اگرچہ چند ہفتوں سے زیادہ



چاہیے تھا۔ کیٹی نے اپنے گھروالوں کو بتا دیا۔ اس کا باپ میرے خون کا پیاسا ہو گیا۔ ممکن ہے مفاہمت کا کوئی راستہ نکل آتا اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا لیکن میں اس قدر خوف زدہ تھا کہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

”چند روز تک شہر سے کئی میل دور ایک خانقاہ میں چھپا رہا۔ میں نے بھکشوؤں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ بے یا روم دو گار اور بے سارا ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے زندہ رہنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا پھر رہا ہوں لیکن ایک روز دو پولیس والے میری تلاش میں اس طرف آنکے۔ میں پولیس والوں کو دیکھ کر جنگل میں چھپ گیا تھا۔ پولیس والے عجائے ان بھکشوؤں سے میرے بارے میں کیا پوچھتے رہے۔ ان کے واپس چلے جانے کے بعد میں خانقاہ میں واپس آیا تو بھکشو مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ انہیں مجھ پر شبہ ہو گیا تھا۔ مجھے اب وہاں بھی خطرہ محسوس ہونے لگا اور پھر اس سے اگلے روز میں ان بھکشوؤں کے سامان سے رقم چوری کر کے وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

”میں کہیں بھی ٹک کر نہیں بیٹھ سکا۔ کسی پولیس والے کو اپنے آس پاس دیکھ کر میری روح فنا ہو جاتی۔ رنگوں میں البتہ تجھے کئی سال رہنے کا موقع ملا۔ میں اپنے ہم عمر جرائم پیشہ لڑکوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ ہم بڑکانوں سے چیزیں چراتے، رہزنی کی وارداتیں کرتے اور جو کچھ بھی ملتا آپس میں بانٹ لیتے۔

”ایک روز ہم تین لڑکے شہر کے ایک دولت مند شخص کے گھر میں گھس گئے۔ اس مکان پر ہماری کئی دونوں سے نظر تھی۔ ایک لڑکا کئی روز سے مکان کی گرائی کر کے گھروالوں کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نگرانی سے ہمیں پتا چل گیا کہ اس گھر میں صرف تین افراد رہا پس پڑے تھے۔ وہ دولت مند شخص اس کی بیوی اور ان کی نو عمر بیٹی۔ ایک ملازمہ تھی جو رات کو بیچے کے بند چھٹی کر کے چلی جاتی تھی۔ اور پھر ایک رات ہم تین لڑکوں نے اس مکان پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے بڑی رقم ملنے کی توقع تھی اور میرا خیال تھا کہ میں اپنا حصہ لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا لیکن انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔

”مکان کے اندر اندر میرے میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ کرسی الٹ گئی۔ آہستہ سے گھروالوں کی آنکھ کھل گئی۔ دولت مند شخص کی بیوی نے ہمیں دیکھ کر شور مچا دیا۔ میرے ایک ساتھی نے اسے دبوچ لیا۔ پہلے دھکا کرا سے

خاموش کرانے کی کوشش کی اور پھر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ وہ دولت مند شخص اور اس کی بیٹی بھی شوری آواز سن کر جاگ گئے تھے۔ انہوں نے بھی شور مچا دیا۔ ہم قیوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

”صبح پتا چلا کہ اس دولت مند شخص کی بیوی مر گئی تھی۔ میرا اگرچہ اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن پکڑے جانے کے خوف سے وہ شہر چھوڑ دیا اور ایک بار پھر مختلف قصبوں اور شہروں میں بھٹکتا ہوا منڈالے پہنچ گیا۔

”جو شخص ایک مرتبہ بھٹک جائے اس کا راستہ پر آنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ کوشش بھی کرے تو بعض عناصر اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی جس کی اگر مجھے سزا مل جاتی تو برائی کے راستے پر میرے قدم رک جاتے مگر میں سزا سے بچنے کے لیے بھاگ نکلا تھا۔ مجھے ایسے لوگ تو بہت ملے جو برائی کے راستے پر میری حوصلہ افزائی کرتے رہے لیکن ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جو مجھے اس راستے پر چلنے سے روکتا۔ میں جرائم کی دلدل میں دھنسا چلا گیا۔

”منڈالے میں ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہو گئی جس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ تریاڈ کا رکن ہے۔ تریاڈ بہت ہی خطرناک تنظیم ہے۔ ساتھ ایشیا کے بیشتر ممالک میں اس کا ہولڈ ہے۔ برما میں بھی تمام جرائم اسی تنظیم کی سرپرستی میں ہوتے ہیں۔ منشیات کے دھندے، عورتوں کی بکیم فروشی، جوا، ہتھیار وصول کرنا۔ یہ تمام جرائم اسی تنظیم کرانی ہے اور پولیس ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔

”گولی نامی وہ آدمی اپنے علاقے میں منشیات کے دھندے کی نگرانی کرتا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ کام کرتا رہا۔ کئی سال گزر گئے۔ اس عرصے کے دوران میں، میں کئی مرتبہ پکڑا گیا تھا لیکن مجھے یاد ہے میں کبھی بھی دو تین گھنٹوں سے زیادہ کسی تھانے میں نہیں رہا تھا۔ جیل جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیس کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ اس سے پہلے ہی معاملہ طے ہو جاتا تھا اور مجھے تھانے ہی سے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا تھا۔

”میں منڈالے میں اس گروہ کے اندر بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ میں نہ صرف اس کاروبار کی اونچ نیچ سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا بلکہ گروہ کے بہت سے راز بھی جان چکا تھا۔

”اور پھر ایک روز دو آدمی میرے ہاتھوں مارے گئے۔

ان میں ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ پولیس کے محکمے میں کھلی سی چی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ پولیس کی سرپرستی کے بغیر جرائم نہیں چل سکتے۔ منڈالے کی پولیس اور دیگر متعلقہ محکمے بھی جرائم میں پوری طرح ملوث تھے۔ بھاری رشوت اور بھتے پولیس کو شرمیں ہونے والے جرائم کی طرف سے انہیں بند کر لینے پر مجبور کر دیتے تھے لیکن یہ معاملہ دو آدمیوں کے قتل کا تھا اور ان میں ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ اپنے ایک ساتھی کے قتل پر پولیس کس طرح خاموش رہ سکتی تھی۔ گول اور تریاڈ کے دوسرے مقامی عہدے داروں نے پولیس کے اعلیٰ افسران سے مل کر معاملے کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ مجھے ان کے حوالے کر دیا جائے۔

”مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میرے پاس تریاڈ کے بہت سے راز تھے جو پولیس تشدد کر کے اگلا سکتی تھی۔ گول نے مجھے منڈالے سے نکال کر یہاں بھیج دیا۔” بوا خاموش ہو گیا۔ چند لمبے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بولا ”مجھے یہاں تین سال ہو چکے ہیں۔ منڈالے میں، میں ان کے لیے اہم آدمی تھا لیکن یہاں ملتا ہے مجھے خاموش کر دیا گیا ہے۔ مجھے عام آدمیوں کی طرح یہاں گاڑی ڈھولی دے دی گئی ہے۔ بہت سی باتیں ہم جیسے لوگوں سے چھپائی جاتی ہیں۔ کچھ باتیں ادھر ادھر سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ دیئے کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم جیسے لوگ اہم معاملات سے بے خبری رہیں۔ اب دارا کا معاملہ ہے۔ مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ اس نے تھائی لینڈ میں سردار تھالوب کے خلاف جہل کھوٹ کے آدمیوں کی مدد کی تھی اور جہل کھوٹ نے تھالوب اور تھمارے انتقام سے بچنے کے لیے اسے یہاں پناہ لینے کی اجازت دے دی۔ دارا اور اس کے ساتھیوں کی نشیت جہل کھوٹ کے سمانوں کی ہے۔ یہاں ان کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔“

”بات صرف اتنی سی نہیں ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”دارا شمشادہ کے خلاف ایک سازش میں بھی ملوث ہے۔ اگر مجھے تھالوب جیسے دوستوں کی مدد حاصل نہ ہوتی تو اس سازش کے نتائج بہت بھیانک ہو سکتے تھے۔ بہر حال، جب بات شروع ہوئی تھی تو تم تھالوب کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے تھے؟“

”میں نے تھالوب کو دیکھا نہیں لیکن اس کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ اس نے تھائی لینڈ میں اپنے قبیلے کے حکمران بہت کچھ کیا ہے۔ یہاں اس کے بارے میں بہت غلط تاثر

پیدا کیا گیا ہے۔ کاش! میں اس کے لیے کچھ کر سکتا؟“

”تم بہت کچھ کر سکتے ہو بوا۔“ میں نے کہا۔

”یہاں میں قیدی ہوں۔“ بوا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”ایک ایسا قیدی جو آزادی سے گھوم پھر سکتا ہے لیکن زانیہ اشکل کی حدود سے باہر نہیں جاسکتا۔“

”تم قیدی ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ اپنی کامیابی پر میرا دل جلیوں اچھل رہا تھا۔ بوا اب مکمل طور پر سرخڑ ہو چکا تھا ”دیکھو بوا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”مجھے دیکھو۔ ان لڑکیوں کو دیکھو۔ ہم نے برائی کے خاتمے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ اپنی جائیں بھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں اور۔“

”خوش قسمت ہو تم کہ تمہیں شروع ہی میں ایسے آدمی مل گئے تھے جنہوں نے تمہیں غلط راستے پر چلنے سے روک دیا تھا اور تمہارے دل میں بدی کے خاتمے کی لگن پیدا کر دی تھی۔ میرے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو۔“

”اب بھی وقت نہیں گزرا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”یہ درست ہے کہ ہم دو چار آدمی دنیا بھر سے برائی کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں کر سکتے لیکن بدی کے اس تناور درخت کی چند شاخیں کاٹ کر اسے مزید پھیلنے سے تو روک سکتے ہیں۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”یہ گولڈن زانیہ اشکل ایسی جگہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو منشیات سپلائی کی جاتی ہیں۔ تم منڈالے میں یہ دھندلا کر چکے ہو۔ تم نے وہاں اس کے اثرات دیکھے ہوں گے۔ اس وقت تمہیں شاید اس کا احساس نہ ہوا ہو لیکن اب سوچو تو تمہیں احساس ہو جائے گا کہ منشیات کا یہ زہر کس طرح دنیا بھر میں نوجوان نسل کو مفلوج کر رہا ہے۔ انہیں تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ دارا کوئی عام قسم کا غنڈا یا بد معاش نہیں ہے۔ اس کا اصل مقصد ایک بہت بڑا ڈرگ ریٹ قائم کرنا ہے اور وہ بہت عرصے سے جہل کھوٹ سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایسے کئی آدمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جو اس کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کر رہے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ جہل کھوٹ کو بھی ایسے ہی بے رحم اور سفاک آدمیوں کی تلاش رہتی ہوگی جو اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کر سکیں۔ اب دارا یہاں تک پہنچ چکا ہے اس سے پہلے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی معاملہ طے ہو ہمیں دارا کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”کاش تم سے بہت عرصہ پہلے ملاقات ہوتی ہوتی۔“ بوا نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا ”میں تمہاری طرف دوستی

کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ اب تم مجھے پہلے سے بہت مختلف پاؤ گے۔

میں نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ ہماری بہت بڑی فتح تھی۔ ہم نے دشمن کے گھر میں گھس کر اپنے لیے جگہ بنائی تھی۔ جو کام طاقت سے نہیں ہو سکتا تھا وہ باتوں نے کر دکھایا تھا۔ میں اس زہریلے کیزے کو بھی دعائیں دے رہا تھا جس نے بوما کو کاٹا تھا اگر وہ زہریلا کیزا اسے نہ کاٹتا تو انہیں ہماری مدد کی ضرورت بھی نہ پڑتی لیکن ہمارے ایک چھوٹے سے احسان نے ان دونوں میاں بیوی کو ہمارا بے دام غلام بنا دیا تھا اور وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے ان کے کانچ میں پناہ لے رکھی ہے تو ہمارے ساتھ انہیں بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔

ہوفانے نے بھی اٹھ کر ہم تینوں سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک ابھرتی تھی۔

اس واقعے کی ابتدا شام کو ہوئی تھی اور اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔  
”اب تم لوگ ہمارے معزز مہمان اور دوست ہو۔“ ہوفانے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”باتیں تو بعد میں بھی ہوتی ہیں گی۔ میں پہلے کچھ کھانے کا بندوبست کروں۔“

اس نے سونیا کی گود میں سوئے ہوئے بچے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے چینی زبان میں بوما سے کچھ کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ جاگتی بھی اٹھ کر اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ میں اور بوما ایک باہر پھرتی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

کھانا تقریباً ایک گھنٹے میں تیار ہو سکا تھا۔ ہوفانے کھانا لگانے کے بعد بچے کو سونیا کی گود سے لے کر بوما کے قریب پانگسپر لٹا دیا تھا۔

کھانے کے بعد بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہم تینوں کے سونے کے لیے ہوفانے دوسرے کمرے میں بندوبست کر دیا تھا اور وہ بندوبست یہ تھا کہ کمرے کے فرش پر ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ اس کمرے میں خیر خیر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اب مجھے بویا ہوفانے کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم تینوں اطمینان سے اس کمرے میں آکر درہی پر بیٹھ گئے اور اس وقت میں نے پہلی بار یہ بات نوٹ کی کہ جاگتی کے پاس

کوئی عام رائفل نہیں سب مشین گن تھی۔ اس کی اپنی رائفل تو میں نے کانچ کے برآمدے میں پڑی ہوئی دیکھی تھی اور جاگتی کے جسم پر اس کا اپنا لباس بھی نہیں تھا۔ وہ زنائی اسٹیکل کے محافظوں والا کمانڈو ڈریس پہنے ہوئے تھی اور اتفاق تھا کہ بوما کی دیکھ بھال اور باتوں میں اب تک ان تبدیلیوں پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔

”ہاں۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف اتر ہی رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ واپس آئے تو کمرے میں خون بکھرا ہوا دیکھا۔ وہ محافظ لڑکی بھی غائب تھی اور تم بھی۔ تمہاری رائفل پر آمدے میں پڑی تھی۔ کمرے کے اندر تمہارا خنجر اور بیڑھ لپ بھی لگ گیا۔ میں تو ہر فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ ہماری عدم موجودگی میں اس کانچ میں کیا ہوا تھا اور تم زندہ کیسے بچیں؟“

”موت نے مجھے دوپٹے کی پوری کوشش کی تھی مگر میں اس بار بھی اسے چمکا دینے میں کامیاب ہو گئی۔“ جاگتی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”تم لوگوں کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں کانچ کے باہر پھرتی ہی بیٹھی رہی پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی قریبی پوسٹ کا کوئی اور محافظ اس طرف نکل آیا تو آپ لباس کی وجہ سے میں فوراً ہی اس کی نظروں میں آ جاؤں گی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس محافظ لڑکی کے ساتھ کیزے تبدیل کر لینے چاہئیں۔ میرے جسم پر کمانڈو ڈریس ہو گا تو فوری طور پر مجھ پر شبہ نہیں کیا جائے گا اور مجھے کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”میں نے کمرے میں داخل ہو کر اس لڑکی کو بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس کی رسیاں کھول دیں اور کیزے اُتارنے کو کہا اور پھر اپنے کیزے بھی اُتار دیے۔“

”وہ موقع کی تلاش میں تھی لیکن میں نے خنجر ہاتھ میں لے رکھا تھا لیکن کیزے پہننے ہی اسے موقع مل گیا اور اس نے گھوم کر میری پیٹنی پر اس زور کا گھونسا مارا کہ میں چلا کر گر پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ میں شاید ایک ڈیڑھ منٹ کے لیے اپنے حواس سے بیگانہ ہوئی تھی۔ مجھے فرش پر بے حس و حرکت دیکھ کر وہ سمجھ گیا۔ میں بے ہوش ہو گئی ہوں۔ میرے حواس بحال ہوئے تو وہ ٹیلی فون پر کسی کو ہمارے بارے میں بتا رہی تھی۔ میرا خنجر قریب ہی پڑا تھا۔ میں خنجر اٹھاتا ہی چاہتی تھی کہ لڑکی نے مجھے دیکھ لیا اور فون کا ریسیور رکھ کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

”وہ کم بخت بہت طاقت ور تھی اور یقیناً اسے لڑائی کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ وہ مجھے بری طرح رگیدتی رہی۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال بکڑ رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے میرے پیٹ اور سینے پر گھونے مار رہی تھی۔“

”بالا آخر مجھے بھی موقع مل گیا۔ میں اسے رگیدتے ہوئے دو پار تک لے گئی۔ اس وقت وہ میرے پیچھے دہلی ہوئی تھی اور قریب ہی فرش پر میرا خنجر بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر اس کے سینے پر وار کیا اور پچھلے اٹھی اور پھر مجھ پر جیسے جنوں سا طاری ہو گیا۔ میں خنجر سے اس کے سینے اور پیٹ پر پچھلے وار کرتی رہی۔ میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی۔ اگر میں اس کے قابو میں آ جاؤں تو وہ میرا بھی یہی حشر کرتی اور پھر اس نے ہمارے بارے میں کسی دوسری جگہ اطلاع دے کر ہماری سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔“

”میں اسے چھوڑ کر اٹھ گئی۔ وہ تڑپتی ہوئی فرش پر ادھر ادھر لڑھک رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر لا دیا۔ اس کی سب مشین گن اٹھائی اور کانچ سے نکل کر سامنے کھیتوں کی طرف دوڑ لگا دی۔“ جاگتی خاموش ہو کر باری باری ہماری طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”تم لوگوں کو گھگھے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ پہلے میں نے بھی سوچا تھا کہ پہاڑی پر چڑھ جاؤں لیکن پھر اس کا موقع نہیں ملا کیونکہ اسی وقت ایک جیب کانچ کے سامنے آکر رک گیا۔ وہ دو آدمی تھے کانچ کے اندر آکر انہوں نے صورت حال دیکھی تو باہر نکل کر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے اور پھر اس لڑکی کی لاش جیب میں ڈال کر بھاگ گئے۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک اس لڑکی میں کچھ سانس باقی ہوں اور وہ اس لیے اسے لے کر بھاگ گئے ہوں کہ شاید اسے بچایا جائے۔“

”مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ جلد ہی واپس آئیں گے اور پھر میری تلاش شروع کر دیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے میں لاور نکل جانا چاہتی تھی۔ میں پوسٹ کے کھیتوں میں دوڑتی رہی۔“

”اور پھر یہ چار دن جس طرح گزرے میں ہی جانتی ہوں۔ اس دوران میں نے کئی محافظوں کو شکاری کتوں کی طرح ہر طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اور تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے اور آج رات کے آخری پانچ گھنٹے درختوں کے پیچھے پوشیدہ ایک عامل لگ گیا۔ میں نے مارا دن اس عامل میں گزرا۔ یہ کانچ قریب ترین تھا۔ میں نے دن میں ایک دو مرتبہ ہوفانے کو باہر نکلتے دیکھا تھا اور میں نے

فیصلہ کر لیا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد کوئی قدم ضرور اٹھاؤں گی اور پھر میں نے تمہیں اور ہوفانے کا کینچ کے عقبی دروازے سے نکل کر جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں تمہیں پہچان نہیں سکتی تھی۔ تم دیے ہو تو بہت خطرناک لیکن شکر ہے میری وارننگ کے جواب میں تم نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔“ وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر میں اسے اپنی روداد سناتے لگا۔ آخر میں یہ کہہ رہا تھا۔

”یہ اتفاق ہی کہہ لو کہ ہم نے بھی اسی غار میں پناہ لی تھی اور کارروائی کے لیے اس کانچ ہی کو نازا تھا۔ ہم نے ہوفانے اور بچے کو پر غمال بنالیا اور بوما کو باہر آنے جانے کی آزادی دے دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو اس کی بیوی اور بچے میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ آج ہمیں یہاں چوتھا دن تھا۔ بوما کو زہریلے کیزے کے کاٹنے کا جو حادثہ پیش آیا تو اس کے بعد ساری صورت حال ہی تبدیل ہو گئی اور جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کیا یہ خطرناک نہیں؟“ جاگتی نے کہا۔  
”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا ”میں کسی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیں دھوکا نہیں دیں گے بلکہ ہمارے لیے بہت ہی کار آمد ثابت ہوں گے۔ ہم ان کے ذریعے دارا وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔“

”اگر کوئی دھوکا ہوا تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔“ جاگتی نے کہا۔

”خطرات میں تو ہم ویسے ہی گھرے ہوئے ہیں۔ جو بھی صورت حال ہوگی اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“

میں اور جاگتی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں سونیا خاموشی سے کھلی رہی تھی۔ میں نے ایک موقع پر اسے مخاطب کیا تو جواب نہیں ملا۔ وہ سو چکی تھی۔ یہاں چار دن ہم نے بڑی نیشیں میں گزارے تھے۔ بوما اور ہوفانے نگرانی کے لیے بھی میں جاگتا اور کبھی سونیا لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی۔ وہ اعصابی تناؤ ختم ہو گیا تھا جس نے چار دن سے ہمیں اپنی لیٹ میں لے رکھا تھا۔ سکون ملنے ہی سونیا سو گئی تھی۔

جائیں بھی بھلیاں لینے لگی۔ وہ بھی اعصاب شکن حالات سے گزری تھی۔ اب اس کی آنکھیں بھی بند ہوئے لگیں اور پھر میں بھی اس سے کچھ دور ہٹ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

بچے کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور اس کے ساتھ ہی میں چیخ گیا۔ سونیا میرے بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ حالانکہ رات کو وہ مجھ سے دور تھی۔ پتا نہیں وہ کس وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکالا اور اٹھ کر دروازہ ذرا سا کھول دیا۔

دن کا اچھلا پھیل رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھول دیا۔ بونا بلیک پر سو رہا تھا اور ہونا بچے کے ساتھ فرش پر پچھی ہوئی چٹائی پر تھی۔ بچے کے رونے کی آواز سے وہ جاگ گئی تھی اور ایک طرف سے اپنے بلاؤز کو اوپر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی دروازہ کھولتے دیکھا تھا کمر میں آگے نہیں بڑھا اور آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر واپس آگیا۔ بچے کے رونے کی آواز بند ہو گئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ اس وقت شاید سات بجتے والے تھے کہ ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا۔

”چائے پیو گے؟“ ہونا نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مل جائے تو بڑی اچھی بات ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔ پچھلے دنوں سے ہم بیڈ کی جیسی عیاشی کو بھول گئے تھے اور آج ہونا کو خودی خیال آیا تھا۔ میں نے جاگی اور سونیا کو بھی جگا دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہونا چائے لے کر آگئی۔ وہ بھی ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد دوسرے کمرے سے بچے کی قلقاریوں کی آواز سنائی دی۔ ہونا نے اٹھنا چاہا مگر سونیا اس سے پہلے ہی اٹھ کر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ چند منٹ بعد وہ بچے کو لے آئی اور اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ پھر مسکرا کر اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ سونیا نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔ پھر کبھی اس کی ناک کو چھوٹا اور کبھی ٹھوڑی کو اور بالآخر سونیا کے بال اس کی مٹھی میں آگئے۔ وہ بالوں کو کھینچتے ہوئے قلقاریاں بھر رہا تھا۔ ہونا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ معصوم سا بچہ کتنی جلدی سونیا سے مانوس ہو گیا تھا۔

”میں نوبیچ کے قریب بونا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں

گی۔ اسے دو تین روز آرام کی ضرورت ہے اور اس کے لیے بستی کے کمانڈر اور ڈاکٹر کو اطلاع دینا ضروری ہے۔“ ہونا میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں کوئی ڈاکٹر بھی ہے؟“ میرے لمبے میں قد سے حیرت تھی۔

”ڑائی!۔“ شکل میں ایسی کئی بستیاں ہیں اور ہر بستی میں ایک ڈاکٹر موجود ہے کیونکہ یہاں سانپ اور زہریلے کینے مکوڑے بکھتر پائے جاتے ہیں۔ ویسے بھی جھوٹے موٹے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ جزل کھوراث اپنے آدمیوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ انیس بہترین خوراک اور علاج معالجے کی سولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کی تفریح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر بستی میں ایک بہت شاندار ریکریشن ہال بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ ڈاکٹر کے پاس چلے جانا اور اس بچے کے بارے میں پریشان ہونے کی بجائے ضرورت نہیں۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔“ سونیا نے کہا۔

”بچے کو ساتھ لے جانا ضروری ہے۔“ ہونا نے کہا ”سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ ہم بچے کو کھر میں اکیلا نہیں چھوڑتے۔ اتنے چھوٹے بچے کو اکیلا چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر آج بچہ ہمارے ساتھ نہ ہوا تو کسی کو شبہ ہو سکتا ہے۔“

ہونا کی بات میں وزن تھا۔ بچہ ساتھ نہ ہونے کی صورت میں کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔

”تم لوگوں میں سے کسی کے دل میں شاید کوئی شبہ ہو۔“ ہونا نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لیکن ہم دوستی کا ہاتھ ملا چکے ہیں۔ ہم اپنی بات نبھانے کے لیے جان تو دے دیں گے مگر تم لوگوں کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کریں گے۔“

”اگر کوئی شبہ ہو تا تو رات کو ہم اطمینان سے نہ سو جاتے۔“ میں نے کہا ”لیکن تم لوگوں کو میرا ایک کام بھی کرنا ہوگا۔ وہ میں جانے سے پہلے بتا دوں گا۔“ ہونا چائے کے خالی گک لے کر چلی گئی۔ ٹھوڑی دیر بعد میں دوسرے کمرے میں بونا کے پاس آگیا۔ رات کو اس کی ٹانگ بہت سوچ گئی تھی لیکن اس وقت سوچیں آدمی وہ تھا تھی۔

”اس کا بہترین علاج تو یہ ہونی ہی ہے لیکن ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔ اگر کمانڈر کو اطلاع نہ دی گئی اور میں ڈوبی کے وقت کنٹرول روم نہ گیا تو میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ادھر آجائے گا۔“ بونا نے کہا۔

”میں نے تم لوگوں کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں

کیا۔“ میں نے کہا ”تمہیں ہمارے لیے کچھ کام بھی کرنا ہوگا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

ناشتے کے بعد پونے نو بجے کے قریب وہ کانچ سے نکل گئے۔ ہونا نے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اس نے بچے کو ننگوں کی ایک مخصوص باسکٹ میں ڈال کر اسٹریپ کی مدد سے باسکٹ کو پشت پر ڈال لیا تھا۔ ہم کھڑکی میں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد وہ درختوں کی آڑ میں ہو کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا اور پردہ برابر کر دیا۔ میں سونیا اور جاگی کے چہروں پر واضح طور پر بے چینی کے اثرات دیکھ رہا تھا۔

”اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو؟“ جاگی نے خدشہ کا اظہار کیا۔

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے جواب دیا ”اگر دھوکا ہوا اور ہمیں گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ہم آخری لمحوں تک لڑیں گے اور چارچہ کو مار کر ہی مریں گے۔“ ہم ٹھوڑی ٹھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانک لیتے تھے۔ دقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پر بھروسہ کر کے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ لیکن بہر حال اب تو خیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

لیکن ہمارے خدشات بے بنیاد نکلے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ہونا اکیلا واپس آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ اس وقت اس نے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔

”مجھے تو کوئی گڑبگڑ لگتی ہے۔“ جاگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہونا اکیلا آ رہی ہے۔ بونا شاید ٹانگ میں تکلیف کی وجہ سے وہاں رہ گیا ہے اور ہو سکتا ہے کچھ دیر بعد اس کا بیچ کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا ”اگر ایسا کوئی منصوبہ ہو تا تو ہونا اپنے بچے کو ساتھ لے کر نہ آتی۔ کوئی ماں باپ اپنے بچے کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔“

ہونا قریب آتی جا رہی تھی اور پھر وہ برآمدے میں پہنچ گئی۔ اس نے شاید مجھے کھڑکی میں دیکھ لیا تھا کیونکہ اس طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

”بونا کہاں ہے؟“ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ پھر اس کی گود میں سو رہا تھا۔ اس نے کمرے میں

داخل ہو کر بچے کو آہستگی سے ہلکے پر لٹا دیا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کنٹرول روم میں تم ہی لوگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تم لوگوں کے ہاتھوں ان کے چار آدمی مارے جا چکے ہیں اور وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وریائی کناروں کے ساتھ ساتھ گشت میں اضافے کے علاوہ دریاؤں میں بھی کشتیاں پر پٹرولنگ شروع کر دی گئی ہے اور ژائی!۔“ شکل کا چپا چپا جھانکا جا رہا ہے۔ ”وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”پہلے جزل کھوراث سے اس بات کو چھپایا جا رہا تھا لیکن اب اسے پتا چل گیا ہے۔ اس نے بستی کے کمانڈر کو چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی ہے کہ تم لوگوں کو زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں اس کے سامنے پیش کیا جائے۔“

”اور دارا وغیرہ کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”سنا ہے کہ وہ بہت خوف زدہ ہیں۔“ ہونا نے جواب دیا ”وہ جلد سے جلد جزل کھوراث کے ہیڈ کوارٹر پہنچنا چاہتے ہیں لیکن جزل کھوراث نے انہیں چند روز اور بیس رکنے کو کہا ہے۔ جزل کھوراث کسی اہم کام میں مصروف ہے ورنہ ایسی سنگین صورت حال میں وہ خود یہاں دوڑا آتا۔ بونا اس لیے وہاں رک گیا ہے کہ وہ دارا وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے آئے گا۔ اب اگر اجات ہو تو میں کھانا تیار کر لوں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔“

”پہلے پیٹ کا خیال نہیں تھا لیکن اب بھوک لگنے لگی ہے۔ چلو۔ میں بھی تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔“ جاگی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کچن میں چلی گئیں۔ میں اور سونیا وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سونیا کے چہرے اور آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

”اگر انہیں شبہ ہو گیا کہ ہم اس کانچ میں چھپے ہوئے ہیں تو؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”رات کو بونا بتا رہا تھا کہ حافظوں کو ہر دو چار مہینوں بعد اُدھر اُدھر تبدیل کر دیا جاتا ہے لیکن یہ دونوں میاں بیوی تین سال سے یہاں ہیں۔ گویا دونوں اس بستی کے سب سے

قابل اعتماد ہیں۔ اگر کاٹھنجز کی تلاشی شروع کی بھی گئی تو ان کے کانچ پر شبہ نہیں کیا جائے گا۔ ویسے میرے خیال میں اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“

چند منٹ بعد سونیا بھی اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور میں اکیلا بیٹھا صورت حال پر غور کرنے لگا۔ جزل کھوراث نے

مقامی کمانڈر کو چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی تھی اور میرے خیال میں اگلے چوبیس گھنٹے ہمارے لیے بھی بہت اہم تھے۔ ویسے یہ اطلاع میرے لیے خوش آئند تھی کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کو اگلے چند روز کے لیے اور نہیں رکنے کو کہا گیا تھا۔ اب مجھے ہوا کا انتظار تھا۔ اس کے آنے پر ہی دارا وغیرہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

دوپہر کا کھانا ہم نے تین بجے کے قریب کھایا تھا۔ بومای واپسی چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ لنگڑا تے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

وہ اندر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کچھ دیر سنانے کا موقع دیا اور پھر اس پر سوالات کی پوچھا کر دی۔ ”دو گینج۔ دو گینج۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگا ”تم لوگوں کی تلاش کے خوالے سے سرگرمیوں کے بارے میں تو ہوفانے بتا رہا ہوگا۔ میں دارا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں رپورٹ دوں گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”تم تو کہتے تھے کہ دارا بہت ظالم اور سفاک آدمی ہے لیکن وہ تو بہت بزدل نکلا۔“

”ظالم بیشہ بزدل ہوتا ہے۔“ میں نے کہا ”وہ ظلم و ستم جو کچھ بھی کرنا ہے، دوسروں کے بل بوتے پر کرتا ہے لیکن جب اپنے سر پر پڑتی ہے تو بیا تو خارش زدہ کتنے کی طرح ڈوم دبا کر بھاگ نکلتا ہے یا قدموں پر گر کر رحم کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔“

”بہر حال تم اپنی بات جاری رکھو۔“

”چار محافظوں کے قتل اور تم لوگوں کے فرار نے دارا پر دہشت سی طاری کر رکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم شیروں کی کچھار میں گھس کر قتل و غارت کر سکتے ہو تو وہ کیسے محفوظ رہ سکتا ہے اس کا خیال ہے کہ تم کسی بھی وقت اس کی گردن ناپ سکتے ہو اسی لیے وہ جلد سے جلد جہاز کھورات کے ہیڈ کوارٹر پہنچ جانا چاہتا ہے جو اس کے خیال میں سب سے محفوظ جگہ ہے لیکن جہاز کھورات نے اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے اسے مزید چند روز نہیں رکنے کو کہہ دیا ہے۔“

”پہلے تم نے بتایا تھا کہ دارا کے ساتھ دو آدمی اور ایک خوب صورت لڑکی ہے اور اس لڑکی کا چلیہ تھالی سے مختلف ہے۔ وہ لڑکی۔ مجھے یاد ہے چھانک سا مین میں دریا کے کنارے والے کانچ میں ان کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کو ان میں سے کسی نے مار ڈالا تھا اور دوسری کو

وہ اپنے ساتھ لے آئے تھے لیکن تھالی۔ وہ بھی ان کے ساتھ تھی۔“

”تھالی اب بھی ان کے ساتھ ہے۔“ بومانے کہا ”میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی ہے۔ میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ وہ بیمار ہے اور کانچ سے باہر نہیں نکلتی۔“

مجھے یاد آیا۔ بومانے پہلے بھی بتایا تھا کہ دارا وغیرہ کے ساتھ دو عورتیں ہیں جن میں ایک بیمار ہے میں جانتا تھا جس رات جھڑپ میں تھالی دارا کے ہاتھ لگی تھی وہ زخمی تھی اور پرے سے لے آیا تھا کہ اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ علان نہ ہونے کی وجہ سے اس کا زخم بگڑ گیا ہوگا۔

”وہ کس کانچ میں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کنٹرول روم سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر جو کانچ ہے، وہ لوگ اسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن تم نے تو اس طرف کا علاقہ دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔“

بومانے کہا۔

”میں وہ علاقہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا۔؟“ بومانا پھل پڑا۔

”اس کے لیے ہمیں محافظوں کے ڈریس درکار ہوں گے اور میرا خیال ہے تم یہ بندوبست کر سکتے ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”نیکڑوں کا تو بندوبست ہو جائے گا لیکن۔“

”اس طرف جانا خطرناک ہوگا۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟“

میں نے اس کا جملہ مکمل کر دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”رہک تو لینا ہی پڑے گا۔ یہاں تک آگے ہیں تو ہم اس کانچ میں چھپ کر تو نہیں بیٹھ رہ سکتے۔ جب تک باہر نہیں نکلیں گے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگلے چوبیس گھنٹے خطرناک ہو سکتے ہیں مگر اس کے بعد۔ میں اس کے بعد اپنی کارروائی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ تم نیکڑوں کا بندوبست کب تک کر سکتے ہو؟“

”کل تک ہو جائے گا۔“ بومانے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”مجھے چھٹی نہیں دی گئی صرف آج کا دن رستہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کل سے مجھے

ڈیوٹی پر جانا ہوگا۔ کمانڈر کا کہنا ہے کہ مداخلت کارروائی کی تلاش کے لیے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اگر بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا تو کنٹرول روم میں تو بیٹھ کر ڈیوٹی دے سکتا ہوں۔“

”اور میرا خیال ہے یہ اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا

”اس طرح ان لوگوں کی سرگرمیوں کا پتا چلتا رہے گا۔“ پھر کہا۔

”ہمیں چوبیس گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جاسکے گا۔“

میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ میرے دماغ پر عجیب سا بوجھ اور انصاف میں تناؤ تھا۔ میں درمی پلٹ گیا اور سونا والا بیک اٹھا کر نیکے کی طرح سر کے نیچے رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سوچا تھا۔

جانکی نے رات کے کھانے کے وقت مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ مجھ پر بجائے کیوں اتنی تھکن سوار ہو گئی تھی۔ کھانے کے فوراً ہی بعد میں دوبارہ سو گیا اور اس کے بعد میری آنکھ مچ دس بجے ہی کھلی تھی۔ اس سے پہلے کسی نے مجھے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بومانے بوجے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ دوپہر دو بجے کے قریب میں کمرے میں دیوار سے نیک لگائے بیٹھا اٹھ رہا تھا کہ ہوفاتیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ آہستہ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ہوفا کے ساتھ سونا اور جاگی بھی تھی۔ ان کے چہروں پر تشویش کے تاثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔

”دروازہ بند کرلو۔ تم لوگ اس کمرے سے باہر مت نکلتا۔ بھاگ اس طرف آ رہا ہے۔ مجھے اس کی نیت کچھ اچھی نہیں لگتی۔“ ہوفانے کہا۔

”بھاگ کون؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اسے یہاں آئے ہوئے صرف چند دن ہوئے ہیں لیکن کانچ چھ لڑکیوں کو پال کر رکھا ہے۔ ایک مرتبہ مجھ پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنے آپ کو بچا کر۔ میں چونکہ ڈیوٹی پر نہیں جاتی اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ مجھے بھول گیا ہے لیکن کل بومای کے ساتھ گئی تو سوچ باہر مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ برا حرامی آدمی ہے۔ بومای ڈیوٹی پر ہے بھاگ سمجھ گیا ہوا گا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ وہ اس طرف آ رہا ہے۔ اس کی نیت اچھی نہیں لگتی۔ میں اسے ٹالنے کی کوشش کروں گی۔ تم لوگ اپنے کمرے کا دروازہ بند رکھنا۔“

میں نے دوسرے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا۔ بھاگ اس وقت تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ درمیانے قد و قامت کا صحت مند آدمی تھا۔ کمانڈر ڈریس پر بیٹ میں اڑا سوا ہوا ریو اور بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

”اسے اپنے کمرے میں لے آنا۔ آج اس سے بھی تمہیں نجات مل جائے گی۔“ میں نے ہوفا کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا اور کھڑکی کا پردہ برابر کر کے دوسرے کمرے میں واپس آگیا۔

سونا اور جاگی اپنی اپنی رائفلیں لیے کھڑکی تھیں۔ میں نے بھی اپنی رائفل اٹھائی اور دروازہ سمجھ کر دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔

تقریباً تین منٹ بعد دستک کی آواز ابھری۔ ہوفانے دروازہ کھول دیا وہ شاید بھاگ کو باہر روک کر ہی بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ زبردستی دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

”خیریت مسٹر بھاگ۔“ ہوفا کی آواز سنائی دی

”تمہارے تیور کچھ۔“

”میرے تیوروں کی بات مت کرو۔“ بھاگ نے اس کی بات کاٹ دی ”کل تمہیں دیکھنے کے بعد تو میرے حواس بھی قابو میں نہیں رہے۔ میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ یہ چوبیس گھنٹے میں نے کس طرح گزارے ہیں۔ پچھلی مرتبہ تو تم مجھے چما دے گئی تھیں مگر آج۔ میں تم سے اپنی پیاس بجھا کر ہی واپس جاؤں گا۔“

”مسٹر بھاگ۔“ ہوفانے کہا ”تم جانتے ہو میں شادی شدہ ہوں ایک بچے کی ماں ہوں۔ اگر بومای کسی اور کو پتا چل گیا تو ان کی نظروں میں میری کیا عزت رہے گی؟“

”میں ہر کام بہت احتیاط سے کرنے کا عادی ہوں۔“

بھاگ نے جواب دیا ”کسی کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں کہ میں اس طرف آیا ہوں۔ کوئی نہیں جان سکے گا کہ۔“

”لیکن مسٹر بھاگ۔“ ہوفا بول اٹھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ کو بچانا بھی چاہتی ہو اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کر رہی ہو۔

”اے۔ کم آن ہوفا۔“ بھاگ نے کہا اور پھر کچھ اور آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں نے جاگی اور سونیا کی طرف دیکھا اور درمیانی دروازے میں آدھے رانچ کے قریب جھری پیدا کر کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بھاگ نے ہوفا کو بوجھ رکھا تھا۔ وہ اسے کس کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہوفا برائے نام مزاحمت کر رہی تھی۔ بھاگ نے اسے پشت کے بل پٹک پر کر دیا۔

ہوفا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی۔ پٹک پر سویا ہوا بچہ بڑا کر جاگ گیا اور رونے لگا۔ بھاگ نے ہوفا کے بلاؤں پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھکا دیا۔ ہوفا کاسینہ برہنہ ہو گیا۔

میں نے اپنی رائفل سونیا کو تھما دی اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے میں آگیا۔ بھاگ، ہوفا پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں

دبے قدموں چلتا ہوا قریب پہنچ گیا اور پھاٹک کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

اس پہلی دستک کا پھاٹک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ قدرے سخت ہاتھ سے کندھا تھپتھپایا تو اس نے ایک جھٹکنے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک ہوفا کو گرفت میں لیے ہوئے تھے لیکن میری شکل دیکھتے ہی وہ بری طرح اچھلا جیسے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا ہو۔ سیدھا ہوتے ہوئے اس کا سیدھا ہاتھ بڑی تیزی سے چٹون کی ٹیبلٹ میں اڑے ہوئے ریو الوور کی طرف بڑھا تھا لیکن ریو الوور اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔

”کون ہو تم؟“ پھاٹک میری طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔

ہوفا نے بتایا تھا کہ پھاٹک کو اس بہت میں آئے ہوئے پندرہ دن ہوئے تھے اور ظاہر ہے وہ یہاں پر تعینات تمام محافظوں کو ابھی پوری طرح نہیں پہچانتا ہو گا۔ مجھے بھی وہ اپنے ہی قبیل کا کوئی آدمی سمجھتا تھا جو اس کی طرح ہوما کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہوفا کے حسن و شباب سے فیض یاب ہونے کے لیے یہاں آگیا تھا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے جو کچھ کہا اس سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔

”دیکھو مسز!“ وہ خون خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم جو کوئی بھی ہو ابھی یہاں سے چل جاؤ۔ ابھی تو۔“

”میں وہ نہیں مسز پھاٹک جو تم سمجھ رہے ہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر کون ہو تم؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”میں وہ ہوں جس کی تم لوگوں کو تلاش ہے۔“ میں نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا۔

”کک۔ کیا۔ کون ہو تم؟“ وہ ہلایا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

”ہی۔ جس کی تم لوگوں کو تلاش ہے۔“ اس مرتبہ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی ”اب تک تم لوگوں کے چار آدمی میرے اور میرے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور اب اس تعداد میں ایک اور اضافہ ہو گا اس کے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تمہاری لاش اس طرح غائب کر دی جائے گی کہ اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا۔“

”اوہ“ پھاٹک کے منہ سے بے اختیار نکلا ”تو ان خدائوں نے تمہیں اپنے کانچ میں پناہ دے رکھی تھی۔ اس

لے تم لوگوں کو اب تک تلاش نہیں کیا جاسکا لیکن اب نہ تو تم لوگ بچ سکو گے اور نہ یہ خدار۔“ اس نے گردن کھما کر ہوفا کی طرف دیکھا۔

ہوفا ابھی تک پٹنگ پر اسی طرح پڑی ہوئی تھی کہ اس کی ٹانگیں نیچے لگی ہوئی تھیں۔ اس سے دو مین فٹ کے فاصلے پر پڑا ہوا بچہ مسلسل رو رہا تھا۔

”ہوفا۔ تمہارا بچہ رو رہا ہے۔ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہوفا ایک ہاتھ سے اپنے پھنے ہوئے بلاؤز کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت پھاٹک نے بھی پہلی مرتبہ اس طرف دیکھا تھا۔ دروازے میں جا چکی اوز سونیا کو را اٹھنے لگانے کھڑے دیکھ کر اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ خوف کے اثرات ابھر آئے تھے۔

”ہاں تو مسز پھاٹک۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم ہوفا کو لوٹ کا مال سمجھ کر یہاں چلے آئے تھے۔ پچھلے پندرہ دنوں میں یہاں آکر تم نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب مجھے معلوم ہو چکا ہے تم شاید دنیا کی ہر عورت پر اپنا حق سمجھتے ہو اور میرا خیال ہے کہ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ کر بھی تمہارے شہوانی جذبات اس طرح بھڑک اٹھتے ہوں گے۔ برے سے برے آدمی میں بھی شرافت اور انسانیت کا تھوڑا بہت مادہ ضرور ہوتا ہے مگر لگتا ہے یہ دونوں چیزیں تو کبھی تمہارے قریب سے بھی نہیں گزریں۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں ان حرکتوں کی سزا دے دی جائے تاکہ آئندہ شریف عورتیں تمہارے شر سے محفوظ رہیں۔“

”تم خوش فہمی میں مبتلا ہو۔“ پھاٹک نے کہا ”تم لوگ بچ کر نہیں جاسکو گے۔ بہتر ہے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔“

”ضرور۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کا ریو الوور ایک طرف پھینک دیا۔

وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ میں واقعی سرنڈر ہو رہا ہوں اور وہ

فرش پر پڑا ہوا ریو الوور اٹھانے کے لیے آگے بڑھا بھی تھا لیکن اسی وقت میں کھڑے کھڑے ایک پیر پر محوم گیا۔ میری دوسری ٹانگ بچھڑیا اسی درجے کا زاویہ بناتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ میں کھڑے کھڑے جس قوت سے گھوما تھا اس سے کہیں زیادہ قوت سے اسپن لگ اس کی ٹھوڑی کے نیچے کلی اور وہ چیخا ہوا چیخ الٹ گیا۔

مرسکوں گی۔ اس کا منصب یہ تھا کہ مجھے ہیروئن سے ادھ موا کر کے کسی طرح تم تک پہنچا دیا جائے وہ صبح شام مجھے انجکشن دیتا تھا پھر اس نے ایک وقت انجکشن دیتا بند کر دیا اور جب پہلے انجکشن کا اثر زائل ہو جاتا تو میری عجیب حالت ہو جاتی۔ جسم ٹوٹنے لگتا میں اپنے بال نوچنے لگتی اور پھر میں دانتوں سے اپنے آپ کو بھینھونے لگتی۔ دارا قریب کھڑا میری بے بسی کا تماشا دیکھتا رہتا۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی۔ اس کے قدموں پر گر جاتی کہ وہ مجھے انجکشن لگا دے۔ وہ کھڑا قہقہے لگاتا رہتا اور جب میری حالت بہت زیادہ بگڑ جاتی تو مجھے انجکشن لگا دیا جاتا۔

”جب ہم یہاں آئے تو ڈاکٹر نے میرے زخم کا علاج شروع کر دیا۔“ اس نے دوسرے بازو پر گولی کے زخم کی طرف اشارہ کیا ”لیکن تین چار دن بعد دارا نے اسے علاج سے روک دیا۔ میرا زخم بہر حال کسی حد تک مندمل ہو چکا ہے لیکن ہیروئن کی افیتہ۔ بری طرح ترپایا ہے اس شیطان نے مجھے۔“

”وہ شیطان بھی اسی طرح تمہارے سامنے ترپے گا۔“ میں نے دانت بچھتے ہوئے کہا۔

گیارہ بجے کے قریب ہوفا واپس آگئی۔ اس کی گود میں دیکھتے ہوئے سونیا کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ چند ہی روز ابھی تو میں بچہ سونیا سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا۔ سونیا نے بچے کو لے لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

ہوفا نے بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر تقریباً تین انچ لمبی ایک شیشی اور ایک سرخ نکل کر جاگی کے حوالے کر دی۔

”یہ لیکویڈ ہیروئن ہے۔“ ہوفا نے مسکراتے ہوئے بتایا ”ڈاکٹر نے کمرے سے چڑا کر لائی ہوں۔“

”اور کیا خبریں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بڑی گرما گرم خبریں ہیں۔“ ہوفا نے جواب دیا ”تمہاری رات کی کارروائی سے دارا بری طرح بدحواس ہو رہا ہے وہ کمائڈر کو مجبور کر رہا ہے کہ انہیں آج شام سے پہلے پہلے جزل کھوراث کے بیڈ کو راز بھیج دیا جائے یا ٹیلی فون پر جزل کھوراث سے اس کی بات کرانی جائے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا اور جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہے۔“

”وہ کہیں بھی چلا جائے میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔“ میں نے دانت چکایاتے ہوئے کہا۔

”اور اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی ہے کہ چھانگ غدار

ہے اور اسی نے تم لوگوں کو کہیں پناہ دے رکھی ہے۔“ ہوفا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا۔؟“ اس کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔ ”کاشیج کے ایک کمرے سے انہیں چھانگ کا والٹ ملا ہے جس میں اس کا شناختی کارڈ بھی موجود ہے۔“ ہوفا نے بتایا ”یہ والٹ ملنے کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ گزشتہ رات اس کانچ پر کارروائی میں چھانگ بھی تمہارے ساتھ تھا۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار گرما سانس نکل گیا۔ کل جب میں نے چھانگ کا ڈریس پہنا تھا تو شرٹ کی جیب میں اس کا والٹ بھی موجود تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ والٹ نکال کر گھر پر ہی کہیں رکھ دیا جائے لیکن پھر میں نے اسے جیب میں ہی رہنے دیا تھا اور اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ جب میں تھائی کو کندھے پر لا دے گا تو لے لے جھکا تھا تو کوئی چیز شرٹ کی جیب سے نکل کر گری گئی تھی لیکن اتنا موقع نہیں تھا کہ میں اس پر توجہ دے سکے۔ کانچ کے باہر فائرنگ ہو رہی تھی اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تھائی کو اٹھا کر بھاگا تھا۔

اور اب اس والٹ کے حوالے سے ایک نئی کمائی سامنے آئی تھی اور میرے خیال میں یہ ہمارے حق میں بہتری تھا۔ وہ لوگ چھانگ کو تلاش کرتے رہیں گے اور ہونا اور ہوفا پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔

ہوفا کے کہنے کے مطابق چھانگ اور ہماری تلاش ہستی کے دوسری طرف ہی ہو رہی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کریڈٹ بھی ہوفا ہی کو جاتا تھا۔ اس نے مجھے اور جاگی کو تو وہاں سے اس طرف دوڑا دیا تھا اور خود فائرنگ کرتے ہوئے مخالف سمت میں بھاگی تھی۔ انہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ تعاقب کرنے والے تو اسی طرف بڑھتے چلے گئے تھے اور ہوفا ایک طویل چکر کاٹ کر اپنے کانچ کی طرف آگئی تھی۔

جاگی تھائی پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ اس نے کھانا پینا تو بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہیروئن کے بکثرت استعمال سے اس کی بھوک مرچ گئی۔ وہ پورا دن خیریت سے گزر گیا مگر شام ہوتے ہوتے وہ بے چینی سی ہونے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ جاگی نے اسے انجکشن دے دیا مگر مقدار بہت کم رکھی تھی۔

چھ بجے کے قریب ہونا واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے مطابق ٹرائی ایکٹل کے دوسری طرف دریا کی ٹاکانڈی کدی گئی تھی کہ ہمارے خزانے کی کوشش کو ناکام بنایا جاسکے۔ مزید یہ

کہ اگر آج شام کا اندھا میرا پھیلنے تک ہم لوگوں کا کوئی سراغ نہ ملا تو کل صبح ہماری تلاش کے لیے پہلی کوپڑا استعمال کیا جائے گا اور تو یہ بھی کہ کل صبح جزل کھوراث بھی اپنے سارے کام چھوڑ کر یہاں پہنچ جائے گا۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم لوگوں نے ان کے گھر میں گھس کر تھائی کو چھڑا لیا تھا اور پچی ٹانگ کی ساشی لڑی بھی میرے ہاتھوں ماری گئی تھی۔

ہونا جاگی کی بتائی ہوئی چیزوں میں سے ایک دو چیزیں کسی طرح بچا کر لے آیا تھا۔ ان میں ایک اہم ترین چیز وہ دو تھئی جو تھائی کے زخموں پر لگانا ضروری تھی۔ ورنہ اس کے زخم بگڑ جاتے اور دونوں ہاتھ بیکار ہو جاتے۔

باہر کے حالات بہت محفوش ہو گئے تھے ہمارے لیے کانچ کے باہر جھانکنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگلے دن صبح سویرے ہی ایک پہلی کوپڑا فضا میں پرواز کرنے لگا تھا۔ اس پہلی کوپڑا کو ایک مرتبہ تو میں نے بھی اوپر سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس میں ٹانگ کے علاوہ دو آدمی تھے جو کوپڑے میں دونوں طرف لائٹ مشین گنوں کے ساتھ مستعد بیٹھے ہوئے تھے۔

اس روز دوپہر کے وقت جزل کھوراث بھی پہنچ گیا تھا۔ وہ اگرچہ صرف ایک گھنٹا یہاں رکھا تھا مگر اس ایک گھنٹے میں اس نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا اس نے اس پونٹ کے کارکنوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کئی کارکنوں کو دوسرے علاقوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ اور ان کی جگہ دوسرے علاقوں سے کچھ نئے۔ کارکن یہاں طلب کر لیے گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ دارا جزل کھوراث کے ساتھ چلا گیا ہوگا لیکن کھوراث نے اسے مزید دو چار دن بیس رکنے کو کہا تھا۔ اس کی تفصیلات شام کو ہونا نے بتائی تھیں۔ اس کے کہنے کے مطابق جزل کھوراث کے پاس کچھ غیر ملکی سمان آئے ہوئے تھے اور وہ ان سے کچھ کاروباری معاملات میں مصروف تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ انہیں وہاں بلا لے گا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم دوبارہ ٹرائی کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مشکل ہے۔“ ہونا نے جواب دیا ”کل رات محض اتفاق تھا کہ دارا اور کم کمائڈر کے کانچ میں رک گئے تھے۔ آج انہیں کمائڈر کے ساتھ والے کانچ میں محفل کر دیا گیا ہے اور چار حافظہ قیادت کو بے گئے ہیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”کمائڈر کا خیال ہے کہ پتیار عورت کو ساتھ لے کر زیادہ دور نہیں گئے

ہوں گے۔ وہ لوگ قریب و جوار کی پہاڑیوں پر توجہ دے رہے ہیں۔ اس طرف کی پہاڑیوں میں لا تعداد غار ہیں اور کمائڈر سمجھتا ہے کہ چھانگ تم لوگوں کے ساتھ کسی غاری میں چھپا ہوا ہے۔“

”اچھا ہے۔ وہ لوگ اسی طرف مصروف رہیں۔“ میں نے کہا۔

دو دن اور گزر گئے اور ان دو دنوں کے دوران میں پہلی کوپڑوں کے وقت مسلسل فضا میں پرواز کرتا رہا تھا۔ میرے خیال میں انہوں نے چپا چپا چھان مارا تھا لیکن انہیں مایوسی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔

”یہاں ہیروئن تیار کرنے کی دو لیبارٹریاں بھی تو ہیں۔“ تیسرے روز میں نے ہونا سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم کسی لیبارٹری کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی سوچ رہے ہو تو یہ خیال ذہن سے نکال دو۔“ ہونا نے کہا ”جس روز چھانگ کے غائب ہونے کا پتا چلا تھا اسی روز دونوں لیبارٹریوں پر سخت پراگا دیا گیا تھا۔ اس طرف جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”ہم ان دو روپوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا ”ویسے بھی کچھ نئے کارڈ یہاں بلائے گئے ہیں۔ وہ سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح تو نہیں پہچانتے ہوں گے۔ اگر رات کے وقت یہ دو روپا پن کر کسی لیبارٹری میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے تو میرا خیال ہے کہ۔۔۔“

”تم موت کے منہ میں جانے کی بات کر رہے ہو۔“ ہونا نے میری بات کاٹ دی۔

”موت تو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔“ میں نے کہا ”ہم اگر ایک قدم اور آگے بڑھ جائیں گے تو میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ کسی ایک لیبارٹری پر محافظوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کی ڈیوٹیاں کب تبدیل ہوتی ہیں۔ یہ ساری تفصیلات معلوم ہو جائیں تو ہمیں کچھ آسانی ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ ہونا نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا ”میں کل یہ ساری معلومات حاصل کر لوں گا۔ میرا خیال ہے دو نمبر والی لیبارٹری مناسب رہے گی۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”کس طرف ہے اور کتنے فاصلے پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے تقریباً ایک میل شمال کی طرف تین چار



”ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے اور پھر دارا اور اس کے ساتھیوں کی گردن تاننا آسان ہوگا۔“  
 ”مگر تھائی۔“ جاگی بولی ”کیا اسے ساتھ لے کر ہم خطرناک اور کٹھن سفر کر سکیں گے؟“

”یہ اس وقت دیکھا جائے گا۔ بہر حال، پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم لیبارٹری والے پروگرام پر عمل کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

سونیا ہماری گفتگو کے دوران میں خاموش بی رہی تھی۔ اگلے روز بومبا کی رپورٹ خاصی امید افزا تھی۔ ہم سے قریب والی لیبارٹری میں چار محافظ دیں اور چار محافظ رات میں ڈیوٹی دیتے تھے۔ ڈیوٹیاں صبح اٹھ بجے اور رات آٹھ بجے تبدیل ہوتی تھیں۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے محافظ سوا سات بجے کے قریب کنٹرول روم سے نکلتے تھے۔ کنٹرول روم سے لیبارٹری کا فاصلہ ایک میل کے لگ بھگ تھا اور وہ آٹھ بجے تک وہاں پہنچ جاتے تھے۔

میں نے اس رات ایکشن لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ سونیا اور جاگی ڈریس تبدیل کر کے فوراً ہی تیار ہو گئیں۔ بومبا بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس کی مدد کے بغیر ہم اس منصوبے پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔

کانچ کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم درختوں میں تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ ہم وہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں جہاں سے کنٹرول روم سے آنے والے محافظوں کو گزرنا تھا۔

بومبا کی ٹانگ میں معمولی سی تکلیف تھی لیکن وہ ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس راستے پر پہنچ گئے اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے جاگی کو اشارہ کیا۔ وہ گھات سے نکل کر راستے کے بیچ میں آگئی اور کراہنے اور لوکڑا تے ہوئے چلنے لگی۔ صرف ایک منٹ بعد کنٹرول روم کی طرف سے آنے والے محافظ اس کے قریب پہنچ گئے۔

”اے خبردار۔ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ کون ہو تم؟“ ایک محافظ کی بارعب آواز سنائی دی۔ شاید ان چاروں نے جاگی کو رائفوں کی زور پر لے لیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی پٹیاں ہیں اور لیبارٹری ان کے دامن میں ہے۔ بومبا نے جواب دیا۔

اسی رات میں جاگی اور سونیا سے بھی اس منصوبے پر بات کرتا رہا۔ انہوں نے بھی میری مخالفت کی تھی۔

”ہم تو پہلے ہی موت کے اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔“ جاگی نے کہا ”اب تک ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے دارا کے خلاف کیا ہے۔ جہز کھوراث کے خلاف ہم نے براہ راست کچھ نہیں کیا۔ اس کے چند آدمی اگر مارے گئے ہیں تو دارا کی وجہ سے لیبارٹری میں کسی قسم کی کارروائی جہز کھوراث سے براہ راست دشمنی مول لینے کے مترادف ہوگی۔ اس لیے۔“

”دشمن۔“ میں نے جاگی کی بات کاٹ دی ”تاکہ ہونے کے بعد اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ جہز کھوراث تھائی لینڈ میں شہنشاہ کے خلاف براہ راست سازش میں ملوث رہا ہے۔ تھائی لینڈ میں دارا کو بھی اس کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ جس کی بنا پر دارا قتل و غارت کر رہا ہے اور اب جہز کھوراث ہی اسے یہاں پناہ دیے ہوئے ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ جہز کھوراث سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے اس کے کئی آدمی اب تک ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں لیکن اس کی نظروں میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان اور کتے کا مر جانا اس کے لیے ایک برابر ہے لیکن۔ وہ اپنا مالی نقصان برداشت نہیں کر سکے گا۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ جاگی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہم ایک یا دو لیبارٹریاں تباہ کر کے دنیا کو پوری طرح ہیروئن کی لعنت سے نجات نہیں دلا سکتے لیکن۔ جہز کھوراث یہ نقصان برداشت نہیں کر سکے گا۔ یہ نقصان چونکہ دارا کی حمایت کی وجہ سے ہو گا اور ہو سکتا ہے وہ اس حمایت سے دستبردار ہو کر دارا کو نرانی اینٹنگل سے نکال دے۔“

”یہ ہے کتنے کی بات۔“ جاگی نے کہا ”تمہارا مطلب ہے وہ دارا کو گولڈن ٹرائی اینٹنگل سے نکال دے گا تو ہم بھی۔“

”تم ٹھیک سمجھیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ دسمبر 2002ء میں شائع ہوگا

تشریفشان



# آتش فشاں

راوی: وجدان علی  
تحریر: اقبال کاظمی

ظلم و تم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے مار باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر حرکت اس کے لئے نئے ہنگاموں کی پیغامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحہ پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو خود کو اتنا توانا و طاقتور بناسکے کہ وہ اس کا بال بھی ہیکانہ کر سکیں۔ نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

## اس ٹھنڈے چراغ کا احوال جو چانک سی آمدنیوں کی زد پر آ گیا تھا

ان محافظوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ جاگی کو کہاں زخم لگا ہے اور وہ اس وقت یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ چانک کو گرفتار کر کے انہیں جیل کھورات کے سامنے سرخ رو ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ انعام کی بھی توقع تھی اور وہ لوگ یہ موقع کھوتا نہیں چاہتے تھے۔

جاگی انہیں ڈھلان پر لے آئی۔ میں سو نیا اور یوما کے ساتھ جھاڑیوں میں تیار بیٹھا تھا۔ ہم تینوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ہمارے پاس اگرچہ آٹومیک رائفیں بھی موجود تھیں لیکن اس وقت ہم نے خنجروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ چاروں محافظ جیسے ہی جھاڑیوں سے آگے نکلے، ہم

”ہم۔ میں گارڈ ہوں۔“ جاگی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے دہری ہو رہی تھی ”اس طرف ان جھاڑیوں کے پیچھے بھاگ زخمی حالت میں پڑا ہے۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے بھی زخمی کر دیا ہے۔ اسے اسے پکڑو۔ جیل کھورات سے انعام لینا چاہتے ہو تو پک۔ پکڑو اسے۔“ جاگی بہت شان دار اداکاری کر رہی تھی۔

”کہاں ہے وہ۔ اس کے ساتھ اور کون ہے؟“ ایک محافظ نے پوچھا۔  
”کیا ہے۔ میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔ وہ بھاگ نہیں سکتا۔ میرے ساتھ آؤ۔ جلدی۔“

تینوں نے بیک وقت چھلانگیں لگا دیں۔ تین محافظوں کو تو ہم تینوں نے چھاپ لیا تھا اور چوتھے کو جاگتی نے گرفت میں لے لیا۔

محافظوں کے لیے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں اور وہ ڈھلان پر ہمارے ساتھ لڑھکتے چلے گئے۔

ان پر قابو پانا آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ تین کے تو ہم نے گلے اڑھڑ دیے لیکن چونکہ زخمی ہو کر سونیا کی گردن سے بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر میں نے اسے چالایا۔ وہ دوڑتے ہوئے بری طرح چڑ رہا تھا لیکن اسے زمین پر گراتے ہی میں نے اسے بوشہ بوشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ میں نے اس کے لباس سے اپنا خنجر صاف کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا۔

”کیا رہا؟“ جاگتی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔  
”اگر کچھ کر نکل جاتا تو غضب ہو جاتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب جلدی کرو۔ اس کے پیچھے کی آواز سنانے میں دور دور تک لگی ہوگی۔“  
میں نے جاگتی کے ہاتھ سے اپنی رائفل لے لی اور تیز تیز قدموں سے لیبارٹری کی طرف جانے لگے۔

لیبارٹری تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ لیبارٹری کی عمارت ایک خوب صورت جھنگے کی طرح تھی۔ جس کے سامنے گیٹ پر تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا اور عمارت کے اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ ان چاروں محافظوں کو ہم نے دور ہی سے گیٹ کے سامنے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شاید ہمیں چند منٹ کی دیر ہو گئی تھی اور وہ محافظ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے درمیان فاصلہ تیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ ہونا نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی اور ایک طرف ڈھلان پر اتار چلا گیا۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان محافظوں میں تین لڑکیاں تھیں اور صرف ایک تھا۔ ہم جیسے ہی قریب پہنچے، مردوں نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”تم لوگ تین منٹ لیت ہو۔ تمہارا چوتھا ساتھی کہاں ہے؟“

”وہ۔“ سونیا نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا کر ہونے کہا۔ ”اس طرف رک گیا ہے۔“  
”تم لوگوں کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔“ اس شخص نے دوبارہ کہا۔ اسے شاید کسی قسم کا شبہ ہو رہا تھا۔

”حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔“ اس مرتبہ بھی سونیا ہی نے جواب دیا۔ ”بیشتر لوگوں کو اُدھر سے اُدھر کیا جا رہا ہے۔ میں آدمیوں کا گروپ آج دوپہر بیڑ کو اردر سے پہنچا تھا۔ ہم بھی اسی گروپ میں شامل تھے اگر تمہیں کسی قسم کا شبہ ہو رہا ہے تو پہلی فون پر کنٹرول روم سے ہمارے بارے میں تصدیق کر سکتے ہو۔“

”شے کی بات نہیں ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”بہر حال“ تم لوگ اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ ہم جارہے ہیں۔ ہم سب کو بڑے زور کی جھوک لگ رہی ہے۔“  
وہ چاروں اپنی اپنی رائفلیں کندھوں پر لٹکائے ہستی کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑے۔ میں انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ نجانے مجھے یا بارہ یہ خیال کیوں آ رہا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں مشکوک ہو چکا تھا۔ میاں سے ٹیلی فون پر اس نے تصدیق کرنے کی کوشش اس لیے نہیں کی تھی کہ ہم ہوشیار ہو جاتے لیکن مجھے یقین تھا کہ کنٹرول روم پہنچتے ہی وہ ہمارے بارے میں تصدیق کرے گا۔

ان کے جانے کے ٹھوڑی ہی دیر بعد ہونا بھی تاریکی سے نکل کر آگیا۔ وہ پیشاب کرنے کے بہانے اس لیے ہم ت الگ ہو گیا تھا کہ پہچان نہ لیا جائے۔

ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ہم سونیا کو گیٹ پر جھوڑ کر اندر آ گئے۔ چند منٹ ہم نے عمارت کا باہر سے جائزہ لینے میں گزار دیے۔ ہونا رہا تھا کہ زانیہ۔ جنگل میں واقع متعدد لیبارٹریوں میں ہفتے میں پانچ دن کام ہوتا ہے۔ ہر

لیبارٹری اپنے علاقے میں پیدا ہونے والی فصل سے اٹھو، مارفا اور ہیروئن تیار کرتی ہے۔ ہیروئن مارفین سے تیار کی جاتی ہے۔ چھپکے بیزن کی مارفین ابھی اتنی مقدار میں موجود تھی کہ پوست کی تازہ فصل تیار ہونے تک وہی مارفین ہیروئن کی تیاری کے لیے استعمال ہوتی رہے گی۔

ہم عمارت کے اندر آ گئے۔ مرکزی ہال میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مرکزی کی سفید دودھیا روشنی میں کئی جدید ترین مشینیں اور آلات نصب تھے۔ یہ وہ مشینیں تھیں جن سے مارفین سے ہیروئن اور دیگر منشیات تیار کی جا رہی تھیں۔

وہ چار آدمی تھے جو سفید لیب کوٹ پہنے ہوئے مختلف مشینوں کے پاس کھڑے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں نے ہونا کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ جاگتی کو دائیں طرف بھیج دیا اور خود بائیں طرف بڑھ گیا۔

دو ڈاکٹروں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ پہلے تو خیال نہیں کیا

پھر ان میں سے ایک چونک گیا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دوسرے ساتھی کے قریب پہنچ گیا اور اس کے کان میں سرگوشی کر کے آگے بڑھ گیا اور پھر ان میں سے ایک آدمی پیسے ہی دیوار میں لگے ہوئے سوچ بوڑی طرف بڑھا ہونے لگا۔ وہ آدمی کچھ کرچہ نچرا۔ اس کے ہاتھ میں گولی لگی تھی۔ وہ شخص الارام کا بن رہا تھا۔ میں دیتے ہی کنٹرول روم میں الارم بجنے لگے اور لاتعداد محافظ اس طرف دوڑ پڑے۔

”تم چاروں ایک طرف جمع ہو جاؤ۔ اس میز کے پاس۔ جلدی کرو۔“ ہونا نے چیختے ہوئے دیوار کے قریب پڑی ہوئی میز کی طرف اشارہ کیا۔  
وہ چاروں میز کے قریب جمع ہو گئے۔ انہوں نے خود بخود ہاتھ سر سے ہٹ کر لیے تھے۔

”ہتھیار پھینک دو ہونا۔ ورنہ میں اس لڑکی کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

یہ آواز سن کر میں نے تیزی سے مرکز اس طرف دیکھا۔ سفید لیب کوٹ والا ایک آدمی جاگتی کی کپٹنی سے ریوالتور لگائے کھڑا تھا۔ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں نے ہونا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی رائفل پھینک دی۔

”تم تو چھپے رہ ستم لگے ہونا۔“ وہ شخص ہونا کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا ”سب لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو چھانگنے نے پناہ دے رکھی ہے اور اس رات دارا والے کانچ پر حملے میں وہ بھی شریک تھا۔ کانچ کے ایک کمرے سے ملنے والا چھانک کا وائٹ تو کم از کم اس شے کی تصدیق کرتا تھا لیکن اب پتا چلا کہ ہم اس بے چارے کو بلا وجہ ہی مورد الزام ٹھہراتے رہے۔ اب یہ بات میں پورے وقت سے کہہ سکتا ہوں کہ چھانک کو تم لوگوں نے قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دی ہے اور سب لوگ یہی سمجھتے رہے کہ وہ غداری کر کے مداخلت کاروں سے مل گیا ہے اور اس نے ان لوگوں کو پناہ دے رکھی ہے لیکن غدار وہ نہیں تم ہو۔ تم نے انہیں اپنے کانچ میں پناہ دے رکھی ہے اور اس لیے ان لوگوں کو اب تک تلاش نہیں کیا جا سکا۔ میں بتاتا ہوں یہ سب کچھ کسی طرح ہوا ہو گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میری سمجھ میں بات کچھ اس طرح آتی ہے کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح تمہاری بیوی سے بھی دل بہلانا چاہتا تھا۔ نہ سکتا ہے کہ وہ اسی نیت سے تمہارے کانچ کی طرف گیا ہو اور وہاں ان لوگوں سے سامنا ہو گیا ہو۔ اس کی زندگی

ان لوگوں کے لیے بلکہ تم لوگوں کے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی اسی لیے انہوں نے چھانک کو قتل کر کے لاش غائب کر دی اور مجھے یقین ہے کہ وہ لاش تمہارے کانچ کے آس پاس ہی کسی جگہ دفن کی گئی ہوگی۔ اسے تلاش کر لیا جائے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکتی کہ تم نے جنرل کھوراث سے غداری کیوں کی۔ انہوں نے تمہیں ایسا کیا لایا تھا کہ تم یہ انتہائی خطرناک قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے؟“

”میں نے جنرل کھوراث سے غداری نہیں کی ڈاکٹر کروک۔“ ہونا نے جواب دیا ”جنرل کھوراث سے انہیں بھی کوئی دشمنی نہیں۔ یہ تو دارا اور اس کے ساتھیوں کے تعاقب میں میاں آئے تھے۔ دارا ان کے ماں باپ کا قاتل ہے۔ اس نے درجنوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ دنیا کا سفاک ترین آدمی ہے۔ آدمی نہیں خونی بھیڑیا ہے۔ اس کی سفاکی کا مظاہرہ تم دیکھ چکے ہو۔ وہ ان کی ایک دوست تھائی کو لٹا لایا تھا جو زخمی تھی۔ تم نے اس کا علاج شروع کیا تو دو تین دن بعد دارا نے تمہیں علاج سے روک دیا۔ اس نے تھائی کو ہیروئن کا عادی بنا دیا اور پھر وہ اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے اسے تزیینا رہا۔

**پاسپورٹ آف اسلام آباد میں سے تمام تصاویر**

قسطیں بیک وقت آتی ہیں ایک پاکستانی جس بانی: ڈاکٹر فاضل جعفر

**علی علی خان کی سرگزشت**

**سب ادا**

قیمت فی حصہ 60 روپے ✽ ڈاکٹریٹ فی حصہ 23 روپے

کیا دیکھ کر اساتذہ محلوں نے سماجی قیامت 600 روپے بیک وقت چاہئے

**کتابیات پبلشنگ**

0343-2222222 0343-2222222

0343-2222222 0343-2222222

ہے؟ وہ ایک بے بس اور کمزور عورت پر ظلم کر کے خوش ہو رہا ہے لیکن وجدان کا نام سنتے ہی خوف سے ہر تھڑکا بننے لگتا ہے۔ وہ اس کے نام ہی سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ محافظوں کی موجودگی کے باوجود اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ کیا ایسے شخص کو زندہ رہنے کا حق ہے؟ میں نے صرف دارا اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ان کا ساتھ دیا۔ میں نے جنرل کھوراث سے غداری نہیں کی۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ لوگ دارا سے اپنا انتقام لے کر واپس چلے جائیں گے تو میں پہلے کی طرح یہاں جنرل کھوراث کے لئے خدمات انجام دیتا رہوں گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ہاں۔ بھانگ کے قتل کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ تم خود ہی اعتراف کر چکے ہو کہ وہ میری بیوی سے دل بہلانا چاہتا تھا اور اس روز وہ اسی نیت سے میری عدم موجودگی میں میرے کالج میں گیا تھا لیکن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے اس کی لاش میرے کالج کے پچھلی طرف درختوں کے نیچے دفن ہے اور جس رات دارا کے کالج پر حملہ کیا گیا تھا، وجدان نے بھانگ کا ڈریس پہن رکھا تھا اور اس کی جگہ سے بھانگ کا دانت وہاں گر گیا تھا اور اس سے سمجھ لیا گیا کہ بھانگ غدار ہے اور ان لوگوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری طرف کسی کا شبہ نہیں گیا۔"

"لیکن اب ہر بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔" ڈاکٹر کروک نے کہا "اگر تم نے جنرل کھوراث سے غداری نہیں کی تو ان لوگوں کو ساتھ لے کر یہاں آنے کا مقصد؟ اوزنیں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں ڈیوٹی پر آنے والے محافظوں کو بھی تم لوگوں نے قتل کر دیا ہے۔"

"میں تمہارے اس یقین کو نہیں جھٹلاؤں گا۔" بومانے کہا "یہاں آنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ لیبارٹری تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں اگرچہ برائے میں تریاؤں میں رہتے ہوئے جنرل کھوراث کے ایجنٹ کی حیثیت سے ہیروئن فروخت کرتا رہا ہوں لیکن ان کی دوست تھائی کو دیکھنے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہیروئن کے اثرات کتنے تباہ کن ہوتے ہیں۔ صرف ایک یا دو لیبارٹریوں کو تباہ کر کے ہم پوری دنیا میں ہیروئن کی پلائی کو نہیں روک سکتے لیکن۔ اس میں اپنا تھوڑا بہت کوارتو ادا کر سکتے ہیں۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے؟" ڈاکٹر کروک نے اسے گھورا "تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہاری ایک عدد حسین اور جوان بیوی ہے۔ ایک بیک یا داسا

بچہ ہے۔ تم نے ان کے بارے میں نہیں سوچا۔ یہ تو موت کی وادی ہے تم لوگ یہاں سے زندہ کیسے نکل سکو گے اور ایک بات اور بتا دو۔ اس روز تمہاری بیوی بچے کے تیار ہونے کا بہانہ کر کے میرے دفتر میں آئی تھی تو کیو بیڈ ہیروئن کی شیشی اور ایک سرخ چڑا کر لے گئی تھی۔ میں نے اس وقت توجہ نہیں دی تھی لیکن اب بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ ہیروئن اس عورت کے لئے چڑائی گئی تھی جسے تم لوگ دارا کے کالج سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اگر پہلے یہ بات میرے ذہن میں آتی ہوتی تو معاملہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔"

اس کی باتوں سے اب مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکٹر کروک نامی یہ شخص ہی ہستی والے کلینک میں بیٹھتا تھا۔ ہم جب ہال میں داخل ہوئے تھے تو صرف ان چار ڈاکٹروں کو دیکھ سکے تھے جو ہمارے سامنے تھے۔ ڈاکٹر کروک اس وقت غالباً کسی مشین کے پیچھے تھا جو ہمیں نظر نہیں آ سکا تھا اور اس نے موقع ملنے ہی جاگ کر ریوالتور کی زد پر لے لیا تھا اور اس کی کھوپڑی اڑا دینے کی دھمکی دے کر ہمیں بھی نہٹا کر دیا تھا۔

"ڈاکٹر سائمن!" کروک ان چاروں میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "الارم کا بٹن دیا اور ان کی رائٹیں اٹھاؤ۔"

ایک آدمی نے سوچ بوز پر سرخ رنگ کا ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی سوچ بوز پر لگا ہوا سرخ رنگ کا ایک بلب روشن ہو گیا۔

"کنٹرول روم میں بیٹھے والے الارم سے ان لوگوں کو اطلاع مل گئی ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔" ڈاکٹر کروک نے کہا "درختوں محافظ چند منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے اور تم لوگوں کی کمائی ختم ہو جائے گی۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ایک سینڈ کے ہزاروں حصے میں، میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ سونیا باہر گیٹ پر تھی۔ اسے اندر کی صورت حال کا علم نہیں تھا۔ اسے تو پتا اس وقت چلے گا جب درختوں محافظ سر پہنچ چکے ہوں گے اور وہ کچھ نہیں کر سکیں گی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سونیا دروازے کے قریب ایک مشین کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس کا نشانہ اشتا نشانہ دار تھا کہ مولیٰ ڈاکٹر کروک کی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

میں نے اور بومانے بیک وقت رائتوں کی طرف چلا جگ لگا دی۔ رائتیں قبضے میں آتے ہی ہم نے ان چاروں پر فائر کھول دیا۔ وہ پیچھے ہٹے ہوئے فرش پر گرے۔ ان کے سفید لباس سرخ ہونے لگے۔ جاگنے نے بھی رائت اٹھائی تھی۔ ڈاکٹر کروک کی گردن میں گولی لگی تھی۔ اس کے زندہ بچنے کا اگرچہ کوئی امکان نہیں تھا لیکن جاگنے نے کئی گولیاں اس کے سینے میں آ کر دیں۔

ہم نے بھی اطمینان کر لیا کہ ان چاروں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا تھا اور پھر ہم چاروں نے اپنی رائتوں کے رخ ان جدید ترین مشینوں کی طرف موڑ دیے جن سے ہیروئن تیار کی جاتی تھی۔

تمام مشینیں ناکارہ کر کے میں نے دیوار پر الیکٹرک پینل پر ایک برسٹ مار دیا۔ الیکٹرک پینل سے پھٹنے نکلے شعاعیں اور چنگاریاں پھوٹیں اور پھر پھٹے اٹھنے لگے۔ یہ بجلی کی آگ تھی جو چند منٹ کے اندر اندر ساری عمارت کو اپنی پیٹ میں لینے والی تھی۔ میں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ بومانے نے بھی میرے پیچھے دوڑ لگا دی۔

ہستی کی طرف بہت دور سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ غالباً کئی محافظ تھے جو فائرنگ کرتے ہوئے اسی طرف دوڑے آ رہے تھے۔

"اس طرف۔ جلدی کرو۔" بومانے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بیچا۔ ہم لیبارٹری کی عمارت کے پیچھے مڑ کر مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔

لیبارٹری کے عقب میں واقع باہری ڈھائی تین سو فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ہمارے کالج کی طرف جانے والا راستہ اگرچہ دائیں طرف تھا لیکن ہم اس پہاڑی پر چڑھتے چلے گئے۔ بومانے سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جاگتی اور سب سے آخر میں، میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

وہ پہاڑی کسی نیلے کی طرح تھی۔ ہمارا لیکن قد آدم جمناڑوں اور درختوں کی بہتات تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ سونیا بری طرح ہانپ رہی تھی۔

لیبارٹری میں ایک دو جگہوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ جو اس امر کا اشارہ دے رہے تھے کہ چند ہی منٹ میں پوری

عمارت شعلوں کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔ میں ہستی سے آنے والے راستے کی طرف دیکھنے لگا۔ فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور لیبارٹری سے دو ڈھائی سو گز دور رہ کر شعلے سے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محافظ اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے دوڑے آ رہے تھے۔

بومانے اپنی رائت کا رخ آسمان کی طرف کر کے ڈیگر دیا دیا۔ لاقعدا گولیاں روشنی کی لکیریں بناتی ہوئی اوپر کی طرف چلی گئیں اور پھر اسی وقت لیبارٹری میں زوردار دھماکا ہوا۔

"شاید کیمیکل کا کوئی ڈرم پھٹا ہے۔" بومانے نیچے دیکھتے ہوئے کہا "لیبارٹری میں ایسے کیمیکل کے لاقعدا ڈرم موجود ہیں جو ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہاں لاقعدا دھماکا ہوں گے۔ چند منٹ بعد ہی عمارت بھی ٹکڑوں کی طرح اڑ جائے گی۔ بہتر ہے اب ہم۔"

اس کا ہلکا سا ہلکا ہونے سے پہلے ہی کے بعد دیگرے تین اور دھماکے ہوئے اور لیبارٹری کی عمارت میں آگ پھیلنے چلی گئی۔

ہم دوسری طرف ڈھلان پر اترنے لگے۔ میں نے اس وقت بھی سونیا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر بھی ہم دوڑتے رہے۔ اب مسلسل دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور دھماکوں کے بیچ میں وہ آواز بھی سنائی دینے لگی جس کے ہم خطرہ تھے۔

وہ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر چھ سات انسانی ہیولے نظر آ رہے تھے۔ پہاڑی کے دوسری طرف چلتی ہوئی لیبارٹری سے اٹھنے والے شعلوں کی روشنی کے پس منظر میں وہ ہیولے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہم انہیں نظر تو نہیں آ رہے تھے لیکن وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

ہم ایک برساتی نالے کے کنارے پر پہنچ گئے۔ یہ نالا پانچ فٹ گہرا اور دس پاؤں فٹ چوڑا تھا لیکن پانی اس کے بیچ میں دو ڈھائی فٹ چوڑی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ ہم اس نالے میں اتر گئے اور بومانے کی رہنمائی میں تیزی سے ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

اس نالے کھاتے ہوئے برساتی نالے میں تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر کے ہم باہر آ گئے۔ بومانے ایک اونچی جگہ پر پہنچ کر اُدھر اُدھر دیکھا اور ہم نے ایک بار پھر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ لیبارٹری کی طرف سے اب بھی دھماکے سنائی دے

رہے تھے اور پہاڑوں کے عقب میں روشنی صاف نظر آرہی تھی۔

جاگتی اور سونیا کی بری حالت ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑے اسے کھینچتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ بونا نے جاگتی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور وہ بھی اسے کھینچ رہا تھا۔

وہ دونوں لڑکھڑا رہی تھیں۔ ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ سونیا اور جاگتی زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کے سانس بری طرح پھولے ہوئے تھے اور منہ سے نف بھر رہا تھا۔ ہم اس وقت تک لیبارٹری سے تقریباً ڈھائی میل دور نکل آئے تھے اور اس کے مخالف سمت بہت دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ ہمیں دوسری طرف تلاش کر رہے تھے۔

”ہم لوگ ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔“ بونا نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی ہی دیر میں گارڈز وحشت الارض کی طرح چاروں طرف پھیل جائیں گے اور اس سے پہلے پہلے ہمیں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہیے۔“ سونیا اور جاگتی چھی کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھیں۔ ہم ایک بار پھر دوڑنے لگے اور بالآخر ایک طویل پیکر کاٹ کر ہم اپنے کالج کی طرف جانے والے راستے پر مزگئے۔ اس وقت فضا میں پہلی کوہر کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

ہم بالکل مخالف سمت سے کالج کی طرف آئے تھے اور جب کالج سے کچھ دور دورہ گئے تو میں نے گردن بٹھا کر لیبارٹری کی طرف دیکھا۔ اس طرف اب بھی روشنی نظر آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ لیبارٹری میں اب بھی آگ بجھ کر رہی تھی۔

کالج سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر میں ٹھک گیا اور پھر بونا وغیرہ نے بھی اس سائے کو دیکھ لیا جو کالج کے سامنے والے دروازے سے نکل کر لڑکھڑاتا ہوا ہستی کی طرف جا رہا تھا۔ کالج سے بچنے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”اے۔۔۔ یہ تو تھائی ہے۔“ جاگتی کی آوازیں کر رہی تھیں۔ اچھل پڑا۔ اس طرف روشنی تھی۔ اگر تھائی کسی کی نظروں میں آگئی تو قیامت ہی بجائے گی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے تھائی کی طرف دوڑ لگا دی۔

تھائی تقریباً تیس گز دور نکل چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دوڑنے لگی۔ میں نے لپک کر تھائی کو گرفت میں لینا چاہا تو وہ۔۔۔ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ میں بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔

اور تھائی کے اوپر گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو سنبھال کر تھائی کو کندھے پر لادنا اور کالج کی طرف دوڑنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے تھائی کو دوری پر لٹا دیا اور پورا سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔ ہونا بھی دوسرے کمرے سے آگئی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا جو بری طرح رو رہا تھا۔

”تم نے خیال نہیں کیا۔ یہ باہر نکل گئی تھی۔“ بونا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو یہ آگے چل جاتی اور ہم سب پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔“ ہونا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی تھی۔

”مجھے بتا نہیں چلا۔“ وہ بولی ”بچہ دور رہا تھا۔ میں اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے۔۔۔“

”خیریت گزری کہ ہم بروقت یہاں پہنچ گئے اور اسے دیکھ لیا تھا۔“ میں نے ہونا کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

تھائی کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ شام کو جاگتی نے اسے بہت کم مقدار میں ہیروئن دی تھی۔ اسے اس بری طرح سے ہیروئن کا عادی بنایا گیا تھا کہ دی جانے والی وہ معمولی سی مقدار اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوئی تھی۔ میں نے جاگتی کو اشارہ کیا۔ اس نے ہیروئن کی معمولی سی مقدار انہماکش کے ذریعہ تھائی کے جسم میں داخل کر دی خون میں یہ زہر شامل ہوتے ہی تھائی پُرسکون ہوئی چلی گئی۔

اس وقت صبح رہے تھے جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو شام کے سات بجنے والے تھے۔ گویا تین گھنٹے گزر چکے تھے اور ان تین گھنٹوں میں ہم نے وہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا جس کا نام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جہز کھوراث کی ہیروئن تیار کرنے والی ایک فیکٹری تیار کر دی گئی تھی۔ اس سے ہیروئن کی سلائی میں زیادہ فرق نہیں پڑے گا لیکن جہز کھوراث کا کمزور ڈالر کا نقصان ہو چکا تھا۔ جدید ترین مشینری بل کر رکھ ہو چکی تھی۔

یہ لیبارٹری تیار کر کے ہم نے جہز کھوراث سے براہ راست ٹکر لے لی تھی۔ جس سے ہمارے لیے خطرات بڑھ گئے تھے۔

”میں نے ڈاکٹر کروک کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ تمہارے کنٹرول سینٹر میں مریضوں کو دیکھتے ہیں لیکن لیبارٹری میں کیسے پہنچ گیا؟“ میں نے بونا کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔

”وہ بھی ہیروئن تیار کرنے کا ماہر ہے۔“ بونا نے جواب دیا۔ ”کبھی کبھی لیبارٹری میں بھی چلا جاتا ہے۔ اس نے جب جاگتی کو کون پوائنٹ پر لے کر ہمارے ہتھیار پھینکوا دیے تھے تو میں سمجھ گیا تھا کہ ہماری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ میں بالکل ناامید ہو گیا تھا لیکن سونیا نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن اس نے بہت بڑا رسک لیا تھا اگر نشانہ خطا ہو جاتا اور۔۔۔“

”تو کیا ہوتا۔“ جاگتی نے اس کی بات کاٹ دی ”اس کی چلائی ہوئی گولی ڈاکٹر کروک کے بجائے میری کھوپڑی اڑا دیتی۔“

”میں نے کالج میں شوٹنگ کے مقابلوں میں پیشہ پھلا انعام حاصل کیا تھا۔“ سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا ”پانچ سال تک میرا ریکارڈ کوئی نہیں توڑ سکا۔ میں نے ڈاکٹر کروک کا نشانہ لیا تو مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا۔“

”لیکن تمہیں گولنگ پڑوٹی سونپ گئی تھی۔ اندر کیسے آگئیں؟“ میں نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ طے ہوا تھا کہ تم لوگ کوئی چلائے بغیر لیبارٹری کے اندر موجود لوگوں پر قابو پانے کی کوشش کرو گے لیکن جب گولی چلی تو میرا چونک جانا فطری بات تھی۔ میں خاموشی سے اندر داخل ہو گئی اور پھر جو صورت حال نظر آئی، وہ خاصی تشویش ناک تھی۔ میں ایک مشین کے پیچھے چھپ گئی اور ڈاکٹر کروک کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اگرچہ نشانے سے چند انچ نیچے لگی لیکن بہر حال مقصد پورا ہو گیا۔“ سونیا نے کہا۔

ہونا کی گود میں بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ سونیا نے اٹھ کر بچے کو لے لیا اور حیرت کی بات یہ ہوئی کہ بچہ اس کی گود میں آئے ہی چپ ہو گیا تھا۔ ہونا اسے گھورتے ہوئے بچن میں چلی گئی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دھماکے کی آوازیں سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ وہ دھماکا دراصل دروازے کی آواز تھی جو دُور دُور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ہر چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ دروازے پر جیسے ہتھوڑے برسائے جا رہے تھے۔

”تم لوگ اسی کمرے میں رہو۔ دروازہ بند کرلو۔ کوئی۔۔۔ گونز ہوئی تو میں گھٹل دے دوں گا۔“ بونا کہتے ہوئے ایک جھٹکے

سے اٹھ گیا۔

ہونا بھی بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور جج کا دروازہ بند کر دیا۔ میں نے جاگتی کی مدد سے تھائی کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ لٹا دیا اور ہم دونوں انہماکش سے دروازے کے دامن بائیں دیوار سے چپک گئے۔ میں نے کمرے کی جتنی بھی بھجادی تھی۔

بونا اپنے کمرے کا دوسرا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ میں سانس روکے کھڑا باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر انہوں نے ہمارا پتا لگالیا ہے تو یقیناً اس کالج کو بھی گھیرے میں لے لیا ہوگا۔ کسی گز بڑی صورت میں میں نے براہ راست انہماکش لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ہم اپنے آپ کو آسانی سے ان کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔

”کیا بات ہے شوٹنگ قیامت آگئی ہے جو اس طرح دروازہ دھڑ دھڑا رہا ہے؟“ باہر سے بونا کی آواز سنائی دی۔

”قیامت ہی آگئی ہے۔ تمہیں فوری طور پر کنٹرول روم میں طلب کیا گیا ہے۔“ دوسری آواز سنائی دی۔

”قیامت!“ بونا بولا ”یہ دھماکے کیسے تھے؟ کیا ہوا؟“

”دو خبریں! لیبارٹری تیار کر دی گئی ہے۔ جہز کھوراث بھی ہینڈ کوارٹر سے یہاں پہنچ گیا ہے۔ تمام گارڈز کو کنٹرول روم میں طلب کیا گیا ہے۔ تم فوراً وہاں پہنچ جاؤ۔ میں شوما کی طرف جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم چلو۔ میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔“ بونا نے جواب دیا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ہم پڑنے والی قیامت ایک بار پھر مل گئی تھی۔

جس طرح دروازہ دھڑ دھڑایا گیا تھا، اس سے نہ صرف ہمارے سینے پھوٹ گئے تھے بلکہ ہونا کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں لیکن باہر ہونے والی گفتگو سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کمرے کی جتنی جلا کر کچ کا دروازہ کھول دیا۔ ہونا بھی رائفل سنبھالے اپنے کمرے کے دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی باہر سے ہونا اور شوٹنگ کی گفتگو سن لی تھی اور اس کے چہرے کی رنگت بھی لوٹ آئی تھی۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور کمرے کے ایک کونے میں دری پر سوتے ہوئے بچے کو آرام سے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ بات ہم سب ہی جانتے تھے کہ اگر کوئی گزبڑ۔۔۔ ہوتی تو ہم سب کو ہی مارے جانا تھا لیکن جس طرح ہم نے



تھائی کو دروازے کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف لٹایا تھا اسی طرح ہونا بھی اپنے بچ کو دروازے کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف لٹا دیا تھا تاکہ گڑبڑ کی صورت میں فوری طور پر کسی گولی کا نشانہ نہ بن جائے اور اسے زندگی کے چند لمحے اور مل جائیں۔

ہوما دروازہ بند کر کے اندر آگیا اور شوٹنگ سے ہونے والی مشکلوں سے آگاہ کرنے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا حالانکہ یہ ساری باتیں ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔

”ژانی! ایسٹلہ پرواقعی قیامت آگئی ہے۔“ ہوما کہہ رہا تھا ”ماضی میں بڑا لاؤس اور تھائی لینڈ کی طرف سے بھی حملے ہوتے رہے ہیں لیکن اتنا نقصان بھی نہیں ہوا۔ لیبارٹری کی تباہی کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ جرنل کھورٹ بھی اطلاع ملتے ہی یہاں پہنچ گیا ہے۔“

مجھے یاد آگیا کہ جب ہم کانج کی طرف آرہے تھے تو ہم نے فضا میں ہیلی کوپٹر کی آواز سنی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ شاید کوپٹر کے ذریعے بھی ہماری تلاش شروع کر دی گئی ہے لیکن کوپٹر کی وہ آواز تھوڑی دیر بعد ہی غائب ہو گئی اور اب یہ انکشاف میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ اس کوپٹر پر جرنل کھورٹ یہاں آیا تھا۔

ہوما چند رہ منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر کنٹرول روم کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ہمارے ساتھ زندگی کے ایک نہایت سنسنی خیز تجربے سے گزرا تھا۔ تین گھنٹوں کی مسلسل بھاگ دوڑ سے نہ صرف بری طرح تھکا ہوا تھا بلکہ ذہنی تناؤ کا شکار بھی ہو گا اور ممکن ہے کنٹرول روم کے بلاؤے سے اعصابی کشیدگی میں اضافہ بھی ہو گیا ہو لیکن وہاں جانا ضروری تھا۔ اگر کوئی ہمانہ بنا کر انکار کر دیتا تو اس پر کسی قسم کا شبہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ خیریت مگر رہے۔

ہوما کی دایبھی دو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ وہ بڑی سنسنی خیز خبریں لے کر آیا تھا۔ جرنل کھورٹ باگل ہو رہا تھا۔ ژانی ا۔ مشکل کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اس طرح کوئی لیبارٹری تباہ کی گئی تھی۔ جرنل کھورٹ نے نہ صرف یہاں کے کمائڈر کو گولی سے اڑا دیا تھا بلکہ لیبارٹری سے ڈیوٹی ختم کر کے واپس جانے والے چاروں محافظوں کو، جن میں ایک مرد اور تین لڑکیاں شامل تھیں، فائرنگ اسکوڈ کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ ڈیوٹی پر آنے والے نئے محافظوں پر شبہ ہونے کے باوجود انہوں نے واپس آکر کنٹرول

روم کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ لیبارٹری میں دھماکے شروع ہونے کے بعد ان محافظوں کی پادنی کے انچارج نے کمائڈر کو ہمارے بارے میں اپنے سب سے آگاہ کیا تھا اور ہمارے ملنے بھی بتائے تھے۔ بعد میں دارا نے ان طبلوں سے مجھے اور جاگی کو شناخت کیا تھا۔ ہمارا چوتھا ساتھی جو واپس جانے والے محافظوں کی نظروں میں نہیں آیا تھا، اس کے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ بھاگتا تھا جو پچان لیے جانے کے ڈر سے سامنے نہیں آیا تھا۔ جرنل کھورٹ کو اس صورت حال کا علم ہوا تو اس نے کمائڈر اور ان چاروں محافظوں کو ختم کر دیا تھا۔

سب سے دلچسپ خبر یہ تھی کہ جرنل کھورٹ اور دارا میں ایک زوردار جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جرنل کھورٹ نے اس تباہی کا ذمہ دار دارا کو قرار دیا تھا جبکہ دارا اس کے آدمیوں کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا جو تھائی کو چپانگ سامنے سے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے اور میں تھائی کو چھڑانے کے لیے ان کے تعاقب میں یہاں پہنچ گیا تھا۔

ہوما نے اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ جرنل کھورٹ نے دارا کی پائیں کیسے برداشت کر لی تھیں اور اسے گولی سے اڑا کیوں نہیں دیا تھا۔

”تم دارا کو نہیں جانتے۔“ میں نے ہوما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ دنیا کا عیار ترین آدمی ہے۔ جرنل کھورٹ کے چند بہت ہی خاص آدمی تھائی لینڈ میں اس کے ساتھ رہے ہیں۔ اس نے یقیناً کوئی ایسی راہ تلاش کر لی ہے کہ جرنل کھورٹ جیسا شخص بھی اس کی توہین نہ کر سکے۔ بہر حال یہ بتاؤ سب لوگوں کو کنٹرول روم میں کیوں طلب کیا گیا تھا؟“

”تم لوگوں کی تلاش کے لیے کچھ نئے پروگرام بنائے گئے ہیں۔“ ہوما نے جواب دیا ”دوسرے علاقوں سے بھی سو سے زیادہ آدمیوں کو طلب کر لیا گیا ہے جن میں کچھ تو پہنچ گئے ہیں اور کچھ صبح ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ کچھ پارٹیوں نے تلاش شروع کر دی ہے اور کچھ پارٹیاں صبح روانہ ہو گی۔ گھیرے کی صورت میں میں پچیس میل تک کے علاقے کو چھان مارا جائے گا۔ ویسے جرنل کا خیال ہے کہ لیبارٹری کی تباہی کے بعد تم لوگ یہاں نہیں رکو گے بلکہ فرار کا راستہ تلاش کر دو گے۔ اس لیے دونوں طرف کے دیواروں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ کسی بھی مشتبہ شخص کو، خواہ وہ گاڑی کی روٹی میں ہو، دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔“

”اور تم؟“ میں نے سوالیہ لہجہ میں اس کی طرف

دیکھا ”کیا تمہیں بھی کسی پارٹی میں شامل کیا گیا ہے؟“ ”نہیں۔“ ہوما نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”مجھے اس بات کا کچھ اندازہ تھا اس لیے میں نے کنٹرول روم پہنچنے سے پہلے ہی انکڑا شروع کر دیا تھا۔ جس شخص کو نیا کمائڈر بنایا گیا ہے وہ۔ میری ٹانگ کی تکلیف سے واقف ہے اس لیے میری ڈیوٹی کنٹرول روم میں ہی رکھی گئی ہے۔“

”مگڑ!“ میں بھی مسکرا دیا ”دارا کے بارے میں کوئی اور بات؟“

”نی الحال کچھ نہیں۔“ ہوما نے جواب دیا ”میرا خیال ہے جرنل کھورٹ ایک دو دن میںیں رہے گا۔ اس کے بعد ہی دارا کے بارے میں بھی کچھ پتا چل سکے گا کہ اس کا کیا پروگرام بننا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس دوران میں ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے۔ تم لوگ تو کانج سے باہر جھانک بھی نہیں سکو گے۔“ ہوما نے جواب دیا۔

اس کے بعد بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ہوما اور ہونا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ سوٹا اور جاگی درہی پر لیٹی سوئے کی تیاری کر رہی تھیں اور میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ غنیمت تھا کہ ان میں سے کسی کے ذہن میں ابھی تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ہم کسی کانج میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اب تک یہی سمجھا جا رہا تھا کہ بھاگنا ہمیں کسی خفیہ جگہ پر پناہ دے دے ہوئے ہے لیکن میرا خیال تھا کہ ایک دو دن مزید تلاش کے بعد بھی انہیں ہمارا سراغ نہیں ملے گا تو شاید کسی کے ذہن میں یہ بات بھی آجائے اور علاقے میں واقع کامیونٹی چینگنگ بھی شروع ہو جائے ایسی صورت میں ہمارے پاس کوئی متبادل جگہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ ہم بھاگ کھڑے ہوتے اور گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔

کسی بھنگی صورت حال میں ہم بھاگ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش بھی کر سکتے تھے لیکن سب سے بڑا مسئلہ تھائی کا تھا۔ ظاہر ہے ہم اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ تھائی اس قاتل نہیں تھی کہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی چند قدم چل سکتی۔ پچھلے تین چار دن سے اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی اور یہاں ایسی کوئی سولت موجود نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ہیروئن کی مقدار کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جس سے ابھی معمولی سافروں کو بھی نہیں پڑا تھا۔

جرنل کھورٹ تین دن یہاں رکا رہا تھا وہ یہ تین دن ہم نے بڑی اذیت میں گزارے تھے۔ ہوما سے ہر روز شام کو ہمیں رپورٹ مل جاتی تھی۔ دن کے وقت ہونا بھی بچے کو ساتھ لے کر اس طرف کا چکر لگا آتی تھی۔ کچھ معلومات اس سے بھی حاصل ہو جاتی تھیں۔

جرنل کھورٹ واپس چلا گیا۔ ہماری تلاش کا معاملہ بھی کچھ سرد پڑ گیا تھا۔ دوسرے علاقوں سے منکوائے ہوئے بیشتر گارڈز واپس بھیج دیے گئے تھے لیکن ان کی ابھی خاصی تعداد اب بھی یہاں موجود تھی۔ اس عرصے میں ہماری طرف سے چونکہ کوئی سرگرمی سامنے نہیں آئی تھی اس لیے فرض کر لیا گیا تھا کہ ہم لوگ کسی نہ کسی طرح ژانی انکیش سے فرار ہو چکے ہیں۔ دو دن پہلے تو اسی رات کے بعد دریا نے میکانگ میں ایک کشتی بھی دھیمی گئی تھی جس پر فائرنگ کی گئی اور وہ کشتی تیزی سے لاؤس کے ساحل کی طرف بھاگ گئی تھی اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ہم اس کشتی پر فرار ہو گئے ہیں۔

جرنل کھورٹ واپس چلا گیا تھا اور دارا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں یہ پروگرام بننا تھا کہ دو دن بعد وہ بھی جرنل کھورٹ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

یہ اطلاع میرے لیے خاصی اہم تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر دارا جرنل کھورٹ کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تو ہماری پہنچ سے باہر ہو جائے گا۔ ہمیں اس سے پہلے ہی اس کا کوئی بندوبست کرنا ہو گا اور جب میں نے ہوما سے بات کی تو وہ بولا۔ ”یہ تو طے ہے کہ جلد یا بدیر ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ اس لیے میں نے بھی یہ پروگرام بنایا ہے کہ اب اس وقت آنے سے پہلے ہی اس سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔“

”تمہارے ذہن میں کوئی پروگرام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جس روز دارا وغیرہ روانہ ہوں گے اس رات ایک کشتی خوردنوش کا سامان لے کر آئے گی۔ یہ سامان ہر دو دوسرے دن لاؤس سے آتا ہے۔ ایک کشتی آج آئے گی اور اگلی دو دن بعد۔ اگر ہم کوشش کریں تو اس کشتی پر قبضہ کر سکتے ہیں۔“

”مگڑ!“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی ”بندرگاہ۔ میرا مطلب ہے وہ گھاٹ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں پر ان کشتیوں کی آمدورفت ہوتی ہے؟“

”یہاں سے گیارہ میل دور میکانگ کے ساحل پر وہ گھاٹ اگرچہ ہمارے لیے خاصا خطرناک ہو سکتا ہے لیکن کوشش کی جاسکتی ہے۔“ ہوما نے کہا ”وہاں سامان رکھنے کے

لے بہت بڑا شہد بنا ہوا ہے۔ ایک بھاری مشین گن بھی نصب ہے۔ چھ گارڈ مستقل طور پر وہیں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس رات کشتی سامان لے کر آتی ہے دو تین محافظوں کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ محافظ ہوتے ہیں جو کشتی کے ساتھ آتے ہیں اور جو ٹرک سامان اٹھانے کے لیے آتا ہے کم از کم دو آدمی اس پر بھی ہوتے ہیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کم از کم ایک درجن آدمیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا ”کشتی عام طور پر کس وقت آتی ہے؟“

”رات کے آخری پہرہ دو اور چار بجے کے درمیان۔“ ہونا نے جواب دیا۔ ”لیکن پہلے ہمیں دارا وغیرہ کا پروگرام معلوم کرنا پڑے گا۔ اگر وہ دن کے وقت گئے تو ہم ان کا پیچھا نہیں کر سکیں گے۔ البتہ رات کو۔“

”لیکن ہم ان کا پیچھا کیسے کریں گے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”تھائی تو اس قابل نہیں کہ چند قدم بھی چل سکے۔ گیارہ میل۔ یہ فاصلہ کیسے طے ہوگا؟“

”میں اس کا بھی بندوبست کر لوں گا۔“ ہونا نے کہا ”لیکن پہلے دارا وغیرہ کا پروگرام معلوم ہونا ضروری ہے۔“

اس کے بعد ایک دن اور گزر گیا۔ اگلے دن شام کو ہونا نے ہمیں بتا دیا کہ ہم اپنی تیاری مکمل کر لیں۔ ہونا نے بھی اپنا بیگ پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بیگ میں زیادہ تر بچے کے کپڑے اور دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ فیڈر اور دودھ کے دوٹن اس نے سب سے پہلے بیگ میں رکھے تھے۔

اس سے اگلے روز شام کو ہونا واپس آیا تو اس کے چہرے پر سستی کے آثار نمایاں تھے۔

”دارا اور اس کے ساتھی آج رات گیارہ بجے روانہ ہو رہے ہیں۔“ اس نے بتایا ”روا لگی کے لیے رات کا وقت رازداری کے خیال سے رکھا گیا ہے۔ وہ ایک بڑی جیپ پر ہوں گے جس میں ان کی حفاظت کے لیے چار محافظ بھی ہوں گے۔“

”ہم لوگ کس وقت روانہ ہوں گے اور بندوبست کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے بندوبست کر لیا ہے۔“ ہونا نے جواب دیا ”میں نے ایک جیپ تازہ کی ہے۔ میں آٹھ بجے یہاں سے چلا جاؤں گا اور ساڑھے دس بجے جیپ لے کر آجاؤں گا۔ تم لوگ تیار رہنا۔ ہم فوراً ہی روانہ ہو جائیں گے۔ یہاں سے تقریباً پانچ میل آگے نکل کر ہم ان کا انتظار کریں گے۔“

ہونا خاموش ہو گیا لیکن یہ خاموشی چند سیکنڈ سے زیادہ

طویل ثابت نہیں ہو سکی۔ ہم ایک بار پھر اپنے اس منصوبے کی تفصیلات کا جائزہ لے رہے تھے جس پر ہم سب کی زندگیوں کا دارومدار تھا۔

ہونا جا چکا تھا۔ ہم نے اپنی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ گولڈن ٹرائی اسٹیکل۔ دنیا کی خطرناک ترین جگہ۔ جہاں سے پوری دنیا میں موت بانی جاتی تھی۔ جہل کھوراث۔ ایک خونخوار پرکھنا گنا تھا جسے چین کی فوج بھی پتا نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ اس سرزمین کا حکمران تھا۔ یہ وہ خطہ تھا جس کی زمین جہل کھوراث اور اس کے ہم پیشہ لوگوں کے لیے تو سونا اگتی تھی مگر دوسروں کے لیے یہاں موت اگتی تھی۔ کوئی اجنبی آج تک موت کی اس وادی میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور ہم اس خونخوار ڈھسے کے جہزوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

آج شاید اس سرزمین پر ہمارا آخری معرکہ ہوتا اور کسی قسم کی پیش گوئی کرنا ممکن نہیں تھا۔ دارا ہمارے ہاتھوں مارا جانا یا ہم زہر اگنے والی اس زمین کے لیے کھاد بن جاتے۔

میں نے کئی مرتبہ ہونا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے آثارات سے بھی اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ وہ جراثیم پیشہ عورت تھی۔ طویل عرصے تک قانون سے آگے چھوٹی کھیتی رہی تھی اور پھر قانون سے تحفظ کا لالچ دے کر اسے یہاں پہنچا دیا گیا۔ وہ چار سال سے یہاں تھی۔ یہ ایک ایسی جیل تھی جہاں اگرچہ ہر قسم کی آزادی حاصل تھی لیکن یہاں سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے کسی طرح سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی، جہل کھوراث کے آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ ہر شخص یہاں سے نکلنا بھی چاہتا تھا اور جہل کھوراث کا وفاقا رہی تھا۔

یہاں آنے والے ہر شخص کو فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ جہل کھوراث نے یہاں جدید ترین اسلحہ جمع کر رکھا تھا اور کئی مرتبہ یہ گولہ بارود استعمال بھی ہوا تھا۔

پچھلے چار برسوں کے دوران میں ہونا ٹرائی اسٹیکل کی مختلف پوسٹوں پر تعینات رہی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف یہاں کے محافظ تھے بلکہ پوسٹ کی کاشت اور منڈیاں کی تیاری کا کام بھی انہی لوگوں سے لیا جاتا تھا۔ یہاں انہیں کسی چیز کی سبک دینی نہیں تھی۔ کھوراث انہیں ضرورت کی ہر چیز مہیا کرتا تھا۔ مردوں کا دل بھلانے کے لیے عورتیں موجود تھیں۔

ہونا بھی دو سال تک مختلف مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی رہی تھی پھر دو سال پہلے اس نے ہونا سے شادی کر لی۔ وہ دونوں یہاں سے نکلتا چاہتے تھے۔ کئی مرتبہ منصوبہ بنائے تھے لیکن فرار کی کوشش کرنے والے دوسرے لوگوں کا انجام دیکھ کر وہ کبھی بھی اپنے کسی منصوبے پر عمل کرنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ زندگی بہت عزیز تھی۔ یہاں وہ زندہ تھے۔ اور پھر وجدان یہاں آگیا۔ ہونا وجدان، ہونا اور جاگی کی ہمت اور حوصلے کی داد دینے بغیر نہ سا جو انجام کی پروا کیے بغیر موت کے کوئیں میں کود گئے تھے۔ ہونا اور ہونا نے بھی اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سرزمین پر جہل کھوراث کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر وجدان وغیرہ کی وجہ سے ہونا اور ہونا میں اتنا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ وہ نتائج کی پروا کیے بغیر ان کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے تھے۔

ہونا اپنے بچے کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ اس کے دوسرے کندھے پر آٹوینک راکٹ لٹکی ہوئی تھی۔ ان کے پاس اتنا ایمونیشن موجود تھا کہ وہ کئی گھنٹوں تک مقابلہ کر سکتے تھے۔

ہونا نے دس بجے واپس آنے کو کہا تھا لیکن اب سوا دس بج چکے تھے۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی ”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“ میں باور بار سوچ رہا تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ وقت کی رفتار جیسے ٹھہر گئی تھی۔ لمحات صدیاں بن کر بہت رہے تھے۔ گھڑی کی سوئیوں کی رفتار سست ہو گئی تھی لیکن ہمارے دلوں کی دھڑکنیں خطرناک حد تک تیز ہو رہی تھیں۔

دس بج کر پینتیس منٹ پر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر ہم سب ہی چونک گئے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانک دیا۔ جیپ تھی جس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور وہ پھر پہلے میدان میں اچھلتی ہوئی تیز رفتاری سے کانچ کی طرف آ رہی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہونا ہی ہو۔ اب اس جیپ میں ہماری موت کا سامنا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے جاگی وغیرہ کو اشارہ کیا اور ہم کسی بھی ناگمانی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

جیپ کانچ کے سامنے رک گئی اور ہونا جیپ سے اتر کر دوڑتا ہوا کانچ کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

”جلدی کرو۔“ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ ہونا

اندر آتے ہی ہولا۔

ہم تو تیار ہی تھے۔ ہونا نے اپنے بیگ کے ساتھ ہونا کا بیگ بھی اٹھالیا۔ میں نے تھائی کو کندھے پر لا دیا اور تیزی سے باہر آگیا۔

جیپ کی پیچھے والی سیٹیں آٹھ سال سے تھیں جن کے درمیان خالی جگہ تھی۔ ہونا اور تھائی کو آگے ڈرائیونگ سیٹ کی پشت کے قریب ان سیٹوں پر آٹھ سال سے بیٹھا رہا گیا۔ ہونا اور جاگی رانڈنل سنہالے پچھلے کنارے پر آٹھ سال سے بیٹھ گئیں۔ ہونا نے آئینہ نگ سنہال لیا اور میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہونا کی سب مشین اس کی سیٹ کے قریب رکھی ہوئی تھی۔

جیپ حرکت میں آکر پھر پہلے میدان میں ایک طرف دوڑنے لگی۔ ہونا نے بیڈ پیس نہیں جلائے تھے۔ جیپ ایک طویل چکر کاٹتی ہوئی اندر لوٹی جس کی طرف جانے والی سڑک پر آگئی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ پھر براستہ تھا جس کے دونوں طرف پوسٹ کے کھیت تھے۔ یہی سڑک جہل کھوراث کے بیڈ کو اڑنی کی طرف چلی گئی تھی جو وہاں سے تقریباً تیس میل آگے تھا۔

آسمان پر بادل تھے جس سے اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہونا نے اب بھی بیڈ پیس روشن نہیں کیے تھے اور جیپ اس پھر پہلے راستے پر اچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہونا نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ وہ تاریکی میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا پھر اس نے جیپ کو دائیں طرف پوسٹ کے کھیتوں میں ایک اور تنگ سے راستے پر موڑ لیا۔ یہ راستہ بتدریج بلند کی طرف جا رہا تھا۔ پیاس گڑ کا فاصلہ طے کر کے اس نے جیپ روک کر انجن بند کر دیا اور بجے آ کر آیا۔

ہونا اور تھائی کو جیپ میں ہی چھوڑ دیا گیا۔ تھائی اس وقت حواس میں تھی۔ انہیں کچھ ہدایات دینے کے بعد ہم سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہونا اور جاگی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم چاروں ڈھلان پر پوزیشن سنہال کر بیٹھ گئے۔

”وہ لوگ ٹھیک گیارہ بجے روانہ ہوں گے۔“ ہونا نے کہا ”چند منٹ یہاں تک آنے میں لگیں گے۔ یہاں سے ہم انہیں آسانی سے نشانہ بنا سکیں گے۔“

ہمیں تقریباً دس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا پھر بائیں طرف سے کسی گاڑی کے بیڈ پیس کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دارا لوگوں کی جیپ تھی۔ انجن کی آواز فضا میں چاروں طرف گونجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہماری

نظر اس اجالتی ہوئی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں اور پھر وہ جب جیسے ہی ہمارے سامنے پہنچی ہوا سے فائر کھول دیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ گولی کی نازیر لگی تھی اور نازیر ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جب لوگوں کو اپنی ہوئی سڑک کے دوسری طرف پست کے کھیتوں میں ٹھس گئی تھی اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی جوانی نازیر ہونے لگی۔ ہوا سے تھوڑی سی غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن گولیاں ذرا نیچے گئی تھیں۔ جب کا ایک نازیر اگرچہ برست ہو گیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ دارا اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کا کچھ نہیں جڑ کا ہو گا۔

کے بل بڑی تھی۔ بچے اس کے نیچے دبا رو رہا تھا۔ اس دوران میں ہونا بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

”تھائی۔ تھائی۔ آٹھویں کھولو۔“ میں اس کا گال  
تھپتھپانے لگا۔

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ہونٹ خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ کئی سال پہلے اس نے بکاک میں..... دارا جیسے خونی بھیڑیوں سے بچا کر مجھے نئی زندگی دی تھی اور آج اس نے میری گود میں دم توڑ دیا تھا۔

میں اندھا دھند فائزنگ کرتا ہوا سڑک پار کر کے سامنے والے کھیت میں گھس گیا۔ وہاں کھڑی ہوئی جپ کے ہیڈ میپس ابھی تک روشن تھے اور اسی روشنی میں دو سائے کھیتوں میں بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں ایک کم تھا اور دوسرا دار۔

میرا خون کھول اٹھا۔ دارا آگے تھا اور کم پیچھے میں نے اسے باؤ پر رکھ لیا۔ کم لوکھڑا کر گرا۔ اس کے جسم میں اتنے سوراخ ہو گئے تھے کہ گنا مشعل ہو جاتا۔ دارا کافی آگے نکل چکا تھا اور پھر نیچے گر کر غائب ہو گیا۔ میں دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا۔ سامنے ایک گہرا کھڈ تھا۔ دارا گولی کھا کر اسی کھڈ میں گرا تھا۔ میں اس کے پیچھے کھڈ میں چھلانگ لگتا جا رہا تھا کہ آنے والی جیپ سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ جیپ اگرچہ ابھی کافی دور تھی لیکن فائر کھول کر انہوں نے شریک جنگ ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور وہ جیپ کسی بھی لمحے ہمارے سر پر پہنچ سکتی تھی۔

”تم لوگ جیپ تک پہنچو۔ میں اسے روکتا ہوں۔“ بوما  
چخا۔

ہوا ایک جگہ پودوں میں پوزیشن لیے بیٹھا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور آگے آتی ہوئی چپ کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی تقریباً دو سو گز دور تھی۔

وہ جپ سڑک پر ہمارے عین سامنے رک گئی۔ فاصلہ  
پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ اس جپ میں کئی محافظ تھے جو  
جپ رکے، یہی جھانگ لگا کر آئے تھے۔ دو تین محافظ کھیت  
میں کھڑی ہوئی اس جپ کی طرف دوڑے جس کے ہیڈ  
لیمپس اب بھی روشن تھے۔

آتش فشاں ۵

ہمارا اچھا نہ کر سکیں۔" ہونا نے بھی سرگوشی میں جواب دیا  
 "مگر ان میں سے کوئی ہماری کسی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے تو  
 اس کی قسمت میں اگلے پسنے کو نشانہ بنانا کا اور تم پچھلے  
 کو۔ ریڈی۔ ون۔ نو۔ تھری۔!"

یہ راستہ نسبتاً تنگ اور غیر ہموار تھا۔ تاریکی میں ایسے راستے پر تھیر رہا تھی۔ یہ گاڑی چلانا خطرناک ہو سکتا تھا لیکن ہوفانہ صرف اپر ڈرائیور ثابت ہوئی تھی بلکہ یہ راستہ بھی دیکھا بھلا تھا اور وہ فشیب و فراز سے واقف تھی اس لیے کسی حادثے کے بغیر سفر جاری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ جاگتی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ رہے تھے۔ تمنا کی موت کا صدمہ اس کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

① حقہ ③

اور پھر میری نظروں نے ایک اور خوفناک منظر دیکھا۔  
تھائی جیپ سے اتر کر ہونا کے بچے کو سینے سے چٹائے ایک  
طرف دوڑی تھی۔ جیپ پر حملہ ہونے کے بعد وہ اپنے آپ  
کو اور بچے کو بچانے کے لیے دوڑی تھی مگر اس نے جوار سے  
منتخار کیا تھا وہ غلط تھا۔ وہ بد خواہی میں اس طرف دوڑی  
تھی جس طرف دارا اور اس کے ساتھی گمات لگے ہوئے  
تھے۔

”کیا تھائی نے اپنی جان دے کر اسے چھایا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بچہ بڑا ہو کر تھائی کے مشن کو جاری رکھے گا۔ ہم کہیں بھی ہوں لیکن جب تک ہم زندہ ہیں تھائی کے مشن کو آگے بڑھاتے رہیں گے“

ہوما کی باتیں میرے لیے بڑی حوصلہ افزا ثابت ہوئی تھیں۔ میں اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنا رہا۔

”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مشرق گھاٹ پر۔“ ہومانے جواب دیا ”جو تقریباً تیرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اب دعا یہ کرنی چاہیے کہ ہمارے بارے میں پہلے سے وہاں کوئی اطلاع نہ پہنچ چکی ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری منزل کے بارے میں صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔“

”کیوں۔“ وہ لوگ کھامزہاں ہیں کیا۔ تم نے بتایا تھا کہ یہ راستہ میکانگ کے گھاٹ کی طرف جاتا ہے۔ انہیں اندازہ لگانے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کچھ آگے جاکر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو تین راستے نکلتے ہیں۔“ ہومانے بتایا ”ایک راستہ کھوراث کے ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتا ہے۔ ایک ہماری بستی کی طرف اور ایک راستہ جنوب کی طرف بھی جاتا ہے۔ میکانگ کے گھاٹ کا وہ اس لیے نہیں سوچ سکیں گے کہ وہاں مشین گن نصب ہے۔ جنرل کھوراث کے ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والے راستے کا خیال بھی وہ مسترد کر دیں گے۔ جنوبی راستہ رہ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے آگے سے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ظاہر ہے ہمیں اس طرف نہیں جانا۔ ہم تو میکانگ کے گھاٹ کی طرف جا رہے ہیں نا۔ ویسے راستے میں ہمیں ایک اور بندوبست بھی کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”راستے میں بتاؤں گا۔“ ہومانے جواب دیا۔ تقریباً چھ میل کا فاصلہ طے ہو جانے کے بعد ہومانے جب رکوالی۔ یہاں سے ایک کشادہ راستہ مشرق میں دیا ہے میکانگ کے گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس سڑک کے کنارے پر بجلی کے کھمبوں کی قطار تھی۔ اوپر بجلی کے تار تھے اور نیچے ٹیلی فون کا تار تھا۔ ٹیلی فون کے تار کے لیے الگ کھمبے لگائے کے بجائے بجلی کے کھمبوں ہی سے کام لیا گیا تھا۔ ہوما جیب سے اتر کر کسی بندر کی طرح کھمبے پر چڑھ گیا۔

ٹانگوں اور ایک ہاتھ سے اس نے کھمبے کو پلٹ میں لیے رہا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر نکال کر ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا اور نیچے آیا۔

”اب کم از کم ٹیلی فون کے ذریعے گھاٹ سے رابطہ قائم نہیں ہو سکتا۔“ وہ جیب میں بیٹھے ہوئے بولا۔

جیب ایک بار پھر حرکت میں آئی۔ سڑک ٹیلا نما پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی جاری تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پوسٹ کے کھیت تھے۔ اگر یہ کہا جاتا تھا کہ گولڈن ٹرائی ایک مشکل سے دنیا بھر کو ہیروئن اور دیگر منشیات سپلائی کی جاتی تھیں تو یہ غلط نہیں تھا۔ کیڑوں مربع میل پر مشتمل اس علاقے میں پوسٹ ہی تو کاٹت کیا جاتا تھا۔ یہاں ہیروئن تیار کرنے کی کئی ٹیکنیکوں تھیں جو بارہ مہینے کام میں مصروف رہتی تھیں۔

ایک ٹیلا نما پہاڑی کا موڑ گھومتے ہی ہومانے جیب روک لی۔ اس نے انجن چلا چھوڑ دیا اور نیچے اتر آئی۔ سامنے نشیب میں کافی فاصلے پر چند روشنیوں جھلساتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

”وہ میکانگ کا گھاٹ ہے۔“ ہومانے ان روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا۔ میں بھی اس کے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور جیب حرکت میں آئی۔ اب ہومانے جیب کے ہیڈ کوارٹر بھی روشن کر لیے تھے۔

ان روشنیوں تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگ گئے۔ اس وقت ڈیڑھ بجتے والا تھا۔ سامنے ہی ایک بت بڑا شیڈ نظر آ رہا تھا جہاں چار پانچ بلب جل رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑا کینچ تھا۔ اس کے سامنے بھی تیز روشنی والا بلب جل رہا تھا۔

ہومانے جیب اس کانچ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر روک لی اور اسی وقت دو مسلح محافظ کسی طرف سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ہومانے انجن بند کر دیا اور نیچے اتر کر ان محافظوں کی طرف چلے گا۔

”ہیلو ہوما۔“ ایک محافظ نے اسے دیکھ کر حیرت کا مظاہرہ کیا ”تم اس وقت یہاں۔؟“

”اوہ۔“ ہومانے باری باری دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں بھی جیب سے اتر کر ان کے قریب آیا تھا۔ ہم دونوں کی رائفلیں جیب میں ہی تھیں۔ یہ منصوبہ ہم نے راستے میں ہی بنالیا تھا کہ محافظوں پر کس طرح قابو پایا جائے گا۔ اس کا مطلب ہے تم لوگوں کو اطلاع نہیں ملی؟“ ہومانے

باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیسی اطلاع؟“ ان میں سے ایک نے سوالیہ نگاہوں سے ہوما کی طرف دیکھا۔ وہ اس گھاٹ کا انچارج تھا۔

”میرا بچہ بیمار ہے اور یونٹ کے ڈاکٹر نے اس کے علاج سے معذور ہی ظاہر کر دی ہے۔“ ہومانے جواب دیا ”ہم اسے لاؤس لے کر جا رہے ہیں۔ آج کتنی آنے والی ہے نا؟ جنرل کھوراث نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن لگتا ہے ہمیں ابھی تک ہمارے بارے میں اطلاع نہیں ملی لیکن تم اگر چاہو تو ٹیلی فون پر تصدیق کر سکتے ہو۔“

”تصدیق تو کتنی ہی پڑے گی مگر یہ کون ہے اور جیب پر دوسرے لوگ کون ہیں؟“ انچارج نے کہتے ہوئے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہمیں معلوم ہے ہمارے علاقے میں ایک لیبارٹری تیار کر دی گئی ہے۔ جنرل کھوراث خود بھی آیا ہوا تھا۔ وہ بہت بڑی ہے۔ اس نے ہماری یونٹ کے بہت سے گارڈز کو تبدیل کر دیا ہے۔ یہ لوگ بھی ہیڈ کوارٹر سے آئے ہوئے ہیں۔“

اس نے میری طرف اشارہ کیا ”اس کے ساتھ ولینڈیز گارڈ ہیں۔ یہ لوگ مجھے چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔“

”میں ان لیڈیز گارڈز سے بھی ملنا چاہوں گا۔“ انچارج نے کہا۔ لڑکیوں کا نام سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

”یہ لوگ رات یہیں رہیں گے۔“ ہومانے کہا ”تم پہلے فون کر لو پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

انچارج سر ہلاتا ہوا کانچ کی طرف چل پڑا۔ دوسرا گارڈ بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ میں اور ہوما بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کانچ میں داخل ہو کر ہومانے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ انچارج نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر کھڑکھٹاپ کرنے لگا۔

”کیا کڑ بڑ ہے۔“ لائن ڈیڈ ہو رہی ہے۔“ وہ میز کے پیچھے جھک کر فون کے تاروں کو جھٹکے دینے لگا۔

میں نے اور ہومانے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے خنجر نکالے اور چیتے کی طرح ان پر جمع پڑے۔ انچارج کو ہومانے سنبھال لیا تھا اور دوسرے محافظ کو میں نے اسے اس محافظ کو پشت کی طرف سے دلوچا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر ٹھیک دل کے مقام پر سینے میں پوسٹ کر دیا تھا۔ محافظ بری طرح تڑپ رہا تھا لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔ اسے آہستگی سے زمین پر ڈال کر میں نے اس کے

سینے میں پیوست خنجر نکال کر اس کے لباس سے صاف کیا۔ ہوما بھی اپنے شکار سے نمٹ چکا تھا۔

ہم دونوں باہر آ گئے۔ ہومانے کمرے سے نکلنے سے پہلے جتنی بھجادی تھی اور پھر دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔

سونیا اور جاگی بھی جیب سے اتر آئی تھیں۔ ہم اوگ شیڈ کے دوسری طرف آ گئے۔ وہاں دو گارڈز کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے گیس بانک رہے تھے۔ انہوں نے جیب کی آواز سنی ہوگی اور پھر انچارج سے ہماری باتوں کی آواز بھی سنی ہوگی لیکن اپنی جگہ سے اٹھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید آدھی رات کے وقت جیب کی آمد۔۔۔۔۔ ان کے لیے غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر کنکریٹ کے ایک چوترے پر بھاری مشین گن رکھی ہوئی تھی۔ اس میں گولیوں کا بلیٹ بھی لگا ہوا تھا۔ مشین گن کا رخ دریا کی طرف تھا۔ چوترے پر ایک شیڈ بھی بنا ہوا تھا۔

ان دو محافظوں میں سے بھی ایک ہوما کا شناسا نکلا لیکن ان میں سے کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہوا۔

ہومانے باتوں یا باتوں میں ان سے اگلا لیا کہ ان کے دو ساتھی کانچ کے پیچھے کمرے میں سو رہے ہیں۔ ہومانے سونیا اور جاگی کو اشارہ کر دیا۔ وہ کانچ کی طرف چلی گئیں۔

شیڈ میں بیٹھے ہوئے ان دونوں محافظوں پر قابو پانے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن ہم نے ان کا خون نہیں بنایا۔ ان کے ہاتھ پشت پر باندھ کر دریا میں پھینک دیا کہ پھیلوں کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔

اور پھر چانک فائر کی آواز سن کر ہم اچھل پڑے۔ ہم دونوں ہی بیک وقت کانچ کی طرف دوڑے تھے اور پھر یہ انکشاف ہوا سنسنی خیز غارت ہو چکا تھا کہ کانچ کے اس کمرے میں ایک محافظ کو جاگی اور سونیا نے ٹھکانے لگا دیا تھا اور دوسرا بھاگ نکلا تھا اور فائرنگ اسی نے کی تھی۔

”فوجدان۔“ ہومانے کہا ”تم گھاٹ پر پہنچو۔ وہاں کوئی نہ کوئی کشتی ضرور موجود ہوگی۔ میں ان لوگوں کو لے کر آتا ہوں۔“

میں شیڈ کے دوسری طرف گھاٹ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ ہوما کا خیال درست نکلا۔ دریا کے کنارے پر کنکریٹ کے پلٹ فارم کے ساتھ ایک کشتی موجود تھی جس میں کم از کم آٹھ آدمیوں کے بیٹھے کی متجاش تھی۔ میں کشتی کے بارے میں اطمینان کر کے واپس دوڑا لیکن ایک مشین گن والے چوترے کی طرف مڑ گیا۔ وہ ہماری مشین گن دریا میں ڈھکانے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں ایک بار پھر جیب کی طرف دوڑا اور پھر ٹھک کر رک گیا۔ سامنے نیلیوں پر کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں نظر آ رہی تھیں۔ وہ یقیناً محافظوں کی جیب بھی جو تیزی سے اس طرف آ رہی تھی۔ فاصلہ تین فرلانگ سے زیادہ نہیں تھا۔

دائیں طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا زندہ بچ جانے والے محافظ کو فائرنگ کے زور پر دوڑاتا ہوا دور تک لے گیا تھا پھر اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔

”تم لوگ گھاٹ کی طرف چلو۔ جلدی کرو۔“ میں نے سونیا وغیرہ کو کہا۔

ہوٹانے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے اپنا بیگ پکڑ لیا تھا۔ سونیا اور جاکی نے بھی اپنے بیگ اور رائفلیں اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں جیب کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا اور تھامی کی لاش کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھامی کو جب میں دارا والے کانچ سے اٹھا کر لایا تھا تو بہت ہلکی ہلکی سی تھی لیکن بے جان ہو کر اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اس لاش کو اٹھا سکا تھا۔ اس دوران میں ہوا بھی میرے قریب پہنچا۔

”بھاگو۔ جلدی کرو۔“ وہ چیخا۔

میں نے شیڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہوا میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیب تیزی سے فاصلہ سمیٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

سونیا نہ صرف کشتی کے چوتھے سے بندھ رہی تھی کھول چکی تھی بلکہ اس نے بچے کو سونیا کے حوالے کر کے انجن بھی اشارت کر دیا تھا۔ کشتی ہولے ہولے مل رہی تھی جس وجہ سے تھامی کی لاش کو کشتی میں ڈالنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

جیب کی آواز اب واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میرے فوراً ہی بعد ہوا نے بھی کشتی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ جیب کے رکنے کی آواز سنائی دیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے کشتی کا انجن بند ہو گیا۔

”یہ کیا ہوا۔ انجن اشارت کرو۔“ ہوا چیخا۔

ہوٹانے ایک دو مرتبہ منہ دبایا۔ انجن کھانس کر رہ گیا۔ میں اور جاکی رائفلیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ ہوا نے ہوفا کو کندھے سے پکڑ کر انجن کے سامنے سے بھاڑ دیا۔ ہوٹانے اس کی رائفل پکڑ کر ہمارے ساتھ پوزیشن لے لی۔

ہوٹانے دو مرتبہ اشارت دیا لیکن ہر مرتبہ انجن کھانس کر

رہ گیا۔ ہماری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا کے باوجود میری قمیض پسینے سے بھینکنے لگی۔ محافظ جیب سے اتر پڑا۔ وہ جیب یقیناً ہماری جیب کے پاس رکھی تھی اور گھاٹ سے اس جگہ کا فاصلہ ڈیڑھ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ دوڑتے ہوئے محافظوں کے قدموں کی آواز میرے دل اور دماغ پر دھک سی پیدا کر رہی تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور دوڑتے ہوئے قدموں کی وہ آوازیں اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھیں۔ موت اپنی پوری خشن سمانیوں کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہی تھی اور بچ کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی وہ آوازیں رک گئیں جو موت کا پیغام لے کر ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ فتنار ایک دم سناٹا چھا گیا اور یہ سکوت موت سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ میری بے چینی بڑھنے لگی۔ میری رائفل رائفل کے ٹریگر پر تھی اور نظریں کسی ایک مرکز پر نکلے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ انیس موت کے ان ہر کاروں کی تلاش تھی جو اچانک ہی کسی جگہ رک گئے تھے یا شاید گھاٹ لگا کر آویزا کیے بغیر ہم پر بھجنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ گردن گھما کر ہوا کی طرف دیکھا۔ وہ انجن اشارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر موت کا انجن ہر مرتبہ کھانس کر رہ جاتا۔ جاکی اور ہوفا بھی اپنی رائفلیں سنبھالے کسی ایکشن کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں ایک بار پھر شیڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں لکڑی کی کچھ خالی پٹیاں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں لیکن ان پٹیوں کے آس پاس کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔

ہوا کی بڑبڑاہٹ سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اشارت سے انجن اشارت کرنے کی کوشش ترک کر کے ٹائیکلون کی وہ ڈوری اپنے ہاتھ پر لپیٹ رہا تھا جسے کھینچ کر موٹر کے پچھلے کو حرکت میں لایا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے ڈوری کو اپنی طرف کھینچا۔ اس طرح پہلی ہی کوشش میں انجن اشارت ہو گیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے میں نے اوپر شیڈ میں لکڑی کی ایک پٹی کو بہت آہستگی سے آگے سرکتے ہوئے دیکھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ پٹیوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”فائر۔“

میں چیخا اور اس کے ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔ جاکی اور ہوفا کی رائفلیں بھی گولیاں اگلنے لگیں۔

”چارنگ!“ پلٹ فارم کی طرف سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

چار محافظ لکڑی کی ان خالی پٹیوں کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئے اور سب مشین گنوں سے فائر کرتے ہوئے ہماری طرف دوڑے۔

ہمارے اور پٹیوں کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ ہمیں یہ ایڈوانس حاصل تھا کہ ہماری کشتی اندھیرے میں تھی جبکہ شیڈ میں بلب جل رہے تھے اور وہ سب روشنی میں تھے۔ وہ چار گن من گئے تھے جو ہماری طرف دوڑے تھے مگر ان میں سے دو کو چند قدم آگے بڑھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ چیخے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ دوسروں نے اپنے ساتھیوں کا یہ انجام دیکھا تو وہ پناہ کی تلاش میں دائیں بائیں دوڑے۔

ہوا کو کشتی کا رخ موڑنے میں ایک سیکنڈ لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے کشتی مینڈک کی طرح اچھل کر آگے بڑھی۔ کئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی تھیں یا آس پاس پانی میں گر رہی تھیں۔ ان دو محافظوں کے مارے جانے کے بعد شیڈ کی طرف سے ایک لمحے کو فائرنگ رک گئی تھی لیکن اس چوتھے کی طرف سے بدستور فائرنگ ہو رہی تھی جس پر کچھ دیر پہلے تک ہماری مشین گن نصب تھی۔ اس طرف دو محافظ تھے جو غالباً مشین گن پر قبضہ کرنے کے لیے ہی اس طرف پہنچے تھے لیکن مشین گن وہاں نہ پا کر انہوں نے اپنی رائفلوں سے فائر کھول دیا تھا۔

ہوٹانے عقل مند یہ کی تھی کہ کشتی کو کھلے دریا میں لانے کے بجائے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑاتا رہا۔ اس طرح اسے اونچی جھاڑیوں کی آڑ مل گئی تھی اور ہم ان کی نظروں سے اوچھل تھے۔ وہ محض ہماری فائرنگ اور بوٹ کے انجن کی آواز پر فائرنگ کر رہے تھے اور ان کا ایمونیشن ضائع ہی جا رہا تھا۔

ہم کنارے کے ساتھ ساتھ گھاٹ سے کافی دور نکل گئے تھے ہم نے فائرنگ روک دی تھی لیکن ہماری انگلیاں اب بھی اپنی اپنی رائفلوں کے ٹریگر پر تھیں۔

سونیا اب تک بچے کو گود میں سینے اوڑھ لی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اب وہ بھی سہمی ہوئی۔ پچہ بڑی طرح رو رہا تھا۔ سونیا نے ہوفا سے رائفل لے کر بچے کو اس کے حوالے کر دیا۔ ہوفا زرا پیچھے ہٹ کر کشتی کے کنارے سے نیک لگا کر بیٹھ گئی اور ایک طرف سے بلاؤز اوپر کھینچنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد بچے کا رونا بند ہو گیا۔

گھاٹ کی طرف سے بھی فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ ہوا کشتی

کو اب بھی کنارے کے قریب ہی رکھے ہوئے تھا۔ میں گھوم کر ہوا کی طرف دیکھنے لگا۔

”کشتی میں تیل کتنا ہے۔ یہ ہمیں کہاں تک پہنچا سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹینک بھرا ہوا ہے۔“ ہوا نے ڈاکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ دراصل پیٹرولنگ بوٹ ہے۔ تیل کا ٹینک ہر وقت فل رکھا جاتا ہے اور تم کشتی کے اطراف میں اوپر گئے ہوئے راڈ دیکھ رہے ہو۔ ان کے ساتھ لائٹ مشین گنیں فٹ کر دی جاتی ہیں۔“

”یہ ہمیں کہاں تک پہنچا سکتی ہے؟“ میں نے اپنے سوال کا دوسرا حصہ دہرایا۔

## مارشل آرٹ

# کراٹے

### ابتدا سے بلیک بیلٹ تک کی مشقیں

اردو میں پہلی بار کرائے سکھانے کی ایک مکمل اور آسان کتاب

قیمت

ڈاک خرچ

(40) روپے

(23) روپے

✱

مکتبہ کی قیمت سے ڈاک خرچ الگ ہے

پتہ: 1970، راولپنڈی، پاکستان

Email: kitablat1970@yahoo.com

”نیک فل ہے چالیس پچاس میل تک تو نکل ہی جائیں گے۔“ بونا نے جواب دیا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر یکایک خاموش ہو گیا اور ایک ہاتھ کان کے قریب رکھ کر ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کیا ہوا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ آواز سن رہے ہو۔“ وہ بڑبڑایا۔

میں نے بھی ایک ہاتھ کان کے قریب رکھ لیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ بونا نے غلط نہیں کہا تھا۔ فضا میں گھر گھر پر کی بجلی سی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بہت دور کی آواز تھی۔ بونا نے بوٹ کا انجن بند کر دیا۔ خاموشی ہوتے ہی وہ آواز کچھ واضح ہو گئی۔ ہم جس طرف سے آرہے تھے تیز ہوا کا رخ بھی اسی طرف سے تھا۔ گویا وہ آواز ہوا کے دوش پر ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔

”جانتے ہو یہ آواز کیسی ہے؟“ بونا نے کہتے ہوئے بوٹ کے انجن کا اشارہ کر دیا۔ اس مرتبہ پہلی ہی کوشش میں انجن اشارت ہو گیا۔

”کسی گاڑی کے انجن کی آواز ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔“ بونا کے لہجے میں تشویش تھی ”دیر کے کنارے کے ساتھ ساتھ سڑک ہے جہاں محافظوں کی گاڑیاں پڑونگ کرتی ہیں۔ وہ اس سڑک پر ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پڑونگ گاڑیوں پر وائرلیس بھی ہوتے ہیں۔ جن کا رابطہ براہ راست ہینڈ کو آرٹر سے ہوتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اگر انہوں نے وائرلیس پر اطلاع دے دی ہو تو سامنے سے کوئی اور پڑونگ گاڑیاں نہ آجائیں یا آگے کسی گھاٹ سے کوئی پڑونگ بوٹ نہ دیا میں آجائے۔“

”لیکن یہ گاڑی تو زانیہ۔ سیکل کے اندرونی حصے کی طرف سے آئی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ ہو سکتا ہے اس پر وائرلیس نہ ہو اور ابھی تک ہمارے بارے میں کسی اور جگہ اطلاع نہ دی گئی ہو۔“ میں نے کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ بونا نے ابھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا ”اگر ہم اس پڑونگ جپ سے بچ کر نکل بھی گئے تو یہ لوگ کسی دوسری جگہ پہنچ کر ہمارے بارے میں اطلاع دے دیں گے اور اس وقت ہمیں گھبرنے کی کوشش کی گئی تو ہمارے لیے بچ نکلنا مشکل ہو جائے گا اس لیے کیوں

نہ اس جپ کا قصہ ہی ختم کر دیا جائے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ بونا نے مجھے گھورا۔

”کشتی کسی ایسی جگہ رو کو جہاں سے ہم آسانی سے کنارے پر پہنچ سکیں۔“ میں نے کہا ”ہم سڑک پر پھنس کر جپ کا انتظار کریں گے اور۔“

”سمجھ گیا۔“ بونا نے میری بات کاٹ دی ”وہ سوچ بھی نہیں کیوں گے کہ انہیں اس طرح روکا جاسکتا ہے۔ ہمارے بارے میں تو وہ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ فرار ہو رہے ہیں اور کہیں رکنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔“

”سمجھ دار آدمی ہو۔“ میں مسکرا دیا ”اب جلدی سے کوئی ایسی جگہ تلاش کرو۔“

بونا کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ جھانپاں اور درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ دیکھ کر بونا نے انجن بند کر دیا۔ اس دوران میں کشتی کچھ آگے نکل چکی تھی۔ وہ کشتی کو گھما کر اسی گیب میں لے آیا اور ری کے ساتھ بندھا ہوا کنڈا درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ میں پھنسا دیا۔

”جاگے۔ سونا۔“ میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم دونوں بیس بیٹھو۔ ضروری نہیں کہ ہر محاذ پر ہمیں کامیابی ملتی رہے۔ بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔ تم لوگ پیچھے رہ کر ہماری مدد کر سکتی ہو۔“

میں اور بونا اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ ہوا نے فوراً ہی بونا کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ پچھ سو گیا تھا اور اس کی گود میں تھا۔

جھانپوں کے درمیان وہ ایک تنگ سا راستہ تھا جو کنارے پر اوپر تک چلا گیا تھا۔ راستے پر پھسلن ہو رہی تھی مگر ہم درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔

فضا میں گاڑی کے انجن کی آواز نمایاں ہو گئی تھی مگر ابھی تک وہ گاڑی بہت دور تھی۔ سڑک دیر کے کنارے سے تقریباً پچیس تیس فٹ آگے تھی۔ میں اور بونا ایک دوسرے سے بیس گز کے فاصلے پر جھانپوں میں بیٹھ گئے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

دو منٹ بعد گاڑی کے ہینڈ لمپس کی روشنی دکھائی دی۔ فاصلہ دو سو گز سے کم نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ پر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ میری نظرس روشنی پر جمی ہوئی تھیں۔ جپ کی رفتار خاصی تیز تھی اور روشنیوں اور نیچے اچھل رہی تھیں۔ فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔

بونا مجھ سے تقریباً بیس گز پہلے تھا۔ جپ جیسے ہی اس کے سامنے پہنچی اس نے فائر کھول دیا۔ گولیوں کی ترزاہٹ کی آواز کے ساتھ دو انسانی جینیں بھی سنائی دی تھیں۔

جپ پر سوار محافظوں کو اس قسم کی کسی صورت حال کی توقع بالکل نہیں تھی۔ دو محافظ بونا کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ دوسرے شاید صورت حال کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ جپ تیزی سے آگے آ رہی تھی اور پھر وہ جیسے ہی میرے سامنے پہنچی میں نے رائفل کا ٹریڈر دیا۔ رائفل سے نکلنے والی لاتعداد گولیوں میں سے ایک نے ڈرائیور کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ وہ ایک طرف لڑھک گیا اور تیز رفتار جپ شتر بے ہمار کی طرح پھیلنے راستے پر لہرائی ہوئی دیر کی طرف مڑی اور مخمخاں جھانپوں کو پکچھتی ہوئی فلا بازی کھا کر دیر میں جا گری۔ جپ کے جھانپوں میں گھسنے سے پہلے ایک آدمی چنچ ہوا مگر ابھی تھا مگر ہم اسے دیکھنے کے لیے رکنے نہیں تھے۔

ہم اس دھلان راستے پر پھسلے ہوئے کشتی میں پہنچ گئے۔ بونا نے درخت کی شاخ میں پھنسا ہوا ری کا کنڈا اٹھینچ لیا۔ اس دوران میں ہوا بڑی پھرتی سے اٹھ کر دوسری جگہ پر چلی گئی تھی۔ بونا نے انجن اشارت کیا اور کشتی کا رخ بدل کر اسے حرکت میں لے آیا۔

جپ ہم سے تقریباً بیس گز آگے دیر میں گری تھی اور ابھی تک پوری طرح ڈوبی نہیں تھی۔ ایک محافظ شاید زندہ بچ گیا تھا اور وہ ڈوبتی ہوئی جپ سے اٹھ دس فٹ کے فاصلے پر پانی میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اسے شاید تیرنا نہیں آتا تھا۔ وہ بری طرح بچ رہا تھا۔ بونا کشتی کو اس کے قریب سے نکال لے گیا۔

اس کے بعد بھی دیر کے وسط میں آنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بونا نے کشتی کو کنارے کے قریب ہی رکھا تھا۔

دس منٹ بعد ہی ایک اور آواز نے ہم سب کو بری طرح جھونک دیا۔ وہ بجلی کا پڑ کے پروں کی آواز تھی۔ ہم سب اوپر دیکھنے لگے لیکن کاپڑ نظر نہیں آیا۔ بونا نے کشتی کو کچھ اور کنارے کی طرف لے لیا۔ دو منٹ بعد کاپڑ خشکی کی طرف سے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور ہمارے اوپر سے ہوتا ہوا دیر کی گمراہی کی طرف چلا گیا۔

ہم کاپڑ کو دور دیر جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ کاپڑ ایک طویل چکر کاٹ کر واپس آ رہا تھا۔ ہونا فوج کو گود میں لے کر اس کے اوپر اوندھ گئی تھی تاکہ اگر کاپڑ سے گولیاں چلائی جائیں تو پچھ محفوظ رہے۔ بونا نے کشتی کا کنٹرول سنبھال رکھا تھا۔ میں

جاگے اور سونا رائفلوں کا رخ اور کیے تیار بیٹھے تھے۔ کاپڑ سے شاید ہمیں دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ اس کا رخ اب سیدھا ہماری طرف ہی تھا۔ بونا کی نظرس کاپڑ پر جمی ہوئی تھیں۔ کاپڑ نے جیسے ہی جھنکا شروع کیا بونا نے بڑی تیزی سے وہیل گھما دیا۔ کشتی ایک دم مڑی اور تیزی سے کھلے پانی کی طرف نکل چلی گئی۔ اس وقت کشتی اٹلتے اٹلتے پانی کی طرف بھاگ رہی تھی۔

بونا کی اس خطرناک حکمت عملی نے ہم سب کو بچا لیا تھا کیونکہ جیسے ہی کشتی مڑی تھی اس وقت کاپڑ سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی تھی اور گولیاں پانی کی سطح کو چیرتی ہوئی دریا کی تھیں۔

کاپڑ کافی آگے جا کر اوپر اٹھا اور واپس آنے کے لیے فضا میں بیکر کاٹنے لگا۔ بونا نے بھی کشتی کو بڑی پھرتی سے کنارے کی طرف گھمایا۔ اس مرتبہ وہ کشتی کو پانی پر جھکی ہوئی درختوں کی شاخوں تک لے گیا تھا۔

بجلی کاپڑ مرکز گولیاں برسائے بغیر خشکی کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ شاید کشتی کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ بونا نے کشتی کچھ اور آگے لے جا کر انجن بند کر دیا۔

کاپڑ واپس آ رہا تھا اور اس مرتبہ اس کے نیچے سرچ لائٹ جل رہی تھی۔ تیز روشنی کے دائرے نے غاصے وسیع علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہم نے ابھی تک فائرنگ کا جواب نہیں دیا تھا جس سے شاید کاپڑ والے یہ سمجھ رہے ہوں کہ ہمارے پاس ایمونیشن ختم ہو چکا ہے۔

کاپڑ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ اس مرتبہ وہ واپس مڑا تو کافی نیچے تھا۔ وہ لوگ دیر کے اندر کی طرف کنارے کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ ہماری کشتی جھانپوں کے اندر اور درختوں کی شاخوں کے بالکل نیچے تھی۔ ہم دم سادھے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے۔

”وہ رعبہ ان جھانپوں میں۔“ کاپڑ سے ایک چیخنی ہوئی آواز سنائی دی ”واپس موڑو۔ جلدی کرو۔“

کاپڑ ہم سے چند گز آگے نکل چکا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال ابھرا ”ابھی یا پھر کبھی نہیں۔“ میں نے جیتنے ہوئے فائر کھول دیا۔ سونا اور جاگے نے بھی رائفلوں کے دھانے کھول دیے۔ بونا بھی رائفل سنبھال چکا تھا۔ چار آٹو بیک رائفیں ایک وقت چمکناڑی رہی تھیں۔ روشنی کی لکیریں برقی کوندوں کی طرح بجلی کاپڑ کا پیچھا کر رہی تھیں اور پھر نجانے ہم میں سے کسی کی گولی کاپڑ کے فیل ٹینک میں لگی۔

زوردار دھکا ہوا۔ بجلی کاپڑ کے پر پچھ اڑ گئے۔ آگ کا



تہ بڑا کولہ ہوا میں تیرتا ہوا دریا کے وسط میں جاگرا۔  
ہوئے رائے نقل چھوڑ کر کشتی کا کنٹرول وکیل سنہال لیا۔  
اس نے انجن اشارت کیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کشتی کو  
حرکت میں لے آیا۔ کشتی کنارے کے قریب رہ کر تیزی سے  
لوہوں پر چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔  
کئی میل تک ہم کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے  
رہے۔ اس دوران میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آئی  
تھی۔ نہ تو کسی کشتی نے ہمارا تعاقب کیا تھا اور نہ ہی کسی اور  
بیل کا پھرنے۔ ہوا اب کشتی کو دریا کے وسط میں گہرے پانی  
میں لے آیا تھا اور اس کی رفتار بھی بڑھادی۔ وہ گہری نظروں  
سے تاریکی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اب پھر اچانک ہی  
اس نے "ہڑے" کا اتنا زور وار لگو لگایا تھا کہ میں اپنی جگہ  
سے اچھل پڑا تھا۔ جاگتی وغیرہ بھی حیرت سے اس کی طرف  
دیکھنے لگی تھیں۔  
"کیا ہوا ہوا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے

پوچھا۔  
"ہم موت کی وادی سے نکل آئے ہیں۔" ہومانے  
جواب دیا "مؤرخ زون بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ پہاڑی چوٹی  
دیکھ رہے ہیں؟" اس نے بائیں طرف اشارہ کیا جہاں بہت دور  
تاریکی میں لپٹی ہوئی ایک بلند پہاڑی چوٹی نظر آ رہی تھی "وہ  
ماؤنٹ سالوین ہے۔" ہوما کہہ رہا تھا "برما کا سب سے بلند  
پہاڑی سلسلہ جو میلوں دور تک چلا گیا ہے۔ اب ہمیں گولڈن  
ٹرائی اینگل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"  
میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن مجھے اس بات پر  
حیرت ضرور تھی کہ جنرل کھورٹ نے ہمارا پیچھا کیسے چھوڑ دیا  
تھا۔ ہم نے اس کا جتنا نقصان کیا تھا اس کے پیش نظر تو اسے  
دنیا کے آخری سرے تک ہمارا تعاقب کرنا چاہیے تھا لیکن  
بیلی کا پڑکی تباہی کے بعد ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی  
گئی تھی۔

کشتی اب پھر کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی  
تھی۔ میکناک اس خطے کا سب سے بڑا دریا تھا جو تبت کی  
برف پوش چوٹیوں سے شروع ہو کر سیکڑوں میل کا فاصلہ طے  
کرتا ہوا اسیج سیام میں جاگتا تھا۔ یہ دریا کئی ملکوں کے  
درمیان سرحد کا کام بھی دیتا تھا۔ پہلے لاؤس اور تھائی لینڈ پھر  
لاؤس اور گولڈن ٹرائی اینگل اور اب ہم لاؤس اور برما کی  
سرحدوں کے درمیان اس دریا میں سفر کر رہے تھے۔  
تھائی کی لاش کشتی کے فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ ہومانے  
وقت اس لاش ہی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کی بات

غلط نہیں تھی۔ ہم تھائی کی لاش کو ساتھ ساتھ لے کر نہیں پھر  
سکتے تھے۔  
ہومانے کشتی کا انجن بند کر دیا۔ کچھ دور جا کر کشتی رک  
گئی۔ ہومانے اپنے بیگ میں سے ایک چادر نکال کر ہوما کی  
طرف بڑھادی۔ میں نے اور ہومانے تھائی کی لاش کو چادر میں  
پیٹ کر اس طرح گہریں لگا دی کہ چادر کھل نہ سکے اور پھر ہم  
دونوں نے لاش اٹھا کر بڑی آہستگی سے پانی میں اتار دی۔  
کچھ دیر تک سفید چادر پانی کی سطح پر نظر آتی رہی پھر  
آہستہ آہستہ اس میں غائب ہوئی چلی گئی۔ میری آنکھوں سے  
بے اختیار آنسو بہ نکلے۔ ماں باپ کے بعد چاچا پر تاب سکھ  
نے مجھے سہارا دیا تھا۔ وہ نہ رہا تھا تو تھائی آگے آئی۔ اس نے  
مجھے ایک نئی زندگی دی اور بالآخر آج وہ عزیز ہستی بھی مجھ سے  
پھڑکنے لگی۔

ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں تھائی کے لیے دعا مانگ رہا  
تھا۔ مجھے بچائیاں بھرنے دیکھ کر جاگتی نے میرے کندھے پر ہاتھ  
رکھ دیا۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر  
رونے لگا۔ ہوما بھی میرا کندھا تھپتھا رہا تھا۔  
ہم تقریباً پندرہ منٹ تک وہاں رکے رہے۔ ہومانے  
بوٹ کا انجن اشارت کر دیا اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع  
ہو گیا۔

رات بیت گئی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ دریا کے کنارے پر  
جنگل اور پہاڑیاں اب واضح ہونے لگی تھیں۔ ہوما تجسس  
نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ مزید  
سفر کرنے کے بعد وہ کشتی کو برما کی سرحد والی سائڈ پر بالکل  
کنارے پر لے آیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔ وہ  
کشتی کو ان چٹانوں کے اندر ایک تنگ سی کھاڑی میں لپٹا  
چلا گیا۔

یہ کھاڑی آگے جا کر مزید تنگ ہو گئی تھی۔ جسے دونوں  
طرف سے بھٹکے ہوئے مخمخ درختوں نے اس طرح ڈھانپ  
رکھا تھا کہ فضا سے اس کھاڑی کی موجودگی کا پتا نہیں چل  
سکتا تھا۔

"ہم ٹھیک جگہ پہنچ گئے۔" ہومانے کہتے ہوئے انجن بند  
کر دیا۔ کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور بالآخر رک  
گئی۔ ہومانے رسی کا ٹکڑا ایک درخت کی جگہی ہوئی موٹی  
شاخ سے پیٹ کر پھنسا دیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس  
کی طرف دیکھا۔  
"میں سے آگے برما کا ایک سرحدی قصبہ ہے۔"

کیننگ لاپ۔" ہومانے جواب دیا "ایک دو روز اس قصبے  
میں رکنے کے بعد ہم ریاست شان سے ہوتے ہوئے منڈالے  
اور وہاں سے آسام کی طرف نکل جائیں گے۔"  
"آسام؟ یہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔  
"آسام پہلے ایک آزاد ریاست ہوا کرتی تھی لیکن پھر  
حالات کے بدلنے پر بھارت نے اس پر قبضہ کر لیا۔ آسام  
کے باشندوں نے آج تک اس تسلط کو تسلیم نہیں کیا۔ یہاں  
بھارت کے خلاف آزادی کی تحریکیں چلی رہی ہیں۔ ناگا  
قبائل نے تو روز اول ہی سے اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ یہ  
واحد تحریک ہے جو چالیس سال گزرنے کے بعد آج بھی  
پوری شدہ کے ساتھ جاری ہے۔ کچھ خطے پر ان کا قبضہ ہے  
جسے ناگالینڈ کا نام دیا گیا ہے۔ ناگالینڈ کی مسلح مزاحمتی تحریک  
نے بھارت کو ناگالینڈ سے چھوڑا رکھا ہے۔"

"تو تم آسام میں کیسا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔  
"ہو سکتا ہے کچھ عرصہ آسام میں رہنے کے بعد ہم  
بھارت کے میدانی علاقوں کی طرف نکل جائیں۔" ہومانے  
جواب دیا "متم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ تم لوگ اگر چاہو تو کوئی  
روپر کے راستے تھائی لینڈ کا رخ کر سکتے ہو۔ وہ راستہ تمہارے  
لیے بالکل محفوظ رہے گا۔"

"میں دوست۔" میں نے جواب دیا "اب میری منزل  
بھارت ہے اور نہ تھائی لینڈ۔"  
"کیا مطلب؟" ہومانے مجھے گھورا "تو پھر کہاں جانا  
چاہتے ہو؟"

"شاؤلن ٹیبل۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا  
"شاہ وہاں مارشل آرٹس کے بڑے بڑے مایہ ناز ماسٹر  
موجود ہیں۔ میں اس فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔  
اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔"

شاؤلن ٹیبل کے بارے میں میں نے بنگاک میں بہت  
کچھ سنا تھا۔ شاؤلن ٹیبل مارشل آرٹس سے لگاؤ رکھنے والے  
ہر شخص کا خواب تھا۔ ہمارا جے بھی کچھ عرصہ وہاں گزارا  
تھا۔ وہ مجھے شاؤلن ٹیبل بھیجتا چاہتے تھے لیکن میں دارا کے  
چکر میں کچھ ایسا الجھا تھا کہ اس کے علاوہ ہر بات ذہن سے  
نکل ہی گئی۔

مگر کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ جی  
فانگ بھاگ نکلا تھا اور دارا کے بارے میں یقین سے نہیں کہا  
جا سکتا تھا کہ گوئی کھا کر کھد میں گرنے کے بعد وہ ختم ہو گیا تھا یا  
زندہ بچ گیا تھا۔ ویسے میرے خیال میں دارا جیسے لوگ آسانی  
سے نہیں مرتے۔ اگر وہ زندہ بچ گیا تھا تو اس سے کہیں نہ

کہیں آنا سامنا ضرور ہو گا۔  
"شاؤلن ٹیبل۔" ہومانے حیرت سے میری طرف دیکھا  
"لیکن وہاں پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔"  
"اگر میں من گھڑی ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔"  
میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہیں روکوں گا نہیں۔" ہومانے جواب دیا "لیکن  
یہ ایک لمبا سفر ہے۔ بہتر ہے اس لمبے سفر روانہ ہونے سے  
پہلے ایک دو دن ہمارے ساتھ کیننگ لاپ میں آرام کر لو۔  
اس کے بعد روانہ ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا یہ مشورہ مان سکتا ہوں۔" میں  
نے جواب دیا۔

کشتی اس کھاڑی میں چھوڑ دی گئی اور ہم پہاڑیوں میں  
تنگ اور دشوار گزار راستوں پر چلنے لگے۔ یہ سرحدی علاقہ  
تھا یہاں سیکورٹی فورسز سے آنا سامنا ہونے کا اندیشہ تھا  
لیکن ہومانے کہنے کے مطابق اس قسم کا کوئی امکان نہیں تھا۔  
اس علاقے کے قبائلی بھی برما کی حکومت سے برسرِ پیکار تھے۔  
یہاں کسی قبائلی گروپ کو راستے سے آنا سامنا تو ہو سکتا تھا لیکن  
حکومت کی سیکورٹی فورسز سے تصادم کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔  
کیننگ لاپ کوئی قصبہ نہیں، چالیس پچاس گیموں پر  
مشتمل ایک قبائلی بستی تھی۔ ان لوگوں کا تعلق شان قبیلے سے  
تھا۔ یہ برما کا سب سے بڑا قبیلہ تھا اور یہی ان علاقوں میں  
حکومت سے برسرِ پیکار تھی۔

یہ قبائلی جنگ جو ہی نہیں بڑے مسمان نواز بھی تھے۔  
پہلے تو ہمیں گھیرے میں لے لیا گیا اور بعد میں جب پتا چلا کہ  
ہم گولڈن ٹرائی اینگل سے فرار ہو کر آئے ہیں تو انہوں نے  
ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

قبیلے کے سردار کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں تھی لیکن  
اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس نے ہمارے لیے ایک بڑا  
جھونپڑا خالی کر دیا اور ہماری خاطر وہ رات کا سلسلہ شروع  
ہو گیا۔

اس وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ ہم بڑی طرح تھکے  
ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ کھانا کرسو جائیں لیکن سردار  
باتوں کے موڈ میں تھا۔ وہ ایک ہی نشست میں ہمارے بارے  
میں سب کچھ معلوم کر لینا چاہتا تھا۔

ہومانے خود برما کا رہنے والا تھا۔ وہ سردار سے باتیں کرتا رہا  
اور میں چٹائی پر لیٹ کر سو گیا۔  
میری آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ جاگتی وغیرہ سوری  
تھیں ہومانے جھونپڑے میں نہیں تھا۔ میں کچھ دیر تک چٹائی پر لیٹا

رہا اور پھر اٹھ کر جمونڈے سے باہر نکلا۔ سامنے ہی درختوں کے نیچے ایک چوترے پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں یو ما بھی تھا اور نیپلے کا سردار بھی۔ مجھے جمونڈے سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”اوہ! یہیں آجاؤ۔“ بومانے اشارہ کیا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چوترے کے پاس پہنچ گیا۔ میرے لیے جگہ بنا دی گئی اور میں سردار کے قریب بیٹھ گیا اور بیٹھے کے بعد ہی احساس ہوا کہ وہاں مرد ہی نہیں چار پانچ عورتیں بھی تھیں اور ان عورتوں کے جسموں پر لباس پرانے نام ہی تھا۔

اس قبیلے کے لوگ بڑے صمان نواز ثابت ہوئے تھے۔ ہماری خدمت خاطر میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ یہ اگرچہ غریب لوگ تھے لیکن ہمارے آرام و طعام کا بہت خیال رکھتے ہوئے تھے۔ ان کی معیشت کا دار و مدار کھیتی باڑی پر تھا۔ یہ ہماڈوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے میدانوں کا سینہ جبر کرانا پید کرتے۔ چاول ان کی بڑی فصل تھی۔ جو اناج ضرورت سے زیادہ ہوتا وہ قریبی شہروں جاکر بیچ دیتے جس سے ملنے والی رقم سے زندگی کی دیگر ضروریات کا سامان خرید لیا جاتا۔

اس قبیلے میں رہتے ہوئے چار دن ہو گئے۔ اس دوران میں ہی عجیب مصیبت میں گرفتار رہا۔ آنوسی رنگت کی تنگ دھڑنگ عورتیں میرے ارد گرد گھومتی رہیں اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتیں۔ میں اپنی کوئی تعریف نہیں کر رہا تھا ہی کچھ ایسا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب قد، گوری جتنی رنگت اور کسرتی جسم۔ دو تین عورتیں تو ایسی بھی تھیں جو میرے قریب آکر میرے بازوؤں کے مسلز اور سینے کو نزل کر دیکھتیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھنے میں آتی تھی۔

ایسے ہی ایک دو مواقع پر جاگی نے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہ صورت حال یقیناً اسے پسند نہیں تھی۔ وہ ان عورتوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن مجھے یہ کہتی رہی کہ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اس روز بھی شام کو اس نے مجھ سے یہ بات کہی تو میں گھور کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہمیں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“  
”میں اور تم۔ یعنی ہم دونوں۔“ جاگی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ”کیا سمجھتے ہو۔ میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں گی؟“

”میری تو کوئی منزل نہیں ہے جاگی۔“ میں نے کہا ”تم نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اپنا سب کچھ برباد کر لیا۔ اب تم شاید تھائی لینڈ جانا تو پسند نہ کرو لیکن ایک مرتبہ تم نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں بھی تمہارے بہت سے رشتے دار موجود ہیں۔ تم اگر چاہو تو یو ما وغیرہ کے ساتھ جا سکتی ہو۔ یہ لوگ تمہاری اسی طرف جا رہے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ جاگی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ”تمہارا کام ہو گیا تو اب مجھ سے جان چھڑا لینا چاہتے ہو لیکن ایک بات یاد رکھو۔ تھائی کی طرح مجھے موت ہی تم سے جدا کر سکے گی۔“

”تم نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے جاگی۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔“ میں نے کہا ”لیکن میں اب تم لوگوں کو مزید آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ یہ ایک بہترین موقع ہے۔ تم اپنے لیے ایک پرسکون راستے کا انتخاب کر سکتی ہو۔ اگر تم نے میرے ساتھ جانے کی ضد کی تو سونیا بھی۔“

”سونیا کی تم فکر مت کرو۔“ جاگی نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ دی ”وہ یو ما اور ہوفا کے ساتھ جا رہی ہے۔ دراصل اس کے ذہن میں یہ بات میں نے ہی بٹھائی تھی کہ ہمارے ساتھ رہ کر وہ اپنی زندگی برباد نہ کرے۔ وہ اپنی ماں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی تھی سو وہ لے چکی۔ اس کا انتقام پورا ہو گیا۔ ہمارے ساتھ مارے مارے پھرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ وہ ہوفا کے ساتھ ہندوستان چلی جائے۔ وہاں اسے آسانی سے سیٹھ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ ویسے بھی وہ دوا کے پیچے سے بہت مانوس ہو چکی ہے اور وہ اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔“

”اور اس نے تمہاری بات مان لی؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیسے نہ مانتی۔“ جاگی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ”ہمارے ساتھ رہتی تو کتاب میں ہڈی بنی رہتی۔“

”کیا بکواس ہے تم۔“  
”کچھ نہیں کچھ نہیں۔“ جاگی نے جلدی سے میری بات کاٹ دی ”کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو ایسے ہی حاورنا کہہ دیا تھا۔ شاید اس موقع پر مجھے اچھا اور کمنا چاہیے تھا۔“  
”تم نے وہی کہہ دیا جو تمہارے دل میں تھا لیکن تم جانتی ہو۔“

”ہاں بھی۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر میری بات کاٹی ”کوئی عورت بھی اپنی عزت کی اس طرح حفاظت نہیں کرتی ہوگی جس طرح تم۔“

وہ بکواس کرتی رہی لیکن میں اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ مجھے ان کیسے میری نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ میرے ذہن میں سونیا کا خیال ابھر آیا تھا۔ غار میں ہماری وہ آخری رات۔ جب سونیا نے میرا بھرم توڑ دیا تھا۔

”کیا ہوا۔“ میری بات بری لگی کیا؟“ جاگی نے کہا۔  
”اوہ نہیں۔“ میرے خیالات منتشر ہو گئے ”مجھانے کیوں اس وقت تھائی کا خیال آ گیا تھا۔“ میں نے بات ٹالنے کے لیے جھوٹ بولا۔

”تھائی۔“ جاگی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا ”اسے تو ہم زندگی بھر نہیں بھول سکیں گے۔“

اس رات ہم سردار کے جمونڈے میں تھے۔ یہ اس بہتی کاسب سے بڑا جمونڈہ تھا۔ سردار نے ہمیں خاص طور پر رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں قبیلے کا کوئی اور فرد شریک نہیں تھا سوائے سردار کے اپنے گھروالوں کے اور سردار کے گھروالوں میں اس کی تین عدد بیویاں اور چار بیٹیاں شامل تھیں۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ایک بھائی تھا جو عمر میں اس سے دس سال چھوٹا تھا اور سردار کے مرنے کے بعد قبیلے کی سربراہی کا دعوے دار تھا۔ یہ الفاظ دیگر اسے ولی عہد کا مسکا تھا لیکن اس دعوت میں وہ ولی عہد بھی شریک نہیں تھا۔

اور پھر اس دعوت میں یہ یہ طے ہوا تھا کہ یو ما اور سونیا صبح سویرے منڈالے کے لیے روانہ ہو جائیں گے جہاں سے وہ آسام کی سرحد کی طرف نکل جائیں گے۔

کھانے کے بعد میری دیر تک سردار کے جمونڈے میں بیٹھے رہے۔ مجھے وہاں انجمن اس لیے بھی ہو رہی تھی کہ سردار کی تیسری اور نوجوان بیوی مجھ سے چپکلی بیٹھی تھی۔ اس کے اس طرح بیٹھنے پر اگرچہ کسی اور کو اعتراض نہیں ہوا تھا مگر جاگی بار بار مجھے گھور رہی تھی۔

میں اپنے جمونڈے میں آیا تو جاگی بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ اس بہتی میں بیکاری نے بھی مجھے تھکا دیا تھا۔ چٹائی پر لیٹے ہی سو گیا۔

صبح چھ بجے ہمیں جگا دیا گیا۔ یو ما وغیرہ روانگی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ ہم بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ملے۔ سونیا بھی مجھ سے پلٹ گئی تھی۔

”میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔“ وہ میری

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ”وہ چند لمحات تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ میں تمہیں بیش بہا یاد رکھوں گی۔“

میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ میں نے اسے ہانپوں سے پکڑ کر اپنے آپ سے الگ کیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اپنا خیال رکھنا اور ان دونوں کے ساتھ ہی رہنا۔ مجھے یقین ہے تمہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل جائے گا۔“ سونیا کو چھوڑ کر میں یو ما کی طرف متوجہ ہو گیا ”چار سال پہلے تم منڈالے ہی سے بھاگے تھے۔ وہاں کی پولیس تمہیں ابھی تک نہیں بھولی ہوگی۔ ہو سکتا ہے جہول کھوراث نے بھی وہاں اپنے تریاؤ کے اگینٹوں کو تمہارے بارے میں اطلاع دے دی ہو۔ تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔“

”سب کچھ میرے ذہن میں ہے۔“ یو ما نے جواب دیا ”ہم منڈالے جانے کے بجائے موگوک کی طرف نکل جائیں گے اور وہاں سے اچھال کا رخ کریں گے۔ اس کے بعد ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔“

ہم بہتی سے نکل کر تقریباً نصف میل دور تک ان کے ساتھ گئے۔ سردار نے اپنے قبیلے کے دو آدمی ان کے ساتھ کر دیے تھے۔ جو آسام کی سرحد تک ان کے ساتھ جاتے۔

یو ما وغیرہ کے جانے کے بعد میں اس بہتی میں پیو اور وحشت سی محسوس کرنے لگا۔ میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ قبیلے کی چند جوان عورتیں خوں خوار ہلیوں کی طرح مجھے گھورتی رہتی تھیں۔ انہیں میں نے اکثر اپنے ارد گرد منڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے مجھ پر بھجھٹ پڑیں گی۔ ان کی کسی ممکنہ کارروائی سے بچنے کے لیے میں ہر وقت جاگی کے ساتھ چپکا رہتا۔

ہمیں دو دن اور یہاں رہنا پڑا اور وقت کاٹنا میرے لیے محال ہو گیا تھا۔ جاگی کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ہم دونوں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے لیکن سردار کی مرضی کے بغیر جانا ممکن نہیں تھا۔ چھٹی رات ہم نے چوری چھپے بھاگنے کا پروگرام بھی بنایا تھا لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر پکڑے گئے تو مجھانے یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اب تو ہمیں اپنا سامان بنائے ہوئے تھے۔ بھاگنے کی کوشش کی صورت میں یہ کوئی غلط مطلب ہی اخذ کر سکتے تھے اور پھر ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے۔ ہماڈوں میں بہت سے رہنے والے فاکہ۔

اگلے روز میں نے خود سردار سے بات کی اور اس سے

رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔ سردار تو چند روز اور ہمیں اپنا سمان بنائے رکھنا چاہتا تھا لیکن میرے اصرار پر اس نے اگلے روز صبح ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

اور پھر اسی رات وہ ہوا جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد سردار ہمارے جمونپڑے میں آگیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو لڑکیاں مشروبات لے آئیں۔ یہ مشروب ہم روزانہ ہی پیتے رہے تھے۔ لیکن آج اس کا ذائقہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ بڑی مسکراہٹ میں اس میں۔

مشروب پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ نشہ سا چھا رہا تھا لیکن یہ نشہ ایسا نہیں تھا کہ میں مدہوش ہو جاتا۔ اس کے برعکس میرے اندر عجیب سی توانائی پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ دماغ میں ہونے والی سنسنائٹ نے سوجنے بجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر ڈالی تھیں۔ میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس نے چٹائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی لڑکی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں گر گئی۔ سردار اٹھ کر باہر چلا گیا اور اس کے فوراً ہی بعد پانچ چھ لڑکیاں غول بیابانی کی طرح شور مچاتی ہوئی جمونپڑے میں داخل ہوئیں اور پھریوں لگا جیسے وہ سب مجھ سے لپٹ گئی ہوں۔ میرے ہاتھ بھی حرکت میں تھے۔ میں کبھی ایک کو اپنی طرف کھینچتا کبھی دوسری کو۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں مدہوش میں ہوتے ہوئے بھی مدہوش تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا تھا۔ البتہ صبح جب میری آنکھ کھلی تو دماغ پر چھایا ہوا غبار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ جاگتی کو اپنے قریب پیچھے دیکھ کر میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم پر لباس نہیں تھا۔ جاگتی بڑی خشک گیس لگا ہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری نظریں جھک گئیں۔

”یہ پکڑے پکڑے کر باہر آ جاؤ۔ سردار نے کہا ہے کہ ہم ایک سہینے بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ جاگتی نے قریب چٹائی پر پڑے ہوئے کپڑے میری طرف پھینکے اور اٹھ کر چلی گئی۔

میں اٹھ کر جلدی جلدی لباس پہننے لگا اور اس وقت میری نظر جمونپڑے کی دیوار کے قریب سوئی ہوئی ایک بے لباس عورت پر پڑی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں لباس پہن کر باہر آگیا۔ سامنے ہی پانچ چھ عورتوں کے ساتھ جاگتی بھی کھڑی تھی۔ ان عورتوں کے سیاہ ہونٹوں پر

مسکراہٹ تھی اور جاگتی کی آنکھوں میں گویا خون اتر رہا تھا۔ وہ میرا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی سردار کے جھونپڑے میں لے گئی۔

ہم نے ناشتا کیا اور سردار کے ساتھ باہر آ گئے۔ دو ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھے۔ جاگتی نے بیگ کے اعم دونوں کندھوں میں ڈال کر پشت پر لاد لیا اور اپنی رائفل اٹھالی۔ میں نے بھی اپنی رائفل اٹھا کر کندھے پر لٹکائی۔ دونوں آدمیوں نے تھیلوں میں کھانے پینے کا سامان اٹھا لیا تھا۔ ایک تھیلے میں شاید کپڑے وغیرہ تھے۔

”یہ دونوں آدمی سرحد کے اس پار میکا گنگ تمہارے ساتھ جا میں گے۔“ سردار نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس سے آگے تمہاری صوابدقت منحصر ہے کہ تم لوگ اپنا سفر کس طرح جاری رکھتے ہو۔“ تھیلے میں کچھ چیزیں ہیں۔“ اس نے ایک قبائلی کے کندھے لٹکے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا ”یہ چیزیں دریا سے میکا پار کرنے کے بعد تمہارے کام آئیں گی۔“

سردار نے بڑی گرم جوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا۔ خیال تھا کہ اس پاس کھڑے ہوئے سردار اور عورتیں معاہدہ کرنے کے لیے آگے آئیں گے مگر خیریت گزری۔ میں سے کوئی بھی آگے نہیں آیا تھا۔ البتہ ان عورتوں ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جنہوں نے گزشتہ رات مجھے کھوسا تھا۔

ہم ہستی سے نکل کر درختوں میں ایک کشادہ گنڈنڈا چلنے لگے۔ دونوں قبائلی آگے تھے میں اور جاگتی ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ جاگتی کا تھوڑا پھولا ہوا تھا۔ وہ مجھ کوئی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ ناراض ہے اور ناراضگی کی وجہ بھی واضح تھی۔ میں نے فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

ہم دوپہر تک رستے بغیر چلتے رہے۔ مسلسل بلندی طرف چلتے ہوئے ہمارے سانس پھول گئے۔ جاگتی پیٹھ پر ہاتھ رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ پتھروں پر پھسل کر لڑکھڑاہٹ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کچھ کئے۔ میرا ہاتھ تمام لیا اور میرے ساتھ چلتی رہی۔

وہ دونوں قبائلی ہم سے تقریباً بیس گز آگے تھے۔ انہا نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ بس ایک مڑتے ہوئے جاگتی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تو وہ رک پیچھے دیکھنے لگے۔ میں جاگتی کا ہاتھ پکڑے کھینچتا ہوا ان قریب پہنچ گیا۔ جاگتی بڑی طرح ہانپ رہی تھی۔ ان میں۔

ایک قبائلی ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے شان زبان میں پچھ گیا۔ اس کی زبان تو میرے پلے نہیں پڑی لیکن مفہوم سمجھ گیا۔

ہم لوگ ساکوان کے درختوں کے نیچے آگئے۔ جاگی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ٹانگیں آگے کو پھیر رکھی تھیں اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ایک قبائلی نے ہمارے سامنے کھانا رکھ دیا۔ تلا ہوا خشک گوشت اور موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ ہم کئی ٹکٹوں تک مسلسل چلے رہے تھے۔ صبح کا کھانا یا ہضم ہو چکا تھا۔ اس وقت بڑے زور کی ہلک لگ رہی تھی۔

شکم سیر ہوتے ہی سستی طاری ہونے لگی۔ جاگی تو باقاعدہ اوجھنے لگی تھی۔ ہمیں یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ایک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ دونوں قبائلی اپنے بیک سینھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کے پاس تھری ٹائٹ تھری کی پرانی رانٹلیں تھیں۔ آج کے دور میں جہاں ذاتی حفاظت کے لیے بھی جدید ترین اسلحہ استعمال ہو رہا تھا۔ وہاں ان فرسودہ رانٹلوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لیکن بہرحال ان سے بھی کوئی نکتہ نکتہ کسی انسان یا جانور کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

میں نے جاگی کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ ہم میں ابھی تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اپنی جگہ شرمندہ تھا اور اس ندامت میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جاگی خنت ناراض تھی۔ شاید وہ یہ سمجھتی تھی کہ گزشتہ رات جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔

ہم بدستور بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ درخت اب کچھ کم ہوتے جا رہے تھے۔ سنگلاخ چٹانیں تھیں جو دھوپ سے تپ رہی تھیں۔ پیسے سے میرا لباس تر ہو رہا تھا۔ گردن اور پشت پر کچھ سے سے رینگتے ہوئے مٹوس ہو رہے تھے۔ جاگی کی حالت بھی مجھ سے مختلف تھی۔ وہ بار بار بے بس لگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ میں بھی اس کا ہاتھ پکڑے خاموشی سے اسے کھینچتا رہا۔

وہ قبائلی بڑے خنت جان تھے۔ لگتا تھا یہ کھن سفران پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہم سے آگے آگے چلے رہے۔ البتہ اب وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتے تھے۔

سورج پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو چکا تھا اور اندھیرا

پھیلنے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب کہیں پڑاؤ ڈال دیا جائے۔ لیکن وہ قبائلی چلے رہے۔ ان میں ایک توشان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا البتہ دوسرا جینی اور تھاکی بھی باجلی بول لیتا تھا۔ میں نے اسے رکنے کو کہا تو وہ آگے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہاں نہیں۔ کچھ آگے جا کر رکھیں گے۔ وہاں ایک مناسب جگہ ہے۔“

اور اس کا ”کچھ آگے“ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ثابت ہوا تھا۔ اس وقت اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ چٹانوں کے درمیان گھری ہوئی وہ ہموار جگہ تھی۔ جاگی نے بیک زمین پر رکھا اور اسے ٹیکے بنا کر لیٹ گئی۔ وہ واقعی بہت تھک چکی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کھانے میں وہی تلا ہوا خشک گوشت اور موٹی موٹی روٹیاں جو اس وقت تک سوکھ کر بھر پھری سی ہو چکی تھیں۔ شدید بھوک میں یہ کھانا بھی کسی مرمغن غذا سے زیادہ لذیذ ثابت ہوا۔

دونوں قبائلی ہم سے کافی دور جا کر بیٹھ گئے تھے۔ جاگی میرے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی۔

”جاگی۔“ میری آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی ”ناراض ہو؟“

”نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔“ جاگی کے لیے میں، ظور تھا ”میرے سامنے تو بڑے پار سامنے ہو اور گزشتہ رات تم نے جو کچھ کیا اس پر مجھے خوش ہونا بھی چاہیے۔“

”تم سمجھتی ہو کہ وہ سب کچھ میری مرضی سے ہوا تھا۔“ میں نے کہا ”یقین کرو جاگی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔“

”دھوکا تو میرے ساتھ کیا گیا تھا۔“ جاگی بولی ”مجھے مشروب میں کوئی نشہ آور چیز پلا کر بے ہوش کر دیا گیا اور تم رات بھر ان کالی جینگ جینگ چٹیلوں کے ساتھ کچھیرے اڑاتے رہے۔“

”یہ غلط ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میرے مشروب میں بھی کوئی ایسی چیز شامل تھی جس سے میں بے ہوش تو نہیں ہوا مگر دماغ میں سنسناہٹ ہوتی رہی۔ میری سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو کر رہ گئی تھی اور میں ان عورتوں کے ہاتھوں کا کھلا پتار رہا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ایک سازش تھی اور اس سازش میں قبیلے کا سردار بھی شریک تھا۔“

”کیا۔؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں کچھ کہ رہا ہوں جاگی۔“ میں نے جواب دیا ”میں دونوں سے دیکھ رہا تھا کہ پانچ پانچ لڑکیاں جیسے میری ٹانگ میں رہتی تھیں۔ سردار بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اس نے ان لڑکیوں کو کبھی منع نہیں کیا۔ اور گزشتہ رات تم نے بھی دیکھا تھا کہ ان لڑکیوں نے سردار کی موجودگی میں ہم دونوں کو شوب پلائے تھے اور پھر سردار جھوٹے سے باہر چلا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ بھی ہوا سردار کی مرضی سے ہوا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”جیت جیت ہے یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ گزشتہ رات ان لڑکیوں میں سردار کی بیٹی بھی شامل تھی۔“

”ہو سکتا ہے یہ بھی میزبانی کا ایک انداز ہو۔“ جاگی نے کہا۔

”یہ اچھی میزبانی ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیا ”اپنی عزت دوسروں کے قدموں میں ڈال دینا۔ بڑی عجیب بات ہے۔“

”اپنی اپنی ریسیں ہوتی ہیں۔“ جاگی بولی۔

”بہرحال کچھ بھی ہو۔ اب تو ہم انہیں بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“ میں نے کہا ”مجھے خوشی تو اس بات کی ہے کہ تم نے زبان تو کھلی۔ صبح سے منہ پھلائے ہوئے تھیں۔“

”غلط فہمی تھی جو دور ہو گئی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔“ جاگی نے کہتے ہوئے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔

”دیکھو دیکھو۔“ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا ”اب تم خوش فہمی میں مبتلا ہو رہی ہو۔“

جاگی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بیک پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

وہ رات بڑی مشکل سے گزری تھی۔ دن میں دھوپ سے سنگلاخ چٹانیں تپ جانے سے گرمی ہو گئی تھی اور رات کو تیز اور ٹھنڈی ہوائ نے سونے نہیں دیا تھا۔ جاگی اگرچہ سو گئی تھی لیکن بار بار وہ بھی اٹھتی رہی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہمارے چادوں طرف چٹانیں تھیں جن سے ہوا کسی قدر رکی ہوئی تھی۔ اگر ہم کبھی جگہ پر ہوتے تو ٹھنڈ کر ختم ہو جاتے۔

صبح دھوپ نکلنے کے تھوڑی سی دیر بعد ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بلند پہاڑوں میں آڑھے تہیجے راستوں پر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا اور یہ تو کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہیں تھا۔

دھوپ کے لگ بھگ ہم رک گئے۔ آگے بہت ہی خطرناک راستہ تھا۔ ایک طرف بلند عموادی چٹان تھی اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہرے گھڑ اور عموادی چٹان کے

ساتھ وہ راستہ چار فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ہوا بھی بہت تیز تھی۔ کوئی معمولی سی لغزش موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

اس بل صراط کو دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میرے پوچھنے پر اس قبائلی نے بتایا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے یا تو ہم ایک میل پیچھے جا کر وہ راستہ اختیار کر کے جو تقریباً چار ہزار فٹ کی بلندی تک چلا گیا تھا لیکن اس کے دوسری طرف اترنے کے لیے ہمیں اس سے زیادہ خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس قبائلی نے بتایا کہ شان قبیلے کے لوگ چین کی سرحد پار کرنے کے لیے عام طور پر یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔

”سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک ٹھنڈا یہاں آرام کرنے کے بعد ہم یہ راستہ پار کر کے چلے رہے ہیں تو شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے سرحد پر پہنچ سکتے ہیں۔“ قبائلی نے بتایا۔

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس بل صراط نما راستے پر ہم زندگی کی سرحد ہی پار کر جائیں۔“ یہ جملہ جاگی نے کہا تھا۔

”ممکن ہے لیکن ہمارے سامنے صرف یہی ایک راستہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ خود کشی کی کوشش کرنی ہی پڑے گی۔“

”مجبوری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم نے وہیں پر پڑاؤ ڈال لیا۔ ایک قبائلی نے ہمارے سامنے کھانا بھی لگا دیا تھا۔

”بھئی میرا تو کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ جاگی نے کہا ”اس راستے کو دیکھ دیکھ کر ہی میرے سینے میں ہول سے اٹھ رہے ہیں۔“

”کھانا۔ شاید یہ ہماری زندگی کا آخری کھانا ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ بات اگرچہ میں نے مذاق میں کی تھی لیکن جاگی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میرے مجبور کرنے پر اس نے چند لمحے کھالے تھے۔

ہم تقریباً ایک ٹھنڈا وہاں رکے رہے اور پھر اس بل صراط پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہماری رانٹلیں ان دونوں محافظوں نے لے کر اپنے کندھوں پر لٹکائی تھیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان رانٹلوں کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہ ہو۔

سب سے آگے وہ محافظ تھا جو ہماری زبان تھوڑی بہت

سمجھتا تھا۔ اس کے تقریباً دس فٹ پیچھے میں میرے ساتھ جاگتی اور اس سے دس پندرہ فٹ پیچھے دوسرا قبائلی تھا۔ تیز ہوا ہمیں آگے کو دھکے دے رہی تھی۔ ہم عمودی چٹان کے ساتھ چپکے ہوئے چل رہے تھے۔ چٹان پر جا بجا پتھر ابھرے ہوئے تھے اور ہم ان پتھروں پر ہاتھ جمانے ہوئے بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری پشت کھنڈ کی طرف تھی اور ہم اس طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

”آنکھیں بند رکھو اور چٹان کے ساتھ ساتھ چلتی رہو۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔“ میں نے جاگتی کو ہدایت کر دی۔ ہم قدم بقدیم آگے بڑھتے رہے۔ ہوا بہت تیز تھی۔ اگر ہم نے چٹان کے ابھرے ہوئے پتھروں کا سہارا نہ لے رکھا ہوتا تو تیز ہوا ہمیں اٹھا کر لے جیتی۔

مُل صراط نمایاں راستہ تقریباً دو پڑھ سو فٹ طویل تھا۔ ہم تقریباً سو فٹ کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور پھر میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مجھے سینے میں اپنا دل دھتسا محسوس ہونے لگا۔ آگے تقریباً دس فٹ کا راستہ ایسا تھا جس کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے جاگتی کی بات یاد آئی۔ ہم واقعی خوشدستی کی کوشش کر رہے تھے۔ تین فٹ چوڑی کارنس پر سفر کرنا واقعی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا ہمارے قدم اکھاڑ سکتا تھا اور اس جگہ قدم اکھڑنے کا مطلب تھا اذیت ناک موت۔

میں چٹان سے چپکا کھڑا تھا۔ جاگتی نے بھی ایک ہاتھ چٹان کے ایک پتھر پر جما رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا بازو گرفت میں لے رکھا تھا۔

میں اپنے آگے والے اس قبائلی کو دیکھتا رہا جو چٹان سے چپکا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اس پُل صراط سے گزر گیا تو میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔

”آہستہ آہستہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو۔ آنکھیں مت کھولنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ویسے یہ راستہ اتنا زیادہ خطرناک بھی نہیں ہے۔ بس خوف کو دل سے نکال دو اور چٹان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہو۔“

”نہیں۔ میں آگے نہیں جاسکتی۔“ جاگتی کے منہ سے خوف زدہ سی آواز نکلنے لگی۔ خوف سے اس کے ہونٹ بالکل سفید ہو رہے تھے۔

”ہمت سے کام لو جاگتی۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی ”ہمارے سامنے صرف یہی ایک راستہ ہے۔ اب تو ہم واپس بھی نہیں جاسکتے۔ آؤ۔ میرے ساتھ ساتھ آؤ۔ آنکھیں بند رکھو اور چٹان کے ساتھ ساتھ آگے

بڑھتی رہو۔“

میں جاگتی کا حوصلہ تو بڑھا رہا تھا لیکن میری اپنی ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے اس خوفناک راستے کا جائزہ لیا۔ چٹان کے ساتھ ساتھ تو راستہ تقریباً ہموار تھا۔ زیادہ اونچ نیچہ نہیں تھی۔ دو چار جگہوں پر چھوٹے چھوٹے پتھر ابھرے ہوئے تھے۔ البتہ کھنڈ والے کنارے کی طرف پتھر ناموار پتھر نظر آ رہے تھے۔ ان میں کچھ پتھر ایسے بھی تھے کہ کسی پر پاؤں پڑا تو وہ اپنی جگہ سے اکھڑ سکتا تھا۔

میں نے قدم آگے بڑھا دیا۔ ایک ہاتھ ۔۔۔ میں نے چٹان میں ابھرے ہوئے پتھروں کا سہارا لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے جاگتی کی شرت پکڑی تھی تاکہ اسے حوصلہ رہے لیکن اس میں خطرہ ہی تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کا پیر پھسلتا تو دونوں ہی موت کے منہ میں گھٹ جاتے۔

ہم ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھتے رہے۔ ہوا بڑی طرح ہمیں دھکیل رہی تھی۔ جاگتی نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

چھ فٹ کا یہ راستہ مٹیوں پر محیط ہو گیا تھا لیکن بالآخر ہم نے یہ پُل صراط عبور کر لیا۔ اس سے آگے کا راستہ تقریباً چھ فٹ چوڑا تھا۔ جاگتی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

میں اس قبائلی کی طرف دیکھ رہا تھا جو ہمارے بعد آ رہا تھا۔ وہ تقریباً نصف راستہ طے کر چکا تھا۔ ہوا تیز تو تھی ہی لیکن اس نے اچانک ہی جھکڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مجھے دھکا سا لگا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کر بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ جاگتی نے بھی اس جھکڑ کو محسوس کیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور میری ہانوں کو سختی سے پکڑ لیا۔

دوسرا قبائلی بھی میرے قریب ہی بیٹھ چکا تھا اور وہ چیخ بچ کر اپنے سامنے سے کچھ کہہ رہا تھا۔

دوسرا قبائلی دونوں ہاتھ چٹان پر جمائے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور پھر وہ رک گیا۔ اس کے کندھے پر لگی ہوئی راتھل کی نال ایک پتھر کے ساتھ انگ گئی۔ وہ کندھے کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے کر راتھل کی نال ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے ہوا کے ایک زوردار جھونکے نے اسے اپنی ناک سے پلا دیا۔ ایک جھٹکے سے راتھل کی نال بھی اس جگہ سے ہٹ گئی۔ وہ قبائلی لڑکھڑکیا۔

میرے قریب بیٹھا ہوا قبائلی چیخ بچ کر کچھ کہہ رہا تھا۔

تیز ہونے اس قبائلی کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ وہ چٹان پر ہاتھ جمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چٹان سے ٹکرانے والی ہوائ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کا پیر کنارے کے ایک پتھر پر پڑا۔ پتھر اکھڑ گیا۔ نیچے گرتے ہوئے اس نے ایک پتھر ہاتھ جمانے کی کوشش کی لیکن وہ پتھر بھی اکھڑ گیا اور پھر وہ اچانک ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو یہ تک پہاڑوں میں گونجتی رہی۔

جاگتی چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ گرنے والے قبائلی کی چیخ دم توڑ گئی اور پتھروں کا جیسے اچانک ہی سناٹا چھا گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دوسرا قبائلی ذرا سا آگے جھکا کھنڈ میں جھانک رہا تھا۔ میں نے جاگتی کو اپنے آپ سے الگ کیا اور کسی چوہے کی طرح آگے بڑھ کر نیچے جھانکنے لگا۔ سیکڑوں فٹ گہرے کھنڈ میں قبائلی کی لاش کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

ہم چند منٹ وہاں بیٹھے رہے۔ میرے اعصاب میں تاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس حادثے نے ہم سب کو افسردہ کر دیا تھا۔ قبائلی پر اپنے ساتھی کی اندوہناک موت کا زیادہ اثر ہوا تھا لیکن ظاہر ہے ہم اس کے سوگ میں وہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔

وہ راستہ اگرچہ آگے بترج کشفادہ ہوتا چلا گیا تھا لیکن میں اور جاگتی اب بھی چٹان کے ساتھ چپکے ہوئے سے چل رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے ہوا کی تندی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ سامنے سے ہوا کے جھکڑ ہمیں پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ہم اس وقت دراصل ایک درے میں سے گزر رہے تھے۔ اور اس درے میں ہوا کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔

تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ہم اس درے میں سے باہر آ گئے اور ہوا کی تیزی میں بھی کمی آ گئی۔ آگے مسلسل ڈھلان تھی۔ جاگتی میرے ساتھ چپکے چپکے چل رہی تھی اور پھر ایک جگہ رک کر میں نے پیچھے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میزائل اچھل کر طلق میں اُگیا۔ وہ قبائلی دُور دُور تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

”دوسرے قبائلی کہاں گیا؟“ میں نے اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”پیچھے رہ گیا ہو گا۔ یہاں رک کر انتظار کر لیتے ہیں۔“ جاگتی نے اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اور ایک پتھر کے سامنے میں بیٹھ گئی۔

میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ مگر اس قبائلی کا کوئی نامزد نشان دکھائی نہیں دیا۔

”تم نہیں بیٹھو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ کہاں رہ گیا۔“ وہ۔۔۔ میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اس درے کے دبانے تک آیا لیکن وہ قبائلی کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ میں اس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن میں اس کے سردار کا نام لے کر پکارنے لگا۔ میرا خیال تھا وہ جہاں بھی ہو گا میری آواز سن کر آجائے گا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نہ تو وہ قبائلی کہیں نظر آیا اور نہ ہی کہیں سے جواب ملا۔ میری آواز پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی۔ یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں کسی حادثے کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ البتہ ایک دو جگہوں پر دایم بائیں ٹک سے راستے تھے۔ اگر وہ ان میں سے کسی راستے پر نکل گیا تھا تو میرے آواز تو اس تک ضرور پہنچی ہوگی۔ اسے جواب تو دینا پڑے۔

میں جاگتی کے پاس واپس آ گیا۔ وہ پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ میں نے ایک دو آوازیں دیں۔ تب بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تو میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

”کک۔ کیا ہوا؟“ اس نے بدحواس سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

”وہ قبائلی کہیں غائب ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ جاگتی ایک ہنسنے سے سیدھی ہو گئی ”وہ ہمیں ان پہاڑوں میں چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہے۔“

”درے سے باہر آنے تک تو وہ ہمارے ساتھ تھا۔ ڈھلان کی وجہ سے ہم تیز چلنے لگے تھے اور وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔“ میں نے کہا۔

”اگر واقعی ایسا ہوا تو۔۔۔“ جاگتی کسی انجانے خوف کی وجہ سے جمل پورا نہیں کر سکی۔

”بہر حال“ انتظار کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ چٹانوں میں اُدھر اُدھر نکل گیا ہو اور میری آواز بھی اس تک نہ پہنچی ہو۔ میرا خیال ہے راستہ تو یہی ہے۔ اسے اس طرف آنا چاہیے۔“ میں بھی جاگتی کے قریب بیٹھ گیا۔

”اگر وہ نہ آیا تو۔۔۔“ جاگتی بولی ”ہم نہ تو راستے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی چیز ہے۔ میرا مطلب ہے کھانے کا سامان اور راتھل بھی اسی کے پاس ہے۔ اگر وہ واقعی واپس چلا گیا ہے تو۔۔۔“

”ہم ان بہاؤوں میں بھٹکتے رہیں گے اور بھوک پیاس سے اڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیں گے۔ یہی کتنا چاہتی ہو تا۔“ میں نے کہا۔

”تقی بے بسی کی موت ہوگی۔“ جاگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے قدم قدم پر موت سے بچہ لڑایا ہے۔ موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکی لیکن ان بہاؤوں میں۔ ایسی بے بسی کی موت نہیں نہیں۔ میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتی وجدان۔“ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

میں اس کا کندھا چھتھانے لگا ”میں ابھی موت کو مایوسی ہوئی۔“ میں نے کہا ”بہم تھوڑی دیر اس کا انتظار کرتے ہیں پھر خود ہی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں یاد ہے اس نے کہا تھا کہ اگر ہم رکے بغیر چلتے رہیں تو شام تک چین کی سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ یہ راستہ مسلسل خشیب کی طرف جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی بستی مل جائے۔ بات بہت دور حوصلے کی ہے۔ اگر ہم حوصلہ ہار گئے تو زندگی ہار جائیں گے۔“

جاگی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھ سے اپنی خاموش بیٹھی رہی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں رکے میں وقفے وقفے سے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھ لیتا، کبھی قبائلی کو پکارنے لگتا لیکن مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا اور بالآخر ہم اٹھ کر ان اونچے پہاڑوں میں نامعلوم منزل کی تلاش میں چل پڑے۔

یہ ایک کشادہ چمکندہ سی تھی اور لگتا تھا یہ راستہ باقاعدگی سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوئی کہ ایک جگہ چٹان کے قریب راہ کو تنے اور جلی ہوئی لکڑیاں دکھائی دیں۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کسی پارٹی نے ڈاؤ ڈالا ہوگا۔

ایک چٹان کے گرد گھوم کر ہم رک گئے۔ سامنے خشیب میں بہت دور ایک سرسبز وادی نظر آ رہی تھی۔ اس سے ذرا پہلے ایک چمکتی ہوئی لکیر بھی دکھائی دی اور میرے خیال میں وہ کوئی دریا تھا جس کا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔

جاگی بڑی طرح تھک گئی تھی۔ اس کے دل میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ ان بہاؤوں میں ہم راستہ کیسے تلاش کریں گے۔ خشیب میں بھٹی ہوئی وہ وادی دیکھ کر کچھ تسلی تو ہوئی تھی لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہاں سے ہمیں منزل کا کوئی نشان مل جائے گا۔

جاگی ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کم از کم ایک گھنٹا باقی تھا اور میں چاہتا تھا کہ۔۔۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم اس وریا تک پہنچ جائیں لیکن

جاگی کی وجہ سے کچھ دیر وہاں رکتا پڑا۔ آدھا گھنٹا مزید چلنے کے بعد ہمیں پھر رک جانا پڑا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور پہاڑوں میں اندھیرا بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا اور وہ وادی ابھی ہم سے بہت دور تھی۔ اندھیرے میں پرستج اور خشیب دو فراز والے راستے پر اترنا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہم نے دین رکنے کا فیصلہ کر لیا اور میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بالآخر چٹانوں میں ایک کھوہ سی نظر آئی۔ یہ کھوہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن دو تین آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں پہلے بھی لوگ ٹھہرے رہے ہیں۔

جاگی نے بیگ کندھے سے آثار کی ایک طرف پھینک دیا اور کھوہ کے دہانے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اس کے قریب جگہ سنبھال لی اور اب تک کی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ میں بار بار اسی قبائلی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چاکا کی غائب ہو گیا تھا۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ وہ راستہ بھٹک کر کسی اور طرف نکل گیا تھا یا واقعی وہاں چلا گیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا شیزہ ہمیں بھٹکانا پڑ رہا تھا۔ ہم بھوکے پیاسے ان سنگلاخ چٹانوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

وہ پہلے صراطِ خدا راستہ پار کرنے سے پہلے دوپہر بارہ بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا تھا۔ جاگی نے تو صرف چند تھپے ہی لیے تھے۔ اس کے بعد ہم مسلسل پہاڑیوں پر چڑھتے اترتے رہے تھے۔ سب کچھ ہمیں ہو چکا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن میں اس کا ذکر اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جاگی کو بھی یہ احساس ہو جاتا کہ وہ بھوکے ہیں لیکن میری خاموشی اس مسئلے کا حل ثابت نہیں ہوئی کیونکہ کچھ ہی دیر بعد جاگی کی کراہتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”وجدان۔۔۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“  
”بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”لیکن صبر اور برداشت کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“  
جاگی گرا سانس لے کر رہ گئی۔

وقت گزرتا رہا۔ شانے میں ہوا کی سائیں لاس میں دل پر ہیبت سی طاری کر رہی تھی۔ جاگی نے میرے کندھے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں سی خارج ہو رہی تھیں۔ اس کی وجہ وہ شدید خشک تھی جس نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ میرا اور جاگی کا ساتھ کئی برسوں سے تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے کھن سے

سبب حالات کا مقابلہ بڑی مردانگی سے کیا تھا۔ وہ بڑی دلیر اور حوصلہ مند عورت تھی۔ اس نے کئی مرتبہ موت کو ٹھکرتے دی تھی لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ بھوک پیاس اور بے بس۔ ہمارا مقابلہ ایسی چیزوں سے تھا جنہیں صبر برداشت سے ہی ٹھکرتے دی جاسکتی تھی۔

وہ رات بڑی طویل ہو گئی تھی۔ زمین کی گردش جیسے تھم جاتی تھی۔ تاریکی جیسے جیسے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں کبھی اونٹن لگتا اور کبھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھومنے لگتا۔

اور پھر چاکا کی مہ جو تک گیا۔ میں کھوہ کے دہانے کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ پانی کے چند چھینے میرے بازو اور چہرے پر پڑے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ باہر کی طرف پھیلا دیا۔ بارش ہو رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بارش تیز ہو گئی۔ بوچھاڑ کا رخ اسی طرف تھا۔ میں پانی میں بھٹکتے لگا۔ جاگی پر بھی پانی کے چھینے پڑ رہے تھے۔ وہ بھی جاگ گئی۔ ہم کھوہ میں اور اندر کی طرف چلے گئے۔

”اگر پانی اندر آ گیا تو کیا ہو گا؟“ جاگی نے خوف زدہ سے لیے میں کہا۔

”اس کا دہانہ زمین سے کافی اونچا ہے اور ویسے بھی سامنے ڈھلان ہے۔ ایسی جگہوں پر پانی نہیں رکتا۔ تم سوا جاؤ۔“  
”میں ہی میں کچھ وقت کٹ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

جاگی نے زمین پر لیٹ کر میری گود میں سر رکھ لیا لیکن وہ بار بار اٹھ جاتی۔ بارش کا خوف، بھوک اور تھکن اسے بے چین کیے ہوئے تھی لیکن بالآخر وہ سو گئی۔

میں باہر تاریکی میں گھورتا رہا۔ بارش نے طوفانی شکل اختیار کر لی تھی۔ تیز ہوا سے بارش کا شور دل پر خوف سا طاری کر رہا تھا۔ اسی کھوہ کے سامنے ڈھلان پر بارش کا پانی منڈور ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹوں تک موسلا دھار بارش جاری رہی اور پھر اس کا زور ٹوٹ گیا۔ میں اس کھوہ کے سامنے بیٹے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا جس کی روانی اور تندی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی، اگر یہ ندی اسی طرح بہتی رہی تو ہمارا اس کھوہ سے ٹکنا مشکل ہو جائے گا۔

میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ یہ مسلسل جاگے رہنے کا نتیجہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

آہستہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا

اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ جاگی کھوہ کے دہانے پر بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ سامنے والی ڈھلان پر پانی اب بھی بہہ رہا تھا لیکن بہت کم اور ہلکا۔

”اب نکلویں اسے وجدان۔“ جاگی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں کچھ کھانے کو مل سکے۔“

اور پھر چند منٹ بعد ہم اس کھوہ سے نکل آئے۔ اس مرتبہ بیگ میں نے اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔ ہم اس ڈھلان راستے پر چلتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جاگی نے لڑکھانا شروع کر دیا۔ میں اسے سہارا دے کر کھینچتا رہا اور پھر جیسے ہی ہم ایک چٹان پر سے گھوم کر دوسری طرف آئے۔ میں جو تک گیا۔ خشیب میں بہت دور ایک جگہ سے دوھوئیں کی لکیر سی اٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

”جاگی۔ وہ دیکھو۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا ”وہ دوھواں یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہاں کوئی بستی ہے۔ بہت سے کام لو۔ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔“

جاگی نے اس طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

”بہت دور ہے۔ شاید کئی میل دور۔“ وہ کراہی ”مجھ سے اب ایک قدم نہیں چلا جا رہا۔ بھوک اور تھکن سے۔۔۔“  
”بہت سے کام لو جاگی۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ”تم تو بڑی حوصلہ مند ہو۔ بڑی بڑی سمیٹوں کا مقابلہ کیا ہے تم نے۔ یہ بھوک کیا چیز ہے۔ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔ کھن ترین مرحلہ تو گزر گیا۔ وہ جگہ اگرچہ دور ہے مگر ایک امید تو پیدا ہوئی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم یوں کرتے ہیں۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا ”کچھ دیر یہاں بیٹھ کر آرام کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم رکے بغیر چلتے رہیں گے۔“

ہم دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ جاگی نڈھال ہو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم بھاک میں اور چٹانک۔۔۔ میں تھے تو کھانے میں ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو وہ چیخ مارتے تھے۔ وہ کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ وہ دنیا کا بہتر سہرا برداشت کر سکتی ہے لیکن بھوک اس سے برداشت نہیں ہوئی تھی اور اب تو چوبیس گھنٹوں سے زیادہ گزر چکے تھے اور وہ ان چوبیس گھنٹوں میں ہی برسوں کی تیار نظر آنے لگی تھی۔ چہرے پر زردی، آنکھوں میں دیرانی اور ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔



بندرہ میں منٹ آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ رات کی دھواں دھار بارش کی وجہ سے پہاڑیوں میں کئی چھوٹے چھوٹے ندی نالے معرض وجود میں آگئے تھے۔ ان کی وجہ سے کچھ دشواری پیش آرہی تھی۔ بعض نالے تو ہم پھلانگ لیتے اور بعض اتنے چوڑے تھے کہ انہیں پار کرنے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں لہا چکر کاٹنا پڑتا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم نشیب میں پہنچ گئے اور پھر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ جس جگہ سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تھا وہ جگہ اب بھی ہم سے میلوں دور تھی اور ایک سمت بڑے نالے نے ہمارا راستہ روک رکھا تھا۔ اس نالے کا پانی چالیس پچاس فٹ سے کم نہیں تھا۔ یہ غالباً وہی تالا تھا جسے پہاڑی چوٹی پر سے میں دیرپا سمجھا تھا۔

پانی بہت گہرا اور بہت تیز تھا اور ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں سے تالا پار کیا جاسکتا۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔ وہ روپائی ہو رہی تھی۔

”اب کیا ہوگا؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے مایوسی تھی۔

”آؤ اس طرف چلتے ہیں۔ شاید کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سے یہ تالا عبور کیا جاسکے۔“ میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم ہماؤ کے مخالف سمت میں چلتے رہے۔ آگے درختوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ڈھانی تین سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم رک گئے۔ کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔ جاگی درختوں کے نیچے ایک پتھر بیٹھ گئی۔ وہ پیٹ پکڑے دہری ہوئی جاری تھی۔ میں اس کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر ایک درخت کی جھلی ہوئی شاخ پر نگاہ پڑتے ہی میں اچھل پڑا۔ اس درخت پر آڈو کی طرح کے زور رنگت کے پھل لگے ہوئے تھے۔

”جاگی وہ دیکھو۔“ میں نے درخت کی جھلی ہوئی شاخ کی طرف اشارہ کیا ”وہ پھل۔ شاید ہماری بھوک کا بندوبست ہو جائے۔“

میں نے اچھل کر اس شاخ کو پکڑ کر نیچے سمجھ لیا اور ایک پھل توڑ کر چیکھا تو اس میں ہلکی سی ترشی بھی مگر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھایا جاسکتا تھا۔ میں نے تین چار پھل توڑ لیے اور جاگی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”لو۔ اسے کچھ کر دیکھو۔“ میں نے ایک پھل اس کی طرف بڑھا دیا۔

جاگی نے وہ پھل میرے ہاتھ سے چھین لیا اور دانٹوں سے کاٹ کر کھانے لگی۔ وہ پھل خوش ذائقہ نہیں تھا تو آڑا بھی نہیں تھا۔ اگر یہ پھل کڑوا بھی ہوتا تو شاید تب بھی نہ چھوڑتے۔

ہم نے ان پھلوں سے پیٹ تو بھر لیا لیکن اس کا نتیجہ آدھے گھنٹے بعد ظاہر ہوتا شروع ہوا۔ میرے پیٹ میں باکباک درد ہونے لگا۔ جاگی بھی پیٹ پکڑے ہوئے تھی۔ یہ شاید اس پھل کا اثر تھا یا خالی پیٹ زیادہ کھانے کی وجہ سے درد شروع ہو گیا تھا مگر یہ درد قابل برداشت تھا۔

دائیں طرف جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی سن کر میں چونک گیا اور پھر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ دو خرگوش تھے اور ان کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جاگی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پتلون کا پانچا اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ اس وقت ایک خرگوش نے ہماری طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا ہا پھر ہمیں بے ضرر سمجھ کر گھاس پر منہ مارنے لگا۔

میں خنجر والا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا اور اچانک ہی خنجر میرے ہاتھ سے نکلا اور اس خرگوش کی طرف لپکا جس نے کچھ دیر پہلے ہماری طرف دیکھا تھا۔ خطرہ بھانپتے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن خنجر اس کے جسم میں ترازو ہو گیا۔ دوسرا خرگوش جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میں دوڑ کر جھاڑیوں میں پہنچ گیا۔ خنجر اس خرگوش کے آریار ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر تعبیر پڑتے ہوئے اس کی شہ رگ پر دھار پھیر دی۔ خرگوش نے آخری دو تین لمحوں کے لیے اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں اسے ٹانگ سے پکڑ کر جھلاتا ہوا واپس آگیا اور جاگی کے قریب ہی گھاس پر رکھ دیا۔

”یہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو اس کی کھال اتار تا ہوں۔ اس دوران میں کچھ کنڈیاں جمع کرلوں۔“ میں نے کہا اور ادھر ادھر گھوم کر خشک جھاڑیاں جمع کرنے لگا۔

گزشتہ رات کی بارش سے سوکھی ہوئی جھاڑیاں بھی بیٹی ہوئی تھیں لیکن بہر حال کوشش کر کے انہیں جلایا جاسکتا تھا۔ جاگی کے بیک میں ایک لائٹر موجود تھا جو اس وقت ہمارے کام آگیا۔

جاگی جھاڑیوں کو آگ لگانے کی کوشش کرنے لگی اور میں خرگوش کی کھال اتارنے لگا۔ کھال اتار کر میں نے آلائش نکال کر ایک طرف پھینک دیں اور گوشت کے ٹکڑے کیے بغیر اسے دریا کے پانی سے دھویا۔

جھاڑیوں کی شاخیں بھینکی ہوئی تھیں۔ جاگی بڑی مشکل سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھانے کی جگہ پر پہنچا۔ دھوئیں سے اس کی ناک اور آنکھوں سے پانی بہ نکلا تھا۔

خرگوش بھونے جانے کے دوران میں اس گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو میرے نتھنوں سے کمراتی رہی اور بالآخر ہمارا کھانا تیار ہو گیا۔ بغیر نمک ماسلے کے خرگوش کا بھنا ہوا گوشت اس قدر لذیذ تھا کہ بس مزہ ہی آگیا۔ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے پہلے میں نے اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔ جاگی بھی مکرار ہی تھی۔

اگرچہ ہم نے پہلے پیٹ بھر کر وہ ترش پھل کھائے تھے لیکن ہماری بھوک خرگوش کا گوشت کھانے کے بعد ہی مٹی تھی اور ترش پھل کھانے سے پیٹ میں جو درد شروع ہوا تھا وہ بھی حیرت انگیز طور پر ختم ہو گیا۔

اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سورج غروب ہو جاتا اور اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے تو ہمیں تالا پار کرنے کا راستہ تلاش کرنا تھا یا پناہ کی کوئی جگہ جہاں رات گزارا جاسکتی۔

ہم درختوں سے نکل کر واپس اسی جگہ آگئے جہاں پہاڑی سے اترے تھے۔ یہاں پتھروں میں ایسی جگہ موجود تھی کہ ہم بیٹھ کر رات گزار سکتے تھے۔

سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی بتدریج بڑھتی گئی۔ میں نے سراخا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس وقت اگرچہ آسمان بالکل صاف تھا لیکن پہاڑی علاقوں کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ بادل نہ چھا جائیں۔ بارش ہو جانے کی صورت میں ہمارے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

پیٹ بھرنے کے بعد جاگی بھی اس وقت کچھ چمک رہی تھی لیکن یہ خوف بدستور... دامن گیر تھا کہ اگر وہ دریا نما تالا پار کرنے کا راستہ نہ ملا تو کیا ہوگا؟

”کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا۔“ میں نے کہا ”وہیے بھی اب ہمیں کیا پریشانی ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے خرگوش اس علاقے میں کثرت مل جائیں گے۔ جب تک کوئی راستہ نہ ملے گا ہم انہیں شکار کر کے کھاتے رہیں گے۔“

”عجب بات ہے۔“ جاگی بولی ”دنیا جدید ترین دور سے گزر رہی ہے اور ہم لگتا ہے پتھروں کے دور میں لوٹ آئے ہوں جب انسان جانوروں کا شکار کر کے پیٹ بھرتا تھا اور عمارتوں میں رہتا تھا۔“

”سادہ جدت طرائیاں شہروں اور بڑی بستیوں تک

محدود ہیں۔“ میں نے کہا ”ان ترقی یافتہ آبادیوں سے دور پہاڑوں اور جنگلوں میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو دنیا کی نئی روشنی اور جدید تہذیب سے قطعی نا آشنا ہیں۔ ان کا اپنا معاشرہ ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ اس کی مثال تم دیکھ چکی ہو۔ ہم تقریباً ایک ہفتہ اس بستی میں رہے ہیں۔ وہاں کی تنگ دھڑنگ عورتیں اور ان کا ماحول۔ کوئی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ بھی جدید ترین ٹیکنالوجی کے دور میں رہ رہے ہیں حالانکہ ان کے اور ترقی یافتہ مذہب بستیوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔“

”ان کی قوت ہی مت کرو۔“ جاگی کے لیے میں تکنیکی تھی ”میں نے وہاں جو کچھ بھی دیکھا تھا اس سے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی غیرت ہی مرچیں ہے۔ انہیں بے حیائی اور بے شرمی کا کوئی احساس ہی نہیں۔“

”بات غیرت اور احساس کی نہیں ہے جاگی۔“ میں نے کہا ”مذہب بستیوں میں کوئی غیر مرد کسی عورت کی طرف میلی نظروں سے بھی دیکھ لے تو خون کی ندیاں بہ جاتی ہیں لیکن یہ لوگ اس احساس سے عاری ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ رشتوں کا تقدس کیا ہوتا ہے۔ افریقہ، جنوبی امریکا اور دنیا میں بہت سے ایسے خطے اب بھی موجود ہیں جہاں تہذیب کی روشنی نہیں پہنچی۔ لوگ جمالت کی تاریکی میں رہ رہے ہیں۔ وہ لوگ تو لباس نام کی کسی چیز سے بھی واقف نہیں ہیں۔ تہذیب اور رشتوں کے تقدس کو کیا سمجھیں گے۔“

”ہاں۔ یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“ جاگی نے گہرا سانس بھرا۔

”تو پھر یہ طے ہو گیا تاکہ اس رات میرا کوئی تصور نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”اب بند کرو یہ کیواس۔“ جاگی نے میرے بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔ میں سی کر رہ گیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات دھیرے دھیرے بتیج رہی۔ حشرات الارض کی آوازیں اور تیز ہوا کی سانسیں سانسیں دل پر خوف سا طاری کر رہی تھیں۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جاگی نے گزشتہ رات کی طرح اس وقت بھی میری گود میں سر رکھ لیا تھا۔ میرے دل میں ایک انجانا سا خوف تھا لیکن رات خیریت سے گزر گئی۔ نہ موسم کے متوریدے اور نہ ہی جاگی کی ذہنی رہنمائی۔

صبح ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے ادھر ادھر گھوم کر دو خرگوش شکار کیے اور سوکھی ہوئی جھاڑیاں جمع کر کے لگا۔

نگوڑا ناشتا کر کے ہم پھر اپنی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔

اس بار ہم نالے کے ہماڑ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ دوپہر ہو گئی مگر ہمیں نالا بار کرنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ جاگتی تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔

”تم بیٹیں بیٹھو۔ میں ذرا اور آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی راستہ مل گیا تو واپس آکر تمہیں لے جاؤں گا۔“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں۔۔۔ یہاں اکیلی۔۔۔“ جاگتی کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

”میاں ویرا نے میں کس بات کا خطرہ ہے۔“ میں نے کہا ”کسی انسان کا تو دور دور تک نام و نشان نہیں اور خرگوش کے سوا ایسا کوئی جانور بھی نظر نہیں آیا جس سے کوئی خطرہ محسوس ہو۔ ویسے تمہارا پستول کہاں ہے؟“

”بیک میں رکھا ہے۔“ جاگتی نے کہا ”ٹھیک ہے۔ تم باؤ۔ میں یہاں بیٹھی ہوں مگر واپس آجاتا۔ ایسا نہ ہو اس قبائلی کی طرح تم بھی غائب ہو جاؤ۔“ وہ بیک میں سے پستول نکال کر چیک کرنے لگی۔

میں نے بھی جیب سے پستول نکال کر اسے چیک کر کے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور نالے کے کنارے پر ہماڑ کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً دو فرلانگ کے بعد وہ تیز رو نالا پہاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ میں پھر دو تک آگے چلا اور پھر رک گیا۔ آگے راستہ خاصا خطرناک تھا۔ میں چند لمحوں پہاڑ کھڑا رہا اور پھر مڑ کر واپس چل پڑا۔

مجھے آنے جانے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا اور میں اس جگہ پہنچا تو جاگتی غائب تھی۔ میں ادھر ادھر گھوم پھر کر اسے دیکھتا رہا۔ آواز میں بھی دیر مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا!

میں ٹنگوں کی طرح چاروں طرف دوڑتا اور جاگتی کو بکارتا رہا لیکن کسی طرف سے جواب نہیں ملا۔ جاگتی اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان نے اچک لیا ہو۔

ہم تین دن سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ اس دوران میں نہ تو کسی انسان کا نام و نشان نظر آیا اور نہ ہی کوئی خطرناک جانور دکھائی دیا تھا جس کے بارے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا تو پھر جاگتی کہاں غائب ہو گئی۔ جاگتی کے پاس تو پستول بھی موجود تھا۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ فائر بھی کر سکتی تھی لیکن وہ تو خاموشی سے غائب ہو گئی تھی۔ جیسے اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان پہاڑوں میں کہاں جاسکتی ہے؟

میں ایک پتھر پر بیٹھ کر کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ اس اچانک صورت حال نے مجھے بڑی طرح بدحواس کر دیا تھا۔

اور پھر اچانک ہی فائر کی آواز میں کر میں اچھیل پڑا۔ میں چھلانگ لگا کر اپنی جگہ سے کئی کز دور ایک پتھر کی آڑ میں جا کر آ گیا۔ میرا خیال تھا وہ گولی کسی طرف سے مجھ پر ہی چلائی گئی تھی۔ میں نے پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا اور تڑپتی ہوئی ایک اپنی جگہ سے حس و حرکت پر اب اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ گولی کس طرف سے چلی تھی۔

ایک منٹ گزر گیا لیکن کسی طرف سے نہ کوئی آہٹ سنائی دی اور نہ ہی کوئی نقل و حرکت محسوس ہوئی تھی۔ میں محتاط انداز میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا ہوا ایک اور پتھر کے پیچھے چلا گیا اور پھر اسی لمحے پہاڑیوں ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھیں۔

میرے منہ سے گھبراہٹ سانس نکل گیا۔ فائر کیس دور سے ہوا تھا لیکن آواز ایسی بھی جیسے قریب ہی سے گولی چلائی گئی ہو۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پتلون کی آڑ سے نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے ہماری طرح کوئی اور بھی پہاڑیوں میں اس طرف آگیا ہو۔ اس نے جاگتی کو اکیلے بیٹھے دیکھا تو اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ ہو سکتا ہے وہ اکیلے نہ ہو ان کی تعداد دو یا اس سے زیادہ ہو اور اس وقت جاگتی کو مدافعت کا موقع نہ ملا ہو لیکن اب موقع پاکر وہ ان کے شائبے سے بھاگ نکلی تھی اور اپنے دفاع میں گولیاں چلائی تھیں۔

میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ گولی کس طرف سے چلی تھی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آسکا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک فائر کر دیا۔

میرے ایک فائر کے جواب میں پہاڑیوں نے تڑپا ہٹ کی آواز سے گونج اٹھیں۔ آٹومیک رائفل کا پورا برست چلا گیا تھا۔

اس فائرنگ سے مجھے سمت کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن یہ سوچ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا کہ جاگتی واقعی کسی مصیبت میں پھنس چکی ہے۔ اس کے پاس پستول تھا۔ پہلے دو فائر پستول ہی کے تھے لیکن یہ فائرنگ آٹومیک

رائفل سے کی گئی تھی۔ جس سے میرے خدشات کی تصدیق ہو رہی تھی۔

یہ فائرنگ اسی طرف ہوئی تھی جہاں وہ نالا پہاڑیوں میں داخل ہوا تھا۔ میں نے خاشا اس طرف دوڑ پڑا اور پھر ایک چوٹی کی چٹان پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگادی لیکن یہ گولی مجھ پر نہیں چلائی گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار گھبراہٹ سانس نکل گیا۔

وہ ہماڑی چوٹی تقریباً ایک ہزار فٹ بلند تھی اور جاگتی اس چوٹی پر کھڑی سرخ رنگ کا کوئی کپڑا ہمارا ہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا جس نے قبائلی لباس پہن رکھا تھا۔

میں چند لمحے اسی طرف دیکھتا رہا پھر اس چٹان سے اتر کر پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں خاصا محتاط تھا۔ جاگتی بظاہر ٹھیک نظر آ رہی تھی لیکن یہ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے مجھے پھانسنے کے لیے جاگتی کو اس طرح سامنے لایا گیا ہو۔

میں محتاط انداز میں پہاڑی پر چڑھتا رہا۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کی نظروں میں کم سے کم آؤں۔ مجھے جب موقع ملا میں اوپر دیکھ لیتا۔ جاگتی اس آدمی کے ساتھ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

کسی پہاڑی پر بالکل سیدھا چڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے مجھے کئی مرتبہ طویل چکر کاٹنے پڑے تھے۔ ایک جگہ ٹرک کر میں نے پھر اوپر دیکھا۔ اب جاگتی کے ساتھ دوسرا آدمی بھی صاف نظر آ رہا تھا اس کا چہرہ دیکھ کر میرے منہ سے ایک بار پھر گھبراہٹ سانس نکل گیا۔ وہ وہی قبائلی تھا جو دونوں پہلے غائب ہو گیا تھا۔

ہمارے درمیان تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ قبائلی تو وہیں کھڑا رہا اور جاگتی دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئی اور پھر اسی لمحے میں نے دو اور آدمیوں کو پچھلی طرف سے پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو چونک گیا۔ میں نے ایک دم پستول والا ہاتھ سیدھا کر لیا تھا۔

”گولی چلا نا۔“ جاگتی نے دور ہی سے چیخ کر کہا ”یہ مارے سا کی ہیں۔“

میں اُسکے بڑھ گیا۔ جاگتی کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں سرخ رنگ کی کٹی ٹرٹ تھی جو اس نے یک میں سے نکالی تھی۔

”میرے سب کیا ہے۔ تم وہاں سے کیوں غائب ہو گئی

تھیں اوس۔ اور یہ کیسے ملا۔ وہ دونوں آدمی کون ہیں؟“ میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

”دیر نہ۔“ جاگتی مسکرائی ”سانس لے لو۔ اس طرف آ جاؤ۔ درختوں کے سائے میں۔ آرام سے بیٹھ کر بتاتی ہوں۔“

ہم پہاڑی کے دوسری طرف آ گئے۔ جہاں درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ وہ دونوں آدمی دلچسپ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جبکہ اس قبائلی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات تھے۔

میں ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تیز سانس لیتا رہا۔ جاگتی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ قینوں آدمی بھی ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے تھے۔

”یہ کیا قصہ ہے؟“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔

”تمہارے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹہ بعد ان قینوں کو اچانک ہی اپنے سامنے دیکھ کر میں بدحواس سی ہو گئی تھی۔“ جاگتی بتانے لگی ”پھر اپنے اس گام کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ یہ لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف نکل آئے تھے۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ تم نالا بار کرنے کے لیے راستے کی تلاش میں اس طرف گئے ہوئے ہو تو انہوں نے کہا تم یقیناً اسی جگہ پہنچو گے جہاں یہ مجھے لے جانا چاہتے تھے۔“

وہ چند لمحے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”وہ نالا بار کرنے کا راستہ انہی پہاڑیوں میں ہے۔ نالے کے ساتھ ساتھ جاتے تو بقل ان کے ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ اس طرف سے آگے جانے کا راستہ نہیں تھا اس لیے ہم پہاڑیوں کے اوپر سے نکل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم آگے جا کر ہمیں تلاش کر لیں گے لیکن تم ہمیں نہیں ملے۔ کلاں پر مگر گر گئی۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر واپس جا کر تم نے مجھے وہاں نہ پایا تو یقیناً پریشان ہو گے اس لیے اپنی موجودگی سے آگاہ کرنے کے لیے میں نے وہ وقت وقفے سے فائر کے جواب میں تمہاری طرف سے بھی فائر ہوا تو مجھے تسلی ہوئی۔“

”تمہیں وہاں نہ پا کر تو میرا دماغ گھوم گیا تھا۔“ میں نے کہا ”لیکن یہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟“ میں نے اس قبائلی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔“ جاگتی نے کہا ”اسے اپنے ساتھی کے مرنے کا دکھ تھا اور اس بات کا بھی افسوس تھا کہ اس کی لاش کو جانور کھا جائے گا اور یہ اسے جانوروں کی خوراک بننے سے بچانا چاہتا تھا۔ اگر ہم سے کچھ کہتا تو شاید ہم ٹیکٹوں فٹ گہرے اس کھد میں اترنے سے

انکار کر دیتے۔ یہ سوچ کر وہ خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے نہ پا کر ہم کسی لمحہ رک کر اس کا انتظار کریں گے لیکن ہم اصل راستے سے آگے بہت آگے نکل گئے تھے اور ہمیں بہت دیر بعد اس کی عدم موجودگی کا خیال آیا تھا۔

”یہ اپنے ساتھی کی لاش کو چھوڑ کر واپس آیا اور ہم تک پہنچنے کے لیے دوڑا تا رہا۔ اس درے سے نکلنے کے بعد ہم توجہ دے آگے تھے جبکہ اصل راستہ واپس طرف تھا۔ بہر حال، یہ اس راستے پر بہت آگے نکل گیا اس لیے ہماری آوازیں اس تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ وہ خود بھی ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ اس دوران میں شام ہو گئی اور یہ کہیں رکنے کے بجائے اس طرف سے ٹالا پار کر کے دوسری طرف جنگل میں واقع اس بستی میں پہنچ گیا۔ وہ بستی بھی یہاں سے تقریباً پانچ میل دور ہے۔ آج وہ بستی کے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر ہماری تلاش میں اس طرف آیا اور اس مرتبہ عقل مند یہ کہ یہ لوگ اس درے کے دبانے پر پہنچ گئے اور وہاں سے اندازہ لگایا کہ ہم کس طرف گئے ہوں گے۔ اس طرح یہ لوگ مجھ تک پہنچ گئے۔ اگر یہ لوگ ہمیں تلاش نہ کر پاتے تو شاید ہم زندگی بھر ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے اور کسی آبادی تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔“

”تمہیں وہاں نہ پا کر میری توجہ جان نکل گئی تھی۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ بہر حال، وہ راستہ یہاں سے کتنی دور ہے؟“ ”میں ابھی وہاں تک نہیں پہنچی لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ جاگتی کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہمیں اٹھتے دیکھ کر وہ قبائلی اور اس کے دونوں ساتھی بھی اٹھ گئے۔ وہ دونوں بھی قبائلی ہی تھے لیکن ان کا تعلق برا سے نہیں جچیں کے کسی سرحدی قبیلے سے تھا۔ ان کے نہ صرف لباس بلکہ چروں کے نقوش بھی مختلف تھے۔ ان کے پاس لمبی لمبی لٹھیاں تھیں جن کے ایک سرے پر لمبے لمبے سوئے لگے ہوئے تھے۔ یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ یہی ان کے دفاعی ہتھیار تھے اور انہی سے وہ جنگی جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ میری رائے قبائلی کے پاس تھی۔

جاگتی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر ہم زندگی بھر ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے تو بھی وہ راستہ تلاش نہ کر پاتے۔ جو وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم چنانوں میں ایک ٹنگ سے راستے پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے ہمارا ساتھی قبائلی تھا۔ اس کے پیچھے میں اور

جاگتی اور آخر میں دوسرے دونوں آ رہے تھے۔ آگے جا کر وہ ٹنگ سا راستہ بھی بند ہو گیا۔ ہم چنانیں تھیں۔ میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تشویش تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ان خطہ عمودی چنانوں پر چڑھنا پڑے گا لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہمارا ساتھی قبائلی ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے جا کر ہو گیا۔

میں اس پتھر کے پیچھے پہنچا تو عمودی چنان میں نے اور تک ایک ٹنگ سی دراڑ نظر آئی۔ لگتا تھا جیسے یہی چنان رہی ہوگی لیکن شاید کسی زلزلے کی وجہ سے نور دو حصوں میں تقسیم ہوئی تھی۔ دونوں چنانوں کے درمیان ڈھائی تین فٹ کا خلا تھا۔

قبائلی اس ٹنگ سی دراڑ میں داخل ہو کر آگے بڑھا۔ میں اور جاگتی بھی اس کے پیچھے ہی دراڑ میں گھسے۔ ہم دونوں آگے ہو کر چل رہے تھے۔ جاگتی میرے پیچھے اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تو سینے میں سانس ہوا محسوس ہونے لگا۔ دونوں چنانیں اوپر سے ایک دور سے ملتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ روشنی کی ایک لہر سانسوں میں کاٹا جاتا اور ٹوکوں پر لاد کر کن منگ روانہ کر دیا سی لکیر بھی جو دور تک چلی گئی تھی۔

یہ دراڑ تقریباً پچاس گز طویل ثابت ہوئی۔ اس اختتام پر ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ آگے ڈھلان تھی اور ساتھی نے بتایا تھا کہ وہ پہاڑی ٹالا پار کرنے کے بعد جچیں کی ڈھلان کے اختتام پر وہ ٹالا تھا جو پہاڑیوں میں ٹھونکے ہمارے سامنے سے گزر رہا تھا۔

یہاں نالے کا پات دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں اندرونی علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ کنارے بالکل عمودی تھے۔ پانی کی رفتار بہت تیز تھی۔ یہاں گہرائی بھی یقیناً بہت زیادہ تھی۔ درختوں کے دونوں میل تک گئے جنگل میں سفر جاری رہا پھر جنگل بند رہا۔ چھ دریا سنے ایک دوسرے سے ملا کر نالے پر رکتے ہوئے تھے۔ ہوتا چلا گیا۔ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ تھا لیکن یہ پہاڑیاں کام دے رہے تھے۔ ان دونوں تنوں کو ملا کر بھی ان کا زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان پہاڑیوں پر درخت تو اکا دکا ہی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

ہمارا ساتھی قبائلی تو بڑے اطمینان سے اس پہاڑیوں کے انکشاف بعد میں ہوا کہ یہی ان کے دفاعی ہتھیار تھے اور انہی سے وہ جنگی جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ میری رائے قبائلی کے پاس تھی۔

جاگتی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر ہم زندگی بھر ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے تو بھی وہ راستہ تلاش نہ کر پاتے۔ جو وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم چنانوں میں ایک ٹنگ سے راستے پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے ہمارا ساتھی قبائلی تھا۔ اس کے پیچھے میں اور

کیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کسی چوہے کی طرح آگے بڑھتی رہی اور بالآخر دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ جنگل میں وہ بستی آٹھ میل سے بھی زیادہ دور تھی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے۔ چھ سات جھوپڑے تھے۔ اس بستی میں رہنے والوں کی تعداد پچیس چھپیس افراد پر مشتمل تھی جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ چینی ہی تھے۔ ان کی زبان خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ میں اگرچہ میٹروپولیٹن زبان اچھی طرح سمجھتا اور بول بھی سکتا تھا لیکن میٹروپولیٹن مذہب لوگوں کی شہتہ اور سلیس زبان تھی۔ اس میں بڑی فکرتھی تھی جبکہ اس بستی کے لوگ جو زبان بولتے تھے، اسے چینی کی کمال زبان کہا جاسکتا تھا۔ بگڑے ہوئے لہجہ کی بگڑی ہوئی زبان۔

یہ میلوں دور تک پھیلا ہوا مہاگنی کا جنگل تھا۔ فرنیچر کے لیے یہ دہائی بہترین لکڑی سمجھی جاتی تھی۔ اس جنگل میں اس جیسی چھوٹی چھوٹی بستانیں تھیں۔ یہ لوگ درخت کاٹ کر لکڑی بیچ کرتے تھے۔ مینے میں ایک مرتبہ ٹرک آتے جو کئی ہوئی کڑیاں ایک بڑی بستی میں پہنچا دیتے جہاں آرا مشینیں ہوا محسوس ہونے لگا۔ دونوں چنانیں اوپر سے ایک دور سے ملتی ہوئی تھیں وہاں ان تنوں کو ضرورت کے مطابق مختلف سے ملتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ روشنی کی ایک لہر سانسوں میں کاٹا جاتا اور ٹوکوں پر لاد کر کن منگ روانہ کر دیا سی لکیر بھی جو دور تک چلی گئی تھی۔

یہ دراڑ تقریباً پچاس گز طویل ثابت ہوئی۔ اس اختتام پر ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ آگے ڈھلان تھی اور ساتھی نے بتایا تھا کہ وہ پہاڑی ٹالا پار کرنے کے بعد جچیں کی ڈھلان کے اختتام پر وہ ٹالا تھا جو پہاڑیوں میں ٹھونکے ہمارے سامنے سے گزر رہا تھا۔

یہاں نالے کا پات دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں اندرونی علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ کنارے بالکل عمودی تھے۔ پانی کی رفتار بہت تیز تھی۔ یہاں گہرائی بھی یقیناً بہت زیادہ تھی۔ درختوں کے دونوں میل تک گئے جنگل میں سفر جاری رہا پھر جنگل بند رہا۔ چھ دریا سنے ایک دوسرے سے ملا کر نالے پر رکتے ہوئے تھے۔ ہوتا چلا گیا۔ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ تھا لیکن یہ پہاڑیاں کام دے رہے تھے۔ ان دونوں تنوں کو ملا کر بھی ان کا زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان پہاڑیوں پر درخت تو اکا دکا ہی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

ہمارا ساتھی قبائلی تو بڑے اطمینان سے اس پہاڑیوں کے انکشاف بعد میں ہوا کہ یہی ان کے دفاعی ہتھیار تھے اور انہی سے وہ جنگی جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ میری رائے قبائلی کے پاس تھی۔

جاگتی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر ہم زندگی بھر ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے تو بھی وہ راستہ تلاش نہ کر پاتے۔ جو وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم چنانوں میں ایک ٹنگ سے راستے پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے ہمارا ساتھی قبائلی تھا۔ اس کے پیچھے میں اور

جو کھانا بیچ آیا وہ رات کے لیے سنبھال کر رکھ دیا گیا۔ ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے اور کہیں رکے بغیر سفر کرتے ہوئے شام سے ذرا پہلے دیا نے میکاگ پر پہنچ گئے۔ یہ دیرا تبت سے اور تھاگلا ماؤنٹین نام پہاڑی سلسلے میں کہیں سے بہنا شروع ہوا تھا اور جنوبی چین کے کیڑوں میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ’برا‘ تھائی لینڈ‘ لاؤس اور کمبوڈیا کے علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ساتھ ساتھ چائنا سی میں جا کر آتا تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں چینی ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ بستی بھی چند جھوپڑوں پر مشتمل تھی۔ ہمارے چینی قبائلی ساتھی تقریباً ایک گھنٹے تک سردار کے جھوپڑے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان کی بگڑی ہوئی زبان تو میری سمجھ میں نہ آ سکی لیکن یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ ان میں ہمارے ہی حوالے سے کوئی بحث ہو رہی تھی۔ اس بحث کے دوران میں بوڑھا سردار بار بار ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

بالآخر ان کی بحث ختم ہو گئی۔ بری قبائلی وہاں سے اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ چھ دیر تک بڑی گہری نظروں سے جاگتی کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے جاگتی کو اس طرح گھورتے دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھنکا۔

”گلیا بات ہے۔ کس بات پر بحث ہو رہی تھی۔“ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں سے چند میل آگے میکاگ کے کنارے پر ہی چلی نام کا شہر ہے۔“ قبائلی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ جگہ اگرچہ سرحد سے میلوں دور ہے لیکن غیر قانونی طور پر لوگوں کی آمد رفت جاری رہتی ہے۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والے عام طور پر ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تلاش میں پولیس بھی ان بستیوں کے چکر لگاتی رہتی ہے اور دریا میں بھی پیٹرولنگ ہوتی رہتی ہے۔ یہ دریا پار کر کے ہی جچیں کے اندرونی علاقوں تک پہنچا جاسکتا ہے اس لیے پولیس کی زیادہ توجہ اس دریا اور اس کے کنارے پر آباد چھوٹی چھوٹی بستیوں پر رہتی ہے۔ کسی بستی سے جب کوئی آدمی پکڑا جاتا ہے تو اس کے ساتھ بستی والوں کی بھی شامت آجاتی ہے اس لیے بستی کا سردار تم لوگوں کو رات یہاں رکھنے کو تیار نہیں البتہ وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ آدھی رات کے بعد تم لوگوں کو کشتی پر دریا پار کر دیا جائے لیکن۔“

”لیکن کیا۔؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔

”آگے تم لوگ اس طے اور اس لباس میں سفر نہیں کر سکو گے۔“ اس نے جواب دیا ”ہمارے سردار نے تم لوگوں کے لیے کچھ چیزیں دی تھیں جو اب اگلے سفر میں تمہارے کام آئیں گی۔“ وہ اپنا تھکا ہوا لہجہ باندھتا تھا کہ بری ہستی کے سردار نے روانہ ہوتے وقت مجھ سے کوئی ایسی بات کہی تھی۔ اس نے تھیلے میں سے ایک اور تھیلہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں زبردنگ کی چادریں اور کچھ اور چیزیں تھیں ”اب تم لوگ ہتھکڑوں کے روپ میں سفر کرو گے۔ ان ممالک میں ہتھکڑوں کا ہی ایک ایسا طبقہ ہے جسے کچھ سولتیں اور مراعات حاصل ہیں۔ یہ سیلانیوں کی طرح ملکوں ملکوں گھومتے رہتے ہیں۔ انہیں پاسپورٹ اور ویزے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سے کچھ پوچھا بھی نہیں جاتا اور یہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے ان حلیوں میں تو تم لوگ دیر پا کرتے ہی پکڑے جاؤ گے مگر ہتھکڑی بن کر آزادی سے سفر کرتے رہو گے لیکن۔“

”لیکن کیا۔؟“ میں نے ایک بار پھر اسے گھورا۔ وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس دوران میں سردار نے آواز دے کر ایک عورت کو جھونپڑے میں بلالیا۔ اس سے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ عورت نے بھی جاگتی کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔ ”کیا مسئلہ ہے اور تم اس طرح جاگتی کو گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

”تمہاری اس ساتھی کے بال کاٹنے پر میں نے اسے اور اسے لباس بھی اس طرح پہننا پڑے گا کہ اس کا جسم نمایاں نہ ہو سکے۔“ قبائلی نے جواب دیا۔

میرے منہ سے گمراہی نکل گیا۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جاگتی کو بار بار اس طرح گھور کر کیوں دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب بھی میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ بدھ مذہب میں عورتیں ہتھکڑی بن سکتیں اور اگر ہمیں آزادی سے سفر جاری رکھنا تھا تو جلدی بدلنا ضروری تھا۔ جاگتی کے بال تو کٹ سکتے تھے لیکن اس کا جسم۔ وہ کم بخت جسم کے ہلالی حصے سے کچھ ایسی صحت مند تھی کہ اس کی یہ صحت مندی پہلے بھی مسئلہ بنی رہی تھی اور اب بھی مسئلہ بن سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“ میں نے

کرن اٹھکیوں سے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ قبائلی اٹھ کر سردار اور اپنے ساتھیوں کے پاس چلا۔ رات کا کھانا ہم نے سردار کے جھونپڑے ہی میں کھا۔ اس سے پہلے میں جاگتی کو سمجھا رہا تھا کہ اسے اپنے کی قربانی دینی ہوگی۔ جاگتی کو اپنے لیے بالوں پر بڑا فخر تھا۔ بنکاک میں تو وہ اپنے بال کھلے رکھتی تھی جو اس کی کمر تک جھولتے رہتے تھے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کھانا پر کبھی بھی آمادہ نہ ہوتی لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی۔

کھانے کے بعد وہ عورت جسے پہلے سردار نے بلایا۔ قبائلی کا دیا ہوا تھیلہ اور جاگتی کو لے کر کسی دور جھونپڑے میں چلی گئی اور ایک گھنٹے بعد جب جاگتی میرے سامنے آئی تو میں بمثل اپنا قدمہ ضبط کر سکا تھا۔ اس گھنٹے میں جو جانے سے اس کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ زبردنگ لباس، بلکہ چادر اس طرح اس کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ نواہت کے نشان بڑی حد تک دب گئے تھے۔

مجھے شے دیکھ کر جاگتی رو ہنسی سی ہو گئی۔ وہ عورت واپس لے آئی تھی۔ میں نے بھی اپنے قبائلی گائڈ سے بال کٹوا لیے اور رنگ کی وہ چادر لپیٹ لی۔ مجھے ہتھکڑوں کی طرح چادر پہننا چاہی۔ ہمارا راج کے پاس رہتے ہوئے میں طویل عرصے تک یہ لباس استعمال کیا تھا۔ قبائلی نے کچھ دھمکیاں بھی میرے حوالے کر دی تھیں جس میں یہ کہہ لیا کہ تمہیں جو سفر میں کسی وقت ہمارے کام آسکتی تھیں۔ رات ایک بجے کے قریب ہم روانگی کے لیے ہو گئے۔ قبائلی گائڈ نے میری رائفل میری طرف ہاتھ میں چوبک گیا۔

”کسی ہتھکڑی کے پاس اس قسم کا خطرناک اسلحہ نہ چاہیے۔“ میں نے کہا ”یہ رائفل تم میری طرف سے سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔“

قبائلی کی ہاتھیں کھل گئیں۔ وہ چائنا کی رائفل ہم بہت قیمتی تھی۔ اگلے سفر کے دوران میں اس رائفل سے خود کوئی ہمارے لیے مصیبت بن سکتی تھی اس لیے اس سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اپنی حفاظت کے لیے میرے اور جاگتی کے پاس پتول موجود تھے جو ہم نے لباس میں چھپا لیے تھے۔ میرے پاس پتلی پر چڑھے سے بندھا ہوا خنجر بھی تھا۔

وہ بادیانی کشتی تھی جو مای گیری کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں میکانگ کی روانی میں تندی تھی لیکن یہ میدان علاقہ تھا۔ یہاں بڑا پرسکون تھا اسی لیے یہاں مای گیری بھی ہوتی تھی۔ پچھلے عام طور پر آدھی رات کے بعد ہی نکلے تھے۔ دیر میں اور کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں جو مختلف سمتوں میں رواں تھیں۔

ہماری کشتی پر ہمارے علاوہ پانچ آدمی اور تھے جن میں اس ہستی کا سردار بھی تھا۔ اس جگہ دیر کا پٹ ہزار میٹر سے کم نہیں تھا۔ گہرائی بھی زیادہ تھی کشتی بلی رفتار سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھتی رہی۔

دوسرے کنارے پر بھی گھاٹ سا بنا ہوا تھا۔ کشتی اس گھاٹ کے ساتھ رک گئی۔ ہمارے ساتھ سردار بھی کشتی سے اتر آیا۔ وہ کچھ دور تک ہمارے ساتھ چلتا رہا پھر ایک جگہ رک گیا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہاں کی میل تک کوئی باقاعدہ آبادی نہیں ہے لیکن اس طرف تقریباً ایک میل آگے ایک اسٹوپا ہے جہاں تم لوگ رات بسر کر سکتے ہو۔ اس سے تقریباً بیس میل آگے نوون نامی گاؤں ہے۔ وہاں سے آگے جانے کے لیے تم لوگوں کو کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔“

میں نے سردار کا شکریہ ادا کیا۔ سردار نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیر کی طرف چل پڑا۔ میں اور جاگتی اسے اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ اپنی کشتی پر نہیں پہنچ گیا تھا اور پھر کشتی سے یہ حرکت میں آئی ہم بھی مڑ کر اس راستے پر چل دیے جس طرف سردار نے اشارہ کیا تھا۔

جھاڑیوں سے اٹا ہوا چھوٹا میدان تھا اور وہ راستہ بھی غیر ہموار تھا۔ جاگتی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ہم دونوں اس راستے پر چلتے رہے۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں بار بار ٹھوکر لگ رہی تھیں۔

وہ اسٹوپا واقعی ایک میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ صرف اسٹوپا ہی نہیں تھا اس سے چند گز آگے ایک مختصر سی عمارت بھی تھی جو تاریکی میں ڈھلے ہوئی تھی۔

اسٹوپا خاص طرز تعمیر کی حامل اس عمارت کو بارہ دری کا نام بھی مناسب ہوگا۔ چھتری نما گول چھت جسے وسط سے ایک بڑے اور اطراف سے چھوٹے ستونوں نے سمارا دے رکھا تھا۔ چھتری زمین کی سطح سے دو فٹ بلند اور بہت کشادہ چوڑا تھا۔ اگرچہ ٹکڑے کے تین چار بیچ بھی رکھے ہوئے تھے مگر وہ سب ٹوکے ہوئے تھے۔ فرش بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔

جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال پر کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ چین، جاپان، براہ اور تھائی لینڈ وغیرہ میں لاتعداد اسٹوپا اور چھوٹا نما عمارتیں موجود ہیں۔ یہ عمارتیں ویرانوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایسی عمارتیں حکومت یا محترم حضرات تعمیر کروا کر رکھول جاتے ہیں اور یہ ان ہتھکڑوں کے آرام کے کام آتی ہیں جو سیلانیوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔

وہ مختصر سی عمارت اسٹوپا سے پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ میں اور جاگتی اسی طرف بڑھ گئے۔ مختصر سا بڑا تھلا اور دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے دروازے اور چھوٹیں غائب تھیں۔ میں نے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں سے جاگتی والا لٹرن نکال لیا۔ پہلے میں ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی ناگوار بو کا بھکا میرے نچھوڑے سے نکلا۔ لاٹرن کی روشنی میں وہ کمرہ کسی بیت الخلاء کا منظر پیش کر رہا تھا۔

دوسرے کمرے کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ ہم دوبارہ اسٹوپا میں آگئے اور ایک ایسے بیچ پر بیٹھ گئے جو زیادہ ٹھنڈا ہوا نہیں تھا۔ اس وقت تین بجے والے تھے۔ جاگتی نے میرے کندھے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تو جلد ہی سو گئی مگر میں جائنٹا رہا اور تاریکی میں گھورتا رہا لیکن میں بھی زیادہ دیر تک نیند کا مقابلہ نہیں کر سکا اور میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر سویا ہوں گا لیکن پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سورج پوری آب و تاب کے ساتھ میری آنکھوں کے عین سامنے چمک رہا ہو۔ ایک لمبے کوٹو کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ میری آنکھیں چند سیانگی تھیں۔ میں بلیکس جھپک جھپک کر سامنے تیز روشنی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا اور پھر اچانک ہی میرے دماغ میں جھپکا سا ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے سورج نہیں چمک رہا تھا بلکہ وہ ٹارچ کی تیز روشنی تھی جس نے میرے چہرے کو اپنے طے میں لے رکھا تھا۔

جاگتی کا سراس وقت میری گود میں تھا۔ اس کے سینے پر سے چادر سر کی ہوئی تھی۔ مجھے فوراً ہی ایک اور احساس ہوا۔ میں نے جاگتی کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ وہ بھی ایک جھنجکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک لمبے کوٹو وہ بدحواس سی رہی پھر اس نے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ٹارچ کے عقب سے ایک خزانہ بوئی آواز سنائی دی۔ زبان اگرچہ چینی ہی تھی مگر تھل فٹم تھی۔

”پانی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ کون ہو تم لوگ؟“

”ہمارے لباس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہم کون ہیں؟“ میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔  
”نہیں۔“ اس آواز نے جواب دیا ”تم لوگ وہ نہیں جو نظر آ رہے ہو۔ یہ عورت ہے اور کوئی عورت بھکشو نہیں ہو سکتی۔“

جاگتی نے جلدی سے چادر سے اپنا سینہ ڈھانپنے کی کوشش کی مگر اس کا راز تو اسی وقت کھل گیا تھا جب وہ میری گود میں سر رکھے سوری تھی اور ٹارچ کی روشنی نے ہم دونوں کو چلتے میں لے رکھا تھا۔

”یہ درست ہے کہ عورت بھکشو نہیں ہو سکتی لیکن یہ عورت مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اس نے یہ روپ دھار لیا ہے لیکن تم۔“

”تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دوسرا ہاتھ روشنی میں اُٹھایا۔ اس ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر ٹارچ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ”میرے سامھی چند منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ہم بہت دنوں سے ایک عورت کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن تم ہی الحال اپنا تھیلا میرے حوالے کر دو۔“

”ہمارے پاس دولت نہیں ہے ہم تو غریب لوگ ہیں۔“

”تھیلا مجھے دے دو۔“ وہ غریبا۔  
میں نے گلے میں لٹکا ہوا تھیلا اتار کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں خنجر اور ظاہر ہے وہ تھیلا ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔  
”تھیلا اس طرف پھینک دو۔“ اس نے خنجر والے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میرا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ تھیلا اس کے خنجر والے ہاتھ پر لگا۔ تھیلے میں کچھ چیزیں تھیں اور ان کا دو کلو کے لگ بھگ وزن تھا۔ تھیلا اس شخص کی کلائی سے ذرا پیچھے لگا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تارکی میں جا گرا۔ وہ شخص بھی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی۔

میں نے اسے حرکت میں لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے پیلو میں زور دار سائیکل رک رید کر دی۔ وہ ہلپلا تا ہوا نیچے گرا۔ ٹارچ بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گئی تھی۔ میں نے ایک اور کنگ لگا دی۔ وہ پیچھے لڑھک گیا لیکن اس مرتبہ وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کے ساتھ ہی

اس نے ٹانگ چلا دی۔ اس کے پیر کی ٹھوک میری پٹن کی بائیں پر لگی۔ میں لڑکھڑکیا اور جیسے ہی نیچے جھکا اس کی دوسری ٹھوک میری ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ یہ ٹھوک اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھی مگر میرا جیڑا بل کر رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ عام لڑیا اور بزن قسم کا آدمی ہوگا لیکن جس طرح اس نے دو دار کیے تھے اس سے اندازہ ہوا کہ وہ مارشل آرٹس کے داؤ بیچ بھی جانتا ہے۔ میری ذرا سی غفلت مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اور پیروں کی پوزیشن لے کر مخصوص اسٹانس بنالیا۔ میں نے لیفٹ کنگ لگائی جسے اس نے ہاتھ سے روکا۔ میں نے دوبارہ لیفٹ کنگ لگانے کے لیے پیر اور اٹھایا۔ اس نے کنگ روکنے کے لیے پھر ہاتھ کو حرکت دی لیکن میرا لیفٹ کنگ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں پوری قوت سے دائیں پیر پر اچھلا اور اس کے ساتھ ہی ہوا میں گھوم گیا۔ یہ اسبٹن کنگ کا خطرناک حملہ تھا جس سے بچنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ میری کنگ اس کے بائیں کندھے کے جوڑ پر لگی۔ وہ چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر چبوترے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں بھی مارشل آرٹ کے کچھ داؤ بیچ جانتا ہوں اس لیے اس نے راہ فراری میں عافیت سمجھی تھی۔

میں نے بھی سنبھل کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ جان چکا تھا کہ جاگتی بھکشو نہیں عورت ہے اور یہ راز جان لینے کے بعد اس کا بھاگ جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً دو قدم آگے تھا اور دائیں طرف مڑتا ہوا جھاڑیوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں دوری سے اس پر چھلانگ لگانے کی سوچ رہا تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شخص چیخا ہوا منہ کے بل گرا۔ میں ایک ہٹلے سے رک گیا۔

جاگتی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں پستول۔ گولی اس نے چلائی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور آگے بڑھ کر اس شخص کو دیکھنے لگا۔ وہ جھاڑیوں میں اونداھڑا ہوا تھا۔ گولی اس کی پشت پر بائیں طرف لگی تھی اور میرا خیال تھا کہ گولی گوشت کو چیرتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ گئی تھی ورنہ وہ اتنی جلدی بے حس و حرکت نہ ہو جاتا۔

”اگر یہ بھاگ جاتا تو ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت نہ ہوتی تھی۔“ جاگتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس

کے لہجے میں کسی قدر جھجک سی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ میں اس کی اس حرکت پر ناراضگی کا اظہار کروں گا۔

”ہمت اچھا کیا تم نے۔ میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں بھی اس کا مہی حشر کرتا۔“ میں نے کہا ”بہر حال“ اب فوراً ہی یہ جگہ چھوڑ دینی ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے ساتھی چند منٹ بعد یہاں پہنچنے والے ہیں اور تم اپنا خیال رکھو۔ کہیں اور ایسی کوئی مصیبت نہ ہو جائے۔“

”تم اسے مصیبت کہتے ہو۔“ جاگتی نے مجھے گھورا ”میں تو عورت کا حسن ہے اور پھر میرے بس میں تو نہیں۔“

”ہمت بے شرمی کی باتیں کرنے لگی ہو۔“ میں نے بھی اسے گھورا ”عورت کا حسن ہی اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ اس لیے۔“

”کاش!“ جاگتی نے گمراہ سانس لیا ”مار دھاڑ کے علاوہ تمہارے دل میں کچھ اور بھی ہوتا۔“

”اب نکل چلو یہاں سے۔“ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں دوبارہ چبوترے پر آ گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے اپنا تھیلا تلاش کیا۔ ایک طرف خنجر بھی پڑا ہوا نظر آیا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ٹارچ بجھا کر میں نے تھیلے میں ڈال لی تھی۔ یہ ہمارے کام کی چیز تھی۔

ہم اسٹوپا سے نکل کر جھاڑیوں میں پگھڑندی پر چلنے لگے۔ سردار نے اشارے سے بتایا تھا کہ اس اسٹوپا سے آگے کا راستہ ہمیں پودوں نامی گاؤں تک پہنچا دے گا۔ یہ چونکہ ایک باقاعدہ پگھڑندی تھی اس لیے میرا خیال تھا کہ یہی راستہ ہمیں اس گاؤں تک لے جائے گا۔ ہم دونوں تیز تیز چلتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم رک گئے۔ جاگتی کی سانس پھول گئی تھی۔ ہمیں وہاں بیٹھنے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ کچھ آوازیں سن کر چونک گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے گھوڑے دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے ہوں۔ میں جاگتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا جھاڑیوں میں لے گیا۔

آوازیں ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں نے جھاڑیوں میں سے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چار مرد سوار تھے جو ہمارے سامنے سے گزر گئے۔ مجھے سمجھے میں دیر نہیں لگی کہ یہ چاروں اس آدمی کے ساتھی تھے جسے ہم ٹھکانے لگا آئے تھے اور میرے خیال میں یہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ یہ چار ڈاکو تو کتنا سوار تھے اور وہ آدمی پیدل تھا جو اپنے ساتھیوں سے پہلے وہاں پہنچ گیا

ہوگا۔  
وہ کھڑے سوار جیسے ہی ہماری نگاہوں سے اوچھل ہوئے ہم بھی جھاڑیوں سے نکل آئے اور تیز رفتاری سے پگھڑندی پر چلنے لگے۔

صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا مگر ہم رکے بغیر چلتے رہے لیکن بالآخر جاگتی کی بہت جواب دے گئی۔ میں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف پانچ سے ہٹ کر چند درخت نظر آ رہے تھے۔ ہم جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے ان درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔

سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن آسمان پر بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں پھیلی تھی۔ ٹھوڑی دیر مزید آرام کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اب تک ہم نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا اور پودوں نامی وہ گاؤں ابھی کتنی دور تھا۔

ڈھانچا تین گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ آگے ایک دم ڈھلان شروع ہو گئی تھی اور خشیب میں ہر طرف سبز ہی سبز نظر آ رہا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خوشگوار مہک رہی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ خشیب میں دھان کے کھیت تھے اور فضا میں وہ مہک بھی دھان کی تھی۔

ہم ڈھلان پر اترتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ کھیتوں میں ہمیں زیادہ نہیں چننا پڑا۔ دائیں طرف کھیتوں میں کشادہ راستے پر ایک گھوڑا گاڑی آتے دیکھ کر ہم رک گئے۔ وہ دراصل ایک چنچڑا تھا جس کے آگے خنجر جتا ہوا تھا۔ چنچڑے پر مویشیوں کے لیے چارالدا ہوا تھا۔ اوپر آگے کی طرف ایک کاشکار بیٹھا ہوا تھا جس نے خنجر کی گام تھام رکھی تھی۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا پتلون نیا جامد اور بغیر آستین کی بنیاد تھی جس کے منہ کھلے ہوئے تھے اور اس کا سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ سر ٹخنوں کا بہت چوڑے پیچھے کا بیٹ تھا۔ اس کاشکار کا برہنہ سینہ دیکھ کر جاگتی اپنے سینے پر چادر درست کرنے لگی۔

چنچڑے پر پیچھے چارے کے کٹھوں پر نو دس سال کی عمر کا ایک بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی چوڑے پیچھے کا بیٹ تھا۔ میں نے راستے کے بیچ میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ میں ایسا نہ بھی کرتا تو وہ کاشکار چنچڑا روک لیتا۔ چنچڑا رکے ہی کاشکار چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر باری باری ہماری طرف دیکھا۔ اس نے کچھ کہا بھی تھا لیکن میں مطلب نہیں سمجھ سکا۔ البتہ میں نے پودوں کا

نام لے دیا تھا۔ کاشکار نے ہمیں چمکڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

میں نے پہلے جاگی کو چمکڑے پر سوار ہونے میں مدد دی پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ اس دوران میں کاشکار بھی اپنی جگہ پر آچکا تھا۔ اس نے لگام کو ہتھکڑا دیا۔ خیر چل پڑا۔

پودوں دو ڈھائی میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ گاؤں ڈیڑھ پونے دو سو گھروں پر مشتمل تھا لیکن وہ چمکڑا گاؤں میں داخل ہونے کے بجائے دائیں طرف مڑ گیا اور ایک طویل چکر کاٹ کر گاؤں کے دوسری طرف ایک..... خانقاہ کے سامنے رک گیا۔

کاشکار عقل مند آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی ہتھکڑا کو کس جگہ پھنسا چاہیے۔

چمکڑا چلا گیا۔ میں مڑ کر خانقاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بیرونی دیواروں پر جچی ہوئی کالی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ عمارت خاصی قدیم ہے اور اس کی دیکھ بھال پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

عمارت کے سامنے تقریباً تین فٹ اونچا کشادہ چبوترہ تھا۔ ہم چبوترے پر بیٹھے ہی تھے کہ دو ہتھکڑی مرکزی دروازے سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ دونوں بڑی خشکیوں لگا ہوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے صاف ظاہر تھا کہ انہیں ہماری آمد پسند نہیں آتی تھی۔

”کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟“ ایک نے آگے بڑھتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔ یہ جملہ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا تھا۔ وہ ہمارے چہرے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ ہم چینی نہیں ہیں اور شاید چینی زبان بھی نہیں سمجھتے ہوں گے۔ ”ہمیں یہ تو یاد نہیں رہا کہ ہم کہاں سے چلے آئے اور کہاں کہاں سے گزرے ہیں۔ لیکن ہماری منزل ابھی دور ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ویسے ایک ہتھکڑی سے یہ سوال پوچھنا بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ ہتھکڑی تو سیلائی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی منزل۔“

”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”لیکن ایک بات یاد رکھو۔ یہ واٹ کوئی قیمتی خانہ نہیں ہے۔ تمہیں زیادہ دنوں تک رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

”پریشان مت ہو سگھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہتھکڑی ایک دوسرے کو پیش سگھی کہہ کر مخاطب کرتے تھے اس کے ترش رویے اور کھری کھری باتوں سے میں

سمجھ گیا تھا کہ یہاں ان کا طوعے ماندے کا کام چل رہا تھا اور وہ اس میں کسی کی شراکت براشت نہیں کر سکتے تھے ”ہم تو لمبے راستے کے مسافر ہیں۔ آج کا دن آرام کرنے کے لیے رک گئے ہیں۔ رات یہاں گزار کر اگلے روز صبح سویرے ہی یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔“

”ایک بات کا خیال رکھنا۔“ اس نے گھورتے ہوئے کہا ”یہاں کے لوگوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرو گے۔ آؤ۔ میں تم لوگوں کو کرا دیکھا دوں جہاں تم لوگوں کو رات بسر کرنی ہے۔“

وہ ہتھکڑی تو مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور اس دوران میں میں نے محسوس کیا تھا کہ دوسرا ہتھکڑی عجیب سی نظروں سے جاگی کو گھور رہا تھا۔

ہم ان دونوں کے ساتھ عمارت کے مرکزی دروازے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک ہال تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چار فٹ اونچے ٹکریٹ کے ایک چبوترے پر مہماندہ کا ایک سمت بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

ایک راستہ اس ہال کے دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف۔ وہ دونوں ہتھکڑی بائیں طرف والے راستے سے ہوتے ہوئے ہمیں ایک کمرے میں لے آئے۔

”تم لوگ اس کمرے میں رہو گے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ آج کا دن اور رات گزارنے کے بعد کل صبح سویرے تم لوگ یہاں سے رخصت ہو جاؤ گے سمجھو؟“

”سمجھ گئے سگھی۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ ہمیں کمرے میں پھونڈ کر چلے گئے کمرے کا فرش گرد آلود تھا۔ اس کے پچھلی طرف بھی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ میں نے وہ کھڑکی بھی کھول دی اور دروازہ بھی۔ عمارت کے پچھلی طرف تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر ایک ندی بہہ رہی تھی اور اس کے برقی طرف کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فضا میں دھان کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ہم اس دروازے سے باہر آکر گھاس پر بیٹھ گئے۔

آسمان پر اب بھی بادل تھے لیکن ٹکڑوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔ سورج کبھی کسی ابر پارے کے چہرے چھپ جاتا اور کبھی تیز دھوپ چمکنے لگتی۔ یہ دھوپ چھاؤں کا منظر بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔

میرے خیال میں اس وقت دوسرا دن بچے کا وقت ہوگا۔ ہم نے رات کو مایہ گیوں کی ہستی میں کھانا کھایا تھا۔ سردار نے ہمیں تھوڑی سی تکی ہوئی چھل دے دی تھی جو ابھی تک ہم نے نہیں کھائی تھی۔ اس وقت مجھے ہبک لگ رہی تھی۔

میں نے تھملا کندھے سے اتار لیا اور کاندھ میں لپی ہوئی چھلی نکال لی۔ کاندھ میں نے گھاس پر پھیلا دیا۔ چھلی اتنی تھکی کہ ہم سکھاتے سے کام لیتے تو دو وقت کھا سکتے تھے لیکن اس وقت بڑے زور کی ہبک لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں وہ ساری چھلی چھٹ کر گئے۔ پانی پینے کے لیے وہ ندی موجود تھی۔

پانی کی بہم ندی کے کنارے پر ہی بیٹھ گئے لیکن ہم سے زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاسکا۔ رات میں نے جاگ کر گزاری تھی اور پیدل چلے رہنے سے تھکن بھی ہو گئی تھی۔ مجھے نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے جاگی کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔

جاگی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ٹانگیں گرد آلود فرش پر پھیلا لیں۔ میں نے اندرونی دروازہ کھول کر دیکھا۔ اس وقت کچھ لوگ خانقاہ کے مرکزی ہال میں مہمانا بدھ کے مجسمے کے ساتھ ہاتھ باندھ کھڑے تھے۔ مجسمے کے ساتھ چبوترے پر نذرانے میں چڑھائی جانے والی کئی چیزیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک ہتھکڑی مجسمے کے قریب کھڑا تھا اور دوسرا شاید باہر تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔ جاگی سوچ لی تھی۔ میں نے باہر والا دروازہ بھی بند کر دیا۔ کھڑکی آدمی کے قریب کھلی رہنے دی اور جاگی کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

دن کا پانی صبر سوتے ہوئے ہی گزر گیا تھا۔ جاگی مجھ سے پہلے جاگ چکی تھی۔ اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ باہر اندھیرا مگرا ہو گیا تھا۔ میں نے اندر کا دروازہ کھول کر ہال میں جھانکا۔ ہال کا مرکزی دروازہ بند تھا اور چھت پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ مہمانا بدھ کے مجسمے والا چبوترہ اب صاف تھا۔ وہاں اب کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں ہتھکڑی کچھ سمیٹ کر لے گئے تھے۔ گاؤں دیہاتوں میں خانقاہوں پر ابھی خاصی آمدنی ہوتی تھی اس لیے وہ ہتھکڑی نہیں چاہتے تھے کہ ہم یہاں زیادہ دن رہیں۔ وہ اپنی آمدنی میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں نے وہ دروازہ بند کر دیا اور کمرے کی دیوار اس ٹولنے لگا۔ ایک جگہ سوچ بوڑھ توکل گیا۔ جس پر دو سوچ لگے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری دونوں سوچ آن کر دیے لیکن جی نہیں چلی تو بلب فیوز تھا یا سرے سے بلب تھا ہی نہیں۔

کچھ مجھ کو دروازے کے سامنے بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ہمیں طویل چکر کاٹ کر گاؤں کی طرف آنا پڑا تھا۔ پہلی گلی میں داخل ہوتے ہی کتوں نے

ہبک کر ہمارا استقبال کیا تھا لیکن کتے دور ہی سے بے دلی سے بھونکتے رہے۔ قریب کوئی نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکنے کی رسم پوری کر رہے تھے اور میرے خیال میں ہتھکڑی ان کے لیے کوئی نئی یا نادرہ مخلوق نہیں تھی جس کے لیے سنجیدگی سے بھونک کر اپنی توانائی ضائع کرتے لہذا بے دلی سے بھونکنے کی رسم پوری کرنے کے بعد یہ کتے پسپا ہو گئے۔

گاؤں کا ایک ہی بازار تھا۔ چند دکانیں تھیں۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن زیادہ رونق نہیں تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں تو لوگ جلد ہی سو جاتے ہیں۔

ایک دکان پر لگی ہوئی کھڑی ساڑھے نو بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ہم بازار میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے لیکن کسی نے ہماری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ ”مجھے ہبک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو لے لو۔“ جاگی نے مٹھائی کی ایک چھوٹی سی دکان دیکھ کر کہا۔

”تم شاید بھول گئی ہو کہ ہتھکڑی دوپہر کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔“ میں نے جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ضروری نہیں کہ تمام ہتھکڑی اپنے آپ کو اس کا پابند سمجھتے ہوں۔“ جاگی نے کہا ”جنگل میں تم دیکھ ہی چکے ہو۔ واٹ نہ بکھٹ میں تو باقاعدہ رات کا کھانا ہوا کرتا تھا اور بھی کئی مرتبہ میں نے ہتھکڑیوں کو بہر وقت کھاتے پیتے دیکھا ہے۔ وہ زمانے گزر گئے جب چنٹ پادری، مولوی اور ہتھکڑی قسم کے لوگ مذہبی روایات و رسوم پر سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ تمام مذاہب میں زیادہ برائیاں ایسے ہی لوگوں کی پیدا کردہ ہیں۔ تم کچھ لے لو۔ اگر کوئی کچھ کئے تو کمرہ دینا مجھے لے لیا ہے۔“

مایہ گیوں کی ہستی کے سردار نے ازراہ کرم مجھے چینی کرنسی میں کچھ رقم دے دی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے چند نوٹ نکالے اور دکان کے سامنے آ گیا۔ جاگی وہیں کھڑی رہی تھی۔

مٹھائی کی اس چھوٹی سی دکان میں کوئی شوکیں وغیرہ نہیں تھا۔ تمام چیزیں کھلی پڑی تھیں۔ میں ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا۔ ایک طشت میں رکھی ہوئی طبیعی قسم کی چیزیں میری سمجھ میں آ سکی تھیں۔ میں نے دکان دار کی طرف نوٹ بڑھاتے ہوئے اس طشت کی طرف اشارہ کیا۔

دکان دار ایک اچھڑ عمر بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اس نے تین چار جلیبیاں کاندھ میں لپیٹ کر میری طرف بڑھائیں لیکن نوٹ میرے ہاتھ سے نہیں لے۔ میں نے اشارے سے اسے



سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ قیمت لے لے اور کچھ جلیبیاں اور بے سے اس نے کافہ میں چند جلیبیاں اور ڈال دیں مگر قیمت نہیں لی۔ میں نے شرافت اسی میں بھیجی کہ وہ خیرات لے کر وہاں سے ہٹ جاؤں۔

ایک اور دکان سے بیک کی ہوئی موٹی سی ایک روٹی مل گئی۔ ہم نے اسی پر اکتفا کیا اور گاؤں کی گلیوں میں گھومتے ہوئے واپس آ گئے۔

ہم نے کمرے کے باہر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا اور دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہم چونکہ دن بھر سو رہے تھے اس لیے اس وقت نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ہانوں اور چہرے پر ہلکے سے چھینٹے محسوس کر کے میں نے اوپر دیکھا۔ ہلکی سی پھوار شروع ہو گئی تھی۔ ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔ دروازہ ہم نے کھلی ہی چھوڑ دیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن ہماری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا اور پھر چانک ایک آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ کسی عورت کے چنچنے کی آواز تھی۔ میں اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکنے لگا۔ ہلکی ہلکی پھوار بدستور جاری تھی لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی وہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

”تم نے وہ آواز سنی تھی؟“ میں نے جاگتی کی طرف جھپٹتے ہوئے سرگوشی کی۔

”ہاں۔ کسی عورت کی گھٹی گھٹی سی چیخ تھی۔“ جاگتی نے جواب دیا۔

تقریباً دو منٹ بعد کسی عورت کے چنچنے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ہم دونوں اچھل پھٹے۔ یہ آواز باہر سے نہیں خانقاہ کے اندر کی طرف سے آئی تھی۔ آدھی رات کے وقت خانقاہ میں کسی عورت کا کیا کام؟ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا اور اٹھ کر بڑی آہستگی سے اندر والا دروازہ کھول کر ہال میں جھانکنے لگا۔ ہال میں سناٹا تھا۔ میرے ذہن میں جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ تقویت اختیار کرنا چاہا تھا اور پھر اسی لمحے ہال کے دوسری طرف سے ایک اور آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازہ دھڑ سے بند ہوا ہو۔

”گلتا ہے۔ اس طرف کوئی گڑ بڑ ہے۔“ جاگتی کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی تھی۔

”عورت کے چنچنے کی آواز بھی اسی طرف سے سنائی دی۔“ آؤ دیکھتے ہیں۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ہم دونوں کمرے سے نکل کر ہال میں آ گئے۔ میں نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور دب قدموں آگے بڑھنے لگا۔ جاگتی بھی میرے پیچھے ہی تھی۔ ہمارا رخ بندھ کے بننے والے چوترے کی طرف تھا۔ سامنے سے جانے کے بجائے میں چوترے کے پیچھے نکل گیا تھا۔

ہال کے دوسری طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ آگے جا کر یہ راہداری انگریزی کے حرف بی کی طرف دائیں بائیں مڑتی تھی۔ دائیں طرف سے ایک آواز سن کر میں اس طرف مڑ گیا۔ راہداری میں تاریکی بھی لیکن ایک دروازے کے نیچے بھری سے دھند سی روشنی جھلک رہی تھی۔ میں دبا قدموں چلا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا اور جبکہ کرک ہول سے آنکھ لگا دی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھ گیا۔ وہ دونوں تنگ دھڑنگ بھٹکھٹک ایک عورت کو رو پتے ہوئے تھے۔ عورت کے جسم پر بھی لباس برائے نام ہی تھا۔ اس کا منہ بندھا ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لڑکی کی لات ایک بھٹکھٹکے سینے پر لگی۔ کراہتا ہوا پیچھے ہٹا لیکن جب سنبھلا تو اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ خنجر دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں خوف و ہمت سے پھینکی چلی گئیں۔

میں ایک جھپٹکے سے پیچھے ہٹ گیا اور جبکہ کر اپنی پٹلیاں بندھا ہوا خنجر نکالنے لگا۔ اس دوران میں جاگتی کی ہول سے آنکھ لگا دی لیکن وہ بھی ایک جھپٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اسی لمحے مجھے اندر سے غراہٹ جیسی آواز سنائی دی۔ میں نے کی ہول سے دیکھا۔ خنجر اس لڑکی کے سینے میں پیوست تھا۔ تڑپ رہی تھی مگر دوسرے بھٹکھٹکے اسے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ لڑکی یقیناً بچ چکی تھی مگر غم نہ رہی بندھی ہوئی کی وجہ سے اس کی آواز حلق ہی میں گھٹ رہی تھی۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے راہداری کی طرف کھینچتی چلی گئی۔

”ہمیں اس پھندے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے دوسری راہداری میں پہنچ کر سرگوشی کی۔ ”میں نے صبح یہاں سے چلے جانا ہے۔ اس وقت ہم نے کوئی مداخلت کی تو گڑ بڑ بھی ہو سکتی ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ واپس چلو۔“

میرے خیال میں جاگتی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہمیں اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے آئی تھی۔ ہماری مداخلت سے معاملہ بڑھ بھی سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں بھی جاگتی کا راز کھل جاتا اور ہمارے ہی لیے کوئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

اپنے کمرے میں آ کر ہم نے خانقاہ کی طرف والا دروازہ بند کر دیا اور باہر والا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ بیکام میں بندو بنڈوں اور بڑھ بھٹکھٹک کے بارے میں ایسی باتیں سنیں تھیں لیکن اس کا عملی مظاہرہ آن چلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ”اسی لیے یہ دونوں بھٹکھٹکیاں ہماری آمد پر خوش نہیں تھیں۔“ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”میں اندیشہ تھا کہ ہماری وجہ سے ان کا یہ راز نہ کھل جائے۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“ جاگتی نے کہا۔ ”ایسے ہی لوگوں نے تو دھرم کو بدنام کر رکھا ہے۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے ان کے پاس آئی ہوئی ہے۔ اگر ہم مداخلت کرتے تو تین ممکن ہے ہمیں ہی کسی معاملے میں پھنسا دیا جاتا اور پھر ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ میں مروت نہیں عورت ہوں۔“

”اس لیے تو میں تمہاری بات مان کر واپس آیا ہوں۔ بہر حال ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن کر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ آواز ہمارے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی اور پھر دروازے کے سامنے رک گئی۔ اس دروازے کو اندر سے کدنا نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ایسے ہی بھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ بعد آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر قدموں کی آواز دور ہوئی چلی گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دروازہ بند تھا۔ وہ ان دونوں بھٹکھٹکیوں میں سے کوئی ایک تھا جو غالباً ہمیں دیکھنے کے لیے آیا تھا اور مطمئن ہو کر واپس چلا گیا تھا۔

ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جاگتی اطمینان سے سو گئی اور میں دیر تک ان بھٹکھٹکیوں کے گھٹاؤنے کردار کے بارے میں سوچتا رہا۔

صبح ہوتے ہی ہم خانقاہ سے نکل آئے گاؤں کے بازار میں پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ ٹانگ نامی ایک کاشتکار اپنی ٹریکٹر ٹرائل پر کچھ سالانہ لے کر مینگ ڈو جانے والا ہے۔ مینگ ڈو وہاں سے ساتھ ستر میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں سے ہمیں کن مینگ کے لیے کوئی سواری مل سکتی تھی۔ ہم فوراً ہی کاشتکار پانگ کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اپنی ٹرائل پر

سامان لا رہا تھا۔ اس نے ہماری بات تو جتے سے سنی اور ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا۔ ایک گھنٹہ بعد اس کا روائی کا ریڈیو گرام تھا۔ میں جاگتی کو وہیں چھوڑ کر بازار کی طرف نکل گیا اور کھانے پینے کی چیزیں خرید کر لے آیا۔ کچھ ناشتا کیا اور کچھ چیزیں سنبھال کر گھٹے میں رکھ لیں۔

روانگی سے دس منٹ پہلے دو ڈالر اور پانچ گئے۔ ان میں ایک عورت بھی اور دوسرا مرد۔ عورت کی عمر بائیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے چین کا روایتی دیکھی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر نکلون کا چوڑے پیچھے والا ہیٹ تھا۔ مرد کی عمر تیس تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی پتلون اور نیلی اور سفید دھاریوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر ماؤکپ بھی۔ اس کے پاس ایک عدد سٹری بیگ بھی تھا۔ ان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ بھی اس ٹرائل پر ہمارے ساتھ جائیں گے۔ اس آوی کا نام چانگ ہوا تھا۔ وہ کن مینگ کا رہنے والا تھا اور یہاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔ لوزدانی اس خوب صورت عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس گاؤں کی رہنے والی تھی اور کسی کام سے مینگ ڈو جا رہی تھی۔ شام کو پانگ کے ساتھ ہی اس کا واپس آنے کا پروگرام تھا۔

پانگ نے ٹرائل پر سامان اس طرح لا دیا تھا کہ ہمارے بیٹے کی جگہ بھی بن گئی تھی۔ میں اور چانگ ہوا ایک طرف بیٹھے تھے اور جاگتی اور لوزو ہم سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

کچے راستے پر ٹرائل کو دھچک لگ رہے تھے۔ بعض جگہوں پر تو ٹرائل اس طرح اچھلتی کہ ہم ایک دوسرے کے اوپر گر پڑتے۔ اس طرف کسی بس کی آمد و رفت نہیں تھی۔ لوگ مینگ ڈو تک اسی طرح سفر کرتے تھے۔ مینگ ڈو، کن مینگ جانے والی ہائی وے پر ایک بڑا قبضہ تھا۔ یہی ہائی وے جنوب میں مختلف چھوٹے بڑے شہروں کو ملاتی ہوئی دست نام کے مرکزی شہر بڑی تک چلی گئی تھی۔

جاگتی بھی میری طرح رات دیر تک جاگتی رہی تھی۔ سفر کے دوران میں وہ آنکھ رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ جھٹکا لٹکنے سے لوزو برکری بھی۔ پہلے تو لوزو کے چہرے پر ناگوار سے تاثرات ابھرتے رہے پھر ایک موقع پر میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی۔ جاگتی اس وقت لوزو کے اوپر ہوئی تھی اور لوزو نے اپنے اٹا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تھی اور اسی وقت میں نے اس کی آنکھوں میں وہ عجیب سی چمک ابھرتی ہوئی دیکھی تھی۔

چانگ نے ایک چھوٹی سی بستی کے سامنے ٹرائی روک لی۔ اس وقت ہم تقریباً تیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ چانگ ہو اور لوزو نیچے اتر گئے۔ جاگلی اٹھ کر میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اسی وقت میری نظر چانگ ہو اور لوزو کی طرف اٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں سڑک پر کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ لوزو نے آنکھوں سے ہماری طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد چانگ ٹریکٹر پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے انجن اشارٹ کیا تو لوزو اور چانگ ہو بھی اوپر آگئے۔ جاگلی چونکہ میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی تھی اس لیے چانگ ہو کو لوزو کے ساتھ بیٹھنا پڑا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ چانگ ہو بار بار کن آنکھوں سے جاگلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دس بجے کے قریب ہم مینگ ڈو پہنچ گئے۔ لوزو تو ہم سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے چلی گئی تھی اور چانگ ہو ہمارے قریب ہی کھڑا رہا۔ ہمیں کن مینگ جانے والی بس کا انتظار تھا اور چانگ ہو کو بھی کن مینگ ہی جانا تھا۔ میں نے قریب ہی ایک دکان سے کچھ چیزیں خرید لی تھیں جو ہم سڑک پر کھڑے کھڑے ہی کھاتے رہے۔ چانگ ہو نے ایک دو مرتبہ ہم سے باتوں میں بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میری حوصلہ شکنی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بس آئی تو میں جاگلی کو لے کر جلدی سے سوار ہو گیا۔ چانگ ہو نے بھی سوار ہونے کی کوشش کی تھی مگر کنڈیکٹر نے اسے نیچے اتار دیا۔ بس میں صرف دو ہی سیٹیں خالی تھیں جن پر ہم بیٹھ چکے تھے۔ چانگ ہو کے چہرے پر مایوسی چھائی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھتا ہوا بس سے اتر گیا۔ بس فوراً ہی چل پڑی۔

”چانگ ہو کو ہم پر شبہ ہو گیا ہے۔“ میں نے جاگلی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ”ٹرائی میں تم بار بار ادنگھ رہی تھیں اور ایک دو مرتبہ لوزو پر گری بھی تھیں۔ اس دوران میں اس نے اندازہ لگایا تھا کہ تم مرد نہیں عورت ہو اور جب راستے میں ٹرائی رکی تھی اور وہ دونوں نیچے اترے تھے تو لوزو نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ راستے بھر مسلسل تمہیں ہی گھورتا رہا تھا۔“

”مجھے بھی لوزو پر کچھ شبہ ہوا تھا کہ وہ میری اصلیت جان چکی ہے۔“ جاگلی نے کچھ سرگوشی میں جواب دیا ”ایک مرتبہ میں اونگھتے ہوئے اس پر گری بھی تو وہ میرا جسم ٹنڈل رہی تھی۔“

”وہ دوسری بس پر آئے گا۔“ میں نے کہا ”خدا کرے دوسری بس دیر سے آئے اور ہمیں اس سے پہلے کن مینگ پہنچنے کا موقع مل جائے۔ سنا ہے کن مینگ بڑا شر ہے اگر وہ دس منٹ پہلے بھی پہنچ گئے تو ہمیں غائب ہونے کا موقع مل جائے گا۔“

اسی دوران میں کنڈیکٹر ہمارے قریب آگیا۔ میں تھیلے میں سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ہم نے ان میں سے دو نوٹ واپس کر دیے اور نوٹ کے ساتھ تین چھوٹے نوٹ اور کچھ ریزگاری بھی واپس کی تھی۔ ”دوسری بس کتنی دیر میں آئے گی۔“ میں نے زبان میں رک رک کر کنڈیکٹر سے پوچھا۔

”ایک گھنٹے بعد۔“ کنڈیکٹر نے جواب دیا اور روانہ کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کن مینگ تقریباً ڈھائی سو میل کے فاصلے پر واقع تھا اس وقت ایک بجنے والا تھا اور شام سات آٹھ بجے سے پڑا وہاں پہنچنے کی توقع نہیں تھی۔

بس اتر کنڈیشنر تھی۔ جاگلی کھڑکی کے شیشے سے ٹیک کر ادنگھنے لگی تھی۔ بھی ہینڈ کے جھونکے آئے تھے۔

ہم سات بجے کے قریب کن مینگ پہنچے تھے۔ کئی لاکھ آبادی پر مشتمل یہ ایک بڑا شہر تھا۔ بلند و بالا عمارتیں، بنگلے، ہوئی روشتیاں اور انسانوں کا شہاں مارتا ہوا سمندر۔

میں کسی اور چیز کی کمی ہو تو ہو مگر انسانوں کی کمی نہیں تھی۔ بس صبح ہی اپنے اسٹیشن پر رکی، میں جاگلی کا ہاتھ پکڑا

سب سے پہلے نیچے اتر آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اجنبی اور اجنبی راستے۔ ظاہر ہے ہم کسی خاص راستے کا تعین کر سکتے تھے۔ میں نے جاگلی کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف

کھینچنا چلایا۔ میں کم سے کم وقت میں بس اسٹیشن سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ہمارے اس طرح چلنے

کچھ لوگوں کو دھکے بھی لگے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت تو گر گرتے پڑی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر تیز بچے میں چھ رہی تھی لیکن ہم اس کی بات کا مطلب سمجھنے کے لیے وہ

رکے نہیں تھے۔

چند منٹ کے اندر اندر ہم وہاں سے تقریباً دو میل دور نکل گئے۔ ابھی شام ہوئی تھی۔ ہر طرف رونق تھی اور رو

ایسی کہ چلنے کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ مجھے کسی ایسی جگہ تلاش تھی جہاں ہم کسی خوف کے بغیر اطمینان سے رات گزار سکیں اور ظاہر ہے ایسی محفوظ جگہ کوئی خانقاہ ہی ہو

تھی۔ ہمیں ایک کشادہ شاہراہ پر ایک بہت بڑی خانقاہ نظر

آئی تھی لیکن میں نے خود ہی وہاں جانے سے گریز کیا تھا۔ ہم شر کے زیریں علاقے میں آگے۔ یہاں کی آبادی شر کے دوسرے علاقوں سے زیادہ گنجان تھی۔ ہم پوچھتے ہوئے چلے رہے اور بالآخر ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گئے۔ اسی گلی میں کچھ آگے جا کر ایک خانقاہ تھی۔

گلی میں خانقاہ کا گیت زیادہ برا نہیں تھا لیکن گیت کے اندر بہت کشادہ صحن تھا اور اس سے آگے خانقاہ کی اصل عمارت تھی۔ اس وقت اگرچہ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے مگر زائرین کی آمد رفت جاری تھی۔ چھوٹے علاقوں میں خانقاہیں عام طور پر شام ہونے سے پہلے ہی بند ہو جاتی تھیں مگر بڑے شہروں میں ان کے دروازے رات نو بجے تک کھلے رہتے تھے۔

خانقاہ کے وسیع صحن میں بھکشو نولوں کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جاگتی لے ایک طرف بڑھتا رہا اور بالآخر ایک جگہ رک کر کسی مناسب جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں ایک عورت اور ایک مرد ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ عورت نے سال بھر کی عمر کے ایک بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ مرد کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلہ تھا جس میں کچھ پکٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے تھیلے میں سے دو پکٹ نکال کر ایک جاگتی کو دے دیا اور ایک میرے ہاتھ میں دیا۔

ان دونوں کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ لباس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ زیادہ پیسے والے نہیں تھے۔ بچے نے سر اپنی ماں کے سینے سے نکال رکھا تھا۔ اس کے چہرے ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے اور شاید یہ دونوں میاں بیوی اس بچے کے لیے کوئی منت ماننے کے لیے یہاں آئے تھے اور خیرات بانٹ رہے تھے۔

ہم ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا پکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں تین کی بنی ہوئی کوئی چیز تھی۔ ہم دونوں سر جھکا کر دیکھنے لگے۔ جاگتی والا پکٹ میں نے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔

نوبے خانقاہ کا گیت زائرین کے لیے بند کر دیا گیا۔ وسیع صحن میں بہت سے بھکشو موجود تھے۔ ہم اپنی جگہ پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ مختلف سمتوں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بعض بھکشو تو بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرنا لگا، آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ میں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بھکشو میرے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے گردن گھمائی تو جاگتی کے ساتھ بھی ایک بھکشو بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے آثار کچھ اتارے نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی تو کوئی سخت چیز میرے پلو میں پھنسے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ ہی بلی کی خرابٹ سنائی دی۔

”کوئی گڑ بڑ کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارا سہ پلو میں سوراخ ہو جائے گا۔“

میرے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بھکشو نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی بے بسی کے تاثرات تھے۔ وہ دوسرا بھکشو اس پر تقریباً جھکا ہوا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کئی بھکشو فرش پر سو رہے تھے۔ گیت کے اندر کی طرف ایک بلب جل رہا تھا جس کی مدد سے دو شیشی چادوں طرف بکھری ہوئی تھی۔

”کون ہو تم لوگ اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟“ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بھکشو کی طرف دیکھتے ہوئے چینی زبان میں رک کر کہا۔

”تم دونوں اٹھ کر خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو۔ اگر کوئی گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی تو لوگوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“ اس بھکشو نے غراتے ہوئے کہا۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔ میں اگر چاہتا تو یہاں بنگامہ کھڑا کر سکتا تھا لیکن مسئلہ جاگتی کا تھا۔ اگر یہاں بھکشوؤں کو پتا چل جائے کہ جاگتی مرد نہیں عورت ہے تو وہ لوگ ہمیں مارنے پر تل جاتے۔ ہماری بات کوئی نہ سنتا کہ یہ سوانگ محض تحفظ کے لیے بھرا گیا ہے۔ یہ تصور کر لیا جاتا کہ یہ ہمیں اپنا کر ہم کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہم دونوں اٹھ کر گیت کی طرف چلے گئے۔ وہ دونوں بھکشو ہمارے دائیں بائیں تھے اور انہوں نے ہمیں پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ میرا تھیلہ بھی ایک بھکشو نے لے لیا تھا۔

خانقاہ کے سامنے والی گلی اس وقت سناں تھی۔ ہم ان دونوں کے بیچ میں چلے رہے۔ گلی کے موڑ پر ایک بند وین کھڑی تھی۔ ہم یہی قریب پہنچے وین کا سلاٹنگ ڈور کھل

گیا۔ ”چلو۔ اندر بیٹھو۔“ میرے ساتھ والے بھکشو نے مجھے دکھایا۔

میں وین میں بیٹھ گیا۔ میرے سامنے جاگتی اور اس کے ساتھ ایک بھکشو بیٹھ گیا تھا۔ دوسرا بھکشو دوسری طرف سے ہر میرے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ہم ان دونوں کے درمیان سینڈویچ بن کر رہ گئے تھے اور پستول ایک بار پھر ہمارے پستولوں سے لگ گئے تھے۔ اسٹیشنرنگ کے سامنے ایک آدمی پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے فوراً ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں بری طرح چونک گیا۔

وہ جاگت ہو تھا۔ اس نے بڑی جلدی ہمیں تلاش کر لیا تھا۔

وین شر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ بیشتر سڑکیں سناں تھیں لیکن شر کے بعض علاقے ایسے بھی تھے جہاں اس وقت بھی رونق ہو رہی تھی۔

ہمارا سفر خاموشی سے جاری رہا۔ نہ ان میں سے کسی نے زبان کھولی تھی اور نہ ہی میں نے کچھ کہا تھا۔ وین شر سے نکل کر نواحی علاقے میں آئی اور بالآخر ایک کالج کے گیت کے سامنے رک گئی۔ جاگت ہونے وین سے اتر کر گیت کھولا اور دوبارہ وین میں آیا۔

گیت میں داخل ہو کر وین کالج کے برآمدے کے سامنے رکی۔ ہم دونوں کو نیچے اتار دیا گیا۔ ان دونوں بھکشوؤں نے اب بھی ہمیں پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ جاگت ہو باہر کا گیت بند کر کے واپس آ گیا اور برآمدے والے دروازے کا لاکھولنے لگا۔

کالج سازد سامان سے آراستہ تھا۔ بال کمرے میں فرش پر دیڑھ قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے قریب صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کئی کئی والی سینئر ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ سامان کے باوجود جگہ کافی کشادہ تھی۔

اندر آنے کے بعد ان دونوں بھکشوؤں نے اپنے جھوسوں پر لپٹی ہوئی پہلی چادریں آبداری تھیں۔ پیچھے انہوں نے پتلونیں اور نی شرٹس پہن رکھی تھیں۔

”مسٹر چانگ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم کرنے کے لیے کہا ”تم ہمیں یہاں کیوں لائے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کسی کو اغوا کرنا جرم ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے پاس دولت ہوگی تو یہ ہمارا غلط فہمی ہے۔ ہم بھکشو لوگ ہیں۔ ہمارے پاس دولت کا کیا کام۔ ہم

سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“ ”تو پھر تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم کتنی بڑی دولت اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہو۔“ چانگ ہو کے ہونٹوں پر مکروہ سی ہنسنکراہٹ اٹھی پھر وہ جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یہ چادر اتار دو۔ میں تمہارے سامنے کو دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی دولت اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہے۔“

جاگتی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ چانگ ہونے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے جاگتی کی چادر پکڑ کر کھینچ دی۔ جاگتی مزاحمت کرنے لگی لیکن چادر اس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ چادر کے نیچے اس نے مختصر سلاواؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

”دیکھ لیا مسٹر بھکشو۔“ چانگ ہونے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ دولت ہماری ہے۔ پہلے ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور جب دل بھر جائے گا تو تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس طرح ہمیں بدل کر اپنی اسلیٹ چھپانا جرم ہے۔ تم لوگ غالباً انڈین ہو۔ تم لوگوں کو جاسوسی کے الزام میں موت کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔“ ”نہیں مسٹر چانگ۔ ہم انڈین نہیں تھائی ہیں۔ یہ مجھیں۔“

”مجھے ریکٹر ڈرائی پر سفر کے دوران میں ہی اس کی اسلیٹ کا پتا چل گیا تھا۔“ چانگ ہونے میری بات کاٹ کر جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس کا انکشاف لوڈ نے کیا تھا اور میں نے اسی وقت تم لوگوں کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ مجھے سینک ڈو سے اس بس میں جگہ نہیں مل سکی تھی۔ میں نے فون پر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے دی کہ وہ تم لوگوں کی نگرانی کریں اور یہ پتا چلا جس کے تم لوگ کہاں جاتے ہو۔ میرے یہ دونوں ساتھی بس پہنچنے سے پہلے ہی اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان لوگوں نے تمہاری نگرانی شروع کر دی اور جب تم لوگ اس خانقاہ میں تک گئے تو یہ سمجھ گئے کہ اب تم لوگ رات وہیں رہو گے اور پھر تم نے دیکھ لیا کہ تم لوگوں کو وہاں سے اٹھانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر باری باری ہم دونوں کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب بتائیے کہ تم لوگ اپنے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ تم لوگ کون ہو اور مجھیں بدل کر یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہم شاولن فیل جا رہے ہیں۔ مارشل آئرس کی ٹریننگ حاصل

کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے۔  
 ”لیکن تم لوگ یہاں انکرہست بری طرح چھس چکے  
 ہو۔“ چانگ ہونے میرے چہرے پر نظر سجتا ہوتا تھا  
 ”پچھلے رات تم لوگوں نے ہون کی خانقاہ میں قیام کیا تھا۔ صبح  
 سویرے ایک کاشکار کو خانقاہ کے قریب جھینوں میں گاؤں کی  
 ایک لڑکی کی لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ اسے خنجروں سے وار  
 کر کے قتل کیا گیا تھا۔ جب تم لوگ ہمارے ساتھ چانگ کی  
 زیکٹر زلی پر روانہ ہوئے تو بات اس وقت تک پہنچی نہیں  
 تھی۔ اگر بات پھیل جاتی تو تم لوگ گاؤں سے نکل نہیں سکتے  
 تھے۔ اب بھی صورت حال کچھ یوں ہے کہ اگر میں یہاں کی  
 پولیس کو اس لڑکی کے قتل کے بارے میں بتا کر تم دونوں کو  
 ان کے حوالے کر دوں تو تم اس کا انجام سمجھ سکتے ہو۔ کسی غیر  
 ملکی پر قتل کا الزام عائد کرنا مقامی پولیس کے لیے مشکل نہیں  
 ہوتا اور پھر تم لوگ تو دیسے بھی خامے مشکوک ہو۔ بڑی  
 آسانی سے۔“

”اس لڑکی کو ہم نے قتل نہیں کیا۔“ چانگی جلدی سے  
 بول پڑی ”ہم رات کو اس خانقاہ میں ٹھہرے ضرور تھے لیکن  
 اس قسم کے کسی واقعے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“  
 ”یہ ٹھیک کہتی ہے۔“ میں نے کہا ”آدھی رات کے بعد  
 ہم نے کسی عورت کے چہرے کی آواز سنی تھی اور جب ہم  
 معلوم کرنے کے لیے خانقاہ کے دوسرے حصے میں پہنچے تو وہ  
 لڑکی ان ہتکشوں کے کمرے میں تھی۔ انہوں نے ہی اسے  
 قتل کیا تھا۔ وہ لوگ لڑکی کو زبردستی خانقاہ میں لے کر آئے تھے  
 اور اس کی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ زیادتی کرتا چاہتے  
 تھے۔ لڑکی کی مزاحمت پر اسے قتل کر دیا گیا۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ چانگ ہو بولا ”لیکن وہ ہتکشو  
 پانچ سال سے اس خانقاہ میں ہیں۔ ان دونوں کے بد معاش  
 ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا  
 ہوں۔ وہ کن منگ کے رہنے والے ہیں۔ یہاں چھوٹے  
 چھوٹے جرائم میں کئی مرتبہ سزا بھگت چکے ہیں اور پھر پانچ  
 سال پہلے ہتکشوں کے جیمس میں انہوں نے اس خانقاہ پر  
 قبضہ کر لیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات باری رکھتے  
 ہوئے کہنے لگا ”کچھ عرصہ پہلے میں اپنی بہن سے ملنے کے لیے  
 ہون گیا تو ان سے بھی سامنا ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے  
 تھے لیکن میں نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ میں ہرچہ مینے بعد  
 وہاں جانا ہوں اور وہ میرا منہ بند رکھنے کے لیے ایک معتول  
 رٹم اور کچھ قیمتی تحائف دے دیتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ  
 وہ دونوں بد معاش ہیں اور خوب عیش گزر رہے ہیں لیکن انہوں

نے گاؤں والوں پر اپنا اعتماد قائم کر رکھا ہے۔ پچھلے  
 برسوں کے دوران میں ایسی تین واردتیں اور بھی ہو چکی ہیں  
 لیکن ان دونوں پر کبھی شبہ نہیں کیا گیا اور اب تم لوگ بڑی  
 آسانی سے اس کیس میں چھس سکتے ہو۔“

”لیکن ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“  
 چانگی نے کہا۔  
 ”میں کب کہتا ہوں کہ وہ قتل تم لوگوں نے کیا ہے۔“  
 چانگ ہو بولا ”چلو تم لوگوں کو پولیس کے حوالے نہیں  
 کروں گا۔ تم دونوں اس قتل کے چشم دید گواہ ہو۔ اگر ان  
 دونوں ہتکشوں کو تمہارے بارے میں اطلاع مل جائے تو وہ  
 سر کے بل یہاں دوڑے آئیں گے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر  
 تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی  
 طرف دیکھا۔  
 ”اس سچی حسرت کو تین چار دن کے لیے ہمارے حوالے  
 کر دو۔“ اس نے چانگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ہم  
 نہ صرف اپنی زبان بند رکھیں گے بلکہ تمہاری کچھ مدد بھی  
 کریں گے۔“  
 میں نے چانگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر  
 ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میرے پاس پستول بھی تھا اور خنجر  
 بھی۔ چانگی نے بھی اسکرٹ میں پستول چھپا رکھا تھا لیکن  
 چانگ ہو کے دونوں ساٹھی دامن بائیں سے ہمیں اپنے  
 پستولوں کی زد میں لے ہوئے تھے۔ ہماری کوئی کوشش نہ کرنے  
 لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ تو میں اس طرف آنے  
 ہوئے دیکھ چکا تھا کہ کالج یا ہنگلے ایک دوسرے سے کافی فاصلے  
 پر تھے۔ رات کا آخری پر تھا۔ لوگ گہری نیند میں ہوں گے  
 گھولی چلے گی بھی تو کسی کو تا نہیں چلے گا۔ میں نے ایک بار بار  
 چانگی کی طرف دیکھا اور آٹھ کا گوشہ دیا دیا۔

”ٹھیک ہے مسٹر چانگ۔“ میں نے گہرا سانس لے  
 ہوئے کہا ”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد  
 ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا؟“  
 ”تمہیں میری زبان پر بھروسہ کرنا ہوگا۔“ چانگ ہوئے  
 ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ لگئی ”ویسے تم عقل مند ہو  
 نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔“

”تم نے تین چار دن کی بات کی ہے۔ اس دوران  
 میں۔“  
 ”اس دوران میں تم لوگ یہیں رہو گے۔ میرے ان  
 کاٹیج میں۔“ چانگ نے میری بات کاٹ دی ”یہاں تم لوگوں  
 کا ہر قسم کا خیال رکھا جائے گا لیکن اگر اس دوران میں کوئی

موجود کرنے کی کوشش کی تو۔۔۔“  
 ”تمہیں ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی مگر اس کے بعد  
 تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا اور اب میرا خیال ہے کہ ماحول  
 میں کچھ تبدیلی آئی چاہیے۔ میرا مطلب ہے یہ پستول۔“  
 میں نے خاموش ہو کر باری باری دونوں آدمیوں کی طرف  
 دیکھا۔

چانگ ہونے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے  
 پستول اپنی جیبوں میں ڈال لیے اور ہم سے قدرے دور ہٹ  
 گئے۔ چانگ ہو خود اختیادی کا شکار ہو گیا تھا۔ میرے شکست  
 خوردہ جے سے بھی اس نے غالباً یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اب  
 ہماری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ اس نے شاید یہ  
 بھی سوچا ہو گا کہ میں اکیلا ان تینوں کا کیا مقابلہ کر سکوں گا اور  
 یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے ہمارے لباس کی تلاشی نہیں لی  
 تھی۔ البتہ میرا تھیلا اپنے قبضے میں کر لیا تھا جس میں کوئی  
 خاص چیز نہیں تھی اور وہ تھیلا بھی وہیں ہی پڑا ہوا تھا۔  
 ”چلو ڈیر۔“ چانگ ہونے چانگی کی کمرے کے گرد بازو  
 حائل کر دیا۔ اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ اب کوئی مزاحمت  
 نہیں ہوگی۔

”تھ۔۔۔“ چانگی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 اس کے لمبے میں غصہ بھی تھا اور بے بسی بھی ”مجھے معلوم  
 نہیں تھا کہ تم اتنے خود غرض ثابت ہو گے۔ تم قابل اعتماد  
 نہیں ہو۔ آئندہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔“  
 چانگ ہو اسے تقریباً دھکیلا ہوا۔ ایک طرف لے  
 جانے لگا لیکن چوتھے ہی قدم پر چانگی نے اس کی ٹانگ میں  
 ٹانگ پھنسا دی۔ وہ لڑکھاتا ہوا منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ  
 سے کراہی نکل گئی تھی۔

چانگ ہو کے دونوں آدمی ایک طرف کھڑے تھے۔  
 انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی۔ وہ  
 سمجھ گئے تھے کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش  
 کروں گا اسی لیے وہ دونوں میری طرف لپکے۔ میں کسی طاقت  
 وراپرنگ کی طرح ہوا میں اچھلا۔

ہوا میں اچھلنے کے بعد میں نے دونوں ناگوں سے کام لیا  
 تھا۔ ڈبل فلاٹنگ لک دونوں کے سینوں پر لگی اور وہ دونوں  
 جھنجھتے ہوئے ڈھیر ہو گئے لیکن ان میں سے ایک حیرت انگیز  
 پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس  
 کے پیٹ پر اسٹریٹ لک ماری وہ پیٹ پکڑا ہوا دھرا ہو گیا۔  
 وہ میری زمین پر پڑنے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر اچھلا اس مرتبہ  
 میرے دوسرے پیر کی لک اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ وہ

زمین سے دوٹ اور اچھلا اور چپٹا ہوا پیچھے الٹ گیا۔  
 اس کا دوسرا ساٹھی اٹھ کر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے  
 بر قوت رہا تھا۔ میں نے موقع دے بغیر اس کے پیلو پر سائڈ  
 ٹنگ لگا دی۔ وہ چیخ اٹھا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں  
 نے اس کی ٹانگ پر سوپ کک لگائی۔ انگوٹھے کی طرف سے  
 میرے پیر کا پیلو اس کی پینڈی کے پچیس طرف لگا تھا۔ وہ بکسے  
 کی طرح بلبلاتا ہوا اچھل کر نیچے گرا اور دونوں ہاتھوں سے  
 پینڈی پکڑ کر قالین پر لوٹنے لگا۔ اس کی پینڈی کا گوشت اندر سے  
 پھٹ گیا تھا۔

پیلو آدمی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر  
 اس کے کندھے پر پوری قوت سے چوب رسید کر دیا۔ مجھ پر  
 اس وقت جنون کی سی کیفیت طاری تھی اور یہ چوب پوری  
 قوت سے رسید کیا تھا۔ اس کی جج کے ساتھ ہی کڑک کی آواز  
 بھی ابھری تھی۔ اس کے کندھے کی ہڈی ٹوٹی گئی اور وہ بھی  
 اپنے ساٹھی کی طرح قالین پر لوٹنے لگا۔

چانگی کی چٹس کر میں تیزی سے اس طرف مڑا۔ چانگی  
 چانگ ہو کی گرفت میں آچکی تھی۔ وہ چانگی کا گلا باندھنے کی  
 کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لپک کر چانگ ہو کو ناگوں سے  
 پکڑ لیا اور اسے اوپر اٹھا چلا گیا۔

میں نے اسے بالکل الٹا کر دیا تھا لیکن چانگی کا گلا اب بھی  
 اس کی گرفت میں تھا۔ میں نے اس کے پیٹ پر گھٹنے سے  
 ٹھوک ماری۔ اس نے چانگی کا گلا چھوڑ دیا۔ چانگی سیدھی ہو کر  
 اپنا گلا سہلانے لگی۔ میں چانگ ہو کو ابھی تک ناگوں سے  
 پکڑے الٹا لٹکائے ہوئے تھا۔ چانگی نے اس کے پیٹ میں  
 زوردار ٹھوک ماری۔

ان دونوں میں سے ایک آدمی اٹھ کر کھڑا ہونے کی  
 کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہی تھا جس کی ٹانگ پر ضرب لگی۔ اس  
 کا وہ پیر زمین پر نہیں لگ رہا تھا اور پھر اسے جب میں ہاتھ  
 ڈالتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے چانگ ہو کو چھوڑ دیا۔  
 اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ  
 پیٹ کے بل گرا۔ چانگی نے اس پر ٹھوکوں کی بارش کر دی  
 تھی۔

میں تیزی سے دوسرے آدمی کی طرف لپکا۔ وہ جیب  
 سے پستول نکال چکا تھا لیکن میرے پیر کی ٹھوک سے پستول اس  
 کے ہاتھ سے نکل کر دور صوفے کے پیچھے جا گرا۔ میری  
 دوسری لک اس کی کینٹری پر لگی تھی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے  
 بکسے کی طرح بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔  
 میں ایک لمبے کو غافل ہوا تھا۔ جس سے فائدہ اٹھا کر

دوسرے آدمی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں اس کی گرفت میں تو آ گیا تھا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو اس سے چھڑایا اور اس کی گردن بازو کی لپٹ میں لے لی۔ میرے اس نیک لاک سے گردن چھڑا لینا ممکن ہی نہیں تھا اور جب مجھ پر خون طاری ہو تو کسی کے بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ وہ کتے تھے جو راہ گروں پر بھونک کر ان کی منزل کھوٹی کرتے تھے اور انہیں اس کی سزا ملتی ہی چاہیے تھی۔ میں نے بازو کو زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز ابھری۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ قایلین پر مایہ آبی کی طرح تر پڑے لگا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد اس کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا جو کھوپڑی کو دونوں ہاتھوں میں تھامے دائیں بائیں بھول رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن بازو کی لپٹ میں لے لی اور اس کا بھی وہی حشر کر کے پھینک دیا۔

جاگتی اب بھی چانگ ہو پر ٹھوکریں برس رہی تھیں۔ اس کی ایک ٹھوکر چانگ ہوئی تاگوں کے بیچ میں لگی اور وہ ہنچے کر کھوٹے لگے۔

”ختم کر دو اسے جاگتی۔“ میں نے کہا ”ان میں سے کسی کا زندہ بچ جانا ہماری موت بن جائے گا۔ دو کو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ تیسرے کو تم ختم کر دو۔“

جاگتی نے اسے ایک اور ٹھوکر ماری اور پھر اس کی نظر صوفے کے پیچھے پڑے ہوئے پستول پر پڑی۔ اس نے لپک کر پستول اٹھالیا اور نال اس کے سینے پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں پوسٹ ہو گئی اور وہ تر پڑے لگا۔

جاگتی نے ایک کپڑا اٹھا کر پستول پر اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور پستول چانگ ہو کے سیدھے ہاتھ میں دبا دیا جو اب بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

”ابنہ وہ چادر اٹھاؤ اور ہاگو میاں سے۔“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ان تینوں کے لباس کی تلاش کی لینے لگا۔

جاگتی کے چہرے پر اس وقت بے پناہ درنگی تھی لیکن میری آواز سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بتدریج معمول پر آتے چلے گئے۔ اس نے لپک کر اپنی زور رنگ کی وہ چادر اٹھائی اور ہم دونوں تیزی سے دروازے سے نکل گئے۔ جاگتی برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی وہیں دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

”تم باہر کا گیت کھلو۔ میں دین باہر نکالتی ہوں۔“ اس

نے کہا۔

”وین!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہم کچھ دور جا کر وین چھوڑ دیں گے۔ یہاں سے ہم بہت ضروری ہے۔“ جاگتی نے وین کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں بیرونی گیٹ کی طرف لپکا اور کنڈا بنا کر آہستگی سے گیٹ کھول دیا۔ یہ کوئی باقاعدہ کلی نہیں تھی۔ کانچ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چل سکا تھا کہ چانگ ہو کے کانچ میں کیا ہو چکا تھا۔

جاگتی وین اشارت کر کے باہر لے آئی۔ میں نے گیٹ بند کر دیا اور دو درکروں میں بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا اپنا تھیلہ اٹھایا تھا۔ میں نے جاگتی کی چادر بھی تھیلے ہی میں ٹھونس لی تھی۔

جاگتی کو وہ راستہ یاد تھا جس طرف سے ہمیں لایا گیا تھا۔ وہ انہی راستوں پر وین کو دوڑاتی رہی اور پھر شہری حدود شروع ہوئے ہی سامنے بہت دور سڑک پر ایک گاڑی آتے دیکھ کر ہم دونوں چونک گئے۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی پھست پر نیلی اور سرخ بنیاں فلش کر رہی تھیں۔ جاگتی نے بڑی پھرتی سے وین دائیں طرف ایک سڑک پر موڑ لی اور اس کے ساتھ ہی رفتار بھی بڑھا دی۔

وین مختلف چھوٹی سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ پولیس کی وہ پیزونگ کار کسی اور طرف نکل گئی تھی۔ جاگتی نے وین ایک سنان جگہ پر روک لی اور ابجین بند کر کے نیچے اتر گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

”آگے وین پر جانا مناسب نہیں ہوگا۔“ جاگتی نے کہا ”لاؤ۔ وہ چادر مجھے دو۔“

میں نے تھیلے میں سے زور رنگ کی وہ... لمبی سی چادر جاگتی کو دے دی۔ ہم درختوں کے پیچھے کچھ اور تاریکی میں چلے گئے۔ جاگتی نے وہ چادر لیٹ لی اور ہم سڑک کے کنارے تاریکی میں چلے گئے۔ وہاں سے تقریباً ڈھائی میل دور نکل آئے کے بعد ہم ایک پارک میں گھس گئے۔ کنکریٹ کے ایک بیچ پر کوئی آدمی سو رہا تھا۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہم نے کئی آدمیوں کو پارک میں سوئے ہوئے دیکھا تھا۔ کن سنگ لاکھوں کی آبادی پر مشتمل ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح بیروزگاری اور رہائش بیہ مسائل موجود تھے۔ یہ غالباً وہ لوگ تھے جو دن میں مزدوری کرتے تھے یا روزگار کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے اور

رات کو پارکوں اور ایسی ہی جگہوں پر سو جاتے تھے۔ ان میں کتنے ہی ایسے ہوں گے جنہیں رات کو ہیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ ایک خالی بیچ دیکھ کر ہم بیٹھ گئے۔

”اس وقت تم نے واقعی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔“ جاگتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ”اگر یہ ترکیب استعمال نہ کرتے تو ہم پھنس جاتے۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا ”اگر ہم اپنی ضد پر اڑے رہتے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ یا تو مجھے باندھ کر ڈال دیتے یا کسی کمرے میں بند کر دیتے اور اس کے بعد جو جو کچھ بھی ہوتا تم اس کا تصور کر سکتے ہو۔“

”میرا دل تو اب بھی کانپ رہا ہے۔“ جاگتی نے کتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا ”ان تین چار آدمیوں کا قتل تو بلاوجہ ہی ہمارے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔“

میں نے کہا ”میں تو چاہتا تھا کہ ہم مزید کچھ کیے بغیر شاؤن فیل بیچ جائیں مگر سب سے پہلے اس استنباط میں اس ڈاکو نے ہمیں اپنی جان لینے پر مجبور کیا اور پھر یہ چانگ ہو بیچ میں پٹک پڑا۔ اگر ان میں سے کسی کو بھی زندہ چھوڑ دیا جاتا تو وہ ہماری موت کا بیج بن جاتا۔“

”کیا شاؤن فیل میں بھی مجھے اس طے میں رہنا پڑے گا۔“ جاگتی نے کہا۔

”وہاں کی صورت حال شاید مختلف ہو۔“ میں نے کہا ”شاؤن فیل خفاخہ تو برائے نام ہی رہ گئی ہے۔ وہ مارشل آرٹ کا بہت بڑا مرکز بن گئی ہے۔ مارشل آرٹس کے شیدائی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر سے وہاں آتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے ماسٹر موجود ہیں۔ مہاراج نے بھی کچھ عرصہ وہیں سے تربیت حاصل کی ہے اور وہاں لڑکیاں بھی آتی ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ وہاں تمہیں اس چادر سے نجات مل جائے گی۔“

رات کا آخری پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اچانک ایک طرف سے باتوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر اس طرف دیکھا۔ دور کسی پول پر بلب جل رہا تھا اور اس کی مدھم کی روشنی میں دو آدمی پارک میں داخل ہوتے نظر آئے۔ وہ دونوں پولیس کی وردی میں تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی جسے اس نے پارک میں داخل ہونے کے بعد جلا لیا تھا۔

وہ ٹارچ کی روشنی میں مختلف جگہوں پر سوئے ہوئے

لوگوں کو دیکھتے آرہے تھے۔ ایک دو کو انہوں نے ہلکی ٹھونسن بھی ماری تھیں۔

”میری گود میں سر رکھ کر اوندھی ہو جاؤ۔ تمہارا چہرہ بھی انہیں نظر نہیں آتا چاہیے۔“ میں نے جاگتی کے کان میں سرگوشی کی۔

”ان لوگوں کو ہماری تلاش تو نہیں۔“ جاگتی کے لیے میں ہلکا سا خوف تھا۔

”پگل مت بنو۔“ میں نے کہا ”ابھی تک تو کسی کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ اس بیگلے میں کیا ہوا ہے اور پھر ہمیں کس نے دیکھا تھا۔ وہ لوگ اسی طرف آرہے ہیں۔ اوندھ جاؤ۔ ٹارچ کی روشنی پڑنے پر بھی کسی رد عمل کا اظہار مت کرنا۔“

جاگتی نے اوندھ کر اپنا چہرہ میری گود میں چھپایا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا اور سر کو پیچھے جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک منٹ بعد وہ دونوں پولیس والے ہمارے قریب آکر رک گئے۔ ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔ ان دونوں نے آپس میں کوئی بات کی اور پھر وہاں سے آگے چل پڑے۔ میں نے آنکھوں میں معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا۔ وہ دونوں پولیس والے دائیں طرف ایک اور بیچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ پولیس والے تقریباً بیس منٹ تک پارک میں گھومتے رہے اور پھر دوسری طرف سے باہر نکل گئے۔ میں نے جاگتی کا کندھا دبا دیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”نیند آ رہی تھی۔ تم نے اٹھا دیا۔ کتنا سکون مل رہا تھا۔“ جاگتی نے مدھم لہجے میں کہا۔ اس کے لیے میں غماز تھا۔

”آجھا۔ سو جاؤ۔ رات کا تھوڑا ہی حصہ باقی ہے۔ میں بھی کچھ اونگھ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

جاگتی نے دوبارہ سر میری گود میں رکھ لیا اور میں نے بھی سر بیچ کی پشت سے ٹکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

رات دھیرے دھیرے بیتی رہی۔ میں ابھی آنکھیں کھول دیتا اور کبھی اونگھتے لگتا۔

صبح کی روشنی پچیلنا شروع ہو گئی تھی۔ آس پاس کی عمارتوں میں رہنے والے لوگ ہوا خوری اور جوگنگ میں آنے لگے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورت بھی اور نو عمر بچے بھی۔ پارک میں سوئے ہوئے بے گھر لوگ اٹھ اٹھ کر جارہے تھے۔ میں اور جاگتی وہیں بیٹھے لوگوں کو جوگنگ کرتے

ہوئے دیکھتے رہے۔

دھوپ نکل آئی۔ پارک میں لوگوں کی تعداد کچھ کم ہونے لگی۔ پارک کے گٹ سے ذرا ہٹ کر نکلا تھا۔ ہم نے وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو دیا اور دوبارہ ایک ایسی بیچ پر بیٹھ گئے جہاں قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے سیٹل میں سے وہ تینوں پر س نکال لیے جو چانگ ہو اور اس کے ساتھیوں کی جیبوں میں سے نکالے تھے۔ ان تینوں میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میں نے رقم تو سیٹل میں ڈالی اور مختار نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ تینوں پر س پودوں کے چیمچے پھینک دیے اور جاکو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔

بدھ بھکشو عام طور پر بیک مانگ کر کھانا کھاتے ہیں۔ وہ بھگ مانگنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ البتہ کچھ بھکشو ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو قین جیز خریدتے ہیں۔ ہم نے قیمت ادا کر کے کھانا خرید اور کھاتے ہوئے فٹ ہاتھ پر چلتے رہے۔ ہم لوگوں سے راستہ پوچھتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے بعد بس اسٹیشن پہنچ گئے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ شاؤن فیل کے لیے یہاں سے کوئی بس نہیں جاتی البتہ ایک گھنٹے بعد ہمیں دی یانگ کے لیے بس مل جائے گی وہاں سے ہم یونان جا سکیں گے جہاں سے شاؤن فیل جانا آسان ہو گا۔

میں نے ٹکٹ لے لیے اور ہم ایک کونے میں بڑے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو عورتیں بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر بھی اور دوسری جوان۔ ان کی باتیں سن کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کسی مل کی بات کر رہی تھیں۔ ادھیڑ عمر عورت کہہ رہی تھی۔ ”وہ انسان نہیں ورنہ تھا۔ پہلے اپنے دوستوں کو گردنیں توڑ کر قتل کر دیا اور پھر پستول سے اپنے آپ کو گولی مار کر خود کشی کر لی۔“

”اچھا ہوا وہ خود بھی مر گیا۔“ جوان عورت نے کہا ”لیکن نجانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ چانگ نے تو اپنے دوستوں کو مارا ہے اور نہ ہی خود کشی کی ہے۔ ایسے بے غیرت لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ ان تینوں کو کسی اور نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو ان سے زیادہ طاقت ور تھا جس نے ان کی گردنیں نگوں کی طرح توڑ ڈالیں۔“

”کس کی بات کر رہی ہو مس؟“ میں نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی جوان عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کنیں کوئی قتل ہو گیا ہے؟“

”ہمارے علاقے میں تین بد معاش مارے گئے ہیں۔“

اس عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پولیس کا خیال ہے کہ ان میں سے ایک نے پہلے اپنے دو ساتھیوں کو قتل کیا اور پھر خود کشی کر لی۔ اچھا ہوا۔ وہ تینوں مر گئے۔ انہوں نے تو پورے شہر میں طوفان اٹھا رکھا تھا۔ پولیس بھی ان کا کچھ نہیں لگا سکتی تھی۔ چانگ ہو اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ وہ جس لڑکی کو چاہتے تھا خرا کر لے جاتے۔ کوئی ان کا کچھ نہیں لگا سکتا تھا۔ لوگ ڈرتے تھے اس سے۔ اچھا ہوا مر گیا لم بخت۔“

”لوگ لارڈ ہدا کا شاتی کا پیغام بھول گئے ہیں۔ خرابیاں تو پیدا ہوں گی۔“ میں نے کہا۔ ان عورتوں کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ بھی اسی علاقے کی رہنے والی تھیں جہاں تھرے قتل کی یہ واردات ہوئی تھی۔ جوان عورت خاصی حسین تھی اس کی باتوں سے میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ وہ بھی چانگ کے ہاتھوں چوٹ کھا چکی ہے۔

قل کی اس واردات کا انکشاف صبح سات بجے ہوا تھا جب چانگ ہو کا ایک اور گرگا اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دے دی اور پولیس نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ رات کو چانگ کا اپنے آدمیوں سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ ان میں زوردار قسم کی لڑائی ہوئی۔ وہ دونوں چانگ کے ہاتھوں مارے گئے اور چانگ نے اپنے آپ کو گولی مار کر خود کشی کر لی۔

لیکن میرے خیال میں پولیس اتنی بے وقوف نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہو لیکن اصل بات تو انکوائری کے بعد ہی سامنے آئے گی کہ چانگ ہو نے خود کشی نہیں کی تھی اسے بھی قتل کیا گیا تھا لیکن بہر حال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ پولیس اس کیس کو کس طرح ہینڈل کرتی ہے ہمارے لیے کوئی خطہ نہیں تھا۔ ہم اس کا بیج میں آتے جاتے کسی کی نظروں میں نہیں آتے تھے اور پھر دیر بعد ہم یہ شہر چھوڑ دینے والے تھے۔

وہ دونوں عورتیں بھی دی یانگ جا رہی تھیں اور انہوں نے بھی اپنے ٹکٹ لے لیے تھے۔ ادھیڑ عمر عورت قریبی اسٹال سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئی تھی اور اس میں ہمارا حصہ بھی تھا۔ میں تو ان عورتوں سے باتیں کرتا ہا لیکن جاکی خاموش ہی رہی تھی۔

بس اسٹیشن پر بڑا رش تھا۔ لگتا تھا شہر کی ساری آبادی نے کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنالیا ہو۔ ان پورٹ اور ریلوے اسٹیشن پر بھی یقیناً یہی صورت حال ہوگی۔

ہماری بس کی روانی کا اعلان ہوا تو ہم بھی اپنی جگہ سے

اٹھ گئے۔ بس انکسپڈ اور بڑی آرام دہ تھی۔ دو دو مسافروں کی سیٹیں تھیں اور درمیان میں کشادہ بینک تھی۔ ہماری سیٹ کے دائیں طرف ان عورتوں کی سیٹ تھی۔ پٹی کی کوئین نے کھڑکی کی طرف دیکھا تھا تاکہ وہ دوسری کی توجہ کا مرکز بن سکے۔

میرا خیال تھا کہ ہم شام سے پہلے دی یانگ پہنچ جائیں گے مگر یہ سفر برا طویل اور تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ رات دس بجے سے پہلے ہم اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

دی یانگ بھی ایک بڑا شہر تھا۔ بس سے اتر کر جب میں نے اپنی سڑا جیز عمر عورت سے کسی خانقاہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کر دی۔ میں نے جاکو کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر یہ پیشکش قبول کر لی۔

ادھیڑ عمر عورت کا نام یا شی اور جوان عورت کا نام کیو بیٹی تھا۔ اس کی عمر پچیس ستائیس سال رہی ہوگی۔ ان کی رہائش شہر کے پوش علاقے میں واقع ایک خوب صورت بنگلے میں تھی جہاں ایک خوب صورت لڑکی اور ایک بوڑھا پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس لڑکی کی عمر بیس یا بیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور وہ کیو بیٹی سے زیادہ حسین تھی جبکہ اس بوڑھے کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے خفاہ پھٹی تھی۔

وہ خبیث بوڑھا کیو بیٹی کا چچا تھا۔ وہ اس بات پر سخت برہم تھا کہ وہ لوگ ہمیں اپنے ساتھ کیوں لے کر آئی تھیں۔ اس کا انکشاف تو بعد میں ہوا کہ کیو بیٹی کا چچا عورتوں کا دھند کرتا تھا۔ وہ شہر کے بڑے لوگوں کو شراب اور عورتیں چلائی کرتا تھا اور اس کی جوان اور خوب صورت بیٹی بھی اس کی آغوش کا ذریعہ تھی لیکن ہماری وجہ سے کم از کم ایک رات کے لیے اس کا دوبارہ شہب ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کسی بھکشو موجودگی میں کوئی شخص ایسا کند کام نہیں کر سکتا تھا۔ کیو بیٹی اور یا شی کے بارے میں بھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ کس منگ میں ان کا بھی یہی دھندا تھا اور چانگ ہو سے بھی ان کا کچھ تعلق نہ تھا۔ چانگ ہو اور اس کے ساتھیوں کے قتل پر انہیں یہ خوف دامن گیر ہو گیا تھا کہ پولیس انہیں پریٹان کرے گی اس لیے وہ دونوں وقت ضائع کیے بغیر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔

ہمیں کسی کے دھندے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہم نے رات دہاں گزاری اور صبح ہوتے ہی یا شی اور کیو بیٹی کا

شکر یہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ یا شی نے ازارہ ہمدردی یا بھکشوئیں سے عقیدت کی بنا پر ہمیں کھانے کا کچھ سامان اور پینہ رقم بھی دے دی تھی۔

دی یانگ سے بائرنگ بھی پورے دن کا سفر ثابت ہوا تھا۔ بائرنگ میں جب ہم بس سے اترے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ رہائش کے لیے جگہ تلاش کرنے میں ہمیں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ یہاں اگرچہ تین بڑی خانقاہیں تھیں لیکن ان تینوں خانقاہوں کے گیٹ شام ہونے سے پہلے ہی بند ہو چکے تھے۔

شہر میں کھوتے ہوئے ہمیں ایک اور آوارہ گرد بھکشو مل گیا۔ وہ بنا کتا آدمی تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بھی ہماری طرح گنجا ہی تھا۔ تنگ سی پیشانی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ مضبوط ہاتھ پیر۔ وہ اگر چاہتا تو محنت کر کے رزق حلال کما سکتا تھا لیکن وہ بھکشو بن گیا تھا کہ اس طرح محنت کے بغیر پیٹ بھرنے کو مل جاتا تھا۔

ہمیں ان کا وہ بھکشو بھی ہماری طرح رات گزارنے کے لیے جگہ کی تلاش میں تھا۔ وہ آوارہ گرد بھکشو ہراس جگہ جا چکا تھا جہاں بدھ کے ماننے والے آباد تھے۔ وہ ہندوستان میں بھی کئی مہینے گزار چکا تھا۔ تھوڑی بہت ہندی بھی سمجھتا تھا۔ چینی، بری اور تھائی زبانیں بھی بول لیتا تھا۔

”میں کئی سال پہلے یہاں آیا تھا۔“ ہمیں بتا رہا تھا ”مجھے یاد پڑتا ہے کہ شہر کے باہر دریا کے کنارے پر ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے۔ ہمیں وہاں رات گزارنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ تم لوگ بھی وہیں چلو۔“

ظاہر ہے ہمیں تو رات گزارنے کے لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ ہم شہر سے نکل کر دریا پر واقع اس خانقاہ میں پہنچ گئے۔ خانقاہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ عمارت کا ایک حصہ دریا کے اندر ایک پتہ چوڑے تنک چلا گیا تھا۔ پانچ تھ بھکشو پہلے ہی سے موجود تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو قریہ قریہ گھومتے رہتے تھے اور ہماری طرح رات گزارنے کے لیے یہاں آگئے تھے۔

دریا کی طرف چوڑے پر ایک بہت بڑا شید بنا ہوا تھا۔ تین بھکشو اس شید کے نیچے بیٹھے تھ کھارے تھے۔ بھکشو بننے کے لیے بہت سی شرائط کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جن میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ کوئی بھکشو دوسرے بعد کسی قسم کی کوئی چیز نہیں کھائے گا۔ یعنی صبح سے دوپہر تک تو کچھ بھی کھایا جا سکتا تھا۔ دوپہر سے اگلی صبح کھانے کی ممانعت تھی لیکن میں نے اکثر بھکشوئیں کو دیکھا تھا کہ وہ دوپہر کے بعد اور رات کو



بھی کھاتے پیتے رہتے تھے۔

ہم تینوں بھی شیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ میں نے بھی اپنا تھلا کھول کر پاشی کی دی بوتلی کھانے کی چیزیں نکال لیں۔ مکیان بھی ہمارے ساتھ کھانے لگا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی سناٹا سا چھا گیا۔ وہ تینوں بھکشو سوچتے تھے جاگنی بھی اٹھنے لگی۔ مکیان مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے ہندوستان کے قصے سناتا رہا تھا۔ ہندو مذہب اور یوگیوں کے بارے میں اس کے قصے واقعی بڑے دلچسپ تھے۔ اس کی باتیں سن کر میرے دل میں بھی ہندوستان دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہونے لگا۔ پاکستان تو مجھے جانا ہی تھا۔ لاہور میری جائے پیدائش تھی اور میرے ماں باپ کے دشمنوں نے انہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجھے دشمنوں سے بچانا چاہتے تھے۔ میرا مستقبل محفوظ بنانا چاہتے تھے لیکن دشمن ان کے پیچھے سگاپور بھی پہنچ گئے تھے۔ میرے باپ کا اصل دشمن تو چودری نواز علی ہی تھا جس نے انہیں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور مجھے اس سے انتقام لینا تھا۔ دارا کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ تھا اور کہیں نہ کہیں میرا اور اس کا آتما سامنا ضرور ہوگا۔

پاکستان جانے سے پہلے میرے لیے شاولن فیل جاننا ضروری تھا۔ اگرچہ ہمارا ج کی تربیت نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ دارا، کم اور پی ٹانگ جیسے لوگ مجھ سے ڈر کر بھاگتے رہتے تھے لیکن شاولن فیل میں تربیت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہاں بڑے بڑے ماسٹر موجود تھے۔ میں ان سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔ ہمارا ج نے میرے اندر لاوا بھرا تھا اور میں شاولن فیل کے ماسٹروں سے سیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لاوا آتش فشاں کیسے بنتا ہے۔

مکیان سے ہندوستان کی باتیں سن کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب پاکستان جاؤں گا تو ہندوستان بھی ضرور جاؤں گا۔

مکیان کی باتیں کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں بھی یہ سوچ کر ہوں ہاں کرتا ہاں کہ کچھ وقت کٹ رہا تھا کیونکہ مجھے نیند تو بے بھی نہیں آ رہی تھی۔

یہاں چھوڑ کی بہتات بھی جو بڑی بے رحمی سے ہمارا خون چوس رہے تھے۔ چھوڑوں ہی کے کانٹے سے جاگنی بھی اٹھ گئی اور خاموشی سے ہماری باتیں سننے لگی۔

مکیان نے اپنے تھیلے میں سے کانڈ کا ایک لفافہ نکال لیا۔

”یہ مٹھائی میں نے آج شام کو خریدی تھی۔“ اس نے

لفافہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا ”لو کھاؤ۔“ بڑے سحر سے ہے۔

وہ برقی قسم کی کوئی چیز تھی۔ میں نے ایک ٹکڑا کھا لیا۔ بھرپور لذت کے ساتھ کھا کر اسے دے دی تھی۔ گویا بھکشو دے دیا اور ایک خود کھانے لگا۔ مکیان دوسرے ٹکڑے سے کوئی اور چیز نکال کر کھانے لگا تھا۔

ہم نے برقی کا صرف ایک ایک ٹکڑا ہی کھایا تھا۔ باقی بڑے علاقوں میں رکھ لیا۔ باتوں باتوں میں کسی مکیان نے دوبارہ اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ باتوں باتوں میں کسی ایک بار پھر پلٹ کر نکلا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی۔

پورے زور کی نیند آ رہی تھی۔ میں سرگراں چھپا دیتے۔ جنگ رہا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد میں اٹا فیل ہو گیا۔ صبح سات بجے جاگنی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ہمارے پاس ابھی خاصی رقم تھی اور ہم بسوں میں سڑک کے سرمنوں بھاری ہو رہا تھا۔ دماغ میں سنسنائٹ سی، دو تین دن میں بڑے آرام سے شاولن فیل پہنچ سکتے تھے مگر تھی۔

”وہ دھبہ بھاگ گیا۔“ جاگنی کہہ رہی تھی ”اٹھو۔“

تلاش کر دو۔“

”کون بھاگ گیا؟“ میں نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔ ہمارا رزق کی فٹل ل گئی۔

”وہ مکیان... بھاگ گیا وہ۔“ جاگنی نے کہا۔ ہمارا سفرات آٹھ بجے شروع ہوا تھا اور ڈرائیور کے ”بھاگ گیا ہے تو جانے دو۔ میں اسے کیوں کہنے کے مطابق ہمیں صبح چھ بجے پوشووانگ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا معاون بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اور جاگنی کے لیے ٹرک میں لدے ہوئے سامان ”کیا۔“ میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور میں اٹھیں تھوڑی سی جگہ بنا دی تھی۔

”وہ اُدھر دیکھتے لگا۔“ صبح چار بجے کے قریب ٹرک خراب ہو گیا۔ میں اس کوئے میں ایک بھکشو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہٹا ہنوت سورا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے معاون کی آواز سن سنا تھی چھ بجے سے پہلے ہی چلا گیا تھا اور سرمئی رنگ کا کریم نیچے اتر آیا۔ پیلپر اس وقت ٹرک کے نیچے لیٹا تاراج کا تھیلہ بھی اسی کے پاس تھا۔

”وہ ابھی شرمیں ہی ہوگا۔ چلو۔ اسے تلاش کرو۔ وہ باہر نکل آیا اور ڈرائیور سے کچھ باتیں کرتا رہا پھر ٹرک کے پیچھے چھ پرچہ لگیا۔ میں نیچے کھڑا ڈرائیور سے ٹرک کی

میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ شری پتے پتے خرابی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اور سے پیلپر کی ایک گھنٹا لگ گیا۔ ہم مختلف سڑکوں پر اسے تلاش، آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے اور جاگنی کے لیے رہے۔ بس اسٹیشن پر مختلف لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا تو یوگ مین کی پھرت پر جگہ بنائی گئی تھی۔ وہیں ٹول بس اس طے کا بھکشو ساڑھے چھ بجے تیار ک ڈو کی طرف، ہنگامہ ہوا تھا۔ پیلپر کو ٹول بس کھولنا تھا اور وہ جاگنی کو وہاں والی بس پر سوار ہوا تھا۔

میرے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔ اس وقت پیلپر دوسرے ہی لمحے میں نے جاگنی کو ٹرک سے اترتے ہوئے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ بس ملاؤں دور جا چکی۔ دی اور دیکھا۔ اس کے پیچھے ہی پیلپر نے بھی چلا لگا دی تھی۔ وہ پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ اس کا پیچھا کر سکتے۔ ہمارے تھیلے میں ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے صورت حال جو کچھ بھی تھا اس تھیلے ہی میں تھا۔ اب ہمارے ہاتھ کاٹا لٹا لٹا گئے میں دھواری پیش نہیں آئی۔

ڈرائیور اور پیلپر آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ کوزی تک نہیں بھی۔ پوٹن نائی اس چھوٹے سے گاؤں میں جاگنی کے

پوٹن نائی اس چھوٹے سے گاؤں میں جاگنی کے

لفافہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا ”لو کھاؤ۔“ بڑے سحر سے ہے۔

وہ برقی قسم کی کوئی چیز تھی۔ میں نے ایک ٹکڑا کھا لیا۔ بھرپور لذت کے ساتھ کھا کر اسے دے دی تھی۔ گویا بھکشو دے دیا اور ایک خود کھانے لگا۔ مکیان دوسرے ٹکڑے سے کوئی اور چیز نکال کر کھانے لگا تھا۔

ہم نے برقی کا صرف ایک ایک ٹکڑا ہی کھایا تھا۔ باقی بڑے علاقوں میں رکھ لیا۔ باتوں باتوں میں کسی مکیان نے دوبارہ اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ باتوں باتوں میں کسی ایک بار پھر پلٹ کر نکلا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی۔

پورے زور کی نیند آ رہی تھی۔ میں سرگراں چھپا دیتے۔ جنگ رہا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد میں اٹا فیل ہو گیا۔ صبح سات بجے جاگنی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ہمارے پاس ابھی خاصی رقم تھی اور ہم بسوں میں سڑک کے سرمنوں بھاری ہو رہا تھا۔ دماغ میں سنسنائٹ سی، دو تین دن میں بڑے آرام سے شاولن فیل پہنچ سکتے تھے مگر تھی۔

”وہ دھبہ بھاگ گیا۔“ جاگنی کہہ رہی تھی ”اٹھو۔“

تلاش کر دو۔“

”کون بھاگ گیا؟“ میں نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔ ہمارا رزق کی فٹل ل گئی۔

”وہ مکیان... بھاگ گیا وہ۔“ جاگنی نے کہا۔ ہمارا سفرات آٹھ بجے شروع ہوا تھا اور ڈرائیور کے ”بھاگ گیا ہے تو جانے دو۔ میں اسے کیوں کہنے کے مطابق ہمیں صبح چھ بجے پوشووانگ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا معاون بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اور جاگنی کے لیے ٹرک میں لدے ہوئے سامان ”کیا۔“ میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور میں اٹھیں تھوڑی سی جگہ بنا دی تھی۔

”وہ اُدھر دیکھتے لگا۔“ صبح چار بجے کے قریب ٹرک خراب ہو گیا۔ میں اس کوئے میں ایک بھکشو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہٹا ہنوت سورا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے معاون کی آواز سن سنا تھی چھ بجے سے پہلے ہی چلا گیا تھا اور سرمئی رنگ کا کریم نیچے اتر آیا۔ پیلپر اس وقت ٹرک کے نیچے لیٹا تاراج کا تھیلہ بھی اسی کے پاس تھا۔

”وہ ابھی شرمیں ہی ہوگا۔ چلو۔ اسے تلاش کرو۔ وہ باہر نکل آیا اور ڈرائیور سے کچھ باتیں کرتا رہا پھر ٹرک کے پیچھے چھ پرچہ لگیا۔ میں نیچے کھڑا ڈرائیور سے ٹرک کی

میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ شری پتے پتے خرابی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اور سے پیلپر کی ایک گھنٹا لگ گیا۔ ہم مختلف سڑکوں پر اسے تلاش، آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے اور جاگنی کے لیے رہے۔ بس اسٹیشن پر مختلف لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا تو یوگ مین کی پھرت پر جگہ بنائی گئی تھی۔ وہیں ٹول بس اس طے کا بھکشو ساڑھے چھ بجے تیار ک ڈو کی طرف، ہنگامہ ہوا تھا۔ پیلپر کو ٹول بس کھولنا تھا اور وہ جاگنی کو وہاں والی بس پر سوار ہوا تھا۔

میرے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔ اس وقت پیلپر دوسرے ہی لمحے میں نے جاگنی کو ٹرک سے اترتے ہوئے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ بس ملاؤں دور جا چکی۔ دی اور دیکھا۔ اس کے پیچھے ہی پیلپر نے بھی چلا لگا دی تھی۔ وہ پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ اس کا پیچھا کر سکتے۔ ہمارے تھیلے میں ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے صورت حال جو کچھ بھی تھا اس تھیلے ہی میں تھا۔ اب ہمارے ہاتھ کاٹا لٹا لٹا گئے میں دھواری پیش نہیں آئی۔

ڈرائیور اور پیلپر آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ کوزی تک نہیں بھی۔ پوٹن نائی اس چھوٹے سے گاؤں میں جاگنی کے

پوٹن نائی اس چھوٹے سے گاؤں میں جاگنی کے

تھے۔ وہ دونوں ایسی زبان بول رہے تھے کہ ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا مگر ان کی نظروں اور انداز گفتگو سے میں ان کا پروگرام سمجھ گیا تھا۔

پیلپر نے اچانک ہی جیب سے چاقو نکال لیا۔ ڈرائیور نے جاگنی کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ ان کا منسوب شاید یہ تھا کہ پیلپر مجھے چاقو کی زور پر لے کر لے گا اور ڈرائیور جاگنی کو دیوبج لے لے گا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا

پستول نکال لیا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ڈرائیور اور پیلپر اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے۔ میں نے انہیں ڈرانے کے لیے ہوائی فائر کروایا اور ایک ہاتھ سے جاگنی کا بازو پکڑا کر اگلے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔

پندرہ بیس گز دور ہٹ کر میں نے اُدھر اُدھر دیکھا اور پھر کھیتوں میں دوڑ لگا دی۔ جاگنی بھی میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں ٹرک کے قریب کھڑے تھے۔ کسی نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہم کھیتوں میں بہت دور تک دوڑتے رہے۔ ایک جگہ رک کر سانس درست کیا اور پھر تیز تیز چلے گئے۔ ڈرائیور نے بتایا تھا کہ صبح چھ بجے کے قریب پوشووانگ پہنچ جائیں گے۔ دو گھنٹے پہلے ٹرک خراب ہو گیا تھا۔ اگر ہم سوک کے متوازی کھیتوں میں چلتے رہیں تو تین چار گھنٹوں میں پوشووانگ پہنچ سکتے تھے۔

لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ ہم کھیتوں میں راستہ بھٹک کر سوک سے بہت دور نکل گئے تھے۔

دن کی روشنی پھیل گئی۔ سورج نکل آیا۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ دھان کے کھیتوں میں کہیں کہیں کسان کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن ہم ان سے دور رہ کر چلتے رہے۔ دھپر کے قریب بہت دور ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دی۔ آس پاس کوئی بستی نہیں تھی۔

جاگنی تھک گئی تھی۔ تیز دھوپ اور پودوں سے پیدا ہونے والے جس سے ٹھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ لباس پہننے سے تر ہونے لگے تھے۔ جاگنی رکنا چاہتی تھی لیکن میں اسے گھماتا رہا۔

کھیتوں میں وہ اگلی کی عمارت اب زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے ارد گرد کچھ درخت بھی تھے۔ ہم ایک جگہ رک کر دیر تک اس عمارت کا جائزہ لیتے رہے۔ وہاں کسی ذی

روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ دراصل ایک چھوٹی سی ویران خانقاہ تھی۔ مرکزی ہال میں ایک چوترے پر مسلمانہ جادہ کا بہت بڑا مجسمہ تھا جو ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ عمارت کی کھڑکیاں اور دروازے غائب تھے۔ مرکزی ہال کے علاوہ پچھلے طرف دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں میں گرد کی موٹی تہ جی ہوئی تھی البتہ مرکزی ہال کا فرش صاف ستھرا تھا۔ شاید آس پاس بھیتوں میں کام کرنے والے چینی کا کاشکار کچھ دیر سنانے کے لیے یہاں بیٹھ جاتے ہوں گے۔ برآمدہ بھی صاف ستھرا تھا۔

ہم برآمدے ہی میں بیٹھ گئے۔ اسی طرف آتے ہوئے میں نے بھیتوں میں جن کسانوں کو کام کرتے دیکھا تھا وہ نیلے لباس میں تھے جس کا مطلب تھا کہ ان کا تعلق ایک ہی کمیونیٹی سے تھا۔ ظاہر ہے وہ کیونٹ تھے اور اسی لیے یہ خانقاہ کھنڈر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہو سکتا ہے جب یہ خانقاہ تعمیر کی گئی ہو۔ اس وقت آس پاس بدھ کے پیرو کاروں کی اکثریت ہو لیکن وقت بدل گیا تھا۔

میں جاگتی کو برآمدے ہی میں بیٹھا چھوڑ کر عمارت کے پچھلی طرف چلا گیا۔ اس طرف شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی اور میرے لیے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ ندی کے آس پاس تربوز کی بیلیں بچھیلی ہوئی تھیں جن میں بڑے بڑے تربوز بھی لگے ہوئے تھے۔ میں نے جاگتی کو بھی بلایا۔ پہلے میری کو پانی پلا پھر ایک بڑا سا تربوز توڑ کر دوبارہ برآمدے میں آگئے اور میں خنجر نکال کر تربوز کاٹنے لگا۔

وہ پورا دن اور اگلی رات ہم نے وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارا پیٹ بھرے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ہم کئی روز یہاں رہ سکتے تھے۔

جاگتی کے چرے پر بایوسی تھی۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ البتہ میں باتوں سے اس کا حوصلہ دھانے کی کوشش کرتا رہا۔

شام ہو چکی تھی۔ اندھیرے کی سیاہ چادر نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے رہے۔ شام ہوتے ہی ٹھنڈک سی ہو گئی تھی اور اب خنکی میں بدترج اضافہ ہو رہا تھا۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے وجدان۔“ جاگتی کہتے ہوئے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

”بابر! ہو چل رہی ہے۔ چلو اندر چل کر بیٹھیں۔“ سردی سے بچ رہیں گے۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں اٹھ کر اندر آگئے۔

مرکزی ہال میں ٹولتے ہوئے ہم جیسے والے چوترے

کے پاس پہنچ گئے۔ میرا خیال تھا چوترے سے ٹیک لگا رہیں گے۔

”رک جاؤ۔ میں اپنی چادر کھول کر فرش پر ہوں۔ آرام سے لیٹ کر سو تو جاویں گے۔“ جاگتی نے ”گھر۔“

”اس ویرانے میں کون آکر مجھے دیکھتے گا۔“ میری بات کاٹ دی۔ کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ چادر کے دو کونے میرے ہاتھ میں دے دیے۔ ٹٹول کر چوترے کے ساتھ چادر بچھا دی اور چوترے کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹانگیں سپار لیں۔

مجھے جلدی نیند آئی۔ اندازہ نہیں کرتی کہ پڑاؤ اپنے سینے پر بوجھ محسوس کر کے میری آنکھ کھل گئی۔ ٹٹول کر دیکھا۔ وہ جاگتی تھی جو مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اسے یقیناً سردی لگ چکی، فرش پر پچھی ہوئی چادر ساڑی کی طرح خاصی لمبی میں نے فالتو چادر سمیٹ کر اس کے اوپر ڈال دی۔ اپنے آپ کو جاگتی سے الگ کرنا چاہتا لیکن اس نے مجھے گرفت میں لے رکھا تھا۔

میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ میں پھر اور پھر کھیر لگنے والی ٹھوکر سے میری آنکھ کھل گئی۔ جاگتی میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ وہ نیند میں تھی۔ شاید نیند میں اس نے ہاتھ مارا ہو گا لیکن اگلی ٹھوکر زیادہ زور دار تھی۔ اس مرتبہ میں نے آنکھیں کھول دیں اور سر اٹھا کر دیکھا۔ میری نیند کا نور ہو گیا اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ پانچ چھ آدمی تھے جنہوں نے ہمیں گھیرے رکھا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی دو کے ہاتھ تلواریں اور باقی ترشول سے ملے جلتے ہتھیار لے رہے۔ اور ان تمام ہتھیاروں کا رخ ہماری طرف تھا۔

میرے سنبھلنے سے پہلے تیری ٹھوکر میری طرف کھینچ گئی۔ میں اب بھی جاگتی کی ہانہوں کی گرفت میں نے اس کی گرفت چھڑانے کے لیے جیسے ہی اس پر ہاتھ رکھا، میں چونک گیا۔ جاگتی کو تیز بخار ہو رہا تھا۔ میرے دائیں طرف کمرے ہوئے آدمی نے ہاتھ پھر ٹھوکر مارنا چاہی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے ہاتھ اس کی ٹھوکر کو روک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گرفت سے چھٹکارا حاصل کر کے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس شخص نے غراتے ہوئے تلواروں کی نوک

کے پاس رکھ دی۔ دوسروں نے بھی اپنے ہتھیار سیدھے کر لیے۔ ایک نے تو ترشول نما ہتھیار سے جاگتی کو بھی زد میں لے لیا تھا۔ وہ دراصل ترشول نہیں تھا۔ ایک لمبے سے ڈنڈے کے آٹے تین آہنی شاخوں والا ہتھیار سا لگا ہوا تھا۔ یہ دراصل بھوسا یا گھاس وغیرہ جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

جسم پر تلنے والی تین ٹھوکروں اور ان ہتھیار بند لوگوں کی موجوں سے میرا دماغ بالکل صاف ہو چکا تھا۔ اس وقت میں دونوں کیناں فرش پر ٹکائے ذرا سا اوپر کو اٹھا ہوا تھا اور تلوار کی نوک میرے سینے پر تھی۔ وہی شخص جو چچ کر کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ وہ اگرچہ چینی زبان ہی بول رہا تھا مگر ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں اسی طرح پڑے پڑے ان لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ باہر اگرچہ دھوپ چمک رہی تھی لیکن کمرے کے اندر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ بغور جائزہ لینے کے بعد پتا چلا کہ ان کی تعداد پانچ تھی۔ جن میں تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں تلوار تھی جو اس نے میرے سینے سے لگا رکھی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ تیسرے نے ترشول سے جاگتی کو زد میں لے رکھا تھا۔ ایک عورت کے ہاتھ میں تلوار اور دوسری کے ہاتھ میں ترشول تھا۔

میں نے گردن گھما کر جاگتی کی طرف دیکھا جو اب بھی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اس کے جسم میں ہلکی سی پکپکاہٹ تھی۔ وہ یا تو مری نیند میں تھی یا بدبو شامی۔ اسے صورت حال کی گھنٹیں کا کچھ احساس نہیں تھا۔

تلوار والے نے ایک بار پھر چچ کر کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار کی نوک سے میرے سینے پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈالا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ نوک اتنے غصے میں کیوں تھے۔ رات کو سو تو میں چادر ہٹ گئی تھی اور میرے بدن پر صرف نیکر تھی۔ جاگتی نے ٹوٹنے سے پہلے ہی اپنی چادر فرش پر بچھالی تھی۔ اس کے جسم پر مختصر سا بلاؤز اور نیکر نما اسکرٹ تھا جو اس وقت اوپر تک سمٹا ہوا تھا۔ وہ جس طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اس سے کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔

”تم اپنی یہ تلوار ہٹاؤ تو میں اٹھ سکوں گا۔“ میں نے اس چینی کی طرف دیکھتے ہوئے رک رک کر کہا جس نے تلوار کی نوک میرے سینے سے لگا رکھی تھی۔

میں نے بھی چینی زبان استعمال کی تھی اور یہ الفاظ رک رک کر کہتے تھے اور شاید وہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

اس نے تلوار میرے سینے سے ہٹائی۔ جاگتی کا ایک ہاتھ اب بھی میرے سینے پر تھا۔ میں نے بڑی آہستہ سی اس کا ہاتھ ہٹایا اور سامنے کھڑی ہوئی تلوار بردار عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میری اس ساتھی عورت کو تیز بخار ہے اور اسے سردی بھی لگ رہی ہے۔ یہ ہوش میں نہیں ہے اس لیے مجھ سے کہنی۔“

میرا اب تک کا یہ تجربہ تھا کہ عورتیں زیادہ نرم دل ہوتی ہیں۔ ان میں ہمدردی اور شفقت کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ کسی کا دکھ جان کر ان کا دل جلدی پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے یہ الفاظ ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے اور میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں اٹھی ہوئی نظروں سے مجھے اور جاگتی کو دیکھتی رہی پھر اپنے ساتھ کھڑی ہوئی دوسری عورت کی طرف دیکھا۔ اس نے مدھم لہجے میں کچھ کہا تو تلوار بدست عورت دو قدم آگے بڑھ کر جاگتی پر جھک گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے پایاں ہاتھ جاگتی کی پیشانی پر رکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگی جس نے مجھے تلوار کی زبرد لے رکھا تھا۔ اس شخص نے بھی تیز لہجے میں کوئی جواب دیا پھر دوسری عورت سے کچھ کہا۔ اس نے بھی جاگتی کو چھو کر دیکھا اور پھر باری باری وہ سب جاگتی کے بدن کو چھو کر دیکھنے لگے۔ پہلے تو وہ لوگ یہی سمجھتے رہے تھے کہ رشتہ ہاتھوں پکڑے جانے کی وجہ سے جاگتی خوف سے کانپ رہی ہے اور جان بوجھ کر نہیں اٹھ رہی تھی لیکن اب بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔

ان کے ہتھیار بچے جھک گئے۔ ان کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ تلوار والے چینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے اس مرتبہ رک رک کر بات کی تو اس کا مفہوم سمجھتے

**مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں**

**بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات**

**روشنی کے مینار**

قیمت: 150/- روپے

مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 راجی نمبر 1

ہوئے میری نظرس بے اختیار اپنی دائیں پٹنڈی کی طرف اٹھ گئیں۔ پٹنڈی پر چڑے کے گھیتے سے بندھا ہوا بھڑکناظر صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھڑکناظر کے اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس طرح میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ان کے سامنے میرا مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نیز کے اندر اڑسا ہوا پستول ان کی نظروں میں نہیں آ سکا تھا۔ میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کا پستول بلاؤز کے اندر تھا اور وہی اچھی تک ان کی نظروں سے محفوظ تھا۔

”اگر اجازت دو تو میں اٹھ کر اپنا لباس درست کرلوں۔“ میں نے اسی جگہ کی طرف دیکھا جس کے بارے میں میں یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ وہ اس پارٹی کا سربراہ ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں پھر پیٹنڈی سے اٹھ گیا اور پہلی چادر اپنے جسم پر لپیٹ لیا پھر میں جاگی پر جھک گیا۔

جاگی اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے کراہیں سی خارج ہو رہی تھیں۔ میں فرش پر چھٹی ہوئی چادر اٹھا کر اس کے جسم پر لپیٹ لگا اور اس دوران میں بڑی ہوشیاری سے اس کے گردبان میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالا اور اپنی چادر میں چھپا لیا۔

”کیا تم میری کچھ مدد کرو گی؟“ میں نے تلوار والی عورت کی طرف دیکھا۔

وہ آگے بڑھ آئی اور جاگی کے بدن پر چادر لپیٹنے میں میری مدد کرنے لگی۔ جاگی کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے ملیا ہو گیا تھا اور فوری طور پر اس کا علاج ضروری تھا۔ اسے تھر تھر کانپتے دیکھ کر ایک آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر اس پر ڈال دیا لیکن اس کی کپکپاہٹ کم نہیں ہوئی۔

اس پارٹی کے سربراہ کا نام ہو کیا تھا لیکن وہ بڑے بگڑے ہوئے لیٹے میں چینی زبان بول رہا تھا۔ وہ کسان تھے۔ ہو کیا نے رک رک کر بتایا کہ صبح سویرے ان کا ایک ساتھی اس طرف آ نکلا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو ساتھ لیے ہوئے دیکھا تو دونوں مردوں کو اطلاع کر دی۔ وہ ہمیں جاسوس سمجھ رہے تھے۔ چچن کی حدود میں نظر آنے والے ہر اجنبی کو جاسوس سمجھ لیا جاتا تھا اور جو شخص ایک مرتبہ جاسوس کے الزام میں پکڑا جاتا پھر زندگی بھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔

”ہم جاسوس نہیں ہیں۔“ میں نے اس کی بات سن کر کہا ”ہم بدمذہب کے بیروکار ہیں، بھکشو، ہم مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے شاؤلن فیل جا رہے تھے لیکن

راستے میں ایک ٹریڈی کی وجہ سے ہمیں راستہ بدلنا پڑا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر انہیں بتانے لگا کہ ایک مال بردار بزرگ پر یوشو وانگ کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں ٹرک خراب ہو گیا اور اسی دوران میں ٹرک کے زرائع اور اس کے ہیلپر کو کسی طرح تپا چل گیا۔ میرا ساتھی مرد نہیں عورت ہے۔ ان کی نیت میں فوراً کیا لیکن ہم کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلے اور کھیتوں میں پھسلے ہوئے اس طرف آ گئے۔

”ہم رات گزارنے کے لیے یہاں رک گئے تھے۔“ میں نے کہا ”ہمارا خیال تھا کہ صبح ہوتے ہی یوشو وانگ کی طرف روانہ ہو جائیں گے لیکن میری یہ ساتھی۔“ میں ہلہ کل کے بغیر خاموش ہو کر جاگی کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم لوگ ہندوستانی ہو؟“ ہو کیا نے میرے چہرے پر نظرس جمادیں۔

”نہیں ہم تھائی ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”بناک سے برما اور وہاں سے بھگتے ہوئے اس طرف آئے ہیں۔“ اب مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ انڈین خاصہ بدنام ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہندوستانی دوست بن کر بھی پشت میں چھری گھونٹنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن چین سے انڈیا کی روایتی دشمنی سے تو میں واقف تھا۔ پُر امن حالات میں بھی انڈیا کے جاسوس چین کی حدود میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہوں گے اس لیے کسی ہندوستانی پر جاسوس ہونے کا شبہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

کن منگ میں جاگتے ہوئے بھی ہمیں یہی دھمکی دی تھی کہ اگر جاگی کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو وہ ہمیں جاسوس کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دے گا اور یہاں بھی ان کسانوں نے سب سے پہلے ہم سے یہی سوال کیا تھا۔

ہو کیا نے اور اس کے ساتھی آپس میں مشورہ کرنے لگے ان میں باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔ دونوں عورتیں بھی اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ مجھے جاگی کی فکر ہو رہی تھی۔ اسے فوری طور پر علاج کی ضرورت تھی۔ تاخیر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

ان کی بحث طویل پکڑتی جا رہی تھی۔ بالآخر مجھے مداخلت کرنی پڑی۔

”میری ساتھی کو علاج کی ضرورت ہے۔ اگر دیر ہو گئی تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔ یہ مر بھی سکتی ہے۔“ ”ٹھیک ہے۔“ ہو کیا نے کہا ”آئی الحال ہم تم لوگوں

کو اپنی بستی میں لے جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ کیا تمہاری ساتھی چل سکتی ہے؟“ ”میں اسے کندھے پر اٹھاؤں گا۔“ میں نے کہتے ہوئے جاگی کی طرف دیکھا پھر ہو کیا نے سب سے پہلے ”بستی کتنی دور ہے؟“

”زیادہ دور نہیں۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔“

ہو کیا نے جواب دیا۔

میں نے جاگی کو کندھے پر لا دیا اور ہم اس اُجڑی ہوئی عبادت گاہ سے باہر آ گئے۔ دھوپ خاصی تیز اور چھتی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق جو بجے کا وقت تھا۔ عبادت گاہ کے چھٹی طرف ایک جگہ سے ندی پار کی اور کھیتوں میں آگے

ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلے گئے۔ سب سے آگے ہو کیا نے اس کے پیچھے ایک آدمی، پھر ایک عورت اور اس کے پیچھے میں تھا۔ میرے پیچھے دوسری عورت اور آخر میں وہ آدمی تھا جس نے بارہو کی بندوق اٹھا رکھی تھی۔

وہاں کے کھیتوں میں پگڈنڈی پر دھوپ میں چلے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ تیز دھوپ کی وجہ سے کھیتوں میں اٹھنے والے بخارات نے کھنکھ اور جس سانس کا رکھا تھا۔ اگر جاگی میرے کندھے پر نہ ہوتی تو مجھے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

ہو کیا نے کہا تھا کہ ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے لیکن اتنی دیر چلنے کے بعد بھی کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں رک گیا اور جاگی کو پگڈنڈی پر بٹھا کر خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا اور اپنا سانس درست کرنے لگا۔ جاگی مجھ سے کہتی ہوئی تھی۔ ہو کیا نے وغیرہ بھی رک گئے تھے۔

بندوق والا شخص ان میں سب سے زیادہ صحت مند اور قدرے دراز قامت تھا۔ اس نے اپنی بندوق دوسرے ساتھی کو بٹھا دی اور جبکہ جاگی کو اٹھانے لگا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

چند منٹ وہاں بیٹھنے کے بعد میں نے جاگی کو دوبارہ کندھے پر اٹھایا اور ان کے ساتھ چلے لگا۔ کھیتوں میں مزید میں پچیس منٹ چلنے کے بعد کسی قدر خستہ میں وہ مختصر سی دھمکی دینے لگی۔

دور ہی سے دیکھا جاسکتا تھا کہ وہ کچے... مکان تھے اور ان کی تعداد س بارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک دو گھروں سے دھواں بھی اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو تین عورتیں اور ایک آدمی اور تین چار بچے بستی سے باہر آ گئے۔

وہ سب حیرت سے کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی میرے کندھے پر لدی ہوئی جاگی کو۔

ہو کیا نے ہمیں ایک مکان میں لے گیا۔ جاگی کو نکڑی کے ایک تختے پر لٹا دیا گیا جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ اس مکان میں ایک دھان پان سی عورت بیٹھی تھی۔ موجود تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ دہلی بستی سی، بہت گوری رنگت، چہرے کے انعوش بہت دلکش۔ وہ بالکل گڑیا لگا رہی تھی۔

وہ ہو کیا کی بیوی ہو کیدو تھی۔ ہو کیا نے تیز تیز بچے میں اس سے کچھ کہا۔ ہو کیدو کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ وہ چند لمحوں جاگی کی طرف دیکھتی رہی جو بالکل ناگہان سینے ٹھڑی سی بنی پڑی تھی۔

ہو کیدو تیز سے کمرے سے نکل گئی اور چند ہی منٹ بعد دو تین کبل آئی جو اس نے سب کے سب جاگی پر ڈال دیے اور دوبارہ کمرے سے نکل گئی۔ کمرے میں چار پانچ افراد اور بھی تھے۔ ہو کیا نے ان سب کو کمرے سے نکال دیا اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی باہر نکل گیا۔

میں دیوار کے قریب پڑی ہوئی نکڑی کی ایک سیدھی پشت والی کرسی تخت کے قریب ٹھیک کر بیٹھ گیا۔ کرسی کی ساری چولیس ڈھیلی تھیں میرے بیٹھے ہی وہ چرچا کر جھولنے لگی۔ کرسی کا یہ احتجاج دیکھ کر مجھے تنہیل کر بیٹھنا پڑا۔

بھاری کبلوں کے پیچھے دہلی ہوئی جاگی اب بھی کپکپا رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہو کیدو ایک پیالی میں کوئی گرم گرم چیز لے آئی۔ اس نے پیالی میرے ہاتھ میں بٹھا دی اور اشارے سے سمجھانے لگی کہ یہ جاگی کو پلا دیا جائے۔ وہ قہوہ یا جو شانہ قسم کی کوئی چیز تھی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں نے پیالی قریب ہی ایک خستہ حال چھوٹی میز پر رکھ دی اور کرسی سے اٹھ کر جاگی کے چہرے سے کبل ہٹا دی۔

”جاگی۔“ میں نے ہولے سے اسے مخاطب کیا ”گرم گرم قہوہ لو۔ تمہیں کچھ سکون ملے گا۔“

جاگی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ بخاری شدت سے اس کی آنکھیں بھی بالکل سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے سارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا اور پیالی اٹھا کر اپنے ہاتھ سے اسے قہوہ پلانے لگا۔ ہو کیدو قریب کھڑی دیکھتی رہی۔ قہوہ پلانے کے بعد میں نے جاگی کو دوبارہ لٹا دیا۔ یہ تو میں کبھی چکا تھا کہ یہ ملیا کا حملہ تھا اور میرے لیے تشویش ناک بات یہ تھی کہ اگر اس کا علاج نہ ہو سکا تو اس کی

حالت بگڑ جائے گی اور میرے خیال میں اسے فی الحال طبی امداد ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ دس بارہ گھروں کی اس بستی میں ڈاکٹر کی موجودگی یا کسی مناسب طبی سہولت کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے دوسرے سوچے ابھارنے لگے۔ کیا جاگتی بھی تھائی کی طرح میرا ساتھ چھوڑ جائے گی؟

پندرہ مہینے میں منٹ اور گزر گئے اور پھر ہو کیا نگ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ میرے خیال میں اس عورت کی عمر پچھتر سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ کمرے کی طرح دہری ہو رہی تھی۔ چہرے پر رگڑوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ سر پر تھوڑے بہت جو بال رہ گئے تھے وہ برف کی طرح سفید ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر مونے عددوں کی عینک تھی جس کی دونوں ڈنڈیاں غائب تھیں اور ناک پر عینک دو سارا ویسے کے لیے کانوں پر دھاگے لپٹے ہوئے تھے اس کے کندھے پر سیلا سا ایک تھملا بھی تھا۔

میں اسے دیکھ کر اٹھ گیا۔ ہو کیا نگ نے اسے سارا دے کر کرسی پر بٹھادیا۔ میں نے قسے کہانیوں میں افریقہ کے وحش ڈاکڑوں کے بارے میں پڑھا تھا اور میرے خیال میں یہ بوڑھی عورت بھی ایسی ہی کوئی چیز تھی جسے جاگی کے علاج کے لیے بلایا گیا تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس بوڑھی عورت نے میری طرف دیکھا۔ میں اندازہ ہی لگا سکا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی پھر اس نے ہو کیا نگ سے کچھ کہا۔ ہو کیا نگ نے مجھے اس کی بات سمجھائی اور میں نے تخت کے قریب بیٹھ کر جاگی کے چہرے سے کپل ہٹا دیا اور اس کا ایک ہاتھ باہر نکال دیا۔

بوڑھی عورت نے سیدھے جاگی کی پیشانی کو چھو کر دیکھا پھر اس کی نبض دیکھی اور پھر تھکی کھولتے ہوئے ہو کیا نگ سے کچھ کہنے لگی۔

”یہ کہہ رہی ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ لمبیا ہے۔ دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“ ہو کیا نگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بوڑھی نے تھیلے میں سے دو چھوٹی ڈنڈیاں نکال لی تھیں۔ اس نے پھر ہو کیا نگ سے کچھ کہا۔ ہو کیا نگ نے چھوٹی میز قریب سرکائی اور دونوں ڈنڈیاں میز پر رکھ کر کھول دیں۔ ایک میں مٹیالے سے رنگ کا کوئی سفوف تھا اور دوسری ڈنڈیاں مٹیوں قسم کی کوئی چیز۔ بوڑھی کے کہنے پر اس نے سفوف کی تین پٹیاں بنائیں۔ ہر پٹیا میں چنگی بھر سفوف تھا۔

بوڑھی کے کہنے پر ایک پڑیا جاگی کو کھلا دی گئی اور تھوڑا سا مٹیوں چٹا دیا گیا۔ بوڑھی تقریباً بیس منٹ وہاں بیٹھی ہو کیا نگ سے باتیں کرتی رہی۔ میں کبھی بوڑھی کی طرف دیکھتا اور کبھی جاگی کی طرف جس کے چہرے سے کپل ہٹا دیا تھا۔ چند منٹ پہلے تک تو یوں لگتا تھا جیسے کپلوں کے پیچھے چھوٹا سا آیا ہوا ہو لیکن اب جاگی کی کپکیپاہٹ بدتر رجحان میں آ رہی تھی اور بالآخر وہ ہونٹوں پر سکون ہو گئی اور پھر کبھی ہی دیر بعد وہ اپنے اوپر سے کپل ہٹانے لگی۔

بوڑھی نے ایک بار پھر آگے جھک کر اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کا ہاتھ کپل کے اندر تک ریزہ ریزہ گیا اور پھر وہ بوڑھی کچھ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس نے اپنا تھوڑا کندھے پر ڈال لیا تھا۔ دو پڑیاں اور مٹیوں کی ڈنڈیاں میری پیچھے دو گئی تھیں۔ ہو کیا نگ بوڑھی کو سارا دے کر کیا ہر لے گیا۔

میں نے جاگی کی پیشانی اور کلائی کو چھو کر دیکھا۔ وہ سفوف یا مٹیوں پر بڑی حیرت انگیز دوامیت ہوئی تھی۔ بخار اتر گیا تھا۔ اس کا جسم پیسے میں شرابور ہو رہا تھا۔ چند منٹ بعد ہو کیا نگ ایک اور عورت کے ساتھ کمرے میں آئی۔ یہ وہی عورت تھی جو عبادت گاہ سے ہمارے ساتھ آئی تھی اور میں نے عبادت گاہ میں سب سے پہلے اس سے بات کی تھی۔ اس کا نام فوشن تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ ہو کیا نگ نے ایک ہاتھ میں کپڑا اور توکیا اٹھا رکھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

میرے باہر نکلنے ہی اور دروازہ بند ہو گیا۔ مکان کے آگن میں کچھ لوگ جمع تھے ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی۔ ایک آدمی اور دو عورتیں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھتے ہوئے گردن کو ذرا سا مڑا دیا تھا۔ میں نے بھی انہیں اس شریاد دینے والے انداز میں سیدھا ہاتھ اور اٹھا دیا تھا۔ میں اس وقت ایک بجھٹو تھا اور مجھے وہی کچھ کرنا تھا جو ایک بجھٹو کو کرنا چاہیے تھا۔

اس صورت حال سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس بستی کی فضا ہمارے حق میں بھی اور دل کے حالات ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہو کیا نگ اور فوشن نے جاگی کے کپڑے بدل دیے تھے۔ اس کی پہلی چادر بلاؤز اور اسکرٹ جو پیسے میں تیار ہو چکا تھا دھو کر سوختنے کے لیے رسی پر ڈال دیے گئے جاگی کو جو لباس پہنایا گیا تھا وہ پھول دار یا جامہ اور چوڑی پر مشتمل تھا۔ سب میں دوبارہ کمرے میں آیا تو وہ بالکل چت لگی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔

”کیا ہوا تھا مجھے یہ لوگ کون ہیں؟“ اس نے کمزوری سے آواز میں پوچھا۔ کھیت کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے میں لکڑی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم اسے مددوشی کی حالت میں اس پر کیا بیت چکی ہے۔

نہیں تھا کہ اب تک اس پر کیا عبادت گاہ میں نہ پہنچتے تو اس ”اگر یہ لوگ اس دیر ان عبادت گاہ میں نہ پہنچتے تو اس وقت ہمارے ہونٹوں پر زندگی کی مسکراہٹ نہ ہوتی۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا ”اس میں شبہ نہیں کہ یہ کیونٹ ہیں۔ انہیں ہم پر انڈیا کے جاسوس ہونے کا شبہ بھی ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ شبہ اب بھی پرقرار ہو لیکن ان کا رویہ ہمارے ساتھ بدداند ہے۔ ابھی فی الحال کسی سے بات نہیں ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں ہمارے لیے کیا لے کر آتا ہے۔“

”جو کچھ تم بتا رہے“ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ اچھے لوگ ہیں اور یہاں ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔“ جاگی نے کہا۔

میں نے وہ سارا دن جاگی کے پاس بیٹھ کر ہی گزارا تھا۔ دوسرے کھانے کے بعد اسے سفوف کی ایک پڑیا اور کھلا دی گئی اور تھوڑا سا مٹیوں بھی چٹا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں بستی کے لوگ بھی ہمیں دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ لگتا تھا جیسے ہم کوئی عجوبہ ہیں۔ بچوں کی نظروں میں زیادہ تجسس تھا۔ وہ تو بعد میں بتا چلا کہ اس بستی کے لوگوں نے برسوں بعد کسی بجھٹو کو دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے بچوں کے لیے تو میں واقعی ایک عجوبہ تھا۔

یہ لوگ کیونٹ تھے انہیں بد مذہب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کوئی عورت بجھٹو نہیں بن سکتی اس لیے اس لحاظ سے ہم پر کوئی شبہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں ہم سے کچھ پوچھا گیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بجھٹو دوسرے کے بعد کچھ نہیں کھاتے اس لیے ہمیں رات کا کھانا بھی دیا گیا تھا۔ ہو کیا نگ نے مرغی کا شوربہ والا سالن بنایا تھا۔ ہو کیا نگ بھی کھانے میں ہمارے ساتھ شریک تھا۔

اس نے بتایا کہ وہاں کے کھیتوں میں واقع وہ عبادت گاہ تو تقریباً پچاس سال پہلے ہی دوران ہو گئی تھی اور اس بستی میں آخری بجھٹو کو تیس سال پہلے دیکھا گیا تھا۔

ہو کیا نگ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس بوڑھی عورت کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ اس بستی کی

معر ترین عورت تھی۔ اس کا کوئی عزیز نہیں تھا لیکن بستی کے لوگ اسے عزیز رکھتے تھے۔ وہ ہر چہ مہینے بعد وائنگ سی کے جنگلوں میں چلی جاتی جہاں سے جڑی بوٹیاں تلاش کر لے لے آتی اور ان سے دوا میں تیار کر کے بستی والوں کا علاج معالجہ کرتی۔ بستی والوں کو اس کا بڑا سارا تھا۔ قریب ترین بڑا قصبہ بھی یہاں سے ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا لیکن علاج کے لیے انہیں وہاں نہیں جانا پڑتا تھا۔ بوڑھی کی تیار کردہ دواؤں میں ہی اس قدر تاثیر تھی کہ بیمار اس کے علاج سے صحت یاب ہو جاتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد ہو کیا نگ مجھے بستی کے ایک اور مکان میں لے گیا جس کے بڑے سے ہال کمرے میں چھٹی ہوئی چٹائیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ وہ شاید یہ اطمینان کر لیتا چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح ان کے لیے نقصان دہ تو ثابت نہیں ہو سکتے۔

انہی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ یو شوا وائنگ وہاں سے تقریباً نوے میل کے فاصلے پر تھا۔ میری باتوں سے وہ لوگ بہر حال مطمئن ہو گئے تھے۔ مجھے بتا دیا گیا کہ میری ساتھی جب ٹھیک ہو جائے گی تو ہمیں یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔

رات کو جاگی کو پھر تیز بخار ہو گیا۔ ہو کیا نگ کے شور سے اسے سفوف کی تیسری پڑیا بھی اسے کھلا دی گئی۔ میں رات بھر جاگی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ صبح چائے پینے کے قریب بخار ٹوٹا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر دن کی روشنی دیکھتے ہی ہو کیا نگ اس بوڑھی کو بلالایا۔ اس نے وہی دوا جاری رکھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ جاگی کا بخار ختم ہو چکا تھا مگر اس میں کمزوری اس قدر ہو گئی تھی کہ وہ سارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسی صورت میں سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس چھوٹی سی بستی میں قیام کے دوران میں یوں تو ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن منگ شونی نامی ایک شخص کی طرف سے مجھے کچھ تشویش ہو رہی تھی۔ وہ لمبا ترنگا شخص شکل صورت ہی سے چھٹا ہو لگتا تھا اور پچھلے چند روز کے دوران میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جاگی کی مزاج پر سی کے بہانے دن میں کئی بار اس گھر کے چکر لگاتا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ جاگی کے چکر میں سے لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ دراصل ہو کیا نگ کو پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے یہ بھی اندازہ لگایا تھا کہ ہو کیا نگ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اسے منگ شونی کو ڈانٹنے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

میں صبح سویرے کھلی فضا میں بیٹھ کر یوگا کی مشق کیا کرتا تھا۔ اس روز بھی پانچ بجے کے قریب میں اپنے کمرے سے نکلا۔ یہی وقت تھا جب بستی کے کاشتکار کھیتوں پر کام کرنے کے لیے نکلا کرتے تھے۔ ہو کیا نگ بھی کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔ ہو کیا دو بھی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی لیکن ہماری وجہ سے وہ کئی روز سے گھر پر رہ رہی تھی۔

میں مکان کے اوپر سے گھوم کر پچھلی طرف کھلی جگہ پر آگیا۔ یہاں ایک چوڑا سا پتلا ہوا تھا۔ میں اسٹالس بنا کر اسی چوڑے پر بیٹھ گیا۔

سون کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں اٹھ گیا۔ واپس جانے کے لیے میں جیسے ہی ہو کیا دو کے مکان کے ایک کمرے کی عقبی کھڑکی کے قریب سے گزرا تو ٹھنک کر رگ گیا۔ کمرے سے کچھ دھینگا مشتقی جیسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی بند تھی لیکن ایک باریک سی جھری سے مجھے اندر جھانکنے کا موقع مل گیا اور دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ دوسرے آپس میں قسم قسم گھٹا نظر آ رہے تھے۔

میں تیز خیز قدم اٹھاتا ہوا اوپر سے گھوم کر مکان میں آگیا۔ ہو کیا دو کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور جاگی ہو کیا دو کو آوازیں دیتی ہوئی دروازے کو تھپتھپا رہی تھی۔

”کیا بات ہے جاگی۔ اندر کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے دھینگا مشتقی ہو رہی ہو۔ میں آوازیں سن کر ہی یہاں آئی ہوں مگر دروازہ اندر سے بند ہے۔“ جاگی نے کہا۔

”ہو کیا دو۔ دروازہ کھولو۔ کیا ہو رہا ہے؟ اندر کون ہے؟“ میں نے دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے اونچی آوازیں کہا۔

اس دوران میں دو ادھیر عمر عورتیں بھی آئی تھیں۔ ان دونوں کے سروں پر ٹکوں سے بٹے ہوئے چوڑے چھٹے والے ہیٹ تھے اور وہ کھیتوں پر جانے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکلی تھیں مگر شاید جاگی کی مزاج پر سی کے لیے اس طرف آگئی تھیں۔

”کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟“ ایک عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیز جیسے میں پوچھا۔

”اندر کوئی گڑبڑ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اندر سے اٹھانچکی آوازیں سن کر وہ دونوں عورتیں بھی چونک گئیں۔ میں نے ان عورتوں کی طرف دیکھا اور پھر گھوم کر دروازے پر کدے سے زوردار ٹکرماری۔ دروازہ پہلی ہی ٹکریں جھول گیا۔

اندر کا منظر بڑا سنائی خیز تھا۔ منگ شوئی اور ہو کیا دو ایک دوسرے سے گھٹا تھا۔ ہورے تھے۔ ہو کیا دو کے پیسے بڑے ہوئے تھے۔ منگ شوئی نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا کر دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازہ ٹوٹنے ہی وہ پہلے ہماری طرف گھوما پھر ہو کیا دو پھوپھو بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جب سے پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول والا ہاتھ سیدھا کرتا میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

میرے پیروں کی ٹھوکراں کے پستول والے ہاتھ پر گئے۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا کر آ۔ وہ ایک لمحے بدحواس ہوا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر کٹھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں غافل تو نہیں تھا۔ اسے اس طرح آڑھے ہاتھوں لیا کہ وہ ہلٹا ہوا کمرے میں پانچ لگا۔ اس خیال تھا کہ میں محض ہمشکو ہوں لیکن میرے دو چار ہاتھوں نے اس کے چوہہ طبق روشن کر دیے۔

منگ شوئی نے موقع پاتے ہی دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ دروازے میں کھڑی ہوئی ایک عورت سے ٹکرایا۔ وہ چپختے ہوئے نیچے گری۔ جبکہ منگ شوئی نے سنبھل کر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی لپکا لیکن وہ باہر گلی میں جا چکا تھا۔

میں واپس آیا۔ تین چار عورتیں کمرے میں بیچ بونچی تھیں۔ ہو کیا دو پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا لباس پٹنا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سینے اور گردن پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ جاگی نے اسے سہارا دے لے اپنے ساتھ لٹایا۔

بستی کی بیشتر عورتیں اور مرد کھیتوں پر گئے ہوئے تھے۔ جو لوگ بستی میں تھے وہ شور سن کر تن ہو گئے تھے۔ میں نے کمرے میں ایک طرف پڑا ہوا منگ شوئی کا پستول اٹھایا اور کمرے سے باہر آگیا۔

آٹھ گھنٹے میں ہو کیا نگ اور چھ سات دوسرے کسان اطلاع یا کر کھیتوں سے آگئے۔ وہ سب بست غصے میں تھے۔ اس کے تھوڑی سی دیر بعد منگ شوئی کی تلاش شروع ہوئی۔ ہر جگہ دیکھ لیا گیا لیکن منگ شوئی بستی میں نہیں تھا اور پھر ایک بچے نے بتایا کہ اس نے منگ شوئی کو بستی سے باہر جانے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ لوگ اس کی تلاش میں بچے کی بتائی ہوئی سمت میں کھیتوں میں نکل گئے۔

دوسرے منگ شوئی کی تلاش جاری رہی لیکن وہ غائب ہو چکا تھا۔ ہو کیا نگ میرا دست شکر گزار تھا کہ میں نے اس کی

ہوئی کی عزت بچالی تھی۔ میں نے منگ شوئی کا پستول ہو کیا نگ کے حوالے کر دیا تھا۔

اس واقعے کے بعد بستی والوں کی نظروں میں ہماری عزت بڑھ گئی تھی۔ بستی کے سب ہی لوگ شکر یہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس آتے۔ رجب منگ شوئی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تقریباً آٹھ مہینے پہلے یہاں آیا تھا اور اس دوران میں اس نے دو تین مرتبہ ایسی حرکتیں کی تھیں۔ ایک مرتبہ تو وہ چپختے بننے رہا تھا۔ اسے وارنٹ دی گئی تھی کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو بستی سے نکال دیا جائے گا۔

مزید تین مہینوں کے دوران میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرنے والا ہے۔ وہ ہو کیا دو اور ایک اور عورت کو اکثر گھور گھور کر دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہو کیا نگ کے گھر بھی نہیں آیا تھا لیکن جاگی اور میری وجہ سے اسے موقع مل گیا۔ وہ جاگی کی مزاج پر سی اور مجھ سے ملنے کے بہانے یہاں آئے لگا اور اس دوران میں شاید وہ موقع کی تلاش میں رہا تھا۔

ہو کیا نگ کھیتوں پر چلا گیا تھا اور میں مکان کے پچھلی طرف چوڑے پر آگیا جہاں یوگا کی مشق کیا کرتا تھا۔ منگ شوئی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا ہو گا جاگی سوری ہوگی۔ وہ ویسے بھی بیار عورت تھی اس کی طرف سے مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اسے بستی چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔

ہم چاروں مزید اس بستی میں رجب اچھی خوراک اور آرام کی وجہ سے جاگی اب پہلے سے کالی بستر ہو گئی تھی۔

”اب آگے چلنے کا موڈ ہے یا۔“

”بست آرام ہو چکا ہے۔“ جاگی نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں تو بستر لینے لیئے آگئی تھی۔ اب تو یہاں سے مل ہی جاتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

اس رات میں نے ہو کیا نگ سے بھی بات کر لی تھی۔ یہ طے ہوا کہ صبح سویرے ہمیں چھوڑے پر لوٹنا پڑے گا۔ یہ گاؤں اس بستی سے اٹھارہ میل دور ہائی وے کے کنارے پر واقع تھا۔ وہاں سے ہمیں پوٹو وائنگ کے لیے بس مل جائے گی۔

صبح رخصت ہونے سے پہلے ہو کیا دو نے کپڑے کا ایک تھیلہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جس میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں

تھیں۔ جاگی پہلی چادر لپیٹ کر ایک بار پھر ہمتا بن گئی تھی۔ بستی کے باہر چھوڑے کے قریب بست سے لوگ جمع تھے۔ اس چھوڑے کے سینے کسی موٹر کے تھے جس وجہ سے یہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ آگے ایک چتر بنایا ہوا تھا۔ کوچوان کی سیٹ سبنا اوجھنی تھی۔ جبکہ پھیلا حصہ کسی قدر نیچے تھا۔ جس میں پیاں بچھی ہوئی تھی۔ دو دروازے عطا قوں میں مال برداری اور آمد و رفت کے لیے اسی قسم کی سواریاں تھیں۔ ہم سب لوگوں سے رخصت ہو کر چھوڑے میں بچھی ہوئی پیاں پر بیٹھ گئے اور کوچوان نے فخر کو ہانک دیا۔ ادھیر عمر کوچوان بھی فخر کی طرح مرل اور دولا پتلا سا تھا۔ اس نے سر پر چوڑے چھٹے والا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ جاگی اور میں نے بھی اسی قسم کے ہیٹ اوڈھ رکھے تھے جو ہمیں بستی والوں نے دے دیے تھے۔ بستی کے دوسرے لوگوں نے بھی ہمیں کھانے پینے کی بست سی چیزیں دی تھیں جن سے میرا تھیلہ بھر گیا تھا۔ چیزیں ایسی تھیں جو کئی دنوں تک خراب نہیں ہو سکتی تھیں اور ہم انہیں اطمینان سے استعمال کر سکتے تھے۔

چھوڑا کھیتوں کے درمیان کچے راستوں پر اچھلتا ہوا جا رہا تھا۔ اچھے خاصے جھنگل لگ رہے تھے۔ دھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی گرمی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، چھوٹے والے ہیٹ اس وقت ہمارے کام آ رہے تھے۔ چھوڑا جس رفتار سے چل رہا تھا اس سے مجھے لگ رہا تھا کہ ہم اٹھارہ میل کا فاصلہ دو گھنٹوں سے پہلے طے نہیں کر سکیں گے۔ کوچوان تو چاکل سے فخر کی خوب پٹائی کر رہا تھا لیکن اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہم دوکان کے کھیتوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے۔ یہ راستہ کسی قدر ہموار تھا اور اس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔ راستے سے تقریباً پچاس فٹ ہٹ کر ایک چوڑی نہر بہ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کوچوان کے قریب اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رک رک کر پوچھنے لگا کہ ہمیں ابھی اور کتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔

”تقریباً آدھے گھنٹے کا راستہ باقی ہے۔“ کوچوان نے جواب دیا اور جب سے بیڑی کی طرح کا ایک لمبا سا چٹ نکال کر سلگائے لگا۔ اس کی بو بڑی ناگوار سی تھی۔ میں دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا۔

تقریباً دس منٹ تک اس راستے پر چلتے رہنے کے بعد چھوڑا واپس طرف مڑ گیا۔ آگے نہر کا پل تھا اور اس سے آگے جنگل سا تھا۔ وہ راستہ اسی جنگل میں سے گزرتا تھا۔ نہر

تقریباً چالیس فٹ چوڑی تھی۔ ابھی بل کا آدھا فاصلہ طے ہوا تھا کہ چٹخڑا رک گیا۔ کوچوان نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گردن پر سونیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

تین آدمی بل پر راستہ روکے کھڑے تھے۔ ان میں دو کے پاس رائفلیں تھیں اور تیسرے کے پاس ریوالور۔ درمیان میں تہ آدمی کو پچھانے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ منگ شوٹی تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ انہیں دیکھتے ہی نہ صرف کوچوان نے چٹخڑا روک لیا تھا بلکہ نگام چھوڑ کر دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیے تھے۔

دو آدمی فوراً ہی پھنکے کے دائیں بائیں آگئے تھے۔ ان دونوں نے مجھے اور جاگی کو رائفلیں کی زد میں لے لیا۔ منگ شوٹی نے کوچوان کو گریبان سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ کوچوان... خوف سے تھر تھرا کپ رہا تھا۔

”منگ شوٹی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ وہ ٹھٹھکیا رہا تھا۔

”میں تم پر اپنی گولی ضائع نہیں کروں گا لیکن ظاہر ہے تمہیں زندہ بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ منگ شوٹی نے کہا اور اسے ایک ہی ہاتھ سے گریبان سے پکڑ کر زمین سے تقریباً دو فٹ اوپر اٹھالیا۔ کوچوان اس کی منت سماجت کر رہا تھا لیکن منگ شوٹی نے اسے مزید اوپر اٹھا کر ایک جھٹکے سے سر کی طرف پھینک دیا۔

کوچوان کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ اس کے پیر کی ریٹک سے کھراے اور وہ فلاپا پھیلا کھاتا ہوا سر میں جاگرا۔ پل کے نیچے پلر کے قریب پانی میں بھنورے بن رہے تھے۔ کوچوان ایسے ہی ایک بھنورے میں گر کر پانی کی یہ غائب ہو چکا تھا۔

میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی بیمار رہ چکی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ خوف سے بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ہم پھنکے کے دونوں طرف سے رائفلیں کی زد پر تھے۔ میرے پاس اگرچہ دو پستول موجود تھے لیکن اس وقت کوئی حرکت کرنا خود کشی کرنے کے مترادف تھا۔

منگ شوٹی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ ان میں سے ایک پھنکے پر پچھلی طرف سوار ہو گیا۔ دوسرا کوچوان کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل اپنے سامنے پائونڈان کے قریب کھڑی کر کے نگام سنبھال لی۔ منگ شوٹی بھی اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا

اور اس نے مجھے رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ تینوا چڑھو میں آیا۔

”منگ شوٹی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک غلطی کر چکے ہو جس کے نتیجے میں تمہیں بہت سزا قرار ہونا پڑا۔ اب تم دوسری غلطی کر رہے ہو۔ اس کا نتیجہ نکلے گا۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے۔“

”اس کا نتیجہ صرف تمہاری موت کی صورت میں نکلا گا۔“ منگ شوٹی نے خراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم دونوں بد اخلاقت کی وجہ سے مجھے نہ صرف ان لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑا بلکہ بہت سی بھی چھوڑی پڑی۔“

”ہماری بد اخلاقت سے تو تمہیں بھانگنے کا موقع بھی مل گیا۔ اگر پکڑے جاتے تو وہ لوگ تمہیں قتل کر دیتے۔“

”وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔“ منگ شوٹی نے کہا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہو کید و لوگوں کو بتا دینی کے میں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟ نہیں مسٹر بھکشو۔ میں آٹھ مینوں سے اس بستی میں رہ رہا تھا۔ بستی کی عورتیں اپنے مردوں کو کچھ نہیں بتاتیں۔ ہو کید وہ بھی اپنی زبان بند رکھتی۔ ان آٹھ مینوں کے دوران میں کئی عورتیں میری قوت کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ کسی نے آج تک زبان نہیں کھولی۔“

”خاموش رہتی لیکن تمہاری وجہ سے مجھے وہاں سے بھانگنا پڑا۔ تمہیں تو ظاہر ہے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن تمہاری یہ سانبھی۔ اسے تو میں کئی دنوں تک زندہ رکھوں گا۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے منگ شوٹی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میری موجودگی میں تم نے ایک عورت کی عزت لوٹنے کی کوشش کی اور پچ کر بھاگ نکلے۔ اور پھر میری نظروں کے سامنے ایک بے گناہ کو اٹھا کر سر میں پھینک دیا۔ دونوں جرائم نہایت سنگین ہیں اور ہم ان دونوں جرائم کے چشم دید کار ہیں لیکن ہم بھکشو لوگ ہیں۔ ان دنیاوی بھیموں میں سے تم قریب آگئی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی چادر اٹھنا چاہی۔ تم ہماری منزل کوئی مت کرو۔ ہمیں اپنے میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا اور غیر محسوس انداز میں راستے پر جانے دو۔ ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔“

”تم تو سب کچھ بھول جاؤ گے مگر میں بستی والوں کے جاگی کے ہاتھ میں تھا۔ اگر اسے مجھ سے الگ کر دیا جاتا تو سامنے اس ذلت کو کیسے بھول سکوں گا جس کے ذہن دار وہ کم از کم پادشاہ نوکر کے گے۔“

دونوں ہوں۔“ منگ شوٹی نے کہا۔ ”تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا اور تمہاری سانبھی کو ہلا کر ایک کھنڈر نما چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گئی۔ یہ بھی اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ یہ کسی کے سامنے اپنی بھوری تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کیا کرتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔“

”پوچھو۔ میں سمجھا دوں گا تمہیں۔“ منگ شوٹی نے کہا۔

”تم لوگ یہاں اس طرح ہمارا راستہ روکے کھڑے تھے جس پہلے سے معلوم ہو کہ ہم اس طرف سے گزریں گے۔“ میں نے کہا۔

”اس بستی میں کم از کم دو آدمی اب بھی ایسے ہیں جو میرے ہم دروہ ہیں۔ وہ دونوں ہمیشہ میری سرگرمیوں میں شریک رہے ہیں۔“ منگ شوٹی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”کل رات تم نے ہو کیا تک کو بتا دیا کہ صبح بستی سے جانا چاہتے ہو۔ ہو کیا تک نے رات ہی کو کیونٹی ہال میں سب کو بتا دیا کہ تم صبح روانہ ہونا چاہتے ہو۔ یہ پروگرام دیں پر طے ہوا تھا کہ تم لوگوں کو پھنکے پر لویا تک چھوڑ دیا جائے گا۔ مجھے رات ہی کو یہ اطلاع مل گئی تھی اور میں صبح سے یہاں تم لوگوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔“

”تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”زادہ دور نہیں۔“ منگ شوٹی نے جواب دیا۔ ”اسی جنگل میں تمہارا ہی آگے ایک محفوظ جگہ ہے جہاں کسی کی بد اخلاقت کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔“

میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کی سیلا ہٹ گئی۔ ہم رائفلیں کی زد میں بیٹھے تھے۔ منگ شوٹی نے ہمیں اپنے منصوبے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مطمئن کیسے ہو سکتے تھے۔

”خیر گاڑی بل سے دو فرلانگ آگے جا کر جنگل میں بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ اس طرف کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ درخت زیادہ ٹھکان نہیں تھے۔ خیر گاڑی ان کے بیچ میں جاگی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی چادر اٹھنا چاہی۔ تم ہماری منزل کوئی مت کرو۔ ہمیں اپنے میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا اور غیر محسوس انداز میں راستے پر جانے دو۔ ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔“

”تم تو سب کچھ بھول جاؤ گے مگر میں بستی والوں کے جاگی کے ہاتھ میں تھا۔ اگر اسے مجھ سے الگ کر دیا جاتا تو سامنے اس ذلت کو کیسے بھول سکوں گا جس کے ذہن دار وہ کم از کم پادشاہ نوکر کے گے۔“

دونوں ہوں۔“ منگ شوٹی نے کہا۔ ”تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا اور تمہاری سانبھی کو ہلا کر ایک کھنڈر نما چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گئی۔ یہ بھی اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ یہ کسی کے سامنے اپنی بھوری تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کیا کرتا ہے۔“

ساتھی گاڑی سے نیچے اتر گئے اور رائفلیں کی زد پر لے کر ہمیں بھی نیچے اتار دیا۔

”یہ تمہارے گرد بدھ کی عبادت گاہ ہے۔“ منگ شوٹی نے گاڑی سے اتر کر مجھے دکھا دیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تو اب بدھ کا مجسمہ بھی نہیں رہا لیکن تمہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس چوڑے پر اس طرح بٹھا دیا جائے گا کہ برسوں بعد اگر کوئی بھکشو اس طرف آئے گا تو تمہارا ڈھانچا دیکھ کر حیران ضرور ہوگا۔“

”دیکھو منگ۔“ میں نے کہا۔ ”میرا لہجہ اب بھی پر سکون تھا۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ ایک جرم کو چھپانے کے لیے کئی جرم کرنا پڑتے ہیں۔ تم راستے سے بھٹک رہے ہو۔ اب بھی وقت ہے کہ ہمیں یہاں سے جانے دو۔ ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔“

”انداز چلو۔ ابھی میں تمہاری زبان بند کرتا ہوں۔“

منگ شوٹی نے مجھے ایک اور دکھا دیا۔

مرکزی ہال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سامنے ہی ایک ٹوٹا پھوٹا چوڑا تھا۔ ہال کے بائیں طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ وہ ہمیں دھکے دیتے ہوئے اس راہداری میں لے گئے۔ اس راہداری کے اختتام پر آئے سامنے دو کمرے تھے۔ دروازہ کسی کمرے کا نہیں تھا۔

منگ شوٹی جاگی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دائیں طرف والے کمرے میں لے گیا۔ جبکہ اس کے دونوں ساتھی مجھے رائفلیں کی زد پر لے کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے اور مجھے دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ہم جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے دوسرے کمرے میں نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دوسرے کمرے سے کچھ ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جاگی اور منگ شوٹی میں کچھ کھینچنا تالی ہو رہی تھی پھر جاگی کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس کے فوراً ہی بعد منگ شوٹی کا زوردار قہقہہ سنائی دیا۔

میں دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ میری مٹھیاں جھنجھی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

جاگی کی ایک دو دلی دلی سی چیخیں اور سنائی دیں اور پھر منگ شوٹی کی دہانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ پیچھے ہٹے گا لیاں بک رہا تھا پھر جاگی کی ایک اور چیخ سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد فائر کی آواز گونج اٹھی۔ میرا دل اچھل کر حلق



میں گیا۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمی بھی اچھل پڑے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان میں سے ایک بڑی تیزی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ اب میرے سامنے جو آدمی کھڑا رہ گیا تھا اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ وہ ایک لمبے کو بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا لیکن ٹھیک ایک منٹ بعد دوسرے کمرے سے اپنے ساتھی کی جگہ سے اس نے ایک لمبے کو دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو دنیا کا سب سے بڑا احمق کہلاتا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ میں دونوں ٹانگیں جوڑ کر ہوا میں اچھلا تھا لیکن اس کے قریب پہنچتے ہی میرے دونوں پیر الگ ہو گئے۔ میرا ایک پیر اس شخص کے منہ پر لگا اور دوسرا پیر اس کے ریوالتور والے ہاتھ پر لگا تھا۔ وہ دھج ہوتے ہوئے ہرے کی طرح بلبلاتا ہوا پچھلی دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ ریوالتور بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا کر اٹھا۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس طرف جا کر ریوالتور اٹھاؤں۔ اس سے زیادہ پتھر سے میں نے اپنا پستول نکال لیا اور بٹھلے ہی دوسرے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ منگ شوئی کا دوسرا ساتھی کمرے کے وسط میں سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے فرش پر پڑی ہوئی جاگی کو رانگل کی زور لے رکھا تھا لیکن وہ بہت پھرتلا اور حاضر دماغ ثابت ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں داخل ہونے والا اس کا ساتھی نہیں کوئی اور تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنا رخ بدلا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی چھلانگ لگا چکا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہوئے میں نے بڑے زور سے یل (YELL) بھی کیا تھا۔ حریف پر حملہ آور ہوتے ہوئے چٹھائی ہوئی آواز حریف پر دہشت طاری کر دیتی ہے۔ اس مرتبہ بھی میرے چٹھائے کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ آدمی بدحواس ہو گیا۔ میں اس کے اوپر گرا تو اس کی رانگل کی ٹال میرے بازو کے پیچھے سے ہوتی ہوئی پیچھے نکل گئی تھی۔ اس شخص نے زنگیر دیا دیا تھا۔ رانگل سے نکلنے والی کوئی سامنے والی دیوار پر لگی تھی۔

میں اس شخص کے اوپر گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل کر پستول کی ٹال اس کے کھلے ہوئے منہ میں ٹھونس دی۔ اس نے ایک بار پھر رانگل کا زنگیر دیا دیا تھا۔ کوئی اس مرتبہ بھی دیوار پر لگی تھی۔

”رانگل جھوڑ دو۔“ میں غرایا ”ورنہ پستول کی گولی

تمہارے تالو کو چیرتی ہوئی کھوپڑی کے پار ہو جائے گی۔“ اس نے رانگل جھوڑ دی۔ پستول کی ٹال اس کے منہ میں گھسی ہوئی کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اس کی دلی کیفیت کر رہی تھیں۔

اسی دوران میں اپنے عقب میں پستول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ لاٹوں کے معاملے میں میں کھانا آفا خاصا طول ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی میں فلاٹنگ لگ لگا کر دوسرے کمرے میں جھوڑا توڑ کر کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی ہاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مسخ نہیں ہوئے۔ ایسے مسکراہٹ آئی۔

میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ پستول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ لاٹوں کے معاملے میں میں کھانا آفا خاصا طول ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی میں فلاٹنگ لگ لگا کر دوسرے کمرے میں جھوڑا توڑ کر کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی ہاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مسخ نہیں ہوئے۔ ایسے مسکراہٹ آئی۔

میں اپنے حریف کو جھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پستول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ لاٹوں کے معاملے میں میں کھانا آفا خاصا طول ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی میں فلاٹنگ لگ لگا کر دوسرے کمرے میں جھوڑا توڑ کر کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی ہاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مسخ نہیں ہوئے۔ ایسے مسکراہٹ آئی۔

جاگی نے پستول پیچھے ہونے بلاؤں کے اندر ٹھونکی۔ میں نے پتھر کو ہاتھ سے گھڑی کا رخ موڑا اور ایک چادر اٹھا کر بدن پر لپیٹنے لگی۔ میں اب بھی اس شخص پر پتھر مار رہا تھا۔ پتھر مارنے کے بعد پستول نکال کر کھڑا تھا۔

”اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے کیا۔ ختم ہو۔“ جاگی نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ راس راسے پڑا تھا اور بالآخر خنصر کی طرف سے آنے والے راسے پر بائیں طرف موڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی راستہ

میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے دو ساتھیوں کا ہاتھ میں لیا گیا لے جانے کا۔ کروہ شخص خوف سے اٹھ مڑا ہوا تھا۔ دہشت۔ یہ جنگل ویران تھا۔ جاتے یا واپس آتے ہوئے ہمیں آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ چند لمبے میری طرف لپکی ڈی روح دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے میں مطمئن تھا کہ پھر کھٹکتا ہوا میرے سامنے سجدے میں گر گیا۔ میں غائبانہ کی دونوں تک منگ شوئی اور اس کے ساتھیوں کی لاٹوں اور پیچھے ہٹ گیا اور اس کی کھوپڑی کا نشانہ بن گیا۔ اگر کسی وقت لاٹیں کسی کو مل دیا۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر پیچھے گر کر اور پانی سے لپکتی ہوئی گولی سے اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ ان کا قاتل کون چھلکی کی طرح ترپنے لگا۔ اس کی کھوپڑی سے خون۔

چادروں طرف اڑ رہے تھے۔

ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رُکے اور کمرے سے نکلے۔ ہم نے پتھر کی لگام کھینچی۔ گاڑی رک گئی۔

تمہارے تالو کو چیرتی ہوئی کھوپڑی کے پار ہو جائے گی۔“ اس نے رانگل جھوڑ دی۔ پستول کی ٹال اس کے منہ میں گھسی ہوئی کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اس کی دلی کیفیت کر رہی تھیں۔

اسی دوران میں اپنے عقب میں پستول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ لاٹوں کے معاملے میں میں کھانا آفا خاصا طول ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی میں فلاٹنگ لگ لگا کر دوسرے کمرے میں جھوڑا توڑ کر کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی ہاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مسخ نہیں ہوئے۔ ایسے مسکراہٹ آئی۔

میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ پستول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ لاٹوں کے معاملے میں میں کھانا آفا خاصا طول ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی میں فلاٹنگ لگ لگا کر دوسرے کمرے میں جھوڑا توڑ کر کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی ہاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مسخ نہیں ہوئے۔ ایسے مسکراہٹ آئی۔

میں اپنے حریف کو جھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پستول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ لاٹوں کے معاملے میں میں کھانا آفا خاصا طول ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی میں فلاٹنگ لگ لگا کر دوسرے کمرے میں جھوڑا توڑ کر کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی ہاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مسخ نہیں ہوئے۔ ایسے مسکراہٹ آئی۔

جاگی نے پستول پیچھے ہونے بلاؤں کے اندر ٹھونکی۔ میں نے پتھر کو ہاتھ سے گھڑی کا رخ موڑا اور ایک چادر اٹھا کر بدن پر لپیٹنے لگی۔ میں اب بھی اس شخص پر پتھر مار رہا تھا۔ پتھر مارنے کے بعد پستول نکال کر کھڑا تھا۔

”اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے کیا۔ ختم ہو۔“ جاگی نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ راس راسے پڑا تھا اور بالآخر خنصر کی طرف سے آنے والے راسے پر بائیں طرف موڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی راستہ

میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے دو ساتھیوں کا ہاتھ میں لیا گیا لے جانے کا۔ کروہ شخص خوف سے اٹھ مڑا ہوا تھا۔ دہشت۔ یہ جنگل ویران تھا۔ جاتے یا واپس آتے ہوئے ہمیں آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ چند لمبے میری طرف لپکی ڈی روح دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے میں مطمئن تھا کہ پھر کھٹکتا ہوا میرے سامنے سجدے میں گر گیا۔ میں غائبانہ کی دونوں تک منگ شوئی اور اس کے ساتھیوں کی لاٹوں اور پیچھے ہٹ گیا اور اس کی کھوپڑی کا نشانہ بن گیا۔ اگر کسی وقت لاٹیں کسی کو مل دیا۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر پیچھے گر کر اور پانی سے لپکتی ہوئی گولی سے اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ ان کا قاتل کون چھلکی کی طرح ترپنے لگا۔ اس کی کھوپڑی سے خون۔

چادروں طرف اڑ رہے تھے۔

ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رُکے اور کمرے سے نکلے۔ ہم نے پتھر کی لگام کھینچی۔ گاڑی رک گئی۔

”کیا ہوا؟“ جاگی نے پوچھا۔

”راستے میں کوئی آدمی پڑا ہوا ہے۔“ میں نے اشارہ کیا اور محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا تھا۔ ہو سکتا ہے ڈاکو آس پاس درختوں میں کہیں چھپے ہوئے ہوں۔ ان کا ایک ساتھی راستے میں اس طرح پڑ گیا کہ ہمیں مجبوراً خنجر گاڑی روکنی پڑے۔ میں نے فلوں میں اے بہت سے سین دیکھے تھے۔

میں نے جاگی کو وہیں بیٹھنے رہنے کا اشارہ کیا اور خنجر گاڑی سے اتر کر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی میں دائیں بائیں دیکھ بھی رہا تھا کہ ڈاکو کس طرف سے برآمد ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی ٹیکر میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا تھا اور میرا دوسرا ہاتھ چادر کے اندر رہی تھا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اوندھا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے کے نیچے تھا دوسرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ دھری تھی اور دوسری بالکل سیدھی۔ میں نے دو قدم دور ہی رک کر بڑے محتاط انداز میں جھک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمبے اچھل کر سیدھا ہو گیا۔

یہ ہمارا وہی کوچوان تھا جسے منگ شوئی نے نہر میں پھینک دیا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے سیدھا کیا۔ اسے کوئی زخم وغیرہ نہیں لگا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔

میں نے اسے اٹھا کر راستے سے ہٹ کر گھاس پر لٹا دیا۔ وہ کسی طرح نہر میں ڈوبنے سے بچ گیا تھا اور باہر نکل کر لوانگ کی طرف جا رہا ہوا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کے کپڑے ابھی تک ٹھیک تھے۔ میں نے جاگی کو بھی بلالیا اور ہم دونوں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

وہ تقریباً دس منٹ بعد ہوش میں آکا تھا۔ کچھ دیر تک تو اس پر بدحواسی طاری رہی۔ وہ ویران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس کے حواس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے۔ اسے زندہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

”دوبہ وہ کہاں ہیں؟“ اس نے خوف زدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”وہ لوگ بھاگ گئے۔ اب کبھی نہیں آئیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ پانی میں غوطے کھاتا ہوا تقریباً سو گز دور کنارے کی ہمایوں میں الجھ گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ پہلے نہر کے کنارے پر بیٹھا رہا پھر لوانگ کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اس پر انجانا سا

خوف طاری ہوا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میرے خیال میں کو جوان کو لویا تک لے جانا مناسب نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں کسی سے کوئی ایسی بات کر دیتا جس سے ہم بھی پھنس جاتے اس لیے ہم نے اسے وہیں سے واپس بھیج دیا مناسب سمجھا۔ ہمارا تھیلہ جھکڑے ہی میں پڑا تھا۔ میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں نکال کر اسے دے دیں۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر لگام سنبھالی اور پھر کو موڑ کر اس پر چابک برساتے لگا۔

لویا تک دو میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں طرف یہ ایسی ہی دیہی آبادی تھی جس کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔ مکان زیادہ تر چمبے تھے۔ اکاؤ کاؤ دو منزل اور پختہ عمارتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف واکس نہیں۔

یہ خاصا مصروف ہائی وے تھا۔ بسوں اور مال بردار ٹرکوں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ پرائیویٹ گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

اس وقت دن کے بارہ بجتے والے تھے۔ ہم صبح سات بجے اس بستی سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر راستے میں منگ شولی والی آقاوندہ پڑتی تو ہم کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہوتے۔

کئی میس آئیں اور رُکے بغیر گزر گئیں اور پھر جیسے ہی ایک بس ٹوکی ہم تیزی سے اس طرف لپکے۔ دو آدمی اور بھی ہمارے ساتھ اس طرف دوڑے تھے۔ بس سے اترنے والے مسافروں کی تعداد تین تھی۔ ہمارے ساتھ دوسرے دو آدمی تو بس میں سوار ہو گئے مگر کنڈیکٹر نے ہمیں روک دیا اور بس آگے روانہ ہو گئی۔

تین چار مرتبہ ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ دو میس تو ایسی تھیں جن میں کئی کئی سیٹیں خالی تھیں مگر کنڈیکٹر نے ہمیں سوار نہیں ہونے دیا تھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک آدمی بہت دیر سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سائیکل پر غالباً سجن جسم کی کوئی پروڈکٹ بیچ رہا تھا۔ سائیکل کے آگے ٹوکر بنی ہوئی تھی اور ہینڈل پر ایک چھوٹا سا بورڈ بھی لگا ہوا تھا جس پر چینی زبان میں کوئی بھی چوڑی تحریر درج تھی۔

پانچویں بس کے کنڈیکٹر نے بھی ہمیں دھکا دیا تو وہ آدمی ہمارے قریب آیا۔ ہمارے چہروں سے اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم چینی نہیں ہیں۔ وہ ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جب سے یو آن (چینی کرنسی) کا ایک نوٹ نکال کر

ہمیں دکھایا اور اشاروں میں کچھ بتانے لگا۔ اشاروں زبان میری سمجھ میں آ گئی۔

ہم بھٹکوتھے جو عام طور پر بھیک مانگ کر ہی گزرتے ہیں۔ وہ بسوں اور ٹریوں میں سفر بھی بغیر ٹکٹ ہی کرتے ہیں۔ مفت خورہ سمجھ کر کوئی کنڈیکٹر ہمیں بس میں سفر تیار نہیں تھا۔ بستی والوں نے کھانے پینے کی چیزیں ہمیں کچھ رقم بھی جمع کر کے دی تھی جو تھیلے ہی میں رہ گئی۔ میں نے چند نوٹ نکال لیے اور بس کا انتظار کرنا

انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ چند منٹ ایک بس وہاں آ کر رکی۔ میں اور جاگی تیزی سے بس میں لپکے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اس سے اتر رہی تھی۔ بعد ہم جیسے ہی آگے بڑھے اندر کھڑے ہوئے کنڈیکٹر ہمیں بھکاریوں کی طرح بھڑک دیا۔ میں نے جلدی نہ

میں پکڑے ہوئے نوٹ آگے کر دیے۔ نوٹ دیکھ کر اسے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور ہونٹوں پر غصہ مسکراہٹ بھی آ گئی۔ اس نے راستے سے ہٹے ہوئے

اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پہلے جاگی کو بس میں ہونے کا موقع دیا اور پھر خود اوپر چڑھ گیا۔ آخر میں پچیسٹیں خالی تھیں۔ دو سیٹوں والی ایک برتھ پر ہم بیٹھ کر لیا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں یوشونگ واکس پہنچے۔ زیادہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن آبادی بے تحاشا تھی۔ اس سے اترتے ہی ہم نے شاؤلن ٹیپل جانے کے لیے ہم بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ میں چینی زبان میں رُک رُک کر بات کرتا تھا لیکن یہاں کی

کی زبان میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر ایک آدمی ہماری مدد پر آدھ ہو گیا۔ وہ ہمیں پکڑ کر ایک بار کے پاس لے گیا جو ٹکڑی لولی انگریزی بھی سمجھتا تھا۔ بتایا کہ اس وقت یہاں سے ہمیں ڈانگ کو کے لیے سکتی ہے۔ وہاں رات گزارنے کے بعد صبح شاؤلن کے لیے بس مل جائے گی۔ اگر ہم چاہیں تو ہمیں گزار لیں۔ صبح چھ اور سات بجے کے درمیان یہاں سے شاؤلن تک کے لیے ہمیں روانہ ہوتی ہیں لیکن ہم رات بسر کرنے کے بجائے اپنا سفر جاری رکھنا مناسب

اس شخص کی باتوں سے مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ تک چین کے صوبوں یونان اور کیوٹو میں سفر کرتے ہیں۔ اس طرف سے ڈانگ اس صوبے کا پہلا بڑا شہر ہے۔ شاؤلن ٹیپل

تاریخی عبادت گاہ بھی اسی صوبے میں واقع ہے۔ شاؤلن تک پہنچنے کے بعد ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

تین بجے کے قریب ہمیں ڈانگ کو جانے کے لیے بس میں جگہ مل گئی۔ جس نے شام سات بجے کے قریب ہمیں ڈانگ کو چنایا۔ میرا خیال تھا کہ ڈانگ کو بڑا شہر ہو گا لیکن یہ درمیانے درجے کا قصبہ تھا اور دیہی رنگ نمایاں تھا۔ یہ قصبہ شاؤلن ٹیپل کے راستے پر تھا۔ اس طرف بڑھ بھٹکوتے آتے رہتے تھے۔ یہاں معقول تعداد میں بدھ کے پیرو کار آباد تھے اور دو چھوٹی عبادت گاہیں بھی تھیں۔ ایک عبادت گاہ دریا کے کنارے پر تھی۔ ہمیں اس طرف راستہ بتا دیا گیا۔

میں والے واقعے کا تصور بہت اثر اب بھی جاگی کے ذہن پر تھا اور پھر دن بھر کے سفر نے اسے کچھ بڑھال سا کر دیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اتنا پھر بخار نہ ہو جائے اس طرح ہمارے لیے پریشانیوں میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

ہم ابھی عبادت گاہ سے دور ہی تھے کہ جاگی نے میرا ہاتھ پکڑ دیا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیاں

لیجے میں بولی۔

”وہ دیکھو۔ اس طرف۔ یہ وہی بھٹکوتہ ہے جو باگنگ میں ہمیں لوٹ کر بھاگ گیا تھا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں چمک مڑی ابھرائی۔ وہ ہمیں ہی تھا وہی آوارہ گرد بھٹکوتہ جس نے باگنگ کی عبادت گاہ میں نشہ آور عطیاتی کھلا کر ہمیں بے ہوش کر دیا تھا اور ہمارا تھیلہ لے کر غائب ہو گیا تھا اور ہمیں باگنگ میں تین چار دن بھیک مانگتی پڑی تھی۔

ہمیں ان کے علاوہ ہمیں بازار میں کچھ اور بھٹکوتہ بھی نظر آئے تھے اس لیے میرا فیصلہ تھا کہ اگر ہم ہمیں ان کا تعاقب کرتے ہیں تو اسے شب نہیں ہوگا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے جاگی کو سمجھا دیا اور ہم نے تقریباً بیس گز کے فاصلے سے ہمیں کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں سڑک کے ایک طرف تھا اور جاگی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ ابھی شام ہوئی تھی۔ چین کی آبادی نے تو مجھے حیران کر دیا تھا۔ آپ جہاں بھی نکل جائیں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہو اسقدر نظر آئے گا۔ ڈانگ کو کے اس بازار کی صورت حال بھی کچھ زیادہ مختلف تھی۔..... کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں اپنے اور ہمیں ان کے بیچ زیادہ فاصلہ اس لیے بھی نہ رکھنا چاہتا تھا کہ اس رش میں اس کے گم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ہمیں ان اس بازار سے ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ اس طرف زیادہ دکانیں نہیں تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اس عبادت گاہ کی طرف ہی جا رہا تھا جس کا پتا ہمیں بتایا گیا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے لگے۔ رجب اس کی گردن تاپنے کے لیے مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

جاگی بھی اس وقت میرے ساتھ ہی چل رہی تھی۔ ہمیں ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ دکانیں وغیرہ نہیں تھیں البتہ لاتعداد بچے ہلپتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھوکے آگے دریا کی موجودگی کی خبر دے رہے تھے۔

رہائشی علاقے کی یہ سڑک آگے جا کر اسٹریٹ روڈ سے مل گئی تھی۔ دریا کے کنارے بند پر واقع یہ سڑک بھی بارونق تھی۔ دریا اور سڑک کے درمیان ایک کشادہ پارک تھا جو دائیں بائیں دور تک چلا گیا۔ پارک میں چمپل پھل تھی۔ ایک طرف شاید کشتیوں کا کھانا تھا۔ وہاں زیادہ رونق نظر آ رہی تھی۔

ہمیں دائیں طرف چلتا رہا۔ وہ عبادت گاہ شاید اسی طرف تھی۔ سڑک کے ساتھ پارک اب ختم ہو گیا تھا۔ سڑک کی ڈھلان سے ڈرا آگے دریا تھا۔ میں نے جاگی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہمیں ان کے قریب پہنچ گئے۔ اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سن کر ہمیں ان کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسٹریٹ لائٹ وہاں سے بہت دور تھی۔ اس جگہ کی قدر تار کی تھی۔ اپنے سامنے دو بھٹکوتوں کو دیکھ کر وہ یقیناً بہت خوش ہوا ہوگا۔

”تم لوگوں کو یقیناً رہائش کے لیے کسی جگہ کی تلاش ہے۔“ وہ بولا ”اس طرف ایک عبادت گاہ ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“

ہمیں ان کے پیچھے آتے ہوئے میں نے اپنی ہینڈل کی فیتے سے خبر نکال لی تھی۔ ہیتوں والی اجڑی ہوئی عبادت گاہ میں یہ خبر ہو گیا کہ نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا جو بعد میں مجھے واپس کر دیا گیا تھا۔

میں نے خبر کی نوک ہمیں ان کے پہلو سے لگا دی۔ ”ہمیں رہائش کے لیے جگہ کی تلاش تو تھی ہمیں لیکن اتفاق سے تم مل گئے۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔“

”کھگ۔ کون ہو تم۔؟“ میری زبان سے اپنا نام سن کر ہمیں ان اچھل پڑا۔

”اب یہ مت کہنا کہ تم ہمیں بالکل نہیں جانتے۔“ میں

نے کہا ”ہمیں بھول گئے ہو تو کوئی بات نہیں۔ باگوگ کی عبادت گاہ تو ہمیں یاد ہوگی۔ جہاں چند روز پہلے تم ہمیں لوٹ رہا تھا گئے تھے۔ آج۔۔۔ ہاں۔۔۔ کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ یہ خنجر تمہارے پهلویں میں پوسٹ ہو جائے گا۔“ میں نے بات کرتے ہوئے خنجر سے ذرا سا دباؤ بھی ڈال دیا تھا۔

”مم۔۔۔ میں نے پہچان لیا ہے۔“ وہ ہلکایا ”مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں معافی مانگتا ہوں اور تمہاری چیزیں واپس کرنے کو تیار ہوں۔ دیکھو۔ ہم تو سنی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے۔ مجھے اپنی غلطی۔“

”تمہیں شرم آتی چاہیے۔“ میں نے کہا ”بھکشو ہو کر لوگوں کو لوٹتے ہو۔ دوسروں کو بھی بدنام کرتے ہو۔ چلو۔ اس طرف۔ ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں۔“ میں نے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

اس وقت ایک کار ہمارے قریب سے گزری۔ ہم تینوں کار کے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگئے تھے۔ کار والوں نے ہمیں دیکھا بھی ہو گا تو جہ نہیں دی ہوگی۔

ہمسایان بار بار معافی مانگ رہا تھا۔ وہ ہماری کوئی ہونٹیں رقم واپس کرنے کو تیار تھا۔ میں اسے دھکے دیتا ہوا دریا کے کنارے کی طرف لے گیا۔ اب میں نے خنجر والا ہاتھ بھی چادر سے باہر نکال لیا تھا اور خنجر کی نوک اس کی پشت سے لگا دی تھی۔ دریا کے کنارے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ جاگنی نے اس کے ہاتھ سے تھیلے لے لیا اور اس کی تلاشی لینے لگی۔ تھیلے میں اور چیزیں تو بھری ہوئی تھیں مگر میں نہیں سمجھی۔

”اس کی جامہ تلاشی لو۔“ میں نے جاگنی سے کہا اور پھر ہمسایان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”چادر اوپر سے کھول دو۔“

”مم۔۔۔ میں نے نیچے کچھ نہیں پنا ہوا۔“ وہ ہلکایا۔ ”کوئی بات نہیں۔ یہاں ہمارے سوا تمہیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں ہے۔“ میں نے کہتے ہوئے جاگنی کو اشارہ کیا۔

جاگنی نے آگے بڑھ کر اس کی چادر ہٹانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تھا کہ ہمسایان اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے چادر میں ہاتھ ڈال کر پتھول نکال لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جاگنی کو گرفت میں لے لیا تھا۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ تمہارے ساتھی کو گولی مار دوں گا۔“ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

ہمسایان کی اس حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے خنجر اور پتھول چھپا کر رکھے ہوئے تھے اور

ہمسایان تو جراتم پیش آ رہی تھی۔ مجھے پہلے ہی سوجنا چاہیے تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز ضرور ہوگی۔

جاگنی کی پشت پر پہنچ کر اس نے پتھول کی نال اس کی کھوپڑی سے لگا دی اور اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے لیے دوسرا بازو اس کے سینے پر لپیٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چوکی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”تو یہ بات ہے۔“ وہ جاگنی کے سینے کو ٹوٹتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا ”تم بھکشو نہیں ہو۔ کسی خطرناک ارادے سے یہ بھیس اپنا رکھا ہے۔ کسی بھکشو کی زندگی میں عورت کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن میں جانتا ہوں۔ بھکشو بھی انسان ہیں۔ ان کے سینوں میں بھی دل ہے اور وہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے اِدھر اُدھر منہ مارتے رہتے ہیں لیکن کسی بھکشو نے مستقل طور پر کسی عورت کو اپنے ساتھ بھی نہیں رکھا اور تم اسے ساتھ ساتھ لے پھرتے ہو لیکن آج یہ میرے کام آئے گی۔ تم اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“

جاگنی کسمارہی تھی۔ ہمسایان جاگنی کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا اُلٹے قدموں سڑک کی طرف چلے گئے۔ میں بھی چند قدم کے فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں چاہتا تو پتھول بھی نکال سکتا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہمسایان نے جاگنی کو اپنی دھال بنا رکھا تھا۔

وہ جاگنی کو اُلٹے قدموں تقریباً گھسیٹتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا اور ٹھیک اسی لمحے ایک تیز رفتار کار سڑک پر نمودار ہوئی۔ ہمسایان اور جاگنی اس کی روشنی کی زد میں آ گئے۔ جاگنی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دم نیچے جھک گئی تھی۔

ہمسایان بھی جاگنی کے اوپر سے غلا بازی کھاتا ہوا سڑک پر گر گیا۔ جاگنی نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ہمسایان نے گولی چلا دی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی سانے میں جاگنی کی چیخ بھی گونجی تھی۔ وہ لوکھرا کر رہ گئی۔ وہ تیز رفتار کار سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز فضا میں گونج گئی۔ جاگنی کا سر سے ٹکرا کر سڑک پر گری۔ کار بھی رک گئی۔

میں تیزی سے آگے دوڑا۔ ہمسایان اس صورت حال سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا سڑک کے دوسری طرف تارکی میں غائب ہو گیا۔

میں ہوا میں اُڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ جاگنی کار کے آگے سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے جھک کر جاگنی کو دیکھنے

لگا۔ اسی وقت کار ڈرائیونگ سائڈ کار دواڑہ کھلا اور ایک عورت نیچے اتر کر تیزی سے ہمارے قریب پہنچ گئی۔ میں جاگنی کو سڑک سے اٹھا کر اس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھنے سے انول رہا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں دھماکے سے بھر رہے تھے۔ میرے خیال میں جاگنی کو گولی لگی تھی اور وہ کار سے بھی گر کر لگی تھی۔

”جاگنی۔“ میں اسے ہلاتے ہوئے چنچا۔ ”میں ٹھیک ہوں وجہ ان۔“ جاگنی کی آواز میری ساعت سے گرائی۔

کار سے اترنے والی چینی عورت نے جاگنی پر جھکتے ہوئے چینی زبان میں کچھ کہا لیکن میں پوری طرح اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔

”ڈوپا سپیک انگش۔“ میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ میں تھوڑی بہت انگش بول اور سمجھ سکتی ہوں۔“ اس عورت نے جواب دیا ”ہاں۔“ یہ بھکشو میری گاڑی سے گر گیا تھا لیکن اس میں میرا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اچانک سامنے آ گیا تھا مگر میں تمہاری پیلپ کرنے کو تیار ہوں۔ اسے میری گاڑی میں ڈالو تاکہ اسپتال پہنچا دیا جائے۔ اس کے علاج کے تمام اخراجات میں دوں گی اور۔۔۔ اور ہرمانہ بھی۔“

میرا خیال ہے گاڑی کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس عورت نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی لیکن اس نے دوسرے بھکشو کو سڑک سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن قرب و جوار میں موجود دوسرے لوگوں نے فائر کی آواز ضرور سنی ہوگی اور پھر سانے میں گاڑی کے بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز بھی دُور تک سنی گئی ہوگی۔ گاڑی کے ہیڈ لائٹس جل رہے تھے۔ گاڑی کو کھڑے دیکھ کر بھی لوگ صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف دوڑے آئیں گے اس لیے میں بھی جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے جاگنی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اس عورت نے کار کا پیچلا دروازہ کھول دیا اور جاگنی کو سیٹ پر ڈالنے میں میری مدد کرنے لگی۔ دوسری طرف کے دروازے سے اترتے ہوئے اس نے ابھی ہوئی نظروں سے پہلے جاگنی اور پھر میری طرف دیکھا تھا۔

اس نے اسٹیشنرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا اور گاڑی حرکت میں آگئی۔ میں نے جاگنی کو بائیں طرف سے پکڑ کر سیٹ پر اس طرح بٹھا دیا کہ وہ نیم دراز سی ہو گئی۔ یہ عورت

جاگنی کو اسپتال لے جانا چاہتی تھی لیکن میں نے پہلے ہی سوج رکھا تھا کہ راستے میں کسی جگہ اتر جاؤں گا۔

تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کر کے گاڑی دانیس طرف ایک سڑک پر مڑ گئی لیکن تھوڑی ہی دور جا کر رُک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کی نظریں سامنے لگے ہوئے عقیقہ منظر پیش کرنے والے آئینے پر مرکوز تھیں پھر وہ بیٹھے بیٹھے کسی قدر پیچھے کی طرف گھوم گئی اور جاگنی کی طرف دیکھنے لگی۔ میری نظریں بھی جاگنی کی طرف اٹھ گئیں اور میرے منہ سے بے اختیار کمراسانس نکل گیا۔ چادر جاگنی کے سینے پر سے ہٹی ہوئی تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ وہ عورت رُک رُک کر بولی ”کوئی عورت تو بھکشو نہیں ہوتی لیکن۔“

”کوئی پراسرار معاملہ نہیں ہے میڈم۔“ میں نے جواب دیا ”یہ عورت بھکشو نہیں۔ میں بھی بھکشو نہیں ہوں۔ ہم نے اپنے دشمنوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے یہ ہمیں بدل رکھا ہے۔ میری بات پر تعین کو پلیز۔ ہم کوئی خطرناک لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو خود چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”میری ساتھی کو زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہیں آنا روکنا چاہیے۔“

اس نے ایک بار پھر جاگنی کی طرف دیکھا اور پھر میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ کار کے اندر بیٹنے والے جب کی پیہم روشنی میں بھی میں نے اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ لی تھی۔

”ہوں۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ”پھر تو تم لوگوں کے پاس رہنے کو بھی جگہ نہیں ہوگی۔“ وہ کار کو گیسٹر میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”ہم رات گزارنے کے لیے عبادت گاہ کی تلاش میں اس طرف جا رہے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ آوی کون تھا جو ہاں سے بھاگا تھا۔“ اس نے کار کو ریورس میں لیتے ہوئے پوچھا ”تمہارا ساتھی یا۔۔۔“

”وہ ہمارے دشمنوں کا ایجنٹ تھا۔“ میں نے جواب میں کہا۔ میرے خیال میں اس وقت جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں تھا ”ہم آج شام ہی یہاں پہنچے تھے۔ اس نے ہمیں تلاش کر لیا اور اس وقت وہ میری ساتھی کو پتھول کی زور لے کر جا رہا تھا کہ میری ساتھی نے اسے دھکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اس شخص نے گولی چلا دی۔ میری ساتھی بدحواس ہو کر سڑک پر گر رہی تھی کہ تمہاری گاڑی سے کنرا

گئی۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین ہو تو ہمیں یہاں اتار دو۔ ہم کسی محفوظ جگہ پر چلے جائیں گے۔

”مجھے تمہاری سچائی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ گاڑی ریورس میں چلتی ہوئی اسی سڑک پر پہنچ چکی تھی جس سے ہم اس ذیلی سڑک پر مڑے تھے اس نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا جس طرف سے ہم آئے تھے ”اگر تمہارے دشمن کے ایجنٹ نے تمہیں تلاش کر لیا ہے اور نوبت فائرنگ تک پہنچ چکی ہے تو پھر ڈانگ کو میں تمہیں کوئی جائے پناہ نہیں مل سکتی۔ میں نے تمہاری بات پر یقین کر لیا ہے۔ تمہارے لیے میں سچائی کی جھلک نمایاں ہے۔ مجھے صرف ایک بات یاد۔ تم انڈین تو نہیں ہو؟“

”نہیں۔ ہم تھائی ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن کیا انڈین ہوتا جرم ہے؟“

”چین کی حدود میں اسے جرم ہی سمجھا جاتا ہے۔“ اس عورت نے جواب دیا ”چین اور ہندوستان کی دشمنی بہت پرانی ہے۔ کئی بار سرحدوں پر بھڑبھڑ ہو چکی ہیں۔ انڈیا اس خطے کی سپر پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر قبضہ کرنا چاہا ہے۔ سب سے پہلے گوا کو ہڑپ کیا اور پھر سکم اور مہاراشٹر کو نگل لیا۔ برما کے صوبے آسام پر بھی اس کا قبضہ ہے اور دوسری طرف پاکستان کے ایک علاقے کشمیر پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں علاقوں میں انڈیا کے خلاف پچاس سال سے مزاحمت ہو رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں ریاستوں میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”انڈیا نے ماضی میں چین کے کچھ علاقوں پر بھی قدم جمائے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ایسی مار لگی کہ وہ آج تک اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ انڈیا چونکہ اس خطے کی سپر پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اس لیے اپنے ہڈی ہڈی ممالک کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے چین میں اپنے اتحاداء جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ بعض پکڑے بھی جاتے ہیں لیکن بعض کسی نہ کسی طرح اپنی خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اس لیے ہندوستان کو سب سے زیادہ خطرہ لگتا ہے۔“

مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں جنہیں میں غور سے سن رہا تھا۔ ہندوستان کے وسعت پسندانہ عزائم کے بارے میں تو مجھے بوجھ

نے بھی بتایا تھا۔ وہی بوجھ جو گولڈن ٹرائی ۱۔ شکل سے میرے ساتھ فرار ہوا تھا۔

ہندوؤں کے بارے میں مجھے بھی کچھ بتا چکے تھے۔ ہندو سب سے پہلا تجربہ بنکاک میں جاگتی کی ملازمہ ہندوئے آوارہ گرد نواتے راجو کے حوالے سے ہوا تھا جس نے مجھے اور تھائی کو چھپانے کی کوشش کی تھی اور ہم بڑی مشکل سے جاگتی کے مکان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ دوسرا تجربہ سوائی رگھوناتھ کے حوالے سے ہوا تھا۔ جس نے بنکاک کے نواح میں آشرم کی آڑ میں عیاشی کا بہت بڑا اڈا بنا رکھا تھا اور وہ یہاں آنے والوں کو بلیک میل کر کے ان سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ راجو اور رگھوناتھ دونوں ہی تھائی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ دوسری طرف جاگتی دیوی تھی جس نے میری خاطر اپنا سب کچھ کر دیا تھا اور اپنی عزت اور جان کو داؤ پر لگائے میرے ساتھ ماری ماری پھر رہی تھی۔

پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔ میں بارہ چودہ سال کی عمر تک سنگاپور میں رہا تھا۔ وہاں بھی ہندوستانی کثرت تعداد میں آباد تھے۔ وہاں بھی میں نے کچھ ایسی ہی جلی باتیں ہی دیکھی تھیں لیکن اس زمانے میں مجھے اتنا شعور نہیں تھا۔ میں نے ایسی باتیں بھی سوچیں تھیں اور اب آہستہ آہستہ ان باتوں کا مفہوم سمجھ میں آ رہا تھا۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی اور چادر بھی درست کر لی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے اثرات تھے جن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی قسم کی تکلیف محسوس کر رہی ہے۔

”کیا بات ہے۔ تم ٹھیک تو ہونا؟“ میں نے جاگتی سے جان بوجھ کر انگریزی میں بات کی تاکہ وہ عورت بھی مطلب سمجھ سکے۔

”کار سے نکلنے سے کدھ سے چوٹ لگی تھی۔ تکلیف ہو رہی ہے۔“ جاگتی نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔ ”تھوڑی دیر اور تکلیف برداشت کرلو۔“ اس عورت نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا ”میں جہاں تم لوگوں کو لے جا رہی ہوں وہاں پہنچ کر تم لوگ اپنی ساری تکلیفیں بھول جاؤ گے۔“

میں کچھ کتنا چاہتا تھا مگر سامنے سڑک پر بجوم دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اس عورت نے بھی کار کی رفتار کم کر لی۔ میرے خیال میں یہ وہی جگہ تھی جہاں جاگتی کی اس حادثہ نگر ہوئی تھی۔ کار بجوم کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ سڑک کے کنارے

پولیس کی گاڑی بھی کھڑی تھی اور دو پولیس والے وہاں پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد جتنا بائیس تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ”ہیلو آفسر“ ہماری سامنے عورت نے ایک پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کیا معاملہ ہے۔ کوئی ایکسیڈنٹ؟“

”اوہ ما دام کاراشان۔“ پولیس آفسر اتے دیکھ کر بولا ”میاں کوئی ایکسیڈنٹ ضرور ہوا تھا لیکن سڑک پر ٹاڑ کھٹنے کے ان نشانات کے سوا اور کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ تاہم اس پارک میں موجود لوگوں نے یہاں غارتگری آواز بھی سن لی تھی لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”ہوسکتا ہے ایکسیڈنٹ زیادہ عظیم نہ ہو اور وہ جو کوئی بھی تھے پولیس کو اطلاع دیے بغیر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہوں۔“ ما دام کاراشان نے کہا۔

”ہوسکتا ہے لیکن وہ فائر۔“

”تم اس قضی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہو آفسر۔ میری مدد کی کوئی ضرورت ہو تو؟“ ما دام کاراشان بولی۔

”تھنک یو ما دام!“ پولیس آفسر نے جواب دیا۔ ما دام سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کم از کم دو مرتبہ ہماری طرف دیکھا تھا لیکن ہمارے بارے میں ما دام سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

ما دام کار کو حرکت میں لے آئی۔ اس صورت حال سے مجھے یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پارک میں موجود لوگوں نے غارتگری آواز سن کر پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔

”تم نے مجھے جو بات بتائی تھی اس پر میں نے کوئی شبہ نہیں کیا تھا۔“ ما دام کاراشان نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہاری سچائی کا ایک ثبوت توں لگا کہ تم میں سے کسی پر فائر کیا گیا تھا۔ میرے دل میں جو شبہات تھے وہ بھی اب ختم ہو گئے ہیں۔“

”شکریہ ما دام کاراشان۔“ میں نے جواب دیا۔

”شکریے کی کوئی بات نہیں۔“ ما دام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

کار اس سڑک پر سیدھی دوڑتی رہی۔ سڑک کے ساتھ پارک ختم ہو گیا تھا اور اب دریا کے کنارے پر کہیں کہیں ہمت وسیع و عریض کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔

میرے دل میں بھی اس عورت کے بارے میں جو شبہات تھے وہ اب ختم ہو گئے تھے لیکن یہ ذہنی الجھن ضرور

تھی کہ صرف میری باتوں پر یقین کر کے یہ ہماری مدد کرنے پر آمادہ کیوں ہو گئی۔ تب میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر کیونو نم کا پھول دار سنگی لباس بہت قیمتی تھا۔ اس کے ہاتھ پر عمارت بہت شان دار اور قیمتی تھی۔ اس پولیس آفسر نے جس طرح اس سے بات کی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اس شرمیلے ایک معزز حیثیت کی مالک ہے۔

دریا کے کنارے پر پہنچے ایک دوسرے سے خات فاصلے پر تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ شہر کے ریمیسوں کے بیچلے تھے۔ دریا میں کچھ بادبانی نشانی بھی موجود تھیں جس پر جلتی ہوئی رنگ پر لگی تھیں اور وہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔

اس سڑک پر تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار کی رفتار کم ہوئی اور وہ دریا کی جھلان پر، بجری کی ایک سڑک پر مڑ گئی۔ تقریباً بیس گز آگے لوہے کی سمانٹوں والا ایک گیٹ لگا ہوا تھا جس کے دونوں طرف اونچی دیوار نے وسیع و عریض رقبہ گھر رکھا تھا۔

ما دام کاراشان نے دور ہی سے بارن بجا دیا۔ قریب پہنچتے تک گیٹ کھل گیا اور ما دام کار کو اندر لیتی چلی گئی۔ اندر بھی بجری کی سڑک تھی جس کے دونوں طرف اونچے سایہ دار درخت تھے۔ اوپر سے ان کی شاخیں آئیں میں ملی ہوئی تھیں اور ایک سرگرم سی بن گئی تھی۔

کار پورچ میں رک گئی۔ انجن بند ہونے سے پہلے ہی ایک ادھیڑ عمر عورت دوواڑے سے نکل کر برآمدے میں آئی۔ اس نے ہنڈیوں تک لہسا پھول دار فراک پٹن رکھا تھا۔ اس کی عمر بیس تالیس کے لگ بھگ تھی۔ بالوں میں ہلکی سی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں ما دام کاراشان کے ساتھ اترتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

ہم کاراشان کے ساتھ اندر آ گئے۔ بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ دیوار قالیں اور شان دار فرنیچر آراستہ تھا اور بال کے ایک کونے میں ممانی کے خوب صورت اشیائے پر مہتابا بدھ کا کاشی کا مجسمہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کاراشان بدھ کی بیوہ کا تھی۔

”تم نے بتایا تھا کہ تم لوگ بکشتو نہیں ہو۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو اس وقت کچھ کھانے پینے پر بھی اعتراض نہیں ہوگا۔“ ما دام کاراشان نے باری بارن ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر اس ادھیڑ عمر عورت نے طرف رخ کر کے کچھ بدایات دیں اور دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں نے ہوتین سے کھانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ تم لوگ اتنی دیر میں اپنے صیے درست کرلو۔ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئی۔ جاگتی بار بار اپنا ہالیاں کندھا دبا رہی تھی۔ کندھے پر چوٹ ٹگنے کے بعد وہ اتر کھینڈ کا مٹیر بھی رہی تھی جس سے اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ یہ بگلا بھی اتر کھینڈ ہی تھا مگر اتر کھینڈ بندھے اور پچھلے چل رہے تھے۔

اس کمرے میں دو دیواروں کے ساتھ شیشوں کے سلاٹنگ ڈور والے وارڈ روپ بنے ہوئے تھے۔ ہر وارڈ روپ میں لاتعداد قیمتی ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظر جاگتی کی طرف دیکھا پھر ایک ڈریس نکال لیا اور جاگتی کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔

جاگتی نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ ہاتھ روم تھا۔ جاگتی کاراشان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ کاراشان مجھے لے کر اس کمرے سے باہر آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آئی۔

یہ ایک بہت کشادہ اور شان دار بڑا روم تھا۔ ڈریسنگ روم کے وارڈ روپ میں مردانہ ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔ ”یہ ہاتھ روم ہے۔“ کاراشان ڈریسنگ روم سے آگے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”تمہارے کے بعد ان میں سے جو لباس پسند آئے پس لینا۔ میں اپنے کمرے میں یا ہال میں ملوں گی۔“

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور وارڈ روپ کا جائزہ لینے لگا۔ تھری پیس سوٹ بھی تھے۔ جین کے روائٹی لباس بھی اور اوپن شرٹس اور چٹلنوں بھی۔ ایک طرف جینز اور ٹی شرٹس بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ٹی شرٹ اور جینز نکال لی۔ جسم پر پہنی ہوئی چادر اتار کر جینز کو پہن کر چیک کیا۔ لمبائی میں وہ میرے ٹخنوں تک تھی البتہ کمرے سے کسی قدر ڈھیلی تھی۔ وارڈ روپ میں کئی بیٹھ بھی ٹنگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بیٹھ بھی نکال لیا۔

مجھے کئی دنوں بعد نہانے کا موقع ملا تھا۔ گرم پانی سے میں دیر تک نہاتا رہا اور جب نماز کا وقت آئے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے بھی کئی روز بعد پہننے کا موقع ملا تھا۔ اپنے کپڑے ہاتھ روم میں ہی چھوڑ دیے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

ٹھیک اسی وقت مادام کاراشان بھی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں ٹھک گیا۔ وہاں پر سنناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے چوڑے پانچوں والے دار پا جامہ اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس کے پیچھے صرف دو بٹن لگے ہوئے تھے اور اوپر لگے تک کا حصہ کھلا تھا۔ شرٹ کے نیچے سینے پر تین چار پچ چوڑی پٹی سی لگی تھیں۔ یہ منظر کسی زائد حد سالہ پر بھی کرۂ عمار کی کوہنبرہ کے لیے کافی تھا۔ میرا سانس بھی بے ربط ہونے لگا تھا۔ اس نے بال کتھنی رنگت کے تھے جسے اس نے گول چوڑے کی ٹی میں سر پر سمیٹ رکھا تھا۔

میں نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا بلکہ اس وقت قیامت ہی لگ رہی تھی۔ میرے اندازے سے اس کی آٹھ تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

”کیا دیکھ رہے ہو مسٹر بھٹشو؟“

”چار منگ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تھینک یو۔“ وہ مسکرا دی اور قریب آکر دونوں بازو میرے بازوؤں کے مسد پر رکھ دیے۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے سسٹم میں انگلیاں گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے مسد بھری طرح سخت تھے جن میں جو تک بھی نہیں لگ سکتی تھی ”وری امارت!“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گز ہو گئی ”بھٹشو کے لباس میں تو تم کچھ عجیب سے لگ رہے تھے۔“

میں اسی وقت جاگتی بھی دروازہ کھول کر کمرے سے آئی۔ کاراشان کا حلیہ اور اس کے ہاتھ میری ہانسیں پر دیکھ کر اس کی ہونٹیں تن گئیں۔ کاراشان بھی شاید سمجھ گئی۔ اس نے ہاتھ ہٹا لیے۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکری نالباہ فراق پس رکھا تھا۔ گریبان اس کا بھی خاصا فراخ تھا۔ ”میری لباس اس وقت مجھے اچھا لگا۔ آرام دہ ہے۔“ جاگتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”صبح میں دوپہر کپڑے پہن لوں گی۔ وارڈ روپ میں پینٹ اور شرٹس بھی ہیں لیکن رات کے لیے مجھے یہی لباس اچھا لگا۔“

جاگتی نے یہ بات اردو میں کی تھی اس لیے کاراشان کچھ نہیں سمجھ سکی۔ اسی دوران میں ہال کی طرف سے عورت کی آواز سنائی دی جسے کاراشان نے کھانا تیار کر کے لیے کھانا تھا۔

”آؤ کھانا تیار ہو گیا ہے۔“ کاراشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہوئے کہا۔ ہم ہال کمرے سے گزر کر ڈائننگ روم میں آئے۔ یہ بھی خاصا کشادہ کھانا لیکن عام ڈائننگ روم سے قطعی مختلف۔ یہاں نہ تو ڈائننگ ٹیبل تھی اور نہ ہی کرسیاں۔ کمرے کے وسط میں فرش سے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی گول میز تھی۔ یہ دراصل دھری میز تھی۔ درمیان کا گول حصہ دھری میز پر کھانے کی ڈشیں اور پاؤں وغیرہ رکھے دیا لوگ تھا جس پر کھانا رکھ دیا جاتا تھا۔ جس پر چائیں، میز کے ہوتے تھے اس میز کا بیرونی حصہ ساکت تھا۔ جس پر چائیں، پیچھے، کانٹے اور چوب اسٹیکس رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے اطراف میں فوم کے کٹھن پڑے ہوئے تھے۔ کاراشان ایک کٹھن پر انگلیں پیچنے کی طرف موڑ کر مخصوص انداز میں بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اسی طرح دو زانو ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور بالا خرہ اتنی پانی مار کر بیٹھ گیا۔ جاگتی بھی اتنی پانی مار کر بیٹھ گئی۔

میز کے وسطی دیوالنگ حصے پر کئی کھانے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اس عورت نے پون گھنٹے کے اندر اندر اتنے سارے کھانے کیسے تیار کر لیے تھے۔ چکن چوپ ہوئے، ڈائیٹ رائس، چکن چاول، سویت اینڈ سا، فرائیڈ پران، فرائیڈ بیٹیز اور بجائے کیا کیا تھا۔

میں نے ایک پلیٹ میں فرائیڈ رائس اور چکن چاول نکال لیا۔ جاگتی نے فرائیڈ رائس کے ساتھ چکن چوپ سوئے پسند کیا تھا کیونکہ اس میں چکن کے ساتھ بڑی بھی تھی۔

کھانا بے حد خوش ذائقہ اور لذیذ تھا۔ کئی روز بعد ایسا کھانا کھانے کو ملا تھا۔ فرائیڈ پران بھی بہت مزے دار تھے۔ میں اور جاگتی کسی لحاظ و محوت کے بغیر کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

”یہ ہم پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے؟“ جاگتی نے کھانے کے دوران میں میری طرف دیکھتے ہوئے اردو میں کہا ”بھٹشوؤں سے تو لوگ دور بھاگتے ہیں اور یہ ہمیں اپنے محل نمائندگی میں لے آئی ہے۔“

”اس لیے کہ ہم بھٹشو نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”دیے ہال میں اس مجھے کو دیکھ کر تم نے اندازہ لگایا ہو گا کہ یہ بدھ کی پیروکار ہے۔ جو سکتا ہے کہ اسے ہم پر ترس آگیا ہو۔“

”مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔“ جاگتی بولی ”جس طرح کا اس نے لباس پہن لیا ہے اور جس طرح یہ تمہارے بازو ٹھٹھ رہی تھیں۔ اس سے تو میں کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔“

”مجھے بھی اپنی عزت خطرے میں نظر آ رہی ہے۔“ میں نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا ”مجھے محتاط رہنا پڑے گا۔“

”شان دار گاڑی، عالی شان بگلا اور قیمتی ساز و سامان دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔“

”میں اس کی دولت سے کیا لینا۔ ایک آدھ دن یہاں رہیں گے اور پھر اس کی مسمان نوازی کا شکر یہ ادا کر کے چلے جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے شبہ ہے۔“ جاگتی بولی ”ہم آسانی سے یہاں سے نہیں جا سکیں گے۔“

”تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟“ کاراشان نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”میری دوست کھانے کی تعریف کر رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”بہت مختصر وقت میں بہت لذیذ کھانا تیار کیا ہے۔“

”ہو تمہیں کھانے بنانے کی ماہر ہے۔“ کاراشان مسکراتی۔

کھانے کے بعد ہم ہال میں آگئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہوتین نے چھوٹی چھوٹی خوب صورت چایوں میں ہمارے سامنے قہوہ رکھ دیا۔ قہوہ بھی بہت خوش ذائقہ تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس دوران میں ہوتین کے علاوہ صرف ایک اور عورت نظر آئی تھی۔ گویا اتنے بڑے بنگلے میں صرف وہی تین عورتیں تھیں۔ میں نے جس بڑا روم میں جاکر کپڑے بدلے تھے وہ کسی مرد کا تھا لیکن ابھی تک کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔

کاراشان ہماری کمائی جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ ہمارے دشمن کون تھے، ہمارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے اور یہ کہ ہم کہاں جانے کا قصد رکھتے ہیں۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اپنے دشمنوں کے بارے میں ایک فرضی کمائی سادی اور بتایا کہ ہم مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے شاؤلن نیپل جارہے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہیں اس لیے ہم نے بھٹشوؤں کا بھیس اپنا رکھا تھا۔ بھٹشوؤں کو سیالی سمجھ کر ان سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی اور وہ آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں لیکن چونکہ کوئی عورت بھٹشو نہیں ہو سکتی اس لیے جاگتی کی وجہ سے ہمیں کچھ دشواریاں بھی پیش آتی رہی ہیں۔ ایک موقع پر جاگتی کا راز فاش ہو گیا تھا۔

کئی منگ میں پیچھے غنڈوں نے جاگتی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک غنڈے کی بنائی کردی۔ اس کا بازو توڑ

دیا تھا۔ اس وقت سے وہ لوگ ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ایک ساتھی نے شام کو پھر جاگ کر پتھول کی زد پر آغا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عین وقت پر کاراشان کی گاڑی اس طرف آجائے سے فائرنگ کرتا ہوا بھاگ گیا اور جاگتی اس کی کار سے نکل کر گر گئی۔

اس دوران میں کاراشان باری باری ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

”اب وہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“ کاراشان نے میرے خاموش ہونے پر کہا ”تم لوگ دو چار دن یہاں رہو۔ اس کے بعد میں خود تم لوگوں کو شاؤن نیپل پہنچا دوں گی لیکن اس دوران میں تم لوگ احتیاطاً اس جنگی کار دیواری سے باہر نہیں نکلو گے۔ میں اس ہتھکڑی کا بھی انتظام کر دوں گی۔ اسے دم دبا کر یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔“

میں نے اور جاگتی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میرے ہی سوال کے جواب میں کاراشان اپنے بارے میں بتانے لگی۔

اس کا تعلق تشنگائی کے متوسط گھرانے سے تھا۔ اس نے ایک انڈین بی بی داخلہ لے لیا اور پچیس سال کی عمر میں سے ڈاکٹر بن گئی۔ شروع میں وہ تشنگائی کے درمیانے درجے کے ہونٹوں میں پروگرام کرتی رہی پھر اسے بڑے ہونٹوں میں پروگرام ملنے لگے۔

سیان چانگ سے اس کی ملاقات ایک بوٹل ہی میں ہوئی تھی۔ سیان چانگ اس علاقے میں چائے کے بنات کا مالک تھا۔ اس کا شمار صوبہ یونان کے چند کروڑ پتیوں میں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت وہ عمر میں کاراشان سے تقریباً تیس سال بڑا تھا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد ہی وہ سیان چانگ سے شادی پر آمادہ ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ چند مہینے تشنگائی ہی میں رہی پھر سیان چانگ اسے ڈانگ کو لے آیا۔

سیان چانگ نہ صرف عمر میں اس سے تیس سال بڑا تھا بلکہ شکل و صورت میں بھی وہ بہت ہی گیا گزرا تھا۔ ہماری بھرم اور بھرا وہ بے ڈول جسم کو تھام کر دوں، پھولے ہوئے گال اور ہاتھی کی طرح چھوٹی آنکھیں۔ اگر اس کے پاس بے حساب دولت نہ ہوتی تو کوئی عورت اسے اپنے قریب نہ پہنچنے دیتی لیکن دولت ہر عیب چھپاتی ہے۔ کاراشان بھی اس کی دولت پر ہی مرستی تھی۔

ڈانگ کو میں دو سال بڑے سکون سے گزرے تھے۔ وہ شہزادیوں جیسی زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام تھا۔ سوسائٹی میں بھی اسے ایک معزز مقام حاصل تھا لیکن وہ

سال بعد کاراشان کا سکون برباد ہونے لگا۔

سیان چانگ کا دیوار کے سلسلے میں مختلف شہروں پر جاتا رہتا تھا اور پھر یہ انکشاف کاراشان کے لیے ہوا کہ وہ اور تکلیف دہ ثابت ہوا تھا کہ سیان چانگ نے مختلف شہروں میں دواستانیں پال رکھی تھیں۔

ان کے تعلقات میں ایک رشتہ سا آگیا اور دوشہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان خلیج مری ہوئی ہو گئی۔ ان میں کئی بار ان باتوں پر جھگڑا بھی ہوا تھا۔ ان کی آخری لڑائی بہت زوردار تھی۔

یہ تقریباً چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ کاراشان کو پچا چار نیان چانگ، فان لنگ میں رہنے والی ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاراشان ایک روز فان لنگ پہنچ گئی۔ پندرہ کو نامی وہ عورت ایک عالی شان فلیٹ میں رہائش پذیر تھی۔ یہ فلیٹ اسے سیان چانگ ہی نے لے کر دیا ہوا تھا اور ان کے تمام اخراجات وہی اٹھا رہا تھا۔

کاراشان کرائے کے دو غنڈے ساتھ لے کر گئی تھی۔ غنڈوں نے تو یاں لگ کر ہاتھ نہیں اٹھایا البتہ اس کی ہرج و مرج کر رکھ دی۔ دوسری طرف کاراشان نے یاں لگ کر دھنگ کر رکھ دیا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اسے سیان چانگ سے شادی کا خیال دل سے نہ نکالا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

سیان چانگ ان دنوں ہانگ کانگ گیا ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد لوٹا تو غصے میں بھرا ہوا تھا۔ یاں لگ کو نے اسے ہانگ کانگ ہی میں فون پر اطلاع دے دی تھی کہ اس پر کیا بند چلی ہے۔ وہ ہانگ کانگ سے پہلے فان لنگ گیا تھا جہاں یاں لگ کو نے کاراشان کے خلاف پولیس میں باقاعدہ رپورٹ لکھ رکھی تھی۔ سیان چانگ نے ایک بڑی رقم خرچ کر کے رپورٹ ختم کرادی اور ڈانگ کو چلا آیا جہاں کاراشان نے زوردار معرکہ ہوا۔ اس نے کاراشان کو طلاق کی دھمکی دی تھی لیکن اس دھمکی پر وہ عمل اس لیے نہیں کر سکا تھا۔ طلاق کی صورت میں اسے اپنی آدھی جائداد سے کاراشان کے حق میں دواستانہ ہونا پڑتا۔ کاراشان نے یہی عقل مندانہ کی تھی کہ شادی کے وقت یہ شرط لکھوائی تھی۔ جن سے اسے کچھ تحفظ مل گیا تھا۔

ایک ہفتہ ڈانگ کو میں رہنے کے بعد سیان چانگ بھر کاروباری دورے پر چلا گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ میں نے پہلے کاراشان کو اطلاع ملی کہ سیان چانگ نے یاں لگ سے شادی کر لی ہے اور وہ دونوں ساتھ رہ رہے ہیں۔

کاراشان حلقہ کر رہی تھی لیکن ظاہر ہے وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ وہ اس کاٹنے کو راستے سے ہٹانے کا موقع کر سکتی تھی جس نے اس کی زندگی میں زہر بھرا تھا۔ حاشا کر رہی تھی جس نے اس کا ہاتھ لیا تھا۔ اس دوران میں وہ لیکن اسے کوئی ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ایک نامی گرامی ایک مرتبہ تشنگائی بھی گئی تھی جہاں اس نے ایک نامی گرامی غنڈے کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی تھی۔ وہ غنڈا جانتا تھا کہ کاراشان کیبرے ڈاکٹر نہیں بنی تھی۔ وہ کوڑھ تو بنی ہے۔ اس نے صرف دو مطالبے کیے تھے اور اب اسے یہ بھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک رات گزارنا چاہتا تھا اور دوسرا مطالبہ اتنی زیادہ رقم کا تھا جو کاراشان کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ وہ رقم بھی پوری ایذا کاں لگ رہا تھا۔

کاراشان کے ساتھ رات گزارنے کا مطالبہ کوئی نیا نہیں تھا۔ کیبرے ڈاکٹر کی حیثیت سے بڑے ہونٹوں میں پروگرام حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت سے لوگوں کے لیے مطالبے کیے تھے۔ اس غنڈے کا مطالبہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ رات گزارنے کے بعد خطرہ رقم وصول کر کے بھی وہ اس کا کام کرنے سے انکار کر دیتا۔ ایسی صورت میں وہ اس کا کیا بھونکتی تھی۔ وہ خاموشی سے ڈانگ کو واپس چلی آئی۔

جاگتی اور میں بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ہوتین اپنے سارے کام ختم کر کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تو ان کی باتوں کا سلسلہ ٹھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ اس نے کاراشان سے کچھ کہا۔ جواب میں کاراشان نے بھی کچھ کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہوتین سونے کے لیے جا رہی ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”آؤ ذرا دیر کی سیر کر آئیں۔ چاندنی رات میں دیر کی سیر کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

میں نے جاگتی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں بھی اٹھ کر کمرے ہو گئے۔ جنگل کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم کھلی جگہ پر آ گئے۔ اس طرف کنکریٹ کا بہت وسیع و عریض چبوترا بنا ہوا تھا جو زمین کی سطح سے تقریباً پانچ فٹ اونچا تھا۔ چبوترے پر ماربل کے بڑے بڑے کمرے لگے ہوئے تھے۔ آگے بڑھے اتارنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ اس طرف تین چار مینولائٹس جل رہی تھیں۔ جن کی روشنی میں چبوترے کے آگے کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔

ہم سیڑھوں سے اتر کر نیچے آ گئے۔ آگے ایک ریتیلی زمین تھی اور تقریباً سو گز آگے دیا تھا۔ جس طرح جنگل کے

سامنے کے رخ پر چبوترے دیواریں تھیں اسی طرح چبوترے طرف بھی دائیں بائیں اونچی دیواریں تھیں۔ البتہ سامنے دیر کے کنارے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک تقریباً پندرہ فٹ اونچا آہنی جھنگلا لگا ہوا تھا۔ خاردار تاریں اتنی تنگ تھیں کہ لمبی کا پتہ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ درمیان میں بوٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔

ہم رست پر چلتے ہوئے بوٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ کاراشان نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر بتی جلا دی۔ روشنی ہوتے ہی میں آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گیا۔

بوٹ ہاؤس خاصا بڑا تھا اور اس میں دیرانی پانی، کافی اور مچھلیوں کی مخصوص بو سنائی ہوئی تھی۔ بوٹ ہاؤس کے دونوں اطراف میں لکڑی کے تختوں سے چار چار فٹ چوڑے پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ فارم کے ساتھ ایک چھوٹی موڑ بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ جس میں صرف تین افراد بیٹھ سکتے تھے۔ ایک بوٹ کے انجن کے ساتھ والی سیٹ پر اردو سامنے دوسری سیٹ پر۔ دوسرے پلیٹ فارم کے ساتھ ایک اور بڑی کشتی آہنی ہک سے بندھی ہوئی تھی۔ یہ بہت شان دار کشتی تھی۔ اسے لالچ تو نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس میں لالچ کی طرح ایک مختصر سا کین بنا ہوا تھا جس کی چھت پر بھی صوفہ نما لمبی سیٹ بنی ہوئی تھی۔ اس سے آگے ذرا سائیڈ میں کنٹرول ویل اور سوچ بیٹل وغیرہ بنے ہوئے تھے۔

”اس کشتی پر کبھی میں اور سیان چانگ چاندنی راتوں میں دیر کی سیر کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔“ کاراشان نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”لیکن لگتا ہے کہ ایسا موقع اب بھی نہیں آئے گا کہ ہم دونوں اٹھنے اس کشتی پر بیٹھ سکیں۔“

اس نے بوٹ ہاؤس کا دریا کی طرف والا گیٹ کھول دیا۔ پہلے ہمیں اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور پھر پلیٹ فارم کے ہک کے ساتھ بندھی ہوئی رسی کھول کر خود بھی اوپر اٹھ گئی۔ کنٹرول ویل کے قریب ہی ایک کینٹ میں سے ایک کپڑا نکال کر اس نے وہ ویل اور سوچ بورڈ صاف کیا اور پھر صوفہ نما سیٹ بھاڑنے لگی جس پر سرخ نمٹلی کشن رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کپڑا دوبارہ اس کینٹ میں ڈال دیا اور ویل کے سامنے کھڑی ہو کر انجن اشارت کرنے لگی۔ ہم صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

فیول تانے والے ڈائل کی سوئی بتا رہی تھی کہ ٹینک بھرا ہوا تھا لیکن کئی ہفتوں سے کشتی استعمال نہیں ہوئی تھی اس لیے انجن تیسری کوشش پر اشارت ہو سکا تھا۔



کشتی بوٹ ہاؤس سے نکل کر دریا میں آگئی اور وسط کی طرف بڑھنے لگی۔ انجن کی پھٹ پھٹ کی بہت بلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر کہیں کہیں مکاں نما کالنج بنے ہوئے تھے۔ جبکہ اس کنارے پر جہاں سے ہم روانہ ہوئے تھے، توڑے توڑے فاصلے پر جنگل بنے ہوئے تھے جن کی روشنائی دریا کے پانی میں لکڑی کے ساتھ جھلجھلا رہی تھیں۔ ہاؤس کے مخالف سمت بہت دور گھاٹ پر بہت سی روشنائی نظر آرہی تھیں۔ دریا میں بھی کہیں کہیں چمک چمک رہی روشنائیاں تھیں۔ تیری بوٹی نظر آرہی تھیں۔

چاند کی چودھویں شب تھی اور لوگ چاندنی رات میں  
وریا کی سیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہماری کشتی ہماؤ کے رخ پر جاری تھی۔ میں اور جاگی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کارا اشان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد سامنے سے تیرہٹی ہوئی روشیاں دکھائی دیں۔ وہ کوئی کشتی تھی جو مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ کارا اشان نے اپنی کشتی کے آگے والی میناں جلا دیں۔ کسی گاڑی کے بیڑ کمپس کی طرح تیز روشنی دریا کی لہروں پر پھیلنے لگی۔

سائے سے آنے والی کشتی ہمارے قریب سے گزر گئی۔ وہ بادبانی کشتی تھی جس میں پندرہ سولہ افراد تھے۔ ان میں کئی لوگوں نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے تھے۔ میں نے بھی بے اعتیاد راجھ ہلایا۔

کشتی لمبی رفتار سے چلتی ہوئی تقریباً دو میل آگے نکل گئی۔ اس جگہ دریا خم کھاتا ہوا بائیں طرف گھوم رہا تھا۔ بائیں کنارے پر مابی کیروں کی چھوٹی سی بستی تھی جہاں کچھ روشتاں عثمانی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کارااشان نے وہاں سے کشتی موڑنا شروع کر دی اور اس طرح ہمارا وہاں ایسی کاسفر شروع ہو گیا۔

ہمارے کشتی اپنے جنگلے کے قریب سے اور گھاٹ کے  
سامنے سے گزرنی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس طرف ہم کافی دور  
نکل آئے۔

”وہ عبادت گاہ ہے۔“ کارا اشان نے دریا کے کنارے پر ایک جگہ روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نیال ہے کہ ہم شام کو اسی عبادت گاہ کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں مکیان سے نکلز ہو گیا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں اس وقت اسی عبادت گاہ میں ہو گیا اس نے کوئی اور محفوظ جگہ تلاش کر لی ہوگی۔

اس عبادت گاہ سے کافی آگے نکل جانے کے بعد واپس مڑی تھی اور جب کشتی دوبارہ بوٹ ہاؤس میں داخل ہوئی تو تین بجے والے تھے۔

بوٹ ہاؤس سے باہر آکر لگتا تھا کاراشان چوڑی سی  
جیٹھ کر کچھ باتوں کے موڈ میں تھی لیکن ہم بڑی طرف  
ہوئے تھے۔

چوتھے والے دروازے سے اندر داخل ہو کر ان  
 شان نے دروازہ لاک کر دیا اور ہم دونوں کو الگ الگ کمرے  
 دکھادیے۔ مجھے وہی کمرہ ملا تھا جہاں شام کو میں نے پہلے  
 بدلے تھے اور یہ یقیناً کارا شان کے شوہر سیان چانگ کا  
 روم تھا۔

میں کچھ دیر جاگنے والے کمرے میں بیٹھا اس سے بات کر رہا تھا اور پھر اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر گیا۔ کئی روز بعد نرم و گداز بستر لیٹنا نصیب ہوا تھا۔ بہت بہت تھک گیا تھا۔ بستر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور کچھ ہی دیر میں کاراشان کے بارے میں سوچنا ہوا غنیمت کی آنکھوں میں چمک گیا۔

○★○

باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔  
 سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی ساڑھے آٹھ کا وقت  
 رہی تھی۔ میں غور سے وہ آواز سننے لگا۔ ان میں یہ  
 کارا شان کی آواز تھی اور دوسری کسی مرد کی۔ میرے ذہن  
 میں شبہات سر اُبھارنے لگے۔ میں بیڈ سے اٹھ کر رہا  
 قدموں کمرے سے باہر گیا۔

راہداری میں بھی دیزقالین بچھا ہوا تھا اس لیے بچے سے ہلکی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ویسے بھی شہ ننگے پیر تھا۔ جاگنی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

آوازیں ہال کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں راولا  
کے آخری سرے پر رک گیا اور جھانک کر دوسری طرف  
دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔  
صوفے پر جو آدمی بیٹھا ہوا تھا، اس کی پشت میں طرف  
اس کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ اس کے دامن میں  
والے صوفے پر شب خرابی کے لباس میں کارا اٹھان  
ہوئی تھی۔ وہ اگر گردن کھمائی تو مجھے دیکھ سکتی تھی۔

جلدی سے نیچے بیٹھ گیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے  
سوچے سرائے اُچھارنے لگے۔ اگر کاراشان نے ہمیں چکڑا  
کے لیے اس پولیس آفسر کو بلوایا تھا تو ہمارے بچے کا کوئی  
جان نہیں تھا لیکن پھر یہ خیال میں نے جھٹک دیا۔ اگر اسے  
چاہتا ہے تو کاراشان کو بڑے مواقع ملے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد جاکر کو اسپتال سے جاری ہو گئی تھی۔ جب وہ نکلے تو دیکھا کہ جاکر کی مرد نہیں عورت تھی اور پھر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ جاکر ہم بھگتو نہیں ہیں۔ اپنے گھر کی سبھی اہواز آتے ہوئے راستے میں وہ پولیس والوں کے پاس رکی طرف سے تھی جہاں سڑک پر کار کے ٹائروں کے ٹھکنے کے نشانات تھے۔ وہ اگر چاہتی تو ہمیں اسی وقت پولیس کے حوالے کر دیتی۔ اس کے برعکس اس نے گھر لاکر ہماری بڑی خاطر ہدایت کی تھی اور دریا کی سیر کے بعد جب ہم اپنے گھروں میں سو رہے تھے تو وہ اس وقت پولیس کو بلا کر ہمیں ان کے حوالے کر گئی تھی۔ میں اپنی جگہ پر دیک کر ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ پولیس آفیسر کہہ رہا تھا۔

”بات یہ ہے مادام کہ آپ کے وہاں سے آنے کے بعد میں نے اپنی تفتیش جاری رکھی تھی اور پارک میں موجود کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ تین بمکشوزں کو دریا والی عبادت گاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ان میں ایک آگے تھا اور دو اس سے ذرا پیچھے“ وہ پسندے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”پارک میں موجود لوگوں کا بیان ہے کہ فائر کی آواز  
تیرنا اسی جگہ سے سنائی دی تھی جہاں کار کے ٹائروں کے  
جھٹکنے کے نشانات پائے گئے تھے۔ میں نے آپ کی کار میں دو  
بمبشوروں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں اسی وقت آپ کی طرف آنا  
چاہتا تھا لیکن ہماری کار کے ریڈیو پر اطلاع ملی کہ وہاں سے  
تفریحی دو سولر ایک آدمی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اسے گولی مار  
کر ہلاک کیا گیا تھا اور گولی چلانے والا ایک بمبشور تھا۔ ہمیں  
نوا چاہئے اور رات پر پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ قتلِ کمبیاں نے ہی کیا ہو گا۔ وہ جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے اس آدمی کو لوٹنے کی کوشش کی ہو اور مزاحمت کرنے پر کمبیاں نے اس پر گولی چلا دی۔ ”سوری آفسر“ کا ارشاد ان کی آواز سنائی دی ”ان دونوں بگشتروؤں کو میں نے کچھ رقم دے کر شرورانی عبادت گاہ کی طرف جانے والی سڑک کے موڑ پر اتار دیا تھا۔“

”میں نے وہاں بھی معلوم کر لیا تھا لیکن اتفاق ہے کہ  
مگزشتہ شام سات بجے عبادت گاہ کا گیت بند ہونے کے بعد  
کوئی ہلچل وہاں نہیں آیا۔“ آئینہ نے کہا۔  
”ہو سکتا ہے وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں۔ کوئی  
سراٹے وغیرہ۔“ کارا شان نے کہا۔  
”میں چیک کر چکا ہوں مگر کوئی سراغ نہیں ملا۔“ آئینہ  
بولی۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو بھکشوؤں کی آپ کو تلاش کیوں ہے جبکہ قتل کی وہ واردات وہاں سے دو میل دور مخالف سمت میں ہوئی تھی؟“ کا ارشاد نے پچھا۔

”ارک والی سڑک پر تین بھکشوؤں کو آگے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔“ پولیس آفیسر نے کہا ”ہو سکتا ہے وہ تینوں ایک دوسرے کو جانتے ہو اور وہ دونوں قابل بھکشو کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔“

آنکھیں بند کر لیں اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔  
 ”میں جانتی ہوں تم جاگ رہے ہو۔ یہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کارا شان کی آواز میری سماعت سے نکلائی۔ ”میں نے تمہیں راہداری میں دیکھ لیا تھا۔ وہ پولیس آفیسر جا چکا ہے۔“ آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”میں اپنے کمرے میں ہوں۔ تم وہیں آ جاؤ۔“ کارا شان نے کہا اور مرکز دروازے سے باہر نکل گئی۔  
 میں چند لمحوں کے بعد باہر نکلا اور پھر اٹھ کر باٹھ روم میں گھس گیا۔

چند روز بعد میں کارا شان کے بیڈ روم میں موجود تھا۔ سائڈ ٹیبل پر کافی کے دو کپ رکھے ہوئے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں ایک کپ کر پی بیٹھ گیا۔ کارا شان بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور میری نظریں اس کی طرف اٹھنے ہوئے ہجھک رہی تھیں۔  
 ”یہ تو تم جاگتے ہو کہ وہ پولیس آفیسر یہاں تم لوگوں کی تلاش میں آیا تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔“ کارا شان نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”لیس ماما!“ میں نے جواب دیا ”میں نہیں سمجھ سکا کہ ہماری وجہ سے تم اپنے آپ کو مصیبت میں کیوں ڈال رہی ہو۔ اگر پولیس کو پتا چل گیا کہ ہم نے یہاں پناہ لے رکھی ہے تو تم پر بلا وجہ شک کیا جائے گا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہم کوئی جرائم پیشہ تو نہیں ہیں کہ پولیس سے اس طرح چیختے پھریں۔ پولیس والے ہم سے صرف اس ہتھکڑی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں جس نے بازار میں کسی کو قتل کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اور جاگی کو پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ ماما نے کہا ”لیکن جب پولیس کو پتا چلے گا کہ جاگی مرنے کی عورت ہے اور تم لوگ جھٹسو نہیں ہو تو پولیس قتل کی اس واردات کو بھول جائے گی اور تم دونوں سے پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔ یہاں ہر اجنبی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی پر بھی جاسوسی کا الزام بڑی آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ تم لوگ ایک مرتبہ پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو زندہ یا مرہ کسی صورت بھی یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔“

کارا شان نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں کافی کی چمکیاں لینے ہوئے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ کم بخت ہسپتال کی وجہ

سے اچھی خاصی الجھن پیدا ہو گئی تھی اور ظاہر ہے سب سے معاملہ سرو نہ پڑ جاتا ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔  
 ”اب صورت حال یہ ہے۔“ کارا شان نے ہمیں ملز سے دیکھتے ہوئے کہا ”میری افال تم لوگوں کے لیے باہر ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں جگہ میں رہتے ہوئے تمہیں کوئی فائدہ نہیں۔ حالات جیسے ہی پر سکون ہوں میں خود تم لوگوں کو ویدر سے نکال دوں گی۔“

”اگر تمہارے ملازمین میں سے کسی نے ہمارے بارے میں بتا دیا تو؟“ میں نے کافی کی چمکی لیتے ہوئے کہا۔  
 ”ایسا نہیں ہوگا۔“ کارا شان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میرے بچکے پر کوئی مرد ملازم نہیں ہے۔ ہوتی کے علاوہ دو عورتیں اور ہیں۔ ایک گھر کے کام کان کے لیے اور دوسری سیکیورٹی گارڈ۔ وہ ریڈ آرم کی رہائش آفیسر سے گیٹ کی ذمہ داری سنبھالنے کے علاوہ باغبانی اور اس قسم کے دوسرے کام بھی وہی انجام دیتی ہے۔ گزشتہ شام جب میں نے لوگوں کو لے کر یہاں آئی تھی تو میں نے اسی وقت ان تینوں کو سمجھا دیا تھا۔ مجھ سے ملاقات سے پہلے اس پولیس آفیسر نے یقیناً میری سیکیورٹی گارڈ اور دو تینوں وغیرہ سے بھی پوچھا ہوگا لیکن انہوں نے اپنی زبان بند رکھیں۔“

”ہمیں کب تک یہاں رہنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”جب تک یہ معاملہ سرو نہیں پڑ جاتا۔“ کارا شان نے جواب دیا ”اور میرا خیال ہے اس میں دو چار دن لگیں گے اس کے بعد تم لوگوں کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے بعد کارا شان کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر گیا۔ دوسری عورت جسے کل شام میں نے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا، بال میں فرنیچر کی صفائی کرتی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ میں اس پر توجہ دیے بغیر جاگی کے کمرے میں گیا۔

اس وقت دس بجے والے تھے جاگی ابھی تک سو رہی تھی۔ میں بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور جاگی کو جگانے کے لیے دھتے لگے۔ میں ایک دو مرتبہ اس کا نام لے کر کارا شان نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

”ارے۔ تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟“ وہ اٹھ کر بیڈ گئی۔  
 ”تمہارے کمرے میں تو ابھی آیا ہوں لیکن میں جلد

جاں سما تھا۔ یہاں کچھ گڑبگڑ کے آثار نظر آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔  
 ”کیسی گڑبگڑ؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔  
 ”پولیس ہماری تلاش میں یہاں آئی تھی۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا ”یہ کم بخت ہسپتال ہمارے لیے مسئلہ بنا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

”اسی صورت میں تو ہمیں پہلی فرصت میں یہ شہر چھوڑ دینا چاہیے۔“  
 لیکن کارا شان کے خیال میں ہمیں چند روز تک اس جگہ سے باہر قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے۔ ”میں نے کہا کہ ہمارے معاملے میں اس نے اگرچہ پولیس کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے اس غلط بیانی کی وجہ سے وہ خود بھی کسی الجھن میں مبتلا ہو سکتی ہے لیکن۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر ہماری مدد کیوں کر رہی ہے۔“ جاگی نے کہا ”اگر ہمارا تعلق بدھ مت سے ہوتا تو یہ سمجھا جاسکتا کہ۔“  
 ”مجھے بھی اس پر کسی قسم کا شبہ ہونے لگا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”بہر حال اب صورت حال یہ ہے کہ ایک دو دن تک ہم یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔ پولیس کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جانے کے بعد بھی اس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو پھر کچھ سوچا جائے گا۔ تم اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔ ناشتا کرنے کے بعد کچھ سوچیں گے۔ مدد خالی ہو تو دماغ بھی کچھ سوچنے سے انکار کر دیتا ہے۔“

جاگی مجھ سے پہلے بیڈ سے اتر کر دروازے کے قریب پہنچی۔ اس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن میں جلدی سے اٹھ گیا۔

”مجھے باہر جانے دو۔“ میں دروازے کی طرف بڑھا۔  
 جاگی دروازہ بند کر کے رکتے رکتے گئی اور پھر میں جیسے ہی باہر نکلا اس نے دروازہ بند کر دیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں باٹھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے کسل مندی بڑی حد تک دور ہو گئی۔ کل رات میں نے اپنے پرانے کپڑے غسل خانے ہی میں چھوڑ دیے تھے لیکن اب وہ کپڑے یہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید وہ ممکن یا دوسری ملازمہ نے اٹھا کر کسین ڈال دیے تھے۔

میں اس وقت بھی کارا شان ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ہم پر اتنی مہربان کیوں تھی؟ اور پھر یہ بات بھی مجھے بڑی عجیب لگی تھی کہ اس بچکے میں کسی مرد کا وجود نہیں تھا۔

سیکیورٹی گارڈ بھی ایک عورت ہی تھی۔ کارا شان کا شوہر چھ مہینوں سے الگ رہ رہا تھا۔ گھر میں کوئی مرد موجود نہ ہو تو عورت عدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔ دولت مند عورت کے لیے تو خطرات اور بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن کارا شان نے کسی مرد کا سارا لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے عورتوں پر ہی بھروسہ کیا تھا۔ اس کی سیکیورٹی گارڈ بھی عورت ہی تھی۔

میں جب کمرے سے باہر نکلا تو جاگی اور کارا شان بال میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کارا شان نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو کل شام ہم نے اس کے جسم پر دیکھا تھا۔  
 اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم ڈانگ روم میں اس گول میز کے گرد بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ ناشتے کے دوران میں ہی کارا شان نے بتایا کہ ناشتے کے بعد وہ ایک ضروری کام سے چل جائے گی۔ ہمیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم بچکے کے اندر اور لان میں آزادی سے گھوم پھرنے میں البتہ ہم باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ہم بلا تکلف وہ تین سے کہہ دیں۔

کارا شان چلی گئی۔ ہم دیر تک لان میں گھومتے رہے۔ بہت سرسبز لان تھا۔ وسط میں ایک خوب صورت فوارہ بھی تھا جس کے اطراف میں بیٹھنے کے لیے سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ گیٹ سے پورچ تک آنے والی بچری کی روش کے دونوں طرف درخت تھے جن کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ بیوی چار دیواری خاصی اونچی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف بھی قطار میں درخت لگے ہوئے تھے لیکن ان درختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی نہیں تھیں۔ بالکل سیدھے اوپر تک چلے گئے تھے۔

گیٹ کے ساتھ کہیں کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی محافظ عورت کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کی صحت مند عورت تھی اور چہرے سے بڑی خزانہ لگ رہی تھی۔ اس کی گود میں آٹونیک رائفل رکھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ رائفل پر تھا۔ ہم قریب سے گزرے تو وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

ہم لان میں گھومنے کے بعد اندر آ گئے اور گھوم پھر کر تمام کمرے دیکھنے لگے۔ کام کرنے والی دوسری عورت تو نظر نہیں آئی تھی البتہ ایک دو مرتبہ وہ تین سے آتنا سامنا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں کسی بھی کمرے میں جانے سے روکنے یا

ٹوکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آخر میں ہم جاگی والے کمرے میں آ گئے۔

باتوں کے لیے ہمارے پاس صرف دو ہی موضوع تھے۔ کاراشان اور ہلکیاں۔ ہلکیاں کی وجہ سے ہم مصیبت میں پھنسے تھے اور کاراشان ہمیں اس مصیبت سے نکالنا چاہتی تھی۔ میرا ذہن بڑی طرح الجھا ہوا تھا۔ کاراشان ہماری مدد کیوں کرنا چاہتی ہے؟ میرا اب تک کا تجربہ یہ تھا کہ کسی مطلب کے بغیر کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اکیلے ہی کھایا تھا۔ کاراشان واپس نہیں آئی تھی۔ کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آکر بستر لیٹ گیا۔ ذہن پر غنودگی سی جارہی ہو رہی تھی اور پھر نجانے کب میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو پانچ بج چکے تھے۔ جاگی میرے بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں باہر آکر لان میں فوارے کے سامنے بیٹھ گئے۔ فوارے کا پانی کئی فٹ اور تک اچھل رہا تھا اور اس کی پھوار چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

کاراشان ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہوتین نے آکر پوچھا کہ ہم کافی اندر بیٹھ کر پینیں گے یا بیس لے آئے۔ جاگی نے اسے کافی پییں پر لانے کو کہہ دیا۔

ہوتین نے پائس کی پھیپھوں کی ایک چھوٹی میز ہمارے سامنے رکھ دی اور تھوڑی دیر بعد کافی بھی لے آئی۔

شام کا اندھرا پھیلنے کے بعد بھی ہم دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ ہوتین نے لان کی بنیاں جلا دی تھیں۔ ایک مرتبہ ہوتین اس طرف سے گزری تو میں نے اس سے کاراشان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر چلی گئی ہے۔ واپس رات کو دیر سے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے وہ رات کو واپس ہی نہ آئے۔

نجانے کیوں میرے ذہن میں طرح طرح کے سوسے سر ابھارنے لگے۔

”یہ ہمیں کسی جگر میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کر رہی؟“ میں نے جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم سے اس کی کیا دشمنی ہے۔“ جاگی نے کہا ”کسی جگر میں پھنسانا ہوتا تو ہمیں پہلے ہی پولیس کے حوالے کر چکی ہوتی۔ دولت مند عورت ہے ایسے لوگوں کی مصروفیات بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہو۔ ہمیں اس پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔“

”لیکن نجانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا۔“ میں نے کہا۔

”وہم ہے تمہارا۔“ جاگی نے جواب دیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جاگی غیر ارادی طور پر کاراشان کے کمرے میں ٹھس گئی۔ یہاں بیڈ کے عین سامنے والی دیوار کے قریب ایک خوب صورت ٹرائی پڑی ہوئی سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ٹرائی کے نیچے خانے میں دی سی آر بھی تھا اور اس کے ساتھ والے خانے میں ویڈیو ریکس رکھے ہوئے تھے۔ جاگی چند لمحوں کی گواہ تھی کہ وہی رسی پھر اس نے پاور کا بٹن دبا دیا اور ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبائے۔ لگی۔ تمام چینلز پر چینی پروگرام تھے۔ کوئی بھی غیر ملکی چینل نہیں تھا۔

جاگی نے ایک کیسٹ نکال کر دی سی آر پر لگا دیا۔ میں اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ چینی فلم تھی مگر تھکے بے ہودہ قسم کی۔ جاگی بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور اسکرین پر جب بھی کوئی اسی قسم کا منظر آتا وہ مجھے چٹکیاں کاٹنے لگتی۔ میں ہر مرتبہ اسے گھور کر رہ جاتا۔ ایک مرتبہ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ بیڈ سے نیچے گر گئی۔

قریب ہی ڈرننگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ جاگی قائلین پر بیٹھے بیٹھے ڈرننگ کی دراز میں کھول کر دیکھنے لگی۔ اس سے یہ حرکت غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی تھی مقصد تلاش لیتا نہیں تھا۔ سب سے نیچے والی دراز میں گتے کا ایک ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈبا دراز سے نکال کر کھول لیا اور پھر اس کے قتبوں کی آواز سن کر میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ ڈبے پر نظر پڑنے ہی میری کپٹیاں سلگ اٹھیں اور سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

جاگی ہانکوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ڈبا چھین کر دراز میں رکھا اور دھڑتے دراز بند کر دی۔ اس وقت لیوی اسکرین پر بھی برا خوفناک قسم کا منظر آ رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے بیڈ سے اٹھ گیا اور لیوی بند کر دیا اور جاگی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے کی طرف کھینچے لگا۔ جبکہ جاگی بدستور قہقہے لگا رہی تھی۔

جاگی کے کمرے میں آکر میں نے اسے بیڈ پر گرا دیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے دماغ میں سنسنی سی ہورہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے کاراشان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے کسی موکی ضرورت کیوں نہیں تھی۔

اجاگک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کاراشان اپنے انہی مندے مقاصد کی تکمیل کے لیے تو مجھے یہاں لے کر نہیں آئی؟ یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔ میں نے صبح اس پولیس آفیسر کی باتیں بھی سنی تھیں۔ کاراشان اکثر آوارہ گرد بھکشوں کو کئی کئی روز تک اپنے گھر میں رکھتی رہی ہے۔ لوگوں کو کھانا بھی ٹھاتا تھا کہ وہ ان کی مالی مدد کرتی ہے مگر اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ کسی بھکشو کو عورت کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن بھکشو بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ کسی مرد کے لیے ہکنا مشکل نہیں ہوتا اور جب کاراشان جیسی حینہ انہیں دعوت گناہ دے تو کسی مرد کے لیے شہر پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا ہوگا۔ مقامی لوگوں کو کاراشان شاید اسی لیے قریب نہ آنے دیتی ہو کہ اس میں بدنامی کا خدشہ تھا۔ بھکشو تو دو چار روزہ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کی طرف سے بدنامی کا کوئی زخیر نہیں تھا اور ہمیں بھی شاید وہ اس لیے لائی تھی۔ پہلے تو وہ جاگی کو بھی مرد ہی سمجھی تھی جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ عورت ہے تو وہ ہمیں راستے میں اتارنے کے بجائے یہاں لے آئی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد جب میں نے ناکر کپڑے بدلے تھے تو وہ میرے بازوؤں کے مسلز ٹٹولنے لگی تھی اور مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا اور اب عیاں قسم کی قہقیں اور ڈرننگ کی دراز میں وہ ڈبا دیکھ کر مجھے اس کی نیت کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

میں کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جاگی آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ مجھے اس وقت جاگی کی نیت میں بھی فوری نظر آ رہا تھا لیکن وہ شرافت سے بیٹھی رہی۔

ہم دیر تک کاراشان کے کردار پر باتیں کرتے رہے۔

• گزشتہ رات کاراشان نے ہمیں اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اب مجھے اس پر بھی شبہ ہو رہا تھا۔ جو عورتیں اس طرح غلط راستے پر نکل جاتی ہوں وہ مردوں کے قابل نہیں رہتیں۔ انہیں مردوں سے تسکین نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے کاراشان کا اپنے شوہر سے بھی کچھ اسی قسم کا جھگڑا شروع ہو گیا ہو اور اس نے دوسری شادی کر لی۔ جاگی نے بھی میری طرح کچھ اسی قسم کا نظریہ قائم کیا تھا۔

ڈیڑھ بج گیا۔ کاراشان کے اس وقت آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مجھے بھی خیند آنے لگی تھی۔ میں نے جاگی کو زبردستی اس کے کمرے میں بھیج دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

## ڈاکٹر جی ایم نازکی

### شہرہ آفاق کتاب

## ازدواجی نفسیات

قیمت  
23 روپے

قیمت  
40 روپے

- ❖ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل
- ❖ منگنی اور آئیڈیل
- ❖ ازدواجی ہم آہنگی
- ❖ ازدواجی زندگی کا جنسی پہلو

کتاب کی قیمت سے ڈاک خرچ پڑے گی

پتہ: سی آر ڈی راولپنڈی



kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

صبح میری آنکھ جلدی اٹھ گئی۔ اس وقت سات بجے تھے۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلیا۔ ہال میں ہوتیں سے پتا چلا کہ کاراشان صبح پانچ بجے واپس آئی تھی اور آتے ہی سو گئی تھی۔ میں ہوتیں سے کھانی کا کپلے کرلاں میں آیا۔ تقریباً تین گھنٹوں بعد کاراشان سے آتنا سامنا ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور چہرے پر عجیب سے تاثرات محسوس کیے تھے۔ میں اس کی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا مگر اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ ایک لمحے وہ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید اسے پتا چل گیا تھا کہ گزشتہ رات ہم نے اس کی ڈرننگ ٹیبل میں وہ ڈبا دیکھ لیا تھا۔ وہ فلم کیٹ تورات کو ہم نے وہی سی آری میں لگا چھوڑ دیا تھا۔ اس قسم کا راز فاش ہو جانے پر تو اس کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت ہوئی چاہے مجھے یہ خیال اس کے چہرے پر تو عجیب سے تاثرات تھے۔ جس سے میرے اندر بے چینی ہی بھڑکی تھی اور میری چھٹی حس کسی گڑبگڑ کا احساس دلانے لگی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے بھی دھوکا نہیں دیا تھا اور اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ بہت جلد کوئی گڑبگڑ ہونے والی ہے۔

”کل تو تم دن بھر اور پھر رات بھی غائب رہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس بھکشو والے معاملے کا کیا ہوا؟“

”کل دوپہر کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔“ کاراشان نے جواب دیا ”بھکشو والا معاملہ ابھی جوں کا توں ہے۔ پولیس نے تو قافلہ بھکشو کو گرفتار کر سکی ہے اور نہ ہی دوسرے دو بھکشوؤں کا کوئی سراغ ملا ہے۔ پولیس کی تحقیقات ابھی جاری ہے۔ گردیشیے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا لیکن تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تم لوگ بالکل محفوظ ہو۔“

جاگتی گیارہ بجے کے قریب سوکرا اٹھی تھی۔ بارہ بجے کے قریب کاراشان گاڑی پر باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس وقت بھی میں نے اس کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی تھی۔

اس رات کھانے کے بعد ہم کاراشان کے ساتھ ہال کمرے ہی میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کاراشان کی فرمائش پر ہوتیں نے ہمیں کافیا بنا کر دی اور سونے کے لیے کوٹھی کے پہلو میں واقع اپنے سرخٹ کو اڑ میں چلی گئی۔

کافی پینے کے بعد ہم زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھے۔ جاگتی کو

بڑے زور کی نیند آ رہی تھی اور میں بھی دماغ میں کچھ بوہاؤ بن سمحوس کر رہا تھا۔ جاگتی اکیلے سونے کو تیار نہیں کرتی کہ وہ میرے کمرے میں اگر بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں نے ٹیبل پر بٹھا کر ناٹ بلب روشن کر دیا اور بیڈ کے کنارے پر لیٹ گیا۔ میں رات کے وقت جاگتی سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس روز وہ کاراشان کے پاس روم میں بیڈ پر لیٹ کر آئی تھی اور میرے ساتھ سونے پر بعد تھی۔ میں نے اسے اور اس کے درمیان کم از کم دو بالشت کا فاصلہ رکھا تھا۔ جاگتی چند منٹ باتیں کرتی رہی اور پھر سو گئی۔

اور پھر ایک لمحے یوں لگا جیسے وہ خواب نہیں سب پتہ حقیقت تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے لیکن حقیقت سے فرار میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے جسم پر لباس نہیں تھا اور وہ حینہ مجھے دوپٹے ہوئے تھی۔ میں اسے پیچھے دھکیلتا تھا۔ میرے خیال میں وہ جاگتی تھی جو موقع پا کر یہ زندگی حرکت کر گزری تھی لیکن یہ خوفناک انکشاف میرے لیے ہوا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ وہ جاگتی نہیں کاراشان تھی۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا دیا اور خود بھی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں سنسنی بھر رہی تھی اور سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ کاراشان بیڈ پر پڑی گہرے کمرے سانس لے رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ نیلگوں روشنی میں اس کا چہرہ اس وقت مجھے کسی چہرے سے بھی زیادہ بھیاک اور گھٹاؤنا لگ رہا تھا۔

”کل رات تمہارے بیڈ روم میں وہ چیزیں دیکھ کر تمہارے گھٹاؤنے کردار کا پتا چل گیا تھا۔“ میں نے اٹھ کر کپڑے پھینٹے ہوئے کہا ”مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ہمیں کل دن میں ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔“

”تم ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو پاتے۔“ کاراشان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اگر تم زبردستی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے تو میری گاڑی یا تو تم لوگوں کو پولیس کے حوالے کر دیتی یا گولی سے اڑا دیتی۔“

”تمہارا گھٹاؤنا مقصد پورا ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا ”بہتر ہے کہ دن کی روشنی پھیلتی ہے یہیں یہاں سے چلے جائے۔ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ جاگتی کہاں ہے؟“ میرا خیال تھا کہ اس نے جاگتی کو بند کی حالت میں ہی اٹھا کر دوسرے کمرے میں لٹا دیا تھا اور مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ جاگتی اتنی گہری نیند سو گئی تھی کہ اس طرح اٹھا کر لے جائے جانے پر اس کی آنکھ نہیں کھل گئی تھی۔

”جاگتی کہاں بھی ہے محفوظ ہے۔ تمہیں اس کے لیے کاراشان نے جواب دیا۔“ کاراشان نے جواب دیا۔ ”میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھا رہا پھر حیرتی سے کمرے سے نکل گیا۔“ اس نے اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ کاراشان کے بیڈ روم میں جھانکا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی اور پھر میں نے تمام کمرے دیکھ ڈالے۔ جاگتی کہیں بھی نہیں تھی۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ آج دن میں میری چھٹی حس نہیں تھی۔ میرا دماغ احساس دلا رہی تھی وہ شروع ہو چکی تھی۔ بار بار جس موزیک کا احساس دلا رہی تھی وہ شروع ہو چکی تھی۔ میں دوبارہ اس کمرے میں آیا۔ کاراشان اب بھی اسی طرح بستر پر لباس پہنی ہوئی تھی۔ جاگتی کے اس طرح غائب کر دینے کے لیے اپنے غصے پر قابو نہیں رہا تھا۔ کاراشان کو شکر آئے دیکھ کر میرا پارا پارچہ اور بھی چڑھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑا اور جھٹکے سے اٹھا دیا۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر جم گیا تھا۔

”ہٹاؤ جاگتی کہاں ہے ورنہ میں تمہاری گردن موڑ دوں گا۔“ میں اس کی گردن پر انگلیاں گزرتے ہوئے غرایا۔ ”مہم مجھے چھوڑ دو۔“ اس کے حلق سے کھنکھنی سی آواز نکلی ”اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم خود بھی نقصان اٹھاؤ گے اور جاگتی بھی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔“

میں نے ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ ”ہٹاؤ جاگتی کہاں ہے۔“ میں اسے گھورتے ہوئے بولا ”اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”جاگتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولی ”البتہ اگر تم نے اپنے غصے پر قابو نہ لیا تو تم خود نقصان اٹھاؤ گے۔ بہتر ہو گا کہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کی جائے اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“

مجھے مجھے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی معاملے میں مجھے ہلکے سا مل کر چاہتی ہے اور اس نے جاگتی کو بھی یہ غماں بنایا تھا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ منصوبہ مجھ سے تیار کیا گیا تھا۔ جاگتی کی کافی میں کوئی نشہ آور چیز ملائی تھی جس نے مجھے اسے نیند آنے لگی تھی اور وہ بستر پر لیٹنے ہی سو گئی تھی بلکہ بے ہوش ہو گئی تھی اور میں بھی اس قدر کمرے میں سویا تھا کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ اسے کب بستر سے اٹھا گیا تھا اور میرے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا اسے میں خواب سمجھتا رہا۔

مجھے کاراشان کے کردار کا تو پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھ سے

ابنی جیسی بھوک مٹانا چاہتی تھی۔ ہمیں یہی کہتی رہی تھی کہ پولیس کو دو بھکشوؤں کی تلاش ہے اس لیے ہمارے لیے باہر نکلتا مناسب نہیں۔ گویا یہ ہمارے لیے دھمکی تھی لیکن اب اس نے جاگتی کو بھی غائب کر دیا تھا۔ اس طرح وہ اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ اس کو کبھی کے نیچے کوئی یہ خانہ موجود ہے جہاں جاگتی کو غائب کیا گیا تھا۔

”نچرے پنہ۔“ میں نے اسے گھورا ”ہم ہال کمرے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔“

اس نے کرسی پر پڑا ہوا شب خولی کا لباس اٹھا کر پہن لیا اور کچھ کے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے بیڈ کا میٹریس اٹھا کر اس کے نیچے چھپایا ہوا خنجر نکال کر قیص کے نیچے چٹوں میں اڑس لیا۔ بیڈ میں سے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں میں نے پہلے ہی روز یہاں چھپا دی تھیں۔ جاگتی کا پستول بھی اس کے بیڈ کے میٹریس کے نیچے چھپا ہوا تھا۔

میں ہال کمرے میں پہنچا تو کاراشان کچن میں داخل ہو چکی تھی۔ میں صوفوں کے درمیان قالین پر بیٹھنے لگا۔ کاراشان تقریباً پندرہ منٹ بعد کچن سے باہر نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کافی کے کپ اٹھا رکھے تھے۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس نے دونوں کپ شیشے کے ٹاپ والی سینئر ٹیبل پر رکھ دیے۔

”میرا خیال ہے تم بھی اس وقت کافی کی طلب محسوس کر رہے ہو گے۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی ”بیٹھ جاؤ۔“ اس طرح کب تک زمین کا بیڈ نہ گوتے رہو گے۔“

”میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ تمہارا گھاگھوٹ دوں۔“ میں اسے گھورتا ہوا اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”تم لوگوں کے سامنے بہت نیک اور پارسنا بیٹھو۔ بھکشوؤں کی مدد کرتی ہو۔ انہیں اپنے گھر میں ٹھہرا کر ان کی خاطر ہدایت کرتی ہو۔ لوگ تمہاری تعریف کرتے ہوں گے۔ کتنی مہربان اور ہمدرد ہو تم لیکن میں نے تمہاری اصلیت جان لی ہے۔ تم نہایت کھلیا اور رنج عورت ہو۔ تم ہمدردی کے جذبے کے تحت نہیں۔“ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بھکشوؤں کو گھر پر لے کر آئی ہو۔ اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے انہیں راستے سے بھونکاتی ہو۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔“

”شیطان میں نہیں۔“ کاراشان نے بے غیبتی سے مسکراتے ہوئے کہا ”شیطان تو ان لوگوں کے اندر چھپا ہوتا

نہیں عورت ہے۔ ہر حال میں تم لوگوں کو میلاں سے  
پھر تم نے بھی یہ اعتراف کر لیا کہ تم بھکشو نہیں ہو۔  
تھا کہ تم لوگوں نے کسی خاص مقصد کے لیے مجھ سے  
ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جیسی کہ  
جاموس ہونے کا شہ کیا جاتا ہے۔ تم لوگ تو یہی  
اس شے کی ذمیں آگئے تھے میں نے تم لوگوں  
اپنے مقاصد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ایک  
لوگوں کو خاموش ہو کر کالی کی جیساکں لیتی رہی پھر  
رکھتے ہوئے کہنے لگی "ملا مقصد تو یہی تھا میں تم  
صورت اور بد رو جوان سے اپنی ہوئی کی پاس کر  
جب میں نے تمہیں اپنی طرف سے آگئیں چاہیں  
دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ حالانکہ میں ایسی  
مجھے دیکھ کر عبادت گاہ کی طرف جانے والے تھے  
بھی ڈانواں ڈول ہو جائے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شہ  
سامنے کی وجہ سے مجھ سے کترارے ہو۔ میں اب  
سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری سامنے بھی تمہارے  
ترس گئی ہوگی۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں  
بھی وہی مسکراہٹ تھی جو مجھے اس وقت بڑی کڑوا  
تھی۔

اس کی بکواس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔  
جاگتی کی فکر تھی۔ مجھے اس نے کہیں غائب کر دیا تھا۔  
پر غل بٹا کر مجھ سے کوئی گٹھائے مقاصد حاصل  
تھی۔ اس نے کالی کی آخری ہجرت کے لیے کر خالی کیا  
دیا۔ میں نے ابھی اپنے کپ کو چھوٹا نہیں غلام  
"میں نے تمہیں اپنے شوہر کے بارے میں بتا دیا  
میزی طرف دیکھتے ہوئے ہوئی۔

"مجھے تم سے یا تمہارے شوہر سے کوئی دلچسپی  
ہے۔" میں نے اسے کھوڑتے ہوئے کہا "میں ڈانواں

بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟“

”میں نے کہا کہ تمہیں اس کے لیے پریشان نہ ہو۔“

ضرورت نہیں۔ وہ خیریت سے ہے۔" کا ارشاد ہوا۔  
 تیس اپنے شوہر میان چانگ کے بارے میں بتا رہی تھی۔  
 نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ایک سال پہلے میان چانگ  
 جو وصیت تیار کی تھی اس کے مطابق اس کی ساری  
 اور جائیداد کی واحد وارث میں ہوں لیکن اب مجھے  
 کہ اس نے اپنے وکیل سے نئی وصیت تیار کر کے  
 جس میں مجھے ہر چیز سے محروم کر دیا جائے گا اور اس  
 بیوی کو واحد قانونی وارث قرار دیا جائے گا۔"

نظریں جمائے ہوئے کہا۔  
 ”تم بیان چاک کو موت کے گھاٹ اتار  
 کارا نشان نے اس طرح پر سکون لےجے میں کما جیسے  
 گھاس اٹھانے کو کہہ رہی ہو۔“  
 میں اچھل پڑا۔ میرے بدترین خدشات دور  
 ہو رہے تھے میں نے شرٹ کے نیچے سے خنجر نکال  
 بڑی بھرتی سے اٹھ کر خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ  
 ”میں کسی بے گناہ کو موت کے گھاٹ نہیں  
 لیکن اگر تم نے جاگنی کا پتا نہیں بتایا تو یہ خنجر تمہارا  
 اتار دوں گا۔ پتاؤ جاگنی کہاں ہے؟“  
 ”میں نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی۔“  
 کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے آپ کو خنجر  
 پار کبھی اس کے چہرے پر خوف کے منہوں سے آواز  
 نہیں اُبھرے تھے ”تم میرے سینے میں خنجر اتار  
 پورا کر سکتے ہو لیکن اس طرح نقصان تمہارا ہی ہو  
 بھی نہیں ملے گی۔ البتہ میری بات بان لو تو تم فائدہ  
 رہو گے میرے خیال میں تین قتل کرنے کے بعد  
 کرنے میں تمہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے  
 ”تین قتل!“ میرا دل اچھل کر حلق میں  
 مطلب؟ کیا کتنا جانتی ہو تم؟“  
 ”کل دوپہر پولیس آفسر سے باتوں کے دوران  
 کہ یہاں سے ساتھ ستر میل دور ایک چھوٹے سے  
 قریب جنگل میں واقع ایک بست پرانی عبادت گاہ  
 آدمیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ پولیس کو وہ بدھشتور  
 شہر ہے۔“ کارا نشان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی  
 کہنے لگی ”مجھے تجسس ہوا اور میں صورت حال معلوم  
 کے لئے خود اس قصبے تک گیا، اور پھر معلوم

”اس بستی میں اس چھوٹی سی بستی میں بھی پہنچ کر ایسے بکشوؤں نے چند روز قیام کیا تھا جن میں ایک بھی تھی۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”اس بستی میں ہماری ملاقات ہو گیا اور یہ بھی ہوئی تھی جن کے گھر میں تم دونوں نے قیام کیا بات جاری رکھتے ہوئے کمرہ ہی تھی۔“ تم دونوں شوئی کے ہاتھوں ہو کیدو کو رسوا ہونے سے بھی بچا دیا۔ بستی کے سب لوگ تم دونوں کے شکر گزار تھے۔“

”اور جب تم لوگوں کو ایک خیر خواہی پر وہاں

”میں نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی۔“ کاراشان کے سکون میں کوئی فرق محسوس آیا۔ اپنے آپ کو خنجر کی زد میں پا کر بھی اس کے چہرے پر خوف کے معمولی سے تاثرات بھی نہیں ابھرے تھے ”تم میرے سینے میں خنجر اتارنے کا شوق پورا کر سکتے ہو لیکن اس طرح نقصان تمہارا ہی ہو گا اور جاگتی بچی نہیں ملے گی۔ البتہ میری بات مان لو تو تم فائدے ہی میں رہو گے۔ میرے خیال میں تین قتل کرنے کے بعد جو تھاقتل کرنے میں تمہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے۔“ ”تین قتل؟! میرا دل اچھل کر حلق میں اٹکیا، ”کیا مطلب؟ کس کا کتنا جاتی ہو تم؟“

”اس بستی میں ہماری ملاقات ہو گیا تم اور ہو کیو سے بھی ہوئی تھی جن کے گھر میں تم دونوں نے قیام کیا تھا۔“ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی ”تم دونوں نے منگ شوئی کے ہاتھوں ہو کیو کو رسوا ہونے سے بھی بچایا تھا۔ سب بستی کے سب لوگ تم دونوں کے شکر گزار تھے۔“

”اور جب تم لوگوں کو ایک خچر گاڑی پر وہاں سے روانہ کیا گیا تو راستے میں منگ شوئی اور اس کے دو ساتھیوں نے تم

لوگوں کو گھیر لیا اور بوڑھے کو سر میں پھینک کر تم دونوں کو جنگل میں داخل ایک پرانی عبادت گاہ میں لے گئے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟" وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی "جس بوڑھے کو جوان کو سر میں پھینکا گیا تھا وہ بچ گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سر سے نکل آیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد تم لوگوں نے اسے سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ تم لوگ اسے ہوش میں لائے اور اسے پھر گاڑی پر بستی واپس بیچ دیا۔"

کاراشان یہ ساری تفصیل اس طرح بتا رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ مجھے اپنے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رہی تھیں ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری شرٹ پیسے سے تر ہوئے تھی۔ وہ میرے چہرے پر نظریں جمائے بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کل صبح جنگل کی اس عبادت گاہ سے تین آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں جن میں ایک لاش منگ شونی کی ہے اور دوسرا اس کے ساتھیوں کی۔ پولیس کو ان دو ہیکلشوں کی تلاش ہے جو اس روز قصبے کے اسٹاپ سے ڈانگ کو آنے والی بس میں سوار ہوئے تھے۔ پولیس ابھی اس چھوٹی سی بستی تک نہیں پہنچی۔ یہ کمائی صرف میں جانتی ہوں کہ وہ دونوں ہیکلش کون تھے۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تم کوئی سارا راستہ اختیار کرتے ہو۔ میری بات مان لینے کی صورت میں تم فائدے میں رہو گے۔ میرا کام ہو جانے کے بعد تم لوگ جہاں چاہو گے، بحفاظت پہنچا دیے جاؤ گے لیکن اگر تم کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر کے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے تو اس شر سے بھی باہر نہیں جاسکو گے۔"

میرا جسم پیسے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میرا خنجر والا ہاتھ نیچے جھک گیا۔ کاراشان اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی "ہو سکتا ہے اس سے پہلے بھی کچھ لوگ تمہارے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ کسی کو قتل کرنا تمہارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایک اور آدمی کو تمہارے لگا دینے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمام تحفظات فراہم کرنے کے علاوہ تمہیں منہ مانگا معاوضہ بھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ میری زبان بھی جیسے لنگ ہو گئی تھی۔ ہونٹ سل گئے تھے منہ سے کوئی

آواز نہیں نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا اور کراٹھ کاٹنے کی طرح تالو میں چبھ رہی تھی۔

کاراشان نے کچھ اور میری طرف جھکتے ہوئے ہوش میں آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنی گال پر رکھ دیے اور کمر سے پگڑا اچھال دیا۔ وہ ہوا میں اڑتی ہوئی فٹ دور سامنے والے صوفے پر گر گئی اور صوفے دوسری طرف الٹ گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دارا اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کولہا اور ہاتھ سے کندھا سلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سی بھر گئی تھی۔ اسے یقیناً اس بات پر حیرت ہوئی کہ بیٹھے بیٹھے اسے اتنی دور کس طرح اچھال دیا تھا۔

وہ چند لمحوں اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر میرے قہر اس نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے اور صوفے میں گاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے تمہاری طاقت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ تم نے بڑی آسانی سے کسی سانڈ کی گردن بھی موڑ سکی۔" اس وقت تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہارا موڑ دوں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ جھٹکے جواب دیا "اگر جاگتی کو کوئی نقصان پہنچا تو میں خبر نہیں چھوڑوں گا۔"

"جاگتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" اس کے ایک بار پھر مسکراہٹ آگئی "میں سمجھتی ہوں کہ اگرچہ کچھ آپ سیٹ ہو رہے ہو۔ کوئی بات ڈھنگ سے نہ ہو سکو گے اب تم آرام کرو۔ ہم صبح بات کریں گے۔" لہجوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم نے کافی نہیں پہنچا۔" ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اگر کو تو میں آج ہی تازہ کافی بنا دوں۔"

میں اس وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کر رہی تھی۔ زبان کو حرکت دینے کے بجائے میں نے اثبات میں ہر وہ سینئر ٹیکل پر پڑے ہوئے کپ اٹھا کر کچن کی طرف لے جانے والے تھے اس وقت جس قسم کی صورت حال تھا، فینڈ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہزار آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کاراشان ہمیں اپنے آگے لے گئی تھیں تو میں اسے بہت بھرپور اور نیک دل خانہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی حرافہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کی عیاری اور کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے

تم از کم سو میل دور اس چھوٹی سی بستی تک پہنچ کر ہمارے محلہ میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ میرے گرد و بارے میں بھی پتہ چل رہا تھا جس سے ٹھکانا نامکن نہیں تو ایک ایسا جال بھی بن رہا تھا جس سے قتل کر کے بڑی مشکل ضرور تھی۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اسے قتل کر کے بڑی آسانی سے یہاں سے فرار ہو سکتا تھا لیکن مجھے جاگتی کی فکر تھی جسے اس نے کہیں غائب کر دیا تھا۔

وہ پندرہ بیس منٹ بعد کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے کپ میرے سامنے بیڑ رکھ دیا۔ وہ خود بھی شاید بیٹھنا چاہتی تھی لیکن میں خالی چاہتا تھا اور فی الحال اس کی بکواس میں سننا چاہتا تھا۔

"مجھے تمہا چھوڑ دو۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ چند لمحوں میری طرف دیکھتی رہی پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں کپ اٹھا کر بلی بلی چسکیاں لینے لگا۔ چند گھنٹے بھر کے بعد میرے دماغ کی سنسناہٹ بتدریج کم ہوئی چلی گئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ کاراشان نے بڑی چالاکی سے میرے گرد و جال بنا تھا۔ میری جلد بازی یا جذباتیت صورت حال کو مزید بگاڑ سکتی تھی۔ اس معاملے پر ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی ضرورت تھی۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔ جاسوسی کا الزام نہ سہی لیکن منگ شونی اور اس کے دو ساتھیوں کے قتل آسانی سے ثابت کیے جاسکتے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کسی اجنبی ملک میں اگر کسی کو چوری کے معمولی سے جرم میں بھی پکڑ لیا جائے تو جان بچرانا مشکل ہو جاتا ہے۔

عجیب صورت حال تھی۔ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ میری زندگی گھڑوں میں بسر ہو رہی تھی۔ میں نے دارا، ٹانگیر، پیر، اور جرنل کھورات تک کو ناکوں پہنے چوا دیے تھے۔ وہ میرا ایک نہیں بگاڑ سکے تھے لیکن اس حسین ناگن نے مجھے اس طرح بیٹھا تھا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ میں چونکا تو اس وقت جب وہ تین تھیں۔ دروازے اندر داخل ہوئی۔ اس وقت صبح کے سات بجتے والے تھے۔ ہوتیں بڑی عجیب سی نظر آ رہی تھیں۔ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے میں آیا اور بہتر ڈھیر ہو گیا۔ خنجر میں نے دوبارہ میزبل سے نیچے پھینکا تھا۔ فی الحال اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میری آنکھوں میں شدید جلن تھی۔ دماغ میں ایک بار

پھر سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جاگتی کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔

میں شاید سو گیا تھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ دماغ میں اب بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ کپنیاں سگ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے کچھ سکون ملا۔

جب میں ہال کمرے میں آیا تو کاراشان پہلے سے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر وہی رات والا شب خوبانی کا لباس تھا۔ سفید شیٹوں جیسے باریک کپڑے سے اس کا جسم جھلک رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور اٹھ کر سائڈ ٹیبل کے قریب جا کر بیٹھ گئی جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسپور اٹھا کر نمبر ملایا۔ کچھ دیر چینی زبان میں بات کرتی رہی پھر فون اٹھا کر میرے قریب آگئی۔

"صوبہ جاگتی سے بات کرلو۔ تاکہ تمہیں قتل ہو جانے کے وہ خیریت سے ہے۔" اس نے کہتے ہوئے ریسپور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس سے ریسپور لے کر کان سے لگالیا۔ اس کے ساتھ ہی جاگتی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو جڈان۔ تم کہاں ہو۔ یہ سب کیا ہے؟"

"تم کیسی ہو جاگتی۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بیدار ہوئی ہوں۔ رات کو شاید کافی میں بے ہوش کی دو ملائی گئی تھی۔ کیا کاراشان؟"

"ہاں جاگتی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "جسے ہم بہت معصوم اور بھولی بھالی سمجھتے تھے۔ وہ بڑی خطرناک عورت نکلی۔" اس نے یہ سب کچھ بڑی پلاننگ کے تحت کیا ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ منگ شونی اور اس کے دو ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس نے ہمیں بے ہوش کر کے کہیں اور پہنچا دیا اور مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا چاہتی ہے وہ۔ ہمارے پاس کیا ہے جس کے لیے یہ تمہیں بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔" جاگتی نے کہا۔

"شہ ہے کہ اس کا شہر ایک نئی دیمیت لکھنے والا ہے جس میں اسے ہر چیز سے محروم کر دیا جائے گا۔ کاراشان اس نئی دیمیت پر دستخط ہونے سے پہلے اپنے شوہر کو میرے ہاتھوں قتل کروانا چاہتی ہے تاکہ پرانی دیمیت کے مطابق



کاراشان ہی اس کی واحد قانونی وارث قرار پائے۔  
”اوہ!“ جاگتی کی آواز سنائی دی ”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”اگر تمہیں برغمال نہ بنایا جاتا تو میرا فیصلہ کچھ اور ہوتا لیکن اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ انکار کی صورت میں اس نے ہم دونوں کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی ہے اور تم جانتی ہو ہمارے خلاف منگ شوٹی اور اس کے ساتھیوں کا قتل ثابت کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“

”اوہ!“ جاگتی صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔  
”تم کہاں ہو۔ میرا مطلب ہے کسی نہ خانے میں یا۔۔۔“  
”نہیں۔ یہ پاڑیوں میں کوئی مکان ہے۔“ جاگتی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”سربراہاڑیاں ہیں۔ مکان کے پچھلی طرف ایک جھڑا بھی بس رہا ہے۔ کھڑی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔“

”تمہاری حفاظت کے لیے کتنے آدمی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”آدمی نہیں دو عورتیں ہیں لیکن آدمیوں سے زیادہ خطرناک۔ دونوں مسلح ہیں اور بڑی خراش ہیں۔“ جاگتی نے جواب دیا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر قریب کھڑی ہوئی کاراشان نے ریسیور میرے ہاتھ سے لے کر فون بند کر دیا۔  
”اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا تاکہ جاگتی محفوظ ہے اور اس کی عزت کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”آؤ۔ باقی باتیں ہم ناشتے کے دوران میں کر لیں گے۔“

ہم ڈائننگ روم میں آگئے گول میز پر ناشتا لگا ہوا تھا۔ جاگتی سے بات ہو جانے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے ناشتے کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا۔  
”تو کیا تم میرا کام کرنے کو تیار ہو؟“ کاراشان نے میری طرف دیکھا۔

”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ کام ہو جانے کے بعد تم ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرو گی؟“ میں نے کہا۔

”تمہیں میری زبان پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔“ کاراشان نے کہا ”میں اگر چاہتی تو یہ کام کسی اور شخص سے بھی لے سکتی تھی۔ میں اس کے قاتل حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ میں جس شخص سے بھی یہ کام لوں گی وہ بعد میں مجھے بلیک میل کرنے لگے گا۔ جبکہ تم سے مجھے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی

پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش اب سب سے اہم مقام لینا اور شوہر کی ساری دولت اور جائیداد پر قبضہ کرنا ہے۔ اس کے بعد تو میرا اور کوئی کام نہیں رہ جائے گا۔ میں تم دونوں کو بڑے احترام سے رخصت کر دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے اور تمہیں میرے وعدے پر یقین کرنا ہوگا۔“

”تم نے بتایا تھا کہ تمہارا شوہر ان کنگ میں ہے۔ کہ تمہارے خیال میں، میں کسی رکاوٹ کے بغیر آسانی سے وہاں تک پہنچ سکوں گا؟“ میں نے کہا۔

”سیان چانگ کو قتل کرنے کے لیے تمہیں فنانسنگ جاننے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم چاہو تو یہ کام آج ہی رات کر سکتے ہو۔“

”کیا وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے اس ٹرم میں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ کاراشان نے نفی میں سر ہلایا۔  
”دیر کے دوسری طرف تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر چائے کے باغات ہیں۔ سیان چانگ آج کل وہیں آیا ہوا ہے۔ وہ تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہے گا۔ وہ ایسی جگہ ہے کہ آسانی سے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو لیکن مجھے کیے پتا چلے گا کہ سیان چانگ کو واقعی قتل کیا جا چکا ہے۔“

”تم میرے ساتھ چلو۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مارتے ہوئے دیکھ لینا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ اگر میں آس پاس کہیں دیکھ لی گئی تو مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حاشی تمہارے ساتھ چلا جائے۔“

”حاشی کون؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری گارڈ۔“ کاراشان نے جواب دیا ”ٹھیک ہے حاشی ہی تمہارے ساتھ جائے گی۔ تم لوگ شام کا اندھا پھیلنے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ اگر کام جلدی ہو گیا تو آدھی رات سے پہلے واپس بھی آ سکتے ہو۔“

”کیا تمہارا شوہر انگریزی زبان سمجھتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں۔ کیا اس سے گپ شپ کا ارادہ ہے۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”میں اسے دور سے گولی نہیں ماروں گا۔“ میں نے جواب دیا ”میں اس سے کسی بھی بے ایمانے براہ راست ملاقات کروں گا اور بلا جھجھکا کر اس کی جگہ پر لے آؤں گا جہاں ماٹ

پلے ہی سے چھپی ہوئی ہوگی۔ میں حاشی کے سامنے اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا تاکہ تمہارے بھی دل میں کوئی شبہ نہ رہے۔“

ناشتے کے بعد کاراشان نے حاشی کو بلایا اور میں اپنے کمرے میں آیا۔ میں نے کاراشان سے سیان چانگ کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں تاکہ اسے شناخت کرنے میں پریشانی نہ ہو۔

اور پھر اس شام اندھیرا پھیلنے ہی میں حاشی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ہم میں ملے ہوا تھا کہ میرے جانے کے بعد کاراشان، جاگتی کو بچنے پر لے آئے گی اور میں اپنے مشن سے چھپے ہی واپس لوٹوں گا جاگتی کو لے کر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

یہ ایک بندوبست تھی۔ حاشی نے اسٹریٹنگ سنبھال رکھا تھا اور میں پچھلی بیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ روائی سے تھوڑی دیر پہلے حاشی کو میں نے پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ اس کی عمر اگرچہ چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن کاراشان سے زیادہ زور دار جسم کی عورت تھی۔ اس وقت اس نے نیلی جینز اور اسی رنگ کی اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ صحت مند عورت تھی اور جسمانی طور پر اس میں کاراشان کے مقابلے میں سیکس ایجیل زیادہ تھی۔

سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ دریا کا ٹیل پار کرتے ہی دین کی رفتار تیز ہو گئی۔

وہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف ٹیلا نما چھوٹی چھوٹی بھاڑیاں تھیں جن پر سبز تو نظر آ رہا تھا لیکن میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس قسم کے پودے یا درخت تھے۔ یہ تو حاشی نے بتایا تھا کہ یہ چائے کے باغات تھے جو ان ٹیلا نما پھاڑیوں میں لمبوں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

ایک گھنٹے تک اس سڑک پر چیلے رہنے کے بعد حاشی نے دین کی رفتار کم کر لی اور پھر اسے بائیں طرف ایک پتھر لے راستے پر موڑ دیا۔ اس طرف ٹیلے زیادہ بلند نہیں تھے ایک دادی جی جو ڈور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دن کا وقت ہوتا تو میرے لیے یہ نظارہ قابل دید ہوتا لیکن رات کے اندھیرے میں پودوں کے بیجوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”یہاں سے سیان چانگ کے چائے کے باغات شروع ہو جاتے ہیں۔“ حاشی نے دائیں بائیں اشارہ کرتے ہوئے بتایا ”یہ باغات لمبوں دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان باغات کا دورہ کرنے کے لیے گاڑی میں ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا ہے۔“

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے دین ایک اور راستے پر موڑ لی۔ دونوں طرف چار پانچ فٹ اونچے کچے کے پودے تھے۔ دین تقریباً دس منٹ تک ان پودوں کے درمیان چلتی رہی اور بالآخر ایک جگہ رگ گئی۔ حاشی نے انجن بند کر دیا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی دین سے اتر آیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ تک ہم دونوں پودوں میں چلے ہوئے ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ دوسری طرف شیب میں تقریباً دو سو گز دور کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

”وہ روشنیاں دیکھ رہے ہو۔“ حاشی اشارہ کرتے ہوئے بولی ”وہاں سپر مارنر کا مرکزی دفتر چائے کی پتیاں بریو کرنے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری اور سیان چانگ کا رہائشی کالج ہے۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلے کے دوسری طرف مزدوروں کے پانچ چھ ہس ہیں جو یہاں سے نظر نہیں آ رہے۔ دائیں طرف سب سے الگ تھلک روشنی سیان چانگ کے کالج کی ہے۔

کچھ کمڑکیوں میں بھی روشنی نظر آ رہی ہے۔ سیان چانگ اس وقت اپنے کالج ہی میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے سپر مارنر کے علاوہ کچھ مزدور بھی اس کے ساتھ موجود ہوں۔ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ معمولی سی غلطی تمہاری موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ دائیں طرف کی اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے تم کالج کے عقب میں پہنچ جاؤ گے۔“

حاشی یہ سب کچھ اس طرح بتا رہی تھی جیسے یہاں کا چپا چپا اس کا دیکھا ہوا اور میرے خیال میں اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ کاراشان کے ساتھ یہاں آتی رہتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”تم یہیں روکی۔ میں سیان چانگ کو لے کر یہیں آؤں گا اور تمہارے سامنے اس کی زندگی کا چرخی گل کروں گا تاکہ تم اپنی مالک کو یقین دلا سکو کہ اس کا راستہ صاف ہو چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں یہاں انتظار کروں گی لیکن تم اسے یہاں تک گھسے لاؤ گے؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ میں نے جواب دیا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ میں چائے کے پودوں کے درمیان تنگ سی راہداریوں میں چلتا ہوا شیب میں اترنے لگا۔ اس کالج تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا قریب پہنچ گیا اور ایک کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا۔ وہ کمر خالی تھا۔ میں دوسری کھڑکی کے سامنے آیا اور اندر جھانکتے ہی میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

اس کمرے میں ایک آدمی اور دو عورتیں تھیں۔ وہ

دونوں جوان عورتیں نیم عریاں لباس میں تھیں اور اس آدمی کو بچانے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سیان چانگ تھا۔ درمیانے قد کا بھدے جسم کا مالک۔ چہرہ بلند آگ سے ملتا جلتا تھا۔ جڑوں کے نیچے گوشت لٹکا ہوا تھا۔ شکل و صورت بھی بس یونانی سی تھی۔ اگر اس کا تعلق عام طبقے سے ہوتا تو کوئی عورت اس کے قریب پھٹنا بھی پسند نہ کرتی لیکن وہ دولت مند آدمی تھا۔ دولت کی طرح اسے حسین عورتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

میں چند لمحے ٹھکی کے قریب کھڑا رہا پھر اوپر سے گھوم کر سامنے کے رخ پر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن تیرا قدم اٹھاتے ہی اپنی پشت پر ایک خوفناک قسم کی غرابٹ سن کر میں اچھل پڑا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو رنہ چھٹی کر دوں گا۔“ یہ الفاظ چینی زبان میں کہے گئے تھے اس غراتے ہوئے لہجے میں یہ الفاظ دنیا کی کسی بھی زبان میں کہے گئے ہوتے تو ان کا مفہوم سمجھ میں آسکتا تھا کیونکہ اس غرابٹ کے ساتھ ہی کسی رات نکل کر نال بھی میری پشت سے لٹک گئی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ پستول میرے ہاتھ میں ہی تھا اور پھر پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے میرے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ یہ اس نے بہت بڑی حماقت کی تھی۔ اگر وہ پستول پھینک دیتے تو کتنا تو دوسری بات تھی۔ پستول پر قبضہ کر کے اس نے اپنی گردن پھنسا لی تھی۔

پستول اس نے نال کی طرف سے پکڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے رات نکل میری پشت سے لگا رکھی تھی اور ظاہر ہے انگلی ڈنگر پر نہیں ہوگی۔ اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوری طور پر پستول یا رات نکل کا ڈنگر دبا سکتا اور میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

میں بڑی تیزی سے نیچے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی پیر کی ایڑی سے اس کی پٹنڈی پر ٹھوکر سید کر دی۔ وہ شخص اس جوانی کا رروائی کے لیے تیار نہیں تھا۔ پٹنڈی کی ہڈی پر ٹھوکر لگنے سے وہ بلبلاتا اٹھا۔ میں نے سمجھلے ہی اس کے گھٹنے کے پیچھے ہلکا سا چوہ مار دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چیخا ہوا نیچے گرا۔

میرا پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور رات نکل پر قبضہ کرنے میں میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے جھک کر پستول اٹھایا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس شخص کو میں نے رات نکل کی زبردستی لے رکھا تھا جو اب بھی زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس شخص کے چپٹے کی آواز سن کر وہ آدمی اور دوڑنے

ہوئے اس طرف پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں خالی ہاتھ تھے۔ اس ساجھی کی چیخ سن کر وہ کچھ بھی سمجھے ہوں لیکن اس صورت حال کی توقع ہرگز نہیں رہی ہوگی۔

”چلو۔ تم بھی اٹھ کر ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔“ نے نیچے کرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔ اس شخص نے اٹھتے ہوئے کہا ”بستر ہے رات نکل پیچھے دو! اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔“

”تو اس مت کو اور مجھے اپنے پاس کے کمرے میں۔“ چلو۔ میں نے تھکانے لہجے میں کہا اور پھر خود ہی ان تینوں ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

سیان چانگ کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے رات نکل سے اشارہ کیا۔ وہ تینوں دروازہ کھولتے ہوئے کمرے میں آئے۔ میں نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا اور ان تینوں کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

اس طرح دھڑے دروازہ کھلنے پر اندر موجود دونوں عورتیں بیچ انھیں اور پھر میرے ہاتھ میں رات نکل دیکھ کر ان کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے اور ایک دوسری سے پلٹ کر خوف زدہ ہی نظروں سے اُدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ سیان چانگ بھی ایک جھپٹے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شراب کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی خوف ابھر آیا تھا۔

”یہ۔ یہ سب کیا ہے کون ہو تم۔؟“ وہ اپنی کیفیت قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنے ان تینوں آدمیوں کی طرف تنہا میں نے کمرے کے ایک گوشے میں کھڑا کر دیا تھا۔

”میں تمہارے لیے اجنبی ضرور ہوں مسٹر سیان چانگ لیکن دشمن نہیں۔ تمہارا دوست ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وقت میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ ہاں۔ تمہارے فائدے کی ہے۔ کیا ہم تنہائی میں گفتگو کر سکتے ہیں؟“

”دوست اس طرح اسلمہ لے کر نہیں آتے۔“ سیان چانگ نے کہا۔ میں نے انگریزی میں بات کی تھی اور اس جواب بھی انگریزی ہی میں دیا تھا۔

میں نے رات نکل اس کے سامنے میز پر رکھ دی اور ”قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔“

”اگر تم ان لوگوں کو باہر بھیج دو تو ہم اطمینان سے باہر کر سکتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سیان چانگ کی آنکھوں میں الجھن سی تھری گئی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھا رہا پھر اپنے آدمیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ جس شخص سے میں نے رات نکل چھینی تھی اس نے تیز دھا۔ جس شخص سے میں نے سیان چانگ کا لہجہ ایسا تھا جیسے لہجے میں کچھ نہ ہو۔ وہ تینوں باہر جانے لگے تو میں نے رات نکل اسے اٹھاتا ہوا دیکھا۔ اس شخص نے رات نکل اٹھائی اور ان کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے رات نکل اٹھائی اور ان تینوں کے ساتھ دونوں عورتیں بھی باہر نکل گئیں۔ وہ اب بھی سہمی ہوئی تھیں۔

میں بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیان چانگ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ اس نے گھورتی ہوئی گاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر جیسے لہجے میں اسے اپنی آمد کا قصد تانے لگا۔

”میا غنات ہے کہ تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کرو گے۔“ وہ میرے خاموش ہونے پر بولا۔

”اگر میں نے تمہیں قتل کرنا ہوتا تو یہ کام یہاں بھی بڑے اطمینان سے کر سکتا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں تمہارے آدمیوں کو کس طرح بے بس کر چکا تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میری دوست کی زندگی خطرے میں ہے کاراشان کو یقین دلانے کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں حاشی کے سامنے قتل کیا جائے۔“

سیان چانگ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

ہم دونوں باہر آگئے۔ برآمدے کے سامنے اب پانچ چھ آدمی نظر آ رہے تھے ان میں سپروائزر بھی تھا۔ وہ دونوں عورتیں برآمدے میں ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ سیان چانگ نے سپروائزر سے کچھ کہا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔

”اگر تم لوگ مائنڈ نہ کرو تو میں ایک فائر کر دوں۔“ میں نے جب سے پستول نکالتے ہوئے کہا اور ہاتھ اونچا کر کے ایک ہوائی فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سیان چانگ کے گن میں کو اشارہ کر دیا۔ اس نے بھی رات نکل سے ایک ہوائی برست مار دیا تھا۔

میں اور سیان چانگ کانچ کے پچھلی طرف نکل کر چائے کے پوڈوں میں پکڑ پکڑی پر چلے گئے۔ ہم دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔

مقررہ جگہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ حاشی کس جگہ پھنسی ہوگی۔ یہ اندازہ لگاتے ہی میں نے پہنچتے ہوئے سیان چانگ کو روک لیا۔

”تمہاری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں سیان چانگ۔“ میں چیخا ”اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکتی۔“

جواب میں سیان چانگ بھی چیخا تھا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے قسم کھتا ہوئے۔ ہم دونوں کے منہ سے غرا نہیں نکل رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ حاشی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوگی اور پھر سیان چانگ کے حلق سے نکلنے والی وہ چیخ بہت بھیاںک تھی۔ میں اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

پوڈوں کی سرسراہٹ سن کر میں ایک دم پیچھے مڑا۔ حاشی کیسے چوپائے کی طرح رینگتے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”ختم ہو گیا۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا ”میں نے اس کی گردن موڑ دی ہے۔ تم بھی سہی کر لو۔“

حاشی آگے آگئی اور جھک کر سیان چانگ کو دیکھنے لگی۔ تقریباً ایک منٹ تک اس کا سناہٹ کرتی رہی۔ گردن کو بھی ہلا جلا کر دیکھا اور پھر ایک جھپٹے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ میری طرف گھومی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ پستول کا رخ میری طرف تھا۔

”تمہارا کام ختم ہو گیا مسٹر ادا رہیں بھی ختم ہو جانا ہے۔“ اس کے منہ سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی۔

حاشی کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ اس قسم کی کسی بھی صورت حال کے لیے میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ آج صبح جب کاراشان نے کہا تھا کہ وہ کسی مقامی غنڈے سے بھی اپنے شوہر کو قتل کروا سکتی ہے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ وہ بعد میں اسے بلیک میل کرنا رہے گا اس لیے وہ یہ کام مجھ سے لینا چاہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ میں منگ شوٹی اور اس کے دو ساتھیوں کے قتل میں ملوث تھا اور پولیس کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے یہاں سے چلے جانا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ کاراشان کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوگی۔ میں کسی بھی وقت اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ وہ مجھے کیسے زندہ چھوڑ سکتی تھی۔

”یہ۔ یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ میں ہلکا کر رہ گیا۔ ”مجھے مادام کا یہی حکم تھا کہ سیان چانگ کے قتل کے

بعد تمہیں بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ تمہیں زندہ رکھ کر اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" حاشی نے کہا "تمہاری زندگی اتنی ہی تھی۔ اب تم بھی مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے پستول والا ہاتھ دوسرا اوپر اٹھایا۔ اس کی انگلی یقیناً ٹریگر پر ہوگی لیکن اس سے پہلے کہ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالتی میں حرکت میں آگیا بلکہ یوں کہتا چاہیے کہ میں نے مکمل طور پر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی بلکہ میری اپ جاکے ایک اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا پودوں میں کہیں جاگرا۔

اب چاکی فرٹ کھ چایا بالنگ میں کھ لگائے کا ایک انداز ہے۔ کھڑے کھڑے ایک ٹانگ کو سامنے کی طرف نیچے سے اوپر اس طرح حرکت دی جاتی ہے کہ پیر کی نو حریف یا اوہ بیکٹ کو نشانہ بناتی ہے۔ میرے پیر کی نو حاشی کے ہاتھ کے پچھلے حصے پر لگی تھی۔ جس سے اس کا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھتا چلا گیا تھا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

حاشی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس کے اس حملے کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ میں لڑکھاتا ہوا پشت کے بل گر۔ حاشی میرے اوپر تھی۔ وہ مجھے پودوں میں رگیدتی ہوئی دور لے گئی۔

کاراشان نے مجھے بتایا تھا کہ حاشی ریڈ آرمی میں رہ چکی ہے۔ ہتھیاروں کے استعمال کے علاوہ وہ خالی ہاتھ لڑائی کے فن میں بھی ماہر ہوگی۔ اس نے جس طرح میرے اوپر چھلانگ لگائی تھی اور مجھے رگیدا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا۔ کہنے کو تو وہ عورت تھی مگر اس کے ہاتھ پیر مردوں کی طرح مضبوط اور طاقتور تھے۔

وہ میرے سینے پر سوار تھی اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ رکھا تھا۔ میرے زرخرے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی جیسی غراہیں نکل رہی تھیں۔

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پہلے میں اس کی گرفت چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی گرفت آہنی شکنے کی طرح مضبوط تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی کلاہیوں پر جماد لیے اور دونوں پیر اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ میری یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ وہ میرے اوپر سے

الٹی قلا بازی کھاتے ہوئے پیچھے گری۔ میں ایک ہاتھ سے سلاتے ہوئے اٹھنے لگا۔ وہ مجھ سے زیادہ پختہ تھی۔ وہ نہ صرف مجھ سے پہلے سنبھل گئی بلکہ اس کے پیر کی نو ٹھوکر نے میری پسیلیوں کو بھی سلاتا تھا۔ میں کراہتا ہوا دوبارہ اٹھنے کی کوشش میں ایک اور ٹھوکر میرے کندھے پر لگی لیکن میں نے اسے تیسری ٹھوکر مارنے کی کوشش نہیں کیا۔

حاشی کا وار روک کر میں نے اس کے پہلو پر زور۔ سائڈنگ لگا دی۔ وہ راجتی ہوئی دہری ہو گئی۔ میری دو ہاتھ اس کے سینے پر اس طرح لگی کہ وہ جتنی بولی اس کی پیچھے گری۔ اس مرتبہ میں نے اسے سینے کے ماموں سے پیچھے سے پستول نکال لیا اور جھک کر اس کی ٹال جا کر کھوپڑی سے لگا دی۔

"اب اگر تم نے کوئی حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔ کھڑی ہو جاؤ اٹھ کر۔" میں نے غرا کر اسے حکم دیا۔ حاشی راجتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ سلاتا رہی تھی۔ کھ شاید کچھ زیادہ ہی زوردار تھی۔ میں نہ تو اسے جان سے مارنا چاہتا تھا اور نہ ہی زبردستی نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس نے جس طرح ہمارے دکھانے کی کوشش کی تھی اسے تھوڑی بہت سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔

ہم دونوں لڑتے ہوئے اس جگہ سے کافی دور نکل آئے۔ تھے جہاں میں نے سیان چانگ کو ڈھیر کیا تھا۔

حاشی سینہ سلاتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اب مجھے ٹھنڈ ہونے لگی۔ میں اس کی پشت پر تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے پیچ ہی نیچے جھکا اس نے پوری قوت سے دونوں کہناں میرے پیٹ میں مار دیں۔ میرے منہ سے اوغ کی آواز نکلی۔ میں نے اور دہرا ہو گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس دوران میں ہاتھ نے بھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے موقع نہیں ڈالا۔ اس مرتبہ دو چار کرادی قسم کی ٹھوکریں رسید کر دیں۔ ان میں شبہ نہیں کہ وہ بہت جان دار قسم کی عورت تھی۔ ان حوصلہ بھی قابل تعریف تھا۔ وہ آسانی سے ہتھیار ڈالنے نہیں تھی لیکن میں نے اسے کھنکھنے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران میں تقریباً سو گز دور کسی جگہ فائر کی سنائی دی۔

"تمہارے باپ سیان چانگ کی تلاش میں اس طرف آرہے ہیں۔" میں نے زہن پر پڑی ہوئی حاشی کو ہلکی سی غراہیں مارنے ہوئے کہا "اگر وہ اس طرف آگئے تو ہم دونوں

مروں سے چھٹی کر دیں گے۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ایک لکھ شائع کے بغیر یہاں سے نکل چکیں۔" ایک لکھ حاشی کی سمجھ میں آئی۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھ گئی۔ بات حاشی نے میرے ساتھ کوئی پنگا لینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تیزی سے ایک طرف پلٹے گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دین کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ پہلے میں اندر داخل ہو کر پچھلی بیٹ پر بیٹھ گیا اور پھر حاشی نے اسٹیرنگ سنبھال کر انجین اسٹارٹ کر دیا اور پودوں میں یو ٹرن لیتے ہوئے دین کو واپس کے لیے موڑ دیا۔

چائے کے باغات سے نکل کر سڑک پر آتے ہی حاشی نے دین کی رفتار بڑھا دی۔ اس کے منہ سے وقفے وقفے سے کراہیں بھی خارج ہو رہی تھیں اور وہ بار بار سیٹ پر پہلو بدل رہی تھی۔ اسے کئی روز تک اپنے جسم کی سکانی کئی پڑے گی۔

میں چاکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کاراشان نے مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو مجھے شبہ تھا کہ وہ چاکی کو بھی بھنگے پر نہیں لائی ہوگی۔ اگر ایسا ہو تو میرے لیے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ چاکی کی بازیابی بہت ضروری تھی اس کے بغیر تو میں میاں سے نکلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم جب بھنگے کے گیٹ پر پہنچے تو اس بجے والے تھے۔ دین کے ہارن کے جواب میں گیٹ کاراشان نے کھولا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے حاشی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔

دین جیسے ہی گیٹ کے اندر داخل ہوئی میں پنجرہ سیٹ پر آگیا اور دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت کاراشان گیٹ بند کر رہی تھی۔ میں نے دوڑ کر ایک ہاتھ سے اسے گرفت میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی کچلی سے لگا دیا۔ کاراشان بڑی طرح بوکھلا گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

"مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو وعدہ خلافی کرتے ہیں۔" میں نے غرا تے ہوئے کہا "تم نے مجھے بھی مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن میں بچ کر آگیا ہوں۔ چاکی کہاں ہے؟"

"دوسرے وہیں ہے۔" کاراشان بھلائی "تجربہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔" "دوڑا حاشی کی طرف دیکھ لو جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے حاشی کی طرف اشارہ کیا جو چند گز

دور دین سے اتر رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سینہ سلاتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے اثرات نمایاں تھے۔

حاشی کی حالت دیکھ کر کاراشان اچھل پڑی۔ "میں نے وعدے کے مطابق اس کے سامنے تمہارے شوہر کی گردن مروڑ کر موت کے کھٹا اتار دیا تھا اور پھر حاشی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے اب یہ بے چاری کئی روز تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گی۔ چاکی کہاں ہے۔ جلدی بتاؤ ورنہ تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"دوسرے وہیں ہے۔ ابھی بلائی ہوں۔" کاراشان نے کہا اور چند گز دور کھڑی ہوئی وہ تین کو اشارہ کیا۔ وہ تین بھنگے کے اندر دوڑ گئی۔ چند منٹ بعد وہ چاکی کو لے کر واپس آگئی۔ چاکی کو دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چاکی دوڑ کر میرے قریب پہنچ گئی۔

"بھگوان کا شکر ہے تم زندہ ہو۔" چاکی نے کہا "اس کتیا کا منصوبہ بہت خطرناک تھا۔ یہ لوگ مجھے تقریباً ایک گھنٹا پہلے پہاڑی والے کانچ سے واپس لے آئے تھے اور اس نے کہا تھا کہ تمہیں وہیں ختم کر دیا جائے گا اور مجھے ہاتھ پر باندھ کر دریا میں پھینک دیا جائے گا۔ اسے حاشی کی واپسی کا انتظار تھا کہ صورت حال کے مطابق اگلا قدم اٹھایا جائے۔ اب یہاں ایک منٹ رکتا بھی حماقت ہوگی۔ بھگ چلو یہاں سے۔"

"تم دین اشارت کر کے اس طرف لے آؤ چاکی۔" میں نے کہا اور حاشی کی طرف دیکھنے لگا جو گھاس پر لیٹی ہوئی ہولے ہولے کر رہی تھی۔

چاکی دین کی طرف دوڑ گئی اور پھر ایک منٹ بعد ہی وہ دین اشارت کر کے گیٹ کے قریب لے آئی۔ میں نے کاراشان کو پنجرہ سیٹ پر وھیل دیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ہو تین وغیرہ سے کہہ دو کہ اگر انہوں نے فون پر پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو تم زندہ نہیں بچو گی۔" میں نے کاراشان کے پہلو میں پستول کی ٹال گاڑتے ہوئے کہا۔

کاراشان نے چیخ کر ہوتین وغیرہ کو ہدایت کر دی کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ میرے اشارے پر چاکی نے دین آگے بڑھا دی۔ سڑک پر تقریباً پچاس گز آگے سنسان جگہ پر میں نے دین کو راکھی اور کاراشان کو لے کر نیچے اتار لیا۔

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”میں خود اس عورت کے جنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ میں  
 نے اپنے منہ کے خون سے ہاتھ نہیں رننا چاہتا تھا۔ اگر میں  
 یہ نہ کرتا تو پھر بھی اس کی سازش کا شکار ہو جاتا۔  
 میں نے یہ شہکار تمہارے قتل کے بعد وہ ہمیں بھی  
 پہلے ہی قتل کر دیتا۔ میرا یہ شہ درست نکلا۔  
 کائنات کی ہر چیز جو موت کے گھاٹ اتار چکی  
 ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ موت کے گھاٹ اتار چکی  
 ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تم پر کوئی احسان  
 نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تم پر کوئی  
 احسان نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تم  
 پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ سیان چانگ نے کہا  
پھر سپردانز کو گلا کر ہدایات دینے لگا کہ دوسرے کانچ میں  
ری راکش کا بندہ دست کر دیا جائے اور ہمارے کھانے پینے  
میں انتظام کیا جائے۔

سپروائزروہاں سے تقریباً بیس گز دور ایک اور ہٹ میں آیا۔ اسی ہٹ میں ایک کرا تو سپروائزروہاں کے تصرف میں دوسرے میں ہمارے لیے شب بسری کا انتظام کر دیا گیا۔ کمرے میں چھوڑ کر سپروائزروہاں ہمارے لیے کھانے کا دست کرنے چلا گیا۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو دو بیاں اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ گاڑیوں کی آواز بلکہ دور ہوتی گئی۔

کھانے کے بعد جاگنی تو جلد ہی سو گئی لیکن مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ شدید تھکن ہونے کے باوجود نیند میری آنکھوں کو سونہرے رنگ پر نہ آئی۔

وہ رات کا آخری پہرہ تھا۔ کسی گاڑی کے رکنے کی آواز

ایہ گاڑی سیان چانگ کے کالج کے سامنے رکی تھی۔ سیان  
 اور عین اور آدمی گاڑی سے اترے۔ سیان چانگ تو  
 کچھ نہیں جلا گیا اور وہ تینوں آدمی اس ٹیلے کی طرف طے

میں دوبارہ کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد  
دیر تک مجھے نیند نہیں آ سکی تھی۔ میں سیان چانگ کے بارے  
میں سوچتا رہا کہ وہ کہاں گیا تھا۔

گاڑی کی آواز اب بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی اور پھر اچانک ہی ایک گاڑی سیان چانگ والے کانیج کے پچھلے طرف سے گھوم کر سامنے آگئی۔

گاڑی سیان چانگ کے کالج سے ذرا آگے آکر رکی۔ چار پولیس والے نیچے اترے۔ دو وہیں کھڑے رہے اور دو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

دونوں پولیس والے میرے سامنے دو قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے تیز بے میں کچھ کہا مگر ایک بھی لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ کچھ کہا مگر اس بار بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ سیان  
چانگ رات کو کئی گھنٹوں کے لیے یہاں سے غائب رہا تھا۔

کسیں ایسا تو نہیں کہ اس نے شرجا کاراشان سے ملاقات کی ہو اور کاراشان نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہو۔ کاراشان آخر اس کی بیوی بھی۔ ایسے رشتے آسانی سے تو نہیں ٹوٹتے البتہ سیان چانگ نے مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا پروگرام بنایا ہو۔ میں ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ میں اور جاگتی بھکشوؤں کا بھی بدل کر دو کاوے رہے تھے اور پھر بہترین آدمیوں کے کل کا الزام تھا۔ یہ لوگ ہماری باتوں پر یقین کیوں کرتے گئے؟

میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن الجھتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری بے چینی بھی بڑھتی رہی۔ اگر ہم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو بچنے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور یہاں سے فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا اگر ہماری طرف سے ایسی کوئی کوشش ہوتی تو یہ لوگ ہمیں گولیوں سے پھینکی کر دیں گے۔

ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ گاڑی کے قریب کھڑے ہوئے پولیس والوں میں سے ایک نکلے درجے کا آفیسر تھا۔ جس پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اسی تیز لہجے میں کچھ کہا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس کی گرفت میں تھا۔

آفیسر کی ہمنویں تن گئیں۔ وہ چند لمبے میری طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا پھر اس نے بھی اسی لب ولہجے میں کچھ کہا۔ میں صرف ایک لفظ سمجھ سکا۔ سیان چانگ۔

”کیا بات ہے؟ مجھے کیوں پکڑا ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟ کس کی تلاش ہے تمہیں۔“ میں نے مینڈر زبان میں رک رک کر کئی سوال کر ڈالے۔

آفیسر کی آنکھوں میں چمک سی ابھرائی۔ اس نے اپنے ماتحت سے کچھ کہا، اس نے جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ آفیسر میری طرف دیکھتے ہوئے مینڈر زبان میں بولا۔

”ہم مسٹر سیان چانگ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا یہ ماتحت تم سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا ”کیا معاملہ ہے۔ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ میں مزید اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

”رات کو مسٹر سیان چانگ کی شہر والی کوٹھی میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ کوٹھی کی آگ پر ابھی تک پوری طرح قابو نہیں پایا جاسکا لیکن اس کی مسز اور دو ملازم عورتوں کو نکال لیا گیا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ مسز

سیان چانگ کا آدھا جسم تو جل کر راکھ ہو چکا ہے۔“

مجھے گلیا منہ کو آتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ آندھیاں سی چلتے گئیں۔ ایک لمحے کو سوچنے کے مصلحتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔ میں نے سر کو دوڑا دیا اور ہونٹوں کی طرح آفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

”مسٹر سیان چانگ کو اس انفوس ٹانک واقعہ دینا ضروری ہے۔ وہ کہاں ہے؟“ آفیسر نے میری طرف ہوتے کہا۔

میں جیسے ہوش میں آگیا۔ انہیں وہیں رکے اور سیان چانگ کے کانچ کی طرف دوڑ گیا۔ اس کے دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ دھکے دروازہ کھلا۔ وہ اندر دونوں عورتوں میں سے ایک تھی۔ گزشتہ رات سیان چانگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے بکھرے ہوئے اور سرخ آنکھوں میں غینہ کا فغاں تھا۔

”سیان چانگ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے گھورتی ہوئی نظروں میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے دھکا دیتے ہوئے آگیا۔ کنگ ساڑنڈیل بیڈ پر دوسری عورت آڑھ لی تھی۔ سو رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سیان چانگ، والیں بھی آگیا۔ اس نے پولیس والوں سے کچھ کہا۔ وہ جلدی میں موجود نہیں تھا۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس نے باہر پولیس کو دیکھ لیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ بند کر دیا۔

”میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ وہ شاید پچھلے طرف آگیا تھا۔“ میں نے پولیس آفیسر سے کہا اور اس نے ہلکا سا ہلکا جس کے دوسری طرف مزدوروں کے بکس نے اوپر غر جوت کو سپردا زری کی ڈنڈے والیاں سوپ دیں اور کپلے پر پہنچا ہی تھا کہ دوسری طرف سے سپراؤز۔

”بوسکتا ہے مجھے آج کا سارا دن اور رات بھی شہری کیلیا بات ہے مسٹر۔ تم بہت گھبرائے ہوئے ہو رہنا پڑے۔ تم لوگ آرام سے یہاں رہو۔ پریشان ہونے و انزور نے کہا اور پھر پولیس کو دیکھ کر چونک گیا۔“

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”شہر میں مسٹر سیان چانگ کی کوٹھی میں آگ لگ گئی۔“

”مسٹر سیان چانگ جل کر مر گئے ہیں۔ یہ لوگ ساڑنڈیل بیڈ پر تھکے ہوئے تھے۔“

”اوہ!“ سپراؤز کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا۔ ”پاس چلو۔ میں ماسٹر کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ واپس مڑا۔ میں دوبارہ پولیس والوں کے پاس آگیا اور پوچھنے لگا کہ آگ کیسے لگی تھی۔

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ آفیسر نے کہا۔

آفیسر کا خیال ہے کہ آگ شارٹ سرکٹ سے لگی تھی جو اچانک ہی بھڑک اٹھی اور ان تینوں عورتوں کو باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ”وہ چند لمبے خاموش ہو پھر بولے۔“

”میں نے غریب کاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسٹر سیان چانگ کا دیواری لوگ ہیں۔ ان کے کچھ دوست ہیں تو دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ مسٹر سیان چانگ شہر میں موجود نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ آگ ان کے کسی دشمن نے لگائی ہو۔ بہر حال حقیقتات کے بعد ہی اصل بات سامنے آئے گی۔“

میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر سیان چانگ سپراؤز اور دو تین آدمیوں کو لٹنے کی طرف سے آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

سیان چانگ کو اپنے سامنے دیکھ کر تینوں پولیس والے اور آفیسر بھی متوجہ ہو گئے۔ آفیسر دھسے لہجے میں اسے کوٹھی میں لے والی آگ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت سیان چانگ کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔

سیان چانگ اپنے کہیں میں چلا گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس بھی آگیا۔ اس نے پولیس والوں سے کچھ کہا۔ وہ جلدی میں موجود نہیں تھا۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس نے باہر پولیس کو دیکھ لیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ بند کر دیا۔

”میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ وہ شاید پچھلے طرف آگیا تھا۔“ میں نے پولیس آفیسر سے کہا اور اس نے ہلکا سا ہلکا جس کے دوسری طرف مزدوروں کے بکس نے اوپر غر جوت کو سپردا زری کی ڈنڈے والیاں سوپ دیں اور کپلے پر پہنچا ہی تھا کہ دوسری طرف سے سپراؤز۔

”بوسکتا ہے مجھے آج کا سارا دن اور رات بھی شہری کیلیا بات ہے مسٹر۔ تم بہت گھبرائے ہوئے ہو رہنا پڑے۔ تم لوگ آرام سے یہاں رہو۔ پریشان ہونے و انزور نے کہا اور پھر پولیس کو دیکھ کر چونک گیا۔“

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”شہر میں مسٹر سیان چانگ کی کوٹھی میں آگ لگ گئی۔“

”مسٹر سیان چانگ جل کر مر گئے ہیں۔ یہ لوگ ساڑنڈیل بیڈ پر تھکے ہوئے تھے۔“

”اوہ!“ سپراؤز کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا۔ ”پاس چلو۔ میں ماسٹر کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ واپس مڑا۔ میں دوبارہ پولیس والوں کے پاس آگیا اور پوچھنے لگا کہ آگ کیسے لگی تھی۔

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ آفیسر نے کہا۔

جائے گا؟“ میں نے کوہانا کو روک کر کہا۔ ”میاں تو کچھ نہیں ملے گا۔ اس نیلے کے دوسری طرف بستی میں آجاؤ۔ میں بندوبست کر دیتی ہوں۔“ کوہانا کہتے ہوئے سیان چانگ والے کانچ کی طرف مڑ گئی اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

میں اپنے ہٹ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن اس میں ذرا سی بھری تھی اور مجھے یقین تھا کہ جاگتی دروازے کے دوسری طرف کھڑی اس بھری میں سے باہر کی صورت حال کا جائزہ لے رہی ہوگی۔ میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

جاگتی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ ”خفہ ٹل گیا ہے۔“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بات وہ نہیں تھی جو ہم سمجھتے تھے۔ معاملہ کچھ اور نکلا۔ پستول کو چھاپو۔ فی الحال ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”کیا معاملہ تھا؟“ مجھے مطمئن پا کر جاگتی کے چہرے پر بھی طمانیت سی آگئی۔ اس نے پستول اپنے لباس کے اندر چھپا لیا۔ ”پولیس یہاں کیوں آئی تھی اور میرا خیال ہے سیان چانگ ان کے ساتھ گیا ہے۔“

”سنو کی تو اچھل پڑو گی۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جاگتی میرے سامنے اسپرنگ والے بیڈ پر ٹانگیں ڈکا کر بیٹھ گئی۔ ”کل رات تک ہم جس کوٹھی میں تھے گزشتہ رات اس میں پر اسرار طور پر آگ لگ گئی۔ کاراشان اور اس کے ساتھ دو عورتیں بھی اسی آگ میں جل کر راکھ ہو گئیں۔“

”کیا؟“ جاگتی واقعی الجھل پڑی۔ ”یہ درست ہے۔“ میں نے کہا ”پولیس والے سیان چانگ کو اطلاع دینے اور اسے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آئے تھے۔“

”آگ کیسے لگی؟“ جاگتی نے پوچھا۔ ”پولیس آفیسر کے کہنے کے مطابق آگ لگنے کی وجہ بجلی کا شارٹ سرکٹ ہو سکتا ہے۔ بعد میں تحقیقات ہوں گی لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ آگ لگنے کی اصل وجہ بھی نہیں جان سکیں گے۔“

”کیوں؟“ جاگتی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”اس کمرے میں آنے کے بعد تم تو جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگتا رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ فطرت کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”دو ہی رات کے قریب سیان چانگ کچھ آدمیوں کے ساتھ یہاں سے گیا تھا۔ وہ ہماری دین بھی لے گئے تھے۔ جو اس وقت موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ جج ہونے سے تقریباً ایک مہینہ پہلے لوٹے تھے۔“

”تو تمہارا خیال ہے کہ آگ سیان چانگ نے لگائی ہوگی؟“ جاگی بولی۔

کالچ کے باہر ایک درخت کے نیچے پانی سے بھر  
رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے اس درخت کے پانی سے  
دھوئے اس وقت وہ دونوں عورتیں بھی سیان پور  
کالچ سے نکل کر اس طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔  
ان دونوں نے کھلے پانیچے کے پاجامے اور سیلو کیس  
پہن رکھی تھیں۔ قریب پانچ گروہ دونوں ہماری طرف  
مسکرا دیں۔ وہ بھی مزدوروں کی بستی کی طرف جا رہی  
تھیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہی ہوئے۔

”معاہدہ میان چانگ کی زندگی اور جانکوا تھا۔“ میں نے کہا ”کاراشان میان چانگ کی دوسری شادی سے خوف زدہ تھی۔ اسے کسی طرح بتا چل گیا تھا کہ میان چانگ دوسری وصیت تیار کروا رہا ہے جس میں کاراشان کو ہر چیز سے محروم کر دیا جائے گا۔ وہ وصیت پر دستخط ہونے سے پہلے میان چانگ کو قتل کروا دینا چاہتی تھی مگر اپنی وصیت کے مطابق وہ خود اصرار اور قانونی وارث قرار پائے میان چانگ کو قتل کرانے کے لیے اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ اس کی تفصیل میں تمہیں بتا چکا ہوں اور جب میان چانگ کو ہمارے ذریعے کاراشان کی سازش کا پتا چلا تو اس نے کاراشان ہی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے اس فیصلے پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی اور میرے خیال میں یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا۔“

ناشتے کے فوراً ہی بعد ہم اپنے کالج میں واپس آئے وہ دن گزر گیا اور پھر رات جمعی گزر گئی۔ سیال: واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ اگلے روز دوپہر کے وقت پر واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ ماسٹر کو دو تین دن مزید ہڑے لگے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی تمام مزدور  
واپس آگئے تھے۔ انہوں نے سپروائزر کو گھیر لیا اور کو  
آتش زدگی کے بارے میں پوچھنے لگے۔  
دودان اور گزر گئے شہر سے آنے والے آدمی  
کہ سیان چانگ کو شہر میں چند روز لگیں گے۔ ہم پیش  
ہوں۔ آرام سے یہاں رہیں۔

ان تین چار دنوں کے دوران میں چیکو اور پاپا ان دونوں عورتوں سے جاگتی کی دوستی ہو گئی تھی۔ ان میں سے کسی کی عمر بھی نہیں سے زیادہ نہیں تھی اور حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ دونوں سڑکی پر رہنے والی تھیں اور سیان چانگ اپنا دل بھلائے انہیں خاص طور پر یہاں لے کر آیا ہوا تھا۔ جاگتی اب تک تو میکسی غداوی لباس پہنتی رہی اس نے کاراشان کے بچے میں پہنا تھا مگر چونکہ ایک پیٹ اور شرٹ دے دی تھی۔ وہ دونوں قد و قامت

”وہ کیسے؟“ جاگکی نے پوچھا۔  
”میاں کی پولیس کو جنگل میں منگ شئی اور اس کے  
ساتھیوں کے قتل کی اطلاع تو مل چکی تھی اور وہ مشتبہ  
بھکشوؤں کی تلاش میں بھی تھے لیکن کاراشان پولیس سے  
زیادہ چالاک نکلی اور وہ ہو گیا نگ کی بستی تک پہنچ گئی اور  
ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا۔ اپنی انہی معلومات  
کے بل بوتے پر وہ ہمیں بلیک میل کر رہی تھیں لیکن ہمارا یہ راز  
بھی اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اب ہمیں کم از  
کم وہ پریشانی تو نہیں رہی۔“  
”اور اگر سیاہ چانگ نے کوئی اور حرکت کر ڈالی تو؟“  
جاگکی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
”وہ ایسا نہیں کرے گا۔“ میں نے دو ٹوٹ بھرے لہجے میں  
جواب دیا۔ ”مگر مجھے تو اس وقت بڑے زور کی بھوک لگ رہی  
ہے۔“ ناشتے کے لیے ہمیں ٹیلے کے دوسری طرف بستی میں  
جانا پڑے گا۔“  
”چلو۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ جاگکی کہتے

تقریباً ایک جیسی تھیں اس لیے جاگی کو یہ کپڑے تقریباً آٹنے سے تھیں۔ سخت بورت تھی۔ میں پروانز کے ساتھ گھومتا رہتا اور جاگی سر پر چوڑے جھنجھ کا ہیٹ جمائے پشت پر مخصوص طرز کی بنی ہوئی بلی سی ٹیکوں والی نوکری لگائے دوسرے مزدوروں کے ساتھ باغ میں چائے کی پتیاں چٹنی راتی۔

دس دن گزر گئے۔ اس دوران میں میان چانگ ایک مرتبہ خود بھی آیا تھا لیکن صرف ایک دو گھنٹوں کے لیے۔ اس نے بھی مجھے تسلی دی تھی کہ ہم پریشان نہ ہوں۔ جیسے ہی شہر کے معاملات سے فارغ ہو گا وہ یہاں آکر ہماری روانگی کا بندوبست کر دے گا۔ کونجی میں آتشزدگی کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس میں تین عورتیں جل مری تھیں جن میں ایک اس کی بیوی تھی۔ وہ دولت مند آدمی تھا اور اس نے شہر میں ایک معزز مقام رکھتا تھا۔ شہر کے لوگ اس واقعہ پر اظہارِ افسوس اور اس کی بیوی کی تعزیت کے لیے اس کے پاس آ رہے تھے اس کے علاوہ آتشزدگی سے بچ کر قانونی الجھنیں بھی پیدا ہو گئی تھیں سلجھانا بہت نوری تھا۔

میان چانگ گیارہویں دن واپس آیا تو اس کی گاڑی کے پیچھے سیاہ رنگ کی ایک اسٹیشن وین بھی تھی جس میں دو دی تھے۔

وہ رات بھی ہمیں وہیں گزارنی پڑی اور پھر صبح سویرے میان چانگ نے ہمیں رخصت کر دیا۔ چیکو اور میکوشی بھی وہ دن میں ہمارے ساتھ جاری تھیں۔ میان چانگ نے ایک بڑی رقم دی تھی جو میں نے یہ سوچ کر قبول کر لی کہ آئے گی۔ اب ہم بھکشوؤں کے بھیس میں نہیں تھے اور ان چانگ کے کہنے کے مطابق ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

”میرے یہ دونوں آدمی شاؤ یانگ تک تمہارے ساتھ نہیں آ گئے۔“ میان چانگ نے کہا تھا ”راستے میں کوئی گڑبڑ کی تو تم سنبھال لیں گے۔ شاؤ یانگ سے آگے چل کر تمہاری کرے گی۔“

ہم سوچنے لگتے سے پہلے ہی راجہ ہو گئے۔ شاؤ یانگ کی طرف جانے والی ہائی وے تک پہنچنے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ ہم ڈانگ کو جاتے اور وہاں سے ہائی وے کی طرف نکلے۔ ان ڈانگ پورے دو سراسر اختیار کیا۔

اس خطے میں چھوٹے بڑے دریاؤں کی بہتات تھی۔ ان

کے نام کچھ اس قدر مشکل تھے کہ کم از کم میرے لیے انہیں یاد رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہماری دین ایک دریا کے ساتھ ساتھ گاؤں شامی قصبے کی طرف دوڑتی رہی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم گاؤں شاپنچہ اور وہاں سے دوسری سڑک پر مڑ گئے۔ مزید ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم مین ہائی وے پر پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہاں سے شاؤ یاں تک تقریباً سات گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور میرے اندازے کے مطابق ہمیں چارپانچ بجے تک شاؤ یاں تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ہائی وے پر بسوں، ٹال بردار ٹرکوں اور پرائیویٹ گاڑیوں کی آمد و رفت بھی لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے ڈرائیور کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

اس علاقے میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن کے دامن میں چائے کے باغات تھے لیکن تین گھنٹے بعد ہم نے سبزے کو پہنچ چھوڑ دیا۔ اب ہمارے چاروں طرف بنجر اور دیان پہاڑیاں تھیں۔ بعض پہاڑیاں تو بہت بلند تھیں۔

ڈرائیور کے ساتھ پینجر سیٹ پر اس کا ساتھی مویانگ بیٹھا ہوا تھا۔ میں جاگنی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر اور چیکو اور میکوشی ہم سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

[illegible]



ایک بجے کے قریب دین ایک چھوٹے سے اسٹاپ پر رک پئی۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ چند دکانیں اور دو تین ریٹورنس تھے۔ ایک ریٹورنس میں کھانا کھاتے ہوئے یہ اطلاع ملی کہ تقریباً تیس میل آگے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ہائی وے پر لوٹ مار مچا رکھی ہے اور اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ انیس تقریباً دو گھنٹے وہاں رکتا ہوا اور جب مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی میں سوار لوگوں سے اطلاع ملی کہ راستہ صاف ہے تو ہم فوراً ہی روانہ ہو گئے۔

تقریباً ایک گھنٹا ہائی وے پر سفر کرنے کے بعد سامنے سڑک پر بڑے بڑے پتھر دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ اس کے سامنے نے جیب سے پستول نکال لیا اور وہ دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سڑک پر پتھر دیکھ کر میرا جی ہاتھ اٹھکا تھا۔ شاہراہوں پر عام طور پر اس طرح روڈ بلاک کر کے لوٹ مار کی وارداتیں کی جاتی تھیں۔ میں نے بھی پستول نکال لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دونوں طرف خبر اور دیر ان پہنچاؤں تھیں۔ کسی ڈی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ ڈرائیور اور موبائیل کچھ دیر تک تیز لیمے میں آپس میں مشورہ کرتے رہے اور بالآخر ڈرائیور نے وہی سڑک سے اتار کر پہاڑیوں میں ایک تنگ سے راستے پر موڑ لی۔ ”دو دھاتی میل ان پہاڑیوں میں چلتے رہنے کے بعد ہم دوبارہ ہائی وے پر نکل آئیں گے“ ڈرائیور نے بتایا ”لیکن تم لوگ سیٹوں سے نیچے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ہو سکتا ہے۔“

پہاڑیوں میں گونجتی ہوئی فائر کی آواز سے اس کا جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ ڈرائیور کے منہ سے ایک خوفناک چوٹ نکلی اور وہ اسٹیرنگ کے ساتھ دروازے کی طرف لڑھک گیا۔ اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ سامنے کسی جگہ سے چلائی جانے والی گولی دینڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی اس کی کھوپڑی میں گھس گئی تھی۔

جاگتی، چپکلی اور میکوشی چیخ اٹھیں۔ دین بے قابو ہو کر ایک چٹان سے ٹکرائی۔ میرا سر بڑے زور سے اٹلی سیٹ سے ٹکرایا اور میرا دماغ بھجنا اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ گولیاں گاڑی کے مختلف حصوں پر لگی تھیں۔ دو نماز بھی دھماکوں سے پھٹ گئے تھے۔ موبائیل نے دروازہ کھول کر

باہر چھلانگ لگا دی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول اندھا دھند فائرنگ کرنے لگا اور پھر اس کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ لہراتا ہوا اپنے گھر کی طرف بے حس و حرکت ہو گیا۔

”سیٹوں کے نیچے دیکھ رہو۔ اٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔“ میں نے چینی زبان میں چیخ کر چپکلی اور میکوشی سے کہا اور جاگتی کو بھی سیٹ پر دبائے رکھا۔

میرے پاس پستول موجود تھا مگر مقابلے کی کوشش کر دینا کی سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ ہم چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور ان لوگوں کو چیلنج کرنا خود کشی کے مترادف ہوتا۔

تقریباً دو منٹ خاموشی میں گزر گئے اور پھر ہمیں طرز سے ایک دھاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ہمیں دین سے اتارنے کا حکم دیا جا رہا تھا اور ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دی گئی تھی کہ اگر ہم میں سے کسی نے غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔

”حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ میں کہتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔

چپکلی اور میکوشی کے چہرے بالکل زرد ہو رہے تھے۔ دونوں خوف سے ہر طرف پل رہی تھیں۔

میں نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ دروازہ کھولا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر نیچے اتار آیا۔ میرے پیچھے جاگتی اور چپکلی اور میکوشی بھی اتار آئیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی مختلف سمتوں سے پانچ آوی سامنے آ گئے۔ ان کے پاس آٹومیک رائفلیں تھیں اور ہم ان رائفلوں کی زد پر تھے۔

وہ لوگ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھتے رہے اور مجھے ہی قریب پہنچنے میں ایک آوی کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ ہلکیاں تھا۔ جرائم پیشہ بھکشو۔ جس کی وجہ سے چین میں ہمارے لیے مصیبتوں کا دور شروع ہوا تھا اور آہستہ آہستہ یہ صورتحال مزید آگے چلی گئی۔

ہلکیاں کے ہونٹوں پر بڑی مغز مچھراکت تھی اور میرے دماغ میں چیخو نہیاں سی رینگ رہی تھیں۔

ہلکیاں نے جاگتی کی طرف دیکھا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر داخل کارخ میرے سینے کی طرف کر لیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہلکیاں کی انگلی کی معمولی سی حرکت بھی بھی وقت میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔

”دھمیں۔“ ہلکیاں نے رائفل نیچے جھکا لی ”میری تم سے ایسی کوئی دشمنی تو نہیں کہ تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی ضرورت پیش آئے۔ معمولی سا ہتھیار تھا ہم دونوں کا۔ اگر تم اس پستول اور اس میں موجود چند ہزار یو این کی رقم کو بھول جاتے تو بات آتی گئی ہوتی۔“ ”گھم۔“ وہ چند لمحوں کو بھول ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”مگر مجھے ڈانگ کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”مگر مجھے ڈانگ کو میں دیکھ کر تو تم نے مجھے خنجر کی نوک پر رکھ لیا تھا۔ اپنے آپ کو کھڑے میں دیکھ کر مجھے مجبوراً پستول نکالنا پڑا تھا۔ میں اس وقت تم دونوں کو ایک ایسی جگہ پر لے جانا چاہتا تھا جہاں ہم تمہیں کے سوا کوئی نہ ہو تا اور ہم اطمینان سے بیٹھ کر یہ ہتھیار طے کر لیتے مگر ہوا میں گاڑی کا جو عین وقت پر اس طرف پہنچی تھی۔ تمہاری سامنے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے مجھے مجبوراً گولی چلائی پڑی۔ تمہاری یہ ساتھی میری گولی سے توجہ نہی مگر کار سے طرانی۔ یہ خوش قسمت ہے کہ کار سے نکلنے کے بعد بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا اور میں بد قسمت ثابت ہوا کہ تم لوگوں سے بچ نہ سکے کے بعد مجھے ایک الجھد شکاری نے گھیرنے کی کوشش کی۔“

”شکاری!“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”لیکن میری اطلاع کے مطابق وہاں سے تقریباً دو میل دور تم نے کسی آدمی کو لوٹنے کی کوشش کی تھی اور عزائم کر کے تم اسے قتل کر کے بھاگ گئے تھے۔“

”قل کی حد تک تمہاری اطلاع درست ہے مگر اس کا پس منظر ہمیں معلوم نہیں“ میں بتاتا ہوں۔ ”ہلکیاں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”وہاں سے بھاگنے کے بعد میں ایک نیم ٹارک علی میں جا رہا تھا کہ ایک آدمی نے اچانک ہی ٹارک سے نکل کر خنجر کی نوک میرے پسلو سے لگا دی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم نے مجھے خنجر کی زد پر لیا تھا۔ بعض لوگ بھکشوؤں کے بارے میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے پاس بڑی دولت ہوتی ہے۔ بھیک مانگ کر بیٹھ بھر لیتے ہیں اور جو نقد رقم لوگوں سے ملتی ہے، اسے جان سے لگاتے رکھتے ہیں۔ میرے بارے میں بھی اس شخص کا یہی خیال تھا۔ وہ بھجھتا تھا کہ میرے کندھے سے لٹکا ہوا ہتھیار یو این کے نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ بڑبڑاتا تھا کہ اسے شکاری کی شناخت نہیں تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شکاری خود شکار کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بہر حال۔“ میں نے ایک بار پھر خاموش ہو کر گھر سانس لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں تو پکڑے جانے کے خوف سے

پولیس سے چھپتا رہا اور تمہارے بارے میں سنا کہ تم لوگ اس دو ات مند عورت کی کوٹھی میں عیش کرتے ہو جس کی کار سے تمہاری یہ ساتھی ٹکرائی تھی۔ میرے لیے کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ کوئی عبادت گاہ اور نہ کسی سرائے کا رخ کر سکتا تھا۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اس بھکشو کو تلاش کر رہی تھی جس کے ہاتھوں ایک شریف شہری مارا گیا تھا۔

”اگر اس رات مجھے یہ شریف آدمی نہ مل جاتا تو میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہو چکا ہوتا۔“ اس نے دائیں طرف کھڑے ہوئے پست قامت۔ اور بھاری بھر کم چینی کی طرف اشارہ کیا ”یہ چو آن ہے ڈاکوؤں کے اس چھوٹے سے گروہ کا سردار۔ محض اتفاق سے ہی ہمارا آمانسا مانا ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کو ایک قاتل بھکشو کی تلاش ہے۔ اس نے جس طرح مجھ سے سوالات کیے تھے اس سے مجھے شبہ ہو گیا کہ یہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں وہی بھکشو ہوں جو پولیس کو مطلوب ہے۔ یہ مجھے اپنے ساتھ دیا کے پار پہاڑیوں میں لے گیا جہاں ان دنوں انہوں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ویسے ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔ یہ شہروں میں وارداتیں نہیں کرتے۔ شاہراہوں پر سفر کرنے والے مسافروں کو لوٹنے ہیں اور ٹھکانے کیا علاقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے فوراً ہی قبول کر لیا۔ ویسے بھی میں زندگی کی یکسانیت بے آگاہ چکا تھا۔

بھیک مانگ کر کھانا، لوگوں کو دھوکا دے کر لوٹنا اور عبادت گاہوں میں راتیں بسر کرنا۔ کوئی مزہ نہیں رہا تھا اس زندگی میں۔ زیادہ رقم بھی نہیں ملتی تھی بلکہ اس نئی زندگی میں ایکشن ہے۔ بنگلہ ہے، ٹھیل ہے۔ جب ہم ہائی وے پر کسی گاڑی کو روکتے ہیں تو اس میں سوار لوگ ہمیں دیکھ کر ہر طرف کانپنے لگتے ہیں اور اگر کوئی بہادری دکھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے جسم میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹا سا رنگین سوراخ کھدیا جاتا ہے۔ جسے دیکھ کر دوسرے لوگ ہمارے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور گھڑا کر رحم کی بھیک مانگنے کے علاوہ اپنا سب کچھ ہمارے قدموں میں ڈھیر کر دیتے ہیں۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ کتنا قہر ہے اس زندگی میں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ پکڑے جانے کا بھی خوف نہیں۔ کسی ہائی وے پر دو دور تک پولیس کا نام و نشان نہیں ہوتا اور جب کسی قصبے کی پولیس کو اطلاع ملتی ہے تو ہم جائے واردات سے میلوں دور پہنچ چکے ہوتے ہیں۔“

میں خاموش کھڑا اس نیا میں سن رہا تھا۔ گستا تھا جیسے

اس نے بیس کھڑے کھڑے اپنے کارناموں کی تفصیل بتانے کا پروگرام بنا رکھا ہو۔ اس کی باتیں سن کر چیکو اور میکوشی کے چہرے پر زردی کچھ اور گہری ہو گئی تھی جیسے ہلدی لپ دی گئی ہو۔ جاگتی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ دن پہلے ہم نے ڈانگ کو کے دوسری طرف کچھ وارداتیں کیں پھر اس طرف آگئے۔ ایک واردات ہم نے کل ڈانگ کو سے چند میل کے فاصلے پر کی تھی اور ایک واردات تم لوگوں کے آنے سے۔۔۔ چند گھنٹے پہلے کر کے لیکن مزہ نہیں آیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ آخری واردات کر کے شاؤ یانگ کی طرف نکل جائیں گے جو آن کا کنا ہے کہ شاؤ یانگ اور ہنگ یانگ کی درمیانی شاہراہ پر بڑا مال ملتا ہے۔ ہنگ یانگ میں اربو پورٹ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے دولت مند لوگ اس شاہراہ پر سفر کرتے ہیں۔ بڑا مال ہے وہاں۔ اس طرف تو ہم وقت ہی ضائع کرتے رہے۔

”تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہم نے جو واردات کی تھی اس میں کبھی کبھار زیادہ نہیں ملا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس وقت بھی ہمیں مایوسی ہی ہوگی لیکن دنیا کی سب سے قیمتی دولت اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔“ اس نے خاموش ہو کر پہلے جاگتی اور پھر چیکو اور میکوشی کی طرف دیکھا۔

یہ سردار چو آن بڑا عقل مند آدمی ہے۔ وہ بولتا رہا ”لوگوں کو لوٹنے کے لیے بڑے بڑے نفسیاتی حربے استعمال کرتا ہے۔ شاہراہ ہلاک کی تھی تو اسے یقین تھا کہ اس طرف جو بھی گاڑی آئے گی، روڈ بلاک دیکھ کر اسی لیے راستے پر نکلنے کی کوشش کرے گی یا واپسی کا راستہ اختیار کرے گی۔ اگر تمہارا ڈرائیور عقل مند ہوتا تو سرک پر سے ایک آدھ پتھر مارتا کر راستہ بناتا اور سیدھا نکل جاتا لیکن وہ اس راستے پر نکل آیا جہاں ہم تیار بیٹھے تھے۔ پہلا وار ہم کرتے ہیں تاکہ دوسرے دہشت زدہ ہو جائیں اور انہیں کچھ سوچنے کا موقع بھی نہ ملے۔ ویسے یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہاں تم سے آنا سامنا ہو جائے گا۔ ذرا نہیں۔ میری تمہاری ایسی دشمنی بھی نہیں ہے کہ تمہاری جان لینے کی کوشش کروں۔ دراصل میں اور میرے ساتھی کئی روز سے اس نعمت کے لیے ترسے ہوئے ہیں۔“ اس نے جاگتی وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ”ان پہاڑوں میں اندر جا کر کہیں ایک آدھ روز آرام کریں گے اور پھر ہمارے اور تمہارے راستے الگ الگ ہو جائیں گے۔ تم لوگ کھینچے جا جائے۔“

آزاد ہو گئے۔

ممکن ہے کہ میان رکے بغیر کچھ اور بھی بولتا رہتا ہو۔ سردار چو آن کی وجہ سے اسے اپنی زبان کو بڑیک لگانا پڑا۔ چند لمبے خاموشی سے میری طرف دیکھا اور پھر بولا۔

”سردار چو آن کا خیال ہے کہ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ ہماری دین انہی پہاڑیوں میں ذرا آگے کو ہے۔ ہے تم لوگوں کو زیادہ نہیں چلنا پڑے گا لیکن۔ پہلے اپنا چر میرے حوالے کرو۔“

میں نے ہنک کر پھینک دیا بندھا ہوا خنجر نکالا اور خاموشی سے اس کے حوالے کر دیا۔ یہ خنجر ہے کہ اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میرے اور جاگتی کے پاس پستول بھی ہوئے ہیں۔ اس نے ہمیں رات نقل کی زد پر لے کر ایک طرف بٹہ اشارہ کیا اور ساتھ ہی اپنے دو ساتھیوں کو بھی اشارہ کر دیا۔

وہ دونوں بڑی تیزی سے دین کی طرف بڑھے۔ ایک ڈرائیور اور مویانگ کی لاشوں کے لباس کی تلاش لینے لگا اور دوسرا دین میں گھس گیا تھا۔ دو منٹ بعد وہ چیکو اور میکوشی کا سوٹ کیس لے کر باہر آگیا۔ سوٹ کیس زمین پر پڑ کر اس نے ایک جھپٹے سے تالا توڑا اور دھککا اٹھا کر تالا لینے لگا۔ وہ کپڑے اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتا رہا۔ کپڑوں کے ٹپے توئوں کے بنڈل رکھے ہوئے تھے ان کے ساتھ ہی چو لری باکس بھی تھا۔ اس نے توئوں کے بنڈل اور چو لری باکس اف

کر سردار چو آن کے حوالے کر دیے اور سوٹ کیس کو زوردار ٹھوکر مار کر دور اچھال دیا۔ سردار نے چو لری باکس اور توئوں کے بنڈل کندھے پر لٹکے ہوئے خیلے میں رکھتے ہوئے کچھ کماتو دی شخص چیکو اور میکوشی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان دونوں کے گلوں میں طلائی لاکٹ تھے اس نے دونوں لاکٹ کھینچ لیے۔ ان دونوں نے اپنی اپنی انگلیوں سے انگوٹھیاں اتار کر خود ہی لٹیرے کے حوالے کر دیں۔ ان دونوں سے فارغ ہو کر وہ جاگتی کی طرف متوجہ ہو گیا مگر یہاں اسے مایوسی ہوئی۔ جاگتی کے جسم پر کوئی زور نہیں تھا۔ ان لاکٹ اور انگوٹھیاں بھی سردار کے حوالے کر دیں۔ ان

دوران میں دو سرا آدمی بھی لاشوں کے لباس کی تلاش لینے لگا تھا۔ اس نے بھی ان کی جیبوں سے برآمد ہونے والی زور سردار کے حوالے کر دی اور پھر ہمارا مارچ شروع ہو گیا۔

دو آدمی ہم سے بیس گز آگے تیز تیز چل رہے تھے۔ سردار اور ہمیں ہم سے تین چار قدم پیچھے تھے۔ ان پہنچاؤں ساتھی سب سے پیچھے تھا۔

ہمیں ان نے نو بیٹن اور بی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ الب

ان ڈاکوؤں کے لباس بالکل مختلف تھے۔ جسم کے زیریں حصے پر جو کچھ چھن رکھا تھا، اسے یا جامد یا پتلون میں لکھا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے ٹراؤزدر میں کے گھوڑوں کے جوکوں کو پھنسے ہوئے دیکھا تھا۔ گھنٹوں کے اوپر سے کسی قدر پھولا ہوا اور بچلنے کے قریب پانچ انگلی سے بالکل چپکے ہوئے سائڈ بٹلن کے نیچے ایک لمبی زپ لگی ہوئی تھی جس سے پانچوں کو تین تقریباً کچھ لمبی زپ پوری آستین والی جینیں تھیں۔ تھوڑا جاسکتا تھا۔ اوپر پوری آستین والی جینیں تھیں۔ سر پر عجیب سی ٹوپیاں جنہیں بوقت ضرورت نیچے کھینچ کر چو لری چھایا جاسکتا تھا۔ ہر شخص کے سینے پر کراس کرتے ہوئے چلنے والے جن میں راتھنوں کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔

تقریباً تین منٹ بعد ہم رک گئے۔ دائیں طرف سرک سے ذرا ہٹ کر دو چٹانوں کے درمیان ایک کشادہ کٹاؤ میں ایک آستین وین کھڑی تھی جس کے چاروں طرف ایسی رنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس وین کا تعلق کسی سرکس سے ہے۔

ہم چاروں کو ایک سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ سردار ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس سے نیچلی سیٹ پر ہمیں ایک آدمی کے ساتھ بیٹھ گیا اور پانچوں آدمی ہماری سیٹ کے پیچھے فرش پر بیٹھ گیا تھا جہاں تیل کے تین گیلن اور کچھ اوپر چس بھی رکھی ہوئی تھیں۔

دین اس کٹاؤ سے نکل کر پتھر لے راستے پر دوڑنے لگی۔ تقریباً تین گھنٹوں تک دین رکے بغیر چلتی رہی۔ اندر جہاں پہل گیا تھا۔ ڈرائیور نے بیڈ لیپس روشن کر لیے۔ اس کے بعد بھی دین اس دیرانے میں تقریباً ایک گھنٹہ تک چلتی رہی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ انہیں کسی خاص ٹھکانے پر پہنچنا تھا اور یا لاشوں پہاڑیوں میں ایک اور ٹک سے راستے پر مڑ گئی۔ چٹانوں میں دو تین پتھر کانٹے کے بعد دین رگ بگ اور ہمیں نیچے اتار کر راتھنوں کی زد پر لے لیا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ ان چٹانوں میں چلنے کے بعد ہم ایک غار میں داخل ہو گئے۔

غار کافی کشادہ تھا اور غالباً اکثر استعمال میں رہتا تھا۔ ایک آدمی نے نارنج روشن کر کے وہاں پر پہلے سے موجود مشعل جلائی۔ غار کے فرش پر چٹانیاں پیچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پتھروں سے بنا ہوا چو لھا اور اس کے پاس لکڑیوں کا بڑھکا ہوا تھا۔

ہمیں ایک دیوار کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ایک ڈاکو نے ہم سے چند زوردار بیٹھ کر ہم پر راتھن تان لی۔ سردار سامنے والی

دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور اسنے آدمیوں کو مختلف احکامات جاری کرنے لگا۔ یہ لوگ دین کی پست سے پانی کا بیس گیلن والا ایک کین، ایک پتیلی، ایک کیتلی اور ایک تھملا بھی اٹھا لائے تھے۔ جس میں چاولوں کے علاوہ کچھ برتن بھی موجود تھے۔

چو لھے میں آگ جلائی گئی اور چاول پکانے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ ہمیں سردار کے قریب بیٹھا ہر پتھر کر رہا تھا۔

چاول اُپالتے وقت تھوڑا سا نمک بھی ڈال دیا گیا تھا۔ آدھے گھنٹے میں چاول تیار ہو گئے جو اس وقت کی خوراک تھی۔

ڈاکوؤں کا یہ گردہ اس قسم کا سارا سامان ساتھ لے کر چلتا تھا اور انہوں نے جبکہ ایسے خفیہ ٹھکانے بھی بنا رکھے تھے جہاں تھوڑے بہت انتظامات پہلے ہی سے موجود تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سردار نے آج دن بھر کی لوٹ کا مال اپنے سامنے ڈھیر کر لیا۔ ایک گھنٹہ تک حساب ہوتا رہا اور پھر اس مال کی تقسیم شروع ہو گئی۔ ہر ڈاکو اپنے حصے کی رقم اپنی بیٹ کے اندر کی خفیہ جیبوں میں چھپانے لگا۔ ہمیں ان کے حصے میں اچھی خاصی رقم آئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لاکٹ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس نے مختصر سے عرصے کے اندر اس گردہ میں اپنے لیے اچھی خاصی جگہ بنالی تھی۔

غار کا دہانہ اگرچہ تنگ تھا لیکن اندر سے کافی کشادہ تھا۔ دائیں طرف ایک کشادہ کٹاؤ تھا جو اندر کی طرف لمبائی میں بھی کچھ سات فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ پچھلے حصے میں ایک جگہ تقریباً تین فٹ اوپر ایک اور تنگ سا دہانہ تھا۔ جہاں سے بیک وقت ایک آدمی ہی اندر داخل ہو سکتا تھا لیکن لگتا تھا اندر سے وہ غار بھی کافی کشادہ ہوگا۔ کیونکہ کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی مشعل لے کر اس دہانے میں چلا گیا تھا اور اندر کافی دیر تک اس کے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ وہ آدمی مشعل اوپر والے غار میں چھوڑ کر ہی واپس آیا تھا۔

سردار چو آن اور ہمیں بدستور سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں کن انگلیوں سے اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ دو آدمی چیکو وغیرہ کو گھور رہے تھے۔ انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر میرے ذہن میں جو اندیشہ ابھرا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ چند لمبے تینوں عورتوں کو گھورتا رہا اور

اپس آیا تھا۔

سردار چو آن اور ہمیں بدستور سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں کن انگلیوں سے اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ دو آدمی چیکو وغیرہ کو گھور رہے تھے۔ انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر میرے ذہن میں جو اندیشہ ابھرا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ چند لمبے تینوں عورتوں کو گھورتا رہا اور

اپس آیا تھا۔

سردار چو آن اور ہمیں بدستور سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں کن انگلیوں سے اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ دو آدمی چیکو وغیرہ کو گھور رہے تھے۔ انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر میرے ذہن میں جو اندیشہ ابھرا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ چند لمبے تینوں عورتوں کو گھورتا رہا اور

اپس آیا تھا۔

سردار چو آن اور ہمیں بدستور سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں کن انگلیوں سے اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ دو آدمی چیکو وغیرہ کو گھور رہے تھے۔ انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر میرے ذہن میں جو اندیشہ ابھرا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ چند لمبے تینوں عورتوں کو گھورتا رہا اور

پھر میکوشی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ میکوشی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ میں سمجھ گیا اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگرچہ میں اس کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر خاموش جی نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ وہ شخص قہقہے لگاتے ہوئے میکوشی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میکوشی چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے آدمی بھی قہقہے لگنے لگے۔

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس شخص کے منہ پر زور دار گھونسا جڑوا۔ وہ شخص میکوشی کا ہاتھ چھوڑ کر چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر ایک ڈاکو نے میرے اوپر راقفل تان لی اسی لمحے ہمسایاں بچ اٹھا۔ جواب میں راقفل بردار بھی کچھ بھونکے تھا۔ سردار نے بھی چیخ کر کچھ کہا تو اس شخص نے بڑی پھرتی سے راقفل کو تال کی طرف سے پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا اس نے راقفل کے ہٹ سے دو تین وار کر دیے۔ ایک ضرب میرے شانے پر لگی اور دو تین ضربیں کمر پر۔ ہمسایاں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شخص کو پکڑ کر گھینٹا ہوا پیچھے لے گیا۔

صورت حال خاصی تشدد ہو گئی تھی۔ ہر ڈاکو نے راقفل تان لی تھی۔ میں جاگی کے قریب زمین پر گرا ہوا تھا۔ میں نے جس شخص کو گھونسا مارا تھا وہ چند لمحے خون خوار سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بیٹک کی آستین سے ہونٹ پونچھتا ہوا آگے بڑھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کچھ کہا اور دوبارہ میکوشی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔

”یہ کہہ رہا ہے کہ پہلے تو اس لڑکی کو الگ لے جانا چاہتا تھا لیکن اب جو کچھ بھی کرے گا تم لوگوں کے سامنے کرے گا۔ واہ! کیا! نظر ہوگا۔“ ہمسایاں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور قہقہے لگنے لگے۔

وہ آدمی میکوشی کو گھینٹا ہوا غار کے کٹاؤ میں لے گیا۔ میکوشی چیختے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی لیکن اس شخص نے دو تین منٹ کے اندر اندر اس کے کپڑے چھاڑ دیے۔ میکوشی نے اس کے بازو پر دانت گاڑ دیے۔ اس شخص نے زور دار جھکا دیا تو میکوشی اس کٹاؤ کے باہر دوسرے آدمی کے قریب گری۔

میں اپنی جگہ پر رہا۔ بسی سے میکوشی کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ قریب ہی دیوار پر لگی ہوئی مشعل

کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے نہایت جرات کا جو کرتے ہوئے قریب بیٹھے ہوئے شخص کی راقفل پھینچ دی اور اس کا رخ کٹاؤ میں کھڑے ہوئے آدمی کی طرف کر دیا۔

غار فائر کے ساتھ اس آدمی کی چیخ تے بھی گونگن اٹھ گئی۔ اس شخص کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر لگی اور ڈھیر ہو گیا۔

ایک لمحے کو شانسا سا چھا گیا اور اس سے پہلے کہ میں سوچ سکتا۔ ایک بار پھر فائر اور چیخ کی آواز سے گونگن فائر یہ چیخ میکوشی کی تھی۔ دامن طرف بیٹھے ہوئے ڈاکو نے کی گھوڑی اڑا دی تھی۔

میں پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جاگی اور چیکو مجھ پر لپ گئیں۔ میری آنکھوں میں دشت سی ابھرتی تھی۔ غار میں چند لمحے سکوت سا رہا اور پھر دو آدمی اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے ہم تینوں کو کرتے رہے۔ جاگی اور چیکو کی جینیں غار میں گونج رہی تھیں اور پھر سردار کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ان دونوں ہمیں چھوڑ دیا۔ سردار نے پھر چیخ کر کچھ کہا اور ہم تینوں والے غار میں دھکیل دیا گیا۔

یہ غار نیچے والے غار سے زیادہ کشادہ تھا لیکن اس میں زمین ہموار نہیں تھی۔ کہیں چھوٹے چھوٹے کڑے پتھر۔ کہیں چارپانچ پتھر اچھ اور پھر ابھرے ہوئے تھے۔ اگر کٹاؤ ہموار ہوتی تو یہ غار زیادہ محفوظ ہوتا۔

نیچے والے غار سے شوری کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب چیخ چیخ کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں بلبل کی آواز بھی شامل تھی۔ میں غور سے وہ آوازیں سننے لگا۔ سب چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ ان کی باتوں سے میں اس پر پناہ کھانڈا۔ وہ ڈاکو ہمسایاں کو اپنے ساتھی کی موت کا غنا ٹھہرا رہے تھے جو ہمیں یہاں لے کر آیا تھا۔ ان کے منہ میں ہم سب کو دیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔

ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بھگوانا گا۔ ہمسایاں اس کردہ کا آدمی نہیں تھا۔ نیا نیا ان کے شامل ہوا تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ اس حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اب اس کی وجہ سے ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔

اس قسم کی صورت حال سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ ہمارے پاس دو پتھروں تھے۔ ایک میرے پاس اور ایک

جاگی اور چیکو کو اشارہ کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ خاصی تنگ تھی۔ میں دیواروں کے ساتھ تھمتا ہوا بڑی مشکل سے اندر داخل ہوسکا تھا۔ میرے پیچھے چیکو اور اس کے پیچھے جاگی تھی۔

تقریباً بیس گز تک ہم اسی طرح دروازہ... کے ساتھ گھنٹے ہوئے چلتے رہے۔ آگے جا کر بائیں طرف مڑتے ہی دروازہ کچھ کشادہ ہو گئی تھی۔ میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک جگہ رک گیا۔

ہم ایک موڑ گھوم کر اچانک ہی کھلی جگہ پر نکل آئے تھے۔ میں کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر بڑے بڑے پتھروں کا سارا لیتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ چیکو اور جاگی بھی میری پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ ہم تو ایسی کھٹائیوں کے غاری ہو چکے تھے مگر چیکو کی زندگی میں شاید اس قسم کا یہ پہلا موقع تھا۔ چٹانوں سے اترتے ہوئے اس کے منہ سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

تقریباً دس منٹ بعد ہم چٹان سے اتر آئے اور پھر اچانک ہی فائرنگ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آوازیں چٹان کے دوسری طرف سے آئی تھیں لیکن چاروں طرف گونجی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

چیکو کے منہ سے لمبی سی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم پتھروں میں تھوکریں کھاتے ہوئے ایک طرف دوڑنے لگے۔ ایک مدت بڑے چٹان نما پتھر کے اوپر سے گھومتے ہی چیکو لڑکھڑا کر گر گئی۔ میں اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی ٹانگیں کا پ رہی تھیں اور مینہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”اے۔ وہ دیکھو۔ اس طرف۔“

جاگی کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ہم سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر دین کھڑی تھی۔ دوسری طرف فائرنگ کی آوازیں میں بھی اب شدت آئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکوؤں میں بیڑھ بڑھ گئی تھی اور وہ آپس ہی میں لڑ پڑے تھے۔ یہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ ہمسایاں کو سردار کی حمایت حاصل تھی۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں ایک طرف ہوں اور دوسرے دو ڈاکو بغاوت کر کے ان سے الگ ہو گئے ہوں اور ان دونوں پارٹیوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہو اور مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی دین کی طرف آنے ہی والا ہوگا۔

”جاگی۔“ میں چیخا ”جلدی کرو۔ دین تک پہنچو۔ اگر ان میں سے کوئی دین تک آگیا تو ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں

میں مقابلے کا خیال ذہن سے نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چٹان کے کٹائی اندر ہونے کے باوجود اس غار میں ٹھنک کا احساس نہیں تھا۔ کسی طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ اس دہانے کے قریب ہی دیوار پر مشعل لگی ہوئی تھی۔ اس سے ذرا بہت کر چیکو دیوار سے ٹیک لگاتے بیٹھی ہوئی تھی۔ مشعل کی روشنی میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی زرد ہو رہا تھا۔ میکوشی کی موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اور شاید اپنی موت ہی سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس کے بدن پر کپکپاہٹ واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ جاگی اگرچہ بیسیوں مرتبہ اس قسم کی خونگ صورت حال سے دوچار ہو چکی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر بھی خوف کے ہلکے سے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میری نظریں غار کے آخر میں ایک تنگ سی دروازہ پر جم گئیں۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا اس دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ دروازہ کسی کھلی جگہ پر کھلی تھی۔

”جاگی!“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی میں کہا ”اس تنگ سی دروازے سے نکلنے کی کوشش کئی چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس غار سے باہر نکلنے کا موقع نکل جائے۔“

”اگر اس دروازے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہو تو یہ لوگ ہمیں یہاں بند کر دیتے۔“ جاگی نے جواب دیا ”یہ لوگ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں اور انہیں اس دروازے کے بارے میں بھی مطلع ہوگا۔“

”لیکن ہو سکتا ہے انہوں نے اس حوالے سے کبھی توجہ نہ دی ہو۔ ہمیں ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”اگر یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔“ جاگی نے کہا۔

میں نے دہانے کے قریب آڑ میں کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان میں کوئی نظر تو نہیں آیا تاہم ان لوگوں کے پیچھے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں

آتش فشانی 3

آتش فشانی 3

گئے۔

جاگنی دین کی طرف دوڑی۔ میں نے چیکو کو کندھے پر لادا اور دین کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

دین کے دروازے لاک نہیں تھے۔ اس دیرانے میں دروازے لاک کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں قریب پہنچا تو جاگنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر چیکو کو بچتر سیٹ پر ڈال دیا اور خود بھی اندر گھس گیا۔

فائرنگ کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ جاگنی انجن اشارت کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر انجن اشارت ہو کر نہیں دے رہا تھا اور بالآخر پانچوں کوشش پر انجن اشارت ہوا۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ جاگنی ٹوئرن لیتے ہوئے دین کو واپس گھمانے لگی اور پھر اسی وقت ایک چینی ہوئی آواز سنائی دی۔

”چوآن۔ بھاگو۔ وہ دین لے جا رہے ہیں۔“

یہ کہانیاں کی آواز تھی۔

”ہری اپ جاگنی۔“ میں چیخا۔

جاگنی نے پیچ پیٹ پر سے پیر بنالیا۔ دین میڈک کی طرح اچھل کر آگے بڑھی۔ اسی لمحے چنائیں ایک بار پھر تڑ تڑا ہٹ کی آواز سے گونج اٹھیں۔ اس مرتبہ دین پر فائرنگ کی گئی تھی۔ کئی گولیاں دین کے پچھلے حصے پر کسی جگہ لگیں۔ جاگنی نے ایکسی لریٹر پر بیچ کا دباؤ ڈال دیا۔ دین پھر لے راستے پر اچھٹی ہوئی دوڑنے لگی اور پھر پٹان کے ساتھ موڑ گھومتی سی ہم گولیوں کی زد سے محفوظ ہو گئے۔

یہ تنگ سا راستہ تھا۔ تاریکی میں تیز رفتاری کسی خوفناک حادثے کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ جاگنی نے ہیڈ لیپس روشن کر لیے اور اس خطرناک راستے پر دین کو اسی تیز رفتاری سے دوڑائی رہی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہم کشادہ راستے پر پہنچ گئے۔ جاگنی نے دین روک لی۔

”اب مجھے یاد نہیں کہ ہم لوگ کس طرف سے آئے تھے۔“ جاگنی کہتے ہوئے وائیں بائیں دیکھنے لگی۔

”وائیں طرف موڑ لو۔ میرا خیال ہے ہم اسی طرف سے آئے تھے۔“ میں نے کہا۔

جاگنی نے دین اس طرف موڑ لی اور رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ میں دروازے کے ساتھ نکلا ہوا تھا اور چیکو میرے اوپر جمبی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح تھر تھر کانپ رہی تھی جیسے جازے سے ہتار گیا ہو۔ اس کے دانت بھی بچ رہے تھے۔

یہ خوف کی انتہا تھی۔ پہلے اس نے ہمارے ساتھ ڈانڈ سے آنے والے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو ڈاکوؤں گولیوں سے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر غار میں چیکو کی آنکھوں کے سامنے تربیت اور جان دینے ہوئے دیکھا تھا۔ میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے والی لڑکی کے لیے تو صورت حال بہت ہی خوفناک تھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لپیٹ لیا اور اس کا کندہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”ہم خطرے سے نکل آئے ہیں چیکو۔ اب دوسری ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ سراسر زبانی ہے وجدان۔“ جاگنی نے میری طرز دیکھتے ہوئے کہا ”میری موجودگی میں تم اسے اپنے سینے پر رہے ہو اور۔“

”اور تم جل کر کباب ہوئی جا رہی ہو۔“ میں نے اس بات کاٹنے ہوئے ہکا ساق تھکا لگایا۔

”جلتی ہے میری جوتی۔“ جاگنی نے ترے جواب پر ”اب دیکھوں گی میں تم میرے سامنے کس طرح مزاحمت کرتے ہو۔“

”ایسا موقع نہیں آئے گا۔“ میں نے منہ ہوتے ہوئے کہا۔

جاگنی مجھے گھور کر رہ گئی اور پھر سامنے دیکھنے لگی۔

دین تقریباً ایک گھنٹے تک دوڑتی رہی۔ اس دوران میں چیکو بھی بڑی حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ میں کوڑھ کر رہا تھا کہ گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں بات نہ لیکن ظاہر ہے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میکوٹی کو یاد کر کے روکنے لگی اور پھر باتوں میں یہ پتا چلا کہ دونوں آپس میں کڑن تھیں۔ میکوٹی اس سے دو سال بڑی تھی۔ وہ دونوں کلب ڈانرز تھیں۔ اس شے میں رہتے ہوئے عورتوں کے لیے اپنے آپ کو بچانے کا مشکل برا مشغلہ ہے۔ یہ دونوں بھی سیان چانگ جیسے دولت مندوں کا ہلانے کا کھلونا بن گئیں۔ کسی حوکے بستر کی زینت بننے دونوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بکاؤ ضرور لیکن لوٹ کا مال نہیں تھیں۔ ڈاکوؤں نے تو انہیں لوٹ مال ہی سمجھا تھا اور میکوٹی نے مزاحمت کرتے ہوئے جان دے دی تھی۔

ہمیں ان پہاڑیوں میں سر کرتے ہوئے تین گھنٹے ہوئے تھے۔ جس وقت ڈاکو ہمیں پائی وے سے لے کر روانہ ہوئے تو شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ تقریباً چار گھنٹوں کے سفر کے اس غار تک پہنچے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے غار میں گزارے گئے

اور اب سر کرتے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے اور یہ رات کا آخری چر تھا۔

”ہم غار راتے پر تو نہیں نکل آئے؟“ جاگنی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جست جلدی خیال آگیا تمہیں۔“ میں نے کہا ”اب بہت جلدی ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ اسی راتے پر واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو جائے۔“

”کیسے نہ کہیں تو پہنچ ہی جائیں گے۔“ جاگنی بولی۔

”اور اگر پہاڑیوں ہی میں بھٹکتے رہے تو؟“ جاگنی بولی۔

”دیکھا جائے گا۔“ میں نے کندھے اچکا دیے۔

”اچھا گھٹنا مزید ملنے کے بعد دین کے انجن سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ جاگنی نے دین روک لی۔

”بے ہلا انکشاف تو یہ ہو کر نیکی میں پیڑوں ختم ہو چکا تھا۔ اس کی زیادہ پریشانی اس لیے نہیں تھی کہ تیل کے کین بھرے ہوئے رکے تھے۔ لیکن انجن کی آوازیں نے پریشان

صور پیدا کیا تھا۔ اگر اس میں کوئی خرابی پیدا ہو سکتی تھی تو ہم یقیناً دیر ان پہاڑیوں میں بھٹکتے رہیں گے۔

چیکو میرے کندھے پر سر رکھے سو گئی تھی۔ میں نے اسے جاگایا اور ہم لوگ دین سے اتر آئے۔ دین میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بھی جیسے جڑ گئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر تک ٹھٹھا رہا اور پھر جاگنی کے قریب ہی پچھر بیٹھ گیا۔ جاگنی کا خیال تھا کہ دین بے بھی جاگنے چلتی رہی تھی اور اب بھی تین گھنٹوں سے ختم دوڑ رہی تھی۔ شاید انجن گرم ہو جانے کی وجہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔

تو مجھے بعد انجن پکلی ہی کوشش میں اشارت ہو گیا لیکن اس مرتبہ ہم زیادہ دور نہیں جا سکے تھے۔ پہاڑیاں ختم ہو گئی تھیں لیکن ان پہاڑیوں کے ختم ہوتے ہی زوردار دھماکا ہوا اور دین لڑکھانے لگی۔

چیکو اچھل کر میرے ساتھ پٹ گئی۔ اس دھماکے سے میں بھی بدحواس ہو گیا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ دھماکے کی وجہ بھی مجھ میں آگئی تھی۔ دین کا آگے کا ایک ٹائر برٹ ہو گیا تھا۔ جاگنی نے دین روک لی اور ہم پیچھے اتر آئے۔

اس وقت صبح کا آگیا سا آسمان چھلنے لگا تھا اور سامنے بہت دور قریب میں سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پکلی تھی اس لیے اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ کوئی جنگل تھا یا نہایت وغیرہ تھے۔

دین کے پچھلے حصے میں ٹول بکس تو موجود تھا مگر فاضل نظر نہیں آتا تھا۔ میں دروازے کے پائداں پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ چمت پر فاضل ٹائر بھی رکھا ہوا تھا جسے میں نے

کھینچ کر نیچے پھینک دیا لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ بھی پچھر تھا اور ہمارے لیے بیکار تھا۔

یہاں تک پہنچ کر یہ بات تو ہم جان گئے تھے کہ غار سے فرار ہونے کے بعد ہم نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا کیونکہ جس ہائی وے پر ہم سر کرتے رہے تھے وہاں دور دور تک سبزے کا نام و نشان تک نہیں تھا اور یہاں ہمارے سامنے قریب میں سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔

دن کی روشنی پچھلی جا رہی تھی۔ ہم تینوں پچھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں غرق تھے۔ میں چیکو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔ وہ ایسے حالات کی عادی نہیں تھی۔

مجھے وہ وقت یاد آگیا جب برما کی سرحدی بستی سے نکلنے کے بعد میں اور جاگنی تین دن تک پہاڑوں میں بھٹکتے رہے تھے اور پھر اس کے کئی روز بعد دو دن تک لوگوں کی نظروں سے چھپتے ہوئے دھان کے بھیتوں میں بھوکے پیاسے بھٹکتے رہے تھے بالآخر ایک ٹوٹی پھوٹی عبادت گاہ میں پناہ مل گئی تھی۔

جہاں ہم رات کو تیزو کھا کر سوئے تھے اور صبح ہمیں ہو کیا گ اور اس کے ساتھیوں نے گھیر لیا تھا۔ ہم تو کئی برسوں سے اسی قسم کے حالات سے دو چار تھے۔ کئی مرتبہ موت کے جڑوں میں بھٹتے تھے اور اب ہم ایسی مشکلوں کے عادی ہو گئے تھے لیکن چیکو کے لیے یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی۔

چیکو اٹھ کر اوپر اُدھر مٹنے لگی اور پھر اچانک ہی وہ چیخ اٹھی۔ میں نے اور جاگنی نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

وہ چیخنے والے انداز میں کچھ کہتے ہوئے ایک طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئے اور پھر میری آنکھوں میں چمک سی ابھرتی۔

قریب میں تاجد گاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور بہت اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار جنگلوں سے دھومیں کی لکیریں سی اٹھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی چھوٹی سی بستی تھی۔

دین میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہم ساتھ لے جاسکتے۔ ہمارا اٹا ڈھ پتوٹل تھے جن میں ایک میرے پاس تھا اور دوسرا جاگنی کے پاس۔ چیکو بالکل خالی ہاتھ تھی۔ وہ سیان چانگ سے جو کچھ کما کر لائی تھی ڈاکوؤں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اندویناک یادوں کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

ہم فوراً ہی قریب میں اترنے لگے۔ دور دور تک زرد رنگ کی کانٹے دار جھانپیاں پھیلی ہوئی تھیں جن میں چلنا

مشکل ہو رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہاں کچھ بستیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے مزید ایک گھنٹے بعد ہم بستی میں پہنچ سکے تھے۔

دس بارہ گھروں پر مشتمل بہت مختصر سی بستی تھی۔ کسانوں نے ہمیں گھیر لیا۔ چیکو نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی اور ہم بیٹھتے ہوئے اس طرف آ گئے ہیں۔ اس نے ہماروں کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ڈاکوؤں کی بات کی تھی جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ اصل بات کو چھپانا چاہتی ہے اس لیے میں نے بھی اس سلسلے میں اپنی زبان بند کر دی۔

ہمیں اس چھوٹی سی بستی میں کھانے کو بھی مل گیا اور آرام کرنے کا موقع بھی۔ اس بستی کا سربراہ ساٹھ سالہ ایک بوڑھا تھا۔ جس کی شکل ویت نام کے انقلابی لیڈر ہوچی منہ سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں کے دس میل دور لاگ ہوئی نای قصبہ ہے جہاں سے پچاس میل آگے شاد یاگ کا بڑا شہر ہے۔

اس بوڑھے کا مشورہ تھا کہ ہم آج کا دن اور رات اس بستی میں رہیں اور کل صبح چلے جائیں لیکن ہم رکنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے بوڑھے سے اصرار کیا کہ وہ ہمیں لاگ ہوئی کی طرف جانے والا راستہ بتا دے۔

”ٹھیک ہے“ بوڑھے نے گہرا سانس لینے ہوئے جواب دیا ”اگر تم لوگ آج کا دن رک جاتے تو کل صبح میں تمہیں پتھر گاڑی پر پہنچ دیتا لیکن بہر حال دس میل کا فاصلہ تم جیسے نوجوان کے لیے زیادہ بھی نہیں ہے۔“

ہم لوگ بستی سے باہر آ گئے۔ دو عورتیں اور کچھ بچے بھی ہمارے ساتھ تھے۔

”یہ راستہ سیدھا لاگ ہوئی کی طرف جاتا ہے۔“ بوڑھے نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”آگے بھی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ممکن ہے وہاں سے تمہیں کوئی سواری مل جائے۔“

ہم اس بوڑھے، عورتوں اور بچوں کا شکر یہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہم تازہ دم ہو چکے تھے۔ چہت بھی بھر چکا تھا۔ اس لیے ہمارے چلنے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس وقت دس بجے کا وقت ہو گا۔ تیز دھوپ چمک رہی تھی لیکن غنیمت تھا کہ اس کشادہ راستے کے دونوں طرف درخت تھے جن کے سائے میں ہم چل رہے تھے۔

چیکو میرے اور جاگی کے درمیان چل رہی تھی۔ جاگی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

”تم نے اس بوڑھے کو اصل بات نہیں کہی۔“ میں نے چیکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم ان کیونٹوں کو نہیں جانتے۔“ چیکو نے جواب دیا۔ ”اگر میں انہیں بتا دیتی کہ ہم ڈاکوؤں کی قید سے فرار ہو رہے ہیں اور تین قتل بھی ہو چکے ہیں تو یہ لوگ ہمیں بستی سے نہ بھی نہ دیتے۔ ہمیں کسی نہ کسی ہمارے یا زبردستی دوک لینے اور لاگ ہوئی سے پولیس کو بلوا کر ہمیں ان کے حوالے کر دیتے اور پھر تم لوگ یہاں کی پولیس سے بھی واقف نہ ہو۔ ایک بہت معمولی سے جرم میں بھی کسی کو پکڑ لیا جاتا ہے اسے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔“

”لیکن شاد یاگ پہنچ کر تو تمہیں پولیس کو سب کچھ بتا دے گا۔“ میں نے کہا ”سیان چانگ کے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ میکوشی ختم ہو چکی ہے۔ یہ ساری باتیں پولیس کے علم میں لانی ہوں گی۔ چلو۔ پولیس کو نہ سہی۔“

میکوشی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کیا تادیبی۔ کیسے چھڑا دی گئی ہو گی بات کو؟

”میرا کھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ چیکو نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ میں اچھل پڑا۔

”گھر جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ایسی مصیبتیں نہ بھگت جاؤں گی جن سے زندگی بھر چھٹکارا نہیں پاسکوں گی۔“

چیکو نے کہا۔

”تو پھر کہاں جاؤ گی؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم لوگوں کے ساتھ۔“ چیکو نے اطمینان سے جواب دیا ”تم لوگ شاد یاگ میں چل جا رہے ہو۔ میرے لیے محفوظ ترین جگہ وہی ہے۔“

میں نے معنی خیز نظروں سے جاگی کی طرف دیکھا۔

”ہم تو اس لیے سامنے نہیں آنا چاہتے کہ ہم غیر قانونی طور پر چین میں داخل ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا ”لیکن یہاں کی رہنے والی ہو۔ اس طرح غائب ہو جانے پر تمہیں کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے ہمیں اور تمہیں ہی ان واقعات کے ذمے دار قرار دیا جائے اور ہماری تلاش شروع ہو جائے۔“

ایسی صورت میں ہمیں پولیس سے کیس بنا دل کے کی؟

”چینی پولیس میں بھی سب فرشتے نہیں ہیں۔“ چیکو نے جواب دیا ”دنیا کے کسی بھی ملک کی پولیس ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتی۔ یہ لوگ صرف کمزوروں کو دبا دیتے ہیں۔ قانون کی تمام پابندیاں شریف لوگوں کے لیے ہیں۔“

میں نے اس بوڑھے کو اصل بات نہیں کہی۔ اگر کوئی قتل اور حالات و لوگ تو بیش محفوظ رہتے ہیں۔ اگر کوئی قتل کرنے کے بعد بھی پولیس کے ہاتھ نہ آتا چاہے تو پولیس اس کا پتہ نہ پاسکتی۔ سیان چانگ کی مثال تمہارے سامنے

جسے ”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سیان چانگ!“ میں چونک گیا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

سیان چانگ پر شبہ کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ جائے واردات سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ صرف پچاس میل کا فاصلہ جو ایک سوا گھنٹے میں طے ہو سکتا ہے۔ اصولی طور پر سب سے پہلے اس پر شبہ ہونا چاہیے تھا لیکن دولت تو بڑے بڑے راز چھپاتی ہے۔ سیان چانگ تقریباً دن شہر میں رہا تھا اور اس دوران میں اس نے پولیس سے تمام معاملات طے کر لیے تھے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تین سال سے سیان چانگ کی خدمت کر رہی ہوں۔“ چیکو نے جواب دیا ”ہم عیسوی عورتیں تو سیان چانگ جیسے مردوں کے دلوں کے اندر بھی جھانک لیتی ہیں۔ وہ جو بات اپنی بیویوں کو نہیں بتاتا چاہتے ہم اگلو لیتی ہیں۔ کو بھی کی آتش زدگی اور کاراشان کی ہلاکت کے بارے میں سب کچھ میں نے اسی رات اگلو لیا تھا جب وہ شہر سے واپس آیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس نے سیان چانگ پر کسی قسم کا شبہ ظاہر نہیں کیا بلکہ اس کے کہنے پر آتش زدگی اور کاراشان کے قتل کی رپورٹ ایک نامعلوم عورت اور مرد کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ جو پچھلے کئی روز سے چوری چھپے اس کو بھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔ جاگی نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔

”میں نے کہا تھا تاکہ دولت مندوں کے کھیل بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کھلونوں سے نہیں انسانی زندگیوں سے کھیلے ہیں۔“ چیکو نے کہا ”اسے تم لوگوں سے ایسی ہمدردی نہیں بھی کہ اتنے روز تک مسمان رکھا اور دو آدمیوں کے ساتھ اپنی گاڑی پر رخصت کیا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر نامعلوم عورت اور مرد کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی اور جب کبھی ضرورت پڑے گی۔ وہ دونوں نامعلوم معلوم ہو جائیں گے۔“

مجھے اپنی گردن پر چونیوں سی ریگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں سیان چانگ کو بہت شرف آدمی سمجھا تھا لیکن چیکو نے اس کی شرافت کا بھرم کھول دیا تھا لیکن بہر حال اتنی شرافت کا ثبوت اس نے ضرور دیا تھا کہ رپورٹ ہمارے ناموں سے نہیں لکھوائی تھی اور ہمیں پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

”اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاد یاگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔“ لیکن۔۔۔ وہ چند

لحوں کو خاموش ہو گئی پھر بولی ”اس غار میں جو کچھ بھی ہوا“ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ میکوشی کو بچانے کے لیے تم جس طرح لپکے تھے اور تمہاری جس طرح پائی ہوئی تھی اور اس کے بعد جس طرح تم لوگوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں سے نکالا وہ دہ بھی مجھے بے ہوش یا درے گا۔ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے شخص ہو جس پر مجھ کو سنا گیا جاسکتا ہے اور اس لیے میں نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے کہ وقت پڑنے پر تم لوگوں کی مدد کر سکوں۔“

”ہماری مدد کیسے کر سکو گی؟“ میں نے پوچھا۔  
”سیان چانگ نے اس وقت تو قانون کو فریب دے دیا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ جلد یا بدیر یہ معاملہ سر ضرور اٹھائے گا۔ اس وقت پولیس سیان چانگ کو تنگ کرے گی تو وہ بڑے اطمینان سے تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ سیان چانگ اور پولیس کے مرنے کی افروں کے لیے تمہارے خلاف جرم ثابت کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ اس وقت میں تمہارے کام آؤں گی۔ میں یہ بتاؤں گی کہ کوئی کونسا کس نے لگائی تھی اور کارا نشان کا قاتل کون ہے۔“

”لیکن اگر ہمارے ساتھ تمہیں بھی وھرایا گیا تو؟“ میں نے کہا۔

”اب اگر میں پولیس کے پکڑ میں پھنس گئی تو میرے لیے چھکارا پانا مشکل ہو جائے گا اور میں تم لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گی لیکن تم لوگوں کے ساتھ رہ کر میں تمہارے کام ضرور آؤں گی۔ سیان چانگ یا کوئی اور سوچ بھی نہیں سکے گا کہ میں بھی شاؤن نیپل میں موجود ہوں۔“ چیکو نے کہا۔

ہمیں چلتے تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ درختوں کے سائے میں ہونے کے باوجود میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ چیکو اور جاگنی کی شرٹس بھی میگی کر جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں ہم آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ چیکو پیدل چلنے کی عادی بھی نہیں تھی۔ وہ تھک گئی تھی۔ سامنے بہت دور کسی آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔ میرا خیال تھا وہاں کچھ دیر کو رک جائیں گے مگر تھوڑا ہی آگے ایک چھوٹی سی ندی دیکھ کر چیکو کے ساتھ جاگنی بھی پھر گئی۔

ہم تینوں ندی کنارے پر بیٹھ گئے۔ بالکل صاف و شفاف پانی تھا۔ پہلے پاس بجھائی اور پھر میں منہ پر پانی کے چھینے مارنے لگا۔

آدھے گھنٹے میں اس بستی تک پہنچ گئے۔ ہم بستی میں رہنا چاہتے رہے۔ بستی سے نکل کر لاگت ہوئی کی طرف رہنا۔ ایک خچر گاڑی پر ہمیں لفٹ مل گئی۔ جس نے ہمیں گھٹنے میں لاگت ہوئی پہنچا دیا۔

لاگت ہوئی خاصا بڑا قصبہ تھا۔ اس کی آبادی پچھڑے بزار کے کنگ جھک ضرور رہی ہوگی۔ تنگ سی گلیاں، بازار۔ دکانوں کے آگے سامان کے انبار، ہاکیوں کے خانے اور پھیلے۔ لاگت ہوئی بھی دنیا کے کسی بھی چھوٹے شہر یا قصبے سے مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف آبادی کا تھا۔ یہاں آبادی کی اس قدر کثرت تھی کہ راستہ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

”تم ہمیں کہاں لے جا رہی ہو چیکو؟“ میں نے پوچھا۔  
”تم شاید بھول گئے ہو کہ ہمیں شاؤنیاں گ جاتے ہیں۔ ہمارے پاس بھونٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔“ چیکو نے جواب دیا۔  
”ہمارے پاس اتنی رقم تو ہونی چاہیے کہ ہم شاؤنیاں گ۔ بس کارا یہ ادا کر سکیں اور میں اسی کا بندوبست کرنے جاؤں ہوں۔“

ایک اور بازار میں گھوم کر چیکو نے ہمیں ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بٹھا دیا۔ پہلے کھیلے لباس میں ایک نوٹریٹر کے کوہمارے لیے جانے کا کہہ کر باہر چلی گئی۔

ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا وہاں انتظار کرنا پڑا۔ وہ جب واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک موٹا پتلا اور تھوڑا سا قامت۔۔۔ آدی بھی تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چند بال ٹھوڑی پر اور چند داہ میں بائیں گلیوں۔ کانوں میں چوڑیوں کے ساز کی چاندی کی بالیاں تھیں۔ بائیں ہاتھ میں چاندی کا کڑا۔ لباس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کا تعلق تیسری جنس سے ہو۔ وہ بڑے عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ چانگ تو ہے۔“ چیکو نے اس کا تعارف کرایا۔ لاگت ہوئی کا ایک معزز اور معتبر پرنس ہیں اور میرا بڑا بڑا دوست۔“

میں نے شیک پیڈ کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر وہ ہاتھ لا۔ کے بجائے ایک مرتبہ میرے سامنے اور دوسری مرتبہ کے سامنے جھک گیا۔

چیکو کے کہنے پر ہم نے سیٹیں چھوڑ دیں۔ ہمارا چانگ تو نے ادا کیا اور ہم باہر آگے۔ کئی گھنٹے آبادی والے بازاروں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے ہم ایک کشادہ سڑک پر آگئے جہاں ایک طرف چانگ تو کی کھڑی تھی۔ اس کار کا اصل رنگ تو بھانسا تھا مگر اب وہ

اس وقت اس پر رش سے سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ آگے اور پیچھے والے پینڈے پر لاقدار ڈینٹ تھے۔ ہم دل ہی دل میں چھپے دالے ہوئے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جبکہ چیکو آگے رہا۔ ہمیں بھی تھی اور چانگ تو نے اسٹرنگ سنبال لیا۔ پینڈے پر نظر آنے کے باوجود کار کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ ہمارے اشارے پر اشارے ہی انجن اشارت ہو گیا۔ کار چلنے کے بعد یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اس میں ہارن نہیں تھا بلکہ ڈرائیونگ سائڈ پر باہر کی طرف بھونٹو لگا ہوا تھا جسے چانگ تو باد بجا رہا تھا۔

میں نے اس قدر کثرت تھی کہ راستہ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اور ہجوم بازاروں سے نکل کر کار نواحی علاقے میں آگئی اور بازار خراب چھوٹے سے کالج مناجنگ کے سامنے رک گئی۔

تین چار کمرے پر مشتمل یہ کالج اندر سے بہت شان دار تھا۔ ایک عداوت پر عمل لازمہ کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ چانگ تو نے غالباً اسے پہلے ہی فون پر ہدایات دے دی تھیں اور وہ کچن میں مصروف تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہمیں کھانا مل گیا۔ چین میں چکن، جیسٹے اور مچھلی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ ان کی روزمرہ کی خوراک میں دوسری چیزیں بھی زیادہ تر ایسی تھیں جن کی تاثیر گرم تھی اور چین کی یہ حساب آبادی کی اصل وجہ بھی غالباً ان کی یہ خوراک ہی تھی۔

کھانے کے ٹھوڑی ہی دیر بعد چانگ تو چلا گیا اور ہم تینوں نشست گاؤں میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ چیکو مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی کہ چانگ تو اس کا بہت پرانا عاشق ہے جو کئی سال پہلے ٹائٹ گلیوں میں اس کے پروگرام دیکھنے کے لیے شاؤنیاں گ آیا کرتا تھا۔

اب تک ہم قدم قدم پر لوگوں کے مکروہ فریب کا شکار ہوتے رہے تھے۔ ہر شخص نے ہم دونوں کو نہیں اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور ظاہر ہے چانگ تو کے بارے میں بھی اسی قسم کے فدا شدت جنم لے رہے تھے۔

”ہم شاؤنیاں گ کب جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔  
”کل صبح۔“ چیکو نے جواب دیا۔ ”ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں کہ یہاں دو شاؤنیاں گ ہیں۔ ایک تو بہت بڑا شہر ہے جس کی آبادی میں لاکھ سے بھی اوپر ہے۔ دوسرا شاؤنیاں گ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ شاؤنیاں نیپل اسی چھوٹے قصبے سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر کہنے

لگی ”شاؤنیاں شہر یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں جانے کے لیے کسی بھی وقت بس مل سکتی ہے۔ شاؤنیاں گ قصبہ جنوب کی طرف تقریباً چالیس میل دور ہے۔ وہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔ دونوں شاؤنیاں گ کے درمیان ساٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ اس لیے ہم یہاں سے سیدھے شاؤنیاں گ قصبہ کی طرف جائیں گے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی پھر بولی ”میں نے چانگ تو سے کچھ رقم مانگی تھی۔ اس نے یہ رقم صبح دینے کا وعدہ کیا ہے اس لیے ہمیں رات کو یہاں رکتا پڑے گا۔“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

میں نے اور جاگنی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چیکو نے بتایا تھا کہ چانگ تو اس کا پرانا چاہنے والا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی حسین عورت کا چاہنے والا مطلب کے بغیر رقم نہیں دے سکتا تھا۔

ہم دن بھر اس پنگل میں بند رہے۔ بڑی مشکل سے ہم یہاں تک پہنچے تھے منزل سے ٹھوڑی ہی دور رہ گئے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موقع پر کوئی گڑبڑ ہو جائے۔

چانگ تو نے کچھ اپنا پروگرام بنا رکھا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چیکو کو قھیر لے گیا۔ اخلا قاس نے ہم سے بھی پوچھا تھا مگر ہماری طرف سے انکار ہو گیا اور شاید وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ ہم ساتھ جانے سے انکار کر دیں۔

ان دونوں کی واپسی تقریباً ایک بجے کے قریب ہوئی تھی۔ جاگنی تو سو گئی تھی لیکن میں جاگ رہا تھا۔ چیکو نے ہمارے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور پھر غائب ہو گئی۔

ہم صبح آٹھ بجے ہی روانی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ناشتے کے بعد چانگ تو نے میرے سامنے ہی چیکو کو کچھ کرٹی نوٹ دیے تھے۔ جو اس نے مسکراتے ہوئے شرٹ کے نیچے گریبان میں ٹھونس لیے تھے۔

بس بہت ہی خٹار سی تھی۔ مسافر بکریوں کی طرح بھڑے ہوئے تھے اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ ایک مسافر کے ساتھ ایک عداوت بکری اور ایک عورت کے پاس دو مرغیاں بھی تھیں۔

جاسی اور چیکو ایک سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔ مجھے جو سیٹ ملی اس پر کھڑکی کی طرف ایک بھاری بھر کم ادھیر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ سیٹ کا زیادہ حصہ تو اسی نے گھیر رکھا تھا۔ میں تو بس کنارے پر لگا ہوا تھا۔

چالیس میل کا فاصلہ چار سو میل سے کم ثابت نہیں ہوا تھا اور یہ فاصلہ ساڑھے تین گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔ ایک تو



سڑک کچی تھی اور پھر چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں تھیں۔ بس ہر بستی میں رک رہی تھی۔ ہر اسٹاپ پر تو رانیور ہی غائب ہو گیا تھا۔ اسے آدھے گھنٹے بعد بستی کے ایک جھونپڑے سے ڈھونڈ نکالا گیا جہاں وہ ایک بہت مونی عورت سے عشق لڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ راستے میں دو مرتبہ بس خراب بھی ہوئی تھی۔ تیسری مرتبہ شاؤننگ سے دو میل دور بس کی کمائی ٹوٹ گئی اور یہ دو میل کا فاصلہ مسافروں کو پیدل طے کرنا پڑا تھا۔

شاؤننگ زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ اس کی آبادی بھی چھ سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ وہی پرانے طرز کے تنگ سے بازار اور گلیاں اور بے تحاشا آبادی۔ یہاں لاتعداد بکھشو بھی نظر آ رہے تھے۔ کچھ عجیب وغریب طیلوں کے لوگ بھی دکھائی دیے تھے۔ بعض کے طے تو ایسے تھے جنہیں بلا تکلف ٹھہر کر سڑک چھاپ غنڈے قرار دیا جاسکتا تھا۔

ہم اس قصبے میں زیادہ دیر نہیں رکے ہماری اصل منزل یہاں سے چھ سات میل آگے پہاڑیوں میں تھی۔ دو بکھشو بھی اسی طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ اکاؤنٹ اور لوگ بھی آتے جاتے دکھائی دیے تھے۔

شاؤننگ نیپل تک جانے کے لیے ایک کشادہ سڑک بھی تھی لیکن وہ پہاڑیوں میں چکر کاتی ہوئی جاتی تھی جس سے فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں بکھشو ہمیں ایک اور راستے سے لے جا رہے تھے۔ پہاڑیوں میں تنگ سی پگڈنڈی تھی اس کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے راستے تھے جن سے پیدل چلنے والوں کے لیے فاصلہ کم ہو جاتا تھا۔

پہاڑیوں میں مل کھائی ہوئی اس پگڈنڈی پر چلنے ہوئے بالآخر ہم دوسری طرف آ گئے۔ مجھے سامنے وہ منزل دکھائی دے رہی تھی جس تک پہنچنے کے لیے اتنے تکمیل مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔

سامنے دو سری پہاڑی کے دامن میں وہ تاریخی اور قدیم عبادت گاہ تھی جس نے ایک طرف چین کی سیاست میں نہ صرف اہم کردار ادا کیا تھا بلکہ دوسری طرف یہ عبادت گاہ صدیوں سے مارشل آرٹ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں اس عبادت گاہ سے چنگ کوان نامی ایک راہب نے جی انگ بادشاہت کے شہنشاہ کے خلاف تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اسی چنگ کوان نے اس سے کچھ عرصہ پہلے جی انگ شہنشاہ کے خلاف صوبہ سیلو کی بغاوت کو کچل دیا تھا۔ چنگ کوان شہنشاہ کی آنکھ کا تار بن گیا۔ شہنشاہ نے اسے اپنی حکومت میں ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی لیکن چنگ کوان کوئی عہدہ

لینے سے معذرت کر کے اپنے ساتھیوں کو لے کر شاؤننگ نیپل واپس آ گیا۔ جہاں عبادت و ریاضت کے علاوہ بالکل کی پریکٹس بھی ہوتی تھی۔

شہنشاہ کے بعض مصاحب اور حکومت کے عہدے دار چنگ کوان کی عزت افزائی سے چلنے لگے تھے۔ انہوں نے شہنشاہ کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ چنگ کوان شہنشاہ کی کمزوریوں کا اندازہ لگا چکا ہے۔ وہ عبادت کرنے عبادت کرنا نہیں گیا بلکہ جنگ کی تیاری کرنے گیا ہے۔ وہ موقع پاتے ہی حملہ کرے گا اور شہنشاہ کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لے گا۔

شہنشاہ نے فوراً ہی چنگ کوان کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ ایک فوجی دستے نے شاؤننگ عبادت گاہ کو گھیرے میں لے کر آگ لگ دی۔ چنگ کوان کے ایک ساتھیوں ساتھیوں میں سے ایک سو دس اس آگ میں جل کر راکو ہو گئے۔ اٹھارہ راہب عبادت گاہ کے ایک دو افتادہ گوشے میں عبادت و ریاضت میں مصروف تھے۔ صرف پانچ راہب زندہ بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ان میں چنگ کوان بھی تھا۔ وہ پانچوں دشمنوں سے بچتے بچاتے، مصائب جھیلنے ہوئے کئی روز بعد ملحقہ صوبہ شاننگ کے شرونگین پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں جی انگ سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کر دیا گیا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ بدلے والی ہر حکومت کے ساتھ شاؤننگ عبادت گاہ پر بھی اوبار نازل ہوتے رہے لیکن اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صدیوں پہلے بھی شاؤننگ نیپل کو مارشل آرٹ کے حوالے سے امتیازی حیثیت حاصل تھی اور آج بھی اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ شاؤننگ نیپل کی یا تار دینا کے ہر مارشل آرٹ کا خواب ہے مگر بہت کم لوگ یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ پچھو سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور کچھ یہاں پہنچ جانے کے بعد ترقی تفتیان برداشت نہیں کر پاتے اور ابتدائی مرحلے میں ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں لیکن میں بھاگنے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔

عبادت گاہ ایک بہت بڑی چٹان کے دامن میں تھی۔ چٹان کو کٹ کر بھی بڑے بڑے ہال اور کمرے بنائے گئے تھے جو اس عبادت گاہ میں شامل تھے۔ اس کمرے کے کمرے عام طور پر عبادت اور ریاضت کے لیے مخصوص تھے۔ زمانہ قدیم میں جو مجھ راہب گیان اور نروان کی تلاش میں یہاں آیا کرتے تھے۔ وہ انہی تاریک کمروں میں بیٹھ کر ریاضت کیا

کرتے تھے لیکن اب یہاں حربی فن کی ریاضت ہو ا کرتی تھی۔ عبادت کے لیے آنے والے راہب کو نوں کھدروں میں چبے رہتے تھے۔

عبادت گاہ کے سامنے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا جس کا پائٹ اگرچہ زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن کہیں کہیں گہرائی بہت زیادہ تھی۔ یہ ہارڈی علاقہ تھا۔ دریا کے دو سری طرف زیادہ خطرناک اور ٹھیک چٹانیں تھیں جن میں لاتعداد غار تھے۔ کچھ غار تو قدرتی تھے اور کچھ انسانی ہاتھوں سے بنائے گئے تھے۔ یہ تمام غار آباد تھے۔ عبادت گاہ کے اطراف کی پہاڑیوں میں بھی چھوٹے بڑے لاتعداد غار تھے جن مختلف لوگوں کا قبضہ تھا۔ قرب و جوار میں چند غار میں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کئی جنازیم تھے جو مختلف ماسٹرز کے نام سے منسوب تھے۔

ایک چھوٹا سا شہر تھا جہاں مختلف ممالک اور مختلف قومیتوں کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ معقول چہرہ کوئی بھی نہیں تھا۔ سب جنگ جو اور لڑاکا تھے۔ بعض کے طے تو اتنے عجیب تھے کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کیا یہ بھی اپنے آپ کو انسان ہی سمجھتے ہیں۔

ماسٹرینگ پائی کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے کئی لوگوں سے دریافت کیا لیکن کوئی بھی مجھ نہ بتا سکا۔

”ماسٹرینگ پائی کون ہے؟“ جاگکی نے پوچھا۔ ”یہ تو مجھے کوئی گمان سا لگتا ہے۔ کسی ایسے ماسٹر کو تلاش کرو جو کچھ شہرت تو رکھتا ہو۔“

”ماسٹرینگ پائی مہاراج کا استاد ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ نام مجھے خود مہاراج نے بتایا تھا۔ انہوں نے جو کچھ سیکھا اسی سے سیکھا اس لیے میں ماسٹرینگ پائی کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”اوہ!“ جاگکی کے منہ سے نکلا ”مہاراج کی عمر ستر کے لگ بھگ ہے بلکہ اب تو زیادہ ہی ہوگی۔ ان کے استاد کی عمر کیا ہوگی۔ وہ زندہ بھی ہے یا اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔“

”معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

سر پر ہوئی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد سے ہم نے کچھ بھی نہیں کھایا یا پھر اور جاگکی حسب معمول مجھے بار بار یاد دلا رہی تھی کہ اسے بھوک لگ رہی ہے کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں کچھ کھایا پیا جاسکے۔ اور بالآخر ہمیں ایک ایسی

جگہ مل ہی گئی جہاں پیٹ بھرنے کے علاوہ ہم کچھ دیر آرام بھی کر سکتے تھے۔

ایک بہت بڑے شیلڈ کے نیچے میزس کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ جہاں کھانے پینے کی ہر موزون چیز دستیاب تھی۔ میز کرسیوں سے ذرا فاصلے پر اس شیلڈ کے نیچے پیالہ قسم کی کوئی چیز بھی بچھی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جاگکی اور چیکو اس پیالہ پر لیٹ گئیں۔ میں بھی ان کے قریب آکر بیٹھا اور تھوڑی سی دیر بعد ایک لڑکی اور دو آدمی اور بھی ہمارے قریب آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اس آدمی سے بھی ماسٹرینگ پائی کے بارے میں دریافت کیا لیکن اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”میں دو سال سے یہاں ہوں لیکن یہ نام میں نے پہلے مرتبہ سنا ہے۔“ اسی شخص نے کہا۔ ”اسے تلاش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہاں جتنے بھی جنازیم ہیں باری باری سب میں جا کر پوچھتے رہو۔ ہو سکتا ہے اس طرح ہمیں اس کا کوئی پتا چل جائے۔“

یہاں چھوٹے بڑے لاتعداد جنازیم تھے اور اس طرح کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اب مجھے پریشانی ہونے لگی تھی یا تو میں نام بھول گیا تھا اور یا جاگکی کی بات ہی درست ہو سکتی تھی کہ وہ اس دنیا سے رخصت نہ ہو گیا ہو۔

رات کو ہمیں ایک سرائے میں کرا لیا گیا۔ یہ کرا آٹھ پائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ فرنچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر مصوئی ریشے کا ایک پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ کثرت استعمال سے نہ صرف اس کا رنگ اڑ چکا تھا بلکہ جگہ جگہ سے اوڑھنا ہوا تھا۔ اس کمرے کا کرایہ ہم سے ایڈوانس لے لیا گیا تھا۔

اس اوڑھنے ہوئے قالین پر ہم دیر تک لیٹے باتیں کرتے رہے۔ چار گھنٹے کا اس کھانا ہی بس کا ذائقہ ناک سفر اور پھر دن بھر گھومتے رہنے سے میں بھی تھک گیا تھا۔ چیکو کی تو آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں۔ دس بجے کے قریب جاگکی نے دروازہ بند کر کے بوٹ چڑھا دیا اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد مینڈے میری آنکھیں بھی بند ہوئے گئیں۔

اور پھر دھڑ دھڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ یوں لگا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ چیکو اور جاگکی بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواس سی ہو کر اوڑھنا اوڑھ دیکھنے لگیں۔ اسی لمحے دروازہ ایک بار پھر زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چیخ بولی۔ کوئی ایک تو از بھی سنائی دی تھی۔ لگتا تھا جیسے



تھی۔ میں نے اختیار کر لیا تھا۔ میں تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ مجھے کی دوسری لک میری ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ میں پیچھے گر۔ مجھے نے میرے اوپر چلا لگا لگا دی مگر میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی بڑی پھرتی سے اٹھ کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ میرا رخ اس کی ٹانگوں کی طرف تھا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کو گرفت میں لے لیا اور پوری قوت سے پیچھے کی طرف موڑنے لگا۔

یہ فری اسٹائل ریسنگ کا بوشن کرپ تھا۔ مجھے کا پیٹ اور سینہ فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ سر کو ذرا سا اوپر اٹھایا تھا اور دونوں ہاتھ فرش پر پکڑ رہا تھا اگر وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میں بھی زیادہ زور نہیں لگا رہا تھا۔ میرا مقصد اسے ختم کرنا نہیں تھا۔

آپ ضرور حیران ہوں گے کہ مارشل آرٹ میں بوشن کرپ کہاں سے آیا۔ تو یہ بتانا چلوں کہ یہ کوئی مارشل آرٹ کی فائنٹ بھی نہیں تھی۔ شروع میں جس طرح مجھے نے اسٹائل بنایا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت برا مارشل آرٹ ہے مگر میرے ایک دو ہاتھ کھانے کے بعد ہی وہ غنڈا گردی اور اسٹریٹ فائنٹ پر اتر آیا تھا اور مجھے بھی ایسے واؤ چیچ استعمال کرنا پڑے تھے جو مارشل آرٹس کے مسئلہ اصولوں کے خلاف تھے۔

میں نے ایک ہلکا سا جھکاؤ کر اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں اور اس کی پشت سے اڑ گیا۔ وہ کچھ دیر تک فرش پر ہاتھ پٹختا رہا اور پھر بہت آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں نے بولٹ بنا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی موٹا چینی اور تین چار اور آدمی کھڑے تھے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مگر اب بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹے ہوئے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد جاگتی اور چلیو لے بالوں والے کو ڈنڈا ڈوبی کرتے ہوئے باہر لے آئیں اور بھوسے کی پوری کی طرح پتہ کر بٹھا بٹھا ڈنڈے لگیں۔

موٹا چینی اور دوسرے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ”یہ کیا ہے کیا کیا ہے تم لوگوں نے ان کے ساتھ۔“ ”موٹا چینی بھلایا۔“

”ان سے پوچھو انہوں نے میری دوست کے ساتھ کیا کیا ہے۔“ میں نے جاگتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب

دیا۔ جاگتی کی شرٹ بالکل پھٹ چکی تھی۔ اس کے سامنے بھی اپنی بریگی جپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اضافی رقم لے کر ان دونوں کو ہمارے کمرے میں گزرنے کی اجازت دی تھی لیکن انہوں نے اس کی انیس توڑی بہت سزا تو ملی ہی چاہیے تھی۔ اس دوران میں کتنی طرح اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے دریا لے اس پار بھی اٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹانگوں اور گردن کے نشان تھے اور یہ جاگتی اور چلیو کے ٹانگوں کا پتہ بھی چینی ان دونوں پر برس پڑا۔ وہ چینی زبان میں کیا کیا بکرا رہا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر بے باک ہاں ہاہری طرف دھکا بھی دیا تھا۔ ان دونوں نے مڑنے کی نظروں سے میری طرف دیکھا اور خطرناک تنہائی کے لیے دیتے ہوئے چلے گئے۔

جاگتی اور چلیو کمرے میں آچکی تھیں۔ میں نے گزرا تھا۔ آکر تھی جلائی اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ جاگتی نے دونوں کندھوں سے پھٹی تھی اور سامنے اوپن شرٹ پہنے ہوئے ایک مرد چل رہا تھا۔ اس نے دونوں کنارے پکڑ ڈرا۔ چلیو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ گروہ لگائی۔ لی شرٹ اب کھلے گئے کا مختصر سا لٹو ڈھنڈا رہا۔ ہم دیر تک بیٹھے اس صورت حال پر تبہو کرتے رہے۔ رات کے آخری پر ہم سو گئے۔

صبح دس بجے کے قریب دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی موٹا چینی تھا۔ اس نے ہلکا سا جھکاؤ کر اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں اور اس کی پشت سے اڑ گیا۔ وہ کچھ دیر تک فرش پر ہاتھ پٹختا رہا اور پھر بہت آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں نے بولٹ بنا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی موٹا چینی اور تین چار اور آدمی کھڑے تھے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مگر اب بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹے ہوئے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد جاگتی اور چلیو لے بالوں والے کو ڈنڈا ڈوبی کرتے ہوئے باہر لے آئیں اور بھوسے کی پوری کی طرح پتہ کر بٹھا بٹھا ڈنڈے لگیں۔

موٹا چینی اور دوسرے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ”یہ کیا ہے کیا کیا ہے تم لوگوں نے ان کے ساتھ۔“ ”موٹا چینی بھلایا۔“

لانا چاہتا ہوں تو وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا اور جب میں نے سماراج کا نام لیا تو وہ اچھل پڑا۔

”تمہاری مراد سماراج وانگ وانگ وانگ بایے سے ہے۔ میرا مطلب ہے تم بنگاک سے آئے ہو؟“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ”میں اس لیے ماسٹر بنگ پائی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر میرے ساتھ بیٹھی ہوئی چلیو اور جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”یہ دونوں بھی تمہارے ساتھ بنگاک سے آئی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جاگتی تو میرے ساتھ بنگاک سے آئی ہے اور چلیو کا تعلق چین ہی سے ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ڈانگ کو سے آتے ہوئے ڈاکوؤں نے ہماری دین پر حملہ کر دیا تھا جس میں دو آدمی اور اس کی کزن ماری گئی۔ ڈاکو سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ہم بڑی مشکل سے ان کے قتلے سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اگر یہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”چلیو ایک مصروف واقعہ ہے۔ ڈاکو اسے پہچانتے ہیں۔ یہ ان کے خوف سے اپنے گھر جانے کو تیار نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ڈاکو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اس لیے یہ ہمارے ساتھ آگئی۔“

ماسٹر بیشیہ اب بھی باری باری گہری نظروں سے ہم تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار جاگتی کے چہرے ہوئے لباس کی طرف اٹھ رہی تھیں پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو گزشتہ رات یوہان کی سرانے میں ان دو یوہین لڑکوں سے تمہارا ہی بھگڑا ہوا تھا۔“

اس مرتبہ چونکے کی باری میری تھی ”تمہیں کیسے پتا چلا ماسٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بڑی چھوٹی جگہ ہے۔“ ماسٹر بیشیہ یان نے جواب دیا ”یہاں کوئی بات کسی سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ یوں سمجھ لو کہ کوئی معمولی سی بات بھی ہو تو اسے پر لگ جاتے ہیں۔“

”غلطی انہی کی تھی ماسٹر۔“ میں نے کہا اور اسے تفصیل بتانے لگا ”انہوں نے جاگتی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں کو اپنے بازوؤں پر بڑا ناؤ تھا مگر شاید آج

کے بعد وہ کوئی ایسی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

”یہ یورپین بڑے بد معاش ہوتے ہیں۔“ ماسٹر لیشی یان نے کہا۔ ”یہ لوگ اپنے شہروں میں بھی بد معاشیاں کرتے ہیں اور یہاں انہیں ایسی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ یہاں کسی نام نہاد اکیڈمی سے سرٹیفکیٹ حاصل کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور اپنے شہروں میں شاؤلن نیپل کا رعب بھاڑتے ہیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”شاؤلن نیپل پتھروں کی بنی ہوئی عمارت کا نام نہیں۔ یہ تو ایک اکیڈمی ہے۔ مارشل آرٹ کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ لوگ دور دراز سے اس فن کی تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔ برسوں یہاں بڑے رہتے ہیں۔ ماسٹر ز مارستے ہیں۔ دکھ اٹھاتے ہیں تب تمہیں فن کے اس سمندر سے ایک قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن یہ یورپین باشندے یہاں آتے ہیں۔ مہینہ دو مہینے رہ کر پلے جاتے ہیں اور اپنے شہروں میں جا کر پلے سے بڑے بد معاش بن جاتے ہیں۔ اغوا، ڈکیتیاں، قتل و غارت، منشیات فروشی اور ایسے ہی گھناؤنے کاروبار تو یہ خود کرتے ہیں یا ایسے کاروبار میں ملوث لوگوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف دولت کمانا ہوتا ہے۔ کسی بھی طریقے سے۔ یہ فن دولت کمانے کے لیے نہیں ہے۔ نہ ہی بد معاشی اور غشہ گردی کے فروغ کے لیے ہے۔ یہ آرٹ تو اخلاقی قدروں کا محافظ ہے۔ برائیوں کے سامنے بند باندھنے کے لیے ہے لیکن یہ جان کر دکھ ہوتا ہے کہ یورپ میں اس فن کو برائیوں کے فروغ کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے لیکن بہر حال۔“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا ”تم لوگ بیٹھو۔ میں ماسٹر ہنگ پائی سے بات کرتا ہوں۔“

وہ دفتر سے نکل کر شیڈ سے باہر چلا گیا۔ ہم اسے دفتر کی کھڑکی سے دیکھتے رہے۔ وہ سامنے والی چٹان پر چڑھ کر ایک غار میں داخل ہو گیا۔ غار کے دہلیز پر اس طرح طے ہوئے تھے کہ ایک خوب صورت محراب سی بن گئی تھی۔ اس میں لکڑی کے تختوں کا دروازہ بھی لگا ہوا تھا۔ لیشی یان اس دروازے میں غائب ہو گیا۔

ماسٹر لیشی یان کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ ہمیں اس چٹان والی محراب میں لے گیا۔ اندر سے یہ عمارت بڑا تھا اور مختلف حصوں میں تعمیر تھا۔ ماسٹر لیشی یان ہمیں ایک بہت بڑے کمرے میں لے گیا۔ جہاں ایک چوتھرے پر گوتم بدھ کا مجسمہ ”فاسٹنگ بدھ“ رکھا ہوا تھا۔ پتھر کا یہ مجسمہ بڑی نفاست سے تراشا گیا تھا۔ فائدہ زدہ دکھ کا پیٹ

اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پسلیاں نمایاں طور پر نکلتی تھیں۔ مجسمے کے سامنے ایک خوب صورت پتھر کا سلگ رہا تھا۔ جس کی بھیجیں بھیجی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میدھا والے چوتھرے کے سامنے ذرا بائیں طرف چوکی پر ایک آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں والی پکی چادر تھی۔ کمر بالکل سیدھا اور کھلے کے چھلکے کی طرح صاف تھا جو ٹیوب لائٹ کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ کوئی جوان آدمی تھا۔ طرح بالکل سیدھا بیٹھا ہوا ہے۔ ماسٹر لیشی نے اس کی سرکوشی میں کچھ کہا اور جب پتھر کی چوکی پر بیٹھنے ہمارے طرف گھوما تو میں اچھل پڑا۔ اس کے چہرے کا جالا سا ہوا تھا اگر میں کو خوش بھی کرتا تو پتھر گھس سکتا تھا۔

وہ ماسٹر ہنگ پائی تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاسی کے درمیان ہوگی مگر وہ جس طرح سیدھا بیٹھا ہوا تھا مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔ سامنے سے اس کا چہرہ تھا اور گوتم بدھ کی طرح اس کی پسلیاں بھی نمایاں ہو رہی تھیں۔

میں نے فوراً ہی اسے پوچھا تھا۔ ماسٹر لیشی یان نے سامنے دو نوں ہاتھ باندھے سر ہٹائے کھڑا تھا۔ پائی نے سیدھا ہاتھ آئینہ یاد دینے والے انداز میں لیشی یان نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے ہاتھ بوڑھے کے سامنے دوڑا تو... جو کر بیٹھ گیا۔ جاگے ہمارے پیچھے دو قدم کے فاصلے پر بیٹھ گئی تھیں۔

ماسٹر ہنگ پائی کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ عجیب سی مقناطیسی کشش تھی ان نظروں میں۔ ان کے باوجود ان کی نظریں نہیں ہٹا سکا۔ میرے پاس چوہنیاں سی بیٹھنے لگیں اور ریزہ کی ریزہ میں ایک لہری دوڑتی چلی گئی۔ مجھے کئی سال پہلے کاروبار کا جب ہنگامہ تھا کہ میں ماسٹر ہو چن عبادت گاہ کے خاندان کے ایک ایسے ہی بڑے اسرار بوڑھے کے سامنے بیٹھ گیا۔ وقت بھی میری کچھ ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھونکے تھے۔ ایک لمحے کو ماسٹر ہنگ پائی کی آنکھوں میں میری نظر آئی۔ میں جھرمجھری لے کر رہ گیا مگر میری آنکھوں سے نہیں نہیں۔ ماسٹر کی آنکھوں میں

جی جی اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ جی جی نے ایک بار پھر آئینہ یاد دینے والے انداز میں ہاتھ اٹھا دیا۔

”کہاں رہے تھے۔ تمہیں تو ڈھائی مہینے پہلے یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔“ ماسٹر ہنگ پائی نے کہا۔

جی جی کا اشارہ آواز تھی اگر وہ پردے کے پیچھے بیٹھا ہوں رہا ہوتا تو یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ یہ کسی اتنی تو بے سالہ بوڑھے کی آواز تھی لیکن اس کی بات سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آ رہا ہوں۔ میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر اسے راستے میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتانے لگا اور پھر یہ بھی پوچھنے بغیر رہ سکا کہ اسے میرے بارے میں کیسے پتا چلا۔

”جب تم تھائی لینڈ سے نکلے تھے تو وانگ وانگ پائی نے مجھے نلی فون پر ہمارے بارے میں بتا دیا تھا۔“ ماسٹر ہنگ پائی نے کہا۔ ”مجھے بہت دنوں سے تمہارا انتظار تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے جس کے لیے وانگ وانگ پائی جیسا شخص اتنے بے تاب ہو رہا ہے۔ اس کا انتخاب غلط نہیں۔ گزشتہ رات وہاں کی سڑے میں جو کچھ بھی ہوا اس کا بھی مجھے علم ہو چکا ہے۔ وہ دونوں یورپین چند روز پہلے یہاں آئے تھے اور فزائگری کرتے پھر رہے تھے۔ تم نے جس طرح ان کا حلیہ بگاڑا ہے وہ اس کے مستحق تھے۔“

”میری فائٹ صرف ایک کے ساتھ ہوئی تھی۔ دوسرے کو تو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کا حلیہ تو ان دونوں نے بگاڑا تھا۔“ میں نے پیچھے بیٹھی ہوئی جاگی اور چیکو کی طرف اشارہ کیا۔

”واہ! وانگ پائی نے تمہیں سونا بنا دیا ہے۔ یہاں دنیا کی سبھی سے کم نکلن بن کر نکلو گے۔“ ماسٹر ہنگ پائی نے کہا۔

اور اس کے بعد مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں اور پھر مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ ماسٹر ہنگ پائی کے بارے میں یہاں کے لوگ کیوں نہیں جانتے تھے۔ ہنگ پائی اس کا اصل نام تھا۔ جسے سماراج اور اس کی عمر کے لوگ ہی جانتے تھے۔ جبکہ یہاں وہ ہنگ شول کے نام سے جانا جاتا تھا اور ہم ہنگ پائی کے نام سے پوچھتے رہے تھے اور بالآخر ہمیں ایک بوڑھے سی اس کا پتا چلتا تھا۔

میں نے تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی دیر تک یہاں کھانا کھاتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر ہم اس کے ساتھ اس غار سے باہر آ گئے۔

ماسٹر لیشی یان ہمیں ایک اور غار میں لے آیا۔ یہ غار زیادہ بڑا نہیں تھا اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں دو آدمی پہلے ہی سے رہ رہے تھے۔

”یہاں دو جاپانی شاگرد رہ رہے ہیں۔“ ماسٹر لیشی یان نے کہا۔ ”میں دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے یہ کراہتم تھیں کے لیے کافی ہوگا۔“

”ہمیں صرف سونے کی جگہ چاہیے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دن ہماری آزادی کا تھا۔ ماسٹر لیشی یان نے ہمیں اجازت دے دی کہ اگر ہم چاہیں تو آج کا دن کھوم پھر کر اس شہر سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نے فاکو کا کوچی نام کے ایک طالب علم کو ہمارا گائیڈ مقرر کر دیا۔ کوچی کو دیکھ کر مجھے گانگ یاو آگیا۔ کوچی کی عمر تیس۔ پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ درمیانہ قد، پتھر پر بدن، لمبے بال جنہیں وہ گردن پر پٹیا کی طرح باندھ لیا کرتا تھا۔ وہ دو سال سے یہاں تھا۔ وہ جاپان کے ساحلی شہروں کے رہنے والا تھا۔ جہاں کچھ عرصہ اس نے ایک سال تک کیوٹن کی تربیت حاصل کی لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھا پھر تائی کوئڈو کیپ میں چلا گیا۔ وہاں بھی مطمئن نہیں ہوا تو شاؤلن نیپل آگیا جہاں ابتدا سے کنگ فو کی تربیت کا آغاز کیا۔ دو سال میں وہ بہت کچھ سیکھ چکا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ ابھی وہ ابتدائی مدارج میں ہے اور آگے چل کر اسے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

کوچی کی رہائش اسی غار میں تھی جو اب ہمیں دیا جانے والا تھا۔ اس کا سامان وہیں رکھا ہوا تھا۔ اس نے چیکو اور جاگی کو بھی دیکھا۔ عورتوں کا نیم عریاں لباس اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن جاگی کو دیکھ کر نجانے کیوں اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس نے پتھر کے پھونے سے چوتھرے پر رینگے ہوئے اپنے سوٹ کیس میں سے ہلکے نیلے رنگ کی ایک نئی شرٹ نکال کر جاگی کی طرف بڑھادی اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ایک طرف کبل تان کر غار کا ایک چھوٹا سا سادہ الگ کمرہ بنایا تھا۔ جاگی نے مسکرا کر کوچی کی طرف دیکھا اور کبل کے پچھلی طرف چلی گئی اور دو تین منٹ بعد شرٹ تبدیل کر کے باہر آئی۔

چیکو ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر رات والے یورپین غمنوں سے آمناسامنا ہو گیا تو بھگڑا ہوگا۔ ہم نے بھی ساتھ چلنے کے لیے اس پر زور نہیں دیا۔

دریا پار کر کے ہم شہر میں آ گئے۔ یہ واقعی ایک چھوٹا سا

شرعی تھا۔ کوچی ہمیں سب سے پہلے شاولن نیپیل لے گیا۔  
بست بڑی عبادت گاہ تھی۔ مرکزی ہال میں ایک بڑے  
چبوترے پر گوتہ بدھ کا بت بڑا سنگی مجسمہ استادہ تھا۔

یہ عبادت گاہ کئی حصوں میں منقسم تھی۔ ایک دور افتادہ  
حصہ عبادت و ریاضت کے لیے مخصوص تھا۔ زمانہ قدیم میں  
بدھ کے پیروکار نروان کی تلاش میں دنیا کو گھوم کر یہاں آتے  
ہوں گے۔ اس زمانے میں یہ جگہ آبادی سے دور و راز اور  
الگ تھلک سمجھی جاتی تھی۔ عبادت و ریاضت میں کسی  
مداخلت کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ راہب پوری یکسوئی سے  
ریاضت میں مصروف رہتے ہوں گے لیکن اب وہ صورت  
حال نہیں رہی تھی۔ اب تو یہ بڑی پُر ہنگام جگہ تھی۔ عبادت  
گاہ کا کنٹرول بہر حال اب بھی مجکشوؤں کے پاس تھا۔

ہم تقریباً دو گھنٹے تک عبادت گاہ کے مختلف حصوں  
میں گھومتے رہے۔ ایک مجکشو بھی ہمارے ساتھ تھا جو کوچی کو  
جانتا تھا۔ وہ ہمیں عبادت گاہ کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔  
عبادت گاہ سے نکل کر کوچی ہمیں مختلف جنازیم میں  
گھماتا رہا۔ ہر جنازیم میں رونق تھی۔ ایک بات میں نے  
خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ یہاں مارشل آرٹ کی تربیت  
حاصل کرنے والوں میں نوٹے فی صد تعداد غیر ملکیوں کی  
تھی۔ کوچی بتا رہا تھا کہ بعض لوگ تو دو تین مہینے رہ کر ہی  
واپس چلے جاتے تھے۔ ایسے لوگ کسی نام نہاد ماسٹر کو رقم  
دے کر سند حاصل کر لیتے تھے جسے وہ اپنے شیروں میں جا کر  
استعمال کرتے تھے اور بعض لوگ کئی کئی سال تک یہاں  
تربیت حاصل کرتے تھے۔

”بدھ کی شام یہاں بڑی رونق ہوتی ہے۔“ کوچی بتا رہا  
تھا ”بدھ کی شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک ہر جنازیم  
میں پاؤٹ ہوتے ہیں جن میں زیر تربیت مارشل آرٹسٹوں کو  
اپنی اپنی صلاحیتوں کو رکھنے کا موقع ملتا ہے۔ صبح میں ایک بار  
مرکزی جنازیم میں چیلنج مقابلے ہوتے ہیں جو بڑے دلچسپ  
اور سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں کے دوران میں بعض  
اوقات ناخوشگوار واقعات بھی پیش آتے ہیں اور ماسٹرز کو  
مداخلت کرنی پڑتی ہے۔“

ہم مختلف جنازیمز میں گھومتے رہے۔ ایک جنازیم سے  
باہر نکلتے ہی میں ٹھک کر رک گیا۔ سامنے سے وہی لمبے پالوں  
والا نوجوان آ رہا تھا جو گزشتہ رات جاگی اور چیکو کے ہاتھوں  
پٹ چکا تھا۔ جاگی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

لمبے پالوں والا وہ غنڈا جنازیم میں جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ  
کر وہ رک گیا۔ اس کے ہونٹ سو بے ہونے تھے اور دائیں

رخسار پر بھی نیلا سادہ ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ رات کو میں اس کا  
ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ جاگی  
اور چیکو نے اس کی اچھی خاصی حرمت کر ڈالی تھی۔ وہ  
ہمارے سامنے رک کر خوں خوار نظروں سے باری باری گئے  
اور جاگی کو گھورنے لگا۔ ایک سرسری نگاہ اس نے کوچی پر  
بھی ڈالی تھی۔

”ہیلو۔“ جاگی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس  
کے ہونٹوں پر اشتعال دلانے والی مسکراہٹ تھی۔

اس کی بھوس تن گئیں۔ وہ چند لمبے جاگی کو گھورتا رہا  
پھر میری طرف رخ کر کے ایک انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

”کل کی رات میں بھولا نہیں ہوں۔“ نرودر بھی ابھی اپنی  
چوٹیں سہلا رہا ہے لیکن وہ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا  
تم بھی کل رات کے واقعے کو ذہن میں رکھنا۔“

”نرودر۔ اوہ۔“ میں نے کہا ”شاید تم اس صبح کی بات  
کر رہے ہو۔ میں اسے بالکل نہیں بھولا لیکن تمہارا اپنا  
بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ہم تم لوگوں کو یہاں سے بھاگنے نہیں دیں گے۔“  
نے سر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم بھاگنے کے لیے یہاں نہیں آئے۔ تمہارا یہ ہونا  
ٹھیک ہو جائے تو ملاقات کرنا۔“ میں نے کہا۔

”اور میں دعا کروں گی کہ اس وقت تک تمہارا کسی اور  
لڑکی سے آتما سامنا نہ ہو جائے۔“ جاگی کے ہونٹوں کا  
مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

وہ پیر پٹتا ہوا جنازیم میں داخل ہو گیا۔

”یہ شاید ان دونوں میں سے ایک ہے جن کی گزشتہ  
رات تم نے پٹائی کی تھی۔“ کوچی نے میری طرف دیکھ  
ہوئے کہا۔

”اسے تو میں نے چھوا بھی نہیں تھا۔ اس کا دلہ نہا  
اور چیکو نے بگاڑا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
کوچی ہمیں ایک چھوٹے سے ریستورنٹ میں لے گیا۔  
کھانا کھانے کے بعد وہ ہمیں پھر گھماتا رہا اور مختلف جنازیمز  
اور ماسٹرز کے بارے میں بتاتا رہا۔

شام سے ذرا پہلے ہم واپس آ گئے۔ اس مرتبہ رستے  
پل سے گزرتے ہوئے جاگی کو ذرا بھی خوف محسوس نہیں  
تھا۔

کوچی اور اس کے ساتھی کا سامان اس عمارت سے باہر  
تھا اور ہم تینوں کے لیے لکڑی کے تخت بچھا دیے تھے۔  
رات کو ماسٹر کیسی یان نے بتایا کہ صبح پانچ بجے ہمیں

جائے گا۔

ان پہاڑیوں میں لاتعداد غار تھے جہاں مختلف ماسٹرز نے اپنے ٹھکانے اور جہازیں بنا رکھے تھے۔ یہاں نہ صرف بجلی بلکہ بجلی فون کا نظام بھی موجود تھا۔ دن بھر آوارہ گردی کرتے ہوئے ہم تھک گئے تھے اس لیے رات کو جلدی سو گئے۔ اور پھر صبح ٹھیک پانچ بجے ماسٹر کیٹی یان نے ہمیں جگا دیا۔ جاگتی چلیو کو چنگاٹے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ اٹھ کر نہیں دی۔ میں اور جاگتا غار سے نکل کر ماسٹر کیٹی یان کے ساتھ چل پڑے۔

ان غاروں کو دیکھ کر مجھے بچپن میں اسپین کے بارے میں دیکھی ہوئی ایک ڈاکو منزی فلم یاد آئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ شہر میں تمام تر سولتیں ہونے کے باوجود اسپین کے باشندے پہاڑی غاروں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ ان غاروں میں بھی انہیں تمام تر شہری سولتیں حاصل تھیں۔ یہی صورت حال یہاں بھی تھی۔ ان پہاڑیوں کے غاروں میں بھی ایک پورا شہر آباد تھا۔

یہی ان ایک پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ تنگ سی گچھندی تھی۔ ابھی نضا میں اندھیرا سا تھا۔ راست صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ جاگتی میرے آگے تھی۔ اسے ایک دو مرتبہ ٹھوکریں بھی لگی تھیں اور اسے میں نے گرنے سے سنبھالا تھا۔

یہ پہاڑی پانچ چھ سو فٹ بلند تھی۔ اور ایک ہزار سا میدان تھا اور ماسٹر ہنگ پانی ایک پتھر پر اپنی پانی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے اسے بوکیا اور اس کا اشارہ پا کر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ پتھر کی زمین پر اس طرح دو زانو ہو کر بیٹھنا خاصا تکلف وہ تھا لیکن ظاہر ہے ہم اپنی مرضی سے کسی اور طرح نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

”مجھے یقین ہے دانگ ونگ یا بے نے تمہیں بت کچھ سکھایا ہوگا۔ وہ کسی ایسے شخص کو یہاں میرے پاس نہیں بھیج سکتا جس کا دل خالی اور سینہ کھوکھلا ہو۔“ ماسٹر ہنگ پانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”راج میں تمہیں کچھ ابتدائی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ جن سے تمہیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ مارشل آرٹ صرف لڑائی بھڑائی کا نام نہیں اور یہی بہت کچھ ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”مارشل آرٹ جس شخصیات کا حامل ہوتا ہے وہ بچہ بنیادی اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ خواہش ”ارادہ“ ایثار، عمل اور ذہن۔

”اپنی ذات اور دنیا کے لیے یہ ایک خواہش ہے کہ ہم

اسے بہتر دیکھنا چاہتے ہیں۔ زندگی ہم سے تقاضا کرتی ہے۔ اس چیلنج سے عمدہ رہا ہوں۔

”ہمت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ”ذاتی دفاع“ صرف جسمانی اور مدافعت کے عمل تک محدود ہے۔ اپنے جسم کی حفاظت کیے کی جائے اور اپنا دفاع کیے کر ہے۔ یہ درست ہے کہ جسم آدمی کی شناخت اور پہچان ہے اور وہ جسم جس کی روح مرچکی ہو، اسے یہ بات درجہ تو دے سکتے ہیں آدمی نہیں کہہ سکتے۔ مارشل آرٹ طالب علم ابتدا ہی میں اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ دفاع کرتے ہوئے وہ دراصل روح کا دفاع کر رہا ہوتا ہے جسم کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

”جہاں تک ذاتی تحفظ کا تعلق ہے تو اس کا مفہوم کے لیے طالب علم کو اپنا کمر اور مسلسل مشاہدہ کرنا پڑتا ہے اور اپنی فطرت کا کمر مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ کتاؤں، بچہ اور خارجی ہدایات سے ایک طرح کی امداد اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے مگر ذات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے دل اور روح کو خوشنما پڑتا ہے۔“ ماسٹر ہنگ پانی خاموش ہوئے میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دن کا پھیلنے لگا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سکون اور کھلا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ماسٹر ہنگ پانی دوبارہ لگا تو اس کی آواز روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی گونج رہی تھی۔

”مارشل آرٹ کو معلوم ہے کہ ذات کا سارا آسان نہیں ہوتا۔“ وہ کہہ رہا تھا ”اور یہ کام ایک دن نہیں ہو جاتا۔ آدمی جب تک زندہ رہتا ہے اسے خود غور و خوض جیسے عمل سے مسلسل گزرنا پڑتا ہے۔ درخت ذات کا یہ سخر اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک وہ قائم رہتی ہے۔ اس کے لیے مشاہدہ، امتحان، تمرین اور ننگ ضروری ہوتا ہے۔“ ذات ”اس کے سخر کے میں ایک مارشل آرٹ پر جو کچھ منکشف ہوتا ہے اوقات حیران کن بھی ہوتا ہے اور وہ خوف زدہ بھی لیکن بہر حال اس کا انعام بھی ملتا ہے۔ بشرطیکہ اختیار کرنے کی جرات کر لی جائے۔

”مارشل آرٹ کے طالب علم کے لیے بنیادی ہے کہ وہ ذات کو پہچانے“ اس کا علم بہت سے مرتبہ کو کھولتا ہے اور زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ”یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر مارشل کا طالب علم روحانی پهلو کو اس قدر اہمیت دیتا ہے

روح کی بلدی کے لیے اسے کڑے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے اور اپنی کھنیاؤں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو جسمانی پهلو کو نظر انداز کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ پھر اس کے جسمانی کام آتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جسم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جسم کے بغیر روح اپنے عمل کی توفیق کھودیتی ہے۔ روح کا ساسھی ہے اور روح اس کے ذریعے حکومت کرتی ہے۔ اس لیے جسم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کماؤ واسطہ بنا کر معاشرے میں وہوں سے رابطہ کرتے ہیں اور میل ملاپ برہماتے ہیں۔

”جہاں تک ذات کا تعلق ہے تو وہ مفرد اور تنہا ہوتی ہے۔ اس میں معاشرت پسندی ہوتی ہے۔ وہ تنظیم کا خیال رکھتی ہے۔ اس لیے ہر فرد کا فرض بنتا ہے کہ وہ معاشرے میں اپنا جگہ کر دے اور اس کے خواہ افروزی سطح پر ناکام ہی کیوں نہ ہو۔

”تائو ازم TACISM کا پانی (LAOTZE) لاؤ زے کہتا ہے ”سکون اور امن پسندی سے زندگی بسر کرو۔ نہ فطرت سے الجھو نہ آپس میں لڑو۔ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو اپنی ذات سے نقصان نہ پہنچاؤ۔ اگر تم نے یہ مفات اپنی ذات میں پیدا کر لیں تو پھر دنیا کا کوئی شخص تم سے نہیں لڑے گا۔ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بدلے مہلکی کر۔ جو لوگ تمہارے ساتھ آجیتے ہوں ان کے ساتھ اچھے اور جو تمہارے ساتھ دشمنی کریں ان کے ساتھ بھی اچھا کر۔“ شخص شخص کے ساتھ خلص رہو اور جو تمہارے ساتھ خلص نہ ہو اس کے ساتھ بھی اخلاص برتو۔ نرم ترین شے سخت ترین شے سے ٹکرانے کی طاقت رکھتی ہے۔ دنیا میں سب سے کمزور اور نرم چیز پانی ہے لیکن کسی سخت سے سخت اور مضبوط سے مضبوط چیز کے ساتھ ٹکرانے والی اس سے زیادہ طاقتور چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی۔“

”مارشل آرٹ کا ماہر بھی کچھ ایسی ہی خاموش قوتوں کا حامل ہوتا ہے کہ کچھ بڑے اور مارشل آرٹ کے ماہر دونوں میں یہ باطنی قوت یکساں طور پر موجود ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ پر غور کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی اصلاح بھی خود ہی کرتے ہیں۔ تاریخ انہما کر دیکھ لو۔ یہ باطنی قوت ہمیں دنیا کے ہر بڑے آدمی میں دکھائی دے گی۔ مثال کے طور پر سقراط نے سولہ اسے معلوم تھا کہ اسے زہر پلایا جا رہا ہے مگر اس نے سولہ پلا دیا۔ جب تک اس کا یہی عمل اس کی عمر بڑھاتا ہے۔ لیکن اسے زندہ رکھنے والا تھا۔ ملین نے بیانی کھودی لیکن اسے معذوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے

اپنی مشہور فلم ”فردوس گم گشتہ“ تخلیق کی تھی۔ بیٹھو دن (BEETHOVEN) بھرا ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے موسیقی کو دنیا کو نئے شروں سے آشنا کر دیا۔ نواں راگ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔“

ماسٹر ہنگ پانی ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ دن کی روشنی کچھ اور ٹھیک آئی تھی میں نے نہ تو تھکا ہوا سرا خایا اور نہ ہی ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ میرے دامن بائیں جاگی اور ماسٹر کیٹی یان بیٹھے ہوئے تھے ان کے جسم بھی ساکت تھے اور سانسیں جیسے ٹھم گئی تھیں۔ ماسٹر ہنگ پانی کہہ رہا تھا۔

”بلاشبہ یہ وہ لوگ تھے جن کا جذبہ عظیم تھا اور جنہوں نے اپنی روح کی آگ کو جسم کے تقاضوں کے ہم آہنگ کر کے فنِ بارے تخلیق کیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی خیال کیا کہ معاشرتی طور پر ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور انہیں یہ ذمہ داریاں کس طرح سنبھالنی ہیں۔

دشواہیوں اور مصیبتوں کے باوجود انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ وہ روحانی طور پر مضبوط اور طاقتور تھے۔

”مارشل آرٹ بھی انہی معنوں میں روح اور جسم کی عظمت اور معاشرے کی مدافعت کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں۔ مارشل آرٹ کسی ”ذات“ کے جسم کی روح کا دفاع کرتا ہے جو کہ معاشرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہم ہانڈوں کی طرح کسی مارشل آرٹ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے حریفوں سے بہتر طور پر سازد سامان سے آراستہ ہو بلکہ سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ کس کے اندر کتنی سکت ہے۔ کتنی روح ہے کہ اپنی ذات کی چمک دمک کو نمایاں کر سکے۔ انفرادی مہارت کا تمام تر زور مدار ان سوالوں کے جوابات میں نمایاں ہوتا ہے جو مسلسل سامنے رہتے ہیں۔ یعنی میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں اور کہاں جا رہا ہوں؟

”مارشل آرٹ سے مرتبے اور حیثیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا مگر آدمی کے خیالات بلند ہو جاتے ہیں اور اس کی جرات اور حوصلے میں اضافہ ہوتا ہے۔

”ایک اچھا مارشل آرٹ اپنی ہی خصوصیات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ جبکہ طالب علم اپنے ماسٹر جیسا بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح دونوں ترقی کی منازل طے کرتے رہتے ہیں۔ جس سے ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

”ضروری نہیں کہ ایک کامیاب مارشل آرٹ اپنے سے کم تر ساسھی کے مقابلے میں جسمانی اور ذہنی طور پر زیادہ



طاقت ور ہو۔ درحقیقت کامیابی اور ناکامی کا انحصار ذات کے نظریے پر ہے یعنی یہ کہ اپنی ذات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر کیا ہے۔ میں کون ہوں؟ کیوں ہوں اور کس سمت میں جا رہا ہوں؟ جیسے سوالات کے متعلق جب وہ درست نظریہ اور جوابات رکھتا ہے تو ایک ماسٹر کی حیثیت سے اس کا رتبہ بلند ہوتا رہتا ہے لیکن اگر ان سوالات کے متعلق اس کے ذہن میں کوئی واضح نظریہ نہیں ہوتا یا اس کے جوابات بڑوانہ نوعیت کے ہوتے ہیں تو اس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے جبکہ واضح نظریے کا حامل ماسٹر کامیابی کی میزبیاں طے کرتا چلا جاتا ہے۔

”زندگی کے دوسرے شعبوں میں آزمودہ کار اور پختہ لوگ نو آموز اور مبتدی لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ ذرا آہستہ کام کریں تیزی نہ دکھائیں۔ جبکہ ایک تجربہ کار مارشل آرٹسٹ اپنے شاگردوں کو حوصلہ بڑھاتا رہتا ہے۔ کسی بھی مرحلے پر ان کا جوش و خروش سر نہیں ہٹتا۔

”مارشل آرٹسٹ کی پریکٹس زیادہ مشکل نہیں۔ اس کے سیکھنے والوں کو پابند رہنا پڑتا ہے اس لیے جد بندی بھی کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ اس مرحلے سے مسلسل گزرتا رہتا ہے تو اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔“

ماسٹر بینگ پائی ایک با پھر خاموش ہو گیا۔ اس مرتبہ میں نے جھکا ہوا سر اٹھ کر دیکھا۔ وہ اب بھی بالکل سیدھا پیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں ذرا بھی خم نہیں تھا۔ اس کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اس کی نظریں افق پر تیرتے ہوئے بادل کے ایک ٹکڑے پر مرکوز تھیں۔

”فطرت تیشہ سے ایک اچھی استاد رہی ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا ”سمندر کی موجیں چٹانوں سے سر کھرائی اور جھاگ اڑاتی ہیں۔ سورج نہایت آب و تاب سے نکلتا اور پھر ڈوب جاتا ہے۔ موسم باندی سے مقررہ وقت پر اپنا مزاج تبدیل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ موت اور زندگی کا ایک مسلسل چکر چلتا رہتا ہے۔ یہ سب کے سب کائنات کے مظاہرے ہی نہیں بلکہ فطرت کی قوت اور نمونہ کا اظہار بھی کرتے ہیں۔“

”زندگی کے دوسرے شعبوں میں نئی نئی ٹیکنیک کا زیادہ استعمال پسندیدہ عمل نہیں ہوتا مگر مارشل آرٹسٹ کی دنیا میں ایسا نہیں۔ یہاں اس بزرگ کا ہر لمحہ وقت کو شاں رہتا ہے کہ پرانے داؤ پیچوں کو نئی سمت اور نیا رخ دے سکے۔“

”مارشل آرٹ کی پریکٹس آدمی سے مکمل کھٹ مٹ کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس میں مادی نشوونما بھی نہیں ہے اور روحانی ترقی بھی۔ اس کے ساتھ تصویر اور ایکشن دونوں

ہی رہتے ہیں اور یہ کام ایک پوری عمر کا مقاضی ہوتا ہے۔ مارشل آرٹس میں آدمی کی باطنی اور ظاہری دونوں نوعیت سامنے رکھا جاتا ہے۔ فطرت سے ”روح“ کی شکل کا پتہ اور اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ مارشل آرٹ فطرت کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ اچھلتا نہیں۔ فطری طور پر اور صلاحیتوں پر ہی اس کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ قانون قدرت ہے کہ صرف موزوں ترین ہی زندہ رہتا ہے۔

”مارشل آرٹسٹ کسی ایک مقام پر مستقل نہیں رہتا۔ وہ اپنی مہارت کو بڑھانے کے لیے ہر لمحہ متحرک و مشغول رہتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں حریف بھی ہوتا اور دوست بھی۔ وہ ذاتی نشوونما کے لیے کسی بھی ممکنہ فیلڈ سے دریغ نہیں کرتا۔

”جیت طاقات کا مظاہرہ نہیں ہوتی۔ یہ دراصل کامیابی کا نام ہے جو آدمی اپنے مشن کی تکمیل کی شکل میں ہے۔ جیت حقیقتاً ایک تعمیری چیز ہے۔ تخریبی نہیں۔ مارشل آرٹ کا ماہر وہی کچھ کرتا ہے جو عین فطرت کے مطابق ہے۔ مثلاً فطرت میں تغیر کا عنصر موجود ہے۔ مارشل آرٹ کا کبھی جامد نہیں رہتا۔ وہ نہ تو باقی ہوتا ہے اور نہ گیم کا فیلڈ اس میں فکر کا مادہ تو ہوتا ہے لیکن خوف نہیں ہوتا۔ اختلاف تو کرتا ہے لیکن کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتا۔

”کسی آدمی میں صبر و تحمل، غور و فکر، استقامت و دلچسپی جیسی خصوصیات فوراً اور اچانک نہیں ابھر سکتیں۔ مارشل آرٹ کا طالب علم انہیں پوری تہیہ اور سرگرمی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک مشکل عمل ہوتا ہے اور اس لیے وہ قربانیاں دیتا ہے۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مارشل آرٹ کسی فلسفہ کا نام ہے؟ اس کا جواب ہے نہیں۔ درحقیقت یہ بزرگمردانہ روح کے اشتراک کا نام ہے۔ یہ اس لطیف توازن کا نام ہے جو خیال و عمل سے بنتا ہے۔ جب ایک ماہر جنگجو کو اپنے پیٹھ پر سوچتا ہوں۔ وہ جنگ کے دوران میں خیال و عمل ہونے کیونکہ جسمانی مقابلے میں خیال کو عمل میں ڈالنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

”مارشل آرٹ کی فلاسفی کو عمل کی شکل میں دیکھ جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں جسم کی تربیت ضروری ہوتی ہے۔ اگر جسم تربیت یافتہ نہ ہو تو دماغ کو عمل کے لیے اچھے نہیں مل سکتے۔ اس لیے مارشل آرٹس میں جسم اور خیال یکساں اہمیت دی جاتی ہے۔“ ماسٹر بینگ پائی ایک بار بار خاموش ہو گیا۔

میں نے سن اٹھیں۔ اسے جاگنی کی طرف دیکھا۔ مجھے یوگا کی پریکٹس تھی۔ میں اس پوزیشن میں بھی گھنٹوں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ جاگنی اس کی عادی نہیں تھی۔ وہ کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔

”اب تک جو بحث ہوئی ہے، اس سے یہ بھی علم ہوا ہے کہ آج کل عدم تحفظ کا احساس اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ”ماسٹر بینگ پائی“ کہہ رہا تھا ”آج کے پریکٹس دور میں آدمی ایسے حالات سے دو چار ہے جہاں اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے موزوں ذرائع نہیں رہے۔ اس کے پاس اے سانچی بھی نہیں ہوتے کہ وہ ضرورت پڑنے پر مدد کے لیے ان کی سمت رجوع کر سکے۔“

”ہمارے سماج میں تیزی بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے۔ دن دواڑے لوگوں کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ قتل اور زکیناں ہو رہی ہیں۔ پولیس کچھ بھی نہیں کر پاتی۔ دراصل پولیس کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ پوری طرح حالات پر قابو پاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی کارکردگی سے سخت بیزار ہیں۔ پولیس شرے شرے مہاراجوں کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہے۔ جرائم کی شرح بڑھ رہی ہے۔ ہر ذہن پر خوف طاری ہے۔ عالم یہ ہے کہ اصل بھرم تو آزادی سے دہناتے پھرتے ہیں اور خاندانی بے لے پولیس اکثر بے گناہوں کو پکڑ لیتی ہے۔ اکثر جھوٹی گواہیوں پر بے گناہوں کو سزا دی جاتی ہے۔ یہ صورت حال اکثر اوقات ذمے دار لوگوں کے علم میں بھی ہوتی ہے لیکن وہ بھی چپ رہتے ہیں۔ مارشل آرٹ کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں ہے اور اب یہ علم صرف لڑنے کا علم نہیں بلکہ خود حفاظتی کا علم بن گیا ہے۔ یہ علم آدمی کو اندرونی اور بیرونی دونوں خطروں سے بچاتا ہے۔“

”مارشل آرٹ صرف سماجی بہبود پر زور نہیں دیتا بلکہ یہ دنیا کی تکمیل سے بھی آشنا کرتا ہے اور اس کی ذات کو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند بناتا ہے۔“

”مارشل آرٹس کے طالب علموں کو اکثر اس پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ پیچ چلانے کی تربیتوں سے فعل مرتبے اور توازن کے فن پر دسترس حاصل کریں۔ توازن سے صرف یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جسمانی توازن سیکھا جائے بلکہ روحانی توازن پر توجہ دینی ہوتی ہے اور یہ توازن صرف توازن و ریزوننس ہی حاصل کرنا ہے۔ مارشل آرٹس میں توازن کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی نہ صرف مستحکم طور پر قائم رہتا ہے بلکہ اسے اپنی توازن بھی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کو اپنے کردار کی خصوصیت کو اجاگر کرنا

ہوتا ہے تاکہ وہ سماج کے لیے ایک بہتر فرد بن کر ابھر سکے۔

”مارشل آرٹس کے طالب علموں کو بہرحال جو فن سکھایا جاتا ہے، وہ خود حفاظتی کا ایسا طریقہ ہوتا ہے جس میں ہتھیار استعمال نہیں ہوتے۔ طالب علم کو ذہن اور جسم کی ایسی یکجا قوتوں سے آشنا کرایا جاتا ہے کہ دونوں چیزیں اسے ہر قسم کے خطرات سے بچانے کا باعث بن جاتی ہیں اور جب اس پر حملہ ہوتا ہے تو اس کی یہی ذہنی اور جسمانی قوتیں ایک ملکہ ہتھیار بن کر اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ مارشل آرٹس کے طالب علم کے ہتھیار بازو سے نہیں خریدے جاسکتے۔ نہ ہی ان کے لیے لائسنس کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ یہ طالب علم کے اپنے اندر کا حصہ ہوتے ہیں اس لیے انہیں کہیں رکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی البتہ ان کے لیے ذہنی اور جسمانی تربیت ضرور درکار ہوتی ہے جس میں اسے مستقل مزاجی، نظم اور ارادے کا درس دیا جاتا ہے۔

”گویا مارشل آرٹ کسی کو اس وقت تک نہیں سکھایا جاسکتا جب تک وہ فرد خود کو اس کا مستحق نہ بنالے۔ ایک طرح سے اسے از سر نو معصوم بنانا پڑتا ہے۔ اس کی پرانی عادات کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ”ذات“ کی ابتدا صفر سے کرنی ہوتی ہے۔ یہ کام مارشل آرٹس کے اسکولوں میں انجام دیا جاتا ہے۔ ویسے اسکول تربیت ہیں لیکن صحیح معنوں میں یہ کام صرف ان اسکولوں میں ہوتا ہے جہاں DO کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اور سکھایا بھی جاتا ہے۔ یہ JANG DO بالکل کسی مشقی MONASTERY طرح ہوتی ہے یعنی ایک مکمل عبادت گاہ۔ یہاں داخلے کی فیس کے طور پر آدمی سے مکمل طور پر ارتکاز ”توجہ اور COMPASSION کی طلب کی جاتی ہے۔ وہ جنہیں صرف کسی SKILL سیکھنے کا شوق ہو تو انہیں JANG-SUL میں جانا چاہیے۔ JANG-DO ان کے مطلب کے نہیں ہوتے۔“

”DO - JANG میں داخلہ پانے والوں کو بے شک فخر کرنا چاہیے یہاں مارشل آرٹس کے لیے ذاتی قربانی سکھائی جاتی ہے۔ یہ ایک مقدس جگہ ہوتی ہے۔ DO - JANG میں داخل ہوتے وقت طالب علم اس کو جھک کر تعظیم دیتے ہیں۔ DO - JANG میں داخلے کے بعد طالب علم کو تین قسم کی قوتوں پر عبور حاصل کرایا جاتا ہے۔ یہ تین قوتیں۔۔۔

NEA - GONG (باطنی قوت) OE - GONG (خارجی قوت) اور SHIM GONG (یعنی روحانی قوت۔

”باطنی قوت سانسوں کی مشق سے حاصل کرائی جاتی ہے کیونکہ دنیا کے تو نے فی صد افراد صحیح طرح سانس لینا بھی

”دو ہمشکو کس جا رہے تھے“ ماسٹر بنگالی کی کہہ رہا تھا۔  
 ”ایک دریا کے پاس ایک خوب صورت لڑکی نظر آئی جو دریا  
 پار کرتا جا چکی تھی لیکن باقی تیرے گمراہ اور وہ اپنے لباس کو  
 بچھیننے سے بچتا بھی جا چکی تھی۔ ان میں سے ایک ہمشکو نے  
 اس لڑکی کی مدد اس طرح کی کہ اسے اپنی پیٹھ پر لاوا اور دریا  
 کے دوسرے کنارے پر اتار دیا۔ دونوں ہمشکو پھر اپنی راہ پر  
 چل دیے۔ کچھ دور جا کر دوسرے ہمشکو نے پہلے ہمشکو کو  
 مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تمہاری یہ حرکت سراغریہ اخلاقی  
 بھی۔“ تمہیں کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے تھا۔“  
 وہ ہمشکو جس نے لڑکی کو اپنی پیٹھ پر لا کر گھروا پار کرایا تھا  
 خاموشی سے چہرہ مارا۔ کچھ دیر بعد اس نے جواب دیا ”میں نے

ہو گئی تھی۔ ماسٹر کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ وہ بوسگاہ کے انتہائی

میں نے جاکے کو اشارہ کیا اور  
 ایک کی ٹیبلٹ دے کر اترے ہوئے واپس آگئے۔  
 چوتھے والے تھے، چیک ابھی تک بے خبر سو رہی  
 تھی۔ اسے جھجھکاتا دیکھا گیا۔ اس کی ٹیبلٹ بھی دے دی  
 وہ تھک گیا۔ کوئی ہمارے لیے ناشتے کر گیا۔  
 سب سے بہتر وقت پر وہاں پہنچ جائیں۔  
 اس کے بعد ایک ہی تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ لڑکوں کی تعداد  
 اب تک ایک ہجڑہ رہی ہوگی۔ وہ سب بڑے مار والے

دوسرا بارہ سے شام چھ بجے تک وقفہ ہوتا تھا مگر ماسٹر لیش یان مجھے اور جاگنی کو کواجبجی بے چارہ لیتا اور ہماری کلاس شروع ہو جاتی۔ جاگنی کو شروع میں تو خاصی مشکل پیش آتی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔

کئی روز گزر گئے۔ اس دوران میں ہم ایک مرتبہ بھی ٹیپل کی طرف نہیں گئے تھے۔ کبھی کبھار کلاسنی رات کو

روک لیا۔ وہ اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر سامنے آئے تھے۔ دو کو تیس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ دونوں وہی تھے جو ہمارے ہاتھوں بٹ چکے تھے۔ لمبے بالوں والا انگریز نوجوان اور گنجا جڑن ٹیڈر۔ یہ نام دوسرے دن لمبے بالوں والے نے ہی بتایا تھا۔ ان کے ساتھ تیسرے آدمی نے سر پر کپڑا ڈال رکھا تھا جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بھی انہی کے قبیل کا کوئی ہوگا۔ وہ دروازے پر قیام اور گھنے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ ہاتھوں پیروں کا بھی خاصا مضبوط تھا۔

”ہم تو بہت دنوں سے تمہیں تلاش کر رہے تھے۔“ مجھے  
 پروڈر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہمیں بتا چل گیا تھا کہ  
 تم منگ شول کیپ میں چھپے ہوئے ہو۔ وہاں جانے کا ہم خطرہ  
 مول نہیں لے سکتے تھے لیکن یہ یقین تو تھا کہ تم اپنے بل سے  
 باہر ضرور نکلو گے اور آج ہمیں اطلاع مل گئی کہ تم اس طرف  
 کسی کے پاس آئے ہوئے ہو۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔  
 اس رات تو ہم دھوکے میں مار کھا گئے تھے لیکن آج تم نینوں  
 بیچ کر نہیں جاسکو گے۔“

”میں بھی بہت دنوں سے تم دونوں کی تلاش میں تھا۔“  
تیسرے آدمی نے کہتے ہوئے اپنے سر پر سے کپڑا ہٹا دیا ”مجھے  
بھی تم تینوں سے پرانا حساب چکانا ہے۔“

اس کا چہرہ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ گردن پر چیونٹیاں سی  
رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ ہمسایان تھا۔ ہمسایان  
سے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو وہ بھی ایک بھکشو کے  
بھیس میں تھا اور میں اور جاگتی بھی بھکشوں والا روپ  
دھارے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں رات گزارنے کے لیے دیا  
کے کنارے ایک عبادت گاہ میں لے گیا تھا جہاں میں نے  
اسے بتایا تھا کہ ہم شاؤن ٹینپل جارہے ہیں اور وہ اسی رات  
ہمیں نشہ آور مٹھائی کھلا کر ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔  
اس کے بعد ہمسایان سے ہماری ملاقات ڈانگ کو میں ہوئی

تھی۔ ہم نے اسے چھاپ لیا تھا لیکن وہ فائرنگ کرتا ہوا فرار ہو گیا تھا اور ہم کاراشان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ کیمیاں سے ہماری تیسری ملاقات راستے میں ہوئی تھی جب اس نے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ہماری دین پر حملہ کر دیا تھا۔ اس حملے میں دو آدمی مارے گئے تھے اور ہمیں قیدی بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد غار میں جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیل میں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور اب وہ میاں ہمارے سامنے ان دونوں یورپی غنڈوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ غار میں ان ڈاکوؤں کو ختم کر کے بھاگ نکلا

نہ ہونے کے بعد جانکی کے پاس رک جاتی۔ وہ مجھ

کئی ہندوستان کے شہر پنکڑی رہنے والی تھی۔ صوبہ  
سجن میں واقع اس شہر کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ کامنی  
تقدیر کے ایک برہمن گھرانے کے تھاکیں اس نے  
بچپن میں ایک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس نے تعلیم کے  
برہمن میں کرانے کی تربیت بھی حاصل کرنا شروع کر دی تھی  
اس کی کامنی باپ نے برداشت نہیں کر سکا کہ اس کی بیٹی  
اس کی تمام تر زبات کے لڑکوں کے ساتھ اس قسم کی حرکتیں  
کرتی ہے اس کے خیال میں لڑائی بھڑائی کا نام ہی دیا  
جائے گا۔ اس کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں کی وجہ  
اس کا لڑائی کی تربیت کا سلسلہ بار بار ٹوٹتا رہا لیکن  
لڑائی کرنے کے بعد اس نے پُر پُر سے نکلنا شروع  
کر لیا اور پھر پور میں اپنے ایک باہنہ دانش کے دوران میں  
اس نے ایک کرائے سینٹر سے ایک ٹیٹ تک ٹینگ حاصل  
کر لیا۔ یہاں کوئی ڈو اسٹر تھا۔ ایک روز وہ ایک ایسے  
میں مل گیا جہاں ایک نو کی ٹینگ دی جاتی تھی۔ اس  
سے سینٹر میں داخلے لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا  
کہ یہ سینٹر چمے پھوٹنے کے لیے ہے۔ یہاں اگلے  
پڑھتا ہے چمے چلانے کے سوا کچھ نہیں سکھایا جاتا۔ یہاں  
سے تین ٹینگ حاصل کرنے والے اسٹریٹ فاسٹری بن  
جاتے تھے۔

کافقہ مارشل آرٹس کے کئی اساتذہ کے لڑچکر کا  
 بیان بھی کیا تھا۔ وہ لگ فو سے سب سے زیادہ متاثر ہو کر  
 ہندوستان کے کئی بڑے شہروں میں لگ فو کے کئی سینٹر  
 کھولے تھے۔ وہ ہر لگ فو، بہمنی، کایک سینٹر ٹینک کے لگھا  
 اسے پنہا گیا مگر وہاں کا ماحول اسے پنہ نہیں آیا اور  
 اس نے شاولی کی تیاریاں کر لیا تھا اور مینی مارپیٹ کی کڑی  
 کی تیار کیا۔ کافقہ نے مکمل طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا۔

دو چھٹا ایک سال سے میاں تھی۔ کئی سینئر ڈھگوتے  
 نے نہ خواہ اس تنگ شول میں داخلہ لے لیا۔ وہ بڑی  
 سخت سے فن حاصل کر رہی تھی۔  
 تین سالہ جلاوت گاہ کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں  
 قیام اس کے کرتے میں دو افراد اور بھی رہ رہے تھے  
 جو بین الاقوامی اور ایک جاپانی۔ وہ دونوں اس کی سینئر

میں نرسنگ لے رہے تھے۔  
 بعض اوقات تو کمانی رات کو در تک ہمارے پاس  
 میٹھی رہتی اور جب وہ واپس جانے لگتی تو میں اور جانی بھی  
 دریا کے کنارے تک اس کے ساتھ جاتے۔

مختے میں دو دن کلاس نہیں ہوئی تھی۔ اس روز ہم نے کلاس کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسے ایک دن پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ شام کا اندھا چرا پھلتے ہی ہم کیمپ سے نکل گئے۔ ماسٹر کی شیپان نے ہمیں پہلے ہی مقابلہ رننگ کی وارننگ دے دی تھی کیونکہ یہاں ایک دوسرے کے کیمپوں کے لڑکوں پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے کیمپوں کی جاسوسی بھی کی جاتی تھی اور یہ جاننے کی کوشش کی جاتی تھی کہ اس کیمپ کے کس لڑکے یا لڑکی سے ماہانہ مقابلوں میں دوسروں کو خطرہ ہو سکتا ہے اسی لیے موقع پا کر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ وہ مقابلے میں شریک ہی نہ ہو سکے۔

میں اب تک ایک مرتبہ بھی اپنے نیپ سے باہر نہیں نکلا تھا لیکن کامنی کوچی اور دوسرے لڑکوں سے مجھے پتا چلتا رہتا تھا کہ میرے بارے میں دوسرے کیمپوں میں کچھ باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اپنے بھنازیم میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا تھا جو مجھے لگا ہوں میں رکھے ہوئے تھے۔ بھنازیم میں کسی کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اکثر لوگ لڑکوں کو زنگ کرتے دیکھنے کے لیے آتے رہتے تھے۔

وہ تین منزلہ عمارت تھی جس میں عربی کے درڑوں جیسے کمرے بنے ہوئے تھے ایک ایک کمرے میں کئی کئی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے کاسنی کے ساتھ بھی دو اور افراد اس کمرے میں رہائش پذیر تھے اور وہ سب مل کر کرایہ ادا کرتے تھے کمرے میں فریج نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان تینوں فرش پر اپنے اپنے بستر لگا رکھے تھے کمرے سے حق ایک چھوٹا سا تاجھہ روٹ بھی تھا۔

ہم دیر تک وہاں بیٹھے کامی اور ان دونوں ریڈیوں سے  
 باتیں کرتے رہے۔ کامی ان کے بارے میں سب کچھ بتا رہی تھی  
 کہی روز کا ساتھ ہونے کی وجہ سے اس میں بے لکھی اور  
 انانیت سی آگئی تھی۔

ہم رات گیارہ بجے کے قریب وہاں سے نکلتے وہ چاند  
رات تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ راستے میں رک کر تھوری دیر  
دیر کا نظارہ کر سگے اور پھر کمپ کی طرف لوٹ جائیں۔  
لیکن ایک موڑ ٹھہرے ہی تھے کہ تین آدمیوں نے ہمارا راستہ

تیزی سے نیچے بیٹھ گیا اور اسے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اوپر اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پست کے مل زمین پر گرا۔ کہکشان پر یہ واؤ استعمال کرنے کے لیے میں بالکل نیچے بیٹھ گیا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹوڈر کو حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی لک میرے بائیں کندھے پر لگی اور میں پیچھے الٹ گیا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے دوسرا حملہ کر دیا۔ یہ لنگ میری کھوپڑی پر لگی اور میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں پھیل رہیں۔ گھٹنے دینے لگا۔ ٹھوکر خاصی لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دیتے لگا۔ ٹھوکر خاصی زوردار تھیں۔ دماغ جھنجھٹا اٹھا تھا۔ حواس بحال کرنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور ان چند سیکنڈوں میں مجھ پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

ٹوڈر کے ساتھ کہکشان بھی میرے جسم پر ٹھوکر پیں برسا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے وائیں طرف دیکھا تو جاگی لمبے بالوں والے سے بھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کا مقابلہ برابر کا تھا اور مجھے خوشی ہوئی کہ جاگی ایک ایسے حریف کا مقابلہ کر رہی تھی جو تربیت یافتہ فائٹر تھا۔ بدلہ چیکو تھی۔ وہی ایک طرف کھڑی بیٹھ رہی تھی۔

اس دوران میں میری پہلوں پر ایک اور ٹھوکر پڑی اور میں پیچھے الٹ گیا لیکن ٹوڈر کا اگلا وار میں نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اپنے آپ کو اس حملے سے بچا کر میں اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔

ٹوڈر میرے سامنے تھا۔ اس کا بایاں پیر آگے کو نکلا ہوا تھا۔ ٹانگ میں اس طرح ٹم تھا کہ کھٹا بھی ذرا آگے کو نکل گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا بایاں پیر اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر رکھ کر... کھڑا ہو گیا اور سیدھی ٹانگ کو گھما کر دائیں باؤں اسٹائل میں اس کی کھوپڑی پر لک رسید کر دی۔ وہ ہلکا اٹھا۔ میں اچھل کر ہوا میں گھوم گیا اور فلائنگ لنگ کہکشان کے سینے پر رسید کر دی جو مجھ پر حملے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ دونوں چیختے ہوئے گرے۔ میں بھی گرا تھا لیکن ان سے پہلے ہی اٹھ گیا اور لمبے بالوں والے پر حملہ آور ہوا جو جاگی پر ایک خطرناک لگ لگانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میری لنگ اس کی انٹھی ہوئی ٹانگ کے نیچے لگی اور وہ ایک ٹانگ پر تاختا ہوا گر گیا۔

چیکو کی چیخوں کی آواز سن کر کچھ لوگ مختلف سمتوں سے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ دونوں جوان لڑکوں نے آگے بڑھنا چاہا مگر ایک آدمی تیزی سے آگے بڑھ آیا۔ اس نے

دونوں ہاتھیں اطراف میں پھیلا دیں اور چیخ کر کہوایا کہ کوئی آگے نہ بڑھے۔ جاگی نے لمبے بالوں والے کو اٹھنے کا موقع نہ دیا وہ اس پر ٹھوکر پیں برسا رہی تھی۔ میرے مقابلے میں تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ دونوں مجھ سے کبیں زیادہ تھے مگر میں جانتا تھا کہ مارشل آرٹ کی فائٹر طاقت نہیں ٹیکنیک کرشمہ دکھاتی ہے۔ کہکشان آرٹ نہیں تھا۔ اس کے کا لڑنے کے انداز میں پن تھا۔ البتہ ٹوڈر اس سے زیادہ خطرناک تھا۔ وہ استعمال کر رہا تھا اور ٹیکنیکس بھی لیکن وہ گرم ہوا تھا۔ طاقت اور ٹیکنیکس کے استعمال میں سوچا کرتا تھا۔ جبکہ میں اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے تھا کہ وہ کون سا واؤ استعمال کرنے والا ہے۔

ہمارے ارد گرد چالیس پچاس افراد اکٹھے ہوئے کامنی بھی شو کی آوازیں سن کر آئی تھی۔ اس۔ ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر اسے بھی روک دیا گیا۔ لوگوں کے چیخنے اور شور مچانے سے میں نے ان کو وہ سب میری فیر میں تھے۔ میں کوئی واؤ استعمال لوگ واہ واہ کراتے۔

کہکشان کی گردن پر لگنے والی میری دائیں بازو تو سب نے ہی چیخ چیخ کر آسمان سر اٹھایا تھا۔ لک کھا کر گرا تو دوبارہ نہیں اٹھا۔ ٹوڈر بھی ہاتھ بیٹھا تھا۔ میں اسے آخری لک مارنے مارنے رہا۔ کر دی لک لمبے بالوں والے کے کولھے پر جھانک رہا تھا۔ بال منحنی میں جکڑے دوسرے ہاتھ سے اس کے گھونے لگا رہا تھا۔ یہ بالکل بازا دی پن تھا۔ میری وہ لکڑا گیا۔ جاگی نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑایا اور ایک بھر پور گھونسا اس کے جڑے پر دیا۔ دوسری طرف سے میری لک اس کے پیٹ پڑی۔ ہوا دُہرا ہوا چلا گیا۔

وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر بڑے بائیں رہے۔ مجھ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں گھٹنے ہوئے وہاں سے دور لے جا کر پست لوگوں نے مجھے اور جاگی کو گھیر لیا۔ کامنی دونوں سے پلٹ گئی اور جو شخص بھوم سے نکل کر سب تک پہنچا تھا وہ کوئی تھا۔

کوچی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کے منکر اہٹ تھی۔ اس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ

یہی ہمارے تعاقب میں رہا تھا۔ جب ہم کامنی کے کمرے میں پہنچے ہوئے تھے تو اس وقت بھی وہ عمارت کے باہر کھڑا تھا اور جب کہکشان وغیرہ نے ہمیں گھیرا تھا تو اس وقت بھی وہ ہم سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اس نے ہماری لڑائی میں مداخلت اس لیے نہیں کی کہ میں ایسا ہی ان دونوں پر شروع ہی سے جاری رہا تھا۔ جاگی بھی لمبے بالوں والے سے بخوبی مت رسی تھی۔ کوچی کے کہنے کے مطابق اگر کوئی نازک مرحلہ آتا تو ضرور مداخلت کرتا مگر اس کا اسے موقع نہیں ملا۔ شاؤلن نیپل کے لوگوں نے اب تک میرے بارے میں صرف باتیں سنیں تھیں اور آج صبح سے لوگوں نے مجھے فائٹ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت لاتعداد تو میٹھی جملے میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ کئی لوگ میرے کندھے پھنستا رہے تھے۔

کوچی مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچتا گیا۔ جاگی اور چیکو میرے ساتھ تھیں اور کامنی بھی ہمارے ساتھ آ رہی تھی۔ ہمیں اپنے کیمپ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ جاگی کو کچھ اندرونی چوٹیں لگی تھیں۔ اس وقت تو جوش و خروش میں کچھ پتا نہیں چلا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا تکلیف کا احساس بھی اُٹا کر ہو رہا تھا۔ میں بھی اپنے کندھے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

کوچی ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے ایک ڈبیا کامنی کو دیتے ہوئے کچھ کہا اور مجھے ساتھ لے کر سامنے والی چٹان پر ماسٹر ٹیشی یان کے کمرے (غار) میں گھلایا۔ ہمیں اپنے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ ٹیشی یان کو اس واقعے کے بارے میں مختصر طور پر بتا چکا تھا اور اب وہ تفصیل سے سب بتاتا رہا تھا۔ ماسٹر ٹیشی یان غور سے اس کی باتیں سننے ہوئے بار بار میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ کوچی خاموش ہوا تو ماسٹر ٹیشی یان نے مجھے قصص اتارنے کا حکم دیا اور میں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ وہ میرے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ اس کی انگلیاں بڑی سختی سے میرے جسم میں گڑ رہی تھیں اور جب اس کا ہاتھ میرے بائیں کندھے پر پہنچا تو میرے منہ سے سکڑا سی آواز نکلی۔ وہ بار بار میرا کندھا دبائے لگا پھر اس نے کوچی سے کچھ کہا۔

کوچینا فوراً ہی ایک ڈبیا اٹھا لیا اور انگلی سے اس میں بھرا ہوا پیسٹ نکال کر میرے کندھے پر مالش کرنے لگا۔ اس دوران ماسٹر ٹیشی یان مجھ سے مختلف سوالات پوچھتا رہا۔ کوچینا بھی چیخ چیخ میں بول رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اپنے کمرے (غار) میں آگئے۔ جاگی اپنے بستر پر اونگھ مچی پڑی تھی اور کامنی اس کے کندھے پر مالش کر رہی تھی۔

کوچی باہری رنگ گیا تھا۔ مجھے بھی رکنا پڑا۔ چند منٹ بعد جاگی شرٹ پس کر بیٹھ گیا تو ہم اندر آگئے۔ کوچی کچھ دیر تک جاگی سے باتیں کرتا رہا پھر چلا گیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے کامنی چیکو کے ساتھ اس کے بستر پر لیٹ گئی تھی۔

صبح ٹھیک ساڑھے پانچ بجے میں اور جاگی پہاڑی پر پہنچ گئے جہاں ماسٹر ٹنگ پانی پیتے سے موجود تھا۔ اسے شاید رات ہی کو ٹیشی یان نے اس واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے اور جاگی سے مختلف سوالات کرتا رہا اور پھر ایک زور دار قسم کا کچھ بھی دے ڈالا۔

اس روز منگ شول جتنا زیم میں بڑا رش تھا۔ گزشتہ رات والے بنگالے کو میں نے ایک معمولی واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ایسے واقعات تو میرے ساتھ قدم قدم پر پیش آتے رہتے تھے لیکن یہاں اس واقعے کو بڑی اہمیت دی جا رہی تھی۔ تین آدمیوں کو ادھ موا کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔

میری شرٹ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ میں جس طرف سے گزرتا لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ دو چار دوسرے ماسٹر نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ مجھے اپنے کیمپ میں لینا چاہتے تھے اور اس کے لیے مجھے کچھ لالچ بھی دیے تھے لیکن میں نے کسی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔

ان غنڈوں سے میری فائٹ کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ منگ شول جتنا زیم میں داخلوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ دوسرے ماسٹر مجھے اپنے کیمپ میں کیوں لینا چاہتے تھے۔

ہر مینے مرکزی بننا زیم میں چیخنے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ وہ میرا پہلا مینہ ہی تھا۔ بعض لوگ مجھے اس نورٹمانٹ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں کی طرف سے ٹیشی یان پر دباؤ بھی پڑ رہا تھا کہ اس نورٹمانٹ میں میرا نام بھجھا جائے لیکن ٹیشی یان کا ایک ہی جواب تھا "ابھی نہیں۔"

اس مینے کوچی کا نام نورٹمانٹ میں شامل تھا۔ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہوا فائنل تک پہنچ گیا اور پھر اس نے فائنل بھی جیت لیا۔ دو سال کے عرصے میں کوچی نے جو کچھ میرے یہ نورٹمانٹ جیتا تھا۔ فائنل والے روز لوگ مجھے

رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ میں کسی نمائش مقابلے سے لے ہی رنگ میں اردن آؤں گی تاکہ ایک فائنل تو رنگ میں آکر مجھے چیلنج بھی کر دیا تاکہ میں اپنی جگہ پر کھڑا سکرا رہا ہوں۔

یہ اسی رات کی بات ہے۔ کوچی کا مقابلہ شروع ہونے والا تھا۔ ماسٹر کی شیپ ان کوچی کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ جاگتی تے میرا بازو پکڑ کر دیا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”وہ سامنے اس آدمی کو دیکھ رہے بڑھ۔ مجھے کچھ مشکوک سا لگ رہا ہے۔“ جاگتی تے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں اس طرف دیکھنے لگا۔

رنگ کے دوسری طرف تماشاخیوں میں کھڑا ہوا وہ آدمی ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد و قامت اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے گلابی رنگ کی پینٹ اور نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

”تمہیں شاید یاد نہیں آ رہا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ جاگتی تے میری طرف جھٹکتے ہوئے سرگوشی کی ”جیانگ رائے کے نواح میں جب ہم نے ایک کانچ پر حملہ کیا تھا تو یہ بھی جی فانگ اور م کے ساتھ تھا۔“

میں نے ایک بار پھر اس شخص کی طرف دیکھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ یا کردہ دوسرے آدمیوں کی آؤں میں ہو گیا۔

”ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ان کم بہتوں کی شکلیں ایک دوسرے سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ آدمی آسانی سے دھوکا کھا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کی ٹھوڑی پر اٹھیں طرف وہ سیاہ و سیاہ تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ جاگتی تے کہا ”یہ جزل کھوراث کا آدمی ہے۔ انہیں شاید کسی طرح یہ پھنک مل گئی کہ تم شاؤن نیپل میں ہو۔ یہ تمہیں تلاش کرتا ہوا میاں پہنچ گیا۔“

”یہ لوگ جیانگ رائے یا گولڈن ژرائی اینگل میں تو ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔ یہاں کیا کر لیں گے۔“ میں نے جواب دیا ”ہو سکتا ہے وہ ہماری تلاش میں یہاں نہ آیا ہو۔ اس کی آمد کا مقصد کچھ اور ہو۔“

”اس کے یہاں آنے کا مقصد کچھ بھی ہو۔ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ جاگتی تے کہا۔

جاگتی کے خدشات بے بنیاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک مشتبہ آدمی ہماری نظروں میں آ گیا تھا۔ ہمیں واقعی محتاط رہنے

کی ضرورت تھی۔ فائنل مقابلہ ختم ہونے کے بعد ایک ہڑبگ کی کوچی تھی۔ کوچی کو ژرائی ملنے ہی اس کے دوستوں نے اسے کندھوں پر اٹھالیا تھا اور وہ لوگ ایک جلوس کی صورت میں جمنائزم سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے اس مشتبہ شخص کو بھی جلوس کے ساتھ باہر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ جزل کھوراث ہی کا آدمی ہے تو ہمارا پیچھا کرے گا لیکن جمنائزم سے باہر آتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

یہ اس کے تین روز بعد کی بات ہے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہمارے جمنائزم میں اسٹوڈنٹس کی اسپرنگ ہو رہی تھی۔ کچھ تماشاخی بھی موجود تھے۔ میری باری آئی تو تمام لوگوں اور تماشاخیوں نے بڑے پُر زور انداز میں تالیاں بجائی تھیں۔

اسپرنگ دراصل مارشل آرٹ میں فائنل کی ابتدائی مشق ہوتی ہے جس میں طالب علم کو سبلے اور دفاع کی ٹیکنیک سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

میری اسپرنگ صبح نامی ایک مصری لڑکے سے تھی۔ وہ ہمارے ویٹ کا بڑا پرفیمنٹ لڑکا تھا اور ڈیڑھ سال سے اس کیپ میں پر ٹیکس کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ ٹورنامنٹ بھی جیت چکا تھا۔

دوسرے روز میں اس نے مجھے ایک زوردار سائڈ کلک لگائی تھی اور پھر چوہ مارنے کے لیے میری طرف لپکا۔ میں نے چوہ ہلاک کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا لیکن صبا حملہ آور ہونے کے بجائے اپنی جگہ پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ چوہ کے لیے اٹھا ہوا اس کا ہاتھ۔۔۔ گردن پر پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے کراہی نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

کوچی ریفری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی صبح کی طرف لپکا۔ صبا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ ہم سمجھے تھے اسے اچانک ہی پینٹ میں درد اٹھا ہے! ایسی ہی کوئی تکلیف ہوئی ہے نہ وہ برواٹ نہیں کر سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا تھا۔

اس کا سیدھا ہاتھ ابھی تک گردن پر تھا۔ میں نے چپے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹایا، میرا دل اچھل کر ملنے لگا۔ اس کی گردن میں ایک سوئی پوسٹ تھی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ بلو پائپ BLOW PIPE کے بارے میں میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ ایک دو فائیں بھی بھیجیں۔ ایک مخصوص قسم کے پائپ یا نیگی میں ڈھیر سے جم ہوئی سوئی رکھ کر پھونک ماری جاتی ہے۔ سوئی بہت ف سے

سے کسی بھی حصے میں پوسٹ ہو کر آٹا فانا اس کی زندگی کا فائدہ کر دیتی ہے۔ آج کل تو بلو پائپ میں بھی جدید ٹیکنیک استعمال کی جانے لگی ہے۔ اس کے اندر اسپرنگ و تیرہ استعمال ہونے لگے ہیں۔ بھونک مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نفا سائین دے دے ہی سوئی پائپ سے نکل کر شکار کی طرف چلتی ہے۔

کوچی نے بھی وہ سوئی دیکھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ تماشاخیوں میں کڑا ہوا ایک آدمی ہماری طرف دیکھا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اور آنکھوں میں دھند سی تھی۔

ماسٹر کی شیپ ان اور کچھ دوسرے لڑکے بھی دوڑتے ہوئے رنگ میں پہنچ گئے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حملہ چھ پر کیا گیا تھا کیونکہ صرف ایک سیکنڈ میں ہی جگہ پر تھا جہاں صبا کو سوئی لگی تھی۔ اگر میں اپنے آپ کو صبا کے چوہ سے بچانے کے لیے پھرتی ہے پیچھے نہ ہٹا تو وہ نہر ملی سوئی صبا کے بجائے میری گردن میں پوسٹ ہوتی۔

وہ آدمی اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر رنگ کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کے پیچھے لپکا لیکن ایک اور آدمی سے ٹکرا کر گر گیا۔ وہ آدمی بھی میرے ساتھ ہی کر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔

وہ آدمی دوڑنا ہوا تقریباً سو گز دور چکا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میرا خیال تھا وہ دریا کی طرف ہی جائے گا لیکن وہ پہاڑیوں میں ایک تنگ سے راستے پر مڑ گیا۔ ان پہاڑیوں میں ایسے کئی راستے تھے جن میں لوگوں کی تعداد رفت رہتی تھی لیکن اس وقت وہ تنگ ساراستہ سنسان پڑا تھا۔ اس آدمی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”تو میں پہاڑیوں کے گرد پھرانے کے بعد وہ بالآخر دریا کی طرف جانے والے راستے پر نکل آیا۔ وہ مجھ سے اب بھی تقریباً سو گز آگے تھا اور دریا کا رستوں والا پہل بھی زیادہ دور نہیں تھا۔“

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ جس میں نیپل پر قدم رکھا تو وہ مجھ سے صرف میں گز آگے تھا۔ اس وقت سامنے سے بھی ایک آدمی بلے پر آ رہا تھا۔ وہ بلے کے بالکل وسط میں چل رہا تھا۔

مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ مخالف سمت سے آنے

والے نے اس بھاگتے ہوئے شخص کو روکنے کی کوشش کی تھی یا وہ دونوں شخص اتفاقاً سے ٹکرائے تھے لیکن اس ٹکراؤ کے نتیجے پر خطرات کا کھلا تھا۔ مشتبہ شخص نہ صرف فوراً ہی سنبھل گیا تھا بلکہ اس نے دوسرے آدمی کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا تھا۔ دریا میں گرنے والے اس شخص کی چیخ بہت بھیاںک تھی۔

وہ شخص اب پھر دوڑ رہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان اب صرف دس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ رستوں کا یہیل جھولے کی طرح جھول رہا تھا اور اس پر دوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ شخص پہل پار کر گیا تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔

”اب یا کبھی نہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی اور پھر پیچھڑوں کی پوری قوت سے مل YELL کرتے ہوئے جھلانک لگا دی۔ اس وقت ہم پہل کے وسط میں تھے۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گرا اور اسے ساتھ لیتا ہوا پہل کے تختوں پر گر گیا۔ میں اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا دو چار فٹ آگے نکل گیا تھا اور وہ پیچھے رہ گیا تھا۔

وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور اٹھ کر اس نے میری کھوپڑی پر ٹھوکر مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا یہ حملہ کامیاب نہیں ہونے دیا۔ میں نے لپٹے یا لپٹے پاؤں ہاتھ سے اس کی ٹک ہلاک کی اور اس کے ساتھ ہی ایک زور وار بھٹکا بھی دے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر ہوا پشت کے من گرا لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں بھی فوراً ہی اٹھ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے مجھے اس سے کوئی نمائش مقابلہ نہیں کرنا تھا۔ وہ قاتل تھا اور اسے ہر صورت میں گرفت میں لینا تھا۔ اس نے تو مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اتفاق سے میں پہنچ گیا تھا اور میرا سامنی موت کی زد میں گیا تھا۔

وہ شخص جس طرح اچھل اچھل کر اسٹائنس بدل رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا۔ وہ حملہ کرنے کے بجائے بڑی تیزی سے بچے پیچھ گیا اور سوپ کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کے جھٹکنے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ میں بڑی پھرتی سے اچھل گیا۔ اس کا ٹانگیں گئے کو پھیل گئی تھیں اور وہ دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکائے ٹوکے طرح صوم رہا تھا

لیکن وہ مجھے سوپ نہیں کرسکا۔ آخری مرتبہ میں نے اوپر اچھلتے ہی اسے کھ لگادی۔ وہ پیچھے اٹ گیا۔

اس مرتبہ بھی وہ پھرتی سے اٹھ گیا اور اس بار اس نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ اسپین کھ لگانے کی کوشش کی لیکن میں دونوں بار اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے فوراً اسٹائلس بدل لیا۔ اس کے دونوں پیر اسٹریٹ لائنٹ میں تھے۔ یعنی ایک پیر آگے کو نکلا ہوا اور دوسرا پیچھے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے کون سی ٹیکنیک استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس پوزیشن پر حریف کو کھ تو نہیں لگائی جاسکتی تھی البتہ حریف کے وار کا دفاع کیا جاسکتا تھا پھر وہ مجھے کوئی چمکا دینے کے چکر میں تھا لیکن شاید اسے میرے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں ورنہ وہ ایسی سفاقت نہ کرتا۔

میں نے بچ کر جھانسا دیا اور اس کی آگے نکلی ہوئی ٹانگ "شوٹان" روک کر اسے اسٹاک کی سلاٹ فرٹ کھ لگادی۔ یہ ٹھگ اور سے نیچے کی طرف ذرا تھجھی لگتی جاتی ہے۔ اگر یہ کھ لگانے کا انداز نہ تھا تو حریف کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

میں اس کے ٹھنڈے پر کھ لگانا چاہتا تھا لیکن یہ کھ لگی اس کے ٹھنڈے سے چند انچ اوپر۔ اگر صحیح جگہ پر لگتی تو اس کا گھٹنا ٹوٹ جاتا اور وہ زندگی بھر پلٹنے کے قابل نہ رہتا لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کھ چند انچ اوپر لگی تھی۔

وہ نیچے گر کر فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی کوئی نمائشی مقابلہ کرنے نہیں آیا تھا جو در یک واؤ پیچ "زنا" نہ رہتا اسے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس کی پہلی کوشش ناکام ہو گئی تھی اور میرے بجائے ایک بے گناہ موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اتفاق سے میں نے ہی اسے گھیرا تھا۔

"تمہاری قسمت اچھی تھی کہ بلو پاپ کے وار سے بچ گئے۔" اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ "یہ خنجر بھی زہر میں بچھا ہوا ہے۔ اس کی نوک بھی تمہارے جسم کو چھو گئی تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے اور میں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ یہ تمہاری بد قسمتی ہے کہ تم میرے پیچھے آگئے ہو۔ اب سمجھو تمہاری زندگی پوری ہو گئی۔" وہ خنجر کو مخصوص انداز میں حرکت دیتا ہوا آگے بڑھا۔

اس کی بات پر شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ مجھے قتل کرنے ہی آیا تھا۔ پہلے بلو پاپ سے حملہ کیا گیا۔ وہ سوئی بھی

زہر میں بھیجی ہوئی تھی اور اس خنجر کے بھی زہر میں بچے ہوئے ہونے پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔

دو تین جھانسنے دینے کے بعد اس نے وار کر دیا۔ میں نے اس کی خنجر والی کلائی پکڑ لی اور پوری قوت سے موڑنے لگا۔ اس نے ایک اور حرکت کی۔ میری ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر زور وار جھٹکا دیا۔ اڑکھا لگنے سے میں ہٹ کر بل پڑنے لگا۔ اس کی کلائی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی مجھ پر چھلانگ لگادی اور میرے سینے پر خنجر سے وار کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

وہ خاصا ہٹا تھا اور مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا لیکن کٹھن ترین حالات اور سخت رشک نے میری ہانوں میں بھی قوت بھروی تھی۔ میں اس دقت اپنا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔

خنجر میرے چہرے سے صرف ایک انچ کے فاصلے پر رہا تھا۔ اس کی نوک کا بہت معمولی سا چرکا بھی میری زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ چہرے اور خنجر کی نوک کے بیچ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے نیچے کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ میں نے گھٹنا اس کی ٹانگوں میں رکھ کر زور سے جھٹکا دیا۔ نتیجہ کچھ خاطر خواہ نکلا۔ میرے سینے پر اس کا ہوجھ کسی قدر بٹا ہوا۔ اب میں نے پیر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں بھنسا دیا اور اسے بتدریج اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ کلائی پر میں نے گرفت مضبوط کی تھی۔ خنجر میرے چہرے سے دور ہوتا گیا اور پھر میں نے اپنی ٹانگ کو زور وار جھٹکا دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پٹ کے بل گر گیا۔

میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے بادلوں میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ لکڑی کے تختوں اور رستوں سے سنے ہوئے اس بل پر بھی زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اب کسی ایک جگہ قدم ہمارا کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا دشمن بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ خنجر لہراتا ہوا بڑے خطرناک انداز میں آگے بڑھا اور حملہ کر دیا۔ میں بڑی پھرتی سے جھکا دیے کر ایک طرف ہٹا۔ خنجر کی نوک میرے بائیں بازو پر آگئی۔ چرتی ہوئی نکلی گئی۔ اگر ٹی شرٹ وغیرہ ہوتی تو میرے بازو کا گوشت کٹ جاتا مگر میں نے مونے کیڑے کا مخصوص ذیلی پسینہ رکھا تھا جو خاصا ڈھلا ڈھلا بھی تھا اور خنجر کی نوک اس لباس ہی کو چرتی ہوئی نکلی گئی تھی۔

میں بل کے رستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس وقت تو میری پیشانی بھی پسینے سے تر ہو گئی اور گردن پر بھی کپھو سے بٹھنے ہوئے چھوس ہونے لگے تھے۔

اب شخص کے حلق سے نکلنے کی طرح غراہٹیں خارج ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ میں نے انھوں سے اس کا وار بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ بل کے رستے کو پکڑ کر اپنی جگہ سے اچھلا۔ میری دونوں ٹانگیں یک وقت مختلف انداز میں حرکت میں آ گئیں۔ بائیں پیر کی ٹھکر اس کے خنجر والے بازو کی کٹنی پر نیچے کی طرف لگی۔ بدگرائیں کی سیدھی اس کے منہ پر لگی۔

خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا دریا میں جا گر۔ منہ پر لگنے والی ٹھکر سے وہ بری طرح پیچ اٹھا تھا۔ وہ پکڑا کر گرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر دوبارہ حملہ کرے گا۔

اب کچھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ہمارے یکپ کی طرف سے تین چار آدمی دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ وہل سے ابھی دور تھے۔ اس آدمی نے بھی بل کی طرف آتے ہوئے لوگوں کو دیکھ لیا۔ وہ اٹھ کر مخالف سمت میں ہٹا کر ہوا لیکن میں نے اسے چند قدم سے زیادہ جانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے چھلانگ لگادی اور اسے ساتھ لیتا ہوا نیچے کرا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے عجم گھما ہو رہے تھے۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اب وہ اپنی جان بچانے کی کوشش نہ کر رہا تھا مگر میں نے اسے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ اس کا کوئی ہی نہیں چل رہا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو گھومتے ہوئے بل کی ریٹنگ سے ٹکرائے۔ بل کی ریٹنگ اوپر نیچے مونے مونے تھیں۔ رستن پر مشتمل تھی۔ ہر دو رستوں کے درمیان ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ سب سے نیچے والے رستے اور بل کے تختوں کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ تھا اور اس طرف نسبتاً کم موٹائی والے رستوں کا جال سا بنا ہوا تھا اس لیے تختوں پر سے دیرا ٹھکرتا ہوا کوئی غصہ نہیں تھا۔

جیساکہ میں بتا چکا ہوں کہ میرا دشمن بہت پھرتیلا اور طاقت ور تھا۔ میں اگرچہ اسے قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب رہا۔ اس نے میرے سینے پر دو تین ٹھوکریں ماریں اور ایک طرف چھلانگ لگادی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اس کا ایک

پیر پکڑ لیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی گئی تھی۔ اس نے زور وار جھٹکا دے کر اپنا پیچہ پھنسا اور اٹھ کر کھانکنا ہی چاہتا تھا کہ دو آدمیوں نے بیک وقت اس پر چھلانگ لگادی۔ وہ ایک بار پھر منہ کے بل گرا اور پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس پر گھونسلوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو رہی تھی۔

دو لوگوں نے آگے بڑھ کر مجھے بھی اٹھا دیا۔ میں رے کی ریٹنگ سے ٹیک لگائے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ لم بخت سائڈ کی طرح طاقت ور تھا اور بہت اچھا مارشل آرٹسٹ بھی۔ وہ غالباً پہلا آدمی تھا جس سے میں اس طرح پناہ لیکن مجھے اپنے بچنے کا افسوس نہیں تھا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ ضائع ہو رہا تھا۔

جن دو آدمیوں نے اس شخص کو گرفت میں لیا تھا، ان میں ایک تو کو پی تھا اور دوسرے کا نام میں نہیں جانتا تھا لیکن وہ تھا ہمارے ہی ایک کلمے اٹھانے والوں کا تعلق بھی ہمارے ہی یکپ سے تھا۔

کو پی وغیرہ اسے پھینکتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ساتھ چلنے والے دوسرے وقتاً فوقتاً ایک آدھ ہاتھ بھی لگا دیتے تھے۔ بل سے اتر کر دریا کے کنارے پر پہنچے تو وہاں کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے ہی یکپ سے تھے اور کچھ کا تعلق آس پاس کے یکپوں سے تھا۔ جو شور کی آوازیں کر آ گئے تھے اس طرح ہم جلوس کی صورت میں اپنے جتنا زیم پہنچ گئے۔

جتنا زیم میں ایک اور سنسنی خیز صورت حال ہماری منتظر تھی۔

صرف چند ہی لوگوں کو اندر آنے دیا گیا جبکہ باقی سب لوگوں کو باہر ہی روک دیا گیا تھا۔ ماسٹرینگ پی بھی اس وقت جتنا زیم میں موجود تھا اور وہ رنگ کے رنگین فرش پر بڑے ہوئے صابن جھٹکا ہوا تھا۔ صابن کو گردن میں جس جلد وہ زہریلی سونی چھپی تھی وہاں تقریباً نصف انچ پوزا زخم تھا۔ جس پر برے رنگ کا کوئی پٹ لگا ہوا تھا۔ ماسٹرینگ پی نے اس کی ایک کلائی تھام رکھی تھی۔ انگوٹھا نہیں پر تھا۔ ماسٹرینگ پی بھی قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے صابن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سرگوشیاں لے لے بولا۔ "بلو پاپ کی سوتیوں کے لیے عام طور پر سائپوں کا زہر استعمال کیا جاتا ہے۔ ماسٹرینگ پی سائپوں کے زہر کا ماہر ہے۔ صابن کو زہر زدہ کر کے کاغذ بنا دیا جا چکا ہے اور یہ



گردن کے زخم پر جو پیسٹ دیکھ رہے ہو، یہ بھی خون میں سے زہر جوس رہا ہے۔ یہ پیسٹ دو مرتبہ تبدیل کیا جا چکا ہے۔ کچھ دیر میں یہ بھی سیاہ پڑ جائے گا تو اس کی جگہ دوسرا پیسٹ لگا دیا جائے گا۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "شاؤن نیپل میں پہلے ہر ماسٹراس قسم کے تھیرپے ہدف ٹوٹے جانتا تھا لیکن اب اس سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ماسٹر ہنگ پائی کے علاوہ تین آدمی اور ہیں جو یہ فن جانتے ہیں۔ ایک ماسٹر ہو داگ اور دو نیپل کے راہب۔"

"یہ پیسٹ کس چیز کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جڑی بوٹیوں کا۔" ایڈیٹی یان نے جواب دیا "ان ہمارے بڑوں میں بہت سی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں مگر ان کی شناخت ہوئی جا رہی ہے۔"

"صبح بچ جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بچ جائے گی امید تو پیدا ہو گئی ہے مگر اسے صحت یاب ہونے میں تین چار مہینے ضرور لگیں گے خون سے زہر کا اثر مکمل طور پر زائل ہونے میں اتنا عرصہ تو لگے گا۔" ماسٹر ایڈیٹی یان نے جواب دیا۔

میں خاموش ہو کر اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ جاگتی، کامنی اور چمکی میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ جتنا زہیم کہ کچھ لڑکے اس شخص کو گھیرے کھڑے تھے جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ میں مڑ کر جاگتی سے باتیں کرنے لگا اور پھر شور کی آواز سن کر چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا۔ کوچی اور دو لڑکے اس شخص کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوچی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا وہ ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کی مٹھی بند تھی۔ کوچی ہاتھ کو اس کے منہ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ شخص ہاتھ اپنے منہ تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی مٹھی کھلی اور اس نے کوئی چیز منہ میں ڈال لی۔ اب کوچی اس کے گلے دبا رہا تھا۔ تاکہ اس چیز کو منہ سے نکال سکے مگر اس شخص نے بڑی سختی سے دانت بھینچ لیے تھے۔

اور پھر اس نے ایک دو جھٹکے لیے اور وہ ایک دم بے حس و حرکت ہو گیا۔ سائیکل کا ننھا سا میکینول پیسٹ میں جاتے ہی پیسٹ لپٹا تھا اور اس کی ٹانگ اور منہ سے خون کی دھاریاں بہہ نکلی تھیں۔

○●○

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

میں اس وقت ماسٹر ہنگ پائی کے عمار میں اسے سامنے آتی پائی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی اسے مخصوص پتھر کی چوکی پر یوگا کے اسٹانس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ ماسٹر ہنگ پائی نے نہ تو ہنسنے لگی تھی اور نہ ہی اس کے یوں کو حرکت ہوئی تھی۔ وہ رات میں گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچتا تھا۔ اس شخص نے سیریل اثر زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کر لیا تھا۔ شاؤن نیپل کی پولیس چوکی کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ پولیس جتنا زہیم کہ لڑکوں کے بیانات لیتے کے بعد اس شخص کی لاش اٹھا کر چلی گئی تھی۔ مجھے معاملے سے الگ ہی رکھا گیا تھا۔ ماسٹر کے حکم پر کیمپ کی شاگردی زبان پر بھی میرا مانتا نہیں آیا تھا۔

صبح بچ گیا تھا۔ اسے دو گھنٹے بعد ایک اور آنکھشن دیا گیا تھا اور پھر ماسٹراس کے بارے میں ایڈیٹی یان کو بدایات دیتا ہوا اپنی اس خلوت گاہ میں آیا تھا۔ چند منٹ پہلے مجھے ماسٹر کا پیغام ملا تھا۔ اس وقت بھی ماسٹراسی پونڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔ قدموں کی آہٹ پا کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ہنسنے کا اشارہ کیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

دو منٹ اور گزر گئے اور پھر ماسٹر نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ چپہ دو نظریں میری آنکھ کے راستے دل کی گہرائیوں میں اتری چلی جا رہی ہیں۔ میرے پورے بدن میں سستی کی ایک لمبی دوڑ گئی۔ ایک عجیب سرور تھا اس سستی میں بھی۔ ایک محسوس ایک نشہ جو اطراف نظروں سے میری آنکھوں کے راستے میرے پورے وجود پہنچتا جا رہا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اپنی نظریں ماسٹر چہرے سے نہیں ہٹا سکا۔ ہٹانا بھی نہیں چاہتا تھا بلکہ اپنی سستی آمیز سرور سے محروم... ہو جاؤں جس نے میرے وجود اپنی پیسٹ میں لے رکھا تھا۔

"وعدان!"

یہ ٹھٹکتی ہوئی آواز میری ساعت سے ٹکرائی تو میں نے جوجھری سی لے کر وہ ایسا کر دیا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں ہونٹا ہو گیا ہوں۔ ماسٹر کمرہ رہا تھا۔

"وانگ وانگ یائے نے مجھے ٹیلی فون پر تمہارے باب میں اطلاع دی تھی تو یہ بھی بتایا تھا کہ کچھ دشمن تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دشمن کون ہیں اور تمہیں کیوں مارنا چاہتے ہیں۔ تم نے بھی انہی کے سلسلے میں زبان نہیں کھولی۔ کیا تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں؟"

"یہ آپ نے کیا کہہ دیا ماسٹر؟" میں تڑپ اٹھا "اگر بھروسہ نہ ہوتا تو میں اس طرف کا رخ بھی نہ کرتا۔"

"تو پھر تم نے اب تک زبان کیوں نہیں کھولی؟" ماسٹر نے کہا۔

"میں ہر جگہ اپنے دکھ کا افسانہ بنا کر اپنے آپ کو مظلوم ثابت نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا "میں مجھے آپ کی اتنی توجہ، اتنی محبت اور ہمدردی ملی ہے کہ میں نے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"تو رہا گھنٹا پہلے ٹیلی فون پر وانگ وانگ یائے سے میری بات ہوئی ہے۔ اب اس نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ لیکن میں تمہاری داستان تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔" ماسٹر نے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہا پھر ماسٹر ہنگ پائی کو اپنی داستان سناتے لگا۔ آخر میں میں کمرہ رہا تھا۔

"میرے خیال تھا کہ گولڈن ٹرائی اسٹیل سے فرار کے بعد انہوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے لیکن آج کا واقعہ اس واقعے نے مجھے یاد دلایا ہے کہ میری جان کے دشمن مجھے بولے نہیں ہیں۔"

"گویا تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ بلو پائپ کی زہریلی سوئی سے حملہ صبح پر نہیں تم پر کیا گیا تھا۔" ماسٹر نے کہا۔

"میں ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "میں نے حملہ آور کا پیچھا کر کے اسے بل پر پکڑ لیا تھا۔ جہاں اس نے زہر میں مجھے ہونے خفرت مجھے پھر قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کس کے ایما پر کیا تھا لیکن اس نے زہر لپٹا کھینچ لیا کہ خود کشتی کر لے۔"

"اس خنجر کی نوک اگر تمہیں چھوئی جاتی تو تم اٹھا ماسٹر نہ لے جاتے۔" ماسٹر نے کہتے ہوئے پتھر کی چوکی کے پیسٹ سے ایک خنجر نکال لیا۔

"نیکس۔" یہ خنجر تو دریا میں گر گیا تھا۔ "میں وہ خنجر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔"

"نیکس۔" یہ خنجر اس جگہ سے چند گز دور پل کے ایک رست میں اٹکا ہوا تھا جہاں تمہاری فائٹ ہوئی تھی۔" ماسٹر نے بتایا۔

"میں نے ایک بار مارشل آرٹس تھا۔ آج تک کوئی دشمن اسے پیچھے کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جس نے اسے پیچھے سے اسٹریچر پر لے جایا لیا۔"

"نیکس۔" آپ اسے جانتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے سب ہی جانتے ہیں۔" ماسٹر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "اس میں خرابی ہے تھی کہ وہ حملوں مزاج تھا۔ کہیں ایک جگہ نکلتا تھا۔ اس کے دماغ میں بھی گرمی بھری ہوئی تھی۔ وہ تو اپنے ماسٹر کو بھی آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ اس کے بعد ہی سے وہ زہر دور کی ٹھوکریں کھانے لگا تھا۔ کبھی ایک جتنا زہیم میں کبھی دوسرے میں۔ وہ ہمارے جتنا زہیم میں بھی اکثر آیا کرنا تھا لیکن رات کو شاید وہ تماشا یوں میں چھپ کر کھڑا تھا اس لیے کسی کی نظروں میں نہیں آتا۔ اس نے بلو پائپ سے نشانہ نہیں ہی بنایا تھا مگر وہ صبح آیا اور اگر تم من شن کو تاڑنے لیتے تو شاید وہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی نہ کرنا لیکن تم چچ کر اس کی طرف لپکے تو وہ خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑا ہوا اور پھر تم نے جس طرح اسے بے بس کر کے پکڑا وہ قابل تعریف ہے لیکن مجھے یہ افسوس رہے گا کہ وہ اس شخص کا نام بتائے بغیر ہی مر گیا جس نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔"

"چند روز پہلے جاگتی نے ایک مشتبہ آدمی کو دیکھا تھا۔" میں نے کہا اور پھر ماسٹر کو اس شخص کے بارے میں بتانے لگا "وہ خود سانس نہیں آیا۔ مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے اس نے من شن کی خدمات حاصل کر لیں اور مجھے یقین ہے کہ دوبارہ بھی اسی قسم کی کوشش کی جائے گی۔"

"اب مجھے خیال رکھنا پڑے گا مگر تم۔" ماسٹر چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ میں تمہیں ذاتی دفاع کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا لیکن دماغ کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔"

اور پھر ماسٹر ہنگ پائی کا لیکچر شروع ہو گیا جو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔

اگلے صبح ایک اور سستی خیر انکشاف ہوا۔ میں اور جاگتی حسب معمول ساڑھے پانچ بجے پہاڑی پر پہنچ گئے۔ ماسٹر ہنگ پائی بھی حسب معمول پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے پاس دو پھیلے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں تھیلوں کے منہ ڈوریوں سے بند تھے اور حرکت دیکھ کر انہی اذہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان میں الگ الگ کوئی جانور بند ہیں۔

لیکچر ختم کرنے کے بعد ماسٹر ہنگ پائی نے بڑا اٹھیا کھول لیا۔ اس میں بی کی جسامت کا کوئی جانور تھا جو اس علاقے میں عام پایا جاتا تھا۔ ماسٹر اس جانور کو گود میں لیے پتھر دیر تک اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر قریب ہی بڑا وہ خنجر اٹھایا جس سے گزشتہ رات من شن نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ماسٹر نے خنجر کی نوک اس جانور کے جسم پر رکھ کر بلکا سا چرک لگایا۔ وہ جانور تڑپ کر ماسٹر کے ہاتھ سے نکلا۔ اس نے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر زمین پر تڑپا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس جگہ چرک لگا تھا وہاں سے صرف دو تین قطرے ہی خون نکلا تھا جس کا مطلب تھا کہ چرکا بہت معمولی تھا لیکن خنجر کے زہر نے اسے آٹا ٹاٹا ختم کر دیا تھا۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھرتا تھا۔ اسے رات ہی کو پتا چل گیا تھا کہ اس خنجر سے من ش نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور میں بھی یہ صورت حال دیکھ کر ایک لمبے کو کانپ کر رہ گیا تھا۔ گزشتہ رات اگر اس خنجر کی نوک بھی میرے جسم کو پہنچتی تو میں اس وقت یہاں بینا ہی سب کچھ نہ دیکھ رہا ہوتا۔

”یہ بہت چھوٹا سا جانور ہے۔“ ماسٹر نے خنجر کی نوک اس جانور کے بالوں سے صاف کرتے ہوئے کہا ”اگر اس خنجر کی نوک کسی صحت مند، بڑے کتے آدمی کے جسم کو بھی چھو جائے تو اسے بھی آخری سانس لینے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔“ اس نے خنجر واپس ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے بائیں ہاتھ آگے کو بڑھایا اور خنجر کی نوک کلائی کے قریب بازو پر پھیر دی۔

بازو پر تقریباً دو انچ لمبی لکیر بن گئی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھیا۔ میں ماسٹر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر ابھی تو ترپنا شروع کر دے گا اور ایک منٹ کے اندر اندر ختم ہو جائے گا مگر ماسٹر کے چہرے پر غمازیت اور بونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

جاگتی بھی وحشت زدہ سی نظروں سے ماسٹر کے بازو کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں لگے والے چرکے پر خون کے قطرے ابھر رہے تھے۔ ایک منٹ گزر گیا۔ دو منٹ۔ تین منٹ۔ ماسٹر اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں وحشت زدہ سی نظروں سے ماسٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا جبکہ چند منٹ پہلے میں زہر میں بیچھے ہوئے اس خنجر کی کارکردگی دیکھ چکا تھا۔

ماسٹر نیچ پائی نے زمین پر پڑا ہوا دو سرا تھیلہ اٹھایا اور اس کے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھولنے لگا اور پھر اس تھیلے سے ایک سانپ کو برآمد ہوتے دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ زور رنگ کا وہ سانپ تقریباً ڈیڑھ انچ موٹا اور ڈھائی فٹ لمبا تھا۔ زرد رنگ کی جلد پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

ماسٹر نے اس سانپ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔

”یہ اس خطے کا سب سے خطرناک سانپ ہے۔“ ماسٹر نے باری باری میری اور جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کو ڈس لیتا ہے اسے اگلا سانس لینے کا موقع بھی نہیں لیکن قدرت نے انسان کو بھی اتنی صلاحیتیں دی ہیں جو اسے اندازہ نہیں۔ اس کے اندر ہر قسم کی قوت و انفرجود ہے مگر وہ انہیں استعمال کرنا نہیں جانتا۔ قدرت نے انسان کے لیے ایسی جڑی بوٹیاں بھی پیدا کی ہیں جن پر موت کے علاوہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے مگر انسان ان جڑوں سے غافل ہو گیا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنی صلاحیتوں سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے۔“

ماسٹر بات کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کو آہستہ آہستہ اٹھا رہا تھا۔ سانپ کی دو شاخہ زبان بار بار لراتی ہوئی آ رہی تھی۔ ماسٹر نے سانپ کا منہ اپنے گلے سے ڈالنا پرہیز سینے پر رکھ دیا اور اس کی گردن پھوڑ دی۔ گردن پھوٹنے ہی سانپ کا پچھلے پھیل گیا۔ اس کے منہ سے مگ سی نکلی اور اس نے ماسٹر کے سینے پر منہ مار دیا۔

میرا خیال تھا کہ سانپ کے ڈستے ہی ماسٹر ہائیڈ ہو جائے گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ماسٹر کو اپنی اطمینان سے بیٹھا رہا البتہ سانپ اس طرح لڑنے لگا کہ چڑھ گیا ہو اور پھر وہ ماسٹر کی گود میں گر گیا۔ اس کا زور منہ سے نکلا رہا تھا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ ماسٹر سانپ کو اٹھا کر دور پر پھینک دیا۔ میں نے ماسٹر کے طرف دیکھا۔ جہاں سانپ نے کانا تھا وہاں خون کا ایک ساقطرہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”ابھی میں نے کہا تھا کہ قدرت نے انسان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔“ ماسٹر میری طرف دیکھتے ہوئے رہا تھا ”یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں فائدہ اٹھاتا ہے یا انہیں ضائع کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے یہ صلاحیت اُٹا کر کیے کہ دنیا کا کوئی زہر بھی پر اثر نہیں کر سکتا۔ اس صلاحیت کو اُٹا کر کرنے میں چند جڑی بوٹوں کے استعمال کے علاوہ مارشل آرٹ کو بھی بڑا دخل ہے۔ مارشل آرٹ پر عبور حاصل کیے بغیر کوئی صلاحیت ماسٹر نہیں کی جاسکتی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات رکھتے ہوئے کہنے لگا ”یہ فن بہت دلچسپ بھی ہے اور غارت پر اسرار بھی اور یہ جگہ شاؤن ٹیپل اس سے زیادہ بڑا اسرار۔ اس فن کو شاؤن ٹیپل نے جو ترقی دی ہے اسے تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔“

”شاؤن ٹیپل کے بڑے ہتھیاروں نے اس فن کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ زمانہ قدیم کے بڑے ہتھیاروں نے اس فن کے ذریعے اس قدر روحانی قوت حاصل کر چکے تھے کہ وہ ہاتھ کی ایک ضرب سے درجن بھر بیٹے اور رگھی ہوئی اینٹیں توڑ دیتے۔ انہیں بند کر کے اڑتی چڑیا کا پر اس طرح نوج لینے کہ چڑیا کو اس کی جڑ تک نہ ہوتی۔ پوری قوت سے کمان سے چھوڑے جانے والے تیر کو خالی ہاتھ پر روک لیتے بڑے ہتھیار (C11) سے حاصل ہونے والی قوت کے بل پر اپنے جسم کے کسی بھی حصے پر لگائی جانے والی ضرب کو برداشت کر لیتے یہ جی کی قوت کا کمال تھا کہ شاؤن ٹیپل کے بڑے ہتھیار ایک ہزار یا دو ہزار جزی بھی اس طرح اٹھا لیتے جیسے اس بوجھ کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو یا کسی اڑتے ہوئے پرندے کی پٹ پر سوار ہوجاتے کہ پرندے کو اپنے اوپر لدے ہوئے بوجھ کا علم تک نہ ہو یا تاکہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بڑے کمان کے ان چڑیا کاروں نے یہ چڑیا اسرار تو کس کس طرح حاصل کیں؟ کیا یہ مارشل آرٹ کا کمال تھا یا اس میں کوئی اور روحانی قوت پوشیدہ تھی۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ روحانی قوت ہی تھی جو شاؤن ٹیپل کے ان بڑے ہتھیاروں نے مارشل آرٹس کے ذریعے حاصل کی تھی۔

”آج کے دور میں صرف دو چار ہی ایسے ماسٹر موجود ہیں جن میں مارشل آرٹس کی یہ چڑیا اسرار تو قیام موجود ہیں۔ وہ اس فن کو دوسروں کو منتقل کرنا چاہتے ہیں مگر کسی میں اتنا حوصلہ نہیں جو اتنی کھانا یا برداشت کر سکے۔“ ”وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔“ ”بہت عرصے بعد تمہاری صورت میں مجھے وہ شخص نظر آ رہا ہے جو اپنے اندر حوصلہ رکھتا ہے اور اس کٹھن راستے پر چل سکتا ہے۔“

”میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا ماسٹر۔“ میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ اپنے بارے میں ماسٹر ہانگ یا کا یہ تبصرہ سن کر اپنے آپ میں ایک عجیب سی سسکی کی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔

**برصغیر کے نام ور گلوکاروں**

**نوٹیشن**

**کے سدا بہار گیتوں کا**

اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف ”دھن“ بھی ہر ساز پر بجائی جاسکتی ہے

موسیقی کے حوالے سے

**ابجد موسیقی**

قیمت 200 روپے

200 سے زیادہ صفحات

موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تھدا

اپنی طرف سے ایسی کتاب پہلے کسی شاعر نہیں ہوئی۔

مجلد اول

مجلد دوم

فون: 5802552-5895313

فیکس: 5802551

krabiati1970@yahoo.com

**کتابیات پبلی کیشنز**

پتہ: گس محلہ، ریلوے اسٹیشن، کلاں، لاہور۔ فون: 74200

عادی ہو گئی تھی۔

اس روز جنازہ میں کم کلاس شروع ہوتے ہی لیشی یان کے لیے ماسٹرینگ پائی کا بلاوا آگیا۔ وہ ماسٹر سے ملاقات کر کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو دیر تک گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھے سمجھنے میں نہ رہی کہ اسے میرے بارے میں کچھ خاص ہدایات دی گئی تھیں۔

کلاس ختم ہونے کے بعد میں صباغ کو دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر بے سُدھ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی نیلا بٹ تھی۔ گردن کے زخم پر بیڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کا سانس کبھی تیز ہو جاتا اور کبھی ہلکا۔ اس وقت کو جی بھی میرے ساتھ تھا۔ میں اس کی طرف مڑ گیا۔

”کیا کیفیت ہے اب؟“ میں نے پوچھا۔

”ذہر کا کچھ ٹھوڑا بہت اثر ہے مگر خطرے سے باہر ہے۔“ کوچی نے جواب دیا ”اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں تین چار مہینے لگ سکتے ہیں۔“

مجھے صباغ کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ بے چارہ بلا وجہ اس کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

○☆☆○

میری شہرت اب چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ منگ شول کیپ پہلے ہی خاصی شہرت رکھتا تھا لیکن میرے نام کے ساتھ اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر طرف میرے ہی چرچے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی بات تھی ”منگ شول میں ایک نیا لڑکا آیا ہے جو بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر وہ ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا تو لوگ شاؤ لن نیپل کے ماسٹروں کو بھول جائیں گے اور صرف وہ جان کا نام یاد رکھیں گے۔“

مجھے ایسی باتیں سن کر خوشی ضرور ہوتی تھی مگر تکبر یا غرور کو اپنے قریب نہیں پھینکنا تھا۔ اب مختلف کیپوں میں میری بھی اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ میں سب لوگوں سے بے تکلفی سے ملتا۔ ہر شخص میرا احترام کرنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جہاں میرے اتنے ذہیر سارے دوست بن گئے تھے وہاں دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ ہکیان، نوڈر اور مجھ پر قاتلانہ حملہ کرانے والے جنرل کھوراث کے اس مشہور آدمی کے علاوہ کچھ پیشہ ور دشمن بھی پیدا ہو گئے تھے جو مجھے زک پہنچانے کے لیے موقع کی ناک میں رہتے۔ قاتلانہ حملے والے واقعے کے بعد کئی روز سکون سے گزر گئے تھے۔ یہ بات ہر شخص تک پہنچ گئی تھی کہ میں نے اس رات من شن کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور پڑے

جانے کے بعد انتقام کے خوف سے اس نے زہر ہلا کر کھا کر خود کشی کر لی تھی۔ اس واقعے کے بعد کسی نے مجھے کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ماسٹر لیشی یان نے کئی آدمی اس مشہور شخص کی تلاش میں چھوڑ دیے تھے۔ جس کے بارے میں مجھے شہر قاز میرے اور قاتلانہ حملہ اس نے کوا تھا تھا۔ اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں تھا مگر اس کا کلیہ سب کو بتا دیا گیا تھا۔ فزوز پر دائیں طرف چھوٹا سا سیاہ دھبہ اس کی شناخت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہکیان کی تلاش بھی جاری تھی مگر وہ فزوز گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ فزوز اور اس کے لیے بالوں والے سامی سے اکثر آئنا سامنا ہوتا تھا مگر وہ دونوں پیش آنکھیں چرا کر گزر جاتے۔

کئی روز گزر گئے اور پھر ایک روز صبح میرے ماسٹر یان مجھے اور جاگنی کو لے کر پہاڑیوں کی طرف نکل پڑے۔ پہاڑیوں میں چکراتے ہوئے تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر کے دریا کے کنارے ایک غار میں پہنچ گئے۔ یہ غار اندر سے اندر کشادہ تھا اور اس کے آخری حصے میں واقع ایک اور غار سے غار میں کچھ ایسی چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو مارشل آرٹ کی ٹریننگ میں استعمال ہوتی تھیں۔ لیشی یان نے دو چار چیزیں نکال لیں۔ ان میں مٹی کی بنی ہوئی ایک بھیگی گدی جس کے اوپر پلیٹ فارم پر ریت کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس بھیگی مٹی لگے ہوئے بزرگوں کے حلقہ دکھایا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ریت تپ مٹی اور مٹی پر پڑے شروع ہو گئی۔ گرم ریت میں ہاتھوں کو دبائے رکھا تھا۔ اذیت ناک تھا۔ یہ پریکٹس میں ہٹاک کے نواح میں لگے والے کیپ میں بھی کرچکا تھا۔ اس کی ٹریننگ مجھے مارشل سونے دی تھی لیکن یہاں اس میں ذرا سی تبدیلی تھی۔ ریت میں ہاتھ رکھنے کے بعد ریت سے بھرے ہوئے کیپ۔ چیونچک کی پریکٹس بھی کرانی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی بڑے پنڈو ڈیفنس کی پریکٹس بھی کرانی جاری تھی۔

”یہ پریکٹس تمہارے ہاتھوں میں سختی پیدا کرنے کے لیے ہے۔“ ماسٹر لیشی یان نے کہا ”جب تم حرف کے منہ سے جیسے کے لیے سیزرڈ پنڈو ڈیفنس کی ٹیکنیک استعمال کرو گے تمہاری کلائیوں میں دب کر حرف کے ہاتھ کی پٹیاں پڑ جائیں گی اور وہ زندگی بھر اپنا وہ ہاتھ استعمال نہیں کرے گا۔“

ماسٹر لیشی یان میرے سامنے کھڑا مجھے بتاتا رہا کہ پنڈو ڈیفنس ٹیکنیک کس طرح استعمال کی جاتی ہے۔ جاگنی

میرے ساتھ یہ ٹیکنیک سکھ رہی تھی لیکن اسے گرم ریت میں ہاتھ دبانے کو نہیں کہا گیا تھا۔

دوپہر تک ہماری یہ پریکٹس جاری رہی اور پھر ہم غار کے باہر بیٹھ گئے۔ میرا جسم سینے میں شرابور ہو رہا تھا اور غمزدگی غمزدگی سے بھری تھی۔

”بہت سے لوگ ہاتھ پیر چلاتا تو سیکھ لیتے ہیں۔ وہ اچھے فائز بھی بن جاتے ہیں لیکن انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔“ ماسٹر لیشی یان کہہ رہا تھا ”ایہ تو یہ ہے کہ آج کے دور میں بہت سے ماسٹر بھی یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے شاگردوں کو کیا سکھا رہے ہیں۔ وہ اسٹائل کے نام سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اس کا پس منظر نہیں جانتے۔ وہ صرف فائز بنا رہے ہیں مارشل آرٹس نہیں۔ ایک اچھا مارشل آرٹس بننے کے لیے اس فن کے پس منظر اور تاریخ سے واقف ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اسے اس کی روح کے مطابق سکھا جائے۔ تم لگتے ہو۔ دو شو کی پریکٹس کر رہے ہو۔ آج میں تمہیں اس کا ٹھوڑا سا پس منظر سمجھانا چاہتا ہوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”آج لفظ کنگ تو کو مختلف معنی پہنائے جاتے ہیں لیکن اس کا اصل ترجمہ ”بہتر طور پر سیکھا ہوا“ ہے۔ جبکہ دو شو WU - SHU کے معنی مارشل آرٹس ہیں۔ اگر پورا نام KUNG FU WU SHU دہرایا جائے تو اس کا مطلب ہوگا ”بہتر طور پر سیکھا ہوا مارشل آرٹس۔“ اس لیے کنگ تو کو فائزنگ اسٹائل یا کوئی اور معنی پہنانا درست نہیں ہے۔“

میں نے اس سلسلہ سے پرہیز کر دیا۔ میری پریکٹس پھر شروع ہوئی اور یہ سلسلہ سہ پہر تک جاری رہا۔ اپنے کیپ کی طرف واپس جاتے ہوئے دو آدمیوں سے آئنا سامنا ہو گیا۔ عجیب سے لگتے تھے ان کے ہاتھ کیپ کے کپڑے، بے حاشا بڑے ہاتھ والے اور دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے نشہ کرنے سے نڈائی ہوئی۔

اس غار میں پریکٹس کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اب دو روز دیر میں ایک کشتی پر چار آدمیوں کو دیکھ کر میں نے پتہ بغیر سہارے نہ کیا۔ میرے چوتھے کی وجہ ہکیان تھا جو طرف طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ماسٹر لیشی یان کو اس کی طرف اشارہ کیا تو اس کی پیشانی پر بھی لکیریں سی ابھر آئیں۔

”یہ کشتی نامت ہے۔ دو آدمی نیچے اتر گئے اور کشتی کے ساتھ ساتھ آگے چلی گئی۔ وہ دونوں آدمی اب رستہ تھے ماسٹر لیشی یان نے جاگنی کو وہیں رکھنے کا

اشارہ کیا اور ہم دونوں غار کے دہانے سے نکل کر نیچے اترنے لگے۔

ایک بڑے پتھر کی آڑ سے نکلے ہی ان دونوں سے آئنا سامنا ہوا۔ یا۔ ان دونوں کا تعقل مارشل آرٹ کے کسی ٹریننگ کیپ سے ہی تھا لیکن حلیوں سے آوارہ گرد ہی لگتے تھے۔

ماسٹر لیشی یان ان سے سوالات کرتا رہا۔ بائیں کرتے ہوئے ان میں سے ایک نے اچانک ہی پستول نکال لیا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں فنگر نظر آنے لگا تھا۔ پستول کا رخ میری طرف تھا۔

ماسٹر لیشی یان گہری نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اچانک ہی اس کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ اس کا پیر پستول والے کے ہاتھ پر لگا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دروازہ جاگرا۔

میں نے خنجر والے پر حملہ کر دیا۔ اس نے بھی حملہ کیا تھا۔ میں پوری طرح دفاع نہیں کر سکا اور خنجر کی نوک میرے بائیں بازو پر کھنسی سے ذرا اوپر کو شت چرتی ہوئی نکل گئی لیکن اس کے بعد میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ خنجر کی نوک نے میرے بازو کی کھال کو کاٹا تھا، زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اس لیے مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنے حرف کو اٹھا کر خنجر دیا۔

ماسٹر لیشی یان بھی اپنے حرف کی دُرگت بنا رہا تھا۔ میرے خیال میں ان دونوں نے ہم سے کھرا کر بہت بڑی حماقت کا شہرہ دیا تھا۔ میرے نام کی دھاک تو بیٹھی ہوئی تھی اور ماسٹر لیشی یان بھی نامی گرائی مارشل آرٹس تھا۔ انہوں نے شاید پستول کے بل بوتے پر ہمیں ذہر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پستول ہاتھ سے نکل جانے کے بعد خود ہی پٹ رہے تھے۔

ہم ان دونوں پر تقریباً قابو پا چکے تھے کہ ناک ایک جاگنی کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔ میں نے اپنے حرف کی گردن بازو کی پلٹ میں لے رکھی تھی۔ ایک زوردار جھٹکا اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ جاگنی کی چیخ سن کر میں نے اوپر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

غار کے دہانے پر ہکیان جاگنی کو گرفت میں لے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی دھار جاگنی کے زخم سے کچھو رہی تھی۔

”میرے آدمیوں کو چھوڑ دو۔“ پچاس فٹ اوپر سے ہکیان کی چیخ بولی آواز سنائی دی ”اگر ان میں سے کسی کو معمولی سا نقصان بھی پہنچا تو میں اس کا گلا کاٹ دوں گا۔“

میں کانپ اٹھا۔ صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ جاگی مکمل طور پر ہکیان کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے ہاتھ کی معمولی سی حرکت جاگی کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میں نے ماسٹر لیشی ان کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے حریف کا ہاتھ مروڑ کر اس کی پشت سے لگا رکھا تھا۔ ماسٹر کا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ شاید وہ اپنے حریف کی گردن یا کندھے پر چوب لگاتا چاہتا تھا مگر جاگی کی چیخ سن کر اس کا ہاتھ ہوا ہی میں مفلج رہ گیا تھا۔

میرے حریف کی گردن میرے بازو کی آہنی پلیٹ میں تھی۔ ایک زوردار جھٹکا اس کی زندگی کا چراغ کل کر سکتا تھا لیکن یہ نئی صورت حال سامنے آتے ہی میرے بازو کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑنے لگی۔ میں نے ماسٹر لیشی ان کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے حریف کو آگے دھکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کا چہرہ ایک پتھر سے ٹکرایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

میری گرفت بدستور ڈھیلی ہو رہی تھی۔ میرا شکار بھی اپنی گردن پھڑپھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گرفت سخت کی اور ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ بھی چپٹن ہوا منہ کے بل گرا۔ وہ فوری طور پر نہیں اٹھ سکا تھا۔ وہیں بیٹھا گردن سلالتا رہا۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی بھی گھٹنوں کے بل بیٹھا اپنی پیشانی سے رسنے والا خون پونچھ رہا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اٹھنے میں جلدی نہیں کی۔ انہیں شاید یہ اطمینان تھا کہ چونکہ جاگی ان کے گرو ہکیان کے قبضے میں تھی اس لیے ہم کوئی حرکت نہیں کر سکیں گے۔

”تم دونوں میرے آدمیوں سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ ہکیان کی چیخ بولی آواز سنائی دی ”اگر کسی نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو یہ لڑکی زندہ نہیں بچے گی۔“

میں اور ماسٹر لیشی ان دونوں سے دور ہٹ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ہمارے پیچھے ایک چٹان تھی۔ اس طرح ہم عقب سے کسی ممکنہ حملے سے محفوظ ہو گئے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے درمیان بھی پانچ گھڑے کا فاصلہ رکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

ہکیان نے جاگی کا ایک بازو مروڑ کر اس کی پشت

سے لگا دیا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اب جاگی کی رگ سے ہٹ گیا تھا تاہم اس کی نوک گردن کو چھونے لگی تھی۔ ہکیان نے جاگی کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے کچھ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ سنائی نہیں دے گا۔ مگر جاگی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

غار کے دہانے سے دریا کے کنارے تک ایک آہستہ تر چھی ڈھلوان تک سی گینڈہ بڑی تھی۔ جاگی آگے قدم بڑھاتا ہوا چھپچھپے پشت سے لگا ہوا جاگی کا ہاتھ بدستور ان کی گرفت میں تھا۔ جاگی کے چہرے کے اثرات بتا رہے تھے وہ خوف زدہ تھی۔ ظاہر ہے خنجر کی نوک شہ رگ سے لگنے پر ہو تو کسی بہادر آدمی کا بھی پانی ہو سکتا ہے۔

وہ تقریباً آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا جو ہمارے حریف بنے تھے ماسٹر لیشی ان سے پٹنے والا غصہ اور دوسرا چھوٹا سا پھول تلاش کر رہا تھا۔ جبکہ دوسرے کو بھی اپنے خنجر کی تلاش تھی جو میرے پیر کی ٹھوک سے کہیں دور جا کر تھا۔

میری نظرس دریا کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ کشتی چٹانوں آڑے سے نکل کر ایک بار پھر سامنے آ رہی تھی۔ اس میں اب صرف ایک ہی آدمی تھا جو آہستہ آہستہ چھپ چلا رہا تھا۔ ہم نے غار کے دہانے پر سے دیکھا تھا تو اس میں چار تہ تھے۔ دو اس وقت کنارے پر اتر گئے تھے۔ اس سے آٹھ دریا میں ڈرا سا ٹھکڑا تھا۔ آگے جا کر کسی چٹان کی آڑے۔ ہکیان بھی کشتی سے اتر گیا تھا۔ میں اور ماسٹر لیشی ان والی چٹان سے نیچے آکر ان دونوں آدمیوں سے منہ بہ منہ تھے اور اسی دوران میں ہکیان چٹانوں کے اوپر سے ہوا غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا جہاں جاگی اس کے قاتل آگئی تھی اور اب وہ کشتی پھر سامنے آگئی تھی لیکن کنارے سے تقریباً دس گز دور تھی۔

میں ایک بار پھر جاگی اور ہکیان کی طرف دیکھا۔ وہ ڈھلوان پر آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے تھے اور میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو بالکل خلاف توقع تھا۔ میں شبہ نہیں کہ جاگی عورت ہونے کے ناطے مردوں کے مقابلے میں کمزور تھی۔ صنف نازک کو بیشہ نراکتوں کا تجربہ اور کمزور سمجھا جاتا ہے مگر تاریخ میں جا بجا ان عورتوں حوالے بھی موجود ہیں جنہوں نے مردوں کو ناکام اپنے جوارہوں کے حکمتوں کے تحت اٹھ دیے۔ میرے خیال میں عورت کو نہیں ہوتی۔ یہ صنف تو مردوں سے زیادہ باحوصلہ اور باہمت

ہے۔ ایک نام عورت بھی زندگی میں مردوں سے زیادہ دکھ سہی ہے۔ غراس کی بہت پست نہیں ہوتی۔ خود میرے سامنے ایسی ہی عورتیں موجود تھیں جنہوں نے بڑے حوصلے سے زندگی کی ٹھکانوں کا مقابلہ کیا تھا اور پھر جاگی تو ان عام عورتوں سے مختلف بھی تھی۔ وہ کئی سال سے میرے ساتھ تھی اور قدم قدم پر خطرات کا سامنا کر رہی تھی۔ کئی مواقع تو ایسے بھی آئے تھے کہ اس نے اپنے سے زیادہ طاقت ور مردوں کو بھی دم بدم کر ہار گئے پر مجبور کر دیا تھا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ابھی چند ہی روز پہلے کی تو بات تھی کہ اس نے اور جبکہ کم از کم دو مرتبہ لمبے بالوں والے اس خنڈے کی پٹائی کی تھی جو اپنے آپ کو ماسٹر سمجھنے لگا تھا۔

حالات نے جاگی کو غمگین سے غمگین تر صورت حال میں بھی ثابت قدم رہنے اور اس سے نسنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ صورت حال کتنی ہی نازک کیوں نہ ہو، جاگی نے اپنے ذہن کو موافق نہیں ہونے دیا تھا۔ بعض حالات میں تو اس نے ایسے فیصلے کیے تھے کہ میں خود بھی حیران رہ گیا تھا۔ اور اس کے ان جرات مندانہ فیصلوں ہی کی بدولت ہم کئی مرتبہ ہار بی ہار جیتے تھے۔ اس وقت بھی اس نے ایک ایسی ہی حرکت کی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ انداز سے کی معمولی سی غلطی اس کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

میں آواز سن کر تھپتھپنے کے لیے دس بار تھک دیا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک جگہ گینڈہ بڑی میں ایک معمولی سا خم تھا۔ اس موڑ پر گھومتے ہوئے جاگی اچانک ہی بڑی تیزی سے نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے آواز کا ہاتھ کو بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف گھمایا تھا۔

جاگی کے اس طرح اچانک بیٹھ جانے سے ہکیان اپنا توازن ہر قرار میں رکھ سکا۔ جاگی کا ہاتھ بھی اس کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ جاگی کے آواز کا ہاتھ سے اس کی پٹنڈی پر ضرب لگی تھی۔ وہ لڑکھارہ لگا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر زیادہ نہ ہو سکا۔ اس دوران میں جاگی نے نہایت جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کہنیوں کے بیک پش سے بھی ایک ضرب لگادی۔ ہکیان جاگی کے اوپر سے الٹی قبا بازی کھاتا ہوا پشت کے بل اس سے پانچ چھ فٹ آگے گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہکیان کی طرف دوڑ لگا دی اور اسے سنبھلنے کا موقع دے بغیر اس پر ٹھوکوں کی بارش لگادی۔ جبکہ ماسٹر لیشی ان نے اس شخص کی طرف جھونک لگا دی جو جبکہ کر زمین سے اپنا پھول اٹھا رہا تھا۔ ماسٹر لیشی ان کے دونوں پیر فلائنگ کلک کے انداز میں اس

کے پہلو پر لگے اور وہ چیخا ہوا دور تک فلا بازیاں کھاتا ہوا چلا گیا۔ ماسٹر نے سنبھل کر دوسرے آدمی پر چھلانگ لگا دی اور اسے پتھروں پر رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔

جاگی ڈھلان کی گینڈہ بڑی پر بیٹھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس نے جو کرتا تھا وہ کر دیا تھا اور باقی کام ہم پر چھوڑ دیا تھا اور ہم ان کا نام کرنا اچھی طرح جانتے تھے۔ خنجر اب بھی ہکیان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے خنجر والی کلائی گرفت میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اس کے اس بازو کے نیچے بغل میں زور دار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا۔

میں نے دوسرا ہاتھ بھی ہکیان کی کلائی پر جمادیا اور اپنا ایک ٹھکانا کسی قدر اوپر اٹھایا۔ میں اس کی کٹنی کو اپنے گھٹنے پر مارنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کی کٹنی کا جو ذنکل سکتا تھا مگر مجھے اس کا موقع نہیں ملا کیونکہ ہکیان نے بڑی تیزی سے اپنی لات گھمادی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوک میری اس ٹانگ کے گھٹنے پر لگی جس پر میرا سار اوجھ تھا۔

میری ٹانگ ایک دم ڈھری ہو گئی اور میں لڑکھارہ بننے لگا۔ ہکیان بھی میرے ساتھ ہی میرے اوپر گر گیا تھا۔ مگر اس کا خنجر والا بازو ابھی تک میری گرفت میں تھا۔

ہکیان جسمانی لحاظ سے مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا مگر وہ مجھ پر غلبہ پایتا تو میرا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا مگر میں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ خنجر کو میرے گلے کی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ خنجر کو اپنے گلے سے دور رکھنے کی کوشش میں کامیاب رہتے ہوئے میں اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش بھی کرتا رہا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔

ہکیان نے بھی میرے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے اوپر لا دیا اور دھوبی پاٹ کے انداز میں چاٹ دیا۔ وہ پشت کے بل پتھروں پر گر گیا۔ اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی تھی۔ اس مرتبہ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا کر تھا۔

اسنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ایک لمحے کو دوسری طرف دیکھا۔ ماسٹر لیشی ان اپنے دونوں حریفوں سے خوب اچھی طرح منٹ رہا تھا اور وہ کشتی اب تیزی سے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے کھوم کر ہکیان پر ٹھوکوں کی بارش کر دی۔ ایک مرتبہ اسے بھی موقع مل گیا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر زور

دار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گر گیا۔ میری کھوپڑی ایک برسے پتھر سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی نیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اور پھر میں نے ہمسایان کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنا دفاع کر سکتا۔ وہ ابھی مجھ سے دور ہی تھا کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

میں نے سر کو دو تین اور جھٹکے دیے۔ میری آنکھوں کے سامنے چھانے والی وٹھ چھٹ گئی۔ ہمسایان میرے اوپر آنے کے بجائے قدرے بائیں طرف گرا۔ اس کے بائیں پہلو سے خون بہہ نکلا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر جاگی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا جس سے خون نچک رہا تھا۔ مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ جاگی نے موقع ملنے ہی ہمسایان ہی کا خنجر اٹھا کر اس پر حملہ کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ہمسایان مجھے گرفت میں لے کر میری گردن مروڑ سکتا تھا۔

اس وقت پہلی بار میں نے جاگی کے چہرے پر بے پناہ وردنگی کے آثار دیکھے تھے۔ وہ ہمسایان پر دوسرا حملہ کرنے کے لیے پکی لیکن ہمسایان نے اٹھ کر دوبار کی طرف دوڑ لگا دی۔ جاگی اپنی ہی جھونک میں آگے جاگری تھی۔

وہ کشتی اب دریا کے کنارے سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ ہمسایان نے دوڑتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی اور کشتی کے قریب ہی پانی میں گرا۔ خشاب کی زور دار آواز ابھری۔ وہ گدے پانی میں نیچے بیٹھتا چلا گیا اور پھر سطح پر ابھرتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے کشتی کا کنارہ پکڑ لیا۔ کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص نے چپو چھوڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ ہمسایان کشتی کے اندر ڈھیر سا بولیا۔ جبکہ دوسرے آدمی نے پھر چپو منبھال لیے، وہ کشتی کو کنارے سے دور لے جانے لگا۔

میں پوری طرح اپنے حواس میں آ گیا تھا۔ میں سر جھٹکتا ہوا اٹھ گیا اور جاگی کو بھی سارا رانے کراٹھا دیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کی کڑکٹی غائب ہو گئی اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔

ماسٹر اپنے دونوں حریفوں کی خاطر خواہ تواضع کر رہا تھا اور پھر ہمسایان کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر ان میں سے ایک نے موقع ملنے ہی دوڑ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کشتی سے چار یا پانچ فٹ نیچے پانی میں گر ا تھا اور بڑی تیزی سے ہاتھ مارتا ہوا کشتی کی طرف تیرنے لگا اور بالآخر اس نے کشتی کا

کنارہ پکڑ لیا اور بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کشتی کے اندر گرانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ ہمسایان یا دوسرے آدمی نے اسے کشتی پر کھینچنے میں کوئی مدد نہیں کی تھی۔ آخری حرف ماسٹر نے ہی ان کا گھوٹا کھا کر لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اسے تھیلے کا موقع دیے بغیر ایک گھوٹا جڑا۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا لیکن دوسرے ہی لمحے منبھال کر اس نے دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔

کشتی اس دوران میں بہت دور جا چکی تھی۔ ایک بات تو طے تھی کہ ہمسایان وغیرہ اپنی جانیں بچا کر راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ لہذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے آخری ساتھی کو بچانے کے لیے کشتی واپس لائیں گے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ چند روز پہلے مجھے بلو پاپ کی زہریلی مٹی اور پھر ذریعے پتھر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے تعاقب کر کے حملہ آور من شن نامی شخص کو پکڑ لیا تھا مگر اس نے کچھ تھانے سے پہلے ہی زہریلا کیپسول کھا کر خود کشتی کر لی تھی۔

من شن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس سے تو میرا بھی آتنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اوپر یہ حملہ کسی اور کے کئے پر کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک نام ہمسایان کا تھا اور دوسرا وہ چروہ تھا جس کی کئی روز پہلے جاگی نے نشان دہی کی تھی اور جاگی کے کئے کے مطابق وہ جزل کھوراث کا آدمی تھا اور آج پھر اس واقعے کو دہرایا گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ ہمسایان مجھے اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اگر اس کا مقصد قتل کرنا ہوتا تو کشتی سے اتر کر کنارے آئے بغیر مجھے کوئی ماری جاسکتی تھی لیکن جس طرح انہوں نے پلاننگ کی تھی اور جس طرح جاگی کو خنجر کی دھاری رکھا گیا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے زندہ پکڑ کر کہیں اور لے جانا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس روز مجھ پر بلو پاپ سے حملہ ہمسایان نے نہیں کرایا تھا۔ وہ چوہا راہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا جس کی نشان دہی جاگی نے کی تھی۔

اور اس وقت اچانک ہی میرے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ ممکن ہے، ہمسایان کے ساتھ آنے والے اسے جانتے ہوں۔ دو آدمی ہمسایان کے ساتھ کشتی پر فرار ہو چکے تھے۔ تیسرے نے میرے سامنے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اور پھر اچانک چپوئوں کی آواز سن کر میں چوک گیا۔

اس شخص نے ہم سے جان بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی لیکن وہ تیرتا نہیں جانتا تھا۔ اب وہ مدد سے

لی جی ہاتھ۔ یہاں علاقہ تھا اور میاں پانی کی لہریں نسبتاً تیز تھیں۔ وہ شخص لہروں کے ساتھ بہتا ہوا ابھی زیر آب چلا جاتا اور ابھی سطح پر ابھر کر چیخ لگتا۔

میں نے ماسٹر کی بیان اور جاگی کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے دوڑتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ شخص لہروں کے ساتھ بہتا ہوا تقریباً بیس بائیس گز آگے جا چکا تھا اور میں اس سے چندہ سولہ گز پیچھے تھا اور اس تک پہنچنے کے لیے پانی پر لیے ہاتھ مار رہا تھا۔

بچپن میں، میں نے باقاعدہ پیرا کی سیکھی تھی اور پھر زندگی کی اس مرحلے پر جہاں میں مجھے کئی مرتبہ دریاؤں اور نہروں میں تیرنے کا موقع ملا تھا اور میں ایک بہت اچھا پیرا بن گیا تھا۔

میں اس جگہ پہنچا جہاں اس شخص کو آخری بار دیکھا تھا لیکن وہ زیر آب جا چکا تھا۔ گدے پانی میں نظر نہیں آ رہا تھا اور مجھ پر تھوڑے دو گز کے فاصلے پر وہ پانی کی سطح پر نمودار ہوا تو میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

وہ پوری طرح مدح حواس ہو رہا تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا وہ میرے ساتھ لپکنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ چیخ کر چیخے بنا۔ پانی کی ایک لہر اسے مجھ سے دور لے گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔

اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کا مقصد موقع سے فائدہ اٹھانا یا کسی قسم کا انتقام لینا نہیں تھا۔ کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانا ہوتا تو اس کے ساتھ ہی سلوک کیا جانا چاہیے۔ بصورت دیگر وہ بدحواسی میں آپ کے ساتھ لپٹ کر آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔

وہ ایک بار پھر پانی کی تہ میں بیٹھ رہا تھا مگر میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا کنارے کی طرف تھرتے لگا۔ بھاؤ کے مخالف سمت کسی دوسرے آدمی کو لے کر تیرنا خاصا مشکل کام تھا اور مجھے واقعی بہت دشواری پیش آرہی تھی اور پھر میں نے ماسٹر لیشیاں کو دریا میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے غالباً میری مشکل کو سمجھ لیا تھا۔

ماسٹر لیشیاں نے ہم تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس طرح ہم دونوں اس شخص کو ہاتھوں میں پکڑ کر کنارے تک لائے۔ میں کامیاب ہوئے۔ کنارے پر کھڑی ہوئی جاگی نے اسے اوپر کھینچ لیا۔

ماسٹر لیشیاں نے اس شخص کو زمین پر اونڈھا لٹا دیا اور اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس طرح غوطہ خوری کے دوران میں

جوانی اس کے ہیٹ میں جا چکا تھا، وہ نکل گیا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن حواس بحال ہونے میں چندہ میں منٹ لگ گئے۔ ہم اسے اوپر غار میں لے گئے اور میں نے بالکل پولیس والے انداز میں اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

”ہمسایان کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی بات پوچھنے سے بہتر ہے کہ مجھے مار ڈالو۔“ وہ شخص گہری سانس لیتے ہوئے بولا ”اگر ہمسایان کو بتا چل گیا کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ مجھے اس طرح اذیتیں دے گا کہ میں مرتی نہیں سکوں گا اور زندہ بھی نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے مار ڈالو۔ پلیز! مجھے مار ڈالو۔“

”اگر ہم نے تمہیں مارا ہوتا تو دریا سے نہ نکالتے۔ تمہیں ڈوبنے دیتے اور ہم کنارے پر بیٹھے اطمینان سے تمہاری بے بسی کا تماشا دیکھتے رہتے۔“ میں نے کہا ”لیکن میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم نے ہمسایان کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ اس وقت بھی ہمارے رحم و کرم پر ہو لیکن وہ ہمسایان تمہیں چھوڑ کر ہٹ گیا۔ اس نے اپنی جان تو بچالی لیکن تمہیں موت کے جڑوں میں چھوڑ دیا۔ کیا یہ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں؟ تم اپنی زبان بند رکھ کر اس شخص کو بچانے کی کوشش کر رہے ہوئے تمہاری ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ کیا تم اس شخص پر بھروسہ کر سکتے ہو؟“

”مجھے ہمسایان سے کوئی شکایت نہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا ”میں نے جو کچھ بھی کیا، ہمسایان کے لیے نہیں پیسوں کے لیے کیا تھا۔ اس نے مجھے ایک بڑی رقم دی تھی۔“

”اور مقصد کیا تھا؟ مجھے جان سے مار دیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ وہ تمہیں کڈ نیپ کرنا چاہتا تھا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ مجھے ہمسایان کی پلاننگ سے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔

”ہمسایان سے میرا کچھ پرانا حساب کتاب چل رہا ہے۔ وہ کئی بار مجھ سے زک اٹھا چکا ہے۔ وہ مجھے قتل تو کر سکتا ہے لیکن کڈ نیپ۔! وہ مجھے اغوا کر کے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ کس کے لیے کام کر رہا ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”مہم میں کچھ نہیں بتاؤں۔“

ماسٹر لیشی یان کے تجھڑے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چنچا ہوا بانیوں طرف لڑکھ گیا۔ ماسٹر لیشی یان نے یکے بعد دیگرے تین چار ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ بری طرح جھج رہا تھا۔ ماسٹر نے اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ دسے مارا۔ اس کے منہ سے ایک اور خوفناک جھج نکل گئی تھی۔ اس کا سر دیوار سے لکرایا تھا۔ اس نے سر کو دو ٹوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”تمہیں ڈوبنے سے اس لیے نہیں بچایا گیا تھا کہ ہم تمہاری مٹھی چا پی کریں گے۔“ ماسٹر اسے ایک ٹھوکہ مارتے ہوئے غرایا ”وہ جان فطرتاً رحم دل ہے۔ یہ ابھی جان کے دشمنوں پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی چٹپٹا نا ہے لیکن میں اس سے بہت مختلف ہوں۔ اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارے منہ میں ہاتھ ڈال کر زبان کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا۔ پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ کس کیمپ سے تعلق رکھتے ہو۔ میں تمہیں صرف تیس سیکنڈ کا وقت دیتا ہوں۔ اس کے بعد میرا ہاتھ حرکت میں آجائے گا۔“

اس شخص کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ آنکھوں میں بے پناہ وحشت ابھر آئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ماسٹر نے جو کچھ کہا تھا، تیس سیکنڈ گزرنے کے بعد اس پر عمل بھی کر ڈالے گا اور پھر اس کی لمبے اس نے فریوڈن شروع کر دیا۔ اس کا نام موسا شارد تھا اور اس کا تعلق جس کیمپ سے تھا اس کا ماسٹر بھی خاصا بدنام تھا۔ اس جاپانی ماسٹر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مارشل آرٹسٹوں کی نہیں، غنڈوں اور قاتلوں کی جماعت تیار کر رہا ہے۔ اسے عام طور پر ٹریل میکر کہا جاتا تھا۔ اس کے شاگرد ہر ایک سے پیچھے بازی کرتے رہتے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ہمیشہ پختے ہی تھے لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے۔

موسا شارد بھی جاپانی ہی تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق تقریباً ایک ہفتہ پہلے ہکیمان نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہکیمان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ ہکیمان مجھے اغوا کرانا چاہتا تھا اور اس کے عوض اس نے ایک مقتول رقم کی پیشکش کی تھی۔

”میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں جانتا تھا کہ تمہیں چھوڑنا اپنی شامت بنانے کے مترادف ہے۔ میں تمہارے ہاتھوں بعض دوسرے لوگوں کا حشر دیکھ چکا تھا لیکن ہکیمان نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ خاصا جان دار تھا۔ ہکیمان نے یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ ہم چار ہوں گے اور تم صرف دو۔ اس لڑکی کو

اس نے کسی شمار میں نہیں سمجھا تھا۔“ اس نے جاگتی طرف اشارہ کیا ”ہکیمان کو معلوم تھا کہ تم تین روزانہ یہاں کسی قسم کی پریکٹس کے لیے آتے ہو۔ اس نے کئی روز تک تمہاری عمرانی کرائی تھی اور یہ اطمینان کر لیا تھا کہ تم تینوں کے سوا یہاں کوئی اور نہیں ہو تا۔“

”اس کا پروگرام یہ تھا کہ ماسٹر لیشی یان اور اس لڑکی بے بس کر کے تمہیں کسی پر ڈال کر لے جائیں گے۔ ہمیں ایڈوانسج تھا کہ ہمارے پاس اسلحہ تھا اور تم خالی ہاتھ تھے مگر ہم بھول گئے تھے کہ تمہارا خالی ہاتھ ہونا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“

”ہکیمان کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ مجھے افوا کر کے کہاں لے جانا چاہتا تھا؟“ اس مرتبہ یہ سوال میں نے کیا تھا۔

موسا شارد کے چہرے پر ایک رنگ سا اگر گزر گیا۔ شاید کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سوال دہرایا۔ اس نے اس مرتبہ بھی زبان بند رکھی۔ آنکھوں میں خوف کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے مگر بتائیں چاہتا۔ میں نے اچانک ہی اس کے منہ پر سات ایک زور وار پینج رسید کر دیا۔ وہ چنچا ہوا پینجے گرا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر دوبارہ سیدھا کر دیا۔ اس کے منہ سے خون برہ نکلا تھا اور جب اس نے تھوکا تو خون کے ساتھ ایک دانت بھی باہر گرا تھا۔ اپنا دانت دیکھ کر وہ اور بھی زور سے چیخنے لگا۔

”ایک ایک کر کے تمہارے سارے دانت نکال دوں گا۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا ”بتاؤ۔ ہکیمان مجھے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے؟“

میرا ہاتھ پھر فضا میں بلند ہوا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چہرے کے سامنے کر دیا۔

”بس۔ بتانا ہوں۔“ وہ ہکلیا۔ منہ سے چلو پھر خون تھوکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اس کا نام میگا تیرا ہے اور وہ تھالی لینڈ کا رہنے والا ہے۔“ اور پھر اس نے بیگ تیرا ڈاکو جو جلیہ بتایا تیس چوک گیا۔ میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ یہ وہی آدمی تھا جس کی نشان دہی چند روز پہلے جاگتی نے کی تھی اور میں اسے صرف ایک مرتبہ دیکھ سکا تھا۔ ”وہ تو کوئی مارشل آرٹسٹ نہیں ہے۔ یہاں شاؤن ٹیپل میں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا مارشل آرٹ

تعلق نہیں۔“ موسا نے جواب دیا ”یگا کے بارے میں کچھ اور بتایا تھا۔ اور میرا خیال ہے اس نے اپنا ہاتھ دیا تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما

۔ ہکیمان نے بتایا تھا کہ میگا کا تعلق گولڈن ٹرائی ہے۔ وہ گولڈن ٹرائی اسٹیکل کے بے تاج بادشاہ کھورات کا خاص آدمی ہے اور تمہارا تعاقب کرتے ہیں۔ یہاں تک آیا ہے۔ تم جزل کھورات کو ناقابل حلانی بن چکا کر بھاگے ہوئے ہو۔ میگا تمہیں پکڑ کر واپس لے جاتا ہے۔ اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا اور اپنے مقصد میں یاب ہو گئے تو وہ ہمیں اپنے ساتھ گولڈن ٹرائی اسٹیکل بٹائے گا۔“

”بتائے ہو گولڈن ٹرائی اسٹیکل کیسی جگہ ہے؟“ میں پوچھا۔

”میں لیکن سنا ہے کہ وہ علاقہ دنیا میں ہیروئن کی بار کا بے پروا مرکز ہے وہاں صرف جزل کھورات عمرانی ہے وہاں بے پناہ دولت ہے اوب۔“

گولڈن ٹرائی اسٹیکل ایک ایسا جہنم ہے جہاں جانے بوجھ کر واپس نہیں آ سکتا۔ میں نے اس کی بات کاٹنے کے لیے کہا ”وہاں تم جیسے لوگوں سے بیگاری جاتی ہے۔ اور وہ نہ مائس تک زندگی کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ وہ موت بٹایا ہوا ہے جہاں سے کوئی نکل نہیں سکتا۔“ میں نے ان کو خاموش ہوا پھر بولا ”اور تم خوش ہو کہ تمہیں گولڈن ٹرائی اسٹیکل جانے کا موقع مل رہا تھا۔“

”وہ طاقت خالص کر رہے ہو وہ جان۔“ ماسٹر لیشی یان نے جزم میں ہونے کا کہا ”یہ وہ لوگ ہیں جو چند ٹکوں کے لیے اس میں جی کو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ اس لیے انہیں کوئی سیدھا نہایت کی کوشش کرنا پڑے۔ اس سے یہ پوچھو کہ ان میں سے کون سے کس کے کہنے پر تمہیں موت کے چمکاتے ہو۔“

”موسا میرے پوچھنے سے پہلے ہی بول چکے۔“ ہکیمان کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر ہم تمہیں نہ بٹائیں تو تمہیں مار ڈالا جائے گا۔“

”اب واضح ہو گئی تھی۔ اس رات بھی مجھ پر قاتلانہ کارروائی کے کہنے پر کیا گیا تھا اور آج کی کارروائی بھی

اس کے کہنے پر عمل میں آئی تھی۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہو چکا تھا۔ موسا اب ہمارے لیے بیکار تھا۔ میں نے ماسٹر لیشی یان کی طرف دیکھا۔ اور پھر ہم موسا کو دوبارہ دینا کے کنارے پر لے آئے اس مرتبہ جاگتی بھی ہمارے ساتھ تھی۔

موسا ابھی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں اور پھر اچانک ہی ماسٹر لیشی یان اور میں نے موسا کو ہاتھوں اور ٹانگوں سے پکڑ لیا اور اسے دینا کے بالکل کنارے پر لے آئے چند سیکنڈ ہم اسے جھولے کی طرح جھلاتے رہے اور پھر اچھال کر دیوار میں پھینک دیا۔

وہ کنارے سے تقریباً دس فٹ دور پانی میں گرا تھا۔ وہ ہاتھ پیر مارتے ہوئے بری طرح جھج رہا تھا۔ پانی کی تیز لہریں اسے بہاتی ہوئی کنارے سے دور لے جا رہی تھیں۔ میں نے کنارے پر بیٹھ کر پانی میں ہاتھ دھوئے کچھ جھپکے منہ پر بھی مارے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں ایک دم نارمل ہو گیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ماسٹر لیشی یان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں فطرتاً رحو دل واقع ہوا ہوں لیکن حالات و واقعات نے میرے اندر کچھ خفی بھی پیدا کر دی تھی اور میں ان لوگوں کو تو زندہ چھوڑنے کو بالکل تیار نہیں تھا جو میرے وجود کو اس دنیا سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ موسا شارد کو دیر میں بھی بھینک کر میں نے کوئی برا نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کو ایک برائی سے نجات دلا دی تھی۔ اگر میں ان کے ہاتھ لگ جاتا تو کیا یہ مجھے زندہ چھوڑ دیتے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لڑائی کے آخری لمحوں میں جب میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور میں وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا تو ہکیمان نے فیصلہ کن انداز میں مجھ پر حملہ کیا تھا اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو وہ میری گردن موڑ دیتا مگر میں وقت پر جاگتی کی مدد اختل نے مجھے بچایا تھا۔ جاگتی کے ہاتھوں دشمنی ہونے کے بعد ہکیمان بھاگ نکلا تھا۔

عام طور پر اس وقت تک ہم لوگ اپنی پریکٹس مکمل کر کے واپس چلے جایا کرتے تھے لیکن آج اس بیٹھنے کی وجہ سے خاص دیر ہو گئی تھی۔ دوبارہ غار میں آکر ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور واپس چل پڑے۔

اپنے کیمپ میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ماسٹر لیشی یان نے ماسٹر ڈنگ پالی کو سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس رات بلو پاپ سے مجھ پر قاتلانہ حملہ کس کے کہنے پر کیا گیا تھا لیکن لیشی یان یہ بات گول کر گیا تھا کہ ہمارے ہاتھوں موسا کا





اس کی واپسی تقریباً دو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس سے ملنے والی اطلاع بڑی سنسنی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ پہلے تو شاؤ لن ٹیپل ہی کے علاقے میں مورود ٹانگ کو تلاش کرتا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا اور پھر شاؤ ٹانگ پہنچ گیا۔

مورود ٹانگ کی کار ایک سڑک پر کھڑی ہوئی مل گئی۔ شاؤ ٹانگ میں بھی بہت سے لوگ مورود ٹانگ کو جانتے ہیں۔ پوچھ چھچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی کل شام سے وہاں کھڑی ہے لیکن کوئی بھی شخص یہ نہیں بتا سکا کہ وہ گاڑی کب وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔

مورود ٹانگ کے بارے میں میرے دوست اب یقین میں بدلنے جا رہے تھے۔ ہکیان کو بھی میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ نہایت کینہ پرور اور کھلیا آدمی تھا۔ جو شخص ڈاکوؤں کے ایک منظم گروہ میں بیٹھ ڈال کر انہیں آپس میں لڑا کر مولا چکا ہو، اس کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوگا۔ وہ جس طرح ہمارے پیچھے رہا ہوا تھا اس سے بھی اس کی گندی فطرت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا اور پھر یہ محض اتفاق تھا کہ شاؤ لن ٹیپل پہنچتے ہی پہلے اس کی ملاقات نوڈر چیتے غنڈوں سے ہوئی اور پھر اسے ایک تیراؤ مل گیا۔

میں اسے اتفاق کہوں یا کچھ اور لیکن یہ کماؤت بالکل صادق آتی تھی کہ "کند ہم جس باہم جس پر دواز۔ کو تر با کو تر باز با باز" مجھے زندگی میں اب تک جو بھی لوگ ملے تھے وہ نہایت شریف، سچائی کا ساتھ دینے والے اور کبھی لوگ تھے۔ ان میں پر تائب نگہ، ہمارا راج، تھائی وانگ، جاگلی، چیکو وغیرہ قابل ذکر تھے اور اب مجھے ماسٹر بنگ پائی اور ماسٹر سی یان چیتے لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے برعکس دارا کو اسی کے قماش کے لوگ ملتے رہے تھے۔ ٹانگیز، بیڈرو، جی فانگ جیتے بد فطرت، غنڈے اور بد معاش اس کے حصے میں آئے تھے اور اب ہکیان کا قصہ تھا۔ زندگی کے اس مرحلے میں مجھے چیکو جیسی لڑکی ملی تھی۔ جو طوائف تھی اور صرف دولت ہی کو زندگی کا مقصد سمجھتی تھی لیکن وہ اپنے گھر کو بھول کر محض اس لیے میرا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تھی کہ اگر ڈانگ کو کار میں سیان چانگ اپنی بیوی سے کاراشان کے قتل میں ہمیں پھنسانے کی کوشش کرے تو وہ ہمارا دفاع کر سکے۔ دوسری طرف ہکیان کو میگا جیسا آدمی مل گیا تھا جو میری تلاش میں گولڈن ٹرائی اسٹیکل سے یہاں تک آ گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہکیان جبرا اپنے گھر کے ہمیں میں دنیا بھر میں لوگوں کو لوٹا پھرتا تھا۔ ہمارے ساتھ تصادم ہونے سے پہلے اس نے کسی کی کار کا ارتکاب نہ کیا ہو اور محض لوٹ مار کی چیزیں واروا تیں ہی کرتا رہا ہو لیکن اب اس کے ہاتھ پر رینگے جا چکے تھے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونے اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ گویا وہ ایسا بھیڑیا بن گیا تھا کہ وہ کو خون لگ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکوؤں کے ہمارے فرار کے بعد اس نے ڈاکوؤں کو تہیں میں کھڑا ہوگا۔ جو ایک آدھ زندہ بچا ہوگا اسے اس موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ یہاں اس نے نوڈر اوریا میں پیچیدگی رہا تھا جن کی لاشیں ماہی کیوں کو اور مجھے یقین تھا کہ اس نے مورود ٹانگ کو بھی ختم کرنا کہ وہ کسی کو شاؤ ٹانگ میں اس کے ٹھکانے کے نہ بٹا سکے اور میرے خیال میں ہکیان آگے بڑھنے کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے ماسٹر سی یان سے اپنے غدشات کا ذکر وہ بولا۔

"تشویش تو مجھے بھی ہے۔ اس قسم کے نوڈر ٹیپل آتے رہتے ہیں جو یہاں کا ماحول بگاڑنے کرتے ہیں لیکن ان کا علاج ہو جاتا ہے۔ وہ جرنیل اس کا لیے بالوں والا سامی۔ ہم سے وہ تین مرتبہ بعد اب ان کا نام سنائی نہیں دے رہا لیکن۔" نوڈر خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "کیس بالکل مختلف ہے۔ وہ دوسروں کی طرح ہر گدی کرنے نہیں آیا۔ اس کی سرگرمیاں تمام ہیں اور ہمیں اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ مجھے ہے کہ اس نے مورود ٹانگ کو قتل کر دیا ہوگا۔ شاؤ لن ٹیپل کو شاؤ ٹانگ بھیج رہا ہوں تاکہ وہ مکمل مطمئن کر کے آئیں۔"

دو دنوں کو اسی روز شام سے ذرا پہلے شاؤ ٹانگ گیا۔

اسی رات میں اور چیکو بھی کامیابی کے ساتھ جاگلی اس روز چیکو زیادہ ہی تھک گئی تھی اس لیے ساتھ نہیں آئی تھی۔

شاؤ لن ٹیپل کے من روڈ پر ہم ایک ریٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ ریٹورنٹ دراصل ایک کے کنارے پر تھا۔ پارک زیادہ بڑا نہیں تھا۔

ایک ایک ریٹورنٹ تھا۔ ہم جس ریٹورنٹ میں بیٹھے تھے اس کی عمارت صرف دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک کمران پر مشتمل تھا اور دوسرا کمر بڑا تھا جس میں من پانچ میزیں سجی ہوئی تھیں۔ البتہ عمارت کے رستے دونوں طرف کشادہ فٹ پاتھ پر دو ایک میزیں کرسیاں لگائی تھیں۔ کچھ کرسیاں پارک میں بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت خاصی رونق تھی۔ ہم تینوں ایک الگ تھلک میز پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیگر کمران کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک کالی پینے کے بعد ہم دو ایک دو ایک دہان بیٹھے بائیں کرتے رہے اور پھر ہم وہاں سے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ کامی سڑک کے دوسرے فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو دیکھ کر چوک ہو گئی۔ اس کے کپڑے کے آثار ایک دم بدل گئے تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ سامنے جو آدمی جا رہا ہے۔" اس نے گروں سے اشارہ کرتے ہوئے سرکوشی میں کہا "یہ وہی ہے جسے اس روز ہم نے ہکیان کے ساتھ مورود ٹانگ کی کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"کیا تمیں یقین ہے، یہ وہی آدمی ہے۔" میں بھی چپک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ نکلے ہوئے قد کا صحت مند آدمی تھا۔ اس نے جینز۔۔۔۔۔ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ چوں میں جو کمر تھے اس کی عمر بیستیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے بال قریب سے تراشے ہوئے تھے۔ گلے میں ایک لاک بھی نظر آ رہا تھا۔ جو بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ حرکت کے کش لگتا ہوا جا رہا تھا۔ اگر وہ یہاں کے قریب سے نہ گزر رہا ہوتا تو میں اس کے چہرے کو اس طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دائیں کندھے سے اس کا ایک تھمبلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ جس پر سفید جھار لگی ہوئی تھی۔

"کاشی۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "تم چیکو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں تموزی دیں آتا ہوں۔"

سڑک پر کچھ اور لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی اس لیے اس شخص کو تعاقب کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ اس سڑک پر دو تین جنازیم تھے۔ ایک جنازیم میں باؤس ہو رہے تھے۔ شور کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ اس جنازیم سے کچھ آگے جا کر وہ ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک کشادہ گلی میں مڑ گیا۔ اس مرتبہ میں جو گئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے تعاقب کا علم ہو گیا تھا یا اسی طرح مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے وہ اس امر کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ ہم واقعی اس کا پیچھا کر رہے ہیں کہ یہ محض اتفاق تھا۔

اور پھر وہ مختلف گلیوں میں گھومتا رہا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور ان گلیوں میں سناٹا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمارے تعاقب سے آگاہ ہو چکا تھا اور اب ان گلیوں میں گھوم کر ہمیں پکڑ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک اور گلی میں مڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دوشاری پیش نہیں آئی کہ وہ ہم سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے چیکو اور کامی کو اشارہ کیا اور خود بھی دوڑ لگا دی۔ اس گلی میں خڑتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ہم آبادی کے آخری سرے پر آن پہنچے تھے۔ یہ گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر چھوٹی چھوٹی چارائیاں شروع ہوجاتی تھیں جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اگر وہ ان پہاڑیوں میں داخل ہو گیا تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔

وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور جب وہ پہاڑیوں میں داخل ہو رہا تھا تو میں اس کے سر پہنچ چکا تھا۔ میں نے دور ہی سے اس پر چھلانگ لگادی اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گررا۔

پچھو پچھوئے چھوئے پھر تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پتھروں پر رگیدے لگے۔ اس نے مونہ پر مجھے دوڑا پھال دیا۔ میں پشت کے بل پتھروں پر گررا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کے بجائے ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ جان بچا کر گھانا چاہتا تھا۔

میں نے بھی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور چند گز کے فاصلے پر اسے جالیا۔ ہم ایک بار پھر ٹھمکنا ہو گئے۔ اس مرتبہ میں نے اسے پیروں پر اچھال کر دوڑ پیچھک دیا اور پھر جی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی اٹھتے میں دیر نہیں لگائی تھی۔





تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟  
”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر تم واپس کیوں آگئیں؟“ جاگتی ہوئی۔

”ایک غیر معمولی واقعہ پیش آگیا تھا جس وجہ سے مجھے ان کے ساتھ واپس آنا پڑا۔“ کاسنی نے کہا اور پھر اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ کوچی اور کوشی بھی توجہ سے سن رہے تھے۔ سچ جیسے میں بھی کچھ سمجھ رہا تھا۔ کاسنی کے خاموش ہونے پر کوچی بولا۔

”تم لوگوں کو دیر ہوگئی تو ہم پریشان ہو رہے تھے ابھی چند منٹ پہلے ہی ماسٹر لیشی یان نے کہا تھا کہ کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد کسی کو کاسنی کے فلیٹ پر بھیجا جائے میں کوشی کو بھیجنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم نے فوراً ہی دوڑ لگا دی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”صورت حال خاصی سنگین ہے اور میرا خیال ہے کہ ماسٹر لیشی یان کو آگاہ کر دینا چاہیے۔“

”ماسٹر کو یہاں بلانا مناسب نہیں۔ چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ میں کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں کوچی اور کوشی کے ساتھ ماسٹر لیشی یان کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر سونے کے لیے لیٹ چکا ہوگا لیکن وہ ایک کرسی پر بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی پشت پر لمب جمل رہا تھا جس کی روشنی کتاب پر پڑ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر ماسٹر نے کتاب رکھ دی اور ٹیبل لائٹ روشن کر دی۔ ہم تینوں نے ماسٹر کو بویا اور اس کے اشارے پر سامنے ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔

مجھے ایک بار پھر خروش سے سارا واقعہ دہرا نا پڑا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے وہ فائرنگ ہمیں جان سے مارنے کے لیے نہیں کی گئی تھی۔ وہ ہمیں صرف ڈرانا چاہتے تھے تاکہ ہم وہاں سے بھاگ جائیں۔“

”تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ حملہ تم پر نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی نہ تو اس کا رٹے تمہیں کیلئے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی فائرنگ تمہیں جان سے مارنے کے لیے کی گئی تھی؟“

”جیس ماسٹر۔۔۔“ میں نے جواب دیا ”کار جب سامنے سے آئی تو ہم پوری طرح اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھے کار میں جو بھی لوگ تھے انہوں نے ہمارے چہرے واضح طور پر دیکھے ہوں گے اگر مجھے مارنا ہوتا تو کار میرے اوپر چڑھا لی جاتی۔ مجھے کیلئے کی کوشش کی جاتی مگر ان کا مقصد شاید اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کی تصدیق اس

طرح بھی ہوتی ہے کہ اس شخص نے مجھ سے ہاتھ چڑھا دوسری طرف چلا گیا لگاوی تھی اور تیز رفتار کار میں دوڑنے اس کی طرف مڑ گئی تھی اور اسے کیلئے ہونے لگی تھی۔ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمیں اور میگا کے گھر آتے اور یقیناً مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ وہ شاید شہر سے رو کر اس شخص کی عمرانی کر رہے تھے اور جب دھماکا اسے پکڑ کر کہیں لے جا رہے ہیں تو انہوں نے اسے کاٹ کر کچل کر ختم کر دیا تاکہ وہ کسی کو کچھ بتانہ سکے۔“

”اور تم پہلے ہی اس سے سب کچھ معلوم کر چکے تھے۔“ ماسٹر بولا۔  
”جیس ماسٹر۔“ میں نے کہا ”مورو ٹانگ کو ہمیں اور میگا میں سے کسی نے مارا ہے۔“ میں نے کہا اور چند لمحوں خاموشی کے بعد بولا ”اس شخص کے کہنے کے مطابق کاسنی شاذ یا ٹانگ کی طرف جاتے ہوئے مورو ٹانگ نے کچل کر باتیں کی تھیں جس سے ہمیں پریشان ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ باتیں ایسی ہوں گی جن سے ہمیں کوشہ ہو گیا ہوگا کہ مورو ٹانگ اس کے کسی راز سے واقف ہو چکا ہے اور اس نے شاذ یا ٹانگ میں ان کا ٹھکانا بھی دیکھ لیا تھا اس لیے مورو ٹانگ کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔“

”اب صورت حال یہ ہے۔“ ماسٹر لیشی یان چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم لوگ نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ ہی تم لوگ اس آدمی سے ملنے بنے کا رے چل کر مار دیا گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ بولا ”یہ پولیس کیس ہے اور ماسٹر بنگ پانی بھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کے کیپ کا کوئی لوکا کسی پولیس پسند نہ ملوث ہو۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا پھر بولا ”یہ ایک ہی ڈہرے قتل کی واردات ہے۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد وہاں دیر بعد میں نے جس لڑکے کو شاذ یا ٹانگ بھیجا تھا وہ وہاں آگیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ پولیس کو مورو ٹانگ کی کار ڈکی سے اس کی لاش مل گئی ہے۔ شام تک تو پولیس شاذ یا ٹانگ ہی میں انٹرازی کر رہی تھی مگر مجھے یقین ہے کہ پولیس یہاں بھی پہنچ جائے گی اور میں نہیں چاہتا کہ اس کیپ کا لڑکا اس کیس میں ملوث ہو۔“

”تو کیا۔۔۔ میگا اور ہمیں کو بچ نکلنے کا موقع مل جائیگا۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا ”وہ قانون کے ہمارا بھی جرم ہے۔ ان لوگوں نے جس میں ایک مرتبہ چڑھا لی جاتی تھی۔ مجھے کیلئے کی کوشش کی جاتی مگر ان کا مقصد شاید اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کی تصدیق اس

دوسری مرتبہ ہمیں کڑی نسیب کرنا چاہا۔ کوئی معمولی بات ہو تو اسے معاف کر دیتے یا نظر انداز کر دیتے ہیں کوئی حرج نہیں لیکن میگا اور ہمیں کے جرائم بہت سنگین ہیں۔ یہ اس شخص کا اصول ہے کہ اپنے معاملات آپس ہی میں منسلک کر دیتے ہیں۔ پولیس کو رخصت نہیں دی جاتی۔ یہ بھی ہمارا آپس کا معاملہ ہے اسے ہم آپس ہی میں منسلک کر دیتے ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی آنسو تھی۔  
”میں نے اس شخص سے میگا اور ہمیں کا شاذ یا ٹانگ والا ٹھکانا تو معلوم کر لیا تھا۔“ ماسٹر لیشی یان نے کہا ”ہم کل کا دن صورت حال کا جائزہ لیں گے اگر میگا اور ہمیں کا پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو پھر ہماری مجبوری ہوگی۔ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ بصورت دیگر ہم کل رات ہی اپنی کارروائی کریں گے۔“

”اگلا میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔“  
ماسٹر لیشی یان مسکرایا۔ وہ میری اندرونی کیفیت کو سمجھ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جب تک میں اپنے اوپر ہونے والے حملوں کا بدلہ نہ لے لوں گا اس وقت تک مجھے چین نہیں آئے گا۔

اس کے بعد بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے اور جب میں واپس آیا تو ڈھائی بج چکے تھے جاگتی کاسنی اور میگا ایک ہی بستر ایک دوسرے سے لپٹی سو رہی تھیں۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

اگلے دن معمول کے مطابق گزرا۔ البتہ صبح سویرے ہی پورے شہر میں کچھ کچھ پولیس گزرتے رہے۔ رات جاتے واردات پر کوئی کچھ جہاں اس شخص کو کار سے پکڑ کر ہلاک کیا گیا تھا۔

پولیس دن بھر کار کے اس حادثے اور فائرنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پولیس سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کر سکی کہ کار سے کچلا جانے والا شخص مارشل آرٹسٹ نہیں تھا۔ کسی کیپ سے نہیں کاٹا گیا تھا۔ پولیس بھی نہیں تھا۔ متعدد لوگوں نے اس کی لاش دیکھی تھی مگر کوئی اسے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ وہ یہاں کے لوگوں کے لیے بھی نیا تھا۔

شام کو ماسٹر لیشی یان کو شاذ یا ٹانگ میں اپنے آدمی سے مل کر پورے مل گئی۔ مورو ٹانگ کی موت کی تحقیقات میں بھی کوئی ترقی نہ ہو سکی تھی۔

مورو ٹانگ کی جب میں ایک معقول رقم موجود تھی جس سے پولیس اس نیچے پر چلی تھی کہ یہ کوئی ڈھنسی یا رہنمی کی واردات نہیں تھی بلکہ قتل کی وجہ کسی قسم کی ذاتی دشمنی ہو سکتی تھی لیکن پولیس قاتل یا قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ اس طرح ہمیں اور میگا کا نام بھی سننے میں نہیں آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں پولیس کی نگاہوں سے محفوظ تھے۔

رات آٹھ بجے تک ہم مزید اطلاعات کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ جاگتی اس روز دن بھر اپنے ہی کمرے میں موجود رہی تھی۔ شاید مسلسل محنت اور ریاضت کی وجہ سے اس پر تھکن طاری ہو گئی تھی اور اسے آرام کی ضرورت تھی۔

نوبے کلاس ختم ہونے کے فوراً ہی بعد ہم کیمپ سے روانہ ہو گئے۔ ہم تین آدمی تھے۔ ماسٹر لیشی یان کوچی اور میں۔ رستوں والا بل پار کرتے ہی ہم سڑک پر دائیں طرف مڑ گئے اور تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے رگ گئے۔ ماسٹر نے کوچی کو چابیوں کا ایک بچھا دے کر کچھ کہا۔ کوچی عمارت کے پچھلی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد ایک کار عمارت کے پیچھے سے نکلی اور ہمارے قریب آکر رگ ٹکی۔ اسٹیرنگ کے سامنے کوچی بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ماسٹر لیشی یان کی کار تھی۔ جسے کبھی بھاری استعمال کیا جاتا تھا۔ میں اور ماسٹر لیشی یان پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار حرکت میں آگئی۔

پہلی مرتبہ ہم شاذ یا ٹانگ سے یہاں تک پیدل آئے تھے۔ وہ راستہ ٹیلا لٹا ہوا بیڑوں کے بیچ میں سے گزرتا تھا مگر سڑک والا راستہ خاصا طویل ثابت ہوا تھا۔

ہمیں شاذ یا ٹانگ پہنچنے میں تیس پینتیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس وقت دس بجے والے تھے اور قصبے کے بازاروں میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ کوچی کار کو پرجھوم سڑک سے گزرتا ہوا ایک کشادہ سڑک پر لے آیا جہاں دونوں طرف بنگلے تھے اس نے ایک بنگلے کے سامنے کار روک کر بارن بنجایا۔ صرف ایک منٹ بعد گیٹ کھل گیا اور کوچی کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

گیٹ کھولنے والا اوجھڑ عمر ملازم تھا۔ برآمدے میں کار رکھنے ہی سامنے والے دروازے سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ وہ درمیانے قد کا محنت مند آدمی تھا اس نے چوٹی لباس پہن رکھا تھا۔ ماسٹر لیشی یان جیسے ہی کار سے اترا، وہ شخص مارے نظم کے جھلکا ہوا آنکھوں تک ہنسا ہوا گیا۔





دیکھتا رہا۔

اسی دوران میں مجھے اپنے عقب میں قدموں کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی، میں نے توجہ نہیں دی۔ میرے خیال میں وہ کوچی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا لیکن اسی لمحے برآمدے کی طرف سے کوچی کی جھنجھکی ہوئی آواز سنائی دی۔

”وہ جان بچو۔“

جھنجھکی میں میں تیزی سے پیچھے گھوما لیکن مجھے بہت دیر ہو چکی تھی۔ سر ہلکنے والی ضرب سے میرا داغ بھینچا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی پانپنے لگیں اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆☆○

زوردار جھناکے کی آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ ذہن پر چھانے والی وحشت بدستور چھٹی چلی گئی۔ میرے حواس بحال ہونے لگے۔ داغ میں اگرچہ اب بھی دھماکے ہو رہے تھے مگر تکلیف اب قابل برداشت تھی۔

چند سیکنڈ پہلے میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تھی تو یہی سمجھا تھا کہ وہ کوچی ہو گا مگر وہ دراصل کوئی اور آدمی تھا جو بچکے کے پہلو کے دروازے سے نکل کر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی کوچی نے جھج کر مجھے خبردار کیا تھا۔ میں نے جھکا کر دے کر بچنے کی کوشش تو کی تھی مگر ڈنڈا میرے سر پر لگا تھا۔ جس سے میرے چوہہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اس شخص نے دو سرا دار کرنے کی کوشش کی ہو گی مگر کوچی نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا اور اس مرتبہ ڈنڈا کھڑکی کے شیشے پر لگا تھا۔ جس سے شیشہ چٹنا چور ہو گیا تھا اور جھناکے کی آواز سے میں بھی ہوش میں آ گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر سر جھٹکتے ہوئے بائیں طرف دیکھا۔ کوچی اور حملہ آور ایک دوسرے سے ٹکے ہوئے تھے۔ وہ شخص کوچی کو رگید رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس شخص کا پیر پکڑ لیا اور اسے پیچھے پھینک دیا۔

اس شخص نے کوچی کو چھوڑ دیا اور سانپ کی طرح پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا گھوٹا میرے سینے پر لگا تھا۔ میں نے اس کا پیر چھوڑ دیا اور لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شخص بھرتی سے اٹھ کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔

اس کا تھ جھٹ سے ٹکھا ہوا تھا اور جسم میں گینڈے کی طرح طاقت بھری ہوئی تھی۔ ماسٹر نیسی یان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس بچکے میں موجود ایک آدمی اسی کی طرح ہٹا کتا ہے اور میرا خیال ہے وہ مارشل آرٹ سے بھی واقف تھا۔ اس

کا پہلا حملہ تو بازاری انداز کا تھا لیکن پھر وہ سنبھلا۔ ایک منجھے ہوئے مارشل آرٹ کی طرح مجھ پر غلہ مارا۔ اس نے میری گردن پر چوہ لگانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا یہ وار روک لیا اور ساتھ ہی اس کی گردن پر فرسٹ لکک رسید کر دی۔ وہ جھٹکے سے ڈبیرا ہوا مگر زور سے لڑا۔

میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اپنے ہاتھ سے اسے اچھلتے ہوئے الٹی غلابازی کھلا کر دوں پیر اس کی گردن پر پلٹ گئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں پر ٹکا کر پوری قوت سے ٹانگوں کو بائیں طرف بھرا۔ شخص پورے تھکے ساتھ بائیں طرف گر گیا۔ میں بھرتی سے اپنے پیر اس کی گردن سے ہٹا لے اور اٹھ گیا۔

اس دوران میں کوچی بھی سنبھل گیا تھا۔ اندر سے عورت کے جھنجھکی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کوچی کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ مجھے سمجھے میں نے لکھی کی ماسٹر نیسی یان اور کوچی دوسری طرف سے آ رہے تھے۔

”کوچی۔ تم اسے سنبھالو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔“ نے جھج کر اندر عمارت کے پہلو کی طرف دوڑا۔ اس طرف کوچی برآمدہ وغیرہ نہیں تھا مگر ایک دھواں ہوا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا شخص اسی دروازے سے آیا تھا۔ سامنے ایک تاریک راہداری تھی۔ میں نے آگے بڑھتا چلا گیا۔ راہداری کے اگلے موڑ پر وہ شخص سے آئے والا کوچی شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس کے ایک نساویلی جھج بھی سنائی دی تھی۔ مجھے سمجھے میں نے لکھی کی کہ وہ کوچی عورت تھی جو کراچی گری تھی۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پیچھے گری ہوئی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر لباس پرانے نامی خوف کی شدت سے مسلسل جھج رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ دائیں طرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس جوان اور خوب صورت عورت کو بے اختیار مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ہو رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو اٹھا کر کمر بچھینک دیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کھڑا ہو گیا۔ اب میں اس کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوں۔

میں نے جھانکنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ عورت جسے میں دیکھتا تھا، ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اس نے ایک قدرے بھاری بھر کم آوی سے قسم کھائی تھی۔ اس کا فرنیچر الٹ پلٹ کیا تھا۔ وہ عورت کوچی پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس نے کوچی کی گردن پر فرسٹ لکک رسید کر دی۔ وہ جھٹکے سے ڈبیرا ہوا مگر زور سے لڑا۔

میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اپنے ہاتھ سے اسے اچھلتے ہوئے الٹی غلابازی کھلا کر دوں پیر اس کی گردن پر پلٹ گئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں پر ٹکا کر پوری قوت سے ٹانگوں کو بائیں طرف بھرا۔ شخص پورے تھکے ساتھ بائیں طرف گر گیا۔ میں بھرتی سے اپنے پیر اس کی گردن سے ہٹا لے اور اٹھ گیا۔

اس دوران میں کوچی بھی سنبھل گیا تھا۔ اندر سے عورت کے جھنجھکی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کوچی کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ مجھے سمجھے میں نے لکھی کی ماسٹر نیسی یان اور کوچی دوسری طرف سے آ رہے تھے۔

”کوچی۔ تم اسے سنبھالو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔“ نے جھج کر اندر عمارت کے پہلو کی طرف دوڑا۔ اس طرف کوچی برآمدہ وغیرہ نہیں تھا مگر ایک دھواں ہوا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا شخص اسی دروازے سے آیا تھا۔ سامنے ایک تاریک راہداری تھی۔ میں نے آگے بڑھتا چلا گیا۔ راہداری کے اگلے موڑ پر وہ شخص سے آئے والا کوچی شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس کے ایک نساویلی جھج بھی سنائی دی تھی۔ مجھے سمجھے میں نے لکھی کی کہ وہ کوچی عورت تھی جو کراچی گری تھی۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پیچھے گری ہوئی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر لباس پرانے نامی خوف کی شدت سے مسلسل جھج رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ دائیں طرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس جوان اور خوب صورت عورت کو بے اختیار مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ہو رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو اٹھا کر کمر بچھینک دیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کھڑا ہو گیا۔ اب میں اس کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوں۔

اس دوران میں وہ عورت بھی سنبھل گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ڈنڈا اٹھا لیا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لگی۔ اس وقت میں اپنے حریف کے اوپر تھا۔ میں اپنے حریف کو ساتھ لیتا ہوا بڑی بھرتی سے بائیں طرف لوٹ گیا۔ اس طرح حریف میرے اوپر آگیا اور ڈنڈے کا وار اس کی گھوڑی پر لگا۔ وہ پھینکا ہوا میرے اوپر ڈھیر ہو گیا۔

وہ عورت ایک لمحے کو ساکت ہو کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ابھر آئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر طیش والے والی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے سنبھل کر ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ ڈنڈا اس شخص کی پشت پر لگا۔ اسے شاید چوٹ کا احساس نہیں ہوا ہو گا کیونکہ سر ہلکنے والی چوٹ سے وہ پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے ایک طرف دھکیل دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس عورت پر جنون سا طاری ہو گیا۔ وہ بے در پے ڈنڈے سے مجھ پر حملے کرتی رہی اور میں اچھل اچھل کر اپنے آپ کو بچاتا رہا اور بالآخر میں نے ڈنڈے کو پکڑ کر اپنی طرف جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑائی ہوئی مجھ سے ٹکرائی۔ میں نے اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو بھی حرکت دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔

وہ اس طرح میرے سینے سے لگی ہوئی تھی جیسے محبوب کو لپٹا رکھا ہو۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ چہرے پر خوف اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔

”جو عورتیں شراب پیتی ہوں مسکرت نوشی کرتی ہوں۔ وہ بہتر مردوں کا دل تو ہلا سکتی ہیں لیکن وقت پڑنے پر اپنا دفاع نہیں کر سکتیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”عورت میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اتنی طاقت کہ وہ دنیا کو دبلا کر سکتی ہے۔ مگر تم نے تو اپنے آپ کو ہی تباہ کر ڈالا۔“

میں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر پیچھے کی طرف زوردار دھکا دیا۔ وہ شیشے کے ٹاپ والی سینئر نیبل پر گری۔ جھناکے کی آواز کے ساتھ ہی اس کی خوفناک جھج بھی کمرے میں گونجی تھی۔ سینئر نیبل کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ اندر دھس گئی تھی۔ شیشہ ٹوٹنے سے اس کی دونوں ٹانگوں اور ایک بازو پر کٹ لگ گئے تھے جن سے خون رسنے لگا تھا مگر زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔

”تم یہاں آرام کرو۔ میں ذرا اپنے ساتھیوں کو دیکھ لوں۔“ میں نے کہا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔

اور پھر وہ منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ایک آدمی کچھلی طرف جھاڑیوں میں بھاگا جا رہا تھا۔ کوشی اور کوئی اس کے پیچھے تھے اور پھر اسی لمحے اندر کسی کمرے سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دروازے کی طرف لپکا۔

دوسرے کمرے کا منظر خاصا دلچسپ تھا۔ ماسٹر لیشی یان دو حریفوں سے ٹپڑا رہا تھا۔ وہ دونوں مارشل آرٹ کے ماہر تھے اور ماسٹر لیشی یان کو بھی شاید ان سے مقابلہ کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ کمرہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس لیے مقابلے کے لیے جگہ کی کمی بھی نہیں تھی۔ البتہ سارا فرنیچر الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

ماسٹر کے حریفوں میں سے ایک کو تو میں نے پہچان لیا۔ وہ میگا تیراڑ تھا اور دوسرا میرے لیے اجنبی تھا۔ جسے ماسٹر نے میرے سامنے اٹھا کر دیوار کے ساتھ بٹخا دیا تھا اور وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ البتہ میگا ماسٹر پر تیزی سے حملہ کر رہا تھا اور ماسٹر بڑی خوب صورتی سے ان حملوں کا دفاع کر رہا تھا۔

دوسرا حریف اٹھ کر حملہ آور ہونے کے انداز میں ماسٹر کی طرف لپکا لیکن میں نے اسے قریب پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں کھڑے کھڑے طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور میری فلائنگ ٹک بھڑپور انداز میں اس شخص کے سینے پر لگی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اسے دو بارہ سینٹلے کا موقع نہیں دیا۔

اسی دوران میں ماسٹر لیشی یان مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ میگا کا ایک بیچ کھا کر اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اپنے آپ کو میگا کے مقابلے کے لیے تیار کرنا سیکھتا تو دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

ماسٹر لیشی یان اس کے پیچھے لپکا۔ میرے حریف نے بھی ایک زوردار چھلانگ لگا دی اور کھڑکی توڑا ہوا باہر چلا گیا۔ میں کھڑکی کی طرف لپکا تو وہ شخص بہت تیزی سے ایک طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے جانا بیکار تھا۔ میں مڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔

ماسٹر لیشی یان پر آمدے میں کھڑا دھڑا دھڑا رہا تھا۔ ”بھاگ گیا۔“ ماسٹر نے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس کے پیچھے جانا بیکار ہے۔“ مکیان کو دیکھو۔ وہ اندر ہی ہے۔“

ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ ماسٹر لیشی یان ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھک کر رک گیا۔ ”اے۔۔۔ وہ یہیں تھا۔ کہاں بھاگ گیا۔“ ماسٹر بولا۔

ہم کمرے سے باہر نکلتا ہی چاہتے تھے کہ آہٹ سن کر میں چوک گیا اور جب میں نے جھانک کر دیکھا تو دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ مکیان نے نیچے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر باہر لیا۔

مکیان کے جسم پر صرف چٹون تھی۔ بڑی ہندمی ہوئی تھی۔ جو پھلو کی طرف خون سے لگی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس روز جاکر وار کاری ثابت ہوا تھا اور مکیان اس قاتل کے کھانا دفاع کر سکتا یا بھاگ سکتا۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ بڑے زور زور سے دھڑا جا رہا تھا اور ساتھ ہی کسی عورت کے چلنے کی بھی سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ پھلو والے کمرے سے یہاں داخل ہوتے ہی ایک عورت مجھ سے ٹکرائی تھی۔ اٹھا کر میں نے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ مکیان کو ماسٹر لیشی یان کے حوالے کیا اور تیزاً کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے سامنے لپکا۔ دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ عورت جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر اندر داخل ہو کر کتنی جلدی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میری نظریں اس عورت کے چہرے پر جم گئیں۔ انہیں میں ایکس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر خوف تھا اور آنکھیں وحشت سے پٹی پڑی تھیں۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ وہ بے کاپ رہی تھی۔

”تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟“ میں نے اسے گھوم کر دوسرے کمرے میں۔“ اس نے ہلکا کر دیا۔

”مہم۔ میں مکیان والے کمرے میں تھی۔“ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور مکیان کے پاس لپکا۔ مکیان بیڈ پر پڑا تھا اور ماسٹر لیشی یان نے کھڑا کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

میں نے ایک کمری پر پڑے ہوئے زنانہ کپڑے دوسرے کمرے میں پھینک کر واپس آ گیا۔ مکیان کے جسم پر ہندمی ہوئی پٹی باندھی ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھا۔ میں نے اسے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔

”تمہارے سارے آدمی تو بھاگ گئے اور تم گھنٹال بھی جس کے کہنے پر تم نے مجھے موانہ کیا۔“

”نہی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”میں تمہارا کیا شکر دلانے کا تم خود ہی سوچ سکتے ہو۔“ ”میں نہیں وجدان۔“ ماسٹر لیشی یان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اے ہم ساتھ لے چلیں گے اور پھر اس سے پوچھ لیں گے۔“

اسی وقت نسوانی چیخ کی آواز سن کر میں باہر کی طرف دوڑا۔ میں عجب بے آہستہ میں پہنچا ہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔ کوئی اور کوشی اسی عورت کو پکڑ کر لے رہے تھے جسے میں نے دوسرے کمرے میں کپڑے لے جا کر دیے تھے۔ اس نے کپڑے پہنے کے بعد پچھلے دروازے سے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر اس طرف کوئی اور کوشی موجود تھی جو اسے پکڑ لے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

”چھوڑ دو اے۔“ میں نے کہا اور پھر اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تمہیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم توڑی دیر میں یہاں سے چلے جائیں گے اور تم بھی آزاد ہوگی۔“

اس لڑکی کو کمرے ہی میں چھوڑ کر ہم باہر آ گئے۔ مکیان ہمارے آگے تھا اور ماسٹر لیشی یان نے اسے کالر سے پکڑ رکھا تھا۔

میں اس کمرے میں آ گیا جہاں وہ دروازہ قامت عورت اب بھی سینٹر نیل کے اندر دھنسی ہوئی تھی۔ وہ اسی جگہ سے سینٹر نیل کا شیش ٹوٹ جانے سے وہ فریم کے اندر اس طرح پھنسی تھی کہ خود سے نکل نہیں سکتی تھی اور شاید اس نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ کوئی حرکت کرنے کی صورت میں ٹوٹے ہوئے شیشے اس کے جسم کو مزید زخمی کر سکتے تھے۔ دوسرا آدمی ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ جس کے سر اسی جگہ لٹکا ہوا تھا۔

”مجھے نکالو۔ مجھے نکالو یہاں سے۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ ”میرا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو رہا ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ مجھے نکالو یہاں سے۔“

”میرا خیال ہے یہ جگہ تمہارے لیے بہترین ہے۔“ میں نے کہا ”پوچھ دو یہاں آرام کرو۔ اور جب ٹھک جاؤ تو کوشش کر کے نکل آنا۔“

”میں تم لوگوں کو چھوڑوں گی نہیں۔“ وہ چیخ ”مار تمہاری تم لوگوں کو۔ تم لوگوں سے میرے گھر پر حملہ کیا ہے۔“ ”شکر کہ صاحب رونا پڑے گا۔“

”کہا۔“ دوسری مرتبہ ہمیں زندہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ میں نے ”دوسری مرتبہ ساتھ آؤ گی تو زندہ نہیں بچو گی۔ ان

لوگوں سے دوستی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“ میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر مکیان کی طرف اشارہ کیا اور کمرے سے باہر آیا۔

وہ لڑکی دوسرے کمرے میں تھی اور مجھے یقین تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ اسی جگہ اس مصیبت سے نجات دلا دے گی۔ ہم مکیان کو لے کر بنگلے سے باہر آ گئے۔

اشیشین وکین درخت کے نیچے موجود تھی لیکن حاشی کسیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ماسٹر لیشی یان نے اس کا نام لے کر آواز دی تو وہ پارک کے پودوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی۔

”سوری ماسٹر۔“ وہ قریب آتے ہوئے بولی ”مگر میں گاڑی ہی میں بیٹھی رہتی تو آپ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہی رہ جاتے اور میں کس نظر نہ آتی۔“

”کیا مطلب؟“ ماسٹر لیشی بولا۔

”تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی بنگلے سے نکل کر دوڑتا ہوا اس طرف آیا تھا۔ مجھے کچھ شبہ سا ہوا اور میں وکین سے اتر کر پودوں میں چھپ گئی۔“ حاشی وکین کا دروازہ کھولتے ہوئے بتا رہی تھی ”وکین سے اترتے ہوئے میں نے انکیشن سے چالی نکال لی تھی اور ڈیڑھ گھنٹے میں نے انکیشن دیا تھا۔ میرا شبہ درست نکلا۔ اس شخص نے وکین میں بیٹھ کر انجن اشارت کرنے کی کوشش کی تھی مگر انجن اشارت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس طرف بھاگ گیا۔“

”اوہ اوہ یقیناً میگا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ہم لوگ وکین میں بیٹھ چکے تھے حاشی انکیشن کے نیچے جھکی وہ تار جوڑ رہی تھی جسے اس نے خود چھینا تھا۔ پھر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور انجن اشارت کر دیا۔

”کیا اسی جگہ لوہے کو اطلاع دے گی؟“ میں نے ماسٹر لیشی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوال یہی ہے انہیں ہوتا۔“ ماسٹر نے جواب دیا ”وہ خود بھی ایک بدنام عورت ہے۔ پہلے سے پولیس کی لسٹ پر ہے۔ اس نے خطرناک مجرموں کو پناہ دے رکھی تھی۔ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے کر وہ اپنی گردن نہیں پھنساوے گی۔“

میں نے مڑ کر مکیان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھلی سیٹ پر کوئی اور کوشی کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وکین حرکت میں آچکی تھی۔ اس مرتبہ حاشی نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کا ایک بج چکا تھا مگر قصبے کے بعض علاقوں میں توڑی بہت رونق نظر آ رہی تھی۔ ایسی جگہوں پر کسی حقیصا ٹائٹ کلب کی وجہ سے اکاؤنڈرینورٹ بھی کھلے

ہوئے تھے۔

ایک موڑ گھومتے ہی حاشی کو دیکھیں کی رفتار کم کرنی پڑی۔ سامنے پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ حاشی نے ماسٹر کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ کر دیا کہ مین روک لے۔ وہ چار پولیس والے تھے۔ تین رائلز تان کر کھڑے رہے اور چوتھا دیکھ کر ڈرائیونگ سائڈ پر آگیا۔ اس نے پہلے حاشی کو دیکھا اور پھر محتاط انداز میں آگے جھک کر دیکھ کر دوسرے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ماسٹر لیشی یان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ چوک گیا۔ اس نے بوکیا اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

”ماسٹر! اس وقت آپ شادی تگ میں ہے“

”ایک ضروری کام سے آئے تھے۔“ ماسٹر نے جواب دیا ”کیا بات ہے۔ یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟“ ”سٹریٹ ایج کے ایک مکان میں ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے۔ قاتل کی تلاش میں چیکنگ ہو رہی ہے۔“ پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ اس نے ایک بار پھر بوکیا اور اپنے ماتحتوں کو گاڑی کے سامنے سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

وہ پولیس آفیسر بھی ماسٹر لیشی یان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ ماسٹر کی موجودگی اس وقت کام آگئی تھی۔ اگر ماسٹر ہمارے ساتھ دیکھن میں نہ ہوتا تو پولیس والے ہمیں دیکھن سے اتار کر چیک کرتے اور ہمسایان کے پیٹ پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی ہمیں پھنسا دیتی۔

حاشی کے بچنے پر پہنچنے ہی ہمسایان کو ایک کمرے میں پھنسا دیا گیا۔ ماسٹر نے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں ہمسایان کے علاوہ صرف میں اور ماسٹر تھے۔

”تم پہلے سے زخمی ہو۔“ میں نے ہمسایان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر تم مزید تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے رہو۔ بصورت دیگر تم“

”اس وقت تو میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“ ہمسایان کراہتے ہوئے بولا ”لیکن یہ بات ذہن نشین کر لو کہ تمہاری موت کے پروانے پر دستخط ہو چکے ہیں۔ میگا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”میگا سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ میگا سے تمہاری ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی؟“

وہ چند لمحوں خاموش رہا اور پھر میرے ہر سوال کا جواب

دیتا چلا گیا۔ ہمسایان کے کہنے کے مطابق میگا سے اس کی ملاقات شادی تگ ہی میں ہوئی تھی۔ میگا کو کسی طرح پتا چڑ گیا تھا کہ ہمسایان سے میری چیکنگ چل رہی ہے اور وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے یہاں آیا تھا۔

میگانے اسے چیکنگ کی تھی کہ اگر ہمسایان مجھے اپنا کر کے اس علاقے سے باہر نکال لے جائے میں اس کی مدد کرے تو اسے نہ صرف ایک خطرناک رقم دی جائے گی بلکہ چاہے تو اس کے ساتھ کوئلڈن ٹرائیڈنگ بھی جاسکتا ہے۔

”میں نے من شرن کو ایک بڑی رقم کالاج دے کر نہیں انوا کر کے کی دسے داری سوچنی تھی۔“ ہمسایان نے کہا

”من شرن شادون کا سب سے سینئر اور ماہر بارشل طرف تھا۔ اسے آج تک کسی نے چیکنگ نہیں کیا تھا کمرے سے وہ خود محسوس کرتے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن من شرن کے مقابل آؤ گے اور وہ تم سے ٹکلت کھا جائے گا۔ اس خوف نے اس کے دل میں تمہارے لیے نفرت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے تمہارے انوا کی دسے داری سوچ کر اس نے بلو پائپ کے ذریعے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی۔ تمہارے بجائے کوئی اور لڑکا زہریلی سونی کا شکار ہو گیا۔ زہر کی کوشش میں من شرن تمہارے ہاتھ لگ گیا اور تم نے من شرن کی طرح اس کی پٹائی کی تھی۔ اس کا بھی مجھے پتا چل گیا تھا۔ اسے شاید یقین تھا کہ تم لوگ اسے تشدد کا نشانہ بناؤ گے اس لیے اس نے سائنائڈ کا کیسول کھا کر خودکشی کر لیا۔“

”اور مورود تانگ کو تم نے قتل کیوں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”مورود تانگ نے خود اپنی موت کو آواز دی تھی۔“

ہمسایان نے جواب دیا ”من شرن سے میری ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی اور ہم میں یہ ساری باتیں ہوئیں۔ مورود تانگ وہاں کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ اس وقت تو وہ مجھ سے بولا تھا لیکن جب میں دوبا پر تمہارے انوا کی کوشش میں ناام اور جاگنے کے ماتحت زخمی ہو کر اس کی کاہر شادی آ رہا تھا تو باتوں ہی باتوں میں اس نے بتا دیا کہ اس روز زہر نے ریسٹورنٹ میں میری اور من شرن کی باتیں سن لی تھیں۔ میں ایک دم چوک گیا۔ وہ میرے لیے خطرہ پیدا کر سکتا تھا۔ میں اسے اپنے ٹھکانے تک لے گیا جہاں میگا بھی موجود تھی اور پھر میگا سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اسے موت گھاٹ اتار دیا۔“

”میگا کا کوئی اور ٹھکانا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ بھلا

بچے کے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے؟“

”مجھے اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔“

ہمسایان نے جواب دیا۔

”میں نے ایک تعلق ہے؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”اینگیلا ایک عورت ہے۔ اس کے پاس کوئی بھی شخص جاسکتا ہے۔“ ہمسایان نے کہا ”میگانے اس سے ملے کر لیا تھا کہ وہ جب تک اس کے پاس رہے گا کوئی اور مرد وہاں نہیں آئے گا۔“

”اس شخص کو کس نے مروایا تھا جو اس روز شادون سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تاد۔“ ہمسایان بولا ”وہ بہت بزدل آدمی تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے یہاں سے بھگا دیا جائے مگر وہ کم بہت شادون پہنچ گیا۔ میگا کے آدمی اس کی عمرانی کر رہے تھے۔ میگا نے اپنے آدمیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر وہ کوئی گویہ کرنے کی کوشش کرے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک میگا کے آدمیوں کی نگاہوں سے اوچھل رہا تھا اور جب دوبارہ نظروں میں آیا تو اس کے ہاتھ دو لڑکیاں اور ایک آدمی بھی تھا۔ وہ خود لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میگا کے آدمیوں کو شبہ ہوا کہ کوئی گویہ ضرور ہے۔ انہوں نے اسے کار سے کچل کر مار ڈالا اور ان لڑکیوں اور اس آدمی کو ڈرانے کے لیے دایں جاتے ہوئے ایک ہوائی بمٹ مار دیا۔“

”جانتے ہو وہ دو لڑکیاں اور ان کا ساتھی کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔

ہمسایان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”وہ میں تھا اور میرے ساتھ کامی اور چیکو تھیں۔“

میں نے کہا ”میں نے انہیں اور تاد کو مورود تانگ کی کار میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور آج ہم ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھے جانے لے رہے تھے کہ کامی نے تاد کو زہر لیا۔ ہمیں مورود تانگ کے قتل کا پتا چل چکا تھا، ہم تاد سے تمہارا اور میگا کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ تاد کو شبہ ہو گیا۔ اس نے ہائیڈروجن کی طرف جا کر ہمیں پتلا دینے کی کوشش کی مگر ہم نے فٹ پائپس سے اسے پتلا دیا اور اس نے سب کچھ بتا دیا۔ لہذا بھلا کے ہاتھوں کو خاموش ہوا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”تمہارے ہاتھوں اتنے بے گناہ مارے جا چکے ہیں کہ تمہیں کم از کم دس مرتبہ پھانسی کے پھندے پر لٹکانا پڑے

گا۔“

”مگر مجھے چھوڑ دو۔“ ہمسایان گھمکتے ہوئے بولا ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا اور آئندہ تمہارے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

”تمہارے ساتھ کیا کرتا ہے؟“ اس کا فیصلہ میں نہیں ماسٹر کریں گے۔“ میں نے لیشی یان کی طرف اشارہ کیا۔

”پلیز! ماسٹر میں زخمی ہوں۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔“ ہمسایان روتا ہوا ماسٹر لیشی یان کے قدموں میں گر گیا۔

ماسٹر نے اسے ٹھوکر مار کر پیچھے کر دیا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ بھی میری طرح کسی بے رحم اور ظالم کو معاف کرنے کا قائل نہیں تھا۔ میں پہلے بھی شاید ایک دو مرتبہ یہ پتا چکا ہوں کہ ظالم جب کسی پر ظلم کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے لیکن جب اپنی جان پر پتی ہے تو خدا یاد آئے لگتا ہے اور رحم کی بجائے مانتے لگتا ہے۔ حقیقتاً یہ لوگ بہت بزدل ہوتے ہیں کسی کا ایک حقیر بھی برداشت نہیں کر سکتے اور میرے خیال میں دھرتی کو ایسے لوگوں کے بوجھ سے ہلکا کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ہمسایان کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے فرش پر ڈال دیا گیا اور جب ہم کمرے سے باہر آئے تو حاشی شب خانی کے رواجی پٹنی لباس میں تھی۔ یہ لباس ڈھیللا ڈھالا لیکن جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤن نمالاس کی آستینیں بھی بہت لمبی تھیں اور ہاتھ بھی مجھے ہوئے تھے۔ جب وہ ہمارے لیے چائے بنانے لگی تو اسے آستینیں اوپر تک اٹوس لینا پڑی تھیں۔

ہم صبح جا رہے تھے۔ وہاں رہے اور پھر ہمسایان کے بارے میں چیکنگ شادون حاشی کو ہدایات دے کر شادون کے لیے روانہ ہو گئے۔

اپنے ٹیک میں پہنچ کر مجھے صرف آدھا گھنٹا آرام کرنے کا موقع مل سکا اور پھر میں تیار ہو کر ساڑھے پانچ بجے ہماڑی پر پہنچ گیا جہاں ماسٹر ہنگ پائی حسب معمول مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ میں نے اگرچہ جاگنے کو آج بھی نہیں بنگایا تھا لیکن میں خود اپنی پی کی پر ٹیکس میں کوئی تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پریکٹس کے اختتام پر حسب معمول ماسٹر ہنگ پائی کچھ دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا اور پھر جب مشرق کی ایک ہماڑی چوٹی کی آڑ سے سورج نے سر اٹھار تو ماسٹر ہنگ پائی نے سورج کے سرخ گولے پر نظریں جمادیں اور مجھے وہاں سے اٹھنے کا موقع مل گیا اور میں جوگ کرتا ہوا وہاں سے دور نکل گیا۔

میں واپس آیا تو جاگی وغیرہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جاگی نے ہی سب سے پہلے مجھ سے سوال کیا تھا کہ گزشتہ رات کیا ہوا تھا۔ میں انہیں تفصیل بتاتا رہا۔

مجھے سیزرینڈ ڈینس کی پریکٹس کرتے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اس روز ماسٹر لیٹی یان خود میرے مقابلے پر آیا۔ وہ مجھ پر ایسے وار کر رہا تھا جنہیں میں نے سیزرینڈ ڈینس ٹیکنیک سے روکنا تھا۔ شروع شروع میں تو مجھے کچھ ناکامی ہوئی لیکن مسلسل پریکٹس سے مجھے عملی تجربہ ہوتا گیا۔ ایک مرتبہ جب لیٹی یان نے حملہ کیا تو اس کا ہاتھ نیچے آنے سے پہلے ہی میں نے بڑی پھرتی سے دونوں بازو اس طرح اپنے سامنے کر لیے کہ کلائیوں کو نیچے کے کیلڈز کی طرح ایک دوسرے کو کراس کرنے لگیں۔ ماسٹر کا بازو اس کی کلائی سے ذرا پیچھے اس کراس پر پڑا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیوں کی پشت کو آپس میں ملا لیا۔ اس طرح ماسٹر کا بازو میرے کراس کے ٹکٹے میں پھنس گیا۔

”گڈ۔“ ماسٹر لیٹی یان مسکرا دیا اور پھر اچانک وہ چیخا ”زور لگاؤ۔ دباؤ میرے بازو کو۔“

میری پوری قوت میری ہاتھوں میں سمٹ آئی تھی۔ میری بند مٹھیوں کے جوڑ سفید ہونے لگے۔ ماسٹر لیٹی یان کا بازو ٹکٹے کی طرح میری کلائیوں کے کراس میں پھنسا ہوا تھا۔ ”تمہارا زور کھندوں میں نہیں۔ کئی سے آگے انگلیوں کی پوروں تک ہونا چاہیے۔“ ماسٹر نے ایک بار پھر چیخ کر کہا ”گڈ۔ لیکن تمہاری کنبیوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اسے روکو۔ وری گڈ۔ اور اب دیکھو میں اپنا بازو کس طرح چھڑاتا ہوں۔“

ماسٹر چند لمحے زور آزمائی کرتا رہا اور پھر اس نے مل کر تے ہوئے اپنے بازو کو اس طرح جھکا دیا کہ وہ میرے ٹکٹے سے نکل گیا۔

”بہت خوب!“ ماسٹر نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ اور اپنی کلائی سسلانے لگا ”پریکٹس کی ضرورت ہے۔ چند روز کی پریکٹس سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ حریف کے بازو کی ہڈی توڑ سکو۔“

اور اس طرح میری پریکٹس جاری رہی۔ ماسٹر لیٹی یان نے مجھ کو ٹیکنیک بھی سکھا دی کہ جب اپنا ہاتھ حریف کے ٹکٹے میں پھنس جائے تو اسے کس طرح آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ تین چار ہفتوں کی مزید پریکٹس کے بعد میں اس ٹیکنیک میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔

انہی دنوں ایک کیپ کے سالانہ چیلنج مقابلوں کی

تاریاں ہو رہی تھیں۔ اس تقریب میں اس کیپ کے کامیاب امیدواروں کو ڈگریاں بھی دی جاتے والی تقریر ہمارے کیپ کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن پھر اچانک اس تقریر کی تقریب ملتوی کر دی گئی۔ اگرچہ اس التوا کی وجہ مجھے کو شش کی گئی تھی لیکن وہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ یہ اکثر سب کے لیے نہایت مستحسن خیر ثابت ہوا کہ اس کیپ کے لڑکیاں اور تین لڑکے ہیروئن استعمال کرنے لگے تھے۔ پانچوں اپنی ٹریننگ کے آخری ٹیسٹ میں حصہ لینے والے تھے۔ کامیابی پر انہیں ڈگریاں دی جاتیں اور وہ اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو جاتے۔

یہ خبر جنگلی کی آگ کی طرح پورے شاولن میں پھیلی گئی۔ اور پھر نئے انکشاف ہونے لگے۔ ہر ایک کی زبان نہ کوئی لڑکا یا لڑکی اس لغت میں جتنا بتایا گیا تھا اور بدقسمتی ہمارے کیپ کے دو لڑکے بھی اس کا شکار ہو گئے تھے۔ کسی بھی کھیل میں کوئی فٹ نقصان نہ ہوتا ہے۔ اسٹیٹمنٹ کو تباہ کر دیتا ہے۔ میں نے بھی کسی کو سگریٹ نہ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہیروئن کے نشے کے تباہ کن اثرات تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس ذہنی میری تھالی کو مجھ سے چھین لیا تھا۔

نشے کے عادی لڑکوں کو کیپ سے نکال دینا کوئی بڑا نہیں تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان لوگوں کو طاق دیا جائے جو یہ ذہن ان کے خون میں پھیلا رہے تھے۔

ابتدائی پوچھ سمجھ سے یہ بھی پتا چل گیا کہ ہیروئن ہیروئن کو متعارف ہوئے دیرھ دو مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوا تھا۔ میرے ذہن میں میگا حیراؤ کا نام ابھر آیا۔ قریب دو مہینے پہلے ہی اسے یہاں دیکھا گیا تھا۔ اس کا تعلق چو کاٹہ برٹس سے تھا اسی لیے اس پر شبہ فطری بات تھی۔ وہاں کے بعد اگرچہ یہاں نظر نہیں آیا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ خود ہی یہاں آکر پڑیاں بانٹا پھرے۔ یہ کام تو وہ کسی سے بھی لے سکتا تھا۔ میرے ذہن میں دو نام اور تھے۔ جس نے وہ اور اس کا لمبے بالوں والا برطانوی ساتھی جو دو مہینے ہمارے ہاتھوں پٹ چکے تھے وہ دونوں اسی فطرت کے تھے کہ پیسے کے لیے اس قسم کا کوئی بھی کام کر سکتے تھے۔ انہیں بھی کئی روز سے شاولن میں نہیں دیکھا گیا تھا۔

میں نے ماسٹر لیٹی یان سے اپنے شیخ کا اظہار کیا۔ پھر ہم نے خفیہ طور پر تحقیقات شروع کر دی۔ کوئی بڑا ساٹھ تھا۔ ہم ہیروئن استعمال کرنے والوں سے پوچھنے کے انہیں پڑیاں کون سیلائی کرتا تھا مگر کوئی بھی نام نہ

نہیں تھا۔ انہیں یا تو بڑے نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھیں یا خوف تھا کہ اگر سیلا کر پکڑا گیا تو وہ لوگ اس نشے سے خود بوجا بن گئے۔

پانا آخر کی دوسرے کیپ کی ایک لڑکی میرے ہاتھ لگ گئی۔ وہ تھالی لینڈ کی رہنے والی تھی اور اتفاق سے ماسٹر ہو جن سے مارشل آرٹ کی ابتدائی تربیت حاصل کر چکی تھی۔

میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو وہ چونک سی گئی۔ اس نے ہنگام میں میرا نام ضرور سنا تھا لیکن مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں جھوٹ بول رہا ہوں لیکن ناموں اور واقعات کے حوالے کام کر گئے۔

”اگر میں نے ان کے بارے میں بتایا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ شاشی نامی اس لڑکی نے کہا ”وہ مجھے پڑا دیتا بند کر دیں گے۔“

”پانا میں تمہیں دوں گا اور ڈرو نہیں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ تم بتاؤ وہ کون ہیں؟“ میں نے کہا ”اور یہ بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہیروئن تمہیں تباہ کر دے گی۔ کھوکھلا کر دے گی تمہیں اور تم بھی مارشل آرٹ نہیں بن سکو گی۔ یہ نشہ تم سے زندگی چھین لے گا اور تم پڑیاں لڑ کر مگر مریاؤ گی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہو کر پھیرا ”تم تو ہنگام کی رہنے والی ہو۔ وہاں تم نے قدم قدم پر ایسے اندوہناک مناظر دیکھے ہوں گے۔ چائنا ٹاؤن میں۔ گانگ اسٹوکر پر۔ گنجان آبادی کی ہر گلی کے موڑ پر تم نے ایسے لوگوں کو ضرور دیکھا ہو گا جو ہیروئن کی لغت کا شکار ہو کر مفلوج ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہے۔ ان کی زندگی خود ان کے لیے بوجھ بن گئی ہے۔ ذی ہوش لوگ انہیں نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انہیں بعد روئے کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ بعد روئی تو ان سے ہوتی ہے جو زیادتی اور ظلم کا شکار ہوا ہو۔ اور جو شخص جان بوجھ کر آگ میں کود رہا ہو۔ اس سے بعد روئی کیسی؟ وہ بڑوں پر بڑے بھیک کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ بچھانے میں کھرا نہیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو؟ نہیں شاشی۔“ میں نے اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے لیا ”یہ ہاتھ بھیک مانگنے کے لیے نہیں ڈھنڈھ میں تو بڑی قوت ہے۔ دوسروں کو سہارا دینے کی بے حد طاقت ہے ان ہاتھوں میں۔ تم ان ہاتھوں کی طاقت کیوں نہ کر لینا چاہتی ہو۔ ہیروئن تمہارے ان ہاتھوں سے تمہارے پورے جسم سے زندگی نچوڑ لے گی۔ نہیں شاشی۔ تم فوٹن بڑی مارشل آرٹ بنا چاہتی ہو۔ یہاں تک آئے

کے لیے تم نے بجائے کتنی مصیبتیں برداشت کر لی ہیں۔ کتنے نقصان مراحل سے گزری ہو گی لیکن بچکی بھراؤور نے تمہیں ڈھیر کر دیا۔ تمہارے جسم کی ساری شکتی نچوڑ کر رکھ دی۔ کیا تم ہار مان جاؤ گی۔ شکست کھا جاؤ گی۔ ایک بات یاد رکھو۔ کوئی سچا مارشل آرٹ آسانی سے شکست نہیں کھاتا۔ وہ ہار میوں کو فروغ نہیں دیتا نہ ہی ان کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنتا ہے۔ تم تو ایک سچی مارشل آرٹ ہو۔ اس فن سے محبت ہی تمہیں اپنے کھرے ہزاروں میل دور یہاں پہنچ لائی ہے۔ کیا تم سب کچھ ضائع کر دو گی۔ اپنی ساری محنت پر پانی پھیر دو گی؟ نہیں شاشی۔ تم اپنے ساتھ ایسا نہیں ہونے دو گی۔ اس برائی کو روکنے میں ہماری مدد کرو۔ تم کیسی نہیں ہو اور ابھی بہت سے لڑکے اور لڑکیاں اس لغت کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ سب برباد ہو جائیں گے۔ انہیں بچانے میں ہماری مدد کرو۔ تم ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ جو یہ زہر پھیلا رہے ہیں اور لیکن کر دو تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ ویسے بھی یہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ تمہارا علاج ہو جائے گا۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور مارشل آرٹ میں ضرور نام پیدا کر دو گی۔“

شاشی سر جھکا کے خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا شاشی۔“ میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”پتاؤ ان کے نام۔ ہم آج ہی ان سے نمٹ لیں گے۔“

شاشی کچھ کتنا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور پھر اس نے وہ نام بتا دیے۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میرا شبہ درست نکلا تھا۔ وہ جرمن نوڈر اور اس کا لمبے بالوں والا ساتھی بائیکل تھے۔

”مگر ان لوگوں کو تو بہت دنوں سے یہاں نہیں دیکھا گیا۔ وہ تم سے کیسے رابطہ کرتے ہیں؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا۔

”وہ دونوں شاولن کی گلی میں رہ رہے ہیں۔“ شاشی نے بتایا ”ہر تیسرے روز یہاں آتے ہیں۔ انہوں نے گیخو پارک کو اپنا آڈا بنا رکھا ہے۔ جہاں کافی شاپ ہے۔ وہ اس سے ذرا ہٹ کر درختوں کے نیچے ایک بیچ پر بیٹھے رہتے ہیں اور ضرورت مند وہاں جا کر ان سے پڑیاں لے لیتے ہیں۔“

”تم دن بعد۔“ میں بڑبڑایا ”وہ آخری مرتبہ کب آئے تھے اور اب کس روز آئیں گے؟“

”دودن پہلے آئے تھے۔ اب وہ کل آئیں گے۔“ شانتی نے جواب دیا ”وہ رات آٹھ سے دس بجے تک وہاں بیٹھے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ لوگ ہیروئن کہاں سے لیتے ہیں؟“

”نہیں۔“ شانتی نے نفی میں سر ہلایا ”مجھے نہیں معلوم۔“

”ٹھیک ہے شانتی۔“ میں نے اس کا کدھا تھپتہاتے ہوئے کہا ”کل وہ یہاں آئیں گے تو واپس نہیں جائیں گے اور ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ مجھے ان کے بارے میں کس نے بتایا تھا۔ میں تمہارے ماسٹر سے بات کرتا ہوں۔ آج ہی تمہارا علاج شروع کر دیا جائے گا اور تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔“

شانتی کی عمر پچیس چھپیس سال رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر اضطحال واضح طور پر نظر آ رہا تھا اور یہ پرموگی ہیروئن کے استعمال کا نتیجہ تھی۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ بروقت پتہ چل گیا تھا۔ اگر چند ہفتے مزید گزر جاتے تو وہ پتھر کر رہ جاتی۔ میں جب رخصت ہونے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

”ایک بات تم بھی سچ بتا دو۔“ وہ میرے چہرے پر نظر فرس جاتے ہوئے بولی ”کیا تم وہی وجدان ہو جو۔“

”تمہیں اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”میں وہی وجدان ہوں جس نے ہنگام میں منشیات کے سب سے بڑے تاجر اور بد معاش ٹائیگر کی گردن مروڑی تھی۔ پندرہ مہینے میرے ہی ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا۔ ویسے کیا تم ڈاکٹر جاگنی دیوی کو جانتی ہو۔“

”ہاں ہاں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ شانتی نے گردن ہلا دی ”ہنگام میں اس کا نام بھی تمہارے نام کے ساتھ سنا جاتا تھا اور ایک اور عورت بھی تھی تمہارے ساتھ۔ ہاں یاد آیا۔ اس کا نام تھانی وانگ تھا۔“

”ہاں تھانی وانگ۔“ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا ”وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ جانتی ہو اس کی موت کیسے ہوئی تھی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش رہا پھر بولا ”وہ میرے دشمنوں کے ہاتھ لگی تھی۔ کئی روز تک ان کی قید میں رہی۔ اس دوران میں اسے کثرت سے ہیروئن کے انجکشن دیے جاتے رہے اور جب میں نے اسے دشمنوں کی قید سے آزاد کر لیا تو اس کے بدن سے زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا۔ ہیروئن نے اسے موت کے تاریک غار میں دھکیل دیا۔“

میں وہ لمحات کبھی نہیں بھول سکوں گا جب تھانی نے آنکھوں میں زندگی کا آخری سانس لیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ شانتی نے کہا ”اور ڈاکٹر جاگنی دیوی۔؟“ وہ سوالیہ لگا ہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”جاگنی میرے ساتھ ہے۔ یہاں شاؤن ہیں۔“

جواب دیا۔ ”ہاں۔ ایک دو دن بعد میں تمہیں اس کے ملوان دیں گا۔“ میں نے کہا۔

میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور شانتی سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا اس کا دادا ہندو تھا۔ عرصہ پہلے روزگار کی تلاش میں تھانی لینڈ آیا تھا اور پھر یہیں آباد ہو گیا تھا۔ اس نے شادی بھی ہنگام کی ہندو برادری میں کی تھی۔ وہ ہندو تھا۔ اس کے بیٹے ”شانتی کے باپ“ نے پھر مذہب اختیار کر لیا۔ اس طرح شانتی اور اس کے بہن بھائی بھی مذہب کے ہونے کے لیے لیکن ہندو برادری سے بھی ان کے تعلقات استوار تھے۔ ڈاکٹر جاگنی کو وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

”اب میں چلتا ہوں شانتی۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”آج ہی سے تمہارا علاج شروع ہو جائے گا اور ہمیں دوا کرنا ہو گا کہ آئندہ تم اس لذت کے قریب نہیں جاؤ گی۔“

”ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔“ شانتی نے سر ہلا دیا۔

میں نے واپس آکر ماسٹر کیسی یان کو صورت حال آگاہ کیا اور پھر ہم رات گئے تک شاؤن کے دروازے کے ماسٹروں سے رابطہ کرتے رہے اور بالآخر قرب لوگ ایک پروگرام پیش ہو گئے۔

شانتی سے طویل ملاقات کے بعد میرے تمام شہادتیں تصدیق ہو گئی تھی۔ مگنا تیرا ڈی مہاں ہیروئن نے کرائو اور ٹھوڑ اور مائیکل اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کے بارے میں، میں پہلے ہی تفصیل سے چکا ہوں کہ وہ کس قماش کے تھے۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا پھیلنے ہی کچھ لمحوں کے پارک میں اور حرا و حریل گئے تھے۔ ان کا تعلق شاؤن کی مختلف کیپیوں سے تھا۔ ان کا پارک میں داخل ہونے اور بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جسے محض وقت گزارنے کے لیے نہیں ہوتا۔ دو لڑکے کافی شاپ میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے لاقطع اور الگ الگ بیٹھے تھے۔ میں اندھیرے میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کوئی بھی موجود تھا۔ جس بیچ کی نشان دہی شانتی نے کی تھی وہ کافی شاپ کے قریب پندرہ گز دور ایک درخت کے نیچے تھی اور وہاں

بنت دو ٹوکی بیٹھے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں اگرچہ ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے مگر وہ ٹھوڑ اور مائیکل نہیں تھے۔

شانتی نے بتایا تھا کہ وہ رات آٹھ سے دس بجے تک بیٹھے تھے۔ اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ بھی تک نہیں آئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انہیں کوئی بد تو نہیں ہو گیا۔ ہم نے اس معاملے میں بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو پولیس کو ان کے بارے میں اطلاع دے سکتے تھے لیکن تمام ماسٹرز کا مشفقہ فیصلہ تھا کہ ان کے معاملے سے اپنے طور پر نمٹنا چاہیے۔

پہلے نو بجے کے قریب پارک کے باہر ایک کار آکر رکی۔ وہاں دو شخص تھے۔ دو آدمی کار سے اتر کر پارک میں داخل ہوئے اور دوسرا دھڑکتے ہوئے اس بیچ کی طرف چلے گئے۔ ان دونوں کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ٹھوڑ نے کندھے پر پکڑے کا ایک تھیلہ لٹکا رکھا تھا۔

وہ دونوں اس بیچ پر اگر بیٹھ گئے۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

ان دونوں کے بیچ پر بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دو لڑکے رشتہ فطرت سے اگر ان کے قریب رکے ہاتھ ملائے گئے اور ٹیکے چلے گئے۔ یہ لڑکے ان کے گاہکوں میں سے تھے اور پہلے ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پروگرام کے مطابق پارک سے نکلنے ہی کے بعد وہاں پہلے ہوئے ہمارے لڑکے انہیں پکڑ کر لے جاتے۔ ٹھوڑ اور مائیکل کے گاہکوں میں شانتی ہی واحد تھی جسے ہمارے پروگرام کا علم تھا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے بھی خریدارین کو آنا تھا اور مجھے اسی کا انتظار تھا۔

شانتی سوانو بیچ کے قریب پارک میں داخل ہوئی۔ وہ بھی سچی اور خوف زدہ سی لگ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی دروازے میں داخل ہوئی، میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹھوڑ اور مائیکل کے قریب چلے گیا۔

ٹھوڑ نے ایک مرتبہ میری طرف دیکھا ضرور تھا مگر وہ بھی ہونے کی وجہ سے وہ میری شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے پینٹ کی جیب سے نوٹ نکال کر ٹھوڑ کی طرف بڑھا دیے۔ ٹھوڑ نے نوٹ لے کر تھیلے میں ڈال لیے اور تھیلے ہی میں سے ایک پڑیا پھر شانتی کی طرف بڑھا دی۔ لمبے بالوں والا مائیکل بیچ پر پہنچا تو انہیں میں گھبرا رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے

وہ اس معاملے سے بالکل لاقطع ہو۔

ٹھیک اسی وقت جب ٹھوڑ شانتی کو ہیروئن کی پڑا دے رہا تھا میں ان کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مائیکل نے خنجر مان لیا۔

”اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ میرے سامنے خنجر لہراتے ہوئے غرایا ”پہلے تو تم ہم سے بیچتے رہے ہو لیکن آج تم نے بد معاشی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔“

میں نے پہلے شانتی کو اشارہ کیا۔ وہ بدحواس ہو کر تیزی سے کافی شاپ کی طرف دوڑ گئی۔

”ہم تو بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھے۔“ میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ زہر تم ہی لوگ پھیلا رہے ہو۔ کوئی حرکت کرنے سے پہلے اپنے چاروں طرف دیکھ لو۔“

ان دونوں نے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف سے کم از کم نصف درجن لڑکے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں بدحواس ہو گئے اور پھر اسی بدحواسی میں مائیکل نے خنجر سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا یہ حملہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے بڑی بھرتی سے اس کی خنجر والی کلائی پکڑ لی اور دائیں ہاتھ سے اسی کے اس بازو کے نیچے بغل میں زوردار پیچ رسید کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ اس کے پیروں پر گرنے سے پہلے ہی میں نے اس کی اس ٹانگ پر ہلکی سی لگ بھی رسید کر دی۔

وہ لڑکھڑا کر پشیمانی کے بل گرا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اسی دوران میں فائز کی آواز گونجی۔ ٹھوڑ نے دوسرے لڑکوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر تھیلے میں سے پستول نکال کر ہوائی فائر کر دیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ان کی طرف آنے والے لڑکے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں گے یا رک جائیں گے۔

ٹھوڑ کا پستول والا ہاتھ ابھی تک اوپر تھا۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر میری لگ اس کی گمشدگی پر پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر در کھیں اندھیرے میں گھاس پر گر گیا تھا۔ ٹھوڑ کچھ اور بدحواس ہو گیا اور اسی بدحواسی میں اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں بڑی تیزی سے پیچھے ہٹا اور اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر در کھال دیا۔ وہ چیخا ہوا گھاس پر گرا پھر اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر تین چار لمحوں نے اسے گھیر لیا۔

میں مائیکل کی طرف گھوم گیا۔ اس دوران میں موقع پا کر وہ مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ میں اپنا دفاع نہیں کر سکا۔ اس کی فرنٹ پائی لنگ میرے بائیں کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑایا مگر اپنے آپ کو گرنے سے بچالیا۔ مائیکل نے دوسری لنگ لگائی جسے میں نے ہاتھ سے روکا اس نے فوراً ہی سائڈ لیفٹ لنگ لگانے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ بھی میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا اور پھر بازو کی ہڈی پر لگنے والے میرے ایک ہی چپ نے اسے ہلکانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ذرا سا ایک طرف جھکا جس نے اسے زوردار سائڈ لنگ لگا دی۔ وہ کراہ کر لیٹ گیا لیکن اس مرتبہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ دوسری طرف ٹرڈر لڑکوں کے گھیرے میں آچکا تھا۔ ٹرڈر کے ہلکانے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ لڑکے اس کی ٹھیک خاک تو واضع کر رہے تھے۔

میں ایک بار پھر مائیکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے پر قول رہا تھا۔ ہمارے گرد بھی چند لڑکے جمع ہو گئے تھے مگر انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ مائیکل کے لیے میں ہی کافی ہوں گا۔

مائیکل نے میرے منہ پر پینچ مارنے کی کوشش کی مگر میں نے بڑی پھرتی سے ذرا سا سائڈ میں ہٹنے ہوئے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے آگے کی طرف ہلکا سا جھکا دیتے ہوئے اس کے منہ پر زوردار رائٹ جھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ٹانگوں کے بیچ میں لیفٹ فرنٹ لنگ بھی مار دی۔

اس دہری تکلیف سے وہ ذبح ہوتے ہوئے کبرے کی طرح ہلکا اٹھا۔ میں نے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ کر آگے کی طرف زوردار جھکا دیا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ چختا ہوا منہ کے بل کراہ میرا خیال تھا کہ اب وہ کچھ دیر تک اٹھنے کی ہمت نہیں کرے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن وہ چند گز سے زیادہ دور نہیں جاسکا۔ تین لڑکوں نے لپک کر اسے گھیر لیا تھا۔

اسی وقت کسی نے چیخ کر کہا ”پولیس آ رہی ہے۔“ ایک سیکنڈ کے اندر اندر لڑکے ٹرڈر اور مائیکل کو لے کر وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ باقی لڑکے ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ چار لڑکے کافی شاپ کے سامنے کریسوں پر بیٹھ گئے۔ شانتی بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور تقریباً اسی وقت دو پولیس والے وہاں پہنچ گئے۔ وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر ایک میز کے قریب آکر رک گئے اور وہاں بیٹھے ہوئے دو لڑکوں سے بنگامے کے بارے میں پوچھنے لگے۔

”بنگامہ۔“ ایک لڑکے نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”ہم ایک گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں۔ یہاں تو کوئی بنگامہ نہیں ہوا۔“

”مگر ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں دو آدمیوں کو ہلاک جا رہا ہے۔“ پولیس والے نے کہا۔

”یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دوسرے لڑکے بیٹھے ہیں۔ ان سے بھی پوچھ لو۔“ اس لڑکے نے جواب دیا۔ پولیس والے دوسروں سے پوچھتے رہے مگر ایک کسی بنگامے سے لاعلمی ظاہر کی۔ ایک پولیس والے نے شاپ کے مالک اور دو ملازموں سے بھی دریافت کیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی میں سر ہلا دیے۔ پولیس والا بدحواس بنے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دوسرا پولیس والا اس بیچ کے آس پاس مثل مائل گاڑی کے قریب سارا بنگامہ ہوا تھا اور پھر اسے وہ تھما لپکا لڑائی کے دوران میں ٹرڈر کے کندھے سے گر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھملا دیکھ کر میں چونک گیا۔ روٹی میں پولیس والے نے تھمے کی تلاش کی تو اس میں کرسی ٹرڈر بیہوش کی پڑیاں دیکھ کر وہ بھی اچھل پڑا اور تیز تر قدم مارا ہوا اپنے ساتھی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر میں باتیں کرتے رہے اور دوبارہ اپنی بیچ کے قریب جھکا۔ انہیں وہاں سے اور کچھ نہیں ملا۔ ٹرڈر کا پتہ تو لگایا گیا۔ خنجر پہلے ہی لڑکے وہاں سے اٹھا چکے تھے۔ اس لمحے کا نظریہ شاید کسی کو نہیں آیا تھا۔ پولیس والے اب اس قلعے بارے میں لوگوں سے پوچھ رہے تھے لیکن ہر کوئی کدہ باندھا رہا تھا۔

دونوں پولیس والوں کے چہروں پر تشویش نمایاں تھی۔ پھر وہ تیز تر قدم اٹھاتے ہوئے چوکی کی طرف چلے گئے۔ ”آؤ۔“ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“ پولیس والوں نے جانے کے بعد میں نے شانتی کی طرف دیکھ کر کرسی سے اٹھ بیٹھے۔

شانتی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اب بھی خوفزدہ تھی اور میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے ٹرڈر سے ملنے والی بیہوش کی پڑیاں دیکھ کر کہنے میں نے جب میں نے ڈال لیا۔ شانتی کو اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر میں اس جگہ جہاں ٹرڈر اور مائیکل کو پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ کوئی بھی وہاں موجود تھا۔ ایک مکان تھا جو الگ تھلک واقع تھا۔ مائیکل کی پانچ اور دو

بہنیں بھی وہاں موجود تھیں۔ لڑکوں کو اس کمرے سے نکلایا گیا اور ٹرڈر اور مائیکل سے پوچھ کچھ شروع ہو گئی۔ شاؤن میں بیہوش کے پھیلاؤ کے حوالے سے میرا برا خیال بھی درست نکلا۔ اس کے پیچھے میگا ہی کا ہاتھ تھا۔ ہمیں بیہوش کا ہی فراہم کر رہا تھا اور یہ دونوں اس کے لے فٹنی فٹنی کے اصول پر کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کو تو میں نے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا جب سرائے میں ہمارے بیٹے میں انہوں نے جاگتی اور چپکے کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی اور اب تو یہ دونوں مکمل طور پر بھل کر مانتے آگئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مارشل آرٹس کہتے تھے اور اس فن کی اعلیٰ تربیت کے لیے یہاں آئے تھے مگر پہلے ہی روز انہیں وہاں ہوا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں اور پھر موقع ملنے ہی انہوں نے میگا اور مکیان کے ساتھ مل کر بیوی کا گھناؤنا شروع کر دیا تھا۔

یورپ والے یوں تو منشیات کی روک تھام کے حوالے سے بہت شور مچاتے ہیں۔ وہ بعض ایشیائی ممالک کو منشیات کے فروغ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مارڈامز کا دوبارہ انہی کے ممالک میں ہوتا ہے۔ بیہوش استعمال کرنے والوں کی سب سے زیادہ تعداد بھی یورپ اور امریکا میں ہے۔ نئے نئے اور تباہ کن نشے متعارف کرانے کا امریکا یورپ اور امریکا والوں کے سر ہی بندھتا ہے۔ مافیا کے بڑے بڑے ڈان اور اس قسم کی ساری تنظیمیں بھی یورپ اور امریکا ہی میں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیہوش کے خالصتے ایشیا کے تین چار ممالک خاصے بدنام ہیں مگر اس کے پیچھے بھی یورپ اور امریکا ہی کا ہاتھ ہے۔ چند سال پہلے ایشیا میں کوئی بیہوش کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ یورپ اور امریکا والے ہی تھے جنہوں نے یہ بدترین لعنت یہاں متعارف کرائی۔

ٹرڈر اور مائیکل کو دوسروں کے حوالے کر کے ہم اپنے کیمپ میں واپس آ گئے۔ چند روز گزر گئے۔ جس طرح اس روز کے بعد میں نے مکیان کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں بھی اس رات کے بعد کچھ سنا نہیں دیا۔

جاگتی بھی اب فٹ ہو گئی تھی اور میرے ساتھ پریکٹس میں آتا تھا۔ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ اسی دوران میں شانتی سے بات چیت ہوئی۔ شانتی کی ماں کا قاتل بھی تھیں۔ شانتی کا باقاعدہ علاج تھا۔ وہ پہلے کی طرح حلق و چوہند تو نہیں رہی تھی لیکن اب وہ چلتی دوڑتی شوخ لڑکی تھی اور بتدریج نفس کی

طرف لوٹ رہی تھی۔ کامنی کو شاؤن آتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ یوں تو کوئی بھی فن سیکھنے کے لیے پوری زندگی بھی ناکافی ہوتی ہے مگر طے شدہ کورس کے مطابق جاگتی اپنی تربیت مکمل کر چکی تھی اور ایک مہینے بعد ہمارے کیمپ کی سالانہ تقریب ہونے والی تھی۔ ٹورنامنٹ کی طرز پر مقابلوں کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں دوسرے کیمپوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ہمارے کیمپ میں بھی بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں بھی ان مقابلوں میں حصہ لے رہا تھا۔ اپنے لڑکوں کے علاوہ دوسرے کیمپوں کے لڑکوں سے بھی میرے مقابلے ہوئے تھے۔ یہی فائنل میں چار کیمپوں کے لڑکے آئے تھے۔ میں نے اپنے حریف کو بہت آسانی سے ناک آؤٹ کر کے فائنل کے لیے کوالیفائی کر لیا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ میں نے اب تک جتنے بھی مقابلے جیتے تھے ناک آؤٹ کی بنیاد پر ہی جیتے تھے۔ میرے مقابلے میں دوسری طرف سے فائنل میں آنے والے لڑکے کا تعلق ماسٹر مشی یانگ کے کیمپ سے تھا۔ وہ شاؤن ٹیمپل کا بہترین مارشل آرٹس سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں شکست نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اپنی دو سالہ زندگی کے دوران میں وہ کبھی کوئی مقابلہ نہیں ہارا تھا۔

ماہانہ مقابلوں میں وہ آٹھ مرتبہ چیمپئن رہ چکا تھا۔ باقی مقابلوں میں اس نے حصہ نہیں لیا تھا۔ ماسٹر یینگ پائی کو شاؤن ٹیمپل کا سب سے معزز اور سب سے قابل احترام استاد سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے تمام ماسٹر بھی اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ فائنل والے روز بھی شاؤن کے تمام کیمپوں کے ماسٹر کو مدعو کیا گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ اس روز ہمارے جہازیم میں ریل دھرنے تک کی جگہ نہیں تھی۔

پہلے چند چھوٹے نمائشی مقابلے ہوئے اور پھر ہمارے مقابلے کا خانان ہوا۔ میرا حریف وہ تین تہیں مجھ سے دو تین اونچے نکلتا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی وہ مجھ سے زیادہ مضبوط اور زیادہ طاقت ور تھا مگر یہ مقابلہ جسمانی طاقت کے مظاہرے کا نہیں ٹیکنیکس کے استعمال کا تھا اور میں جانتا تھا کہ کامیابی اسی کے حصے میں آئے گی جو بہتر ٹیکنیک استعمال کرے گا۔

مقابلہ شروع ہوتے ہی حریف نے مجھ پر تباہ توڑ حملے شروع کر دیے۔ وہ چوچیں، پیچس اور گس کا بڑی بے رحمی سے استعمال کر رہا تھا۔ اس کی پھرتی بھی قابلِ تعریف تھی۔ میرے خیال میں اس کی اب تک کی کامیابیوں کا راز یہی تھا۔ اس

مقابلہ شروع ہوتے ہی حریف نے مجھ پر تباہ توڑ حملے شروع کر دیے۔ وہ چوچیں، پیچس اور گس کا بڑی بے رحمی سے استعمال کر رہا تھا۔ اس کی پھرتی بھی قابلِ تعریف تھی۔ میرے خیال میں اس کی اب تک کی کامیابیوں کا راز یہی تھا۔ اس



اسے وارننگ دے رہا تھا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اچانک اس نے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا اور باؤ سرے بلند کر کے حملہ آور ہوا۔

لوگوں میں شور مچ گیا۔ ایک دو چنچیں بھی سنائی دیں۔ میں خنجر دیکھ کر ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ میں اپنے باؤ سرے پر سکون اور مطمئن تھا۔ اس کا ہاتھ جیسے ہی حرکت کیا، میں نے بڑی تیزی سے چرے کے سامنے دونوں کانٹوں کا کراس بنالیا اور پھر اس کا بازو جیسے ہی کراس سے ٹکرایا، نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو پشت سے ملا لیا۔ یہ میرے بازوؤں کا آہنی شکنجہ تیار ہو گیا تھا اور میرے حریف کا بازو اس شکنجے میں پھنس گیا تھا۔

وہ اپنے بازو کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا مگر میرے شکنجے کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے دونوں پیروں کا الائنمنٹ بھی بالکل درست تھا۔ کب ہونے کے اس انداز سے بھی مجھے اپنی اس سیزرز چنڈ ڈھکے ٹیکنیک میں بڑی مدد مل رہی تھی۔ یوں سمجھئے کہ پیروں کی آواز بھی پورے جسم میں سرایت کرتی ہوئی میرے بازوؤں کے اگلے حصوں میں سمٹ آئی تھی۔

میرا حریف اپنے بازو کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا مگر میں نہ تو اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی میری گرفت ڈھیلی پڑی۔ اس میں مزید سختی آئی گئی۔

حریف کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی اور پھر الجھن وحشت میں بدلتی گئی۔ اس کے چرے پر بھی کرب۔ آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

تماشا کی اب بالکل خاموش تھی۔ اس طرح سناٹا چھا تھا جیسے سب کو سانپ سو گھم گیا ہو۔ وہ سب مارشل آرٹس تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے یہ سیزرز چنڈ ڈھکے ٹیکنیک کیسی ہوگی۔ مگر اس کا عملی مظاہرہ آج پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے اور وہ بھی اس انداز میں کہ میرا حریف مجھے مکمل کرب تلا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی تھی۔ میرے سینے میں ہوسٹ ہو سکتا تھا۔

میں نے پہلی مرتبہ بل کرتے ہوئے اپنے بازوؤں کے شکنجے کو مزید کسا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ حریف کی کھلتی چلی گئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے سر کے قریب لکڑی کے فرش میں نوک کے بل ہوسٹ ہو گیا۔ تماشا بینوں میں ایک مرتبہ شور مچا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ حریف نے اپنا آزاد ہاتھ میرے بازوؤں اور میری گرفت ڈھکے ٹیکنیک کے لیے جھٹکے دینے لگا۔

کی فائٹنگ ٹیکنیک یہی تھی کہ اپنے حریف کو شروع ہی سے دباؤ میں رکھا جائے۔ جبکہ میری فائٹنگ ٹیکنیک اس سے مختلف تھی۔ میں شروع میں دفاعی انداز اختیار کر کے اپنے حریف کو تھکا تا تھا اور پھر اس طرح حملہ آور ہوتا تھا کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔ اس وقت بھی میں یہی ٹیکنیک اپنائے ہوئے تھا۔

یہ مقابلہ بارہ راؤنڈ کا تھا۔ پہلے راؤنڈ میں وہ دو پوائنٹس لے گیا۔ دوسرے راؤنڈ میں مجھے ایک پوائنٹ ملا۔ دسویں راؤنڈ میں ہم دونوں کے پوائنٹ برابر تھے۔ مقابلہ خاصا سنسنی خیز تھا۔ لوگ پوری طرح محفوظ ہو رہے تھے۔ رنگ کے چاروں طرف کھڑے ہوئے کرانے کا زچ بیچ کر ہمیں داد دے رہے تھے اور ہماری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

گیارہواں راؤنڈ شروع ہوتے ہی میں نے پوری شدت سے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ دو مرتبہ نیچے گرا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس قسم کے مقابلوں میں جب کسی ایک میں جنون آجائے تو اس کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ وہ قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر کے ہر جائز و ناجائز طریقے سے حریف کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنے حریف میں شکست کے آثار نظر آرہے تھے۔ جبکہ میرے ہونٹوں پر اشتعال دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک بار پھر سنبھل گیا۔ اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر اشارے بنالیا۔ میری نظر کبھی اس کے ہاتھوں پر جاتی اور کبھی پیروں پر اور پھر میرے ہونٹوں پر ایک بار پھر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے پیروں کا الائنمنٹ درست نہیں تھا۔ پیروں کی چوڑائی بیشہ کندھوں کی چوڑائی سے ڈیڑھ گنا رکھنی چاہیے اور جسم بالکل سیدھا ہوتا ہو۔ معمولی سا فرق بیشہ اپنے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر جسم آگے کو یا پیچھے کو ذرا سا جھکا ہوا ہو تو نہ صرف اپنے دفاع بلکہ حملہ آور ہونے کی صلاحیت بھی کم ہو جاتی ہے اور میں نے اپنے حریف میں یہ خامی نوٹ کر لی تھی۔ وہ جیسے ہی بیچ مارنے کو حرکت میں آیا، میں بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ وہ بھد کی آواز سے پشت کے بل گرا لیکن اس نے آنکھیں میں دیر نہیں لگائی۔ اور اس مرتبہ شاید وہ اپنے حواس ہی کو بچا تھا۔ وہ ہر قیمت پر مجھے شکست دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے فائٹنگ کا ہر اصول نظر انداز کر دیا تھا۔ ریفری بار بار جج کر

میں نے ایک بار بھریل کیا اور جسم کی پوری قوت ایک بار پھر بازوؤں کے ٹکٹے میں منتقل کر دی۔ کڑک کی آواز ابھی جو لوگوں نے بھی سنی۔ یہ حرف کے بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خوفناک چیخ بھی نکل گئی تھی۔ میں نے بائیں طرف جھکتے ہوئے زوردار جھٹکاوے کر اپنے ہاتھ کھول دیے۔

میرا حرف دائیں پہلو پر پٹنے گرا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا شکستہ بازو پکڑ لیا اور فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ لوگ شور مچا رہے تھے۔ میرے نام کے گھرے لگا رہے تھے۔ ریفری نے میرے حرف پر جھک کر کٹنگ شروع کر دی مگر میرے حرف میں اب اتنی سخت نہیں تھی کہ اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہو سکتا۔ ریفری نے دس کہا اور سیدھے ہو کر میرا ہاتھ اوپر اٹھادیا۔

جنازیم شور کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ رنگ کے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ دو ذکر اندر آ گئے۔ مجھ تک پہنچنے والا سب سے پہلا شخص کوچی تھا۔ اس نے مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔ میرے دوست خوشی سے ناچ رہے تھے۔ میرے حرف کے جناحی اسے اٹھا کر باہر لے گئے تھے۔

پورے رنگ کا چکر لگانے کے بعد کوچی نے مجھے ماسٹر ہنگ پائی کے سامنے اتار دیا۔ ماسٹر ہنگ پائی اور دوسرے تمام ماسٹرز بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے تمام ماسٹرز کو بوکیا۔ ماسٹر ہنگ پائی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے آئینہ یاد دہائی اور جب میں سیدھا ہوا تو ماسٹر بیٹی یان نے مجھے گلے سے لگالیا۔ یہ اس کی محنت کا نچاڑ تھا کہ آج مجھے ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ شاؤن ٹیپل میں میری پہلی باقاعدہ فائٹ تھی جس میں میں سرخ رو ہوا تھا۔

اس ہنگامے کے بعد ہمارے کیمپ کے ان اسٹوڈنٹس میں ڈگریوں کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا جنہوں نے اس پیچ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ماسٹر ہنگ پائی اپنے ہاتھ سے ڈگریاں دے رہے تھے۔ سب خوش تھے۔ کامنٹی بھی بہت خوش تھی۔ اسے فورڈان کی ڈگری دی گئی تھی۔

کامنٹی اس رات واپس جانے کے بجائے ہمارے ہی پاس رہ گئی تھی۔ پہلے تو کوچی اور دو تین اور لڑکے بھی ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ ایک بچے کے قریب وہ چلے گئے۔ ہم اس کے بعد بھی جاگتے رہے۔ آج رات تو سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ کامنٹی کی خوشی قابل دید تھی۔ اس نے شاؤن ٹیپل کا جو خواب دیکھا تھا آج اس کی تعبیر مل گئی تھی۔ دوسری طرف جاگتی بھی میری کامیابی پر بیچوں نہیں ساری

تھی۔ وہ بار بار مجھے اسے ساتھ لپٹا رہی تھی اور میرا منہ پر رہی تھی اور پھر نہایت کچھ تھائی یاد آئی۔ وہ آج زندہ ہوئی۔ کتنی خوش ہوئی۔ تھائی کی یاد آتے ہی میرے چہرے پر اظہار سی چھا گئی۔

چیکو بھی میری کامیابی پر بے پناہ خوش تھی۔ اس نے ہم ایک مرتبہ میرے گال پر بوسہ دیا اور پھر اٹھ کر وہاں اتر آیا۔ میں رقص کرنے لگی۔ وہ بہت اچھی رقصہ بھی۔ وہ رقص ناچ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی رہی۔

ہم صبح چار بجے کے قریب سوئے تھے اور جب بھرا ہوئے تو باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ کوچی کو دیکھ کر میں نے قدرے پرہی کا اظہار کرنے ہوئے کہا۔

”تم نے ہمیں جگایا نہیں کوچی۔“

”آج چھٹی ہے۔ جتنا نامزد ہے۔“ کوچی نے جواب دیا۔ ”اور تم اپنی پریکٹس کے سلسلے میں پریشان مت ہو۔ ماسٹر ہنگ پائی نے کہا تھا کہ تمہیں سونے دیا جائے۔“

”اوہ ٹائم کیا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دس بج رہے ہیں۔ تم لوگ جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ میں ناشتہ لے کر آ رہا ہوں۔“ کوچی کستا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ناشتا کر کے کامنٹی چلی گئی۔ ناشتہ دوران میں ہی اس نے اپنا ہندوستان واپسی کا پروگرام بنا دیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ آج کا دن شاؤن ٹیپل میں رہے گی۔ تیار کی مکمل کر کے وہاں اپنے دوستوں سے ملے گی اور کل شاؤن ٹیپل چلی جائے گی جہاں سے کمن ٹک دکان ہو جائے گی اور وہاں سے ہندوستان کے لیے ہوائی جہاز سوار ہو جائے گی۔

ہم نے اس رات کامنٹی کے لیے ایک چھوٹی سی الوداعی پارٹی کا پروگرام بنالیا۔ اس پارٹی میں میرے اور جاگتی کے علاوہ کوچی بھی شریک تھا اور اس پارٹی کا اہتمام شاؤن ٹیپل کا ایک ریستورانٹ میں کیا گیا تھا اور پھر جردن بیٹھے بیٹھے پروگرام بن گیا کہ کل ہم سب کامنٹی کو شاؤن ٹیپل تک چھوڑنے جائیں گے۔

اگلے دن ہم شاؤن ٹیپل پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق کامنٹی کو وہ دن بھی وہیں گزارنا تھا۔ اسے اپنے دوستوں کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحائف بھی خریدے تھے۔ کوچی نے ہمیں چیاگک شاؤن کے بیچلے پر لے گیا۔ حاشی بھی اس وقت پر ہی موجود تھی۔ وہ دونوں میاں پوری ہمیں دیکھ کر بہت خوش

ہوئے۔ انہوں نے کامنٹی کو مبارکباد دی اور پھر چیاگک شاؤن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ میں اس روز تمہارا مقابلہ نہیں دیکھ سکا۔ سنا ہے بہت سنسنی خیز مقابلہ تھا۔ یہاں تو ہر طرف تمہارے ہی نام کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ کاش میں وہ مقابلہ دیکھ سکتا۔“

”وہ مقابلہ بہت ہی میرا کوئی کمال نہیں تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ تو تمہیں پتہ ہے اور کھڑے دوستوں کی دعا میں ساتھ نہیں کہ میں اپنے سے زیادہ طاقت ور حرف کو شکست دینے میں کامیاب ہو سکا۔“

”دیکھا چیاگک شاؤن۔“ حاشی شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کو کتنے ہیں عظمت اور بڑائی۔ ایک تم ہو کہ بلیک پلٹ نے کرسی اڑاتے پھر رہے ہو۔“

چیاگک شاؤن کھیا کر رہ گیا۔ اس وقت ہم وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم نے ہمارے سامنے چائے رکھ دی۔ میرا اس وقت چائے کا موزہ نہیں تھا۔۔۔ اتفاق سے میرا کپ بھی بھرا ہوا تھا۔ حاشی میز کے دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا کپ آدھا تھا۔ اس وقت میں تجانے یہ کیوں سوچنے لگا کہ کاش آدھا کپ میرے سامنے آجاتا۔

اتفاق سے میری نظرس حاشی کے سامنے رکھے ہوئے کپ پر ہی مرکوز تھیں۔ اچانک فطرتی میں رکھا ہوا وہ کپ بہت آہستہ تھر تھرا لگا اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا، وہ سب کے لیے ہی حیرت انگیز تھا۔

وہ کپ سارسیت سینئر ٹیپل کے ٹیشے پر پھسلتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کوئی تادیبہ قوت اسے کپ پر مرکوز تھیں اور مجھے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے اس کپ کے علاوہ دنیا کی ہر چیز میری نظروں سے غائب ہو چکی ہو۔

وہ کپ میرے سامنے رکھے ہوئے کپ کے قریب آکر رہ گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔

”وہ کپ لوگ بیٹھی بیٹھی ہی نظروں سے کبھی کپ کو اور جیتا جیتا بار دیکھتا تھا۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں ناشی کے سامنے آ گیا۔ میں نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے اپنا کپ ”میں اتنی زیادہ چائے نہیں پی سکتا۔“ میں نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”وجدان۔“ کامنٹی میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولی ”تمہیں شاید احساس نہیں۔ جانتے ہو ابھی یہاں کیا ہوا ہے؟“

مجھے شاید واقعی احساس نہیں تھا اور جب جاگتی نے اس کپ کے بارے میں بتایا تو میں خود بھی حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ میں نے دل میں آدھا کپ چائے پینے کی خواہش کی تھی اور حاشی والا کپ میز پر خود بخود سرکنا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ اس وقت اگرچہ آخر تک میری نظرس کپ پر ہی مرکوز رہی تھیں لیکن مجھے اس کا قطعی احساس نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

”جی۔۔۔! میرے ذہن میں خیال ابھرا اور میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں سنسنات ہوئے لگی اور پورے جسم میں سنسنی سی جھیلی چلی گئی۔ اگر چائے کا وہ کپ میری نظروں کے اشارے سے حرکت میں آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میری محنت اور ریاضت بار آور ثابت ہو رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر نظرس حاشی کے سامنے رکھے ہوئے اس کپ پر مرکوز کر دیں جو میں نے اس کی طرف سرکایا تھا۔

میں تصور کرتا رہا کہ میری آنکھوں سے مقناطیسی لہریں خارج ہو کر کپ سے ٹکرا رہی ہیں اور اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ مگر کپ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگی۔ میں نے کپ پر سے نظرس ہٹالیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میرے چہرے پر باؤسی چھا گئی۔

سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھالیا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ کپ کی اپنی جگہ سے حرکت کرنے والی کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن جاگتی حاشی کے لیے کی۔ تک پیچ چکی تھی۔ وہ کمری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن بولی کچھ نہیں۔

دن کا بیشتر حصہ ہم نے شرم میں گھومتے ہوئے گزرا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں شاؤن ٹیپل میں اس طرح آزادی سے گھوم پھر رہا تھا۔

وہ رات بھی ہم نے چیاگک شاؤن کے بیچلے پر گزارا۔ ایک مرتبہ موقع پا کر میں نے چیاگک شاؤن سے لمبیان کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا مگر اس نے مسکرا کر بات ٹال دی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے کامنی کو بس پر بٹھا کر ہم لوگ شاؤن واپس آگئے اپنے کمرے میں آتے ہی جاگی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سرسری آواز میں بولی۔

”وہ جانے چائے کی پیالی کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا کیا دہم؟“

”میں تو خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔“ میں نے اس کی بات

کاٹ کر کہا ”کچھ عجیب سی بات ہوئی تھی۔ میرے سامنے جو کپ رکھا گیا تھا، وہ بالاب بھرا ہوا تھا اور میرا چائے کا موڈ بھی نہیں تھا۔ چاشنی کے سامنے رکھا جانے والا کپ آٹھا تھا۔

اس کپ کو دیکھ کر بے اختیار میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ آٹھا کپ میرے سامنے آجاتا۔ اور پھر میں نے اس کپ کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کپ میرے سامنے کیسے آیا۔“

”اس دوران میں تمہاری نظریں کپ پر مرکوز رہی تھیں؟“ جاگنی نے پوچھا۔

”ہاں۔ لیکن۔“

”یہ جی کی پاور تھی۔“ جاگنی نے میری بات کاٹ دی ”تمہارے دل میں اس کپ کو حاصل کرنے کی خواہش ابھری تھی۔ اس وقت جی کی قوت تمہاری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی اور وہ کپ تمہاری نظروں سے تمہاری طرف کھینچ چلا آیا۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو ممکن۔“

”یقیناً ایسا ہی تھا۔“ جاگنی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی ”تمہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

تمہاری محنت بار آور ثابت ہو رہی ہے۔“

”لیکن میں نے دوبارہ یہ کوشش کی تھی کہ نظروں کی قوت سے دوسرے کپ کو اپنی طرف کھینچ سکوں مگر کچھ نہیں ہوا تھا۔“ میں نے کہا ”ہو سکتا ہے بلکہ کپ کا اپنی جگہ سے سرکنا محض اتفاق رہا ہے۔ وہ میز نشینی کی تھی۔ ہو سکتا ہے

سارے گہلی ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی گہلی پلیٹ یا ایسی کوئی چیز کسی چٹنی سٹال والی جگہ پر رکھی جائے تو اس کے نیچے ہوا بھر جاتی ہے جو اس چیز کو حرکت میں لے آتی ہے۔ ممکن ہے کل

نہی ایسا ہی ہوا ہو۔“

”مانتی ہوں۔“ جاگنی نے کہا ”ایسا ہو سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں وہ چیز اپنی جگہ سے ایک دو سینٹی میٹر کے فاصلے

تک ہی حرکت کر سکتی ہے جبکہ وہ کپ میز پر پھلتا ہوا تھا، اٹھا رہا کچھ کا فاصلہ طے کر کے تمہارے سامنے پہنچ گیا تھا۔“

پھر اس کپ نے تمہاری طرف ہی حرکت کیوں کی کہ وہ کپ اور طرف کیوں نہیں پھلتا؟“ جاگنی چند لمحوں کو خاموش رہی پھر بولی ”کسی دہم کو دل میں جگہ مت دو۔ وہ محض اتفاق تھا۔ وہ تمہاری جی کی قوت کا اعجاز تھا۔ تم نے وہ کپ حاصل

کرنے کی خواہش کی۔ جی کی قوت تمہاری آنکھوں میں سمٹ آئی اور تمہاری نظروں نے اس کپ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ تمہاری محنت رنگ لاری ہے اپنی پیکس جاری رکھو۔“

ہم دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ جی کا موضوع سب کچھ سن رہی تھی۔ اسے مارشل آرٹس کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جی کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی تھی اور ظاہر ہے کوئی بات اس کے لیے نہیں پڑی تھی اس لیے اس نے ہماری باتوں میں مداخلت بھی نہیں کی تھی۔

اس روز میں نے ماسٹریشیپ یان سے اس کا تذکرہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”خوش قسمت ہو۔“ وہ بولا ”بہت کم عرصے میں تم خطی کو چھوٹے لگے ہو اور یہ سب تمہاری سچائی فن سے لگن اور محنت کا نتیجہ ہے۔ میں تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔“

اور پھر اگلے روز ماسٹریشیپ یان نے بھی اس کی تعریف کر دی کہ میرے اندر جی کی قوت بیدار ہو رہی تھی۔ اس قوت کو کنٹرول میں کرنے کے لیے اب مجھے زیادہ محنت اور

ریاضت کی ضرورت تھی۔

چند ہفتے اور گزر گئے میری پیکس جاری رہی۔ اس دوران میں شاؤن میں میرے باقاعدہ مقابلے بھی ہوئے رہے۔ مجھے ناقابل تفسیر قرار دے دیا گیا تھا۔ کوئی مارشل آرٹس میرے سامنے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگتا تھا۔

ایک روز اس طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا بلکہ اسے حادثہ ہی کہوں گا۔ شاؤن میں ایک نیا جٹانم بنا تھا۔ عمارت زیر تعمیر تھی میٹرل ناقص تھا یا کوئی اور وجہ۔ عمارت گر پڑی۔ کام کرنے والے مزدور لمبے کے نیچے گئے۔ چیخ و پکار کی آواز سن کر لوگ دوڑ پڑے اور لمبے کے

دبے ہوئے مزدوروں کو نکالنے لگے۔

میں بھی اس وقت جاگنی کے ساتھ قریب ہی موجود تھا۔ ہم دونوں بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ عجیب دوح فرما رہی

تھی۔ خون میں لت پت زخمی مزدوروں کو نکالنا جا رہا تھا۔ دو مزدور ایک آہنی گاڑو کو ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر ان کیوں من لیا ہوئے کی وجہ سے گاڑو نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کی۔

میں نے لوگوں کو ہٹا دیا اور جگہ کر صرف ایک ہاتھ سے آہنی گاڑو کو اوپر اٹھانے لگا۔ گاڑو اوپر اٹھتا چلا آیا۔

مجھے دے ہوئے دو مزدوروں میں سے ایک سرکھٹا تھا اور دوسرا شدید زخمی تھا۔ اگر وہ زندہ بچ بھی گیا تو زندگی بھر ہاتھ پیر ہانے کا قائل نہیں تھا۔

میں اس زخمی گاڑو کو اب بھی ایک ہاتھ سے اٹھائے گا تھا۔ مجھے قطعاً احساس ہی نہیں تھا کہ میں نے کوئی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے کسی درخت کی جھکی ہوئی پتی یا شاخ کو اس کی جگہ سے ہٹا رکھا ہے۔ آس پاس

کڑے ہوئے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جس آہنی گاڑو کو دس بارہ آدمی مل کر بھی حرکت نہیں دے سکتے تھے۔ اسے میں نے بڑے اطمینان سے ایک ہاتھ سے کئی

نٹ اوپر اٹھا دیا تھا۔

”وہ جان۔“ جاگنی کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت سے لگائی ”مزدوروں کو نکال لیا گیا ہے۔ گاڑو چھوڑ دو۔“

میں نے گاڑو کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ لوگ بھی بھٹی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جاگنی مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی وہاں سے دوڑے گئی۔ اور ایک جگہ رک کر بھی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”اب اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم اپنے اندر مخفی جی کی اس پراسرار قوت پر قابو پا چکے ہو۔ اور تم اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہو۔“ جاگنی کہہ رہی تھی ”ذہن میں دوچار لوگ ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے اس فن میں اس قدر کمال حاصل کیا ہو۔ اس پراسرار قوت سے

بہت بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کس طرح استعمال کرتے ہو۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں جاگنی۔“ میں نے کہا ”اے اطمینان رکھو۔ میں اس قوت کا غلط استعمال نہیں کروں گا۔“

مگر یہی عمارت کے قریب اب بھی لوگوں کا جھوم تھا۔ ہم وہاں سے بہت دور آکر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ گرم لکڑی کی اس وقت مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی اور شاید میں اس کی طلب بھی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ایک اور بات خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ پہلی

مرتبہ جیٹنگ شاور کے گھر پر چائے کے کپ والا واقعہ پیش آیا تھا تو میری کنٹیناں سلگنے لگی تھیں اور میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے اور اس وقت مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ لا شعوری طور پر مجھ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے لیکن

آج وہ کیفیت نہیں تھی۔ میں ذہنی طور پر بالکل مسکون تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ لا شعوری طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے اس حقیقت کا پوری طرح

ادراک تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

اس رات میں دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ آج کے واقعے اور اندر کی اس مخفی اور پراسرار قوت کے بارے میں سوچتا رہا جس پر میں قابو پا چکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے اس کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ بڑی ریاضت کی تھی۔ بڑے کٹھن مراحل سے گزرا تھا مگر میری اس کامیابی میں مہاراج

ماسٹر ہو چکا۔ دوسرے انسٹرکٹرز ماسٹریشیپ یان اور سب سے زیادہ ماسٹرینگ پانی کا دخل تھا۔ ان سب کی توجہ اور محنت سے ہی میں اس مقام تک پہنچ سکا تھا۔

اس دوران میں دوسری طرف سے بھی غافل نہیں رہا تھا۔ کوچی میرا بہترین دوست بن گیا تھا اور اس کے ذریعے

مجھے ادھر ادھر کی معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔ مائیکل اور ٹیڈر کا بندوبست کرنے کے بعد اگرچہ شاؤن میں ہیروئن کی سپلائی رک گئی تھی اور راشنی جس نے پانچ چھ ہفتوں تک

ہیروئن استعمال کی تھی، وہ بھی علاج سے مکمل طور پر صحت یاب ہو کر معمولات کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی تھی۔

اور پھر ایک روز وہ بھی اپنا کورس مکمل کر کے تھائی لینڈ واپس چلی گئی۔ اس نے مجھے بنگاک کا ایڈریس بھی دیا تھا اور بہت اصرار کیا تھا کہ اگر میں بنگاک آؤں تو اس سے ضرور

ملوں۔ ایسی ہی دعوت مجھے اور جاگنی کو کامنی نے بھی دی تھی۔ اس نے بے پور میں اپنے اماں کا ایڈریس دیا تھا اور

آکاید کی تھی کہ میں جب بھی ہندوستان آؤں، اس سے ضرور ملوں۔

جن دنوں ہم نے کمپیان اور پھر بعد میں ٹیڈر اور مائیکل کو پکڑا تھا ان دنوں میگا غائب ہو گیا تھا۔ ان تینوں کی کامنی تو ختم ہو گئی تھی مگر میگا کے بارے میں ایک بار پھر مجھ

باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔ کوچی کی اطلاع کے مطابق وہ شاور

بانگ میں کسی جگہ موجود تھا اور اس نے کچھ لوگوں کو میرے پیچھے بھی لگا دیا تھا جو مجھے نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔

یوں تو شاؤن میں میرے بہت سے دوست بن گئے تھے

مگر دشمنوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ہر وہ شخص میرا دشمن تھا جو میری کامیابیوں سے جلتا تھا یا مجھ سے شکست کھا چکا تھا۔ ان میں ہوشین کا نام سرفہرست تھا جو مقابلے میں مجھ سے اپنا بازو تروا بیٹھا تھا۔ اس کے بازو پر ابھی تک پلستر چا ہوا تھا۔ اُس کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو کھیل کے میدان میں تو اترتے تھے مگر ان میں اسپورٹس مین اسپرٹ نہیں تھی۔ یہ صرف جیتنا چاہتے تھے شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ہار کو یہ اپنی آنا کا مسئلہ بنالیتے تھے اور جیتنے والے کو اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگتے تھے اور اپنے اوتھے ہتھکنڈوں سے اسے نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تاک میں رہتے تھے۔

یہی سب کچھ اس روز بھی ہوا تھا۔ ہوشین بہت اچھا مارشل آرٹ تھا، اس نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ اس روز میرے ساتھ ہونے والا مقابلہ بھی پراسنسی خڑ تھا۔ اس نے مجھے زیر کرنے کے لیے کچھ بہت عمدہ قسم کی ٹیکنیکس بھی استعمال کی تھیں لیکن پھر اس پر جنون طاری ہو گیا اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اگر وہ خنجر سے حملہ کرنے کے بجائے ہوش و حواس میں رہ کر اپنی کوشش جاری رکھتا تو شاید پراسنسی پر مجھے شکست دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن وہ تو پہلے سے طے کر کے آیا تھا مجھے ہر حالت میں زیر کرنا ہے۔ دوسری رائڈ میں ہمارے پراسنسی برابر ہو گئے تھے اور اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب میں اسے زیر کروں گا تو اس نے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔

وہی ہوشین اب میرا سب سے بڑا دشمن تھا اور اب میکا ایک بار پھر میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ اگرچہ خود پس نظر میں تھا مگر اس نے اپنے کچھ گڑے میرے چھپے لگا دیے تھے۔ وہ مجھے ہر صورت میں گولڈن ٹرائی ایٹنگ سے جانا چاہتا تھا۔ ماسٹر بینک پائی بھی اس صورت حال سے آگاہ تھا۔ اس کی ہدایت پر ماسٹر ٹینی بان نے میری حفاظت کا بندوبست اس طرح کر دیا تھا کہ دو تین لڑکے دور رہ کر میری نگرانی کرنے لگے تھے۔ کسی مشتبہ شخص کو میرے قریب دیکھ کر وہ منڈلاتے ہوئے میرے قریب آجاتے۔

اسی دنوں کچھ اور اسٹوڈنٹس نے ہمارے جنازہ میں داخلہ لیا تھا۔ ان میں ہوشنگ نام کی ایک چینی لڑکی بھی تھی۔ اس کی عمر پانچ تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور وہ فان کلک کی رہنے والی تھی۔ دوسرے شہروں یا غیر ممالک سے آنے والے عام طور پر پیسے کے معاملے میں پریشان رہتے تھے۔ وہ ایک ایک پانی سوچ سمجھ کر خرچ کرتے تھے۔ خرچ

بچانے کے لیے ایک ایک کمرے میں کئی کئی لڑکے اور لڑکیاں اٹھنے ہی رہتے تھے۔ لیکن ہوشنگ دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ اسے اخراجات کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے عبادت گاہ والی پھاڑی کے دامن میں ایک مختصر سا کپڑا کرانے پر لے لیا تھا جہاں وہ اکیلی ہی رہتی تھی۔ ہوشنگ نے پہلے چیکو سے دوستی کی پھر جاگی سے تعلقات برپائے اور پھر مجھ سے۔ مجھ سے بھگت ہوئی کی کوشش کرنے لگی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میں اسے بات کرتے ہوئے ذرا دیر دیر دیتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی بے تکلفانہ انداز میں بات چیت بھی نہیں کی۔ مگر وہ جاگی سے میرے بارے میں گریڈ گریڈ کر پوچھتی رہتی۔ میرا بہت احترام کرتی تھی۔ کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ مجھ سے بہت شرمیل ہو اور کبھی اس طرح باتیں کرنے لگتی جیسے میں اس کا بہت پرانا اور بے تکلف دوست ہوں۔

ہوشنگ عام طور پر صبح کی کلاس میں آیا کرتی تھی لیکن پھر اس نے کلاس بدل لی اور شام کی کلاس میں آنے لگی۔ ایک روز کلاس ختم ہونے کے بعد وہ جاگی اور چیکو کے ساتھ ہمارے کمرے میں آگئی اور ویر تک باتیں کرتی رہی اور جب وہ واپس جانے لگی تو معلوم ہوا کہ شاؤن سے آنے والے تمام لڑکے جا چکے تھے اور کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جو اس کے کالج تک پہنچا سکتا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ رات سنان تھا۔ وہ اکیلے جاتے ہوئے کچھ گھبرا رہی تھی اس لیے میں اور جاگی اس کے ساتھ چل دیے۔

اس کا کالج عبادت گاہ والی پھاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ دوسرا قریب ترین کالج بھی وہاں سے تقریباً چالیس گزے فاصلے پر تھا۔ کالج کے آس پاس درختوں کی بہتات تھی۔ بڑی چیزت ہوئی۔ ہوشنگ ٹیپ سے اکیلی آنے ہوئے گھبرا رہی تھی اور یہاں سنان جگہ پر اکیلی رہتی تھی۔

دو گروں پر مشتمل کالج ضرورت کی ہرجیز سے آراستہ تھا۔ ایک بڑے روم تھا اور دوسرے کو شنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ فرنیچر اور دیگر سامان دیکھ کر اس کی امارت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ہوشنگ نے بتایا کہ اس نے یہ فرنیچر شاؤنک سے منگوا لیا تھا جب اپنی ٹیننگ مکمل کر کے واپس جانے کی تو یہ فرنیچر یہیں چھوڑ دیا۔

خوش ذائقہ مشروب سے تواضع کیے بغیر اس نے واپس نہیں آنے دیا تھا۔ واپس پر میں اور جاگی اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہوشنگ فان کلک کے ایک

بندہ ہونے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ محض شوقیہ طور پر کچھ ہی دیر تھی۔ بلیک بیلٹ اس نے فان کلک ہی کے نام پر آرٹ کلب سے حاصل کیا تھا اور مزید تربیت کے لیے یہاں بھی تھی۔ اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ وہ کم از کم ایک سال یہاں رہنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ہوشنگ رفتہ رفتہ مجھ سے بھی بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔

میرے وہ رات کو ہمارے پاس ہی رہ گئی تھی اور کئی دنوں اور جاگی یا چیکو کے کالج تک چھوڑنے لگے تھے۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ساڑھے دس بج چکے تھے جاگی نے تو ہوشنگ کو رک جانے کو کہا تھا مگر وہ کالج کے باہر ہی بیٹھ گئی۔ جاگی اور چیکو اس وقت کہیں جانے کے یوں نہیں تھے۔ مجبوراً مجھے ہی ہوشنگ کے ساتھ جانا پڑا۔

شاؤن کے بعض علاقوں میں ابھی رات تھی۔ ہوشنگ بہت سا جگہ چڑچول رہی تھی۔ اس نے میرا ایک ہاتھ بھی ڈبایا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہیں کیا اور اس کے ساتھ جڑا اور پھر وہ ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔

”ایک کپ کافی ہو جائے میری طرف سے؟“ اس نے

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت میرا بھی کافی یا چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ پر پڑی ہوئی ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کافی پینے کے بعد جب ہم ریسٹورنٹ سے اٹھے تو ہمارے کیا نہ بچ رہے تھے۔ ہوشنگ اب اس پر بھی میرے ساتھ چڑچول رہی تھی اور اس نے میرا ہاتھ بھی تمام رکھا تھا۔ وہ پہلے تو میں سے سلانا لگتی اور کبھی ہولے ہولے دبانے کے لیے تو میں نے خیال نہیں کیا لیکن پھر میں اپنے آپ کو مجبوری کی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ انہیں گھما کر ہوشنگ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

میرا خیال تھا کہ میں اسے کالج کے دروازے پر ہی چھوڑ دوں گا۔ وہ بعد میں کبھی کہیں اندر چل کر تھوڑی دیر تک بیٹھنے کی بات مانتی پڑی۔

پندرہ منٹ شنگ روم میں میرے سامنے بیٹھی باتیں کرتی ہوئی آئی تھی اور اس کے دو سرے کمرے میں اس کی آواز سن کر میں نے اُس کی طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ میرا چل چل کر آگئی اور جسم پر ایک مختصر سا کپڑا پہنے دروازے

میں اس طرح کھڑی تھی کہ ”صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں“ والی صورت تھی لیکن اس کا یہ انداز اور ہونٹوں پر شوق منکراہٹ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

”میں کپڑے بدلنے کی نیت سے اس کمرے میں آئی تھی۔ مگر میرا شب خوابی کا لباس تو وہ پڑا ہے، اس کرسی پر۔ پلیز اذرا وہ لباس مجھے دے دو۔“ اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک کرسی کی پشت پر پڑی ہوئی شینون کی ٹائٹی اٹھائی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر ٹائٹی اس کی طرف بڑھا دی۔ ٹائٹی لینے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چڑایا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گرمی ہو گئی تھی۔ میری کنکاشیاں سلگنے لگیں۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور صوفے پر بیٹھ کر بے ربط محفل پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ ایک بار تو میرے دل میں آئی کہ اٹھ کر بغیر بتائے چلا جاؤں اور ممکن ہے میں اپنے اس ارادے پر عمل بھی کر ڈالتا لیکن ٹھیک اسی وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک خوب صورت ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں رنگے ہوئے دو نازک سے گلاسوں میں مشروب بھرا ہوا تھا۔ بیکے گولڈن کلر کا یہ وہی مشروب تھا جو پہلے بھی ہم کی باربی پکے تھے۔ میں یا جاگی وغیرہ جب بھی ہوشنگ کو چھوڑنے آتے، وہ اس مشروب سے ہماری تواضع ضرور کرتی تھی اور اس میں شہ نہیں بہت خوش ذائقہ تھا۔

ہوشنگ نے ٹرے چھوٹی سینئر نیبل پر رکھ دی اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ میرے سامنے بیٹھی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ایک گلاس اٹھا کر آگے جھکتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک دو پیسے لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ میرا بہت کڑا امتحان لے رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ میرے جذبات کو اشتعال دلانے کے لیے اور اس سے پہلے کہ میں اس کے داؤ میں آجاتا۔ میں ایک جھکتے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہوشنگ کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ بھی ایک جھکتے سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے ایک بازو میری



میں بھی چونک گیا اور آنکھ میں ہمت معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا تو ایمرینس کے پچھلے دروازے کے شیشے سے پیچھے آنے والی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی اندر پہنچ رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے یہ پزیرنگ پولیس کی گاڑی ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے منٹ لوں گا۔ تم وہ کمائی مت بھولنا۔ دماغ پر چوٹ لگنے کی وجہ سے مریض کو سہمے میں ہے اور ہم اسے شہر کے اسپتال میں لے جا رہے ہیں۔“ میگا نے کہا۔ جیب سے ہسپتال نکال کر چیک کیا اور دوبارہ جیب میں رکھ لیا پھر کھڑکی پر جھک کر ڈرائیور سے بھی کچھ کہا۔

ہوشنگ اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے منہ پر ہانک لگا دیا جس سے ہشنگ ربر کی ٹنگلی سیلنڈر سے لگی ہوئی تھی لیکن اس نے سیلنڈر کا والو نہیں کھولا تھا۔ میرے منہ پر ہانک رکھ کر غالباً یہ تاثر دیا جانا مقصود تھا کہ مریض کو آنکھیں پر رکھا گیا ہے۔

پیچھے آنے والی گاڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی اور پھر وہ ہماری ایمرینس کے برابر پہنچ کر آگے لٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے میگا کی چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ کہا تھا۔ میں نے آنکھ میں جھری بنا کر دیکھا۔ میگا کے ہاتھ میں ہسپتال تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف رخ کر کے غالباً دوسری گاڑی پر فائر کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت میں نے ہوش میں آجاتا ہی مناسب سمجھا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت ہوشنگ اپنی سیٹ پر بیٹھی میری طرف بھیگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے مجھے آنکھیں کھولنے دیکھ کر یہ تاثرات کچھ اور نمایاں ہو گئے۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنے منہ پر سے ہانک ہٹا دیا۔ ہوشنگ کے منہ سے ٹنگی سی چیخ نکل گئی۔

ہوشنگ کی چیخ سن کر میگا تیزی سے میری طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشت سی ابھرتی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے دونوں ٹانگیں سمیٹ لیں اور مل کرتے ہوئے دونوں پیر فلٹنگ ٹک کے انداز میں اس کے سینے پر دے مارے۔ وہ چیخا ہوا سیٹ پر الٹ گیا۔ ہسپتال بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا تھا۔

میگا کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ ہوشنگ نے اسے بتایا تھا کہ میں آٹھ دس گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آؤں گا لیکن میں نہ صرف ہوش میں آیا تھا بلکہ اس پر بھرپور انداز میں حملہ بھی کر دیا تھا۔

ہوشنگ بھی چیختی ہوئی ایک طرف گر گئی تھی۔ اس نے

میگا کا گرا ہوا ہسپتال اٹھانے کی کوشش کی مگر کھڑکی پر ٹک گیا اس کے کندھے پر سانسے کی طرف لگی اور وہ پیچھے الٹ گئی۔

دوسری گاڑی ایمرینس کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں دونوں گاڑیاں آپس میں ٹک رہیں۔ میگا نے اٹھ کر کچھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک زوردار پیچ رسید کر دیا جو اس کی ٹانگ پر لگا۔ اٹھا۔ ٹانگ سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ سیٹوں کے درمیان سی جگہ میں پھنسا ہوا تھا اور آڑاوی سے حرکت کر سکتا تھا اور مجھے اس پر یہ بالادستی حاصل تھی کہ میں اس کی حرکت اور اپنی مرضی کے مطابق حرکت کر سکتا تھا۔ دونوں گاڑیاں سڑک سے اتر کر پتھر لے پڑیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ کئی مرتبہ لگایا گیا ایمرینس الٹ جائے گی۔

میں سیٹوں میں بیٹھنے ہوئے میگا پر گھونے پرمانہ اسی دوران میں ہوشنگ کو موقع مل گیا۔ وہ ن کی سیٹ سے دو ایچ گولاٹی والا ایک تین چار فٹ لمبا جیسی پائپ تھا۔ ہوشنگ نے وہ پائپ اٹھا کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔ بروقت ایک طرف نہ جھک جاتا تو میری کھوپڑی کے چالے لیکن بہر حال پائپ کی ضرب میرے بائیں کندھے پر لگی اور بڑے زور سے لگی تھی۔ میں نے ہوشنگ کو حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور پلٹ کر اس کے سینے پر زور سے پیچ رسید کر دیا۔ وہ خوفناک انداز میں چیختی ہوئی پھرتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔ اس نے بھی اٹھا کر میگا پر پھینک دیا اور پیچھے دوڑنے کے قریب بڑا ہوا ہسپتال اٹھالیا اور ڈرائیور کو بھی پھونکی سی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ڈرائیور کو ایمرینس روک کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ بھی کر دیا۔ ایمرینس لہرا گئی۔ لیکن پھر اس کی رفتار چلی گئی اور کچھ دور جا کر روک گئی۔

دوسری کار اس سے چند گز آگے جا کر روک گئی تھی۔ ایمرینس کے ڈرائیور نے گاڑی روکنے ہی بجائے اترنے کی طرف دوڑ لگا دی مگر کار سے اترنے والے ایک شخص لپک کر اسے پکڑ لیا اور اس کی دھتائی کرنے لگا۔

میں نے دو اور آدمیوں کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک کو جی تھا اور دوسرا بھی ہمارے ہی ایک سینئر اسٹوڈنٹ تھا۔

ہوشنگ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ان گدی پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چیختی ہوئی

بھاگ بھاگ رہی تھی۔ مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا تھا۔ ایسی ہیٹ اور سازشی ذہن رکھنے والی عورت کسی بھڑادی کی منت نہیں تھیں۔

میں نے پلٹ کر دروازے پر زوردار لگ مار دی۔ دروازہ کھل گیا اور جب میں باہر نکل رہا تھا تو اسی وقت کوچی اور اس کا دوست بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ”وہاں! وہاں! تم ٹھیک ہو؟“ کوچی بولا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ انہیں باہر نکالو۔“ میں نے ایمرینس کے اندر اشارہ کیا۔

وہ دونوں ایمرینس میں گھس گئے اور ان دونوں کو اترتے پتھے ہوئے باہر نکال لائے۔ ہوشنگ کو دیکھ کر کوچی کا بھی خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے دو چار ہاتھ بولس کے طور پر لگا لگائے۔ تیسرا آوی ڈرائیور کو بھی مارا جیتا ہوا لے گیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ہم شاؤ یا نگ سے توپا تیس میل دور تھے۔ ہمارے چاروں طرف ہولناک ماحول تھا۔ میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔

میگا تیز رفتاری سے میرے اس طرح میرے ہاتھ لگا تھا اور میں اس سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت مشکل آدمی ثابت ہوا تھا لیکن اسے زبان تو بہر حال کھولی پڑی تھی۔ اس نے دو کچھ بتایا وہ بہت سنسنی خیز تھا۔

گولڈن ٹرائی ایک مکمل کارجنل کھوراٹ اس وقت میرا بہترین دشمن تھا۔ یوں تو دنیا کا ہر شریف آدمی موت کے اس ہوا گز کا دشمن تھا۔ بہت سی حکومتوں نے بھی اس پر طرح طرح کی پابندی لگا رکھی تھی۔ مگر اس طرح اسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا جس طرح میں نے اس کے گھر میں گھر کے نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی ایک لیبارٹری تباہ کر دی تھی۔ درجنوں کارندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور فرار ہونے والے اس کا ایک بیلی کا پڑ بھی تباہ کر دیا تھا۔ میں واحد شخص تھا جو اس کی راجدھانی میں گھر کر تباہی مائل کرتا ہوا زندہ سلامت وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس نے میری تلاش میں ہونے والے اسے آوی پھینکا دیا تھا اور وہ مجھے ہر قیمت پر زندہ گولڈن ٹرائی ایک مکمل واپس لانا چاہتا تھا۔ اس نے میرے لیے کئی بہت سی خاص سزا تجویز کر رکھی تھی۔

میگا نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ کم تو گولڈن ٹرائی ایک میں میرے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔ دارا اور جی ٹانگ چوتھے سنسری کونوں میں رہنے کے بعد خفیہ طور پر بنگاک واپس چلے گئے تھے۔ انہوں نے جنرل کھوراٹ سے وعدہ کیا

کھا

آپ جانتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟  
آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کے لیے سی بی سی اور بین الاقوامی سطح پر مشقیں نہیں کرنا پڑتیں!

جدید اور سائنسیک اصولوں پر مبنی حیرت انگیز کتاب

مقناطیت

آپ کی شخصیت میں انوکھا پن پیدا کر دیں  
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

اس کتاب کا مطالعہ کیجئے  
اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنالیں!

قیمت 40 روپے \* ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت، معدومہ ڈاک خرچ بذریعہ سی آر ڈی ٹی، ان کریس

مکمل وکٹ بکس



مزید بہت سی معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے کوچی کے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ میگا کو دھکیلا ہوا ایک طرف لے گیا۔ میگا کو زندہ چھوڑنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد ہی بھاگ دوڑی آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ میں کوچی کو دہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا اس طرف بچھڑ گیا جہاں میگا کو لے جایا جا رہا تھا اور پھر میں ٹھک کر رک گیا۔ کوچی کا ساتھی زمین پر پڑا کرہ رہا تھا اور میگا کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بہت دور سنائی دے رہی تھی۔ اس کا داؤ چل گیا تھا اور وہ ہمارے آدی کو فخری کر کے بھاگ گیا تھا۔ اس دیرانے میں اس کا پیچھا کرنا رہا تھا۔ میں اپنے ساتھی کو اٹھا کر واپس آیا۔

جب ہم اپنے کیمپ میں واپس پہنچے تو رات ڈھل رہی تھی۔ جاگنی جاگ رہی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان تھی اور ساری رات اس نے اس پریشانی میں گزاری تھی۔ میں اپنے بستر پر گیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور میں اسے گزروں ہوئے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ باتیں کرتے کرتے میری آنکھ گھٹی۔ جاگنی بھی میرے قریب ہی لیٹ کر سو گئی۔

دو ہفتے اور گزر گئے۔ ماسٹر بنگ بائی نے میرے کچھ امتحان لیے اور مجھے کامیاب قرار دیا اور مجھے اجازت دے دی کہ میں جب چاہوں وہاں سے جا سکتا ہوں۔ میرے اعزاء میں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں شاولن نیپل کے تمام ماسٹرز مدعو تھے۔ میں نے ان کے سامنے سینئر کراکاز کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ مجھے ہر طرف سے مبارک بادیں ملتی رہیں۔

اس سے اگلے روز صبح سویرے میں اور جاگنی پہاڑی پر  
ماسٹرینگ بائی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لیے  
ماسٹرینگ پانی کی آخری لچکر تاجو خاصا طویل ثابت ہوا۔  
میرا خیال تھا کہ دوستوں سے ملنے کے لیے دو چار دن

چیکو کا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ ڈانگ کو میں کارا  
شان کی کوٹھی میں آنکھ دوگی اور اس کی موت کا راز ایک  
ایک دن ضرور کھل جائے گا۔ اس وقت کارا شان کے شوہر  
سیان جاگتے اگرچہ پولیس کو رشتہ دے کر اس آنکھ  
کو ایک اتفاق حادثہ بنوا لیا تھا مگر چیکو نے کہا تھا کہ یہ معاملہ  
کبھی نہ کبھی ضرور اٹھے گا اور سیان جاگتے اپنی جان بچانے  
کے لیے ہمیں پھنسانے کی کوشش کرے گا اور بالآخر اس  
ایسا ہی کیا تھا اور پولیس ہماری تلاش میں پہنچ کر محمد سیان  
جاگتے کو معلوم تھا کہ میری اور جاگتے کی منزل شاؤلن نیچر  
کوٹھی۔ اس نے پولیس کو ہمارے بارے میں یقیناً سب کچھ  
دیا ہوگا۔

وہ رات ہم نے وہیں گزار دی اور اگلے روز صبح  
وہ دونوں میاں بیوی ہمیں اپنی گاڑی پر لے کر روانہ ہو گئے  
چھ مہینوں کے طویل سفر کے بعد ہم کوئے لین پہنچے  
یہ ایک بڑا شہر تھا، میاں اتر بورت بھی تھا لیکن ظاہر ہے  
ہوئی جنازہ پر سفر نہیں کر سکتے تھے  
میاں ہم نے حاشی کے ایک کزن کے ہاں قیام کیا۔

دن یہاں رہے اور پھر حاشی کا کزن ہمیں اپنی گاڑی پر لے کر  
 ڈور کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہم صبح نو بجے کے قریب کوئٹہ  
 لیں سے روانہ ہوئے تھے۔ کوڈور پہنچے تو چار بج گئے  
 وہاں بھی ہمارا قیام حاشی کے کزن کے ایک دوست کے  
 رہا۔ اس نے اگلے روز شام کو نامک پہنچا دیا۔  
 ہماری رہائی کا یہ سخریادہ دلچپ نہیں تھا۔ اس نے  
 کے کہ ہم کوئٹہ سے چھپ کر سکر رہے تھے۔ اس نے  
 اس سخری قصصیات بتا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروا  
 کوئی دلچپ واقعہ پیش آتا تو اس کے بارے میں ضرور  
 ۔۔۔ البتہ ان سطور کے ذریعے میں جیسا کہ شاعر اور اس  
 خوب صورت ہیوی حاشی کا شکر ہے ضرور ادا کرنا چاہوں

وہ شام کا وقت تھا۔ میں اور جاکی جیسے چھپاتے رات بسر کرتے رہے۔ یہ پہاڑی علاقہ جنگلوں سے پٹا ہوا تھا۔ ہلال خوں خوار دندے بھی ہو سکتے تھے لیکن خوش قسمتی سے کراہندے سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔

دنیا میں خدا کے نیک بندے اس بھی موجود ہیں۔ اس  
ہی میں بھی ہمیں ایسے کچھ لوگ مل جئے جنہوں نے ہماری  
ہم کو روکی کا بندوبست کر لیا۔ اس طرح ہم مزید تین دن سفر  
کی کھنچائیاں اٹھانے کے بعد ہوئے سائی چانچ گئے۔ لاؤس کا  
یہ شرفائی لینڈ کی سرحد کے قریب ہی واقع ہے۔ چین کی  
سرحد کے قریب کی ہستی سے ہمارے ساتھ آنے والا آدمی  
ہمیں ایک سے علی شان کو بھی ملے گیا۔ جس کے ہانک کے باہر  
ہم پہنچا۔ کچھ ہی اس چھوٹی سی ہستی ہی کا رہنے والا تھا جس  
نے شرمیں اگر تعلیم حاصل کی اور پڑوس شروع کر کے بست  
یا آدمی بن گیا۔ یہاں اس کا شمار شر کے معززین میں ہوتا  
ہے۔ اس کے تعلقات بھی بست و معیت تھے۔ ہماری کمائی سننے  
کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ ہم دو چار دن اس کے مہمان  
رہیں۔ بعد میں سرحد پار کرانے کا بندوبست کر دے گا۔

ہمارے لیے یہ اطلاع بڑی منفی خیر ثابت ہوئی تھی کہ  
جیسے سالکی سے چند میل آگے سرحد کے دوسری طرف تھائی  
بڑا کاوہ سرحدی قصبہ جپانگ سامین واقع ہے جس سے  
نہایت ہی یادیں وابستہ تھیں۔ سردار خاتلוב کا شہر  
نہایت ہم کو لٹن نرائی ایک میل داخل ہوئے تھے۔

یہ طرف ہم چانگ سامیہ کی طرف جا سکتے تھے اور دوسری طرف یہی آگے گولڈن ٹرائی ایٹھکل کا کنارہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر جرنل کھوڑا کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم نیسے سالانی میں موجود ہیں تو اس کے لیے ہمیں گولڈن ٹرائی

ہوئے سناٹے کے برس میں مٹرک منہ نے دوسرے روز کسی وجہ سے ہمیں اپنی کوٹھی سے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل کر دیا تھا جہاں ہماری دیکھ بھال اور کھانے وغیرہ کے بندوبست کے لیے ایک ادھیز عمر عورت بھی موجود تھی۔

اس شام آٹھ بجے کے قریب میں اور جاغی مکان سے نکل کر ٹہلے ہوئے کچھ آگے بازار کی طرف نکل گئے۔ سڑک پار کرنے کے لیے ہم ایک جگہ رک گئے۔ اسی وقت ایک سڑخ رنگ کی چمچ چمائی ہوئی خوب صورت کار ہمارے قریب آکر رکی۔ اسٹیرنگ کے سامنے باوروی شو فر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ پہلے ایک اویسز عرب بھاری بھر کم آدی نیچے اتر اور پھر ایک عورت کار سے برآمد ہوئی۔

اس عورت کو دیکھ کر میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جاںکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بت بنی کھڑی پلک جھپکے بغیر کار سے اترنے والی عورت کو دیکھ رہی تھی۔  
وہ تھائی وانگ تھی!

ماہنامہ پاکیزہ کا مقبول ترین سلسلہ

ماہنامہ سلطانہ اختر کے طلسماتی لکچر ایک شامیہ کا راجہ عاشق نازوں

بہت سے پانی پہ مکان

پانی گھس گھس ہے کچن میں سہاوائے دل کی کہیں سوسن میں کھانسی

مقبول دی وی سیرل

آنچ

کی کہانی اس کتاب پر مشتمل ہے

قیمت 100 روپے، نمبر 23، 1-اے

پ

برہ خود اپنی نہیں، بھی منکر دوسروں کی کہیں سنا لیا

22 ستمبر 2023ء

کتابیات پبلشرز

0300-363-3633

7428061

کراچی

0300-363-3633

کراچی

میں یہ بھول گیا تھا کہ تھائی مرچکی تھی اور تقریباً ایک سال پہلے میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے چادر میں لپیٹ کر دریائے میکسیکو کے لہروں کے سپرد کیا تھا اور تیز دریا تیز لہروں میں اسے اپنے ساتھ بہا کر مجھ سے دور لے گئی تھی۔

لیکن میرے سامنے وہ حسین عورت۔ وہ تھائی ہی تھی۔ میری نظرس دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں اس لیے تو میں بائیس پھیلا کر والمانہ انداز میں اس کی طرف لپکا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی دوڑ کر مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے گی۔ مجھے اپنے سینے سے لگا کر پہنچنے لے گی اور میں اپنے وہ سارے دکھ بھول جاؤں گا جو میں نے اس عرصے میں اٹھائے تھے۔ مجھے پھر وہی گداز آغوش مل جائے گی جس میں ماما جیسی حدت اور محبوب کے پیار جیسی جولانی تھی۔ ایک سیکنڈ کے پزارویں حصے میں میرے ذہن میں اس جیسے ان گنت خیالات آئے تھے اس وقت میری بے تابی اور میرا اضطراب قابل دید تھا اور دیکھنے والوں نے یقیناً مجھے باگل ہی سمجھا ہو گا مگر مجھے کس کی پروا تھی۔ میں تو اپنی تھائی کو اپنی بانہوں میں لینے کے لیے لپک رہا تھا لیکن۔۔۔ مجھے اسی طرح والمانہ انداز میں اپنی طرف لپکتے دیکھ کر اس حسین عورت کی آنکھوں میں الجھن سی تھری۔ پہلے تو وہ شاید یہ سمجھی ہو کہ میں کسی اور طرف بڑھ رہا ہوں لیکن مجھے اپنے بالکل سامنے باکرہ وہشت زدہ سی ہو کر بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی اور میں اپنی ہی جھونک میں کار سے ٹکرا گیا۔

”یہ کیا بد تیزی ہے؟ کون ہو تم اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟“

وہی آواز تھی۔ تھائی جب غصے میں بولتی تو اس کی آواز اسی طرح کپکپانے لگتی تھی۔ میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ کپٹیشن سلگ اٹھیں اور دل سینے کے بجائے حلق میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے لپٹ کر دیکھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔

”میں۔ میں ہوں۔ تھائی۔ وجدان۔ تمہارا وجہ۔۔۔“

ایک ایک لفظ میرے حلق سے ایک ایک ٹکڑا نکل رہا تھا۔ اس ایک بل میں میرا حلق اس طرح خشک ہو گیا تھا۔ جیسے مٹی بھر ریت بھر دیا گیا ہو۔ زبان سوکھ کر کانٹے کی طرح ٹالو میں جیسے لگی۔

”کون وجہ۔۔۔؟“ اس عورت کے حلق سے نکلنے والی

آواز میں بھی اس مرتبہ بڑی کاٹ تھی ”میں کیسے دو کو نہ جانتی۔ نہ جانے کون ہو تم۔ شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ گھر سے باہر نکلو تو اس میں رہا کرو۔“

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے دل پر نشتر کی طرح چھ رہا تھا۔ دماغ ایک بار پھر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میری تھائی نے پچھانے سے انکار کر دے؟ مگر وہ تھائی ہی تھی۔ میری نظرس دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔

وہ اسی طرح جوان اور حسین تھی۔ جب میں ٹھوکر اس سے ملا تھا۔ چپکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، جن میں اب اجنبیت اور سرد مہری تھی۔ سرخ کال اور بھر بھر کر کہہ رہا تھا۔ اس نے نیوی بلو رنگ کا بلاؤز اور مٹی اسٹریٹ پر رکھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پر یہ لباس خوب فٹا ہوا تھا۔ دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے چند انچ اوپر انگوٹھے کے خانے کے برابر گھلائی جلد سے قدرے گہری گھلائی رنگت کا ایک ٹکڑا تھا۔ تھائی نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ یہ پیدائشی نشان ہے نہیں نہیں۔ میری نظرس دھوکا نہیں کھا سکتی۔ یہ تھائی تھی لیکن وہ مجھ سے اس طرح اجنبی کیوں بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے اتنی سرد مہری کیوں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ اس کی یادداشت! نہیں کھو گئی۔

وہ کوئلہ زراٹی۔ مشکل میں کئی روز تک دارا دیوہ قبضے میں رہی تھی۔ اسے کثرت سے ہیروئن استعمال کرنا پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے ہیروئن کا اثر دماغ پر ہوا ہو اور اس کی یادداشت ختم ہو گئی ہو۔

تھائی نے آخری سانس میری آغوش میں لیے تھے۔ اسے ہم نے مردہ سمجھ کر رویا کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ لیکن شاید وہ مری نہیں تھی۔ ہم نے اس کی زندگی کا باعث فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا تھا اور وہ ہمارے پاس رہا۔ بڑا ہو گئی تھی مگر کسی طرح وہ خنکی تھی اور اب یہ سال بعد وہ زندگی اور رعنائی سے بھرپور میرے سامنے کھڑی تھی۔

”تم جھوٹ بولتی ہو۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تم تھائی ہو۔ میری نظرس مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔“

دل جھوٹ نہیں بول سکتا۔

”کہا نا کہ میرا نام تھائی نہیں ہے اور میں جیسے نہ جانتی۔“ اس نے پہلے کی طرح سرد لہجے میں جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس کے ساتھ کار سے اترنے والا اور میرا بھاری بھر کم آدمی آگے آگیا۔ اس کا لباس فنی اور چمے پر بڑی سخت تھی۔ وہ چمچاتی ہوئی میٹھی لالچی تار ہی تھی کہ اس کے پاس دولت کی کی نہیں تھی۔ وہ یقیناً اسے دولت کا بہت گھمڈ تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔

”اے مسٹر۔“ اس کے حلق سے ہمیشہ جیسی غراہٹ نکلتی تھی۔ ”میں اسے لپٹے ہو یا میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔“

اس شخص کی اس حرکت پر میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے آثار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ اگر کوئی میلا آنکھ سے بھی میری طرف دیکھتا تھا تو تھائی مرے مارنے پر مل جاتی تھی اور اب وہی تھائی مجھے اس شخص کے ہاتھوں ڈکیل ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

میرا دماغ چکار رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور اپنا سیدھا ہاتھ اس شخص کی کلائی پر رکھ دیا۔ اسی لمحے جاگی ”دوڑ تمہارے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ اس شخص کی کلائی سے الگ کیا اور اس شخص کا ہاتھ بھی مجھے گریبان سے ہٹا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا تو دنیا کی کوئی طاقت اس شخص کو مجھ سے نہیں چاٹے گی۔

”پلیز مسٹر!“ وہ اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ملتی تھی۔ ”میں یہ بولی۔“ آپ لوگ اس کی حرکت کا براہ امت مانتے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ دراصل یہ۔۔۔ اس نے ایک انگلی اپنی پیٹنی کے قریب لے جا کر خصوص انداز میں گھمائی ”پلیز! اس معاف کر دیجئے۔“

”اگر یہ پاگل ہے تو اسے سڑک پر لے کر کیوں پھری رہا۔“ اس عورت نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

”یہ پاگل ہی تو ہو گیا ہے۔“ جاگی نے کہا اور مجھے پکڑ کر ایک طرف چلنے لگی۔

میں نے جاگی کو اپنی کپٹنی کے قریب انگلی گھماتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی بائیں بھی سلیں۔ میں پیچھ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک میری قوت کو اپنی سلب ہو کر رہ گئی۔ لگتا تھا جیسے منہ سے خود ہی سانا سا طاری ہو گیا ہو۔

جاگی مجھے تقریباً کچھ پیچتی ہوئی اس مکان میں لے آئی جو

وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کمرے میں گھستے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے اور پھر میرے ہونٹوں سے سسکیاں اور ہچکیاں خارج ہونے لگیں۔ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

میں اپنے ماں باپ کی موت پر اس طرح رویا تھا اور دوسری مرتبہ اس وقت بلک بلک کر رویا تھا۔ جب میں نے اپنے ہاتھوں سے تھائی کو میکسیکو کی لہروں کے سپرد کیا تھا اور اب پھر تھائی کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ میرے سامنے کھڑی تھی اور اس نے مجھے پچھانے سے انکار کر دیا تھا۔

”وجہ۔۔۔ جب ہو جاؤ۔ وجہ۔۔۔“ جاگی نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”اپنے آپ کو سنبھالو وجدان۔ جو کچھ دیکھا اسے ایک خیال سمجھ کر بھول جاؤ۔“

”وہ۔ وہ تھائی ہی تھی نا؟“ میں نے سر اٹھا کر جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

”بعض اوقات ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ، وہ نہیں ہوتا جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔“ جاگی نے کہا ”سمجھ میں نہیں آتا اس کیفیت کو کیا نام دوں۔ نظروں کا فریب۔ سراب۔ تصویر یا لا شعوری دھوکا۔“

”یہ لا شعوری دھوکا۔۔۔ سراب، تصور یا نظروں کا فریب نہیں تھا۔ ایک ایسی زندہ حقیقت ہے تم سے بھی نہیں جھٹلا سکتیں۔“ میں نے جواب دیا ”تم بھی طویل عرصے تک اس کے ساتھ رہی ہو۔ میری طرح تمہارے دل میں بھی اس کے لیے جاہت ہے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دو کہ وہ تھائی نہیں تھی۔“

”ہو سکتا ہے وہ اس کی کوئی جڑواں بہن ہو جو بچپن میں کبھی چھڑ گئی ہو۔“ جاگی نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”تھائی کی زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اگر کوئی بہن ہوتی تو مجھے ضرور بتاتی لیکن اس نے کبھی ایسا ذکر نہیں کیا۔ ہم نے راتوں میں جاگ جاگ کر ایک دوسرے سے باتیں کی ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگی کے گوشے گوشے میں جھانکا ہے۔ نہیں جاگی اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ وہ تھائی ہے اور۔۔۔ اور ہو سکتا ہے اس کی یادداشت کھو گئی ہو اور اسی لیے وہ مجھے اور تمہیں نہیں پہچان سکی۔“

”تم ایک اور حقیقت کو بھول رہے ہو وجدان۔“ جاگی

نے کہا "تم بھول گئے ہو کہ اس نے تمہاری آغوش میں دم توڑا تھا اور تم نے اپنے ہاتھوں سے اسے دریا کی لہروں کے حوالے کیا تھا۔ وہ زندہ کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے اس وقت ہمیں دھوکا ہوا ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میں ممکن ہے کہ اس پر کتنے جیسی کیفیت طاری ہو گئی ہو اور ہم نے اسے مراد سمجھ کر دیا میں پھینک دیا۔ تم تو ڈاکٹر ہو جاگے۔ تم بتاؤ کیا ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔"

"ہو سکتا ہے۔" جاگتی بولی "بعض اوقات مریض کو مے میں چلا جاتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ کوئی کیفیت بعض اوقات کئی کئی مہینوں تک طوالت پہنچ لیتی ہے ایسی صورت حال میں مریض کا زندہ بننا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ کوئی ہی میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس دوران میں بھی اس کے دل کی دھڑکن نہیں بند ہوتی۔ اسے سانس اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو مصنوعی طریقوں سے اسے پہنچائی جاتی ہے مگر تھائی کو تو ہم نے دریا میں ڈال دیا تھا۔ اگر وہ کوما میں بھی تھی تو پانی میں ڈوبنے کے بعد وہ چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہی ہوگی۔"

"نہیں جاگتی۔" میں نے کہا "ہم اسے پانی میں ڈال کر موٹر بوٹ پر دیاں سے بہت دور چلے گئے تھے اور ہو سکتا ہے تھائی پانی کی لہروں پر بہتی ہوئی کنارے پر آگئی ہو اور کسی نے اسے پھانسا ہو۔ وہ زندہ تو بچ گئی مگر مداح پر میریوں کے اثر سے اس کی یادداشت چلی گئی جس وجہ سے وہ ہمیں نہیں پہچان سکی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔" میں چند لمحوں کو خاموش رہا پھر بولا "آج رات ہمارا یہاں سے جانے کا پروگرام ہے مگر میں نہیں جاؤں گا۔ میں اسے تلاش کروں گا۔"

"پاگل مت ہو جو بداند۔" جاگتی نے کہا "ہم پاسپورٹ اور کاغذات کے بغیر چوری چھپے سفر کر رہے ہیں۔ چھین ڈیوٹ نام اور لاؤس جیسے کیونٹ ملوں میں بغیر کاغذات کے سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے لیکن یہ ہماری خوش قسمتی رہی ہے کہ اب تک ہمیں ایسے لوگ ملتے رہے ہیں جو ہمیں تمام مفیبتوں سے بچاتے رہے ہیں۔ آج رات ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع مل رہا ہے تو نکل جانا چاہیے۔" "تھائی کے بغیر؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں سے چند میل دور دریا نے مریگاں گے۔" جاگتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور مریگاں کے اس طرف چنانچہ ساکین ہے۔ سردار تھالوب کا علاقہ۔ اس نے ایک

مرتبہ بنایا تھا کہ دریا پار لاؤس میں بھی اس کے چچو رہا ہوا ہیں۔ ہم سردار تھالوب کو صورت حال سے آگاہ کر رہے ہیں۔

وہ خود یہاں آکر تھائی کو تلاش کر لے گا اور ویسے بھی رات کے بعد یہاں رہنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ خاموش ہو کر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "تھائی کے ساتھ جو آدمی تھا وہ شکل سے ہی غیبیت لگتا ہے۔ وہ دولت مند ہے۔ اس کے تعلقات بھی بہت ہوں گے۔ اس نے ہر طرح جنس کے ریمان سے پکڑا تھا میں تو کھراگنی بھی کر رہا ہوں۔ اگر واقعی پولیس کو بلایا تو ہمیں سلاخوں کے پیچھے بند کر جائے گا۔ اگر ہم یہاں رہے تو ممکن ہے کسی وقت ہمیں گرفت کر دیا جائے۔ ظاف کوئی سنگین قدم اٹھا دیتے اور ہم کئی مہینے میں پھنس جائیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ انجان تھائی کو بھول جاؤ۔ جیسے ایک سال سے بھولے ہوئے تھے۔"

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ میں تھائی کو بھولا ہوا تھا۔ میں نے کہا "میں تو ایک لمحے کو بھی اسے نہیں بھولا۔ دوپہر گھڑی پہل میرے ساتھ رہی ہے۔"

جاگتی چند لمحے گری نظروں سے میری طرف دیکھ کر رہی۔ ہو سکتا ہے میری اس بات سے اسے کچھ دکھ بھی پہنچا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ ایک سال کے دوران میں تھائی کی جگہ لینے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ تھائی کی طرف اس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ دکھ سے تھے مجھے تھائی کی طرح بہت پیار دیا تھا کہ اس حقیقت سے بھی انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں کہ میں تھائی کو ایک لمحے کو بھی نہیں بھولا تھا اور آج جب میں نے تھائی کو دیکھا تو خوشی سے مجھم اٹھا مگر اس کی اجنبیت اور بے اعتنائی سے میرا دل پھٹ کر رہ گیا اور ایک سال سے آنکھوں میں رکھا ہوا سیلاب بہ نکلا۔

"تم ادھر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں کافی بوا کر لائی ہوں۔" جاگتی نے مجھے اپنی آغوش سے ہٹا کر ایک طرف دھکیل دیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ تقریباً بیس منٹ بعد خادمہ کے ساتھ ہی واپس آئی تھی۔ خادمہ نے کافی کے دونوں کپ چھوٹی میز پر رکھ دیے اور میری طرف دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔ جاگتی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

کافی پیتے ہوئے بھی ہم تھائی ہی کے بارے میں بات کرتے رہے تھے۔ مجھے نجانے تھے یہ کون کون تھا کہ وہ تھائی تھی۔ جبکہ جاگتی اس سلسلے میں کسی ایک فیصلے پر قائم تھی۔

تھی۔ کبھی وہ کہتی کہ ممکن ہے وہ واقعی تھائی ہی ہو اور کبھی تھائی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے مرے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے اور مرنے کے بعد کوئی زندہ نہیں ہوتا۔

"میں میں شبہ نہیں کہ اسے دیکھ کر میں بھی کچھ بدحواس ہوئی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "لیکن وہ اس کی کوئی ہم شکل بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ایک بڑے سے بڑا رول میل دور دور ہم شکل کو دیکھا گیا ہے۔ بداند میں کوئی رشتہ یا کوئی تعلق بھی نہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی اتفاق ہو سکتا ہے۔"

"ہم شکل ہونے کا اتفاق ہو سکتا ہے لیکن اس کی زبان و لہجہ، آواز اور انداز گفتگو میں بھی کوئی فرق نہیں۔" تھائی میں ہوا کہ تھائی جب غصے میں بولتی تھی تو اس کی زبان پر قہر خراںے لگتی تھی اور اس کی ٹانگ پر گھائی رنگ کا وہ پیرائے ٹٹان۔ وہ نشان کسی اور کے جسم پر کیسے ہو سکتا ہے؟

"اتفاق۔" جاگتی نے کہا "میں اسے حیرت انگیز اتفاق ہی کہوں گی۔ بہر حال، تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔ یہاں رہ کر ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ سردار تھالوب اپنے ذراغ سے اس عورت کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لے گا۔"

"اور اگر وہ تھائی ہی ہوئی تو۔؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تو پھر ہم اسے یہاں سے لے جائیں گے۔" جاگتی نے جواب دیا "میں بھی تمہارے ساتھ آؤں گی۔ تمہارے اور تھائی کے لیے اگر جان کی قربانی بھی دینی پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گی۔ میرے دل میں تھائی کے لیے جو کچھ ہے تم بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہو۔"

میں جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ جاگتی مجھے خاموشی یا کمزید کچھ کتنا چاہتی تھی کہ باہر سے دروازے پر بجلی کی دسک سن کر ہم دونوں چونک گئے۔ ٹٹانے دیوار گیر کھاک کی طرف دیکھا۔ اس وقت گیارہ بجتے تھے۔ ہمیں کمال آیا تھا کہ کوئی آدمی آدھی رات کے بعد سے لینے کے لیے یہاں آئے گا اور ابھی گیارہ بجیں نہیں گئے تھے۔ غمخیز خیال آیا کہ ممکن ہے ہمیں لے جانے والوں کے غناقت وقت سے پہلے ہی محل پر پہنچے ہوں۔

اسی دوران میں دسک کی آواز ایک بار پھر ابھری۔ تھائی اس مرتبہ مجھ سے زیادہ اوجھ نہیں تھی لیکن لگتا تھا جیسے وہ اپنے والوں کی بات میں ہو۔ میں غیر ارادی طور پر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے سے نکل کر میں نے ساتھ

والے دروازے کی طرف دیکھا جو بند تھا۔ میرے خیال میں خادمہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سو چکی تھی۔ میں نے تلتے قدم اٹھاتا ہوا بیوی دروازے کی طرف چلنے لگا۔ اس دوران میں تیسری مرتبہ دسک کی آواز ابھری۔ میں دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

میں نے دروازے کی جھریوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی مگر باہر گلی میں تاریکی تھی۔ میں نے آہستہ سے کٹھ اٹھا کر دروازہ کھول دیا۔

سیاہ چادر میں لپٹا ہوا وہ انسانی ہویلا دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے سے آنکھیں میں جلنے والے بلب کی روشنی اگرچہ اس پر پڑ رہی تھی لیکن اس نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ نہ صرف چہرہ بلکہ ہاتھ بھی چادر کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ہویلا مجھے ایک طرف ہٹاتا ہوا اندر گھس آیا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور جب اس نے میری طرف گھوم کر اپنے اوپر سے چادر ہٹائی تو میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ تھائی، دانگ تھی۔

میں اپنی جگہ پر اس طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا جیسے سنگت طاری ہو گیا ہو۔ تھائی بھی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر جھپٹی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اپنی ہاتھوں میں پیچھ ڈالا اور پھر دالمانہ انداز میں مجھے چومنے لگی۔

آواز سن کر جاگتی بھی دوڑی ہوئی کمرے سے باہر آگئی اور پھر تھائی کو دیکھ کر وہ بھی دوڑ کر تھائی سے لپٹ گئی۔ عجیب جذباتی منظر تھا۔ تھائی کبھی جاگتی سے لپٹ جاتی اور کبھی مجھ سے لپٹ کر مجھے چومنے لگتی۔

تین چار منٹ گزر گئے۔ ہم ابھی ایک تک دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے پھر شاید جاگتی ہی کو اس بات کا خیال آیا تھا۔ وہ ہم دونوں کو ہاتھوں سے پکڑے کمرے کی طرف لے جانے لگی اور شاید ہماری آواز سن کر خادمہ بھی جاگ گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی حیرت زدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"بہی تم نے ہمیں کافی پلائی تھی۔" جاگتی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "بہت خوش ذائقہ تھی۔ ایک کپ اور پیئے کو دل چاہتا ہے۔"

نادرہ سر ہلاتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔ ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ تھائی نے مجھے بند پر مگر ایسا اور ایک بار پھر

مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ کبھی قدرے پیچھے ہٹ کر مجھے اس طرح دیکھنے لگتی جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

”تم نے مجھے بہت دکھ پہنایا ہے تھائی۔“ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا ”مجھے پہچاننے سے انکار کر کے تم نے میرا دل پاش پاش کر دیا تھا۔“

”وہ میری غبوری تھی دجو۔“ تھائی نے میرا سراپے پہنے سے لگایا ”میں ایسا رویہ اختیار نہ کرتی تو تان منہ تمہارا دشمن ہو جاتا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ اس وقت میری جو حالت ہوئی تھی، تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”تم دونوں کو دیکھ کے میں بھونچکا رہ گئی تھی۔ میرا بھی دل چاہا تھا کہ دوڑ کر تم سے لپٹ جاؤں لیکن مجھے اپنے جذبات کے انظار سے زیادہ تم دونوں کی سلامتی کا خیال تھا اس لیے میں نے وہ رویہ اختیار کیا جس پر میں خود بھی دل ہی دل میں روتی رہی۔“

”اور جانتی ہو، وہ جہاں میں اسے آکر کتنا رویا ہے۔“ جاگی نے کہا ”میں نے اسے کبھی اس طرح ہلکتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”میں جانتی ہوں تم دونوں پر خاص طور سے وجوہ پر کیا غمزدگی ہوئی۔“ تھائی نے کہتے ہوئے مجھے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

تھائی جب بھی مجھے اپنے ساتھ لپٹاتی یا میرا منہ چومتی تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور میرے لیے اس سرور نگین کیفیت کو کوئی نام نہ نہ مشکل تھا۔

”وہ کون تھا؟“ جاگی نے پوچھا ”میرا مطلب ہے وہ آدمی جو تمہارے ساتھ کار سے اتر اٹھا۔“

”تان منہ۔“ تھائی نے گہرا سانس لینے ہوئے جواب دیا ”وہ اس شہر کا بہت بڑا رئیس ہے۔ اس کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں تو وہ تم لوگوں کو قہر کر دیتا یا پولیس کے حوالے کر دیتا۔ میں جانتی تھی تم لوگ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے ہو۔ میں اس کی پولیس ایسے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم لوگ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو میں نے موقع پا کر ایک ہالکر کو پتہ کر لایا جو تم لوگوں کے پیچھے بھیج دیا تھا۔ دو ڈھائی منٹ بعد اس نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ

تم لوگ کہاں ہو۔ میں اب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے نکلی تھی اور بڑی مشکل سے چھپتی چھپاتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی۔ اگر تان منہ کو پتا چل گیا تو وہ میرے ساتھ تھیں، ابھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

میں بڑی گہری نظروں سے تھائی کی طرف دیکھتا ہوا تقریباً ایک سال پہلے جب میں نے گولڈن ٹرائی اسٹریٹ کے دارا کے قہقہے سے چھڑایا تھا تو ہیروئن کے کونہ استعمال سے وہ بالکل مرده ہو چکی تھی۔ وہ کسی دیرانہ طور پر طرح دکھائی دیتی تھی۔ پیچھے ہوئے گال اور اندر گھس گھس ویران آنکھیں۔ ہیروئن نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور بالآخر چند روز بعد ہی اس نے ”دم توڑ“ دیا تھا اور میں نے اسے دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا اور ایک مجرّمہ بھی تھا کہ اس ”مافو“ نے ایک سال بعد وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے تھائی کو دیکھا تھا تو وہ اپنی زندگی سے بھرپور اور ایسی ہی حسین تھی۔ اس وقت ہم ان کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی اور اس وقت ان کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

ایک سوال اب تک میرے ذہن میں پکرا رہا تھا۔ ہیروئن نے تھائی کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر گولڈن ٹرائی اسٹریٹ کے فرار ہوئے ہوئے وہ گولیاں کھا کر گری گئی۔ خون میں لت پت تھی اور میں نے خود اسے اٹھا کر پیچھا اور پھر کشتی میں ڈالا تھا اور پھر اسے اپنے ہاتھوں سے دریا تیز لہروں کے حوالے کر دیا تھا لیکن وہ زندہ کیسے بچ گیا تھا؟ جاگی کے ذہن میں بھی شاید یہی سوال گردش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے تھائی سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

”یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔“ تھائی نے کہا ”میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے لپٹ لیا تھا۔“ ”مجھے نہیں معلوم تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا کیا تھا۔ میں شاید تمہاری گود میں سرسے ہوئی تھی۔“ اس نے میری طرف دیکھا پھر بات جاری رکھی۔ ”بولی “آکھ کھلی تو میں ایک جھونپڑے میں زمین پر چھٹی جا رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں ایک جھونپڑے میں زمین پر چھٹی جا رہی تھی۔ میرے ارد گرد کی لوگ جمع تھے ان میں سے بھی تھیں اور وہ آدمی ایسے تھے جن کے جسون پر فتنہ ہو گیا تھا۔

”ان کی باتوں سے پتا چلا کہ میں ایک چادر میں جھاڑیوں میں اٹھی دیر میں بیٹھی ہوئی رہی تھی۔“ ”سرحدی محافظوں نے مجھے دیکھ لیا۔ کنارے سے دوڑ کر

پہلے رہائی گروں کی ایک جھونپڑی میں بیٹھی تھی۔ ایک محافظ نے مجھے ہاتھوں میں لپٹ لیا اور مجھے دریا سے نکال کر اس جھونپڑی میں لپٹا لیا۔

”تان منہ کے بارے میں پوچھتے رہے مگر میرا ذہن کام نہیں کرتا تھا۔ میں انہیں کچھ نہیں بتا سکی۔“ سرحدی محافظوں کا بیان تھا کہ میں کوئی جاسوس ہو سکتی ہوں لیکن کچھ لوگ اس بات سے متفق تھے کہ مجھ جیسی لیب گورنر جاسوس نہیں ہوتی۔ ان کے خیال میں میرا تعلق اسمگلروں کی کسی پارٹی سے ہو سکتا تھا۔ جو کسی جھڑپ میں زخمی ہو کر دریا میں گری گئی اور لہروں پر بہتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی۔

”پانی میں رہنے سے میرے زخموں سے خون بہتا بند ہو گیا تھا۔ بہتی کے کھانے اپنے طور پر میرے زخموں کی دیکھ کر کوئی بھی مجھے مزید خون نہ بہہ سکے۔“

”میں رات اس جھونپڑے ہی میں بڑی رہی۔ دو محافظ اپنی میری نگرانی کے لیے موجود رہے۔ تاکہ میں بھاگ نہ دوں۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت بھی نہیں دے سکتی تھی۔“

”مجھ کو تو ایک عورت نے مجھے پیچھے سے تھوڑا سا پکڑ لیا۔“ فونی محافظ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن میں اپنی زبان کو بھی حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔

”محافظ مجھے شرے جاکر حکام کے حوالے کر دینا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے شہر کا ایک رئیس تان منہ ماہی گیروں کی اس کشتی میں پہنچ گیا۔“ محافظوں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات دریا کے دوسری طرف گولڈن ٹرائی اسٹریٹ کے علاقے میں ایک زبردست فائرنگ ہوئی رہی ہے۔ انہوں نے ایک ٹیلی فون پر بھی تہہ ہو کر دریا میں گرتے ہوئے دیکھا تھا اور اس سب سے میں انہیں دریا میں ملی تھی۔ ان کے خیال میں، یہاں پہنچا ہوا سرحدی محافظ بھی ان کے اس خیال سے متاثر ہوئے تھے۔

”میں حالت اور میری دونوں باتوں پر انجکشنوں کے ساتھ استعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔“ تان منہ ایک بار پھر بولے ”وہ اپنی ضمانت پر مجھے شرے لے آیا اور ایک کشتی میں داخل کر دیا۔“

”ان کشتیوں پر ہتھیار استعمال میں رہی پھر مجھے تان منہ کی کشتی میں منتقل کر دیا گیا۔“ باقاعدہ علاج دیکھ بھال

اور بہترین خوراک کی وجہ سے میں بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگی۔ میری یہ حالت دیکھ رہے ہو۔ میں آج پھر اپنے آپ کو پہلے جیسی محسوس کرتی ہوں۔ زندگی سے بھرپور۔“ تھائی خاموش ہو کر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”تان منہ بہت دولت مند آدمی ہے۔ اس کا بزنس کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک بہت بڑی سطح سے اٹھ کر اوپر آیا ہے۔ اس نے بڑی محنت بھی کی مگر ماضی کی محرمیوں اور اب دولت کی فراوانی نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ بڑا اگڑا اور بد مزاج آدمی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لانا۔ اس کی بد مزاجی اور اگڑاپن کی وجہ سے اس کی بیوی کئی سال پہلے اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ تنہا ہے۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔“

”اس کے بارے میں“ میں نے بہت باتیں سنی ہیں مگر حیرت انگیز طور پر میرے ساتھ اس کا رویہ بہت مختلف ہے۔ وہ میرے سامنے بچھا جاتا ہے۔ میرے سامنے اس نے بھی اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی۔

”شروع میں جب میں اسپتال میں تھی تو مختلف متعلقہ اداروں کے اہلکار مجھے تنگ کیا کرتے تھے۔ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں۔ یہاں آنے کا میرا مقصد کیا ہے؟ مگر میں نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ تان منہ نے اپنے تعلقات استعمال کر کے مجھے ان پریشانیوں سے نجات دلا دی اور مجھے اسپتال سے اپنے گھر لے آیا جہاں میرا ہر طرح سے خیال رکھا گیا۔“

”تان منہ نے بھی مجھ سے میرے بارے میں پوچھنا چاہا۔ وہ یہ تو سمجھ گیا کہ میں تھائی لینڈ کی رہنے والی ہوں لیکن اس نے کوئی بات جاننے کے لیے کبھی مجھ سے ضد نہیں کی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ جس روز مجھے دریا سے نکالا گیا تھا اس سے ایک رات پہلے گولڈن ٹرائی اسٹریٹ میں بڑا زبردست ہنگامہ ہوا تھا اور اس کی معلومات کے مطابق اس رات جہل کھوراٹ کے کچھ قیدی گولڈن ٹرائی اسٹریٹ سے فرار ہو گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی فرار ہونے والے انہی قیدیوں میں سے ایک ہو سکتی ہوں لیکن اس نے مجھ سے بھی اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔

”تان منہ بہت دولت مند غصہ ور ہے رحم اور بد مزاجی کا گڑھ ہونے کے باوجود بہت شریف آدمی ہے۔ بیوی چھوڑ کر بھاگ گئی تو اس نے کسی عورت کو کبھی اپنے قریب نہیں کھینکے دیا۔ حالانکہ اس قسم کے لوگ بڑے بد معاشر اور عیاش

ہوتے ہیں۔

”میں تقریباً ایک سال سے اس کے پاس ہوں۔ اس نے کبھی میلی آنکھ سے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے لیکن میری مرضی کے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔ شادی کی خواہش کا اظہار اس نے دو مہینے پہلے کیا تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر بھی اس نے اصرار نہیں کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جس روز میں خود رضامندی کا اظہار کروں گی اسے خوش ہوگی۔ ویسے میرے لیے اس کے دل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ میرا بہت احترام کرتا ہے اور بقول شخصے مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا ہے لیکن میرے معاملے میں وہ اس قدر حساس ہے کہ کسی مرد کا میرے قریب کھڑے ہونا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک مہینہ پہلے ایک دعوت میں ایک بہت بڑے سرکاری آفسر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ تان منہ نے سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اسے مار مار کر ادھ موار کیا۔ یہ تو دوسرے روز پتلا چلا کہ تان منہ نے اس آفسر کی ٹانگ کی ہڈی بھی توڑ دی تھی اور وہ ابھی تک اسپتال میں برا ہوا ہے۔

”تم خوش قسمت ہو کہ آج بچ گئے۔ اگر بات ذرا سی بھی بڑھتی تو بہت برا ہوتا۔ تم جس طرح میری طرف لپکتے تھے اور تم نے جو باتیں کی تھیں اس سے اسے شہ ہو گیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ہمارا کوئی پرانا تعلق ہو سکتا ہے۔

”میں اب وہ سب کچھ چھوڑ کر آئی ہوں۔ میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ دو چار دن میں یہاں سے نکل جائیں اور اگر اس سے ہمیں تعلق نہ ملے تو مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر میری محبت بھی اس کے دل سے نکل جائے گی۔“

”دو چار روز نہیں تھائی۔“ میں نے تھائی کے خاموش ہونے پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہم آج رات ہی یہاں سے جا رہے ہیں۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ ہمیں اس آدمی کا انتظار ہے جو ہمیں لینے کے لیے یہاں آنے والا ہے۔“

”اوہ! تھائی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی، ”کون ہے وہ؟“

”بے ایک شریف آدمی۔ جس نے ہمارے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کیا ہے۔ ویسے سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً سات میل۔“ تھائی نے جواب دیا ”درا کے

قریب کا کچھ علاقہ کھینچے جگہ پر مشتمل ہے۔ ان دنوں فوجی محافظ چھپے رہتے ہیں تاکہ دریا پر نگاہ رکھ سکیں۔ طرح دریا پار کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“

”ہمارے حسن نے کوئی نہ کوئی بندوبست کر لیا ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کانی لے کر آگئی۔ ہمارے سامنے کانی رکھتے ہوئے وہ فوجی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی تھائی کو دیکھ رہی تھی۔ کانی پینے کے دوران میں بھی ہماری منتظر کا سلسلہ نہیں رہا۔ میں بار بار تھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کو اس نے نیوی بلو کمر کا بلاؤز اور اسکرٹ پہن کر کھانا کھا اور اس وقت جینز کی پینٹ اور وینم کی شرٹ میں تھی جس کے اوپر وہ ٹین کھلتے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر اس کے پائے پر اثر یہ تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ قیامت خیز ہو گئی تھی۔

”میں نے تمہیں مردہ سمجھ کر اپنے انسی ہاتھوں سے اس کی لمبوں کے سر پر کیا تھا۔ یقین نہیں آتا کہ تم اس وقت میرے سامنے کبھی ہوئی ہو۔“ میں نے ایک بار لمبات پر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

”جیسی واہ۔“ جاگی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”میرا پہلے تمہیں اس کے مرنے کا یقین نہیں تھا اور اب اس کے زندہ ہونے کا یقین نہیں آ رہا۔“

”ہاں۔ بعض اوقات اسی طرح یقین ڈالنا ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

تھائی کانی کی چپکلیاں لیتے ہوئے اب ہمارے بارے میں کیرید کر پوچھ رہی تھی اور اب اسے اپنے بارے میں بتانے کی میری باری تھی۔ میں نے کانی کی ایک دو جملہ اور اسے پچھلے ایک سال کے اہم واقعات کے بارے میں بتائے۔

”یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بھول کر کھلا جہاز سرحد عبور کر کے لاؤس میں نکل آئے تھے۔“ میں نے کہا کہ رہا تھا ”اگر ہم صحیح جگہ سے سرحد پار کر کے برائے نکل جاتے تو تم سے ملاقات نہ ہوتی اور ہم تمہارے میں بے خبری رہتے اور تمہیں مردہ ہی سمجھتے رہتے۔“

”کانی دکھ اٹھائے ہیں تم نے بھی۔“ تھائی نے کہا۔ ”ہاں۔ تمہارے بغیر دکھوں کا احساس کچھ زیادہ رہا۔“ میں نے جواب دیا۔

”بڑے احسان فراموش ہو۔“ جاگی نے مجھے

”میں جاگی۔“ میں نے کہا ”تم دو دن ہی تو ہو جن کی ہے میں آج تک زندہ ہوں۔ اس میں شہ نہیں کہ تم نے مجھے تھائی کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ تم نے تھائی کی طرح میرے دل میں گھسی پچھی ہو۔“

میری اس بات پر تھائی نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر جاگی فورے ہوئے ہوئے۔

”میں جاگی۔ میری عدم موجودگی میں تم اس کے ساتھ رہی ہو؟“

”مجھے افسوس ہے میں کوشش کے باوجود تمہاری جگہ میں کامیاب نہیں ہو سکی۔“ جاگی نے مسکراتے ہوئے کہا ”تمہاری جگہ کوئی دوسرا لے بھی نہیں سکتا۔ اب وہ تو ہسپتال کو اپنے لاؤ لے کو۔“

کانی کے لفظ پر تھائی نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میں نے تھائی سے بات کر کے بعد مجھے یہ خوشی ملی تھی۔ ہم اسی طرح تھائی کی باتیں کرتے رہے۔ ہمیں وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا اور جب میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو

میں نے گھڑی دیکھ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”میرا دیکھو! میں نے تمہاری باتیں سنی ہیں۔“ میں نے کہا ”اب میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جاگی کی آنکھوں میں بھی بے چینی دکھائی دیتی تھی۔“

تھائی بے کے قریب بیوی دو روزے پر دستک کی آواز سن کر ہلکے پھلکے میں اٹھ کر تیزی سے باہر آ گیا اور تھائی کے ساتھ ساتھ کانی کے ساتھ ایک دھلا پتلا سا لپٹے ہوئے تھا۔ اس نے سر پر سرخ رنگ کا دو تین انچ لمبائی کی طرح باندھ رکھا تھا۔ اس نے کالے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ممکن ہے ان کپڑوں کا رنگ تھائی کے جس میں وہ کالے ہی لگ رہے تھے۔ وہ چند لمحے تھائی کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اندر آ گیا۔

”تم لوگ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ

وقت نہیں ہے۔ تمہارا سامان کہاں ہے؟“

”ہمارے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنی۔ ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“ میں کہتے ہوئے کمرے کی طرف آیا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی آ گیا۔

وہ دروازے میں رک کر باری باری تھائی اور جاگی کی طرف دیکھنے لگا۔

”کون کون جائے گا؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہم تینوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تینوں!“ اس کی آنکھوں میں ابھرنی سی تیرگی ”لیکن ہمیں دو آدمیوں کے لیے کہا گیا تھا اور یہ۔“ اس نے تھائی کی طرف اشارہ کیا ”یہ تو تان منہ کی عورت ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ ہم نے اسے سرحد پار پچھایا ہے تو وہ ہماری پارٹی کے کسی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

میں کانپ اٹھا۔ بدن پر چوڑیاں سی رینگنے لگیں۔ اس نے تھائی کو بچان لیا تھا کہ وہ تان منہ کی عورت تھی اور ہم اسے چوری چھپے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔

”تان منہ کو پتا نہیں چلے گا کہ تم نے مجھے سرحد پار کرائی تھی۔“ تھائی نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا اور اپنے پنڈ بیک میں سے کئی کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”تم اپنی زبان بند رکھو گے۔ تم نے مجھے کبھی نہیں دکھا۔ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

اس شخص نے نوٹ لے کر پتلون کی جیب میں ٹھونس لیے۔

”مگر ہمیں صرف دو آدمیوں کو سرحد پار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔“ وہ ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”مستر کن منہ کہاں ہے تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ کن منہ ہمارا وہی دولت مند ہمدون تھا جس نے ہمارے فرار کا بندوبست کیا تھا۔

”مستر کن منہ تو اس وقت اپنے گھر میں سو رہے ہوں گے۔ ادھر عید ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں اس شخص کی نام سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے یا مرد لیکن اس شخص نے چونکہ اس مشکل نام کے ساتھ مزنٹ کا لینڈ استعمال کیا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔“

”چلو۔“ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

آتش فشانی حصہ 3

آتش فشانی

ہم تینوں کمرے سے باہر آگئے۔ میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر خادمہ کو جگا دیا۔ اسے بتایا کہ ہم جا رہے ہیں وہ باہر کا دروازہ بند کر لے۔  
ہم چاروں تاریک گلی میں دوپے قدموں چلتے رہے۔ وہ آگے تھا اور ہم اس کے پیچھے گلی کے موڑ پر ایک بندوین کھڑی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ اگر اوپدھ سے ہم تینوں کو لے جانے سے انکار کر دیا تو ہم آج نہیں جا سکیں گے۔ ظاہر ہے میں نہ تو جا سکی کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی تھائی کو۔ اوپدھ کے انکار کی صورت میں ہم واپس آجاتے اور صبح میں اپنے مہربان دوست کن منہ سے بات کرتا۔  
وین کے شیشوں پر سیاہ شیش لگی ہوئی تھیں۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہمارے ساتھ آنے والے وین کا دروازہ کھول کر اندر جھکتے ہوئے کچھ کہا۔ جواب میں ایک نسوانی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اس شخص نے ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پانچر سیٹ پر بیٹھ گیا۔  
وین کے پچھلے حصے میں ایک عورت کے علاوہ دو آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے مگر تاریکی کے باعث ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ عورت نے چھت پر لگی ہوئی بتی جلا دی۔ روشنی اگرچہ زیادہ تیز نہیں تھی مگر ایک دوسرے کے چہرے دیکھ جاسکتے تھے۔

اس عورت نے باری باری ہماری طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں تھائی کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی ابھمن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے بیٹھے کے بعد وین چل پڑے گی مگر وین حرکت میں نہیں آئی۔ وہ عورت تھائی سے مختلف سوالات کرنے لگی اور میں اسی دوران میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی عمر تیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔ خاصی حسین تھی اور چہرے سے خراٹ لگ رہی تھی۔ کسی جراثیم پیشہ گروہ کی سربراہی کرنا کسی شریف عورت کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔  
تانا منہ شر کا ایک مشہور و معروف آدمی تھا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں شر کا پچہ بچہ واقف ہوتا ہے۔ تھائی ایک سال تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ بہت سے لوگ اسے بھی جانتے تھے۔ اس آدمی نے تھائی کو ”تانا منہ کی عورت“ کہا تھا۔ ممکن ہے شر کے لوگ تھائی کو تانا منہ کی والدہ سمجھتے ہوں۔  
تقریباً پانچ منٹ تک تھائی اور اوپدھ میں باتیں ہوئی

رہیں۔ آخر میں تھائی نے اپنا پینڈ بیگ اس کے حوالے کر دیا۔ اوپدھ نے بیگ کھول کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہنس سی ابھر آئی۔ غالباً بیگ میں ٹھنڈی رقم موجود تھی۔ اوپدھ نے چھت کی بتی بجھا دی۔ ڈرائیور سے کچھ کہا اور انجن اشارت کر دیا اور وین حرکت میں آگئی۔  
مجھے اوپدھ سے مذاکرات کا موقع ہی نہیں ملا۔ سارا معاملہ تھائی ہی نے طے کر لیا تھا۔ وہ تانا منہ سے نکلے وقت غالباً خاصی بڑی رقم لے کر آئی تھی۔ ان خیال ہو گا کہ یہاں رہتے ہوئے ہمیں رقم کی ضرورت نہ تھی اور اس طرح رقم کا کام آگئی تھی۔ تھائی نے پورا بیگ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ ظاہر ہے تھائی نے ہمیں ہم ہو گا کہ ہم تو یہاں سے جا ہی رہے ہیں۔ لاؤس کی کرنی لینڈ میں ہمارے کام نہیں آئے گی۔

تاریک شیشوں سے ہم تو باہر دیکھ سکتے تھے لیکن باہر اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ شر کی سڑکیں سنسن فیم۔ صرف ایک سڑک پر سامنے سے آئی ہوئی ایک گاڑی دکھائی دیتی تھی اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ شہر میں کسی جگہ پولیس کوئی تفتیشی یار بھی دکھائی نہیں دی تھی۔  
وین خسرے نکل کر ویا کی طرف جانے والے راستے مڑ گئی۔ اس سڑک کے دونوں طرف درخت تھے۔ درختوں میں وین کے ہیڈ لیمپس کی روشنی یوں لگتی تھی جیسے ہم کسی سرنگ میں سفر کر رہے ہوں۔

بالآخر وین ایک جگہ رک گئی۔ ڈرائیور نے آگے کر دیا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد ایک کھلی جیب ہارنگ کے قریب آکر رکی۔ اس میں فوجی دروہوں میں لکھن ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپدھ وین سے اتر کر ان سے بات کرنے لگی۔ چند منٹ بعد ہمیں وین سے اتر کر جیب میں آگیا۔ اوپدھ وین اور اس کے دو ساتھی بھی ہمارے ساتھ آگئے تھے اور جیب حرکت میں آگئی۔ اوپدھ کے ساتھ ساتھی دین ہی میں رہ گئے تھے۔  
چھ سات منٹ بعد جیب درختوں کے درمیان ایک جگہ پر رک گئی۔ یہاں لکڑی کے تین چار بیٹھے تھے۔ صرف ایک بیٹ میں روشنی ہو رہی تھی۔ اوپدھ سے اتر کر ایک فوجی کے ساتھ اس بیٹ میں داخل ہوئے۔ یہ سرحدی محافظوں کی نگران پوسٹ تھی۔ تقریباً پچاس گز آگے دیا گیا۔ وہاں ایک بڑا مکان تھا۔ اس کے دوسری طرف تھائی لینڈ تھا۔ ہم اپنی منزل کے قریب گئے تھے۔ راستے میں صرف میکانک حامل آکر

ہوئی تو ہم چند منٹ بعد تھائی لینڈ میں ہوں گے۔ وہ محافظ اوپدھ کو بیٹ میں چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔ تقریباً سات منٹ بعد بیٹ کا دروازہ کھلا اور اوپدھ وین کے قریب کے ساتھ بیٹ سے برآمد ہوئی۔ اوپدھ کی شرٹ کے اوپدھ کے ہاتھں کھلے ہوئے تھے۔  
اس کے ساتھ بیٹ سے برآمد ہونے والا آفسر اس نگران پوسٹ کا انچارج تھا۔ وہ ہماری جیب کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بیٹ کے کھلے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی جاگتی اور تھائی کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور وہ آفسر باری باری ان دونوں کو گھور رہا تھا۔ وہ دونوں بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں اور میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی۔ آفسر نے ان دونوں سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے سوالات کرنے لگا۔

میں جانتا تھا کہ ہمارے بعد درکن منہ سے ہمیں سرحد پار کرانے کے لیے اوپدھ کو ایک خطیر رقم دی ہوگی اور اوپدھ نے اس آفسر کو بھی حصہ دیا ہو گا۔ اس کے بغیر تو ہم دیا کے اتنا قریب آ سکی نہیں سکتے تھے لیکن اس کے باوجود کسی گز پر تو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس موقع پر میں نے ٹپ کا پتا چھیننے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے امید تھی کہ یہ پتا کام کرائے گا۔ میں نے مہاراج اور سردار تھالوب کے ناموں کا سامرا لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

آفسر یہ دونوں نام سن کر چونک گیا۔ مہاراج کا نام لاؤس کے لوگوں کے لیے بھی اچھی نہیں تھا۔ یہاں کے لوگ تھائی لینڈ سے لگ باگن کی نشانی لے کر آتے تھے۔  
اور سردار تھالوب کو تو یہ آفسر زیادہ جانتا تھا۔ وہ تھائی لینڈ کے ایک بہت بڑے قبیلے کا سردار تھالوب اور یہ قبیلہ فوجوں میں دیا کے ساتھ ساتھ اپنی سرحد میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سردار تھالوب ویسے بھی منشیات کی پیداوار کی ذمہ داری کے حوالے سے ان علاقوں میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اسی حوالے سے لاؤس کے سرحدی علاقوں میں رہنے والے بعض بڑے بڑے لوگوں اور سرکاری افسروں سے اسی کے رابطے تھے۔  
سردار تھالوب کا نام سن کر آفسر مجھ سے اس کے بارے میں سوالات کرتا رہا اور میں ایک سال پہلے تک کے واقعات سامنے میں اسے بتاتا رہا اور پھر تقریباً آٹھ گھنٹے بعد اس نے پناہ مانت سے کچھ کہا۔ مانت نے ہمیں اپنے ساتھ ساتھ لے لیا۔ آٹھ گھنٹے بعد آفسر نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے سے منع کیا۔ ہم جیب سے اتر کر اسی کے ساتھ چلے گئے۔

ہم میں داخل ہو رہی تھی۔  
دیا کے کنارے پر ایک موٹر بوٹ تیار کھڑی تھی۔ ہم تینوں کے علاوہ اوپدھ کے دونوں آدمی بھی بوٹ میں بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے انجن اشارت کر کے کنٹرول لیور سنبھال لیا۔  
ہمارے ساتھ آنے والے فوجی نے اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔ وہ دو ٹوٹا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کے تقریباً پانچ منٹ بعد اس طرف سے ٹارچ کی روشنی حرکت کرتی ہوئی دکھائی دی۔  
”گو۔“ ہمارے قریب کھڑے ہوئے فوجی نے چیخ کر کہا اور موٹر بوٹ حرکت میں آگئی۔  
بوٹ دیا کی تہ لہروں کو چرتی ہوئی سامنے والے کنارے کی طرف دوڑنے لگی۔ یہاں دیا کا پاٹ ہزار میٹر سے بھی زیادہ تھا۔ ہمارے کپڑے گہرے رنگوں کے تھے اور بوٹ پر بھی سیاہ رنگ پینٹ کیا ہوا تھا۔ تاریکی میں دور سے بوٹ کو دیکھ لینا آسان نہیں تھا۔  
بوٹ دیا کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ اچانک فائرنگ کی آواز سن کر میرا دل اچھل کر صحن میں آگیا۔ جاگی تو سیٹ سے اچھل کر بچنے کر بڑی تھی۔ میں بھی نیچے آگیا اور تھائی کو بھی سیٹ کے نیچے چھینچ لیا۔  
آئوٹیک رائفلوں سے فائرنگ کی آوازوں نے سناٹے کو چر کر رکھ دیا تھا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ایک حربہ میں نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپدھ کے دونوں آدمی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ فائرنگ ہماری بوٹ پر نہیں کی جا رہی تھی۔ میں محتاط انداز میں اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔  
فائرنگ بائیں جانب تقریباً ایک ہزار میٹر دور ہو رہی تھی اور پھر اوپدھ کے سامنے ہی بتایا کہ جب بھی یہاں سے کوئی بوٹ چوری پیچھے دوسرے کنارے کی طرف جاتی ہے تھائی محافظوں کی فوج بھانے کے لیے کچھ دور فائرنگ شروع کر دی جاتی ہے۔ دوسرے کنارے پر گنت کرنے والے تھائی محافظ اس طرف چلے جاتے ہیں اور بوٹ خیریت سے منزل پر پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی۔  
چند منٹ میں ہی بوٹ دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ کنارے پر گنجان درختوں کی شاخیں پانی میں جھکی ہوئی تھیں۔  
”پندر گز آگے تمہیں ایک پگنڈی ملے گی۔ اسی پر چلنے چلے جاؤ۔ کہیں رکنے کی کوئی گنجائش مت کرو۔“ اوپدھ کے



ایک آدمی نے کنارے پر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود کنارے پر اتر گیا تھا۔ ہم دونوں نے پہلے جاگی اور تھائی کو بوٹ سے اترنے میں مدد دی پھر میں نے بھی چھلانگ لگا دی۔ وہ آدمی دوبارہ بوٹ پر بیٹھ گیا اور بوٹ تیزی سے واپس روانہ ہو گئی۔

ہم وہاں رکے نہیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے تیزی سے درختوں میں چلتے رہے۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد ہمیں وہ گھنڈنڈی مل گئی۔ وہ ایک باقاعدہ کشادہ راستہ تھا۔ ہم تیز رفتاری سے چلتے رہے۔

اندھیرے میں جاگی اور تھائی کو کئی مرتبہ ٹھوکریں لگی تھیں اور دوسرے تو میں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا تھا۔

یہ پتھر پلا راستہ بتدریج بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ تھائی اور جاگی ہانپتے لگی تھیں مگر ہم رکے بغیر چلتے رہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد راستہ خلیب میں اترنے لگا۔

”رک جاؤ۔“ تھائی ہانپتے ہوئے بولی ”تھوڑی دیر کو رک جاؤ۔ اب مجھ سے ایک قدم نہیں چلا جا رہا۔“ وہ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں اور جاگی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ سناٹے میں حشرات الارض کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔

اس وقت شاید پانچ سے اوپر کا وقت تھا۔ اندھیرا بتدریج کم ہو رہا تھا اور فضا میں بہت مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم خلیب میں اترنے لگے۔

ہم مزید دو گھنٹوں تک رکے بغیر چلتے رہے اور اب دھوپ پھیل رہی تھی۔ دھوپ کی روپش نرم کر نہیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ایک چٹان کے اوپر سے گھوم کر ہم جیسے ہی دوسری طرف آئے، تھائی ٹھٹک کر رک گئی اور ہاتھ سے بائیں طرف اشارہ کرنے لگی۔

خلیب میں تاحہ نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور ان کھیتوں کے بیچ میں ایک مکان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مکان ہم سے کم از کم ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر خلیب میں نہ ہوتا تو اتنی دور سے ہمیں وہ مکان نظر نہ آتا۔

ہم چند منٹ وہاں رکے اور پھر خلیب میں اترنے لگے۔ نیچے کھیتوں تک پہنچنے کے لیے کوئی سیدھا راستہ نہیں تھا۔ ہمیں بائیں طرف مڑنا پڑا۔ اس طرف تنجان درخت تھے جن کی شاخیں راستے پر بھٹی ہوئی تھیں لیکن ٹوٹی ہوئی شاخوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس راستے پر گاڑیوں کی آمدورفت رہی ہوگی جن کے ٹکرائے سے شاخیں ٹوٹی

تھیں۔

ہم تقریباً پندرہ منٹ تک ان تنجان درختوں میں پھرتے رہے اور پھر اس راستے سے مرکز ایک گھنڈنڈی پر اترے۔ ہمیں دھان کے کھیتوں تک لے گئی۔ وہ مکان اتنا بڑا کہ ہمیں نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اب بھی تقریباً دو سو گز دور تھا۔ ہم ایک اونچی جگہ پر رک کر اوپر ادھر دیکھنے لگے۔ مکان کے آس پاس تو کیا دور دور تک کوئی آدمی نہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”حیرت ہے کوئی نظر نہیں آ رہا۔“ جاگی ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی ”حالا نہ کا شکار کسم کے لوگ تو سورج نکلنے سے پہلے ہی کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔“

”کھیتوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہو سکتا ہے اس موقع پر فصل کو کا شکار کی وجہ کی زیادہ ضرورت نہ ہو۔ بہر حال آگے چل کر دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ لوگ ابھی تک سو رہے ہوں۔“

ہم اونچی جگہ سے اتر کر کھیتوں کے درمیان ایک ٹھٹھکی گھنڈنڈی پر چلنے لگے۔ سب سے آگے تھائی تھی۔ اس نے پیچھے میں اور میرے پیچھے جاگی۔ دھان کے پودے دو احوال نشا اونچے تھے۔ ان میں ابھی پھل آنا شروع ہوا تھا۔ دھان کی فصل کو پھیری کی بوائی سے لے کر پھل پلٹنا شروع ہونے تک بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت فصل جوان تھی اس لیے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ تنگ سی گھنڈنڈی میں پانی میں بھٹی ہوئی تھی۔

ہم سب بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔ میرے پیچھے جاگی کے پیروں کے نیچے سے اچانک ٹھٹھکی نکل گئی۔ اس نے سنبھلنے کے لیے مجھے پکڑ لیا۔ وہ خود سنبھل سکی بلکہ میرا توازن بھی بگڑ گیا اور میں اس سے چلے لڑکھڑا ہوا کھیت میں گر گیا۔ میرے ساتھ ہی جاگی گر پڑی تھی۔

تھائی ہم سے چند قدم آگے تھی۔ اس کے حلق سے احتیاط قہقہے ابل پڑے۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی جاگی کی طرف۔ میں چند لمحے پانی میں پڑا جاگی کو گھور رہا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں سر سے پیر تک پیچڑ میں لٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جاگی نے بھی قہقہے لگانا شروع کر دیے اور کوئی نہ کر کے وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے دیکھ کر ہنس رہی ہو۔ ذرا اپنا جلیہ دیکھو۔ بالکل بھٹی لگ رہی ہو۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

جاگی نے اپنا جائزہ لیا مگر اس کی ہنسی نہیں رکی۔ وہ مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور میرا خیال تھا کہ فکس کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی باہر ضرور آئے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک بار پھر آگے چلنے لگے۔ اس مکان کے سامنے دو تین سو گز ہوا جگہ تھی جہاں کھادوں میں پھول گئے ہوئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس مکان میں ہونگی وہ کھادیں ابھی تک مٹی کی نیند سو رہے تھے لیکن قریب پہنچے تو ہمارا یہ خیال سو فصد غلط ثابت ہوا۔ مکان کے دروازے پر ایک چھوٹا سا کالا گھوٹا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ ہماری توازن سن کر بھی کوئی باہر کیوں نہیں نکلتا تھا۔

”میرا خیال تھا کہ یہاں کسی سے ہمیں کپڑے مل جائیں گے مگر اب تو پیچڑی میں ہی رہنا پڑے گا۔“ میں نے جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے سروی لگ رہی ہے۔“ جاگی بولی ”ان گیلے کپڑوں میں تو ہم ٹھٹھکر رہ جائیں گے۔ میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے روک کر کوشش کی مگر اس نے میری ایک بات نہیں سنی اور اگلے پتھر سے فرش میں لگنے لگی۔ دیکھ کر میں نے اسے زیادہ مضطرب نہیں کیا۔ تیسری ہی ضرب پر ٹوٹ کر لٹک گیا۔

”یہ کون سے اچھا نہیں کیا جاگی۔“ تھائی نے کہا ”اس طرح کی کھڑکا کالا تو زنا اچھی بات نہیں ہے۔“

”ہم یہاں چوری کرنے تو نہیں جا رہے۔“ جاگی نے کالا کٹسے سے نکالتے ہوئے جواب دیا ”ہمیں خشک کپڑوں کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے کپڑے دھو کر ڈال دیں گے۔ یہ سوکھ جائے گا تو ہم ان کے کپڑے اتار دیں گے۔“

اس نے دروازے کے دونوں پٹ مکمل کھول دیے۔ میں جاگی کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔ کافی بڑا کمر تھا جس میں آٹے سانے کی دیواروں کے ساتھ لکڑی کے دو تخت بنائے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ صرف ایک بیڈ پر دوڑی پھٹی ہوئی تھی۔ ایک میلا سا کتبہ بھی پڑا تھا۔ ایک دیوار کی کھونٹیوں پر پہلے سے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ جن کی ایک پتلون اور ایک اوپن شرٹ اور ایک ٹی شرت ایک میز کی چادر لٹکی ہوئی تھی۔

دائیں طرف ایک دروازہ تھا اور پچھلی طرف بائیں طرف کھڑکی کے قریب کچھ کر باہر جاسکتے تھے۔ مکان کے بائیں طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ایک ندی بہہ رہی تھی۔ وہاں چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ پانی بالکل

شفاف تھا۔ کھیتوں کو اس ندی سے پانی دیا جاتا تھا۔ میں پیچھے مڑا تو تھائی دوسرے دروازے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں بھی اس طرف پہنچ گیا۔ یہ ایک کشادہ اور لمبا سا کچن تھا۔ ایک طرف چوٹھانا ہوا تھا جس کے قریب ہی لکڑیوں کا جھڑکا ہوا تھا۔ لکڑی کے تختوں کے عارضی شافت بنے ہوئے تھے جن پر برتن اور کچھ ڈبے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ جاگی ان ڈبوں کی تلاش لینے لگی۔ بالآخر اسے دو ڈبوں میں چائے کی پتی اور چینی مل گئی۔ ایک طرف پانی سے بھری ہوئی بانٹی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایلو مینیم کی کیتلی بھی پڑی تھی جو دھوئیں سے بالکل سیاہ ہو رہی تھی۔ تھائی کیتلی دھونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چائے بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

بادرہی خانے کے عقب میں بھی ایک کھڑکی تھی جہاں سے وہ ندی اور اس کے پیچھے دور تک کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ میں چولہے کے سامنے بیٹھ کر اس میں لکڑیاں بھانے لگا۔ اس دوران میں تھائی نے کیتلی دھو کر اس میں چائے کے لیے پانی ڈال لیا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ہمارے پاس ماچس تو بھی نہیں آگ کیسے جلانی جائے گی۔ یہی بات میں نے تھائی سے کہی تو وہ مسکرا دی۔

”اس شاعت پر میں نے ایک ماچس بھی رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ اس لیے تو چائے بنانے کا خیال ذہن میں آیا تھا۔“ اس نے کہا۔

میں اٹھ کر شافت پر دیکھنے لگا۔ ماچس تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں چولہے میں آگ جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھائی نے کیتلی چولہے پر رکھ دی۔ آگ جلانے سے دھواں پھیلنا تو میری آنکھوں سے پانی..... بہنے لگا۔ میں اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور تھائی کو پکڑ کر بیٹھ کر آگ جلانے لگی۔ ہم یہ سب کچھ اس طرح اطمینان سے کر رہے تھے جیسے یہ اپنا ہی گھر ہو اور ہمیں کسی کی مداخلت یا پکڑے جانے کا کوئی خوف نہ ہو۔

میں شیشوں میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یقیناً یہاں کسی کی مستقل رہائش تھی۔ جو کسی کام سے قریبی بستی یا شہر کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ رات ہی کو گیا ہو اور اب آئے والا ہو۔

میری نظر اچانک ہی عقبی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی اور مجھے سینے میں ایسا سا سس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جاگی ندی کے قریب بے لباس کھڑی تھی۔ اس نے جسم سے آٹارے ہوئے کٹسے کپڑے ندی کے کنارے پر بیٹھ کر دیکھے تھے۔

دھو کر ڈال دوں۔ نما کر یہ چادر پیٹ لوں گا۔"

جاگتی نے وہ چادر پیٹ دے دی۔ وہ دونوں اٹھ کر باہر آکر دھوپ میں بیٹھ گئیں۔ میں چادر لے کر مکان کے پچھلی طرف چلا گیا۔ مذی کچھ آگے جا کر بائیں طرف کھیتوں میں مڑ گئی تھی۔ میں بھی اس طرف جا کر ایسی جگہ رک گیا جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

میری واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ میں نے چادر کو بھٹکھٹک کی طرح جسم پر پیٹ لیا تھا۔ دھوئے ہوئے کپڑے دھوپ میں پھیلا دیے۔ وہ دونوں مکان کے دروازے کے قریب دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جاگتی اب سیلے کی طرح نہیں کانپ رہی تھی۔ اس کا گریبان بھی اب ٹھلا ہوا نہیں تھا۔ کبکڑے کانٹے کی طرح سوئی جیسے ایک لمبے کانٹے سے گریبان بند کر دیا گیا تھا اور یہ کام غالباً تھائی نے کیا تھا۔ جاگتی نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

تھائی اٹھ کر اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد قبوہ گرم کر کے لے آئی۔ قبوے کا یہ دوسرا دور چل رہا تھا کہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر ہم تینوں اچھل پڑے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور قرب وجوار میں کوئی کتا دکھائی نہیں دیا تھا اور اب کسی کتے کے بھونکنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا تھا۔ یہ آواز دائیں طرف سے آ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی طرف دیکھنے لگا۔ دائیں طرف تقریباً سو گز دور درختوں کا جھنڈ تھا اور اس جھنڈ سے ذرا آگے ایک مرمل سا کتا کھڑا بھونک رہا تھا۔ اس کا رخ مکان کی طرف تھا۔ غور سے دیکھنے پر درختوں کے جھنڈ میں ایک خچر بھی نظر آ گیا۔ جس کے ساتھ ہی ایک ادھیر عمر آدمی بھی کھڑا تھا اور اس کے ساتھ غالباً کوئی عورت بھی تھی جو درختوں کی آڑ میں کھڑی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اس گھر کے مالک تھے جو واپس آ گئے تھے لیکن مکان کے سامنے پہلے ہوئے کپڑے دیکھ کر انہوں نے یہاں ہماری موجودگی کا اندازہ لگایا تھا اور وہ لوگ وہیں رک گئے تھے۔ کتے نے بھی کسی اجنبی کی موجودگی محسوس کر کے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

درختوں میں خچر کے قریب کھڑے ہوئے اس بوڑھے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مڑ کر درخت کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت سے کچھ کہا اور دوبارہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے تھائی اور جاگتی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں میرے قریب آ گئیں۔

"اس مکان کے مالک آ گئے ہیں اور غالباً کسی اور جگہ سے آ گئے نہیں آ رہے۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ذرا آگے جا کر انہیں بتاؤ کہ ہم چور نہیں ہیں۔ یہ انہیں کوئی خطرہ نہیں۔"

تھائی کے ساتھ جاگتی بھی اس طرف چلے گئیں۔ جگہ پر کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ بوڑھا کچھ حیرت ہو گیا تھا۔ تھائی اور جاگتی اپنی طرف آتے دیکھ کر کتا کچھ اور بھی زور سے بھونکنے لگا تھا۔ تھائی اور جاگتی دور ہی رک گئیں۔ تھائی اونچی آواز پر اس بوڑھے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ بوڑھے نے بھی کچھ جواب میں تھائی کچھ بولی۔ ان کے مذاکرات تقریباً تین منٹ تک جاری رہے۔ اس دوران میں کتے کی مداخلت بھی ہو رہی تھی۔ بالآخر بوڑھے نے پیچھے مڑ کر اس عورت سے کہا۔ وہ عورت درخت کی آڑ سے نکل کر سامنے آئی اور وہ دونوں درختوں کے جھنڈ سے نکل کر آگے آئے۔ عورت نے پتلون اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر ٹکڑے سے بٹا ہوا چوڑے جھمبے کا بیٹ تھا۔ جس کی نوک اور ڈبک ہوئی تھی۔ اس خطے کے کاشتکار عام طور پر اسی قسم کے بیٹ پہنتے تھے۔ بیٹ کا چھبھا آگے جو کھکا ہوا تھا جس سے اس کا بچہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے جسم کے اندر لگایا جاسکتا تھا کہ وہ جوان عورت تھی۔ بوڑھا آگے بڑھے ہوئے کتے کو بھی ڈانٹ رہا تھا۔

تھائی اور جاگتی کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔ تھائی اور اس بوڑھے میں ایک بار پھر مذاکرات شروع ہو گئے۔ بوڑھا خاصاً برہم نظر آ رہا تھا لیکن بالآخر تھائی اپنی باتوں سے اس کا غصہ سمجھنا کر دیا اور میری طرف اشارہ کر کے سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ قریب پانچ گھنٹے عورت جھمبے والا بیٹ سر سے اتار دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔

وہ بے حد حسین تھی اور میرے خیال میں اس کی تیس چوبیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور میرے اطلاع خاصی دلچسپ ثابت ہوئی کہ وہ اس بوڑھے کی بیٹی تھی۔ بوڑھے کی عمر پچپن سال سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں تھی۔

خچر پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ بوڑھا وہ سامان اتار دے ہوئے کچھ بوڑھا رہا تھا۔ وہ اب بھی ناراض تھا۔ اسے بتایا ہوا تھا کہ وہ اس کے پاس رہے گا۔ ہم نے نہ صرف ان کے مکان کا رخ کیا تھا بلکہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے کپڑے بھی اٹھائے۔

میرے وہ ساتھ والے کمرے میں کھوئی پرنگی ہوئی پیٹنٹ شرٹ بھی لے گئی تھی۔ یہ دونوں کپڑے بھی قریب ہی پڑے تھے۔ وہ پانی پی اترئی۔ ندی کا پانی اس کی سرنگ آ رہا تھا۔ اس نے پانی میں کھڑے کھڑے اپنے کپڑے دھو کر کنارے کے قریب گھاس پر اچھال دیے اور پانی میں بیٹھ گئی۔ غوط لگانے کے بعد وہ پانی سے ابھری تو پانی اس کے بدن سے آبشاروں کی طرح بہنے لگا۔

میرے دل کی دھڑکن خدایک حد تک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں کسی قدر مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو روکنا چاہتا تھا کہ میری بے قابو نظریں بار بار اس طرف اٹھ رہی تھیں۔ کبھی میں تھائی کی طرف بھی دیکھنے لگتا۔ یہ بھی خوف تھا کہ تھائی میری بے چوری نہ پکڑ لے۔

تھائی اور جاگی میرے لیے ابھی نہیں تھیں۔ تھائی تو کئی مرتبہ میرے سامنے بے لباس ہوئی تھی جب میں اس کے جسم پر کوزے اور پھریاں برسایا کرتا تھا۔ جاگی کو بھی کئی مرتبہ مختصر ترین لباس میں دیکھا تھا لیکن آج اسے اس طرح بے لباس پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

وہ ندی کے پانی میں بیٹھی تھی اور میں بے حس و حرکت کھڑا اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ میرا سانس بھی جیسے رک گیا تھا اور آنکھیں جیسے پلک جھپکنا بھول گئی تھیں اور پھر اچانک اپنے کان پر ہلکی سی گرفت محسوس کر کے میں اچھل پڑا۔

”بڑے بد تمیز ہو گئے ہو تم۔“ یہ تھائی کی آواز تھی جس نے میرے کان کو چنگی میں پکڑ رکھا تھا ”بری بات ہے اچھے بچے ایسی نازیبا حرکتیں نہیں کرتے۔ چلو۔ بیٹھو میرے پاس۔“

میری نظریں جھک گئیں اور چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ مارے ندامت کے میں کنا جا رہا تھا۔

”وہ۔ وہ تھائی۔ میں تو۔“ میں ہٹا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

”میں سمجھتی ہوں۔ تم تو بہت شریف آدمی ہو۔ محض اتفاق سے نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں۔“ تھائی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”تم میرے بغیر تقریباً ایک سال جاگی کے ساتھ رہے ہو۔ کیا۔“

”نہیں تھائی۔“ میں ایک دم تڑپ اٹھا ”تمہاری قسم۔ میں کبھی جاگی کے اتنا قریب نہیں گیا کہ۔“

”قسم تم کھاؤ۔ مجھے تم پر یقین ہے۔“ تھائی نے میری بات کاٹ دی اور پھر بچانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اپنا سر

تھائی کے سینے پر رکھ دیا۔ میرے اندر وہی احساس جاگا اور جب میں پہلے اسی طرح تھائی کے سینے پر رکھ کر رہا کرتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس جس میں مستی کی حد تک بھی انداز اور کسی عزیز ترین ہستی کی چاہت بھی۔

میری سسکیوں کی ہلک پالک تھائی نے ایک ہاتھ میرے پشت پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مجھے عجیب سا سکون محسوس ہونے لگا۔ کئی کئی کا پانی کھول کر چوٹے میں گرے لگا تو شوں کی آواز سن کر تھائی کے ساتھ میں بھی چوٹک گیا۔ میں تھائی سے اٹھ ہو کر بیٹھ گیا۔ تھائی نے کتیلی میں جتنی ڈال کر اسے چوٹے سے اتار دیا۔ بغیر دودھ کی چائے کے لے اٹھی اباں کا تھائی۔

میں شہت پر رہے ہوئے پلاسٹک کے کپ اٹھانے کے لیے کھڑا ہوا تو میری نظریں ایک بار پھر غیر ارادی طور پر کتیلی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس وقت تک جاگی نہ صرف ندی کے باہر آچکی تھی بلکہ اس نے کپڑے بھی پہن لیے تھے اور اپنے دھوئے ہوئے کپڑے اٹھائے واپس آ رہی تھی۔

میں اور تھائی کپ اور کتیلی لے کر کمرے میں آئے۔ جاگی اس وقت اپنے کپڑے مکان کے سامنے دھوپ میں گھاس پر پھیلا رہی تھی۔ تھائی نے تینوں کپڑوں میں قنواں لپیٹ دیا۔ جاگی اندر آئی تو اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور جاگی نے اس شرٹ کے نیچے کچھ بھی نہیں پہنا تھا۔

مسکراتی ہوئی میرے سامنے دوسرے تخت پر بیٹھ گئی۔

”اچھا ہوا نہیں یہاں چائے بنانے کا سامان مل گیا۔“ وہ تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں تو سردی سے غصہ رہی ہوں۔ ندی کا پانی بھی کئی بجت بہت ٹھنڈا ہے۔ مجھے داغی اس وقت چائے کی ضرورت تھی۔“

تھائی نے ایک کپ اٹھا کر جاگی کی طرف بڑھا دیا۔ واقعی سردی سے غصہ رہی تھی۔ میری نظریں اب پھر بار بار جاگی کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے انا تک اٹھا دیا۔ کمرے سے باہر آ کر دھوپ میں کھڑا ہو کر قنواں کی پکسل لینے لگا۔ میرے جسم پر بھی جھیکے ہوئے کپڑے تھے اور سونے مجھے بھی لگ رہی تھی۔

میں اپنی چائے ختم کر کے کمرے میں آ گیا۔ جاگی چادر اوڑھ رکھی تھی جو میں نے کھوئی پرنگی ہوئی بھی تھی۔

”تم باہر دھوپ میں بیٹھ جاؤ اور یہ چائے مجھے دے۔“ میں نے جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں بھی اپنے کپڑے

کے تھائی بدستور بوڑھے کے ساتھ آگے پیچھے چلتے ہیں اس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہم بڑے لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں مجبوراً جان کا تھوڑا بڑا تھا۔ ہم نے اجازت کے بغیر اس کے اپنے استعمال کیے تھے۔ چائے بھی بنائی تھی لیکن کوئی ایسا ٹھکانہ نہیں کیا تھا جس کا ازالہ نہ ہو سکے۔ ہماری وجہ سے جو گرفت ہوئی تھی ہم اس کا ازالہ کرنے کو تیار تھے۔

جاگی نے عقل مندی یہ کہ اس دوران میں ان بوڑھوں کے لیے قنواں بنالیا۔ وہ دونوں ایک لمبے سر سے آئے تھے اور انیس چائے کی ضرورت تھی۔ چائے کے دوران میں میں نے بھی ان کی باتوں میں مداخلت شروع کر دی اور جب میں نے باتوں ہی باتوں میں سردار تھالوب کا نام لیا تو بوڑھا ہلک گیا۔

”تم لوگ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے ہو۔ سردار تھالوب سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ وہ مجھے گھورنے لگا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے تھائی کی طرف دیکھا اور پھر تھائی اس بوڑھے کو بتانے لگی کہ سردار تھالوب سے نارایا تعلق ہے۔

”اوہ! بوڑھے نے ایک بار پھر چوٹک کر باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔“ تو تم لوگ وہی جو جن کی وجہ سے چینگ نامی میں خون خرابا ہوا تھا اور سردار تھالوب کے بھی کئی دلی داسے گئے تھے۔“

”خون خرابا ہماری وجہ سے نہیں ہوا تھا۔“ میں نے ہلکوی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ لگایا تھا کہ ہمارے بارے میں اس کے ذہن میں کس قسم کا شبہ تھا۔ وہ شاید یہی سمجھ رہا تھا کہ ایک سال پہلے چینگ نامی میں ہونے والے خون خرابے کے ذمے ہم لوگ تھے۔ ”بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔“ میں نے ان کا ذہن صاف کرنے کے لیے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ خون خرابے کی ذمہ داری ہم پر نہیں جزل کھوراث تھیں۔ ہمیں پر عائد ہوتی ہے جو تین غیر ملکیوں کی مدد سے یہاں اپنے آؤسے بنا رہے تھے۔ ہم ان تین غیر ملکیوں کا قتل کرتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ سردار تھالوب سے ان ملاقات چینگ نامی میں نہیں چینگ نامی میں ان کے دو بھائی ہم خیال تھا۔ تم جانتے ہو اس نے اپنے بھائیوں میں دوست کی کاشت ممنوع قرار دے رکھی ہے۔ یہی بیرونی کی پیداوار اس کے پھیلاؤ اور اس کے

استعمال کا شدید مخالف ہے۔ اس لیے وہ ہماری مدد کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے تمام آدمی میری مکان میں دے دیے تھے۔ بعد میں وہ خود بھی چینگ نامی گیا تھا۔ وہ جزل کھوراث کے آدمیوں کے خلاف ہمارے شانہ بشانہ لڑا ہے۔ اس میں خیر نہیں کہ اس جنگ میں اس کے بھی کئی آدمی مارے گئے لیکن ہم نے یہاں جزل کھوراث کے آدمیوں کے قدم نہیں مٹنے دیے۔ انہیں یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سردار تھالوب کی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

”لیکن تم لوگ اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔“ بوڑھے نے میرے خاموش ہونے پر کہا ”بعد میں اکیلے رہ جانے والے سردار تھالوب کو جو مشکلات پیش آئیں۔۔۔ اس کے بارے میں تم لوگ شاید کچھ نہیں جانتے۔“

”ہم بعد کی صورت حال کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے۔“ میں نے جواب دیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ذہین اور سمجھ دار آدمی ہے اور اپنے ارد گرد کے ماحول کی پوری خبر رکھتا ہے ”سب سے پہلے تو میں یہ واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ یہاں سے بھاگے نہیں تھے بلکہ جزل کھوراث کے ساتھیوں، ان تین غیر ملکیوں کا تعاقب کرتے ہوئے گولڈن ٹرائی ا سٹیل میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کا انتظام بھی سردار تھالوب نے کیا تھا اور ایک کتشی پر ہمیں رخصت بھی اسی نے کیا تھا۔ ہم اسے چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے لیکن اب تمہاری باتوں سے مجھے بڑی تشویش ہو گئی ہے۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ بعد میں بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ اب میں تم سے اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔“

”زیادہ تفصیل میں نہیں جانتا۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”لیکن اس جنگ کے ٹھوڑے ہی عرصے بعد سردار تھالوب پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ جن میں وہ بال بال بچتا رہا۔ قریبی پہاڑیوں سے راکٹ برس کر اس کے مکان کو تباہ کر دیا گیا۔ یہ سردار تھالوب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ حملہ ہونے سے صرف ایک گھنٹا پہلے اس مکان سے نکل گیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ حملہ کرنے والے کون لوگ تھے؟“

”میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اُن کی اُن کی خبر سن تھی کہ سردار تھالوب کے مکان کی تباہی اور اس پر ہونے والے قاتلانہ حملوں میں جزل کھوراث کے علاوہ یہاں کے کچھ سرکاری افسروں کا بھی ہاتھ تھا۔“

”اوہ! میں چوٹک گیا۔“ میرے ذہن میں ششہا لے

خلاف وہ سازش ابھر آئی جسے کھیلنے کی ذمہ داری مجھے مہراج نے سونپی تھی اور شمشاد کے ایک کزن رتنا کو سن نے مجھے بریف کیا تھا۔ اس سازش کے حوالے سے بھی چیاگک سامین میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ہنگامہ میں بھی وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ ہوئی تھی۔ اس سازش میں شریک حکومت کے کئی بڑے بڑے افسروں کو بھی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ سازش انہی دنوں ختم ہوگئی تھی لیکن اس بوڑھے کی باتوں سے انکشاف ہوا تھا کہ بعد میں بھی یہاں بڑے زبردست ہنگامے ہوتے رہے تھے۔ میں سردار تھالوب اور رگولی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کہاں تھے۔

”سردار تھالوب آج کل ہنگامہ میں ہے۔“ بوڑھے نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ ”سننے میں آیا تھا کہ اسے حکومت میں ایک اہم عہدے کی پیشکش کی گئی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا تھا لیکن اس کے بعد اس کی ہنگامہ آمدورفت بڑھ گئی ہے۔ وہ کئی کئی روز وہاں رہتا ہے۔ اب بھی تقریباً تین ہفتوں سے گیا ہوا ہے۔“

”اور اس کی دوست۔“ میں نے کہا ”میرا مطلب ہے اس کی ایک دوست رگولی بھی اس کے پاس رہ رہی تھی۔ وہ کہاں ہے؟“

”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”سردار تھالوب پر حملوں کے الزام میں کوئی پکڑا بھی گیا تھا یا نہیں!“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”کئی لوگ پکڑے گئے تھے لیکن وہ سب نچلے درجے کے کارندے تھے۔“ بوڑھے نے جواب دیا ”سردار تھالوب کے مکان پر پھاڑپوں سے راکٹ برسائے جانے کے بعد دیا کے ساتھ ساتھ فوج تعینات کر دی گئی تھی۔ اس طرح سرحد سیل کر دینے سے حملے بند ہو گئے مگر چھ ماہ بعد فوج ہٹائی گئی۔ اس کے بعد کوئی حملہ نہیں ہوا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر باری باری ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم لوگ اگر سردار تھالوب کے دوست اور ہم در ہو تو اتنا عرصہ کہاں غائب رہے۔ لوٹ کر اس کی خبر کیوں نہ لی۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”جنرل کھوراث کے ساتھی میری اس دوست کو اٹھا کر لے گئے تھے۔“ میں نے تھالی کی طرف اشارہ کیا ”اس کا نام تھالی ہے۔ چیاگک سامین میں ہونے والے ہنگاموں کے دوران میں ہی یہ ان کے قابو میں آگئی تھی اور جب ہمیں پتا چلا کہ وہ لوگ اسے لے کر گولڈن ٹرائی آچکے

کی طرف نکل گئے ہیں تو میں نے بھی ان کے پیچھے جانے کی فیصلہ کر لیا۔ سردار تھالوب بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ میں نے اسے روک دیا تاکہ وہ یہاں کے معاملات و سنبھال سکے۔ برحال میں اور جاگلی۔“ میں نے جاگلی کی طرف اشارہ کیا ”ایک رات کسی پر گولڈن ٹرائی آچکے تھے۔ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر گولڈن ٹرائی آچکے۔ پیش آنے والے واقعات اُسے مختصر طور پر بتائے۔ آخر میں کہہ رہا تھا ”ہم نے تھالی کو ان کے قبضے سے توجہ دلا لیکن اس عرصہ میں ہیروئن کے انجکشن دے دے کر اسے اودھ موار کر دیا گیا تھا۔ ہم دیا کے ہنگامہ میں گولڈن ٹرائی آچکے۔ برہا کی سرحد کی طرف فرار ہو گئے تھالی کی حالت بہت بری تھی اور ایک موقع پر یہ کوئے میں چلی گئی۔ ہم نے اسے مردہ سمجھ کر دیا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ ہمارے جاگلی برہا سے ہوتے ہوئے چین کی طرف نکل گئے تھے۔ اسی دوران میں ہم زندگی کے کن مراحل سے گزرے؟ اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ برحال، کچھ عرصہ ٹھانی ٹھیل میں گزارنے کے بعد واپس آئے ہوئے ہم نے غلطی برما کے بجائے لاؤس کی سرحد میں داخل ہو گئے اوب۔“

”ایک منٹ!“ بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا ”ابھی تم نے بتایا تھا کہ ہیروئن کے استعمال سے یہ اودھ موتی ہو چکی تھی اور تم لوگوں نے اسے مردہ سمجھ کر دیا میں پھینک دیا تھا لیکن یہ تو ہمارے سامنے زندہ موجود ہے اور اس کی صحت بھی غالباً ہم سب سے زیادہ اچھی اور تھالی رشک ہے۔“

”یہ تمہارے سامنے زندہ کس طرح موجود ہے؟“

ایک دلچسپ کہانی ہے اور اس کی تفصیل ہمیں تھالی خود بتائے گی۔“ میں نے کہتے ہوئے تھالی کی طرف اشارہ کیا۔ ہماری اس گفتگو کے دوران میں اب تک تھالی نے جان دخل اندازی کی تھی اور نہ ہی جاگلی نے بوڑھے کی جان اور حسین پوری بھی خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی اور کبھی چمک تشریش کے ساتھ لرانے لگتے۔ میں نے یہ بات بھی غامض، پرنوٹ کی تھی کہ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے اور پھر تھالی بتانے لگا۔ وہ زندہ کس طرح پئی تھی۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی سے باتیں سن رہے تھے۔ آخر میں تھالی کہہ رہی تھی۔

”ہاں منہ نے میری زندگی بچائی تھی۔“ وہ بتاتے ہوئے منہ اور غلام آدمی ہے اسے عورتوں کی بھی کئی نہیں

ہے۔ لے وہ ایک مختلف انسان ثابت ہوا۔ شرافت کا پیکر۔ میں نے مجھے کبھی چھوا تک نہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے مجھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ وہ پانچاگک میں خودباں کروں۔“

”اسی دوران میں۔۔۔ میرا ایک روز چیاگک ہی ہوئے۔“ میں نے ان سے سنا ہوا کیا۔ ”اس نے میری اور جاگلی کی طرف اشارہ کیا۔“ میرے ساتھ تان منہ تھا۔ اس کی وجہ سے میں ان کے لیے اس وقت بالکل اجنبی بن گئی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئی اور رات کے آخری پہر ہمارا پارا کر کے اس طرف آگئے۔ کتنا سکون مل رہا ہے مجھے۔ اپنے وطن کی سرزمین پر آنے کے بعد۔ لگتا ہے میں اپنی ماں کی تخت بھری آغوش میں آگئی ہوں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے اپنے وطن سے واقعی کتنی محبت تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی ”اگر اب بھی تمہیں ہماری باتوں کا یقین نہ آیا ہو تو میں مزید کچھ کمنا ضروری نہیں سمجھتی۔ ہم نے اپنے وطن کی سلامتی کے لیے جان کی بازی لگائی ہے۔ قدم قدم پر موت سے بچنے آنا ہی ہے بلکہ میں نے تو ایک طرح سے موت کا دھوکہ بھی کھاکا ہے۔ ہمیں کسی سے اپنی وفاداری کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے ہماری باتوں کا یقین کر لیا ہے تو کچھ عرصہ صبر دیکر۔“

”وہیں تھالی روہن!“ میں اس کا کندھا جھٹکتا ہوا لگا۔ ”میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہا ہوں۔“ بوڑھے نے تھالی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا ”مجھے تم دونوں پر شہوت تھا مگر اتنی تفصیل باتیں ہونے کے بعد اب کسی بھی لمحہ غائب نہیں رہی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر ”ہاں اصل پچھلے سال ان خونی ہنگاموں میں کچھ غیر ملکیوں کی شرکت سے ذکر رہا ہے۔ تم تو تھالی لینڈ ہی کی رہنے والی ہو۔ یہ دونوں چہرے مقامی نہیں ہیں اس لیے مجھے کچھ شبہ ہے۔“ اس نے میری اور جاگلی کی طرف اشارہ کیا ”اب بت صاف ہو چکی ہے اس لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔“

”اگر بات صاف ہو چکی ہے تو ہمارے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔“ تھالی نے کہا ”ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔“ تھالی کوہنہ کی کر بیٹ میں اور بھی ایٹھن ہونے لگی تھی۔

”اگر بات صاف ہو چکی ہے تو ہمارے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔“ تھالی نے کہا ”ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔“ تھالی کوہنہ کی کر بیٹ میں اور بھی ایٹھن ہونے لگی تھی۔

”اگر بات صاف ہو چکی ہے تو ہمارے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔“ تھالی نے کہا ”ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔“ تھالی کوہنہ کی کر بیٹ میں اور بھی ایٹھن ہونے لگی تھی۔

کے ہونٹوں پر بھی آسودہ سی مسکراہٹ آگئی۔

بوڑھے نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ اندھ کرچن میں چلی گئی۔ جہاں خچر سے اٹارنا جانے والا کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ بوڑھا تھالی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اس سے میرے اور جاگلی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

اس بوڑھے کا نام پوری رام اور بیوی کا نام مائے پانگ تھا۔ بوڑھے کا تعلق یزوفیلے سے تھا۔ یہ قبیلہ بھی صدیوں سے برہا کی سرحد پر آباد تھا۔ نام کی لوگ ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ بوڑھے کا خاندان کئی نسلوں سے یہاں آکر آباد ہو گیا تھا اور انہوں نے کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ اس کی بیوی مائے پانگ تھانگ ساگ کی رہنے والی تھی۔ یہ قبضہ یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ پوری رام کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کا مکان تھانگ ساگ میں بھی تھا جہاں وہ اکثر جاتا رہتا تھا۔ مائے پانگ اس کے ایک بہت غریب دوست کی بیٹی تھی۔ کثرت اولاد کی وجہ سے وہ خاصا پریشان تھا۔ دوست کی غریب ترس کھا کر پوری رام نے مائے پانگ سے شادی کر لی تھی۔ اس شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ پوری رام اپنی بیوی کے ساتھ بھی اس فارم ہاؤس میں رہتا اور کبھی ایک آدھ دن کے لیے تھانگ ساگ جلا جاتا۔ وہ گزشتہ روز دوپہر کے بعد تھانگ ساگ گئے تھے اور اب واپس آئے تھے۔

بوڑھے کی باتوں سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہم چیاگک سامین سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھے۔ یہاں سے چھ میل تھانگ ساگ تھا اور اس سے بارہ میل آگے چیاگک سامین اور یہاں اس بوڑھے کے پاس اس خچر کے سوا کوئی ساری نہیں تھی اور ظاہر ہے ایک خچر پر ہم قیڑوں سفر نہیں کر سکتے تھے۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد مائے پانگ نے ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا۔ چائے دودھ والی تھی۔ پاؤڈر کا دودھ یہ لوگ قبضے سے لے کر آئے تھے۔ گھر کا پانا ہوا ایک، موتی موتی روٹیاں اور کھانے پینے کی کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ یہ لوگ جب بھی تھانگ ساگ جاتے تھے اپنے لیے اس قسم کی کچھ نہ کچھ چیزیں لے آتے تھے۔

ان لوگوں کے آنے سے پہلے میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا کیونکہ اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ہمیں کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن پوری رام اور مائے پانگ کے آجانے اور ان سے باتوں کے بعد میری بے چینی ختم ہو گئی تھی۔

ہمارے کپڑے سوکھ چکے تھے۔ میں اپنے کپڑے اٹھا کر ایک کھیت میں گھس گیا اور کپڑے بدل کر واپس آگیا۔ وہ چادر میں نے شکر کے ساتھ بوری رام کو واپس کر دی۔ جاگتی اپنے کپڑے لے کر دور درختوں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ زحمت بھی اس نے بوری رام اور ماٹے پانگ کی موجودگی کی وجہ سے کی تھی اگر وہ دونوں نہ ہوتے تو جاگتی ڈھیل بن کر ہم دونوں کے سامنے ہی کپڑے بدل لیتی۔

اس وقت دوسرے ہونے والی تھی۔ جاگتی اور تھانی رواگٹی کے لیے پر تزلزل رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم تھانگ سانگ تک پیدل چلیں گے اور وہاں سے کسی سواری کا بندوبست کر کے چانگ سامین کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ان دونوں کے خیال میں اب چونکہ ہم اپنی سرزمین پر تھے اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں ان کے اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ پہلے بھی تو ہم اپنی ہی سرزمین پر تھے اور ہمیں سکھ کا سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ بوری رام سے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد چانگ سامین میں خاصے معرکے ہوئے تھے۔ سردار تھالوب کا گھیر پڑا کر دیا گیا تھا۔ اب اگرچہ وہ صورت حال نہیں رہی تھی مگر بوری رام کی باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چانگ سامین اور اس کے قرب و جوار میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہوں گے جن کا شمار ہمارے پرانے دشمنوں میں کیا جاسکتا ہو۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی سرگرم عمل ہو جائیں گے اور پھر سردار تھالوب بھی چانگ سامین میں موجود نہیں تھا۔ ہمیں کچھ دشواریاں پیش آسکتی تھیں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں سفر کرنے کے بجائے شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد یہاں سے روانہ ہوا جائے۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ بوری رام نے کہا ”اس وقت تک سواری کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مائے پانگ خچرے واپس چلی جائے اور تھانگ سانگ سے گاڑی لے آئے۔“ بوری رام نے کہا ”میں چونکہ چھوڑا گاڑی کی ان دونوں ضرورت نہیں ہوتی اس لیے میں اسے تھانگ سانگ والے مکان پر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ مائے پانگ اس میں یہی خچرہ چوت کر لے آئے گی۔“

تجویز مقبول تھی۔ جاگتی نے فوراً ہی ہاں میں ہاں ملا دی اور تھانی نے بھی تائید میں گردن ہلا دی۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی اور ویسے بھی ہمیں تھانگ سانگ تک پیدل سفر کرنے کے

بجائے کسی سواری کا بندوبست کیا جائے۔ آدھے گھنٹے بعد مائے پانگ خچرے سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس وقت دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ اس نے چوڑھے بجے والا بیٹ سر پر جھار کھا تھا۔ کتا بھی خچرے کے پیچھے چل رہا تھا۔

ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم بارہ درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔ بوری رام پہلے کچھ کمرے کے اندر اپنے کاموں میں مصروف رہا پھر اس نے قریب کے کھیتوں کا ایک چکر لگایا اور ہمارے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ہتھتی باڑی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں ہوتی تھیں۔ ان دونوں فصلوں کے پھل میں کچھ بنزیاں اگانے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

”ہم نے گزشتہ رات اس طرف سے دریا پار کیا تھا۔“ میں نے ایک طرف اشارہ کیا ”یہاں اور لوگوں کی بھی غیر قانونی آمد و رفت رہتی ہوگی۔“

”اکثر۔“ بوری رام نے جواب دیا ”لیکن غیر قانونی طور پر سرحد پار کنارے کے ساتھ ساتھ چٹانوں اور گھنے درختوں میں چھپ کر دور نکل جاتے ہیں۔ دیکھ لے جانے یا بچنے جانے کے خوف سے اس طرف یا کسی اور بستی کا مان نہیں کرتے۔“

”اور سرحدی محافظ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم لوگ آئے تھے تو کیا یہاں کچھ کے دوسری طرف سرحدی محافظوں نے تم لوگوں کو روکا تھا؟“ اس نے التلاش سے سوال کر ڈالا۔

”ہم تو انہیں رقم دے کر آئے تھے۔ ہمارے دریا پار کرنے کے لیے کشتی بھی انہوں نے ہی فراہم کی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔“ بوری رام نے جواب دیا ”یہ راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کام دونوں طرف کے محافظوں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو کرپشن کا شکار نہ ہو۔ ہر جگہ سب کچھ ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے گہرا سانس لیا۔

”کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر کرپشن ہی کے موضوع پر باتیں ہونے لگیں۔ بوری رام..... بظاہر ایک جاہل سیدھا سادہ کسان نظر آتا تھا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت سلجھا ہوا اور باخبر آدمی ہے۔ اسے سب

زیادہ کہ تو اس بات کا تھا کہ جن لوگوں کو کسی چیز کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے وہی اسے نقصان پہنچاتے ہیں۔ کرتے کرتے وہ اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ ایک مرتبہ اوپر اٹھ کر دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں بیٹے والے پس اور میں نے ابھی تک تم لوگوں کو کھانا نہیں کھلایا۔“

اس وقت واقعی ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ بوری رام نے وہی کھانا ہمارے سامنے چن دیا جو ہم صبح ناشتے میں کھا چکے تھے۔ کھانے کے بعد جاگتی اور تھانی ایک تخت پر لیٹ گئیں اور کچھ ہی دیر بعد ان کے خزانے سنائی دینے لگے۔ دونوں رات بھر کی جاگتی ہوئی تھیں اور مجھے حیرت تھی کہ اب تک کس طرح انہیں کھولے بیٹھی رہی تھیں۔ جلی میری آنکھوں میں بھی ہو رہی تھی لیکن میں ابھی تک برداشت کر رہا تھا۔

پانچ بجے کے قریب مائے پانگ پھنکے پر واپس آگئی۔ نیکڑ زالی کی طرح پھنکڑا تھا جس میں موٹر کے پیسے لگے ہوئے تھے اس گاڑی کو کھینچنے کے لیے گھوڑے کے بجائے خچرے ڈالیا جا رہا تھا۔

مائے پانگ اپنے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی لے کر آئی تھیں۔ وہ کمرے میں سنبھال کر رکھنے لگی۔ اس کی آواز سن کر تھانی اور جاگتی جاگ گئیں۔ مائے پانگ ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ میں باہر بوری رام کے ساتھ تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ مائے پانگ نے کمرے میں باپ دوڑھن کر دیا اور ہم سب کے لیے چائے بنانے لگی۔ اندھا پرور رام ہم تھا کہ چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ بوری رام نے ہمیں اس مکان کے اندر سے ملتا ہوا تھا جہاں ہمیں یہ خچر گاڑی چھوڑنی تھی۔

اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ہم رواگٹی کی تیار کر رہے تھے کہ فضا اچانک ہی فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ سنگل شاٹ نے آواز اس طرف سے آئی تھی جس طرف سے ہم دریا پار کرتے آئے تھے۔ ہم سب مرکز اس طرف دیکھنے لگے۔

”دو تین منٹ بعد ہمیں بہت دور ڈھلان پر دو سائے بن کر دکھائی دیے۔ ان دونوں نے سفید لباس پہن رکھے تھے جس وجہ سے وہ ہمیں نظر آگئے تھے۔ اگر لباس ہندو ہوتے تو اندھیرے میں دکھائی نہ دیتے۔“

”اب تم لوگوں کا جانا مناسب نہیں ہے۔“ بوری رام نے خچر گاڑی دیکھ کر انہیں شک ہو جانے کا گھر کوئی یہاں

سے گیا ہے۔ میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی ہے۔ اس لیے تم لوگ اس وقت تک یہاں رک جاؤ جب تک وہ لوگ کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔“

”یہ کیوں لوگ ہو سکتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”تان منہ۔“ تھانی کے منہ سے بے اختیار نکلا ”اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر میں کبھی اسے چھوڑ کر گئی تو وہ دنیا کے آخری سرے تک میرا پیچھا کرے گا۔ ہو سکتا ہے اس نے پتا چلایا ہو کہ میں تم لوگوں کے ساتھ بھاگی ہوں۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ میں نے تھانی کو گھورا ”اسے کیا پتا کہ ہم سرحد پار کر کے کس طرف گئے ہوں گے۔“

”میں ایک سال اس کے ساتھ رہی ہوں اور اسے اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ میری تلاش میں تھانی لینڈ کا چننا چننا چننا مارے گا۔“ تھانی نے کہا۔

تھانی کی بات میں کچھ وزن تھا۔ عین ممکن ہے تان منہ ہی اس کی تلاش میں آیا ہو لیکن وہ گولی کیوں چلائی تھی۔ ”تم لوگ اوپر چھت پر چلے جاؤ۔“ بوری رام نے کہا ”ادھر پچھلی طرف اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ چھت پر چڑھنے میں آسانی رہے گی۔ میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔“

ہم فوراً ہی مکان کے پچھلی طرف آگئے۔ جہاں دیوار کے ساتھ اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے اور بوری رام نے پہلے تھانی اور جاگتی کو اوپر چڑھنے میں مدد دی پھر میں بھی اوپر آگیا۔ بوری رام نے ڈھیر سے کچھ اینٹیں گرا دیں اور سامنے کی طرف چلا گیا۔

چھت کے کنارے پر تقریباً دو فٹ اونچی منڈر تھی۔ ہم سینے کے بل لیٹ کر منڈر کے دو سرے طرف دیکھنے لگے۔ وہ دو ہی آدمی تھے جو کھیتوں میں چلے ہوئے مکان کی طرف ہی آرہے تھے۔ انہیں مکان تک پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بوری رام اس وقت کمرے سے باہر آگیا اور جب ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے اونچی آواز میں بوری رام سے کچھ پوچھا تو تھانی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ دیکھ۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں ذرا سانس اٹھ کر دیکھنے لگا۔

کمرے میں لیٹ جھل رہا تھا اور کھلے ہوئے دروازے سے مدھم سی روشنی باہر بھی آ رہی تھی اور اس مدھم سی روشنی میں دونوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ تھانی نے آواز سے ٹھیک پچھنا تھا۔ میں نے تان منہ کو صرف ایک

مرتبہ ہوئے سائی میں تھائی کے ساتھ دیکھا تھا اور اس وقت اسے بچانے میں مجھے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔ بوری رام ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا اور وہ تان منہ کے سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ کل رات اگر کسی نے دریا پار کیا تھا تو وہ کس طرف گیا۔ ویسے کل رات میں یہاں تھا بھی نہیں۔ تھاگ ساگک گیا ہوا تھا۔ آج صبح ہی واپس آیا ہوں۔“

”ایک آدمی دو عورتیں۔“ تان منہ نے کہا ”انہوں نے یہیں سے دریا پار کیا تھا۔ سب سے پہلے تمہارا ہی فارم ہاؤس آتا ہے۔ تم نے یقیناً انہیں دیکھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں آئے بھی ہوں اور تم نے انہیں پناہ دی ہو۔ اس لیے بتا دو کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟“

”میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ بوری رام نے جواب دیا ”میں نے کہا تھا کہ کل رات میں یہاں نہیں تھا۔“

”تم یہ مت سمجھو کہ میں چوری چھپے سرحد پار کر کے آیا ہوں تو یہاں چھپ کر رہوں گا اگر وہ عورت مجھے نہ ملی تو میں اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ اس لیے مجھے بتا دو کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ تم زندگی بھر ان زمینوں پر مل چلانے کے بعد بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔“

”میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ بوری رام نے جواب دیا۔

”تورانہ۔“ تان منہ نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تم مکان کی تلاش لو۔ مجھے یقین ہے وہ یہاں ضرور ٹھہرے ہوں گے ہو سکتا ہے ان کا کوئی سراغ مل جائے۔“

دوسرا آدمی تورانا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے صرف ایک منٹ بعد کمرے سے مائے بائگ کی ہلکی سی چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تورانا اسے بازو سے پکڑے کھینچتا ہوا بارے آیا۔

”یہ عورت اندر ایک کونے میں چھپی ہوئی تھی۔“ تورانا نے تان منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے یہ کچھ بتا سکے۔“

”کون ہے یہ؟“ تان منہ نے بوری رام سے پوچھا۔

”میری بیوی ہے۔“ بوری رام نے جواب دیا ”یہ بھی

میرے ساتھ گاؤں گئی ہوئی تھی۔ ہم آج صبح ہی آئے ہیں۔ یہ بھی کچھ نہیں جانتی۔“

”چار منگ۔“ تان منہ ”مائے بائگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”بہت حسین ہے۔ تم بھی اسے اس طرح پار کرتے ہو گے جس طرح میں اس عورت کو پار کرنا چاہتا ہوں۔“

مجھے دھوکا دے کر بھاگ آئی ہے۔ تمہاری یہ خوب صورت بیوی بتائے گی کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے یا نہیں اور اگر آئے تھے تو کہاں گئے۔“ اس نے سرگوشی میں تورانا سے کچھ کاہل خود تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

تورانہ ان دونوں کو پستول کی زد پر لے لے کھڑا کمرے میں خیال میں اب حیل شروع ہونے والا تھا۔ یہ لوگ ہمارے بارے میں پوچھنے کے لیے مائے بائگ کے ساتھ زیادتی کریں گے اور ظاہر ہے میں اپنے آپ کو اس معاملے سے اٹک نہیں رکھ سکوں گا لیکن۔ ابھی میری مداخلت کا وقت نہیں آیا تھا۔

تان منہ تقریباً پانچ منٹ بعد کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ غصے میں لال سمجھو کا ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنانہ پنڈ بیک تھا جسے دیکھ کر میرے منہ سے کمرے میں نکل گیا۔ وہ تھائی کا پنڈ بیک تھا۔

”یہ پنڈ بیک۔“ تان منہ بیک بوری رام کے چہرے کے سامنے پچھاتے ہوئے غرایا ”اسی عورت کا ہے۔ تمہارے فارم ہاؤس میں اس بیک کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے اور ممکن ہے اب بھی یہاں موجود ہوں اور ہمیں آتے دیکھ کر تم نے انہیں کہیں چھپا دیا ہو۔ بتاؤ کہاں ہیں؟“

”یہ بیک میری بیوی کا ہے۔ میں کسی اور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ بوری رام نے جواب دیا۔

تان منہ چند لمبے خوں خوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بیک بوزے زور سے بوری رام کے منہ پر مار دیا۔ بوری رام کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ لوکڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم زیادتی کر رہے ہو۔“ وہ تان منہ کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا ”ایک تو تم غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے اور اوپر سے ہمیں ہراساں کر رہے ہو۔ میں اتنا تیز نہ کھڑا کر دوں گا۔“

”تمہاریز کو اطلاع ہو تو تم اس وقت دو گے جب اپنے پیروں پر چلنے کے قابل رہو گے۔“ تان منہ نے کہا ”اب بھی تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تمہارے کمرے

اس بیک کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ ہو سکتا ہے تم نے انہیں کہیں چھپا دیا ہو۔ ان کے منہ میں بتا دو تو میں انہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ بصورتِ بُرائی یہ خوب صورت بیوی ہے۔“ اس نے خاموش ہو کر بیک کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”خود توں کی عمر میں کم از کم تیس سال کا فرق لگتا ہے۔ نہ ہی عمر پتہ چلتی ہے کہ تم اندر سے کھوٹے ہو چکے ہو اور یہ بت شاید اس بے چاری کا کچھ نہیں بگاڑ سکے لیکن ہم ناچاوش کر سکتے ہیں۔“

”میں۔“ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ بوری رام چیخا تھا۔

”مگر تم ان لوگوں کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہاری بیوی کو کچھ بھی نہیں لگا سکتے گے۔“ تان منہ نے جواب دیا۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ بوری رام نے اس بار بھی چیخ کر جواب دیا۔

”لیکن یہ جانتی ہے اور ہمیں بتا بھی دے گی۔“ تان منہ ”مائے بائگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔“ کیا خیال ہے۔ ہمارے شوہر کو تو تمہاری عزت اور جان کا کچھ خیال نہیں۔ اگر تم اپنی عزت بچانا چاہتی ہو تو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ مائے بائگ نے خوف زدہ ہونے کے باوجود محسوس کیے میں جواب دیا ”یہ بیک میرا ہے اور یہاں کوئی آدمی نہیں آیا۔“

”تورانہ۔ یہ پستول مجھے دو اور اسے بتاؤ کہ اس جیسی نینکی زبان ہم کس طرح کھلاتے ہیں۔“

تورانہ نے پستول تان منہ کے حوالے کر دیا اور اچانک نائے بائگ پر جھپٹ پڑا۔ مائے بائگ چیخنے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی کھینچا تانی میں اس کی منٹ چاک ہو گئی۔ وہ جدوجہد کرتی رہی۔ قمیص اس کے جسم سے الگ ہو کر تورانا کے ہاتھ میں آگئی۔ تورانا نے قمیص بھینچ دی اور لپک کر مائے بائگ کو رو پکڑ لیا۔

اس موقع پر بوری رام نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر تان منہ نے اس کے پیروں کے قریب گولی چلا دی۔ اس نے ساتھ ہی وہ جھپٹ کر اس کی طرف غرایا۔

”اپنی جلد پر کھڑے رہو۔ اگر حرکت کی تو دوسری گولی میری چھڑی اڑا دے گی۔ ویسے تمہارے پاس اب بھی میرا خنجر ہے اس کی عزت بچا سکتے ہو۔“

تان منہ نے اس کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہتھیلی پھیل کر اس کے چہرے پر وار کیا۔ یہ ضرب گھونٹے سے بھی زیادہ

قابل تھا۔ یہ قابل مہمان نوازی کی روایات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہم اگرچہ ان کی عدم موجودگی میں تالا توڑ کر ان کے گھر میں گئے تھے مگر بعد میں اس نے بہر حال ہمیں اپنا مہمان تسلیم کر لیا تھا اور یہ لوگ مہمان کی عزت و سلامتی کے لیے اپنی عزت اور جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ توئی سلامتی کا معاملہ بھی تھا۔ صبح کی باتوں سے اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم لوگ بھی اس وطن کی سلامتی کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر لے پھر رہے تھے اس لیے ان دونوں مہمان بیوی نے ہمارے بارے میں اپنی زبانیں بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اب میں بھی خاموش نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔

”ہاں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ لوگ یہاں آئے تھے۔“ بوری رام نے چیخنے ہوئے کہا ”لیکن تمہیں نہیں بتاؤں گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ ہم نے انہیں چھپا رکھا ہے لیکن تم ہماری زبان نہیں کھلوا سکو گے اور تم بھی یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔“

میں نے مڑ کر تھائی اور چائکی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور منڈ پر چڑھ کر چھلانگ لگانے کے لیے پر تزلزل رہا تھا کہ بوری رام نے پستول کی پروا کے بغیر تورانا کی طرف چھلانگ لگا دی جس نے مائے بائگ کو رو پکڑ رکھا تھا۔ اسی لمحے فضا فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ تان منہ کی چلائی ہوئی گولی بوری رام کی ٹانگ پر لگی اور وہ چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ تان منہ نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

”اب تم زبان کھولو گے۔“ وہ غرایا ”تورانہ۔ چروالواس عورت کو۔ اسے بتا دو کہ ہم کسی کی زبان کس طرح کھلاتے ہیں۔“

میں نے منڈ پر پھر سے چھلانگ لگا دی۔ کمرے کی پچھت تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے اوپر دو فٹ کی منڈ پر تھی۔ میں تقریباً چوہ فٹ کی بلندی سے تان منہ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر گرا۔ اگر تان منہ عین وقت پر اپنی جگہ سے نہ ہٹ جاتا تو میں اس کے اوپر ہی گرتا۔

اپنے عقب میں دھب کی زوردار آواز سن کر تان منہ اچھل کر میری طرف ٹھوم گیا لیکن میں نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع دینے بغیر پھر زوردار ٹھوکر اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ پستول اس کے ہاتھ سے پھوٹ کر دوڑ جا کر۔ تان منہ اس اچانک افتاد سے بدحواس ہو گیا۔ میں نے اس کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہتھیلی پھیل کر اس کے چہرے پر وار کیا۔ یہ ضرب گھونٹے سے بھی زیادہ



شعید ثابت ہوئی۔ وہ بلبلاتا ہوا دوہرا ہو گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے ایک زوردار لگ بھی لگا دی۔ وہ ایک بار پھر جیتا ہوا بائیں طرف الٹ گیا۔  
تورانے نے اب بھی مائے پانگ کو دو بچ رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف چلا لگا لگا دی۔ میری نگر سے وہ مائے پانگ کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

تان منہ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں تھا اور اس میں اتنا حصول بھی نہیں تھا لیکن تورانا دروازہ قامت اور ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اس کی عمر بھی تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس سے مجھے مقابلے کی توقع تھی۔

تورانے گرتے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ میری زوردار سائیکل اس کے کولے پر لگی۔ وہ... لاکھایا مگر سنبھل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر مجھ پر حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے مائے پانگ کی طرف چلا لگا لگا دی اور اسے گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مائے پانگ کو گرفت میں لے کر مجھے مزید کارروائی سے روکنے کی کوشش کرے گا لیکن مائے پانگ کی مزاحمت کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ مزید برآں میں نے بھی اس پر چلا لگا لگا دی تھی۔

میں تورانا کو رکھتا ہوا دور تک لے گیا۔ مائے پانگ اپنے آپ کو چھڑا کر الگ ہو گئی تھی۔ پوری رام زخمی ہونے کے باوجود تان منہ سے پٹ گیا تھا۔ تان منہ دولت سے کھینچنے والا آدمی تھا۔ عیاشیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ لڑائی بھڑائی سے تو وہ بالکل واقف نہیں تھا۔ اس کے برعکس پوری رام کی عمر بھی اگرچہ پچاس سے اوپر تھی مگر وہ کسان تھا۔ دھرتی کا سینہ چیرنے والا۔ اس میں اب بھی بہت دم ختم تھا۔ وہ تان منہ کو بری طرح رگید رہا تھا اور تان منہ کے منہ سے گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔ دوسری طرف پوری رام کے کتے نے بھی بھوک بھوک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لکٹا تھا جیسے اس کتے اور تان منہ میں زور دار قسم کی گالیوں کا تبادلہ ہو رہا ہو۔

میں تورانا کو رکھ رہا تھا۔ ایک موقع پر تورانا کا داؤ چل گیا۔ وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے میرے گلے کو گرفت میں لے لیا تھا اور دونوں انگلی میرے نر خترے پر دباؤ ڈال رہی تھی۔

اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے مائے پانگ کی طرف دیکھا۔ اس نے لپک کر وہ پھٹل انگوٹھی شروع میں تان منہ کے ہاتھ سے نکل کر دو اڑنے کے قریب جا کر اٹھا۔

تھائی اور جاگی چھت پر کھڑی بیچ رہی تھیں۔ وہ شاید نیچے نہیں اتر پاری تھیں کیونکہ ہمارے چھت پر چڑھنے کے بعد پوری رام نے دیوار کے قریب ڈھیر سے ہمت کی انڈی بنا دی تھیں مگر مجھے تورانا کی گرفت میں دیکھ کر ان دونوں نے بیک وقت چھت سے چلا ننگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی نئے جاگی کی بیچ بھی سنائی دی تھی۔

مائے پانگ پھٹل اٹھا کر ہماری طرف لپکی۔ اس نے پھٹل کے دستے کی زوردار ضرب تورانا کے سر پر لگائی تو وہ کراہتا ہوا ایک طرف الٹ گیا۔ اس کی گرفت سے تان منہ میں ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس سے پہلے کہ میں تورانا کی طرف بڑھتا مائے پانگ پھٹل سیدھا کر کے بے درے زبردستی چلی گئی۔ تورانا کی صرف ایک بیچ سنائی دی تھی۔ گلیوں اس کے جسم میں پیوست ہوئی رہیں اور وہ سرنگ لکی کی طرح زمین پر لوٹا رہا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر مائے پانگ کے ہاتھ پھٹل لے لیا۔ اس کے چہرے پر بخون کی سی کیفیت تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے پھٹل لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا کندھا پھٹپھٹانے لگا اور پھر چاکل بنی وہ مجھ سے ہٹ گئی۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ تھائی دو ڈکیر میرے قریب آئی۔ میں نے مائے پانگ کو اس کے حوالے کیا اور دو ڈکیر پوری رام اور تان منہ کے قریب پہنچ گیا۔ پوری رام اگرچہ تان منہ کو چھوڑ کر الگ ہو گیا تھا مگر تان منہ پست کے بل بے حس و حرکت اپنا منہ پڑا تھا۔

جاگی اسی جگہ پڑی کراہ رہی تھی جس جگہ وہ چھت سے گری تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بائیں چہرہ چھڑا رکھا۔ میں دو ڈکیر اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے سارا منہ اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار کی بیچ اٹھی۔ اس کے منہ میں موج آنی تھی اور وہ اس پر دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی۔ میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور کمرے میں لے جا کر رکھ دیا۔ تھائی مائے پانگ کو اپنے ساتھ لپٹا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مائے پانگ کو پکڑ کر اپنے ساتھ خست رہ گیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو تھائی بھی میرے پیچھے آئی۔ پوری رام نے ایک بار پھر تان منہ کو دو بچ رکھا۔

نہ نے آگے بڑھ کر پوری رام کو کھینچ کر الگ کر دیا اور تان منہ پھٹل تان لیا۔  
"تم نے کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔  
"جیسے ساجھی کا انجام دیکھ چکے ہو۔ اگر تم نے کوئی ہوشیاری بھاننے کی کوشش کی تو تمہارا انجام اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔"

اس کی حالت دیکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ہی گوبڑے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے آدمی کا انجام دیکھ کر اس کی ساری طراری ختم ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر لوٹا ہو گیا۔

"تھائی وانگ۔" وہ تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
اس کی آواز میں یکساںیت تھی "میں نے تمہارے ساتھ بھائی کی اور تم نے مجھے اس طرح دھوکا دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم۔"

"تم نے میری زندگی بچائی تھی۔ میں اس کے لیے تمہاری احسان مند ہوں لیکن کسی پر احسان کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے بدلے کی توقع رکھی جائے۔ مجھے زندہ باکر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال تمہاری بھائی ہے کہ تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔"

دونوں لوگوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "میں تمہارا دوست ہوں۔ یہ دوست ہوئے سانی میں نظر آگئے تھے۔ میں اگر تمہیں ان سے متعارف کروا دیتی تو تم جیتا نہیں پکڑا دیتے یا ختم کروا دیتے۔ اس لیے میں نے تمہارے سامنے انہیں پہچانے ہی سے انکار کر دیا تھا لیکن میں نے بغیر طور پر یہ معلوم کر لیا تھا کہ یہ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور پھر میں اسی رات ان کے پاس پہنچ گئی۔ یہ رات ہی کو وہاں سے روانگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں ان کے ساتھ آئی۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے نشان پر بیٹھے ہوئے پوری رام کی طرف دیکھا پھر دوبارہ تان منہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم نے ان بے کناہوں پر زبردستی اسے نہایت ذالت کا ثبوت دیا ہے۔ تورانا کو تو اس سے کیے کی سزا ملنی تھی۔ تمہارے لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ میں نے اسے جا کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ تم اپنے ملک میں ضرور معزز ہو گے مگر یہاں تمہارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ تم اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجائے۔ وہ تو میرے لیے ہے۔ اب تم خود ہمارے رحم و کرم پر ہو۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی اور چند لمحوں بعد بات بدل کر کہنے لگی "میں احسان فراموش نہیں ہوں۔"

تم نے میری زندگی بچائی تھی۔ تمہارا یہ احسان میں زندگی کی آخری لمحوں تک یاد رکھوں گی اور اس وقت میں اپنے کندھوں پر تمہارے احسان کا کچھ بوجھ اس طرح ہکا بکسکتی ہوں کہ تمہیں یہاں سے زندہ سلامت نکل جانے کا موقع دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ جس کشتی پر آئے تھے دیر کے ساحل پر کسی جگہ چھپا رکھی ہوگی۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہم تمہیں صرف دو گھنٹوں کا وقت دے سکتے ہیں۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد سرحد کے اس طرف دکھائی دیے تو وہ تمہاری زندگی کا آخری وقت ہوگا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"تھائی۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔" تھائی نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا "تم مجھ سے شادی کے لیے میرا فیصلہ سننا چاہتے تھے۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اب تم بھاگ لو یہاں سے۔"

اس موقع پر پوری رام نے مداخلت کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک دیا۔ اس کے خیال میں تان منہ کو اس طرح چھوڑنے کے بجائے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا لیکن میں نے اسے خاموش کر دیا۔

تان منہ کچھ دیر کھڑا تھائی کی طرف دیکھتا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ سڑھری تھی اور پھر وہ مڑ کر کھیتوں میں گھنڈی پڑ چلنے لگا۔ کتے نے بھونکنے ہوئے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر پوری رام نے اسے ڈانٹ کر دوسری طرف بھاگ دیا۔

بہر دور تک وہیں کھڑے تان منہ کو کھیتوں میں جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور جب وہ دور پہنچ کر لگا ہوں سے اوچھل ہو گیا تو ہم بھی کمرے میں آگئے۔ میں جھک کر پوری رام کی ناک کو دیکھنے لگا۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چھیل گئی تھی۔ بہت معمولی سا خون رس رہا تھا۔ میں نے چادر کی ایک کپڑی چھاڑ کر اس کے زخم پر باندھ دی اور جاگی کا پیر دیکھنے لگا۔ کتے کے آس پاس سو جن بڑھ رہی تھیں۔ چھت سے چلا لگا لگاتے ہوئے زمین پر اس کا پیر سیدھا نہیں پڑا تھا جس سے ٹکٹا مڑ گیا تھا۔ مائے پانگ اس کے ساتھ پہلی بیٹھی تھی۔ خود تکلیف میں ہونے کے باوجود جاگی نے ایک ہاتھ سے اسے اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔ مائے کی شرٹ تو پھٹ گئی تھی۔ مائے پانگ کا جسم اب بھی بولے بولے کانپ رہا تھا۔ جنوں کی کیفیت میں اس کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا تھا اور یہ غالباً اس خوف کا نتیجہ تھا۔

میں جاگنے کے پیر کو نکل کر دیکھنے لگا۔ مارشل آرٹ کی تربیت کے دوران میں میرے ساتھ بھی اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میرے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسی کچھ ہوتا رہا تھا اور میں نے بھی کچھ لیا تھا کہ اکھڑے ہوئے جو دس طرح اٹھائے جاتے ہیں۔

نچنے کے آس پاس ہلکا سا پاؤ ڈالنے سے جاگنی کراہنے لگی۔ میں اس کے کراہنے کی پروا کے بغیر نچنے کے آس پاس پیر کو نکلنا رہا اور پھر ہلکا سا جھکا دیا۔ ٹکڑک کی بلکی سی آواز کے ساتھ ہی جاگنی کے منہ سے جھج نکلی مگر میں نے اس کا پیر نہیں چھوڑا۔ بوری رام بھی شاید ایسی چیزوں سے واقف تھا۔ وہ لپک کر چپکن سے سروس کے تیل کی بوتل اٹھایا اور خود ہی جاگنی کے پیر پر مالش کرنے لگا۔ جاگنی کراہتے ہوئے پھل رہی بھی مگر میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ بوری رام نے چادر کا ایک لمبا ٹکڑا بچاڑ کر جاگنی کے پیر پر پٹی باندھ دی۔

تھائی اور مائے پانگ سامنے والے تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔ تھائی نے اسے اپنی آغوش میں اوندھالنا رکھا تھا اور آہستہ آہستہ اس کا کندھا چھینچھا رہی تھی۔ ”تم نے اسے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔“ بوری رام تھائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اسے تو باندھ کر پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔“

”یہ درست ہے کہ وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا تھا۔ ہم اسے قانون کے حوالے کر دیتے تو اسے سزا بھی ہوسکتی تھی مگر تم نے شاید تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔

”دوسرا رخ۔ کیا مطلب؟“ بوری رام نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”تصویر کا دوسرا رخ اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔“ میں نے کہا ”تمہاری بیوی کے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا ہے۔ اگر ہم تان منہ کو لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیتے تو وہ اپنے آدمی کی ہلاکت کا رونا روتا اور اس طرح مائے پانگ بھی قانون کی گرفت میں آجاتی اور تم بھی اس چکر میں پھنس جاتے۔“

”لیکن وہ قانون کا مجرم تھا۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا تھا۔“ بوری رام نے کہا۔

”بلاشبہ وہ مجرم تھا مگر سزا دینے کا حق صرف عدالت کو ہے۔ کسی اور کو قانون ہاتھ میں لینے اور اپنے طور پر فیصلے کرنے کی اجازت نہیں۔“ میں نے کہا۔

بات بوری رام کی سمجھ میں آگئی۔

”اس نے مائے پانگ کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی تو پین ٹی تھی۔ مائے نے اسے سزا دے دی۔ اگرچہ اس نے یہ قدم نہایت اشتعال میں اٹھایا تھا۔ اس صورت میں اس کے ساتھ کچھ قانونی رعایت ہو سکتی ہے مگر سزا سے بہر حال وہ پھر بھی نہ بچ سکتی اور تم جانتے ہو جب کوئی قانون کے چکر میں پھنستا ہے تو اسے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تم دونوں کو ان مصائب سے بچانے کے لیے ہی ہم نے تان منہ کو جانے دیا تھا۔“

”اگر وہ واپس جانے کے بجائے اپنے آدمی کے قتل کی اطلاع دینے کے لیے پولیس کے پاس چلا گیا تو؟“ بوری رام نے کہا۔

”وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔“ مجھ سے پہلے تھائی بول پڑی ”وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا ہے۔ اپنے ملک میں وہ کتنا ہی بارسوخ تھی، یہاں اس کی حیثیت ایک مجرم کی ہوگی۔ پولیس قتل کے بارے میں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر دے گی۔ میں بوری رام وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اس نے تو اپنی جان کاٹا جانے پر شکر ادا کیا ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ کہیں رگے بغیر چلتا ہوا اب تک دیا رہا ہے۔“

”باہر جو لاش پڑی ہے اس کا کیا کرنا ہے؟“ جاگنی نے ہماری باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنے آپ کو قدرے پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

”ظاہر ہے اسے اس طرح نہیں چھوڑا جاسکے۔“ میں نے کہا ”اسے مکان سے کیس دور لے جا کر دفن کرنا ہو گا کہ بعد میں بھی اس کا سراغ نہ لگایا جاسکے۔“

تھوڑی دیر بعد میں اور بوری رام باہر آگئے۔ بوری رام دو بھڑوڑے بھی لے آیا تھا۔ وہ لشکر اکر چل رہا تھا۔ مکان کے پیچھے کافی دور جا کر ایک مناسب جگہ پر ہم گڑھا کھودنے لگے۔ زمین نرم تھی اس لیے پانچ چھ فٹ گڑھا کھودنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گڑھا کھودنے کے بعد میں لاش کو گھسیٹنا ہوا وہاں تک لے آیا۔

تو رات کی لاش دفن کرنے کے بعد ہم نے واپس جہان جگہ کی مٹی کھود کر برابر کر دی جہاں تو رات کا قتل ہوا تھا اور ان کا خون پھیلنا ہوا تھا۔

مٹی کی دیوار بعد چائے بنا کر لے آئی۔ اس وقت ہم سب چائے کی طلب محسوس کر رہے تھے۔ چائے پینے کے لیے ہم پورگرام بھی بناتے رہے۔ اب بوری رام اور پانگ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھے۔ مائے پانگ صبح خوف زدہ تھی۔ اس نے نوکہ دیا تھا کہ اب وہ کئی روز یہاں واپس نہیں آئے گی۔ بوری رام کو زخم کے زخموں کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے یہاں وہ اپنا علاج نہیں کر سکتا تھا۔

چائے پینے کے بعد میں اور بوری رام باہر آگئے۔ فخر بنی تیار کرنے میں، میں بھی اس کی مدد کرنے لگا اور پھر۔ نوکوں سے جو چیزیں لائے تھے، وہ بھی گاڑی میں ڈال دی۔ پھر تھائی اور مائے نوخوسہ گاڑی پر سوار ہو گئیں البتہ نوکے کو دھکیں اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ مائے نے عقل مندی یہ بھی کر دیا کہ جب وہ تھانگ ساگ گئی تھی تو واپسی پر ایک گئی لے آئی تھی اور اس وقت دروازے پر وہی مالا لگایا تھا۔

میں بوری رام کے ساتھ اگلے حصے پر بیٹھ گیا تھا۔ لگام لہرام کے ہاتھ میں تھی۔ سرو کی وجہ سے اب اس کے لمبے پٹلی کی ٹکلیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔

ناری میں کھیتوں میں چھ میل کا یہ فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ ٹھہرتی ہی سست رفتار تھا۔ ویسے بھی مجھے کی وجہ سے گاڑی بار بار راستے سے اتر کر کچے میں گرنے لگی تھی۔ نئے لگانے کے لیے مجھے ہی بیچنے اتر کر زور دینا پڑا تھا۔

تھانگ ساگ خاصا بڑا قصبہ تھا۔ اس وقت رات کے پانچ بجے تھے لیکن قصبے میں ابھی روشن تھی۔ بوری رام کو قصبے کے بیرونی علاقے میں مختلف کشادہ مڑوں پر لے آیا۔ ایک مکان کے بہت بڑے پھانک کے سامنے۔ یہاں اس نے بیچنے اتر کر آہنی چادر والے گیٹ کو زور دیا۔

چند منٹ بعد گیٹ کھل گیا۔ بوری رام گاڑی کو اندر لے گیا۔ اندر بہت وسیع و عریض کپڑاؤں کا خانہ تھا۔ خانہ ایک طرف روک گیا۔ اس دوران میں گیٹ کھولنے کے لیے ایک شخص آیا تو پتا چلا کہ وہ ایک پانگ تھا۔ مائے پانگ گاڑی رکھنے کی چھلانگ لگا کر باہر نکل آیا اور اس عورت سے لپٹ گئی۔ وہ عورت مائے کی

یہ بات راستے ہی میں طے ہو گئی تھی کہ بوری رام کے گھر والوں یا کسی اور کو اصل بات نہیں بتائی جائے گی۔ البتہ یہ بتایا جائے گا کہ فارم پر کام کے دوران میں بوری رام کو چوٹ لگ گئی تھی جس وجہ سے ان دونوں کو واپس آنا پڑا اور ہم چپانگ کھوں سے چپانگ سائین کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ بھگ کر ان کے فارم ہاؤس کی طرف نکل گئے اور یہ وہاں ہمیں ساتھ لے آئے۔

بوری رام کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ مائے پانگ کی ماں اور اس کی بڑی بہن اس مکان میں رہتی تھیں۔ بوری رام نے گاڑی پر بیٹھے بیٹھے اپنی ساس کو ایک من گھڑت کہانی سنا دی۔ میں نے بیچے اتر کر اسے گاڑی سے اترنے میں مدد دی۔ بوری رام نے اپنی ساس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میری ایک ساتھی کے پیر پر بھی چوٹ لگی ہوئی ہے اور وہ چل نہیں سکتی۔

بوری کی ساس نے کمروں کے سامنے کھڑی ہوئی اپنی دوسری بیٹی سے اونچی آواز میں کچھ کہا اور پھر مجھے بتایا کہ میں جاگنی کو وہاں لے جاؤں۔ میں نے جاگنی کو گود میں اٹھالیا۔ مائے پانگ اپنے شوہر کو سہارا دے کر کھینچے لگی۔ تھائی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بوری رام کی ساس خیر کو گاڑی سے کھولنے لگی تھی۔

میں جاگنی کو لے کر اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کے دروازے پر کھڑی ہوئی مائے پانگ کی بہن نے اشارہ کیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھی۔ میں نے جاگنی کو بیٹھ بٹھا دیا اور مائے کی بہن کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا لگا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جیسے ہی تھائی کمرے میں داخل ہوئی مائے کی بہن اسے دیکھ کر اچھل پڑی۔ تھائی بھی اسے دیکھ کر چوک گئی۔

”ارے! انراک تم۔“ تھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور انراک بھی ”ارے تھائی“ کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ دریائی سرحد پار کرنے کے بعد ہم پناہ لینے کے لیے بوری رام کے فارم ہاؤس میں رکے تھے۔ ان دونوں میاں بیوی نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا بلکہ ہماری وجہ سے اپنی جانیں بھی خطرے میں ڈال دی تھیں اور یہاں بوری رام کی سالی انراک تھائی کی شہناکھی تھی اور پھر یہ انکشاف بھی میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا کہ جس زمانے میں تھائی بنکاک میں مساج پار کر چلا یا کرتی تھی، انراک بھی اس کے پاس کام کرتی تھی۔ انراک اس

کے ایک مساجد پارلر رانچ کی انچارج تھی اور پھر مجھے بھی یاد آگیا کہ میں نے انراک کو کہاں دیکھا تھا۔ دراصل میں نے انراک کو نہیں بلکہ تھائی کے جنگلے میں موجود ایک الیم میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ تصویر نہایت مختصر لباس میں تھی اور اب میں اس کے بارے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔

میری وجہ سے جب تھائی پردار اور ٹائگر کا قہر غلڑ ہونا شروع ہوا تو اس کا سارا بزنس چوہٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا وہ مساجد پارلر انراک کو دینے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ اسے نہیں چلا پائی تھی اور چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

مائے پانگ اور بوری رام بھی اس کمرے میں آگئے اور جب انراک نے انہیں تھائی کے بارے میں بتایا تو بوری رام کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔ انراک کی باتوں نے اس کمائی کی تصدیق کر دی تھی جو ہم اپنے بارے میں پہلے ہی بوری رام کو سنا چکے تھے۔

مائے پانگ کی ماں کمرے میں آکر بوری رام سے سوال جواب کرتی رہی۔ بوری رام نے اسے بتایا کہ کام کرتے ہوئے لوے کا نوک دار سر یا اس کی ٹانگ کے گوشت کو چرتا ہوا چلا گیا تھا۔

”انراک“ ماں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم ان لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرو میں ڈاکٹر لوے کر آتی ہوں۔ اس کے زخم کی ڈرنک بہت ضروری ہے۔ انفیکشن ہو گیا تو زخم بگڑ جائے گا اور مائے تم بھی بوری کو دوسرے کمرے میں لے چلو۔“

مائے پانگ کی ماں چلی گئی۔ مائے بھی بوری رام کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور انراک بھی کھانے کا بندوبست کرنے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔

ہمیں بوری رام اور مائے پانگ کی وجہ سے کچھ حوصلہ تو تھا ہی انراک کی وجہ سے مزید اطمینان ہو گیا۔

جاگتی کی وجہ سے ہمیں تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہنا پڑا۔ اس دوران میں ایک مخصوص تیل سے جاگتی کے پیر کی ماش ہوئی رہی جس سے اسے کافی فائدہ ہوا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

اس ایک ہفتہ کے دوران میں ہم میں بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ انراک تھائی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ تھائی سے پیش آمدہ حالات کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ ہماری باتوں میں اکثر سردار تھالوب کا بھی ذکر آتا۔ انراک اکثر چیاگ سائین جاتی رہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ تین چار مہینے پہلے سردار تھالوب کے

بتاہ شدہ مکان کی جگہ نیا مکان تعمیر ہو چکا ہے۔ مزید دو دن گزارنے کے بعد بالآخر ہم نے چیاگ سائین جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انراک بھی ہمارے ساتھ گئے۔

انراک مائے پانگ سے تین سال بڑی تھی۔ دوسرے بہن بھائی الگ مکان میں رہتے تھے۔

اس روز بھنبوری رام اور مائے پانگ سے رخصت کر شام کی آخری بس سے چیاگ سائین کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس وقت دن کی روشنی تھی لیکن پانچویں مارچ نہایت دشوار گزار ہونے کی وجہ سے بس کی رفتار کم تھی۔ بارہ میل کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں ہی ہوا۔

چیاگ سائین پہنچے تو آٹھ بج رہے تھے۔ میں ایک بل بعد اس شہر میں آیا تھا۔ ہوٹلوں اور ٹائٹ لوہوں کے گھنٹے جگمگا رہے تھے۔ جس جگہ ہم بس سے اتارے گئے۔ سردار تھالوب کے جنگلے کا فاصلہ تقریباً ایک میل کے بلج تھا اور ہم نے یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک سال پہلے جب ہم یہاں تھے تو صورت حال مختلف تھی۔ اس وقت ہمارے چاروں طرف دشمن پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں قدم قدم پر خطرات رہنا پڑتا تھا لیکن ان صورت حال مختلف تھی۔ اس وقت ہم آزادی سے چلتے ہوئے رہے تھے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس شہر میں اب بھی میرے بہت سے دشمن موجود تھے اور بوری رام نے بھی خبردار بھی کر دیا تھا۔

ہم چاروں باتیں کرتے، شہلے ہوئے چل رہے تھے۔ سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار ٹریلوپ ہمارے قریب سے گزر گئی لیکن بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز سننے نے پیچھے سرگرد کیا۔ تقریباً پچاس گز دور وہ پلٹ کر آیا اور پھر دو ٹرن لے کر واپس آئے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے قہر سے کسی ممکنہ خطرے سے آگاہ کر دیا اور جب سے وہ پلٹ گیا۔

لیا جو چند روز پہلے تک تان منہ کی ملکیت تھا۔ اب اس میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین گولیاں ہوں گی۔ تھالوب نے حال میں یہ بھی کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ پیچھے سے آنے والی جپ ہمارے قریب سے گزری۔ بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز سے ہم سے چند گز دور رک گئی۔ ہم رک گئے۔ میں کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

جاگتی ایک سائڈ کا دروازہ کھلا اور ایک دروازے کی طرف لپکا۔ قریب ہی ایک ٹائٹ کی پٹائی پر رنگ برنگ ٹین سائن جگمگا رہا تھا۔ ویسے تو یہ جگہ کافی روشنی تھی۔ اس دروازے کا مقصد شخص کو اسے انراک کی طرف لپکتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

سردار تھالوب کی گرم جوشی قابل دید تھی۔ وہ مجھ سے باطنی ملا تھا جیسے برسوں سے بچھا ہوا سا بھائی مل گیا ہو۔ وہاں میرا دم چوم رہا تھا۔ گلے لگا کر بچھڑ رہا تھا۔ تھائی اور گئی تھی وہی اسی گرم جوشی سے ملا تھا البتہ انراک سے نہایت ملنے پر ہی اتفاق کیا تھا۔

ہم کچھ دیر تک وہیں کھڑے باقیں کرتے رہے پھر سردار جپ کے ساتھ اس کی ٹریلوپ میں بیٹھ گئے۔ بے جیرو کی جپ بہت شان دار تھی۔ تھائی وغیرہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور میں آگے پینچرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سردار جپ اس وقت کسی کام سے مائے سین کی طرف جا رہا تھا۔ ہم نے ملاقات کے بعد اس نے ارادہ بدل دیا اور جپ کے پیچھے کی طرف سوڑا۔

پہلے یہاں قدیم طرز کی عمارت ہوا کرتی تھی جو جنرل ہوائی کے آدھیں نے راکوں سے تباہ کر دی تھی۔ اس عمارت اب بڑی شان دار جدید طرز کی عمارت نظر آ رہی تھی۔

جپ جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوئی مجھے لونا نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ دو قبا کی اور بھی تھیں۔ وہ تینوں عمارت کے قریب آدھے میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن جپ کو میں نے داخل ہوتے دیکھ کر گڑھا گئے تھے۔ مجھے اور تھائی کے قریب سے اترتے دیکھ کر لونا پہلے تو حیرت سے ہمیں دیکھا پھر مجھ جپ کا اور پھر دوڑ کر مجھ سے مل گیا۔ اس نے سردار تھالوب کی طرح گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”دیکھ لو بک کو تم سے کتنی محبت ہے۔“ سردار تھالوب نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم لوگوں کے لیے سب متفکر رہا۔ دیکھو لونا کا چہرہ کیسے کھل اٹھا ہے۔“

”تمہارے دلوں سے بھی کسی کی محبت کم نہیں ہوئی۔“ میں نے تھائی سے جواب دیا ”ہم بھی ہر لمحہ تم سب کو سوس لیا کرتے تھے۔“

”تمہارے دل سے بھی کسی کی محبت کم نہیں ہوئی۔“ میں نے تھائی سے جواب دیا ”ہم بھی ہر لمحہ تم سب کو سوس لیا کرتے تھے۔“

”سائے تمہاری روح کھڑی ہے۔“ ”یہی سمجھ لو تھالوب“ میں نے کہا ”یہ تھائی کا دوسرا جنم ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ سردار تھالوب کے لیے میں اب بھی حیرت تھی۔

”لہذا قصہ ہے اطمینان سے بتاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا۔ چلو۔ اندر تو چلو۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں بھی کتابے وقف ہوں۔ تم لوگوں کو باہری روکے ہوئے ہوں اور لونا۔“ وہ لونا کی طرف گھوم گیا ”تمہارے سیمان آئے ہیں۔ ان کی کوئی خاطر نہیں کرو گے۔“

”کیوں نہیں سردار۔“ لونا بولا ”پہلے میں انہیں کافی پلاؤں گا اور پھر ان کے لیے تھائی سوپ اور کھانا تیار کروں گا۔“

ہم سردار تھالوب کے ساتھ اندر آ گئے اور پہلے گھوم پھر کر مکان دیکھنے لگے۔ مکان پہلے سے بڑے رتبے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کمروں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ پہلے سے زیادہ کشادہ بھی تھا۔ اوپر جانے کے لیے گول زینہ تھا۔ اوپر کی منزل پہنچی پانچ کمرے تھے۔ ہم گھوم پھر کر نیچے نشست گاہ میں آ گئے۔ تمام کمرے بہت شاندار تھے، فرنیچر سے آراستہ تھے۔

”بہت شان دار۔“ جاگتی نے کہتے ہوئے ایک بار پھر اُدھر اُدھر دیکھا ”لیکن ایک چیز کی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“

”تم جس چیز کی محسوس کر رہی ہو، وہ اس وقت چیاگ رائے میں ہے۔“ سردار تھالوب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

تھالوب کے اس جواب پر جاگتی نے بڑا جان دار قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔ پہلے تو میں مطلب نہیں سمجھ سکا پھر بات سمجھ میں آ گئی۔ جاگتی نے رنگولی کی کی کا ذکر کیا تھا۔

”رنگولی چیاگ رائے میں کیا کر رہی ہے؟ اسے تو یہاں ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسے رقص سے عشق ہے۔“ تھالوب نے جواب دیا ”میں اس چھوٹے شہر میں اسے موقع نہیں ملتا۔ یہاں اس کے فن کی داد دینے والا بھی کوئی نہیں۔ فنکاروں کو داد کی طلب ہوتی ہے اور داد وہیں ملتی ہے جہاں قدر داں ہوں اور قدر داں چیاگ رائے اور رنگاک جیتے بڑے شہروں ہی میں ہوتے ہیں۔ میں اس کے شوق میں مزاحم نہیں ہونا چاہتا اس

لیے۔

”اسے کھلی جھوٹ دے رکھی ہے۔“ جاگی نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

”جھوٹ۔“ تھالوب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”میں اس پر پابندی لگانے والا کون ہوتا ہوں؟“

”میرا خیال ہے کہ تم دونوں کے بیچ میں جو جواب ہے اسے اب ختم ہو جانا چاہیے۔“ جاگی نے سردار تھالوب کے چہرے پر نظر سجمائے ہوئے کہا۔

”جواب!“ تھالوب کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

اسی وقت لوبا کافی لے کر آیا۔ دور سے میں نے اس کی سنگتاکھٹ کی آواز سنی تھی لیکن قریب آکر اس نے سنگتاکھٹ بند کر دیا۔

کافی آنے کے بعد گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ تھائی نے انزاک کا تعارف کرایا جو اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی بوری رام اور مائے پاک کا ذکر بھی آیا اور ان کے ساتھ تان منہ کا تذکرہ بھی ضروری ہو گیا۔

”تان منہ!“ سردار تھالوب کے لہجے میں حیرت تھی ”وہ حرامی یہاں کیسے آگیا؟“

”وہ تھائی کے بیچے آیا تھا۔“ میں نے کہا اور پھر میں اسے تھائی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”میں تان منہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت حرامی آدمی ہے۔“ تھالوب نے میرے خاموش ہونے پر کہا

”یہ تھائی کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے چنگل سے بچی رہی۔ میں آج ہی سرحدی چوکی کے کمانڈر کو فون کر کے اس کے بارے میں بتا دیتا ہوں اگر تان منہ تھائی سرحد میں موجود ہو

تو اسے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا اور تم لوگ۔“ وہ انزاک کی طرف دیکھنے لگا ”بوری رام اور مائے

پاک کو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مائے پاک کے ہاتھوں اگر کسی کا قتل ہوا ہے تو اس میں مائے پاک کے

ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے اشتعال میں گولی چلائی تھی اور اس کی ذمہ داری بھی

تان منہ پر عائد ہوتی ہے جس نے اپنے آدمی کو مائے پاک پر بمباران حملہ کرنے پر اکسایا تھا۔ بہر حال میں اس سلسلے میں بھی

بات کروں گا اور تم لوگوں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔“

انزاک حیرت سے ہم سب کی صورتیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے تو یہ انکشاف ہی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ

اس کی چھوٹی بہن کے ہاتھوں کوئی قتل ہو چکا ہے۔ انزاک اس کی ماں کو تو ہم نے تان منہ اور اس قتل کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

وہ دھتکے سے گفتگو کا موضوع بھی بدلتا رہا۔ سردار تھالوب کہہ رہا تھا۔

”مجھے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

”میں نے تم کو یہ بتا دیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھورائے بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اے۔“

ہے۔ میں نے اس وقت چینگ سائین میں سردار ڈوب کے مہمان ہیں۔“

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

”ہاں۔“ ہاسٹریوچن کی آواز سنائی دی ”مجھے تمہارے آگے آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہونا۔ تھائی اور جاگی

کے لئے لگا ”براہ اور لاؤس کی سرحد کی طرف بعض قبائل اب بھی پوسٹ کی کاشت کرتے ہیں۔ منشیات کے بین الاقوامی اسمگلر ہمارے معاوضے پر ان سے فصل خرید لیتے ہیں جن سے

تیار ہونے والی منشیات انسانیت کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہ قبائل بھی پوسٹ کاشت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس پر ایک تو

محنت کم ہوتی ہے اور معاوضہ زیادہ ملتا ہے۔ دوسرے ان کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ان زمینوں پر کچھ اور کاشت کر سکیں۔

میں نے حکومت کو تجویز پیش کی تھی کہ ان علاقوں میں بیجی اور اسٹرابری کی کاشت ہو سکتی ہے مگر کاشتکاروں کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں اور انہیں ان فصلوں کا زیادہ

معاوضہ بھی نہیں ملے گا لیکن اگر حکومت ان کی مالی معاونت کرے تو صحت مند فصلیں کاشت کر کے پوسٹ کی کاشت کو

بتدریج کم کیا جاسکتا ہے۔ حکومت نے میری یہ تجویز مان لی اور کرشنتر چار پانچ مہینوں سے اس پر کام ہو رہا ہے۔ اس

سلسلے میں مجھے بار بار بنکاک بھی جانا پڑتا ہے اور ان قبائلی علاقوں کے دورے بھی کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر

خاموش ہو گیا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تقریباً ایک منٹ کی خاموشی کے بعد سردار تھالوب نے دوبارہ لب کشائی کی۔

وہ کہہ رہا تھا ”ہم اس برائی کو مکمل طور پر ختم تو نہیں کر سکتے مگر اسے کم کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک سال پہلے

جب تم سے ملاقات ہوئی تھی تو میں تمہاری باتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی میں منشیات کے خلاف

تھا۔ اپنے زیر اثر علاقوں میں پوسٹ کی کاشت کا خاتمہ کر دینا تھا لیکن تمہاری باتوں اور تمہارے خیالات نے میرے

خیالات کو ہمیز کیا اور میں ہر طرح سے تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ ہماری مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہم کم از کم

اپنے علاقے میں اس برائی کو کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور

ایک نہ ایک دن کم از کم اپنے علاقے میں اس برائی کا بڑے خاتمہ کر دیں گے۔“

مجھے سردار تھالوب کی نیت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر اس کے لیے بہت کام کیا تھا۔ اپنے کئی

آدمی مراءئے تھے۔ اپنی جان خطرے میں ڈالے رکھی تھی۔ انہیں گناہ کر دیا تھا مگر اس کے باوجود اشتعال میں کوئی لغزش

نہیں آئی تھی۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کے دل میں کوئی ایچ نہیں تھا۔ دل میں ایچ ہوتا تو وہ ان سرگرمیوں

میں میرا ساتھ ہی نہ دیتا۔ اپنے علاقوں میں پوسٹ کاشت کر کے عیش کرنا مگر اس کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔ وہ

جان گیا تھا کہ یہ لعنت انسانیت کو مفلوج کر رہی ہے۔ اس نے اپنے علاقے میں اس کی کاشت بند کروا دی تھی۔ اسے حکومت میں ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی گئی تھی جسے اس نے قبول نہیں کیا تھا۔ لاج ہوتا تو وہ یہ عہدہ قبول کر کے بھی عیش کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے مکان کو راکٹوں سے حملہ کر کے تباہ کر دیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے مکان کے معاوضے اور تعمیری پیشکش بھی کی گئی تھی لیکن اس نے یہ پیشکش بھی قبول نہیں کی تھی۔

”تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں مہاراج جیسا آدمی مل گیا۔“ سردار تھالوب کہہ رہا تھا ”تم اگر غلط باتوں میں چلے جاتے تو آج دو سرون کے لیے بہت بڑا خلعہ بن چکے ہوتے لیکن مہاراج نے جس طرح تمہاری تربیت کی ہے وہ قابل رشک ہے۔“

”ہاں۔ یہ واقعی میری خوش قسمتی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”مہاراج جیسے لوگوں کی محبت اور شفقت بھی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔“

رات جی جاری تھی لیکن ہماری باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوران میں لوہانے ہمیں کم از کم دو مرتبہ کافی بنا کر دی تھی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا کہ نجانے کب ہمیں کس چیز کی ضرورت پڑ جائے لیکن بالآخر صبح چار بجے کے قریب میرے قوی متنبہ ہونے لگے اور جہلیاں آنے لگیں۔

”رات ختم ہو رہی ہے۔“ سردار تھالوب نے کہا ”اب تم بھی سو جاؤ۔ صبح مائے سین چلا جاؤں گا۔ تین چار گھنٹوں میں واپسی ہوگی۔ شام سے ذرا پہلے ہم چیاگ رائے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس وقت تک تم لوگ بھی یہاں گھوم پھر لینا۔ میں زو جیب بیٹیں چھوڑ جاؤں گا۔“

سردار تھالوب نے مجھے وہ کراؤ کھا دیا جہاں مجھے رات کا باقی حصہ گزارنا تھا۔ اس کا اپنا بیڈ روم اوپر کی منزل پر تھا۔ سردار تھالوب اوپر چلا گیا۔ میرے سامنے والے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر جی جل رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ جاکئی تھائی اور انزاک ایک ہی بیڈ پر ایک دوسرے پر لدی سو رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد میں کچھ دیر تک نہیں سو سکا اور سردار تھالوب کے بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر میری آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہونے لگیں۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو کیا درجہ رہے تھے۔ باہر لان

سے جاگنے وغیرہ کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اندر ہاتھ روم میں کھس گیا اور جب باہر نکلا تو لوہا میز پر ناشتا لگا ہوا تھا۔

”یہ اتنا سارا ناشتا؟ کیا صرف میرے لیے؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے لوہا کی طرف دیکھا۔

”صرف تم نہیں۔ سب لوگ ناشتا کریں گے۔“ لوہانے جواب دیا۔

”سردار تھالوب بھی؟“

”وہ تو صبح سات بجے چلے گئے۔“ لوہانے کہا ”لوہا تھالی وغیرہ نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔ انہوں نے کہا تھا وہ تین بجے بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کریں گی۔“

”چلو۔ بلاؤ انہیں۔“ میں کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا تھا۔ وہ تینوں پتا نہیں کب سے اٹھی ہوئی تھیں لیکن میری وجہ سے بھوک بھی تھی۔

چند منٹ بعد وہ تینوں بھی اندر آ گئیں۔

”ارے واہ۔“ جاکئی تنک کر بولی ”ہم تو تمہارے انتظار میں صبح سے بھوکے بیٹھے ہیں اور تم سے چند منٹ انتظار نہیں ہو سکا۔“

”ابھی میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔“ میں نے جواب دیا ”تم لوگ میٹھو تو ناشتا شروع ہو۔“

وہ تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ لوہا ایک ایک چیز اٹھا کر ہمارے سامنے رکھ رہا تھا۔ طویل عرصے بعد اس طرح ہمارے ناشتا لگا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔

ہم ناشتے کے بعد نشست گاہ میں بیٹھے کافی پارہے تھے کہ لوہانے ایک پھولا ہوا والٹ میری طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سردار نے تمہارے لیے دیا تھا۔“ لوہانے جواب دیا ”تم لوگ شہر گھومنے کے لیے جاؤ گے۔ کوئی چیز دیکھ کر مل چکی سکتا ہے۔“ لوہانے کہا پھر بولا ”ڈرائیو رہا رہا موجود ہے جب جانا ہو تو بتا دینا۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تینوں گے اور یہ والٹ مجھے دے۔“ ہمارا دل چل سکتا ہے۔ اس بندے کے سینے میں تو بڑا نہیں۔ چلے گا کیا۔“

لوہانے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے والٹ کر جاکئی کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے ہوا میں ہی چھٹ

میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

”یہ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔“

میرے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ رنگ سنت انہی دنوں ماری گئی تھی۔ اس کی بیٹی سونیا اپنی ماں کے گناہوں کا قہارہ ادا کرنے کے لیے ہمارے ساتھ مل گئی تھی۔

سونیا نے واقعی اس مٹی سے وفا کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ قدم قدم پر موت کا سامنا کیا تھا۔ گولڈن ٹرائی اسٹیکل کے جنم سے فرار ہونے کے بعد وہ بوبا اور اس کی بیوی ہوا کے ساتھ برما سے ہوتی ہوئی ہندوستان کی طرف چلی گئی تھی۔

سونیا کی یاد سے میرے اندر ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ مجھے گولڈن ٹرائی اسٹیکل کی وہ رات یاد آگئی جب تارک عار میں اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے چت کر دیا تھا حالانکہ جاکئی بھی عرصے سے ایسی کوشش کرتی رہی تھی مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا لیکن

سونیا۔ وہ لمحات یاد کر کے میں اپنے آپ میں ندامت محسوس کرنے لگا اور شاید ندامت کا یہ احساس زندگی بھر میرا چچا نہیں چھوڑے گا۔

ہم اس پہاڑی پر بھی گئے جہاں فاسٹ فوڈ کے کئی ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے اور جہاں سے خلیب میں بہت دور دریاے میکانگ کے اس پار گولڈن ٹرائی اسٹیکل کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ اس وقت بھی یہاں بہت سے غیر ملکی سیاح موجود تھے۔ جنگ کے قریب ایک میز پر بیٹھ کر فرولی فٹ کھاتے ہوئے مجھے اسی ریسٹورنٹ کی ویڈیو سائے یاد آگئی۔ جس نے ایک دن کے کتنے پر ہمارے لیے کام کیا تھا اور بالآخر ماری گئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹا وہاں رکنے کے بعد ہم واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ جیب اب بھی ہمارے پیچھے تھی جس میں چار قبائلی بیٹے ہوئے تھے۔ جاکئی وغیرہ نے بھی اس جیب کو بہت پسند دیکھ لیا تھا اور وہ تینوں بھی سمجھ گئی تھیں کہ وہ قبائلی ہماری حفاظت کے لیے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

انزاک یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ تھالوب اس علاقے کے سب سے بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ ہمارے ساتھ اس کے سلوک کے بھی انزاک کو بے حد متاثر کیا تھا۔

ہم جب جنگل پر واپس پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد سردار تھالوب بھی واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ ہم پانچ جیب سے چیاگ رائے کے لیے روانہ ہوں گے۔ اس نے انزاک سے بھی پوچھ لیا تھا کہ کیا وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔

”نہیں سردار۔“ انزاک نے جواب دیا ”میں گاؤں

آتش فشانی حصہ 3

آتش فشانی حصہ 3

آتش فشانی حصہ 3

آتش فشانی حصہ 3

آتش فشانی حصہ 3

واپس جاؤں گی اور میرا خیال ہے کہ اب مجھے آپ لوگوں سے اجازت لے لینی چاہیے۔ بازار سے کچھ چیزیں بھی خریدنی ہیں۔ میں سچے بچے والی ہنس سے چلی جاؤں گی۔

”بس سے نہیں۔ میرا ڈرائیور تمہیں جیب پر چھوڑ آئے گا اور۔“ اس نے فونوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”یہ رکھ لو۔ بازار میں کچھ شاپنگ کر لینا اور ایک بات ذہن میں رکھنا۔ تم لوگوں کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے متعلقہ حکام سے بات کر لی ہے۔ تان منہ کو تھائی لینڈ کی سرحد میں دیکھتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا اور اگر کوئی تم لوگوں کو پریشان کرنے کی کوشش کرے تو فوراً مجھے اطلاع دے۔ یہ میرا کارڈ بھی رکھ لو۔ اس میں میرا پتہ اور چپانگ رائے کا بھی فون نمبر موجود ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”تم نے میرے ان دوستوں کی مدد کر کے دراصل مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور میں یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم لوگوں کو کسی بھی قسم کا مسئلہ درپیش ہو بلا تکلف میرے پاس چلی آنا اور اب تم جانا چاہو تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔ تمہیں بازار میں بھی کچھ وقت لگے گا۔“

انزاک رٹم لیتے ہوئے جبکہ رہی تھی۔ اس نے تھائی کی طرف دیکھا۔ تھائی نے سردار کے ہاتھ سے فونوں کا بنڈل لے کر اس کے ہاتھ میں تھادیا۔ سردار تھالوب نے ڈرائیور کو بلا کر ہدایت کر دی کہ وہ دوسری جیب پر انزاک کو لے جائے اور بازار میں شاپنگ کے بعد اسے تھانگ سانگ چھوڑ آئے انزاک بڑی گرم جوشی سے ہم لوگوں سے مل کر رخصت ہو گئی۔

ہم ٹھیک پانچ بجے چپانگ سائین سے روانہ ہو گئے۔ مجھے بوری رام نے بتایا تھا کہ سردار تھالوب کے بعض دشمن اب بھی اس علاقے میں موجود ہیں اور ظاہر ہے وہ جنرل کھورات کے آدمی تھے اس کا تذکرہ تو خود سردار تھالوب نے بھی کیا تھا اس لیے سردار تھالوب کبھی بھی غیر محتاط نہیں رہا تھا۔ آج صبح مائے سین جانے سے پہلے وہ ہماری حفاظت کا بندوبست بھی کر گیا تھا اور اب بھی محافظ ہمارے ساتھ موجود تھے۔ ایک جیب ہم سے پانچ منٹ پہلے روانہ ہو چکی تھی اور محافظوں کی دوسری جیب ہم سے پچیس منٹیں گز چکی تھی۔

جب ہم پہلی مرتبہ چپانگ رائے سے چپانگ سائین آئے تھے تو سفر اندھیرے میں ہوا تھا لیکن اس وقت ہم دن میں سفر کر رہے تھے۔ سردار تھالوب ڈرائیور کر رہا تھا اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جاگی اور تھائی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ دن کی روشنی میں ہمیں یہ علاقہ دیکھنے کا موقع

مل گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں سے ڈھکی چھپی پہاڑیاں تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ خطرناک موڑ تھے۔ گاڑی کے ڈرائیور کی معمولی سی غفلت ہمیں موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ سردار تھالوب بھی بہت محتاط ڈرائیور تھا۔

فاصلہ اگرچہ صرف اسیٹھ ساتھ کلومیٹر تھا۔ سڑک بہت ہوتی تو یہ فاصلہ پینتیس چالیس منٹ میں طے ہو سکتا تھا لیکن ہم تقریباً دو گھنٹوں کے بعد چپانگ رائے کے نواح میں پہنچے تھے اس کے مزید آدھے گھنٹے بعد ہم سردار تھالوب کی مالی شان کو بھی میں موجود تھے۔

میرا خیال تھا کہ یہاں رنگولی ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوگی لیکن سردار تھالوب نے بتایا کہ اس نے ابھی تک رنگولی کو ہمارے بارے میں اطلاع ہی نہیں دی۔ دراصل وہ رنگولی کو سربراہنا ہوتا چاہتا ہے۔

رنگولی اس جنگلے میں بھی رہائش پذیر نہیں تھی۔ وہ اپنے اسی چھوٹے سے مکان میں ہی رہ رہی تھی جہاں چند روزہ بھی رہے تھے۔ تھالوب نے بتایا کہ چپانگ سائین سے واپس آنے کے بعد سے وہ اسی مکان میں تھی۔

”وہ آج کل گولڈن ٹرائی اینجیل ہوٹل میں پروگرام کر رہی ہے۔“ سردار تھالوب بتا رہا تھا ”اس ہوٹل میں بہت کم رقاصوں کو اپنے فن کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ رنگولی نے اپنے فن میں واقعی کمال حاصل کیا ہے۔ ہوٹل انتظامیہ نے خود اسے معاہدے کی پیشکش کی تھی۔ ہفتہ میں صرف دو پروگرام۔ اور ان دو پروگراموں میں اسے ایک گھنٹہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ اس کے معاہدے کا آخری مہینہ ہے شاید دو ہفتے اور رہ گئے ہیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ اس سے مزید تین مہینے کا معاہدہ کرنا چاہتی ہے مگر رنگولی نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ آج رات اس کا پروگرام ہے۔ میں تم لوگوں کو اچانک سامنے لا کر اسے سربراہنا ہوتا چاہتا ہوں۔ اسی میں نے اسے تم لوگوں کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں دی۔“

”پہلے تو شاید وہ ڈنکی سکس کلب میں تھی نا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں شاید۔“ تھالوب نے مختصر سا جواب دیا اور پھر رات کو کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔ ہمارے لیے کافی لے کر آیا تھا۔

اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم دوبارہ قریب جنگلے سے نکلے۔ رنگولی کا پروگرام ساڑھے چار بجے



شروع ہوتا تھا۔ اسٹیج کے قریب سردار تھالوب کی میز اگرچہ ہمیشہ ریزرو رہتی تھی لیکن اسی رات چنانچہ رائے نیچتے ہی اس نے فون کر کے ایک اور میز مخصوص کروائی تھی۔

اور یہ میز اسٹیج سے بہت ہٹ کر تھی۔ میں سمجھ گیا کہ تھالوب نے یہ میز یوں ریزرو کروائی تھی تاکہ رقص کے دوران میں رنگینی ہمیں نہ دیکھ سکے۔

رنگینی واقعی اپنے فن میں بیٹا تھی۔ اس کے رقص کے دوران میں لوگ سانس تک لینا بھول جاتے تھے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ رقص کے دوران میں اس کی نظریں بار بار اسٹیج کے قریب اس میز کی طرف اٹھ رہی تھیں جو خالی تھی اور جس پر ریزروڈ کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ وہ سردار تھالوب کی مخصوص میز تھی مگر آج وہ ہمارے ساتھ اسٹیج سے دور دوسری میز پر بیٹھا تھا۔

رقص کے اختتام پر رنگینی نے ایک بار پھر اس خالی میز کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ادا سی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ جیسے ہی اسٹیج کے پیچھے غائب ہوئی سردار تھالوب نے اشارہ کیا اور ہم اسٹیج کے پہلو کے دروازے سے نکل کر اس طرف آگئے جہاں ڈرننگ رومز تھے۔ رنگینی والے ڈرننگ روم کے دروازے پر اس کے نام کی پلٹ لگی ہوئی تھی۔ سردار تھالوب دروازے پر ہلکی دستک دے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ رنگینی نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھ کر مارے خوشی کے چیخ اٹھی۔

ہم چند رہے میں منت تک رنگینی کے ساتھ ڈرننگ روم میں رہے اور پھر ہال میں آگئے۔

ہم دو بجے تک ہوٹل میں رہے۔ سردار تھالوب نے رنگینی کو بھی اپنے بنگلے پر چلنے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ ہمیں اپنے مکان پر لے جانا چاہتی تھی۔ سردار تھالوب ہم سب کو اپنی گاڑی پر رنگینی کے مکان پر چھوڑ کر چلا گیا۔

رنگینی کے مکان کو اندر سے دیکھ کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ سردار تھالوب نے اس کی آمدنی لاکھوں میں بتائی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس نے گھر میں قیمتی سازو سامان جمع کر رکھا ہو گا لیکن گھر کی حالت بالکل ویسی تھی جو ایک سال پہلے تھی۔ بالکل بے سرو سامانی کی سی کیفیت تھی۔

”تھالوب نے تو بتایا تھا کہ تم لاکھوں تک ما رہی ہو لیکن تمہارے گھر کی یہ حالت۔“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اور پھر ہمارے لیے یہ انکشاف بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا نوے فی صد حصہ ”ایٹوانٹرنسٹ فرینڈز“

نامی ایک تنظیم کے عطیے میں دے دیتی تھی۔ یہ تنظیم ترقیاتی پروگرام کے علاوہ اور بھی کئی رفقاء پر جوینٹ چلائے تھی جس کا ایک پروجیکٹ منشیات کے عادی افراد کی بحالی بھی تھا۔ اس پروجیکٹ میں کئی ایسے ادارے کام کر رہے تھے جہاں منشیات کے عادی افراد کا علاج کر کے انہیں معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرنے میں مدد دی جاتی تھی۔

رنگینی کے بارے میں یہ جان کر واقعی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے ایک سال پہلے مار دھاڑ میں بھی ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ”ایٹوانٹرنسٹ فرینڈز“ نام کا یہ ادارہ چند مہینے پہلے قائم ہوا تھا اور اسے بہت اچھا ریسپانس ملتا تھا۔ یوں تو تینوں کمروں میں بیٹھے تھے ہوتے لیکن سونے ہوش کے تھا۔ ہم سب رنگینی ہی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رنگینی اس ایک سال کے عرصے میں ہم پر ہوتی بات کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔

اس وقت پونے چار بیٹے والے تھے۔ رنگینی ہائے بنانے کے لیے بچن میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ میں جاگنی اور تھانی کے ساتھ پلنگر تانی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رنگینی نے دروازے میں قدم رکھا اور اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں چائے کپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دو سرا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک زور وار دھماکا ہوا۔ رنگینی اچھل کر گری۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ تھانی بھی چیختی ہوئی اچھل کر پلنگ سے گر گئی۔ میں بھی اچھل کر جاگنی کو ساتھ لیتا ہوا دوسری طرف آگرا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکا ایک اور کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور پھر تو کیا ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

کچھ بعد دیگرے چار دھماکے ہوئے۔ لگتا تھا جیسے مکان پر راکٹوں سے حملہ کر دیا گیا ہو یا بم پھینکے جا رہے ہوں۔ چھٹ کا ایک حصہ اڑ گیا۔ ٹوٹی ہوئی چھت ہمارے اوپر گر رہی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ چھت پختہ لینڈر کی نہیں تھی۔ مکان پرانی طرز کا تھا۔ زمین سے پانچ فٹ اونچی دیوار۔ اس کے اوپر لکڑی کی بلوں کا فریم بنا کر اندر کی طرف خاص میٹل سے بنے ہوئے دو اونچے مونے گتے کے پس اور باہر کی طرف نیچے چادریں تھیں۔ چھت بھی اسی طرح تھی۔ سینکڑوں گتے کی اور اوپر ہٹ کی طرح سلائٹ ٹن کی چھت اس علاقے کے بیشتر مکان اسی طرز کے تھے۔

دیوار کی ایک ملی ٹوٹ کر میرے سر پر گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے نیلی چلی چنگاریاں سی رقص کرتی ہوئی

دھوئیں گئیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ جاگنی اور تھانی کی چیخیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ رنگینی بہت سے گرنے والے ایک حصے کے نیچے دب گئی تھی اور ٹاپا بے ہوش ہو گئی تھی اس لیے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہماری طرف والی ایک دیوار اندر کی طرف جک رہی تھی۔ میں نے جاگنی کو پلنگ کے نیچے دھکیل دیا اور ڈوبی نیچے گھس کر دوسری طرف سے تھانی کو کھینچنے لگا۔ اسی لیے ایک اور زور وار دھماکا ہوا اور پوری کی پوری چھت تارے اوپر آن گری۔

تھانی کا اوپر کا دھڑ پلنگ کے نیچے تھا مگر اس کی ٹانگیں گری ہوئی چھت کے نیچے دب گئی تھیں۔ میں اور جاگنی پلنگ کے نیچے ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے تھے۔ مجھے سر پر جو جوت لگی تھی میں اس سے سنبھل گیا تھا مگر سر میں ابھی تک ٹکسٹل اٹھ رہی تھیں۔

اب دھماکے نہیں ہو رہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مکان پر راکٹوں یا بموں سے حملہ کیا گیا تھا۔ حملہ آور غالباً بائیس تھے لیکن ایک اور خوفناک حقیقت نے مجھے لرزا کر رکھا۔ دھوئیں کی بو میرے متھوں سے ٹکرا رہی تھی۔

میں پلنگ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ تھانی بھی بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے پلنگ کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی مگر گرنے والی چھت کے بوجھ سے پلنگ کی ایک پٹی ٹوٹ گئی تھی جس سے پلنگ نیچے دب گیا تھا اور ہم اس کے نیچے پھنس گئے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ مظہر گھوم گیا جب میں نے ٹائلاں ٹیکل میں عمارت کے لیے کے نیچے دبے ہوئے ایک آدمی کو نکالا تھا۔ وہ میری جی کا کارنامہ تھا اور اس وقت بھی بیٹھنے کے لیے کام لینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر مجھے مشکل پیش نہیں آئی۔ میں نے پلنگ کو اپنے اوپر سے اٹھا کر ایک طرف بیٹھ دیا۔

اور پھر وہ خوفناک حقیقت کھل کر میرے سامنے آگئی۔ کمرے کے دروازے کے باہر تاریخی شعلے اٹھ رہے تھے۔ جو جس میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ غریبوں اور غنتے سے بنے ہوئے اس مکان میں آگ پھیلنے کی توجہ زیادہ نہیں لگے گی۔

میں نے صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک سینکڑ فٹ زیادہ نہیں لگایا۔ جاگنی کے بھی کندھے اور سر پر چوٹ لگی تھی اور وہ کراہ رہی تھی۔ تھانی بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں پلنگ کے نیچے دب گئی تھیں۔ رنگینی تو پوری کی پوری

چھت کے ایک حصے کے نیچے دب گئی تھی۔ میں نے سب سے پہلے لمبا ہٹا کر رنگینی کو کھینچ کر باہر نکالا اور اسی وقت شور اور چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آگ بجھتی جا رہی تھی۔ دروازے کی طرف سے ٹکنا ٹکنا سنیں رہا تھا۔

”جاگنی۔“ میں جاگنی کو اٹھاتے ہوئے بولا ”آگ بجھل رہی ہے۔ دیوار کا یہ حصہ گرنے میں میری مدد کر۔“ دیوار اس طرح ٹوٹ کر گری تھی کہ اس طرف کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ میں نے لکڑی کی ایک ملی ٹوٹ کر آگ کی اور دیوار پر مارنے لگا۔ چند ضرپوں سے وہ حصہ ٹوٹ گیا اور چھت کا باقی حصہ دھڑام سے میرے اوپر آن گرا۔

آگ بجھل رہی تھی اور باہر سے شور کی آوازیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ گلی کے دوسرے مکانوں کے لوگ جمع ہو گئے تھے اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آگ بجھانے کے لیے کہہ رہے تھے۔

شاید دو تین آدمی آگ کے خوف کی پروا کیے بغیر مکان میں گھس آئے تھے۔ ایک آدمی چیخ چیخ کر رنگینی کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ وہ شاید کوئی پڑوسی تھا اور رنگینی کو جانتا تھا۔ آگ خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ میں لمبے کو بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹا رہا تھا۔ دیوار میں اتنا گپ بن گیا تھا کہ ایک آدمی باہر نکل سکے۔ میں نے جاگنی کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ وہ چیخ چیخ کر اس طرف سے لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔

کچھ لوگ دوڑ کر اس طرف آگئے اور دیوار توڑنے لگے۔ وہ کام کم اور شور زیادہ چار رہے تھے۔ میں نے لمبے کے نیچے دب گئی تھانی کو بھی نکال لیا تھا۔ پلنگ کی پٹی ٹوٹنے سے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

باہر سے لوگوں نے دیوار کا کافی حصہ توڑ لیا تھا۔ میں نے تھانی کو دوسرے لوگوں کے حوالے کیا اور رنگینی کی طرف لپکا۔ دھوئیں سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ میں رنگینی سے ابھی کچھ دور ہی تھا کہ دیوار کی لکڑیوں کا جلتا بولہ پورا فریم رنگینی کے اوپر گرا۔ میں نے بڑی تیزی سے جلتی ہوئی بلیاں ایک طرف ہٹائیں اور رنگینی کو ایک طرف گھسیٹنے لگا۔ اسی دوران میں دو آدمی ٹوٹی ہوئی دیوار سے کود کر اندر آگئے اور انہوں نے رنگینی کو سنبھال لیا۔

پہلے رنگینی کو باہر نکالا گیا اور پھر میں بھی باہر نکلیا۔ گلی میں بیسیوں لوگ جمع تھے۔ بہت سے لوگ بالٹیوں سے پانی آگ پر پھینک رہے تھے۔ وہی سب کچھ ہو رہا تھا جو ایسے

مواقع پر ہوتا ہے۔ لوگ بدحواسی کا شکار تھے اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو بدایت دے رہے تھے۔

انگ پھیل گئی تھی اور پڑوس کا ایک مکان بھی اس کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔

رنگولی اور تھانی کو وہاں سے دور ایک مکان کے سامنے چھوٹے سے لان میں ڈال دیا گیا۔ جاگتی بھی ان کے پاس کھڑی تھی۔ بہت سے لوگ ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ ایک دو آدمی چیخ چیخ کر انہیں اسپتال لے جانے کو کہہ رہے تھے اور پھر اسی جگہ کا ایک آدمی گاڑی لے آیا۔ بے ہوش رنگولی اور تھانی کو گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ ایک اور آدمی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے اور جاگتی کو دوسری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ دو آدمی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ گئے تھے اور پھر دونوں گاڑیاں تیزی سے حرکت میں آ گئیں۔

دونوں گاڑیاں گلیوں سے نکل کر سہاٹ روڈ سے ہوتی ہوئی سربانی دے پر آ گئیں۔ کنگ میننگرائے اسٹیجیو والے چوراہے سے اگلی کار تو سٹپا کھٹکے روڈ پر مڑ گئی جبکہ ہماری کار سربانی دے پر سیدھی دوڑتی رہی۔

”وہ گاڑی اس طرف گئی ہے۔ تم کس طرف جا رہے ہو۔“ میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ لوگ اور بروک اسپتال کی طرف گئے ہیں لیکن یہ راستہ ذرا لمبا ہے۔ ہم شارٹ کٹ سے نکلیں گے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ کار سامکون نامی بدھ عبادت گاہوں کے قریب سامکون روڈ پر مڑ گئی تھی۔ اس راستے سے ہم اور بروک اسپتال تو نہیں البتہ مخالف سمت جا رہے تھے۔

”یہ۔۔۔ یہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔ یہ اسپتال کا راستہ تو نہیں ہے۔“ میں نے ایک بار پھر ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”خاموشی سے بیٹھے رہو مسٹر۔“ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی سخت چیز میرے پلو میں جیسے کئی ”اگر کوئی لڑبو کرنے کی کوشش کی تو میں نے سوراخ کدوں گا۔“

میرے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی بھی ہماری طرف مڑ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالتور تھا۔

”ہمیں مکان پر راکٹ برسانے کے بعد چلے جانا چاہیے تھا۔“ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا ”لیکن ہم کوئی

کام ادھورا نہیں چھوڑتے۔ ہماری ماضی کی غلطیوں سے نہ بچتے رہے ہو لیکن اس مرتبہ ہم کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں شبہ تھا کہ تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچا جائے گا۔ اس لیے ہم ایک طویل پیکر کٹ کر واپس آ گئے اور ہائیڈروجن بمیز میں شامل ہو گئے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش رہا پھر ”تم۔۔۔۔۔ واقعی ڈھیٹ اور سخت جان قسم کے لوگ ہیں۔“ میں نے اس مکان پر چار راکٹ مارے تھے۔ مکان اگل کی لپیٹ میں آ گیا تھا مگر اس کے باوجود تم لوگ بچنے نکلے مگر اب تم لوگ گے۔ ان دونوں عورتوں کو تو محلے والے اسپتال لے گئے اور تم لوگ ہمارے ہاتھ لگ گئے۔ بدحواسی میں کسی نے پوچھا بھی نہیں دی ہوگی کہ تم لوگوں کو کون لے گیا تھا۔ تم لوگوں کی تلاش میں شہر کے تمام اسپتال چھان مارے جائیں گے کہ تم لوگوں کا سراغ کسی کو نہیں ملے گا۔“

”تم لوگ کون ہو۔ ہماری تو تم سے کوئی دشمنی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”دشمنی تو تم سے ہماری بھی نہیں ہے۔ ہم تو آپ کے احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”بناک والوں کو تمہارے واپس آنے کی اطلاع اسی منزل گئی تھی جب تم سردار تھا لوگ کے بیٹھے رہے۔ تمہیں فوراً ہی حکم مل گیا تھا کہ تمہارا بندوبست کر دیا جائے۔ میں حکم تو یہ ملا تھا کہ تم لوگوں کو ختم کر دیا جائے لیکن یہ بھی کیا تھا کہ اگر تم زندہ ہاتھ آ جاؤ تو ہمارا معاوضہ دینا ہوگا اور اب یہ ہماری قسمت ہے کہ تم زندہ ہی ہاتھ لگے ہو۔ جس کا مطلب ہے ہمارا معاوضہ ڈیل۔“

”اگر میں تمہیں اس سے بھی ذیل معاوضہ دوں۔“ میں نے کہا۔

”بات نہیں بنے گی۔“ اس نے جواب دیا ”ان سے غدار کی کر کے ہم دشمنی مول نہیں لینا چاہتے۔ تم نے ان سے دینا معاوضہ تو مل جائے گا مگر وہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لیے بات ختم۔ اب تم خاموش بیٹھے رہو۔“ ”اچھا۔ یہ تو بتا دو کہ تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”واٹنگ جائے۔“ اس شخص نے جواب دیا ”یہ جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ دو چار دن وہاں تم لوگوں کو مہمان رکھیں گے اور جب یہ جگہ کچھ سرورجیانے لگے گی تو دونوں کونک والوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔“ اس کے بعد میں نے واقعی کوئی بات نہیں کی۔ سب کچھ سنسنائیں۔ کار اب سامکون روڈ سے اتر کر وائنگ چائے

جائے والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ آگے دریا کا ایک طرف۔ جگہ کی طرح شہر کے اندر نکلا ہوا تھا۔ کار کا رخ اسی طرف تھا۔ آگے ایک موڑ کی وجہ سے کار کی رفتار کم ہو گئی۔ ”روڈ زبے کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے پیلو کیٹا مٹا ہوا کار اور موڑ کھوٹنے کے لیے کار کی رفتار جیسے ہی کم ہوئی جاگتی نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر دنگ لگا دی۔“

”اے۔۔۔۔۔ روک اسے۔“ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی ”جاگتی نے مجھے جیسے ہی ٹوک دیا تھا میں اسی وقت سنبھل گیا اور اس نے جیسے ہی دروازے کو جھٹکا دیا میں نے بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کا ڈھیر دیا۔ پھول کا رخ پچھلی طرف ہو گیا تھا۔ اس شخص نے زبردستی دیا یا بدحواسی میں دب گیا تھا۔ گولی پچھلی دنگ میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ ایک اور جھٹکا دیا۔ اس کا ہاتھ اوپر سے مڑا ہوا سامنے کی طرف آ گیا اور پھول کی ٹال اگلی سیٹ کی پشت سے لگ گئی۔

”اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی تیزی سے پیچھے مڑا تھا مگر اترتے ہی ہوئی کوئی سیٹ میں سوراخ کرتی ہوئی اس کی تھیں پیوست ہو گئی۔ وہ اپنی سیٹ پر اچھلا اور قدرے سن طرف لڑھک گیا۔“

ڈرائیور بھی اسی صورت حال سے بدحواس ہو گیا تھا۔ یہاں وقت سامنے دوسرے موڑ سے ایک گاڑی اسی طرف سے آ رہی تھی۔ اس پر چسکتی ہوئی سرخ اور نیلی فلیش لائٹ ہٹا کر کار کو پولیس کی گاڑی تھی جسے دیکھ کر ڈرائیور کچھ ڈر ہوا ہو گیا تھا۔ کار سڑک پر لہرائے لگی۔

میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے حرف کا ہاتھ نہیں موڑ دیا کہ پھول کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے حرف کا دروازہ کھول دیا اور باہر چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ اس کا ہوا راجم کار سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ نہ ہٹا میں تھا۔ کار سڑک پر لہرا رہی تھی۔ میں نے اس کو پھونک دیا۔

”اگر کوئی طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ سامنے سے آنے والی کار نے بھی اس کا راستہ روک لیا۔ میں نے اپنی پچھلی کار ایک بازو ڈرائیور کے گلے پر لپیٹ دیا۔ کار سڑک پر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ سے ٹکرا گئی۔ مجھے

بھی زوردار جھٹکا لگا تھا۔ ڈرائیور کی گردن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اور ایک طرف دوڑنے لگا۔

اس وقت پولیس کار سے تین کانٹیل پر آمد ہوئے۔ ان میں سے ایک نے چیخ کر ڈرائیور کو روکنے کا حکم دیا اور جب وہ نہیں رکا تو گولی چلا دی۔ ڈرائیور چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ میں بھی کار سے اتر آیا۔ ایک پولیس والے نے مجھے ریوالتور کی زور لے لیا۔

”یہ لوگ ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔“ میں نے کہا اور جلدی جلدی اسے صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں کہا ”میری ساتھی نے اس موڑ پر کار سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ زخمی ہے۔“

پولیس والے نے میرے ساتھ اس طرف دوڑ لگا دی۔ تقریباً پچاس گز پہنچے جاگتی لنگڑاتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔ کار سے چھلانگ لگانے سے اس کے دونوں گھٹنوں پر چوٹ لگی تھی۔

کار سے چھلانگ لگانے والا دوسرا آدمی گلیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ میں جاگتی کو سارا دے کر کار تک لے آیا۔ زخمی ڈرائیور کو ایک پولیس والے نے ریوالتور کی زور لے رکھا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا دوسرا آدمی ختم ہو چکا تھا۔ سیٹ کی پشت سے نکلنے والی گولی پچھلی طرف سے اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھی۔ لاش کو کار ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ ایک پولیس والا مجھ سے جرح کرنے لگا۔

”تم وقت ضائع کر رہے ہو آفسر۔“ میں نے اس کی جرح سے تنک آ کر کہا ”میری دوست زخمی ہے۔ اسے طبی امداد کی ضرورت ہے اور میری ساتھی دو خواتین کو بے ہوش کی حالت میں اور بروک اسپتال بھیجا گیا تھا۔ پانس تین وہ بھی وہاں پہنچ پائی ہیں یا ان کے ساتھ بھی کوئی دھوکا ہوا ہے۔ یہ شخص۔“ میں نے زخمی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا ”اس نے اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ رنگولی کے مکان پر راکٹوں سے حملہ کیا تھا۔ ہم لوگ بچ گئے مگر وہ مکان اب بھی جل رہا ہے۔ تم اپنے بیٹے کو اٹھائے متعلق پولیس اسٹیشن سے اس کی تصدیق کرو۔ مکان پر حملے کی اطلاع پولیس اسٹیشن پہنچ چکی ہوگی۔“ ”کیا نام بتایا تم نے۔ رنگولی۔ یہ وہی مشہور رفاقتو نہیں ہے۔“ پولیس میں نے پوچھا۔

”ہاں وہی۔ ہم اس کے دوست ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کرو آفسر۔ اگر مزید کوئی گڑبڑ ہو گئی تو سہرا تھا لوگ تم لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔“



## ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں

کتابیات پبلی کیشنز اور مکتبہ نفسیات کی  
کتب کے بول سیل ڈسٹری بیوٹر

## شاملہ پک ایجنسی

ہماری تمام کتب کے حصول کیلئے ان سے  
رابطہ کریں۔

آپ کے آرڈر کی فوری تعمیل کرتے ہوئے،  
کتب، آپ کی دکان پر پہنچائی جائیں گی۔



## شاملہ پک ایجنسی

دربار بابا بجلی شاہ اسٹریٹ،  
چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

فون 515011

موبائل 0300-4291286

اور چند منٹ مزید باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا اور کمرے  
میں بکڑھائی اور جاگتی کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔  
تھائی ہوشنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی البتہ جاگتی  
اس سے اچھی طرح واقف تھی۔

”تو وہ حراذہ بنگا ک بھی پہنچ گئی۔“ جاگتی نے کہا ”ہم  
وٹ تو لاؤں میں بھٹکتے رہے۔ وہ لوگ یقیناً ہم سے پہلے  
بنگہ پہنچ گئے ہوں گے اور ہمارے آنے سے پہلے انہوں  
نے ہمارے استقبال کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔“

”اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں  
دارائے میاں آکر ہاتھ پیر کالی پھیلا دیے ہیں لیکن اب میں  
انہیں زیادہ پھینکنے کا موقع نہیں دوں گا۔“

”صحیح صورت حال کا اندازہ تو وہاں پہنچ کر ہی ہوگا۔“  
جاگتی نے کہا۔

ہم دیر تک بی باتیں کرتے رہے۔ میگا تیراؤنے جس  
طرح شاؤلن نیپل تک میرا چپچہا کیا تھا اور جس طرح وہ مجھ  
سے پہلے بنگا پہنچ گیا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ  
جنرل گھوڑا مجھے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کا ارادہ نہیں  
رکھتا۔ اس نے شاید طے کر لیا تھا کہ دنیا کے آخری سرے  
تک اور زندگی کے آخری لمحوں تک میرا پیچھا کرے گا۔ میں  
ناتوا ہلا ٹھٹھ تھا جس نے گولڈن ٹرائی اسٹیکل میں گھس کر  
اسے گولڈن ڈالر کا نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے اس کی نہ  
صرف بیرونی کی ایک جدید ترین لیبارٹری تباہ کی تھی بلکہ اس  
کے کئی آدمی بھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ہمارے  
فرار کے دوران میں اسے اپنے ایک بلی کا پیرتے بھی ہاتھ  
دھونے پڑے تھے۔ اس طرح میں اس کا دشمن نمبر ایک بن  
لیا تھا اور وہ مجھے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے تین بجے کھایا۔ اس وقت میں نے  
سردار تھالوب کو ماسٹر ہوچن کی کال کے بارے میں بتا دیا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سردار تھالوب نے کہا ”ہم  
سنہ چہانگ سامین سے ان کے قدم اکھاڑے ہیں تو بنگا  
میں بھی انہیں نہیں نکلے دیں گے۔ بس دو چار دن کی بات اور  
”سنہ“

سردار تھالوب کو ہوشنگ اور میگا تیراؤ کے بارے میں  
تفصیل نہیں تھی۔ میں نے ان دونوں کے بارے میں اسے  
تفصیل سے بتا دیا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تھالوب نے کہا۔  
کھانے کے بعد تھالوب فوراً ہی رنگولی کے کمرے میں  
پلایا۔ وہ کھانے پر نہیں آئی تھی۔ سردار تھالوب جس طرح

ناشتا کرنے کے فوراً ہی بعد وہ کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔  
تھالوب کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا پھر وہ بھی لیٹ کر کمرے  
میں چلا گیا۔ ہم بھی اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھنے  
تھائی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر بعد  
اوتھینے لگی۔ جاگتی بھی اس کے قریب ہی ٹانگیں پھیلا کر لیٹ  
ہوئی تھی۔ اس کی ایک کہنی اور دونوں گھٹنوں پر بیڈ پر  
گھٹنوں کے زخموں کی وجہ سے اس نے پیٹ کے بجائے غر  
پہن رکھی تھی جو گھٹنوں سے مت اور تھی۔  
تقریباً دو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو میں نے کال  
روم میں آکر کال ریسیو کی۔ وہ بنگا سے ماسٹر ہوچن کی کال  
تھی۔

”میں ماسٹر ہوچن کیا رہا؟“ میں نے پوچھا۔  
”گور ہو گئی لٹل ماسٹر۔“ ماسٹر ہوچن نے جواب دیا

”میں نے تمہاری طرف سے اطلاع ملنے کے بعد ایک گئے  
کے اندر اندر ڈی جے کلب پر ریڈ کیا تھا لیکن جنگ جی کوئی  
شاید چہانگ رائے میں اپنے آدمیوں کے مارے اور پلے  
جانے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ ہمارے وہاں پہنچے سے پہلے  
ہی غائب ہو گیا۔ البتہ ہوشنگ نام کی ایک چینی لڑکیاں ہمارے  
ہاتھ لگی ہے۔ جس نے کچھ اور سنسنی خیز اگشتات کیے  
ہیں۔“

”ہوشنگ!“ میرا دماغ بھٹک سے اڑ گیا۔ ہوشنگ وہی  
لڑکی تھی جس نے شاؤلن نیپل میں مجھے دھوکے سے اڑا  
کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر ایک ویرانے میں میگا تیراؤ  
کے ساتھ فرار ہو گئی تھی لیکن ممکن ہے ڈی جے کلب سے  
پکڑے جانے والی ہوشنگ نام کی یہ لڑکی کوئی اور ہو۔ میں نے  
تصدیق کرنے کے لیے پوچھا ”کیا اس لڑکی کا شاؤلن نیپل  
سے جہی کوئی تعلق رہا ہے؟“

”میں لٹل ماسٹر۔“ ماسٹر ہوچن نے جواب دیا ”یہ  
لڑکی ہے جس نے شاؤلن نیپل میں تمہیں دھوکے سے اڑا  
کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اور بھی بہت سی باتیں  
بتائی ہیں۔ میگا نام کا اس کا ایک اور ساتھی بھی یہاں  
تھا۔ وہ بھی جنگ جی کے ساتھ غائب ہو چکا ہے۔“  
”اوہ۔“ میں نے کہا ”ہوشنگ بہت خطرناک لڑکی ہے  
ماسٹر۔ اس کا خیال رکھنا۔ اس سے ہمیں بہت کچھ سیکھ  
ہو سکتا ہے۔“

”اس کی تم فکر مت کرو لٹل ماسٹر۔“ ہوچن نے جواب دیا  
”تم کب تک یہاں آ رہے ہو؟“  
”میں کل یا پھر سوں پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا

میں بھی ان کے خیال سے متفق تھا۔ اب یہاں میرا بھی  
دل نہیں لگ رہا تھا۔ بنگا میں بھی اگرچہ ہمارا کوئی ایسا  
مستقل ٹھکانا نہیں تھا جسے لگہ لگا جاسکتا مگر میں اسے ہوم سک  
ہی کہوں گا کہ جہاں ہماری زندگیوں کا بیشتر حصہ گزرا تھا۔ اب  
وہ جگہ ہمیں بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی۔

ہم ابھی باہیں کمرے رہتے تھے کہ کامن روم سے ٹیلی فون  
کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ماسٹر  
ہوچن نے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا تھا اور ابھی آدھا  
گھنٹا ہی ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سردار تھالوب کے لیے  
کال ہوگی۔ اس لیے میں اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھا رہا۔  
سردار تھالوب نے اپنے کمرے سے نکل کر کال ریسیو  
کر لی اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد اس نے مجھے آواز دے کر  
بلایا۔

”مہاراج تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے  
ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ریسیور لے لیا۔ پانچ منٹ کی گفتگو کے دوران  
میں سردار تھالوب سے مہاراج نے بہت کچھ معلوم کر لیا ہوگا  
لیکن وہ میری زبان سے بھی کچھ سننا چاہتے تھے۔ میں تقریباً  
پندرہ منٹ تک مہاراج سے باتیں کر رہا رہا۔ سب سے پہلے  
انہوں نے ہماری خیریت دریافت کی اور پھر مجھے گزشتہ رات  
کے واقعات کی تفصیل دہرائی پڑی۔

”وہاں اگر کوئی گزرتا نہیں ہے تو تم لوگ بنگا آجاؤ۔  
تاکہ یہاں تم لوگوں کا بہتر علاج اور دیکھ بھال ہو سکے۔“  
مہاراج نے کہا۔

”سردار تھالوب کی وجہ سے یہاں ہمیں کوئی پریشانی  
نہیں ہے لیکن ہم سوچ رہے ہیں کہ کل یا زیادہ سے زیادہ  
پرسوں بنگا آجائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ جو تم مناسب سمجھو اور میری طرف سے  
تھائی، جاگتی اور رنگولی کو پوچھنا اور اب تم ریسیور تھالوب کو  
دے دو۔“ مہاراج نے کہا۔

میں نے ریسیور سردار تھالوب کو دے دیا۔ تھالوب  
تقریباً پانچ منٹ تک مہاراج سے باتیں کر رہا رہا۔ وہ مہاراج کو  
تسلیم دے رہا تھا کہ ہمارے لیے پریشان نہ ہوں۔ ایک دو دن  
آرام کرنے کے بعد وہ خود ہمیں بنگا لے آئے گا۔

اس کے ٹھوڑی ہی دیر بعد ملازم نے بتایا کہ میزبان  
لگا دیا گیا ہے۔ ہم سب ڈائننگ ہال میں آگئے۔ رنگولی بھی  
آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں تک آئی تھی۔ یوں تو ہم سب کو  
چو نہیں لگی تھیں مگر رنگولی سب سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔

رنگولی کے پنگ کی پٹی سے لگا بیٹھا۔ تھا اور جس طرح اس کی ناز برداری کر رہا تھا اس سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ رنگولی کو کس قدر چاہتا ہے۔

اس رات کھانے کے بعد میں جا چکی اور تھائی بھی ان کے کمرے میں آگئے اور ہم نے ان دونوں کو گھیر لیا۔  
”مجھے تم لوگوں کی نیت کچھ اچھی نہیں لگ رہی۔“  
سردار تھالوب نے مسکراتے ہوئے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔

”ہاں تھالوب۔“ تھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا  
”آج ہم نے ملے کر لیا ہے کہ کوئی فیصلہ کر کے ہی یہاں سے انہیں گئے؟“

”کیسا فیصلہ؟“ تھالوب بولا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ غالباً ہماری باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کہنے والے ہیں۔  
”اب وقت آگیا ہے کہ تم دونوں میں جو تھوڑا بہت فاصلہ ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔“ میں نے کہا ”میرا مطلب ہے اب تم دونوں کو شادی کرنی چاہیے۔“  
”کیا یہ کافی نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر زندہ ہیں۔“ سردار تھالوب نے کہا۔

”اگر تم دونوں میں سے ایک مثل گیا تو حسرتیں بھی ساتھ ہی دفن ہو جائیں گی۔“ تھائی نے کہا ”اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں۔“  
”تھائی۔“ رنگولی نے اسے ٹوک دیا۔ وہ کچھ کتنا چاہتی تھی مگر تھائی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔  
”تم چپ رہو۔“ تھائی نے اسے ڈانٹ دیا ”جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹے نہیں بولتے۔“

تھائی کی اس بات پر سب ہی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔  
”اگر رنگولی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں۔“  
”اعتراض۔“ جا چکی نے اس کی بات کاٹ دی ”ارے اس کے دل میں تو توند پھوٹ رہے ہیں۔ بس تم یہ بتاؤ کہ تم دونوں ایک کب ہو رہے ہو۔“

تھالوب چند لمحوں کے رنگولی کی طرف دیکھتا رہا پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔

”بنکاک والا معاملہ تو چلتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ طول بھی کھینچ جائے لیکن ہم تم دونوں کو صرف ایک ہفتے کی مہلت دے رہے ہیں۔ صرف ایک ہفتہ۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس وقت تک رنگولی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ تم بھی

اپنے قبیلے والوں کو بتا دو۔ یہ شادی چینگک سامین میں ہوگی اور تمہارے قبیلے کی رسم و رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے ہوگی۔“

سردار تھالوب کے خیال میں ایک ہفتے کی مہلت بہت کم تھی۔ بہر حال یہ مہلت دو ہفتے کر دی گئی۔ ہم ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ بیڈ سائیز ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تھالوب نے رسیور اٹھالیا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد رسیور میری طرف بڑھا دیا۔

”تمہاری کال ہے۔“  
میں نے رسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بنکاک سے ماسٹر ہو چن کی کال تھی۔ اس نے جو اطلاع دی وہ خاصی تشویش ناک تھی۔

”ہوشنگ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ شدید زخمی ہے اور بے ہوش پڑی ہے۔“  
”کیا ہوا؟“ میں جلدی سے بولا ”وہ تو تم لوگوں کی تحویل میں تھی۔ اس پر حملہ کیسے ہوا؟“

”ان لوگوں کو شاید ہمارے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا تھا۔“ ماسٹر ہو چن نے جواب دیا ”اس ٹھکانے پر ہمارے صرف دو آدمی تھے۔ حملہ ہوا تو انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حملہ آور یقیناً چنگک جی یا دارا کے آدمی تھے۔ وہ لوگ ہوشنگ کو لے جانا چاہتے تھے لیکن ہمارے آدمیوں کی مزاحمت کے باعث وہ اپنے اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہو سکے تاہم فائرنگ میں اسے دو گولیاں لگی ہیں۔ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس حملے میں ہمارا آدمی مارا گیا ہے اور دوسرا معمولی زخمی ہوا ہے۔“

”ہوشنگ کہاں ہے۔ اسپتال میں یا۔“  
”اسے دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ دو ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ماسٹر ہو چن نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ماسٹر۔ میں کل بنکاک پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”روانگی سے پہلے اطلاع دے دیتا۔“ ہو چن نے کہا۔  
”ٹھیک ہے۔ میں فون کر دوں گا۔“ میں نے کہتے ہوئے رسیور رکھ دیا اور تھالوب اور تھائی وغیرہ کو صورتحال سے آگاہ کرنے لگا پھر میں نے تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں کل صبح جہاز پر ٹھیک مل سکیں؟“  
”کیوں نہیں۔“ سردار تھالوب نے کہا ”میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔“ اس نے فون اٹھا کر اپنے سامنے رکھ

لیا اور نہر ملانے لگا۔  
وہ کئی منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر رسیور رکھتے ہوئے بولا ”صبح دس بجے والی فلائٹ سے تم تینوں کی سیٹوں کا بندوبست ہو گیا ہے۔ دو تین دن بعد میں بھی پہنچ جاؤں گا۔“

اس کے بعد بھی ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن موضوع بدل گیا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہم وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئے۔

صبح نو بجے کے قریب ہم ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ سردار تھالوب ہمارے ساتھ تھا۔ وہ رن وے پر جہاز کی پریڈیون تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ ماسٹر ہو چن کو روانگی کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔

”تم فکرت کرو۔“ تھالوب نے میری بات کے جواب میں کہا ”میں یہاں سے لاؤنچ میں پہنچنے ہی فون کر دوں گا۔ میں اپنے آدمیوں کو بھی اطلاع دے دوں گا وہ گاڑی لے کر ایئر پورٹ پہنچ جائیں گے۔ اگر ماسٹر ہو چن کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا تو میرے آدمی تم لوگوں کو پہنچا دیں گے۔“

سردار تھالوب رخصت ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد جب ہمارے ٹیک آف کیا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ رہی تھی۔ ایک سال پہلے ہم یہی کہتے تھے۔ میں تھائی اور جا چکی۔ ہم نے بیڈو اور دارا کو کتنی کاناچ بچا رکھا تھا اور اب بھی ہم تینوں ٹی کے تھے لیکن اب ہماری یہ ٹیم ننگرے لولوں پر مشتمل تھی۔ ایک ٹھکانا چنگک منٹ کا راستہ تھا۔ جہاز نے چینگک رائے ایئر پورٹ سے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا تھا اور مقررہ وقت پر بنکاک ایئر پورٹ پر لینڈ کیا۔

میرا خیال تھا کہ ماسٹر ہو چن یا اس کا کوئی نہ کوئی آدمی ہمیں لینے کے لیے ایئر پورٹ پر موجود ہو گا لیکن کوئی ایسا چہرہ اٹھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک ذہنی تیز قدم اٹھا آیا تو ہمارے قریب پہنچ گیا۔

”مسٹر ورجن۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مڑ دیا۔  
”میں فون پر آپ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ آئیے گاڑی اس طرف کھڑی ہے۔“

سردار تھالوب نے اپنے آدمیوں کو بھی فون پر اطلاع دے دی تھی۔ میں نے ماسٹر ہو چن یا اس کے آدمیوں کا انتظار کرنے کے بجائے اسی آدمی کے ساتھ جانے کا فیصلہ لیا۔ میرے ہاتھ میں ایک تھا جو اس شخص نے لے لیا۔  
”ہم رنزل سے نکل کر پارکنگ میں آگئے۔ پارکنگ کے قریب میں نیلے رنگ کی ایک اسٹیشن دیکھ کر کھڑی تھی۔

اسٹیشنرنگ کے سامنے ڈرائیور بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے شخص نے بیک وین کی چھت پر رکھ کر دروازہ کھول دیا۔ پہلے جا چکی اندر بیٹھی پھر تھائی اور آخر میں میں اندر داخل ہوا۔ میں پوری طرح سیٹ پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پچھلی سیٹوں اور ڈرائیور کی سیٹ کے درمیان لوہے کا جنگلا دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ شیشے رنگین اور دن وے تھے۔ اندر سے تو بارہ دیکھا جاسکتا تھا مگر باہر سے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا اور پھر دونوں طرف کے دروازوں پر نظر پڑتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اندر کی طرف سے دونوں دروازوں کے پنڈل غائب تھے۔

ہمیں اپنے ساتھ لانے والا آدمی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہماری طرف رخ کر کے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔

”تم میں سے کسی کے منہ سے آواز نہیں نکلی چاہیے۔“ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی ”یہ پستول شور مچانا پسند نہیں کرتا۔ کسی نے شور مچانے کی کوشش کی تو یہ خاموشی سے تم لوگوں کا خاتمہ کر دے گا۔“

جا چکی اور تھائی کو بھی صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ ان دونوں کے چہروں پر ہواکیاں سی اڑنے لگیں۔ میں نے ایک خاموش گہرا سانس لیتے ہوئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ہم واقعی چوبہ دان میں پھنس گئے تھے۔

دیکھ کر ایک جھنجھٹے سے حرکت میں آئی اور پارکنگ سے نکل کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ اس صورت میں کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہم واقعی بچرے میں بند تھے۔ دن کے دونوں دروازوں کے پنڈل اندر سے غائب تھے۔ آگے لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا جس کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں سائینسز لگا ہوا پستول تھا۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اگر ہم کچھ کرنا بھی چاہتے تو اس شخص کی وجہ سے ہماری کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

بنکاک ایئر پورٹ کو اس خطے کا مصروف ترین ایئر پورٹ کہا جاسکتا ہے۔ مختلف فلائٹس کی آمد و رفت کی وجہ سے ایئر پورٹ کے سامنے خاصا ترافیک تھا۔ وین ایئر پورٹ کی حدود سے نکل کر چاہوں تو پچھن روڈ پر نکل آتی جو گزنی میموریل والے چوراہے سے ہوتی ہوئی اندرون شہر تک چلی گئی تھی۔ وین کی رفتار خاصی تیز تھی لیکن سو سنی سان روڈ کے چوراہے پر سکنل بند ہونے کی وجہ سے وین رک گئی۔ اس

ڈرائیور نے جیک لگا کر پہلے برسٹ شدہ ٹائر نکالا اور پھر

حسن مین نے فائزنگ اگرچہ بدحواسی میں لپکتی ہوئی چلائی ہوئی ایک گولی ماسٹر ہو چن کے ایک ساسھی کے  
میں لگی۔ وہ چیخا ہوا لڑکھڑکیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا ہوا  
بھی ہوا میں اڑتا ہوا اور جاگرا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے

محکمہ خیال میں ان لوگوں کو کسی طرح چاہیے تھا کہ انہوں نے ہمارے بچے میں بٹائی ہوئی کھرااس کے لیے بھی باقاعدہ پلاننگ کی تھی۔ ایک دین میں ہمیں انو کیا گیا تھہ نیر ایک اور کار کو اس دین کے پیچھے رکھا تھا تاکہ کسی

دوسری کار سے چلائی جانے والی ایک گولی دین کے پچھلے فینڈر پر لگی۔ میرے لیے فائر کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرے خیال میں جاگنی اور تھائی کا وین میں رہنا مناسب نہیں تھا۔ وین کی پٹرول کی پینک اسٹی اس طرف تھی جس طرف سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ اگر کوئی گولی ہینکلی برگ کی تو ہم تینوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں



بچ سکتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

ہماری دین فٹ ہاتھ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس سے آگے کشادہ سروس روڈ تھی جس کے دوسری طرف بلند عمارتیں تھیں جن کے نیچے دکانیں تھیں ان میں کئی بڑے بڑے پراسنورز بھی تھے لیکن فائرنگ شروع ہوتے ہی دکانیں دھوا دھبہ ہونے لگی تھیں اور اب دور دور تک کوئی بھی دکان کھلی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی البتہ سروس لین کے دونوں طرف متعدد گاڑیاں کھڑی تھیں۔

”تھائی۔ جاگلی۔ نیچے اترو۔ ہری اپ!“ میں نے دین کے دروازے کے سامنے آتے ہوئے جھج کر کہا۔

وہ دونوں جھک کر دین سے باہر آ گئی تھیں۔ ہم تینوں فٹ ہاتھ پر دوڑتے ہوئے سروس روڈ پر آ گئے۔ ہمارا بیک وین کی چست پر رکھا ہوا تھا لیکن اس وقت بیک اٹھانے کا ہوش کے تھا اور پھر اس میں کوئی قیمتی چیز بھی نہیں تھی۔ صرف ہم تینوں کے کپڑے ہی تھے۔

ماسٹر ہوجن نے ہمیں دین سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہم تینوں سروس روڈ پر کھڑی ہوئی کاروں کی آڑ لیتے ہوئے ایک طرف دوڑتے رہے۔ جاگلی کی ٹانگوں میں اگرچہ تکلیف تھی مگر جب جان پر ہنی ہو تو اس قسم کی معمولی تکالیف خود بخود نظر انداز ہو جاتی ہیں۔

میں نے ایک لمحے کو رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر دکانوں کے درمیان ایک کشادہ گلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم اس گلی کے موڑ پر پہنچے ہی تھے کہ فضا کان بھاڑ دینے والے ایک زور دار دھماکے سے گونج اٹھی۔ ہم تینوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ کوئی گولی دین کے پیٹریول ٹینک میں گئی تھی۔ دین کے پرچے اڑ گئے۔ آگ اور گاڑی دھوئیں کا ایک بہت بڑا گولا اوپر کھڑے ہوا تھا۔ گلی کے موڑ پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ دھماکا ہوتے ہی وہ بھی گلی کے اندر کی طرف دوڑ پڑے۔

جب ہم دین سے اتر کر اس طرف آئے تھے تو بہت سے لوگوں نے ہمیں دیکھا تھا لیکن اب وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بھی ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

یہ براہ راست علاقہ تھا۔ فائرنگ سے پہلے تو بھگدڑ مچی پھر سناٹا چھا گیا۔ میں جاگلی اور تھائی کے ساتھ پہلے تو دوڑا رہا پھر ہم ایک جگہ رک گئے۔ ہم وہاں سے کلاں دور نکل آئے تھے۔ اس طرف دکانیں وغیرہ کھلی ہوئی تھیں اور رونق بھی نظر آ رہی تھی۔

دوڑتے ہوئے جاگلی اور تھائی کے سانس بھول گئے تھے مگر ہم وہاں صرف دو منٹ کے اور تیر تیز چلے ہوئے ایک اور کشادہ گلی میں مڑ گئے۔ اس گلی میں بھی دکانیں تھیں۔ اس طرف پہنچ کر معلوم ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہر جگہ معمول کے مطابق تھی۔

تقریباً سو گز آگے یہ گلی ایک بڑی سڑک سے جا ملے۔ یہاں بڑے بڑے شاپنگ مالز اور پراسنورز تھے۔ میں ٹانگ میں ہمت نہ کھوایا تھا اور یوں ہی واپس آیا تھا اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی مگر جاگلی اور تھائی تو اس شر کے چپے چپے سے واقف تھیں۔ تھائی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بتایا کہ یہ دگ نام روڈ ہے۔ ہم یہاں سے چائنا ٹاؤن یا کسی بھی طرف جا سکتے تھے۔

ہم تینوں نیکی اسٹینز کی طرف چلے گئے ابھی چوڑی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے سے آنے والی ایک کار ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ماسٹر ہوجن کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ پچھلی سیٹ پر اس کا ایک ساتھی تھا جس نے اس شخص کو دبوچ رکھا تھا جس نے دین میں ہمیں پستول کی زد پر لیے رکھا تھا۔

”کار میں بیٹھو۔ جلدی کرو۔“ ماسٹر ہوجن نے کھڑی سے گردن نکال کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھائی اور جاگلی اگلی سیٹ پر ایک دوسرے میں پھنس کر بیٹھ گئیں اور میں پچھلی سیٹ پر آیا۔ اس طرح وہ قیدی میرے اور ماسٹر ہوجن کے آویں گئے۔ پچھلے بیٹھنے والے کرہ گیا۔ میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ قیدی کی ٹانگ زخمی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کار دوگ نام روڈ سے یو تھی روڈ اور وہاں سے راماسکر روڈ کی طرف مڑ کر تیزی سے دوڑنے لگی۔ ”اچھا ہوا تم لوگ مل گئے ورنہ ہم پریشان ہوتے رہتے۔“ ماسٹر ہوجن نے سامنے گئے ہوئے آئینے میں میرا طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے ماسٹر۔ وہ شاید زخمی ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔“ ہوجن نے کار ایک اور سڑک پر موڑتے ہوئے جواب دیا۔

”پولیس!“ میں چونک گیا۔ ”سائرن کی آوازیں تم نے بھی سنی ہوں گی۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”تڑنک جام ہو جانے کی وجہ سے پولیس گاڑی کو تو آگے آنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن پولیس

اے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے اس حرا کی کو تو ہم نے اپنی گاڑی میں ڈال لیا تھا۔“ اس نے قیدی کی طرف اشارہ کیا ”مگر دوسری کار تک آنے کا موقع نہیں مل سکا۔ پولیس کی ایک گولی اس کی ٹانگ میں گئی تھی جس وجہ سے وہ بڑبڑکتے ہیں کاسیاب نہیں ہو سکا۔ اگر ہم اس کا انتظار کرتے تو ہم بھی یا تو مارے جاتے یا دھر لیے جاتے اس لیے میں اس کے بغیر ہی وہاں سے بھاگنا پڑا۔“

”اور میرا خیال ہے دوسری کار والے بھی بھاگ گئے ہیں گے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“ ہوجن نے جواب دیا ”فائرنگ کرنے والا پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ڈرائیور نے کار بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر ایک گولی سے اس کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ پولیس نے ڈرائیور کو بھی گرفت میں لے لیا ہوگا۔“

”تم لوگوں کو ان پورٹ پیچھے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی اور پھر یہ کیسے پتا چلا کہ ہم اس دین میں ہیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”تقریباً ایک گھنٹہ پہلے سردار تھالوب نے فون پر اطلاع دی تھی کہ تم لوگ اس فلائٹ سے روانہ ہو چکے ہو۔ اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم ان پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے لیکن راستے میں کار کا اگلا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ یہ قیمت تھا کہ

ان کی اس اسٹیشن موجود تھی تاہم تبدیل کرنے میں چند منٹ لگ گئے اور بعد ان پورٹ پہنچنے کو پتا چلا کہ فلائٹ آجکی ہے اور بیشتر مسافر جا چکے ہیں۔ تم لوگ نظر نہیں آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ اتفاق سے ایک پرائیڈر ٹول گیا۔ اس نے تم لوگوں کو دیکھ کر تم کی اس دین میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ

”اچھا۔ اسے بھی شر کی طرف آتا تھا۔ مجھے بھی کسی گڑبڑ کا شائبہ نہ ہوا تھا۔“ میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ ”میرا خیال تھا کہ وہ دین ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔ اس نے میں کو تیزی سے دوڑا تاہم ابھی پچھلے سڑک پر پہنچا تو وہ دین دیکھ لی۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا

”یوگ۔“ میں نے کہا ”وہ زخمی ہے اور پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ کیا اس طرح مزید گڑبڑ نہیں ہو جائے گی۔“

”اس نے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”وہ ایک کار ایک اور سڑک پر موڑ دی۔“

”میرا خیال تھا کہ ماسٹر ہوجن ہمیں اپنے جنازیم یا واٹ میں لے جانے کا گھر کار پر اتنا دم نہ سڑک میں پھٹ پوری ہو کر چھوٹا تھا۔“ روڈ پر پہنچی اور ہوٹل ایشیا کے سامنے پہنچی ہوئی ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ میں خاموش بیٹھا ہر

دیکھتا رہا۔ ساتھ بیٹھا ہوا آدمی ایک دو بار کسمایا تھا لیکن ایک طرف سے میں نے دباؤ ڈالے رکھا اور دوسری طرف سے ماسٹر ہوجن کے آدمی نے۔

کار ایک اور کشادہ گلی میں گھوم گئی۔ اس گلی میں دونوں طرف بڑے بڑے بنگلے تھے کار گلی کے وسط میں ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ماسٹر ہوجن نے صرف ایک عرصہ بارن بجایا تھا۔ گٹ فوراً ہی کھل گیا۔ ہوجن نے کار اندر لے جا کر پورچ میں روک دی جہاں پہلے ہی ایک کار کھڑی تھی۔

کار رکتے ہی سب سے پہلے تھائی اور جاگلی نیچے اترتی تھیں۔ ماسٹر ہوجن نے انجن بند کر دیا اور پیچھے مڑ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اسے اندر لے جا کر یہ خانے میں پہنچا دو۔ اگر یہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو گولی مار دیتا۔“

میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اسی دوران میں ایک آدمی پر آمدے والے دروازے سے نکل کر سامنے آچکا تھا۔ اس نے اسٹون واشڈرینز کی پیٹ اور ڈینیم کی نیلی ٹرٹ پین رکھی تھی۔ وہ دریاے قد کا قدرے بھاری بھر کم آدمی تھا۔ بال قریب سے ترشے ہوئے اور بائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ چالیس اور پینتالیس کے درمیان لگایا جا سکتا تھا۔ چہرے کے نشانات میں نری تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک شریف آدمی ہی لگتا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر پہلے ماسٹر ہوجن اور پھر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر فوراً ہی قیدی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”یہ کون ہے؟“ ”ابھی تک ہم نے اس کا نام یا حدود اربعہ معلوم نہیں کیا لیکن اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے ان پورٹ سے ملش ماسٹر کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔“ ماسٹر ہوجن نے بتایا۔

”اس کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”ایک پولیس کے ہاتھوں مارا گیا اور دو زخمی ہو کر پولیس کی گرفت میں آ گئے۔ یہ ہمارے ہاتھ لگ گیا۔ اب یہ ہمیں بتائے گا کہ اس نے کس کے کہنے پر ملش ماسٹر کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ شخص ماسٹر ہوجن کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تو ان اسے نیچے پہنچا دو۔ کچھ دیر بعد اس سے معلوم کرتے ہیں کہ یہ کون ہے اور کس کے لیے کام کر رہا

ہے۔

قیدی کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ توران اسے دھکے دیتا ہوا برآمدے والے دروازے میں داخل ہو گیا۔ تھائی اور جاگی بھی برآمدے میں آچکی تھیں اور پھر اسی وقت ماسٹر ہوجن نے اس شخص سے ہمارا تعارف کرایا۔

وہ چندا روہن تھا۔ ہمارا راج کا ایک برائا شاگرد اور رتا کوسن کا قریبی عزیز۔ وہ اسپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس سے وابستہ تھا اور یہ بنگلہ اسی کا تھا۔ ماسٹر ہوچہ جس طرح براہ راست ہمیں یہاں لے کر آیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پروگرام پہلے سے طے تھا کہ ہمیں یہاں لایا جائے گا۔

چند ا روہن ہمیں کامن روم میں لے آیا۔ یہ وسیع و عریض کمرہ شان دار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ روہن نے خادمہ کو بلا کر کافی کے لیے کہا اور ماسٹر ہوچن سے ہمارے ساتھ پیش آنے والے واقفے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے کہ چینگ رائے میں ان کا کوئی آدمی موجود تھا جو ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ ان کے ایئر پورٹ پر جتنی پتے اس نے بنناک والوں کو اطلاع دے دی اور وہ ایئر پورٹ پہنچ گئے اور ان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا۔“ چندا روہن نے ماسٹر ہوچن کے خاموش ہونے پر کہا۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس کے کہنے پر ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟“ تھائی نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”مثل ماسٹر کے اڑی وشمون کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“ چندا روہن نے کہا ”دارا اور اس کے ساتھی بنناک میں ہیں لیکن اس مرتبہ وہ خود پس منظر میں ہے۔ اس نے کچھ اور لوگوں کو آگے کر رکھا ہے جن میں چنگ چی سرپرست ہے لیکن کچھ اور نام بھی سامنے آئے ہیں اور یہ نام بھی پہلی مرتبہ سے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا تھا تھا۔“

”مثلاً کون سے نام؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہوشنگ۔ جو اس وقت ہماری قید میں ہے۔“ اُس نے بتایا اس کے علاوہ میگا اور تان منہ کے نام ہمارے لیے

نئے ہیں۔“

”تان منہ۔“ میں اچھل پڑا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی متحیر ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے!“

چند ا روہن نے باری باری ہانڈ طرف دیکھا ”یہ نام سر کرتم دونوں چوٹ کیوں گئے ہنٹے ہو انہیں؟“

”میکا تیرا؟“ جنرل کھورٹ کا آدمی ہے جس نے تھائی نیپل تک میرا پیچھا کیا تھا اور ہوشنگ اس کی ساتھی سہ میں نے جواب دیا ”اور تان منہ لاؤس کا ایک ریکس سہ تھائی کا پیچھا کرتا ہوا چینگ سائین تک پہنچ گیا تھا اور کچھ حیرت ہے وہ بنگا بھی پہنچ گیا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ چندا روہن نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا ”تھائی تو تمہارے ساتھ تھی۔ لاؤس کے کسی ریکس سے اس کا کیا تعلق؟“

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر اسے تھائی کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا۔

”چینگ سائین سے اٹھارہ میل دور ایک قلم بازار میں اس سے سامنا ہو گیا تھا۔ اس تصادم میں ایک کورٹ کے ہاتھوں اس کا ساتھی مارا گیا اور اسے ہم نے وارنٹ دے کر بھاگ دیا اور یہ میری غلطی تھی۔ اسے جانے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”یہ واقعی تمہاری غلطی تھی۔“ چندا روہن نے کہا ”اس قسم کے لوگ کورٹ سے زیادہ خطرہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تو پہلے موقع پر ہی سرچل دینا چاہیے۔ ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی جائے تو بعد میں خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ بہر حال۔“ وہ مگر سانس لیتے ہوئے بولا ”اسے بھی ہم قتل کر لیں گے۔“

اسی دوران میں خادمہ کافی لے کر آگئی۔ ماسٹر ہوچن اپنے کپ لے کر دوسری سیٹ پر جا بیٹھا جہاں قریب ہی اسٹینڈ نیپل فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے کپ صونے کے سامنے بیٹھ نیپل پر رکھ دیا اور فون کا ریسپورڈ اٹھا کر غبر ملانے لگا۔ تقریباً دس منٹ تک وہ فون پر بات کرتا رہا پھر ریسپورڈ رکھ دیا اور دوبارہ ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ہم میگا اور تان منہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

”دونوں پہلے تمہاری اطلاع پر ہوجن نے ڈی جے ہنٹ کلب پر ریڈ کیا تھا۔“ چندا روہن کہہ رہا تھا ”ہوشنگ تھائی تو ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی مگر چنگ چی اپنے دو آدمیوں کے ساتھ فرار ہو گیا تھا۔ ان میں ایک میگا تیراؤ کا نام بھی تھا۔“

”میکا تیراؤ جنرل کھورٹ کا آدمی ہے جو میرا ہنڈ کرتا ہوا شاؤلن نیپل تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے کئی آدمی

ہم پر بھیجے لگایا تھا مگر سب بتدریج ختم ہوتے گئے۔ ہوشنگ بھی اسی کی ساتھی ہے جس کے ذریعے اس نے مجھے ڈاکر نے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ فرار ہو گیا۔ میں چند لوگوں کو خاموش ہوا اور تھکیل سے شاؤلن نیپل کے واقعات کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں نے پوچھا۔

”ہوشنگ کہاں ہے؟“

”اس کو مٹی کے ڈھانے میں۔“ چندا روہن نے کہا ”انی لوچر اس سے تمہاری ملاقات کراتے ہیں۔“

کافی چیتے ہوئے میں نے کئی بار جاگی اور تھائی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دونوں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھیں۔ وہ ایڈن چینگ رائے میں ایک سنگین حادثے سے گزری تھیں۔ انہیں جسانی تکلیف تو تھی ہی مگر ذہنی طور پر بھی اپ بٹ تھیں اور یہاں آتے ہی یہ واقعہ پیش آیا جس نے ان کے ذہن کو کچھ زیادہ ہی متاثر کیا تھا اور میرے خیال میں بائیس آرام کی ضرورت تھی۔

”ہماری رہائش کا بندوبست کیا ہو گا؟“ میں نے ماسٹر ہوچن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”ہم نہیں رہیں گے یا۔“

”تم لوگ نہیں رہو گے۔“ چندا روہن میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بول پڑا ”میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خواہیں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی ہیں اور میرے خیال میں انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ پہلے انہیں کمرہ دکھا دوں۔“

یہ بنگلہ دو منزلہ تھا اور اوپر جانے کے لیے زینہ اندر ہی تھا۔ اوپر ایک بست بڑا ہال، ایک کچن اور تین بیڈ رومز تھے۔ ہر کمرہ شان دار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ چندا روہن ہمیں ”ہرے دکھا رہا۔“

”یہ تینوں بیڈ رومز تم تینوں کے استعمال میں رہیں گے۔“ اس نے دوبارہ ہال میں آکر کہا پھر جاگی اور تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اب تم لوگ کچھ دیر آرام کرو۔ دوپہر اٹھانا تیار ہو جائے گا تو بتا دیں گے۔ ہم نیچے مثل ماسٹر کے ہاتھ جو باتیں کریں گے۔“

جاگی اور تھائی ایک ہی کمرے میں گھس گئی تھیں۔ ہم بارہ نیچے آگئے۔

”ہوشنگ کہاں ہے؟“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

”آؤ تمہیں ہوشنگ سے بھی ملا دیا جائے۔“ چندا روہن نے کہا۔

اس مرتبہ ماسٹر ہوچن بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم تینوں کمرے میں آگئے۔ یہ بھی بیڈ روم ہی تھا۔ ایک طرف

دوڑار کے اندر بیٹھے کے دروازے والی بست بڑی الماری فٹ تھی جس میں کتابیں آراستہ تھیں۔ انہی کتابوں میں دو تین جگہوں پر کچھ آرائشی چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ انہی میں ایک تقریباً چھ انچ اونچا سا تہا بہ کا مجسمہ بھی تھا۔

چند ا روہن نے الماری کھول کر مجھے کے پیچھے ہاتھ ڈال کر اس میں لگی ہوئی ایک ٹاپ کو کھمایا۔ اس کے ساتھ ہی الماری اپنی جگہ پر گھوم گئی۔ الماری کے پیچھے ایک کشادہ زینہ تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اس بیٹی کا تعلق غالباً اس میکیزم سے تھا جس سے الماری گھومی تھی۔

ہم تینوں زینے سے اتر کر نیچے آگئے۔ سامنے ایک وسیع ہال تھا۔ جس سے آگے تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہال میں ایک میز اور چند کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔ توران ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

”اس نے کچھ بتایا؟“ چندا روہن نے توران سے پوچھا۔

اس کا اشارہ اس قیدی کی طرف تھا جسے یہاں لایا گیا تھا۔

”میں نے ابھی کچھ پوچھا ہی نہیں سر۔ آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔“ توران نے جواب دیا ”ویسے وہ بست بد حواس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ایک دو ہاتھ پڑنے پر ہی سب کچھ اگل دے گا۔“

”ابھی دیکھتے ہیں۔ پہلے اس لڑکی کے کمرے کا دروازہ کھولو۔“ چندا روہن نے کہا۔

توران دائیں طرف والے ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ دروازہ لوہے کی موٹی چادر کا تھا۔ اس میں کوئی کنڈا یا پینڈل وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا البتہ چوکت پڑا اوپر ایک پالش مین لگا ہوا تھا۔ توران نے وہ مین دبا دیا۔

لوہے کا دروازہ اپنی جگہ سے سرکنا ہوا دائیں طرف کی دیوار میں غائب ہو گیا۔

کمرہ کافی کشادہ تھا۔ چھت بست اونچی تھی جہاں ایک مرکزی بلب روشن تھا۔ دیواریں بالکل سیاہ تھیں۔ دائیں طرف بیڈ تھا اور آگے ہاتھ روم کا دروازہ تھا۔ بیڈ پر ہوشنگ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ اور بٹنیں کندھے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دشت سی بھر گئی۔

”تست۔ تست۔“ وہ ہکا کر رہ گئی۔

”تمہارا خیال تھا کہ میں ساری زندگی شاؤلن نیپل ہی میں گزار دوں گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ کافی خوف زدہ تھی۔ اس نے سرمئی بلاؤز اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور یہ لباس غالباً کئی دنوں سے اس کے

جسم سے مجھ انہیں ہوا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟“ میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ”زیادتی! یہ مجھ سوال کیا ہے تم نے۔“ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”مجھے دو دن سے زخمی حالت میں اس کمرے میں بند رکھا گیا ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”یہ لوگ دو دن سے مجھ سے اٹنے سے دیر سوال کر رہے ہیں۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں دارا نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میرا اس نام کے کسی شخص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو پہلی مرتبہ بنگاک آئی ہوں۔ مجھے تو اس حرامی میگا نے پھنسا دیا۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔ اس نے میگا تیراؤ کو چند موٹی موٹی نہایت فحش قسم کی گالیاں دیں پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”شاؤنل نیپل میں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ تم سے اپنی کسی توہین کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ تمہیں کسی قسم کا سبق سکھانا چاہتا ہے۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ مارسل آرٹ کے کسی مقابلے میں اس نے تمہارے ہاتھوں شکست کھائی ہوگی اور وہ اپنا انتقام لینا چاہتا ہوگا۔ شاؤنل نیپل میں اس قسم کے ڈرامے ہوتے رہتے ہیں اس لیے میں اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی اور پھر جب تمہارے اغوا کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ بھاگ گیا اور تم مجھے بھی ویرانے میں چھوڑ گئے تو مجھے تم پر اور اس پر بھی بدست غصہ آیا تھا۔“

”میں شاؤنل کس طرح پہنچی تھی؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔ میں اس روز کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل گئی اور تین چار روز بعد فان لنگ پہنچی۔“ اس کے ایک ہفتے بعد میگا مجھے فان لنگ میں مل گیا۔ دیر تک اپنے طرز عمل کی معافی مانگتا رہا اور پھر اس نے مجھے ایک نئی بیٹی بڑھائی۔ ”وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی چندا روہن اور ماسٹر ہوچن نے مداخلت کی۔ کچھ دیر بعد ہوشک بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ کہنے لگی۔

”میگا نے مجھے بتایا کہ تم شاؤنل نیپل کے اندر ایک ایسی جگہ سے واقف ہو جہاں منگ خاندان کا صدیوں پرانا خزانہ دفن ہے۔ وہ خزانہ اتنا قیمتی ہے کہ اس کی ایک ایک چیز آج کے دور میں کروڑوں ڈالر مالیت کی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم تم سے اس خزانے کا راز معلوم کر لیں تو کسی شہنشاہ کی طرح دولت مند ہو سکتے ہیں۔ اس نے مجھے اس خزانے کے چالیس

فی صد جسے کالاج ڈوا اور مجھے اپنے ساتھ بنگاک لے آیا۔ تاکہ تمہیں چکر خزانے کا راز معلوم کیا جاسکے۔

”میں ہمارا ملاقات چنگ جی سے ہوئی۔ وہ دو دن ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ چنگ جی نے بتایا کہ بنگاک نہیں آئے۔ میگا کو یقین تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گے۔ چنگ جی نے جگہ جگہ اپنے آدمی پھیلا دیے تاکہ تم جیسے بنگاک میں داخل ہو انہیں اطلاع مل جائے۔

”مجھے چنگ جی کے نائب کلب میں رقص کے پروگرام مل گئے۔ اس طرح مجھے وقت گزارنے کا بہانہ مل گیا اور پھر ایک رات میں نے چھپ کر میگا اور چنگ جی کی باتیں سن لیں۔ تب مجھے پتا چلا کہ اصل قصہ کیا ہے۔ میگا جزل کھورات کا آدمی ہے اور تم کسی وقت جزل کھورات کا ناقابل طاقی نقصان پہنچا دینے اور جزل کھورات تمہیں ہر قیمت پر اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ میگا اسی پلڑی میں تمہارے پیچھے لگا ہوا تھا۔

”ان کی باتوں میں جی فانگ اور دارا نامی کسی شخص کا ذکر بھی آیا تھا لیکن میں ان دونوں کو نہیں جانتی تھی۔ انہیں کبھی دیکھا ہے لیکن بہر حال اصل بات معلوم ہونے کے بعد میں خوف زدہ ہو گئی تھی اور یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ایک موقع پر میں نے ایسی کوشش بھی کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں کنچن بوری سے ہوتی ہوئی برام کی طرف نکل جاؤں گی لیکن بنگاک سنٹرل ریلوے اسٹیشن پر پکڑی گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ ان کے گھٹنے سے ٹکنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ میری عمرانی کی جاتی تھی۔

”اور پھر اس روز میں دوپہر کے وقت ڈی جے کلب کی اور والی منزل پر اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ شو کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ کلب میں جگہ ڈی جی ہوئی تھی۔ دو آدمی میرے کمرے میں بھی گھس آئے تھے اور مجھے چکر کلب سے نکال لے گئے۔ پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ پولیس نے چھاپا مارا ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ لوگ مجھے کسی جنگل میں لے گئے۔ اس جنگل میں بھی جگہ ہو گیا۔ اس مرتبہ شاید مجھے ہی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں واقعی بدست ڈھمیت اور سخت جان ہوں کہ دو گولیاں لگنے کے باوجود اب تک زندہ ہوں۔“

”تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہاری کمائی پر یقین کر لیا ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”انہوں نے بھی یقین نہیں کیا۔“ ہوشک نے چندا روہن اور ماسٹر ہوچن کی طرف اشارہ کیا ”گرج دی ہے“

میں ہاتھ پکڑی ہوں۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی بچتا کئی ہوں۔“

”شاید تم نے اپنی زبان اس لیے بند رکھی ہے کہ تمہارے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جا رہا ہے۔“ میں نے کہا لیکن میرا پوچھ کچھ کا طریقہ ان سے قدرے مختلف ہے۔ میں پوچھوں تو کبھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔ تم مجھے اچھی طرح جان چکی ہو۔ میں اس بات کی بھی پروا نہیں کروں گا کہ تم قوت ہو یا زخمی ہو۔ میں تم سے صرف چند سوال پوچھوں گا اگر تم ٹھیک ٹھیک جواب دے دو گی تو میں تمہاری کچھ مدد بھی کر سکوں گا لیکن میں صرف سچ جانتا چاہتا ہوں۔“

”سچ وہی ہے جو میں بتا چکی ہوں۔“ ہوشک نے جواب دیا۔

”یہ لوگ تمہاری کسی بھی کمائی پر یقین کر سکتے ہیں۔“ میں نے چندا روہن اور ماسٹر ہوچن کی طرف اشارہ کیا ”اگر تم دو دو کر بار بار یہی کمائی دہراؤ گی تو یہ لوگ تمہیں معصوم اور عظیم سمجھ لیں گے لیکن میں نہیں کیونکہ میں تمہیں بدست اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اس لیے میں تم سے کمائیاں نہیں صرف اور صرف سچ سننا چاہوں گا۔“

”کھانچ۔“

”ہاں۔ صرف سچ!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر چندا روہن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اس کے زخموں کی پوزیشن کیا ہے؟“

”بیت میں اور ہنسل کی ہڈی کے قریب گولیاں لگی تھیں۔“ چندا روہن کے بھانے ماسٹر ہوچن نے جواب دیا ”گولیاں نکال دی گئی ہیں۔ تقریباً چار بوتل خون دیا گیا ہے۔ تب کس فحش کی ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد ڈاکٹر اسے چیک کر رہا ہے۔ اس وقت تو اس کی حالت پہلے سے بدست بہتر نظر آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے دو چار روز میں یہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگے گی۔“

میں نے ایک بار پھر بغور ہوشک کا جائزہ لیا۔ تکلیف اور پھر خوف کی وجہ سے اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ کندھے والی بیٹی پر سرخ دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا بالیاں پیریلک کی بیٹی پر رکھ لیا اور پتلون کا پانچپہ کچھ اوپر اٹھا لیٹل پیر بندھوا کر خنجر نکال لیا۔

میرے ہاتھ میں خنجر کچھ کر ہوشک کے چہرے پر خوف کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے۔ آنکھوں میں ویرانی سی پائی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے پیٹ پر بندھی ہوئی بیٹی کے پیٹ پر رکھ کر ہلکا سا جھکا دیا۔ بیٹی کھلی چلی گئی۔ میں نے خنجر

ہی کی نوک سے بیٹی سے کئے ہوئے دونوں حصوں کو الگ الگ کر دیا اور زخم پر رکھا ہوا کاش ہٹانے لگا۔

چندا روہن اور ماسٹر ہوچن بھی ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہوشک کی حالت تو ایسی تھی جیسے وہ ابھی جیج پڑے گی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ زخم پر رکھنا چاہا تو میں نے خنجر کی نوک اس کے ہاتھ کی پشت پر چھو دی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے پھینکا۔

خاف سے ذرا اوپر زخم خاصا بڑھا تھا۔ گولی نکالنے کے لیے آدریشن کیا گیا تھا جس سے زخم پھیل گیا تھا۔ دس بارہ ٹانگے لگے ہوئے تھے۔

”یہ لوگ بدست رحل ہیں۔“ میں نے چندا روہن اور ہوچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ان پر بھی ظلم نہیں ہوا۔ انہیں بھی تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کے کسی عزیز کو ذبح نہیں کیا گیا اس لیے یہ لوگ نہیں جانتے کہ ظلم اور تشدد کیا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کسی پر ظلم کرنا بھی نہیں جانتے۔ تمہارے ساتھ تو انہوں نے بدست رحم دلی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن میں ان سے بدست مختلف ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو ذبح ہوتے دیکھا ہے۔ میں اپنی زندگی بچانے کے لیے بھانٹا رہا ہوں۔ خونی بھیڑیے میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ میں ایک لمحہ بھی کبھی سکون سے نہیں بیٹھ سکا۔ جان کا خوف ہر لمحہ میرے ذہن پر سوار رہا۔ میں نے بے پناہ ظلم برداشت کیے ہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو خوف سے ہی مر چکا ہوتا لیکن میں بدست سخت جان واقع ہوا ہوں۔ مجھے صرف ایک چیز زندہ رکھے ہوئے ہے۔ انتقام۔ اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا انتقام۔ اپنی بربادی کا انتقام جو میری روگوں میں دوڑنے والے خون میں رچ بس گیا ہے اور تم جانتی ہو۔۔۔ کہ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا انسان اس حد تک آگے چلا جاتا ہے کہ وہ انسانیت کو بھی بھول جاتا ہے۔ میں بھی انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں اور انسانیت کو بھول چکا ہوں۔ میں درندہ ہوں جس کے دل میں درگزر اور رحم نام کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ میں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنے دشمنوں کی تلاش میں ہوں اور تم جانتی ہو وہ لوگ کہاں ہیں۔“ میں خاموش ہو کر ہوشک کی طرف دیکھنے لگا۔ خوف سے اس کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا تھا اور جسم پر ہلکی سی کپکپات طاری ہو گئی تھی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے زخم کے قریب پیٹ پر رکھ دی ”میرے ہاتھ کا ایک ہلکا سا جھکا تمہارا پیٹ چاک کر دے گا۔ تمہاری آنکھیں

باہر نکل آئیں گی اور۔“

”نہیں۔“ ہوشنگ بیانی انداز میں چیخ اٹھی ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔“

”مجھے کون روک سکے گا۔“ میں نے کہا ”مجھے یاد ہے چند سال پہلے دارا نے میری ایک ہمدرد کا پیٹ اسی طرح چاک کیا تھا اور میں تمہارا پیٹ چاک کرنے میں جھجک کیوں محسوس کروں گا۔ مجھے تم پر بالکل رحم نہیں آئے گا۔“

”نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ ایک بار پھر چیخا۔

”سنو ہوشنگ۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں ”میری تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے پیسے کے لالچ میں میرے ساتھ کچھ زیادتیاں کی ہیں اور تمہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تم پر جب بھی برا وقت آیا تمہیں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ شاؤ لن ٹیپل میں بھی میگا تمہیں ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا اور یہاں بھی میرے آدمیوں نے تمہیں نائنٹ کلب سے اٹھایا تو انہوں نے تمہیں جان سے مار دینے کی کوشش کی تاکہ تم ان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکو۔ موقع ملے ہی وہ لوگ تمہیں پھر جان سے مارنے کی کوشش کریں گے۔ کیا تم ایسے لوگوں پر بھروسا کر سکتی ہو جو تمہاری جان کے دشمن ہوں؟

”میں تمہاری جان بخشی کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم یہ بتا دو کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ بصورت دیگر میں تمہارا پیٹ چاک کروں گا اور مجھے تمہاری موت کا کوئی افسوس نہیں ہو گا۔“

میں نے اس کے پیٹ پر خنجر کی نوک کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ چیخ اٹھی۔

”اب مجی تمہارے پاس وقت ہے۔“ میں غرایا ”میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ اگر اب بھی تم نے زبان نہ کھولی تو میرا ہاتھ حرکت میں آجائے گا۔“

”ٹھہرے۔ ٹھہرو۔“ وہ چیخا ”بب۔ بتاتی ہوں۔“

”گڈ۔“ میں نے خنجر ہٹایا ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تم بولنا شروع کرو۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ دارا کہاں ہے؟“

وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ماسٹر ہو جن کو اشارہ کیا۔ اس نے کائن دوبارہ زخم پر رکھ دی۔ پٹی تو میں کٹ چکا تھا۔ لہذا فوری طور پر دوسری پٹی باندھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”بتاؤ۔ دارا کہاں ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر

نظریں جماتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

”مم۔ میں دارا کو نہیں جانتی۔“ وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولی ”سچ کہتی ہوں۔ میں اسے نہیں جانتی۔ میں اسے کبھی نہیں دیکھا۔ صرف نام سنا ہے۔“

”جنگ جی کا دارا سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“ ہوشنگ نے جواب دیا ”مجھے جنگ جی کے پاس لے کر آیا تھا اور مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ جنگ جی کی مدد سے تمہیں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اصل کمائی معلوم نہیں تھی۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ تم شاؤ لن ٹیپل میں منگ خاندان کے کسی دھنپنے کے راز سے واقف ہو۔ اتفاق سے میں نے ایک روز چوری چھپے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔ جس سے پتا چلا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے اور میگا تمہیں ہر حالت میں گولڈن ڈرائی ٹانگلے بنا چاہتا ہے۔ ان کی باتوں میں دارا اور پٹی فاک کا نام بھی آیا تھا۔ وہ دونوں بھی میگا کے ساتھی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ جنگ جی کے نائنٹ کلب میں آتے رہے ہوں مگر میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“

”مجھے کس کے کہنے پر اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جنگ جی اور میگا نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔“ ہوشنگ نے جواب دیا ”چند روز پہلے تان منہ نامی ایک شخص نے نائنٹ کلب میں ان سے ملاقات کی تھی۔“

”تان منہ۔“ میں اچھل پڑا۔

”ہاں۔ یہی نام بتایا تھا اس نے۔“ ہوشنگ نے کہا ”وہ لاؤس کا رہنے والا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ تم ہوئے سالی سے اس کی عورت کو بھگا کر چٹانک سامین لے آئے ہو جان اس کا ایک آدمی بھی تمہارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔“

”تمہارے خلاف کارروائی کرنا چاہتا تھا مگر تم حوالہ دہانی کی شخص کے پاس چلے گئے۔ جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ بہت طاقت ور قبائلی سردار ہے۔ اس کی موجودگی میں تمہارے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تان منہ بھاگ گیا۔ یہاں اس نے جنگ جی اور میگا تھراؤ سے رابطہ کیا۔“

”کیا وہ پہلے سے انہیں جانتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے یہ لوگ پہلے سے ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہوں۔“ ہوشنگ نے جواب دیا ”تان منہ نے بتایا تھا کہ تھائی نامی عورت کو تمہارے قبضے سے آزاد کرانے کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے پروگرام بنایا تھا اور چٹانک رائے میں

آدمیوں کو مظلوم کر دیا تھا کہ تم لوگوں پر نگاہ رکھی جائے۔“

”مجھ کو تمہیں زندہ ہی پکڑنا چاہتا تھا تاکہ جزل کھوراث کے سامنے پیش کیا جاسکے لیکن اسی رات جنگ جی کو ایک دن کا موصول ہوئی۔ میں بھی اس وقت اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ جنگ جی نے فون پر باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم لوگوں کو چٹانک رائے ہی میں ختم کر دیا جائے گا اور اس کے بعد اس نے فون پر چٹانک رائے میں اپنے آدمیوں کو اس قسم کی ہدایات بھی دی تھیں۔“

”تم لوگ تو چٹانک رائے میں بیچ گئے لیکن یہاں میگا نیا اور جنگ جی کی شامت آگئی۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ ہاں تمہارے آدمی اتنی جلدی کوئی کارروائی کریں گے مگر بگاڑ اور جنگ جی کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ تان منہ بھی ان کے ساتھ ہی تھا کہ میں پھنس گئی۔“

”سچ سچ جی ان کے آدمیوں نے ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی محفوظ جگہ پر ہیں اور تم ان کے نکلنے کے بارے میں ضرور جانتی ہو گی۔“

”وہ دونوں ایک مرتبہ مجھے ایک مائی روڈ پر واقع بروٹائی کے سفارت خانے کے پیچھلی طرف ایک بنگلے میں لے گئے تھے میگا تو واپس گیا تھا اور میں جنگ جی کے ساتھ تین دن اکی بنگلے میں رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ اسی بنگلے میں چھپے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ میں ان کے کسی اور ٹھکانے کے بارے میں نہیں جانتی۔“ ہوشنگ نے کہا۔

”وہ اس بنگلے کا نمبر نہیں جانتی لیکن اس نے لوکیشن لکھا دی اور یہ لوکیشن بھی اسے بروٹائی کے سفارت خانے کی اجازت سے یاد ہو گئی تھی۔“

”وہاں اور کون کون ہو سکتا ہے؟“ میں نے ہوشنگ سے ترقی سوال کیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ ہوشنگ نے جواب دیا ”جب مجھے یہاں لے جایا گیا تھا تو ایک بوڑھی خادمہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے ہوشنگ۔“ میں نے کہا ”میں ان سے کون سا ڈاکو کو لاکر تمہاری ڈرننگ کروی جائے۔ اگر اس بنگلے سے جنگ جی یا اس کے کسی ساتھی کا سراغ مل گیا تو تمہیں ہتھ پڑ جائے گا اور اگر یہ پتا چلا کہ جنگ جی یا میگا تھراؤ کا بنگلے سے کوئی تعلق نہیں اور انہیں کبھی وہاں آتے نہیں دیکھا گیا تو تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہارا انجام کیا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”میں ان سے کون سا ڈاکو کو لاکر تمہاری ڈرننگ کروی جائے۔ اگر اس بنگلے سے جنگ جی یا اس کے کسی ساتھی کا سراغ مل گیا تو تمہیں ہتھ پڑ جائے گا اور اگر یہ پتا چلا کہ جنگ جی یا میگا تھراؤ کا بنگلے سے کوئی تعلق نہیں اور انہیں کبھی وہاں آتے نہیں دیکھا گیا تو تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہارا انجام کیا ہو گا۔“

ہوشنگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ کرب کے آثار ابھی نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کا زخم خاصا گہرا تھا اور اسے آرام کی ضرورت تھی۔ جبکہ میں نے اس کا زخم فہم کر خنجر کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ دی تھی اور اسے مزید دہلا دیا تھا۔ حالانکہ اسے مزید زخمی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اگر میں یہ حربہ استعمال نہ کرنا تو وہ زبان بھی نہ کھولتی۔ اس نے اگرچہ اس بنگلے کا پتا بتا دیا تھا جہاں وہ جنگ جی کے ساتھ دو تین دن رہی تھی لیکن میرے حوالے سے میگا کے بارے میں جو کمائی سنائی تھی وہ جھوٹی تھی۔ یہ غلط تھا کہ میگا نے اسے کسی خزانے میں چھپے کا لالچ دیا تھا۔ شاؤ لن ٹیپل میں اس نے مجھے کوئی اور کمائی سنائی تھی۔

ہم تینوں اس کمرے سے باہر آگئے۔ ماسٹر ہو جن نے چوکھٹ پر لگا ہوا بین دبا کر دروازہ بند کر دیا۔ توران اس دوران میں باہر ہی کھڑا رہا تھا۔ اس نے ہو جن کا اشارہ پا کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازہ بھی اسی کمرے کا تھا۔ اس لحاظ سے یہ تان منہ اس حد تک محفوظ ہو گیا تھا کہ کمروں کے دروازے بند کرنے کے بعد اگر یہ خانے میں آمدورفت کا راستہ کھلا بھی رہ جاتا تو قیدیوں کے فرار ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

دوسرا کمرہ بھی اسی طرح کا تھا۔ پاٹ دیواریں اور ایک بیڈ۔ پیچھلی طرف ایک ہاتھ روم تھا۔ وہ آدمی بیڈ پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے رایاں گھٹنا کھڑا کر رکھا تھا۔ بائیں اوپر چڑھا ہوا تھا اور پینڈی خون آلود تھی۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ماسٹر ہو جن نے بتایا تھا کہ سڑک پر جب پولیس آگئی تھی تو اس شخص نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر توران نے اس کی ٹانگ پر خنجر سے وار کر کے زخمی کر دیا تھا۔ زخم اگرچہ معمولی تھا مگر مسلسل خون بہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگ تہ زور ہی تھی اور خون جوتے پر بھی جما ہوا تھا۔

ہمیں کچھ گہرہ ایک جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے صرف ایک ٹانگ پر زور دے رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے۔

”توران۔ اس سے پوچھو کہ اس نے کس کے کہنے پر ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ لوگ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔“ میں نے توران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

توران نے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ اس خنجر کا پھل آگے سے کسی قدر چوڑا اور مڑا ہوا تھا۔ اس نے

آگے بڑھ کر خنجر کو اس کے چرسے کے سامنے لہرایا اور اچانک ہی بائیں ہاتھ کا پتھر اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔ وہ شخص کراہتا ہوا پشت کے بل بیٹھ پر گرا۔ توران بھی چھلانگ لگا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ بائیں ہاتھ سے اس کے بال جکڑ لیے اور خنجر اس کے کان سے ذرا نیچے گردن پر رکھ دیا۔

”یہاں سے تمہاری صرف ایک نرس گئے گی اور تمہارے جسم کا سارا خون بہہ جائے گا۔“ توران کے طعن سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔

”بب۔ بتانا ہوں۔“ وہ شخص ہلکایا۔ اس کا چہرہ خوف سے ایک دم سیاہ پڑ گیا تھا۔

توران نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلا دیا اور وہ اس شخص کو پھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ وہ شخص بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک اپنا جڑا سلاٹا رہا پھر بولا۔

”میکا تیرا ذمہ ہے تم تھا کہ تم لوگوں کو از پورٹ سے اغوا کر کے یونانی کے سفارت خانے کے پیچھے ایک جنگل میں پہنچایا جائے وہاں وہ لوگ ہمارا انتظار کرتے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر اب دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ انہیں گزربڑی اطلاع مل چکی ہوگی اور وہ لوگ وہاں سے چلے گئے ہوں گے۔“

اس شخص کی باتوں سے ہوشنگ کے بیان کی تصدیق ہو گئی تھی کہ جنگل جی اور میکا یونانی کے سفارت خانے کے عقب میں واقع کسی جنگل میں رو پڑے تھے اور اس شخص نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا۔ انہیں دیر ہو جانے کے باعث میکا و میرہ کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہو گا اور ممکن ہے وہ لوگ اب تک وہاں سے غائب ہو چکے ہوں۔

”ان کا کوئی اور ٹھکانا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

”ذی بے نائٹ کلب۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”لیکن اب وہاں کوئی نہیں ملے گا۔ چند روز پہلے ان لوگوں نے وہاں چھاپا مارا تھا تو اس وقت سب لوگ بھاگ گئے تھے۔“

”دارا اور جی فانگ کہاں ملیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے دارا کا صرف نام سنا ہے۔ دیکھا نہیں۔ البتہ جی فانگ کو میں جانتا ہوں۔ وہ آج کل مادام اوٹوکو کے ساتھ رہ رہا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”مادام اوٹوکو کون ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”رقاصہ ہے۔ خود رنار ہو چکی ہے۔ اس نے تین چار

نوکریاں رکھی ہوئی ہیں جن کے سرورہ پیش کر رہی ہے۔ اس نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”مادام اوٹوکو دراصل ٹائیگر کی داشت تھی۔ ٹائیگر کی موت کے بعد وہ پینڈرو کی تحویل میں آئی۔ پینڈو مارا گیا تو مختلف لوگوں کے ساتھ رہی۔ جی فانگ گولڈن ٹرائی ایگل سے واپس آیا تو اس وقت سے مادام کے ساتھ رہ رہا ہے۔“

”اور یہ مادام اوٹوکو کہاں رہتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نانا نوا روڈ پر واقع آکاش بلڈنگ کے چیمبر ہاؤس میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن کسی اجنبی کے لیے اس بلڈنگ میں داخل ہونا آسان نہیں۔ وہ بہت بڑی بلڈنگ ہے جہاں دولت مند لوگوں کی رہائش ہے۔ گیٹ پر بڑی سخت سیکیورٹی ہے۔ ہر فلیٹ سیکیورٹی کے مرکزی نظام سے وابستہ ہے۔ میرا خیال ہے تم لوگ وہاں داخل نہیں ہو سکو گے۔“

”یہ ہمارا مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال، تم اس وقت تک رہو گے جب تک وہ لوگ ہمارے قابو میں نہیں آجاتے۔“

”مم۔ میری ٹانگ میں تکلیف ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”میری ڈرننگ کراؤ۔ خون زیادہ بہہ گیا تو۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ چندا روہن نے کہا۔ ”ڈرننگ کرویں گے۔ فی الحال آرام سے یہاں لیٹے رہو۔“

ہم لوگ۔ خانے سے باہر آ گئے۔ اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ خادمہ نے بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔

”تم لوگ بیٹھو۔ میں اوپر سے جاگی اور تھائی کو بلا لاؤں۔“ میں کہتے ہوئے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

جاگی اور تھائی ایک ہی کمرے میں تھیں۔ جاگی ورمی نیند سو رہی تھی۔ تھائی اس کے قریب ہی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی۔

”کھانا تیار ہو چکا ہے۔ جاگی کو بھی جگا دو۔“ میں نے اندر داخل ہو کر کہا۔

”اے سونے دو۔“ تھائی ہنستی سے بیڈ سے اترنے ہوئے ہوئی۔ ”اس نے کہا تھا کہ اگر سو جائے تو جگایا نہ جائے۔“

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے اور کچھ ہی دیر بعد ہم نیچے ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ میرے کھانا لگا ہوا تھا اور پینڈو روہن اور ماسٹر ہوچن ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

توران بچن ہی میں ایک کرسی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا اگرچہ بے تکلف تھا۔ تین چار چیزیں تھیں مگر میری بھوک مچ چکی تھی۔ میں نے صرف تھائی سوپ پر ہی اکتفا کیا۔ تھائی

نے بھی بہت کم کھایا تھا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں آ گئے اور تھوڑی سی دیر بعد خادمہ نے ہمارے سامنے کافی سرو کر دی۔

”میں نے ہمارا کون فون پر اب تک کی صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔“ ماسٹر ہوچن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا رات کو یہاں آئیں گے۔ میں نے ہوشنگ والے جنگل اور آکاش بلڈنگ کی گھرائی کے لیے بھی کمہ دیا ہے۔ غم بہت تھک چکے ہو گے۔ چائے پینے کے بعد آرام کرو۔ جو کچھ بھی ہو گا شام کو دیکھا جائے گا۔“

میں اس وقت خاموش رہا۔ چائے پینے کے بعد تھائی اوپر چلی گئی۔ چندا روہن بھی باہر نکل گیا۔ میں اور ماسٹر ہوچن باہر کرنے لگے۔ یہاں آتے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا اور اب پہلی مرتبہ ہمیں اس طرح آرام سے بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ ہم دیر تک باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن کھانا کھانے کے بعد مجھ پر کسٹی سی طاری ہونے لگی۔ میرے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ نیند کے بھوکے آ رہے تھے۔ ماسٹر ہوچن میری کیفیت کو سمجھ گیا اور میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ماسٹر۔ اب تم اوپر جا کر آرام کرو۔ شام کو باتیں ہوں گی۔“

میں صوفے سے اٹھ گیا۔ اوپر آ کر اس کمرے میں جھانکا۔ تھائی بھی جاگی کے ساتھ اسی بیڈ پر سو رہی تھی۔ میں سامنے والے کمرے میں آیا اور بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

مجھے شام چھ بجے کے قریب جاگی نے جگایا تھا۔ اس کے جڑے پر کچھ عجیب جینی سی برس رہی تھی۔

”ایسا ہوا۔ کیا بات ہے؟“ میں اس کی شکل دیکھ کر جو ٹکے غیر نہیں رہ سکا۔

”بیٹ میں ایفمن ہو رہی ہے۔“ وہ جینٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ تمہیں یاد ہے ہم نے سو مینج ٹائٹس کے بعد کچھ بھی نہیں کھایا۔“

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ بھوک کبھی بھی جاگی سے بڑاشت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ صبح جنانک رائے میں سردار تھالوب کے گھر سے ناشتا کر کے نکلے۔

شعبہ بنگال از پورٹ سے نکلے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب اس جنگل میں آ کر ایک ایک کب کا پیلا غامور پھر دو بجے کے قریب ہم نے تو کھانا کھایا تھا مگر جاگی ان کا وقت سو رہی تھی۔

”ہم نے تو دوپہر کو خوب بیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔“ میں

نے جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم سو رہی تھیں اور تم نے ہی تھائی کو منع کیا تھا کہ جگایا نہ جائے۔“

”اس وقت بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔“ جاگی بولی۔

”اور اب بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تھائی کہاں ہے۔“

”وہ ہاتھ روم میں ہے۔“ جاگی نے جواب دیا۔

”نیچے خادمہ سے جا کر کہہ دو نا کہ تمہیں کچھ کھانے کو دے دے تمہیں گھمرو۔ میں خود کمہ کر آتا ہوں۔ چائے کے لیے بھی کمہ دوں گا۔“ میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نیچے نہ تو ماسٹر ہوچن تھا اور نہ ہی چندا روہن۔ وہ دونوں باہر گئے ہوئے تھے۔ البتہ توران باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بچن میں برتنوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں بچن کے دروازے پر آیا۔ خادمہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

”چائے کی طلب ہو رہی ہے؟“ وہ بولی۔ ”چند منٹ لگیں گے۔ بس میں تیار کر رہی ہوں۔“

”میری ایک سامیٹی سے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ہو تو۔“

”میں نے ڈاکٹر جاگی کے لیے کھانا رکھا ہوا ہے۔“ خادمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”صرف چند منٹ میں آواز دے دوں گی۔“

”تم ڈاکٹر جاگی کو جانتی ہو؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کئی سال پہلے میں نے اپنی بیٹی کا علاج اس سے کروایا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے میری بیٹی کو نئی زندگی دی تھی۔ ڈاکٹر جاگی تو مجھے بھول گئی ہے مگر میں اسے کس طرح بھول سکتی ہوں۔ بہر حال، کھانا اودن میں رکھا ہوا ہے۔ چائے تیار ہونے میں چند منٹ لگیں گے۔ میں آواز دے دوں گی۔“

میں اور آ گیا اور جاگی کو بتایا کہ خادمہ اس سے اپنی بیٹی کا علاج کروا چکی ہے اور اسے اچھی طرح جانتی ہے۔

”جانتی ہوگی۔“ جاگی نے کندھے اچکا دیے۔ ”میں سرکاری اسپتال میں تھی اور بعد میں پریویٹ کلینک میں پریکٹس کرتی رہی۔ میرے پاس سیکولر مریض آتے تھے۔ بہت سے لوگ مجھے جانتے ہوں گے مگر میرے لیے تو ہر ایک کو یاد رکھنا ممکن نہیں۔ صبح میں نے اسے دیکھا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔ اب دیکھوں گی شاید پہچان لوں۔“

میں جاگی کو دوپہر چھوڑ کر اپنے کمرے کے ہاتھ روم میں

گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے میری کسل مندی دور ہو گئی۔ جب میں باہر نکلا تو تھائی اور جاکنی کمرے کے سامنے ہی کھڑی تھیں۔ اسی وقت ادیبہ عمر خادمہ بھی زینے پر نمودار ہوئی۔ ہمیں دیکھ کر وہ واپس مڑ گئی۔

ڈانٹک روم میں میز پر جاکنی کے لیے کھانا اور ہمارے لیے چائے رکھی ہوئی تھی۔ جاکنی کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے واقعی کئی روز سے فالنے سے ہو۔ قریب کھڑی ہوئی خادمہ بھی مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جاکی نے چند منٹ میں ہی پلیٹیں صاف کر دیں اور پھر چائے کا کپ اٹھالیا۔ اس دوران میں ہمارے چائے کے کپ صرف اٹھ ہی ہوئے تھے۔

”باہر لان میں چل کر بیٹھیں۔ کھلی ہوا میں۔“ تھائی نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”چلو۔“ میں نے بھی اپنا کپ اٹھالیا۔

جاکی اس وقت خادمہ سے باتوں میں مصروف ہو چکی تھی۔ وہ جاکی کو یاد دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے کس طرح اس کی بیٹی کی جان بچائی تھی۔

میں اور تھائی لان میں آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دھوپ رخصت ہو رہی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ تھوڑی دیر بعد جاکی بھی وہیں آ گئی۔

ہم تقریباً ایک سال بعد بنگاک واپس آئے تھے اور یہاں آتے ہی بنگائے شروع ہو گئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ بنگائے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ میری ساری زندگی اسی طرح بار دھاڑ میں گزر جائے گی اور میں اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔

ہماراج نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ مجھے قاتلوں سے پناہ دی تھی اور ایک خاص انداز میں میری پرورش کی تھی۔ میں بہت عرصے سے سنتا آ رہا تھا کہ ہماراج مجھ سے کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں اور وہ کام بھی میرے ہاتھوں یا یہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ شیشہ کے خلاف سازش چلی جا چکی تھی۔ کچھ سازشی عناصر اگرچہ اس وقت بچ نکلے تھے مگر اب ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہماراج کی خواہش پر میں نے شاولن نہیں سے نزدیک بھی حاصل کر لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ واپس آؤں گا تو امن و سکون سے زندگی گزار سکوں گا مگر یہاں پھر وہی بنگائے میرے خطرے تھے۔

میں ایک ایسا جنگ جوجن کر رہا گیا تھا جس کے لیے کوئی اور انتخاب نہیں رہا تھا لیکن میں اب ان ہنگاموں سے آگتا

گیا تھا۔ پر سکون زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو جہنم رسید نہیں کر دوں گا مجھے سکون نہیں آئے گا۔ یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ چند گھنٹے پہلے میں نے یہی بات ہوشک سے بھی کی تھی کہ انتقام ہماری رگوں میں رچ بس گیا ہے۔ ہم بعض اوقات انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ انسان اور انسانیت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے میں بھی انسانیت کو بھول گیا تھا۔ لیکن۔ اپنی بربادی کے ساتھ مجھے ان لوگوں کا بھی خیال تھا جو میری خاطر بریاد ہوئے تھے۔ اپنی جانیں تک قربان کر دی تھیں۔ اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ تھائی اور جاکی چند سال پہلے تک اسی شہر میں عیش و آرام کی زندگی گزار رہی تھیں۔ آزادی سے گھومتی پھرتی تھیں کوئی خوف نہیں تھا انہیں لیکن میرا ساتھ دینے کے جرم میں ان کا سب کچھ تباہ کر دیا گیا تھا۔ انہیں ہر چیز سے ہاتھ دھوئے پڑے تھے۔ اپنی جان کے خوف سے میرے ساتھ دنیا کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک بھاگتی پھری تھیں اور اب بھی اس بیٹلے میں چپ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کیا یہ بھی میری طرح زندگی بھر ایسے ہی بھاگتی رہیں گی۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کار کے پارکن کی آواز سے میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ آواز گیت کے باگل سامنے سے آئی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ گیت کی جھریوں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ کار گیت کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ میرا خیال تھا برآمدے میں بیٹھا ہوا تو ران اٹھ کر گیت کھولے گا مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور پھر اسی لمحے کڑک کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور گیت کے دونوں پٹ خود بخود اندر کی طرف کھلے گئے۔ گیت میں الیکٹرک سٹم تھا اور اندر ہی سے کوئی جن دیا کر گیت کھولا گیا تھا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ صبح ہمارے آنے پر گیت کھلا تھا تو کوئی آدمی دکھائی کیوں نہیں دیا تھا۔ اس وقت بھی خادمہ نے اندر ہی سے جن دیا کر گیت کھولا تھا۔

کار اندر داخل ہونے کے بعد گیت بند ہو گیا۔ کار پونچ میں جا کر رکی۔ میں نے اسٹیرنگ کے سامنے ماسٹر ہوجن کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے جاکی اور تھائی کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر کار کے قریب آ گیا۔ ماسٹر ہوجن جیسے ہی انجن بند کر کے کار سے اترا، میں نے اسے بوکیا اور پھر ہم دونوں لان ہی میں آ گئے۔

”میں تو سارا دن سویا رہا۔ کوئی خاص خبر ماسٹر؟“ میں نے

بوکیا ہوں سے ماسٹر کی طرف دیکھا۔

”جنگ پی کے بیٹلے اور آکاش بلڈنگ کی نگرانی جاری ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے جواب دیا ”جنگ پی کے بیٹلے میں کسی نے جاتے نہیں دیکھا گیا۔ البتہ جنگ پی ٹانگ کے بارے میں ذرا لی ہے کہ وہ آکاش بلڈنگ ہی میں رہ رہا ہے لیکن وہ انہیں بچے کے قریب بلڈنگ سے باہر گیا تھا اور ابھی تک ان کی ریسل آیا۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا بلڈنگ پر ہل بول پڑے گا۔“

”چنداروبن کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اپنے ذاتی کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔ نوبے تک اپنے گا۔“ ماسٹر ہوجن نے جواب دیا۔

اسی دوران میں خادمہ ماسٹر ہوجن کے لیے چائے لے کر چائے کے دوران میں بھی ماسٹر ہوجن بول رہا۔ جاکی بغاں خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔

ہم کافی دیر لان میں بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر اندر نکلے۔ نوبے کے قریب چنداروبن بھی پہنچ گیا اور اس کے گاڑی پر بعد ایک اور گاڑی گیت کے سامنے آ کر رکی۔ دونوں نے برآمدے والے دروازے کے قریب ہی سوچ بورد گاڑی میں ٹک دیا۔ باہر گاڑی کھل گیا۔

میں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا وہاں کھڑکی سے باہر گاڑی کا منظر آ رہا تھا۔ سفید رنگ کی ایک بہت شاندار لمبی سی گاڑی میں داخل ہو کر پونچ میں چنداروبن کی کار کے پیچھے گاڑی پر آمدے میں جلتے والی ٹیوب کی روشنی میں کار میں بیٹھے افراد کو دیکھ کر میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ ماسٹر چنداروبن میں بھی دروازے کی طرف لپکے تھے۔

میں جب برآمدے میں پہنچے تو کار کا ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک باوردی شوفر نیچے اتر کر پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر رتا کون اور ماسٹر ساتھ ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آگے پہنچ کر سیٹ پر اتر بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر ہوجن نے تیزی سے آگے پہنچ کر سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور ہماراج بھی نیچے اترے۔

میں نے آگے بڑھ کر ہماراج کو بوکیا۔ ہماراج حسبِ عہد ہلکے ہلکے دالے لباس میں تھے۔ پہلی چادر جو ہماراج نے پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں سلپر تھے۔ ہماراج نے میری طرف دیکھتے رہے اور پھر دونوں ہاتھیں ہاتھ میں لے کر ہماراج کے سینے سے لپٹ گیا۔

ہلکیاں بندھ گئیں۔ ہماراج مجھے سینے سے بچنے رہے اور ایک ہاتھ سے میرا کندھا تھپتھپاتے رہے۔

ہماراج دانگ دانگ یائے میرا روحانی باپ بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور ہماراج نے میرے لیے جس طرح اپنی آغوش دوائی تھی اس سے تو میں اور بھی بے قابو ہو گیا تھا اور ان کے بوڑھے سینے سے لپٹ کر بے اختیار رو دیا تھا۔

ہماراج نے مجھے اپنے سے الگ کیا۔ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میرے چہرے کو دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ آئی تھی پھر انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور رتا کون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”رتا کون بھی تم سے ملنے کو بے چین تھے۔“

میں نے رتا کون کو بوکیا۔ اس نے بھی مجھے سینے سے لپٹا لیا اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

”مجھے تم پر فخر ہے مائی سن۔ پوری قوم کو تم پر فخر ہے۔ میں پوری تھائی قوم اور شیشہ کی طرف سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک سال پہلے تم نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، اس سے یہ ملک ایک بہت بڑی تباہی سے بچ گیا تھا۔“

”شیشہ خود تم سے مل کر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے مگر اپنے دشمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔ شیشہ کو تمہاری آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ بھی تم سے ملنے کو بے چین ہیں۔“ رتا کون رکے بغیر بولے چلا جا رہا تھا اور میں اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

”اور ان سے ملو۔“ وہ آخر میں کہہ رہا تھا ”مادام اپنا کورٹیکو۔ میری مسز یہ خاص طور پر تم سے اور تمہاری دوستوں تھائی اور جاکی سے ملنے آئی ہیں۔“

میں نے مادام اپنا کورٹیکو کو بوکیا۔ اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

مادام اپنا کورٹیکو بڑی شاندار عورت تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے رواجی تھائی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر بالوں کا گول جوڑا بٹا ہوا تھا جس سے نکلی ہوئی بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر لگی ہوئی تھی۔ جسم صحت مند اور چہرے کے نفوس بہت دل فریب اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس کی عمر اگرچہ پینتالیس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آ رہی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بہت شاندار بہت پروقار اور حسین



عورت تھی۔

ہم لوگ چند منٹ وہیں کھڑے رہے اور پھر اندر آگئے۔ جاگی اور تھائی انہیں دیکھ کر اٹھ گئیں۔ مادام اینا کو رنیکو بڑے پر جوش انداز میں انہیں بادی بادی لگے لگا کر ملیں۔ تھوڑی سی دیر بعد چندا روہن کے کمنے پر خادمہ نے ہم سب کے سامنے کافی سرو کردی اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

رتا کو سن کی باتوں سے یہ سستی خیر انکشاف ہوا کہ ایک سال پہلے اگر ہم شمشادہ کے خلاف اس سازش کو ناکام نہ بناتے تو یہاں ایک خوفناک خانہ جنگی شروع ہو جاتی اور یہ ملک تباہ ہو جاتا۔ گفتگو میں سردار تھالوب کا بھی ذکر آیا تھا۔ رتا کو سن کے کہنے کے مطابق سردار تھالوب کو حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے کی پیشکش کی گئی تھی جسے اس نے قبول نہیں کیا تھا تاہم اس کی خدمات کے پیش نظر برما اور گولڈن ٹرائی ایجنسی کے سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھالوب کے قبیلے اور دوسرے قبائل کو بھی بہت سی مراعات دی گئی تھیں۔ تھالوب کے مشورے سے ان قبائل کی بہبود کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا تھا۔ جن قبائلی علاقوں میں پوست کاشت کی جاتی تھی وہاں دوسری صحت مند فصلوں کی پیداوار کے لیے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

سردار تھالوب نے "ایو اثر منٹ فرینڈلی گیس" سے بھی ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس عظیم کے تحت دیہی ترقیاتی پروگراموں کے علاوہ اور بھی کئی رفاہی پراجیکٹس نے کام شروع کر رکھا تھا۔ اس پراجیکٹ کے تحت منشیات کے عادی افراد کی بحالی کا ایک ادارہ بھی شامل تھا۔ مجھے یاد آیا کہ رنیکو اپنی آبدی کا تو سے فی حد حصہ اسی ادارے کو عطیے کے طور پر دیتی تھی اور اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ یہ ادارہ سردار تھالوب کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ سردار تھالوب کو حکمران طبقے میں اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور یہی بات تو یہ ہے کہ وہ اس کا حق دار بھی تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کی فلاح و بہبود ملک کی سلامتی اور انسانیت کی خدمت کے لیے بہت کام کیا تھا اور کر رہا تھا۔

مادام اینا کو رنیکو تو جاگی اور تھائی سے باتیں کرنے لگی تھی اور ہم الگ الگ بیٹھے تازہ ترین صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

"اب صورت حال پہلے جیسی نہیں رہی۔" رتا کو سن کہہ رہا تھا "شمشادہ کے خلاف سازش چلی جا چکی ہے۔ جو آگا

و کا عناصر بچ نکلے ہیں وہ روپوش ہیں۔ ان سے بہر حال محنت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بنگاک اور دوسرے بڑے شہروں میں دہشت گردی، غنڈا گردی، منشیات فروشوں کی پرموشیاں سرگرمیاں بھی دراصل اسی سازش کا ایک حصہ نہیں۔ فنانسنگ کی مکمل تیاری کر لی گئی تھی مگر اس سازش کے سربراہی کروادوں کی موت کے ساتھ ہی صورت حال بدل گئی۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہتا تھا "ہائیکر اور پیڈرو تمہارے ہاتھوں ختم ہو گئے تھے۔ دوسرے اگرچہ اب بھی موجود ہیں مگر بہت کمزور پڑ چکے ہیں۔ ان کے خلاف بھی بہت جلد حکومت ایک کریک ڈاؤن شروع کر دے گی۔" رتا کو سن نے ان گروہوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ غیر ملکیوں پر بھی نگاہ رکھی جا رہی ہے۔ دارا جیے لوگوں کو تلاش کیا جا رہا ہے اور بہت جلد تم پر خوش خبری سنو گے۔ دھرتی ان کے ناپاک وجود سے نجات حاصل کر چکی ہے۔

"پیڈرو کے ٹینگ کو کون لیڈ کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "جنگ جی۔" رتا کو سن نے جواب دیا "وہ ایک فوج کا اس ٹائٹ گلب کا مالک اور تھوڑا رینٹ غنڈا ہے۔ اے لوگوں پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ پولیس کا ایک عملی انسپکٹر بھی اسے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر سکتا ہے مگر کچھ سیاسی مصلحتیں حاصل ہیں جس وجہ سے اس کے خلاف ابھی تک کوئی موثر کارروائی نہیں ہو سکی۔"

"مثلاً کیا مصلحتیں ہیں؟" میں نے سوالیہ ٹھٹھکیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جنگ جی کو ایک سیاسی لیڈر کی پشت پناہی حاصل ہے۔" رتا کو سن نے جواب دیا "پہلے تو صورت حال یہ تھی کہ ہم اس سیاسی لیڈر کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ایک معاملے میں اس سیاسی لیڈر پر بھی ہمیں ہتھ پڑا تھا۔ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ وہ ایک فوجی قانونی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا ہے جو حکومت اور عوام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں اس لیے بہت جلد اس کے خلاف بھی کارروائی ہونے والی ہے۔"

"کیا آپ تازہ ترین صورت حال سے واقف ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں۔ مجھے مہاراج سے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ کو یہ مطلب ہے کہ آج جو چاہے ہوا اس کے بارے میں آپ کو پتہ نہیں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر تعجب

کا اظہار کیا۔ "ہاں۔ مجھے مہاراج سے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ کو یہ مطلب ہے کہ آج جو چاہے ہوا اس کے بارے میں آپ کو پتہ نہیں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر تعجب کا اظہار کیا۔ "ہاں۔ مجھے مہاراج سے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ کو یہ مطلب ہے کہ آج جو چاہے ہوا اس کے بارے میں آپ کو پتہ نہیں ہے۔"

نے جواب دیا۔

"اور آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ ہمارے اغوا میں کوئی شک نہیں ہے۔ پیچھے بھی جنگ جی کا ہاتھ تھا۔" میں نے "اوہ!" رتا کو سن چونک گیا "سیاسی لیڈر کی پشت پناہی کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ جنگ جی میں اس اتادم تم نے کیا ہے کہ تم جیسے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی کر سکتے ہو۔" انکشاف میرے لیے خاصا دلچسپ ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسے کسی اور طرف سے بھی شمل رہی ہے۔

"دارا؟" میں نے کہا۔ "نہیں۔" رتا کو سن نے نفی میں سر ہلایا "دارا جب پولیس آیا ہے مسلسل پس منظر میں ہے۔ ہم تو یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس شرط پر گولڈن ٹرائی ایجنسی سے واپس لایا گیا تھا کہ وہ کسی بھی طریقے سے جزل کھورٹ کا غنا پورا کرے گا جو اسے ہماری وجہ سے اٹھانا پڑا تھا۔ یہاں اب اتادم تم نہیں رہا لیکن ہو سکتا ہے کہ۔" "جزل کھورٹ کا ایک آدمی میگا تیرا بھی میرا چچا کرتا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اوہ!" رتا کو سن ایک بار پھر چونک گیا "ایسی صورت حال ممکن ہے کہ دارا اور جنگ جی اس سے مل گئے ہوں۔" یہاں کا مشترکہ منصوبہ ہو۔"

"یہ ان تینوں کا مشترکہ منصوبہ ہے۔" میں نے ایک لفظ پر زور دے دیا "بلکہ اس منصوبے میں لاؤس، تائیوان، تان منہ بھی شریک ہے۔" میں نے اسے "دارا" کے نام سے یاد دلایا۔ "جنگ جی کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں آچکا ہے۔" میں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے پہلے ہی کے ٹھکانے کا پتا چل گیا۔ اس جنگی کی نگرانی میں وہ وہاں سے بھی غائب ہو چکا ہے۔ آپ کی رائے مجھے خیال آ رہا ہے کہ اب اس کا ایک ہی ٹھکانا ہے۔"

"وہ کونسا؟" رتا کو سن نے پوچھا۔

"وہی سیاست دان جس کی اسے پشت پناہی حاصل ہے۔" میں نے کہا "وہی اسے پناہ دے سکتا ہے۔ اس کے بارے میں میں کوئی پتہ نہیں۔"

"اگر یہ بات سے تو اب نہ تو جنگ جی بچ سکے گا اور نہ ہی رتا کو سن نے کہتے ہوئے چندا روہن کو

اشارہ کیا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر سامنے رکھ دیا۔ رتا کو سن نے ریسور اٹھایا اور پولیس کمشنر کو کچھ باتیں دینے کے بعد فون بند کر دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "جنگ جی وہاں نہ بھی ہوا تو وہ سیاسی لیڈر ہماری گرفت میں آجائے گا۔ اس کے خلاف ہمارے پاس اتنے ثبوت موجود ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکے گا اور جنگ جی بھی کہیں پناہ حاصل نہیں کر سکے گا۔"

چند لمحوں خاموش گزیرے پھر ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب رتا کو سن اپنی بیگم مادام اینا کو رنیکو کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ مہاراج وہیں رہ گئے تھے۔ رتا کو سن جاتے ہوئے کہا تھا کہ ایک دو روز میں مجھے شمشادہ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

رتا کو سن اور مادام اینا کو رنیکو کو رخصت کرنے کے بعد ہم مہاراج کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مہاراج ہم سے بہت خوش تھے۔

اس وقت گیارہ بج چکے تھے کسی نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ خادمہ نے چندا روہن سے پوچھ کر کھانا میز پر لگا دیا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم کھانے سے فارغ ہوئے۔ یہ تھے کہ فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ چندا روہن نے اٹھ کر فون کا ریسور اٹھایا۔ وہ تقریباً دو منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر ماسٹر ہوجن کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے سرگوشی میں کچھ کہا اور پھر ریسور ماسٹر ہوجن کے ہاتھ میں دے دیا۔ فون پر بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی تھی۔ تقریباً تین منٹ بات کرنے کے بعد اس نے ریسور رکھ دیا اور ہمارے قریب آگیا۔

"جی فانگ آکاش بلڈنگ کے پنشن ہاؤس میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے ساتھ دارا بھی ہے۔" اس نے پہلے مہاراج اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" میں اچھل پڑا "تو پھر سوچ گیا رہے ہو ماسٹر ہمیں انہیں وہاں سے ہٹانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔" "دھیرن مائی سن دھیرن!" مہاراج نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا پھر ماسٹر ہوجن کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس اطلاع کے بارے میں تفصیل سے پوچھنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ آخر میں بولے "میرا خیال ہے زیادہ لوگ ہوتے تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔ تو ان بیان موجود ہے۔ ایک اور لڑکے کو بلاؤ۔ دو تم ہو۔ میرا خیال ہے تم چاروں ان سے نمٹ سکتے ہو۔"

"ان کے لیے تو ہم دونوں ہی کافی ہیں مہاراج۔" میں نے کہا "آپ اجازت دیں تو ہم ابھی روانہ ہو جائیں۔"

"ان کے لیے تو تم اکیلے ہی کافی ہو سکتے ہو۔" مہاراج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس مرتبہ ان میں سے کوئی بچ نکلے اور یہ بھی ممکن ہے ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو جو نگرانی کرنے والے کی نگاہوں میں نہ آیا ہو اس لیے دو لڑکے اور ساتھ لے جاؤ۔"

"نہیں مہاراج۔" میں نے سر جھکا دیا۔

ماسٹر ہوچن ایک اور لڑکے کو بلانے کے لیے فون کرنے لگا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ جاگتی اور تھائی بار بار میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ میری بے چینی کو سمجھ رہی تھیں۔ وہ خود بھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی تھیں مگر مہاراج کی وجہ سے دل کی بات نہیں کہہ سکتی تھیں کیونکہ مہاراج انہیں کسی صورت بھی ہمارے ساتھ جانے کی اجازت نہ دیتے۔

ہم اس وقت پھایا تھائی روڈ کے قریب تھے اور چائنا ٹاؤن میں مہاراج کا جنازہ ہم وہاں سے کافی دور تھا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر ہوچن کا آدمی بیس پچیس منٹ سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکے گا لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ تقریباً آٹھ منٹ بعد کوئی گاڑی گلی میں رکی اور پھر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ تو رات اس وقت باہر ہی موجود تھا۔ اس نے آکر بتایا کہ رنگت پہنچ چکا ہے۔ دراصل ماسٹر ہوچن نے مہاراج کے جنازہ کے بجائے اسی علاقے میں واقع اپنے ایک شاگرد کے ٹریننگ سینٹر پر فون کروا دیا تھا۔ جہاں سے رنگت سات آٹھ منٹ میں یہاں پہنچ گیا تھا۔

مہاراج نے ہمیں آئیر بادوی اور ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ دروازے سے نکلنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جاگتی اور تھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ چندا روہن ہمیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک ساتھ آیا تھا۔

باہر سفید رنگ کی ایک دین کھڑی تھی۔ رنگت اسٹریٹنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور توران باہر کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی دین کا دروازہ کھول دیا۔ ہمارے پیٹھ کے بعد وہ بھی پیٹرنز سیٹ پر بیٹھ گیا اور دین حرکت میں آگئی۔

"آکاش بلڈنگ کی طرف لے چلو۔" ماسٹر ہوچن نے رنگت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے رنگت کو دیکھتے ہی اس کے بارے میں ایک

رائے قائم کر لی تھی۔ اس کی عمر انیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، گھٹا ہوا جسم اور سر کے بال غائب تھے جنہیں اس نے گردن پر ایک چٹیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ اس نے سیلو لیس ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بازوؤں کے ابھرے ہوئے مسلوں کو دیکھ کر اس میں بھری ہوئی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

وین ایشیا ہوٹل کے قریب سے پہلے پھایا تھائی روڈ پر پھر پھلین ٹ روڈ کی طرف گھوم گئی۔ اگرچہ آدمی رات ہو رہی تھی مگر سڑکوں پر ٹریفک خاصا تھا اور پھر ہم ایک پیرس وے اور ریلوے برج سے ہوتے ہوئے مین سوکھم وٹ روڈ پر آ گئے۔ یہ شہر کا مرکزی اور سب سے بارونق علاقہ تھا۔ مین سوکھم وٹ روڈ یہاں سے شروع ہوتا تھا اور یہاں اس وقت بھی دن کا سا ساں تھا مگر ہمیں سوکھم وٹ روڈ پر زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ رنگت نے ہوٹل گرینڈ ان کے قریب سے وین کو ناتواں روڈ پر موڑ لیا۔

اس سڑک پر پاکستانی سفارت خانے کے سامنے سے ہوتے ہوئے ہوٹل پینشن ان اور ایک اسپتال کی عمارت کے قریب سے وین بائیں طرف ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر ذرا ہی آگے دائیں طرف مائیک پیل ہوٹل کی بلڈنگ تھی۔

"ہوٹل سے اگلے موڑ پر گھما کر گاڑی روک لو۔" ماسٹر ہوچن نے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

رنگت نے وین کی رفتار کم کر لی اور ہوٹل سے آگے نکل کر بائیں طرف ایک گلی میں مڑتے ہی وین روک لی۔ اس گلی میں بنگلے تھے مگر سناٹا تھا۔ گلی میں کسی قسم کی آمد و رفت نہیں تھی جبکہ چند گز کے فاصلے پر ہوٹل کے سامنے خاص چہل پھل نظر آ رہی تھی۔

دین رکنے کے صرف ایک منٹ بعد ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر دین کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ہاتھی نوڈر آکاش بلڈنگ کی نگرانی کر رہا تھا۔ بلڈنگ میں جی ٹانک اور دارا کی آمد کی اطلاع اسی نے دی تھی۔

"کیا رپورٹ ہے؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"ان دونوں کے بعد ایک آدمی اور آدمی چنٹ باؤنٹی لفٹ پر سوار ہو کر اوپر گیا ہے۔" ہاتھی نے بتایا "لیکن شکل صورت سے وہ تھائی لینڈ کا باشندہ نہیں لگتا۔"

"کوئی انڈین؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس کے چہرے کے نقوش دیتے تھے کہ اس نے ہاتھی سے ملنے جلتے ہیں۔" ہاتھی نے بتایا۔

”اوہ!“ میں چونک گیا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی تان منہ کا خیال ابھر آیا تھا۔ لاؤس اور دیت نام کے باشندوں کے چرے ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ میں نے تان منہ کا طبعیہ بتایا تو پتی زور زور سے سرھلانے لگا۔

”یہی ہے بالکل یہی طبعیہ ہے ماسٹر۔“ اس نے کہا۔

”وہ تان منہ ہے۔“ میں نے ماسٹر ہوجن کو بتایا۔

”ان کے علاوہ اور کون کون ہے؟“ ماسٹر ہوجن نے پاتھی سے پوچھا۔

”ادام اوٹو کو اور دو لڑکیاں۔ جوچی فانگ اور دارا کے ساتھ ہی آتی تھیں۔ ان میں ایک لڑکی غالباً نیشے میں دھت تھی جسے چی فانگ نے سنبھال رکھا تھا۔“ پاتھی نے جواب دیا۔

پاتھی کی بات سن کر ماسٹر ہوجن جیسے چونک سا گیا۔ وہ پاتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہوٹل میں کوئی لڑکی ملے گی۔ بہت زور دار قسم کی ہونی چاہیے۔“

”سوتے اس وقت ہوٹل میں موجود ہے۔“ پاتھی نے مائیک پیلس ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ تھوڑا کلاس ٹائٹ کلبوں کی رقاہ ہے آج کل بڑے ہوٹلوں میں پروگرام حاصل کرنے کے لیے ایسی جگہوں پر پھرتی ہے۔ بائیس تیس سال عمر ہے۔ بڑی حسین لڑکی ہے۔“

”لے آؤ اسے مگر جلدی۔ جو مانگے دے دنا۔“ ماسٹر نے کہا۔

”لیکن ماسٹر۔ آپ چاروں کو دیکھ کر شاید وہ ساتھ جانا پسند نہ کرے۔“ پاتھی بولا۔

”تم اسے لے آؤ۔ میں بات کر لوں گا۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا۔

پاتھی چند لمبے لمبے ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر سرھلا ناہوا ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

ماسٹر ہوجن کی باتوں سے میں بھی الجھ کر رہ گیا تھا۔ ہم دارا اور چی فانگ جیسے شاطر اور خطرناک لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے آئے تھے اور ماسٹر ہوجن کو لڑکی کی سوجھ رہی تھی۔ میں نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا اور پھر جیسے لمبے میں ہاتھ لگا کر اسے کسی حسین لڑکی کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔

میں دین سے پیچھے اتر آیا۔ اس سڑک پر تقریباً سو گز آگے آکاش بلڈنگ تھی۔ ماسٹر ہوجن بھی میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور آکاش بلڈنگ کے بارے میں بتانے لگا۔

یہ بلڈنگ ایک ہندو تاجر کی ملکیت تھی۔ وہ کوڑ بچا آدمی تھا اور شرمیں اور بھیست ہی پر اپنی ٹھکانے آٹھ سو گز آکاش بلڈنگ کو تعمیر ہوئے صرف پانچ سال ہوئے تھے یہاں صرف دولت مندوں کی رہائش تھی۔ اس بلڈنگ کے گرد چار ایکڑ رقبے پر خوب صورت لان بنے ہوئے تھے جن میں فوارے بھی تھے اور ایک بہت شاندار سوئمنگ پول تھی۔ بلڈنگ کے کمینوں کو تفریح کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں ان کی تفریح کا ہر سامان موجود تھا۔ سوئمنگ پول کے دوسری طرف ٹینس کورٹ بھی بنا ہوا تھا اور بلڈنگ کے نیچے بیسمنٹ میں خواتین کے لیے فٹنس کلب اور ریکریشن ہال بھی تھا جہاں چھوٹی موٹی تقریبات بھی ہوتی رہتی تھیں۔

اس بلڈنگ کی سیکورٹی کے بارے میں ہمارا قیدی بچہ ہی بتا چکا تھا۔ اصل بلڈنگ گیٹ سے بہت دور تھی۔ گیٹ کے اندر کی طرف گاڑو روم بنا ہوا تھا۔ جہاں چوبیس گھنٹے ایک گاڑو موجود رہتا تھا۔ چار دواوری بہت اونچی تھی اور اس پر خار دار تار لگے ہوئے تھے جس سے کسی کے گونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ گاڑو روم میں انٹر کام سسٹم بھی موجود تھا۔ جہاں سے بلڈنگ کے کسی بھی فلیٹ سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ گیٹ سے آگے کشادہ روش تھی جس کے دونوں طرف لان تھے۔ روش کے کناروں پر مور چمک قسم کے پورے تھے اور کوئی بھی پودا چارٹ سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ روش کے اختتام پر بلڈنگ کے سامنے آگے کو نکلا ہوا وسیع عریض پورچ تھا۔ جس کے بعد ایک کشادہ لابی تھی۔ اس لابی کے اندر دونوں طرف اوپر آمد رفت کے لیے کشادہ دروازے تھے اور سامنے چار لفٹیں لگی ہوئی تھیں۔ دو عام لوگوں کے استعمال کے لیے اور دو پینٹ ہاؤسز کے لیے اس وقت عریض بلڈنگ پر دو پینٹ ہاؤسز تھے جن میں سے ایک ادام اوٹو کو کے استعمال میں تھا۔

ماسٹر ہوجن مجھے آکاش بلڈنگ کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ بڑی بڑی برائیاں کے اڈے ایسی عالی شان عمارتوں میں ہوتے ہیں جہاں شرم کے معزز اور دولت مند لوگ رہتے ہیں۔ ایسی برائیاں پھیلانے میں ایسی معزز لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے مگر المیہ تو یہ ہے کہ حکومت متعلقہ ادارے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تقریباً دو منٹ بعد پاتھی ایک لڑکی کے ساتھ اس طرف آتا ہوا نظر آیا۔ ہم جس جگہ کھڑے تھے وہاں دو تیرے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہمارے قریب آکر کھڑے ہوئے۔

منا غور سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سونے تھی اور واقعی بہت حسین تھی۔ اس کی عمر بائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے لباس پہننے کا محض تکلف کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے جسم پر سجے ہوئے ان ریشمی جھیزوں کو لباس نہیں کہا جاسکتا تھا۔

سوتے نے پہلے ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر دین میں بنے ہوئے توران اور رنگت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ ہی اس کے چہرے پر گہرا ہمت کے تاثرات ابھر آئے۔

”نہیں سسٹم۔“ وہ پاتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

”میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“

وہ دو قدم پیچھے ہٹی تو ماسٹر ہوجن نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ سوتے کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ایک منٹ سوتے۔“ ماسٹر ہوجن نے نرم لہجے میں کہا

”ہم نے تمہیں کسی برے مقصد کے لیے نہیں بلایا۔ ہم نہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ایک معمولی سا کام ہے جو تمہیں کرنا ہے اور تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔“

”تم۔“ سوتے نے پہلی مرتبہ غور سے ماسٹر ہوجن کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ ہاں۔“

”دراصل۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ مہاراج کے بتناؤں میں تھی۔ وہاں تمہیں۔“

”تم نے ٹھیک پہچانا۔“ ماسٹر ہوجن نے اس کی بات کاٹ دی ”میں مہاراج کا نائب ہوجن ہوں اور یہ میرے است ہیں۔ ہم برے لوگ نہیں ہیں بلکہ ایک برائی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جس میں اس وقت ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ یہ یہ رقم پیشگی سمجھ کر رکھ لو۔“ ماسٹر ہوجن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ کئی ہزار روپے کے نوٹ تھے۔

سوتے کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ ماسٹر ہوجن کو پہچان لینے کے بعد وہ کئی قدر مطمئن ہو گئی۔ اس نے نوٹ اپنے پوسٹ میں ڈال لیے اور ہوجن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ کیا کام لینا چاہتے ہو؟“

”اس طرف آجاؤ۔“ ماسٹر ہوجن اسے لے کر دین کی زمیں چلا گیا کیونکہ اس وقت سامنے سے کوئی گاڑی آ رہی تھی اور یہ بھی غصہ تھا کہ ہمیں ایک لڑکی کے ساتھ اس نیم

تاریک جگہ پر دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہو جائے میں بھی ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

ماسٹر ہوجن سوتے کو ایک فرضی کمائی بنانے لگا۔ اس کمائی میں ادام اوٹو کو کا نام بھی تھا۔ اوٹو کو کے نام پر سوتے چونکے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”دراصل ہم ادام اوٹو کو کے مہمانوں کو سرسرا زورنا چاہتے ہیں۔“ ماسٹر ہوجن کہہ رہا تھا ”وہ ہمارے دوست ہیں۔ بہت پرانے دوست۔ چند گھنٹے پہلے کلب میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لڑکیوں کے چکر میں ہیں پتی بچا دے کر نکل گئے۔ ہم نے معلوم کر لیا کہ وہ لوگ ادام اوٹو کو کے فلیٹ پر ہیں۔“

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا

”اگر ہم بلڈنگ کے گاڑو کو بتائیں گے تو وہ انٹر کام پر ادام کو ہماری آمد کی اطلاع دے دے گا۔ اس طرح سارا مزہ کر کا ہو جائے گا اس لیے ہم بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں سمجھ گئی۔“ سوتے نے کہا ”لیکن کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوگا؟“

”ہو سکتا ہے ہمارے دوست ہمارے اس مذاق کا برا مان کر کچھ شور چلائیں مگر تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلڈنگ میں داخل ہونے کے بعد تمہیں نیچے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ تم چاہو تو واپس بھی آسکتی ہو۔ آگے کا کام ہم خود سنبھال لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ سوتے نے کہا اور میرا خیال ہے کہ وہ معاملے کی توجہ نہ دے گا۔ اتنی بے وقوف تو وہ ہرگز نہیں تھی کہ بات کو نہ سمجھ سکتی لیکن اس کے پاس واپس آنے کا چانس تھا اور اسی لیے وہ آمادہ بھی ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے ماسٹر۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

ماسٹر ہوجن نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سرھلا دیا۔ پانچ منٹ مزید گزر گئے۔ اب میں سوتے کو سمجھا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور پھر ہم دونوں دین سے اتر آئے۔

آکاش بلڈنگ وہاں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ میں اور سوتے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چلتے رہے۔ سوتے اس طرح جھوم رہی تھی جیسے نیشے میں ہو۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ میں نے ہولے سے گیٹ پر ہاتھ مارا۔ ذیلی دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ وہ ایک باوردی گاڑی تھا جس کے ہولسٹر میں پتول کا دستہ بھانک رہا تھا۔ اگر میں اکیلا

ہوتا تو شاید وہ دروازہ چند انچ سے زیادہ نہ کھولا مگر میرے ساتھ ایک حسین لڑکی تھی۔ اس نے اطمینان سے دروازہ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ہم چونکہ اس کے لیے اجنبی تھے اس لیے ہمیں مزید آگے جانے سے روک دیا گیا۔ ”کس سے ملنا ہے آپ لوگوں کو۔ کون سے فلیٹ میں؟“ گارڈ نے سوال کیا۔ ”میں نے جواب دیا۔“

”داماد آؤ تو کو۔ پنٹ ہاؤس۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک منصف میں ان سے پوچھ لوں۔ داماد کے پاس پہلے ہی ہیمان آئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ مصروف ہوں۔“ گارڈ کہتے ہوئے گیٹ سے ملحق گارڈ روم میں گھس گیا۔

سوئے بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں دروازے میں کھڑے ہو کر مختاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گارڈ انٹر کام کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا کہ سوئے لڑکھرائی ہوئی اس سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ گارڈ بدحواس سا ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔

”سہہ یہ۔“  
”نٹے میں ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن میں نٹے میں نہیں ہوں۔“

میں نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر گارڈ کو گرفت میں لے لیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا دے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کان کے پیچھے گردن کی نس ملنے لگا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر پیچھے ایک کرسی پر ڈال دیا۔

سوئے فوراً ہی گارڈ روم سے نکل کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور پھر میں سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں رنگٹ اور توران اندر داخل ہوئے اور گارڈ کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

دو منٹ بعد ماسٹر ہوچن، رنگٹ، توران، پانچی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ پانچی کے جسم پر گارڈ کی وردی تھی۔ بے ہوش گارڈ کو گیٹ کے باہر والے چھوٹے سے لان کی باڑھ کے پیچھے ڈال دیا گیا تھا۔ وہ دو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔

وہ چاروں گارڈ روم میں داخل ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ میں اس وقت گارڈ روم کی عقبی کھڑکی سے بلڈنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر ہوچن کا اشارہ یا کمرے میں سوئے کے ساتھ باہر آگیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بلڈنگ کی طرف چلے لگا۔ روش کے دونوں طرف مورچک کے پورے تھے جن کے پیچھے

وسیع لان تھے۔ ہو سکتا ہے شام کے بعد کچھ دیر کے لیے میاں تمیاں جلتی ہوں لیکن اس وقت لان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وسیع و عریض پورچ میں کافی آگے دو گائیاں کھڑی تھیں۔ سوئے پہلے بھی اسی بلڈنگ میں آچکی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ بلڈنگ کے پیچھے بیسمنٹ میں کینوں کی گاریوں کے لیے پارکنگ تھی۔

لالی کافی کشادہ تھی۔ مختلف جگہوں پر چند صوفے رکھے ہوئے تھے۔ کنکریٹ کے بڑے بڑے مکے بھی تھے جن میں چھوٹے قد کے بچوں کے پورے لگے ہوئے تھے۔ مرکزی دروازے کے بائیں طرف ایک دروازے پر آئس کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دن میں یہاں عمارت کا نگران بیٹھا ہوگا لیکن اس وقت دفتر تھا۔ اس دروازے کے ساتھ ہی دو پارے ایک بت بڑے بورڈ پر کارڈ لگائے والے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ ہر خانے پر فلیٹ نمبر اور کین کے نام کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ اوپر دو پنٹ ہاؤسز کے خانے تھے جن میں ایک پر ”اے“ اور دوسرے پر ”بی“ لکھا ہوا تھا۔ لی والے خانے میں داماد آؤ تو کو کے نام کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ اے والے خانے کا کارڈ دیکھنے کی میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔

ایک کشادہ زینہ دائیں طرف تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ سامنے چار لفٹس تھیں۔ درمیان والی دو عام کینوں کے استعمال کے لیے اور دائیں بائیں والی دونوں پنٹ ہاؤسز کے لیے مخصوص تھیں۔

لالی کے دائیں طرف اس میں منٹ کا راستہ تھا۔ جہاں کینوں کے لیے ریکریشن ہال تھا۔ نیچے جاتے ہوئے اس راستے میں اگرچہ ہم سی روشنی تھی مگر اس طرف سناٹا تھا۔ ظاہر ہے رات ایک بجے تو ریکریشن ہال نہیں کھلا ہوگا۔

میں نے لالی کے دروازے کے قریب آگیا ہر کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کر دیا۔

ماسٹر ہوچن، رنگٹ اور توران گارڈ روم سے نکل کر تیزی سے اس طرف آنے لگے۔ پانچی وہیں رہ گیا تھا۔ ہم سب لفٹ بی کے قریب جمع تھے۔ لفٹ اوپر تھی۔ ماسٹر ہوچن نے دو تین مرتبہ جھن دیا لیکن لفٹ نیچے نہیں آئی۔

”ایک منٹ!“ سوئے آگے بڑھتے ہوئے بولی ”لفٹ اوپر لاک ہوگی۔ ایمر جی کا مٹن دبانے سے لاک کھل جائے گا اور لفٹ نیچے آئے گی۔“ اس نے پلیٹ پر وہ جھن دیا جس پر اسی لکھا ہوا تھا۔ وہ ہندسہ روشن ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے

”سراخانہ روشن ہو گیا جس پر اریو کا نشان بنا ہوا تھا تیر کا رخ نیچے کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ لفٹ نیچے آ رہی تھی۔ ماسٹر ہوچن نے توران کو اشارہ کیا۔ وہ ایک صوفے کے پیچھے جھک کر بیٹھ گیا۔ لفٹ کو نیچے آنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ سوئے نے ٹاپ فلور کا مٹن دبا دیا۔ ویسے بھی یہ لفٹ ٹاپ فلور کے لیے ہی تھی۔ راستے میں کینیں نہیں رکھی تھیں۔

لفٹ رکنے سے پہلے ہی میں نے جھک کر پانچے کے نیچے سے خنجر نکال لیا۔ ماسٹر ہوچن نے بھی جب سے پتھول نکال لیا تھا اور رنگٹ کے ہاتھ میں بھی خنجر نظر آ رہا تھا۔

ہمارے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر سوئے کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ معاملہ گھبر تھا اور کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

”یہ کیا ہے۔“ وہ باری باری ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے ہٹائی ”تم لوگ تو اپنے دوستوں کو سربراہ کر دیتا چاہتے ہو۔“

”ہاں۔ یہ بھی سربراہ کا ایک طریقہ ہے۔“ ماسٹر ہوچن نے کہا ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم دبی کیوی جو ہم کینیں گے۔“

لفٹ رکنے کی اور دروازہ کھل گیا۔ لفٹ کے دروازے کے سامنے ایک کینوٹی سی بی ہوئی تھی۔ اس سے آگے ایک خوب صورت لان تھا اور لان کے پری طرف پنٹ ہاؤس تھا۔ لان میں دو بنگلوں پر مرکزی ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں۔ لفٹ کے بائیں طرف ذرا ہٹ کر نیچے آؤد رنٹ کے لیے زینہ بھی تھا جس کا دروازہ بند تھا۔

یہ پنٹ ہاؤس کسی طرح بھی ایک شاندار بیٹنگ سے کم نہیں تھا۔ لفٹ سے لے کر۔۔۔ برآمدے تک لان کے کچھوں بیچ ایک دوش تھی جس کے اوپر سامنے کے لیے ایک خوبیل سائیکل بنا ہوا تھا۔

برآمدے والا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ دائیں بائیں کے کھول کی کھڑکیوں میں روشنی جھلک رہی تھی۔ کھڑکیوں کے سامنے اندر کی طرف پارک ریڈیو پڑے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری دونوں کھڑکیوں میں جھانک کر دیکھا مگر کوئی دھماکی نہیں دیا۔

ماسٹر ہوچن نے دروازے کے پنڈول پر ہاتھ رکھ کر غلطی سے ٹھکرایا۔ دروازہ آواز پیدا کیے بغیر بہت آہستہ چلا گیا۔ اندر کسی طرف سے قہقہوں کی ملی جلی آوازیں غلغلے سے رہی تھیں۔ ماسٹر نے سوئے کو اشارہ کیا۔ اس کے

چہرے پر ایک بار پھر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے چٹکیا رہی تھی۔ ماسٹر نے دوبارہ پتھول سے اشارہ کیا تو وہ دروازے میں داخل ہو گئی۔

اس کے پیچھے ہی میں بھی دروازے میں داخل ہو گیا۔ ماسٹر ہوچن نے رنگٹ کو دہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اندر آگیا۔

یہ مختصر سی راہداری تھی۔ جس کے آگے ایک وسیع ہال تھا جو شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہال کے اختتام پر بائیں طرف دو کمرے تھے اور دائیں طرف ایک کشادہ راہداری تھی۔ اس راہداری میں بھی آئے سانے دو کمرے تھے اور قہقہوں کی آوازیں اسی طرف سے آ رہی تھیں۔

ہال کے اختتام پر دونوں کمروں کے دروازے چند انچ کے قریب کھلے ہوئے تھے۔ اس طرف بھی ایک کمرے سے نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ماسٹر ہوچن نے سوئے کو اس طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سوئے نے ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ وہ دروازہ کھل گیا اور داماد آؤ تو کو باہر نکلی ہوئی نظر آئی۔ عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوئی مگر بڑی حسین عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بول تھی۔ دروازے کے باہر سہلا قدم رکھتے ہی وہ سوئے اور پھر ماسٹر ہوچن کو دیکھ کر کرا پھیل پڑی۔

”اے۔۔۔ کون ہو تم لوگ!“ وہ چیخی۔ ماسٹر تیزی سے اس کی طرف پلک۔ آؤ تو کو چیخی ہوئی دوبارہ کمرے میں گھس گئی۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی مگر ماسٹر ہوچن نے بڑی پھرتی سے پھر دروازے میں پھنسا دیا تھا۔ سوئے نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے ایک بھاری صوفے کے پیچھے چھلنا لگا دی۔

میں نے راہداری کی طرف چھلنا لگا دی۔ دائیں طرف کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور قہقہوں کی آوازیں اسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ میں نے پیر کی زوردار ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

کمرے کے اندر کا منظر بہت شرمناک تھا۔ تان منہ ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھ پر ہتھم لکھا ہو رہا تھا۔ دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔ دروازے پر لگے والی میری ٹھوکر خاصی زوردار تھی۔ ان دونوں نے مزکرہ دروازے کی طرف دیکھا اور پھر لڑکی کے حلق سے خوفناک چیخ نکل گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو تان منہ کی گرفت سے چھڑا کر وہ چیخی ہوئی ہاتھ روم کی طرف لپکی۔ تان منہ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میرا خیال

تھا کہ وہ میرے اوپر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بھی ہاتھ روم کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے اندر بھاگتے ہی دروازہ دھڑ سے بند کر دیا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو باہر سے کھڑا لگا دیا۔ تان منہ نے اس لڑکی کے ساتھ ہاتھ روم میں گھس کر بہت بڑی حفاقت کا ثبوت دیا تھا۔ باہر رہ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تو شاید اس کے بھاگ نکلنے کا کوئی چانس ہو تا مگر ہاتھ روم میں گھس کر اس نے خود ہی اپنے آپ کو قید کر لیا تھا۔

میں ہاتھ روم کے دروازے کو کھڑا لگا کر مڑا ہی تھا کہ سامنے والے کمرے سے ایک چچی ہوئی آواز سنائی دی۔

”اوٹو کو کیا ہوا؟“

یہ جی فانگ کی آواز تھی۔ اس آواز کو تو میں لاکھوں کے جھوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔ میں نے اس طرف چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی وقت سامنے والا دروازہ کھلا اور جی فانگ باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بد خواص سا ہو گیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے منہ پر زور وار ٹھونسنا رسید کر دیا۔ وہ جھپٹا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

میں اس کے پیچھے ہی کمرے میں گھس گیا۔ جی فانگ بے لباس تھا۔ وہ لٹکھڑا ہوا ایک کرسی سے ٹکرایا اور کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ کمرے میں ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ چینی ہوئی ہاتھ روم میں گھس گئی اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ جی فانگ نے بھی اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف چھلانگ لگائی تھی مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میرے پیر کی زور وار ٹھونس کر وہ بیڈ کے دوسری طرف گرا۔

میں نے راستے میں پڑی ہوئی کرسی اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور جی فانگ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اچھل کر کودا ہو گیا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں اگرچہ خنجر تھا مگر اس نے خنجر کی پروا کیے بغیر چھلانگ لگا دی۔ اس کے پیر کی ٹھونس میرے خنجر والے ہاتھ پر لگی۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل کر ڈرننگ ٹیبل پر جا گرا۔ وہاں پہلے سے جی فانگ کا پستول بھی رکھا ہوا تھا۔ جی فانگ نے ہتھیلیوں سے مجھے سائیڈ کلک لگانے کی کوشش کی مگر میں نے وہ کلک لگا کر ہی روک لی اور جوابی حملہ کرتے ہوئے اسے زور وار فرنٹ کلک رسید کر دی۔ وہ چیختا ہوا بیڈ پر گرا۔ میں اس پر دوسرا وار کرنے کے لیے ہاتھ پھیر رہا تھا کہ وہ سانپ کی طرح بڑی تیزی سے رینگتا ہوا بیڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور ڈرننگ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ غالباً اپنا پستول اٹھانا چاہتا تھا مگر اسی لمحے میں نے

اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر پیچھے گھمٹ لیا۔ تاہم پستول کے بجائے میرا خنجر اس کے ہاتھ میں پھنسا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میری گرفت میں تھیں۔ اس نے اپنے کندھے سے اوپر اٹھاتے ہوئے خنجر سے حملہ کر دیا۔ میں نے اس کی ٹانگیں چھوڑ کر دروازے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خنجر کی نوک میرے بازو کے مسل پر کھال چربی ہوئی نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی جی فانگ نے میرے سینے پر زور دار ٹھونس کر بھی رسید کر دی تھی۔

میں کراہتا ہوا پیچھے الٹ کر بیڈ سے نیچے گر گیا۔ میرے ہتھیلیوں سے پہلے ہی جی فانگ نے اٹھ کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس نے خنجر سے حملہ کیا تھا مگر میں نے اس کا وار روک لیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی کھائی موڑنے لگا۔

بہت عرصے بعد جی فانگ سے میرا اس طرح مقابلہ ہوا تھا اور میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ جی فانگ میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کی ہاتھوں میں فولادی قوت تھی۔ اس عرصے میں میں نے بھی اگرچہ مسلسل پریکٹس کی تھی مگر اس وقت تو مجھے واقعی واہتوں پہنچنے لگا تھا۔

خنجر کی نوک میری آنکھ کے عین اوپر تھی۔ تقریباً ایک انچ کا فاصلہ تھا۔ جی فانگ کے چہرے پر شدید تباہی تھا۔ خنجر کو نیچے لانے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ خنجر آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کا ایک معمولی سا جھٹکا مجھے ایک آنکھ سے محروم کر سکتا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ موڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی گھٹنے سے اس کی ٹانگوں میں ضرب لگائی تھی۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے اسے دونوں پیروں پر اٹھا کر پوری قوت سے اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں نے اٹھتے ہی اس کے ہاتھ پر زور وار ٹھونس کر دیا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا مگر وہ خود ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے موقع ملنے ہی دیا میں ٹانگ پر چمکتے ہوئے ہاتھیں پیر سے فرنٹ ہائی کلک لگائی۔ کلک اس کی غوڑی کے نیچے لگی۔ وہ کراہتا ہوا لٹکھڑا کر پیچھے ہٹا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔

ہاتھ روم سے لڑکی کے چینی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ اگرچہ اس نے اندر سے بند کر لیا تھا مگر خنجر سے وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کی بیٹیوں کی آواز سن کر کوئی مدد کے لیے آجائے گا لیکن کم از کم اس فلیٹ میں اس کی مدد کو آنے والا کوئی نہیں تھا۔ بلڈنگ

میں کسی اور جگہ اس کی آواز سننے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ سینٹ ہاؤس تھا۔ آٹھ منزلہ بلڈنگ کی چھت۔ تراز فضا میں تو چاروں طرف پھیل سکتی تھی لیکن اس بلڈنگ کے کسی فلیٹ میں سننے جانے کا امکان نہیں تھا۔

یہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ مارشل آرٹ کا مظاہرہ کیا جائے۔ یہ موقع تو ایسا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے حریف کو زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ جی فانگ بھی غالباً اس رخ پر سوچ رہا تھا۔ وہ کسی قدر نیچے جھک کر تیزی سے میری طرف ہلکا۔ وہ غالباً میرے سینے یا پیٹ پر سر کی کل مارنا چاہتا تھا۔ میں نہ صرف تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا بلکہ اس کے سر پر زور دار ٹھونس کر بھی رسید کر دی۔ وہ کراہتا ہوا ہاتھ روم کے دروازے کے قریب گرا۔

اسی لمحے باہر سے فانگ کی آواز سنائی دی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ گولی کسی نے چلائی تھی۔ میں تان منہ کو دوسرے کمرے کے ہاتھ روم میں بند کر چکا تھا۔ جی فانگ میرے سامنے تھا۔ اب صرف دارا رہ جاتا تھا اور اس کے مقابلے پر وہ آ رہی تھی۔ ماسٹر ہو جن اور رنکٹ ہو سکتا ہے گولی ماسٹر ہو جن ہی نے چلائی ہو لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ دارا کے پاس بھی پستول یا ریو لور موجود ہو اور گولی اس نے چلائی ہو۔

جی فانگ نے ایک بار پھر اٹھ کر حملہ کر دیا۔ اسی وقت ایک اور فانگ کی آواز سنائی دی۔ جی فانگ جو تک کی طرح مجھ سے پلٹ گیا تھا۔ وہ میرے گلے پر ہاتھ جمائے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیتے رہے اور پھر میں نے اسے اپنے پیروں پر اٹھا کر پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ وہ فلا بازی کھانا ہوا ہاتھ روم کے دروازے سے ٹکرایا۔ وہ لڑکی ہاتھ روم اندر سے لاک نہیں کر سکتی تھی۔ جی فانگ کی ٹکر سے دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کی فونک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ جی فانگ پشت کے بل گرا تھا۔ اس کا اوپر کا دھڑ ہاتھ روم کے اندر تھا اور ٹانگیں باہر۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور اوپر اٹھاتے ہوئے اسے پیچھے الٹا دیا اور بڑی پرحمت سے دروازہ کھینچ کر باہر سے کھڑا لگا دیا اور پھر اسی وقت باہر سے مجھے ایک تیز نسوانی چیخ بھی سنائی دی تھی۔

میں باہر کی طرف ہلکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رکھا۔ بائیں کورڈرننگ ٹیبل سے جی فانگ کا پستول اٹھایا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی لیکن راہداری میں آتے ہی ایک چینی اور

غرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”وہیں رک جاؤ۔ ورنہ اس لڑکی کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

وہ دارا کی آواز تھی۔ میں رک گیا مگر میرے منہ سے اس طرح گرا سانس نکل گیا جیسے اچانک ہی غبارے کی ہوا نکل گئی ہو۔ دارا نے سونے کو گرفت میں لے رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی ٹال سونے کی کینٹھیں کو چھو رہی تھی۔

”ایک روز میں نے کہا تھا کہ تم بہت تیز دوڑ رہے ہو۔ منہ کے بل کرو گے۔“ دارا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم واقعی بہت تیز دوڑ رہے ہو۔ تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے، قابل تعریف ہے۔ گولڈن ٹرائی اینٹنگل سے بچ کر نکل جانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ تم بلاشبہ بہت تیز اور حوصلہ مند اور تیز رفتار آدمی ہو لیکن اس وقت میں تمہاری تعریف کرنے کے لیے یہاں نہیں رکوں گا۔ پستول پھینک دو۔ ورنہ میں اس لڑکی کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

میں نے ماسٹر ہو جن اور رنکٹ کی طرف دیکھا۔ ماسٹر ہو جن کا پستول اس سے دور قایلین پر بڑا تھا۔ ماسٹر نے اشارہ کیا اور میں نے بھی پستول پھینک دیا۔ سونے بے گناہ تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ دارا اس کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

”گھنڈ۔ سمجھ دار ہو۔“ دارا کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آگئی۔ ”میں چاہوں تو اس وقت تمہیں بھی گولی سے اڑا کر یہ قصہ ختم کر سکتا ہوں لیکن تمہاری وجہ سے میں اپنا سب کچھ ہار چکا ہوں۔ میرے سارے منصوبے لمبا میٹ ہو چکے ہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا لیکن پاکستان میں تمہارے باپ کا چھپایا ہوا سونا اب بھی محفوظ ہے اور اس سونے کا راز اس ڈاکٹر میں ہے جو تمہارے قبضے میں ہے۔ وہ سونا میرے نقصان کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اگر اس وقت تمہیں مار ڈالوں تو میرے ہاتھ کچھ نہیں آتے گا۔ اس وقت میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ تم سے اچھے سکھ لیکن میں جانتا ہوں کہ ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ کسی اور وقت کسی اور جگہ۔ اور ہماری وہ ملاقات فیصلہ کن ہوگی۔“ بات کرتے ہوئے اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ اتنا غیر محتاط نہیں تھا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکتی۔ میں نے بھی اُدھر اُدھر دیکھا۔ مادام اوٹو کو بھی ایک طرف کھڑی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک لڑکی

بیٹے کے قریب قاتلین پر اندھ بھی پڑی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ بے ہوش بھی یا سرچکی بھی۔  
 ”میں جانتا ہوں کہ تم کوئی انتظام کیے بغیر اوپر نہیں آئے ہو گے۔“ دارا نے ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں تمہارے داد بیچ بڑی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ نیچے گیٹ پر بھی تمہارا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور موجود ہوگا۔ یہاں سے انٹرکام پر اپنے آدمی کو بدایت کر دو کہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے اگر اس نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو یہ لڑکی زندہ نہیں رہے گی۔ چلو۔ سامنے انٹرکام لگا ہوا ہے۔ اپنے ساتھی کو بتا دو کہ میں نیچے آ رہا ہوں۔ گیٹ کھول دے۔“

میں نے آگے بڑھ کر دیوار پر لگے ہوئے انٹرکام سینک کا ریسپورڈ اٹھایا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ گاڑی روم میں کس نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔  
 ”اوٹو ٹوک۔ اسے گیٹ کا نمبر بتاؤ۔“ دارا نے اوٹو کو کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

مادام اوٹو کو نے ہیں کھڑے کھڑے گاڑی روم کا نمبر بتادیا۔ میں نے مطلوبہ نمبروں کے شن دیا۔ دوسری مرتبہ ٹکٹنی بجنے کے بعد ہی دوسری طرف سے ریسپورڈ اٹھایا گیا تھا۔  
 ”یس۔ آکاش بلڈنگ۔“

اگر اصل گاڑی انٹرکام کی یہ کال ریسپورڈ کرتا تو وہ آکاش بلڈنگ کبھی نہ کہتا۔ کیونکہ یہ باہر کی کال نہیں تھی۔ بلڈنگ کے اندر سے انٹرکام کی کال تھی اور کال ریسپورڈ کرنے والا یقیناً پاتھی تھا۔

”پاتھی۔“ میں نے کہا ”دارا اسونے کے ہاتھ نیچے آ رہا ہے۔ کوئی مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ران کو بھی لانی سے باہر بلا دو۔ گیٹ کھول دو۔ ساتھ نہ کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔“

”یس مکمل ماسٹر۔“ پاتھی کی آواز سنائی دی۔  
 میں نے ریسپورڈ رکھ دیا اور دارا کی طرف دیکھنے لگا۔  
 ”شکر ہے۔“ دارا کے ہونٹوں پر کموہ سی مسکراہٹ آگئی  
 ”تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ مجھے اس طرح نکل جانے کا موقع دو گے۔“

”ہاں۔ میں تمہیں موقع تو دے رہا ہوں لیکن پھر ملاقات ہوگی۔ بقول تمہارے کسی اور وقت کسی اور جگہ۔ ویسے ایک بات تم بھول رہے ہو۔ ٹرپ کا پتا اب بھی میرے پاس ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”میں سمجھ گیا تم کسی جے کی بات کر رہے ہو۔“ دارا بولا

”میں جی فانگ کے شور کی آواز سن رہا ہوں۔ اسے شاید تم نے کمرے کے ہاتھ روم میں بند کر دیا ہے۔ اگر مجھے اس کی ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے اسی کو پھرانے کی کوشش کرتا، لیکن اب وہ میرے کام کا نہیں رہا۔ بوجھ بن چکا ہے۔ میں تو پہلے ہی اس سے پیچھا پھرانا چاہتا تھا۔ یہ ایک ایسا موقع ہے اور اب تم لوگ اس طرف جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ اگر کسی نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اس لڑکی کا میاں اڑا دوں گا۔“

”تم اس لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔“ میں نے کہا ”اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے تو ہم زبردستی پکڑ کر لائے تھے۔ بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اب تم لوگ ادھر۔“ اس نے آگے ت اشارہ کیا۔

ہم سب ہال کے آخری کونے میں چلے گئے۔ دارا اس لڑکی کو لے کر دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کی نظریں ہم پر ہی مرکوز تھیں۔ برآمدے والے دروازے سے باہر نکل کر اس نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا اور باہر سے کنڈا لگائے جانے کی آواز بھی سنائی دی۔

میں اور ماسٹر بوجھ اپنے اپنے پستول کی طرف لپکے۔ رکھت بھی حرکت میں آ گیا تھا اور پھر ایک سینکڑ بعد ہم دروازے کے سامنے موجود تھے۔ رکھت دروازے پر کنڈے سے ٹکرائے مار رہا تھا۔ بعد میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن بہت جلد ہمیں اپنی حیات کا احساس ہو گیا۔ یہ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا اور باہر سے کنڈا لگا دیا گیا اسے باہر سے ٹکرائے مار کر توڑا جاسکتا تھا لیکن اندر سے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

”اے ادھر۔“ مادام اوٹو کی آواز سن کر میں چونک گیا  
 ”ادھر کچن کی طرف سے بھی باہر نکلے کا راستہ ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم کچن کی طرف لپکے۔ اس طرف سے ایک چھوٹا دروازہ پھلوں میں کھلتا تھا۔ ہم بڑی تیزی سے اس دروازے سے باہر نکلے تھے اور پھر لان میں دوڑتے ہوئے لفٹ کے دروازے کے سامنے رک گئے۔ لفٹ نیچے جا چکی تھی۔  
 ”ماسٹر۔“ میں نے ماسٹر بوجھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا  
 ”ان دونوں کمروں کے ہاتھ روم میں تان منہ اور جی فانگ بند ہیں۔ تم دونوں انہیں سنبھالو۔ انہیں فرار کی کسی کوشش

بہا بہا نہیں ہونا چاہیے۔ میں دارا کو دیکھتا ہوں۔“  
 میں تیزی سے زینے کی طرف دوڑا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ میں ایک ایک چھلانگ میں کئی چھلانگیں پھلانگتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔

میں جب نیچے پہنچا تو دارا سونے کو لے کر لانی کے باہر چل بیٹھ چکا تھا۔ باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ توران اور لانی کے قریب ایک طرف کھڑے تھے۔  
 دارا نے پستول بدستور سونے کی کینٹی سے لگا رکھا تھا۔  
 رہے ہاتھ سے وہ اسے بازو سے پکڑے سمجھتا ہوا جا رہا تھا۔  
 پوچھ میں آتے دیکھ کر کچھ چیخا۔  
 ”انی جگہ پر رک جاؤ اور اپنے آدمیوں سے کو دور رہیں۔“

میں رک گیا۔ پاتھی اور توران بھی ایک طرف ہٹ گئے۔ دارا سونے کو لے کر گیٹ سے باہر نکل گیا اور پھر

لانے کی اور سونے کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگیں۔  
 میں دوڑ کر گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لمبے گور کا پھر

بہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا نالہ نکل گیا۔ سونے سڑک پر پڑی بیانی انداز میں چیخ رہی اور پائی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔  
 ”ہی تھیں اور پھر وہ آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔“

میں دوڑ کر سونے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سڑک پر پڑی تھی، بیانی طرح چیخ رہی تھی۔ میں جھک کر اسے نونٹے لگا۔  
 نالہ تھا شاید دارا نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تھا لیکن

بالائی بات نہیں تھی۔ دارا نے اسے دھکا دے کر دور بٹھایا تھا جس سے اسے معمولی سی چوٹ لگی تھی۔ وہ نہ بچتی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔  
 اس دوران میں پاتھی اور توران بھی دوڑتے ہوئے

نکلے۔ توران دارا کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر میں نے نہ دیکھ دیا۔  
 کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے کہا ”ان تاریک گلیوں میں

نت درج چکا ہوگا۔ اب وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ بیکار ہے۔“  
 ”نیچے جانا۔“  
 توران اور پاتھی، سونے کو پکڑنے کے گاڑی روم میں لے گئے۔ اور ایک کمرے پر ٹھہرا دیا۔ خوفناک ترین لمحات اگرچہ  
 بچا تھے اب وہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ اسے کوئی ایسا خطرہ ان خوفناک لمحات کے تصور سے وہ قہر قہر  
 پہنچ رہی تھی۔  
 ”میں نے جی فانگ والی بھاگ دوڑا اور سونے کی چیخوں کے نتیجے

میں بلڈنگ کے بعض فلینوں کی کھڑکیاں روشن ہو گئی تھیں۔  
 بعض بجلی منروں کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں اور کچھ لوگ آگے کو بھاگنے دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت نے گاڑی کا نام لے کر چیختے ہوئے پوچھا بھی تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ یہ کڑ بولیں  
 ہے۔ وردی میں لمبوس پاتھی کو وہ گاڑی سمجھی تھی لیکن  
 پاتھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم لوگ یہیں رکو۔ میں اوپر جا رہا ہوں۔“ میں نے پاتھی اور توران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دوڑتا ہوا لابی میں پہنچ گیا۔

وہ لفٹ نیچے ہی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر مٹن دیا۔  
 لفٹ تیزی سے اوپر اٹھنے لگی۔

لفٹ رکی تو دروازہ کھلتے ہی میں نے باہر چھلانگ لگا دی اور دوڑتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ میرے بعد ماسٹر بوجھ یا  
 رنگت نے برآمدے والا دروازہ باہر سے کھول دیا تھا۔

اندر کا منظر خاصا دلچسپ تھا۔ جی فانگ اور تان منہ قاتلین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ باندھنے سے پہلے ماسٹر بوجھ نے انہیں کپڑے سینے کا موقع دے دیا تھا۔ تین جوان اور خوب صورت لڑکیاں اس وقت تک کپڑے پہن چکی تھیں اور  
 ایک صوفے پر مادام اوٹو کو اور دوسرے پر وہ تینوں لڑکیاں  
 ایک دوسرے سے لپٹی بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک تو  
 بھائیں بھائیں رو رہی تھی۔

”کیا رہا؟“ ماسٹر بوجھ نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔  
 ”بھاگ گیا۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔  
 ”اور وہ لڑکی؟“

”وہ محفوظ ہے۔“ نیچے گاڑی روم میں ہے۔“ میں نے جواب دیا اور جی فانگ کی طرف دیکھنے لگا ”بہت زعم تھا  
 تھیں دارا کی دوستی پر۔ دیکھ لیا اس دوستی کا انجام۔ بھاگ گیا  
 تھیں چھوڑ کر۔ تم اس کے لیے بوجھ بن گئے تھے اور وہ  
 تم سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس وقت تو اسے ایک  
 بھانہ مل گیا تھا۔“

”میں۔ تم جھوٹ بکتے ہو۔ دارا ایسا نہیں کر سکتا۔“  
 جی فانگ چیخا۔

”ایسا تو پوچھا۔“ میں نے پوچھا ”اور ایسا کیوں ہوا؟ یہ  
 تم اسی سے پوچھ لینا۔ اگلے جنم میں۔“  
 جی فانگ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔  
 میں تان منہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”میں نے جی فانگ ساکین کے اس فارم ہاؤس میں



اس کے ہاتھوں سے بچ نکلا اور کبھی وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گیا اور آج کا منظر کچھ ایسا تھا کہ وہ مکمل طور پر میرے قابو میں تھا۔ میں نے اسے غسل خانے میں بند کر دیا تھا اور اگر میں دارا کے پیچھے نہ بھاگتا تو جی فانگ کی ٹانگیں چیر ڈالت۔ دارا کے فرار کے بعد جب میں فلیٹ میں واپس آیا تو جی فانگ بندھا ہوا رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر بچانے مجھے کیوں جوش نہیں آیا۔ خون میں ابال کیوں نہیں پیدا ہوا۔ میں نے اسے خون خوار بھیرے کی طرح چیرھاڑ کیوں نہیں دیا تھا۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں خون خوار بھیڑیا نہیں تھا۔ میری رگوں میں شریف النفس والدین کا خون دوڑ رہا تھا۔ میں فطرتاً رحم دل اور شریف انسان ہی تھا مگر مجھے جنگ جو بنا دیا گیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں دوسروں کی جان لینا رہا تھا اور اب شاید میں نے جی فانگ کو اس لیے نہیں مارا تھا کہ وہ میرے سامنے بے بسی کی حالت میں بندھا پڑا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ پیر کھلے ہوتے اور وہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی اور وہ میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔

”تمہیں افسوس ہو رہا ہو گا کہ جی فانگ کو پولیس کے حوالے کیوں کر دیا گیا۔“ جاگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے تھے۔

”ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے گہرا سانس لینے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارا مقصد تو اسے کیفر کرنا تک پہنچانا تھا۔“ جاگی بولی ”ضروری نہیں کہ کسی سے انتقام لینے کے لیے اسے اپنے ہاتھوں ہی سے قتل کیا جائے۔ وہ قاتل ہے کئی بے گناہ لوگ اس کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اب وہ قانون کی تحویل میں ہے اور قانون اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اسے اس کے جرائم کے مطابق سزا ضرور ملے گی۔“

”ہاں یہی ایک اطمینان ہے کہ قانون اسے معاف نہیں کرے گا۔“ میں نے کہا ”اب دارا باقی رہ گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی زیادہ دنوں تک آزاد نہیں رہ سکے گا۔ اسے میں قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ سارا ہنگامہ اس نے شروع کیا تھا۔ میرے ماں باپ کا اصل قاتل تو وہی ہے۔ میں اسے کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔“

”ہم بھی اسی کی وجہ سے یہ عذاب بھگت رہے ہیں۔“

تو یہ سارے ہنگامے شروع نہ ہوتے اور ہمیں اس بڑی کڑن برباد نہ ہونا پڑتا۔“

میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی زبان پر پہلی مرتبہ اس قسم کی کوئی بات آئی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ اپنی زبان پر احساس ہوا تھا اور شاید اب اسے کچھ پتہ چلتا ہو رہا تھا۔

”ٹھیک کہتی ہو تھائی۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا سانس نکل گیا۔ ”مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے جب میرا جی فانگ سے اپنی جان بچانے کے لیے تمہاری کار میں پھپ گیا تھا اور تمہاری بربادی تو اسی وقت شروع ہو گئی جب تم نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی اگر تم اسی وقت مجھے دھکا دیتیں تو آج تمہیں یہ دن۔“

”وجہ۔“ تھائی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی تمہاری زبان سے ایسی کوئی بات نہیں سننا چاہتی جس سے مجھے دکھ پہنچے۔

”لیکن تمہارا شکوہ۔“

”میں نے کوئی شکوہ نہیں کیا۔“ تھائی نے ایک بار بار میری بات کاٹ دی ”میں تو صورت حال کا جو بڑی برائی گم صرف میں۔ تم اور جاگی ہی ان دو شیوں کی برکت کا ٹھکانہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے تو درجنوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کئی گھر جاڑے ہیں۔ میں اور جاگی گناہ اس لیٹ میں آئیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم نہ ہوتے ہماری جگہ کوئی اور ہوتا۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ ہم ایک سچائی کا ساتھ دیا اور ہمارے قدم نہیں ڈگمگائے۔“

”یہی تمہاری بڑائی ہے کہ سب کچھ چھین جانے کے باوجود تم دونوں اب تک ثابت قدم رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”بس اب اس بات کو ختم کرو۔“ تھائی نے ہاتھ اٹھائے ہوئے کہا ”آئندہ تمہاری زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکلے چاہیے جس سے مجھے اور جاگی کو کوئی دکھ پہنچے۔“

یاد دہانے لگی۔ وہ گھر جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جس کے دروازے کے سامنے میرے ماں باپ کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور قاتلوں کے خوف سے مجھے بھی وہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ کئی سال بیت چکے تھے لیکن میں اس گھر کو ایک لمحے کو بھی نہیں بھولا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد تھا۔ کس کمرے میں کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی تھی۔ آئینے میں کہاں کون سا پودا لگا ہوا تھا۔ کس کس پودوں کے گلے کہاں کہاں رکھے ہوئے تھے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا سانس بھی تیز ہو رہا تھا۔

میں اپنے گھر کب جاؤں گا؟

میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر میں گھر کے سنے دیکھنا ہوا سو گیا۔

صبح دس بجے سے پہلے میری آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ تھائی اور جاگی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔ وہ دونوں کمرے میں بھی نہیں تھیں۔ میں اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو جاگی اوپر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر زینے پر ہی رک گئی۔

”ناستیا رہا ہو چکا ہے۔ میں تمہیں کو بلائے آ رہی تھی۔“ جاگی نے کہا۔

تھائی بال میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھی اٹھ گئی اور ہم تینوں ڈائمنگ ٹیبل پر آ گئے۔

”چند آدمیوں نے کہاں ہے؟“ میں نے خادمہ سے پوچھا۔

”اور دارا کا کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کا ابھی تک پتہ نہیں چلا لیکن اب اسے بھی پناہ نہیں ملے گی۔ ایک آدھ دن میں وہ بھی گرفت میں آجائے گا۔“ ماسٹر ہو جن نے جواب دیا اور پھر بولا ”تمہارے لیے ایک خوش خبری یہ ہے کہ اب تم لوگ آزادی سے گھوم پھر سکتے ہو۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مہاراج نے کہا ہے کہ تم لوگ اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکتے ہو۔ آدھے گھنٹے میں ایک گاڑی تمہارے پاس پہنچ جائے گی اور اسی خوشی میں تم لوگ آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ گے۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”اندر ریجنٹ ہوٹل کے سالن تھائی ریستورنٹ میں۔ ٹھیک آٹھ بجے۔“ ماسٹر ہو جن نے جواب دیا ”میں نے ٹیبل بزرگ کر دیا ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تھائی کلاسک ڈانس پریگرام شروع ہو جاتا ہے۔ تم لوگ انجوائے کرو گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس سے پہلے ہم اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جاگی دالے بنگلے میں۔“ میں نے کہا۔

”ہوٹل سے واپسی پر تم لوگوں کو دین چھوڑ دیا جائے گا۔ میں دو تین لوگوں کو سکھدر کے ساتھ وہاں پہنچ دیتا ہوں۔ وہ صفائی وغیرہ کر دیں گے۔“ ماسٹر ہو جن نے جواب دیا اور پھر چند اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے تھائی اور جاگی کو ماسٹر ہو جن سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ دونوں کھل اٹھیں۔ وہ دونوں بیس کی رہنے والی تھیں۔ بیس پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی پوری زندگی یہاں گزری تھی لیکن چند سال پہلے مجھ سے ملاقات ہونے کے بعد شر کے دیو دیواران کے لیے انہیں بن گئے تھے۔ لوگ انہیں بن گئے تھے۔ ان کے اپنے ہی ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ ان کے آشیانوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے تعین پھر رہی تھیں اور آج چند سال بعد انہیں یہ نوپ ملی تھی کہ یہ شر انہی کا ہے۔ وہ آزادی سے اس شر کے کلی کوچوں میں گھوم پھر سکتی ہیں۔ آزاد فضا میں سانس لے سکتی ہیں۔

”ابھی تم نے بتایا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف آپریشن کریک ڈاؤن شروع کر دیا گیا ہے۔“ جاگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کیا ایسی صورت میں کھلے عام پھرنا ہمارے لیے خطرناک نہیں ہو گا؟“

”ماسٹر ہو جن نے کہا ہے کہ بڑی بڑی چمیلیوں کو پکڑ لیا گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”گزشتہ رات کو جی فانگ کی

گرفتاری کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا تھا جو صبح تک جاری رہا۔ بڑے بڑے سب لوگ سلاخوں کے پیچھے پیچھے نکلے ہیں۔ اب صرف چھوٹی چھیلیاں رہ گئی ہیں جنہیں پکڑنے کے لیے جال پھیلائے جا رہے ہیں اور بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

”میں خطرات سے تو نہیں ڈرتی ہوں۔“ جاگی مسکرائی ”بہر حال“ چلیں گے۔ آج خوب کھوئیں پھرں گے۔“

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارا موضوع دار تھا۔ وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ بہر حال اب اس کی طاقت ٹوٹ چکی تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک چھپا نہیں رہ سکے گا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ اس مرتبہ پولیس نے پوری جھنجھکی سے کارروائی شروع کی تھی۔ رتا کو کون اس آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا اور اس میں کسی پولیس آفیسر کی طرف سے کوئی تباہی کی توقع نہیں تھی۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ باہر کار کے بارن کی آواز سنائی دی۔ خادمہ اس وقت لان میں گیٹ کے قریب ہی تھی۔ اس نے پہلے ذیلی دروازہ کھولا اور پھر پورا گیٹ کھول دیا۔ سفید رنگ کی ایک شان دار کار اندر آکر پورچ میں رک گئی۔ میں اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے جو آدمی نیچے اڑا وہ کاپرو تھا۔

تھائی اور جاگی بھی باہر آچکی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ کاپرو نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفاظہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لفاظہ کھولا تو میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس میں بڑی باریت کے تھائی کرکسی ٹوٹ بھرے ہوئے تھے۔ کار اور یہ کرکسی ٹوٹ ہمارے لیے رتا کو کون نے بھیجے تھے۔ ہمارے پاس واقعی رقم وغیرہ نہیں تھی اور رتا کو کون نے کار کے ساتھ رقم بھی بھیج دی تھی۔

چند منٹ بعد ہی ہم اس شان دار کار میں چندا روہن کے بیٹکے سے نکل رہے تھے۔ کار اڑکھڑبھڑاتی تھی اور بلٹ پروف تھی۔ رتا کو کون شاید یہ احساس تھا کہ ہم ابھی پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔

سب سے پہلے ہم سوہم وٹ روڈ پر گئے جہاں سوئے گیارہ پر نیورائل فیشن شاپ تھی۔ یہ بنگاک کی سب سے بڑی فیشن ٹیلرنگ شاپ تھی۔ یہاں ریڈی میڈ ملبوسات بھی تھے۔ اس اسٹور کا مالک ایک سکھ تھا۔ دکان پر اگرچہ کئی سبزین موجود تھے لیکن اتفاق سے ہمارا سامنا سکھ مالک ہی

سے ہوا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے ہم اسٹور میں رہے۔ ہم تینوں نے اپنے لیے دو سو تھ پیند کی تھیں۔ سوہم وٹ روڈ سے نکل کر ہم کوونگ تھان پوری روڈ پر آگئے۔ جہاں ایک ذیلی گلی میں نہر کے قریب تھائی کا بنگلا ہوا کرتا تھا۔ وہاں ملایا اب بھی موجود تھا۔ صرف مٹی کا ڈھیر تھا۔

تھائی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جاگی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسری طرف سے میں نے تھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے اور پھر کار میں بیٹھ گئے۔

”اب کہاں چلنا ہے لٹل ماسٹر؟“ کاپرو نے انہی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”کس بھی۔“ میرے بجائے جاگی نے کہا ”پورا شہر گھما دو۔ کس بھی ڈرائیور پر لے چلو۔“

کاپرو بھی مسکرا دیا۔

کار ٹاکس برج سے ہوتی ہوئی سیستھرون روڈ پر آگئی اور ایکسپریس وے عبور کرتے ہوئے رامافور روڈ پر نکل آئی اور پھر نیچے یاد نہیں کہ کار کن کن سڑکوں پر ہوتی ہوئی شہر سے باہر جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ میں پنچر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری نظر چانگ ہی عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف اٹھ گئی۔ پیچھے آنے والی ایک سرخ کار کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کار کو میں ایک دو مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

”کاپرو۔“ میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا ”ایک سرخ کار ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی اسے دیکھا ہے۔“

”وہ سرخ کار۔“ کاپرو مسکرا دیا ”گھبرانے کی ضرورت نہیں لٹل ماسٹر۔ اس میں اسے ہی گن مین ہیں۔“

”گن مین!“ میں چونک گیا ”کیوں۔“

”تم لوگوں کی طرف سے آنکھیں تو بند نہیں رکھی جا سکتیں۔“ کاپرو نے جواب دیا ”تم نے شاید دھیان نہیں دیا۔ یہ کار شروع ہی سے ہمارے پیچھے ہے۔“

میں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ کار تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ پیپلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھائی اور جاگی کسی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

”یہ کون سی جگہ ہے۔“ میں نے سڑک کے بائیں طرف ایک شان دار عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کاپرو سے پوچھا۔

”تم شاید اس جگہ کو بھول گئے ہو لٹل ماسٹر۔“ کاپرو نے جواب دیا ”یہ وہی جگہ ہے جہاں سوای رگوناٹھ کا آشرم ہوا کرتا تھا۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”ایک سال میں شہر کتنا بدل گیا ہے۔ سوای رگوناٹھ کا آشرم تو جل کر راکھ ہو گیا تھا اور رگوناٹھ بھی ختم ہو گیا تھا۔ یہ بلڈنگ ہی ہے۔ کس نے بنائی ہے؟“

”آپ کے چنانگ سامن والے دوست سردار تھالوب نے۔“ کاپرو نے جواب دیا ”یہ زمین اس نے حکومت سے لے لی تھی۔ یہاں اس نے حکومت ہی کے تعاون سے منشیات کے عادی افراد کی بحالی کے لیے اسپتال بنایا ہے۔ اس بلڈنگ کی تعمیر کے لیے دن رات کام ہوا تھا اور تقریباً دو مہینے پہلے ہی یہاں کام شروع ہوا ہے۔“

”گڈ۔“ میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے سردار تھالوب واقعی ہمت کام کر رہا ہے۔“

وہ عمارت واقعی بہت شاندار تھی۔ ذرا آگے جانے کے بعد میں نے کار واپس مڑوائی اور عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے پھر اس طرف دیکھنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں لادینیت اور فاشی کا بہت بڑا اڈا قائم تھا۔ یہاں کئی لوگوں کی زندگیاں برباد ہوئی تھیں۔ کئی گھرا جڑے تھے اور اب اس جگہ پر ٹشے میں بھلا ہو کر زندگی سے دور ہوئے والوں کو زندگی کے قریب لایا جا رہا تھا۔

کار دوبارہ شہر میں داخل ہو کر ایک بار پھر رامافور روڈ پر مڑنے لگی۔

اس وقت دو بج رہے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے کاپرو سے کہا کہ وہ کار کسی اچھے ریستورنٹ کے سامنے روک لے۔

کچھ دیر بعد کاپرو نے کار رامافور روڈ سے ذرا بہت کر ڈویٹ تھائی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر روک لی۔ اس کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ٹورسٹ پولیس اسٹیشن اور اس کے پیچھے لم فیلنی پارک تھا جس کے گیٹ کے قریب شمشاد رامافور بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔

ڈویٹ تھائی بہت بڑا رہائشی ہوٹل تھا۔ اس کا ریستورنٹ بھی بڑا شان دار تھا۔ کاپرو اگرچہ باہر گاڑی میں ہی رکنا چاہتا تھا مگر ہم اسے بھی اپنے ساتھ ریستورنٹ میں لے گئے تھے۔

ہوٹل کا کھانا بھی بہت لذیذ تھا۔ تھائی اور جاگی کھانے کے دوران میں بھی چمکتی رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا

کہ جب سے ہم کار پر چندا روہن کے بیٹکے سے باہر نکلے تھے وہ دونوں چمک رہی تھیں اور بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ انہیں خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہو رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی سال بعد ہم تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

ہوٹل سے نکل کر بھی ہم دیر تک کار میں شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ ایک سال پہلے جب میں یہاں تھا تو بیٹنگاموں میں گھرا رہا تھا۔ میری زندگی بھگا دوڑ میں ہی گزری تھی۔ مجھے شہر کی سڑکوں اور عمارتوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اور اب تھائی اور جاگی میری معلومات میں اضافہ کر رہی تھیں۔

پانچ بجے کے قریب میں نے کاپرو کو ہدایت کی کہ وہ کار کو جاگی کے بیٹکے کی طرف موڑ لے۔ اس وقت ہم شہر کے جنوبی علاقے میں بس ٹرمینل کے آس پاس تھے۔ کاپرو نے کار پہلے پھر این روڈ اور پھر روڈن امارن روڈ پر موڑ لی۔ اس کے ٹھوڑی ہی دیر بعد ہم جاگی کے بیٹکے والی گلی میں مڑ رہے تھے۔

ہم ایک سال بعد یہاں آئے تھے۔ یہاں کی فضا بڑی عجیب اور اجنبی سی لگ رہی تھی حالانکہ یہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم نے ایک سال پہلے چھوڑا تھا۔

گیٹ کے سامنے کار رکھنے ہی میں نیچے اتر گیا اور تیل بجائے لگا۔ اسی دوران میں تھائی اور جاگی بھی میرے قریب آگئی تھیں اور وہ اچک اچک کر گیٹ کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گیٹ کے دوسری طرف دیکھ سکتا تھا اور میں نے سکھدر کو برآمدے سے نکل کر گیٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

گیٹ کھلا اور ہم تینوں بے صبری سے اندر داخل ہو گئے۔ کار ہمارے بعد گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ سکھدر نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ جاگی اور تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں وہی پنک تھی جو میں پہلے بھی دیکھا کرتا تھا۔

برآمدے کے سامنے لان میں بے ترتیب سا فرنچیز اور گھر کا دوسرا سامان بکھرا ہوا تھا۔ جب ہم اندر آئے تو مسارج کے بتنازم کے دولہ کے ایک کمرے میں فرنچیز سیٹ کر رہے تھے۔ تمام کمرؤں کے فرش مٹلے ہوئے تھے۔ تمام دیواریں بھادڑی گئی تھیں۔ چھتوں سے لٹکے ہوئے پتے بھی صاف گردیے گئے تھے۔ اب صرف سامان بیت کرنا باقی رہ گیا تھا۔

وہ کمر تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ دونوں لڑکے بیڈ پر چادر بچھا



”اس کیس کی تفتیش کیلئے پولیس جی فانگ کو رات دو بجے اس بنگلے میں لے گئی تھی۔ دراصل پولیس دارا کو بھی اس کیس میں نامزد کرنا چاہتی ہے۔ اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے جی فانگ کو وہاں لے جایا گیا تھا مگر اس نے موقع پا کر ایک پولیس والے کا روبرو اس کے ہولسٹر سے نکال لیا اور ایک کانسٹیبل کو قتل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ رات بھر اس کی تلاش ہوتی رہی۔ محکمے کی ساری نفری پورے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ کئی مشکوک مقامات پر چھاپے مارے گئے۔ کئی مشتبہ لوگوں کو حراست میں لیا گیا تاکہ ان سے جی فانگ کے بارے میں پوچھ گچھ کی جاسکے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“ ماسٹر ہوجن چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”رتا کو کون کو صبح چار بجے اس کی اطلاع دی گئی تھی۔ وہ فوراً ہی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ صورت حال کا صحیح علم ہونے کے بعد اس پولیس اسٹیشن کے سارے عملے کو معطل کر کے گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”کیا جی فانگ کے فرار میں پولیس کے کسی آدمی کی سازش ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہو سکتا ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے جواب دیا ”یہ تو تحقیقات کے بعد ہی بتا چلے گا کہ کوئی پولیس والا اس سازش میں شریک تھا یا نہیں لیکن اتنے خطرناک مزم کو اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر پولیس اسٹیشن سے باہر لے جانا شہادت کو ہوا دے رہا ہے اگر کوئی پولیس والا اس سازش میں ملوث ثابت ہو تو پتہ نہیں سکے گا۔“

”اور دارا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ خیال ہے کہ جی فانگ بھی اسی کے پاس گیا ہوگا۔ پورے شہر کی پولیس بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے جواب دیا۔

کافی دیر تک ماسٹر ہوجن سے اس موضوع پر بات ہوتی رہی پھر میں نے فون بند کر دیا اور جاگتی اور تھکی کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں بھی تشویش ابھر آئی تھی۔ بات بھی بھی تشویش کی۔ جی فانگ کا فرار خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ دونوں دوبار مل گئے تو صورت حال بڑی دھماکا خیز ہو سکتی تھی۔

ناشتے کے دوران میں بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ جی فانگ فرار ہو کر کہاں جا سکتا ہے اور دارا کہاں چھپا ہوا ہوگا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھمکا سا

ہوا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“ جاگتی اور تھکی نے بیک وقت پوچھا۔ ”میری وہ پینٹ کہاں ہے۔“ میں نے کہا ”پنڈا روٹی کے بنگلے سے یہاں آنے کے بعد ہم نے کپڑے بدلے تھے میری پینٹ کہاں ہے؟“ ”اس وقت گھر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے سارے محلے کپڑے اس کمرے میں الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیے تھے مگر کیا بات ہے؟“ تھکی نے کہا۔ ”ایک منٹ۔ میں ابھی آرہا ہوں۔“ میں کہتا ہوا کمرے کی طرف چلا آیا۔

یہ وہی کمرہ تھا جہاں سب سے پہلے فرنیچر وغیرہ آرامتہ کر دیا گیا تھا اور ہم تینوں نے باری باری اسی کمرے میں لباس تبدیل کیے تھے سب سے پہلے میں نے کپڑے بدلے تھے اور اتارے ہوئے کپڑے پلنگ پر ڈال کر ہی باہر چلا گیا تھا۔ آخر میں تھکی نے لباس تبدیل کیا تھا اور سارے محلے کپڑے اٹھا کر الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیے تھے۔

میں نے الماری کھول کر نچلے خانے میں رکھے ہوئے کپڑے نکال لیے اور اپنی پینٹ اٹھا کر جیبوں کی تلاشی لینے لگا اور بالآخر پچھلی جیب سے مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ وہی وزٹنگ کارڈ تھا جو داماد اوتو کو کے پینٹ ہاؤس میں دارا کی قمیص کی جیب سے ملا تھا۔

”مس شیوانی۔ گل بانسنگ پروموزر!“ میں نے کارڈ پر لکھا ہوا نام زیر پراب دہیرا اور اس کارڈ کو چنگی میں دبائے کمرے سے باہر آگیا۔

”یہ کیا ہے؟“ تھکی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ وزٹنگ کارڈ داماد اوتو کو کے پینٹ ہاؤس میں دارا کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔“ میں نے کہا اور پھر تفصیل بتانے لگا اور آخر میں کہہ رہا تھا ”مس شیوانی گل بانسنگ پروموزر ہے۔ دارا کی جیب سے اس کارڈ کے برآمد ہونے کا مطلب ہے کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے دارا نے اس کے ہاں پناہ لے رکھی ہو۔“ ”میں ممکن ہے لیکن۔“ جاگتی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ”لیکن کیا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کارڈ دارا کی جیب میں تھا اور اسے یہیں موجود کر بھگانا پڑا تھا۔“ جاگتی نے کہا ”میں سے معلوم ہو گا کہ کارڈ اس کی جیب میں ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ یہ کارڈ ہمارے ہاں

ہمیں کے ہاتھ آ سکتا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ دارا شیوانی کے ہاں جانے کی حماقت نہیں کرے گا۔“ ”ہزارا غفلت۔“ میں نے کہا ”گوگوں کا اکثر یاد نہیں پتا کہ امن کی جیبوں میں کیا کچھ بکھرا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے اراکھی یاد نہ رہا ہو کہ یہ کارڈ اس کی جیب میں تھا اور میں نے اس سے مس شیوانی کے پاس ہی پناہ لے رکھی ہو۔ بات کو آج چار دن ہو چکے ہیں اور اگر وہ وہیں ہے تو اب نہ اسے اطمینان ہو گیا ہو گا کہ پولیس مس شیوانی کے رہے میں نہیں جاتی۔“

”ممکن ہے تمہاری بات درست ہو۔“ جاگتی نے میرے اس تسلیم کرتے ہوئے کہا ”کوئی کارروائی کرنے سے پہلے ہی کی تصدیق کرنی پڑے گی اور اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہوگا۔“

”ہاں۔ اگر احتیاط نہ برتی گئی تو دارا کو وہاں سے بھی راہ ہونے کا موقع مل جائے گا۔“ میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد میں نے ماسٹر ہوجن کو فون کیا اور اسے بنگلے آنے کو کہا۔ فون پر تفصیل سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ ماسٹر ہوجن تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچ گیا۔ میں نے سے مس شیوانی کا وہ کارڈ دکھایا اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”مس شیوانی لیڈر گل بانسنگ کی پروموزر ہے اور اسے ہر کارہہ شخص جانتا ہے جسے گل بانسنگ سے ذرا سی بھی بچی ہو۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا ”شیوانی کو میں بھی جانتا ہوں اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ وہ بہت بے ایمان اور ہائیر عورت ہے۔ وہ گل بانسنگ کے مقابلے تو متفقہ ذاتی ہے لیکن اکثر و بیشتر مخالف پارٹی سے پیسے لے کر اپنی ذرا کمزور ہوا دیتی ہے جیسے ہی اس کا دین دھرم ہے۔ ہوتا ہے پیسے کے لالچ میں اس نے دارا کو اپنے ہاں پناہ لے رکھی ہو۔“

”لیکن کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس کی تصدیق بہت ضروری ہے کہ دارا وہاں موجود ہے یا نہیں اور اس مقدمے کے لیے ہمیں کسی ایسی لڑکی کو استعمال کرنا پڑے گا جس کا تعلق گل بانسنگ سے ہو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن لڑکیاں تو مل سکتی ہیں لیکن رتا کو کون چونکہ اس کے بچپن ہی غرائز لبرال رہا ہے اس لیے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اسے علم میں لانا ہوگا۔“ میرا خیال ہے تم فون پر رتا کو کون سبابت کرو۔ اس کے بعد ہم اس سے مل لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ نمبر تازہ میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ماسٹر ہوجن نے نمبر تھانے کے بجائے فون کا ریسپورڈ اٹھا کر نمبر ملا یا اور لائن ملنے کے بعد ریسپورڈ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ کال رتا کو کون کی سیکریٹری نے ریسپو کی تھی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے فوراً رتا کو کون سے لائن ملا دی۔ میں تقریباً پانچ منٹ تک رتا کو کون سے بات کرتا رہا پھر فون بند کر دیا اور ماسٹر ہوجن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب چل پڑو ماسٹر۔ اس نے ہمیں فوری طور پر اپنے دفتر میں بلایا ہے۔“

میں اور ماسٹر ہوجن فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ ماسٹر اپنی گاڑی لے کر آیا تھا۔ تھکی اور جاگتی سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ کسی جانا چاہیں تو چلی جائیں۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں رتا کو کون کے دفتر میں پہنچ گئے۔ ہمیں باہوں ہاتھ لایا گیا اور فوراً ہی اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت رتا کو کون کے پاس دو اور اعلیٰ افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں فوراً ہی فارغ کر دیا گیا۔

میں نے مس شیوانی کا وزٹنگ کارڈ رتا کو کون کو دکھایا اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ہم میں تقریباً آدھا گھنٹا گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر طے پایا کہ دو لڑکیوں کے ذریعے مس شیوانی کے دفتر اور گھر پر یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کہ دارا وہاں موجود ہے یا نہیں۔

رتا کو کون کے دفتر سے نکل کر ماسٹر ہوجن نے مجھے بنگلے پر چھوڑا اور خود دوسرے اختیارات کرنے کے لیے چلا گیا۔ اور پھر اسی شام ہی اطلاع مل گئی کہ مس شیوانی کے فلیٹ میں کچھ پر اسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ عام حالات میں گل بانسنگ سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اس کے فلیٹ میں آتی رہتی تھیں مگر چند روز سے لڑکیوں کو فلیٹ پر آنے سے روک دیا گیا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے مس شیوانی دفتر بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہر وقت فلیٹ پر ہی موجود رہتی تھی۔ کوئی لڑکی اس کے ہاں جاتی بھی تو اسے دروازے ہی سے لوٹا دیا جاتا تھا۔

اس رپورٹ سے میرے شیعہ کو تعزیت ملی۔ رتا کو کون کو بھی اطلاع کر دی گئی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ پولیس کے ذریعے چھاپا مارنے کے بجائے ماسٹر ہوجن اور میں اپنے آدمیوں کے ساتھ کارروائی کریں۔

ماسٹر ہوجن اور میں ایک کمرے میں بیٹھ کر پلاننگ کرنے لگے۔ مس شیوانی کا دفتر اور فلیٹ سلیم روڈ پر واقع تھے۔ یہ

وہ علاقہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رات کبھی نہیں ہوتی۔ چوں کہ گھنے لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ اس لیے یہ طے پایا کہ اس فلیٹ پر چھاپا رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان مارا جائے کیونکہ وہاں رات کے آخری پہر بھی لوگوں کی آمدورفت کی صورت حال کچھ ایسی ہی رہتی تھی اس لیے انتظار کرنا پکار تھا۔ پلاننگ کرتے ہوئے چھاپے میں ایک لڑکی کی ضرورت بھی محسوس ہوتی اور ظاہر ہے تھائی یا جاگی میں سے کسی کو ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔

”ٹھیک ہے یہ بندوبست ہو جائے گا۔ ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کو بلا لیں گے۔“ ماسٹر ہوجن نے کہا۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ ماسٹر ہوجن نے ٹیلی فون پر رنگٹا بھی اور پونپانامی ایک لڑکی کو اطلاع دے دی کہ وہ لوگ رات دس بجے سیلوم روڈ پر واقع مونا راک ہو مل سے ذرا آگے پولیٹن ریسورٹ میں پہنچ جائیں۔

پونے دس بجے کے قریب میں اور ماسٹر ہوجن بھی ٹھکل کھڑے ہوئے۔ ہم نے دیا پھرا پوک کلاڈ برج سے پار کیا تھا۔ وہاں سے ہم سوک واٹ روڈ سے ہوتے ہوئے نیو روڈ پر آگئے۔ کئی بڑی سڑکیں نیو روڈ سے آکر ملتی تھیں۔ یہاں دور دور تک بہت بڑے بڑے شاہجیک سینٹر ریسورٹ اور ہو مل وغیرہ تھے۔ ہمیں سے سیلوم روڈ بھی شروع ہوتا تھا۔

سیلوم روڈ کو بنگاک کی وال اسٹریٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرف سے سوامی وانگ روڈ، دوسری طرف سے رامافور روڈ، تیسری طرف سے نیو روڈ اور چوتھی طرف سے سیتھرون روڈ سے گھرا ہوا ہے۔ شہر کا وسطی علاقہ ہونے کے علاوہ یہ سب سے بڑا کاروباری مرکز بھی ہے۔ اس سڑک کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی سڑک بھی ہے جس کے مغربی کنارے پر ایک بہت بڑی بین چلے ہے۔ اس بین چلے کی وجہ سے اس سڑک کا نام بھی سیلوم روڈ رکھا گیا تھا۔

تمام بڑے بڑے بینک، بہت سے سفارت خانے اور بڑے بڑے رہائشی ہو مل اسی علاقے میں واقع ہیں۔ یہ شہر کا وہ حصہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی رات نہیں ہوتی۔ مرکزی شاہراہ کے علاوہ ایک دوسرے کو ملانے والی ذیلی سڑکوں پر بھی لائقہ اور ریسورٹ، شراب خانے اور پیراسٹور ہیں جہاں چوبیس گھنٹے لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔

تین کلومیٹر لمبی سیلوم روڈ کے تقریباً آخر میں ہیٹنگ نام کی دو ذیلی سڑکیں سوامی وانگ روڈ سے آکر ملتی ہیں۔ دن

کے وقت اس علاقے میں کاروباری لوگوں کا ہجوم رہتا ہے لیکن شام پانچ بجے کے بعد یہاں آمدورفت کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ شام کے بعد یہاں لوگ صرف تفریح، ماؤنٹین اور عیاشی کے لیے آتے ہیں۔ دونوں ہیٹنگ اسٹریٹس لائقہ اور چھوٹے بڑے شراب خانے، ریسٹوران اور جوئے خانوں کے علاوہ بازار حسن بھی ہے۔ صرف ان دو گلیوں میں ایک ہزار سے زیادہ طوائفیں آباد ہیں جو قدم قدم پر راہ گریوں کو دعوت گناہ دیتی نظر آتی ہیں۔

نیو روڈ پر نیو فیو جی شاہجیک سینٹر سے ذرا آگے ماسٹر ہوجن نے کار سیلوم روڈ پر موڑ لی۔ مونا راک ہو مل تقریباً ایک کلومیٹر آگے تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک اس قدر زیادہ تھا کہ گاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی چل رہی تھیں۔ میرے خیال میں چینی کی رفتار سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے والے اس ٹریفک میں شامل ہونے کے بعد یہ بھول جانا چاہیے کہ مقررہ وقت پر کہیں پہنچنا ہے۔ ساڈا اسٹریٹ کی بھی یہی صورت حال تھی۔ پیدل چلنے والوں کا بھی کھوٹے کھواٹ چل رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے شہر کا ہر شخص اس طرف آیا ہو۔ بنگاک کی ہوئی رنگ برنگی روشنیوں سے یہ علاقہ جھلک رہا تھا۔

”عطش ہو گئی۔“ ماسٹر ہوجن بڑبڑایا۔ ”ہمیں سوراوانگ روڈ کی طرف سے آنا چاہیے تھا۔ بچ کی کسی گلی سے نکل آئے۔“

”اب تو بھینس ہی گئے ہیں۔ کار کو سربرا اٹھا کر تولے جا نہیں سکتے۔“ میں نے کہا۔ کار چینی کی رفتار سے آگے بڑھ رہی اور میں اوپر اوپر دیکھتا رہا۔ میں پہلی مرتبہ اس طرف آیا تھا۔ لوگ کس طرح زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب میری زندگی مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ میں گزری تھی۔ خدا خدا کر کے ہم کسی نہ کسی طرح مونا راک ہو مل سے سامنے پہنچ گئے۔ ماسٹر نے ہو مل سے آگے نکل کر کار ایک

ساڈا اسٹریٹ پر موڑ کر روکی اور انجین بند کر دیا۔ ”آگے پیدل ہی جانا پڑے گا۔“ وہ نیچے اترتے ہوئے بولا۔ ”کار پر تو ہمیں وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔“ میں بھی کار سے اتر آیا اور ہم تین روڈ پر ہجر ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پولیٹن ریسورٹ تقریباً پچاس گز آگے تھا اور جب ہم وہاں پہنچے تو سوامی وانگ روڈ پر رنگٹا بھی اور پونپانامی ریسورٹ سے باہر آگئے۔ ہم ایک بار پھر تیزی سے آگے چلے گئے۔

بڑے کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے چند منٹ میں طے کر لیا۔ ہیٹنگ پوک اسٹریٹ ون اور ہیٹ پوک اسٹریٹ ٹوپر زائدہ رش تھا۔ ان دونوں سڑک پر لائقہ اور ریسورٹ ٹرپ خانے اور جوئے خانے تھے۔ ہم ہیٹ پوک اسٹریٹ ٹوپر بند گز چلنے کے بعد رک جئے ماسٹر ہوجن نے سڑک کے دوسری طرف ایک پرانی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ عمارت کے نیچے دو شراب خانے اور ایک ریسورٹ تھا۔ شراب خانے کے ساتھ ہی اوپر بانے کے لیے تنگ سائز تھا۔ ان دکانوں کے اوپر صرف ایک رہائشی پونٹ تھا۔ اس اکھری عمارت کے دائیں بائیں والی عمارتیں کئی کئی منزل بلند تھیں۔ اسی طرح یہ چھوٹی عمارت ان کے بیچ میں سینڈ وچ بن رہی تھی۔

دکانوں اور اوپر والے رہائشی پونٹ کے درمیان سبز تان فلور تھا۔ اوپر والے فلیٹ اور سبز تان فلور کی کھڑکیاں سڑک کی طرف تھیں اور سب میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

”اوپر والے فلیٹ میں شیوان کی رہائش ہے۔“ ماسٹر ہوجن نے بتایا۔ ”اس کے نیچے سبز تان فلور ہے جس پر طوائفوں کا قبضہ ہے۔ ویسے دارائے چھینے کے لیے بڑی اچھی جگہ کا انتخاب کیا ہے کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔“

”کیا میں شیوان بھی طوائف ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”شیوانی جیسی عورتوں اور طوائفوں کے کردار میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔“ ماسٹر نے جواب دیا اور پھر رنگٹا اور پانچھی کو سمجھانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

رنگٹا تو وہیں کھڑا رہا۔ یہاں سے وہ زینے اور فلیٹ پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ پانچھی سڑک پار کر کے زینے کے بائیں طرف ٹرپ خانے کے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

”اور تم۔“ ماسٹر نے پونپانامی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے جاکر دروازہ کھلاؤ اور کوشش کرنا کہ دروازہ کھولنے والے کو دو تین منٹ تک باتوں میں الجھائے رکھو۔ اگر وہ دروازہ بند کرنے کی کوشش کرے تو پیر چسنا دینا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ دروازہ کھولنے والے کو کس طرح باتوں میں الجھا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ پونپانامی نے کہا اور لڑھکھو دیکھتے ہوئے فٹ پاتھ سے اتر گئی۔

میں اور ماسٹر ہوجن اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ پونپانامی سڑک پار کر کے زینے والے دروازے میں داخل ہو گئی۔ ماسٹر ہوجن نے نیچے اشارہ کیا اور ہم دونوں سڑک پار کر کے ”مڑکی طرف آگئے۔“

میں نے دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر بیڑھیوں پر دیکھا۔ تقریباً چند بیڑھیوں پر ایک لینڈنگ تھی جس کے دائیں بائیں ایک ایک دروازہ تھا۔ بائیں طرف کا دروازہ نیم وا تھا جبکہ دائیں طرف والا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور نیم عریا لباس میں ایک عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ نیچے بیڑھیوں والے دروازے کے قریب بھی دو طوائفیں کھڑی تھیں جن میں سے ایک نے لیے بالوں والا ایک جھوٹا سا کتا بغل میں دبا رکھا تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ گڑبگڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور ایک اور آدمی کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دوسری طوائف ماسٹر ہوجن کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اوپر دیکھا۔ پہلی لینڈنگ سے دس بارہ بیڑھیاں اوپر ایک اور لینڈنگ تھی۔ وہاں ایک ہی دروازہ تھا اور پونپانامی دروازے میں کھڑی ہوئی کسی عورت سے باتیں کر رہی تھی۔

میں نے ماسٹر ہوجن کو اشارہ کیا اور بیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ سبز تان والی لینڈنگ کے کھلے ہوئے دروازے میں کھڑی ہوئی عورت یہ سمجھی کہ میں اس کے پاس آ رہا ہوں۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا اس نے اچانک ہی مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجھے اندر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس اچانک اقدام پر میرے منہ سے ہلکی سی جھنجھکی گئی۔

میرے چپچپے کی آواز سن کر اوپر والے دروازے میں کھڑی ہوئی عورت نے نیچے دیکھا اور پھر پونپانامی کو، کھادے کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پونپانامی کچھ دھکا کھا کر پیچھے گری تھی مگر اس نے اپنا پیر دروازے میں پھنسا دیا تھا۔ اندر کھڑی ہوئی عورت نے پیچھے ہٹنے سے اس کے پیر پر زور دار ٹھوکر ماری۔ پونپانامی چنچ اٹھی اور اس نے پیر پیچھے ہٹا لیا۔

میز تان والی عورت مجھ سے لپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس دوران میں ماسٹر ہوجن بیڑھیوں پر دوڑتا ہوا اوپر آیا اور میرے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے پونپانامی کو گھٹیت کر ایک طرف ہٹا لیا اور دروازے پر کندھے سے ٹکرس مارنے لگا۔ میں نے بھی اس عورت کو دھکا دے کر پیچھے کرا دیا اسے بھی شاید کسی گڑبگڑا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ میں اوپر کی طرف دوڑا۔

فلیٹ کا دروازہ خاصا مضبوط تھا۔ اندر سے چنچ چنچ کر بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دو نسوانی آوازیں

تھیں اور ایک کسی مرد کی اور میں نے وہ دیکھنا ہی نہ دیا تھا۔

میں بھی ماسٹر ہو جن کے ساتھ دروازے پر کھڑے تھے۔  
نکریں مارنے لگا۔ تیسری ٹکر پر دروازہ جھول گیا اور چوتھی  
ٹکر پر تختہ اندر جا گرا۔ میں اور ماسٹر ہو جن گرتے گرتے بچے  
تھے اور پھر اسی لمحے فائر کی آواز گونج اٹھی۔ گولی میرے سر  
کے چند انچ اوپر سے گزر گئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے  
ایک طرف چھلانگ لگادی۔ اسی وقت ایک اور فائر ہوا۔ اس  
مرتبہ گولی ماسٹر ہو جن نے چلائی تھی۔

ایک طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی  
دی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ دروازے  
کے قریب میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے آگے کھلی جگہ تھی  
اور اس سے آگے کمرے تھے۔ ایک طرف اوپر جانے کے  
لیے لکڑی کے تختوں کی سیڑھیاں تھیں اور ایک آدمی ان  
سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا اور جا رہا تھا۔

میں نے پتلون کا پانچواں ٹکڑا اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکالا  
اور اس کے پیچھے دوڑ لگادی۔ جب میں نے پہلی سیڑھی پر قدم  
رکھا تو وہ اوپر آخری سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے  
مڑا۔

وہ دارا تھا۔ اس نے فائر کرنے کے لیے پستول والا ہاتھ  
اوپر اٹھایا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ خنجر میرے ہاتھ  
سے نکل کر دارا کے بازو کو خنجر کرتا چلا گیا۔ اس کے منہ سے  
چپ نکل گئی۔ وہ لڑکھایا مگر دوسرے ہی لمحے سمجھ گیا۔ پستول  
اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا تھا۔ دارا نے دوسری  
طرف دوڑ لگادی۔

میں پھر اوپر کی طرف دوڑا۔ میں نے راستے میں ایک  
سیڑھی پر بڑا ہوا اپنا خنجر اٹھایا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا  
چھت پر پہنچ گیا۔

دارا اس وقت چھت کے دوسرے سرے پر پہنچ چکا  
تھا۔ اس نے مڑ کر فائر کر دیا۔ اس سے صرف ایک لمحے پہلے  
میں کسی چیز سے ٹکرا کر گر گیا۔ اگر میں نیچے نہ گرنا تو گولی میرا  
بھیجا آزاد ہوتی۔

میں اٹھ کر دوبارہ دارا کے پیچھے لپکا۔ وہ اس وقت منڈیر  
پر چڑھ کر باہر کی طرف ایک پائپ کے ساتھ لٹک چکا تھا۔ یہ  
پائپ پچھلی گلی میں گزراؤں کی ٹنڈی گیس کے اخراج کے لیے  
لگایا گیا تھا جو چھت سے چار پانچ فٹ اوپر تک چلا گیا تھا۔  
پائپ دیوار کے ساتھ آہنی کپڑوں سے لگایا گیا تھا۔  
میں جب وہاں پہنچا تو دارا اس پائپ سے لٹک کر منڈیر

سے نیچے جا چکا تھا تاہم اس کا ایک ہاتھ ابھی منڈیر سے اوپر  
پائپ کو گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ میں نے خنجر سے اس کے  
ہاتھ پر وار کر دیا۔ اس نے چیختے ہوئے ہاتھ بنایا لیکن اس کی  
ایک انگلی کٹ گئی تھی۔ اس کا دوسرا بازو میں پہلی ہی زخمی  
کر چکا تھا لیکن وہ پائپ کے ساتھ پلٹا بڑی تیزی سے نیچے  
طرف پھسل رہا تھا۔ میں منڈیر پر چڑھ کر پائپ کے ساتھ ٹکرا  
چاہتا تھا لیکن رگ گیا۔

چھ انچ قطر کا وہ پائپ زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ دارا کے  
بوجھ سے ہی دیوار کے ساتھ اس کا اوپر والا ایک کب اٹھ  
چکا تھا۔ میں پائپ کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلنے لگا۔ میری کوشش  
بار آور ثابت ہوئی۔ دو کپ اور اٹھ گئے اور دارا کے بوجھ  
کی وجہ سے پائپ بتدریج دیوار سے پیچھے ہٹنے لگا لیکن میرے  
خیال میں اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دارا کالی نیچے پہنچ  
چکا تھا۔

پچھلی گلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ روشنی کا انتظام بھی  
مناسب نہیں تھا۔ یہاں بھی طوائفوں ہی کی آبادی تھی اور  
گلی میں معقول تعداد میں لوگ بھی موجود تھے۔

ایک راہ گیر نے دارا کو پائپ سے اترتے ہوئے دیکھ لیا  
تھا۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا۔ کچھ اور لوگ بھی اس طرف  
متوجہ ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں دارا نے پائپ چھوڑ کر  
چھلانگ لگادی۔

ایک دو آدمی اسے کوئی حادثہ سمجھ کر دارا کی طرف  
دوڑے تھے مگر دارا نے دو ہوائی فائر کر دیے۔ لوگ بدحواس  
ہو کر ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھگدڑی خنجر گئی تھی۔  
دارا نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک طرف  
دوڑ لگادی۔ میں منڈیر پر ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس کی طرف دیکھا  
رہا۔ دارا کچھ دور تک لوگوں کو دھکے دیتا دوڑتا ہوا نظر آیا اور  
پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا اور پھر  
دوسرے لمحے نسوانی چیخوں کی آواز سن کر میں نے سیڑھیوں  
کی طرف چھلانگ لگادی۔

ماسٹر ہو جن ایک آدمی سے مستحکم گھٹا ہو رہا تھا۔ پونا مس  
شیوانی کو رگید رہی تھی اور پاتھی بھی ایک عورت سے الجھ  
ہوا تھا۔ ماسٹر ہو جن دوسرے آدمی کے پیچھے دبا ہوا تھا اور ان  
آدمی کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ میگا تیراز تھا۔  
میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میگا کو بالوں سے پکڑ  
اور اس کو اوپر کھینچتے ہوئے پے درپے اس کے چہرے کی  
گھونٹے جڑ دیے۔ ماسٹر ہو جن ایک جھپٹکے سے اٹھ کر ٹھہرا



ہو گیا۔

”نسل ماسٹر۔ تم اسے سنبھالو۔ میں دوسرے کو دیکھتا ہوں۔“ وہ چیخا ہوا ایک کمرے کی طرف دوڑ گیا اور بند دروازے پر کندھے سے ٹکریں مارنے لگا۔

میں نے میگا تیرا ڈھونڈنے کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت خنجر میرے ہاتھ میں نہیں تھا اگر ہوتا تو اب تک میں میگا کا کام تمام کر چکا ہوتا۔

دارا کے فرار ہو جانے سے میں بہت تڑپا کھائے ہوئے تھا اور اپنا سارا غصہ میگا پر اتار رہا تھا۔ میگا کے ہونٹوں، ناک اور ایک کان سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا مگر میں اس پر گھونسلوں اور ٹھوکروں کی بارش کرنا رہا۔ ماسٹر ہو جن جس کمرے کے دروازے پر ٹکریں مار رہا تھا، وہ سڑک کی طرف تھا۔ ہم نے سڑک پر سے اس کمرے کی کھڑکیوں میں روشنی دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ بھی ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ چوٹ کھلا ہوا تھا۔

ماسٹر کی تیسری ٹکر سے دروازہ ٹوٹ گیا اور پھر اسی لمحے چھٹا کے سے شیشے ٹوٹے اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ماسٹر ہو جن دوڑتا ہوا نکلتے سے باہر آ گیا۔

”چنگ جی نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔“ اس نے چیخ کر کہا ”تم ان لوگوں کو سنبھالو۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔“

وہ نیچے جانے کے لیے دروازے کی طرف لپکا لیکن دروازے ہی میں ٹھنک کر رک گیا۔ میڑھیوں پر دوڑتے ہوئے ہماری قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر پانچ چھ پولیس والے میڑھیوں والے دروازے سے اندر آ گئے۔ ان میں ایک انسپٹر تھا جس نے پستول سے دو تین ہوائی فائر کر دیے۔ دوسرے پولیس والوں نے بھی رائفلیں تان لی تھیں۔

میں میگا کو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ وہ پکڑا ہوا نیچے گرا تھا۔ پانچویں نے بھی اس عورت کو چھوڑ دیا۔ پوینا اور شیوانی اب بھی ایک دوسرے سے شکم گتھا ہو رہی تھیں۔ دونوں خوں خوار بلیوں کی طرح غرا رہی تھیں۔ انہیں بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے الگ کیا گیا۔

”ماسٹر ہو جن۔“ انسپٹر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے افسوس ہے ہمیں اور آنے میں کچھ دیر ہوئی۔“

”چنگ جی نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی ہے وہ۔“

”اس کی فکر مت کرو ماسٹر۔“ انسپٹر نے اس کی بات کاٹ دی ”ہمارے آدمی نیچے موجود ہیں۔ وہ اسے سنبھال لیں گے۔ یہاں تمہارے آدمی کون ہیں؟“

ماسٹر نے پانچویں، پوینا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔ ہم تینوں الگ ہو گئے۔ میگا شیوانی اور دوسری عورت کو پولیس والوں نے گرفت میں لے لیا اور دو پولیس والے دوڑ دوڑ کر کمروں کو چپک کر گئے۔

اور پھر انسپٹر کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ اسے آج شام ہی کو اوپر سے یہ حکم جاری ہوا تھا کہ اس علاقے پر خاص طور پر نگاہ رکھی جائے۔ اسے ماسٹر ہو جن کے نام کے حوالے سے خاص طور پر کچھ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ لینڈنگ بائسنگ کی پروموشن شیوانی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والا ہے اگر کوئی گزیر ہو تو وہ اپنی فورس لے کر اس کی مدد کو پہنچ جائے۔ اسے سختی سے یہ وارننگ بھی دی گئی تھی کہ اگر یہ خبر کسی کارروائی سے پہلے ایک ہوئی تو اسے نہ صرف ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا بلکہ اس کے خلاف ندادی کے الزام میں کارروائی بھی کی جائے گی۔ انسپٹر کے کہنے کے مطابق وہ ایک ایک کر کے اپنے آدمیوں کو سامنے والی بلڈنگ میں جمع کر چکا تھا۔ وہ ایک تاریک کمرے کی کھڑکی سے شیوانی والی عمارت پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اور جب اس نے ماسٹر ہو جن کو میڑھیوں والے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو ہوشیار ہو گیا اور پھر فائر کی آوازیں کر اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ اس طرف دوڑ دوڑ لگا دی۔

”اب آپ لوگ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔“ انسپٹر نے بات ختم کرتے ہوئے کہا ”یہاں کی صورت حال اب میں سنبھال لوں گا۔“

ہم لوگ نیچے آ گئے۔ میز ٹائمن والے دونوں دروازے بند تھے اور اندر تاریکی تھی۔ یہاں کی طوائفیں یا تو خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی تھیں یا انہوں نے اپنے کمروں میں بند ہو کر بتیاں بجادی تھیں۔

نیچے عمارت کے دروازے کے سامنے بھی کئی پولیس والے موجود تھے۔ آس پاس کے شراب خانے اور ریستوران بند ہو چکے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت اگرچہ جاری تھی مگر سامنے والے فٹ پاتھ سے۔

چنگ جی پولیس کے ٹھہرے میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ایک بازو اور ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔

رنگت بھی وہاں موجود تھا مگر پولیس نے اسے آگے نہیں آنے دیا تھا۔ ماسٹر نے رنگت، پانچویں اور پوینا کو نصت کر دیا۔ میں اور ماسٹر ہو جن ایک طویل چکر کاٹ کر شیوانی کی عمارت کے پچھلی طرف آ گئے جہاں سے دارا فرار ہوا تھا۔

یہاں کی رونق پہلے کی طرح تھی۔ دارا کی ہوائی فائرنگ سے کچھ جھگڑا ہو چکی تھی مگر اس کے بعد صورت حال پھر پر سکون ہو گئی تھی۔ راہ کیوں اور طوائفوں میں آزادانہ طور پر سوسے بازی ہو رہی تھی۔

عمارت کے ساتھ وہ باپ سڑک کی طرف جھکا ہوا تھا اور میں ماسٹر ہو جن کو بتا رہا تھا کہ دارا کس طرح فرار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں جبکہ کرپا پ اور ووار کے آس پاس دیکھ رہا تھا اور پھر مجھے وہ چیز مل گئی جس کی تلاش تھی۔

وہ ہاتھ کی کٹی ہوئی چھوٹی انگلی تھی جو خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ دارا اگرچہ ایک بار پھر فرار ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے فرار ہونے کا افسوس تو تھا لیکن خوشی بھی تھی کہ اس بار میں اس پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے جب سے رومال نکالا اور جبکہ کر وہ انگلی اٹھائی۔

”کیا ہے؟“ ماسٹر ہو جن نے پوچھا۔  
”دارا کے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی۔“ میں نے کہا ”ہو سکتا ہے اب وہ کبھی میرے سامنے نہ آئے لیکن جب تک زندہ رہے گا مجھے یاد رکھنے گا۔“

میں نے دارا کے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی رومال میں پلٹ کر جیب میں رکھ لی اور ہم واپس پلٹ گئے۔ اس رات بھی میں دیر تک نہیں سو سکا۔ مجھے دارا کے ٹانگے کا بے حد افسوس تھا۔ میرے سینے میں بھرنے والے انعام کے شعلے کچھ اور ہوا جا چکے تھے۔ جب دشمن اس طرح چکر کھل جائے تو ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔

دن بدن گزرتے رہے۔ اگرچہ رتنا کو سن کا مشن کرکیک ڈاؤن جاری تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کو کونوں کھدروں سے تلاش کر کے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کیا جا رہا تھا مگر دارا اور جی ٹانگ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ انہیں ہر اس جگہ تلاش کیا گیا جہاں ان کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ایک مہینہ گزر گیا اور پھر ایک روز ہمیں ایک خاص تقریب میں رائل بیس میں شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس موقع پر سردار تھاپا بھی موجود تھا اور ہمارا ج بھی تھا، جاگی اور میں اس تقریب کے مرکزی کردار تھے۔ ملی سلامتی کے لیے ہماری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہمیں بے پناہ مراعات اور انعام سے نوازا گیا۔ مجھے قومی ہیرو قرار دیا گیا اور تھاپا لینڈ کی اعزازی شہریت بھی دی گئی۔

رتنا کو سن کا مشن کرکیک ڈاؤن بے حد کامیاب ہو گیا تھا۔ جرائم پیشہ گروہوں کا خاتمہ ہو جانے کے بعد لوگوں نے

بھی سکھ کا سانس لیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس وقت بھی یہ صورت حال زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہے گی۔ شہر بند عناصر کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ سر اٹھانے لگیں گے۔

ہمیں بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ ہم حمل طور پر آزاد تھے لیکن اب میرا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں گھر جانا چاہتا تھا اپنے گھر۔ جہاں ماں باپ کی شفقت و محبت کے سائے میں میرا بچپن گزرا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہاں میرے ماں باپ نہیں تھے مگر مجھے اب اس گھر کی یاد بڑی شدت سے آرہی تھی۔

میں نے جاگی اور تھاپا سے ذکر کیا تو وہ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ یہاں انہیں بہت کچھ مل گیا تھا۔ تھاپا کو اس پلاٹ پر نیا بنگلا بنانے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ جاگی کا مکان بھی خالی کر دیا گیا تھا۔ اس سرکاری اسپتال میں ملازمت کی پیشکش بھی کی گئی تھی اور بھی بہت کچھ ملا تھا۔ وہ یہاں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھیں مگر وہ دونوں مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ بقول جاگی کے ”میں ان دونوں کی سانس کی جان داتا تھا اور دونوں میں سے کوئی بھی مجھ سے دستبردار ہونے کو تیار

**شیخ کرامت کی سرگزشت**

**جہاں سے شہر گسہ بیان کی**



© 2023

- ایک بے سزا شخصیت کی کہانی جس کیلئے کوئی بھی کامیابی نہیں تھا
- اس شخص کا قصہ جس کے چرے کی عمر 130 سال تھی
- اور تقریباً 25 برس
- شیخ کرامت نے ہزاروں طرح تبخیر کیا

**کتاب کی قیمت: 500 روپے**

© 2023

0303551

0303551

**74300**

© 2023

نہیں تھی۔

میں نے مہراج سے ذکر کیا تو وہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔  
”مجھے معلوم تھا کہ اب تم یہاں نہیں رہنا چاہو گے اور میں تمہیں اب روکوں گا بھی نہیں۔ میں تمہارے جانے کا بندوبست کروں گا۔“

اور جب میں نے بتایا کہ جاگی اور تھائی بھی میرے ساتھ جانا چاہتی ہیں تو مہراج کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔

اور پھر ایک ہفتے بعد ہمارے پاسپورٹ بھی تیار ہو گئے۔ میں نے کئی روز پہلے ہی سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو کو بتا دیا تھا کہ میں واپس آنے والا ہوں۔ سنگاپور میں ہمارے مکان کی چابیاں اس کے پاس تھیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ میرے آنے سے پہلے مکان ٹھیک کروا دے گا۔ انسپکٹر چیانگ شو سے ویسے بھی وقتاً فوقتاً ٹیلی فون پر میری بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ یہ جان کر بہت حد خوش ہوا تھا کہ میں واپس آنے والا ہوں۔

بنکاک میں اگلے چند روز بڑی مصروفیت میں گزرے۔ سب کو پتا چل گیا تھا کہ میں واپس جانے والا ہوں۔ دعوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمیں تحائف سے لاد دیا گیا اور بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب ہم بنکاک کو الوداع کہنے والے تھے۔ ماسٹر ہو جن اور پھر مہراج سے رخصت ہوتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان سے پوچھنے کا مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ مہراج میرا روحانی باپ تھا۔ انہوں نے مجھے جینا سکھایا تھا اور میں مرتے دم تک انہیں نہیں بھول سکتا تھا۔

سنگاپور کے چانگنی ائر پورٹ پر انسپکٹر چیانگ شو نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہم کئی سال بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ انسپکٹر چیانگ شو تو مجھے نہیں پہچان سکا تھا مگر میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا مگر اس کی شخصیت اب بھی بہت شان دار تھی۔

وہ ہمیں سیدھا گھر لے جانے کے بجائے ایک ہوٹل میں لے گیا جہاں پہلے سے ہمارے لیے ایک کمرے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو بھی شام تک ہمارے ساتھ ہوٹل ہی میں رہا۔ شام سے ذرا پہلے حارہ کاشی اور چاچا پر تاب سنگھ کے دوست خشونت سنگھ کی بیوی رجنی اور بیٹی ارلما بھی آئیں۔ خشونت سنگھ کا انتقال ہو چکا تھا اور ارلما شادی کے بعد دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ان کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے محلے کی دو خواتین بھی آئیں۔ ان

میں ایک اوجیز عمر تھی اور دوسری بوڑھی ہو چکی تھی۔ ان سب کو انسپکٹر چیانگ شو نے بلایا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جب میں گھر میں داخل ہوں گا تو میری کیا کیفیت ہوگی اسی لیے اس نے ان سب کو یہاں جمع کر لیا تھا۔ اور پھر اسی رات نوبے کے قریب جب میں نے گھر کے دروازے میں قدم رکھا تو میری عجیب سی کیفیت تھی۔ دروازے میں سنہاٹ سی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے روشنی کے چمکتے ہوئے لہرے سے رقص کرنے لگے۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن اس وقت نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا کہ میں اپنے حواس پر قابو نہیں پاسکا۔ جذبات آنسوؤں کا سیلاب بن کر بہہ نکلے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں اس گھر کے دروازے سے لپٹ لپٹ کر خوب رویا۔ انسپکٹر چیانگ شو اور دوسرے لوگ مجھے محلے سے لپٹا لپٹا کر ولاسا دیتے رہے۔ میں جب پر سکون ہوا تو میرے یہ سہانے ایک ایک کمرے کے جانے لگے۔ آخر میں صرف انسپکٹر چیانگ شو رہ گیا تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں تھائی، جاگی اور انسپکٹر چیانگ شو کے ساتھ بینکک روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت چاچا پر تاب سنگھ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چاچا پر تاب سنگھ کے تذکرے پر بھی میرا دل بھرتا اور میں ایک بار پھر ہچکیاں لینے لگا۔ وہ خوفناک منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب مجھے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ سو اوروں کے قریب انسپکٹر چیانگ شو جانے کے لیے

اٹھ گیا۔  
”ایک بات اور۔“ وہ پہلے جاگی اور تھائی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں تم لوگوں کی حفاظت کے لیے دو آدمی یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“  
”کیوں؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”تم جن دشمنوں سے بچنے کے لیے برسوں تک مختلف ملکوں میں بھاگے پھرتے رہے وہ بھی دوبارہ یہاں پہنچ گئے ہیں۔“  
”کیا؟“ میں اچھبل پڑا۔

مجھے انسپکٹر چیانگ شو کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں کچھ کے بغیر بیٹھی بیٹھی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میرے سر پر گویا بم پھٹ پڑا تھا۔

یہ خبر یہی ایسی تھی جس نے وقتی طور پر میرے حواس خنق کر دیے تھے۔ میرے دماغ میں آنندھیاں سی چلنے لگیں اور گردن پر چوڑیاں سی رنگیں ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

مجھے یاد تھا۔ جی فانگ سے آخری مرتبہ میرا سامنا بنکاک میں بادام اوٹو کے فلیٹ پر ہوا تھا۔ دارا بھی وہیں موجود تھا۔ وہ دونوں اس فلیٹ میں داد عیش دے رہے تھے اور ہم نے چھاپا اسی طرح مارا تھا کہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکی تھی لیکن عین آخری لمحوں میں باڑی اس طرح پلٹ گئی تھی کہ دارا تو سونے کو ڈھال بنا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور جی فانگ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا جسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس کے چند روز بعد لیڈی کالنگ پر مومنزس شیوانی کے فلیٹ پر دارا سے ملے پھڑپھڑاتی تھی جہاں دارا نے مقابلے کے بجائے فرار کو ترجیح دی تھی اور اس کو شش میں اس کے ایک ہاتھ کی انگلی بھی کٹ گئی تھی۔

میں شیوانی کے فلیٹ سے دارا کے فرار کے چند روز بعد جی فانگ بھی حیرت انگیز طور پر پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ دونوں مل گئے تو ایک بار پھر نئے سرے سے بنگالے شروع ہو جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی بھی نئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ رتنا کون نے اپنی نگرانی میں بنکاک میں زبردست قسم کا آپریشن کر دیا تھا۔ جی فانگ کو بھی دیکھا گیا۔ وہ ٹرین کے ذریعے آیا تھا۔ اس کی پولیس کے ایک آدمی نے اسے پہچان لیا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ پولیس میں کو ذبحی کر کے فرار ہو گیا۔ ان کے تمام پرانے اڈوں اور پرانے دوستوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔ ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرا خیال ہے وہ کسی جزیرے پر روپوش ہیں۔ انہیں تلاش کر لیا جائے گا اور میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ اب اس جزیرے پر وہ پرانی کمانی دہرائی نہیں جائے گی لیکن بہر حال تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے چیانگ انکل۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”میں محتاط رہوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے محافظوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے آدمی واپس لے جائیے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔“  
”اوکے“ انسپکٹر چیانگ شو نے کہا ”میں چلتا ہوں۔“  
کل کسی وقت ملاقات ہوئی۔

چیانگ شو نے میرے بعد جاگی اور تھائی سے بھی ہاتھ

مہینہ بنکاک میں رہا تھا۔ اس دوران میں خاموشی ہی رہی تھی۔ کوئی بنگامہ نہیں ہوا تھا۔ رتنا کون کا آپریشن کر دیا تھا۔ دارا اور جی فانگ کو تلاش کیا جا رہا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ دونوں بنکاک ہی میں کس روپوش ہو گئے ہیں لیکن اب انسپکٹر چیانگ شو سے ملنے والی یہ اطلاع میرے لیے بم کا دھماکا ہی ثابت ہوئی تھی کہ وہ دونوں مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔

یہ خبر سننے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میرے جڑے پہنچ گئے۔ میری مٹھیاں بھی اس سختی سے پہنچ گئی تھیں کہ انگلیوں کے جوڑ سفید ہو گئے۔

”ایزی مائی بوائے ایزی۔“ انسپکٹر چیانگ شو نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ”تم نے انہیں تھائی لینڈ میں نہیں نکلے دیے۔ انہیں جب پتا چلے گا کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو تو وہ یہاں سے بھی فرار ہونے کی کوشش کریں گے اور پھر ہم بھی یہاں موجود ہیں۔ سنگاپور کی پولیس بنکاک پولیس سے بہت مختلف ہے۔ ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں جیسے ہی سراغ ملا ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پٹنا دی جائیں گی۔“

”وہ لوگ یہاں کب آئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔  
”دارا کے آنے کی اطلاع تو چند دن پہلے ملی تھی۔“

انسپکٹر چیانگ شو نے جواب دیا ”اسے چانگنی ائر پورٹ پر دیکھا گیا تھا اس کے بعد وہ غائب ہو گیا اور پھر ایک ہفتے پہلے جی فانگ کو بھی دیکھا گیا۔ وہ ٹرین کے ذریعے آیا تھا۔ اس کی پولیس کے ایک آدمی نے اسے پہچان لیا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ پولیس میں کو ذبحی کر کے فرار ہو گیا۔ ان کے تمام پرانے اڈوں اور پرانے دوستوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔ ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرا خیال ہے وہ کسی جزیرے پر روپوش ہیں۔ انہیں تلاش کر لیا جائے گا اور میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ اب اس جزیرے پر وہ پرانی کمانی دہرائی نہیں جائے گی لیکن بہر حال تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے چیانگ انکل۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”میں محتاط رہوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے محافظوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے آدمی واپس لے جائیے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔“  
”اوکے“ انسپکٹر چیانگ شو نے کہا ”میں چلتا ہوں۔“  
کل کسی وقت ملاقات ہوئی۔

چیانگ شو نے میرے بعد جاگی اور تھائی سے بھی ہاتھ

ملایا۔ میں اسے رخصت کرنے کے لیے باہر کے دروازے تک آیا اور اس وقت تک باہری کھڑا رہا جب تک اس کی جیب گلی کا مونڈھ گھوم کر نگاہوں سے اوچھل نہ ہو گئی۔ میں دروازہ بند کر کے اندر آیا۔ انسپٹر چانگ شونے کما تھا کہ وہ میری حفاظت کے لیے مقرر کیے جانے والے اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دے گا لیکن مجھے یقین تھا کہ حفاظت گے کے لیے اس کا کوئی نہ کوئی آدمی سادہ لباس میں ہمارے آس پاس موجود رہے گا۔

تھائی اور جاگی ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ہم دیر تک دارا وچی فانگ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ اب یہاں ہاتھ پیر پھیلانے کی کوشش نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا ”میں ان کے کروہ کا شیرازہ پہلے ہی بکھریا تھا۔ ہمارے ہنگامے جانے کے بعد اس کے کزن جمال نے یہاں قدم جمائے کی کوشش کی تھی اور میں نے انسپٹر چانگ شو کو ہنگامے سے فون پر اطلاع دے دی تھی۔ جس نے وہ سینڈ کیٹ قائم ہونے سے پہلے توڑ دیا۔ جمال اور اس کے ساتھی ابھی تک جیل میں ہیں۔ اب یہاں کی صورت حال کیا ہے؟ اس کے بارے میں میں نہیں جانتا لیکن ایک بات طے ہے کہ اب وہ لوگ یہاں قدم نہیں جما سکیں گے۔“

”لیکن ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“ جاگی نے کہا۔

”مقصد کچھ بھی رہا ہو لیکن اب وہ یہاں نہیں نکلیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ بات کرتے ہوئے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں تھائی لینڈ میں کئی مرتبہ دارا کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ ایسے کسی بھی موقع پر مجھے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن اسے کسی طرح یہ پتا چل گیا تھا کہ میرے ڈیڑی نے لاہور چھوڑنے سے پہلے ان کا جو سونا غائب کیا تھا اس کا راز کسی ڈائری میں محفوظ ہے اور میں اس ڈائری کے بارے میں جانتا ہوں۔ وہ کروڑوں کی مالیت کا سونا تھا اور اب تو اس کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہوگی۔ ہنگامے میں مادام او تو کو کے فلیٹ پر دارا نے کما تھا کہ وہ اپنا سب کچھ بار چکا ہے۔ اس کے سارے منصوبے لمبا میٹ ہو چکے ہیں اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ وہ بالکل فلاش ہو چکا ہے لیکن پاکستان میں میرے ڈیڑی کا چھپایا ہوا سونا اب بھی محفوظ ہے اور وہ ڈائری میرے قبضے میں ہے جس میں سونے کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ سونا اس کے نقصان کا ازالہ کر سکتا ہے اور وہ مجھ

سے وہ ڈائری ضرور حاصل کرے گا۔

اب مجھے دارا کے سنگاپور آنے کے مقصد کا پتا چل گیا تھا۔ سنگاپور دارا کے لیے ڈیجیٹل زون تھا۔ یہاں سے فرار ہونے سے پہلے یہاں وہ لاتعداد جرائم کا مرتکب ہو چکا تھا۔ کئی بے گناہ اس کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ جی فانگ اور دارا سنگاپور پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھے انہیں تو اس طرف کا رخ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن وہ دونوں یہاں پہنچ گئے تھے۔ دارا ہر قیمت پر وہ سونا حاصل کرنا چاہتا تھا اور ڈائری کے بغیر اسے سونے کا سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ یقیناً ڈائری کی تلاش ہی میں یہاں آیا تھا لیکن اسے کچھ کرنے کا موقع شاید اس لیے نہیں مل سکا تھا کہ یہاں اس کی آمد کا پتا چل گیا تھا اور پولیس سرگرم ہو گئی تھی۔

میں نے تھائی اور جاگی کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو ان دونوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”یقیناً یہی بات ہے۔“ جاگی نے کہا ”اس کے یہاں آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور اب تک اس کی خاموشی بھی بلا وجہ نہیں ہوگی۔“

”پولیس کو اس کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔“ میں نے کہا ”اس کی تلاش فوراً ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اڈوں کی نگرانی ہو رہی ہے اس لیے وہ کہیں دیکر بیٹھ گیا ہے۔ اس کی یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اور یہ طوفان اچانک ہی اٹھے گا۔“

”یہاں ہنگامے والی صورت حال تو نہیں ہے۔“ جاگی نے کہا ”ہاں تو ان کے درمیان حواری موجود تھے۔ دارا انہیں کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ ملا لیتا تھا لیکن یہاں۔“ ”تم شاید بھول رہی ہو کہ شروعات میں سے ہوئی تھیں۔“ میں نے کہا ”اس نے پاکستان سے یہاں آتے ہی بچے گاڑ۔۔۔ لیے تھے۔ پیسے کے لالچ میں ہر کوئی برائی کا حصہ بننے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے کچھ پرانے دوست اب بھی یہاں موجود ہیں۔ وہ دونوں اتنے دنوں سے یہاں روپوش ہیں اور پولیس ان کا سراغ نہیں لگا سکی۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں یہاں آتے ہی کچھ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہو چکی ہیں جنہوں نے انہیں پناہ دے رکھی ہے۔ ہو سکتا ہے دارا نے اندر ہی اندر اپنے کچھ حمایتی تیار کر لیے ہوں یا ایسا کرنے کی کوشش کر رہا ہو ایسی لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ موقع پا کر اچانک ہی کچھ کرے گا۔ ہو سکتا ہے اسے ہماری آمد کا پتا چل چکا ہو۔ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو جائے گا۔“

جاگی اس مرتبہ خاموش رہی۔ تھائی تو اس دوران میں

کی خاموش بیٹھی رہی تھی۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے ان دنوں سے مسانوں کی آمد و رفت گلی رہی تھی۔ گلی کے ان لوگ بھی آتے رہے تھے اور ہم لوگ ڈرائنگ روم کی طرف کرسی اور کمرے میں نہیں جاسکے تھے۔ دو بجے اپنا چانگ شو کے جانے کے بعد بھی ہم یہیں بیٹھے رہے۔ دارا اس وقت تین بجنے والے تھے جاگی بجائی لینے لے اٹھ گئی۔

”اب تو تیند آ رہی ہے لیکن سونے سے پہلے میں تمہارا مکان دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب سے آئے ہیں ایک ہی کمرے رہے ہوئے ہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تھائی بھی اٹھ گئی۔ میں انہیں گھر دکھانے لگا۔ مختلف رومں سے ہوتے ہوئے میں انہیں اپنے اسی اہوالے بندہ میں لے آیا۔ یہ مکان کئی سال بعد رہا تھا لیکن میرے لیے سے پہلے انسپٹر چانگ شو نے بڑی محنت سے معائنہ کر رکھا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ میں نے بنگ ٹیبل کی سب سے اوپر والی دراز کھول لی۔ اس میں نیلیس اسٹیل کا وہ خوب صورت فریم رکھا ہوا تھا جس کی اوپر ڈیڑی کی تصویر تھی۔ میں نے وہ فریم اٹھالیا۔ میرا دل بے کہ یہ فریم صاف کر کے ٹیبل پر رکھنے کے بجائے ان پوچھ کر دراز کے اندر رکھ دیا گیا تھا تاکہ فوری طور پر اسے نظر اس پر نہ پڑ سکے۔

میں فریم اٹھا کر تصویر دیکھنے لگا۔ میری آنکھوں میں نمی گئی۔

تھائی نے فریم میرے ہاتھ سے لے لیا۔ چند لمبے تصویر دیکھی رہی پھر میرا کندھا تھپتانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس کی ہو سکتی ہے۔ جاگی نے بھی تصویر لے کر دیکھی۔ پھر فریم ڈرائنگ ٹیبل پر سجایا۔ میرے منہ سے بے اختیار نگیں ہی نکل گئی۔

میں دوسری درازیں کھول کر دیکھنے لگا۔ نیچے والی دراز میں بھی ایک فریم شدہ تصویر موجود تھی۔ یہ تصویر بھی بڑے کھل سے تقریباً دو مہینے پہلے گھر کے آگن میں لٹھیری ہوئی تھی۔ ڈیڑی کو یہ تصویر بہت پسند آئی تھی اور انہوں نے اسے انکار کر دیا تھا۔

”یہ تصویر کس کی ہے؟“ جاگی نے پوچھا۔ حالانکہ وہ غریبی تھی کہ یہ تصویر کس کی ہو سکتی ہے ”ہمت پرا سا لاکھ کا بیٹا ہے؟“

”اُسے تم نے پہچانا نہیں جاگی۔ تمہارے سامنے ہی تو ہے۔“ تھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گوا تم بچپن ہی سے ایسے تھے دوسروں کو پریشان کر کے ڈالے۔“ جاگی بھی مسکرا دی۔

”بچپن کی نہیں یہ میرے لڑکپن کی تصویر ہے۔“ ڈیڑی کے انتقال سے تقریباً دو مہینے پہلے لٹھیری ہوئی تھی۔ اس روز میری چودھویں سالگرہ تھی۔ مجھے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک بات یاد ہے۔ رات کو ہم ہوٹل سے ڈنر کر کے واپس آ رہے تھے ہماری ٹیکسی جیسے ہی دروازے کے سامنے رکی تھی ایک اور کار ہمارے قریب آ کر رکی تھی اور دارا اور اس کے ساتھیوں نے ممی ڈیڑی کو گھیر کر ان پر حملہ کر دیا تھا اور میں۔۔۔ میں اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔

تھائی نے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ مجھے کمرے سے باہر لے آئی۔ لاڈلج میں رک کر اس نے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے اور میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے بولی۔

”تم نے نو عمری میں اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کی بہت بڑی ٹریڈی دیکھی۔ تم نے بڑے ضبط اور صبر سے کام لیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں پر تاب نگلے اور انسپٹر چانگ شو جیسے سرپرست مل گئے تھے۔ ان لوگوں نے تمہیں محبت بھی دی اور تمہارے اندر زندگی کا حوصلہ بھی پیدا کیا۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا میں اس سے ناواقف تو نہیں ہوں۔ تم نے بڑی کھٹنایاں برداشت کی ہیں۔ اب تم جوان ہو۔ اور اب تو تمہیں زیادہ حوصلے کی ضرورت ہے۔ ابھی تمہارا مشن پورا تو نہیں ہوا۔ تم نے تو قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام نہیں لے لو گے تمہیں چین نہیں آئے گا اور اگر حوصلہ ہار بیٹھے تو اپنے مشن کو کیسے پایہ تکمیل تک پہنچاؤ گے۔“

”میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”ہمت عرصے بعد یہاں آیا ہوں نا۔ ایک ایک چیز ممی ڈیڑی کی یاد دلا رہی ہے۔ میری بہت اور میرا حوصلہ اب بھی قائم ہے۔ یہاں جا چا پر تاب نگلے اور انسپٹر چانگ شو نے مجھے سہارا دیا اور تھائی لینڈ میں صہراج اور تم دونوں میرا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ اگر مجھے تم لوگوں سے حوصلہ نہ ملتا تو میں عرصہ پہلے زندگی کی بازی ہار چکا ہوتا۔“

”ساڑھے تین بج رہے ہیں۔“ تھائی دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ باقی باتیں ہم صبح

کریں گے۔

میں نمی ڈیڈی والے بندہ میں سونا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے دے کرے میں لے آئی تھی میرا بندہ روم تھا۔ میں پہلے بھی نہیں سوا کرتا تھا۔ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر وہ دونوں سامنے والے کمرے میں چلی گئیں جو دراصل گیسٹ روم تھا اور اس کا ایک دروازہ برآمدے کی طرف بھی کھلتا تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جاگتی اور تھانی نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا تھا۔ مجھے سامنے والے کمرے سے ان دونوں کی سرگوشیوں میں باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ آوازیں بند ہو گئیں۔ میرا خیال ہے وہ دونوں سو گئی تھیں لیکن میں دیر تک جاگتا رہا اور نمی ڈیڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے آج بڑی شدت سے ان کی یاد آ رہی تھی۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے بار بار میری نگاہوں کے سامنے محوم رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت غنودگی سی طاری ہو رہی تھی اور پھر یوں لگا جیسے ایک ہولنا کمرے میں داخل ہوا ہو۔ مسکراتا ہوا وہ چہرہ مانتا کہ نور سے روشن ہو رہا تھا۔

وہ ہولنا میرے قریب آکر ستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں اپنے آپ کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ میری نظریں اس مانتا بھرے مسکراتے ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں۔ نقش واضح نہیں تھے لیکن وہ میری ماں کا چہرہ تھا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ غنودگی گہری ہوتی گئی اور پھر نیند کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ آنکھوں پر چمک پڑنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں چند لمحے یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا اور پھر ایک اور بات محسوس کر کے میں چونک گیا۔ میرا سر تکیے کے بجائے کسی کی آغوش میں تھا۔ میں نے ہلکا سا ہاتھ تو ایک نرم اور گداز ہاتھ نے ہلکا سا دباؤ ڈال کر مجھے حرکت کرنے سے روک دیا اور بڑے ہولے ہولے میرے بالوں میں انگلیاں چلنے لگیں۔

میں نے بڑی آہستگی سے اپنی گردن کو حرکت دی اور اس کے ساتھ ہی میرے پورے جسم میں سنسنی سے پھیلنے چلی گئی۔ وہ تھانی تھی جو پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز سو رہی تھی۔ میرا سر اس کی گود میں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا اور دوسرا سر پر۔ میں نے جب چلنے کی کوشش کی تھی تو اس نے نیند ہی میں مجھے پٹنے سے روک دیا۔

تھا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔

میرے دماغ میں سنسنائیت سی ہو رہی تھی۔ تورات میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں آنے والا وہ ہولنا اور مانتا کے نور سے منور وہ چہرہ محض تصور نہیں تھا۔ وہ تھانی تھی جو میرے کمرے میں آئی تھی اور میرا سر اپنی گود میں رکھ کر اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔

مجھے یاد آ گیا۔ بنگالک میں بھی ایک مرتبہ وائٹ نائٹ کے کمرے میں تھانی اسی طرح میرا سر اپنی گود میں رکھے رات بھر بیٹھی رہی تھی۔

میں چند لمحے تھانی کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر پریں آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹا کر اپنا سر اس کی گود سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھانی کی آنکھ کھل گئی۔

”سو جاؤ۔ ابھی رات باقی ہے۔“ تھانی کا انداز۔

بڑبڑانے والا تھا اور لہجہ خوابیدہ سا تھا۔

”تھانی۔“ میں نے کہا۔

تھانی کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی مانتا کا نور نظر آیا جو میں نے ہم تصور سے دیکھا تھا۔

”تھانی۔“ میں ہولے سے بولا ”تم میاں کب آئیں اور کب سے اس طرح بیٹھی ہوئی ہو؟“

”تم شاید نیند میں اپنی می کو پکار رہے تھے۔“ تھانی نے بھی ہولے سے جواب دیا ”تسماری آواز سن کر میں میاں آگئی۔ تم نیند میں بے چین ہو رہے تھے اور بار بار می کو پکار رہے تھے۔ میں نے تمہارا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور تم پر سکون ہوتے چلے گئے اور پھر میں نے میاں سے اغما مناسب نہیں سمجھا۔“

”تھانی تم۔“ میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ تھانی نے جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میں اٹھ کر تھانی سے لپٹ گیا۔ تھانی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس کے سینے سے لگ کر مجھے بڑا سکون مل رہا تھا۔ جیسے مجھے ماں کی مٹا بھری آغوش مل گئی ہو۔

تھانی میری پیشانی پر بوسے دیتے ہوئے میری پیٹھ پر رہی تھی۔ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ میں ایک عجیب سرور کی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہونے لگیں۔

میں تھانی کی آغوش میں پھر سو گیا تھا اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو میرا سر تھانی کی گود میں نہیں تکیے پر تھا البتہ تھانی

بٹنی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

”آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے

مکان تقریباً دو سال پہلے خرید ا تھا۔

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”ہاں۔“ واقعی

بست سی تبدیلیاں آچکی ہوں گی لیکن۔ تم یہ بتانی میں کیا کیا

رہی ہو۔ خوشبو تو بہت مزے کی آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کھر

میں تو ایسی کچی چیز نہیں تھی۔“

”گھر میں برتن تو تھے۔“ تھانی نے جواب دیا ”تمہیں یاد

ہے انپکڑ چپاگ شورات کو کچھ رقم دے گیا تھا۔ جاگتی صبح

ہی مارکیٹ سے کچھ چیزیں لے آئی تھی۔ میں نے اسٹوکے

لیے کہا تھا۔ سب کچھ تیار ہو چکا ہے۔ صرف تمہارا انتظار

تھا۔“

”میں جاگتی کو بلاتا ہوں۔ تم کھانا نکالو۔ بڑے زور کی

بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

باہر آکر میں نے کھلی میں زور اور دھڑکیا۔ مجھے سب کچھ

پیدا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ

سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا اور جاگتی نمودار ہوئی۔ اس

کے پیچھے ایک اور اچھڑ عمر عورت بھی تھی۔ اس نے گلابی

ریگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر ہنڈیا بھی نظر آ رہی

تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہی

مس رنجنا پٹیل تھی۔

جاگتی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آگئی۔

”تسماری دوستی شروع ہو گئی۔“ میں نے کہا۔

”موقع ملا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے نا۔“ جاگتی

نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اب جلدی سے اندر چلو۔

مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“

”نیکوں۔“ مس رنجنا نے کچھ کھلایا نہیں۔“ میں نے

دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”وہ بے چاری تو کھانے کو بہت کمر رہی تھی مگر میں نے

ہی منع کر دیا پھر اس نے کافی بنالہ خالی پیٹ بلیک کافی پی کر

آنتیں سلگ اٹھی ہیں۔“ جاگتی نے جواب دیا۔

ہم دونوں اندر آگئے۔ تھانی اس وقت میز پر کھانا لگا رہی

تھی۔ جاگتی نے کرسی پر بیٹھتی ہی ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔

میں کھانا ختم کر کے کرسی سے اٹھائی تھا کہ فون کی گھنٹی

بج اٹھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسپورڈ اٹھالیا۔ وہ انپکڑ

چپاگ شو کی کال تھی۔ اس نے یونہی خیریت دریافت کرنے

کے لیے فون کیا تھا۔ کئی منٹ تک فون پر گپ شپ ہوئی

ریٹورنٹ میں آجائے وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔“  
 ”ٹھیک ہے، بیٹھ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا اور چند جھلسوں کے تبادلے کے بعد میں نے ریسیور رکھ دیا۔  
 میں نے جاگنی اور تھائی کو بتا دیا کہ شام کی چائے انیسٹر چیانگ شو کے ساتھ لی جائے گی۔ وہ دونوں اٹھ کر برتن سینے لگیں۔ اس کے بعد ہم لاؤنج ہی میں بیٹھ باتیں کرنے لگے۔ مجھ پر حسب معمول کھانے کے بعد غنڈی سی طاری ہوئے لگی۔ نیند کے جھوٹے آرہے تھے اور پھر کال بیل کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ جاگنی مجھ سے پہلے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ دو عورتیں اور ایک آدمی تھا۔ اس کے سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی پٹری دیکھ کر اندازہ لگا جا سکتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔  
 وہ جگ بیت سنگھ اور ڈا تھا۔ اویسر عمر عورت اس کی بیوی امریتا کو راور اور جوان لڑکی اس کی بیٹی زینجی کو رکھی۔ جگ بیت سنگھ کی شکل و صورت تو واجبی سی تھی البتہ دونوں ماں بیٹیاں خاصی حسین تھیں۔  
 میں نے اٹھ کر جگ بیت سنگھ سے ہاتھ ملایا۔ دونوں خواتین کو سلام کیا اور ان کے بیٹھنے کے بعد خود بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ باتوں کی ابتدا ہی میں مجھے پتا چل گیا کہ جگ بیت سنگھ چاچا پر تاب سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ کافی عرصہ پہلے کام کی تلاش میں سنگا پور آیا تھا۔ کچھ عرصہ پر تاب سنگھ کے پاس بھی رہا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ ہندوستان واپس چلا گیا۔  
 بنکاک میں چاچا پر تاب سنگھ کی ملاکت کے بعد سنگا پور میں اس کی جائیداد کی وراثت کا مسئلہ کھڑا ہوا تو جگ بیت سنگھ ہی اس کا ایسا قریبی رشتے دار تھا جسے اس کا جائز وراثت قرار دیا جا سکتا تھا۔  
 سنگا پور میں سکھوں کی تنظیم ”خالصہ جتھہ“ اور انیسٹر چیانگ شو کے تعاون سے جگ بیت سنگھ کو ہندوستان سے سنگا پور بلایا گیا اور پر تاب سنگھ کی ساری جائیداد اور کاروبار قانونی طور پر اس کے حوالے کر دیا گیا۔ انہی لوگوں کی کوششوں سے اسے یہاں کی شہرت بھی مل گئی اور اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی یہاں بلایا۔ ان کی رہائش پردوس والے چاچا پر تاب سنگھ کے مکان ہی میں تھی۔  
 ان لوگوں کے مخلص اور ہمدرد ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ جاگنی نے چائے پانی بھی اور چائے کے ساتھ دیر تک باتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ دونوں میاں بیوی بار بار مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اب مجھے

پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ چار بجے جب وہ جاگنے لگے تو انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر بھی مدعو کر لیا۔ ہمارے انکار کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہے کہ ہم رات کا کھانا انہی کے گھر پر کھائیں گے۔  
 پونے پانچ بجے کے قریب ہم بھی تیار ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جاگنی نے ساڑی پہنی تھی۔ جو اس پر خوب فٹ رہی تھی جبکہ تھائی نے پیٹت اور اوپن شرٹ پہنی تھی۔ میں نے جینز اور لی شرٹ کو ترجیح دی تھی۔  
 گلی سے نکل کر ہم مین روڈ پر آگئے۔ وہاں سے تو بڑا سوگڑ آگے ریڈ کراس ہاؤس والے چوراہے کے قریب ٹیکسی اسٹینڈ سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھا اور جاگنی اور تھائی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ٹیکسی کئی منٹیں روڑ سے ہوتی ہوئی دوسرے چوراہے پر آرچرڈ روڈ پر مڑ گئی۔  
 آرچرڈ روڈ پر اس وقت ٹریفک کا ازدحام تھا۔ جس درجہ سے ٹیکسی کی رفتار بھی کم رہی اور بالآخر طویل فاصلے کرنے کے بعد ٹیکسی اسکاٹس روڈ پر مڑ گئی۔ اس طرف بھی ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ اس سڑک پر بھی بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز اور لاتعداد آفائو اشارہ ہوٹلوں کے علاوہ بی بی بین الاقوامی تجارتی کمپنیوں کے دفاتر تھے۔  
 ٹیکسی بیاباں رستہ چھٹی ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو کر عالی شان پورج میں رک گئی۔ پورج میں کھڑے ہوئے ایک باوردی ملازم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا پتلا اگلا دروازہ کھولا اور پھر پچھلا دروازہ بھی کھول دیا۔ میری جیب میں تو پیسے نہیں تھے تھائی نے نیچے اتر کر ایہ دینے کے لیے پرس کھولا تو کوئی چیز پرس سے نکل کر پھٹنے کی آواز پیدا کرتی ہوئی نیچے گر گئی اور اس چیز کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔  
 وہ پھل کاٹنے والی چھری تھی۔  
 میں نے جبکہ کر چھری اٹھاتے ہوئے ٹیکسی کے قریب کھڑے ہوئے ہوٹل کے ملازم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی الجھن سی تھی جیسی تھی اور تھائی کی حالت تو ایسی تھی جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔  
 ”یہ کیا؟“ میں نے تھائی سے تھائی زبان میں پوچھا۔  
 ہوٹل کا وہ ملازم انڈین یا پاکستانی تھا۔ وہ انگریزی یا چینی زبان تو سمجھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ تھائی زبان نہیں سمجھتا ہوگا۔ اسی لیے میں نے تھائی زبان میں بات کی تھی۔  
 ”ہمارے لیے سنگا پور میں بھی خفہ تو بہر حال ہے۔“ تھائی نے جواب دیا ”کوئی اور ہتھیار تو تھا نہیں۔ اسی لیے میں

نے یہ چھری اپنے پرس میں رکھ لی تھی تاکہ اگر دارا یا جی ہانگ کا آنا سامنا ہو جائے تو۔“  
 میرے منہ سے بے اختیار فقتہ نکل گیا۔ جاگنی بھی ہنس پڑی۔ تھائی واقعی بہت معصوم تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید دارا یا جی ہانگ خالی ہاتھ ہمارے سامنے آکر ہمیں لگا کر اس کے تھائی کے چہرے پر فحاش سی تھی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے ایک ڈالر کا نوٹ ہوٹل کے ملازم کے ہاتھ پر بھی رکھ دیا اور مجھ سے چھری لے کر پرس میں رکھ دی۔  
 ہوٹل کے دروازے سے لابی میں داخل ہوتے ہوئے میں سنجیدگی سے تھائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنے رویے پر افسوس ہو رہا تھا۔ پھل کاٹنے والی چھری پرس میں رکھ کر تھائی نے کسی حماقت کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہ اس کی عقل مند تھی۔ اس نے احتیاط کا دامن تو نہیں چھوڑا تھا۔ ضرورت کے وقت یہ معمولی سی چھری بھی خطرناک ہتھیار ثابت ہو سکتی تھی۔  
 ہوٹل کا ہوگو ریٹورنٹ بہت شان دار تھا۔ سائڈ کی ایک میز پر بیٹھا ہوا انیسٹر چیانگ شو ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں دور سے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا اور ہم میزوں کے درمیان چلائے ہوئے اس کی میز پر آگئے۔ انیسٹر سادہ لباس میں تھا۔ گرے اینڈنگ سوٹ میں اس کی شخصیت بہت شان دار لگ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔  
 ”تم لوگ پورے پندرہ منٹ لیٹ ہو۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”سوری انکل۔“ میں نے کہا ”پدوس سے جگ بیت سنگھ انکل اپنی فیملی کے ساتھ آگئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد تیار ہو کر نکلے تو ٹیکسی کے لیے دور تک پیدل چلنا پڑا اور پھر سڑکوں پر ٹریفک کا جھوم۔ اس طرح ہمیں دیر ہو گئی۔ میں ان کی طرف سے بھی معذرت چاہتا ہوں۔“ میں نے تھائی اور جاگنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”بھلا موقع ہے اس لیے معاف کیا۔“ چیانگ شو مسکرایا ”ویسے جگ بیت سنگھ ارڈو بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اس نے ہمیں بتایا ہو گا کہ وہ کون ہے اور اس مکان میں کیسے رہ رہا ہے۔“  
 ”جی ہاں۔ اس سے خاصی تفصیلی باتیں ہوئی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”اس کی بیوی امریتا کو راور بھی بڑی درد خاتون ہے۔ ان کی وجہ سے تم لوگوں کو بڑی سہولت ہو جائے گی۔ وہ جاگنی اور

تھائی کو یہاں اجنبیت محسوس نہیں ہونے دے گی۔“  
 ”اس کا اندازہ ہمیں ہو گیا ہے۔“ جاگنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 انیسٹر چیانگ شو نے ڈیٹریش کو بلا کر چائے کے لیے کہہ دیا۔ چند منٹ بعد ہی میز چائے اور دیگر لوازمات سے سج گئی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ چیانگ شو نے ہمارے آنے سے پہلے ہی لہسا چوڑا آرڈر دے رکھا تھا۔  
 چائے نوشی کے دوران میں صورت حال پر تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا۔ میرا تو آج یہاں پہلا دن تھا۔ یعنی آج پہلی مرتبہ ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کیا اخبار بھی لے آئی تھی۔ اخبار میں میرے بارے میں بھی لکھا ہوا تھا کہ میں کس طرح اپنے ماں باپ کے قتل کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گیا تھا اور اب کئی سال بعد واپس آیا ہوں۔ دارا اور جی ہانگ کے بارے میں بھی ایک خبر تھی کہ پولیس بڑی سرگرمی سے ان کا تلوں کو تلاش کر رہی ہے۔  
 تقریباً ایک گھنٹا ہم وہاں بیٹھے۔ انیسٹر نے بل ادا کر دیا اور ہم باہر آگئے۔ پارکنگ میں چیانگ شو کی کار کھڑی تھی۔  
 ”آپ کی جیب کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ سرکاری جیب ہے اسے میں صرف سرکاری کاموں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔“ انیسٹر چیانگ شو نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ”یونی کے بعد اپنے پرائیویٹ کاموں کے لیے میں اپنی کار ہی استعمال کرتا ہوں۔“  
 ”لوگ۔“  
 میں آگے پیچھے سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ تھائی اور جاگنی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ کار ہوٹل کی پارکنگ سے نکل کر اسکاٹس روڈ پر آگئی اور وہاں سے آرچرڈ روڈ کی طرف مڑ گئے۔  
 اس وقت شام ہو چکی تھی۔ پورا علاقہ رنگ برنگی روشنیوں سے جھونپا ہوا تھا۔ ٹریفک کچھ اور بڑھ گیا۔ ٹریفک کی رفتار اگرچہ کم تھی مگر گاڑت کمیں بھی نہیں تھی۔ ایک سسٹم کے تحت روانی کسی غلطی کے بغیر جاری تھی۔  
 کار جب آرچرڈ روڈ سے کئی سیسٹمی ایونو کی طرف مڑی تو میں ہی سمجھا تھا کہ انیسٹر چیانگ شو ہمیں گھر پہنچوٹنے کے لیے جا رہا ہے لیکن کار ریڈ کراس بلاڈنگ والے چوراہے سے فورٹ کیننگ روڈ پر مڑنے کے بجائے سیدھی نکل گئی تو میں نے گردن کھما کر انیسٹر کی طرف دیکھا۔ انیسٹر کچھ کہنے کے بجائے صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تھائی اور جاگی بڑی دلچسپ نظروں سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ میں بھروسہ ہا ہو کر بیٹھ گیا۔ کار ریور ویلی روڈ پر سڑگنی آگے بہت بڑا چوراہا تھا جہاں سے کارنیو برج روڈ کی طرف گھوم گئی۔ اب میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر چینگ شو ہمیں چائنا ٹاؤن کی طرف لے جا رہا تھا۔ کار ریور واک گیلریا اور چائنا ٹاؤن پوائنٹ شاؤنگ سینٹر کے سامنے سے ہوتی ہوئی ریور برج روڈ پر دوڑتی رہی۔ یہاں واقعی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ کئی سال پہلے جب میں ابو کے ساتھ دکان پر آیا کرتا تھا تو چائنا ٹاؤن کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ تنگ سے بازار جہاں چلنے کو راستہ نہیں ملتا تھا، اندھیری گلیاں اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتی ہوئی پرانی عمارتیں مگر اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ اندھیری گلیاں تھیں اور نہ پرانی عمارتیں۔ لگتا تھا جیسے یہاں ایک نیا شہر آباد ہو گیا ہو۔ خوب صورت عیالشان کئی کئی منزلہ بلڈنگیں، کشادہ سڑکیں اور روشنیاں ایسی کہ رات کو بھی دن کا لگتا گزرتا تھا۔

کارنیو برج سینٹر کے ساتھ اسٹیم اسٹریٹ پر سڑگنی۔ اس کے ساتھ ہی چائنا ٹاؤن کیپیکس بلڈنگ تھی۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ اس جگہ بہت تنگ تنگ سی گلیاں اور بازار ہوا کرتے تھے مگر اب کئی کئی منزلہ شان دار شاؤنگ سینٹر تھے جو رنگ پرنگی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے اور گاہکوں کی خوب بھرمار تھی۔

مجھے یاد آیا کہ میرے ابو کی دکان اسی علاقے ہی میں۔ ساگو اسٹریٹ پر واقع ایک پرانی سی عمارت میں ہوا کرتی تھی اور جب کار ساگو اسٹریٹ پر گھومی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر چینگ شو یہ علاقہ دکھانے کے لیے مجھے اس طرف لایا تھا مگر ساگو اسٹریٹ بھی بالکل بدل ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کوئی پرانی عمارت کیسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی کئی منزلہ جدید عمارتیں تھیں۔ جن کے گراؤنڈ لیول پر شان دار دکانیں اور اوپر تجارتی کمپنیوں کے دفاتر یا رہائشی فلیٹ تھے۔ میں ایک بار پھر پیچھے کی طرف گھوم گیا اور جاگی اور تھائی کو بتانے لگا کہ اس اسٹریٹ پر نہیں میرے والد کا جزل اسٹور ہوا کرتا تھا لیکن اب تو وہ قدیم بلڈنگ بھی کیسے دکھائی نہیں دے رہی۔

کار ایک ساؤنڈ اسٹریٹ پر مڑ کر رک گئی۔ انسپکٹر چینگ شو نے ابجی بند کر دیا۔

”یہاں آپ نے کار کیوں روک لی انکل۔ کوئی خاص بات؟“ میں نے سوالیہ لہجہ میں اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس جو اب تمہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ہم بھی نیچے اتر آئے۔ گلی سے نکل کر سڑک پر آئے تو سامنے ایک دکان پر ”عابد علی اینڈ سن“ کا بورڈ دیکھ کر اچھل پڑا۔ وہ کئی منزلہ جدید طرز تعمیر کی حامل عمارت تھی اور اس کے گراؤنڈ لیول پر تین بڑے بڑے جزل اسٹور تھے اور وہ بورڈ درمیان والے اسٹور پر تھا۔

ایک لمحے کو تو میں سامنے میں رہ گیا۔ ابو کے انتقال کے بعد میں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا پھرتا تھا اور پھر چاہا پر تاب سنگھ مجھے تھائی لینڈ لے گیا تھا۔ گھر کی یاد تو مجھے اکثر ستاتی رہتی تھی لیکن دکان کا خیال کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دکان انہی دنوں ختم ہو گئی ہوگی اور وہاں کسی اور کا قبضہ ہوگا مگر اب اپنے ابو کے نام کا بورڈ دیکھ کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

بازار میں خاصا جھوم تھا۔ بقول مجھے کھوسے سے کھوا چھل رہا تھا۔ یہاں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ہم سڑک پار کر کے اسٹور میں داخل ہو گئے۔ میں دکان کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ہر قسم کا مال بھرا ہوا تھا۔ دوسری دکانوں کی طرح یہاں بھی گاہکوں کا رش تھا اور چار سائز میں ان سے نمٹ رہے تھے۔

دکان کے پیچھے ایک دروازے پر آفس کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ انسپکٹر چینگ شو کا رخ اسی طرف تھا۔ تمام سائز میں ان کے پیچھے ایک سائز میں سے

”بوٹا سنگھ کہاں ہے؟“ انسپکٹر نے ایک سائز میں سے دریافت کیا۔ سائز میں نے آفس والے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اسی وقت آفس کا کیشے والا دروازہ کھلا اور ایک امیٹر عمر آدمی باہر نکلا۔ وہ سنگھ تھا۔ سر پر گڑی اس کے دھرم کی نشان دہی کر رہی تھی۔

میں اس وقت جاگی اور تھائی کو بتا رہا تھا کہ میرے والد کی دکان تھی۔ بورڈ تو اب بھی انہی کے نام کا لگا ہوا ہے لیکن صورت حال کیا ہے اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔

دفتر سے برآمد ہونے والا شخص بوٹا سنگھ تھا۔ اس نے پہلے انسپکٹر چینگ شو سے ہاتھ ملایا پھر مجھ سے۔

”بوٹا سنگھ۔“ چینگ شو بولا ”یہ وجدان ہے۔ عابد علی کا بیٹا۔ کل ہی تھائی لینڈ سے آیا ہے۔ میں نے سوچا آج اس کی

امانت واپس کر دوں۔“

بوٹا سنگھ چند لمحے میری طرف دیکھا رہا پھر ”خوش کیٹا ای۔“ کہتے ہوئے مجھے گلے سے لگالیا۔ اس کے انداز میں بڑی گرم جوش تھی۔

”آؤ! اندر آؤ! باہر کیوں کھلوتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ہم سب اندر آ گئے۔ دفتر اگرچہ کافی کشادہ تھا۔ اس میں ایک طرف لاتعداد کارٹن بنے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ آفس ٹیبل زیادہ بڑی نہیں تھی اور چیروں کے علاوہ دو ٹیلی فون سیٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ کچھ ٹیبل دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا جس پر اسٹوری تختی لگی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر کمپیوٹر بھی رکھا ہوا تھا۔

میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے لگا تو بوٹا سنگھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بھئی نہیں۔“ اسی اوتھے بیٹھو پڑی۔“ اس نے میز کے پیچھے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کیا ”خسی خیر مال واپس آ گئے۔ او۔ تمہاری جگہ وہ ہے۔“

”چا چا جی۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ وہاں بیٹھ جائیے۔“ میں نے بڑی آہستگی سے اس سے اپنا ہاتھ پھڑاتے ہوئے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

بوٹا سنگھ نے چینگ شو کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کھنٹی بج کر ایک لڑکے کو بلا لیا اور کچھ ٹھنڈا وغیرہ لے کر آیا۔

چند منٹ بعد ہی لیوینڈ آیا۔ ٹھنڈے مشروب کی چمکیاں لیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بہت ہی زیادہ سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ میری عدم موجودگی میں انسپکٹر چینگ شو نے نہ صرف میرے مکان کا خیال رکھا تھا بلکہ میرے والد کا کاروبار بھی سنبھال لیا تھا۔ بوٹا سنگھ اس کا بہت پرانا جاننے والا تھا جسے اس نے دکان کا فیئر بنادیا تھا۔ بوٹا سنگھ بہت ذہین اور کاروباری ذہنیت کا مالک تھا۔ اس نے جدید خطوط پر کاروبار کو از سر نو منظم کیا۔ میرے جانے کے ایک سال بعد پرانی بلڈنگ گر کر آریہ بنی بلڈنگ تعمیر کی گئی تھی۔ گراؤنڈ لیول پر پہلے باغ و کائیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب صرف تین تھیں۔ بوٹا سنگھ نے دو اور دکانوں کی جگہ خرید کر اس دکان میں شامل کر لی تھی۔ اس طرح یہ دکان دوسری دکانوں سے بہت زیادہ بڑی تھی اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ انسپکٹر چینگ شو اور بوٹا سنگھ نے میرے باپ کے نام کو یہاں زندہ رکھا تھا۔

”تم نے واپس آ کر تمہیں چنگا کیا پڑ۔“ بوٹا سنگھ کہہ رہا تھا

”یہ سب کچھ تمہاری امانت ہے۔ کئی ورہوں کا سارا حساب کتاب اس کمپیوٹر اور یہی کھاتوں میں محفوظ ہے۔ اب تم سنبھالو اس کو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے ہے کہ بھائی چینگ شو نے سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ یہ نہ ہوتے تو یہاں تمہارا سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا۔ پر تاب سنگھ کی جائداد اور بڑس کو بھی اس نے بکھرنے سے بچایا ہے۔ اب تم اپنا کام کہ کل منج سے یہاں بیٹھنا شروع کرو۔ میں دو چار دن میں سارا حساب کتاب تمہیں سنبھادوں گا۔“

”نہیں چا چا۔“ میں نے کہا ”ابھی میں اس بکھیرے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے کاروبار کی کچھ سمجھ بھی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ آپ ہی سنبھالے رکھیے۔ میرا مشن ابھی۔“ میں نے جان بوجھ گربات پوری نہیں کی۔

”ٹھیک ہے پڑ۔“ بوٹا سنگھ نے کہا ”تو وہ دن آرام کر لو۔ سیر پانا کرو اور پھر ریلکس ہو کر بیٹھ جاؤ اپنے باپ کی گدی پر۔“

اس مرتبہ میں خاموش ہی رہا۔ انسپکٹر چینگ شو نے موقع پا کر بات شروع کر دی۔ وہ بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اب مجھے اپنے باقی کچھ پر سکون زندگی شروع کر دینی چاہیے۔

”اپنے ماں باپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے تم سے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ تم نے کر لیا۔“ چینگ شو کہہ رہا تھا ”تمہیں یاد ہے جب تم اپنی جان کے خوف سے بھاگے پھر رہے تھے۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ تمہارے دشمن اپنی جان بچانے کے لیے تم سے پیچھے پھر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ دوبارہ یہاں کیوں آئے ہیں حالانکہ وہ یہاں کی پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس سے خوف زدہ نہ ہوں لیکن جب انہیں یہ بتا دیے کہ تم بھی یہاں پہنچ گئے ہو تو وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ تم سے جو کچھ ہو سکا تم نے کیا۔ اب اپنا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔“

”دارا یہاں کیوں آیا ہے انکل۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”ہو سکتا ہے وہ اس مرتبہ بھی پولیس کے ہاتھ نہ آئے لیکن میں نے بہر حال یہ طے کر رکھا ہے کہ ان دنوں کو اپنے ہاتھوں سے کیفر کر دار تک پہنچاؤں گا۔“

”تم یہ بات ایک پولیس آفیسر کے سامنے کہہ رہے ہو۔“ چینگ شو نے کہا۔



”سوری انکل۔“ میں نے کہا ”میں بعد میں اس موضوع پر آپ سے بات کروں گا اور یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری طرف سے لائینڈ آرڈر کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔“ انسپکٹر چیانگ شوگر اسانس لے کر رہ گیا۔

ہم لوگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ ہونا کچھ زیادہ تر کاروبار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر دفتر سے نکل کر وہ ہمیں دکان دکھانے لگا۔ یہ شعبہ جاتی اسٹور تھا۔ ہر شعبہ الگ الگ تھا اور سیلز میں بھی الگ الگ تھے۔ تھائی اور جاگنی یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں یہ تو بتایا تھا کہ میرا پ سنگاپور میں ایک شاپ کیپر تھا لیکن ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں کسی معمولی دکان دار کا تصور ابھرا ہو لیکن یہاں ان کے لیے نئے نئے اکشفاٹ ہو رہے تھے۔ میرا امکان یہ اتنا بڑا اسٹور اور میری آؤ بکٹ دیکھ کر انہیں شاید میری اہمیت کا کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

”انکل۔ ہمیں ایک گاڑی چاہیے۔“ میں نے انسپکٹر چیانگ شو کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھتے ہوئے کہا ”کسی کار رینٹل ایجنسی سے اگر کوئی گاڑی مل جائے تو ہمیں آمدورفت میں کچھ آسانی ہو جائے گی۔“

انسپکٹر چیانگ شو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر کار مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گھومتی ہوئی نورج روڈ پار کر کے یو تانگ سین اسٹریٹ پر نکل آئی۔ یہ بھی ایک کشادہ اور بارونق سڑک تھی اس کے دوسری طرف سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو کی ڈیوٹی بھی یہیں ہوتی تھی۔ اس نے کار پولیس ہیڈ کوارٹر کے کمپاؤنڈ میں روک لی اور ہمیں وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔

اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے ہوئی تھی۔ ”ڈرائیونگ لائسنس کس کے پاس ہے۔“ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کسی کے پاس نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”میں نے تو آج تک ڈرائیونگ سیکھی نہیں۔ تھائی اور جاگنی ڈرائیونگ جانتی ہیں۔ ہنگام میں تو ان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی تھے لیکن یہاں۔“

”یہاں ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر کوئی گاڑی نہیں چلا سکتا۔“ انسپکٹر چیانگ شو نے میری بات کاٹ دی ”سنگاپور دنیا کے بہت سے ممالک سے بہت مختلف ہے یہاں قانون بنائے جاتے ہیں تو ان پر سختی سے عمل بھی کرایا جاتا ہے کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ بہر حال مجھے بندوبست کرنا پڑے گا۔“

کار پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر یو تانگ سین اسٹریٹ پر آگئی۔ ایک بار پھر نورج روڈ عبور کر کے مختلف سڑکوں اور گلیوں میں ہوتے ہوئے میکس دیل روڈ پر ٹریفک پولیس ہیڈ کوارٹر آگئے۔ یہاں انسپکٹر چیانگ شو ہمیں بھی اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ایک دفتر میں پہنچ کر اس نے جاگنی اور تھائی کے نام کاندات تیار کرائے ان دونوں کے دستخط بھی کوائے گئے تھے اور پھر ایک ایک کاپی انہیں بھی دے دی گئی۔

”یہ ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے۔“ اس نے کہا ”جزیرے کی سڑکوں پر کار چلانے کا عارضی اجازت نام ہے۔ تم دونوں کے نام رجسٹر کر لیے گئے ہیں پندرہ دن کے اندر اندر ڈرائیونگ لائسنس بنوانے ہوں گے۔“

ٹریفک پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر انسپکٹر چیانگ شو ہمیں کلب اسٹریٹ کے کراسنگ پر واقع ”ان آف سیکھٹ“ ایسی نیس“ لے گیا۔ پہلے ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر ہوٹل بی کی بلڈنگ میں واقع ایک کار رینٹل ایجنسی کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے ہم نے اپنی پینڈ کی ایک کار کرائے پر حاصل کی اور دفتر سے باہر آگئے۔ ایجنسی کے آدمی نے پارکنگ میں کھڑی ہوئی اس کار کی نشان دہی کر کے چابی ہمارے حوالے کر دی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات جو تھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے۔

# آتش فشان



# آتش فشان

راوی: وجدان علی

تحریر: اقبال کاظمی

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک محصور ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشان کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر حرکت اس کے لئے نئے نئے ہنگاموں کی پیغامبر تھی۔ یہ رحم و سفاک قاتل اسے بھی جاننا ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب پناہ گاہ کی تلاش لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ اتنا توانا و طاقت ور بناسکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں۔ بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

اس ٹھمکتے چراغ کا احوال جواچانک ہی آندھیوں کی زد آ گیا تھا

دور میں کبھی نہیں گیا تھا اس لیے راستوں کی شناخت بھی نہیں تھی۔ جاگی اپنی مرضی سے کار چلائی رہی اسی طرح ہم تھینک دے سے ہوتے ہوئے کئی سڑکوں پر گھوم کر ساتھ برف روڈ پر آ گئے اور سنگا پور ریور پر الگن برف عبور کر کے تارتھ برف روڈ پر آ گئے اور وہاں سے جیسے ہی اسٹیم فورڈ روڈ پر پہنچے مجھے راستہ یاد آیا۔

”یہاں سے بائیں طرف موڑ لو جاگی۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

جاگی نے بڑی بھرتی سے کار اس طرف گھمائی تھی۔ اسٹیم فورڈ سے کار ابل اسٹریٹ پر مڑ گئی۔ ٹیلی فون ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے امریکن چرچ کے قریب دائیں طرف کیننگ وائز کی طرف کاموڈ کاٹ لینے کو کہا۔ یہ سڑک فورٹ کیننگ پارک کے ساتھ ساتھ فورٹ کیننگ روڈ تک چلی گئی تھی لیکن ہمیں وہاں تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ تو وہ جگہیں تھیں جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ پارک سے آگے دو سری گلی میں ہی تو ہمارا گھر تھا۔ ”اوہ!“ اس گلی میں کار موڑتے ہی جاگی بولی ”ہم تو گھر پہنچ گئے۔“

انٹیکر ڈینک شو کی وجہ سے ہماری بہت سی مشکلیں حل ہو گئی تھیں۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے اپنی کرائے کی کار میں بیٹھ گئے اسٹریٹ جاگی نے سنبھال لیا تھا۔ میں اور تھالی پیچھے بیٹھ گئے تھے۔

ہم ایک بار پھر میکس ویل روڈ سے ہوتے ہوئے آئسن روڈ اور اس سے آگے آہڑا جا ایکسپریس وے پار کر کے کیپٹل روڈ پر آ گئے۔ یہ سڑک ریلوے اسٹیشن کے قریب سے ہوئی ہوئی ساحل کے قریب واقع ورلڈ ٹریڈ سینٹر تک چلی گئی تھی۔ اس کے قریب ہی جزیرہ سنٹو شاجانے کے لیے فیوری اسٹیشن اور اس سے ڈراہٹ کر کیپٹل کار اسٹیشن تھا۔

اس وقت یہاں بڑی رونق تھی۔ جاگی نے کار ایک ایسی جگہ روک لی جہاں پارکنگ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہاں اور کاریں بھی کھڑی تھیں۔ کار ہم نے وہیں چھوڑ دی اور دیر تک ادھر کھوتے رہے۔ ایک ریستورنٹ میں کھانا کھایا اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

واپسی کے لیے ہم نے لبارا سٹہ اختیار کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں طویل عرصے بعد یہاں آیا تھا۔ بچپن میں گھر کے آس پاس کے علاقوں میں سائیکل پر گھومتا رہتا تھا۔ زیادہ

”تو گویا تمہیں لکھری شناخت ہوگئی۔“ میں مسکرایا۔  
 ”پام کے وہ تین درخت۔“ جاگی نے سامنے اشارہ کیا  
 ”مجھ جب میں سوڈا لینے کے لیے مارکیٹ گئی تھی تو پام کے ان  
 تین درختوں کو نشانی کے طور پر ذہن میں رکھا تھا۔“  
 کار مکان کے سامنے رگ ٹپ۔ جاگی نے انجن بند کر دیا  
 اور کار کے ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی  
 ”بارہ بجتے والے ہیں۔ ہم شام پانچ بجے کے قریب گھر سے  
 نکلے تھے۔ سات گھنٹے گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔“  
 ”گوئی پریشانی نہیں تھی اس لیے سیریا نے میں وقت  
 گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔“ میں نے اپنی طرف کا  
 دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جاگی اور تھالی بھی نیچے اتر آئیں۔ جاگی نے کار کے  
 دروازے لاک کر دیے۔ گھری چابیاں تھالی کے پاس تھیں۔  
 اس نے پرس میں سے چابیوں کا چمچا نکالا اور مالا کھولنے  
 لگی۔  
 اندر داخل ہونے کے بعد میں نے احتیاط سے  
 دروازے بند کر دیے۔ لوگ روم میں آکر تھالی تو صوفے پر  
 ڈھیر ہو گئی اور جاگی نے سیدھا چمک کا رخ کیا تھا۔ میں بھی  
 تھالی کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا اور کسی قدر جھک کر اپنا  
 سر تھالی کے کندھے پر نکالا۔ جاگے نہیں کیا بات تھی کہ صبح  
 جاگنے کے بعد جب میں نے اپنے آپ کو تھالی کی آغوش میں  
 پایا تھا اور تھالی سے لپٹ کر جس طرح مجھے سکون ملا تھا، اس  
 کے بعد سے میں اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس  
 کرتے لگا تھا۔ کرائے کی اس کار میں ٹھوکتے ہوئے بھی میں  
 پچھلی سیٹ پر تھالی کے ساتھ چپکا بیٹھا رہا تھا اور جاگی نے تو  
 ایک دو مرتبہ جھپٹتے ہوئے جلتے بھی کتے تھے لیکن میں نے  
 اس کی پروا نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ  
 میں تھالی کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ میری کیفیت اس بچے  
 کی سی تھی جو ماما کو ترس گیا ہو اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میں  
 تو ماما کو ترسا ہوا تھا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ تھالی نے مجھے اس طرح پیار کیا  
 ہو۔ اکثر ایسا ہوا تھا۔ تھالی نے مجھے جب بھی اس طرح اپنی  
 آغوش میں لیا تھا، میں نے ہمت کی حدت محسوس کی تھی اور  
 آج تو یہ احساس فزوں تر ہو گیا تھا اور نجانے مجھے آج صبح  
 سے یہ احساس بھی کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی انجانی قوت تھالی کو  
 مجھ سے جھین لے گی۔

میں تھالی کے کندھے سے سر نکالے گھرے گھرے سانس  
 لینے لگا۔ تھالی میرے بالوں میں انگلیاں بھیرنے لگی اور مجھ پر

عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی اور شاید میں اسی طرح بیٹھے  
 بیٹھے سو جا تا کہ جاگی کی آواز سن کر چونک گیا۔  
 ”کیا بات ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں  
 صبح سے دیکھ رہی ہوں کہ تم تھالی سے کیسے جا رہے ہو۔“  
 ”تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ تھالی نے اسے گھورا۔  
 میں اس کے کندھے سے سر اٹھا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔  
 ”نہیں۔ بالکل نہیں۔ مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔“  
 جاگی نے تھالی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور رے میز  
 پر رکھ دی۔ جس میں کافی کے تین مک رکھے ہوئے تھے۔  
 تھالی اور جاگی کئی سال سے میرے ساتھ تھیں۔ یہ  
 دونوں مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ ہر نازک موقع پر انہوں نے  
 مجھے بچانے کے لیے اپنے آپ کو ڈھال بنایا تھا۔ وہ دونوں ہی  
 مجھ پر اپنا حق سمجھتی تھیں اور ایک بات میں نے خاص طور پر  
 نوٹ کی تھی کہ میرے حوالے سے ان دونوں میں کبھی حسد و  
 رقابت کا جذبہ نہیں ابھرا تھا۔ کبھی ایک دوسرے کو نیوڑھی  
 نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھیں  
 لیکن ان کی چاہت میں تو ہوا سا فرق تھا۔

تھالی کے ذہن میں میرے حوالے سے کبھی اوٹ چانگ  
 خیالات نہیں آتے تھے۔ ہم دونوں کی مرتبہ ایسی حالت میں  
 ایک دوسرے کے قریب رہے تھے کہ کوئی اور دیکھ لیتا تو ہم  
 دونوں کو..... گردن زنی سمجھتا لیکن نہ تو یہی تھالی کی طرف  
 سے ایسی حرکت ہوتی تھی اور نہ ہی میری طرف سے۔ البتہ  
 جاگی کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کی چاہت کا رنگ کچھ اور تھا۔  
 ماضی میں اسے جب بھی موقع ملا تھا اس نے مجھے گھبرنے کی  
 کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی بیٹھ حوصلہ شکنی کی  
 تھی۔ جاگی بھی جانتی تھی کہ میں پشوری سے اترنے والا نہیں  
 لیکن اسے جب بھی موقع ملا وہ شرارت کر گزرتی۔  
 اور اس وقت بھی اس نے یہ جملہ شرارتیں کیا تھا اور  
 ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اس کے دل میں حسد یا رقابت کا  
 کوئی جذبہ نہیں تھا۔

کافی کی چکیاں لیتے ہوئے وہ دونوں میری دکان کے  
 بارے میں باتیں کرتی رہیں اور پھر انیکلر چانگ شو کا ذکر بھی  
 چل نکلا۔ وہ ایک ڈسے وار پولیس آفیسر ہی نہیں تھا بلکہ ایک  
 شریف، مخلص اور ہمدرد انسان بھی تھا اگر اس میں شرافت  
 اور دیانت نہ ہوتی تو چاچا پر تاب ٹکھ کی جائد اس کے  
 وارث کے حوالے نہ کرتا اور میرے ابو کی دکان اور مکان کو  
 امانت سمجھ کر نہ سنبھالے رکھتا۔ اس نے نہ صرف دکان کو  
 سنبھالے رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دیتا رہا۔ دکان کی دیکھ بھال

کے لیے اس نے ہوتا سنگھ جیسے شخص کا انتخاب کیا تھا جس نے  
 بڑی کڑی دیکھ کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔  
 چاچا پر تاب سنگھ اور ہوتا سنگھ کے بارے میں سوچتے  
 ہوئے اچانک ہی مجھے اپنے پڑوسی بک جیت سنگھ اردوڑا کا  
 خیال آ گیا۔ وہ لوگ آج بعد دوپہر ہمارے گھر آئے تھے اور  
 کتنے غلوں سے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا مگر ہمیں بالکل  
 یاد نہیں رہا تھا۔ میں نے جاگی اور تھالی کو یاد دلایا تو وہ بھی  
 پریشان سی ہو گئیں۔  
 ”مجھ سب سے پہلے میں ان کے گھر جا کر معذرت کروں  
 گی اور انہوں نے ہمارے لیے جو کچھ بھی پکا رکھا ہے وہ ہم  
 دوپہر کو کھا نہیں گے۔“ جاگی نے کہا۔

ہاتوں کا سلسلہ دو بجے تک چلتا رہا۔ جاگی ہماری لیتے  
 ہوئے آغوشی تو ہم بھی اٹھ گئے۔ وہ دونوں تو اپنے کمرے میں  
 چلی گئیں اور میں اپنے کمرے میں آگیا اور پھر اس رات بستر  
 پر لیٹنے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔  
 اگلے چار پانچ روز سیرو تفریح میں ہی گزرے۔ ہوتا سنگھ  
 نے مجھے اخراجات کے لیے معقول رقم بھجوا دی تھی۔ اس  
 سیرو تفریح کے دوران میں ہی میں نے جاگی سے ڈرائیونگ  
 بھی سیکھنا شروع کر دی۔ تھالی لینڈ میں بڑی ہنگامہ خیز زندگی  
 گزرتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ چاچا تھا کہ ڈرائیونگ سیکھ لوں  
 لیکن ایک ایک لمحہ تو ہماگ دوڑ میں گزار رہا تھا۔ کبھی اتنا  
 وقت نہیں ملا کہ ہم سکون کا سانس لے سکیں اور میں کسی  
 سے ڈرائیونگ سیکھ سکوں۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ ایک  
 مرتبہ میں ایک سنگھین اور نازک صورت حال سے دو چار  
 ہو گیا تھا۔ میں دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس وقت میرے  
 قریب ایک کار موجود تھی۔ انجین میں چالی بھی لگی ہوئی  
 تھی لیکن مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی اور اس وقت میں  
 اس سنگھین صورت حال سے کس طرح عمدہ برا ہوا تھا یہ میں  
 ہی جانتا ہوں۔

اس روز سہ پہر کے قریب میں اور جاگی ریور دیلی روڈ کی  
 طرف نکل گئے ریور دیلی روڈ کا ایک حصہ شہر کے کاروباری  
 علاقے میں تھا جہاں صبح سے رات تک ٹریفک کا ازدحام اور  
 لوگوں کا رش رہتا تھا۔ جبکہ اس سڑک کا دو سرا حصہ رہائشی  
 علاقے میں سے گزرتا تھا۔ ہم اسی طرف آئے تھے جہاں کچھ  
 اور ایسی سڑکیں بھی تھیں جہاں ٹریفک زیادہ نہیں ہوتا تھا  
 اور ڈرائیونگ سیکھی جاسکتی تھی۔

تھالی اس روز گھر پر ہی تھی اور جب تھالی آس پاس نہ  
 ہو تو جاگی شرارت کے موڈ میں ہوتی تھی۔ اس روز بھی اس

کی آنکھوں کی پٹک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ کر میں سمجھ  
 گیا تھا کہ وہ شرارت کے موڈ میں ہے۔  
 تیس پینتیس منٹ تک تو وہ مجھے ڈرائیونگ کا سبق دیتی  
 رہی پھر اس نے مجھے پینتیس منٹ پر بٹھایا اور خود اسٹیرنگ  
 سنبھال لیا۔ وہ کار کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتی، بولی سارا شہر پار  
 کر کے نکل انڈیا کی طرف لے آئی۔  
 ”اس طرف آنے کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے اس کی  
 طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آج میں تم سے ہمت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کسی  
 جگہ بیٹھ کر، تنہائی میں۔“ جاگی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے  
 میں شہید کی تھی۔  
 ”راستے میں ہمت سی ایسی جگہیں تھیں جہاں ہم بیٹھ  
 سکتے تھے۔ ویسے کار میں بھی تو ہم دونوں اکیلے ہی ہیں۔ ویسے  
 اس وقت مجھ کچھ عجیبہ سی نظر آ رہی ہو۔“ میں نے کہا۔  
 ”ہاں میں عجیبہ ہوں اور میرے خیال میں تمہیں بھی  
 اب عجیبہ ہو جانا چاہیے۔“ اس نے جواب دیا۔  
 ”چھا۔ ایسا کرو۔“ میں نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے  
 کہا ”اس طرف آگئے ہیں تو کار کو سیراگوں روڈ پر موڑ لو۔  
 اس طرف ذرا آگے چاچا خشونت سنگھ کا مکان ہے۔ ذرا ان  
 کے کھرتے ہوتے چلیں۔ چاچی رجنی اور ارملا سے ملاقات۔“

ایک اچھوتی سرگزشت

# چھلاوا

تیسویں صدی کی ایک نہایت پر اسرار خاتون

صحبہ بانو کو آپ بیعتی

✽ دولت مند، آزاد خیال، پر وقار، خوبصورت اور خطرناک مہم باز، جنہیں  
 لوگ جانتے ہیں تمہیں جانتے!

✽ چراغِ ہند اور انہیں ”چھلاوا“ کہتے ہیں!

✽ مہم باز، نہایت عجیب اور خطرناک حالات سے گزرتی رہی ہے۔

انہوں نے جب اپنی زندگی کے کچھ حالات قلم بند کئے تو ان میں پڑھ کر ہزاروں  
 لوگ اس سے لے کر آئیں جانتے کہ جتنی ہو گئے۔ اسی لئے ان کی آپ  
 جتنی اشاعتیں روزانہ میں ایک دیکر رہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں شہناز بیگم نے

سمت: 1120 | قیمت: 200 روپے | 30 روپے

کتاب کی قیمت: 600 روپے | خراج: 200 روپے | 30 روپے

کتابیات پبلیکیشنز

دفتر: 23، پتہ: 23، پتہ: 23

فون: 8022841، 8022552، 8022513

کتابیات 970@yaho.com

”میں تمہاری چاہتی ہوں اور تم مجھے خشونت سنگھ کے گھر لے جا رہے ہو پھر کسی دقت حل لینا ان سے۔“ جاگلی نے کہا۔ تاہم اس نے کار سیرانگون روڈ پر موڑ لی تھی۔

”میں نے برسوں پہلے چاچا خشونت سنگھ کے پاس ایک امانت رکھوائی تھی۔ چاچا تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ چاچی رجنی سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”کیسی امانت؟“ جاگلی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تمہارے خیال میں وہ امانت خشونت سنگھ کے گھر والوں کے پاس اب تک محفوظ ہوگی؟“

”ہوئی چاہیے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے ابو کی ڈائری ہے۔ چاچا خشونت سنگھ اس کی قدرو قیمت سے واقف تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے وہ ڈائری یقیناً چاچی رجنی یا کسی اور ذمے دار شخص کے حوالے کر دی ہوگی۔ وہ ڈائری میرے لیے بہت ضروری ہے۔“

”اوہ! وہ ڈائری جس میں سونے کا راز پوشیدہ ہے اور جس کے لیے دارا نے بھی اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔“ جاگلی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”ویسے میری بات مانو تو اس ڈائری کو وہیں رہنے دو جہاں وہ اس وقت ہے۔ وہ وہیں زیادہ محفوظ ہے۔ دارا کا کاٹنا نکل جائے تو وہ ڈائری لے آئے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ وہ ڈائری نہیں لیتا لیکن ان لوگوں سے مل تو لیا جائے۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت نہیں۔“ جاگلی نے جواب دیا۔ ”پھر کبھی آجانا۔ اس وقت میرا موڈ اچھا اور ہے۔“

”تم واقعی بہت سنجیدہ ہو رہی ہو۔“ میں اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

جاگلی نے جواب نہیں دیا۔ اس وقت سیرانگون روڈ پر ٹریفک زیادہ تھا۔ جاگلی بہت محتاط ہو کر ڈرائیو کر رہی تھی۔ کار بلیوس روڈ کے موڑ پر کالی ماتا کے مندر کے قریب پہنچی تو ایک آدمی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ درواز قامت اس آدمی نے آف وائٹ کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں مگر وہ چہرہ اس چہرے کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ دارا تھا۔

وہ سڑک کے کنارے ایک کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مندر کا ایک بچاری اور ایک خرب صورت عورت بھی کھڑی تھی جس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔

”اے جاگلی۔ روکو۔ گاڑی روکو!“ میں ایک دم چیخ

اٹھا۔

”کھٹک۔ کیا ہوا؟“ جاگلی ایک دم بدحواس سی ہو گئی۔

”دارا۔“ میں نے وہاں دارا کو کھڑے دیکھا ہے۔“

”نہ کہہ اور سڑک پر پیچھے دیکھنے لگا۔ دارا اس بچاری اور عورت کے ساتھ کار میں بیٹھ رہا تھا۔

جاگلی نے کار کی رفتار مزید کم کر دی لیکن ٹریفک کی وجہ سے اسے روکنے کا موقع نہیں مل رہا تھا اور پھر تقریباً سو گز آگے جا کر کار روکنے کی جگہ مل سکی۔

میں کار سے اتر کر پیچھے کی طرف دوڑا۔ اس وقت سڑک کی وہ کار سائڈ اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی اور جب میں اس موڑ پر پہنچا تو وہ کار آگے کسی اور گلی میں سڑک ٹکا ہوا سی اور جھل ہو چکی تھی۔ میں وہیں کھڑا دھڑکھڑا رہ گیا۔ اس دوران میں جاگلی بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

”کیا ہوا۔ کہاں گیا؟“ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھاگ گیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ یہاں سرخ رنگ کی ایک کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مندر کا ایک بچاری اور عورت بھی تھی جس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔“

”تمہیں دھوکا تو نہیں ہوا۔“ جاگلی بولی ”پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور وہ اس طرح آزادی سے تو نہیں گھوم سکتا۔“

”میری نظرس دھوکا نہیں کھا سکتی۔“ میں نے جوار دیا ”اس نے اگرچہ داڑھی مونچھیں رکھ لی ہیں مگر میں اسے دیکھتی ہی پہچان لیا تھا۔ اگر تم اس وقت کار روک لیتے تو اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔“

”دیکھ رہے ہو یہاں ٹریفک کی کیا صورت حال ہے؟“ جاگلی نے کہا۔ ”آگے بھی گاڑیاں تھیں اور پیچھے بھی۔“ مجھے کار روکنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا؟“

”میرا خیال ہے اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن اتنا تو جانتا چلا گیا ہے کہ اس مندر کے کچھ بچاری سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ میں نے اس بچاری کاچہ ذہن نشین کر لیا ہے۔ اب اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“

”اس کے بارے میں کچھ معلوم کیا جائے۔ میرا مطلب ہے اس بچاری کے بارے میں۔“ جاگلی نے کہا۔

”ہم دونوں مندر کی طرف چلے گئے۔ سنگاپور میں ہندوؤں کے کئی مندر ہیں۔ جو مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں

سے منسوب ہیں۔ کالی کے ماننے والے بھی دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی کالی کے ماننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔“ کالی ماتا کا یہ مندر بہت بڑا اور بہت شان دار تھا۔

مندر کے گیٹ سے کچھ دور جاگلی نے اندر سے آنے والے ایک بچاری کو روک لیا۔ وہ کچھ دیر تک اس سے بات کرتی رہی پھر اس بچاری کا حلیہ بتا کر اس کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ میں نے اس عورت کا حلیہ بھی بتایا تھا۔

”یہ تو کالی ماتا کا امتحان ہے۔ یہاں بہت لوگ آتے جاتے ہیں۔ بچاری بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ویسے مجھے یاد رہنا ہے کہ تم جس بچاری کا حلیہ بتا رہے ہو، اس کا نام ملی دھر ہے۔ پہلے وہ شری بیرومل مندر میں ہو کر آتا تھا۔ چند روز سے ہی یہاں آئے لگا ہے۔ ویسے اگر تمہیں اس کی تلاش ہے تو وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟“

”وہ جاگلی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہمیں اسی لیے اس کی تلاش ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔“ جاگلی نے جواب دیا۔ ”ویسے وہ اس مندر کے علاوہ کہاں مل سکتا ہے۔ میرا مطلب اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ۔“

”مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ویسے سنا ہے کہ وہ چھتھاری مندر کے آس پاس کبھی رہتا ہے۔ وہاں سے معلوم کرلو۔

”چھتھاری مندر۔ وہی جو امپریل ہوٹل کے قریب ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں وہی۔“ بچاری نے سر ہلایا۔ ”وہاں سے تمہیں پتا چل جائے گا۔“

چھتھاری مندر تو ہمارے گھر کے راستے ہی میں تھا۔ ہم اس بچاری کا شکریہ ادا کر کے اپنی کار کی طرف آگے جاگلی نے اب اپنا پور گرام بدل دیا تھا۔ اس گز بڑی وجہ سے اس کاموڈ آف ہو گیا تھا۔

ہم کئی سینٹی اینیو کی طرف آگے۔ ریڈ کراس بلڈنگ والے چوراہے سے ایک سڑک تو ہمارے گھر کی طرف چلی جاتی تھی اور دوسری ٹینک روڈ نام کی سڑک ریورولی روڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ میرے کہنے پر جاگلی نے کار اس طرف موڑ لی۔ یہ سڑک اگرچہ زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن یہاں ایک دو ایجنٹ ہوٹل اور ایک شاؤنگ سینٹر بھی تھا جو اگرچہ زیادہ پرانے تھے لیکن شام کے وقت یہاں خاصی رونق رہتی تھی۔ چھتھاری مندر کے علاوہ ایک بہت بڑا چرچ اور یہودیوں کا سب سے بڑا معبد سائنا گگ اسی علاقے میں تھا۔

ٹینک روڈ پر چھتھاری مندر سے ذرا آگے نکل کر جاگلی نے کار روک لی اور ہم دونوں کار سے اتر کر مندر کی طرف آگے۔ یہ بھی بہت بڑا مندر تھا۔ جاگلی نے مندر کے باہری ایک بچاری کو پکڑ لیا اور اس سے مل کر دھر کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”وہ راکھش۔“ بچاری بولا۔ ”تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔ کیا تم بھی انہی عورتوں میں ہو جو بیسہ کمانے کے لیے مل کر دھر جیسے شیطان کے ساتھ مل کر دھرم نشٹ کرتی ہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے پنڈت جی۔“ جاگلی نے کہا۔ ”میری ایک سکیم دو دن سے غائب ہے۔ آخری بار وہ مل کر دھر کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ ہم اسی لیے مل کر دھر کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”اوہ!“ بچاری بولا۔ ”وہ باری تو نہیں جو چند روز پہلے ہندوستان سے آئی تھی۔“

”ہاں ہاں وہی۔“ جاگلی جلدی سے بولی ”ہمیں اس کی تلاش ہے۔“

”مل کر دھر اب یہاں نہیں آتا۔ اب اس نے کالی ماتا کے مندر کو اپنی بد معاشیاں کا اڈا بنا رکھا ہے۔ ویسے وہ ان چٹاؤ ہائی اسکول کے پیچھے مارٹن روڈ پر رہتا ہے۔“ بچاری نے کہا اور مکان کا پتا سمجھانے لگا۔

”ان چٹاؤ ہائی اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں ایک مرتبہ دارا کے آدمیوں سے بچنے کے لیے میں نے پناہ لی تھی۔“

مارٹن روڈ رہائشی علاقہ ہے۔ ایک بنگلہ گلی میں وہ بنگلا تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی جس کی نشان دہی چھتھاری مندر کے بچاری نے کی تھی۔

اس بنگلے میں ہمارا سامنا ایک اوجھڑ عمر ہندو عورت سے ہوا۔ اپنی عمر سے قطع نظر وہ خاصی حسین تھی۔ باتوں کے دوران وہ گہری نظروں سے جاگلی کو گھورتی رہی تھی۔ اس کی باتوں سے تعجب نہ ہو گئی تھی کہ یہ بنگلا مل کر دھر کا تھا لیکن وہ اس وقت کہاں ہو گا۔ وہ عورت کچھ نہیں بتا سکی تھی۔ میں نے دارا کا موجودہ حلیہ بتا کر اس کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا مگر وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس طے سے ملتے جلتے شخص کو اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس بھاگ دوڑ میں باپوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا لیکن بہر حال ڈور کا ایک سراپا تھوڑا سا تھا جس سے ابھی ہوئی تھکی سلجھانے میں مدد مل سکتی تھی۔

ہم جب گھر پہنچے تو نو بجنے والے تھے۔ تھائی خاصی پریشان تھی۔ اس نے ہم دونوں کو اس طرح گھورا جیسے ماں دیر سے گھر آنے والے بچوں کو گھورتی ہے۔

”کہاں تھے تم دونوں؟“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”تھائی۔“ جاگتی ہنس پڑی ”تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے ہم دونوں چھوٹے بچے ہوں۔“

اس سے پہلے کہ تھائی کچھ کہتی، میں بول پڑا۔

”دارا کی جھلک نظر آگئی تھی۔ اس کی تلاش میں بھاگے پھر رہے تھے۔“

”اوہ!“ تھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا ”اس کا مطلب ہے کہ۔“

”مطلب کچھ بھی نہیں تھائی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”نیک کی وجہ سے ہمیں کچھ تاخیر ہوگئی اور اسے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ ویسے میرا خیال ہے اس نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ ہم اسی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے پھر رہے تھے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔

”میں ایک بات کہوں۔“ تھائی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”بہتر ہوگا کہ خود کوئی قدم اٹھانے کے بجائے انسپکٹر چانگ شو کو اس کے بارے میں بتا دو۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہاں کی صورت حال تھائی لینڈ سے بہت مختلف ہے۔ وہاں تمہیں کچھ رعایتیں حاصل نہیں۔ یہاں قانون کی پاسداری ہے۔ کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ انسپکٹر تمہیں وارنٹک بھی دے چکا ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ سب کچھ اسے بتا دو۔ وہ خود ہی ان لوگوں کو تلاش کر لے گا۔“

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے خیال میں تھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے اس کے شورے پر عمل کرتے ہوئے فون کا ریسپور اٹھا کر انسپکٹر چانگ شو کا نمبر ملایا اور اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”گڈ۔“ چانگ شو نے کہا ”میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں۔ وہ سادہ لباس میں ہوگا۔ اسے ساتھ لے جا کر مارٹن روڈ والا وہ بنگلا دکھا دو۔ اس کے بعد تم سب کو اس کے پاس لے جاؤ۔“

”تم ایک بات کہو۔“ تھائی نے کہا ”میں نے اس کی بات کاٹ دی۔“

”تم ایک بات کہو۔“ تھائی نے کہا ”میں نے اس کی بات کاٹ دی۔“

”تم ایک بات کہو۔“ تھائی نے کہا ”میں نے اس کی بات کاٹ دی۔“

معلوم ہوا؟ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کوئی بھی نام اور ایڈریس بتا کر نمبر معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر انہیں دارا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ٹوٹ رہا ہے۔“ تھائی نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔

”ہاں۔“ اس کے ٹکست خوردہ لہجے سے تو کچھ ایسا ہی اظہار ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں ابو کی ڈائری اس کے حوالے کر دوں تو وہ خاموشی سے یہاں سے چلا جائے گا لیکن میں آسانی سے اسے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ ایک تو مجھے دارا سے اپنا حساب کتاب کرنا ہے اور اس کے بعد چودری نوازش علی سے بھی اپنے باپ کی بربادی کا حساب پکڑنا ہے۔“

”یہ چودری نوازش علی کون ہے؟“ جاگتی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا ”یہ نام تو میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔“

”چودری نوازش علی بی دراصل سارے فساد کی جڑ ہے۔“ میں نے کہا ”میرے باپ کا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے تھا۔ پاکستان میں ان کی زمین انڈیا کی سرحد سے ملی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چودری نوازش علی کے باپ کی بھی زمین تھی۔ وہ اسمگلر تھا اور ہمارے خاندان کی زمین بھی خریدنا چاہتا تھا تاکہ آزادی سے انڈیا کی سرحد سے اپنی غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھ سکے مگر میرے دادا نے وہ زمین بیچنے سے انکار کر دیا۔ نوازش علی کے باپ نے جمل سازی سے وہ زمین بھرتیائی کی کوشش کی۔ عدالت میں سالانہ مقدمہ چل رہا۔“

”چودری نوازش علی اوتھے بھکندڑوں پر اتر آیا۔ اس نے دارا جیسے غنڈے پال رکھے تھے۔ وہ طاقت کے زور پر زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرے ماں باپ کو زندہ جلانے کی کوشش بھی کی۔ میں اس وقت صرف دو مہینے کا تھا۔ میرے ماں باپ مجھے لے کر سنگ پور آگئے۔ یہاں انہوں نے محنت کی۔ دکان بنائی اور یہ مکان خرید لیا۔“



اور می کو قتل کر دیا اور اس طرح ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔

”اور سونے کا کیا پکڑے؟“ جاگتی نے پوچھا۔

”جب میرے ڈیڑی لاہور میں تھے اور اپنی زمینوں پر تھے تو ایک رات چوہدری نواز شعلی کے آدمی بڑی مقدار میں سونا سرحد پار لے جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ڈیڑی نے انہیں لٹکارا۔ وہ یہی سمجھ کر پولیس یا ریجنل آفیسر گھیر لیا ہے۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ڈیڑی نے گاڑی کی تلاشی لی اور سونے سے بھرے ہوئے دو بیگ اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی انسپکٹروں کو احساس ہو گیا کہ وہ دھوکا کھا گئے ہیں۔ وہ پہلے تو ڈیڑی کو وہاں سے بھانکنا پڑا۔

”وہ ابو کو پورے شہر میں شکاری کتوں کی طرح تلاش کرتے رہے۔ یہی دارا پیش پیش تھا۔ ایک موقع پر اس نے مجھے اور امی ابو کو زندہ جلانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس واقعے کے بعد ہی ابو ہمیں لے کر سنگا پور آگئے تھے۔

”اس ڈائری میں نہ صرف سونے کا راز پوشیدہ ہے بلکہ چوہدری نواز شعلی، دارا اور اس کے ساتھیوں کے جرائم کی پوری داستان بھی رقم ہے۔ یہ ڈائری اگر پاکستان میں پولیس کے حوالے کر دی جائے تو ان سب کو موت کی سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

”ہوں۔“ میرے خاموش ہونے پر جاگتی نے ہنکارا بھرا ”تو اسی لیے وہ اس ڈائری کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”ہاں لیکن وہ قیامت تک یہ ڈائری حاصل نہیں کر سکے گا۔“ میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”ہم نے مارٹن روڈ والے بنگلے پر اس عورت سے بات کر کے واقعی غلطی کی۔ ہمارے آنے کے بعد اس نے دارا کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اب وہ محتاط ہو جائے گا۔ پولیس نے اگرچہ اس بنگلے کی نگرانی شروع کر دی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہاں اب کچھ نہیں ملے گا۔“

”پھر تو اس کی گھرائی بھی بیکار ہے۔“ تھائی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”ہاں۔“ میں انسپکٹر جیاگ شو کو بتا دوں۔ گھرائی جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ وہ خود ہی کرے گا۔“ میں نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور نمبر ملانے لگا۔

لائسنس میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن پولیس ہیڈ کوارٹر سے بتایا گیا کہ وہ آدھا گھنٹا پہلے گھر چکا ہے۔ میں نے کریٹل

نیپ کر کے گھر کا نمبر ملایا۔ کال تیسری تھنٹی پر ریسیو کی گئی تھی اور کال ریسیو کرنے والا جیاگ شوی تھا۔

”خیریت۔“ وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔

”کچھ دیر پہلے دارا کا فون آیا تھا انکل۔“ میں نے کہا اور پھر اسے اس گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”وہ ڈائری کہاں ہے؟“ جیاگ شوی نے پوچھا۔

”مجھے معلوم نہیں انکل۔“ میں نے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڑی کے انتقال کے بعد وہ ڈائری میں نے چاچا پر تاب سنگھ کو دے دی تھی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ چاچا پر تاب سنگھ وہ ڈائری اپنے ساتھ تھائی لینڈ لے کر گیا تھا یا یہاں کسی کو دے گیا تھا۔“

”تھائی لینڈ میں تو تم بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کے قتل کے بعد ڈائری اس کے سامان سے ملی تھی یا نہیں؟“ جیاگ شوی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے جواب دیا ”اس وقت میری اپنی حالت بہت خراب تھی۔ مجھے مہاراج کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ چاچا پر تاب سنگھ کا سامان ہوٹل میں تھا جو بعد میں پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ ڈائری اس سامان میں مگنی تھی۔“

”میری معلومات کے مطابق سنگا پور چھوڑنے سے پہلے وہ تمہیں اپنے دوست خشونت سنگھ کے پاس لے گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ڈائری اس کے حوالے کر گیا ہو۔“ جیاگ شوی نے کہا۔

”لیکن ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ ڈائری کو اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گیا ہوگا۔“ جیاگ شوی نے جواب دیا ”اس کے گھر والوں سے معلوم کرو۔ خشونت سنگھ نے مرنے سے پہلے اپنی بیوی یا بیٹی کو اس ڈائری کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا۔ تم صبح سب سے پہلے ان کے گھر جا کر معلوم کرو۔ اگر اس ڈائری میں ان لوگوں کے بارے میں تمہارے فادر نے کچھ لکھا ہے تو وہ انہیں پھاسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ میں صبح ہی جا کر معلوم کروں گا۔“ میں نے کہا۔ میں نے ڈائری کا تذکرہ اس انداز میں کیا تھا کہ اس میں دارا وغیرہ کے خلاف کچھ ثبوت ہیں۔ میرا خیال تھا کہ جیاگ شوی ڈائری کو اتنی اہمیت نہیں دے گا لیکن وہ بال کی کھال نکالنا چلا گیا تھا ”مارٹن روڈ والے بنگلے کی گھرائی کے بارے میں اب آپ کا کیا خیال ہے انکل۔“

”وہ ہمارا درو سر ہے۔“ جیاگ شوی نے جواب دیا ”اب

تم اس بات کو بھول جاؤ۔ مجھے بہر حال تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ یہ تمہارے توسط سے ایک کلیو تولا۔ اب آگے کا راستہ ہم خود تلاش کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ میں نے کہا اور ایک دور سی جملوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

جاگتی اور تھائی سے باتیں کرتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ بات اگرچہ کئی سال پرانی ہو چکی تھی لیکن انسپکٹر جیاگ شو کو یاد تھا کہ سنگا پور چھوڑنے سے پہلے چاچا پر تاب سنگھ مجھے خشونت سنگھ کے گھر لے گیا تھا اور یہ بات تو دارا کو بھی نہیں بھولی چاہیے تھی کیونکہ دارا نے تو اپنے غنڈوں کے ذریعے میرے اوپر وہاں بھی حملہ کر دیا تھا اور اسے بڑی زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون پر بات کرتے ہوئے دارا نے کہا تھا کہ وہ وہیں دن میں ڈائری تک پہنچ جائے گا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کے ذہن میں بھی تو وہی بات نہیں تھی جس کا اظہار انسپکٹر جیاگ شوی نے کیا تھا۔

”صبح کا انتظار کیوں کیا جائے ہم ابھی جا کر معلوم کر لیتے ہیں۔“

”ابھی۔“ میں نے کہتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ عام طور پر لوگ بارہ بجے سے پہلے نہیں سوئے۔ خشونت سنگھ کے گھر والے بھی ابھی جاگ ہی رہے ہوں گے ”ٹھیک ہے چلو۔“ میں کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

اور پھر دس منٹ بعد ہم گھر سے باہر آچکے تھے۔ تھائی نے تالا لگا کر چابیوں کا گچھا اپنے پرس میں ڈال لیا۔ کار کی چابی جاگتی کے پاس تھی۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ان چند فٹوں کے دوران میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ گھر تھائی نے سنبھال لیا تھا اور ڈرائیور کی ڈیوٹی جاگتی نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ صبح مارکیٹ سے سودا وغیرہ بھی دی لاتی تھی۔

کار گلیوں سے نکل کر پہلے فورٹ کیننگ روڈ اور پھر دھولی گھاٹ کے قریب سے آچرڈ روڈ پارک کے سلیبی روڈ پر آگئی۔ اس وقت اگرچہ ٹریفک زیادہ نہیں تھا لیکن جاگتی نے کار کی رفتار کو کنٹرول ہی میں رکھا تھا۔ یہ سڑک سیدھی وچر کینال روڈ اور بکٹ تیار روڈ کے عظیم پر سڑک پل پارک کے سیرنگون روڈ سے جالمتی تھی۔ یہ لٹل انڈیا علاقہ تھا اور اس وقت اسے شہر کا سب سے زیادہ باوقوف علاقہ کہا جاسکتا تھا۔ یہاں ریسیورنٹ، شراب خانے اور کھانے پینے کی دکانیں رات گئے تک کھلی رہتی تھیں۔

سیرنگون روڈ پر کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے جاگتی کو کار بائیں طرف کھینچا روڈ پر موڑ لینے کا اشارہ کیا۔ اس طرف کچھ آگے سکھوں کا بہت بڑا گردوارہ تھا اور اس کے آس پاس کی زیادہ آبادی بھی سکھوں پر ہی مشتمل تھی۔ اس سے آگے سیرنگون روڈ پر ہی کالی کا مندر تھا۔ جہاں صبح میں نے دارا کو دیکھا تھا۔ اس مندر کے آس پاس ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی بلکہ سید علوی روڈ اور مسٹر عبدالغفور روڈ کے آس پاس کا علاقہ مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل تھا۔

گردوارے سے آگے نکل کر میں نے کار تیسری گلی میں مڑوا کر ایک جگہ رکوا لی اور نیچے اتر کر اوپر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس گلی میں بھی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ گلی کے دونوں طرف کئی نئے مکان نظر آ رہے تھے۔ میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوا چلتا رہا لیکن خشونت سنگھ والا مکان میں بھول گیا تھا۔

میں ایک جگہ رک گیا۔ جاگتی میرے قریب رک گئی تھی۔ اسی دوران میں سامنے سے دو سائیکل سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ مجھ سے ذرا آگے ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ وہ دونوں یوڈشین تھے۔ میں نے آدمی سے خشونت سنگھ کے مکان کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولا۔

”مسٹر خشونت سنگھ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا مکان وہاں موجود ہے۔ وہ پہلے گیٹ والا۔“ اس نے سامنے والی لین کے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس مکان کے سامنے آ گیا۔ جاگتی بھی گاڑی قریب لے آئی۔ مکان کے اندر جی بل رہی تھی۔ میں نے بلا بھگ کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ چند منٹ بعد ہی ایک آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دھوئی اور بنیان پینے ہوئے تھا۔ سر پر کپڑی نہیں تھی البتہ بالوں کا جوڑا بنا ہوا تھا۔ واٹھی گول اور چھوٹی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا پھر چاچی رجنی کے بارے میں پوچھا۔

”آؤ جی۔ جی آیا نوں۔ اندر آ جاؤ جی۔“ اس نے گیٹ کا ذیلی دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

میں نے کار میں بیٹھی ہوئی جاگتی اور تھائی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ شخص اندر بھاگ گیا اور چاچی چاچی پکارتا ہوا برآمدے والے دروازے میں غائب ہو گیا۔

ہم تینوں اندر آ گئے۔ میں نے گیٹ کا ذیلی دروازہ بند

کر دیا اور پھر ایک منٹ بعد ہی چاچی رجنی برآمدے والے دروازے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم تینوں کو باری باری گلے لگا کر پیار کیا اور اندر لے گئیں۔ برآمدے والے دروازے کے ساتھ ہی اندر کی طرف ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر بتایا جلا دیں اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اگلا اور وہ آدمی بھی آیا جس نے گیٹ کھولا تھا۔ اب اس نے کمرے پر کھڑا ہوا اور اگلا کا شوہر منت نکلتے ہوئے وہ سب ہمارے آنے سے بہت خوش تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اگلا ہمارے لیے ٹھنڈا مشروب لے آئی۔

”خیر تو ہے ناچڑ۔ اس وقت ادنیٰ رات کو ہے“ چاچی رجنی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”ایک بہت ضروری کام آج ہوا تھا چاچی جس کے لیے آپ لوگوں کو اس وقت زحمت دی۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو تمہارا اپنا گھر ہے پڑ۔ تکلیف کیسی؟ ہم تو جاگ رہے تھے۔ ویسے پریشانی تو ہو جاتی ہے نا۔ مجھے تسلی ہو گئی کہ تم خیر حال آئے ہو۔ اب بتاؤ کیا کام ہے۔“ چاچی رجنی نے کہا۔

”آپ کو یاد ہو گا کہ جب میں چاچا پر تاب نگاہ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس وقت دارا کے غنڈوں نے حملہ کر دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”میں اس روڈ گھٹنا کو کیسے بھول سکتی ہوں پڑ۔“ چاچی نے کہا۔ ”تم یہاں سے جا کر بھائی پر تاب نگاہ کے ساتھ غائب ہو گئے تھے تو ہم سب گھر والے کئی روز تک پریشان رہے تھے۔ ہم تو بہل چلے تمہاری زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔“

”آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی میں آج زندہ اور سلامت ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس رات ہم نے چاچا خوشونت نگاہ کو ایک بریف کیس دیا تھا جس میں میرے کچھ ضروری کاغذات تھے۔“

”کئی ورش گزر گئے ہیں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔“ چاچی نے جواب دیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رہ گئیں۔ اگر انہوں نے بریف کیس یا اس میں رکھی ہوئی ڈائری اور کاغذات بیکار سمجھ کر پھینک دیے ہوں گے تو۔

میں اس سے آگے نہیں سوچتا چاہتا تھا۔

”مجھے یاد ہے نا۔“ اگلا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی ”باپو نے وہ بریف کیس آپ کو دیا تھا

اور آپ نے مجھے دے دیا تھا۔“

”کہاں ہے وہ بریف کیس؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ بریف کیس تو ٹوٹ گیا تھا۔“ اگلا نے جواب دیا۔

”اور اس میں رکھی ہوئی ڈائری اور کاغذات کا کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ محفوظ ہیں۔“ اگلا نے جواب دیا۔

میری جان میں جان آئی۔ ”کہاں ہے وہ ڈائری۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ کاغذات اور ڈائری میں نے ایک تھیلے میں لپیٹ کر بڑی جپٹی میں سامان کے نیچے رکھ دی تھی اور وہ جپٹی تو ان کے فلیٹ میں رکھی ہوئی ہے۔“ اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔

”فلٹ قریب ہے یا دور۔ میرا مطلب ہے اس وقت۔“

”اس وقت تو نہیں دیر چلی۔“ اگلا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”فلٹ تو قریب ہی ہے۔ شیلو روڈ پر گھروں کی بجلی کٹی ہوئی ہے۔ آپ صبح آ جانا دیر چلی۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم کل دن میں کسی وقت آ جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”ایک بات اور۔“ میں نے منت نگاہ کی طرف دیکھتے ہوئے با۔ جباری رکھی ”میرے دشمن اب بھی میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ڈیڑی کی وہ ڈائری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں ان کے سیاہ کتوتوں کی تفصیل درج ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ بھی کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس لیے تم لوگ ذرا محتاط رہنا۔“

”فکر ہی نہ کرو بھائی جی۔“ منت نگاہ نے کہا ”آپ کی چیزیں ہمارے پاس امانت ہیں۔ وہ کسی اور کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔“

میں نے اسے اپنا اور انکسپر چانگ شو کا فون نمبر بھی دے دیا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو دونوں میں سے کسی نمبر پر فوری طور پر اطلاع دے دی جائے۔

واپس پر ہم سیراگون روڈ سے بکٹ روڈ کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے سینٹرل ایکسپریس وے کا راستہ اختیار کیا اور وہاں سے آرچرڈ روڈ کراس کرتے ہوئے کئی مینیسی ایوینو کی طرف نکل آئے۔

کار جب اپنے مکان والی گلی کی طرف مڑی تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس علاقے میں مکمل ساٹھا تھا۔ گلی کے آگے والے موڑ پر ایک کار کھڑی تھی جس کی ساری بتیاں بھی

ہوئی تھیں۔ میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہاں ایسے مکان بہت کم تھے جن میں گیٹ کے اندر گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی۔ لوگ عام طور پر اپنی گاڑیاں گلی میں یا ادھر ادھر ہی کھڑی کر دیتے تھے اور میرے خیال میں وہ کار بھی کسی نے اسی طرح کھڑی کر دی تھی۔

کچھ دیر والا دروازہ کھول کر ہم برآمدے میں پہنچے تو میں ٹھک گیا۔ ہم گھر کی تمام بتیاں بند کر کے گئے تھے لیکن اس وقت اندر دمدمی روشتی نظر آرہی تھی اور وہ روشنی متحرک تھی۔ چاچی اور تھانی نے بھی وہ روشنی دیکھ لی۔

”اے۔ کون ہے۔ اندر کون ہے؟“ چاچی نے چیخ کر پوچھا۔

روشتی بچھ گئی اور پھر یوں لگا جیسے کوئی تیزی سے ایک طرف دوڑا ہو۔ کوئی کرسی وغیرہ اٹکنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے تھانی سے چالی لے کر نکلا کھولا اور دروازے کو زور وار دھکا دیا۔

دروازہ دھڑکی آواز سے کھل گیا۔ پچھلی راہداری کی طرف آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں چپتا ہوا تیزی سے اس طرف دوڑا مگر راہداری میں کسی چیز سے ٹکرا کر گر گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی میں دیوار سے ٹکرا گیا اور پھر ٹھیک اسی وقت پچھلی طرف ایک فائز کی آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

میں سمجھ کر پھر اس طرف دوڑا۔ عقبی دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں تیزی سے اس طرف لپکا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے تک پہنچتا ایک اور گولی چلی۔ اس مرتبہ فائز کی یہ آواز مکان کے باہر سے آئی تھی۔ میں ایک بار پھر اس طرف دوڑا۔

مکان کے پچھلی طرف بھی ایک مختصر سالان تھا۔ میں جب دروازے سے نکل کر اس طرف پہنچا تو پچھلی گلی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں لان سے نکل کر کھلی جگہ پر گیا۔ اسی وقت ایک سایہ اٹکی گلی میں دائیں طرف مڑتا ہوا نظر آیا۔ میں بھی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا اور جب میں گلی کے موڑ پر پہنچا تو وہ سایہ اس کار تک پہنچ چکا تھا جو میں نے اپنے مکان کے سامنے والے رخ پر گلی کے اگلے موڑ پر کھڑی دیکھی تھی۔

کار اشارت ہو کر حرکت میں آ چکی تھی۔ دوڑتا ہوا وہ سایہ بھی کار میں گھس چکا تھا اور پھر میں نے کار کی طرف سے ایک شعلہ سالپک ہوا دیکھا۔ میں بڑی تیزی سے نیچے گر گیا۔ شعلہ چمکنے کی فائز کی آواز بھی فضا میں گونجی تھی۔

جب میں سنبھلا تو وہ کار بہت دور جا چکی تھی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا اس کی عقبی سرخ بتیوں کو دیکھتا رہا اور پھر وہ سرخ بتیاں بھی غائب ہو گئیں۔

میں مڑ کر دوڑتا ہوا عقبی گلی ہی سے مکان میں واپس آیا تھا۔ ساری بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ مکان میں داخل ہوتے ہی میرا سامنا سب سے پہلے تھانی سے ہوا۔ اس کی آنکھوں۔۔۔ اور چہرے پر دشت تھی۔ میں دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ گھر کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کچی اور ڈیڑی والے بینڈ روم کی حالت سب سے زیادہ ابتر تھی۔ الماریوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ تمام کپڑے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ بینڈ کامیٹریس غالباً چاقو سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ڈرائنگ ٹیبل کی دراڑیں بھی کھلی ہوئی تھیں اس میں کئی چیزیں بھی اُدھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔

دوسرے کمروں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بڑی تفصیل سے تلاشی لی گئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا کا کوئی آدمی مکان کی گمرانی کر رہا ہو گا اور ہمارے جانے کے بعد اس نے فون پر دارا کو اطلاع دی ہوگی اور اس کا کوئی اور آدمی بھی یہاں پہنچ گیا ہوگا۔ ممکن ہے دارا خود بھی یہاں آیا ہو لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ اسے ڈائری کی تلاشی تھی اور ڈائری تو ابھی تک میرے قبضے میں بھی نہیں آئی تھی۔ اسے کہاں سے ملتی۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارے مکان کی گمرانی ہو رہی تھی۔“ چاچی نے کہا ”اور موقع ملنے ہی انہوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔“

”اور انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا۔“ میں نے جواب دیا۔

”سب سے پہلے تو تم پولیس کو اطلاع دو۔ اس کے بعد یہ سامان درست کیا جائے گا۔“ تھانی نے کہا۔

”پولیس کے آنے کا فائدہ تو کوئی نہیں ہو گا لیکن ایک فارمیسی پوری ہو جائے گی۔“ میں نے جواب دیا اور بولنگ روم میں آکر پولیس کو فون پر اطلاع دینے لگا۔

اسی دوران میں کال بتل کی آواز سنائی دی۔ وہ چاچا جگ جیت نکلتے تھا جو کال بتل کا فون دبانے کے ساتھ میرا نام لے کر آوازیں بھی دے رہا تھا۔

میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ چاچا جگ جیت نکلتے کے علاوہ اس گلی میں رہنے والے چار اور آدمی بھی موجود تھے۔

”خیر تو ہے پڑ۔ یہ گولیوں کی آواز کیسی تھی؟“ جگ جیت

تکھ نے پوچھا۔  
 "ہماری عدم موجودگی میں چور گھس آئے تھے چاہا۔"  
 میں نے جواب دیا "ہم واپس آئے تو ہماری آواز سن کر کھانک  
 گئے۔"  
 "کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" ایک اور آدمی نے پوچھا۔  
 "سارا سامان ٹھہرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے وہ چور کچھ  
 لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ خالی ہاتھ ہی گیا ہے۔"  
 میں نے جواب دیا۔

ہم ابھی باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ پولیس  
 سائرن کی آواز سنانی دینے لگی۔ اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی  
 پولیس کار گلی میں داخل ہوئی اور ہمارے قریب پہنچ کر رک  
 گئی۔

اس پولیس پارٹی کا انچارج سب انسپکٹر وجے ملو ترہ  
 ہندوستانی تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی تھی اور انداز گفتگو  
 میں بھی بڑی نفرت تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا  
 جیسے ملزم میں ہی ہوں۔ میں اسے اندر لے آیا اور کمروں میں  
 ٹھہرا ہوا سامان دکھانے لگا۔

"تم لوگ کہاں تھے؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے  
 پوچھا اور پھر تھائی اور جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔  
 "اپنے ایک جانے والے کے ہاں گئے ہوئے تھے۔"  
 میں نے جواب دیا۔

"کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی؟" دوسرا سوال تھا۔  
 "میرا خیال ہے نہیں۔"  
 سب انسپکٹر وجے ملو ترہ گھوم پھر کر جائزہ لیتا رہا پھر  
 میرے چہرے پر نظرسنجمتے ہوئے بولا۔

"مسٹر وجدان۔ چند سال پہلے یہاں جو درگھٹنا ہوئی تھی  
 مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں اس زمانے میں دوسرے  
 ڈسٹرکٹ میں تھا اور یہاں کا چارج انسپکٹر چینگ شو کے پاس  
 تھا۔ اس نے جہیں ہیرو بنانے کی پوری کوشش کی تھی اور  
 اب بھی وہ تم پر اپنا سایہ کیے ہوئے ہے لیکن میں ایک بات  
 تمہیں ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں کہ اس علاقے میں امن و  
 امان قائم رکھنے کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں یہاں کسی قسم کی  
 بد امنی پسند نہیں کروں گا لہذا اس قسم کے ڈرامے اب ختم  
 ہو جانے چاہئیں۔"

"آئیفر۔" میرے قریب کھڑی ہوئی جاگتی نے اسے  
 گھورتے ہوئے کہا "تم سمجھتے ہو کہ یہ سب کچھ ہم نے خود کیا  
 ہے اود۔"  
 "ایک منٹ!" میں نے جاگتی کو مزید کچھ کہنے سے روک

دیا اور سب انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا "میں نے پولیس کو  
 ایک واردات کی اطلاع دی تھی۔ تم یہاں آگئے ہو تو یہ  
 تمہاری بڑی مہمائی ہے۔ جو کارروائی کرنا چاہتے ہو کہو اور  
 چلے جاؤ اور اس زخم میں مت رہنا کہ تم پولیس آفیسر ہو۔"  
 "مجھے دھمکی دے رہے ہو۔" ملو ترہ نے میری بات  
 کاٹ دی۔ اس کا لہجہ کاٹ کھانے والا تھا۔  
 "نہیں۔ تمہیں تمہارا فرض یاد دلانا چاہیے۔" میں نے  
 سکون سے جواب دیا۔

اس وقت چاچا جگ جیت تکھ نے بھی کچھ کہنا چاہا تھا؛  
 میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر خاموش کر دیا۔  
 سب انسپکٹر ملو ترہ تقریباً آدھے گھنٹے تک مختلف کمروں  
 کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے اسے پچھلا دروازہ بھی کھول کر دکھایا  
 اور پھر پچھلی گلی سے ہوتا ہوا اپنی گلی کے اس سوڑ پر ابھر  
 جہاں میں نے وہ کار کھڑی دیکھی تھی۔

"تم نے کار کا نمبر نوٹ کیا ہوگا۔" ملو ترہ نے جہیز  
 ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
 "نہیں۔" میں نے جواب دیا "کار اس رخ پر کھڑی تھی  
 کہ گلی سے اس کی نمبر پلٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔  
 ویسے بھی فاصلہ زیادہ ہونے کے علاوہ یہاں اندھیرا بھی ہے  
 اور مجھے یہ شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ کار یہاں کیوں کھڑی  
 ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سب انسپکٹر ملو ترہ نے کہا "ہم دیکھیں  
 گے کہ پولیس اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے اور ہاں۔ انسپکٹر  
 چینگ شو کے پاس فریاد لے کر جانے کی ضرورت نہیں۔ مگر  
 اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے آئیفر۔" میں نے جواب دیا۔ میں بڑی  
 مشکل سے ضبط کر رہا تھا "میں کسی کے پاس فریاد لے کر نہیں  
 جاؤں گا۔ ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے میرا جو فرض  
 تھا وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ ویسے اس قسم کے معاملات سے  
 نمٹنا میں بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی  
 بات ہوئی تو میں پولیس کو زحمت نہیں دوں گا۔"

"اگر تم نے کسی موقع پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی  
 کوشش کی تو جہیز آگے۔ میرا شمار ان پولیس آفیسرز میں  
 ہوتا ہے جو رشوت، سفارش اور لحاظ سے کوسوں دور ہوتے  
 ہیں۔"

"میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا آئیفر۔" مگر  
 نے کہا "تم نے یہاں تک آنے کی جو زحمت کی ہے اس کے  
 لیے بہت شکر ہے۔"

میں نے ملو ترہ سے ہاتھ ملانے کی ضرورت بھی نہیں  
 سمجھی۔ چند لوگ اس وقت بھی گلی میں کھڑے تھے۔ میں ان  
 سب کو نظر انداز کرتا ہوا اندر آیا۔ چاچا جگ جیت تکھ بھی  
 میرے ساتھ ہی آیا تھا اور پھر ہم نے مل کر سامان سیٹ کرنا  
 شروع کر دیا۔  
 چار بج گئے۔ چاچا جگ جیت تکھ اس دوران میں  
 مسلسل سب انسپکٹر ملو ترہ کو برا بھلا کہتا رہا۔  
 "یہ سالا ہے ہی ایسا۔ بد دماغ اور بد تیز۔" وہ کہہ رہا  
 تھا۔ "سالا کہتا ہے میں سفارش اور رشوت نہیں مانتا۔  
 حقیقت یہ ہے کہ رشوت کے بغیر یہ کوئی کام ہی نہیں کرتا۔  
 ایک سال پہلے تک یہ انسپکٹر تھا۔ اپنی بددعائی اور بد تیزیوں  
 کی وجہ سے انسپکٹر کے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھا اور لگتا ہے  
 کہ اب یہ اپنی نوکری سے بھی ہوجائے گا۔"

"آئیے لوگوں کے ساتھ تو یہی کچھ ہوتا ہے چاچا۔" میں  
 نے گہرا سانس لینے ہوئے جواب دیا۔  
 چاچا جگ جیت تکھ کے جانے کے بعد میں نے دروازہ  
 بند کر دیا۔ جاگتی اور تھائی اپنے کمرے میں ٹھس ٹھکیں اور میں  
 اپنے کمرے میں آکر بستر لیٹ گیا اور دیر تک سب انسپکٹر  
 ملو ترہ کے رویے کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ایک پولیس  
 آفیسر تھا۔ میں نے ایک واردات کی اطلاع دی تھی۔ شکایت  
 منٹا اور تحقیق و تفتیش کرنا اس کا فرض تھا لیکن اس کا طرز  
 عمل ایسا تھا جیسے اس واردات کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ اس  
 کے علاوہ وہ بلا وجہ انسپکٹر چینگ شو کا ذکر لے بیٹھا تھا۔ اس  
 سے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ دوسرے آفیسروں سے جلتا تھا  
 اور چینگ شو سے تو وہ کچھ زیادہ ہی الگ تھا۔ اس کے  
 علاوہ اس نے مجھے بہت واضح الفاظ میں یہ دھمکی بھی دی تھی  
 کہ میں قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کروں۔

میں دیر تک ملو ترہ کے اس رویے کے بارے میں سوچتا  
 رہا اور پھر فیصلہ کرنا تو اس میں پہنچ گیا۔  
 ○☆☆○

ڈائری میں نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔  
 اگرچہ میں نے اس ڈائری کو گھر ہی چھپایا تھا لیکن اس  
 کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے اسے  
 تلاش کرنا ممکن نہیں تھا اور اس روز سے صورت حال میں  
 بھی کچھ تبدیلی رونما ہو کر شروع ہو گئی تھی۔

میں نے اگرچہ انسپکٹر چینگ شو کو گزشتہ رات کے  
 واقعے کے بارے میں کچھ نہیں کیا تھا لیکن اگلے روز دوسرے  
 وہ گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے پولیس ہی کے کسی آدمی سے پتا چل

گیا تھا کہ سب انسپکٹر ملو ترہ نے میرے ساتھ بد تیزی کی  
 تھی۔  
 "ملو ترہ کے بارے میں ہیڈ کوارٹر میں اور بھی بہت سی  
 رپورٹس جمع ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چند روز میں اس  
 کے خلاف کوئی کارروائی ہونے والی ہے۔" چینگ شو نے  
 کہا۔  
 "اس کی گزشتہ رات والی حرکت پر مجھے کچھ اور شبہ  
 ہونے لگا ہے۔" میں نے کہا۔  
 "مثلاً؟ کس قسم کا شبہ؟" چینگ شو نے ابھی ہوئی  
 نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"گزشتہ رات جب میں نے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا تو  
 اس کے پانچ منٹ بعد ہی ملو ترہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ جس کا  
 مطلب تھا کہ وہ اس علاقے میں موجود تھا اور پولیس اسٹیشن  
 سے ریڈیو پر اطلاع ملنے ہی یہاں آیا تھا۔"  
 "یہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔" چینگ شو نے کہا "ممکن  
 ہے وہ گفت پر اس علاقے میں موجود ہو اور اطلاع ملنے ہی  
 پہنچ گیا ہو۔"

"لیکن اس نے جس طرح کی گفتگو کی تھی اس سے شبہ  
 ہوتا ہے کہ۔"  
 "او کم آن ہوائے۔" چینگ شو نے میری بات کاٹ دی  
 "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملو ترہ ان لوگوں سے ملا ہوا ہے جنہوں  
 نے ہمارے مکان کی تلاشی لی تھی اور ان لوگوں کو تحفظ  
 فراہم کرنے کے لیے آس پاس موجود تھا۔"

"ہاں۔" مجھے کچھ ایسا ہی شبہ ہے۔ "میں نے جواب دیا۔  
 "ہو سکتا ہے۔" چینگ شو سر ہلاتے ہوئے بولا "ممکن  
 ہے تمہارا شبہ درست ہو۔ میں اس سلسلے میں اپنے طور پر  
 معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال تم لوگوں  
 کو اب محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی بات ہو تو اسے  
 چھپانے کی کوشش مت کرو۔ مجھے اطلاع دے دیتا۔"

انسپکٹر چینگ شو چلا گیا۔  
 ایک دو روز اور گزر گئے اور پھر مجھے یہ شبہ ہونے لگا کہ  
 میری گھرائی کی جارہی ہے۔ گھرائی کرنے والا کوئی شخص  
 اگرچہ نظروں میں نہیں آ سکا تھا مگر یہ احساس قوی تر ہوتا  
 جا رہا تھا کہ میں جہاں بھی ہوجاتا ہوں کسی کی نظروں میں رہتا  
 ہوں۔ جاگتی نے بھی ایسے ہی شبہ کا اظہار کیا تھا۔ وہ سودا  
 سلف لینے کے لیے روزانہ صبح مارکیٹ جاتی تھی۔ اسے بھی  
 یوں لگتا تھا جیسے اس کی گھرائی کی جارہی ہو مگر کوئی مشتبہ شخص  
 اس کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

دو تین روز اور گزر گئے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ اور چاچی رجی کے ہاں بھی گیا تھا۔ اس سے اگلے روز رات گیارہ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو ریڈیو میں نے ہی اٹھایا تھا۔ اس وقت جگ بیت سنگھ اور اس کے گھر والے بھی ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ کال ار ملا کی بھی اور اس نے جو اطلاع دی تھی وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس کا شوہر سنت سنگھ زخمی حالت میں کان ڈانگ اسپتال میں پڑا تھا۔

میں فون بند کر کے فوراً ہی اسپتال جانے کو تیار ہو گیا۔ جگ بیت سنگھ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ یوں تو جاگلی وغیرہ بھی جانے کو تیار تھیں مگر میں نے انہیں روک دیا اور انہیں ہدایت کر دی کہ یا تو وہ امیتا کو اور زنجن کے ساتھ ان کے گھر چلی جائیں یا ہماری واپسی تک انہیں اپنے پاس بٹھائیں رکھیں۔

کار کا اسٹینڈنگ جگ بیت سنگھ نے سنبھال لیا۔ کان ڈانگ اسپتال میں سیرنگون روڈ کے آس پاس ہی تھا۔ جگ بیت سنگھ راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر ہم سیرنگون روڈ کی طرف سے جاتے تو لمبا راستہ پڑتا۔ تیاروڈ پر سہر کاہل پار کرتے ہی اس نے کار فوڈ سینٹر مارکیٹ کے قریب سے کبٹ روڈ پر موڑ لی اور پھر ایک ذیلی سڑک سے ہوتے ہوئے ہم اسپتال کے سامنے پہنچ گئے۔

سنت سنگھ ایمرجنسی روم میں تھا۔ ار ملا اور چاچی رجی سے ہماری ملاقات ویننگ روم ہی میں ہو گئی۔ وہ دونوں رو رہی تھیں۔

”کیا ہوا چاچی۔“ میں نے قریب پہنچ کر کہا ”سنت سنگھ کیسے زخمی ہوا۔ کوئی حادثہ؟“

”حادثہ نہیں پترا سے مارا پٹا گیا ہے۔“ چاچی رجی نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مارا پٹا ہے۔“ میں چونک گیا ”کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ کون تھے وہ لوگ؟“

”سنت سنگھ کا کبھی کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔“ رجی نے بتایا۔ ”شام سات بجے کے قریب دو آدمی اسے ہلا کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔ ہم نے اس کے دوستوں سے معلوم کیا لیکن کسی کو اس کا پتا نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے میں اور ملادروان سے میں گھڑی تھیں کہ لال رنگ کی ایک کار ہمارے قریب آکر رکی۔ دروازہ کھول کر دو آدمیوں نے سنت سنگھ کو باہر پھینک دیا اور کار تیزی سے

آگے چلی گئی۔

”سنت سنگھ خون میں لت پت اور بے ہوش تھا۔ اسے دیکھ کر ہماری چیخیں نکل گئیں۔ ہمارے رونے پینے کی آواز سن کر گلی کے لوگ جمع ہو گئے اور سنت سنگھ کو گاڑی میں ڈال کر یہاں پہنچا دیا۔ وہ ہوش میں آیا ہے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ تمہیں بلائیں۔ اندر ایمرجنسی روم میں پڑا ہے۔ ڈاکٹر اور پولیس والے ہمیں اس سے ملنے نہیں دیتے۔ جاؤ پترا۔ تم دیکھو اسے کیا ہوا ہے۔ ظالموں نے مار مار کر اس کی کیا حالت کر دی ہے۔“

”پریشان مت ہو چاچی۔ میں دیکھتا ہوں اور ار ملا۔ تم حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور ویننگ روم سے نکل کر ایمرجنسی روم کی طرف چل پڑا۔ جگ بیت سنگھ بھی میرے ساتھ تھا۔

ایمرجنسی روم میں دو ڈاکٹروں کے علاوہ دو پولیس والے بھی موجود تھے۔ ان میں ایک تو پچھلے درجے کے رینک کا آفیسر تھا اور دوسرا کانسٹیبل۔ سنت سنگھ لمبی سی ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

”کیا ہوا سنت سنگھ۔ کون تھے وہ لوگ؟“ میں نے قریب پہنچ کر پوچھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

سنت سنگھ کراہ اٹھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ڈاکٹر اور پولیس والوں کی طرف دیکھنے لگا۔ میں ایک ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس سے سنت سنگھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”ایک ٹانگ اور دائیں بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ جسم کے دوسرے حصوں پر بھی چوچیں آئی ہیں۔ ایک سرے لے لے گئے ہیں۔ رپورٹ کا انتظار ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

میں پولیس آفیسر سے بات کرنے لگا۔ انہوں نے ابھی تک سنت سنگھ کا بیان نہیں لیا تھا۔

”میں اپنے دوست سے ختمی میں بات کرنا چاہتا ہوں آفیسر اگر آپ اجازت دیں تو۔“

”کیوں نہیں۔“ پولیس آفیسر نے جواب دیا اور اپنے ماتحت کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

دونوں ڈاکٹر بھی باہر چلے گئے تو میں سنت سنگھ کے قریب آ گیا۔

”کیا معاملہ ہے۔ کون تھے وہ لوگ سنت سنگھ۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ دو آدمی تھے جو مجھے گھر سے ہلا کر دھوکے سے لے

گئے تھے۔“ سنت سنگھ نے جواب دیا ”مگر دوا رے والی گلی کے موڑ پر ایک سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی جس میں ایک چینی پیلے ہی سے بٹھا ہوا تھا۔ میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے اچانک ہی پتھول نکال کر میرے پیلو سے لگا دیا اور مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا۔ وہ دونوں بھی میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور کار حرکت میں آگئی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ اسے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کنا شروع کیا ”پہلے وہ لوگ مجھے سنگ لی روڈ، کمپونگ جاوا روڈ اور اس کے آس پاس کی چھوٹی سڑکوں پر گھماتے رہے اور ہمارے بارے میں پوچھتے رہے۔ کار ڈرائیو کرنے والے چینی نے کہا تھا کہ تم نے کئی سال پہلے خشونت سنگھ کو ایک ڈائری دی تھی اگر میں وہ ڈائری تلاش کر کے ان کے حوالے کر دوں تو وہ مجھے نہ صرف کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑ دیں گے بلکہ ایک معقول رقم بھی انعام میں دیں گے۔ میں ڈائری کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتا رہا پھر وہ لوگ دھمکیوں پر اتر آئے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بڑھ گئے تھے۔ وہ چند لمحوں کے گھرے گھرے سانس لیتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”تینوں روڈ پر پہنچ کر انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ مزید آگے مجھے تک سڑکوں پر گھماتے رہے پھر ایک جگہ کار رک گئی اور مجھے اتار دیا گیا۔ کار کسی بنگلے کے کپڑاؤں میں رکھی تھی۔ انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ میں اس جگہ کا صحیح اندازہ تو نہیں لگا سکا لیکن وہاں سے کچھ دور رائل ہوٹل کا تینوں سائن نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے فوراً ہی اندر لے گئے۔“

”اس بنگلے میں دو آدمی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک تو کوئی ہندو پنڈت تھا اور دوسرا شاید مسلمان تھا۔ اس نے داڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔“

سنت سنگھ نے داڑھی والے اور چینی کار ڈرائیو کا جو طبع بتایا، اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دارا اور بچی فاکنگ تھے اور ہندو پنڈت کا جو طبع بتایا وہ سونی صد اس پکاری کا تھا جسے میں نے کالی کے مندر کے سامنے دارا کے ساتھ کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔

”وہ مجھے تھانے میں لے گئے۔“ سنت سنگھ کہہ رہا تھا ”پہلے تو مجھے لالچ دیا گیا کہ میں ڈائری کے بارے میں بتا دوں پھر دھمکیاں دیں اور اس کے بعد مجھ پر تشدد کیا جانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ تم ڈائری لے جا چکے ہو۔ اگر میں انہیں بتا دیتا

تو وہ تمہارے پیچھے لگ جاتے اور تمہیں مار ڈالتے لیکن میرا خیال ہے تمہارے پیچھے تو وہ اب بھی لگے ہوئے ہیں مگر میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ دونوں آدمی جو مجھے گھر سے ہلا کر لائے تھے، ہندو تھے۔ وہ مجھے بے تحاشا پینتے رہے۔ لوہے کے سرے سے مجھے مارا پٹا گیا۔ میری ٹانگ اور بازو کی ہڈیاں تو یقیناً ٹوٹ چکی ہیں۔ تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جسم کی کئی اور ہڈیاں بھی کرک ہوئی ہوں گی۔“

”یہ تم نے کیا کیا سنت سنگھ۔“ میں نے کہا ”تم بتا دیتے کہ میں ڈائری لے جا چکا ہوں۔ تمہیں اتنی تکلیف تو نہ اٹھانی پڑتی۔“

”جیسے بتا دیتا۔“ سنت سنگھ نے کہا ”میں نے ار ملا کے ساتھ گردوارے جا کر گنتھ صاحب (سکھوں کی مذہبی کتاب) پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ ڈائری کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

”ہندو پنڈت، چینی اور داڑھی والے کے بارے میں تو میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کون ہیں۔ وہ دونوں ہندو کون تھے جو تمہیں گھر سے لے گئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ویسے میں سنت سنگھ کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی ہڈیاں تڑوا لی تھیں مگر ڈائری کے بارے میں زبان نہیں کھولی تھی۔

”غضب نہ ہی تھے۔“ سنت سنگھ نے گھرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”یہ ہندو تو جہاں جاتے ہیں گند ہی پھیلاتے ہیں۔ یہاں بھی زیادہ تر یہی لوگ جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ چینی غنڈوں کے ساتھ مل کر ان کے حوصلے کچھ اور بڑھ گئے ہیں۔“

”اس کار کے بارے میں کچھ یاد ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ سرخ رنگ کی کار تھی۔“ سنت سنگھ نے جواب دیا ”جب وہ مجھے گھر سے ہلا کر کار کی طرف لائے تھے تو میں نے اس کار کا نمبر دیکھ لیا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر کار کا نمبر بتا دیا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا۔

”تمہیں چھوڑ دینے کا مطلب ہے کہ انہوں نے تمہاری باتوں کا یقین کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”میری باتوں کا یقین نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے مجھے مردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا۔“ سنت سنگھ نے جواب دیا ”میں ان کی مار کھاتے ہوئے۔۔۔۔۔ دو مرتبہ بے ہوش ہوا تھا اور دونوں مرتبہ میرے اوپر پانی پھینک کر مجھے ہوش میں لے آئے تھے۔ تیسری مرتبہ بے ہوش ہوا تو شاید وہ دھوکا کھا گئے تھے اور مجھے مردہ سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ بہت دور کی کوئی آواز

میرے لاشعور سے ٹکرائی تھی جیسے کوئی کہہ رہا ہو ”مرگیا سلا۔ اس کی لاش اس کے گھر کے سامنے لے جا کر پھینک دو۔“ اور اس کے بعد واقعی میرے حواس شاید سو گئے تھے۔ ہوش آیا تو یہاں بڑا ہوا تھا۔

”تم نے پولیس کو ابھی بیان تو نہیں دیا۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی تک میں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے سنت سنگھ۔“ میں نے کہا ”تم نے مجھے بچانے کے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی میں نے فراموش نہیں کر سکتا۔ بہر حال، پولیس تمہارا بیان لینا چاہتی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب کچھ بتا دو لیکن کار کا نمبر۔“

”نہیں بتاؤں گا۔“ سنت سنگھ نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں اس سے کچھ اور بھی پوچھتا لیکن اس وقت دونوں ڈاکٹر کمرے آ گئے۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں ایکس رے فائیں تھیں۔

”اب آپ باہر جائیے پلیز۔“ ایک ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”آپ ڈینٹک روم میں جا کر بیٹھے۔ آپ کی ضرورت ہوگی تو بلا لیا جائے گا۔“

میں خاموشی سے کمرے سے نکل آیا۔ دونوں پولیس والے باہر کھڑے تھے اور چاچا جگ بیت سنگھ بھی۔ میں چاچا کو اشارہ کرتا ہوا ڈینٹک روم میں آ گیا جہاں چاچی رجنی اور ارملہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ارملہ اب بھی رو رہی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔

سنت سنگھ کو اس طرح اسپتال چھوڑ کر چلے جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فون پر تھائی اور جاگی کو بتا دیا کہ میری واپسی دیر میں ہوگی۔ وہ لوگ غمناک رہیں۔

تین بجے کے قریب ایک نرس مجھے بلا کر لے گئی۔ سنت سنگھ آریٹھن ٹیبل پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے وائیں بازو اور ایک ٹانگ پر پلستر بڑھا ہوا تھا۔ سینے اور کندھے پر بھی کربس بندھ چکے تھے۔

سنت سنگھ کو ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ظاہر ہے اس کا بیان نہیں لیا جاسکتا تھا۔ پولیس آفیسر کاشنیل کو چھوڑ کر چلا گیا۔

میں اس سے کسی کے دیاں رہنے کی ضرورت نہیں تھی مگر ارملہ دہاں رہنے پر بعد بھی لٹا اسے وہیں چھوڑ کر ہم اسپتال سے باہر آ گئے۔ پہلے چاچی رجنی کو اس کے گھر پر چھوڑا اور پھر میں اور جگ بیت سنگھ اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہو گئے۔ سنت سنگھ کا کزن ان کے گھر آچکا تھا اس لیے مجھے چاچی اور ارملہ کے بچوں کی بھی زیادہ فکر نہیں تھی۔

لیکن سنت سنگھ کے بارے میں پریشانی ضرور تھی۔ جی ٹانگ وغیرہ نے اسے مرده سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو وہ اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یاد تھا۔

چاچا پر اب سنگھ کا باڈی گارڈ سوت سنگھ ہماری حفاظت پر مامور تھا۔ ایک رات دارا کے آدھوں نے ہمارے مکان پر حملہ کر دیا تھا۔ جس میں سوت سنگھ زخمی ہو کر اپنی یادداشت کھو چکا تھا اور دارا نے جیلی نرس کے ذریعے زہر کا انجکشن لگوا کر اسے اسپتال میں ہی ختم کروا دیا تھا اور اب مجھے شبہ تھا کہ اگر انہیں سنت سنگھ کے زندہ ہونے کا پتا چل گیا تو وہ اسے بھی ختم کروانے کی کوشش کریں گے۔

صبح ہوتے ہی میں نے انسپکٹر چٹانگ شو کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اسے سرخ کار کا نمبر بھی بتا دیا جس میں سنت سنگھ کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ اس روز دوپہر کے بعد میں خود بھی اسپتال پہنچ گیا تھا۔ میرے ساتھ جاگی اور تھائی بھی تھی۔

اسپتال میں رجنی اور ارملہ بھی موجود تھیں۔ سنت سنگھ کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کم از کم تین مہینوں تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گا۔ گھر کا سارا خرچ دی چلا آتا تھا اب یہ میری ذمہ داری تھی کہ میں انہیں مالی معاملات میں پریشان نہ ہونے دوں۔ لہذا اسپتال کے اخراجات کے علاوہ میں نے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔

اس سے اگلے روز اسپتال سے واپس آتے ہوئے میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ ہماری نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ نیلے رنگ کی فیاٹ کار تھی۔ جو اسپتال سے نکلنے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔

تھائی اس وقت ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ جاگی اس کے ساتھ پیئرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور میں پچھل سیٹ پر تھا۔ میں نے ان دونوں کو اس کار کے بارے میں بتا دیا۔

ہماری کار اس وقت لیونڈر سے ہوتی ہوئی وکٹوریہ اسٹریٹ پر آچکی تھی۔ میرے کہنے پر تھائی نے کار کو چپن آلی لینڈ ایکسپریس وے کی طرف موڑ دیا۔ یہ سڑک چائنگی ائز پورٹ کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والی کار میں صرف دو آدمی تھے اور میں نے ان سے نینٹے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس مقصد کے لیے شہر کا بیرونی علاقہ ہی مناسب تھا۔ اس

لے میں شہر سے باہر کا رخ اختیار کر رہا تھا۔

کار اپر تارٹھ چائنگی روڈ پر آئی اور چائنگی جیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم لوہاگ لیونڈر والی سڑک پر آ گئے۔ ہمارے دائیں طرف چائنگی انٹرنیشنل ایئر پورٹ تھا اور یہ سڑک چائنگی اسپتال، چائنگی گولف کورس اور چائنگی ویج سے ہوتی ہوئی چائنگی سیلنگ کلب تک چلی گئی تھی۔

اگر ہم چاہتے تو ایئر پورٹ کے اوپر سے گھوم کر ساحل کے ساتھ ساتھ مکمل روڈ پر ہوتے ہوئے فیوری ٹریس کی طرف جاسکتے تھے اور ایئر گوسٹ روڈ سے ہوتے ہوئے۔۔۔

دوبارہ شہر کے مرکزی علاقے کی طرف آتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ ان لوگوں سے نینٹے کے لیے جگہ کی تلاش میں ہمیں اتنا طویل چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے مقصد کے لیے گولف کورس بہترین جگہ تھی۔

لوہاگ لیونڈر والی سڑک پر چائنگی ویج کی طرف مڑتے ہی بائیں طرف گولف کورس شروع ہو جاتا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ اس نے کار کیچے میں آٹا لی۔ پورا خطہ سرسبز گھاس سے اٹا ہوا تھا۔ زمین ادھی بچی اور ناہموار تھی۔ کار اچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ نیلی فیاٹ بھی سڑک سے اتر کر ہمارے پیچھے ہی آ رہی تھی۔ گویا اب وہ لوگ مکمل کر سامنے آ گئے تھے۔

میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ اس نے پام کے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب کار روک لی اور انجین بند کر دیا۔ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور آگے جا کر بوٹ کھول دیا۔

وہ گاڑی ہم سے تقریباً بیس گز پیچھے رک گئی۔ وہ دونوں آدمی نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک تو کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور دوسرا ہماری طرف آئے گا۔ اس کا سیدھا ہاتھ چٹون کی جیب میں تھا۔

وہ دونوں ہندوستانی تھے۔ ہمارا تعاقب کرنے کے بعد جس انداز میں انہوں نے کار روکی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان کی نیت اچھی نہیں تھی اور ان کے پاس یقیناً پستول بھی ہوں گے۔

سنگاپور جیسی جگہوں پر پستول وغیرہ کا حصول کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ البتہ ایک عدد خنجر کا انتظام کر لیا تھا جو حسب معمول میری پٹولی سے بندھا ہوا تھا۔ اس وقت میں نے چٹون بھی مکمل پانچنے کی پین رکھی تھی اور خنجر نکالنا زیادہ مشکل نہیں

تھا۔

اس وقت شام کا دھند لگا پھیل چکا تھا۔ گولف کورس ویران تھا البتہ دور ایک طرف میرین چائنگی ہوٹل اور دوسری طرف چائنگی اسپتال کی عمارت پر بنگاتے نیون سائن نظر آ رہے تھے۔

وہ آدمی میرے قریب پہنچ رہا تھا۔ وہ شکل ہی سے چمنا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔ اتنے میں جاگی بھی کار سے اتر کر میرے قریب آئی۔

”ان کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگتے۔“ جاگی نے سرگوشی کی۔

”مجھے اندازہ ہو گیا ہے اسی لیے میں اس طرف آیا ہوں۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”ہیلو۔“ وہ شخص ہمارے قریب آکر بولا ”بھائی خراب ہو گئی۔ میری مدد کی ضرورت ہو تو۔۔۔“

”شکریہ۔“ میں نے خشک لہجے میں جواب دیا ”ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔“

”اوہ سمجھ گیا۔“ وہ معنی خیز انداز میں جاگی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم تو جان بوجھ کر اس ویرانے میں آئے ہو۔ میں تمہارا مقصد سمجھ گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم دو دو عورتوں کے ساتھ کیسے نٹ رہے ہو۔ ویسے دونوں ہیں بڑی زوردار۔ اگر تمہاری گاڑی میں کوئی خرابی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ کوئی خرابی پیدا کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

اس نے چٹون کی جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول پر سائنسٹر لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے پستول کا رخ اگلے ٹانگی طرف کر کے ٹیکر دیا۔

ٹانگہ کھینچ کر دھکا زیادہ زوردار نہیں تھا۔ جاگی اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

”اب تو گاڑی خراب ہو گئی نا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”شہر یہاں سے بہت دور ہے۔ اس طرف کوئی ٹیکسی ملنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنی کار میں لفٹ دے سکتا ہوں۔ صرف تمہیں۔ ان دونوں کو پھوڑنے کا دل تو نہیں چاہتا لیکن ہماری گاڑی میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ انہیں تو سڑک پر کوئی بھی لفٹ دے دے گا مگر مسئلہ تمہارا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔“

”میرے خیال میں تم سے بڑا حق اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوگا۔“ میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا ”کیا سمجھے تھے کہ ہم بے خبری میں تمہارے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ میں نے

تو تمہاری کار کو اس وقت دیکھ لیا تھا جب اسپتال سے تم لوگوں نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا۔ ہم تو جان بوجھ کر اس طرف آئے تھے تاکہ کسی پر سکون جگہ پر تم لوگوں سے غما جاسکے اور میرے خیال میں اس مقصد کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی۔ دو دروازے کوئی نہیں ہے۔ اس طرح کسی کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔

”وہ!“ اس شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ ”ایسا کر کے تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن اب بہتر یہی ہے کہ تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو اور یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میرا ہسپتال شور مچانا پسند نہیں کرتا۔ چلو۔ آگے بڑھو۔ ورنہ میں ٹیکس دہانے میں ذرا بھی نہیں بچکاؤں گا۔“

”مجھ سے واقعی غلطی ہو گئی۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ اس طرح مسلح ہو گے۔ اب تمہارے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور تم لوگ۔“ میں جاگتی کی طرف مڑ گیا۔

”مجبوری ہے ڈیڑ۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔ تم لوگ سڑک پر چلی جانا۔ کسی نہ کسی گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔“

”تم تو بہت بزدل نکلتے۔“ وہ شخص بولا۔ ”ہم نے تو سنا تھا کہ تم بہت خوفناک قسم کے آدمی ہو۔ تھائی لینڈ میں تم نے بڑے نامی گرامی غنڈوں کو انگلیوں پر پٹا رکھا تھا مگر شاید وہ سب فرضی داستانیں تھیں۔ بہر حال اب واقعی تم پھنس گئے ہو۔ اس دیرانے میں کوئی تمہاری مدد کو بھی نہیں آئے گا۔ چلو۔ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

میں کار کے سامنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سائڈ والے دروازے کے قریب سے گزر گیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے میں نے اس کے سامنے واقعی ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ میں کار کے پیچلی نشست والے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ شخص مجھ سے دو قدم پیچھے تھا۔ وہ جیسے ہی ڈرائیونگ سائڈ والے دروازے کے قریب پہنچا اندر بیٹھی ہوئی تھائی نے دروازے کو پوری قوت سے باہر کی طرف دھکا دیا۔

کار کا دروازہ اس شخص کی ٹانگ پر لگا۔ وہ کراہتا ہوا۔ لکڑہٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھٹکتا، میں نے بڑی تیزی سے گھوم کر اسپن کک لگا دی۔ کک اس کے بازو پر کسی سے ذرا اوپر لگی۔ وہ بلبلا ہوا دو سری طرف الٹ گیا۔ ہسپتال ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس نے نیچے کرتے ہی سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹیکس دہانہ۔ ایک شعلہ سا چمکا۔ گولی

کار کے پیچھے دروازے کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی لیکن اسے دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ جاگتی کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی اس کے اوپر آن گری تھی۔

جاگتی نے کسی ریلس کی طرح ہی اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی کسی کار کا دراز اس شخص کے کندھے پر لگا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس مرتبہ ہسپتال اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا کر۔ تھائی شاید تاک میں بیٹھی تھی۔ اس نے کار میں سے چھلانگ لگا دی اور ہسپتال اٹھایا۔

اسی دوران میں دوسرا آدمی چیتا ہوا ہماری طرف نکلے اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ تھائی تیزی سے اس طرف غموم گئی۔ گولی مت چلانا تھائی۔ میں چیخا اور آنے والے سے نسنے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ شخص اپنے نسنے کی طرح ڈکراتا ہوا آ رہا تھا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا اور اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں میں پھنسا دی۔ وہ نیچے کرا اور فلا بازیاں کھاتا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے خنجر والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ پند لکھو مجھے خنجر کو میرے سامنے مخصوص انداز میں حرکت دیتا رہا پھر ہاتھ سر سے بلند کر کے وار کر دیا۔ میں نے سیزر پینڈ ڈینس کی ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے بڑی تیزی سے دونوں بازوؤں کو کراس کی صورت میں ملا لیا۔ اس کی کھائی میرے دونوں بازوؤں کے جوڑ پر آ گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے مٹھیاں پہنچ لیں اور دونوں ہاتھوں کی پشت کو آپس میں ملا لیا۔ اس طرح اس شخص کی کھائی میرے بازوؤں کے ششے میں پھنس چکی تھی۔

یہ ٹیکنیک میں نے اس سے پہلے شاؤن نیپیل میں بائو لیٹی یان کے ساتھ ٹریننگ میں ہی استعمال کی تھی۔ حقیقی لڑائی کا یہ پہلا موقع تھا اور میں نے اس ٹیکنیک کے استعمال میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

خنجر آگے میرے چہرے کی طرف نکلا ہوا تھا اور وہ شخص اپنے ہاتھ کو پوری قوت سے جھٹکے دے رہا تھا مگر میرے اس ششے سے تو بائو لیٹی یان بھی اپنا ہاتھ نہیں پھنسا سکا تھا اور یہ تو ایک معمولی بازواری غذا تھا جو مارشل آرٹس کی ایجو سے بھی واقف نہیں تھا۔

وہ خاصا طاقتور تھا لیکن ہر جگہ طاقت کام نہیں کرتی۔ طاقت کے استعمال کے ساتھ کسی ٹیکنیک کی بھی ضرورت

ہوتی ہے اور وہ بغیر کسی ٹیکنیک کے طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اب کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ میں نے اپنا کنبہ تھوڑا سا سکا۔ اس کی انگلیاں کھل گئیں اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہم دونوں کے درمیان زمین پر گر گیا۔

وہ شخص اب باقاعدہ چیخنے لگا تھا۔ میں نے زوردار جھٹکا دے کر اس کی کھائی چھوڑ دی۔ وہ لڑکھاتا ہوا زمین پر کرا اور دوسرے ہاتھ سے مجھ کو کھائی پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے حملہ آور سے بہت خوبی سے نمٹ رہی تھی۔ جاگتی نے میرے ساتھ شاؤن نیپیل میں جو ٹریننگ کی تھی وہ اس کے کام آ رہی تھی۔ یہ دونوں بازواری غنڈے تھے اسٹریٹ فائٹنگ میں تو ماہر ہو سکتے تھے لیکن مارشل آرٹس سے واقف نہیں تھے۔ ایک میرے ہاتھوں کھائی کی پڈی تروا بیٹھا تھا اور دوسرا جاگتی کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔

”کولف کورس میں جس جگہ یہ ہنگامہ ہو رہا تھا سڑک وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ اس جگہ سڑک پر ذرا سی گولائی تھی۔ اسی وقت شرکی طرف سے آنے والی ایک کار اس سڑک پر ٹھکی تو ہم سب بیٹھ پچس کی روشنی میں آگے میں نے جو تک کر اس طرف دیکھا۔ وہ پولیس کار بھی جس کی پھت پر فلیشر چمک رہے تھے۔

شاید پولیس والوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ فوراً ہی سائین کی آواز گونج اٹھی اور پولیس کار راک گئی۔ میں نے وہ پولیس والوں کو کار سے اتر کر اس طرف دوڑتے دیکھا۔ جاگتی کا حریف بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو جاگتی کی گرفت سے چھڑایا اور اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

دوسرے آدمی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔

دونوں پولیس والے دوڑتے ہوئے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک نے ریو اور نکال لیا۔ ایک اور پولیس والا کار سے اتر کر فرار ہونے والے شخص کے پیچھے دوڑا لیکن وہ تار کی بل میں غائب ہو چکا تھا۔

تینوں پولیس والوں نے ہمیں گھیر لیا۔ دو کے ہاتھ میں ریو اور نظر آ رہے تھے۔ ان تینوں میں ایک ہندوستانی ایک چینی اور تیسرا یورپین تھا۔ ان تینوں نے ہمیں پینڈز اپ کو الیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا تھا۔ کیا معاملہ ہے؟“ پولیس باری کی انچارج نے باری باری ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ لوگ مجھے اور میرے ساتھی کو لوٹنا چاہتے تھے آفیسر۔“ وہ شخص فوراً ہی بول پڑا جس کی کھائی میں نے توڑ دی تھی۔ ”ہم لوگ چانگئی انزپورٹ سے نکل رہے تھے کہ اس آدمی نے ان دو خوب صورت عورتوں کو لالچ دے کر ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور یہاں اس دیرانے میں آکر ہمیں لوٹنے کی کوشش کی۔ مزاحمت کرنے پر یہ ہم سے الجھ پڑے۔ میرے بازو کی پڈی توڑ دی۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔ اگر آپ لوگ نہ آجاتے تو یہ ہم میں سے ایک کو یا دونوں کو ختم کر دیتا۔“

جاگتی اور تھائی تو اس کی بات سن کر سائلے میں آ گئیں۔ میں البتہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”بھاگنے والا کون تھا؟“ پولیس آفیسر نے اس سے پوچھا۔

”میرا ساتھی تھا۔ وہ اگر نہ بھاگتا تو یہ اسے مار ڈالتے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟“ پولیس آفیسر مجھے گھورنے لگا۔ ”تم کون ہو اور یہ عورتیں کون ہیں؟“

”میرا خیال ہے اسے اور ہم دونوں کو پولیس اسٹیشن لے چلو۔ وہیں چل کر فیصلہ ہو گا کہ حقیقت کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ پولیس آفیسر ہند لکھ گھوڑا رہا پھر اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے اور اس آدمی کے لباس تفتیشی میری پینڈی پر بندھا ہوا خنجر اس کے قبضے میں چلا لیا۔ پولیس والے کو وہ خنجر بھی مل گیا جو کار سے کچھ دور پڑا تھا۔ تھائی نے وہ ہسپتال اس طرح چھپایا تھا کہ پولیس والوں کو اس کا پتا بھی نہ چل سکا۔

ہماری کار کا ایک ٹائر برست ہو چکا تھا۔ ہم تینوں کو پولیس کار کی پیچلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا جبکہ دو پولیس دلس اس شخص کے ساتھ اس کی ٹیلی فائٹ میں بیٹھ گئے۔

لوہانک پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس وقت شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ پولیس اسٹیشن میں خاصی گھما گھمی تھی۔ میں نے جانتے ہی ایک سینئر آفیسر سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کرانے کے بعد اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ آفیسر ب انسپکٹر تھا اور انسپکٹر چیاک شو کی ماتحتی میں رہ چکا تھا۔ اس نے فوراً ہی ٹیلی فون پر انسپکٹر چیاک شو کو اطلاع دے دی۔ انسپکٹر چیاک شو نے مجھ



سے بھی بات کی اور پھر کئی منٹ تک سب انپکڑ سے بات کرتا رہا۔

سب انپکڑ نے فون بند کر دیا اور ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے آیا جہاں سلیٹے کا فریج لگا ہوا تھا۔ ہمیں وہاں بٹھا کر اس نے ہمارے لیے چائے منگوالی اور خود فتراوے کمرے میں چلا گیا۔

انپکڑ چیاگ شہو تقریباً ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔ اسے ایک بار پھر پوری بات بتانی پڑی۔

”ٹھیک ہے ہم معلوم کر لیتے ہیں وہ کون ہیں اور تم لوگوں کا چیچا کیوں کر رہے تھے۔“ انپکڑ چیاگ شہو کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

ہمیں تقریباً ایک گھنٹا اور اس کمرے میں بیٹھنا پڑا اور پھر چیاگ شہو کے ساتھ وہ سب انپکڑ بھی کمرے میں داخل ہوا۔

”تم نے مجھے سنت سگھے والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔“ چیاگ شہو نے کھڑی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”وہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ میں نے آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ دونوں وہی غنڈے ہیں جنہوں نے سنت سگھے کو اغوا کر کے اس پر تشدد کیا تھا۔“ انپکڑ چیاگ شہو نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بتانے لگا کہ ٹھری دھناتی ایک ہندو پنڈت نے ہماری معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کی تھیں اور انہیں ریش ثانی ایک اور آدمی کے پاس لے گیا تھا۔ جس نے انہیں سنت سگھے کو اغوا کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ اس شخص نے ریش ثانی داڑھی مونچھ والے جس شخص کا حلیہ بتایا وہ سونی صد دارا پرنٹ آتا ہے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا اس مرتبہ کلن کرساٹے نہیں آیا تھا۔ حلیہ بدلنے کے ساتھ اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔

”وہ لوگ سنت سگھے کو اغوا کر کے بیکلے روڈ کے ایک بنگلے میں لے گئے تھے جہاں اس سے کسی ڈائری کے بارے میں پوچھنے کے لیے تشدد کیا گیا اور بالآخر مردہ سمجھ کر اس کے گھر کے سامنے چھینک دیا گیا۔“ انپکڑ چیاگ شہو کہہ رہا تھا ”آج صبح انہیں جیل میں لایا گیا کہ سنت سگھے زندہ ہے۔ وہ ہسپتال کی نگرانی کرنے لگے۔ ریش ثانی اس شخص کو یقین تھا کہ تم ہسپتال ضرور آؤ گے ریش نے انہیں حکم دیا تھا کہ اگر تم نظر آ جاؤ تو ہمیں اغوا کر کے بیکلے روڈ کے اس بنگلے میں پہنچا دیا جائے۔“ انپکڑ چیاگ شہو چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات

جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”انہوں نے ہمیں ہسپتال سے نکلنے دیکھ کر تعاقب تو شروع کر دیا مگر تم پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ کر سکے کیونکہ تم لوگ تین تھے۔“ چیاگ کے ہونٹوں پر جھنجھکی سی مسکراہٹ آئی ”جب تم لوگ شہر سے باہر کی طرف نکل گئے تو انہیں حوصلہ ہوا کہ اس نسبتاً غیر آباد علاقے میں تم لوگوں پر قابو پایا جاسکتا ہے اور جب تمہاری کارگرفرواہ کو رس میں داخل ہو کر رک گئی تو انہوں نے تم لوگوں پر قابو پانے کا فیصلہ کر لیا۔“

”بہت بھونڈا طریقہ اختیار کیا تھا انہوں نے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”بہر حال۔“ انپکڑ چیاگ شہو بلا ”ایک پولیس پارٹی اس بنگلے پر چھاپا مارنے کے لیے جا چکی ہے۔“

”لیکن تجھے یقین ہے کہ وہاں پولیس کو اب کچھ نہیں ملے گا۔“ اس کا دوسرا ساتھی تقریباً دو گھنٹے پہلے گولف کورس سے بھاگا تھا۔ اس کا رخ میری جانگنی ہوئی طرف تھا۔

وہاں سے اس نے یا تو فون پر اطلاع دے دی ہوگی یا ٹیکسی وٹیر لے گئی ہوگی۔ وہ لوگ بنگلا خالی کر کے چاہتے ہوں گے۔ ”بہر حال کوئی سراغ تو ملے گا۔“ چیاگ شہو نے کہا ”تم لوگ اب چلے جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔ جو بھی صورت حال ہوگی ہمیں فون پر آگاہ کر دوں گا۔“

”میرا خنجر۔“ میں نے کہا ”وہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا ہے اور ہماری کار بھی گولف کورس میں کھڑی ہے۔ اس کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا تھا بلکہ گولی مار کر برسٹ کر دیا گیا تاکہ ہم لوگ بھاگ بھی نہ سکیں۔“

”میں اپنی گاڑی پر تم لوگوں کو بھیج دیتا ہوں۔ ایک کانٹیل تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہ ٹائر بھی بدل دے گا۔“ یہ بات سب انپکڑ نے کسی جی جی جواب تک خاموشی سے ہماری باتیں سنتا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے تم لوگ چلو۔ میں فون پر تمہیں بتا دوں گا۔“ انپکڑ چیاگ شہو نے کہا۔

ہم اس کمرے سے باہر آگئے سب انپکڑ نے میرا خنجر واپس کر دیا جسے میں نے پنڈلی پر بندھے ہوئے ہوسٹر میں اڑس لیا اور پھر گیٹ سے باہر آکر ہم پولیس کی ایک کار میں بیٹھ گئے ڈرائیور ایک کانٹیل تھا۔

ہم تقریباً دس منٹ میں گولف کورس میں کھڑی ہوئی اپنی کار کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے تھائی سے چالی لے کر کار کی ڈکی کھول دی۔ کانٹیل نے اپنی کار اس طرح کھڑی کر دی

کہ اس کے بیٹھ چمپس کی دوستی ہماری کار پر بڑتی رہے۔ میں نے اس دوران میں اپنی کار کی ڈکی سے فاصلہ مائز اور جیک وغیرہ نکال لیا۔

مائز تبدیل کرنے میں دس بارہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہم نے کانٹیل کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کر دیا اور اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت اسٹینرنگ کے سامنے میں بیٹھا تھا۔ رات کے گیارہ بجتے والے تھے سڑک پر ٹریفک اس وقت بہت کم تھا۔

جاگی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کوئی غلطی نہیں بغیر ہلکی رفتار سے کار چلاتا رہا۔ ہمارا رخ چانگنی ونگ کی طرف تھا۔

ہم چانگنی سیلنگ کلب کے قریب سے کھول روڈ پر مڑ گئے اور لائٹس کے زیرے نان جنگ سیلنگ کور کے لیے فیوری ٹریمل کے سامنے سے ہوتے ہوئے چانگنی کو سٹ روڈ پر آگئے یہ سڑک آگے جا کر ایٹ کو سٹ پارک وے سے جا ملتی تھی۔

ایٹ کو سٹ پارک وے سے میں اسٹینڈم روڈ پر نکل آیا اور سنگ پور ان دور اسٹینڈم کے قریب کار روک کر ڈرائیونگ سیٹ جاگی کے حوالے کر دی اور خود بچھلی سیٹ پر تھائی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آگے شہر کا بارونق علاقہ تھا۔ میرے پاس چونکہ لائسنس نہیں تھا اس لیے میں ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ گیا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ بھوک سے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ جاگی تو حسب معمول بلبل رہی تھی۔ وہ آتے ہی کچن میں گھس گئی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد فون کی ٹھنکی بجی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسور اٹھالیا۔ میرا خیال تھا انپکڑ چیاگ شہو ہو گا جو مجھے بیکلے روڈ والے بنگلے پر چھاپے کے بارے میں بتانا چاہتا ہو گا لیکن جیلو کے جواب میں اپنی غلطی گالی سنائی دی کہ میرا داغ بھگ سے اڑ گیا۔ میں نے ریسور کان سے ہٹا لیا۔

”میری آواز سن رہے ہو حرام زادے!“ دارا کی آواز اب بھی میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میری گردن پر چوٹیاں سی رہ گئیں۔ دارا کہہ رہا تھا ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا اب مجھے اس ڈائری کی بھی پروا نہیں۔ دو تین دن۔ صرف دو تین دن انتظار کرو۔ تمہاری زندگی کے دن پورے ہونے والے ہیں۔ اب تم زندہ نہیں رہو گے۔“ ”کتے رہو۔ میں سن رہا ہوں۔“ میں نے پر سکون لہجے

میں کہا۔

”تمہاری وجہ سے میں مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہوں۔ اب میں تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ دو تین دن اور زندگی کے مزے لوٹ لو۔ اس کے بعد تمہارے لیے یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ دارا نے کہا۔

”میں بہت عرصے سے تمہاری یہ دھمکیاں سن رہا ہوں۔ اب کچھ کر بھی چکو۔“ میں نے کہا۔

جواب میں ایک بہت غلط گالی سنائی دی اور لائن منقطع ہو گئی۔ میں نے بھی ریسور رکھ دیا۔

”میرا خیال درست نکلا۔“ میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دارا اس بنگلے سے فرار ہو چکا ہے۔ وہ تیل میں پھنکی کی طرح تاج رہا ہے۔ کاش! میں اسے اس حالت میں دیکھ سکتا۔“

”تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ تم اسے اس سے بھی بدتر حالت میں دیکھو گے۔“ تھائی نے کہا۔

اسی دوران میں جاگی انڈے اور کافی بنا کر لے آئی۔ دو انڈے کھانے کے بعد میں کافی پی رہا تھا کہ انپکڑ چیاگ شہو کا فون آگیا۔

”تمہارا خیال درست نکلا۔ اس بنگلے میں کچھ نہیں ملا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”شراب کی خالی بوتلیں پکڑے اور کچھ اور سامان بکھرا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ بڑی افرا تفری میں وہاں سے بھاگے ہیں۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہاں کچھ نہیں ملے گا۔“ میں نے کہا ”اگر آپ دارا اور جی فانگ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو پہلے اس ہندو پنڈت کو تلاش کریں۔ میرا مطلب ہے ٹھری دھر گو۔ وہ ان لوگوں تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔“

”مارش روڈ والے بنگلے کی بھی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ عورت بھی وہاں سے غائب ہے جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا لیکن ہم ٹھری دھر کو تلاش کر رہے ہیں اور اب اس غنڈے کو بھی تلاش کیا جا رہا ہے جو گولف کورس سے فرار ہو گیا تھا۔ اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“ انپکڑ چیاگ شہو نے کہا۔

”وہ زندہ تو نہیں لیکن ہو سکتا ہے اس کی لاش آپ کو کہیں مل جائے۔“ میں نے کہا ”وہ ہماری نظروں میں آچکا ہے۔ دارا بہت چالاک آدمی ہے۔ وہ اپنے ایسے آدمیوں کو زندہ نہیں چھوڑتا جو دشمن کی نظروں میں آجاتے ہیں اور وہ غذا تو ویسے بھی اس کے لیے زیادہ اہم نہیں ہوگا۔ وہ تو ایک معمولی سا سہارا ہے۔“ میں چند لمحوں کو... خاموش ہوا پھر بولا

”ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ چند منٹ پہلے دارا کا فون آیا تھا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ دو تین دن میں میری زندگی کا چراغ نکل کر دے گا۔“

”تمہاری حفاظت کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“ چینگ شو نے کہا۔ ”میں صبح ہی سادہ لباس میں دو آوی بیچ دیتا ہوں۔ وہ دروہ رو کر تم لوگوں کی گھرائی کریں گے۔“

اس مرتبہ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چند منٹ اور بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

کافی پینے کے بعد بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر چاکل ہی مجھے اس ہسپتال کا خیال آگیا جو گولف کورس میں وہ غنڈا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔

”وہ ہسپتال کہاں ہے تھائی؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس ہے۔“ تھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کر اپنے ٹراؤزر میں ہاتھ ڈال کر ہسپتال نکال لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی ”بہترین چیز ہے اور میرا خیال ہے کیا ہی ہے۔“

میں نے ہسپتال اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ ایک دو دن میں اس کی ضرورت پڑے گی۔“ میں نے ہسپتال سے لوٹا دیا۔ اس وقت دو بج چکے تھے تھائی تو اٹھ کر اپنے کمرے

میں چلی گئی۔ میں اور جاگتی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر مجھے بھی تنہائیاں آنے لگیں۔

دو تین دن گزر گئے۔ دارا کی دھمکی کے باوجود ہماری۔۔

سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پولیس کے دو آدمی سادہ لباس میں دروہ کر ہماری گھرائی کر رہے تھے شام کو ان کی ڈیوٹی بدل جاتی۔ ان کی جگہ دوسرے دو آدمی آجاتے جو صبح تک ہمارے مکان کے آس پاس موجود رہتے۔

میں دارا کی دھمکی کو محض گیدڑ بھبکی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔ شکست خوردہ آدمی جب جھنجھلاہٹ میں دارا کرتا ہے تو زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور میں جانتا تھا کہ دارا بھی اس مرتبہ کوئی ایسی ہی حرکت کرے گا۔

پولیس ابھی تک نہ تو محولی دھر کا کوئی سراغ نکال سکی تھی اور نہ ہی اسے کوئی اور کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ البتہ میری یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی کہ دارا اس غنڈے کو ختم کر دے گا جو گولف کورس سے فرار ہوا تھا۔ اس کی لاش اگلے ہی روز نونٹن روڈ کے قریب ایک ویران جگہ پر پڑی ہوئی لی

گئی تھی۔ اسے پیشانی میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

اس روز شام کو ہم سنت سنگھ کو دیکھنے کے لیے اسپتال گئے تو چاچی رجنی وہاں موجود تھی۔ ارٹلا بھی عام طور پر اس

وقت اسپتال آجایا کرتی تھی لیکن اس روز اس کے چھوٹے بیٹے کو بخار تھا جس کی وجہ سے وہ گھر پر ہی رہ گئی تھی۔ چنانچہ جب اسپتال سے نکلے تو یہ پروگرام بنایا کہ ان کے گھر سے ہوتے ہوئے چلیں گے۔ چاچی رجنی بھی ہمارے ساتھ ہی تھی۔

ارٹلا ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ہمارا پروگرام تو چند منٹ وہاں رکنے کا تھا مگر ارٹلا اور چاچی رجنی نے ہمیں رات کے کھانے تک روک لیا۔

ہم دس بجے کے قریب وہاں سے نکلے تو بیگولین اسٹریٹ پر واقع ایک ٹائٹ کلب میں رک گئے۔ ہم بہت عرصے بعد کسی ٹائٹ کلب میں آئے تھے۔ ایک انڈین رقامہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

ہمیں اسٹیج کے قریب ایک میز مل گئی اور ہم دیر تک رقص کے اس پروگرام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ انڈین رقامہ کے بعد ایک یوریشین رقامہ اسٹیج پر آگئی۔ وہ صرف جسم کی نمائش کے فن میں ماہر تھی۔ ہم دوسرے بال میں آگئے۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ہم کلب سے باہر نکل آئے۔

ڈرائیونگ کی ڈے واری اس وقت میں نے سنبھال لی تھی۔ تھائی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور جاگی پیچھے

ہمارے محافظوں کی کار ہمارے پیچھے ہی پارکنگ سے نکلی تھی۔ ہمارے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور کار بھی پارکنگ سے نکلی تھی لیکن میں نے زیادہ

توجہ نہیں دی۔ پارک پلازا کے قریب سے اس باشی روڈ کو اس کر کے

ہم نیچل میوزیم اینڈ آرٹ گیلری کی طرف نکل آئے۔ اس دورا ہے سے ایک طرف آرچرڈ روڈ شروع ہوتا تھا اور

دوسری طرف فورٹ کیننگ روڈ۔ ہماری کار اس چوراہے پر پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار

فائرنگ کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزری۔ اسٹیرنگ پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کار لہرائی لیکن

میں نے بڑی بھرتی سے کار سنبھال لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مرکز جاتی بھر تھائی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں

پر وحشت تھی لیکن وہ دونوں محفوظ تھیں۔ تب مجھے احساس

ایک فائرنگ ہماری کار پر نہیں کی گئی تھی بلکہ وہ جو کوئی بھی نے ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے نکل گئے تھے۔ پورا برسٹ مارا یا تھا۔

”یہ کون لوگ تھے۔“ بچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی نے کہا۔ اس کے لمبے میں خوف نمایاں تھا۔

”میرا خیال ہے کوئی اور ہی چکر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر وہ لوگ ہمارے پیچھے ہوتے تو ہوائی فائرنگ کے

بائے براہ راست ہمیں نشانہ بناتے۔“

تھائی نے بڑی بھرتی سے اپنے پرس میں سے ہسپتال نکال دیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ ہمارے محافظوں کی کار بھی

ی تیزی سے ہمیں اور ٹیک کرتے ہوئے گزر گئی۔ وہ اس کے پیچھے گئے تھے جو فائرنگ کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔

میں نے تھائی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا۔ بہت راک اور گاڑی آ رہی تھی۔

میں نے ٹھیکر کے قریب سے کار ایک ذیلی سڑک پر ڈلی۔ اس طرح فورٹ کیننگ روڈ پر جانے کے بجائے ہم

دو تین چار گلیوں میں ہوتے ہوئے اپنے گھر پہنچ سکتے تھے۔

تین چار گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم اپنے مکان والی ل میں پہنچ گئے۔ میں نے مکان کے سامنے پہنچ کر انجن بند

رہا۔ تھائی نے ہسپتال دوبارہ پرس میں رکھ لیا تھا۔ وہ اور تھی مجھ سے پہلے کار سے اتر چکی تھیں۔ میں دروازہ کھول کر

رہا تھا کہ ایک کار گلی میں داخل ہوئی۔ ہم تینوں ہیڈ پچس کی روشنی میں نما گئے۔ میں نے زیادہ توجہ نہیں دی

بلکہ میرے خیال میں وہ ہمارے محافظوں کی کار تھی۔ وہ کار تیزی سے آگے نکل کر رک گئی۔ میں اس وقت

اپنی کار کا دروازہ بند کر کے لاک میں چابی گھما رہا تھا کہ تھائی بائیں طرف نکلی۔

”وعدا نہ۔ بچو!“

میں جلدی سے سیدھا ہو گیا۔ تین آدمی آگے والی کار سے اتر کر پیچھے ہوئے ہماری طرف لپک رہے تھے۔ مجھے

دور حال کی شکنیں کا اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

ان تینوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ایک میری طرف لگا۔ ایک کارن تھائی کی طرف تھا اور تیسرے کارن جاگی کی

طرف۔ میری طرف آنے والا آدمی چنگھاڑتا ہوا حملہ آور ہوا۔

میں نے بڑی بھرتی سے اس کا وار روکا۔ بائیں ہاتھ سے اس کے

مارنے کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی بھرتی سے اپنے آپ کو بچایا تھا۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی اس کی کلائی پر بجا دیا اور

اس کا بازو مروڑنے لگا اور پھر اس وقت اٹلی کار کی طرف سے دارا کی چٹنی ہوئی آواز سنائی دی۔

”آج تم نہیں بچ سکو گے حرام زادے!“ وہ کہہ رہا تھا

”میں اگر چاہتا تو راستے میں تم تینوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیتا

جاتا لیکن میں تم لوگوں کو اس طرح مارنا چاہتا تھا جس طرح تمہارے ماں باپ کو مارا تھا۔ اس جگہ تمہارے گھر کے

سامنے۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر چیخے ہوئے بات جاری رکھی ”راستے میں وہ ہوائی فائرنگ اس لیے کرانی گئی

تھی کہ تمہارے محافظوں کو ہٹایا جاسکے۔ تم لوگوں کو میں نہیں پر گھیرنا چاہتا تھا۔ تم لوگ میرے گھر سے آگے ہو۔

اب تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔“

وقت اپنے آپ کو دہرا رہا تھا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا جو کئی سال پہلے اسی وقت

میں اپنے حریف کی کلائی پوری قوت سے مروڑتا چلا گیا۔ میں اس کے ہاتھ سے خنجر پھرانے کی کوشش کر رہا تھا

مگر خنجر اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور پھر اس نے اپنے آپ کو اس طرح زوردار جھٹکا دیا کہ میرا ایک پیر سلپ

ہو گیا۔ میں لڑکھاتا ہوا اپنی کار سے نکل گیا۔ اب اسے موقع مل گیا تھا۔ وہ مجھے دبا ہوا خنجر کو میرے چہرے کے قریب لا

رہا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ قد آور اور زیادہ طاقت ور تھا۔ میں نے

بھی پوری قوت سے اس کے ہاتھ کو روکا ہوا تھا مگر اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ خنجر کی نوک میری بائیں آنکھ سے

دو تین انچ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ ایک معمولی سا جھٹکا مجھے نہ صرف ایک آنکھ سے بلکہ زندگی سے بھی محروم کر سکتا تھا۔

اسی لمحے مجھے تھائی کی کرناک چٹ سنائی دی اور پھر دوسری چٹ گونجی۔ مجھے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں

آئی کہ تھائی کس صورت حال سے دوچار ہو رہی ہوگی۔ میری پشت کار سے لگی ہوئی تھی اور میرا حریف پورے قد سے

میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ خنجر کی نوک میری آنکھ کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ خنجر میری آنکھ میں

پیوست ہو جائے۔ تھائی کی ایک اور چٹ سنائی دی۔ یہ چٹ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔ میں نے ایک پیر مضبوطی سے زمین پر

جماے رکھا اور دوسرا پیر اٹھا کر گھٹنے سے حریف کی ٹانگوں کے

ہر ایک اور ضرب لگائی جو پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔

میرا حریف بچ اٹھا۔ اس کا جارحانہ انداز رخصت ہونے لگا۔ میں نے اس کی کلائی سے ایک ہاتھ ہٹا کر اس کی نبض میں ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ کم از کم ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ میں نے دو سر گھونسا اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگایا اور اسے سینٹھ کے موقع دیے بغیر گھٹنے سے ٹانگوں میں ایک اور ضرب لگا دی۔ اس مرتبہ وہ بلبل اٹھا۔ خنجر کے دسے پر اس کی طمعی ٹھکنے لگی اور وہ نیچے جھکنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا اور سنبھل کر ایک بار پھر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں زوردار گھونسا رسید کر دی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکھرے کی طرح بلبل اٹھا اور دونوں ہاتھ ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر نیچے جھکتا چلا گیا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر ٹھوکر مار دی۔ وہ چیخا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

اس وقت تھائی کی ایک اور کرناک چیخ سنائی دی۔ میں اپنے حریف سے چھینا ہوا خنجر سنبھالنا ہوا اس طرف لپکا اور پھر صورت حال دیکھ کر میں کاب اٹھا۔

تھائی مکان کے سامنے گارڈینیا کی باڑھ پر پشت کے بل گرے ہوئی تھی اور ایک آوی اس پر بچہ کاپے در پے اس پر خنجر کے وار کر رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور ایک جھٹکے سے زمین پر گرا دیا اور پھر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اپنا دل کپٹیوں میں دھونکن ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ جی فانگ تھا۔

رگوں میں میرا خون اچھلنے لگا اور پھر میرے لیے اپنے آپ کا قابو پانا ممکن نہیں رہا۔ خنجر جی فانگ کے ہاتھ میں بھی تھا مگر میرا ہاتھ بتی رو سے زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ میرا چہرہ دیکھ کر جی فانگ کی آنکھوں میں وحشت سی ابھرائی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی خوفناک چیخ نفا میں جھیلی چلی گئی۔

میرا خنجر دسے تک اس کے سینے میں ہی پوسٹ ہو چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے خنجر کو باہر کھینچ کر دو بارہ وار کیا۔ دوسری چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی اور پھر میں نے در پے اس کے سینے پر وار کرنا چلا گیا۔

فانز کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ تھائی اور جی فانگ کی چیخوں کی آواز سن کر شاید کئی کے مکانوں سے کچھ لوگوں نے باہر آنے کی کوشش کی تھی اور دارانے انہیں مداخلت سے باز رکھنے کے لیے ہوائی فائر کر دیا تھا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک کار موٹر پر کئی میں گھومی تھی۔ اس کے ساتھ ہی

وارا کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔

”جڈت بھاگے۔“

دارانے اپنی کار کی طرف بھاگے ہوئے میری طرف سے فائر کر دیے تھے لیکن اتفاق سے میں اس وقت زمین پر گر چکا تھا۔ دونوں گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔

دارا والی کار کا انجن اشارت ہی تھا۔ وہ ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی۔ دارا ہوائی فائر کرتا ہوا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک اور آوی دوڑتا ہوا کار کے دروازے سے نکل گیا۔ میرے حریف نے بھی اٹھ کر کار کی طرف دوڑنے کی کوشش کی تھی مگر جاگی نے اس پر چھلانگ لگا دی اور ان کی ٹانگوں سے لٹ گئی۔

میں خنجر جی فانگ کے سینے میں چھوڑ کر تھائی کی طرف لپکا۔ وہ گارڈینیا کی باڑھ پر پڑی پھیلی کی طرح ترپ رہی تھی۔ میں تھائی کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آہٹ سن کر تیزی سے پیچھے مڑا۔ وہ جی فانگ تھا جس نے اپنے سینے میں پوسٹ خنجر نکال لیا تھا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لوٹھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے محسوس کر اسے لگ رہا کہ وہ لوٹھڑا کر پشت کے بل گرا اور پھر وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے جاگی کو دونوں ہاتھوں میں بھر لیا۔ وہ خون میں لپکتی تھی اس کے سینے پر کئی گھاؤ تھے جن سے خون بہہ رہا تھا۔

کلی میں مڑنے والی کار ریگوں کی تیز چرچاہٹ کے ساتھ رک گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہمارے محافظوں کی کار تھی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔ ایک جاگی کی طرف لپکا جس نے ایک حملہ آور کی ٹانگوں کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ دوسرا محافظ میری طرف دوڑا۔

میں اس وقت تھائی کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھائی زخموں سے چور تھی۔ وہ چیخ اٹھی اور پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی۔

”ننٹ نہیں دو۔“ وہ کہہ رہی تھی ”ممہ مجھے مارا تھا۔“ ممہ میں اب نہیں بچوں گی۔ تنستہ تم اپنا خیال رکھنا۔“

تھائی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

”نہیں تھائی۔“ میں چیخ اٹھا ”آنکھیں کھولو۔ تم اس طرح نہیں سرکتیں۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“

میرا ایک محافظ دوڑتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا تھا۔ تھائی کو دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہو گیا۔

”کھل گیا ہوا۔“ وہ بدحواسی میں اپنی بات وری نہیں کر سکا اور قریب پڑی ہوئی جی فانگ کی لاش کی طرف دیکھنے لگا۔

”اسپریٹس کے لیے فون کرو۔ جلدی!“ میں اس کی طرف دیکھ کر چیخا ”میں تھائی کو مرنے نہیں دوں گا۔“

بلدی فون کرو۔“

محافظ ایک طرف بھاگ گیا۔ اس وقت کئی لوگ گھروں سے آئے تھے چاہا جگ جیت سکھ بھی باہر آ گیا۔

سے حال دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہو گیا۔

”وہ ان تھائی۔ کہاں ہو تم۔“

جاگی کی آواز سن کر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے حریف سے مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن خنجر کا ایک وار پڑی گیا تھا۔ اگر مارشل آرٹس سے واقف نہ ہوتی تو شاید اپنا دفاع نہ کیا ہوتا۔

وہ تھائی کی طرح وہ بھی زخموں سے چور ہو چکی۔

”مرتا کر رہ۔ زخموں۔ دیکھو انہیں کیا ہوا ہے۔“ جگ

یت سکھ چیخا ”تم انہیں دیکھو۔ میں اسپتال فون کرتا ہوں۔“

وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

جاگی کو امرتا کو رنے سنبھال لیا اور میں نے تھائی کا سر پٹی گود میں سنبھال لیا۔

”تھائی۔ تھائی۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں ہوں۔“

میں بار بار تھائی کو بکا رہا تھا۔

تھائی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کی نظریں میرے برے پر مرکوز تھیں اور ان آنکھوں میں کیا تھا؟ میں بیان میں کر سکتا۔ ایسی چمک میں نے ابھی کی آنکھوں میں پہلی بار دیکھی تھی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر سکراہٹ آئی ہو۔

”وصلہ رکھو تھائی۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے اس پر جھٹکے ہوئے کہا۔

تھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ واضح ہو گئی۔ آنکھوں کی ہلک پھلک اور بڑھ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چمک بتر تری حدم ہوئی جلی گئی اور پھر وہ آنکھیں دیران ہو گئیں۔

”تھائی!“ میں چیخ اٹھا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے بلانے لگا۔

جاگی بھی ترپ کر میرے قریب آئی اور وہ بھی تھائی کو لٹھوٹنے سے باز رکھنے لگی۔ اتنے میں جگ جیت سکھ بھی ابھی آ گیا تھا اور بھی بہت سے لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔

”وصلہ رکھو پتر۔“ جگ جیت سکھ میرے قریب بیٹھے ہوئے بولا ”میں نے فون کر دیا ہے۔ اسپریٹس ٹھوڑی دیر میں آئے گی والی ہے۔“

جاگی کے پیٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بھی جذہ حال سی ہو کر ایک طرف کو لڑھک گئی۔ جگ جیت سکھ نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

امرتا کو ر اور دو اور عورتیں تھائی پر جھک گئیں۔ امرتا کو ر نے تھائی کو اپنی آنکھوں میں لے لیا۔ دوسری عورت جھک کر تھائی کو دیکھتی رہی اور پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

”یہ جا چکی ہے۔“

ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”نہیں!“ میں ایک دم چیخ اٹھا اور تھائی کو کھینچ کر دوبارہ اپنی آنکھوں میں سیٹھ لیا۔

اسی وقت سائرنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں اور پھر دو منٹ کے اندر اندر دو اسپریٹس اور پولیس کی ایک کار گلی میں داخل ہو کر رک گئیں۔

پولیس پارٹی کا انچارج ایک چینی سب انسپکٹر تھا۔ اس نے صورت حال کا تجزیہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ ایک اسپریٹس میں ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس نے تھائی کو دیکھا اور دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے مگر میں تھائی سے الگ ہونے کو تیار نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر زبردستی ایک طرف کھینچ لیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر تھائی کو دیکھا اور پھر اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

جاگی کو ایک اسپریٹس میں اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ میں اپنے آپ کو ان آدمیوں کی گرفت سے چمڑا کر دوبارہ تھائی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کا سراپنی گود میں رکھا اور ہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

تھائی ہم سے چھڑ گئی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

○☆☆○

سنگاپور میں مجھ کے ماننے والے بھی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ تھائی کی آخری رسومات مجھ عقیدے کے مطابق ادا کی گئی تھیں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر دیا تھا۔ ماں باپ کے بعد مجھے تھائی ہی سے محبت ملی تھی۔ اسی سے مجھے ماستا ملی تھی اسی سے مجھے محبوب کا پاپا ملا تھا۔ وہی میرے لیے سب کچھ تھی اور اب سب کچھ مجھ سے چھین گیا تھا۔

جاگی سنگاپور جنرل اسپتال میں تھی جہاں اس کی

فانگ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے پیچھے بھی پہنچ گیا تھا اور یہاں دارا نے اسے مجھ سے بھڑکایا بالآخر وہ میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو گیا۔

پولیس نے ابھی تک کیس کی ابتدائی رپورٹ کی تھی۔ انسپکٹر چینگ شو چونکہ برسوں پہلے بھی میرے کا انچارج رہ چکا تھا اس لیے یہ کیس بھی اس کے کردیا گیا۔

جی فانگ کی موت اگرچہ میرے ہی ہاتھوں واقع ہوئی تھی مگر تجزیہ میری انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ میں فانگ پر آخری وار کر کے تجزیہ کے سینے ہی میں چھوڑ دیا تھا اور جی فانگ نے اپنے سینے سے وہ تجزیہ کا پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح خون آلود میری انگلیوں کے نشان مٹ گئے تھے اور جی فانگ کا کے نشان آگئے تھے۔

پولیس رپورٹ میں میرے خلاف کوئی سنگین الزام تھا۔ میں نے اپنا دفاع کیا تھا۔ اس طرح ایک حملہ فانگ (میرے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پولیس رپورٹ میں اگرچہ مجھے کیڑے تھالین مجھے شامل تفتیش رکھا گیا تھا۔

میں پولیس کی اجازت کے بغیر سنگاپور سے باہر جاسکتا تھا لیکن جزیرے پر کہیں بھی آمدورفت کے پوری آزادی تھی۔

دس دن گزر گئے۔ جاگکی اسپتال ہی میں تھی۔ دیکھ بھال کے لیے جگ بیت سنگھ کی بیٹی زنجی بھی ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ میں بھی دن میں ایک آدھ اور رات کو بھی دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اکیلے رہتے ہوئے مجھے بڑی وحشت ہونے لگی تھی کسی نہ کسی طرح گزر جانا گھبرات کو تنہائی میں طے کے خیالات مجھے گھبرلاتے تھے۔ تنہائی کا خیال مجھے بے چیرہ اس کی یاد سے بعض اوقات میرے منہ سے بے سسکیاں نکل جاتیں۔

تنہائی نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ملاقات سے پہلے بڑی پرسکون اور خوش حال زندگی تھی لیکن مجھے پناہ دے کر وہ مشکلات کا شکار ہو گیا میرے ساتھ وہ بھی اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگی اور بالآخر میری خاطر اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ اور جاگکی۔ وہ بھی تنہائی سے کسی طرح پیچھے نہیں اس نے بھی اپنا سب کچھ برباد کر دیا تھا۔ میری خاطر

حفاظت کے لیے پولیس کا ایک پورا اسکواڈ موجود تھا۔ جی فانگ کی لاش تین دن تک اسپتال کے مرده خانے میں رکھی رہی تھی اور بالآخر ایک رفائی دارا کے ذریعے اس کی آخری رسومات بھی ادا کر دی گئیں۔

جاگکی کے پیٹ فانگ اور باؤ پر زخم تھے۔ تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ میں پولیس کی تحویل میں تھا لیکن مجھے باقاعدہ طور پر حراست میں نہیں لیا گیا تھا اس لیے مجھے سلاخوں کے پیچھے بند بھی نہیں کیا گیا تھا۔

جاگکی نے زخمی ہونے کے باوجود جس طرح ہمت اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس شخص کو گرفت میں لیا تھا وہ قابل تعریف تھا۔ وہ یوریشین تھا جو اس سے پہلے بھی مختلف جرائم میں ملوث رہا تھا۔ اسے پولیس کی ایک تفتیشی ٹیم کے حوالے کر دیا گیا تھا جو اس سے دارا وغیرہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھی۔

انسپکٹر چینگ شو پاگل ہوا پھر رہا تھا۔ ان دو پولیس والوں کو غفلت رہنے کے الزام میں معطل کر دیا گیا تھا جنہیں سادہ لباس میں ہماری حفاظت پر مامور کیا گیا تھا لیکن میرے خیال میں ان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان سے کوئی غفلت بھی نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں جب وہ کار ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزری تھی تو وہ یہی سمجھتے تھے کہ ہم پر حملہ کیا گیا ہے اور وہ ہمیں چھوڑ کر اس کار کے تعاقب میں نکل گئے تھے اور وہ کار بھی انہیں چکامدے کر نکل گئی تھی اور جب وہ واپس آئے تھے تو ہم پر قیامت گزر چکی تھی اور یہ انکشاف تو دارا ہی نے کیا تھا کہ محافظوں کو ہٹانے کے لیے ہماری کار کے قریب ہوائی فائرنگ والا ڈراما کیا گیا تھا۔

پولیس نے جزیرے سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکابندی کر دی تھی۔ ان رپورٹ ملائیشین ریلوے اسٹیشن ملائیشیا کی طرف جانے والی مسافروں کے گھات اور بس ٹرمینل کے علاوہ کاروں پر ملائیشیا کی طرف جانے والی ٹیکسیوں اور پرائیویٹ گاڑیوں کی بھی بڑی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔

شہر میں بھی جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے تھے۔ درجنوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی جارہی تھی لیکن دارا کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ دارا نے فرار ہوتے وقت کسی پنڈت کو آواز دی تھی اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پنڈت مرنی دھر تھا۔ سنگاپور میں دارا کا نیا دوست جس نے اسے پناہ دے رکھی تھی۔ یہ اندازہ تو مجھے بنگاک ہی میں ہو گیا تھا کہ دارا جی

موت کے منہ میں چلا لگائی تھی اور اب بھی وہ موت کے منہ سے نکلی تھی۔ یہ تو میں نے پہلے بھی ملے کر دکھا تھا کہ دارا کو کسی صورت میں زندہ نہیں چھوڑتا۔ وہ اپنے جرائم کی فہرست میں مسلسل اضافہ کرتا رہا تھا اور اب تھائی کو مجھ سے چھین کر اس نے اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کر لی تھیں اور میں نے قسم کھائی تھی کہ دنیا کے آخری سرے تک اس کا چچا کھوں گا۔

پولیس دارا اور پنڈت مہلی دھر کی تلاش میں تھی لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ سنگاپور کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بھی انہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ یا تو کسی رات سنگاپور سے نکل گئے تھے یا وہ اگر سنگاپور میں تھے تو کسی جگہ دیک کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ انہوں نے کسی مندر میں پناہ لے رکھی تھی۔ میں نے انسپکٹر چانگ شو کے سامنے بھی اپنے اس شبہ کا اظہار کیا تھا لیکن محض شبہ کی بنا پر کسی مندر پر چھاپا نہیں مارا جاسکتا تھا البتہ مندروں کی خفیہ طور پر نگرانی کی جارہی تھی۔

میں بھی اپنے طور پر اس کی تلاش میں تھا۔ اگرچہ یہ خطرہ بھی تھا کہ اچانک ہی کسی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے لیکن اب مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں ہر خطرے سے بے نیاز آزادی سے گھوم پھر رہا تھا۔ میرے لیے اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ سوائے اس کے کہ مجھے دارا سے اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام لینا تھا اور اب تھائی کے قتل نے میرے انتقام کی آگ بھڑکادی تھی اور میں نے صرف ایک بات طے کر لی تھی۔ مرویا مارو اور مجھے یقین تھا کہ دارا کو ٹھکانے لگائے بغیر میں نہیں مروں گا۔

پولیس تباہی معاشقہ کر رہی تھی میں بھی دارا کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ میں نے اپنی توجہ مندروں پر مرکوز رکھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر دارا سنگاپور میں موجود ہے تو وہ کسی مندر ہی میں چھپا ہوا ہوگا۔ سنگاپور میں کی مندر تھیں۔ کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے۔ ان مندروں میں ہی دارا کو تلاش کرنے کے لیے میں نے خفیہ طور پر دو آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں۔ وہ دونوں ہندو تھے اور مندروں میں گھومتے رہتے تھے لیکن وہ بھی دارا یا مہلی دھر کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے تھے۔

سنگاپور جزیروں سے ملائیشیا جانے کے لیے کئی ذرائع تھے۔ ہوائی جہاز، ٹرین، بسوں یا ٹیکسیوں کے ذریعے بڑی آسانی سے جزیروں چھوڑا جاسکتا تھا بشرطیکہ تمام کاغذات مکمل

ہوں۔ غیر قانونی طور پر جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ کشتی۔ ملائیشیا جانے کے لیے کشتیوں کے دو گھاٹ تھے جہاں سے چھوٹی کشتیوں کے علاوہ اسٹیمر بھی چلتے تھے۔ میں ان دونوں لیری اسٹیشنوں پر بھی معلومات حاصل کر رہا تھا کہ اس رات یا اس کے بعد کوئی کشتی غیر قانونی طور پر حاصل کی گئی ہو لیکن اس طرح بھی کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

پندرہ دن ہو چکے تھے۔ جاگتی کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ تھوڑا بہت چلنے لگی تھی۔ مجھے کمر کی تھائی بری طرح چلنے لگی تھی اور جاگتی بھی اسپتال میں پڑے پڑے تک آئی تھی۔ چنانچہ میں اسے کمر لے آیا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک پرائیویٹ نرس کا انتظام بھی کر لیا۔

جس روز میں جاگتی کو اسپتال سے کمر لے کر آیا تھا اس سے اگلے ہی روز میرے چھوڑے ہوئے دو جاسوسوں میں سے کمار نامی شخص نے اطلاع دی کہ چائنا ٹاؤن میں واقع ہونان مندر میں کچھ مشتبہ سرگرمیاں دیکھی گئی ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق گزشتہ رات وہ ایک سادھو کے ہمیں میں اس مندر میں موجود تھا۔ اس نے ایک یوریشین عورت کو ایک سادھو کے ساتھ مندر کے اندرونی حصے کی طرف جانے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ دوسرے مذہب کے لوگوں کا مندروں میں آنا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ باہر سے آنے والے سیاح مندروں اور مسجدوں میں بھی جاتے ہیں لیکن جس یوریشین عورت کو اس سادھو کے ساتھ مندر کے اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے وہ جانتا تھا۔ وہ جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک ہوٹل میں ویڈیو ہوا کرتی تھی۔ کما نے پہلی مرتبہ اسے اسی ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کا روار قابل تعریف نہیں تھا۔ وہ بیسے لے کسی بھی مروے کے ساتھ کہیں بھی جاسکتی تھی اور کچھ کم کر سکتی تھی۔

کمار کے کہنے کے مطابق وہ اس وقت تک مندر میں موجود رہا تھا جب دوازے بند کیے جا رہے تھے۔ اس وقت تک وہ یوریشین عورت باہر نہیں آئی تھی۔ مندر بند ہو۔ کے بعد بھی کمار رات بھر یا ہر چھپا بیٹھا رہا تھا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ وہ یوریشین عورت رات بھر مندر میں ہی ہے یا رات کے کسی حصے میں مندر کے کسی اور خفیہ راستے سے باہر نکل گئی تھی۔“ کمار نے کہا۔

”کمار مندر میں۔“ ”تم نہیں جانتے باس۔“ کمار نے میری بات کا رد

”میں بندہ ہوں۔ اپنے پنڈتوں اور پجاریوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ مندر ان کے لیے نہ صرف کمانی کا ذریعہ بلکہ عیشی کے اڈے بھی ہیں۔ تمہاری مسجدوں میں تو جوتے پہن کر جانا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے مگر ہمارے مندروں میں ایسی ایسی حرکتیں ہوتی ہیں کہ کوئی ایسی شاید ایسی باتوں پر یقین نہ کرے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”مجھے یقین ہے کہ مہلی دھر اس مندر میں کہیں چھپا ہوا ہے اور اگر وہ نہ ہو تو کوئی دوسرا لوگ ہوں گے جو۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کا ٹھنڈی ”لیکن اس کی تصدیق کس طرح کی جائے۔“ ”کمار نے کہا ”اس کام کے لیے کسی خوب صورت ہندو عورت کو آمادہ کیا جائے۔ اگر تم کو تو میں اس کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“

”کون ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔ ”میری ایک دوست۔“ کمار نے جواب دیا ”قابل بھروسہ اور نڈر۔ وہ اندر تک کی بات معلوم کر لے گی۔“ ”ٹھیک ہے۔ اس سے بات کر لو۔ مجھے زیادہ سے زیادہ دو دن میں معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہاں کون ہے اور کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

اور پھر اس کے دو دن بعد مجھے مرلانا نامی اس عورت سے بھی رپورٹ مل گئی۔ وہ پوری رات مندر میں گزار کر آئی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق دارا یا مہلی دھر میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ البتہ ان کا ایک اور ساتھی وہاں چھپا بیٹھا جو اس رات ہمارے خلاف ہونے والی کارروائی میں شریک تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ پولیس کی سرگرمیاں سو پڑیں تو وہ سنگاپور سے بھاگ نکلے۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس رات تین آدمی بھر حملہ آور ہوئے تھے۔ ایک چچی فانگ جو مارا گیا تھا۔ دوسرا مہلی دھر جو بھاگ کر کار میں سوار ہو گیا تھا۔ تیسرے کو جاگتی نے پکڑ لیا تھا۔ چوتھا دارا تھا لیکن وہ کون تھا۔

اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ جب یہ سارا ہنگامہ ہو رہا تھا تو دارا کار کے قریب کھڑا تھا اور کار کا انجن اشارت تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک آدمی کار میں بھی اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور یہ یقیناً وہی آدمی ہوگا جس نے مندر میں پناہ لے رکھی تھی اور اس سے دارا یا مہلی دھر کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔

میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ مندر پر بلر بول سکتا۔ اس لیے میں نے انسپکٹر چانگ شو کو صورت حال سے آگاہ

کر دیا۔

اور پھر اسی رات چانگ شو نے مندر کو گھیرے میں لے کر چھاپا مار دیا۔ ہریش چندر نامی اس شخص نے مندر کے پچھلی طرف ایک خفیہ دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن دھرا لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ مندر کے دو پنڈت اور دو عورتیں بھی پکڑی گئی تھیں۔

ہریش چندر پنڈت مہلی دھر کا آدمی تھا جو دارا کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس رات اس نے دارا اور مہلی دھر کو ایسٹ کوٹ پارک وے پر اتار دیا تھا۔ کار کو کسی اور جگہ چھوڑ کر وہ اس مندر میں آ گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ دارا اور مہلی دھر کہاں ہیں۔ وہ خود میاں سے نکلنے کے لیے موقع کے انتظار میں تھا۔ ہریش چندر پر تھوڑا ڈگری بھی استعمال کی گئی تھی مگر اس کے بیان میں فرق نہیں آیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ چھپ چھپ نہیں بول رہا تھا۔

سارے راستے ایک بار پھر بند ہو گئے لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ دارا وغیرہ کو سنگاپور سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ جزیروں پر ہی کچھ روپوش تھا اور مجھے توقع تھی کہ بہت جلد اس سے میرا سامنا ضرور ہوگا۔ جاگتی کی حالت۔۔۔ پہلے سے کافی بہتر تھی۔ اب وہ اٹھ کر چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگی تھی۔ اس لیے نرس کی چھٹی کروی گئی تھی۔ دن کے وقت امریتا کو یا اس کی بیٹی زرنجی آجاتی تو کھانا وغیرہ تیار کر دیتی۔ رات کو جگ بیت سنگھ دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔

نرس کی چھٹی کروی کے بعد میں نے اسپرنگ والی ایک چارپائی جاگتی والے کمرے میں ڈال لی تھی اور رات کو میں وہیں سو گیا تھا۔

جاگتی کئی روز تک مضعل اور اداس سی رہی۔ تھائی کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا جاتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں پر لگے ہوئے زخم بھی بھرنے لگے۔

جاگتی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی غود کر آئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں شرارت بھی چمکنے لگی تھی۔

پہلے میں تھائی میں اس کے قریب رہتے ہوئے گھبراہٹ کرتا تھا۔ ایک آنجانا سا خوف رہتا تھا کہ وہ مجھ سے کس وقت کیا کر گزرے لیکن حیرت کی بات تھی کہ اب مجھے اس سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اور نہ اس کی آنکھوں کی چمک سے۔ اب تو

میں اس سے دور بھی نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میری نیت یا عزائم میں کچھ تبدیلی آگئی تھی اور مزید حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جاگتی میں بھی بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس رات ہوا جب میرا سر درد سے چٹا جا رہا تھا۔ اسپرین کھانے کے باوجود کوئی افادہ نہیں ہوا۔ میں اس وقت جاگتی کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور وہ میرا سر دبا رہی تھی۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بولے بولے دباتی رہی۔ مجھے تو یقین بھی کہ وہ کوئی شرارت کرے گی۔

میں اس کی گود میں سر رکھے ہوئے سو گیا۔ رات کے پچھلے پر میری آنکھ کھلی تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جاگتی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی سو رہی تھی۔ میرا سر اس کی گود میں تھا اور اس کا ہاتھ میرے سر پر۔ میں نے اٹھنا چاہا تو وہ۔۔۔

ہڑٹا کر جاگ گئی۔  
”شٹی!“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ”سوجاؤ۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔“ وہ دوسرے ہاتھ سے پھر میرا سر دبائے لگی۔

مجھے بڑی شدت سے تھائی یاد آگئی۔  
”جاگتی۔“ میں نے اس کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے کہا

”تم رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی ہو۔“  
”اوہ۔“ وہ جیسے حواس میں آگئی ”تمہارا سر دکھ رہا تھا نا۔ کیسی طبیعت ہے اب۔ سوجاؤ۔ میں تمہارا سر دبا دوں۔“

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں جاگتی۔“ میں نے جواب دیا  
”تم رات بھر بیٹھی میرا سر دباتی رہی ہو۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم آرام سے سوجاؤ۔“

جاگتی نیچے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ میں بھی اس کے قریب لیٹ گیا۔

جاگتی نے میرے بازو پر سر رکھ دیا اور چند سیکنڈ بعد ہی اس کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد میں بھی سو چکا تھا۔

کال تیل کی گھنٹی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سامنے دو پار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ جاگتی اب بھی میرے بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ مصوہیت تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سر کے نیچے سے نکالا اور

باہر آکر دو واڑہ کھول دیا۔  
وہ چابی امریتا کو رکھی تھی۔ جو آلو کے پراٹھے بنا کر لائی تھی۔ میں نے جاگتی کو دیکھا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم

بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اس دوران میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسپور اٹھالیا۔ بیلو کے جواب میں دوسری طرف کی آواز سن کر میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔

وہ دارا تھا۔  
”امید ہے تمہاری طبیعت کچھ صاف ہوگئی ہوگی۔“ وہ کہہ رہا تھا ”اس رات تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ گئے۔ جی فانگ اپنے ہاتھوں سے تمہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا جس طرح اس نے تمہاری ماں کو اسی جگہ خنجر کے بے در پے وار کر کے ہلاک کیا تھا مگر وہ تمہاری چینی تھائی اس لئے آڑے آگئی اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور جی فانگ خود تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اچھا ہوا امریکا سالا۔ بوجھ بن گیا تھا مجھ پر۔ اور اب۔“

”تمہاری باری ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی  
”تم کب تک چپے رہو گے۔ سنا پور بہت پھونکی سی جگہ ہے میں ایک نہ ایک دن تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”جزیرے کی ساری پولیس مجھے تلاش نہیں کر سکی تو تم کیا کر لو گے اور اب تو ویسے بھی میں تم لوگوں کی پیچھے سے دور نکل چکا ہوں۔“ دارا نے کہا۔

”تم میری پیچھے سے دور نہیں جا سکتے۔“ میں نے کہا۔  
”اس وقت تو میں تمہاری وسرے سے بھی بہت دور ہوں۔“ دارا نے کہا ”جس رات پولیس نے ہونامان مندر پر چھاپا مار کر ہریش چندر کو گرفتار کیا تھا اس رات میں اس مندر سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک اور بلڈنگ میں

تھا اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں کل رات ہی سنا پور سے ایک کشتی کے ذریعے لائیکا کے جزیرے جو بوہر پہنچ گیا تھا اور اس وقت تو کوالا لپور میں بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ گھنٹوں بعد میں یہاں سے بھی نکل جاؤں گا۔ چند گھنٹوں بعد

جماز مجھے پاکستان پہنچا دے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”مجھے یہ اعتراف کرنے میں ہلک نہیں کہ تمہاری وجہ سے مجھے اس وقت میدان چھوڑنا پڑا ہے لیکن میں ہلک نہیں رہا پھر آؤں گا۔ نئی طاقت کے ساتھ اور اپنے ہاتھوں سے تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔“

میں کچھ کہتا چاہتا تھا لیکن لائن کٹ گئی۔ میں نے ریسپور رکھ دیا۔

میں نے امریتا کو رکھی موجودگی میں کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا لیکن بھر حال وہ سمجھ گئی تھی کہ کسی کی کال ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد امریتا چلی گئی تو میں نے جاگتی کو بتا دیا کہ دارا اس وقت کوالا لپور میں ہے اور دو گھنٹوں بعد وہاں سے پاکستان کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔

”انسپکٹر چیانگ شو کو بتا دو۔“ جاگتی نے کہا ”وہ کوالا لپور پولیس کو فون کر دے گا۔ دارا کو ہوائی اڈے پر پکڑا جا سکتا ہے۔“

”بیکار ہے۔“ میں نے کہا ”وہ بہت چالاک ہے۔ ایک مہینے سے یہاں چھپا ہوا تھا لیکن پولیس اسے تلاش نہیں کر سکی۔ وہ کل رات بڑے اطمینان سے یہاں سے نکل گیا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ ظاہر ہے پولیس میں سب ہی لوگ چیانگ جیسے فرض شناس اور دیانت دار۔۔۔ نہیں ہیں۔

دارا کسی بھی دیانت پولیس آفسیر کی مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ بہرحال جس طرح وہ یہاں سے نکل گیا ہے اسی طرح کوالا لپور سے بھی نکل جائے گا۔ اب اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجھے پاکستان جانا پڑے گا۔“

”کیا۔!“ جاگتی اچھل پڑی ”تم پاکستان جاؤ گے؟“  
”ہاں۔“ میں نے جواب دیا ”میرا اصل وطن تو پاکستان ہی ہے۔ میں نے جنم تو اس مٹی سے لیا تھا۔ دارا سے دو دو ہاتھ کرنے کے علاوہ مجھے ملک فوٹوش علی سے اپنے باپ کا حساب بھی کرنا ہے۔“

جاگتی جواب دینے کے بجائے مجھے سختی رہ گئی۔  
اس روز میں نے بہرحال انسپکٹر چیانگ شو کو دارا کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں پاکستان جانا چاہتا ہوں اور کاغذات و فیملی کی تیاری کے سلسلے میں مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

انسپکٹر چیانگ شو مجھے روکنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی کوئی بات نہیں مانی اور اپنے طور پر تیاری شروع کر دی۔ جاگتی بھی میرے ساتھ جانے کو تیار تھی۔

دارا سے میری جو جنگ کئی سال پہلے شروع ہوئی تھی وہ ابھی تک جاری تھی۔ اس میں زیادہ نقصان تو میرا ہی ہوا تھا۔ میرے بعد وہ میرے چاہنے والے ہی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ابھی یہ جنگ ادھوری تھی اور میں اسے اختتام تک پہنچانے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

دس بارہ دن اور لگ گئے اور پھر وہ دن بھی آگیا جب میں اور جاگتی سنا پور اتر لائن کی ایک فلائٹ سے پرواز کر رہے تھے۔

اس فلائٹ کا پہلا اسٹاپ ہندوستان کا شہر بمبئی تھا اور اس کے بعد کراچی۔

بمبئی سے ٹیک آف کرنے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوائی جہاز اترپاکٹ میں آگیا۔ مسافروں کو اسے سیٹ بیلٹ باندھ لینے کی ہدایت کر دی گئی۔ جہاز بڑی طرح لٹکھڑا رہا تھا۔ کبھی ایک طرف جھٹکتا اور کبھی دوسری طرف۔

جہاز کے مسافروں میں مختلف قومیتوں اور مذاہب کے لوگ تھے سب لوگ بلند آواز سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ جہاز کے ٹیک سسٹم سے بار بار مختلف اعلان ہو رہے تھے۔ آخری اناؤنٹس منٹ یہ تھی کہ جہاز کو کراچی لے جانے کے بجائے راجستان کے شہر جودھ پور کے ہوائی اڈے کی طرف لے جائے گی کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس اعلان کی بازگشت ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ جہاز تیزی سے بائیں طرف جھٹکے لگا۔ بعض مسافر چیخ رہے تھے۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو کیا منہ کو آتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

زمین بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بچپن میں قرآن شریف کی جتنی سورتیں پڑھی تھیں زیر لب دہرانے لگا۔ ہوائی جہاز بڑی تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ میرے کان کسی دھماکے کے شکر تھے اور اس دھماکے کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جاتا۔ جہاز کے تقریباً دو سو مسافر بڑی تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ زمین کا فاصلہ کچھ اور کم ہو گیا تھا۔ جہاز بڑی تیزی سے بائیں پہلو پر نیچے جا رہا تھا۔ نیچے ایک بہت بڑی جھیل تھی جو ابھی میرے قریب آ رہی تھی یا یہ لفظ دیگر جہاز بہت تیزی سے جھیل کے پانی میں غوطہ لگانے کے لیے جھک رہا تھا۔ جھیل کے آس پاس اونچے درخت

اب صاف دکھائی دے رہے تھے اور میرا خیال تھا کہ جہاز پہلے ان درختوں سے ٹکرائے گا۔

میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ہماری زندگیوں کا خاتمہ ہونے میں صرف چند ہی لمحوں باقی رہ گئی تھیں لیکن پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔ جہاز بڑی تیزی سے اوپر اٹھنے لگا۔

ہوا کے گرد اب میں پھنسا ہوا ہوائی جہاز کئی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔ تقریباً دو سو مسافروں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں جن میں سے بیشتر لوگ چیخ رہے تھے۔ باقی اونچی آواز میں اپنی اپنی زبان میں اپنے اپنے خدا کو یاد کر رہے تھے اور پھر اسی شور میں جہاز کے ٹیک سسٹم پر اتر ہو سنس کی چینی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔



”ممتاز مسلمانوں سے درخواست ہے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ جہاز کنٹرول میں ہے۔ کسی ایئر پورٹ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اب ہم ریگستان پر کریش لینڈنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں۔ سیٹی بیٹھ کھولنے کی کوشش نہ کریں اور۔۔۔“ اس کے بعد ایئر ہوسٹس کی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کی ساری جہازیں بھی بجھ گئی تھیں۔ جہاز کا ایک انجن بند ہو گیا تھا۔ تاریکی چھاتے ہی ایک مرتبہ پھر مسافروں کی چیخیں گون آنیں۔

جہاز دائیں بائیں جھکولے کھاتا ہوا اپنے جھک رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس جھیل کا آب نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا جو کچھ دیر پہلے نظر آتی تھی۔ چاروں طرف وسیع و عریض اور لہو و دق صحرا نظر آرہا تھا اور جہاز اس ریگ زار پر جھک رہا تھا۔

میں نے گردن گھما کر جاگی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ خوف سے پیلا ہو رہا تھا اور ہونٹ بڑی در سے حرکت کر رہے تھے۔ وہ زہر لب کوئی دغا مانگ رہی تھی مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آگے والی سیٹ کو تھام رکھا تھا۔ اس علاقے کی ریت شاید سخت تھی کیونکہ جہاز زمین

سے ٹکرا کر کئی فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جہازیں ایک بار پھر روشن ہو گئیں۔

جہاز دور سری مرتبہ زمین سے ٹکرایا تو مسافروں کی چیخیں پہلے سے زیادہ خوفناک اور بلند تھیں۔ جہاز مینڈک کی طرح سخت ریتیلی زمین پر چھڑک رہا تھا۔ اسے بڑے زوردار جھٹکے لگ رہے تھے۔ میرا خیال تھا جہاز کے پٹے ریت میں دھنس رہے تھے۔ ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ جہاز کی باڈی زمین پر رگڑ کھانے لگی۔ کئی مسلسل جھٹکے لگنے کے بعد ایک اور زوردار جھٹکا لگا اور جہاز رک گیا۔

کئی مسافروں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ایئر ہوسٹس کچھ کہہ رہی تھی مگر مسافروں کی چیخ دیکار میں اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی مسافر اپنے بیٹھ کھول کر سیٹوں سے اٹھ رہے تھے۔ ایئر ہوسٹس اب بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی لیکن لوگوں کے شور میں اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اور پھر جہاز کے دروازے کھل گئے۔ لوگ بدحواسی

کے عالم میں دروازے کی طرف لپکے۔ جہاز کا دروازہ زمین سے تقریباً بیس فٹ بلند تھا۔ دو چار آدمیوں نے چھلانگ لگی تھی۔ ان میں سے ایک کی خوفناک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ دوسرے رک گئے۔

”جہاز بیٹھنے والا ہے۔ باہر چھلانگ لگا دو۔“ یہ کسی مسافر کی آواز تھی جو چیخ چیخ کر جہاز کے دھماکے سے پٹنے کی پیش گوئی کر رہا تھا۔

دو چار اور آدمیوں نے چھلانگ لگا دی اور پھر ایئر ہوسٹس کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو پرسکون رہنے کی درخواست کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آپ لوگ پرسکون رہیں۔ جہاز کے شوٹس کھولے جا رہے ہیں۔ برائے مہربانی ان شوٹس پر دوڑنے کی کوشش نہ کریں اور نیچے اتر کر جہاز سے زیادہ سے زیادہ دور چلے جانے کی کوشش کریں۔ شوٹس کھلنے کے بعد پہلے خواتین اور بچوں کو اترنے کا موقع دیں۔“

جہاز کے دونوں طرف ایمرجنسی دروازے کھل گئے اور جہاز کے اندر پوشیدہ شوٹس سلائیڈز کی طرح پھٹنے لگے۔ باہر نکل گئے۔ ان کے اگلے حصے زمین پر ٹک گئے۔ اس طرح جہاز کے دروازوں سے زمین تک ایک ڈھلان بن گئی۔ اس ڈھلان پر دوڑنا ممکن نہیں تھا۔ صرف پھسل کر ہی اترنا جاسکتا تھا۔ لوگ سیٹوں کے درمیان ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

”پہلے بچوں اور خواتین کو اترنے کا موقع دیں پلیز!“ کوئی آدمی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر ایک کو اپنی جان باری تھی اور ہر کوئی سب سے پہلے جہاز سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ خطرہ برحال اپنی جگہ موجود تھا کہ جہاز کی فیول ٹینک کی بھی وقت زوردار دھماکے سے پھٹ سکتا تھا۔

میں اور جاگی بھی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر دھکے کھاتے ہوئے ایک ایمرجنسی دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت وہ عورتیں اپنے بچوں کو سینوں سے چٹائے شوٹ کی چٹکی ڈھلان پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے خوف سے زرد تھے۔ ہمارے عقب میں ایک آدمی دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔

”جہاز کے پچھلے حصے سے شوٹس کی آواز آ رہی ہے۔“ وہ چیخ رہا تھا ”جلدی باہر نکلو۔ جہاز پھٹنے والا ہے۔“

لوگوں میں کچھ اور بھی خوف و ہراس پھیل گیا اور پھر وہی غصہ دوسروں کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر شوٹ

کی ڈھلان پر بیٹھنے کے بجائے دوڑنے لگا۔ دوسرے ہی قدم پر اس کا چہرہ پھیلا۔ اس نے پھٹنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ منہ کے بل گرا اور غلابازیاں کھاتا ہوا گرنا چلا گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بڑی خوفناک تھیں۔

لوگ افزاتفری میں شوٹس سے اتر رہے تھے۔ وہ غصہ غصے ریت پر پڑا مایا بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ دو آدمیوں نے اسے اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا۔ کچھ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

میں اور جاگی نیچے اترے تو وہ غصہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ختم ہو چکا تھا۔

جہاز کے پچھلے حصے سے بڑے زور کی شوٹس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کسی نے چیخ کر اس طرف متوجہ کیا تو لوگ بدحواس ہو کر ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک ایمرجنسی عورت۔۔۔ جس نے ساڑی پہن رکھی تھی پانچ سال کی بچی کو اٹھائے بائیتی ہوئی ایک طرف کو اٹھا کر رہی تھی۔ اچانک اس کا پیر ساڑی میں الجھا اور وہ منہ کے بل گر گئی۔ اس کے ساتھ بچی کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے دوڑ کر بچی کو اٹھالیا۔ جاگی اس عورت کو سہارا دے کر اٹھانے لگی اور پھر ہم دوڑتے ہوئے وہاں سے دور ہوتے چلے گئے۔

جہاز سے تقریباً سو گز دور ہم رک گئے۔ دوسرے لوگ

بھی وہاں جمع ہونے لگے۔ وہ عورت اس بچی کے ساتھ اکیلی سڑک رہی تھی۔ وہ بھی سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور اسے کراچی جانا تھا۔ اکیلی ہونے کی وجہ سے اس حادثے نے اسے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ کر رکھا تھا۔ ہم نے چونکہ اس کے ساتھ تھوڑی سی ہمدردی کی تھی اس لیے وہ۔۔۔۔۔ ہمارے ساتھ ہی کھڑی رہی۔ بچی میری گود سے اتر کر اس کی ٹانگوں سے لپٹی کھڑی تھی۔

جہاز کے دوسری طرف بھی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر کچھ لوگ ٹیلیوں میں کھڑے تھے اور کچھ ابھی تک جہاز سے اتر رہے تھے۔

جہاز کا کیپٹن اور کاک پٹ کرپوسب سے آخر میں جہاز سے اتر تھا۔ ان میں کیپٹن اور کاک پٹ کے علاوہ چار پر سر اور پانچ ایئر ہوسٹس تھیں۔ کچھ لوگوں نے جہاز کے کیپٹن کو گھیر لیا تھا اور اس سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے۔

”جہاز کا فیول ٹینک تو نہیں پھٹ جائے گا؟ جہاز تباہ تو نہیں ہو جائے گا؟ ہم کس جگہ پر ہیں؟ یہاں سے کیسے جائیں

گئے؟“ بہت سے سوال تھے جن کا پاکستان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ لوگوں کو تسلی دے رہا تھا۔ جہاز کا دوسرا عملہ بھی مسافروں کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بہت سے لوگ اپنے سامان کے لیے فکر مند تھے۔ ان میں کچھ لوگ کیسیسے بھی تھے۔ یہ لوگ سنگاپور سے جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ سنگاپور میں چند روز اپنی دکان پر بیٹھنے سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان سے بہت سے ایسے لوگ آتے ہیں جو عام استعمال کا کچھ سامان اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور واپس جا کر بیچ دیتے ہیں جس سے انہیں معقول منافع ملتا ہے۔ چند روز آرام سے گزارنے کے بعد وہ دوبارہ سنگاپور آ جاتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ناہید نامی اس عورت کی باتوں سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اس کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا۔ ناہید بیوہ عورت تھی۔ تین سال پہلے کراچی میں زینفک کے ایک حادثے میں اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ کراچی کے فیڈرل لی اریا کے علاقے میں دو سو چالیس گز کے ایک مکان کے سوا کوئی

**جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا نمبر خیر مسلمان**

ایک ایسے نوجوان کی داستان عبرت  
جو حالات کے جال میں پھنس کر حرام  
کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعامیاز شہر مصنف جہاز ترقی کا منظر اور ترقی

قیمت  
نیم روپے  
60 روپے

گمراہ

8 حصے

ڈاک  
خارج  
نی  
حصہ  
23  
روپے

کتابی شکل میں تیار ہے

**کتابیات پیلی کیشنز**

چھاپہ گھر: علامہ اقبال پبلشرز

فون: 3402561-3402562-3402563

کتابیات1970@yahoo.com

پتہ: 23

74200

جائداد نہیں تھی۔ اس مکان پر بھی ناہید کے سرال والوں نے قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ جگہ اعداء تک پہنچا۔ ایک سال کی مقدمے بازی کے بعد عدالت نے ناہید کے حق میں فیصلہ دیا اور مکان کا قبضہ اسے دلوا دیا۔

شوہر کے انتقال کے بعد جو جمع ہو چکی تھی وہ مقدمے پر خرچ ہو گئی۔ شوہر کی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کی وجہ سے کسی پیشین وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ناہید انشورنس تھی۔ اسے کوئی اچھی ملازمت تو نہیں مل سکتی تھی البتہ محلے ہی کے ایک پرائیویٹ اسکول میں پرائمری کے بچوں کو پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ صرف پندرہ سو روپے تھی۔ فارغ وقت میں لوگوں کے کپڑے سی کر وہ اپنی گزر اوقات کر رہی تھی۔ اسی دوران میں ناہید کی ملاقات صدر میں الیکٹرونکس کا کاروبار کرنے والے سلطان احمد نامی ایک آدمی سے ہو گئی۔ اس نے ناہید کو سناگور کے پیچھے لگانے کی پیشکش کی۔ معقول معاوضے کے لالچ میں ناہید نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ سلطان احمد ہی نے اسے پاسپورٹ بنوا دیا تھا۔

ناہید تقریباً ڈیڑھ سال سے یہ ”پیچھے“ لگا رہی تھی اور اس مرحلہ وہ اپنی بیٹی بلی کو بھی ساتھ لے آئی تھی مگر بد قسمتی سے یہ حادثہ پیش آیا۔ ناہید کو اپنی بیٹی اور اس سلمان کی فکر بھی جو ہزاروں روپے مالیت کا تھا اور جہاز کے بیچ ہولڈ میں رکھا ہوا تھا۔

جہاز کے تمام مسافر ایک جگہ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں کئی لوگ کریٹش لینڈنگ کے دوران میں لگنے والے جھکوں سے زخمی ہوئے تھے۔ جہاز کے دروازوں سے بدحواسی میں چھلانگ لگنے والوں میں ایک آدمی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بیچ رہا تھا۔ ایک مسافر ہلاک ہوا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے شوش سے دوڑتے ہوئے اترنے کی کوشش کی تھی اور قلابازی کھاتا ہوا زمین تک پہنچا تھا۔ اس کی لاش کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ جہاز میں نہ تو آگ تھی اور نہ ہی فیول ٹینک پھنسا تھا۔ لوگ جہاز کے کیمپن اور دوسرے عمل کو گھیرے ہوئے تھے کہ وہ یہاں سے نکلنے کا کوئی حل تلاش کریں۔

جہاز کا کیمپن کو پائلٹ اور دو پر سرز کو اشارہ کرتا ہوا جہاز کی طرف چل پڑا۔ میرے ساتھ وہ دو آدمی بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔

جہاز کا کیمپن اور اس کے ساتھی تو کسی طرح شوٹ پر

سے ہوتے ہوئے جہاز میں چلے گئے اور ہم نیچے ہی رہ کر جہاز کا معائنہ کرنے لگے۔ جہاز کے پینے ٹوٹ چکے تھے۔ باؤی کا نیچا حصہ بھی زمین سے رگڑا تھا کہ ایک دو جگہوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ جہاز کا فیول ٹینک کیوں نہیں پھنسا تھا اور جہاز تباہ کیوں نہیں ہوا تھا۔ جہاز کی حالت دیکھ کر کما جا سکتا تھا کہ اب وہ پیش کے لیے سیمی رہے گا۔ اس دوران میں اگر اس کی مرمت کر بھی دی گئی تو اسے اڑانے کے لیے لیا چوڑا دن دے تعمیر کرنا پڑے گا جو ممکن نہیں تھا اور ریت پر اڑیں جیسے اس جہاز کے لیے دوڑنا اور ٹیک آف کرنا اس سے بھی زیادہ ناممکن تھا۔

دونوں پر سیرا برمنی میڈیکل سسٹم لے جہاز سے اتر آئے۔ ہم بھی ان کے ساتھ واپس آگئے اور زخمی مسافروں کو طبی امداد دی جانے لگی۔ اتر ہو شوش اس سلسلے میں بڑی مہارت کا ثبوت دے رہی تھیں۔ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اسے کمر پر باندھ دی گئی۔ اس سے زیادہ اس کی مدد نہیں کی جاسکتی تھی۔

لوگ مختلف ٹیبلوں میں ریت پر بیٹھے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ اس مصیبت سے کیسے نجات ملے گی اور ایک پر سر مسافروں کو تسلی دے رہا تھا کہ کیمپن جہاز کے ریڈر پر قریبی اڑ ہوٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کیمپن دو گھنٹوں میں امدادی ٹیم یہاں پہنچ جائے۔

میں جاگتی اور ناہید کے ساتھ لوگوں سے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ بلی ناہید سے جڑی بیٹھی تھی۔ وہ بار بار ٹھک رہی تھی اور ناہید بھی اسے پیار کرتی اور کبھی ڈانٹتے لگتی۔

ہمارے چاروں طرف دور دور تک ویرانہ تھا۔ بے برگ و گیہا ریگستان تھا۔ دور دور ریت کے ٹیلے بھی نظر آتے تھے۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ جہاز سخت ریت والے اس خطے اتر گیا تھا۔ اگر کچھ آگے لینڈنگ کی کوشش کی جاتی تو نیلور سے ٹکرا کرتا ہوا تھا۔

کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم کسی آبادی سے کتنے دور ہیں۔ کریٹش لینڈنگ سے چند منٹ پہلے میں نے ایک جمیل دیکھی تھی۔ ہو سکتا ہے اس جمیل کے آس پاس کوآ آبادی بھی ہو اور ہو سکتا ہے اس بستی کے لوگوں نے جہاز دیکھا بھی ہو لیکن جمیل کے عین قریب پہنچ کر جہاز اڑا گھڑا تھا اور تین چار منٹ تک پرواز کرتا ہوا وہاں سے ملیوں دو نکل آیا تھا۔ جمیل کے آس پاس کسی بستی کے لوگوں نے جہاز کو دیکھا بھی ہو گا تو وہ ہماری مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سنا پور سے ٹیک آف کرنے کے بعد جہاز نے بنگلورا

پورٹ پر قیام کیا تھا۔ اس وقت موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہمیں اڑ ہوٹ پر قیام کے دوران میں ہی موسم تبدیل ہونا شروع ہوا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش کے آثار تھے لیکن کنٹرول ٹاور سے جہاز کو ٹیک آف کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی شاید موسم میں شدت آنا شروع ہو گئی تھی اور پھر جہاز اڑ پائلٹ میں پھنس گیا۔ کیمپن نے شاید ایس او ایس کا سگنل نشر کر دیا تھا اور اس کے مدد ہی اڑ ہو شوش نے اعلان کیا تھا کہ جہاز کو جو وہ پور اڑ ورت کی طرف لے جانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن جہاز خیر ہواؤں کے گرداب میں پھنس گیا تھا اور پائلٹ کی وہ کوشش ناکام ہو گئی تھی لیکن اس کی ذہانت اور مہارت نے ماز کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا اور اس ریگستان میں کریٹش بڑبڑ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس وقت باغیچہ رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل تھے درخت ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہی طرف کوئی گولا بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس جگہ زمین سخت تھی اور زیادہ ریت نہیں اڑ رہی تھی۔ ریت نرم ہوتی تو یہاں اس طرح بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔

مسافروں کو پریشانی تو تھی لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ ٹلٹ جہاز کے ریڈر پر کسی قریبی اڑ ہوٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اگر کیمپن رابطہ ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ دو ان گھنٹوں میں کوئی امداد پہنچ جائے گی۔

ایک گھنٹے بعد کیمپن اور کو پائلٹ جہاز سے اتر کر آتے۔ بے دکھائی دیے۔ بہت سے لوگ ان کی طرف چل دیے۔ رانٹیں راستے ہی میں جالیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کیمپن ایک چھوٹے سے جلوس کی صورت میں اس جگہ پہنچا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے گھیر لیا۔

”امدادی پارٹی کب تک پہنچے گی کپتان صاحب؟ وہ لوگ اس کیسے پہنچیں گے؟ کیا وہ لوگ پہلے پہنچیں گے؟“ کیمپن پر سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور وہ خاموش مڑا لوگوں کی شکایں دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے کیمپن صاحب؟“ ایک آدمی نے کہا۔ آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں۔ امدادی ٹیم یہاں کب تک پہنچے گی؟“

کیمپن نے مڑ کر سوال کرنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ دیکھ کر بولا۔ ”جہاز کا ریڈر بوسٹم خراب ہو گیا ہے۔ ہمارا کسی بظ نہیں ہو سکتا۔“

ایک لمحے کو بوں لگا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سنا سنا جھگایا اور پھر کھینچوں کی سی جھنجھٹ سنائی دینے لگی۔ لوگ پہلے سرگوشیاں کرتے رہے پھر ان کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ اب کیا ہوگا؟

کسی آبادی سے ملیوں دور بے برگ و گیہا ریگستان میں بے یار و مددگار پڑے رہنے کا تصور ہی ریزہ ریزہ تھا۔

”آپ لوگ شانت رہیے۔“ کیمپن کی آواز سنائی دی۔ ”کریٹش لینڈنگ سے پہلے ہم نے ایس او ایس کا سگنل دیا تھا۔ یوں بھی کسی نہ کسی بستی سے ہمارے جہاز کو دیکھ لیا گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے شہر تک یہ خبر پہنچ جائے اور ہماری تلاش شروع ہو جائے۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔“

”موسم کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔“ ایک آدمی نے کہا۔ ”کیا ایسے خوفناک موسم میں ایسی کوئی توقع کی جاسکتی ہے۔“ ”ناپوس نہ ہوں۔“ کیمپن نے کہا۔ ”میدہ کہ جلد ہی کوئی نہ کوئی امداد پارٹی اس طرف آجائے گی۔“

کیمپن مسافروں کو تسلیاں دیتا رہا اور لوگ طرح طرح کے خدشات کا اظہار کرتے رہے۔ سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اگر کوئی امداد پارٹی نہ پہنچ پائی تو کیا ہوگا۔ مسافروں میں زخمی بھی تھے اور چھوٹے بچے بھی۔ خوراک کی صورت حال کا کلم نہیں تھا۔ آیا جہاز پر اپنی خوراک موجود تھی کہ ایک دو وقت تک تقریباً دو سو مسافروں کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اس ہولناک ویرانے میں رات بسر کرنے کا تصور ہی ہولناک تھا۔

ساڑھے باغیچہ چکے تھے۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا تھا۔ پھر دیر بعد شام ہو جائے گی اور اندھیرا گہرا ہو جائے گا اور اس کے بعد کسی امداد پارٹی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہوا کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ موسم اگرچہ بتدریج برسرکون ہوتا جا رہا تھا مگر لوگوں کے دلوں پر ایک انجانا سا خوف طاری تھا۔ اگر کوئی امداد پارٹی نہ پہنچی تو کیا ہوگا؟

”اوکے۔ وہ دیکھو۔ کوئی آ رہا ہے!“ ایک آدمی چیخ اٹھا۔

میں نے بھی چونک کر اس طرف دیکھا۔ وائیں طرف بہت دور دو گھڑ سو اڑ دکھائی دے رہے تھے اور پھر ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ جہاز کے مسافر خوشی سے چیخ اٹھے۔ امداد پہنچ رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ دور کی کسی بستی کے لوگ تھے جنہوں

نے اس طرف جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا ہوگا اور اس کی تلاش میں اس طرف نکل آئے تھے۔

ان گھڑسواروں کی تعداد پندرہ اور بیس کے درمیان تھی۔ فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ اتنا قریب آگئے کہ ہم ان کی ٹینکوں کو دیکھ سکتے تھے۔

ان گھڑسواروں کو دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ ان کے طے بہت عجیب تھے۔ کئی آدمیوں نے ڈھالے ہاتھ رکھے تھے اور ان کے چہرے جیسے ہوئے تھے۔ رائفل ہر ایک کے پاس نظر آ رہی تھی۔ ہر ایک کی کمر پر پلٹ بندھے ہوئے تھے جن میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔

میری طرح کچھ اور لوگوں کے ذہنوں میں بھی کچھ خدشات ابھرے ہوں گے جن کا اظہار ان کے چہروں سے بھی ہو رہا تھا۔

”وہ جان!“ جاگتی نے میری طرف جھٹکتے ہوئے سرگوشی کی ”یہ لوگ ہماری مدد کو نہیں آئے۔ یہ۔ یہ تو ڈاکو ہیں۔“ ہمارے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔ ان گھڑسواروں نے قریب آتے ہی ہوائی فائرنگ شروع کر دی اور اس طرح پھیل گئے جیسے ہمیں گھیرے میں لینا چاہتے ہوں۔

فائرنگ سے عورتیں اور بچے چیختے چلائے۔ کچھ مرد بھی خوف زدہ ہو گئے تھے۔ عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ہم تو پہلے ہی مصیبت میں گرفتار تھے اور اب ڈاکوؤں کے اس گروہ نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ جہاز کے مسافروں میں سے کسی کے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی جبکہ ڈاکو پوری طرح مسلح تھے۔ ان سے مقابلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوگی۔ یہ لوگ ڈاکو ضرور تھے لیکن انسان تو تھے۔ ہماری مصیبت دیکھ کر لوٹ مار کا خیال ذہن سے نکال دیں گے اور ہماری مدد کریں گے مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ وہ ڈاکو تھے جن کے دل رحم اور ہمدردی جیسے جذبات سے نا آشنا تھے۔

”سب لوگ ایک جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“ ایک گھڑسوار نے چیخ کر کہا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ لمبا قد، مضبوط جسم، سر کے بال بے خاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیک رائفل تھی۔ سینے پر کراس کرتے ہوئے دو پلٹ تھے جن میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں خون جیسی سرخی تیر رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کے

طے بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔

”دیکھو سزا!“ جہاز کا لیپٹن آگے بڑھ گیا۔ ”تم دیکھ رہے ہو کہ ہم لوگ پہلے ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ہمارے سامنے عورتیں بھی ہیں، بچے بھی اور کچھ مسافر زخمی ہیں۔ ہمارے جہاز کا ریڈیو خراب ہو چکا ہے۔ کسی طرف سے امداد کی توقع نہیں۔ تم لوگ ہماری مدد کرو۔ اگر کوئی بستی قریب ہو تو۔“ ”ہم یہیں پر بستی بنا دیں گے۔ لاشوں کی بستی۔“ ہم نے گھصنے لگا۔ وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سردار تھا۔ ”ہم ڈاکو ہیں بھائی۔ ڈاکو کا کام لوٹنا ہوتا ہے کسی کی مدد کرنا نہیں۔ سب لوگ اپنی اپنی جیبوں سے ساری چیزیں نکال کر اس طرف رکھ دو۔ اور رانا۔“ اس نے گردن ٹھکرا کر اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا ”میں نیچے چادر بچھا دے اور ان سر کی جیبیں خالی کرادے۔“

وہ آدمی گھوڑے سے اتر آیا اور زمین پر ایک چادر پھیلا دی۔

مسافروں میں سے ایک دو نے انسانیت کا واسطہ دے کر سردار کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ڈاکو تھا۔ اس نے پے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور ڈاکوؤں کا کام صرف لوٹنا ہے۔

جہاز کے مسافر بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ رانا نامی ڈاکو نے لیپٹن کو گریبان سے چمڑکے آگے لیا۔ پہلے اس کی کلائی سے کھڑکی اٹاری اور پھر جیبیں خالی کرنے کا حکم دیا۔

ان کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی خاص نہیں تھا۔ سناپ سے آنے والی عورتیں طلائی زیوروں سے لدی چنداں تھیں۔ مردوں کی انگلیوں میں بھی موٹی موٹی انگلی تھیں اور گھلے میں موٹی موٹی سونے کی چین پڑی ہوئی تھیں۔ سناپ سے خریدے جانے والے یہ سونا پاکستان جا کر منگے داموں فروخت کر دیا جاتا مگر اب یہ سب کچھ زمین پر پڑی ہوئی چادر پر ہوا رہا تھا۔

ایک آدمی نے مزاحمت کی تو رانا نامی ڈاکو نے پلا بیدردی سے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ اس شخص کی لاش ریت پر ترپنے لگی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی۔ ایک آدمی کا حشر دیکھ کر دوسروں کو مزاحمت کی جرأت نہیں ہوئی۔

سردار نے اپنے چارپانچ ساتھی جہاز کی طرف بھیج دیے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی مسافروں کا وہ سامان نیچے پھینکے۔ جو پینڈ تیل کے طور پر مسافروں نے دوران سفر اپنے پاؤں رکھا ہوا تھا۔ ان میں الیکٹرونک کا بھی بہت سا سامان موجود

تھا۔ ڈاکوؤں کی لوٹ مار جاری تھی۔ کسی کی آواز نہ رہی تھی۔ مسافروں کی جیبوں سے سب کچھ نکال لیا گیا۔ ان کی گھڑیاں اور انگلیں بھی اتروالی تھیں۔ عورتوں کے زیورات اڑا لیے گئے۔ ایک بچی کے کانوں سے سونے کی بالیاں نوج لی گئیں۔

مزاحمت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک کا انجم سب دم دیکھ چکے تھے۔ کسی اور میں احتجاج یا مزاحمت کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

دوسرے ڈاکو بھی جہاز میں سے بہت سا سامان نیچے پھینک کر باہر آگئے تھے۔ انہوں نے قیمتی سامان چادروں میں نا کر لیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ڈاکوؤں کی سرگرمیاں اڑی تھیں۔ ایک عورت اپنا لاکٹ چھانے میں کامیاب ہوئی تھی مگر اتفاق سے وہ لاکٹ ایک ڈاکو کی نظروں میں لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر عورت کے گلے پر ہاتھ ڈال دیا۔ رلاکٹ نوج لیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اچانک رگ گیا۔ اس کی نظریں عورت کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

”سردار!“ وہ چیخا ”کیا یہ خزانہ یہیں چھوڑ جاؤ گے۔“ ”بھوتوں کیسے قیمتی چیزیں ہوتی ہیں۔“ وہ اس عورت کو کلائی سے پکڑ کر کھینچا ہوا سردار کی طرف لے جانے لگا۔

عورت بری طرح چیختی ہوئی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اسے رانے کی کوشش کی تو ایک اور ڈاکو نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی رائفل کاٹ پوری قوت سے اس کے سر پر سید کر دیا۔

ادھر مگر وہ شخص چمڑکے گرا اور پھر اس کی آواز نہیں آئی۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی۔ بعض لوگوں کے چہنچہاں نکل گئیں۔ یہ جہاز کے مسافروں میں دوسرا گناہ تھا جو ان بے رحم ڈاکوؤں کی سفاکی کا شکار ہوا تھا۔ پانچ دوسرا افراد کا مجمع اس طرح خاموش تھا جیسے سب کو پ سو گھ گیا ہو۔

اور پھر فائرنگ کی آواز سے سناٹا ٹوٹ گیا۔ سردار نے قتل اور اٹھا کر ایک برست چلا دیا تھا۔ گولیوں کی آواز دیر دیر اسے مل کر گنتی رہی اور پھر بچوں کی چیخیں سنائی دینے لگی۔ عورتیں خوف زدہ ہو کر مردوں کے پیچھے چھپنے لگیں مگر یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ سردار کا اشارہ پا کر چار

ڈاکو آگے بڑھے اور چار عورتوں کو کھینچے ہوئے مجمع سے باہر نکال لے گئے۔ وہ چاروں بے حد حسین تھیں۔ ان میں ایک کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ اس نے جینز اور نی شہرت پہن رکھی تھی۔ دوسری بائیس تیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ اس نے شلوار کھینچیں پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے پر غیر معمولی تھے پانی دونوں عورتوں کی عمریں تیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوں گی۔ وہ بھی بے حد حسین تھیں۔

جاگتی اور تابید کے چہرے بھی خوف سے پیلے پڑ رہے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ جن عورتوں کو ڈاکوؤں نے اپنے قبضے میں لیا تھا ان کا کیا شہر ہونے والا تھا۔ میں بھی سمجھ گیا تھا کہ ڈاکو ان عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اس وقت تک ان کی بوئیاں نوچتے رہیں گے جب تک ان میں دم بانی رہے گا اور پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

تابید ہم سے ذرا دور ہٹ کر دو آدمیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ منجی پہلی بھی اس کی طرف لپکی۔ اس طرح تابید ایک ڈاکو کی نظروں میں آگئی۔ اس نے لپک کر تابید کو پکڑ لیا اور ایک طرف کھینچ لگا۔

پہلی چیختی ہوئی تابید سے لپٹ گئی۔ ڈاکو نے اسے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر دوڑ پھینک دیا۔ پہلی اٹھ کر دوبارہ ماں کی طرف لپکی تو ڈاکو نے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ چیختی ہوئی اچھل کر دوڑ جا کر گری۔ ایک آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھالیا اور چیخ کر اس ڈاکو کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ ڈاکو بھی ایک انداز میں ٹھٹھکتے لگتا ہوا تابید کو کھینچ رہا۔ تابید اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مزاحمت کرتی رہی۔ اس کی چیخاں مانی میں اس کی ساڑی بھی اس کے جسم سے الگ ہو گئی تھی اور اب اس کے جسم پر صرف بلاؤ زور پڑی کوٹ رہا تھا۔

تابید نے موقع پا کر دانت اس ڈاکو کے بازو پر گاڑ دیے۔ ڈاکو بلبلاتا ہوا مگر تابید نے اسے نہیں چھوڑا۔ ڈاکو نے دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار گھونسا تابید کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ تابید چیخ اٹھی۔ ڈاکو کے بازو سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹک گیا۔ تابید کے منہ سے بھی خون ٹپک رہا تھا۔ ڈاکو نے اپنے زخمی بازو کو دیکھا اور پھر گویا اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔ وہ تابید پر جھٹ پڑا۔ اس نے تابید کو گرفت میں لے کر دانت اس کے جسم پر گاڑ دیے۔ تابید کی خوفناک چیخیں اور دوسرے ڈاکوؤں کے وحشت ناک ٹھٹھکے فضا میں گونج رہے تھے۔

میں اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھ سے عورتوں کی یہ تذلیل برداشت نہیں ہو رہی تھی مگر میں

بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ دو آدمیوں  
 کا حشر میں دیکھ چکا تھا۔ اگر مقابلہ دست بستہ ہوتا تو میں  
 اب تک دو چار گولہ جرح کرچکا ہوتا مگر وہ سب آتشیں اسلحے سے  
 ليس تھے۔ ان کے ساتھ پنج لینا خودکشی کے مترادف تھا۔  
 اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں دوسروں کی طرح  
 خاموش تماشاخی بنا رہوں۔

جہاں نظمیں  
ڈاکوئیں کی دست بدست لڑائی جاری تھی اور پھر ایک  
قادر ہوا۔ کسی ڈاکو نے گولی چلا دی تھی اور پھر دست بدست  
لڑائی ایک باقاعدہ محاذ میں تبدیل ہو گئی۔ ڈاکو ایک دوسرے پر  
گولیاں برسا رہے تھے۔

کر چند منٹ میں ہی وہاں سے میلوں دور نکل گیا تھا اور پھر یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ جھیل کس طرف رہ گئی تھی لیکن دل میں امید تھی کہ شاید ہم اس طرح چلتے چلتے اس جھیل تک پہنچ جائیں۔ صحراؤں میں پانی کے کسی ذخیرے یا کسی جھیل کے آس پاس کوئی نہ کوئی آبادی ضرور ہوتی ہے اور یہ امید ہی ہمیں کشاکش کشاں لیے جاری تھی اور پھر ڈاکوؤں کے سردار کی بات بھی رہ رہ کر میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔

اس نے کہا تھا کہ یہاں سے کوسوں دور ایک بستی ہے۔ اس بستی کے لوگوں نے جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا تھا اور ممکن ہے وہ صبح تک ہماری مدد کو پہنچ جائیں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ان ڈاکوؤں نے بھی یقیناً جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا ہو گا اور اسی لیے گھوڑوں پر سوار ہو کر اس طرف آئے تھے۔ ان کا مقصد جہاز کے مسافروں کی مدد کرنا نہیں انہیں لوٹنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ عین آخری لمحوں میں جب وہ مسافروں اور جہاز سے لوٹا ہوا مال اور پانچ غوروں کو اٹھا کر فرار ہو رہے تھے، میرے اندر کی وہ ہراساں قوت (جی) بیدار ہو گئی اور یہ اسی ہراساں قوت کا کرشمہ تھا کہ ڈاکو آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ ہراساں قوت سمٹ کر میری آنکھوں میں جمع ہو گئی تھی اور میں نے اپنی نظروں کی قوت سے کام لے کر ان ڈاکوؤں کو آپس میں لڑا دیا تھا لیکن یہ بات تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کی کوئی کوئی جہاز کے فیول ٹینک میں لگ جائے گی اور جہاز تباہ ہو جائے گا۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ وہ ڈاکو اسی طرف سے آئے تھے جس طرف ہم جا رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ڈاکوؤں کا ٹھکانا زیادہ دور نہ ہو۔ چند میل۔ اور چند میل کا یہ فاصلہ چند گھنٹوں میں طے ہو سکتا تھا بشرطیکہ ہم صحیح سمت میں چلتے رہیں۔ آسمان پر گہرے بادل تھے جن کی وجہ سے تاریکی چھ اور بھی دیر ہو گئی تھی۔ ہوا اگرچہ بہت پہلے ٹھم چکی تھی لیکن مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں بارش شروع نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ہمیں کہیں پناہ نہ ملتی۔

لیکن ایک اور انکشاف نے میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہری دوڑا دی۔ مجھے اگرچہ اس کا تجربہ نہیں تھا لیکن سنا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ ریگستان کے دن گرم اور راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ صحرائی علاقوں میں دن کے وقت دماغ پھٹکا دینے والی گرمی پڑتی ہے تو رات کو جسم میں خون جمنا کر دینے والی سردی ہوتی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ ہوتا شروع ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے ہلکی سی خشکی تھی جس میں

بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ہمارے لباس بھی ایسے نہیں تھے کہ سردی کی شدت کا مقابلہ کر سکتے۔ میں نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جاگتی نے بھی ایسا ہی لباس پہنا ہوا تھا۔ ہلی کے جسم پر گھٹنوں تک لباس فراک تھا اور سفید موڑ۔ پنڈلیوں تک چڑھے ہوئے تھے جبکہ ٹائیڈ کے جسم پر صرف بلاؤز اور چٹنی کوٹ تھا۔ اس کی سازی تو ڈاکو کے ساتھ کھینچا آئی تھی۔ اتر کر گر گئی تھی۔

ہم بہت دور نکل آئے تھے۔ میں نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے کہیں بڑھ سی روشنی بھی نظر نہیں آئی۔ جہاز کی آگ یا تو بجھ گئی تھی یا ہم نشی علاقے میں آ گئے تھے جس کی وجہ سے وہ خطہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

آگے ریت نرم تھی جس کی وجہ سے تین چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ جہاں تک زمین سخت تھی ہمارے چلنے کی رفتار بھی تیزی تھی لیکن نرم ریت کی وجہ سے ہماری رفتار کم ہو گئی تھی۔ جاگتی اور ٹائیڈ تھک گئی تھیں۔ وہ بار بار رک کر ہانپنے لگتیں لیکن میں انہیں چلتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وقت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میرے خیال میں ہمیں چلتے ہوئے کم سے کم چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی سی دیر بعد جہاز تباہ ہوا تھا اور اس کے فوراً ہی بعد ہم بھاگ نکلے تھے۔ اس طرح ایک مختلا اندازے کے مطابق اس وقت دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا کوئی وقت ہو گا۔

ٹائیڈ چلتے چلتے لڑکھا کر گر گئی۔ جاگتی نے پہلے تو اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن پھر خود بھی ڈھیر ہو گئی۔ ظاہر ہے مجھے بھی رک جانا پڑا۔ اس وقت میں نے ہلی کو کسی دیرپائی کی طرح کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اسے اپنے اتار تو وہ اپنی ماں کے ساتھ بڑ کر بیٹھ گئی۔

”اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔“ ٹائیڈ نے بانیٹے ہوئے کہا ”تم لوگ جاؤ میں تمہارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گی۔“

”یہ شہر کی کوئی سڑک نہیں ریگستان ہے۔“ میں نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا ”یہاں تو دن کی روشنی میں کسی سمت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تم رات کی تاریکی میں ہمیں کیسے تلاش کرو گی۔“

”مجھ سے اب بالکل نہیں چلا جاتا۔“ وہ کراہتے ہوئے بولی ”میں نے میں درد ہوا ہے اور سردی بھی لگ رہی ہے۔ تم لوگ جاؤ۔“

”حقانہ بائیں مت کرو۔“ میں نے کہا ”ہم نہیں رات کی تاریکی میں اس دیرانے میں چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں۔ یہاں بیٹھے رہنے سے تو اور زیادہ سردی لگے گی۔ چلتی رہو گی تو خون میں حرارت پیدا ہوگی۔“

ٹھکانہ ٹائیڈ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ باپتی اور کراہتی رہی۔ جاگتی بھی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ دونوں اپنی کیفیت پر کسی حد تک قابو پانے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ میں نے ہلی کو ایک بار پھر کندھے پر اٹھایا اور اس طرح ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا مگر اب ہمارے چلنے کی رفتار کچھ اور ست ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بار بار رک جاتیں۔

ٹائیڈ ایک بار پھر گر گئی۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو چونکہ گیا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹی شرٹ اتار کر اسے پہنا دی۔

میرے جسم پر بنیان رہ گئی تھی۔ سردی اگرچہ مجھے بھی لگ رہی تھی مگر میں برداشت کر سکتا تھا۔ پچھلے کئی برسوں کے دوران میں مارشل آرٹ کی ریاضت نے مجھے اس قدر سخت جان بنا دیا تھا کہ میں موسم کی سختیاں برداشت کر سکتا تھا اور پھر میرے اندر وہ ہراساں قوت پوشیدہ تھی جو مجھے موسم کی شدت سے بچا سکتی تھی۔ میرا مطلب جی کی قوت سے تھا۔

میں اس ہراساں قوت کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ یہ قوت تو ہر جاندار کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جسے یہ قوت اجاگر کرنے کے لیے خاصی ریاضت کرنی پڑتی ہے اور بہت کم لوگ اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ اپنی ریاضت، خود اعتمادی اور ماسٹر بینک پائی اور ماسٹر لیشی پائی کی توجہ اور محنت سے اپنے اندر پوشیدہ اس ہراساں قوت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس قوت کے بل بوتے پر میں نے ڈاکوؤں کو آپس میں لڑنے پر مجبور کر دیا تھا (لیکن جہاز کی تباہی کا مجھے افسوس تھا) اور اب میرے اندر کی یہی ہراساں قوت مجھے موسم کی سختی سے بچا سکتی تھی۔

جاگتی کی حالت بھی اب غیر ہو رہی تھی۔ مسلسل چلتے رہنے سے ٹانگیں تو شل ہو رہی تھیں اب اس پر بھی سردی کا اثر ہونے لگا تھا۔ ہلی بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لپٹا رکھا تھا۔ تاکہ میرے جسم کی حرارت سے تھوڑی بہت گرمی پہنچائی رہے۔

اب پھر سخت زمین شروع ہو گئی تھی۔ میں ان دونوں کو چلتے رہنے پر مجبور کر رہا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی بہت

جواب دے چکی تھی۔ ٹائیڈ تو قدم قدم پر لڑکھا کر گر رہی تھی۔ جاگتی اپنی حالت غیر ہونے کے باوجود اسے سنبھالے ہوئے تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے سینے سے کہنی ہوتی پہلی بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ٹائیڈ سے اب واقعی تسلی نہیں چلا جا رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھا کر گر رہی تھی۔ جاگتی اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے خود بھی ڈگر رہی تھی۔

ایک موقع پر چلتے ہوئے میرے پیر کو ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھا آتا ہوا نیچے گر گیا۔ ہلی بھی میرے ساتھ ہی گر گئی تھی۔ یہ خیمت تھا کہ ہمارے سامنے جھانپاں تھیں اور ہلی جہاز میں گر گئی تھی۔ اس طرح وہ چوٹ لگنے سے محفوظ رہی تھی۔

مجھے پہلی مرتبہ جہازوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل میں امید کی ایک کرن سی جاگ اٹھی۔ جہاز یا سبز وغیرہ تو اسی جگہ ہوتا ہے جہاں زمین میں پانی موجود ہو اور ان جہازوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ قرب و جوار میں کوئی جھیل یا دریا موجود ہے۔ وہ دریا یا جھیل کہیں آس پاس بھی ہو سکتی تھی اور میلوں دور بھی۔ بہر حال ایک امید بندھ گئی تھی۔

میں نے ہلی کو گود میں اٹھایا اور ٹائیڈ اور جاگتی کی حوصلہ افزائی کرتا ہوا آگے چلے لگا۔ وہ دونوں بڑی مشکل سے میرا ساتھ دے رہی تھیں۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو اب تک کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹے مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور خوش قسمتی سے چند گھنٹہ بھی نظر آ گئے۔ یہاں یقیناً کسی زمانے میں کوئی بستی رہی ہوگی جو امتداد زمانہ سے گھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ٹائیڈ اور جاگتی ایک جگہ پر ڈھیر ہو گئیں۔ میں نے ہلی کو بھی ان کے قریب بٹھایا اور خود کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں سردی سے محفوظ رہا جاسکے۔

یہ بہت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ کوئی مکان سلامت نہیں تھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں رہ گئی تھیں۔ البتہ ان مکانات سے ذرا بہت کر ایک ٹوٹا پھوٹا مندر بھی تھا۔ یہ عمارت عمل طور پر تباہ نہیں ہوئی تھی اور اس میں پناہ لی جاسکتی تھی۔

میں جاگتی وغیرہ کو مندر میں لے آیا۔ گرمی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ بٹھالی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نکلنے دروازے میں داخل ہو کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ہلی کو جاگتی

نے گود میں لے لیا تھا۔

اب مجھے بھی تمھیں کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہم رات بھر چلتے رہے تھے۔ اس وقت آگے بڑھتے رہنے کا جذبہ تھا اور تمھیں کا احساس نہیں ہوا تھا مگر اب بڑا کڑ پر پہنچتے ہی میرا حوصلہ دم توڑ گیا اور کوئی متحمل ہونے لگا۔

میں نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دائیں طرف جاگتی بھیجی ہوئی تھی اور بائیں طرف ناہید تھی۔ وہ دونوں گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔

اندر کی فضا باہر کے مقابلے میں بہت بہتر تھی بلکہ نہایت خوشگوار تھی۔ سردی کا احساس بھی بتدریج کم ہو رہا تھا۔

میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ غوغائی سی طاری ہو رہی تھی۔ ناہید مسلسل کراہ رہی تھی۔ اس کے کراہنے کی بلکی بلکی آوازیں میری سماعت سے ٹکرانی رہیں لیکن پھر وہ آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ میں نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو بستر خاک پر دراز پایا۔ ناہید میرے بازو پر سر رکھے اس طرح سو رہی تھی کہ اس کا ہاتھ میرے سینے پر تھا اور گھٹنے دہرے ہو کر پیٹ سے ملے ہوئے تھے۔

دن کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک آنکھیں میچ چاکر صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے دوسری طرف بلکی بھی گمرد آلود فرش پر آڑی رہ تھی پڑی سو رہی تھی۔ جاگتی مجھے نظر نہیں آتی۔ میں نے ناہید کو اپنے آپ سے الگ بنایا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مندر کا بال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک طرف ٹوٹا چھوٹا سا چوہہ تھا۔ ہر طرف مگزی کے چالے تھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ایک چنگاڈ بھی پر پھر پھڑائی ہوئی باہر نکل گئی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی واپس آگئی اور چھٹ کے قریب ایک دو چکر لگانے کے بعد کسی ناریک گوشے میں غائب ہو گئی۔

جاگتی بال میں موجود نہیں تھی۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ آسمان پر بادل چھٹ گئے تھے اور سورج چمک رہا تھا۔ تیز دھوپ میں ایک لمبے کو میری آنکھیں چند ہی سہاگئیں اور جب میری آنکھیں تیز روشنی سے ماموس ہوئیں تو میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بائیں طرف بستی کے کھنڈر تھے اور سامنے تقریباً سگز کے فاصلے پر وہ جھیل تھی۔ جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ جھیل کے کناروں پر ناریل یا اس سے ملتے جلتے درخت بھی تھے مگر بالکل

نڈ منڈ۔ سوکھے ہوئے۔

جاگتی باہر بھی کسین دکھائی نہیں دی۔ میری پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ کہاں جا سکتی ہے؟

”جاگتی!“ میں نے زور سے نکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ دوسری آواز کے بعد جاگتی کھنڈروں کی طرف سے آتی ہوئی دکھائی دی تو مجھے اطمینان ہوا۔

ایک بہت بڑے سیاہ پادل نے سورج کو ڈھانپ لیا۔ میں جاگتی کے ساتھ چلتا ہوا جھیل کے کنارے پر آیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ یہ بستی دیر ان کیوں ہوئی تھی۔ جھیل کا پانی کڑوا تھا۔

ہو سکتا ہے کسی زمانے میں جھیل کا پانی میٹھا رہا ہو۔ جس کی وجہ سے یہاں یہ بستی بھی آباد تھی لیکن شاید کسی وجہ سے پانی کا ذائقہ تبدیل ہو گیا ہو۔ ہو سکتا ہے زیر زمین لیکن پانی کی کوئی رگ جھیل کے پانی سے مل گئی ہو اور اس طرح جھیل کا سارا پانی نمکین ہو گیا۔ یہ پانی کڑوے پن کی حد تک نمکین تھا اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ یہاں کی آبادی کسی اور جگہ منتقل ہو گئی تھی اور یہ بستی دیر ان ہو گئی تھی۔

میں اور جاگتی جھیل کے کنارے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ مندر کی طرف سے ناہید کی چیچی آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ ناہید کی وہ چیچی بڑی خوفناک تھی۔ میں نے مندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ جاگتی بھی میرے پیچھے دوڑی آ رہی تھی۔

ناہید کے ساتھ اب بلکی کی چیچیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں مندر کے دروازے میں داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر اس طرح رک گیا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ ناہید اور بلکی ایک طرف کھڑی بری طرح چیچ رہی تھیں اور سامنے گرو آلود فرش پر ایک آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

اس آدمی کو بلاشبہ کسی بھوت یا عفريت سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ جسم کے نچلے حصے پر بلکی سی دھوئی لپٹی ہوئی تھی۔ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ اس کی رنگت تو بے جیسی سیاہ اور سینہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ دائرہ می اور مونچھوں کے بال اس طرح آپس میں ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دبانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ ماتھے پر سفید دھاریاں (کھٹکا) سی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک ترشول بھی پڑا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں کپڑے کے ایک تھیلے کا اسٹریپ بھی نظر آ رہا تھا اور تھیلے شاید اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔

”کیا ہوا۔ کون ہے یہ؟“ میں حیرت سے اس شخص کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ جاگتی نے لپک کر بلکی کو گود میں اٹھالیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے ناہید کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی شرٹ پر خون کے دھبے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ ”بیہ یہ کیا۔ یہ خون۔“

”یہ ایک الگ معاملہ ہے۔“ ناہید نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا ”پہلے اس کو دیکھو۔“ ”ہپ۔ ہپ۔ ہپ۔ ہپ۔“

”لیکن یہ وحشی آیا کہاں سے؟“ میں نے کہا۔ ”ہپ۔ ہپ۔ ہپ۔“ ناہید ہکلائی ”میں سو رہی تھی کہ سینے پر بوجھ محسوس کر کے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس کی خوفناک شکل دیکھ کر میں چیخ اٹھی۔ میں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گر دیا اور جب یہ دوبارہ میری طرف بڑھا تو میں نے قریب پڑا ہوا وہ پتھر اٹھا کر دے مارا۔ یہ چوٹ کھا کر گر پڑا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو تم دونوں غائب تھے۔ میری چیخ سن کر بلکی جاگتی گئی اور اس وحشی کو دیکھ کر یہ بھی خوف سے پیچھے لگی۔ تم دونوں کہاں چلے گئے تھے ہمیں چھوڑ کر؟“

”اوہ!“ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے آخری الفاظ جس شاک کی بجائے میں نے اسے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہمیں محض وقتی ہم سفر نہیں اپنا سامھی سمجھنے لگی تھی ”اسے تو میں بعد میں دیکھوں گا مگر تمہاری شرٹ پر خون کے یہ دھبے کیسے ہیں؟ اگر ہوائی جہاز کی کریش لینڈنگ کے دوران میں تمہیں کوئی چوٹ لگی تھی تو تم نے بتایا کیوں نہیں تھا۔“

”مجھے چوٹ نہیں لگی تھی۔“ ناہید نے جواب دیا ”جب وہ ڈاکو مجھے اٹھا کر لے جا رہا تھا تو میں نے اس کے بازو پر دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ جس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے خون خوار۔“

”بھیرنے کی طرح میرے سینے پر دانت گاڑ دیے تھے۔ میں رات بھر تکلیف میں مبتلا رہی ہوں۔ پیدل چلتے رہنے سے تکلیف کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ اس وقت بھی بڑی اذیت محسوس کر رہی ہوں۔“

اس اذیت اور کرب کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جا سکتا تھا۔ رات کو راستے میں میں نے کئی بار اسے کراہتے ہوئے سنا تھا اس وقت میں نے کوئی خیال نہیں کیا تھا تو اب سمجھتا رہا تھا کہ وہ سردی اور تمھیں سے کراہ رہی تھی لیکن اب مختلف صورت حال سامنے آئی تھی۔ اسے سردی سے بچانے کے لیے میں نے اپنی ٹی شرٹ پہنا دی تھی جواب خون آلود ہو چکی تھی۔

”جاگتی۔ تم ناہید کو باہر لے جا کر دیکھو۔ زخم زیادہ خطرناک تو نہیں۔ میں اس وحشی کو دیکھتا ہوں۔“ میں نے جاگتی سے کہا اور وہ ناہید اور بلکی کو لے کر مندر سے باہر چل گئی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر زخم زیادہ خطرناک بھی ہوا تو ہم کیا کر سکیں گے آبادی سے دور اسے دیرانے میں اس کا علاج تو نہیں ہو سکتا تھا۔

میں اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش اور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ اس کڑوے پانی کی جھیل کے آس پاس تو کسی قسم کی زندگی کے آثار نہیں تھے البتہ نواح میں کوئی بستی ضرور موجود ہوگی۔ اس شخص کا تعلق بھی اسی بستی سے ہوگا۔

اور پھر اچانک میں چونک گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس شخص نے ایک آنکھ میں ذرا سی جھری پیدا کر کے میری طرف دیکھا ہو۔ یہ میرا وہاں بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کے پیر پر بلکی سی ٹھوک مار دی۔

”اگر تم ہوش میں آجکے ہو تو شرافت سے اٹھ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں اپنے طریقے سے ہوش میں لانے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے اس کے پیر پر ایک اور بلکی سی ٹھوک مارنے ہوئے کہا۔

اس شخص نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمبے میری طرف دیکھتا رہا پھر حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے نہ صرف قریب پڑا ہوا ترشول اٹھالیا بلکہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش بھی کی۔

مجھے اس وحشی سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی لیکن بہر حال میں غافل بھی نہیں تھا۔ اس نے ترشول سے میرے پیٹ پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں برقی سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا اور ترشول کو پچھے کے پیچھے ڈنڈے سے پکڑ لیا۔

ترشول کا ڈنڈا تقریباً چار فٹ لمبا تھا۔ دوسرا سرا اس وحشی کے ہاتھ میں تھا۔ میں ترشول کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ شخص بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ترشول کا ڈنڈا اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ میں اسے اپنی طرف کھینچنے لگا اور پھر اس نے وہی حربہ استعمال کیا جو ایسے موقع پر کیا جاتا چاہیے تھا۔ اس نے اچانک ہی ڈنڈا ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لاٹکھڑتا ہوا پشت کے بل گر ا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا اس نے



میرے اوپر جھانگ لگا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی وزنی پٹان میرے اوپر گری ہو۔ میں اس کے بوجھ کے نیچے دب گیا۔ وہ دونوں ہاتھ میرے گلے پر دبائے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیوں پر ہاتھ جما دیے اور اس کے پنجوں کو اپنے گلے سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ناخن بھیڑیے کے پنجوں کی طرح تھیلے تھے اگر وہ میرے گلے تک پہنچ جاتے تو یقیناً میرا زخرا اذیت کر دیتے۔

میں آہستہ آہستہ اپنی ٹانگیں دہری کرنے لگا اور پھر پیر اس کے پیٹ پر جما کر اسے پوری قوت سے اوپر اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل پیچھے گرا۔ میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ دونوں بچے پھیل کر کسی بھیڑیے ہی کی طرح غرانا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرخ تھیں جیسے خون نچک رہا ہو۔

وہ مجھے گرفت میں لینے کے لیے لپکا مگر میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ میں نے پیچھے سے اس کے کولھے پر ایک زوردار کلک رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کی پیشانی پر پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ دیوار سے سر ٹکرانے سے ایک اور چوٹ لگی تو وہ ہلکا اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ پڑا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ سانڈ کی طرح طاقت ور تھا۔ اس پر قابو پالینا کوئی آسان نہیں تھا اور اس وقت تو وہ سانڈ ہی کی طرح بھگتا رہا تھا۔ وہ پھٹکا رہا ہوا آگے بڑھا تو میں طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔

میری فلائنگ کلک اس کے سینے پر لگی وہ ہلکا اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دھیر ہو جائے گا لیکن وہ محض لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر پھر میری طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اس کے پیٹ پر اسٹریٹ کلک رسید کر دی۔ وہ ذرا سا آگے جھکا تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سانڈ کلک لگائی اور پھر سنبھلے کاموٹ دیے بغیر اس پر ٹکس برسنا رہا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ گوشت کے اس پہاڑ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک اور فلائنگ کلک لگانے کی کوشش کی تو اس کا داؤ چل گیا۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے الٹا لٹکا دیا۔ میں بھی اچھے فائدہ کاٹھ اور تن و توش کا مالک تھا لیکن اس نے مجھے چوبے کی طرح اپنے سامنے الٹا لٹکا رکھا تھا۔

میرا سر اس کے پیروں سے چند انچ اوپر تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے ناخنوں سے ذرا اوپر پھنڈیلوں پر بتامہ دیے اور اسے اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ میں اس کی ٹانگوں کو زور سے جھٹکے دیتا رہا مگر میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔

اس نے میری ٹانگوں کو جھکا دے کر چھوڑ دیا۔ پہلے میرا سر زمین سے ٹکرا یا پھر میں پورے قدم کے ساتھ کسی کتے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرا۔

ایک لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری گردن کندھوں کے اندر دھنس گئی ہو۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس وحشی نے پیر میرے سینے پر روک دیا۔

مجھے سینے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ میرے سینے پر کابو چھ بڑھا تا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوسرا پیر زمین سے اٹھا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی اور پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ شاؤلن ٹیپل میں جب میں نے اپنے اندر جی کی قوت پر قابو پایا تھا تو کی من وزنی پتھر سینے پر رکھ کر ہتھوڑی سے تروایا تھا۔ وہ میری جی کی قوت تھی جو نے اس وقت نہ تو مجھے سینے پر پتھر کا بوجھ محسوس ہونے کا فائدہ اور نہ ہی وزنی ہتھوڑوں کی ضرب۔ وہ سب کچھ یاد آتے ہی میں نے اس وقت بھی جی کی قوت سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سانس روک لیا اور جب مگر سانس لیا تو میری مشکل حل ہو چکی تھی۔ وہ اب میرے سینے پر اپنا پورا بوجھ ڈال رہا تھا لیکن اب میں نہ تو سینے پر دباؤ محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی ٹھنکن محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا دوسرا پیر زمین سے چھ انچ کے قریب اوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں نے وہ پیر پکڑ لیا اور پوری قوت سے مونڈتے ہوئے زوردار جھکا دیا۔ وہ اچھل کر پیچھے گرا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس پر حملہ کرنا وہ پہل کر گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے لپک کر مجھے گرفت میں لے کر سر سے اوپر اٹھالیا اور پوری قوت سے ایک طرف اچھال دیا۔

میں دیوار سے ٹکرا کر بھد کی آواز سے نیچے گرا۔ دیوار سے ٹکرانے اور نیچے گرنے سے میرے اندر کا سارا سٹم کل کر رہ گیا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میرے سنبھلنے سے پہلے اس نے پھر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ میرے

بسم کہ آیا تو ڈھو کر بس بسا رہا تھا۔

ایک ٹھوکر میرے سر پر لگی۔ میرا دماغ بل کر رہ گیا۔ پہلے آنکھوں کے سامنے نیلی چلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں اور پھر اندھیرے کی چادر پھیلنے لگی۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دیتے لگا۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میرے حواس ختم ہو گئے تو وہ میری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے۔

میں سر کو زور زور سے جھٹکتا رہا۔ میری یہ کوشش بار آور ثابت ہو رہی تھی۔ تاریکی جھٹکنے لگی۔ میرے حواس بحال ہو رہے تھے۔ میں ہشکل سنبھل پایا تھا کہ اس نے زمین پر پڑا ہوا ترشول اٹھا کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ترشول کی اگلی تینوں نوکیں زمین میں پیوست ہو گئیں۔ اگر مجھے وہاں سے ہٹنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ ترشول میرے سینے کے آریار ہو چکا ہوتا۔

ترشول زمین میں گڑا ہوا تھا۔ اس کا دست اب بھی اس وحشی کی گرفت میں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ ڈنڈے کے درمیان سے بڑھا دیے اور پوری قوت سے اچھل کر دونوں پیروں کی پھر پورے گھٹکے اس کے سینے پر رسید کر دی۔

میرا یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ وہ ہلکا اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ترشول ابھی تک زمین میں گڑا ہوا تھا۔ میں نے ڈنڈے سے پکڑ کر ترشول کو کھینچ لیا اور اپنے حریف کی طرف لپکا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک پیر اس کے پیٹ پر رکھ دیا اور ترشول کے دسے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

وہ محض اب مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھا۔ میرے ہاتھوں کا ایک مضبوط جھکا اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ اس نے بھی شاید صورت حال کو محسوس کیا تھا۔ اس کا چہرہ خوف کی شدت سے کچھ اور سیاہ پڑ گیا۔ سرخ انگارے آنکھوں میں گھومتے تھے اور پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیک مانگتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ہمارے کو مت مارو بھایا۔ ہم تمہارا کیا بگاڑتے ہے۔ بھگاڑو ہم کا۔“

اچانک ایک اور خیال کو نہ کے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ہم لوگ جہاز کی تباہی کی جگہ سے تعلق دور نکل آئے تھے اور یہ کون سی جگہ تھی۔ کوئی بستی یہاں سے کتنی دور تھی۔ یہ شخص ہماری امیدوں کا واحد مرکز تھا۔ یہی ہمیں کسی آبادی تک لے جاسکتا تھا اگر اسے مار دیا تو

ہم پھر دیرانے میں بسکتے رہیں گے۔ ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ میرا اسے جان سے مار دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو اس بات پر غصہ آیا تھا کہ پہلے اس نے سہی ہوئی تابعدار کیا۔ غیبت سمجھ کر اس پر بھجوان حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی آنکھ مکمل گئی اور اس نے قریب پڑا ہوا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ پتھر پٹنی پر کسی نازک جگہ پر لگا تھا جس سے وہ فوری طور پر بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر ہوش آجائے پر بھی وہ بے ہوش کا ٹکری رہا اور مکاری سے کام لیتے ہوئے اس نے ترشول سے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اگر میں غافل ہوتا تو اس کے پہلے ہی منہ میں مارا جاتا اور اب وہ میرے سامنے پڑا مجھ سے زندگی کی بیک مانگ رہا تھا۔

”اس عورت نے کیا قصور کیا تھا کہ تم اسے مارنا چاہتے تھے یا۔“

”ہم اس ناری کو مارنا نہیں چاہت تھا۔ کچھ بھی کرن کو نہیں تھا۔“ وہ گھگھایا ”ہم تو اس کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ وہ اس دیران مندر میں کہاں سے آئی رہت ہے۔ ہم تو دیکھنے کو جھٹکتے رہے۔ رام کہہ۔ ہم اس ناری کو کچھ کرن کا نہیں تھا۔“

”پھر تم نے مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”ہم کا کھتی ہوئی۔ چھرا کر دونا۔“ وہ بولا ”رام بھلی کرے گا۔ ہم اس کا پراچت کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کے پیٹ پر سے پیر ہٹالیا ”لیکن اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں وجہ دیوت ہوں بھایا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا ”تم ممان ہو جایا۔ تم نے ہم کا جیون دان کر دیا۔ ایک گریب شیا کی کا جیون دان کر دیا۔ بھگوان تمہاری رکشا کرے گا۔“ وہ راجستانی زبان بول رہا تھا۔ اس کے بعض الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن میں اس کی باتوں کا مفہوم بخوبی سمجھ رہا تھا۔

میں اسے اٹھا کر مندر سے باہر لے آیا۔ ترشول میرے ہاتھ میں تھا لیکن مجھے توقع تھی کہ اب وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ ایک اور بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی کہ ہماری اس دھند کا منشی اور اٹھانچ کے باوجود کپڑے کا وہ میلا سا تھیلہ ابھی تک اس کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔

باہر دھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا اور ابھی تیز دھوپ چمکنے لگتی۔ تابعدار جاگتی

مندرجہ کی عمارت سے ہیں بیٹیں گز دور ایک جگہ بیٹھی ہوئی تھیں، پہلی بھی ان کے قریب موجود تھی۔  
اس دشتی کو میرے ساتھ دیکھ کر تائبہ کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے لہا گئے۔  
”اب اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا  
”یہ ہمارا منطیع ہو چکا ہے۔ اب یہ کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“

ترشل بھی میرے ہاتھ میں تھا اس لیے تائبہ کچھ مطمئن ہو گئی۔ البتہ پہلی ڈر کر اپنی ماں کی ناگواری سے لپٹ گئی تھی۔  
اس وحشی نے تائبہ اور جاگی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور معافی مانگنے لگا اور پھر وہ بتانے لگا کہ یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ پچھلی طرف کے راستے سے مندر کی عمارت میں داخل ہوا تو ایک عورت اور ایک بچی کو زمین پر پڑے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا اور پھر تائبہ کی قمیص پر خون کے دبے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے ہی اس پر چھکا تھا کہ تائبہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے چہرے سے سنیا سی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور تائبہ نے قریب پڑا ہوا پتھر اٹھا کر اس پر دے مارا۔ جس سے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور بعد میں بھی جو کچھ ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا اور اب وہ باری باری ان دونوں سے معافی مانگ رہا تھا۔  
”تماری کے سینے پر زخم کیسا ہے بھایا۔ یہ کیسے گھائل ہوئی تھی؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ زخم کیسے لگا تھا تو اس نے فوراً ہی گلے میں لٹکا ہوا تھپلا اٹا لیا اور زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھیلے میں سے تین چار پھونٹی پھونٹی ڈنیاں نکال لیں اور پھر ایک ڈنیا منتخب کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم بے میں پچھ کئے لگا۔

وہ تائبہ کے سینے کا زخم دیکھنا چاہتا تھا مگر تائبہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے ڈنیا جاگی کے ہاتھ میں تمھاری اور اسے بتانے لگا کہ اس پر تھوڑا سا مرہم نکال کر اس کے زخم پر لگا دے۔ جاگی تائبہ کو وہاں سے کچھ دور لے گئی اور ایک ٹھنڈے دیواری آڑ میں بیٹھ کر اس کے زخم پر مرہم لگانے لگی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آگئی۔ جاگی نے ڈنیا سنیا سی کو لوٹا دی۔ سنیا سی نے بتایا کہ اس علاقے میں سانپ اور بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دوسری دیواریں میں ایسے مرہم موجود ہیں کہ زہریلے سے زہریلے سانپ یا بچھو کے کاٹنے کے زخم پر فوری طور پر لگا دیا جائے تو زہر کا اثر ذرا کم ہو جاتا ہے۔  
اس کا نام واسودیو تھا۔ پیسے کے لحاظ سے وہ سنیا سی تھا

اور بعض دواؤں کی تیاری کے لیے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس طرف آتا رہتا ہے۔ بہت سی دواؤں کی تیاری میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں ایسے علاقوں میں پائی جاتی ہیں جہاں کھار پائی ہو۔ یہاں ایک ایسی بوٹی بھی پائی جاتی ہے جس سے تیار کی جانے والی دوا سے مرگی کا کامیاب علاج کیا جاتا ہے۔

”اور بھایا۔“ وہ میری طرف دیکھ کر اذدارانہ لہجے میں بولا ”یہاں ایسے چھوٹے چھوٹے جانور بھی پائے جاتے ہیں جن کی چربی سے تیار ہونے والی دوا سو سالہ بڑے کو بھی اکثر سال کا جوان بنا دیت ہے۔ راجستان کے بڑے بڑے راج مہاراج ہم سے یہ دوا خریدتے ہیں۔“

”تم کہاں سے آئے ہو؟“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ”میرا مطلب ہے قریب ترین بستی یہاں سے کتنی دور ہے۔“  
”ادھر پانچ کوس کی دوری پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔“

اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔  
اس کے کہنے کے مطابق وہ بستی چند گھروں پر مشتمل تھی جبکہ اس سے دس بارہ کوس آگے ایک اور بڑا گاؤں ہے۔ وہ خود جودھ پور کا رہنے والا ہے اور جڑی بوٹیوں اور اپنی دواؤں کی تیاری کے لیے ان چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تلاش میں پھرنا رہتا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق غلے صورت میں چھپکلی سے ملتے جلتے مگر سائز میں اس سے کئی گنا بڑے ہوتے ہیں۔

”جودھ پور کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”دھون پور گاؤں سے چھ سات گھنٹے کا راستہ ہے۔ وہاں سے ہمیں چلتی ہیں۔“ واسودیو نے بتایا۔

ہمارا جہاز جب ان پانچ کوس میں پھنسا تھا تو اتر ہوئیں۔ اعلان کیا تھا کہ جہاز کو جودھ پور انٹرپورٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کی جائے گی مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور ریگستان میں کریش لینڈنگ کرنی پڑی تھی۔

”تم نے کیا بستی کے دوسرے لوگوں نے کل شام کو ہوائی جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔  
”نہیں بھایا۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا ”میں کل دن میں اس بستی میں پہنچا تھا۔ کسی جہاز کو گرتے ہوئے کیا اثر بستی کے اوپر سے گزرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔“

اب تک میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم کون پڑ اور اس ویرانے میں کیسے پہنچے تھے لیکن اب میں نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ حیرت سے ہماری صورتیں دیکھتا رہا۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم رات بھر ریگستان میں پیدل چلتے رہے ہیں۔

”یہ تمہیں کسی بستی تک پہنچا سکتے ہو؟“ میں نے کہا۔  
”ہمیں نہیں مہاراج۔“ وہ بولا ”پانچ کوس کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم ایک گھنٹے میں پہنچ جاویں گے۔“  
”تو پھر چلو۔ اب ہمیں یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہم جمیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوسری طرف آگئے آگے تاحد نگاہ ہمارے سامنے ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کانٹے دار جھانپاں بھی تھیں۔ غنایا واسودیو آگے آگے چل رہا تھا۔ میں پہلی کو اٹھائے اس کے پیچھے تھا۔ واسودیو کا ترشل میرے ہی پاس تھا۔ غنایا سے کسی دھوکے کی توقع تو نہیں تھی لیکن پھر بھی میں غلط تھا۔

کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد میں نے پہلی کو جاگی کے والے لے کر لیا اور واسودیو کے ساتھ ساتھ چل ہوا اس سے اجتناب کرتے لگا۔ پہلی کے ٹھکنے کی آواز سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”کیا بات ہے پہلی۔ تھک گئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔ بہت تھک گئی ہوں انکل۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔“ پہلی نے ٹھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

اور تب یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ کل دوپہر سے ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھگور سے ٹیک آف کرنے کے بعد نماز میں مسافروں کو کھانا سرو کیا گیا تھا اور ہمیں سے ٹیک آف کرنے کے بعد چائے سرو کی جانے والی تھی کہ جہاز انٹرپورٹ میں پھنس گیا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ آپ بانی بکے ہیں۔

پہلی واقعی بہت صابر رہی تھی۔ جو اب تک خاموش رہی تھی۔ رات بھر کے سفر کے دوران میں بھی اس کی زبان پر نف شکایت نہیں آتا تھا لیکن اب شاید اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور اس نے پہلی بار بھوک کی بات کی تھی۔

”واسودیو۔“ میں اس کے قریب پہنچ گیا ”تمہاری اس زنجیل میں کھانے کی کوئی چیز ہے یا نہیں۔“ میں نے اس کے غیلے کو چھوئے ہوئے کہا۔

زنجیل کا مطلب وہ سمجھا ہوا یا نہ سمجھا ہو مگر تھیلے کو

چھوئے سے وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔  
”کھانے کی چیزیں ہاں ہاں۔ روٹی ہے اور اچار بھی۔“ وہ رک گیا اور تھیلے سے اٹا لیا۔

بچوں کے اسکول بچ باس کی طرح ایک برائے سا پلاسٹک کا ڈبہ تھا جو ایک پرانے سے شائنگ بیک میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے پہلے شائنگ بیک کھولا پھر ڈبہ اس میں دو موٹی موٹی روٹیاں تھیں اور اس پر مرچوں کا اچار رکھا ہوا تھا۔ اوپر والی روٹی تو اچار سے آلودہ ہو گئی تھی۔ میں نے نیچے والی روٹی اٹک کر کھائی۔ وہ بے چاری بہت بھوکھی تھی۔ فوراً ہی دانتوں سے نوالے توڑ کر کھانے لگی۔

”تم کھاؤ گے واسودیو۔“ میں نے سنیا سی سے پوچھا۔  
”نہی بھایا۔“ وہ بولا ”ہم کا ابھی بھوک نہی ہے۔ بستی میں جا کر کھالیں گا۔ تم لوگ پیٹ پوجا کر لو۔“

پیٹ پوجا۔ میں مسکرا دیا۔ ایک روٹی اور کھانے والے تھیں۔ میں نے ایک نوالہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور باقی روٹی جاگی کے ہاتھ میں دے دی۔ جاگی کو میں ابھی طرح جانتا تھا۔ اس سے بھوک ذرا بھی برداشت نہیں ہوتی تھی لیکن انتہائی حیرت کی بات تھی کہ جو میں کھنے کی بھوک ہونے کے باوجود اس نے کوئی فزاد نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ بھی میں سمجھ سکتا تھا۔ وہ ابھی طرح جانتی تھی کہ اس ویرانے میں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔

جاگی نے روٹی کو آٹھ پلٹ کر دیکھا پھر بڑی ایمان داری سے روٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ تائبہ کو دے دیا اور دوسرا حصہ خود نیدوں کی طرح کھانے لگی اور پھر اچار کی مرچ چباتے ہی وہ چلانے لگی۔

”پانی۔ پانی۔“ وہ سی سی کرتے ہوئے اوجھڑاؤ دیکھنے لگی۔

”باؤلی ہوئی ہو۔“ میں نے کہا ”یہاں ریگستان میں تمہیں پانی کہاں سے ملے گا۔ کس نے کہا تھا مرچ چبانے کو۔“

واسودیو چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے مسکرا کر جاگی کی طرف دیکھا اور پھر ٹھٹھکیں سے خیالے سے رنگ کا ایک قرص (گولی) نکال کر جاگی کی طرف بڑھا دی۔

”یہ جو کس نے مندری۔ ساری پیاس مٹھاوے گی۔“  
اگر عام حالات میں واسودیو سے آمناسامنا ہوا ہوتا تو جاگی اسے قریب بھی نہ ٹھٹکتے دیتی۔ وہ نہایت بدہیت اور کمرہ صورت تھا مگر صورت حال ایسی تھی کہ جاگی نے نہ صرف اس کے ہاتھ کی دی ہوئی روٹی کھائی تھی بلکہ وہ گولی بھی

اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے گولی منہ میں ڈال لی۔  
وہ گولی واقعی حیرت انگیز طور پر چر تاثیر تھی۔ منہ میں رکھنے کے چند سیکنڈ بعد ہی جاگتی پڑ سکون ہو گئی۔ اسے اب نہ تو مریں لگ رہی تھیں اور نہ ہی پیاس۔  
”اور تمہارا کیا حال ہے؟“ میں نے چلتے چلتے تائید کی طرف دیکھا۔ لگتا ہے وہ مرہم لگانے سے تنہیں بھی کافی فائدہ ہوا ہے۔“

”ہاں۔“ تائید نے جواب دیا ”وہ تکلیف تقریباً تو نے ہی صد ختم ہو چکی ہے۔ سیاسی کی یہ مرہم تو تریاق ثابت ہوئی ہے میرے لیے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ بلی کو میں نے پھر کندھے پر اٹھالیا۔ واسودیو نے کہا تھا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ پانچ کوس کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ ہم دو گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے مگر یہ فاصلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس ریگ زار میں دور دور تک کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

آدھا گھنٹا مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ٹیلے پر رک گئے۔ دوسری طرف شیب میں بہت دور کچھ بکھرے ہوئے درخت نظر آ رہے تھے۔ انہی درختوں میں چند مکانات کے ہیولے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے قریب پہنچتے رہے وہ مکان واضح ہوتے چلے گئے۔

ہمیں وہاں پہنچنے میں آدھا گھنٹا اور لگ گیا۔ وہ کوئی باقاعدہ آبادی نہیں تھی۔ پانچ گھنٹے کے مکان تھے۔ ایک محدود رقبے پر ناریل کے پتھر درخت اور تھوڑا بہت سبزہ تھا جس کے وسط میں ایک چھوٹی سی جھیل نظر آ رہی تھی بلکہ جھیل کے بجائے ایک بڑا تالاب کہنا مناسب ہوگا اور چند گھروں پر مشتمل یہ آبادی بھی پانی کے اس مختصر ذخیرے کی وجہ سے تھی۔ میں نے صحراؤں میں نخلستانوں کے بارے میں سنا تھا اور یہ ایک چھوٹا سا نخلستان ہی تھا۔ زیر زمین پانی چشمے کی طرح بہہ کر ایک بہت بڑے تالاب کی صورت میں جمع ہو گیا تھا۔ جو اس مختصر آبادی کا باعث بن گیا تھا۔

ناریل کے علاوہ یہاں کچھ اور درخت بھی تھے جنہیں میں شناخت نہیں کر سکا۔ ان درختوں کے نیچے پانچ چھ اونٹ اور تین گدھے بندھے ہوئے تھے۔ ان جانوروں کے علاوہ کسی اور ذی روح کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ان مکانوں کا رخ تالاب کی طرف تھا۔ ہم اوپر سے گھوم کر سامنے پہنچے تو ایک درخت کے نیچے چارپائی پر دو آدمی

بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں اٹھ گئے۔ دونوں کے لباس ان ڈاکوؤں سے مختلف نہیں تھے جنہوں جہاز کے مسافروں پر حملہ کیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں کی، سے ان کی شکلیں بھی بڑی خوفناک ہو گئی تھیں۔ ان دو کے کندھوں پر رائفلیں ٹنگی ہوئی تھیں اور دونوں کے سر پر کراس کرتے ہوئے بیٹھ تھے جن میں گولیاں بھری تھیں۔

انہیں دیکھ کر میرا ہاتھ کا تھا اور میرے ذہن میں وقت صرف ایک ہی خیال ابھرا تھا کہ ہم ایک مصیبت نکل کر کسی اور بڑی مصیبت میں پھنسنے والے تو نہیں تھے؟  
”یہ کون ہیں واسودیو؟ انہیں ادھر کیوں لے کر آ رہے۔“ ان میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔ اس کا قد چھ سے کم نہیں تھا۔

”یہ پرہی ہیں وجے ٹھاکر۔“ واسودیو نے جواب دیا۔ ”ادھر ریگستان میں بھٹک رہت تھے۔ بولت ہیں کسی جہاز گرت گئے تھے۔ بے چارے بہت پریشان تھے۔ میں ادا لے آیا۔ شہر جانے کا ہے۔“

”تیرا دماغ تو کھراب نہیں ہوتا گیو واسودیو۔“ شخص نے سیاسی کو گھورا ”جہاز سے گرت گیو ہیں تو جی کیلے ہیں یہ لوگال۔“

”ہم کا تو یہی بولت ہیں جی۔“ واسودیو نے جواب دیا۔ ”اچھا اچھا۔ بہت بری حالت ہو رہت ہے ان کا وجے ٹھاکر نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان ناریلوں کی شیلہ مائی کے پاس لے جاؤ اور جوان۔ تم ادھر کو آؤ۔ ہمارے کئے نارائن جا شیلہ مائی سے کہہ کر ان کے بھوجن کا بندوبست کرو۔ مجھے تو یہ بھوکے دکھت ہیں۔“

واسودیو اور نارائن، جاگتی تائید اور بلی کو لے کر مکان کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ اندر داخل ہوا سے پہلے جاگتی نے مرکز میری طرف دیکھا تھا۔

”بیٹھ جا مو رکھ۔“ وجے ٹھاکر نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور تم جتنا کون لوگال ہو اور جہاز والی بانہ ہے۔“

میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد میں وجے ٹھاکر جہاز کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران میں اس کا ساتھی نارائن پانی کا گلاس لے آیا۔ مجھے واقعی بہت شاکہ کی پیاس لگی تھی۔ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر چند لمحے خاموش رہا اور ایک بار پھر انہیں اپنی داستان سنائی۔ ان دونوں کے چہروں سے لگتا تھا جیسے انہیں میری کہ

باں یقین نہ آیا ہو اور اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ میرے خادش ہونے پر وہ بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”تمہاری بات اپنے حلق سے نہ اترے ہے بھائی۔“ اس کی نظر میں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ”پر تم جن ڈاکوؤں کی بات کرت ہو۔ وہ رانا شمشیر سنگھ کا گروہ ہے یہ علاقہ اس کا تابی ہے وہ تو یہاں سے پچاس کوس دور ہی رہت ہے اچھا بھائی۔“ اس نے گہرا سانس لیا ”تم کہت ہو تو ہم مان لیتا ہوں۔ تم لوگ اس سر جانے کا ہے۔ پانچا دیویں گے۔ جردور پانچا دیویں گے۔ آج کا دن اور رات یہاں رہنا پڑے گا۔ کل سویرے چلاں گے۔“

تھوڑی دیر بعد ہی دائیں طرف مکان سے ایک اور آدمی برآمد ہوا۔ اس کا چلیہ بھی اس سے ملتا جلتا ہی تھا۔ سر پر سیندوری رنگ کی پگڑی تھی۔ وہ بے تحاشہ تیز تیز لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ دوسرا آدمی سر ہلانا رہا پھر اونٹوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک اونٹ کی رسی کھول لی اور کچھ ہی دیر بعد وہ اونٹ پر سوار ریگستان کی طرف جا رہا تھا۔

میں چارپائی پر پیرنٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ بے پناہ حشکن کی وجہ سے اوٹھ ہی طاری ہو رہی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھلی رکھے ہوئے تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد تارائن اور واسودیو بھی مکان سے باہر آگئے۔ تارائن نے ایک تھال اٹھا رکھا تھا جس میں دو روٹیاں اور ایک کٹوری میں اچار رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کٹورے میں اونٹ کے خشک گوشت کے تلے ہوئے قتلے رکھے ہوئے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد میرے لیے بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ بے تحاشہ وغیرہ سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی باتوں کی آواز کھیموں کی جھنجھٹاہٹ کی طرح میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں مینڈ کی گہرائیوں میں اتر چلا گیا۔ میری آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ اگرچہ ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں جلیبی سی تپش تھی اور میرا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ دماغ میں سنناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک تو چارپائی پر لیٹا رہا۔ معنی نگاہوں سے اُدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد ہی واسودیو ایک مکان سے نکل کر سامنے آگیا۔

”لوہت سویا ہو مہاراج۔“ وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔“ حشکن بہت تھی۔ گہری نیند آگئی۔ میں نے کہا

”وہ تینوں کہاں ہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ تینوں بھی سو رہے ہیں۔“ واسودیو نے جواب دیا۔ اسی دوران میں ریگستان میں ایک طرف دھول کا پل ساد کھائی دیا تو واسودیو درختوں سے نکل کر ذرا آگے چلا گیا۔ میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔

وہ کوئی شتر سوار تھا جو اسی طرف آ رہا تھا۔ اونٹ کے دوڑنے سے ریت اڑ رہی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ شتر سوار لمحہ بہ لمحہ قریب آتا گیا۔ واسودیو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک مکان میں چلا گیا اور میں وہیں کھڑا اس شتر سوار کو دیکھتا رہا جو قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کے منہ پر ڈھانپنا بندھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے علاوہ پورا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ درختوں کے نیچے پہنچ کر اونٹ رک گیا اور اس کا سوار میری طرف دیکھنے لگا۔

وہ اونٹ کو ہٹا کر نیچے اتر آیا اور چہرے کا ڈھانچا کھول دیا۔ اس کے داڑھی نہیں تھی مگر موچیں بڑی خوفناک تھیں۔ ٹھوڑی پر دائیں طرف تقریباً ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے ہنسنے لگا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اسی دوران میں وہ بے تحاشہ وغیرہ بھی مکان سے باہر آگئے اور سب لوگ درخت کے نیچے جھجی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ واسودیو نے پانی کا ایک گلاس شتر سوار کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک سی سانس میں غٹاٹ پی گیا۔

وہ خالص ہندی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدھ لفظ ہی میری سمجھ میں آ رہا تھا لیکن ایک آدھ لفظ سے پوری گفتگو کا مفہوم افاد کرنا مشکل تھا۔ میں اٹھ کر وہاں سے تقریباً بیس گز دور آلاب کی طرف آگیا اور کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے لگا۔

میں میں بیٹھیں منٹ تک وہاں بیٹھا رہا اور پھر ہلکی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ اٹکل اٹکل کستی ہوئی میری طرف دوڑی آ رہی تھی۔

جاگتی اور ناہید ایک درخت کے نیچے کھڑی تھیں اور وہ بے تحاشہ وغیرہ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں الجھن سی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ایک بھاری بھرے اور دراز قامت عورت بھی تھی جس نے راجستانی لباس پہن رکھا تھا۔

میں جلیبی کے ساتھ ان کے قریب آگیا۔ وہ بھاری بھرے عورت شتر سوار سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے جھپٹی بول

اس کی طرف دیکھا۔ اس نے مختصر سی چوٹی اور نعلوں سے اس کا کھٹکھٹا پن رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس پچھل وار کپڑے کا کھٹکھٹا پن رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ رنگت تانبے جیسی اور چہرے کے نعوش خاصے دل فریب تھے۔ اس عمر میں بھی وہ بڑی پُرکشش لگ رہی تھی۔

”شیلا مائی۔“ وہ بے تحاشہ اس عورت سے کہہ رہا تھا ”یہ تاریاں تمہاری سمان ہیں مگر تم نے ان کی دیکھ بھال پر توجہ نہیں دی۔“

”ارے یہ سوری تھیں غماکر۔“ اس عورت نے ’نئے شیلا مائی کہہ کر مخاطب کیا تھا‘ جواب دیا ”ابھی سورج ڈھل جائے تو یہ اشتان کر کے کپڑے بدل لیں گی۔ پھر تم ان کو دیکھنے ہی رہ جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ ان کہہ۔ اور ان کا خیال رکھو۔“ وہ بے تحاشہ لگتا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا ”تم بھی اشتان کرلو بھائی۔ تمہارے شر پر بھی ریت جی ہوئی ہے۔ ادھر آلاب میں ایک کھاڑی سی نکلی ہوئی ہے۔ ادھر کو چلے جاؤ۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

شیلا مائی جاگتی وغیرہ کو اندر لے جا چکی تھی۔ میں اس کے بعد بھی وہاں بیٹھا رہا۔ اس شتر سوار کا نام دکرم سنگھ تھا۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آج رات وہاں کچھ اور لوگ آنے والے تھے اور صبح ہمیں ان کے ساتھ روانہ کر دیا جائے گا۔

میرے دل میں طرح طرح کے سوے اٹھ رہے تھے۔ مجھے ان کی نینوں پر شک ہو رہا تھا۔ خیالی واسودیو کا رویہ بھی بڑا پراسرار سا ہو گیا تھا۔ میری چمٹی حس بتا رہی تھی کہ ہم کسی اور بڑی مصیبت میں چھپنے والے ہیں۔

واسودیو چائے بنا کر لے آیا۔۔۔۔۔ بغیر دودھ کا قہوہ اس وقت واقعی مزہ دے گیا۔ میرے اعصاب پر طاری کشیدگی کی حد تک کم ہو گئی۔

سورج کا سرخ تھال افق کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ گلتا تھا مجھے وہ ریت میں ڈھکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آسمان پر اب بھی کس کس بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج کی کرنی سے نضا بڑی وحشت ناک ہو گئی تھی۔ ریگستان کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے خون کا سمندر لرہیں لے رہا ہو۔

میں اٹھ کر آلاب کی اس کھاڑی کی طرف چلا گیا جو تیس چالیس گز اندر تک چلی گئی تھی۔ یہ کھاڑی تقریباً بیس فٹ چوڑی تھی۔ دونوں کناروں پر کھجی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے جھاڑیوں میں گھس کر اُدھر اُدھر دیکھا اور کپڑے اتار کر

پانی میں گھس گیا۔ میرے کپڑوں میں اس وقت جینز کی پینٹ اور بنیان شامل تھی۔ لی شرت تو میں ناہید کو دے چکا تھا۔ بنیان بہت زیادہ گندی تھی جسے میں نے دھو کر جھاڑیوں پر پھیلا دیا اور پانی میں غوطے لگائے لگا۔

○●○

وہ کرا خاصا بڑا تھا۔ فرش پر چٹائی اور اس کے اوپر اونٹ کے بالوں کا گدہ سا بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں گھڑوئی پر پانی کا گھڑا رکھا ہوا تھا جس کے اوپر ایلو مینیم کا ایک برائنا سا گلاس بھی تھا۔ گھڑوئی کے قریب ہی اسٹول پر ایک لائٹن بھی رکھی ہوئی تھی۔

کمرے میں کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ ایک روشن دان پچھلی دیوار میں تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ روشن دان چوڑائی میں آٹھ انچ سے زیادہ نہیں تھا البتہ لمبائی میں چار فٹ سے بھی زیادہ تھا۔

دوسرا روشن دان بائیں طرف کی دیوار میں تھا جو اتنا ہی لمبا چوڑا تھا۔ اس کے دوسری طرف غالباً کوئی اور کمرہ تھا۔

کمرے کا دروازہ کھڑکی کا نہیں تھا۔ لوہے کی سلاخوں والا تھا۔ ایسے دروازے عام طور پر نیل کی کوٹھڑیوں میں ہوتے ہیں۔ واسودیو نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں ڈھور ڈنگر بند کیے جاتے تھے۔ اس لیے یہاں اس قسم کے سلاخوں والے دروازے لگائے گئے تھے کہ ہوا کی آمد و رفت جاری رہے لیکن میں واسودیو کی اس ترجمہ سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

میں دیوار سے ٹپک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے دائیں طرف ناہید بیٹھی ہوئی تھی۔ جلیبی اس کے گھٹنے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ سامنے جاگتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ٹانگیں سامنے کو پھیلا رکھی تھیں اور ہاتھ پیچھے لگا رکھے تھے۔ اس کا سارا بوجھ ہاتھوں پر تھا۔

ابھی شام ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ کچھ دیر بعد شیلا مائی دروازے میں نمودار ہوئی اور جاگتی اور ناہید کو اپنے ساتھ چلے کا اشارہ کیا۔ ناہید نے جلیبی کا سر آٹھنٹی سے زمین پر ٹکایا اور وہ دونوں شیلا مائی کے ساتھ چلی گئیں۔

ان دونوں کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ انہوں نے نہانے کے بعد کپڑے بدل لیے تھے اور ان کے لباس دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مختصر لباس میں ناہید کچھ حجاب سا محسوس کر رہی تھی اور وہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

شاید اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ اونٹوں کی توازن سن کر میں چونک سا گیا۔ شام کے وقت وجے ٹھاکر اور ختر سوار کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ آج رات کو کچھ لوگ آنے والے تھے اور میرا خیال تھا کہ وہ لوگ آگئے تھے۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔

اونٹوں کے بلبلانے کی آواز تیز ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دو سوائی چٹیں بھی سنائی دیں۔ جاگی اور ناہید نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے سامنے برآمدہ اور اس سے آگے وسیع آنگن تھا۔ اس آنگن میں بھی دو نیم کے اور تین چار تاریل کے درخت تھے۔ یہاں بھی شاید اونٹ یا گدھے بندھے ہوں گے کیونکہ سوکھے ہوئے فصلے کی بونفٹاں پھیلی ہوئی تھی۔

میں تیز قدم اٹھتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب آ گیا۔ یہ دروازہ محض بھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک پٹ کھولا اور باہر نکل گیا۔

باہر گہری تاریکی تھی مگر درختوں کے نیچے کچھ سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی وقت اونٹ کی بلبلاہٹ اور ایک عورت کی خوف زدہ سی چیخ بیک وقت سنائی دی۔ میں دروازے سے نکل کر دو تین قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی طرف سے اچانک ہی ایک سایہ نمودار ہوا اور میرے سامنے اگر راستہ روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں رات نکل تھی۔

”نہیں سو رکھ۔ تم آگے نہیں جاؤ گے۔ واپس جاؤ۔“ تاریکی میں اس شخص کی غراہٹ سنائی دی۔ ”وہ وہ عورت کون ہے جو چیخ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ وہ استری کون ہے تم اندر جاؤ۔“ وہ شخص پھر غرایا اور رات نکل کی ٹال میرے سینے پر رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلتے لگا۔

میں نے اس سے اٹھنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے واپس آ گیا۔ دروازے میں داخل ہوا تو اس شخص نے دھڑے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا چڑھا دیا۔ میں کمرے کی طرف جانے کے بجائے وہیں رک گیا۔

یہ دہشت کا دروازہ تھا۔ زنجیر چھانے جانے کے باوجود اس میں تقریباً آدھے انچ کی بھری رہ گئی تھی۔ میں اس بھری سے آنکھ لگا کر باہر دیکھنے لگا۔ اس طرف کسی طرف سے ایک آدمی لالین لے کر درختوں کے نیچے پہنچ گیا۔

لالین کی برقان زدہ روشنی میں سات آہستہ سائے

حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں تین عورتیں تھیں۔ اس کا اندازہ میں نے ان کے لباس سے لگایا تھا۔ وہ نے سائیاں پن رکی تھیں اور ایک کے جسم پر شلوار قمیض تھی۔ ان کے ساتھ چار آدمی تھے اور ان سب کے پاس رات نکل تھیں۔ ان میں سے ایک نے غراتے ہوئے ان عورتوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا مگر وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ اس شخص نے ایک عورت کو بازو سے پکڑ کر آگے دھکیلا تو وہ خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھی۔

”نہیں نہیں۔ بھگوان کے لیے مجھے کچھ مت کہو۔ چھوڑ دو مجھے۔“

”تمہیں چھوڑ بھی دیں تو اس درانے میں کہاں جاؤ گے۔“ اس شخص نے جواب دیا ”رات کو تو یہاں بھینڈے آجاتے ہیں۔ چیر پھاڑے رکھ دیں گے تمہیں۔ اندر چلو۔ ہم کم از کم تمہیں چیر پھاڑ کر کھا دیں گے تو نہیں۔“

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اب مجھے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ یہ لوگ ان عورتوں کو کہیں سے اغوا کر کے لائے تھے۔ اب مجھے جاگی اور ناہید کی خیریت بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔

وہ لوگ ان عورتوں کو لے کر کسی اور مکان میں چلے گئے۔ کچھ دیر تک عورتوں کی آواز داری کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ باہر بھی صرف ایک آدمی کا پتلا پھرنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شاید اونٹوں کو چاراد وٹرو ڈال رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی اور پھر وہ انسانی ہیولا بھی غائب ہو گیا۔ میں بھی دروازے سے ہٹ کر کمرے میں آ گیا۔

”کیا ہوا؟ یہ کون عورتیں چیخ رہی تھیں؟“ جاگی نے پوچھا۔

”یہاں آتے ہی میرے ذہن میں جو خدشات سر ابھارنے لگے تھے۔ وہ حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں۔“ میں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب! ایسے خدشات؟“ اس مرتبہ ناہید نے سوال کیا۔

”ہم دھوکا کھا گئے۔“ میں نے کہا ”یہ ایسے لوگ نہیں ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کا تعلق بھی ڈاکوؤں کے کئی گروہ سے ہے۔“

”لیکن۔۔۔ ہمارے پاس اب کیا ہے جو یہ لوٹا چاہیں گے۔“ ناہید بولی ”جو کچھ تھا وہ پہلے ہی ان ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور پھر وہ جہاز بھی تباہ ہو گیا جس میں ہمارا سامان تھا۔“

”جی بھول رہی ہو کہ عزت ہی عورت کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ اگر عورت حسین ہو تو اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میرا خیال ہے یہ لوگ ہم عورتوں کو کہیں سے اغوا کر کے لائے ہیں۔ چیخنے کی آواز نئی عورتوں کی تھی۔“

لالین کی زرد روشنی میں ناہید کا چہرہ کچھ اور زرد ہو گیا۔ باہر کے چہرے پر بھی پٹلاہٹ دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے غم کر دوازدہ بند کر کے اندر سے کنڈا لگا دیا۔ میرے ہونٹوں پر خفگی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی یہ احتیاط فضول تھی۔ سلاخوں والے دروازے کو اندر سے کنڈا لگانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ باہر سے ہاتھ ڈال کر کنڈا کھولا جاسکتا تھا۔ دروازہ بند کر کے ہم محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔

دروازہ بند کر کے جاگی منگے کے قریب رک گئی۔ پہلے دو باتنی پتھر ایک گلاس میں گلاس خالی کر دیا۔

ناہید میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی دف زدہ ہو رہی تھی۔ ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے قدموں کی آوازیں سن کر خاموش ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی واسودیو دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ میں تانبے کا قھال اٹھا رکھا تھا جس میں تین پیالیاں تھیں۔ وہ بولی تھیں۔ اس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چائے۔“ واسودیو نے کہا ”سہرے کے لوگ رات کو بھی بے پیوس ہیں۔ وکر م شہر سے دودھ لے کر آیا ہے اس لیے اس کے دودھ والی جائے بنائی ہے۔ سب لوگ پی رہے ہیں۔“

”ابھی پیو۔“

اس نے ہم تینوں کے سامنے ایک ایک پیالی رکھ دی۔

”دودھ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔“

”شہر سے کون لوگ آئے ہیں واسودیو۔“ میں نے پوچھا۔

”جھانڈو یہ عورتیں کون تھیں جو چیخ رہی تھیں؟“

”کیا بتاؤں بھائی۔“ واسودیو میرے سامنے بیٹھ گیا ”وہ بڑے بڑے ٹھاکر و کر م اور ہمیر سنگھ کی لوگائیاں ہیں۔ دو ماں تھیں تو بڑی خبی سے رہ رہی تھیں۔ تیسری سر سے آئی او اس ہو گئی۔ اس نے دو سری دونوں استروں کو بھی ور غلایا دو تین دن پہلے چوری چھپے تینوں سر پیلی گئیں۔ آج وکر م نے انہیں واپس لے آیا ہے اس لیے چیخ چلا رہی تھیں۔“ وہ

چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اب ہی پتاؤں بھائی۔ جہاں جی ہو گا تو لگائی کہ بھی تو وہیں رہنا ہے نا۔ کوئی جی اپنی جتنی کے بغیر تو نہیں رہ سکتا نا۔“

”مگر وہ کیسے بھاگ گئیں۔ شہر یہاں سے قریب ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”سہر تو بہت دور ہے۔“ واسودیو نے جواب دیا ”سہر میں رہنے والی یہ تاریاں ریگستان کا سفر نہیں کر سکتیں مگر تم راجستان کی تاروں کو نہیں جانتے بھائی۔ یہ اونٹ پر سو کوں کا سفر کرتی ہیں اور تھکی نہیں ہیں۔“

اگر واسودیو نے سمجھ رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کا یقین کر لیا ہے تو یہ اس کی حماقت تھی۔ جب تک ہم چائے پیتے رہے وہ بیٹھا باتیں کر رہا اور پھر خالی پیالیاں لے کر چلا گیا۔

جانتے ہوئے اس نے ایک بار پھر یہ کہا تھا کہ صبح ہمیں شہر بھیج دیا جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد جاگی نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رات کا ابتدائی حصہ ٹھاکر ہر طرف سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں کبھی کبھی کسی اونٹ کے بلبلانے یا گدھے کے ہنسنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

دروازہ بند نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ سمجھ رہے تھے اور میرا خیال تھا کہ ہم رات بھر جاگتے رہیں گے تاکہ اگر صورت حال کوئی ناخوشگوار رخ اختیار کرے تو اس کا کسی حد تک متقابلہ کیا جاسکے۔ ویسے میں نے طے کر رکھا تھا کہ ان لوگوں نے رات کو کسی وقت کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں ناہید اور جاگی کو بچانے کے لیے زندگی کے آخری لمحوں تک مقابلہ کروں گا۔ ناہید سے اگرچہ ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جہاز کے حادثے کے بعد

ہی ان ماں بیٹی سے ہمارا واسطہ پڑا تھا اور پچھلے چوبیس مہینوں کے دوران میں ان سے کچھ اگس سا ہو گیا تھا اور ان دونوں کی حفاظت بھی میں اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔

لیکن میرے سارے عوام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میرا دماغ جو جھل ہو رہا تھا۔ پورے بدن میں سنسناہٹ سی پھیلنے لگی اور نیند کے بجائے چٹکیں بھجی جاری تھیں۔ اس وقت مجھے ایک ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی رو رہا ہو۔ سنانے میں رونے کی آواز بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور اندرونی دیوار میں روشن دان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دوسری طرف بھی کمرہ تھا اور رونے کی وہ آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔

میں نے جاگنی اور ناہید کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں فرش پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھیں۔ میں نے باری باری ان دونوں کو پکارا مگر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں اپنے آپ کو گھسیٹ کر جاگنی کے قریب آیا اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلانے لگا۔

”جاگنی۔ جاگنی۔ سو گئیں کیا؟“ مجھے اپنی آواز بھی سنو نہیں کی مگر انہوں نے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ہلانے یا پکارنے کا جاگنی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں ناہید کی طرف مڑ گیا۔ اب تو میرے بازو میں بھی اتنی قوت نہیں رہی تھی کہ میں اسے حرکت دے سکتا۔ اسی وقت رونے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی وہ کوئی عورت تھی جو سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے پھر روشن دان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اس طرف بڑھا لیکن ابھی دوسرا ہی قدم اٹھایا تھا کہ سننا ہٹ پورے جسم میں پھیل گئی۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ ان میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی قوت نہیں رہی اور میں آہستہ آہستہ نیچے جھکتا چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

○☆☆○

آنکھ کھلی تو پچھلی دیوار کے روشن دان سے آنے والی دھوپ میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میری آنکھیں چند ہی سی گئیں۔

میں کچھ دیر آنکھیں بند کیے بڑا رہا۔ پورے جسم پر بوجھل پن اور بے پناہ ٹھنکن کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں ملبوں دور سے بھاگتے بھاگتے تھک کر گر گیا ہوں۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور دماغ پر بھی جیسے منوں بوجھ لدا ہوا ہو۔

میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں۔

یہ ماحول مجھے انجینی سالگا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں کب اور کیسے آیا تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ دماغ پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ جھٹنے لگی اور پھر سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

جاگنی ناہید اور بلی اس کمرے میں نہیں تھیں۔

میں دروازے کی طرف لپکا لیکن ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس مرتبہ مجھے اپنا دل کپٹیوں میں دھرکتا ہوا محسوس ہوا۔ کپٹیاں سنگ آئیں۔ دماغ کی نسلوں میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا۔ دروازے پر باہر بڑا سالا لگا ہوا تھا۔

مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں ایک منٹ لگ گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گزشتہ رات ہماری چائے میں بے

ہوشی کی کوئی چیز ملا دی گئی تھی۔ جاگنی اور ناہید تو چائے کے تھوڑی سی دیر بعد بے ہوش ہو گئی تھیں اور میں اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اس کے بعد بھی کھانی دیر تک جانے رہنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور جب میں نے ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر انجینی کی کوشش کی تھی تو میری قوت مدافعت بھی جواب دے گئی تھی اور میں بھی اٹنا غفلت ہو گیا تھا اور وہ لوگ رات ہی کو کسی وقت جاگنی وغیرہ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ کھارے پانی والی جھیل کے کنارے ٹوٹے ہوئے مندر میں سنیا سی واسو دیو سے میرا مقابلہ ہوا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا لیکن اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ میں بھی اسے مارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کی رہنمائی کے بغیر ہم اس ظالم دیرانے سے نہیں نکل سکتے تھے لیکن وہ بے حد مکار تھا اور ہمیں دھوکے سے میاں لے آیا۔ دسے تھا کہ کوئی نکل ہی شہادت نے میرے ذہن میں جنم لیتا شروع کر دیا تھا اور رات کو ان عورتوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سن کر تو میرے شہادت یقین میں بدل گئے تھے اور ان کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔

میں دروازے کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ آہنی دروازے کی دھڑ دھڑاہٹ کی آواز دور تک پھیل گئی۔

”واسو دیو۔ واسو۔ کہاں ہو تم؟“ میں چیخ چیخ کر اس مکار سنیا سی کو پکارنے لگا۔

دو منٹ بعد ہی دو آدمی دروازے کے سامنے نمودار ہوئے۔ ایک تو واسو دیو تھا اور دوسرا لمبا ترنگا آدمی جس نے ایک ہاتھ میں آٹومیکر رائل اٹھار رکھی تھی۔ یہ چہرہ میرے لیے اتنی تھا شاید یہ ان لوگوں میں شامل تھا جو رات کو ان تین عورتوں کو لے کر یہاں آئے تھے۔

”کیا بات ہے۔ کیوں چیخ پڑا ہے مورکھ۔“ واسو دیو نے غراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر بڑی کرختگی اور آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”یہ کالا کھلو۔ وہ دونوں عورتیں اور بچی کہاں ہیں؟“ میں نے اس کی غراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

”وہ خنوں آرام سے ہیں مورکھ اور تو بھی اپنی خیریت چاہتا ہے تا تو آرام سے بیٹھا رہ۔“ واسو دیو نے جواب دیا۔

”تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں چیخا۔

”میں جان سب کو باری ہوتی ہے منٹ۔“ واسو دیو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت ہم تیسرے آگے تھے جوڑا تو ہم کا مر دیتا۔ اپنا جیون بچانے کا ایک ہی لہجہ تھا۔ جو میں نے اختیار کیا۔ میں تمہیں سر کا راستہ لہجہ تھا۔ تمہیں لایا تھا۔ تم نے مندر میں مار مار کر میرا کھانے کے لیے تو نہیں لایا تھا۔ نہیں بھولوں گا۔ پر دیکھ میں نے مرنا بنا دیا تھا۔ ہم وہاں رہیں۔ تمہیں بھولوں گا۔ یہاں رہنے کا مارا کیا بدل لیا ہے کہ تو زندگی بھر مارا کھانا رہے گا۔“

واسو دیو بات کرتا ہوا دروازے کے بالکل قریب آیا۔ میں نے اچانک ہی سلاخوں سے ہاتھ نکال کر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکے سے اپنی طرف بھیج لیا۔ واسو دیو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے آپ کو بڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ واسو دیو گھوم گیا۔ اس کی پشت دروازے کی سلاخوں سے لگ گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک بازو اس کے گلے میں پھپٹا دیا اور دوسرے ہاتھ سے بدستور اس کے بال جکڑے رکھے۔ واسو دیو ہی طرح اچھل رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے سے میری گرفت چھڑانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

بن میری یہ گرفت ایسی نہیں تھی جسے وہ چھڑا سکتا۔ اس کے ساتھ آیا ہوا کن مین بھی ایک لمحے کو بد خواص دیکھا۔ اسے شاید میری طرف سے کسی ایسے اقدام کی توقع میں تھی۔ وہ چند سیکنڈ تو موت سا کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

را نقل ایک طرف پھینک کر اس نے بھی دونوں ہاتھ جڑے بازو پر جمادیے غمرو نہیں جانتا تھا کہ میری یہ گرفت ڈونٹنے کے بعد ہی چھوٹ سکتی تھی۔

واسو دیو ہی طرح پریچ رہا تھا۔ وہ چیخا چاہتا تھا مگر اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ حلق سے کتے جیسی خرخراہٹ در غراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

کن مین نے میرے بازو سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ بری لمبا ہٹ گیا تھا۔ اس نے لپک کر را نقل اٹھالی اور اس کے بٹ سے میرے پیٹ پر وار کر کے لگا لیکن واسو دیو کے گلے پر میری گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔ مجھ پر خون سا طاری درہا تھا۔ اس کی گردن پر میرے بازو کا کلچہ زور سے والے اس کے ساتھ مزید ٹاٹ ہو رہا تھا۔

کن مین پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے را نقل سیدھی کر لی۔ اس کی ٹال میرے پہلو سے لگا کر انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ میں سمجھا کہ اب کیا ہونے والا ہے لیکن میرا جیون کم نہیں ہوا۔ دھڑکنے سے فائر کرنے کے بجائے را نقل پیچھے ہٹا لی اور جتا ہوا باہر کی طرف دوڑ گیا۔

صرف دو منٹ بعد تین چار آدمی دوڑتے ہوئے آنگن والے دروازے سے اندر داخل ہوئے اور پھر وہ بھی چپختے چلاتے ہوئے آگے لپکے۔ اس دوران میں واسو دیو کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں بازو پہلوؤں میں لٹک گئے تھے۔ وہ لوگ چپختے چلاتے ہوئے جیسے ہی قریب پہنچے میں نے واسو دیو کو ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ مٹی کی پوری کی طرح بھد سے نیچے گرا۔ میں نے صرف ایک لمحے کو اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور زبان باہر لٹک گئی تھی۔

دو آدمیوں نے واسو دیو کو ٹانگوں سے پکڑ کر دروازے سے دور گھسیٹ لیا۔ میں دروازے سے ہٹ کر پیچھے والی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک آدمی واسو دیو پر جھکا ہوا تھا۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرکا ہے اور میں جانتا تھا کہ اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ میری اس گرفت میں آنے کے بعد کسی کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ آدمی ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

”یہ مرچو بے!“ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر چیخا۔ ”اس نے ہتیا کر دی واسو دیو کی۔ یہ ہتیار ہے۔ مارو اسے۔“

کن مین نے را نقل میری طرف تان لی اور انگلی ٹریگر پر پریچ گئی۔ اس کی انگلی کی معمولی سی حرکت میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی اور اب مجھے بھی جیسے ہوش آیا تھا۔ غصے اور طیش میں میں نے واسو دیو کو موت کے کھٹا آتا رہا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ ایسا کر کے میں نے جاگنی ناہید اور بلی کی کوئی مدد..... نہیں کی تھی۔ میں زندہ رہ کر تو ان کی مدد کر سکتا تھا لیکن میری موت کے بعد وہ میری مدد سے محروم ہو جاتیں اور مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر ہوتیں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گولی کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دھکا ہوا تو اس کے ساتھ ہی میری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن گولی نہیں چلی بلکہ ایک اور گرن دار چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دسے تھا کہ تھا جو دوڑتا ہوا اندر آیا تھا۔ کن مین نے را نقل نیچے کر لی۔ مجھے زندگی کے چند اور لمحے متعارف لگے۔ کن مین تیز تیز لمبے میں دسے تھا کہ کو بتانے لگا۔ دسے تھا کہ واسو دیو کی لاش پر جھک گیا۔ اس کی زبان اب بھی باہر لٹکی ہوئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں۔ دسے تھا کہ



نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد تباہ ختم ہو چکا تھا۔  
وہ بے ٹھاکر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دروازے کے قریب آکر میری طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے گولی مار دینے کا حکم دے گا لیکن اس کی آنکھوں میں عجب سی چمک تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ گن مین نے جب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی قتب کی اور تالا کھول دیا۔

گن مین اور وہ بے ٹھاکر دروازے ہی میں کھڑے رہے اور چار آدمی اندر گھس آئے وہ چاروں موت کے فرشتوں کی طرح میری طرف بڑھنے لگے اور میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا انہیں آگے آتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں سمجھ گیا وہ میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ گولی سے اڑا دینے کے بجائے اپنے ایک ساتھی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ میری طاقت کا اندازہ انہیں ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ چاروں بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ مزاحمت کروں گا۔ انہیں مجھ سے جارحانہ انداز کی توقع نہیں تھی لیکن وہ جیسے ہی قریب پہنچے میں کسی نہایت طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس طرح کھڑے کھڑے فلائنگ کلک لگانا بڑی مہارت کا کام ہوتا ہے اور اس میں ذرا سی غلطی اپنے لیے ہی نقصان کا باعث بنتی ہے لیکن مجھے مارشل آرٹ کے ہر شعبے میں ایسی تربیت دی گئی تھی کہ اس میں غلطی کا امکان نہیں تھا۔

اپنی جگہ سے اچھلتے ہی میں نے پھینچوں کی پوری قوت سے YELL بھی کیا تھا۔ کمرامیری دھاڑ سے گونج اٹھا۔ اس قسم کی دباؤ بھی حریف کا حوصلہ پست کر دیتی ہے۔ وہ چاروں بھی کسی قدر ہراساں ہو گئے۔

میں نے ذہل فلائنگ کلک لگا دی تھی۔ میرا ایک پیر ایک آدمی کے منہ پر اور دوسرا پیر دوسرے آدمی کے سینے پر لگا۔ وہ دونوں ہلبلاتے ہوئے پشت کے مل جا کر رہے۔ میں بھی زمین پر گر کر رہ گیا۔ البتہ چوتھے آدمی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری ٹانگ پر زور وار ٹھوکر سید کر دی۔ میں... ٹھوکر لایا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ جس شخص کے منہ پر فلائنگ کلک لگی تھی، اس کا شاید

ایک دانت اپنی جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ اس کے منہ سے برہم تھا اور وہ بری طرح چیختے ہوئے اپیل کرتا تھا۔ جیسے پر کلک لگی تھی، وہ سنبھل گیا تھا۔ البتہ تیرا ابھی پیٹ پڑے ہوئے تھا۔

دو آدمی بیک وقت حملہ آور ہوئے۔ میں دونوں دے کر اپنے آپ کو بچا گیا۔ ان میں سے ایک تو اب جموںک میں دیوار سے جا کھرایا جبکہ دوسرے نے بڑی سے پلٹ کر حملہ کر دیا تھا۔

یہ کمر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مجھے کھل کر اپنے حملے کا مظاہرے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ حریف اگر ایک ہوتا جبکہ ہوتی گردنوں ہم پانچ آدمی تھے۔ جس وجہ سے کئی ہو گئی تھی۔

میں ان سے دور رہ کر ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش تھا۔ وہ بھی اب محتاط ہو گئے تھے اور پھر مجھ سے ایک ہو گئی جس کا انہوں نے پھر پور فائدہ اٹھایا۔ دو آدمی پلٹ گئے۔ وہ مجھے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک کی پیسلوں میں کسی سے ضرب لگائی۔ اس کی ڈھیلی پڑ گئی۔ میں دوسرے کی گردن پر بازو پھینک کر رہا تھا کہ میرے سر قیامت ٹوٹ پڑی۔

چوتھے آدمی نے پانی سے بھرا ہوا مٹکا اٹھا کر میرے دے مارا تھا۔ گھڑا میرے سر ٹوٹا اور میں سرست پڑ کر میں شرابو رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کی گمیری گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس شخص نے ایک زچھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور پھر وہ چاروں بچہ پڑے۔ پہلے تو میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا۔ کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک آدمی نے میرے گھٹنے کی طرف ٹھوکر ماری۔ میں ٹھوکر مگر اگرا اور پھر مجھے موقع نہیں مل سکا۔

میرے جسم پر لاتوں اور گھونٹوں کی بارش ہو۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ایک مجھے کھڑے ہونے کا موقع مل گیا۔ ایک آدمی کو تو میر چار ہاتھ بڑی دے چکے تھے لیکن دوسرا جو تک کی طرح پلٹ گیا اور مجھے دھکیل دیا دیوار تک لے گیا۔ جبکہ نے مجھ پر گھونٹے بازی کی پر پیکس جاری رکھی۔

میں اگرچہ پھر پور مزاحمت کر رہا تھا لیکن مجھے دو تھا، وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ چاروں بازو توڑنے لگے۔ ایک گھونٹا میرے جڑے پر لگا۔ میرا ایک دانت مل میں اپنے خون کا ذائقہ محسوس کر کے مجھ پر ایک بار

ساٹا ماری ہو گیا۔ میں نے زخمی شیر کی طرح، پاؤں سے ہونے آؤں کو پیچھے دھکیل دیا لیکن اس مرتبہ مجھے بھی زیادہ ہاتھ چھلانے کا موقع نہیں مل سکا۔

پانچ آدمی ہونے والے ایک گھونٹے سے میرا دماغ جھینٹا۔ انہوں نے سانسے نیلی پیلی سی چنگاریاں دھس کرنے لگیں۔ میں پھیلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دو تین گھونٹے اور پانچ میرے حواس ختم ہونے لگے اور آنکھوں کے سامنے ہلکے دھند اور پھر تاریکی چھانے لگی۔ میں تورا کر نیچے گرا۔ کرنے کے بعد بھی میرے جسم پر گھونٹوں اور ٹھوکروں کی بارش ہوتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی گہری ہوئی پلٹ گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

○●○

چنوں کی وہ آواز مجھے میلوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن پھر وہ آواز واضح ہوتی گئی۔ میرے حواس تدریج بحال ہو رہے تھے۔

کینٹیاں سنگ رہی تھیں اور دماغ میں دھماکے سے دور رہے تھے۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں ٹیسس نہ ٹھہری ہوں۔ ظالموں نے مجھے روٹی کی طرح دھتک کر رکھ دیا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم پر صرف پتلون رہ گئی تھی۔ بنیان تو پتھر میں بدل کر میرے جسم سے الگ ہو گئی تھی۔

دلی چنوں کی وہ آواز اب واضح ہو گئی تھی۔ یہ آواز آواز دلی دیوار کے روشن دان سے آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر دیوار کے قریب پہنچ گیا اور سر اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھنے لگا۔

روشن دان میرے قد سے تقریباً چار فٹ اوپر تھا۔ میں نے ایک کر سلاخیں پکڑیں اور اپنے جسم کو آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے پڑی شکل سے اپنے چہرے کو سلاخوں کے درمیان لاسا تھا اور پھر دوسری طرف کا منظر دیکھ کر میرا خون کھل اٹھا۔

وہ آدمی تھے جو ایک نازک اور روحان پان سی عورت کو روپے ہوئے تھے۔ یہ ان تین عورتوں میں سے ایک تھی جنہیں کٹر رات میں لایا گیا تھا۔ اس کے کپڑے گھرے مل لہر لہر کھڑے ہوئے تھے اور وہ دونوں وحشی پھینچوں کی طرح اسے فوج رہے تھے۔ وہ عورت اپنے آپ کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔  
میں زیادہ دیر تک یہ منظر نہیں دیکھ سکا۔ سلاخیں میرے

ہاتھوں سے چڑھ گئیں اور میں نیچے گر گیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی جل رہی تھیں۔ میں دیوار سے نیک لگائے بیٹھا تھپید اور جاگنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ دونوں کہاں ہیں۔ ان کا کیا شہر ہوا ہوگا۔

مجھے اس طرح بیٹھے ہوئے شاید آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر میں نے سانسے دیکھا۔ دو آدمی دروازے کے سامنے نمودار ہوئے ایک کے ہاتھ میں راتھل تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں پیتل کا تھال جس میں کھانا رکھا ہوا تھا اور پانی کا گلاس بھی۔ میں اٹھ کر دروازے کے قریب آیا۔

”پچھلے پچھلے ہو۔ اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ گن مین نے راتھل تان کر غراتے ہوئے کہا۔

میں دلی سی دل میں مسکرایا۔... واسو دیوالے تجربے کے بعد وہ لوگ کوئی نیا خطرہ مول نہیں لیتا چاہتے تھے۔ میں پیچھے ہٹتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دوسرے آدمی نے دروازے کے قریب آکر پہلے گلاس سلاخوں کے اندر رکھا پھر تھال بھی دروازے کے پیچھے سے اندر سرکا دیا۔ اسی دوران میں اس کی نظریں مسلسل میری طرف اٹھی رہی تھیں۔ اسے شاید اندیشہ تھا کہ میں اس پر جھبٹ نہ پڑوں۔

”جاگتی اور تھپید کہاں ہیں؟“ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر گن مین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم لوگ اچھا نہیں کر رہے۔ پچھتاؤ گے۔“

”شکر کو روپے ٹھاکر کی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی۔“ گن مین نے گھورتے ہوئے جواب دیا ”ویسے تم ہو بڑے جان دار آدمی۔ فولاد بھرا ہوا ہے تمہاری بانسوں میں۔ تم نے جس طرح واسو دیو کی گردن مروڑی ہے وہ سب کے لیے حیرت کی بات ہے۔ وہ ساندھ تو چار آدمیوں کے قابو میں بھی نہیں آتا تھا۔“

”وہ تھا ہی اس قاتل۔“ میں نے کہا ”اس نے ہمارے ساتھ دھوکا لگایا تھا۔ اسے تو اس سے بھی زیادہ بھیاک موت ملنی چاہیے تھی۔ ویسے تم نے میری بات کا جواب نہیں کیا۔ وہ دونوں عورتیں کہاں ہیں؟“

”تمہاری دونوں عورتیں ابھی تک حیرت سے ہیں۔ انہیں کسی نے چھوا تک نہیں۔“ گن مین نے جواب دیا ”شکر کرو واسو دیو ہم میں سے نہیں تھا اگر وہ ہمارا ساتھی ہوتا تو تمہارے شر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے لیکن تمہاری وجہ سے ہمارا وگرا م غارت ہو گیا ہے۔“  
”کیا پروگرام؟“ میں نے ابھی ہوئی ٹکاہوں سے اس

کی طرف دیکھا۔

”کل صبح منڈی لگنے والی ہے۔ ہمیں آج وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ تمہارا تھما رہے ہاتھوں واسو دیو کی ہتھیلی کی وجہ سے ہمیں آج کا دن بھرا رکنا پڑا۔ اب تم یہ بھوجن کرلو اور ایک بات کا کھیاں رکھنا۔ اب اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو تم زندہ نہیں بچو گے۔“

”تم لوگ بھی ایک بات یاد رکھنا۔“ میں نے کہا ”اگر میری ساتھیوں میں سے کسی کو کچھ ہوا تو میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کی گردن مروڑوں گا۔“

مگر میں مجھے غور کر رہا تھا اور پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ ساتھ والے کمرے سے اب عورت کی سسکیوں اور آہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک کر روشن دان کی سلاخوں کو پکڑ لیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اس طرف کا منظر دیکھ کر میں دہل گیا۔ کمرے میں اس عورت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ بے لباس تھی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیے سکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے دونوں بازو گھٹنوں پر پلٹ رکھے تھے۔ دوسری طرف کی ایک کھڑکی سے آنے والی دھوپ براہ راست اس پر پڑ رہی تھی۔ اس کے بائیں بازو پر کندھے سے ذرا نیچے خون کا دھبہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں کمرے کی گھاس بھاسوں تک تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

”اے۔ کیا تم میری آواز سن رہی ہو۔“ میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

اس نے چونک کر گھٹنوں پر بھکا ہوا سر اٹھایا اور وحشتانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ادھر۔ تمہارے سامنے والی دیوار کے روشن دان میں۔“ میں نے اسے توجہ دلانے کے لیے کہا۔ میری آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے لپک کر چند فٹ دور فرش پر پڑی ہوئی ساڑی اٹھا کر اپنے اوپر ڈال لی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

”قیدی۔“ میں نے جواب دیا ”میں تمہارے علاوہ

دوسری عورت بھی نہیں۔ وہ کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں مگر تم کون ہو؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”میں بھی ان وحشیوں کی قید میں ہوں۔ میرے ساتھ عورتیں تھیں ان لوگوں نے ہمیں دھوکے سے اپنا قید خانہ اور ان عورتوں کو مجھ سے الگ کر دیا۔ ان کے ساتھ میرے ہاتھ سلاخوں پر پھسل رہے تھے میں بند اور موہا کر گرفت بنانے کی کوشش کرنے لگا مگر ہتھیلیوں میں پوچھ وچھ سے اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور دھب سے پڑ گیا۔ میں نے تجسس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور ایک کونے میں گھڑوچی اور اس کے قریب لکڑی کا ٹکڑا دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسٹول تقریباً دو فٹ تھا جسے میں نے اٹھا کر دیوار کے قریب رکھ دیا اور اس اوپر گھڑوچی رکھ دی۔

میں گھڑوچی پر کھڑا ہو گیا۔ دونوں چیزیں غاصی تھیں۔ ان کی چوٹیں ہل رہی تھیں۔ میں نے گھڑوچی پر کھڑا ہو کر روشن دان کی سلاخوں کو تھام لیا اور اپنا نیا دھبہ ہاتھوں پر ہی رکھا۔

اب میرا چہرہ روشن دان کے سامنے تھا اور میں دشواری کے بغیر دوسرے کمرے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی سامنے والی دیوار کے ساتھ بیٹھی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ساڑی سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔

”کیا تم ان عورتوں کے بارے میں پتہ جانتی ہو کے ساتھ ایک بچی بھی تھی۔“ میں نے اسے توجہ ہونے پوچھا۔

”وہ۔ وہ سب دوسرے مکان میں ہیں۔“ اس نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

”تم کو ہو۔ یہ لوگ تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مم۔ میں۔“ وہ بولی ”انہوں نے مجھے رنک پر دھوکے سے اٹھایا تھا۔“

”رنک پور۔ کیا تم رنک پور کی رہنے والی ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”میں احمد آباد کی رہنے والی ہوں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ سیر تفریح کے لیے آئی ہوئی تھی۔ میں دن پچاس تاجی تماروں کی سیر کرتے ہوئے میں اپنے گھر والوں کے چھڑ گئی۔ میں انہیں تلاش کرتی پھر رہی تھی کہ ایک آٹا میرے قریب آکر تپا کہ میرے گھر والے ڈاک بنگلے پر انتظار کر رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ڈاک بنگلے میں وہاں میرے گھر والے نہیں تھے البتہ دو آدمی اور تھے سمجھ گئی کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں نے دیوار

جھانکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور کچھ سو گھما کر بے ہوش کر دیا۔“

”انہوں نے ملے مجھے جنگل میں واقع کسی مکان میں رکھا۔ وہاں دو عورتیں اور بھی تھیں۔ کل رات یہ لوگ ہمیں اونٹوں پر لاد کر یہاں لے آئے۔ میرے ماتا پتا بنانے کس حال میں ہوں گے۔ یہ انسان نہیں درندے ہیں۔ دیکھو۔ انہوں نے میری کیا حالت کر دی ہے۔“ اس نے اپنے جسم پر سے ساڑی ہٹا دی۔

میں کانٹا اٹھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ دانٹوں سے کاٹے جانے والے نشان تھے۔ وہ واقعی انسان نہیں درندے تھے۔ اس نے ساڑی کو دوبارہ چادر کی طرح اپنے جسم پر پلٹ لیا اور سکیاں بھر لگی۔

اس کی عمر یا میں نہیں کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دہلی جلی باز ک سی۔ چہرے کے نقوش بڑے تھکے اور جاذب نظر تھے۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں بے پناہ وحشت بھری ہوئی تھی۔ بال لہریے دار اور گردن تک کٹے ہوئے تھے۔

میں کچھ کتنا چاہتا تھا کہ دروازے کی طرف سے غراہٹ سن کر چونک گیا۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہی گھن میں تھا جو پہلے آچکا تھا۔

”دیکھ لو لونا! کو۔ سالی شے بے ہاتھ نہ دھرن دیوے تھی۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی کھوہی مسکراہٹ اٹھ گئی تھی۔

”تم لوگ انسان نہیں درندے ہو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ اسی دوران میں بے خیالی میں گھڑوچی پر بوجھ زیادہ پڑ گیا اور وہ میرے پیروں کے نیچے سے پھسل گئی۔ میں روشن دان کی سلاخوں سے لٹکا رہ گیا اور پھر میں نے ہاتھ چھوڑ دیے اور دھب سے نیچے گرا۔

”تم لوگ ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے غرایا۔

”تو اپنی کھال بچا بھایا۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹے ہوئے بولا ”تو نے تمہارا کوپتا نہیں تم سے عشق کیوں ہو گیا ہے وہ نہ ہوتا۔ تمہاری تپا پاپا ہو چکا ہوتا۔ زیادہ ہوشیار مت بن۔ وکرم تم بہت گرمی کھائے ہوئے ہے۔ تو نے اس کا دانت توڑا ہے۔ اسے موقع مل گیا تو وہ تیری گردن توڑ دے گا اور تو نے بھوجن نہیں کیا۔ پسند نہیں آیا کیا۔“

”میں تمہارا خون پیوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”واہ بھئی واہ۔“ وہ مسکرا دیا ”اتنی مار کھانے کے بعد

بھی اگر نہیں مٹی تیری۔ کوئی بات نہیں۔ سب کچھ بھول جائے گا۔“

میں کچھ کتنا چاہتا تھا کہ روشن دان کی طرف سے اس عورت کے چہرے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”نہیں نہیں۔ چھوڑ دو مجھے۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“ وہ چیخ کر فریاد کر رہی تھی۔

میں پچھلی دیوار کی طرف لپکا اور ایک کر روشن دان کی سلاخوں سے لٹک گیا۔ دو آدمی اس عورت کو کھینچے ہوئے

لے جا رہے تھے۔ چادر کی طرح لپٹی ہوئی ساڑی ایک بار پھر اس کے بدن سے جدا ہو گئی تھی۔ وہ دونوں وحشی اسے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ میں نیچے اتر آیا۔ گھن میں بھی جا چکا تھا اور دروازے کے اندر کی طرف رکھا ہوا کھانے کا تھاں بھی غائب تھا۔ اس نے موقع پا کر تھاں باہر کھینچ لیا تھا۔ البتہ پانی سے بھرا ہوا گلاس وہیں رکھا ہوا تھا۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا کمرے کے گھرے سانس لیتا رہا۔ اس عورت کی چپٹیں دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ حلق میں کانٹے سے چپٹے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں بانی حلق میں اندھیل لیا اور وہیں بیٹھ کر اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ دن گزر گیا۔ میں دروازے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اس دوران میں نہ تو کسی عورت کے چہرے کی آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی ڈاکوؤں کا کوئی آدمی میری طرف آیا تھا۔

صورت حال عجیب سی پیچیدگی اختیار کر گئی تھی۔ نہ جہاز کو حادثہ پیش آتا اور نہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہوتے اور میرا خیال میں اس سے نجات حاصل کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ کمرے میں چھپر بھٹکانے لگے۔ لالین تو موجود تھی لیکن میرے پاس ماچس نہیں تھی کہ لالین جلا کر روشن کر لیتا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اس کے ساتھ ہی چھپروں کی ہلنا بڑھتی گئی۔ یہ چھپر تو کم بخت ان قزاقوں سے بھی زیادہ خطرناک اور خوں خوار تھے جو میرا خون چوس رہے تھے۔

قدموں کی آہٹ سن کر میں چونک گیا اور پھر بائیں طرف سے مدد میری روشنی دکھائی دینے لگی جو بدتر رنج و داغ ہوئی چلی گئی۔

وہ وہی دونوں آدمی تھے جو دن میں بھی آچکے تھے۔ ایک گھن میں تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں کھانے کا تھاں تھا۔ وہ

آتش فشانی 66 حصہ 4

دونوں دروازے سے چنٹو دور ہی رک گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آگے نہیں آئیں گے اسی لیے میں دروازے کے قریب سے اٹھ کر سامنے والی دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مگر میں تو رات اٹھ گھنٹے پہلے دروازے سے آویں دروازے کی سلاخوں کے پیچھے سے تھال اندر سرکا دیا اور قریب ہی پانی کا گلاس بھی رکھ دیا۔

”تم میں سے کسی کے پاس ماچس ہو تو دے دو۔ لالین جلائی ہے۔“ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا۔ مگر میں نے جب سے ماچس نکال کر سلاخوں میں سے میری طرف اچھال دی۔ ماچس میرے گھٹنے سے ٹکرا کر گری بنے میں نے اٹھالیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے لالین حلا کر ماچس باپریچیک دی۔ مگر میں نے جبکہ کر ماچس اٹھائی اور وہ دونوں کچھ کے بغیر واپس چلے گئے۔

میں نے تھال اپنی طرف سرکالیا۔ تو بے کی بکی ہوئی دو موٹی موٹی روٹیاں ایک ٹھوری میں اچار اور اونٹ کے گوشت کے تے ہوئے تھلے تھے جن میں سے بلی سی باند آ رہی تھی۔ میں دو دن سے فائے سے تھا۔ پیٹ سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنے حقیقی دشمنوں سے منہنے کے لیے مجھے جسمانی طاقت کی ضرورت تھی اور یہ توانائی کھانے پینے سے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

کھانے کے بعد میں سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ٹانگیں آگے کو پھیلا لیں۔ میں کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی آنکھیں پوری طرح کھول کر باہر تاریکی میں گھورنے لگتا۔

سانے میں کسی وقت کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز سنائی دے جاتی اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔ وہ شاید آدھی رات کا وقت تھا۔ نسوانی چیخ کی وہ آواز سانے کو چربی ہوئی در تک پھیل گئی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ چیخ کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فضا شیطانی قوتوں سے گونج اٹھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دو وحشی پھر کسی عورت کو کبھی بھڑونے لگے تھے۔ وہ نسوانی چیخ پھر سنائی دی لیکن اس مرتبہ آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ہی تاہید اور جاگی کا خیال ابھر آیا۔ چیخ کی آوازیں نہیں پہچان سکا تھا مگر وہ ان دونوں میں سے جی کوئی ہو سکتی تھی۔

میں اٹھ کر دروازے کے قریب آگیا اور سلاخیں پکڑ کر

کھڑا ہو گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ دروازہ توڑ کر باہر نکل جاؤں اور ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں جو کسی معصوم عورت کی عزت سے کھیل رہے تھے۔ ان کے شیطانی قوتوں کی گونج فضا میں گھڑی جا رہی تھی۔

میرے ہاتھ سلاخوں پر پھسلے ہوئے نیچے آ گئے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں باہر کے کندے میں لگے ہوئے تالے سے مس ہوئیں تو میں غیر ارادی طور پر تالے کو ٹٹولنے لگا۔

میرے دماغ میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ مجھے ہلکا سا وہ واقعہ یاد آگیا جب میں تھالی اور جاگی کے ساتھ چنانچہ راتے سے واپس آیا تھا تو ہلکا سا اثر پورٹ پر دارا کے آدمیوں نے ہمیں ایک دین میں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ دین کے دروازے لاک تھے اندر سے پینڈل ٹکے ہوئے تھے اس وقت میری نظریں دین کے ایک دروازے کے لاک پر مرکوز ہوئی تھیں اور لاک کھل گیا تھا اور ابھی تین دن پہلے ہی تو میں نے اپنی نظروں کی اس پراسرار قوت سے کام لے کر جہاز کے مسافروں کو لوٹنے والے ڈاکوؤں کو آپس میں لڑا کر ان کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان میں سے کسی کی چلائی ہوئی گولی جہاز کے فیول ٹینک میں لگی تھی اور جہاز بھی تباہ ہو گیا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری نظروں کی یہ پراسرار قوت میرے اندر پوشیدہ جی کی وجہ سے تھی یا اس کا سبب پھر اور تھا۔ بہر حال میں نے اس وقت بھی اس پراسرار قوت سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا اور تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر نظریں اس پر جمادیں۔

ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں کلک کی بلکی سی آواز ابھری اور تالا کھل گیا۔ میں نے بڑی آہستگی سے تالے کو کندے میں سے نکال کر ایک سلاخ میں اٹکا کر کندہ کھول دیا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

دو سرا قدم اٹھاتے ہی میں رک گیا۔ کمرے میں داہیں جا کر لالین بھجادی اور دروازہ بند کر کے تالا کندے میں اٹکا دیا اور دبے قدموں پہنچتی دروازے کی طرف چلے گا۔

گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ آٹھن کا باہر والا دروازہ کس طرف ہے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی اس لیے میں تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا رہا۔

دروازے کو باہر سے کد اٹکا ہوا تھا۔ میں نے زور دیا اور دیکھا۔ دیوار چھٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں اچک کر اوپر چڑھ گیا اور بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔

آٹھن پر پائل تھے اور باہر درختوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ سی گہری تھی۔ میں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پانچ چھ مکان تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جاگی وغیرہ کو کس مکان میں رکھا گیا تھا اور وہ لوگ کس مکان میں تھے اور یہ کہ وہ نسوانی چیخ کس مکان سے سنائی دی تھی۔

میں ابھی ہی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کھٹی کھٹی چیخ دوبارہ سنائی دی۔ میں اچھل پڑا۔ اس چیخ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ وہ شیطانی کس کمرے میں تھے۔ میں دبے قدموں اس طرف چلے گا۔

یہ مکان بھی پہلے مکان جیسا ہی تھا۔ آٹھن اور پچھلی طرف کمرے۔ آٹھن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں دیوار

چھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔ اس آٹھن میں جی بنیم کے دو درخت تھے۔ میں چند لمبے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا رہا اور پھر بہت محتاط انداز میں چلا ہوا۔ ایک درخت کے نیچے رک گیا۔ آٹھن کافی کشادہ تھا۔ جس کے آخر میں غالباً دو کمرے تھے۔ ان کے دروازے دائیں رخ تھے جو یہاں سے نظر نہیں آ رہے تھے البتہ اس طرف بہت دم دھوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ کسی کمرے میں لالین جل رہی تھی۔ دہلی دہلی چیخیں اور شیطانی قوتوں کی آوازیں بھی اسی طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔

میں آگے بڑھتا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز سن کر رک گیا۔

”میں اب چلا ہوں۔“ یہ وجہ تھا کہ آواز تھی ”تم لوگ رات بھر اس چھوکی سے کھیل مت کرتے رہنا۔ سویرے جلدی جانا ہے۔“

اس کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک انسانی پیولا اس طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اوپر ادھر دیکھا اور درخت کے تنے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ درخت کا تانا اگرچہ زیادہ موٹا نہیں تھا لیکن یہاں گہری تاریکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

دبے ہاتھ مجھ سے چار پانچ فٹ کے فاصلے سے گزر گیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ بیٹھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اسے ہوشی کھلا چھوڑ گیا تھا۔

میں درخت کی آڑ سے نکل کر آہستہ آہستہ اس طرف چلے گا۔ جس طرف سے دبے ہاتھ آیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس طرف وہ ہی کمرے تھے پہلے کمرے کا دروازہ اگرچہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تاریکی تھی البتہ دوسرے

کمرے میں روشنی تھی اور دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ شیطانی اس کمرے میں تھے۔ ان کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر ایک روتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

”خدا کے لیے چھوڑ دو مجھے۔ مراؤں گی میں۔ چھوڑ دو مجھے۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔“

میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ مجھے تاہید کی آواز پہچانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جو ان شیطانیوں کو خدا کے واسطے دے کر اپنی جاں بخشی کی فواد کر رہی تھی۔

”تمہارا خدا سرحد کے دوسری طرف رہتا ہے سندر۔ یہ ہندوستان ہے یہاں تو کالی ماں کی پوجا کرنے والے سوراؤں کا راج ہے۔ یہاں تو بھگوان بھی بے بس ہے۔ تمہارا خدا یہاں اگر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اسی لیے۔“

میں اس سے آگے نہیں سن کا۔ وہ جو کوئی بھی تھا واقعی شیطانی تھا اور اس قسم کے لوگوں کے سامنے تو واقعی ان کا بھگوان بھی بے بس ہو تا ہے۔

میں اس وقت اپنے پورے بدن میں سنسناہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ میری مٹھیاں بچھ گئیں۔

میں دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر کتنے آدمی تھے۔ سوچے سمجھے بغیر خون خوار بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں تجسس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دروازے کے دوسری طرف تین چار فٹ آگے دو رائٹیں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔

میں نے اپنا سانس روک لیا اور آہستہ آہستہ آگے سرکنے لگا اور پھر بڑی تیزی سے دروازے کے سامنے سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گیا اور ایک رائٹ اٹھائی۔

”اے۔ کون ہے رے ادھر؟“

اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ میں دونوں ہاتھوں میں رائٹ اٹھا کر دروازے کے سامنے آگیا۔ اس وقت ایک آدمی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شاید یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ دروازے کے سامنے سے کون گزرا ہے لیکن مجھے دیکھ کر وہ اس طرح بے حس و حرکت ہو گیا جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت ابھرتی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پوری قوت سے رائٹ کاٹ

اس کے سینے پر رسید کر دیا۔ وہ بلبلا تا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ کمرے میں دو آدمی اور تھے جن میں سے ایک نے زمین پر پڑی ہوئی ٹاہید کے ہاتھوں کو سر کے پیچھے لے جا کر گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرا کسی خوبی بھڑیے کی طرح ٹاہید کو جھنجھوڑ رہا تھا اور ٹاہید سرخ رہی تھی۔ اپنے سامنے کی چیخ سن کر وہ دونوں چوک گئے۔ پہلا آدمی ٹاہید کے ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دوسرے آدمی کے کندھے پر ہر نقل کے بٹ سے زوردار وار کیا۔ وہ بھی چیخا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ ٹاہید کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مٹی کے فرش پر پڑی ہاتھ پیریز رہی تھی۔ وہ شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس کے سینے پر ایک زخم تو پسے ہی تھا۔ گردن کے قریب بھی خون کا ایک دھبہ نظر آ رہا تھا۔

”ٹاہید! انھو جلدی کرو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

میری آواز سن کر ٹاہید نے آنکھیں کھول دیں۔ بے پناہ دیرانی تھی۔ ان آنکھوں میں لیکن صورت حال کا اور اک کرے ہی اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار آئی۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ سکی تھی۔

میں نے ان تینوں کو رانقل کی زور لے رکھا تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر بے پناہ خوف تھا۔ آنکھوں میں وہشت تھی۔ وہ لوگ وہ بدولائی میں میری قوت کا اندازہ لگا چکے تھے اور اب تو میرے ہاتھ میں ہتھیار بھی تھا۔

میں نے بت بڑا رسک لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر ان بد معاشرین پر قابو پایا جائے تو میں ان تمام عورتوں کو لے کر صحرائیں اس طرف نکل جاؤں گا جس طرف سے پہلے روز میں نے اس شہر سوار کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمارے باپ کی جھیل پر شیا سی واسو دیو نے بتایا تھا کہ چند گھروں پر مشتمل اس چھوٹی سی بستی سے دس بارہ کوس آگے ایک بڑا قصبہ ہے اور میرا خیال تھا کہ ہم صبح ہونے تک اس قصبے میں پہنچ جائیں گے لیکن میں نے تصویر کے دوسرے رخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اگر میرا منصوبہ ناکام ہو گیا تو دنیا کی کوئی طاقت کم از کم مجھے تو بھانک موت سے نہیں بچا سکے گی۔

”ٹاہید! وہ چادر اتھا کر اوڑھ لو اور اس طرف آ جاؤ۔“ میں نے ٹاہید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹاہید نے چادر اتھا کر اوڑھ لی اور میرے قریب آ گئی۔ میں نے کچھ دیر پہلے یہاں سے وجہ تھا کر کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر ٹاہید کی حالت دیکھ کر کوئی احمق بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس کا دامن عصمت تار تار ہو چکا ہے۔ اس

کے منہ سے نکلنے والی سسکیاں اور ہچکیاں بھی اس کی تصویر کر رہی تھیں۔

”مارو! انہیں۔“ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی ”مار انہیں میرے بھائی۔ انہیں بھون دو گلیوں سے۔ یہ اڑا نہیں خوں خوار درندے ہیں۔ ان تین دنوں میں انہوں ہم عورتوں کو بری طرح روندنا ہے۔ ہمیں اپنے کندھے سے تپے پال کیا ہے۔ یہ کالی کے پجاری ہیں تپائی اور بربادی ہر کار ہے۔ یہ انسان نہیں بھڑیے ہیں۔ مارو! انہیں میر بھائی۔ زندہ مچھوڑو انہیں۔ مارو۔ انہیں ختم کرو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل کانپ کر رہا اس نے کہا تھا کہ ”ان تین دنوں میں انہوں نے ہم عورتوں کو بری طرح روندنا ہے۔“ میرے ذہن میں جا کی کا خیال آیا۔ کیا وہ بھی ان بد معاشرین کی ہوس کا شکار ہو چکی ہے۔

”ہمیں مار کر بھی تم لوگ یہاں سے زندہ نہیں جا گے۔“ میرے سامنے کھڑے ہوئے تینوں بد معاشرین میں ایک نے کہا۔ ”ہم نہیں جانت ہیں کہ تم اس کو ٹھری سے کیسے نکلے ہو۔ یہاں تک چلے آئے کہ اپنی کامیابی سمجھو۔ تمہاری موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے لیکن تم بدنوق پھینک کر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دنا نہیں معاف کر سکتے ہیں۔ پھینک دو بدنوق۔“

”نہیں بھائی۔ بدنوق مت پھینکنا۔“ ٹاہید چیخی درندے ہیں۔ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔“

”نہیں۔ میں وجہ دیتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں جائے گا۔“ اس شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بات کرتے کرتے اس کی نظریں میرے پیچھے کی اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھرتی آئی۔ اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ چھٹی جس نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ میں تیزی سے مڑا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ میرے کندھے پر لگنے والی وہ خاصی زوردار تھی۔

میں بری طرح لڑکھڑایا۔ سینے کی کوشش کرنے پہلے ہی وہ آدمی چیل کی طرح مجھ پر جم پڑا۔ جس نے بدنوق پھینک دینے کا مشورہ دیا تھا۔

اسی وقت ٹاہید کی زوردار چیخ سنائی دی۔ دروازے مجھ پر حملہ کرنے والے نے اسے بھی کسی بھاری چیز ضرب لگائی تھی اور وہ چیخ ہوئی زمین پر گر گئی تھی۔ میرا حریف مجھ سے رانقل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا اس نے رانقل پر گرفت بھی مضبوط کر لی تھی۔ میں نے

پیروں پر اچھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اس کے عکس اس نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا ایک ساتھی ٹھوکوں سے بھی میری تواضع کر رہا تھا۔

رانقل کے ڈنگروالے مجھ پر میرے حریف کا ہاتھ آیا تھا اور پھر کھینچا تانی میں اس کی انگلی سے ٹریک دب گیا۔ سرگرمی کی ترزاہٹ کے ساتھ ہی ٹاہید کی خوفناک چیخ بھی فضا میں گونج اٹھی۔ وہ دھڑلے لگی تھی اور رانقل سے نکلنے والی گولیاں اس کے جسم میں پست ہو گئیں۔ میں نے گردن ٹھاکر اس کی طرف دھکا۔ اس کے بدن سے خون کے کئی فوارے پھوٹ پڑے تھے اور پھر اسی لمحے میری کھوپڑی کے پچھلے حصے پر زوردار ٹھوک لگی اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆☆○

دی کرا تھا اور میں فرش پر تقریباً اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پیریز تھے۔ ہر بندھے ہوئے تھے جس رخ پر پڑا تھا وہاں سے دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور بڑی مشکل سے پہلو بدلنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اب مجھے دروازہ بھی نظر آ رہا تھا اور کمرے کا باقی حصہ بھی۔

یہ کرا ٹاہید کا مقتل بنا تھا۔ فرش کے ایک بڑے حصے پر خون پھیلا ہوا تھا جو جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ ٹاہید کی لاش وہاں سے اٹھائی گئی تھی۔

پچھلے واقعات کسی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھومتے چلے گئے۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آیا تھا تو وہ خون خوار جیمزوں کی طرح ٹاہید کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ دروازے کے باہر رکھی ہوئی رانقل میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور میں نے ان تینوں پر تقریباً قابو پا ہی لیا تھا کہ عقب سے کسی نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس طرح بازی پلٹ گئی اور نہ صرف میں مار کھایا بلکہ ٹاہید بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھ لیا تھا جس نے دروازے کے باہر سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ وہ دسے تھا کہ تھا جو پہلے تو باہر چلا گیا تھا مگر بعد میں واپس آیا تھا یا تو اس کی چھٹی جس نے اسے کسی خطرے سے آگاہ کیا تھا اور یا ہو سکتا ہے وہ ساتھ والے مکان میں گیا ہو جہاں سے اس نے اپنے کسی آدمی کی چیخ سن لی تھی۔

میں فرش پر پچھلے ہوئے خون کے اس دھبے کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مندر کے کھنڈر میں شیا سی واسو دیو سے تصادم کے بعد قدم قدم پر شکست میرا مقدر کیوں بن گئی تھی۔

کیا میری صلاحیتیں دم توڑ رہی تھیں؟

میں نے سر جھٹک کر ان خیالات کو ذہن سے نکال دیا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگا تھا۔ وہ تو پتویشن ہی کچھ ایسی ہو جاتی تھی کہ میری دھناتی ہو جاتی تھی مگر نہ میری صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ اس طرح اپنے حریفوں سے پٹ رہا تھا لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں بیش بالا دست ہی رہوں۔ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کر لینے کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں بہترین اور ناقابلِ تغیر بن گیا ہوں۔ فتح اور شکست لڑائی کے حصے ہیں۔ اب شکست میرے حصے میں آ رہی تھی اور یہ میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ مجھے ان پر بالادستی حاصل ہو گئی تو ان میں سے کوئی بھی میرے ہاتھوں سے فتح نہیں سکے گا۔

میں نے بچپن میں ہندوستان کے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی تھیں جن سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہندوستان کوئی بہت ہی پر اسرار ملک ہے لیکن میں نے ان باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے لوگ سنگاپور میں آباد تھے۔ ان میں چاچا بڑا تاب سنگھ جیسے لوگ بھی تھے مخلص اور دھرم دہ۔ میں نے ان لوگوں میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی تھی۔ جسے پر اسرار کہا جاتا۔ البتہ سنگاپور میں آباد بعض ہندو ایسے بھی تھے جو دوسروں سے تو کیا اپنے آپ سے بھی مخلص نہیں تھے۔ فریب، دھوکا اور دھکاری ان کی سرشت میں شامل تھی اور شاید ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہندوستان کو پر اسرار کہا جاتا تھا۔

میں حادثاتی طور پر ہندوستان پہنچ گیا تھا اور یہاں آتے ہی میں جن تجربات سے گزر رہا تھا اسی سے میں یہ رائے بہ آسانی قائم کر سکتا تھا کہ دھوکا اور فریب یہاں کی مٹی میں شامل ہے۔ ان لوگوں کو تو ہمارے ساتھ بہرہ ردی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ ہماری مدد کرنی چاہیے تھی لیکن صورت حال اس کے برعکس تھی۔ پہلے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے جہاز کے مصیبت زدہ مسافروں کو لوٹنے کی کوشش کی اور پھر خود ہی جہاز ہونگے اور اب یہ لوگ۔ یہ انسان نہیں شیطان تھے۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا میرے دماغ میں سناہٹ بڑھتی گئی اور پھر باہر سے کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ میں ایک بار پھر اوڑھ اڑھ دیکھنے لگا۔

کمرے میں لائین کی زرد روشنی بجلی ہوئی تھی۔ بائیں طرف روشن دان سے بہت دم سا اجالا دکھائی دے رہا تھا

جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ رات بیت چکی تھی اور دن طلوع ہونے والا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آنے والا یہ نیا دن اپنے دامن میں ہمارے لیے کیا لے کر آ رہا تھا۔

چند منٹ اور گزر گئے اور پھر باہر سے اونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو تین آدمیوں کی بھی زور زور سے بولنے کی آواز میری سماعت سے نکلنے لگی۔ دروازے کے باہر ایک بار پھر کھانسی کی آواز سنائی دی۔

میں نے ایک بار پھر ہلو ہلا اور بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی دوران میں باہر قدموں کی آواز ابھری جو قریب آکر رک گئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔

وہ دو آدمی تھے اور دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک رائفل اٹھانے کھڑا رہا اور دوسرا میرے قریب بیٹھ کر میرے پیروں کی رسی کھولنے لگا۔

”یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے“ وہ کہہ رہا تھا ”تمہارے صرف پیر کھولے جا رہے ہیں۔ اگر تم نے اس مرتبہ کوئی گڑبگڑ کرنے کی کوشش کی تو تمہیں بے دریغ گولی سے ڈاڑھا دیے جائے گا۔ اس لیے اگر تمہیں اپنا جیون بچا رہے تو کوئی ایسی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے پیر کھول کر اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور لائین بچا دی اور وہ دونوں مجھے دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے آئے۔

ہم اس مکان سے نکل کر درختوں کے جھنڈ کی طرف آگئے جہاں جا کر بھی دوسری تین عورتوں کے ساتھ موجود تھی۔ بلکہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی رہی تھی۔ بلکہ کوئی کچھ میرے دل پر گھونسا لگا۔ کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کی ماں اس سے چھڑ چکی ہے اور وہ ماما کے سامنے سے بیشہ بیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔

وہ بے تحاشہ کے آدمی اونٹوں پر کباوے کس رہے تھے اور وہ بے تحاشہ خود ایک طرف کھڑا انکامات جاری کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شیلانا بھی ایک مکان سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے بڑی سی ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی۔

جاگتی اور دوسری عورتوں کو مختلف اونٹوں پر بٹھایا جانے لگا۔ وہ دونوں آدمی مجھے بھی دھکیلے ہوئے ایک اونٹ کی طرف لے گئے۔ اونٹ کے قریب پہنچ کر میں نے غیر ارادی

طور پر پائیں طرف دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ چند گز آگے مجھے جھاڑیوں میں ایک پیر نظر آیا۔ میں اس طرف چلے لگا۔ مجھ روکا نہیں گیا۔

اور پھر جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر میں کانٹا اٹھا۔ بائیں کی ہر بند لاش جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جسم کوئی گز سے چھلکی تھا۔ زخموں سے بننے والا خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا اور میرا خیال ہے لاش اکڑ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری طرف دیکھ رہی ہو۔

یہ سفلی اور برستی کی انتہا تھی۔ ایک انسان کی لاش کو مردہ کتے کی طرح پھینک دیا گیا تھا۔ ایسے شقی القلب انسان میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے مگر یہ لوگ انسان تھے ہی کبھی شیطان تھے ہی تو۔

”اس کو دیکھیں سے دل بھر گیا ہو چلو بھایا۔“ یہ آواز سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ گھٹن رائفل لے میرے قریب کھڑا تھا۔ ہم اونٹوں کے قریب آگئے۔ سب لوگ اونٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ جاگتی اور وہ تین عورتیں الگ الگ اونٹوں پر تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ایک آدمی بھی پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشہ نے ایک اونٹ پر پوٹلی کو سنبھال رکھا تھا جو بڑی طرح روتے اور چیختے چلاتے ہوئے پھل رہی تھی اور بار بار ماں کو پکار رہی تھی۔ میرے ہاتھ پست سے کھول کر آگے باندھ دیے گئے۔

”چل بھایا۔ بیٹھ اس اونٹ پر۔“ میرے ساتھ آنے والے نے کہا۔

”میرے ہاتھ تو کھول دو۔ میں اونٹ پر کیسے بیٹھوں گا۔“ میں نے کہا۔

”نہ بھایا۔ یہ غلطی میں نہ کر سکتا۔“ اس نے جواب دیا ”یوں اوھر پیر رکھ کر اوپر چڑھ جا اور کباوے کو یہاں سے پکڑ لے۔“

میں اونٹ پر کسے ہوئے کباوے کو دیکھنے لگا۔ اس پر وہ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ میں لکڑی پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ گیا اور دوسرا پیر دوسری طرف ہٹا لیا۔ آگے سے کباوے کی لکڑی نصف دائرے کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ میں بندھے ہوئے ہاتھوں کو الگ الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے دونوں ہاتھ ایک ہی جگہ اس لکڑی پر بٹھا دیے۔

میرے شتران نے منہ پر ڈھانا باندھ لیا اور میرے پیچھے بیٹھ کر اونٹ کی ٹیکل کی رسی پکڑ لی اور رسی کو جھٹک دیتا ہوا ہش ہش کرنے لگا۔ رسی کھینچنے سے اونٹ بلبلانا اٹھا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اونٹ پر بیٹھنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔

اور ذرا دیر جھٹکے لگنے سے میں گرتے گرتے بچا تھا۔ دوسرے اونٹ بھی بلبلاتے ہوئے اٹھ گئے۔ میں نے گردن کھڑک دیکھا۔ تمام آدمیوں نے اپنے چروں پر ڈھانے باندھے تھے۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ جاگتی اور تینوں عورتوں کے چوہوں پر خوف کے سامنے نظر آ رہے تھے۔ بلبلے دستور اپنی ماں کو پکار رہے ہوئے دور رہی تھی۔ وہ بے تحاشہ نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور تمام اونٹ بلبلاتے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔ شیلانا بھی ایک الگ اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی چرے پر ڈھانا باندھ رکھا تھا اور میں نے اسے اس کے کپڑوں سے بچایا تھا۔

اونٹ اس غلغلے سے نکل کر مشرق کی طرف چلنے لگا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ مڑ کر ان جھاڑیوں کی طرف دیکھا جہاں ٹاہیدی کے بے کفن لاش پڑی ہوئی تھی۔ مجھے ٹاہیدی کی موت کا بے حد افسوس ہوا تھا اور بجلی پر ترس آ رہا تھا جو دیشیوں کے اس دیس میں اکیلی رہ گئی تھی۔

میں سیدھا چوہا کر بیٹھ گیا۔ اونٹ کی بے دھنگی چال سے ذرا دیر جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں قدرے آگے جھکا ہوا تھا اور سامنے والی لکڑی کو بڑی سختی سے پکڑ رکھا تھا۔

غلغلے میں پیچھے رہ گیا۔ اونٹ ایک قطار میں چلنے رہے۔ میں نے کسی قسم میں اونٹوں کے ایک کارواں کو صحرا میں چلنے ہوئے دیکھا تھا۔ فلم میں کارواں کا وہ منظر بہت اچھا لگا تھا اور آج میں خود ایک کارواں میں شامل تھا لیکن میری حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور میں اسی سزے سے بالکل بھی لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس دل و دماغ میں طرح طرح کے دوسوے ابھر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنا قیدی کیوں بنا رکھا ہے اور یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔

سامنے آتی پر سرفی پھیل رہی تھی۔ سورج نکلنے والا تھا۔ دن کے وقت صحرا میں سڑ کر آسمان نہیں تھا۔ جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جاتے گا ریت بھی جیتی جائے گی۔ اوپر آگ برساتا ہوا سورج اور نیچے جیتی ہوئی ریت۔ اس جہنم میں سڑ کر مرنے کا تصور ہی ہولناک تھا۔

سورج نکل آیا۔ دھوپ کی رو بہلی کر میں شروع میں تو بہت بھلی لگیں لیکن پھر ان کی حدت بڑھتی گئی اور بدن پر ٹوٹیاں لگ جیتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ہم مشرق کی طرف سڑ کر رہے تھے۔ دھوپ براہ راست چوہوں پر پڑ رہی تھی۔ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

ہمارے چاروں طرف تاحہ نگاہ ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ ہوائے ریت پر لہریں بادی تھیں اور لگتا تھا جیسے یہ ریت کالہریں لیتا ہوا سمندر ہو جس میں ہم سڑ کر رہے تھے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ مجھے یوگا کی پریکٹس تھی اور میں گھنٹوں ایک ہی انسان میں بیٹھا رہ سکتا تھا لیکن یہاں ایسی صورت حال نہیں تھی۔

اونٹ کے جھکوں کی وجہ سے میری گردن کھٹکی تھی۔ کبھی میں آگے کو جھک جاتا اور کبھی سیدھا ہو جاتا۔ اگر میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو شاید اتنی زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔

دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی۔ میرے جسم کا اور کاحصہ بہرہ نہ تھا۔ اس لیے دھوپ براہ راست سونٹیوں کی طرح چھ رہی تھی۔ بیٹھنے کی دھاریں پورے بدن پر کچھوں کی طرح رینگ رہی تھیں پھر شاید قدرت کو ہم پر رحم آگیا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تو پہلے ہی سے تھے لیکن اب وہ ابر پارے آپس میں جڑتے جا رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔

ہمارے اس قافلے میں سات اونٹ شامل تھے۔ جو ایک قطار میں چل رہے تھے۔ وہ بے تحاشہ کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ اس نے جیج کر کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی شتر سواروں نے اونٹوں کی رفتار تیز کر دی۔ میرے اونٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے ٹیکل کی رسی کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ اونٹ پہلے بلبلایا اور پھر دوڑنے لگا۔

پہلے تو مجھے ٹیکلے ٹیکلے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن اب میں باقاعدہ اچھل رہا تھا۔ میں نے آگے کو جھک کر لکڑی کو اس قدر مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ میری انگلیوں کے جوڑوں میں درد ہونے لگا۔

عورتوں کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں لیکن شتر سواروں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اونٹوں کو دوڑاتے رہے اور پھر وہ حادثہ پیش آگیا جس کی شاید میں توقع کر رہا تھا۔ ایک عورت اونٹ سے گر گئی۔ اس کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں کچھ آگے جا کر اونٹ روک لیے گئے اور دو آدمی اپنے اونٹوں سے اتر کر اس طرف دوڑے جہاں وہ عورت ریت پر پڑی بیڑی رہی تھی۔

یہ وہی عورت تھی جسے اس روز میں نے اپنے ساتھ والے کمرے میں روئے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ قیمت تھا کہ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ اسے دوبارہ اونٹ پر بٹھا دیا گیا اور قافلہ پھر چل پڑا۔

تین مہینوں کے جان لیوا سفر کے بعد درختوں کا ایک  
 جھنڈ سا نظر آیا۔ یہ بیکر کے درخت تھے جو تقریباً ایک فرلانگ  
 کے رتنے پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ پانی کا کوئی چشمہ وغیرہ  
 نہیں تھا لیکن شاید زیر زمین پانی موجود تھا جس سے بیکر کے یہ  
 درخت پرورش پا گئے تھے۔

ان درختوں کے قریب اونٹ روک لیے گئے۔ اونٹوں کے بیٹھنے کا انداز بھی بڑا روح فرسا تھا۔ اونٹ جب آگے کی طرف بھٹکتا تو تیس منہ کے بل گرتے گرتے بچا تھا۔

کیکر کے درختوں کے اس ذخیرے میں دو چار نیم کے  
درخت بھی تھے ہم ان درختوں کے نیچے بیٹھ گئے جاگتی  
اپنے اونٹ اترتے میری طرف دوڑی تھی لیکن اسے  
میرے قریب آنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ وہ مجھ سے چند فٹ  
دور بیٹھ گئی۔

شیلہ مائی نے اپنی بوٹی کھول لی۔ جس میں روٹیاں بندھی ہوئی تھیں ان کے ساتھ مہروں کا چار تھا۔ اس نے ایک ایک روٹی ہم سب میں تقسیم کر دی۔ ہر روٹی پر چار کی ایک سرخ بھی رکھ دی تھی۔ میرے ہاتھ اس وقت بھی نہیں کھولے گئے البتہ جانی کہ یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے روٹی کھلا دے۔

جائی میرے قریب آگئی۔ آج کی روز بعد مجھے جاگنی کو دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں دیرانی سی تھی لیکن میرے سامنے آکر وہ اپنے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو گئی۔

ہم انگریزی میں باتیں کرنے لگے تاہم کبھی کبھی افسوسناک  
سوت پر ہم دونوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا اور پہلی  
کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ اس کا کیا ہو گا۔ پہلی وجے  
ٹھاکر کے پاس ہی بیٹھی روٹی کھا رہی تھی۔ وجے ٹھاکر نے  
نجانے اس بچی پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ ہمیں بھول کر اس کے  
پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔

باتوں ہی باتوں میں 'میں نے محتاط القاط میں جا چکی سے وہ سوال بھی پوچھ ہی لیا جو کافی دیر سے میرے ذہن میں کلایا رہا تھا۔ جا چکی گئے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور پھر اس نے جتا بھی رہا کہ وہ ان وحشیوں کی ہوس سے محفوظ ہی رہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ شاید جاگتی کو علم ہو کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے لیکن اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارا کار واں ایک بار پھر چل پڑا۔

ہم لوگ صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اس نخلستان سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک بجے کے قریب ایک نئے جنگل میں داخل ہو گئے۔ تقریباً پورے نخلوں کے اس سفر میں ہمیں کوئی آبادی دکھائی نہیں دی تھی یا پھر یہ بات بھی کہ یہ کوئی قصداً ایسے راستے پر چلے رہے تھے جہاں آبادی نہ ہو۔ اس جنگل سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید اس کے دوسری طرف کوئی آبادی ہو کیونکہ جنگل میں جانے والے راستوں پر عاڑیوں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں مختلف گاڑیوں کی آمد و رفت بھی ہوتی رہی ہے۔

ہم جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل گھٹان ہو گیا تھا۔  
تھا لیکن بالآخر ہم آگے گھٹنے بعد ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔  
اور پھر میری آنکھیں حیرت کے باعث کھلی کی کھلی رہ گئیں۔  
وہ بہت شاندار اور وسیع و عریض عمارت تھی۔ اس کی  
بیرونی چار دیواری کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ عمارت  
کے ارد گرد کوئی ایکڑ زمین گھری گئی تھی۔ عمارت کا گیت کہ  
پرانے قلعے کی طرح تھا جو اس وقت بند تھا۔

وَجَعَلَ خُفَّاهُ كَالْجَبَلِ الْوُحُوشِ وَأَوْنَتْهُ أَرْكَرُكَيْتُ كَالْقَرَبِ بِهَجْجَا  
وَلَمَّا دَرَوَاهُ كَهَكَتَنَ لَهَا - لَهَا - وَهَدَرَوَاهُ فَوْرًا يَمُكَلُ نِيَا - اَمْر  
سَ بَرَدَ هُوَ نَ وَالْأَدَوِي يَمُكَلُ شَكْلَ وَصُورَتَ سَ اُكُوِي لَ  
تَهَا - كُنْدَه سَ پَر اَوْتِيَك رَاغُل لُكِي هُوِي تَهِي - وَتَ خُفَّاهُ  
وَرِ اسَ سَ بَاتَ كَر تَا رَا اَوْر بِمَرَّاسَ هُفُصَ نَ اَمْر رَجَا كَرِي  
كَ اِيَك حَصْر كُوَل دِيَا اَمْر اَمْرَا قَاغَلْ اَمْر دَاغُل هُوِيَا -

چارہ داری کے اندر کا خطر میرے ہے اور بھی حیران کن تھا۔ فصل کے ساتھ ساتھ اندری طرف لاتعداد کرکے بنے ہوئے تھے جن کے سامنے برآمدہ بھی تھے۔ سامنے بہت شاندار عمارت تھی جس کے سامنے ایک وسیع و عظیم بارہوری بنی ہوئی تھی اور اس کے اطراف میں کئی اسٹیلز کی سیٹوں کی طرح سنک مرمر کی بیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ خیال تھا کہ اس بارہوری میں کوئی کھیل تھا شے ہوتے ہوا گے اور چاروں طرف وہ بیڑھیاں تماشاہوں کے بیٹھنے لے گئیں۔

اس فصل کے اندر پورا شہر آباد تھا۔ درمیان میں بہر  
وسیع و عریض میدان تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے  
اونٹ اور گھوڑے وغیرہ بندھے ہوئے تھے۔ اس میدان  
ایک طرف گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے جگہ بھی جہاں اس  
وقت دس بارہ لینڈ کروزر قسم کی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں  
فصل کے ساتھ ساتھ واقع بہت سے کمرے آباد تھے۔  
طرف لوگوں کی چل پھل نظر آرہی تھی۔ گیت سے ایک

یہی وجہ تھا کہ اسے اونٹ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو  
خاک کے ایک جگہ رک گیا۔ ہمارا قافلہ بھی وہاں رک گیا۔ اس  
سنگین کا ایک چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا جس میں پانی  
ابھرتا تھا۔

ہم لوگوں کو اہارے سے باز رکھیں اور اس آدمی کے  
 کھوتوں سے باندھ دیا گیا۔ وہ نے تھا کہ اس آدمی کے  
 ایک طرف چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ  
 ہوئی تھی۔

اور ایسے کی کمروں میں عورتیں اور مرد قید تھے بعض توں کے رونے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

جانگی اور ان میٹوں عمروں کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔  
 پہلی جہی ان کے ساتھ تھی۔ مجھے ایک اور کمرے میں  
 مل کر سلاخوں والے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔  
 یہ کمرہ اس باہی دس فٹ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش  
 سبز رنگ کی کھلی سی چادر بھی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک  
 بلب اور پمپ پر لٹکا ہوا پنکھا کچھ کنبھے حیرت بھی ہوئی  
 ۔ شمرے ملیں دور دیر نے میں واقع اس عمارت میں  
 اپنا بھلا پیدا کرنے کا جہز رکھا ہوا تھا۔ میں نے پنکھا بھی  
 لایا اور بلب بھی چلا دیا۔

اس کمرے میں پچھلی طرف بھی ایک دروازہ تھا۔ وہ دروازہ خاص میں نکلے کے نیچے پلانک کے ایک بائیں رکھی تھی۔ ہاتھ دھو کر پچھلی دیوار میں اوپر ایک روشن وان خاص میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چھ کھنوں تک اونٹ پر مسلسل سفر نے میرا تجربہ کر دیا تھا جس کا جوڑو ڈھک رہا تھا۔ میں دیوار سے نیک دہری پر بیٹھ گیا۔ یہ قیمت تھا کہ اس کمرے میں بند کرنے پہلے میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے۔ میری کھانسیوں پر کئی دگر سے سرخ نشان پڑ گئے تھے۔ جن میں جلن سی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہمیں یہاں  
 لایا گیا ہے۔ دوسرے لوگ کون ہیں۔ بہت سے کمروں  
 دوں اور غوروں کو بند دیکھ چکا تھا۔ یہ جیل تو ہرگز نہیں  
 تھی۔ اسے کاموں کے لئے بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔  
 یہ انسانی شان و عمارت جیل یا کاروان سرائے  
 تو کبھی نہ ہو سکتا۔ ادھر کا محلہ ہے یا کاروان سرائے

تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ میں سانسے وسیع و عریض میدان میں ان لوگوں کو آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی سرگرمیاں بڑی پراسرار سی لگ رہی تھیں اور پھر ایک آدمی دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تاروں سے بنا ہوا چھینکا تھا جس میں چائے کے متعدد گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاس چھینکے سے نکال کر سٹالوں کے اندر دروازے کے قریب رکھ دیا اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

”یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں اتنے لوگوں کو قید میں کیوں رکھا گیا ہے؟“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔  
وہ شخص پہلے تو مجھے اوپر سے نیچے تک دکھاتا رہا پھر بولا۔  
”کیا تمہیں نہیں معلوم؟“  
”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ غلاموں کی منڈی ہے بھایا۔“ اس شخص نے اوپ دا ”جو قیدی ہیں سب کینس اور غلام ہیں۔“ انیس ہائی کے لئے میاں لایا گیا ہے اور تم بھی ان میں سے ایک ہو۔ وہ بے شمار اس مرتبہ بڑی اچھی چیزیں لے کر آیا ہے اور ہمارے جیسا جو ان توہین نے آج تک نہیں دیکھا۔ دے گا کروڑ کا اکا کر لے جائے گا اس مرتبہ۔“

میں سنائے میں آگیا۔ دماغ اس طرح ہو گیا جسے  
ف جی کہتے ہیں۔ میں دشتِ زدہ سی نظروں سے اس شخص کی  
گفرت دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا۔  
ج کے جدید ترین دور میں کینوز اور غلاموں کی تجارت!  
لیکن اس شخص نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ یہاں جو دیکھ کھائی  
رہا تھا، اس سے اس کی باتوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔

اس شخص نے جو کچھ بھی بتایا وہ بہت خوفناک تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میاں ہر تین مہینوں بعد کینڑوں اور ناموں کی منڈی لگتی ہے۔ بردہ فردشوں کے گردہ پورے ہندوستان میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ لڑکیوں اور عورتوں کو لوٹا کر کے میاں لے آیا جاتا ہے۔ بعض مرد بھی ان کے ہتھے پھانسی دیے جاتے ہیں لیکن زیادہ توجہ حسین اور جوان عورتوں پر دی جاتی ہے۔

یہاں تین دن تک میلا ساگرا رہتا ہے۔ ہندوستان کے لئے کوئے سے دولت مند لوگ کینزس اور غلام خریدنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ نیلامی رات کے وقت اس بارہ ی میں ہوتی ہے جس کے چاروں طرف خریداروں کے لئے سٹیکر لگا ہوئی ہوتی ہیں۔



”انسانوں کی خرید و فروخت تو جرم ہے کیا یہاں کی حکومت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”سرا!“ وہ شخص مسکرا دیا ”میں تو یہ جانتا ہوں بھایا کہ دنیا کے ہر ملک میں انسانوں کی خرید و فروخت کو سنگین ترین جرم سمجھا جاتا ہے مگر دنیا میں ہر جگہ یہ گناہنا کاروبار ہوتا ہے انداز مختلف ہیں۔ طریقے الگ الگ ہیں۔ یہ منڈی کسی بھی آبادی سے ملیوں دور ہے مگر سرکار سب کچھ جانتی ہے۔ قانون کی رکشا کرنے والوں کو بتاتا ہے تو وہ اس کے خلاف کارروائی کیوں.... کریں گے یہاں تو یہاں کی لیڈر بھی آتے ہیں اور خوب صورت کنیزیں خرید کر کے جاتے ہیں۔ تم چائے پو بھایا۔ یہ سب کچھ مت سوچ۔ تمہاری تقدیر پر تو مرگ چکی ہے سو چنا تب تمہارا کام نہیں ہے۔“

وہ شخص چلا گیا اور میں دیر تک بیٹھا اس صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں انسانوں کی تجارت ہوتی ہے۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن الجھتا گیا۔ ہندوستان واقعی بہت پر اسرار ملک ہے۔ مجھے بھی نیلا کی سولی پر چڑھایا جانے والا تھا۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل تھمتے لگنے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے سلاخوں کے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھایا اور چائے کے ہلکے ہلکے کھونٹ لینے لگا۔

میرے دماغ میں اب بھی سنناٹا ہی پھیلی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میری کمائی میںیں پر ختم ہو جائے گی؟ کیا میں اپنے ماں باپ، بھائی اور ان درجنوں بے گناہوں کا بدلہ نہیں لے سکوں گا جنہیں دارا اور اس کے ساتھیوں نے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ کیا دارا اسی طرح دندا تا پھرے گا۔ اسے اس کے گناہوں کے جرائم کی سزا نہیں ملے گی اور کیا میری باقی زندگی غلامی میں گزرے گی۔ میرے گلے میں طوق پڑا رہے گا اور میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکوں گا؟

یہ سوچیں بڑی ہیساکت تھیں لیکن حقیقت سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان سے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

نخلستان میں ایک کوشش کر چکا تھا لیکن مقدر نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا اور یہاں تو ایسا کوئی چانس نظر نہیں آتا تھا

اگر میری ایسی کوئی کوشش کامیاب ہو بھی گئی تو یہاں نکل نہیں سکوں گا۔

وقت کی رفتار جیسے ختم گئی تھی۔ میں سلاخوں پر بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ لوگوں کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ کارواں اور یہاں آتے تھے۔ لوگوں کی باہو کے ساتھ کی بلبلاہٹ کی آوازیں بھی فضا میں گونج رہی تھیں۔ تین اور شان دار گاڑیاں پارکنگ ایریا کی طرف جا رہی تھیں۔ یہ خریداروں کی گاڑیاں تھیں۔ ان رہائش کا انتظام بھی عمارت کے مرکزی حصے میں تو لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لایا جا رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چھٹنے لگا۔ وسیع و عریض عمارت کے مختلف حصوں میں پرتی قہقہے بندھاؤ کی سرگرمیاں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ ہر طرف سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

آٹھ بجے کے قریب دہی آدی میرے لیے کھانا لایا جو پہلے چائے لایا تھا۔ پیتل کے تھاں میں دو دونا ہوئی تھیں۔ ایک کنوری میں پانی کی طرح دو ٹوک کی وال تھی اور دوسری کنوری میں ٹٹو کی بھجیا تھی۔

میں ابھی کھانا کھا رہا تھا کہ وہ بے شمار دروازے سامنے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کالے رنگ بنیان تھی اور ایک نیکر جو اس نے سلاخوں سے اٹھ

دی۔ ”رونی کھا کر نما لیتا اور یہ کپڑے پہن لیتا۔“ اور رکے بغیر وہاں چلا گیا۔

اور پھر تقریباً دو گھنٹوں بعد مجھے راتھنوں کی زبرد کی طرف لے جایا گیا۔ اس وقت میرے پیڑھی تھے اور ہاتھ بھی آزاد تھے۔ میرے ہاتھ اس باندھے گئے تھے کہ انہیں شاید یہ یقین تھا کہ بیسیوں موجودگی میں میں کوئی گزیر کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ وہ منظر دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت۔ کھلی رہ گئیں۔ بارہری جھوٹوری ہوئی تھی۔ چار بیٹیوں پر وہ دولت مند لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو خوب کنیزیں اور غلام خریدنے کے لیے ہندوستان کے کھنوں سے یہاں آئے تھے۔

اس وقت بارہ در کی وسط میں ایک نیا صورت عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر تیس بیس ہوگی۔ اس کے جسم پر نہایت مختصر سا لباس تھا۔ وہ بھنی کی طرح سخی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی

مت آدی کھڑا تھا جس نے رقی برق مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اس حینہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا تھا۔ اس کے حسن و شباب کی تعریفوں کے بل باندھنے کے بعد اس کے جسم کے مختلف حصوں کو چھو رہا تھا اور عورت ایسے ہر موقع پر اپنا بدن چرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اور پھر اس کی بولی نکلنے لگی۔ بولی دینے والے اپنی جگہ اٹھ کر آئے۔ اس حینہ کے بدن کو نکل کر دیکھتے اور بولی لڑائی جگہ پر چلے جاتے۔

ایک کھٹے میں تین لڑکیاں غلام ہو گئیں۔ ان کی قسمت سوہنے ہو گئی۔ ان کی قیمت لگ گئی اور وہ ایک ہاتھ سے سر پہاتھوں میں منتقل ہو گئیں۔ ان کی تقدیر پر غلامی کی مہر لگی کی تھی۔

آدھی رات کے قریب دو غلام بھی غلام ہوئے اور پھر بارہ در میں لایا گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے پیڑھی میں لپٹل سی گئی تھی۔ کھینوں کی جھنجھٹاٹ طح سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔

نیلا کی آواز لگنے والے کو غالباً میرے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ وہ اپنی چرب زبانی سے مجھے پھر میں ت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے جسم کے مختلف

دل پہاتھ مار کر میرے اندر بھری ہوئی طاقت اور میرے دلی جسم کے بارے میں بتا رہا تھا۔

اس نے مجھے یوسف ثانی کا نام بھی دیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی رہا تھا کچھ غلام بھی نہیں تھا۔ گوری جی رگت دراز ت اور ابھرے ہوئے سسز میرے جسم پر سیاہ رنگ کی اور فیان بھی جو خاص طور پر پہنائی گئی تھی۔ اس مختصر لباس میں میرے سسز کچھ اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ ایک دو آدمیوں نے میرے قریب آکر مجھے اس طرح تھامے قربانی کا کبرا خریدنے سے پہلے ٹٹولا جاتا ہے۔ میں نے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سنسنی تھی بلی ٹٹولوں کی طرح میرے پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ لک چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ہو سکتا ہے میں اس کی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا مگر جاکی کے بغیر میں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس دوران میں وہ بے شمار کچھ اور آگیا۔ وہ مسکراتی نظروں سے مجھ کو دیکھتا اور کبھی چاروں طرف بیٹھے لوگوں کو دیکھنے لگتا۔ دوسرا شخص میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”سنیاسی واسو دیو کو آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ بہت سی نظریں اسے تلاش بھی کر رہی ہیں مگر آج وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں واسو دیو ایک پھر ہوا سنا تھا۔ وہ چار آدمیوں کے قابو میں بھی نہیں آتا تھا مگر یہ نوجوان۔“ اس نے میرا ہاتھ کچھ اور اور اٹھا دیا ”یہ ہے وہ نوجوان جس نے دو منٹ میں واسو دیو کی گردن موڑ دی اور اسے ترک میں پھانسا۔“

ایک بار پھر سرگوشیوں کی جھنجھٹاٹ سنائی دینے لگی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے سب کے سامنے مجھے قائل ثابت کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس کا خریدار وہی ہو گا جو اسے سنبھال سکے ہے کوئی ایسا دل والا جو اس شیر کو اپنے گھر لے جا سکے میری بولی پچیس ہزار۔“

سرگوشیوں کی جھنجھٹاٹ ایک بار پھر فضا میں ارتعاش پیدا کر نے لگی۔ ”پچاس ہزار!“

ایک طرف سے یہ کھٹکتی ہوئی نسوانی آواز سننے ہی سناٹا سا چھا گیا۔ خاموشی اس قدر گہری تھی جیسے وہاں زندگی کا وجود

کالہ خاں بھوئے خاں

قیمت 150 روپے

25 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

23 پکس

74200

6862281-686313

6862281

کتابیات1970@yahoo.com

# مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

## روشنی کے مینار

قیمت - 150/- روپے ڈائجسٹ - 25/- روپے

## عظمت کے مینار

قیمت - 150/- روپے ڈائجسٹ - 25/- روپے

## ایمان کا سفر

قیمت - 150/- روپے ڈائجسٹ - 25/- روپے

## پچرا گھر

قیمت - 100/- روپے ڈائجسٹ - 25/- روپے

## آدھا چہرہ

قیمت - 250/- روپے ڈائجسٹ - 25/- روپے

## کالی کمائیاں

قیمت - 30/- روپے ڈائجسٹ - 23/- روپے

## نکاح کی پوٹیاں

قیمت - 60/- روپے ڈائجسٹ - 23/- روپے

500/- روپے کی کتابیں ایک ساتھ بیگانہ پیرا کے تحت حراف  
یہ نصابیت پیشکش آؤ رارسال کرنے پر ہی موصول ہوگی  
کتابیات پبلیکیشنز  
74200

اسلام کے روشن مکتوں  
اولیائے کرام کے دلچسپ  
اور شگفتہ واقعات  
نیا و نیم نیا کلمی کے قلم سے

ضیاء تسمیم بنگرامی  
کے مضامین  
مکتا دوسرا مجموعہ

محمد الدین نواب کی  
اسلامی زندگی کی بڑی مجموعہ  
وہ فن پارے  
دن کی آپ کو خوش ہے

محمد الدین نواب کی  
کمانوں کا دوسرا مجموعہ  
جسے آپ آنکھوں سے بین  
دل سے پڑھیں گے

محمد الدین نواب کا پہلا خوب  
مشہور کتابوں کی ایک  
ایک تازہ نیا مجموعہ  
میں اپنا دل چڑھایا کرتے ہیں

گرام جمادو شہان اہم اوراق  
طرح و مزاج اسرار و خوف  
سپنس جوڑ جس پر  
مبنی ۴۰ کمائیاں

مشہور نکتہ بلوٹ جو بہت  
چیزیں گاہ قدر معاضہ پر  
چراغ ہے

دو دفعہ قیمت تین حصہ 60/- روپے  
قیمت - 60/- روپے ڈائجسٹ - 23/- روپے

یہ نہیں۔ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی۔ اس نے میرے  
لب سے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ قدم قدم پر اپنی زندگی کا ڈاڑھ لگائی  
تھی اور بالا خرچہ سے اس طرح پھنجر جائے گی۔ یہ تو میں نے  
بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

میرے ذہن میں روپ متی کا خیال ابھر آیا۔ وہ بلاشبہ  
دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اس نے مجھے تین لاکھ میں  
خریدا تھا۔ مجھ سے پہلے کسی بھی غلام کی بولی تیس پینتیس ہزار  
سے اوپر نہیں گئی تھی اور میری بولی تین لاکھ پر ختم ہوئی تھی۔

بولی شروع ہوتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ روپ متی مجھے  
بریت پر خریدنا چاہتی ہے۔ اس کا حریف بولی بڑھاتا تو یہ اور  
آگے بڑھتی مگر حریف نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور روپ متی  
نے مجھے تین لاکھ میں خرید لیا تھا اور یہاں کی روایت کے بر  
خلاف اس نے میرے گلے میں غلامی کا طوق بھی نہیں ڈالنے  
دیا تھا۔

روپ متی نے مجھے کیوں خریدا تھا؟ یہ سوالیہ نشان بار  
بار میرے ذہن میں ابھر رہا تھا۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر قدموں کی  
آواز سنائی دی۔ جو دروازے کے سامنے رک گئی۔ چند سیکنڈ  
بعد دروازہ کھلا۔ کسی نے ایک عورت کو اندر دھکیلا اور  
دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔

وہ عورت منہ کے بل قالین پر گر گئی۔ اس کے منہ سے  
ہلکی سی چیخ نکلی تھی اور جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو  
میں اچھل پڑا۔  
وہ جاگتی تھی۔

جاگتی نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں والمانہ  
انداز میں ایک دوسرے کی طرف لپکے اور اس طرح ایک  
دوسرے سے لپٹ گئے جیسے صدیوں سے پھنجرے ہوئے  
ہوں۔

میں نے جاگتی کو اسے سے الگ کیا تو اس کی آنکھیں  
بھلکی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحوں میں میری طرف دیکھتی رہی اور پھر  
مجھ سے لپٹ گئی۔

اُس کے دروازہ کھلا۔ میں نے آواز سن کر اس طرف  
دیکھا۔

روپ متی دروازے میں کھڑی عجیب سی نظروں سے  
ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے  
تأثرات ابھر آئے تھے اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی  
تھی۔

”دولاکھ۔“ حینہ نے پتھرتے ہزار کا اضافہ کر کے  
کہے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔  
”دھالی لاکھ۔“ حریف نے تنی بولی لگائی۔

سناتا برقرار تھا۔ لوگ حیرت سے ایک دوسرے  
طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا  
نے ایک طرف کھڑے ہوئے وہ بے تحاشہ کرکری طرف دیکھ  
کیا جیسے کھلی جارہی تھیں۔

”تین لاکھ۔“ حینہ نے بولی لگائی اور مرکز  
نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”دسے داد روپ متی گئی۔“ حریف نے دونوں  
دیکھے۔

بولی تین لاکھ پر رک گئی۔ روپ متی نام کی  
فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ ایک مسکرائی  
میرے چہرے پر ڈالی اور پھر وقار انداز میں قدم اٹھا  
اپنی جگہ پر چلی گئی۔

بولی کی آواز لگانے والا اشتعال دلانے والے  
بولی بڑھانے کی آواز لگاتا رہا لیکن سناتے میں کوئی توا  
نہیں دی۔ اس نے بولی روپ متی کے نام پر ختم کر  
میرے گلے میں نصف انچ موٹی سیاہ رسی کا طوق پہنا  
لے آگے بڑھا تو روپ متی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”نہیں۔“ اس نے بلند آواز میں کہا ”اس کی ذ  
نہیں۔ اسے میرے آدمیوں کے حوالے کر دو۔“  
نیلام ہونے والی ہر عورت اور مرد کے گلے میں  
کا طوق پڑنا پڑا جاتا تھا لیکن روپ متی نے مجھے غلامی

پستانے سے منع کر کے بھی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا  
دو لمحوں کے بعد آوی بارہ دہری میں آگئے اور مجھے  
بانسوں سے پکڑ کر عمارت کے اندر لے گئے۔ اندر  
عمارت بہت شان دار تھی۔ کئی راہداریوں سے ا  
ہوئے وہ ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔ دروازہ  
مجھے اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے لٹا

کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی  
تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورت حال  
کرنے لگا۔ کیا میرا مقدر یہی تھا کہ باقی زندگی ایک  
غلامی میں گزار دوں؟

یہاں آنے کے بعد جاگتی کو مجھ سے الگ کر دیا  
مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کی بولی مجھ سے پہلے لگ  
اس کی نیلامی ابھی باقی تھی۔ کیا میں اسے دوبارہ

ہی نہ رہا ہوں۔ سب لوگ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے اور پھر وہ  
خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ لوگوں کی سرگوشیاں  
ایک بار پھر کھینوں کی جھنجھٹ سی پیدا کرنے لگی۔ میں نے  
بھی چونک کر اس آواز کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی  
مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میری بولی  
لگانے والی اپنی جگہ سے اٹھ رہی تھی۔ میں نے زندگی میں  
بڑی حسین عورتیں دیکھی تھیں اور بعض تو ایسی تھیں جن پر  
نظر پڑتے ہی دل میں کچھ ہونے لگتا تھا مگر یہ تو کچھ اور ہی چیز  
تھی۔ کسی اپرے نے عورت کا روپ دھار لیا تھا۔

چھ فٹ کے قریب قد، بھرا بھرا سڈول جسم، غزال جیسی  
موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، سیب جیسے گال اور گلاب کی  
پنکھڑیوں جیسے سرخ ہونٹ۔ اس کا لباس بھی عجیب تھا جس  
سے بدن کے نشیب و فراز بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کے  
چہرے پر شہانہ مہکتی اور کھڑے ہونے کا انداز بڑا دل  
فریب تھا۔ ہاں، ہاں، انداز میں قدم اٹھاتی بولی بارہ دہری میں  
آگئی۔ چند لمحوں میں میرے سامنے کھڑی بڑی دل فریب نظروں سے  
میرے سر پانچ کا جائزہ لیتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر بازو لے مسل  
نٹونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر پراسرار سی  
مسکراہٹ آگئی۔

لوگوں کی سرگوشیاں اب بھی جاری تھیں۔ میں تین چار  
گھنٹوں سے یہاں کینٹینوں اور غلاموں کو نیلام ہوتے ہوئے  
دیکھ رہا تھا۔ بعض حسین ترین عورتیں بھی نیلام ہوتی تھیں  
لیکن کسی کے لیے کوئی بھی بولی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں بڑھی  
تھی اور اس اپرے نے میرے لیے ڈبل بولی لگا کر لوگوں کو  
چراں کر دیا تھا اور غالباً چھ بیگونیاں اسی سلسلے میں ہو رہی  
تھیں۔

”میرے کی قدر جو ہری جانتا ہے۔“ بولی کی آواز لگانے  
والا کہہ رہا تھا ”یہ ہیرا صرف پچاس ہزار میں۔ کوئی اور قدر  
والے۔“

”ساٹھ ہزار۔“ ایک اور مردانہ آواز سنائی دی۔  
سب لوگوں نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ ہماری بھر کم اور  
اوپر لپکے قد کے مالک اس شخص نے راجستانی لباس پہن  
رکھا تھا۔ سر پر گلابی رنگ کی پٹری تھی۔ شان بڑھانے کے  
لیے کمرے کے ساتھ میان میں تلوار بھی لٹکی ہوئی تھی۔

”ایک لاکھ۔“ میرے سامنے کھڑی ہوئی حینہ نے بولی  
لگائی۔ ایک بار پھر سناتا چھا گیا۔

”سوا لاکھ۔“ اس کے حریف نے پچیس ہزار بڑھا  
دیا۔

روپ متی کو اس طرح اچانک سامنے دیکھ کر میرا دل یک بارگی اچھل پڑا۔ کنپٹیاں سٹکنے لگیں۔ میں نے جاگی کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے میرے گرد اپنی باہوں کا حصار کیچھ اور بھی مضبوط کر دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن مجھے اپنے سینے میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اس لیے وہ روپ متی کو نہیں دیکھ سکی تھی۔ میں نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر تناؤ نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے دل میں ایک عجیب سا خوف جاگ اٹھا۔ میں اب روپ متی کا زور خرید غلام تھا۔ وہ میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کر سکتی تھی لیکن میں روپ متی سے خوف زدہ نہیں تھا۔ خوف زدہ تو میں ان حالات سے تھا جنہوں نے مجھے ایک عورت کی غلامی میں دے دیا تھا۔ غلاموں کی اس منڈی میں آنے کے فوراً ہی بعد مجھے اور جاگی کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا تھا۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اب کبھی جاگی کی صورت نہیں دیکھ پاؤں گا۔ غلاموں اور کنپٹیوں کے خریدار مختلف شروں سے آئے ہوتے تھے مجھے روپ متی نے خریدا تھا اور اس کمرے میں آنے کے بعد میں بھی سوچتا رہا تھا کہ جاگی کا خریدار نجانے کون ہوگا۔ وہ کس شہر میں جائے گی۔ میں بھی اس کا سراغ یا بھی سکون گایا نہیں لیکن پھر قسمت نے ایک عجیب کرشمہ دکھایا۔ جاگی کی بولی بھی روپ متی ہی نے جیتی تھی اور قدرت نے ایک بار پھر اسے مجھ سے ملا دیا تھا لیکن اب روپ متی کو سامنے دیکھ کر میرے دل میں اچانک ہی یہ خوف اجاگر ہو گیا تھا کہ کہیں جاگی کو مجھ سے دوبارہ الگ نہ کر دیا جائے۔ میری نیلائی کے وقت روپ متی نے جس طرح مجھے منول کر دیکھا تھا جس طرح میری بولی بڑھاتی چلی گئی تھی اس سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اب تک اس منڈی میں فروخت ہونے والا میں سب سے مزگ غلام تھا اور کوئی آقا ہی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا زور خرید غلام اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکے۔ میرا خریدار کوئی مرد نہیں ایک حسین عورت تھی۔ غالباً دنیا کی حسین ترین عورت۔ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ اس کا غلام اس کی مرضی کے بغیر کسی عورت سے اس طرح ملے کہ وہ ایک نظر آئیں۔

سب سے زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ ہمیں اس طرح ایک دوسرے سے لینے دیکھ کر روپ متی یہ سمجھ گئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے گے اجنبی نہیں ہیں اور اس حقیقت کا انکشاف ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

روپ متی کی آنکھوں کی وحشت اب تیرہ میں بدلنے جا رہی تھی۔ اسے غالباً اس بات پر حیرت تھی کہ اپنی نئی مالک کو سامنے دیکھ کر بھی ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے تھے۔

روپ متی کے عقب میں وہی دو بچے کتے رانچوت کھڑے تھے جو مجھے اس کمرے میں ڈال گئے تھے۔ وہ دونوں بھی تجب خیز لگا ہوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور پھر ان میں سے ایک روپ متی کے پہلو سے کھڑا کر آگے بڑھ آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ مجھے یا جاگی کو کوئی نہیں مارے گا۔ پستول تو اس نے محض ڈرانے کے لیے نکالا تھا لیکن روپ متی نے بازو پھیلا کر اسے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ہونٹوں پر ہست خفیف سی مسکراہٹ بھی ابھرتی تھی اور غالباً وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور تم کی بات تو یہ بھی کہ جاگی ابھی تک اپنی کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح لپٹی ہوئی بھی جیتے اسے اندیشہ ہو کہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔

”جاگی!“ میں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی ”ہم اس وقت تھما نہیں ہیں۔ دروازے میں کچھ لوگ کھڑے ہیں۔“

جاگی یوں اچھل کر مجھ سے الگ ہو گئی جیسے میں نے اسے اپنے قرب و جوار میں کہیں ایٹم بم پھینکے کی اطلاع دی ہو۔ وہ تنہا کرو حشت زدہ سی نظروں سے روپ متی اور اس کے قریب کھڑے ہوئے افراد کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ تم دونوں پہلے ہی سے ایک دوسرے کو جانتے ہو اور ایک دوسرے سے پریم کر رہے ہو۔“ روپ متی کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں ٹھنک سی تھی جیسے پانی سے لبریز چاندی کی دو تھنی بنی کنویرا ہوئے ہوئے تپس میں کبھی نہ کبھی نہ کسی نہ کسی سے بڑھتی۔ انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی نہ کسی نہ کسی سے بڑھ کرنا چاہیے۔ پریم کے بغیر یہ جیون بالکل بیکار پیکا سا لگتا ہے لیکن یہ پریم کتنا اس وقت اچھی لگتی ہے جب انسان آزاد ہو۔ اس کی زندگی اپنی ہو۔ خواہشات اس کی مرضی کے تابع ہوں لیکن جب زندگی کا مالک و مختار کوئی اور ہو، انسان کی دور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو پریم کی باتیں بڑی عجیب سی لگتی ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر بیٹھ جاتا

جاری رکھے ہوئے بولی ”پریم تو آزاد نفساؤں کا پنچھی ہے۔ قید میں رہ کر وہ پرواز نہیں کر سکتا بلکہ پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے اور“

”زیادہ قلق بگھارنے کی ضرورت نہیں۔“ جاگی نے روپ متی کی بات کاٹ دی۔ اس کے لیے میں بے پناہ سختی تھی ”آج تم نے دولت کے بل بوتے پر ہمیں خرید لیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ کل کو ہم بھی تمہیں اپنے ہیرو بننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔“

روپ متی کے چہرے پر شدید تناؤ پیدا ہو گیا۔ اس کی مونہی آنکھوں میں چنگاریاں سی جھلکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بچہ کھنے کے لیے ہونٹوں کو حرکت دیتی، دوسرا آدمی اس کے عقب سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھری تھی جس کی موٹائی ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر اور لمبائی تین انچ کے قریب تھی۔ اس نے جاگی کو محسوس ہی سزا دینے کے لیے چھری والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ بید کی لپک دار چھری ہوا کو چرتی ہوئی ”زوں“ کی آواز کے ساتھ جاگی کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے کہ چھری جاگی کے بدن کے کسی حصے کو چھوئی میں نے بڑی پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر چھری کو پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی ایک زوردار جھٹکا دیا۔

اس لیے ترنگے محض کو شاید میری طرف سے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ جھٹکا کھا کر اپنی ہی جھوک میں لڑ کھڑا ہوا سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے طاقت کا یہ بلا سامظہ اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر بیٹھے بیٹھے ہی کیا تھا۔ چھری اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دیوار سے ٹکرائے والا وہ شخص بڑی تیزی سے پلٹا تھا۔ اپنی اس توہین پر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور پھر اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طرف جھلانگ لگادی۔ میں مجھ پر حملہ کرنے کی حسرت اس کے سینے ہی میں دم توڑ گئی۔ وہ جیسے ہی میرے قریب پہنچا میں تیزی سے نیچے جھکا اور اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اچھال دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ اس کے حلق سے تیز گراہ نکل گئی تھی۔

روپ متی کے دائیں طرف کھڑا وہ دوسرا آدمی پستول منہمال کر تیزی سے آگے بڑھا لیکن روپ متی نے ایک بار بھڑکناٹھا کر اسے روک دیا۔

”نیں ناں نکھ۔“ وہ بولی ”تم مداخلت نہیں کرو گے مجھے یہ دیکھنے کا موقع دو کہ میں نے اس غلام پر پیسے ضائع تو

نہیں کیے اور تم یہ پستول جیب میں رکھ لو۔ میں کوئی گڑ بڑ بند نہیں کروں گی۔“

بچہ نکھ نے عجیب سی نظروں سے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس نے کچھ کہنا بھی چاہا مگر روپ متی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میرا حریف اب وہی تھا جسے میں نے اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔ اسے اٹھنے میں دو تین سیکنڈ لگے تھے۔ وہ پورے قد کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تناؤ پایدا ہو گیا تھا اور آنکھیں ایک دم سرخ ہو گئی تھیں۔

”پھو کرے!“ اس کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی ”تم نے دھرمیش کے ساتھ پیگلے کر اچھا نہیں کیا۔ میں چاہوں تو ایک سیکنڈ میں تمہاری ہڈیوں کا سڑمہ بنا سکتا ہوں لیکن راج کمار کی تم پر روکڑا خرچ کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ روکڑا (رقم) بدو دار کوشت کا ڈھیر بن جائے۔“

”تم میرے روکڑے کی پروا مت کرو دھرمیش۔“ روپ متی نے کہا ”جب اس کی نیلائی ہو رہی تھی تو تم نے دینے ٹھاکر کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ اس نے واسو دیو جیسے سانڈ کی گردن بھی دو منٹ میں موڑ دی تھی۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ اسے خریدتے ہی اس کی طاقت دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ تم میرے روکڑے کی فکر مت کرو۔ اگر تم نے اس کی گردن موڑ دی تو میں تمہاری وہ خواہش پوری کر دوں گی جو اب بھی تمہارے دل میں چل رہی ہے۔“

دھرمیش نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ روپ متی کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آگئی۔ ہونٹوں میں مخصوص انداز میں خم پیدا ہوتے ہی اس کے ہاتھیں گال پر ایک ننھا سا ڈھیل پیدا ہو گیا۔ اس چھوٹے سے چاہ بندھان نے اس کے حسن میں کتنا اضافہ کر دیا۔ اس نے اس کے ساتھ ہی اپنے بدن کو اس زاویے سے حرکت دی کہ اس کے دائیں کندھے پر نکا ہوا کپڑے کا اسٹریپ سرک کر کندھے کے بالکل کنارے پر آ گیا اور اس کے بدن کا سامنے والا وہ حصہ کچھ اور عریاں ہو گیا۔

میں نے اس نظر سے روپ متی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی تک اسے نظر بھر کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر گال پر نمودار ہونے والے چاہ بندھان اور اس قیامت خیز منظر نے میرے سینے میں بھی ایجنس سی چا دی تھی۔ عکس یہ دل فریب منظر میرے لیے نہیں تھا بلکہ دھرمیش کو اشتعال دلانے کے لیے تھا تاکہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو اور روپ متی کو میری طاقت کا مظاہرہ دیکھنے کا موقع بھی

دیئے یہ بات میں سمجھ گیا تھا کہ روپ مئی کے حوالے سے دھرمیش کے سینے میں کون سی خواہش چل رہی ہوگی اسی لیے تو روپ مئی اسے اشتعال دلا رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ ایک تیرے دو شکار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دھرمیش کو جو جھک دکھائی تھی وہ میرے لیے بھی تھی۔ اس نے مجھے بھی اشتعال دلانے کی کوشش کی تھی مگر اسے میں ایسی خرافات سے ابھی بہت دور تھا۔ میری زندگی میں کتنی حسین لڑکیاں آئی تھیں مگر میرے دل میں بھی ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ صرف ایک مرتبہ کولڈن زرائی اسٹائل میں سونا کے فریب میں اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد زندگی میں کئی ایسے موڑ آئے تھے کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہر موڑ پر پھسلتا مگر میں بڑی مضبوطی سے قدم جمائے چل رہا تھا۔ اس سے زیادہ اشتعال کیا ہو سکتا ہے کہ جاگتی جیسی کافرا اور حسینہ مستقل طور پر میرے ساتھ تھی اور میں اپنے آپ کو اب تک اس سے بجائے ہوئے تھا لیکن یہاں اس کمرے میں مجھے اور جاگتی کو ایک دوسرے سے لینے دیکھ کر روپ متنی نے پتھر غلط مطلب اخذ کیا اور اب اپنے حسن و شباب کی جھک دکھلا کر مجھے اپنے پاتو ساند دھرمیش کے خلاف اشتعال دلا رہی تھی۔

کچھ پر حملہ آور تھیں اس کے سوا اسے بھگتنا ہی تھی۔ یہ کمر اخصا بڑا تھا۔ دھرمیش مجھ سے تقریباً آٹھ دور کھڑا ہوا۔ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی مٹھیاں بٹھینچا اور کبھی انگلیوں کو خونا پینے کی موڑنے لگتا۔ اس کے جبڑوں کے سبز بھی اچھڑاتے تھے۔ اپنی جگہ پر کھڑا اس طرح ہل رہا تھا جیسے حملہ کرنے کے موقع کی تلاش میں ہو۔

میرا خیال ہے، اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ باہر غلاموں اور کنیزوں کا نیلام اب بھی جاری تھا۔ کمرے کے عقبی روشن دان سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور غالباً کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں ایک خوفناک ڈراما شروع ہونے والا ہے۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا مری نظروں سے دھرمیش کی طرف دیکھتا رہا۔ دھرمیش کی نظرس بھی میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے جب دیکھا کہ میں بچہ لڑانے کے موڈ میں نہیں ہوں تو وہ ارٹنے جیسے کی طرح ڈنکراتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ اس طرح آگے کو بڑھے ہوئے تھے کہ میری گردن کو گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور قدمے دائیں طرف ہٹے ہوئے اس کی بائیں بغل کے نیچے راؤنڈ ہاؤس ٹنگ لگا دی۔ میں نے اگرچہ پوری قوت استعمال نہیں کی تھی لیکن بغل کے نیچے ضرب خاصی زور دار لگی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی دشت ابھری آئی تھی۔ میں بھی ممکن جوالی میلے سے بچنے کے لیے اپنی جگہ سے اچھل کر دور ہٹ گیا تھا لیکن اس نے فوری طور پر حملہ نہیں کیا۔

میا۔ اپنے جملہ کام ہوئے دیکھ کر شاید اس کا دماغ بھٹا گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر دو سرحاصل کیا اس مرتبہ میں صرف اپنے آپ کو بچا گیا بلکہ اس کے پیلو میں ایک بھلی سی لک بھی لگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑایا تو مجھے بھی موقع مل گیا۔ میں کڑے کڑے ایک ٹانگ پر گھوم گیا۔ میری پہلی اسپن کلک اس کے پائیں بازو پر کندھے سے لگی۔ وہ کراہ اٹھا۔ دوسری ایسی ہی کلک اس کے سینے کی تیرہ کلک لگانے کا مجھے موقع ہی نہیں مل سکا کیونکہ وہ کراہنے مگر گیا تھا۔

مجھے بے درپے حملے کرتے دیکھ کر روپ متی بے اختیار  
 نچاخمی "واہ! کیا اونگایا ہے ایک اور۔"  
 چنگھ کو شاید روپ متی کی زبان سے میری تعریف پسند  
 نہیں آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی دھرمیش کی حمایت میں چنگ  
 ڈھا۔

”منا! اچھ۔ گردن مروڑ دے اس کی۔ ڈر مت۔ داؤ  
 ”وہ چیخ کر دھرمیش کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

دھرمیش اٹھ گیا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے مائیک لگانے کی کوشش کی لیکن اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں ایک ٹانگ پر...

ہوئے دوسری آزاد ٹانگ سے اس کے پیٹ پر کک لگانا چاہی  
 میری یہ ٹانگ بھی اس کی گرفت میں آگئی۔ اب میری

پوزیشن چھو ایسی تھی کہ اس نے میرے دونوں پہر ٹخنوں کے قریب سے اپنی انگلیوں میں دبوچ رکھے تھے۔ میں پشت کے بل غامد میرا سر زمین پر لگا ہوا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو دوبارہ ڈال کر دی آسانی سے میری گردن توڑ سکتا تھا لیکن اس کے بارے میں میرے تمام اندازے سو فی صد درست ثابت ہوئے تھے۔ اس میں طاقت تو بلاشبہ بے پناہ تھی مگر اس کے استعمال کا طریقہ نہیں تھا۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا کہ مجھے زیر لکھتا لیکن اس نے حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے میری ٹانگوں کو گرفت میں لے رکھا اور اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گھومتے گا اور میری لمبھڑی کو قالین پر رگڑنے لگے۔ میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹانگوں پر جمائے اور سر کو کسی قدر اوپر اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے رک جانے سے میرا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ اُگر  
 قالین نہ ہوتا تو کھوپڑی کی کھال پھٹ جاتی۔

دلہان کی نسوں میں تناؤ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ کانوں میں سیال کی سیجئے لگیں۔ میں پوری طرح اس کی گرفت میں تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اگرچہ آزاد تھے لیکن میں ان سے کوئی کام لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

صورت حال واقعی ہے حد نازک اور عقین بھی۔  
آنکھوں کے آگے نیلی چلی چنگاریاں سی رقص کرتی نکلیں۔  
میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہی صورت حال چھ دیرو اور یہ قرار رہی  
تو میرے دماغ کی فیس پھٹ جائیگی اور ناک اور کانوں سے  
خون بہنا شروع ہو جائے گا۔

دھرمیش نے بھی یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا پسِ داؤ  
مجھے شکست سے دو چار کر سکتا ہے اس لیے وہ میری ٹانگوں کو  
گرفت میں رکھنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہا تھا۔

”منا! اس کے سر پر دباؤ ڈال۔ گردن توڑ دے اس کی۔“

تج سنگھ کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے صورت حال کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا اور دھرمیش کو میری گردن توڑ دینے کا مشورہ دیا تھا۔

”وہ جو! سنبھالو! آپ کو! اٹھو! سنبھالو!“

بخشا اور میں نے اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ جی کی وہ بار بار اصرار و قوت تھی جس نے مجھے ہر تکلیف اور اذیت سے بے نیاز کر دیا۔ میں بے اصول گیا کہ میرے دماغ میں شہیدیت کا وہ ہے اور نہیں سمجھنے والی ہیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ مضطرب خود بخود بچھینچ گئیں اور میں اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔

آپ میری پوزیشن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو ایک اچھے ادب پر اٹھانا بھی ممکن نہیں تھا مگر میرے اندر وہی کپڑا اسرارِ قوت نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ قوت جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے شاذ و نادر ہی ٹیبل کے غاروں میں بڑی ریاضت کی تھی۔

میرے کندھے ایک ایک انچ کر کے آہستہ آہستہ اوپر اٹھے۔ لگے میرے دونوں بازو میرے سینے کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اس طرح بچھنی ہوئی تھیں جیسے میں نے کسی چیز کا سہارا لے رکھا ہو۔

نکرا رہی تھیں۔ جا بکی میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور بچ  
لگھ دھرمیش کو اشتعال دلایا تھا۔  
دھرمیش میری ٹانگوں کو پوری قوت سے گرفت میں لے  
ہوئے تھا۔ وہ بار بار جھک کر میرے سر کو زمین سے ٹکرانے کی  
کوشش کر رہا تھا لیکن اب اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں  
ہو رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھا رہا تھا۔  
میری ٹانگوں پر اس کی مضبوط گرفت اب میرا سارہا بن گئی  
تھی۔ یہاں بارش آرٹ کے حوالے سے وہ بات بالکل سچ  
ثابت ہو رہی تھی کہ حریف کو اس کی قوت سے شکست دی  
جائے۔ میں دھرمیش کی قوت کو اس کے خلاف استعمال کر رہا  
تھا۔

میں چاقو کی طرح بالکل دہرا ہو گیا۔ میرا سر اب اس کے سینے کے برابر پہنچ گیا۔ میں نے دونوں بازو سیدھے کر لیے۔ میں دونوں ہاتھ دھرمیش کی گردن کے پیچھے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ زور زور سے سر کو جھٹکنے دینے لگا۔ اس کی گردن میری گرفت میں آئی۔

”منا! سچ گنگہ پیٹنا“ اس کی ٹانگیں چھوڑ دے۔“

لیکن منا کو اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر دونوں ہاتھوں سے گرفت جتاتے ہی اپنے آپ کو نیچے کی طرف زوردار جھٹکا دیا۔

اس طرح زوردار جھٹلے سے دھرمیش کے قدم اٹھ گئے۔ وہ بھی میرے ساتھ جھٹکا چلا گیا۔ مری پٹ زمین پر لگی اور دھرمیش میرے اوپر سے الٹی فلانی زبانی کھانا ہوا "دھب" کی آواز کے ساتھ پٹ کے بل میرے پیچھے کی طرف گرا۔ اس کے منہ سے کراہ بھگی نکلی تھی۔

میرے ہاتھیں اس کے گھٹنے سے آزاد ہو چکی تھیں لیکن میرے اندر آنکھ کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں بے دسم پارہا تھا۔ میرے جسم کا سارا خون اب بھی میرے سر میں جمع تھا۔ لگتا تھا چپے خون کی ردائی گھمری ہو۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

جانگی کی آواز میری سماعت سے نکلا رہی تھی۔ وہ چنچ کر میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ پہلے تو یہ آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی پھر تدریجاً واضح ہوتی چلی گئی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ ہودھوٹے لگا۔ میرے حواس بحال ہونے لگے اور جسم میں توانائی عود کر آنے لگی۔ میں پہلو کے بل ہو گیا اور کنبیاں قالین پر نکال کر اٹھنے کی کوشش کر نے لگا۔

میں اٹھنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن اپنی ٹانگوں پر رکھ کر وہ سکا اور لڑکھڑا گیا۔ کم بخت دھرمیش نے میری ٹانگ پر دو منٹ تک اپنے بازوؤں کے شعلے میں کس کر رکھی۔ اس سے خون کی روانی متاثر ہوئی تھی۔

میں نے باری باری دونوں ٹانگوں کو ہلکے ہلکے کیے۔  
 نیلے۔ اس دوران میں میں نے ایک نظریہ روپ متی کی ما  
 بھی دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی تھی اور آنکھوں  
 تیز کا سمندر لہریں لے رہا تھا۔ اس کے قریب کھڑا  
 اب بھی جیج کر رہے تھا کہ اس کو حوصلہ دلا رہا تھا۔

دروازے کے قریب وہ دونوں اب اکیلے نہیں۔  
ان کے پیچھے دروازے میں اور باہر راہداری میں مجھے  
چہرے نظر آئے سب لوگ حیرت زدہ سی نگاہوں سے  
سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

جاگئی سانسے والی دیوار کے قریب کھڑی اب بھی؟  
 کر میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اس کی آواز نے فی  
 کا کا کام کیا تھا اور میں اپنے ہیروں پر کھڑا ہونے میں کام  
 ہو سکا تھا۔

دھرمیش اب بھی بے سُدھ سا رہا تھا۔ تیج سنگھ نے  
قریب جھکا مسکلس چیخ رہا تھا۔ بالآخر دھرمیش کے زور  
حرکت پیدا ہوئی اور وہ کہنیوں کا سہارا لے کر اٹھ گیا۔  
سے بھی ٹھیک طرح سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ بد  
ہاتھی کی طرح بھجور رہا تھا۔

میں اب پوری طرح اپنے حواس میں آچکا تھا اور ہمیشہ کو پوری طرح سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے حملہ کر دیا۔ میری سائیڈ کلک اس کے دائیں بازو کی گئی۔ وہ کراہ اٹھا اور بازو جھٹکنے لگا۔ میں نے ایک اور

دھرم میں سے ایک کر مجھے گرفت میں لے کر کوشش کر  
 اپنے آپ کو بچا کر مگر اس نے بڑی پھرتی سے پلٹ کر  
 حملہ کر دیا۔ اس کے چہرے کی ٹھوک میرے بائیں پہلو پر  
 پڑی۔ لڑکھار گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ دھرم  
 میں کروڑوں بار میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں  
 ہل کر دوڑا کر گیا تھا اس لیے اس کے داؤ میں آ جاؤں گا لیکن  
 وہ خوش قسمتی فوراً ہی رفع کر دی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کسی طاقت ور اور بڑی کسی  
چلا۔ مجھے اس طرح اچھلتے دیکھ کر اس نے اپنے آپ  
جائے کی کوشش کی مگر میری فلائنگ گس اس کے سینے پر  
اور وہ ہلایا ہوا زلزلہ اٹھایا تھا۔ یہ اس کی ہمت تھی کہ  
فلائنگ گس پر دھاوا کر گیا تھا اور گرا نہیں تھا۔ وہ  
بے حس و حرکت رہ گیا۔

میں نے اس مرتبہ اپنی فائٹنگ ٹینک میں تھوڑی سی  
تبدیلیاں کر لی ہیں اور دھرمیش کی طرف سے رخ موڑ کر مخالف  
دشمن کی طرف ہجرت کر کے اچھل کر فائٹنگ ٹینک  
کے اندر میں دونوں جہازوں پر اتر چکا ہوں اور پوری قوت سے  
مڑھ مار رہا ہوں۔

ظاہر ہے، دھرمیش میری اس ٹینک کو نہیں سمجھ سکا۔ جب میں دیوار کی طرف پکا تھا تو وہ یہی سمجھا تھا کہ میں سے بچنے کے لیے راہ فرار اختیار کر رہا ہوں لیکن جب اپنے بیروں سے دیوار کو دیکھ کر ہوا میں واپس چلا تو لئے گوشے نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس آنکھوں میں شدید ترین حیرت اور الجھ آئی تھی لیکن میں نے زناؤہ دیر تک حیران ہونے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے لمحے میری فلائنگ کلک نے اسے ہلکانے پر مجبور کر دیا۔ بے یامیں ٹانگ اندر کی طرف سمیٹ رکھی تھی اور کلک نے ٹانگ سے لگائی تھی۔ میرے پیر کا ٹوکے والا حصہ اس پشانی پر لگا۔ میرے بیروں میں جو گرز تھے، ضرب زوردار اس کی پشانی کی کھال پھٹ گئی اور فوراً ہی خون رسنے

دھرمیش ادنٹ کی طرح بلبلاتا ہوا الزکھرا کر پشت کے بل

میں نے جس انداز سے دیوار کا سہارا لے کر فلائنگ لگا لی تھی اس پر دواڑے میں کھڑے ہوئے سب ہی سب اختیار ”واہ واہ“ کا راتھٹھے تھے۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اب لوگوں کی

غدا بڑھ گئی تھی۔ چچے والے لوگ آگے والوں کو دھکیل کر  
 اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روپ متی کی آنکھوں میں  
 عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے قریب کھڑا ہوا تین نگہ  
 ایک بار پھر چچ چچ کر دھرمیش کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

دھریس اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اچھل کر فلائنگ کلک لگا دی۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر اس کا پیر میرے بائیں کندھے پر لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کئی من دہلیز سے تھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ میں ڈر سا تھکا تو دھرمیش نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اور کلک لگادی۔ اس حرتہ ٹھوک میرے سینے پر لگی۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دھرمیش نے تیسری ٹھوک مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی یہ کلک کھانی پر روک لی اور فوراً ہی سنبھل کر جو ایلی حملہ کر دیا۔

میری چلی سائڈ لگ اس کے کولھے پر لگی۔ وہ...  
لوکھڑایا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے دوسری لگ رسید  
کر دی اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ اپنے  
آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا مگر میرا ہر لگ اس کے بدن  
کے کسی نہ کسی حصے کو گرما دیتی۔ سائڈ فرنٹ اور اسپین  
لگک۔ میں ہر طرح سے اس کی تواضع کرتا تھا اور پھر ایک  
دور دراز لگک نے اسے زمین جانے پر مجبور کر دیا۔

دروازے کے سامنے اور اندر لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ یہ وہ دولت مند لوگ تھے جو ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے غلاموں اور کینڑوں کی خریداری کے لیے کسی بھی آبادی سے میلوں دور دیرانے میں نکلنے والی انسانوں کی اس ہنڈی میں آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے میری بولی لگانے میں روپ متی کا مقابلہ کیا تھا اور پھر شکست تسلیم کر کے روپ متی کے حق میں بولی سے متبردار ہو گیا تھا۔

میں ایک بار پھر دھرمیش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر مار دیا۔ میری دوسری ٹھوکر اس طرح ناکام ہوئی کہ اس نے وہی پتھر سے میرا پیچہ کھینچ لیا تھا۔ میں ایک نالچہ بے پناہ کر رہ گیا۔ وہ پھر دھرم سے دھرمیش کے قریب کر گیا۔

دھر میش نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور میرے اور لہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو بہانے

کی کوشش کرتا، اس نے میری گردن دبوچ لی۔ اس کا ایک گھٹنا میرے سینے پر اور دونوں انگوٹھے میرے زرخے پر تھے۔ میرے سینے اور زرخے پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ دھرمیش پر جنون طاری ہو چکا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ زرخے اور سینے پر دباؤ بڑھ رہا تھا اور مجھے اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ طاقت کا پہاڑ تھا جو میرے اوپر لدا ہوا تھا۔ میرے لیے صرف ایک چانس تھا۔

میں اس کی گردن کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سر کو جھٹکے دے کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بالآخر اس کے بال میری گرفت میں آ گئے۔ میں نے اس کے بال مضی میں بکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ کی پھٹی سے اس کی زخمی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ کراہا اٹھا اور سر کو جھٹکا دے کر بال چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اس کی زخمی پیشانی پر ایک اور ضرب لگائی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو گرفت میں لے لیا۔

میری اپنی حالت اگرچہ غیر بھی زرخے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ سانس رکنے لگا تھا مگر میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ میری معمولی سی کمزوری میری موت کا باعث بن جائے گی۔ میں نے اپنی تمام تر قوت اپنی بانوں میں جمے کر لی اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اس کی نالی کی ہڈیوں سے ذرا اوپر گردن پر جمادے۔

گردن کے دونوں طرف کے یہ پریشور پانٹ اب میرے انگوٹھوں کے نیچے تھے۔ یہ خطرناک ترین پریشور پانٹ تھے۔ انگوٹھوں کا غیر معمولی دباؤ حریف کی موت کا باعث بن سکتا تھا مگر میں دھرمیش کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں نے انگوٹھوں کا بہت معمولی سا دباؤ ڈالا جسے وہ برداشت کر گیا پھر میں آہستہ آہستہ دباؤ بڑھانے لگا۔

دھرمیش کے چہرے پر اب جنون کے بجائے تکلیف اور اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میری گردن پر اس کی گرفت بتدریج کمزور پڑنے لگی اور بالآخر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کے بدن میں تباہی مچا دینے والے گھٹنے چبے پر بے پناہ کرب ابھرتا تھا۔ اس کے حلقے سے چیخ جیسی گھٹی گھٹی آواز خارج ہونے لگی اور پھر اس کا جسم ڈھیل پڑنے لگا۔

دہ ہراسی لمحے فضا فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے پر قاتلین میں گئی تھی۔ میں نے اس کی دھمک محسوس کی تھی۔ میں نے دھرمیش کو اپنے اوپر سے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ مٹی کی بوری کی طرح

”بھد“ سے نیچے گر ا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کودا ایک عجیب منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ چیخ گٹھ کی کلائی اپنے دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوط رکھی تھی۔ چیخ گٹھ کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا وقت اوپر کی طرف تھا۔ وہ جھٹکے دے کر اپنی کلائی پر کوشش کر رہا تھا لیکن جاگی کی گرفت خاص مضبوط گٹھ کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار ابھر آئے۔ خیال میں جاگی عام سی عورت تھی۔ نازک اندام۔ نہیں جانتا تھا کہ جاگی زندگی کی کھٹائیوں کی بھی سمجھتی تھی۔ اس نے شادولن نیپل میں مارشل آرٹس کی لڑائی کی تھی۔ اس کی گرفت اتنی ٹھنکے سے کہ نہیں سمجھتی۔ چیخ گٹھ کی انگلی ابھی تک زخم پر بھی ہاتھ کو جھٹکا لگنے سے زخمی رہ گیا۔ اس مرتبہ گولی جاگی بالکل قریب سے گزرتی ہوئی سامنے والی دیوار میں قریب پلستر اچھرتی ہوئی پوسٹ ہو گئی۔

پلے فائز کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کے اندر ہوئے لوگ چیخنے ہوئے باہر بھاگ گئے تھے اور اب کے سامنے راہداری میں کھڑے یہ قماشہ دیکھ کر کمرے کے اندر صرف دو افراد وہ گئے تھے۔ ایک اور دو سرا وہ شخص جس نے میرے نیلام کی بولی میں کا مقابلہ کیا تھا۔

مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشوا نہیں آئی۔ میری اور دھرمیش کی لڑائی کے دوران میں چیخ گٹھ کو دھرمیش کی حوصلہ افزائی کرتا رہا تھا۔ اسے خلاف داؤ بتاتا رہا تھا لیکن اس نے جب دیکھا کہ پوری طرح میرے جھٹکے میں پھنس چکا ہے اور اسے کوئی امید نہیں تو چیخ گٹھ نے دھرمیش کو بچانے موت کے کھٹات اتارنے کے لیے پستول نکال لیا۔

نے عین وقت پر اس کی یہ حرکت دیکھ لی اور اس بڑی۔ اس کا ہاتھ بروقت چیخ گٹھ کے پستول والے ہاتھ جس سے پستول کا رخ بدل گیا اور گولی میرے سر انچ دور قاتلین میں لگی۔ اگر جاگی بروقت کارروائی میری کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا ہوتا۔

میں نے دھرمیش کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس پڑا تھا۔ اس کا ہیٹ پھول پھٹ رہا تھا جس کا مطلب زندہ تھا۔ میرا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں نے مرکز ایک بار پھر روپ متی کی طرف دیکھا۔ وہ طے جوالی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ رہا تھا۔ ”وہ جی پی پستول پھینک دو۔“

”نہیں راج کماری۔“ چیخ گٹھ نے جواب دیا۔ اس کی دھمکیوں کی تھی ”اس نے میرے منا کو مار دیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں تمہیں حکم دیتی ہوں، پستول پھینک دو۔“ روپ متی نے چیخ گٹھ کو جواب دیا۔ اس کی انگلیوں کی گرفت میں لے لیا۔ اس کی کلائی اس طرح اپنی گرفت میں لے لی تھی کہ وہ پستول بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر اس نے دونوں انگوٹھوں کے ناخن اس کی کلائی کی رگ میں بہت کر دیے۔

چیخ گٹھ کے چہرے پر اذیت کے آثار اب بڑھ گئے اور اس کے ساتھ ہی پستول کے دتے پر اس کی انگلیوں کی گرفت میں پڑی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ روپ متی کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے جھپٹ کر پستول ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ان میں سے کسی پر حملہ کرنے کی کوشش کروں گا مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

جاگی نے ابھی تک چیخ گٹھ کی کلائی گرفت میں لے رکھی تھی۔ چیخ گٹھ بھی دھرمیش کی طرح تھوڑا اور تومند آدمی تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جاگی نے میرے ساتھ مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کی تھی اور اسے لڑائی کا خاصا تجربہ حاصل تھا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت ضرور تھی کہ چیخ گٹھ جیسا مضبوط قد کاٹھ کا شخص جاگی سے اپنی کلائی نہیں ڈرا سکتا تھا۔

جاگی غالباً ابھی اس کی کلائی چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے شاید یہ طے کر لیا تھا کہ اپنے ناخنوں سے اس کی کلائی کی رگ کاٹ کر ہی رہے گی۔

روپ متی اب چیخ گٹھ کی جاگی کو حکم دے رہی تھی کہ وہ گٹھ کو چھوڑ دے مگر جاگی پر اس کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

میرے خیال میں بات اس وقت تک بہت بڑھ چکی تھی۔ صورت حال بہت سنگین تھی۔ ہم روپ متی کے زور پر غلام تھے۔ اس صورت حال کے بعد وہ ہمارے ساتھ لڑی ہوئی بہرمانہ سلوک کر سکتی تھی لیکن میں اس صورت

حال کو مزید سنگین نہیں بنانا چاہتا تھا۔ روپ متی نے اگرچہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں دھرمیش کو بچاؤ دوں تو مجھے کچھ ”مراعات“ مل جائیں گی لیکن مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ روپ متی نے اگرچہ چیخ گٹھ کو بھی شروع ہی میں مداخلت کرنے سے منع کیا تھا لیکن اس نے دھرمیش کو میرے ہاتھوں میں پٹے دیکھ کر مجھے گولی مارنے کی کوشش کی تھی مگر جاگی کی بروقت مداخلت سے میری جان بچ گئی تھی اور اب میں زیادہ ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے جاگی کو اشارہ کیا کہ وہ چیخ گٹھ کو چھوڑ دے۔

جاگی نے ایک پروا پر اٹھا کر ٹانگ دھری کر لی اور چیخ گٹھ کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے زوردار ٹھوک مار دی۔ چیخ گٹھ چیخا ہوا دہرا ہو گیا۔ جاگی نے زوردار جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

چیخ گٹھ بالکل دہرا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ ٹانگوں کے بیچ میں رکھا ہوا تھا اور مضبوط کلائی کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

جاگی روپ متی کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ ”اپنے کتوں کو پٹے ڈال کر رکھا کرو ورنہ کسی کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔“ وہ روپ متی کے چہرے پر نظریں نہاتے ہوئے غرائی۔

روپ متی کا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ اس نے کچھ کتنا چاہا مگر اس کے قریب کھڑا ہوا شخص اس سے پہلے ہی بول پڑا۔

”اے چھو کر۔“ اس کے لہجے میں غراہٹ نمایاں تھی ”راج کماری روپ متی نے تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپے دے کر خریدا ہے۔ اب تم ان کی کنیز ہو۔ تمہیں اب اس لہجے میں بات کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اب اگر تم نے ایک بھی لفظ کہا تو تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔“

”یہ بھی اپنے آپ کو موصوفتا ہے مگر میرے بچے سے اپنی کلائی نہیں چھڑا سکا اور تم۔“ جاگی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اگر تمہیں بھی مرد ہونے کا دعویٰ ہے تو آؤ کچھ لڑالو۔“

اس شخص نے پستول کو ٹال کی طرف سے پکڑ لیا اور بھنائے ہوئے انداز میں جاگی کی طرف بڑھا مگر روپ متی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”نہیں ٹھاکر بھنور گٹھ۔“ وہ بولی ”تم جانتے ہو جب پہلی مرتبہ کسی کے ماتھے پر غلائی کا ٹھپکا لگتا ہے تو وہ اسی طرح اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ یہ چھو کر بھی غالباً پہلی مرتبہ



منڈی میں کی ہے اور میرے خیال میں اس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے اسی لیے کیتیا کی طرح چلا رہی ہے۔  
”بہت بھونک لیا تم نے بھی۔ اپنی زبان کو لگام دو!“  
جاگی چیخی۔

روپ متی نے اس مرتبہ کسی شدید رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ مسکرا کر رہ گئی۔ ٹھاکر بھنور سنگھ اور اس سے پہلے جتنے نے اسے راج کماری کہہ کر مخاطب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا تعلق کسی بہت اونچے خاندان سے تھا اور اس بات کی عکاسی تو اس کی حیثیت بھی کر رہی تھی۔ وہ کوئی معمولی عورت ہرگز نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی ٹھاکر بھنور سنگھ نے انکشاف کیا تھا کہ روپ متی نے جاگی کو ڈیڑھ لاکھ روپے میں خرید لیا تھا اور میری اپنی قیمت کا تو مجھے علم تھا۔ جو عورت کھڑے کھڑے ساڑھے چار لاکھ روپے میں دو انسانوں کو خرید سکتی تھی وہ کوئی معمولی عورت تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اس کے ایک اشارے پر وہاں کھڑے ہوئے آدمی جاگی کا بھرتا ہاتھ تھمے۔ زر خرید غلام یا کنیر کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے مگر روپ متی نے ایسا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ اٹھ گئی تھی۔ وہ تھاکر کی طرف مڑی تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

”ٹھاکر بھنور سنگھ جی۔“ اس کے لہجے میں چاندی کی گھنٹیوں جیسی ٹھنک عود کر آتی تھی۔ ”آپ اس غلام کو خریدنا چاہتے تھے لیکن نلام کی بازی ہم نے جیت لی۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”پھر اس چھوڑ کر کی پہلی بولی بھی آپ نے لگا لی تھی۔ دوسری بولی ہماری تھی لیکن اس کے فوراً ہی بعد ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلی بولی نہیں لگائیں گے تاکہ اس کی بولی آپ کے حق میں ختم ہو جائے مگر ایک اور ٹھاکر کچھ میں کوہ پورا اور آپ دستبردار ہو گئے۔ اس طرح ہمیں مجبوراً بولی بڑھانی پڑی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”ہماری وجہ سے آپ کو نلام میں دُک اٹھانی پڑی جس کے لیے ہم شرمندہ ہیں۔ ہم آپ کو کچھ خیر والی کوفت کی تلائی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟“

”راج کماری روپ متی جی۔“ ٹھاکر بھنور سنگھ بولا ”آپ کی مہمانی ہے جو آپ میرے بارے میں اس طرح سوچ رہی ہیں۔ آپ کا معمولی اور حقیر سا تحفہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔“

”تو پھر میری طرف سے یہ تحفہ قبول کیجئے بھنور جی۔ روپ متی نے مسکراتے ہوئے جاگی کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک دم سنانے میں آ گیا۔ میرے دماغ پر میری جی جی۔ سوچنے لگنے کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں۔ میں کتنا چاہتا تھا مگر تو کبھی نہ بھی جیسے ساتھ چھوڑاؤم میں پہلی پہلی ہی نظروں سے کبھی روپ متی کی طرف دیکھا تھا اور بھی جاگی کی طرف۔ جاگی کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے میری طرح ٹھنک نہیں ہوئے تھے اور وہ میری طرح غماز بھی نہیں رہ سکی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ وہ روپ متی کی طرف بڑے جتنی ”میں کوئی بے جان چیز نہیں ہوں نہ اٹھا دو سروں کو دے دیا جائے میں ایک انسان ہوں۔ ایک انسان۔ مجھے دھوکے سے پکڑ کر۔“

”خاموش۔“ روپ متی پہلی مرتبہ اونچی آواز میں ”تمہاری آزادی تو اس وقت سلب ہو گئی تھی جب وہ نے جیسے شخص کا سایہ تم پر ڈالا تھا۔ میں نے ایک بڑی رقم کر کے تمہیں خریدا ہے۔ اب تم میری ملکیت ہو۔ یہ میری مرضی پر منحصر ہے کہ تم سے اپنے پیسوں کے تم چٹاؤں یا کسی کو تحفے میں دے دو۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی ”اب ٹھاکر بھنور سنگھ تمہارا آقا ہے۔ ٹھاکر تجربہ کار آدمی ہیں۔ انہیں غلام اور کنیرس پالنے کا شوق۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم جیسی خوب صورت کنیر کو طرح رکھا جاسکتا ہے۔ ٹھاکر جی!“ اس نے آخری دو ٹھاکر بھنور سنگھ سے مخاطب ہو کر کہے تھے ”ہماری طرف سے یہ تحفہ قبول کیجئے اور اب اسے یہاں سے لے جائیے۔“ ٹھاکر راج کماری جی!“ ٹھاکر بھنور سنگھ کی بات کھل گئیں۔

”نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں رندھی!“ جاگی چیخی روپ متی کی طرف لپکی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ روپ متی کے قریب پہنچا ٹھاکر بھنور سنگھ کا اشارہ پا کر تین منٹوں کے لیے گھس آئے اور جاگی سے لپٹ گئے۔ جاگی چیخ چیخ کر کہتے ہوئے مزاحمت کرنے لگی۔ وہ بڑی طرح ہاتھ پاؤں سے گھرانے میں تین منٹوں کے سامنے اس کی ایک منٹ وہ بے بس چڑیا کی طرح چڑچڑا کر رہ گئی۔ وہ تین منٹ اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔

میں اب بھی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ میرا دماغ جک جک تھا۔ وہ لوگ جاگی کو اٹھا کر لے گئے اور کچھ نہیں کر سکا تھا اور شاید کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جاگی انچھن دیک کر میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔

اور پھر جیسے میرے دماغ پر طاری ہجو ٹوٹ گیا۔ میں ش میں آ گیا۔ جھنجھٹ تھی۔ درد اڑے کے قفا میں کھینکوں کی سی جھنجھٹ تھی۔ درد اڑے کے اسنے راہداری میں بہت سے لوگ جمع تھے جو روپ متی کی حالت پر سرگوشیوں میں تبصرے کر رہے تھے۔ ٹھاکر نور سنگھ کے آدمی جاگی کو لے جا چکے تھے لیکن وہ ابھی تک ہی موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری طرف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اب میں کچھ نہ بھ ضرور کروں گا لیکن میرا اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسنے لوگوں کی موجودگی میں کچھ کرنا خود کشی کے مترادف تھا۔ میں ایک غلام تھا اور یہاں سب وہ لوگ تھے جو غلام بیٹے آئے تھے۔ یہ الفاظ دیکھ کر سب آقا تھے اور کسی آقا غلام سے کیا ہرودی ہو سکتی ہے۔

میرے اس طرح خاموش رہنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے جاگی سے کوئی ہرودی نہیں رہی تھی اور میں بے حس نہ تھا۔ میں نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا مگر جاگی نے میری بے چارگی پھیرا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آج کے دور میں غلاموں کی خرید و فروخت ایک سنگین جرم ہے لیکن اس کے باوجود یہاں اموں کی جو منڈی لگی تھی وہ میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ جگہ اگرچہ کسی آبادی سے میلوں دور تھی مگر زمین کی فراوانی میں تو نہیں تھی کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلتا اور یہ دل ایک دن کی بات بھی نہیں تھی۔ غالباً برسوں سے یہ ماڈرن ترین کاروبار ہو رہا تھا۔ انڈیا کے دور دراز کے شہروں سے لوگ یہاں آکر غلاموں اور کنیروں کی خرید و فروخت کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ لوگ اس منڈی کے بارے میں جانتے تھے۔ یہاں کی حکومت بھی واقف تھی لیکن یہ دوبارہ ہو رہا تھا۔

غلاموں کے اس غیر قانونی کاروبار کے خلاف پہلے بھی وائس اٹھاتی جاتی ہوں گی لیکن یہ دھندا جاری تھا۔ یہ دوبارہ کرنے والے بہت طاقتور تھے۔ خریداروں میں بھی رُ رجوع والے لوگ تھے۔ روپ متی کی مثال میرے سامنے تھی۔ اس کے بارے میں ابھی تک میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس کی حیثیت دیکھ کر یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس

کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ اس دولت سے ہر چیز خرید سکتی تھی۔ انسان بھی اور انسان کی آزادی بھی۔ اس دولت کے بل بوتے پر اس کا ایسا رسوخ... ہو گا کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

جب میری بولی لگی تھی تو میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن جاگی کو دوبارہ اپنے قریب دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا اور ذہن میں اس سنگین ترین صورت حال سے نجات کا ایک منصوبہ بھی ترتیب دینے لگا تھا۔

روپ متی نے جس انداز سے میری بولی لگائی تھی اور میں نے اس کی آنکھوں میں جو برسرِ اسی چمک دیکھی تھی اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس نے مجھے محض غلام بنانے کے لیے نہیں خریدا تھا۔ اتفاق سے جاگی کی خریدار بھی وہی تھی اور اس طرح ہم دوبارہ مل گئے تھے۔ ہمیں ایک ہی جگہ پر رہنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ سب سے پہلے ہم روپ متی کا اعتماد حاصل کریں گے اور اس کے بعد وہاں کی کوئی ترکیب سوچی جائے گی مگر جاگی کی گرم دماغی نے میری سوچوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ روپ متی کا سامنا ہوتے ہی اس سے الجھ پڑی۔ دھرمیش نے جاگی کو اس کی گستاخی کی سزا دینا چاہی تو میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہ سکا اور اس طرح بات بڑھتی چلی گئی۔ میں اور دھرمیش ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے۔ روپ متی نے فائٹ کے شروع میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں دھرمیش کو پچھاڑ دوں تو مجھے بہت سی مراعات مل جائیں گی۔ مجھے اس کے وعدے پر اعتبار تو نہیں تھا لیکن اگر واقعی مجھے کچھ مراعات حاصل ہو جائیں تو ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر جاگی نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا جس کے نتیجے میں روپ متی نے اسے دوسرے کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ روپ متی بہت دولت مند تھی۔ وہ لاکھوں روپے مالیت کے تحائف اپنے دوستوں کو پیش کر سکتی تھی۔ ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدی ہوئی کنیر کی کیا حیثیت تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے ٹھاکر بھنور سنگھ کو یہ تحفہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یا خیر سگالی کے جذبے کے تحت نہیں دیا تھا۔ وہ تو دونوں بولیوں میں اس کا حریف تھا۔ جاگی کو اس کی جھولی میں ڈال دینا دراصل جاگی کے خلاف انتقامی کارروائی تھی۔ جاگی کو اس کی بد زبانی اور گستاخی کی سزا دینے کے لیے ایک بکڑے ہوئے ریشم کے قدموں میں ڈال دیا گیا تھا اور اس کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہوا تھا۔ جاگی کے ساتھ آنے والے وقت میں

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔  
دھر میں ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا اور تیرنگہ اس کے  
قریب بیٹھا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی  
اپنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ مجھے متوجہ پا کر اس نے میری  
طرف دیکھا اور بھیڑنے کی طرح غراتے ہوئے بولا۔  
”اگر میرے سنا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں  
چھوڑوں گا۔“

”میری زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے تمہیں راجہ کی روپ متی سے اجازت لینا پڑے گی جس نے مجھے نے کے لیے رو کر اُخرج کیا ہے۔“ میں نے اپنی جگہ سے کھینچ کر بغیر ہر سون کے لیے جس جواب دیا ”یہ ایم اطمینان تمہارے مناکو کچھ نہیں ہوگا۔ بس چند روز بدن کی کرنی پڑے گی۔“

میری اس بذلہ سستی پر بیچ گئے تو تھملا کر رہ گیا البتہ روپ  
مٹی کے ہونٹوں پر دلفریب فکسراہٹ آگئی تھیں۔ میں نے اس  
کے نام کا خوالہ خاص طور پر دیا تھا۔ اس طرح میں یہ ظاہر کرنا  
چاہتا تھا کہ میں بیچ گئے گا نہیں، روپ مٹی کا ز خرید غلام  
ہوں اور اب میری مالک و وارث وہی ہے۔ یہ بات کہہ کر  
گویا میں نے اپنے اس منصوبے پر عمل شروع کر دیا تھا جس  
کے تانے بانے میں نے اس کمرے میں جاگلی کے آتے ہی بنا  
شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ جاگلی اب چاچی بھی مگر مجھے روپ  
مٹی کا اعتماد حاصل کرتا تھا۔ ایک وفادار غلام بن کر۔

”بیچ کنگھ۔“ روپ مٹی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دھرمیش کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جاؤ اور جب یہ ہوش میں آجائے تو رو داگنی تیار کر دو۔ ہم بیچ سو جن گھنٹے سے پہلے ہی میاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے کمرے میں جاری ہوں۔ یہ غلام میرے ساتھ جائے گا۔“

روپ مٹی کے اس فیصلے پر بیچ کنگھ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے کچھ کسنا چاہا مگر روپ مٹی نے ہاتھ اٹھا کر زبان کھولنے کا موقع نہیں دیا۔

”راج کماری جی!“ قریب کھڑے ہوئے بھنور سنگھ نے کہا ”آپ دیکھ چکی ہیں، یہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے اپنے کمرے میں لے جانا چاہتی ہیں۔ بغیر محافظوں کے۔“

”میرے محافظوں کا حال تو آپ بھی دیکھ چکے ہیں  
ٹھا کر رہی۔“ روپ متی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”یہ  
اصل ہے اور میں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی۔“

آپ اطمینان رکھیے۔ یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" اس نے مجھے اشارہ کیا "تمہارا کپڑا اور مہارت کا مظاہرہ میں دیکھ چکی ہوں۔ اس میں شہر کے تمام حکم جمعیتے کی دہر میں جڑے جڑے سوراخوں کی آواز موزوں ہے جو لیکن راج کمار کی روپ متی سے بغاوت کی خبر خیال بھی ذہن میں مت لانا۔ ایسی صورت میں تمہارے ہندوستان تو کیا دنیا کے کسی گوشے میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ تو میرے ساتھ۔"

راہداری میں کھڑے ہوئے لوگ بھی روپ حتیٰ  
اس فیصلے پر حیران اور پریشان تھے ہم جی پی کمرے سے  
نکلے لوگ راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹے جاتے  
روپ حتیٰ بڑی شان اور محکمات سے آگے چلے رہی تھی  
میں اس کے پیچھے ایک مصلح اور فرماں بردار غلام کی طرح  
چھکائے چلا رہا تھا۔

ہم ایک اور راداری میں مڑ گئے۔ یہ بہت دور  
عریض غارت تھی۔ یہاں راداریوں کا جال بچا ہوا  
ہر راداری میں آنے والے کسی کمرے تھے ہر کمرے  
تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہندوستان کے دور  
شہروں سے آئے ہوئے ٹیکڑوں لوگ تھے جو اس وقت  
قدیم کل نما غارت میں مقیم تھے یہ سب دولت مند  
تھے جو غلام اور کنیز خریدنے آتے تھے۔ جبکہ غلام  
ان کے تاجروں کے لیے رہائش کا انتظام باہر والے  
کیا گیا تھا جہاں وسیع و عریض میدان کے اطراف میں  
کے ساتھ ساتھ لاتعداد کمرے بنے ہوئے تھے۔

میرے خیال میں اس وقت صبح کے چار بجے والے  
مگر ہر شخص جاگ رہا تھا۔ تمام راہداریاں روشن تھیں  
لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہم جس طرف سے  
گزر رہے تھے، لوگ مزہ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگتے۔ وہ  
واقعی روپ متی تھی۔ اس کے حسن میں کوئی شبہ نہ  
وہ ایک مکمل عورت تھی۔ اس نے لباس بھی ایسا پہنا  
تھا کہ اس کے گداز و حسین بدن کے تمام خوب و فراز  
ہورہے تھے۔ اس کی چال میں بھی ایک کمکت تھی  
تھا۔ لوگ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور  
کے ساتھ میں تھا۔ میں نے کبھی اپنے بارے میں اس  
نہیں سوچا تھا لیکن میری زندگی میں جتنی بھی عورتیں  
تھیں، اپنی اور اداؤں سے اور اپنی باتوں سے مجھے اس کا  
رہتی تھیں کہ میں گلفام سے زیادہ خوب رو اور حسین  
مجھے یلزام کرنے والے نے تو مجھے یوسف ثانی کا خطاب

[illegible]

نے اپنے کے اختتام پر ہم راہداری میں دائیں طرف  
مڑ گئے۔ یہاں بھی کچھ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔  
راہداری کے اختتام پر لنگڑی کے انشول پر ایک اوجیز عمر آدمی  
بیٹھا ہوا تھا جس نے میوں رنگ کا ڈیس پین رکھا تھا۔ کرپ  
پلاٹ بھرچوڑا سنہری بیٹک تھا جس میں بائیں طرف ہولسٹر  
بھی لگا ہوا تھا جس سے پستول کا دستہ جھانک رہا تھا۔ سر بل  
دار چڑکی بندھی ہوئی تھی۔ وہ روپ متی کو دیکھتے ہی انہ کے  
کھڑا ہو گیا اور بائیں طرف کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

روپ متی اندر داخل ہو گئی جبکہ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ وہ دریاں بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ روپ متی نے کمرے کے وسط میں رک کر میری طرف دیکھا۔  
 ”تم باہر کھڑی رک گئے۔ اندر آؤ۔“ اس نے تھکسانہ لہجے میں کہا۔

میں سر جھکائے اندر داخل ہو گیا۔ دربان نے دروازہ بند کر دیا۔

ڈرانگ روم کے طور پر آراستہ یہ وسیع کمرہ بہت شان دار تھا۔ فرش پر دیزر قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی قیمتی تھا۔ بائیں طرف ایک اور دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ اس کے دوسری طرف بند روم تھا جس کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔

یوں تو محلِ نماز عمارت میں وہ دولت مند لوگ مقیم تھے جو غلام اور کینز خریدنے کے لیے یہاں آتے تھے لیکن عمارت کے اوپر کا یہ حصہ راج مہاراج قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں کے اخراجات بھی زیادہ تھے۔

روپ متی بندہ روم میں داخل ہو گئی۔ اس نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ یہ کمر بستہ شان دار طریقے پر آراستہ تھا۔ مسمری پر آرام دہ میٹرکس تھا جس پر ہلکے نیلے

رنگ کی روشنی چادر بھی ہوئی تھی۔ کمرے کے پچیس طرف کشادہ کھڑکی تھی جس سے تازہ ہوا کے جھوٹے اندر آ رہے تھے کھڑکی عمارت کی عقبی سمت میں کھلتی تھی لیکن باہر چونکہ ابھی اندھا تھا اس لیے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”بہت تھک گئی ہوں۔“ روپ متی یہ کہتے ہوئے مسسری پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ کچھ اس انداز میں بستر پر گری تھی کہ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں سر جھکائے کھڑا اس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا مگر کم بخت یہ نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”صبح ہوتے ہی پھر ایک طویل سفر کرنا ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میرے پیڑ ببا دو۔ بہت مشکل ہو رہی ہے۔“

میں کانپ اٹھا۔ غلام کی حیثیت سے یہ میرے لیے سہا  
 حکم تھا۔ کسی اور کام کے لیے کہا جاتا تو میں عمل کرنے میں  
 ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کرتا مگر اس کے پیر دبانے میں مجھے کچھ  
 قائل تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس کے پیر دبانے کو اپنی  
 توہین سمجھتا تھا بلکہ اس لیے کہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے  
 مجھے اپنی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ میرا وہ شبہ بالکل  
 درست ثابت ہو رہا تھا کہ روپ متی نے مجھے محض غلام  
 بنانے کے لیے نہیں خرید ا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ میری  
 رعنائی پر مرمنی تھی جس کے لیے اس نے تین لاکھ روپے  
 خرچ کر دیے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری بولی پچاس  
 لاکھ تک جاتی تو بھی وہ بیچنے نہ ہنتی۔

مجھے وہ وقت یاد آگیا جب تھائی نے مجھے کمرے میں لے جا کر ہنزا اٹھایا تھا اور مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا تھا اور پھر اپنی قمیض بھی اتار دی تھی۔ تھائی نے بھی میرے جسم کو ٹٹول کر دیکھا تھا اور پھر مجھے اپنے جسم پر ہنتر سارنے کا حکم دیا تھا لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ میں سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

”سنا نہیں تم نے ہم نے کیا کہا ہے۔“ روپ متی کی  
آواز اگرچہ کسی قدر بلند تھی لیکن توجہ میں نہ جھتی تھی۔

میں نے جھک کر دونوں ہاتھ اس کے پیروں پر رکھ دیے اور بچوں کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس نے گھٹنے اوپر اٹھا لیے اس کے ساتھ ہی لباس بھی سمٹ گیا۔ پنڈلیاں برہنہ ہو گئیں۔ میرے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔

میں نے جیسے ہی اس کی پنڈلی پر ہاتھ رکھا، میرا دل اچھل

کر حلق میں آیا۔ کپنیاں سٹگے لگیں۔ روپ متی بھی کراہ اٹھی تھی۔

ممکن ہے میں جذبات کی اس دلدل میں پھنس جاتا مگر دروازے پر دستک کی بجلی سی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آیا۔ روپ متی نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ میں سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ روپ متی بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی اور بارہ والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ روپ متی نے باہر کا دروازہ کھول دیا حالانکہ وہ دروازہ کھولنے کا حکم مجھے بھی دے سکتی تھی لیکن اس نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔

باہر بچ ٹنگے تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھے بند روم میں کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت سی بھر گئی۔

”کیا بات ہے بچ ٹنگے۔“ روپ متی قدرے ڈرشت لہجے میں بولی ”دھریش کیسا ہے اب۔ ہوش میں آیا یا نہیں۔“

”دھریش اب ٹھیک ہے راج کمار کی۔“ بچ ٹنگے نے بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”چٹوڑ کڑھ کا راج کمار کنور بلونت ٹنگے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

روپ متی کی بھوئیں سکڑ گئیں۔ وہ چند لمحے خشک نظروں سے بچ ٹنگے کی طرف دیکھتی رہی جیسے راج کمار بلونت ٹنگے کی خواہش میں اس کا تصور ہو۔

”راج کمار کو اندر لاکر بٹھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ روپ متی کے لہجے میں ناگواری تھی۔

وہ پھر بند روم میں چلی۔ اس نے بچ کے دروازے پر پردہ کھینچ دیا تھا۔ ڈرننگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنا چلیہ درست کیا۔ اس دوران میں دوسرے کمرے سے اب چٹوڑ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ روپ متی نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا دوسری طرف کی آوازیں سنتا رہا۔ وہ غالباً چٹوڑ کڑھ کا راج کمار تھا جو اس وقت کمرہ رہا تھا۔

”ہمیں یہاں بیٹھنے میں کچھ تاخیر ہوگئی راج کمار کی روپ متی جی۔ مگر سنا ہے آپ نے ایک ایسا ہیرا خرید لیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ کہاں چھپا کر رکھا ہے اسے ہمیں بھی تو اس کے درشن کرا دیجئے راج کمار کی جی۔“

”ہاں۔ وہ ہیرا یہی ہے۔ آپ بھی دیکھیں گے تو پھر ک انھیں گے کنور جی۔ میں ابھی بلاتی ہوں اسے۔“ روپ متی نے جواب دیا۔

اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی دروازے کا پردہ ہٹا اور بچ ٹنگے کی صورت دکھائی دی۔ وہ بڑی خشک نگاہوں سے میری

طرف دیکھ رہا تھا۔ اب وہ میرے بالکل سامنے آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کا دایاں بازو ٹنگے میں پڑی ہوئی تھی میں رکھا ہوا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ کالی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ جاگتی نے چٹوڑ زیادہ سی زور لگایا تھا۔

”میری صورت کیا دیکھ رہا ہے۔ چل۔ راج کمار نے طلب کیا ہے تجھے۔“ اس کے لہجے میں نفرت بھری ہوئی تھی مگر آواز زیادہ اونچی نہیں تھی۔

مجھے اس کے بارے میں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ہماری دشمنی کی بنیاد تو اسی وقت رکھی گئی تھی جب میں نے دھریش کو بچھاڑا تھا اور بچ ٹنگے نے مجھے کوئی کارنامہ کی کوشش کی تھی۔ مجھے اب روپ متی کے پاس ہی رہنا تھا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک مجھے نجات کا کوئی راستہ نہ مل جاتا اور اس کا مطلب تھا کہ میری اور بچ ٹنگے دھریش کی دشمنی بے عرصے تک چلنے والی تھی۔

بچ ٹنگے کے حکم پر میں نے قدم اٹھاتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا۔

ایک صوفے پر روپ متی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ سامنے والے صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”واہ۔“ ان میں سے ایک کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ دراز قامت اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے راجستانی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر کمرے نیلے رنگ کی چڑی بندھی ہوئی تھی۔ موچیں زیادہ بھاری نہیں تھیں مگر ہونٹوں کے کناروں پر او کی طرف بل کھائی ہوئی تھیں۔ گلے میں دو تین کی ایک مالا بھی پڑی ہوئی تھی ”واہ روپ متی جی۔“ وہ کہہ رہا تھا ”تو واقعی ہیرا ہے۔ کالی ماں کی قسم۔ اگر ہم ہوتے تو اسے دوسرے کے پاس جانے نہ دیتے۔ وجہ تھا کہ کو منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتے لیکن۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش ہو کر بات جاری رکھتے ہوئے ”لیکن میرے خیال میں وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں نکلا آپ نے یہ ہیرا تین لاکھ میں خریدا ہے۔ ہم آپ کو چھ لاکھ دینے کو تیار ہیں۔ ہمارے پاس بہت دولت ہے۔“

”دولت تو ہمارے پاس بھی بہت ہے کنور جی۔“ روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”آپ یہ بھی جانتے کہ ہم شوق سے خریدی ہوئی کوئی چیز بیچتے نہیں ہیں۔“

طور پر دے سکتے ہیں لیکن اس وقت ہم تحفہ دینے کے موذ بھی نہیں ہیں۔“

”دس لاکھ۔ پندرہ لاکھ۔“ کنور بلونت ٹنگے نے میری پٹی لگائی۔ میں چونک گیا۔ اس کے پاس واقعی بہت دولت تھی اور وہ مجھے بہت پر خریدنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔

”کنور جی! روپ متی ایک جھگڑے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ناؤ سا پیدا ہو گیا۔ ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم اپنے کھر کی کوئی چیز بیچتے نہیں ہیں۔ آپ ہماری توہین کر رہے ہیں۔“

”آپ تو ناراض ہو گئیں روپ متی جی۔“ کنور بلونت ٹنگے معنی خیز انداز میں مسکرا دیا ”ایک غلام کے لیے آپ اپنے دوستوں کو بھی ناراض کر رہی ہیں۔ خیر۔ جیسی آپ کی مرضی لیکن یہ بات یاد رکھ لیں کہ یہ غلام پالا خراٹے گا ہمارے پاس۔ میں چلتا ہوں۔ مسکرا۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی اور آنکھوں میں کمار کی جھلک لگی تھی۔

روپ متی چند لمحوں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔ اس نے بچ ٹنگے کو رخصت کر دیا اور میری طرف دیکھنے لگی پھر آگے بڑھ کر وہ میرے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔

دونوں ہاتھ میرے بازوؤں کے فولادی سسز پر رکھ دیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دل کی دھڑکن کپنیوں میں محسوس ہونے لگی۔ روپ متی کی آنکھوں میں ستارے سے فوج رہے تھے۔ میں زیادہ دیر تک اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ میں نے نظریں جھکا کر ایک بار پھر میا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ روپ متی کا شخص بے ربط ہو رہا تھا اور اس کے نیم بند سینے کا زیروم قیامت ڈھا رہا تھا۔

روپ متی نے اچانک میرے بازو چھوڑ دیے اور دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں جا کر ہنسنے لگی۔ میں مبہوت سا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ روپ متی نے ایک بڑی رقم خرچ کر کے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدا تھا لیکن اس کا اب تک کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجھ سے پیر دوائے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام خدمت کے طور پر نہیں لایا گیا۔ بیروبا تے ہوئے اس پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی وہ ایک دوسری کہانی تھی اور اب وہ جس انداز میں میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی یہ بھی ایک دوسری کہانی تھی۔

روپ متی کی اس کیفیت سے قطع نظر میرے خیال میں یہاں ایک اور کہانی جنم لے چکی تھی۔ کنور بلونت ٹنگے نے مجھے سے پندرہ لاکھ کی آفر دے دی تھی اور روپ متی نے

انکار کر دیا تھا اور اس طرح میرے خیال میں ان دونوں کے بیچ بھی دشمنی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

میں ایک عجیب سی صورت حال سے دو چار ہو گیا تھا۔ جاگتی مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ کھانکر بخنور ٹنگے کون تھا۔ وہ کس شہر کا رہنے والا تھا اور جاگتی کو لے کر کہاں جائے گا لیکن بہرحال میں نے اسے تلاش کر دیا تھا اور اس سے پہلے اپنے غلامی کے طوق سے نجات حاصل کرنی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس میں مجھے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف روپ متی نے اپنے آدمیوں کے مقابلے میں میری حمایت کر کے میرے لیے مزید مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں دھریش کو بچھاڑ دوں تو مجھے بہت سی مراعات حاصل ہو جائیں گی۔ یہ جملہ گویا دھریش کے مقابلے میں میری حمایت کا اعلان تھا۔ میں نے دھریش کو ادھ موا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ دونوں میرے دشمن ہو گئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ دونوں کون تھے۔ ان کا آپس میں کیا رشتہ تھا اور روپ متی سے ان کا کیا تعلق تھا۔ وہ دونوں اس کے غلام تو ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔

بچ ٹنگے اور دھریش نہایت خوب رو اور بھرپور جوان آدمی تھے اور پھر میری بولی لگاتے ہوئے بھی روپ متی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے میرے بازوؤں کے سسز بھی ٹھونک کر دیکھے تھے اور ابھی چٹوڑ چلے جس طرح وہ میرے بازو تمام کر میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں جس طرح پراسرار چمک ابھر رہی تھی اس سے میں نے روپ متی کے بارے میں ایک مختلف رائے قائم کر لی تھی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ روپ متی کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ مجھے خواب گاہ میں طلب کر رہی تھی۔ میں اندر داخل ہو کر اس کے سامنے مسری کے قریب کھڑا ہو گیا۔

وہ مسری پر نیکی سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اس کی نظریں میرے بدن کا طواف کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں اس وقت بھی وہی پراسرار سی چمک تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس کی آوازیں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ساتھ ہی اس نے مسری کے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں جھپٹتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری اس فرماں برداری کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کا غلام تسلیم کر لیا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ میں اطاعت اور

میرے سامنے اس وقت ایک اور موقع بھی تھا جس نے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ نیلا ہی تسم ہونے پر روپ متی نے میرے گلے میں غلامی کا طوق ڈالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے مجھے دھریش کے ساتھ لڑنے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا اور یہ بھی جان گئی تھی کہ میں کس قدر فخرناک ہوں۔ نیلا ہی کے وقت دے شکر کرنے بھی گویا میری تعریف کرتے ہوئے لوگوں کو خبردار کر دیا تھا کہ میں نے سیاسی واسودو جیسے سانڈ کی گردن مروڑ دی تھی اور جب روپ متی مجھے اکیلے ہی اپنے ساتھ کمرے میں لانا چاہی رہی تھی تو خاکہ بنور سنگھ نے بھی اسے خبردار کر دیا تھا کہ روپ متی نے اس کی پروا نہیں کی تھی اور کسی محافظ کے بغیر مجھے اکیلے ہی اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ اسے شاید اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ عورت کے لیے کسی مرد کو غلام بنانے کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ہاتھ میں ہنر اٹھائے رکھے۔ میرے خیال میں مرد کو مطیع کرنے کے لیے عورت کو ہنر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور روپ متی جیسی بھرپور جوان اور حسین عورت تو سرکش سے سرکش مرد کو بھی اپنے پیر چائے پر مجبور کر سکتی ہے۔ جب میں اور دھریش حرف بن کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے تو روپ متی نے دھریش کو بھی یہ آفر دی

میں کرسی پر بیٹھا یہی سب کچھ سوچا رہا۔ ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر دیکھا تو روپ متی کی آنکھیں بند تھیں۔ سوچا کہ متی اس کے سینے کا ہمارا زور و ہم اس کی چڑھوں کیفیت کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے بھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کل دن بھر صحرا میں اونٹوں، سفر اور پھر دار بھر جانے کی وجہ سے میں بڑی طرح تھک گیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نیند کی آغوش میں پڑ گیا۔ مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا تھا لیکن بیلوں پر نہ والی ایک زوردار ٹھوکری مجھے ہوش میں لے آئی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی اور میں کرسی سمیت الٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں حواس پر قابو پا کر اسے آپ ک سنیاں، ایک اور زوردار ٹھوکرنے مجھے ایک بار پھر کراہنے

میرزا کو دیر دوار سے ٹکرائی تھی۔ میرزا داغ جھینپا  
 انگوٹھوں کے سامنے نیلی جلی چنگاریاں سی رخص کرنے  
 داغ نگوٹھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور دوسرے ہی لمحے  
 اپنے گچھوٹے اڑنے جینے کی طرح میری طرف  
 اٹھ کھڑے ہوئے۔ میری سرکری ٹکرائی چاٹا تھا اور اس مقصد  
 لاکھڑا ہوئے۔

”تج سچ نکھڑے“ روپ متی کی آوازیں بجلی کی سی کرک نکلیں۔  
 ”میں اس غلام کو سزا دے رہا تھا راج کمار۔“  
 ”تج سچ نکھڑے“ نے ایک بار پھر ناک سے رستے والا خون پونچھتے ہوئے جواب دیا ”میں جب کمرے میں آیا تو یہ حرامی

ہوں لیکن آئندہ ایسی کوئی بات برداشت نہیں کروں گی۔ اب تم جاسکتے ہو۔ اور سنو۔ اس وقت سات بج رہے ہیں۔ میں

جہاں پھرتی کی صرب لے سرح لیکر بتا دی تھی  
میرے روم روم میں سنسنی کی لہریں سی دودھ

رکھا اور اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب مجھے

”یہ ناشتا میں نے دونوں کے لیے منگوایا ہے۔ بیٹھو تم

بھی۔" روپ متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ما لکن۔ غلام پر اتنی مہربانی نہ کیجئے کہ وہ غلامی کے آداب کو فراموش کر دے۔ آپ ناشتا کیجئے۔ میں بعد میں کھالوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"غلام! ہاں ٹھیک ہے، تم میرے غلام ہو۔ میں نے ایک بڑی رقم خرچ کر کے تمہیں خریدا ہے لیکن تم ناشتا میرے ساتھ بیٹھ کر کرو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

میں روپ متی کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پرانے، انڈے کا آلیٹ، آلو میٹھی کی بھجیا اور ایک کٹوری میں اچار بھی تھا۔ روپ متی نے ناشتا شروع کیا تو میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ اس وقت مجھے واقعی بہت سخت بھوک لگی تھی اس لیے بے تکلفی سے کھانے لگا۔ یہ احساس تو مجھے بہت بعد میں ہوا کہ روپ متی نے نرے خالی ہونے تک صرف دو چار نوالے ہی لیے تھے اور وہ ہاتھ روکے بیٹھی دلچسپ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھوجن اور منگواؤں؟" اس نے کہا۔

"نہیں ما لکن۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پلیٹ کی طرف دیکھا۔ اس میں اب چپا پراٹھا ہی رہ گیا تھا یا پھر تھوڑا سا آلیٹ بچا تھا۔ مجھے واقعی بہت شرمندگی ہو رہی تھی "مجھے افسوس ہے ما لکن۔ میں نے کھانا کھانے کے آداب کا بھی خیال نہیں رکھا۔ مجھے اس طرح نیدے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تمہیں بھوک لگی ہوئی تھی، تم نے کھالیا۔ اس میں نیدے پن کی کیا بات ہے اور اس میں شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔" روپ متی نے یہ کہتے ہوئے پلیٹ میں بچا ہوا پراٹھا اٹھالیا "جب آدمی کھانے کے لیے بیٹھا ہو تو اسے کسی قسم کی ہجک کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ دسترخوان سے خالی پیٹ اٹھ جانے کو میں ممانعت ہی سمجھتی ہوں۔"

میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر پہلے بلکی سی دستک کی آواز ابھری اور پھر دروازہ کھل گیا۔

بچ ٹنگہ اور دھرمیش کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

مجھے روپ متی کے ساتھ کھانے کی میز پر اس طرح بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں مسک اٹھے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں

چنگاریاں سی بھڑکتی تھیں۔

بچ ٹنگہ کا سیدھا ہاتھ اب پھر گلے میں لٹک رہا ہوا تھا۔ اس کی ناک پھول کر پکڑا ہو رہی تھی اور ناک کے اوپر کسی قسم کی دو انگلی گئی تھی۔ اچھی سوچا ہوا تھا۔ جبکہ دھرمیش کی پیشانی پر بھی آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سنا ہوا تھا اور صورت بہت بیمار نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے بچ ٹنگہ۔۔۔ اور تم کیسے ہو روپ متی نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا لہجے میں بے اعتنائی نمایاں تھی۔

"ٹھیک ہوں راج کماری۔" دھرمیش نے "ہم پوچھنے آئے تھے کہ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے شاید بچ ٹنگہ سے کہہ دیا تھا کہ کر کے روانہ ہو جاؤ۔ ہم شام کو یہاں سے روپ متی نے جواب دیا۔

"راج کماری۔" اس مرتبہ بچ ٹنگہ بولا "رات ہو جائے گی اور آپ جانتی ہیں کہ رات غلام بغیر محافظوں کے اس علاقے میں رات کے وقت کیا تم لوگ میری حفاظت کر سکتے ہو؟" وہ بات کانٹتے ہوئے باری باری ان دونوں کو گھورا "جاؤ اور میری فکر مت کرو۔ میں راج بھون بچکا فیصلہ کروں گی۔"

بچ ٹنگہ نے کچھ کہنا چاہا مگر روپ متی نے اسے روک دیا اور زبان سے کچھ کہے بغیر انہیں اشارہ کیا۔

وہ دونوں خوں خوار نظروں سے میری طرف چلے گئے۔ روپ متی نے جس انداز میں دالہا فیصلہ کرنے کی بات کہی تھی اس سے مجھے اندازہ دونوں اس کے ملازم تھے اور غالباً باڑی کا رڈا جس طرح میرے ہاتھوں پڑے تھے، روپ متی اس طرح بدل ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا اور میرے روپ متی کا اس طرح رویہ تبدیل کر لینا مناسب وہ بھی اس وقت جبکہ وہ اپنے گھر سے دور تھی۔ اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ میں نے اس کا اظہار کیا تو روپ متی کے ہونٹوں پر خفیف آ گئی۔

"مجھے درد نہ پانے کا شوق ہے۔" وہ بولا



سُدا جاتا اور انہیں کنٹول میں رکھنا جاتی ہوں۔ جو جانور سرکشی کرتا ہے یا میں سمجھتی ہوں کہ وہ میرے کام کا نہیں رہا، میں اسے گولی مار دیتی ہوں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ دونوں بھی میرے ہاتھوں میں نے انہیں اپنی حفاظت کے لیے رکھا تھا لیکن اب یہ بھولتے زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ واپس جا کر ان کا فیصلہ کروں گی۔"

میرے کانوں کی لوہیں جتنے لگیں۔ روپ متی کی بات بالکل واضح تھی۔ اس نے کتے پالے تھے جو اب نہ صرف سرکشی پر آمادہ تھے بلکہ ان میں پہلے جیسا دم بھی نہیں رہا تھا۔ اسے اپنی دانت میں میری صورت میں ایک نیا اور تازہ دم کتا مل گیا تھا اور وہ ان دونوں ناکارہ کتوں سے چمکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

روپ متی نے شاید میری کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ہماری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔

میں نے اٹھ کر برتن سینے اور باہر لے جا کر دیباں رنگو کے حوالے کر دیے۔ میں واپس آیا تو وہ خواب گاہ میں جا چکی تھی۔ میں نے ایک کرسی کی پشت پر پڑا ہوا کپڑا اٹھا کر میز صاف کی اور خواب گاہ کے دروازے میں جھانکنے لگا۔

روپ متی اس کمرے میں بھی نظر نہیں آئی۔ وہ ہاتھ روم میں تھی۔ میں پیچھے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میری تنہا دور ہو چکی تھی۔ روپ متی نے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدا تھا لیکن ابھی تک میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ ناشتا بھی مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر کرایا تھا۔ غلاموں یا نوکروں کے ساتھ ایسا مہربانی کا سلوک نہیں کیا جاتا جس کا واضح مقصد تھا کہ اس نے مجھے کسی اور مقصد کے لیے خریدا تھا اور میری خاطر اپنے دو درانے ملازموں یا غلاموں کے لیے گارڈز کو بھی ہر طرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ شاید آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ خواب گاہ سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ روپ متی ہاتھ روم سے نکل کر میری رہ سونگی ہوئی۔ وہ بھی تو رات بھر جاگتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اندر جھانک کر دیکھ لوں مگر پھر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

چند منٹ اور گزر گئے اور پھر خواب گاہ سے ہلکی سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میری نظرس بے اختیار دروازے

کی طرف اٹھ گئیں۔ دروازے کے سامنے بیک نیلے رنگ کی غالباً شیون کا باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا جو تھوڑا سا سہل ہوا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ ڈرائنگ ٹیبل ذرا سی آڑی رکھی ہوئی تھی اور اس کے آئینے میں کمرے کے دوسرے حصے کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ آئینے پر نظر پڑتی ہی میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھ گیا۔ کپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ روپ متی ہاتھ روم سے بے لباس ہی باہر نکل آئی تھی۔ میرے آنکھیں بند کر لیں۔

چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روپ متی بے لباس پہن چکی تھی لیکن وہ لباس بھی ایسا تھا کہ اس کے بدن کے خطوط نمایاں ہو گئے تھے۔ اس وقت تو لیا اس نے کپڑی طرح سر کے بالوں پر لپیٹ رکھا تھا۔ تو لیا سر سے ہٹا رہی تھی۔ اس کی نظرس ڈرائنگ ٹیبل کی طرف اٹھ گئیں۔

ایک لمحے کو ہماری نگاہوں کا تصادم ہوا اور روپ متی کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ آگئی۔ میرے دل اچھلنے لگا۔ ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشوار پیش نہیں آئی کہ بہت پہلے روپ متی نے بھی مجھے ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ لیا تھا۔

وہ تو لے سے بالوں کو جھٹک رہی تھی پھر اس نے تو ایک طرف ڈال دیا اور مسمری کے اوپر سے کھوم کر ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر برش سے بال سنوارنے لگی۔ مثلاً جگہ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

اپنے آپ کو بناتے سنوارنے میں اسے آدھا گھنٹہ گیمیا اور پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مجھے اشارہ۔ اندر بلا لیا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے ہونٹوں پر دھک مسکراہٹ لاتے ہوئے پوچھا۔

میں چونک گیا۔ وہ اپنے غلام سے پوچھ رہی تھی کہ لگ رہی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جگہ سے ایک اسکرٹ پہن رکھا تھا جس کے ایک طرف اوپر تک ہاتھ تھا۔ وہ اس طرح کھڑی تھی کہ چاک کھل گیا تھا اور اس ٹانگہ ران تک پہنچ رہی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر رنگ کا نہایت مختصر بلاؤز تھا۔ کانوں میں میرے آنکھوں اور گلے میں خوب صورت لاکٹ تھا جس میں جڑا ہوا بلب کی روشنی میں جگہ گہرا تھا۔

"بہت اچھی لاکھن۔" یہ الفاظ میرے منہ سے

نکلے تھے۔

روپ متی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس کے رخسار پر نمودار ہونے والا تھا سا ڈھیل اس کے حسن میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔

میں اس نے مرکز ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ روپ متی کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ اور دروازے کی طرف دس بجنے والے تھے۔ راہداری میں اٹاؤ کا

لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ نیم زینے سے ہوتے ہوئے آٹھ بجے راہداری میں زیادہ لوگوں کی آمدورفت تھی۔ جو لوگ رات بھر جاگتے رہے تھے وہ تو شاید اپنے کمروں میں دیکھ کر سو رہے تھے لیکن صبح سے اب تک بہت سے نئے لوگ بھی آگئے تھے اور ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔

لوگ عجیب سی نظروں سے روپ متی کو اور مجھے دیکھ رہے تھے۔ روپ متی کو اپنے حسن و شباب پر غرور تھا ہی، وہ مجھ پر بھی غمزدہ نظر دیتی تھی۔ اس نے اپنی شان بڑھانے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اس کے کچھ شناسا بھی ملے تھے اور وہ لوگ مجھ جیسے خوب رو غلام کی خریداری پر اسے مبارکباد دے رہے تھے۔

روپ متی اپنی شان بڑھانے کے لیے مجھے ساتھ لے کر توڑاؤ دیکھنے تک اس محل نما عمارت میں گھومتی رہی اور بعض لوگوں سے ملاقاتیں کرتی رہی۔

عمارت کے سامنے والا وسیع و عریض کمپاؤنڈ اب بھی پوری طرح آباد تھا اور ایک بہت بڑی کاروان سرائے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آگن کے وسط میں کہیں اونٹ بندھے ہوئے غرا رہے تھے اور کہیں خیریا گھوڑے۔ ہر طرف لوگوں کی آمدورفت جاری تھی البتہ وہ بارہ دری و پرانے تھے جہاں کوشش رات غلاموں اور کنیزوں کی بنیادی ہوئی تھی۔ یہاں کا انداز تو رات کا انداز تھا۔ بعد شروع ہوتا تھا۔

روپ متی کے ساتھ گھومتے ہوئے میں تجسس نگاہوں سے جا لوں طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ لڑکیوں کی تھی۔ ہمارے ہاں بھی کہیں دکھائی نہیں دیا اور ایک موقع پر یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے ہاں بھی آج صبح لڑکیاں اپنے آدھوں کو لے کر یہاں سے چلا گیا تھا۔ اس نے ایک جاننے والے نے روپ متی کو بتایا کہ ہمارے ہاں تو عمارت ابھی ٹھہرنے کے موڈ میں تھا مگر کسی نے اسے ڈرا دیا۔ روپ متی کے سامنے غلام نے آج صبح ہی سچنگ لگنے کی دھمکی دی تھی اور ممکن ہے وہ جا بجا کی ہو حاصل کرنے کے لیے

اس (بھنور سنگھ) سے بھی بھڑ جائے۔ اس لیے بھنور سنگھ کوئی اور کثیر خریدنے کا خیال ذہن سے نکال کر روپ متی سے تجھے میں لے والی کنیز ہی پر اکتفا کر کے واپس چلا آتا تھا۔

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ جا بجا جا چکی تھی۔ مجھے پتا نہیں وہ کہاں گئی تھی لیکن مجھے بہر حال اسے تلاش کرنا تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میں خود آزادی حاصل کر لیتا۔ میری آزادی سلب ہو چکی تھی لیکن اپنے ساتھ روپ متی کا طرز عمل دیکھ کر مجھے امید ہو چلی تھی کہ میں بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ہم عمارت سے نکل کر عقیق لان میں آگئے۔ یہاں بھی بڑی رونق تھی۔ آسمان پر اب بھی بادل تیر رہے تھے اور موسم برا خوشگوار تھا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ روپ متی جیسی ایک حسین عورت نظر آئی۔ اس نے بھی شان دار لباس پہن رکھا تھا۔ وہ روپ متی کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ روپ متی نے بھی اسے دیکھ لیا۔

دونوں بڑے مجرّبوش انداز میں ایک دوسرے سے ملے۔ روپ متی کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس عورت کی آنکھوں میں چمک سی ابھرتی۔

"میں ابھی توڑی دیر پہلے ہی یہاں پہنچی ہوں۔" وہ روپ متی سے کہہ رہی تھی "مجھے آتے ہی پتا چل گیا تھا کہ تم نے کیا خریدا ہے۔ واقعی تمہارے ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ تمہارے اس غلام کے بارے میں جیسا سنا تھا وہی پایا۔" وہ بات تو روپ متی سے کر رہی تھی لیکن اس کی نظرس میرے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی "لیکن سنا ہے یہ بڑا خطرناک ہے اور تم نے اسے اس طرح آزاد چھوڑ رکھا ہے۔"

"یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اور یوں بھی ہر ایک کے گلے میں پٹا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی کچھ آگے نکل گئیں اور میں وہیں کھڑا رہا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو چوڑ گڑھ کے راج کمار کنور بلونت سنگھ کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ وہ میرے سامنے آیا اور مجھے اس طرح نازل کر دیکھنے لگا جیسے بکرا خریدنے سے پہلے دیکھا جاتا ہے۔

"شان دار۔" وہ بولا "روپ متی نے واقعی ہیرا خریدا ہے لیکن وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔ تم جیسے غلام تو ہم

جیسے مردوں کے پہلو میں کھڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ تو تمہیں  
نچوڑ ڈالے گی۔ میں جانتا ہوں اس نے تمہیں کیوں خریدا  
ہے۔ کچھ ہی عرصے میں جب تمہاری قوت دم توڑے گی تو وہ  
تمہیں اٹھا کر اسبل میں پھینک دے گی۔ وہ اس آدمی کو دیکھ  
رہے ہو۔ اس نے ایک طرف کھڑے ہوئے دبلے پیلے مگر  
دراز قامت شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے گال نارنگی کی  
طرح چمکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ”وہ  
سال پہلے یہ بھی تمہاری طرح نہایت خوب رو اور تندرست و  
توانا تھا۔ اسے دیکھ کر عورتیں غصہ کی سانس بھرا کرتی  
تھیں۔ روپ متی نے اسے اسی منڈی سے تمہاری طرح  
منگے داموں خریدا تھا مگر دو سال کے عرصے میں اسے اس  
طرح نچوڑ کر پھینک دیا کہ اب وہ اپنے جہوں سے بھی بیزار  
ہو رہا ہے لیکن میں تم پر ایسا وقت نہیں آنے دوں گا۔“  
”تھک! آپ کو تو ہم اسے بھی اٹھا کر لے جائیں۔  
دیکھاں گے کہ وہ چھو کر کیا کر لے گی۔“ بلونت سنگھ کے  
قریب کھڑے ہوئے ایک لمبے ترنگے شخص نے کہا۔ اس کے  
ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا اور وہ دونوں مسکاتے تھے مجھے  
میں دیر نہیں لگی کہ وہ بلونت سنگھ کے محافظ تھے۔

”نہیں۔“ بلونت سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر ”روپ متی  
ہماری پرانی جانکار ہے۔ میں شرفناہ طور پر ایک اور کوشش  
کر لینا چاہتا ہوں۔ اگر بات نہ بنی تو پھر کئی نکالنے کے لیے  
انکی نیزہ سی کرنی ہی پڑے گی۔“  
وہ اپنے تئیں قدم اٹھاتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں  
روپ متی اپنی دوست کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ میں نے  
آگے بڑھنا چاہا تو بلونت سنگھ کے محافظوں نے مجھے روک لیا۔  
”دو مالک آپس میں بات کر رہے ہوں تو غلاموں کو ان  
سے دور ہی رہنا چاہیے۔“ ان میں سے ایک نے مجھے  
گھورتے ہوئے کہا۔  
میں بھی اسے گھور کر رہ گیا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا تھا  
کہ ان کے ہولسنوں میں پستولوں کی پروا کے بغیر بھڑ جاؤں  
لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ میں فی الحال اپنے  
دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ویسے بھی  
میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس شخص نے  
ٹھیک ہی کہا تھا کہ جب دو مالک آپس میں بات کر رہے ہوں تو  
غلاموں کو دور ہی رہنا چاہیے۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ کنور بلونت  
سنگھ اور روپ متی باتیں کر رہے تھے پہلے تو ان دونوں کے  
چہروں پر مسکراہٹ تھی لیکن پھر تدریج تاثرات بدلتے گئے۔  
روپ متی کے حسین چہرے پر تباہ سا پیدا ہو گیا تھا۔  
بلونت سنگھ نے مڑ کر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور  
ایک طرف چل دیا۔ اس کے چہرے پر بھی تباہ سا تھا۔ اس  
کے دونوں محافظ بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پیچ  
چل دیے تھے۔ میں بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روپ متی کے  
قریب پہنچ گیا۔  
”ہاں لیکن! میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“  
حکم دیں تو میں کنور بلونت سنگھ کو اس کی گستاخی کا مزہ بھرا  
دوں۔“  
”نہیں۔“ روپ متی نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”میں لوگ  
بد مزگی نہیں چاہتی۔ ہمیں آج شام سے پہلے یہاں سے چل  
جانا ہے۔ بلونت سنگھ بھی دو چار روز بعد سب کچھ بھول جائے  
گا۔“  
میں دیکھ رہا تھا کہ روپ متی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔  
نے جب اسے بلونت سنگھ کے محافظ کی بات بتائی، یعنی بڑے  
اخلاقیے والی، تو اس کی آنکھوں میں تشویش کی لہرں اٹھ  
آئیں۔  
”اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔“ وہ مدھم مدھم لہجے میں بولی۔ ”مگر  
اس سے کسی بھی اقدام کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن مجھے اس  
بندوبست کرنا پڑے گا۔“  
اور پھر میرے لمبے یہ انکشاف خاصا دلچسپ ثابت  
تھا کہ یہاں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ کسی غلام  
یا کنیز کی بولی پر دو پارٹیوں میں طعن جاتی اور کبھی کبھار تو آبا  
آدھ لاش بھی کر جاتی تھی۔ کبھی کوئی حریف پارٹی کسی  
اس کا خریدا ہوا غلام یا کنیز جیت لیتی جاتی تھی۔ زیادہ روایت  
کنیزوں کے چھیننے کی ہوتی تھی۔ یہاں آنے والے دور  
مندلوگ عیاشی کے لیے حسین کنیزیں خرید کر لے جاتے۔  
اور جب ان سے دل بھر جاتا تو انہیں اپنے نشوون  
طوائفوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔

اچھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے کمرے میں واپس جائے گی  
اور داخل ہو کر وہ پہلی راہداری میں بائیں طرف مڑ گئی  
اور کمرے کا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل  
رہا۔ کمرے کے پیچھے تھا۔  
میں بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔  
یہ بت بڑا کراؤ فتر سے طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز  
یہ بت بڑا کراؤ فتر سے طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز  
بن اور شاندار صوفے بچھے ہوئے تھے اور اس وقت  
نیم نصف درجن آدمی ان صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔  
نیم ایک بت شاندار آفس فیل بھی جس کے پیچھے  
نے ایک اوپر عورت بھاری بھر کم آدمی بیٹھا ہوا تھا۔  
کئی ایک اوپر مردوں، بیٹھائی ٹنگ اور آنکھیں چہرے کے  
کا کراہتا ہوا گھونڈا گردن، بیٹھائی ٹنگ اور آنکھیں چہرے کے  
ب سے بت چھوٹی تھیں۔ آٹھ جیسی رنگت پر بڑی بڑی  
اونچیں اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر دے رہی  
تھیں۔ وہ مارواڑی تھا اور اس نے لباس بھی مارواڑی طرز کا  
پہنا رکھا تھا۔

اس کے سامنے کرسی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جن سے  
اتنی کر رہا تھا۔ روپ متی کو دیکھ کر وہ گنجامارواڑی اٹھ کر  
اٹھ گیا اور ہونٹوں پر بھدی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے  
ان ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ غلاموں کی اس منڈی کا مالک  
ھے سنگھ تھا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کی ہیبت دیکھ کر  
دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی توند  
کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔  
میں دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا جبکہ روپ  
میر کے قریب جاکر رک گئی۔ اس نے مدھم مدھم لہجے میں  
ھے سنگھ سے کچھ کہا اور اودھے سنگھ نے اپنی کرسی سے  
اٹھ کر پچھلی طرف کا ایک دروازہ کھول دیا اور روپ  
کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ روپ متی اندر داخل ہو گئی۔ اس  
پیچھے ہی اودھے سنگھ بھی اندر غائب ہو گیا اور دروازہ بند  
ہوا۔

اودھے سنگھ کی ہیبت دیکھ کر میرے ذہن میں اس کے  
بے میں کچھ عجیب سا خیال ابھرا تھا۔ کوٹاہ گردن، ٹنگ  
ٹی اور چھوٹی آنکھیں اس کے نہایت مکار اور کینہ پرور  
نہ کی غمازی کر رہی تھیں اور در حقیقت ایسے ہی مکار اور  
لوگ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر بڑے پیمانے پر  
حکم کے گھماؤنے کا روباہر کر سکتے ہیں۔  
دوسری بیٹھے ہوئے لوگ بار بار میری طرف دیکھ رہے  
تھے۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر معنی خیز نگاہوں سے میری  
دیکھا ہوا باہر چلا گیا تھا۔  
تقریباً پندرہ منٹ بعد میرے پچھلی طرف والا دروازہ کھلا

اور پہلے روپ متی برآمد ہوئی پھر اودھے سنگھ باہر نکلا۔ اس  
نے رخصتی انداز میں روپ متی کو سلام کیا اور اپنی کرسی پر  
بیٹھ گیا۔

روپ متی میرے قریب سے گزرتی ہوئی دفتر سے باہر  
نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس مرتبہ اس کا رخ  
زینے کی طرف تھا اور پھر چند منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے  
میں موجود تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے روپ متی  
نے دربان رنگو سے چائے لانے کو کہہ دیا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر روپ متی ایک صوفے پر ڈھیر  
ہو گئی۔ اس نے ایک پیر اٹھا کر سامنے کافی فیل پر رکھ لیا۔  
اس طرح اس کے اسکرٹ کا چاک کھل گیا تھا اور ٹانگ اور  
تک برہنہ ہو گئی تھی۔ میں سامنے کھڑا اس کی طرف دیکھتا  
رہا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں ابھرنے اور چہرے پر  
تشویش اب بھی نمایاں تھی۔ کنور بلونت سنگھ سے ملاقات  
سے پہلے وہ بالکل تازہ دم تھی اور اب تھکی تھکی سی لگ رہی  
تھی۔ وہ آنکھیں موند سے صوفے پر پڑی رہی۔

دس منٹ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے  
آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ رنگو تھا۔ اس نے اندر  
داخل ہو کر چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور واپس چلا گیا۔  
میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ دروازے پر دستک  
اور میز پر ٹرے رکھنے کی آواز سے وہ سنہیل کر بیٹھ جائے گی مگر  
اس نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ ہی میز پر سے پیر ہٹایا۔

”ہاں لیکن!“ میں نے ہولے سے پکارا ”چائے آگئی  
ہے۔“

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا مگر پیر میز پر  
سے نہیں ہٹایا۔

”ٹھیک ہے۔ چائے بناؤ۔“ اس کی آواز سے بھی تھکن  
کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں میز کے قریب قالین پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ ٹرے  
میں دو کپ تھے۔ صبح رنگو نے مجھے روپ متی کے ساتھ بیٹھ کر  
بٹاشا کرتے دیکھا تھا اس لیے سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ ایشیل  
حکم کا غلام ہوں۔ اس لیے وہ اس وقت چائے بھی ہم دونوں  
کے لیے لایا تھا۔

میں نے چائے بنا کر ایک کپ روپ متی کی طرف بڑھا  
دیا۔ اس مرتبہ اس نے پیر میز سے ہٹا لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ  
گئی۔ میں قالین پر ہی بیٹھا رہا اور دو سرا کپ میز پر اپنی طرف  
سرکالیا۔ روپ متی نے مجھے کرسی یا صوفے پر بیٹھنے کو نہیں  
کہا۔ اس کا ذہن شاید کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ وہ خاموش

بیٹھی چائے کی چسکیاں لیتی رہی۔

”ماکن!“ بالآخر میں نے ہی مجھ کو توڑا۔ ”آپ کچھ بھیجی سی نظر آ رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کنور بلونت سنگھ کی دھمکی نے آپ کو پریشان کر رکھا ہو؟“

”تم ٹھیک سمجھتے۔“ روپ متی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ بہت کینہ زدور آدمی ہے۔ میں نے بچہ سنگھ اور دھرمیش کو پہلے بھیج کر غلطی کی ہے لیکن شاید کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ دونوں مکرے پٹ چکے ہیں۔ میرے لیے بیکار ہو چکے ہیں۔ تم نے جس طرح ان کی دھنکی کی تھی اس سے میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ اب وہ کسی کام کے نہیں رہے لیکن بہر حال میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔“

”کیسا بندوبست ماکن؟“ میں نے پوچھا۔  
”میں نے اودھے سنگھ سے بات کی تھی۔ تھوڑی دیر میں دو مسلح محافظ یہاں پہنچ جائیں گے جو بے پور تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔“ روپ متی نے کہا۔  
”کیا آپ کو اپنے اس غلام پر بھروسہ نہیں ماکن۔“ میں نے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔

”میں نے تمہیں دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف پایا ہے۔“ وہ دہشت لہجے میں بولی ”جب کوئی نئی کینیا یا غلام خریدتا جائے وہ سرکشی ضرور دکھاتا ہے۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہارا تعلق کسی ایسے خاندان سے ہے۔ تم نے اب تک جس طرح اطاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے میں سمجھ گئی ہوں کہ تم نے حالات سے سمجھو ناکر لیا ہے۔ یہ تم پر میرا اعتماد ہی تھا کہ میں نے دھرمیش اور بیچ سنگھ کے مقابلے میں تمہاری حمایت کی حالانکہ وہ میرے پرانے خدمت گار ہیں اور میرے پیر چائے ہیں لیکن ان کے مقابلے میں میں نے تم پر زیادہ اعتماد کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔ یہ تم پر میرا اعتماد ہی تو ہے کہ تم فعل و حرکت میں آزاد ہو اور میرے کسی محافظ کے بغیر یہاں میرے پاس موجود ہو مگر نہ جو غلام خریدے جاتے ہیں ان کے گلوں میں طوق ڈال کر انہیں سلاخوں کے پیچھے بندھا رکھا جاتا ہے اور یہاں سے لے جانے کے لیے انہیں زنجیروں یا رسیوں سے باندھا جاتا ہے تاکہ وہ سرکشی دکھانے یا فرار ہونے کی کوشش نہ کریں مگر تم۔“

”آپ مجھے بے وفا نہیں پائیں گی ماکن۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”یہ درست ہے کہ آزادی سلب ہو جانے پر

مجھے بھی دکھ ہے مگر آپ نے یہ بھی ٹھیک سوچا کہ ہر وقت سے سمجھو ناکر لیا ہے۔ وقت نے میری پیشانی پر مہر لگائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وقت ہی یہ دامن ساقط کرے گا۔“

روپ متی نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جسے میں نے میز پر رکھ دیا۔ وہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے منہ سے چند الفاظ اسے اسے برا حوصلہ ملا تھا اور اس کے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ آنکھوں میں بھی وہ آشوبہ نہیں رہی تھی۔

”کون کون ہو؟“ اس کے باقوتی لبوں سے سرسراہٹ سی آواز نکلی ”غلاموں کی اس منڈی تک کیسے پہنچا ہمارے ہاتھ کیسے لگے؟“

”کیا آپ وجہ ہمارے ہاتھ کو جانتی ہیں؟“ میں نے نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ صحرا کا چڑا ہے۔“ روپ متی کے ہونٹوں پر سی مسکراہٹ آئی ”اسے راجستان کا ہر وہ شخص جانتا ہے جو غلام یا کینیز لانے کا شوق ہے۔ وجہ ہمارے ہندوستان کے کونے کونے میں گھومتے رہتے ہیں۔ یہ صورت عورتوں کو دھوکے سے اپنے جال میں پھنسا کر کے اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں جنہیں ہر تین دنوں میں منڈی میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ بہترین مال لے کر منڈی میں آتا ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں۔ اس منڈی کے علاوہ راجستان کے مختلف شہروں میں حسین عورتیں راہ کے پاس فروخت کرتا رہتا ہے مگر میں دیکھ چکی ہوں تو آدمیوں کے قابو میں آنے والے تو نہیں۔ وجہ یہ ہوتے کیسے چڑھ گئے؟“

”یہ سب مقدر کا کھیل ہے ماکن۔“ میں نے گہرے لہجے میں جواب دیا اور اپنی اصلیت ظاہر کیے بغیر اسے میں بتانے لگا۔

”میں سنا چکا ہوں کہ کراچی جانے کے لیے جس ہوا میں سفر کر رہا تھا وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ ہم ہوا کے حادثے میں توجہ تھے مگر ہمیں ڈاکوؤں کے ایک گھیر لیا جس سے بیچ کر ہم رات بھر صحرا میں بھٹکتے رہے چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے بعد کے واقعات لگا۔ میں آخر میں کہہ رہا تھا ”ناہید بے چاری وجہ اس کے آدمیوں کی ہوس کا شکار ہو کر اپنی جان سے

بیٹھی۔ اس کی چھ سات سالہ بیٹی ہمارے ساتھ تھی۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اسے کوئی خرید کر لے گیا یا ابھی تک وہیں ٹھہر کر قبضے میں ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہے۔“

”وہ متنی زوری طور پر کچھ نہیں بولی۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھیں پھر وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔“

”اس جہاز کی تباہی کا تو بہت چرچا رہا ہے۔ پہلی کاپڑوں اور اتر فورس کے طیاروں کے ذریعے تلاش کی گئی مگر شروع کی گئی تو دوسرے دن اس کا پلہ راجستان میں بڑا ہوا ملا۔ جہاز کے زیادہ مسافر لمبے کے آس پاس ہی مل سکے۔ وہ بمبوک پاس اور شہید گمری سے بد حال تھے۔ انہیں پہلی کاپڑوں کے ذریعے جوڑہ پور پہنچا دیا گیا۔ کئی مسافر لاپتہ تھے۔ ان کی تلاش اب بھی جاری ہے۔ جائے حادثہ سے ملین دور مختلف محلوں میں ایک عورت اور تین مردوں کی لاشیں بھی مل چکی ہیں جن کے بارے میں تصدیق ہو چکی ہے کہ وہ بد نصیب اسی جہاز کے مسافر تھے لیکن آٹھ مسافر ایسے بھی ہیں جن کی تلاش اب بھی جاری ہے اور تم بھی ان میں سے ایک ہو۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلایا اور سوچنے لگا کہ طیارے کے حادثے کے بعد وہاں سے کسی پناہ کی تلاش میں روانہ ہونے والے چار تو ہم تھے۔ میں ’جانبی‘ بنیاد اور اس کی بیٹی پہلی۔ ہمارے بعد کچھ اور لوگ بھی پناہ کی تلاش میں راجستان میں داخل ہوئے۔ ان میں سے چار افراد اہل بن گئے۔ اس طرح میرے حساب سے چار مسافر بچے ہو گئے تھے جو واقعی گمشدہ تھے اور ان کی تلاش جاری تھی۔ میرے خیال میں یا تو وہ کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہوں جہاں انہیں پناہ مل گئی ہو یا وہ ابھی بمبوک پاس اور راجستان کی شہید گمری سے موت کا شکار ہو گئے ہوں گے اور ممکن ہے ان کی لاشیں اڑتی ہوئی ریت کے نیچے دفن ہو چکی ہوں۔ ”وہ عورت کون تھی؟“ روپ متی نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ جانبی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔“

”جانبی!“ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا ”جانبی دیوی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات ہوس پہلے ہنگام میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس کے خاندان کے کچھ لوگ ہندوستان میں بھی ہیں۔“

”کیا تم اس سے پریم کرتے ہو یا دھم؟“ اس نے جان بوجھ کر جملہ اودھورا چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”نہیں۔ ہم میں انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہم طویل عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں لیکن ہم میں کبھی ایسا کوئی تعلق نہیں رہا۔ وجہ ہمارے یہاں بیچ کر ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا لیکن پھر اتفاق سے اسے بھی آپ نے خرید لیا۔ دوبارہ ملنے کی خوشی میں وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ آپ نے ہمیں دیکھا تو شاید۔“

”میں غلط سمجھی تھی۔“ اس نے میری بات مکمل کر دی ”اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں جس چیز کو اپنا سمجھ لیتی ہوں اس پر کسی دوسرے کا حق تسلیم نہیں کرتی۔ میں نے بتائی میں تمہیں دیکھتی ہی پسند کر لیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ تمہیں ہر قیمت پر خرید لی جائے گی۔ ہمارے بھنور سنگھ چھوٹا آدمی ہے۔ وہ بولی کو آگے نہ بڑھا سکا لیکن اگر تمہاری بولی پچاس لاکھ تک بھی جاتی تو میں پیچھے نہ ہیتی۔“

میں نے ”کیوں“ والا سوال نہیں کیا۔ میں اب تک بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس نے مجھے کیوں خرید لیا تھا اور یقیناً اسی لیے اس نے جاگتی کو مجھ سے الگ کر دیا تھا تاکہ کباب میں بڑی کا جو دہی نہ رہے۔

”کئی لحاظ خاموشی کی نذر ہو گئے۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا لیکن جب باتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو اس نے میری مشکل حل کر دی اور خود ہی اپنے بارے میں بتانے لگی۔

ہندوستان تقسیم ہونے سے پہلے راجستان لاتعداد چھوٹی بڑی جاگیروں اور ریاستوں میں بنا ہوا تھا جن پر راجپوت راجے اور ہمارا بے حکمران تھے لیکن بعد میں ساری خود مختار ریاستیں ختم کر کے اس خطے (راجپوتانہ) کو راجستان کے نام سے ہندوستان کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ راجوں کے اختیارات ختم کر کے ان کے لیے سرکار کی طرف سے گراں قدر وظائف مقرر کر دیے گئے۔

روپ متی کا باپ سیوا سنگھ بے پور سے تھے ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمران تھا۔ اس کی ریاست ختم ہو گئی تو کچھ عرصے بعد وہ بے پور آیا جہاں اس نے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی صرف دو اولادیں تھیں۔ روپ متی اور اس کا ایک بڑا بھائی جو شکار کا بہت شوقین تھا۔ ایک مرتبہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ جنگلوں میں شکار کیلئے گیا تو خود پتہ نہ لگا کر شکار ہو گیا۔

بیچ بنگلہ اور دھرمیش اس کے دور کے رشتے دار تھے۔ وہ دونوں گئے بھائی تھے۔ ان کا باپ پہلوان تھا اور یہ دونوں بھی

تھا۔ اسے اٹھاتے ہوئے روپ متی کی نظرس میری طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے وہ زبر جامہ سوٹ کیس میں بھرے ہوئے کپڑوں کے نیچے ٹھونس دیا۔  
تیاری مکمل کرنے کے بعد روپ متی کچھ دیر کے لیے اودھے سنگھ کے دفتر میں بھی گئی تھی۔ غالباً بل وغیرہ چکانے کے لیے۔

اور پھر پانچ بجے کے قریب ہم کمرے سے نکل آئے۔ روپ متی بڑے پروقار انداز میں آگے آگے چل رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ میں نے سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا جو خاصا بھاری تھا۔

دس بج و عریض کپاؤنڈ میں اس وقت خاصی چل چل تھی۔ دوڑنے کا دوران آئے تھے اونٹوں کی بلبلات ہر طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ پارکنگ ایریا میں بہت سی شان دار گاڑیاں کھڑی تھیں۔

روپ متی کمرے رنگ کی ایک شان دار لینڈ کروزر کے پاس رکتی تھی۔ اس نے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر دروازہ کھول دیا۔

ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے دو اور سیٹیں تھیں اور ان کے پیچھے بھی کافی کشادہ جگہ تھی جہاں میں نے سوٹ کیس رکھ دیا۔ دونوں محافظ پمپلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے حکم پر پیچڑ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

روپ متی نے چالی گھنٹائی گرانجن اشارت نہیں ہوا۔ دوسری اور تیسری کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ تقریباً دو منٹ تک انجن اشارت کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

”ڈرائیونگ کھول کر دیکھو۔ کیا گڑبڑ ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں انجن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو ڈرائیونگ بھی نہیں آتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا۔؟“ اس نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

روپ متی نے ایک مٹن دبا کر بونٹ کالا کھولا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ میں بھی نیچے اتر آیا اور پھر بونٹ میں نے ہی اٹھا کر ڈرائیونگ کھول دیا۔

روپ متی گہری نظروں سے انجن کا معائنہ کرنے لگی۔ ”اوہ!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا ”یہ۔۔۔ یہ

دوسری پوزیشن کی لینڈ غائب ہے۔“ اس کی آواز میں ہلکا سا ہٹ تھی۔

میں انجن کو نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ تو نظر نہ روپ متی انگلی سے جس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ایک بار غائب تھا۔ میں نے روپ متی کی طرف دیکھ کے چہرے پر انجانے سے خوف کے جھلکے سے سانس اٹھتے۔

میرے دماغ میں بھی بیہوشیاں سی رہنے لگیں۔ پوزیشن دائرہ خود بخود غائب نہیں ہو گیا تھا۔ میری چوٹی کسی انجانے خطرے کا احساس دل رہی تھی۔

”یہ یقیناً کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔“ بولی۔

”جی ہاں۔۔۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا خود بخود تو نکل کر غائب نہیں ہو گیا۔

”میں سمجھ گئی یہ کسی کی شرارت ہو سکتی ہے۔ تم یہاں رکو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ یہ کہتی ہوئی ا طرف چلی گئی۔

دونوں محافظ بھی نیچے اتر آئے تھے۔ ان میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا یہ اسے شہر موقع ہا کر نہیں بھاگنے کی کوشش کروں گا لیکن میرا ارادہ نہیں تھا۔

میں خاموش کھڑا دھرا دھرا دیکھتا رہا۔ گاڑی تار نکالنے کے حوالے سے مجھے شبہ تھا کہ یہ کورپ کی شرارت ہو سکتی ہے۔ کل رات اس نے کلا

روپ متی کو دھمکی دی تھی کہ وہ اس غلام کو (مجھے) چھین لے گا اور آج دن میں بھی محل کے عقبی لار میں کوئی بات ہوئی تھی۔ میں ان کی باتیں نہیں لیکن چہوں کے تاثرات سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہونے والی ہفتنگ خوشگوار نہیں تھی اور اب گاڑی

میں سے ایک بار کا غائب ہو جانا۔ دھیان بلونت طرف جاتا تھا۔ وہ شاید ہم لوگوں کو یہاں روکنا چاہتا روپ متی کی دایبھی تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کے ساتھ اودھے سنگھ بھی تھا جس کی تودہ

طرح پھول چپک رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے خدمت گار بھی چلے آ رہے تھے۔ اودھے سنگھ نے گاڑی کے انجن کا معائنہ کیا اور دھرا دھرا دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تشویش کی آہیں۔

”پیشان نہ ہوں روپ متی جی۔“ وہ اس کی طرف بچے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے کسی نے شرارت سے تار ہل کر اودھر پھینک دیا ہو گا۔ مل جائے گا۔“

”میں دیر ہو رہی ہے اودھے سنگھ۔“ روپ متی کے بچے ہیں ناگوار کی تھی ”اگر تار نہ ملا تو کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔“

”نہیں روپ متی جی۔“ اودھے سنگھ بولا ”میں نے کماتا پیشان نہ ہوں۔ اودھے سنگھ اپنے مہمانوں کا خیال

مانتا ہے اس کے لیے کبھی کوئی بات مسئلہ نہیں بنی۔“ اودھے سنگھ کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ وہ تار تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اس کا

لچکا کہ کسی نے شرارت اتر نکال کر اودھر پھینک دیا لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ یہ کسی کی شرارت سازش تھی۔ تاکہ نہ ملنا تھا نہ ملا لیکن اودھے سنگھ نے

پارکنگ ایریا میں اور بھی کئی لینڈ کروزر گاڑیاں کھڑی رہیں۔ محرمی اور نامور علاقوں میں طویل سڑک لے لے ایسی گاڑیاں ہی مناسب رہتی ہیں۔ ان میں سفید رنگ کی ایک لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی جو ایسی میک اور ماڈل کی تھی۔ اسے سنگھ نے بڑے اطمینان سے اس کا تار نکال کر روپ

آئی گاڑی میں لگا دیا۔ ”آپ کا کام ہو گیا دیوی جی۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے بولا ”آپ کی گاڑی کا تار کسیں مل جائے گا تو وہ اس کی کھول دیا جائے گا۔“

روپ متی نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور بونٹ سیٹ پر بیٹھ کر انجن کی گھما دی۔ اس مرتبہ پہلی کوشش میں انجن اشارت ہو گیا۔

لینڈ کروزر اس قدم عمل نما عمارت کے بیرونی گیٹ سے کربل کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ یہ راستہ تھا جہاں سے وہ بھاگ کر قافلہ آیا تھا۔ تقریباً دو لاکھ فاصلے طے کرنے کے بعد روپ متی نے گاڑی ا طرف ایک اور راستے پر موڑ دی۔ یہ راستہ کشادہ تھا رختوں میں مل کھا تا ہوا چلا گیا تھا۔

راستہ نامور ہونے کی وجہ سے گاڑی کو ہلکے ہلکے جھٹکے رہتے تھے۔ میرے سامنے ڈیش بورڈ کے اوپر دائیں سے تقریباً ایک انچ موٹی آئینی راڈ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے لے لیا۔ ایک ہاتھ اس راڈ پر ہمارا کھاتا تھا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ ملا۔ طرہ یہ کہ سب سے

بٹھے ہوئے ایک محافظ نے گاڑی رکوالی۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور میری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ میں ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اب بھی ڈیش بورڈ کی اوپر والی راڈ پر لگا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ محافظ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے نہایت غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پتلون کی بیک باگ سے ہتھکڑیوں کا جوڑا نکال کر ایک ہتھکڑی میری ایک کھائی میں ڈال دی اور دوسری اس آئینی راڈ میں۔

میں اپنی سیٹ پر اٹھ چلا۔ اس صورت حال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ روپ متی بھی اٹھ چلی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر تعجب سے تاثرات ابھرائے تھے۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ وہ محافظ کو گھورتے ہوئے درشت لہجے میں بولی ”تم نے اسے ہتھکڑی کیوں لگائی؟“

”معافی چاہتا ہوں دیوی جی۔“ محافظ نے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے جواب دیا ”ہمیں حکم ملا تھا کہ آپ کو اور آپ کے اس غلام کو بحفاظت سے پور پہنچانا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ راستے میں کچھ نامعلوم لوگ آپ کے اس غلام کو چھیننے کی کوشش کریں گے۔“

”لیکن اسے ہتھکڑی لگانے کا کیا مطلب؟“ روپ متی نے اسے گھورا۔

”خطرہ صرف موہن لال کے ڈھابے تک ہے۔“ محافظ نے جواب دیا ”راستے میں اگر کوئی پارٹی حملہ کرتی ہے تو وہ لوگ اسے لے جانے کی کوشش کریں گے لیکن اب وہ ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اگر اس غلام کے دل میں بھی فرار ہونے کا کوئی خیال ہو تو اس کا سہارا ابھی ہو گیا ہے۔ اب نہ تو کوئی حملہ آور پارٹی اسے ہم سے چھین کر لے جاسکتی ہے اور نہ ہی یہ راستے میں فرار کی کوشش کر سکتا ہے۔“

”یہ فرار کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کی ہتھکڑی کھول دو۔“ روپ متی کے لہجے کی ناگوارابی ابھی بے قرار تھی۔

”معافی چاہتا ہوں دیوی جی۔“ محافظ نے جواب دیا ”اس غلام کو آپ کے ساتھ بحفاظت منزل تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہم اس کی حفاظت نہ کر سکتے تو اودھے سنگھ کھڑے کھڑے ہماری کھال انا دے گا۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ خطرہ صرف

موہن لال کے ڈھابے تک ہے۔ راستے کا جنگل خطرناک ہے۔ غلام اس جنگل میں فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ موہن لال کے ڈھابے پر پہنچ کر اس کی ہتھکڑی کھول دی جائے گی۔

روپ متی نے کچھ کھانا چاہا مگر میں نے اپنا آزاد ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”کوئی بات نہیں ماکن۔“ میں نے کہا ”مگر ڈھک کر رہا ہے انہیں اپنی ذمہ داری پوری کرنے دیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔“

روپ متی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر سنبھل کر بیٹھے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔

ہم لوگ اپنے پروردگار سے تقریباً ایک گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوئے تھے۔ سورج ابھی اگرچہ خاصا اوپر تھا لیکن جنگل بہت گھنا ہونے کی وجہ سے فضا میں کچھ اندھیرے کا احساس ہو رہا تھا۔

دونوں محافظوں نے ہولسٹروں سے پستول نکال لیے تھے اور بڑی چوکنا نظروں سے دامنیں پائیں دیکھ رہے تھے۔ روپ متی بھی خاصی محتاط نظر آ رہی تھی۔

”اگر ہم دقت پر روانہ ہو جاتے تو اس جنگل سے نکل کر سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد موہن لال کے ڈھابے پر پہنچ جاتے مگر اب جنگل ہی میں اندھیرا ہو جائے گا۔“ ایک محافظ نے کہا۔

”یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے غلاموں کی یہ منڈی کس جگہ پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ روپ متی کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی اور میں باتوں میں اس کا دھیان بنانا چاہتا تھا۔ ویسے میرے ذہن میں بھی کچھ خدشات سر ابھارنے لگے تھے۔

”یہ محل تین سو سال پرانا ہے۔ اس کی تاریخ کسی کو معلوم نہیں۔“ روپ متی نے جواب دیا ”سنا ہے پہلے یہاں آبادی ہو کر آئی تھی لیکن حادثہ زمانہ نے اس آبادی کا نام و نشان تک مٹا دیا اور یہاں جنگل پھیلنا چلا گیا۔ یہاں سے قریب ترین آبادی۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی پھر یائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اس طرف تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر پوکھران ہے اور اس سے چند کلومیٹر آگے رام ڈیوڑھا میں قصبہ ہے۔ وہاں سے تقریباً سو کلومیٹر آگے پاکستان کی سرحد ہے جہاں سے ٹھہر کا بے آب و گیاہ صحرا شروع ہوتا ہے اور اس طرف۔“ اس نے دوسری طرف اشارہ کیا

”تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر جوہ پور ہے۔ اس سے کلومیٹر پہلے ایک چھوٹا سا نخلستان ہے جہاں موہن لال ڈھابا ہے۔ اس نخلستان کی آبادی صرف دو تین ہشتل ہے۔ اس کے علاوہ جوہ پور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ ہر طرف دور دور تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔“ ”سو کلومیٹر زیادہ فاصلہ تو نہیں۔“ میں نے کہا ”کی حکومت کو یہ معلوم نہیں کہ یہاں انسانوں کی تو گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔“

”سرکار کو سب کچھ معلوم ہے۔“ روپ متی ”لیکن سرکار سے زیادہ طاقت اودھے سنگھ جیہ کو پاس ہے جو یہ کاروبار کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ قانون سے زیادہ لمبے ہیں۔ راج مہاراج اور یہ سیاسی لیڈران کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے خوف ہو کر اس قسم کے غیر قانونی اور گھناؤنے کرتے ہیں۔ کئی سال پہلے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش اس کی نظریں سرخ لاش کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ باتوں سے اس کا خوف بھی کئی قدر کم ہو گیا۔

”بے کئی سال پہلے جب غلاموں کی اس منڈی قائم تھا تو ایک پولیس پارٹی کو تحقیقات کے لیے اس طرز تھا۔ پولیس کی وہ پارٹی ایک اے سی پی ڈو انسپکٹور سب انسپکٹروں پر مشتمل تھی۔ اگلے روز ان سب لاشیں اس جنگل کے شروع میں پڑی ہوئی ملیں۔ یہ خبر دی گئی کہ جنگل میں داخل ہوتے ہی انہیں جنگلی درندوں نے اذیت دلا تھا حالانکہ اس جنگل صورت پرندوں، خرگوشوں اور ان جیسے بے ضرر جانوروں کے سوا کسی اور خطرناک جانور کا وجود اس واقعے کے بعد قانون کے محافظوں کی کوئی اور طرف نہیں آئی۔ اس طرح اودھے سنگھ اور دوسرے لوگوں کا یہ کاروبار بلا کسی خوف خطر ہے۔ ویسے اس جنگل کی طرف آنے کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ محض بادداشت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ والے تو ریگستان میں بھگ کر موت کا شکار بن جاتے ہیں خاموش بیٹھا روپ متی کی باتیں سن رہا تھا۔ ٹھیک ہی کہا تھا۔ اودھے سنگھ جیہ لوگوں کے ہاتھ زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ وہ تو قانون کو اپنے سامنے مجبور کر دیتے ہیں مگر قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس جنگل میں سفر کرتے ہوئے ایک گھناؤنا سورج غروب ہو رہا تھا۔ جنگل میں اندھیرا پھیل گیا

میں نے گاڑی کے ہیڈ لمپس روشن کر لیے تھے۔ مجھے تھائی لینڈ میں بھی اور برما اور چین کے بعض علاقوں میں بھی جنگلوں میں سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ جنگل میں ہوا کی آواز رفت کم اور گرمی اور نمٹن کا احساس زیادہ ہوتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم شان دار گاڑی میں سفر کر رہے تھے جس کے شیشے بند تھے اور اندر ان کے شیشے چل رہا تھا۔ جس کے شیشے بند تھے کے مطابق اس جنگل میں کم از کم روپ متی نے اور سفر کرنا تھا۔ اس کے بعد کچھ صحرا میں پہنچ ایک ڈیڑھ گھنٹے اور سفر کرنا تھا۔ اس کے بعد کچھ صحرا میں پہنچ کر گاڑی کی رفتار بڑھانی چاکی تھی۔

”آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب ہمارے چاروں طرف گرمی اور ہولناک تاریکی تھی۔ ہیڈ لمپس کی روشنی میں سامنے درختوں میں روشنی کی ایک سرنگ سی جتنی جاری تھی۔ اور پھر چاک ہاری آنکھیں چند ہی گھنٹے میں یوں لگا تھا جیسے اچانک ہی ہمارے سامنے سورج طلوع ہو گیا ہو۔ میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑا۔ روپ متی بھی بدحواس ہو گئی۔ اس نے جتنی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور لینڈ کروزر اپنے راستے سے ہٹ کر بھاڑیوں میں گھس گئی۔ روپ متی نے پٹا باندھا اور ادنی طور پر بریک پیدل دیا ہوا تھا۔ لینڈ کروزر رک گئی اور ایک جھٹکے سے اس کا جین بند ہو گیا۔

لینڈ کروزر کے مڑ جانے سے سامنے تیز روشنی کا زاویہ بھی بدل گیا تھا۔ میں نے اپنی سیٹ پر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرف دیکھا۔ وہ انیشین دیکھ کر اسی قسم کی کوئی گاڑی تھی جس کی اندر کی جتنی بھی جل رہی تھی اور کنور بلونت سنگھ سیٹ پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دیکھنے کے ہیڈ لمپس کی روشنی میں آگے دو آدمی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

روپ متی کے پیچھے بیٹھے ہوئے محافظ نے دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرا خیال تھا وہ دیکھنے کے سامنے کھڑے ہوئے آدمیوں پر حملہ کرے گا کوئی چلائے گا۔ ایک محافظ سے اسی قسم کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن اس نے نہ تو کسی پر حملہ کیا اور نہ ہی کوئی چلائی بلکہ خوف زدہ اندازہ میں بیٹھنے ہوئے تیار کیا اور کچھ درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی لمحے سامنے کھڑے ہوئے ایک آدمی کے پستول نے شعلہ اگلا۔ جنگل گولی اور بھاگنے کی کوشش کرنے والے محافظ کی چیخ سے گونج اٹھا۔ وہاں ہی بزدل تھا۔

”ذرا یوگ سیٹ پر جمی ہوئی روپ متی بھی چیخ اٹھی۔ لیکن کے سامنے کھڑا ہوا دوسرا آدمی دوڑنے کی بجائے گھبراہٹ میں روپ متی کی چیخ اٹھی۔

”ذرا یوگ سائیڈ پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور روپ متی کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ روپ متی خوف سے چیخ اٹھی۔

دوسرا آدمی جس نے محافظ کو گولی ماری تھی ”دوڑنا ہوا میری سائیڈ پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں ہمارا دوسرا محافظ بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں بھی تھا مگر اس کا رخ زمین کی طرف تھا۔ میرا خیال تھا کہ پہلا محافظ بند تھا۔ بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا تھا۔ یہ دوسرا محافظ حملہ آور کا مقابلہ کرے گا کیونکہ راستے میں اس نے جو باتیں کی تھیں اس سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ کچھ ڈنٹے دار آدمی ہے اور اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دے گا۔ وہ جب مجھے ہتھکڑی لگا رہا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں کچھ خدشات بھی ابھرے تھے اور اس وقت میرے وہ خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ وہ دوسرا محافظ قریب آنے والے بلونت سنگھ کے آدمی سے کہہ رہا تھا۔

”کنور جی کو پولو، اپنی امانت سنبھال لیں۔ ہم بہت برا رسک لیا ہوں۔ بڑی مشکل سے اسے ہتھکڑی لگا کر رکھا ہوں۔“

”گڈ۔“ وہ ٹھنک بولا ”تم تو واقعی کام کے آدمی ثابت ہوئے۔ ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟“

محافظ نے جیب سے چابی نکال کر اس کے حوالے کر دی اور میری طرف کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

”یہ برا خطرناک آدمی ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا اور ہمارا انعام“ محافظ بولا۔

”اس سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ یہ تو غلام ہے۔ اسے خریدنا تو روپ متی نے تھا مگر سبب ہمارے کنور جی کی کرے گا اور تمہارا انعام۔“ وہ بولا ”کنور جی دیکھنے میں بیٹھے ہیں۔ اپنا انعام لے لو۔“

محافظ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیکھنے کی اس کھڑکی کے سامنے رک گیا جس کے اندر کنور بلونت سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ کہا مگر میں نے جواب میں بلونت سنگھ کا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور اس ہاتھ میں پستول دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے فضا ایک بار پھر غازی آواز سے گونج اٹھی۔ محافظ کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی تھی۔ گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرچے اڑا دیے تھے۔ وہ زمین پر گر کر ترپنے لگا۔

دوسری طرف روپ متی کی چیخیں بھی گونج رہی تھیں۔



وہ اپنے آپ کو اس آدمی سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دونوں دیکھ کر بیہوش کی روشنی میں تھے اس شخص نے ایک ہاتھ سے روپ متی کے بال پکڑ رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے بھی اسے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دھچکا مشقی میں روپ متی کا بلاؤز بھی پھٹ گیا تھا اور اس کے سینے کا ایک حصہ برہنہ ہو رہا تھا لیکن اسے شاید برہنگی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

دوسرا آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی چابی۔ ہتھکڑی لگائے جانے کے بعد سے اب تک میں نے ہتھکڑی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا لیکن میرے خیال میں اب اس کا وقت آگیا تھا کہ میں اپنے آپ کو اس قید سے آزاد کرالوں۔ میں نے اپنی نظریں ہتھکڑی کے اس حصے پر مرکوز کر دیں جو آہنی راڈ میں لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کلک کی بلکی سی آواز ابھری اور ہتھکڑی کھل گئی۔

وہ شخص میری ہتھکڑی کھولنے کے لیے ہی چابی والا ہاتھ آگے بڑھا رہا تھا۔ ہتھکڑی کھلتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس سے پہلے کہ وہ حیرت کے اس جھٹکے سے متنبہ سکنا میں نے سیٹ پر تیزی سے گھوم کر اس کے سینے پر زور دار رات رسید کر دی۔ وہ چیخا ہوا الزکھڑا اور پشت کے بل جھاڑیوں میں جا کر۔ میں نے پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف جھاڑیوں میں گرے ہوئے دیکھا تھا۔

میں نے بڑی بھرتی سے ہتھکڑی کو راڈ سے نکالا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ شخص اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے موقع دیے بغیر اس کے سینے پر ایک اور کلک بھادی۔ وہ چیخا ہوا ایک بار پھر ڈھیر ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دوسرا ہیر جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا اور میں بھی لڑکھڑا کر گر گیا تھا۔

وہ شخص مجھ سے پہلے ہی متنبہ چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر میری کھوپڑی پر ٹھوکر مار دی۔ میرا داغ جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں ہی رقص کرنے لگیں۔ میں نے سر کو زور دار جھٹکا دیا اور کمٹیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس شخص کی دوسری ٹھوکر میری پیٹلوں پر لگی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم لینڈ کرڈز کے پہلو میں تھے۔ بیڈ لمپس اگرچہ روشن تھے مگر ان کی روشنی سامنے جھاڑیوں اور درختوں پر پڑ

رہی تھی۔ دیکھ کر روشنی کا رخ بھی ہماری طرف نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف جس جگہ ہم ایک دوسرے سے نہرہ آزماتھے وہاں کم روشنی تھی بلکہ روشنی کا شائبہ سا تھا۔

وہ شخص مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا اور کسی بظاہر طرح میرے سامنے کھڑا تھا اور پھر اچانک ہی اس سے کھڑا۔ وہ غالباً میری گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا مگر میں تیزی سے جھٹکا دیں کہ ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ شخص جھوٹک میں آگے نکل گیا لیکن پھر فوراً ہی پلٹ پڑا لیکن اس کے ساتھ ہی میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ میری ٹانگ اس کے سینے کے اوپر والے حصے پر لگی۔ وہ ہلچلا ڈھیر ہو گیا۔

میں نے سنبھل کر دوبارہ اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے اسے روک لیا۔ سیدھا بازو اس کی گردن پر پلٹ کر گرفت مضبوط کرنے کے لیے اس ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پھسالیں۔

یہ میرا پسندیدہ داؤ تھا۔ حریف کا زندہ بچ کر لٹکانا ہی ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ شخص دونوں ہاتھ میرے بازو پر اپنی گردن سے میری گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دونوں ہیر بھی مضبوطی سے زمین پر تھالے تھے زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کر کے لیکن وہ نہیں جانتا جس مصیبت میں وہ پھنس چکا ہے اس سے اب موت اسے نجات دلا سکتی ہے۔

میں نے بازو کو ایک زور دار جھٹکا دیا۔ اس کی گریڈز کے کی طرح مضبوط تھی۔ اس جھٹکے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ اس کے طنز گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی اور پھر میں مسلسل جھٹکے دیتا رہا۔ اس کی طرح چل رہا تھا۔ ٹانگس چلا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں گھوستا جا رہا تھا۔ چوتھے کڑک کی آواز ابھری۔

گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے ایک اور زور دار دیا اور اسے چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ وہ جھاڑیوں اس طرح ترپنے لگا جیسے بکمرے کے گلے پر چھری پھیر کر دیا جائے۔

روپ متی کی چیخوں کی آواز اب بھی میری سماعت کر رہی تھی۔ میں لینڈ کرڈز کی آڑ سے نکل کر اس کا ڈوڑا۔

کنور بلونت سنگھ اور اس کا آدمی روپ متی کو

ہوئے دیکھ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے اور روپ متی اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بری طرح کھل رہی تھی۔ اس میں چھپا ہوا اس طرف دوڑا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ پلٹ کر روپ متی کو چھوڑ کر میری طرف لپکا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے اور ہتھم کھائے ہوئے۔ وہ شخص میرے پیچھے دب آیا تھا لیکن اس نے مجھے اپنے پیروں سے اٹھا کر پیچھے اچھال دیا۔ اسی وقت میں نے روپ متی کی ڈھنگ کی چیخ سنی تھی جو بتدریج طویل کراہ میں تبدیل ہوئی ہوئی خاموشی میں ڈوب گئی۔

میں اپنی ملا بازو لکھتا ہوا مگر اٹھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اسی لمحے مجھے بلونت سنگھ کی چیخیں ہوئی آواز سنائی دی۔

”رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی بات پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے ٹھیکر دیا اور ٹھیک اسی وقت اس کے سامنے نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس طرح وہ میرے سامنے ڈھال بن گیا اور گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ میں نے اسے ہاتھوں پر روک لیا اور جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ کھسکے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

کنور بلونت سنگھ کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ اس نے ایک اور ٹانگہ لکھ کر حواس میں چلائی گئی گولی میرے سر کے کئی فٹ اوپر سے گزر گئی۔ بلونت سنگھ خوف زدہ ہو گیا اور یہ اس بے پناہ خوف کا نتیجہ ہی تھا کہ اس نے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی جیتے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور اپنا ایک ہیر اس کی ٹانگوں میں پھنسا دیا۔ وہ چیخا ہوا منہ کے بل کراہ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا کر اگر اس وقت اسے بوتل کی ٹیس، اپنی جان کی فکر تھی۔ اس نے اٹھ کر ایک بار پھر ٹانگہ درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اٹھ کر کچھ دور تک اس کے پیچھے بھاگا لیکن پھر رک گیا۔ رات کے وقت اس ٹانگہ جھنگل میں اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں پلٹ کر روپ متی کی طرف لپکا جو دیکھ کر قریب سے ہوش بڑی تھی۔

روپ متی کا لباس اس دھچکا مشقی میں تار تار ہو چکا تھا۔ میں نے اسے ”ماکن ماکن“ کہہ کر دو تین آوازیں دیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ میں نے ماکن اور غلام کے بچے آواز کو بالائے طاق رکھ دیا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ہلانے لگا۔

”روپ متی۔ روپ متی۔ اٹھو۔ ہوش میں آؤ۔“

آنکھیں کھولو۔“ لیکن روپ متی نے آنکھیں نہیں کھولیں، نہ ہی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔

میں پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے چاروں طرف سناٹا تھا۔ جھینگروں اور دیگر حشرات الارض کی آوازیں ماحول کو کچھ اور بھی دشت ناگ باری تھیں۔ میں ایک بار پھر روپ متی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس مرتبہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے ذہن میں ایک ناشابہ سر ابھارنے لگا۔ جب میں اس آدمی سے ہتھم کھاتا تو مجھے روپ متی کی آخری چیخ سنائی دی تھی۔ اس کے سر پر شاید کوئی زور دار ضرب لگائی گئی تھی لیکن اس کا ہوش میں نہ آتا میرے لیے تشویش کا باعث بن رہا تھا۔

میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سینے کے بہت ہلکے سے زبردوم سے میری تشویش رفع ہو گئی۔ وہ زندہ تھی۔ میں نے اس کی بظلوں میں ہاتھ ڈالا اور اسے کھیت کر دیکھ کر بیڈ لمپس کی روشنی میں لے آیا۔

میرا خیال درست نکلا۔ اس کی پیشانی پر بائیں طرف گومو سا ابھرا ہوا تھک بلونت سنگھ نے غالباً پستول کے دھتے سے ضرب لگائی تھی اور شاید چوٹ کچھ زیادہ ہی زور دار لگی تھی جس سے وہ گہری بے ہوشی میں چلی گئی تھی۔

مجھے اچانک ہی ایک اور خیال آیا اور میں اٹھ کر لینڈ کرڈز کی طرف لپکا۔ سیٹوں کے پچھلے طرف جہال میں نے سوٹ کیس رکھا تھا وہاں دونوں طرف لگے ہوئے ہس کے ساتھ پانی کے دو مشینز لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک مشینیز۔ اٹھایا اور دوڑا تا ہوا دوبارہ روپ متی کے قریب پہنچ گیا اور مشینیز کے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھول کر روپ متی کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ دو تین مرتبہ پانی کے چھینٹے دینے کے بعد روپ متی نے کراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور پھر اچانک ہی اس نے چیخے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دوبارہ گر گئی اور ہولے ہولے کراتے لگی۔

”ماکن۔ ماکن۔ ہوش میں آئے ماکن۔“ میں نے روپ متی پر جھٹکے ہوئے ہولے سے پکارا ”سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

روپ متی نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے خوف زدہ ہی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر کراتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اس کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی سر

پر تھا۔  
بولی۔

”کیا ہوا۔ مجھے کیا ہوا تھا؟“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ میں نے مستندہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں گیا اور کچھ پانی ہانپنوں سے بہہ کر گلے کو تر کرنا ہوا سینے پر بہنے لگا۔

پانی کا ایک آدھ گھونٹ پینے سے اس کے حواس بحال ہو گئے۔ وہ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں گئے؟ بلونت سنگھ کہاں ہے؟“

”بلونت سنگھ بھاگ گیا۔“ میں نے جواب دیا ”بائی سب ٹھیک ہے ماکن۔ اب آپ جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لے تاکہ یہاں سے روانہ ہو سکیں۔“ میں اسے لاشوں کے بارے میں بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ہمارے محافظ کہاں ہیں اور بلونت سنگھ اور اس کے ساتھی۔“ وہ کہتے کہتے رک ٹپٹی۔ اس کی نظریں بائیں طرف جھاڑیوں میں پڑی ہوئی بلونت سنگھ کے ساتھی کی لاش پر گویا جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا ”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“ وہ بھلا کر رہ گئی۔

”صورت حال بڑی خوفناک ہے ماکن۔“ میں نے کہا ”یہاں چار لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔“

”چار لاشیں!“ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔

”ہاں ماکن۔“ میں نے کہا ”دو لاشیں ہمارے محافظوں کی ہیں اور دو کنور بلونت سنگھ کے آدمیوں کی۔“ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اسے اسے ”دوسرے والے کی تفصیل بتانے لگا۔

وہ خود بھی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی لیکن اس وقت تو وہ خود مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی اور شاید صورت حال پر پوری طرح توجہ نہیں دے سکی تھی لیکن اب تفصیل جان کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی چلی گئیں۔

”تم نے میری خاطر۔۔۔“

”جانی ماکن کی جان بچانے کے لیے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ماکن نہیں۔۔۔ روپ متی۔۔۔ صرف روپ متی۔۔۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے دیوی جی۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کہا، صرف روپ متی۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے روپ متی جی۔“ میرے ہونٹوں پر پانی

مکراہٹ آگئی ”لیکن اب ہمیں یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔ بلونت سنگھ جنگل میں روپوش ہو گیا ہے۔ ہمیں یہاں تک نہیں آنا چاہیے۔ وہ چھپ کر حملہ کرے۔ اسے یہاں بیٹھے رہنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”بلونت سنگھ۔“ روپ متی نے دانت پیچائے ”اس وقت وہ وحش کروں گی کہ زندگی بھر یاد کرے گا اور تم۔۔۔“

نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جمادیں ”میں نے تمہیں قیمت دے کر خرید لیا تھا لیکن تم نے مجھے بے قیمت خرید لیا ہے۔ تم میرے غلام نہیں۔ میں تمہاری راز

ہوں۔“

”کانے بولنے کا وقت نہیں روپ متی جی۔“ میرے

نے کہا۔

”اچھا۔ مجھے اٹھاؤ۔“ روپ متی نے ایک ہاتھ میرے

طرف بڑھا دیا۔

میں نے اسے سارا دے کر اٹھا دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور جسم کا بالائی حصہ بالکل برہنہ ہو رہا تھا۔

وہیں کے ہیڈ سپیس کی روشنی میں اس کا بدن کنکن کی طرح چمک رہا تھا۔ میں گردن جھکا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

نظریں بلونت سنگھ کے ساتھی کی لاش کے قریب پڑے ہوئے پتھوں پر جم گئیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر

پتھوں اٹھالیا اور وہیں کے سامنے آ گیا۔

میں نے دو فائر کیے اور وہیں کے آگے دو ٹوکے

کے چیتھرے اڑ گئے۔ جنگل کی یہ سکوت فضا ماکنوں کے

اٹھی۔ روپ متی نے مجھے فائر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھی اور دوڑ کر مجھ سے پلٹ گئی۔

”اب بلونت سنگھ نہ تو ہمارا چپچا کر کے گا اور نہ آسانی سے منڈی تک واپس چلے گا۔“ میں نے اسے

طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب ہمیں مزید دیر نہیں چاہیے۔ پہلے آپ گاڑی میں بیٹھ کر کپڑے بدل لیں۔“

کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

روپ متی لینڈ کروزر میں کھس گئی اور آخری بار

میں اندر کی طرف جھک کر ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے بیٹنوں کو دیکھا۔

میں نے کہا ”میں نے یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔ بلونت سنگھ جنگل میں روپوش ہو گیا ہے۔ ہمیں یہاں تک نہیں آنا چاہیے۔ وہ چھپ کر حملہ کرے۔ اسے یہاں بیٹھے رہنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”بلونت سنگھ۔“ روپ متی نے دانت پیچائے ”اس وقت وہ وحش کروں گی کہ زندگی بھر یاد کرے گا اور تم۔۔۔“

نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جمادیں ”میں نے تمہیں قیمت دے کر خرید لیا تھا لیکن تم نے مجھے بے قیمت خرید لیا ہے۔ تم میرے غلام نہیں۔ میں تمہاری راز

ہوں۔“

”کانے بولنے کا وقت نہیں روپ متی جی۔“ میرے

نے کہا۔

”اچھا۔ مجھے اٹھاؤ۔“ روپ متی نے ایک ہاتھ میرے

طرف بڑھا دیا۔

میں نے اسے سارا دے کر اٹھا دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور جسم کا بالائی حصہ بالکل برہنہ ہو رہا تھا۔

وہیں کے ہیڈ سپیس کی روشنی میں اس کا بدن کنکن کی طرح چمک رہا تھا۔ میں گردن جھکا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

نظریں بلونت سنگھ کے ساتھی کی لاش کے قریب پڑے ہوئے پتھوں پر جم گئیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر

پتھوں اٹھالیا اور وہیں کے سامنے آ گیا۔

میں نے دو فائر کیے اور وہیں کے آگے دو ٹوکے

کے چیتھرے اڑ گئے۔ جنگل کی یہ سکوت فضا ماکنوں کے

اٹھی۔ روپ متی نے مجھے فائر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھی اور دوڑ کر مجھ سے پلٹ گئی۔

”اب بلونت سنگھ نہ تو ہمارا چپچا کر کے گا اور نہ آسانی سے منڈی تک واپس چلے گا۔“ میں نے اسے

طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب ہمیں مزید دیر نہیں چاہیے۔ پہلے آپ گاڑی میں بیٹھ کر کپڑے بدل لیں۔“

کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

روپ متی لینڈ کروزر میں کھس گئی اور آخری بار

آئی تھی۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔

”ہماری گاڑی کو ذرا پیچھے ہٹاؤ۔“ ہتھکڑی کی چابی ہمیں کہیں گری تھی۔ ہیڈ سپیس کی روشنی میں نظر آجائے گی۔“ میں نے اس سے دو قدم پیچھے ہٹے ہوئے کہا۔

روپ متی میری طرف دیکھتی ہوئی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور انجن اشارت کر کے گاڑی کو ریورس گئیر میں پیچھے لینی چلی گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے گاڑی روک لینے کو کہا اور جبک کر بیٹھ دیکھنے لگا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ آدمی میری لاش کھا کر رہا تھا۔ اس جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور میرے خیال میں ان جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی چابی کا ملنا مشکل ہی تھا لیکن یہ

میری خوش قسمتی تھی کہ تیز روشنی میں جھپٹتی ہوئی وہ چابی نظر آگئی۔ میں نے چابی اٹھائی اور گاڑی کی سپرژر سیٹ پر بیٹھتے

ہوئے چابی روپ متی کی طرف بڑھا دی۔

”دل تو چاہتا ہے کہ دوسری کڑی اپنی کلائی میں پس کر اس چابی کو دوسری پینک دوں اور۔۔۔“

”اس طرح نہ تم گاڑی ڈرائیو کر سکو گی اور نہ میں آرام سے بیٹھ سکوں گا اس لیے بہتر ہے کہ اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔“

”نکال دو۔ اور میری ہتھکڑی کھول دو۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میں نے ہتھکڑی ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دی اور کلائی

سلائے لگا۔

روپ متی گاڑی کو مزید پیچھے لے گئی اور پھر اس کا رخ بدل کر اصل راستے کی طرف لانے لگی۔ ہیڈ سپیس کی

روشنی میں تین لاشیں نظر آئی تھیں۔ ایک اس محافظ کی جس نے مجھے ہتھکڑی لگائی تھی اور بالآخر بلونت کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور دو لاشیں بلونت سنگھ کے آدمیوں کی تھیں۔ ایک

تو میرے ہاتھوں گردن تڑوا کر ہلاک ہوا تھا اور دوسرا بلونت سنگھ کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ ہمارے دوسرے محافظ کی لاش

وہاں سے کچھ دور تھی جو نظریں آ رہی تھی۔

وہ لاشیں دیکھ کر روپ متی کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے ابھر آئے اور اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ

کناں گئے۔

”تم ٹھیک ہوا۔ گاڑی چلا لو گی؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کنور بلونت نگھ فرار ہو کر زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ وہ آپس پاس ہی کہیں موجود ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہم سے بہت قریب تاریکی میں درختوں کے پیچھے چھپا ہوا دیکھ رہا ہو۔

میں نے اس کی دیکھنے کے دونوں ٹائمرسٹ کر کے اسے بس کر دیا تھا۔ دیکھنے میں یقیناً ایک اسٹیشن پر موجود ہوگی لیکن وہ صرف ایک ٹائمر کی بجائے لگائی جا چکی تھی۔ وہ تین سیوں پر گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ اب ہمارے خائب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس تاریک جنگل میں وہ پیدل واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ شاید اسے یہ رات اپنی دیکھنے میں ہی بیٹھ کر گزارنی پڑے۔ صبح یا تو وہ پیدل اس قدیم عمارت تک پہنچنے کی کوشش کرے گا یا انسانوں کے چوپاریوں کی کسی پارٹی کا اس طرف سے گزر ہو تو اسے کچھ سارا مل جائے۔

روپ متی اب اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی اور اسٹیشن تک اس کی گرفت بھی مضبوط تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جڑے پیچھے ہوئے تھے۔ اس نے جو لباس بدلنا تھا میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اب اسے دیکھ کر میں اپنے آپ میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کشادہ گلے کی سفید رنگ کی سلیوٹس کی شرٹ اور گھٹنوں سے ذرا اوپر تک کی ڈیم کی شارٹس پہن رکھی تھی۔

”تمہیں یہ دونوں محافظ اودھے نگھ کے فراہم کیے تھے۔“ میں نے اس کے لباس سے توجہ ہٹانے کے لیے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ”کیا یہ اس کی سازش ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب ہے کنور بلونت نگھ نے اسے رشوت دے کر۔“

”اودھے نگھ ایسا نہیں کر سکتا۔“ روپ متی نے میری بات کا ٹی دی۔ ”اودھے نگھ ایک کاروباری آدمی ہے۔ اس کا یہ کاروبار ہم جیسے لوگوں کے سہارے ہی چل رہا ہے۔ وہ اپنے گاؤں سے مخلص ہے۔ کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔ کسی ایک کے ساتھ دھوکا کرنے کی صورت میں وہ دوسروں کی حمایت سے بھی محروم ہو جائے گا اور اس طرح نہ صرف اس کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا بلکہ اس کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ بلونت نگھ کی سازش تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”تم جانتے ہو وہ تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دو مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ تمہارے سامنے بات ہوئی تھی۔ اس نے تمہارے لیے چند لاکھ کی پیشکش کی تھی۔ دوسری مرتبہ آج صبح لال میں اس نے اپنی

پیشکش پانچ لاکھ کے اضافے کے ساتھ دہرائی تھی۔ اگر پورے اس نے دھمکی دی تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ پور نہیں لے جا سکوں گی۔“

”تو پھر اودھے نگھ کے فراہم کردہ حافظہ؟“ میرا سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”سو فیصد بات ہے۔ وہ دونوں حافظہ اس سازش میں شریک تھے۔ نگھ نے معلوم کر لیا ہو گا کہ میں نے اودھے نگھ سے محافظوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس نے محافظوں رابطہ قائم کیا اور انہیں انعام کا لالچ دے کر اپنے ملا لیا۔ وہ دونوں لالچی تھے۔ ان کا یہی انجام ہونا چاہتا تھا۔“

”دونوں نہیں ایک۔“ میں نے کہا۔ ”وہ حافظہ مجھے ہتھکڑی لگائی تھی۔ مجھے اسی وقت اس پر شبہ ہوا۔ دوسرا حافظہ تو شاید اس سازش سے بے خبر تھا کیونکہ ہماری گاڑی روکی گئی تھی تو اس نے خطرہ دیکھ کر کہا۔ کوشش کی تھی مگر گولی کا نشانہ بن گیا جبکہ دوسرا لالچ کا انعام لینے کے لیے دیکھنے کے قریب پہنچا تو بلونت نگھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو مگر۔“ وہ ایک کو خاموش ہوئی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”لیکن مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں زندگی کے آخری سانس نہیں بھلا سکوں گی۔“

”میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تمہارا زر خرید غلام ہوں اور ایک وفادار غلام کا ہے کہ اپنے آقا کی اطاعت کرے اور وقت پڑنے پر باز لے اپنی جان بھی دے دے۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو نا۔“ روپ متی کے ہونٹوں پر سی مسکراہٹ آگئی۔ ”کوئی دوسرا ایسا نہیں سوچتا۔ یہاں حریف پارٹیاں ایک دوسرے سے کنیزیں اور غلام جگہ لے جاتے ہیں اور کنیزیں اور غلام اس کی وفاداری بھرتے ہیں جو طاقت کے بل پر انہیں چھین لیتا ہے۔ اس بات کی پروا انہیں ہوتی کہ انہیں خریدنے والا کون انہیں اپنی عافیت عزیز ہوتی ہے اور وہ طاقت کے غلام ہیں۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے مگر اس سانس لیتے ہوئے دیا۔ ”لیکن میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا جائے۔“

میں ہلکا سا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں نے اسے ساتھ دہرائی تھی۔ تم نے مجھے پتہ نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کون سی چیزیں ہیں۔“

”بلونت نگھ واقعی درندہ ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اس لیے وہ مجھے ہی دیکھنے میں ڈال کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر تم نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو۔“ بات کرتے ہوئے اسے جھجھکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ”اب بھی وہ جین سے تو نہیں کر سکتے۔ وہ واقعی درندہ ہے۔ اب بھی وہ جین سے تو نہیں کر سکتے۔ کچھ روز تو اپنے زخم چاٹتا رہے گا اور پھر میرے خلاف کوئی کارروائی کرے گا۔“

”کیا وہ جودھ پور جا کر تمہارے خلاف پولیس کو اس واقعے کی رپورٹ کرے گا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ایسا نہیں کرے گا۔“ روپ متی بولی ”پولیس سے پہلے اودھے نگھ کو اس واقعے کی خبر ہو جائے گی۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ لائیں غائب کر کے اس واقعے کے بارے میں ثابت بنا دے گا۔ یہ جنگل اودھے نگھ کی عمل داری میں سمجھا جاتا ہے۔ قانون کی دسترس سے بہت دور۔ پولیس اس طرف آنے کی حماقت نہیں کرے گی اور پھر بلونت نگھ خواہ اس روایت میں ملوث ہے۔ دو آدمی اس کے اپنے ہاتھوں سے مارے گئے ہیں اس لیے وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کرے گا لیکن شاید مجھ سے بدلے لینے کے لیے کوئی دوسرا اوجھا جبرہ استعمال کرے۔“

”ایک اور بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دو مرتبہ اس طرح نگھ میرے ہاتھوں تک آٹھا چکے ہیں۔ تم نے بھی ان کے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں بھی اس سازش میں بلونت نگھ کے ساتھ شریک رہے ہوں؟“

”ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔“ روپ متی نے جواب دیا۔ ”ان کے بارے میں میں پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہوں لیکن اگر وہ اس سازش میں کسی بھی طرح شریک پائے گئے تو میں انہیں کتوں سے نچوڑ دوں گی۔“

میں اس مرتبہ خاموش رہا اور گاڑی کے ہیڈ لمپس کی

روشنی میں سامنے دیکھتا رہا۔ آگے جنگل اب چھوڑا ہوتا شروع ہو گیا تھا اور بالآخر ”جائے حادثہ“ سے روانگی کے آدھے گھنٹے بعد ہم اس جنگل سے نکل آئے۔ اب ہمارے سامنے اور چاروں طرف وسیع و عریض ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ کھنکھنے جنگل میں سفر کرتے ہوئے تنگیاں اور فلک بوس درختوں کی دجہ سے ہمارے اطراف میں تاریکی ہی رہی تھی لیکن کھلی جگہ پر اگر انکشاف ہو کہ آسمان پر سے بادل غائب ہو چکے تھے۔ مطلع صاف تھا اور چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔

”آج پونم کی رات ہے۔“ روپ متی نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے دھرم میں پونم کی رات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہم جودھ پور کے ہوٹل اجیت بھون کے رنگا رنگ پروگرام میں شریک ہو سکیں گے۔ ہم وقت پر جودھ پور پہنچ تو جائیں گے مگر یہ بگڑی ہوئی صورت ہے کہ کسی قریب میں شریک نہیں ہونا چاہی۔“

بات کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار پیشانی کے گوشہ پر پہنچ گیا تھا۔

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ رنگین محفلوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

رست سخت تھی جس پر گاڑی چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں کوئی باقاعدہ مسوک تو نہیں تھی۔ ایک غیر ہمارا سارا راستہ تھا جس کی ہیڈ لمپس کی روشنی میں واضح طور پر نشان دی ہو رہی تھی۔ روپ متی لینڈ کروزر کی رفتار بڑھا رہی تھی۔

میں خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ پورے چاند کی روشنی میں تاحہ نگاہ پھیلا ہوا صحرا عجیب پر اسرار سا منظر پیش کر رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ بڑا صحرا چاندنی رات کے اس منظر میں۔

روپ متی بھی اب خاموش تھی۔ اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ ہاتھ مضبوطی سے اسٹیشنرنگ پر تھ ہوئے تھے اور نظریں سامنے راستے پر مرکوز تھیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک لینڈ کروزر تیز رفتاری سے ریگ ڈال میں دوڑتی رہی اور بالآخر بہت دور پہنچ کر روشنیوں جھلکاتی ہوئی نظر آئے لگیں۔

”وہ موبن لال کا ڈھابا ہے۔“ روپ متی نے ان روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں دو چار گھروں کے سوا کوئی آبادی نہیں ہے اور وہ گھر بھی موبن لال

کے بھائی اور نہایت قریبی عزیزوں کے ہیں جو اس ڈھابے پر مل جل کر کام کرتے ہیں۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”دراصل پوکران سے بلوڑا جانے والی سڑک اس طرف سے گزرتی ہے اور جودھ پور سے آنے والی سڑک بھی اسی جگہ پر ملتی ہے۔ اس طرح وہاں ایک جکشن سامنے گیا ہے۔ جودھ پور وہاں سے قریب چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بیچ میں کوئی آبادی بھی نہیں۔ اگر جودھ پور زیادہ دور نہ ہوتا تو ممکن ہے اس جکشن پر بھی کوئی بڑی ہسپت آباد ہو چکی ہوتی۔ اس صورت حال سے فائدہ موہن لال نے اٹھایا اور کئی سال پہلے وہاں ڈھابا کھول لیا۔ دن میں کئی بیس اس طرف سے گزرتی ہیں۔ رات کو ٹرکوں کی آمد رفت بھی رکتی ہے جن کی وجہ سے اس ڈھابے پر رونق رہتی ہے اور اس طرح موہن لال کو بھی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔“

”میلوں دور تک آبادی نہیں تو وہاں پانی وغیرہ کی تو بڑی پریشانی ہوگی۔“ میں نے کہا۔  
”وہاں دراصل ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔“ روپ متی بولی ”جھیل کیا، ایک قدرتی چشمہ ہے جس کا پانی ایک بڑے تالاب میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ پانی کی وجہ سے وہاں سمجور اور ناریل کے کچھ درخت بھی ہیں۔ موہن لال نے بڑی محنت سے نیم کے چند درخت بھی لگا رکھے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا سا خوب صورت ٹکستان ہے۔“

میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ روشنیوں قریب آتی جاری تھیں اور پھر ہم اس ٹکستان میں پہنچ گئے۔ واقعی صرف چند مکان تھے۔ ایک دکان تھی جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ ریسٹورنٹ تھا۔ اسے چارپائی ہوئی کمانا زیادہ مناسب ہوگا اور دور تک چارپائیاں بھی ہوتی تھیں۔ ذرا آگے دو مال بردار ٹرک کھڑے تھے جن کے ڈرائیور اور کلینرز

چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دور دور تک زمین میں گڑے ہوئے بانسوں کے ساتھ رنگ برنگی ٹیوب لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ بجلی کے لیے موہن لال نے اپنا جرنیلز لگا رکھا تھا۔ روپ متی گاڑی کا انجن بند کر کے نیچے اتر گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور ہم دونوں ہی قریب پڑی ہوئی چارپائیوں کی طرف بڑھ گئے۔

روپ متی تو ایک چارپائی پر لیٹ گئی اور میں اس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جنگل میں پیش آنے والے واقعے نے روپ متی کو آپ سیٹ کر دیا تھا اور وہ نہ حال سی لگ رہی تھی۔

دو منٹ بعد ہی ٹکے جیسی توند والا ایک اوجیزو ہمارے قریب آگیا۔ اس نے دھوئی پن رکھی تھی۔ بالائی حصے پر بغیر آستین کی صدی جیسی کوئی چیز پن رکھی جس کے پن کھلے ہوئے تھے اور اس کا پالوں بھرا آ رہا تھا۔ کینے سے سر پر باشت بھر لی پٹیاں تھیں۔ ماتھے اس کے کمر بندھنے کی نشان دہی کر رہا تھا۔ وہ اس کا مالک موہن لال تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور لیٹائی ہوئی نظروں سے روپ متی کی برہنہ ٹانگوں کو دیکھنے لگا۔

”موہن لال جی۔ ہمیں چائے پلا دو مگر ذرا دل روپ متی نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا ”مگر مطلب یہ نہیں کہ تم جو شاندار بنا کر لے آؤ۔ چائے نہ ہونی چاہیے۔“

”جی دیوی جی۔“ موہن لال نے ایک بار پھر ہاتھ دے کر اور مینڈک کی طرح پھدکتا ہوا چلا گیا۔ طویل ڈرائیونگ نے بھی روپ متی کو تھکا دیا۔ بان کی کھردری چارپائی پر چاروں خانے چت لٹی ہوئی گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر بڑبڑا رہا تھا۔ سلیپس اور کشادہ نگہ والی ٹی شرٹ کے سینے کا زرد ورم ہاتھ پر تھکن۔ منظر پیش کر رہا تھا۔

دوسری چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور بک وچسپ نظروں سے اس طرف دیکھ رہے تھے اور پھر بڑبڑا آئی اٹھ کر ٹھٹھا ہوا اس طرف آگیا۔ لہذا ڈرائیور ڈول سیاہی مائل رنگت اور بڑی بڑی مونچھوں کے چہرے کو بڑا خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ وہ ہوس بھری نظروں سے روپ متی کی دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ مجھے اس کی نیت میں کچھ فورا تھا لیکن میں کسی بھی ناخوشوار صورت حال سے نمٹنے لے تیار تھا۔

وہ شخص چند گز آگے جا کر مڑا اور ایک بار پھر ہوس نظروں سے روپ متی کو دیکھتا ہوا اپنے ساتھیوں جا کر بیٹھ گیا اور سرگوشتیوں میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ ڈھابے میں اگرچہ دو عین ملازم بھی موجود تھے۔ موہن لال روپ متی سے خود آکر ڈالنے آیا تھا اور چا

خوبی لے کر آیا۔ روپ متی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چائے واقعی خوش ذائقہ تھی۔ ہم چائے پینے فورا ہی اٹھ گئے۔ روپ متی نے موہن لال کو لگا کر کے دونوں اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ موہن

باجیں کل انھیں۔  
”لبا ترنگا آدمی ایک بار پھر اٹھ کر ہمارے پاس منڈلانے لگا تھا۔ ہم اس پر توجہ دے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ منجی نے انجن اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ روپ متی سے کہتا تھا۔ اس دوران میں دو آدمی دریا پار آئے۔ اس نے صورت حال کا اندازہ لگایا تھا۔ ٹھٹھا پھر آئی۔ اس نے روپ متی کی آنکھوں میں س نے کئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر اسٹینڈنگ پر اٹھ جاتے ہوئے ہارن بجایا اور اس کے ساتھ ہی بیکسل پھر ایک دم دباؤ ڈالی دیا۔ لینڈ کروزر مینڈک کی لٹا چل کر آگے بڑھی۔ وہ شخص بڑی تیزی سے اچھل کر ایک طرف گرا۔ روپ متی گاڑی کو اسی رفتار سے آگے لے لے گئی۔

”سلاہ حرامی۔“ وہ دانت کلکاتے ہوئے بولی جوروں کو دیکھ کر ان کی رال پکٹنے لگتی ہے۔ مفت کا مال بچتے ہیں۔“  
”تمہاری آواز سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ آدمی نہ کہ کپڑے بھڑا رہا تھا اور اس کے سامنے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں سدا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ آگے جا کر لینڈ کروزر جودھ ہر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی اور روپ متی رفتار حالی پل گئی۔

قریب ایک گھنٹے بعد ہم جودھ پور پہنچ گئے۔ ریگستان میں رنگ پھیلا ہوا یہ شراس وقت رنگ برنگی روشنیوں سے گرا رہا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کے گیارہ بجنے والے تھے رشر کے کئی علاقوں میں دن کا سماں تھا اور بڑی رونق

لینڈ کروزر شرکی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی سرکٹ ل کے گیٹ میں داخل ہو کر پارکنگ لٹ پر رک گئی۔ باوردی ملازم فوراً ہی ہمارے قریب پہنچ گیا۔

سرکٹ ہاؤس میں کرا حاصل کرنے میں روپ متی کو ادنیٰ پیش نہیں آئی تھی لیکن مجھے یہ جان کر بڑی حیرت کہ اس نے میرے لیے سوئٹ روم کا انتظام کرایا تھا۔ رات کے پچھلے طرف چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار میں کوئی کمروں میں قیام کرنے والے دولت مندوں کے ایک کمرے میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ مجھے بھی انہی میں مجھے روپ متی کے اس رویے پر براہ کھ ہوا لیکن پھر انبال کو فٹن سے جھٹک دیا۔ اس میں افسردہ ہونے کی کیا

بات تھی۔ میں اس کا زبرد خیر غلام ہی تو تھا۔ وہ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتی تھی۔ جنگل میں اس حادثے کے بعد اور سڑک کے دوران میں اس نے مجھ سے جو بھی باتیں کی تھیں وہ محض میرا دل رکھنے کے لیے کی تھیں لیکن سہرا ل یہ اس کی مہمانی تھی کہ اس نے اب مجھے بھی براہ کھ کیا تھا اور مجھے رسیوں سے باندھ کر ڈالنے کے بجائے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

میں رات کو دیر تک روپ متی کے اس طرز عمل کے بارے میں سوچتا رہا پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔  
”مجھ بچے مجھے سرکٹ ہاؤس کے ایک ملازم نے: دیا۔“

”آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر ناشتا کرو۔ تمہاری مالک ٹھیک ساڑھے چھ بجے پارکنگ میں پہنچ جائے گی۔“  
میں نے کیا تیار کی تھی۔ کمروں کی اس تھار کے آخر میں غسل خانہ تھا۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے ماسکسل مندی دور کی اور جب کمرے میں واپس پہنچا تو چھوٹی سی سا بخوردہ میز ٹرے میں ناشتا رکھا ہوا تھا۔

ناشتا کر کے میں پارکنگ میں آگیا۔ روپ متی گاڑی کے قریب کھڑی تھی۔ مجھے اس کے رویے نے بہت بد دل کر دیا تھا۔ کئی مرتبہ بھاگ جانے کا خیال آیا تھا لیکن کہاں جاتا۔ یہی سوچ کر ہر مرتبہ بھاگنے کا ارادہ بدل دیا۔  
مجھے دیکھتے ہی روپ متی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا۔ میں خاموشی سے پیچڑ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی سرکٹ ہاؤس سے نکل کر شرکی مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ایک پھیول پپ سے فیول ٹینک فل کر دیا گیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی شرکی حدود سے نکل کر بے پور کی طرف جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

”تمہیں شاید میرے رات والے رویے پر دکھ پہنچا ہے۔“ روپ متی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”مجھے اس کا افسوس ہے مگر اس کی ایک خاص وجہ ہے جو بعد میں بتاؤں گی۔“  
”میں آپ کا غلام ہوں مالکن۔ مجھے آپ کے رویے پر کوئی دکھ نہیں۔“

”ڈائٹان سنس۔“ روپ متی نے مجھے ڈانٹ دیا ”اگر تمہیں باتیں کو گے تو میں تمہیں اتار دوں گی۔“

”مجھے تو آزادی مل جائے گی البتہ نقصان آپ ہی کا ہوگا۔“ میں نے کہا۔  
”ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔  
”میں تمہیں کھانا نہیں چاہتی مگر تم اس طرح خاموش رہو گے

تاریخ ازبر ہو۔

پوری طرف روانہ ہو گئے جو اجیرتے ایک سو پچیس تھیں کہانہ  
گئے فاصلے پر تھا۔ روپ مٹی راستے میں آنے والے ہر قبیلے  
گاؤں، بستی اور ان چھوٹی بڑی جمیلوں کے بارے میں قافیہ  
ریں جن کی بدولت زندگی اس ریگستان میں سانس لے رہی  
تھی۔ شام چھ بجے کے قریب ہماری گاڑی ہے پور شرکی  
میں داخل ہو گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس شہر  
ہر چھوٹی بڑی عمارت کا رنگ کھائی تھا۔

”جے پور کو گلابی شہر ہی کہتے ہیں۔“ روپ مئی میرہ  
پوچھنے پ پتا رہی تھی ”جے پور سے پہلے امیر احمد شاہ  
وارا لکھنؤ موت ہو کر آتا تھا لیکن وہاں زندگی کی سوسائٹس منتقل  
ہوئے تھیں تو ۱۷۲۸ء میں وہاں سے صرف گیارہ کلومیٹر  
مہاراجا بیویاں جے نکھہ ٹانی سے اس شہر کی بنیاد رکھی۔  
”اس شہر کی عمارتیں بھی دوسرے شہروں کی طرح  
مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں لیکن ۱۸۸۳ء میں برطانیہ  
کے نپس البرٹ نے جے پور کا دورہ کیا تو اسے خوش آمد  
کہنے کے لیے اس شہر کی تمام عمارتوں پر گلابی رنگ لگوا  
دئے خوشی اور شادمانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔“

شہر کی قدیم اور شاندار عمارتوں کو کچھ کرکھے چڑھو رہی تھی۔ روپ متی مختصراً راستے میں آنے والی ان عمارتوں کے بارے میں بتا رہی تھی ابلا پالا خرگاہی شہر مشرق علاقے میں واقع ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ایک نہایت عالی شان محل نمائندگی میں داخل ہو گئی۔ یہ روپ متی کی حویلی تھی جو کسی شاہی محل سے کم نہ تھی۔ بہت وسیع و عریض لان تھا جس کے وسط میں بہت بڑا حوض میں فوارہ لگا ہوا تھا۔

شان دار پورج میں گاڑی رکی تو دوڑنے لگا  
 اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر سامنے آئے۔ وہ دونوں  
 مخصوص راحتہانی لاسز میں تھے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ

روپ متی کو پر نام کیا اور میری طرف دیکھنے لگے۔ روپ نے انہیں سچھ ہدایات دیں اور مجھے ساتھ لے کر برآمد ہوا۔

یہ وسیع و عریض ہال دیکھ کر میری آنکھیں جرت گئیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں کسی شادی محل میں ہوں۔ ہر کمر بست کشادہ، چینی اور شاندار ساز و سامان آراستہ تھا۔ پورچ میں ملے والے دو آدمیوں کے علاوہ جوان اور حسین عورتیں بھی ملی تھیں۔ وہ بھی روپ منی خاں تھیں۔

میں نے سوچا کہ میری اسی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی۔  
 وہ مجھے قریب ایک ملازمہ نے بگایا تھا۔ میں  
 تھکے ہوئے غسل کر کے تازہ دم ہو کر خادمہ کے ساتھ  
 کھانے کے کمرے میں پہنچا تو روپ متی میری ہنسنے لگی۔  
 دیکھ کر میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ بہت ہی  
 اچھا لگا، پھر رکھا تھا اس نے۔

اس کے چہرے سے پریشانی ہوید اٹھی۔  
 صوفی پر بیٹھا ہوا ٹھاکر بھنور سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”غضب ہو گیا روپ متی جی۔“ ٹھاکر لولا ”وہ داسی فرار ہوئی جو آپ نے مجھے تحفے میں دی تھی۔“

میں اب ٹھاکر کی بات نہیں سن رہا تھا۔ پیشکر کا نام سن کر میرے دماغ میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ میری نظروں کے سامنے کاسنی کا جو گھبراہٹ والا منہ تھا۔

”پتی اور ٹھاکر بھنور سنگھ باتیں کر رہے تھے اور میں خاموش لفظوں میں دل میں مسکرا رہا تھا۔“

گزری تھی۔ بنارس کے حوالے سے بچپن کی ان یادوں سے قطع نظر ہندوستان میری طرح جاگتی کے لیے بھی اجنبی تھا۔  
 بشکر کا اس نے بھی صرف نام ہی سنا تھا۔ اس شر کے بارے میں وہ بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ کسی اجنبی شر میں نامعلوم منزل تک پہنچنا آسان نہیں ہو تا اور جاگتی جیسی حسین عورت اکیلی ہو تو اس کے لیے خطرات اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اس کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پنہاں لباس اور بہنا۔ پولیس ایسے لوگوں کی طرف جلد متوجہ ہوجاتی ہے اور اگر پولیس توجہ نہ بھی دے تو جرنی تہی حسین اور بد حالی عورتیں غٹھوں اور بد معاشوں کی زد میں تو فوراً ہی آجاتی ہیں۔ وہ تو ایسی حسین عورتوں کی ناک میں رہتے ہیں جنہیں آسانی سے شکار کیا جاسکے۔ یہ میں جانتا تھا کہ جاگتی آسانی سے کسی کا شکار ہونے والی نہیں تھی مگر بدترین اندیشوں کو نظر انداز تو نہیں کیا جاسکتا تھا کہ میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا۔ جاگتی بغیر سوچے سمجھے فرار نہیں ہوگی۔ بشکر شر کا نام سننے ہی اس کے ذہن میں کاٹھی کا نام بھی ابھرا ہوگا اور اسی لیے اس نے اچانک ہی فرار کا منصوبہ بنایا ہوگا۔ اسے موقع بھی مل گیا۔

حقه 4

آت فشاں ۱۱۶ حصہ ۴



بھلا سکتا اور جہاں تک اس کے بھاگ جانے کا تعلق ہے تو مجھے یہ خبر سن کر واقعی خوش ہوئی ہے۔" میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "اب میری دعا ہے کہ وہ دوبارہ غلط باتوں میں نہ پڑے اور وہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں اس کے خاندان کے کچھ لوگ موجود ہیں۔ تمہارے خیال میں بشکر میں اس کے لیے کوئی محفوظ جگہ ہو سکتی ہے؟" روپ متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بچپن میں ایک مرتبہ بنارس گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "اب مجھے نہیں معلوم کہ بنارس بھٹنڈے کے قریب دور ہے اور یہ کہ بشکر میں اسے کوئی سارا مل سکتا ہے یا نہیں۔"

"بنارس ہندوستان کے دوسرے سرے پر ہے۔" روپ متی نے کہا۔ "اور جہاں تک سارے کا سوال ہے تو جا چکی جیسی حسین اور جوان عورتوں کو کوئی سارا تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ وہ سارا اس قیمت پر ملتا ہے اور کتنا پائیدار ہوتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ اس وقت ایک ملازمہ ہال میں موجود تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر میں اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ ایسی گوری کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے۔ اس کے چہرے کے نقوش عام ہندوستانی عورتوں سے مختلف تھے لیکن اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اغما ہوا شباب تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا راجستھانی گھاکرا اور اسی رنگ کی چولی پہن رکھی تھی۔

"یہ مندری ہے۔" روپ متی نے ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف اس سے کہہ دینا۔ میں دوسروں کو بھی ہدایت کر دوں گی۔ کوئی بھی ملازم یا ملازمہ تمہاری بات نہیں ٹالے گی۔ آؤ۔ میں پہلے تمہیں اپنی چولی دکھاؤں۔"

میں نے ایک بار پھر مندری کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور ابھن بھی۔ حیرت شاید اس بات پر تھی کہ گھر کے پرانے ملازموں کی باگ ڈور اس غلام کے ہاتھ میں دی جا رہی تھی جسے ماگن آج ہی خرید کر لائی تھی۔

"مندری کے چہرے کے نقوش بتا رہے ہیں کہ یہ ہندوستانی تو نہیں ہے۔" میں نے روپ متی کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں

لوئیس دوومن رنگ سنت کی بیٹی سونیا یاد رکھتی تھی۔ جو گولڈن ٹرائی اسکول تک ہمارے ساتھ گئی تھی اور ساڑھے کے بعد ہندوستان کی طرف آ گئی تھی۔ مندری کے چہرے پر نقوش بڑی حد تک سونیا سے مشابہت رکھتے تھے۔

"مندری سونی صد ہندوستانی ہے۔" روپ متی نے جواب دیا۔ "اس کی ماں جتنی تھی اور باپ پنجاب کا۔ دوومن کا انتقال ہو چکا ہے۔ تین سال پہلے میں ایک کام دہلی گئی تھی۔ وہاں اپنے ایک رشتے دار کے گھر میں رہا۔ دیکھا۔ یہ اگرچہ بھی تو ملازمہ ہی مگر اس کے ساتھ بہت افسوس ناک سلوک کیا جاتا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس وقت سے یہ میرے پاس ہے۔ میں نے سارا کا اس پر چھوڑ رکھا ہے۔ بہت بھروسے کی اور قابل اعتماد ہے۔"

میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے روپ متی کے ساتھ چلا رہا۔ وہ مجھے گھوم پھر کر اپنی چولی دکھاتی رہی۔ وہ کیا تھی، ایک محل تھا۔ کئی غلام کردشیں اور متعدد کمرے تھے۔ ہر کمرہ قیمتی سازو سامان سے آراستہ تھا۔ اوپر کی محل بھی چار کمرے تھے جن کے آگے بہت وسیع تیسری تہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں اس چولی میں گھومنے کے بعد مرکزی ہال میں واپس آ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ روپ متی کا باپ ایک چھوٹی سی ریاست کا راجا تھا۔ ریاست ختم ہو گئی تو اب ہندو سرکار کی طرف سے غلام لگا۔

باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد سرکار سے روپ متی کو روپ متی کو ملتا تھا۔ نقد لاکھوں روپے سالانہ کے علاوہ سرکار کی طرف سے اور بھی بہت سی مراعات اسے حاصل تھیں۔ ان کے علاوہ اسے اپنے سوگ باپشی بی بی نوان کی طرف سے بھی کروڑوں کا ورثہ ملا تھا اور یہ ساری دولت اتنی تھی کہ روپ متی کے بعد اس کی آنے والی دو بی بی بھی کوئی کام دھندا کیے بغیر عیش کی زندگی گزار سکتی تھیں۔ بارہ بی بی تھیں۔ ہم ایک بار پھر ہال میں آ گئے۔ ملازمہ ہمارے لیے کافی بنا کر لے آئی۔ اس کا نام کلا تھا۔ بھی مندری کی طرح حسین تھی اور اس کی عمر بھی بائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تیسری ملازمہ کو بھی شروع میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہ آئی تھی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو دو بی بی کے ملازمہ کو دکھائی دیے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی اب تک ایک مرتبہ بھی اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ انہیں شاید اندر

ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ کلا کی چٹکیاں لیتے ہوئے روپ متی راجستھان کے غنٹ راجاؤں کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی ہر بات میں ایک نیا انکشاف تھا۔ تمام راجاؤں سے سرکار کے دیے ہوئے زمینوں پر رہ رہے تھے۔ ان کے پاس دولت کی ریل تھی اور کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ انہیں عیاشیوں اور بلی کے چھڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ کوئی اور کام نہیں کرتے!

ہالوں کے دوران میں مجھے اچانک ہی توجہ گھر اور درمیان کا خیال آ گیا۔ وہ لوگ ہم سے کئی گھنٹے پہلے منڈی سے روانہ ہوئے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب سے ہم آئے تھے ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے روپ متی سے ان کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ راجاؤں تک تو وہ مجھے اپنی صورت نہیں دکھائیں گے اور جب آپس گئے تو میرے پیچھا چلنا شروع کریں گے۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے لیے اب میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو اس طرح وہ تمہارے دشمن نہیں بن جائیں گے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"چند چپ چاپ کی جاؤں گا۔" روپ متی نے کہا۔ "ان کی رات یہ کیا ہے میں نے انہیں گندی مٹی سے اٹھا کر محل لے آیا تھا۔ وہ یہاں عیش کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے تھوڑے کچھ حاصل کر لیا ہے۔ بڑی لمبی چوڑی جائیداد بنائی ہے۔ وہ شرافت سے رہیں گے تو ان کے دن اچھے گزر جائیں گے اور اگر پرزورے نکالنے کی کوشش کی تو میں انہیں پتھر کی چٹکی میں ختم کر دوں گی۔"

"وہ چٹکی میں کسے جانے سے پہلے تمہارے لیے کچھ نمایاں تو پیدا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ سب کچھ میری سے ہوا۔ نہ میں بی بی آتا اور نہ یہ بد مزگی پیدا ہوتی۔ کچھ بھی مجھ اپنے تعلقات ہوں گے۔ تمہیں کوئی نقصان اٹانے کے لیے کہہ دوں۔ سوں سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ کہیں نہ ہو کہ تمہیں ان سے یہ دشمنی منگنی پڑ جائے!"

"میں اس اتنی جرات نہیں کہ میرے خلاف کوئی ایسا افتخار منگ سکے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارے تے ہوئے مجھے کسی کی دشمنی کی پروا نہیں۔ میں نے تم پر کئی اعتبار نہیں بھروسہ کیا ہے اور میں۔" وہ خاموش رہی۔ آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ "اور میں نے کسی کو

پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کی۔" "دھوکا اور قریب میری فطرت میں نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں۔" روپ متی مسکرائی۔ "منڈی سے روانہ ہونے سے لے کر یہاں تک تمہیں بہت سے مواقع ملے تھے۔ جنگل میں جب ہمیں روکا گیا تھا اور تمہاری ہتھکڑی بھی کھل گئی تھی تو تم بڑی آسانی سے وہاں فرار ہو سکتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس مجھے ان لوگوں سے پہچاننے کے لیے اپنا بیچون داؤ پر لگا دیا اور جب میں بے ہوش ہو گئی تھی اور تم میرے دشمنوں کو بھی ختم کر چکے تھے اس وقت بھی تمہیں بھاگ جانے کا موقع حاصل تھا مگر تم نے وہاں پر آج نہیں آنے دی اور پھر۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ "جودھ پور میں سرکٹ ہاؤس میں قیام کے دوران بھی تمہیں ایسا موقع ملا تھا۔ تم کو کوئی گمراہی نہیں تھی۔ تم سرکٹ ہاؤس سے نکل کر شہر میں گم ہو سکتے تھے۔ جودھ پور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں اور تم بڑی آسانی سے غائب ہو سکتے تھے مگر تم نے وہاں بھی ایسا نہیں کیا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ تم پر آنکھیں بند کر کے دشواریاں جاسکتا ہے؟"

"تھک کہتی ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہارے اس دشواری کو دھوکا نہیں دوں گا لیکن ایک بات میں جی تم سے نہیں چھپانا چاہتا اور۔"

"میں جانتی ہوں تم کی کیا چاہت ہے۔" روپ متی نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"کیا۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے بارے میں اس کا ایک اندازہ تو درست تھا کہ میں اس کے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کروں گا اور اس کے اعتماد کو نہیں نہیں پہچاؤں گا اور اب میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے بارے میں اس کا دوسرا اندازہ کہاں تک درست نکلتا ہے۔

"بتا دو۔؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہاں۔ بتا دو۔" میں بھی مسکرایا۔

"میں کہہ رہی کہ تم زندگی بھر میرے غلام بن کر نہیں رہ سکتے اور ایک نہ ایک دن مجھے چھوڑ کر پلے جاؤ گے۔" روپ متی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

میں اچھل پڑا۔ درحقیقت یہی بات تھی جو میں اس سے

کنا چاہتا تھا۔ وہ واقعی سمجھ دار تھی۔ اس نے میرا ذہن پڑھ  
لیا تھا۔

ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور کسی غلام سے پریم کرنا بڑی معیوب سی بات ہوگی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔  
اسی وقت مندری بھی کسی طرف سے نمودار ہو کر سامنے  
آئی۔

”جی مانگن۔“ مندری نے جواب دیا۔  
روپ متی نے مڑ کر میری طرف دیکھا پھر میرے قریب  
آکر دونوں بازو پکڑ لیے اور میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”کُنڈ نائٹ“ اس نے دھیسے بچے میں کہا اور میرے بازو چھوڑ کر زینے کی طرف چلے گئی۔  
اوپر جانے والا زینہ ذرا سی گولائی لیے ہوئے تھا۔ نیچے

”میرے ساتھ آؤ۔“

مندری کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی عجب سی نظروں سے میری طرف دیکھ

وہ چند لمحے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف، کچھ  
رہی پھر اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑی۔ میں بھی  
خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔“ کمرے میں پہنچ کر مند ری نے کہا۔

”پڑے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”لیا جائے  
 پہننے کے لیے کپڑے مل سکتے ہیں؟“  
 ”تم ہاتھ روم میں جاؤ۔ میں کوئی بندوبست کرتی ہوں۔“

دار تھا۔ ایک دیوار پر بڑے اوم امینے لگا ہوا تھا۔ اس سے  
 ہی ایک خوب صورت میڈیسن کینٹ تھی جس میں ایک  
 سپرنٹ اور مختلف اقسام کے لوٹن رکھے ہوئے تھے ایک

ہی ایک اسٹینڈر صابن اور شیمپوز وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔  
نہانے کے لیے ایک خوب صورت ٹب بھی تھا اور ام

شاہد کو ترجیح دی۔

”کون ہے؟“ میں نے دوڑ کر اسے قریب آ کر کہا۔  
 ”اے میں پوچھا۔“ اس نے لوپٹنے کے لیے۔ ”یہ مندوی کی آواز  
 ہے۔“

اور بلا کر روچے سے ایک رات میں اس پر  
 ے کپڑے اتار کر پہنے لگا۔ وہ سلیپنگ سوٹ تھا، پاجامہ  
 اورینٹل شرت۔ شرت میں سے بڑی مسکوری کن خوشبو آ رہی  
 تھی۔ مجھے کہہ کر، قدرے غصہ تھا، لیکن بہر حال میں

۱۔ ٹرٹ کا ٹکڑا گولائی میں تھا اور اس پر نصف انچ چوڑی ب صورت نیل بھی لگی ہوئی تھی۔  
میرا خیال تھا کہ مندری نے روپ متی سے جا کر کہا ہو گا

میں ہاتھ روم سے باہر آگیا۔ مندری جا چکی تھی اور بستر  
خفید داغ دار چادر کے بجائے ہلکے گلابی رنگ کی چادر پر بچھی  
ہو کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ بند سانس

میں نے ایک گلاس پانی چا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ بیڈ کے  
 ایک طرف دیوار پر ایک سوچ بورڈ لگا ہوا تھا۔ بیڈ پر لیٹے

آتش فشاں

مجھے کسی نے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ آنکھ کھل جانے کے بعد بھی میں دیر تک بستر پر رہا۔ پہلے تو میں سمجھتا تھا کہ کھانا ہوا ہے، اب ابھر دھند کا چھا ہوا ہے اور ابھی لکڑی

ہونے کے باوجود میرے لیے بہت ہی پراسرار بھی۔ اس نے میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک ہرگز نہیں کیا تھا۔ وہ اب تک میرے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے تھے،

مجھ پر فی الحال کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ یہاں سے ایک نئی کہانی

دھرمیش تو میرے ہاتھوں گدھوں کی طرح پئے تھے اور کنور  
بلونت سنگھ کو میری وجہ سے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی۔  
اس کا ایک آدمی بھی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور خود اسے

کے لیے مجھے بھی اس معاملے میں پینے کی کوشش کر سکتے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں یہاں ان معاملات میں الجھ کر رہ جاؤں گا اسے ماں باپ کے قاتلوں کو ٹھکانے

لگانے کے لیے کوئی اقدام کر سکیں گے۔ دار اسٹیکا پور سے فرار

حصہ 4

ہو کر ہندوستان آیا تھا لیکن غلام رہا ہے ہندوستان اس کی منزل نہیں تھی۔ اس کی منزل تو لاہور تھی جسے وہ اپنی پناہ گاہ سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب تک لاہور پہنچ چکا ہو گا جبکہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ اسے دنیا کے کسی کونے میں بھی پناہ نہیں لینے دوں گا لیکن اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ یہاں سے کیسے نکلا جائے؟

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور مندری چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے چائے کا کپ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ میں اٹھ کر باغچہ روم میں ٹھس گیا۔

چند منٹ بعد میں دوبارہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز گرم گرم چائے کی چٹکیاں لے رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے میں اپنے آپ کو بہت ہلکا چھکا محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ روپ متی جاگ چکی ہوگی اور ناشتا بھی کر چکی ہوگی لیکن پتا چلا کہ وہ ابھی تک سو رہی ہے۔ اس نے رات ہی کو کمرہ دیا تھا کہ صبح اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے اس لیے مندری نے اسے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

”بھوجن کرو گے بنا دوں؟“ مندری نے میرے قریب آکر کہا۔

”ابھی نہیں۔ مگر اٹھ جائے تو ناشتا کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

مندری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ بات میں نے کل ہی نوٹ کر لی تھی کہ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آتی تھی۔

میں ہال سے ہوتا ہوا باہر گیا۔ روپ متی کی لینڈ کروزر اب بھی پورچ میں بیٹھ کر کھڑی تھی۔ میں چند لمحوں پورچ میں کھڑا رہا اور پھر محسوس پھر کر کپاؤنڈ کا جائزہ لینے لگا۔ کپاؤنڈ کم از کم دو ایکڑ رقبے پر مشتمل تھا۔ بوڑے خوب صورت لان بنے ہوئے تھے جن کے کناروں پر پھولوں کے بوڑے بھی بکھرتے تھے۔ بیرونی تفصیل نماد یوار کے ساتھ ساتھ ناریل کے درخت تھے۔

جولہ کی عمارت کے ایک طرف تین گیران بنے ہوئے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ میں ان کے سامنے سے گزرا۔ ایک گیران خالی تھا لیکن دو دروازوں کی جھریوں سے اندر کھڑی ہوئی گاڑیاں نظر آئیں۔ میں جولہ کی عمارت کے چپچلی طرف گیا۔

اس طرف بھی بہت لمبی چوڑی کھلی جگہ تھی اور عمارت سے بہت ہٹ کر عظیم دیوار کے ساتھ کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سروٹ کوارٹروں کی تو تھی۔ ہر کوارٹر کے سامنے مختصر سا صحن بھی تھا اور باہر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ہر کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ یہ یہاں اکیلی ہی رہتی تھی۔ اس کی خدمت اور کھانا کے لیے زیادہ سے زیادہ دو ملازم کافی تھے لیکن اب ملازموں کی ایک فوج پال رکھی تھی۔ پانچ ملازم تو خولی میں موجود تھے۔ تین عورتیں اور دو مرد اور دو دھرمیش (گودھ نکالنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

میں خولی کی وسیع و عریض عمارت کے اوپر ہوا ایک باہر پھر سامنے کے رخ پر گیا۔ ایک دیوار پر پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اس کے بدن پر صرف دھوپ تھی جو مخصوص انداز میں بندھی ہوئی تھی۔ آنسو پینڈا دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کے قریب تراشے ہوئے بال چاندی کی طرح سفید تھے۔ چہرے پر بڑی بڑی سفید مونچھیں عجیب سی لگ رہی تھیں قریب پہنچا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پام کیا اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں کچھ دیر لان میں ادھر ادھر ملتا ہوا قریب رک گیا۔ اس وقت میری نظر اظہار کا خولی کی طرف گئی تھی۔ اوپر والی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کا پتلا ہٹا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی اس پرے کی جھانک رہا ہو۔ میں اس کی ایک معمولی سی جھلک سی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ برابر ہو گیا تھا۔ وہ روپ متی کے علاوہ ہو سکتا تھا۔

میں ایک درخت کے سائے میں کھڑا ادھر ادھر رہا۔ میں اس وقت عجیب ذہنی الجھن میں گرفتار تھا۔ روپ متی کا وز خرید تھا لیکن اس نے مجھے آزاد چھوڑا تھا۔ میں اگر چاہتا تو بوڑے اطمینان سے یہاں بیٹھ کر میری قوت فیصلہ بھی شاید مفلوج ہو کر رہ جاتی تھی۔ فیصلہ نہیں کر رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن اب طے تھی کہ میں روپ متی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میں مجھ پر اعتماد کیا تھا اور میں اس کے اعتماد کو اپنی نظروں میں نہیں گرنا چاہتا تھا۔

میں نیم کے درخت کے سائے میں کھڑا ایک سوچا رہا کہ یہاں سے نکل بھی گیا تو کہاں جاؤں گا۔

چمک میرے لیے اجنبی تھا۔ یہاں کے لوگ اجنبی تھے اور چمک حالات میں یہاں پہنچا تھا وہ بھی بڑے عجیب تھے۔ ہمیں جن حالات کی جاکڑ تھی کے بعد جہاز اور مسافروں کی پیمین میں ہوئی تھی۔ کچھ مسافر مل گئے تھے۔ کچھ کی لاشیں بھی ہوئی تھیں۔ کچھ اور کچھ ابھی تک لپاتا تھے۔

میں اگر یہاں سے نکل کر اپنے آپ کو سرکاری حکام کے سامنے پیش کر دیتا تو میرے لیے مزید الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میں اتنے روز کہاں غائب رہا؟ میں نے کسی اتھارٹی سے رابطہ کیا نہیں کیا؟ میری یہ بات ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہو گا مجھے پکڑ کر غلاموں کی منڈی میں بیچ دیا گیا تھا۔

غلاموں کی منڈی کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں مگر ان ہی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ راجستان میں باؤں کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے مگر وہ نئے والے بھی منڈی کے وجود سے انکار کر دیں گے۔ دوسری طرف میں جا کر کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مائے میری خاطر اسباب کچھ لانا تھا اور اس پر یہ عذاب باعمری عا وجہ سے نازل ہوا تھا۔ اسے بے یار و مددگار رہنا پڑا دیتی ہوئی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ روپ متی پر آمدے نمودار ہوئی۔ وہ ایک لمحے کو وہاں رکی تھی اور پھر مڑے سے اتر کر بنے تلے قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آیا۔ اس نے شب خونی کا پارک لباس پہن رکھا تھا جس میں لالہ رنگ تھا۔ وہ شاید نما کر نکل گئی تھی اور بال بال نکلتے تھے بالوں سے غچرے والے پانی سے میکسی کر اس کے بدن سے چمک رہی تھی۔

وہ میرے سامنے آکر گر گئی اور مجھے اوپر سے نیچے تک لگی اور پھر اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ ”یہ یہ کپڑے کہاں سے لیے تم نے؟“ اس نے اپنی ہونٹوں سے میری طرف دیکھا۔

”رات کو مندری نے دیے تھے شاید تمہارے ہی“ میں نے جواب دیا۔ میں اس لباس میں پہلے ہی کچھ ناکی محسوس کر رہا تھا اور اب تو میں جینپ سا گیا تھا۔

”یہ مجھے کپڑے نہیں ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مندری کے ہیں۔ تم نے مانگے ہوں گے تو مجھے کپڑے لاد دیے لیکن۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش رہا۔ ”لیکن تمہاری نظریں جھٹکتے ہوئے ہوئی“ لیکن کہیں نہیں کہ مندری نے رات تمہارے کمرے میں گزرا رہی

میں بری طرح جینپ گیا ”میرے خیالات اتنے پست نہیں ہیں۔“

”بڑا مان گئے۔“ وہ مسکرا دی ”میں نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ ویسے تم ہو ایسی چیز کہ تمہیں دیکھ کر ہر جوان عورت کے سینے میں الجھل مچ جاتی ہے۔ بہر حال آؤ۔ میں تمہیں اپنا گاؤں دکھاؤں۔“

وہ مجھے لان کے مختلف حصوں میں گھماتی ہوئی اس طرف لے گئی جہاں ایک لمبا چوڑا قطعہ گلاب کے پودوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں کئی رنگوں کے گلاب تھے اور وہ مجھے بتا رہی تھی کہ گلاب کا کون سا پودا کہاں سے لاکر لایا گیا تھا۔ میں روپ متی کے ساتھ ساتھ چلتا ”ہوں ہاں“ کرتا رہا۔ اس وقت دوسرے ہو رہی تھی۔ میں نے دس بجے کے قریب چائے کا ایک کپ پیا تھا اور اب پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

کلا نامی ملازمہ نے برآمدے میں نمودار ہو کر کھانا لگائے جانے کی اطلاع دی تو میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

”آؤ۔ کھانا لگ چکا ہے۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔“ روپ متی نے کہا اور ہم لان سے نکل کر اندر کی طرف چل پڑے۔

میزر انواع و اقسام کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ اس میز کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی خاص مہمان کے لیے ہر تکلف و عوت کا اہتمام کیا گیا ہو۔ تین ڈشٹر سبزوں کی تھیں جن میں نیچر استعمال کیا گیا تھا۔ ایک ڈش چکن فرائی کی تھی۔

ہم دونوں میز پر آئے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نظریں جھکائے کھانا کھانا رہا۔ میں روپ متی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ البتہ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”اے کلا۔“ روپ متی کو اچانک ہی جیسے کچھ یاد آ گیا ”دھرمیش کے کوارٹر کی چابی تو تمہارے پاس ہے نا؟“

”جی مگر۔“ کلا نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں جھک گئی تھیں جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

”اس کے کمرے سے کپڑوں کے دو تین جوڑے نکال لاؤ۔“ روپ متی نے کلا سے کہا پھر میری طرف مڑ گئی ”میرا خیال ہے دھرمیش کے کپڑے تمہیں پورے آجائیں گے۔ چند روز تو انہی پر گزارہ کرو۔ اس دوران میں کوئی اور بندوبست کر لیا جائے گا۔“

”وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا؟“ میں نے کہا۔

”عزاض!“ روپ متی بولی ”اگر اس نے ایک لفظ بھی منے نکالا تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گی۔ ویسے اطمینان رکھو۔ وہ دونوں بھائی اب ادھر کارخ نہیں کریں گے۔ فیصلہ سنانے سے پہلے یہ وہ میرے فیصلے سے آگاہ ہو چکے ہیں۔“

کھانا روپ متی کا حکم سن کر اسی وقت چلی گئی تھی۔ ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو کھانا بھی آگئی۔

”میں نے کپڑے ان شریمان جی کے کمرے میں رکھ دیے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

میں روپ متی کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ کئی قیمتی سوٹ بیگلوں میں لگے ہوئے تھے۔ لاتعداد شرٹس اور پتلونیں الگ سے ڈکی ہوئی رکھی ہوئی تھیں۔ کئی جوڑے راجستانی لباس کے بھی تھے۔ روپ متی نے کھانا دو چار جوڑے لانے کو کہا تھا مگر وہ شاید اس کے وارڈ روپ کے سارے کپڑے نکال لائی تھی۔

میں نے ایک پتلون اٹھا کر اپنی ٹانگوں سے لگا کر دیکھی۔ دھرمیش قدو قامت میں میرے جیسا ہی تھا اور میرے خیال میں اس کے کپڑے مجھے پورے آتے تھے۔ گرے رنگ کی اس پتلون کے ساتھ پہننے کے لیے میں کوئی مناسب شرٹ تلاش کر رہا تھا کہ روپ متی نے وہ پتلون میرے ہاتھ سے لے کر ایک طرف ڈال دی اور نیلے رنگ کی ایک اسٹون واشر جینز اور گہرے رنگ کی ٹی شرٹ نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

”یہ پس لو۔ اچھی لگے گی۔“ اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ”تم یہ کپڑے بدل لو۔ میں کچھ اور تلاش کرتی ہوں۔“

میں کپڑے لے کر ہاتھ روم میں ٹھس گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ کپڑے میرے جسم پر بالکل فٹ تھے۔ میں جب ہاتھ روم سے باہر نکلا تو روپ متی بیڈ پر جگمی دھیر میں سے کپڑے الگ کر رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ایک ہنسنے سے سیدھی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی تھی۔ وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور میرے بازوؤں کے سسٹنٹوں نے لگی۔ آرمے آئین کی ٹی شرٹ میں میرے بازوؤں کے سسٹنٹ ابھرے ہوئے تھے۔ سینہ بھی کسی گاڑی بلڈر کی طرح تپا ہوا تھا اور روپ متی یہی سب کچھ دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے میرے لیے ایسے لباس کا انتخاب کیا تھا۔

میں اب تک روپ متی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ جنم جنم کی بیاسی تھی۔ اس نے جب بھی اپنی بیاسی بچھانے کی

کوشش کی تسکین کے بجائے اس کی بیاسی اور بڑھتی تھی اور اب وہ مجھ سے تسکین حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شروعات تھیں اور میں جانتا تھا آگے کیا ہوسکتا ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ مجھے اس شرٹ سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ میں گولڈن زائی اسٹیل کے بنیاد پر دھوکا کھا گیا تھا۔ جاگتی عرصے سے میرے پیچھے کی اور میں اپنے آپ کو اس سے بچاتا تھا تھا اور اب روپ متی سے پتا تھا جو میری مالکین تھی اور میں اس کا گناہ روپ متی نے میرے لیے اسی دھوکے سے جوڑے نکال کر الگ کر لیے اور کھانا کھانا کھانا کھانا لے جانے کا حکم دیا۔

”اور دیکھو۔“ روپ متی نے کہا ”اگر وہ روزہ عدم موجودگی میں یہاں آئیں تو ان سے کتنا پتلا سا لے جائیں ورنہ سڑک پر پھینک دیا جائے گا اور اگر آئیں تو صرف اپنے کو اور رز تک جائیں گے اور کسی اور حصے میں جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔“

”جی مالکین۔“ کھانے نظر سے جھکا کر جواب دے نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اب وہ دونوں بھائی یہاں آئیں گے۔

کچھ دیر بعد روپ متی نے تارا سنگھ اور دیوار ملازموں کو بھی یہ حکم سنایا۔

چار بجے کے قریب روپ متی مجھے ساتھ آگئی۔ لینڈ کروزر اب بھی پورچ میں ہی کھڑی تھی۔ برآمدے سے اتر کر گیراج کی طرف چلی گئی۔ اتار جانے دیکھ کر تارا سنگھ بھی دوڑ کر اس کے قریب ڈھکی اپنی جگہ پر کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔

تارا سنگھ نے ایک گیراج کا دروازہ کھول دیا جا کر گرے رنگ کی ایک کار صاف کرنے لگا۔ روپ متی بھی گیراج میں داخل ہو کر کار میں بیٹھ کر اشارت کر کے کار کو باہر نکال لائی۔

چند سال پرانے ماڈل کی مسرڈر تھی جو اب طرح طرح پر ہمارے تھی جسے ابھی شروع سے نکال بیوروچ اٹنا کشادہ تھا کہ دو کاربن پمپلو پہلو پہلو تھیں۔ روپ متی نے کار لینڈ کروزر سے ڈرائیو روکی اور پیچہ ریزٹ کا دروازہ کھول کر مجھے اشارت میں پیچہ ریزٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے پوچھا تھا کہ کہاں جانا ہے پوچھنے کا کوئی حق بھی

میری مالکین تھی اور جہاں چاہے مجھے لے جاسکتی تھی۔ کار نیم چھانے سے پہلے اس نے مندر کی گلا کراتے بتا دیا تھا کہ لوگ رات کا کھانا باہر لکھا ہیں۔

کہ لوگ رات کا کھانا شری مختلف سڑکوں پر دوڑنے والی سے نکل کر کار شری عمارتوں سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کچھ قدم تاریخی عمارتوں سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ راجوں مہاراجوں کو قلعہ نما عمارتیں اور راجستان کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

ملائے خزانے کے شہر کو دیکھنے کے لیے کئی روز درکار ہیں لیکن میں تو اس شہر کو دیکھنے کے لیے کئی روز دیکھنے کے لیے لائی تھی۔ میں چند بت خاص عمارتیں دیکھنے کے لیے لائی ہوں۔ ”دپ متی نے کار ایک اور سڑک پر موڑتے ہوئے

کہا ”آج تم مجھے سیر کرانا چاہتی ہو۔“ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی سمجھ لو۔“ اس نے جواب دیا ”اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ تم شری سڑکوں سے واقف ہو جاؤ۔ آج تو میں تمہیں پوچھ رہی ہوں۔ کل میں تمہیں ڈرائیونگ کھانے کے لیے لے جاؤں گی۔“

”ڈرائیونگ!“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”تمہیں یہ خیال کیسے آگیا کہ مجھے ڈرائیونگ ضرور سیکھنی پڑے گی۔“

”تمہیں تو حیرت ہے کہ تم نے اب تک ڈرائیونگ سیکھی کیں نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”تم نے اپنا ہونٹ مڑھایا ہے اس کے پیش نظر تو تمہیں ڈرائیونگ کا باہر ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال اب میں تمہیں ڈرائیونگ سکھائوں گی لیکن آج کا دن میں تمہیں شہر کے راجستھان سے شہر نکالنا چاہتی ہوں۔“

وہ کار کو شری مختلف کشادہ سڑکوں پر گھماتی رہی۔ وہ مجھے راستے میں بڑے والی ہر مشہور عمارت کے بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔ ہوا اچھل کو دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں دھکا تھا۔ باہر کی طرف نیچے سے اور تک لاتعداد ٹرائیں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے جھونکے بنے ہوئے تھے گلابی رنگ کی یہ عمارت بہت خوب صورت تھی۔

مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے جتنے جتنے چھوٹے گئے۔ یہ مستوحہ عمارتیں پارک تھا جہاں آبرو پٹری بنی ہوئی تھی۔ قدم لڑکی یہ آبرو پٹری ہمارا جابے شک ٹالی نے ۱۹۷۷ء میں بنائی تھی۔

ہم گاڑی سے اتر کر در تک جتنے جتنے مختلف حصوں میں گھومتے رہے روپ متی مجھے ہر چیز کے بارے میں اسی

طرح بتا رہی تھی جیسے میں صرف سیاحت کے لیے یہاں آیا ہوں اور وہ میری گائیڈ ہو۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ میرے ساتھ چلتے ہوئے روپ متی کا انداز اپنا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ میری موجودگی پر بڑا فخر کر رہی ہو۔ لوگ بھی سڑک پر دیکھ رہے تھے۔ جب کوئی عورت میری طرف دیکھتی تو روپ متی یا تو میرا ہاتھ پکڑ لیتی یا میرے ساتھ جڑ کر چلتے گئی۔

اس پارک کے ایک حصے میں کھانے پینے کی اشیا کے لاتعداد پھیلے بھی کھڑے تھے۔ وہیں ایک پھیلے کے قریب کھڑے ہو کر ہم نے پھیل پوری کھائی اور ایک دوسرے پھیلے سے ٹاربل میں اسٹرا لگا کر پیٹھا پانی پیا۔

روپ متی مجھے شہر کے مختلف حصوں میں گھماتی رہی۔ میں ہر عمارت اور ہر راستے کو ذہن نشین کر رہا۔ آج کی یہ سیر بعد میں میرے کام آسکتی تھی۔

مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے بالآخر ہم جوہری بازار پہنچ گئے۔ یہ شہر کا گلیان آباد اور بارونق کمرشل ایریا تھا۔ یہاں ہر قسم کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور پورا علاقہ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یوں تو مقامی باشندوں کا بھی خاصا رش تھا مگر غیر ملکی سیاح بھی بڑی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ یہاں کپڑے ’ریڈی میڈ گارمنٹس‘ لکڑی کی آرائشی مصنوعات مارمل کی مصنوعات اور زیورات کی بے شمار دکانیں تھیں۔ راجستانی زیورات کو ان دکانوں میں نمایاں طور پر سجایا گیا تھا۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے ایسی جگہوں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ روپ متی کے اس انکشاف پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ راجستھان میں ہر سال چھ لاکھ غیر ملکی سیاح آتے ہیں۔

روپ متی نے کار ایک بڑی عمارت کے سامنے پارکنگ لائٹ پر چھوڑ دی تھی اور ہم دونوں پیڈل ہی چلتے رہے۔ اس علاقے کو دیکھ کر مجھے سنگاپور کا کاشل انڈیا یاد آگیا۔

روپ متی ایک اور کشادہ بازار میں گھوم گئی۔ یہاں بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ روپ متی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جیسے اندیشہ ہو کہ میں اس ہجوم میں کھو جاؤں گا یا اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

اور بالآخر وہ کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہو گئی۔ اسے کپڑے کا ڈپارٹمنٹل اسٹور کہا جاسکتا تھا۔ ایک حصہ مردانہ کپڑوں اور دوسرا حصہ زنانہ کپڑوں پر مشتمل تھا۔ ریکس میں تھان آراستے تھے اور شوکیوں میں ڈیسوں پر خوب صورت ساڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

ہمارے سامنے رکھ دی۔ روپ متی فیشن بک کھول کر دیکھ لگی۔

روپ متی نے میرے کمروں کے ڈیزائن بھی اپنی مرضی سے پسند کیے۔

ایک گھنٹے بعد ہم نیچے آگئے۔ کپڑا پسند کرنے میں ہر ایک گھنٹا لگ گیا اور بالآخر ہم اس دکان سے باہر آگئے۔

”تم نے دھنی رام سے میرے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا ”کیا تم سمجھتی ہو کہ اسے پتا نہیں چلے گا کہ میں کون ہوں بلکہ میں تو جانتا ہوں کہ اس نے تمہاری بات کا یقین ہی نہیں کیا ہو گا اور کچھ ہو گا کہ میں ہی وہ غلام ہوں جسے۔“

”اس غلام کو تو میں نے اسی وقت آزاد کر دیا تھا۔ اس نے جنگل میں بلونت سکھ اور اس کے گروں سے میرا جان بچائی تھی۔“ روپ متی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”اور اب میں تمہاری زبان سے کبھی غلام کا لفظ نہ سنوں۔ میری طرف سے آخری وار تنگ ہے۔ سمجھے!“

”جی ہاں۔“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”کیا۔؟“ اس نے گھور کر میری طرف دیکھا۔

مسکراتے پا کر اس کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ اس وقت تو بچنے والے تھے۔ مرید بن ایک بار مجھ پر مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی اور بالآخر بھوانی سنگھ روڈ پر رام باغ پکس ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو کر پارکنگ لگا۔

رک ٹکی۔ وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا یہ ڈی گس تھا۔

یہاں جس طرح روپ متی کا سواگت (استقبال) اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ ڈائنگ ہال بھی پوری طرح تھا۔ ہمیں ایک میز مل گئی جس پر ”ریزروڈ“ کی کٹی ہوئی تھی۔ ہمارے بیٹھے ہی بیڈ ویئر نے وہ سختی ہٹا دی۔ میز گیا کہ روپ متی نے حویلی سے نکلنے سے پہلے فون کر میز ریزرو کو لائی ہوگی۔

کھانے کے بعد ہم ریکریشن ہال میں آگئے۔ یہاں متی کے کئی جانکار (شاسا) تھے۔ وہ اپنے اپنے بڑے فخر سے میرا تعارف بہت سنگھ کے نام سے کیا۔

روپ متی میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ میں نے عورتوں کی نظروں سے حسد کی چنگاریاں بھی پھونکی تھیں اور بعض کی نظروں میں رشک بھی نمایاں تھا۔

آدی ایسے بھی تھے جنہوں نے میری طرف بڑی توجہ

اس دکان میں بھی غماش تھا۔ کئی سیلز مین تھے جو گاؤں سے منٹن میں مصروف تھے۔ دائیں طرف آخر میں کیش کاؤنٹر تھا جہاں سانولی رنگت اور تھیکے نقوش والی ایک جوان لڑکی کے ساتھ ایک اوجیز عمر آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سفید پاجامہ اور سفید کلف لگا ہوا کرت۔ پیشانی پر سرخ مچکا چمک رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔

روپ متی کو دیکھتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ اس نے بڑے پرجوش انداز میں آگے بڑھ کر روپ متی کا استقبال کیا۔

”دھن بھاگ ہمارے (ہماری خوش قسمتی) راج کماری روپ متی جی۔ بہت عرصے بعد درشن دیے ہو اپنے۔“ سیٹھ دھنی رام کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ تھی۔

”درا مصروفیت رہی۔ اس طرف آنے کا موقع نہیں ملا سیٹھ جی۔“ روپ متی نے جواب دیا۔

”تھوڑی دیر پہلے ٹھاکر بھنور سنگھ بھی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ نے کوئی میرا خریدا ہے۔ کیا وہ۔“ اس نے کمر لکھیں سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں دھنی رام جی۔“ روپ متی نے جواب دیا ”یہ میرے دوست بہت سنگھ ہیں۔ یہ کئی دہائی سے آئے ہیں۔ دوران سفر میں کوئی مسافر غلطی سے ان کا سوٹ کیس اٹھا کر لے گیا۔ ان کے لیے کچھ پکڑنے سوائے ہیں۔“

”غلطی سے نہیں روپ متی جی۔“ دھنی رام مسکرایا ”میںوں میں چوری کی وارداتیں عام ہو گئی ہیں۔ کوئی چور تاک میں ہو گا۔ انیس غافل پاکر سوٹ کیس اٹھا لے گیا۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا شرمیان جی؟“ اس نے آخری الفاظ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”کم یا زیادہ۔ اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے جواب دیا۔ مجھے روپ متی کے جھوٹ بولنے پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میرے بارے میں بتاتے ہوئے وہ یہ بات بھی جانتی ہوگی کہ جلد یا بدیر اس کا یہ جھوٹ کھل جائے گا۔

دھنی رام نے کاؤنٹر کی چھیل دیوار پر لگا ہوا ایک ٹن دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد کاؤنٹر کے ساتھ تنگ سے زینے سے ایک آدمی اتر کر نیچے آگیا۔ دکان کے اوپر والے حصے میں درزی خانہ تھا اور وہ آدمی ٹیلر ماسٹر تھا۔ دھنی رام نے اسے میرے بارے میں بتایا اور جب ٹیلر ماسٹر نے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا تو روپ متی بھی ہمارے ساتھ ہی اوپر آگئی۔

اوپر بہت بڑا درزی خانہ تھا۔ کئی کارگر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ٹیلر ماسٹر نے ایک فیشن بک

نگاہوں سے دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کس وقت روپ متی کے قریب رہ چکے تھے اور اب مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر ان کے دلوں میں حسد و رقابت کے جذبات جاگ اٹھے تھے۔

ہر میز پر کوئی نہ کوئی جوان اور حسین عورت موجود تھی۔ یہ یا تو شکاری عورتیں تھیں یا ان کا تعلق ایسے گھرانوں سے تھا جہاں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ان عورتوں کے لباس ہی نہیں حرکات بھی شرمناک تھیں۔ میں نے سٹگا پور اور تھانی لینڈ کے ہوٹلوں اور مینٹ کلبوں میں بڑے شرمناک مناظر دیکھے تھے۔ ہندوستان کے بارے میں سنا تھا کہ یہ پس ماندہ ملک ہے جہاں عورت کو آزادی حاصل نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر تو میں کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان کی عورت سب سے زیادہ آزاد ہے۔ ایک مثال تو روپ متی کی صورت میں میرے سامنے تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس نے پابندی کی تمام زنجیروں کو توڑ دیا تھا۔ مذہبی رسم و روایات سے بغاوت کر کے وہ راہ اپنائی تھی جو بہت ہی شرمناک تھی۔ ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نئے مرد کو پہلو میں لے کر چلنے کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھی۔

ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہاں روپ متی کے جاننے والے دو افراد اور بھی تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ مرد کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی، جبکہ عورت کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اپنی شکل و صورت، لباس اور باتوں ہی سے فاش تھکتی تھی۔ مرد بھی بہت گھٹا تھا۔

میز پر انگلیش دہسکی کی بوتل رکھی ہوئی تھی جو ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ مجھے شراب سے نفرت تھی اور میں روپ متی کو بھی بار بار ٹوک رہا تھا لیکن وہ دوسری عورت تھی۔ وہ نہ صرف خود سوا ملائے بغیر پی رہی تھی بلکہ اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھی کو بھی پلا رہی تھی اور اس کا ساتھی اپنا گلاس بار بار روپ متی کے ہونٹوں سے لگا رہا تھا اور روپ متی بھی خالص دہسکی حلق میں اندھیلی جاتی رہی تھی۔

اسٹیج پر ایک قاصد تھرتے ہوئے اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش شروع کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسٹیج سے اتر کر ہال میں میزوں کے گرد پکڑانے لگی۔ یہ ڈی گیس ہوٹل تھا۔ فائو اشار سے بھی اوپر کی چیز۔ گلاب ایسے تھے جن کا شمار شر کے معززین میں ہوتا تھا۔ صنعت کار، بزنس مین اور سیاست دان، سابق راہبے اور مہاراجے ان میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک جملہ اشاک

مارکٹ کو کریش کر سکتا تھا یا سیاست کا رخ بدل سکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شرکی ان معزز ترین عتیموں اور گھرانوں کے خاندان میں غریباں یا تاؤی کی کرہنگامہ کرنے اور گندلی پکڑنے والے شریعوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ بھی ان کی غریباں کرہنگامہ جاتے ہیں اور یہ معززین بھی انگلیش دہسکی بے قابو ہو رہے تھے۔ کوئی میزوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ کوئی پکڑ کر اپنی آنکھوں میں گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اپنے ساتھ چینی ہوئی عورت کو بے لباس کرنا کوشش میں تھا۔

ایک کے بعد دوسری قاصد آتی رہی اور اپنے جم نمائش کر کے شر کے ان باعث لوگوں کے جذبات کی آگ بجھاتی رہی۔

ایک بیٹے والا تھا۔ روپ متی اب کسی قدر بچے تھی۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے ہاتھ سے پکڑ کر کرسی سے اٹھالیا۔

”بس کرو اس!“ میں نے اس کے دوسرے ہاتھ سے اس کے میز پر پکڑ دیا۔ ”اور پوچھو تو ہیں ڈیرہ بوجاؤ۔“

”تھمتہ تم کون ہو تمہو ہم مجھے روکنے والا مہم میں بیوں گی۔ اور اور بیوں گی۔“ روپ متی نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں اور نہیں پینے دوں گا۔ اب گھر چلو!“

”تھمتہ تمہارے بات کرو۔ تم میرے غلے ہو۔ مہم۔ مہم۔ لک نہیں۔ مہم۔ میں نے تمہیں غلے لاکھ میں خریدا تھا۔“

وہ ایک بار پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں سانے میں آیا۔ یہ الفاظ جھوٹے کی میرے دل پر لگے تھے۔ دماغ میں سننا نہایت ہی بولے ایک لمحے تو ذہن میں خیال آیا کہ اسے چھوڑ دوں۔ اس کا غلام ہی تو تھا۔ مجھے اس طرح بات کرنے کا لگا نہیں تھا لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں غلام ضرور تھا لیکن وفادار اور بھی میری سرشت تھا۔ میں اور ایک وفادار غلام اپنی ماں کو اس حالت میں چھوڑ سکتا تھا۔

میں نے کن انکھیں سے اس مرد اور عورت کی دیکھا۔ وہ دونوں روپ متی کی بات پر چونک گئے تھے۔ ان چہروں کے تاثرات بدل گئے۔ وہ دونوں ہلاؤش تھے۔ زیادہ شراب پینے کے باوجود وہ نہیں ہنسنے لگے۔

دماغ پر اثر ہونے لگا تھا۔ میں نے میز پر رکھا ہوا روپ متی کا بیک دوسرے ہاتھ سے اٹھا اور اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ روپ متی چپٹی چٹائی تو نہیں البتہ اپنے آپ کو چھڑانے لگا۔ کوشش ضرور کرتی رہی۔ ہم دروازے سے دو تین قدم ادری تھے کہ ایک ویٹر نے راستہ روک لیا۔

”ایکسیکوزی سر۔“

”کیا بات ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”ہیل۔“ ویٹر بولا۔ ”میزم کا ٹیبل پہ نہیں ہوا سر۔“ اس نے ہل کی بجائے چھینک دھکیلی۔

میں نے روپ متی کو چھوڑ دیا۔ وہ دوبارہ کے ساتھ ٹیک لگا کر میرے گھرے سانس لینے لگی۔ میں نے ویٹر کے ہاتھ سے ہتھی لیا۔ تین ہزار سے اوپر کا ٹیبل تھا۔ میں نے روپ متی کا پرس کھولا۔ اس میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میں نے مطلوبہ رقم نکال کر ویٹر کے ہاتھ میں تمھادی پرس اپنے کندھے پر لٹکایا اور روپ متی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ہال سے باہر لے آیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔

لالی سے گزرتے ہوئے ایک اور آدمی نے ہمارا راستہ روک لیا۔

”اے۔“ اس شخص کا لہجہ بہت اکڑ تھا۔ چلے سے بھی وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا۔ وہ اس کلاس کا بھی نہیں تھا جو ایسے بڑے ہوٹلوں میں آمد و رفت اور اخراجات کے معاملہ ہو سکتے ہیں۔ ”اے۔“ وہ ایک بار پھر مجھے کھانچا جانے والی نظموں سے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ ”روپ متی کی کو اس طرح کھینچ کر کمر لے جانے کا ہے؟“

”جسم میں۔ تم کون ہو؟“ میں نے بھی کھینچ کر اسے کھینچ لیا۔

میرے لہجے کی غراہٹ نے اس شخص کو دوپن رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں روپ متی کو کھینچتا ہوا پارکنگ میں لے آیا۔ اس کی کار کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے پرس میں سے چھوٹی سی ڈیوڈ اور دو روپے کا نوڈا پارکنگ سٹپ پر ڈال دیا اور چابی دروازے کے لاک سے نکال کر انکھیں میں لگا دی۔

”دوسری طرف کالا کھولو اور انجن اشارت کرو۔“

میں نے کہا اور کار کے سامنے سے گھوم کر دوسری طرف آیا۔

اور ٹھیک اسی وقت وہ آدمی بھی پارکنگ میں پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ ان دونوں کے تیر اچھے نہیں دکھائی دیتے تھے۔

”اے۔“ وہی شخص آگے بڑھتے ہوئے غرایا۔ ”روپ متی جی کو چھوڑ دو ورنہ ہم تمھارا بڈیاں توڑ دوں گا۔“

”دیکھو۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”میں روپ متی کو اغوا کر کے نہیں لے جا رہا۔ میں اس کا دوست ہوں۔ اس نے شراب زیادہ پی لی ہے اس لیے میں اسے زبردستی وہاں سے نکال کر لایا ہوں۔ ویسے تم لوگ کون ہو اور روپ متی سے تمھارا کیا تعلق ہے؟“

”روپ متی تو ہمارے دلاں کی رانی ہووے ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اب تم چلے جاؤ۔ ہم اس کو گھر چھوڑ دیں گے۔“

میرا خون کھول اٹھا۔ روپ متی کے بارے میں سننے نے انکشاف ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اتار کر لایا تھا کہ ان جیسے ٹھوڑے ٹھنڈے بھی اس لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو لڑنے پر ہنستے تھے۔ روپ متی نشے میں تھی اور ان دونوں کا خیال تھا کہ مجھے راستہ سے ہٹا کر وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے لیکن میں ایسا کیوں ہونے دیتا۔ میں نے ایک بار پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر ان میں سے ایک نے چاقو نکال لیا۔

اب میری قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ شخص چاقو تھامتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے کندھے پر لٹکا ہوا روپ متی کا پرس کار کی چھت پر رکھ دیا اور گھوم کر بڑی تیزی سے لات چلا دی۔ میرے پیر کی ٹھوک اس کے ہاتھ پر لگی۔ چاقو اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑا ہوا چو بھی یا پانچویں کار کے پیچھے جا کر۔

وہ شخص حملہ آور ہونے کے لیے میری طرف لپکا۔ میں نے بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ کر ٹانگ گھما دی۔ اس مرتبہ میرے پیر کی ٹھوک اس کے نچنے سے ذرا اوپر پھٹتی پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے گرا۔

میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھتے ہوئے دوسرے شخص کے پہلو میں سائیڈ لگ ریسید کر دی۔ وہ بھی کراہتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ وہ دونوں غنڈے ہوں گے لڑنا بھی جانتے ہوں گے لیکن اسٹریٹ فائٹنگ اور لڑائی کی ٹیکنیک کے استعمال میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

وہ دونوں سنبھل گئے تھے۔ اس مرتبہ ان دونوں نے بیک وقت میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ کوشش کے باوجود میں



اب کو نہیں بچا سکا۔ وہ مجھے رگیدتے ہوئے ایک دوسرے تک لے گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے مجھے پیچھے سے گرفت میں لے لیا اور دوسرا میرے پیٹ اور سینے پر ٹھونسنے پر سامنے لگا۔

اس دوران میں کار کا انجن اشارت ہونے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ روپ متی کی کار تھی جو ایک جھنگ سے حرکت میں آگئی تھی۔ اس کی چھت پر رکھا ہوا پرس بیچے مگر گیا۔

میں ان دونوں سے بچ رہا تھا مگر میرا دھیان روپ متی کی طرف تھا۔ وہ نشے میں تھی اور کار کو بڑے خطرناک انداز میں پارکنگ سے نکال کر لے گئی تھی۔ گیٹ پر بریکوں کی تیز چراہٹ کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد کار پھر خطرناک انداز میں اچھل کر آگے بڑھی تھی۔

وہ شخص اب بھی مجھ پر ٹھونسنے پر سارا ہوا تھا۔ ایک گھوٹا میرے منہ پر لگا۔ ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ میں نے اپنا سارا ہوجھ اس شخص پر ڈال دیا جس نے مجھے پیچھے سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اپنے آپ کو اور اٹھا کر میں نے دونوں چیز پوری قوت سے سامنے والے شخص کے سینے پر رسید کر دیے۔ وہ ہلکا ہوا اور لڑکھا کر پیچھے گرا۔

اپنے چیز زمین پر نکتے ہی میں بڑی تیزی سے نیچے جھکا۔ دوسرا شخص بھی میرے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں نے ان دونوں پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

”اے۔ کون ہے۔ ادھر کیا ہو رہا ہے؟“

یہ آواز سننے ہی وہ دونوں اٹھ کر پارکنگ ایریا کی عقبی سمت میں بھاگ نکلے۔ میں نے جبکہ کر روپ متی کا پرس اٹھایا اور گھرے گھرے سانس لینے لگا۔

وہ پارکنگ کا نگران تھا۔ اس نے روپ متی کی کار کو خطرناک انداز میں نکلنے ہوئے دیکھا تھا اور ہمارے لڑنے کی آواز سن کر اس طرف آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آ رہا تھا۔

”کیا ہوا حکم! وہ کون لوگ تھے؟“ اس نے میرے قریب آکر پوچھا۔ وہ مجھے پہلے روپ متی کے ساتھ دیکھ چکا تھا ورنہ ممکن ہے کسی شک میں مجھے ہی دھریلتا۔

”بد معاش تھے۔“ میں نے جواب دیا ”میری دوست کا پرس چھین کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھاگ گئے۔“

”نہ دھرنے وہ؟“ نگران نے پوچھا۔

”اس طرف۔“ میں نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا

”پیچھے بانٹا بیکار ہے۔ اب وہ ہاتھ نہیں آئیں گے۔“

نگران نے میرا مشورہ مان لیا اور ان بد معاشوں کا پیچ کرنے کی کوشش نہیں کی اور پھر میرے ہونٹوں سے خور بے دیکھ کر وہ چونک گیا۔

”آپ زخمی ہو حکم۔ آپ کے منہ سے رت (خون) بہ رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی ”آؤ۔ آپ کو کار کے پاس لے چلوں۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ معمولی چوٹ ہے۔ پریشان کی گڑ بات نہیں۔“ میں نے انگلیوں سے ہونٹ نڈتے ہوئے جواب دیا۔ نگران نے اپنی جیب سے رومال نکال کر میرا طرف بڑھا دیا۔

میں اس کے ہاتھ سے رومال لے کر ہونٹوں سے پڑ والا خون پونچھ لگا۔ مجھے روپ متی کی طرف سے تشویش تھی۔ وہ نشے میں تھی اور بڑے خوفناک انداز میں کار کو کار سے نکال کر لے گئی تھی۔ وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتی تھی۔

میں نگران کا شکریہ ادا کر کے پارکنگ سے باہر نکلا۔ گیٹ پر بھی ایک بادری کھن میں کھڑا تھا۔ وہ بھی مجھے روپ متی کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور ظاہر ہے اس نے روپ متی کو واپس جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ میں زنانہ پرس تھا اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ حالات میں مجھے کوئی اٹھائی گبری سمجھا جا سکتا تھا لیکن مجھ میں چونکہ مجھے پہلے روپ متی کے ساتھ کار میں یہاں تک دیکھ چکا تھا اس لیے اسے مجھ پر کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اسی برعکس اس کی نگاہوں میں تشویش تھی۔

”وہ گاڑی کس طرف گئی ہے۔ میرا مطلب ہے وہ روپ متی کی گاڑی؟“ میں نے گاڑی سے پوچھا اور ادھر ادھر دیکھ لگا۔

”کماری جی کی گاڑی اس طرف گئی ہے حکم۔“ گاڑی ایک طرف اشارہ کیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا مگر چند قدم چلنے کے بعد رک گیا۔ میرے دماغ میں اچانک ہی اندھیاں سی چلی گئیں۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ روپ متی اور ان حالات سے نجات حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ روپ متی شراب کے نشے میں بڑی تیزی سے گاڑی لے گئی تھی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ سکے گی۔ راستے میں وہ کسی خوفناک حادثے کا شکار بھی ہو سکتی تھی۔

میرے پاس روپ متی کا پرس تھا جس میں ہزاروں روپے کی رقم موجود تھی۔ میں یہ رات کہیں بھی گزار لیتا اور صبح سویرے پندر کے لیے روانہ ہو جاتا۔ وہاں کاشی کا نیشنل آرٹس ٹریننگ سینٹر تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ ہو گا اور مجھے یقین تھا کہ جاگتی بھی وہیں ہوگی۔ ہم دونوں کاشی کی مدد سے نہایت آسانی سے ہندوستان سے نکل سکتے تھے۔

یہ خیال آتے ہی میں ایک طرف چل پڑا لیکن چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے قدم ایک بار پھر رک گئے۔ میرا غریب مجھے حلاوت کر رہا تھا۔ جس عورت نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ بھاری رقم خرچ کر کے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدتا تھا میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔

اس نے مجھے تمام آسائشیں مہیا کی تھیں۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ میرے لیے کپڑے بنوانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر کے آئی تھی۔ کیا میں اس عورت کو دھوکا دوں جس نے میرے ساتھ اس قدر ہمدردی کا سلوک روا رکھا تھا؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں اس کی اپنی بھی کوئی غرض پوشیدہ تھی لیکن مجھے زب نہیں دیتا تھا کہ میں اس کے ساتھ دھوکا کروں۔ اس کے اعتماد کو نہیں پینچاؤں۔ میں نے تو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی کھلی جنگ لڑی تھی۔ بیٹھ لگا کر سامنے سے وار کیا تھا۔ میں نے تو واراچیہ دشمن پر بھی کبھی دھوکے سے وار نہیں کیا تھا۔ روپ متی تو میری محنت تھی۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور شخص مجھے خرید لیتا تو وہ مجھے غلام بنا کر بیٹھاتا۔

میرے گلے میں غلامی کا طوق ہوتا اور شاید بیچوں میں بیچاں بھی لیکن روپ متی نے میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو بڑے فخر سے اپنے جانے والوں سے دوست کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ہوٹل میں شراب کے نشے میں بھی لیکن اگر اس نے مجھے غلام کہہ بھی دیا تو غلط نہیں کیا تھا۔ میں اس کا غلام ہی ہوتا تھا۔

جھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ ایک اس وقت وہ میری ہمدردی اور توجہ کی مستحق تھی۔ اسے میری ضرورت تھی۔

نیک۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ دھوکا اور فریب میری حرمت میں شامل نہیں تھا۔ میں نے سر جھٹک کر پر آئندہ خیالات کو ذہن سے نکال دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ہوٹل کے گیٹ کی طرف سے ایک خالی عینکی اسی طرف آ رہی تھی۔ میں نے عینکی کو رکنے کا اشارہ کیا اور عینکی جیت ہی میرے قریب رکی، میں جھٹ سے پچھلی سیٹ کا

دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میرے ہونٹوں سے اب بھی خون رس رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا رومال بھی خون سے تر ہو چکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے کو ایڈجسٹ کر کے مجھے دیکھا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے بغیر بولا۔

”کہاں چلوں حکم۔ اسپتال یا پولیس اسٹیشن!“

”سیدھے چلتے رہو۔ میں تمہیں راستہ بتا دوں گا۔“ میں نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے کہا ”وہیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔“

”منہ پر چوٹ کیسے لگی حکم؟“ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں دو غنڈوں نے میری دوست کا پرس چھیننے کی کوشش کی تھی۔ پرس اور اپنی دوست کو بچانے کی کوشش میں ان میں سے کسی کا ہاتھ پڑ گیا۔“ میں نے جواب دیا۔

عینکی کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے راستوں کا پتا چل جائے گا مگر بڑی باؤسی ہوئی۔ ڈرائیور میری ہدایت پر عینکی کو مختلف سڑکوں پر کھماتا رہا اور بالآخر اس نے ایک جگہ عینکی روک لی۔

”رات کے دو بج رہے ہیں حکم۔“ اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر پولیس والوں نے روک لیا تو تمہارا طریقہ دیکھ کر تمہیں تھانے پہنچا دیں گے۔ تمہیں جانا کہاں ہے۔ مجھے جگہ کا نام بتاؤ۔“

”جگہ کا نام ہی تو بتا نہیں۔“ میں نے گھرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اس شہر میں نیا ہوں۔ وہ راستہ بھی بھول گیا ہوں جس طرف سے آتا تھا۔“

”کسی ہوٹل یا گیٹ ہاؤس یا کسی کے گھر مہمان ٹھہرے ہوئے ہو؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”روپ متی۔ راج کماری روپ متی نام ہے اس کا۔ میں اسی کی حویلی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ایسا بولنے کا ہے نا۔“ ڈرائیور رسید ہوا جو کابینہ گیا اور عینکی ایک جھنگ سے آگے بڑھا دی۔

اور پھر ٹھیک پندرہ منٹ بعد عینکی روپ متی کی حویلی کے گیٹ کے سامنے رک رہی تھی۔ میں نے پرس بھول کر ڈرائیور کو منہ مانگا کرایہ ادا کر دیا اور آگے بڑھ کر گیٹ کے ستون پر نصب کال بیل کا بھنسا دیا۔

دو منٹ بعد گیٹ کی پھونکی سی ٹھکڑی سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور پھر ذیلی دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ تارا سنگھ تھا جو عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا

تھا۔

”روپ متی آگئی یا نہیں؟“ میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔  
”ماکن تو آگئی۔ بہت دیر ہوئی۔“ تارا اٹھ کے جواب دیا۔

میں تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے چلا گیا۔ پورچ میں لینڈ کروزر کے پیچھے مرسیڈز کھڑی تھی۔ میں جیسے ہی برآمدے میں داخل ہوا دروازہ کھل گیا۔ وہ مندری بھی جواب تک جاگ رہی تھی اور اس نے غالباً جالی والے دروازے سے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

”روپ متی کہاں ہے؟“ میں نے مندری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اوپر۔ اپنے کمرے میں۔“ مندری نے جواب دیا مگر تمہیں کیا ہوا۔ یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری؟“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔  
”بھڑا ہو گیا تھا۔“ میں یہ کہتے ہوئے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

روپ متی اپنے کمرے میں موجود تھی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے لیے یہ اطمینان کا کافی تھا کہ روپ متی خیریت سے تھی۔ اسے راستے میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ البتہ وہ گھر آنے کے بعد اپنا غصہ اس طرح اتار رہی تھی کہ اس کا کمرہ کسی میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ کچھ اور بھڑکی اور بید پر پڑی ہوئی لوشن کی ایک بوتل اٹھا کر میری طرف پھینچ ماری۔ میں بڑی پھرتی سے جبک کر اپنے آپ کو بچا گیا۔ بول دیوار پر لگ کر ٹوٹ گئی۔ لوشن بکھر گیا۔ کمرے کی فضا میں تیز خوشبو پھیل گئی۔

روپ متی اب بھی نشے میں تھی۔ وہ کوئی اور چیز اٹھانے کے لیے جھکی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہانوں میں پکڑ کر جھنجھوڑا لیا۔

”ہوش میں آؤ روپ متی۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تم نشے میں ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کیا کر رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔“

”ممہ میں نشے۔“ میں ہوں۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اور اپنے آپ کو مجھ سے جھڑا کر دو قدم دور بیٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی شرت کے گریبان پر رکھے اور ایک

زور دار جھٹکے سے قیص پھاڑ ڈالی ”یہ یہ دیکھو۔ شرت سیدھی پھٹی ہے۔ اب اگر میں نشے۔ میں ہوتی تو یہ قیص سیدھی۔ نہ پھٹتی۔ ممہ۔ میں۔ میں نشے میں ٹھنک ہوں۔ تم نکل جاؤ۔ یہاں سے۔“

میں نے اصرار اور دیکھا۔ بند سائیڈ ٹیبل پر پانی کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے جگ اٹھا کر روپ متی پر انڈل دیا۔ چچا اٹھی اور مارنے کے لیے میری طرف لپکی۔ میں نے اسے گمے دونوں ہاتھ اپنے ایک ہاتھ کی گرفت میں لے لیے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر دو چار کراہے طعنے چڑھ دیے۔ وہ چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے چند گندی گالیاں بھی نکلی تھیں مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی اور اسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تھپڑوں سے ابو کا داغ ٹھکانے پر آ گیا تھا۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ میرے سامنے کھڑی چند لمحوں میری طرف دیکھتی رہی اور پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

مجھے روپ متی کی حالت پر واقعی ترس آ رہا تھا۔ وہ لپٹی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ میں اس کے ہالہ میں اٹھیاں پھیرنے لگا۔ اس دوران میں آہٹ سن کر مجھ نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر مندری کھڑی تھی۔ وہ غالباً میرے پیچھے ہی اوپر آگئی تھی اور باہر کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔

میں نے روپ متی کو بیڈ پر ڈال دیا۔ وہ بستر اور اندر پڑی سسکیاں بھرتی رہی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ مندری آگے آتا چاہتی تھی مگر میں نے اسے واپس جانے اشارہ کیا اور اندر ہی پڑی ہوئی ایک کرسی سیدھی کر کے کے قریب بیٹھ گیا۔

روپ متی اور اندر ہی پڑی سسکیاں بھرتی رہی۔ اس کے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں چند لمحوں اس کی طرف دیکھا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا جس میں مجھے تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔

لوشن کی جو بوتل دیوار پر لگ کر ٹوٹی تھی اس کی کچلا دیوار کے قریب بکھری ہوئی تھی۔ میں نے مولی مولی لٹا اٹھا کر ایک طرف ڈال دیں۔ لوشن مرنے سے قایل ہو پڑ گیا تھا۔

میں دوبارہ بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھا تو روپ متی وقت بھی بستر پر اندر ہی پڑی تھی اور سسکیاں اب بھی باہر

”ماکن!“ میں نے دھتے لہجے میں بکارا تو وہ ایک جھٹکے ہاتھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”تم نے پھر مجھے ماکن کہا۔“ اس کے لہجے میں اب بھی ایسا بیکہاٹ تھی۔

”میں تو آپ کا غلام ہوں ماکن۔“ میں نے جواب دیا اور کئی غلام اپنی ماکن سے بد کمیزی کے بات نہیں کہتا۔ بول میں مجھ سے گستاخی ہوئی تھی۔ اس کی معافی مانگنا ہوتا تھا۔“

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیا اور مجھ سے لڑا ایک بار پھر رونے لگی۔ پہلے میں مجھے میں تھا لیکن اب مجھ سے کچھ دور تھا۔ وہ مجھ سے لپٹی تو میں اپنے آپ میں عجیب طبعی محسوس کرنے لگا۔ میں اسے الگ بٹانا چاہتا تھا مگر ہاتھ مجھے جتنی جتنی سے اپنی ہانوں کے قہقہے میں لے رکھا اور جب میں اسے اپنے سے الگ کرنے میں کامیاب ہوا تو شاید پہلی مرتبہ توجہ سے میری طرف دیکھا تھا۔ میرا ناگوار ہوا ہوا ہونٹ دیکھ کر وہ اٹھ پھل پڑی۔

”یہ یہ کیا ہوا؟“ وہ میرے ہونٹوں کو انگلی سے دے رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔ ٹھوکر لگنے سے گر گیا تھا۔ منہ پر چوٹ لگ گئی۔“ میں نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”بعض لوگ کو کوشش کے باوجود ڈھنگ سے جھوٹ بھی لے لے سکتے اور تم بھی ان میں سے ایک ہو۔“ اس نے اپنے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”بھڑا کیا ہوا تھا۔“

”تم نے کئی کچھ؟“

”میں نے افسوس ہے۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی ”میری وجہ اس سے نیند نہ آنا تھا۔“

”میں نے نیند سے اتار کر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی فوراً مٹا دی۔“ اس نے اور میڈیسن کی کینٹ کھول کر اس کی ہاتھ دھوئی کہ ایک بوتل نکالی اور کانٹن کے ایک رول سے غوراً غور اس کے گال پر لگ کر لگی۔

”اب تم میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ میرے اور تمہیں جتنی چار آنچ کا فاصلہ تھا۔ اس کی قیص سامنے نہ دیکھ رہی تھی اور وہ لوشن سے بھیجی ہوئی کانٹن سے میرے ہاتھ پر لگ رہی تھی۔ میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سینے میں بائبل سی پئی ہوئی تھی۔ میں اس کی

طرف سے نظریں چراتے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری نظریں کم بخت بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لوشن کی بوتل اور کانٹن لے لی۔

”لاؤ۔“ میں خود لگا لیتا ہوں۔ تم کمرے میں جا کر کپڑے بدل لو۔“ میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ رخسار پر پڑنے والا ننھا سا ڈھیل پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگا۔

”اوہ! سمجھ گئی۔“ وہ بولی ”ہونٹ صاف کر کے وہ کرم لگا لینا۔“ اس نے کینٹ میں رکھی ہوئی ایک ٹوب کی طرف اشارہ کیا اور ہاتھ روم سے باہر نکل گئی۔

میں دیوار میں لگے ہوئے قہقہہ آدم آئینے کی طرف غوم گیا۔ میرا ننھا ہونٹ درمیان سے گٹ گیا تھا۔ اوپر کا ہونٹ بھی سو جا ہوا تھا۔ میں نے خون اچھی طرح صاف کر کے ٹوب والی کرم لگائی اور ہاتھ روم سے باہر نکلیا۔

روپ متی کپڑے بدل چکی تھی۔ میں نے ایک نظراس کی طرف دیکھا اور پھر بار بار نکل گیا۔ میری توقع کے عین مطابق مندری بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کافی بنا کر لانے کو کہا اور دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ روپ متی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہوٹل میں جو کچھ بھی ہوا تھا مجھے اس کا بے افسوس ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے جو کچھ بھی کیا بہت ٹھیک کیا۔“ روپ متی نے جواب دیا ”شرمندگی تو مجھے ہے کہ میں نے نشے میں تمہیں نجانے کیا کچھ کر دیا تھا۔ اس بات کی خوشی بھی ہے کہ کوئی تو میرا ہاتھ روکنے والا ہے۔ جسے مجھ سے واقعی ہمدردی ہے۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا بلکہ گلاس بھر بھر کے مجھے اپنے ہاتھ سے پلاتا۔ سب لوگ اب تک ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ تم ان لوگوں سے بالکل مختلف ثابت ہوئے ہو۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کئی لمحات خاموشی میں بیت گئے۔ وہ ایک بار پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”تم نے موقع سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ میں تمہیں ہوٹل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ اس وقت میں نشے میں تھی۔ ہوش میں نہیں تھی۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوسکا تھا کہ

تمہیں چھوڑ کر جاری ہوں۔ تم اگر چاہتے تو کہیں بھی جاسکتے تھے۔ تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر تم سیدھے یہاں چلے آئے اور یہاں آکر بھی تم نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی اور ہو تا تو بھیڑیے کی طرح رات بھر مجھے بنیوڑا رہتا۔ میرے شریر (بدن) کی ہونیاں نوچا رہتا۔ میں نشے میں تھی۔ مجھے کچھ پتا نہ چلتا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مگر تم مجھے تھپڑ مار مار کر ہوش میں لے آئے۔ وہ بات کرتے ہوئے اپنے گال مسلاتے گئے۔

میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں گالوں پر میری انگلیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ غصے میں ہاتھ زیادہ ہی سخت دیکھا تھا۔

”مجھے افسوس ہے۔ مجھے تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“ میں نے ندامت کا اظہار کیا۔

”نہیں۔ تم نے بہت ٹھیک کیا۔“ روپ متی بولی ”اگر تم ہاتھ نہ اٹھاتے تو میں ہوش میں نہ آتی اور مجھے ان باتوں کا احساس بھی نہ ہوتا۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”یہ درست ہے کہ تم نے مجھے ایک بڑی رقم خرچ کر کے خرید لیا تھا لیکن تم نے میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ تم میری محنت ہو اور میں اپنی محنت کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”بہاد تو میں پہلے ہی ہو چکی ہوں۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”لیکن مجھے خوشی ہے کہ تمہاری صورت میں مجھے ایک ایسا آدمی تو ملا ہے۔ مجھ سے واقعی ہمدردی ہے۔ جو میری بھلائی چاہتا ہے۔ جو میرا ہاتھ روک سکتا ہے اور مجھے طمانچہ دے سکتا ہے۔“

”اپنی بربادی کی ذمہ داری تم خود ہو۔“ میں نے کہا ”میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ عورت کمزور ہوتی ہے اور مرد اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عورت کے بارے میں میرا نظریہ دو مردوں سے مختلف ہے۔ میں عورت کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔ عورت ہی مرد کو جنم دیتی ہے اور عورت ہی کے وجود سے مرد توانائی و قوت حاصل کرتا ہے۔ عورت ماں ہو سکتی ہے، بہن ہو سکتی ہے، بیٹی ہو سکتی ہے، بیوی ہو سکتی ہے مگر کنیز اور لونڈی نہیں ہو سکتی۔“

”اس میں شبہ نہیں کہ خدا نے عورت کو مرد کی تسکین کے لیے بنایا ہے۔ اس میں وہ کشش پیدا کی ہے کہ مرد بے اختیار اس کی طرف ہٹتا چلا جاتا ہے اور اس کشش کی

بدولت اپنے ظاہری غلبے کے باوجود اندر سے مظلوم ہے۔ بڑے بڑے جاہلوں فاتح اور رستم نال اور عورت کے سامنے اپنے اقتدار و حکم کو بالائے طاقت جھک جاتے ہیں۔

”عورت کمزور نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو لیا ہے۔ میرا کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عورت ہے اور وہ مردوں پر حکومت کر سکتی ہے اسے اپنی لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اندر کی طاقت مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کے ظلم و ستم کا شکار ہو سکتی ہے۔ اگر عورت اپنے اندر کی طاقت کا ادراک وہ اس طرح برباد نہ ہو مگر آئیہ یہ ہے کہ عورت نے کمزور سمجھ لیا ہے اور مرد اس کے اس احساس فائدہ اٹھا کر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے اور کاجی بھر جاتا ہے تو اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔“

”تم پہلے مرد ہو جو عورت کے حق میں اسی رہے ہو۔“ روپ متی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ میں عورت کی عقلیت نہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مرد و زانے میں داخل ہوتے کچھ خاموش ہو گیا۔

”اے۔ تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟“ وہ چونک کر کہا۔

”میرا خیال ہے جس کے دل میں تمہارے بھی ہمدردی ہے وہ چین کی نیند نہیں سو سکتا۔“ تم جس حالت میں گھر میں آئی تھیں اس سے تو چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے کافی لا۔ میں نے ہی کہا تھا۔

روپ متی کو پرسکون دیکھ کر مندردی کے رونق سی آگئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں صورت سیڑھے اٹھا رکھی تھی جس میں کافی کد ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک گہک ڈریسنگ ٹیبل پر، جگہ بنا کر رکھ دیا اور دوسرا در قریب سائیڈ ٹیبل پر۔ دونوں گد دیکھ کر میں دل مندردی کی ذہانت کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دودھ والی تھی اور روپ متی کے لیے بچہ دودھ کی روپ متی اٹھ کر ہاتھ روم میں گئی تھی اور کے چھینے مار کر واپس آگئی۔ میں نے کمرے میں چپڑیں سمیٹ کر ایک طرف ڈال دی تھیں۔ اٹھا کر سینے سے ان کی جگہوں پر رکھنے لگی۔

”جا کر سو جاؤ مندردی۔“ روپ متی نے اس کی طرف اشارہ کیا ”چارج رہے ہیں۔ یہ کام صبح کر لیتا۔“

میں نے کام چھوڑ دیا۔ اس نے ایک نظر روپ متی دیکھا اور پھر میری طرف دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

”کیوں کے دوران میں گفتگو کا سلسلہ ایک بار ٹھکا۔ موضوع وہی تھا۔ عورت کی کمزوری۔ میں اپنی اور جاگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ بھی عورتیں رانہوں نے اپنے اندر کی طاقت استعمال کی تھی اور یہاں مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بڑی دلیری سے دنیا کے ترین مردوں کا مقابلہ کرتی آئی تھیں اور تھکی نے تو ہارے وہی تھی مگر مرد کی طاقت کے سامنے سر نہیں اٹھا اور جاگی اب بھی میرے شانے بٹانہ صورت حال کا ردی تھی۔

اگلی اور تھکی کے بارے میں ذرا تفصیل سے جان کر فی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

”اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔“ روپ متی میرے ہونے پر بولی۔

”کس بات کا افسوس؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے طرف دیکھا۔

”تمہاری دوست جاگی کو تم سے جدا کرنے لگا۔“ اس نے ”تاکر بھنور سنگھ کی سناات سے وہ اسے بھی چکادے گا۔ کاش! اچھے پتا ہو تاکہ وہ کہاں ہے؟“

”میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ بھنور سنگھ تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے اس سے تھوڑی دیر کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے عورت کی عقلیت کا دلا تھا اور وہ اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اب اسے ٹھٹھے لگ کر نہ کیا چیتا تھا اور ہاتھوں میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

”اگر وہ اب بھی خفا کر بھنور سنگھ کے پاس ہوتی تو میں بچنے لے آتی۔“ روپ متی نے جواب دیا۔

”بہت خوشی کے میزائل ہلیوں اچھٹے لگا۔ مجھے اس کی بات سن کر تھیں۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا، خلوص انداز میں اس کا پتا بتا دوں تو کیا تم اسے لے آؤ گی؟“

”میں نے اسے لے کر نہیں جاتا۔“ میں نے کہا۔

”اب اس طرح میں اپنی زیادتی کا پراپت (تلافی) نہیں کر سکتا۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”میں کیا چاہا کہ کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی؟“

”میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا۔“ وہ اچھل پڑی ”جاگی بیکٹر میں غائب ہوئی تھی۔ تم اس وقت سے میرے پاس ہو۔ اب سے پہلے تم حویلی سے بھی باہر نہیں گئے تھے۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس کے بارے میں جانتے ہو جبکہ بیکٹر بھی یہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ہے۔“

”وہ بیکٹر میں غائب ہوئی تھی اس لیے جانتا ہوں وہ کہاں ہوگی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تم پہیلیاں بھجوا رہے ہو۔“ اس نے مجھے گھورا ”یا میں یہ سمجھوں کہ تم دونوں سے پہلے ہی سے ایسا کوئی منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اپنے آقا کی قید سے فرار ہو کر کہاں پہنچنا ہے۔“

”ہمارا پتلے سے کوئی منصوبہ نہیں تھا۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے کاٹنی کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں ”میں کہہ رہا تھا ”بیکٹر کچنچ کر جاگی کو بھی کاٹنی کا خیال آیا ہوگا اسی لیے وہ ہاتھ روم جانے کے بجائے ہونٹ سے غائب ہو گئی۔“

”اوہ! روپ متی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

”جب تمہیں معلوم تھا کہ جاگی کہاں ہو سکتی ہے تو تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی جبکہ تمہیں آج رات موقع بھی میسر تھا؟“

”میں نے کہا تاکہ میری سرشت میں دھوکا اور فریب شامل نہیں ہے اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں کبھی تمہارے احماد کو نہیں نہیں پہچاؤں گا اور تمہیں میرے وہ الفاظ بھی یاد ہوں گے۔“

”کون سے الفاظ؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”میں نے کہا تھا کہ زندگی بھر تمہارا غلام بن کر یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور یہاں سے جاؤں گا لیکن تمہیں دھوکا دے کر نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”بے شک مجھے فرار ہونے کا بہترین موقع حاصل تھا لیکن میں کبھی تمہارے ساتھ دھنیا نہیں کروں گا۔ میں یہاں سے اس طرح جاؤں گا کہ تم خود مجھے رخصت کرو گی۔“

”شاید ایسا ہی ہوگا۔“ روپ متی نے غنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا ”تم نے میرے اوپر احسانات کا اتنا بوجھ لا دیا ہے کہ میری گردن جھکتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہیں ہر پابندی سے آزاد رکھا تھا اور اب تو میں پابندی کا کوئی خیال ذہن میں بھی نہیں لاسکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تین لاکھ روپے خرچ کر کے مجھے ایک اچھا دوست مل

گیا ہے۔ بہت ہی اچھا دوست۔“

”دوست اور دوستی۔“ میں نے کہا ”کسی سیانے نے کہا ہے کہ جب کوئی دوست بناؤ تو اپنے دل میں ایک قبرستان بھی بنالو جس میں اس کی تمام برائیاں دفن کر سکو۔ تم نے اب تک جتنے بھی دوست بنائے ہیں وہ سب دوستی کے مفہوم سے نا آشنا تھے۔ تم بھی نہیں جانتی تھیں کہ دوستی کیا ہوتی ہے۔ تم نے اپنی تعریف کرنے والے ہر شخص کو اپنا دوست سمجھا اور تنقید کرنے والے کو اپنا دشمن گردانا۔ ابن الوقت لوگ دوسروں کی تعریف کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو طوطے کی طرح نظرس پھیر لیتے ہیں۔ اچھا دوست وہی ہے جو تمہیں غلط کاموں سے نوکے تم پر تنقید کرے۔ ممکن ہے تمہارے حلقے میں ایسے لوگ بھی رہے ہوں جنہیں تم نے اپنا دشمن اور حاسد سمجھ کر چھوڑ دیا اور تم ایسے لوگوں کے جال میں پھنسی رہیں جو تمہاری چال چوری کر کے تمہاری تعریفیں کر کے تمہاری دولت اور تمہارے حسن و شاپ سے فیض یاب ہوتے رہے اور تم بخوشی ان کے ہاتھوں لیتی رہیں۔ میں نے ابھی کہا تھا تاکہ دوست بنانے کے ساتھ اپنے دل میں ایک قبرستان بھی بنانا پڑتا ہے جس میں دوست کی برائیوں کو دفن کیا جاسکے۔ تمہیں بھی اپنے دل میں ایک قبرستان بنانا پڑے گا جس میں میری برائیاں گودفن کر سکو۔ میں بھی انسان ہوں۔ میرے اندر بھی بہت سی برائیاں ہیں اور۔“

”نہیں۔“ روپ متی نے مجھے ٹوک دیا ”تمہارے اندر کوئی برائی نہیں ہو سکتی۔“

”یہ تو تمہاری اعلیٰ طرفی ہے کہ تمہیں میرے اندر ابھی تک کوئی برائی نظر نہیں آتی لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ انسان کو پرکھنے کے لیے ایک یا دو ملاقاتیں کافی نہیں ہوتیں۔ اسے جاننے اور پہچاننے کے لیے اس کے اندر بسنا پڑتا ہے۔ ایک ملاقات میں دوستی کرنے والے لوگ ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں اس لیے پہلے انسان کو پرکھ لو جانو پھر دوستی کا دعویٰ کرو۔ اگر تم دوستی کو سچے دل سے نبھاؤ گی تو دوستی کا اصل مقام بھی پالو گی۔“

”میرے تمہارے اندر بے بغیر تمہیں جان چکی ہوں اور تمہیں پرکھ بھی لیا ہے۔“ روپ متی نے مسکراتے ہوئے کہا ”دیے تم باتیں بہت اچھی کر لیتے ہو لیکن اس وقت ہم تمہاری دوست جا چکی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔“

”جا چکی تمہاری بھی بہت اچھی دوست ثابت ہو گی۔“ میں نے کہا۔

”اسے بھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“ بتایا تھا تم نے اس لڑکی کا؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھ دیکھنے لگی۔

”کاشی۔“ میں نے جواب دیا ”وہ ہمیں بچے پورے والی ہے۔“ پشکر میں تو اس کا مانا ہے۔ اس کے مانے (باپ) بچے پورے ہی میں ہیں۔ برا مزہ پر ہم خاندان کے باپ کا نام بھی یاد نہیں رہا لیکن چند سال پہلے کا میٹر (MAYER) بھی رہ چکا ہے۔“

”اوہ۔ تم پنڈت ہری رام کی بات تو میں کر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”شاید یہی نام ہے۔“ میں نے اثبات میں گویا ”اگر کاشی پنڈت ہری رام ہی کی بیٹی ہے تو رات جا چکی اس حویلی میں ہمارے ساتھ بیٹھی کھانا ہو گی۔“ روپ متی نے کہا ”دیے بھی میں تم سے ہوں کہ کل رات جا چکی ہر حالت میں یہاں ہو گی۔ پشکر میں کاشی کے پاس ہوئی تو۔۔۔“

”مجھے یقین ہے وہ وہیں ہو گی۔“ میں نے جواب کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر دن کی روشنی پہلے آ باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اسے اٹھ گیا ”رات آنکھوں میں بیت گئی۔ اب تمہیں بھی نیند آ رہی ہو گی۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ مسکرا دی ”دل تو چاہتا ہے زندگی تمہارے سامنے بیٹھی تمہیں دیکھتی رہوں۔“ زبان سے نکلنے والے شہ (الفاظ) سنتی رہوں لیکن تمہیں نیند آ رہی ہے۔ تم نہیں سو جاؤ۔ میرے بلگ قالین پر لیٹ جاؤ گی۔“

”تم آرام سے اپنے بستر سو جاؤ۔ میں مجھ اپنے کمرے میں۔“ میں نے کہا۔

”اور ہاں۔“ روپ متی نے کہا ”کل ہفتہ کھاتے ہی ہم پشکر روانہ ہو جائیں گے۔ میں جاؤ گی۔“

میں نے ایک لمحے اس کی طرف دیکھا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

میں اپنے بستر لیٹا دیر تک روپ متی سے سوچتا رہا۔ وہ قریب کا شکار ہوتی رہی تھی۔ اسے دھوکا دیا گیا تھا۔ اسے محبت کی تلاش تھی لیکن پھنسی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے دھرم سے بغاوت کی تھی۔ اسے سمجھانے والا کوئی نہیں

لا، بہن گنگا سمجھ کر ہاتھ دھوتا رہا لیکن اس کے بارے میں میرا اندازہ بڑی حد تک درست نکلا تھا۔ اس کی رنگوں میں شریف ماں باپ کا خون تھا۔ مجھ سے بھی ذرا سی بد روئی ملی۔

میت کے دیوہل سے تو رو پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسے کوئی چاروت مل جائے تو وہ راہ راست پر آ سکتی تھی۔

میں منج بچے کے قریب سویا تھا اور مجھے دو بچے کے قریب جھجھوڑ کر دیا گیا۔ وہ روپ متی تھی جو میرے اوپر فحش کلاموں سے بکڑے مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔

مجھے بستر چھوڑنے میں پندرہ منٹ لگ گئے اور پھر پندرہ ہیں منٹ تک میں ہاتھ دھو میں شاور کے ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا ہوا۔ اس طرح دماغ کی پیش اور ساری کسل مندی دور ہو گئی۔

تین بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا اور چار بجے کے قریب ہم لینڈ کروڑ پر پشکر کے لیے روانہ ہو گئے۔ روپ متی نے تارا سنگھ کو بھی ساتھ لے لیا تھا جو رات نقل سنبھال کر گچی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

بچے پورے اجبر جانے والی شاہراہ اگرچہ کافی کشادہ تھی لیکن اس سڑک پر ٹریفک کی بھی بھرمار تھی۔ بچے پورے اجبر پشکر بوجھ پور، چٹوڑ گڑھ اور صوبہ ہجرات اور مدھیہ پردیش آنے جانے والا سارا ٹریفک اسی پینٹل ہائی وے سے گزرتا تھا۔

شرے کئی میل آگے نکل آنے کے بعد ہائی وے کے دونوں طرف ریگستان شروع ہو گیا۔ اس وقت دھوپ تیز تھی۔ ریگستان کی طرف دیکھتے ہوئے لگتا تھا جیسے الاؤ دھک رہے ہوں۔ باہر یقیناً شدید گرمی ہو گی لیکن لینڈ کروڑ میں ”اسے سی“ چل رہا تھا اور اندرونی فضا بڑی خوشگوار تھی۔

روپ متی پر میری رات کی باتوں کا خاصا اثر ہوا تھا اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس وقت اس نے ہم عیال لباس کے بجائے پنڈت اور لی شرت پنن رکھی تھی۔ میں نے بھی دھرمیش ٹی کا دوسرا جوڑا پنن لیا تھا۔ یہ بھی جینز اور لی شرت ہی تھی۔

میرا نیچے کا ہونٹ کچھ زیادہ ہی سوج گیا تھا اور مجھے بات کرنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ دوا لگی سے پہلے میں نے کم ہونٹوں پر لگائی تھی اور وہ ٹوب بھی گاڑی کے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ لی تھی۔

اس وقت ہم دھرمیش اور تیج سنگھ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ روپ متی کا خیال تھا کہ اب وہ حویلی کا رخ نہیں کریں گے مگر مجھے روپ متی سے اختلاف تھا۔ ابھی تو وہ

دونوں بھائی اپنی چوٹیں سلا رہے ہوں گے اور مجھے یقین تھا کہ وہ موقع ملنے ہی کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ انہیں ذلت میری وجہ سے اٹھانی پڑی تھی اور میں یہ بات بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ان کا نشانہ بھی میں ہی ہوں گا۔

بچے پورے پشکر کا فاصلہ اگرچہ ڈیڑھ سو کلومیٹر سے کچھ کم ہی تھا اور روپ متی کا خیال تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹوں میں وہاں پہنچ جائیں گے مگر تقریباً سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہونے سے پہلے ایک زوردار دھماکا ہوا اور لینڈ کروڑ سڑک پر لہرا گئی جسے روپ متی نے بڑی مہارت سے سنبھال لیا۔

گاڑی کا اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ روپ متی بہت آہستہ آہستہ گاڑی کو چلاتی ہوئی بستی تک لے گئی اور ایک ڈھابے کے سامنے روک لی۔ سڑک پر کچھ اور گاڑیاں بھی تھیں۔ آنے جانے والی ہیں تھوڑی دیر کے لیے یہاں رکتی تھیں۔ فضا میں اب بھی جسم کو ٹھنڈا دینے والی پیش تھی۔ گاڑی میں اگرچہ فاصلہ ٹائر موجود تھا مگر روپ متی جانتی تھی کہ برسٹ ہونے والا ٹائر بھی درست کر دیا جائے کیونکہ راستے میں اس قسم کا کوئی اور حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔

ہم گاڑی سے اتر کر ڈھابے کے سامنے نیم کے درختوں کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تارا سنگھ کسی پکچر لگانے والے کو تلاش کرنے چلا گیا۔ اس کی داہنی پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والا آدمی گاڑی کے نیچے جبک لگا کر پیا نکال کر لے گیا تھا۔ تارا سنگھ ہمارے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ روپ متی نے کولڈ ڈرنکس منگوا لیے اور ہم بھلتی ہوئی فضا میں ٹھنڈے مشروب کی چسکیاں لیتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور ٹھیک اسی وقت میری نظر سڑک کی دوسری طرف ایک کار کی طرف اٹھ گئی۔ مخالف سمت سے آنے والی سرخ رنگ کی وہ کار اس وقت وہاں آکر رکی تھی۔

اس کار میں اسٹینرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ چٹوڑ گڑھ کا راج کمار بلونت سنگھ تھا۔ کار کی چیمپلی سیٹ پر بڑی بڑی مونچھوں اور خوفناک شکل والا ایک گن مین بیٹھا ہوا تھا۔

بلونت سنگھ نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ وہ چونک سا گیا اور پھر اس کی نظروں میں نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے روپ متی کو اس طرف متوجہ کیا۔ بلونت

نگھہ کو دیکھ کر روپ متی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔  
بلونت نگھہ اپنی کار سے اتر گیا اور اپنے تلے قدم اٹھاتا

ہو اس کو بار کر کے ہماری طرف آنے لگا۔  
”تم بیٹھی رہو۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ جو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ  
سکے گا۔“ میں نے روپ متی کا ہاتھ ہتھکتا یا اور دو واہ کھول  
کر نیچے اتر آیا اور گاڑی کے سامنے سے گھوم کر روپ متی  
والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

بلونت نگھہ کا گن میں بھی کار سے اتر گیا تھا۔ اس نے  
را نقل دونوں ہاتھوں میں اس طرح تھام لی تھی کہ اسے کسی  
بھی لیے استعمال کر سکتا تھا۔

بلونت نگھہ نے تلے قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے رک  
گیا۔ اس کی نظریں شعلے اگل رہی تھیں اور میں کسی بھی  
طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار  
کر چکا تھا۔

”میں کسی زر خرید سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔  
سامنے سے ہٹ جاؤ۔“ بلونت نگھہ خوں خوار نظروں سے  
میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ  
نمایاں تھیں۔

”ماں تک پہنچنے سے پہلے تمہیں اس زر خرید سے سی  
بات کرنی ہوئی۔“ میں نے پر سکون لہجے میں جواب دیا ”دوینے  
تم بہت ڈھیٹ ہو اور بے غیرت قسم کے آدمی ہو۔ اس رات  
جنگل میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد تو تمہیں کہیں ڈوب مرنا  
چاہیے تھا۔“

”اے!“ وہ بھیڑیلے کی طرح غرایا ”اپنی اوقات میں  
رہ۔ تو جانتا نہیں کس سے بات کر رہا ہے۔ چھمکی طرح چٹکی  
میں مسل کر رکھ دوں گا۔ اس رات دھوکے سے تمہارا واؤ  
چل گیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہت بڑے سورا ہو۔  
اس وقت میرے ایک اشارے پر تم زندگی بھر کے لیے  
سلاخوں کے پیچھے پھنچ جاؤ گے۔“

”کوئی اشارہ کرنے سے پہلے ہی میں تمہاری انگلی توڑ  
دوں گا اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ تم ایسا کرنے کی ہمت  
نہیں کر سکتے۔ اس رات جنگل میں گرنے والی چار لاشوں میں  
زیادہ حصہ تمہارا ہے میرے ہاتھوں تو صرف ایک آدمی مارا  
گیا تھا۔ ایک تمہارے گر گئے کے ہاتھوں مرا تھا اور دو  
تمہاری گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ اب اگر تم کسی کو اشارہ  
کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔“ میں نے جواب دیا۔ میری نظریں  
اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

ایک لمبے لمبے بلونت نگھہ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے

لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

اس دوران میں روپ متی اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھ  
رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑی سختی سے اسٹیرنگ پر  
رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے سائے غم  
کر رہے تھے۔

مارا نگھہ بھی گاڑی سے اتر گیا تھا۔ وہ را نقل سنبھال  
گاڑی کی آڑ میں اس طرح کھڑا ہو گیا تھا کہ سڑک کی دواہ  
طرف کھڑا ہوا بلونت نگھہ کا باؤں گاڑی اس کی را نقل کی دواہ  
تھا۔

لوگ ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے کسی نے:  
پر توجہ نہیں دی تھی۔ کاروبار حیات معمول کے مطابق چار  
تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ موسم کی حدت میں یہاں کیا  
قسم کا لاوا بھی کھول رہا ہے۔

”بلونت نگھہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جمایا  
ہوئے کہا ”ایک بار تم گدھے کی طرح میرے ہاتھوں پر  
ہو اور ذلیل ہو چکے ہو۔ وہاں تمہارا حشر دیکھنے والے بھی  
ہو گئے تھے لیکن اگر تم اس بھرے بازار میں دوبارہ ذلیل  
چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تمہیں پا  
کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ اٹھاؤ ہاتھ۔“

بلونت نگھہ خوں خوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔  
کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن زبان سے ایک لفظ تک  
نکلا۔

”میں جانتا ہوں تم میں اتنی جرأت نہیں ہے۔  
نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ”تم مجھ سے اور  
متی سے اپنی ذلت کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ ضرور۔ لیکن  
کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ میں روپ متی کا  
ہوں۔ اس کی طرف اٹھنے والا ہر ہاتھ جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا  
دوں گا۔“

بلونت نگھہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا  
پھر اس نے ایک نظر روپ متی کی طرف دیکھا اور کچھ  
پلیٹ کر تیز تر قدم اٹھاتا ہوا اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ کار  
قریب کھڑے ہوئے گن میں نے کار کا دروازہ کھول دیا  
بلونت نگھہ نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور انجین  
کرنے لگا۔ میرے اور اس کے درمیان اگرچہ چٹکیں  
فٹ کا فاصلہ تھا لیکن کار کے اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھوں  
کلیکناہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔

بلونت نگھہ کا گاڑی بھی چپچی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور پھر  
اس قدر زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی تھی کہ قریب

سے گزرنے والے لوگ اچھل پڑے تھے۔

بلونت نگھہ کی کار کا رخ بے پوری کی طرف تھا۔ میں  
مسکراتی ہوئی نظروں سے دور ہوتی ہوئی اس کار کو دیکھتا رہا پھر  
لینڈ کروزر کے اوپر سے گھوم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مارا نگھہ  
بھی چپچی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

کار کا ”اے سی“ بند تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور  
گاڑی اندر سے خور کی طرح تپ رہی تھی۔ میں نے روپ  
متی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیرنگ پر تھے  
ہوئے تھے۔ جڑے سے بچھے ہوئے تھے پیشانی پر پسینے کے قطرے  
چمک رہے تھے۔ اس کی ٹی شرٹ بھی پسینے سے تر ہو رہی  
تھی۔

”تمہارا یہ دوست تو بہت بزدل نکلا۔“ میں نے روپ  
متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میرا خیال تھا یہاں جنگامہ  
ہوگا۔ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ ایک آدھ لاش گرے گی۔ تم  
کچھ نہیں ہو۔ وہ ہماری طرف آیا تو بہت غصے میں تھا کہ  
چوہے کی طرح دم دبا کر بھاگ گیا۔“

روپ متی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کے  
ہونٹوں پر کھلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی۔

”وہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔“ وہ سامنے رکھے ہوئے ڈبے  
میں سے ٹوپ پیپر نکال کر پتیلیوں کا پینڈو پونچھے ہوئے بولی  
”چھپ کر بیٹھو پر دار کرنٹ والا۔ اس وقت اگر تم اس سے  
دب جاؤ تو وہ مجھے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنا اور  
ہوسکتا ہے اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن  
تمہارے تیور دیکھ کر وہ دم دبا کر بھاگ گیا لیکن مجھے یقین ہے  
کہ وہ خاموش نہیں رہے گا اور ہمارے خلاف کچھ کرنے کے  
لیے موقع تلاش کرے گا۔“

”میں اسے ایسا موقع ضرور دوں گا۔“ میں نے کہا ”اب  
تم گاڑی کا ”اے سی“ چلا دو۔ گرمی سے دم گھٹنا جا رہا ہے اور  
میرا خیال ہے روانہ ہونے سے پہلے ٹھنڈے پانی کی ایک  
ایک بوتلی ہو جائے۔“ میں نے اس کے جواب کا انتظار کیے  
غیر مکر آوارہ نگھہ کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر  
نیا۔

روپ متی نے اپنی طرف کھڑکی کا شیش چڑھا دیا۔ پہلے  
نجن اشارت کیا اور پھر بعد ”اے سی“ میں کر دیا۔ گاڑی  
مارا نگھہ کی غنایت پر توجہ سے غور ہوئی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد  
مارا نگھہ۔ مجھنی بوتلیں لے آیا۔

روپ متی اب بڑی حد تک پر سکون ہو چکی تھی۔ چند  
تھ بعد ہماری لینڈ کروزر اس بہتی سے نکل کر نیشنل ہائی

وے پر دوڑنے لگی۔

تم بلونت نگھہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔  
روپ متی خوف زدہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بلونت نگھہ ایک  
بار پھر ذلیل ہوا تھا اور اپنی اس توہین کا بدلہ لینے کے لیے وہ  
انتقامی کارروائی ضرور کرے گا۔

میں بلونت نگھہ کی فطرت سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کی  
کینٹکی کا اندازہ تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب اس نے  
غلاموں کی منڈی میں روپ متی کو دھمکی دی تھی اور پھر اس  
نے جنگل میں گھات لگا کر حملہ کیا تھا اور مجھے روپ متی سے  
چھیننے کی کوشش کی تھی لیکن اسے چار لاشیں چھوڑ کر رات  
کی تاریکی میں جنگل میں فرار ہونا پڑا تھا اور اب محض اتفاق  
سے اس سے آمان سامنا ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں وہ روپ  
متی کو دھمکانا چاہتا تھا لیکن میں اس کے آڑے نہ آیا۔ اس  
نے تو یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک زر خرید غلام اس طرح  
اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس نے جنگل والے  
واقعے کے حوالے سے مجھے بھی دھمکانے کی کوشش کی تھی مگر

میں جانتا تھا کہ وہ ہمارے خلاف پولیس کے پاس جانے کی  
ہمت نہیں کر سکے گا کیونکہ اس کے اپنے ہاتھ بھی دو آدمیوں  
کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور یہ بات اس کی سمجھ میں  
آگئی تھی کہ اس حوالے سے اگر ہمارے خلاف کوئی  
کارروائی کرے گا تو خود بھی نہیں بچ سکے گا۔

میرے اکر جانے سے اس وقت وہ دم دبا کر بھاگ گیا  
تھا لیکن میں روپ متی کے اس خیال سے متعلق تھا کہ وہ موقع  
ملنے پر دوبارہ کرے گا اور چھپ کر وار کرے گا۔

اگر راستے میں گاڑی پھنچ نہ ہوتی اور بلونت نگھہ سے  
سامنا نہ ہوتا تو ہم چھ بجے سے پہلے ہی پتھر پھینچ چکے ہوتے  
لیکن اس وقت جب ہم شہری حدود میں داخل ہوئے تو سات  
بجے والے تھے۔

پتھر کے پورے پورے شہر تو نہیں تھا لیکن اس کی اپنی  
ایک تاریخی اہمیت تھی۔ یہ شہر سیانت کا مرکز تھا۔ یہاں بے  
شمار تاریخی عمارتیں تھیں۔ یہ شہر ہزاری کے دامن میں آباد  
تھا اور اس کے پہلو میں ایک خوب صورت جھیل بھی تھی۔  
اس جھیل کو گنگا کی طرح پوتر (پاکیزہ) سمجھا جاتا تھا اور ہر  
سال یہاں ایک بہت بڑا میلہ بھی لگتا تھا۔

لینڈ کروزر ہلکی رفتار سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔  
ایک پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے روپ متی  
کو گاڑی روکنے کو کہا تو اس نے ایک دم بریک لگا دی۔ اس  
طرح چانک بریک لگنے سے چپچی سیٹ پر بیٹھا ہوا مارا نگھہ

دیتے تھے اور واپسی پر لے لیتے تھے۔  
 ”کامنی دیوی کہاں ملے گی؟“ میں نے اس شخص سے  
 پوچھا۔

”وہاں۔ اس طرف۔“ اس نے میدان کے اس پہاڑ کی چوٹی کی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور الجھی ہوئی نظروں سے باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہ غالباً اس کے کدو کی پریشان ہو رہا تھا۔

”تارا نکھ۔ ہم نہیں رو۔ ہم کھوئی دیر میں آئے ہیں۔“ میں نے تارا نکھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور لاہ منی کے ساتھ چوبلی کی عمارت کی طرف چلے گا۔ ہم گھاس کے میدان کے اوپر سے گھومتے ہوئے جا رہے تھے اور جب ہم چوبلی کی عمارت کے سامنے پہنچے ایک لڑکی اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ سے الگ ہو کر خیمہ قدم اٹھائی ہوئی ہماری طرف آگئی۔ اس نے اپنے اسٹاکل سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سینے پر سنہری دھاگے سے اسٹاکل مخصوص مونو گرام بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے دروہی پچان لیا۔

وہ کامیابی تھی اور اتنے عرصے میں ذرا بھی سنبھلا نہ تھا۔ لیکن حیرت تھی کہ مجھے دور سے نہیں پہچان سکی مگر قریب پہنچتے ہی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ چند لمحوں میں ہی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر مجھے حواس آ گئی۔ سب سے پہلے اس نے مجھے بو (BOW) کہا پھر وہ ہاتھ جوڑ کر مجھے اور روپ متی کو پر نام کیا اور دوسرے علی وود کو مجھ سے مل گئی۔

روپ مٹی سمیٹ کر ڈھکوا دیا۔ ہمیں دیکھ رہی تھیں کہ کاشی گواہ نے ایک ایک اور اسے اور سے بچے دیکھنے لگا۔ اس کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہو چکی تھی۔ کے علاوہ اس میں اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جانے کے لیے وہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ کو بلا کر اسی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور لباس بگا ہوا تھا۔

”مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ وہ بچہ  
چہرے پر غم نظر میں جماتے ہوئے بولی ”میں سوچ بھی نہیں  
تھی کہ تم یہاں آؤ گے۔“

”محض اتفاق کہہ لو۔“ میں نے جواب دیا ”وہ  
لفظوں میں یہ کہہ کر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ طلبہ  
لے لے لگن بھی سو تم سے ملاقات ہو گئی اور ان سے ملو۔“

روایک گھڑی ہو کر اوجھ اور اڑیں ہونے لگی۔ تمام  
موجود اس کی طرف متوجہ تھے اور پھر صف بندی ہو گئی۔  
ان کے لحاظ سے ہر گروپ کے اسٹوڈنٹ قطاروں میں  
بٹے ہو گئے۔ ان میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ ہر  
گروپ کے سامنے ان کا لیپ ٹاپ تھا۔ کامیابی ان سب کے  
خاموشی میں روپ متنی کے ساتھ کھڑا دلچسپ نظروں  
انہیں دیکھ رہا تھا۔ روپ متنی کی آنکھوں میں حیرت لہریں  
لہریں تھیں۔

اور یہ ”وَلَمْ نُرِثْ“ بڑا دلچسپ تھا۔ بالکل اسی طرح ہم شاہنشاہ ٹیپل میں اپنے گریڈ ماسٹر کو سالانہ تقریب میں ”موسمِ برکتِ عظیم“ دیا کرتے تھے۔ آخر میں وسیع و عریض ”بان“ ”یل“ اور نعروں سے گونج اٹھا۔

کائنات نے اپنے تابعین کو کچھ ہدایات دیں۔ ایک لڑکے کو دھڑلے سے لٹا کر دیکھنا اور دوسرے کو بچنے والے کی طرح چلنے کے لئے ہاتھ دھرنے کی تلقین کی۔ یہی باتیں ہیں جن سے ہمیں اپنے لئے کچھ سیکھنا چاہیے۔

آتش فشاں

تھوڑی دیر بعد ایک جوان لڑکی کوئلہ ڈر نکلس۔ اگر آگنی۔ اس نے بڑے احترام سے ہمیں ڈر نکلس پیش کیے اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔

”یہ حوصلی میرے ماما کی ہے۔“ کامنی نے بتایا ”انہوں نے مجھے دے دی ہے۔ سب سے پہلے تو میں۔۔۔ میدان میں گھاس لگوائی تھی۔ ایک دو کڑوں کو درتے کر دیا ہے۔ آہستہ آہستہ کام کھانڈوں کی اور پھر۔۔۔ کچا (مرضی) ہوئی تو ایک روز اسے ایشیا کا سب۔۔۔ ریشل آرٹ کلب بنا دوں گی۔“

کولڈ ڈرنکس کی چٹکیوں کے ساتھ دوسری باتیں ہوتی  
 رہیں۔ کامنی نے یہ بھی بتایا کہ اس کا باپ ابھی تک اس سے  
 ناراض ہے البتہ اما کی مکمل حمایت حاصل ہے اور اما کی  
 حمایت اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی وہ اس حد تک کامیابی  
 حاصل کر سکی ہے۔ اما سے بہت دور اور چلنا چاہتا ہے۔

کامنی نے تو یہی سمجھ لیا، مجھ سے جاگتی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں اکٹھے ہی تھے۔ اگر جاگتی اس کے پاس نہیں آئی تھی تو اسے میرے ساتھ نہ دیکھ کر کامنی کو کم از کم اس کے بارے میں پوچھنا تو چاہیے تھا۔

1



رہی ہو۔

”ایک بات پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔“ کامنی نے کہتے ہوئے پہلے روپ متی کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھنے لگی ”غلاموں کے ساتھ اس طرح برابری کا سلوک میں نے پہلی بار دیکھا ہے بلکہ میں محسوس کر رہی ہوں کہ مالکین دہلی ہوئی ہے۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ جاگی اس کے پاس پہنچ چکی ہے۔

”میں تمہاری آزادی کے لیے روپ متی جی کو منہ مانی قیمت دینے کو تیار ہوں۔“ اس نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

روپ متی کا چہرہ دھواں ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

”کامنی جی۔“ وہ کرسی سے اتر کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے ”میں نے شرمینا جی کو نہ پہلے غلام سمجھا تھا نہ اب سمجھتی ہوں۔ یہ تو میرے لیے دیوتا ساں ہیں۔ میں ان کی داسی ہوں۔ ان کے احسان کے بوجھ سے تو میں اپنا سر بھی نہیں اٹھا سکتی۔“

اس مرتبہ میں نے کامنی کے چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کی بات سن کر روپ متی بھڑک اٹھے گی لیکن یہاں تو صورت حال ہی مختلف ہو گئی تھی اور روپ متی کامنی کے سامنے جھک گئی تھی۔

”کامنی جی۔“ روپ متی کہہ رہی تھی ”ہم تو جاگی دیوی کو لینے آئے ہیں۔ شرمینا کو یقین ہے کہ وہ آپ کے پاس پہنچ گئی ہے اگر جاگی دیوی مل جائے تو میں سمجھوں گی کہ میرے گناہوں کا راجت ہو گیا۔“

کامنی چند لمحے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئی۔ اس نے روپ متی کو بانسوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے سینے سے لگالیا۔

”مجھے چھما (معاف) کر دو روپ متی جی۔“ وہ اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولی ”میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔ اچانک میں کچھ کہہ دیا ہو تو چھما کر دو۔“

”کر دیا چھما۔“ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”جاگی کہاں ہے؟“

”گھر پر ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔“ کامنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“ میں نے کہا ”جب مجھے پتا چلا کہ وہ جسر میں ایک ہوٹل سے غائب ہوئی

ہے تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہارے ہی پاس آئی۔ اتنی دیر سے تمہاری زبان پر اس کا نام نہیں آیا تو میں ہو رہا تھا۔“

”میں روپ متی کی وجہ سے خاموش تھی۔“ ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ”میں نے سوچا تھا کہ الگ لے جا کر بتا دوں گی لیکن جلد ہی بات کھل گئی جاگی تمہارے لیے پریشان ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی ایک دولت مند عورت تمہیں خرید کر لے گی۔ اس دولت مند عورت کا نام اس کے ذہن سے نکل آج دوپہر جب اس نے روپ متی کا نام بتایا تو اس نے جے پور چلے گئے تاکہ روپ متی سے تمہارے مسئلے کی جانچے۔ میں بھی جانا چاہتی تھی لیکن انہوں نے زبردستی یہاں روک دیا۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کامنی مجھ سے اتنا گدگد تھا کہ جاگی سے میرے بارے میں میری بازیابی کے لیے کوشش شروع کر دی تھی اور لے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کے علاوہ کوئی اور بھی اٹھانے کو تیار ہو جاتی۔

ہماری باتیں سن کر روپ متی کے چہرے کے آنے لکھ بدل رہے تھے۔ میرے بارے میں انکشافات تو وہ سوچ رہی ہو کہ کس مصیبت میں پھنس گئی۔ میں کی طرف دیکھتے ہوئے یہی بات کہی تو وہ مسکراتے ہوئے ”میں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ شخص سے ملاقات ہو گئی لیکن یہ راز میں نہیں سمجھ اٹنے عظیم بارش آ رہا ہے تو دوبارے شکر کے ہتے گئے تھے؟“

”اسے بھی میں البتہ ہی کہوں گا۔“ میں نے مڑ لیتے ہوئے جواب دیا ”دھوکے سے تو شکر کو بھی جیل جاسکتا ہے۔ میں بھی دھوکے میں مار کھا گیا تھا اور مجھے غلاموں کی منڈی تک لے گئی۔“

ہم ابھی یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ کامنی کی بڑی خوب صورت جوان لڑکی دروازے میں نمودار ہوئی۔

”تو ج رہے ہیں میڈم۔ کلاس آف کر دی جانے والا۔“

”اوہ۔“ کامنی ایک جھپٹکے سے اٹھ گئی۔ وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔

کامنی نے ہم سے معذرت کی اور دروازے

کی۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر آ گئے۔ نئی کی نایب نے کلاس ڈسٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ تمام نوٹس اور ادھر بکھرے گئے۔

کامنی حویلی کے ایک اور کمرے میں چلی گئی اور تقریباً دوہین منٹ بعد لباس تبدیل کر کے واپس آئی۔ اب اس نے مازنی بن لی تھی۔ اسے اس لباس میں دیکھ کر کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی مار دھاڑ کی ماہر ہو گئی۔

عزیز کے پہلو میں کامنی کی ماریون کار بھی کھڑی تھی۔ فارمانے لے آئی اور انہیں چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آئی اور رت کے اندر دھکی دے برآمد ہونے والے دو آدمیوں کو بند کرنے اور دیگر کاموں کے بارے میں ہدایات دینے لگی۔ اس نے اپنے نائین کو بھی رخصت کر دیا اور پھر ہماری بے متوجہ ہو گئی۔

روپ متی نے بتایا کہ ہمارے پاس اپنی گاڑی موجود ہے اور مگر اتنے ہوئے بولی۔

”کوئی بات نہیں۔“ تم دونوں میری گاڑی میں بیٹھو۔ اماں اور یوگا گاڑی پیچھے پیچھے لے آئے گا۔“

کامنی نے اسٹرنگ سنبھال لیا اور ہم دونوں پیچھے بیٹھ گئیں۔ پاس گاڑی دوڑنے لگی۔ روپ متی نے آواز دے کر ہدایت کر دی کہ وہ لینڈ کرؤز کو ماروٹی کے پیچھے لیتا ہے۔

دونوں گاڑیاں مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی براہِ مندر تھیں۔ تقریباً دو فرلانگ آگے ایک رست بڑی حویلی کے کھلے ٹکڑے میں داخل ہو کر رکت گئیں۔ یہ کامنی کے ماما کی بلی تھی جس ان کی رہائش تھی۔ کامنی نے مجھے شاؤنل لائی جس میں بتایا تھا کہ اس کا تعلق بے پور کے معزز ترین گن خاندان سے ہے جو صدیوں سے اس خطے میں دھرم کی پوجنا کرتا آ رہا ہے۔ ہندوستان کے مندر تو دراصل سونے کی مورتیں ہیں۔ پنڈتوں اور پجاریوں کا قبضہ تھا۔ کامنی کے خاندان نے بھی ان مندروں سے بڑی لمبی چوڑی ذاتی ملاقاتیں کیں اور مالی لحاظ سے وہ لوگ بھی راجستھان کے بڑے راجوں سے تلم نہیں تھے۔ بعض پنڈتوں نے تو پنڈت راجوں سے بھی زیادہ دولت جمع کر رکھی تھی۔

پتا تھا جس کے خاندان کی دولت کا اندازہ میں اس حویلی سے ہو سکتا تھا۔ اس نے مارشل آرٹ کاب کھول رکھا تھا۔ یہاں اس حویلی کے کپڑوں میں کھڑا تھا جو کسی محل کے نہیں تھے۔

ہم گاڑی سے اتر کر برآمدے کے سامنے سرخ پتھر کی

کشادہ بیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے کہ سامنے خرمالی دروازے سے جاگی نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ چند لمحوں تک پلکیں جھپکاتی رہی پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”مجھے یقین تھا تم یہاں تک ضرور پہنچو گے۔“ وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی اور پھر اس کی نظر روپ متی کی طرف اٹھ گئی۔ ”یہ۔ یہ کتیا۔“

میں نے جلدی سے جاگی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”روپ متی میری مالکین نہیں ہماری دوست ہے۔“ میں نے مدد گم لہجے میں کہا ”اگر یہ میرا ساتھ نہ دیتی تو میں کبھی تم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہمیں تو اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ۔“

”اس میں بھی کوئی چال ہوگی اس کی۔“ جاگی نے منہ سے میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ”اس شکر کرنے سے جاگرتا ہوں گا کہ اس نے بھیک میں جو کینڑا سے دی تھی وہ شکر میں غائب ہو گئی ہے۔ اس نے تم سے انگوٹیاں کہ میں پشکر میں کہاں پناہ لے سکتی ہوں۔ تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو جو اسے سب کچھ بتا دیا اور لے کر یہاں آ گئے۔“

”نہیں جاگی۔ یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”مجھے دیکھو۔ میں آزاد ہوں۔ اپنی مرضی کا مالک و مختار ہوں۔ منڈی میں جو کچھ ہوا تھا، بھول جاؤ اسے۔ روپ متی کو اپنے اس رویے پر پچھتاوا ہے۔ وہ تم سے نہ صرف معافی مانگنے آئی ہے بلکہ تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہے تاکہ ہم دونوں پہلے کی طرح اٹھنے رہ سکیں۔“

”شرمینا جی ٹھیک کہتے ہیں جاگی دیوی۔“ روپ متی نے کہا ”مجھ سے جو غلطیاں ہو کر تو گناہیں ہوئی ہیں، میں ان کی تلافی کرنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم موقع ضرور دو گی۔“

جاگی کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین تو شاید اسے میری باتوں کا بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں اور کامنی تقریباً آدھے گھنٹے تک وہیں کھڑے اسے سمجھاتے رہے اور بڑی مشکل سے اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو سکے کہ اس مرتبہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو رہا اور روپ متی پورے خلوص سے ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو اہل خانہ خرمالی دروازے کے قریب خاموش کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک اوجیز عورت تھی جو کامنی کی ماما تھی۔ دو نو عمر لڑکیاں تھیں۔ ایک کی عمر چھوڑہ اور دوسری کی بارہ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ایک نو دس سال کی عمر کا لڑکا تھا جس نے کیڑے رنگ

”یہ کیا ہے؟“ میں نے ایک اور گھونٹ بھر کر کہا  
طرف دیکھا۔

”جل زیرہ“ کامنی نے مسکراتے ہوئے جواہر  
”بھنے اور بے ہوئے زیرے کا شربت جس میں شکر کا  
تھوڑی سی گلیوں کی کھٹائی بھی ملا دی جاتی ہے خوش ذائقہ  
ہونے کے علاوہ یہ نہ صرف نظام ہضم کو درست رکھتا ہے  
گرمی کا بھی دشمن ہے۔“

اس میں شبہ نہیں کہ یہ جل زیرہ واقعی بہت  
ذائقہ تھا اور باضم بھی کیونکہ اس کے پینے کے فوراً  
مجھے زکارت بھی آگئی تھی اور کھانا کھانے کے بعد میں  
جو بوجھل پن محسوس کر رہا تھا اس سے بھی نجات مل گئی۔  
جل زیرہ تو جلد ہی ختم ہو گیا لیکن ہماری باتوں کا  
دراز ہو آ گیا۔ وقت گزرنے کا احساس کسی کو نہیں ملتا  
باتوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ روپ متی کے بارے میں  
کے ذہن میں جو شبہات تھے وہ رفع ہو گئے۔ جاگتی صوفی  
اتھ کر روپ متی کے قریب جا بیٹھی تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں صوفی پر دراز ہو گیا  
پھر رات نہیں کب میری آنکھ لگی تھی۔  
صبح نو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو کامنی اپنے  
آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی اور دوسرے بیڈ پر جاگ  
روپ متی ایک دوسرے سے لپٹی گئی تھیں۔  
رہی تھیں۔ یہ دلچسپ منظر دیکھ کر میں مسکرائے بغیر  
رکا تھا۔



ہم دوسرے سے پہلے واپس آنا چاہتے تھے لیکن  
کامنی کے مامانے روک لیا جو اس روز صبح سویرے  
پورے واپس آ گیا تھا۔ کامنی کا بھی اصرار تھا کہ  
وہاں رہیں۔ گوکہ میری کوئی مصروفیات نہیں تھیں  
جے پور پہنچ کر اپنے بعض معاملات سیدھے کرنا چاہتا  
جلد سے جلد ہندوستان سے نکل کر پاکستان جاسکوں۔  
لیے سب سے بڑا مسئلہ کاغذات کا حصول تھا۔  
گوکہ ہم حادثاتی طور پر ہندوستان پہنچے تھے۔  
اور پاسپورٹ وغیرہ بھی تیار ہونے والے جہاز کے ساتھ  
راکھ ہو چکے تھے۔ ہم نہایت کی تلاش میں وہاں سے  
تھے اور پھر دوسرے ہمارے کہتے چڑھ کر نہایت ذرا  
میں جائے حادثہ سے سیکڑوں میل دور پہنچے تھے۔  
گمشدہ مسافروں کی تلاش کا سرکاری سلسلہ بھی اب  
گیا تھا۔ اوہرا اوہرا بکھر جانے والے چند مسافر روزانہ

کاگڑے اور اسی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھیں۔ اس کا سر گنجا  
تھا مگر کھوپڑی پر قدرے پائیں طرف بالشت بھر لی چھائی تھی۔  
گھٹے میں رنگ برنگے موتیوں کی دو ملائیں اور ماتھے پر کٹکا  
بھی تھا۔ دونوں لڑکیاں اور وہ لڑکا کامنی کے عم زاد تھے۔ میرا  
تعارف ہونے پر وہ سب بہت خوش ہوئے۔

ہمیں اندر لاکر ہال نما کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ وسیع و  
عریض کمرہ قیمتی سازو سامان سے آراستہ تھا۔ فرش پر دینر  
قالین اور آرام دہ صوفے سامنے والی دیوار کے ایک  
طاغیے میں کسی دیوی کی مورتی بھی رکھی ہوئی تھی۔

ان لوگوں نے کامنی کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں  
کھایا تھا۔ چند منٹ بعد ایک طرف قالین پر دسترخوان بچھا دیا  
گیا۔ ملازمہ نے ہر ایک کے سامنے پیتل کی ایک ایک تھالی  
رکھ دی تھی جس میں پیتل کی کٹوریوں میں دو تین قسموں کے  
سالن تھے۔ ایک میں دال، ایک میں آلو تیشی کی بھجیا اور  
تیسری کٹوری میں پڑی ہوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔  
میں نے صرف آلو تیشی کی بھجیا پر ہی اکتفا کیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے تو دس بج چکے تھے اور اس  
وقت بے پور واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔  
تارا سنگھ کے لیے بھی ایک سروٹ کوارٹریں رات گزارنے  
کا بندوبست کروا گیا تھا۔

کامنی نے جے پور فون کر کے اپنے ماما کو اطلاع دے دی  
تھی کہ میں پشکر پہنچ گیا ہوں۔ وہ میرے بارے میں چٹا  
(فکر) نہ کریں اور کل واپس آجائیں۔

ہم کافی دیر تک ہال میں بیٹھ کر کامنی کے گھر والوں سے  
باتیں کرتے رہے پھر کامنی ہمیں اوپر کی منزل پر اپنے کمرے  
میں لے آئی۔ اس وسیع و عریض کمرے میں دو بیڈ پیچھے ہوئے  
تھے جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی  
کہ جاگتی بھی اسی کمرے میں رہائش پذیر تھی۔ ان دو  
مسکروں کے علاوہ ایک صوفہ سیٹ اور تین چار کرسیاں بھی  
رکھی ہوئی تھیں۔ میں اور جاگتی صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ روپ  
متی اور کامنی بھی سامنے والے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

ہمیں وہاں بیٹھتے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک  
ملازمہ نرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ نرے میں چار  
بڑے گلاس رکھے ہوئے تھے جن میں کافی کلر کا کوئی مشروب  
بھرا ہوا تھا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کوک یا پیپی ہوگی۔ میں نے  
ایک گلاس لے لیا اور سلا گھونٹ بھرتے ہی اچھل پڑا۔ یہ نہ  
کوک بخنی نہ پیپی اور نہ کوئی اور کولا۔ میں نے ایک اور پکلی  
لی۔ بلکی سی کٹاس لیے ہوئے بہت خوشگوار ذائقہ تھا۔



کچھ بانی چٹک کر اس کی شرٹ پر مگر۔ میں نے گلاس لے کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ شراب نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا اور وہ شاید بلڈ پریشر کی مرہض بن گئی تھی۔ غصے میں جیتنے ہوئے اس طرح ہاتھ پیر کاٹنے کا مطلب تو یہی ہو سکتا تھا۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ پولیس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا ”میں اس قسم کے حالات سے گزر چکا ہوں اور جاگتی اس بات کی گواہ ہے۔ غنڈوں نے ہمارا عینا حرام کر دیا تھا۔ جاگتی اور میری انجمنی دوست تھائی کے گھر جلا کر خاک کر دیے گئے۔ ہم اپنی جان بچانے کے خوف سے بھاگے پھر رہے تھے۔ پولیس ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی بلکہ اصل بات تو یہ تھی کہ پولیس ان بد معاشوں کے ہاتھ بک چکی تھی جو ہمیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔ ہم اپنی جان بچانے کے خوف سے جیتے پھر رہے تھے اور وہ غنڈے پورے شرمیں وندنا رہے تھے۔ پولیس بھی ہماری تلاش میں تھی۔ ہمیں کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ یہ ہنگام کی بات ہے مگر ہر جگہ کی پولیس ایک جیسی ہی ہوتی ہے اور ہندوستان کی پولیس کے بارے میں تو سنا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ گریٹ پولیس ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ پولیس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم ایک سابق ریاست کی راج کمار ہی ہو۔ تمہارے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ تمہارے پاس دولت کی بھی کمی نہیں ہے۔ تم حسین بھی ہو اور جوان بھی۔ تم نے ہر لحاظ سے لوگوں کو خوش رکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے لیکن وہ دونوں پہل کر گئے ہیں۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر لڑا ”کسی بڑی شخصیت سے بیٹھنا یا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اس قسم کے کام پولیس کے تعاون اور مدد کے بغیر نہیں ہوتے اور پھر وہ دونوں بہت عرصہ تمہارے پاس رہ چکے ہیں۔ تمہاری کمزوریوں سے واقف ہیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پولیس والوں کا رویہ تم دیکھ چکی ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بات جاری رکھی ”ایک معمولی کانسٹیبل جو عام حالات میں تمہارے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا اس نے کس قدر دیدہ دلیری سے کہہ دیا کہ یہ کوئی کیس ہی نہیں بنتا۔ کیا کوئی معمولی کانسٹیبل اس قسم کی بات کر سکتا ہے؟ یہ تو دراصل اس انسپکٹر کے الفاظ تھے جو

کانسٹیبل کی زبان سے کہلائے گئے تھے۔ اس کا نظا اب تم خاموش بیٹھی رہو۔ ویسے اس کو بھی غیرت تمہارے خلاف کوئی کیس نہیں بنا دیا گیا۔“

”میرے خلاف کیس؟“ روپ متی نے چونک کر طرف دیکھا۔ وہ اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا کر توڑ پھوڑ میں نے کی ہے؟ میرے خلاف کیوں کیس بنا رہا ہے۔

”مار پیس۔ توڑ پھوڑ۔“ میں نے کہا ”وہ دونوں مسلمان ملازم تھے۔ تم نے کسی بات پر ناراض ہو کر انہیں کوڑا مار نکال دیا اور جب وہ اپنا ذاتی سامان لینے کے لیے چاہا آئے تو تم نے اپنے نوکروں سے ان کی پٹائی کرادی اور انہیں الزام لگانے کے لیے خود ہی اپنے گھر میں توڑ پھوڑ مچا دی۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ روپ متی مجھے گھورا ”جب یہاں یہ سب کچھ ہوا تھا تو میں یہاں ہی تھی۔“

”تم کہیں بھی ہو مانی ڈیئر۔ یہ الزام تم پر مل گیا ہے میں نے کہا ”پولیس کے پاس بڑے اختیارات ہوتے ہیں قانون تو موم کی گڑیا ہے جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق شکل چاہیں دے سکتے ہیں۔ اگر تم خاموش بیٹھی رہیں ایسی کوئی بات نہ ہو لیکن اگر تم نے ان کے خلاف کوئی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو تمہارے خلاف ایسا کوئی اقدام جاسکتا ہے۔“

”میں انہیں معاف تو ہرگز نہیں کروں گی۔“ میں نے کہا ”میرے کمروں پر چلنے والے کتے مجھے ہی گتا دوڑیں۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔“

”میں راج کمار کی روپ متی بول رہی ہوں مندر ناتھ جی۔“ روپ متی نے کہا۔ دونوں طرف سے چند برقی جھنوں کا جھلکا ہوا اور پھر روپ متی اسے اپنا مسئلہ بناتے لگی۔

”آپ حوصلہ رکھیے روپ متی جی۔“ دوسری طرف سے کہا گیا ”میں معلوم کرتا ہوں کیا معاملہ ہے۔ انسپکٹر نے اگر ایسی کوئی بات کی ہے تو اس کے خلاف ایکشن ضرور لیا جائے گا۔ میں چند منٹ بعد آپ کو فون کروں گا۔“

روپ متی نے ریسور رکھ کر دیا اور کھڑے ہوئے سامان کو دیکھنے لگی۔ جاگتی بھی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ مندری اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ روپ متی نے مندری کو چائے پانے کے لیے کہا تو جاگتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ بے چاری چائے کیسے پئے گی۔ میں بتاتی ہوں۔“ جاگتی مندری کو ساتھ لے کر کچن میں چلی گئی۔ تقریباً تین منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ ہم چائے کی چمکالیں لے رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ روپ متی نے ریسور اٹھا لیا۔

”میں روپ متی۔“ وہ فون کی طرف کسی قدر جھک کر بولی۔

”اے سی بی مندر ناتھ بول رہا ہوں روپ متی جی۔“ دوسری طرف سے وہی ہماری آواز سنائی دی ”میں نے انسپکٹر بھگت سنگھ سے بات کی ہے وہ تو کوئی اور ہی کمائی سنا رہا ہے۔“

”کیسی کمائی؟“ روپ متی بولی۔

”انسپکٹر کے کہنے کے مطابق بیج سنگھ اور دھرمیش بھی آپ سے پہلے اس کے پاس گئے تھے۔“ مندر ناتھ کہہ رہا تھا ”وہ دونوں زخمی تھے۔ آپ نے انہیں نوکری سے نکال دیا ہے اور وہ اپنا ذاتی سامان لینے چلی گئے تھے۔ آپ نے سامان ان کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے نوکروں سے انہیں پڑایا۔ ان کے کہنے کے مطابق آپ نے کسی غنڈے کو بھی اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اس غنڈے نے چند روز پہلے بھی انہیں مارا پینا تھا۔ بہر حال، انسپکٹر ان دونوں بھائیوں کی رپورٹ پر آپ کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن میں نے اسے روک دیا ہے۔“

روپ متی نے جو اب دیے بغیر ریسور ڈال دیا۔

”بھابھو!“ وہ چیختی ”دیکھ لوں گی۔ ان سب کو دیکھ لوں گی۔“

”چائے پیو۔“ میں نے کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا ”اور تمہیں میری ذہانت کی داد دینی چاہیے کہ میں نے جو کچھ

کہا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ اب صورت حال تمہارے سامنے واضح ہو گئی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان دونوں بھائیوں کے ہاتھ تم سے زیادہ لمبے ہیں۔ تمہارے ساتھ رہتے ہوئے انہوں نے تمہاری حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے لیے وہ جگہ بنالی جس کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا اور تم وہیں کی وہیں رہیں۔“

”میں انہیں چھوڑوں گی نہیں۔“ روپ متی غرائی۔

”ان الفاظ کی رٹ لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا ”اس کیس میں اب میرا نام بھی مل گیا ہے۔ ان کی اصل دشمنی تو مجھ سے ہی ہے۔ یہ سارا بیگانہ میری ہی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ میری ہی وجہ سے تم نے بھی انہیں ذلیل کیا۔ وہ اصل انتقام تو مجھ سے لینا چاہتے ہیں۔ میرے اگرچہ اپنے معاملات میں بھی خاصے گنہگار ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی نہ کسی طرح تم سے اجازت لے کر چلا جاؤں گا لیکن اب ان حالات میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ بیج سنگھ اور دھرمیش کو سبق سکھانے کے لیے ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

وہ چند لمحوں میری طرف دیکھتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ان کتوں کو میں اپنے پیر چائے پر مجبور کر دوں گی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اوھر اُھر دیکھنے لگی۔

میں نے بھی ایک نظر اُھر اُھر دیکھا۔ کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ کئی قیمتی چیزیں تو زدی گئی تھیں۔ میرے صاب سے لاکھوں کا نقصان ہوا تھا۔

میں نے آرا سنگھ اور دیوان سنگھ کو بھی اندر بلایا اور ہم سب مل کر کبھری ہوئی چیزیں سیننے لگے۔

○●○

تین چار دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔

اسی روز روپ متی نے میرے گیراج میں سے غلے رنگ کی ایک شیرازہ نکالی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر خولی سے تقریباً تین میل دور ایک بہت بڑے میدان میں لائی۔ وہ مجھے ڈرائیونگ سکھانے کے لیے یہاں لائی تھی اور یہ وسیع و عریض میدان شاید اسی مقصد کے لیے مخصوص تھا کیونکہ یہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے جو ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کئی گاڑیاں ڈرائیونگ سکھانے والے اسکو لڑکی تھیں جن کے دونوں طرف نام لکھے ہوئے تھے۔

بست سی ری انیویٹ گاڑیاں بھی تھیں اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ڈرائیونگ سیکھنے والوں میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔

روپ متی نے مجھے اسٹینڈنگ کے سامنے بٹھادیا اور خود ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر کسی باہر نریزی طرح اسٹینڈنگ پر گرفت مہمسر بڑیک کچ اور اسٹینڈنگ کے استعمال کے بارے میں بتانے لگی۔ میں اتنا بدحوہ بھی نہیں تھا کہ ان چیزوں کو نہ سمجھ سکتا۔ تھائی لینڈ میں اکثر جاگی، تھائی اور گانگ وغیرہ کے ساتھ کسی کار میں سفر کرتے ہوئے انہیں دیکھتا رہتا تھا۔ میں ان سب چیزوں کے استعمال سے کسی حد تک واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ وہ دن میں گاڑی چلاتا سیکھ جاؤں گا۔

روپ متی کی ہدایت کے مطابق میں نے گیسٹر کو کنٹرول میں رکھ کر انیشی کی چابی تھما دی اور کچ پیدل دبا کر گیسٹر بدلنے لگا۔ روپ متی کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا۔ وہ انجن کو فرسٹ گیسٹر میں ڈالنے میں میری مدد کر رہی تھی اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق میں آہستہ آہستہ کچ پلٹ کو ڈھیلا چھوڑنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کار بھی آہستہ آہستہ حرکت میں آنے لگی۔

روپ متی نے ایک ہاتھ اسٹینڈنگ پر بھی رکھا ہوا تھا۔ کار بلکی رفتار سے چلتی رہی اور وہ مجھے مختلف ہدایات دیتی رہی۔ میدان میں اور بھی بست سی گاڑیاں ادھر ادھر گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دو تین چھڑا قسم کے ٹرک بھی نظر آ رہے تھے ان پر بھی ڈرائیونگ اسکول کے نام لکھے ہوئے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ اب روپ متی نے اسٹینڈنگ پر سے ہاتھ ہٹا لیا تھا اور گیسٹر بھی میں خود ہی بدلتا رہا۔ تاہم اس میں روپ متی کی ہدایات شامل تھیں۔ کار کی رفتار کبھی ذرا تیز ہو جاتی اور کبھی آہستہ۔

”تم واقعی بہت ذہین ثابت ہوئے“ روپ متی نے یہ کہتے ہوئے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی ”میرا تو خیال تھا کہ ان باتوں کو سمجھنے میں ہی تم تین دن لگا دو گے لیکن اب میں پورے دشواری سے کہہ سکتی ہوں کہ کل شام تک تم شہر کی ہر جگہ سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھرو گے۔“

”اگر بے وقوف نہ ہوتا تو اب تک کسی کے ہاتھوں مارا جا چکا ہوتا اور میری بیڑیاں بھی گل سڑ جی ہوتیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تھوڑی دیر اور پریکٹس کر لو پھر واپس چلے ہیں۔ مجھے بھوک لگنے لگی ہے۔“ روپ متی نے کہا۔

”تم بھی جاگی کی طرح ہو۔ بھوک برداشت نہیں کر سکتیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے میدان کا ایک اور پتھر لگایا۔ دوسرے پتھر کے لیے کار گھمائی ہی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے ایک کھلا ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے آگے ریڈی ایٹر کے سامنے آہنی پائپوں کا ایک ہنگامہ لگا ہوا تھا کہ کسی حادثے کی صورت میں ریڈی ایٹر یا انجن کو زیادہ نقصان نہ پہنچے۔

ٹرک میں دو آدمی تھے۔ ایک زیر تربیت ڈرائیور اور دوسرا شاید نریز تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹرک کی رفتار بھی کم تھی۔ برا خیال تھا کہ قریب پہنچنے سے پہلے ہی ٹرک کا رخ بدل جائے گا یا میں اپنی کار کو ایک طرف ہٹاؤں گا۔ فاصلہ کم ہوا کیا میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔

اب تقریباً میں گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں بری طرح چونک گیا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے چہرے اب صاف نظر آ رہے تھے۔

وہ جج سنگھ اور دھرمیش تھے۔ اسٹینڈنگ کے سامنے بیٹھ گئے تھا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر دھرمیش۔ ان دونوں کے چہروں پر بے پناہ کراہٹ تھی۔

ان دونوں کو دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا ٹرک کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔ ٹرک کسی خوں خوار دوندے کی طرح اور بندوق سے نکلے ہوئی گولی کی سی تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

میرے حواس ایک لمحے کو ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ روپ متی چیختی ہوئی اپنی سیٹ پر اچھل پڑی۔ گز کے والے ہر گھمے کے ساتھ فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ ٹرک موت کے فرشتے کی طرح دنداٹا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی نظر آنے لگی۔

اعتراف کرنے میں کوئی ندامت نہیں کہ اس وقت مجھے حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ دماغ جیسے من ہو گیا تھا اور ذہن فیصلہ بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسٹینڈنگ پر میرے ہاتھوں کا گرفت بالکل ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

ٹرک بالکل سامنے پہنچ گیا تھا اور کسی بھی لمحے دھماکا ہو سکتا تھا۔ روپ متی چیختی ہوئی میری طرف گری۔ اس نے دونوں ہاتھ اسٹینڈنگ پر آگے اور اس نے پوری قوت سے اسٹینڈنگ کو بائیں طرف گھمایا۔

کار تیزی سے بائیں طرف گھوم گئی۔ اسی لمحے اچھا

دھماکا ہوا اور ہماری کار لٹو کی طرح گھوم گئی۔ وہ ٹرک کار کی پہلی سائیڈ کو ٹکراتا ہوا نکل گیا تھا۔

میں پہلے دھماکا کر دوڑاؤ سے بے فکر یا پھر اسٹینڈنگ کی طرف جھکا۔ میرا سر اسٹینڈنگ سے ٹکرایا۔ روپ متی بھی چیختی ہوئی ایک طرف گری تھی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ لٹو لٹو کی طرح گھومتی ہوئی جگہ سے دھماکے سے ایک اور کار سے ٹکرا کر رک گئی۔

اس وقت ایک اور دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ہماری کار کی سائیڈ سے ٹکرانے کے بعد وہ ٹرک ایک اور کار سے ٹکرایا تھا۔ دھماکے کے ساتھ نسوانی چیخوں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں تیس سیکنڈ لگ گئے۔ میں نے پیچھے سرگردم کیا۔ وہ ٹرک تیز رفتاری سے میدان سے باہر جا رہا تھا۔ جس دوسری کار کو اس نے ٹکرایا تھی اس کے اندر سے اب بھی نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں روپ متی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اوپر اٹھانے لگا۔

میدان میں تمام گاڑیاں رگ جکی تھیں اور لوگ گاڑیوں سے اتر کر ہماری اور دوسری کار کی طرف دوڑ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہماری کار کے گرد آٹھ دس آدمی جمع ہو چکے تھے۔ ہماری کار کے دونوں طرف کے دروازے کھول دیے گئے۔ ایک آدمی دوسری طرف سے روپ متی کو بازو سے پکڑ کر نیچے اتارنے لگا۔ ایک آدمی نے مجھے بھی بازو سے پکڑ کر نیچے اتارنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور خود ہی نیچے اتر آیا۔ میرے حواس اب آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے۔

ہر شخص ہماری مدد کرنے پر تیار ہوا تھا لیکن جب انہیں ہاتھ مل گیا کہ ہم میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا بہت معمولی زخمیں تھیں مگر لوگوں کو اطمینان ہوا۔ میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا لیکن روپ متی اس صدمے سے بے حال ہو رہی تھی۔ میں لوگوں کو بٹاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جمبھوڑنے لگا۔

”بوس میں آؤ روپ متی۔ سب ٹھیک ہے۔ کچھ نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

”انہیں سامنے میں لے جاؤ۔ وہاں درختوں کے نیچے۔“ ایک آدمی پچھلے ایک عورت بھی لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتی

ہوئی آگے آگئی اور روپ متی کو سمارا دے کے میدان کے باہر درختوں کی طرف لے جانے لگی۔

میں دوسری کار کی طرف آگیا۔ وہ کسی ڈرائیونگ اسکول کی کار تھی۔ اسے ٹرک نے سامنے والے حصے پر ٹکرایا تھا۔ ماری بھی اور فینڈر کو ادھڑتا ہوا نکل گیا تھا۔ زوردار جھکا لگنے سے آگے والی وینڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی۔ اس کار میں بھی دو عورتیں تھیں۔ ایک زیر تربیت اور ایک نریز جس کے بازو اور چہرے سے خون رس رہا تھا۔ یہ زخم اسے پیشے کی کڑیوں سے آئے تھے۔ زیر تربیت ڈرائیور ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ دونوں بہت زیادہ ہراساں ہو رہی تھیں۔

ان دونوں کو بھی میدان کے باہر درختوں کے سامنے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک آدمی اپنی کار میں سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لایا۔ اس کا تعلق کسی ڈرائیونگ اسکول سے تھا اور ایسی ہر گاڑی میں فرسٹ ایڈ باکس لازمی ہوتا تھا۔ وہ آدمی باکس کھول کر زخمی لیڈی نریز کے زخموں پر ہینڈل کرنے لگا۔

میں روپ متی کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اب اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ اس کی پیشانی پر ہلکا سا مڑدو تین دن پہلے ہی ٹھیک ہوا تھا اور اب ایک نیا گومڑا بھر آیا تھا۔

ہمارے چاروں طرف لوگ جمع تھے اور اس ٹرک ڈرائیور کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی زیر تربیت ڈرائیور تھا جس سے ٹرک بے قابو ہو گیا تھا اور وہ بدحواسی میں بریک پیدل کے بجائے اسے بڑھاتا چلا گیا تھا۔ لوگ ہمیں خوش قسمت قرار دے رہے تھے کہ ہم لوگ ایک خوفناک حادثے سے بچ گئے تھے۔

اس جھوم میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو نہ صرف روپ متی کو پہچانتا تھا بلکہ اس نے اسے شک کا اظہار کیا تھا کہ یہ حادثہ محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ ٹرک ڈرائیور اتاری نہیں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر روپ متی کی کار کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر روپ متی کی طرف دیکھنے لگا۔ روپ متی نے عقل مندی یہ کہ اپنی زبان بند رکھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں پولیس کو اس واقعے کی اطلاع ضرور دینی چاہیے لیکن ایک آدمی نے ہماری یہ مشکل یہ کہہ کر حل کر دی کہ اس ٹرک پر نہ تو کوئی نام لکھا ہوا تھا اور نہ ہی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ حادثے کا شکار ہونے والی دوسری دو خواتین بھی پولیس کے پاس جانے کو تیار نہیں تھیں۔

آتش فشاں 150 حصہ 4

آتش فشاں 150 حصہ 4

آتھ فہرست 152 حصہ 4



باپ کو پرانی دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا اور میں انتقام لینے کے لیے اپنے ماں باپ کے قاتلوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس اخباری اطلاع کے مطابق میں پاکستان جانے کے لیے جاگتی دیوبی کے ساتھ اس جناز میں سفر کر رہا تھا جو ریگستان میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ مضمون نگار نے خندہ خاہر کیا تھا کہ ممکن ہے ہم دونوں بھی مر چکے ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس قوی امکان کا بھی اظہار کیا تھا کہ ہو سکتا ہے ہم دونوں زندہ ہوں اور راجستان کے کسی شہر میں موجود ہوں۔ اخبار نے آخر میں ایک نوٹ بھی لکھا تھا کہ اس سلسلے میں مزید تفصیلات آئندہ دو تین روز میں شائع کی جائیں گی۔

یہ مختصر سا مضمون جاگتی اور روپ متی نے بھی پڑھا تھا اور یہ بھی خیبت تھا کہ ریگستان میں وہ بے خاکر کے ہاتھ آئے سے لے کر نظام ہونے تک اور اس کے بعد بھی ہم نے اپنے اصل کام کی کوئیں بتائے تھے۔ صرف روپ متی ایسی تھی جسے میں نے جاگتی کا نام بتایا تھا اور میرا نام تو اسے اب بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ مجھے شریکان ہی بتی کتی تھی اور اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں لیکن اب اخبار میں یہ مختصر سا فیچر پڑھنے کے بعد وہ بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہوں۔“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں ”تم نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن کچھ باتیں تم نے مسکھٹا چھپائی تھیں۔ مثلاً۔“

”مثلاً یہ کہ میں مسلمان ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”تمہیں میرے دھرم کے بارے میں جان کر شاید دکھ ہوا ہو اور۔“

”بالکل نہیں۔“ اس مرتبہ روپ متی نے میری بات کاٹ دی ”میں تنگ نظروں اور متعصب نہیں ہوں اور ویسے بھی میں خود کو کسی اپنے دھرم کی پابند ہوں۔ دھرم کا تو محض ٹھپا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”جاگتی بھی ہندو ہے اور کئی سال سے تمہارے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دین اور دھرم کے چکروں سے نکل جائیں تو بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔“

”ابا بھی نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”دھرم کوئی بھی ہو اس میں ضابطہ اخلاق اور ضابطہ حیات ہوتا ہے۔ مذہبی پابندیاں نہ ہوں تو انسان جانوروں سے بھی بدتر ہو جائے۔ بہر حال، میں اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ جسے تو یہ جان کر خوش ہوئی کہ تم میں ایسا کوئی تعصب نہیں ہے۔“

”لیکن اس انکشاف کے بعد ہمارے لیے ضرور پیدا ہو جائیگی۔“ روپ متی نے کہا ”سفر دھرم میں کو پتا چل گیا کہ تم دونوں ویسے تو وہ مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے پتا چلے گا۔“ میں نے کہا ”اس تصویریں تو بھیجیں نہیں جن سے وہ ہمیں پہچان بہر حال، ہم محتاط رہیں گے اور تم مجھے اس نام جس نام سے مجھے دوستوں سے متعارف کرایا تھا میں تو بھول گیا۔“

”ہمت تنگ۔“ روپ متی نے کہا ”اور ہم غلط نہیں رکھا تھا۔ تم واقعی بہت والے ہو۔ ہونوں پر مسکراہٹ آگئی۔

جاگتی خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں دیر بعد ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ دھرم تنگ کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھا کہ چونکہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب روپ متی نے کہا ”لے دھرم میں کے کپڑے لانے کے لیے کہا تھا تو کو اڑھائی چالی کلا کے پاس تھی اور اس بات پر بھی گئی تھی جس سے میں یہ اندازہ لگا چکا تھا دھرم میں کے تعلقات کچھ زیادہ ہی گہرے تھے اور دونوں بھائیوں نے خولی میں آکر توڑ پھوڑ کر کے کہنے کے مطابق لکھا ایک طرف خاموش کلا اور پھر ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔

ان ساری باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا شروع ہی سے ان کے ساتھ بھی اور موٹے ساتھ چلی گئی تھی۔

”لکھا کا ایک گراؤنڈ کیا ہے؟“ میں نے، طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ کب سے تمہارے پاس ہیں کس کے توسط سے آئی تھی؟“

”میری ایک دوست نے اس کے لیے تمہیں۔“ روپ متی نے جواب دیا ”لکھا دراصل رہنے والی ہے۔ یہ قصبہ یہاں سے چند میل کے

ہے۔ اس کا باپ قصبہ میں آگیا تھا۔ شریانی کوئی بھی ایسا عیب نہیں تھا جو اس میں نہ ہو۔ جوئے اور شراب میں آگیا تھا پھر اس نے آگیا اس کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی اسے جو ناموٹا لکھا اور کچھ پیسے مل جاتے تھے۔ پیسے چھین لیتا۔ اس نے گھر کی ساری چیزیں

کی نظریں جو ان بیٹی پر پڑ گئیں۔ وہ اسے بھی بھیج دینا تھا۔ اس کی ماں شوہر کے مظالم سے تنگ آگئی تھی۔ اس نے بنا کہ وہ اپنی بیٹی کا بھی سودا کر رہا ہے تو وہ کانپ اس نے میری دوست لکشی کو بتایا جس کے گھر کا کام لکشی تھی اس کے شرابی شوہر کو ڈرا دھکا کر کلا نے گھر لے گئی۔

لکھا کے باپ کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ سونے کی چڑیا کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ اپنی بیوی کو تصور دار سمجھتا ایک بات شراب کے نشے میں اس نے اپنی بیوی کو اس چاکر دے چارہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس کے

گھر میں ایک سال لکشی کے پاس رہی۔ تقریباً ایک سال لکھا چار سال لکھی کو لکھا کو میرے حوالے کر دیا۔ لکھا اس سے میرے پاس ہے۔“ روپ متی چند لمحوں کو خاموش بھارت جادری رہتے ہوئے گویا ہوئی ”شروع میں تو یہ ناگ رہی لیکن بعد میں ہر پڑے نکالنے لگی۔ ایک ماہ سے اسے دھرم میں کے گوارے سے نکلے ہوئے دیکھ رہے تھے اسے ڈانگا اور خولی سے نکال دینے کی دھمکی بھی لے۔ وہ چند روز تک تو محتاط رہی لیکن پھر اسی ڈر پر چل بیٹھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔“

”اور میرا خیال ہے اب وہ دھرم میں کے ساتھ ہوگی۔“ لکھا نے خاموش ہونے پر کہا۔

”ظاہر ہے۔ وہ اور کہاں جا سکتی ہے۔“ روپ متی نے کہا۔

”اور یہ دونوں بھائی کہاں ملیں گے۔ ان کا کوئی ٹھکانا؟“

”پندرہ پہلے میری عدم موجودگی میں جج تنگ ایک اور کلا کو خولی میں لے آیا تھا۔ میں نے سرزنش کی تو نے جیل کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ نام ڈنڈوں کے لیے یہ دونوں بھائی اکثر وہاں جاتے تھے اور میرا خیال ہے اب بھی وہیں ہوں گے۔“

”میں نے کہا۔“ کل رات ہم ان کے گھر پہنچے۔“ روپ متی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔

”میں نے کہا کہ وہ ہمارے خلاف کوئی اور حرکت نہ کرے گا۔“

”میں نے کہا کہ ہم بے بس نہیں ہیں۔“

”میں نے کہا کہ ہم بے بس نہیں ہیں۔“

میں جانتا تھا کہ یہ پنگالینے والی بات ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ وہ دو مرتبہ ہمارے خلاف تنگین نوہیت کی کارروائیاں کر چکے تھے۔ دوسری مرتبہ تو انہوں نے ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور میرے خیال میں تیسری مرتبہ انہیں پہل کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا کیونکہ اس طرح وہ ہمیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔

نئی شراذم حرمت ہو کر روپ کشاپ سے آچکی تھی۔ اگلے روز ہم نے اسی گاڑی کا انتخاب کیا اور رات نو بجے کے قریب ہم تینوں اس گاڑی پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ روپ متی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور جاگتی پچھلی نشست پر تھی۔

سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ میرے اندر ابھی کچھ جبک تھی اس لیے میں نے اس کی رفتار بلکی ہی رکھی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم جمیل کے ساتھ والی سڑک پر پہنچ گئے۔ جمیل کے کناووں پر گنجان آبادی تھی۔ مختلف گلیوں میں گھومنے کے بعد روپ متی کے گھر پر میں نے ایک جگہ کار روک لی۔

”یہ گلی مزد کے دو تین طرف دو سرا مکان ہے۔“

**بزرگان دین کے**

ایک اور فز و زواجات ہے (2) کار و راز تاب کتابیں

اسلام کے خاموش مبلغین کے دلچسپ اور پڑاؤ والے واقعات

کتابوں سے زیادہ دلچسپ

دستاویزوں سے زیادہ پڑاؤ انگیز

**بزرگ کے سیر**

قررت فی رب 150 روپے

اولیائے اکرام جو تیارہ رش و بدایت تھے

**ضیائے سیم کے اہل**

انہیں اپنے ہمراہ مستقل مبعوض بنایا ہے۔

دو ہفتے کی کتابت کو تلفظ 325 روپے کا آؤ اور اس کیس

**کتابیات پبلشرز کراچی**

23 سٹریٹ 74200

0322-8888313 0322-8888313

0322-8888313 0322-8888313

0322-8888313 0322-8888313

روپ متی نے اشارے سے بتایا۔

میں نے روپ متی کو کاری میں بیٹھے رہنے کو کہا اور جاگتی کو اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر آیا۔

کلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ تقریباً ہر مکان کے دروازے کے سامنے دو دو تین تین سیڑھیاں تھیں۔ اس مکان کے سامنے بھی تین سیڑھیاں تھیں۔ دروازہ ایک بالشت کے قریب کھلا ہوا تھا۔

میں چوروں کی طرح مکان میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری اور تیسری دستک کے جواب میں بھی خاموشی رہی۔ میں نے جاگتی کو اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

مخزن بہت کشادہ اور فرش سرخ اینٹوں کا تھا۔ بائیں طرف دھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ دوسرے دائیں طرف تھے دو سامنے۔ بائیں طرف ایک چھ سات فٹ چوڑا گلیارہ سا تھا۔ سامنے اور دائیں طرف والے کمروں کے دروازے بند تھے اور اندر تاریکی تھی۔ میں اس گلیارے کی طرف بڑھ گیا۔ جاگتی بھی میرے پیچھے تھی۔

سامنے نظر آنے والے کمروں کے پچھلی طرف بھی مختصر سا محن تھا جس کے اختتام پر دائیں بائیں کمرے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پرانی طرز کے اس مکان میں دو خاندان رہائش پذیر تھے یا یہ کہتے تھے بلکہ ایسے مکان میں تو کسی کئی خاندان رہتے تھے لیکن اس وقت یہ مکان بظاہر خالی ہی نظر آ رہا تھا۔

میں کچھ اور آگے بڑھا تو بائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی بوری تھی۔

میں اور جاگتی دبے قدموں دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور اندر سے کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے ناکاکی نہیں ہوئی۔ ایک نسوانی ہنسی کی دہلی دہلی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جاگتی بڑی آہستگی سے دروازے کے دوسری طرف چلی گئی اور اس سے پہلے کہ میں اندر بھاگنے کے لیے آگے جھٹکا، اس نے جھری سے آنکھ لگا دی اور ایک جھٹکے سے سیدھا ہوئی۔ اس کے چہرے پر بڑے ناگوار تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔

میں بھی جھری سے آنکھ لگاتے ہی ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اندر بہت سی قابل اعتراض منظر تھا۔

تج سنگھ بیٹہ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور کلا اس نے تھی۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ تج سنگھ شدید جھٹکا لگا۔ کلا تو چھوٹے بھائی دھر میشل کی لیکن اس وقت بڑا بھائی اس سے دل بسلا رہا تھا۔ میں نے جاگتی کو اشارہ کیا اور تیری کی ٹھوکر کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ دونوں بدحواس ہو پڑے۔ کلا نے بیٹے سے جھٹکا لگا دی اور کچی چادر اٹھا کر اپنی برتنی چھائی کی کوشش کرنے لگی۔ تج سنگھ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پچھلی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا پچھلا آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

جاگتی بھی اندر آکر دروازے کے سامنے کو تھی۔ اسے دیکھ کر بھی تج سنگھ کی آنکھیں پھٹی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا تھا۔

”جس تمہاری موت ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے غرایا“ اب یہاں سے نما ہی اٹھے گی۔

”ابھی بتا چل جائے گا کہ ارجمی کسی کی وہ میں نے پرسکون کچے میں جواب دیا“ تم نے جو کا

اب میری باری ہے۔“ جاگتی مجھ سے دو قدم آگے نکل گئی۔ ام کی طرف تھا کہ اسے قابو میں کر سکے۔ ”تمہارا منا کہاں ہے اسے بھی بلاو گا۔“ دونوں کا فیصلہ ہو سکے۔ ”میں نے تج سنگھ کی طرف کہا۔ ”منا یہ ہمارے۔“

اپنے عقب سے آواز سن کر میں اچھل پڑا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ دھر میشل کی ہوئی شراب کی بوتل سر پر لگی اور میری آنکھوں نیچلی نیچلی چنگاریاں سیانے لگیں۔ بوتل سر پر لگی تھی اور شراب میرے سر اور چہرے کو ترس رہی تھی۔ گردن پر بیٹے لگی۔ سخت ناگوار بو میرے منہ پر جاری تھی۔

میں لڑکھا گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے تج سنگھ نے میرے اوپر چلا اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرا کھرا یا اور دوسرے ہی لمحے میری نظروں کے سامنے چادر پھیلتی چلی گئی۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی بڑھ رہی تھی۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکتے لگا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی بات تھی۔ اگر اس وقت میں نے اپنے حواس بحال نہ رہتے تو یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے۔

تج سنگھ نے ایک بار پھر مجھے گرفت میں لے کر دیوار کے ساتھ دبا لیکن اس مرتبہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا تھا۔ اس کے برعکس ایک اور کمرے سے ہوا کہ زوردار جھٹکا لگنے سے میرے حواس بحال ہونے لگے تھے اور آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تاریکی بھی گھٹنے لگی اور پھر اسی لمحے میری ہات سے ٹکرانے والی ایک نسوانی چٹخ مجھے ہوش میں لے آئی۔ یہ چٹخ اگرچہ کسی کمرے کو نہیں کی تھی۔ سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن اس آواز نے میرے ہوش و حواس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے سر کو ایک اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے سامنے کمرے ہوئے تج سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن دھند بتدریج پھٹتی چلی گئی اور اس کا چہرہ عیاں دکھائی دینے لگا۔

ایسا کمرہ اور خوفناک چہرہ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تج سنگھ اگرچہ خاصا خوب رو آدمی تھا مگر غصے کی شعلے نے اس کے چہرے کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ انگارے برساتی ہوئی سرخ آنکھیں، بیچنے ہوئے ہماری جہزے، خون خوار ہچیرے کی طرح جھپٹتے ہوئے دانت اور شدید تاؤ سے اس کے چہرے پر بے پناہ۔ فحاشی آگئی تھی۔ وہ اس وقت انسان نہیں کوئی خون خوار درندہ ہی لگ رہا تھا۔

وہ نسوانی چٹخ ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس مرتبہ وہ آواز بہت واضح اور بہت قریب سے آئی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس طرف دیکھا۔ جاگتی دھر میشل کی گرفت میں تھی اور وہ اسے مسری پر گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تج سنگھ نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ میرے گریبان پر ڈال دیے۔ وہ اسی مرتبہ بھی مجھے اٹھا کر پٹننا چاہتا تھا لیکن اب میں نے اسے موقع نہیں دیا اور اپنے تمام حواس مجتمع کر کے اس کے چہرے پر زوردار ٹکرا دی۔

تج سنگھ کی ناک پر ٹنگے والی ٹکڑا خاصی زوردار تھی۔ وہ لپٹا اٹھا اور میرے گریبان سے ہاتھ ہٹا کر جھٹکا چلا گیا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک پر پٹننا چاہتا تھا۔ میں نے سنبھل کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ناک سے بیٹے والا خون ہاتھ کو تر کر رہا تھا۔

ہوا فرش پر ٹپک رہا تھا۔

میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر سیدھا لیا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے بے پناہ تاثرات اٹھ آئے تھے۔ شاید اس کی ناک کا بانٹا ٹوٹ گیا تھا۔ خون دھاری صورت میں بہ رہا تھا لیکن مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ وہ میری جان کا گاہک تھا۔ میں اسے کس طرح معاف کر سکتا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کا ٹھونسا بنایا لیکن پھر مٹھی پوری طرح کھول دی اور مکلی پھیلنے سے اس کے منہ پر ایک اور زبردست وار کیا۔ وہ ایک بار پھر پھینچ اٹھا۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔

وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا سائیڈ ٹیبل سے ٹکرایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا اور حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی شراب کی خالی بوتل اٹھالی اور دوسرے ہی لمحے پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے بوتل زور سے دیوار پر ماری۔

بوتل پینڈے کی طرف سے اس طرح ٹوٹ گئی کہ شیشے کی ٹوٹیں نکل آئیں۔ وہ بوتل کو گردن کی طرف سے پکڑے میری طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر فحاشی کے نقاب میں چھپ گیا تھا۔ ناک اور منہ سے پتے ہوئے خون سے اس کا چہرہ اور اوپر بھی سیاہ لگ گیا تھا۔

ٹوٹی ہوئی بوتل ایک خطرناک ہتھیار بن گئی تھی۔ وہ بوتل والا ہاتھ نکالے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک دوسرے حملہ آور انداز میں اس نے ہاتھ کو حرکت بھی دی تھی لیکن میں پیچھے ہٹنا چلا گیا۔

میرا پاؤں فرش پر پڑی ہوئی ایک خالی بوتل پر پڑا۔ وہ بوتل فرش پر پھسل گئی۔ میں اپنا توازن پر قرار نہ رکھ سکا اور۔۔۔ لڑکھا لیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا تھا۔ تج سنگھ نے مجھ پر پھلانگ لگا دی۔

جھلانگ لگاتے ہوئے اس نے ٹوٹی ہوئی بوتل سے میرے چہرے پر حملہ کیا اگر میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ نہ روک لیتا تو جھنجھکی طرح بوتل کی ٹکلی ٹوٹیں میرے چہرے کو اس طرح مس کر دیتیں کہ میں خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکتا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کا وار روکا تھا لیکن پھر دوسرا ہاتھ بھی اس کی کھائی پر جمادیا۔ وہ میرے سینے پر سوار تھا اور بوتل والے ہاتھ کو پوری قوت سے نیچے لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس میں بے پناہ طاقت تھی۔ بول آہستہ آہستہ میرے گلے کی طرف نیچے آ رہی تھی۔ میں نے دانت بھیجنے لیے اور میرے جسم کی پوری طاقت اس وقت میری ہانوں میں سمٹ آئی تھی۔ میں اس بول کو اپنی شہ رگ سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت میں واقعی شدید دباؤ میں تھا۔ میرے جسم کے تمام بڑی تیزی سے پسینہ اگلنے لگے تھے اور چہرے پر بھی پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ موت لمحہ بہ لمحہ میری شہ رگ کے قریب آ رہی تھی۔

تج سنگھ نے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ بول کا ایک کنارہ میری ٹھوڑی کو چھو گیا۔ ہا کا سا چر کا لگا اور خون رسنے لگا۔

اس کا ہاتھ کچھ اور نیچے آ گیا تھا۔ میرے زرخے اور بول کے درمیان غالباً ایک انچ یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا اور یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ کسی بھی لمحے میرا زرخہ اُدھر ٹک سکتا تھا۔

”اب کبھی نہیں۔“

میرے دماغ میں ایک زوردار جھماکا ہوا اور مجھے بولوں کا جیسے میری ہانوں میں نئی قوت بھگتی ہو۔ میں اس کا ہاتھ اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ ٹوٹی ہوئی بول پلٹے میرے گلے اور پھر میرے چہرے سے اوپر ہوئی چلی گئی اور پھر میں نے اس کے ہاتھ کو ایک زوردار ہتھکا دیا۔

تج سنگھ دائیں طرف فرش پر الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بول دیوار سے ٹکرا کر مزید ٹوٹ گئی۔ اب اس کے ہاتھ میں صرف بول کی گردن رہ گئی تھی۔

میں بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے سنبھالنے کا موقع دینے بغیر اپنا پیر اس کی کٹائی پر رکھ دیا اور دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ اس کی مٹھی بتدریج چلتی چلی گئی اور ٹوٹی ہوئی بول کی گردن بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے دوسرے پیر سے اس کے اسی بازو کے کندھے پر زوردار ٹھوکر ماری۔

تج سنگھ ہلکا اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے پیر کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں نے پوری قوت سے اچھیل کر اپنا پیر اس کی گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف ہٹ گیا اور بائیں ہاتھ کی پٹیلی سے اپنی ٹھوڑی پر رسنے والا خون پونپٹنے لگا۔

تج سنگھ بھی بڑا جگرے والا آدمی تھا۔ جس طرح اس کی ٹاک کا بانٹا ٹوٹا تھا اور شاید سانے کے ایک دو دانت بھی اپنی جگہ سے ہل گئے تھے اسے تو ہتھیار ڈال دینا چاہیے تھے لیکن

وہ نہ صرف میرا مقابلہ کر رہا تھا بلکہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اپنا سینے کی طرف مڑا اور ہوا ٹکڑوں میں اسے طرح دے کر اپنے آپ کو بچا گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے دوسری طرف دیکھا۔ دھرمیش جاگی کو روک رہا تھا لیکن جاگی بھی بڑی دلیری سے اس کا مقابلہ کر رہی تھی اور دھرمیش ابھی تک اسے پوری طرح زیر نہیں کر سکا تھا۔

کھلا چادر جسم پر لپیٹ کر کے کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ دہشت اور چہرے پر خوف تھا اور پھر وہ موقع پا کر دروازے کی طرف لپک گیا۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا مگر اس وقت تج سنگھ نے ایک بار پھر پلٹ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں غفلت میں اس مرتبہ مار کھایا اور وہ مجھے دیکھا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکا اس نے میرے جڑے پر دو تین ہمت ہی کر کے قسم کے ٹھونکے جڑ دیے۔

میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ میں نے تج سنگھ کی کٹائی گرفت میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اسی بازو کی بٹل میں ایک دھار گھونسا مارا۔ وہ تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ میرا دھار گھونسا اس کے کندھے والے جوڑے پر پڑا۔ وہ بڑی طرح کی گھبراہٹ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ٹھٹھنے سے ضرب لگا کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ ہرا ہوا گیا اور میں دھرمیش کی طرف لپک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جاگی کے گلے پر تیار رکھے تھے اور جاگی بری طرح ہاتھ پیر پیر کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے خرواحٹ کی عجیب مٹھی مٹھی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

دھرمیش کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے کف بہہ رہا تھا۔ شاید اسے اب بات کا بھی خدہ تھا کہ اتنی دیر میں ایک عورت اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی اور جب وہ اس کے قابو میں آئی تو اس پر بخون ملائی ہو گیا تھا اور وہ جاگی کو جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔

میں نے لپک کر دھرمیش کی پالیوں پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری «مری» ٹھوکر اس کی ٹھوڑی پر پڑی۔ یہ وار کارگر ثابت ہوا اور وہ کراہتا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کر دی۔ اس دوران میں تج سنگھ میری طرف لپک گیا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھل کر اس کے چہرے

فٹانک تک رسید کر دی۔ وہ الٹ کر دروازے میں مگر میرا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر کچھ پر حملہ کرے گا لیکن اس نے سنبھلتی ہی دروازے سے باہر چلا گیا۔

”منا بھاگ! وہ! نہ چٹا۔“  
منا بھاگ دھرمیش بھی کھونچتی سسلاتا ہوا اٹھ گیا تھا۔ میں نے لپک کر اسے کندھا مارنا چاہی لیکن وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ میں اپنا توازن کھو بیٹھا اور لڑکھڑا کر گر گیا اور جب یہ تو دھرمیش دروازے کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔

میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں بجائی باہر والے دروازے کی طرف گئے ہوں گے لیکن بائیں طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے اس طرف دیکھا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ اوپر جانے کے لیے پڑھیاں تھیں اور وہ دونوں سیڑھیوں پر دوڑے جا رہے تھے۔ میں اس طرف اٹھا لیکن وہ پھست پر پہنچ چکے تھے۔

میں دوڑتا ہوا کمرے میں واپس آ گیا۔ جاگی مہسری پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے حلقوں سے ابلی پڑی تھیں۔ چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ اسے شاید سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا کلا سلا رہی تھی۔

”جاگی۔ جاگی۔ بوش میں آؤ۔“ میں نے اسے سارا دے کر اٹھا دیا۔

”پسپ۔ پانی۔“ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ الماری کے ساتھ ڈرننگ ٹیبل پر شیشے کا جگڑ رکھا ہوا تھا جو ادھے کے قریب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بٹک اٹھا لیا اور جاگی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی جاگی کے حلق میں گیا اور کچھ اس کی ٹھوڑی اور گلے پر بہتا ہوا شربت کو تر کر دیا۔

پانی کے ایک دو اور ٹھونٹ پینے کے بعد جاگی کے چہرے پر بحال ہونے لگے۔ وہ متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”وہ بھاگ گئے۔“ میں نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھنے سے کہا۔

”تج سنگھ تم ٹھیک ہو؟“ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔  
”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا تم اٹھ سکتی ہو؟“  
”میں ابھی زیادہ دیر رکتا مناسب نہیں ہے۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ جاگی بالکل بحال ہو رہی تھی۔ میں نے اسے سارا دے کر اٹھا دیا اور بازو سے پکڑ کر دروازے کی

طرف چلے لگا۔ دو تین قدم چلنے کے بعد وہ سنبھل گئی۔ میں دروازے کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ڈرننگ ٹیبل کی اوپر والی دروازہ اب کھلی ہوئی تھی اور اس میں کوئی چیز چھپنے دیکھ کر میں اس طرف بڑھ گیا اور دروازے کی طرف باہر پہنچ دی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

درازیں ایک خطرناک خنجر تھا۔ کھلی ہوئی دراز میں وہی خنجر بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ خنجر کے ساتھ ہی بیٹھوٹی ٹال والا ایک ریوالور بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ ریوالور اٹھا لیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں پوری گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ ریوالور میں نے نیب میں ڈال لیا اور خنجر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ایک طرف دھار تھی اور دوسری طرف دراہنی کی طرح بہت باریک باریک دندانے بنے ہوئے تھے۔ میں نے خنجر بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ ان دونوں بھائیوں میں سے کسی کو یہ ہتھیار اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر ریوالور ان میں سے کسی کے ہاتھ میں آجاتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

جاگی دروازے سے نیک لگائے کھڑی ایک ہاتھ سے گلا سہلا رہی تھی۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ دونوں بھائی جس طرح بھاگے تھے ان کے واپس آنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

بیرونی دروازے کے قریب آکر میں نے گلی میں ادھر ادھر بھاگنا۔ کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک عورت بائیں طرف جا رہے تھے۔ مرد نے کندھے پر تین چار سال کے ایک بچے کو بٹھا رکھا تھا۔

میں نے جاگی کو اشارہ کیا اور ہم مکان سے نکل کر گلی میں آ گئے۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے مخالف سمت سے آنے والے دو اور آدمی بھی ملے تھے وہ اپنے کسی ٹیبلو مسٹر پر بحث کرتے ہوئے چل رہے تھے اس لیے ہماری طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔

روپ مٹھی کی کار دو سری گلی میں موجود تھی لیکن جب ہم کار کے قریب پہنچے تو روپ مٹھی کو کار میں نہ پا کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لیے روپ مٹھی کار سے اتر کر کسی تاریک گوشے میں دبک گئی ہوگی۔

میں تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے سر کو شیاں انداز میں اس کا نام لے

کردو تین مرتبہ پکارا بھی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میرے دماغ میں سنسنابٹ سی ہونے لگی۔ اگر روپ متی اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لیے کار سے اتر کر کہیں چھپی ہوئی تو ہمیں دیکھ کر یا میری آواز سن کر اسے سامنے آ جانا چاہیے تھا۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے دوسرے سہارے لگے۔ میں نے جاگنی کو کار کے قریب چھوڑا اور روپ متی کو ادھر ادھر کی گلیوں میں تلاش کرنے لگا۔ میں اس کا نام لے کر سرگرمیوں میں آوازیں بھی دے رہا تھا لیکن روپ متی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں واپس آگیا۔ جاگنی کا رستہ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

وہاں سے چند گز کے فاصلے پر بجلی کے کھمبے پر بلب جل رہا تھا جس کی زرد روشنی یہاں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ بلب کی روشنی میں جاگنی کا چہرہ چھ اور بھی پیلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ٹھیںڈی دامن کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

میری حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ٹھوڑی کے زخم سے اب بھی بہت ہلکا خون رس رہا تھا جسے میں بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ شراب کی بول میں میرے سر پر پٹی تھی۔ میرے بال بھی بھیکے ہوئے تھے اور شرٹ بھی تر تھی۔ شراب کے بھیکے سسکل میرے دماغ میں گھسے جا رہے تھے اور میں اس وقت سے اب تک بڑی مشکل سے یہ برداشت کر رہا تھا۔

ہم روشنی میں کھڑے تھے اور اس وقت تو ابھی رات کے گیارہ ہی بجے تھے۔ گلی میں اکا دکا لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ جب کوئی ہمارے قریب آتا تو ہم نرم رخ بدلیتے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ہماری حالت دیکھ کر کوئی راہ گیر ہم سے پوچھنا شروع نہ کر دے۔

”روپ متی میں ملی۔ کہاں گئی؟“ جاگنی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی۔“ میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ دونوں بھائی چیت پرست بھائے تھے۔ وہ سکتا ہے وہ مکان کی چیتوں کی چیتوں پر ہوتے ہوئے اس طرف کہیں گلی میں اترے ہوں اور روپ متی کو اکیسے دیکھ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔

”گاڑی میں بیٹھو۔ ہم زیادہ دیر یہاں انتظار کر سکتے۔“ میں نے جاگنی سے کہا اور اس کے لیے کچھ کچھ کا دروازہ کھول دیا۔

جاگنی کے بیٹھنے کے بعد میں بھی اوپر سے گھوم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”تمہاری ٹھوڑی سے خون بہہ رہا ہے۔“ جاگنی سیٹ پر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے لمبے لمبے ٹھنڈے نمایاں تھے۔

”ہاں۔“ میں نے انجن اشارت کرتے ہوئے کہا۔ غصیت سے کہ چوٹ ٹھوڑی تک ہی محدود رہی۔ اگر ٹیلا بولن کی نوک میری شہ رگ کو چھو جاتی تو میں مجرم ہو جاتا۔“

”ایسی باتیں منہ سے مت نکالا کرو۔“ جاگنی نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”روپ متی کو تلاش کرنا چاہیے۔ اگر وہ ان حرام زادوں کے ہاتھ لگ گئی تو وہ کا حشر کریں گے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ دونوں بھائی چیتوں سے ہونے لگے۔“ اس گلی میں کووے ہوں گے اور یہاں روپ متی کو دیکھنا اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔“ جاگنی نے کہا۔ ”اگر انہوں نے یہاں روپ متی کو دیکھا ہو تو انہوں نے گاڑی کو نظر انداز نہ کرتے۔ گلیوں میں پیدل دوڑنے لاکھ دوڑے بہتر ہوتی۔“

جاگنی کا خیال بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جتنی جلدی زخمی تھا۔ دھرمیش کا چہرہ بھی جاگنی نے اپنے ٹانگوں سے تھام لیا۔ وہ اپنے گھر سے بھاگے بھی نکلے تھے۔ اس وقت اس کے حوالے کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس طرف آئے ہوتے تو وہ متی سے زیادہ اس گاڑی پر توجہ دیتے جو انہیں فراہم میں مدد سے کھتی تھی۔ تو پھر روپ متی کہاں گئی؟

میں سوچتے ہوئے میں نے گاڑی آگے بڑھا کر اس طرف کی ایک گلی میں موڑ دی۔ دراصل مجھے معلوم تھا کہ یہ راستہ آگے کس طرف جاتا تھا۔ میں تو گاڑی کی موڑ کر پورے میں لینا چاہتا تھا تاکہ جس راستے سے ہم آتے تھے اس راستے سے واپس جا سکیں۔

اس گلی میں اندھیرا تھا۔ میں نے کار کے بلیک پیس نہیں جلائے تھے۔ کار کو اس گلی میں موڑا ہی تھا کہ کار سے ٹکرا گیا۔ میں نے جلدی سے بریک لگا دی۔

”ساتھ ہی بند۔“ لمپس روشن کر دیے۔ دوسرے ہی لمحے میں جھلکا۔

”کار سے نکالنے والا وہ سب کچھ کھلا تھی اور اس کے پیچھے روپ متی بھی جو کھلا کر دھکے دیتی ہوئی لاری بھی۔“ کھلانے کے بعد میں نے اپنے جسم پر پٹی ہوتی چادر پکڑ رکھی تھی لیکن س کے جسم کا کچھ حصہ برہنہ ہو رہا تھا۔ بند لمپس کی روشنی میں اس کے چہرے پر بے پناہ خوف نظر آ رہا تھا۔

”اے روپ متی۔ کہاں غائب ہو گئی تھیں تم؟“ میں انجن بند کر کے جلدی سے کار سے اتر آیا۔ ”یہ کیا اتفاق سے مجھے اس گلی سے نکلتی ہوئی نظر آ گئی تھی۔“ روپ متی نے جواب دیا۔ ”مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں کار سے اتر کر اس کے پیچھے لپکی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ بہت جلدی سے دوڑا دوڑا کر تھکا دیا۔ اس کا حساب کتاب تو میں جو گلی میں جا کر کروں گی اور تمہ۔ زخمی ہو رہے ہو۔ ان دونوں حراموں کا کیا ہوا؟“

”وہ دونوں بھاگ گئے اور مجھے ٹھوڑی پر معمولی سی چوٹ لگی ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تو ہمیں گاڑی میں نہ پکڑ کر نشان ہو گئے تھے۔“

”تم اسے لے کر پیچھے بیٹھو۔ میں ڈرائیونگ کرتی ہوں۔“ روپ متی نے کہا اور اوپر سے محوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں کھلا کو بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے آیا۔ پہلے اسے دھکا دے کر اندر بٹھایا اور پھر خود بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ کھلا میرے اور جاگنی کے بیچ سینڈوچ میں کر رہ گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے جسم پر پٹی ہوتی چادر کو سامنے سے میٹ پکڑ کر رکھا تھا۔

”روپ متی نے انجن اشارت کر کے گاڑی اسی گلی میں سے بھاڑی اور پھر مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک ایک دوایر لپکی۔ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی کھلا بالکل خاموش تھی لیکن میں اس کے جسم کی کپکپاہٹ کو واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس طرح پکڑے جانے پر خوف زدہ تھی اور خوف نے اس کی زبان بھی بند کر رکھی تھی۔

”مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی داند مارگ میں چار دوایر کی طرف نکل آئی اور وہاں سے سورج پل بازار اور رات گڑ بازار کا چوک پار کر کے گھاٹ دروازے سے ہوتی ہوئی اندھیرا کی طرف نکل آئی۔

یہاں میں ایک بات اور بھی بتانا چاہوں کہ سب پورا ایک تاریکی شہر ہے اس کی بنیاد مسارا جا ہے سنگھ خانی نے ۱۷۴۷ء

میں رکھی تھی۔ اس نے تقریباً چوالیس سال سے پور پر راج کیا۔ اس نے سب پور شہر میں بہت سی خوب صورت عمارتوں کے علاوہ شہر کے نواح میں واقع پہاڑی پر ایک بہت مضبوط اور شاندار قلعہ بھی تعمیر کروایا۔ یہ قلعہ ۱۷۴۴ء میں تعمیر ہوا تھا لیکن بعد میں آنے والے مہاراج اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں بھی کرتے رہے۔ اس قلعے کا قدیم نام تو سدھرن گڑھ ہے مگر بے پور سے قلعے تک جانے والا راستہ چونکہ نہار گڑھ نامی بستی سے گزرتا ہے اس لیے اس کا نام ہی نہار گڑھ قلعہ پڑ گیا اور آج کل اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ شہر کے تین اطراف میں پہاڑیاں اور ایک طرف ریگستان ہے۔ شہر کو دشمن کے حملوں اور ریگستان کی طرف سے اٹھنے والے ریت کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گرد ایک بہت اونچی اور بہت مضبوط فصیل تعمیر کروائی گئی تھی۔ شہر میں آمد و رفت کے لیے سات مرکزی دروازے تھے جو آج بھی موجود ہیں اور مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ شہر فصیل کے باہر بھی چاروں طرف پھیلتا چلا گیا۔ اس قدیم فصیل کے بیشتر حصے آج اگرچہ غائب ہو چکے ہیں لیکن ان دروازوں سے اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

میں نے چار دروازہ اور گھاٹ دروازہ نامی جن دو دروازوں کا ذکر کیا ہے یہ دروازے بھی اسی فصیل کا ایک حصہ ہوا کرتے تھے۔ آج یہ ان علاقوں کے نام ہیں۔

اگرہ مارگ کی مرکزی سڑک پر پہنچے فاصلے طے کرنے کے بعد کار آدرش ٹرکی طرف مڑ گئی۔ اس طرف مڑتے ہی مجھے بھی راستے کی سمجھ آ گئی۔ روپ متی کی حویلی آدرش ٹرکی میں تھی۔

حویلی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ روپ متی نے دور ہی سے ہمارا بجا دیا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو حویلی کا گیت بکھلا ہوا ملا۔ روپ متی کے بغیر کار کو اندر لینی چلی گئی۔

پورچ میں کار رکھتے ہی تارا سنگھ وہاں پہنچ گیا۔ کار کا انجن بند ہوتے ہی میں اور جاگنی بھی نیچے اتر آئے تھے۔ وہاں تیز روشنی تھی روپ متی فوراً ہی ہماری طرف متوجہ ہو گئی۔ جاگنی اب بھی کچھ نہ بول سکی ہو رہی تھی اور بار بار ایک ہاتھ سے اپنا گلا سلارہی تھی۔ روپ متی فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ میں نے بھی پہلی بار جاگنی کو غور سے دیکھا۔ اس کے گلے پر دھرمیش کی انگوٹھوں کے نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ زرخرے پر دو تین خراشیں بھی تھیں۔ خون تو نہیں

لکھا تھا البتہ وہ جگہ سرخ ہو گئی تھی۔

روپ متی میری طرف مڑ گئی۔ وہ جیسے ہی میرے سامنے آئی۔ ایک جھٹکے سے رک گئی اور مجھے گھورتے ہوئے بولی۔  
”شراب کی بوسہ کیا۔“

”جب ہم بیچ سنگھ کے مکان میں داخل ہوئے تو بیچ سنگھ کلا کے ساتھ دائرہ پیش دے رہا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے روپ متی کی بات کاٹ دی ”اس کے فوراً ہی بعد دھرمیش بھی شراب کی نئی بوتل لے کر آگیا۔ میں ان کا سامان تھا۔ انہوں نے شراب سے میری تواضع کر ڈالی اور میں پوری بوتل۔“

”دھرمیش نے شراب کی بوتل اس کے سر پر توڑ دی تھی۔“ جاگتی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ روپ متی بولی ”میں بھی راستے بھرجان رہی کہ گاڑی میں سے شراب کی بوتل کہاں سے آ رہی ہے۔ لگتا ہے انہوں نے تم لوگوں کی کچھ زیادہ ہی تواضع کر ڈالی تھی۔ تمہاری ٹھوڑی سے بھی خون بہہ رہا ہے۔ اندر چلو۔ اوپر میرے کمرے میں۔“ اس نے کہا اور پھر قریب کھڑے ہوئے تارا سنگھ کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی ”اس کتیا کو کار سے اتار کر پیچھے سرون کوارٹریں لے جا کر بند کر دو۔ میں تھوڑی دیر بعد اس سے بات کروں گی۔“

کلا ابھی تک کاری میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تارا سنگھ نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا تو وہ روپ متی کے قدموں پر گر گئی۔ وہ اس طرح کانپ رہی تھی جیسے شدت کی سردی میں ٹھنہ رہی ہو۔

”مجھے معاف کر دو دیدی۔“ وہ اس کے پیر پکڑ کر مڑ گزرائی۔ ”مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں دھرمیش کے بھکاوے میں آ گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”چپ رہ کتیا!“ روپ متی نے اسے ٹھوکر مار کر دوڑا دیا ”گھنڈی نالی کے کپڑے گھنڈی نالی ہی میں اچھے رہتے ہیں۔ لکشی نے غلطی کی تھی کہ تمہیں تمہارے باپ سے بچایا تھا اور اس سے بڑی غلطی مجھ سے ہوئی کہ میں تمہیں یہاں لے آئی۔ یہاں تمہیں کیا دکھ تھا۔ عیش کرتی تھیں لیکن بیچ آخر بیچ ہی ہوتے ہیں۔ تم اس تھالی میں سوراخ کرتی رہیں جس میں کھاتی تھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دھرمیش کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا تو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم سدھ جاؤ گی لیکن تم وہی سب کچھ کرتی رہیں جس سے میں تمہیں روکنا چاہتی تھی لیکن وہ

حرامی پتا نہیں تمہیں کیا سزیاں دکھاتا رہا اور تمہیں اتنا غیرت نکلیں کہ بیک وقت دونوں بھائیوں کے سامان پھرے اڑائی رہیں۔ بست آگ لگی ہوئی ہے تمہارے اندر۔ میں بھادوں کی یہ آگ۔ برف کی طرح ٹھنڈا کھا گی تمہیں۔“

”مجھے جھما (معاف) کر دو راج کماری جی۔“ کلا۔ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے ”میں مجبور تھی۔ وہ جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے۔“  
”لے جاؤ اسے تارا سنگھ۔“ روپ متی نے یہ کہہ کر ہٹ کر کلا کو ایک اور ٹھوکر مار دی۔

تارا سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ کلا کی پھرا گئی۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر نہایت ٹھنڈا ہوا تھا۔ تارا سنگھ پروا کیے بغیر اسے کھینچتا ہوا حویلی کے کچھ طرف لے آیا۔

مندری بھی آواز میں سن کر پوچھ میں آ گئی تھی۔ تشویش آمیز نگاہوں سے مجھے اور جاگتی کو دیکھ رہی تھی۔ اندر داخل ہو کر روپ متی کے پیچھے چلتے ہوئے اوپر اس کمرے میں آ گئے۔

کمرے میں آتے ہی جاگتی مجھ سے پہلے ہاتھ دھو کر کھس گئی۔ واپس آنے میں اس نے تقریباً بیس منٹ لے دیے۔ اس نے منہ دھو کر کمرے پر اپنی سپنگ لوشن لگا تھا۔ اس کے بعد میں ہاتھ روم میں کھس گیا۔ پہلے ٹھوڑی پر زخم صاف کر کے اپنی سپنگ لوشن لگایا اور پھر کمرے کے کراؤں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میرے سر کے بال اور پیر۔ اب بھی شراب سے تر تھے اور بو سے میرا دماغ بھٹا جا رہا تھا۔ نما کر میں نے ایک بار پھر ٹھوڑی پر لوشن لگایا اور بڑا تو کیا لیٹ کر ہاتھ روم سے نکل کر کمرے میں رکتے بغیر تیز قدم اٹھاتا ہوا نیچے اپنے کمرے میں آ گیا اور وہاں: کر کے الماری سے کپڑے نکال کر سیننے لگا۔

میں جب دوبارہ اوپر پہنچا تو جاگتی بھی کمرے بدل چکی تھی اور مندری بھی میرے پیچھے ہی چائے لے کر کمرے میں آ ہوئی تھی۔ وہ عقل مند عورت تھی۔ اسے احساس تھا ہمیں کس وقت کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ”مندری۔ دیکھو اس دروازے میں بیچ سنگھ کے اسٹاپ ہوں گے۔ ایک نکال لاؤ۔“ روپ متی نے کہا۔ مندری نے ڈرنے کی ایک دراز کھول کر کاندے پر ٹاٹ کور میں سے ایک بیچ سنگھ اسٹاپ نکال کر روپ متی طرف بڑھا دیا۔ روپ متی نے کاندہ پکڑ کر بیچ سنگھ

اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے پہلے میرا اٹھایا اور پھر بڑی احتیاط سے زخم پر بیچ سنگھ لگا دی۔ جو اوپر کے ساتھ ایڈیسیو شپ تھا جو میری جلد پر چپک گیا تھا۔ بیچ سنگھ کی چسکیاں لیتے ہوئے کن انکھیوں سے ہماری ہانسی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کن انکھیوں سے ہماری

فرس دیکھ رہی تھی۔  
”ان دونوں حرامیوں کا کیا ہوا؟“ روپ متی نے اپنی کرچی پھینچتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”جھاگ گئے وہ دونوں۔“ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا ”اگر مجھے جاگتی کی فکر نہ ہوتی تو ان میں سے ایک تو قابو آتی جا۔“ میں چند ٹھوکوں کو خاموش ہوا اور پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں ”میں کہہ رہا تھا“ اور ہم باہر واپس آئے تو ہمیں غائب پا کر مجھے کچھ اور پریشانی ہوئی تھی۔ وہ وہاں چھوڑا ہوا کالی گلی میں کار ریورس کرتے ہوئے غم لگتی رو نہ ہم تمہیں وہیں چھوڑ آتے اور تم ہمیں ڈھونڈ رہیں۔“

”میں نے محض اتفاق سے کلا کو اس گلی سے نکلے ہوئے دیکھا تھا۔“ روپ متی نے میرے خاموش ہونے پر کہا ”میں نے پورا لیٹ رکھی تھی۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی لیکن سامنے والی گلی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مڑ کر کلا کو مجھے پر ملنے والے لب کی روشنی میں اس کا چہرہ نظر آ گیا اور میں نے بھی کار سے اتر کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔“ وہ خاموش ہو کر چائے کی چسکیاں لینے لگی اور پھر تفصیل سے بتانے لگی کہ اندھیری اور بیچ سنگھوں میں کلا کو تلاش کرنے اور پھر اس پر قابو پانے میں اسے کیا کیا پڑے بیٹے ہنسے تھے۔ وہ ایک بار پھر چائے کی چسکیاں لینے لگی اور چند ٹھوکوں کی خاموشی کے بعد وہ کہہ رہی تھی۔

”بیچ سنگھ کے کم از کم دو ٹھکانے ایسے ہیں جن کے بارے میں میں جانتی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی جگہ نہیں ملیں گے۔“

”مثلاً۔“ وہ ٹھکانے کیسے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں وہ اپنے آپ کو وہاں محفوظ سمجھ سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”ایک تو ان کا کھانا ہے۔ اجیری گیٹ کے قریب۔“ روپ متی نے جواب دیا ”وہ بھانجان آبادی کا علاقہ ہے۔ مجھے پاس آنے کے بعد وہ اگرچہ اکھاڑا بند کر چکے تھے لیکن اب بھی وہاں جاتے رہتے تھے۔ بڑی لمبی جوڑی جگہ ہے۔ دیکھو وہاں اسٹاپ میں ایک طرف اکھاڑا ہے اور اس کے باقیوں میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی وہ عمارت ہے جو اگرچہ ٹھوڑی تھی ہے لیکن اس کے کچھ کمرے اب بھی رہائش

کے قابل ہیں۔ یہ عمارت دراصل بیچ سنگھ کے استاد نور سنگھ پہلوان کی ملکیت تھی۔ نور سنگھ پہلوان کا دور قریب کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور وہ وسیع و عریض عمارت اسے ورثے میں ملی تھی۔ بیچ سنگھ چالاک آدمی ہے۔ اس نے نور سنگھ کو اس طرح شیشے میں اتار لیا کہ اس پہلوان نے اسے اپنا بیٹا بنالیا اور یہ عمارت اس کے نام لکھ دی۔ نور سنگھ کا کوئی اور رشتے دار تو تھا نہیں جو اس کے اس فیصلے کو چیلنج کرتا۔ بہر حال، بیچ سنگھ کے نام کا جادو مختل کرنے کے تقریباً چھ مہینے بعد نور سنگھ پہلوان پر اسرار طور پر ہلاک ہو گیا۔ اور اس کا دوسرا ٹھکانہ۔“ وہ چند ٹھوکوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”بھکوان واس روڈ پر واقع ایک عمارت شان بلندنگ میں وہ گھڑی فلیٹ ہے جو اس نے تقریباً ایک سال پہلے خریدا تھا۔ وہ دونوں بھائی چھٹیاں اس فلیٹ میں گزارہ کرتے تھے لیکن مجھے پورا وشواش (یقین) ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی جگہ پر نہیں ملیں گے۔“

”مجھے تم سے اتفاق ہے۔“ میں نے کہا ”وہ یقیناً کسی ایسی جگہ پناہ لیں گے جس کے بارے میں تم نہ جانتی ہو۔“  
”لیکن کلا ضرور جانتی ہوگی۔“ روپ متی نے کہا ”میں تو اب تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ وہ صرف دھرمیش کے ساتھ گل چھڑے اڑاتی رہی ہے لیکن یہ انکشاف تو میرے لیے بڑی سنسنی خیز ہے کہ وہ دونوں بھائی اس بستی لگا میں ہاتھ دھوئے رہے ہیں۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ وہ ان بیچ سنگھ کے ساتھ بھی باہر جاتی رہی تھی۔ بہر حال، آؤ۔ کلا سے معلوم کرتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں وہ کہاں پناہ لے سکتے ہیں۔“

وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اٹھ گئی۔ میں نے بھی سیٹ چھوڑتے ہوئے سوالیہ نظریں سے جاگتی کی طرف دیکھا۔

”تم لوگ جاؤ۔ میں سونا چاہتی ہوں۔“ جاگتی نے جواب دیا اور کمرے سے اٹھ کر روپ متی کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ بیس سو یا کرتی تھی۔ روپ متی کے ساتھ۔

میں روپ متی کے ساتھ نیچے آ گیا۔ تارا سنگھ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔

”وہ کہاں ہے؟“ روپ متی نے پوچھا۔

”سرون کوارٹریں میں راج کماری۔“ تارا سنگھ نے جواب دیا اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔

تارا سنگھ نے اسے اپنے سرون کوارٹریں میں بند کیا تھا۔ دروازے کو باہر سے ٹالا لگا ہوا تھا اور چابی تارا سنگھ کے پاس

موجود تھی۔

صحن والا دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ گوارڈ دو دو کمروں کے تھے۔ کمروں کے ساتھ برآمدہ تھا اور برآمدے میں بتی جل رہی تھی۔

تارا سنگھ نے ذیبت سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے دائیں طرف والے کمرے کا تالا کھولنے لگا۔ کمرے کے اندر بھی بتی جل رہی تھی جس کی روشنی دوپٹ والے دروازے کی بھڑوں سے جھلک رہی تھی۔

تارا سنگھ نے تالا کھول کر دونوں ہاتھوں کے پلکے سے دھکے سے دروازہ چوٹ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

کمالا ایک پھندے میں چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل کپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بہت ہی خوفناک منظر تھا۔ کمالا گلے میں پڑے ہوئے پھندے سے جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں صفوں سے اٹلی ہوئی اور زبان ہا ہر کو لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ بہت بھیاک ہو گیا تھا۔

اپنے قریب ہی بلکی سی چیخ سن کر میں چونک گیا۔ وہ روپ متی تھی جو کمالا کو اس طرح پھندے سے لٹکے ہوئے دیکھ کر چیختی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر بے پناہ وحشت تھی۔ ہمارے پیچھے کھڑا ہوا تارا سنگھ بھی وحشت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔

میں ایک بار پھر سامنے دیکھنے لگا۔ کمرے کی چھت کافی اونچی تھی۔ یہ لیٹر کی چھت نہیں تھی بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آہنی گارڈر ڈال کر چھت تیار کی گئی تھی۔

کمالا نے بستر کی چادر کی ایک چوڑی پٹی پھاڑ کر اسے رسی کی طرح بٹ لیا تھا اور اسے چھت کے آہنی گارڈر میں سے گزار کر پھندا بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔ رسی کو چھت کے آہنی گارڈر سے گزارنے اور گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے ایک چھوٹی میز اور کرسی استعمال کی گئی تھی۔ میرا اندازہ ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں بھی کر کمالا چھوٹی میز پر کرسی رکھ کر اس کے اوپر چڑھی ہوئی۔ پہلے اس نے رسی گارڈر میں سے گزار کر پھر گلے میں پھندا ڈال کر کرسی کو پیروں کے نیچے سے گرا دیا اور وہ پھندے سے لٹک کر رہ گئی۔ کرسی اور میز اس کی بھولتی ہوئی لاش کے عین نیچے فرش پر الٹی پڑی تھیں۔

میں اور میرے پیچھے روپ متی اور تارا سنگھ بھی کمرے میں آ گئے تھے۔ تارا سنگھ نے تیزی سے آگے بڑھ کر چار پر سیدھی کی پھر کرسی اس کے اوپر رکھ کر اوپر چڑھ گیا اور آہنی گارڈر میں رسی کی گرہ کھولنے لگا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر پھندے سے جھولتی ہوئی کمالا کی ٹانگوں کو گرفت میں لے لیا تاکہ رسی کھلے۔ وہ نیچے نہ گر سکے۔

تارا سنگھ کو وہ گرہیں کھولنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ میں نے لاش کو سنبھال کر آہستہ سے نیچے اتارا اور چارپالی پر ڈال دیا۔ تارا سنگھ نیچے آ کر آیا۔ اس نے کمرے اور میز انہماک پر ایک طرف رکھ دی اور وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ تارا سنگھ مار دھاڑ کا آدھی تھا۔ چنگیز قسم کا۔ ممکن ہے زندگی میں ایک دو آدمی اس کے ہاتھ مارے بھی جا چکے ہوں یا شدید زخمی ہوئے ہوں۔ وہ انہماک باتوں سے خوف زدہ ہونے والا نہیں تھا لیکن کمالا کی لاش دیکھ کر وہ بھی وحشت زدہ سا ہو گیا تھا۔

میں نے کمالا کے گلے پر سے بڑی مشکل سے پھندے کی گرہ کھول کر رسی اس کے گلے سے الگ کی۔ گلے پر رسی کا گہرا نشان بن گیا تھا۔ زخروں کی جگہ دہی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

کمالا کے جسم پر زیر جانے کے نام پر ایک نہایت نازک لباس تھا۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی ٹھنک محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے کان کے نیچے گردن پر ایک مخصوص جگہ پر انگلی رکھی۔ وہاں بھی خاموشی تھی۔ ٹھنک نہ آ رہی تھی۔ چارپالی کے کتیلے کے قریب چند اور جگہ کے علاوہ ایک چھوٹا آئینہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے ساری چیزیں پہلے میز پر پڑی ہوں گی۔ میز استعمال کرنے کے لیے کمالا نے یہ چیزیں اٹھا کر چارپالی پر ڈال دی تھیں۔ میں نے وہ آئینہ اٹھا کر کمالا کی ناک کے نیچے لگا دیا لیکن ابھی سو اچھ نہیں ملا۔ کمالا میں اگر زندگی کی رقت ہوئی تو وہ بلی ہی سی سسلی سسلی کی آمدورفت بھی ہوتی جس سے ناک نیچے رکھا ہوا آئینہ دھندلا جاتا لیکن آئینہ بالکل صاف تھا۔ کمالا کو پھندے سے لٹکے ہوئے دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ وہ ختم ہو چکی ہے لیکن یہ سب کچھ میں نے تارا سنگھ روپ متی کی نسل کے لیے کیا تھا۔

کمالا کا چہرہ بہت بھیاک ہو رہا تھا۔ میں نے بستر پر کھینچ کر اس کے اوپر ڈال دی اور روپ متی کی طرف گیا۔

”ختم ہو چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ہمیں یہاں آ

”مجھے تو بوجھ ہی ہے۔“ اگر کمالا نے اس کے ایک بعد ہی گلے میں پھندا ڈالا ہو گا تو اتنی دیر لٹکے رہنے کے بعد زندہ جانے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھندے پر سے وہ دو منٹ میں ہی جان کنل جاتی ہے۔

موت۔ کتابچہ ایک لفظ ہے۔ ہر ذی روح اس سے زور دیتا ہے۔ اپنے آپ کو اس سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن۔ آتما ہوتا (خود کشی)۔ اپنے آپ کو خود موت کے حوالے کرنا واقعی بہت جرات اور کلام ہے۔

کمالا نے خوف ہی کی وجہ سے اپنے آپ کو پھندے سے ختم کر لیا تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں جگہ جگہ ش کا شکر کچھ لیا تھا۔ پکڑے جانے کے بعد اسے بھی ہمارے اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بد تر سلوک کیا۔ آتما اسے تشدد اور اذیت سے بچنے کے لیے اس نے کیا کیا اس کے خیال میں تمام تظنیفوں اور اذیتوں سے ایک آسان راستہ تھا۔

ہم نے گھوم کر روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کی لباس اب بھی وحشت سی بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ہونے میں ایک اور بات سوچ رہا تھا۔ اگر پولیس کو اطلاع دی جاتی تو ہم خوبی کسی چکر میں آتے تھے۔ روپ متی کے ساتھ پولیس کا رویہ میں دیکھ کر کئی بھی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ کمالا نے خود کشی کی۔ جب اس کی موت کی خبر سامنے آئے گی تو وہ دونوں بھی سامنے آجائیں گے۔ وہ پولیس کو بتائیں گے کہ ہم انہماک کر کے لٹکے تھے اور پھر اسے گلا گھونٹ کر کھلا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس ان دونوں بھائیوں کے واپس دے گی اور روپ متی ایک ایسے چکر میں پھنس جائے گی جس سے کمالا مشکل ہو جائے گا اور ظاہر ہے میں بھی اس کا بوجھ دوں گا۔

”اب کیا ہو گا؟“ روپ متی کی سرسراہٹ ہوئی تو اس نے انہماک کی طرف گھوم گیا لیکن میرے کچھ بولنے سے پہلے انہماک بول پڑا۔

”پولیس کو خبر کروں راج کماری جی؟“ روپ متی اس زور سے چیختی تھی کہ انہماک پڑا۔ ”خبردار۔ اگر تمہاری زبان سے ایک کلمہ نکلے گا تو تمہاری زبان سے ایک کلمہ نکلے گا۔“ تارا سنگھ سم گیا۔

پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب ہو گا کہ ہم کسی نئی

صیبت میں پھنس جائیں گے۔“ میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پولیس پہلے ہی تمہارے خلاف ہے۔ تمہیں بڑے آرام سے قتل کے گیس میں چھانسا لیا جائے گا۔“ ”تو پھر؟“ روپ متی بولی ”لاش کو حویلی کے کپڑوں میں کسی جگہ دبا دیا جائے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہل دیا۔ ”کمالا کی لاش کی پر وہ دونوں بھائی پولیس کو تمہارے خلاف ضرور درخلا دیں گے۔ تم پر اس کے قتل کا شبہ بھی ظاہر کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے پولیس حویلی کی تلاشی بھی لے لے ایسی صورت میں وہ سب سے پہلے کپڑوں پر توجہ دے گی۔ تازہ کھدی ہوئی جگہ پر فوراً شبہ ہو گا۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنی ہوگی۔“

”حرام زادی۔ کتیا۔!“ روپ متی کمالا کی لاش کی طرف دیکھ کر دانت کچکاتے ہوئے بولی ”مرنے کے بعد بھی میرے لیے مشکل پیدا کر رہی۔“

”اب وہ تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہمیں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں سے اس کا سراغ نہ لگایا جاسکے۔“ ”اس وقت ذہن میں صرف ایک ہی بات آ رہی ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سنگانیر۔“ روپ متی نے جواب دیا ”یوں تو بہت سی جگہیں ہیں جہاں اس حرافہ کی لاش کو پھینکا جاسکتا ہے لیکن سنگانیر ایسی جگہ ہے جہاں کی روز تیک اس کا پتا نہیں چل سکتا گا۔“

”یہ کہاں ہے؟“ میں نے پھر پوچھا۔ ”میان سے تقریباً سولہ کلومیٹر جنوب میں ایک قدیم شہر ہے جو اب تقریباً کھنڈرات میں بدل چکا ہے۔ وہاں چند تاریخی عمارتیں اور قدیم مندر بھی ہیں۔ اگرچہ سیاح اس طرف جاتے رہتے ہیں لیکن اس لاش کو ان کھنڈروں میں کہیں بھی ڈالا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی وہ علاقہ زیادہ تر جنگل سے بنا ہوا ہے۔“

”تو پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا ”بہتر ہو گا کہ ہم دن کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے پہلے اس لاش کو ٹھکانے لگا دیں۔“

”تارا سنگھ۔“ روپ متی اس کی طرف مڑتی ”اس لاش کو کسی بوری میں ڈال دیا چاروں میں ٹھہری بانہ دو۔ میں



ابھی آ رہی ہوں اور سنو۔" اس نے تارا سنگھ کے چہرے پر نظریں جمادیں "تمہاری زبان بند رہتی چاہیے۔ کھلا کے بارے میں کوئی بات اس حویلی کی چار دیواری سے باہر نہ نکلتے۔"

"میں نے آپ کا نمک کھایا ہے یا بھکاری۔" تارا سنگھ نے جواب دیا۔ روپ متی اس کی طرف دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

تارا سنگھ نے کھلا کی لاش پر پڑی ہوئی چادر کھینچ کر فرش پر بچھا دی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر لاش اٹھا کر چادر پر ڈال دی۔ تارا سنگھ نے بڑی بے دردی سے لاش کی ٹانگیں موڑ کر گھڑی باندھ دی اور باہر جا کر کہیں سے پوری لے آیا۔ ہم دونوں نے مل کر وہ گھڑی اس پوری میں ڈال دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پوری سرونٹ کو اڑے نکال کر پچھارو کے پچھلے حصے میں ڈال دی گئی۔ مندری بھی برآمدے میں کھڑی تھی۔ جاگی کے بارے میں مندری نے بتایا کہ وہ سو چکی ہے۔

تارا سنگھ نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ مندری اس کے برابر پیئجریز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اور روپ متی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے لباس بدل لیا تھا۔ چہرے پر پکا سا میک اپ بھی تھا اور وہ بڑی حد تک تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ پچھارو حویلی کے گیٹ سے نکل کر تیزی سے ویران سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

مندری کو ساتھ لے جانے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور جب یہی سوال میں نے روپ متی سے کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"جے پور اڈاپورٹ میں بھی اسی طرف ہے۔ بعض اوقات اس طرف آنے جانے والی گاڑیوں کو چیکنگ کے لیے روک لیا جاتا ہے لیکن اگر گاڑی میں عورتیں ہوں تو چیکنگ نہیں کیا جاتا۔"

روپ متی کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس وقت تین بیٹے والے تھے پچھارو آدرش مگر سے نکل کر موٹی ڈوگھری روڈ پر آگئی۔ یہی سڑک انڈسٹریل روڈ کو کراس کرتی ہوئی سنگانہ اور انڈرپورٹ کی طرف جاتی تھی۔ اس سڑک پر لاکھ لاکھ گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ شہر سے تقریباً پانچ گلو میٹر دور نکل آنے کے بعد تارا سنگھ نے پچھارو ایک اور ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ یہ سڑک بالکل سنسان تھی۔

سنگانہ سڑکی گھر تھیب میں واقع تھا۔ یہ شہر کے ویران نہیں تھا۔ بہت زیادہ قدیم عمارتیں کھڑی تھیں۔ تبدیل ہو چکی تھیں جبکہ باقی حصہ آباد تھا۔ شہر کے ویران کے ساتھ ایک گنجان اور بہت بڑا جنگل تھا۔ تارا سنگھ پچھارو اس جنگل کی طرف جانے والے راستے پر موڑنا اور بالآخر ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔

کسی بہت قدیم عمارت کے کھنڈر تھے۔ توہم دونوں جھاڑیوں، بیلوں اور بے تحاشا پھیلے ہوئے درختوں سے عمارت کو تقریباً چھپا کر رکھا تھا۔

تارا سنگھ نے انجن بند کر دیا۔ تمام بوٹھیاں بج دیں۔ اس کے ساتھ میں بھی بیٹھے اتر آیا۔ ہم دونوں نے کرپوری کو باہر نکالا جسے تارا سنگھ نے کندھے پر لا کر عمارت کے کھنڈر کی طرف جھاڑیوں میں گھسٹا چلا گیا۔

میں گاڑی کے قریب کھڑا رہا۔ تارا سنگھ کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کراچی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں میں بھی کھلی پر بیٹھ چکا تھا۔

تارا سنگھ نے واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ جنگل سے نکل کر گاڑی نے شہر کے باہر ہی پھول پھولنے والی پورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئی۔ انڈرپورٹ سے اس سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت تھی۔ تارا سنگھ بھی اس ٹریفک میں شامل ہو گئی۔

شہر کے پہلے چوراہے پر پولیس کی ایک پائلٹ گاڑیوں کو روک رہی تھی۔ ہماری گاڑی کو بھی روک لیا گیا۔ تارا سنگھ نے رفتار کم کر دی لیکن گاڑی نے اس طرح رکنے سے پہلے ہی پولیس والے نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

روپ متی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پولیس والے سیٹ پر مندری کو بیٹھنے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ روپ متی دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوسکا ہے یا نہیں؟ یہ بھی پڑی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ مندری کو وہ ٹائٹیل نے گاڑی کو جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم مختلف سڑکوں سے ہوئے حویلی پہنچ گئے۔

"تم جاکر سو جاؤ مندری۔" روپ متی نے اس کے بعد کہا "اور ایک بات یاد رکھنا۔ کھلا میلان تھی۔ اس روز تارا سنگھ اور دھرمیش کے ساتھ جانے نہ تم نے کھلا کو دیکھا نہ تم نے اس کے بارے میں کچھ دیا تو ان سنگھ اور تارا سنگھ کو بھی یہ بات اچھی طرح

مجھ غنی راج کماری۔" مندری سر ہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں نے آواز بند کر دیا۔ ٹھٹھ کی ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔ لاک کی ٹاب آتے ہوئے۔ مندری کے پاس سے گزرتی ہوئی۔ صبح اندر آنے کے لیے وہ اپنی چابی سے لٹکی ہوئی تھی۔ ویسے مندری عام طور پر حویلی کے اندر آ کرے میں رہتی تھی لیکن اس وقت روپ متی نے اسے کہیں باہر نکال دیا تھا۔

ہم دونوں اوپر آگئے۔ روپ متی والے کمرے میں جا چکی تھی۔ مندری سوری تھی۔ ہم نے اسے ڈسٹر کرنا مناسب سمجھا اور روپ متی مجھے اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ کر کھلی پر آکر چڑھ کر اوپر کمرے بھی تھے لیکن روپ متی آگئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے کمرے میں آئے گی لیکن وہ راولپارہ میں مڑ گئی اور اس کے ساتھ میں جس میں داخل ہوا اسے دیکھ کر میری آنکھیں مارے کی طرح کی ہلکی رہ گئیں۔ یوں تو پوری حویلی ہی کسی محل کی طرح لگتی تھی لیکن اس وسیع و عریض کمرے کو دیکھ کر مجھے میں واقعی کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔

میں شاندار کمرہ تھا۔ درمیان میں ایک بہت بڑا بینڈ فاجس پر ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ فز پر دبیز قالین تھے اور بہت قیمتی اور آرام دہ کپڑے پھیلے تھے۔

روپ متی نے پھر ہو گئی اور میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب یہ ایک نئی پریشانی پیدا ہو گئی۔ "روپ متی میری بات نہ کر رہی تھی۔ اگر ان دونوں بھائیوں کو شبہ ہو گیا کہ ان کو لڑائے تھے تو وہ میرے خلاف ایک نیا محاذ کھڑا کر سکتے تھے۔"

میں نے ان کے خلاف نہیں میرے خلاف۔" میں نے ہتھیار اٹھانے کی بات تو نہیں کہی تھی۔ ان دونوں نے مجھے اور جاگی کو دیکھا تھا۔ کھلا وہاں ہماری میز پر بیٹھا تھا۔ کھلا کی گمشدگی کے بارے میں میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ توہم دونوں پر ہو گا۔

میں نے ان کے نظریات پر غور نہیں کیا۔ "روپ متی نے کہا کہ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ تمہاری باتیں سچی ہیں۔" یہ بات میرے ذہن میں نہیں

رہی تھی۔ "میں نے کہا" لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں تلاش کس طرح کیا جائے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ ہمیں یہ زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" روپ متی نے جواب دیا "دو چار دن تو وہ کسی پناہ گاہ میں دیکھے رہیں گے اور پھر خود ہی سامنے آجائیں گے۔ اس وقت دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں یہ کہتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ صوفہ اس قدر نرم تھا کہ میں اس کے اندر دھنسا جا رہا تھا۔

"تم یہاں بند پر آ جاؤ۔ میں صوفے پر لیٹ جاتی ہوں۔" روپ متی یہ کہتے ہوئے بند سے اتر گئی۔

میرے منع کرنے کے باوجود وہ اس بات پر مصر رہی کہ میں بند پر سو جاؤں اور بالآخر مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔

آج کی اس بھگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ ٹھوڑی میں بھی تکلیف ہو رہی تھی لیکن اس تکلیف سے قطع نظر میں آرام دہ بستر لیٹنے ہی سو گیا۔

میں ابھی زیادہ گہری نیند میں نہیں تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے بچھوئے ڈنک مار دیا ہو۔ روپ متی میرے ساتھ کھلی ہوئی تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اس کمرے میں کیوں لائی تھی۔

میں نے اسے اپنے سے الگ کرنا چاہا تو وہ اور بھی سختی سے میرے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ جاگ رہی تھی۔

"پلیز! مجھے اسی طرح لینے رہنے دو۔" وہ عیبیدہ سے لہجے میں بولی "زندگی میں پہلی بار ایسا کیونکر مل رہا ہے۔ مجھے اس سے محروم نہ کرو۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ روپ متی میرے ساتھ لپٹی رہی اور پھر وہ سو گئی۔

میں نے یہ آدھا گھنٹا کانٹوں کی بیچ پر گزارا تھا۔ روپ متی اس وقت گہری نیند میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ کیا اور اس سے بھی زیادہ احتیاط اور آہستگی سے بند سے اتر کر ننگے پیر دبیز قالین پر چلتا ہوا دروازے کی طرف آ گیا۔ دروازہ کھول کر میں نے بیچے مڑ کر دیکھا اور باہر نکل کر آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا۔

ہال میں آ کر میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس وقت میرے دماغ میں سنسانٹ ہو رہی تھی اور میں پندرہ بیس منٹ بعد اپنی کیفیت پر قابو پا۔ کا تھا اور پھر تیس بیس منٹ میری آنکھ لگ گئی۔

مندری کی طرف دیکھا اور پھر حوالیہ نکاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

تمہیں پوجا پاٹ کا خیال کیسے آگیا؟

آتش فشاں

4 حقه

# باخبری

## لاشعور میں دبے ہوئے خوف احساسات اور محرکات کو بے نقاب کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت  
25 روپے  
23 روپے ڈاک خرچ

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذیل  
پیشگی منی آرڈر یا رسالہ گریس

مکتبہ نفسیات  
74299  
8802553-8802554  
8802551

kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

قدہ بھی شامل ہوتا تو میں اس کی بو کو فوراً محسوس کر لیتا۔ یہ تو منزل کی خوشبو! بڑا خوش ذائقہ شربت تھا۔  
برآمدے والے دروازے میں داخل ہوتے ہی روپ  
منے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اور جس میں اپنے کمرے  
کی طرف مڑنے لگا تو روپ متی نے میرا بازو پکڑ لیا۔  
”دھر نہیں اوپر۔“ اس نے سرسراہٹ سے آواز میں کہتے  
ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔  
میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز  
ہو رہی تھی اور پھر میں منہ سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر اس  
کے ساتھ بیڑھیوں پر چھٹنے لگا۔ اس نے اب بھی میرا ہاتھ پکڑ  
رکھا تھا۔

کمرے میں آکر روپ متی نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے  
بڑا گرا کر قہقہے لگانے لگی۔ میں حیرت سے اس کی طرف  
دیکھنے لگا۔ یوں تو میں پوری طرح ہوش میں تھا لیکن سوچنے  
میں کی تمام قوتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔  
دوسرے ہی لمحے روپ متی نے مجھے پیر چھلانگ لگا دی  
لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ گئی۔ شیشے والی الماری میں نیچے  
کبیس سے شراب کی بوتل نکالی اور دو گلاسوں میں شراب  
انڈیل کر اس نے ایک طرف رکھے ہوئے چھوٹے فرنیج میں  
سے ٹرے نکال کر برف کی ٹکڑیاں دو نوں گلاسوں میں ڈال  
ڈال کر ایک گلاس میرے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”اصل سوم رس۔“ روپ متی کے ہونٹوں پر بڑی دل  
نیز مسکراہٹ تھی۔ ”اسے پی کر تم مجھ سے اٹھو گے۔“ اس  
نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پہلا گھونٹ بھرے ہی یوں لگا جیسے پگھلا ہوا لاوا حلق کو  
جالتا ہوا پورے سینے میں پھیل گیا ہو۔ شدید جلن ہونے لگی  
لیکن میں اس جلن کو فوراً ہی بھول گیا۔ میرے اندر تو پہلے ہی  
سے لاوا کھول رہا تھا۔

اچانک چمنائے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ لگتا تھا  
جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہو اور چمنائے کی یہ آواز نیچے سے آئی  
تھی۔ میں نے ابھی شراب کے دو ہی گھونٹ بھرے تھے جن  
سے سینے میں تو شدید جلن ہو رہی تھی مگر شراب ابھی  
محسوس ہوا تو میں چڑھ چکی تھی۔

پھر روپ متی نے مجھے یہ آواز سنی تھی۔ ایک لمحے کو وہ بھی  
بے آواز ہو گیا لیکن پھر چمنائے کی اس آواز کو نظر انداز کرتے  
نہیں اس نے گلاس ایک بار پھر میرے ہونٹوں سے لگا دیا  
نہیں اس مرتبہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑے پٹاڑا اور ٹھیک اسی

اس طرح ٹیک لگائی کہ اس کے جسم میں تباہ سا سیدھا گولہ  
ہوا سے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ اس نے دونوں  
ہاتھوں سے بال پیچھے ہٹائے اور ایک جھٹکے سے سدھری  
ہو گئی۔

”تم پہلے مرد ہو جو عورتوں سے اس طرح ڈرتے ہو۔“  
مسکراتے ہوئے بولی ”لیکن اطمینان رکھو۔ میں تمہیں کو  
نہیں جاؤں گی۔ ویسے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آج کی رات میں  
اور تم اس حویلی میں اکیلے رہیں۔ بس اور کوئی بات نہیں  
ہے۔“

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گردن گھما کر اوپر  
اُٹھ کر دیکھنے لگا۔ چودھویں شب کا چاند اپنا نصف سڑکل  
کرنے والا تھا۔ آج پورن ماسی (پورے چاند) کی رات تھی۔  
ہندوؤں کے عقیدے کے بھی بڑے عجیب ہیں۔ پورن ماسی اور  
امادس کی راتوں کو ان کے دھرم میں خاص اہمیت حاصل  
ہے۔

”سوم رس پیو۔ اس میں برف ختم ہو رہی ہے۔“  
روپ متی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس نے اپنا  
گلاس اٹھالیا تھا۔ دوسرا گلاس میں نے اٹھالیا اور ہلکی ہلکی  
چٹکیاں لینے لگا۔ صندل کی خوشبو والا یہ شربت واقعی بہت  
خوش ذائقہ تھا۔

مشروب پینے کے بعد بھی ہم کافی دیر وہاں بیٹھے بات  
کرتے رہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے اندر ایک  
عجیب سی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ سینے میں جیسے  
بھڑکنے لگے تھے اور داغ میں بھی ہلکی ہلکی سنسنات ہونے  
لگی تھی۔ میں بار بار کرسی پر پسلیوں بدل رہا تھا۔ اس بے چینی کی  
وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن ایک تبدیلی میرے

اندر آئی تھی جسے میں نے خود بھی نوٹ کیا تھا۔

پہلے میں روپ متی کی طرف دیکھنے سے سکتا رہا تھا  
لیکن اب میری نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔  
روپ متی بھی بار بار عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ  
رہی تھی۔

دور کہیں کسی گھڑیال نے ایک کاٹھنا بجایا اور ہنسنے  
مٹی کرسی سے اٹھ گئی۔

”ایک بج چکا ہے۔ آؤ۔ اب اندر چلیں۔“  
میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور ایک بار پھر سوچا  
کہ اس بے چینی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اچانک مجھے اپنا  
مشروب کا خیال آیا۔ ایک روپ متی نے کبیس اس میں شراب  
نہیں ملا دی تھی۔ لیکن نہیں۔ اس میں اگر شراب کا ایک

”یہ کیا ہے؟“ میں نے گلاسوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان  
میں بھرے ہوئے مشروب میں برف کی ٹکڑیاں بھی تھیں۔  
”سوم رس۔“ روپ متی اس مرتبہ مسکرائی تو اس کے  
رخسار پر ننھا سا چاہ زندان نمودار ہو گیا۔ ”میں نے سوچا آج  
تمہیں چائے کے بجائے سوم رس پلایا جائے۔ اس کا ذائقہ  
اور سرور تمہارے دل کو کھو گے۔“

میں نے ایک گلاس اٹھا کر ہلکی سی چٹکی کی۔ دیکھنے میں یہ  
مشروب لیمن اسکا ٹھیک ہی لگتا تھا لیکن اس میں صندل جیسی  
مہک تھی اور ذائقہ بھی صندل جیسا ہی تھا۔ میں نے گلاس  
دوبارہ ٹرے میں رکھ دیا اور روپ متی کی طرف دیکھنے لگا۔  
باریک ناخن میں اس کا بدن جھٹک رہا تھا۔ میری نظریں  
اس کے چہرے پر جم گئیں۔ مجھے اس کی نیت پر شبہ ہو رہا تھا۔  
جاگتی مندری کے ساتھ چل گئی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ بھی روپ  
متی کی کوئی سازش ہی ہو۔ میں تو نہیں جانتا تھا کہ مندری ہر  
پورن ماسی کی شب واقعی کالی کے مندر میں جاتی تھی یا نہیں۔  
یہ بات تو مجھے روپ متی ہی نے بتائی تھی۔ اب مجھے اس پر  
شبہ ہو رہا تھا۔ اس نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت مندری کو  
بھیجا تھا اور ہو سکتا ہے اس کے کہنے پر مندری نے جاگتی کو بھی  
ایسی پٹی بڑھا لی ہو کہ وہ بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار  
ہو گئی۔ دیوان سنگھ بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔ چار گھنٹے  
ہو چکے تھے اور وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا اور روپ متی  
نے ہمارا سنگھ کو بھی رات بھر کے لیے چھٹی دے دی تھی۔  
یقیناً کوئی گڑبڑ تھی۔ میری چھٹی جس خطرے کی کھنٹی بجانے  
لگی۔

”دیوان سنگھ تو ان دونوں کو مندر چھوڑنے گیا تھا۔  
ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ میں نے اپنے خیال کی تصدیق یا  
تردید کے لیے پوچھا۔  
”اگر مندری اکیلی جاتی تو وہ اسے چھوڑ کر واپس آ جاتا۔“  
روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”لیکن جاگتی ساتھ  
تھی۔ صبح واپسی پر انہیں ہسپتال میں دھکے کھانے پڑے اس  
لئے میں نے دیوان سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ مندر کے باہر کسی  
جگہ گاڑی ہی میں رات گزارے اور ان کا انتظار کرے۔“  
”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے یہ کہتے ہوئے  
روپ متی کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

روپ متی کے حلق سے بڑا زوردار قہقہہ نکلا اور پھر وہ  
ہنسنے ہنسنے دہری ہو گئی۔ میں اس کے بل کھاتے ہوئے جسم کو  
دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کرسی کی پشت سے

آتش فشان (171) حصہ 4

سایہ آنکھیں، ستواں ٹاک اور پتلے پتلے ہونٹ، پیشانی پر سرخ بندیا چمک رہی تھی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ہندو تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دینے لگا کہ یہ عورت کون ہے اور میں کہاں ہوں۔ پھر مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ روپ متی والا وہی لڑکا تھا اور میں بیٹہ پر ہوا تھا۔ دائیں طرف تو وہ عورت کھڑی تھی جو کچھ دیر پہلے میرے اوپر جھکی ہوئی تھی اور بائیں طرف مندری کھڑی تشویش آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے ہٹنے کی کوشش کی تو اس مرتبہ بھی کراہ اٹھا۔

”آرام سے لیٹے ہو۔“ اس عورت نے ایک بار پھر مجھ پر جھپٹتے ہوئے کہا ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ زیادہ حرکت کرو گے تو تکلیف ہوگی۔“

اور پھر اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر چادر پڑی ہوئی تھی اور اس کے نیچے میرا جسم برہنہ تھا۔

”میرے کپڑے کہاں ہیں؟“ میں نے گردن کھما کر مندری کی طرف دیکھا۔

”تمہارے کپڑے بت خراب ہو گئے تھے۔ میں نے باہر ڈال دیے ہیں۔“ مندری نے جواب دیا ”تمہارے جسم کی چونوں کا معائنہ کرنے کے لیے کپڑے اتارنا ضروری تھا۔ یہ ڈاکٹر رادھا ہیں۔ میں تمہارے لیے دوسرے کپڑے لے کر آتی ہوں۔ تم آرام سے لیٹے رہو۔“

مندری کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ اس کے خواس بھی شاید اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں گردن کھما کر ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دراز قامت حسین عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے میوٹن لکری ساڑی پہن رکھی تھی۔

”روپ متی کہاں ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہی بات میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔“ ڈاکٹر رادھا نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا ”مندری کے بلاوے پر جب میں یہاں آئی تو سب کچھ اس طرح ٹھکرا ہوا تھا۔ وہاں قالین پر خون کا دھبا تھا جو اب بھی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی بڑی ہی (جنگ) ہوئی ہے۔ تم اس طرف قالین پر بے ہوش پڑے تھے لیکن روپ متی کا پوری حویلی میں سراپا نہیں ملا۔“

”وہہ! وہ کہاں گئی؟“ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ایک جھپٹتے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا

کہ اس طرح اٹھنے سے چادر کا ایک حصہ میرے جسم پر ہٹ جائے گا۔ میں نے چادر درست کی اور سر کا کچھ سا سلائے لگا جہاں ایک بڑا سا گمڑا نمودار ہو چکا تھا۔

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”اسے وہ لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

”کون لوگ؟“ ڈاکٹر رادھا نے ابھی ہوئی نظروں میری طرف دیکھا۔

”تج سنگھ۔“ میں نے کہا ”دھرمیش کو روپ متی مار دی تھی۔ وہ یہاں کرا تھا۔“ میں نے اس طرف اشارہ جہاں قالین پر خون کا دھبا نظر آ رہا تھا ”ان دونوں بھائی کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ پہلے انہوں نے میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو اور روپ متی کو بچانے کی کوشش کرتا رہا اور جب روپ متی نے دھرمیش کو گولی تو وہ سب مجھ سے پلٹ گئے تھے۔ وہ لوگ مجھے پتہ نہ تھا شاید مرہہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔“

ڈاکٹر رادھا گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے خیال میں میرا دماغ پلٹ گیا تھا۔

”تمہارے منہ سے اب بھی شراب کی بو آ رہی ہے۔“ وہ رک گئی۔ شاید اسے میرا نام معلوم نہیں تھا۔ شاید نشے میں تھے۔ تمہاری باتیں اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ تمہیں فی الحال آرام کی ضرورت۔ تمہارے خواس بحال ہو جائیں تو۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے اس کی بات دہرائی ”میں شراب کے نشے میں نہیں تھا۔ روپ متی زبردستی دو گھونٹ پلا دیے تھے مگر میں پوری طرح بیدار رہا۔“ جس نے کبھی شراب نہ پی ہو وہ ایک گھونٹ پلا ہوش میں نہیں رہ سکتا۔“ ڈاکٹر رادھا نے میری بات دہرائی۔

”تمہیں کیسے پتا کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مندری نے بتایا تھا کہ ایک روز تم نے شراب روپ متی کو کبھی تمہارے ہاتھ میں لیکن مجھے جرت ہے کہ اس کے ہاتھ سے دو گھونٹ پینے پر بھی کیسے آتا ہو۔“ ڈاکٹر رادھا نے یہ کہتے ہوئے میرے چہرے پر نظر دیا۔

”میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔“ میں نے نظروں سے اٹھائی۔

”میری طرح ہوش میں ہونے کے باوجود میرے خواس برا بھلا نہیں دے رہے تھے۔ مجھے روپ متی کے سوا کچھ یاد نہیں رہا تھا اور پھر وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شراب پلانے لگی۔ مجھے شراب سے شدید نفرت ہے لیکن روپ متی نے وہی انکار نہ کر سکا۔ ابھی وہی گھونٹ پینے تھے کہ نیچے کوئی بڑے لڑکے کی آواز سنائی دی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نہیں بول رہا۔ میرے اندر سے کوئی اور بول رہا ہو۔ ڈاکٹر رادھا نے اسے سامنے کر کے بیٹھ گئی تھی اور پوری توجہ دے رہی تھی۔

”ایک نام بتایا تھا تم نے۔“ سوم رس۔“ وہ میرے چہرے پر نظر کر رہی تھی۔ ”صندل کے ڈالتے والا لیکن کی رات جیسا شربت۔“

”ہاں ہاں۔ وہی۔“ میں نے جلدی سے کہا ”وہ شربت بچے کے بعد ہی میں اپنے آپ میں وہ تیدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔“

”تو پھر تم واقعی بے قصور ہو۔“ ڈاکٹر رادھا کے منہ سے گونج رہی تھی۔

”ایک بار وہ شربت۔“ میں غاروش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”ہاں۔ ساری خرابی اس شربت ہی کی تھی۔“ ڈاکٹر رادھا نے جواب دیا ”روپ متی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ میں نے اسے ایک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”میں نے اسے بہت سمجھایا تھا لیکن اس نے سننے سے انکار کیا۔“

”یہ راجاؤں کا خط ہے۔“ ڈاکٹر رادھا کہہ رہی تھی ”ان کے ہاتھوں (آباؤ اجداد) کو محلات تعمیر کرنے اور جنگیں لڑنے کا شوق تھا اور یا پھر لونچیاں پالنے کا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”لیکن اب دور بدل گیا ہے۔ راج پاٹ ختم ہو چکے ہیں۔ آپس کی جنگیں نقصان بار بن چکی ہیں۔ موجودہ راجاؤں کو حکومت سے لاکھوں کروڑوں روپے کے وظائف ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس عیاشی کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ گیا۔ رانیوں اور راجاؤں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ راجاؤں نے جوان اور حسین داشتائیں رکھی ہوئی ہیں تو رانیوں نے بھی پہلوان پال رکھے ہیں۔ کئی راجبھاریاں اور رانیاں ایسی ہیں جو اپنے شہوانی جذبات کو برقرار رکھنے کے لیے مجھ سے انکسشن لگواتی رہتی ہیں اور راج مہاراج سنیا سیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں تاکہ ان کے نسخوں سے وہ سدا جوان رہیں۔ سوم رس۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر مجھ سے نظروں ملانے بغیر کہنے لگی ”سوم رس بھی ایسا ہی ایک نسخہ ہے جو خاص قسم کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے راجاؤں جیسے دولت مند لوگ یہ نسخہ حاصل کرنے کے لیے سنیا سیوں کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔“

”لیکن روپ متی۔“

”اس نے اپنے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا ہے اس سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہ کس قسم کی صورت حال سے دوچار ہے۔“ ڈاکٹر رادھا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”اسے بھی پہلوانوں کا شوق تھا۔ ہر جوان اور خوب روخص کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ وہ ہمیں بھی اپنی عیاشی کے لیے خرید کر لاتی تھی لیکن تم اس کے حسن کے بال میں جھپٹنے کے بجائے ناخوش بن گئے اور اسے اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتاتی فون پر بتاتی رہتی تھی۔ مجھے بھی تمہاری طرح اس سے ہمدردی ہے۔ صرف دو روز پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں زیر کر کے ہی چھوڑے گی۔ میں نے اس وقت بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے میری بات ہنسی میں اڑادی تھی اور آج۔“

”اور آج وہ ہو گیا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”مجھے شبہ ہے کہ اس کے دشمن اس حویلی کی مسلسل نگرانی کر رہے تھے اور آج انہیں پتا چل گیا کہ حویلی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ وہ چڑھ دوڑے اگر روپ متی میرے ساتھ یہ حرکت نہ

کرتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔“  
ڈاکٹر رادھا بیٹھ کرنا چاہتی تھی مگر مندری کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ مندری نے پا جامہ اور کرتے پہن کر رکھ دیا۔

”تمہارے شریر (بدن) پر بہت چوٹیں آئی ہیں۔“ ڈاکٹر رادھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے دوا لگا دی ہے۔ کچھ دوا نہیں کھانے کے لیے بھی بھجوا دوں گی مگر تمہیں ٹھیک ہونے میں کئی دن لگیں گے۔ بہر حال۔ ہم باہر جا رہے ہیں تم کپڑے بدل لو۔ بعد میں بات کریں گے۔“

وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں۔ مندری نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ میں نے ہنگامے سے اتر کر چاروں طرف ڈال دی اور کپڑے پہنے لگا۔ ہر حرکت کے ساتھ میرے جسم کے مختلف حصوں میں سیسے اٹھ رہی تھیں۔ کپڑے بدل کر میں نے دروازہ کھول دیا اور ہاتھ روم میں گھس کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔

میری پیشانی پر بھی دامن طرف ایک چھوٹا سا گڑبڑ نظر آ رہا تھا۔ بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبہ پڑ چکا تھا۔ میں نے کریم اٹھا کر آئینے میں اپنی پشت پر دیکھا۔ بائیں طرف شو لڈر بلیڈ پر بھی برا سا نیلا دھبہ دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف اسی جگہ تھی۔ یہ خیمت تھا کہ کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ اگر ہڈی ٹوٹی ہوتی تو وہ جگہ سو جگہ ٹوٹی ہوتی۔

میں ہاتھ روم سے نکلا تو وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کا سارا سامان اسی طرح بکھرا ہوا تھا۔ میں بھی ڈاکٹر رادھا کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مندری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں تو صبح آتا تھا۔ پہلے کیسے آگئیں اور جاگتی کہاں ہے؟“

”مندری میں۔“ مندری نے جواب دیا ”دیوان سنگھ اسے لینے کے لیے گیا ہوا ہے۔ بس آئے ہی والی ہوگی۔“

مندری نے دیوار پر ٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو میری نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔

”تم پہلے کیسے آگئیں اور جاگتی کہاں کیوں چھوڑا؟“ میں نے مندری کو گھورا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ۔“ مندری نے ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھا اور پہلو بول کر گرہ لگائی۔

”کیا بات ہے؟“ میرے لہجے میں کڑھکی آئی ”جاگتی کہاں ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم اس کی چتا (گلر) مندری نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کچھ بتایا وہ میرے لیے بہت بھیانک اور سنسنی خیز تھا۔ کالی ماما عرف درگادیوی کا یہ مندر راجا جان سنگھ نے کروایا تھا اور مشرقی بنگال سے بچان جیسا تھا پانچواں منگوا کر اس سے کالی کا مجسمہ تیار کروایا تھا۔ کالی کا یہ اس قدر ہیبت ناک ہے کہ اسے دیکھ کر ہی دل پر لٹہ طاری ہو جاتا ہے۔

اس مندر کو سیلا دیوی کا مندر بھی کہا جاتا ہے اور وہ کالی کے چرنوں (قدموں) میں انسانی جانوں کی بیھنت لگتی تھی لیکن بعد میں راجا جان سنگھ نے انسانی جانوں کی بیھنت پابندی لگا دی اور اس کی جگہ بکری یا کسی اور جانور کی بیھنت دی جانے لگی۔

”آج رات۔“ مندری کہہ رہی تھی ”کالی کی ہر حرکت کے ساتھ تو بکری کی بیھنت ہی دی جانے والی تھی گرد کے پچھلے حصے میں کالی کی ایک اور چھوٹی موٹی کے پڑا میں ایک انسان کی بیھنت دینے کا بھی منصوبہ تھا اور اس بارے میں کچھ خاص خاص لوگوں کو ہی معلوم تھا۔ یہی جانکار (شناسا) بوڑھی عورت مجھے بھی اس طرف لگا کر ایک انسان کو کالی کے سامنے موت کے گھاٹ اتارنے کریں کانپ اٹھی اور وہاں سے بھاگ آئی۔

”جاگتی مندر کے مرکزی ہال میں تھی جہاں سیکڑوں جمع تھے۔ میں بڑی مشکل سے جاگتی کو تلاش کرنے کا میاب ہو سکی اور جب میں نے اسے اپنے ساتھ لے آئے تو کہا تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں فوراً دیوان جاؤں اور تمہیں بتا دوں کہ پنڈت ملے دھر اس مندر موجود ہے۔ میں نے جانتے کی کوشش کی تھی کہ پنڈت دھر کون ہے لیکن اس نے مجھے وہاں سے بھاگوا کر کہا۔ تمہیں اطلاع کر دوں۔“

”دیوان سنگھ کی گاڑی وہاں سے تقریباً نصف میل تھی۔ وہ کار کی پچھل سیٹ پر سوار تھا۔ میں نے اسے جاگتی کو واپس چلنے کو کہا اور جب ہم یہاں پہنچے تو جاگتی کا گیت چوتھ لکھا دیکھ کر میرا ہاتھ جھٹکا تھا۔

”برآمدے کے دائیں بائیں والے کمروں کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور برآمدے والا دروازہ کھلا تھا۔ میں اور دیوان سنگھ نے پہلے نیچے والے کمرے میں پھراؤ پر آئے تو یہ کمرہ اسی حالت میں تھا اور وہاں کچھ پڑے تھے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا ”پہلے میں

میں لانے کی کوشش کرتی رہی پھر دیوان سنگھ کو ڈاکٹر کی طرف بھیج دیا۔ یہ یہاں سے ذرا ہی آگے ایک ایندھن میں دیوان سنگھ کے جانے کے بعد میں روپ ور آگیا تو تلاش کرتی رہی لیکن پوری حویلی میں ان بائیں سے کسی کا سراغ نہیں ملا۔ میں پولیس کو بھی بلا دینا چاہتی تھی لیکن مجھے پولیس کا وہ رویہ یاد تھا جب بیج اور حریش یہاں توڑ پھوڑ کر کے گئے تھے اور پولیس نے روپ مٹی کو دھکا کر خاموش کر دیا تھا اس لیے میں یہ ڈاکٹر خاموش رہی کہ ڈاکٹر رادھا سے مشورہ کرنے کے بعد آئی ایڈم لکھایا جائے گا۔

”مجھے تمہاری بھی چتا (گلر) تھی۔ دیوان سنگھ کے ذمے کے بعد میں بھی تمہیں بار بار ہوش میں لانے کی کوشش رہی اور پھر ڈاکٹر رادھا بھی تقریباً ایک گھنٹے کی کوشش بعد تمہیں ہوش میں لاسکی ہے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ تم ہو لیکن راجا کی کہاں سے کس حال میں ہوگی۔ یہ چتا لکھنے والی ہے مگر وہ کون لوگ تھے؟“

”چنگ سنگھ اور دھریش۔ ان کے ساتھ دو غنڈے بھی وہ یہاں سے بھاگے ہوئے اپنے ساتھ ایک لاش بھی لگے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہائے رام اس کی لاش؟“ مندری کا چہرہ ایک دم زرد پڑا۔ اس نے اپنا اختیار اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا۔ ”دھریش کی۔“ میں نے جواب دیا ”روپ مٹی نے کھلی مار دی تھی۔“ چنگ سنگھ اور اس کے دونوں غنڈے لپٹائی گئے تھے۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ وہ شاید مجھے مرہ و کرہ پھوڑ گئے یا ممکن ہے اس خیال سے غلت میں بھاگے تاکہ شاید دھریش کو بچایا جائے اور وہ روپ مٹی کو بھی قتل کر لیں لیکن تم نے کیا نام بتایا تھا کہ جاگتی نے کالی کے ”میں کس کو دیکھا تھا؟“

”پنڈت ملے دھر۔“ مندری نے جواب دیا ”اس نے کہا۔“ ”وہ کیا نام سن کر سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔“

”اوہ! میں اچھل پڑا۔“ مندری نے پہلے بھی یہی نام بتایا تھا۔ کالی کے چرنوں میں انسانی بیھنت کے تذکرے نے اسے ایسی کوئی طور پر اس حد تک ماؤف کر دیا تھا کہ میں ماہر قویہ نہیں دے سکتا تھا۔

”پنڈت پنڈت ملے دھر تھا جس نے سگا پور میں دارا کو ہلاک کیا اور دارا اسی کے ساتھ سگا پور سے فرار ہو کر جہان کیا تھا اور قسمت نے مجھے اور جاگتی کو بھی جہان پناہ کر عجیب و غریب حالات میں الجھا دیا تھا اور

اتفاق سے آج جاگتی نے ملے دھر کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے مندری کو واپس بھیج دیا تھا کہ وہ مجھے لے کر کالی کے مندر پہنچ جائے اور مندری کے لیے یہاں کی صورت حال بڑی پیچیدہ ثابت ہوئی تھی۔

میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کیا دارا بھی یہاں ہو سکتا ہے؟ اس کا پتا تو اس وقت چلے گا جب پنڈت ملے دھر گرفت میں آئے گا۔

میں ایک بار پھر مندری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آپ آپ ہی بتائیے رادھا جی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ پولیس کو اطلاع دی جائے یا۔“

”معاذ اس قدر کچھ ہے کہ پولیس کی مداخلت ضروری ہو گئی ہے لیکن۔“ ڈاکٹر رادھا نے کہا ”لیکن یہاں ایک لاش بھی گری تھی اور اتفاق سے وہ قتل روپ مٹی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اگر پولیس کو اطلاع دی جاتی ہے تو روپ مٹی بھی اس پکڑ سے نہیں نکل سکے گی۔ میں اس کی دوست ہوں۔ اس کا نمک کھایا ہے اور میں ایسی قانون پسند بھی نہیں ہوں کہ پولیس کے پاس دوڑی جاؤں۔ اس شر کے بڑے بڑے لوگ تو اس سے بھی زیادہ سنگین معاملات میں لوٹتے ہیں۔ میرے سینے میں تو ایسے ایسے راز پوشیدہ ہیں کہ اگر میں انہیں ظاہر کر دوں تو اس شر میں بھونچال آجائے میں اس راز کو بھی اپنے سینے میں جگہ دے سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ۔“

اس کی طرف دیکھا۔

”تم مسلمان ہو۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں اچھل پڑا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں مسلمان ہوں؟ میں نے ایک لمحے کو سچا پھر خیال آ گیا کہ کچھ دیر پہلے ہی تو میں چادر کے نیچے بے لباس پڑا تھا۔ میری بے ہوشی کے دوران میں میرے جسم کی چونکوں کا معاخذہ کرنے کے لیے ان دونوں نے مجھے بے لباس کیا تھا۔ میں نے مندری کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں ہٹا لیں۔

”یہ ہندوستان ہے۔ یہاں ہندو اپنے آپ کو برتر و اعلیٰ اور سپر یا دھر سمجھتے ہیں۔ دوسری اقلیتوں سے تو انہیں خدا واسطے کاگیر ہے۔ سکھ عیسائی اور مسلمان ان کی زیادتیوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ مسلمان تو انہیں ایک سنگھ نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے پاکستان بنایا تھا تو وہ



لوگ اب پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ صرف مسلمانوں کو  
ذک پہنچانے کے لیے کٹر اور انتہا پسند ہندوؤں کی کئی تنظیمیں  
سرگرم عمل ہیں۔ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع  
بانتے جاتے نہیں دیتے۔

”یہ لوگ اپنی ہی ذات سے مخلص نہیں تو دوسروں کو کیا  
سمجھیں گے یہ تو خود اوچ بچ میں بنے ہوئے ہیں۔ اوچی  
ذات کے ہندو چلی ذات کے ہندوؤں پر آئے دن حملے کرتے  
رہتے ہیں اور جب چلی ذات کے ہندوؤں کو موقع ملتا ہے تو وہ  
اوچی ذات کے ہندوؤں کے دس میں بندے مار ڈالتے ہیں۔  
”روپ متی ایک راج کماری ہے۔ راج پاٹ نہیں رہا  
تو کیا ہوا۔ اسے سرکاری طور پر تو یہ اعزاز حاصل ہے  
معاشرے میں اس کا ایک مقام ہے ایک رتبہ ہے۔ یہاں تو  
اسکول کا پانچویں کوئی مسلمان لڑکا کسی ہندو لڑکی سے دوستی  
کر لے تو خون کی نیناں برس جاتی ہیں اور جب لوگوں کو یہ بتا  
چلے گا کہ ایک مسلمان مرد راج کماری روپ متی کے ساتھ  
اس کی حویلی میں رہ رہا ہے تو یہاں تو قیامت آجائے گی۔  
یہاں کے راجواڑے یہ بھول جائیں گے کہ وہ اپنی عیاشی کے  
لئے دوسری ذاتوں اور اپنی ہی چلی ذات کی عورتوں کو تو اپنے  
بستر کی زینت بناتے ہیں لیکن وہ یہ بھی برواشت نہیں کر سکیں  
گے کہ ایک ہندو عورت کسی مسلمان کے ساتھ اسی طرح  
رہے۔ وہ تمہیں بھی قتل کر دیں گے اور روپ متی کے بھی  
نکلنے کر ڈالیں گے۔“

”حیرت ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا  
”ایک ہندو عورت کے منہ سے اپنے ہی دھرم (مذہب) کے  
خلاف ایسی باتیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“  
”میں نے دھرم کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔“ ڈاکٹر  
راوا نے جواب دیا ”میں تو ان جنونیوں کی بات کر رہی ہوں  
جو دھرم کا نام لے کر دھرم کو نشٹ (تباہ و برباد) کر رہے ہیں  
اور ایسے لوگ تو ہر دھرم میں پائے جاتے ہیں۔ ہندو دھرم میں  
پنڈتوں اور پجاریوں نے نصاب اور نفرت پھیلا رکھی ہے اور  
تمہارے دین میں یہ کام تک نظر متعصب اور فرقہ پرست ملامت  
انجام دے رہے ہیں۔“

میرے پاس ڈاکٹر راوا کی اس بات کا کوئی جواب نہیں  
تھا۔ اس نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ ہندو پنڈتوں کے بارے  
میں تو میں بہت اچھی طرح جان چکا تھا۔ سب سے بڑی مثال تو  
بنکاک کا سوامی رتھوناتھ تھا جس نے دھرم کے نام پر عیاشی کا  
بہت بڑا ادا قائم کر رکھا تھا۔ کون سے جرائم تھے جو وہاں نہیں  
ہوتے تھے اور وہ بد بخت بالآخر میرے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچے۔

تھا۔

دھرم کو نشٹ کرنے یا پوتر (یا کیزہ) بنانے کی اس بڑی  
سے قطع نظر صورت حال میرے لیے خاصی گھبر اور خطر  
تھی۔ جاگی کالی کے مندر میں بھی اور ابھی تک والیں نے  
آئی تھی۔ اس نے پنڈت مہلی دھرم کو دیکھ لیا تھا۔ وہ لکڑی  
نگرائی کر رہی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ خود مہلی دھرم  
نظروں میں نہ آگئی ہو۔ جو لوگ بے دردی سے ایک انسان  
پتھر کی صورت کے قدموں میں موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں  
ان سے کسی رحم دلی کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔

ڈاکٹر راوا نے اگرچہ اس واقعے کے بارے میں دلچسپی  
کو اطلاع نہ دینے کا عندیہ دیا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا  
پولیس اس واقعے سے بے خبر رہے۔ دھرمیش کو بچہ  
گولی ملی تھی۔ میں نے خود اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔  
شک و غمیرہ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ اس دن  
تک مرانہ ہو لیکن اگر وہ مر گیا ہو گا تو بچہ شک اسے مارتا  
پر خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ اگرچہ روپ متی کو بھی اٹھا کر  
لے گئے تھے لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ  
پولیس کو خبر کر دیں گے۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ ڈاکٹر راوا نے سوالیہ نگاہ  
سے میری طرف دیکھا۔  
”اگر بچہ شک نے پولیس کو اطلاع دے دی تو؟“

کہا۔

”وہ ایسا نہیں کریں گے۔“ راوا نے جواب دیا  
”کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آدھی رات کے بعد انہوں نے  
یہاں حملہ کیا تھا اور پھر دوسری بات یہ کہ معاملہ ایک قتل  
ہے اور روپ متی بھی غائب ہے۔ چھپتی بار پولیس نے کوئی  
(دھوت) کھا کر ان کی حمایت کر دی تھی لیکن اس پر  
نہیں ہو گا۔ روپ متی کوئی گری بڑی عورت تو نہیں کرنا  
نظر انداز کر دیا جائے گا۔ یہاں کے راجواڑے ان کو  
افسروں کی کھال سمجھ لیں گے جو اس معاملے میں شہ  
حمایت کریں گے۔ بچہ شک بھی اس بات کو سمجھتا ہو گا۔  
اگر اس نے پولیس کے پاس جانے کی کوشش کی تو بچہ شک  
دھ لیا جائے گا۔ ویسے۔“ وہ خاموش ہو کر پوچھ کر پوچھ کر  
طرف دیکھنے لگی ”مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً تین  
ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟“  
”ڈیڑھ اور دو بجے کے بیچ۔“ میں نے پہلو ہٹاتے ہوئے  
جواب دیا۔ کرسی اگرچہ آرام دہ تھی مگر جسم کی چوڑائی  
میں کافی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تقریباً پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں۔“  
ڈاکٹر راوا نے کہا ”اگر انہوں نے اطلاع دی ہوئی تو پولیس  
بک یہاں پہنچ چکی ہوتی۔“

اور پھر ٹھیک اسی وقت حویلی کا پھانک دھڑ دھڑائے  
نے کی آواز سنائی دی۔  
پھانک دھڑ دھڑائے جانے کے اس انداز میں جارحیت  
اب بھی۔ کوئی عام آدمی اس طرح دھک نہیں دے سکتا  
نہم نہیں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف  
ملے۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔  
کے پائے کے قریب اندر کی طرف پستول پڑا ہوا دیکھ کر  
باطلی سے آگے لپکا اور پستول اٹھالیا۔ یہ وہی پستول تھا  
مات روپ متی نے دھرمیش کو گولی ماری تھی۔ میں چند  
پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر مندری کو اشارہ کیا۔  
”تم جا کر گٹ کھلو۔ اگر پولیس یا کوئی اور ہو تو اسے  
پانی روکنے کی کوشش کرنا۔ میں اس دوران میں دیکھوں گا  
بمیں کیا کرنا چاہیے۔“

مندری اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر راوا نے  
ناٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور میرے قریب آئی۔ میں تیرس

والے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے  
پردہ برابر کھینچا اور ایک کونڈرا سا سرکار باہر جھانکنے لگا۔  
یہاں سے حویلی کا پھانک صاف نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر راوا بھی  
پردے کے دوسری طرف کا کونڈرا سرکار باہر دیکھ رہی تھی۔ اس  
کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے میرے  
ساتھ بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کی تھیں۔ پنڈتوں اور پجاریوں کو  
برا بھلا کہا تھا۔ پولیس پر دشنام طرازیوں کی تھیں لیکن میں  
سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا اور بڑ کر یوں نہ ہو  
پولیس کے نام سے بدک جاتا ہے۔ پولیس ہر ملک کی ایک  
جیسی ہی ہوتی ہے۔ ایک معمولی سا کانسٹیبل بھی بڑے سے  
بڑے آدمی کو سڑک پر نفا کر سکتا ہے اور ڈاکٹر راوا تو ایک  
علامہ سی عورت تھی۔ اس کے خیالات بہت سیدھے سادے  
تھے۔ وہ غشی محظوظ میں بیٹھ کر تو بے پائی سے اپنے ان  
خیالات کا اظہار کر سکتی تھی لیکن پولیس کا سامنا کرنا شاید اس  
کے بس کی بات نہیں تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی مندری پورچ سے نکل کر پھانک کی  
طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ پھانک کے قریب پہنچ کر اس نے  
ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا اور ذیلی دروازہ کھول دیا اور اندر  
داخل ہونے والے کو دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا

**سب بک انجسٹ کے مشورے کنڈا ٹکلیں دستیاب ہیں**

**اگلا** | **اقبال** | **علامہ امین**

دو حصے مکمل قیمت: 50/- روپے فی حصہ | قیمت: 40/- روپے  
ڈاکٹر فرح: 23/- روپے

دو حصے مکمل قیمت: 50/- روپے فی حصہ | قیمت: 40/- روپے  
ڈاکٹر فرح: 23/- روپے

**کتابیات ملی کیشتر، پوسٹ بکس ۲۳۰۰**

سائنس نکل گیا۔  
وہ جاگئی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ ڈاکٹر راوحا نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”جاگئی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ! تو یہ ہے جاگئی۔“ راوحا بولی ”روپ متی نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ یہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے۔“

جاگئی کی تعریف سن کر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے پڑھ پوری طرح ہٹا دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ نرم اور روپلے صوب میں جاگئی کا چہرہ دکھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ مندری بھی اس کے ساتھ تھی اور شاید وہ تیز چلنے میں اسے کچھ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ دونوں پورج کے نیچے میری نگاہوں سے او جھل ہو گئیں۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور کمرے کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر راوحا بھی کمرے کے وسط میں کھڑی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک منٹ بعد جاگئی اندر داخل ہوئی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر وہ دروازے ہی میں رک گئی اور پھر مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف لپکی۔

”اوہ! یہ سب کیا ہوا ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا۔ روپ متی کہاں ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”بیٹھ جاؤ۔ آرام سے بات کریں گے۔“

جاگئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر راوحا کی طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف اس کے بال کی حد تک بکھرے ہوئے آنکھیں سرخ اور چہرہ ہٹا ہوا تھا۔ ساڑی بھی مسلی ہوئی تھی۔

”مندری۔“ ڈاکٹر راوحا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بہتر ہو گا کہ تم سب کے لیے چائے کا بناؤ۔ تاکہ ہم کوئی ڈھنگ کی بات سوچ سکیں۔ اس وقت تو ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے۔“

مندری باہر چلی گئی۔ میں نے ڈاکٹر راوحا اور جاگئی کا تعارف کرایا۔

”جاگئی بھی ڈاکٹر ہے۔“ میں نے کہا ”اس کی ساری زندگی تھائی لینڈ میں گزری ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کے

خاندان کے کچھ لوگ ہیں لیکن یہاں اگر ہم عجیب حالات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ کسی سے رابطہ کرنے کی بات نہیں مل سکا۔“

وہ دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتی رہیں پھر جاگئی کر میرے قریب آئی اور میری چونوں کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے میرا کمرہ اٹھا کر میری پشت پر بھی چونوں کا جائزہ لیا۔ راوحا سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کرنے لگی۔

”تمہارا یہ دوست بہت بہت آدمی ہے۔“ ڈاکٹر راوحا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اگر کسی اور کی بات ہو تو ہفتہ وس دن تک بستر سے اٹھنے کا نام نہ لیا کریں۔ دیکھو۔ کتنے مزے سے نسل رہا ہے۔“

اتنے میں مندری چائے بنانے لگی۔

”اب کیا کیا جائے۔“ ڈاکٹر راوحا نے چائے بنانے کے بارے میں کیے معلوم کیا جائے۔“

”تج سگھ کے ایک دو ٹھکانے میرے علم میں ہیں۔“ متی ہی نے بتایا تھا۔ ”میں نے جواب دیا ”سب سے پہلا ٹھکانوں پر معلوم کیا جائے یا پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔“

”وہ کیا؟“ ڈاکٹر راوحا نے پوچھا۔

”میں اور جاگئی یہاں سے کسی دوسری جگہ ہو جاتے ہیں اور مندری کی طرف سے پولیس مدد لکھوا دی جائے۔ مندری پولیس کو یہ بتائے گی کہ وہ سگھ کے ساتھ کالی کے مندر مٹی ہوئی تھی۔ صبح وہاں لٹا کر اس حالت میں ملا اور روپ متی غائب ہو گئی۔“ ڈاکٹر راوحا نے جواب دیا ”اور ابھی بہت سے لوگ لپیٹ میں آئے۔ پولیس تم دونوں کو بھی تلاش کرے گی۔ تم انہیں کو نہیں چانتے۔ یہاں چھپنے ہوئے غنڈے اور بدعنوان میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔ نہایت سفاک اور بے رحم تشدد کے ایسے ایسے طریقے جانتے ہیں کہ چھریوں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر تم دونوں ایک بار پولیس کے پھنس گئے تو زندگی بھر ایسا پتھا نہیں چھڑا سکو۔ اور نہ کسی ایسے چکر میں نہیں پھنستا جاتی۔“

”تو پھر؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا دل دیکھا۔

”ہمیں اپنے طور پر انہیں تلاش کرنا چاہیے۔“ راوحا نے جواب دیا۔

”ہم دونوں تو اس شرم میں الجھیں ہیں۔ اگر تم اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکو تو۔۔۔؟“ میں نے کہا۔

”میں خاکر بھانوت سگھ سے بات کرتی ہوں۔“ ڈاکٹر راوحا نے کہا۔ ”وہ میرا اور روپ متی کا دوست ہے۔ قابل اعتماد بھی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکے۔“

”ہاں اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ڈاکٹر راوحا نے اثبات میں سر ہلایا ”وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جو روپ متی سے واقعی ملحق ہیں۔ خاکر بھانوت سگھ بھی روپ متی کو سمجھتا رہتا تھا لیکن پھر بالکل الگ ہو گیا اور روپ متی سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہے وہ ہماری مدد پر آمادہ ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”میرا خیال ہے ہم نیچے چلے ہیں۔ تم لون پر اس سے بات کرو۔“

ہم روپ متی والے کمرے سے نکل آئے۔ اس کمرے کوئی اچال ایسے ہی رہنے دیا گیا تھا۔ نیچے آتے ہوئے ڈاکٹر راوحا مجھے خاکر بھانوت سگھ کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کے مطابق بھانوت سگھ کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ دراصل روپ متی کے بی (شوہر) کا بچپن کا دوست تھا۔ اس کے زمانے (اقبال) کے بعد جب اس نے روپ متی کو غلط راستے پر چلے دیکھا تو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے روپ متی کو شادی کی پیشکش بھی کی تھی۔ وہ اسے اپنا لے کر تیار تھا مگر روپ متی نے انکار کر دیا۔ بھانوت سگھ اس کے بعد بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر جب وہ سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھی راہ پر آنے والی نہیں تو بھانوت سگھ نے اس سے ملنا ہی چھوڑ دیا لیکن وہ روپ متی کی حالت پر کڑھتا رہتا تھا۔ وہ ڈاکٹر راوحا سے ملتا اور روپ متی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا۔

ڈاکٹر راوحا نیچے آکر بال میں اس طرف چلی گئی جہاں میز پر ٹیبل فون رکھا ہوا تھا۔ میں جاگئی کے ساتھ اپنے کمرے میں آیا۔

”باب! اب بتاؤ۔“ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے جاگئی کی طرف دیکھا جو ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی ”تم نے کالی کے مندر میں مل دھرو دیکھا تھا۔ کیا دارا بھی۔“

”نہیں۔“ جاگئی نے میری بات کاٹ دی ”دارا کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے صرف مرلی کو دیکھا تھا اور مندری کو یہاں دوڑا دیا تھا۔ میرا خیال تھا تم مجھے تو بتاؤ۔“

”نہ گھبرنے کی کوشش کریں گے لیکن

مندری یہاں آکر پھنس گئی۔“

”مندری نے دیوان سگھ کو واپس بھیج دیا تھا تاکہ تمہیں لے آئے۔ وہ بھی ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔

”دیوان سگھ مجھے وہاں تلاش کر بھی نہیں سکا تھا۔“ جاگئی نے جواب دیا۔ ”چار بجے کے قریب ہنڈت مرلی دھر کالی کے مندر سے نکل گیا تھا اور میں بھی اس کے تعاقب میں چل پڑی تھی۔“

”تو کیا وہ اس وقت کالی کے مندر میں نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جاگئی نے جواب دیا ”وہ اس وقت نیو گیٹ اور چوڑا راستہ والے چوراہے کے قریب واقع ایک مندر میں ہے۔ میں اس خیال سے اس مندر کی بیڑھیوں پر بیٹھی رہی کہ شاید وہ وہاں سے پس اور جائے گا لیکن ایک بچاری سے پتا چل گیا ہے کہ وہ کئی ہفتوں سے اسی مندر میں رہ رہا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد میں فوراً ہی وہاں سے چل پڑی اور یہاں کی صورت حال دیکھ کر تو میرے حواس اڑ گئے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔“

”میرا خیال ہے تج سگھ وغیرہ موقع کی ناک میں تھے۔“ میں نے جواب دیا اور اسے تفصیل بتانے لگا لیکن سوم رس اور شراب کا قصہ گول کر گیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں جلد ہی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ بصورت دیگر روپ متی کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔“ جاگئی نے کہا۔

”ڈاکٹر راوحا نے اپنے ایک دوست کو بلایا ہے۔ اس کے آنے کے بعد ہی دیکھتے ہیں کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ مندری دروازے میں نمودار ہوئی۔

”میں ناشتا بنا رہی ہوں۔ تم لوگ بڑے کمرے میں آجاؤ۔“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور واپس چلی گئی۔

”تمہاری اب کیا حالت ہے۔ لگتا ہے انہوں نے ٹھیک ٹھاک مارا لگا رہی تھی۔“ جاگئی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اپنی ٹھکی سے ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اگر میں حواس میں رہتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔“

”کیا مطلب!“ جاگئی نے مجھے گھورا ”تمہارے حواس گھاس چرے نہ چلے گئے تھے کیا؟“

”وہ لوگ اچانک ہی کمرے میں گھس آئے تھے۔“ میں نے بات بناتے ہوئے کہا ”ایسی صورت میں حواس پر قابو رکھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔“

جاگتی چند لمحے گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر باہر روم میں گھس گئی اور میں ہال میں آگیا۔

ڈاکٹر رادھا خلی فون والی میز کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مندری پنچن میں تھی۔ ویسے مندری کی حقیقت پسندی مجھے پسند آتی تھی۔ صورت حال کسی بھی رہی ہو، اس نے کھانے پینے کا پیشہ خیال رکھا تھا۔ کسی پریشانی میں خالی پیٹ رہنے سے پریشانی بڑھ جاتی ہے اور مندری اس حقیقت سے واقف تھی کہ خالی پیٹ رہنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

چند منٹ بعد جاگتی بھی وہاں آگئی۔ نہانے اور کپڑے بدل لینے سے وہ تازہ دم لگ رہی تھیں لیکن رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی پر قرار تھی۔

ہم ناشتا کر رہے تھے کہ دیوان سنگھ بھی پہنچ گیا۔ صورت سے وہ خاصا پریشان لگ رہا تھا لیکن جاگتی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ ہم نے اسے بھی اپنے ساتھ ناشتے کی میز پر بٹھالیا۔

ڈاکٹر رادھا کا دوست شاکر بھانوت سنگھ دس بجے کے قریب وہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک خوب رو اور بھرپور جوان آدمی تھا۔ بڑا وقار شخصیت کا مالک۔

”تمہارے بارے میں میرے خیالات کچھ اور تھے۔“ وہ تعارف ہونے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں یہی سمجھتا تھا کہ تم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہو جو جتنی گنگا میں ہاتھ دھوئے کالن جانتے ہیں لیکن ایک رات پتا چلا کہ تم نے روپ متی کو شراب نوشی پر سرزنش کی تھی اور اسے گھینٹے ہوئے ہونے سے لے آئے تھے۔ ایسی حرکت تو کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جسے واقعی اس سے ہمدردی ہو۔ اس واقعے کے بعد مجھے تمہارے بارے میں اپنے خیالات بدلنے پڑے تھے۔“

”اب سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ روپ متی کو کیسے تلاش کیا جائے۔“ میں نے کہا ”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے خطرہ بھی بڑھتا جائے گا۔“

”تجربہ ہی پتا چلایا جائے گا۔“ شاکر بھانوت سنگھ نے کہا ”وہ گندی مٹی کے کیزے اگر اپنے آپ کو ہمارے برابر سمجھنے لگے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ ناجائز طریقے پر دولت جمع

کر لینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کی ذات اور فطرت بھی بدل گئی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”مطلب اس میں روپ متی ہی کی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک لڑکیا لیا کہ تھڑا ریت غنڈے بھی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ بہر حال، میں آج ہی ان کا سراغ لگاؤں گا۔ وہ اس شرم ہوں یا نہیں اور بیچ کر نہیں جاسکیں گے۔“

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے اوپر آگئے کمرے کے بکھرے ہوئے سامان کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر چائیں پر ایک طرف پڑے ہوئے چاندی کے ایک تعویذ پر پڑی۔ میں نے جھک کر وہ تعویذ اٹھالیا۔ اس میں سیاہ رنگ کی ڈوہری تھی جو ٹوٹ جانے سے تعویذ بچ سکے یا دھڑبھڑکے گئے۔ گرا ہوا تھا۔ میں نے ان دونوں کو ایسے تعویذ پینے ہوئے دیکھا تھا اور ظاہر ہے یہ انہی میں سے کسی ایک کا ہو سکتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد شاکر بھانوت سنگھ چلا گیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوراً ہی اپنے آدمیوں کو ان کی تلاش پر دے گا۔ ڈاکٹر رادھا بھی چلی گئی۔

ہم سب مل کر کمرے کی حالت درست کرنے لگے۔ ہم پر حملہ ہونے سے پہلے نیچے والے کمرے کی کھڑکی کا پینڈ ٹوٹنے اور غالباً چنگ سنگھ کی آواز سن کر ہی روپ متی نے اپنا پستول تلاش کرنا شروع کیا تھا لیکن وہ اس قدر بدحوال ہو رہی تھی کہ اس نے ڈرائنگ ٹیبل اور الماری کا مارا سامان نکال کر پھینک دیا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ پستول اس نے کہاں رکھا تھا لیکن بہر حال آخری لمحات میں پستول اس کے ہاتھ آ گیا تھا اور اس نے وہ پیش کو گولی مار دی تھی۔ اگر یہ پستول پہلے اس کے ہاتھ میں آچکا ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

مجھے بھی اپنے آپ پر ندامت تھی۔ میں کس قدر تیار سے ان لوگوں سے مار گھسیا تھا لیکن شاید اس میں میرا بوجھ قصور نہیں تھا۔ غلطی تو روپ متی کی تھی جس نے اپنی ہوش مٹانے کے لیے مجھے شربت میں سوم رس مچھلی چھینچ کر ڈال دی تھی۔ اگر میں اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو چنگ سنگھ کو روپ متی کو لے جانے میں بھی بھی کامیاب نہ ہوتا۔ مجھے غار روپ متی کی ذہنیت پر بھی افسوس ہوا تھا۔ شاکر بھانوت سنگھ کے رستے پر اتنا آگے نکل چکی تھی کہ اس کی بات ناممکن ہو گئی تھی۔

اب یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ چنگ سنگھ نے پولیس اس واقعے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ صورت حال

نراکت اور غنچنی سے واقف تھا۔ خود اس کے پھنس جانے کا بھی احتمال تھا اس لیے وہ پولیس سے دور ہی رہا تھا۔ روپ متی اس کے قبضے میں تھی اور وہ اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا اور مجھے روپ متی کے بارے میں تشویش تھی۔ جیسے وقت گزر رہا تھا، میری تشویش بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس شام میں اور جاگتی اس مندر کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ روپ متی کی تلاش اگرچہ سب سے زیادہ اہم تھی مگر میں نے سوچا کہ اس دوران میں مری دھر کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کر لی جائیں۔

دیوان سنگھ کار چلا رہا تھا۔ میں اور جاگتی چھپلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج دوپہر کے بعد تارا سنگھ بھی واپس آگیا تھا۔ صورت حال جان کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے حویلی میں مندری کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

شرچا کوکڑاؤرش نگر سے نکل کر گوند مارگ والی سڑک پر ہوئی ہوئی اگرہ مارگ پر بائیں طرف مڑ گئی۔ یہ مرزا انجیل روڈ (انیم آئی روڈ) تھی۔ بہت کشادہ سڑک تھی۔ شہر کے تمام اہم بازار اور بعض سرکاری دفاتر اس سڑک کے آس پاس تھے۔ ماڈرن آرٹ گیلری، راجستان گورنمنٹ ہینڈل کرافٹ ایجوویم، سینٹرل کالج انڈسٹریز، میموریم اور جنرل پوسٹ آفس کی خوب صورت عمارتیں بھی اسی سڑک پر واقع تھیں۔

کار ایک چوراہے پر دائیں طرف مڑ گئی۔ اگلے چوراہے پر سنگا گریٹ اور سامنے شہر کا مشہور ترین چوری بازار تھا مگر گاڑی اس طرف مڑنے کے بجائے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی عمارت کے سامنے سے ہوتی ہوئی بند گیت والے چوراہے پر پڑ پڑا راست کی طرف مڑ گئی۔ یہ بھی ایک باروق بازار تھا جو اسے جا کر توپلیا بازار سے مل جاتا تھا۔

جاگتی اب تک دیوان سنگھ کو راست بتاتی جا رہی تھی۔ اس کے کہنے پر دیوان سنگھ نے کار ایک کشادہ کلی میں روک لیا۔

”ہمیں واپسی میں شاید توڑی دیر ہو جائے۔ تم ہمیں روک رکھا اور انتظار کرنا۔“ جاگتی نے دیوان سنگھ سے کہا اور اپنا طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

میں بھی نیچے اتر آیا۔ شام کا وقت تھا۔ بازار میں گھما گھمی تھی اور روشتیاں بند کر دی تھیں۔ چند گز آگے جانے سے پھر جاگتی بائیں طرف ایک کشادہ کلی میں مڑ گئی۔ یہی کلی سب جا کر کھن پول بازار سے مل جاتی تھی لیکن ہمیں اس کلی

میں زیادہ نہیں چلنا پڑا۔

دائیں طرف ایک بہت بڑا گھنٹش مندر تھا۔ دس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد عمارت کا وسیع و عریض پر آمدہ تھا۔ لاقعد استون تھے جنہوں نے پر آمدے کی چھت کو سارا دے رکھا تھا۔ سیڑھوں کے عین سامنے والے دو ستونوں گنیش دیوتا کی بہت بڑی بڑی مورتیاں کندہ تھیں۔ ویسے ہر ستون پر چھوٹی بڑی مورتیاں کندہ تھیں۔

سیاہ ماربل کے فرش والے پر آمدے میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے مندر کا اصل ہال سامنے ہی تھا جہاں گنیش دیوتا کی بہت بڑی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ مندر میں آنے والے لوگ چھت پر لگی ہوئی گھنٹیاں بجاتے، مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھا (دعا) کرتے کوئی چیز بھیٹ چکا تھا اور ایک طرف ہٹ جاتے۔

”بھڈت مری دھر کو میں نے صبح اس راہداری میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ جاگتی نے سرگوشی کرتے ہوئے آٹھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”کئی پجاری یہاں گھوم رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی سے اس کے بارے میں پوچھ لینا چاہیے۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔ اس طرح اگر ہم سارا دن بھی یہاں کھڑے رہیں تو شاید وہ ہماری نظروں میں نہ آسکے۔ چلو اس بھڈت سے پوچھتے ہیں۔ وہ اسی طرف آ رہا ہے۔“ میں نے ایک بھڈت کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پیلا رنگ کی ایک چادر ساڑی کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ رکھی تھی۔ توند ٹکے کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ تجرب چہرہ، پھولے ہوئے گال اور سرخ آنکھیں اور گلے میں رنگ برنگ موتیوں کی کئی لاکھیں نظر آ رہی تھیں۔ سرگھیا اور چوڑی پیشانی پر نقشہ۔

میں اس پجاری کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ بائیں طرف سے آنے والے ایک آدمی کو دیکھ کر ٹھک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جاگتی کا ہاتھ پکڑا اور اسے سمجھتا ہوا ایک ستون کے پیچھے لے گیا۔

”کیا ہوا؟“ جاگتی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ اس طرح کھینچے جانے پر بدحوال ہو گئی تھی۔ ”وہ اس آدمی کو دیکھ رہی ہو۔ وہ سفید دھوئی کرتے والا جو مورتی کی طرف جا رہا ہے۔“ میں نے ستون کی آڑ سے اشارہ کیا ”یہ چنگ سنگھ کا ساتھی ہے۔ کل رات روپ متی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے خنجر سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

”وہ!“ جاگتی چونک گئی ”تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں

ہوئی۔ میرا مطلب ہے اتنی عین واردات کے بعد وہ اس طرح دیدہ دلیری کا مظاہرہ کسی طرح کر سکتے ہیں کس۔  
 ”میری نظرس دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”کل رات یہ لوگ شاید مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ انہیں تو توقع بھی نہیں ہوگی کہ میں اس طرح گھوم پھر رہا ہوں گا۔ تم ایسا کسو۔“ میں نے خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”تم مثلی ہوئی اس کے قریب چلی جاؤ۔ اسے جال میں پھنسا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ تم اسے لے کر اس دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔“

جاگتی میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے مسکرا کر۔۔۔ میری طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ میں نے ستون کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ شخص خاصا تہ آور اور جیم تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کا تعلق بھی پهلوانوں کے کسی خاندان سے تھا۔ مخصوص انداز میں بندھی ہوئی سفید دھوٹی، اجلا سفید کمرہ اور ماتھے پر ٹیکا۔ وہ بہت بھلا مانس اور شریف آدمی لگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیر پلٹ تھی جس میں ناریل پھول، مٹھائی اور ایسی ہی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس قسم کی تیار تھالیاں باہر دکانوں پر ملتی تھیں۔

اس نے تھالی نکش دی تو ان کے چروں پر رکھ دی اور کرتے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے۔ چند تہہ دور دور کھڑا ہوا۔ ایک بچاری فوراً قریب آگیا اور اس کے ہاتھ سے نوٹ لے کر اپنی چادر کے اندر رکھی۔ جب میں ڈال لے اور موتی کے سامنے رکھی ہوئی اس کی تھالی میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی پھیلی پر رکھ دیا۔ یہ رساد تھا۔

ٹھیک اسی وقت جاگتی بھی وہاں پہنچ گئی۔ ہنڈت نے اسے بھی پر ساد دیا۔ جاگتی نے مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور فوراً ہی اس شخص کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں ستون کی آڑ سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دائیں طرف اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کے بارے میں جاگتی کو ہدایت کی تھی۔ وہ دروازہ بھی کافی کشادہ تھا اور اس طرف سے بھی لوگوں کی آمد رفت جاری تھی۔ میں اس دروازے سے نکل کر سائڈ اسٹریٹ میں گیا۔

یہ گلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ مندر کے دروازے پر ایک بلب بھل رہا تھا۔ اس گلی میں رہائشی مکان تھے۔ مکانوں کے سامنے مدھم روشنی والے بلب بھل رہے تھے۔ دائیں طرف یہ گلی دور تک چلی گئی تھی جبکہ بائیں طرف تقریباً بیس گز آگے جا کر اس کشادہ گلی سے مل جاتی تھی جس طرف

مندر کا مرکزی دروازہ اور برآمدہ تھا۔

میں دروازے سے ذرا ہٹ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد جاگتی اس آدمی کے ساتھ مندر کے دروازے سے باہر نکلی۔ میں رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

صرف ایک منٹ بعد وہ دونوں میرے قریب سے گزرے۔ اس شخص نے ایک ہاتھ جاگتی کی کمر میں تامل کر رکھا تھا۔ کشادہ گلی والے موڑ پر آکر وہ دونوں رک گئے۔ ”اس طرف۔“ اس شخص نے جاگتی سے کہا ”وہ میری گاڑی کھڑی ہے۔“

”نہیں مسز! اس طرف۔ ہماری گاڑی ادھر کھڑی ہے۔“ میں نے اس شخص کے برابر پہنچ کر کہا۔

وہ شخص اس مخالفت بے جا پر اچھل پڑا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا تو اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔ اس نے جاگتی کی کمر سے ہاتھ ہٹایا۔

”نہیں۔“ تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔“ میرے من سے غراہٹ نکلی اور اس کے ساتھ ہی میں نے پستول کی ٹال سے اس کے پهلے سے لگا دی ”اگر تم نے منہ سے آواز بھی نکالی تو اس پستول کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتر دوں گا۔ خاموشی سے چلتے ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلے چل رہے تھے۔ اپنا ہاتھ اس کی کمر پر پلٹ دو۔ شاباش۔“

اس نے میرے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی کوئی تامل نہیں کیا۔ اس نے اپنا پائیاں ہاتھ پہلے کی طرح جاگتی کی کمر کے گرد حاصل کر دیا۔ وہ ہمارے درمیان چلا رہا۔ پہلے تو وہ جاگتی کو نجانے کیسے کیسے سبز باغ دکھا رہا تھا لیکن اب اس طرح خاموش تھا جیسے زبان لنگ ہو گئی ہو۔

ہم بازار کی طرف جانے کے بجائے بیچ کی ایک عک کی گلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں آٹا کالوں کی آمد رفت تھی۔ میں نے اس کے پهلے پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا تاکہ وہ موٹے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

دوسری کشادہ گلی میں نکل کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہماری شیراز بائیں طرف تقریباً دس گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ دیوان سنگھ ایک بند دکان کے کھڑے پر ایک اور آدمی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ویسے اس کشادہ گلی میں زیادہ

دکانیں تھیں اور خاصی رونق تھی۔ دیوان سنگھ ہمیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اس شخص کے ساتھ بالکل بڑ کر چل رہا تھا تاکہ کوئی راہگیر میرے ہاتھ میں پستول نہ دیکھ لے۔ کار کے قریب پہنچ کر جاگتی

حکم کر دوسری طرف چلی گئی۔

میں دروازے لاک نہیں تھے۔ جاگتی دوسری طرف رکھ کر اندر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے اپنی طرف کا ہاتھول کر اس شخص کو اندر دھکیلا اور خود بھی اس کے محل کر اس شخص کو اندر بند کر لیا۔ دیوان سنگھ نے اپنی سیٹ پر بٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر دیکھا تھا اور پھر انجن دے کے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر انجن دے کے آگے بڑھ دیا۔

جاگتی نے عقل مندی کی۔ اس نے بیٹھے ہی اس شخص کی بھی لے ڈالی اور اس کی دھوٹی کے بند کے بل میں اپنا ہاتھ نکال لیا۔

دیوان سنگھ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا ”بغیر اور رفتار تیز مگر احتیاط سے۔ حادثہ نہیں ہوتا۔“

”یہاں سنگھ نے سر ہلادیا۔

اور اپنی کار سے اختیار کرنے کے بجائے تھوڑا سا بازار نہ نکل گئی۔ سورج پولی گیسٹ سے چاند پول بازار تک می سڑک بہت کشادہ تھی۔ اس پوری سڑک کو ٹاموں نے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سڑک کے طرف کشادہ سروس روڈ اور ان کے ساتھ بڑی بڑی گھنٹیں۔ کئی ذیلی گلیاں اور بازار تھے۔

اور سورج پول گیسٹ سے کافی آگے نکل کر دائیں طرف در تقریباً دو گھوڑے کا فاصلہ طے کر کے آگے مار گئے۔ وہاں گوند مارگ کی طرف نکل آئی اور پھر آدھ شہر میں نہایت ہی زیادہ پر نہیں لگی تھی۔

ہاتھ میں کار سے اترتے ہوئے اس شخص کی ٹانگیں ڈولے کاپ رہی تھیں۔

”سورج بھان سنگھ تھا۔“

”یہاں سنگھ کا دوست بھی تھا اور اس کا شاگرد بھی۔ چند سال پہلے یہاں سنگھ سے پہلوانی کے داؤ بیچ کھیا کرتا تھا لیکن کئی نوکری کے بعد ان دونوں بھائیوں نے اکھاڑا بند کر دیا۔ سورج بھان سنگھ نے شہر کے ایک پس ماندہ علاقے میں ملازمت کر لیا۔ کوشش کے باوجود اس کے شاگردوں کی پارسے اوپر نہیں جاسکتی تھی۔ اس علاقے میں وہ نہ بجائے دادا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ڈیل ڈول نہ اس علاقے کے کھڑے ریت غنڈے، بد معاش، بڑاوش اور انٹھائی کیرے اسے دادا مان کر اس کے سامنے جھکے ہوئے تھے۔ اس طرح سورج بھان سنگھ کا بد معاش کا ادا بن گیا۔“

سورج بھان سنگھ نے اپنے ارد گرد جمع ہونے والوں سے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ اس نے علاقے کے دکانداروں، ٹھیلے والوں اور خانوے فروشوں سے بہت وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس علاقے سے گزرنے والے رکشے اور ٹیکسیوں سے بھی غنڈا لیکس وصول کیا جانے لگا۔

سورج بھان سنگھ نے اپنے اس گردہ کو رکھنا منڈل کا نام دیا تھا۔ جو دکان دار بہت دینے سے انکار کر دیتا تو پڑ پھوڑ سے اس کی دکان کو ختم کر دیا جاتا اس لیے ہر دکان دار طے شدہ رقم ہر مہینے اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

پولیس سورج بھان سنگھ کی ان سرگرمیوں سے آگاہ تھی لیکن علاقے کے انکسپکٹور بھی اس کی طرف سے باقاعدگی سے بہت مل رہا تھا اس لیے پولیس نے اس کی طرف سے تہمتیں بند کر رکھی تھیں۔ صرف اس ایک علاقے پر کیا منحصر ہو رہے شہر میں یہ سلسلہ چل رہا تھا۔

سورج بھان سنگھ کے کہنے کے مطابق ایک ہفتہ پہلے تیج سنگھ نے اسے بلا کر روپ مٹی کے انگو کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ اس سے اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

”مجھے تیج سنگھ نے پیاس بھرا کی چٹکن کی تھی۔“

سورج بھان سنگھ کہہ رہا تھا ”پہلی دروازہ کے دادا لالہ رنجیت کو بھی اس نے اسے ساتھ ملایا تھا۔ کل رات ہمارے ساتھ وہی تھا۔“ وہ چند ٹھوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میرا ایک آدمی ایک بیٹھے سے حویلی کی گھرائی کر رہا تھا اور کل رات اس نے اطلاع دی کہ میدان صاف ہے تو ہم نے بلا ہول دیا۔ مجھے وہاں مقابلے کی زیادہ توقع نہیں تھی۔ تیج سنگھ نے ہمارے بارے میں بتایا تھا، دو چار ہاتھ سے زیادہ بار برداشت نہیں کر سکو گے لیکن وہاں صورت حال مختلف نکلی۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر خشک ہونٹوں پر زبان

پھیرنے لگا پھر بولا ”روپ مٹی نے دھرمیش کو گولی ماری تو تیج سنگھ نے اس کی کینٹ پر ایک ہاتھ مار کر اسے بے ہوش کر دیا اور ہم تینوں تم پر بل پڑے اور پھر تھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے بعد میں تیج سنگھ نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم زندہ بیچ بھی گئے تو وہاں رکے یا پولیس کے پاس جانے کے بجائے بھاگے کی کوشش کرو گے۔ تم نے اس کی زیادہ دشمنی بھی نہیں کی۔ وہ تو روپ مٹی سے بدلہ لینا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اسے اس قدر زلت اٹھانی پڑی تھی۔“

”دھرمیش زندہ ہے یا؟“

”میں تک تو زندہ تھا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”تیج سنگھ نے رات کے پچھلے پہری ایک ڈاکٹر کو بلایا تھا جس

نے اس کے سینے کے زخم سے گولی نکال دی تھی لیکن میرا خیال ہے اس کے بچنے کا زیادہ چانس نہیں ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ بہر حال میں جج سنگھ سے اپنی رقم لے کر مرجح و س بچے کے قریب وہاں سے آیا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہیں لیکن تمہ "وہ وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا" میرا تو خیال تھا کہ اگر تم زندہ بچ بھی گئے تو کسی ہفتوں تک اسپتال کے بستے سے نہیں اٹھ سکو گے لیکن۔

"تمہیں جج سنگھ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دونوں بھائی دو مرتبہ گھر کی طرف سے پٹ چکے ہیں۔" میں نے کہا "بہر حال۔ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں اور روپ متی کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہے؟"

"روپ متی کو باندھ کر ایک کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی جج سنگھ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے گا لیکن اگر وہ ہمیشہ مر گیا تو جج سنگھ روپ متی کو بھی ازیتیں دے کر ہلاک کر دے گا۔"

"ایسا وقت آنے سے پہلے ہی میں جج سنگھ کو ختم کر دوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظرسنما دیتے ہوئے کہا "وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" سورج بھان سنگھ نے جواب دیا "جج سنگھ کو پتا چل جائے گا کہ تم مجھے اغوا کر کے لائے ہو۔ وہ اس حوالی کی اینٹ سے اینٹ بنادے گا۔"

"اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔" میں نے کہا "اس کا ٹھکانا بتاؤ؟"

"تم میری بوٹیاں نوچ دو تو بھی میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" سورج بھان سنگھ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا لیکن میرے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ تم خود ہی زبان کھول دو گے اور فر فر بوتے لگو گے۔" میں نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

اور پھر چند ہی منٹ کے اندر اندر میں نے وہ انتظام کر لیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ سورج بھان سنگھ کو ایک چارپائی پر لٹا کر باندھ دیا گیا۔ اس کا رتہ میں نے اترا لیا تھا۔ چارپائی سے پانچ فٹ اونچ ایک ڈبا باندھ کر اس میں فرنج کا ٹھنڈا پانی اور برف ڈال دی۔ ڈبے کے پینے میں ایک سوراخ کر دیا تاکہ قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا رہے۔

سورج بھان سنگھ وحشت زدہ سی نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی اوپر لٹکے ہوئے ڈبے کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے دیوان سنگھ کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے پینے کے سوراخ میں پھنسی ہوئی کپڑے کی چھانچا ٹھنڈے پانی کے قطرے سورج بھان سنگھ کے سینے لگے۔ میں نے دیوان سنگھ کی مدد سے چارپائی کو اس سے ہٹا کر اس طرح سیٹ کیا کہ پانی کے قطرے اب بھان سنگھ کے سینے پر عین دل کے مقام پر ٹپک رہے۔

"میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔" میں نے سورج بھان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔" میں نے سورج بھان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

سورج بھان سنگھ کی آنکھوں میں وحشت کی برق نے مندری کو اشارہ کیا اور ہم ہاں میں ہاں ملے آگے چلے ہی کچن میں جا چکی تھی۔ اسے شاید چائے کی طلب تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہم سب کے لیے چائے بنا کر دیوان سنگھ کا قہقہہ پر آتی پانی مار کر بیٹھ گیا۔ قلعہ آباد ہی تھا۔ مندری اسے وہیں چائے دے آئی تھی۔

"ایک بات کہوں حکم۔ برا تو نہیں مانو گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بولو۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے طرف دیکھا۔

"سورج بھان سنگھ کو میں بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ پانی کے قطرے اس کا کیا بگاڑیں گے اسے تو ہم آرا سنگھ کے حوالے کر دوں۔ ہم گیارہ منٹ میں لے جا کر سب کچھ اگلا لیں گے۔" دیوان سنگھ نے کہا۔

"صرف آدھا گھنٹا۔" میں نے سکرٹا ہوتے ہوئے کہا "اگر میری یہ ترکیب ناکام ہوگی تو پھر میں اسے حوالے کر دوں گا۔"

"دیکھ لو حکم۔" دیوان سنگھ بولا "اٹا ناں کے پور سے نہیں مانتے۔"

"ایک مرتبہ آزما تو لو۔ ممبر کو چند منٹ۔"

اور پھر آدھا گھنٹا پورا ہونے سے پہلے ہی سورج بھان سنگھ کی چیخوں کی آواز سنانی دینے لگی۔ میں نے سکرٹا سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر ہم سب ہال سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئے۔

چارپائی پر بندھا ہوا سورج بھان سنگھ کما کما خوف سے اس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ رو رہا تھا۔

"ابھی تو صرف ابتدا ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

ہوئے کہا "قطرہ قطرہ ٹپکنے والا یہ پانی تمہارا سینے میں رچ بسے گا اور پھر پانی کے یہ قطرے براہ راست دل پر پڑیں گے اور دل میں بھی سوراخ کھدیں گے۔" میں نے کہا "تم شاید تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

"نہیں! وہ چیخا۔" میں نے نہیں کر سکتے۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔" میں نے جواب دیا "لیکن زراں ازیت سے بچنا چاہتے ہو تو۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جج سنگھ مجھے زندہ نہیں دے گا۔" وہ پھر چیخا۔

"ٹپک ہے۔" میں نے کندھے اچکا دیے "آرام سے بندہ۔ میں تو تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مندری اور دیوان سنگھ بھی ہال کی طرف گئے۔ سورج بھان سنگھ کی طرف دیکھ کر ہاتھ پانی کے قطرے دھتے دھتے سے ٹپک رہے تھے۔ پھر ایک ہی جگہ ٹپکنے والا پانی کا ہر قطرہ اس کے جسم میں لپٹتا تھا۔ مندری نے کہا "دیکھو وہ چارپائی پر اس طرح بندھا ہوا لگا ہوا ہے۔ ایک انچ بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔"

سورج بھان سنگھ نے سختی سے دانت بچھڑکے تھے۔

"وہ ہمارے سامنے اپنے آپ کو بڑول ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے کہا "اس کی یہ کیفیت چند منٹ سے زیادہ برقرار نہیں رہے گی۔"

پانی دینا کی نرم ترین شے ہے لیکن یہ سنگھانچاؤں میں سوراخ کھدینے کی طاقت رکھتا ہے۔ انسان تو گوشت و ہڈی کا بنا ہوا ہے۔

"میں مجھے کھول دو۔" وہ چیخا "بب۔ بتا ہوں۔"

"نہیں۔" میں سکرٹا ہوتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر گیا۔

"نہیں۔" میں نے کہا "اگر وہ اپنی مرضی کی مدد سے لٹکا ہوا ڈبا ایک ٹپکا دے گا۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

اور پھر چند منٹ بعد ہی سورج بھان سنگھ کو پیر ہاتھ باندھ کر ایک سرونٹ کوار میں ڈال دیا گیا۔ وہ کمرہ بالکل خالی تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی بند شیں نہ کھول سکے۔

ہال میں آنے کے تھوڑی سی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ مندری نے ریسیور اٹھایا۔ وہ ایک منٹ تک کسی سے بات کرتی رہی پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ تھا۔"

"ہیلو ہمت سنگھ! اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اسے میرا نام بہت سنگھ ہی بتایا گیا تھا۔" میں نے جج سنگھ کے ٹھکانے کا پتا لگایا ہے۔"

"نیش گڑھ میں۔" میں نے کہا۔

"وہ! ٹھاکر کے لیے میری حیرت تھی "تو تم بھی۔"

"ہاں۔ میں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔" میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا "بہتر ہو گا کہ تم بھی یہاں آ جاؤ تاکہ ہم جلد سے جلد کوئی قدم اٹھا سکیں۔"

"میں آؤں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھاکر بھانوت سنگھ نے جواب دیا اور لاٹن بے جان ہو گیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور جاگنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھاکر بھانوت سنگھ نے بھی جج سنگھ کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا ہے۔ وہ آؤں گے۔ میں یہاں پہنچ رہا ہے اور پھر ہم نیش گڑھ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

میں دیوان سنگھ سے نیش گڑھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کسی قصبے یا آبادی کا نام ہو گا لیکن نیش گڑھ شیر کے شمال مشرق میں چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پہاڑی تھی۔ جس پر ایک پرانا قلعہ اور نیش دیوتا کا ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔ اس پہاڑی تک پہنچنے کے لیے راجاؤں کے مرگھٹ کے پاس سے گزرنا پڑے گا۔ یہ ایک تاریخی شمشان بھوی ہے۔ جس جگہ کسی راجا کی چنا جلائی گئی، وہیں اس کی یادگار تعمیر کر دی گئی ہے۔"

نیش گڑھ میں کوئی باقاعدہ آبادی تو تھی نہیں۔ پہاڑیوں پر ادھر ادھر قدیم عمارتیں بکھری ہوئی تھیں۔ بہت سی عمارتیں ٹھنڈے بن چکی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی بعض ایسی عمارتیں تھیں جہاں اب بھی دولت مندوں کی رہائش تھی اور جج سنگھ ایسی ہی کسی عمارت میں چھپا بیٹھا تھا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ تقریباً چالیس منٹ بعد پہنچا تھا۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹا پروگرام بناتے رہے اور پھر روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے صرف دیوان سنگھ کو ساتھ لیا تھا۔ جاگنی

بھی ہمارے ساتھ ہوئی تھی۔

ٹھاکر بیپ پر آیا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جاگتی اور دیوان سنگھ چھٹی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ بغیر ہڈی کی چپ بھی اور ہم آسانی سے چاروں طرف دیکھ سکتے تھے۔

روپ متی والا پستول میرے پاس تھا۔ جو روپالور میں تاج سنگھ کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا وہ میں نے جاگتی کو دے دیا تھا۔ جاگتی بھی اس وقت جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی اور روپالور اس نے پیچھے کر کے جینز کی بیٹ میں اڑس رکھا تھا۔

جب آدرش گھر سے نکل کر مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی اجیری گیٹ کی طرف آگئی۔ اس وقت وہ بھی نہیں بچے تھے۔ بازاروں میں گماگماہی تھی۔

شرے نے نکلنے ہی ویرانہ شروع ہو گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پھاڑی ٹیلے تھے جو آگے جا کر بتدریج بلند ہوتے چلے گئے اور تنگ سی سڑک ان پہاڑیوں میں بتدریج مل جاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ جب لے کر کیوں آیا تھا۔ سڑک بہت تنگ تھی۔ نہایت خطرناک اور تنگ موڑ تھے۔ کوئی بڑی گاڑی تو اس طرف آئی نہیں سکتی تھی اور پچارو یا سریندر جیسی نازک مزاج گاڑیوں کا بھی اس پہاڑی سڑک پر چلنا ممکن نہیں تھا۔

ان پہاڑیوں میں کہیں کہیں دامن بائیں تنگ سے راستے نکلتے تھے۔ کئی کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹھاکر نے ایک جگہ بیپ روک لی اور تاریکی میں اوپر اُدھر دیکھنے لگا۔ مہاراجوں کا قبرستان بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب پہاڑیوں میں یہ تنگ سی سڑک مار گڑھ قلعہ تک چلی گئی تھی جو میاں سے مزید کئی کلو میٹر آگے تھا۔

”میرے آدمی نے بتایا تھا کہ اس راستے کے موڑ پر واقع چٹان پر گیش کی ادھوری مورٹی کھدی ہوئی ہے۔“ وہ ایک بار پھر اوپر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا ”لیکن ابھی تک ایسی کوئی چٹان نظر نہیں آئی۔ ہم غلط راستے پر تو نہیں نکل آئے؟“

”وہ چٹان سے آگے ہے حکم۔“ چھٹی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیوان سنگھ نے کسی قدر آگے جھکے ہوئے کہا ”سورج بھان سنگھ نے بھی یہی نشانیاں بتائی تھیں۔“

جب ایک بار پھر حرکت میں آئی۔ اس مرتبہ رفتار بہت بلکی تھی۔ تقریباً نصف کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب لایک بار پھر رگ گئی۔ چند گز آگے بائیں طرف چٹانوں میں ایک تنگ سا راستہ تھا اور بالکل سامنے والی چٹان پر بائیں

کے چہرے والی مورٹی ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وجہ سے ادھوری چھوڑ دی گئی تھی۔

”اسی راستے پر موڑ لو حکم۔“ دیوان سنگھ نے بڑھائی۔ تھوڑے ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں طرف چٹان پر کسی قدیم عمارت کے کھنڈر دکھائی دیے۔ وہ رات میں وہ کھنڈر بڑا سراٹھا رہے تھے۔

”بیپ کو ادھر ہی کہیں روک لو حکم۔“ دیوان نے کہا ”سورج بھان سنگھ نے جو نشانیاں بتائی تھیں ان مطابق اب وہ عمارت زیادہ دور نہیں ہے اور جب لے جانا خطرناک ہو گا۔ بیپ بیپس کی روشنی یا ٹھکانے سن کر وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔“

دیوان سنگھ نے عقل مندی کی بات کی تھی۔ غار بیپ کی رفتار مزید کم کر دی اور تجسس نظموں سے لہرا دیکھنے لگا اور پھر اس نے بیپ دامن طرف ایک لہر سے راستے پر موڑ دی جو قد آور بھاڑیوں سے اچھا نہ گز آگے لے جا کر ٹھاکر نے بیپ روک لی اور آگے نہ بڑھنے کیس بھی بچا دیا۔

ہم بیپ سے اتر کر اس راستے پر واپس آگے اور کافاصلہ طے کر کے ایک پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ گنگا بہت ہی مشکل تھا۔ تقریباً سو فٹ کی بلندی تک پہنچنا چڑھتے ہوئے جاگتی بری طرح تھک گئی تھی۔

آگے چٹان ایک مسلح میدان کی طرح دکھائی ہوئی تھی اور تقریباً دو سو گز آگے ایک عمارت کا پہاڑا دے رہا تھا۔ اس عمارت کی کسی کھڑکی سے زوردار جھلک رہی تھی۔ اس عمارت تک پہنچنے کا راستہ پھر دوسری طرف سے تھا۔ جبکہ ہم شارٹ کٹ کر کے آئے۔

ان فاختری پہاڑیوں پر اونچے درخت نہیں تھے کہیں قد آور کسی قسم کے کانٹے دار پوسے تھے بھاڑیاں بکثرت تھیں جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے تھیں۔

چند گز آگے بڑھ کر ہم رک گئے۔ کچھ دور چلا جائزہ لیتے رہے پھر تین حصوں میں بٹ گئے۔ دیوان وہیں روک دیا گیا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ دامن طرف اور جاگتی بائیں طرف سے عمارت کی طرف بڑھنے لگی چاندنی میں یہ عمارت خاصی پراسرار لگ رہی تھی عمارت کے گرد یقیناً اونچی چار دیواری بھی رہی ہو۔ حادثہ زمانہ نے اسے زمین بوس کر دیا تھا۔

تیس کہیں اس چار دیواری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کہیں تیس یہ دیوار پانچ فٹ لمبی اور دو ڈھائی فٹ تک اونچی تھی۔

میں جاگتی کے ساتھ سنبھل کر چلتا ہوا کافی آگے نکل گیا اور پھر دیوار کی آڑ میں بیٹھ کر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ سامنے کے رخ سے یہ عمارت خوبصورتی کی طرح لگتی تھی اور اس کے کئی حصے ٹٹلتے تھے۔ اس طرف بھی ایک کمرے کی کڑی سے زرد اور مدھمی روشنی نظر آ رہی تھی اور پھر میں ایک آدمی کو اس کمرے میں ایک طرف سے دوسری طرف جانے ہوئے دیکھ کر چونک گیا۔

”وہ تاج سنگھ نہیں تھا۔“

مجھے سورج بھان سنگھ کی بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ لالہ رنجیت نام کا ایک بدعاش بھی تاج سنگھ کے ساتھ تھا اور وہ شرے کسی ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان دونوں میں سے کوئی ہو۔

میں ذرا سا اوپر اچک کر اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے کسی زمانے میں پورچ بھی رہا ہو گا لیکن اب وہ غائب ہو چکا تھا البتہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو ستون نظر آ رہے تھے۔ ایک ستون آدھے کے قریب ٹٹ چکا تھا۔

سامنے کافی وسیع میدان تھا جہاں تقریباً وسط میں چار بڑے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا اور اس جھنڈ کے نیچے دو گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک تو بیپ تھی اور دوسری کار۔

”جاگتی تم بیس روک۔ میں اندر جا رہا ہوں۔“ میں نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور دیوار کی آڑ سے ٹھاکر بھانوت آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

حویلی کے قریب پہنچ کر میں دیوار کے ساتھ چپک گیا اور گزرتے دروازے کی طرف سرکتا رہا۔ روشن کھڑکی کے سامنے سے نڈتے ہوئے میں نے اندر بھانوت کمر خالی تھا۔ فرش پر ایک پیڑو میسک رکھا ہوا تھا جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دامن طرف اندر کی جانب ایک اور دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں کھڑکی سے آگے بڑھ گیا۔

فٹ حویلی کے مرکزی دروازے میں داخل ہو کر میں دامن پہنچ گیا۔ یہ خرابی دروازہ بہت اونچا تھا مگر اس میں ایک اونٹ نہیں تھیں۔ صرف ایک راستہ سارہ گیا تھا۔ میں اچھی چندی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک آہستہ سن کر میں تیزی سے بائیں طرف اک۔ اور دروازے میں گھس گیا۔

اور دے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ اس کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھتا گیا۔

میں مختلف کمروں سے گزرتا ہوا ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں سامنے والی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں دے قدموں جتنا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور بھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی مجھے چونک جانا پڑا۔

دوسرا کمرہ بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کمرے میں بھی کہیں پیڑو میسک جل رہا تھا جس کی روشنی کمرے میں بھری ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ فرش پر بستر بچے ہوئے تھے۔ ایک طرف پانی کا مٹکا بھی رکھا ہوا تھا جس کے ڈھکنے پر گلاس اونڈھا ہوا تھا۔

ایک بستر پر دھریس پڑا ہوا تھا۔ اس کے برہنہ سینے پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو خون سے تر ہو رہی تھی۔ دھریس اینٹوں پر گڑ رہا تھا اور اس کے چہرے پر بے پناہ کرب اور اذیت کے آثار تھے۔

تاج سنگھ اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دھریس کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دوسری طرف بینٹ شرٹ والا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹینشن اسکوپ تھا۔ وہ بار بار دھریس کے دل کی دھڑکنیں چیک کر رہا تھا۔ ایک بنا کٹا آدمی دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ وہ لالہ رنجیت تھا۔

”اے بھلاؤ! کون۔ میرے منہ کو بچاؤ۔“ تاج سنگھ نے چیخ کر کہا ”اگر یہ مر گیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ڈاکٹر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے قریب بڑے ہوئے بیگ میں سے سرج نکالی اور انجکشن تیار کرنے لگا۔ اس دوران میں دھریس بری طرح تر پڑنے لگا۔ تاج سنگھ اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کسی بھی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

اور پھر دھریس کا جسم تختے کی طرح اکڑ گیا۔ اس نے دو تین جھٹکے اور پھر اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔

”منہ۔ ہوش میں آ۔ منہ!“ تاج سنگھ چیلا۔ ڈاکٹر نے سرج ایک طرف رکھ دی اور اسٹینشن اسکوپ سے اس کے دل کی دھڑکنیں چیک کرنے لگا۔ اس کی نبض چپک چپک لگی۔ ایک نرس پر اٹھلی رکھ کر دیکھی اور پھر مایوسی سے سر ہلاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“ اس نے گہرا



سانس لیتے ہوئے کہا ”یہ ہم سے بہت دور جا چکا ہے۔“  
 ”نہیں۔ میرا منا نہیں سرسکا۔“ سچ سچ گنگا۔ اس نے  
 دھرمیش کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا ”ہوش میں آنا۔“  
 آنکھیں کھول۔ تو بولنا کیوں نہیں منا۔“  
 ”مرنے والے بولا نہیں کرتے سچ سچ گنگا۔“ میں نے پستول  
 والا ہاتھ کھڑکی میں رکھتے ہوئے کہا۔

سچ سچ گنگا ایک دم سیدھا ہو گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے  
 کھڑے ہو کر اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن میری  
 غراہٹ سن کر اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔  
 ”نہیں۔ سچ سچ گنگا۔ تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔“ میں  
 نے کہا ”اس حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ بہتر  
 ہے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“  
 ”تمہاری موت ہی تمہیں یہاں سمجھنے لائی ہے کتے۔“ سچ  
 سچ گنگا نے دانت پکچپائے ”میرا منا مر گیا۔ تو بھی سچ کر نہیں  
 جاسکے گا۔“

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن اپنے عقب میں ہلکی  
 سی آہٹ سن کر چونک گیا۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا لیکن مجھے  
 دیر ہو چکی تھی۔ میرے دائیں کندھے پر لگنے والی ضرب بڑی  
 زوردار تھی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ پستول بھی میرے  
 ہاتھ سے نکل کر کھڑکی کے دوسری طرف گر گیا تھا۔

میں تیزی سے مڑا۔ ایک اور ضرب میرے اسی کندھے  
 پر سانس کی طرف سے گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بڑی کریک ہو گئی  
 ہو۔ ضرب بہت شدید تھی۔

اس کمرے میں تاریکی کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں  
 آ رہا تھا اور پھر میں اس اچانک حملے سے بدحواس بھی ہو گیا  
 تھا۔ دوسری ضرب لگنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھال  
 لیا۔

کھڑکی سے آنے والی مدھم سی روشنی میں مجھے وہ انسانی  
 ہیولا دکھائی دے گیا جو ایک بار پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے  
 قتل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً دو فٹ لمبا سرسکا تھا اور  
 اس سریلے سے اس نے میرے کندھے پر ضربیں لگائی تھیں  
 اور اب تیسری بار حملہ کرنے کے لیے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا  
 تھا۔

میں نے اس کا یہ وار ہاتھ پر روکا اور سریلے پر گرفت  
 جما کر اس طرح زوردار جھٹکا دیا کہ وہ شخص لڑکھڑا کر آگے  
 آ گیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ کراہ اٹھا لیکن وہ فوراً  
 سنبھل کر سیدھا ہو گیا۔ سریلے پر اس کی گرفت اب بھی قائم  
 تھی۔ میں نے اسے ایک لود جھٹکا دیا لیکن وہ اپنی جگہ قائم

رہا۔  
 اس کا قد چھ فٹ سے نکلا ہوا تھا جسم بھی قد سے بھاری  
 بھر کم تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس میں گیندے کی سی  
 طاقت بھری ہوئی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ کھڑکی کی دھڑکی  
 میں آیا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ لالہ رنجیت تھا  
 دوسرے کمرے سے نکل کر خاموشی سے اس طرف آیا تھا  
 لیکن وہ لالہ رنجیت نہیں کوئی اور تھا۔

میں نے ایک بار پھر جھٹکا دے کر اسے اس جگہ سے  
 ہلانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ ستون کی طرح  
 اپنی جگہ پر غرا رہا۔ میں نے کھڑے کھڑے اچھل کر اس کے  
 پہلو پر رانٹ لگ لگائی لیکن لگتا تھا اس پر اس لگ کالٹی! وہ  
 نہیں ہوا تھا۔ یا تو اس کا جسم ہی پتھر کی طرح سخت تھا یا  
 میری لگ زوردار نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے  
 اچھلا۔

دوسری لگ کچھ کارآمد ثابت ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے  
 گیا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے کراہی خارج ہوا  
 تھی۔

لوہے کا سراب بھی ہم دونوں کے بیچ میں دوڑھائی نہ  
 کے فاصلے کا باعث بنا ہوا تھا۔ سریلے پر ہم دونوں کی گرد  
 تھی۔ میں نے آگے کی طرف زوردار جھٹکا دے کر سریلے  
 سے گرفت ہٹائی۔ وہ اپنی جھوک میں آگے جھک گیا۔  
 مرتبہ میں نے پہلے سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
 زوردار لگ لگادی۔ وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گر گیا لیکن  
 نے اٹھتے ہی سریلے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر حملہ کیا۔  
 نے ایک طرف جھک کر اپنے آپ کو بچالیا۔ اس نے وہ  
 حملہ کیا۔ میں اس مرتبہ بھی اپنے آپ کو بچالیا تھا لیکن یہ  
 مرتبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ سریلے کا وار میرے کولے  
 جسے میں برداشت کر گیا۔ اگر یہ وار کسی اور جگہ پر پڑتا  
 ٹوٹ چکی ہوتی۔

میں لڑکھڑا کر سانس والی دیوار سے ٹکرایا اور اس  
 ساتھ ہی لاشوری طور پر میں نے ایک اور حربہ استعمال کر  
 کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکرا کر اپنے  
 پیچھے دھکیلا اور اس کے ساتھ ہی ہوا میں اچھل کر  
 لگ لگائی۔

لگ لگائی کے تھوڑے پر بڑی۔ وہ چپٹا ہوا لڑکھڑا کر  
 ہٹا۔ سراب تو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا لیکن  
 نہیں گرا۔ میں نے فوراً ہی اس کے سینے پر دوسری لگ  
 لگائی۔ اس مرتبہ وہ چپٹا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر چھلانگ لگادی اور اسے فرش پر رگیدے لگا۔ ادھر ہمارا ہیہ بنگامہ جاری تھا اور ادھر دوسرے کمرے سے جیج گنگھ کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”مار دو اس سالے حرامی کو۔“ وہ جیج جیج کر کہہ رہا تھا اس کی وجہ سے میرا منہ مارا گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دو اس کے۔“ مجھے گردن گھما کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بہت بھیاںک ہو رہا تھا۔

کھڑکی کے راستے کمرے میں آنے والی روشنی سے کمرے میں اب دم سا جالا جا رہا تھا۔ پچھلے دروازے سے آہٹ پا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ لالہ رنجیت تھا جو خبر تانے حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپک رہا تھا۔

میں اس وقت اپنے حریف کے سینے پر سوار تھا۔ لالہ رنجیت نے جیسے ہی حملہ کیا، میں بڑی بھرتی سے بائیں طرف لوٹ لگا گیا اور اگلے ہی لمحے کرا ایک بھیاںک جیج سے گونج اٹھا۔ لالہ رنجیت کا خنجر دوسرے شخص کے سینے میں پھوست ہو گیا تھا۔ اگر میں ایک طرف لوٹ نہ لگا دیتا تو یہ خنجر میری پشت میں پھوست ہوتا۔

لالہ رنجیت کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے خنجر اس شخص کے سینے سے کھینچ لیا اور ہاتھ سر سے بلند کر دیا۔ اس مرتبہ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے بڑی بھرتی سے اس کے سینے پر ٹھوکر رسید کر دی۔ لالہ رنجیت پیچھے الٹ گیا۔

”لالہ رنجیت!“ کھڑکی کی طرف سے جیج گنگھ کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی ”ماسہ مار دے اس حرامی کو۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔“

میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر میرا ہاتھ ایک چھوٹے سے پتھر پر پڑنے سے پھسل گیا اور میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی دوران میں لالہ رنجیت سنبھل کر میری طرف لپکا۔ اس مرتبہ مجھے موت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی۔ اس وقت میں اس یوزن میں نہیں تھا کہ اپنا دفاع کر سکتا یا اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا۔

لالہ رنجیت کا خنجر والا ہاتھ سر سے بلند تھا۔ صرف ایک جھٹکے کی ضرورت تھی اور خنجر میرے سینے میں پھوست ہو جاتا اور پھر اس کے ہاتھ کو جھکا تو لگ لگ کر اس طرح نہیں جیسا

میں نے سوچا تھا۔

فائر کی آواز سے کرا گونج اٹھا تھا۔ دروازے کی طرف سے چلائی جانے والی گولی لالہ رنجیت کے خنجر والے ہاتھ کی پکڑ پر لگی تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قریب گرا اور وہ چیختا ہوا پیچھے پلٹ گیا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھاکر بھانوت عرق تھا اور پھر اسی لمحے کھڑکی میں کھڑے ہوئے جیج گنگھ نے ہم پر ہڑکھڑا کر دیا۔ خنجر گرا اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی کی طرف فائر کر دیا تھا۔

میں نے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جیج عرق غائب ہو چکا تھا اور حویلی میں کسی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالہ رنجیت اپنے ڈی بازو کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے دروازے کی طرف دوہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور لاتوں کو گھونٹوں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔

اسی وقت حویلی کے باہر کسی جگہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ”ٹھاکر۔ تم اسے سنبھالو۔ میں باہر دیکھتا ہوں۔“ میں نے لالہ رنجیت کو ایک آخری زوردار ٹھوکر لگائی اور باہر کی طرف دوڑا۔

فائرنگ کی آواز حویلی کے سامنے کی طرف سے آتی تھی اور پھر کسی گاڑی کا اجنبی اشارت ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد ایک زوردار دھماکا ہوا۔ گاڑی کا تار پھوٹا تھا۔

میں حویلی کے کھنڈر نما دروازے سے باہر نکلا تو ایک جیب بڑی تیزی سے مخالف سمت میں دوڑتی ہوئی نظر آئی اور ایک ہولادو سری کار کے قریب سے جھاڑیوں کی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔

میں اس طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس طرف توڑ جھاڑیاں تھیں اور ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے آدمی ان جھاڑیوں میں ایک دوسرے سے ٹھکر کھاتا ہو رہا ہو۔ خشک جھاڑیوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں گھسنا چلا گیا۔

وہ جاگتی تھی جو کسی آدمی سے ٹھکر کھاتا ہو رہی تھی۔ میں نے اس شخص کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی اور پھر جلد ہی میں نے اس پر قابو پایا۔ وہ ڈھکڑھٹانے میں پلٹ کرے میں دیکھا تھا۔

جاگتی ایک طرف کھڑی ہانپ رہی تھی۔

میں نے ڈاکٹر کو بالوں سے پکڑ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا دیلی کی طرف لے آیا۔ جاگتی بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

”میں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بتا رہی تھی کہ اس نے دو آدمیوں کو درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھڑی ہوئی گاڑیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ایک آدمی پر فائر کیا لیکن نشانہ خطا گیا۔ وہ شخص جوالی فائر کرتا ہوا جیب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر جاگتی اسے نہیں روک سکی۔ وہ جیب پر فرار ہو گیا۔ دوسرا آدمی دوسری کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جاگتی کی ایک گولی نے کار کا ایک پہاڑا ڈالا۔ وہ شخص جھاڑیوں کی طرف دوڑا اور جاگتی نے بھی اسی طرف دوڑ لگا دی اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس شخص کو گھس گھساتا ہوئی۔

وہ ڈاکٹر تھا اور غنیمت تھا کہ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا لیکن وہ جاگتی سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اگر ہم بدقت وہاں نہ پہنچ جاتا تو وہ جاگتی کی گرفت سے نکل کر رازدار اختیار کر چکا ہوتا۔

ہم حویلی کے دروازے سے ابھی دور ہی تھے کہ خنیش میں کسی جگہ گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی پھائی۔

میں ڈاکٹر کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ٹھاکر، لالہ رنجیت کو اسی کمرے میں لے آیا تھا جہاں فرش پر بیٹھے ہوئے بہتر دھڑکیں لاش پڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے بستر کی چادر پھاڑ کر لالہ رنجیت اور ڈاکٹر کو ہاتھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ چند منٹ بعد دیوان گنگھ بھی ڈوڑا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

”وہ وہ بھاگ گیا حکم۔“ اس نے پھولے ہوئے بالوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دیوان گنگھ کی باتوں سے پتا چلا کہ فائرنگ کی آواز سن کر ڈوڑا ہوا حویلی کے دوسری طرف آیا تھا۔ اس وقت اس نے خنیش کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جیب کو روکنے کے لیے ٹاٹ ٹٹ کرتا ہوا خنیش میں دوڑتا چلا گیا۔ اس نے فائرنگ کر کے جیب کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن جیب پٹاؤں میں مل کھاتے ہوئے راستے پر غائب ہو گئی۔

ہم دوپ متی کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ اسی حویلی کے کسی کمرے میں سے اور ہاں۔ ایک لاش اس کمرے میں بھی پڑی تھی۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

دیوان گنگھ اس کھڑکی کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے

بھاگ کر دوسری طرف دیکھا۔

”یہاں تو کوئی لاش نہیں ہے حکم۔“ اس نے مڑ کر کہا۔ ”کیا۔؟“ خنشا کر اچھل پڑا۔

اور پھر ہم دونوں بیک وقت ہی کھڑکی کے قریب پہنچے تھے۔ لاش واقعی کمرے میں نہیں تھی۔

مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ لالہ رنجیت کے خنجر کے وار سے وہ شخص مرا نہیں تھا اور موقع پا کر وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

جاگتی کو کمرے میں چھوڑ دیا گیا اور ہم تینوں اس شخص کو تلاش کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ وہ زخمی ہونے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں گیا ہو گا لیکن آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی ہمیں مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ شاید چٹانوں میں غائب ہو گیا تھا۔

ہم واپس آ گئے۔ جاگتی ڈاکٹر اور لالہ رنجیت پر ریوالتور تانے کھڑی تھی۔ لالہ رنجیت کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات تھے۔ گولی گھنے سے اس کی کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

دیوان گنگھ کو وہاں چھوڑ کر ہم روپ متی کو تلاش کرنے لگے۔ ٹھاکر نے دوسرے کمرے سے پینو مسکس اٹھایا تھا۔ اب اگرچہ بظاہر کوئی خدشہ نہیں تھا لیکن کسی بھی ناگمانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے میرے اور جاگتی کے ہاتھوں میں ہتھیار بالکل تیار تھے۔

بہت بڑی حویلی تھی۔ لمبی چوڑی راہداریاں اور کئی کشادہ کمرے تھے کسی زمانے میں یہ حویلی واقعی بہت شان دار رہی ہوگی لیکن اب تو نصف سے زیادہ کھنڈر بن چکی تھی۔ بہت سے کمروں کی دیواریں اور چھتیاں اپنی جگہ پر قائم تھیں لیکن وہ رہائش کے قابل نہیں تھے۔ صرف چند ہی کمرے ایسے تھے جن میں رہائش اختیار کی جاسکتی تھی۔

ٹھاکر بھانوت گنگھ بتا رہا تھا کہ پہاڑیوں میں یہ قدیم عمارتیں دراصل ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کا مسکن بنی ہوئی تھیں۔ وہ شہر یا گردو نواح کی آبادیوں میں وارداتیں کرنے کے بعد یہاں کسی عمارت میں پناہ لے لیتے تھے۔ رات کے وقت تو پولیس ان کے تعاقب میں ادھر آنے کی ہمت نہیں کرتی تھی اور دن کے وقت ڈاکو پولیس کی آمد سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ ہر عمارت ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں سے دور دور تک پہاڑی راستوں پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔

ہمیں۔۔۔ جلی میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ انہی

کمروں کے پچھلی طرف راہداری کے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی میں ٹھک گیا۔

ٹھاکر بھٹے سے پہلے اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں لٹکایا ہوا پیڑو میکس ذرا آگے کرنا تو اس کی روشتی میں مجھے کمرے کے ایک کونے میں ایک گھڑی سی نظر آگئی اور میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

وہ روپ متی تھی۔ اس کے جسم پر گلابی رنگ کی نائی تار تار ہو چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ خولی میں یا میاں آکر اس نے کافی مزاحمت کی ہوگی جس کے نتیجے میں اس کا شب خرابی کا یہ باریک سلباس پھٹ گیا تھا۔ وہ گھڑی کی طرح مڑی تڑی سی پڑی تھی۔ اس کے پیچ اور ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر پی باندھ دی گئی تھی تاکہ وہ کپڑا منہ سے نہ نکال سکے۔ وہ ہوش میں ہی تھی۔ اس کے چہرے پر دہشت اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ ہمیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھیں کسی انجانے خوف سے پھیل گئیں لیکن جب ہم دو قدم آگے بڑھے اور میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا تو ہمارے چہرے پہچان کر اس کے چہرے پر تناؤ اور خوف کے آثار اتنا بدترجیح ہوئے چلے گئے۔

میں گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھولی اور پھر منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والا سانس ایسے تھا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے لگا۔

جاگتی بھی دوڑ کر میرے قریب آگئی تھی۔ اس نے سارا دے کر روپ متی کو اٹھا دیا۔ روپ متی کے ہاتھ کھل چکے تھے۔ وہ جاگتی سے لپٹ گئی جس سے مجھے اس کے پیروں کی بندشیں کھولنے میں کچھ دشواری پیش آئی۔

اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ روپ متی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سترہ انچ اونچے گھٹنوں سے میاں بندھی پڑی تھی۔ وہ تو اپنی ٹانگیں بھی سیدھی نہیں کر سکتی تھی۔

ٹھاکر بھٹوں نے پیڑو میکس زمین پر رکھ دیا اور آگے بڑھ کر جاگتی کے ساتھ دوسری طرف سے سارا دے کر روپ متی کو اٹھا دیا اور میں روپ متی کی ٹانگیں سیدھی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خود بھی کوشش کر رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے منہ سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔

اس کمرے میں گری تھی۔ روپ متی بیٹھنے میں تھوڑی تھی۔ میں نے پیڑو میکس اٹھالیا اور ہم لوگ اسے باہر لے آئے۔ آواز اور ٹھنڈی ہوا سے روپ متی کے حواس کی قدر بحال ہوئے۔

اپنی قوت ارادی اور ہماری کوششوں سے روپ متی تقریباً آدھے گھنٹے بعد اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکی تھی۔ جاگتی اسے سارا دے کر مسلسل شکاری دیکھ اور پھر جاگتی اسے لے کر ایک چوتھرے پر بیٹھ گئی۔

ہمارے ساتھ ٹھاکر بھٹوں نے کچھ دیر روپ متی کو کچھ روپ متی کچھ پریشان ہو رہی تھی اور جب اسے یہ بتایا گیا کہ ہمارا فکر سے رابطہ کس طرح ہوا تھا تو میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے لہجے میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں یہ کٹ (مشکل) اٹھانا پڑا۔“

”میں نے ٹوئٹ برداشت کر لیا۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا ”لیکن اگر تمہیں کچھ ہوا تو“

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کیا ہو سکتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

”لگتا ہے میاں لانے کے بعد تم پر کچھ تشدد بھی کیا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔“ روپ متی نے جواب دیا ”انہوں نے مجھے میاں باندھ ڈالا۔“

”جنگ ٹھک پر گھنٹے بڑھ گئے بعد میاں آکر مجھے دھمکیاں دیں۔“

”کہ اگر اس کے منہ کو کچھ ہو گیا تو وہ میرے بھی گلوے کرے۔“

”کتوں کو ڈال دے گا۔ کبھی وہ مجھے ایک آنکھ ٹھوکر بھی دیتا۔ اسے اپنے منہ کی زیادہ فکر تھی۔ اس نے آج دن تک کسی کو شرمینج کر کسی ڈاکٹر کو بھی بلایا تھا۔ وہ لوگ مجھے چبے کے قریب میاں لے کر آئے تھے۔ اس وقت سے اب تک ایک گھنٹہ بانی بھی نہیں دیا گیا۔ میاں میرا دم ٹھکانا۔“

”ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب مجھے لگا کہ میرا دم کھٹ گیا اور میں ختم ہو جاؤں گی۔“

”اگر تم لوگ نہ آجاتے تو مجھے وہ ہی ڈالنا۔ دھرمیش کیسا ہے۔ زندہ ہے یا۔۔۔؟“

”اس کی ملتی (نجات) ہوگئی۔“ میرے بجائے جاگتی۔

”جواب دیا۔“

”تم لوگوں کو کیسے بتا چلا کہ میں میاں ہوں؟“ روپ متی نے پوچھا۔

”ایک بہت لمبی کہانی ہے۔“ میں نے غمراہ سا لہجہ

ہوئے جواب دیا ”وہ لوگ مجھے مرہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے اور پھر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ رات کے آخری پرمندری دہلی چلی گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر رواحا کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔“

”میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے تفصیل سے بکچہ بتاتا گیا۔“ آخر میں ”میں کہہ رہا تھا ”تمہیں تو ٹھاکر بھٹوں کے شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس جیسے مخلص دوست کی بات پر کام آتے ہیں۔ اگر یہ ہمارا ساتھ نہ دیتے تو ہمیں یہاں تک پہنچنے میں کافی دشواریاں پیش آتیں اور اس وقت تک شاید تمہارا بھی کام تمام ہو چکا ہوتا۔“

”میں واقعی شرمندہ ہوں۔ میں نے دوستوں کی قدر نہیں کی۔“ روپ متی نے ٹھاکر بھٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

”شرمنگی کا اظہار بعد میں کر لیتا۔“ ٹھاکر نے پہلی مرتبہ زبان کھلی ”ہم ساری رات میاں نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ ایک لاش میاں پڑی ہے اور دو قیدی بھی میاں موجود ہیں۔ ابھی میں شرمناک پولیس سے بھی نمٹتا ہے۔“

”پپ۔ پولیس۔“ روپ متی کا چہرہ دھماکا ہو گیا۔

”ٹھاکر نے ان کی ضرورت نہیں۔“ ٹھاکر نے کہا ”وہ لوگ زندگی تمہارے گھر میں گئے تھے اور تم نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی اور پھر دھرمیش کی لاش تمہاری حویلی میں دریافت نہیں ہوئی۔ وہ ملیں دور میاں آکر مرا ہے۔ تم نے قانون کا ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی اس بات کا گواہ ہے کہ اس نے دھرمیش کو میاں پر زخمی حالت میں دیکھا تھا۔“

”اس کے زخم سے گولی نکالی تھی اور اس کا علاج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ مر گیا۔ جرم انہی پر ثابت ہوتا ہے۔ دی نہیں اغوا کر کے بھی لے گئے تھے۔ تم ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”لیکن پولیس۔“ روپ متی بولی ”چند روز پہلے بھی ایک لیاوا تھ ہوا تھا لیکن پولیس نے مجھے ہی دھمکیاں دیں۔“

”دیکھو روپ متی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

”میں نے غلطی کی۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسے غلط ہوئے کہا ”اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی غلطی کی۔“

دے کر ڈرایا دھمکا تھا تو وہ اور بات تھی۔ اب معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ سچ ٹھک کا بھائی مارا جا چکا ہے۔ ایک دوسرا آدمی بھی لالہ رنجیت کے ہاتھوں زخمی ہو کر میاں سے بھاگا ہے۔ مجھے اس کے بچنے کی بھی امید نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اب تک ختم ہو چکا ہو اور اس کی لاش پڑاؤں میں کہیں پڑی ہو۔ ہم اس معاملے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ ہمیں تو قانون کا ساتھ دینا چاہیے تاکہ ایسے جرائم پیشہ لوگوں کو ایسی سزا دی جاسکے کہ پھر کسی سچ کو ہم جیسے لوگوں کے منہ لگنے کی جرأت نہ ہو سکے۔“

”ٹھک۔“

”اگر ٹھک کچھ نہیں۔“ ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ بہت ٹھک جیسا نوجوان تمہارا دوست ہے۔ تمہارے لیے تو ان دونوں نے اپنے جیون کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ چلو۔ اب دیر مت کرو۔“

جاگتی کو وہیں روپ متی کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ میں اور ٹھاکر اندر آگئے۔ دیوان ٹھک ڈاکٹر اور لالہ رنجیت پر ریوالور تانے لگا تھا اور پھر ٹھاکر کے کہنے پر دیوان ٹھک باری باری ان دونوں کو کندھے پر لاد کر باہر لے آیا۔

ہماری جپ وہاں سے کافی دور تھی اور پھر راستہ بھی دشوار تھا۔ ان دونوں کو وہاں تک لے جانا مشکل تھا۔ اس لیے دیوان ٹھک کو چابی دے کر بھیج دیا گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ دوسرے راستے سے جپ لے کر آیا۔

جپ کی پچھلی سٹیش آٹے ساٹنے تھیں۔ لالہ رنجیت اور ڈاکٹر کو سیٹوں کے بیچ میں ڈال دیا گیا۔ روپ متی اور جاگتی آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ دیوان ٹھک اور میں نے پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر پھر ان دونوں پر رکھ لیے۔

واپسی پر دھلان ہونے کی وجہ سے راستہ زیادہ خطرناک تھا۔ نہایت غلط اور خطرناک موڑ تھے۔ ٹھاکر بہت محتاط ہو کر ڈرائیو کر رہا تھا۔

جپ اس وقت ایک نہایت خطرناک موڑ مڑ رہی تھی۔ ایک طرف چٹان تھی اور دوسری طرف عمودی دھلان جو تقریباً ڈیڑھ سو گز نیچے تک چلی گئی تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ جپ کا آگے کا ایک ٹائر برست ہو گیا اور جپ لڑکھائی لگی۔ اسی وقت فضا ایک بار پھر دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ گولی پٹنے کی آواز تھی۔

جپ کا ایک ہیڈ لیمپ چھنکے سے ٹوٹ گیا۔

ٹائر پھٹنے سے جپ بڑی طرح لڑکھائی لگی تھی۔ اس وقت

آتش فشاں 195 حصہ 4

آتش فشاں 195 حصہ 4

آتش فشاں 195 حصہ 4

آتش فشاں 195 حصہ 4

آتش فشاں 195 حصہ 4

آتش فشاں 195 حصہ 4

آتش فشاں 195 حصہ 4

رفار اگرچہ بہت جلدی تھی مگر لہرا جانے سے اس کے اگلے دونوں پہنے ڈھلان پر اتر گئے۔ جاگی اور روپ متی چیخ اٹھیں۔

جیپ بڑی تیزی سے عمودی ڈھلان پر جاری تھی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے تیزی سے نیچے جاتی ہوئی جیپ کو بڑی مہارت سے سنبھال لیا لیکن اسے روک لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایک دم بریک لگا دینے سے جیپ رکنے کے بجائے غلا بازیاں کھانے لگی اور ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔

جیپ کا ایک ہیڈ لیمپ ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے ہیڈ لیمپ کی روشنی جیپ کے اچھٹنے کی وجہ سے کسی ایک جگہ نہیں نک رہی تھی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نے بڑی ہوشیاری سے جیپ کا رخ قدرے بائیں طرف موڑ دیا جہاں نیچے قدرے آدم پودوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر روپ متی اور جاگی ایک دوسرے سے لپٹ کر رچ رہی تھیں۔ دیوان سنگھ اور میں نے سیٹوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

جیپ کو روکنے کے لیے ٹھاکر کی ٹریک کامیاب رہی تھی۔ جیپ گنجان پودوں کے جھنڈ میں گھس گئی اور دو چار زوردار جھٹکے کھانے کے بعد رک گئی۔ جاگی اچھل کر باہر پودوں میں گری اور بری طرح پیچھے لگی۔ میں نے سیٹ پر گھڑے ہو کر چھلانگ لگا دی اور جاگی کو پکڑ کر پودوں سے باہر کھینچ لیا۔

جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔ دوسرا ہیڈ لیمپ بھی بجھ گیا البتہ عقبی سرخ بتیاں جل رہی تھیں اور پھر ٹھیک اسی وقت اوپر کہیں سے کوئی چلائی گئی۔ فائر پو اوپر پھوٹا تو کیا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے گولی یا تو کہیں راستے ہی میں دم توڑ گئی تھی یا کسی اور طرف نکل گئی تھی۔

ٹھاکر نے عقبی سرخ بتیاں بھی بجھا دیں اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیا اور تیزی سے گھوم کر اس نے روپ متی کو بھی نیچے اتار لیا اور اسے کھینچتے ہوئے ایک طرف گنجان پودوں کے پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیچے گر کر رہا تھا۔

”بہت سنگھ۔ اس طرف آ جاؤ۔ دیوان سنگھ۔ تم بھی۔ جلدی کرو۔“ میں جاگی کو کھینچتا ہوا اس طرف لے گیا۔ دیوان سنگھ بھی جیپ سے چھلانگ لگا کر وہاں پہنچ گیا۔ جاگی ہولے ہولے کر اپنے ہونے اپنے جسم کے مختلف حصے سسلا رہی تھی۔ وہ جیپ سے کانٹے دار بھاریوں میں گری تھی اور کچھ دور تک

لوٹکتی چلی گئی تھی۔ کانٹوں نے اس کے جسم کو اچھیر کر ڈھیر کر دیا تھا۔

”تم لوگ بیس روپ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے روپ متی کو جاگی کے قریب لاکر چھوڑ دیا اور نیچے سے پستول نکال کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ چاندنی بھانوت دور تک اس کا پیولا دکھائی دیا اور پھر وہ دکاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

جیپ کے پیچھے حصے میں فرش پر بڑے ہونے والے رنجیز اور ڈاکٹر بری طرح بیچ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور ظاہر ہے جیپ کو جھٹکنے لگے۔ انہیں پوچھ بھی لگی ہوں گی۔

دیوان سنگھ دوڑتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ گیا اور لوہ چڑھ کر ان دونوں پر ٹھوکریں برسائے لگا پھر اس کی غرائز ہوا آواز سنائی دی۔

”اب اگر کسی کے منہ سے آواز نکلی تو گولی اتاروں گا کھوپڑی میں۔ سارے حرامی۔“ اس کے بعد ان دونوں کی بولتی بند ہو گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے اور پھر چاکلی کی اوپر چٹانوں میں فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ آدھا گھنٹا اور گزر گیا اور پھر ٹھاکر بھانوت سنگھ واپس آ گیا۔

”بھاگ گیا۔“ وہ اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”شراب بھی یہاں سے کی گئی۔ فاسلے پر ہے۔ اب ہمیں پیدل ہی جانا پڑے گا۔“ جیپ کے پیچھے ایک فالتو ٹائر تو پڑا ہوا ہے۔ ”دیوان سنگھ نے کہا۔“ ”جسم کرو تو میں دو منٹ میں مچھل دوں۔“

”ٹائر تو تبدیل ہو جائے گا مگر اندھیرے میں جیپ کو ان خطرناک راستے پر اتارنا ممکن نہیں ہو گا۔ جیپ کے باب میں سوچا جائے گا۔ اس وقت تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا ”وہ گنجان یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ان کے قریب ہی گنیش کا ایک چھوٹا سا مندر بھی ہے۔ وہاں لوگ آتے رہتے ہیں۔ شاید بندوبست ہو جائے۔“

”چھترسوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے جاگی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ”راجوں کا مرگھٹ قینی قبرستان۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔ ”دراصل ہر راجا کی قبر۔ میرا مطلب ہے جہاں اس کی

خیمہ پر سبک مر مر کا خوب صورت چوتھرہ اور اس سبک سرمرہی کی خوب صورت بارہ دریوں بنی ہوئی ایک عام طور پر انہیں چھترس ہی کہتے ہیں۔ ان کے ایک بہت خوب صورت اور وسیع و عریض پارک ہے۔ عام طور پر پبلک منانے کے لیے اس طرف آتے ہیں۔ ان لوگوں میں تو کبھی کبھی تفریح کے دلدادہ لوگ رات بھی پارک میں گزار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گنیش کا مندر بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے کوئی نہ کوئی تہہ بچ جائے گا۔“

ہم لوگ ڈھلان پر اترتے رہے۔ میں نے جاگی کا ہاتھ رکھا اور ٹھاکر نے روپ متی کا۔ ڈاکٹر اور لالہ رنجیت پر کھل دیے گئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بندھی ایک ری دیوان سنگھ نے تمام رکھی تھی اور وہ انہیں کی طرح بانٹتا ہوا رہا تھا۔

عمودی ڈھلان پر اترتا بھی خاصا خطرناک تھا۔ کانٹے دار بان بار بار ہمارے قدموں سے الجھ رہی تھیں۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہر دو خشیب میں مدھم سی چند بان بھائی دینے لگیں۔ ”اسخ دو سنی گنیش مندو کی ہے اور تقریبی روشنیاں دل۔ یہ روشنیاں رات بھر جلتی رہتی ہیں۔“ ٹھاکر نے

مزید افسہ گھنٹے بعد ہم اس مندر کے سامنے پہنچ گئے۔ طرف چار پانچ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں اور سامنے ہی میں ٹھٹک جگہوں پر چھ نولیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے، جو تیسری اور نیچے بھی۔ اس وقت اگرچہ لالہ کیخ رہا تھا مگر ان لوگوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ابھی پہنچے ہیں۔

”خوش اتفاق تھا کہ وہاں بیٹھی ہوئی ایک پارٹی میں ٹھاکر سنگھ کا ایک چاکلا (شاسا) بھی نکل آیا۔ وہ اٹھ کر آتے چلا ہوا ہمارے قریب آیا۔ اس نے باری باری ہر کوئی پام (سلام) کیا پھر ٹھاکر سے دریافت کرنے لگا۔“ ”سارانت۔ آپ آدھی رات کو اوھر سے یہ کون کیس نے رنجیت اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔“ ”آیت ہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا پھر فوراً ہی اصل پہنچ گیا۔ ”تمہارے پاس گاڑی ہے؟“

”یہ سارانت۔ وہ سفید ہائی روف۔“ اس نے ایک ہاتھ اشارہ کیا۔ ”تمہاری گاڑی، اچا یہی یا کسی کو ہمارے ساتھ بھیج

دو جو ہمیں شہر چھوڑ کر گاڑی واپس لے آئے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”میں خود آپ کے ساتھ چلتا ہوں ٹھاکر جی۔“ اس شخص نے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہم سب اس ہائی روف دین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہی شخص خود ڈرائیو کر رہا تھا اور ٹھاکر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہاں پولیس ہیڈ کوارٹر کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ روپ متی ایک سابق راجا کی بیٹی تھی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کا تعلق بھی شہر کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ہیڈ کوارٹر میں پہلے سی گئی۔ ٹھاکر نے ڈاکٹر اور لالہ رنجیت کو ایک آفسر کے حوالے کر دیا۔

پولیس نے اس معاملے کو کافی بخوبی دیکھا۔ ایک گھنٹے اندر اندر پولیس کمشنر بھی ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ ہم صبح باج گئے۔ پہلے وہاں سے فارغ نہیں ہو سکے تھے۔ اس دوران میں روپ متی نے اپنی حویلی فون کر کے تارا سنگھ کو بتا دیا تھا۔ وہ بچا رو لے کر آیا۔

جب ہم لوگ پولیس ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوئے تو دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور سورج پر ٹریفک کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔

پیارو جیسے ہی جواہر لال نہرو مارگ والے چوک پر مڑی، بائیں طرف سے ایک ٹرک تیزی سے آتا ہوا نظر آیا۔ پیارو اس وقت سڑک کے وسط میں تھی۔ ٹرک موت کے فرشتے کی طرح ہماری طرف آ رہا تھا۔ فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک کے اسٹیزنگ ریج سنگھ کو بیٹھے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کھٹکی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی، وقت، صما کا ہو سکتا تھا۔

سینس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ  
جیسے قائدین ان تک نہیں ہولے

**طالوت**

3 ستریں میں (میں)

آیت فی صفر 50۔ پ۔ 23۔ 24۔ 25۔ 26۔ 27۔ 28۔ 29۔ 30۔ 31۔ 32۔ 33۔ 34۔ 35۔ 36۔ 37۔ 38۔ 39۔ 40۔ 41۔ 42۔ 43۔ 44۔ 45۔ 46۔ 47۔ 48۔ 49۔ 50۔ 51۔ 52۔ 53۔ 54۔ 55۔ 56۔ 57۔ 58۔ 59۔ 60۔ 61۔ 62۔ 63۔ 64۔ 65۔ 66۔ 67۔ 68۔ 69۔ 70۔ 71۔ 72۔ 73۔ 74۔ 75۔ 76۔ 77۔ 78۔ 79۔ 80۔ 81۔ 82۔ 83۔ 84۔ 85۔ 86۔ 87۔ 88۔ 89۔ 90۔ 91۔ 92۔ 93۔ 94۔ 95۔ 96۔ 97۔ 98۔ 99۔ 100۔ 101۔ 102۔ 103۔ 104۔ 105۔ 106۔ 107۔ 108۔ 109۔ 110۔ 111۔ 112۔ 113۔ 114۔ 115۔ 116۔ 117۔ 118۔ 119۔ 120۔ 121۔ 122۔ 123۔ 124۔ 125۔ 126۔ 127۔ 128۔ 129۔ 130۔ 131۔ 132۔ 133۔ 134۔ 135۔ 136۔ 137۔ 138۔ 139۔ 140۔ 141۔ 142۔ 143۔ 144۔ 145۔ 146۔ 147۔ 148۔ 149۔ 150۔ 151۔ 152۔ 153۔ 154۔ 155۔ 156۔ 157۔ 158۔ 159۔ 160۔ 161۔ 162۔ 163۔ 164۔ 165۔ 166۔ 167۔ 168۔ 169۔ 170۔ 171۔ 172۔ 173۔ 174۔ 175۔ 176۔ 177۔ 178۔ 179۔ 180۔ 181۔ 182۔ 183۔ 184۔ 185۔ 186۔ 187۔ 188۔ 189۔ 190۔ 191۔ 192۔ 193۔ 194۔ 195۔ 196۔ 197۔ 198۔ 199۔ 200۔ 201۔ 202۔ 203۔ 204۔ 205۔ 206۔ 207۔ 208۔ 209۔ 210۔ 211۔ 212۔ 213۔ 214۔ 215۔ 216۔ 217۔ 218۔ 219۔ 220۔ 221۔ 222۔ 223۔ 224۔ 225۔ 226۔ 227۔ 228۔ 229۔ 230۔ 231۔ 232۔ 233۔ 234۔ 235۔ 236۔ 237۔ 238۔ 239۔ 240۔ 241۔ 242۔ 243۔ 244۔ 245۔ 246۔ 247۔ 248۔ 249۔ 250۔ 251۔ 252۔ 253۔ 254۔ 255۔ 256۔ 257۔ 258۔ 259۔ 260۔ 261۔ 262۔ 263۔ 264۔ 265۔ 266۔ 267۔ 268۔ 269۔ 270۔ 271۔ 272۔ 273۔ 274۔ 275۔ 276۔ 277۔ 278۔ 279۔ 280۔ 281۔ 282۔ 283۔ 284۔ 285۔ 286۔ 287۔ 288۔ 289۔ 290۔ 291۔ 292۔ 293۔ 294۔ 295۔ 296۔ 297۔ 298۔ 299۔ 300۔ 301۔ 302۔ 303۔ 304۔ 305۔ 306۔ 307۔ 308۔ 309۔ 310۔ 311۔ 312۔ 313۔ 314۔ 315۔ 316۔ 317۔ 318۔ 319۔ 320۔ 321۔ 322۔ 323۔ 324۔ 325۔ 326۔ 327۔ 328۔ 329۔ 330۔ 331۔ 332۔ 333۔ 334۔ 335۔ 336۔ 337۔ 338۔ 339۔ 340۔ 341۔ 342۔ 343۔ 344۔ 345۔ 346۔ 347۔ 348۔ 349۔ 350۔ 351۔ 352۔ 353۔ 354۔ 355۔ 356۔ 357۔ 358۔ 359۔ 360۔ 361۔ 362۔ 363۔ 364۔ 365۔ 366۔ 367۔ 368۔ 369۔ 370۔ 371۔ 372۔ 373۔ 374۔ 375۔ 376۔ 377۔ 378۔ 379۔ 380۔ 381۔ 382۔ 383۔ 384۔ 385۔ 386۔ 387۔ 388۔ 389۔ 390۔ 391۔ 392۔ 393۔ 394۔ 395۔ 396۔ 397۔ 398۔ 399۔ 400۔ 401۔ 402۔ 403۔ 404۔ 405۔ 406۔ 407۔ 408۔ 409۔ 410۔ 411۔ 412۔ 413۔ 414۔ 415۔ 416۔ 417۔ 418۔ 419۔ 420۔ 421۔ 422۔ 423۔ 424۔ 425۔ 426۔ 427۔ 428۔ 429۔ 430۔ 431۔ 432۔ 433۔ 434۔ 435۔ 436۔ 437۔ 438۔ 439۔ 440۔ 441۔ 442۔ 443۔ 444۔ 445۔ 446۔ 447۔ 448۔ 449۔ 450۔ 451۔ 452۔ 453۔ 454۔ 455۔ 456۔ 457۔ 458۔ 459۔ 460۔ 461۔ 462۔ 463۔ 464۔ 465۔ 466۔ 467۔ 468۔ 469۔ 470۔ 471۔ 472۔ 473۔ 474۔ 475۔ 476۔ 477۔ 478۔ 479۔ 480۔ 481۔ 482۔ 483۔ 484۔ 485۔ 486۔ 487۔ 488۔ 489۔ 490۔ 491۔ 492۔ 493۔ 494۔ 495۔ 496۔ 497۔ 498۔ 499۔ 500۔ 501۔ 502۔ 503۔ 504۔ 505۔ 506۔ 507۔ 508۔ 509۔ 510۔ 511۔ 512۔ 513۔ 514۔ 515۔ 516۔ 517۔ 518۔ 519۔ 520۔ 521۔ 522۔ 523۔ 524۔ 525۔ 526۔ 527۔ 528۔ 529۔ 530۔ 531۔ 532۔ 533۔ 534۔ 535۔ 536۔ 537۔ 538۔ 539۔ 540۔ 541۔ 542۔ 543۔ 544۔ 545۔ 546۔ 547۔ 548۔ 549۔ 550۔ 551۔ 552۔ 553۔ 554۔ 555۔ 556۔ 557۔ 558۔ 559۔ 560۔ 561۔ 562۔ 563۔ 564۔ 565۔ 566۔ 567۔ 568۔ 569۔ 570۔ 571۔ 572۔ 573۔ 574۔ 575۔ 576۔ 577۔ 578۔ 579۔ 580۔ 581۔ 582۔ 583۔ 584۔ 585۔ 586۔ 587۔ 588۔ 589۔ 590۔ 591۔ 592۔ 593۔ 594۔ 595۔ 596۔ 597۔ 598۔ 599۔ 600۔ 601۔ 602۔ 603۔ 604۔ 605۔ 606۔ 607۔ 608۔ 609۔ 610۔ 611۔ 612۔ 613۔ 614۔ 615۔ 616۔ 617۔ 618۔ 619۔ 620۔ 621۔ 622۔ 623۔ 624۔ 625۔ 626۔ 627۔ 628۔ 629۔ 630۔ 631۔ 632۔ 633۔ 634۔ 635۔ 636۔ 637۔ 638۔ 639۔ 640۔ 641۔ 642۔ 643۔ 644۔ 645۔ 646۔ 647۔ 648۔ 649۔ 650۔ 651۔ 652۔ 653۔ 654۔ 655۔ 656۔ 657۔ 658۔ 659۔ 660۔ 661۔ 662۔ 663۔ 664۔ 665۔ 666۔ 667۔ 668۔ 669۔ 670۔ 671۔ 672۔ 673۔ 674۔ 675۔ 676۔ 677۔ 678۔ 679۔ 680۔ 681۔ 682۔ 683۔ 684۔ 685۔ 686۔ 687۔ 688۔ 689۔ 690۔ 691۔ 692۔ 693۔ 694۔ 695۔ 696۔ 697۔ 698۔ 699۔ 700۔ 701۔ 702۔ 703۔ 704۔ 705۔ 706۔ 707۔ 708۔ 709۔ 710۔ 711۔ 712۔ 713۔ 714۔ 715۔ 716۔ 717۔ 718۔ 719۔ 720۔ 721۔ 722۔ 723۔ 724۔ 725۔ 726۔ 727۔ 728۔ 729۔ 730۔ 731۔ 732۔ 733۔ 734۔ 735۔ 736۔ 737۔ 738۔ 739۔ 740۔ 741۔ 742۔ 743۔ 744۔ 745۔ 746۔ 747۔ 748۔ 749۔ 750۔ 751۔ 752۔ 753۔ 754۔ 755۔ 756۔ 757۔ 758۔ 759۔ 760۔ 761۔ 762۔ 763۔ 764۔ 765۔ 766۔ 767۔ 768۔ 769۔ 770۔ 771۔ 772۔ 773۔ 774۔ 775۔ 776۔ 777۔ 778۔ 779۔ 780۔ 781۔ 782۔ 783۔ 784۔ 785۔ 786۔ 787۔ 788۔ 789۔ 790۔ 791۔ 792۔ 793۔ 794۔ 795۔ 796۔ 797۔ 798۔ 799۔ 800۔ 801۔ 802۔ 803۔ 804۔ 805۔ 806۔ 807۔ 808۔ 809۔ 810۔ 811۔ 812۔ 813۔ 814۔ 815۔ 816۔ 817۔ 818۔ 819۔ 820۔ 821۔ 822۔ 823۔ 824۔ 825۔ 826۔ 827۔ 828۔ 829۔ 830۔ 831۔ 832۔ 833۔ 834۔ 835۔ 836۔ 837۔ 838۔ 839۔ 840۔ 841۔ 842۔ 843۔ 844۔ 845۔ 846۔ 847۔ 848۔ 849۔ 850۔ 851۔ 852۔ 853۔ 854۔ 855۔ 856۔ 857۔ 858۔ 859۔ 860۔ 861۔ 862۔ 863۔ 864۔ 865۔ 866۔ 867۔ 868۔ 869۔ 870۔ 871۔ 872۔ 873۔ 874۔ 875۔ 876۔ 877۔ 878۔ 879۔ 880۔ 881۔ 882۔ 883۔ 884۔ 885۔ 886۔ 887۔ 888۔ 889۔ 890۔ 891۔ 892۔ 893۔ 894۔ 895۔ 896۔ 897۔ 898۔ 899۔ 900۔ 901۔ 902۔ 903۔ 904۔ 905۔ 906۔ 907۔ 908۔ 909۔ 910۔ 911۔ 912۔ 913۔ 914۔ 915۔ 916۔ 917۔ 918۔ 919۔ 920۔ 921۔ 922۔ 923۔ 924۔ 925۔ 926۔ 927۔ 928۔ 929۔ 930۔ 931۔ 932۔ 933۔ 934۔ 935۔ 936۔ 937۔ 938۔ 939۔ 940۔ 941۔ 942۔ 943۔ 944۔ 945۔ 946۔ 947۔ 948۔ 949۔ 950۔ 951۔ 952۔ 953۔ 954۔ 955۔ 956۔ 957۔ 958۔ 959۔ 960۔ 961۔ 962۔ 963۔ 964۔ 965۔ 966۔ 967۔ 968۔ 969۔ 970۔ 971۔ 972۔ 973۔ 974۔ 975۔ 976۔ 977۔ 978۔ 979۔ 980۔ 981۔ 982۔ 983۔ 984۔ 985۔ 986۔ 987۔ 988۔ 989۔ 990۔ 991۔ 992۔ 993۔ 994۔ 995۔ 996۔ 997۔ 998۔ 999۔ 1000۔ 1001۔ 1002۔ 1003۔ 1004۔ 1005۔ 1006۔ 1007۔ 1008۔ 1009۔ 1010۔ 1011۔ 1012۔ 1013۔ 1014۔ 1015۔ 1016۔ 1017۔ 1018۔ 1019۔ 1020۔ 1021۔ 1022۔ 1023۔ 1024۔ 1025۔ 1026۔ 1027۔ 1028۔ 1029۔ 1030۔ 1031۔ 1032۔ 1033۔ 1034۔ 1035۔ 1036۔ 1037۔ 1038۔ 1039۔ 1040۔ 1041۔ 1042۔ 1043۔ 1044۔ 1045۔ 1046۔ 1047۔ 1048۔ 1049۔ 1050۔ 1051۔ 1052۔ 1053۔ 1054۔ 1055۔ 1056۔ 1057۔ 1058۔ 1059۔ 1060۔ 1061۔ 1062۔ 1063۔ 1064۔ 1065۔ 1066۔ 1067۔ 1068۔ 1069۔ 1070۔ 1071۔ 1072۔ 1073۔ 1074۔ 1075۔ 1076۔ 1077۔ 1078۔ 1079۔ 1080۔ 1081۔ 1082۔ 1083۔ 1084۔ 1085۔ 1086۔ 1087۔ 1088۔ 1089۔ 1090۔ 1091۔ 1092۔ 1093۔ 1094۔ 1095۔ 1096۔ 1097۔ 1098۔ 1099۔ 1100۔ 1101۔ 1102۔ 1103۔ 1104۔ 1105۔ 1106۔ 1107۔ 1108۔ 1109۔ 1110۔ 1111۔ 1112۔ 1113۔ 1114۔ 1115۔ 1116۔ 1117۔ 1118۔ 1119۔ 1120۔ 1121۔ 1122۔ 1123۔ 1124۔ 1125۔ 1126۔ 1127۔ 1128۔ 1129۔ 1130۔ 1131۔ 1132۔ 1133۔ 1134۔ 1135۔ 1136۔ 1137۔ 1138۔ 1139۔ 1140۔ 1141۔ 1142۔ 1143۔ 1144۔ 1145۔ 1146۔ 1147۔ 1148۔ 1149۔ 1150۔ 1151۔ 1152۔ 1153۔ 1154۔ 1155۔ 1156۔ 1157۔ 1158۔ 1159۔ 1160۔ 1161۔ 1162۔ 1163۔ 1164۔ 1165۔ 1166۔ 1167۔ 1168۔ 1169۔ 1170۔ 1171۔ 1172۔ 1173۔ 1174۔ 1175۔ 1176۔ 1177۔ 1178۔ 1179۔ 1180۔ 1181۔ 1182۔ 1183۔ 1184۔ 1185۔ 1186۔ 1187۔ 1188۔ 1189۔ 1190۔ 1191۔ 1192۔ 1193۔ 1194۔ 1195۔ 1196۔ 1197۔ 1198۔ 1199۔ 1200۔ 1201۔ 1202۔ 1203۔ 1204۔ 1205۔ 1206۔ 1207۔ 1208۔ 1209۔ 1210۔ 1211۔ 1212۔ 1213۔ 1214۔ 1215۔ 1216۔ 1217۔ 1218۔ 1219۔ 1220۔ 1221۔ 1222۔ 1223۔ 1224۔ 1225۔ 1226۔ 1227۔ 1228۔ 1229۔ 1230۔ 1231۔ 1232۔ 1233۔ 1234۔ 1235۔ 1236۔ 1237۔ 1238۔ 1239۔ 1240۔ 1241۔ 1242۔ 1243۔ 1244۔ 1245۔ 1246۔ 1247۔ 1248۔ 1249۔ 1250۔ 1251۔ 1252۔ 1253۔ 1254۔ 1255۔ 1256۔ 1257۔ 1258۔ 1259۔ 1260۔ 1261۔ 1262۔ 1263۔ 1264۔ 1265۔ 1266۔ 1267۔ 1268۔ 1269۔ 1270۔ 1271۔ 1272۔ 1273۔ 1274۔ 1275۔ 1276۔ 1277۔ 1278۔ 1279۔ 1280۔ 1281۔ 1282۔ 1283۔ 1284۔ 1285۔ 1286۔ 1287۔ 1288۔ 1289۔ 1290۔ 1291۔ 1292۔ 1293۔ 1294۔ 1295۔ 1296۔ 1297۔ 1298۔ 1299۔ 1300۔ 1301۔ 1302۔ 1303۔ 1304۔ 1305۔ 1306۔ 1307۔ 1308۔ 1309۔ 1310۔ 1311۔ 1312۔ 1313۔ 1314۔ 1315۔ 1316۔ 1317۔ 1318۔ 1319۔ 1320۔ 1321۔ 1322۔ 1323۔ 1324۔ 1325۔ 1326۔ 1327۔ 1328۔ 1329۔ 1330۔ 1331۔ 1332۔ 1333۔ 1334۔ 1335۔ 1336۔ 1337۔ 1338۔ 1339۔ 1340۔ 1341۔ 1342۔ 1343۔ 1344۔ 1345۔ 1346۔ 1347۔ 1348۔ 1349۔ 1350۔ 1351۔ 1352۔ 1353۔ 1354۔ 1355۔ 1356۔ 1357۔ 1358۔ 1359۔ 1360۔ 1361۔ 1362۔ 1363۔ 1364۔ 1365۔ 1366۔ 1367۔ 1368۔ 1369۔ 1370۔ 1371۔ 1372۔ 1373۔ 1374۔ 1375۔ 1376۔ 1377۔ 1378۔ 1379۔ 1380۔ 1381۔ 1382۔ 1383۔ 1384۔ 1385۔ 1386۔ 1387۔ 1388۔ 1389۔ 1390۔ 1391۔ 1392۔ 1393۔ 1394۔ 1395۔ 1396۔ 1397۔ 1398۔ 1399۔ 1400۔ 1401۔ 1402۔ 1403۔ 1404۔ 1405۔ 1406۔ 1407۔ 1408۔ 1409۔ 1410۔ 1411۔ 1412۔ 1413۔ 1414۔ 1415۔ 1416۔ 1417۔ 1418۔ 1419۔ 1420۔ 1421۔ 1422۔ 1423۔ 1424۔ 1425۔ 1426۔ 1427۔ 1428۔ 1429۔ 1430۔ 1431۔ 1432۔ 1433۔ 1434۔ 1435۔ 1436۔ 1437۔ 1438۔ 1439۔ 1440۔ 1441۔ 1442۔ 1443۔ 1444۔ 1445۔ 1446۔ 1447۔ 1448۔ 1449۔ 1450۔ 1451۔ 1452۔ 1453۔ 1454۔ 1455۔ 1456۔ 1457۔ 1458۔ 1459۔ 1460۔ 1461۔ 1462۔ 1463۔ 1464۔ 1465۔ 1466۔ 1467۔ 1468۔ 1469۔ 1470۔ 1471۔ 1472۔ 1473۔ 1474۔ 1475۔ 1476۔ 1477۔ 1478۔ 1479۔ 1480۔ 1481۔ 1482۔ 1483۔ 1484۔ 1485۔ 1486۔ 1487۔ 1488۔ 1489۔ 1490۔ 1491۔ 1492۔ 1493۔ 1494۔ 1495۔ 1496۔ 1497۔ 1498۔ 1499۔ 1500۔ 1501۔ 1502۔ 1503۔ 1504۔ 1505۔ 1506۔ 1507۔ 1508۔ 1509۔ 1510۔ 1511۔ 1512۔ 1513۔ 1514۔ 1515۔ 1516۔ 1517۔ 1518۔ 1519۔ 1520۔ 1521۔ 1522۔ 1523۔ 1524۔ 1525۔ 1526۔ 1527۔ 1528۔ 1529۔ 1530۔ 1531۔ 1532۔ 1533۔ 1534۔ 1535۔ 1536۔ 1537۔ 1538۔ 1539۔ 1540۔ 1541۔ 1542۔ 1543۔ 1544۔ 1545۔ 1546۔ 1547۔ 1548۔ 1549۔ 1550۔ 1551۔ 1552۔ 1553۔ 1554۔ 1555۔ 1556۔ 1557۔ 1558۔ 1559۔ 1560۔ 1561۔ 1562۔ 1563۔ 1564۔ 1565۔ 1566۔ 1567۔ 1568۔ 1569۔ 1570۔ 1571۔ 1572۔ 1573۔ 1574۔ 1575۔ 1576۔ 1577۔ 1578۔ 1579۔ 1580۔ 1581۔ 1582۔ 1583۔ 1584۔ 1585۔ 1586۔ 1587۔ 1588۔ 1589۔ 1590۔ 1591۔ 1592۔ 1593

اور پھر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں اپنی جگہ سے اچھل کر ڈش بورڈ سے ٹکرایا۔ میرے سر سے ہلکی سی پیچ نکل گئی۔ روپ متی اور جاگتی بھی بری طرح جھنجھی تھیں۔

پیارو میزنگ کی طرح جھدک کر نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھی تھی۔ میں نے پیٹھلے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

ہماری پیارو آگے نکل گئی تھی اور ٹرک خوفناک رفتار سے چوک کے وسط کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر سامنے دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنا دل کنٹینوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پیارو تیزی سے فٹ پاتھ کے کنارے پر لگے ہوئے پائپوں کے جنگل کی طرف بڑھ رہی تھی اور پھر پیارو وہ نکلا توڑی ہوئی فٹ پاتھ پر چڑھ کر سامنے والی واکان سے ٹکرا کر رک گئی۔

میں ایک بار پھر ڈش بورڈ سے ٹکرایا۔ پیچلی سیٹوں پر سے جاگتی اور روپ متی کی چیخیں ایک بار پھر سنائی دی تھیں۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ واکان بند تھی اور گاڑی سڑ سے ٹکرائی تھی۔ سڑ اندر کی طرف دھنسن گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا وہ تیز رفتار ٹرک چوراہے کے وسط میں ٹریفک کا سنبھل کے لیے بنے ہوئے چوڑے اور چمڑی سے ٹکرا کر الٹ گیا تھا۔

اس وقت ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ چند ہی گاڑیوں کی آمد و رفت تھی۔ کچھ سائیکل سوار دکھائی دے رہے تھے۔ ٹریفک رک گیا۔ کچھ لوگ ہماری طرف دوڑے اور کچھ ٹرک کی طرف۔

ہمیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ روپ متی کا سر اچلی سیٹ سے ٹکرایا تھا جس سے اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی اور بالکا سا خون رسنے لگا تھا۔ اس کے سوا کسی کو چوٹ نہیں آئی تھی۔

میں پیارو سے اتر آیا۔ اس وقت کئی لوگوں نے پیارو کو گھیر لیا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے روپ متی اور جاگتی کو نیچے اتار دیا۔ دیوان سنگھ بھی نیچے اتر کر لوگوں کو ادھر ادھر ہاربا رہا تھا۔

چوراہے کے وسط میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں اور ٹھاکر بھی اس طرف دوڑ پڑے اور لوگوں کا ہٹا کر آگے بڑھنے چلے گئے۔

وہ مظہر بہت ہی روح فرسا تھا۔ ٹرک اسٹیئرنگ والی سائینڈ پر لٹا تھا اور جج سنگھ کی لاش اسٹیئرنگ اور دو واڑے

کے بیچ میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ لاش ہی تھی۔ اس پر کی کوئی رمتی نظر نہیں آتی تھی۔ چوہ خون سے تر تھا۔ مڑی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ گرہن کی ہڈی تھی۔

پولیس سائزن کی آواز سن کر لوگ ادھر ادھر اور چند سیکنڈ بعد پولیس کی چپ وہاں آکر گئی۔ پولیس کی مداخلت کے بعد جلد جھٹکارے کی ڈھائی تھی۔ جاگتی اور روپ متی کو دیوان سنگھ کے ساتھ دوا گیا اور ہمیں آٹھ بجے سے پہلے پولیس سے نجات

مکمل تھی۔ آٹھ بجے بھی دیوان سنگھ کے ساتھ ہی چلا۔ جج سنگھ کی لاش جب ایمرلیس میں ڈالی جانے میں نے آخری مرتبہ اس کی طرف دیکھا اس کا بھانک ہو رہا تھا۔ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا وہ ٹرک کی آگ میں پیچ گیا تھا۔

ہمارا وہ دن بہت برا گزرا تھا۔ ٹھاکر بھانوت میرے اصرار پر وہیں رہ گیا۔ ناشتا کر کے وہ تو سونایا۔ تک باتیں کرتے رہے۔ روپ متی بھی اپنے کمرے سو گئی۔

رات بھر جاگنے اور بھاگ دوڑے مجھے ہر جھٹکا تو ہوی رہی تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کوشش کے باوجود بند نہیں کر سکا تھا۔

اور پھر اسی شام میں اور جاگتی پنڈت محلاد میں نکل کھڑے ہوئے۔ میرے جسم پر بے شمار چوٹیں کوئی اور ہوتا تو واقعی کئی روز تک بہتر نہ تھا۔ میں نے جی کی قوت سے اپنی تکلیف پر قابو پا رکھا۔

بھی آرام سے بیٹھے رہتا میری فطرت میں شامل تھیں۔ ہم نے گاڑی اجیری گیٹ سے ڈرا آگے ایک عمارت کے سامنے چھوڑ دی اور چند رپل بازار ہوئے مندر والی گلی میں داخل ہو گئے۔

کشاہد بیڑھیاں چڑھ کر دستار باند میں آئے۔ ان میں رک گیا۔ میں سامنے سے آئے والے دو دیکھ رہا تھا۔

ان میں ایک پنڈت محلاد دھر تھا اور دوسرا پروہت۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا ایک جھپکے بغیر ان دونوں طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ان دونوں پنڈتوں اور ہمارے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ جاگتی کی طرف دیکھا اور پھر بڑی تیزی سے تینوں کی آڑ میں دیکھا۔ جاگتی کو اس طرف آنے کا سہارا مل گیا۔ اس نے وہی طریقہ اپنایا جو پوترلی کو کچھ مہینے پہلے کے لیے اختیار کر رہا تھا۔ یعنی اس نے ہاتھ کر لیں اور دونوں ہاتھ سامنے کو جوڑ کر کھڑی

ہاتھ ملے دھر اور مندر کا پروہت سر جھکائے باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ شاید کوئی بہت ہی گھبرائے ہوئے شخص تھا۔ اس نے انداز سے ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے علاوہ کسی کی موجودگی سے قطعی بے خبر ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مندر میں ان کے اور ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے پنڈت تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ دونوں ہاتھ انہیں پر نام کر رہے تھے مگر ان کی توجہ کسی طرف نہیں

کی انہماک کی وجہ سے وہ دونوں اپنے سامنے کھڑی کی کوئی نہیں دیکھ سکے اور بے دھیانی میں پنڈت محلاد کی بات غرا گیا۔

اپنی لکڑائی لیکن اس نے تو آنکھیں کھولیں اور نہ بڑے ہوئے ہاتھ الگ کیے۔ وہ اس طرح کھڑی رہی کہ ان کی پر اتھا کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو۔

فٹ محلاد دھر بھی اس سے ٹکرا کر لکڑا گیا تھا لیکن وہ سنبھل گیا اور روایتی انداز میں دونوں ہاتھ جاگتی کی ڈھک کر بولا۔ "صاف کرنا دیوی جی۔ میں اپنے دھیان

کا ایک خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم تناؤ تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی چھ اور گہری ہو گئی۔ وہی نظریوں سے جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔ جواب بھی نہ دیکھے اور ہاتھ جوڑے کھڑی زبردست کچھ بدداری

تینوں کی آڑ میں کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ پنڈت نے سڑک پار میں بھی جاگتی کو دیکھا تھا۔ ان دونوں وہاں ٹھہر کر پھر لکڑائی تھی جبکہ اس وقت وہ سڑکی پار ڈھک کر صورت اور فطرتی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ بال

بہت پرست ہوئے تھے۔ کانوں میں آویزے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ رہے تھے۔

بڑے نازک اور ہلکے ہینکلی سینڈل تھے۔ وہ اس جاگتی سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جسے پنڈت محلاد دھرنے سنگاپور میں دیکھا ہوگا۔

اسی دوران ایک اور جوڑا پروہت کے قریب آکر رک گیا۔ ان دونوں کی شاید نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ لڑکی نے دلہنوں جیسا قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ زیورات سے لدی پھندی تھی۔ اس کی رنگت اگرچہ سالوں کی مگر چہرے کے نقوش بڑے اور قریب تھے۔ اس کی عمر بیس ایس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے سامنے مڑی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی رنگت بھی سالوں کی لیکن وہ بھی صحت مند اور خوب رو جوان تھا۔ اس نے دھوئی اور کرت پہن رکھا تھا۔ گلے میں سونے کی ایک مولی سی پھین تھی۔

"کل ہمارا بیاہ ہوا ہے پنڈت جی۔" وہ شخص پروہت کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "ہم ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آپ کی آشریاد لینے آئے ہیں۔"

پروہت نے آشریاد دینے کے لیے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ان دونوں نے جھک کر پروہت اور پنڈت محلاد دھر کے چوٹوں کو چھوا۔ سیدھے ہوتے ہوئے لڑکی جاگتی سے ٹکرائی اور جاگتی لکڑا کر پنڈت محلاد دھر سے ٹکرائی۔ پنڈت محلاد دھر شاید اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لکڑا کر نیچے اتر کر جاگتی بھی اس کے اوپر ہی گری تھی۔

مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جاگتی نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔ نیچے گرتے ہی وہ اس طرح چینی تھی جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ اس نے پیٹھلے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے نیچے دھبے ہوئے پنڈت محلاد دھر کو ایک دو ہاتھ بھی جڑے تھے۔

آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ رک گئے۔ ایک عورت نے جلدی سے آگے بڑھ کر جاگتی کو سارادے کرنا تھا دیا۔ جاگتی اپنی ساڑی درست کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ دو آدمیوں نے پنڈت محلاد دھر کو بھی سارادے کرنا تھا دیا۔ وہ خالص بد خواص ہو رہا تھا۔

"جیسا چاہتا ہوں دیوی جی۔" وہ جاگتی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "مطلبی میری نہیں تھی پھر بھی میں معافی مانگتا ہوں۔"

"مرد چاہتے دیوتا کے روپ میں ہوا پنڈت کے روپ میں۔ اپنی مطلبی کبھی نہیں مانتا۔" جاگتی کے تجزیے میں نا کواری کا اثر نمایاں تھا "میں یہاں کھڑی بیگوان سے پرارتہ نہ کر رہی تھی تو تم اس وقت مجھ سے ٹکرائے تھے۔ مرد چاہتے دیوتا کا

روپ بھی دھار لے تو اس کا من میلای رہتا ہے اور وہ۔  
 ”معاف کر دو دیوی جی۔“ پنڈت مل دھر بولا ”اس  
 وقت میں بے دھیانی میں آپ سے چھو گیا تھا اور۔“  
 ”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ مرد اپنی غلطی کبھی نہیں  
 مانتا۔“ جاگی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پنڈت جی معافی مانگ رہے ہیں دیوی جی۔ اب چھو  
 کر دیں انہیں۔“ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔  
 ”بچہ تھا رویا۔“ جاگی نے اس شخص کی طرف دیکھے بغیر  
 جواب دیا ”ویسے پنڈت جی سے کہہ دو کہ اپنی آنکھیں کھلی  
 رکھا کریں۔“

”میری آنکھیں تو نیند میں بھی کھلی رہتی ہیں۔ ویسے لگتا  
 ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“ پنڈت مل  
 دھر جاگی کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولا۔  
 ”ضرور دیکھا ہو گا مہاراج۔“ جاگی نے جواب دیا ”ہم  
 اپنے پتی کی تلاش میں دو سال سے پورے ہندوستان کے  
 مندروں کی یا ترا کر رہے ہیں۔ کس ہمارا اور آپ کا سامنا  
 ہو گیا ہو گا۔“

”پتی کی تلاش میں مندروں کی یا ترا۔“ مل دھر نے  
 ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ایک بھگوان ہوتا تو ہم اپنی حویلی میں چوکی پر بیٹھے بیٹھے  
 پرارتھنا میں دو سال گزار دیتے۔“ جاگی نے جواب دیا ”پر  
 ہمارے تو کئی بھگوان ہیں۔ لاتعداد دیوتا ہیں۔ ہم اس لیے  
 ہندوستان بھر کے مندروں کی یا ترا کر رہے ہیں کہ کوئی بھگوان  
 تو ہماری سنے گا۔“

جاگی کی اس بات پر پروہت کی پیشانی پر ہل بڑھنے لگیں  
 اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور جاگی کو آئبر باد  
 دینے کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تیرا پتی تجھے مل جائے گا۔ اپنا من میلان کر۔ ہم  
 جانتے ہیں تم نے بہت کشت اٹھایا ہے۔ پر اب تیرے من کی  
 آتش پوری ہونے والی ہے۔۔۔ ہم خاص طور پر بھگوان سے  
 پرارتھنا کریں گے کہ تیرا پتی تجھے جلدی مل جائے پر وہ تجھ  
 جیسی سندر کی چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟“

”کیا بتاؤں مہاراج!“ جاگی کرا سانس لیتے ہوئے بولی  
 ”وہ ایک تپنے والی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ وہ شاید مجھ سے  
 زیادہ سندر تھی۔ وہ اس کے ساتھ بھاگ گیا اور مجھے  
 مندروں کے چکر لگانے کے لیے چھوڑ گیا۔“

”مل جائے گا۔ مل جائے گا تیرا پتی۔“ پروہت نے کہا۔  
 ایک بار پھر آئبر باد کے لیے ہاتھ اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

پنڈت مل دھر بھی اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ  
 مڑ کر جاگی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب  
 ابھرنے لگی تھی۔

جاگی ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر  
 ہو گئی تھی۔ میں ستون کے اوپر سے گھومتا ہوا دوسری  
 سے جاگی کے سامنے آگیا۔

پنڈت مل دھر اور پروہت مندر کے باہر  
 دروازے کی طرف جا رہے تھے مل دھر نے ایک بار  
 پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے جاگی  
 کی آؤ سے نکل کر جاگی کے قریب آیا۔

”یہ کیا حرکت تھی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا  
 سرگوشی میں کہا۔

”اوہ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ پنڈت کی دعا اتنی  
 قبول ہو جائے گی۔“ جاگی نے کہتے ہوئے جلدی سے آ  
 کھول دیں۔

”کیوں بند کرو۔“ میں نے اسے ہولے سے ڈا  
 ”مل دھر کے سامنے اتنی کیوں کرنے کی کیا ضرورت  
 ضرورت تھی۔“ جاگی نے جواب دیا ”وہ  
 میرے سامنے آ گیا تھا اور مجھے تمہاری طرح مجھے  
 نہیں مل سکا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر شبہ میں مبتلا ہو گیا تھا  
 خاموش رہتی تو وہ سمجھ جاتا کہ میں کون ہوں۔ میں  
 لیے یہ ڈراما کیا تھا۔ ایسے نفسیاتی حربے اکثر کم کر  
 ہیں۔ اس کے ذہن سے یہ بات تو نکل گئی ہوگی کہ  
 جاگی ہوں جس سے سگ پور میں غاکرا ہوا تھا۔ اب وہ  
 جائے گا کہ میں کون ہوں اور ایک دو گھنٹوں بعد وہ  
 بھول جائے گا۔“

”لیکن وہ چلا گیا۔ اب ہم اسے کیسے تلاش کریں  
 میں نے کہا۔  
 ”چینا مت کرو۔“ جاگی مسکرائی ”وہ اسی منہ  
 ہے۔ پروہت کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ واپس آجائے  
 دوران میں ہم اس کے بارے میں میاں سے پتہ  
 حاصل کر سکتے ہیں۔“

میں جواب دینے کے بجائے ادھر ادھر دیکھنے  
 مندر بھی دوسرے مندروں کی طرح بہت شان دار  
 اتنے بڑے تھے کہ چار آدمی مل کر بھی ایک ستون  
 کے حصار میں نہیں لے سکتے تھے۔ مندر کی قدیم  
 کثرت سے استعمال کیا گیا تھا لہذا حقیقت جیسی کرا  
 سوا کوئی اور چیز دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔

ادوں پر مینا کاری کا کام اس مہارت اور نفاست سے کیا گیا  
 کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

یہ شخص دیوتا کا مندر تھا۔ مرکزی ہال میں سامنے سنگ  
 مر کا ایک بہت بڑا چوتھڑا جس پر کیش دیوتا کی بہت بڑی  
 رتی رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر اور ستونوں پر بڑی مہارت  
 سے ہندوؤں کے دوسرے دیوتاؤں کی صورتیں بھی بڑی  
 ست سے تراشی گئی تھیں۔

ہم دونوں کیش دیوتا کی مورتی والے چوتھڑے کے  
 نیس طرف ایک بہت کشادہ راہداری میں آگئے۔ یہ  
 راہی بھی ہال کی طرح سنی اور ادھر بھی دیواروں پر  
 ریتاں نظر آ رہی تھیں۔ بہت سے لوگ ادھر بھی گھوم پھر  
 رہے تھے۔ ہر مورتی کو دیکھ کر وہ ہاتھ جوڑ دیتے۔ ذرا آگے  
 ہوئے لباس والا ایک پنڈت آنکھیں بند کیے اتنی پاپتی  
 لے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اس طرف جا رہے تھے کہ ایک  
 زخمی عورت ہمارے سامنے رک گئی اور جاگی کی طرف  
 تے ہوئے بولی۔

”تمہارا بچہ مل گیا۔“

”جی۔“ جاگی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا ”یہ تو  
 رہے پتی کا بہت جو مجھے دان ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔  
 ماکھیاں ہے کہ اب میرا پتی کبھی واپس نہیں آئے گا۔  
 مہلے۔“

عورت کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس نے گھوم  
 رہم دونوں کی طرف دیکھا اور رام رام کہتے ہوئے آگے  
 بڑھی۔

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی۔“ میں نے جاگی کو  
 نورا۔

”حرکت ہی میں برکت ہے لیکن اگر تم تھک گئے ہو تو  
 غور دیو کہ میاں بیٹھ جاتے ہیں۔“ جاگی نے مسکراتے  
 سے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر فرش پر بیٹھے  
 سے پنڈت کے پاس بیٹھ گئی۔ میں بھی جاگی سے دو چار فٹ  
 نہ چھوڑ گیا۔

جاگی نے آنکھیں موند کر دونوں ہاتھ سامنے کر کے جوڑ  
 نا اور زرب پچھہ بدبانے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں  
 ما کہ وہ اس وقت کسی شرارت کے موذ میں ہے۔ میں کن  
 فیمل سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک منٹ بعد ہی  
 اسے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

جاگی نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے پچھہ اس طرح جوڑے  
 تھے کہ اس کی کنٹاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے

کمنی سے پہلو میں بیٹھے ہوئے بیماری کے پہلو میں کا دیا تو  
 اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور گھور کر جاگی کو دیکھنے  
 لگا۔

”سوامی جی۔“ جاگی کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی  
 ”انسان بھگوان سے دو ہی چیزیں مانگتا ہے۔ دولت اور خوب  
 صورت عورت جن سے جیون کو سندر بنایا جاسکے۔ اس وقت  
 دونوں چیزیں تمہارے بہت قریب موجود ہیں۔“

”کیا انت کا شنٹ بک رہی ہو ناری۔“ پنڈت کے منہ  
 سے ہلکی سی غراہٹ نکلی ”تم میری پوجا کو نشٹ کر رہی ہو  
 اور۔“

”انت کا شنٹ چھوڑ دو سوامی جی۔ یہ بتاؤ میں کیسی لگ  
 رہی ہوں۔“ جاگی نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی  
 بات کاٹ دی۔

”بہت سندر۔“ پنڈت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”تو پھر سوچ کیا رہے ہو۔“ جاگی بولی ”تمہیں ایک عدد  
 سندر ناری اور دولت کی ضرورت ہے جس سے تم اپنا جیون  
 سندر سکوا کر اچھے ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو بلا جیون و  
 چرامیرے اشاروں پر چل سکے۔ تمہاری مطلوبہ دونوں چیزیں  
 میرے پاس ہیں۔ سندر تاہمی اور روکر تاہمی۔ اگر تم یہ دونوں  
 چیزیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ کسی ایسی جگہ چلو  
 جہاں ہمارے سوا کوئی نہ ہو اور سنا۔ انکار کرنے سے پہلے  
 اچھی طرح سوچ لینا۔ کشمی جیون میں صرف ایک بار کسی کے  
 دروازے پر دستک دیتی ہے اور میں تو دستک دیے بغیر  
 تمہارے پاس آگئی ہوں۔“

میں کمن آنکھوں سے اس پنڈت کی طرف دیکھ رہا تھا  
 جس کے چہرے پر شدید ابھرنے کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ  
 بار بار جاگی کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر جاگی نے اپنی بانوں کو  
 حرکت دیتے ہوئے اس طرح پہلو بدلا کہ ساڑی کا پلو کندھے  
 سے نیچے گر گیا۔ اس مرتبہ پنڈت کی آنکھوں میں عجیب سی  
 چمک ابھر آئی۔

”جلدی فیصلہ کرلو سوامی جی۔“ جاگی بڑبڑائی ”تمہارے  
 پاس صرف ایک منٹ رہ گیا ہے۔ ایک منٹ بعد میں تمہاری  
 انگاہوں سے اوٹ چھل ہو جاؤ گی۔ کسی اور کو تلاش کرلوں گی  
 اور تم زندگی بھر پھر کی ان صورتوں کے سامنے ہاتھ جوڑے  
 بیٹھے رہو گے اور تمہیں پچھہ نہیں ملے گا۔ کشمی کو نکلنا اگر تم  
 جیون کی سب سے بڑی غلطی کرو گے اور اسی طرح بیک مانگتے  
 رہو گے جلدی سے فیصلہ کرلو۔ ورنہ میں یہاں سے جاتے  
 والی ہوں۔“



”مجھے کیا کرنا ہوگا دیوی جی۔“ پنڈت کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔

”لکشی۔ میں لکشی ہوں۔ لوگوں کی قسمت بدل دیتی ہوں بلکہ جھپٹنے کی دیر میں۔ بولو۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ جاگتی لے گئی۔

”تم جو بولو گئی میں کرنے کو تیار ہوں لکشی جی۔ مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ پنڈت بولا۔

”میا نے آدمی ہو۔“ جاگتی لے گئی۔ ”کسی ایسی جگہ چلو جہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہ ہو۔“

”تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“ پنڈت کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اب بھی کن انکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کیڑے رنگ کی دھوئی باندھ رکھی تھی اور اسی رنگ کی ایک چادر جسم کے اوپر والے حصے پر لپی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے پر ایک میلا سا تھمبھا بھی لٹکا ہوا تھا۔ جب وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسٹریپ ٹکنڈ پر ہی ٹکا ہوا تھا جبکہ تھمبھا اس کے پہلو میں زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ اٹھتے ہوئے اس نے تھمبھا کو بھی سنبھال لیا اور اوپر چادر ڈال لی۔ اس نے چادر درست کرتے ہوئے جاگتی کی طرف دیکھا تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہریں لے رہی تھی۔

اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے تھے۔ رنگت آبنوس جیسی گہری اور آنکھوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ دانت چوڑے اور میلے تھے۔ وہ غالباً قاعدہ کی سے شیو بنانے کا عادی تھا۔ تو بھر برش ٹائپ کی بھاری مونچھوں نے اس کے چہرے کو کسی حد تک خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کا سینہ بڑبڑا ہوا تھا۔ سینے پر رینگھ کی طرح بال بھرے ہوئے تھے جس میں کہیں کہیں سفیدی بھی جھنک رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ مندر کے مرکزی دروازے سے باہر جائے گا مگر وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ لکشی کی دیوی کے ساتھ چلے ہوئے دوسرے پجاریوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ ”اس طرف میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو دیوی جی۔“ اس نے جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور وہ دونوں مخالف سمت میں چل پڑے۔ مندر میں چلے اور لوگ بھی تھے۔ کسی نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ کوئی انوکھی بات تو بھی نہیں۔ مندروں میں آنے والے دولت مند لوگ

کچھ دینے کے لیے پجاریوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے تقریباً بیس گز آگے جا کر وہ دونوں جیسے ہی بائیں طرف کرنگا ہوں سے اوچھل ہوئے۔ میں بھی ایک منجھٹے سیٹھی سے اٹھ گیا اور تیز تیز چلا ہوا اس موڑ پر پہنچ گیا۔

اس طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ جو مندر چالیس فٹ سے بھی زیادہ طویل تھی اور اس میں ایک دوسرے سے خاص فاصلے پر دو بلب جل رہے تھے۔

وہ دونوں اس راہداری کے آخری سرے پر پہنچ چکے تھے۔ مندر کی یا تڑا کے لیے آنے والے لوگ اس طرف نہیں جا رہے تھے۔ یہ راہداری غالباً مندر کے پجاریوں کے لیے مخصوص تھی جو مندر کے اندرونی یا بیچلے حصے کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے ہندوستان کے مندروں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ تنگ و تاریک راہداریاں، خفیہ راستے اور خانے۔ یہ مندر پنڈتوں کی عیاشیوں کے اڈے اور سازشوں کے گڑھ تھے۔ یہاں آدمی کو اس طرح غائب کر جاتا تھا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔

وہ دونوں اگلے موڑ پر غائب ہو چکے تھے۔ مجھے اب جاگتی کی حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ کہیں وہ بھی کسی پکڑ میں نہ پھنس جائے۔ میرے ذہن میں ایک خیال نے بھی تھا کہ اس پجاری کی جاگتی پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو گیا ہو۔ اگر وہ جاگتی کو لے کر نہ کے یا خانوں میں کہیں غائب ہو گیا تو میں زندگی بھر تلاش نہیں کر سکوں گا۔

آگے راہداریوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور تھمبھا راہداریاں سنسان تھیں۔ دل پر عجیب سی وحشت طاری ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی پجاری سے آسانا ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔

میں قدموں کی آواز پر ان دونوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ بالآخر مندر سے باہر آیا۔ میرے منہ سے گہرا سانس نکلا گیا۔

یہ مندر کے پچھلی طرف تنگ اور تاریک سی گلی تھی جس کے اختتام پر بجلی کے پول پر پدم روشتی کا بلب جل رہا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کے دس بجے بھی نہیں بجے تھے گلی سنسان تھی۔

اگلی گلی میں رہائشی مکان تھے اور کچھ لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی۔ اس گلی میں بھی زیادہ روشنی نہیں تھی۔ دو اور گلیاں ٹھونکنے کے بعد وہ ایک ایسی تنگ سی گلی میں مڑے جہاں دور دور تک روشنی کا نام و نشان تک

نہا۔ اب مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ پجاری جاگتی کو کسی ایسی جگہ لے جا رہا تھا جہاں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہ ہو اور یہ بھی اسے جاگتی ہی نے لے لیا تھا کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے چلے جہاں تیرا کوئی نہ ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جاگتی کو ایسی کون سی بات ہو سکتی تھی جس کے لیے اس نے اس پجاری کو پناہ دیا تھا اور ایک طرح سے خطرہ مولی ہو گیا تھا اگرچہ میں ان کا پیچھا کر رہا تھا لیکن اگر وہ پجاری اسے لے کر تاریک گلیوں میں کہیں غائب ہو گیا تو مصیبت کے وقت میں جاگتی کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔

اور بالآخر ان کا یہ سفر ختم ہو گیا۔ گلی کے اختتام پر وہ ایک کھنڈر نما عمارت تھی۔ باہر کی دیوار ٹوٹ چکی تھی اور اندر بھی بلب کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ اینٹوں کے اونچے ڈھیر کے پیچھے کہیں غائب ہو گئے۔ میں آگے بڑھ کر آڑ میں ٹکرا ہوا۔

چند سینکڑے بعد ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی دروازے کا زنجیر والا لٹکا کھولا گیا ہو اور پھر دروازے کے کھلنے سے بجلی کی چڑچڑاہٹ کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھ گیا۔

اور پھر تھوڑی سی دیر بعد ایک طرف ایک شعلہ سا چمکا اور ایک محدود جگہ پر زرد دھم سی روشنی پھیل گئی۔ اس کمرے میں شاید لائٹیں یا بلب چلا گیا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس سے بہرے کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب رک کر اندر جھانکنا لگا۔

وہ اس کھنڈر نما وسیع و عریض عمارت کا بچا ہوا غالباً دایہ کمرہ تھا جس میں رہائشی اختیار کی جاسکتی تھی۔ مگر زیادہ تر کمرے خالی تھے۔ ایک طرف جھانکا ہی چارپائی بھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ زمین پر بھی گدا اور بستر بچا ہوا تھا۔ چارپائی کے نیچے لوہے کا ایک بڑا سا ٹرنک بھی لٹکا ہوا تھا۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک کافی زوہ منکا اندھا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں میں طالعے بنے ہوئے تھے۔ ہاتھ دالے طالعے میں کافی دیوی کی ایک صورتی رکھی تھی۔ اس کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ دوسرے دیو جن میں تری مور تیاں سی رکھی ہوئی تھیں۔ لائین دیوار کے ساتھ ایک ایسی سی ٹھونکی پر ٹنگی ہوئی تھی۔ جاگتی بھی کمرے کے وسط میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی

تھی۔ اس پجاری نے کندھے پر لٹکا ہوا تھمبھا اتار کر چارپائی پر ڈال دیا۔ منگے میں سے گلاس بھرا ہوا پانی ایک ہی سانس میں مٹل میں اندھا گلاس منگے کے ڈھکنے پر رکھا اور سیدھا ہوا کر جاگتی کو گھورنے لگا۔

”تمہاری خواہش کے مطابق میں تمہیں ایسی جگہ لے آیا ہوں جہاں بیچا کوئی نہیں ہے۔“ وہ جاگتی کو اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم لکشی تو ہو سکتی ہو لیکن وہ نہیں جو دو جوں پر دھن بھجھوڑ کرتی ہے۔ پر میں جانوں کہ تمہارے پاس بھی دولت کی کمی نہیں۔ تمہارا یہ حسین کھنڈر اور خوب صورت شریر بھی بہت بڑی دولت ہے۔ ذرا ساڑی کا پلو تو ہٹاؤ۔ میں دیکھوں تو تم نے کتنی دولت چھپا رکھی ہے اپنی چوٹی میں۔“

”سو امی جی۔“ جاگتی دو قدم پیچھے ہٹے ہوئے بولی ”میں تو تمہیں۔“

”بند کرو اپنی بکواس۔“ پجاری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تم جیسی عورتوں کو ابھی طرح جانتا ہوں۔ جو شریر کے سوا کے لیے اپنی پسند کے مردوں کو تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ تم جیسی بہت سی عورتیں مندروں کے پجاریوں کو شکار کرتی ہیں تاکہ وہ بعد میں تمہارا راز فاش نہ کر سکیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر آگے بڑھ کر اس نے جاگتی کی ساڑی کا پلو کھینچ کر ہٹا دیا۔ ”میرے پاس آنے سے پہلے تم پنڈت و سبھر ناتجاری کو اپنے گمشدہ پتی کی کھٹانا رہی تھیں اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہیں تو ہر رات ایک پتی کی تلاش رہتی ہوگی۔ اب میرا سے برباد مت کرو اور اپنے ہاتھوں سے یہ چوٹی بھی اتار دو۔“

”سو امی جی۔“ جاگتی اب واقعی بدحواس ہو گئی تھی۔ ”بند کرو یہ بکواس۔“ پجاری نے اسے جھڑک دیا۔ ”آج کی رات میں ہی تمہارا پتی ہوں۔ جلدی کرو۔ مجھے مندر واپس جانا ہے۔“

”میں تمہیں دھن دان بنانے آئی تھی مگر لگتا ہے تم بھی ہوس کے پجاری ہو اور اپنے پیروں پر کھڑکی مارنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ جاگتی کہتے ہوئے مزید دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ پجاری چند لمبے ہوس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اچانک ہی اچھل کر اسے گرفت میں لے لیا۔ جاگتی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہاں نہ تو کوئی تمہاری چیخوں کی آواز سنے گا اور نہ ہی

کوئی تسماری مدد کو آئے گا۔" وہ پجاری غراتے ہوئے کہہ رہا تھا "تم خود ہی مجھے لے کر آئی ہو۔ اب خرے کا ہے کو دکھا رہی ہو۔"

مجھے جاگتی بڑی شدت سے غصہ آ رہا تھا لیکن یہ جاگتی پر غصہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس دوران میں وہ جٹا کٹا پجاری جاگتی کو چارپائی پر گرگا چکا تھا اور اس پر جبک کراتے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر پجاری کا کندھا چھو لیا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔ میرا زوردار گھونسا اس کے جڑے پر پڑا۔ وہ کراہتا ہوا الٹ کر فرش پر بیچے ہوئے گدے پر گر گیا۔

"اب تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔" میں نے بڑی بھرتی سے جیب سے پستول نکال لیا۔

"تک یہ کون ہو تمہیں۔" پجاری ہلکا کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ خوف سے پتھر اور بھی سیاہ پڑ گیا تھا۔

"تمہارے لیے یہ موت (موت کا فرشتہ) بھی ثابت ہو سکتا ہوں۔" میں نے کہا "اگر پولیس کو اطلاع دے دی جائے کہ تم اس عورت کو مندر سے روغلا کر یہاں لے آئے ہو تو تمہیں انگوٹھ کے الزام میں آٹھ دس سال کی سزا ہو جائے گی اور تم جیل میں چلی پیٹے رہو گے۔"

"میں مہاراج۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے "مجھ پر دیا کرو۔ میں نے اس باری کو نہیں روغلا یا۔ میں تو وہاں پوجا کر رہا تھا۔ یہ خود مجھے روغلا کر لائی ہے۔ مہمہ میرا کوئی قصور نہیں ہے مہاراج۔"

میں نے جاگتی کی طرف دیکھا۔ وہ چارپائی سے اٹھ چکی تھی اور ساڑھی سنبھال رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"میں تمہاری قسمت بدلنا چاہتی تھی مگر تم ہلک گئے۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "بولو۔ تمہیں روکڑا چاہیے یا انگوٹھ کے الزام میں جیل کی ہوا کھانا چاہتے ہو؟"

"تم جو کو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔" پجاری نے ہاتھ جوڑ دیے اور باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا "میں بالکل نردوش ہوں۔ میرا کوئی دوش نہیں ہے۔"

"خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ رہو۔" میں نے پستول سے اشارہ کیا اور جاگتی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے قریب آئی "یہ کیا تیزی ہے۔ تم اسے یہاں کیوں لے آئیں۔"

"اس روز درگا کے مندر میں یہ بھی پنڈت ملے دھر ساتھ تھا اور آج جب میں ملے دھر اور پرودہ سے باہر کر رہی تھی تو یہ بھی وہاں آکر رہا تھا پھر ملے دھر نے آٹکھ سے اشارہ کیا تو یہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ بعد میں اس کی تلاش کرتی رہی بھی اور بالآخر یہ مل گیا۔ اس سے ملے دھر کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"

"اس سے مندر ہی میں کسی اور طریقے سے بھی بات چا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"کسی اور طریقے سے شاید یہ قابو میں نہ آتا۔" جاگ نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی "لیکن اب یہ پوری طرح ہماری گرفت میں ہے۔ ہماری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور دو دنوں اس پجاری کے قریب آگئے جو اب بھی سما ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگا کہ میں دشواری میں نہیں آئی کہ وہ ڈرپوک قسم کا آدمی ہے اور اس پر ہمیں زیادہ محتسب نہیں کرنی پڑے گی۔

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں لکشی ہوں۔" جاگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا یہ شریر تو تمہیں نہیں لگے گا لیکن میں تمہیں دھن وان بنا سکتی ہوں۔" "تم جو کوئی میں کرنے کو تیار ہوں دیو کی جی۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہاری اس کھولی کی حالت بتا رہی ہے کہ تمہارا دم کا دھندا کچھ چل نہیں رہا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم ہمارا ایک کام کرنا تمہارے دن پھرکتے ہیں۔"

"میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مہاراج۔" اس نے بند توڑی کو ہمارے سامنے سے ہٹا لیا۔ بہت دیر لگتے ہوئے اس نے کہا۔

میں نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ واقعی بہت بدلتا تھا۔ چٹلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا پتلا نکالو اس میں سے ہزار ہزار والے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ نوٹ لیتے ہوئے اس کے ہاتھ کاپ رہے تھے۔ "لو۔" جاگ نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں دھن وان بنا دوں گی۔ ابھی وقت ہے۔"

تمہارے نوٹوں کی اس طرح بارش ہو گئی کہ تم سنبھال سکتے ہو۔"

"مہمہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔" اس نے نوٹ پکڑ لیے۔

میں نے اس کے لیے بھی پکچاہٹ تھی۔

میں نے اس کے بارے میں سوال کرنا رہا۔ اس کا نام نی داس تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ راجستان کے ف مندروں میں گھوم پھر کر پنڈتوں کی سیوا کرتا رہتا ہے۔

مندر کے پنڈت اسے زیادہ عرصے اپنے ہاں رکھنے نہیں دیتے۔ وہ پچھلے کئی برسوں میں صرف دو مرتبہ پچھلے یہاں آیا تھا۔ اب تین مہینوں سے یہاں پڑا ہوا ہے۔ پنڈتوں کی سیوا کے اسے صرف اتنا کچھ ہی ملتا ہے کہ وہ تنگ دستی میں رہ کر رہ سکے۔ جبکہ اس کے کہنے کے مطابق بڑے بڑے مندروں پرودہ کر دیتی ہیں۔ انہوں نے کدو ٹوں کی بڑائی بنا رکھی ہیں۔ اس شخص مندر کے پرودہ پنڈت نے ہاتھ کے بارے میں بھی اس نے چند بڑے سستی خیز شہادت کئے تھے۔ مجھے پنڈت وسمہر ہاتھ سے بہر حال کوئی بات نہیں تھی اس لیے میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا۔

"پنڈت ملے دھر کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کون پنڈت ملے دھر؟" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔ "میں اس نام کے کسی پنڈت کو نہیں جانتا۔ یہ نام چل نہیں پاتا ہے۔"

"وہی پنڈت جو تقریباً دو گھنٹے پہلے پنڈت وسمہر ہاتھ کے مندر سے باہر آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ وہ!" موتق داس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "ملے دھر نہیں۔ اس کا نام پرشورام ہے۔ بہت حرامی ہے۔" وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر بولا "اسے بدیش نے بے پروا توڑی ہی دن ہوئے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نے یہاں آتے ہی پنڈت وسمہر ہاتھ اور درگا مندر سے بہت پنڈت ہاتھن کو کس طرح اپنے قابو میں کر لیا۔

"بہت دوروں اس کی ہر بات مانتے ہیں۔"

"اس کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسا کیا ہے۔" موتق داس نے جواب دیا۔

"وہ بڑا حرامی آدمی ہے۔" موتق داس نے اسے ایک

بار پھر گالی دی "پتا نہیں اس نے ان دونوں پنڈتوں کو کیا کیا کیا ہے کہ وہ ہر وقت اسی کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ میں پچھلے دو مہینوں سے یہاں پڑا ہوا ہوں۔ وسمہر ہاتھ کی بہت سیوا کی لیکن مجھے جیسے پجاریوں کو تو وہ اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہے۔

پرشورام جب یہاں آیا تو پنڈت جی نے مجھے اس کی سیوا کر دیا۔ میں نے اس کی بہت سیوا کی۔ پچھلے تین چار ہفتوں کے دوران میں اس کی فرمائش پر تین مرتبہ اسے عورتیں فراہم کر چکا ہے اور وہ سلا مجھے دس تیس روپے دے کر خزا دیتا ہے۔"

"پرشورام یہاں اسی مندر میں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ یہیں رہتا ہے۔ پنڈت جی کے ساتھ عیش کرتا ہے پر وہ جس دن عورتوں کی فرمائش کرتا ہے اس رات یہاں نہیں رہتا۔" موتق داس نے کہا۔

"تو پھر کہاں جاتا ہے وہ؟" میں نے سوالیہ انگوٹھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"رام گڑھ جمیل والے مندر میں۔" موتق داس نے جواب دیا "وہ ہفتے میں ایک مرتبہ وہاں ضرور جاتا ہے اور وہ ہمیشہ دو عورتوں کی فرمائش کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کہتے کہتے رک گیا۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟" میں نے اس کی بات پر پوری کر دی۔

"جی مہاراج۔" وہ جلدی سے بولا "یقیناً یہی بات ہے۔"

"رام گڑھ جمیل کہاں ہے اور وہ کون سے مندر میں جاتا ہے۔" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"رام گڑھ! اس شکر کے شمال میں ہیں بائیس کلو میٹر کی دوری پر ہے۔" موتق داس نے بتایا "وہاں ماہی کیروں کی بستی ہے۔ یوں تو اس بستی میں بھی ایک مندر ہے۔ پر مجھے دوشواس ہے کہ پرشورام اس مندر میں نہیں جاتا۔"

"تو پھر وہ کون سے مندر میں جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جمیل سے ذرا آگے پہاڑیوں میں ایک پرانا مندر ہے۔ لوگ یا تڑا کے لیے اس طرف جاتے رہتے ہیں مگر بہت پیدل چلتا پڑتا ہے اس لیے لوگ وہاں تک جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پرشورام اسی مندر میں جاتا ہے۔" موتق داس نے جواب دیا۔

"اس مندر کے بارے میں کوئی خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

آتش فشاں 385 حصہ 4

گا۔ ”میں نے کہا ”ایک بات اور بھی ہے اگر ہنرت  
تاتھ بھی ان کے جرائم میں ملوث پایا گیا تو اسے بھی راز  
سے ہٹا دیا جائے گا اور ہو سکتا ہے اس طرح تمہیں اس  
میں کچھ اختیارات مل جائیں۔“

موتن داس کی آنکھوں میں چمک سی ابھرتی۔  
”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ہر  
طرف دیکھا۔

”رام گڑھ جھیل والے مندر میں جا کر پناہ لے کر  
رام کے ساتھ اور کون ہے۔ اگر تم نے صحیح اعلان کیا تو  
تمہیں مالا مال کر دیں گے لیکن اگر تم نے ہم سے غداری  
اور انہیں ہمارے بارے میں بتا دیا تو یاد رکھو ہم ہندوستان  
کسی مندر میں محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔“

”میں“ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں  
گا۔“ موتن داس نے کہا ”میں کل ہی وہاں جا کر پناہ  
لے گا۔“

”تو پھر ہم کل رات تم سے ملیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”کل رات تو میں وہیں رہوں گا۔ پرسوں رات در  
گھنٹا بجتے ہی تم لوگ یہاں آجانا۔ میں تمہیں ملوں گا۔“  
کھولی میں۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔  
اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔“  
”تمہیں مہاراج۔ تمہارے ساتھ دھوکا نہیں ہو گا۔“  
اس نے کہا۔

”اب ہمیں ان گھیلوں سے باہر چھوڑ کر آؤ۔ مندر  
طرف۔“ میں نے کہا۔

موتن داس اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم کمرے سے باہر  
آگئے۔ موتن داس نے لالین چلتی رہنے دی اور باہر نکل  
دروازہ بند کر کے اشارہ کرتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔  
جاںکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔



روپ متی کا معاملہ کچھ الجھ گیا تھا۔  
پولیس تحقیقات کرتے ہوئے شہر کی نوائی پہاڑیوں  
واقع اس کھنڈر نما عمارت تک پہنچ گئی تھی جہاں روپ متی  
باندھ کر رکھا گیا تھا۔ پولیس کو نہ صرف اس غلطی اور  
عمارت سے دھرمیش کی لاش بلکہ عمارت سے غائب  
میل دور پہاڑیوں میں اس شخص کی لاش بھی مل گئی تھی  
لالہ رنجیت کے خنجر سے کھائے ہوئے عمارت سے بھاگ  
تھا۔ دونوں لاشیں آدھی سے زیادہ بھیڑیوں کی خوراک

”وہ بہت پرانا مندر ہے۔“ موتن داس نے کہا ”وہاں  
ہنرت کلیان راج قابض ہے۔ اس کے ساتھ چند ایک گئے  
ہنے پجاری ہیں۔ وہ کسی اور گروہاں گئے ہیں نہیں دیتا۔ دور  
دور سے آنے والے دولت مند یا تری وہاں بہت سی چیزوں  
کی بیعت چڑھاتے ہیں۔ زبورات، سونے کی مورتیاں اور  
نقدی۔ وہاں لاکھوں کی آمدنی ہے۔ اسی لیے ہنرت کلیان  
راج وہاں کسی کو پیر نہیں جمانے دیتا۔ پر یہ پرشورام ہر ہفتے  
وہاں دو عورتوں کو لے جا کر جاتا ہے۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“

”کیا تم وہاں رہ چکے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”دو تین سال پہلے صرف ایک مرتبہ گیا تھا مگر تیسرے  
ہی دن ہنرت کلیان راج نے بھگا دیا۔“ موتن داس نے کہا۔  
”دیکھو موتن داس۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں  
جماتے ہوئے کہا ”ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میری  
اس دوست نے کل تمہیں کالی کے مندر میں ہنرت مری دھریا  
پرشورام کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس لیے آج اس طرح مندر  
سے لایا گیا ہے کہ کسی کو شبہ نہ ہو اور تم بھی لالچ میں آ جاؤ۔  
بات دراصل یہ ہے کہ۔ ہنرت مری دھر کا دوست خونی ہے۔  
اس نے کئی قتل کیے ہیں اور بھاگا ہوا ہے۔ ہنرت مری دھریا  
پرشورام اس کا شریک جرم ہے لیکن ہمیں اس کے خونی  
دوست کی تلاش سے جو غالباً کسی مندر ہی میں چھپا ہوا ہے۔  
تم چونکہ پرشورام کے سیوک ہو۔ اسی لیے ہم نے تم سے  
رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ تم سے ان دونوں کے بارے  
میں معلومات حاصل کر سکیں۔“

”کیا تم لوگ پولیس والے ہو؟“ موتن داس کے چہرے  
پر خوف کے سائے ابھر آئے۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”ہمارا ان کے  
ساتھ کوئی اپنا حساب کتاب ہے جسے برابر کرنا پڑتا ہے۔“  
”پرشورام کو دیکھ لیا تھا تو اسے پکڑا کیوں نہیں۔“ اس  
نے پوچھا۔

”اگر ہم پرشورام کو پکڑ لیتے تو اس کا دوسرا ساتھی  
ہو شیار ہو جاتا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ ہم دونوں پر اکٹھے  
ہی ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں تمہاری مدد کی  
ضرورت ہے۔ تم ہم سے تعاون کرو گے تو ہم تمہیں اتنی  
دولت دیں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”لیکن۔“ وہ خوف زدہ سے لہجے میں بولا ”اگر پرشورام  
یا ہنرت وغیرہ ساتھ کو بھگت بھی مل گئی کہ میں تم لوگوں کے  
لیے کام کر رہا ہوں تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“  
”بب تک تمہاری زبان بند رہے گی کسی کو پتا نہیں چلے

چکی تھیں۔ اتفاق سے ان کے چرے سلامت تھے جن سے انہیں شناخت کیا گیا تھا۔

بہاؤیوں میں بانی جالی والی لاش بشن سنگھ نامی ایک آدمی کی تھی جس کے بارے میں تحقیقات سے پتا چلا کہ اس کا تعلق چتور گڑھ کے سابق راجہ کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ راجہ کا کزن تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ چتور گڑھ کی گدی کا دعوے دار تھا مگر اس وقت کی انگریز حکومت نے راجہ رنجیت سنگھ کو چتور گڑھ کا راجہ تسلیم کر لیا تھا۔ بشن سنگھ کا باپ اودھم سنگھ گدی حاصل کرنے کے لیے اودھم چاٹا رہا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف بھی سازشیں شروع کر دیں لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اسی دوران میں ہندوستان کا بھوارہ ہو گیا۔ ہندوستان میں تمام ریاستیں ختم ہو گئیں۔ راجاؤں سے اختیارات چھین لیے گئے اور ان کے وظائف مقرر کر دیے گئے۔ ہند سرکار نے بھی رنجیت سنگھ کو ہی چتور گڑھ کا سابق راجہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے لیے گران قدر وہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ اودھم سنگھ نے اپنی اودھم بازی جاری رکھی۔ عدالتوں میں مقدمے بازی سے لے کر رنجیت سنگھ کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ہر صورت میں رنجیت سنگھ کو گرانا چاہتا تھا تاکہ سرکار سے ملنے والا وظیفہ اور دیگر رعایتیں خود حاصل کر سکے۔

اودھم سنگھ نے راجہ رنجیت سنگھ کے سالے دھرم دیر سنگھ کو کسی طرح اپنے ساتھ ملا لیا۔ رنجیت سنگھ کو اب دو دشمنوں کا سامنا تھا۔ دھرم دیر سنگھ، اودھم سنگھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ ایک طرف اس نے اودھم سنگھ کو لادالیا لگائے رکھا اور دوسری طرف وہ راجہ کے خلاف بھی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا کیونکہ ہند سرکار سے ملنے والا وظیفہ وہ خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دھرم دیر سنگھ کے دہلی سے بھی بڑے اپنے تعلقات تھے۔ اس وقت کے کئی بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور دنیا اس کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ اس کی رسائی راجہ بھون تک تھی اور بالآخر وہ اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہو گیا۔ ہند سرکار نے راجہ رنجیت سنگھ کو مطلع کر کے دھرم دیر سنگھ کو چتور گڑھ کا سابق راجہ تسلیم کرتے ہوئے سرکاری وظیفہ اور دیگر تمام مراعات اس کے نام منتقل کر دیں جبکہ راجہ رنجیت سنگھ کو ہر چیز سے محروم کر دیا۔ اس نے ساتھ ہی اس کے خلاف انکم ٹیکس کی جو ری اور اختیارات کے ناجائز استعمال اور بد عنوانیوں کے لاتعداد مقدمات شروع ہو گئے۔ راجہ رنجیت سنگھ ایک غیر مت آدی تھا۔ وہ یہ ذلت

برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے اپنے آپ کو گولی مار کر ہتیا کر لیا۔

راجہ رنجیت سنگھ کا باب ختم ہو گیا اور اودھم سنگھ دھرم دیر سنگھ میں ٹھن گئی۔ دھرم دیر سنگھ کے بیٹے بھون اور اودھم سنگھ کے بیٹے بشن سنگھ میں گہری دوستی ہو گئی۔ دونوں بد قماش اور عیاش تھے۔ بھون کی لڑائی سے انہیں غرض نہیں تھی۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے اتنا دلچسپ نہیں ملا تھا کہ کسی اور معاملے پر توجہ دے سکیں۔ ٹم طوائفوں کے کوٹھے ان کے دم سے آباد تھے۔ رات کو محو تھیں۔ جن میں شری حسین ترین کال کر لیا جاتا۔ ایسی لڑکیاں بھی ہوتیں جنہیں اغوا کر کے لایا جاتا۔ بلونت سنگھ اور بشن سنگھ کو بیش اکٹھے دیکھا جا لوگ حیران تھے کہ ان دونوں کے باپ تو ایک دوسرے جان کے دشمن تھے اور یہ دونوں ایک ہی تھالی میں کھا تھے۔

اور پھر ایک روز اودھم سنگھ پر اسرار طور پر ہوا ہو گیا۔ اس کی لاش شہر سے چند میل دور ایک جمیل ٹھکانہ گئی تھی۔ پلٹ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جمیل میں ڈوب کر تھا اور پچھ لوگوں کے نزدیک اسے پہلے گھونٹ کر کھا لیا گیا پھر لاش جمیل میں پیسٹک دی گئی۔

پولیس نے اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دے کر کبھی کر دیا۔ شہر کا ہر فرد جانتا تھا کہ اودھم سنگھ کی دھرم دیر سے دشمنی چل رہی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ اودھم سنگھ قتل کیا گیا تھا لیکن اس کے بیٹے بشن سنگھ پر اپنے باپ کی موت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مزید تحقیقات نہ کی تھیں۔ پولیس نے جو کچھ کہتا اسے آنکھیں بند کر کے کر لیا اور باپ کی پتا چلا کر کھیر بیٹھ گیا۔

بشن سنگھ اب مکمل طور پر بلونت سنگھ کا پس منظر بن گیا۔ وہ سنگھ کو بھی اس سے کوئی ڈھرو نہیں تھا۔ پچھ دی اور بے پور آ گیا۔ یہاں کوئی جائیداد نہ تھی۔ بجائے اس نے سردار پھیل مارگ کے محلے میں ایک دار کو بھی کرائے پر لے لی اور رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے گرد ایسے لوگ جمع ہو جاتے تھے جو اسے آسانی سمجھتے تھے۔ وہ اس کے خراج پر بیش کر رہا تھا۔ اس کی کو بھی یہ ہر روز راگ رنگ کی محفلیں ہوتیں۔ شراب آوارہ عورتوں پر ہر رات ہزاروں روپے اڑاتے تھے۔

دوست عیش کر رہے تھے اور روپیہ پانی کی طرح اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

بلونت سنگھ بھی ہفتہ دس دن میں ایک مرتبہ اس کے حضور آتا تھا۔ اس نے بھی بشن سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ روپیہ اس طرح نہ لٹائے لیکن بشن سنگھ پر کی باتوں کا اثر نہیں ہوا۔ بلونت سنگھ نے اپنی باتوں پر کبھی بھی نہیں مانا تھا کہ وہ خود بھی اسی قماش کا تھا۔

دو سال میں بشن سنگھ فلاح ہو گیا۔ اس کے دوست بھی کامیاب چھوڑ گئے۔ جو اس کی دولت پر عیش کرتے رہے اب اس کے سامنے سے بھی دور رہنے لگے تھے۔

بشن سنگھ کو وہ عایشان کو بھی خالی کرنی پڑی۔ اس نے دروازہ کی گنجائش آبادی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے لے لیا اور زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ بلونت بھی بھارے پور آتا تو اس کی ٹھوڑی بہت مالی مدد دیتا۔

اسی دوران میں بشن سنگھ کی ملاقات جیج سنگھ اور بھن سے ہو گئی۔ جیج سنگھ چالاک آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ اسے ایسے آدمیوں کی ضرورت دیکھ سکتی ہے۔ وہ وقتاً بوقتاً بشن سنگھ کی مالی مدد کرتا رہا اور اس سے کچھ ایسے کام بھی لگاؤ جو ان کے زمرے میں آتے تھے۔ اسے خود بھی اس کا احساس تھا لیکن وہ جیج سنگھ کے لیے ایسے کام کرنے پر رعا۔

بشن سنگھ ہی کے ذریعے جیج سنگھ کی ملاقات بلونت سنگھ ہو گئی۔ وہ دونوں ایک ہی قماش کے تھے۔ جیج سنگھ بھاری روپ متی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور بلونت سنگھ اپنے باپ کی دولت لٹا رہا تھا۔ جیج سنگھ کے توسط سے بلونت سنگھ راجا بھاری روپ متی سے ملنے لگا لیکن روپ متی کو یہ شخص زیادہ پسند نہیں آیا اور اسے دور رہنے کی کوشش کرنے لگی۔

اور پھر غلاموں کی منڈی میں پیش آنے والے واقعے میں صورت حال یک فورت تبدیل ہو گئی۔ روپ متی کے ہاتھ سے بلونت سنگھ اس روز پھٹک جاتے ہوئے راستے پر گر پڑا۔ روپ متی کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ انہیں دیکھا کہ ان کو وہ راہ قرار اختیار کرنے میں تیار تھا۔ انہیں دیکھا کہ وہ موقع پا کر کوئی ایسی حرکت کرے گا جس سے جیج اور روپ متی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکے۔ تاہم وہ ابھی تک خاموش تھا البتہ جیج سنگھ

اور دھرمیش مکمل کر روپ متی کے مطلب پر آگے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ دونوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دھرمیش روپ متی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور جیج سنگھ ہمیں رُک سے کھینچنے کی کوشش میں خود بھی اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔

اور اب بہاؤیوں سے بشن سنگھ کی بیٹی ہوئی لاش ملنے کے بعد بلونت سنگھ مکمل کر سامنے آ گیا تھا۔ بشن سنگھ اس کا کزن تھا اس نے بشن سنگھ کے قتل کا الزام روپ متی پر عائد کر دیا اور روپ متی کو بھی عین نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کی وجہ سے روپ متی کی طرف سے اگرچہ مجھے بھی کچھ اطمینان ہو گیا تھا لیکن میرے لیے بھی کئی محاذ کھل گئے تھے۔ جیج سنگھ اور بلونت سنگھ وغیرہ سے روپ متی کی دشمنی کی بنیاد تو میں ہی تھا۔ جیج سنگھ تو اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن بلونت سنگھ مقابلے پر آیا تھا۔ اس نے مجھے بھی دھمکیاں دی تھیں۔

ایک طرف بلونت سنگھ تھا اور دوسری طرف میں پنڈت مل دھار اور دارا کے پیکر میں الجھا ہوا تھا۔ وہ دونوں سنگاپور سے فرار ہو کر آئے تھے اور اتفاق سے ہم بھی ریگستان میں جہاز کریش ہونے کے بعد یہاں پہنچ گئے تھے۔ روپ متی میرے کردار سے متاثر ہو کر مجھے آزاد کرنے کو تیار بھی ہو گیا۔ اس کی طرح سرحد پار کر کے پاکستان جانا چاہتا تھا لیکن اتفاق سے اس روز جاگنے کے اندر میں مندر میں پنڈت مل دھار کو دیکھ لیا اور ہم مل دھار کی تلاش میں گمشدہ دیوتا کے مندر تک پہنچ گئے۔ جہاں پجاری موتی داس ہمارے ہاتھ لگ گیا۔ موتی داس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ مل دھار کا ایک اور ساتھی بھی تھا جو رام گڑھ جمیل کے کنارے کسی قدیم مندر میں چھپا ہوا تھا اور مل دھار ہر ہفتہ اس کے لیے شراب اور عورتیں لے کر جاتا تھا۔ اب یہ تصدیق کرنا باقی تھی کہ قدیم مندر میں چھپا ہوا وہ شخص دارا ہی تھا یا کوئی اور۔ موتی داس نے دولت کے لالچ اور جان کے خوف سے اگرچہ اسی سلسلے میں مداخلت فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھے اس پر بھروسہ نہیں تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ مل دھار کو ہمارے بارے میں بتا دے گا۔ اسی لیے میں نے خود رام گڑھ جمیل والے مندر میں جا کر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جس رات ہم نے پجاری موتی داس کو پکڑا تھا۔ میں اس سے اگلے ہی روز رام گڑھ جمیل والے مندر کی طرف جانا چاہتا تھا مگر صبح سویرے ہی پولیس کی ایک پارٹی روپ متی سے پوچھ گچھ کے لیے کوئی پتہ بھیجی۔ یہ پارٹی چار باکاردوں پر مشتمل تھی جس کا سربراہ وہی انسپکٹر تھا جس نے پہلے روز جیج

نگھ وغیرہ کے خلاف رپورٹ درج کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انہی کو دھمکا کر زبان بند رکھنے کا مشورہ دیا تھا لیکن آج اس کا رویہ بدلا ہوا تھا اور وہ روپ متی کے سامنے بڑی تابعداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

میں ان لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور میں ساتھ والے کمرے میں کھینے والی کھڑکی کے قریب بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کھڑکی کے سامنے مہار والا سائٹ کا دیز اور خوب صورت پردہ چڑا ہوا تھا۔ اس گھر میں رہنے والوں کو تو معلوم تھا کہ یہاں ایک کھڑکی بھی ہے لیکن کسی انجینی کے ذہن میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔

کنور بلونت نگھ نے رپورٹ کی ہے کہ آپ اس کے کزن بشنگھ اور اس کے دوستوں جیٹنگھ اور دھرمیش کے قتل میں ملوث ہیں۔" انسپکٹر کہہ رہا تھا "جب تک کوئی ثبوت نہ مل جائے ہم آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے لیکن آپ سے اس سلسلے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قانونی حق ہے۔"

"اسے شاید قانون کی زبان میں شامل تفتیش کرنا کہتے ہیں۔" روپ متی نے کہا۔

"یہی نتیجہ ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اب تک ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں اس کے مطابق وہ دونوں بھائی میرا مطلب ہے جیٹنگھ اور دھرمیش کسی معاملے پر بات کرنے کے لیے آپ کے پاس آئے تھے اور۔"

"تم پھر بھڑکی سے اتر رہے ہو آئیہ۔" روپ متی نے اس کی بات کاٹ دی "وہ مجھ سے کسی معاملے پر بات کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں بھائی دو اور غنڈوں کے ساتھ مجھے اغوا کرنے آئے تھے۔ اس رات میرے دونوں ملازم جھپٹی پر تھے۔ میری ملازمہ مندری بھی میری دوست کے ساتھ مندر گئی ہوئی تھی۔ میرا دوست ہمت نگھ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ شیش ٹوٹنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

"میرے دماغ پر نیند کا خمار طاری تھا۔ میں ابھی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ جیٹنگھ اپنے بھائی دھرمیش اور دو اور بدعاشوں کے ساتھ میرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس آئے اور مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔

"میری چیخوں کی آواز سن کر ہمت نگھ بھی اوپر آیا اور مجھے ان سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہمت نگھ اکیلا تھا

اور وہ چار تھے۔ انہوں نے ہمت نگھ کو مار مار کر اوڑھ مارا اور بے ہوش کر کے پھینک دیا۔ انہوں نے کمرے میں پھوڑ بھی کی اور مجھے کھینچے ہوئے حویلی سے باہر لے گئے۔ گیت کے سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ مجھے اس گاڑی پر ڈالنے ہوئے کسی ٹھوس چیز سے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا گیا تھا تاکہ میں راستے میں شور نہ مچا سکوں اور۔"

"آپ نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔" روپ متی نے "ایک مرتبہ پہلے بھی وہ دونوں تنگ حرام میری حویلی میں تھے تو پھوڑ کر چلے گئے اور میں فریاد لے کر تھمارے پاس آئی تھی۔ اس وقت تم نے کیا کر لیا تھا جواب کچھ کر لیتے۔" اس کے لیے میں طے تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی "اور پھر رپورٹ کون کرنا۔ وہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے اور ہمت نگھ بے ہوش پڑا تھا۔ میری ملازمہ مندری رات کے آخری پیر مندر سے واپس آئی تو وہ صورت حال دیکھ کر بدحواس ہوئی۔ اس نے پہلے تو خود ہی ہمت نگھ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی پھر فون کر کے میری دوست والا رادھا کو بلا لیا اور ڈاکٹر رادھا نے دن چڑھے میرے ایک دوست تھا کر بھانوت نگھ کو اطلاع دے دی۔"

"ان لوگوں نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی۔" اس کے خاموش ہونے پر انسپکٹر نے کہا۔

"وہ بھی جانتے ہیں کہ پولیس گھوس (رشوت) کماؤ ہے۔ انہوں نے پہلے بھی کچھ نہیں کیا تھا اور اب بھی نہیں کریں گے۔" روپ متی نے جملے کوڑھے لیے مجھے بددعا دیا "میں پولیس کی بے تکلی باتوں اور اپنے بدمعاشوں میں وقت ضائع کرنے سے زیادہ میری فکر تھی۔ وہ اپنے طور پر مجھے تلاش کرتے رہے اور بالآخر انہیں چال چل گیا کہ آج اور اس کے ساتھی مجھے کہاں لے کر گئے تھے۔ انہوں نے رات کو پانچویں میں واقع اس کھنڈر نما عمارت پر بل بولنا مجھے رہا کر دیا۔"

"اور اس سلسلے میں میں بشنگھ آپ کے دوستوں سے کسی ایک کے ہاتھوں مارا گیا۔" انسپکٹر نے اسے خاموش ہونے پر کہا۔

"یہ غلط ہے۔" روپ متی بولی "لالہ رنجیت مائی خنڈ نے میرے دوست ہمت نگھ پر خنجر سے حملہ کیا تھا جو وقت بشنگھ سے گھم گھما ہو رہا تھا۔ ہمت نگھ نے آپ کو اس وار سے بچایا اور بشنگھ کو زمین پر ہٹا دیا اور

کے سینے میں پیوست ہو گیا۔"

"اور ڈاکٹر سین کا بیان ہے کہ جیٹنگھ نے اسے بھائی لانے کے لیے وہاں بلوایا تھا۔" انسپکٹر نے کہا "ڈاکٹر کے کے مطابق دھرمیش کو سینے میں گولی لگی تھی۔ اس نے سے گولی تو نکال دی لیکن دھرمیش جاں بڑ نہیں ہو سکا۔ گولی کس نے ماری تھی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" روپ متی نے جواب دیا "وہ جب مجھے یہاں سے اغوا کر کے لے گئے تھے تو میں بے ہوشی اور اس وقت دھرمیش بھی زندہ تھا۔ مجھے اس رفا عمارت میں باندھ کر ڈال دیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان میں اس کی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو اور اسے گولی مار دی گئی ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری ہوئے کئے گئی "تھا کر بھانوت نگھ اور ہمت نگھ نے ہی کھنڈر نما عمارت سے آزاد کر لیا اور ڈاکٹر سین اور نیت کو شہر اکر پولیس کے حوالے کر دیا۔"

"میں نے ان دونوں کے بیانات بھی لیے ہیں۔" انسپکٹر اس کے خاموش ہونے پر کہا "لالہ رنجیت کا بیان ہے کہ اس کو گولی یہاں حویلی میں لگی تھی اور وہ گولی۔"

"ایک منٹ!" روپ متی نے اسے جلدی سے ٹوک دیا "میں نے کہا تھا کہ وہ دونوں بھائی یعنی جیٹنگھ اور دھرمیش معاملے پر مجھ سے بات کرنے آئے تھے لیکن اب لالہ

"میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے لالہ رنجیت بھی ان کے آیا ہو اور باہر کھڑا رہا ہو اور۔" انسپکٹر کو بدگیا تھا۔

"ایسی صورت میں وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم لوگ حویلی کے گھر میں تھے اور دھرمیش کو گولی کس نے ماری۔" روپ متی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے "تم نے اپنا ہوم ورک ٹھیک سے نہیں کیا انسپکٹر۔ تم کچھ دیکھ رہے ہو یا میں یہ سمجھوں کہ تم کسی کے دباؤ میں آکر ایسی باتیں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایسی باتیں ٹھیک سے لیکن اب میں تمہارے دباؤ میں نہیں آؤں جس جاتی ہوں تم مجھے پھنسانے کے لیے اور بھی ہمت بھنڈنے استعمال کر سکتے ہو تمہارے اس مرتبہ نہ تو تم مجھے اٹھو گے اور نہ ہی تمہارا کوئی اور بھنڈا کامیاب

میں روپ متی کی ذہانت کی داد دے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہی مرتبہ جب جیٹنگھ وغیرہ نے حویلی میں توڑ پھوڑ کی اور وہ رپورٹ لکھوانے پولیس اسٹیشن بھی بھیجی تو اسی

انسپکٹر نے اسے دھمکا کر بھاگ دیا تھا۔ اس وقت روپ متی سمجھتی تھی۔ کوئی اس کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی ذہانت سے کمائی کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ وہ نہ تو گھبرائی تھی اور نہ ہی بات کرتے ہوئے اس کے لیے میں نفرت سمجھتی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ تھا کر بھانوت نگھ جیسا آدمی اس کے ساتھ تھا۔ روپ متی جانتی تھی کہ اس وقت میں بھی پردے کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوں۔ اسی لیے وہ ذرا اوپنی آواز میں بات کر رہی تھی تاکہ میں بھی سن سکوں۔

"ہم پر اس کیس کی تحقیقات کے لیے اوپر سے دباؤ ہے اور۔"

"تمہیں تحقیقات سے کسی نے روکا ہے۔" روپ متی نے اس کی بات کاٹ دی "اگر تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے تو میں تمہیں اپنے خلاف کسی کارروائی سے بھی نہیں روکوں گی لیکن اگر تم نے مجھے فریم کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"راج کار بلونت نگھ کی رسائی ہمت اوپر تک ہے اور وہ۔"

"اوہو۔" روپ متی اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دے بغیر بول پڑی "تو اصل بات یہ ہے کہ تم قانون کے نہیں غنڈوں، بدعاشوں اور قاتلوں کے دباؤ میں ہو۔ تمہیک ہے انسپکٹر۔" اس نے گہرا سانس لیا "تم میرے خلاف جو کارروائی کرنا چاہتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ تم بھی اس طرح لیٹ میں آؤ گے کہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں بچا نہیں سکے گی۔ اب تم جانتے ہو۔"

"میں آپ کے دوست ہمت نگھ سے ملنا چاہوں گا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔ میں اسے تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ دیوان نگھ۔" اس نے شاید باہر کی طرف رخ کر کے دیوان کو پکارا تھا "انسپکٹر کو باہر کا راستہ دکھا دو۔"

پولیس کے جانے کے بعد روپ متی بال ٹاکرے میں آگئی۔ میں بھی اس کمرے سے نکل کر وہاں پہنچ گیا۔

"تم نے ساری باتیں سن لیں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "تم نے تو کمائی بالکل ہی بدل دی۔ مجھے لگتا ہے اس میں مزید انجینینر پیدا ہوں گی اور میرے خیال میں تمہیں تھا کر بھانوت نگھ کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔"

"یہ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ہوا ہے۔"

روپ متی بولی۔

”کیا مطلب؟“ میں ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آن صبح نیلی فون پر طویل گفتگو ہوئی تھی۔“ روپ متی نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ میں اپنے سرقل کا الزام کیوں لوں۔ قانون کی مدد کسی اور طریقے سے بھی کی جاسکتی ہے۔ جج سنگھ اور دھرمیش اگر زندہ پولیس کے حوالے کر دیے جاتے تو وہ صاف بیچ نکلتے۔ یہ تو میاں کا دستور ہے بے گناہوں کو تو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا ہے اور گناہگار اور مجرم دندناتے پھرتے ہیں جبکہ میں یہ باتیں ہوں کہ اپراوھی (مجرم) کو اس کے اپراوھ (جرم) کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ ان دو بھائیوں میں سے ایک کو میرے ہاتھوں سزا ملی اور دوسرے کو قدرت نے سزا دی۔ اپراوھیوں کو ان کے اپراوھ کی سزا مل گئی۔ میں اپنی گردن کیوں پھنساؤں۔ قانون کی مدد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں اور میں نے ہتھاکر کو یہ بات سمجھا دی تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تھاکر بھانوت سنگھ ایک قانون پسند شری ہے لیکن اتنی بات وہ بھی جانتا ہے کہ قانون کے رکھوالے کرپٹ ہوں تو پھر خود بھی تھوڑا سا راستے سے ہٹا پڑتا ہے۔ اس نے میری بات سے اتفاق کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ کسی کو اس کے جرم کی سزا قانون ہی دے سکتا ہے۔ کسی اور کو فیصلہ سنانے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن یہاں صورت حال اس طرح مختلف ہے کہ قانون کے محافظوں کو قانون پسند شریوں سے نہیں قاتلوں اور لیٹیروں سے ہمدردی ہے۔ ان سے کسی انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے تھاکر نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ کمائی کو اس طرح بدل دیا جائے۔ یہ کمائی اسی نے تیار کی تھی۔“

”لیکن کیا یہ قانون کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا اپنٹ بارے میں کیا خیال ہے؟“ روپ متی نے میرے چہرے پر نظرسنجمادیں۔ اس کے لہجے میں کتنی آہنی تھی ”تمہارے ماں باپ کو تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ کیا تمہیں قانون سے انصاف ملا۔ وہ ہتھیارے دنیا بھر میں نل و غارت مچاتے پھر رہے ہیں۔ قانون نے ان کا کیا لگا ڈالا۔ کہتے ہیں کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں تو پھر یہ لمبے ہاتھ آج تک ان اپراوھیوں تک کیوں نہیں پہنچ سکے۔ بے گناہ تو مارے جارہے ہیں اور وہ بے رحم قاتلوں کیوں دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہیں مانی ڈیزر۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی

پھر بولی ”ہم قانون کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش نہ کر رہے بلکہ ان اپراوھیوں کو سزا دی ہے جو قانون کی گردن میں آنے کے باوجود سزا سے بچ سکتے تھے۔ تم نے بھی ان لوگوں باتیں سنی تھیں۔ اس نے بلونت سنگھ کا حوالہ کیا وہ قاتل تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں کو قانون سے آزاد اہم سمجھتا ہے جو اس کی جبینیوں نفلوں سے بھر سکتے ہیں۔“ شاید روپ متی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اگر یہ بات سنا دے آجائے کہ دھرمیش روپ متی کے ہاتھ سے چلائی جائے گا۔ کوئی سے ہلاک ہوا تھا تو اس کے گرد و جال میں دیا جائے لیکن یہ سرشتی اور بے ضمیر پولیس والے اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ دونوں بھائی۔ غنڈوں کو ساتھ لے کر زبردستی حویلی میں گھسے تھے اور مجھے اور روپ متی کو قتل کر چاہتے تھے۔

تھاکر بھانوت سنگھ نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اس نے اپر راستہ اختیار کیا تھا کہ قانون سے تصادم بھی نہ ہو اور ہاتھ طرف سے اسے تعاون بھی حاصل رہے اور پھر ان لوگوں باتوں سے میں یہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ پچھل مرتبہ اپر بھانوت پڑنے کے باوجود وہ روپ متی کو کسی نہ کسی پکڑ کر پھنسانا چاہتا تھا۔ وہ واقعی بے ضمیر شخص تھا۔ اتنے قانون کی پروا تھی نہ کسی کی عزت کا خیال۔ وہ تو بلونت سنگھ جیسے بد قماش اور بد کردار لوگوں کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ اس نے بے ضمیر اور مہشی انڈسٹری جرائم پیش لوگوں کو بھیلے پھولے کا موقع دیتے ہیں۔ اس جیسے پولیس افسروں کو تو ڈال چورا ہے پر لٹکا کر جوتے لگانے چاہئیں۔

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ جاگی مندری کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔ تقریباً آٹھ بجے تھے بعد مندری واپس آگئی مگر جاگی اس کے ساتھ نہیں تھی۔

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے مندری کی طرف دیکھا۔

”جاگی دیوی تو مندر چلی گئی۔“ مندری نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا کہ میں سو والے کروا پس چلی جاؤں۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آجائے گی۔“

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دو بج گئے۔ مندری نے کھانا تیار کر کے میرے لگا دیا۔ روپ متی مجھے صوفے سے اٹھا کر کھانے کی میز پر لے گئے۔

”پریشان کیوں ہو رہے ہو۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جاگی کوئی بچی تو نہیں ہے جو راستہ بھول جائے گی۔ تم لگنا لگاؤ۔ آجائے گی وہ۔“

”ہات راستہ بھولنے کی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نہیں جانتے وہ جہاں گئی ہے ہمارے لیے کتنی خطرناک جگہ ہے۔“ ”کتنش دیوتا کہ مندر میں جاگی کے لیے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ روپ متی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”جس رات مندری اور جاگی کالی کے مندر گئی تھیں اور یہاں ہم پر حملہ ہوا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مندری نے انکرتیا یا تھا کہ جاگی نے پیڈتہ مرلی دھر کو لپکا لیا ہے۔ وہ اس کی عمرانی کر رہی ہے اور اس نے مجھے لپکا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو وہ لوگ اٹھا کر لے گئے تھے۔“ روپ متی نے کہا۔

”اوہ! میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا اس قدر اطمینان ہوا ہے کہ ڈھنگ سے کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔“ میں اپنی پریشانی مٹانے لگا اور پھر روپ متی کو مرلی کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں ”میں کہہ رہا تھا۔“ جاگی کا مندر میں گئی ہے اگر مرلی دھر کو اس پر کوئی شبہ ہو گیا تو وہ کی سمجھت میں پھنس سکتی ہے۔“

”اوہ! اس مرتبہ روپ متی کی آنکھوں میں بھی تشویش پارا بھر آئی۔ ”بات ہے تو تشویش کی لیکن ہمیں ابھی امید ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دن کے وقت اس مندر میں سیکڑوں لوگ ہوتے ہوتے ہیں۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کسی گڑبڑ کا فہم نہیں ہو سکتا۔ ویسے ممکن ہے وہ مندر سے نکل کر دفن و قبر کے لیے بازار کی طرف نکل گئی ہو۔ تم کھانا کھاؤ۔ پریشان مت ہو۔ آجائے گی۔“

اس مرتبہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔ بجائے کیوں میری پچھنی جس کسی گڑبڑ کا ڈر نہ رہا۔ روپ متی۔ روپ متی کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔

چار بج گئے۔ نہ تو جاگی واپس آئی تھی اور نہ ہی اس نے کھانا کھا دیا۔ اس نے اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی تھی۔ اب مجھے

کسی گڑبڑ کا یقین ہو گیا تھا۔ جاگی اتنی غیر ذمے دار تو نہیں تھی کہ بازار میں اس میرے پالنے کرنی رہتی اور یہاں کوئی اطلاع نہ دیتی۔

”میں دیوان سنگھ کو مندر بھیجتی ہوں۔ وہ معلوم۔“ ”نہیں۔“ مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔ ”میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہاں موتن داس یا کسی اور ایسے پجاری سے سامنا ہو جائے جس سے جاگی کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ روپ متی بھی کہتے ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔“ میں نے کہا۔ ”ہم میں سے ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ تم یہیں رہو تاکہ میں نیلی فون پر رابطہ کر کے تم سے کچھ معلوم تو کر سکوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ بات روپ متی کی سمجھ میں آگئی۔ ”جاؤ مگر اپنا خیال رکھا۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس کو تو فوراً خبر کر دینا۔“ میں نے اپنے کمرے میں جا کر پتول پتلون کی جیب میں رکھا اور باہر آیا۔ روپ متی پورج تک میرے ساتھ آئی

**خصوصیات کہانیوں کے شائقین کیلئے**

**جائے پناہ قتل**

**ایک قصہ صدیقی**

**کے رچ خیل کی پیشکش**

**کالی کہانیاں**

**قیمت - 30 روپے**

**ڈاک خرچ - 23 روپے**

حسابد  
آلوگن  
شیطان ازم  
خون آشامی  
اندراج  
طنز و مزاح  
اور دیگر جیسے موضوعات پر  
غیر متوقع انتخاب کا ایک

مارکٹ کی قیمت  
مکتبہ منسختات

14011111111111111111  
14011111111111111111  
14011111111111111111  
14011111111111111111



تھی جہاں پیار اور نیلی شیراز کھڑی تھی۔ دونوں گاڑیوں میں چائیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں اب ڈرائیونگ میں خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا اور بے پور کی سڑکیں بھی اب میرے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔

میں کار شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتا ہوا سنگتیر گیٹ اور جوہری بازار سے نکل کر توپیا بازار کی طرف آگیا۔ میں نے کار ایک کشادہ گلی میں موڑ کر روک لی۔ اجنبی بند کر کے نیچے اتر آیا۔ دروازے لاک کیے اور ایک اور گلی میں سے گزرتا ہوا گنیش مندر کی طرف آیا۔

اس وقت چھ بجنے والے تھے۔ بازاروں میں بھی خوب رونق تھی اور مندر میں بھی سیکڑوں لوگوں کی آمد رفت تھی۔ روپ متی کی اس بات پر بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں کوئی لڑ بڑ نہیں ہو سکتی تھی لیکن مندروں کے بارے میں میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ یہاں تو ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں کسی انسان کو اس طرح غائب کر دیا جاتا تھا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا اور کل رات میں نے مندر کے پچھلی طرف جو پڑیچ رہا دیاں دیکھی تھیں، ان کے بارے میں میں کہہ سکتا تھا کہ اکیلا ان میں داخل ہونے کے بعد واپس نہیں آسکتا تھا۔

مندر میں واقعی کھوے سے کھوا جھیل رہا تھا۔ کوئی پوجا کے لیے آیا ہوا تھا کوئی منت پوری ہونے پر ہیمنت چڑھانے اور کوئی منت ماننے۔ تمام پجاری اور پنڈت اس وقت بہت معصوف تھے۔ انہیں حقیقتاً سر جھکانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

میں مندر میں گھوم پھر کر موتن داس کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ بالآخر میں نے ایک پنڈت کو روک لیا جو ایک تھالی اٹھائے تیزی سے ایک طرف جا رہا تھا۔ اس تھال میں ناریل، مٹھائی، پھولوں کے علاوہ گنیش دیوتا کی ایک مورتی بھی رکھی ہوئی تھی جس کی اونچائی آٹھ انچ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ مورتی سونے کی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو ہیرے جڑے ہوئے تھے جو بلبوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس پنڈت کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر جوڑا بھی چلا آ رہا تھا۔ عورت کی عمر چالیس اور مرد کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ان کے قیمتی لباس ان کی مالی پوزیشن کی عکاسی کر رہے تھے۔

میں نے پنڈت سے موتن داس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بھوس کیڑے ہوئے بولا۔

”اتے میں نے آج صبح دیکھا تھا۔ اس کے بعد نظر نہیں

آیا۔“

میں نے اس کے ساتھ کھڑے ہوئے جوڑے کی طرز دیکھا۔

”ہنگوان نے پہلا پتہ دیا ہے۔ ہیمنت چڑھانے آئے ہیں۔“ عورت نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا کہ تھالی کی طرف اشارہ کیا، ”کھالھ سونے کی مورتی ہے ہنگوان کھس ہو جاویں گے۔“

”پہلا بیٹا۔ اس عمر میں۔“ میں نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا۔

”بیٹا مجھے نہیں میری بہو کو ہوا ہے۔“ عورت نے غصہ کر جواب دیا اور اپنے بندے کے ساتھ پنڈت کے پیچھے چل پڑی۔

میں کچھ دیر مزید اس مندر میں گھومتا رہا پھر باہر آگیا۔ ایک طویل چکر کاٹتا ہوا مندر کی پچھلی طرف والی گلیوں میں آیا۔ وہ گلی تلاش کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔

میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھنڈر نما عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شام کا اندھیرا جھیل چکا تھا اور اس گلی کے کچلے ہوئے دروازے سے لائین کی زد روشنی چمک رہی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے ہوتا ہوا باہر ایک دم دروازے کے سامنے آگیا۔ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ چٹون کی جیب میں پتول کے دستے پر رکھ لیا تھا۔ آگہ کوئی بڑ ہو تو پتول فوراً ہی جیب سے نکالا جاسکے۔

کمرے میں روشنی دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید سوز داس کمرے میں موجود ہو گا لیکن وہ کوئی اور تھا جو جھلکا چار دیواری پر لیٹا بیڑی کے نش لگا رہا تھا۔ کمرے میں بیڑی کے پتے کی بو بھری ہوئی تھی۔

”کک۔ کون ہو بھایا۔ کون ہو تم؟“ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ بھی کوئی پجاری ہی تھا۔ اس کے جسم پر بھی پلیرجی کا لمبا کرت تھا۔ پیشانی پر قشقہ لائین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

”درو نہیں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

میں نے کہتے ہوئے ہاتھ جیب سے نکال لیا۔

”تو پھر کون ہو تم۔ یہاں کیا لینے آئے ہو۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”میں دراصل سوامی موتن داس سے ملنے آیا ہوں۔“

اس نے آج اس وقت مجھے یہاں بلایا تھا۔ میں کہنے لگا۔

ادھر ادھر دیکھتے لگا۔ کل یہاں زمین پر بھی ایک بستر بچھا ہوا تھا جو اس وقت غائب تھا۔

”موتن داس۔“ پجاری بڑ بڑایا ”وہ تو آج صبح ماؤنٹ آہو چلا گیا ہے بھایا۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتاؤ۔“ اپنے احسان پر بجا کرانی ہوئے ہون کرانا ہوا کی اور سیوا ہو تو ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”ایک ہاتھ آشرم کے لیے ایک پنڈت کی ضرورت تھی۔ کوئی گھار تو ملے کی نہیں۔ سوامی موتن داس کو بڑی مشکل سے تار کیا تھا وہ بھی بھاگ گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ماؤنٹ آہو کہاں ہے اور وہ کون سے مندر میں گیا ہے؟“

”ماؤنٹ آہو تیریاں سے باجنگ سولہ میٹر دور ہے بھایا۔“ اس نے جواب دیا ”سیلائیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہو تا وہاں بہت سے جین مندر ہیں۔ وہ کہیں بھی جا سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ دھننے داد۔“ میں اس کا شکریہ ادا کر کے واپس آگیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ ان ٹھگ و تارک گلیوں سے نکل کر اپنی کار تک پہنچنے میں مجھے آجھا ٹھنڈا لگ گیا تھا۔ میرے دماغ میں اندھیاں سی چلی رہی تھیں۔ موتن داس واقعی بھول نکلا تھا۔ شاید وہ کسی سنگین معاملے میں نہیں الجھتا چاہتا تھا کسی لیے بھاگ گیا یا ممکن ہے صبح مندر میں اس نے حملہ کر کے ہمارے بارے میں بتا دیا ہو اور کسی خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے چپکے سے فرار ہو گیا تھا۔

مجھے جاگنی کی حماقت پر تازہ آ رہا تھا۔ وہ مندر میں آئی تھی۔ اس پر حملہ دھڑکے توکل ہی ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے آج اسے دیکھ کر اس کا شبہ یقین میں بدل گیا ہو اور وہ کسی طرح جاگنی کو وہاں سے نکال لے گیا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اسے رام کڑھ جھیل والے مندر ہی میں لے گیا ہوگا۔

جیب میں حویلی واپس پہنچا تو آٹھ بجنے والے تھے۔ دھن متی لان میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر تیز قدم اٹھاتی ہوئی پورج کی طرف آئی جہاں میں کار روکنے کے بعد پورج اتر رہا تھا۔ روپ متی کو اکیلے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جاگنی فرار نہیں ہوئی تھی۔

”کیا ہوا۔ جاگنی کا بیٹھ جتا چلا؟“ اس نے قریب آتے ہی پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”اور موتن داس نہ وہ پجاری بھی بھاگ گیا ہے جس نے کل رات جھیل سے مندر اور حملہ دھڑکے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔“

”تو موتن داس کے بارے میں معلوم کیا؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”اور موتن داس کے بارے میں

بولی۔

”رام کڑھ جھیل والے مندر۔“ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا لان میں آگیا ”موتن داس ڈروپک آدمی ہے۔ کل رات اس نے پتول دیکھ کر حملہ دھڑکے بارے میں کچھ بتا تو دیا تھا گھر وہ کسی سنگین معاملے میں نہیں الجھتا چاہتا تھا۔ اس لیے آج صبح ہی ماؤنٹ آہو کی طرف بھاگ گیا۔ فرار ہونے سے پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے مندر بھی گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے حملہ دھڑکے ہمارے بارے میں بتا دیا ہو۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”کل رات حملہ دھڑکے جاگنی کو دیکھا تھا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے جاگنی کو سنگ پور میں دیکھا تھا۔ وہاں وہ کسی اور ملے میں تھی جبکہ کل رات وہ ساڑی پہنے ہوئے تھی اور بہت بدلی ہوئی تھی۔ جاگنی نے بھی اسے اپنے بارے میں ایک نئی کہانی سنا دی تھی۔ بہرحال وہ جاگنی کو دیکھ کر شبہ میں مبتلا ہو گیا تھا اور آج جب جاگنی کو اس نے دوبارہ مندر میں دیکھا تو اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ یہ جاگنی ہی ہے اور ہو سکتا ہے موتن داس نے بھی صبح اسے ہمارے بارے میں بتا دیا ہو۔ اس طرح جاگنی اس کے ہتھے چڑھ گئی اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ اسے رام کڑھ جھیل والے مندر ہی میں لے کر گئے ہوں گے۔“

”رام کڑھ جھیل یہاں سے میں بائیں کھو میٹر کے فاصلے پر ہے۔“ روپ متی نے کہا ”اور وہ مندر اس جھیل سے بھی تقریباً دو کھو میٹر آگے پہاڑیوں میں ہے۔ میں ٹھاکر کو فون کر کے بلاتی ہوں۔“

”ٹھاکر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”تم مجھے رام کڑھ کا راستہ بتا دو۔ میں اکیلا جاؤں گا۔“

”میں تمہیں اکیلے تو نہیں جانے دوں گی۔“ روپ متی جلدی سے بولی ”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے تیار ہونے میں صرف دو منٹ لگیں گے۔“

وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی لان سے نکل کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی ہال ٹرنکرے میں آگیا۔ روپ متی اس وقت اوپر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کے فوراً ہی بعد مندری نے میرے سامنے جائے کا کپ رکھ دیا۔ میرا خیال ہے اس نے مجھے باہر لان میں دیکھ کر جانے کا پالی چڑھا دیا تھا۔

میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھا ہوا تھا اور میں واقعی بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں کپ

انہا کر بکلی چسکیاں لینے لگا۔

تقریباً دس منٹ بعد روپ متی میڑھیوں سے اترتی ہوئی نظر آئی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو وہ ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اب اس نے ٹانگوں سے چسکی ہوئے اسٹون واش نیلی جینز اور اوپر سیلوئس کی شرٹ پہن لی تھی اس کا رنگ بھی ہکا بٹایا تھا۔ پیروں میں جو گرز تھے۔ کمر جینز کی بلیٹ میں اس نے پستول ڈس رکھا تھا جو نی شرٹ کے نیچے چسپ گیا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ روپ متی نے مندری کو اور برآمدے میں اکروپان سٹھ کو بھی چھہ بدایات دیں اور شیراز کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ میں اوپر سے گھوم کر پیٹرن سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار آؤٹ سر گمر سے کھل کر گھٹا دروازہ بازار سے ہوتی ہوئی رام گنج بازار پار کر کے دیانند مارگ کی طرف نکل آئی۔ ابھی رات کے نو بجے تھے۔ بازاروں میں خوب گما گما تھی اور ٹریفک بھی زیادہ تھا جس کی وجہ سے کار کی رفتار بھی کم ہی رہی تھی۔ چار دروازہ سے ذرا آگے نکل کر روپ متی نے کار ایک پیڑوں پر پارک کر دی۔

روپ متی نے کار کی کینگی فل کر دی۔ میں نے پتلون کی جیب سے نوٹوں کا بڈل نکال کر بیل ادا کر دیا اور روپ متی نے کار آگے بڑھا دی۔ ایک دوسروں پر گھومنے سے فار کارخ شال کی طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک سیدھی رام نرہ تحصیل کی طرف چلی گئی تھی۔

شہر سے نکلتے ہی آبادی چھدری ہو گئی اور پھر ایک دم ویرانہ شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف ریگستان تھا۔ دور کہیں کہیں کوئی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دے جاتی۔

روپ متی نے رفتار بڑھا دی۔ اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھا۔ دس کلومیٹر کے سفر کے دوران میں سامنے سے آتی ہوئی صرف ایک گاڑی دکھائی دی تھی جو نہایت تیز رفتاری سے ہمارے قریب سے گزر گئی تھی۔

اور پھر آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہو گئیں جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئیں۔

تقریباً دس کلومیٹر تک ہم پہاڑیوں میں سفر کرتے رہے۔ بل کھاتی ہوئی سڑک بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی اور پھر ڈھلوان راستہ شروع ہو گیا۔ ایک موڑ گھومتے ہی روپ متی نے کار روک لی۔ سامنے خلیب میں بہت دور روٹھیاں ٹھنٹائی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کچھ روٹھیاں ٹھکری ہوئی اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

”وہ ماہی گیروں کی بستی ہے۔“ روپ متی نے

روٹھنیوں کے پھیلے ہوئے جمند کی طرف اشارہ کیا۔ ”بلکہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو جمیل کے اس کنارے پر پہاڑی کے دامن تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے دوسری طرف جمیل ہے۔ وہ جو اطراف میں لگاؤ کا دور دور پھیلی ہوئی روٹھیاں دیکھ رہے ہو تا وہ کانچ ہیں۔ پچھلے دنوں یہاں کچھ سیسل ڈپٹی کی وارداتیں ہوئی ہیں جس وجہ سے بہت کم لوگ رات کو یہاں ٹھہرتے ہیں۔ یہ تو تفریح کے لیے آنے والے لوگ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی شرلوٹ جاتے ہیں۔ البتہ عیاچی کے لیے آنے والے ہر خوف سے بے نیاز ہو کر رات بھر کے لیے یہاں رک جاتے ہیں۔“

میں دور تک پھیلی ہوئی ماہی گیروں کی بستی اور اس کے دوسری طرف جمیل کو دیکھتا رہا۔ ابتدائی تاریکیوں کا چاند فو چاندنی بہت مدھم تھی۔ دور تک چمکتے ہوئے پانی کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جمیل بہت بڑی تھی اور اس کے اطراف میں ناریل کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ جمیل کے چاروں طرف دور دور تک پہاڑیوں کے پہلے نظر آ رہے تھے۔

”یہ بیٹھے پانی کی جمیل ہے۔“ روپ متی کہہ رہی تھی ”یہاں سے پکڑی جانے والی چھلیاں۔“

”ہم پھیلیوں کے شکار کے لیے یہاں نہیں آئے روپ متی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”وہ مندر کہاں ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔“

”جمیل کے پرلی طرف پہاڑیوں میں۔“ روپ متی نے سامنے اشارہ کیا ”ایک راستہ تو اس طرف سے جانا ہے۔ بستی کے قریب سے ہو کر جمیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ اور دوسرا راستہ اس طرف پہاڑیوں میں ہے۔ اس طرف ہم گاڑی زیادہ آگے نہیں لے جاسکیں گے۔ تقریباً دو کلومیٹر پیدل چلنا ہوگا۔“

”ہم اس طرف سے جائیں گے۔“ میں نے کہا ”بستی کی طرف سے گاڑی دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے۔ تم پیدل چل سکتا ہو؟“ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بالکل چل سکتی ہوں۔“ روپ متی سنبھل کر بیٹھ گئی اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

کار تقریباً سو گز تک اس راستے پر چلتی رہی اور پھر روپ متی نے اسے دائیں طرف ایک اور راستے پر موڑ دیا۔ راستہ بل کھاتا ہوا قسبا تک اور غیر ہموار تھا۔ روپ متی بہت احتیاط سے ڈرائیو کر رہی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک پہاڑیوں میں اس پر چڑھتے رہے۔

بے کے بعد روپ متی نے کار روک لی اور انجن بند کرنے کا فیصلہ کر رہے دیے تھے۔ جن کی نیز البتہ بیٹھ بیٹھ چلے رہی تھی اور ان جھاڑیوں سے آگے جھاڑیوں پر پڑی تھی جس نے راستہ روک رکھا تھا۔

”اس نے اب یہاں سے آگے پیدل چلنا پڑے گا۔“ اس نے لڑکھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیش چڑھا دیا اور دروازہ کھینچ کر باہر آیا۔ روپ متی نے ہیڈ لمپس بند کر دیے اور دروازہ بند کر دیا۔

یہ لمپس بچھ جانے کے بعد کافی دیر تک آنکھوں کے اندر اچھا لگا رہا اور جب آنکھیں اندھیرے سے کھولیں تو ہم اس چٹان پر چڑھ کر دوسری طرف آگئے۔

ہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ایک پڑتی ٹنگ سی لی گئی۔ روپ متی میرا ہاتھ چکڑے ہوئے چل رہی تھی۔ وہ اس مندر کے بارے میں بھی پتا رہی تھی۔ یہ ماہجن مندر تھا جو صدیوں پہلے تعمیر ہوا تھا۔ بے پور باراجانے جمیل سے مندر تک ایک سربھی کھدوا دی گئی تھی۔ یہ مندر مٹی کی ضرورت پوری کی جاسکتی۔ یہ سربھی کے قریب سے گزر کر پہاڑیوں میں مل کھاتی ہوئی دوبارہ سے جا ملتی تھی۔

روپ متی نے مجھے جین مت اور ہندومت کا فرق بھی بتا دیا۔ جین مت کے پیروکار صرف ایک بھگوان کو مانتے ہیں۔ ہندومت کے ماننے والوں کے بھگوان لاتعداد ہیں۔

پ سے لے کر کچھ تھی تک کی پوجا کرتے ہیں۔ انہیں درختوں اور پتھروں میں اور آسمان پر چمکتے ہوئے چاند اور ستاروں میں بھی اپنے بھگوان بیٹھے نظر آتے ہیں۔

نہایت اس میں کیش دیوتا کے مندر میں تھا اور مجھے

تھا کہ وہ ماؤنٹ آبو کے کسی جین مندر کی طرف گیا

کی کا مطلب یہ ہوا کہ پڈت وغیرہ۔“

”ان پڈتوں کا کوئی دھرم نہیں۔“ روپ متی نے میری

”نہایت لوگ صرف دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوستان

دھرم کے لوگ نہیں ہیں۔ ان پر قبضہ کرنے کے لیے یہ

پکڑی پکڑی بڑی سازشیں کرتے ہیں۔ کسی مندر پر قبضہ

کے لیے اپنے حریف کو موت کے کھاتے میں ڈال دیتا ان

ہماری معمولی بات ہے۔ دولت کے لیے یہ لوگ کسی بھی

سامانے تھکا دیتے ہیں۔ یہ مندر سازشوں کا گڑھ

ہماریشوں کے اؤٹسے آج تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو

ان مندروں میں کیا ہوتا ہے۔“ وہ رک کر ادھر ادھر

دیکھنے لگی پھر ایک اور پکڑ پکڑی پر مڑتے ہوئے بولی ”لوگ ان مندروں کو پوتر اور پڈتوں کو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ وہ دور دور سے مندروں کی یا ترا اور پوجا کے لیے آتے ہیں۔ کتنی چیزیں سمجھتے چڑھاتے ہیں۔ عورتیں اپنے زور تک اوتار کر پتھروں کی صورتوں کے چٹروں میں ڈال دیتی ہیں اور یہی ا معصوم اور بھولی عورتیں ان بدکرداروں پڈتوں کی ہوس کا شکار بنتی ہیں۔ انہیں مندروں ہی میں کسی طرح غائب کر دیا جاتا ہے۔ ان دھرم چاروں کے کردار اس قدر گھٹاؤنے ہیں کہ انہیں سوچ کر ہی گراہیت ہونے لگتی ہے۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

تھی۔“

”کیا حکومت۔۔۔“

”حکومت کیا کرے۔“ روپ متی نے ایک بار پھر میری

بات کاٹ دی ”یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر

حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے

راجے ہمارے ان پڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے

اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پڈت کو مندر میں

آنے والی ایک لڑکی کے ہلاک کار کے جرم میں پولیس نے

گرفتار کیا تھا تو پورے شہ

گئی۔ دکانوں کے شر تو ذکر انہیں لوٹ لیا گیا۔ اتحاد و گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ مندروں کے پنڈت اور بچاری بھی کر رہے تھے جنہیں بنگلوان کا دنا سہنا جاتا ہے اور بالآخر سرکار کو ان کے سامنے ٹھیک دینے پڑے۔ اس پنڈت کو بے گناہ قرار دے کر باعزت طریقے سے رہا کر دیا گیا۔

میں اگرچہ ہندوستان کے ان پنڈتوں اور مندروں کے بارے میں تھوڑا بہت جان چکا تھا لیکن روپ متی جو انکشافات کر رہی تھی اور واقعی بڑے سسٹی خیز تھے اور اب میں خود بھی شاید کسی ایسے ہی سسٹی خیز تجربے سے گزرنے والا تھا۔

روپ متی ایک جگہ رک گئی۔ نقیب میں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر سرخ جلی جلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس سے ذرا نیچے دو مختلف جگہوں پر بھی بلب روشن تھے۔

”وہ رام گڑھ مندر ہے۔“ روپ متی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”یہ مندر کا عقی حصہ ہے جو چٹانوں سے ملا ہوا ہے۔ ان چٹانوں میں پہلے غار ہوا کرتے تھے جو اب مندر میں شامل ہیں اور شاید یہ مندر اس جگہ بنایا بھی اسی لیے گیا تھا کہ ان چٹانوں اور غاروں سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکے۔ مندر کا سامنے کا حصہ دوسری طرف ہے۔ ہمیں اس طرف سے گھوم کر جانا ہوگا۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں غور سے اس طرف دیکھ رہا تھا مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سامنے کے رخ سے مندر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم فوراً ہی نظروں میں آسکتے تھے۔ اگر دن کا وقت ہو تا تو کچھ باتری بھی ہوتے اور ہم ان کی آڑ میں اندر گھس جاتے لیکن اس وقت بیکہ رات کے دس بجے والے تھے کسی باتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ”اس طرف آؤ۔“ روپ متی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم چٹانوں پر اترتے ہوئے ایک طرف چلے گئے اور تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے رک گئے۔ ہمارے سامنے فصیل نما دیہی دیوار تھی۔

”اسی دیوار پر چڑھ کر ہم دوسری طرف جاسکتے ہیں۔“ روپ متی نے اشارہ کیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کسی قلع کی فصیل کی طرح وہ دیوار تقریباً بیس فٹ بلند تھی۔ چٹانوں سے بنی ہوئی اس دیوار پر چڑھنا میرے لیے اگرچہ زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن روپ

متی کے بارے میں نہیں کہہ سکتا وہ اتنی اچھی دیوار کے کی یا نہیں۔

”تم اس دیوار پر چڑھ سکو گی؟“ میں نے اس کی دیکھا۔

”زیادہ مشکل تو نہیں۔“ اس نے جواب دیا ”چڑھنے میں اور ابھرے ہوئے ہیں۔ کوئی مشکل تو نہیں ہے۔“

”تو چلو پھر۔“ میں نے اشارہ کیا۔

اس فصیل نما دیوار کی تعمیر کے لیے پتھر استعمال کیے گئے تھے جنہیں تراش کر ایک دوسرے بجایا گیا تھا۔ یہ پتھرا ہری طرف ابھرے ہوئے تھے۔ روپ متی ان پتھروں پر ہاتھ پیر تھا کر اوپر چڑھنے میں نیچے کھڑا دیکھتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ گر گئی تو میں اسے کسی تعین حادثے سے بچاؤں گا؟ وہ تقریباً دس فٹ اوپر جا چکی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ پتھروں پر ہاتھ پیر بھاتی ہوئی اوپر چڑھتی رہی اور کئی کے بغیر اوپر پہنچ گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دیوار پر چڑھنے لگا۔ ان ابھرے ہوئے پتھروں کی وجہ سے دیوار کی پیش نہیں آئی اور میں بھی آسانی سے اوپر چڑھا۔ دیوار خاصی چوڑی تھی۔ اس پر کھڑے ہو کر آگے چلا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف بھی پتھرا کی طرح ابھرے تھے۔ دیوار پر چڑھنا تو بہت آسان ثابت ہوا تھا۔

اترنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں دیوار پر بیٹھا اور دھڑک دھڑکے لگا اور پھر اترنے کی طرف چلنے لگا۔ تیز ہوا کی وجہ سے توازن پر قرار رکھنا ہو رہا تھا۔ روپ متی..... پیچھے کر آہٹ میرے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

میں ایک جگہ رک گیا۔ مجھے بالآخر وہ جگہ ملی جہاں سے نیچے اترنا جاسکتا۔ دیوار کے اندر کی طرف فٹ بہت کم نکلی کا ایک کھبا کھڑا تھا جس پر بنگلوان اور اس پر شیش بھی لگا ہوا تھا۔ ایسے شیش عام طور پر لگے ہوتے تھے جن کے کھبوں پر نظر آتے ہیں لیکن اس ساتھ کوئی ناروغیہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے نیچے نہیں گئی کہ دیوار کے اندر کی طرف مناسب فاصلہ قائم کر کے اور کھبے بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے دیوار کے حصے کو روشن رکھنے کے لیے یہ کھبے لگائے گئے ہوں۔ بعد میں کسی خرابی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کات کرنا نکال لیے گئے تھے اور اب صرف کھبے

نہانے روپ متی کو سارا دے کر آگے بڑھایا۔ وہ کھبے کے آہٹ آہٹ نیچے چھلنے لگی۔ اس کے پیچھے ہی اسی طرح نیچے اترنے لگا۔

مندر کی عمارت اس دیوار سے تقریباً بیس گز کے فاصلے بائیں طرف اور پتھروں کے مندر کے مرکزی گیٹ کی پہنچا جاسکتا تھا جبکہ دائیں طرف مندر کی عمارت کا حصہ چٹانوں سے ملا ہوا تھا۔

اس طرف آؤ۔“ روپ متی نے پچھلی طرف اشارہ کیا ایک مچھ پھیاں آچکی ہوں۔ اس طرف دو چھوٹے گے ہیں۔ کسی ایک دروازے سے اندر داخل ہونے کی جاسکتی ہے۔“

میں دونوں اس طرف چل پڑے۔ چھوٹے چھوٹے پتھر چٹانوں سے گرا کر لڑکھک رہے تھے۔ سامنے میں کی آواز پھیل رہی تھی۔ ہم کچھ اور محتاط ہو کر چلے

ہلا دروازہ اس طرح بند تھا جیسے اڑنا ٹٹ ہو۔ اس میں سی جھری بھی نہیں تھی جس سے کوئی کوشش کی جاسکتی۔ اس سے چند سو فٹ آگے دوسرا دروازہ خاصا فوارا اس میں اتنا تھا تھا کہ میں اپنا ہاتھ پھیلا کر اندر کر سکتا تھا۔ انکھوں کی گرفت میں سے لے کر دروازے کو دھکیلتے تھے کہ اس کا نیچے کا قبضہ ٹوٹا ہوا ہے۔ دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو اس میں اتنا تھا تھا کہ میں اپنا ہاتھ پوری طرح اندر داخل کر سکتا تھا۔ اندر زنجیر والا کنڈا لگا ہوا تھا اور یہ ہماری خوش قسمتی اس کنڈے میں کوئی آلا نہیں تھا۔ میں نے زنجیر ہٹا کر اسے کھینچے دھکیلا تو چرچاہٹ کی آواز سامنے میں

بڑا ٹپک اور تنگ سی راہداری تھی۔ میں نے بہتول سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دیوار سے چپک سے بڑھنے لگا۔ روپ متی نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

راہداری خاصی طویل ثابت ہوئی۔ اگلے موڑ پر ہم نے بائیں طرف بہت دور مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ مندر کا سامنے کا حصہ تھا اور اس طرف کسی جگہ نہ رہا تھا جس کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم

پتھر کے آگے راہداریوں کا ایک اور چوڑا ہاتھ دیا۔

دی تھی۔ ہم اسی طرف چل پڑے۔ ہم دونوں نے جو گزر پھین رکھے تھے ہمارے قدموں کی بہت جگہ سی آواز ابھر رہی تھی۔

اس راہداری کے اختتام پر دائیں بائیں اور راہداریاں تھیں اور وہ روشنی دافیں طرف سے آ رہی تھی۔ ہم اس طرف مڑ گئے۔ یہ راہداری زیادہ طویل نہیں تھی۔ البتہ آگے اور راہداریاں تھیں۔ مجھے ان راہداریوں کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ یہ مندر تھا یا کوئی بھول بھلیاں۔ کسی کسی راہداری میں روشنی تھی۔ جس طرف روشنی نظر آتی، ہم اسی طرف چل پڑتے اور بالآخر ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔

نکلی کا وہ دروازہ پانی طرز کا اور خاصا ذنی تھا۔ میں نے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ کھٹکا چلا گیا۔ پہلے میں اندر داخل ہوا اور پھر روپ متی۔

یہاں بھی سامنے ایک طویل راہداری تھی جس کے اختتام پر روشنی ہو رہی تھی۔ روپ متی نے بھی بہتول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ہم دونوں دبے قدموں آگے بڑھتے رہے۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک کسی سے آمانا سامنا نہیں ہوا تھا۔ دیسے روپ متی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہاں کسی کو غائب کر دیا جائے تو اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔

اس راہداری میں دائیں بائیں کمرے بھی تھے۔ کسی میں دروازہ تھا اور کسی میں کھنکھری راستہ بنا ہوا تھا۔ میں نے ایک دو دروازے کھول کر بھی دیکھے تھے تمام کمرے خالی تھے۔

اور پھر ہلکے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ کم از کم دو آدمی تھے جن کی اب باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”تم اس کمرے میں جاؤ۔“ میں نے روپ متی کو ایک مخربانی راستے میں دھکیل دیا۔ ”اور جب تک میری آواز نہ سنو باہر مت آنا۔“

میں خود سامنے والے ایک کمرے میں گھس گیا۔ یہاں بھی دروازہ نہیں تھا مخنکھری راستہ تھا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور اپنی تمام تر توجہ ان آوازوں پر مرکوز کر دی۔ وہ دو آدمی تھے جو بائیں کمرے ہوئے اس راہداری میں داخل ہو چکے تھے۔ آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

اور پھر وہ دونوں اس کمرے کے سامنے سے گزر کر آگے نکل گئے۔ میں نے جھانک کر دیکھا اور پھر باہر نکل آیا۔

"پنڈت جی۔" میں نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "ذرا ہماری ایک بات تو سنتے جانا۔"

وہ دونوں ٹھنک کر رک گئے اور پھر بیک وقت تیزی سے پیچھے ہڑے۔ وہ دونوں میرے پستول کی زد میں تھے۔ راہداری کے آخری سرے سے آنے والی مدھم سی روشنی میں ان کے چہروں پر دشت سی نظر آ رہی تھی۔

"تم کون ہو مورکھ؟ اور رات کے اس سے یہاں کیسے آئے۔" ان میں سے ایک نے میرے چہرے پر نظر سجماتے ہوئے کہا۔ وہ قدرے بھاری بھر کم اور لمبے قد کا مالک تھا۔ سر انڈے کے جھلکے کی طرح صاف لیکن مونچھیں گویا پورے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی بچہ ان مونچھوں کو پکڑ کر آسانی سے جھولا جھول سکتا تھا۔ اس نے پہلی دھوٹی پہن رکھی تھی اور جسم کے اوپر والے حصے پر ساڑی کی طرح پہلی چادر لپی ہوئی تھی۔ ماتھے پر سرخ ٹیکا اور آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔

دوسرا آدمی بھی اسی طے میں تھا۔ البتہ اس کا قد نسبتاً چھوٹا اور توند منکے کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ "ہم بھاڑیوں میں راستہ بھٹک گئے تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "کسی طرح اس مندر میں پہنچ گئے لیکن مندر کے اندر آکر پھر بھٹک گئے۔"

"مگر یہ بندو قری۔" وہ پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اسے جب میں رکھ لو اور آؤ۔ میں تمہیں باہر کا راستہ بتاؤں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ تم کوئی بڑی واردات کر کے بھاگے ہوئے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر تم مجھے باہر کا نہیں اندر کا راستہ بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" وہ چونک گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ شکرست میں کوئی بات کی۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے اس طرف چلو۔"

اور پھر جو کچھ بھی ہوا میری سمجھ میں نہیں آکا۔ اس نے نہایت تیزی سے گھوم کر میرے پستول والے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی اور پستول میرے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اچھلا اور اس کمرے میں کسی جگہ جاگرا جہاں چند لمبے پہلے میں نے پناہ لی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اپنی حیرت پر قابو پاسکتا، وہ دونوں بچھ سے لپٹ گئے۔

میں نے فوراً ہی اپنے خواص پر قابو پایا اور اپنے آپ کو ان کے ٹکپنے سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ گل جھجھ

والے نے میرا بازو موڑ کر پشت سے لگا دیا۔ جبکہ وہ نے سامنے سے آکر میرے پیٹ پر تین چار کراسے کر گھونٹے رسید کر دیے تھے۔

"بتاؤ تم کون ہو؟" مونچھوں والے کے منہ غراہٹ نکلی "مندر کے تمام دروازے بند ہیں۔ دو اونٹ گیت کے اندر موجود ہیں۔ تم اندر کیسے داخل ہو سکتے تم کون ہو اور اندر کیسے آئے ہو؟"

"میں بتاتی ہوں پنڈت جی۔"

روپ متی کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔ "ہیلے! اسے چھوڑ دو۔ ورنہ میں تم دونوں کی کواڑا دوں گی۔" اس مرتبہ روپ متی کے منہ سے ملی خوفناک غراہٹ نکلی تھی۔

وہ دونوں پنڈت اچھل پڑے اور پھر روپ متی ہاتھوں میں پستول دیکھ کر گل جھجھوں والے پنڈت کو گرتے سے آزاد کرنا ہی پڑا۔ میں نے آواز دی ہٹو! پوری قوت سے اس کی ٹانگ پر پھینکی سے وار کر دیا۔ ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کی ٹانگ سے سینے والا غنا مونچھوں کو اکوڑھ کر آہوا ٹھوڑی کو تر کر کے لگا۔ ام سنبھلنے سے پہلے میں نے بڑی تیزی سے سائیڈ لگ لگ اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر ٹانگ پر لگی۔ وہ لڑا اپنے پیچھے کھڑی ہوئی روپ متی سے ٹکرانیا۔

میں غلطی ہو گئی کہ ہم دونوں ایک ہی لائن میں آئے اور روپ متی کو پستول استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ روپ متی نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر مونچھوں والے نے اس کے سینے پر زور دار گھونسا رسید کر دیا۔ روپ متی نے گرتے ہوئے پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل

فرش پر پھسلتا ہوا اور چلا گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ دوسرا پنڈت مجھ پر حملہ آور ہو کر میرے ہی کمرے میں چھتا ہوا اس طرف دوڑ پڑا جس طرف وہ آئے تھے۔

میں نے بھی سنبھل کر اس کے پیچھے دوڑنا لگا۔ اندیشہ تھا کہ اگر وہ بھاگ نکلے گا کلاب ہو گیا ہو جائے گی۔

میں نے دور ہی سے... جھلاٹ لگا دیکھ کر اپنی ٹانگیں کھینچ کر اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر کر پنڈت کا سر فرش پر تھا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ میں نے موقع دیے بغیر اٹھ کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی

تھوڑی دیر میں وہ اس طرف لے آیا جہاں دوسرا پنڈت روپ متی ختم گھٹا تھا۔

وہ نظر بھی بڑا دلچسپ تھا۔ روپ متی پشت کے بل فرش پر لیٹی۔ پنڈت اس کے اوپر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ اس ایک ٹانگ روپ متی کے ایک طرف تھی اور دوسری دوسری طرف۔ روپ متی نے اس کی بڑی بڑی مونچھوں کو ہاتھوں کی مٹھلیوں میں جکڑ رکھا تھا اور زور زور سے لہرے رہی تھی جبکہ پنڈت اپنی مونچھوں کو چھڑانے کے اس کے سینے پر گھونٹے برسا رہا تھا۔

مجھے روپ متی کے ساتھ رہتے ہوئے تین چار مہینے بچے تھے۔ وہ اب تک بڑی بڑول اور کم ہمت ثابت ہوئی۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتی لیکن اس وقت وہ بالکل ثابت ہو رہی تھی۔ سینے پر ہتھوڑوں کی طرح گھونٹنے کے باوجود اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی رہی۔

میں نے اپنے حریف کو ایک اور زوردار ٹھوکری اور پھوں والے پنڈت کی طرف لپکا اور اس کے پیلو پر زور لگ کر رسید کر دی۔ وہ ایک طرف الٹ گیا۔ اس کے منہ ایک بار پھر چیخ نکلی تھی۔ اس کی مونچھیں ابھی تھک چکی تھیں۔

تقریباً تین گز آگے دیوار کے قریب فرش پر پڑا ہوا لپٹا رہا تھا۔ میں نے لپک کر وہ پستول اٹھا لیا۔ اسی ت میرا حریف حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپکا تھا لیکن وہ ہاتھ میں پستول دیکھ کر رک گیا۔

"روپ متی! چھوڑ دو اسے۔" میں نے کہا "اب اگر یہ لڑکتے کرے گا تو میں اس کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

روپ متی نے مونچھوں کو زوردار جھکا دیا اور اسے بڑ کر تھوڑی سے الگ ہو گئی۔ وہ پنڈت دونوں ہاتھوں پر رکھے بڑی طرح سر جھٹک رہا تھا۔ اس کے منہ نالکی کراہیں نکلتی رہی تھیں۔ جیسے بڑی آذیت میں ہو اور یہ اس نے ہاتھ بنائے تو ہاتھوں پر خون دیکھ کر میں ڈانٹے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ روپ متی نے اس کی مونچھوں پر ٹیکہ خفاک دینے دیے تھے۔ اس کی ٹانگ سے تو پہلے ہی زخمی رہا تھا اور اب اوپر والے ہونٹ پر مونچھوں میں بھی لہرے لہرے لگا تھا۔

"میں تم لوگوں سے شرافت سے بات کرنا چاہتا تھا مگر تم نے لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا "اب تم لوگ مندر کے اس حصے

تک ہماری رہنمائی کرو گے جہاں اس لڑکی کو رکھا گیا ہے۔" "کون لڑکی۔ مندر میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔" چھوٹے قد والے پنڈت نے کہا۔ دوسرا اپنی تکلیف پر قابو پانے کے لیے بار بار سر جھٹک رہا تھا۔

"میں اس کا شجرہ نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا "تم سب کچھ جانتے ہو کہ آج صبح کنیش مندر سے اغوا کر کے لائی جانے والی لڑکی کہاں ہے۔ اب اگر تم نے کسی بات سے انکار کیا تو میں بلا جھجھ گولی مار دوں گا۔" میں نے کہتے ہوئے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"تم لوگ جو کوئی بھی ہو زندہ نہیں بچ سکو گے۔ تمہاری لاشیں اس مندر میں اس طرح غائب ہو جائیں گی کہ کوئی باہر کھو جی بھی نہیں دھونڈ سکے گا۔" اس پنڈت نے جواب دیا۔

میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر ٹرگر دبا دیا۔ گولی اس کی ران میں لگی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی اس کی خوفناک چیخ بھی کوچ اٹھی۔ انہیں سیدھے راستے پر لانے کا

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے میں یہ بات نوٹ کر چکا تھا کہ یہاں بہت دیر سے دھچکا مٹتی ہو رہی تھی۔ اگر ہیٹ کے دوران میں وہ دونوں بھی بار بار پھینچتے تھے اور روپ متی بھی لیکن کوئی اور شخص صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف نہیں آیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ مندر میں اگر دوسرے لوگ موجود تھے تو وہ کسی ایسے حصے میں تھے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے بے خوف ہو کر گولی چلا دی تھی۔ وہ شخص نیچے گر گیا تھا۔ اس کی ٹانگ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹانگ کو پکڑ رکھا تھا۔

"دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔" میں نے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کر دیا۔

"بب۔۔۔ بتانا ہوں۔۔۔ لگے۔۔۔ گولی مت چلائو۔۔۔"

رے۔۔۔ "وہ ہاتھ اٹھا کر پکڑا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا پھر میں نے پستول روپ متی کے حوالے کیا اور اس کمرے میں ٹھس گیا جہاں میرا پستول تھا۔ اندھیرے میں فرش پر ٹٹول کر پستول تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں پستول اٹھا کر کمرے سے باہر گیا۔

"تم دونوں آگے چلو۔ اگر کسی نے کوئی کڑ بڑیا بھاگنے کی کوشش کی تو میں بددیگ گولی مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

"بھانسن قابل چھوڑا ہی کہاں رہے۔" وہ پنڈت کراہتے ہوئے بولا۔ جس کی ٹانگ میں گولی ماری تھی۔ وہ مینڈک کی

# دست شناسی کے نئے رخ مع دست شناسی کی آسان لغت



ان لوگوں کے لئے جو کسی  
پیشہ ور دست شناس کے بغیر  
دست شناسی سیکھنا چاہتے  
ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ پندرہ روپے  
پیشگی ادائیگی آرڈر وار سال کریں

مکتبہ نفسیات  
پرنٹنگ اور پبلشنگ سروسز  
7429094  
03025551  
0302552-0302553  
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ پندرہ روپے  
پیشگی ادائیگی آرڈر وار سال کریں  
kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

میں نے ان دونوں زخمی ہڈیوں کو زور وار دھکے سے  
نہرا کر اٹھا اور وہ دونوں پیچ اٹھے تھے۔ دھکے سے دروازہ  
ٹٹا اور ان دونوں ہڈیوں کے چپٹے سے کمرے میں موجود  
بٹا چھل پڑے تھے۔ طبلے کی تھاپ رک گئی۔ ہارمونیم  
ہاوش ہو گیا اور رقص چپٹے ہوئے دوڑ کر کمرے کے ایک  
کونے میں چلی گئی۔ دوسری لڑکیاں بھی چپٹے لگیں۔  
وہ ہڈت جس نے ایک لڑکی کو دبوچ رکھا تھا، اس نے  
بٹی کر دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور حیرت انگیز پھرتی  
ہے اٹھ کر عقبی کھڑکی میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے فائر کر دیا۔  
ایک لڑکی کے دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہو گئی۔  
چھلانگ لگانے والے ہڈت کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔  
ایک اور ہڈت نے دوسری کھڑکی سے چھلانگ لگانے کی  
کوشش کی لیکن میں نے دوسری گولی چلا دی۔ میرا کسی کو  
ارے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے اس مرتبہ میں نے  
ہولی فائر کیا تھا۔  
لڑکیوں کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ وہ سب ادھر  
اُٹھ دوڑ رہی تھیں اور بالآخر ایک کونے میں ایک دوسرے  
سے پٹ کر تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان سب کے چہرے خوف  
سے پیل ہو رہے تھے۔  
اس کمرے میں چار ہڈت تھے جن میں سے ایک عقبی  
کھڑکی سے چھلانگ لگا کر غائب ہو چکا تھا۔ دو ٹٹے میں دھت  
ہو رہے تھے ان میں ایک اس مندر کا پروتہ ہری رام  
لوا تھا۔ دوسرا شاید اس کا نائب تھا اور تیسرا جس نے  
کھڑکی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی، ہڈت مٹی دھر  
تھا اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں  
دھت سی بھر گئی تھی۔  
"دونوں زخمی ہڈت، جنہیں میں نے دھکا دے کر گر گرایا  
تھا، کھڑکی کے نیچے گئے تھے۔ ایک اپنی زخمی ٹانگ کو پکڑے بیٹھا  
تھا اور دوسرا ناک اور مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر راہ رہا تھا۔  
"کون ہو تم اور یہ سب کیا ہے؟" ہڈت مٹی دھر میری  
طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔ اس نے حیرت انگیز طور پر اپنی  
بجٹ پر قابو پایا تھا "جانتے نہیں یہ کون سی جگہ ہے۔ تم  
تھوڑی پوچھنا کرو۔"

"اگے کچھ مت بولنا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا!" میں  
نے چپٹے ہوئے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کر دیا "میں  
کچھ ماہوں تو لوگ مندر کی پوچھنا تو کس طرح خیال رکھے  
ہوئے ہو تم جیسے لوگوں نے دھرم نشٹ کر رکھا ہے اور  
لوگوں کا اعتماد دھرم پر سے اٹھا جا رہا ہے۔ ویسے،" میں نے

سامنے والے دروازے کے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی  
دروازہ بند تھا۔  
ان دونوں ہڈتوں نے دروازے کے قریب رک کر  
ہماری طرف دیکھا اور پھر مونچھوں والے ہڈت نے ایک  
زور دار جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے  
ان دونوں کو دھکا دے کر اندر کر دیا اور خود بھی اچھل کر  
اندر آ گیا۔ جبکہ روپ مٹی دروازے کے باہر ہی کھڑکی رہی  
تھی۔  
اندر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور  
مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔  
بست وسیع کمر تھا۔ فرش پر دیہڑے قایلین بچے ہوئے تھے۔  
اطراف میں سرخ اور سنہری کور والے گاؤں بکھیرے ہوئے  
تھے شراب کی بوتلیں اور گلاس پورے کمرے میں بکھیرے  
ہوئے تھے۔ ایک طرف تین جوان اور حسین لڑکیاں بھی  
ہوئی تھیں۔ ان کے جسموں پر لباس برائے نام ہی تھا ان  
سے ذرا ہٹ کر دو ساندے طبلے اور ہارمونیم پر اپنے فنان  
مظاہرہ کر رہے تھے ان دونوں کے جسموں پر بھاریوں بچے  
لباس تھے۔  
ایک بے لباس رقصہ کمرے کے وسط میں طبلے کی  
تھاپ پر رقص کے نام پر بے حیائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس  
کے پیروں میں بندھے ہوئے ٹھنڈے دھڑوں کی آواز طبلے کی تھاپ  
سے زیادہ بلند تھی۔  
وہ چار آدمی تھے جو ریشمی مندوں سے ٹک لگائے بیٹھے  
تھے۔ وہ ہڈتوں والے کیوے لباس میں تھے مگر انہیں شاید  
اپنے لباس کا ہوش نہیں تھا۔ ان چاروں کے ساتھ تین عموں  
لباس میں ایک ایک لڑکی موجود تھی۔ کوئی اپنے سامنے کی گور  
میں گر کر پڑی تھی اور کوئی شراب کا گلاس اپنے سامنے کے  
ہونٹوں سے لگا رہی تھی۔ ایک ہڈت نے تویم عموں کو دیکھ کر  
اس طرح دبوچ رکھا تھا جیسے اندیشہ ہو کہ گرفت ڈھل جائے  
یہ وہ بھاگ نکلے گی۔  
اس کمرے کے پچھلی طرف دو کشادہ کمریاں تھیں جو  
کے دوسری طرف اندھیرا تھا۔ بائیں طرف ایک دروازہ تھا  
تھا جو بھڑا ہوا تھا اور اس دروازے کے قریب ہی ایک چھوٹا  
میز پر شراب کی بوتلیں اور فواکس کی ایک چھوٹی سی ٹرے  
پلاٹنگ کی دو تین ٹکلیاں اور نرسسینٹ پلاسٹک کی ایک  
تھیلی رکھی ہوئی تھی جس میں سفید رنگ کا پاؤڈر نظر آ رہا تھا  
میں نے پک جھپٹنے کی دیر میں اس کمرے کی صورت  
حال کا۔

طرح چھٹکتا ہوا ہمارے آگے چلے لگا۔ دوسرا ہڈت بھی  
مونچھوں اور ناک پر ہاتھ رکھے سر کو ہلکے ہلکے دیتا ہوا  
چل رہا تھا۔  
"میں نے پہلے ہی ہڈت ہری رام سے کہا تھا کہ پر شو  
رام سے دوستی مت لگاؤ مگر وہ نہیں مانتا۔ آج تو یہ سورما اس  
کی بھی کھلیا کھڑی کر دے گا۔" زخمی ٹانگ والا ہڈت کراہتے  
ہوئے کمرہ رہا تھا۔  
میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ پر شو رام کے نام سے  
اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ ہڈت مٹی دھر اسی مندر  
میں موجود ہے اور جا کی بھی۔  
"ہڈت ہری رام ہماری کب سے ہے۔" مونچھوں  
والے نے کراہتے ہوئے جواب دیا "پر شو رام نے تو ولا جاتی  
دارو... کی بوتلیں اور نئی نئی لونڈیاں دے کر اسے رام کر رکھا  
ہے اور اس کا دوسرا ہڈت اس نے تو ہڈت کو سفید پاؤڈر کا  
چھکا لگا دیا ہے۔ یہ پاؤڈر اس کی جان لے لے گا۔ پر وہ نہیں  
سمجھتا ہے۔ ہماری بات نہ مان کر اس نے تو ہماری کھلیا کھڑی  
کر دیا اور وہ بھی ایک لونڈیا کے ہاتھوں۔ اب وہ بھی نہ  
بچیں گے۔"  
میں نے روپ مٹی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرائے بغیر  
نہیں رہ سکی تھی۔ حالانکہ اپنی تلافی ضبط کرنے کے لیے وہ  
ایک ہاتھ سے مسلسل سینہ سلا رہی تھی۔  
کئی طویل راہداریاں گھومنے کے بعد بالآخر ہم ایک ہال  
نما کمرے میں آ گئے۔ یہاں ایک چوڑے پر کسی دیو کی مجسمہ  
نصب تھا۔ مونچھوں والے ہڈت نے آگے بڑھ کر مورتی کے  
سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بائیں طرف گھمایا۔ وہ چوڑا تقریباً چھ  
انچ اوپر اٹھ گیا اور پھر گھومتا ہوا آگے بڑھ کر رک گیا۔  
میری آنکھیں حیرت سے جھپٹی چلی گئیں۔ میں نے ان  
مندروں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس وقت اپنی آنکھوں  
سے دیکھ رہا تھا۔  
چوڑا گھومتے ہی نیچے سے موسیقی اور گانے کی آواز  
سنائی دینے لگی۔ ٹھنڈے دھڑوں کی آواز نمایاں تھی۔ چوڑے  
کے نیچے سے خانے کی میز عموں اور روشن ہو رہی تھیں۔  
میں نے ان دونوں ہڈتوں کو اشارہ کیا۔ وہ میز عموں پر اترنے  
لگے۔ ان کے پیچھے میں اور میرے پیچھے روپ مٹی بھی  
میز عموں پر اترنے لگی۔  
نیچے ایک وسیع و ارض ہال تھا۔ دیہڑے قایلین بیٹھے ہوئے  
تھے۔ دیواروں پر برقی ٹھنڈے بجکا رہے تھے۔ اس ہال کے  
اطراف میں تین دروازے تھے اور موسیقی اور گانے کی آواز

اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی  
"وہ" ہماری پچھلی ملاقات کو اتنا عرصہ تو نہیں گزرنا کہ تم  
میری شکل بھول جاؤ۔"

"میں نہیں جانتا تم کون ہو۔" مرلی دھرولا "راترا سمجھتا  
ہوں کہ تم یہاں سے اپنے بیروں پر واپس نہیں جا سکو گے۔"

"جانکی کہاں ہے؟" میں نے بات نظر انداز کرتے ہوئے  
اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"کون جانکی؟" میں کسی جانکی کو نہیں جانتا۔ "وہ بولا۔

میں نے اس کے بیروں کے قریب قالین پر فائر کر دیا۔ وہ  
اچھل پڑا۔ کمرے میں موجود لڑکیاں ایک بار پھر جھنجھکی

"اس مرتبہ گولی قالین پر نہیں تمہاری ٹانگ پر لگے گی  
اور اس کے بعد تمہارے پیٹ میں۔ اگر میری بات کا قائلین نہ

ہو تو ان دونوں حرامیوں کی طرف دیکھ لو۔ یہ تھیں بتا دیں  
گے کہ میں جو کتا ہوں وہ کر کے بھی دکھاتا ہوں۔" میں نے

ان دونوں زخمی پنڈتوں کی طرف اشارہ کیا۔

"برشو رام۔ یہ بڑا جور آور ہے۔ مان لے اس کی  
بات۔" زخمی ٹانگ والا مرلی دھری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جانکی کہاں ہے؟" میں ایک بار پھر غرایا۔

"دھم۔ دھم۔ دھم۔" اس کمرے میں ہے۔" مرلی دھرنے  
بھڑے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ایک بار

پھر خوف طاری ہونے لگا تھا۔

میں نے روپ متی کو آواز دے کر اندر بلایا۔

"دیکھو۔ جانکی اس کمرے ہے یا نہیں؟" میں نے روپ  
متی کو اشارہ کیا۔

جانکی نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھول دیا۔ پہلے بھانک  
کر دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ چند منٹ بعد وہ جانکی کو

تقریباً گھسیٹتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔ اس نے جانکی کو  
قالین پر ڈال دیا۔ جانکی کی حالت دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ بات

شراب کے نشے میں مدہوش تھی یا اسے ہیروئن استعمال  
کرائی گئی تھی۔

"کیا کیا ہے ات؟" میں مرلی دھری کی طرف دیکھ کر غرایا

"اگر ات چند ہو گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"دارو کا نشہ ہے۔" مرلی دھرولا "کمرے کی نہیں۔"

میں نے جبکہ کر جانکی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند  
تھیں۔

"وہ دارو دو گھنٹہ پہلے دو۔ وہ ہری بوتل والا۔ دو منٹ  
میں نشہ اتر جائے گا اور مدہوش میں آجائے گی۔" مرلی دھرنے

میز پر رکھی ہوئی ایک بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" میں نے روپ متی سے کہا اور  
اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ پنڈت جو اس کھڑکی کے راستے فرار ہوا  
ہے کون تھا؟" یہ سوال میں نے مرلی دھری کی طرف دیکھتے ہوئے

کیا۔

"تم برسوں سے اس کا پیچھا کر رہے ہو لیکن اسے پکڑنے  
کا تمہارا سہنا کبھی پورا نہیں ہوگا۔" مرلی دھرنے جواب دیا۔

اس کی بات پر میں جو کچھ بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں اس  
کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ کھڑکی کے راستے فرار ہونے والا دارو

تھا لیکن اس نے اس طرح پنڈتوں والا بھیس بدل رکھا تھا کہ  
میں اسے واقعی نہیں پہچان سکتا تھا۔

روپ متی نے میز پر سے ہرے رنگ کی بوتل اٹھالی۔  
اسی وقت ایک لڑکی آگے آئی۔

"یہ بوتل مجھے دے دیں راج کمار۔ میں اسے ہوش  
میں لاتی ہوں۔" اس نے روپ متی کے ہاتھ سے بوتل لینے

ہوئے کہا۔

روپ متی کے منہ سے بھی گھرا سانس نکل گیا۔ اسی  
لڑکی نے اسے پہچان لیا تھا۔ لڑکی نے جانکی کا منہ کھول کر

اس کے دھڑکنے والے دو تین گھنٹہ اس کے حلق میں انڈیل دیے۔  
کچھ دارو ہونٹوں سے گر کر اس کی ٹھوڑی اور گردن پر پڑنے

تھا۔

جانکی صبح ساڑی پہن کر حویلی سے نکلی تھی لیکن اس  
وقت اس کے بدن پر صرف بلاؤ زور چنی کوٹ نظر آتا تھا۔

اس دوران میں ایک لڑکی اور آگے بڑھ آئی اور روپ  
متی کے قدموں پر سر رکھ کر گڑ گڑانے لگی۔

"ہمیں صاف کر دیجئے راج کمار۔ ہم بالکل زرد  
ہیں۔ ہمیں پنڈت پر شو رام دھوکے سے یہاں لایا تھا۔ اس

نے کہا تھا کہ پوچھا۔"

روپ متی نے ٹھوکر مار کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

"تم لوگ تو ہر رات ایسی پوچھا گئے کہ شو رام  
لوگوں کے ساتھ جاتی ہو۔ آرام سے وہاں بیٹھی رہو۔ ہمیں

میں نے پہچان لیا ہے۔ ہوتلوں اور گیٹ ہاؤس میں بھی  
پوچھا ہی کے لیے جاتی ہو۔"

میں جانکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دارو واقعی تیرا  
ثابت ہوا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے ہاتھیں

کھول دیں۔ میں نے قالین پر پڑا ہوا ایک اٹھا کر جانکی کی  
دیا۔ وہ سر جھٹکتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر ہاتھ

حواس بحال ہونے لگے۔

"تھ۔ تھ۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بھلائی تم

آتش فشاں 321 حصہ 4

"بچے آجھے؟"  
"ہاں جاکر آئے!" میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا "اپنے  
کو بنبھالنے کی کوشش کرو۔ گھر جا کر تم سے بات کروں

"مہم میں تو ٹھیک ہوں۔ یہاں بات کر لو نا۔" جانکی  
نے اپنے لیے ایک لڑکھاٹ تھی اور میرا خیال ہے اس کا نشہ

بہت ہی طرح نہیں اترتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے اپنے  
پاکوٹش کی تو میں نے اس کے منہ پر زور وار چھڑ رسید

نہا۔

جانکی چلا تھی۔ وہ لڑکھا کر پیچھے ہٹی تو روپ متی نے  
سے نبھال لیا۔ جانکی گال سلواتے ہوئے خوں خوار نظروں

سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔" پنڈت ہری رام کی لڑکھائی  
بلی تو آسن کر میں اس کی طرف مڑ گیا۔ "وہ۔ وہ زنگی کہاں

لگا۔ اوس۔ یہ کون سا تھا ہے۔"

"یہ ساتا نہیں مسلمان ہے۔" قریب کھڑے ہوئے  
مدھرنے کہا۔

"مسلمان۔" پنڈت ہری رام اچھل پڑا "مسلمان۔ یہ  
بل کیسے آیا۔ اس نے مندر کو نشہ کر دیا۔ ہمارے دھرم

نشہ کر دیا۔ مارا ات۔"

"یہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک ہندو ناری بھی  
ہے۔ راج کمار کی روپ متی۔" مرلی دھرنے کہا۔ وہ آگ

بڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اسے روک نہیں سکا۔

"ہندو راج کمار کی ایک مسلمان کے ساتھ۔ مار دو۔  
"ان کو مار دو۔" پنڈت ہری رام کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ ایک

مسلماں کے نام پر اس کی غیرت جوش میں آئی تھی "مار دو۔  
"ان کو مار دو۔ ایک ہندو ناری کسی مسلمان کے ساتھ۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زور وار چھڑ رسید

نہا۔ وہ چیخ کر الٹ گیا۔ اس کا سات کا ایک وانت بل گیا

فوارہ سے خون بہہ نکلا تھا۔

"رام رام۔ ہری رام۔ ہری رام۔" وہ چیخنے لگا۔

"اس مسلمان نے تمہاری طرح کسی مندر کو عیاشی کا  
نشانہ بنا رکھا۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "اگر اپنی جان

محفوظ چاہت ہو تو آرام سے بیٹھ رہو۔"

پنڈت ہری رام کو منہ میں دیک کر رام رام کی گردن  
پر ہاتھ دھر کر پنڈت بھی اگرچہ خواہش میں اچکا تھا مگر اس

مندر پر رہنے میں اپنی عافیت سمجھی تھی۔  
"مرلی دھر۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

آتش فشاں 320 حصہ 4

"اب تم بتاؤ گے کہ دارا کہاں گیا ہے۔ چلو۔ اسی کھڑکی کے  
راستے باہر نکلو۔" میں نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس  
سے دارا فرار ہوا تھا۔

"تم اسے تلاش نہیں کر سکو گے۔" مرلی دھرنے جواب  
دیا "وہ چھلوا رہا ہے۔ اب تک یہاں سے بہت دور جا چکا

ہوگا۔"

"تم ہمیں اس کے ٹھکانے تک لے کر جاؤ گے۔" میں  
نے اس کے منہ پر زور وار گھونسا مارتے ہوئے کہا اور پھر

روپ متی کو اشارہ کیا۔

روپ متی کھڑکی کے فریم پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی  
اور جانکی کو بھی سارا دے کر دوسری طرف اتار دیا۔ میں نے

آگے بڑھ کر مرلی دھرو کو دکھا دیا۔ وہ بھی کھڑکی پر چڑھ کر دوسری  
طرف کود گیا اور پھر میں نے بھی اسی طرف چھلانگ لگا دی۔

"ہمارے جانے کے بعد پولیس یہاں چھاپا ماروے گی۔  
بہتر ہو گا کہ پولیس کے آنے سے پہلے تم لوگ اپنا بندوبست

کر لو۔" میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور مرکز  
پنڈت مرلی دھرو کو دکھا دے دیا۔

یہ ایک کبی سی سرنگ تھی جس کے آخر میں مدھم  
روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ پنڈت مرلی دھر آگے اور ہم اس

کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے  
تھے۔ نیچے اندازہ لگاتے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ہم

اس وقت مندر کی عقبی پہاڑیوں کے پیچھے تھے۔ ان پہاڑیوں  
میں غارتھے۔۔۔ جنہیں خراش کر مندر میں شامل کر لیا گیا تھا۔

تقریباً ایک تھیک تک ہم ان سرنگوں میں چلتے رہے اور  
پھر ایک خفیہ راستے سے نکل کر کھلی فضا میں آ گئے۔

"دارا کہاں گیا ہو گا؟" میں نے تاریکی میں ادھر ادھر  
دیکھتے ہوئے پنڈت مرلی دھر سے پوچھا۔

"ان پہاڑیوں میں تم اسے تلاش نہیں کر سکتے۔" مرلی  
دھرنے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آگے چلتے رہو۔ ہم تم سے پوچھ لیں گے  
کہ وہ کہاں گیا ہے۔" میں نے اسے دکھا دیا اور پھر روپ متی

کو اشارہ کیا۔

روپ متی ہمیں راست بتاتی رہی اور ہم اونچے نیچے  
ناہموار راستے پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے رہے۔ میں نے

پنڈت مرلی دھرو کو پتہ تو دل رہا تھا اور دو سر ہاتھ  
سے جانکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ میں اپنی کار کے پاس پہنچ چکے تھے۔

جانکی اس وقت تک اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی لیکن وہ

آتش فشاں 320 حصہ 4



شاید مجھ سے ناراض تھی۔ راستے بھراس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

روپ متی نے اسٹریٹنگ سنبھال لیا۔ میں اور جاگی پنڈت مل کر دھوکا اپنے بیچ میں لے کر کچھیلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

روپ متی نے اپنا ہسٹل جاگے کے حوالے کر دیا تھا۔ شہر کے بعض علاقے سنان تھے اور بعض جگہوں پر خاصی چل چل دکھائی دے رہی تھی۔ کار جب خولی میں داخل ہوئی تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔

جاگی اور روپ متی تو برآمدے والے دروازے کی طرف چلی گئیں اور میں دیوان سنگھ کے ساتھ پنڈت مل دھوکے کو لے کر کچھیلی طرف ایک کیران میں آگیا۔ دیوان سنگھ سمجھ گیا تھا کہ اس پنڈت کو یہاں لانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

”ہاں تو پنڈت مل دھوکے پر شور اٹھ رہا ہے۔ میں نے مل دھوکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب تم یہ بتاؤ گے کہ دارا مندر سے فرار ہو کر کہاں گیا ہے؟“

”وہ میرا گرو ہے اور میں اپنے گرو کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ پنڈت مل دھوکے نے جواب دیا۔

”جرت اٹھین۔“ میں نے کہا ”کچھ دیر پہلے تو تم نے پنڈت ہری رام اور اس کے ساتھیوں کو بھڑکانے کی پوری کوشش کی تھی کہ ایک مسلمان نے مندر میں قدم رکھ کر دھرم کو نشٹ کر دیا ہے۔ ایک ہندو لڑکی کی مسلمان سے دوستی

نے تمہارے دھرم کا ستیاناس کر دیا ہے اور اب تم ایک مسلمان کو اپنا گرو مان رہے ہو۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ مل دھوکے نے دھڑائی سے جواب دیا ”میں کسی کو بھی گرو مان لوں۔ تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟“

”تو پھر یہ بھی میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کے جڑے پر زور دار گھونسا سید کر دیا۔ مل دھوکے نے بھی

”میرے ذاتی معاملات میں کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تم سے یہ پوچھ کر ہی رہوں گا کہ تمہارا گرو کماں کیا ہے۔“

”میں نہیں بتاؤں گا۔“ مل دھوکے نے جواب دیا۔

”دیوان سنگھ۔“ میں دیوان سنگھ کی طرف مڑ گیا ”اس سے معلوم کرو اس کا گرو کہاں ہے۔ اس کی زبان کھولنے کے لیے تم جو من میں آئے کر سکتے ہو۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔“

”کیوں پنڈت جی۔ کیا چارہ ہے؟“ دیوان سنگھ وہ قدم

آگے بڑھ کر مل دھوکے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”تم جو کرنا چاہو کرلو۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ مل دھوکے نے جواب دیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے

نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اپنے بارے میں بت بڑی خوش فہمی میں چلتا ہو۔ تمہاری لینڈ اور سنگاپور

پر معاشوں کو اپنے ساتھ ملا کر قتل و غارت کرنا اور بات کرنا یہ ہندوستان ہے۔ یہاں کی پولیس تم جیسے بد معاشوں

نمٹنا خوب جانتی ہے اور میرا خیال ہے پولیس کو بھی بڑا کڑا کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پنڈت ہری رام صبح ہونے

بست کچھ کر چکا ہو گا۔ ایک ہندو ناری کے ساتھ تمہاری بات طوفان کھڑا کر دے گی۔ تم ہندوستان کے پنڈتوں کو

جانتے تم دونوں کو زندہ جلا دیا جائے گا اور کوئی ان کا نہیں بگاڑ سکے گا۔“

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مل دھوکے نے مندر میں بھس میں چنگاری ڈال دی تھی۔ اپنے کروت چما

کے لیے یہ اس واقعے کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش آگے بچھلے چند مہینوں کے دوران میں ”میں نے یہاں

کچھ دیکھا تھا۔ یہاں کٹر ہندوؤں کی کئی انتہا پسند سرگرم تھیں۔ دوسرے مذاہب سے انہیں شدید نفرت

تھی۔ مسلمانوں سے انہیں خدا واسطے کا قیصر معلوم بات کو ایٹھ بتا کر بنگالے کھڑے کر دیا جاتے تھے۔

مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل جاتی تھی۔ کٹر اور متعنا مسلمانوں کی ان مسلح تنظیموں کو سرکاری بھی

حاصل تھی۔ مختلف طریقوں سے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور اس کے برعکس بے گناہ مسلمانوں کو جیلوں

فحش دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہاں کٹر ہندو کی عیسائیوں سے بھی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے

چلائے جا رہے تھے۔ پادریوں کو بے وردی سے موت گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پنڈت ہری رام کچھ چاہے گا کہ مندر میں اس کی عیاشیوں کا راز فاش ہو۔

اس واقعے کو ایٹھ بنانے کی کوشش کرے گا۔ اگر ایسا ہوتا ہے

میں نے دیوان سنگھ کو اشارہ کیا۔ وہ اچانک سی مل پر چل پڑا۔ وہ لاتوں اور گھونٹوں سے مل دھوکے کی قوت

رہا۔ اسے دو مرتبہ اٹھا کر دیوار کے ساتھ ٹکائی گئی۔ وہ ہی سخت جان واقع ہوا تھا۔ ہر جوت پر اس کی پانچ ٹونیاں

مگر وہ زبان کھولنے پر تیار نہیں ہوا۔

”ایسے نہیں مانے گا حکم!“ دیوان سنگھ ایک طرف

ہٹے ہوئے بولا۔ وہ پتلوان نما آدمی تھا لیکن پٹائی کرتے ہوئے

”اب ہاپ کیا تھا مگر مل دھوکے نے پتیا نہیں ہوا۔“

مل دھوکے نے اور ناک کے علاوہ سر سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ اب بھی مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا

تھا۔ دیوان سنگھ چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر پھر اس نے ایک طرف پڑی ہوئی رسی اٹھا کر مل دھوکے کے ہاتھ پر پاندھ

دے اور ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹول بکس میں سے پلاس ٹال کراس کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں پنڈت!“ وہ مل دھوکے کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولا ”اب بھی کچھ بتاتے

ہو یا اٹھاؤں تمہارے پیروں کے ناخن۔“

”نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ مل دھوکے نے جواب دیا۔

دیوان سنگھ نے اس کا ایک پیر پکڑ لیا۔ مل دھوکے نے ہلک کر اپنا پیر چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے آگے

بڑ کر اس کی ٹانگ پر پیر رکھ دیا۔

دیوان سنگھ نے اس کا پیر مضبوطی سے پکڑ لیا اور انگوٹھے کا ناخن پلاس کی گرفت میں لے کر زور زور سے جھٹکے دینے

لگا۔ مل دھوکے کی چیخیں کیراج میں گونجنے لگیں۔ وہ بری طرح زپٹ لگا تھا مگر دیوان سنگھ نے اس کا پیر نہیں چھوڑا۔ اس

نے پلاس کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ انگوٹھے کا ناخن جڑ سے اٹھ گیا اور خون کی دھار بہہ نکلی۔

دیوان سنگھ اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت فرش پر لٹے ہوئے بیچ رہا تھا۔ اس کے انگوٹھے سے بننے والا خون

نیچوں کی صورت میں ہر طرف پھیر رہا تھا۔

دیوان سنگھ نے پلاس میں پھنسا ہوا ناخن باہر پھینک دیا اور مل دھوکے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

”تمہارے پیر تو تمہارے کمر کی طرح کندے ہیں۔“

”ابو لگاتے ہوئے بھی گھن آتی ہے۔ اب میں تمہارے ہاتھ

سناٹا کر دے گا ناخن نکالوں گا۔“ وہ جھک کر بیٹھ گیا اور پلاس

نیزک سے کرکٹ لگانے لگا۔

”نہیں نہیں۔“ پنڈت مل دھوکے نے اٹھا ”بب۔ بتاتا

ہوں۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔“

”اب ہوئی بات!“ دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

نیزک سے اپنا پیر چھوڑا اور بولنا شروع کر دیا۔

”چند لمحے خاموش رہی اور پھر پنڈت مل دھوکے کو کچھ

تلاش کرنے کی ضرورت

گیا ہوگا۔

”اس نے کئی ٹھکانے بنالے ہیں۔“ ہنڈت ملی دھرنے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔“  
”دیوان سنگھ۔“ میں نے کہا ”اس کا ایک اور ناخن اکھاڑ دو۔“

”نہیں نہیں!“ ملی دھر چنچ اٹھا، بھگونے کے لیے مجھ پر دیا کرو۔ میں پہلے ہی تکلیف سے مڑ جا رہا ہوں۔“  
”تمہارے زخم کا علاج بھی کریں گے لیکن پہلے اپنے گرد کا پتا بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میرا دوشواس کرو۔ مجھے نہیں پتا وہ کہاں گیا ہوگا۔ اس نے کئی ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔“ ملی دھرنے کہا۔  
”تمہیں جتن بھی ٹھکانے معلوم ہیں سب بتا دو۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کالی کا مندر اور امیر میں کلیان جی کا مندر اس کے اہم ٹھکانے ہیں۔“ ہنڈت ملی دھرنے جواب دیا ”اس کے علاوہ اس نے شہر میں بھی ایک دو ٹھکانے بنا رکھے ہیں لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔“ اس نے شہر کے ان ٹھکانوں کے پتے بھی بتا دیے جہاں دارا کے پناہ لینے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میرا تو کوئی بندوبست کرو مہاراج۔ میں تکلیف سے مڑ جا رہا ہوں۔“ وہ میری طرف دیکھ کر گھٹکیا یا۔  
”تمہیں تھوڑی بہت سزا تو بھگنی چاہیے نا۔“ میں نے کہا ”آج کی رات اسی طرح گزار لو۔ صبح دیکھا جائے گا۔“  
میں نے دیوان سنگھ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گیاراج سے باہر آگئے۔ ہنڈت ملی دھر چنچ چلا تا رہا لیکن دیوان نے گیٹ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

میں دیوان سنگھ کو برآمدے ہی میں چھوڑ کر اندر گیا۔ روپ متی اور جاگی پال نامکرم سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں لباس بدل چکی تھیں۔ جاگی نے تشنگیس ڈنگا ہوں سے میری طرف دیکھا اور رخ بدل لیا۔ روپ متی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”سوئے کار دو گرام نہیں سے کیا۔ ڈھائی بج رہے ہیں۔“ میں نے دیوار گیر تھاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”جاگی تم سے ناراض ہے اور اسی ناراضگی کی وجہ سے کھانا بھی نہیں کھا رہی۔ حالانکہ اس نے خود ہی بتایا تھا کہ اسے دن بھر بھوکا رکھا گیا تھا اور شام کو زبردستی اتنی شراب

پلا دی گئی کہ ہمارے جانے تک بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ روپ متی نے کہا۔

”میں اس کی ناراضگی کی وجہ سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا ”اگر میں اسے چھوڑ نہ مارتا تو یہ ہوش میں نہ آتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اگر یہ مجھ سے ملت جاتی تو ان لوگوں کو ہمارے خلاف کچھ کرنے کا موقع مل جاتا۔ اسے تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ۔“

”ہاں۔ میں واقعی تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے غور مار کر میرا منہ سجا دیا۔“ جاگی نے دوٹھے ہوئے لہجے میں کہا ”ابھی تک میرا جہاز دکھ رہا ہے اور گال پر تمہاری انگلیوں کے نشان بڑگئے ہیں۔“

”سو رہی ڈیڑھ۔“ میں نے کہا ”جو پٹیشن کا تقاضا کیا تھا میں تمہیں چھوڑ رہا کہ ہوش میں نہ لانا تو شاید صورت حال بدل اور ہوتی۔ ایک بار پھر سو رہی۔ اب مسکرا دو۔ جلدی کرو۔“ بات جاگی کی سمجھ میں آگئی تھی اور پھر اس نے مسکراتے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ روپ متی نے منہ دیکھا آواز دے کر کھانا لگانے کو کہا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھنے کا کھانا کھا رہے تھے۔

○●○

صبح سویرے ہی ٹھاکر بھانوت سنگھ کا فون آگیا۔ کال ٹپ نے ہی ریسپونڈ کی تھی۔ دراصل روپ متی اور جاگی رات اوپر والے کمرے میں جا کر سو گئی تھیں اور وہاں ہل نہ کر سکے صوفے پر ہی لیٹ گیا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اٹھ کر ریسپونڈ کیا۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ میری آواز پہچانتے ہی بولا۔

”کل رات رام گڑھ بھیل والے مندر میں تم کو گول کوئی پھنڈا ہو گیا تھا؟“

”ہاں مگر تمہیں صبح ہی صبح کیسے پتا چل گیا۔“ میں۔

پوچھا۔  
”بعد میں پتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ کیا معاملہ تھا؟“ ٹھاکر

پوچھا۔  
”کل دن میں جاگی کو گیش دیوتا کے مندر سے اغوا کر لیا گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا اور پھر اسے سارے واقعے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا ”دارا امیر، باپ کا ہتھیار ہے۔ میں بہت عرصے سے اس کے پیچھے ہوں۔ تمہیں تفصیل بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔“ غصہ نہ ہے کہ دارا ہنڈت ملی دھر کے ساتھ سکا پور سے فرار

ہوا تھا اور دو چار روز پہلے اچانک ہی جاگی کی نظروں پر ہم اسے چھوڑ کر دارا کے بارے میں معلوم کرنا پہنچے مگر آج اس کا داؤ چل گیا اور وہ اسے اغوا کر کے

اپنے پاس چل گیا کہ جاگی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ زرات میں اور روپ متی اسے چھڑانے کے لیے رام بھیل والے مندر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے جو کچھ بھی کہہ سکیں وہاں وہاں میں ٹیلی فون پر نہیں پتا سکتا لیکن کہے پتا چل گیا؟“

تھوڑی دیر پہلے میرے ایک دوست کا فون آیا تھا۔ وہ کارپورٹ ہے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے جواب دیا ”وہ بے کس آج کل روپ متی کو دلہل سے نکالنے کی لڑ رہا ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ روپ متی کی زندگی میں بے تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔ جتنی جلد دیکھ کر لوگ وہاں سے نکل جائے۔ روپ متی سے کہو وہ ان کو لے کر میری آگہ مارگ والی حویلی میں پہنچے۔ یہ حویلی آگہ مارگ سے بھرت پور جانے والی سڑک لڑائی آگے ہے۔ روپ متی نے وہ جگہ دیکھی ہوئی اب تم لوگ زیادہ سے زیادہ آگے گھسنے میں وہاں سے باہر میں حویلی میں اپنے ملازموں کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ مہاراجا خاں رخصتے اور باقی بائیس وہیں پر ہوں گی۔“

میں نے ریسپونڈ کر دیا اور دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اور روپ متی ایک ہی بیڈ پر سو رہی تھیں۔ انہیں نہ کچھ خاصے دشواری پیش آئی تھی اور جب میں پہنچا تو مندر ہی جاگ چکی تھی۔

”روپ متی! دیر میں روپ متی اور جاگی بھی نیچے آگئیں۔ پتا چلا اس وقت خاص بدحواس ہو رہی تھی۔ حالانکہ

روپ متی نے ایک پوٹلی بھی اٹھا رکھی تھی جس میں دارا جاگی کے لیے چند جوڑے باندھ لیے تھے۔ ہم نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا۔

ہنڈت ملی دھر کو بھی اٹھا کر بجا دو۔ میں ڈال دیا گیا۔ ہنڈت ملی دھر کو پتا ہو رہا تھا۔ آرا سنگھ اور دیوان سنگھ کو پتا چلا تھا کہ میں نے پھنڈا دیا گیا تھا۔ روپ متی کے پاس ایک نیند کا ٹھکانہ تھا۔ اس لیے ڈرائیونگ سیٹ پر چل گیا۔

متی کے کہنے پر میں نے گاڑی دائیں طرف موڑ لی اور اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم بھرت پور کی طرف جانے والی ہائی وے پر نکل آئے۔

اس شاہراہ کے دونوں طرف اونچے نیچے نیلیں پر پرانی عمارتیں تھیں۔ عمارتوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اور ہر عمارت کے گرد لمبی چوڑی جگہ بھی باؤنڈری وال میں گھری ہوئی تھی۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد روپ متی کے اشارے پر میں نے گاڑی بائیں طرف سڑک پر موڑ لی۔ اس سڑک کے دائیں بائیں نیلیں پر قدیم عمارتیں تھیں۔ ہمیں اس سڑک پر زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔

”آگے سیدھے ہاتھ پر موڑ لینا۔“ روپ متی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ ٹیپا پر جو حویلی نظر آ رہی ہے وہی ہماری منزل ہے۔“

میں نے ٹیپا کی طرف جانے والے راستے پر گاڑی موڑ لی۔ ٹیلا زمین کی سطح سے چند میٹر ہی بلند تھا اور سامنے ہی وہ قدیم حویلی نظر آ رہی تھی جسے دیکھ کر ذہن میں عجیب سا تاثر ابھرا تھا۔

حویلی کے چاروں طرف ایکڑوں کے حساب سے زمین گھری ہوئی تھی اور ناریل کے لافند اور درخت نظر آرہے تھے۔ حویلی کے گرد چار دیواری پانچ چھ فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ گیٹ پر ایک آؤٹی ہمارا منتظر تھا۔ اس نے گاڑی دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ وہ شخص خالص راجستانی لباس میں تھا۔ سر پر نیلے رنگ کی بلی کھاتی ہوئی پگڑی تھی۔ کمرے پرزے کا چوڑا بلیٹ تھا جس کے بائیں طرف ہولسٹرمیں ریو لوار کا دستہ بھی نظر آ رہا تھا۔

حویلی کی عمارت وہاں سے تقریباً سڑک کے فاصلے پر تھی۔ میں نے کشادہ پورچ میں گاڑی روک لی اور انجن بند کر دیا۔

برآمدے میں اسی طے کا ایک اور ملازم بھی کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے ہمارے قریب آیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر روپ متی اور ہم سب کو نام کیا۔

”گاڑی میں کوئی سامان ہے راج کمار جی؟“ اس نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ پیچھے رکھا ہے۔ آمارو۔“ روپ متی نے پیچھے سامان رکھنے کی جگہ پر پڑے ہوئے ہنڈت کی طرف اشارہ کیا۔ اسے میں دوسرا ملازم بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں ہنڈت ملی دھر کو دیکھ کر اچھل پڑے۔

”رام۔ رام۔ رام۔ رام۔“ ان میں سے ایک ہاتھ

جوڑتے ہوئے بولا "ہنڈت جی۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا۔ آپ کا ایک پایہ کس نے توڑ دیا۔"

"اسے اٹھا کر کسی کمرے میں ڈال دو۔ شاکر آئے گا تو اس کے پائے کی مرمت کی جائے گی۔" روپ متی نے کہا۔

وہ دونوں ہنڈت کو گاڑی سے نکال کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اندر لے گئے۔ میں پورچ سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گیا۔

بست خوب صورت لان بنے ہوئے تھے۔ گہری سبز گھاس خاصی دبیز تھی۔ لازم کے کناروں پر پھولوں کے پودوں کی کیا دیاں تھیں۔ ٹاربل کے درخت بھی بڑے سلیختے سے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ ہر لان کے وسط میں سات

سات درختوں کا جھنڈ تھا۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ باغبانی کے لیے بڑی پلانٹک سے کام لیا گیا تھا۔

حویلی کی عمارت بست پر شکوہ اور بست شان دار تھی۔ میں اپنے دھیان میں حویلی کو دیکھتا ہوا دائیں طرف نکل گیا اور پھر آٹھ سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو جا بھی میرے پیچھے

پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔

ہم حویلی کے پچھلی طرف آ گئے۔ حویلی کے عقب میں کم از کم دو ایکڑ زمین چار دیواری میں گھری ہوئی تھی اور یہاں کا

منظر کچھ زیادہ ہی دلچسپ تھا۔ یوں تو چاروں طرف برنی کی کھوپڑیوں جیسی آہنی جالی کا بنگلا تھا مگر آدھے حصے پر جالی کی پھت تھی جو زمین سے کم از کم بیس فٹ اونچی تھی اور اس

حصے میں بیس بائیس مور ٹھل رہے تھے۔ دو تین مور تو پر پھیلائے اپنی ڈھن میں مست ناچ رہے تھے۔ دوسرے حصے

میں ایک درجن سے زائد ہرن ٹھل رہے تھے۔ ان میں تین کالے ہرن تھے۔ راجستان میں مور اور ہرن بڑی تعداد میں

پائے جاتے ہیں اور کالے ہرن کو بست قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ ہرنوں والے جنگل میں مرغیاں اور سرخے بھی ٹھل رہے

تھے۔ ہم حویلی کی لمبی چوڑی عمارت کے پچھلی طرف آ گئے۔

اس طرف بھی ایک وسیع برآمدہ تھا جس میں پائیس کی کھچپیوں کی ایک میز اور کئی کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔

برآمدے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم اسی دروازے سے اندر آ گئے۔

مندری کاو رام نامی ایک ملازم کے ساتھ کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔ ان دونوں ملازمین کو ٹھاکر نے ہمارے

بارے میں پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ روپ متی حویلی کے مرکزی ہال میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور کپڑوں والی

پوٹلی بھی اس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ "بھونج تیار ہو رہا ہے راج کمار کی۔" دوسرے ملازم نے قریب آ کر کہا "آپ لوگ اشتراک

میں نے سب چیزیں رکھ دی ہیں۔" اور پھر اس نے ہمیں تین مختلف کمروں میں ہم

کمرے کے ساتھ ایک ساتھ دو کمرے میں ضرورت موجود تھی۔ یہ حویلی اگرچہ بست پر اپنی گئی لیکن

ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ ایک کمرے بعد ہم ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے بائو

تھے۔ کالو اور شکر جس طرح روپ متی کے ساتھ چلے آئے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی یہاں

ہے اور یہ ملازم اسے بست اچھی طرح جانتے تھے۔ ناشتے کے بعد میں اور جاگتی گھوم پھر کر حویلی پر

بست بڑی حویلی تھی۔ کئی راہداریاں اور کئی کمرے والے حصے پر بھی کئی کمرے تھے۔ میرے اندازے

ساتھ ستر افراد ایک وقت یہاں قیام کر سکتے تھے۔ ہم گھوم پھر کر مرکزی ہال میں آ گئے جہاں

شکر سے باتیں کر رہی تھی۔ شکر اس کے ساتھ ہاؤس موڈیانہ انداز میں کھڑا تھا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں مجھے اس راہروا سے بتایا تھا کہ وہ روپ متی کا دوست اور

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جان سکتا تھا۔ مجھے اس میں کچھ صحیح اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن اب یہ سنا

دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ بھانوت سنگھ کتنا ہموگ۔

"تم نے ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں کچھ بتایا۔" میں نے شکر کے وہاں سے بٹنے کے بعد وہ

پوچھا "میں نے اس کی شہر والی حویلی تو نہیں دیکھ کر حویلی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بھی

کے خاندان سے ہے۔" "ٹھاکر بھانوت سنگھ کا دادا الفٹ سنگھ ماہ

ماہو سنگھ کا دیوان تھا۔ ۱۸۳۲ء میں ماہو سنگھ کے بعد ماہاراجا سوائے مان سنگھ ثانی نے گدی پر

سنگھ کی خدمات کو جاری رکھا کیا۔ ۱۸۳۳ء میں دہانت ہو گیا تو دیوان کا عہدہ اس کے بیٹے دولت

دے دیا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں ریاستی راج پات کیم سرکار کی طرف سے راجا مان سنگھ کا ولیفتر

دولت رام سنگھ اس وقت بھی راجا کا دیوان تھا۔

انت (انتقال) ہوا تو بھانوت سنگھ کی عمر اس وقت سال تھی۔ یہ حویلی۔" اس نے ادھر اُدھر دیکھا

راجا سوائے ماہو سنگھ نے اس کے دادا کو تختے میں بنو اس زمانے میں کچھ عرصہ آباد رہی پھر ویران

نہ۔ یہ لوگ دوبارہ اپنی شہر والی آباؤی حویلی میں چلے

نوت سنگھ کی مائاتی بڑی ذہین عورت تھی۔ اس نے غ نہیں کی۔ اپنا سرمایہ کاروبار میں لگا دیا۔ جس سے

نفع ملتا رہا۔ اچا کا انتقال ہوا تو بھانوت سنگھ نے میٹرک کا

ایک کیا تھا۔ اس نے نہ صرف تعلیم جاری رکھی بلکہ پھوڑے ہوئے کاروبار کو بھی سنبھال لیا اور مرزا

ل جیسے پوش اور بارون علاقے میں ایک بست بڑا ل بھی قبول لیا اور اس حویلی کو بھی ریویوٹ

پڑ عرصے تک یہ حویلی بھی ٹورسٹ گیسٹ ہاؤس استعمال ہوتی رہی لیکن پھر بھانوت سنگھ نے اسے

نے مخصوص کر لیا۔ وہ ویک اینڈ اس حویلی میں ہم اس کے ساتھ بعض اوقات چند دوست بھی

یوں تو حویلی کی ہر چیز شان دار ہے مگر اس کا ال بہت خوب صورت ہے۔"

ٹھنگ پول۔" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا "کیا پول کسی نے خانے میں ہے۔ ہم تو ادھر سے حویلی

خوٹے ہوئے آئے ہیں۔ ہمیں تو کس نظر نہیں ٹھنگ پول۔"

ٹھنگ پول اسی طرف تھے۔" روپ متی نے بتایا "میرا خیال ہے تم لوگ اس طرف نہیں

راجی تک نہیں آیا۔" میں نے موضوع بدلتے اس نے فون پر کہا تھا کہ وہ خود بھی یہاں آجائے

گے۔ ہو سکتا ہے کسی اور کام سے نکل گیا ہو۔" نے جواب دیا "آؤ۔ میں تمہیں سو ٹھنگ پول

برگڑی آمد سے دسترس طرف مڑ گئے اور حویلی فکھوتے ہی میں ٹھنگ کر رک گیا۔ کڈنی شیب

ٹھنگ پول تھا جس میں بھرا ہوا شفاف پانی پنک ہا تھا۔ ایک طرف دس باہر فنک کی بلندی پر

کے تھے۔ گے ہوئے تھے پول کے کناروں

کے ساتھ ساتھ ٹاربل کے درخت تھے اور باقی حصے پر دبیز گھاس کے لان تھے۔ کڈنی کے تختوں کی رنگ پر کئی لمبی

کرسیاں کناروں کے ساتھ ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف واش رومز بھی بنے ہوئے تھے۔ سو ٹھنگ پول واقعی

بست شان دار تھا۔ ہم ابھی اس طرف ٹھل رہے تھے کہ باہر کسی گاڑی کی

آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ شکر تقریباً دوڑتا ہوا گیسٹ کی طرف جا رہا تھا اور پھر اس نے جیسے ہی گیسٹ

کھولا سیاہ رنگ کی ایک شان دار کار اندر داخل ہوئی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر ٹھاکر بھانوت سنگھ کو دیکھ لیا تھا۔ ہم بھی

پورچ کی طرف آ گئے۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ بھانوت سنگھ کار سے اترتے ہی دیر سے آنے پر معذرت کرنے لگا اور پھر ہم بائیں

کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ "معاملہ خاصا گہیر ہو گیا ہے۔" رمی گفتگو کے بعد اس

نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "میرا دوست وشنو ایک انجمن ایونگر کارپورٹ ہے۔ یہ اخبار دیو سہراہ بے کے قریب

مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ وشنو نقل کی ایک اطلاع ملنے پر تفصیل حاصل کرنے کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر گیا تھا۔ وہاں

رام گڑھ جھیل والے مندر کا پرست ہری رام اور تین اور ہنڈت بھی بیٹھے ہوئے تھے جن میں دو زخمی تھے۔" وہ چند

فحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ہنڈت ہری رام نے پولیس کو ایک بڑی دلچسپ کہانی سنائی

تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق راج کمار کی روپ متی ایک مسلمان مرد کے ساتھ مندر کے ایک اندرونی حصے میں رنگ

رلیاں منارہی تھی۔ ایک بیماری نے انہیں دیکھ لیا اور ہری رام کو اطلاع کر دی۔ رنگ ہاتھوں پکڑے جانے پر دونوں گڑ

بڑا گئے مگر شرمندہ ہونے کے بجائے وہ ہنڈتوں پر چڑھ دوڑے اور مار پیٹ شروع کر دی۔ راج کمار کی روپ متی کے

مسلمان یار نے ایک ہنڈت کو ٹانگ پر کوئی مار دی اور دوسرے نے ہنڈت کی ٹانگ کا پانسا توڑ دیا اور اس کی مونچھیں

اکھاڑنے کی کوشش کی جس سے وہ مزید زخمی ہو گیا۔ مزید برآں وہ پر شو رام نامی ایک ہنڈت کو انگوٹھ کر کے لے گئے۔

ہنڈت ہری رام نے دھمکی دی ہے کہ اگر جو میں گھنوں کے اندر اندر راج کمار کی روپ متی اور اس کے مسلمان عاشق

کو گرفتار کر کے مونوی ہنڈت کو بایا بن نہ کیا گیا تو شہر کے تمام مندروں کے ہنڈت خود کارروائی کریں گے۔

"میرے دوست وشنو نے پولیس اسٹیشن سے نکلے ہی

ایک پبلک بوتھ سے مجھے فون کروا۔ وہ جانتا ہے کہ میں آج کل پھر روپ متی کو دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بات تو میں نہیں مانتا کہ تم دونوں مندر میں رنگ رلیاں مٹا رہے ہو گے لیکن بہرحال میں اصل بات جاننا چاہتا ہوں۔ وہ خاموش ہو کر باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی جاگنی اور روپ متی کی طرف دیکھا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے اصل واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا۔

”ہمیں جس شخص کی تلاش تھی وہ تو بھاگ گیا لیکن اس کا سامی پنڈت پر شو رام ہمارے ہاتھ آیا۔ اس کا اصل نام ملی دھر ہے۔“

”کمان ہے وہ؟“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ وہ اس حویلی میں ہے۔“ میرے بجائے روپ متی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ دیکھتا ہوں اسے لیکن صورت حال خاصی گنبد ہو گئی ہے۔“ ٹھاکر نے کہا ”پنڈتوں اور پجاریوں کے کرتوتوں سے سب ہی لوگ واقف ہیں۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مندر عیاشی کے اڈے بنے ہوئے ہیں لیکن کسی میں ان کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات نہیں۔ اگر کبھی ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو یہ پنڈت اور پجاری دھرم کی آڑ لے کر نکلے ہنگامے شروع کر دیتے ہیں اور ظاہر ہے دھرم کے نام پر کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ معاملہ بھی خاصا گنبد ہے۔ پنڈت ہری رام اپنے آپ کو بچانے اور تم دونوں کو پھنسانے کی پوری کوشش کرے گا لیکن اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ مندر میں رنگ رلیاں تم لوگ نہیں وہ مٹا رہے تھے تو بات بن سکتی ہے۔“

”ہم ثابت کر سکتے ہیں۔“ روپ متی نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ ٹھاکر نے سوال کیا۔

دیکھا۔

”پنڈت پر شو رام عرف ملی دھر ہمارے قبضے میں ہے۔“ روپ متی نے کہا ”اس کے علاوہ میں ان دونوں کو بھی جانتی ہوں جو ان کے ساتھ دادعیش دے رہی تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ انہیں عیاشی کے لیے شرے اس مندر میں لے جایا گیا تھا۔ وہ بتا سکتی ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔“

”لیکن وہ پنڈت ہری رام کے خوف سے زبان نہیں کھولیں گی۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”اگر انہیں تحفظ کی ضمانت دی جائے تو وہ سب کچھ

بتا سکتی ہیں۔“ روپ متی نے کہا۔

”کون ہیں وہ؟“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”ایک کا نام لاجو جی ہے۔ اس نے ام آئی ایڈیٹورسٹ ہوٹل میں ایک کمرہ مستقل طور پر کرایہ پر رکھا ہے۔ یہی اس کا بیڈ کوارٹر ہے۔ وہ بڑے پست اور گیسٹ ہاؤسز میں گھومتی رہتی ہے اور گاؤں کو بڑے اسی ہوٹل میں لے جاتی ہے۔ دوسری لڑکی کا نام ریکھا ہے۔ وہ بے پور کلب میں راقصہ ہے۔ کل رات وہی ان کے سامنے ڈانس کر رہی تھی۔ لاجو جی اسے اچھی طرح ہے۔ دوسری لڑکیوں کے بارے میں بھی ان سے پوچھا ہے۔“

”کچھ کرنا پڑے گا۔“ ٹھاکر بھانوت ٹکھ لے کر فرج باب اخباروں میں جھپکے گی تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو گا۔ پنڈت ہری رام اپنے آپ کو بچانے کے لیے کے مذہبی جذبات بھڑکانے کا اور تم لوگ جانتے ہو کہ موقع پر وہ لوگ آگے آجائے ہیں جن کا دھرم ہے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور اس سے پہلے کہ صورت سنگین ہو جائے ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔ بہرحال پنڈت کمان ہے؟“

”ٹھاکر نے اسے پیچھے کسی کمرے میں ڈال دیا۔ روپ متی نے جواب دیا۔

”میں ذرا اسے دیکھ لوں پھر بات کرتے ہیں۔“ ٹھاکر نے اٹھ گیا اور میں نے بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ دی۔

پنڈت ملی دھر حویلی کے پچھلی طرف ایک کمرہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیر اور ہاتھ بھی پست ہوئے تھے۔ ایک پیر خون آلود تھا اور چپے کی طرح تھا۔ وہ فرش پر پڑا کر رہا تھا۔ اسے رات کو بھی ہم کھانے کو نہیں دیا تھا اور صبح ٹھاکر نے بھی پاشا دیو تھا بلکہ پانی تک نہیں پلایا تھا۔ وہ فرش پر پڑا ہوا کرا رہا تھا۔

”تمہارے پیر کو کیا ہوا؟“ ٹھاکر بھانوت ٹکھ۔

جائزہ لینے ہوئے پوچھا۔

”کل رات یہ مندر سے نکل کر ہاڑیوں میں ہوا۔“ ٹھاکر نے بتایا۔

”میں دھرتے میں بول پڑا۔“ ٹھاکر نے بتایا۔

”ٹھاکر لگی تو ناخن اکھڑ گیا۔“

”میرا ناخن اس نے اکھاڑا ہے۔“ ملی دھر

نہیں دیا۔ ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیا۔ میری مدد کرو نہ میں مر جاؤں گا۔“

ٹھاکر نے میری طرف دیکھا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”ٹھاکر نے اس کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ گیا تھا۔ جس سے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ دیوان نے پاس سے ناخن اکھاڑ دیا۔ ہمارے پاس کوئی مرہم ملا نہیں تھا جو لگا دیتے۔ بس اس سے اس کا پیر بھول گیا ہے۔ معمولی سی تکلیف ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ظالم آدمی ہے۔ مجھے مار ڈالے گا حکم۔“ پنڈت ملی دھر نے رکی طرف دیکھتے ہوئے پھر بچا ہوا ”رحم کرو مجھ پر۔ اس نے جو کچھ پوچھا میں نے بتا دیا۔ مجھے بچا لو اس سے۔“

”اب تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔“ ٹھاکر بھانوت ٹکھ نے کہا ”لیکن تم مجھے بتاؤ مندر میں کیا ہوا تھا۔ میں سچ سننا چاہتا ہوں اگر ایک لفظ بھی غلط ہوا تو میں تمہارے بالی ناخن ہی نہیں شمر کی کھال بھی اڑھیز ڈالوں گا۔“

”رام رام۔“ رام رام۔“ پنڈت ملی دھر بچا ہوا ”تم و اس سے بھی کڑے ٹکھ۔ پانی۔“ مجھے پانی دو۔ اور دید کو ملاؤ۔ میرا پیر۔“ میں مٹا رہا ہوں۔

”ٹھاکر پانی لاؤ اسے۔“ ٹھاکر نے کہا پھر ملی دھر کی طرف مڑ گیا ”دید کو بھی بلاؤں گا اور تمہیں کھانا بھی کھلایا جائے گا مگر پہلے ہاتھ مندر میں کیا ہوا تھا؟“

”میں نرودش ہوں حکم۔“ ملی دھر بولا ”وہ حرامی دارا مجھے لالچ دے کر سنا پور سے لایا تھا اور پھر میری بھی اس نے مجھے لالچ دیا کہ مجھے مندر کا پردہ بتا دے گا۔ وہ سالا زانیہ۔ مجھے پھنسا کر بھاگ گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر وہ سب کچھ بتانے لگا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ البتہ بعض ایسی باتیں تھیں جن کا مجھے پہلے علم نہیں ہو سکا تھا۔ آخر میں یہ کہہ رہا تھا ”دارا نے پاکستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا وہ اس مندر پر بصورت میں قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اگلے چار مہینوں میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔“

”یوں تو ہم جانتے ہیں کہ مندروں میں کیا ہوتا ہے۔“ پنڈتوں کے کمرے سے بھی واقف ہیں۔ تم یہ بات ٹھیک کرنا۔“ رام گڑھ جھیل والے مندر میں شراب اور ٹیبل گول لے کر جاتا تھا۔

”ٹھاکر نے پوچھا۔“

”اس دوران میں ٹھاکر پانی لے آیا۔ اس کے ایک ہاتھ

فرش پر رکھ دیں اور ملی دھر کو سہارا دے کر اٹھا دیا اور دوسرے ہاتھ سے جگ اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے منہ میں گیا۔ زیادہ اس کی ٹھوڑی اور گردن کو تر کرنا ہوا سینے پر بہنے لگا۔

ٹھاکر نے ٹھاکر کے کہنے پر اس کے پیروں کی رسی بھی کھول دی۔

”وہ وہ لڑکیاں میں لے جاتا تھا اور پنڈت بھولا ناٹھ۔“ پنڈت ملی دھر نے کہا ”ولایتی دارو بھی ہم دونوں ہی لاتے تھے۔ چند روز پہلے پنڈت ہری رام کسی دھن دان کے ساتھ جے پور کلب چلا گیا تھا۔ وہ وہاں ٹھوڑی دیر ہی رہا مگر اس نے ریکھا کو وہاں رخصت کر دیا۔ دیکھ لیا اور اسی کی فرمائش پر کل رات ہی ریکھا کو لے کر آیا تھا۔ اس نے کلب میں ایک ہفتے کے پروگراموں کے معاوضے کے برابر رقم ملی۔ وہ زیادہ بھی مانگتی تو ہری رام دے دیتا۔ وہ تو اس کا ناچ دیکھنا چاہتا تھا اور کل رات جب محفل میں رنگ آ رہا تھا تو یہ سورا اس ناری کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔“

”کیا تم یہ سب کچھ پولیس کے سامنے کہہ سکتے ہو۔“

”ٹھاکر نے کہا۔“

”وہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔“ پنڈت ملی دھر کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے ”پنڈت ہری رام مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”پنڈت ہری رام پولیس کی تحویل میں ہے۔“ ٹھاکر بھانوت ٹکھ نے کہا ”اس نے جو بیان دیا ہے وہ تم سے بت مختلف ہے۔“

”ٹکک۔ کیا۔“ ملی دھر بھلایا ”ہری رام کو پولیس نے پکڑ لیا۔ اس نے کیا بولا۔“

”اس نے بولا کہ تم اور دارا آوارہ عورتوں کو لے کر مندر میں آئے تھے اور ان کے ساتھ رنگ رلیاں مٹا رہے تھے۔ اس نے یعنی پنڈت ہری رام نے منع کیا تو تم نے اور دارا نے ان پر حملہ کر دیا۔ دو پنڈتوں کو زخمی کر دیا اور مندر سے قیمتی چیزیں چرا کر بھاگ گئے۔“

”وہ حرامی ایسا بولا۔“ پنڈت ملی دھر کے حلق سے غراہٹ سے ملتی جلتی آواز نکلی ”وہ جھوٹا ہے۔ مکار۔ بد معاش۔ اپنے آپ کو بھانا چاہتا ہے۔ مندر جیسی ہوتے جگ کو اس نے عیاشی کا آڈا بنا رکھا ہے۔ میں۔ میں پولیس کو بتاؤں گا۔ لوگوں کو بتاؤں گا کہ اس کے اصل کرتوت کیا ہیں۔“

”ٹھک ہے۔“ ٹھاکر نے گھرا سانس لیا ”آج شام تک یا کل صبح تھیں پولیس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دارا کو بھی ہم پکڑ لیں گے۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ کسی کے ہاتھ آئے گا۔“ پنڈت ملی دھر نے کہا ”وہ بہت چالاک ہے۔ اس نے میاں کنی ٹھکانے بنا لیے ہیں۔ وہ کسی ایسی جگہ چھپ گیا ہو گا جہاں اسے تلاش نہ کیا جاسکے۔“

”ہم اسے تلاش کر لیں گے۔“ ٹھاکر نے کہا اور ششکری طرف گھوم گیا۔

”اسے بھوجن کراؤ اور اس کے ہاتھ بھی کھول دو۔ یہ بھانگے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر کوئی گڑبڑ کرے تو کھوپڑی اڑا دینا۔“

”جی حکم۔“ ششکر نے سر ہلایا اور جبکہ کر ملی دھر کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ بھی کھول دیے۔

ملی دھر پہنچ کر اڑا دیاں سسلاتا رہا پھر پیر کو سسلانے لگا تھا۔ اس کا پیر پختے تک بہت زیادہ سوچ گیا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں کمرے سے باہر آگئے۔ بھانوت سنگھ ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گیا اور ریسور انٹر کو کنی نہر ملانے لگا۔

میں روپ متی کے پاس بیٹھ گیا۔ جاگی اس وقت وہاں نہیں تھی۔

”ٹھاکر بھانوت سنگھ واقعی ذہن آوی ہے۔“ میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس نے بڑی خوب صورتی سے ایک کہانی گھڑ کر ملی دھر کو پولیس کے سامنے زبان کھولنے پر آمادہ کر لیا ہے۔“

اور یہ واقعی اس کی ذہانت تھی۔ اگر وہ پنڈت ہری رام کے بارے میں فرضی کہانی نہ سنانا تو شاید ملی دھر بھی اتنی آسانی سے پولیس کو بیان دینے پر تیار نہ ہوتا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ تقریباً پندرہ منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر ریسور راکھ کر ہمارے پاس آگیا۔

”میں نے ڈاکٹر شامندر کو گولایا ہے۔“ وہ روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں نے اسے ملی دھر کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ اس کی ذہن رکھ کر دے گا اور دوا وغیرہ دے دے گا اور جب تک میں اجازت نہ دوں تم لوگ خاص طور سے تم!“ اس نے اٹھنے سے روپ متی کی طرف اشارہ کیا ”باہر نہیں نکلو گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ معاملہ آج رات تک ختم ہو جائے۔ اگر یہ پنڈت لوگ سوکوں پر آگئے تو

صورت حال خاصی سنگین ہو جائے گی۔“

”تم کس جا رہے ہو؟“ روپ متی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلایا ”تھوڑی مدت بھاگ دوڑ تو کرنی پڑے گی۔ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ میری طرف متوجہ ہو گیا ”تمہارے لیے لی الحال زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ تمہیں تو بہت کم لوگ پہچانتے ہیں۔ ویسے بہتر ہو گا کہ چند روز تم بھی اپنے آپ کو میاں کنی محدود رکھو۔“

میں نے سر ہلایا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ شکر اور کالو کا کچھ ہدایات دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔

ہم جب سے آئے تھے مندر کی بکن میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اس نے آتے ہی بکن سنبھال لیا تھا اور اب وہ دھیر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کالو رام نے ملی دھر کے لیے ناشتا بنایا اور وہ ششکر کے ساتھ ملی دھر والے کمرے میں چلا گیا تھا۔

میں اور روپ متی باہر آگئے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم برا خوشگوار ہو گیا تھا۔ تیز ہوا سے بارش کے پودے جھٹکے جا رہے تھے۔ ہم لان میں گھومتے ہوئے سوئمٹنگ پول کی طرف آئے تو جاگی کو دیکھ کر ٹھک لیا۔ پول میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ میں اب تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ کسی کمرے میں جا کر سو گئی ہے لیکن اسے یہاں بیٹھے دیکھ کر جوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

”تم ایسی یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“ میں نے اس کے قریب پڑی ہوئی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”اندھ بیٹھے بیٹھے بورہوری تھی۔“ جاگی نے جواب دیا ”موسم برا خوشگوار ہو رہا ہے۔ یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔“

روپ متی نے بھی سینٹرل اتار دیے اور جاگی کے قریب ہی پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

ہم دیر تک وہاں بیٹھے بائیں کرتے رہے اور پھر ایک گاڑی گیٹ کے باہر ہکر رکی۔ ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے وہاں سے گیٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیٹ کھلے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور گاڑی اندر آکر پورچ میں رک گئی۔ اس کے تقریباً پانچ منٹ بعد ششکر نے آگرتیا کا ڈاکٹر شامندر آگیا۔ میں جاگی اور روپ متی کو دیکھ چوڑا کر اندر آگیا۔ ڈاکٹر شامندر جوان اور خوب رو آوی تھا۔ رنگ کا۔ غاری سوٹ اس پر خوب چنچ رہا تھا۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم بہت سنگھ ہو۔“ اس نے

بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے منکرا رہا۔ میں جب سے روپ متی کے ہاں آیا تھا وجدان علی سے بہت سنگھ بن گیا تھا اور روپ متی کے جاننے والے مجھے اسی نام سے پکارتے لگے تھے۔ ڈاکٹر شامندر کو یقیناً ٹھاکر نے میرے بارے میں بتایا ہو گا۔

ہم پنڈت ملی دھر والے کمرے میں آگئے۔ اب اس کے کمرے میں ایک چارپائی ڈال دی تھی جس پر بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ ملی دھر بستر پر بٹھال سا رہا تھا۔ ششکر بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اس نے جلدی سے ڈاکٹر شامندر کے لیے ایک کرسی بھی لاکر رکھ دی۔

ڈاکٹر نے ملی دھر کا پیر دیکھا اور ششکر سے گرم پانی لانے کو کہا اور ملی دھر کا پیر پتھر پتھر دیکھنے لگا۔

ملی دھر کو ایک سو دو سے اوپر بخار تھا۔ ششکر پانی گرم کر کے لے آیا۔ ملی دھر کو پیر لٹکا کر چارپائی پر بٹھایا گیا۔ ڈاکٹر نے نیچے تیار رکھ کر خود ملی دھر کا پیر دھوا۔ اسے کاشن سے خشک کر کے اسپرٹ سے ختم صاف کیا۔ زخم پر اسپرٹ لگنے کی عملی دھریچ اٹھا تھا۔ ششکر نے اسے گرفت میں لیے رکھا۔

بہت سوچ جانے کی وجہ سے اس کے ذہنی انگوٹھے کی ڈرنگ میں آدھا ٹھکانا لگ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک آنکھنشن بھی لگایا اور ایک کیپول اور دو روگلیاں بھی کھلا دیں۔ چند کیپول اور روگلیاں ایک گھلی میں ڈال کر ششکر کے حوالے کر دیں اور ان کے استعمال کے بارے میں ہدایات دیتے لگا۔

میں ڈاکٹر کے ساتھ تقریباً آدھا ٹھکانا ہال میں بیٹھا رہا۔ اہل دوران میں جائے بھی گئی تھی اور بہت سی باتیں بھی ہوئیں لیکن ڈاکٹر نے ایک مرتبہ بھی دریافت نہیں کیا تھا کہ پنڈت ملی دھر کے پیر کے انگوٹھے کا ناخن کیسے اڑا تھا اور پیر خیال تھا کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے اسے سمجھا دیا ہو گا۔ ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد میں سوئمٹنگ پول کی طرف واپس آیا تو جاگی اور روپ متی اسی طرح پول میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔

تم آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ ہوا میں بھی تیزی آگئی تھی اور پھر کھن کھن کی آواز کے ساتھ مولی مولی ہوندریں ہونے لگیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے کی طرف ڈوڑا کھاتے کی دیوار کے ساتھ موڑ پر گھومتے ہوئے پیچھے جڑ بڑیکھا۔ میرا خیال تھا کہ روپ متی اور جاگی بھی میرے پیچھے آ رہی ہوں کی لیکن وہ دونوں اپنی جگہ سے ایک انچ

بھی نہیں ہلی تھیں۔ ان دونوں کے نفرتی قہقہے میرے ذہن میں بازگشت کی پیدا کر رہے تھے۔

میں برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا اور لان کی طرف دیکھنے لگا۔ آسمان سے برستی ہوئی مولی مولی ہوندروں نے اب باقاعدہ بارش کی صورت اختیار کر لی تھی جس میں بتدریج تیزی آتی جا رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا پھولوں کے پودوں اور ناریل کے درختوں کو جھولتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پندرہ بیس منٹ بعد بارش بہت تیز ہو گئی۔ مجھے اچانک ہی جاگی اور روپ متی کا خیال آگیا۔ وہ دونوں ابھی تک سوئمٹنگ پول کی طرف ہی تھیں۔ وہ شاید پوری طرح آسمان سے برستے پانی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔

دس منٹ اور گزر گئے۔ پادلوں کی گھن کرج کے ساتھ بارش میں کچھ اور تیزی آگئی تھی اور پھر وہ دونوں پول کی طرف سے نکل کر اس طرف آتی ہوئی دکھائی دیں اور دو منٹ بعد ہی وہ برآمدے میں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں بھی اندر جانے کے لیے کرسی سے اٹھ چکا تھا۔ ان دونوں کے لباس جسم سے چپکے ہوئے تھے اور پانی کی دھاریں سرہری تھیں۔ اسیں دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی اور پھر اسی لمحے بجلی چمکی اور زوردار کڑکا ہوا۔ میں بھی وحشت زدہ سا ہو گیا اور پھر میری وحشت اس وقت اور بڑھ گئی جب وہ دونوں چمکتی ہوئی دوڑ کر مجھ سے پلٹ گئیں۔

○●○

تین گھنٹوں کی موسلا دھار بارش نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں خولی کے چپٹے برآمدے میں آیا تھا۔ اس طرف بھی جل تھل ایک رہ گیا تھا۔ مور اور ہرن وغیرہ جنگل میں شیدز کے نیچے دھکے ہوئے تھے۔ میں چند منٹ وہاں کھڑا رہا پھر سامنے والے برآمدے میں آگیا۔ جاگی اور روپ متی وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی ایک کرسی ٹھیکٹ کر بیٹھ گیا۔

شام ہو گئی۔ بارش بند ہو چکی تھی لیکن آسمان پر پادلوں کی گھن گرج اب بھی جاری تھی۔ بجلی بھی رہ رہ کر پتک رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ بارش ہوگی اور پہلے سے زیادہ شدت سے ہوگی۔

اٹھ بجے کے قریب ٹھاکر بھانوت سنگھ پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہوں نے مندر میں روپ متی کے قدموں پر لڑکھڑا کر معافی مانگی تھی۔ بعد

میں معلوم ہوا کہ اس کا نام لاجوئی ہے۔ ہمارا سامنا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر کسی قسم کی ندامت یا شرمندگی کے تاثرات نہیں تھے۔ ندامت اور شرم دینا کا احساس تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جن میں کچھ غیرت ہو۔ ان بھی لڑکیوں میں نہ تو شرم دینا ہوتی ہے اور نہ غیرت۔ مجھے پر نام کرتے ہوئے بھی وہ بڑی دھڑالی سے مسکرا رہی تھی۔

”رات دس بجے ہم نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا اہتمام کیا ہے۔“ ٹھاکر بھانوت سنگھ کہہ رہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں روپ متی وغیرہ سے ذرا دور بیٹھے ہوئے تھے ”آج دوسرے اخبارات میں پولیس میں درج کرائی جانے والی رپورٹ کی تفصیل اور پنڈت ہری رام کا بیان شائع ہوا ہے۔ اس بیان کا اثر زائل کرنے کے لیے ہمارے لیے بھی یہ قدم اٹھانا ضروری ہو گیا تھا۔“ اس نے چٹون کی جیب سے یہ کیا ہوا ایک انگریزی اخبار نکال کر میری طرف بوجھا دیا۔

میں نے اخبار کھول کر دیکھا۔ وہ خبر پہلے صفحے پر ہیڈ لائن کے ساتھ چھپی تھی۔ پنڈت ہری رام اور ان دو پنڈتوں کی تصویریں بھی تھیں جو مندر میں ہمارے ہاتھوں پڑے تھے۔ میں خبر پڑھنے لگا۔

پنڈت ہری رام نے ہم پر (میں اور روپ متی) سنگھین الزامات لگائے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق آوارہ مزاج راج کمار روپ متی اپنے ایک مسلمان عاشق کے ساتھ مندر کے ایک ویران حصے میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی تھیں۔ انہیں سرزنش کی گئی تو انہوں نے مندر کے پنڈتوں پر حملہ کر دیا۔ روپ متی کے ساتھی نے کوئی چلا دی جو ایک پنڈت کی ٹانگ میں لگی۔

پنڈت ہری رام نے روپ متی پر اور بھی کئی سنگھین الزامات لگائے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق راج کمار روپ متی مختلف اوقات میں مختلف مردوں کو لے کر مندر میں آتی رہتی تھی۔ اس بیان میں روپ متی کی کردار کشی کی بھرپور کوشش کی گئی تھی اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔

میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

”پریس کانفرنس کا انتظام تم نے کیا ہے؟“  
”میں نے پولیس کنشنسٹریبل سے بات کی تھی۔“  
ٹھاکر نے جواب دیا ”پہلے تو وہ میری بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا بلکہ اس نے تو مشورہ دیا تھا کہ میں اس معاملے سے بالکل

اگک رہوں اور راج کمار روپ متی کی مدد سے دست بکھڑ ہو جاؤں۔

”میں نے بھی تیور کر لے کر لیے۔ مسٹرائڈ سے جانتا ہے کہ اگر مجھ جیسے دو چار آدمی اکڑ گئے تو نہ صرف اس کی کوئی بلکہ جیون بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ میری بات سن کر وہ میرے مشورے پر پریس کانفرنس بلائے پر آمادہ ہو گیا جس میں پنڈت مل دھر اور ان چار لڑکیوں کو پیش کیا جائے گا جو کل رات مندر میں موجود تھیں۔“

”کل رات تو شاید مندر میں سات آٹھ لڑکیاں تھیں۔“ میں نے کہا۔

”صرف چار ہی سے رابطہ ہو سکا ہے۔ باقی ڈر کے مارے روپوش ہو گئی ہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”ہم ساڑھے نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ میرے دو آدمی راقصہ دیکھا اور دوسری لڑکیوں کو لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں گے۔“

”کیا ہمیں بھی جانا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔ لیکن تم سانس نہیں آؤ گے۔“ ٹھاکر نے کہا ”جاگتی اور روپ متی سانس آئیں گی۔ جاگتی بٹائی کے اسے نکش مندر سے کس طرح اغوا کیا گیا تھا اور روپ متی باقی تفصیلات بتائے گی۔ پنڈت مل دھر اور لاجوئی وغیرہ بتائیں گے کہ مندر میں کیا چمھ ہوتا ہے۔ لاجوئی وہ لڑکی ہے جو کئی مرتبہ اس مندر میں جا چکی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”اگر مل دھر اور لاجوئی وغیرہ نے وہاں کوئی گڑبڑ کی تو میرا مطلب ہے۔“

”ایسی صورت میں پولیس انہیں اپنی تحویل میں لے گی اور خود ہی ان سے سب کچھ اگھوالے گی۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہم دونوں پنڈت مل دھر والے کمرے میں آ گئے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اسے سمجھانے لگا کہ اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا تو اسے پولیس کی طرف سے سنگھین ٹانگا سامنا کرنا پڑے گا۔

”نوبت کے قریب شکر نے میز پر کھانا لگادیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم روانہ ہوئے تو پونے دس بج رہے تھے۔ ٹھاکر نے اپنی کار کے بجائے روپ متی کی پیادہ کو ترجیح دی تھی۔ ہمیں گھنٹوں کی موسلا دھار بارش نے شہر کو اٹک کر رکھ دیا تھا۔ ہر طرف جیل جیل ایک بورہا تھا۔ کئی سڑکیں اب بھی آب تھیں۔“

پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ایک اور سنسنی خیز خبر سننے کو

اے تقریباً ایک گھنٹا پہلے سچے پور کلب کی راقصہ دیکھا تو اسے گھڑے بے دردی سے تھک کر دیا گیا تھا۔ اس کا بائیں اس وقت ہوا تھا جب اٹھ کھٹا پہلے ٹھاکر بھانوت کا ایک آدمی دیکھا کہ لینے کے لیے تھکی مارگ میں داغ کی کوٹھی پر پہنچا۔ دیکھا اکیلی رہتی تھی۔ گھر کے کام کاج اس کی سیوا کے لیے ایک ملازم اور ایک ملازمہ تھی۔ راکوئی تیل جتنا رہا لیکن کافی دیر بعد جب کوئی باہر نہیں تو وہ گیت کے کھلے ہوئے ذیلی دروازے سے اندر داخل ہو کر ملازم کو آوازیں دیتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ اس نے بھی کوئی سانس نہیں آتا تو وہ اندر داخل ہو گیا۔

ہیڈ روم میں دیکھا کہ لاش دیکھ کر وہ جھج اٹھا۔ دیکھا گاٹا بوا تھا۔ پیٹ چاک تھا اور ایک خنجر دسے تک سینے میں تھا۔ ہر طرف خون ہی خون بھرا ہوا تھا۔ ٹھاکر کا آدمی باہر آیا اور پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اس کی اطلاع دی۔ ایک پولیس پارٹی فوراً ہی دیکھا کہ ٹی کی طرف روانہ ہوئی جو ابھی تک واپس نہیں آئی۔

اس صورت حال نے مجھے اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کو بھی تاثر دیا جو اس کر دیا تھا۔ ٹھاکر معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہیڈ کوارٹر میں جمع اخبار نویس جانے واردات پر جانا پڑے تھے لیکن پولیس کنشنسٹریبل انہیں یہ کہہ کر روک لیا کہ مالکی لاش اس وقت تک نہیں اٹھائی جائے گی جب تک کہ پریس کانفرنس سے فارغ نہیں ہو جائے۔

ہیڈ روم سے ملحق کمرے میں چلا گیا۔ پریس کنشنسٹریبل نے پولیس کنشنسٹریبل سے اخبارات میں جانے والی آن کی اہم ترین خبر کے حوالے سے پس منظر بتا کر پنڈت مل دھر لاجوئی اور دوسری دو لڑکیوں نے اخبار نویسوں کے سامنے اپنے بیانات دیے۔

”میں کسی دباؤ کے بغیر یہ بیان دے رہا ہوں۔“ پنڈت ہری رام کہہ رہا تھا ”جاگتی دیوی کو میں نے ہی دارا کے خنجر پر مندر سے اغوا کیا تھا۔“ وہ جاگتی کے اغوا کا مقصد اس کے پس منظر میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا کہ ہری رام بدعاش آدمی ہے۔ اس نے مندر کو عوامی اثنا کر رکھا ہے۔ وہاں ہر رات آوارہ عورتوں کو لایا جاتا ہے۔ رات بھر رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ کل رات۔“

میں نے اسے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے

”یہ جھوٹ ہے کہ ہری رام اور دوسرے پنڈتوں نے راج کمار روپ متی اور اس کے مسلمان دوست کو مندر میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی ساتھی جاگتی دیوی کی تلاش میں وہاں آئے تھے۔ اس وقت پنڈت ہری رام اور ہم لوگ رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔ راقصہ دیکھا پنڈت ہری رام کی فرمائش پر برہنہ ہو کر ڈانس کر رہی تھی۔ اسے ہری رام کی خواہش پر ہی بھاری معاوضہ دے کر وہاں لایا گیا تھا۔“

دیکھا کہ نام پر سب ہی اخبار نویس چونک گئے تھے۔ پنڈت مل دھر نے اپنا بیان جاری رکھا۔ وہ پنڈت ہری رام اور مندر کے دوسرے پجاریوں کے سیاہ کرکوت کھل کر بیان کرتا رہا۔ اس کا یہ انکشاف تو بہت ہی سنسنی خیز تھا کہ دو ہفتے پہلے اسی مندر سے پراسرار طور پر لاپتا ہونے والی پونم نامی ایک خوب صورت عورت کو بھی انہی پنڈتوں نے غائب کیا تھا۔ وہ تین دن تک اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ اس نے ایک مرتبہ موقع پا کر بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گھاٹ گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا اور اس کی لاش مندر کے پیچھے پھاڑیوں میں گڑھا کھود کر دبا دی گئی۔

لاجوئی اور دوسری لڑکیوں نے بھی اسی قسم کے بیانات دیے۔ لاجوئی نے تو مزید کئی انکشافات کیے تھے۔ اسے داو عیش دینے کے لیے اکثر اس مندر میں لایا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے شرکی بعض اہم شخصیات کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ انہیں رنگ رلیاں منانے کے لیے خاص طور پر مندر میں بلایا جاتا تھا۔ بارہ نویسوں نے پنڈت مل دھر لاجوئی اور دوسری لڑکیوں سے لاتعداد سوالات کیے۔ جاگتی اور روپ متی سے بھی کچھ باتیں پوچھی گئیں۔

آخر میں پولیس کنشنسٹریبل نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ شرکی مشہور راقصہ دیکھا کو بھی مندر کے اندر کے خفاقی بتانے کے لیے یہاں لایا جانے والا تھا لیکن اسے قتل کر دیا گیا۔ اس نے کھل کر اس شبے کا اظہار کیا تھا کہ راقصہ دیکھا

**مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں**

**بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات**

**عظمت کے مینار**

قیمت 150/- روپے

ذائقہ 25/- روپے

مصنف: ضیاء تنسیم بلگرامی



کا قتل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو سکتی ہے۔ اسے شاید اس لیے قتل کر دیا گیا کہ وہ رات کو رام گڑھ جمیل والے مندر میں روٹنا ہونے والے واقعے کے سلسلے میں پولیس کو کوئی بیان نہ دے سکے۔

ریکھا کے قتل سے مندر والے واقعے کے دوسرے چشم دید گواہوں کی زندگیوں کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ پولیس کسٹرن پانڈے نے بتایا کہ چنڈ مری دھرو کو تو پولیس کی حراست میں رکھا جائے گا جبکہ دوسری لڑکیوں کی حفاظت کے لیے مضبوط انتظامات کیے جائیں گے۔

ذیہہ ٹھنڈے میں یہ پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔ تمام اخبار نویس رفاہہ ریکھا کی کوشش کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ اس سنسنی خیز واردات کے لیے اپنے اپنے اخباروں کے لیے رپورٹ تیار کر سکیں۔

○

اگلے روز اخبارات نے تسلسلہ چلایا اور پھر اسی شام شہر میں بنگامے شروع ہو گئے۔ دو مخالف دھڑے بن گئے تھے۔ ایک دھڑا دھرم کو نشٹ کرنے کے جرم میں چنڈ ہری رام اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور کڑی سزا کا مطالبہ کر رہا تھا جبکہ دوسرا دھڑا راج کماری روپ متی اور اس کے مسلمان عاشق کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے ہے۔ مسلمانوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ یہ مطالبہ ہر ہندو مسلم فساد کے موقع پر کیا جاتا تھا۔

ان بنگاموں پر قابو پانے کے لیے پورے شہر کی پولیس حرکت میں آگئی تھی اور یہ بھی خیانت تھا کہ بنگامے شروع ہونے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی اور لوگ گھروں میں دیک گئے تھے۔

بارش رات بھر ہوئی رہی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ ہمیں حویلی میں چھوڑ کر دوبارہ شہر چلا گیا تھا۔

اگلے روز بنگامے پھر شروع ہو گئے لیکن اب پولیس بلوائیوں سے منٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ دھنڈے دھنڈے سے بارش بھی ہوئی رہی۔ اس طرح بنگامے زیادہ دور نہیں

چل سکتے تھے۔ تین چار روز تک یہ صورت حال برقرار رہی۔ بارشوں نے شہر کو اٹھل پھٹل کر دیا تھا جس سے بنگامے کرنے والوں کا جوش و خروش بھی دب گیا اور بارشیں نہ ہوتیں تو صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں ہم حویلی سے باہر نہیں گئے۔ موسلا دھار بارش کا سلسلہ اگرچہ رک گیا تھا مگر

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ہلکی ہلکی بارش ہوجاتی۔

اور پھر چانک ہی ایک روز پھر بنگامے شروع ہو گیا۔

بنگامے کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہ آئی۔

جن دنوں یہاں یہ گڑ بڑ شروع ہوئی تھی ان دنوں چنڈ گڑھ کا بکڑا ہوا بد قماش اور راج کماری بولنت سنگھ اور آٹھ

ہوا تھا۔ وہ دونوں پہلے چنڈ گڑھ سے ہوتا ہوا یہاں آیا تھا۔ احمد آباد میں بھی وہ اخبارات میں سب کچھ پڑھتا رہا تھا۔

یہاں آیا تو بنگامے کسی قدر دب گئے تھے۔ پولیس شہر معززین اور بعض بڑے مندروں کے چنڈ تل پٹھ کر رہا۔

کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بولنت سنگھ یہ ہو گواٹا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چند نہایت کمزور قسم کے چنڈ

کو جمع کر کے راج کماری روپ متی کے خلاف بھڑکایا۔ کچھ کرائے کے غنڈے بھی جمع کر لیے اور نعرے لگاتے۔

روپ متی کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ وہ لوگ حویلی کو آگواٹا چاہتے تھے۔

روپ متی کی حویلی پر پہلے ہی دو کانٹیل قبیلہ نے اطلاع دے دی۔ پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچی۔ اس دن

بلوائیوں کا ٹونڈ بولنت سنگھ کی قیادت میں حویلی پر حملہ ہو چکا تھا۔ پولیس بروقت پہنچی گئی۔ بولنت سنگھ تو پولیس کو

بھی ٹھک گیا تھا البتہ ایک گھنٹے کی بنگامہ آرائی کے بعد چنڈ اور کئی غنڈے پولیس کے ہاتھ آ گئے جنہیں سلاخ

کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میں حویلی کا قیدی بن کر رہ

تھا۔ جاگتی بھی بیزار ہو رہی تھی اور پھر اسی شام میں نے جاگتی بے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا اور روپ متی کی پکارا

کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر کی رونق معمول پر آچکی تھی۔ ہم مختلف بازار

میں گھومتے ہوئے ایم آئی روڈ پر راجستان پینٹری کے پاس ای۔ پیو ریم سے ذرا آگے انڈین کٹنی ہاؤس میں آ گئے۔ ہم

روپ متی وغیرہ کے لیے بہت سی چیزیں خریدی تھیں۔ خیال تھا کہ یہاں ایک کپ کافی پانی کر حویلی کی طرف

ہو جائیں گے۔ کافی ہاؤس میں بڑی رونق تھی۔ ہمیں ایک بیٹہ

ہمیں اپنے سامنے پا کر شاید اس ویٹریس کو اپنی

میں پچھین نہیں آ رہا تھا۔ وہ شہر کی دیر تک متوحش

ہوئے ہادی بادی ہماری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی

لوہوں میں عجیب سی چمک لہریں لینے لگی اور پھر ناقابل بیان

کی نظر پڑ کر رہے ہوئے۔ وہ جاگتی سے لپٹ گئی اور پھر اس

بچے بھی نہیں بچھا۔ وہ خوشی سے چیختے ہوئے میری پیشانی

پر میرے گالوں پر میرے پوسے دے رہی تھی۔ ہال میں

ہوئے لوگ سڑ سڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ یہاں کی

اشنی اور سابی زندگی کا مجھے کچھ کچھ تجربہ ہو چکا تھا۔

روپ کا نیم عراں لباس پہننا تو ایک عام سی بات تھی۔

پک کی طرح یہاں بھی سرعام بوس و کنار کو برا نہیں سمجھا

آقاہیں میں بارے شرم کے کتا جا رہا تھا۔ کافی ہاؤس کے

ہال میں درجنوں لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو دلچسپ نظروں سے

ب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس ویٹریس کا بس چہرہ تو کھنٹوں

طرح مجھ سے لپٹی رہتی اور میری پیشانی اور گال چومتی

تی کہیں میں نے ہی اس کی دونوں بائیں پکڑ کر اسے اپنے

پستے الگ کیا تھا۔ میری یہ داستان دہننے والے تھا کی لینڈ کے سرحدی شہر

نگم سامین میں لپٹنے والی پولیس دو من رنگ سنت کی بیٹی

جنازہ کرکٹ :۔ نے کے بعد میں اور جاگتی سے پور پہنچ گئے اور

اس سے زیادہ حیرت انگیز اتفاق یہ ہوا تھا کہ یہاں میرا اپنی

دشمن دارا بھی موجود تھا جو اس رات رام گڑھ جمیل والے

مندر میں ایک جھٹک دکھلا کر غائب ہو گیا تھا اور یہ اس سے

بھی بڑا اور ناقابل یقین اتفاق تھا کہ اس وقت سونیا ہمارے

سامنے موجود تھی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا۔" سونیا اس مرتبہ جاگتی کا ہاتھ

پکڑتے ہوئے بولی۔ فرط انبساط سے اس کے لمبے میں ہلکی

لرزش تھی۔ "میں تو سمجھی تھی کہ برما کے اس گاؤں سے

رخصت ہونے کے بعد ہم بھی ایک دوسرے کی صورت بھی

نہیں دیکھ پائیں گے۔" اسے اتفاق کہہ لو کہ ہم ایک زندہ حقیقت کی طرح

اس وقت تمہارے سامنے موجود ہیں۔" جاگتی نے مسکراتے

ہوئے جواب دیا "اور اس سے صمان (بڑا) اتفاق یہ ہے کہ

ہمارا وہ دشمن بھی اس شہر میں موجود ہے جس کے تعاقب میں

ہم گولڈن ٹرائی اینٹل جیسے موت کے حصار میں گھس گئے

تھے۔ "اوہ! تمہارا مطلب ہے۔۔۔ دارا۔" وہ چونک کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ تم لوگ اس کا پتہ چھارتے ہوئے یہاں

آئے ہو لیکن تم لوگ تو برما سے چین کی طرف نکل گئے

تھے۔" یہ بات اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔

"ہاں۔ یہ لمبی باتیں ہیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر ایک

دوسرے کے دکھ سکھ سنیں گے اور سنائیں گے۔ اس وقت

تھیں یہاں ویٹریس کے لباس میں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت

ہو رہی ہے لیکن میں یہ نہیں بھولا ہوں کہ ہم یہاں کافی پہنچے

آئے ہیں اور۔" میں خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا

"لوگ نہیں اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ہمارے سروں پر

سینگ نکل آئے ہوں۔ بہتر ہے تم ہمیں کافی پلاؤ۔ یہاں سے

جھکی کے بعد کسی جگہ بیٹھ کر تعقیب پائیں ہوں گی۔"

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم لوگ گاہک کی

حیثیت سے یہاں آئے ہو۔" سونیا نے کہا "کون سی کافی پیو

گے میرا خیال ہے اسپریسو (ESPRESSO) ہی مناسب

رہے گی۔" مجھے تمہاری پسند سے اتفاق ہے۔" جاگتی بولی "اب

جلدی سے لے آؤ۔" سونیا مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے جاگتی کی طرف

دیکھا۔ وہ کچھ مسکرا رہی تھی۔ "کیسا حسین اتفاق ہے کہ ہم سب ایک جگہ پر جمع

ہوئے۔" آتش فشاں 239 حصہ 4

آتش فشاں 239 حصہ 4

آتش فشاں 239 حصہ 4

آتش فشاں 239 حصہ 4

ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ میں پہلے بھی اےسپریسو (ESPRESSO) کافی کی مرتبہ پی چکا تھا لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اےسپریسو اور خوش ذائقہ کافی میں نے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ کافی کی چمکیں لینے ہوئے میں گاہے گاہے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ کر یہ لیتا تھا اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی شخص کو میں نے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا بلکہ یہ کمنا زیادہ مناسب ہو گا کہ جاگتی کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ جاگتی یہاں آنے کے بعد زیادہ تر سازی ہی سنتی تھی

کائی باؤس سے نکلتے ہوئے سونا بتا رہی تھی کہ  
 باؤس شو بھاڑوی نامی ایک بیوہ عورت کی ملکیت ہے اس  
 جی (ہر) ڈاکٹر تھا۔ ٹھاکر اور راجا قسم کے چند بڑے بڑے  
 لوگ اس کے سینکڑ پر تھے جن سے اس نے خوب دولت کمائی  
 تھی۔ کئی سال پہلے اس نے ایک راجا کو ایک منگیت سونائی

”یہ گڑی؟“  
 ”جاری ہے۔“ میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کیا۔  
 ”اس کا مطلب ہے تم لوگ بہت عرصے سے یہاں ہو  
 رہے ہو۔“ وہ اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے  
 ہوئے۔

عمارت خاصی پرانی تھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور لگتا تھا جیسے یہ کبھی بند نہ ہوا ہو۔ گیٹ کے اندر کافی کشادہ جگہ تھی۔ سامنے دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ بجلی کے لافعداد میسر لگے ہوئے تھے اور تارکزی کے جالے کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ میسرزں کے قریب ہی پندرہ سائیکلیں بھی

کھڑی تھیں۔ دو تین سائیکس تو ایسی تھیں جنہیں شاید کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے قریب ہی تین چار بچیاں اسٹاپ کھیل رہی تھیں۔ گیت کے ساتھ ہی دامن طرف دیوار پر گئے ہوئے لکڑی کے ایک باکس میں بہت سارے خطوط رکھے ہوئے تھے۔

اس عمارت میں صفائی کا بالکل دھیان نہیں رکھا گیا تھا۔ گیت کے اندر کی طرف کوڑا بھی بھرا ہوا تھا اور دیواریں بھی اس قدر گندی ہو رہی تھیں کہ ان کا اصل رنگ چھپ گیا تھا۔ غالباً کئی برسوں سے رنگ روغن پر توجہ نہیں دی گئی تھی۔

گیت کے دامن بائیں اوپر آمدورفت کے لیے زینے تھے زینوں کی دیوار اور رنگ بھی بہت مٹی ہو رہی تھی۔ عمارت میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہم سونیا کے پیچھے بائیں طرف والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔

سونیا کالینٹ دوسری منزل پر بائیں طرف والی راداری کے آخر میں تھا۔ دو کمروں کے اس فلیٹ میں ایک بہت مختصر سالانج اور چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ ہاتھ دوم دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔ سامنے ساتھ ساتھ دو کمرے تھے اور کوئی بھی کمرہ اس بائیں دس فٹ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دونوں کمروں کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ سونیا ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہ غصہ تھا کہ ان کمروں کی کھڑکیاں سامنے گلی کی طرف کھلتی تھیں۔ سونیا نے کمرے میں داخل ہو کر پردہ ایک طرف کھینچا اور کھڑکی کھول دی۔

کمرے میں گرے کھر کا سستا سا کابینہ بچھا ہوا تھا۔ کھڑکی والی دیوار کے ساتھ دو کرسیاں اور ان کے ساتھ ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ دوسری دیوار کے ساتھ سٹکل بینڈ بچھا ہوا تھا اور سامنے والی دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی تھی۔ الماری کے لکڑی کے دروازے کے اوپر والے حصے پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ بند پر میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ سونیا نے وہ کپڑے اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں ڈال دیے۔

”نیٹو۔“ وہ ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”یہ فلیٹ میں نے ایک اور لڑکی کے ساتھ مل کر کرانے پر لے رکھا ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہے اور ایک ہفتے کی چھٹی لے کر چودھ پور گئی ہوئی ہے۔ شاید برسوں واپس آجائے گی۔“ میں اور جاگنی کھڑکی کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سونیا سامنے کھڑی باری باری ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”تم دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اس قدر خوش

ہو رہی ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔“ دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ دھڑلے ہاتھوں سے بولنے لگی۔ ”ہم بتاؤ کہ چائے پوگے یا کافی ہی چلے گی۔“ ”کافی ابھی تو پی کر آئے ہیں لیکن بہر حال تم کچھ پلاؤ۔“ پر بعد ہو تو چائے بنالو۔“ میں نے جواب دیا۔

سونیا کمرے سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جاگنی بھی اندر کمرے سے نکل گئی۔ میں بھی اٹھ کر باہر آیا۔ وہ دونوں کمرے میں تھیں۔ میں سالانج میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں فرش کوئی درزی یا قالین نہیں بچھا تھا۔ تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچن کے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا فریج رکھا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف کونے میں ڈالیا ہوا چھوٹا کالینٹ لڈی رکھا ہوا تھا۔ زالی کے نچلے حصے میں وئی سی پی اور چند ڈیو بسنس بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش کر رہا تھا۔ سونیا کے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ یہاں بھی بند پر میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے اندازہ لگا۔ میں دھڑلے پیش نہیں آئی کہ سونیا کے ساتھ رہنے والی لڑکی بھی کچھ بے پروا واقع ہوئی تھی۔

وہ دونوں چائے لے کر آئیں۔ سونیا نے چھوٹی میز پر کچن میں کردی اور چائے کے کپ رکھ دیے۔ جاگنی میرے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور سونیا بند پر میلے کپڑے لے کر آئی۔ ”ہم تو شخص حادثاتی طور پر یہاں پہنچے تھے۔ تم بتاؤ۔ یہاں کیسے آئیں گے؟“ میں نے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے سوال لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ سونیا نے گہرا سانس لے کر جواب دیا ”ہم برما سے نکل کر آسمان سے ہوتے ہو۔ انڈیا کے صوبہ بہار میں بیٹھ بیٹھ گئے تھے۔ راتے میں ہم بڑی تکلیفیں اٹھاتی تھیں۔ آسمان میں دو مرتبہ ہم موت منہ میں جاتے جاتے بچے تھے۔ وہاں قبائلی طویل عمر۔ حکومت سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک مرتبہ تو سرکاری فوجی کے ساتھ ہم بھی ان کے نرے میں آ گئے تھے اور ہمارے خوش قسمتی ہے کہ قابیلیوں ہی نے ہمیں وہاں سے بھاگ کر دیا تھا۔ بہر حال، ہم تھیں جیسے جیسے ہوئے کسی نہ کسی طرح بچ گئے۔“ وہ چند محو کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھنے لگی۔

”ہونا کا خیال تھا کہ ہم پٹنہ ہی میں سیٹ ہونے کی کوشش کریں گے۔ اسے وہاں کام بھی مل گیا تھا لیکن وہ پٹنہ

وہاں ایک ایسے آدمی کو دیکھ لیا جو کچھ عرصے کو لڈن ٹرائی کل میں بھی رہ چکا تھا۔ ہونا کا خیال تھا کہ شاید وہ بھی لڈن ٹرائی اسٹیکل سے بھاگ کر آیا ہو مگر اس سے رابطہ کرنے سے پہلے وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ پٹنہ میں سنسی خیر انکشاف ہوا کہ وہ شخص پٹنہ میں بات کا ایک ریکٹ چلا رہا تھا اور اس کے رابطے اوپر برے سینڈ ٹیکسٹ سے بھی تھے۔ ہونا نے وہاں سے بھاگ ہی میں غائب ہو گئی۔

”ہم مصائب جھیلے ہوئے کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچے۔ خیال تھا کہ دہلی جیسے بڑے شہر میں ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں ہمیں کوئی فیروز شاہ کے علاقے میں رہائش کے ایک کونہ بھی مل گئی اور ہونا کو کام بھی مل گیا۔“

”ہونا اور ہونا میرا بہت خیال رکھے ہوئے تھے۔ ان کا بیٹھنا بہت مانوس ہو گیا تھا لیکن میں ان پر بوجھ بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میں نے بھی نوکری کی تلاش شروع کی لیکن ہر جگہ میری خوب صورتی آڑے آتی رہی۔ ایک رات کے لیے مجھے اپنے بہتر کی زینت بنانے کو تو مجھے نوکری نہیں ملی۔ کہیں نوکری کی امید دلائی بھی گئی شرط رکھی گئی کہ میں ان کا دل بھی بھلاؤں گی۔“

”تین مہینے گزر گئے۔ ایک شام جب میں اسی طرح رہتا ہوں تو لڑکی نے سنسی خیر انکشاف ہوا کہ ہونا اور اسے اس کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ بات تو بہت دنوں سے نوت کر رہی تھی کہ ہونا کی شکل و صورت سے لے کر کچھ بڑبڑا کر رہی تھی۔ وہ چچی تھی اور چینیوں نے انہیں میں شکر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا اور بالآخر ہونا نے ہونا کو چینی جاسوس ہونے کے شبے میں گرفتار کر لیا۔“

”ہونا بھی لیٹ میں آ گیا۔“

”لوگس کے چند الٹا ساہ لباس میں میرے انتظار میں آئے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ ہونا کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آئے اور پھر اگلے ہی بات باہر بھی پہنچ گئی کہ میں بدھا کی بیوی کا رہوں اور دونوں سے میرا تعلق صرف اتنا ہے کہ میں ان کے ساتھ آئی تھی۔“

”ہندوستان میں تبت کے ہزاروں مساجدیں آباد ہیں۔ اگرچہ میسوری اور دھرم شالہ کے علاقوں میں رہ رہا تھا ہے لیکن لاتعداد تبتی دہلی میں بھی آباد

ہیں۔“ تبت کا جلا وطن لانا بھی اتفاق سے ان دنوں دہلی میں موجود تھا۔ میری گرفتاری کی خبر اس تک بھی پہنچ گئی اور پھر محض دھرم کی بنیاد پر تبتی باشندوں کی طرف سے میری رہائی کی کوشش شروع ہو گئی۔ لانا اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کے ایک نمائندے نے جیل میں مجھ سے ملاقات بھی کی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ میں کون ہوں اور یہاں تک کیسے پہنچی ہوں۔

”میرے لیے تھائی سفارت خانے سے بھی رابطہ کیا گیا اور سفارت خانے کے ذریعے تھائی لینڈ سے بھی میرے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ بالآخر چار مہینے تک جلا وطن تبتی رہنماؤں اور تھائی سفارت خانے کی کوششوں سے مجھے جاسوسی کے الزام سے بری کر دیا گیا۔ تاہم بغیر پاسپورٹ ہندوستان میں داخل ہونے کے جرم میں مجھے تین مہینوں کی قید کی سزا دی گئی۔“

”یہ تین مہینے میں نے دہلی کی متاثرہ جیل میں گزارے۔ یہ دنیا کی خوفناک ترین جیل ہے۔ اس جیل میں قانون کا نہیں بد معاشوں اور غنڈوں کا راج ہے۔ یہاں انہی کا قانون چلتا ہے اور جیل کے حکام انہی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ بہر حال، میں نے اس جیل میں تین مہینے جس طرح گزارے وہ میں ہی جانتی ہوں۔“

”ہند سرکار میری سزا پوری ہونے کے بعد مجھے تھائی لینڈ واپس بھیجنا چاہتی تھی لیکن میں تھائی لینڈ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس موقع پر بھی جلا وطن تبتی رہنما میرے کام آئے اور انہی کی کوششوں سے مجھے ہندوستان میں رہنے کی اجازت مل گئی اور مجھے دھرم شالہ بھیج دیا گیا۔ میں نے دو مہینے دھرم شالہ کی عبادت گاہ میں گزارے اور پھر شملہ اور انبالہ ہوئی ہوئی دوبارہ دہلی پہنچی۔“

”یہاں بڑے بڑے شکاری گھات لگائے بیٹھے تھے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ اسی دوران میں میری ملاقات منندہ دیوی نامی ایک عورت سے ہو گئی جو مجھے یہاں لے آئی۔“

”میں منندہ دیوی کو ایک شریف عورت سمجھتی تھی لیکن وہ بڑی بد معاش نکلی۔ وہ بہت اورنجی تھی جو بے پور کے بڑے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سلائی کرتی تھی۔ میں پہلی فرصت میں موقع ملنے ہی وہاں سے بھاگ نکلی اور کسی طرح شوبھا دیوی تک پہنچ گئی۔ اس نے مجھے اپنے کافی باؤس میں ملازمت دے دی۔ چند روز تو میں کافی باؤس کے اوپر ایک کمرے میں



نکل آئے تھے۔ میں نے جاگ کر متوجہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں راستہ بھولی نہیں ہوں، جان بوجھ کر اس طرف آئی ہوں۔“ اس نے گاڑی کو ایک اور کشادہ سڑک پر موڑ دیا۔ ”جان بوجھ کر یہ لمبا راستہ اختیار کیا ہے تاکہ حویلی پہنچنے سے پہلے اطمینان سے کچھ باتیں کر سکیں۔“

”تمہارا مطلب ہے اگر تم یہ باتیں روپ متی کے سامنے کہیں تو وہ برا مان جائی؟“ میں نے کہا۔

”ان باتوں سے اسے برا ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ میری تائید کرے گی اور پھر یہ تو تاریخی حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ میں تو کچھ اور باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ جاگتی نے کہا۔

”اوہ!“ میں چونک گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کچھ اور باتیں ابھی باقی ہیں۔“

”شکر کو مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔ کوئی اور ہوتی تو تمہارے کان کھا جاتی۔“ جاگتی نے کہا۔

”خدا میری حالت پر رحم کرے۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا ”سو نانا کے فلیٹ سے نکلنے سے لے کر اب تک تمہاری زبان ایک لمبے کوچی نہیں دی اور تم کہہ رہی ہو کہ ہمیں زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔ اس کا تجربہ تو مجھے پہلے بھی ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے ریڈیو یا بی وی کی ضرورت نہیں۔ ہرسال جو باتیں باقی رہ گئی ہیں وہ بھی کہہ ڈالو۔“

”بہت بولنے لگے ہو تم؟“ جاگتی نے مجھے گھورا۔

”اچھا بابا۔ میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ تم بولو۔“ میں نے کہا۔

”اتفاق سے سو نانا ہمیں مل گئی ہے۔“ جاگتی کہہ رہی تھی ”وہ وفادار اور قابل اعتماد لڑکی ہے۔ اسے آزمانے کی ضرورت نہیں اور ہم یہاں جس قسم کے حالات سے دوچار ہو چکے ہیں اس کے پیش نظر ہمیں کسی ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔“

”میں سمجھا نہیں۔ کھل کر بات کرو۔“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے جاگتی کی طرف دیکھا۔

”اس میں شبہ نہیں کہ روپ متی بھی ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہے اور اس پر اتنا اعتماد بھی مجھ جیسا کیا جاسکتا ہے۔“ جاگتی نے کہا ”ہندو تو ان ہندوؤں کے پیچھے دارا جیسا دماغ کام کر رہا ہے وہ ہندوستان کے مندر دیکھ چکا ہے یہ عبادت گاہیں نہیں، سو نے کی کائیں ہیں۔ وہ کسی نہ کسی مندر پر ہر صورت

میں قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ زندگی بھر عیش کر سکے اور اتفاق سے بلونت سنگھ جیسا شیطان بھی بیچ میں کود پڑا ہے۔ دو چار دن کی خاموشی کا مطلب یہ نہیں کہ یہ (لڑائی) ختم ہو گئی ہے بلکہ میرے خیال میں یہاں ایک اور مہم بھارت چھڑنے والی ہے جو طویل عرصے تک جاری رہے گی۔“

”میں اس ساری بات کو اس کا مطلب اب بھی نہیں سمجھ سکا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے حیرت ہے کہ یہاں اگر تمہارا دماغ اتنا کندھ کیوں ہو گیا ہے کہ سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔“ جاگتی نے کہا ”ہم روپ متی اور بھانوت سنگھ پر ہی ڈی پڈ نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کو شہر کے سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ ہمیں ایمر جنسی میں کسی ایسی جگہ کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے جس کے بارے میں ان دونوں کو بھی علم نہ ہو۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ ”اتنی جھوٹی سی بات کے لیے اتنی لمبی کھانسانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اگر تم آج کل عقل سے پیدل نہ ہوتے تو مجھے یہ کتنا خانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔“ جاگتی نے جواب دیا ”بہتر ہو گا کہ سو نانا کو یہاں کے حالات سے پوری طرح آگاہ کر دیا جائے۔ اگر وہ ابھی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے۔“

”تو اسے بھی اس معاملے میں ٹھیکٹ لیا جائے۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہی سمجھ لو۔“ جاگتی بولی۔

”لیکن اس کے ساتھ وہ جو ماحوری ڈکٹ رہ رہی ہے اس کا کیا ہو گا؟“ میں نے کہا۔

”ماہوری ڈکٹ!“ جاگتی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”وہ ان ڈیٹا فلیٹوں میں رہنے والی نہیں۔ یہ ماہوری تو۔“

”وی وی۔“ میں سمجھ گیا۔ ”میں نے کہا اس کا کیا ہو گا۔ کیا ہم اسے اٹھا کر فلیٹ سے باہر پھینک دیں گے؟“

”ہمیں کوئی دوسرا بندوبست کرنا ہو گا۔“ جاگتی نے کہا ”اس بلڈنگ میں رش بہت ہے۔ یہاں متوسط اور چھوٹے کے لوگ رہتے ہیں۔ میں پورے دو تھوک سے کہہ سکتی ہوں کہ اس بلڈنگ میں جو چیزیں گھنے لوگوں کی آمد رفت رہتی ہوں اور ایسی کوئی جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہو سکتی۔“

”اس کا مطلب ہے اس کے لیے کوئی الگ مکان لینا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اور یہ کام خود ہی کرے گی۔ اسے جتنے روپوں کی ضرورت ہوگی وہ میں دے دوں گی۔“ جاگتی نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے گردن کھما کر اس کی طرف دیکھا

”تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے آگئے؟“

”روپ متی نے مجھے اچھی خاصی رقم دے رکھی ہے اور وہ رقم اتنی ہے کہ ہم کئی درمیانے درجے کے مکان کا کچھ مینے کا کرایہ ایڈوانس تو دے ہی سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں روپ متی سے مزید رقم لے سکتی ہوں اور مجھے یقین ہے وہ کوئی جرح بھی نہیں کرے گی۔“ جاگتی نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم اس وقت کہاں رہی ہو؟“ میں نے کہنے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”ہم اس وقت اشوک مارگ میں گھوم رہے ہیں۔“ جاگتی نے جواب دیا ”اور سینٹرل میوزیم والے چوراہے سے ہوتے ہوئے جواہر لال نہرو مارگ کی طرف نکل جائیں گے۔“

”یہاں خیال ہے، تم واقعی راستہ بھول گئی ہو۔“ میں نے کہا ”اٹھا کر بھانوت سنگھ کی حویلی آگرہ مارگ سے بھرت پور کی طرف جانے والی سڑک پر ہے جبکہ تم اس وقت روپ متی کی حویلی کی طرف جا رہی ہو۔“

”میری واقعی مت ماری گئی ہے۔“ جاگتی نے پیشانی پر ہاتھ مارا ”میں واقعی بھول گئی تھی۔ ہرسال، ہم سینٹرل میوزیم والے چوراہے سے ہی آگرہ مارگ کی طرف نکل جائیں گے۔“

اس وقت ساڑھے گیارہ بجتے والے تھے۔ اس وقت ان سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ سینٹرل میوزیم والے چوراہے سے آگے نکل کر موٹی ڈوگرہ کی اس کرتے ہی جاگتی کو رفتار کم کر دینی پڑی۔ ایک ہندو ماحوری سڑک کے وسط میں دوڑتا ہوا اٹھائے کھڑا تھا۔

”یہ ماحور شاہی لفٹ لینا چاہتا ہے۔“ جاگتی نے رفتار بڑھانے کے لیے کہا ”ذرا ہو سار رہنا۔ ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔“

”تو پھر اسے لفٹ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ چڑھا دو گاڑی اس کے اوپر۔“ میں نے کہا۔

”میں اتنی غلام بھی نہیں ہوں کہ تصور کیے بغیر کسی آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔“ جاگتی نے کہا ”ہمارا یہ ڈیڑھائی چونکہ اس قبیل کے لوگوں سے ہے اور ایسے لوگوں سے ہنر کا کام کی باتیں بھی معلوم ہو سکتی ہیں۔“

اس جاگتی نے ماحور کے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کھڑا ہوا وہ ماحور بہت ہی بد ہیئت لگ رہا تھا۔ اسے دلچسپ کرنا نہیں کیوں مجھے ہلکا سا ہنرناک لگا۔

”یہ بند کر دیا اور اپنی طرف کاٹھ بھگیا رہا۔“

میں میٹھی کامت بڑا اڑا کھول رکھا تھا۔ پانچ فٹ کے قریب تھ ”ابو سی رنگت“ ہنسا سر ہاتھ پر بیچ میں اوپر سے بیچ کی طرف سرخ ٹیکا اور دائیں بائیں تین تین سفید لکیریں۔ سرخ آنکھیں، چہرہ بے حد جرب، پھولے ہوئے گل اور بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے چمکتے ہوئے سفید دانستہ داڑھی نہیں تھی۔ لگتا تھا یہ بچہ دیر پہلے ہی شیو بنایا ہو۔

اس نے پہلی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ جسم کے اوپر والے حصے پر کوئی کرتہ وغیرہ نہیں پہن رکھا تھا۔ البتہ اس نے پہلی چادر اوڑھ رکھی تھی جس پر جگہ جگہ ”اوم“ چھپا ہوا تھا۔ منگے کی طرح توند باہر کو نکلی ہوئی تھی اور سینے پر رچی کی طرح پال بھرے ہوئے تھے۔

اس کے ایک ہاتھ میں پیتل کا ایک ڈول تھا جس میں ڈھالی تین لیریاں آگستھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ترشول تھا۔ یہ بھی دو ڈھالی فٹ سے زیادہ لمبا نہیں تھا۔ اس نے کندھے پر ایک تھیلا بھی لٹکا رکھا تھا جو چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کے بالے تھے اور گلے میں رنگ برنگ موتیوں کی تین ملاؤں کے بیچ میں سونے کی ایک موٹی سی چین بھی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

”کہاں جانا ہے سادھو ماریا؟“ جاگتی نے اپنی سائیڈ کا شیشہ مگر گردن باہر نکالنے ہوئے پوچھا۔

”سوڈا کے مندر جانے کا ہوں دیوی مہارانی۔“

”سادھو نے کھڑکی کے سامنے آکر کہا ”بہت دیر ہو گئی ہے۔ اس دلیے کوئی بس نہیں ملے۔ ہم کا تھوڑا آگے چھوڑ دیو تو ہم یہاں یہاں چلا جاوے گا۔“

یہاں یہاں والی بات پر میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”سوڈا کے مندر تو نہیں پرنتو ہم تمہیں اس سے تھوڑا پہلا اتار دیں گے۔ وہاں سے تمہیں کسی اور گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔“ جاگتی نے کہا۔

”دھنے واد (شکر)۔ دھنے واد۔“ سادھو نے دونوں ہاتھ جوڑنے والے انداز میں ایک دوسرے کے قریب کھینچے۔

جاگتی نے پیچھے جھک کر پیچلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ سادھو گاڑی میں داخل ہوا تو گاڑی بڑا ایک ہیکہ میرے منتظروں سے ٹکرایا اور میں نے جلدی سے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ جاگتی کے چہرے کے تاثرات بھی مجھے گزرتے۔ اس نے اسے ہی بند کر دیا اور اپنی طرف کاٹھ بھگیا رہا۔

جاگتی نے پیچھے جھک کر پیچلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ سادھو گاڑی میں داخل ہوا تو گاڑی بڑا ایک ہیکہ میرے منتظروں سے ٹکرایا اور میں نے جلدی سے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ جاگتی کے چہرے کے تاثرات بھی مجھے گزرتے۔ اس نے اسے ہی بند کر دیا اور اپنی طرف کاٹھ بھگیا رہا۔

جاگتی نے پیچھے جھک کر پیچلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ سادھو گاڑی میں داخل ہوا تو گاڑی بڑا ایک ہیکہ میرے منتظروں سے ٹکرایا اور میں نے جلدی سے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ جاگتی کے چہرے کے تاثرات بھی مجھے گزرتے۔ اس نے اسے ہی بند کر دیا اور اپنی طرف کاٹھ بھگیا رہا۔

جاگتی نے پیچھے جھک کر پیچلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ سادھو گاڑی میں داخل ہوا تو گاڑی بڑا ایک ہیکہ میرے منتظروں سے ٹکرایا اور میں نے جلدی سے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ جاگتی کے چہرے کے تاثرات بھی مجھے گزرتے۔ اس نے اسے ہی بند کر دیا اور اپنی طرف کاٹھ بھگیا رہا۔

”اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں سادھو مہاراج۔“ جاگتی نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر پوچھا۔ ظاہر ہے اس کی موجودگی میں ہم اپنی باتیں نہیں کر سکتے تھے اس لیے جاگتی نے اس سادھوی سے دل بھلائے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”موتی ڈوگری میں گیش دیوتا کے مندر گیا رہا ہوں۔“ سادھو نے جواب دیا ”تم کا گھر تو ہے“ اس غریب ماں راکشش گھس آیا ہیں۔ ان کو باہر کرنے کا واسطے اپوائے کرن کا جڑ بھرت تو ہوت ہے نا۔“

”راکشش! میں سمجھی نہیں سادھوی۔“ جاگتی نے کہا۔

”تم دھن والے لوگ ان باتوں پر چھپان نہیں دیتو ہو۔“ سادھو نے کہا ”ایک مسلمان راکشس ایک ہندو ناری کے ساتھ عیش کرنا ہے سالا۔ اس پلیٹھ (پلید) نے ہمارے مندروں اور دھرم کو بھی نشٹ (تباہ) کر دیا ہے۔“

”وہ تم اس مسلمان کی بات کر رہے ہو جس نے رام مگڑھ جمیل والے مندر میں پنڈتوں کی پٹائی کی تھی۔“ جاگتی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری طرف دیکھ کر آٹھ مادی تھی تاکہ میں خاموش رہوں۔

”ہاں دی۔“ سادھو بولا ”وہ ہندو ناری کے ساتھ مندر میں چھپ کر مونج اڑا رہا تھا۔“

”مگر سادھوی ہم نے تو سمجھ اور سنا ہے۔“ جاگتی بولی۔

”اور جو سنا ہے سب کھل ہے۔“ سادھو بولا ”اپنی سرکار بھی جھوٹ کا چرچا کر رہی ہے اس لیے بڑے بڑے مندروں کے پنڈتوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ خود سزا دیوں گے اس مسلمان چھو کرے اور ہندو ناری کو۔ دونوں کو جلا کر بھسم کر ڈالیں گے۔“

اس انکشاف پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور پھر اس نے جو مزید انکشافات کیے وہ اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز تھے۔

اس سادھو کے کہنے کے مطابق مندروں کے پنڈت اس بات سے خوش نہیں تھے کہ روپ متی اور اس کے مسلمان دوست کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اس کے برعکس رام مگڑھ جمیل والے مندر کے پنڈتوں پر جھوٹے الزامات لگائے گئے تھے اور پنڈت پر شو رام (محل دھر) سے ان کے خلاف جھوٹا بیان دلوایا گیا تھا۔

مندروں کے پنڈتوں نے روپ متی اس کے مسلمان دوست اور شر کے مسلمانوں کو خود سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں کل آدھی رات کو سویرا مندر میں تمام

پنڈتوں کی میٹنگ بلائی گئی تھی جس میں آخری فیصلہ کیا جانے لگا۔

اس سادھو کی باتوں سے شروع ہی سے پتا چل گیا تھا کہ اسے شر کے دولت مند لوگوں سے نفرت ہے۔ جاگتی نے پھر اس طرح کی باتیں کی تھیں کہ ہم دولت مند ضرور ہم دھرم کی رکشا کے لیے ہم اپنی جائیں بھی بچھو کر سکتے ہیں اور غالباً اسی لیے وہ سادھو کچھ مکمل چلا گیا تھا۔

گاڑی اب بھرت پور جانے والی سڑک پر نکل آئی تھی۔ اس سڑک پر کئی کلو میٹر آگے جا کر جاگتی نے گاڑی روک ڈالی اور پرس میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سادھو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”یہ دان (خند) سمجھ کر رکھ لیجے گا سادھو مہاراج اور یہ مت سمجھنے کہ دھن والوں کو دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ آپ ایک آواز لگا لیں گے تو ہندوستان کے سارے دھن دان دھرم کی رکشا کے لیے نکل آئیں گے۔ آپ لوگ اور یہ میں اکیلے نہیں ہوں گے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو کر بولی ”ہم اگلے ہاتھ کو جائیں گے۔ آپ یہاں اتر جائے۔ سوڈیا کا مندر اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس طرف جانے والی کسی نہ کسی گاڑی پر آپ کو لفٹ مل جائے گی۔“

”دھن دان۔ بے رام کی۔“ سادھو روانہ ہو کر نیچے اتر گیا۔

”حزای۔ سالا۔“ جاگتی گاڑی کو ایک جھکے سے آگے بڑھاتے ہوئے بڑبڑائی ”یہ شیطان بھی لوگوں کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ان کے اپنے طوطے مانڈے اور عایشیاں خطرے میں پڑ گئی ہیں تو ان میں کچھ جوڑ بھی ہوا ہے۔ ورنہ یہ لوگ تو ایک دوسرے کو اوچھڑانے کے لیے موقع کی ناک میں رہتے ہیں۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے گہرا سانس لینے ہوئے کہا ”بہر حال، صورت حال خاصی کمبیر ہوئی جا رہی ہے۔ ہم اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔“

”اچھا ہی ہوا ہم نے اس سادھو کو لفٹ دے دی۔ اس کی باتوں سے پتا چل گیا ورنہ ہم اندھیرے ہی میں رہتے۔“ جاگتی نے کہا۔

”سویرا مندر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بھی اس شہر کے بارے میں اتنا ہی جانتی ہوں جتنا تم۔“ جاگتی نے جواب دیا ”روپ متی اور ٹھاکر بھائی بھائی جانتے ہوں گے۔“

گاڑی اس وقت بائیں طرف کی ڈبلی سڑک پر چلتی تھی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ یہ سڑک بالکل

تھی۔ دائیں بائیں ٹیلوں پر عمارتوں میں کہیں کہیں نظر آ رہی تھی۔ جاگتی نے گاڑی اس راستے پر موڑ دی مٹھاکر بھائیوں کے حوالے تک چلا گیا تھا۔

بڑی جی پی قریب پچاسی گیت کھل گیا۔ جاگتی گاڑی کو اندر لیتی چلی گئی۔ سامنے پورج میں ٹھاکر کی گاڑی تھی۔ جاگتی نے پچھو اس کے پیچھے روک لی۔ میں نے پچھو دیکھا۔ کالو گیت بند کر کے آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہماری گاڑی کو موڑ پر اس طرف گھومتے ہوئے غلواردان بچانے اور گاڑی روکنے کا موقع دینے بغیر مل رہا تھا۔

روپ متی اور ٹھاکر بھائیوں کے لائن ہی میں کرسیوں پر تھے۔ جاگتی بھی ایجنڈا بند کر کے گاڑی سے اتر آئی۔ نون اس طرف بڑھ گئے۔ ان دونوں کے سامنے میز پر خالی کب رکھے ہوئے تھے۔ کالو بھی گیت بند کر کے لڑ ہی آ گیا تھا۔

”کالو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”شکر ہمیں چائے پلانے اور تم پیپروں کے تمام دروازے گاڑی میں اچھی طرح اسپرے کر دو۔“

”ہاں۔ گاڑی میں کیا ہوا؟“ روپ متی نے پوچھا۔

جاگتی نے راستے میں ایک سادھو کو گاڑی میں بٹھالیا۔ سامنے جواب دیا ”ایسا گندا اور غلیظ سادھو میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے لباس اور بدن سے بدبو کے رہے تھے۔ دماغ پلٹ گیا میرا۔ مجھے تو اب تک متلی ہے۔“

”ابن تم لوگ غائب کہاں تھے؟“ روپ متی نے اصل پر آتے ہوئے کہا ”میں پریشان ہو رہی تھی۔ دس بجے ٹھاکر کو فون کیا تو یہ بھی پریشان ہو گئے۔ ہماری سمجھ آ رہا تھا کہ تم لوگوں کو کہاں تلاش کیا جائے۔“

”اب دونوں سے۔“ میں نے جواب دیا ”ہمیں یہ ٹیلی فون کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ آپ پریشان ہوئی اس کے لیے ایک بار پھر مندر ت۔“

”روپ متی نے ایک بار پھر

”میری معلومات بھی یہی ہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ سب ہی لوگ ایسے بے وقوف نہیں ہیں کہ پنڈتوں کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں۔ رام مگڑھ جمیل والے مندر کے پروہت پنڈت ہری رام نے تم دونوں پر الزام لگایا تھا کہ تمہیں مندر میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا گیا تھا مگر اگلے ہی روز پنڈت محل دھر اور لاجپتی دھیرہ کے بیانات بھی اخبار میں آ گئے جس سے دھرم سے لگاؤ رکھنے والوں کے دلوں میں پنڈتوں کے خلاف نفرت

سے ڈھلک کر نیچے گر گیا اور اس مرتبہ جاگتی نے اسے سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔

”اور یہ سادھو کا قصہ کیا ہے؟“ روپ متی نے پوچھا۔

”واپس یہ میں غلطی سے گاڑی کو آؤش مگر کی طرف لے گئی تھی۔“ جاگتی نے جواب دیا ”وہاں سے آگہ مارگ کی طرف مڑے تو سڑک پر کھڑے ہوئے ایک سادھو نے ہمیں روک لیا۔ وہ موتی ڈوگری والے گیش مندر سے آیا تھا اور سوڈیا مندر جانا چاہتا تھا۔ میں نے ترس کھا کر اسے لفٹ دے دی۔ اگلے موڑ پر اسے اتار دیا ہے۔ کسی اور گاڑی سے اسے لفٹ مل جائے گی۔“

ٹھاکر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسی وقت شکر ہم سب کے لیے چائے لے کر آیا۔ اس نے گرم چائے کے کپ ہمارے سامنے رکھ دیے اور پیسلے سے بڑے ہوئے کپ اٹھا کر چلا گیا۔

”یہ سادھو اور سنت لوگ تم لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔“ ٹھاکر نے شکر کے جانے کے بعد کہا ”پچھلے دو چار روز کی خاموشی سے یہ سمجھ لینا کہ پنڈت لوگ دیکھ گئے ہیں ہماری بہت بڑی حماقت ہوگی جبکہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔“

”اور مکمل اسی سلسلے میں بڑے بڑے مندروں کے پنڈتوں کی ایک میٹنگ سویرا مندر میں بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ! تمہیں کیسے پتا چلا؟“ ٹھاکر چونک گیا۔

”اس سادھو کے گاڑی میں بیٹھنے سے اس کے لباس اور بدن سے اچھے دماغ تو گھوم گیا تھا مگر جاگتی نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس سے کچھ باتیں بھی معلوم کر لی تھیں اور انہی باتوں سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا تھا کہ اندر ہی اندر کچھ لاوا پک رہا ہے اور کل رات شہر کے بڑے بڑے تمام مندروں کے پروہتوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی ہے جس میں ہمارے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔“

”میری معلومات بھی یہی ہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ سب ہی لوگ ایسے بے وقوف نہیں ہیں کہ پنڈتوں کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں۔ رام مگڑھ جمیل والے مندر کے پروہت پنڈت ہری رام نے تم دونوں پر الزام لگایا تھا کہ تمہیں مندر میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا گیا تھا مگر اگلے ہی روز پنڈت محل دھر اور لاجپتی دھیرہ کے بیانات بھی اخبار میں آ گئے جس سے دھرم سے لگاؤ رکھنے والوں کے دلوں میں پنڈتوں کے خلاف نفرت



یہاں اگرچہ ہم الگ الگ کمروں میں

”ٹھیک کہتے ہو۔“ ٹھا کر بولا ”ہم اس کا دھیان رکھیں

موت آگے کو جھکا تو میں نے گھٹنے سے اس کے پیٹ پر  
بڑا کڑی وہ چیخ اٹھا۔ ترشول کے ڈنڈے پر سے اس  
تڑپا لڑکے میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ  
لٹا زمین کر کے اس کے سر کے نیچے لٹا دیا۔

ایک کمرے سے نکلے ہوئے دو آدمی مجھ سے ٹکرا گئے۔ وہ چنڈت ہی تھے۔ میں لڑھکا کر پشت سے بل گرا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے مرکزی ہال کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ میں نے غار کر دیا۔ گولی ایک ستون پر لگی۔ وہ دونوں صاف بیچ نکلے۔

لیکن کبھی کبھی جاگی میرے کمرے میں بھی گھس آیا کرتی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں اور یوں بڑا رہا جیسے گہری نیند میں ہوں اور کچھ دیر بعد میں واقعی نیند کی آغوش میں پھنچ چکا تھا۔

○☆☆○

وہ علاقہ واقعی بڑا خطرناک تھا۔

دن کے وقت تو اسے ایک شان دار اور بہت بارونق تفریح گاہ کہا جاسکتا تھا لیکن جیسے جیسے شام کا اندھیرا پھیلنے لگتا اس کی رونق اجڑتی جاتی۔ ایک دو اسٹاپ ایسے تھے جہاں رات دس گیارہ بجے تک بھی کچھ رونق رہتی تھی۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں مندر اور وہ تالاب تھے جہاں یا تری اشیان کرتے تھے۔ یہاں یا تریوں کے لیے گھاٹ بھی بنے ہوئے تھے۔

سوریا مندر وہاں سے تقریباً ہزار گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے ایک طرف پتھر ملا میدان تھا جو مندر اور تالابوں تک چلا گیا تھا اور دوسری طرف عمودی ڈھلانی تھیں جہاں سے شیب میں بہت دور شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ عرصہ پہلے انہی ڈھلان کے کنارے کے ساتھ ساتھ حفاظتی ریٹک بھی لگی ہوئی تھی۔ ریٹک تو اب نہیں رہی تھی تاہم کہیں کہیں تین چار فٹ اونچے کنکریٹ کے ستون اب بھی موجود تھے۔ پتھر ملے میدان سے میں چپکنے فٹ چوڑی ایک چٹائی بنی آگے کو لگی ہوئی تھی۔ یہ چٹائی بی تقریباً دو سو گز طویل تھی جس کے اختتام پر سطح میدان سا تھا اور وہ سوریا مندر اسی جگہ پر تھا۔

مندر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ عمارت بھی زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔ اختراؤ زمانہ نے اس کی ہیئت کو بڑی حالت تک بگاڑ رکھا تھا۔ مندر تک پہنچنے کے لیے اس چوڑی چٹائی بنی پر سے گزرتا پڑتا تھا۔ اس پٹی کے دونوں طرف عمودی شیب تھے جہاں جھاڑیوں نے ذیرے لگا رکھے تھے۔ اس چٹائی بنی کے دونوں طرف بھی کسی زمانے میں حفاظتی ریٹک رہی ہوگی لیکن اب یہاں بھی صرف ستون ہی رہ گئے تھے۔ وہ میدان دراصل ایک سطح چٹان پر مشتمل تھا۔ وسط میں وہ مندر تھا۔ اس کے اطراف میں چاروں طرف خاصی کھلی جگہ تھی اور جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ چٹان کے کنارے بالکل ڈھلان تھے۔ یہاں بھی کنارے کے ساتھ ساتھ حفاظتی ریٹک کی باقیات نظر آرہی تھیں۔

مندر کی پچھلی طرف چٹان کے کنارے پر دو مقامات پر دو چھوٹی عمارتوں کے کھنڈروں دکھائی دے رہے۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر کسی بہت بڑے پتھر کے کھنڈر کا گمان ہوتا تھا۔ دائیں طرف والی عمارت تین کمرے پر مشتمل تھی۔ سامنے بھی کھنڈر کی چار دیواری بھی تھی۔ لیکن اب وہ نوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صرف ایک طرف آٹھ چار فٹ لمبی اور دو ڈھائی فٹ اونچی دیوار رہ گئی تھی۔ کمروں کی چھتیں غائب تھیں البتہ میرے کمرے کی یہ ایک کونے میں ڈیڑھ دو فٹ چوڑا کثافت نظر آ رہا تھا باقی حصہ صحیح سلامت تھا۔ تینوں کمرے کی پچھلی طرف کو کھڑکیاں بھی تھیں۔

ایسی ہی دوسری عمارت اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی اور اسی کی صورت حال بھی ایسی ہی تھی البتہ یہ عمارت کی دو چھتیں اپنی جگہ پر قائم تھیں جبکہ تیسرے کمرے میں کھڑے ہو کر سر پر آسمان کو دیکھا جاسکتا تھا۔ مندر ان دونوں عمارتوں کا فاصلہ پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ اس سطح چٹان کی دوسری طرف عمودی ڈھلان پر ایک طرف پہاڑی کے دامن میں چھدری آباد تھی۔ دو سو گز دوری چٹان تھی۔ اس پہاڑی سے آگے چند اور پہاڑ بھی تھے جن پر کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کسی قسم کا درخت نہیں تھا۔

مندر کے چار اطراف میں دروازے تھے۔ سامنے، مینٹ، پچھلی طرف بھی ایک بڑا دروازہ تھا جبکہ دائیں بائیں بھی دروازے تھے جو زیادہ بڑے نہیں تھے۔ مرکزی ہال چاروں دروازوں کی طرف کشادہ راہ دیا جاتی تھی۔ اس کی دیواروں پر ایسے پورے پورے پتھر لگے ہوئے تھے جو موریتیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ان راہداریوں میں کمرے تھے جن کے دروازے عرصہ پہلے غائب ہو چکے تھے۔ مرکزی ہال کے عین وسط میں ایک بہت بڑا چوڑا جس پر کسی زمانے میں کسی بیگوان کی مورٹی رکھی رہی ہوگی لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ چوتھو بھی نوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس کی بلندی صرف تین فٹ رہ گئی تھی۔ اس چوتھے کے اطراف میں بڑے بڑے ستون تھے جنہوں نے چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ ان ستونوں پر کسی زمانے میں قیدی ماربل لگا ہوا ہوگا لیکن وہ اب اکھاڑا لیا گیا تھا۔ اس رات ہم اگرچہ دیر سے سوئے تھے لیکن معمول میری آنکھ صبح آٹھ بجے کھل گئی تھی اور بھلا

ہوئی تھی کہ جاگی اور روپ متی مجھ سے پہلے ہی جاگ اٹھیں۔ اور پھر ناشتے کے بعد روپ متی ہی نے یہ تجویز پیش کی کہ آج دن میں اس مندر کی یا تری کی جائے حقیقت تو یہ کہ میں خود بھی دن کی روشنی میں سوریا مندر اور اس کے باہر کا علاقہ دیکھنا چاہتا تھا۔ روپ متی نے ٹھاکر بھانوت کو فون کر کے اپنے پروگرام سے آگاہ بھی کر دیا۔ ٹھاکر کی بھی بات ہوئی تھی۔ اس نے محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور کچھ نہیں۔

ہم دس بجے کے قریب حویلی سے نکلے۔ روادگی سے ٹھکر نے میرا حلیہ اس طرح بدلا تھا کہ میں خود بھی اپنے کو بڑی مشکل سے پہچان سکا تھا۔ راحت سانی لباس اور ہاتھ پیر کی طرح کے کپڑے کی رنگ برنگی پڑی۔ آنکھوں پر بدھروالی عینک لگائی گئی تھی۔ اس عینک اور لباس سے جلد بہت بدل گیا تھا۔

یہ جگہ واقعی چمک پوٹھ تھی۔ بڑی تعداد میں یا تری تو ہی چمک مٹانے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ہوں کے ساتھ اشیان کے گھاٹ بنے ہوئے تھے اور ان اطراف پر جو لوگ اشیان کر رہے تھے ان میں صحت مند لوگ تھے۔ باقی بھی بوڑھے اور بوڑھی بھی۔ حفظان کے اصولوں کو بد نظر رکھا جائے تو یہ اشیان گھاٹ بیل کا گڑھ تھے لیکن چونکہ اس بانی کو گنگا کی طرح پوتر مانا جاتا تھا اس لیے کسی کو یہ پروا نہیں تھی کہ اس بانی میں نے انہیں کوئی بیادری لگ سکتی تھی۔ عورتوں کے لیے بچہ الگ غسل خانے بنے ہوئے تھے لیکن میں نے کئی دفعہ کو کپڑوں سمیت ان تالابوں میں بھی نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔

سوریا مندر والی پہاڑی پر جانے کے لیے ایک کشادہ راہ تھی جو مسلسل بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔ اس راہ پر پتھر کاٹ کاٹ کے پتھر دیواریں بنائی ہوئی تھیں۔ پہاڑی پر چڑھتا اگرچہ زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس فاصلے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ہم کچھ دیر تالابوں کے آس پاس گزارنے کے بعد لوگوں کے ساتھ اس پگھڑی پر چلے گئے۔ ان لوگوں کا تو ایک ہی غائدانہ سے تھا اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ دکن کے کسی چھوٹے شہر سے آئے ہوئے ہیں۔ سوریا مندر اور اس کے سامنے والے میدان میں کچھ

اور لوگ بھی موجود تھے۔ یہاں تین چار مزدور قسم کے آدمیوں نے اسٹینڈز پر دور بینس بھی لگا رکھی تھیں۔ یہ دور بینس ان کی روڑی کا وسیلہ تھیں۔ وہاں آنے والے لوگ ان دور بینوں سے شہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ہم نے کھوم پھر کر وہ سب کچھ دیکھ لیا جو میں پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ مندر رات کو واقعی جراثیم پیشہ لوگوں اور ڈاکوؤں کی پناہ گاہ کا کام دیتا ہوگا۔

ہم تقریباً تین بجے شہر لوٹے تھے۔ ایک اچھے ریستورنٹ میں کھانا کھایا اور پھر حویلی واپس آ گئے۔ پہاڑی پر چڑھنے اور مسلسل گھومتے رہنے سے جاگی اور روپ متی ٹھک گئی تھیں۔ وہ ایک ہی کمرے میں بیڈ پر ڈھیر ہو گئیں۔ میں لاؤنج میں صوفے پر ٹانگیں پھار کر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

جب میں بیدار ہوا تو باہر شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے ہی لگا تھا کہ نیلی فون کی گھنٹی بج گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ وہ ٹھیک دس بجے یہاں پہنچ جائے گا۔ میں تیار رہوں۔ میں ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آیا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔

مٹھنڈے پانی کے غسل سے ساری کسل مندی دور ہو گئی۔ میں لاؤنج میں آیا تو مندری میرے لیے چائے کا کپ لے کر چکن کی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے چائے کا کپ لے لیا اور باہر لان میں آ گیا۔ میں نے مندری سے جاگی اور روپ متی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں ابھی تک سو رہی ہوں گی۔

میں نے لان میں کرسی پر بیٹھ کر چائے کے دو تین گھونٹ ہی بھرے تھے کہ حویلی کے بائیں طرف نفرتی قسموں کی آواز سن کر چوک گیا۔ یہ آواز سو ٹمنگ پول کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے گردن تھما کر اس طرف دیکھا۔ سو ٹمنگ پول وہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کرسی سے اٹھا اور چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اس طرف چل دیا۔ اور پھر اس طرف پہنچے ہی میں ٹھک کر رک گیا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ چمک گیا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جاگی اور روپ متی دونوں ہی سو ٹمنگ پول میں ایک

دوسرے پر پانی اچھالتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر صرف اندویش زدہ اور شفاف پانی میں ان کے بدن جھللاتے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں واپس مڑنا ہی چاہتا تھا کہ روپ متی کی آواز سنائی دی۔

”چھپ چھپ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ آجاؤ۔ ہم تم سے بالکل نہیں گھبراہٹیں گے سخت تھے۔“

میں رکے بغیر لان کی طرف بڑھتا رہا۔

”تمہاری ہمت اور بہادری دیکھ کر میں نے تمہارا نام ہمت سنگھ رکھا تھا لیکن اب پتا چلا کہ تم بہت ڈرپوک ہو۔“ روپ متی نے چیخ کر کہا۔

”میں واقعی بہت ڈرپوک ہوں۔“ میں نے بھی چیخ کر جواب دیا اور لان میں آکر گر کر پیٹ پیٹہ گیا اور حواس پر قابو پانے کے لیے چائے کی چکیاں لینے لگا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ ٹھیک دس بجے پہنچ گیا تھا۔ وہ کار پر آیا تھا اور اس وقت جاگتی اور روپ متی بھی میرے قریب لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ رات کا کھانا کھا کھاتے تھے اور میں بھی تیار ہو چکا تھا۔ میں نے نیلی جینز پر ٹی شرٹ بھی نیلی ہی پٹنی تھی تاکہ اندر میرے میں یہ لباس کسی جگہ میری موجودگی کی نشان دہی نہ کر سکے۔

ٹھاکر کھانا کھا کر آیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ صرف چائے پینا چاہتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شکر نے ہمارے سامنے چائے رکھ دی اور چائے پینے کے فوراً ہی بعد میں اور ٹھاکر جیب میں سوار ہو گئے۔ روپ متی اور جاگتی سمجھتی تھیں کہ اس مہم میں ان کی گنجائش نہیں ہے اس لیے ان میں سے کسی نے ہمارے ساتھ چلنے کی ضد نہیں کی تھی۔

میں کاری پر پتھر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ پستول میں نے اپنی کمر پر چٹون کی بیٹ کے نیچے اڑس رکھا تھا۔ اوپر سے ٹی شرٹ آجانے کی وجہ سے اس جگہ پستول کی موجودگی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ خنجر بھی میں نے ہڈی پر چڑے کے فیٹے سے باندھ لیا تھا۔ یہ وہی خنجر تھا جو تین گھنٹہ وغیرہ اس رات روپ متی کی حویلی میں چھوڑ رکھا گئے تھے۔

گاڑی آگے ہار مارگ سے پہلے ہی دائیں طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک سرکلر روڈ کی طرح مختلف سڑکوں کو چھوتی ہوئی آگے جا کر رام گڑھ جھیل کی طرف چلی گئی تھی لیکن سورج پویل والے چوراہے پر ٹھاکر نے جیب کو دائیں طرف گالائی کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لی۔

تین کلومیٹر آگے جا کر ٹھاکر نے کار اس سڑک پر موڑ لی جس طرف پہاڑی کے دامن میں آبادی تھی۔ ایشان گھاٹ

اور تالاب دوسری طرف رہ گئے تھے۔

آبادی کے بالکل آخر میں جا کر ٹھاکر نے گاڑی ایک ویران جگہ پر روک لی اور انجن بند کر دیا۔ وہ نیچے اتر کر پتھر لے لے اور دھڑ دھڑا رہا پھر مجھے اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہے۔ یہاں تک درخت بھی تھے لیکن کچھ ہی فاصلے طے کرنے کے بعد دونوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے جھاڑیاں تھیں اور ہم ان جھاڑیوں میں ایک تنگ سی گلیزندی پر چلتے رہے۔

ہم مسلسل بلندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آگے رات مزید دھوا رہا تھا اور پتھر بھری گلیزندی بھی ختم ہو گئی۔ اس سے آگے وہ عمودی ڈھلان تھی جو آج دن میں ہمیں نے سوچا مندر والی چٹان سے دیکھی تھی۔

یہ ڈھلان تقریباً ساٹھ کے زاویے پر تھی اور بڑی شکل سے اوپر چڑھا جا رہا تھا۔ کئی جگہوں پر تو ہمیں جگہ کر جھاڑیوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ بالآخر ہم اوپر صلع چٹان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں نے عرصے سے ایک سرسبز یا یوگا وغیرہ کی پریکٹس نہیں کی تھی جس وجہ سے بڑی حد تک کھل الیہود ہو گیا تھا اور اب ہزار ہا سو فیٹ کی چڑھائی چڑھنے سے سانس پھول گیا تھا۔ ٹھاکر بھی اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم کچھ دیر ڈھلان کی چوٹی پر کھڑے رہے اور پھر مل چٹان پر آگئے۔ ہم اس وقت مندر کے عقب میں سو فیٹ کو اڑنوں کے تقریباً درمیان میں تھے۔ سامنے مندر کی عمارت کا پیلا دکھائی دے رہا تھا اور عقبی دروازے سے اندر مدھم سی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

”تم اس طرف چلو۔“ ٹھاکر نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی ”میں عقبی دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میری طرف سے اشارہ لے سے پہلے کوئی کارروائی مت کرنا۔“

ٹھاکر بھانوت سنگھ وہیں کھڑا رہا اور میں میدان میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دائیں طرف والا دروازہ بند تھا۔ کھڑکی کا وہ دروازہ بہت مضبوط اور دھڑکی تھا۔ کوشش کے باوجود میں اسے کھولنے کی حرکت دینے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں کوشش ترک کر کے عمارت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور کچھ ہی دوسری طرف پہنچا، ٹھاکر کرک گیا۔

مندر کے سامنے والے دروازے کی سیڑھیوں پر کوئی لی بیٹھائی یا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں دیوار کی آڑ لے کر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھنے کا ارادہ ہی رہا تھا کہ نئی ناچٹائی راستے کی طرف سے دو بیویوں کو تکرے کر کے گر کر رک گیا۔

سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا شخص بھی اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھانا کھا کر سگریٹ ایک طرف پھینک دیا تھا۔ وہ غالباً بہت لمبا قسم کا سگریٹ تھا۔ اس کی ناگوار سی بو میرے منتھوں پر گرا رہی تھی۔

چٹائی پٹی پر آنے والے دونوں بیولے سیڑھیوں کے بآگے وہاں کھڑے ہوئے شخص نے ان کا راستہ ل لیا۔ ان میں آپس میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا پھر پہلے وہاں کھڑے ہوئے شخص کی آواز سنائی دی۔

”پدھاریے (تشریف لائیں) کلیان جی۔ آپ ہی کی بل (انتظار) ہو رہی ہے۔“

چند لمبے خاموشی رہی اور پھر اس شخص کی بے رام جی آواز سنائی دی۔ بعد میں آنے والے دونوں آدمی اندر آگئے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں ہنڈت تھے جس شخص نے ان کا استقبال کیا تھا وہ بھی ہنڈت ہی تھا۔

وہ شخص ایک بار پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ پر راسخ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اسے کس طرح گرفت میں لیا۔ اسے وہاں سے ہٹائے بغیر مندر میں داخل ہونا ممکن نہ تھا۔

اور پھر چاکل ہی تاریکی میں ایک شعلہ سا چمک اٹھا۔ مجھ پر بیٹھے ہوئے ہنڈت نے ایک نیا سگریٹ سلگانے کے بعد سلائی جلائی تھی اور اس کی روشنی میں اس شخص کا ”کچھ کر میں اچھل پڑا۔ یہ وہی بد ہیئت سادھو تھا جسے کل تہم نے پجارد میں لطف دی تھی۔ وہ سیڑھی پر بیٹھا بیٹان سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور ناگوار سی بو میرے الٹے گرائی رہی۔

دو تین منٹ گزر گئے۔ ابھی تک ٹھاکر کی طرف سے کسی لڑائی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج گئے۔ تمام ہنڈت آگے تھے اور میرے خیال میں ان کی ٹانگوں پر شروع ہو چکی تھی یا شروع ہونے والی ہوگی۔ اس کو شاید عمرانی کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔

میں نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور پھر دیوار کے ساتھ ”کر آہستہ آہستہ آگے سرکے لگا۔ میری نظریں اس جگہ مرکوز تھیں جس کا رخ مندر کی طرف آنے والا

راستے کی طرف تھا۔ وہ جب سگریٹ کا کش لگاتا تو چنگاری سی چمک اٹھتی اور پھر تاریکی پہلے سے زیادہ گہری محسوس ہوتی۔

میں بہت غلط انداز میں دیوار کے ساتھ سرکتا رہا۔ آگے ایک جگہ عمارت کا ایک حصہ چارپانچ فٹ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے کچھ آڑ مل گئی تھی۔

سادھو نے سگریٹ کا ختم ہوتا ہوا ٹکڑا ایک طرف اچھال دیا اور تھیلے میں سے ایک چھٹی سی بوتل نکال لی اور اس کا ڈھلکا کھول کر بوتل منہ سے لگائی۔

میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گندی سی گالی دی اور اس آڑ سے نکل کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک پتھر میرے پیروں سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا اور تنک چلا گیا۔ خاموشی میں پتھر کے لڑھکنے کی آواز خاصی بلند تھی۔

سادھو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ کر دوبارہ آڑ میں آگیا۔ سادھو نے بوتل زمین پر رکھ دی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے لباس میں چھپا ہوا پستول نکالنے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ پستول والا ہاتھ آگے کو نکالے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ رہا تھا۔ پتھر لڑھکنے کی آواز سے اسے اس طرف کسی کی موجودگی کا شبہ ہو گیا تھا اور میں بھی اس کا استقبال کرنے کو تیار تھا۔

وہ دسے قدموں چلتا ہوا مجھے ہی عمارت کے بڑے ہوئے حصے سے آگے کو نکلا، میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ سب سے پہلے میرے پاؤں کی ٹھوک اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول ہوا میں اچھلتا ہوا اور پتھروں میں جاگرا۔

سادھو کے منہ سے کراہی نکل گئی۔ اس نے سمجھنے کی کوشش کی لیکن میرا زوردار ٹھوکنا اس کی گردن پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر رہ گیا لیکن اس مرتبہ اس نے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

سادھو کسی بلندی کی طرف مجھ سے ٹکرایا۔ میں اگرچہ اس کی طرف سے کسی ٹھٹھائی یا کارروائی کے لیے تیار تھا لیکن اس زوردار تصادم سے اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور وہ مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

میری پشت دیوار سے ٹکی ہوئی تھی اور وہ بلندی زری کی طرح مجھے دبا رہا تھا۔ مجھے سینے میں اپنا سانس کھٹکا ہوا محسوس ہونے لگا میں نے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا اور پھر اس نے دونوں ہاتھ

پھیلا کر دونوں طرف سے میرے سر پر مارے۔  
میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی بجلی  
چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ سادھو نے غراتے ہوئے  
ایک بار پھر دونوں ہاتھ اٹھائے یہ ضرب پہلے سے زیادہ زور  
دار تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں میری  
کھوپڑی چبک مٹی ہوئی۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔  
میری مرتبہ سادھو نے یہی حربہ استعمال کرنے کی  
کوشش کی تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ کھانسیوں پر سے  
پکڑ لیے اور انہیں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانے لگا۔ اس کم بخت  
میں گینڈے کی طرح بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کے  
بازوؤں کو موڑنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ اس کے  
ساتھ ہی میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ضرب لگا  
دی تھی۔

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اس نے اپنی جگہ سے  
حرکت کی تو مجھے بھی اس کے ہڈا سے ٹکے کا موقع مل گیا اور  
پھر میں نے اس کی ٹانگے جیسی توند پر کھونسوں کی بارش کر دی  
لیکن لگتا تھا جیسے اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو رہا ہو۔

میں اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور چند فٹ دور ہٹ کر  
ہوا میں اچھلا۔ میری فلائنگ کلک اس کے سینے پر لگی اور وہ  
کراہتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے سنبھل کر اس پر  
چھلانگ لگا دی لیکن وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔  
میں منہ کے بل پیچھے گرا۔ اگر دونوں ہتھیلیاں زمین پر نہ ٹکا  
دیتا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے۔

سادھو بھاری بھر کم ہونے کے باوجود بہت پھرتیلا ثابت  
ہوا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے پلٹ کر مجھے دو بج لیا۔ میں  
نے اپنا ہاتھ موڑ کر بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور اسے  
دبانے کے لیے پوری قوت استعمال کرنے لگا اور بالآخر اسے  
اپنے اوپر سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا اور پھر میں نے اسے  
سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میری فوکریں اس کے جسم کے ہر  
حصے پر پڑ رہی تھیں۔

اور پھر میں نے اس کی گردن گرفت میں لے لی۔ میرے  
پاس اتنا قوت نہیں تھا کہ ساری رات اس سے محکم رکھتا ہوتا  
رہتا۔ میں دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اس کے کانوں  
کے پیچھے مخصوص نیس سلتا رہا اور پھر اس کی گردن ڈھلک  
گئی۔ اسے بے ہوش کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔

میں اسے گھمٹتا ہوا آؤ میں نے لیا۔ اسے گھمٹتے ہوئے  
بھی میرا سانس بے ربط ہو گیا۔ کم بخت مرہ سائڈ سے بھی  
زیادہ بھاری تھا۔

میں نے اس کا لباس اتار لیا جو زور رنگ کی دھوٹی اور  
چادر پر مشتمل تھا۔ دھوٹی کے نیچے اس نے چوٹی پہن رکھی  
تھی۔

میں نے دھوٹی اپنے جسم پر پلٹ لی اور چادر بھی اوپر  
اس طرح ڈال لی کہ میرا اپنا لباس چھپ گیا۔ میں نے اپنا  
پتھول نکال لیا اور دے دے قدموں مندر کے دروازے کی طرف  
بڑھنے لگا۔ اس سادھو کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ توڑے  
گھٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔

میں نے مرکزی دروازے کے ساتھ ایک ستون کی آڑ  
سے جھانک کر دیکھا اور پھر دے دے قدموں چلتا ہوا اندر داخل  
ہو گیا۔ یہاں بہت بجلی سی روشنی تھی۔ یہ روشنی دراصل  
دائیں طرف والی راہداری سے یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

میں وسط میں چوترے کے قریب سے گزر کر ایک ستون  
کی آڑ میں جانا چاہتا تھا کہ ایک غرامٹ میری سامت سے  
نکل آئی۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“  
اس کے ساتھ ہی میں نے پتھول کی ٹال اپنی پشت پر  
چبھتی ہوئی محسوس کی۔ میرے منہ سے گھراسانس نکل گیا۔  
”یہ میں ہوں ٹھاکر۔ گولی مت چلا دینا۔“ میں نے ہاتھ  
اٹھانے کے بجائے سرگوشی میں جواب دیا۔ ایک تو میں نے  
ٹھاکر بھانوت ٹکھ کی آواز پہچان لی تھی اور دوسرے فوراً ہی  
میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں نے کسی سادھو کی  
طرح بجلی دھوٹی باندھ رکھی تھی اور اوپر بھی بجلی چادر اوڑھے  
ہوئے تھا۔ اس لباس میں تو میں کوئی پنڈت یا بھاری ہی لگا  
تھا۔ کوئی پنڈت مجھ پر پتھول نہیں اٹھا سکتا تھا البتہ ٹھاکر ہوا  
کھا سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

”اوہ! تم۔“ ٹھاکر کے منہ سے گھراسانس نکل گیا۔ او  
نے پتھول ہٹالیا۔ ”تم بیس روک۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں۔“  
میں آگے بڑھ کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ٹھاکر  
راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ اس ستون کی آڑ سے بھی  
راہداری نظر آ رہی تھی جہاں آخر میں دیوار بھی ہو گی  
ایک مشعل جل رہی تھی اور یہ روشنی اس کی تھی۔ ٹھاکر  
میں غالباً چنی یا کوئی اور بدودار روغن استعمال کیا تھا جس  
کے جلنے کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

ٹھاکر بھانوت ٹکھ اس راہداری میں دے دے قدموں چلا  
ہوا ایک دروازے کے قریب رکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔  
میں ستون کی آڑ میں کھڑا اس کے باہر آنے یا اندر  
کسی آواز کا فتنہ رہا لیکن نہ تو ٹھاکر باہر آیا اور نہ ہی کوئی

تھ۔ میں اٹھ کر دوڑتا ہوا اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں  
میں نے دونوں پر آمد ہوئے تھے۔

کمرے کا منظر خاصا سنسنی خیز تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ  
ضلع جل رہی تھی اور دوڑنے کے کئے پنڈت ٹھاکر بھانوت ٹکھ  
سے ٹکھٹکھٹا ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا  
لیکن وہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر رہا تھا۔

میں نے پتھول کو ٹال کی طرف سے پکڑا اور آگے بڑھ کر  
دے دے کی زور دار ضرب ایک پنڈت کے منہ پر سر پر رسید  
کر دی۔ کتبے سر پر لگنے والی ضرب خاصی زور دار تھی۔ وہ  
بیاہک انداز میں چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے پنڈت کو ٹھاکر نے ایک طرف اچھال دیا۔ وہ  
بھی چیخا ہوا دروازے کے قریب گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے  
اس نے اٹھ کر دروازے کے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں اس  
کے پیچھے لپکا اور اسی لمحے مجھے ٹھاکر کی چیخیں ہوئی آواز سنائی  
دئی۔

”اسے جانے دو بہت ٹکھ۔ اس طرف۔ وہ تے خانے  
میں ہیں۔“

میں ایک دم واپس پلٹ آیا۔ وہ پنڈت دوڑتا ہوا مندر  
سے باہر چلا گیا تھا اور اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔  
یہ کمرہ بہت بڑا تھا اور ایک کونے میں فرش میں خلا نظر  
آ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ٹنگریٹ کا ایک سلیب بھی بڑا بڑا  
تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ مینٹنگ یا توڑ  
فلانے میں ہو رہی تھی یا وہ لوگ اسی کمرے میں تھے اور گڑ بڑ  
شروع ہوتے ہی کچھ لوگ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تے  
فلانے میں اتر گئے تھے اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ تے خانے میں  
کوئی ایسا خفیہ راستہ ضرور ہوگا جس سے کسی محفوظ جگہ پر  
پہنچا جاسکے۔

ٹھاکر بھانوت ٹکھ نے دیوار میں لگی ہوئی مشعل نکال لی  
اور ایک طرف فرش پر پڑا ہوا اپنا پتھول بھی اٹھالیا۔

تے خانہ کالی کشادہ تھا۔ ایک دروازہ دائیں طرف اور  
ایک بائیں طرف کی دیوار میں نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف کا  
دروازہ بند تھا البتہ بائیں طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”اس طرف۔“ ٹھاکر یہ کہتے ہوئے کھلے ہوئے  
دروازے کی طرف لپکا۔

یہ ایک کشادہ سرنگ تھی۔ ہم دونوں اس سرنگ میں  
”تے رجب“ تقریباً چالیس گز آگے جا کر سرنگ بائیں طرف  
گئے۔ یہاں سے آگے سرنگ کسی قدر تنگ تھی۔ اس  
راہداری کے آخر میں ایک لمحے کو روشنی نظر آئی پھر غائب

ہو گئی۔

”وہ اسی طرف گئے ہیں۔ بھاگو۔“ ٹھاکر چیخا۔

ٹھاکر کی ٹانگ زخمی تھی جس سے خون رس رہا تھا لیکن  
وہ مجھ سے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ یہ سرنگ بھی تقریباً چالیس  
گز لمبی تھی۔ اس کے آخر میں روشنی نظر آئی۔

وہ تین آدمی تھے جن میں سے ایک نے مشعل اٹھا رکھی  
تھی۔ وہ ہم سے تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر آگے تھے۔ ٹھاکر  
نے کوئی چلا دی۔ طویل سرنگ فائز کی بازگشت سے گونج اٹھی  
لیکن اس کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ تینوں  
آدمی موز کھوم کر ہماری نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ البتہ  
اس طرف روشنی بدستور دکھائی دے رہی تھی۔

اور جب ہم دوڑتے ہوئے سرنگ کے اس موز پر پہنچے تو  
ٹھنک کر رک گئے۔ وہ تینوں غائب ہو چکے تھے۔ تازہ ہوا کا  
جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ  
اس طرف باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ ہم دونوں دوڑتے  
ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ تینوں غائب ہوئے تھے۔

میرا خیال درست نکلا۔ اس طرف ایک تنگ سی دراڑ  
تھی جس سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں ٹھاکر سے پہلے  
اس دراڑ میں گھس گیا اور دیواروں سے رگڑ کھاتا ہوا آگے  
نکلنا چلا گیا۔ اس تنگ سی دراڑ کا اختتام اس عمودی ڈھلان پر  
ہوا تھا جس پر چڑھ کر ہم اوپر آئے تھے۔

اس دراڑ کے آس پاس کانٹے دار گھنی جھاڑیاں  
تھیں۔ اس سے آگے عمودی ڈھلان بھی اور تین انسانی  
ہوئے اس ڈھلان پر بڑی تیزی سے نیچے پھسلنے ہوئے جا رہے  
تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مشعل تھی جو اب تک  
جل رہی تھی اور پھریوں لگا پیچہ وہ مشعل اس کے ہاتھ سے  
چھوٹ گئی ہو۔ اب وہ خود پھسلنے کے بجائے لڑھک رہا تھا۔  
چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کا شور بھی سنائی دے رہا  
تھا۔

ٹھاکر بھانوت ٹکھ بھی دراڑ سے نکل کر میرے قریب  
کھڑا ہو گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں مشعل تھی اور دائیں  
ہاتھ میں پتھول۔ چند سینکڑہ بعد ہی پہاڑیاں فائز کی آواز سے  
گونج اٹھیں۔ تقریباً سو گز نیچے ایک شعلہ سا لپکا اور گولی  
ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی۔

ٹھاکر نے بھی نیچے کی طرف پورے پورے فائز کر دیے اور  
مشعل ایک طرف پھسلنے ہوئے چیخا۔

”ان کے پیچھے چلو۔ بھاگتے نہ پائیں۔“  
عمودی ڈھلان پر کھڑے ہو کر اترنے کی کوشش کرنا یا

دو ناموت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے چلانگ لگا دی۔ میرے پیڑھلان پر گئے اور میں تیزی سے نیچے پھسلنے لگا۔

یہ پہاڑی بھر بھری تھی۔ میرے ساتھ مٹی اور ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے پتھر بھی پھسل رہے تھے۔ مجھ سے چند گز اوپر ٹھاکر بھی اسی طرف پھسلا آ رہا تھا۔

تقریباً تین سو گز نیچے آکر میں جھاڑیوں میں الجھ کر رک گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے بائیں جانب چند گز کے فاصلے پر کسی کے کراہنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور پھر میں جھاڑیوں کا سہارا لیتا ہوا تیزی سے اس طرف پہنچ گیا۔

وہ ان پنڈتوں میں سے ایک تھا جو بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پکڑے کراہ رہا تھا۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی پھسلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

”تم اسے سنبھالو۔ میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔“ ٹھاکر یہ کہتے ہوئے پھر ڈھلان پر پھسلنے لگا۔

اس پنڈت نے دھوئی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ ڈھلان پر لڑھکنے اور تلا بازیاں کھانے سے دھوئی کھل کر راتے ہی میں کسی جگہ جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا تو وہ چیخ اٹھا۔

اس کا گھٹنا مڑ گیا تھا۔ یہ غصیت تھا کہ تلا بازیاں کھانے سے اس کی گردن نہیں ٹوٹی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر ٹانگ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پنڈلی کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ چیخ اٹھا۔ میں نے دوسرا جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ اس کی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی لیکن وہ بتدریج پرسکون ہوتا چلا گیا۔ اس کے گھٹنے کا جو زخاؤں جگہ پر بیٹھ گیا تھا۔

پہاڑی پر کافی نیچے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ٹھاکر کی ان دو آدمیوں سے ٹھن گئی تھی۔

”پنڈت جی۔“ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے پنڈت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”آرام کر لیا ہو تو اب چلیں نیچے کی طرف۔“

”مو رکھ۔ مجھے نہیں پتا تم کون ہو مگر دھرم دیروں کو پریشان کر کے تم نے اچھا کیا۔ تمہیں اس کا کٹ اٹھانا پڑے گا۔ اچھا ہو گا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ بولا۔ اس کے لیے میں بلکی سی غراٹ تھی۔

”کٹ تو میں پہلے ہی اٹھا رہا ہوں۔ بہتو تم اپنے بارے میں سوچو۔“ میں نے جواب دیا ”ابھی تو تمہاری دھوئی اترتی ہے۔ یہاں اند میرے میں کوئی دیکھ بھی نہیں رہا۔ میں تمہارا

کرتہ بھی اتار دوں گا اور تمہیں گھینٹے ہوئے بازار میں لے جاؤں گا۔ وہاں چیخ چیخ کر تم لوگوں کو بتانا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم نہیں بتاؤ گے تو میں بتاؤں گا پھر ایک بات اور سمجھ لو۔ تم جو کچھ بھی کہو گے لوگ اب تمہارا دھواں نہیں کریں گے اب کیا ارادہ ہے۔ خود سے چلو گے کہ میں۔“

”چلتا ہوں۔ چلتا ہوں۔“ وہ کراہتا ہوا اٹھ کر کمرہ ہو گیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم آہستہ آہستہ ڈھلان پر اترنے لگے۔ وہ ہولے ہولے ٹکڑا رہا تھا اور اس کے سر سے بلکی بلکی کراہیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ آگے ڈھلان بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

ہم سے تقریباً سو گز آگے بھاگ دوڑی کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر فائرنگ ہونے لگی۔ دو مختلف سمتوں سے پانچ چار ہوئے تھے اور پھر خاموشی چھا گئی۔

تقریباً سو گز مزید آگے جا کر میں رک گیا اور تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”ٹھاکر کہاں ہو تم؟“ میں نے زور سے پکارا۔ ”یہاں ہوں۔ اس طرف!“ جواب میں نیچے قدم وائیں طرف سے آواز سنائی دی۔

میں پنڈت کا ہاتھ پکڑے اس طرف چلنے لگا اور کچھ دیر بعد ہم ٹھاکر کے قریب پہنچ گئے جو اپنی ٹانگ پکڑے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”بھاگ گئے۔ سامنے حرامی۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”ان میں ایک تو بلونت سنگھ تھا۔ وہ حرامی یہاں میرے قریب

میں آگیا تھا لیکن پھر بھاگ نکلا۔ دوسرا اس سے پہلے ہی دوسری طرف نکل گیا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر

”اسے گاڑی کی طرف لے کر چلو۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ اس طرف چلنے لگا۔

”یہ اب بھاگنے کے قابل نہیں رہا۔“ میں نے جواب دیا اور پنڈت کا ہاتھ پکڑ کر پھر چلنے لگا۔

تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے پنڈت رک گیا۔

”اب نہ چلا جاؤ۔“ وہ کراہنے ہوئے بولا۔

”گوڑے میں بیڑہوت ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ دو منٹ رک جاؤ۔ اس کے بعد تمہارے

گوڑے میں بیڑہوتی تو میں تمہارا گوڑا ہی توڑ دوں گا۔“

”کما۔“

پنڈت ایک پتھر بیٹھ گیا۔ اس نے کرتے کے دامن کو اپنے نیچے دبایا تھا۔ دو تین منٹ بعد ٹھاکر بھی ٹنگڑا ہوا پہنچ گیا اور ہم پھر اگلے چل پڑے۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر ٹھاکر نے جیب سے چابی نکال کر

”بے دی۔“

”تم ڈرائیو کرو۔“ وہ بولا ”مجھ سے گاڑی نہیں چلائی

گئی۔ پنڈت میں گولی لگی ہے۔“

میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور پچھلا دروازہ

رہنے کے ساتھ ہی اندر کی طرف بھی چلا دی۔ ٹھاکر نے پہلے

ت کو اندر دھکیلا اور پھر خود اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

ان اشارت کرتے ہوئے میری نظر سامنے لگے ہوئے آئینے

طرف اٹھ گئی اور میں تیزی سے پیچھے گھوم گیا۔

وہ پنڈت ہری رام تھا۔ رام گڑھ جمیل والے مندر کا

ہت۔

”کیسے ہو پنڈت جی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے

”کما۔“

”اوہ اتہم؟“ پنڈت ہری رام کا چہرہ حواں ہو گیا۔

”پچان لیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اب آئے

نام کا تو میں۔ بہت شور مچا رکھا تھا تم نے۔ بہت چچا

رہتے تھے مسلمان آدمی اور ہندو ناری کی دوستی کا۔ اب تم

دائیں زبان سے لوگوں کو بتاؤ گے کہ اس رات مندر میں کیا

”اتھا۔“

”اب تم گاڑی چلاؤ بہت سنگھ۔ اس سے حساب کتاب

رہیں کریں گے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”بہت سنگھ۔“ پنڈت ہری رام چونک گیا ”یہ مسلمان

بھائی نے ایک ہندو ناری کے ساتھ مندر کی پوتر ٹانگ۔“

ٹھاکر نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے

”بہنو دار پتھر رسید کر دیا۔“

”اچھا لکھی زبان بند رکھو۔“ وہ غرایا ”اب اگر ایک

اچھی منہ سے نکالا تو تمہاری زبان پہنچے لوں گا۔“

پنڈت چیخ اٹھا تھا۔ پتھر کچھ زیادہ ہی زوردار تھا۔ اس

”پچھلے ہوئے پچال پر انھوں نے نشان بڑھ گئے۔“

”مکان چلنا ہے ٹھاکر؟“ میں نے گاڑی کو ایک ہلکے سے

”آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔“

”کافی چند مارگ کی طرف لے چلو۔ راستے کا پتا چل

”گا؟“ ٹھاکر نے کہا۔

”کھانا رتنا۔“ میں نے کہا۔

”یہ سیدھی سڑک ہے۔ کسی طرف نہیں مڑنا۔ شر کے

”سچ میں سے ہوتے ہوئے لے چلو۔“ ٹھاکر نے بتایا ”سوچ

پول گیٹ سے سیدھا۔“

”رات کے دو بج رہے ہیں ٹھاکر۔ اگر راستے میں کہیں

پولیس نے روک لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ میں سنبھال لوں گا۔“ ٹھاکر نے

”کما۔“

پہلے تو میں نے گاڑی کی رفتار بلکی ہی رکھی لیکن پہاڑی

کے دامن میں اس نواحی علاقے سے نکل کر میں نے رفتار

بڑھا دی لیکن سورج پول گیٹ کے قریب پولیس کی ایک پارٹی

نے ہماری گاڑی روک لی۔ کچھ فاصلے پر ایک جپ بھی کھڑی

تھی۔ ایک سب انسپکٹر گاڑی کے سامنے سے گزر کر میری

طرف آیا۔

”میلہ رام، کیا بات ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے کیا؟“ پچھلی

سیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹھاکر بھانوت سنگھ نے اسے کچھ کہنے کا

موقع دیے بغیر سوال کیا۔

سب انسپکٹر میلہ رام نے چونک کر پیچھے دیکھا پھر دونوں

ہاتھ جوڑ دیے۔

”ٹھاکر جی آپ۔“ وہ بولا ”شرما تو کوئی گڑبڑ نہیں ہے

پر تو فون پر۔ ملت رہی ہے کہ ادھر گولیاں چلت ہیں۔“

اس نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک اطلاع ملی ہے میلہ رام۔“ ٹھاکر نے کہا ”کچھ

یاد تری اشیاں گھانوں پر اور مندر میں بھرتے ہوئے ہیں۔ ہم

بھی وہیں موجود تھے۔ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ یہ پنڈت جی بھی

ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے اسے بچا کر

لائے ہیں۔“

”رام بھلی کرے۔“ میلہ رام بڑبڑایا ”کوئی مرلہ دن کا

بات تو نہیں؟“

”نہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”یاد تریوں نے مقابلہ کیا تو

ڈاکو بھاگ گئے کوئی نہیں مرنا ہی زخمی ہوا ہے۔ سب

”ٹھیک ہے۔“

پنڈت نے کچھ کہنا چاہا تو ٹھاکر نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ دیا۔ وہ منہ سے ایک لفظ نہیں نکال سکا تھا۔

”ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔“ سب انسپکٹر میلہ رام نے کہا۔

”آپ جاؤ۔ رام بھلی کرے۔“ ٹھاکر نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔

”جے رام جی کی۔“ ٹھاکر نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ خاصی طویل سڑک

تھی۔ شہر کا مرکزی اور کاروباری علاقہ تھا۔ شہر کے تمام مشہور

بازار اسی سڑک کے دائیں بائیں تھے۔ دن کے وقت اور رات دس گیارہ بجے تک یہاں کھوسے سے کھوا پھلتا تھا لیکن اس وقت سنا تھا تاہم بعض علاقے ایسے تھے جہاں بعض ریٹورنٹ کھلے رہتے تھے اور رات بھر رونق رہتی تھی۔

چاند پول گیٹ سے ذرا آگے نکل کر ٹھاکر کی بدایت پر میں نے بائیں سمت گاڑی موڑ لی۔ یہ کافی چند مارگ کا علاقہ تھا۔ یہاں لب سڑک کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں اور ان کے چہچہے جھنگے تھے۔ میں ٹھاکر کی بدایت پر گاڑی مختلف گلیوں میں گھمنا رہا اور بالآخر ایک جھنگے کے سامنے روک لی۔ ٹھاکر نے نیچے اتر کر گیٹ کی تیل بجا دی۔ گیٹ تیسری مرتبہ کھنی بجانے کے بعد ہی کھلا تھا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کا جسم اور چہرے کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں بڑی قیامت قسم کی شے رہی ہوگی۔

گیٹ کھلتے ہی میں گاڑی اندر لے گیا اور پورچ میں کھڑی ہوئی ایک کار کے پیچھے روک کر انجن بند کر دیا۔ ٹھاکر نے کار کا پتلا دروازہ کھول دیا۔

”آئیے پنڈت جی۔ پدھاریے۔“ اس نے پنڈت کو اشارہ کیا۔

پنڈت ہری رام اس عورت کی موجودگی میں کار سے اترتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن ٹھاکر نے انہیں دکھائیں تو اسے اتنا ہی پڑا۔ اس نے کرتے کے دامن کو آگے پیچھے سے اس طرح پھیرا تھا کہ ہوا سے انڈر اسٹیم ٹیم نہ کھڑا دے۔

”ہے بھگوان۔“ اس عورت نے پنڈت کی طرف دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا ”یہ کیا ہوا پنڈت جی۔ آپ کی وہ کہاں گئی۔ دھوئی؟“

پنڈت کا رنگ سانولا تھا۔ شرم کے مارے سیاہ پڑ گیا۔ ”شرما کیوں رہے ہو پنڈت جی۔“ ٹھاکر بولا ”میاں تمہیں اسی مہلا (عورت) کے ساتھ رہنا پڑے گا اور بھی بہت سی آویں کی۔ سیوا (خدمت) کریں گی تمہاری۔ جی سہلا رہے گا۔“

”ہم کا کوئی دھوتی دیدو مہاراج۔“ پنڈت نے ٹھاکر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ”ہم کا تارویں کے سامنے اس طرح جلیل مت کرو۔“

”مندر میں تو تارویں کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے۔ یہاں بھی خوش رہو گے۔“ ٹھاکر نے اسے بازو سے پکڑ کر آگے دھکیل دیا۔

ایک کمرے میں لے جا کر ٹھاکر نے اسے ایک چار لینے کو دے دی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر سے کڑا لگا دیا۔

”ہمارے لیے چائے بناؤ بھان متی۔“ ٹھاکر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں اتنے میں اپنے ذمے کی ڈرننگ کروں۔“

”مجھے بتاؤ“ فرسٹ ایڈ پکس کہاں ہے۔ میں ڈرننگ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ٹھاکر نے آواز دے کر بھان متی سے فرسٹ ایڈ پکس منگوالیا۔ ٹھاکر ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اس کے سامنے قالین پر بیٹھ کر اس کی پتلون کا پانچھ اوپر اٹھا دیا۔ ذم زبہو خطباتک نہیں تھا۔ گولی پنڈلی کے گوشت کو چرنی ہوئی نکل گئی تھی۔

فرسٹ ایڈ پکس میں کسی ایسے موقع کے لیے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے پہلے اسپرٹ سے ذم صاف کیا اور پھر دوا لگا کر ڈرننگ کروی۔ اسی دوران میں بھان متی چائے بنا کر لے آئی۔

”ہاتھ روم کس طرف ہے؟ ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

بھان متی مجھے ایک کمرے میں لے آئی اور ہاتھ روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ پہاڑی ڈھلان پر مٹی پر کھیلے اور لمبے سے یوں تو میرا حلیہ جڑا ہوا تھا ہی لیکن اس وقت میں نے ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں داخل ہوا۔ ٹھاکر اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ قہقہہ منٹ مزید بات کرنے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”میں نے روپ متی کو اطلاع دے دی ہے کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔“ ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ اٹھالیا۔

میں نے اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ میں نے چائے کا کپ اٹھالیا اور ہلکی ہلکی چمکیاں لینے لگا۔

”مندر کے ذمے خانے میں کتنے لوگ تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”بھ سات ہی تھے۔“ ٹھاکر نے کہا اور چند لمحوں کو خاموشی کے بعد بولا ”جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کونے میں فرش میں خلا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ ذمے خانے میں ہیں۔ میں دو تین میٹر حیاں اتر کر کچا جھانکنے لگا۔

سب لوگ ذمے خانے میں تھے اور بلونت سنگھ بھاشن لے رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بھجا ہوا تھا۔ بڑوں کو روپ متی اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہا باکی بائیں ایسی تھیں کہ نہایت ٹھنڈے دماغ کا شخص ان اختیار اور پھر یہ تو نہایت کڑ اور متعصب پنڈت

بلونت سنگھ انہیں صلاح دے رہا تھا کہ کل رات سب لے روپ متی کی حویلی کو آگ لگا دی جائے اور پھر بعض ن کے کھنوں کو بھی جلا کر پھس کر دیا جائے۔ چار چھ لی لاشیں بھی گرا دی جائیں تو ٹھیک رہے گا۔

بلونت سنگھ کے کہنے کے مطابق ایک مسلمان نے نہ یک ہندو تارویں کو اس کے دھرم سے گمراہ کیا ہے بلکہ ہرنما کو بھی نشٹ کیا ہے۔ آج اگر اس کی سزا نہ دی لے کو دوسرے مسلمان بھی ایسی حرکتیں کرنے لگیں ہندو دھرم خطرے میں پڑ جائے گا۔ دھرم کو بچانے کے لیے ہے کہ اسے (ٹرائی) کے شروع ہی میں چار چھ مائی لاشیں گرا دی جائیں تاکہ آئندہ کسی مسلمان کو ت کرنے کی جرأت نہ ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ت جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

بلونت سنگھ نے ان پنڈتوں کو میرے اور تمہارے کی خوب بھڑکا دیا تھا۔ وہ پنڈتوں کو یہ باور کرانے کی کر رہا تھا کہ مجھے جیسے لوگ بھائی چارے کی آڑ میں ماکا ساتھ دے کر ہندو دھرم کو ختم کرنے کی کوشش ہیں۔

میں ابھی یہ باتیں سن ہی رہا تھا کہ اوپر کمرے میں لے آئیں سن کر تیزی سے سیڑھیوں سے اوپر اٹھ گیا۔ وہ ایک پنڈت شاعر سیلے کی اور طرف تھا جو اس طرف بائیں سے مجھے دیکھتے ہی چھلانگ لگا دی۔ باہر سے بھی ٹانگی آواز سن سائی دے رہی تھیں۔

میں نے اس پنڈت کی دھیمے جھٹکی کی آوازیں سن کر میں موجود پنڈت باہر آگئے۔ ان میں بلونت سنگھ بھی تھے۔ گولی چلا دی جو میری ٹانگ کو زخمی کرتی ہوئی نکل لے بھی پھوٹ لگنے کا موقع مل گیا۔ میں نے فائر کیا تو فو ذمے خانے میں واپس دوڑ گیا اور دو پنڈت مجھ سے اس دوران میں میرا پھوٹل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک وقت نہ پہنچ جاتے تو شاید وہ منڈے مجھے بے ہوش کر لیا ہوتا۔“

پنڈت ہری رام کے بارے میں تمہارا کیا خیال

ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”کیا اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے؟“

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پولیس ان پنڈتوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکے گی۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”اس کے لیے میں نے ایک اور طریقہ سوچا ہے۔ اس میں دو چار روز لگیں گے مگر اس کے بعد پنڈت ہری رام اور اس کے چیلوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔“

ٹھاکر نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے پنڈت ہری رام کی زبان بند کرنے کے لیے ایک طریقہ سوچا ہے اور اس وقت میں نے بھی کچھ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔

چار بج کرے تھے میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ٹھاکر نے مجھے اس کمرے میں پھنسا دیا جہاں ہاتھ روم میں میں نے ہاتھ دھوئے تھے۔ میں آرام وہ بستر پر گرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆☆○

ان پنڈتوں کا منصوبہ واقعی بہت خوفناک تھا اور میرا اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا کہ انہیں کسی اور کی آسیر واد حاصل تھی۔ وہ شخص جو پس منظر میں رہ کر ان متعصب پنڈتوں کو کور کر رہا تھا۔ میں نے پہلے بلونت سنگھ کا نام لیا تھا اور یہ بات ثابت بھی ہو گئی تھی۔ گزشتہ رات وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کی گرفت میں آکر نکل گیا تھا۔

پنڈت ہری رام کے کہنے کے مطابق بلونت سنگھ نے اسے بچپائی ہزار روپے دیے تھے اور ہنگامے شروع کرانے کے بعد مزید رقم دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

بلونت سنگھ کے حزامی ہونے میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ کئی ماہ پہلے غلاموں کی منڈی میں اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون بہت ہی گندا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات ثابت بھی ہوئی گئی تھی۔ اس کے باپ نے بٹن سنگھ کے باپ کو قتل کر کے دھوکے سے چوڑ کر ڈھکی کی گدی حاصل کی تھی۔ باپ کی زندگی دھوکے اور فریب میں گزری تھی تو بیٹا کس طرح نیک ہو سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں ثابت کرتی تھیں کہ ان کا تعلق راجپوتوں کی کسی اچھی نسل سے نہیں تھا۔

بلونت سنگھ کی کینکری میں کوئی شبہ نہیں تھا اور یہ روپ متی کی بدستھی تھی کہ وہ اس جیسے کینکری شخص سے دوستی کر بیٹھی تھی جس کا خیاں اب اسے بھی بھٹکتا رہا تھا۔ وہ روپ متی اور میرے خلاف کوئی موقع نہیں کھوتا چاہتا تھا۔ پہلے بیج سنگھ اور دھرمیش کو ہمارے خلاف بھڑکایا۔ وہ دونوں بھائی



عقل مند ہوتے تو اس کی باتوں میں آنے کے بجائے روپ متی سے معافی مانگ لیتے اور بات ختم ہو جاتی لیکن وہ بلونت سنگھ کے ہنگامے میں آگئے اور جوش انتقام میں وہ اپنی اوقات بھی بھول گئے۔ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ اسی روپ متی نے انہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچایا تھا۔ تو کرجب مالک کے سامنے گردن تان کر کھڑے ہو جائیں تو ان کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کا انجام ایسا ہی ہوا۔ محض بلونت سنگھ کے ہنگامے میں آکر وہ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب پنڈت ہری رام اس کی مکاری کا نشانہ بنا ہوا تھا۔

اگلے روز صبح ٹھاکر نے میری موجودگی میں پنڈت ہری رام سے پوچھ گچھ کی اور اس وقت ہری رام نے یہ سسٹی خیز انکشاف بھی کیا کہ اس رات کلب کی راقصہ ریکھا کو بھی بلونت سنگھ ہی نے قتل کیا تھا۔ ان لوگوں کو کسی طرح بتا چل گیا تھا کہ ریکھا اور بعض دوسری لڑکیوں کو پولیس کسٹرن کے سامنے پریس کانفرنس میں پیش کیا جانے والا تھا۔ رام گڑھ جمیل مندر والے واقعے کے بعد تمام لڑکیاں روپوش ہو گئی تھیں البتہ ریکھا بلونت سنگھ کے ہاتھ لگی تھی اس نے ذبح کر ڈالا۔

”پنڈت جی۔“ میں نے کہا ”اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کتنی کینے شخص کی دوستی کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ کینے آوی کی دوستی اس کو کٹے کی طرح ہے جو دبک رہا ہو تو ہاتھ جلا دیتا ہے اور بجھا ہوا ہو تو ہاتھ کالے کر دیتا ہے اور اس کینے نے تمہارے ہاتھ تو کیا، نہ بھی کالا کر دیا ہے۔“

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس رات ہم اپنی دوست کی تلاش میں تمہارے مندر میں آئے تھے جسے گیش مندر سے اغوا کر کے وہاں لے جایا گیا تھا۔ تمہارے مندر میں ہمارا ایک پرائوٹن بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ جرم ٹیپ شدہ آدمی ہے اور کئی بے گناہوں کا قاتل بھی۔“

”ہیں دیکھتے ہی وہ فرار ہو گیا۔ ہم نے اپنی دوست کو بازیاب کر لیا تھا اور تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کیے بغیر واپس آگئے تھے۔ تم لوگ اگر خاموش رہتے تو بات ختم ہو جاتی لیکن دارا اور بلونت سنگھ نے تمہیں ہنگامہ اور ان کے ہنگامے میں آکر تم لوگوں نے عام لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی اور ہنگامے کو دیے۔“

”کل رات بھی بلونت سنگھ تم لوگوں کو بھڑکا رہا تھا لیکن تمہیں کیا ملا۔ ذلت اور رسوائی۔ میں ایک بات تمہیں بتا دوں پنڈت ہری رام۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظرسنما

دیں ”بلونت سنگھ کو دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ محض انتقام لینے کے لیے تم لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ دارا تو مسلمان ہے۔ ایسے لوگ اپنے نام کے ساتھ مذہب ٹھیک لگائے پھرتے ہیں جبکہ حقیقت میں ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور تم جانتے ہو دارا نے کیا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ پنڈت ہری رام کچھ بولنے کے بجائے خاموشی میری طرف دیکھا رہا۔

”غوب صورت لونڈیا، ولایتی شراب۔ وہ جبر راستے سے بھٹکا رہا تھا۔ تمہیں ہیروئن کا عادی بنا دیا اس کا منصوبہ یہ تھا کہ تمہیں ان چیزوں میں الجھا کر موت گھاٹ اتار دیا جائے اور وہ اس مندر پر قبضہ کر لے۔ پنڈت ہری رام، جس کا اصل نام مٹی دھر ہے وہ بھی جرم ٹیپ شدہ دارا کا ساتھی ہے۔ تم ان کے چال میں پھنس گئے تھے لوگ تو بھاگ گئے اور تمہیں سزا بھگتنے کے لیے پھونک دیا۔ پنڈت ہری رام کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ دم ملا نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ٹھاکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظرسنما دیتے ہوئے کہا ”تم اگرچہ اس دلیل میں گہرا دھنسنے ہوئے ہو لیکن ہم تمہیں بچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ تم دو چار دن میں رہو۔ یہاں ہمیں ایک تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر طرح سے تمہاری سیوا کی جائے گی۔ لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو مار دے گا۔“

”مارے کو پولیس کے ہاتھ تو نہ دیو گے؟“ پنڈت رام نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”بالکل نہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”وہ چاروں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ جان چاہے، چلے جانا۔“

ہم پنڈت والے کمرے سے باہر آگئے اور پھر ان کچھ دیر بعد میں تو ٹھاکر کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا اور اسی جگہ میں رہ گیا تھا۔

”نہیں بھئی۔ ابھی چائے کا موڈ نہیں ہو رہا۔“ میں نے دبا دیر اپنے کمرے میں گیا۔

ہم بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بستر لیتے ہی آنکھ سات بجے کے قریب جا گئی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

لیا بات ہے۔ قیامت آگئی ہے کیا؟“ میں نے جھنجھلا کر

”ہاں۔ قیامت ہی آگئی ہے۔“ جاگتی نے جواب دیا ابھی ٹھاکر کا فون آیا ہے۔ کچھ غنڈوں نے اس کے راگ لگا دی ہے۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔ میری نیند اگرچہ کافر ہو گئی تھی میں دھماکے سے ہونے لگے تھے ”کب۔ کس نے؟“

”یہ تو ابھی بتا نہیں چلا کہ آگ کس نے لگائی۔ ہوٹل میں نے ایک آدمی کو پکڑ لیا ہے اور ٹھاکر بھی ہوٹل گیا ہے۔ اسے شہ ہے کہ اس حویلی پر بھی حملہ کیا۔“

”تین چار سلاخ آدمی اس نے ہماری حفاظت کے لیے نہ بھیجے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہم میں سے کوئی کی کوشش نہ کرے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ٹھاکر پر مصیبت نازل ہو رہی ہو یہاں چھپ کر بیٹھے رہیں!“ میں اچھل کر بیٹھ سے اتر آدلوں بہر حال حویلی سے نہیں نکلو گی۔ میں ٹھاکر کے لی طرف جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے“ اسے میری مدد کی تہ نہ ہو۔“

”میں نے ہاتھ دھوم میں گھس کر منہ پر پانی کے چھینٹے اور تولیے سے منہ پونچھتا ہوا باہر گیا۔ روپ متی ناموس منہ پر بٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر و کے تاثرات نمایاں تھے۔

”بلونت سنگھ کی چابیوں کا رنگ میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے جیسے کر کے رنگ اٹھایا، روپ متی بھی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”میں جا رہا ہوں نا۔“ میں نے کہا ”وہاں بجائے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے اس لیے فی الحال تم یہیں رہو تو بہتر ہے۔“

”کل رات تم لوگ سو رہا مندر گئے تھے وہاں کیا ہوا تھا۔“ روپ متی نے پوچھا۔

”میں نے مختصر آئے کل رات کے بارے میں بتا دیا۔ آخر میں کہا۔“

”ان پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے میں بلونت سنگھ اور دارا کا ہاتھ ہے۔ بلونت سنگھ تو ہاتھ آکر نکل گیا۔ پنڈت ہری رام ہمارے قبضے میں ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ ٹھاکر کے ہوٹل کو آگ لگانے میں بھی بلونت سنگھ ہی کا ہاتھ ہو گا۔ ایسے بد فطرت لوگ آسانی سے اپنی بار نہیں مانتے۔ بہر حال میں جا کر دیکھتا ہوں کہ کیا صورت حال ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد موقع ملا تو فون پر بتا دوں گا۔“

جاگتی اور روپ متی بھی برآمدے تک میرے ساتھ آئی تھیں اور تقریباً اسی وقت ٹھاکر کے چار آدمی جب پر سوار وہاں پہنچ گئے ان چاروں کے پاس سب مشین گنز تھیں۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی اور پچا روپ سوار ہو کر وہاں سے شرکی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹھاکر کا وکرہ ہوٹل سینٹرل بس اسٹینڈ سے ذرا آگے اسٹیشن روڈ پر واقع تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب تھا۔ ایم آئی (مرزا اسماعیل) روڈ پر کم از کم دو جگہوں پر ٹریفک جام تھا۔ اس طرح اسٹیشن روڈ تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ پہلے میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی ٹھاکر کا ہوٹل دیکھا تھا لیکن وکرہ ہوٹل تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

ہوٹل کی عمارت چار منزلوں پر مشتمل تھی۔ گر انڈین فلو پر شان دار ریسٹورنٹ تھا اور اوپر کی چار منزلوں پر رہائشی کمرے تھے۔ ریسٹورنٹ کا منیجر ایک تھا اور رہائشی ہوٹل کا انتظام و انصرام دوسرے منیجر کی نگرانی میں تھا۔

مجھے پچا روڈ پر ہی روک لینی پڑی تھی۔ ہوٹل کے سامنے سڑک کے کچھ حصے کو پولیس نے کھیر رکھا تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں ہوٹل کی عمارت کے سامنے کھڑی تھیں۔ ہوٹل کے ریسٹورنٹ کے دروازے وغیرہ ٹوٹے اور چلے ہوئے تھے۔ دھوئیں سے اوپر تک عمارت کے سامنے کالہ اور اچھہ کالا ہو رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کے سامنے پانی پھیلا ہوا تھا۔ کئی فائرمن اور چند دوسرے آدمی

وہاں موجود تھے۔ ریسٹورنٹ سے اب بھی ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

میں دور کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ٹھاکر مجھے کیس نظر نہیں آیا۔ میں آگے بڑھتا چاہتا تھا مگر مجھے ایک پولیس والے نے روک لیا اور پھر اسی وقت ٹھاکر ریسٹورنٹ سے باہر آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس آفیسر اور فائر بریگیڈ کے دو آفیسر بھی تھے۔ میں پولیس والے کو ایک طرف دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ٹھاکر مجھے دیکھ کر چونک گیا۔

”یہ کیا ہوا؟ آگ کس نے لگائی تھی؟“ میں نے ٹھاکر کے سامنے جاتے ہی پوچھا۔

”ابھی حتیٰ طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”فیور کا کتا ہے کہ چند غنڈے اندر گھس آئے تھے جنہوں نے پہلے تو پڑھو شروع کو دی اور پھر اردوں اور پنجبر کو آگ لگا دی۔ ملازمین نے آگ بجھانے کی کوشش کی تو انہیں بھی مارا پینا گیا۔ آگ بے قابو ہو کر پھیلنے لگی تو فائر بریگیڈ کو کسی نے فون کر دیا۔ یہ بھی خیمت ہے کہ فائر انجن بروقت پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے مگر آگ کو اور تک پھیلنے سے روک دیا گیا ہے۔“

”کون تھے وہ لوگ؟“ میں نے پوچھا ”جاگتی نے بتایا تھا کہ شاید ایک آدمی کو پکڑ لیا گیا ہے۔“

”ہاں۔ وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ ویسے میں پورے دسواں (پینین) سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بلونت سنگھ کے سوا کسی اور کا کام نہیں ہو سکتا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ پولیس آفیسر ہمارے قریب آیا۔

”ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔“ وہ ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں چتا ہوں۔ چند پولیس والے یہاں رہیں گے۔ آپ اپنے فیور کو پولیس اسٹیشن بھیج دیجئے تاکہ رپورٹ درج کر لی جائے۔“

”بہتر ہے میں بھیج دوں گا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔ پولیس آفیسر رخصت ہو گیا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ وہاں موجود رہا۔

آگ گلنے کی وجہ سے ہوٹل کی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔ اندھیرا ہونے کے بعد ہوٹل کے رہائشی حصے میں ایمر جسی لائٹس کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ آگ لگنے کے بعد مہمانوں سے ہوٹل خالی کر لیا گیا تھا لیکن ریسٹورنٹ میں آگ پر قابو پالنے کے بعد مہمانوں اور اسٹاف کو اندر جانے کی اجازت

دے دی گئی تھی۔

ٹھاکر مجھے لے کر ریسٹورنٹ میں آیا۔ یہاں دو تین مین اب بھی موجود تھے اور ٹارچوں کی روشنی میں ہر جگہ چیک کر رہے تھے۔ کیس کیس سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

ٹھاکر کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی جو میں نے لے کر اس کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ریسٹورنٹ مکمل تباہ ہو چکا تھا اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ آگ لگنے کی بجلی دی گئی تھی۔ بصورت دیگر پوری عمارت آگ کی لپیڑ آ جاتی اور سب کچھ تباہ ہو جاتا۔

میں تقریباً دو گھنٹے وہاں رہا۔ میں نے مناسباً میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تو ٹھاکر میرے کھٹے ہر رنگتے ہوئے بولا۔

”سچائی کی خاطر اگر مجھے اپنا جیون بھی لٹانا پڑے تو کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ تم کوئی چتا (گھر) مت کوڑھک ہو جائے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”تم گھر جاؤ اور خیال رکھنا۔ بلونت سنگھ جیسے مکاؤ دشمن شخصے کے لیے ہمیں کچھ زیادہ ہی محتاط رہنا پڑے گا۔“ ”تم جلدی نہیں آؤ گے؟“ میں نے چلے چلے پوچھا۔ ”ابھی تو یہ سارے معاملات دیکھتے ہیں۔ پورے کارروائی سے تمنا ہے ہو سکتا ہے، میں رات آسکوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں ٹھاکر سے ہاتھ ملا کر پیادہ میں آیا اور اشارت کر کے اسے ہٹکے سے جھپٹنے لگا۔ آگے بڑھاؤ۔ چند رمارگ سے نکلے ہوئے ایم، آئی روڈ پر گاڑی بھائی سونیا کا خیال آیا اور پھر میں نے پیادہ اندھین کالی ہاتھ قریب روک کر انجن بند کر دیا۔

سونیا کی ڈیوٹی دوپہر دو بجے سے رات دس بجے تک تھی اور اس وقت دس بجتے ہیں چند منٹ پہلے تھے۔ جب میں کافی باؤس میں داخل ہوا تو سونیا نے آئی۔ میں ادھر ادھر دیکھا ہوا اس میز پر بیٹھا تھا۔ جاگتی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ فوراً ہی ایک عورت دو سرے اٹھ کر میری میز پر آئی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ جوانی میں یقیناً حسین رہی ہوگی لیکن اب اس کا ڈھل چکا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو جوان بتانے پر کوشش نظر آنے کی پھر پور کوشش کی تھی۔ سائی کا ہوا تھا اور بلاؤز کا کرپان اتنا کشادہ تھا کہ غیر خودی جھانک کی ضرورت نہیں تھی۔

”ہیلو۔“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

میں جواب دینے کے بجائے بائیں طرف کچن والے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے سونیا برآمد ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں نرے اٹھار کھئی تھی۔ مجھے اور اس عورت کو دیکھ کر وہ ٹھک سی گئی۔ وہ ہم دونوں کو گھورتے ہوئے آگے نکل گئی۔ چوتھی میز پر اس نے کافی سرو کی اور ہمارے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”مس ٹائیڈ۔“ وہ اس عورت کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے لیے میں بھی سی غراہٹ تھی ”یہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ اپنی میز پر چلی جاؤ۔ یہاں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع مت کرو۔“

”اوہ۔ سمجھ گئی۔“ مس ٹائیڈ نامی اس عورت کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آئی اور دوسرے ہی لمحہ وہ اٹھ کر ایک اور میز پر چلی گئی جہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سونیا اب مجھے گھور رہی تھی۔

”میں نے اسے نہیں بلایا تھا۔“ میں جلدی سے بولا ”وہ خود ہی میری میز پر آ گئی تھی۔ شکار سمجھ کر۔“

”میں جانتی ہوں۔“ سونیا بولی ”میں برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”تمہاری چمچی کا وقت ہونے میں چند ہی منٹ رہ گئے ہیں۔“ میں نے سامنے دو پار پر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں باہر پیادہ میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

میں سونیا کے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر باہر گیا۔ چند منٹ کافی باؤس کے سامنے کھڑا موقوف دیکھا رہا اور پھر بکاؤ میں آکر بیٹھ گیا۔

تقریباً سو اسی بجے سونیا سائیز اسٹریٹ سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے انہیں اشارت کر دیا اور جھپک کر پنجرہ سیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا۔ سونیا پیادہ کے قریب آکر ایک لمحے کو کھڑی اور پھر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”سب سے پہلے یہ بتاؤ تم دو دن کہاں غائب رہے؟“ سونیا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”تم نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔“

”میں نے جواب دیا ”یہاں پنڈتوں سے کچھ جھگڑے بازی شروع ہو چکی ہے اور اتنے عرصے سے یہاں رہتے ہوئے تمہیں یہ تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پنڈت ہندوستان کی خطرناک ترین مخلوق ہے۔ یہ جس کے پیچھے پڑ جائیں، انسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“

”دارا سے پیچھا چھوٹنے کے بعد اب پنڈت۔“

”دارا سے پیچھا نہیں چھوٹا۔“ میں نے جواب دیا ”بلکہ دارا اور یہاں کے بعض پنڈتوں میں خطرناک قسم کا کٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ کل رات ان سے ہماری جھڑپ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں آج میرے دوست کے ہوٹل کو آگ لگا دی گئی۔“

”دوست کا ہوٹل۔ تمہاری مراد وکرم ہوٹل تو نہیں ہے آج سہ پہر غنڈوں نے آگ لگا دی تھی؟“ سونیا نے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ ہوٹل میرے دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ کا ہے۔ وہ یہاں بڈی کے مقابلے میں میرا ساتھ دے رہا ہے۔ میری دوستی کا خیزاڑہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا کہ اس کے ہوٹل کو آگ لگا دی گئی۔ یہ خیمت ہے کہ پوری عمارت کو آگ کی لپیٹ میں آنے سے بچالیا گیا۔ لاگوں کا نقصان ہوا ہے مگر ٹھاکر بھانوت سنگھ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے۔ میں ابھی اس کے ہوٹل کی طرف سے ہی آ رہا ہوں۔“

”اب کہاں جانے کا ارادہ ہے اور اس طرف کہاں جا رہے ہو تم؟“ سونیا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”زور آور گیٹ۔“ میں نے جواب دیا ”سنا ہے وہاں ایک دو ریسٹورانوں میں ہرن کی ران لپٹی ہے۔ کوئلوں پر بھی ہوئی۔“

”ہاں۔“ سونیا نے جواب دیا ”راجستان میں ہرن کے شکار پر پابندی ہے مگر بے پور کے بعض ہوٹلوں میں ہرن کا گوشت دھڑلے سے فروخت ہوتا ہے۔“

جو ہری بازار سے ہوتے ہوئے رام گنج بازار کراس کر کے میں گاڑی کو سرائے ڈیوڑھی بازار کی طرف لے گیا اور پھر ایک اور سڑک گھوم کر اسے زور آور گیٹ کی طرف موڑ دیا۔ زور آور گیٹ متوسط آبادی پر مشتمل ایک بارونق علاقہ تھا۔ یہاں بہت سے ریسٹورنٹ اور کھانے پینے کی اور بھی بہت سی دکانیں تھیں۔ ہرن کے گوشت کی وجہ سے دور دور سے لوگ یہاں آتے تھے۔ کوئلوں پر بھونے جانے والے گوشت کی اشتہا آمیز خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت یہاں کی رونق عروج پر تھی۔ ریسٹورانوں کے سامنے فٹ پاتھوں پر بھی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ سب سے پہلے میں نے ایک پبلک فون بوتھ سے جاگتی کو اطلاع دی کہ دیر سے آؤں گا۔ اسے میں نے یہ نہیں بتایا کہ دیر کس وجہ سے ہوگی اور اس کے جرح کرنے سے پہلے ہی میں نے فون بند کر دیا۔

گنگوری بازار کی طرف سے آنے والی وہ سڑک ابھی مزید دو کلو میٹر آگے تھی جو اس سڑک کو قطع کرتی ہوئی چاند پول بازار کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اگلے موڑ پر ہی گاڑی کو گنگوری بازار کی طرف جانے والی سڑک پر موڑوں گا۔

”اس طرف کہاں جا رہے ہو؟“ سونیا نے پوچھا۔ ”آہم تو سنا تا ہے اور غیر آباد سڑکوں پر وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔“ ”تمہارا خیال ہے، ہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا ”میرا خیال تھا کہ ہم طویل ڈرائیو کرتے ہوئے بائیں بھی کرتے رہیں گے لیکن تم شاید ڈری ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں اگلے موڑ پر گاڑی گنگوری بازار کی طرف موڑوں گا۔“

”تم ساتھ ہو تو مجھے ڈرنے یا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔“ سونیا نے کہا ”لیکن گاڑی سائیڈ پر کروی۔ پیچھے سے ایک گاڑی آ رہی ہے۔“

میں نے سائیڈ میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی چمکتی ہوئی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی جس طرح تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں بچاؤ سڑک کے وسط میں چلا رہا تھا۔ میں نے اسٹیرنگ کو معمولی سی حرکت دے کر گاڑی سائیڈ پر لے لی۔ وہ گاڑی بڑی تیز رفتار سے قریب آ رہی تھی۔ ہیڈ لائٹس بددی وہ زنانے کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری اور پھر اچانک ہی ہمارے آگے آ گئی۔ بریکوں کی جچاوت کی آواز نے مجھے ہری طرح چونکا دیا۔

وہ کار ہم سے تقریباً بیس گز آگے سڑک کے وسط میں رک گئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے بریک پدال دیا۔ گاڑی سڑک پر چر جائے اور پچاؤ اگلی کار سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ اس طرح اچانک بریک لگنے سے سونیا کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے بلی کی جیج نکل گئی تھی۔

میں گاڑی روک کر پوری طرح سنبھل بھی نہیں تھا کہ آگے والی کار کے دروازے کھلے۔ دو آدمی چھلانگ لگا کر نیچے اترے اور ہماری بچاؤ کی طرف لپکے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

میرے منہ سے بے اختیار رگرا سانس نکل گیا۔ ان دونوں میں سے ایک سونیا والی سائیڈ پر چلا آیا اور دوسرا میری طرف لپکا۔ میرا خیال تھا کہ یہ غنڈے زور اور

ہمیں ایک ریٹورنٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر غالی میز بل گئی۔ ویٹر کو میں نے بہن کی روشنڈ ران کا آڈر دے دیا اور اودھ دیکھنے لگا اور پھر مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس پاس لی میزوں پر بیٹھے ہوئے کئی لوگ کھا جانے والی نظروں سے سونیا کی طرف دیکھ رہے تھے اور جب میں نے سونیا کی طرف دیکھا تو میرے منہ سے گمرا سانس نکل گیا۔ وہ تنگ پانچنے والی چٹون اور سیلوئیس ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی جس کا گریبان خاصا فراخ تھا۔

میں کئی مہینوں سے اس ایک شہر میں رہ رہا تھا لیکن جس طرح ایک چاول دیکھ کر پوری دیکھ کا اندازہ لگایا جاتا ہے اسی طرح اس ایک شہر میں رہتے ہوئے میں ہندوستان کے معاشرے کا اندازہ لگا چکا تھا۔ یہاں خواتین کے اس قسم کے لباس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اونچی سوسائٹی میں تو خواتین ایسے لباس پہنتی تھیں کہ اسے لباس کے نام پر وہاں ہی کہا جاسکتا تھا لیکن متوسط اور پچھلے درجے کی آبادی والے علاقوں میں اس قسم کا لباس پہننے کا مطلب تھا ”آئیل مجھے مار“ اس طرح یہاں غنڈوں کو جمعی سرگرم ہونے کا موقع مل جاتا تھا لیکن بہر حال، اب تو ہم یہاں آ رہے تھے اور میں نے اپنے آپ کو کسی بھی ناخوشگوار صورت حال سے بچنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

لیکن خیریت ہی گزری۔ چند بد قماش قسم کے لوگ آس پاس منڈلاتے تو رہے لیکن کسی نے ایسی حرکت نہیں کی جس پر سونیا کو یا مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ملتا۔ ہم کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد وہاں سے اٹھ گئے۔

واپسی پر میں نے طویل راستہ اختیار کیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک طویل جکر کاٹ کر چاند پول گیٹ کی طرف نکل جاؤں گا اور سونیا کو نیو گیٹ کے قریب اس کے فلیٹ والی عمارت کے سامنے اتار کر ایم، آئی روڈ سے ہوتا ہوا اگر گرہ مار گئی کی طرف چلا جاؤں گا۔ طویل راستہ اختیار کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ راستے میں سونیا سے کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں گی لیکن میں بھول گیا تھا کہ اس شہر میں میرے لیے قدم قدم پر خطرات گھات لگائے بیٹھے تھے۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ زور اور گیٹ کے علاقے میں اس وقت بھی رونق تھی لیکن دو تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہی ویرانی شروع ہو گئی۔ ویرانی ان معنوں میں تھی کہ اس سڑک کے آس پاس بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ چند قدیم محلات تھے اور ٹریفک برائے نام ہی تھی۔

گیٹ سے ہمارے پیچھے لگے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں قانون کا نہیں غنڈوں کا راج تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور لڑکیوں کو اٹھالینا عام سی بات تھی۔ کسی کو دن دباڑے سرعام قتل بھی کر دیا جاتا تو قانون کے محافظ کھڑے دیکھتے رہتے اور قاتل تلواریں لہراتے ہوئے اطمینان سے فرار ہو جاتے۔ کسی باروق بازار سے کسی لڑکی کو زبردستی اٹھالیا جاتا تو بھی قانون کے یہ محافظ مداخلت نہ کرتے اور منہ دوسری طرف کر کے کھڑے ہو جاتے۔

میں بھی سمجھا تھا کہ یہ غنڈے سونیا کی وجہ سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور یہاں موقع ملنے ہی انہوں نے ہماری گاڑی روک لی تھی۔ اس کار میں جموی طور پر تین آدمی تھے۔ دو پتول تان کر ہماری طرف لپکے تھے اور تیسرا کار کے اسٹیرنگ کے سامنے بٹھا رہا تھا۔

میری طرف آنے والے دو دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا اور میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر مجھے بھی نیچے کھینچ لیا۔ جبکہ دوسری طرف سے دوسرے غنڈے نے سونیا کو بھی نیچے کھینچ لیا تھا۔ سونیا جیٹی تو اس غنڈے نے اس کے منہ پر زوردار چھڑر سید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی تھی۔

”اے۔ کیا بات ہے۔ کون ہو تم لوگ؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

”خاموش رہو۔“ میرا حریف گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے غرایا۔ ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتول میرے سینے سے لگا دیا۔ ”اگر منہ سے آواز نکالی تو اس پتول کی ساری گولیاں تمہارے شر (بہم) میں اتار دوں گا۔“

”ہمارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے بھائی۔ میری جیب میں جو کچھ بھی ہے، تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ میں اپنے آپ کو بالکل کم ہمت اور بزدل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہمیں تمہاری جیب سے کوئی سروکار نہیں۔“ وہ غرایا۔ ”خاموشی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔ بہت دوڑایا ہے تم نے۔ سالے حرامی۔!“

”اے۔ گالی مت دینا۔“ میں نے بھی غرا کر جواب دیا۔ اس نے اچانک ہی میرے منہ پر گھونسا مار دیا۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ وہ مجھے دھکے دیتا ہوا آگے پیچھا روکی بیڑ لائسنس کی روشنی میں لے آیا۔ دوسرا آدمی سونیا کو بھی پانڈو سے پکڑے کھینچتا ہوا سامنے لے آیا تھا۔ سونیا کے چہرے پر

خوف کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

میں روشنی میں آنے کے بعد باری باری ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جس شخص نے مجھے پتول کی زد پر لے رکھا تھا وہ دراز قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اس نے ہاتھوں سے چپکی ہوئی جینز اور اوپر ڈھیلا ڈھالا سا کرت پہن رکھا تھا جو گھٹنوں تک لمبا تھا۔ کرتے کے ٹٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں بڑی ہوئی سونے کی چین رہتی تھی۔ وہ کلین ٹشیرو تھا لیکن غالباً دو دن سے شیشو نہیں بنایا تھا۔ سر کے بال بھی خاصے لمبے تھے۔ بائیں کان میں سونے کی بالی چمک رہی تھی۔ اس کی ناک بھی ہوئی تھی اور بائیں رخسار پر تقریباً ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔

دوسرا آدمی درمیانے قد کا اور کسی قدر بھاری ہڈیوں کا تھا۔ اس کا حلیہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر کٹ کا نشان تھا اور اس کے کان میں بھی سونے کی بالی ہلک رہی تھی۔

”چلو۔ ادھر گاڑی میں بیٹھو۔“ میرے حریف نے ایک بار پھر مجھے دھکا دیا۔

”دیکھو۔ میں پھر کتا ہوں کہ میری جیب میں جو کچھ ہے وہ لے لو اور ہمیں جانے دو۔“

”ہم تو سمجھتے تھے کہ تو اپنے نام کی طرح ہمت والا ہو گا مگر تو بہت بزدل نکلا۔ چل بیٹھ گاڑی میں۔“ اس نے مجھے ایک اور دھکا دیا۔

یہ جملہ سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے ہوا نام معلوم تھا۔ یعنی بہت سنگھ۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ عام غنڈے نہیں تھے اور محض سونیا کی وجہ سے زور آور گیٹ سے ہمارے پیچھے نہیں لگے تھے۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ ٹھاکر کے بھول کو آگ بلونت ٹھکانے لگوائی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تھا تو بھول کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے اور یقیناً یہ دونوں بھی وہیں موجود تھے اور انہوں نے وہیں سے میرا تعاقب شروع کیا تھا۔ مجھے یاد آ رہا۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا۔ بہت دوڑایا ہے تم نے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ شروع ہی سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

”چل بیٹھ گاڑی میں۔“ وہ شخص غرایا پھر اپنے سامنے سے مخاطب ہوا۔ ”اے او پانڈو۔ لوٹ دیا کو دوسری طرف سے بھاگاڑی میں۔“

”لوٹ دیا تو بہت زوردار ہے رامو۔ بدلیسی (دوسرا) ہمارے حوالے ہے۔“ پانڈو نے کہا۔ ”اے تو اس حرامی بلونت کے حوالے

”اے۔“ اس کا فیصلہ بھی بعد میں کریں گے۔“ رامو نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک دھکا دے دیا۔

اس کا پتول ایک لمحے کو میری پشت سے ہٹا دیا۔ اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف کہلاتا۔

میں تیزی سے گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری ایک بال بھی حرکت میں آگئی تھی۔ کب اس کے پتول والے نے پکڑ لیا۔ وہ اگرچہ خاصا چٹا تھا لیکن شاید اسے میری زف سے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ پتول اس کے ذمے سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا سڑک کے کنارے ڈھلان پر لڑا۔

رامو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی لیکن میں نے اسے سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ میرا زوردار چیخ اس کے جڑے گاؤں پہنچا تا ہوا لڑکھار کا کار کے گلے ہوئے دو دروازے نہ کرا گیا۔ میں نے اس کی ناک پر ایک اور چیخ سید کر دیا۔ ایک بار پھر چیخ ہوتے ہوئے کمرے کی طرح ہلچلایا۔ اس کی بالوں کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

دوسری طرف پانڈو سونیا کو کار میں کھونسنے کی کوشش رہا تھا۔ سونیا بری طرح چیخ رہی تھی۔ رامو کو پتے دیکھ کر ڈنٹے سونیا کو چھوڑ دیا اور کار تک پھیل چلی طرف سے گھوم کر بالی طرف لپکا۔ میں نے اس وقت تک رامو کو گریبان سے ڈالیا تھا۔

”اے۔ چھوڑ دو اسے ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ پانڈو نے کہا۔

میں رامو کو گریبان سے پکڑے بڑی تیزی سے گھوم گیا۔ طرح رامو ڈھال بن کر میرے سامنے آ گیا اور میری ڈنٹا سے تنگ ہو گیا۔

اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی بھی بڑی تیزی سے ہاتھ کھول کر نیچے آتے آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کار کے بائیں گھوم کر ہماری طرف آتا، سونیا نے بڑی جرات کا ڈھکے کرتے ہوئے اس پر چلا ٹنگ لگا دی۔ سونیا بزدل تو نہیں تھا۔ اس صورت حال نے اسے وقتی طور پر بھول دیا تھا لیکن اس نے اپنے حریف کو مارا لیا اور سر کے بالوں کو زوردار جھٹکے دیتے ہوئے ماکس سڑک سے ٹکرانے لگی۔ وہ شخص بری طرح چیخ رہا تھا۔

پانڈو پتول لے دو تین قدم کے فاصلے پر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اگر وہ گولی چلاتا تو رامو ہی نشانہ بنتا۔ پانڈو چیخ کر مجھے رامو کو چھوڑ دینے کا حکم دے رہا تھا۔

رامو کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ناک پر لگنے والی ضرب کچھ زیادہ ہی زوردار ثابت ہوئی تھی۔ وہ سر کو بری طرح جھٹک رہا تھا اور پھر میں نے اچانک ہی اسے اٹھا کر پیچھے اچھال دیا۔

وہ پانڈو سے ٹکرایا اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر گیا۔ میں نے انہیں سمجھنے کا موقع دیے بغیر ان دونوں پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میری پہلی ٹھوکرا پانڈو کے پتول والے ہاتھ پر لگی تھی۔ پتول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ دوسری ٹھوکرا اس کے سر پر لگی۔ وہ چیخ اٹھا۔

میں ان دونوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا سڑک سے نیچے لے گیا۔ ان میں اگر کوئی ایک بھی سنبھل جاتا تو میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن میں نے انہیں موقع ہی نہیں دیا۔

اور پھر سڑک کے سامنے والے کسی موٹر پر ایک گاڑی اس طرف مڑی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنیوں دیکھ کر وہ دونوں کچھ اور لڑ بڑا گئے۔ پہلے پانڈو اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا اور پھر رامو نے بھی راہ فرار اختیار کر کے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

سونیا کی چیخ سن کر میں اس طرف دوڑا۔ وہ آدمی سونیا کا گلا دباچے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے سر پر دو ہتھوڑ سید کر دیا۔ اس کا سر سونیا کے سر سے ٹکرایا۔ سونیا کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکلی۔ میں نے اس شخص کو سر کے بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پٹلو میں زوردار گھونسا سید کر دیا۔ گھونسا اس کے گردے کی جگہ پر لگا تھا۔ وہ ہلچلایا اٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے چل کر اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔

میں اس کے پیچھے لگا لیکن وہ تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ سامنے سے آنے والی گاڑی قریب آ کر بریکوں کی تیز چرابت کی آواز کے ساتھ رگ گئی۔ میں اس وقت سڑک پر بڑی ہوئی سونیا کو اٹھا رہا تھا۔ دو آدمی کار سے اتر کر ہماری طرف دوڑے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، کار کی پیمپل سیٹ پر ایک عورت اور دو بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

”اے۔ کون ہو تم لوگ۔ کیا ہوا؟“ میں نے ایک آدمی کو پکڑے کھینچتا ہوا سامنے لے آیا تھا۔ سونیا کے چہرے پر

”کچھ غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔“ میں نے سونیا کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا ”وہ میری دوست کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ آپ لوگوں کی گاڑی اس طرف آتے دیکھی تو بھاگ گئے۔“

”بچ گئے۔“ ریو الوردا لے کر آئے۔ ”بہتر ہے اب جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ لوگ واپس آگئے تو زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔“

میں سونیا کو سہارا دے کر پچھار کی طرف لے آیا۔ کار کے قریب سے گزرتے ہوئے کوئی چیز چمکتی ہوئی دیکھ کر میں رک گیا اور جھپک کر وہ چیز اٹھالی۔ وہ سونے کی چین تھی جو پاتھا پانی کے دوران میں غالباً رامو کے گھر سے نوٹ کر گر گئی تھی۔

وہ دونوں آدمی بھی اپنی کار کی طرف چلے گئے۔ ہم روی میں وہ یہاں رک تو گئے تھے مگر مصورت حال جاننے کے بعد کسی قدر خوف زدہ ہو گئے تھے اور اپنے پاس ریو الوردا ہونے کے باوجود انہوں نے وہاں سے فوری طور پر چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے کار کے قریب ہی بڑا ہوا رامو کا ہسپتال بھی اٹھالیا۔ پہلے سونیا کو پچھار میں بیٹھنے میں مدد دی پھر اوپر سے گھوم کر اسٹینرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہیڈلائٹس روشن ہی تھیں۔ میں نے ہسپتال ڈیش بورڈ والے خانے میں ڈال دیا اور سونے کی چین سونیا کی طرف بڑھادی۔

”یہ ہر جانہ سمجھ کر رکھ لو۔ کام آئے گی۔“ میں نے کہا۔ سونیا نے تکلیف میں ہونے کے باوجود چین لے کر مٹھی میں دبالی۔

میں نے انجن اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھادی۔ ابھی چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ جھناکے کی زوردار آواز ابھری۔ سونیا جیج کر میری طرف مگری۔ میں بھی سیٹ سے اچھل پڑا تھا۔ ایک لمحے کو اسٹینرنگ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ پچھارو سڑک پر لہرائی لیکن میں نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

گاڑی کی بائیں پچھلی کھڑکی کا شیشہ پکنا چور ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی کہ اس طرف پانڈویا رامو میں سے کسی نے پچھار مارا تھا۔ ان دونوں کے ہسپتال تو وہیں گر گئے تھے۔ رامو کا ہسپتال میں نے اٹھالیا تھا۔ ہمیں ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر وہ پتھر پاری پر اتر آئے تھے۔ شیشے پر گولی لگنے کے بارے میں اس لیے نہیں سوچا جاسکتا تھا کہ فائر کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ان کے تیسرے

ساتھی کے پاس اگرچہ ہسپتال ہو گا لیکن وہ سڑک کی دوسری طرف بھاگا تھا۔

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھادی اور آگے جا کر اس سڑک پر سونیا کو کھڑی گاڑی کے قریب سے ہوئی ہوئی گاڑی کی پولی کیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ سونیا بھی اب سیدھی ہو کر بیٹھنے لگی تھی۔

”یہ کون لوگ تھے؟“ اس نے بلیاں کندھا سلاتے ہوئے پوچھا۔ اس آدمی کے ساتھ دھیمکا مشین سے اسے اچھو خاص پویش لگی تھیں۔

”غڈ۔“ میں نے کہا ”یہ لوگ زور آور گیٹ سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور غالباً ہمیں لے جانا چاہتے تھے۔“

”جو اس مت کرو۔“ سونیا نے مجھے گھورا ”ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ لونڈیا کو بلونت کے حوالے نہیں کر رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے نہیں چھین لے گا۔ چاہتے تھے اور میں تو بس ان کے طور پر ان کے ہاتھ لگتی۔ ٹھیک بتاؤ۔ یہ کون لوگ تھے اور بلونت کون ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مگر اس سانس لینے ہوئے جواب دیا۔ سونیا اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اسے کالا جاسکا کر روز میں سے ہمیں کچھ باتیں بتائی تھیں لیکن بلونت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اگر وقت تک میں بلونت کو کوئی اہمیت دے جانے کے قابل نہیں سمجھتا تھا لیکن۔ ”میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور ہمارے بلونت کے بارے میں شروع سے بتانے لگا۔ میں آخر میں کہ رہا تھا ”پچھلے تین چار روز سے بلونت سنگھ بھی محل کراٹے آگیا ہے اور یہ بھی دارا سے مل گیا ہے۔ یوں کہ لو کہ تو شیطانی قوتیں ہمارے خلاف مشترکہ محاذ بنا رہی ہیں۔“

رات یہ سب لوگ ایک دیر ان مندر میں جمع تھے۔ یہ لوگ منصوبہ بنا رہے تھے وہ مدت ہی خوفناک تھا۔ اس میں چند کہ پنڈتوں اور پجاریوں نے بعض مندروں کو عوامی آڈے بنا رکھا ہے لیکن یہ لڑنے بھڑنے والے لوگ سید ہیں۔ دارا اور بلونت سنگھ انہیں بھڑکا رہے ہیں۔ کلی رات بلونت سنگھ ہمارے دوست شاکر بھاتوت سنگھ کے ہاتھ بٹکر گیا تھا۔ ”میں اسے کل رات کے واقعے کے بارے میں بتانے لگا پھر ہوا۔“ اسی بلونت سنگھ نے آج۔ پھر شاکر ریسٹورنٹ کو آگ لگوا دی۔ مجھے سات بجے کے بعد پاتھا اور میں آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بلونت کے آدمی وہاں موجود ہوں گے اور جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو انہوں نے

تب شروع کر دیا اور یہاں آکر انہیں کچھ کرنے کا موقع مل گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ اگر میں اپنے تعاقب کا خیال رکھتا مورت حال ایسی نہ ہوتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ، جنہیں بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔“

”تمہاری خاطر تو میں موت کے منہ میں بھی چھلانگ لگا ہوں۔“ سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم جانتے ہو کہ ہارنے والی نہیں ہوں لیکن اس اچانک اور غیر متوقع رت حال نے مجھے واقعی بدحواس کر دیا تھا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ میں نے ایک بار پھر اس سے ردی کا اظہار کیا ”بات دراصل یہ ہے کہ اس روز تم سے بات کے بعد میں نے اور جاگتی نے ایک پروگرام بنایا تھا۔ ارے بارے میں۔“

”کیا پروگرام؟“ اس نے سوالیہ لگا ہوں سے میری بددیکھا۔

”یوں تو روپ مٹی اور شاکر بھاتوت سنگھ بے حد قابل اور اور بھروسے کے لائق ہیں۔ میری وجہ سے وہ لوگ بھی وقتی قوتوں کے جال میں پھنسے جا رہے ہیں۔ وہ بزدل نہیں آگے بھی ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور ان کے ہوتے ہیں زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہمارے پاس ایک الگ ایسا حکمتا بنایا ہوا چاہیے جو وہ محفوظ ہو اور روپ مٹی اور شاکر کو بھی اس کے بارے میں علم نہ ہو اسی لیے ہم نے سوچا تھا کہ تم۔“

”میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔“

”تمہارا وہ گھر بہت چھوٹا ہے۔ تمہارے ساتھ ایک اور بھی رہتی ہے اور اس بلڈنگ کی آبادی اتنی گنجان ہے کہ وہاں اپنی موجودگی کو راز میں نہیں رکھ سکتے۔“ میں نے کہا ”اگرچہ پروگرام یہ ہے کہ تو وہ فلیٹ چھوڑ کر کوئی ایسا مکان یا کرائے لے لو جہاں کسی بنگالی صورت حال کے وقت پناہ لے سکیں۔“

”بھگاہ۔ کہاں؟“ سونیا نے پوچھا۔

”یہ دیکھا تمہارا کام ہے۔“ میں نے کہا ”میری نسبت تم گھمست زیادہ اچھی طرح واقف ہو۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ کون سا ملحقہ مناسب رہے گا لیکن کوئی ایسی جگہ ہو مانتے ہو اور بال۔ اس بنگلے کا کرایہ وغیرہ ہم دوسرے اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں اتنی گنی گزری بھی نہیں ہوں۔“ سونیا نے

سراٹے ہوئے جواب دیا ”میں نے بھی تھوڑی بہت رقم جمع کر رکھی ہے۔ وہ کس کام آئے گی؟“

”ٹھیک ہے۔ ہم لوگ مل جل کر کام چلائیں گے۔“ میں نے گاڑی نیو گیٹ کی طرف موڑتے ہوئے کہا ”اب میں تمہیں اگلے موڑ پر اتار دوں گا۔ وہاں سے فلیٹ تک جاتے ہوئے پریشانی تو نہیں ہوگی۔“

”نہیں۔ وہاں سے فلیٹ قریب ہی ہے لیکن تم مجھے اپنی راج کماری روپ مٹی سے کب ملاؤ گے۔ وہ تو اس شرکی بہت معروف رہتی ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ابھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”ابھی تو ہم نے اسے بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کسی مناسب وقت پر ملاقات ہو جائے گی۔ میں کل صبح رقم لے کر تمہارے فلیٹ پر آؤں گا۔ تم محل ہی سے بنگلے کی تلاش شروع کر دو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں صبح تمہارا انتظار کروں گی۔“ سونیا نے سر ہلادیا۔

میں نے گلی کے موڑ پر گاڑی روک لی۔ سونیا نے نیچے اتر کر ہاتھ ملایا اور گلی میں داخل ہو گئی۔ اس وقت ساڑھے بارہ سے اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگوں کی آمدورفت تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا سونیا کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی چال متوازن نہیں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بار بار پشت پر آ رہا تھا۔ یقیناً اسے کوئی تکلیف تھی۔

سونیا گلی میں کافی آگے نکل گئی تو میں نے بھی گاڑی آگے بڑھادی اور کچھ آگے جا کر پوٹن لیتا ہوا بارہ ایم آئی روڈ پر آگیا اور گاڑی کو آگرہ مارگ کی طرف دوڑا دیا۔

جس وقت میری گاڑی حویلی میں داخل ہوئی ”ایک بچ رہا تھا۔ روپ مٹی اور جاگتی لان ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے چہرے سے پریشانی ہوا دیکھی۔“

”کہاں رہتے تھے تم؟“ جاگتی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی ”ساڑھے دس بجے تمہارا فون آیا تھا کہ تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ اس وقت ایک رجا رہا ہے اور یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے تم نے؟“

”کچھ کڑ بڑ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔“ میں نے جواب دیا۔

روپ مٹی کرسی پر بیٹھی گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کا وہ پہلو اس طرف تھا جس طرف کا شیشہ ٹوٹا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور کچھ کے بغیر اٹھ کر گاڑی کی طرف چلی گئی۔

روپ متی کچھ در گاڑی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو اور اس کے اندر بیٹھی رہی پھر گاڑی کے گرد ایک چکر لگایا اور دوبارہ لان میں آئی۔  
”تم ٹھیک ہو نا۔ کیا گڑبڑ ہوئی تھی؟“ اس نے مجھے نیچے سے اوپر تکیہ دیکھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کرسی پر بیٹھے ہوئے جواب دیا ”بلونت سنگھ کے آدمیوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔“  
”کیا؟“ ان دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

”میں دو زحالی گھنٹوں تک شکار کے پاس رہا۔“ میں نے کہا اور پھر ریسٹورنٹ میں آتش زدگی کے بارے میں بتانے لگا  
”میں پوئے دس کے قریب وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ میں نے سوچا زور آور گیٹ سے ہرن کی بجھی ہوئی رائیں لی جائیں۔ میں نے فون دیں ایک پبلک فون سے کیا تھا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے میں نے محسوس کیا کہ دو آدمی میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وہ شکل سے ہی غنڈے اور بد معاش لگتے تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں محض آزمائے کے لیے پیچا رو پر سوار ہو کر چاند پول بازار کی طرف جانے والی سڑک کی طرف نکل گیا۔ میرا شبہ درست نکلا۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔ انہوں نے ایک ویران جگہ پر مجھے گھیر لیا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رامو اور پانڈو سے جھڑپ کے بارے میں بتانے لگا۔ سونیا کا ذکر میں نے کول کر دیا تھا اور تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا تھا کہ ان کے لیے ہرن کی بجھی ہوئی رائیں لینے کے لیے زور آور گیٹ کی طرف گیا تھا۔ میرے خیال میں معمولی سا جھوٹ بول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

”ہوں۔“ میرے خاموش ہونے پر روپ متی نے ہنکارا بھرا ”رامو وہ تو نہیں جس کے رخسار پر زخم کا نشان اور ناک چپکی ہوئی ہے۔ ذرا لے نہ کہ ناک ہے؟“

”بالکل دی۔“ میں نے جواب دیا ”اب اسے چپکی ناک والا نہیں چپکی ناک والا کہا جائے گا کیونکہ میرے بچے نے اس کی ناک کو اب بالکل برابر کر دیا ہے۔ ویسے کیا تم اسے جانتی ہو؟“

”وہ اس شر کا بہت بڑا دادا ہے اور کرائے کا قاتل بھی۔“ روپ متی نے جواب دیا ”بڑے بڑے لوگ اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہماری معاونت پر اس کی خدایت حاصل کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اب تک آٹھ قتل کر چکا ہے جن میں ایک پولیس آفیسر بھی شامل ہے۔“

”حیرت انگیز!“ میں نے کہا ”اگر یہاں کی بد معاشی اور وادہ گیری کا معیار یہی ہے تو پھر میں تو پورے شہر کو اگھیل پناہ سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ روپ متی نے مجھے گھورا۔  
”میرا خیال ہے لوگوں پر اپنی دھماکے بھاننے کے لیے اس نے آٹھ آدمیوں کے قتل کا پریکٹس کر رکھا ہے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے آج تک ایک چوہا بھی نہیں مارا ہوگا۔“ میں نے کہا ”اگر اس پر پریکٹس میں کوئی حقیقت ہوتی تو میں اس کے ہاتھوں قتل نہ بھی ہوتا تو اسے میری کئی بڑیاں تو ڈرتی چاہیے تھیں مگر وہ تو پہلے ہی مرے میں میرے قدموں میں گر گیا تھا۔ وہ پہلے تو گدھے کی طرح مجھ سے بھاڑ پھرا اپنے ساتھیوں سمیت کتے کے پلے کی طرح چپا کلاں پائل کرنا ہوا بھاگ گیا۔“

”پھر تو واقعی حیرت کی بات ہے۔“ روپ متی نے کہا ”ہو سکتا ہے آٹھ آدمیوں کے قتل والی بات میں مبالغہ ہو لیکن پولیس آفیسر کے قتل کی چشم دید گواہ تو میں بھی ہوں۔“  
”تو کیا وہ قتل ہمارے سامنے ہوا تھا؟“ میں نے اسے گھورا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا ”تو یہاں ممل پہلے کی بات ہے۔ شام سات بجے کا وقت تھا۔ اس سے (وقت) تم جو ہری بازار کی رونق کا اندازہ لگاتے ہو۔ میں اس وقت اپنے ایک دوست کے ساتھ ایل ایم ای ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ باہر شور کی آواز سنائی دی۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔

”میں بھی اپنے دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکل تو سامنے کا منظر دیکھ کر کانپ اٹھی۔ ایک آدمی سڑک پر گرا ہوا تھا اور رامو اس پر پے در پے پنجھوں سے وار کر رہا تھا۔ وہ اس وقت انسان نہیں ڈرنده ہی لگ رہا تھا۔ سڑک پر گرا ہوا آدمی ہرادر پر چڑھتا تھا۔

”آس پاس سیڑیوں لوگ موجود تھے مگر کوئی جمع نہ آیا۔ رامو کے تین ساتھی کواں میں لہراتے ہوئے خوں خوار ورنڈوں کی طرح دہاڑتے پھر رہے تھے۔

”میں یہ دل دلا دینے والا نہیں دیکھ سکی اور دو در دوبارہ ریسٹورنٹ میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد رامو اور اس کے ساتھی بڑے اطمینان سے ایک جگہ پر بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سناٹا چھا گیا۔ کامیں دھڑ دھڑ ہونے لگیں۔ میرا دوست بھی مجھے وہاں سے لے کر نکل آیا۔

”بعد میں پتا چلا کہ رامو کے ہاتھوں بے وردی سے مارا جانے والا اے سی بی (اسسٹنٹ کمشنر پولیس) تھا جو پہلے لباس میں تھا اور کسی کام سے اس طرف آیا تھا۔ چند روز پہلے اس نے رامو کو تھانے بلوا کر اس کی دھنائی کی تھی اور اسے وارننگ دی تھی کہ وہ اس کے علاقے سے نکل جائے۔

”اس روز وہ رامو کے ہتھے چڑھ گیا اور رامو نے بے وردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس رات پولیس نے شہر بھر سے درجنوں غنڈوں کو پکڑ کر سلاخوں کے چپچھے بند کر دیا۔ رامو تین دن بعد پکڑا گیا۔

”عدالت میں رامو کا مقدمہ صرف دو مہینے چلا۔ استغاثہ اس کے خلاف قتل کا کیس ثابت نہیں کر سکا۔ اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے کوئی شخص سامنے نہیں آیا۔ اس کے برعکس رامو کے وکیل نے ایسے گواہوں کی ایک طویل فہرست عدالت میں پیش کر دی جنہوں نے گیتا پر ہاتھ رکھ کر یہ گواہی دی کہ جس شام پولیس آفیسر کو بے پور میں قتل کیا گیا اس شام رامو وہاں سے تین سو میں گلو میزور بیکائیر میں تھا۔

”استغاثہ اپنا کیس ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا۔ ایسا کوئی ایک شخص بھی عدالت میں نہیں آیا جو یہ کہہ سکتا کہ اس نے رامو کو پولیس آفیسر کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رامو کے خلاف جرم ثابت نہیں ہو سکا اور اسے بری کر دیا گیا۔“ روپ متی چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”اپنی عزت اور اپنی جان سب ہی لوگوں کو ہماری ہوتی ہے۔ رامو جیسے لوگوں کے خلاف ان جرائم کی گواہی دینے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوتا اور یہ لوگ ایسے خوں خوار دوندے بن جاتے ہیں جنہیں قابو کرنا قانون کے لافظوں کے بس میں نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ قانون بھی ان لوگوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

”میں نے اس سے پہلے بھی رامو کے بارے میں سنا تھا کہ کرائے کا قاتل ہے ایسی ہی کچھ سنگین وارداتوں کے باعث میں سننے میں آتا رہا جن میں رامو کے نام کا حوالہ دیا اس پولیس آفیسر کے قتل کے مجھے جیتنے بعد ہائی کورٹ نے ایک میٹریج کو اس کے گھر میں قتل کر دیا گیا۔

”ایک سابق نیا (ذریعہ) کا مقدمہ اس جج کے پاس زیرِ عدالت تھا۔ شہر میں اس مقدمے کا بہت چچا ہوا تھا۔ اس نیا بہت سنگین الزامات تھے اگلے روز صبح وہ جج اس مقدمے فیصلہ سناتے والا تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ اس نیا کو نہ صرف قتل کر کے لیے کسی بھی قسم کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا جائے گا بلکہ اسے کم سے کم تین سال

قید کی سزا بھی سنائی جائے گی مگر اسی رات جج کو اس کی کوٹھی میں قتل کر دیا گیا تھا۔

”اس رات جج کے تمام گھر والے شادی کی ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے جج کوٹھی پر اکیلا رہا تھا۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے صرف ایک ملازم کو چھوڑ دیا گیا۔

”جج کے گھر والے تین بجے کے قریب واپس لوٹے تو برآمدے میں ملازم کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا جبکہ جج کی لاش بند روم سے ملحق دفتر میں قلابین پر پڑی ہوئی ملی۔ اسے بکے کی طرح ذبح کر دیا گیا تھا۔ سینے اور پیٹ پر بھی جھجکے کی کمرے گھاؤ تھے خون کے چھینٹے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے دفتر کا سارا سامان بھی الٹ پلٹ تھا۔ میز کی دراڑیں کھلی ہوئی تھیں۔ کاندھا ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور تیتا کے کیس کی وہ فائل غائب تھی جو اس روز جج عدالت سے گھر لے کر آیا تھا۔

”جج کے قتل کے بعد وہ نیا روپوش ہو گیا۔ چند روز بعد پتا چلا کہ وہ ملک سے فرار ہو گیا ہے۔ قتل کے حوالے سے رامو کے نام کی بازگشت سنی گئی تھی۔ کئی روز تک پولیس اس سے پوچھ چوچھ بھی کرتی رہی لیکن اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ پولیس کو جانے واردات سے بھی کوئی ایسا نشان نہیں ملا جس کی بنا پر اس پر شبہ کیا جاسکتا لیکن سب جانتے تھے کہ یہ قتل بھی رامو ہی نے کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ آج بھی آزادی سے زندہ نا پھر رہا ہے اور پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔“

”پھر تو واقعی حیرت کی بات ہے بلکہ میں اپنے آپ کو خوش قسمت ہی سمجھوں گا کہ ایسے خطرناک آدمی کے ہتھے چڑھ جانے کے باوجود بچ گیا۔“ میں نے روپ متی کے خاموش ہونے پر کہا۔

”ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔“ روپ متی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے بلونت سنگھ نے اسے ہمارے قتل کی سیاری نہ دی ہو بلکہ اسے اس حد تک محدود رکھا ہو کہ ہمیں زندہ پکڑ کر اس کے حوالے کیا جائے۔“

”ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا ”میرے سامنے بے بس ہو کر وہ جس طرح دم بڑا کر بھاگا تھا اس سے مجھ کو ایسی نتیجہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن کیا تم نے کبھی اسے قریب سے دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے، کبھی کوئی ملاقات؟“

”ہاں۔ ایک ملاقات ہوئی تھی اور یہ تقریباً ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ روپ متی نے کہا ”میں اس رات پولو



گراؤنڈ میں واقع ہے پور کلب میں ایک پارٹی میں شریک تھی۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ بدعاش بھی وہاں آگیا اور بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت بہت قیمتی تھری پیس سوٹ میں تھا اور یہ شریفانہ لباس اس پر بالکل نہیں بیچ رہا تھا۔ میرے ہی ایک دوست نے بتایا کہ یہ رام لال عرف راموداوا ہے۔

”ان دنوں میری کسی سے نسل چل رہی تھی اور پورے شہر میں اس کا چرچا تھا۔ رامو نے کہا کہ اگر مجھے اپنے حریف کو اپنے چرنوں پر بھگانے کے لیے اس کی خدمات کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے۔ ممکن ہے وہ ہماری ہی میز پر ٹکا رہتا کہ ایک لڑکی اسے پاؤ سے پکڑ کر وہاں سے اٹھا کر لے گئی۔ وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ میں نے اسے اتنا قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایسا کوئی موقع نہیں آیا اور بھگوان نہ کرے کہ آئندہ بھی ایسا کوئی موقع آئے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولی ”اس نے مجھے اپنا وزینگ کارڈ بھی دیا تھا لیکن کبھی میرے ذہن میں اس سے رابطہ کرنے کا خیال نہیں آیا۔“

”حیرت ہے“ لیرے اور قاتل بھی وزینگ کارڈ رکھتے گئے ہیں۔“ میں نے کہا ”وہ کارڈ ہمارے پاس ہے یا کہیں پھینک دیا؟“

”وزینگ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا تھا۔ شاید بڑا ہو گا۔“ روپ متی نے کہا ”لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ رامو کے معاملے میں تم زیادہ سنجیدہ نہیں ہو اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”میں نے اپنے کسی دشمن کو کبھی کتیا کزور نہیں سمجھا۔ تم نے تو رامو کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ میں محتاط رہوں گا۔“

”اچھا۔ اب مجھے ٹھاکر کے بارے میں بتاؤ۔ کتنا نقصان ہوا ہے ہوٹل کا اور پکڑا جانے والا آدمی کون ہے۔ کس کے کہنے پر آگ لگائی گئی تھی؟“ روپ متی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ یہ بات انہیں ٹھاکر کی فون پر بتائی تھی کہ ایک آدمی پکڑا بھی گیا ہے۔

”نقصان کا اندازہ تو بعد میں لگایا جائے گا دیسے ریٹورنٹ والا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”جو آدمی پکڑا گیا تھا وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ آگ لگائے جانے کے بعد بھی ہوٹل کے آس پاس بلونت سنگھ کے آدمیوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ آگ اس نے لگوائی تھی۔ پولیس بہر حال زیر حراست شخص سے

سب کچھ معلوم کر لے گی۔“

”ٹھاکر تو مت پریشان ہو گا؟“ یہ سوال جاگکی نے کیا تھا۔

”اے پریشان تو ہونا ہی چاہیے لیکن وہ بہت والا آدمی ہے اور میرا خیال ہے“ اسے زیادہ نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ روپ متی نے پوچھا۔

”ریٹورنٹ اور ہوٹل یقیناً انشورڈ ہو گا۔“ میں نے جواب دیا ”انشورنس کمپنی سے ملنے والی رقم اس کے نقصان کا بڑی حد تک ازالہ کر دے گی۔“

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ٹھاکر کے پیچھے ہوئے گن مینوں میں سے ایک کسی طرف سے نکل کر ہمارے قریب آگیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے منہ پر ہاتھ دیا۔

”سڑک پر سے ایک گاڑی اس طرف مڑی ہے۔ ہم اس کی بتیاں بھی بھیجی ہوئی ہیں۔ اس میں ٹھاکر کے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ لوگ اندر چلے جائیے۔“

ہم لوگ فوراً ہی اٹھ گئے۔ جاگکی اور روپ متی قاتل اور چلی گئیں۔ میں نے پچھارو کے ڈیش بورڈ کے خانے سے رامو والا پستول نکال لیا اور برآمدے کے ایک ستون کی آؤٹ میں کھڑا ہو گیا۔

ٹھاکر کے پیچھے ہوئے چار گن مینوں میں سے دو حویلی کی چھت پر تھے جہاں سے وہ چاروں طرف دور تک نگاہ رکھتے تھے اور دو ایسی جگہوں پر تھے جہاں سے وہ حویلی کے اوٹلی راستوں کو گور کر سکتے تھے۔ انہی میں سے ایک نے اس گاڑی کو سڑک سے اس طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ہم لوگوں کو اندر جانے کے لیے کہا تھا۔ اس شخص نے مجھے پچھارو سے پستول نکال کر برآمدے کے ستون کی آؤٹ میں کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اگر اس گاڑی کی بیڈ لائٹس روشن ہوتیں تو اس کی روشنی برآمدے سے بھی نظر آسکتی تھی لیکن بیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں جس وجہ سے وہ گاڑی یہاں سے نظر نہیں آتی تھی۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کے انجن کی بجلی کی آواز بڑا بڑا سرسرا تاثر پیش کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے لیکن پھر اپنے اس خیال پر خود ہی جھٹکا۔ بلونت سنگھ کے آدمیوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے تھے۔ ان کا خیال ہو گا کہ سب لوگ سو رہے ہوں گے اور وہ حملہ کرے ہم سب کو ختم کر دیں گے۔

اچانک ہارن کی آواز خاموش فضا میں گونج اٹھی۔

ٹھاکر کی گاڑی کے ہارن کی آواز تھی۔ وہ جب یہاں آیا تھا، دور ہی سے اسی طرح مخصوص انداز میں گونج رہا تھا۔

ٹھاکر کسی طرف سے نکل کر دوڑتا ہوا ایک پر پہنچ گیا اور ان کھول دیا اس کے ہاتھ میں بھی آؤٹریک راتر نقل نظر رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی ٹھاکر کی گاڑی گیٹ میں داخل ہو کر باؤں کے پیچھے رک گئی۔ میں ستون کی آڑ سے نکل کر سامنے آیا۔

”کون کون کہاں ہیں؟“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”پوٹیشن ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”تمہاری گاڑی کو ایک پر سے اس طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ بتیاں ہی ہونے کی وجہ سے شبہ ہوا تھا کہ یہ گاڑی دشمنوں کی بھی ہکتی ہے۔“

”یہ میرے لیے بھی حیرت کی بات ہے۔“ ٹھاکر آگے بڑھے ہوئے بولا ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ دونوں ہیڈ لٹس نے بیک وقت کام کرنا کیسے چھوڑ دیا۔ بہر حال، صبح سے پیک کراؤں کا لیکن تم ابھی تک کیسے جاگ رہے ہو؟“

”ہم سب ہی جاگ رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”ہم تو ادھر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گن مین نے تمہاری ڈی سڑک سے اس طرف مڑتے دیکھ کر ہمیں اندر چلنے کو ممانعت۔“

”تین بج رہے ہیں۔ رات کو دیر تک جاگنا صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے کہا۔

ٹھاکر جواب سا ہو کر رہ گیا۔ ہم اندر آگئے۔ جاگکی اور روپ متی سامنے ہی صوفوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ٹھاکر کو بلور ٹھاکر کھڑی ہوئیں اور پھر ان دونوں نے ٹھاکر پر بات کی جو پچھارو کر دی۔ ٹھاکر مسکراتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔

”دھیرن (وصلہ) دھیرن!“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”میں نے مجھ سے جل پان کا نہیں پوچھا اور سوالات کی پچھارو کر دی۔“

”جل میں بلا دیتی ہوں۔ پان یہاں نہیں ملے گا البتہ پین کی پلاسٹی ہے۔“ روپ متی نے کہا۔

”چلے گی۔ چائے بھی چلے گی۔“ ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دلی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

روپ متی اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی کہ مندر کی کسی طرف سے نکل کر سامنے آگئی۔ وہ کسی کونے میں بڑی سوری تھی اور آواز میں گونج رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

”آپ بیٹھے۔“ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی بہن کی طرف چلی گئی۔

چند رہ میں منٹ میں چائے آگئی اور پھر اس کے ساتھ ہی باتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ٹھاکر ہوٹل کے نقصان کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”دیری سیڈ!“ جاگکی نے کہا ”ہماری دوستی تم لوگوں کو مسگی پڑ رہی ہے۔ تمہارے ہوٹل کو آگ لگا دی اور آج رات ہی روپ متی کی گاڑی کا شیشہ توڑ دیا گیا۔“

”کیا مطلب؟“ ٹھاکر بولا ”شیشہ کس نے توڑا؟“

اور پھر مجھے ایک بار پھر رامودا کی کہانی وہرانی پڑی۔

”پہلے میں بلونت سنگھ کو زیادہ اہمیت میں دیتا تھا لیکن اب مجھے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔“

ٹھاکر نے کہا۔

باتوں ہی باتوں میں صبح ہو گئی۔ روپ متی اور جاگکی اوتھیں گئیں۔ میری آنکھوں میں چند کا نام و نشان تک نہیں تھا اور کچھ بھی کیفیت ٹھاکر کی بھی تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔ دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے بوئے پھیلے لگ رہے تھے۔ ہم دھوپ نکلنے تک وہیں بیٹھے رہے اور پھر اندر آگئے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نو بجے کے قریب ناشتا کر کے چلا گیا۔ میں کافی دیر تک حویلی کے پینچیلے میں بیٹھوں اور صوفوں کو دیکھتا رہا پھر اندر آیا۔ جاگکی اور روپ متی لاؤنج میں صوفوں پر ہی آؤٹریک پڑی سوری تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آکر ہاتھ دھو کر صوفوں پر بیٹھ گیا۔

دیر تک ٹھنڈے پانی کے غسل سے میری کسل مندی دور ہو گئی۔ میں تیار ہو کر باہر نکلا اور جاگکی کو جگا کر کمرے میں لے آیا۔

”میں سونا کی طرف جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اپنے لیے کسی اور ٹھکانے کا بندوبست کر لیں۔ تمہارے پاس جو رقم تھی کہاں ہے وہ؟“

”اس الماری میں رکھی ہے۔ ابھی نکال کر دیتی ہوں۔“ جاگکی نے کہا اور آگے بڑھ کر الماری کھولنے لگی۔ ساتھ ہی وہ بتا رہی تھی کہ روپ متی کی حویلی سے جگت میں نکلے ہوئے

## ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں

کتابیات پہلی کیشنز اور مکتبہ نفسیات کی  
کتاب کے ہول سیل ڈسٹری بیوٹر

## شاملہ کتب خانہ

ہماری تمام کتب کے حصول کیلئے ان سے  
رابطہ کریں۔

آپ کے آرڈر کی فوری تعمیل کرتے ہوئے،  
کتب، آپ کی دکان پر پہنچائی جائیں گی۔



## شاملہ کتب خانہ

دربار بابا بجلی شاہ اسٹریٹ،  
چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

فون 515011

موبائل 0300-4291286

معمولی بھی ہو تو غفلت نہیں برتنی چاہیے۔“  
”سونیا نے بتایا تھا کہ تم جو وہ پور مٹی ہوئی ہو۔ کب  
واپس آئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کل شام“ مادھوری نے جواب دیا پھر اپنی جگہ سے  
اٹھتے ہوئے بولی ”میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔  
سونیا کے گی کہ میرے دوست کو جل (لالی) پان کو بھی نہیں  
پوچھا۔“  
”مجھے صرف ایک گلاس ٹھنڈا جل پلا دو۔ چائے کا  
کلف مت کرو۔“ میں نے کہا۔

صرف دو منٹ بعد اس نے کمرے میں آکر پانی کا گلاس  
میری طرف بڑھا دیا۔ گلاس لیتے ہوئے میری انگلیاں اس کی  
انگوٹھوں سے چوم گئیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔  
تقریباً آٹھ منٹ بعد سونیا آئی۔ اس کا چہرہ سنا ہوا تھا۔  
وہ صورت ہی سے بیمار لگتی تھی۔ صحن کے آثار بھی نمایاں  
تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ میلوں کا فاصلہ پیدل طے کر کے آئی ہو۔  
مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آئی۔

مادھوری نے اس سے صورت حال دریافت کی اور پھر  
کمرے سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔ سونیا پیڈ پر لیٹ گئی۔  
ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوا میں اس نے سائینڈ ٹیبل پر رکھ دی  
تھیں۔

”تمہیں بخار کیوں ہو گیا۔ رات کو ڈر مٹی تھیں کیا؟“  
میں نے پوچھا۔

”اس مسئلے سے دو چار مٹی میں کچھ اندرونی چو نہیں  
گئی تھیں۔“ سونیا نے بتایا ”اس وقت تو احساس نہیں ہوا  
لیکن رات کو تکلیف شروع ہو گئی۔ میاں اور میاں۔“ اس  
نے پہلے سینے پر اور پھر پشت پر بائیں شولڈر بلڈ پر ہاتھ رکھا  
”بڑی شرت سے درد اٹھتا رہا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ مادھوری  
کل شام کو واپس آ گئی تھی۔ وہ میری سنگائی کرتی رہی۔ رات  
ہی کو بخار ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی ایک سو دو کے لگ بھگ  
سب ڈاکٹر نے التجنٹن لگا دیا ہے اور کچھ دوائیں بھی دی  
جیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”میں تو کبھی تھی  
کہ تم آج بھی گول کر رہے۔“

”آج تو مجھے ہر صورت میں آتا ہی تھا لیکن اب شاید  
تمہاری وجہ سے معاملہ کچھ لیٹ ہو جائے۔“ میں نے کہا۔  
”ایک دو دن کی بات ہے۔“ سونیا مسکراتی ”آج بخار  
اڑ گیا تو میں کل ہی اپنی مسم شروع کر دوں گی۔“  
”ڈاکٹر نے کوئی خاص چیز کھانے کو کہا ہو تو بتاؤ“ میں بتا  
لاں گی۔“

رش تھا۔ میں کچھ دیر ادھر ادھر ٹھٹھا رہا اور پھر گلی میں داخل  
ہو گیا۔

عمارت میں بھی لوگوں کی آمد و رفت تھی لیکن کسی نے  
میری طرف توجہ نہیں دی۔ دوسری منزل پر راہداری کے  
آخری فلیٹ کے سامنے میں رک گیا اور دروازے پر ہلکی سی  
دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا لیکن سونیا کے بجائے  
ایک اور عورت کو دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ مجھے اندازہ  
لگائے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ یہ مادھوری تھی اور  
سونیا نے بتایا تھا کہ وہ صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر چلی جاتی ہے لیکن  
اس وقت اسے گھر پر موجود دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہا  
تھا۔

”مجھے سونیا سے ملنا ہے۔ میں اس کا دوست۔“  
”اندرا آجاؤ۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے دوڑاں  
پوری طرح کھول دیا ”میں اس کی دوست ہوں مادھوری۔“  
اس نے تعارف کرایا ”سونیا ڈاکٹر کے ہاں گئی ہے۔ بس آتی  
ہی ہوگی۔“

”ڈاکٹر کے پاس!“ میں نے چونک کر اس کی طرف  
دیکھا۔

”ہلکا سا ٹیپر ہو گیا تھا۔“ مادھوری نے کہا ”رات کو اسے  
کچھ غنڈوں نے گھیر لیا تھا۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش  
کرتے ہوئے اسے کچھ اندرونی چویش آئی تھیں۔ شاید ان  
چوٹوں اور خوف کی وجہ سے اسے تپ (بخار) چڑھ گیا تھا۔  
تم اندر آکر بیٹھ جاؤ۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ اس نے مجھے تمہارے  
بارے میں بتا دیا تھا۔“

میں اندر داخل ہو گیا۔ مادھوری نے دروازہ بند کر دیا  
اور مجھے سونیا کے کمرے میں لے آئی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔  
مادھوری بھی میرے سامنے چنگ کی پٹی پر ٹک گئی۔ میں اس کی  
طرف دیکھنے لگا۔

اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز  
قامت، بھرا بھرا اسٹول جسم، چہرے کے نقش نمایاں و کثر  
اور آنکھیں بادامی جن میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس  
نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی لیکن دوپٹا نام کی کوئی چیز  
نہیں۔ وہ جو وہ پور کی رہنے والی تھی اور ملازمت کے لحاظ  
میں یہاں مقیم تھی۔

”سونیا کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”معمولی سا ٹیپر ہو گیا تھا۔ پریشان ہونے کی ضرورت  
نہیں۔“ مادھوری نے جواب دیا ”وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کو  
تیار نہیں تھی۔ میں نے ہی زبردستی بھیجا ہے۔ آپ اگر

بھی وہ اس رقم کو ساتھ لانا نہیں بھولی تھی۔“ یہ ساتھ ہزار  
روپے ہیں۔“ وہ ایک رومال میں لپٹا ہوا نوٹوں کا بڈل میری  
طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے بڈل چٹون کی جیب میں ٹھونس لیا۔ دوسری  
جیب میں اپنے استعمال کے لیے کچھ اور رقم رکھی ہوئی تھی۔  
ہسپتال میں نے ٹی شرت کے نیچے چٹون کی جیب میں اسے رکھا  
تھا۔ ہاتھ کے اندر بڈل پر پتھر بھی بندھا ہوا تھا۔ غیر محتاط تو  
میں پہلے بھی نہیں تھا لیکن گزشتہ رات رامو وغیرہ سے جھڑپ  
کے بعد مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔ روپ مٹی کے جو کچھ  
بتایا تھا اسے میں نے مذاق میں نہیں ملا تھا۔ اس جیسے لوگوں  
کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر روپ مٹی مجھے اس کے  
بارے میں اتنی تفصیل سے۔۔۔ بھی بتاتی تو بھی میں اس کا  
دھیان رکھتا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں معمولی سی غفلت  
بعض اوقات ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔

اس وقت میں نے بچارو لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔  
حوالی سے نکل کر پیدل چلتا ہوا سڑک پر گیا۔ اتفاق سے آٹو  
رکشال گیا جس پر ایک آدمی پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔  
”اگر مارگ کے پہلے چوراہے پر ہیں تو آٹو رکشا چھوڑ  
دیا۔ کچھ دور تک پیدل چلتا رہا پھر ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر سورج  
پول گیٹ سے ہوتا ہوا ہوا نند مارگ میں چار دروازہ پہنچ گیا  
اور یہاں ٹیکسی چھوڑ دی۔ اس طرح مجھے ایک بہت طویل  
چکر لگانا پڑا تھا لیکن اب میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا  
چاہتا تھا اور اس مرتبہ میں نے اپنے تعاقب کا پورا پورا خیال  
رکھا تھا۔ چار دروازے سے میں ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور  
سراے ڈیوڑھی بازار اور ہوا محل کے سامنے سے ہوتا ہوا  
چوڑا راستہ سے نیو گیٹ کی طرف آیا۔

ہوا محل۔ گلابی رنگت کی اس قدیم اور تاریخی  
عمارت کو فن تعمیر کے لحاظ سے شہر کی خوب صورت ترین  
عمارت کہا جاسکتا ہے۔ پانچ منزلہ یہ عمارت ۱۹۹۷ء میں  
سوائے پر تاپ سنگھ نے بنوائی تھی۔ یہ عمارت ایک بلند  
چوڑے پر بنی ہوئی ہے۔ چوڑے سے تنک جینچنے کے لیے پانچ  
کشادہ میڑھیاں ہیں اور اس سے آگے عمارت میں داخلے  
کے لیے عمارتی دروازے ہیں۔ لاعداد عمارتی کمزریاں ہیں جن  
میں سنگ مرمر کی خوب صورت جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ اوپر  
سے یہ عمارت بجنوی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ میں کئی  
مرتبہ ہوا محل کے سامنے سے گزرا تھا مگر ابھی تک اندر  
جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ٹیکسی میں نے گلی کے موڑ پر چھوڑ دی۔ بازار میں خاصا  
آتش فشاں ۱۹۹۷ حصہ ۱۴



ساتھی پستول سے فائرنگ کر رہا تھا۔

میں نے اور ٹھاکر نے بیک وقت جیب سے چھلانگ لگا دی۔ جس دیوار سے ہماری جیب نکلا کر رکی تھی وہ چار فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس کی دوسری طرف بہت وسیع و عریض لان تھا اور اس دیوار سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر سیکرٹریٹ کی عمارت تھی۔ دیوار کے اندر کی طرف مورچک اور اسی قسم کے پودے تھے۔

ٹھاکر کا گن مین ابھی جیب ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جو ابلی فائر کرتے ہوئے جیب کی پچھلی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز اور اس کی چیخ بھی گونج اُٹھی تھی۔ اسے شاید کوئی لگی تھی اور وہ جیب کی پچھلی طرف گر گیا تھا۔

”کیا ہوا راج مل؟“ ٹھاکر نے چیخ کر پوچھا۔

”ہاں میں گولی لگی ہے حکم“ محافظ نے چیخے ہوئے جواب دیا ”آپ ہشکرت کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ میں ان کو روکتا ہوں۔“

”ہمت نہ کرو۔ تم اس طرف جاؤ اور میں اس طرف سے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ٹھاکر نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری طرف جانے لگا۔

میں مخالف سمت میں رینگتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ چند گز آگے جا کر میں نے دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ رامو کا ایک ساتھی فائرنگ کرتا ہوا ہماری جیب کے قریب پہنچ چکا تھا جبکہ رامو نے دیوار پر چڑھ کر اندر کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ میں نے تیزی سے رخ بدل کر فائر جھونک دیا۔ گولی ٹھکان پودوں کی شاخوں میں الجھ کر رہ گئی اور رامو پودوں کے پیچھے کس غائب ہو چکا تھا۔

اس سڑک پر زیادہ تر دفاتر تھے۔ شام سات آٹھ بجے کے بعد اس طرف ٹریفک کم ہو جاتا تھا اور اتفاق تھا کہ اس وقت وہ سڑک دونوں طرف دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ سڑک پر بجلی کے گھمبے بھی دور دور تھے۔ سڑک پر بہر حال کچھ روشنی تھی لیکن دیوار کی اندر کی طرف اندھیرا تھا۔

رامو کا ساتھی ہماری جیب کے قریب پہنچ چکا تھا اور پھر راج مل نے جیب کی آڑ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی اور دوسرے شخص کو اپنے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ہٹھمکھٹا ہو گئے۔

چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

ٹھاکر نے دیوار پر چڑھ کر اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے زمین پر گر کر رگید لگا۔

اپنے پیچھے پودوں میں آہٹ پٹا کر میں تیزی سے مڑا لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی۔ وہ ہیولا میرے اوپر آ رہا تھا۔ میں نے پستول کا ٹریگر دبا دیا لیکن اسی لمحے میرے ہاتھ پر ٹھوکر لگی۔

پستول سے نکلی ہوئی گولی تو بچانے کس طرف چل گئی البتہ پستول بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پودوں میں گر گیا تھا۔

وہ ہیولا اس طرح میرے اوپر آیا تھا جیسے مل میز پر اس اپنے شکار پر چھلانگ لگا رہا ہے۔

وہ رامو تھا۔ اس کے ہاتھ میں تینے کی چمک بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی اور اس کا ہاتھ جیسے ہی نیچے آیا میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ تینے کا بلبلہ تقریباً آٹھ انچ لمبا تھا جو لمحہ بہ لمحہ میرے سینے کی طرف جھک رہا تھا۔

رامو میں گیندے کی طاقت بھری ہوئی تھی۔ کل رات اسے میرے ہاتھوں زک اٹھائی پڑی تھی۔ انتقام کے جذبے نے بھی اسے وحشی بنا دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے حلق سے بھیرے جیسی غراہیں نکل رہی تھیں۔

میں بھی اس کا ہاتھ موڑنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہا تھا اور پھر میں نے ایک ہاتھ اس کی کلائی سے ہٹا کر پھیلے سے اس کی زخمی ناک پر زور درواڑا کر دیا۔

میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے اسے پوری قوت سے ایک طرف دھکیل دیا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رامو نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

اس مرتبہ میں نے حملہ کرنے میں پہل کرنے کی کوشش کی مگر میرا ہیر پودوں میں الجھ گیا۔ میں اپنا توازن بے قیامت دکھ سکا اور پشت کے بل گر گیا۔ میرا ہیر ایک پتھر سے ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، رامو نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس کا چمکتا ہوا تینہ بجلی کے کوندے کی طرح میرے سینے کی طرف لپکا۔ میرے سینے اور تینے کی ٹوک میں فاصلہ ہی نہ کی تیزی سے کم ہو رہا تھا اور کوئی لمحہ جانا تھا کہ تینہ میرے سینے میں پیوست ہو جائے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا دھڑکتا جا رہا تھا۔

میری زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ میں غار خیمہ تینہ کسی بھی لمحے میرے سینے میں پیوست تھا۔

لیکن پھر اچانک میرے دماغ میں روشنی کا ایک ت جھپکا ہوا جیسے آسمانی بجلی کوندہ کی ہو۔ اس کے ہی پورے بدن میں برقی لہریں بھی پھیلنے لگیں۔

میرے ہتھ میں ٹھیک ٹانف کی جگہ پر آگ سی بھڑک پڑی۔ شدید کھولن ہو رہی تھی اور پھر لوگ اچھے کھولنا رہے۔

میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ اندھیرا چھٹ چکا ہند لمحے پہلے میں موت کے جھٹکے کا فتنہ تھا لیکن اب تمام توانائیاں عود کر آئی تھیں۔ میں اپنے آپ میں نئی قوت محسوس کرنے لگا۔ میرے پورے جسم میں برقی کوندہ رہی تھیں۔

میرا دایاں ہاتھ اچانک ہی حرکت میں آیا اور میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ تینے کی ٹوک میرے سینے سے صرف دو انچ کے فاصلے پر رک گئی۔

یہ صورت حال بیان کرنے میں تو یقیناً وقت لگا ہے لیکن ابھی ہوا تھا، پلک جھپکنے کی دیر میں ہو گیا تھا۔

رامو نے کرائے کا قائل ”اس شہر کا سب سے بڑا دادا“ اچانک کا گایک۔ جو میری زندگی کا خاتمہ کرنے جا رہا تھا، صورت حال پر چونک گیا۔ ایک لمحہ پہلے تک اس کے من یقیناً یہ بات تھی کہ تینے کے ایک ہی دار سے ۷ جیون (زندگی) کا انت (خاتمہ) کروے گا۔ وہ مجھے ناگزیر شکار سمجھا تھا۔ وہ تو اس بات کا فتنہ تھا کہ اس کا بھرے خون سے اپنی پیاس بجھانے والا ہے لیکن اس بدلی امورت حال نے اسے بڑا مایوس کیا تھا۔ اس کی آنکھوں یک لمحے کو ابھرنے کے تاثرات ابھرے لیکن اگلے ہی لمحے کے چہرے پر دردندگی کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی نینوں خوار دردنے کی سی تھی جس کے ہاتھ سے اس کا ٹھکانا جا رہا ہو۔

رامو تینے کی ٹوک میرے سینے میں گاڑنے کے لیے اپنی نر قوت کو بروئے کار لا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید فلاح گون کی رنگیں پھول گئی تھیں۔

تینے کی ٹوک میرے سینے سے آہستہ آہستہ پرے ہٹنے لگی۔ صرف ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھام رکھی۔ لا کرا بازو مڑ کر میرے اپنے ہی جسم کے نیچے دبا ہوا

تھا۔ رامو مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے اپنی پوری طاقت استعمال کر رہا تھا لیکن اس سے (وقت) وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ خنجر میرے سینے سے دور ہٹا گیا اور پھر میں نے اپنے جسم کو ذرا سی حرکت دے کر نیچے دبا ہوا اپنا دو سرا بازو سیدھا کیا۔ انگلیوں کو ایک دو مرتبہ حرکت دی اور پھر زوردار چیخ اس کے جڑے پر برسد کر دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی لیکن شاید اس چیخ کا اس نے زیادہ اثر نہیں لیا تھا لیکن دوسرے نیچے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔

میں اب بھی اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اپنی دونوں ٹانگیں سینے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ میرے دونوں ہیر اس کے ہتھ پر آگئے اور میں اپنی پوری قوت کو ٹانگوں میں سمیٹ کر اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔

رامو میرے ہیروں پر میرے جسم سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھ گیا۔ اس کی تینے والی کلائی اب بھی میری ٹرٹ میں تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے سر پر ٹھونسنے مارنے کی کوشش کی مگر میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا وہ ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

اب رامو پوری طرح میرے قبضے میں تھا۔ میں نے اسے تقریباً ڈیڑھ فٹ اوپر اٹھالیا تھا اور پھر پوری قوت سے اسے اچھال دیا۔

وہ ”بھد“ کی آواز سے کیاری میں گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ رامو سے نجات ملنے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رامو نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر میرے سامنے کھڑا ہاتھ آگے کو نکالے تینے کو مخصوص انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شاید ابھرنے کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ شاید اس بات پر حیران تھا کہ میں اس کے اس حملے سے بچ کیسے گیا تھا۔

اس کا یہ حملہ یقیناً بہت ہی خطرناک تھا اور اس وقت میں جس کیفیت سے دو چار تھا اس کے پیش نظر تو مجھے اس وقت خاک و خون میں لوٹنے ہوئے نظر آتا چاہیے تھا لیکن میں چٹان کی طرح اس کے سامنے سڑا تھا اور یہ سب میرے اندر پر اسرار پچی کی قوت کا کمال تھا۔ جی۔ وہ پر اسرار قوت جو میں نے بڑی تپسیا (پریکٹس) کے بعد حاصل کی تھی اس سے بروقت میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔

آگے کو بڑھے ہوئے ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے رامو نے اچانک ہی ہاتھ سرے بلند کیا۔ تینے کی چمک آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی۔ میرے ہاتھ اس سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت میں آگئے۔

میں نے اس حملے سے بچنے کے لیے نائف پینڈ وینس کی ٹیکنیک استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ فیصلہ برقی رو سے بھی زیادہ تیزی سے ہوا تھا۔ مارشل آرٹس کی کڑی ریاضت جہاں بدن میں چوکی پیدا کرتی ہے وہاں دماغی صلاحیتوں کو بھی متیل کرتی ہے اور مارشل آرٹس ذہنی طور پر بھی اس قدر چاق و چوبند ہوتا ہے کہ اسے فوری طور پر کوئی درست فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور یہی صلاحیتیں حریف پر برتری حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

میرے دونوں بازو ایک دوسرے کو کراس کرتے ہوئے سامنے آگئے۔ رامو کا دار میں نے اپنی کلائیوں کے بیچ میں روکا اور بڑی پھرتی سے دونوں ہاتھوں کی ٹھکیاں بیچ کر انہیں پشت کی طرف سے آپس میں ملایا۔ رامو کی کلائی میری کلائیوں کے ٹھکنے میں پھنس گئی تھی۔

اپنا یہ دار بھی ناکام ہوتے دیکھ کر رامو کی آنکھوں میں ایک بار پھر شدید الجھن ابھر آئی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر یہ وہ ٹھکنے تھا جس میں زیادہ زور آزمائی سے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ تو سکتی تھی مگر آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔

میں زمین پر پیر ہائے اپنی جگہ پر اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس وقت میری تمام تر قوت ہاتھوں میں سمٹ آئی تھی۔ میں نے کلائیوں کے ٹھکنے کو ذرا اور کس دیا۔

رامو کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب وحشت سی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اس کا پورا جسم بھی متحرک تھا۔ وہ زاویے بدل بدل کر زور آزمائی کر رہا تھا مگر اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

میں نے اپنی کلائیوں کے ٹھکنے کو کچھ اور کس دیا۔ رامو کراہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات نمودار ہونے لگے اور پھر پیٹنے کے دے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ انگلیاں کھلتی چلی گئیں اور تینداس کے ہاتھ سے نکل کر میرے پیروں کے قریب ہی زمین میں گر گئیں۔

میں نے اچانک ہی ایک جھٹکے سے اپنی کلائیوں کا ٹھکنہ کھول دیا۔ رامو لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور دہرا ہو کر دوسرے ہاتھ سے اپنی مضروب کلائی سسلانے لگا۔ اس کے چہرے پر اب بھی کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔

اور پھر اچانک ہی وہ سیدھا ہو کر میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں غفلت میں مار کھا جاؤں گا لیکن میں نے

بڑی پھرتی سے اچھل کر سائڈ کنگ لگا دی۔ ضرب اس کے پبلو پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک بار پھر طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے کنگ نہیں لگا بلکہ میرے دونوں ٹانگیں فینچی کی طرح اس کی گردن سے لپٹ لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو دائیں طرف دوڑا دیا۔

بچے گرتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا دیے تھے لیکن رامو چپٹا ہوا نیچے گرا۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس مرتبہ میں نے اس پر ٹھوکوں کی بارش کر دی۔

رامو گدھے کی طرح چٹا رہا۔ میری ہر ٹھوک پر وہ بلبلاتا اٹھتا۔ مجھے وہ آسان شکار سمجھا تھا مگر وہ خود غلطی میں پھنس گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اب وہ اپنی جان بچانے کی کوشش میں تھا۔

میں نے ایک اور ٹھوک مارنا چاہی تو اس نے میرا ہاتھ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں ایک پیر پر تاج کر رہ گیا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل پودوں میں گرا۔

میرا خیال تھا کہ رامو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے دوپٹے کی کوشش کرے گا لیکن مجھے یہ دیکھ کر ہی حیرت ہوئی کہ اس نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی تھی۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس وقت میں جھاڑیوں میں چٹ پڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ جھاڑیوں کی گھنجان شاخوں میں الجھ گئے تھے۔ وہ اگر چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے گرفت میں لے لے لے بس کر سکتا تھا لیکن اس پر شاید میری وحشت طاری ہو گئی تھی اور اس نے مقابلے سے دستبرداری کا فیصلہ کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

میں نے اٹھ کر اوپر اوپر دیکھا۔ ٹھاکر بھانوت عمو رامو کے ایک کمرے سے نمت رہا تھا۔ ٹھاکر کی ٹانگ اگرچہ بلی کی زخمی تھی لیکن اس کے باوجود وہ رامو کے کمرے کی ٹانگ ٹھاکر حرمت کر رہا تھا۔

دیواری کی دوسری طرف جپ کے قریب ٹھاکر کا گھبراہٹ راج مل رامو کے دوسرے کمرے سے پت ہوا تھا۔ وہ ہلاک ہٹا کٹا آدمی تھا لیکن شروع ہی میں اس کے بازو میں گولی لگی تھی جس سے وہ کمزور پڑ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کی مدد پہنچ گیا۔

میں نے اس بد معاش کو سر کے بالوں سے پکڑ کر ان ل

اوپر سے اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے جڑے پر وار کھوسنا جیادیا۔ وہ بلبلاتا اٹھا۔ میں نے دوسرا گھوسنا کر کے ہوئے اس کے بال جھوڑ دیے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بے فکر آیا۔

ٹھکنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک لمحے میں رت حال کا اندازہ لگایا تھا۔ رامو اس وقت سیکرٹریٹ پہنچ کر عیض یارک میں دوڑتا ہوا سمت دور پہنچ چکا تھا۔ کا صرف ہولنا نظر آ رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس ناش کی آنکھوں میں وحشت سی الجھن آئی اور دوسرے ہی اس نے بھی سڑک پر دوڑ کھڑی ہوئی اپنی چپ کی طرف لگا دی۔

میں نے اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ با آدنی تو رامو تھا۔ وہی بھاگ گیا تھا تو اس کے گڑگوں کو کر کیا کر رہا تھا۔ میں دیوار پھاند کر دوسری طرف پہنچ گیا یا ٹھاکر رامو کے گرگے کو بالوں سے پکڑے کھینچتا ہوا لارہا

دیوار کے قریب آکر ٹھاکر نے اسے دونوں ہاتھوں میں کر دوسری طرف رخ دیا۔ زمین پر گرتے ہی وہ چچ اٹھا۔ رت بھی دیوار پر چڑھ کر اس طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ نے آتے ہی اس ٹھٹے کو دو چار ٹھوکریں رسید کر دیں۔ ”بھاگ جاؤ۔“ وہ اسے آخری ٹھوکہ دے رہا تھا۔ مارا دارا تو میدان چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن ہم اسے نہیں ڈرے گے۔

اس آدمی نے اٹھ کر جپ کی طرف دوڑ لگا دی۔ پہلا ناچپ اشارت کر چکا تھا۔ دوسرا بھگدڑا ابھی دور ہی تھا جپ حرکت میں آگئی۔ وہ دوڑتا ہوا جپ کے پیچھے لپک اور جپ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح بھاگ نکلی۔

میں لمحہ بہ لمحہ زور ہوتی ہوئی جپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلب میں ایک اور خیال سے اچھل پڑا۔ جب وہ جپ خیز ہوئی سے ہمارے قریب سے گزری تھی تو اس نے ہماری ہونٹوں کے لیے تازہ برکولی چلائیں تھی اور جواب میں سے گن میں راج مل نے بھی ریوالت سے فائر کر دیا تھا۔ ناچپ کے پیچھے حصے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو لگی ہتھیار چٹا ہوا جپ سے سڑک پر گر گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لاش سڑک پر پڑی ہوگی لیکن دو در دو تک ایسی کوئی چیز نہیں آ رہی تھی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ صرف زخمی ہوا تھا اور لاشوں کے دوران میں وہ موقع پا کر فرار ہو گیا تھا۔

میں ناکر اور راج مل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹھاکر راج مل کو سر رادے کر زمین سے اٹھا رہا تھا۔ دوسرے بازو سے میں نے راج مل کو پکڑا تو وہ کراہ اٹھا۔ گولی اس کے بازو پر لگی تھی۔ اس کا بازو خون سے تر ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ بھی چپ چپا گیا۔

راج مل کو پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ٹھاکر کی ٹانگ کے زخم میں بھی تکلیف ہو رہی تھی اسی لیے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ٹھاکر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس سڑک پر سے اب تک کوئی گاڑی وغیرہ نہیں گزری تھی اور پھر جلد ہی بات میری سمجھ میں آئی۔ اس علاقے میں سیکرٹریٹ کی پچھلی طرف بھی بڑی بڑی کوٹھی نما عمارتوں میں سرکاری دفاتر تھے۔ دن کے وقت تو اس طرف اچھا خاصا ٹریفک رہتا ہوگا اور اب آدھی رات کے وقت اس طرف کون آ سکتا تھا۔

ٹھاکر کی ہدایت کے مطابق میں نے اگلے چوراہے پر جپ کو ہائی کورٹ کی بلڈنگ سے آگے نکال کر پونہ دو میل کی طرف موڑ دیا۔ وہاں سے ٹھاکر کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔ بارن، بجائے کے ایک منٹ بعد حویلی کا پھانک کھل گیا اور میں جپ کو اندر لیتا چلا گیا۔

جپ سے اتر کر رآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پر نیم دراز لڑکی کو دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔

اس لڑکی کی عمر میں اکیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے راحتانی لباس پہن رکھا تھا۔ مختصر سی چولی اور منی اسکرٹ کی طرح ٹخنوں سے اوپر تک کھانکرا۔ چولی میں کپڑا صرف سامنے کی طرف تھا جس سے سینے کی ستر پوشی بھی بخشل ہو رہی تھی۔ پشت پر کپڑا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ چند باریک ڈوریاں تھیں جنہوں نے چولی کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ مرکزی بلب کی روشنی میں اس کا بدن کندن کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ صوفے پر نیم دراز ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہندی زبان کے کسی فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ ٹھاکر بھانوت سمجھ کو دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے رسالہ سامنے شیشے کی ٹاپ والی کانی ٹیبل پر بیٹھک دیا تھا۔

”کیا وہاں ٹھاکر کیا پھر گولی لگی؟“ وہ تیزی سے آگے بڑھ آئی اور ٹھاکر کی ٹانگ کو دیکھنے لگی۔ اس کی زخمی ٹانگ پر پتلون کا پانچہ خون آلود ہو رہا تھا۔

”نہیں۔ میرا خیال ہے پرا ندم ختم کیا ہے۔“ ٹھاکر

نے جواب دیا۔ ”تم فون کر کے ڈاکٹر شام کو میرا بلاو۔ رات مل بھی نہ سکی ہے۔ اس کے بازو میں گولی لگی ہے۔“  
 ”نہ تو یہ ہوا کیسے؟ کس سے بھڑکا ہوا تھا؟“ لڑکی نے تشویش آمیز لہجہ میں پوچھا۔  
 ”رامو اور اس کے گڑگوں نے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔“  
 ٹھاکر نے جواب دیا ”تم پہلے ڈاکٹر شام سندھ کو فون کر دو۔ باتیں بعد میں کرنا۔“  
 لڑکی میری طرف دیکھتی ہوئی وسیع ہال میں اس طرف چلی گئی جہاں ایک صوفے کے قریب سائڈ ٹیبل پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ وہ صوفے کے کنارے پر ٹک گئی اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔  
 ٹھاکر بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور چٹون کا پانچھ اٹھا کر پنڈلی پر بندھی ہوئی پٹی کھولنے لگا۔ پٹی بھی سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کا زخم کھل گیا تھا۔ جس طرح ماروھاڑ اور اٹھاٹھ ہوئی تھی اس کے بعد بھی یہ نہ ہوتا تو مجھے حیرت ہوتی۔

وہ لڑکی فون بند کر کے ہمارے قریب آگئی۔ اس نے ایک نظر ٹھاکر کی زخمی ٹانگ کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔  
 میں بھی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی جوانی سمندر کی اٹھتی ہوئی موج بھی جو ساحل کی قید سے آزاد ہونے کے لیے چل رہی تھی۔ اس کا حسن لا جواب تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی کشش تھی جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد بھی میں نے بہت سی حسین عورتیں دیکھی تھیں مگر ایسی سمندر ناری (خوب صورت عورت) پہلی مرتبہ میری نظروں کے سامنے آئی تھی اور میں یہ اعتراف کرنے میں بھی پاک نہیں سمجھتا کہ بلا وہ پہلی لڑکی تھی جسے دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ میری نظروں اس کے حسین پیکر کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ میں اسے کتنی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور یہ مسکراہٹ بھی بڑے غضب کی تھی۔  
 ایک ملازم بڑے آدے والے دروازے سے اندر داخل ہوا تو بلا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”راج مل کہاں ہے۔ تم نے کہا تھا اسے بھی گولی لگی ہے!“

”راج مل باہر بیٹھا ہے۔“ ٹھاکر سے پہلے وہ ملازم پڑا جو ابھی ابھی اندر آیا تھا۔  
 ”اسے کوارٹر میں لے جاؤ۔ ڈاکٹر شام سندھ آنے والا ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ملازم فوراً ہی باہر نکل گیا۔  
 میں بھی ٹھاکر کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر میری نظروں اب بھی بار بار بلا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔  
 ”ان مہاشے کا تعارف نہیں کرایا تم نے ٹھاکر۔“ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”ان مہاشے کا تعارف۔“ ٹھاکر نے سر اٹھا کر اس طرف دیکھا ”حیرت ہے۔ سارا شران سے متعارف ہو ہے اور تم انہیں میرے ساتھ دیکھ کر کبھی نہیں سمجھ سکتی یہ کون ہو سکتا ہے۔“  
 ”ہمت سنگھ۔“ بلا کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی نظروں میری طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں سے زیادہ چمک تھی۔

”ہاں یہ ہمت سنگھ ہے۔“ ٹھاکر نے گہرا سانس لے کر جواب دیا ”سچائی اور بھگتی کے راستے کاہ سافرا ہر یک ہوتا چار (ظلم) کا سامنا ہے اور یہ کسی سائنات (درا) بغیر ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ بھگوان نے اس کی باتوں میں اٹھتی (توت) دی ہے کہ اسے کسی اور کی سامانتی کی ضرورت بھی نہیں۔“  
 ”یہ تمہاری دیا (مہرانی) ہے ٹھاکر کہ مجھے اس کا سمجھتے ہو۔“ میں نے کہا ”مجھے تم جیسے مان مٹھوں کی سادہ نہ ملتی تو میں ہوتا چار کا مقابلہ نہ کر سکتا۔“  
 ٹھاکر کچھ کھٹکنا چاہتا تھا کہ باہر سے کارے ہانک کی آواز سنائی دی۔

”میرا خیال ہے ڈاکٹر شام سندھ آگیا ہے۔ اسے لے آؤ بلا۔“ ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اٹھ کر فوراً ہی باہر نکل گئی۔  
 میرے خیال میں ڈاکٹر شام سندھ کس قریب رہا ہے جو اتنی جلدی پہنچ گیا تھا۔ حویلی کے ایک ملازم نے اسے ایک اٹھا رکھا تھا جو قریب آکر اس نے کالی ٹیبل پر رکھ دیا۔  
 ”پھر کوئی گزربو۔“ ڈاکٹر نے ٹھاکر کے سامنے کالی ٹیبل پر رکھ دیا۔  
 بیٹھے ہوئے کہا ”کیا آج پھر کسی پنڈت سے سامنا ہو رہا ہے؟“  
 ”نہیں۔ آج کچھ ڈشٹ (بد معاش) کھا رہے تھے۔“  
 ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”ان کے بھاگ (خف) اچھے تھے جو چکر نکل گئے۔“

ڈاکٹر شام سندھ نے مزید کچھ کہنے کے بجائے ٹیبل پر کہا ”بائیگ اٹھا کر اپنے قریب قالین پر رکھ لیا اور اسپرٹ کی بوتل اور کاشن نکال کر ٹھاکر کا زخم صاف کرنے لگا۔ ٹھاکر نے دانت بچھتے لیے۔ اسپرٹ تو اتنے اچھوں کو سسکاریاں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔  
 زخم صاف کر کے ڈاکٹر نے دوا لگا کر ڈرنک کر دی۔  
 ”میں چار روز تک مکمل آرام کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر زخم بڑھ گیا تو کئی روز تک کھات پر پڑے رہنا پڑے گا۔“  
 ”اب صوبہ احتیاط کروں گا۔“ ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا ”اب دوا راج مل کو بھی دیکھ لو۔ اس کے بازو میں گولی لگی ہے۔“  
 ”اوہ کہاں ہے وہ؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔  
 ”اپنے کوارٹر میں ہے سرکار۔“ ایک ملازم نے جلدی سے کہا۔  
 ”چلو اسے بھی دیکھ لیں۔“ ڈاکٹر بولا۔

ملازم نے بیگ اٹھایا اور میں بھی ان کے ساتھ چل رہا۔ سرونٹ کوارٹر حویلی کی پچھلی طرف تھے۔ ہم ایک کوارٹر میں داخل ہو گئے۔ راج مل چارپائی پر پیر لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے زخمی بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چارپائی پر لٹا دیا اور اس کے بازو کو زخم کے آس پاس نکل کر دیکھنے لگا اور پھر میری طرف دیکھ کر تشویش آمیز لہجے میں بولا۔

”گولی اندر رہ گئی ہے۔ آپریشن کرنا پڑے گا۔“  
 ”اسپتال۔“  
 ”نہیں۔“ ڈاکٹر نے میری بات کاٹ دی ”اگر اسے اسپتال لے گئے تو ہم پولیس کی مداخلت کو نہیں روک سکیں گے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے یہیں پر کرنا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے پاس کیا بچہ ہے۔“  
 وہ اپنا بیگ کھول کر اس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے سائیکورہی میز پر ایک صاف کپڑا بچھا دیا اور بیگ میں سے چیزیں نکال کر اس پر رکھنے لگا۔ تیز دھار والا شیزنگ نوک والی پٹی اور ایسی ہی کچھ چیزیں۔ آخر میں اس نے شیزنگ کی ایک بوتل نکالی جس کا پینڈا ایچے سے گول تھا اور منہ باؤنڈم اسپرٹ کی بوتل کی طرح نوزل لگی ہوئی تھی۔ اس بوتل میں بے رنگ سا مائع بھرا ہوا تھا۔ یہ لوکل اسٹیمپیا تھا۔

”راج مل۔“ ڈاکٹر ایک بار پھر اس کا بازو ٹٹوتے ہوئے بولا ”ڈرنک نہیں۔ یہ اسپرٹ کرنے سے تمہارا بازو ٹٹوٹا ہو جائے گا اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“  
 راج مل کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ گولی لگنے سے شاید اسے اتنی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی جتنا خوف زدہ وہ اب ہو رہا تھا۔  
 ڈاکٹر شام سندھ نے اس کے زخم کے آس پاس اسپرٹ کر دیا اور چند سینکڑا انتظار کرنے کے بعد وہ نشتر سے اس کا زخم کھینچنے لگا۔ راج مل نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے آگے جھک کر اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔  
 کسی کے زخم کو اس طرح نشتر سے کھینچتے ہوئے دیکھنا بھی عام آدمی کے لیے بڑے دل گروے کا کام تھا لیکن میرا شمار عام آدمیوں میں نہیں ہوتا تھا۔ میری توانی زندگی ایک مسلسل عذاب بنی رہی تھی۔ میں نے اتنے دکھ اتنے کٹھٹ اٹھائے ہیں کہ کوئی عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔  
 میرے جسم پر بھی بڑے بڑے گھاؤ لگے ہیں۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب بنگال میں میری ٹانگ میں گولی لگی تھی اور کئی مہینوں بعد میرے دوست گانگ نے خنجر کی نوک سے میرے زخم سے وہ گولی نکالی تھی۔ نہ مجھے بے ہوش کیا گیا تھا نہ میری ٹانگ کو کسی اسپرٹ سے سُن کیا گیا تھا۔ میں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر اپنے زخم کو خنجر کی نوک سے چرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے وہ اذیت کس طرح برداشت کی تھی؟ وہ میں ہی جانتا تھا۔ راج مل تو خوش قسمت تھا۔ اس کے آپریشن کا سارا سامان موجود تھا اور اس کا آپریشن کرنے والا گانگ کی طرح رکشا ڈرائیور نہیں، ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔  
 ڈاکٹر شام سندھ نشتر اور چھٹی کی مدد سے زخم کو کھول رہا اور بالآخر گوشت میں دھنسی ہوئی گولی کو چھٹی سے پکڑ کر نکال دیا۔  
 اس آپریشن میں صرف بیس منٹ لگے تھے۔ مزید دس چندہ منٹ ڈرنک میں لگ گئے۔  
 ”بس اتنی سی بات تھی۔“ وہ راج مل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”چند روز تک اس بازو کو زیادہ حرکت مت دینا۔ میں کچھ گولیاں دے جاؤں گا۔“ پتہ (دور) ہونے لگے تو ایک گولی نکال دیتا۔“  
 راج مل نے اثبات میں سر ہلایا دیا۔ ہم سرونٹ کوارٹر سے نکل کر حویلی کے ہال میں آگئے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ صوفے پر نیم دراز تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔ بلا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن کی



طرف چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ ڈاکٹر شیام سندھو چائے پی کر رخصت ہو گیا۔

”شیام سندھو کون ہے؟“ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”لگتا ہے تمہارا کوئی راز اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔“ ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”شیام سندھو میرا ایسا ہی گہرا اور بھروسے کا دوست ہے جس سے میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔“

”میرا خیال ہے تم دونوں کا بچپن بھی ایک ساتھ ہی گزرا ہے!“ میں نے کہا۔

”کسی حد تک۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”شیام سندھو دراصل ہمارے مائی کا بیٹا ہے۔ یہ چھ سال کا تھا جب اس کے باجی (باپ) کا درمات (انتقال) ہو گیا تھا۔ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا ہے۔ یہ اس وقت پہلی جماعت میں تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ سبق فوراً ہی یاد کر لیتا تھا۔ اس کی ماں اسے اسکول سے اٹھالینا چاہتی تھی لیکن اس کا شوق دیکھ کر میری ماما جی (ماں) نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس کی تعلیم جاری رکھی۔“

”اس نے آٹھویں جماعت پاس کی تو شیام سندھو کی ماما جی بھی گزر گئیں۔ شیام سندھو آگرہ میں اپنے کسی چاچا کے پاس جانا چاہتا تھا مگر ماما جی نے اسے منع کر دیا۔“

”شیام سندھو ذہین لڑکا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا بے حد شوقین۔ ماما جی نے اس کی تعلیم جاری رکھی۔“

”شیام سندھو کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ ماما جی نے اس کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ اس نے بہت اچھی پوزیشن میں ایم بی بی ایس پاس کر لیا تو اس کی خواہش پرماتا جی نے اسے میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیج دیا۔“

”شیام سندھو چھ سال انگلینڈ میں رہا۔ وہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا کہ ماما جی شدید بیمار ہو گئیں۔ شیام سندھو کو پتا چل گیا۔ وہ واپس آنا چاہتا تھا تاکہ اس دیوی کی سیوا (خدمت) کر سکے جس نے اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچایا تھا مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا اور بدایت کی کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ واپس آیا تو اس کی تعلیم کا حرج ہوگا اور ماما جی کی حالت دیکھ کر وہ واپس جانے سے بھی انکار کر دے گی۔ میں خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے اسے ماما جی کے بارے میں تسلیاں دیتا رہا۔“

”ماما جی کا درمات ہو گیا۔ میں نے یہ خبر بھی شیام سندھو سے چھپائی اور چند ماہ بعد جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو ماما جی کو نہ پا کر وہ اس طرح پھوٹ کر رویا کہ میرا کلیجہ بھی پھٹ گیا۔“

”میں بڑی مشکل سے شیام سندھو کو سنبھال سکا تھا۔ اس صدمے نے کئی روز تک اسے نڈھال رکھا لیکن وقت ایک ایسا مرحلہ ہے جو بڑے بڑے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ شیام سندھو کے دل پر ماما جی کی موت سے جو زخم لگا تھا وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مندمل ہو گیا۔“

”شیام سندھو نے کچھ عرصے تک سرکاری اسپتال میں ملازمت کی پھر میں نے اسے رام باغ میں کلینک کھول دیا۔ رام باغ پبلک ہسپتال کے قریب ہی ہماری ایک کوٹھی ہے جو کرائے پر چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے وہ کوٹھی خالی کر دیا کہ شیام سندھو کے خوالے کر دی جہاں کلینک کھولا گیا۔“

”ابھی پچھلے سال ہی میں نے اس کی شادی کرائی ہے۔ اس نے کلینک کے قریب ہی رہائش کے لیے بھی ایک کوٹھی خرید لی اور میری آشریاد سے وہ اس کو بھی میں نخل ہو گئے۔“

”یہ ہے شیام سندھو کی کمائی۔“ ٹھاکر نے گہرا سانس لیا۔ ”اسے تم میرا دوست کہہ لیا بھائی۔ یہ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتا ہے۔“

”اور یہ۔؟“ میں نے آنکھ سے ہلا کی طرف اشارہ کیا۔

”میری دوست ہے مگر غلط مت سمجھنا۔“ ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بھائی پنڈت رام سروپ برہمن کی بیٹی ہے۔“

”اور یہ پنڈت رام سروپ برہمن کون ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پنڈت رام سروپ برہمن وہ شخص ہے جس سے بلونت سنگھ نے سب سے پہلے رابطہ کیا تھا اور اسے تمہارے اور روپ متی کے تعلقات کے بارے میں بھڑکا تھا۔ پنڈت رام سروپ برہمن ہی نے بعض دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں کو اکسایا۔ جب تم دونوں کے خوالے سے پہلی مرتبہ شہر میں بنگلے ہوئے تھے تو پنڈتوں کے ٹولے کا سرخند پنڈت رام سروپ سی تھا لیکن اس بنگلے کے انت (اختتام) منظر سے غائب ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے اب بنگالوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی یا وہ پولیس کی پکڑ ہو کر سے خائف ہو گیا تھا۔“

”تو پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

پنڈت اور پجاری آسانی سے کوئی بات ماننے والے تو نہیں ہوتے۔“

”لیکن پنڈت رام سروپ نے بلا چون و چرا ایک مذہبان کی بات مان لی تھی۔“ ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے مزید حیرت ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ملا پنڈت رام سروپ کی دوسری بیٹی ہے۔“ ٹھاکر نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”مقامی یونیورسٹی میں فائن آرٹس کی اسٹوڈنٹ اور بہترین رقاصہ ہے۔ ہمارے دھرم میں رقص کو برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک طرح سے یہ ہمارے دھرم کا حصہ ہی ہے۔ اس کے رقص ہونے پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک دھرم اتنا (مذہبی پیشوا) کے گھر کی نارویں (عورتوں) کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوسری فیشن ایبل نارویں کی طرح اپنے شرعی نمائش نہیں کرتی پھر اس کی لیکن ہلا کو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ نہ صرف آزاد منش ہے بلکہ پاس بھی ایسا سستی ہے کہ وہ دوسروں کی نظریں خوا خواہ اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔“

”لوگ اس بات کو بھی نظر انداز کرنے کو تیار ہیں لیکن ہلا کی بڑی بہن پوجا بھی میں ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پوجا کو فلفوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہیروئن بننا چاہتی تھی۔ وہ بھی جلی جلی تھی۔ ہیروئن تو نہ بن سکی، انڈسٹری سے فلفوں رکھنے والے عیاش طبع مردوں کا کھلونا بن گئی۔“

”بہن کے لوگوں کو پتا نہیں کہ پوجا ایک پنڈت کی بیٹی ہے۔ پوجا نے یہ قتل مندی ضرور کی کہ وہاں اپنے باپ کا نام نہیں بھلا۔ وہ آج کل باندھ میں ایک مسلمان کیرا میں کے ماتھے اس کے فلیٹ میں رہ رہی ہے۔ سلیم نامی اس کیرا میں نے اسے یہ وشواس (یقین) دلا رکھا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اسے اسے ہیروئن ضرور بنائے گا۔ ہیروئن تو بہت پرے کی بات ہے وہ تو اسے کسی فلم میں ایکسٹرا کا دول بھی نہیں دلا سکا۔ وہ نہ صرف خود اس کے ساتھ تیش کر رہا ہے بلکہ اس کے دوست بھی اس بہن گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں۔ پوجا اس لیے اپنے آپ کو لٹا رہی ہے کہ شاید انہی میں سے کوئی اسے سرکیننگ تک پہنچا دے۔“

”یعنی میں کیرا میں سلیم اور پوجا کا بدوسی ہے پور کا خلیج والا ہے۔ وہ کئی سال پہلے کاروباری سلسلے میں پہنچ گیا ہو گیا تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو اسی علاقے میں رہتا تھا۔“

”نہی پنڈت رام سروپ کی حویلی ہے۔ فیروز شاہ نامی وہ شخص جسے بھلا اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے یہاں آتا رہتا ہے۔“

”جن دنوں ہندو تاری اور مسلمان مرد کے تعلقات کو بنایا کرتا تھا بنگالے شروع کیے گئے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی گئی تھی، فیروز شاہ ان دنوں یہاں آیا ہوا تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ پنڈت رام سروپ پجاریوں اور پنڈتوں کے اس ٹولے کا سرخند ہے جو جگہ جگہ زہر میں بچھے ہوئے بھاشن (ٹپتے) دے کر لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا رہے ہیں تو فیروز شاہ پہلے روز کے بنگالوں کے دوران میں ہی پنڈت رام سروپ کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔“

”فیروز شاہ کے پاس پوجا اور سلیم کی ایک تصویر بھی تھی جس میں نیم عریاں لباس میں ملبوس پوجا سلیم سے ہم آغوش تھی۔ یہ تصویر فیروز شاہ نے کیسے کھینچی تھی یا کہاں سے حاصل کی تھی؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے لیکن یہ تصویر ایک زبردست ہتھیار ثابت ہوئی۔“

”فیروز شاہ نے وہ تصویر پنڈت رام سروپ کو دکھا کر دھمکی دی تھی کہ وہ اس معاملے سے الگ ہٹ جائے اور اپنی زبان بند رکھے اور دوسرے پنڈتوں کو بھی بے گناہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے سے روکے۔ بصورت دیگر وہ یہ تصویر اخبارات میں شائع کروا دے گا اور شر کے پنڈت، پجاری اور گٹر ہندو اس کی بوئیاں فوج ڈالیں گی۔ اس کی حویلی کو جلا کر بھسم کر دیں گے اور اس کے گھر کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”یہ دھمکی کام کر گئی۔ پنڈت رام سروپ اس ٹولے سے ایسا غائب ہوا کہ آج تک کسی کو نظر نہیں آیا۔“

”کیا وہ شر چھوڑ کر بھاگ گیا؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”نہیں۔ وہ اپنی حویلی میں ہے۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔ ”اس نے گھر سے لنگھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ پنڈت اور پجاری اس سے ملنے کے لیے جاتے مگر انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیا جاتا۔ کم از کم دو مرتبہ بلونت سنگھ نے بھی اس سے ملنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔“

”اگر بنگالوں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ پنڈت رام سروپ سے مایوس ہو کر بلونت سنگھ نے دوسرے پنڈتوں کی طرف رخ کیا اور رام اور اتار چیت پنڈت اس کے بستے چھو گئے۔ اس معاملے میں پنڈت رام اور اتار ہی زیادہ متاثر ہو رہا تھا اس لیے وہ بڑی آسانی سے بلونت سنگھ کے جال میں پھنس گیا۔“

”لیکن تمہیں ان ساری باتوں کا پتا کیسے چلا؟“ میں نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی میری نظریں غیر ارادی طور پر بھلا

کی طرف اٹھ گئیں۔  
 ”بھلا سے۔“ تھا کرنے جواب دیا ”بات دراصل یہ۔“

میرے متر (دوست) ! ”اس نے نظریں میرے چہرے پر  
 دیں ”گھر کا ماحول بچوں کی تربیت گاہ ہوتا ہے۔ گھر میں سکو  
 نہ ہو، انتشار ہو، ماحول کدو ہو تو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے۔  
 کہ بچے دیوی دیوتاؤں کی طرح معصوم ہوں گے۔ یہ کسی  
 بات کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔“

”ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔۔۔  
 ضرورت سے زیادہ پابندیوں نے بھی انہیں باغی بنا دیا۔  
 سے تین سال چھوٹا بھائی پنڈت جی کی مار کھا کر اس طرح  
 سے بھاگا کہ آج تک اس کا پتا نہیں چلا۔ لڑکیوں نے بھی  
 کے ماحول کا کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ یہ مادر پدر آزاد  
 ہو گئیں۔ ایک فلمی ہیروئن بننے کے لیے بمبئی چلی گئی،  
 دوسری یہ۔۔۔“ اس نے بھلا کی طرف اشارہ کیا ”اس۔۔۔  
 میری ملاقات چند مہینے پہلے ہوئی تھی۔ میں اس وقت ا۔۔۔  
 ریٹورنٹ میں تھا۔ یہ دو لڑکوں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ نہ  
 نے انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگالیا کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ یہ  
 اس وقت وارو (شراب) پئے ہوئے تھی اور پوری طرح  
 اپنے خواں میں نہیں تھی۔

”آدھے گھنٹے بعد ایک اور آدمی وہاں آیا اور ان تینوں  
 کو ساتھ لے گیا۔ وہ آدمی میرے ہی ہوٹل کی جو بھی منزل

”اس میں شبہ نہیں کہ بیشتر رہائشی ہوٹل عیاشی کے  
 اڈے بنے ہوئے ہیں۔ کئی ہوٹل تو ایسے ہیں جن کے منتظمین  
 اور مالک خود ہوٹل میں ٹھہرنے والے مسلمانوں کو لڑکیاں  
 سلائی کرتے ہیں۔ بعض ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے مسلمان باہر  
 سے لڑکیوں کو لے کر آتے ہیں اور ویٹروں وغیرہ کو چند روپے  
 رشوت دے کر انہیں زبان بند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ میرے ہوٹل یا ریٹورنٹ  
 میں ایسی کوئی بات نہ ہو لیکن بعض اوقات ایسی کوئی  
 ”واروات“ ہر ہی جاتی ہے۔  
 ”اس رات لڑکی نشے میں تھی۔ ات دو ادبائش جسم کے  
 لڑکے لے کر میرے ریٹورنٹ میں آئے تھے اور پھر اپنی

ایک ایسا آدمی اپنے ساتھ لے گیا تھا جو میرے ہی ہوٹل میں  
 ٹھہرا ہوا تھا۔ میں تو پہلی ہی نظر میں اپنے لوگوں کو تازہ لیتا ہوں  
 اور یہ تو ایک کدہ ہوا کیس تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ  
 15 مئی 2003ء کو شائع ہوگا۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا پہلا نمبر سالانہ

# آتش فشان



5

حصہ

آگ کا دل میں جھلکے لڑنے والے ہیں  
ان کی ہر بات، ہر حرکت، ہر قدم  
ہماری نگاہوں کے لیے ایک نیا عالم ہے

## آتش فشاں

تحریر: اقبال کاظمی

راوی: وجدان علی

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کڑواہٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ یہ رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بناسکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکانہ نہ کرسکیں۔ بالاخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

علی میر کی کہانیاں لکھنے والے ایک نئے نئے عالم کی تلاش میں ہیں

کے باپ کو کچھ نہ بتایا جائے اور اس نے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ نجانے کیوں اس نے میرے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

”ان تینوں آدمیوں کو حالات میں بند کر دیا گیا اور میں لڑکی کو اپنی ضمانت پر اپنی حویلی لے آیا۔

”میں کوئی پارسیا دیوتا نہیں ہوں لیکن اس لڑکی کے لیے میرے دل میں کوئی میل نہیں آیا۔ یہ دو دن میرے پاس رہی۔ میں اسے سمجھاتا رہا۔ دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

”دو دن بعد یہ چلی گئی اور کئی روز بعد ایک شام میرے ہوٹل آگئی۔ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی اور پھر اس کے بعد ہماری دوستی ہو گئی۔ یہ کئی کئی روز تک میری حویلی میں رہ جاتی ہے۔ پنڈت جی نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ یہ کہاں غائب رہتی ہے۔

”یہ اس ممان پنڈت کی بیٹی ہے جس نے میرے خلاف بھی بہت زہر اگلا تھا۔ مجھے مسلوں کا پتہ دلا اور نجانے کیا کیا کیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی بیٹی کئی کئی روز تک میرے پاس رہتی ہے تو شاید وہ خود کشی کر لے۔“ تحاکر

”میں ریسٹورنٹ چھوڑ کر اوپر آگیا اور یہ تعین ہو جانے کے بعد کہ وہ چاروں چوٹی منزل والے کمرے میں موجود ہیں، میں نے پولیس کو بلایا اور جب اس کمرے کا دروازہ کھلوا یا تو لڑکی کے جسم پر لباس برائے نام ہی رہ گیا تھا اور وہ تینوں کھلونا سمجھ کر اس سے کھیل رہے تھے۔

”ان کے ساتھ مجھے بھی پولیس اسٹیشن جانا پڑا۔ ایک تھنر کھانے کے بعد لڑکی ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکا اس کا کلاس فیلو تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ وہ دونوں اسے ورغلا کر لے آئے تھے اسے زبردستی شراب پلائی گئی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں رہی کہ وہ دونوں اسے کہاں کہاں لے پھرے رہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس ہوٹل کے کمرے میں کس طرح آئی تھی۔

”ہوش میں آنے کے بعد لڑکی نے ذلت و رسوائی کے خوف سے اپنے ماں باپ یا گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تاہم اس کے کلاس فیلو سے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک ممان پنڈت کی بیٹی ہے۔ وہ منت ساجت کرنے لگی کہ اس

خاموش ہو کر بلا کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی بلا کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ٹھاکر کی باتوں کا برا مان گئی ہوگی لیکن اس کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو چمک گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ تو غیبت تھا کہ یہاں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ٹھاکر نے ٹیلی فون پر جاگی اور روپ مٹی کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم یہاں ہیں اور وہاں نہیں آئیں گے۔

”اچھا بھئی۔ میں تو چلا۔ نیند آ رہی ہے۔“ ٹھاکر اٹھتے ہوئے بولا ”تم بھی اس کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“ اس نے یہ جملہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی ہال کی دوسری طرف ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

”ہاں۔ نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔“ میں بھی اٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ٹھاکر کو سہارا دے کر اس کے کمرے تک چھوڑ آؤں گا لیکن بلا نے مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اٹھنا ایک بازو اس کی کمر میں جامل کر دیا اور اس طرح ٹھاکر کو سہارا دے کر اس کے کمرے کی طرف لے جانے لگی۔

میں چند لمحوں ان کی طرف دیکھتا رہا پھر اسی کمرے میں آ گیا جس کی نشان دہی ٹھاکر نے کی تھی۔

وہ بہت شان دار بیڈ روم تھا۔ میں نے ٹیوب لائٹ بجھا کر ٹائٹ بلب روشن کر دیا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کمرے کے بل لیٹا بلا کے بارے میں سوچ رہا۔

مجھے اس کمرے میں آئے ہوئے شاید آدھا گھنٹہ ہوا تھا۔ میں سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بلا کا خیال کسی طرح ذہن سے نہیں نکل رہا تھا۔ کتنی حسین تھی وہ۔ بھی تو اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں گدگد سی ہونے لگتی اور بھی میں اس کو جانتا۔ وہ حالات کا شکار ہوتی تھی۔ اس کی شخصیت بکھر گئی تھی اور یہ بھی غیبت تھا کہ اسے ٹھاکر بھانوت سنگھ جیسا دوست ملا تھا۔ اگر وہ ان بد معاشرلوں کے ہستے چڑھ جاتی تو آج وہ نہ ہوتی جو نظر آ رہی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ”چٹ“ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں تیز دودھیا روشنی بکھر گئی۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی

دھڑکن بے ربط ہونے لگی۔

بلا دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

بلا نے شاید میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔

”بیکار (بے قرار) ہو گئے؟“ وہ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی ”چتا (گھر) مت کرو۔ میں تمہیں کوئی کٹ (تکلیف) نہیں دوں گی۔“ اس کے لہجے میں بے باکی تھی ”میں جانتی تھی تم سوئے نہیں ہو گے اس لیے میں یہاں آ گئی۔“ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ باتیں کریں گے دونوں۔“

وہ بے تکلفی سے ہلکے پڑھ کر میرے سامنے آئی باقی مار کر بیٹھ گئی۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرے اندر اوپر سے نیچے تک سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا جو چوٹ کھلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کی دوست تھی اور ٹھاکر میرا احسن تھا۔ میری خاطر اس نے بہت کٹ اٹھائے تھے۔ اس کا ریسٹورنٹ جلا دیا گیا تھا۔ اس پر قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ وہ زخمی ہوا تھا۔ اس کے دھرم (نذہب) کے لوگ اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ بلا کے بارے میں اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس سے ٹھاکر کو ناراض ہونے کا موقع ملے۔

”میں ٹھاکر کی دوست ہوں۔ رکھیں نہیں۔“ بلا نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے تھے ”تم کوئی چٹا مت کرو۔ اس نے اگر مجھے تمہارے پاس بیٹھنے ہوئے دیکھ بھی لیا تو کچھ کہے گا نہیں۔ ہم تو یہاں باتیں کریں گے۔ صرف باتیں۔“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی ”ایک بات بتاؤ تم مجھے دیکھ کر اتنے بیکار کیوں ہو رہے ہو۔ کیا کبھی کسی ناری کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا؟“

وہ واقعی بڑی ذہین تھی۔ اس نے میری بے چینی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

”ناریاں تو میں بہت دیکھی ہیں پر۔“

”مجھے بھیسی کوئی نہیں دیکھی۔“ اس نے ہنسنے ہوئے میری بات کا ٹیپ ”پتو (گھر) میں کوئی دوسروں سے مختلف تو نہیں۔ بالکل ویسی ہوں جیسے دوسری ناریاں ہوتی ہیں۔ ہاں۔ تم مجھے ذرا بگڑی ہوئی کہہ سکتے ہو۔ پر میں اتنی بگڑی ہوں۔“

بھی نہیں۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔ اتنی بگڑی ہوئی ہو تیں تو یہاں ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی میں نظر نہ آتیں۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی ”تمہارا نام بہت سنگھ تو نہیں ہو سکتا۔ سارے شرمیں تمہارا چرچا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ راج کماری روپ مٹی سے تمہاری دوستی ہے اور یہ دوستی ہی ان ہنگاموں کا باعث بنی ہے۔ کیا واقعی؟“

”اب تم بھی کسی پنڈت کی طرح سوچنے لگیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پنڈت۔ پجاری۔“ بلا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا ”انہوں نے دھرم کا ٹھیک لے رکھا ہے اور دھرم کو سب سے زیادہ قصان پہنچانے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ جاتیوں (ذات پات) کا زہر بھی انہی پنڈتوں اور پجاریوں نے پھیلا دیا ہے۔ میرے پتا پر رہن ہیں۔ ہندو دھرم میں سب سے اونچی اور پوتر جاتی (ذات) مگر ان کے کرم (اعمال) بچی جاتی کے لوگوں سے بھی بدتر ہیں۔ لیجئے ہیں وہ۔“

”بہت نفرت ہے تمہیں اسے پتا چلی ہے۔“ میں نے کہا ”باپ کتابی برا کیوں نہ ہو“ اولاد کے لیے تو دیوتا مان (جیسا) ہوتا ہے مگر تمہاری یہ نفرت۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ تم پر ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی ہے یا۔“

”پتا جی سے نفرت کا کارن (وجہ) وہ کٹ نہیں جو میں نے ان کی اور (طرف) سے اٹھائے ہیں۔“ بلا نے جواب دیا ”ماں باپ اولاد پر تھوڑی بہت سختیاں کرتے ہیں اور اولاد ان باتوں کا بھی برا نہیں مانتی۔ یہ سختیاں ان کی بھلائی کے لیے ہوتی ہیں۔ پر ہمارے پتا جی نے ہم پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”تم نے ٹھیک کہا۔ پتا اولاد کے لیے دیوتا مان ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہی اولاد اپنی زندگی کے راستے کا تعین کرتی ہے۔ باپ ہی اگر اولاد کے سامنے نگلی باتیں کرے گا۔ نگلی کر تھیں گے گا تو اولاد سے یہ توقع کیسے کی جاتی ہے کہ وہ فرشتوں کی طرح نیک اور معصوم ہوگی۔“

”میرے پتا جی کے کرم بھی کچھ ویسے ہی ہیں۔ وہ غیر عورتوں کو حویلی میں لے کر آتے۔ میری ماما جی کو مجبور کرتے کہ ان کی سیوا کرے۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے دارو پلائے۔ بات صرف عورتوں تک ہوئی تو قابل برداشت ہوئی۔ وہ تو عورتوں کے ساتھ دوسرے پنڈتوں کو بھی لے کر آتے تھے اور

ماما جی کو مجبور کیا جاتا تھا کہ ان پنڈتوں کو اپنے ہاتھوں سے دارو پلائے۔“

”یہ سب کچھ ماما جی کے ٹھپے ناقابل برداشت تھا لیکن وہ یہ دیکھ سنے پر مجبور نہیں۔ ان کی خود جو دیسی عورتوں کو ننگا کیا جاتا ہے۔ دھرم اتنا انہیں نوچتے کھوٹتے ماما جی وہاں سے جانا چاہتیں تو انہیں زبردستی روک لیا جاتا اور یہ سب کچھ دیکھتے پر مجبور کیا جاتا۔“

”ماما جی نے انہی دکھوں میں گھل گھل کر جان دے دی۔ پتا جی اس پر بھی نہیں سنبھلے۔ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ ان کے گھر میں بھی دو جوان بیٹیاں ہیں۔“

”اور پھر ایک رات تو۔“ برغیر قی کی انتہا ہو گئی۔ اس رات پنڈت شیوا ناٹھ آیا ہوا تھا۔ ایک ناری بھی تھی۔ دارو پیتے پیتے وہ اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔

”پتا جی نے پوجا کو آواز دے کر پانی منگوایا۔ پوجا پانی لے کر اندر گئی۔ وہ جب رکھ کر لوٹنے لگی تو پنڈت شیوا ناٹھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پوجا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو پنڈت اس سے لپٹ گیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ پوجا نے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تو پتا جی نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا ”میرے دوست کو خوش کرو پڑی۔“ شیوا ناٹھ ممان پنڈت ہیں۔ شرم کے سب سے بڑے مندر کے بدھت ہیں۔ یہ خوش ہو جائیں گے تو اپنی گدی مجھے دے دیں گے۔“

”دارو کے نشے میں باپ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے کیا کر رہا ہے۔ پوجا کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا کر وہاں سے نکل آئی اور مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں بند ہو گئی۔ وہ رات بھر روٹی رہی اور اگلے روز صبح ہی بھینج چلی گئی۔ مجھے بھی اس نے خبردار کر دیا تھا کہ میں اپنا بددھت کرلوں ورنہ میرا باپ کسی دن اپنے ہی ہاتھوں مجھے ننگا کرے گا۔“

”پوجا چلی گئی۔ اس نے اپنی زبان بند رکھی تھی۔ میں نے بھی اپنے ہونٹ ہی لیے تھے۔ اگر لوگوں کو پتا چل جائے کہ باپ (گناہ) اور بیٹی (نواب) پر لیے لیے بھانٹ دینے والے پنڈت رام سروپ کے اپنے کرم کیا ہیں تو اس کی بوئیاں فوج خرتکوں کو کھلا دیں۔“

”یہ ہیں ہمارے دھرم چاریوں کے کرتوت۔“ بلا نے گہرا سانس لیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”پتا جی اصل روپ دیکھ کر مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی۔ دھرم کا

پر چار کرنے والے خود گندگی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔  
گڈا نا کو بھگوان کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی پوجا کرتے ہیں۔  
اس کے گوہر کو پوتر سمجھ کر اپنے شر پر ملتے ہیں۔ اس کوئی  
کشت دینا بہت بڑا باپ سمجھتے ہیں مگر یہی لوگ اس گڈا نا کو  
مسلمان قصابیوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں کہ اس کے گلے پر  
چھری پیسہ اور اس کی بونیاں کھاؤ۔ اس کی کھال کے جوئے  
بنا کر پیوں میں پہنوں۔ عجیب دھرم ہے اور عجیب تر دھرم چاری  
ہیں۔

”مجھے اپنے پتا سے شدید نفرت ہے مگر میں نے کسی کے  
سامنے ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولی۔ تم پہلے شخص ہو  
جسے میں اپنا دکھ بتا رہی ہوں۔  
”مانا جی انہی دکھوں میں گزر گئیں۔ ایک بٹی گھر چھوڑ کر  
چلی گئی۔ دوسری کئی جنگ کی طرح ڈانواں ڈول پھر رہی ہے مگر  
پتا جی کو اب بھی ہوش نہیں آیا۔ کسی دُشٹ (بد معاش) کے  
برکانے میں آکر انہوں نے شہر میں بنگاے شروع کر دیے۔  
مسلمانوں کے خلاف زہرا لگتے ہوئے ان کی زبان نہیں کھلتی  
تھی۔ انہیں دکھ تھا کہ ایک مسلمان کسی ہندو ناری کو بھل  
میں لے کر کیوں گھوم رہا ہے۔ ان کے خیال میں دھرم کے  
خلاف یہ بہت بڑی سازش تھی۔ دھرم کو ٹھٹھ (تباہ) کیا جا رہا  
تھا مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے کرم کیا ہیں۔ وہ خود  
دھرم کو کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ  
ان کی اپنی ایک بٹی ایک مسلمان کے ساتھ اس کے فلیٹ میں  
رہ رہی ہے۔

”ممکن ہے وہ ان ہنگاموں کو مزید ہوا دیتے مگر فیروز شاہ  
نے پوجا اور سلیم کی تصویر دکھا کر ان کی زبان بند کرادی اور وہ  
حوالی میں بند ہو کر رہ گئے۔

”اس رات اگر ٹھاکر بھانوت سنگھ مجھے ان بد معاشوں  
سے نہ بچاتا تو میں برباد ہو چکی ہوتی۔ میں عزت سے یہاں نہ  
بیٹھی ہوتی۔ ویسا (طوائف) بن جاتی۔

”کوئی پڑی اپنے پتا کے خلاف اس طرح نہیں بولی ہوگی  
جس طرح تم نے مجھے کہنے سنا۔ میرا پتا انسان نہیں راکشش  
(دُشمنی) حیوان۔ جنگی) ہے۔ ان کے کارن مجھے بھی اس  
دھرم سے نفرت ہو گئی ہے جس دھرم میں جھوٹ ہو۔ مکاری  
ہو، دھوکا اور فریب ہو وہ دھرم سچا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”بات دھرم کی نہیں۔“ میں نے اس کے خاموش  
ہونے پر کہا ”بات ان لوگوں کی ہے جو اپنی بد اعمالیوں سے  
دھرم کو بدنام کرتے ہیں۔ بہر حال تمہارے ساتھ جو کچھ بھی  
ہو اس کا مجھے افسوس ہے۔“

”میں اپنا بکھیرالے کر بیٹھ گئی۔“ بہت دیر بعد بلار کے  
ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی ”میں تم سے تمہارے  
بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ تم مسلمان ہو۔ راج مکاری  
روپ متی اور ٹھاکر سے تمہاری دوستی ہے۔ اپنے پتا جی اور  
دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں کو تو آج تک میں نے یہی کہتے  
سنا ہے کہ مسلمان لیچہ (ٹپاک غلط) ہیں لیکن ٹھاکر نے بتایا تھا  
کہ تم بھگوان کی طرح پوتر اور مہمان (مہتمم) ہو۔ تم نے ہندو  
ناری (روپ متی) کی نہ صرف عزت بچائی بلکہ کئی مرتبہ اس  
کی جان کی رکھنا (حفاظت) بھی کی۔ یہ تمہاری مہمان  
(محظنت) ہے کہ تم ایک ہندو ناری کے لیے ایک خطرناک پُ  
(لڑائی) لڑ رہے ہو۔“

”میں مہمان نہیں۔ مہانتا تو ان لوگوں کی ہے جو سچائی  
کے راستے پر میرا ساتھ دے رہے ہیں۔“ میں نے جواب  
دیا۔

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم سے ملاقات ہوگی۔“  
بلار نے کہا ”میں اس عورت سے بھی ملنا چاہوں گی جس نے  
تمہارے لیے اپنا گھر بار اور سب کچھ چھوڑ دیا اور تمہارے  
ساتھ کئی ورشو (سالوں) سے ماری ماری پھر رہی ہے۔“

”چالکی۔“ میں مسکرا دیا ”وہ میری بہت اچھی دوست  
ہے۔ اس نے واقعی میرے لیے بہت کشت اٹھائے ہیں۔ میں  
نہیں اس سے ضرور ملاؤں گا لیکن اب یہ تباہ کہ تم یہاں  
سے جانے کا کیا لوگی۔“

”پہلی ہی ملاقات میں تک آگئے ہو۔ میں تو تم سے بہت  
سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ بلار نے کہا۔

”ساری باتیں ایک ہی ملاقات میں ختم ہو گئیں تو  
دوسری ملاقات میں کیا کوگی؟“ میں نے اس کے چہرے پر  
نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”تمہیں دیکھتی رہوں گی لیکن خیر۔“ اس نے مگر اور  
لباساں لیا ”تم کہتے ہو تو میں اس وقت چلی جاتی ہوں۔“

اس نے بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر ایک  
خونناک قسم کی انگڑائی کی اور بیٹھ سے اتر گئی۔ چند لمبے میری  
طرف دیکھتی رہی پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جانے کے  
بعد وہ تیز رفتاری سے کالہ بھجنا میں بھولی گئی۔

میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں بیٹھ کی پشت سے  
تک لگائے نیم دراز پر تک بلار اور اس کے پنڈت باپ کے  
بارے میں سوچتا رہا۔ اگر بلار نے اپنے باپ کے بارے میں  
جھوٹ نہیں بولا تھا تو وہ واقعی بہت بے غیرت آدمی تھا جسے  
اپنی بیٹیوں کی عزت کا بھی خیال نہیں تھا اور میرا خیال ہے

بلار نے کوئی بات غلط نہیں کی تھی کیونکہ ٹھاکر بھی مجھے اس  
کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اس وقت ایک نیا  
دن طلوع ہو رہا تھا۔ لوگ رات بھر کے آرام کے بعد بیدار ہو  
کر ایک نئے دن کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے اور میں  
نیند کی لمبوں میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔

”میری آنکھ بارہ بجے سے پہلے نہیں کھل سکی تھی۔ میں  
بیدار ہونے کے بعد بھی دیر تک بستر پر اڑا بیٹھا رہا۔ سوچی  
میں خاموشی تھی۔ کسی طرف سے آواز سنائی نہیں دے رہی  
تھی۔ ٹھاکر بھی رات میں بجے کے لگ بھگ سو رہا تھا اور بلار  
بھی صبح پانچ بجے کے بعد ہی اپنے کمرے میں گئی تھیں۔ مجھے  
یقین تھا کہ وہ دونوں بھی ابھی تک سو رہے ہوں گے اور ملازم  
شاید باہر ان میں ہو گا کسی لیے حویلی میں خاموشی تھی۔

میں اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک ٹھنڈے  
پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جب میں کپڑے پن کر رہا  
تھا تو اسی وقت نارائن نامی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔

”آپ تیار ہو گئے سرکار۔ ناشتا لگا دوں؟“ اس نے  
پوچھا۔

”بلار اور ٹھاکر جاگ گئے یا ابھی سو رہے ہیں؟“ میں نے  
اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

”بلار جی سو رہی ہیں اور ٹھاکر جی تو سویرے سات بجے  
ہی چلے گئے تھے۔“ نارائن نے جواب دیا۔

”کہاں۔ ہوئی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی  
طرف دیکھا۔

”ہوئی نہیں سرکار۔“ نارائن بولا ”کسی نے چھوٹے  
سرکار کی ہتھ (جان لینا) کروی ہے۔ ٹھاکر جی وہاں گئے ہیں۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑا ”تمہارا مطلب ہے شام  
سندر؟“

”جی سرکار۔“ نارائن نے سر ہلا دیا۔ وہ جانے کب سے  
مضبک کے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے سیلاب کا  
بند ٹوٹ گیا اور آنسو بہنے لگا۔

”کس نے بتایا؟“ ڈاکٹر شام سندر کی۔ کون تھا وہ؟“ میں  
نے پوچھا۔ میرے داغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔  
ستینے میں غونا گونٹیں سننے لگی۔

”جی نہیں سرکار وہ کون سا دل تھا۔ ہو رانی پاروتی  
دیوی بھی بہت کمال (ذہنی) ہوئی ہیں۔ سنا ہے انہیں  
ہسپتال بھیجا دیا ہے۔“

میں چند لمبے نارائن کی صورت دیکھتا رہا پھر کمرے سے

نکل آیا۔ ہال ٹھاکرے میں بلار سے سامنا ہو گیا۔ اس کے جسم پر  
شب خوالی کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ ہال بکھرے ہوئے اور  
آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ ہوا تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی  
تھی اور غالباً اس وقت بھی اس کے داغ پر نیند کا بخار طاری  
تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پر نام (سلام) کیا اور  
مسکراتے ہوئے بولی۔

”کہاں چل دیے شرمیان جی سویرے سویرے۔“  
”اس وقت دوپہر ہو رہی ہے بلار۔“ میں نے کہا ”میں  
ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم ناشتا کرو۔“

میں وہاں رکے بغیر باہر آگیا۔ ٹھاکر کی جیب موجود تھی۔  
البتہ وہ کار غائب تھی جو رات کو میں نے پورنگیوں میں کھڑی  
دیکھی تھی۔ جیب کا اگلا ایک ٹائر پٹنا ہوا تھا۔ گزشتہ رات  
رامو وغیرہ نے ہمیں سستان سڑک پر روکنے کے لیے گولی چلا  
کر ٹائر برسٹ کر دیا تھا اور ان کے فرار کے بعد جب کو میں ہی  
چلا تا ہوا حویلی تک لایا تھا اور میرا خیال تھا کہ نیوٹ تو بالکل  
ختم ہو چکی ہوگی۔ اگرچہ جیب کے پچھلے حصے میں ایک فاضل  
ٹائر موجود تھا مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ٹائر تبدیل  
کر سکتا۔

گیٹ سے باہر نکلے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بلار  
برآمدے میں کھڑی ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ  
رہی تھی۔ میں گیٹ سے نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے ایک  
طرف چلنے لگا۔ اتفاق سے چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد  
ہی دائیں طرف کے موڑے ایک خالی ٹیکسی سامنے آگئی۔  
میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی رکوالی اور بڑی جلدت  
میں دو دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

”کہاں چلنا ہے حکم۔“ ڈرائیور نے سامنے لگے ہوئے  
آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا ”ٹیکسی کا میٹر ٹھیک نہیں ہے۔  
بھاؤ (کرایہ) کا آپ خیال رکھنا۔“

میرا داغ بھنا گیا۔ دینا بھر کے ٹیکسی ڈرائیور ایک جیسے  
ہی تھے یہ لوگ کبھی میٹر درست نہیں رکھتے کرایہ زیادہ  
وصول کرتے ہیں اور بخشش الگ سے طلب کرتے ہیں لیکن  
اس وقت میں میٹر اس سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔

”کہاں جانے کا ہے حکم؟“

ڈرائیور نے دوبارہ پوچھا تو میں چونک گیا۔ گزشتہ رات  
ڈاکٹر شام سندر کے بارے میں باتیں کرتے رہے ٹھاکر نے  
بتایا تھا کہ اس کا کلینک رام باغ میں ہے اور قریب ہی کسی  
بنگلے میں رہائش بھی ہے۔ رام باغ بہت بڑا علاقہ تھا اور مجھے  
کچھ اندازہ نہیں تھا کہ شام سندر کا بنگلا کس طرف ہوگا۔



”پولیس اسٹیشن۔“ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ آرام باغ کے علاقے کو جو تھانہ لگتا ہے وہاں چلو۔“ ڈرائیور نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ عمارت کے سامنے ٹیکسی رکتے ہی میں دروازہ کھول کر نیچے اترا اور ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہہ کر تیز تر قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ برآمدے میں سسٹم سنتری نے میرا راستہ روک لیا۔

”کس کو ملنے کا ہے شریمان جی؟“ اس نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”کوئی آفسر۔“ میں نے کہا ”وہ دراصل ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بھائی کی بیٹا ہو گئی ہے۔ ٹھاکر میرا مہتر ہے مگر مجھے اس کے بچکے کا پتا معلوم نہیں ہے۔ کوئی ایسا آدمی جو مجھے وہاں تک پہنچا سکے۔“

”اوہ۔“ سنتری نے ایک بار پھر مجھے گھورا ”ایک منٹ روکو۔ میں دیکھتا ہوں۔“

سنتری اندر چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد سنتری واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک سادہ پوش بھی تھا۔

”اس کو ساتھ لے جاؤ حکم۔“ سنتری نے کہا ”مگر میرا خیال ہے ڈیڈ باڈی کو اسپتال بھیج دیا گیا ہو گا۔“

میں اس آدمی کے ساتھ جا ہر آیا۔ میں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آدمی آگے والی سیٹ پر براجمان ہو گیا اور ڈرائیور کو رام باغ ہسپتال کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹیکسی حرکت میں آکر سڑکوں پر فرارے بھرنے لگی اور میں ڈاکٹر شام سندر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے کس نے قتل کیا تھا۔ اس کی بیوی پاروتی ابھی تک زندہ ہے یا وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔

ٹیکسی ایک جھپٹکے سے رکی تو میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔ اس جھپٹکے کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ گیٹ پر دو پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے کچھ لوگ اندر بھی نظر آ رہے تھے۔

سادہ پوش ساتھ ہونے کی وجہ سے گیٹ پر تعینات کانسٹیبلوں نے مجھے نہیں روکا۔ میں برآمدے میں پہنچا تو اندر کی رایداری میں دو کمرہ ہول کے اسٹنٹ نیچر بھارت بھوشن کو دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کا چہرہ رنج و ملال کی

سور بنا ہوا تھا۔

”ٹھاکر ماں ہے اور شام سندر۔“

”اسپتال۔“ بھارت بھوشن نے مجھے بات بوری کرنے کا موقع نہیں دیا ”ڈیڈ باڈی دو گھنٹے پہلے اسپتال پہنچ دی لیکن وہاں پاروتی بھائی کو بھی۔ وہ شدید ٹھاکر ہے۔ ٹھاکر بھی دین ہیں۔“

اسی دوران میں ایک سب انسپکٹر ہمارے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلب بورڈ تھا۔ جس پر لگے ہوئے کاندات پر وہ رپورٹ مرتب کر رہا تھا۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو بھارت بھوشن ہی نے بتایا کہ میں ٹھاکر بھانوت سنگھ کا قریبی دوست ہوں۔

سب انسپکٹر نے مجھ سے چند سوالات کیے۔ کچھ باتیں میں نے اس سے پوچھیں اور پھر وہ مجھے شام سندر کے بیڈ روم میں لے گیا۔ بیڈ روم کے دروازے کے سامنے رایداری کے فرش اور دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے اور جب میں اندر داخل ہوا تو میری روح تک کانپ اٹھی۔

ہر چیز الٹ پلٹ نظر آرہی تھی۔ ڈبل بیڈ کی سفید چادر خون میں بھیجی ہوئی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ کوئی چیز ایسی نظر نہیں آرہی تھی جس پر خون کے چھینٹے یا دھبے نہ ہوں۔ بیڈ سے ذرا ہٹ کر قالین پر بھی خون کا بہت بڑا دھبا تھا۔ لگتا تھا جیسے کچھ دھڑیلے میاں خون کا بہت بڑا تالاب تھا۔ دو قالین میں جذب ہو گیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر یہ بات کہی جاسکتی تھی۔ ”جیسے کسی کمرے کے گٹے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔“

میں نے زندگی میں بہت خون پینے دیکھا تھا لیکن نجائے کیا بات بھی کہ یہاں کی صورت حال دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میں باہر آیا اور برآمدے میں رک کر تازہ ہوا میں گھرے گھرے سانس لینے لگا۔

”کون سے اسپتال میں لے کر گئے ہیں؟“ میں نے بھارت بھوشن سے پوچھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔

”سوائے جے سنگھ اسپتال۔“ بھارت بھوشن نے بتایا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر میں اس کی پوری بات سننے بغیر تیز تر قدم اٹھاتا ہوا کوشی سے باہر آیا۔ اس مرتبہ وہ سادہ لباس والا میرے ساتھ نہیں تھا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اسپتال کا نام بتا دیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں ٹھاکر

کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر شام سندر سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اس کے ایک آدمی سے ملازم کا بیٹا تھا جسے اس کی ماں نے بالا تھا لیکن ٹھاکر کو شام سندر سے حقیقی بھائیوں جیسی محبت تھی۔ وہ بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ شام سندر کی موت پر ٹھاکر کا کیا حال ہو گا!

سوائے جے سنگھ اسپتال ہوٹل جے پور اشوک سے ذرا آگے سوائے جے پور ہائی ویے واقع تھا۔ بہت وسیع و عریض اور شان دار عمارت تھی۔ کئی بلاک تھے جو وسیع و عریض رنبے پر پھیلے ہوئے تھے۔

میں گیٹ پر میں نے ٹیکسی کو فارغ کر دیا۔ استقبال سے مجھے پتا چل گیا کہ پاروتی دیوی کو ابھی تک ایمرجنسی ہی میں رکھا ہوا ہے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کشادہ رایداری میں بیٹھ گیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاے شیخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ رینٹورنٹ اور ہوٹل کے منیجر اور اس کے چند دوست بھی وہاں جمع تھے۔ میری آواز پر ٹھاکر نے سر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ پہچانہ کرب کے آثار چہرے پر ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور میرے ساتھ لپٹ کر دھڑاں مار مار کر اس طرح رونے لگا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس کے دوست بھی بار بار اسے اپنے ساتھ لپٹا کر دلا سادے رہے تھے۔

ٹھاکر دیر تک مجھ سے لپٹا بیٹھیاں بھرتا رہا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کون تھے وہ لوگ؟ کس نے یہ ظلم ڈھایا ہے۔“ میں نے کہا ”شام سندر تو بہت معصوم تھا۔ وہ تو مسیحا تھا۔ دوسروں کو زندگی دینے والا۔ اس کی زندگی کس ظالم نے چھین لی۔“

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ٹھاکر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی ”اس کے شر کے اتنے ٹکڑے کدوں کا کہ کوئی گن نہیں سکے گا۔ اس کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دوں گا۔ ایسا انتقام لوں گا اپنے مٹا کا اپنے دنیا عبرت حاصل کرے گی۔“

”کون تھادے؟“ میں نے انجھی ہوئی ”انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پتا چلا۔ وہ کون ظالم تھا؟“

”راسو۔“ ٹھاکر کے منہ سے نکلا ”وہ میرے انتقام سے بچ نہیں سکے گا۔“ ”اوہ!“ میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں آنکھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ ہم اس وقت دوسرے لوگوں سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”صبح سات بجے مجھے پولیس نے ٹیلی فون پر اس ڈرگھٹنا (سامنے) کی اطلاع دی تھی۔ میں نے سوچا تمہیں بھی جگا کر ساتھ لے چلوں مگر پھر خیال آیا کہ تم ساری رات جاگتے رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور شام سندر کی کوشی پر پہنچ گیا۔“

”کو کوشی کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ اندر پولیس بھری ہوئی تھی۔ پڑوس کے بچگوں کے دو تین آدمی بھی موجود تھے۔ شام سندر کی لاش دیکھ کر میں وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پاروتی کی دشا (حالت) بھی بہت بری تھی۔ وہ بہت ٹھاکر تھی۔ میرے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پاروتی کو اسپتال بھیج دیا گیا تاکہ اس کا جیون (زندگی) بچایا جاسکے۔“

”شام سندر کے پڑوسی نے بتایا کہ صبح چھ بجے دودھ والے نے اسیں جگا کر بتایا کہ بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی دودھ لینے کے لیے باہر نہیں آ رہا۔ اس نے کڑی گڑ کا شہ ظاہر کیا تو پڑوسی دودھ والے کے ساتھ گیٹ پھاند کر اندر آیا۔“

”برآمدے والا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ شام سندر کو پکارتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور بیڈ روم کا منظر دیکھ کر کانپ اٹھے۔ بیڈ کے قریب قالین پر شام سندر کی زخموں سے چھوڑا لاش پڑی ہوئی تھی۔ پاروتی بھی اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ اس کا سر شام سندر کے پیروں پر تھا۔“

”پاروتی بھی بہت ٹھاکر تھی۔ پڑوسی پہلے تو یہ سمجھا کہ وہ بھی ختم ہو چکی ہے لیکن وہ زندہ تھی۔ ان دونوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پاروتی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹوں سے صرف ”راسو“ کا لفظ نکلا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔“

”پڑوسی نے اپنے جھپٹکے سے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے یہاں کی صورت حال دیکھ کر مجھے فون کر دیا اور میں فوراً ہی یہاں پہنچ گیا۔ آؤ۔ میں تمہیں دکھاؤں اس راتشن نے میرے بھائی کی کیا حالت کی ہے۔“

ٹھاکر مجھے لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر ایک مسٹر پولیس کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے ہمیں روکا نہیں۔

کمرے کی فضا برف خانے کی طرح سرد تھی۔ پیروں والے اسٹریچر پر ایک لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چادر اگرچہ سفید تھی لیکن اس پر خون کے اتنے دھبے تھے کہ سفید نہ ختم ہوتی لگ رہی تھی۔

ٹھاکر نے چادر ہٹا دی اور میں کانپ کر رہ گیا۔ شام

سندر کے جسم پر کوئی لباس وغیرہ نہیں تھا اور لاش پر اتنے زخم تھے کہ میرے لیے انہیں گناہگار نہیں تھا۔

ٹھاکر جبکہ اس کی پیشانی پر بوسے دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے الگ ہٹایا اور لاش کو چادر سے ڈھک دیا۔

میں ٹھاکر کو لے کر سرد خانے سے باہر آگیا۔ رابادری میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک دو جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے لیکن اس وقت مجھے یاد نہیں آسکا کہ وہ کون تھے اور میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔

ایک پولیس آفیسر ٹھاکر کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور درجہ اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا۔ میں دباو سے ٹپک لگائے کھڑا اور دھڑک رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آگیا۔ رابادری میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں شام سندر اور ٹھاکر کے دوست بھی تھے اور پاروتی کے رشتے دار بھی۔ اس کی ماں تو بار بار پچھاؤںس کھا رہی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور خواتین بھی تھیں لیکن جاگیا روپ متی دکھائی نہیں دیں۔

صبح سا آٹھ بجے شام سندر کے قتل کی اطلاع ملنے ہی ٹھاکر جوئی سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے تو اس خیال سے نہیں چٹایا تھا کہ میں رات بھر جاگتا تھا اور پھر شام سندر کی کوٹھی پر آنے کے بعد وہ اپنے کو پیشا تھا اور اس نے روپ متی کو اس درگھٹنا کی اطلاع نہیں دی تھی۔

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر نے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نظرس جمائے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف آگیا۔

بہت وسیع و عریض لابی تھی۔ اسے انتظار گاہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صوفے اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مناسب جگہوں پر کنکریٹ کے بڑے بڑے خوب صورت کتلے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں ایسے پودے لگے ہوئے تھے جو صرف سائے ہی نشوونما دیتے تھے۔

لے چوڑے استقبالیہ کاؤنٹر سے ذرا آگے ایک قطار میں چار ٹیلی فون بوٹھ تھے۔ ایک بوٹھ خالی تھا۔ ایک عورت اس طرف بڑھ رہی تھی۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا اس سے پہلے ہی بوٹھ میں گھس گیا۔ ریسپور اٹھا کر مطلوبہ نمبر ڈالے اور نمبر ملنے لگا۔

دوسری طرف سے کال روپ متی نے ریسپو کی تھی۔

میں اور دھڑک رہی باتوں سے یہ ٹوہ لینے کی کوشش کرتا رہا کہ انہیں اس رات کی اطلاع ملی تھی یا نہیں۔ ٹھاکر نے رات ہی کو فون پر اسے رامو سے مجھ کے بارے میں بتایا اور اس وقت روپ متی میری اور ٹھاکر کی خیریت دریافت رہی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر شام سندر کے قتل کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔

”ایک بری خبر ہے روپ متی۔“ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

”کو میں سن رہی ہوں۔“ روپ متی نے کہا ”لیکن بھگوان کے لیے کوئی ایسی خبر مت سنانا جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔“

”بات کچھ ایسی ہی ہے لیکن برداشت کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا اور پھر مناسب الفاظ میں اسے ڈاکٹر شام سندر کے قتل کے بارے میں بتانے لگا۔

روپ متی تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ مجھے جتنا معلوم تھا میں نے اسے بتا دیا اور پھر فون بند کر کے میں بوٹھ سے باہر آگیا۔

جب میں رابادری میں پہنچا تو پاروتی کو ایرجنی روم سے باہر لایا جا رہا تھا۔ وہ پیوں والے اسٹریچر پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا البتہ چہرے پر چادر نہیں تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ دو دروازے پر اسٹریچر کو کھیل رہے تھے اور ایک ٹرس نے خون کی وہ بول اور کر کے اٹھا رکھی تھی جس سے مشک ربر کی پتلی سی ٹکلی سے قطرہ قطرہ خون پاروتی کے جسم میں غفل ہو رہا تھا۔

اسٹریچر کو پاروتی کے رشتے داروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی ماں تو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور دو عورتوں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ پاروتی کے پتا رانا ایٹوری سنگھ، ٹھاکر کو سہارا دیے چل رہا تھا۔ ان دونوں کی حالت خاصی اہتر تھی۔

پاروتی کو ایک پرائیویٹ روم میں پہنچا دیا گیا۔ تقریباً آٹھ بجے بعد جب ڈاکٹر کمرے سے نکلا تو رانا ایٹوری سنگھ اور ٹھاکر کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”مریض اب خطرے سے باہر ہے۔ تھوٹھ کی کوئی بات نہیں۔ اسے شام تک ہوش آجائے گا۔“

رانا اور ٹھاکر کمرے میں چلے گئے۔ میں باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جاگیا اور روپ متی بھی پہنچ گئیں۔ روپ متی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ یہاں میں نے ہر

غصے کی آنکھوں کو اشک بار دیکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ ڈاکٹر شام سندر کو بھی کتنا چاہتے تھے۔ جاگیا اور روپ متی کمرے میں چلی گئیں۔ دو مسٹر پولیس کا نشیمل بھی دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ دن ہم نے اسپتال ہی میں گزارا۔ ٹھاکر صبح سات بجے اطلاع پاکر جوئی سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے چائے تک نہیں پی تھی اور میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا یا تھا۔ چار بجے کے قریب میں نے اور روپ متی نے زبردستی اسے تھوڑا بہت کھلا دیا۔ میں نے بھی ایک سینڈویچ لے لیا تھا۔

رات آٹھ بجے کے قریب پاروتی کو ہوش آگیا۔ پولیس آفیسر اس وقت اسپتال ہی میں موجود تھا۔ وہ ڈاکٹر کی اجازت پا کر پاروتی کا بیان لینے کے لیے آگیا۔

قانون لوگوں کو کمرے سے نکال دیا گیا۔ رانا ایٹوری سنگھ، ٹھاکر اور میرے علاوہ ڈاکٹر اور دو پولیس آفیسر تھے۔ پاروتی کو اگرچہ کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا بچہ اب اس سنسار (دنیا) میں نہیں رہا لیکن کھانٹا ہو کر بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے جو کچھ دیکھا ہوگا اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا ساگ اجڑ چکا ہے۔

بچکیوں آنسوؤں اور آہوں کے بیچ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے اپنا بیان مکمل کیا۔

پاروتی کے بیان کے مطابق وہ دونوں اپنے بندہ روم میں سو رہے تھے کہ صبح ساڑھے چار بجے کے قریب کوئی آہٹ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ڈاکٹر شام سندر کو جگایا۔ لاؤنج کی طرف سے دو بارہ آہٹ سنائی دی تو شام سندر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ شام سندر کی چیخ سن کر وہ اچھل پڑی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلی لیکن شام سندر دروازے ہی میں اس سے ٹکرا گیا۔ وہ زخمی تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

پاروتی ایک دم بدحواس ہو گئی۔ وہ بچی (شوہر) کو سہارا دینا چاہتی تھی کہ وہ آؤدی کمرے میں گھس آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ان میں ایک کے لیے قد کا ٹکڑا تھا۔ اس کی ناک پر بیڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے پاروتی کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور شام سندر پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ پاروتی اسے بچانے کے لیے پہلی۔ اس مرتبہ دوسرے آؤدی نے اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

زخمی ناک والا شام سندر پر پے در پے خنجر کے وار

کر رہا تھا اور وہ اسے بچانے کے لیے بار بار لپک رہی تھی۔ اس طرح وہ کئی بار خود بھی خنجر کی زد میں آئی۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ اپنے بچی کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔

زخمی ناک والے نے اس بار براہ راست پاروتی پر خنجر سے وار کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہاری اور ڈاکٹر کی لاشیں دیکھ کر ٹھاکر کو پتا چل جائے گا کہ رامو سے کتنے بازی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آئندہ وہ رامو کا راستہ کانٹے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

وہ دونوں پے در پے خنجروں سے شام سندر پر وار کرتے رہے اور پاروتی اسے بچانے کے لیے بار بار لپکتی رہی اور بالآخر وہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑی۔

”میں شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔“ اس نے بتایا ”پتا نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آگیا۔ اس وقت ہمارا بڑا ہی پریم چند میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا یہ سب کیسے ہوا۔ وہ کون لوگ تھے۔ اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے منہ سے صرف رامو کا نام نکل سکا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔“

پاروتی کے اس بیان سے تصدیق ہو گئی کہ ڈاکٹر شام سندر کا قاتل رامو ہی تھا۔ وہ دو مرتبہ ہمارے ہاتھوں بزمیت اٹھا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ مجھ سے اس وقت پتا تھا جب اس نے مجھے اور سونیا کو ویران سڑک پر روکا تھا اور دوسری مرتبہ گزشتہ رات جب اس نے مجھے اور ٹھاکر کو سیکرٹریٹ کے عقب میں سنسان سڑک پر روک کر ہمیں کچھ سبق سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن خود ہی گدھے کی طرح مار کھا کر بھاگ نکلا تھا۔

بلونت سنگھ انتقام تو مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے متعصب پنڈتوں اور پجاریوں کو میرے اور روپ متی کے پیچھے لگایا۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے رامو جیسے غنڈے کی خدمات حاصل کیں۔ رامو کو اپنی طاقت پر بہت سمجھند تھا۔ وہ اس شر کا بہت بڑا بدعاش تھا۔ آٹھ قتل اس کے کھاتے میں تھے۔ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں قتل جیسی سنگین وارداتیں کر کے بھی وہ قانون کی زد سے بچا ہوا تھا۔ شر میں اس کے نام کی دہشت تھی۔ اسے سمجھند تھا کہ کوئی اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا اور یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اسے دو مرتبہ بزمیت اٹھانی پڑی تھی۔

رامو مجھے اغوا کر کے بلونت سنگھ کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن دونوں مرتبہ اپنی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ ٹھاکر

بھانوت سنگھ کو میری پشت پر پا کر وہ جھنجھلا گیا تھا اور اس جھنجھلاہٹ میں اس نے شام سندر کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ یقیناً باروٹی کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ باروٹی کے اس بیان سے اس کے اس گھٹاؤ نے عزائم کی تصدیق بھی ہوئی تھی اور وہ غالباً باروٹی کو مرہو سمجھ کر ہی چھوڑ گیا تھا۔ باروٹی کے جسم پر بھی خنجروں کے اتنے گھاؤ لگے تھے کہ اس کے زندہ بچ جانے کی امید کی بھی نہیں جاسکتی تھی لیکن وہ بڑی خوش قسمت ثابت ہوئی تھی۔ اتنا زیادہ خون بہہ جانے کے باوجود وہ بچ ہی گئی تھی۔

ایک جگہ رک گیا۔ ہمارے ساتھ دھوکا بھی ہو سکتا تھا لیکن ہم پوری طرح محتاط تھے۔ وہ بہت پرانی سی عمارت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی کھولیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کھولی کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہو کر بتی جلانی اور ہمارے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

”میں اس علاقے کی پولیس کے ایک ایک منٹ کو جانتا ہوں۔“ وہ ہم دونوں کو پیچھے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولا ”تم دونوں پولیس والے تو نہیں ہو سکتے۔ سی بی آئی سے ہو یا سی آئی ڈی سے؟“

”ہمارا تعلق نہ تو پولیس سے ہے نہ سی آئی ڈی اور نہ سی بی آئی سے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”لیکن کیا تم یہی کہنے کے لیے ہمیں یہاں لائے تھے؟“

”سے (دقت) بڑا ناک جا رہا ہے مہاراج۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”میں کی چتا دور کر لیتا ضروری ہے۔ ویسے تم لوگ رامو کو تلاش کیوں کر رہے ہو؟“

”اس سے ایک کام لینا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا میں وہ کام نہیں کر سکتا۔“ بھگت کا بھی علاقے میں بڑا ٹھکانا ہے۔“ اس نے کہا۔

”دو آدمیوں کو قتل کر سکتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”نہ۔ نہ سرکار۔“ وہ جلدی سے بولا ”اپن تو جھوٹے چھوٹے کام کرنے کا ہے۔ کسی کی پٹائی کرنی ہے۔ کسی کو اٹھانا ہے۔ کوئی لونڈیا چاہیے۔ بس سرکار۔ قتل جیسے کام میں اپن ہاتھ نہیں ڈالتا۔ ویسے۔“ وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا ”ویسے اگر رامو مل بھی گیا تو وہ بھی ہمارا کام نہیں کرے گا۔ آج کل اس کا ستارہ بھی گردش میں ہے اور وہ چوہے کی طرح کسی تل میں گھسا ہوا ہے۔“

”کیوں۔ کیا وہ اتنا ہی بزدل ہے۔“ میں نے کہا ”ہم نے تو سنا ہے کہ وہ بڑا جگر آوی ہے۔ پر ہجوم بازار میں کسی کو موت کے گھاٹ اتار دے تو پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔“

”پلے ایسا ہی تھا۔ پر تواب اس کا سے بدل گیا ہے۔“ بھگت نے کہا ”اس نے ایک غلط آدمی پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے بھائی کا قتل کر دیا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شہر کا بہت بڑا اور عزت والا آدمی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ہتھیار کا بدلہ لینے کے لیے بیاکل ہوا پھر رہا ہے۔ پر تم لوگ کس دنیا میں رہتے ہو۔“

کیا تمہیں یہ سب کچھ معلوم نہیں۔ پورے شہر کی پولیس رامو کو کھوجتی پھر رہی ہے۔“

”ہمیں واقعی معلوم نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہم لوگ بیکار سے آئے ہیں لیکن کیا تم ٹھاکر بھانوت سنگھ کو جانتے ہو؟“

”وہ مہاراش (بڑا آدمی) ہے۔“ بھگت نے جواب دیا ”اپن نے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ پر اس کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ اپن کا ایسا نصیب کہاں کہ اس جیسے مہمان دیوتا کے درشن کر سکیں۔ پر مہاراج۔“ وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا ”تم لوگ اپنا سے بڑا نہ کرو۔ میری بات تو بیکارہ واپس چلے جاؤ۔ پولیس رامو کا کھوج نہیں لگا سکی، تم کیا کرو گے۔ اپنے کام کے لیے بیکار ہی میں کسی کو تلاش کرلو۔“

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک سی ابھر آئی تھی اور میں بھی دلی ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ بھگت ایک بد معاش ضرور تھا لیکن اس کے دل میں کھوت نہیں تھا اور پھر ٹھاکر کے بارے میں بھی اس کے خیالات بہت اچھے تھے۔ وہ ہمارے کام آ سکتا تھا۔

”بھگت۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”اگر میں یہ کہوں کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کو رامو کی تلاش ہے تو کیا تم ہماری کچھ مدد کرو گے؟“

”ٹھاکر کو اپن دیکھا نہیں ہوں۔ نظریں بہت سنی ہیں۔ پر تو اپنا نصیب کہاں کہ اس مہاراش کی کوئی سیوا (خدمت) کر سکوں۔ اپن تو بہت تھوڑا کلاس آدمی ہوں۔ جس بچ کر اور گالم گلوچ کر کے ایک وقت پیٹ بھر کے روٹی کھاتا ہوں۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ۔ کہاں وہ مہمان ہستی اور کہاں بھگتا دھوئی۔ وہ کیا کہتے ہیں مہاراج۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیل۔“

”راجا بھوج تمہارے سامنے ہے۔“ میں نے کہا ”ٹھاکر بھانوت سنگھ اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے اور یہ تمہارے نصیب ہیں کہ یہ خود چل کر تمہارے پاس آئے ہیں۔“

”کیا۔۔۔! بھگت اچھل پڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹھاکر کو دیکھنے لگا پھر اس نے دیوار میں بنی ہوئی ہنسی الماری کے نکرے کے سلیب پر رکھے ہوئے چند کپڑے اٹھا کر جھٹکا سی چار پائی پر پینک بک ویلے اور سلیب پر بچھا ہوا ہندی کا اخبار اٹھالیا۔

یہ اخبار کئی مہینے پرانا تھا اور صفحہ اول پر ٹھاکر بھانوت سنگھ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ ایک مندر کے سامنے

غریبوں میں کپڑے بانٹ رہا تھا۔ یہ تصویر اس کی ماتمی ن برسی کے موقع پر چھپی گئی تھی۔ بھگت بھی تصویر کو دیکھتا بھی سامنے کھڑے ہوئے۔ ر کو اور پھر اس نے بڑی تیزی سے جھک کر ٹھاکر کے چن (قدم) چھوئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرے بھگت۔“ وہ بولا ”کیا سیوا کروں مہاراج۔ چائے پھنڈا۔“ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا جیسے کوئی دیوتا آکا ش سے اتر کر اس کے سامنے آ گیا ہو۔

”رامو کی تلاش کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکو تو یہی تمہاری بہت بڑی سیوا ہوگی بلکہ ہم بہت بڑا احسان ہوگا۔“ مجھے شرمندہ مت سمجھئے مہاراج۔“ بھگت بولا ”رامو نے آپ کے بھائی کی ہتھیار کر کے آپ کا بہت ایمان (بے عزتی) کیا ہے۔ پر تو آپ تراش (دکھی) نہ ہوں۔ آپ کا یہ سیوک (خدمت کار) موجود ہے مہاراج۔ وہ بد معاش جہاں کہیں بھی ہے اسے کھوج کر آپ کے چروں پر ڈال دے گا۔ آپ بیٹھے نا۔“ اس نے جلدی سے کمرے میں موجود واحد سا فوروہ سی کرسی صاف کی۔ بستر کی چادر بھاڑ کر پھیلائی اور ہم سے ایک بار پھر بیٹھنے کی درخواست کی۔

ہم دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ٹھاکر کو کرسی پر بیٹھ گیا اور میں چار پائی کی کچی پر ٹک گیا اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا، بھگت دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ ٹھمبر اپ (THUMBS-UP) کی ٹھنڈی بو تھلیں لے کر آیا تھا۔ اس نے بو تھلیں کھول کر اسٹرا لگائے اور بو تھلیں ہماری طرف بڑھا دیں۔

”میں جات کا دھوئی ہو سرکار۔“ وہ بولا ”پر تو سنا ہے آپ ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ یہ آپ کی ممانتا ہے۔“

”میں ایسی باتوں پر واقعی دھیان نہیں دیتا بھگت۔“ ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے بوٹ لے لی۔

دوسری بوٹ میں نے لے لی۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو مجھ سے پہلے ٹھاکر بول اٹھا۔

”یہ بہت سنگھ ہے۔ میرا احترام۔“

”اودھ۔ بہت سنگھ!“ بھگت کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ”آپ کے ناؤں کا بھی بڑا چاہے مہاراج۔ آج تو واقعی میرے بھگت جاگ اٹھے ہیں۔“

بھگت تو ہمارے آنے سے خوش تھا ہی، میں بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ہم ٹھیک آدمی کے پاس پہنچے تھے۔

میں کولہ ڈرک کی چسکیاں لیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ کمرہ دس بالی دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دیواریں کالی ہو رہی تھیں اور پلستر جگہ جگہ سے اودھڑا ہوا تھا۔ فرش انڈین کا تھا اور یہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک دیوار میں تو دیو ہنسی الماری تھی جس میں نکرے کے تین سلیب لگے ہوئے تھے۔ ایک خانے میں کپڑے تھے۔ دوسرے خانے میں کنگھا، چینی کی تیل کی بوتل، ایک چٹا ہوا آئینہ اور اسی قسم کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر والے خانے میں کالی کی مورتی بھی رکھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر کھونٹیوں پر چند میلے کپڑے لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دیواروں پر کئی کا کٹر، ہتھیار، سری دیوی اور دیگر قلم ایکٹریکٹوں کی نیم عریں رنگین تصاویر چپاں تھیں۔ یہ تصویریں اخباروں اور رسالوں سے کاٹ کر یہاں چپائی گئی تھیں۔

بھگت کو غائب کر کے کی صفائی کا کوئی دھیان نہیں تھا۔ فرش پر اودھ اور سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کمرے میں کچھ ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا اور یہ دروازہ غالباً عمارت کے کپاؤڈ میں کھلتا تھا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بھگت کا دھندا کچھ ٹھیک نہیں چل رہا تھا اور غالباً اس نے یہ بات بھی ٹھیک ہی کہی تھی کہ وہ اسے علاقے میں تھوڑی بہت بد معاشی دکھا کر روٹی کا بندوبست کر لیا کرتا تھا۔

”ہاں تو بھگت۔“ میں نے خالی بوتل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ”تم رامو کی تلاش میں ہماری کیا سہانتا (مدد) کر سکتے ہو؟“

”سیدھے سیدھے رامو کو تلاش کرنا تو بڑا کٹھن ہے مہاراج ہے۔“ اس نے جواب دیا ”اس کے قریب کے آدمی بھی روپوش ہو چکے ہیں۔ پر میں ایک ایسے بندے کو جانتا ہوں جو ہمیں اس کا پتا بتا سکتا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ مجھ سے پہلے ٹھاکر نے سوال کر ڈالا۔

”کرن ناؤں (نام) ہے اس کا۔“ بھگت نے جواب دیا ”وہ رام گنج بازار میں رہتا ہے۔“

”کیا تم ابھی ہمیں اس کے پاس لے جاسکتے ہو؟“ ٹھاکر نے کہا۔

”دھیرج مہاراج۔ بیاکل نہ ہوں۔“ بھگت نے کہا ”وہ بہت چھل کپٹ (عیار) آدمی ہے۔ تم دونوں کو میرے ساتھ دیکھ کر ترنت (فورا) سمجھ جائے گا کہ کوئی گڑباز (ضرور)

ہے اور ہو سکتا ہے وہ آپ کو جانتا بھی ہو۔" اس نے ٹھاکری طرف اشارہ کیا "میں آج ہی جا کر پتا کرتا ہوں کہ وہ اپنے ٹھکانے پر ہے بھی یا نہیں۔ ہم کل رات کو اس پر چھاپا ڈالیں گے۔"

ٹھاکر کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"بھگت ٹھیک کتا ہے" میں نے کہا "جلد بازی میں کام چل سکتا ہے۔ ایک امید پیدا ہوئی ہے اگر کرن کو شہ ہو گیا تو وہ بھی روپوش ہو جائے گا۔ بہتر ہو گا کہ پوری جانکاری ملنے کے بعد ہم اگلا قدم اٹھائیں۔"

"میری بھی یہی رائے ہے ٹھاکر جی۔" بھگت نے پہلے مرتبہ اسے ٹھاکر کہہ کر مخاطب کیا "میں آج رات کرن کے بارے میں پوری جانکاری پر اپنا (حاصل) کر لوں گا۔ کل اسی سے آپ یہاں آجائیں۔"

"ہم یہاں نہیں آئیں گے۔" ٹھاکر نے کہا "تم میرے ہوٹل آجانا۔ وکرم ہوٹل۔ اسٹیشن روڈ پر ہے۔ دیکھا ہے نا؟"

"نہیں" ٹھاکر نے کہا "بھگت بولا "ہاں ہاں۔ ہم چھ لوگ اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔"

"کل ہمیں کوئی نہیں روکے گا۔" ٹھاکر بولا "رات دس بجے آجانا۔ ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

ٹھاکر نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ میں نے جب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈی میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر بھگت کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پیسے کے لالچ میں ہی ہمیں کچھ معلومات فراہم کرنے پر تیار ہوا تھا لیکن اس وقت اس نے پانچ سو روپے کا نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"نہیں مہاراج۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا "میں آپ کا سیوک ہوں ٹھاکر جی۔ یہ تمہارا ادیکار (حق) ہے۔ رکھ لو۔" ٹھاکر نے نرمی سے کہا۔

وہ پھر بھی پیسے لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

"ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا "تم چند منٹ بیس روپے ہمارے بعد گھولی سے نکلتا تاکہ کوئی تمہیں ہمارے ساتھ نہ دیکھ سکے۔"

"جو گیا (گم) سرکار۔" بھگت نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

ہم تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے بازار میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری جپ کھڑی تھی۔ اس وقت ساڑھے

گیارہ بج رہے تھے لیکن بازار کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ ٹھاکر ہی نے سنبھالی تھی۔ ہم اجیری گیٹ سے نکل کر ایم آئی روڈ پر آگئے۔ میرا خیال تھا کہ ٹھاکر اپنے ہوٹل یا بھوانی سنگھ مارگ والی حویلی کی طرف جائے گا مگر اس نے جپ کا رخ آگرہ مارگ کی طرف موڑا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم نیلے والی حویلی میں پہنچ گئے۔ جاگی وغیرہ جاگ رہی تھیں۔ وہ تینوں روپ متی والے کمرے میں بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ میں کمرے میں جھانک کر واپس آیا اور وہ بھی کمرے سے نکل کر ہال میں آگئیں۔

"کچھ کامیابی ہوئی؟" روپ متی نے صوفے پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک سراغ تو ملا ہے۔" میں نے گہرا سانس لینے ہوئے جواب دیا "لیکن صحیح صورت حال کل رات کو سامنے آئے گی۔"

"کیا مطلب؟" روپ متی نے مجھے گھورا۔

"مطلب یہ کہ ایک آدمی کا پتا چلا ہے جو رامو کی تلاش میں ہماری سہاگت کرنے کو تیار ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے بھگت سے ملاقات کی تفصیل بتانے لگا۔ جاگی اور بھلا بھی فور سے ہماری باتیں سن رہی تھیں "کل ہم کرن کو تلاش کریں گے اور مجھے امید ہے کہ ہم کل ہی رامو کی گردن پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"تم لوگ باتیں کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں تو چلا۔"

ٹھاکر یہ کہتے ہوئے ایک جھگٹے سے اٹھ گیا۔

میں سمجھاؤہ دوسری حویلی جانے کی بات کر رہا ہے لیکن اسے اپنے بند روم کی طرف جاتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ٹھاکر کے جانے کے بعد وہ تینوں بھی پھیل کر بیٹھ گئیں۔ میں صوفے پر کچھ بے آرامی سی محسوس کر رہا تھا اس لیے قالین پر بیٹھ کر ٹانگیں آگے پھیلا کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔ وہ تینوں بھی قالین پر آگئیں۔

"مندری۔" روپ متی نے مندری کو آواز دی "چائے بنا کر لاؤ۔ اندر بسجا (راجا اندر کی محفل) جی ہے۔"

جاگی میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ روپ متی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ اندر بسجا ہی تھی۔ میں راجا اندر بنا بیٹھا تھا اور دنیا کی تین حسین ترین عورتیں میرے سامنے بیٹھی تھیں

لیکن میں راجا اندر ہوتے ہوئے بھی راجا اندر نہیں تھا۔ میری فطرت اس سے بہت مختلف تھی۔ میں عیاش نہیں تھا۔ زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آئے تھے۔ کئی حسین لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں اور ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح نکل جاتی تھیں۔ میں نے کسی کی طرف ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا جو میرے دل میں ہوس کی نشان دہی کرتی ہوں۔ ایک مرتبہ۔ صرف ایک مرتبہ میں ہکا تھا۔ مجھے گولڈن ٹرائی، ہنگل کے اس غار میں سونیا کے ساتھ گزرنے والی وہ رات اب بھی یاد تھی جب سونیا نے مجھے زیر کر لیا تھا اور میں آج تک اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ جاگی کئی برسوں سے میرے ساتھ تھی۔ کئی مرتبہ اس نے مجھے گھبرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے حسن کے چمکدار دکھائے تھے مگر میں ہر مرتبہ اپنے آپ کو بچاتا رہا تھا اور اب تو وہ مجھے اکثر سادھو کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

یہاں روپ متی بھی تھی۔ اس نے بھی اس بھڑا کو سر کرنے کی کوشش کی تھی مگر متلاخ چٹانوں سے سر ٹکرا کر رہ گئی تھی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی یہ وہی روپ متی تھی جو گیارہ لاکھ کی آبادی والے اس گلابی شہر میں ٹیکس کی دیوی کے نام سے مشہور تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اتار کر لیا تھا کہ ہوٹلوں کے وینڈر اور سڑک چھاپ ٹھونڈ غنڈے بھی اس کے حسن و شباب سے فیض یاب ہونے کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک راج کمار کی ہے۔ اس کا مطلب ایک عزت دار اور معزز گھرانے سے ہے۔

مجھے بھی وہ غلاموں کی منڈی سے اسی لیے خرید کر لائی تھی کہ مجھ سے اپنی ہوس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر سکے۔ اس مقصد کے لیے روایتی حیلوں میں ناکام ہونے کے بعد اس نے نشہ آور مشروب (سوم رس) پلا کر مجھے زیر کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی تھی اور اپنی اس غلطی کا خمیازہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا تھا کہ اس کے دشمنوں کو دار کرنے کا موقع مل گیا۔

مجھے وہ رات بھی یاد تھی جب شراب کے نشے میں مدہوش روپ متی نے ایک بار پھر مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی اور اس رات اس کے رخسار پر پڑنے والا میرا چھڑی اسے ہوش میں لے آیا تھا اور یہ وہی روپ متی تھی جو پہلے میری آتما تھی اور اب میری غلام بن گئی تھی۔

میں نے اسے ذلت و رسوائی کی دلدل سے نکالا تھا اور اس کے لیے تو اس کا پرانا دوست ٹھاکر بھارت سنگھ بھی میرا شکر گزار تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی طرف سے مایوس ہو چکا

تھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اور اس کے بعد حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے گئے کہ ہم ملاخوئی قوتوں کے پکڑ میں پھنس کر رہ گئے اور ان باطل قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم ایک انڈی بن گئے تھے۔

میری وجہ سے یہاں قتل و غارت شروع ہوئی تھی۔ روپ متی کے اور ٹھاکر کے نئے نئے دشمن پیدا ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کا منہ بولا بھائی ڈاکٹر شیا م سندر جو اسے سگے بھائی کی طرح پیارا تھا، بے دردی سے مارا گیا تھا۔

میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو بہت سی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ وہ چہرے میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جنہوں نے میری خاطر اپنی جائیں قربان کر دیں۔ تھائی وانگ، چاچا پر تاب سنگھ، ماسٹر چھوٹ، ٹانگ، رامن برسا، پامیلا، ماسٹر چھوٹھانگ اور شجائے کون کون۔ کس کس کو یاد کروں۔ کس کس کا نام لے کر آنسو بہاؤں۔

ممکن ہے میری اس سرگزشت کے کچھ حصے بعض بڑھنے والوں کو کراں گزریں لیکن جن لوگوں نے میری طرح مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ دکھ، بے بسی ہیں۔ مجھ جیسے ناگفتہ بہ حالات کا شکار رہے ہیں انہیں میرے درد اور کرب کا احساس ضرور ہوگا۔

میرا درد، میری ذات کا دکھ، میرا کرب۔ میری گردنیں اور میرے مصائب ایسے نہیں کہ کوئی عام آدمی اس کا تصور بھی کر سکے۔ ایک کے بعد ایک حادثہ، یکے بعد دیگرے امتحان اور آزمائشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ میرے اندر شکست و ریخت کے یہ مرحلے، اہل دل ہی انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ میری یہ داستان بڑھ کر انہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکلے ہوں گے جو کبھی خود ایسے الم ناک حادثات سے دوچار رہ چکے ہوں۔

گیارہ بارہ سال کا ایک معصوم بچہ جس کی نظروں کے سامنے اس کے ماں باپ کو بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ وہ ان قاتلوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے چھپتا پھرا، بھاگتا رہا۔ جس نے بھی اسے پناہ دی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آج وہی بچہ جوان ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں۔ اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھولنا بھی چاہا تو نہیں بھولے دیا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے ایک نیا زخم لگا رہا جاتا پھر وہ اپنے ماضی کو کیسے بھولتا۔ اس کے سینے میں انتقام کا لالہ اگھول رہا جو بالآخر آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا۔ اب اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ انتقام! اپنے ماں باپ کا اپنے ان ہمدردوں اور پیاروں کا

انتقام جنوں نے صرف اور صرف اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔

میں اس وقت بے قول روپ متی کے اندر سمجھا میں بیٹھا تھا مگر یہ باتیں نبھانے مجھے کیسے یاد آگئی تھیں۔ میرے دماغ میں لاڈا سا یک رہا تھا۔

”کہاں کھو گئے سادھو مہاراج!“

جاگتی کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ اس نے مجھے پکارنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ میرا پیر بھی پکڑ کر زور سے ہلا دیا تھا۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔

ہمارے بیچ قالین پر چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ مندری بھی قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور وہ چاروں مجھے اس طرح گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے میرا چہرہ بدل گیا ہو اور پھر غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ اپنے چہرے پر پھینک گیا۔

”کیا ہوا۔ تم ایک دم سے اتنا پریشان کیوں ہو گئے ہو؟“ جاگتی اٹھ کر میرے قریب آئی۔ ظاہر ہے میرا سب سے زیادہ درد دہی محسوس کر سکتی تھی۔

”اوہ! کچھ نہیں۔“ میں سنہل کر بیٹھ گیا۔ ”ایسے ہی کچھ برائی باتیں یاد آگئی تھیں۔“ میں نے جینپ مٹانے کے لیے گما اور اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھالیا۔

جاگتی چند لمبے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر دوبارہ اپنی جگہ پر چلی گئی۔ روپ متی وغیرہ کی موجودگی میں وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

چند لمبے فضا کچھ اداس سی رہی یا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا لیکن روپ متی کے ایک پٹکنے نے یہ اداسی دور کر دی اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو میں بھی بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے مجھ پر کس قدر غلبت طاری تھی۔

اگلے روز میں صبح دیر تک سویا رہا اور جب بیدار ہوا تو میرے آس پاس کوئی نہیں تھا حالانکہ جاگتی اور روپ متی وغیرہ بھی رات کے آخری پروہیں قالین پر آڑی ترچھی ہو کر سو گئی تھیں۔

میں اٹھ کر اپنے بندہ روم میں آ گیا اور دروازے میں قدم رکھتے ہی ٹھنک کر گر گیا۔ بلا میرے بندہ پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کا لباس سنا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرے قدم بے اختیار اس کی طرف اٹھنے لگے۔

اس وقت شاید میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میرے حواس میرے بس میں نہیں تھے۔ میں بیڈ کے قریب کھڑا چند لمبے بلا کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس پر ہنسنے لگا۔

شاید وہ میرے بے ربط سانسوں کا لمس تھا کہ بلا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر کچھ ٹھول رہی تھیں۔ آنکھوں میں غماز بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آگئی اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور اس سے پہلے کہ میں پشروی سے اتر جاتا، ٹھٹکتے ہوئے نفرتی قسموں کی آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔

جاگتی اور روپ متی کے قسموں کی یہ آواز ہال کی طرف سے آئی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ہاتھ روم میں گھس گیا۔

میرا دماغ بری طرح سلگ رہا تھا۔ سینے میں بھی جیسے انگارے سے بھر گئے تھے۔ میں نے کپڑے جیسے اپنے جسم سے نوج کر پھینک دیے اور شاور کھول دیا اور پھر اسی وقت کمرے سے روپ متی کے پینے کی آواز سنائی دی۔ روپ متی اور جاگتی کمرے میں آگئی تھیں۔

میں دیر تک شاور سے برسی ہوئی ٹھنڈے پانی کی پھوار کے نیچے کھڑا سوچتا رہا کہ مجھ سے یہ حماقت کیوں سرزد ہونے جا رہی تھی۔ میں بلا کو دیکھ کر اتنا بے قابو کیوں ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار کیوں نہیں رہا تھا۔ بلا نے مجھے اپنے اوپر ہنسنے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔

ہاتھ روم کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی روپ متی کی آواز سنائی دی۔ ”شرمان جی۔ اب جلدی سے باہر آ جاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

میں کچھ دیر اور شاور کے نیچے کھڑا رہا پھر توبے سے رگڑ کر اپنا بدن خشک کیا اور کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند لمبے وہیں کھڑا رہا پھر باہر آ گیا۔

وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مندری نے مجھے کچن کی کھڑکی سے دیکھا اور اس کے دو تین منٹ بعد میرے پاس ناشتا لگا دیا۔ بلا میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر

بڑی شوخی مسکراہٹ تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے مکرر کرتا رہا۔

اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ تینوں بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور میں اٹھ کر لالان میں آ گیا۔ آسان پر بادل تھے اور موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔

میں ڈائننگ روم کے قتل کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ رامو دو مرتبہ مجھ سے جٹ چکا تھا۔ اپنے آپ کو بہت بڑا بد معاش سمجھتا تھا۔ اس کے نام کی دہشت تھی۔ آج تک شاید کسی نے اس کے سامنے نظریں اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کی تھی۔ وہ لوگوں کو اپنے قدموں پر جھکا دیکھنے کا عادی تھا لیکن۔ میں شاید پہلا شخص تھا جس نے اسے اپنے قدموں پر جھکا کر زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ بری طرح جھجکا گیا تھا۔

رامو شاید یہ سمجھتا تھا کہ مجھے شاکر کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ دوبارہ شاکر سے ٹکرانے کی ہمت تو نہیں کر سکا تھا تاہم جھجکاہٹ میں اس نے معصوم اور بے گناہ ڈائننگ روم کے سندر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ تو پاروئی کو بھی مار ڈالنا چاہتا تھا مگر وہ خوش قسمتی سے بچ گئی تھی۔

رامو نے شاید یہ سوچا ہو گا کہ شام سندر کے قتل کے بعد شاکر میری پشت سے ہاتھ ہٹائے گا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ شاکر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ اس معاملے کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس کی پشت پر بھی راجستھان کے کئی سابق راجے مہاراجے اور دیگر کئی اعلیٰ شخصیات تھیں۔ انہی کے دباؤ سے انتظامیہ کی پوری مشینری حرکت میں آگئی تھی اور شر بھری پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپے مارنا شروع کر دیے تھے۔ اس کے کئی گروگوں کو پکڑ کر سلاخوں کے نیچے بند کر دیا گیا تھا۔

دوسری طرف شاکر بھی زخمی شریک طرح بھرا ہوا تھا۔ میری طرح اس کے سینے میں بھی بدلے کا لاوا اکھول رہا تھا۔

سانا کی تھا کہ رامو پہلے سرعام قتل جیسی سنگین وارداتیں کرنے کے بعد بھی آزادی سے زندہ نا پھرنا تھا لیکن شاید یہ سلا موق تھا کہ وہ اس طرح بھاگا پھر رہا تھا اور اسے چھیننے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

میں اس صورت حال پر غور کرتا رہا اور پھر میری ذہنی رو بک گئی۔ اب میں بلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری زندگی میں کئی حسین لڑکیاں آئی تھیں مگر میں نے کسی کے لیے دل میں کدک محسوس نہیں کی تھی۔ کسی کے لیے دل اتنا مضطرب اور بے چین نہیں ہوا تھا۔ جاگتی اور روپ متی بھی

لاکھوں میں ایک تھیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر گھرے سانس بھرتے تھے۔ وہ دونوں مجھے عزیز تھیں۔ ان دونوں کے لیے میرے سینے میں تڑپ بھی مگر وہ بات نہیں سمجھی کہ میں انہیں دیکھ کر سڑک چھاپ عاشقوں کی طرح گھرے سانس بھرتا رہتا لیکن نبھانے کیا بات تھی کہ آج صبح بلا کو دیکھنے کے بعد میں بیاکل سا ہو گیا تھا اور اپنے آپ میں عجیب سا اضطراب محسوس کرنے لگا تھا۔ بلا میں ایسی کیا بات تھی جو وہ میرے حواس پر چھائی چلی جا رہی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ان تینوں کو برآمدے والے دروازے سے برآمد ہوتے دیکھ کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ تینوں میرے پاس اگر گھاسا پر بیٹھ گئیں۔ میں بھی کرسی چھوڑ کر نیچے آ گیا۔

میرا وہ دن بڑی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت میں گزرا۔ میں بلا کا سامنا کرنے سے گریز کرتا رہا مگر وہ مختلف جیلوں بہانوں سے بار بار میرے سامنے آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر چھلنے والی دل فریب مسکراہٹ سے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی۔

روپ متی نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ ہو سکتا ہے، جاگتی نے بھی نوٹ کیا ہو لیکن اس نے اپنی باتوں یا چہرے کے تاثرات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ البتہ روپ متی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ ایک موقع پر مجھے اکیلے پا کر وہ شوخ نظروں سے میری طرف دیکھنے ہوئے ہوئی۔

”کیا بات ہے، یہ حسین تخیلی بیچ سے تمہارے گرد منڈلا رہی ہے۔“

”لگ۔ کون۔“ میں گڑبڑا سا گیا۔ ”کون سی تلی۔؟“ ”اب زیادہ بے نیکی کو شش مت کرو۔“ روپ متی نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں بلا کی بات کر رہی ہوں اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ جب بھی تمہارے قریب آتی ہے، تمہارے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔“

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ روپ متی بڑی گھاگ تھی۔ اس نے سب کچھ ناؤ لیا تھا۔ میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ آسانی سے پچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کچھ انگوائے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں بھی سنہیل گیا تھا اور پھر جاگتی کے آجانے سے موضوع بدل گیا۔

تھاکر صبح آٹھ بجے ہی چلا گیا تھا اور میرے لیے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں رات دس بجے ہو مل بیچ جاؤں۔ شکر مجھے رات نو بجے کے قریب ہم نے کھانا کھالیا۔ شکر مجھے



گڑھ جمیل کی طرف جانے والی سڑک پر لے لو۔ شر سے نکلے ہی پانی کی سلائی کا جو پمپنگ اسٹیشن ہے۔ کن دین چھا بیٹھا ہے۔

ٹھاکر نے جیب کا رخ چاند پول گیٹ سے اس سڑک پر موڑ دیا جو زور آور گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ وہی سنسان سڑک تھی جہاں اس رات رام اور اس کے ساتھیوں نے ججھے اور سونیا کو روک کر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ زور آور گیٹ کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم رام گڑھ جمیل کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اس سڑک پر بھی سناٹا تھا۔ ٹھاکر نے جیب کے ہیڈ لیمپ بجھا دیے اور تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیب کو سڑک سے ہٹا کر روک لیا اور انجن بند کر دیا۔

میں دائیں طرف دیکھنے لگا جہاں تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ایک بلب کی روشنی نظر آرہی تھی۔

وہ شر کو پانی کی سلائی کا پمپنگ اسٹیشن تھا۔ رام گڑھ جمیل کے قریب تالابوں سے آنے والا پانی اس پمپنگ اسٹیشن سے آگے پمپایا جاتا تھا۔ پمپنگ اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ اینٹیڈنٹ کا کوارٹر تھا جہاں صرف ایک آدمی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔ بھگت نے بتایا کہ مکشن نامی ایک شخص گزشتہ دو سال سے یہاں تعینات ہے۔ اس کی بیوی اور دو بچے بھی یہاں اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور کرن بھی یہیں چھپا ہوا ہے۔

پمپنگ اسٹیشن تک جانے کے لیے کوئی پتہ سڑک نہیں تھی۔ ایک چمڑا کشادہ راستہ تھا جس پر بھی کبھار انور کس کے افسروں کی گاڑیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ہم اس راستے سے ہٹ کر چل رہے تھے۔

پمپنگ اسٹیشن تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ قریب پہنچ کر ٹھاکر نے پستول نکال لیا۔ میری ہنڈی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا تھا مگر میں نے اسے نکالنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے جمائو کی باڈی لگا کر آئینہ لٹکایا گیا تھا۔ ایک کمرے میں اندھیرا تھا البتہ دوسرے کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔

بھگت خشک جمائو کی باڈی میں الجھ کر گرا۔ کانٹے جیسے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کی جتنی جگہ گئی اور ایک بیماری آواز سنائی دی۔

”کون ہے۔ ادھر کون ہے؟“

روپ متی کی بچاؤ پر مبن روڈ تک چھوڑ گیا جہاں سے مجھے ایک آنر رکشا مل گیا اور میں پونے دس بجے کے قریب ریسنورنٹ پہنچ گیا۔

ٹھاکر کا ڈنکر کے پیچھے نیچر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ریسنورنٹ میں داخل ہو کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر بھی اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

ٹھیک دس بجے بھگت ریسنورنٹ کے سامنے دکھائی دیا۔ وہ شاید اندر داخل ہوتے ہوئے جھبک رہا تھا۔ ٹھاکر نے ویٹر کو اشارے سے قریب بلایا۔

”اس آدمی کو اندر لے آؤ اور اسے کھانے چائے وغیرہ کا پوچھو اور اسے یہ بھی کہہ دینا کہ ہماری طرف نہ آئے البتہ جب ہم یہاں سے اٹھ کر باہر نکلیں تو ہمارے پیچھے چلا آئے۔“

ویٹر ریسنورنٹ سے باہر نکل گیا۔ بھگت کے قریب رک کر اس نے ایک دو منٹ اس سے بات کی اور اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ بھگت ہماری میز کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا بھی تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ہم سے شناسائی کا اظہار کیے بغیر ویٹر کے ساتھ آگے نکل گیا۔

اس وقت ہوٹل میں رش تھا۔ اس ریسنورنٹ میں ہائی جینزڈی کے لوگ آتے تھے۔ بھگت جیسے لوگوں کو تو دروازے کے قریب بھی نہیں بٹھک دیا جاتا تھا۔ گاہکوں میں اس وقت مردوں کے ساتھ عورتیں بھی معقول تعداد میں موجود تھیں۔ بعض لوگوں نے تو بڑی ناگوار سی نظروں سے بھگت کی طرف دیکھا تھا۔ ویٹر اسے ایک خالی میز پر بٹھا کر کچن کی طرف چلا گیا تھا۔

بھگت نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے ویٹر کو بلا کر بل دینا چاہا تو ویٹر نے مسکرا کر چٹھہ کہا۔ بھگت نے نوٹ جیب میں رکھ لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ٹھاکر نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹھاکر کی جیب پارکنگ والے حصے میں بائیں طرف سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ جیب پر بیٹھے ہوئے میں نے پیچھے مڑ دیکھا۔ بھگت ریسنورنٹ سے نکل رہا تھا۔ ٹھاکر نے انہی اشارات کر دیا اور اسی وقت بھگت اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”کہاں جانا ہے۔ رام تنج پاؤار؟“ ٹھاکر نے جیب کو سڑک پر لانے کے بعد بھگت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں سرکار۔“ بھگت نے جواب دیا ”جیب کو رام

”میں بھگتا دھوبی ہوں کرن۔ تم سے ملے آیا ہوں۔ ضروری کام ہے۔“ بھگت نے چچا کو کہا۔

جواب میں فضا فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں بھگت کے قریب ہی کھڑا تھا۔ گولی زنائے کی آواز کے ساتھ میرے اور بھگت کے سروں کے درمیان سے گزر گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

ٹھاکر نے بھی گولی چلا دی۔ وہ کرن ہی تھا جس نے ہم پر فائز کیا تھا۔ وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اور ٹھاکر نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

کرن ٹیلیوں میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ اس نے مرکز ایک دو فائز بھی کیے تھے۔ میں اور ٹھاکر مختلف سمتوں سے اس کا چھپا کر رہے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر کرن رات کی تاریکی میں ٹیلیوں میں غائب ہو گیا تو ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔

لیکن میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دور ہی سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے مرکز فائز کیا لیکن ٹیلے کی دھلان پر اس کا پیر رہت کیا تھا۔ گولی میرے سر کے بست اوپر سے گزر گئی بھی اور میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گرا اور اسے دوسرا فائز کرنے کا موقع نہیں دیا۔

کرن کا پستول والا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ ہم دونوں دھلان پر لڑھکتے ہوئے ٹیلے کے واسن میں پہنچ گئے۔ میں نے جھنگل سے اس کے ہاتھ سے پستول چھڑایا اور اس کی دھنائی شروع کر دی۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گیا۔

ہم کرن کو مارے اور تھینے ہوئے سپرنگ اسٹیشن والے کوارٹر میں لے آئے۔ بھگت نے سپرنگ اسٹیشن کے انٹینڈنٹ لکشمین اور اس کے بیوی بچوں کو حراست میں لے رکھا تھا۔ وہ سب بست خوف زدہ تھے اور پھر لکشمین نے یہ انکشاف کیا کہ کرن اس کا دور کا رشتے دار ہے مگر اس کی بد معاشی کی وجہ سے عرصہ پہلے وہ اس سے ملنا جانا چھوڑ چکا تھا۔

لکشمین کے کہنے کے مطابق کرن تین دن پہلے وہاں آیا تھا اور اس نے لکشمین کو دھکی دی تھی کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو بتایا گیا تو وہ اس کے بیوی بچوں کو قتل کر دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ چند روز یہاں رہے گا اور حالات برسکون ہوتے ہی چلا جائے گا۔

لکشمین بے قصور تھا۔ اس نے محض خوف کی وجہ سے کرن کو پناہ دے رکھی تھی۔ میں نے لکشمین اور اس کے بیوی بچوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور کرن کی طرف

متوجہ ہو گیا جو ٹھاکر کی چند ٹھوکریں کھانے کے بعد فرش پر پڑا کر رہا تھا۔

”ہم تم سے رامو کا پتا جانتا چاہتے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”اگر تم بتاؤ کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا اور اگر انکار کرو گے تو تمہیں موت کٹ اٹھانا پڑے گا۔“

”تم مجھ سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکو گے۔“ کرن نے جواب دیا۔

میں چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بھگت کو اشارہ کیا۔ بھگت پہلے ہی برتول رہا تھا۔ اس نے کرن پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ کرن کی چپٹیں کمرے میں گونج رہی تھیں مگر اس نے زبان نہیں کھولی۔ بھگت نے اسے پکڑ کر سر سے اوپر اٹھالیا اور پوری قوت سے سامنے والی دیوار کی طرف اچھال دیا۔

کرن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خون کا چچ نکلے۔ وہ ”بھد“ سے نیچے گرا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ترپنے لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔ ”بتا تیرا گرو کہاں ہے۔ نہیں تو بڑیاں توڑ دوں گا۔“ بھگت اسے زوردار ٹھوکراتے ہوئے غرایا۔

”نن۔ نہیں بتاؤں گا۔“ کرن نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

بھگت نے اسے دو تین ٹھوکریں اور لگا دیں۔

”بٹ جاؤ بھگت۔“ میں نے پتلون کے پائنتے سے خنجر نکال لیا۔ ”یہ ایسے کچھ نہیں بتائے گا۔“

میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر کرن کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے کرتے کے کمریوں پر رکھ کر جھکا دیا۔ کرتے نیچے تک پھٹ گیا اور اس کا سینہ برہنہ ہو گیا۔

میں نے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر لپکا سا چرکا دیا۔ کرن چیخ اٹھا۔ کھال میں تقریباً تین انچ لمبائی لگا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔

”کیا وچار (خیال) ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”میں تمہارے سینے پر سرخ رنگ کی اتنی گیریں سمجھتی ہوں گا کہ شہر کا نقشہ بن جائے گا۔“

”وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ کرن نے اس مرتبہ فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے ”وہ انسان نہیں راکش ہے۔ خون خوار و درندہ۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں اس کا پتا بتایا تھا تو وہ مجھے کتے کی شوت مار دے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تمہاری رکھنا (حفاظت) کروں گا۔ بتاؤ۔ وہ درندہ کہاں چھپا ہوا ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ“ وہ کہنے کہتے کہتے رک گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ زبان کھولنے ہی رامو اس کے سینے میں خنجر ٹھونک دے گا۔ ”وہ وہ کالی کے پرانے مندر میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور ہیں لیکن۔ میں تم لوگوں کو ٹکشا (شوہر) دوں گا کہ وہاں جانے کی غلطی مت کرنا۔ وہ واقعی خونیں بیڑیا ہے۔ مار ڈالے گا تم لوگوں کو۔“

”کالی کا پرانا مندر کہاں ہے؟“ میں نے اس کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”سوائے دھو پوری کی طرف جانے والی سڑک پر۔ شہر سے تقریباً پانچ کوس آگے ایک بستی کے کھنڈر ہیں۔ وہ مندر انہی کھنڈروں میں ہے۔“ کرن نے بتایا۔

”کیا اس کا گردہ کھنڈال بھی اسی مندر میں ہے۔ میرا مطلب ہے کنور بلونت سکھ“ جس کے لیے وہ آج کل کام کر رہا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ بلونت سکھ وہاں نہیں ہے۔“ کرن نے جواب دیا ”یہ سب کچھ اسی کا کیا دھڑا ہے۔ اسی نے تمہیں اٹھانے کے لیے رامو کو پیر دیا تھا۔“

”اوہ! تو تم مجھے جانتے ہو!“ میں نے پوچھا۔

”اس رات اس لونڈیا کے ساتھ تمہیں اٹھانے کی کوشش کی گئی تھی تو رامو کے ساتھ میں بھی تھا۔“ کرن نے جواب دیا ”میں نے تمہارے ہاتھ دیکھ لیے تھے اور رامو سے کہا تھا کہ بلونت سکھ کا بیچنا داپس کر دے لیکن وہ تو کچھ اور جھیل گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مرتبہ تم ٹھاکر کی وجہ سے بچ گئے ہو۔“ اس نے ٹھاکر کی طرف دیکھا ”اس نے ٹپس میں آکر ٹھاکر کے بھائی کی ہتیا کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ٹھاکر تمہاری پشت بنائی سے باز آجائے گا مگر یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے چیتا پھر رہا ہے۔ بلونت سکھ بھی غائب ہو چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے کرن۔“ میں نے کہا ”ہو تو تم بھی بیڑیوں کے گردہ میں سے ایک۔ تمہارے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا گیا ہوگا۔ یہی تو یہ چاہتا ہے کہ یہ خنجر تمہارے سینے کے آبار کردوں لیکن میں تمہیں دیے ہوئے اپنے وچن (دودھ) کا پالن (ایٹا) کروں گا۔ اس وقت میں تمہیں زندہ

چھوڑ رہا ہوں۔ آج رات تم یہیں رہو گے۔ صبح سویرے لکشمین تمہیں لات مار کر یہاں سے نکال دے گا اگر اس کے بعد تم نظر آئے تو زندہ نہیں بچ سکو گے۔“

میں ٹھاکر کو اشارہ کر کے کمرے سے باہر گیا۔ بھگت وہیں رہ گیا تھا۔ میں نے لکشمین کو بلا کر پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں چھسوا دیا۔

”اس کو باندھ کر رکھنا اور صبح ہوتے ہی یہاں سے بھاگ دینا۔“ میں نے کہا ”یہ اب تم لوگوں کو نہ کوئی دھمکیاں دے گا اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اس نے ایسا کیا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

لکشمین نے اسی وقت بھگت کی مدد سے کرن کو باندھ کر اس کمرے میں ڈال دیا۔ ہم وہاں سے رخصت ہو کر سڑک کی طرف آگئے جہاں جپ کھڑی تھی۔

”اب کیا وچار ہیں ٹھاکر جی؟“ بھگت نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”ہم اسی وقت کالی کے پرانے مندر جا رہے ہیں۔“ ٹھاکر نے انہیں اشارت کرتے ہوئے کہا ”تم اگر چاہو تو ہم تمہیں شہر میں کسی جگہ چھوڑ دیں گے۔“

”کیسی باتاں کرتے ہو ٹھاکر جی۔“ بھگت جلدی سے بولا ”میں تو اب آپ کا سیوک ہوں۔ اپنا جیون بھینٹ کر دوں گا پر پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

”سوچ لو بھگت!“ ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے جپ آگے بڑھا دی۔

”سوچا تو وہاں جاتا ہے ٹھاکر جی جہاں نقصان کا ڈر ہو۔“ بھگت نے جواب دیا ”آپ جیسے مساتما کی سیوا کر کے تو زندگی سپسل (کامیاب و کامران) ہو جاوے گی۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ ٹھاکر جپ کو گھما کر سڑک پر لے آیا ”آج سے تم ہمارے ہو گئے۔ پچھلی زندگی سے تمہارا ناتا ختم ہو گیا۔ بھول جاؤ سب کچھ۔“

”بھول گیا ٹھاکر جی۔“ بھگت خوش ہو کر بولا۔

میں نے کل بھی بھگت کی باتیں سنی تھیں اور آج بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ شہر بھر کے غنڈے رامو کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن بھگت اس کے خلاف جس طرح کھل کر ہمارا ساتھ دے رہا تھا وہ قابل تعریف تھا اور اس پر ہر لحاظ سے بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔

جپ شہر کی بیرونی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گودند مارگ، انڈسٹریل روڈ اور سوائے مان سکھ اسٹڈیم کے قریب سے ہوئی ہوئی اس سڑک پر آگئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ

آدمی رات کا وقت تھا۔ رات کے وقت شہر تباہر  
جانے والی سڑکوں پر کسی قسم کا ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ ریگستان  
میں سفر کے دوران میں قدم قدم پر ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا۔  
اس وقت یہ سڑک بھی سنسان تھی۔

”یہ بے پور شہر جب آباد ہوا تو اس وقت بھی یہی مسئلہ تھا۔ ریگستان کی اُڑتی ہوئی ریت شرکی سڑکوں پر جمع ہو جاتی۔ راستے بند ہو جاتے۔ مکاتوں کی دیواروں کے ساتھ راتوں رات ریت کے ٹیلے معرض وجود میں آ جاتے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے شہر کے گرد ایک بلند دیوار تعمیر کر دی گئی۔ ریت کا پھیلاؤ رک گیا اور شہر محفوظ ہو گیا۔ اگر یہ شہر بھی ریت کے سمندر میں غرق ہو جاتا تو اسے بھی کالی مانا کا عذاب گردانا جاتا۔“

خوبی کے ایک کمرے میں بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں پوجا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے خیال میں دھرم کو سب سے زیادہ نقصان بیڑتوں اور پجاریوں نے پہنچایا تھا اور یہ بیڑی حد تک درست بھی تھا۔ یہ سب کچھ تو میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور بھگت بھی رہا تھا۔

کالی کاروانا مندر بستی کی دوسری طرف تھا۔ اس کے  
اوپر دو بھی مکان تھے۔ مندر کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی  
تاہم اس کا ٹوٹا ہوا اکس رات کی تاریکی میں بھی دکھائی دے  
رہا تھا۔  
ٹھکر اک جگہ رک گیا۔ اس نے جب سے پستول نکال

”تم اس طرف کھڑے رہو بھگت“ ٹھاکر نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”اور ہمت نہ کھو، تم اس طرف سے آگے بڑھتا ہوں۔“

مندرجہ ذیل کے مرکزی ہال کے علاوہ شاید کمرے بھی تھے۔ ایک کھڑکی سے زور بھج کر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر دو بے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ خالی جگہ عبور کر کے میں تقریباً چوتھ اوٹاؤں پہنچ چوتھے پر چڑھ گیا اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

دیوار کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکڑی ہوئی تھیں اور مجھے  
چوڑھے میں گولی دھاری پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں  
ہستہ آہستہ اوپر چڑھتا رہا اور بالآخر اس کھڑکی تک پہنچے  
جس کا کامپا ہو گیا۔ میں نے دو سلاخوں کو پکڑ لیا اور دونوں  
دیوار میں اکڑی ہوئی اینٹوں کی جگہ بن جانے والے  
گڑبڑ میں جمادے۔

میں نے سلاخوں پر مضبوطی سے گرفت جما کر اپنے آپ کو پوری طرح اوپر اٹھادیا اور اندر جما کئے لگا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے مہینے کی کمری دوڑ گئی۔

کمر اُٹھا کر دیکھا۔ اندرون دیواروں کی حالت قدرے ترقی تھی۔ ایک دیوار میں مشعل لگی ہوئی تھی جس میں کسی نوکیل چڑیا یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز جل رہی تھی۔ ناکوار بالکی بومیرے تختوں سے ٹکرا رہی تھی۔

”حرامی!“ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ اس پر قتل کے کئی الزام تھے۔ اس وقت وہ ڈاکٹر شام سندھ کے قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس بوسے شہر میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اس حرامی سے شام سندھ کے قتل کا رولہ لیتا چاہتا تھا اور یہ نطفہ ناتحقیق یہاں گالی کے مندر میں پیش کر رہا تھا۔

پنچھیا اس کی طرف مڑ گئی۔ اس نے گلاس ابھی اس کے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ ایک اور آدمی تقریباً دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ روشن دان کی سلاخیں میرے ہاتھوں سے چھوٹنے لگیں۔

”رامو دادا۔ غضب ہو گیا۔“  
 لکھن آگے بڑھ کر  
 امو کے چہرے چھوتے ہوئے بولا۔

کلشمن بولا۔ ”اس سے بھی زیادہ خطرناک بات ہے رامو، ا۔ ا۔“

”ابے کچھ بکے گایا خطرے کی گھنٹیاں بجاتا رہے گا۔“  
 اموداؤا۔  
 ”راموداؤا۔“ کلکشن بولا ”ٹھاکر ہانوت سنگھ اور اس

کے دوست ہمت سنگھ نے میرے کوارٹر پر حملہ کر کے کرن کو پکڑ لیا تھا۔ اسے بوت مارا ہے ان لوگوں نے وہی طرح گھاسل ہے اور میرے کوارٹر میں پڑا ہے۔" لکشمی ایک لمحے کو نہ دوش ہوا پھر رامو کو مدخلت کا موقع دے بغیر بولا "کرن بہت گھاسل ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ س نے مجھے بھیج دیا ہے کہ ہمیں خبردار کروں گا کہ تم اپنا بندہ بست کرلو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ آج رات ہی یہاں حملہ کریں یا پولیس کو تمہارے اس ٹھکانے کی خبر کریں اور ہاں۔ ان کے ساتھ بھگت بھی تھا۔ اجیری گیٹ والا۔"

"وہ حرامی۔ بچ۔ دھولی کی اولاد۔" رامو دبا دبا "اس کی تو میں بوڑا کتوں کو کھلا دوں گا۔ رامو کے مقابلے پر آنے کی ہمت کرے اس نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ پر تو یہاں کا پتا نہیں کس نے بتایا۔ لکشمی نے جواب دیا "اگر وہ زبان نہ

کھولے تو بہت سنگھ فخر سے اس کی کھال اتار دیتا۔ وہ مار ڈالتا۔"

"وہ حرامی سٹلا۔" رامو نے دانت کھپکپائے "آج اگر وہ یہاں آئے تو کل صبح اس کی لاش پر گدہ دعوت اڑائیں گے۔ پر یہ بتا تو بس تک کیسے آیا ہے؟" لکشمی نے جواب دیا۔

"میرزا سائیکل پر رامو دوا۔" لکشمی نے جواب دیا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ موٹر سائیکل پر یہاں تک آیا تھا اور میں نے موٹر سائیکل کی آواز نہیں سنی تھی۔ میں شاید کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے میں کچھ زیادہ ہی غور ہو گیا تھا یا شاید وہ میرزا سائیکل کو ہستی کے باہر چھوڑ آیا تھا۔

"یہ جارہا ہوں رامو دوا۔ تم لوگ اپنا بندہ بست کرلو۔ وہ لوگ ایک یا پولیس کو لے کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔" لکشمی نے کہا۔

"ابے حرامی۔ رامو کو ڈراتا ہے۔" رامو نے کہا "اچھا ایسا کر تو سن چھمیا کو ساتھ لے جا۔ چل چھمیا کپڑے پن لے اور اس کے ساتھ چل جا ورنہ بے موت ماری جائے گی۔"

"نہیں رامو! اب یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔"

دور زے کی طرف سے ٹھاکر کی آواز سن کر میں ایک بار پھر چرک گیا۔ رامو اور اس کے ساتھی بھی اچھل پڑے۔ چھمیا منہ سے تو ہلکی سی چیخ نکلی گئی تھی۔ وہ فرش پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر ایک کونے میں دب گئی اور مہر مہر کانپنے لگی۔

لکشمی کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ٹھاکر

کو دیکھ کر وہ قہر کاٹنے لگا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ غدار کی مت کرنا۔" اس کی طرف دیکھ کر غریبا "اگر مجھے وہاں شبہ بھی ہو جائے تو انہی کے ساتھی ہو سکتے ہیں جنہم گودتا اور کرن کو زندہ نہ چھوڑنا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری موت تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

"موت تو ہمیں یہاں گھیر کر لائی ہے ٹھاکر۔" رامو غراہے ہوئے کہا "میں نے تمہیں کہا تھا رامو سے بھاگ کر لینا لیکن تم نے اپنے بھائی کی موت سے بھی کوئی سبق نہ لیا۔ آج میرا حساب بھی پتہ کر رہی دوں گا۔"

"آج پتا چل جائے گا کہ تم کتنے بڑے بد معاش ہو۔" ٹھاکر نے بھی غرا کر جواب دیا "مٹائی کے اس مندر کو تمہارا چتا بنا دوں گا۔"

ان دونوں میں مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ وہ بڑے تیز تند الفاظ میں ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ لکشمی ہوا کھڑا تھا اور رامو کے دوسرے ساتھی بھی بڑے چاق پتہ کھڑے شاید ٹھاکر پر حملہ کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھے لیکن ٹھاکر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول۔ انہیں اپنی ہتھکڑوں پر کھڑے رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ کچھ جھجھکیا جیسے تیسے کر کے پکڑے پن چکی تھی اور کونہ پستول کے ساتھ چپکی کھڑی قہر قہر کر رہی تھی۔

رامو کے جنم کے بالائی حصے پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کا سینہ رچھہ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی جس میں بیٹل کے ساتھ ٹھاکر کی پٹائی ہوئی تھی لیکن ٹھاکر ایک طرف پٹائی پر شراب بوتلوں کے پاس پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر اس طرح اچانک پستول پر دست کمرے میں وارد ہوا تھا کہ رامو کو خبر اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

شراب کی ایک بوتل رامو کے پیروں کے قریب پڑی تھی اور وہ اپنا سیدھا چہرہ بہت آہستہ آہستہ بوتل کی طرف بڑھا رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی لیکن غلغلے کے کہ میں اس کا مقصد سمجھ سکتا "اس نے بوتل کو کچرے اچھال دیا۔"

بوتل چگاڈو کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی ٹھاکر کے منہ کی طرف گئی۔ ٹھاکر کے لیے بھی یہ حملہ بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا۔ وہ کراہ کر ایک طرف جھکا۔ اس کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔

اور پھر یوں لگا جیسے جنم کی ساری باتیں بیک وقت

حرکت میں آتی ہوں۔ رامو اس کے دونوں ساتھی اور لکشمی بیک وقت چیخنے ہوئے اپنی اپنی جگہ سے اچھلے تھے۔ رامو اپنے خنجر کی طرف لپکا تھا۔ اس نے ٹھاکر کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن اسی وقت کمرے کی فضا غار کے دھاکے اور لکشمی کی خوفناک چیخ سے گونج اٹھی۔ کمرے کی دوسری طرف کھڑی سے چلائی جانے والی کوئی اس کی پشت میں لگی اور وہ دھڑکنا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میں نے چپک کر اس طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی تو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی مگر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس کھڑکی میں چھٹی صلیب لگی ہوئی تھی اور اس کی دوسری طرف بھگت دھولی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ سلاخوں کے اندر تھا۔

رامو کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک ٹھاکر سے ٹکرا چکا تھا۔ ٹھاکر سر ہٹنے والی بوتل کی ضرب سے ابھی پوری طرح نہیں سنبھل سکا تھا۔ وہ بد معاش پوری قوت سے ٹھاکر سے غرایا تھا اور ٹھاکر کو کھڑا ہوا دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول بھی پھوٹ گیا تھا۔

اس بد معاش نے اڑنا بیٹھنے کی طرح دباؤتے ہوئے ٹھاکر کے سینے پر زور سے ٹکرائی۔ ٹھاکر بھی بلبلاتا تھا۔ رامو اپنا خنجر اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ کھڑکی کی طرف سے ایک اور چارو۔ گولی رامو کے ہاتھ پر لگی۔ اس کی چھٹی انگلی اڑ گئی۔ وہ اچھل کے پیچھے ہٹ گیا اور زور زور سے ہاتھ جھٹکنے لگا۔ خون کے چھینٹے چاروں طرف اڑ رہے تھے۔

"تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے رامو۔" بھگت چپا "آج تم نے حرکت کی تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔"

رامو بھڑپے کی طرح غرا کر رہ گیا۔ رامو کا دوسرا ساتھی بھی ٹھاکر سے بھڑ گیا تھا۔ وہ ٹھاکر کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر ٹھاکر پھر پور انداز میں مزاحمت کر رہا تھا۔

"اے! کھڑکی میں کھڑا ہوا بھگت چپنا "ٹھاکر سے دور ہٹ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کمرے کی فضا ایک بار پھر غار کی آواز سے گونج اٹھی۔ بھگت نے ہوائی غار کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ غار کی آواز سن کر وہ دونوں ٹھاکر سے الگ ہٹ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس طرح ٹھاکر سے

الٹھے ہوئے تھے کہ بھگت براہ راست کسی پر گولی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ اس طرح ٹھاکر کے بھی زور پر آجائے گا اندیشہ تھا۔ بھگت نے ایک بار پھر چیخنے ہوئے زنگر دیا۔ اس مرتبہ غار نہیں ہوا۔ "ٹنگ" کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ یا تو اس کا پستول خالی ہو گیا تھا یا کسی اور وجہ سے گولی نہیں چلی تھی۔ رامو ایک بار پھر اپنے خنجر کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

میرے لیے اب تماشا بنی رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بے جگری سے ان دونوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

"ڈنے رہو ٹھاکر۔ میں آ رہا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ رامو خنجر اٹھانے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر اس نے اوپر دیکھا۔ میں اس وقت روشن دان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

میں روشن دان کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے نیچے لٹک گیا۔ ٹٹول کر ایک پیر ذرا نیچے والی دیوار کے کھڈے میں جھپٹا۔ سلاخوں کو چھوڑ دیوار کی ٹوٹی ہوئی اینٹوں پر گرفت رکھی اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔

دیوار پر چڑھنا تو آسان ثابت ہوا لیکن نیچے اترنا خاصا مشکل تھا۔ میں نے تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی اور اٹھ کر مندر کے دروازے کی طرف دوڑا۔

کمرے میں گھسنا کارن بچا ہوا تھا۔ وہ دونوں غنڈے تو اب بھی ٹھاکر سے غمگین گھٹا تھے اور بھگت دھولی رامو سے بھڑا ہوا تھا۔ بھگت نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے رامو کے منہ سے غلیظ گالیوں کا گڑا بل رہا تھا۔

میں نے ان دو غنڈوں میں سے ایک کو جو ٹھاکر سے غمگین گھٹا ہو رہے تھے، بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا اور اس کے چہرے پر تباہ توڑ کئی گھونٹے رسید کر دیے۔ وہ بلبلاتا ہوا کمرے کے گونے میں چھمیا کے قریب جا کر ا۔ چھمیا کے منہ سے چیخ نکلی گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

رامو نے بھگت کی ٹانگ میں اڑنا لگا کر اسے گرا دیا اور خنجر لہراتا ہوا ٹھاکر کی طرف لپکا۔ میں اس کے راتے میں تھا۔ میں نے بڑی بھرتی سے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ وہ لوکھڑاتا ہوا اس طرح گرا کہ اس کا خنجر اپنے ہی ساتھی کی پشت میں پھوست ہو گیا جو ٹھاکر کو رگید رہا تھا۔

کمرہ اس شخص کی بھیانک چیخ سے گونج اٹھا۔ رامو بھی وحشت زدہ سا ہو گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کھینچا

تو خنجر باہر آتے ہی اس شخص کی پشت سے خون کی دھار برہ نکلی۔

رامو بلیٹ کرو حشیانہ انداز میں میری طرف لپکا۔ اس نے خنجر سے بھر پور وار کیا تھا لیکن میں نے کلائی پر اس کا وار روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر زور وار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چیخ کر دہرا ہوا تو میں نے اس کے بازو پر چپ رسید کر دیا جو میری گرفت میں تھا۔ اس مرتبہ وہ فوج ہوتے ہوئے بکڑے کی طرح بلبلا اٹھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے نیچے کھٹنے سے زور وار ٹھوکر مار کر چھوڑ دیا۔ وہ چیخا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ ٹھاکر اب سنبھل چکا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر رامو پر بل پڑا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ دوسری طرف بھگت دھوئی نے اس پر مدعا ش کو دو بوج رکھا تھا جسے میں نے جھمکیا کے قریب گرایا تھا۔ بھگت اطمینان بخش طریقے سے اس کی ٹھکانی کر رہا تھا۔

میں دوبارہ رامو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رامو اب میرے اور ٹھاکر کے درمیان فٹ بال بن گیا تھا۔ ابھی میں اسے ٹھوکر مارتا اور ابھی ٹھاکر اسے گھونسا رسید کر دیتا۔

رامو ایک لات کھا کر دوڑاڑے میں گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ مندر کے ہال میں پہنچ کر رامو نے اچانک ہی بلیٹ کرات چلا دی۔ اس کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی اور میں گر رہا ہوا گر گیا۔ رامو وہاں رکا نہیں۔ وہ دوڑتا ہوا مندر سے باہر نکل گیا۔ ٹھاکر نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔

رامو کی آخری ٹھوکر میری پنڈلی کی ہڈی پر لگی تھی۔ مجھے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور جب میں اٹھ کر لنگھتا ہوا مندر سے باہر آیا تو سامنے ہستی کی گلیوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھیں اور پھر قدموں کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ ایک دم سناٹا چھایا جیسے یہاں زندگی کا وجود ختم ہو گیا ہو۔

اور پھر اچانک میں اچھل پڑا۔ وہ کسی گاڑی کا انجن اشارت ہونے کی آواز تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رامو نے اپنی گاڑی ہستی کے کھنڈروں میں کہیں چھپا رکھی تھی اور اب وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے مندر والے چوترے سے چھلانگ لگا دی اور گلیوں میں اس

طرف دوڑنے لگا جہاں ہماری جیب کھڑی تھی۔ رامو کی گاڑی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ میرے جسم کی تمام قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی اور میں گلیوں میں پکڑا ہوا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا اور صرف دو منٹ میں ٹھاکر کی جیب تک پہنچ گیا۔

رامو کی گاڑی کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ میں اچھل کر ٹھاکر کی جیب میں بیٹھ گیا اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ چابی انگلیشن میں موجود تھی۔ میں نے انجن اشارت کیا اور جیب کو ریورس میں کٹاں گلی میں لے آیا۔ ہستی سے باہر نکلنے کا یہی راستہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ رامو کی گاڑی اس طرف سے آئے گی اور بالفرض وہ کسی اور گلی سے بھی نکل گیا تو میں اس کا تعاقب کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

میرا پہلا خیال درست نکلا۔ رامو کی گاڑی اسی طرف آ رہی تھی۔ کھنڈروں میں ہیڈلائٹس کی روشنی چمکی تو میں نے اپنی جیب کو گلی کے وسط میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ راستہ بند ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے رامو کی گاڑی بڑی تیزی سے اس طرف مڑی۔

وہ بھی جیب تھی۔ رامو راستہ نہ پا کر شاید بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے تصادم سے بچنے کے لیے اپنی جیب کو دائیں طرف گھما دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پہلو سے نکل جائے گا مگر بدحواسی میں اسٹیرنگ کچھ زیادہ ہی محوم گیا تھا۔ جیب کے پیچھے لٹکے ہوئے ٹھاکر کو دیکھ کر بھی میں چونک گیا تھا۔ جیب دائیں طرف ایک کھنڈر کی دیوار سے ٹکرائی۔ ٹھاکر اچھل کر دوڑ جا کر۔ رامو نے جیب سے چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحے میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا رامو کے اوپر گرا۔

رامو میرے نیچے دبا ہوا تھا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ میری گرفت سے نکل کر وہ ایک طرف بھاگا تو ٹھاکر نے اسے چھاپ لیا۔ ٹھاکر کا زور وار گھونسا کھا کر رامو اپنی جیب سے ٹکرا گیا۔ میں نے اپنا خنجر نکال لیا۔ میرے خیال میں اس کے استعمال کا وقت آ گیا تھا۔ ٹھاکر نے خنجر میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور رامو کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”مجھے معاف کر دو ٹھاکر۔ چھما کر دو مجھے۔“ رامو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف اٹھ رہا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ رحم کی جھلک مانگنے لگا تھا۔ اس

خفص سے جس کے بھائی کو اس نے خنجر سے چھلچھو کر دیا تھا

اور بھائی زبانی اودھ موار کے پیچھے بھاگتا تھا۔ نکل گئی ساری بدعاشی؟“ ٹھاکر غرایا ”تم نے اب تک کتنے بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ انہوں نے بھی تم سے اسی طرح زندگی کی جھلک مانگی ہوگی۔ وہ بھی تمہارے سامنے اسی طرح ہاتھ جوڑ کر سٹھکائے ہوں گے۔ تم نے انہیں معاف کر دیا تھا؟ اور میرے بھائی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا جرم کیا تھا اس نے؟ تمہاری دشمنی مجھ سے تھی۔ مرنے کو مجھے لگا رہا تھا مگر تمہاری بدعاشی تو بے گناہوں پر ہی پلٹی رہی ہے اور اب موت کو سامنے دیکھ کر گھٹائیے لگے۔“

”مجھے چھما (معاف) کر دو ٹھاکر۔“ رامو کی آواز رو دینے والی تھی ”تم جو کو گمے میں کروں گا۔ مجھے بلونت تنگھ نے آکھیا تھا۔ تم کو تو میں اس کی لاش تمہارے چروں میں ڈال دوں گا۔ مجھے ایک اور (روح) دو ٹھاکر۔“

”بلونت تنگھ کہاں ہے؟“ ٹھاکر نے پوچھا۔ ”مارسا میں۔ وہ اپنے گرو کے ساتھ دو دن پہلے وہاں چلا گیا تھا۔“ رامو نے جواب دیا۔

”کون گرو؟“ ٹھاکر بولا۔ ”وہ بدیشی مشلا جو ہمیں بدل کر پنڈتوں میں گھسا بیٹھا ہے۔“ رامو نے کہا۔ اس کی بات سن کر میں بھی چونک گیا۔ ”ان دونوں سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے پہلے تم۔“ ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے اس پر خنجر سے وار کر دیا۔ رامو نے وار روکنے اور بچنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا اور اس کی خوفناک چیخ و رانے میں گونج گئی۔

ٹھاکر نے بڑی پھرتی سے خنجر چھین لیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرا وار کر دیا۔ خنجر اس مرتبہ بھی رامو کے سینے ہی میں پیوست ہوا اور اس کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ پہلے ہی سے زیادہ خوفناک تھی۔

اور پھر ٹھاکر پر جیسے خون طاری ہو گیا۔ وہ چیخ چیخ کر رامو کے سینے اور پیٹ پر خنجر کے پے در پے وار کرتا رہا۔ رامو کی پشت جیب سے لگی ہوئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اب بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اب اس میں قوت مدافعت نہیں رہی تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ پر ٹھاکر نے اتنے وار کیے تھے کہ پیٹ سے آنتیں بھی باہر نکل گئی تھیں۔

مجھے بے گناہ میں اندر راجیٹ ہوٹل کے سامنے کا وہ منظر یاد آیا جب پتی ٹانگ نے ماسٹر پوچھا جگ کو میری نظروں کے

۱۔ ہنر ہی طرح خنجر کے بے در۔ ہموار کر کے دیئے دور، سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ماسٹر پوچھا جگ کو دو آدمیوں نے گرفت میں لے رکھا تھا تاکہ وہ مزاحمت نہ کر سکے اور یہاں دن نوٹوں مقابلہ تھا۔ رامو اپنا دفاع کرنے کے لیے آزاد تھا لیکن وہ اپنا دفاع نہیں کر سکا۔

رامو زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر گیا۔ ٹھاکر کے جنون میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خنجر کے وار کر رہا تھا۔ رامو میں اب کچھ نہیں بچا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹھاکر کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بار بار رامو پر خنجر کے وار کر رہا تھا۔ بدلے کی آگ نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بھائی کا قاتل اس کے ہاتھوں ختم ہو چکا تھا مگر وہ آگ شاید ابھی غصنی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اسے ہاتھوں سے جکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”بس کر دو ٹھاکر۔ وہ ختم ہو چکا ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اپنے حواس پر قابو پاؤ۔“ میں اسے کھینچتا ہوا رامو کی لاش سے دور لے گیا۔

کافی دیر بعد ٹھاکر اپنے حواس پر قابو پاسکا تھا۔ میں نے اسے ایک شکستہ چوترے پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

اس وقت مندر کی طرف کھنڈروں کی کسی گلی سے نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں ٹھاکر کو پیس چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑا مگر چند قدم بعد ہی مجھے رک جانا پڑا۔

بھگت دھوئی جھمکیا کو بالوں سے پڑے گھینٹا ہوا الارہا تھا اور جھمکیا تکلیف سے چیخ رہی تھی۔

قریب پہنچ کر بھگت نے جھمکیا کو زور وار دھکا دے کر گرا دیا۔ جھمکیا منہ کے بل گری۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ جس جگہ ہم موجود تھے وہاں دونوں جیپوں کی ہیڈلائٹس کی روشنی پہنچ رہی تھی اور جھمکیا کے چہرے پر خوف کے گہرے سائے صاف نظر آ رہے تھے۔

”وہ کہاں گیا؟“ میں نے بھگت سے رامو کے اس ساتھی کے بارے میں پوچھا جس سے اسے بھڑا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔ ”نرگ (نرگ) میں پہنچا ہوا اس سالے حرای کو بھی۔“ بھگت نے جواب دیا۔

بھگت واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ ٹھاکر نے اسے اپنا سیوک بنالیا تھا اور پہلے ہی موقع پر اس نے اپنی وفاداری

ثابت کر دی تھی۔ اس نے ہمارا مان رکھ لیا تھا۔  
میں ٹھاکر کو اٹھا کر اپنی جیب کے پاس لے آیا۔ اس کے  
کپڑے بھی خون میں لت پت ہو رہے تھے۔ خون کے کچھ  
چھینٹے میرے لباس پر بھی پڑے تھے۔  
بھگت نے ہتھمیا کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ رامو کی لاش دیکھ  
کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ بھگت نے اس کے  
منہ پر زوردار چھڑا مار دیا۔  
”اس حرامی کے ساتھ عیش کر رہی تھی نا۔ اس کا انجام  
بھی دیکھ لے۔“ بھگت نے غرا کر کہا پھر ٹھاکر کی طرف دیکھتے  
ہوئے بولا ”اس کا کیا کروں سرکار؟“  
”اسے یہیں چھوڑ دو۔ صبح تک بیٹھ لے اس کا بھی تیا  
پانچا کوس گے۔“ ٹھاکر کے بجائے میں نے جواب دیا۔  
”نہیں نہیں۔ مجھے یہاں مت چھوڑنا۔“ ہتھمیا ہوتے  
ہوئے میرے قدموں پر گر گئی ”میں مردوش (بے قصور)  
ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“  
”اسے جپ میں بٹھاؤ بھگت۔“ ٹھاکر نے کہا ”شر میں  
کسی جگہ اتار دیں گے اسے۔“  
”لیکن سرکار۔“ بھگت بولا ”اسے زندہ چھوڑنا بہت  
بڑے خطرے کی بات ہوگی۔ یہ پولیس کو بتا دے گی کہ یہاں  
کیا ہوا ہے۔“  
”اگر یہ کسی کے سامنے زبان کھولے گی تو اس کا بھی  
رامو جیسا حشر ہوگا۔ بٹھاؤ اسے جپ میں۔“ ٹھاکر نے کہا۔  
رامو نے ہتھمیا کو اٹھا کر جپ کی پچھلی سیٹ پر بٹھ دیا۔  
ٹھاکر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے  
دوسری سیٹ پر بٹھایا اور خود راویونگ سیٹ سنبھال لی۔  
میں جپ کو کنڈروں سے نکال کر سڑک پر چلے آیا اور  
اسے شریک کی طرف دوڑا دیا۔ ٹھاکر اب پوری طرح اپنے  
حواس میں آچکا تھا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ  
اس کے انتقام کی آگ ابھی پوری طرح سرد نہیں ہوئی تھی۔  
اب وہ بلونت سنگھ کو مزہ چکھانے کا پروگرام بنا رہا تھا جو دون  
پہلے اپنے گرو کے ساتھ سارسکا کی طرف فرار ہو چکا تھا۔  
رامو نے جن الفاظ میں بلونت سنگھ کے گرو کا تذکرہ کیا  
تھا اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بلونت سنگھ اپنے  
کون ہو سکتا ہے۔ بدیشی مسلا۔ وہ دارا کے علاوہ کون ہو سکتا  
تھا!

وہ دارا ہی تھا جس نے یہ آگ بھڑکائی تھی۔ پہلے اس  
نے پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا پھر اتفاق سے اسے بلونت  
سنگھ مل گیا جو روپ متی سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں مل

گئے تو ہمارے خلاف سازشوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ  
شروع ہو گیا۔ دارا مجھ سے پچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ بلونت سنگھ  
روپ متی سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ان دونوں نے  
مل کر پنڈتوں کو بھڑکایا تو انہوں نے ہندو مسلم فساد چمکانے کی  
کوشش کی۔ یہ تو اتفاق تھا کہ کچھ لوگ ہمارے ہاتھ لگ گئے  
تھے جنہوں نے برہمن کے سامنے یہ اعتراف کر لیا کہ مندر میں  
روپ متی کو کسی مسلمان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے  
ہوئے نہیں پکڑا گیا تھا بلکہ یہ ساری حرکتیں پنڈت لوگ ہی  
کر رہے تھے۔ دھرم کو کسی مسلمان نے نہیں اتنی دھما دھماکوں  
نے نشٹ کیا تھا اور پھر یہ بھی محض اتفاق تھا کہ پنڈت رام  
سروپ فیروز شاہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ پنڈت رام سروپ  
ہندوؤں کو بھڑکا رہا تھا کہ ایک مسلمان ہندو ناری کو بھل میں  
لے کر کیوں گھوم رہا ہے۔ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے  
ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی پوجا ایک مسلمان کے  
ساتھ رہ رہی تھی اور شاید اس خوف سے وہ اس ٹولے سے  
اگ ل ہو گیا تھا کہ اگر اس کی بیٹی کے بارے میں پتا چل گیا تو  
یہی پنڈت اور پجاری اس کی بوئیاں فوج ڈالیں گے۔

ہماری جوانی کا رونا انہوں کے باعث ان پنڈتوں کی بڑی  
سازشیں بری طرح ناکام ہو گئی تھیں۔ ان پنڈتوں کے ہا  
کرتوت بھی لوگوں کے سامنے آگئے تھے جس وجہ سے  
ہنگاموں نے شروع ہی میں دم توڑ دیا تھا ہم جو پنڈت اور  
پجاری دارا اور بلونت سنگھ کے آگے کاربند ہوئے تھے وہ بھی  
ہمیں زک پہنچانے کے لیے اندر ہی اندر سازشوں میں  
مصروف تھے۔ ان میں سے پنڈت رام اور دارا ہمارے قہقہے میں  
تھا۔ اس سے ابھی ہم نے کام لینا تھا۔

بلونت سنگھ نے ہی رامو جیسے خطرناک بد معاش اور  
کرائے کے قاتل کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا اور آج ہم نے  
اسے بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔

شروع میں ایک مرتبہ جب بات ہوئی تھی تو ٹھاکر نے کہا  
تھا کہ ان سارے ہنگاموں کے پیچھے بلونت سنگھ کا ہاتھ ہے اور  
میں نے کہا تھا کہ بلونت سنگھ کو بھی کسی اور کی آستین پر ہاتھ  
ہے اور ٹھاکر کے ہاتھوں مرنے سے پہلے رامو کے بیان نے  
میرے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ بلونت سنگھ اپنے  
گرو کے ساتھ سارسکا کی طرف فرار ہو گیا تھا اور وہ گرو  
بدیشی مسلا۔

شر میں داخل ہونے کے بعد وہاں محفل والی سڑک  
ریلوے برج کے قریب ٹھاکر کے کہنے پر میں نے جپ روک  
لی۔

”بھگت۔“ ٹھاکر نے پیچھے مڑ کر دیکھ بغیر کہا ”اس  
چھوٹکی کو یہاں اتار دو۔“  
”نہیں نہیں۔ مجھے یہاں مت اتار دو۔“ ہتھمیا جلدی  
سے بولی ”میں سنا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ریلوے  
اسٹیشن کے پاس اتارنا۔“  
”ہر اسٹیشن کی طرف نہیں جا رہے۔“ ٹھاکر نے کہا  
”یہاں اگر کسی غنڈے نے ہمیں پکڑ لیا تو ہمارے ساتھ  
وہی کچھ ہوگا جو تم کالی کے پرانے مندر میں ان حرامیوں کے  
ساتھ کر رہی تھیں۔ اترو پیچھے جلدی کرو۔“  
بھگت نے ہتھمیا کو اٹھا کر جپ سے نیچے پھینک دیا اور  
میں نے ایک بجنگے سے جپ آگے بڑھا دی۔

ریلوے برج پار کر کے ہم بھوانی سنگھ مارگ کی طرف  
نکل آئے اور پھر پوٹھ ہوٹل کے سامنے سے ہوتے ہوئے  
ٹھاکر کی حویلی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس  
وقت تین بج رہے تھے۔  
ٹھاکر فوراً ہی اپنے کمرے کے ہاتھ روم میں گھس گیا۔  
میں نے بھگت کو حویلی کے ملازم جیوے کے سپرد کر دیا۔

”اسے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا دے دو اور ہاتھ روم  
دکھا دو۔“ میں نے کہا۔ بھگت نے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے  
پڑے ہوئے تھے۔

بھگت بڑی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی  
زندگی تنگ و تنار ایک گلیوں کی کھولیوں میں گزری تھی اور اس  
قسم کی عمارت میں داخل ہونے کا شاید پہلا موقع تھا اور وہ  
بھی ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی۔

جوا بھگت کو ہاتھ روم میں چھوڑ کر آیا تو اس نے بتایا کہ  
تقریباً دو گھنٹے پہلے نیلے والی حویلی سے راج کماری روپ متی کا  
فون آیا تھا۔

اس وقت اگرچہ تین بج رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ  
وہ تین بج چک رہی ہوں گی۔ میں کوٹے والے صوفے پر بیٹھ  
گیا اور قریب رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے  
لگا۔

کال دوسری ہی ٹکٹی پر رسیو کر لی گئی۔ آواز روپ متی کی  
تھی۔

”کہاں غائب تھے تم لوگ؟“ روپ متی نے میری آواز  
سننے ہی کہا ”تین بج رہے ہیں۔ تم لوگوں نے کوئی اطلاع بھی  
نہیں دی۔“

”ہم لوگ بھینڑوں کا شکار کھیلنے کے لیے ریگستان کی  
طرف نکل گئے تھے۔ وہاں کوئی ٹیلی فون نہیں تھا جس سے

تمہیں اطلاع دی جاتی۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ روپ متی کے لیے جس حیرت تھی۔

”مطلب تمہیں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔ اس وقت  
تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہم حیرت سے ہیں۔ کل  
صبح ملاقات ہوگی۔“ میں نے کہا۔

روپ متی لمبی گفتگو کے موڑ میں تھی لیکن میں نے چند  
رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا اور دوسرے  
کمرے میں جا کر ٹھاکر کے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور ہاتھ  
روم میں گھس گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب میں ہال میں آیا تو ٹھاکر اور  
بھگت وہاں موجود تھے۔ ٹھاکر صوفے پر بیٹھا تھا اور بھگت  
قالین پر اپنی پانچواں مارے ہوئے تھا۔ اس وقت میں نے جوا کو  
بھی ٹرے اٹھائے کچن کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ اسے  
معلوم تھا کہ ہم اس وقت چائے پینا پسند کریں گے اور ہمارے  
کہنے سے پہلے ہی وہ چائے بنا کر لے آیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں ٹھاکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت  
ہلکا چمکا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب وہ تناؤ بھی نہیں  
تھا۔ چائے پینے کے دوران میں ہم میں زیادہ گفتگو بھی نہیں  
ہوئی۔

پونے چار بج کے قریب ہم اٹھ گئے۔ ٹھاکر اپنے  
کمرے میں چلا گیا اور میں دوسرے کمرے میں آ گیا۔ بھگت  
ہال ہی میں قالین پر لیٹ گیا تھا۔

میری آنکھوں میں مریچیں ہی لگ رہی تھیں۔ میں سونا  
چاہتا تھا مگر آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں۔ میں ٹھاکر کے  
بارے میں سوچ رہا تھا۔ دکھ اور کرب کا احساس اس وقت  
ہوتا ہے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی عزیز ترین ہستیوں  
کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ میں نے یہ  
کرب جھیلا تھا۔ اس دکھ کا بوجھ اب تک اٹھائے ہوئے  
ہوں۔ میرے سینے میں اب تک لاوا کھول رہا ہے۔

ٹھاکر نے اپنے منہ بولے بھائی کی لاش اور مزی ہوئی  
دیکھی تھی اور وہ حواس کھو بیٹھا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ ایک  
لمحے کو بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ ہانگوں کی طرح بھائی کے  
ہتارے (قائل) کو تلاش کرتا رہا تھا اور بالآخر آج اس نے  
بدلہ لے لیا تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکتے ہوئے انتقام کے  
شعلے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اسے سکون مل گیا تھا لیکن۔۔۔  
میں۔ میرے سینے میں اب تک لاوا کھول رہا تھا۔

وہ بھیاک منظر میری نظروں میں گھوم گیا جب ہم رات  
کو اپنے گھر کے سامنے ٹیکسی سے اترے۔ تھے اور دارا اور



اس کے گروں نے میرے مئی اور ڈیڑی پر حملہ کر دیا تھا۔ ان وحشیوں نے بھی مئی اور ڈیڑی کو اسی طرح اوجھڑا تھا۔ مجھے اس رات کی ایک ایک بات یاد تھی۔ میں کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ مئی اور ڈیڑی کی خوفناک چپچسپ اب بھی مجھے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ یوں تو میں ایک لمحے کو بھی مئی اور ڈیڑی کو نہیں بھولا تھا لیکن آج بڑی شدت سے ان کی یاد آ رہی تھی۔ میرے سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور زبان اکثر کرتالو سے چپکی جا رہی تھی۔ مجھے سانس لھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں اٹھ کر کمرے سے باہر گیا۔ کچن کے دروازے کے ساتھ فرنج رکھا ہوا تھا۔ میں نے فرنج کھولا اور پانی کی بوتل نکال کر بوتلوں سے لگالی۔ میرا حلق تو تر ہو گیا لیکن نہ پیاس بجھی اور نہ ہی سینے میں بھڑکنی ہوئی آگ ٹھنڈی ہوئی۔ میں اپنے کمرے کی طرف واپس جا رہا تھا کہ بجٹ کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ ہال میں اس وقت مدھم مدھم روشنی غالب چل رہا تھا۔ بجھ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے سرکار۔ نیند نہیں آ رہی۔“ میں نے رک کر بجٹ کی طرف دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

”تم بھی تو ابھی تک جاگ رہے ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”آج کے واقعے نے شاید تمہیں بے جا کل کر رکھا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے سرکار۔“ بجٹ نے جواب دیا ”یہ سب کچھ تو میں بچپن ہی سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اپنی کاتوجیوں ہی ایسی دشاؤں (حالات) میں گزرا ہے۔ جوں میں بولی بار آج کسی بندے کو اوپر پہنچایا ہے۔ ہاں اس کی بھی چپتا ہے پر نیند نہ آنے کا کارن (بب) کچھ اور ہے۔“

”اور وہ کارن کیا ہے؟“ میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہمت ٹکھ جی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اپنا جیون فٹ باتھوں اور کھولیوں میں جتا ہے۔ ہمیں تو بیشہ گندی نالیوں کے گڑے ہی سمجھا گیا۔ اپنی ننگے فرش اور کھری بان کی چارپائیوں پر سونے کے عادی ہیں۔ یہ ابھی جبکہ یہ محل۔ بس یہی کارن ہے نیند نہ آنے کا۔“

”عادی ہوا جاؤ گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات بتانا ہمت ٹکھ جی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یہ ہمت میری طرف دیکھتے

ہوئے بولے۔ جو کالی کے پرانے مندر میں چار کھون (قل) ہوئے ہیں۔ ان میں دو تو ان کے کھاتے میں ہیں۔ ایک کھنڈر اور دو جا جو بعد میں میرے ہاتھوں اپنی گردن تروا بیٹھا۔ اور وہ لونڈیا جیتیمیا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسے ٹھاکر جی نے چھوڑ دیا۔“ وہ چند لمحوں کا خاموش ہوا پھر بولا ”ان کھونوں کا پتا تو چل ہی جائے گا۔ پولیس ٹھاکر جی کی حویلی پر نہیں آئے گی؟“

میں سمجھ گیا کہ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ تھا لیکن مکمل اپنے خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”قاتلوں سے پالا دست تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ میں نے

رانا شمشیر سنگھ شیلادھون کو بھی کچھ عرصے کے لیے اپنی حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ شیلادھون کو اپنی حویلی تک لے جانا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن صرف ایک بات اس کے بعد دوسری سب سے اونچی ذات۔ شیلادھون کی ذات کی دھون تھی۔ ذات کا یہ فرق ہی رانا کے قدم روکے ہوئے تھا لیکن اس نے شیلادھون کے حسن و شباب سے سیراب ہونے کا تیرہ کر رکھا تھا۔

دھون کی بستی شہر سے باہر تھی۔ ایک رات منگل سنگھ ڈاکو کے گروہ نے بستی پر حملہ کر دیا۔ منگل سنگھ کے نام کی دو دروہر تک دہشت تھی۔ بڑے بڑے زین دار اور جاگیر دار اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بتا دیتے تھے۔ ضرورت کے وقت اسے پناہ بھی دیتے تھے اور اپنے دشمنوں سے سینے کے لیے اس سے کام بھی لیتے تھے۔ منگل سنگھ چھوٹی چھوٹی بستیوں کو بھی لوٹا رہتا اور اس رات اس نے دھویوں کی بستی کا انتخاب کیا تھا۔

وہ جاتے ہوئے بستی کی دو لڑکیوں کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ ان میں ایک مالا تھی اور دوسری شیلادھون۔

چھ مہینے بعد اڑنی اڑنی سی خبر سن گئی کہ شیلادھون رانا شمشیر سنگھ کی حویلی میں ہے۔ یہ بھی سنایا کہ جس رات دھون بستی پر منگل سنگھ نے حملہ کیا تھا، شیلادھون کو اسی رات رانا کی حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔

شیلادھون کے ماں باپ کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مزید ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے انہوں نے نہ صرف وہ بستی بلکہ شہری چھوڑ دیا۔ کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں گئے تھے۔

چھ مہینے بعد رانا شمشیر سنگھ کے آدمی شیلادھون کو چوڑ گڑھ لے گئے۔ اس وقت شیلادھون مہینے کے محل سے تھی مگر اس کی پروا کیے بغیر رانا کے آدمی اسے ہال کر رہے۔ وہ چوڑ گڑھ سے سوائے باہر پور اور وہاں سے بے پروا آگئے اور شیلادھون کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں تھما کر وہاں چلے گئے۔

شیلادھون پورے دنوں سے تھی جب ایک بد معاش شیلادھون کو اس شخص سے چھین کر لے گیا۔ وہ پس ماندہ علاقے میں واقع ایک کھولی میں رہتا تھا۔ اسی کھولی میں شیلادھون نے ایک بچے کو جنم دیا جسے دو دوسرے ہی روز انا تھ آشرم (بے سارا افراد کی پناہ گاہ) پہنچا دیا گیا۔

بچے کی پیدائش کے چند ہی روز بعد شیلادھون پھر پہلے

جیسی ہو گئی بلکہ اس کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا۔ اسے صرف بچے کا غم تھا لیکن جلد ہی وہ اسے بھی بھول گئی بلکہ اسے بھولنے پر مجبور کر دیا گیا۔

شیلادھون کا بیٹا بجٹ انا تھ آشرم میں پلٹا رہا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ انا تھ آشرم سے بھاگ نکلا اور جب تراشوں کے ایک گروہ کے کمرے سے چھ گیا۔ اسے پہلے جب کترا بنایا گیا پھر وہ چھوٹے موٹے دوسرے جرائم میں بھی ہاتھ ڈالنے لگا۔

کچرا جاتا تو سزا ہو جاتی۔ جیل سے نکلتا تو جرائم کے کچھ اور گروہ کیسے چکا تھا۔

اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ اس کی راتیں بھی فٹ باتھ پر اور کبھی کبھی بستیوں کی تنگ و تاریک کھولیوں میں گزرتیں۔

بجٹ نے چوری چکاری اور غذا امردی کے سوا کچھ نہیں سیکھا تھا۔ بڑا ہو کر بھی وہ دادا کی طرح ہی کر رہا۔ اس نے کبھی کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ بچپن جرائم سے وہ بیشہ بچتا رہا اسی لیے وہ کبھی بڑا بد معاش نہیں بن سکا۔ زندگی میں یہ سلا موقع تھا کہ اس کے ہاتھ سے دو بندے مارے گئے تھے لیکن پشت پر ٹھاکر بھانوت جیسے آدمی کا ہاتھ ہونے کی وجہ سے وہ مطمئن تھا کہ وہ کچرا نہیں جائے گا۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ ٹھاکر جیسے آدمی نے اسے اپنے شرن (بڑا) میں لے لیا تھا اور آئندہ زندگی اس کی سیوا میں گزارے گا اور جرائم سے اسے نجات مل جائے گی۔

بجٹ کے ارادے اچھے تھے۔ نیت صاف تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کا اور ٹھاکر کا لہبا ساتھ رہے گا۔

بجٹ باتیں کرتے کرتے اب اوجھنے لگا تھا۔ میں نے بھی صوفے کا کش اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں اور پھر مجھے پتا نہیں، میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔



بے پروا سے ایک سو پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر سار سا کسی زمانے میں ایک آواز ریاست ہوا کرتی تھی لیکن ریاست کی حیثیت سے اس کا وجود بتدریج ختم ہوتا چلا گیا اور اب یہ ریاست محض ایک ضلع بن کر رہ گئی تھی۔

سار سا زیادہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن چند تفریح گاہوں کی وجہ سے اسے دور دور تک خاصی شہرت حاصل تھی۔ شہر کے نواح میں ایک بہت بڑی اور خوب صورت ٹیٹھ پانی کی جھیل تھی جسے چاروں طرف سے سبزے، بھجور اور ناریل کے

درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں رہائش کے لیے ہمارے بھی اتنے اور چند رہنورض بھی جمیل کا ایک نصاب جو ایک جنگ سی کھڑی کی طرح جنگ میں دور تک چلا گیا تھا، پھل کا شکار کھیلنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرف کشمیر وغیرہ نہیں جاتی تھیں۔

اس جمیل کے علاوہ چند قدیم تاریخی عمارتیں بھی تھیں جو سیاحوں کے لیے اپنے اندر خاصی کشش رکھتی تھیں۔ ان میں دو عمارتیں سب سے زیادہ اہم تھیں۔ ایک جین مندر اور دوسرا سارکا پیل۔ کسی مہاراجا کا یہ محل عرصے تک ویران رہا تھا اور اب یہاں ایک شان دار ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔

جمیل اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ سارکا کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ وہ شکار گاہ بھی جو شہر کے نواح سے شروع ہو کر میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا تنگیاں اور خوفناک جنگل تھا جو ایک طرف کوٹ پل اور دوسری طرف الور تک پھیلا ہوا تھا۔

میلوں دور تک پھیلے ہوئے اس جنگل میں بے ضرر جانوروں کے علاوہ ٹیل گائے، ہرن، بارہ سنگھ، سا بھڑ، رچھ، چیتے اور شیر جیسے خوفناک ورنڈے بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔

شکار کے شوقین دور سے شکار کھیلنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ کوئی شکار کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور کوئی خود ان خوں خوار درندوں کا شکار ہو جاتا۔

سارکا بے پور دہلی نیشنل ہائی وے پر واقع ہے۔ جے پور سے اس کا فاصلہ ایک سو پانچ اور دہلی سے دو سو کلومیٹر ہے جبکہ الور نامی قصبہ صرف پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

سارکا سے ایک سڑک کوٹ پل تک بھی چلی گئی ہے۔ تقریباً پچاس کلومیٹر تک یہ سڑک اس خوفناک جنگل میں سے گزرتی ہے۔ ندی نالوں کے علاوہ اس جنگل میں ایک چھوٹی سی جمیل بھی ہے جس کے کنارے مابی گھروں کی مختصر سی بستی ہے۔ چھیلیوں کے علاوہ یہ مابی گھر بے ضرر قسم کے جانور بھی پکڑ لیتے ہیں جنہیں شہر میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ ان مابی گھروں کا ہی حوصلہ ہے جو اس جنگل میں خوں خوار درندوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی اس جنگل میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ہم صبح چھ بجے جے پور سے روانہ ہوئے تھے۔ روپ متی کی بچاؤ میں اگلی سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ پچیس سیٹ پر

روپ متی، ایک اور ایسی ہی تھی۔ آخری سیٹ پر ٹھاکر کا ملازم شکرار بھگت بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑا بہت سامان بھی ان کے پاس رکھا ہوا تھا۔ رات کو ایک سیٹ ٹھاکر نے سنبھال رکھی تھی۔ اگرچہ ایک خطرناک مشن پر جا رہے تھے لیکن دیکھنے والا کہہ سکتے تھے کہ ہم بالکل سمانے جا رہے ہیں۔

کالی کے پرانے مندر میں رامو اور اس کے ساتھیوں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ہم تین دن اور سب پوری رات رہے تھے۔ اس دوران میں پولیس نے ان لاشوں کا پتہ چلا دیا تھا۔

پولیس نے رام گڑھ جمیل والی سڑک پر واٹر پمپنگ اسٹیشن سے رامو کے ساتھی کرن کو بھی زخمی حالت میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے اگرچہ الزام لگایا تھا کہ رامو اور اس کے ساتھیوں کی ہمت میں میرا اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کا ہاتھ ہے لیکن پولیس نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ اس کی بات کا یقین بھی کیوں کیا جاتا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شکر کا ایک معزز آدمی تھا اور پولیس کو ایک ایسے درندے سے نجات مل گئی تھی جس نے طویل عرصے سے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ پولیس تو ان لوگوں کی شکر گزار تھی جنہوں نے موت کے اس فرشتے کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بہر حال، پولیس کے ریکارڈ میں اس واقعے کی جو رپورٹ لکھی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر شام مندر کے محل کے کمرے رامو اور اس کے ساتھی پکڑے جانے کے خوف سے کالی کے پرانے مندر میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور غالباً اس عورت کی وجہ سے ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا جس نے خوفناک لڑائی کی صورت اختیار کر لی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو مار کر ختم ہو گئے۔

پولیس نے اپنی رپورٹ میں ایک عورت کا ذکر کیا تھا لیکن اس کا نام کہیں نہیں آیا تھا۔ وہ عورت جیہیا بھی تھی اس رات پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی لیکن اس کے بعد نہ جیہیا کا نام سننے میں آیا اور نہ ہی وہ کس دیکھی گئی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ دو دن پولیس کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ مصروف رہا تھا اور بالآخر یہ قضیہ ختم ہونے کے بعد تیسرے دن ہم سارکا جا رہے تھے۔

ایک سو پانچ کلومیٹر کا فاصلہ دو گھنٹوں میں بڑی سہولت سے طے ہو گیا۔ یوں تو سارکا میں سارکا پیل ہوٹل کے علاوہ دو تین ایجنے رہائش ہوٹل، دو گیٹ ہاؤسز اور ایک ڈاک بنگلا بھی تھا لیکن ٹھاکر نے رہائش کے لیے اس ہٹ کو

ترجیح دی تھی جو آبادی اور سڑک سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ اس کے قریب ہی تین چار ہمس اور بھی تھے جو سب کے سب آباد تھے۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں سے یہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ہم نے جس ہٹ میں پڑاؤ ڈالا تھا وہ ٹھاکر کے ایک دوست کی ملکیت تھا۔ ایک ملازم یہاں موجود تھا جسے پہلے سے ہماری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم آئے ہیں یہاں پچیس گے اور ناشتا بھی کریں گے چنانچہ جب ہم یہاں پہنچے تو ناشتا تیار تھا۔

ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں اور ٹھاکر پیدل ہی بلونت سنگھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پچاؤ ہم نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ بلونت سنگھ روپ متی کی اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ہم نے ہٹ سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے جلیوں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کر لی تھی تاکہ فوری طور پر ہمیں شناخت نہ کیا جاسکے۔

رامو کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق بلونت سنگھ کے ساتھ اس کا گرو بھی تھا۔ بدلتی مٹلا جو پنڈت کا بھڑپ بھرے ہوئے تھا اور وہ پنڈت دارا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ دارا کو ہندوستان کے مندر پسند آگئے تھے یہ مندر سونے کی کانیں تھیں، عیاشی کے اڈے تھے اور دارا کسی مندر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا باقی زندگی عیش و عشرت میں گزار سکے۔ اگر پنڈت مولی دھر، دارا کے بارے میں یہ انکشاف نہ کرتا تو مندروں کی طرف میرا دھیان کبھی نہ جاتا اور اب میں نے طے کر لیا تھا کہ اسے کہیں نکلے نہیں دوں گا۔

شہر میں چھوٹے بڑے کئی مندر تھے۔ سب سے بڑا جین مندر تھا جو آبادی کے وسط میں تھا۔ ہم نے فی الحال جین مندر کو نظر انداز کر دیا اور انہیں چھوٹے مندروں میں تلاش کرتے رہے لیکن ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ شام تک ہم ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔

تین دن گزر گئے۔ ہم نے شکر کا کوئی مندر نہیں چھوڑا تھا۔ جین مندر کو بھی چیک کر لیا۔ کئی بچاریوں کو نوٹوں کی ہنگامہ دیکھا کہ کسی ایسی پنڈت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

”ضروری نہیں کہ وہ کسی مندر میں ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہوں۔“ چوتھے روز واپس آنے کے بعد میں کہا۔ اس وقت ہم سب ہٹ کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ایسی صورت میں انہیں تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ ایک نہ ایک دن ہم انہیں کھوج نکالیں گے۔ ہم یہیں رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک ان کا سراغ نہ لگائیں۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”تم لوگوں نے وہ عمارت تو سنا ہوگا کہ جب تک چاراندہ ڈالا جائے، پھل کاٹنے کے قریب نہیں پہنچتی۔“ جاگی نے ہماری گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”کیا کتنا چاہتی ہو؟“ ٹھاکر نے اسے گھورا۔

”چارے کا مطلب چارہ ہی ہوتا ہے۔“ جاگی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کل میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ یعنی چارے کے طور پر۔ مجھے دشواری ہے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے بل سے ضرور باہر نکل آئیں گے۔“

جاگی کی بات دل کو گنتی تھی۔ بس یہی ایک طرفہ تھا جس پر عمل کرنا باقی رہ گیا تھا لہذا یہ طے ہوا کہ کل جاگی ہمارے ساتھ جائے گی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم بڑے کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ ملازم نے آکر بتایا کہ ایک بچاری ہم سے ملنا چاہتا ہے۔ رات دس بجے کسی بچاری کا سن کر میں اچھل بڑا اور پھر میں اور ٹھاکر بیک وقت اپنی اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

وہ بچاری برآمدے میں کھڑا تھا۔ گہرے رنگ کی چادر

**خُدا یانِ حُسن**

مضبوط چاند

خدیجہ صورت سرفروز

نیر غائب سون اور داغ

ان چار خدا یانِ حُسن کی زندگی سے وابستہ چونکا لینے والے راز!

320 صفحات

قیمت 200 روپے \* ڈاک کے 25 روپے

طلبہ اور شائقین ادب کے لئے بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب

اس کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ گلے میں مونے موتیوں کی مالا مالتھے پر نقشہ۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑے ہوئے تھے۔ مونچھوں کے بال بھی داڑھی کے بالوں سے اس طرح لمبے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ سامنے جوڑ دیے۔

”آپ کو ایک پنڈت اور اس کے چیلے کی تلاش ہے مہاراج۔“ وہ بولا ”میں ایک ایسے ہی پنڈت کی خبر لایا ہوں جو اپنے چیلے کے ساتھ چند روز پہلے یہاں آیا تھا۔ وہ بہت گیان وھیان والا پنڈت ہے۔“

”ہاں ہاں۔ ہمیں اسی کی تلاش ہے۔ کہاں ہے وہ؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

پجاری اس کا پتا بتانے کے بجائے ادھر ادھر کی مارنے لگا۔ میں سمجھ گیا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”وہ پنڈت اپنے چیلے کے ساتھ یہاں سے چار کوس دور دھول پور میں کالی کے مندر میں ملے گا۔“ پجاری نے سو کا نوٹ منہ میں دبائے ہوئے کہا۔

”کیا اس وقت بھی وہ مندر میں ہو گا؟“ یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا۔

”نہیں مہاراج۔“ پجاری نے جواب دیا ”اس کا اصل آستانہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ شام ہونے سے ذرا پہلے وہاں آتا ہے اور دو تین گھنٹوں بعد کہیں اور چلا جاتا ہے۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔“

”دھننے واد (شکریر) مہاراج۔“ ٹھاکر نے کہا ”وہ واقعی بہت گیان وھیان والا پنڈت ہے۔ مہاراج۔ وہ جس کے سر پر ہاتھ دھرتا ہے اس کے من کی آشا (خواب) تنہا آواز (ضرور) پوری ہوتی ہے۔ ہم اسی لیے اس کی تلاش میں ہیں۔“

پجاری چند لمحوں ہماری طرف دیکھ کر رہا پھر ”ہری اوم۔ ہری اوم۔“ تارائن۔ تارائن کی آواز لگتا ہوا چلا گیا۔

اس رات ہم دویر تک گیان وھیان والے اس پنڈت اور اس کے چیلے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ دارا اور بلونت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ انہیں چھپنے کے لیے کسی ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی جہاں کسی کا دھیان نہ جائے۔

گلے روز سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے میں اور ٹھاکر پجاری پر روانہ ہو گئے۔ جاگتی بھی ضد کر کے ہمارے ساتھ ہوئی تھی۔

یہ علاقہ تھور، کھجور، بھول اور دیگر کانٹے دار جھاڑوں سے بنا ہوا تھا۔ پجاری ہم نے دھول پور نامی اس علاقے میں تقریباً نصف میل دور جھاڑوں میں چھوڑ دی اور کپڑے دار پر پیدل آگے چلے رہے۔

وہ بہت سی چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ کالی کپڑے بستی کی دوسری طرف تھا۔ بستی میں داخل ہوئے تو وہاں عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بستی کے ایک کونے دیہات (اقبال) ہو گیا تھا اور اس کے کمریا کرم (نور رسوات) کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فضا میں سوگوار کی کانٹیاں نمایاں تھیں۔

ہم کالی کے مندر کی طرف پہنچے تو پتا چلا کہ وہ گیان وھیان پنڈت اپنے چیلے کے ساتھ شیشان گھاٹ کی طرف گیا ہے جہاں وہ اپنی نگرانی میں چتا تیار کروا رہا ہے۔

شیشان گھاٹ مندر سے ذرا آگے تھا۔ ہم اس طرز جا کر جھاڑوں میں چھپ گئے۔ سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے جن میں دو پنڈت بھی تھے۔ ان میں ایک تو وہی کپڑے وھیان والا پنڈت تھا اور دوسرا اس کا چیلہ۔ انہیں دیکھ

ہمیں بڑی باؤسی ہوئی۔ گیان وھیان پنڈت چھوٹے قد کا بھاری بھر آوی تھا۔ توند ٹٹکے کی طرح لنگی ہوئی تھی۔ وہ دارا پر گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا چیلہ قد میں چھ فٹ سے ٹکٹا ہوا تھا۔ اس بھی بلونت ٹکھ ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اچانک کسی لڑکی کی چیخوں کی آواز سن کر ہم چونک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بستی کی طرف سے ارٹھی کا جلوس آ رہا تھا اور ایک لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی۔ دو آدمیوں نے انہیں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ارٹھی کا جلوس ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ شاید گاؤں کے سب ہی لوگ اس میں شامل تھے۔ میں نے سامنے گزرتی ہوئی اس لڑکی کو بھی دیکھا جسے دو آدمیوں نے گریز میں لے رکھا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لڑکی تھی۔ اس عمر میں مشکل سترہ سال ہوئی۔ اس نے ولنتوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ عورتیں ارٹھی کے ساتھ شیشان گھاٹ نہیں جاتیں اور پھر اس لڑکی نے ولنتوں جیسا لباس کیوں پہن رکھا تھا؟

”اس عورت کا پتی (شوہر) مر گیا ہے۔ اسے بھی تپا جا رہا ہے۔“ ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ستی۔ میں کانپ اٹھا۔ ہندوؤں کی یہ بڑی گناہی ر

مرنے والے پتی کے ساتھ اس کی پتی (بیوی) کو بھی چتا میں زندہ جلا دیا جاتا تھا لیکن اس ظالمانہ رسم پر پابندی لگا کر اسے شیشان گھاٹ کی طرف دیکھا رہا۔

مرنے والے کی لاش کو چتا پر رکھ دیا گیا تھا اور اب ولنتوں کے لباس میں اس لڑکی کو چتا پر رکھنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ لڑکی بری طرح جھاڑوں کی کھاری تھی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ بیگوان کے واسطے دے رہی تھی لیکن کسی پر اس آہ و فغاں کا اثر نہیں ہوا۔ پانچ چھ آدمیوں نے مل کر اسے زمین پر رکھے ہوئے لوہے کے اس فریم پر لٹا دیا جس پر پانچ میں لوہے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

فریم لڑکی ہاتھ پیر چلا رہی تھی لیکن پانچ چھ آدمیوں کے سامنے وہ بے بس ہو گئی۔ اس کو پٹوں والے آہنی فریم پر جت لٹا کر اس کے ہاتھ پیر سیوں سے باندھ دیے گئے اور اس کے جسم پر بھی کئی رسیاں لپیٹ دی گئیں تاکہ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دے سکے۔

لڑکی کی چیخیں آسمان کی خبر لارہی تھیں اور جب اسے اٹھا کر اس کے پتی کی لاش کے پہلو میں چتا پر لٹا دیا گیا تو اس کی چیخیں کچھ اور بلند ہو گئیں۔

ایک آدمی نے بھی کانٹہ لاش اور اس لڑکی پر انڈیل دیا اور پھر ان کے اوپر لکڑیاں رکھی جانے لگیں۔ اس طرح چتا خاصی اونچی ہو گئی۔ لکڑیوں پر بھی کھجور کے قشر انڈیلے گئے۔ اس دوران میں لڑکی بدستور بری طرح چیختی رہی۔

اور پھر اچانک ہی دھول بجنے لگے اور وہ شاید لڑکے کا باپ تھا جس نے چتا کو آگ لگائی تھی۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ خشک لکڑیاں جھنکنے لگیں۔ لڑکی کی چیخوں کی آواز دھول کی آواز سے بھی تیز تھی۔ میں متحش نظروں سے چتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چتا کے اندر لکڑیوں میں پھنسل سی بھی۔ آگ نے اس لڑکی کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا اور شاید اس نے آخری مرتبہ پوری قوت استعمال کر کے اپنی بندھنیں توڑنے کی کوشش کی تھی اور وہ فریم سمیت الٹ کر پتی کی لاش پر جا گری تھی۔

دھول کی آواز میں اس کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ لڑکی کی چیخیں معدوم ہوتی گئیں اور اب وہاں صرف لکڑیوں کے جھنکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ جاگتی موجود نہیں تھی۔ گاؤں کے لوگ اب بھی چتا کے چاروں طرف جمع تھے۔ دھول بج رہے

تھے اور لوگ ناچ رہے تھے۔ ٹھاکر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم جھاڑوں سے نکل کر اس طرف چل پڑے جہاں ہماری پجاری کھڑی تھی۔ جاگتی پجاری سے ٹیک لگائے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ وہ شاید اس وقت بھاگ آئی تھی جب اس لڑکی کے ہاتھ پیر باندھے جا رہے تھے۔

”حیرت کی بات ہے۔“ میں نے پجاری میں بیٹھے ہوئے کہا ”ایک عورت کو زندہ جلا دیا گیا اور کسی نے پجانے کی کوشش نہیں کی۔“

”اگر کوئی بیجانے کی کوشش کرتا تو اسے بھی چتا میں پھینک دیا جاتا۔“ ٹھاکر نے انجمن اشارت کرتے ہوئے جواب دیا۔

واپسی پر چار کوس کا فاصلہ جلد ہی طے ہو گیا۔ شرمیں داخل ہوتے ہی ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر طرف غلغلہ مچا ہوا تھا۔ خوف زدہ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

اور یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز تھا کہ گنگولی چوہدری کے گمروہ نے شہر کے شمالی علاقے پر حملہ کر دیا تھا اور وہاں گیسٹ ہاؤسز اور ہسپتال میں گھبرے ہوئے سیاحوں کا اغوا کر کے لے گیا تھا۔

ہمارا ہٹ بھی اسی علاقے میں تھا۔ ٹھاکر نے پجاری کی رفتار بڑھا دی اور ہٹ کے سامنے گاڑی روکی تو ہمارے بدترین خدشات درست نکلے۔

ہٹ کے سامنے کئی پولیس والے جمع تھے۔ ہمارے ہٹ کا ملازم ذمہ ٹھی تھا اور روپ منی بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔

ہمیں دیکھ کر روپ منی دوڑتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئی اور اس نے جو انکشاف کیا وہ بہت سنسنی خیز تھا۔ گنگولی چوہدری کے آدمی ہمارے قریبی ہسپتال سے دوسرے چند سیاحوں کے ساتھ بھلا کر بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔



میرے آس پاس کہیں ہم کا تھا ہوتا تو اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس خبر سے ہوا تھا۔

روپ متی نے یہ خبر دوتے ہوئے سنائی تھی۔ اس کی پوری بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ تاہم اس کے ٹوٹے پھوٹے جملوں سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا تھا کہ گنگولی چوہدری نامی کوئی شخص اسے گروہ کے ہاتھ میاں وارہوا تھا۔ انہوں نے پہلا فائرنگ کر کے لوگوں کو ہراساں کیا اور پھر گیسٹ ہاؤس اور قریب قریب واقع اور پارکس کو گھیرے میں لے کر یہاں گھسے ہوئے تمام سیاحین کو ایک جگہ پر جمع کر لیا تھا اور انہیں بمیز بکریوں کی طرح ہانکتے اور مارنے ہوئے جنگل کی طرف لے گئے تھے اور انہوں کے اس ریوڑ میں ہماری بیل بھی شامل تھی۔

روپ متی کے حواس بحال ہوئے ہیں نے ایک بار پھر اس سے اس سانحہ کی تفصیل پوچھی۔

”تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے کی بات ہے۔“ وہ دہرای تھی ”میں کچھ چیزیں لینے کے لیے بازار جا رہی تھی۔ میں نے بھلا کو بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔“

”میں بازار میں شاپنگ کر رہی تھی کہ اچانک گولیاں چلنے کی آواز سنائی دینے لگیں۔ اس نے دو منٹ بعد بازار میں شور مچ گیا کہ گنگولی چوہدری نے حملہ دیا ہے۔“

”لوگ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ میں جس دکان میں کھڑی تھی وہاں چند گاہک اور بھی تھے۔ دکان دار نے شکر ادا کیا۔ اس طرح ہم بھی اندر بند ہو گئے۔“

”بازار منساں ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے تک کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ تاہم دور سے وقفہ وقفہ سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور بالآخر یہ آوازیں بھی بند ہو گئیں۔“

”بازار میں لوگوں کی آوازیں سن کر دکان دار نے شکر ادا کیا۔ پون گھنٹے تک دکان میں بند رہنے سے میرا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میرے کپڑے پسینے میں بیگ کر میرے بدن سے چپک گئے تھے۔ دوسرے لوگوں کی بھی یہی حالت تھی۔“

”میرے حواس بحال ہوئے تو لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ گنگولی چوہدری نامی ڈاکو کے گروہ نے شہر کے شمالی علاقے میں واقع نیٹ ہاؤس اور ہٹس پر حملہ کیا تھا اور وہاں مقیم کئی سیاحوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔“

”میں ایک بار پھر حواس باختہ ہی ہو گئی اور واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔ مجھے بھلا کی فکر تھی اور جب میں یہاں پہنچی تو

برے بدترین اندیشہ درست نکلتا۔ بھلا اپنے ہٹ سے غائب تھی۔“

”میں اسے ادھر ادھر تلاش کرتی رہی۔ میرا خیال تھا شاید وہ بچنے کے لیے کہیں چھپ گئی ہو۔ ہمارے اسی طرز والے ہٹ میں ایک کچھ فیلکی گھری ہوئی ہے۔ سردار جی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکو اس کے سینے اور ہٹ کو لے گئے ہیں۔ اس نے ہماری بھلا کو بھی دیکھا تھا جسے ڈاکو ہٹ سے گھٹیتے ہوئے باہر لے آئے تھے۔“

”ہمارے ملازم پر کاش نے مزاحمت کی کوشش کی؟“

رائٹل کا ہٹ مار کر اسے زخمی کر دیا۔ تیسرے ہٹ میں بھی ایک آدمی نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

”پولیس آدھے گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ اس وقت تک ڈاکو لوگوں کو لے کر یہاں سے ہٹ دور جا چکے تھے۔ اپنا بھلا کایا ہو گا؟ وہ لوگ مار ڈالیں گے۔“

”فکر نہ کرو روپ متی۔“ میں نے کہا ”ہو سکتا ہے پولیس کی کوئی پارٹی ان کے تعاقب میں گئی ہو۔ پکڑ لیں گے۔“

میں نے ہٹا کر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات پتا رہے تھے جیسے اس خبر نے اسے بھی ہلکا کر دیا ہو۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر ان پولیس والوں کی طرف بڑھ گیا جو بوڑھے سردار جی سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ سردار جی کی بوڑھی بیوی دھڑائیں مار مار کر رو رہی تھی۔ کچھ اور لوگ بھی رو رو کر انسپکٹر سے بار بار یہ سوال کر رہے تھے کہ پولیس نے ان ڈاکوؤں کا پیچا کیوں نہیں کیا!

ہٹا کر انسپکٹر کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ اس نے اپنے تعارف کرایا تو انسپکٹر کچھ سرعوب سا ہو گیا اور پھر انسپکٹر نے جو کچھ بتایا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

انسپکٹر کے کہنے کے مطابق ڈاکو گنگولی چوہدری کے گروہ نے بہت عرصے سے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا علاقہ اور اور جنگل کی دوسری طرف کوٹ چا تک پھیلا ہوا ہے۔ ان شہروں کے بیچ میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں اور گاؤں آئے دن اس کی لوٹ مار کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

گنگولی چوہدری بہت بے رحم اور بھیڑیا صفت انسان ہے بلکہ انسان نہیں درندہ ہے۔ وہ بات بعد میں کرتا ہے پہلے چلاتا ہے۔ اور کی طرف چھوٹی چھوٹی پھاڑیاں اور

سارے گاؤں میں دوڑ تک پھیلا ہوا جنگل اس کا مسکن ہے۔ ہر واردات کے بعد یا تو وہ جنگل میں ردپوش ہو جاتا ہے یا ان پھاڑیوں میں پناہ لیتا ہے۔ ان پھاڑیوں میں لاتعداد غار تھے جن میں فوج کی پوری رجمنٹ بھی چھپ جاتی تو اسے تلاش کرنا ممکن نہ ہو۔ اس کے علاوہ راستے اتنے دشوار تھے کہ پولیس ان کے تعاقب میں ان پھاڑیوں میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی اور نہ ہی پولیس کے جوان سارے گاؤں کے جنگل میں ان ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ جنگل میں ڈاکوؤں کے ساتھ خوں خوار درندوں کا بھی خوف ان کے قدم روک لیتا تھا۔

چند روز پہلے گنگولی چوہدری کا گروہ پولیس کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ کئی گھنٹوں کے زبردست مقابلے کے بعد ڈاکو پولیس کا گھیرا تو ڈر کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم ایک ڈاکو زخمی ہو کر پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔

مگر قاتر ہونے والا ڈاکو گنگولی چوہدری کا چھوٹا بھائی چڑا تھا۔ گنگولی چوہدری نے دھمکی دی تھی کہ اگر چڑا کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اس شہر کو آگ لگا دے گا۔

اس واردات کے بعد گنگولی چوہدری اور کی پھاڑیوں کی طرف فرار ہو گیا تھا۔ پولیس چند روز تک جو کس رہی تھیں گنگولی کی طرف سے کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تو شہر کے اطراف سے پھرا ہوا پولیس کے اعلیٰ افسران کا خیال تھا کہ شہر کو آگ لگا دینے کی دھمکی محض عمدہ دھمکی تھی اور گنگولی اب طویل عرصے تک پھاڑیوں سے نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

لیکن پولیس افسران کا خیال غلط نکلا۔ گنگولی چوہدری اپنے بھائی کو نہیں بھولا تھا۔ آج اسے موقع مل گیا۔ گنگولی چوہدری نے جس طرح کارروائی کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا تھا۔ اس کے آدمی بھگس بدل کر کئی روز تک شہر کی صورت حال کا جائزہ لیتے رہے تھے۔

آج اس کے آدمی صبح سے دہائیوں کے بھیس میں شہر کے مختلف علاقوں میں موجود تھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مقررہ وقت پر شہر کے شمالی علاقے میں اس جگہ جمع ہو گئے جہاں ایک گیسٹ ہاؤس اور یہ چار ہٹس تھے جن میں سے ایک میں ہم موجود تھے۔ چند بھیس اور بھی تھے لیکن وہ تقریباً دوسو گز کے فاصلے پر تھے۔

گنگولی چوہدری کے آدمیوں نے گیسٹ ہاؤس اور ہٹس کو گھیرے میں لے کر فائرنگ شروع کر دی اور یہاں ٹھہرے

ہوئے تمام سیاحوں کو باہر نکال کر ایک جگہ جمع کر لیا۔ ہمارے ہٹ کے ملازم نے مزاحمت کی تو اسے رائفل کا ہٹ مار کر زخمی کر دیا۔ ایک اور آدمی نے مزاحمت کی تو اسے گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

گنگولی چوہدری کے آدمی یہاں سے تیرہ سیاحوں کو مارنے پہنچے اور بمیز بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے جنگل کی طرف لے گئے۔ ان میں پانچ عورتیں اور آٹھ مرد تھے۔ دو لڑکیاں غیر شادی شدہ تھیں۔ ان میں ایک ہماری بھلا اور دوسری الہ آباد سے آئی ہوئی ایک فیلکی کی لڑکی تھی۔ وہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی اور اس کی عمر بیس ایس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ہم شہر سے چار پانچ میل دور دھول پور نامی اس بستی کے شیشاں گھاٹ میں لڑکی کے سنی ہوئے گاؤں دلوں منظر دیکھ رہے تھے اور اب سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس طرح ڈاکوؤں کو وہاں سے گئے ہوئے دھمکے ہوئے چلے گئے۔

ڈاکو بوڑھوں کو چھوڑ گئے شاید اس لیے کہ وہ بھاگ دوڑ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ روپ متی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت بازار گئی ہوئی تھی اور بھلا کی بد قسمتی کہ وہ ہٹ میں موجود تھی۔

گنگولی چوہدری پولیس اور دیگر حکام کے لیے یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی چڑا کو نہ چھوڑا گیا تو چوتھے دن وہ تمام مغویوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اور پولیس کو یہ پیغام مل گیا تھا۔

”لو دیکھو۔“ بوڑھا سردار جی کہہ رہا تھا ”وہ ڈاکو یہاں سے تیرہ بندوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر لے گئے اور پولیس کچھ بھی نہ کر سکی۔ کم از کم ان کا پیچھا کیا ہوتا۔“

”پولیس تو تین شہریوں پر لائیاں اور گولیاں برسائی ہے۔ ڈاکوؤں کا سامنا کرتے ہوئے انہیں موت آتی ہے۔“

ایک اور شخص نے کہا ”اگر ہمارے بندوں کو کچھ ہو گیا تو ہم اس شہر کو آگ لگا دیں گے۔“

انسپکٹر گھور گھور کرب کو دیکھ رہا تھا مگر ظاہر ہے اس کے پاس پھرنے ہوئے ان لوگوں کی باتوں کا کوئی ذاب نہیں تھا۔

”پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا کیوں نہیں کیا آفیسر؟“ یہ سوال ٹھانڈے لگا دیا تھا۔

”ہمیں بہت دیر سے خبر ہوئی تھی ٹھانڈی۔“ انسپکٹر نے جواب دیا ”اس وقت تک ڈاکو یہ غمغیاں کو لے کر جنگل میں

داخل ہو چکے تھے۔

”جنگل میں بھی ان کا پیچھا کیا جاسکتا تھا۔“ ٹھاکر نے اسے گھورا۔

”اس طرح برغالیوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔“ انسپکٹر نے جواب دیا ”اعلیٰ حکام اور پولیس افسران کو اطلاع ہوئی ہے۔ آٹھ بجے سرکٹ ہاؤس میں ان کا گھنڈہ جوڑ ہوا جس میں برغالیوں کو ڈاکوؤں سے چھڑانے کے لیے حکمت عملی طے کی جائے گی۔“

”گویا بے گناہ برغالی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر رہیں گے۔“ ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو اب بھی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر ہیں۔“ انسپکٹر نے تپ کر جواب دیا ”اس وقت ہم کیا کر سکتے ہیں۔ رات کے اندر میرے میں تو اس خطرناک جنگل میں داخل نہیں ہوا جاسکتا جس میں ان ڈاکوؤں کے علاوہ خوفناک، درندے بھی ہیں۔“

انسپکٹر کے اس جواب سے وہ شخص بھی تپ گیا اور اس نے انسپکٹر کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”اگر ہمارے آدمیوں کو کچھ ہوا تو ہم کسی پولیس والے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ شخص غرایا۔ انسپکٹر کسی اور طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتا تو بات لوگوں کی سمجھ میں آجاتی مگر انسپکٹر کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو تھپڑ رسید کر دیا۔ دوسرے تین پولیس والوں نے کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تو لوگوں نے انہیں بھی بیٹھا شروع کر دیا۔

صورت حال بگڑ رہی تھی۔ میں نے اور ٹھاکر نے بڑی مشکل سے انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں کو لوگوں سے چھڑایا اور انہیں وہاں سے رخصت کر دیا۔

لوگ سردار جی والے ہٹ کے سامنے جمع ہو گئے اور ہم اپنے ہٹ کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زخمی ملازم کو پولیس والوں کے ساتھ اسپتال بھیج دیا گیا تھا اور تیسرے ہٹ کے سامنے پڑی ہوئی لاش بھی اٹھائی گئی تھی۔ اس ہٹ کی طرف سے بین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ صورت حال خاصی گھبر ہو گئی تھی۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مجھے شکر اور بھگت کا خیال آگیا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں۔ بھگت اور شکر؟“ میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دونوں ڈاکوؤں کے حملے سے آدھا گھٹنا پلے جنگل والے ریسٹورنٹ کی طرف گئے تھے۔ ڈاکوؤں کے فرار کے

بعد اس طرف سے بھی گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پتا نہیں۔ وہ لوگ کہاں ہیں؟“ روپ متی نے جواب دیا۔

میں ایک جھنجکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ مجھے اس طرف بھی پتہ نہ پڑا کہ وہ کہاں سے آئے۔ میں گھبرے ہوئے پچھڑی کی طرف آیا۔ چالی انگلیشن ہی میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے انڈر اشارت کیا اور پچھڑی کو گھبرا کر ایک طرف دوڑا دیا۔

تقریباً نصف میل آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جس جگہ سے کوٹ تپکی کی طرف جانے والی سڑک جنگل میں داخل ہوتی تھی وہاں ایک بہت بڑا اوپن ائیر ریستورنٹ بنا دواغہ دینر کھاس کا بہت لمبا چوڑا پلاٹ تھا جس کے گرد پھولوں کے پودے تھے۔ پلاٹ کے ایک کونے میں ریسٹورنٹ کی مختصر عمارت تھی اور سامنے دور دور تک میز کرسیاں چھپی ہوئی تھیں۔ لوگ تفریح کے لیے اس طرف جاتے رہتے تھے۔ چائے کھانا بھی ہوتا اور جنگل کا نظارہ بھی۔ میں دو دن پہلے ٹھاکر کے ساتھ اس طرف جا چکا تھا۔

ریستورنٹ کی روشنیاں دور ہی سے نظر آگئیں اور پھر پولیس کی ایک جیپ بھی دکھائی دی۔ کچھ لوگ بھی جمع تھے۔ میں نے پولیس جیپ کے قریب پچھڑی روک لی اور اتر کر اس طرف دوڑا جہاں پولیس والے اور دوسرے لوگ جمع تھے۔ وہاں کی صورت حال کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔ ریسٹورنٹ کی عمارت کے قریب دو تین جگہوں پر خون کھرا ہوا تھا۔

اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ ڈاکو برغالیوں کو لے کر جب اس طرف آئے تھے تو ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے چند بالوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں ڈاکوؤں نے فائر کھول دیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوشش کرنے والوں میں سے ایک آدمی مارا گیا تھا۔ دو زخمی ہوئے تھے۔ برغالیوں میں سے بھی ایک آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی۔ تھی اسے بھی مار ڈالا گیا تھا۔ ڈاکو ریسٹورنٹ سے ایک اور آدمی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ لاشوں اور زخموں کو اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔

میں نے وہاں پر موجو لوگوں سے شکر اور بھگت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی کچھ نہ بتا سکا۔ من دوبارہ پچھڑی میں بیٹھ گیا اور اسے شکر کی طرف دوڑا دیا۔ اسپتال پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یہاں بھی لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا

آگے پہنچ گیا۔

مجھے پہلے میں نے لاشوں کو دیکھا۔ ان میں نہ بھگت سے نہ شکر کی ایک نرس نے مجھے اس وارڈ میں پہنچا دیا تھا اور نہ شکر۔ ایک نرس نے مجھے اس وارڈ میں بھیست سے لوگ جمع کیا، زخمی پڑے ہوئے تھے۔ وارڈ میں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں زخموں کو دیکھتا ہوا ایک بیڈ کے قریب رک گیا۔

”شکر تھا جس کے سینے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں سمجھا کہ وہ بے ہوش ہے لیکن میں نے ہلے سے ہکا پھاسا اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ بے شکل بول سکتا تھا۔ بہر حال اس کی باتوں سے مجھے پتا چل گیا کہ گنگولی چوہدری کے آدمی بھگت کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ میں شکر سے باتیں کر رہا تھا کہ نرس آگئی۔

”مرضی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوش میں آیا ہے۔ آپ اس سے زیادہ باتیں نہ کریں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے مذہبانہ لہجے میں کہا۔

”اس کی حالت زیادہ تشویش ناک تو نہیں؟“ میں نے نرس سے پوچھا۔

”فکر نہ کریں۔ گولی نکال دی گئی ہے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ بولنے سے اسے تکلیف ہوگی۔“ نرس نے جواب دیا۔

میں شکر کی طرف دیکھتا ہوا وارڈ سے باہر آگیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ شکر شدید زخمی تھا اور بھگت بھی ڈاکوؤں کے ہتھ چڑھ گیا تھا۔

میں پچھڑی کو طوفان کی طرح دوڑاتا ہوا ہٹ پر پہنچ گیا۔ ہٹ کے سامنے پچھڑی روک کر میں جس طرح نیچے اترتا تھا۔ سامنے لان میں بیٹھا ہوا ٹھاکر بہت کچھ سمجھ گیا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے میری طرف آگیا اور مجھے راستے ہی میں روک لیا۔ ”کیا ہوا؟ تم بڑے بدحواس ہو رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”بات ہی ایسی ہے ٹھاکر۔“ میں نے جواب دیا ”شکر زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے اور بھگت ڈاکوؤں کے ہتھ چڑھ گیا ہے۔“

ٹھاکر کا چہرہ بھی خنجر ہو گیا۔ ہم چند لمحے وہیں کھڑے رہے پھر جاگے اور روپ متی کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ ان سے کچھ چھپانا بے کار تھا۔ جلدیادیر انہیں پتا چل ہی جاتا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب پچھڑی میں سوار اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ ہٹ کو مارا لگا دیا گیا تھا۔ ٹھاکر نے ڈاکٹر سے مل کر شکر کے بارے میں تفصیل

سے معلومات حاصل کیں اور اسے وارڈ سے برائٹیوٹ روم میں منتقل کروا دیا۔ جاگتی اور روپ متی کو شکر کے پاس چھوڑ کر ہم سرکٹ ہاؤس کی طرف چلے گئے جہاں آٹھ بجے انتظامیہ کے حکام اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی میٹنگ ہونے والی تھی۔

سرکٹ ہاؤس کے سامنے بھی لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ جن لوگوں کے بندوں کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے وہ پولیس اور انتظامیہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

گھٹ پر متعین دو پولیس والوں نے ٹھاکر کو روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ انہیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ ہم سرکٹ ہاؤس کے اندر تو آگئے لیکن ہمیں اس کمرے میں نہیں جانے دیا گیا جہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ ہم لابی میں بیٹھ گئے جہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

رات گیارہ بجے میٹنگ ختم ہوئی۔ ٹھاکر نے ڈپٹی کمشنر کو گھیر لیا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ٹھاکر کو جانتا تھا۔

”اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا ٹھاکرجی۔“ ڈپٹی کمشنر نے بتایا ”رات کے وقت تاریک جنگل میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ ہم نے بے پور سے پولیس کی مزید نفری منگوائی ہے۔ امید ہے کہ یہ نفری رات کو کسی وقت پہنچ جائے گی اور صبح جنگل میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا جائے گا۔“

”آپ جانتے ہیں صورت حال کتنی نازک ہے۔“ ٹھاکر نے کہا ”وہ ڈاکو اب تک پانچ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ برغالی ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ ان بے چاروں کا کیا حال ہوگا اور یہاں جو ان کے عزیز و اقارب ہیں ان کی حالت تو دیکھیں۔“

”میں صورت حال سے پوری طرح واقف ہوں۔“ ڈپٹی کمشنر نے کہا ”لیکن اس وقت کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“ ڈپٹی کمشنر باہر نکلا تو لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ انہیں بھی یہی کہہ کر تسلی دی گئی کہ صبح ہوتے ہی ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے گی۔

ہم اسپتال پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ شکر کی حالت کسی قدر تسلی بخش تھی۔ ٹھاکر نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم جاگتی اور روپ متی کو لے کر واپس آ گئے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ آس پاس کے تینوں ہسپتال اور گیسٹ ہاؤس میں بھی لوگ جاگ رہے تھے۔ ظاہر ہے اس سانحے کے بعد نیند کس کو آئی۔

اس بنائے میں ہم رات کا کھانا بھی بھول گئے تھے۔ کسی کو ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ اس وقت جاگی جائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی چھیکوں کے ساتھ ہم صورت حال پر تبصرے بھی کرتے رہے۔

یوں تو بھگت اور ہلا کے اغوا کا سب ہی نے اثر لیا تھا۔ بلا پہلے چند روز کے دوران میں جاگی سے کچھ زیادہ مانوس ہوئی تھی۔ اس کے فراق میں رو رو کر جاگی کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ روپ متی بھی دیر تک روئی رہی تھی۔ ٹھاکر نے بھی اس کا بہت اثر لیا تھا لیکن میری حالت ان سب سے ابتر تھی لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیت کا زیادہ اظہار نہیں کیا تھا۔

ملا سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن نجاب نے کیا بات کہی کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں ایک عجیب سی کک محسوس کرنے لگا۔ اس کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ پتا نہیں ان ڈاکوؤں نے اس کا کیا حشر کیا ہو گا۔

رات آنکھوں میں بیت گئی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو میں قریبی ڈھابے (چھپرہ ہوسل) سے ڈبل روٹی لے آیا۔ جاگی نے چائے تیار کر لی۔ ہم نے انساہید خاٹا شاکیا اور سرکٹ ہاؤس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

باہر نکلے تو دوس میں رہنے والے بوڑھے سردار جی نے بتایا کہ وہ ابھی سرکٹ ہاؤس سے ہو کر آیا ہے۔ پولیس کی نفری جنگل والے ریٹورنٹ (جنگل ریٹورنٹ) کے قریب جمع ہے اور بعض اعلیٰ افسران بھی وہیں موجود ہیں۔

وہ سردار جی بھی وہاں جانا چاہتے تھے۔ ہم نے انہیں بھی پکار دیے۔ بٹھالیا اور دوس منٹ بعد جنگل ریٹورنٹ کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ بے پور سے رات ہی کو پولیس کی بھاری نفری پہنچ گئی تھی اور پولیس کے مسلح جوان جنگل کے ساتھ ساتھ دو دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس مشن کا انچارج انسپکٹر نوڈو پانڈے تھا اور مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ پولیس کی کوئی پارٹی ابھی تک جنگل میں داخل نہیں ہوئی تھی اور پھر اس کی وجہ بھی سمجھ میں آئی۔

گنگولی چوہدری نے جنگل کی ایک بستی کے رہنے والے ایک دیہاتی کے ذریعے پولیس کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر ان کا پتہ چپا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ تمام غریبوں کو ہلاک کر دیں گے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دہرائی تھی کہ اگر تین دن کے

اندر اندر اس کے بھائی چڑا کو رہا نہ کیا گیا تو یہ غریبوں کے جیون (زندگی) کی ضمانت نہیں دی جائے گی اور اس دھمکی سے مرعوب ہو کر پولیس پارٹی جنگل میں داخل نہیں ہوئی تھی۔

لوگوں نے ابھی وہیں ڈیرے جمادیرے۔ جنگل کے کنارے کنارے مسلح کاغذ بیل اس طرح تعینات تھے جیسے حکام کو یقین ہو کہ ڈاکو ختم ہوئے جنگل سے باہر آئیں گے تو انہیں پکڑ لیں گے۔

دوپہر کے وقت تک بار بار افسران سے لوگوں کی تہزہیں ہوتی رہیں اور پھر چھ آدمی رضا کارانہ طور پر جنگل میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ پولیس نے انہیں بڑی مشکل سے روکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی اطلاع کر رہا تھا۔

”آپ لوگ یہ غریبوں کے جیون بھی خطرے میں ڈال رہے ہیں۔“ ڈپٹی کمشنر نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”گنگولی چوہدری انسان نہیں درندہ ہے۔ اسے جیسے ہی پتا چلے گا کہ کوئی پارٹی اس کے تعاقب میں جنگل میں داخل ہوئی ہے تو وہ یہ غریبوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔“

”ہم اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لیے گنگولی چوہدری کو ڈنڈ دینے کو تیار ہیں۔“ ایک آدمی نے کہا ”ہم دو آدمی جنگل میں جائیں گے اور گنگولی چوہدری کو تلاش کر کے اسے ڈنڈ (ٹاوان) کی پینکشن کریں گے۔ دولت ہی ان ڈاکوؤں کا وھرم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری پینکشن مان لے گا اور ڈنڈ لے کر ہمارے آدمیوں کو چھوڑ دے گا۔“

”یہ آپ لوگوں کی خوش فہمی ہے۔“ ڈپٹی کمشنر نے کہا ”اس کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ وہ اپنے بھائی کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔“

”تو پھر اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا جاتا۔“ ایک آدمی بولا ”کیا ایک ڈاکو ان تیرہ آدمیوں سے زیادہ جیتی ہے کہ آپ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے؟“

”آپ لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ ڈپٹی کمشنر بولا ”گنگولی چوہدری کے گروہ نے طویل عرصے سے اس علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ وہ درختوں بے گناہوں کو قتل کر رہا ہے۔ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی ہیں اس نے۔ لوگ خوف و ہراس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ اس کے گروہ کا کوئی آدمی پکڑا گیا ہے اور وہ بھی اس کا بھائی۔ ہم اسے کھینچنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔“

”اور اس کے لیے آپ لوگوں نے تیرہ بے گناہوں کی

زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔“ اس آدمی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ”میری گشتا (مشورہ) ہے کہ آپ خود اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے آپ کو ڈاکوؤں کے حوالے کر کے ہمارے آدمیوں کو چھڑا دیں اور اس کے بعد آپ لوگ اختیار کرتے رہیں کہ گنگولی چوہدری کھینچتا ہے یا نہیں۔“

ڈپٹی کمشنر اسے گھور کر رہ گیا۔ بات بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ دو آدمی دو سادہ لباس پولیس والوں کے ساتھ جنگل میں جائیں گے اور گنگولی چوہدری سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ ڈنڈ لے کر یہ غریبوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا تو ٹھیک۔ بصورت دیگر پولیس کوئی نئی حکمت عملی اپنائے گی۔

وہ لوگ دو بجے کے قریب جنگل میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس صرف ایک رائفل تھی۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اگر کوئی درندہ راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ اگر سب کے پاس رائفلیں ہوتیں تو ہو سکتا ہے ڈاکو سمجھتے کہ پولیس انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہی ہے اور وہ کسی وارنٹ کے بغیر ان پر فائر کھول دیں۔

ہم لوگ شام تک وہاں رہے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکوؤں سے رابطہ کرنا مشکل ہو گا۔ بے جنگل ملیوں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکوئیں سے کہیں نکل گئے ہوں گے اور ڈاکوؤں سے پہلے اگر کسی درندے سے ان کی ملاقات ہو گئی تو شاید ہی ان میں سے کوئی زندہ بچ کر واپس آسکے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان کی دایہی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو ہم اپنے ہٹ میں واپس آ گئے۔ بعض لوگ وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے رات وہیں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔

ٹھاکر ہمیں ہٹ میں چھوڑ کر بازار کی طرف چلا گیا۔ اس کی دایہی تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہوئی تھی۔ وہ کسی ہوٹل سے کھانے لے کر آیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ہٹ کے سامنے لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب والے تیوں ہٹ اور گیسٹ ہاؤس بھی اگرچہ آباد تھے مگر خاموشی ایسی تھی کہ جیسے وہاں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ کل کے واقعے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بعض لوگ تو شہر کے ہوٹلوں میں منتقل ہو گئے تھے۔ جو لوگ ان ہٹس اور گیسٹ ہاؤس میں رہ گئے تھے ان پر بھی خوف طاری تھا۔

ہم آدھی رات تک لان میں کرسیوں پر ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔

گنگولی چوہدری کا گروہ اور یہ غمناں۔

مجھے امید نہیں تھی کہ گنگولی چوہدری یہ غریبوں کی رہائی کے لیے نقد آواؤں کی پیشکش قبول کرے گا۔ اس ۵ ہینی پولیس کی حراست میں تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسے ڈاکوؤں اور بدعاشوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ دوسروں کو تو یہ لوگ کاجر مولیٰ کی طرح کاٹ دیتے تھے۔ کسی کی زندگی کو زندگی نہیں سمجھتے تھے۔ جلتے پھرتے انسان کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان کے لیے معمولی بات تھی لیکن جب اپنے آپ پر بڑتی ہے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو یا اپنے کسی بھائی بند کو بچانے کے لیے پورے شہر کو بھی آگ لگا دینے سے گریز نہیں کرتے۔

میں بنگال میں بیڑو کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس کا بھائی سانی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش ہم نے بوری میں ڈال کر اسی کے کلب میں پینک دی تھی اور بیڑو نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے کیا قیامت مچائی تھی۔ کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لاتعداد عمارتوں کو آگ لگا دی تھی اور سرکوں پر لاتعداد بوسوں اور دوسری گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا تھا۔

اور اب گنگولی چوہدری۔۔۔ اس کا بھائی بھی پولیس کی حراست میں تھا جس کے بدلے اس نے تیرہ بے گناہوں کو یہ غمناں بنالیا تھا اور دو آدمی ان لوگوں کو چھڑانے کے لیے ٹاوان کی پیشکش لے کر گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس پیشکش کو قبول نہیں کرے گا۔

ہم لوگ کل رات سے نہیں سوئے تھے اور اس وقت بھی رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جاگی اور روپ متی بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھیں۔ ٹھاکر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ سٹا ہوا تھا۔ میری حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔

ایک بجے کے قریب ہم لوگ ہٹ کے اندر آ گئے۔ جاگی اور روپ متی ایک کمرے میں چلی گئیں اور میں اور ٹھاکر الگ الگ کمروں میں۔ یہ ہٹ خاصا بڑا تھا۔ چار بیڈ رومز تھے۔ سنگ روم اور لاونج اس کے علاوہ تھا۔

میں بستر لیٹا ہلا کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجات کیوں وہ میرے درمیان پر چھائی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس رات میں نے ایک بھیا تک خواب دیکھا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔



بلا جنگل میں ادھر ادھر دوڑی پھر رہی تھی۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر خوف و ہشت کے سائے تھے۔ خون خوار ہیمیزے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ نکلیا دانت، باہر کو لٹکی ہوئی سرخ زبیاں جن سے خون ٹپک رہا تھا۔

بلا بار بار ٹھوکریں کھا کر گر رہی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں، ہاتھوں اور چہرے پر لمبی لمبی خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔

وہ جس طرف بھی جاتی، ہیمیزے اس کا راستہ روک لیتے۔ وہ پلٹ کر دوسری طرف دوڑتی۔ اس طرف بھی خون خوار ہیمیزے دانت ٹوٹے ہوئے اس کے پیچھے اوڑھ دینے کو تیار نظر آتے۔

دوڑتے دوڑتے بلا ایک بار پھر کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر گر گئی۔ وہ ایک طرف ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی اور جب سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کی تو چاروں طرف سے ہیمیزوں کو یلغار کرتے دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔

بلا کی خوفناک چیخ کی آواز میرے کانوں کے پردوں کو جرتی ہوئی چلی گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور متحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے حواس بھی شاید قفل ہو گئے تھے اور جب میرے حواس بحال ہوئے تو میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس بے ہیاک خواب نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں پندلے ہستہ ہی بیٹھا گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور پھر اٹھ کر ہٹ سے باہر آ گیا۔ کرسیاں اب بھی لان میں پڑی تھیں۔ میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوائ نے نہایت خوشگوار اثر ڈالا اور میں مکمل طور پر ہوش و حواس میں آ گیا۔

اس وقت صبح ہونے والی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میں نے کرسی کی پشت سے نیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے بلا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ واقعی خون خوار ہیمیزوں کے غول میں گھری ہوئی تھی۔ دو راتیں بیت چکی تھی۔ وہ ہیمیزا صفت ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔ اس کے ساتھ اب تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا؟ یہ کنامہت مشکل تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے تھپک کر ایک بار پھر سلا دیا اور دوسری مرتبہ میری آنکھ اس وقت کھلی جب چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی اور تقریباً بیاس گز کے فاصلے پر سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی آوازیں بھی

سنائی دے رہی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھ بیٹھ سو گیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی بڑبڑاک اٹھ گیا۔ میں نے سردار جی والے ہٹ کی طرف دیکھا۔ اسی وقت ہٹ کا دروازہ کھلا اور سردار جی باہر آ کر پہلے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر مجھ پر نظر پڑے یہ میری طرف آئے۔

وہ ہٹ وضع دار آدمی تھا۔ چوڑی دار باجامہ، سفید کپڑے جس کا دامن فراک کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ گلے میں کپڑا۔ اور سر پر نیلے رنگ کی مخصوص انداز میں بندھی ہوئی کچڑی۔ اس کے ہاتھ میں جیبی ڈائری کے سائز کی سرخ جلد والی کتاب تھی۔ وہ قریب آیا تو ہاتھ چلا کہ یہ گرتھ صاحب (مکسوں کی مذہبی کتاب) کا پاکٹ سائز ایڈیشن تھا۔

”جرتی۔“ وہ میرے قریب آ کر بولا ”کچھ پتا لگا ان ڈاکوؤں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”نہیں سردار جی۔ کھل شام اندھا صبح پھلتے تک تو وہ بندے واپس نہیں آئے تھے جو ان سے مذاکرات کرنے کے لیے جنگل میں گئے تھے۔“ میں نے کہا۔

”رب بھلا کرے۔“ سردار جی بولے ”دون دن پہلے میں بچوں کو کہہ رہا تھا کہ بت سیر ہو چکی۔ اب واپس چلیں۔ بروہ دیر تک کی ماں ہے نا۔ اس نے کہا تھا ایک دن اور رگ جائیں۔ رگ گئے ایک دن۔ اور دیکھ لیا نتیجہ۔ اب کرے میں بیٹھی رو رو کے پاگل ہو رہی ہے۔“

دیر تک سردار جی کا وہ بیٹا تھا جس کی شادی صرف تین مہینے پہلے ہوئی تھی اور وہ دون دن پہلے ڈاکو دوسرے سیاخوں کے ساتھ ان میاں بوی کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

سردار جی جالندھر کے رہنے والے تھے اور بت عرصے بعد اپنی ٹیبل کو لے کر یہاں تفریح کے لیے نکلے تھے اور اب پچھتا رہے تھے کہ وہ دن پہلے وہ میاں سے چلے کیوں نہیں گئے۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سر کے لیے کہیں اور چلے ہیں۔ اپنے پنجاب میں کیا تھوڑی جگہیں ہیں سر کر کے گئے پر دیر تک تو راجستان دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں پرانے راجوں کے محل اور حویلیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھ لیا۔ یہ تو ڈاکوؤں اور لیروں کا علاقہ ہے۔ اب جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔“

سردار جی بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ سردار جی جنگل رینورٹ جانا چاہتے تھے تاکہ تازہ ترین صورت حال کا پتا چل سکے۔ یہ سب کچھ تو میں بھی جانتا چاہتا تھا۔ میں ہٹ میں آ گیا۔ دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی

مجھ کے ساڑھے سات بجے تھے۔ ٹھاکر وغیرہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے فرنگ میں سے بوقت نکال کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور میز پر سے گاڑی کی چابیوں کا رنگ اٹھا کر باہر آ گیا۔ ہٹ کے دروازے کو میں نے باہر سے کھٹک دیا تھا۔

اس پلنگ پر اپنی پست سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ چاروں آدمی بھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آئے تھے جو ڈاکوؤں سے مذاکرات کے لیے نکل دیے تھے وقت جنگل میں داخل ہوئے تھے۔

مذاکرات ناکام ہو گئے تھے۔ گنگولی چوہدری اپنے بھائی چڑا کی رہائی سے کم کسی بات پر سوا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے یہ دھمکی ایک بار پھر دہرائی تھی کہ اگر مقررہ مدت تک اس کے بھائی کو رہا نہ کیا گیا تو وہ یر غمائیوں کو ہلاک کر دے گا۔

ماہوی بڑھ گئی۔ لوگوں نے ایک بار پھر اس مشن کے انجام دینے کو فیصلہ کیا۔

”آپ لوگ جنگل پر چڑھائی کیوں نہیں کرتے۔“ ایک آدمی نے چیخ کر کہا ”کیا آپ لوگ اس وقت کوئی قدم اٹھائیں گے جب ڈاکو بے گناہ یا تریوں کی لاشیں گرانا شروع کر دیں گے؟“

”جنگل میں دو تین چھوٹی بستیاں ہیں۔“ انسپکٹر وندو پانڈے نے جواب دیا ”ان بستیوں کے لوگوں اور ڈاکوؤں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکو تو بچ جائیں گے لیکن دھوکے میں بے گناہ ورمائی مارے جائیں گے۔ ہمیں جو بھی قدم اٹھانا ہو گا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔“

یہ جھگڑا جاری رہا اور میں ان آدمیوں میں سے ایک کے پاس بیٹھ گیا جو جنگل سے واپس آئے تھے۔ وہ دہلی کا رہنے والا فیش چوڑا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی بوی بیٹا ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔ وہ لوگ ہمارے قریبی گیسٹ ہاؤس میں گھرے ہوئے تھے۔

میش چوڑا کے کہنے کے مطابق وہ اس روز کچھ چیزیں خریدنے کے لیے بازار کی طرف گیا ہوا تھا کہ جیسے یہ واقعہ پیش آیا اور ڈاکو دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹا کو بھی اٹھا کر لے گئے۔

بیٹا عمر میں مییش چوڑا سے تقریباً پندرہ سال چھوٹی تھی۔ تیس سال کی عمر میں بھی وہ عمر نوکیلی کی طرح نظر آتی تھی۔ مییش چوڑا نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ تین مہینے کے حمل سے تھی۔ ان کی شادی کو اگرچہ دس سال ہو چکے تھے لیکن ان کے بیٹوں میں پہلی مرتبہ پھول کھلنے کی امید پیدا ہوئی

تھی اور وہ اسی لیے پریشان بھی تھا۔

”ان غلاموں نے مجھے میری پتی سے ملنے بھی نہیں دیا۔“ مییش چوڑا کہہ رہا تھا ”انہوں نے تمام یر غمائیوں کو ہم سے دور رکھا۔ کسی سے نہیں ملنے دیا۔“

میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے کہنے کے ”مطابق“ جنگل میں داخل ہونے کے تقریباً چار گھنٹوں بعد اچانک ہی دو آدمیوں نے ہمیں ان گھٹوں کی زد پر لے لیا تھا۔ وہ دونوں آدمی درختوں کی گنجان شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ہمارے پاس ایک رات قفل تھی جو انہوں نے ہم سے چھین لی اور ہمیں وہاں سے تقریباً تین میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں لے گئے۔

”یہ بستی دس بارہ گھروں پر مشتمل تھی اور جنگل سے گزرنے والی سڑک سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت اندھا رات پھیل چکا تھا۔ ہمیں ایک جھوپڑے میں بند کر دیا گیا۔“

”آدمی رات کے قریب دو اور آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اور وہ لوگ ہمیں بستی سے تقریباً پانچ میل دور لے گئے۔ اس گنجان جنگل میں تو دن میں بھی اندھا رہی رہتا ہے اور رات کے وقت تو ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ لوگ اس طرح چل رہے تھے جیسے اس جنگل کا چنچا چان کا دیکھا بھلا ہو اور گہری تاریکی میں بھی انہیں چلنے کی کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ جبکہ ہم قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے تھے۔“

”وہ لوگ ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں دو مشعلیں روشن تھیں جن میں شاید کسی جانور کی چربی استعمال کی جا رہی تھی۔ گنگولی چوہدری کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ یر غمائی ہم سے دور بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار آدمی ان پر ان گھٹوں کے ماتھے کھڑے تھے۔

”ہم صبح چار بجے تک گنگولی چوہدری سے مذاکرات کرتے رہے۔ اسے منہ مانگی رقم کی پیشکش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ اسے صرف اپنا بھائی چاہیے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دہرائی کہ اگر مقررہ وقت تک اس کے بھائی کو رہا نہ کیا گیا تو وہ یر غمائیوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دے گا۔“

”صبح پانچ بجے ہمیں دو آدمیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹا پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں۔ ہم نے سب کچھ ان افسروں کو بتا دیا ہے لیکن پتا نہیں یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟“

میں تقریباً ایک گھنٹہ تک وہاں کھوم پھر کر معلومات

حاصل کرتا رہا۔ یہ جان کر مجھے بہر حال اطمینان نہ تھا کہ ان ڈاکوؤں نے یہ غالیوں، خصوصاً خواتین کے ساتھ ابھی تک کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔

میں جب واپس پہنچا تو روپ مٹی، ٹھاکر اور جاگی ابھی تک سو رہی تھیں۔ میں نے ہٹ کا دروازہ اور کھڑکیاں پوری طرح کھول دیں اور کچن میں آکر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ میں باہر لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ٹھاکر بھی اٹھ کر باہر آیا۔ میں نے اسے اب تک کی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”مجھے لگتا ہے پولیس افسران اور دوسرے حکام اپنی ضد نہیں چھوڑیں گے اور گنگولی چوہدری بھی اپنی ہٹ سے باز نہیں آئے گا۔“ ٹھاکر نے کہا۔ اس کے لیے میں تشویش بھی ”اگر یہ غالیوں میں سے کوئی ایک بھی مارا گیا تو بڑے خوفناک ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔“

”ایسی صورت میں یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے طور پر جنگل میں داخل ہونے کی کوشش کریں لیکن ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”پولیس کسی کو جنگل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔“ ٹھاکر نے کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ جاگی اور روپ مٹی بھی جاگ گئیں اور پھر ناشتہ وغیرہ کی تیاری ہونے لگی۔

بارہ بجے کے قریب ہم ریٹورنٹ پہنچ گئے۔ یہ ریٹورنٹ ان دنوں انفارمیشن سینٹر بنا ہوا تھا۔ ہمیں سے کچھ معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔

ٹھاکر انسپکٹر نوڈ پانڈے سے بات کر رہا تھا۔ جاگی اور روپ مٹی ایک درخت کے سائے میں گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور بالآخر میں اس آدمی کے قریب رک گیا جو ایک طرف کھڑا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

اس شخص کو میں دو تین دن سے یہاں دیکھ رہا تھا۔ انہو ہونے والے سیاحوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گیسٹ ہاؤس یا ہٹ وغیرہ میں بھی نہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ شہر سے ہٹ سے لوگ تماشہ دیکھنے یہاں جمع ہوئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص بھی انہی میں سے کوئی ہو۔ نہ جانے کیوں، وہ شخص مجھے مشتبہ سا لگ رہا تھا۔ ”کوئی نئی خبر؟“ میں نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، سفید کرتہ اور چوڑے پانچوں کا سفید پاجامہ۔ پیروں میں ہوائی نپل جو خاصی پرانی لگ رہی تھی۔

وہ غالباً باقاعدگی سے شیونانے کا عادی تھا۔ مونچھیں، نوٹوں کے کناروں سے چوٹ کی دم کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بھی چڑیا کے گھونسلے کی طرح کبھیرے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پلاسٹک کے کالے فریم والی عینک بھی جو اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت آنکھوں کی لکڑی کی طرح خاصی گہری تھی۔

”کوئی نئی خبر نہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں گنگولی چوہدری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سارا حرامی یا تریوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پولیس کو چڑا کو چھوڑنا ہوگا۔“

”تم گنگولی چوہدری کو کیسے جانتے ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ پر میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری رکھتا ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا ”دو تین مرتبہ اس سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ سالا بہت خطرناک آدمی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”تمہاری ایک مہینا (عورت) اس کے قبضے میں ہے۔ تم خود اسے چھڑانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تین دن سے باقاعدگی سے یہاں آ رہا تھا۔ وہ سب جانتا تھا کہ یہاں آنے والے کون لوگ تماشائی ہیں اور کون یہ غالیوں کے رشتہ دار ہیں۔

”تمہارا خیال ہے کہ ہم میں سے کوئی آدمی کسی ایسی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”کوشش کی جاسکتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہماری طرف آیا۔ وہ شخص وہاں سے ہٹنے لگا تو سب انسپکٹر نے اسے گردن سے دبوچ لیا۔

”اے نارائن۔“ سب انسپکٹر اس کی گردن کو جو کا دیتے ہوئے فرمایا ”سالے حرامی۔ یہاں بھی اپنا دھندا چلا رہا ہے۔ بھاگ جا یہاں سے۔ دوبارہ نظر آیا تو لے جا کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دوں گا۔“

اس شخص کا نام نارائن تھا۔ وہ انسپکٹر کو گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے نارائن کے بارے میں دریافت کیا تو بتا چلا کہ سارے شہر کی پولیس اسے جانتی ہے۔ وہ شہر میں گھوم پھر کر جس اور بیرونی فروخت کرتا ہے۔ سیاحوں کے ہنس، گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹل اس کی شکار گاہیں

ہیں۔ ان مقامات پر اسے آسانی سے گنک مل جاتے ہیں۔ وہ بیرونی فروخت کے لیے اکیلا آنے والے سیاحوں کو لڑکیاں بھی چلائی کرتا ہے۔

سب انسپکٹر کو میں نے یہ نہیں بتایا کہ نارائن سے میری سیالیاں ہو رہی تھیں لیکن اب نارائن کسی حد تک میری سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے گنگولی چوہدری کے بارے میں بڑے وثوق سے کچھ باتیں کی تھیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ گنگولی چوہدری کے بارے میں دوسروں سے زیادہ جانکاری رکھتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہی شہروں میں ڈاکوؤں کے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں اور انہیں خفیہ طور پر اطلاعات فراہم کرتے رہتے ہیں۔

میں نے نارائن کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا مگر وہ نظر نہیں آیا۔ شاید سب انسپکٹر کو دھمکی نے اسے وہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے ٹھاکر کو نارائن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے وہ دن وہیں رہ کر گزار دیا۔ آج گنگولی چوہدری کی دی ہوئی مہلت کا خیرا اور آخری دن تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ بار بار پولیس آفیسروں کو گھیر رہے تھے۔ انسپکٹر نوڈ پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس گنگولی چوہدری کے بھائی چڑا کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

میری تشویش بھی بڑھ رہی تھی۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں بھی بے بسی کے تاثرات نمایاں تھے۔ ہر شخص یابوس دکھائی دے رہا تھا لیکن ظاہر ہے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس نہ تو چڑا کو چھوڑنے کو تیار تھی اور نہ ہی کسی کو جنگل میں داخل ہونے کی اجازت دے رہی تھی۔

شام ہو گئی اور پھر اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم وہاں سے آگئے۔ ہماری وہ رات بھی جاگتے ہوئے ہی گزری۔ یوں تو ہم تمام یہ غالیوں کے لیے پریشان تھے۔ وہ سب بے گناہ تھے لیکن ہمیں بھگت اور ہمارا کے بارے میں زیادہ تشویش تھی کہ یہ دونوں ہمارے اپنے تھے۔

صبح چھ بجے گیسٹ ہاؤس سے ملی جلی آوازیں سن کر ہم باہر آگئے۔ اس وقت ہم چائے پی رہے تھے۔ ٹھاکر نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خالی کپ قریب کھڑی ہوئی جاگی کی طرف بڑھا دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں گئے تھے۔

”کوئی گڑبڑ ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں

ریٹورنٹ کی طرف جا رہا ہوں۔“

”ہم بھی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ چائے کا آخری گھونٹ میرے حلق سے نہیں اترتا تھا۔

دس منٹ بعد ہماری پچھاور تیز رفتاری سے جنگل کے کنارے ریٹورنٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔

وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہے جس کی خبر آنا فانا پورے شہر میں پھیل گئی تھی اور بہت سے لوگ یہاں جمع ہو گئے تھے۔

ہم لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے تو ٹھٹک کر رک گئے۔ ریٹورنٹ کی مختصر سی عمارت کے سامنے گھاس پر ایک لاش پڑی تھی۔ ہاں وہ لاش ہی تھی جو چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور چادر پر خون کے دبے بھی نظر آ رہے تھے۔ مسلح پولیس والوں نے لاش کے گرد گھیر ڈال رکھا تھا۔

انسپکٹر نوڈ پانڈے بھی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح پانچ بجے جنگل میں ایک بستی کے دو آدمیوں نے آکر اطلاع دی کہ گنگولی چوہدری کے آدمی یہاں سے تقریباً نصف میل دور ایک عورت کی لاش پھینک گئے ہیں۔ ہم وہ لاش اٹھالائے ہیں لیکن ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی۔ یہ غالیوں کے تمام رشتہ داروں کو اطلاع بجھوا دی ہے۔ وہ آئیں گے تو اس کی شناخت ہوگی۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا اور ہم دونوں لاش کے قریب آگئے۔ پتیت کی جگہ پر چادر کچھ اوپر کا اٹھی ہوئی تھی اور چادر کا وہی حصہ خون سے تر ہو رہا تھا۔

ٹھاکر نے ہمیک کر چادر کا کونا پکڑ کر اٹھایا تو اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

لاش کا چہرہ دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ بلا نہیں تھی۔ ٹھاکر نے بھی چادر برابر کر دی اور سیدھا ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ لاش ہمارا کی نہیں تھی لیکن وہ ایک عورت کی لاش تو تھی جو سارے شہر کا ریٹورنٹ کی ضد کی ہیونٹ چڑھ گئی تھی۔ گنگولی چوہدری نے اپنی بیٹی کا تھا کہ اگر تین دن کے اندر راندہ اس کے بھائی کو نہ چھوڑا گیا تو چوتھے دن وہ یہ غالیوں کو مارنا شروع کر دے گا۔ اس نے اپنی بات پوری کر دی تھی۔ آج اس نے پولیس اور ضلعی حکام کو پہلی لاش کا تحفہ پیش کر دیا تھا۔

میں ایک بار پھر لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کا پیٹ ابھرا ہوا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میں کانپ اٹھا۔

ابھی کل ہی تو ہمیش چوڑا سے میری بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی بچی بیٹا تین مہینوں کے حمل سے تھی۔ میں نے پہلے سیتا کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس لاش کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سیتا ہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس معصوم روح کو بھی چل دیا گیا تھا جو دنیا میں آنے کی تیاری کے ابتدائی مرحلے میں تھی۔

لوگ آتے رہے اور چادر ہٹا کر لاش کو دیکھتے رہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمیش چوڑا بھی پہنچ گیا اور پھر وہاں جو منظر دیکھنے میں آیا وہ قیامت سے کم نہیں تھا۔

ہمیش چوڑا دیر تک سیتا کی لاش سے لپٹا ہوا بیٹا مارتا رہا۔ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اس پر پلٹ پڑا۔

ہمیش چوڑا پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے سب انسپکٹر کی درودی بھاڑ دی اور اسے زمین پر گر کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھ اس کے نر خرے پر جمادیے۔ وہ اسے گھا گھونٹ کر مار دینا چاہتا تھا۔

چھ سات پولیس والوں نے بڑی مشکل سے سب انسپکٹر کو اس کے شانے سے نجات دلائی تھی۔ آٹھ دس کانٹیل ہمیش چوڑا کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ سانڈا کی طرح بھڑا ہوا تھا۔ اسے بے بس کرنے کے لیے پولیس والے اس کی پٹائی بھی کر رہے تھے۔ ایک زوردار ضرب لگنے سے اس کے سر سے خون بہہ نکلا۔

یہ زیادتی دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور لپک کر ان پولیس والوں پر چل پڑا جو ہمیش چوڑا کی پٹائی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور پولیس والا مداخلت کرتا، دو کانٹیل میرے ہاتھوں پر طرح پٹ چکے تھے۔ ایک کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا اور دوسرے کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

پندرہ پولیس والے مجھے پکڑنے کے لیے لپکے تو وہاں جمع بیسیوں لوگوں نے بڑنگ ملی کا نعرہ لگاتے ہوئے پولیس والوں پر حملہ کر دیا اور اس طرح وہاں ایک باقاعدہ محاذ کھل گیا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے پولیس نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی اور شہر سے بھی پولیس کی بھاری نفری پہنچ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد یہ جنگ ختم ہو سکا تھا اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ پولیس کی ہوائی فائرنگ کے باوجود کوئی بھی

شخص وہاں سے بھاگا نہیں تھا۔ جن لوگوں کے رشتہ دار ڈاکوؤں کے قفسے میں تھے وہ بری طرح بھیڑے ہوئے تھے۔ تماشا دیکھنے کے لیے شہر سے آئے ہوئے لوگ بھی فٹیش میں آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پہلے ہی ڈاکوؤں کی جڑہ دستوں کا شکار تھے اور آج تو پولیس کے رویے کے خلاف سب کے ہر کاہنہ ٹوٹ گیا تھا۔

مزید آگے گھٹنے بعد ڈپٹی کمشنر بھی پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ چیتے اور چار دوسرے آدمیوں کو پولیس والوں پر حملہ کرنے کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کی آمد کے فوراً ہی بعد پندرہ معززین بھی شہر سے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر ہمارے خلاف قانونی چارہ جوئی اور ہمیں جیون بھر نیل میں سزائے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرے حق میں سب سے پہلی آواز ٹھارنے اٹھائی تھی اور پھر شہر سے آئے ہوئے معززین بھی اس زبانی جنگ میں کود پڑے۔

”آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔“ رائے پر تاپ سنگھ ٹائی ایک بھاری بھر کم آدمی نے ڈپٹی کمشنر کو آنکھیں دکھائے ہوئے کہا ”آپ لوگوں کی ضد کی وجہ سے ایک بے گناہ عورت ماری گئی۔ اس کے بیٹے میں اس کے بچے کی بھی جان لے لی گئی۔ اور کوئی مثبت قدم اٹھانے کے بجائے آپ لوگوں نے اس عورت کے شوہر کو مار مار کر ادھوا کر دیا۔ کیا کسی کو اپنے ساتھ زیادتی کے خلاف احتجاج کا بھی حق نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسے بچانے کی کوشش کی انہیں نیل میں سزائے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے جنہیں۔“

”احتجاج کا یہ طریقہ۔“

”سن رہے ڈپٹی۔“ ایک اور شخص نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ اور صحت قابل رشک تھی۔ اس نے سفید کرت اور سفید دھوتی پہن رکھی تھی۔ سر پر چڑی جیسے کپڑے کی بل دار پگڑی تھی۔ ہاتھ پر سیدور کا ٹیکا لگا ہوا تھا ”ہمارا بہت دلچسپ لیا ہوں اور سن بھی لیا ہوں۔ بہت ہو چکا یہ کھیل تماشا۔ اب اگر گنگولی چوہدری کی طرف سے کوئی لاش آئی تو ہم تمہارے کو تمہارے بچکے میں باندھ کر آگ لگا دیں گے۔ جنہیں ہم جاکر ڈپٹی کمشنر کی کرتے رہتا۔ بو کیا ہوتا ہے؟“

”رائاجی۔ آپ حالات کو سمجھنے کی کوشش۔“

”ہم حالات کو سمجھ لیا ہوں۔“ رائاجی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی ”آج سانجھ (شام) سے پہلا پہلا ان

تمام یا تریوں کو یہاں ہونا چاہیے۔ کسی کو کوئی نقصان پہنچا تو تمہاری چٹنی۔ بول کیا ہوتا ہے۔ اور سن۔ ان منٹوں کو چھوڑ دے۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

اس مرتبہ ڈپٹی کمشنر جواب دینے کے بجائے ایک طرف ہٹ کر پولیس اور انتظامیہ کے چند اور آفیسروں کے ساتھ مشورہ کرنے لگا اور دوسرے منٹ بعد ہی اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ٹھیک سے رانا جی۔" وہ بولا "ہم گنگولی کے بھائی چڑا کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ دوسرے یا تریوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔"

"چڑا کو ابھی جیل سے نکال کے لاؤ اور جنگل میں دھکا دے دو اس راکش کو۔" رانا جی نے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا رانا جی۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "ہم گنگولی چوہدری کو پہلے بیٹام بھیجیں گے کہ ہمیں اس کی شرط منظور ہے۔ اس کے بعد یا تریوں اور چڑا کے تبادلے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ تمام یا تری آج شام سے پہلے یہاں آجائیں گے۔"

اس طرح رانا جی اور شر کے دوسرے با اثر لوگوں کی مداخلت سے یہ معاملہ طے ہو گیا۔ جن کے رشتہ دار ڈاکوؤں کی قید میں تھے وہ خوش ہو گئے مگر میٹش چوہدری کی بیوی اور اس کے بیٹے میں پٹنے والا چپر سرکار کی ضد کی جینٹ چڑھ گیا تھا۔ سیتا کی لاش اٹھا دی گئی اور اس کے کرایا کریم کی تیار ہوئی تھی۔

وہ دو دہائی جو سیتا کی لاش لے کر آئے تھے انہیں بیٹام دے کر گنگولی چوہدری کے پاس بھیج دیا گیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی وہیں ذرا بٹائے رہے۔ چڑا کو بھی جیل سے نکال کر وہاں لے آیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اسے پولیس کی کڑی نگرانی میں ریسٹورنٹ کے برآمدے میں بٹھایا گیا تھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر اس طرح اسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجیب ہو۔

اور وہ واقعی ایک عجیب تھا۔ چڑا کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ساڑھے پانچ فٹ کے قریب قد، صحت مند جسم، وہ نیلی جینز اور اوپن شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ دونوں کپڑے سیاہ ہو رہے تھے۔ ٹیس کے منٹ کھلے ہوئے تھے۔ کئی روز کا شیوہ بڑھا ہوا تھا۔ مونچھوں کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ سر کے بال خاصے لمبے تھے جنہیں ربر بیئز سے ڈھکیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ آنکھیں انکاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کی بالیاں

تھیں۔ وہ صورت ہی سے راکش لگتا تھا۔ دھٹی۔ چڑا کو دیکھ کر اس کے بھائی گنگولی چوہدری کے بارے میں بھی رائے قائم کی جاسکتی تھی۔ ایسے لوگوں سے کسی رحم کی توقع کرنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہی کہلا سکتی تھی۔

شام ہو گئی۔ ان دونوں دہائیوں کے ذریعے بیٹام رسائی کا سلسلہ جاری رہا۔ ہماری طرح دوسرے لوگ بھی اپنے باروں کی واپسی کی امید لگائے وہاں بیٹھے رہے اور بار بار آخر شام کے لگ بھگ گنگولی چوہدری کا آخری بیٹام ملا کر صبح بچے دو غیر مسلح پولیس والے چڑا کو لے کر وہاں سے تقریباً ایک میل جنگل کے اندر ندی کے کنارے پر اس جگہ پہنچ جائیں جہاں چار درخت تازہ کٹے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں دہائی ان کی رہنمائی کریں گے۔ گنگولی چوہدری نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ دونوں پولیس والے مسلح ہوئے یا انہیں دھوکے سے گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ان یا تریوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔

یہ بیٹام ملنے کے بعد وہاں کھڑے رہنا بے کار تھا۔ ہم اپنے ہٹ کی طرف جانے کے بجائے شر آگئے۔ شرمیں یہی چرچے تھے۔ لوگوں کو سیتا کی موت کا افسوس بھی تھا اور اس بات کی خوشی بھی کہ دوسرے یا تریوں کے جیون بچ جانے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں میں ڈپٹی کمشنر پولیس اور دیگر افسران کے خلاف غصہ بھی پایا جاتا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ہم نے سارے کپڑے ہٹ کر اس کے کھانا کھایا اور اپنے ہٹ میں واپس آگئے۔ آس پاس کے ہٹوں میں رہنے والے لوگ گیسٹ ہاؤس میں جمع تھے۔ جاگی اور روپ مٹی کو ہٹ میں چھوڑ کر میں اور ٹھاکر بھی گیسٹ ہاؤس کی طرف چل دیے۔ ہم سیتا کے کرایا کریم میں شریک نہیں ہو سکے تھے لیکن میٹش چوہدری کو پرسہ دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا۔

میٹش چوہدری کی حالت واقعی بہت بری تھی۔ اس کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا تھا۔ پیوی کے ساتھ اس کے بونے والے بچے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

ہم گیارہ بجے کے قریب اپنے ہٹ میں واپس آئے تو ہمارا پڑوسی بوڑھا سردار جی اور اس کی بیوی وہاں بیٹھے جاگی اور روپ مٹی سے باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے۔

ہماری وہ رات بھی جاگتے ہوئے گزری۔ راتوں جاگ جاگ کر اور بے آرامی سے ہم سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ سب کی آنکھیں سرخ اور چہرے سے ہوئے تھے۔ میری

کیفیت ان سے ذرا مختلف تھی۔ میں ہلا کے لیے کچھ زیادہ ہی نے چین اور پریشان تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں سے اوچھل رہا تھا۔ مجھے وہ صبح یاد تھی جب ٹھاکر کی حویلی میں وہ سوری بھی اور میں اسے پیار کرنے کے لیے غیر اختیار طریقہ پر اس کے چہرے پر جھکا جا رہا تھا۔

میں نے کسی لڑکی کے لیے اتنی بے چینی اور دل میں اتنی بے چینی بھی محسوس نہیں کی تھی۔ سینے میں اپھل سی پچی ہوئی تھی۔

ہم صبح چھ بجے جنگل کے کنارے پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ ہم سے پہلے ہی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ پولیس بھی پہلے سے زیادہ تعداد میں نظر آ رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر جی پہنچ چکا تھا۔ رانا جی اور کچھ اور معززین بھی پھولوں کے ہار لے کر یا تریوں کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔

رانا کا تعلق سارکا کے سابق مہاراجا کے خاندان سے تھا۔ اسے شری اہم ترین شخصیت کہا جاسکتا تھا اور یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سرکاری حکام گنگولی چوہدری کے بھائی کو واپس کرنے پر تیار ہوئے تھے۔

پولیس کے دو غیر مسلح آدمی چڑا کو لے کر جنگل میں جا چکے تھے۔ ان کے ساتھ وہ دونوں دہائی بھی تھے۔ وہ جگہ یہاں سے ایک میل دور بھی جہاں یا تریوں اور چڑا کا تبادلہ عمل میں آنے والا تھا۔

ہم سب کی نظریں جنگل کی طرف سے آنے والے راستے پر بھی ہوئی تھیں۔ وقت بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

سو اچھ بجے کے قریب جنگل کی طرف سے ایک فائر کی آواز گونجی ہوئی سنائی دی تو سب ہی اچھل پڑے۔ ہر چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ سب لوگ سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا گنگولی چوہدری نے بدھمدی کی کھجور؟ یہ سوال میرے ذہن میں بھی اٹھ رہا تھا لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

رائٹل کے اس ایک فائر کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دی تھی۔

اس کے بعد وقت کی رفتار جیسے ایک بار پھر تھم گئی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر پریشانی اب بھی مشرق تھی۔ شاید ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہا تھا کہ فائر کیوں ہوا تھا؟ کوئی کس پر چلائی گئی تھی؟

آدھا گھنٹا اور گزر گیا اور پھر گھنٹان درختوں میں کچھ

لوگوں کی جھلک دیکھ کر وہاں کھڑے ہوئے سب ہی لوگ بیک وقت بچ گئے۔

"آگے۔ وہ لوگ آگے۔"

لوگ جنگل سے آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے ان کی طرف لپکے۔ وہ لوگ تقریباً سو گز دور تھے۔ میں بھی ٹھاکر کے ساتھ دو قدم آگے بڑھا پھر ٹھیک کر رک گیا۔ پیچھے دو آدمیوں نے ایک آدمی کو اٹھایا ہوا تھا۔

وہ لوگ تعداد میں بارہ تھے اور میری نظریں ایک ایک کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں مگر مجھے ان میں وہ چہرہ نظر نہیں آیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تین عورتیں تھیں حالانکہ عورتوں کی تعداد چار ہوئی چاہیے تھی مگر وہ تین عورتیں اور ان میں ہلا نہیں تھیں۔ جس شخص کو دو آدمیوں نے اٹھایا ہوا تھا، وہ بھگت تھا۔

ہم سب تیزی سے آگے بڑھے۔ قریب آکر انہوں نے بھگت کو گھاس پر لٹا دیا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر مروئی سی چھائی ہوئی تھی۔

لوگ اپنوں سے گلے مل رہے تھے۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنانے جا رہے تھے۔ انہیں زندہ سلامت واپس آجانے پر مبارک باد دی جا رہی تھی مگر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ہلا ان لوگوں میں نہیں تھی اور بھگت زخمی تھا۔ میں دوڑ کر بھگت کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا ہوا بھگت۔ ہلا کہاں ہے؟" میں نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"بولتے کیوں نہیں بھگت۔ ہلا کہاں ہے؟" یہ سوال

ٹھاکر نے کیا تھا جو دوسری طرف بھگت پر جھکا ہوا تھا۔

"ٹھاکر جی۔" بھگت نے مرہو سی آواز میں جواب دیا "گنگولی چوہدری اور اس کے آدمی ہم لوگوں کو لے کر ندی کے پاس آئے تھے۔ عین وقت پر گنگولی چوہدری نے ہلا دیوی کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور اعلان کیا کہ یہ چھوکر ہی نہیں جائے گی۔ پہلے تو کچھ دیر بحث ہوئی رہی کہ وہ عدہ خلائی کر رہا ہے مگر گنگولی ہلا دیوی کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ چھوکر ہی اسے پسند آئی ہے اور اس کے پاس ہی رہے گی۔ میں نے گنگولی پر حملہ کر دیا۔ اس کے دو آدمیوں نے مجھے دھکا دے کر گرادیا۔"

"گنگولی چوہدری نے میرے اوپر رائٹل تان لی اور کہا کہ ہم لوگوں کو زندہ واپس کرنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو مجھے چھلنی کر دیتا لیکن مجھے میری گستاخی کی سزا دینے کے لیے اس

نے میری ٹانگ پر گولی چلا دی اور ہلا کو کھینچا ہوا وہاں سے لے گیا۔

”گنگولی کے آدمی ہم پر راتھنل تانے کھڑے تھے۔ اس کے بھائی چڑا کے ہاتھ کھول دیے تھے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک راتھنل اٹھی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ ہم سب وہاں سے چلے جائیں ورنہ وہ فائر کھول دے گا۔“

ڈپٹی کمشنر اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ خبر ہو گئی کہ گنگولی چوہدری نے وعدہ خلائی کرتے ہوئے ایک لڑکی کو زبردستی روک لیا ہے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کا دماغ ہی پلٹ گیا تھا۔ اب ہنگامہ کرنے کی باری اس کی تھی۔ ڈپٹی کمشنر جانتا تھا کہ اس کا تعلق جے پور کے کس خاندان سے ہے۔ رانا جی سے بھی واقفیت کُل آئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے ٹھاکر کو سنبھالا۔

”فکر مت کر ٹھاکر۔“ اس نے ٹھاکر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”ہم پولیس والوں کو میاں سے جانے نہیں دیوں گا جب تک تمہاری چھوڑی واپس ناہی آجاتی ہے۔“ اور پھر رانا نے ڈپٹی کمشنر اور پولیس افسران کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ڈپٹی کمشنر کو ایک بار پھر پھٹنے ٹیک دینے پڑے اور پولیس کی ایک پارٹی ڈاکوؤں کے تعاقب میں بھیج دی گئی۔

بھگت کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر کے لیے ہم بھی اسپتال گئے تھے۔ وہاں بہت کا ملازم اور شکر پہلے ہی زخمی پڑے ہوئے تھے۔ تیسرا بھگت بھی پہنچ گیا۔

”تمہیں جانا پڑے گا شہر کی اس کچھار میں۔“ نارائن نے جواب دیا ”کل میں نے تمہیں پولیس والوں کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے جس طرح ان کی بڑیاں توڑی تھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے اندر دم خم ہے اور شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہو۔ یہ جو پولیس والے تھے ہیں نا۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا ”یہ لوگ بے گناہ اور نرستہ بندوقوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسا سکتے ہیں۔ گھوس (رشت) کھا سکتے ہیں لیکن ان میں تو شیر کے سڑک چھاپ غنڈوں کا مقابلہ کرنے کی بہت نہیں“ گنگولی چوہدری جیسے درندوں کا مقابلہ کرنے کی عکس (طاقت) کہاں سے لائیں گے۔ یہ لوگ سانجھ (شام) سے پہلے پہلے پٹ پٹا کر واپس آجائیں گے۔ ہو سکتا ہے کندھوں پر اپنے ہی ایک دوسرا تھیں کی لاشیں بھی اٹھائے ہوئے ہوں۔“

”تم نے کہا تھا کہ مجھے جانا پڑے گا۔“ میں نے کہا ”لیکن میں کیسے جاسکتا ہوں۔ پولیس والے مجھے نہیں جانے دیں گے اور پھر سنا ہے کہ جنگل میں دو درندہ پھیلے ہوئے۔ وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ میں انہیں کیسے تلاش کروں گا اور پھر سنا ہے اس جنگل میں شیر اور چیتے درندے بھی ہیں۔“

”گنگولی چوہدری اور اس کے ساتھیوں سے زیادہ خون خوار درندے اور کون ہو سکتے ہیں۔“ نارائن نے کہا ”اگر تم اپنی چھوڑی کو ان درندوں کی جڑ پھاڑ سے بچانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”کیا۔؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“

”میں تمہیں جنگل میں لے جاؤں گا۔“ نارائن نے جواب دیا ”مجھے معلوم ہے وہ لوگ کہاں ہوں گے۔ میں تمہیں ان کے ٹھکانے تک لے جاؤں گا۔ تمہارے اندر طاقت ہے۔ تم اس چھوڑی کو بچا سکتے ہو۔“

”تمہارے اس حیلے میں کیا ہے؟“ میں نے موضوع سے ہٹ کر بالکل مختلف سوال کر ڈالا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے جواب دیا ”تمہیں اس کی فکر نہیں۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

”کیا تم نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔“

جسے دیکھ کر میرے من میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا اور میں اسے

میں بھگت کے پاس بیٹھا گنگولی چوہدری اور اس کے

کمرے میں ڈال رہے ہو۔" جانکی نے تڑپ کر جواب دیا "اور

تھی لگ رہی ہیں۔" جانکی نے جواب دیا۔



”ملا معصوم اور بے گناہ ہے۔“ میں نے کہا ”باپ کے گناہوں کی سزا اسے کیوں ملے اور کیا تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کیا تم یہ گوارا کرو گے کہ اسے ان وحشیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ تو سب سے زیادہ تم سے ہی مانوس ہو گئی۔ یہ ہر وقت تمہارے ہی ساتھ چپکی رہتی تھی۔ کیا اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے؟“

”نہیں۔ اس کے لیے میرا دل بھی ہول رہا ہے۔“ جاگی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”لیکن ان ڈاکوؤں کے خلاف پولیس کچھ نہیں کر سکی۔ تم اکیلے کیا کرو گے۔ تم اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

”یہ خطرناک جنگل ملیوں دور تک پھیلنا ہوا ہے اس میں خون خوار درندے بھی ہیں اور پھر تم ان ڈاکوؤں کو کہاں تلاش کرو گے؟“

”نارائن ان کے ٹھکانے سے واقف ہے۔ وہ میری رہنمائی کرے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”نارائن کون؟“ جاگی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”وی آدی مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔“ میں نے کہا ”میرا خیال ہے کہ وہ گنگولی چوہدری کا اغوا کر رہے۔ بتتے روز یہ ہنگامہ جاری رہا اسے میں نے جنگل کنارے کیمپ کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہی دیکھا۔ ہو سکتا ہے اس کا ساتھ بھی سفارش بن کر کام آجائے۔“

”یہ خیال ذہن سے نکال دو۔“ جاگی نے کہا ”ان چند دنوں کے دوران میں ہم سب نے گنگولی چوہدری کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ وہ بہت خود سر ہے۔ اس نے کبھی اپنے آدمیوں کی بات بھی نہیں مانی۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اسے اپنے ارادے پر عمل کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس کی ضد کا مظاہرہ تم خود بھی دیکھ چکے ہو۔“

”میں تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گا مگر مجھے ایک کوشش کر لینے دو۔“ میں نے کہا ”اگر میں بھی دوسروں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے کچھ لگا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جاگی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”جب تک تم واپس نہیں آ جاؤ گے، میں انکاروں پر لوثی رہوں گی۔“

”شانت رہو۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا ”میں انشا اللہ ضرور واپس آؤں گا۔“

اور پھر رات کا باقی حصہ باتیں کرتے ہوئے ہی گزرا۔

جاگی میرے گھٹنے پر سر رکھ لیٹی رہی اور میں نے اسے ہنسنے کی کوشش نہیں کی۔

مجھے پنج پانچ بجے جنگل کے کنارے مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا۔ میں نے جاگی کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ساڑھے چار بجے میں بڑی آہستگی سے جٹ کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ جاگی بھی میرے ساتھ ہی باہر آئی تھی۔ جٹ کے سامنے لان کے آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ جاگی میرے سامنے کھڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

اس وقت میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں جس دم پر جا رہا تھا اس میں زندہ واپس آنے کا امکان ایک فیصد سے بھی کم تھا اور میں ان آخری لمحوں میں جاگی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب میں رخصت ہوا تو جاگی کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔ میں ہاتھ ملاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک میں سڑک کا موڑ گھوم کر اس کی نگاہوں سے او جھل نہیں ہو گیا۔

ابھی پانچ نہیں بجے تھے۔ بہت سویرا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خشکی تھی اور گنگا سا اجالا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جنگل کی طرف چلا رہا۔

مقررہ جگہ تک پہنچنے میں مجھے چند رہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس جگہ ایک بہت بڑا بوڑھا لگا ہوا تھا جس پر بندی اور انگریزی میں سیاحوں کو درندوں کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے اور بھی بہت سی ہدایات لکھی ہوئی تھیں۔ اس بوڑھے کے قریب ہی جھاڑیوں میں ایک تنگ سی کچھنڈی جنگل کے اندر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں بوڑھے کے قریب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر نارائن مجھے نظر نہیں آیا اور پھر بائیں طرف سے دو پولیس والوں کو آتے دیکھ کر میں جلدی سے جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ وہ پولیس والے مجھ سے تقریباً دس گز کی دوری سے آگے نکل گئے۔ میں جھاڑیوں سے سر نکالے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے نارائن کی سرگوشیاں آواز سنائی دی۔ گزشتہ روز باتوں میں میں نے اسے اپنا نام بہت سنگھ بتایا تھا اور وہ اسی نام سے مجھے پکار رہا تھا۔

نارائن مجھ سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں ابھی کہ جھاڑیوں کی آؤ لیتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”سائے حرامی جنگل کے ساتھ ساتھ گھٹت کر رہے ہیں۔ اس کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا۔“ میں نے کہا ”جنگل کی حفاظت کر رہے ہیں یا ڈاکوؤں کو کسی قسم کا تحفظ فراہم کر رہے ہیں یا اس شر کو کسی آفت سے بچانا چاہتے ہیں۔“

”سرمال ٹو۔ اپنی امانت سنبھالو۔“

اس نے ایک ریو اور جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ریو اور کھول کر دیکھا۔ وہ گیارہ جیمبرز کا ریو اور تھا اور تمام جیمبرز بھرے ہوئے تھے۔ میرے پاس چٹوں کے پانچنے کے اندر پنڈلی پر اپنا خنجر بھی چھڑے کے نیچے میں بندھا ہوا تھا لیکن ریو اور دور کی لڑائی میں بہت موثر ثابت ہو سکتا تھا۔

اس وقت دن کا پکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ نارائن کے قریب زمین پر ایک شوٹر بیک بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پر انڈیا کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ یہ بیک نہ چھوٹا تھا نہ زیادہ بڑا۔ درمیانے سائز کا تھا اور پھولا ہوا تھا۔ اس نے بیک اٹھا کر کندھے پر لٹکالیا۔

”پلیس؟“ اس نے میری طرف دیکھا۔

”پلو۔ میں تیار ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ میں موت کے منہ میں چھٹاک لگنے جا رہا تھا۔ نارائن نے اوپر اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھے اشارہ کر دیا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر ہم دونوں نے جھاڑیوں سے نکل کر کچھنڈی کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ دونوں پولیس والے واپس آ رہے تھے۔ وہ اگرچہ ہم سے کافی دور تھے مگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ پہلے تو انہوں نے ”کون ہے۔ رک جاؤ۔“ کا شور مچایا اور پھر فائر کھول دیا۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی لیکن ہم دونوں عجیبانہ درختوں میں کچھنڈی پر دوڑتے رہے۔

ہمارے پیچھے فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں اور ہم درختوں کی آؤ لیتے ہوئے جھاڑیوں میں دوڑتے رہے۔

میرا خیال تھا کہ پولیس والے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تقریباً ایک میل تک دوڑتے رہنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی ندی کے قریب رک گئے۔ ندی تین فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ پانی کدلا سا تھا۔

نارائن ندی کے کنارے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس کے منہ سے کف بہ رہا تھا اور وہ بار بار کرتے کرتے آستین سے ہونٹ پونچھ رہا تھا۔ میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا لے

کھڑا اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں جب تھائی لینڈ میں تھا تو ملیوں دور تک دوڑ لگا یا کرتا تھا۔ ایک سرسبز کیا کرتا تھا اور پوگی کی مشق بھی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ ان دنوں میرے اندر گینڈے جیسی طاقت اور چیتے کی سی بھرتی تھی لیکن جب سے ہندوستان آیا تھا، جسم کو چاق چوند رکھنے والے سارے کام مجھ سے چھوٹ گئے تھے اور میں کاہل و سست ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ صرف ایک میل دوڑنے سے میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ دوبارہ ایک سرسبز شروع کروں مگر چھوٹی چھوٹی انجمنوں کی وجہ سے میں اپنے ارادے پر اب تک مکمل نہیں کر سکا تھا۔

نارائن نے شوٹر بیک ایک طرف رکھ دیا۔ عینک اتار کر اس کے اوپر رکھی اور ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ پر پانی کے چھینے مارنے لگا۔

تقریباً پانچ منٹ رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے۔ نارائن نے بیک کندھے پر لٹک رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے نیچے سے بھی سہارا دیے ہوئے تھے۔ ہر تھوڑی دیر بعد بیک کو ایک کندھے سے اتار کر دوسرے کندھے پر لٹکالیتا جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ وہ بیک خاصا وزنی تھا۔ ایک دو مرتبہ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ بیک تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے دے لیکن اس نے ہر مرتبہ ٹال دیا تھا۔

ہم جنگل میں تقریباً تین میل اندر آ چکے تھے۔ سورج اگرچہ خاصی بلندی پر اچکا تھا مگر درخت اتنے عجیبانہ تھے کہ دھوپ زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ درختوں کے نیچے جھاڑیاں بھی بے حد عجیبانہ اور بعض جگہوں پر ہمارے قدم سے بھی اونچی تھیں۔ بعض پودوں کے پتے پلاٹ پھر چوڑے اور دو دو فٹ لمبے تھے جن میں کوئی چھپ جائے تو تلاش کرنا مشکل ہو جائے۔

ان عجیبانہ درختوں بڑے بڑے پتوں والے پودوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے اچھا خاصا جھس ہو رہا تھا۔ میری شرٹ پسینے میں بیگم کردہن سے چپک گئی تھی اور گردن پر کچھوڑوں کی طرح بٹنے والی پسینے کی دھاروں سے شدید الجھن ہو رہی تھی۔ اس گھٹن اور جس کی وجہ سے پیاس بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ حلق خشک ہو گیا اور زبان سوکھ کر گانے کی طرح ٹالو لیں چبے لگی۔ میں چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں پانی نظر آجائے۔ کوئی ندی، ٹال یا کوئی جوڑ۔ لیکن کہیں پانی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

”نارائن! یہاں کہیں پانی نہیں ملے گا۔“ بالآخر میں نے نارائن سے پوچھ ہی لیا۔  
”آدھا میل آگے ایک صاف پانی کی ندی ہے۔“  
نارائن نے ایک طرف اشارہ کیا ”وہاں ہم پانی بھی پئیں گے اور کچھ دیر آرام بھی کریں گے۔“  
”لگتا ہے تم پہلے بھی اس جنگل میں آتے رہے ہو۔“  
میں نے کہا ”نہاے اس جنگل میں جیتے اور دیکھ وغیرہ بھی ہیں لیکن ابھی تک تو غرگوں اور لومڑیوں کے سوا کوئی خطرناک جانور نظر نہیں آیا۔“

”جس ندی کی میں بات کر رہا ہوں۔ وہاں تک کا علاقہ بڑی حد تک محفوظ ہے۔“ نارائن نے جواب دیا ”اس سے آگے درندوں سے سامنا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہاں جیتے بھی ہیں، سا بھری اور شیر بھی لیکن کسی درندے کے منہ کو ابھی تک انسانی خون نہیں لگا۔ یہاں لاتعداد ایسے جانور ہیں جو بڑی آسانی سے ان درندوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ کئی سال پہلے ایک شیر کے منہ کو انسانی خون کا مزہ لگ گیا تھا۔ دو مہینے کے اندر اس نے تین انسانوں کو شکار کر لیا تھا۔ سرکار کے بھیجے ہوئے درجن بھر شکاریوں نے کئی دن کی کوشش کے بعد اسے گھیر کر مار ڈالا۔ اس کے بعد آدم خوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے برعکس شکاری یہاں آکر درندوں کے شکار سے اپنا شوق پورا کرتے رہتے ہیں جس وجہ سے اس جنگل میں خون خور درندوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔“  
”یہاں دو تین ہستیاں بھی تو ہیں۔“ میں نے کہا ”کیا ان لوگوں کو اس خوفناک جنگل میں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟“

”یہ پیٹ بہت پالی ہے بہت سگھ۔“ اس نے ایک ہاتھ پیٹ رہا رہتے ہوئے جواب دیا ”پیٹ کا جنم بھرنے کے لیے انسان کو چاہیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں جنگل میں ناریل اور کیلے کے علاوہ بہت سے پھل درخت ہیں۔ ان بستیوں کے رہنے والے یہی پھل تو ذکر شرمیں فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو خطرہ تو ہر وقت لاحق رہتا ہے یہ پیٹ بھرنے کے لیے ایسے خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔“  
”ابھی تک تو تمہیں کوئی قیمتی دھماکی نہیں دی۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں ان بستیوں سے بچا کر لے جا رہا ہوں۔“ نارائن نے جواب دیا ”ان بستیوں میں رہنے والے سالے بہت حرامی ہیں۔ کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہماری خبر ہم سے پہلے گنگو یا چوہدری تک پہنچ جائے گی اور وہ ہمیں راستے ہی میں گھیر لیں گے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ میں نے اپنے رویہ اور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کسی بھی وقت اس ضرورت پڑ سکتی تھی۔

نارائن نے بتایا تھا کہ وہ ندی تقریباً نصف میل فاصلے پر ہے لیکن ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہاں پہنچ سکے تھے۔ شروع میں ایک ڈیڑھ میل تک تو جنگل میں ہی تھا لیکن اس کے بعد پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا تھا اور مسلسل بلندی کی طرف چلتے رہے تھے۔

یہ ندی بھی چھوٹی میں اوپر سے نیچے کی طرف بہتی تھی۔ پانی شفاف تھا۔ نارائن نے تو کسی چوپائے کی طرح پتھروں کے بل لیٹ کر منہ پانی میں ڈال دیا تھا جبکہ میں دونوں ہاتھ کا پیالہ بنا کر پانی پیتا رہا۔

پانی پینے کے بعد نارائن ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ اور بیڑی سلگا کر لیے کھسک لگے۔ اس کے ساتھ اس نے اپنا پستول نکال کر قریب رکھ لیا تھا۔ اس نے کچھ خبردار کر دیا تھا کہ اس ندی پر درندے وغیرہ پانی پینے کے لیے آتے رہتے ہیں اسی لیے ہم دس منٹ سے زیادہ یہاں ٹھہر کر ٹھہر گئے۔

میں ندی پار کر کے ٹھٹھا ہوا کچھ آگے نکل گیا۔ کم بختی صورت حال سے نمٹنے کے لیے رویہ اور میرے ہاتھ تھا۔ آگے ڈیڑھ دو سو گز تک جنگل چھدرا تھا اور اس نے آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر درخت اور بھائیوں اس نے عجیبان تھیں کہ بھائیوں بھی چھپ کر رہ گئی تھیں۔

میں ایک طویل پتھر کاٹ کر دوسری طرف سے داخل ہوا تو ٹھٹھا کر رک گیا۔ وہ خوفناک منظر دیکھ کر مجھے سینے پر سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نارائن لینے اپنے آؤٹ گھٹا اور اس کے پیروں کی طرف بھروسے بالوں والا ایک بڑا پورے قد کے ساتھ کھڑا وائٹ کوس رہا تھا۔ اس کے سبز سفید بالوں سے انگریزی کے حرف وی (V) کا نشان سامنے تھا۔ بھروسے بالوں والا ریچھ کالے ریچھ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور وہ خطرناک بھروسے بالوں والا ریچھ نارائن۔ پیروں کے قریب کھڑا وائٹ کوس رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی۔

میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ریچھ کو دیکھ رہا تھا پھر وہ جیسے ہی جھکا میں نے رویہ اور والا ہاتھ آگے بڑھا کر ڈبا دیا۔ جنگل فانز کی آواز اور دیکھ کی دباؤ سے گونج اٹھا۔ ریچھ کے بائیں بازو پر کندھے کے قریب لگی تھی۔ نارائن بھی گولی کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ ان

اپنے ساتھ ریچھ کو دیکھا تو بدحواسی میں لینے لینے چلا گیا لگا دن اور ندی میں جا کر۔

ریچھ داڑیاں دو دونوں ہاتھوں سے سینہ کو پی کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر نارائن کی طرف لپکا۔ نارائن نے جھپٹتے ہوئے ایک بار پھر چلا گیا۔ اس کا پیچھے سلا اور وہ بھریائی میں گر گیا۔ ریچھ سینہ کو پی کر آتا ہوا اس کی طرف لپکا تو میں نے دوسرا ناکڑ کر دیا۔ اتھانی سے یہ گولی بھی اس کے اسی کندھے پر گئی۔ اس بار اس نے نارائن پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مکر ٹھٹھا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میں نے دو ڈکڑا نارائن کو ندی سے نکالا۔ وہ بری طرح بدحواس تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اسے حواس بحال کرنے میں کئی منٹ لگ گئے۔

”آؤٹ لگ گئی تھی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے ہوتے تو آج میری کمائی ختم ہو چکی ہوتی۔“  
”اس کا ارادہ ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
”چلتے ہیں گرو۔ چلتے ہیں۔“ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے ”یہاں رکنا اب خطرے سے خالی نہیں۔“

اس نے پہل پھینکی ”بیک کندھے پر لٹکا یا اور پستول ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے پیروں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ گیلی پہل میں پھر پہل رہے تھے لیکن اب وہ یہاں ایک لمحہ بھی رکنے کو تیار نہیں تھا۔

ہم سامنے والی پہاڑی کی طرف جا رہے تھے جو گھنجان درختوں اور قد آدم جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔  
”گھنکیوں کی آواز جنگل میں بہت دور تک گونجی ہوگی۔“ نارائن نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا ”مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ آواز انہوں نے سن لی ہوگی تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔“

”اگر میں گولی نہ چلاتا تو تمہارا وہ بڑا بھائی تمہارے بچے کو تھوڑتا۔“ میں نے جواب دیا۔  
”اب ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔“ اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

میں وہ پہاڑی ڈھانی تین سو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی دشوار تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے میری دونوں ہاتھوں پر لاتعداد خراشیں آچکی تھیں جن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ ہم اس مرتبہ تقریباً تین گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے۔

جس کی وجہ سے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں بہ رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک اور چھوٹی سی ندی کے قریب پہنچ گئے۔ ندی کیا تھی ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا کالا سا تھاب جس میں شفاف پانی بہ رہا تھا۔ یہاں درخت کسی قدر چھدرے تھے اور کہیں کہیں دھوپ بھی درختوں کی شاخوں سے چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ اس دھوپ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دوپہر ڈھل رہی تھی۔

نارائن مجھ سے الگ بٹ گیا اور دوسری طرف رخ کر کے بیک کھولے لگا۔ اس نے بیک میں سے ایک پولی نکال کر پتھر دوپارہ بند کر دی اور میرے قریب آگیا۔ پولی میں چھ تواری دوئیاں تھیں جن پر مرچ کا چار رکھا ہوا تھا۔

ہم مرچ پانچ بجے سے چل رہے تھے۔ دو تین مرتبہ صرف پانی پیا تھا۔ مجھے بھی بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور اس وقت مرچ کے اچار کے ساتھ روٹی کھانے میں واقعی مزہ آگیا۔

یہاں آدھا گھنٹا رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے اور مزید دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پر نکل آئے جہاں درخت زیادہ گھنیاں نہیں تھے البتہ چوڑے پتوں والے پودے اور بھائیوں بکثرت تھیں۔ سامنے چھوٹی چھوٹی کئی چٹانیں تھیں۔ بعض چٹانوں میں چھوٹے غار بھی نظر آ رہے تھے۔

نارائن ان چٹانوں سے دور ہی رک گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھائی اور اس مایوسی کی وجہ میں بھی سمجھ گیا تھا۔ چٹانوں کے قریب ایک جگہ پر تین پتھر رکھ کر جو لہما سا بنا ہوا تھا۔ راکھ، بچے ہوئے کوئلے اور جلی ہوئی چند نکریاں دور ہی سے نظر آرہی تھیں۔ ادھر ادھر چند ایسی چیزیں بھی دکھائی دیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کچھ لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جو ہمارے آنے سے پہلے ہی کہیں اور جا چکے تھے۔

”بہت برا ہوا۔“ نارائن کے لہجے سے بھی مایوسی جھلک رہی تھی ”ان کی تلاش میں اب ہمیں کم از کم سات آٹھ گھنٹے اور چلنا پڑے گا۔ ان کا دوسرا ٹھکانا یہاں سے پچھم (غرب) کی طرف بہت دور ہے۔“

”سوچ ڈھل رہا ہے اور ہم رات میں تو سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔“ میں نے کہا۔  
”رات ہمیں یہیں گزارنی پڑے گی۔“ نارائن نے

جواب دیا "یہ جگہ محفوظ ہے۔ اس طرف پانی کا چشمہ بھی ہے۔" اس نے درختوں کی طرف اشارہ کیا "اگے ہمیں ایسی محفوظ جگہ نہیں ملے گی۔"

"تو پھر لگا دو بیس پر ڈیرا۔" میں یہ کہتے ہوئے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

نارائن اس پاس کی چٹانوں میں بھاگتا رہا۔ بیک اس نے بدستور کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور اب اس بیک کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ بیک خاصا بھاری تھا اور نارائن صبح پانچ بجے سے اسے کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے اس کا یہ بوجھ اٹھا لوں لیکن ہر مرتبہ اس نے انکار کر دیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد دو دویاں پچی تھیں جو نارائن نے سنبھال کر رکھ لی تھیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم نے وہ دویاں بھی کھالیں اور چٹنے سے پانی پی کر ایک دوسرے کے قریب زمین پر لیٹ گئے۔ نارائن نے بیک کو تنیک کی طرح سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جلد ہی اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے نارائن سے ابھی تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے۔ کیا دھندلا کرتا ہے۔ وہ اس جنگل میں کیوں آیا ہے۔ پولیس گنگولی چوہدری کے جس ٹھکانے کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی وہ آسانی سے یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ بہت سے سوالات میرے دماغ میں گھبرا رہے تھے۔ اس نے میرے صرف پہلے سوال کا جواب دینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

نارائن بگڑ کر رہنے والا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود نہ تو اسے ماں کی ماحصل سکی اور نہ ہی باپ کی شفقت۔

نارائن اپنا باضی نہیں بھولا تھا۔ اسے سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ دس سال کی عمر تک تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا لیکن پھر اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ اس کے ماں باپ میں کسی بات پر جاتی شروع ہوئی جس نے بڑھتے بڑھتے سنگین صورت اختیار کر لی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر بے وفائی کے الزامات عائد کرتے رہے۔ اس کے باپ نے اس کی ماں کو آوارہ اور بدچلن قرار دے کر نارائن کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جبکہ نارائن کی ماں اپنے شوہر پر الزام لگاتی رہی کہ وہ آوارہ اور بدکار عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہے۔

دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ ماں کے پاس آمدنی کا کوئی

ذریعہ نہیں تھا۔ وہ بیٹے کی پرورش کیسے کرتی۔ وہ نارائن اس کے باپ کے دروازے پر چھوڑ آئی اور نارائن کا باپ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔

دونوں میں طلاق ہوئی تو نارائن کی زندگی پر چھڑا ہوئے اندھیرے بگڑے اور گھرے ہو گئے۔ ماں نے دو گزر شادی کر لی اور نئے شوہر کے ساتھ بگڑے چھوڑ کر چلی گئی۔ باپ شراب جوئے اور آوارہ عورتوں کا ریا تھا۔ ایک رات شراب خانے میں ایک عورت کی ملکیت پر جھگڑا ہو گیا۔ نارائن کے باپ نے اپنے رقیب کو پیٹ میں جڑا گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لوگوں نے پکڑ کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

عدالت میں کیس چلا۔ جرم ثابت ہو گیا اور نارائن کے باپ کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔ نارائن اس وقت چودہ سال کا تھا۔ باپ کے جیل جانے کے بعد وہ باپ کے مکان میں آکر جس پر اس کا حق تھا۔ اس موقع پر اس کا ایک ہمدرد بھی ہوا ہو گیا۔ بگڑے چھوڑا پہلے بھی اسی شہر میں رہتا تھا لیکن اس نے کبھی نارائن کو نہ نہیں لگایا تھا لیکن اب اسے نارائن سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔

بگڑے شہر کا بدنام ترین آدمی تھا اس نے تو عمر لوگوں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا جس سے وہ چھوٹے موٹے جرائم کروا رہا تھا۔ وہ تو عمر لوگوں کے اس ریوڑ کے ساتھ شہر کے نہایت ہی ماندہ علاقے میں واقع ایک کھنڈر نما مکان میں رہتا تھا جسے اس نے اتھ آشرم (بے سارا بچوں کی پناہ گاہ) کا نام دے رکھا تھا حالانکہ اس کے آشرم میں کئی ایسے بچے بھی تھے جن کے ماں باپ زندہ تھے لیکن وہ خود عمرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اگر بچوں ان کے بچوں کو اتھ کہہ کر وہ وقت کی دہلا کھلاتا تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بچوں ان کے جرائم کا ارتکاب کر داتا ہے لیکن انہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔

بگڑے نارائن کو بھی قابو میں کر لیا۔ تمام بچے اس کے مکان میں منتقل کر دیے گئے اور نارائن کا گھر اچھا خاصا اندام آشرم بن کر رہ گیا۔

نارائن اب کوئی بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھتا تھا مگر نجانے کیا بات تھی کہ بگڑے چھوڑا کے ساتھ اس کی زبان نہیں کھلتی تھی۔ بگڑے چھوڑا نے اسے بھی جرائم کی آوازوں سے دلوں پر وحشت سی طاری کر رکھی تھی۔ کبھی بگڑے چھوڑا نے اسے قسم کے جانور کی خوفناک آوازیں

دو سال گزر گئے۔ نارائن نے چھوٹے موٹے جرائم پورے کر دیے تھے اور پھر ایک روز

چھوڑا تمام بچوں کو چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد چھوڑا دولت رام اپنے آدمیوں کو لے کر نارائن کے مکان میں پہنچا اور یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ بگڑے نے یہ مکان بچوں کے ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ کاندھ پر نارائن ہی کے دستخط تھے۔ نارائن قسمیں کھاتا رہا کہ اس نے مکان فروخت نہیں کیا اور نہ ہی کسی کانڈ پر کبھی دستخط کیے تھے مگر ساہوکار نے اسے اور تمام بچوں کو دھکے دے کر نکال دیا۔

نارائن پولیس کے پاس بھی گیا مگر پولیس نے بھی ساہوکار ہی کا ساتھ دیا۔ ساہوکار دولت رام نے اسے یہ چھوٹا البتہ دے دی کہ اگر وہ بچوں کے ہزار روپے ادا کر دے تو وہ مکان خالی کر دے گا۔ دوسری صورت میں وہ عدالت کا دروازہ کھٹکا سکتا ہے۔

نارائن کے پاس نہ تو ساہوکار دولت رام کو دینے کے بچوں کے ہزار روپے تھے اور نہ ہی عدالت سے انصاف حاصل کرنے کے لیے رقبہ وہ اتھ (بے سارا) بچوں کو لے کر شہر سے باہر ایک مندر کے کھنڈر میں منتقل ہو گیا۔ اب وہی ان بچوں کا ان اتھ تھا۔

نارائن کی زندگی اتھ بچوں کی پرورش کرتے ہوئے گزر گئی۔ وہ خود بھی دادواتیں کرتا اور بچوں سے بھی جرائم کروا دیتا۔ کبھی جیل میں اور کبھی سڑکوں پر۔ نارائن کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ وہ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے اس کا ساتھ چھوڑتے گئے اور بالآخر نارائن اکیلا رہ گیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے بھی بگڑے چھوڑا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں دھکے کھاتا ہوا تین سال پہلے سارکا پہنچ گیا۔ یہ جگہ اسے زیادہ پسند آئی اور وہ بیس کا ہو کر رہ گیا۔

نارائن نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ڈاکو گنگولی چوہدری کو کس طرح جانتا ہے اور جنگل میں کیوں آیا ہے اور یہ کہ اس بیک میں کیا ہے؟ میں نے بھی یہ سب کچھ جاننے کے لیے زیادہ

تعمیر کر تک بائیں کرتے رہے۔ رات اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن گھٹا تھا جیسے رات اپنے آخری پہر میں پہنچ گئی ہو۔ تاریکی میں چاروں طرف سے آنے والی حشرات الارض کی آوازیں نے دلوں پر وحشت سی طاری کر رکھی تھی۔ کبھی بگڑے چھوڑا نے اسے قسم کے جانور کی خوفناک آوازیں سنائیں۔

نارائن بائیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میں اس کے بعد

بھی دیر تک آسمان پر جھکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ ڈاکوؤں کی بھی کیا زندگی ہے۔ وہ ایسے جنگلوں اور پہاڑوں میں کیسے زندہ ہیں پھر مجھے ہمارا خیال آیا۔ شرکی رہنے والی نازو نعم میں پکی ہوئی وہ لڑکی یہاں کس حال میں ہوگی۔

مجھے جاگنی وغیرہ کا بھی خیال آیا۔ میرے بعد وہاں کیا ہنگامہ ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے شکر پولیس اور انتظامیہ پر چڑھ دوڑا ہو۔ بہر حال یہ سب کچھ تو دواپس جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ بشرطیکہ میں گنگولی چوہدری اور جنگلی درندوں سے زندہ بچ کر واپس جا سکا۔

آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا افق پر غائب ہو گیا۔ آسمان کتنا روشن نظر آ رہا تھا۔ ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ شرکی مصنوعی روشنیوں میں ان ستاروں کی چمک بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ تھکن سے جسم کے تمام اعضا شل ہو رہے تھے اور پھر اس بات کی پروا کے بغیر کہ رات کو کسی وقت کوئی جنگلی جانور ہمارا تپا تپا کر سکتا ہے، میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور نیند کی دوا لی میں اتر گیا۔

○●○

ماں کی کوکھ سے جنم لینے والا ہر بچہ برا معصوم اور فرشتہ صفت ہوتا ہے۔ وہ ماں کے پیٹ سے جرائم سیکھ کر نہیں آتا۔ دنیا میں آنے کے کئی سال بعد بھی وہ دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔ اسے ایتھے بڑے کی تمیز نہیں ہوتی۔ دنیا کے نشیب و فراز کا شعور نہیں ہوتا۔ وہ بالکل نہیں جانتا کہ اگلا قدم اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ قدم قدم پر بڑوں کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ اب یہ بڑوں پر منحصر ہے کہ وہ اسے کون سا راستہ دکھائے ہیں۔ وہ اسے باعزت زندگی کی رفعتوں کی طرف لے جائیں یا ذلت کے صیب کھڑ میں دھکیل دیں اور جب وہ شعور سنبھالتا ہے تو بہت کچھ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اسے وہی کچھ کرنا ہوتا ہے جس کا اسے درس دیا گیا یا جو وہ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ اگر اسے اچھی تربیت نہیں ملی، اس کے ارد گرد رونا ہونے والے معاملات قابل تعریف نہیں تو وہ تباہی کے راستے کی طرف چل پڑتا ہے بلکہ اس کے لیے اسے مجبور کر دیا جاتا ہے اور وہ معاشرے پر ایک بوجھ بن جاتا ہے۔

میری اپنی زندگی قابل مثال یا قابل تعریف نہیں تھی۔ میں نے جو راستہ اپنا یا تھا وہ خود اختیار کردہ نہیں تھا۔ مجھے

اس کانٹوں بھرے راستے پر دھکیلا گیا تھا۔ میں نے بار بار اپنے قدموں میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ جتنے منہ کے بل گر آیا گیا۔

میرے سینے میں تواضع کا جذبہ تھا۔ ممکن ہے کسی موقع پر میں وہ سب بھول جاتا اور ایک عام آدمی کی طرح نارمل زندگی گزارتا لیکن میری زندگی میں ایسا موقع آنے ہی نہیں دیا گیا۔ قدم قدم پر اور ہر لحظہ میرے سینے میں انتہائی جذبات کی آگ کو بھڑکایا گیا اور میں اس آگ میں جلتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

میں جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن زندگی کے اس کانٹوں بھرے راستے پر میرا واسطہ زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں ہی سے رہا تھا۔ چور، ڈاکو، قاتل، بدمعاش اور جعل ساز۔ ان میں کئی ایسے تھے جو ایک وقت بہت بھرپور کھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے جرائم تک محدود تھے اور کئی ایسے تھے جن کا جرائم کی دنیا میں بڑا نام تھا۔ بڑا دبدبہ تھا۔ بڑی دہشت تھی ان کے نام کی۔

لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اپنی مرضی سے اس ذلت بھرے راستے پر قدم رکھا ہو۔ انہیں اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ ایسے ہر شخص کی زندگی کے پس منظر میں ایک ہی کہانی تھی۔ ایک ہی کشمکش تھی۔ نارائن کی کہتا۔

اور اب میں اسی نارائن کے ساتھ اس خوفناک اور بے نیات جنگل میں چل رہا تھا جہاں کسی جگہ گنگولی چوہدری جیسا درندہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔

نارائن، جگو چاچا کے قریب کا شکار ہوا تھا اور میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا تھا کہ گنگولی چوہدری کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ وہ بھی کسی جگو چاچا کے قریب کا شکار ہوا ہوگا یا کسی شکار کے ستم کا شکار ہوا ہوگا۔ یہاں نہ تو جگوؤں اور ننگیوں کی کمی تھی اور نہ ہی نارائینوں اور گنگولیوں کا قاتل تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا نارائن کے ساتھ چل رہا۔ نارائن نے حسب معمول بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر یہ پیشکش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے میں اس کا یہ بوجھ اٹھاؤں مگر اس نے اس مرتبہ بھی نہیں کڑھایا تھا۔

میں وہاں سے روانہ ہونے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ ناشتہ کا تو تصور ہی نہیں تھا البتہ چلنے سے پہلے خوب سیر ہو کر جتنے کا ٹھنڈا اور ٹھنڈا پانی پیا تھا۔ اس کے بعد کہیں پانی بھی نہیں ملا۔

تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے بیٹھ میں ایڑی ہونے لگی۔ نارائن بیڑی پہ بیڑی بیٹھ کر جا رہا تھا۔ بیڑی کے دھوکے سے بھوک کے احساس کو ماننا پانا تھا۔

نارائن کی طرح چلتے ہوئے میری نظرس بھی اوپر اور نیچے رہی تھیں۔ شاید کوئی پھل دار درخت نظر آتا تو نارائن کے کئی درخت نظر آتے تھے۔ ان پر پھل بھی لگے ہوتے مگر چلنے اور سیر سے تپنے پر چالیس پچاس فٹ کی بلندی پر چڑھنا شاید ہم دونوں میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا۔ راستے میں گھروندے کی جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں خوش نما لگاتی پھل سے لدی ہوئی شائیں بھی جاری تھیں۔ میں نے ایک پودے سے چند گھروندے توڑ لیے تھے لیکن دانہ منہ میں رکھتے ہی اسے تھوک دینا پڑا۔ ترشی اس قدر کہ نہ تو میری زبان اسے برداشت کر سکتی تھی اور نہ ہی منہ قبول کر سکتا تھا۔

بالآخر ہم ایک اور جگہ پر رک گئے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند ایسے درخت نظر آئے جن پر پھل پھل نظر آئے۔ درختوں کی شاخیں پھل کے بوجھ سے نیچے ہوئی تھیں۔ میں نے اس قسم کا پھل بے پور میں غلیوں بکتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

نارائن نے بیگ زمین پر رکھ دیا اور پھل سے لدی ہوا ایک شاخ کو پکڑ کر دوڑ دوڑ سے جھٹکنے لگا۔ بکے ہوئے پھل نوٹ کر کرنے لگے۔ یوں لگا جیسے پھلوں کی بارش ہو رہی ہو۔ "یہ پھل تم جتنے بھی چاہو کھاؤ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔" نارائن نے گھاس پر گرے ہوئے پھل سینے ہوئے کہا۔

میں بھی جیسے پھل جمع کرنے لگا۔ ایک دانہ منہ رکھا تو یوں لگا جیسے شہد کاچہ منہ میں ڈال لیا ہو۔ شہد کی طرح ہی میٹھا تھا یہ پھل۔ ہم بڑے اطمینان سے بیٹھے ان پھلوں سے بیٹھ کی آگ بجھا رہے تھے کہ فضا فائرنگ کی آواز نہ گونج اٹھی۔

ہم دونوں اچھل پڑے۔ یکے بعد دیگرے دو فائرنگ تھیں اور اس کے ساتھ ہی شیریا جیتے کی دھاڑ جیسی آواز دی گئی۔ فائر اور دھاڑ کی آوازیں زیادہ دور کی نہیں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق فاصلہ پچاس اور سو گز دور میان رہا ہوگا۔

نارائن نے وحشت زدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنا بیگ اٹھا کر چوڑے پتوں والی گھنٹیاں باندھنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چلا گیا۔

تمہی۔ ہم چوڑے پتوں والی جھاڑیوں میں اندر تک چلے گئے۔ ہم جھاڑیوں میں اندر گھس گئے کہ اگر کوئی شخص چار فٹ کے فاصلے پر ہمارے سامنے سے بھی گزرتا تو ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

صرف دو گھنٹیاں چلی تھیں اور شیریا جیتے کی دھاڑ سنائی دی تھی۔ گلیوں کی گونج کی آواز تو جلد ہی معدوم ہو گئی لیکن لاتعداد پودوں کے پتوں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان کے چیتنے کی آوازیں دیر تک گونجی رہیں اور بالآخر جنگل کی فضا معمول پر آگئی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" میں نے نارائن کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "گنگولی چوہدری یا۔"

"یہ گنگولی چوہدری یا اس کے آدمی نہیں ہو سکتے۔" نارائن نے میری بات کاٹ دی۔ "گنگولی چوہدری ایسی بیگلوں پر نہیں رکھا۔ نہ ہی وہ اس طرح جانوروں پر گولیوں کی شائع کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے شکار یوں کی کوئی پانی اس طرف موجود ہو۔ بہر حال اب ہمیں زیادہ غلط رہنا پڑے گا۔ اب تم بیگلوں سے یہ پرارتنا (دعا) کرو کہ یہ کم بخت یہاں سے آگے نہ جائیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ گنگولی چوہدری اپنا وہ ٹھکانا بھی چھوڑ کر کی اور طرف نکل جائے۔"

ہم تقریباً آٹھ گھنٹے تک ان جھاڑیوں میں دیکے رہے اور جب کوئی مشتبہ آواز سنائی نہیں دی تو ہم آگے چل پڑے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا ریو اور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بیٹھ کی آگ بھی بجھ گئی تھی اور ہم تازہ دم ہو کر تیزی سے چل رہے تھے تاہم کسی جگہ بھی ہم نے قدم قدم پودوں یا جھاڑیوں سے ٹکرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جنگل بہت گھنٹیاں اور راستے اونچے نیچے تھے۔ چلنے میں خاص دشواری پیش آرہی تھی۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

"دوسرے وقت ہم پھر ایک جگہ رک گئے۔ یہاں بھی ہمیں وہ پھل مل گئے اور شفاف پانی کی بندی بھی تھی۔ نارائن نے کہا تھا کہ ہم گنگولی کے دیرے پر آٹھ گھنٹوں میں پچاس گز کے ہم سفر اندھیرے کی چل پڑے تھے۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے آٹھ گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا مگر گنگولی کے ڈیرے کے کہیں آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ہم مزید آگے چلے۔ رتب۔ فائرنگ کی اس آواز کے بعد سے جانتے سمجھے بار بار یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ مرکز دیکھا تھا مگر کوئی دکھائی

نہیں دیا تھا۔ نارائن بھی کئی مرتبہ چوڑا ہوا اور پھر نارائن نے یہ بتا کر مجھے مزید خوف زدہ کر دیا کہ شیریا جیتا بعض اوقات اپنے شکار کا ملبہ دور تک پھینک دیتا ہے۔ کسی انسان کے اچانک چلنے سے بھی بچا جاسکتا ہے لیکن شیریا جیتا جب گھات لگا کر حملہ آور ہوتا ہے تو اس سے بچ جانا ممکن نہیں ہوتا۔

مزید دو گھنٹے چلنے کے بعد درخت کچھ چندرے ہونے لگے۔ سامنے بہت دور چھوٹی چھوٹی چٹانیں بھی دکھائی دینے لگیں اور میرا خیال تھا کہ ہم ایک کھنڈے سے پہلے ان چٹانوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

پودے اور جھاڑیاں اب بھی گھنٹیاں تھیں۔ ایک جگہ ہم جیسے ہی پودوں سے باہر نکلے اپنے پیچھے "دھب" کی زوردار آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا اور اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ انسان ہرگز نہیں کھلا سکتا تھا لیکن بہر حال انسان تھا۔ کئی روز کا بڑھا ہوا شیو، بے حاشا بڑھے اور بھرے ہوئے بال، میلی پتلون اور بغیر آستین کی قمیص جس کے ہنر کھلے ہوئے تھے اور سینہ بھی ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابھرے ہوئے رخسار، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں اور پیلے دانت۔ مجھے وہ ریچھ یاد آیا جو میری گلیوں سے زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا۔ وہ وحشی تھا جس کے ہاتھوں میں آٹھ گھنٹے کا راکٹ بھی تھا۔

اس وقت ریو اور میری جیب میں تھا اور میں نے جیسے ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے مجھ سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی میرے پیروں کے قریب لگی۔

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسا تو اس کے پیلے دانت کچھ اور بھی نمایاں ہو گئے "اوپر۔" اس نے رائفل سے اشارہ کیا "دونوں ہاتھ سر سے اوپر۔ ورنہ تم اوپر پہنچ جاؤ گے۔ ہی ہی۔"

میں نے نارائن کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی دونوں ہاتھ گردن پر رکھ چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھالے اور اس حیوان نما انسان کی طرف دیکھنے لگا جو غلیظ دانت نکالے اب بھی "ہی ہی" کر رہا تھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بیس فٹ کے قریب تھا۔ اس پر قابو پانے کا کوئی چانس نہیں تھا اگر میں کوشش بھی کرتا تو وہ مجھے اپنے تک پہنچنے سے پہلے ہی چیلنی کر دیتا۔

اس نے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سینے

بنائی۔ دو آدمی دائیں بائیں قدم آدمیوں سے نکل کر سامنے آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی آئینک رانٹلیں تھیں اور ان کے علاوہ بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔ اب تو بچاؤ کی امید بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر نارائن کی طرف دیکھا۔

”یہ گنگولی چوہدری کے آدمی ہیں۔ کوئی گڑبومت کرنا ورنہ مار دیے جاؤ گے۔“ نارائن نے سرگوشی کی۔

میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں میں نے جو تصور قائم کیا تھا یہ بیٹوں جوان نما انسان اس سے بالکل مختلف ثابت ہوئے تھے۔ کئی انڈین فلموں میں بھی ڈاکوؤں کو دیکھا تھا۔ کالے کپڑے، گم بوٹ قسم کے جوتے، سینے پر کراس کرتے ہوئے گولیوں سے بھرے ہوئے سیلٹ۔ کمر پر بھی چوڑے سیلٹ جن میں گولیاں بھری ہوئیں۔ باقاعدگی سے شیونانے والے لیکن موچیں بڑی خوفناک۔ بعض ڈاکو تو کلین شیو بھی ہوتے تھے لیکن ان کے چہروں پر بھی بڑا رعب ہوتا تھا اور یہ۔۔۔ یہ تو ان سے بالکل مختلف تھے۔ لگتا تھا کسی پاگل خانے سے بھاگ کر آئے ہوں اور پکڑے جانے کے خوف سے عرصے سے اس جنگل میں جیسے حیوانوں جیسی زندگی گزار رہے ہوں۔ وہ حیوان ہی تھے اور ان کے چہرے بڑے خطرناک تھے۔

وہ بیٹوں ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے پھر تقریباً پانچ قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ ان کی رائٹل ہمارے طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ پہلا جوان نما انسان جس نے سب سے پہلے درخت سے چھلانگ لگا کر ہمیں رائٹل کی زد پر لیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے میرا ریا اور الودہیب سے نکل لیا اور پھر نارائن کو بھی اس کے پستول سے محروم کر کے اس کا بیگ بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ بیک کو دونوں ہاتھوں میں تولتے ہوئے ”سچی سچی“ کرتے ہوئے پہلے اور غلط دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

”چوہدری تمس ہو جاوے گا۔“ وہ نارائن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”انعام دیوے گا تمہارے کو۔“ چل آگے لگے۔ حرامی۔۔۔ سالار۔۔۔

اس نے نارائن کے کولنے پر زور دلا دیا۔ رسد کر دی۔ نارائن لڑکھڑکیا۔ وہ کرتے کرتے پچھا۔ دو سرا وحشی میری طرف بڑھا۔ وہ شاید مجھے بھی لات رسد کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی آگے بڑھ گیا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد ہم اپنا چٹانوں کے قریب پہنچ گئے۔ چٹانوں کی طرف درخت چھوڑے تھے جبکہ چند گز کے

فاصلے پر درخت بھی گھنٹاں تھے اور جھاڑیاں بھی۔ اس چٹانوں کی طرح بڑے بڑے پتھر نظر آ رہے تھے اور ان پتھروں کے بیچ میں نمایاں تھیں جن میں شفاف پانی بہ رہا تھا۔ طرف قدم گمرانی میں بہت بڑا تالاب سا تھا۔ وہ تالاب پانی اس تالاب میں گر رہا تھا جبکہ ایک کم چوڑی ندی کے قریب سے گزرتی ہوئی شیب کی طرف گئے جنگل میں گئی تھی۔

ہم گھنٹاں درختوں سے نکل کر چھپے ہی کھلی جگہ پر مجھے وہ لوگ نظر آ گئے جو چٹان کے دامن میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص محتاط تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں آئینک رائٹل نظر آ رہی تھی۔ ان میں چوہدری کا بھی چڑا بھی تھا۔

میں تجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور پھر وہ نظر اپنی بھلا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا گیا۔ یہ بھی۔ اس نے سرگھٹوں میں دے رکھا تھا۔ میں نے اس پر چڑھ نہیں دیکھا تھا۔ اسے لباس سے پہچانا تھا۔ وحشیوں۔ فیملے میں وہی ایک انسان نظر آ رہی تھی۔

ایک آدمی اپنے ساتھیوں سے بالکل الگ تھک رہا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ رہا ہو گا۔ کمر پر مضبوط ہاتھ پیر، چھوٹی قدر لمبا، دو تین دن کا شیو بھلا تھا۔ ٹوٹھ برش ٹاپ کی موچیں۔ سر کے بال گردن پر لے جاتے تھے اور پیشانی پر بھی کچھ بال اس طرح گرے ہوئے۔ کہ اس کی بائیں آنکھ کسی قدر چھپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے نیلی جینز اور ڈنیم کی بغیر آستین کی جینٹ پہن رکھی تھی۔ کے ٹین کلمے ہوئے تھے۔ اس کے سینے پر بھی رینجہ کی لم سیاہ بال تھے۔ ایک خنجر اس کی پتلون کے سیلٹ میں اڑھتا تھا اور قریب ہی زمین پر آئینک رائٹل پڑی تھی۔

”یہ گنگولی چوہدری ہے۔“ نارائن نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

نجانے کیا بات تھی کہ گنگولی چوہدری کو دیکھ کر ہر دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اگر وہ بہتر علم اور دھنک کے ہاتھ میں ہوتا تو روقار اور شان دار شخصیت کا مالک ہوتا۔ ڈاکو تھا اور ایک ڈاکو کو یہی جلد بتاتا تھا۔

آوازیں سن کر ہلا کر جھکا ہوا برہنہ تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا اور یہ کرب دیکھ کر میرا دل یک دم دھڑک اٹھا۔ ہلا کر مجھے دیکھ لیا۔ اسے شاید اپنی آنکھیں نہیں آ رہا تھا۔ چہرے پر کرب کے بجائے کچھ عجیب تاثرات پھیل گئے۔ اس نے اپنی ایک انگلی دانتوں میں

بٹھائی۔ وہ لونی خواب نہیں دیکھ رہی تو وہ اور جب اسے اٹھ کر چننی ہوئی میری طرف دوڑی۔ اس نے ایک جھپٹے سے آگے کو پھلپھلایا۔ میں لیکن میرے قریب دوڑنا نہیں آئے ایک وحشی نے لپک کر اسے پھلپھلایا۔ چننے سے پہلے ہی ایک وحشی نے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے رائٹل کی ٹال میرے سینے پر رکھ دی اور بھیڑیے کی طرح غرایا۔

”اپنی جگہ پر کھڑا رہو مگر (حق)۔ حرکت کی تو تیرے شر (بدن) میں درختوں سوراخ بنا دو گا۔“ اس شخص نے ہلا کو میں نے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ اس شخص نے ہلا کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور ہلا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک نازک سی لڑکی کے لیے اپنے آپ کو کسی وحشی سے چھڑانا آسان نہیں تھا۔ اس وحشی نے ہلا کو پوری طرح اپنی ہانوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اس موقع سے کچھ اور ناگہانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس نے ہلا کو اپنے سینے کے ساتھ بچھ کر رکھا تھا اور اس کے چہرے پر بوسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہلا اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

”لوڈیا کو چھوڑ دے رامو۔“ گنگولی چوہدری نے اس وحشی کو کھارتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز قدرے بلند اور لہجہ پر سکون تھا۔

مگر اس وحشی نے ہلا کو نہیں چھوڑا۔ اسے سینے سے لگائے اٹھا کر اس درخت کے نیچے لے گیا جہاں کچھ دیر پہلے ہلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہلا کو نیچے کرا دیا اور اس کی قمیص کے کمریوں پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھکا دیا۔ قمیص کے اوپر والے دو بٹن ٹوٹ گئے۔

رامو پر شیطان سوار تھا۔ وہ بھیڑیے کی طرح ہلا کو فونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو آدمی دوڑ کر قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے رامو کو ہلا سے الگ کیا اور اسے چوہدری کے سامنے لے آئے۔

چوہدری چند لمحوں کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی وحشتانہ سی چمک ابھر آئی تھی اور پھر اس کے جسم میں اچانک ہی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے بڑی چوڑی سے قریب پڑی ہوئی رائٹل اٹھا کر ٹھیک کر دیا۔

آخر فضا قاز اور رامو کی خوفناک چیخ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی اس کے سینے میں ٹھک کر دل کے مقام پر گئی تھی۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور رامو زمین پر گر کر مر گیا۔

رامو کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے دونوں

ساتھی وحشت زدہ نظروں سے کبھی چوہدری کو اور کبھی رامو کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ چوہدری نے رائٹل پھر اپنے قریب زمین پر رکھ دی تھی۔

چڑا اور اس کے دوسرے ساتھی بھی وحشت زدہ سے ہو گئے تھے۔ ہلا کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بدخواہ ہو کر میری طرف دوڑی۔ اس مرتبہ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہلا دوڑتی دوڑتی میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اپنی ہانوں میں بچھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں ہولے ہولے اس کا کندھا چھو رہا تھا۔ ہولے کبھی رامو کی لاش اور کبھی گنگولی چوہدری کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب پہلے کی طرح بالکل پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے چوہدری؟“ میرے دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”تم نے رامو کو مار دیا۔ اس کی ہتھی کر دی۔“

”جو ہمارا اکٹ نہ مانے ہے اس کا یہی انجام ہووے گا۔ اس کی لاش اٹھا کر ادھر دوڑ پھینک دو۔“ بھیڑیے لگادیں گے اس کا ماس۔“ چوہدری نے ایک طرف اشارہ کیا ”سالار حرامی۔ چوہدری کے مال پر ہاتھ ڈالے ہے۔“

کسی نے مزید جرح کرنے کی جرات نہیں کی۔ دو آدمی رامو کی لاش اٹھا کر ڈنڈا ڈنڈی کرتے ہوئے درختوں کی طرف لے گئے۔

”کوشا۔“ چوہدری چٹان کی طرف رخ کر کے پینچا۔ اس کی آواز کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ چٹان کے غار سے ایک عورت برآمد ہوئی۔ وہ باقاعدہ نار نہیں تھا۔ کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا چٹانی پتھر سائیکل کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ عورت وہاں بیٹھی یہ سب پتھر دیکھ رہی تھی۔

میں اس عورت کو دیکھ کر بلیکس جھپکنا بھول گیا۔ چھ فٹ کے قریب قد، سٹول جسم، ہرٹی جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، چہرے کے نقوش بے حد جاذب نظر، شہد کی رکت کے بال ٹھکڑے ہوئے تھے۔ اس نے گھٹنوں سے بہت اوپر تک کی ٹیکر اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسے شاید بلاؤز بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کپڑے کا چندا اچھوڑا نکلا تھا جو سینے پر لپٹا ہوا تھا لیکن پوری طرح پردہ پوشی نہیں کر رہا تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ سینے کے گرد اڑ بھاڑوں کے عین وسط میں تھا ہوا تھا۔ ایک کان میں بند تھا اور دوسرے میں چوڑی کی طرح کا طلائی بالا۔

اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی رنگت پہلے ضرور گوری چنی رہی ہوگی لیکن دھوپ اور کھلی فضا میں رہنے سے جلد تانے جیسی رنگت اختیار کر گئی تھی۔ اگر وہ بچل میں اس طے میں نہ ہوتی۔ وہ صبح کا لباس پہنا ہوتا اور ہانکا سا مسک اپ ہوتا تو اسے ملکہ حسن قرار دیا جاسکتا تھا۔ گنگولی چوہدری کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کروشہ نے قریب آکر ہمارے کو زبردستی مجھ سے الگ کیا اور اسے تقریباً بچپن ہی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ بلا مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

دیا "تیری یہ ہمت۔ چوہدری کو کلکشا (مشورہ) دیتا ہے۔ تو۔"

"ناٹلی ہو گئی چوہدری۔ معاف کر دو۔" ناٹا نے دم ہاتھ جوڑ دیے۔ چوہ ایک دم دھواں ہو گیا۔ رام پوہ وہ دیکھ کر دکھا۔

چوہدری نے رانکھل سے ہاتھ ہٹایا اور میز دیکھنے لگا۔ میں نے بھی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز نہیں۔

"وہ چھو کر کیا لگتی ہے تیری؟" چوہدری نے کہا

سچو کو کہ اس مرتبہ میں نے تمہیں پنڈت کی اس جھوٹری کے  
صدمے میں زندہ چھوڑ دیا ہے لیکن اب اگر تم نے گالی دی تو  
تمہارے دل میں اتنے سوراخ کروں گا کہ گتے بھی نہیں  
جاسکے گا۔"

دیکھا۔ دو آدمی مختلف جگہوں پر رائفلیں لیے ہماری گمرانی کے لیے کھڑے تھے۔ نارائن چوہدری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے بائیں کرتے ہوئے گنگولی چوہدری کے چہرے کے تاثرات ہمارے تھے کہ وہ نارائن سے خوش نہیں تھا۔ اب میں نارائن کی اسلیٹ جان چکا تھا۔ وہ گنگولی چوہدری کا انفارمر تھا اور اس نے نہ صرف اطلاعات فراہم کرنا تھا بلکہ انہیں ایجوکیشن بھی پلائی کرتا تھا۔



# پانچویں

## لاشعور میں دبے ہوئے خوف، احساسات اور محرکات کو بے نقاب کرنے والی عجیب و غریب کتاب

25 روپے قیمت  
23 روپے ڈاک خرچ

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذیلہ  
پیشگی منی آرڈر یا سال گریس



kitabiat@hotmail.com  
kitabiat1970@yahoo.com

موقع ملا تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔  
کروشا اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے قریب آئے۔  
میرے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ کروشا کو دیکھ کر وہ اٹھ کر  
گئی۔ رامو سے دھنگا سختی میں ہلا کی قمیض کے اوپر سے  
بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے اسے سینے کی پرستی چھپانے کے لیے  
ایک ٹکے سے ہلکے کا کام لیتے ہوئے گریبان بند کر دیا۔  
کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ کروشا  
ساتھ آکر بیٹھی تو میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ ایک لمحہ  
ہمارے ساتھ والے درخت کے تنے کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔  
اور اس کی روشنی براہ راست بیٹھی ہوئی کروشا پر پڑی تھی۔  
وہ اس طرح جھک کر بیٹھی تھی کہ میری نظریں بار بار ہتھکڑی  
چوڑے کپڑے کے پیچھے ہلک رہی تھیں۔

”تیرے گنگولی چوہہ کی لڑائی آدی ہے۔“ کروشا نے میری  
طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میری وجہ سے وہ ابھی تک تمہارا  
بلا پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ میں کوشش کروں گی کہ ایک  
روز میں تم دونوں کو یہاں سے نکال دوں۔“  
میں نے اس ہمدردی کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔  
پولا۔

”اس نے تو مجھے صرف آج رات کی مہلت دی ہے۔  
صبح سویرے مجھے یہاں سے چلے جانا ہوگا۔“  
”میں کسی نہ کسی سبب تمہیں روک لوں گی۔“ کروشا  
نے کہا ”تمہیں ذرا حقاقت رہنا پڑے گا۔ اس بچ کو کوئی  
ٹپ بھی تو چھانگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کے ہمیشہ  
آدی تم لوگوں کو زیادہ درد نہیں جانے دیں گے۔“  
”لیکن تم ہمیں یہاں سے کیسے نکالو گی؟“ میں نے  
”اگر بعد میں اسے پتا چل گیا کہ ہمارے فرار میں تمہارا ہاتھ  
ہے تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”میری تم فکر مت کرو۔“ کروشا بولی ”اب میں کیا  
فیصلہ کر چکی ہوں اور اس پر عمل کرنے کا وقت آیا ہے۔“  
”مگر تم ہمارے لیے یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟“  
نے پوچھا۔

”تم لوگوں کے لیے نہیں اپنے لیے کر رہی ہوں۔“  
کروشا نے جواب دیا ”میں کئی روز سے دیکھ رہی ہوں کہ  
چوہہ ری کا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔ بلا کو دیکھ کر وہ اسی  
ست مجھ سے بے رخی برت رہا ہے۔ بلا کی طرف بڑھتے ہوئے  
اس کے قدم میں نے روکے ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں  
نے ایک مرتبہ بلا کو برت لیا تو مجھے ان وحشیوں کے دل  
کروے گا جو عرصے سے میرے بچے اور میری بیویاں

ایک گھنٹے میں کھانا تیار ہو گیا۔ تمام لیرے چلیں میں  
وال چاول لے کر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ میرے اور بلا کے  
ساتھ بھی ایک بڑی پلیٹ رکھ دی گئی تھی۔ وال چاول  
کھاتے ہوئے واقعی مزہ آ گیا۔

سورج غروب ہوتے ہی تین چار شعلیں جلا کر مختلف  
جگہوں پر رکھ دی گئیں۔ دو آدی بدستور رائٹلیں تانے میری  
اور بلا کی نگرانی کر رہے تھے۔ تاریکی الگ ٹکڑے پٹیا ہوا  
بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ گنگولی چوہے بھی اپنے مخصوص  
انداز میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ کروشا ایک آدی کے  
ساتھ چٹنے پر برتن دھوئے کئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی تقریباً  
تین منٹ بعد ہوئی تھی۔

ایک آدی نے ایک راجستانی گیت گانا شروع کر دیا اور  
دوسرا چٹیلی کے ڈھنگ پر نال دینے لگا۔ جنگل میں مشکل کاماں  
تھا۔ اگر حالات معمول پر ہوتے اور ہم پلک متانے کے لیے  
آئے ہوتے تو ہم اس صورت حال سے ضرور لطف اندوز  
ہوتے لیکن یہاں صورت حال مختلف ہی نہیں، سنگین بھی  
تھی۔

میں خاموش بیٹھا فرار کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔  
رات میں کسی وقت ایسا کوئی موقع مل تو سکتا تھا۔ میرے پاس  
اپنی اور بلا کی حفاظت کے لیے وہ خنجر بھی موجود تھا جو پٹلون  
کے پائینے کے اندر پندلی سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے وقت  
جب ڈاکوؤں نے ہمیں حراست میں لیا تھا تو میری بیب سے  
ریوا اور نکال کر ہی وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ مزید تلاشی لینے کی  
ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ وہ شاید مطمئن ہو گئے تھے کہ  
میرے پاس اس ریوا اور کے سوا اور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

میں رات کے وقت کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا  
لیکن اس میں بھی بے پناہ خطرات تھے۔ اگر ہم ان لیروں  
کے جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو خون خوار  
دروندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں رات کے وقت سفر کرنا  
خودکشی کے مترادف ہوتا اور مجھے تو اس جنگل سے باہر نکلنے کا  
راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ کل ہم سارا دن سفر کرتے رہے  
تھے اور آج بھی بھول بھلیوں کی طرح آٹھ تو گھنٹے کھونٹے کے  
بعد یہاں تک پہنچے تھے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ رات کو  
یہاں سے نکلنے کے بعد کسی خطرے سے دو چار ہوئے بغیر  
رات بھر چلتے رہیں اور جب صبح کی روشنی ہو تو پتا چلے کہ ہم  
کوم پھر کر پھر وہیں پہنچ گئے ہیں۔ ان خدشات کے پیش نظر  
میں نے رات کو کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال ذہن  
سے نکال دیا۔ البتہ یہ سوچ لیا کہ دن کی روشنی میں ایسا کوئی

”گنگولی چوہدری چند روز کے لیے گاؤں آیا۔ اس نے بتایا کہ اسے دلی میں بہت بڑی نوکری ملنے والی ہے۔ وہ چند مہینوں میں پنڈت دینا ناتھ کا قرضہ چکا دے گا۔“

”پنڈت دینا ناتھ کچھ اور سوچے بیٹھا تھا۔ وہ گاؤں کے کئی چھوٹے کاشتکاروں کو قرضے دے کر سودور سود کے چکر میں جکڑ کر ان کی زمینوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ وہ دھرمیش چوہدری کی زمین پر بھی دانت گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے اتنا عرصہ انتظار کیا تھا اور اب اسے خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر دھرمیش کا بیٹا واقعی کسی بڑی نوکری پر لگ گیا تو زمین اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

”ان دونوں فصل یک چکی تھی۔ چند روز میں کٹائی ہونے والی تھی۔ اس رات ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ دھرمیش چوہدری کے کھیتوں کو آگ لگا دی گئی۔ گاؤں میں اس کے گھر پر بھی ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ گنگولی کی جوان بہن، چھوٹا بھائی اور ماں باپ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔“

”خبر ملنے پر گنگولی واپس آیا تو اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی مارے گئے۔ گھر جل کر بھسم ہو گیا۔ زمین پر پنڈت دینا ناتھ نے اپنے مسلح آدمی بٹھادیے۔ ”زمینوں پر، گنگولی کا پنڈت دینا ناتھ کے آدمیوں سے جگڑا ہو گیا اور دینا ناتھ کے دو آدمی گنگولی کے ہاتھوں مارے گئے۔ گنگولی بکڑے جانے کے خوف سے مدھیہ پر دیش میں چھپل واپی کی طرف بھاگ گیا۔“

”وہ چھپل واپی میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا۔ وہ کئی سال تک اس گروہ کے ساتھ مدھیہ پر دیش کے علاقوں میں وارداتیں کرتا رہا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر وہ وحشیانہ زندگی گزارا۔ اس میں انسانیت ختم ہو چکی تھی۔ مدھیہ پر دیش میں اس کے نام کی دہشت پھیل گئی تھی۔“

”اور پھر ایک روز اسے کسی ڈاکو سے یہ پتا چل گیا کہ کئی سال پہلے پنڈت دینا ناتھ نے ڈاکوؤں سے اس کے باپ کے کھیتوں کو آگ لگوائی تھی اور اس کے گھر پر حملہ کرایا تھا اور اس کے گھر والے مارے گئے تھے۔“

”گنگولی چوہدری نے پہلے تو چھپل واپی میں ان ڈاکوؤں کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس نے اپنے گروہ کے ساتھ صبح سویرے ننگن پور میں پنڈت دینا ناتھ کی حویلی پر حملہ کر دیا۔ پنڈت دینا ناتھ اس کے پیروں پر گر کر رحم کی بھیک مانگنے لگا لیکن گنگولی چوہدری کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے حویلی کو لوٹ لیا۔ اس کی بیٹی نے بھاگ

”انسان کبھی بھی اپنی قسمت پر شاکر نہیں ہوتا۔ انسان ہر کام پر سوچ کر کمرے کہ اسے کوئی شکر نہیں ملتا۔ کامیابی حاصل کرنی ہے اور فلاں چیز کو ہر قسم سے قسمت بنانا ہے تو وہ یقیناً اس کو حاصل بھی کر لے گا۔“

”انسان کا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر بات کے نتیجے پر رکتے ہوئے ہیں۔ کوئی جدوجہد بھی جاتی ہے تو ہم میں۔ جس کے نتیجے میں ہم ناکامی کے اندھیروں میں رہتے ہیں اور الزام دیتے ہیں قسمت کو۔ بہر حال، ہم مگر سانس لیتے ہوئے کما“ میں گنگولی چوہدری کی کہانی سننا چاہوں گا جسے تم قسمت کا چکر کھ رہی ہو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ کوٹشا میرے چہرے پر ہنساتے ہوئے بولی ”گنگولی نے جدوجہد تو کی لیکن تمہارے غلط سمت میں جس کے نتیجے میں وہ کئی سال اندھیرے میں بھٹک رہا ہے۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایکڑوں میں شیشے شیشے ٹھک گئی تھی۔ اس نے میرے کندھے کے ساتھ ٹپک لگائی۔ کوٹشا نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ”گنگولی راجستان اور مدھیہ پر دیش کی سرحد پر ننگن پور نامی قصبے کے ایک کاشتکار کا بیٹا ہے۔ یہ قصبہ سے تھوڑا ہی آگے ہے۔ اس قصبے سے آگے چھپل واپی جو مدھیہ پر دیش میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پھر کوہندوستان میں ڈاکوؤں کی جنت کھا جاتا ہے۔“

”گنگولی کا باپ دھرمیش چوہدری نے کواٹلی نامی بہت بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ گنگولی نے رات رات کی نیند میں بڑھا۔ میزک جھلوار شر کے ہائی اسکول سے پاس پھر کالج میں داخلہ لینے کے لیے اسے دلی بھیج دیا۔“

دھرمیش چوہدری کا بھائی رہائش پذیر تھا۔ ”دھرمیش چوہدری کے پاس چند بیگمے زمین تھی۔ نے کہنے کے دو سرے افراد کو بھی پانا تھا۔ سخت شہرت پادجو زمین کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ قصبے پر پنڈت دینا ناتھ سے قرضہ لیتا چلا گیا۔ اس کا خیال نہ پڑا کہ بڑا آفسر بنے گا تو پنڈت کی پالی پالی بچاؤ ہے۔“

”گنگولی دلی کی نہرو یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کر چکا تھا۔ اس وقت تک اس کے باپ کا بال بالی تھا۔ جکڑا جا چکا تھا۔ مکان اور زمین بھی پنڈت دینا ناتھ گروی تھے۔ قرضہ اتنا تھا کہ زمین اور مکان دینے کے حساب چکنا نہیں ہوتا تھا۔“

”انسان کبھی آپ کو بچانے کی کوشش کی تو گنگولی چوہدری نے سر اٹھ کر اسے جھٹ لیا۔ اس نے پنڈت دینا ناتھ کو عقاب کی طرح اسے نہیں اتارا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اور بازو موت کے کراے میں پھنس چکے۔ حویلی اور گاموں کو اور کھیتوں کاٹ کر اسے بھگ لگا دی اور پنڈت دینا ناتھ کی جوان بیٹی کو اور کھانوں کو بھگ لگا دی اور پنڈت دینا ناتھ کی جوان بیٹی کو لے کر چھپل واپی کی طرف واپس جانے کے بجائے راجستان کی طرف آیا۔ اس نے دو سال سے اس علاقے میں تباہی پھینا رکھی ہے۔ ہر طرف اس کے نام کی دہشت ہے جو تم بھی دیکھ چکے ہو۔“

”تم نے کہا تھا کہ اس کے تمام گھر والے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے مگر اس کا چھوٹا بھائی چرا؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ اس کا بھائی نہیں دوست ہے جو چھپل واپی میں اس کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ اس کے بھائیوں کی طرح چاہتا ہے۔“ کوٹشا نے جواب دیا۔

”اور پنڈت دینا ناتھ کی وہ لڑکی۔“ میں نے ابھی بولی تھی تو اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں یقیناً افسوس ہو گا کہ کب کے کمروں کی سزا تم بھگت رہی ہو۔“

”میں نے کہا تھا کہ قسمت کے چکر ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ کوٹشا نے مگر سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے من کے کرب کو میں محسوس کر سکتا تھا۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا۔“ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”تصور تیار کرنا ہوتا ہے اور الزام ہم قسمت کو دیتے ہیں۔ ہماری اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں زندگی کو مایوسی اور ناکامیوں کے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہیں اور یہ زندگی ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسا ناگوار بوجھ جس سے پیچھا چھڑا لینے کو بھی چاہتا ہے۔“

”ہم زندگی کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ کیا مفہوم لیتے ہیں اس کا۔“ میں نے مگر سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”زندگی کیا ہے؟ کیا ہے؟ کی دودھ کا نام ہے؟ فکری شعور کے آثار کا نام ہے؟ ذہم و انگ کے انمول رشتے کا نام ہے؟ درد و کرب کے اور اک کا نام ہے؟ محض ایک نام ہے یا زندگی صرف زندگی ہے؟“

”زندگی تو ایک فلسفہ ہے لیکن ہماری ذات اس سارے فلسفے سے دو گردانی کرتی ہے۔ ہمارے خیال میں زندگی میں اُکڑے شاعر خوب صورت مناظر ہیں تو ہمارا جیسی مصیب حقائق کا وجود بھی ہے۔ ہم جگر کی تمازت سے تو دوسال کے سانس کی انمول ٹھنڈک بھی نہیں۔ آہوں کے بعد قہقہے بھی

”ہاں اور یہ جیتی ہے تو درد کا صحرا بھی ہے لیکن نجات کیوں انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ یہاں دیکھتا ہے تو اس کے کانٹوں کی جھین محسوس نہیں کرتا۔ تڑپا ہے تو قزار کے کھوں کو یاد نہیں کرتا۔ بس خوش فہمی کے سراب کے پیچھے دو دو ڈکڑے سکون تلاش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وقت کا بے رحم پیکر اس کے گلے گلے کر کے اسے زمین میں دفن کر دیتا ہے۔“

میں خاموش ہو کر کوٹشا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں پہلے ہی میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ابھرنے کے آثارات بڑھتے جا رہے تھے۔

”تم نے بھی آنکھوں میں زندگی کے بہت سے خواب سجائے ہوں گے جو تمہارے باپ کی ہوس کی نذر ہو گئے۔ تم نے اپنے حسین سپنوں کی ایسی بھینک تعبیر کا تو تصور بھی نہیں کیا ہو گا لیکن تمہارے خوابوں کی تعبیر نہیں ہے۔ تم ابھی زندہ ہو۔ تم میرا ابھی زندگی ہے۔ تم یوں دوری ہو اور مایوسی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ اگر زندگی کو واقعی مایوسی کی دیمک لگ جائے تو اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور وہ لے کا ڈھیر بن جاتی ہے مگر تم۔ اپنی زندگی کو لے کا ڈھیر نہیں بننے دو گی۔ تمہیں یہ فکر تو ہے کہ گنگولی چوہدری مایا کو بھی برباد نہ کر ڈالے لیکن اپنے بارے میں سوچتے ہوئے کیوں ڈرتی ہو؟“

”میرے اندر اب کیا رہ گیا ہے۔“ کوٹشا نے جواب دیا ”میں تو پہلے ہی لے کا ڈھیر بن چکی ہوں۔ کھنڈر ہو گئی ہوں۔“

”تمہارے میں درناؤ میں ضرور بڑ گئی ہیں مگر اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”وعدہ کرو کہ تم ان بنیادوں پر زندگی کی ایک خوب صورت اور مضبوط عمارت تعمیر کرو گی۔ وعدہ کرو کہ جب ہم اس جنگل سے نکلیں گے تو اکیلے نہیں ہوں گے۔ تم ہمارے ساتھ ہو گی۔“ میں نے اس کا ہاتھ سلاتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر تبادلیں۔

”زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے مجھ سے ایسی باتیں کی ہیں۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ”کیا تم سمجھتے ہو کہ۔“

”ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”وحشیوں کے اس غول سے نکلنے کے بعد تم ایک نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔“

میں کوٹشا کا ہاتھ بدستور سہلا رہا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں سرخی پھیل رہی

میں اور ہمارا دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ہمارا باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ میں کچھ دیر تک اندھیرے میں ادھر ادھر، کھتا رہا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے پاس ہوں گا کہ ایک جیتی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک آدمی جنگل کی طرف سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا اور وہ جیتے جیچ کر کہہ رہا تھا۔

”چوہدری۔ چوہدری۔ پولیس ہمیں گھیر رہی ہے۔ کرشنا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔“ ٹیپ میں کھلبلی سی چیخ مچی۔ گنگولی چوہدری کے اوجھتے ہوئے سارے آدمی جاگ گئے اور راتنگلیں سنبھالے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ گنگولی بھی چٹان کی کتھو سے باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی راتنگلی تھی۔ وہ ایک طرف دوڑتے ہوئے اپنے آدمیوں کو احکامات جاری کرنے لگا اور پھر اسی وقت جنگل فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس سنگل شاٹ کے ساتھ ایک خوفناک انسانی چیخ بھی سنائی دی۔ وہ گنگولی کے کرشنا نامی اس آدمی کی چیخ تھی جو ٹیپ سے تقریباً سگز آگے پہرے کی ڈیوٹی پر تھا اور پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا اور شاید اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ پولیس نے اسے اڑا دیا تھا۔

”گنگولی چوہدری!“ مگ فون پر ایک ہماری آواز سنائی دی جسے پہچانتے میں مجھے دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ وہ انسپکٹر نوڈو پانڈے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ”گنگولی چوہدری۔ تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے ہو۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرو۔ میں تمہیں تین منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد فائر کھول دیا جائے گا۔“

گنگولی چوہدری نے جواب نہیں دیا۔ اس کے آدمی پوزیشن لینے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور وہ خود ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں پوزیشن لے چکا تھا۔ اس کی پتیلی طرف ندی بھی اور گنجان درختوں کے ساتھ قد آدم جھاڑیاں اور پودے بھی تھے۔

میں بری طرح گڑبڑایا ہوا تھا۔ ہمارا بھی جاگ گئی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں بھرا ہوا تھا اور وہ مجھ سے پلٹ گئی تھی۔ خوف کے باعث اس کے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ میرے پاس صرف خنجر تھیں لیکن ظاہر ہے اس موقع پر خنجر کام نہیں دے سکتا تھا۔ میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ان دریاں نارائن ایک طرف سے دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر ادھر

تھی۔ یہ میری باتوں کا اثر تھا۔ مجھے اور کہ اس پر سبب نہ ہونے کی طاری ہونے لگی تھی۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ چٹان کی طرف سے اب وحشی کی آواز سنائی دی۔

”اے کرشنا! چوہدری بلاوت ہے تیرے کو۔ بلاوت کے پاس۔ وہ کلپ رہا ہے۔“

”میں چلتی ہوں۔“ کرشنا نے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا ”کل بات کریں گے۔“ وہ اٹھ کر چٹان کی طرف چلنے لگی جہاں اس کو کھڑے دہانے کے سامنے گنگولی چوہدری بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ابھی قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ راستے میں بیٹھ ہوئے ایک وحشی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بھئی ہمارا گود میں بھی آجایا جیون بھر چوہدری۔ کھوٹے سے بندھی رہے گی۔“

”دشمن اور راسو کا انجام بھول گیا ہے تو۔“ کرشنا نے کہتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر زور دیا اور اسے رسید کر دیا۔

”بھئی کھی کھی۔“ وہ کمال سہلاتے ہوئے بے غیرتی نہ ہنس پڑا ”آج کی رات اور عیش کر لے چوہدری کے ساتھ کل تو ہمارا ہی بس آوے گی۔ چوہدری نے سننے سے سب کچھ بھول گیا ہے۔ وہ تمہیں دان (خفہ دینا) کر دے گا ہمارا کو پھر کما جاوے گی؟“

میں چونک گیا۔ کرشنا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہمارا کولہا تصرف میں لانے کے بعد چوہدری اسے (کرشنا کو) اور وحشیوں کے حوالے کر دے گا۔ کرشنا نے یہ بھی بتایا تھا۔

شروع میں ایک موقع پر گردہ کے دشمن نامی ایک آدمی نے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی تو چوہدری نے اسے گولی اڑا دیا تھا۔ جس طرح ہمارا کو ہاتھ لگانے کے جرم میں چوہدری نے راسو کو گولی سے اڑا دیا تھا۔

کرشنا کے جانے کے بعد ہمارا میری گود میں سرکھڑا لیٹ گئی۔ میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس بالوں میں انگلیاں پیھ رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے میں آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ رات دیرے دیرے بیت رہی تھی۔ حشرات الارض کی آوازیں کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گنگولی کے بیشتر آدمی اونگھ رہے تھے۔ وہ آدمی اپنے اپنے راتنگلی سنبھالے پہرے کی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ اب ہماری عمرانی کر رہا تھا اور دو سرا چٹان پر کھڑا تھا۔

ادھر دیکھا اور دوڑتا ہوا چوہدری کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھے بجلا چوہدری۔ ”وہ گنگولیا“ پولیس نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”حڑی۔ گنگولی چوہدری۔ ہمارا۔“ ”اب حڑی۔ پولیس تیری وجہ سے یہاں آئی ہے اگر تو اس لوٹنے کو ساتھ لے کر نہ آتا تو پولیس ادھر کا رخ نہ کرتی مگر ڈو نہیں۔ میں تمہیں پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔“ چوہدری نے راتنگلی سیدھی کر کے ٹھیک کر دیا۔

”گولی نارائن کی کھوپڑی میں لگی اور وہ آواز نکالے بغیر دھیرے دھیرے۔“ ”ارے اوچڑا۔“ چوہدری کی گونج ہوئی آواز سنائی دی اس جھوکی اور لوٹنے کا دھیان رکھیو۔ لوٹنا بھاگنے کی کوشش کرے تو آڑا ناسالے کو۔“

چرا دوڑتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا اور ہم دونوں کو راتنگلی کی ذرے لے لیا۔ میں درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اب مجھ سے پتلی پتھر کا پری تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ یہاں بالکل محفوظ نہیں تھے۔ اگر دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو جائی تو ہم دونوں آسکتے تھے۔

انسپکٹر نوڈو پانڈے کی دی ہوئی مہلت ختم ہو گئی۔ اس نے مگ فون پر ایک بار پھر اور تنگ دی اور اس کے ایک منٹ بعد فائر کھول دیا۔

فائرنگ کی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔ میں ہمارا کو اپنے ساتھ لپٹائے دوست کی آڑ میں ہو گیا۔ گنگولی چوہدری کے آدمی بھی جگہ بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا چڑا بھی فائرنگ کر رہا تھا۔ وہ بار بار ہماری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اگر ہمارے ساتھ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیں گولیوں سے چیلنی کر دیتا۔

اسی وقت کرشنا بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی راتنگلی تھی۔

”چڑا۔“ وہ چیخ ”ان لوگوں کو میں دیکھتی ہوں۔ تم رگھو کی طرف جاؤ۔ اس طرف پولیس والے پودوں میں چھپ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔“

چرا دوڑتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ کرشنا نے سامنے سنبھال درختوں کی طرف ایک برست مارا۔ غمناک ناخوں سے ادھر ادھر دیکھا اور تنگ کی تیب سے ریو اور اہل کر میری طرف اپنا دیا۔ یہ وہی ریو اور تھا جو مجھ سے چھینا گیا تھا۔ ”چٹان کی پتیلی طرف نکل جاؤ۔“ کرشنا نے میری

طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا ”وہاں ایسی جگہیں ہیں جہاں تم محفوظ رہ سکو گے۔“

”اور تم۔“ میں نے جب کہ ریو اور اٹھاتے ہوئے کہا ”تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ یہ بہترین موقع ہے۔ اس سے فائدہ سناؤ۔“

”میری فکر مت کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔“ کرشنا چیخا۔

”خدمت کرو کرشنا۔“ میں نے بھی چیخ کر کہا ”یہ بہترین موقع ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔“

”میں کبھی ہوں، چلے جاؤ یہاں سے۔“ کرشنا دھاڑی ”ہمارا کو لے کر نکل جاؤ۔ بحث میں وقت ضائع مت کرو۔“ واقعی بحث بے کار تھی۔ میں نے آخری بار کرشنا کی طرف دیکھا اور ہمارا کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کی طرف دوڑ لگا دی۔ چٹان کی دوسری طرف کھوٹے سے پلے میں نے مڑ کر دیکھا۔ کرشنا بھی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف دوڑی جا رہی تھی۔ یہ چٹان نہ تو زیادہ اونچی تھی اور نہ ہی زیادہ لمبی چوڑی۔ اس کی پتیلی طرف بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور زمین ہموار نہیں تھی۔ چھوٹے بڑے لالچھ ادا کھڑے تھے۔

میں بعد کا ہاتھ پکڑے ایک طرف دوڑتا رہا۔ ہمارا پر دہشت طاری تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اگر میں نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ رکھا ہوتا تو وہ ایک بار کرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھ پاتی۔

ہم چٹان کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف آگئے۔ اس طرف جھاڑیوں اور پودوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ہمارا کا پیر جھاڑیوں میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ چیختی ہوئی جھاڑیوں میں گر پڑی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا کہ کئی سنسناتی ہوئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ میں ہمارے اوپر گر گیا اور اسے ساتھ لے کر لوٹ لگا تا ہوا خشیب کی طرف لڑکھڑا چلا گیا۔

چند منٹ تک میں ہمارا کا ہاتھ پکڑے بے حس و حرکت پڑا رہا پھر اسے وہیں رکھنے کا اشارہ کر کے جھاڑیوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

وہ رگھو تھا جس نے گزشتہ رات کرشنا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں کھڑا پولیس والوں پر فائر کر رہا تھا مگر اس طرف ہمیں دوڑتے دیکھ کر اس نے ہم پر بھی فائر کھول دیا تھا۔

جھاڑیوں کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر مڑا۔ اس نے

مجھے دیکھ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ رانقل سیدھی کرتا میں نے ریو اور کاٹنگر دبا دیا۔ گولی اس کی ہنسی کی ہڈی کے قریب گئی۔ وہ چیخ کر لڑکھایا تو میں نے دوسرا فائر کر دیا۔ یہ گولی اس کے سینے میں گئی اور وہ گر کر جہازوں میں لڑھکتا ہوا دوسری طرف ندی میں جا کر۔

میں نے ہمارے اشارہ کیا۔ وہ ریٹنگ ہوئی میرے قریب آگئی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑے ایک بار پھر جھٹکا ہوا دوڑنے لگا۔ میں اس کو شش میں تھا کہ یا تو اوپر سے گھوم کر پولیس پارٹی کی دوسری طرف دھک جاؤں یا کسی اور محفوظ جگہ کی طرف لیکن۔۔۔ بد قسمتی سے ہم اس وقت پولیس اور گنگولی چوہدری کے آدمیوں کے گھیرے میں تھے۔

پتھوں کی دوسری طرف پہنچنے ہی گنگولی کے ایک اور آدمی سے ٹکھ بھیز ہو گئی۔ ہم اپنا کبھی ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں رانقل تھی اور اسے فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تاہم اس نے رانقل کو لٹھ کی طرح اٹھا کر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ہمارے ہاتھ پکڑ کر بڑی تیزی سے اس کے پیٹ میں سر کی ٹکر سید کر دی۔ اس کے منہ سے ”اوٹ“ کی آواز نکلی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا دوڑ نک لے گیا اور پھر اسے دونوں ٹانگوں سے گرفت میں لے کر اوپر اٹھایا اور اپنے پیچھے اچھال دیا۔

وہ سر کے بل گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی گئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے شبلیئے کی کوشش کی تھی لیکن اس مرتبہ میں نے اسے کوئی موقع نہیں دیا اور ریو اور کاٹنگر دبا دیا۔ گولی اس کی خوب پڑی میں گئی۔ میں نے ہمارے ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے انسانی چیخوں کی آوازیں بھی گونج جاتیں۔ گنگولی چوہدری کے دو آدمی تو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کم از کم تین آدمی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پولیس کے بھی کچھ آدمی زخمی یا ہلاک ہوئے تھے کیونکہ اس طرف سے بھی چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

میں ہمارے پکڑے تیزی سے ایک طرف دوڑتا رہا۔ ہمارے ایک بار پھر ٹھوکر کھا کر گرے۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے نکلتے والی چیخ کچھ زیادہ ہی خوفناک تھی اور غالباً چیخ کی آوازیں کر ہی ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہوا چڑا ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

ہمیں دیکھ کر چڑا کی آنکھوں میں وحشت سی بھرجی۔

اس نے رانقل کا رخ ہماری طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ اُس میں ہمارے ساتھ ایک طرف لوٹ نہ لگا دیتا تو ہم دونوں نے جسم بچانی ہو جاتے۔

چڑا کی رانقل خالی ہو گئی۔ اس نے رانقل ایک طرف پھینک دی اور خنجر نکال کر میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تو کہ میں منتا تھا۔ میں اس وقت ہمارے قریب پشت کے ہاتھ پر تھا۔ چڑا نے خنجر والا ہاتھ اٹھا کر خوں خوار ہیمو گیلے کی طرح میرے اوپر چھانک لگا دی۔

میں نے بڑی پھرتی سے ہمارے اوپر سے دھکیل دیا اور ریو اور والا ہاتھ اٹھا کر ٹریگر دبا دیا چلا گیا۔ مجھ تک پہنچنے سے پہلے تین گولیاں چڑا کے سینے میں پھوس ہو گئیں اور وہ چیخ ہوا ڈھیر ہو گیا۔ میں نے بھی بڑی پھرتی سے ایک طرف لوٹ لگا دی تھی۔

چڑا فتم ہو گیا تھا۔ وہ چڑا بنے پولیس سے چھڑانے کے لیے گنگولی چوہدری نے تیرہ بے گناہ سیاحوں کو اٹھایا تھا اور تین دن میں کم از کم چھ افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اتفاق سے وہ میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

میں ہمارے ہاتھ پکڑ کر پھر ایک طرف دوڑا۔ ہمارے ایک طرح ہانپ رہی تھی۔ میں اسے کھینچتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر میں رک گیا۔ آگے پتھوں کی دوسری طرف وہ ندی تھی جو کچھ دور جا کر تالاب میں گرتی تھی۔ پتھوں کی دوسری طرف سے گنگولی اور کروشا کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ہمارے چھوڑ کر آگے بڑھا اور پتھری دوسری طرف جھانکنے لگا۔

وہ دونوں تقریباً دس فٹ نشیب میں تھے اور وہ غلغلہ خوفناک تھا۔ گنگولی چوہدری نے کروشا کو رانقل کی ذرپے لے رکھا تھا۔ قریب ہی ایک لاش پڑی تھی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے چوہدری۔“ کروشا چیخ رہی تھی ”اس وقت تمہیں آدمیوں کی ضرورت ہے اور تم اپنے ہی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہو۔“

”تم جانتی ہو غداروں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔“ چوہدری نے جواب دیا ”یہ بھنڈاری بھی پولیس کو رات کے اندر میرے میں میاں لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے غدار کی سزا دی ہے اور تم۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا ”میں بھی غدار ہوں۔ تم نے اس چوکری اور اس کے عاشق کو قتل ہوئے۔“ موقع دیا۔ تمہیں بھی غدار کی سزا ملے گی۔“

”چوہدری!“ میں چیخا ”رانقل پھینک دو۔ تم میری ذمہ

ہو۔“ چوہدری تیزی سے میری طرف گھوما۔ میں نے ریو اور کاٹنگر دبا دیا۔ ”سب“ کی آواز نکلی کر وہ گئی۔ ریو اور خالی ہو چکا تھا۔ چوہدری نے رانقل کا بدست مارا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف کر کے اپنے آپ کو بچایا اور پھر دوسرے ہی لمحے کروشا کی بیسٹک چیخ اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں کر میں اچھل پڑا۔ میں نے پتھری کی آواز سے جھانک کر دیکھا تو کچھ منہ کو آتا ہوا محسوس ہوا۔ کروشا گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ وہ خون اور کچڑ میں لٹ پٹ ترپ رہی تھی۔ گنگولی چوہدری وہاں سے بھاگ چکا تھا۔

میں نے اس دھلان پر جھانک لگا دی۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ دائیں بائیں بڑے بڑے چوڑے پتھر تھے جن کے اندر سے ندی کا پانی رس رہا تھا اور سامنے منجھان درخت تھے۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے یہ محفوظ ترین جگہ بھی اور اسی لیے گنگولی چوہدری نے یہاں مورچہ لگا رکھا تھا لیکن میری وجہ سے اسے یہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔

گنگولی چوہدری واقعی انسان نہیں بھیٹا تھا۔ میرے سامنے وہ اب تک اپنے ہی تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ پہلا، اموجس نے ہمارے ساتھ دست دراز

لی کوشش کی تھی۔ دوسرا بھنڈاری جو اس کے کینے کے مطابق پولیس کو سنا لایا تھا۔ اس کی لاش بھی میرے سامنے پڑی تھی اور تیسری کروشا جس کا جسم یہ تھا کہ اس نے نیچے اور ہمارے کونان کے پتھل سے نکلنے میں مدد دی تھی۔

میں دوڑ کر کروشا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کچڑ اور خون میں لٹ پٹ تھی۔ ساری گولیاں اس کے پیٹ میں گئی تھیں۔ خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سینے کا زبردست ہتارہا تھا کہ وہ ابھی زندہ تھی۔ ”کروشا! کروشا! آنکھیں کھولو۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی لمحے پیچھے آہٹ سن کر میں تیزی سے مڑا۔ وہ ہمارا تھی جو دھلان پر ٹھسٹی ہوئی تھی آری بھی اور پھر کروشا کو دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی گئی۔

”یہ۔ یہ کیا ہوا؟“ وہ ہبشل بول سکی۔ ”اسے ہماری مدد کرنے کی سزا بھگتی پڑی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”چوہدری نے اسے محض اس لیے گولیوں سے چھانی کر دیا کہ اس نے ہمیں بھانگے میں مدد دی تھی۔“ ”یہ۔ یہ زندہ ہے۔“ ہمارے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

## جاسوسی انجمن میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کتابیں

### علی بابا خان کی سرگزشت

کتابی صورت

(گیارہ حصوں میں)

تیسرا حصہ



قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

## کتابیات بیلگی کی پبلشر

فون: 5802552-5895313

5802551

74200

kitabiat1970@yahoo.com

آتش فشاں 75 حصہ 5

آتش فشاں 74 حصہ 5

نہ دشا نے آنکھیں کھول دیں۔ بے پناہ کرب تھا ان آنکھوں میں۔ وہ چند لمحے ہماری طرف دیکھتی رہی۔ شاید اسے پہچانتے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور پھر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر ہمارے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”جی۔ جیسے۔“ اس کے ہونٹ کھپکھپائے اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی نہ کھولنے کے لیے۔

میں نے کوشا کا ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ ہمارے بڑی مشکل سے اس کے سینے پر سے ہاتھ ہٹایا تھا۔ خوف و دہشت سے اس کا چہرہ پیلا ہو گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ہمارے ہونٹوں سے لنگھتی چوہری جیسے وحشیوں کے جال میں پھنسنے والی تھی اور وہ کوشا کی بھی جو اب تک اسے بچائے ہوئے تھی اور ہمارے کونجائے کے لیے ہی اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ مجھے بھی کوشا کے اس طرح مرنے کا بہت افسوس تھا۔ اگر وہ اس وقت ہمارے ساتھ بھاگ نکلتی تو ہم یقیناً اس بھگن سے نکلنے میں بھی کامیاب ہو جاتے اور مجھے یقین تھا کہ کوشا ایک نئی اور خوشگوار زندگی کے راستے پر بھی گامزن ہو جاتی لیکن شاید یہ سب کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ قسمت کا پتھر بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔

تر تراہٹ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ ہمارے سامنے درختوں میں فائرنگ ہو رہی تھی۔ سامنے سے اس پناہ گاہ سے لگنا ممکن نہیں تھا۔ ہم کراس فائرنگ کی زد پر آ سکتے تھے۔

میں ہمارا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ میرا ریا اور تو خالی ہو چکا ہے۔ مجھے کوشا کی رائے منتقل کرنا چاہیے تھی۔

”تم یہیں رکو۔ میں آتی ہوں۔“ میں نے ہمارے کما اور دوبارہ ڈھلان پر اترنے کے لیے مزاحمتی ہاتھ چوہری کا ایک آوی کسی طرف سے دوڑا ہوا ہاں پہنچ گیا۔ میں نے مرکز ہمارا ہاتھ پکڑا اور دوسری طرف دوڑ لگا دی۔

اب میرا دایاں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ہمارا ہاتھ پکڑے دوڑنا رہا اور پھر ہمیں رک جانا پڑا۔ ہمارے راستے میں حائل وہ ندی چارپانچ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ میں تو آسانی سے چلا تک لگا کر دوسری طرف پہنچ سکتا تھا لیکن ہمارے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

”رک جاؤ۔ ایک منٹ رک جاؤ بہت سنگھ۔“ ہمارے

کہا۔ وہ بری طرح بانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے نہ ہر رہا تھا۔ اس سے اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہوا ہمارا ہاتھ۔ میں نے پیچھے سرگرد کیا۔ ہم اس جگہ سے بہت دور آ گئے تھے۔ پولیس نے گنگولی چوہری کے کیپ کو گیرے میں لے رکھا تھا اور میرے خیال میں کسی کے بھی زندہ بچنے کا امکان نہیں تھا۔ فائرنگ کی آوازیں خاصی دور تھیں اور میرے خیال میں چند منٹ رک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

میں نے ہمارا ہاتھ پھوٹ دیا۔ وہ ”بھد“ سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے زمین پر ٹکا لیے۔ اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ میں اس کے قریب کھڑا تھا نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد ہمارا اپنی حالت پر قابو پانے لگی۔ اس نے شکم سیر ہو کر ندی سے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں میں اب بھی بلی کی نیکیا ہٹ تھی۔ میں نے بھی پانی کے چند گھونٹ پئے اور آگے روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

ندی کا پانی شفاف تھا۔ اس کی تہ میں پتھر نظر آ رہے تھے۔ گہرائی ڈھائی تین فٹ کے قریب تھی۔ پانی کا بناؤ بھی کسی قدر تیز تھا اور ہمارا ندی میں اترتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

”اگر تم پانی میں نہیں اترنا چاہتیں تو ندی پار کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا؟“ ہمارے سوالیہ لٹاؤں سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ۔“ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ”میں نے یہ کہتے ہوئے بڑی پھرتی سے جبکہ کمر ہمارے گود میں اٹھالیا۔

ہمارے منہ سے بلی کی چیخ نکلی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی ٹانگوں کے نیچے اور دوسرا گردن کے نیچے تھا۔ اس کی شرٹ کے ٹخن ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کے اندر کی تصویر میرے دماغ میں سنسانٹ سی پیدا کر رہی تھی۔ ہمارے ایک ہاتھ میری گردن پر ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے فیص کے گردن کے دونوں حصے پکڑ کر میری نظروں کے سامنے برد ڈال دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ہمارا آنکھوں میں ایک دم سرخی کے ڈورے تیرنے لگے تھے اور چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔

میں بڑی احتیاط سے ندی میں اتر گیا۔ کنارے کے قریب تو پانی واقعی ڈھائی تین فٹ گہرا تھا لیکن درمیان میں پانی میری کمر تک پہنچ گیا اور ہمارا بھی نیچے۔ ندی کی دہائی خاصی تیز تھی۔ دو تین مرتبہ میرے قدم لڑکھائے تھے۔ ایک

مرتبہ تو میں گرتے رہا تھا۔ ”سرسے کنارے کے قریب پہنچ کر میں نے ہمارا کو ”سرسے کنارے پر ڈال دیا۔ وہ پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں پر ہمارا ہاتھ۔ ندی کا کنارہ عمودی تھا۔ اور ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔ یہاں بھی ہمیں اس وقت تک کھڑے رہنا چاہیے کہ ہمارے کپڑوں سے پانی چڑھا بند نہیں ہو گیا اور پھر ہم تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔ ہمارا کا اپنے آپ پر اعتماد بحال ہو رہا تھا اور وہ بھی میرے ساتھ تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی۔

جب میں فائرنگ کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ ممبرک مجھ پہلے کے قریب شروع ہوا تھا۔ اب سورج سوا نیچے پر آ رہا تھا اور یہ ممبرک ابھی تک جاری تھا۔ گنگولی چوہری کے آدمیوں کے پاس وافر مقدار میں اسلحہ موجود تھا۔ پانچ سو گولیاں توکل ہی رائفٹس نے لاکر دی تھیں اور لگتا تھا کہ پولیس بھی پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

اوپر نیچے راستوں پر چلتے دوڑتے ہوئے ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں اب بھی ہم تک پہنچتی تھیں اور وہ بہت دور کی آوازیں تھیں۔

اس جگہ درخت چھدرے تھے لیکن جھاڑیاں اور چڑے پتوں والے پودے بکثرت تھے۔ کہیں کہیں تو یہ پودے اتنے گنجان تھے کہ ہمیں راستہ بنانے میں بھی خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔

دوپہر ہو گئی۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ ہمارا تنگ گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھائے لگی تھی۔ پاس کی شدت سے اس کا بھی برا حال ہو رہا تھا اور میرے حلق میں بھی کانٹے چبھنے لگے تھے۔ اس ندی کے بعد سے ہمیں کہیں نہ تو کوئی اور ندی ملی تھی اور نہ ہی کسی جگہ جوڑیاں تالاب کی صورت میں پانی کا ذخیرہ نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ بھوک سے بھی بیت میں کر رہی سی رہنے لگی تھیں مگر بھیاں کی شدت نے زیادہ بچھین کر رکھا تھا۔

میں ایک گھٹنا چلتے رہنے کے بعد بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں درختوں کے جھنڈ کی دوسری طرف ایک سٹیج پر لڑے میں پانی نظر آیا۔ یہ بارش کا پانی تھا جو اس لڑے میں جمع تھا۔ دوسرے کنارے پر دو ہرن پانی پی رہے تھے۔ دو بیکس دیکھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔

دو بیکس میں بونے کی وجہ سے پانی گرم تھا لیکن بہر حال پیاس کو بوجھ سہی تھی۔ عجیب قسم ظریف تھی۔ جس جوڑے سے

جنگلی جانور پانی پیتے تھے اسی سے ہم اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ پانی کی گرمیہ بوڑے چند گز دور درختوں کے سامنے میں آ گئے۔ ہمارا پیاس پر لٹ گئی۔ گہرے سانس لینے سے اس کے سینے کا ذریعہ ہم بڑا دل فریب منظر پیش کر رہا تھا۔ اس سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے میری نظرس ایک بار پھر جوڑے کی طرف اٹھ گئیں اور اس مرتبہ میں بری طرح چوک گیا۔

جوڑے کے دوسرے کنارے پر ایک بھینڑیا پانی پی رہا تھا۔ دراصل زبان سے پانی پینے کی ”چڑچڑ“ کی آواز نے ہی مجھے اس طرف متوجہ کیا تھا۔ پانی پینے کے بعد بھینڑی نے تھو تھنی اوپر اٹھائی۔ وہ شاید فضا میں کچھ سوگندہ رہا تھا اور پھر اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے اس کی ماں مر گئی ہو اور وہ بین کر رہا ہو۔

ہمارا بھینڑی کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ وہ چھٹی پھٹی سی نظروں سے اس بھینڑی کو دیکھ رہی تھی جو اب بھی تھو تھنی اٹھائے بین کر رہا تھا۔

”بھاگو یہاں سے۔“ وہ نوب زدہ سی آواز میں بولی ”یہ اپنے دوسرے ساتھ ہے۔“ ہمارے جب آگے دو چار بھینڑیے اور یہاں جمع ہو گئے تو ہمیں گھبر کر ہمارے سینے اوپر دھڑکیں لگنے لگیں۔ ”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بلا رہا ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ بھینڑی کی فطرت ہے۔“ ہمارا بولی ”وہ اکیلا ہو تو کسی انسان پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کرتا لیکن اگر غول کی صورت میں ہوں تو اکیلے دو ایک انسان کو زندہ بچ کر جانے نہیں دیتے۔ اس سے پہلے کہ اس کے دو چار ساتھی اور آجائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

ہمارے غلط نہیں کہا تھا۔ دو تین منٹ بعد ہی جوڑے کی دوسری طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر درختوں سے ایک اور بھینڑیا نکل کر جوڑے کے کنارے پر پہنچ گیا اور وہ بھی پہلے بھینڑی کے ساتھ تھو تھنی اٹھا کر منہ سے بین جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ دونوں بار بار ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دو چاروں کی طرح چلتے ہوئے گنجان درختوں میں چلے گئے اور پھر اٹھ کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ جوڑے کے پرلے کنارے سے بھینڑیوں کے رونے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں مگر ہم لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہوتے رہے۔

ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے اور یہ شکر ہے کہ ان بھیڑیوں نے ہمارا پیچھا نہیں کیا تھا۔ مجھے اچانک ہی وہ خواب یاد آیا۔ وہ میں نے تین چار روز پہلے دیکھا تھا۔ بھیڑیوں نے بلا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے لپک رہے تھے۔ اسے چیر پھاڑ کر اپنی خوراک بنانا چاہتے تھے۔

میں نے اسے انسان نما بھیڑیوں کے جنگل سے تو نکال لیا تھا اور اب اصلی خوں خوار بھیڑیوں کے گھیرے میں آتے آتے رہ گئے تھے۔ میں نے بلا کو اپنا خواب سنایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”تو تم مجھے سپنوں میں بھی دیکھنے لگے بہت سنگھ!“ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بڑی پراسراری پنک تھی۔

”کیا کتنا چاہتی ہو؟“ میں نے اسے گھورا حالانکہ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

”سپنوں میں تو اس کو دیکھا جاتا ہے جس کی من میں لگن ہو۔“

”اگر لگن نہ ہوتی تو میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہیں بچانے کے لیے بھیڑیوں کے اس بھٹ میں کیوں گھستا۔“ یہ الفاظ میرے منہ سے بالکل غیر ارادی طور پر نکلے تھے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ بلا کی لگن ہی نہ مجھے موت کے اس کنوئیں میں کودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں نے جب سے بلا کو دیکھا تھا اپنے آپ میں عجیب سی ہانپل اور بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ لڑکی میرے حواس پر بڑی طرح چھائی تھی۔

بلا پچھلی رات سے میرے ساتھ تھی۔ رات تو وہ میری گود میں سر رکھ کر سوئی رہی تھی اور صبح سے میرے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر نندی پار کی تھی تو اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی تھی اور اب اس کی جبک ختم ہو گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی اور اپنا ایک ہاتھ بھی میری کمر میں تھام کر رکھا تھا۔

بہم خطرے سے نکل آئے تھے لیکن میرے خیال میں ہم نے خطرے کی آخری حد ابھی پار نہیں کی تھی۔ گنگولی جو بددی کے کئی آدمی میرے اور پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ جو بچے تھے انہیں ہم پولیس سے الٹھا چھوڑ آئے تھے۔ ان کا خطرہ تو فی الحال مل گیا تھا لیکن میلوں دور تک پھیلنا ہوا یہ جنگل بھی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ یہاں خوں خوار درندے بھی تھے اور ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم

کس طرف جا رہے ہیں اور کبھی اس جنگل سے باہر نکل سکیں گے یا نہیں۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے بہت سنگھ۔“

بلا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں اب تک اس احساس کو دبائے ہوئے تھا مگر بلا کی قوت برداشت تو اب دے گئی تھی۔ میں نے اوڑھ اڑھ کر دیکھا۔

”اس طرف چلو۔ شاید وہاں کوئی پھل درخت نظر آجائے۔“ میں نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں گنجان درخت تھے اور ان میں ناریل کے بھی کئی بلند درخت نظر آ رہے تھے۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ دوسرے زحل پر تھی۔ سورج کا جھکاؤ مغرب کی طرف تھا اور میں سورج ہاتھ کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی ایسی محفوظ جگہ بھی تلاش کر لینی چاہیے جہاں ہم رات گزار سکیں۔

درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چند ناریل مل گئے۔ درختوں کے کب سے درختوں سے ٹوٹ کر وہاں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پتلون کے پانچنے سے خنجر نکال لیا اور ایک ناریل کا چمکاؤ جھرنے لگا۔

ناریل کھول کر میں نے گرمی میں خنجر کی نوک سے سورج نکال دیا اور اسے بلا کی طرف بڑھا دیا۔ بلا نے ناریل سے لگا کر پانی کا ایک ٹھونک بھرا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ناریل میں بچا کھپائی میں نے حلق میں اندر لیا اور خنجر ناریل کے ٹکڑے کرنے لگا۔

میں نے ایک اور ناریل اٹھالیا اور ہم وہاں سے آگے چل پڑے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے ایک ایسی جگہ نظر آئی جہاں ہم آرام سے رات گزار سکتے تھے۔ یہ پہاڑی میں ایک کھوہ سی تھی جس میں تین چار آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ اس کھوہ کے سامنے قد آور بوڑھے اور درخت تھے اور اس طرح یہ چھوٹا سا غار کچھ اور جمی ٹھونڈا ہو گیا تھا۔

ابھی دن کی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے اس بٹ سے تھرے غار کا جائزہ لے کر اندازہ لگالیا کہ وہاں ہم سے کچھ بھی کوئی نہ کوئی رہتا رہا ہے۔

جب تک دن کی روشنی رہی ہم باہر بیٹھے رہے اور بلا اندھیرا پھیلنے کی غار میں آگے اور وہاں کے قریب ہی رہا۔ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور باتوں میں وقت گزارنے کی کوشش کرنے لگے۔

بلا کے بارے میں میں نے جو کچھ بھی سنا تھا، نوکر

بھانوت سنگھ ہی سے سنا تھا۔ وہ تو خود بھی اپنے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی لیکن بہت سی باتیں ایسی تھیں جو پہلی ملاقات میں نہیں کہہ سکی تھی۔

باہر رات گہری ہو رہی تھی۔ جمینگوں اور حشرات الارض کی آوازیں دلوں پر عجیب سی وحشت طاری کر رہی تھیں۔ غار میں بھی گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ جھانکی نہیں دیتا تھا۔ بلا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے اوپر اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور پھر اس نے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کے منہ سے سرگوشی جیسی آواز نکلی۔

”ڈر۔ کس چیز سے۔“ میں نے کہا ”اندھیرے سے“ مجھ سے اس جنگل سے؟“

”ہاں ایسی چیز تو نہیں ہو کہ تم سے ڈرا جائے لیکن ڈر تو ڈر ہی ہوتا ہے۔ یہاں اندھیرا بھی ہے۔ جنگل بھی ہے۔ خوں خوار درندے بھی ہیں اور۔“

”دیکھو بلا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”ڈر کی ٹرنگ تو ہمیں پہنچ ہی سے ملتی ہے اور شروع ہی سے ہمیں بھوت، چیل، اندھیرے اور دوسری بہت سی چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے لیکن ایک وقت میں ایک ہی چیز سے ڈرنا چاہیے۔ تم نے تو بہت سی چیزوں کے نام لے دیے۔ اب میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا کہ تم دراصل کس چیز سے ڈر رہی ہو۔“

”تمہیں مذاق سوچ رہا ہے اور میں واقعی ڈر رہی ہوں۔ دیکھو میرا دل کس تیزی سے دھڑک رہا ہے۔“ بلا نے میوا ہاتھ پکڑ کر اپنے پر رکھ دیا۔

بلا نے ایسا بے اختیار ہی میں کیا تھا اور میرے خیال میں اس کے ذہن میں کوئی پر اُتار نہ بھی نہیں تھی لیکن اس کی اس مصروف حرکت سے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کپٹیاں لگ گئیں اور داغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر دبا رہی تھی۔ میری گردن پر چیونٹیاں سی لگیں گئیں اور جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

”دیکھا۔ دیکھا میرا دل کتنی زور سے دھڑک رہا ہے؟“ اس نے میرا ہاتھ دبا دے ہوئے کہا۔

بلا کے دل کی دھڑکن تو میں محسوس نہیں کر سکا لیکن میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے میرے سینے میں دھڑکتا ہوا گوشت کا ٹکڑا سینے کا پیڑہ

توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہا مگر اس نے میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ مزید بڑھا دیا۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ کیا حرکت کر گزری ہے اور شاید اب وہ اس ڈر اور خوف کے تحلیل کو آگے بڑھانا چاہتی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ میری گردن میں ڈال دیا اور دباؤ ڈالتے ہوئے میرا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لانے لگی۔

اس کی گرم گرم ہلے دباؤ سانس میرے چہرے سے نکلا رہی تھیں اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے ہونٹوں پر انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ ان انگاروں کی تپش میرے اندر تک پھیلنے لگی تھی۔

اور پھر اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے گولڈن ٹرائی کی جنگل کی وہ رات یاد آگئی۔ بالکل ایسی ہی صورت حال تھی۔ میں اور سونیا موت کے ہرکاروں سے بچنے کے لیے ایسے ہی ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ ایسی ہی کالی رات تھی۔ اندھیرا غار۔ ہمارے دلوں پر موت کے ہرکاروں کا خوف طاری تھا لیکن اس تاریک غار میں ایک دوسرے کے قرب میں وہ خوف ہمارے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ گھٹا گھٹا اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن لمس سے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے۔

بالکل ایسے ہی ہوا تھا۔ سونیا اس اندھیرے غار میں اسی طرح میرے کھنچے پر سر رکھ کر لیٹی تھی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح سونیا نے میری گردن میں بازو ڈال کر میرا چہرہ اپنے چہرے پر جھکایا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر اس کی گرم سانسوں کا لمس محسوس کیا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں کی تپش نے میرے سینے میں آگ لگادی تھی اور میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اسے کروار کی عظمت کو بھول گیا تھا اور میں بلند یوں سے پتھروں کی طرف گرتا چلا گیا تھا۔

وقت اپنے آپ کو اسی رنگ اور اسی انداز میں دہرا رہا تھا۔

”نہیں!“ میرے اندر سے کوئی چیخا۔

میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ بلا تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ کر دیا۔

”کیا ہوا بہت سنگھ۔ ناراض ہو گئے؟“ اندھیرے میں بلا کی لرزت ہوئی تو آواز سنائی دی۔

”نہیں بہا۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے



ہوئے کہا "جو کچھ ہوا... مجھے چھما (معاف) کر دو۔ میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا جس سے میرے اور لنگولی چوہہ کی کے چھ فرق مٹ جائے۔ ہمیں یہ سب کچھ شوبا (ذریعہ) نہیں دیتا۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم باتیں کریں گے۔ بہت ساری باتیں۔"

"اب باتیں تو بہت اچھی کر لیتے ہو۔" بلا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم نے کل رات یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے بڑی لگن ہے اور یہ لگن ہی تمہیں اس خطرناک جنگل میں لے آئی تھی جہاں لنگولی چوہہ ری جیسے لیروں نے مجھے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔"

"ہاں بلا۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔" میں نے بر سکون لیٹے میں جواب دیا۔ ویسے میں اس کے طنز کو سمجھ گیا تھا۔ لیکن تم تو پدمی لکھی لڑکی ہو۔ سمجھ دار ہو لیکن یہ چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آسکتی کہ جس کھلونے سے کھیل لیا جائے اس سے جی بھر جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک دوست کی طرح اپنے دل میں جگہ دی ہے اور دوستی تو وہ پوتر اور مقدس رشتہ ہے جس کی بنیاد وفا اور اعتماد پر قائم ہوتی ہے اور اگر اعتماد ہی چٹا چر رہے ہوتے تو اس رشتہ کا تقدس بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

"مجھے نیند آرہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میں اس کی ناراضگی کو سمجھ گیا "آؤ۔ میری گود میں سر رکھ کر سو جاؤ۔" میں نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ واقعی ناراض تھی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور کچھ دیر بعد وہ واقعی سو گئی۔ میں اسی طرح دوبارہ سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور پھر میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

پرنندوں کے چھپانے اور ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بلا میرے پاس نہیں تھی۔ وہ قمار میں جی نہیں تھی۔ میں نے باہر دیکھا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے باہر گیا اور پھر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

بلا غار سے چند گز دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ واقعی ناراض تھی۔

"لتنا اچھا لگ رہا ہے یہاں بیٹھنا۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا "پرنندوں کے سر پیلے لگتے، تازہ ہوا"

کی بہتات تھی۔ بلا جلتے لڑکھا کر گر گئی۔ "اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" وہ کراہ رہی تھی "پانی۔ مجھے پانی دو۔ میرا گلہ خشک ہو رہا ہے۔ سانس رک رہا ہے۔" میری آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ میں چند لمحے اوجھل اور دیکھتا رہا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم یہیں رکو۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں۔ شاید پانی مل جائے۔"

"جلدی آ جانا۔" مہم مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بلا نے کراہتے ہوئے کہا۔ میں جواب دیے بغیر دوڑتا ہوا شیب میں اترتا چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد میں ایک چھوٹی سی ندی پر پہنچ گیا اور اتفاق سے ایک ناریل کے گری کے اوپر والے سخت ٹھیکے کا آدھا حصہ بھیج مل گیا جو کسی کنویرے کی طرح تھا۔ شاید یہی کوئی اور تھ کر زرا تھا جس نے یہ پیالہ ناریل کا چٹکا یہاں پھینک دیا تھا۔

میں نے ناریل کے پیالے کو خوب اچھی طرح دھو کر پلے خود پانی پیا اور پھر پیالہ بھر کر واپس چل پڑا۔ واپسی میں جی مجھے دس منٹ لگ گئے اور جب میں پودوں سے نکل کر کھل جگہ پر آیا تو اس درخت کے نیچے بلا کو نہ پا کر پریشان ہو گیا۔

جگہ وہی تھی مگر بلا غائب تھی۔ وہ کہاں جا سکتی ہے؟ میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ کر اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ ہوسکتا ہے کسی جانور کو دیکھ کر بلا ڈر گئی ہو اور اس سے بچنے کے لیے جھاڑیوں میں چھپ گئی ہو۔

"بلا۔ کہاں ہو تم۔" میں دیکھو تمہارے لیے پانی لے آیا ہوں۔" میں نے بلا کو پکارا۔

جواب میں خاموشی رہی۔

"بلا۔ کہاں ہو تم؟" میں نے اس مرتبہ زیادہ اونچی آواز میں پکارا۔

اس مرتبہ ایک طرف سے ٹھنڈی ہوا آواز سنائی دی۔ میں اس طرف مڑ گیا۔ اس طرف چوڑے پتوں والے قد آدم پودوں میں حرکت ہو رہی تھی اور چند سیکنڈ بعد میں نے جو منظر دیکھا وہ بہت ہی خوفناک تھا۔ وہ لنگولی چوہہ ری تھا جس نے ایک ہاتھ بلایا کی گردن پر سے گھما کر اس کا منہ بند رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر نوک اس کے برہنہ سینے سے لگا رکھی تھی۔ "خبر مجھے تھے چھوڑ کر کی کو لے کر بھاگ جاؤ گے۔" لنگولی نے خلق سے جیسے لے کی غراہٹ نکلی "لنگولی شیر

# ہزاروں ماہرین طب کی آراء گردشی شش مرثہ کردہ کتاب



قیمت 45 روپے ❖ ڈاک خرچ 23 روپے

مناپا..... دل سے دشمنی  
مناپا..... زندگی کا خاتمہ

کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔

تو پھر جلدی کیجئے.....

## ہزاری مرثہ کردہ کتاب

"مناپا اور اس کا سدا باب" کا مطالعہ ضرور کیجئے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ پندرہ روپے یعنی آٹھ روپے ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں



63-C فیئر بینک منس D.H.A. میں کوئی روڈ راجی

ہے اور اس کے منہ سے شکار چھیننے کے لیے کوئی مائی کالا ل  
ابھی پیدا نہیں ہوا۔“  
میرے دماغ میں سنسنی ہو رہی تھی مگر میں نے فوراً  
ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ پانی کا پالہ ابھی تک میرے ہاتھ  
میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے وہ پیالہ پوری قوت سے  
چوہدری کی طرف اچھال دیا۔

آدھے سے زیادہ پانی راستے ہی میں گر گیا لیکن نارمل کا  
پیالہ گنگولی چوہدری کے منہ پر لگا۔ اس کے منہ سے گندی گالی  
اُٹکی۔ اس کا پتھر دلی کے سینے سے ہٹ گیا اور یہی میں چاہتا  
تھا۔ میں نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر چلاٹنگ لگا دی اور  
چوہدری کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ بلا بھی جتنی ہوئی ایک  
طرف گر گئی تھی۔

خبر چوہدری کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں کچھ دیر  
چوہدری کو روک دیا تاہم پھر اس کا داؤ چل گیا۔ اس کی چند  
ٹھوکریں کھانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے  
سے جھگڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو روکتے ہوئے  
پھاڑی کے کنارے کے قریب پہنچ گئے۔ دوسری طرف عمودی  
ڈھلان تھی اور سیکنڈ فٹ گہرا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور اٹھ  
کر کھڑا ہو گیا۔ گنگولی چوہدری مجھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا اور  
میں اس سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹ رہا تھا۔

اور پھر یہ جنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ اس طرح مجھے کھڈ  
کے کنارے کی طرف لا رہا تھا۔ کھڈ کا کنارہ صرف چند فٹ  
دور رہ گیا تھا۔

گنگولی کی ایک ٹھوکریں سے بچنے کے لیے میں نے اچھلا  
چاہا تو ایک پتھر میرے پیر کے نیچے سے نکل گیا۔ میں لوکڑا کر  
گرا اور کنارے کی طرف لڑھکتے لگا۔

میری ٹانگیں عمودی کنارے سے نیچے لٹک گئی تھیں اور  
میں نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے کنارے پر  
ایک جمادی کی شاخوں کو پکڑ لیا۔ نیچے کی طرف نگاہ ڈالی تو  
سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کھڈ سیکنڈ فٹ  
گہرا تھا اور نیچے بڑے بڑے پتھر تھے۔

میرے جسم کے تمام پسینہ اگلنے لگے۔

گنگولی چوہدری پر جنون طاری تھا۔ وہ جمادی پر سے  
میری گرفت چھڑانے کے لیے میرے ہاتھوں پر ٹھوکریں برسا  
دہا تھا۔ موت مجھے آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی اور میں  
نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے سیدھے ہاتھ پر گنگولی چوہدری کے پیر کی ایک  
اور ٹھوکریں لگی۔ یہ ٹھوکریں پہلے سے زیادہ دردناک تھیں۔ اس نے  
جو گردن پھرنے لگی تھی اور جوتے کی ٹوٹے میری انگلیوں کے  
جوڑوں کی کھال اوپر زور دیتی تھی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔  
جمادی پر میری گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ اب میرا سارا زور  
بائیں ہاتھ پر تھا جس سے میں نے جمادی کی دوسری شاخ کو  
پکڑ رکھا تھا۔

گنگولی چوہدری کی حالت واقعی اس درد سے جیسی تھی  
جس کے منہ سے اس کا نوالہ چھین لیا گیا ہو۔ وہ مجھے زندہ  
نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے سیدھے ہاتھ پر ایک  
اور ٹھوکریں لگائی۔ اس مرتبہ اسے باؤسی نہیں ہوئی۔ جمادی  
میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے ایک تھکا سا لگا۔ اب میں نے  
صرف بائیں ہاتھ سے جمادی کی دوسری شاخ کو گرفت میں  
لے رکھا تھا اور گنگولی جس طرح میرے ہاتھوں پر دہلی  
جھکوڑے کی طرح ٹھوکریں برسا رہا تھا اس سے کسی بھی لمحے  
میرے دوسرے ہاتھ کی گرفت بھی چھوٹ سکتی تھی۔

میں نے گردن جھکا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ مجھے سیکنڈ  
فٹ نیچے کی زمین گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سر کو دو  
تین جھٹکے دے کر اپنے حواس پر قابو پایا۔ اس وقت معمولی  
ساخوف بھی میرے حوصلے کی مضبوط بنیادوں کو ہلا سکتا تھا اور  
یہ دراصل حوصلہ ہی تھا کہ میں اب تک زندگی اور موت کے  
درمیان لٹکا ہوا تھا۔

گنگولی اب میرے دوسرے ہاتھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔  
میرے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑوں کی کھال اوپر زور  
دیتی تھی جس سے بہت ہلکا سا خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اپنے  
آپ کو ہلکا سا جھکا دے کر اس ہاتھ سے ایک بار پھر جمادی کی  
ایک شاخ کو پکڑ لیا۔

چٹان کے کنارے پر پتھروں میں وہ جمادی اگرچہ خاصی  
مضبوط تھی لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اس کی جڑیں زیادہ دیر تک  
ابھی جگہ پر جچی نہیں رہ سکیں گی۔ یہ چٹان پتھروں اور سبز پتھر  
بھری مٹی پر مشتمل تھی۔ گنگولی چوہدری کی ہر ٹھوکریں کے ساتھ  
سرخ مٹی جی اڑ رہی تھی۔ ہر ٹھوکریں کے ساتھ میرے جسم کو  
جھٹکا بھی لگ رہا تھا اور اس بات کا ہاتھ کہ کسی جھٹکے کے  
ساتھ جمادی کی جڑیں اپنی جگہ نہ چھوڑ دیں۔

کچھ دیر پہلے گنگولی چوہدری نے ہلا کو اٹھا کر ایک طرف  
پھینک دیا تھا۔ گرنے سے اس کے سر پر شاید چوٹ لگی تھی۔  
وہ کچھ دیر جمادیوں میں بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اٹھ کر  
جتنی ہوئی گنگولی چوہدری کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور اسے وہاں

سے پھینک دیا۔ اس کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ  
چینا کر مجھے بھی خبردار کر رہی تھی۔  
چینا بہت تھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکڑ رکھا ہے۔ تم  
اپنے آپ کی کوشش کرو۔

گنگولی چوہدری کو وہاں سے چند فٹ دور لے جانے  
میں کامیاب ہو گئی تھی۔ گنگولی چوہدری اپنے آپ کو چھڑانے  
کی کوشش کرتے ہوئے غلط گالیاں بک رہا تھا۔ اس نے اپنی  
ایک ٹانگ چھڑائی۔ دوسری ٹانگ اب بھی ہلا کی گرفت میں  
تھی۔ وہ جو بک کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں اس  
نازک بدن لڑکی کی بہت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ گنگولی  
چوہدری اپنی آزاد ٹانگ سے اسے ضربیں لگا رہا تھا مگر بلا جس  
طرح دہلیزی سے اس صورت حال کا مقابلہ کر رہی تھی وہ قابل  
تغریف تھا۔

”ہمت نکلے۔ اوپر آؤ۔ جلدی کرو۔“  
میں نے اب جمادی کی شاخوں کو مضبوطی سے دونوں  
ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے گرفت کچھ اور مضبوط کر کے  
دونوں پیر چٹان پر بٹھا دیے۔ اس وقت میری پوزیشن بالکل  
ایسے تھی جیسے کوئی کوئی کپڑا رسی سے لٹک کر چٹان پر پیر جمائے  
اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میرے دونوں پیر قریب قریب چٹان پر پڑے ہوئے تھے پھر  
میں نے سیدھا چپ اٹھا کر اس جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر  
رکھا پھر دوسرا پیر اس سے ایک فٹ اوپر لے گیا۔ ایسا کرنے  
ہوئے میرا تمام توجہ جمادی پر پڑ رہا تھا۔

میں نے سیدھا پیر مزید اوپر بڑھایا تو مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔  
اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا دل سینے کے بجائے گھٹنوں میں  
دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جھٹکا لگنے سے میں کچھ نیچے آ گیا۔  
تھا۔ جمادی کی جڑیں مل گئی تھیں۔ میرے جسم کے تمام  
ایک بار پھر تھری سے پسینہ اگلنے لگے۔ میں بے حس و حرکت  
ہو گیا اور گرنے کے سانس لینے لگا۔ اگر میں چٹان پر پیر جماتا  
کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو سارا توجہ جمادی پر پڑنا اور  
جمادی کی جڑیں اکھڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ دینے بھی  
میرا توجہ جمادی پر تھا۔ جڑیں مل چکی تھیں اور جمادی کسی  
بھی لمحے اپنی جگہ چھوڑ سکتی تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف  
موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور ہلا  
کے چپٹے کی آوازیں ان لحات کو اور بھی سنگین بنا رہی تھیں۔  
وہ اب بھی گنگولی چوہدری کو اس جگہ سے دور رکھنے کی  
کوشش کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میرے

پاس چلی کی وہ پراسرار قوت موجود تھی جو ایسے موقع پر میری  
مدد کر سکتی تھی۔ مجھے شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں  
ماسٹرینگ پانی کی سنانی ہوئی وہ کمالی یاد آئی کہ کس طرح زمانہ  
قدیم میں بدھ بھکشو پرنڈوں کی پشت پر بیٹھ کر سفر کر لیا کرتے  
تھے اور پرنڈے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے  
اوپر کوئی بوجھ لدا ہوا ہے۔ ان بھکشوؤں کے پاس چلی کی قوت  
تھی اور وہ اس سے کام لیتا جانتے تھے۔ چلی کی وہ پراسرار  
قوت میرے پاس بھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس  
درجے تک پہنچ سکا ہوں جس پر زمانہ قدیم کے وہ بھکشو فائز  
تھے۔ بہر حال میں نے اپنے اندر کی اس پراسرار قوت کو  
آزمائے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت میرے جسم کو ایک اور ہلکا سا جھٹکا لگا۔  
جمادی کی جڑوں سے چند انچ اور جگہ چھوڑ دی تھی۔ میں نے  
آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے اندر اس پراسرار قوت کو آواز  
دینے کے لیے مراقبہ اور ارتکاز ضروری نہیں تھا اور مجھے جیسے  
فحش کے لیے بھی یہ ضروری نہیں تھا کہ مراقبے کے لیے کسی  
جگہ اسانس بنا کر بیٹھا جائے۔ میں تو اپنی کسی بھی مصروفیت  
کے دوران میں چند لمحوں کے لیے بھی مراقبے میں جا سکتا تھا۔  
اور اس وقت مجھے باؤسی نہیں ہوئی۔ بہت معمولی سے

انداز میں حرکت کرتی ہوئی جمادی رک گئی۔ میں اپنے آپ  
کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں  
محسوس ہوا جیسے میرا وزن ختم ہو گیا۔ میں نے ہلکا ہلکا کاندھ  
کی طرح لٹکا ہوا ہوں۔ بے دہلیزی نے یہ کیفیت مجھے بہت عجیب  
سی لگی۔

گنگولی نے ہلا کو ایک بار پھر دور جمادیوں میں اچھال دیا  
تھا اور وہ دوبارہ میرے ہاتھوں پر ٹھوکریں برسانے لگا اور میں  
اس کی ٹھوکریں برداشت کرتا رہا۔

ہلا اٹھ کر جتنی چلائی اور اُدھر دھڑوڑ رہی تھی۔ اسے کسی  
ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے گنگولی چوہدری پر حملہ کر سکے۔  
وہ ایک بودے کی ڈنڈا نما شاخ کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکے  
دینے لگی لیکن وہ شاخ ٹوٹ کر نہیں دی۔ وہ اس شاخ کو چھوڑ  
کر پانچوں کی طرح جتنی ہوئی ایک بار پھر اُدھر اُدھر دوڑنے لگی  
اور بالآخر ایک بڑا سا پتھر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گنگولی  
چوہدری کی طرف لپٹا۔

پتھر خاصا بڑا تھا اور ہلا نے عقل مندی یہ کہ گنگولی  
کی طرف آتے ہوئے اس نے چٹنا بند کر دیا تھا لیکن گنگولی  
چوہدری بھی غافل نہیں تھا۔ آہٹ یا کردہ تیزی سے پیچھے  
مڑا۔ اس دوران میں ہلا حملہ کر چکی تھی۔ گنگولی چوہدری نے

جہاں دے کر پہنچنے کی کوشش کی مگر پتھر اس کے سر پہ بھا۔ وہ چنچتا ہوا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر ہڑا ہو گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ نکلا تھا۔ ہمارے اسے زوردار لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھار کر گرا اور دوسری طرف کی ڈھلان پر پودوں کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

”آؤ، آؤ بہت سنگھ۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر آ جاؤ۔“ ہمارے نے جبکہ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہمارے سینے کے بل لیٹ گئی اور مجھے اور چھپنے لگی۔

میرا اوپر کا دھڑپٹان پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے جھاڑی کو کچھ اور پیچھے سے پکڑ لیا اور اوپر آنے کے لیے زور لگانے لگا۔ میری ٹانگیں ابھی تک نیچے لٹکی ہوئی تھیں کہ گنگولی چوہدری وحشی کی طرح چنچتا ہوا ہماری طرف پکا۔ اس نے ہمارے گونگولے سے پکڑ لیا اور اسے کھڈ کی طرف دھکیلنے لگا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ ہم دونوں کو کھڈ میں دھکیل کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

”ہمارا ہاتھ چھوڑ دو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

ہمارے نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے جھاڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے آپ کو جھکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اوپر آچکا تھا۔ گنگولی چوہدری اب بھی ہمارے گونگولے سے پکڑ کر کھڈ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہمارے برقی طرح چنچ رہی تھی۔

مجھے شبہ تھے میں صرف ایک سینکڑ لگا تھا۔ اس جھاڑی کو چھوڑتے ہی میں اپنے آپ میں اٹھ گیا تھا یوں کہنے کہ میری بے وزنی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

گنگولی چوہدری ہمارے ٹانگیں پکڑے کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر سے بہتے ہوئے خون نے اس کے چہرے کے کچھ حصے کو بھی تر کر دیا تھا جس سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی بھیاںک ہو گیا تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اونے کی طرح اس کے پیٹ میں زوردار ٹکرا دی۔ گنگولی چوہدری ڈرنا ہوا پیچھے گرا اور لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ میں نے بھی چلا ٹنگ لگا دی۔

ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کو دھک دے گئے۔ گنگولی نے ایک موقع سے فائدہ اٹھایا اور میرے سینے پر سوار ہو کر دونوں ہاتھ میری گردن پر جمادے۔ اس کے انگوٹھے میرے زرخے پر پڑے۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ فرمایا۔ اس

کے چہرے پر بے پناہ سفاکی تھی ”تمہاری وجہ سے میرا سر کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے سارے دوست ختم ہو گئے۔ میرا رات ختم ہو گیا۔ کیڑوں میں تک میری دہشت تھی۔ بڑے پیسے سودا میرا نام نہ کر تھے مگر کانتے تھے لیکن تمہاری وجہ سے سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا اور اس جھوٹے جہنم میں پھنسا دوں گا۔“

میرے زرخے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گنگولی چوہدری کے چہرے پر درد کی بڑھتی جا رہی تھی اور پھر اس کے پیچھے ہلا کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسے کہیں سے ایک سڑی سی ٹکڑی مل گئی تھی جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔

میری نظروں سے گنگولی چوہدری نے کسی گڑباز کا اندازہ لگایا۔ اس نے گردن گھمائی۔ ہمارا اس دوران میں حملہ کر چکا تھی۔ گنگولی کا سر تو چنچ گیا۔ ٹکڑی کا وار اس کے بائیں کندھے پر پڑا۔

میرے گلے سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کی دونوں کھانسیوں کو پکڑ کر زوردار جھکا دیا۔ اپنی گردن آزاد ہوتے ہی میں نے اس کی ایک ہلائی چھوڑ کر اس کے جہزے پر زوردار گھونسا مار دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے بھی دوسرا وار کر دیا تھا اور یہ وار بھی گنگولی کے بائیں کندھے پر ہی پڑا تھا۔ وہ ہلکا اٹھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گنگولی چوہدری نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس وقت ہمارا اس پر تیسرا حملہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گنگولی نے اپنے سر کی طرف آنے والی ٹکڑی کو ایک ہاتھ میں روک لیا اور دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ پر زوردار چھوڑ دیا۔ ہمارے چنچنے ہوئی گری۔ گنگولی اس کے ہاتھ سے چنچنے ہوئی ٹکڑی سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کسی طاقتور سپرنگ کی طرح اچھلا۔ میرے دونوں پیر اس کے سینے پر گئے اور وہ چنچا ہوا پٹ کے بل گرا۔ میں نے دوبارہ اس پر چلا ٹنگ لگا دی لیکن میرا پیر جھاڑی میں الجھ گیا اور میں لڑکھار کر گر گیا۔

”بہت سنگھ۔ انھو۔ یہ خنجر لو اور اس وحشی کے گلے کر دو۔“ ہمارے کے چنچنے کی آواز سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے کہیں سے گنگولی چوہدری والا خنجر مل گیا تھا۔ لیکن مجھ سے پہلے گنگولی چوہدری نے ہمارے چلا ٹنگ لگا دی۔ اس کے پیٹ میں لگنے والی گنگولی کی ٹھوکر بہت زہ

دار تھی۔ وہ چنچنے ہوئی دہری ہو کر گری۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گنگولی خنجر کی طرف پکا۔ میں نے اس پر چلا ٹنگ لگا دی۔

خنجر گنگولی کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے ایک طرف لوٹ لگا دی۔ میں اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل گرا۔ اگر میں دونوں ہاتھ زمین پر نہ ٹکا دیتا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے۔ گنگولی نے خنجر سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگوں کو حرکت دے کر اس کی گردن کو پیروں کی قبضی میں لے لیا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔

ہمارا ایک بار پھر ٹکڑی اٹھا کر چنچنے ہوئی اس کی طرف لپکی لیکن اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ رک گئی اور مرکز اس طرف دیکھنے لگی۔ ان قدموں کی آوازیوں سے میں بھی چونک گیا۔ اگر وہ گنگولی چوہدری کا کوئی ساتھی ہوا تو پھر ہماری زندگیوں کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا اور اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے پولیس انسپکٹر دونوں پانڈے کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔

میں نے گنگولی چوہدری کی گردن اب بھی ٹانگوں کی قبضی میں لے رکھی تھی اور میرے اس بازو کی دھچ سے وہ اب تک خنجر سے مجھ پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ”گنگولی چوہدری۔“ انسپکٹر دونوں پانڈے کی چنچنے ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ ہم سے تقریباً دس گز دور رک گیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسیل بھی تھا۔ انسپکٹر پانڈے بھی سمجھا تھا کہ گنگولی اس وقت مجھ پر حاوی ہو رہا ہے اور کسی بھی لمحے خنجر کے وار سے میرا خاتمہ کر سکتا ہے۔

”مارو۔ گولی مار دو اس حرای کو۔ ختم کر دو اسے!“

ہمارے چنچنے ہوئی انسپکٹر کی طرف دوڑی اور اس کے ہاتھ سے ریواور چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید وہ خود گنگولی کو گولی مارنا چاہتی تھی۔

انسپکٹر نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ گنگولی چوہدری گردن چھڑانے کے لیے اپنے آپ کو جھٹک دینے لگا۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو پوری قوت سے بائیں طرف بھٹکایا۔ گنگولی بھی اس کے ساتھ ہی جھٹکا چلا گیا اور پھر میں نے ایک زوردار بھٹکا دے کر اپنی ٹانگیں اس کی گردن سے الگ کر دیں۔ گنگولی گر جاتا ہوا الٹ گیا۔ میں اٹھ کر تیزی سے ہمارے

کی طرف آگیا۔ گنگولی نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ”گنگولی چوہدری!“ انسپکٹر پانڈے نے چیخ کر کہا۔ ”تمہارے تمام ساتھی ختم ہو چکے ہیں۔ بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ خنجر پیمیک دو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”گنگولی چوہدری کوئی کتا نہیں جس کے گلے میں تیرے ڈال سکوں۔“ گنگولی کے منہ سے بیضرے کی سی غراہٹ نکلی۔ ”گنگولی چوہدری شیر ہے اور شیر آزاد رہنا جانتا ہے۔ اسے زنجیروں میں نہیں جکڑا جاسکتا۔“

”تمہارے بچنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“ انسپکٹر نے پھر چیخ کر کہا۔

”مارو۔ مارو۔ اسے گولی مار دو انسپکٹر۔“ ہمارے چنچنے ”یہ انسان نہیں بھینچتا ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ گئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ مارو اسے۔ گولی مار دو۔“

میں نے بڑی مشکل سے ہمارے گرفت میں لے رکھا تھا۔ گنگولی چوہدری کا خون آلود چہرہ بہت بھیاںک ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

”گنگولی چوہدری نے اپنے فرار کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔“ اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں گئی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے خنجر کو نوک کی طرف سے پکڑ لیا تھا اور پھر خلاف توقع اس نے خنجر پوری قوت سے ہماری طرف کھینچ مارا۔ میں ہلکا کود کھلتا ہوا ایک طرف گر گیا۔ خنجر زائے کی آواز سے ہمارے سروں کے اوپر سے ہوتا ہوا پیچھے کھڑے ہوئے کانسیل کے حلق میں پھنسا ہو گیا۔

بیک وقت دو چیخوں اور ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ ایک چیخ اس کانسیل کی تھی جس کے گلے میں خنجر پیوست ہوا تھا۔ گولی انسپکٹر پانڈے نے چلائی تھی اور دوسری چیخ گنگولی چوہدری کی تھی جو انسپکٹر کی گولی لگنے سے پادیے سی لڑ کھڑا کر پیچھے کھڈ میں گر گیا تھا۔ اس کی چیخ کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی اور پھر ”بھد“ کی زوردار آواز سنائی دی۔

میں ہلکا کو چھوڑ کر چٹان کے کنارے کی طرف لپکا اور جھانک کر دیکھا تو میری روح تک کانپ اٹھی۔ تقریباً سو فٹ نیچے چٹانوں میں گنگولی چوہدری کی خون میں لٹ پٹ لاش پڑی تھی۔ وہ لاش ہی تھی۔ اتنی بلندی سے چٹانوں پر گرنے

کے بعد کسی کا زندہ بچ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اب گنگولی چوہدری کے ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ گنگولی چوہدری نے اپنے فرار کا راستہ پیش محفوظ رکھا ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس نے انسپٹر پانڈے کی گولی لگنے سے پہلے ہی کھد میں چھلانگ لگا دی تھی۔

میں پیچھے مڑ گیا۔ انسپٹر پانڈے جھانپوں میں پڑے ہوئے کانٹھیل پر جھکا ہوا تھا۔ خبر ابھی تک کانٹھیل کے حلق میں پیوست تھا اور وہ فزع ہوتے ہوئے بکری کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے خبر کے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ کانٹھیل کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے تڑپنے لگا۔ اس کے پیروں کی رٹڑ سے مٹی اڑ رہی تھی اور کتے ہوئے حلق سے خرخرات کی عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ ہٹا ہوا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا اور بالا خروہ سے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے خون آلود خبر کو دیکھا۔ اس کی ایک طرف تیز دھار تھی اور دوسری طرف باریک دندانے تھے جس سے اس کا زخراٹا گیا تھا۔

میں نے خبر لاش کے قریب پھینک دیا اور جیسے ہی سیدھا ہوا ہلا چلتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے خوف کی شدت سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جب تک یہ فونی ڈاربا جاری رہا تھا اس وقت تک اس نے ہمت قائم رکھی تھی۔ گنگولی چوہدری پر بڑھ بڑھ کر حملے کرتی رہی تھی لیکن اب اس کی ہمت نے بھی دم توڑ دیا تھا اور حوصلے نے بھی گزرے ہوئے خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

میرا نے بڑی سختی سے مجھے اپنی ہانپوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بلاؤز کے مٹن تو پہلے ہی ٹوٹے ہوئے تھے اور اب گنگولی چوہدری سے ہاتھ پائی کے دوران میں بلاؤز پوری طرح پھٹ گیا تھا اور اس کے جسم کے بالائی حصے پر اب مختصر سا زبر جامہ رہ گیا تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے کندھے سے پھٹتا ہوا پیرا ہے اسے اپنے سے الگ کر کے اپنی لیٹ شٹ اتار کر اسے پاندائی اور انسپٹر پانڈے کی طرف دیکھنے لگا جو اٹھ کر چٹان کے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہمارے میرے ساتھ تھی۔ سو فٹ نیچے پتھروں میں پڑی ہوئی گنگولی چوہدری کی لاش دیکھ کر وہ میرے ساتھ جڑ گئی۔

”تم ہو گیا۔ راکھس۔ اچھا ہوا۔“ وہ بڑبڑائی اور پیچھے

بٹھ گئی۔

میں اور انسپٹر پانڈے بھی پیچھے ہٹ گئے۔ ہمارے دور ہٹ گئی اور ہم دونوں کانٹھیل کی لاش کے قریب بیڑ گئے۔

انسپٹر پانڈے کا بھی بایاں بازو زخمی تھا جس پر میلا مارا رومال بندھا ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”کل رات ان حرامیوں میں سے کسی کی گولی لگی تھی۔“ انسپٹر نے بتایا۔ ”گوئی کھال کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ذرا اور اندر کی طرف گئی تو میرا بازو بیکار ہو جانا لیکن اب کیا کیا جائے؟“ اس نے کانٹھیل کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”گنگولی چوہدری کی لاش تو وہاں گرائی میں ہی ہے۔ اسے ہم وہاں سے نکال نہیں سکتے اور یہ۔“ میں نے کانٹھیل کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم چاہتے ہیں کسی آبادی سے کتنی دور ہیں اور اس لاش کو اٹھا کر لے جانا بھی ممکن نہیں۔ تمہارے دوسرے سپاہی کہاں ہیں؟“

”سب ختم ہو گئے۔“ انسپٹر پانڈے نے جواب دیا اور چنبرہ لکھوں کی خاموشی کے بعد بولا ”لاش کو اٹھا کر لے جانا واقعی ممکن نہیں ہے اور یہاں اس کا کپڑا کرم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز ہے کہ زمین کھود کر اسے دفن کر سکیں اور نہ ہی ماچس ہے کہ اس کی جلا چٹا سکیں۔“

”یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو جھاڑیوں سے ڈھک دیا جائے۔ اس کے لیے ہم اس وقت یہی کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

انسپٹر پانڈے نے تائید میں سر ہلا دیا اور اس کے پکڑوں کی تلاشی لینے لگا۔ چند روپوں اور ڈیوٹی کارڈ کے علاوہ اس کی جیبوں میں کچھ نہیں تھا۔ انسپٹر نے اس کی رائفل بھی اٹھائی جو خالی ہو چکی تھی۔

”ہم آس پاس سے جھاڑیاں جمع کر کے لاش کے اوپر ڈالے گئے۔ ہلا بھی اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی اور اس کام میں وہ بھی ہماری مدد کر رہی تھی۔

ہم نے لاش پر جھاڑیوں کا اچھا خاصا ڈھیر لگا دیا تھا لیکن ہمیں یقین تھا کہ ہمارے جانے کے بعد یہ لاش زیادہ دیر تک جنگلی جانوروں سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔

”مہمہ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔“ ہلا اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اس بنگاہ آرائی میں وہ اپنی پیاس کو بھولی رہی تھی لیکن اب پھر اسے

پیاس لگنے لگی تھی۔ اس طرف آؤ۔ اس طرف تھوڑی سی دور ایک ندی ہے۔“ انسپٹر نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنا ربوہ اور بولسٹرمیں ڈال لیا تھا اور کانٹھیل والی رائفل کندھے پر تھام لی تھی۔

انسپٹر پانڈے ایک طرف پودوں میں ڈھلان اترنے لگا اور میں اور ہلا اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ہلا نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو نا ہمت سگھ؟“ وہ چلتے چلتے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاتھ پر ذرا چوٹ لگی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ ہلا کو دکھایا جس پر گنگولی چوہدری کے پیروں کی ٹھوکروں سے انگلیوں کے جوڑوں کی کھال اوڑھ گئی تھی۔

ہلا نے میرا وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چند لمبے آنے دیکھتی رہی۔ میرا زخمی ہاتھ اپنے چہرے کے قریب لے گئی اور اپنے ہونٹ میرے ہاتھ کی پشت پر ثبت کر دیے۔

اس وقت انسپٹر پانڈے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے جلدی سے ہلا سے اپنا ہاتھ پھیر لیا۔

”وہ ندی بس تھوڑی سی دور ہے۔“ انسپٹر پانڈے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے شاید ہلا کو میرے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

ہم تقریباً چند ہنٹ میں اس ندی پر پہنچ گئے۔ یہ وہی ندی تھی جس سے میں ہلا کے لیے پانی لینے آیا تھا لیکن ہم اس جگہ سے کافی دور آ گئے تھے۔ یہاں ندی کے کنارے پر

ہلا ندی کے کنارے پر گر سی گئی۔ اس نے بکری کی طرح منہ لگا کر پانی پیا مگر اس طرح شاید پیاس نہیں بجھی تھی۔ وہ چلو بھر بھر کے پانی پینے لگی۔ انسپٹر پانڈے اور میں نے بھی غلیم سیر ہو کر پانی پیا۔ ہلا تو ندی کے کنارے پر بیڑ حال ہی ہو کر لپٹ گئی تھی اور ہم دونوں درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

”تم واقعی ہمت سگھ ہو۔“ انسپٹر پانڈے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان درختوں کے جنگل میں چھن کر زندہ بچ کر نکلنا واقعی تمہیں بہت طاقتور لوگوں کا کام ہے۔“

میں انسپٹر کے منہ سے اپنا نام سن کر جو کجک سا گیا۔

”تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا انسپٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے دوست غما کر تے۔“ انسپٹر نے جواب دیا۔ ”اسے جب پتا چلا کہ تم ہلا کو بچانے کے لیے جنگل میں ٹھس گئے ہو تو اس نے بنگاہہ بنایا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر ہمت سگھ اور ہلا کو کچھ ہو گیا تو وہ کسی کو جین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ اس نے بے یو میں آئی جی کو بھی ٹیلی فون کر دیا اور آئی جی نے حکم دیا کہ پولیس کی ایک پارٹی فوراً جنگل کی طرف روانہ کر دی جائے۔ قریب میرے نام لگا اور میں ایک درجن مسلح پولیس والوں پر مشتمل پارٹی کو لے کر موت کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگل میں داخل ہو گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو کر اپنی اس مہم کے بارے میں بتانے لگا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ راستے میں ایک چھپتے سے ان پر حملہ کر دیا تھا جسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مجھے فائر اور کسی درندے کے دھاڑنے کی آواز یاد آئی۔ اس آواز کو سن کر ہی میں اور تارائن وہاں سے بھاگ نکلتے ہوئے تھے۔

انسپٹر پانڈے گنگولی چوہدری کے گردہ سے ٹڈھ بھیڑ کا قصہ سن رہا تھا۔ اس کا تو میں بھی چشم دید گواہ تھا۔ انسپٹر کے کہنے کے مطابق اس کے چار آدمی تو کل صبح ہی جھڑپ میں مارے گئے تھے اور دو دن بھر لڑائی میں کام آئے تھے اور چار کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شام کا اندھیرا چھٹنے کے بعد وہ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اس نے ایک کانٹھیل کے ساتھ رات بھر گنگولی چوہدری کا تعاقب جاری رکھا اور بالآخر آج اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

”میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں ہمت سگھ۔“ اس نے آگے بڑھ کر میرا کندھا چھتے بتایا۔ ”جب مجھے پتا چلا کہ تم ہلا کو بچانے کے لیے تارائن کے ساتھ جنگل میں ٹھس گئے ہو تو مجھے تم پر ہمت غصہ آیا تھا۔ ایک عورت کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دینا حماقت ہی کہلا سکتی ہے لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ تم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس بیبی سندرناری کے لیے تو کئی جیون قربان کیے جاسکتے ہیں۔“ اس نے خاموش ہو کر ہلا کی طرف دیکھا۔

ہلا آنکھیں بند کیے پشت کے بل گھاس پر لیٹی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ انسپٹر کے منہ سے آخری الفاظ سن کر اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اب انسپٹر کو روداد سنانے کی میری باری تھی۔ میں نے اپنی کھانا سنانے کے بعد کہا۔

”اب کیا پروگرام ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم جنگل

میں کس جگہ پر ہیں اور یہاں سے قریب ترین کون سی بستی ہو سکتی ہے؟

”کچھ پتا نہیں۔“ انسپکٹر نے جواب دیا ”لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ سارے شہر اس جنگل کے چھک چھک (غرب) کی طرف ہے۔ ہو سکتا ہے آج صبح کوئی اور پارٹی ہماری تلاش میں بھیجی گئی ہو لیکن ہم ان کا انتظار نہیں کر سکتے۔ یہ جنگل جلیوں میں پھیلنا ہوا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اس طرف آئیں۔ اگر وہ دوسری طرف نکل گئے ہوں گے تو زندگی بھر ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ بہتر ہے کہ چند منٹ سنا کر ہم چھک کی طرف اپنا سفر شروع کر دیں اور مجھے اُمید ہے کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”تو پھر چل پڑو۔ یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

بلا بھی اٹھ کر کمری ہو گئی اور انسپکٹر پانڈے را نقل اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے را نقل کندھے پر لٹکائی اور ہمارے آگے آگے چلے لگا۔ میں اور بلا اس سے تقریباً پانچ گز پیچھے چل رہے تھے۔

اس ندی کا بہاؤ بھی چھک کی طرف تھا اس لیے ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے درختوں کا سلسلہ گھٹان ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ندی ایک دم بائیں طرف مڑ گئی۔ ہم کچھ دیر سستانے کے لیے وہاں رک گئے پھر جی بھر کے پانی پیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

سورج ہمارے سروں پر تھا۔ گھٹان درختوں کی وجہ سے دھوپ اگرچہ بہت کم زمین تک پہنچ رہی تھی لیکن ہمیں سمت کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔

بلا چلتے چلتے ایک دم کراہ کر رک گئی اور اس نے اپنا ایک پیڑ اوپر اٹھالیا۔ وہ بٹنے پیر تھی اور اس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں پیر کو پکڑ لیا اور منہ بسورنے لگی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا اور کانٹا نکلنے کے لیے جیسے ہی اس کے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ چیخ اٹھی۔

”نہیں نہیں۔ ہاتھ مت لگاؤ۔ تکلیف ہو رہی ہے۔“  
”کچھ نہیں ہوگا۔ تم آئیں گے بند کرو۔ میں کانٹا نکالتا ہوں۔“  
”تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔“ میں نے کہا۔  
انسپکٹر پانڈے بھی ہم سے چند گز آگے رک گیا تھا۔ بلا

نے زور سے آئیںکس مچھ لیں۔ میں نے کانٹے کو نافروں پر پکڑ کر کھینچا تو اس کے منہ سے کراہی نکل گئی۔ میرے پیڑ میں جو گر جتے ہو ہیں نے اتار کر بلا کی طرف بڑھا دیا۔  
”لو۔ یہ پس لو۔“ میں نے کہا۔  
”اور تم۔ کیا تمہیں کانٹے نہیں چھیں گے بہت خطرہ نہیں۔ میں جوتے نہیں پہنوں گی۔ تم پس لو۔“ اس نے کہا۔  
”نہیں۔ تم پس لو۔“ میں نے کہا ”جلدی کرو۔ ورنہ ہو رہی ہے۔“

انسپکٹر پانڈے دور کھڑا دلچسپ نظروں سے ہماری غلظت دیکھ رہا تھا۔ میں نے ضد کر کے بلا کو جو گر ز پنا دیا اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔  
میرے جسم پر صرف جینز تھے۔ پیر بھی ننگے تھے اور جم کا بالائی حصہ بھی کیونکہ میں اپنی ٹی شرٹ پہلے ہی بلا کو پٹائی تھا۔ بلا سے تو مجھے کچھ عجیب سا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس کی جڑ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کے ساتھ بھی میں یہی غلظت عمل اختیار کرتا۔

انسپکٹر پانڈے نے اپنی رفتار کم کر دی تھی۔ اب ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر بلا کو دیکھ کر اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
”لگتا ہے تم اسے بہت چاہتے ہو اس لیے تو پہلے اسے اپنی شرٹ اتار کر پٹائی اور اب اپنے جوتے بھی اسے پہنا دیے۔ دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانا واقعی بڑے ظرف کی بات ہے۔“

”تم بہت سمجھنا کہ مجھے چونکہ بلا سے لگاؤ ہے اس لیے میں نے اپنی شرٹ اور جوتے اسے پہنا دیے ہیں۔ اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو کبھی میں یہی کچھ نہ کرتا۔“  
میں نے جواب دیا ”کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس دنیا میں بکھرے تمام لوگوں کے دکھ اپنے اندر سمیٹ لوں۔ کسی کی پکڑوں پر تھرتے ہوئے آنسوؤں کو قطرہ قطرہ کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہو جائے۔“

”بہت شاعرانہ باتیں کرتے ہو۔“ انسپکٹر نے میرا طرف جھکتے ہوئے سر کوئی میں کہا ”کیا رشتہ ہے تمہارا ان سے جس کے لیے تم نے اپنی جان کی بھی بازی لگا دی تھی؟“  
”رشتہ؟“ میرے منہ سے بے اختیار گھرا سانس نکل پڑا۔  
”بعض لوگ رشتوں کو بدن پر پہنے ہوئے کپڑوں کی طرح سمجھتے ہیں جنہیں کسی بھی وقت بدن سے اتارنا جاسکتا ہے لیکن میرے خیال میں رشتے شراوٹوں میں بننے والے لوکی طرح

کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جیون سے ہوتے ہیں۔ ان کی جیون سے جدا ہوتا ہے تو کبھی دن سے اور وابستہ نہ ہونے میں ایک رشتہ ہے دوستی کا۔ میرا اور بلا کا ان ہی رشتوں میں ایک رشتہ ہے۔“

رشتہ دوستی کا رشتہ ہے۔  
انسپکٹر پانڈے بولا ”کاش! میں بھی بہت خوب۔“  
”بہت دوستوں میں سے ہوتا۔ اس دیوی کو تو تمہاری دوستی تمہارے دوستوں میں سے۔“

”مجھے نہ کرنا چاہیے۔“  
”اس کا خیال تھا کہ بلا کچھ گے کی لیکن اس نے صرف اس کا خیال تھا۔“

سکرانے پر ہی اکتان کیا تھا۔  
ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ ہم ایک بار پھر گنگولی ہادی منگلو کا موضوع بنے۔  
چوہدری اور اس کے ساتھیوں کے بایں میں باتیں کرنے لگے۔  
انسپکٹر پانڈے نے اس وقت یہ انکشاف کیا کہ گنگولی چوہدری کا ایک ساتھی زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ دوسری طرف کسی بستی میں پناہ مل گئی ہو۔  
ہم تقریباً تین گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے۔ بلا بری طرح تھک گئی تھی۔ ہم ایک بار پھر ایک ندی پر رک گئے۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ بلا نے پانی گے چند گھونٹ پھرے اور ندی کے کنارے پر ڈھیر ہو گئی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ ندی سی صورت بناتے ہوئے بولی۔  
انسپکٹر پانڈے نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کے بغیر اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ اس کی داہنی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ناریل اٹھا رکھے تھے۔  
انسپکٹر نے جب سے چاقو نکال کر ایک ناریل کا چھلکا اویڑ کر اسے ایک پتھر دے مارا۔ ناریل دو ٹکڑے ہو گیا۔  
اس نے چاقو کی نوک ہی سے گری نکال کر ہمارے حوالے کر دی اور دوسرا ناریل اویڑنے لگا۔

چند منٹ بعد ہم ناریل کھاتے ہوئے آگے چل پڑے۔  
سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا لیکن جنگل میں کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ درختوں میں تاریکی بڑھ گئی تھی۔ انسپکٹر پانڈے کے چہرے پر بھی اب تشویش کے سائے ابھر آئے تھے۔  
”ہمیں رات گزارنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہیے۔“ انسپکٹر نے کہا ”کچھ دیر میں سورج ڈوب جائے گا اور ہمیں چند قدم چلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔“  
”ہم تھکے تھکے ہیں۔“ بلا تھکنے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑادی تھی اور میں اس کا ہاتھ پکڑے اسے تقریباً کھینچتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی

جگہ پر نکل آئے۔ اس سے بہتر ہمیں اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ یہ پتھر کا ٹیلا سا تھا۔ ہم اوپر چڑھ گئے۔ بلا تو فوراً ہی لیٹ گئی۔ میں اور پانڈے بیٹھے بائیں کرتے رہے۔

وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ بلا سوچتی تھی۔ کبھی میں اونگھنے لگتا اور کبھی پانڈے۔ اور رات کے آخری پیر ہم دونوں کے اعصاب جواب دے گئے۔ نیند اور تھکنے نے ہمیں زیر کر لیا تھا۔

اور پھر بلا کی چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ انسپکٹر پانڈے بھی جاگ گیا۔ انسپکٹر پانڈے کی آنکھوں میں وحشت تھی اور بلا کے چہرے پر بے پناہ خوف۔ وہ دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے اور پھر ان کے خوف اور وحشت کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔

میں اس وقت پتھر دائیں کوٹ لینا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ نیچے کی طرح سر کے نیچے تھا اور دوسرا ہاتھ بالکل سیدھا پناہ پر رکھا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چیز میرے جسم پر رینگ رہی ہو۔

”بہت سکھ! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ سانس روکے بالکل بے حس و حرکت پڑے رہو۔“ انسپکٹر پانڈے نے سر کوئی میں کہا۔

اور پھر واقعی میرا سانس رک گیا۔ وہ سیاہ کورا تھا جو میری کمر اور پشت پر رینگتا ہوا آگے سینے کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے سینے میں دل ڈھٹا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کورا میرے ہر بدن پر رینگتا ہوا آگے آ گیا اور پھر اچانک ہی اس نے پھین پھینا لیا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہاں سے ہٹ سکتا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا، پتھر پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ میں غیر ارادی طور پر معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور اسی لمحے کورا نے میرے بازو پر ڈس لیا۔

میرے بازو میں سوئی جیسی چھین ہوئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سانپ کا خوف ہی بڑا بیت ناک ہوتا ہے اور مجھے تو اس ڈھیر لے کورا نے میری نظروں کے سامنے ڈس لیا تھا۔ میں اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بلا اس قدر زور سے اچھلی تھی جیسے سانپ نے مجھے نہیں بلکہ اسے ڈسا ہوا۔ انسپکٹر نوڈ پانڈے بھی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے ہولشر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

انسپکٹر پانڈے کا ہاتھ ہولشر میں اڑے ہوئے رہا اور کورے کے دستے پر چڑھ گیا تھا لیکن اس نے رہا اور نکال نہیں۔ اس

جی زیادہ خطرناک اور سرخ الاثر زہر موجود تھا جس نے اس زہرے سانپ کو بھی آفتاب خانہ ختم کر دیا تھا۔  
مجھے ماسٹر بنگ پانی کی بائیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ بعض جڑی بوٹیوں میں ایسی تاثیر پائی جاتی ہے جن کے کھانے سے دنیا کا کوئی زہر اثر نہیں کرتا لیکن یہ جڑی بوٹیاں بھی ایک خاص طریقے سے خوراک میں شامل کر کے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کا غلط استعمال زہر سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

اس واقعے کے دو چار دن بعد ہی میں نے اپنی خوراک میں کچھ تبدیلی محسوس کی تھی۔ ذائقہ بدلا ہوا تھا لیکن چند روز بعد میں اس ذائقے کا عادی ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہر کھانے کے بعد ماسٹر لیشی اناکم از کم دو گھنٹے میرے آس پاس ضرور موجود رہتا تھا اور بار بار میری طرف دیکھتا رہتا تھا۔ ان دنوں میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی تھی۔ میں اور جاگی اگرچہ اکٹھے ہی بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے لیکن کھانے میں ایک آدھ چیز ایسی ضرور ہوتی تھی جو صرف میرے لیے ہوتی اور جاگی کو وہ چیز کھانے سے منع کر دیا جاتا اور میرے خیال میں یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پاؤں بندنگ، بالنگ اور مارشل

کے کائنات کے بارے میں نشان نظر آ رہے تھے۔ میرے چہرے پر بھی اور چہروں کو آزادی سے خون چوتے تھے۔ میں نے اس کا تھوڑا سا تجربہ کیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے خون کا ذائقہ بڑے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے گا۔  
”سب سانپ مر گیا۔“  
”اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس وقت تک میں اپنی کیفیت پر قہار پانا جاندار کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کوئی بھی جاندار اپنی زندگی سے تو ایک لمحہ بگڑتا ہے اور نہ ایک لمحے کے لیے مر سکتا ہے۔ اس سانپ پورا ہو گیا تھا اس لیے یہ مر گیا۔“

”مگر یہ سیاہ کوبرا بہت زہریلا ہوتا ہے۔“ انہیں بولا۔  
”اس کا ڈسٹا تو پانی بھی نہیں مالگتا اور اس نے کبھی تمہاری یہ خود مر گیا۔“  
”اوہ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو کبھی سانپ کو نہیں مجھے مرنا چاہیے تھا۔“  
”ہاں۔ ہاں۔“ انہیں نے سر ہلایا۔ اس کے ذہن الفاظ غالباً غیر ارادی طور پر نکل گئے تھے پھر جلدی۔  
”مہم۔ میرا مطلب ہے، یہ سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے۔“  
”دونوں میں سے ایک کو تو مرنا تھا۔“ میں نے۔  
”سانپ مر گیا اور میں بچ گیا۔ کیا تمہیں میرے زندہ رہنے کی خوشی نہیں ہوئی؟“

کو ٹھنڈ کر دیکھ رہی تھی پھر وہ میرے پورے جسم کو ٹھونکنے لگی جیسے اسے میرے زندہ ہونے کا یقین نہ تھا۔ انہیں پانڈے نے بھی میرے بازو کو ٹھونک کر دیکھا تھا۔  
”سب سانپ مر گیا۔“  
”اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس وقت تک میں اپنی کیفیت پر قہار پانا جاندار کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کوئی بھی جاندار اپنی زندگی سے تو ایک لمحہ بگڑتا ہے اور نہ ایک لمحے کے لیے مر سکتا ہے۔ اس سانپ پورا ہو گیا تھا اس لیے یہ مر گیا۔“

”مگر یہ سیاہ کوبرا بہت زہریلا ہوتا ہے۔“ انہیں بولا۔  
”اس کا ڈسٹا تو پانی بھی نہیں مالگتا اور اس نے کبھی تمہاری یہ خود مر گیا۔“  
”اوہ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو کبھی سانپ کو نہیں مجھے مرنا چاہیے تھا۔“  
”ہاں۔ ہاں۔“ انہیں نے سر ہلایا۔ اس کے ذہن الفاظ غالباً غیر ارادی طور پر نکل گئے تھے پھر جلدی۔  
”مہم۔ میرا مطلب ہے، یہ سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے۔“  
”دونوں میں سے ایک کو تو مرنا تھا۔“ میں نے۔  
”سانپ مر گیا اور میں بچ گیا۔ کیا تمہیں میرے زندہ رہنے کی خوشی نہیں ہوئی؟“

”ہوئی۔ بہت ہوئی۔“ انہیں نے پھر سر ہلایا۔  
میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ زہریلا کوبرا تمہیں ڈنڈے بعد خود کیسے مر گیا۔“  
”شاید میرے خون میں اس سے زیادہ زہر ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔  
”ہاں۔ ایسا ہی گتہ ہے لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔“ انہیں نے کہا اور ایک جھاڑی کی سوچی ہوئی شاخ قوڑا سے سانپ کو اٹھا کر کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اسے اچھال دیا۔  
”ہاں۔ اب بھی میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹھنڈ تھی۔ وہ میرے بازو کو دباتے ہوئے بولی۔  
”تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی بہت تھکے ہو تو ہوتا؟“

”ہاں۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیوں پریشان ہو۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اپنے بازو کو خون کا قطرہ جم رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے

کا ہاتھ جیسے ہولسٹرے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ چپٹی چپٹی نظروں سے میرے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہلا کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے پناہ وحشت تھی اور وہ بھی میرے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر وہ چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچنے پھینچنے لگی۔

مجھ پر بھی سانپ کے ڈنڈے کی وحشت سی طاری تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ مجھے ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ سوئی کی چیبن اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”دھم۔ دھم۔ سانپ۔“ ہلا کے منہ سے خوف زدہ سی آواز اٹھی۔

میں نے نیچے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے زور دار جھٹکے سے اٹھنے اور ہلا کے چیختے سے وہ کوبرا ہلکا گیا ہوگا لیکن اس بلیک کوبرا کو اپنے پیروں کے قریب دیکھ کر مجھے پھر بری سی آہٹی۔

وہ بلیک کوبرا زمین پر پڑا اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے اس پر تھک کی سی کیفیت طاری ہو۔ وہ بھی بل کھا کر بالکل چپسا سا بن جانا اور بھی لکھ کی طرح بالکل سیدھا ہو کر اکڑ جانا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔

ہلا اور انہیں پانڈے اب بھی وحشت زدہ سی نظروں سے دو ڈھائی فٹ لمبے سیاہ کوبرا کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں پھر تو اس قدر وحشت طاری تھی کہ وہ ہولسٹرے سے ہاتھ اٹھاتا بھی بھول گیا تھا۔ وہ کبھی مردہ سانپ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی مجھے۔

ہلا کی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کی آنکھیں خوف کی دہشت سے چپٹی پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ مرزہ سانپ کی طرف دیکھا اور پھر مجھے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

”تم ٹھیک ہو۔ بہت تھکے تم ٹھیک ہو؟“ وہ چیخی۔  
”اوہ!“ میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔“

انہیں پانڈے بھی دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور میرا بازو پکڑ کر دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اپنے بازو کو دیکھا۔ جس جگہ سانپ نے ڈسنا تھا وہاں خون کا ایک ننھا سا قطرہ پتک رہا تھا۔ میں بالکل اپنے حواس میں تھا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ سوائے سوئی کی چیبن کے احساس کے۔ ہلا میرے بازو

اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف ”دھن“ بھی ہر ساز پر بجا لی جاسکتی ہے



بزرگ کے نام اور گلوکاروں کے سدا بہار گیتوں کا



موسیقی کے حوالے سے

موسیقی کے حوالے سے

25 روپے

200 روپے

200 صفحات

موسیقی کے دیوانوں کے لیے ایک منفرد کتاب  
اپنی طرز کی اس کتاب پڑھنے کی مثال نہیں ملتی

کتابیات پبلی کیشنز

فون: 5802552-5895313  
فیکس: 5802551  
kitabiat1970@yahoo.com

پتہ: 23، مین سٹریٹ، لاہور۔ 74200



آرٹس کی کٹھن پر یکٹس کرنے والے لڑکے عام طور پر توانائی حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص اور اضافی خوراک کھاتے رہتے تھے۔ لڑکیاں چونکہ زیادہ ریاضت اور مشقت نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے جاکتی کو میرے حصے کی وہ خوراک استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اور اب اس ذریعے سانپ کے ڈسنے اور اس کی موت کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے خوراک میں وہی مخصوص جڑی بوٹیاں کھانی جاتی رہی تھیں اور جاکتی کو شاید اس لیے منع کر دیا گیا تھا کہ وہ اسے برداشت نہیں کیا کرتی تھی اور آج میرے خون میں شامل باسٹریلنگ بائی کے اس تختے نے مجھے مرے سے بچالیا تھا۔ اگر مجھے وہ جڑی بوٹیاں استعمال نہ کرائی گئی ہوتیں تو اس سیاہ کوبرا کے بجائے میری لاش ریاں بڑی ہوتی۔

اس وقت صبح کے سات بجے تھے سورج طلوع ہو چکا تھا۔ یہ چونکہ کھلی جگہ تھی اس لیے صبح کی نرم اور کوئل دھوپ یہاں بھی پہنچ رہی تھی۔ بلا اور انسپکٹر پانڈے اب بھی غیر یقینی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بلا تو میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹوٹتے ہوئے بار بار پوچھ رہی تھی کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی۔

"کیا خیال ہے انسپکٹر؟" میں نے انسپکٹر پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ بیچ میں بول پڑا۔

"مجھے دشواش (یقین) نہیں ہو رہا۔ یہ تو چنگا رہو گی۔"

"میں اس چنگا کر کی بات نہیں کر رہا۔" میں نے مسکرا کر کہا "میں نے تو پوچھا تھا کہ آگے چلنا ہے یا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟"

"اوہ!" انسپکٹر پانڈے جڑ بڑسا ہو گیا "دوبی جی تیار ہوں تو ہم چل پڑیں۔"

"دوبی جی کو کون سا سنگار کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا "کوئی زندہ اس کا گوشت کھاتے ہوئے یہ نہیں دیکھے گا کہ اس نے چرے پر لپٹا پوتی کر رکھی ہے یا نہیں۔"

انسپکٹر پانڈے نے ہلکا سا تھکے لگایا اور بلا میرے سینے پر تلے گھومتے مارنے لگی۔ انسپکٹر نے جگ کر زین پر بڑی ہوئی رائفل اٹھائی۔

میں نے بلا کو اپنے سے الگ کیا اور ہم ٹیلا نما اس چتر پر مزید اتر چڑھنے لگے اور پھر بلا ایک دم چنچا اٹھی۔

"دوسرے وہ دیگھوا دھر دھوا۔"

انسپکٹر پانڈے اور میں نے بیک وقت اس طرف دیکھا۔ درختوں میں بہت دور سرسئی دھوئیں کی لکیری اٹھتی ہوئی نظر

آری تھی۔

"جنگل میں کہیں آگ لگ گئی ہے شاید۔"

پانڈے بولا۔

"یہ جنگل میں لگی ہوئی آگ نہیں ہے۔"

"اگر درختوں میں آگ لگی ہوئی تو دھواں سیاہ ہوتا۔ یہ سرسئی دھواں لکیری صورت میں اوپر اٹھتا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس طرف ان درختوں میں آگ ہے یا ہو سکتا ہے وہ کوئی شکاری ہوں جنہوں نے آگ جلائی ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بہت شک۔"

"وہاں کوئی بستی ہو یا شکاریوں کی کسی پانی نہ ڈیڑا ہو، ہمیں ان سے رہنمائی مل سکتی ہے یا کم از کم یہ پتہ ہے کہ ہم کہاں پر ہیں اور ہمیں کسی آبادی تک پہنچنے کس طرف جانا چاہیے۔"

ہم ٹیلے کی دوسری طرف اتر کر درختوں میں اس چلنے لگے جہاں سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم پھر نجان درختوں میں داخل ہو گئے تھے اور بار بار دوسرے گھران درختوں کی وجہ سے دھواں نظر نہیں لیکن ہم اندازے کی بنا پر اس سمت میں چلے رہے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ جگہ بارہ جمو پڑوں پر مشتمل تھی۔ کھاس پھوس سے یہ جمو پڑے ایک دائرے کی صورت میں تھے۔ درہار چھوٹا سا میدان تھا جہاں تین چار ٹنگ وھڑنگ رہے تھے۔ کوئی مرد یا عورت دکھائی نہیں دی۔ جمو پڑوں کے بیچ میں اس میدان میں ایک جگہ سے نظر آ رہا تھا۔

ایک لمحے کو رکے اور پھر ہم ایک جمو پڑے سے گھومتے ہوئے سامنے آگئے۔ بلا نے میرا ہاتھ میرے ساتھ جڑ کر چلنے لگی۔ انسپکٹر پانڈے ہم سے آگے تھا۔

جمو پڑے کی دوسری طرف پہنچ کر ہم رگے جمو پڑے کے سامنے چھروں سے بنے ہوئے دو چار آگ روشن تھی اور دو عورتیں بیٹھی روٹیاں پکادی ایک عورت ادھیر عمر تھی اور دوسری جوان۔ دونوں چولیاں اور گھاکھرے پن رکھے تھے۔ دونوں کی ہاتھ گھائیوں سے لے کر پاؤں کے اوپر تک پلاسٹک کی پیلے رنگ کی چڑیاں بھری ہوئی تھیں۔

جوان عورت نے ہمیں دیکھا تو اپنی ساتھی سے

ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کا گھبرا تو پنڈلیوں تک تھا۔

تین چار منٹ بعد دوسری ادھیر عمر عورت بھی اٹھ کر کھڑی ہوئی اور ایک جمو پڑے کی طرف دیکھ کر اونچی آواز نکلتی ہوئی کہ۔

میں جگہ کہ۔

وہ آوی ایک جمو پڑے سے نکل آئے۔ دونوں جوان تھے اور دونوں نے دھوئیاں پن رکھی تھیں۔ ایک کے جسم پر ملا سا کہ۔ تھیں دوسرے کا بالائی جسم بالکل برہنہ تھا۔ غوروں کی رنگت تو قدرے صاف تھی لیکن مرو توے کی طرح

کا لے تھے۔

انسپکٹر پانڈے آگے بڑھ کر ان سے باتیں کرنے لگا اور ان کے ساتھ کھڑا دھر دھوٹا رہا۔ دو جمو پڑوں کی چھٹی طرف کھلی جگہ پر نارمل کھیت بڑا دھیر لگا ہوا تھا۔ آوازیں سن کر کچھ اور لوگ بھی جمو پڑوں سے نکل آئے ان میں مودی تھے اور عورتیں بھی۔ ان میں سے بعض کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ آوازیں سن کر نیند سے بیدار ہوئے تھے۔

اس دوران میں ایک بوڑھا آدمی بھی ایک جمو پڑے سے نکل کر انسپکٹر پانڈے اور دوسرے آدمیوں کی گفتگو میں شامل ہو گیا اور پھر ٹھوڑی ہی دیر بعد ہمارے لیے ایک جمو پڑا نکال کر گیا۔

جمو پڑے میں چٹائیاں اور ان پر میلے کپیدے سے گدے بچھے ہوئے تھے جن میں نارمل کے چھلکے بھرے گئے تھے۔ تقریباً تین فٹ تک اونچی گارے کی دیوار تھی اور اس کے اوپر کھڑکی کی لمبائی کے ساتھ درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں کو لٹا کر جمو پڑے کو اوپر تک کھل کر کیا تھا۔

بلا ایک گدے پر لیٹ گئی اور انسپکٹر پانڈے بتانے لگا کہ یہ ٹیلے قبیلے کے لوگ ہیں جو برسوں سے اس جنگل میں آباد ہیں۔ بستی کے اطراف میں دور دور تک نارمل کے درختوں کی بساتیں تھیں اور یہ لوگ نارمل جمع کر کے شرمیں فروخت کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد ہمیں ناشتہ کیا کھانا دیا گیا۔ موٹی مٹی روٹیاں اور بغیر دودھ کی چائے کے دوران میں اس بستی کا بوڑھا سردار بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔

سردار کے کہنے کے مطابق سارسا شکاری طرف جانے والی سڑک یہاں سے کم از کم چار گھنٹوں کے فاصلے پر تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک آدمی کو ہمارے ساتھ بھیج دیا جائے گا کہ وہ جنگل میں بیٹھ نہ جائیں۔

کھانا کھانے کے ٹھوڑی ہی دیر بعد بلا گدے پر لیٹ کر

سو گئی۔ انسپکٹر پانڈے اٹھ کر باہر چلا گیا اور میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔ اب اطمینان ہو گیا تھا اس لیے میں بھی چند دیر آرام کر لیتا چاہتا تھا۔

دوسرا ایک بجے کے قریب ہمیں جگایا گیا تھا۔ ہمارے لیے دوسرا کھانا بھی تیار تھا۔ ہم نے جمو پڑوں کے پیچھے بننے والی ندی سے منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھا کر اپنے سرخ روانہ ہو گئے۔ بستی کا ایک آدمی ہمارے ساتھ تھا جو تقریباً دس گز آگے چل رہا تھا۔

سردار نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم واقعی چار گھنٹوں بعد جنگل سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سارسا سے بے پور کی طرف جانے والی ہائی وے تھی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ سارسا شہروں سے بائیں طرف تقریباً دس میل کے فاصلے پر ہے۔ میرے منہ سے ایک گرا سانس نکل گیا۔ ہم شہر کی دوسری طرف تقریباً ایک میل آگے جنگل میں داخل ہوئے تھے اور اب دس میل اوپر جنگل سے باہر نکلے تھے۔

اس وقت سہ پہر کے پانچ بج رہے تھے اور اس گائیڈ کو ہمارے ساتھ ہی شہر جانا تھا۔ اس نے دوسری صبح اپنی بستی واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم جنگل میں چار دن تک بیٹھتے رہے تھے۔ اس دوران میں میلوں کا فاصلہ طے کیا تھا لیکن اب پختہ سڑک دس میل کا فاصلہ طے کرنے کی بہت نہیں تھی۔ بلا سڑک کے کنارے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"بے پور کی طرف سے نہیں آتی رہتی ہیں۔" انسپکٹر نے کہا "کوئی نہ کوئی بس اس طرف آئے والی ہوگی۔"

اور پھر ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ بے پور کی طرف سے ایک بس کو آتے دیکھ کر انسپکٹر سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ بس اس کے قریب آکر رک گئی۔ یہ ٹھکانہ سیاحت کی بس تھی جو بے پور سے اور کی طرف جا رہی تھی۔ اس بس کو رات بھر کے لیے سارسا کا ہی میں رکنا تھا۔

بس بہت شان دار تھی۔ تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ اس میں غیر ملکی سیاح بھی تھے اور ہندوستانی بھی۔ وہ لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف، بھڑکے رہتے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ پولیس انسپکٹر ہمیں گرفتار کر کے لے جا رہا ہے۔ بلا کو تو دو پورین عورتوں نے اپنے ساتھ سیٹ پر بٹھایا اور ہمیں کھڑے ہی رہنا پڑا تھا۔ دس میل کا فاصلہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں طے ہو گیا۔

بس کو تواری کے سامنے سے گزری تو انسپکٹر نے اسے روک لیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ کو تواری میں قدم رکھتے ہی مجھے

اندازہ ہو گیا کہ ہمارے بعد شہر میں کیا صورت حال رہی ہوگی۔

میں اور بہار زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ انسپکٹر پانڈے نے ہمیں جیپ پر ہمارے کیسٹ ہاؤس کی طرف بھجوا دیا۔

جاگتی روپ متی اور شاکر بھانوت سنگھ بٹ کے باہر لان میں بیٹھ ہوئے تھے۔ جب ان سے چند گز کے فاصلے پر رکی اور مجھے اور بہار کو جب سے اترتے دیکھ کر وہ تینوں اچھل پڑے اور کریموں سے اٹھ کر ہماری طرف لپکے۔

ہمارے ملاط کا وہ منظر بڑا ہی سستی خیز تھا۔ روپ متی اور جاگتی بہار کو گھٹکے لگا لگا کر رو رہی تھیں۔ جاگتی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ ہم تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑے رہے اور پھر بٹ کے اندر آ گئے۔

”یہ کیا ملے بنا رکھے ہیں تم دونوں نے۔“ روپ متی نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہاری شرت اور جو تے بہار۔“

”لبی کہانی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”فرصت میں سناؤں گا۔ اس وقت تو کوئی ہمیں چائے پلاوے تو بڑی مہمانی ہوگی۔“

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ جاگتی اٹھ کر کچن کی طرف دوڑ گئی۔

بہار نے صوفے پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔

پندرہ میں منٹ بعد جاگتی سب کے لیے چائے بنا کر ملے آئی۔ بہار بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اور پھر چائے کے دوران میں ”میں انہیں اپنی رام کہانی سناتا رہا۔“

”یہاں کی کیا صورت حال رہی؟“ میں نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے شاکر کی طرف دیکھا۔

”تمہارے جانے کے بعد تو یہاں بھونچال اٹھ گیا تھا۔“ شاکر نے کہا ”ڈپٹی کمشنر پولیس پارٹی کو جنگل میں بھیجنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے بے پور آئی جی کو فون کر دیا اور پھر اس کے حکم پر ایک پولیس پارٹی انسپکٹر دو نو پانڈے کی قیادت میں جنگل کی طرف بھیج دی گئی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”پرسوں شام تین پولیس والے زخمی حالت میں جنگل سے باہر آئے تو شہر میں پھیلی سی بچ گئی۔ اسی شام میں اہلکاروں پر مشتمل ایک اور پولیس پارٹی کو جنگل میں بھیج دیا گیا۔ اسلئے سے لیس ہونے کے علاوہ ان کے پاس نارنجیں بھی تھیں۔ وہ لوگ کل تقریباً اسی وقت چند

لاشیں لے کر واپس آ گئے۔ ان میں چار لاشیں ان پانڈے والوں کی تھیں جو انسپکٹر پانڈے کی ہم میں شامل تھیں۔ لاشیں گنگولی چوہدری کے ساتھیوں کی تھیں جن میں ایک عورت اور چڑا کی لاش بھی تھی۔ آج صبح سویرے ایک پارٹی بھیجی گئی ہے۔ شام تک ہی اس کے بارے میں ہر چلے گا۔“

”یہاں کی صورت حال کا کچھ بتا چلا۔ میرا مطلب جس کام سے ہم یہاں آئے تھے اس میں کوئی پیش رفت یا نہیں؟“ میں نے شاکر کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ ہم یہاں بلونت سنگھ اور دار تلاش میں آئے تھے مگر زیادہ ہفتہ گنگولی چوہدری کے کچر نکل گیا تھا۔ گنگولی چوہدری کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ ہم ابھی وہیں کھڑے تھے جہاں سے چلے تھے۔

”ہم جب سے یہاں آئے ہیں اسی ہنگامے میں اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ دوسری طرف توجہ ہی نہیں دی جا سکی۔“ شاکر کہتے کہتے رک گیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ”اڑتی اڑتی یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ ایک عورت کو اپنے کے سلسلے میں تحقیقات کے لیے پولیس جب در پور پہنچی تو گاؤں کے لوگوں نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا جس سے دو پولیس والے زخمی ہو گئے تھے۔ اس طرح پولیس پارٹی کو واپس آنا پڑا اور سننے میں آیا ہے کہ چاروں پولیس جس روز تم نارائن کے ساتھ جنگل میں گئے تھے اسی روز ایک پنڈت اپنے دو چیلوں کے ساتھ دھول پور پہنچ گیا تھا۔ اسی گاؤں کے لوگوں کو پولیس کے خلاف بھڑکایا تھا اور لوگوں دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ عورت کو کسی کرنا ان کی رسم ہے اور وہ اس باندی پر باندی لگنے کا کوئی بھی سننے میں آئی کہ وہ پنڈت اپنے آپ کو بدیشی انمبر سا دھو کھاتا ہے۔“

”بدیشی سا دھو؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آگے کوئی سوال مت کرنا۔“ شاکر بولا ”اس میں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا۔ موقع ملے گا۔ اب کل سب سے پہلے یہی کام کریں گے۔“

”اب کوئی اور موضوع شروع کرنے سے بہتر ہے۔“ وہ دونوں جا کر اپنے ملے درست کرو۔ ”روپ متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”لگتا ہے جنگل میں چھوڑ تمہارے خون پر خوب دعوتیں اڑائی ہیں۔ تمہارا پورا سرخ دانوں سے بھرا ہوا ہے۔“

”ایک اور بات بتاؤں دیدی۔“ بہار ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”میرے گھر کو دیکھا تو بہار آگے کچھ نہ بول سکی۔ اس کا منہ بند کر دیا۔“

”تم شاید کوئی خاص بات بتا رہی تھیں۔ چپ کیوں ہو تھیں۔“ روپ متی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بہت سنگھ نے ایک سانپ بھی مارا تھا۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر پٹخا تھا۔ میں تو ڈر گئی تھی۔“ بہار نے بات جاری رکھی اور فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی ”میں تو نماںے جاری رہی ہوں۔ کئی روز ان وحشیوں میں رہی ہوں۔ کھن آ رہی ہے مجھے اپنے آپ سے۔“ وہ روپ متی والے کمرے میں چلی گئی۔

”تم بھی اپنا جلیہ بدل لو سا دھو مہاراج۔“ جاگتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور دروازہ بند کر کے پہلے بیک میں سے کپڑے نکالے اور پھر ہاتھ روم میں گھر گیا۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا۔ جاگتی نے مجھے سا دھو کہ کر کوئی تپکلی نہیں کی تھی۔ میرا جلیہ داغی توارہ گرد سا دھوڑا جیسا تھا۔ کھڑے ہوئے گرد آلود بال میں جن چند ٹکے بھی پھنسے ہوئے تھے۔ تین چار دن کا پھل پھلکا ہوا شیوہ سرخ آنکھیں۔ میں اپنی یہ حالت دیکھ کر سکرے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں تقریباً آٹھ گھنٹے تک شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جب کپڑے بدل کر باہر آیا تو بال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں بہت سے باہر آ گیا۔ جاگتی لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کمال چلے گئے یہ لوگ؟“ میں نے پوچھا۔ ”روپ متی اور شاکر بازار گئے ہیں۔ اسپتال سے ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا ”میں نے کہا تھا کہ ابھی تک ہاتھ روم میں نہ جاتی ہوئی ہے۔“ جاگتی نے جواب دیا ”اب تم بندے سے پتہ لگ رہے ہو مگر شیشیوں نہیں بنایا؟“

”موت نہیں ہو رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”کیا تم ایک کپڑے پانچ پانچ کر رہی؟“ ”بڑا خیال ہے جنگل میں گزرنے والے ایک ہفتے کی ایک سی دیں میں نکال لینا چاہتے ہو۔“ جاگتی نے کہا اور ”بہار اور جاگتی۔“

ساتھ ملا بھی تھی۔ اس نے فلیپر اور سلپوں میں سرخ ملاوڑ پہن رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور میں ملک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

”کہاں کھو گئے سا دھو مہاراج۔“ میں آپ کے لیے کافی بنا کر لائی ہوں۔ اس کے بعد آپ چائے کی طلب محسوس نہیں کریں گے۔“ جاگتی نے ٹرے میرے رکھتے ہوئے کہا ”اور ویسے دھیان دو تو ہم بھی بڑے ہیں رہا ہوں میں۔“

جاگتی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے الفاظ اور لہجے میں سا کسا نظر اٹھنے میں نے بھی محسوس کیا تھا اور بہار نے بھی لیکن نہ تو بہار نے اور نہ ہی میں نے اس کا جواب دینا مناسب سمجھا۔

میں نے ایک گنگ اٹھالیا۔ پہلی پتکی لیتے ہی میں اچھل پڑا۔ کانی تیز اور خوش ذائقہ تھی۔

کانی کی پتکیاں لیتے ہوئے ہم جنگل میں پیش آنے والے خونی واقعات کے بارے میں بھی باتیں کر رہے تھے۔ ”سنائے ڈاکوؤں کے ساتھ ایک عورت کی لاش بھی ملی ہے۔ وہ کون تھی؟“ جاگتی نے پوچھا۔

”گنگولی چوہدری کی رکھیل گروشا۔“ میں نے جواب دیا ”گنگولی چوہدری نے دو سال پہلے اسے ایک گاؤں سے اغوا کیا تھا اور اب غالباً گروشا سے اس کا جی بھر گیا تھا اسی لیے اس نے بہار کو روک لیا تھا اور یہ گروشا ہی تھی جس نے بہار کو اس وحشی کی دست برد سے بچائے رکھا تھا۔“

”حیرت ہے۔ ڈاکوؤں کی ساتھی کو کسی دوسرے سے اتنی ہمدردی؟“ جاگتی بولی۔

”وہ ڈاکوؤں کی ساتھی نہیں تھی۔ وہ تو ان کے جنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔“ میں نے کہا اور گروشا کے پس منظر کے بارے میں بتاتے لگا ”اگر گروشا ہمارا ساتھ نہ دیتی تو ہم ان وحشیوں کے جنگل سے نہیں نکل سکتے تھے۔ یا تو انہی کے ہاتھوں مارے جاتے یا گراس فائرنگ میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ ہم نے کوشش تو کی تھی کہ گروشا کو وہاں سے نکال لاتے لیکن اسے ہماری فکر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہم کسی طرح وہاں سے نکل جائیں۔ وہ بے چاری بھی چوہدری کے ہاتھوں ماری گئی اور مجھے اس کی موت کا افسوس رہے گا۔“

”چوہدری کے ہاتھوں!“ جاگتی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”گنگولی چوہدری انسان نہیں وحشی تھا۔ ورنہ۔۔۔“ میں

نے کہا "اس نے اپنے کم از کم تین آدمیوں کو تو میرے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان میں ایک کا قصور یہ تھا کہ اس نے بلا کہ بوسہ لینے کی کوشش کی تھی۔ جبکہ وہ بلا کو اپنی ملکیت سمجھ چکا تھا اور گروشا کو اس نے شخص اس لیے چٹائی کر دیا تھا کہ اس نے ہمیں وہاں سے بھاگنے میں ہماری مدد کی تھی اور مجھے انیسویں ہوا کہ میں اس وقت گروشا کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا لیکن ہجرال میں نے گنگولی سے اس کی موت کا بدلہ لے لیا۔"

"اور دیدی۔ وہ تو راکشس تھا راکشس۔" بلا نے کہا "مجھے تو اس کی شکل دیکھ کر ہی خوف آنے لگتا تھا۔"

"عجیب زندگی ہے ان ڈاکوؤں کی بھی۔" جاگی نے گمراہ سانس لینے ہوئے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر ایک گاڑی کو سڑک سے اس طرف مڑنے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

میں بھی اس گاڑی کی طرف دیکھنے لگا چونکہ سینکڑوں بعد ہی ہٹ کے سامنے آکر رک گئی۔ وہ پولیس کی جپ بھی۔ انسپکٹر پانڈے کے ساتھ دو اور پولیس آفیسر جپ سے اتر کر ہماری طرف آ گئے۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا اور دوسرا اے سی بی۔ (اسسٹنٹ کمشنر پولیس) وہ دونوں ردی میں تھے جبکہ انسپکٹر پانڈے سادہ لباس میں تھا۔ اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور زخمی بازو پر پی بندھی ہوئی تھی۔

وہ لوگ قریب آئے تو ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان تینوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بلا اور جاگی کو ہاتھ جوڑ کر پر نام کیا۔ یہاں صرف چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں برآمدے سے دو اور کرسیاں اٹھا لیا۔

"یہ ہمارے اے سی بی مسٹر بھنڈاری ہیں۔" انسپکٹر پانڈے نے تعارف کرایا اور یہ انسپکٹر جاتی داس۔ ہم آپ دونوں کا بیان دیکھ کر رڑ پڑا نا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ۔"

"اس کے علاوہ کیا۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سرکار نے گنگولی چوہدری کی زندگی یا مرادہ فدا کی پر پھر پانچ لاکھ روپے کا انعام مقرر کر رکھا تھا۔ آپ دونوں نے خاص طور پر آپ نے بہت سچہ! اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ گنگولی چوہدری کے گروہ کے خاتمے اور گنگولی چوہدری کو انجام تک پہنچانے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے سرکار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انعام کی رقم آپ دونوں کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔"

میں نے بلا اور جاگی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی اور بلا کا تو چہرہ تہمتا اٹھا تھا۔

اس لیے نہیں کہ پانچ لاکھ کا انعام مل رہا تھا بلکہ اس سرکار نے ہماری خدمت کا اعتراف کیا تھا۔

"پانڈے جی۔" میں نے کہا "آپ اس بات پر دید گواہ ہیں کہ گنگولی چوہدری کس طرح اپنے اپنے تھاک۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی زندگیوں کا خطرہ

تھیں لیکن گنگولی چوہدری کے گروہ کے خاتمے میں کردار ان پولیس اہلکاروں نے ادا کیا ہے جنہوں میں حصہ لیا اور جنہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے کر کے اس گروہ کا قلعہ فتح کیا اور آئندہ کے لیے اس کی دہشت سے نجات دلائی۔ انعام کے حق دار۔"

میں وہی ہیں اس لیے میری اور بلا کی یہ خواہش ہے انعامی رقم اس معرکے میں جاں گوانے والے پولیس اہلکاروں میں تقسیم کر دی جائے۔"

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں جی۔" اے سی بی بھنڈاری نے کہا "یہ ایک بڑی بات ہے۔"

"اور اس پر ان کی حق ہے۔" میں نے اس کا کٹ دی "اور بیان دینے کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔"

"شکریہ مسٹر بھٹ! اے سی بی نے کہا "اس تو ہم آپ سے صرف بات کرنے آئے تھے۔ بیان دینے کے لیے آپ کو کوئی تک آنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ نو اور گیارہ کے درمیان تشریف لے آئیے۔ اس دن بھی وہاں موجود ہوں گا۔"

"ہم پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ وہ لوگ اٹھ کر اپنی جپ کی طرف بڑھے۔

روپ مٹی اور خاک بھی آگئے۔ خاک کے پچاؤ پولیس سے ذرا ہٹا کر روکی تھی۔ خاک کے آنے کے بعد وہ منٹ اور رک گئے۔ اس وقت مجھے ایک ادب بات آئی۔

"انسپکٹر پانڈے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کا ٹیٹیل اور گنگولی چوہدری کی لاشوں کو لانے کا کوئی بندوبست کیا نہیں؟"

"شام سے پہلے پولیس کی ایک پارٹی ہستی کے ساتھ روانہ کر دی گئی تھی۔" انسپکٹر پانڈے "رات وہ لوگ جمیل فیملی کی ہستی میں رہیں۔"

سورے وہاں سے آگے روانہ ہو جائیں گے۔ انچارج کو لوکیشن سمجھا دی گئی ہے۔ گنگولی چوہدری اگر جنگلی جانوروں کی چیرہ دستی سے بچتی تو اسے چوراہے پر رکھ دیا جائے گا تاکہ لوگ اپنی آنکھوں

کی جس شخص نے کئی درشوں (مالوں) سے ان کا جینا دیا۔ کرکھ تھا اس کا انجام پالا خر کیا ہوا۔"

دھم دھم کر رہی تھی۔ یہ انجام واقعی بہت عبرت میں جھجھکی لے کر رہ گیا۔

ان کے جانے کے بعد ہم ہٹ کے اندر آ گئے۔ خاک ان کے کھانے آیا تھا۔ روپ مٹی نے پچاؤ سے پاکٹ پولیس کے حوالے کر دی اور پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد نکال کر جاگے۔

ہم بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔

بٹی سادھو کا سراغ بڑی مشکل سے ملا تھا۔ اگلے روز پولیس سے فارغ ہونے کے بعد میں اور خاک پچاؤ دھول پر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ اس روز صبح سورے بجی سی بارش ہوئی تھی جس سے کچا راست دلدل بن گیا تھا۔ دھول پور کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہاں پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ خاک نے پچاؤ روپ مٹی کے مرکز چوراہے پر ایک طرف روک لی۔

یہ چوراہا خاما بڑا تھا جس کے عین وسط میں پتیل کے دو تین درخت تھے۔ ان کے گرو تقریباً دو فٹ اونچا وسیع و عریض چوڑے بنا ہوا تھا۔ درختوں کی جڑوں کے قریب سوکھے ہوئے پتیل کی والی چادر چالو وغیرہ بکھرے ہوئے تھے اور وہاں چوڑیوں کی بھرا ہوا تھی۔ یہ بندوبست عجیب ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جہاں مان کر یہ اس کی پوجا نہ کرتے ہوں۔ پتیل کے درخت کو بھی مقدس سمجھا جاتا ہے اور تلسی کے پودے کی تو باقاعدہ پوجا کی جاتی ہے۔ گھروں میں تلسی کا پودا لگانا عادت ہے۔

دو تین آدمی چوڑے کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گلی کے موڑ پر بننے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی تھی۔ دکان کے سامنے جتنی تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے ہمیں دیکھ کر وہاں میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ جس روز اس عورت کو کسی کیا گیا تھا اس دن بھی ہم یہاں موجود تھے۔ اس دن ہمیں ہستی کے زیادہ لوگوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک چہرہ ایسا تھا جسے میں نے پہچان لیا تھا۔ اس آدمی کو میں نے اس روز بھی دیکھا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اسی سے ہم نے اس پنڈت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

خاک نے انجن بند کر دیا اور ایک آدمی کو بلانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک کے بجائے دو آدمی اٹھ کر گاڑی کے قریب آ گئے۔ ان دونوں نے ہاتھ اٹھا کر پر نام (سلام)

کیا۔

"جی سہاراج۔" ان میں سے ایک نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"وہ پنڈت کہاں ملے گا؟" خاک نے پوچھا۔

"وہ پنڈت جی تو اس سے اگلے ہی روز یہاں سے چلے گئے تھے جب پتیل پر آپ یہاں آئے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک دیوی جی بھی تھیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ وہ دہلا پتلا سادسی تھا اور اس کی عمر تیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس روز ہمارے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔

"جی سہاراج۔" ان میں سے ایک نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"وہ پنڈت کہاں ملے گا؟" خاک نے پوچھا۔

"وہ پنڈت جی تو اس سے اگلے ہی روز یہاں سے چلے گئے تھے جب پتیل پر آپ یہاں آئے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک دیوی جی بھی تھیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ وہ دہلا پتلا سادسی تھا اور اس کی عمر تیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس روز ہمارے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔

"میں اس پنڈت کی بات نہیں کر رہا۔" خاک نے کہا "میں بدیشی سادھو کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ دو چیلے بھی ہیں۔"

"اچھا وہ بدیشی سادھو۔" وہ شخص گمراہ سانس لیتے ہوئے بولا "کل شام تک تو وہ پنڈت سوہراج جی کا سمان تھا اور پھر وہ اپنے چیلوں کے ساتھ رات ہی کو کہیں چلا گیا تھا۔"

"پنڈت سوہراج کہاں ملے گا؟" خاک نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی گلی میں جا کر سیدھے ہاتھ مڑ جائے۔ وہاں مندر کے ساتھ ہی پنڈت سوہراج کا مکان ہے۔ وہ اس وقت گھر پر ہی ہوگا۔" اس شخص نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دھن باد۔" خاک نے ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور انجن اشارت کر دیا۔

گاڑی چوراہے سے گھوم کر سامنے والی گلی میں داخل ہو گئی اور پھر وہاں سے دائیں طرف موڑنے کے بجائے خاک نے گاڑی روک لی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ بائیں طرف شروع ہی میں ایک مکان کے رقبے کے برابر مندر تھا اور اس سے آگے پنڈت سوہراج کا مکان۔

ہمیں دروازے پر دستک دینے یا پنڈت سوہراج کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ ہم جیسے ہی مندر کے سامنے سے گزرے، ایک آدمی لمحہ مکان کے دروازے سے برآمد ہوا۔ وہ لباس اور صورت ہی سے کوئی پنڈت یا پجاری لگتا تھا۔ پیر میں لکڑی کی کھڑاؤں، مخصوص انداز میں پسینے ہوئی دھوئی جبکہ جسم کے بالائی حصے پر زرد رنگ کی چادر بھی مخصوص انداز میں لپی ہوئی تھی۔ اس چادر پر جا بجا "اوم" چھپا ہوا تھا۔ ایسی چادریں بازار میں عام طور پر

سستے داموں مل جاتی تھیں۔ اس شخص کا سر منہ تھا۔ ماتھے پر سفید قشعہ، اس سے ذرا اوپر درمیان میں سرخ تلک اور دونوں رخساروں پر بھی اور سے نیچے سیندر سے لکیریں سی کھینچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ صورت ہی سے وہ کٹر متعصب اور کینہ پرور ہندو لگتا تھا۔ اس کی ہن جیسی آنکھوں میں عیاری کی چمک نمایاں تھی۔

ٹھاکر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر پر نام کیا تو وہ رک کر کینہ توڑ نظروں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بادل ناخواست اس نے بھی دونوں ہاتھ اٹھا کر جوڑ دیے۔

”کون ہو تم لوگ۔ کہاں سے آئے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ اس کے لیے میں بھی کینہ توڑی کی تحک نمایاں تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سب کو اپنے آپ سے کم تر سمجھتا ہو۔

”ہوں (گ میں کھی جھینکے کی ہندوانہ رسم۔ اسے ہوم بھی کہتے ہیں) کرانا ہے پنڈت جی۔ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔“ ٹھاکر نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

”کہاں سے آئے ہو تم لوگ۔ اس ہستی کے تو نہیں ہو۔ میں تو اس ہستی کے ایک ایک چہرے کو پہچانتا ہوں۔“ پنڈت نے کہا۔ اس نے نوٹ مٹھی میں دبا لیا تھا۔

”ہم سارسکا سے آئے ہیں پنڈت جی۔ آپ کو واپس یہاں چھوڑ دیں گے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”سارسکا۔ کیا شہر میں کوئی پنڈت نہیں رہ گیا جو۔۔۔؟“

”بات یہ ہے پنڈت جی۔“ ٹھاکر نے کہا ”پنڈت تو شہر میں بہت ہیں لیکن ہم ذرا پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔ آج کل کے پنڈت اور پجاری تو دھرم کی پرانی رسموں کو بھول چکے ہیں۔ مجھے تو شک ہے کہ وہ اشلوک بھی ٹھیک پڑھتے ہیں یا نہیں۔ آپ کے بارے میں سنا تو ہم یہاں آگے اور آپ کو دیکھا تو دوشواس (تھین) ہو گیا کہ آپ کا ہون ٹھیک رہے گا۔

آپ انکار نہ کیجئے پنڈت جی۔“

”کتنی دیر لگے گی؟“ پنڈت نے پوچھا اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

”سب تیاری مکمل ہے پنڈت جی۔“ ٹھاکر نے جواب دیا

”زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہمارے پاس گاڑی ہے۔ ہم آپ کو واپس یہاں چھوڑ جائیں گے۔“

پنڈت سو بھراج پنڈت لکھے خاموش رہا پھر ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے دوبارہ گھر میں گھس گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ لگے تھے۔ اس مرتبہ اس نے کندھے پر ایک تھیلیا لٹکا

رکھا تھا۔

ہم اس کے ساتھ باہر والی گلی میں آگے ارد گرد کی بچے جمع تھے اور ایک بچہ تو بونڈ پر چڑھ کر ہمیں دیکھ کر وہ سب بھاگ گئے۔

ٹھاکر نے دروازہ کھول کر پہلے پنڈت سو بھراج سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی ذرا نیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت سیٹ پر برا بھلا ہو گیا تھا۔

ٹھاکر گاڑی کو اس چوک کی طرف سے نہیں ایک گلی سے نکال کر لے گیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا پنڈت لب کچھ بدبواہا تھا۔

بستی سے تقریباً دو میل دور آنے کے بعد ٹھاکر گاڑی کو اصل راستے سے ہٹا کر بائیں طرف موڑ دیا۔

”ادھر کہاں جا رہے ہو مورکھ۔ (اسحق) شہر کا راستہ سامنے ہے۔“ پنڈت سو بھراج فوراً ہی بول پڑا۔

”سچ بارش کی وجہ سے وہ کچا راستہ دلدل بن گیا۔ پنڈت جی۔ گاڑی کچھ نہیں پھنس جائے گی اس لیے ذرا گھبرا جانا پڑے گا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

اس طرف کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ آگ پودے اور بھول کی جھاڑیوں کی برسات تھی۔ ٹھاکر جھاڑیوں میں گاڑی چلا تا رہا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ کرنے کے بعد ٹھاکر نے گاڑی روک کر انجن بند کر دیا۔

”کیا ہوا۔ تم نے موٹر کیوں روک لی؟“ پنڈت نے پوچھا۔

”کتھے ہوئے ابھی ہوئی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔

”مجھے ایک اور بات یاد آگئی ہے پنڈت جی۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ کسی اور پنڈت کو بھی ساتھ لے جائے۔ پوچھا میں ذرا رونق ہو جائے گی۔ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم بدیشی سادھو اور اس کے دو چیلوں کو ساتھ لے لیں۔“

”بدیشی سادھو!“ پنڈت سو بھراج اچھل پڑا۔

”ہاں۔ بدیشی سادھو اور اس کے دو چیلے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”مہ۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ پنڈت ہٹکایا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ ٹھاکر اس پنڈت کو پوچھا ہوں کا بہانہ کر کے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔ میں شاید پنڈت سے وہ سب کچھ پوچھتا آسان نہ ہوتا۔ جانتا چاہتے تھے۔ آبادی سے دور اس ویرانے میں ہمارے بدلے ہوئے تیر دیکھ کر یہ پنڈت نفسیاتی دباؤ میں آئے۔

کا اثر بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

اور پنڈت بچہ جانتے ہوئے۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر غور کیا۔

نظریں تباہ ہیں۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر غور کیا۔

ہو وہ اس وقت کہاں ہیں۔“ ٹھاکر نے اس کے چہرے پر غور کیا۔

”میں کسی بدیشی سادھو کو نہیں جانتا۔“ پنڈت نے جواب دیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”تم لوگ کون ہو۔ اور کیا چاہتے ہو۔“ پنڈت ہٹکایا۔

”پنڈت جی۔ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

”مہ۔ میں مانو گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائے میں سے خنجر نکال لیا۔

نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ کھٹک رہا تھا۔ پنڈت سو بھراج کی عمر چالیس اور بیٹا تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس وقت وہ مجھے عام پنڈتوں اور پجاریوں سے مختلف نظر آ رہا تھا۔

ٹھاکر پنڈت کے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک ہی پنڈت پر ہاتھ اٹھا دیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پنڈت سو بھراج نے اس کا ہاتھ اوپر ہی روک لیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں بھی ابھرنے کے اثرات ابھر آئے تھے اور پھر جو کچھ ہوا وہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ پنڈت نے ٹھاکر کی کلائی کو زور دار جھٹک دیا اور ساتھ ہی اس کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کر دی۔ ٹھاکر گرا ہوتا ہوا جھاڑیوں میں گرا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ٹھاکر جیسا کچھ ختم آدمی ایک ہی دار سے ڈھیر ہو گیا تھا میں جھٹکا لگا کر گاڑی سے اتر آیا اور پنڈت کو لٹکارتا ہوا خنجر اٹھائے اس کی طرف لپکا۔

میں نے خنجر سے حملہ کرنے کی کوشش کی تو پنڈت نے بڑی مہارت سے میرے خنجر والے ہاتھ کی کلائی تھام کر میرا حملہ ناکام بنا دیا۔

پنڈت کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ لگتا تھا جیسے میری کلائی آہنی شکنے میں جکڑی گئی ہو۔ میں کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ تو گرفت ڈھیلی ہوئی اور نہ ہی پنڈت سو بھراج نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ بیجان کی طرح تباہ ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

ٹھاکر اٹھ کر پنڈت کی طرف لپکا تو میں چیخ اٹھا۔

”نہیں ٹھاکر! تم اس پر حملہ نہیں کرو گے۔ اسے اپنی طاقت آزما لینے دو۔“

ٹھاکر تین چار قدم دور رک گیا۔

”نہیں نہیں۔ اپنے متر (دوست) کو بھی اپنی شکتی (طاقت) آزما لینے دو۔“ پنڈت نے طنزیہ لہجے میں کہا ”تم دونوں کو بڑا گھمنڈ تھا اپنے آپ پر۔ میرے اندر اتنی شکتی ہے کہ میں تم دونوں کو خون تھوکنے پر مجبور کر دوں گا۔“

پنڈت نے میری کلائی کو جھٹکا دیا۔ میری مٹھی کھل گئی اور خنجر نیچے گر گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میری کلائی کی ہڈی چنچ رہی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنڈت سو بھراج کسرتی بدن کا مالک تھا اور اس میں طاقت ہوئی چاہے کھی لیکن اس کی گرفت میں آہنی شکنے جیسی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

ہندوستان کے پنڈت اور بیماری بڑی پراسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی شہنشاہی حاصل کرنے کے لیے بڑے سنگین جاپ کرتے ہیں۔ ان میں ایسی پراسرار شہنشاہی آجاتی ہے کہ کوئی عام آدمی انہیں شکست نہیں دے سکتا۔

میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایسی باتیں سوچ کر میں کسی نفسیاتی دباؤ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے پنڈت کی قوت کو آزمائے کے لیے کلائی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پنڈت نے میری کلائی پر گرفت اور مضبوطی کر لی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں پنڈت کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پنڈت بھی پلک جھپکے بغیر میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ذرا سا اچھلا اور اپنا بوجھ پیچھے کی طرف ڈال کر دونوں ہاتھیں دہری کر کے اوپر کی طرف نکال لیں۔ پنڈت جھٹکا لگنے سے ذرا سا آگے کو جھٹکا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، میری دونوں ہاتھیں اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ میں نے اپنے آپ کو بائیں طرف مگرادیا۔

بہم دونوں کانٹے دار بھاریوں میں گرسے کئی کانٹے میرے جسم میں جیسے تھے لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت نے بھی اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

پنڈت سوہراج نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور اس سے پہلے کہ پنڈت میرے قریب پہنچتا، میری سائڈنگ لگ اس کے کندھے سے ذرا نیچے بازو پر لگی۔ وہ ہلکا کر نیچے مگر لیکن اس مرتبہ بھی اس نے اٹھنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیدیے بغیر اسے ایک اور لگ لگائی کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی پھرتی سے میری لگ ہلاک کر دی اور پھر وہ میری ہر لگ کو ہلاک کر رہا تھا۔

میں سنبھل گیا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ پنڈت اور مارشل آرٹسٹ؟ میں نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے حریف سوہراج کے لیے پنڈت کا لفظ ذہن سے نکال دیا۔ بدھ ہمشو مارشل آرٹسٹ ہوتے تھے تو ایک پنڈت کیوں نہیں۔ میرے سامنے ایک پنڈت نہیں، مارشل آرٹسٹ کھڑا تھا جس نے میری کئی ٹھکس ہلاک کی تھیں۔

اور پھر سوہراج نے بھی جوانی کا رووائی شروع کر دی۔ میں نے اس کی ایک سائڈنگ لگ دوکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پلو میں دینی

ہتھوڑے سے زور دار ضرب لگائی گئی ہو۔ میں توڑ گیا۔ پنڈت کی دوسری لگ میری اسی ٹانگی کی پنڈت کی طرف لگی۔ اگر میں اچھل کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتا تو اس زور دار ضرب میں پنڈت کا کوشٹ پھٹ جاتا۔ میں اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

پنڈت نے آگے بڑھ کر ایک اور لگ مارنے کی کوشش کی مگر میں بڑی تیزی سے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ پنڈت نے اچھلا۔ اس مرتبہ اس نے ذیل فلائنگ لگائی کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اسے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ الٹی فلا بازی کھاتا ہوا پھر مگر اور فوراً ہی سنبھل گیا۔

میں نے رائٹ لگ کا جھانساؤے کر لینٹ لگ لگائی۔ اس مرتبہ پنڈت اپنا دفاع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لڑکھڑا گیا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن پر راؤنڈ ہاؤس لگ لگائی۔ وہ ہلکا ہوا مگر پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس میں شہر میں کہ وہ بہت اچھا مارشل آرٹسٹ تھا لیکن میں نے بھی نہیں کائی تھی۔ بنگال میں مہاراج وانگ وانگ لگائی اور اس کے نامور شاگردوں کی مار کھائی تھی اور پھر شاؤنل ٹیبل ریاضت اور تربیت کی تختیاں جھیلی تھیں۔ یہ سب کھانسی میں نے اس لیے برباد کی تھیں کہ پنڈت سوہراج جیسے مارشل آرٹسٹ سے مار کھا جاؤں۔

میں نے آخری مرتبہ فلائنگ لگ لگائی۔ پنڈت نے کی کوشش کی مگر میرا اس کی پیشانی پر لگا۔ میں نے اسے پکڑ رکھے تھے جس کے کھوڑے سول سے اس کی پیشانی کھال چھل گئی۔ وہ چیخا ہوا پشت کے بل بھاڑیوں میں گرا۔ میں چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا اور ایک پیر اس کے سینے پر دیا۔

”تم تو ہم دونوں کو چھروں کی طرح چپکی میں سے جا رہے تھے مہاراج۔“ میں نے پیر کا دباؤ ڈالنے سے روک دیا۔ لیکن تم تو خود ڈھیر ہو گئے۔ میں اگر چاہوں تو تمہارا پیر توڑ سکتا ہوں۔“ میں نے پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کے سینے پر میرے پیر کا دباؤ کچھ زیادہ ہی تھا تو اس کا سانس کھٹکے لگا۔ چورس ہو گیا اور آنکھیں مٹھنے لگیں۔

”لیکن تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم سادھو کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“

صورت دیکھ کر۔“ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی ”بب“ بتاتا ہوں۔“

ی تو اڑا۔ وہ چند لمبے اسی حالت میں بڑا مگرے میں نے پیر بٹایا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ مگرے سے لپٹا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیشانی کو سہلایا اور پھر ہاتھ پر خون دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

خاکر بھانوت سنگھ اتنی دیر تک دور کھڑا تھا دیکھتا رہا تھا۔ میرا خنجر بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ آگے آگیا۔ ”وہ بدیسی سادھو اور اس کے چیلے کہاں ہیں؟ وہ تمہارے پاس کیوں آئے تھے؟“ خاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے سوال کیا۔

”یہ سب کچھ حرای بلونت سنگھ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کی بات نہ مانتا تو مجھے یہ سے (وقت) نہ دیکھنا پڑتا۔“ پنڈت سوہراج نے کہا۔ بلونت سنگھ کے نام پر ہم دونوں چونک گئے۔ میں نے خاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک ابھر آئی تھی۔

”بلونت سنگھ کو کیسے جانتے ہو؟“ خاکر نے پوچھا۔ ”میں اس حرای کے خوف سے کئی سال سے یہاں اس بستی میں چھپا ہوا تھا لیکن پچھلے سال اس نے مجھے کھوج نکالا۔“ پنڈت سوہراج نے جواب دیا اور پھر اس نے جو کمانی سالانہ فامی دلچسپ تھی۔

پنڈت سوہراج بھی چوڑا گڑھ کا رہنے والا تھا۔ اس کا حلق بھی ایک کھانے پینے کھانے سے تھا۔ بلونت سنگھ اس کا دوست تھا۔ یہ لوگ چند اور لڑکوں کے ساتھ مل کر ”سرسن“ کرتے رہتے تھے۔ بلونت سنگھ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ یہ لوگ آئے دن کسی نہ کسی لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے رات بھر بھوکے بھینڑیوں کی طرح اسے بھینڑتے رہتے اور صبح زار دھماکا کر چھوڑ دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ چھوٹے اور بچہ گردنوں کی لڑکیوں پر ہاتھ ڈالتے تھے اور وہ لوگ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی زیادتیوں کے خلاف پولیس سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن معزز اور دولت مند گھرانوں کے سامنے بچہ لوگوں کی کیا حیثیت تھی۔ پولیس انسانی لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے بند کر دینے کی دھمکیاں دے کر بھاگتی۔

ایک رات ایک باعزت گھرانے کی لڑکی بلونت سنگھ اور سوہراج کے ہاتھ لگ گئی۔ سوہراج کے کہنے کے مطابق وہ

لڑکی تیرہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن اس کے جسم کی اٹھان بڑے غضب کی تھی۔ یہ دونوں اسے سہلا پھلا کر شہر سے باہر ایک ویران مندر میں لے گئے اور رات بھر اسے ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ وہ لڑکی زیادتیوں کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے دم توڑ دیا۔

رات کے پچھلے چہرہ وہ دونوں اس لڑکی کی لاش ویران مندر میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ سوہراج اس قدر خوف زدہ ہوا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی شہر سے بھی بھاگ نکلا۔ سب سے پہلے اس نے جودھ پور کے ایک مندر میں پناہ لی۔ یہاں پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کے بدلے اسے کھانے کو بھی مل جاتا اور سر چھپانے کو جگہ بھی مل گئی۔

تقریباً دو مہینوں بعد وہ مندر میں دو پولیس والوں کو دیکھ کر وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ ہو سکتا ہے پولیس والے کسی اور کام سے مندر میں آئے ہوں۔ لیکن وہ بھی سمجھا کہ شاید وہ اس کی تلاش میں آئے ہیں اور اسے بھانسنے ہی میں عافیت نظر آئی تھی۔

وہ دو سال تک مختلف مندروں میں گھومتا رہا۔ اس کے خیال میں مندر ہی اس کے لیے سب سے محفوظ ٹھکانے تھے۔ یہاں اسے کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا اور مزے مزے کے کھانے بھی ملتے تھے۔ وہ باقاعدہ پجاری بن گیا۔ اس نے دھرم کے حوالے سے وہ سب کچھ سمجھ لیا تھا جو ایک پجاری اور پنڈت کے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔

تین سال پہلے وہ سارکا آیا تھا۔ اس نے سارکا کے جس مندر کو ٹھکانا بنایا تھا وہاں کا پنڈت اس کی سیوا سے بہت خوش ہوا۔ اس دوران میں اس بستی کے چھوٹے پنڈت کا وراثت (انتقال) ہو گیا۔ شہر والے مندر کے پنڈت نے بستی کا یہ مندر سوہراج کے حوالے کر دیا۔ سوہراج بہت خوش تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا۔

وہ پچھلے چند برسوں کے دوران میں جن مندروں میں بھی گیا تھا وہ کالی کے استھان تھے۔ ان مندروں کے پجاری اور پنڈت نہایت کڑا اور انتہا پسند تھے۔ یہ صفت سوہراج میں بھی آگئی۔ اسے دھرم میں تبدیلیاں پسند نہیں تھیں۔ اس کے خیال میں کالی کے مندروں میں انسانوں کی بھینٹ بھی ہونی چاہیے اور یہ وہ ہونے والی عورت کو اپنے بچے کی لاش کے ساتھ چٹا میں جل مرنا چاہیے۔ یہ سوہراج کے پرچار (تبلیغ) کا نتیجہ تھا کہ اس روز گاؤں والوں نے ایک عورت کو اس کے بچے کی لاش کے ساتھ جلا ڈالا تھا۔ پولیس کو اس کی

اطلاع مل گئی تھی۔ لڑکی کے سر اور بعض دوسرے لوگوں کو اگرچہ پکڑ لیا گیا تھا لیکن گنگولی چوہدری والے چکر میں یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔

”پچھلے سال“ پنڈت سوہراج کہہ رہا تھا ”سارے ساشر میں بلونت سنگھ سے منہ بھیڑ ہو گئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے اس سے اپنا چچا چھڑ لیا اور پھر اسی رات اسے یہاں بستی میں اپنے مکان کے دروازے پر دیکھ کر میرا ہاتھ اٹھکا تھا۔“ وہ چند تھوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بلونت سنگھ نے بتایا کہ چٹوڑ گڑھ میں اس کم سن لڑکی کے قتل کے سلسلے میں میرا نام سامنے آیا تھا اور پولیس کو اب بھی میری تلاش ہے۔ بلونت سنگھ بہت چالاک آدمی ہے۔ پتا نہیں اس نے اپنے آپ کو قتل کے اس معاملے سے کس طرح الگ کر لیا تھا اور سارا الزام مجھ پر اٹھایا تھا۔ بہرحال“ اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور چار دن پہلے۔“

سوہراج ایک بار پھر خاموش ہو گیا پھر بولا ”چار دن پہلے وہ اپنے گرو اور ایک چیلے کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ وہ خود بھی بچاری کے بیس میں تھا۔ اس کا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا اور اس کے گرو کا دوسرا چیلہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ بہت سندر تھی۔“

میں ایک بار پھر بڑبک گیا۔ ٹھاکر بھی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بلونت سنگھ نے بتایا کہ اس کا گرو بدیشی سادھو ہے اور بہت پتلی ہوا ہے۔“ پنڈت سوہراج کہہ رہا تھا ”اس نے بتایا کہ ان کے بعض دشمن ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو انہیں جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ چند روز یہاں رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ اس نے مجھے دھکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کی اصلیت بتائی تو وہ مجھے چٹوڑ گڑھ میں لڑکی کے قتل کے الزام میں پکڑو اے گا۔ وہ کل رات یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”کہاں گئے ہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں نے کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ سوہراج نے جواب دیا۔

”دیکھو پنڈت جی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظرس

جماتے ہوئے کہا ”میں نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ وہاں ہے لیکن ان کا گرو دنیا کا سب سے خطرناک آدمی بننے کے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔“ بلونت سنگھ کے ہاتھ بھی کئی بے گناہوں کے خون سے رنگ ہوئے۔ ایک طرف پولیس ان کی تلاش میں ہے اور دوسری طرف ہم۔ اگر تم نہیں ان کے بارے میں بتا دو تو پوری اپنی ہوگی۔ ورنہ تم مجھے دیکھ چکے ہو۔ میں تمہاری ہڈیوں کا بنا سکتا ہوں۔ ویسے تم نے مارشل آرٹ کہاں سے سیکھا تھا؟“

”چٹوڑ گڑھ میں“ کالج کی تعلیم کے دوران میں سوہراج نے جواب دیا۔

”تم بہت اچھے مارشل آرٹسٹ ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم ان صلاحیتوں کو مثبت کاموں میں استعمال کرتے تمہاری عزت ہوتی اور نام بھی۔ بہرحال“ کہاں ہیں لوگ؟“

”میں نہیں بتاؤں گا۔“ سوہراج نے جواب دیا۔ ”تم پھراؤ گے۔“ میں نے اسے گھورا ”ایک اور بندہ

بتاؤں تمہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظرسے ”بلونت سنگھ کا گرو بدیشی سادھو ہندو نہیں، مسلمان ہے۔ تمہارے دھرم کو نشٹ کر رہا ہے اور بلونت سنگھ کو بھی۔“ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے ساتھ وہ خوب صورت لڑکی کی رکھیل ہے۔ کیا تم اپنے دھرم کی یہ توہین برداشت کرنا ہو؟“

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اس کا چہرہ ایک دم نرم ہو گیا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے دماغ میں ہچک چکی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے ٹھنک خورہ سے لہجے میں بولا ”میں بتاؤں گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔“

”بتاؤ۔ جلدی کرو۔“ میں نے کہا اور اسی وقت ہو ہاتھ پر پانی کا چھینٹا پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر اور دیکھا۔ آہستہ گہرے بادل تھے اور بجلی بوند ابلندی شروع ہو گئی تھی۔

”چلو۔ گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ ٹھاکر اور میرا خنجر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے سمجھ کر جینز کا پانچہ اٹھایا اور خنجر کو ہاتھ بندھے ہوئے چڑے کے ہولسٹر میں ڈال دیا۔ پنڈت سوہراج کی پیشانی سے اگرچہ خون رستا بند ہو گیا تھا مگر پیشانی پر ہونہری تھی۔ اس کے بدن پر بھی کانٹوں سے کئی خراشیں

تھیں۔ اس نے پہلے زمین پر پڑا ہوا اپنا تھیلہ اٹھا کر کندھے پر ڈال دیا اور پھر جھاڑیوں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر بدن پر ڈال دیا۔

بارش کی بوندیں اب تیزی سے گر رہی تھیں۔ ہم دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور دروازے بند کر کے شیشے چڑھا دیے۔ ٹھاکر نے انجین اسٹارٹ کر کے اسے سی چلا دیا اور گاڑی کی حرکت میں لے آیا۔ گاڑی کا رخ شرکی طرف تھا۔ گاڑی کی حرکت میں ہو تم لوگ؟“ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹھاکر نے پوچھا۔ اس کے لیے میں ہلکا سا خوف تھا۔

پنڈت نے پوچھا۔ ”بارش میں یہاں دیرانے“ ٹھاکر نے جواب دیا ”بارش میں یہاں دیرانے میں کڑے رہنا مناسب نہیں ہے لیکن اطمینان رکھو۔ ہم نہیں واپس بستی میں چھوڑ دیں گے۔“

گاڑی مناسب رفتار سے چلتی رہی۔ اس کے ساتھ ہم نے پنڈت سوہراج سے سوال جواب کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس کے کہنے کے مطابق سارے تقریباً بیس بائیس میل آگے سلسلہ نام کا ایک قصبہ ہے اور اس سے مزید پندرہ میل آگے اور تائی قصبہ ہے۔ یہ دونوں قصبے تاریخی عمارات کی وجہ سے خاصی اہمیت اور شہرت رکھتے ہیں۔ سلسلہ اور اور کار میانی علاقہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں شہروں کے بیچ میں ایک راستہ واپس طرف کو نکلتا ہے۔ اس راستے پر تین میل آگے جا کر ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور اس سے آگے ریگستان ہے لیکن ایک میل مزید آگے جانے کے بعد سرخ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان پہاڑیوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے غار ہیں لیکن پہاڑی سلسلے کے وسط میں ایک بہت بڑا غار ایسا بھی ہے جہاں کالی کا مندر بننا ہوا ہے۔ سال بھر یہ راستہ مندر اور غار دیران رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی باڑی اس طرف چلا جاتا ہے لیکن سال میں ایک مرتبہ وہ مندر اور اس کے آس پاس کے غار آباد ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں مہلے کا سا سال ہوتا ہے۔ ان دونوں کالی کے ماننے والے باڑی ہندوستان کے کونے کونے سے بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی یہاں آتے ہیں۔ یہ میلہ سات دن جاری رہتا ہے اور ان سات دنوں میں تین غار والے مندر میں کالی کے چٹوں پر تین انسانی جانوں کی مجسمت چڑھائی جاتی ہے۔“

میں نے تو سنا ہے کہ انسانی جانوں کی مجسمت پر پابندی ہے اور رسم ختم کی جا سکتی ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”پابندی تو کسی کی رسم پر بھی ہے لیکن چند روز پہلے ہم

نے اپنے گاؤں میں وہ رسم ادا کی۔“ پنڈت سوہراج نے اس لہجے میں جواب دیا جیسے ایک زندہ عورت کو چتا میں ہلا کر انہوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ ”الور کی پہاڑیوں میں ہر سال میلہ لگتا ہے اور کالی کے چٹوں پر تین انسانوں کی مجسمت دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور اس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی۔“

”کیا تم بھی کبھی وہاں گئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک مرتبہ گیا تھا۔“ پنڈت نے اثبات میں سر ہلایا ”پھر مجھے مندر میں کالی کی موتی کے قریب جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بہت رش ہوتا ہے وہاں۔“

”کیا سرکار کو معلوم نہیں کہ؟“

”سرکار سب جانتی ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”لیکن وہاں کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں کے عام میلوں ٹھیلوں میں پولیس بھی ہوتی ہے تاکہ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن پہاڑیوں میں کالی کے اس میلے میں کوئی پولیس والا نہیں ہوتا۔ پولیس ادھر کا رخ ہی نہیں کرتی۔“

”تو تم یہ کتنا چاہتے ہو کہ بلونت سنگھ اپنے گرو یعنی بدیشی سادھو کے ساتھ وہیں گیا ہے؟“ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ وہ لوگ وہیں گئے ہیں۔“ پنڈت نے جواب دیا ”میلہ اگرچہ پندرہ دن بعد شروع ہونے والا ہے۔ اس سے ایک ہفتہ پہلے لوگ اس طرف جانا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی اس سے بھی پہلے وہاں جانا چاہے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

بارش تیز ہو گئی تھی۔ کچا راستہ پہلے ہی خراب تھا۔ بارش کی وجہ سے اور گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اندیشہ اس بات کا تھا کہ بچے دلدل میں نہ دھنس جائیں۔ ٹھاکر بہت محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا اور بالآخر ہم بچے کے علاقے سے نکل کر سارے شہر کے نواح میں پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکر نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور شرکی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہم اپنے ہٹ کی طرف نکل آئے۔

”بلا“ روپ متی اور جاکی پر آدھے میں بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ ایک پنڈت کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر تینوں چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

وہ تینوں ہمارے ساتھ ہی اندر آ گئی تھیں۔ پنڈت سوہراج پلکیں چپک چپک کر ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور روپ متی کو



جائے بنانے کو کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔  
 ”تم لوگ مجھے یہاں لے آئے ہو؟“ پنڈت سوہراج نے میری طرف دیکھا۔  
 ”راجا اندر کے اکھاڑے میں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”یہ دیکھو۔ کتنی حسین دیوایاں ہیں یہاں۔ آرام سے بیٹھے آنکھیں سیلکے رہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں چائے بن جائے گی تو ٹیکے کی سکاٹی بھی ہو جائے گی۔“ پنڈت کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔  
 ”یہ کون ہے؟“ جاگتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پنڈت سوہراج۔ بہت پہلے ہوئے مہاراش (عظیم انسان) ہیں“ میں نے جواب دیا ”یہ آدمی کالہ اوڑھنے سے پہلے بڑے رنگیلے آدمی ہوا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر رات کسی نہ کسی لڑکی کو لے اڑتے تھے۔ آخری لڑکی ان کی زیادتوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے جاں سے گزر گئی اور یہ چوڑ گڑھ سے ایسے بھاگے کہ آج تک پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان مہاشے کے لیے آخری لڑکی تھی۔ چوڑ گڑھ سے بھاگنے کے بعد انہوں نے جو راست اختیار کیا ہے وہاں لڑکیوں کی تو کمی نہیں۔ انہوں نے داسیوں سے خوب خوب سیوا کروائی ہوگی۔ ان مہاشے (صاحب) کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ کہ یہ دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں جانتے ہیں۔“

”کیا؟“ جاگتی اچھل پڑی۔ بچن میں کھڑی ہوئی روپ متی نے بھی یہ بات سن لی تھی اور وہ بھی کھڑی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ میں نے کہا ”یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ دارا اور بلونت سنگھ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے اور ان کا ایک اور کارنامہ یہ بھی ہے کہ چند روز پہلے دھول پور میں اس عورت کو سستی کرنے میں انہوں نے سب سے اہم رول ادا کیا تھا۔“

”کیا؟“ جاگتی ایک بار پھر اچھل پڑی۔  
 ”ہاں۔“ یہ لیکر فقیر ہیں۔ انہیں دھرم میں تبدیلیاں پسند نہیں۔“ میں نے کہا ”نئی کے پرچار سے متاثر ہو کر دھول پور کے سیدھے سادے اور معصوم ریمائی اس عورت کو چتا میں زندہ جلائے پر تیار ہو گئے تھے۔“

بلا اور جاگتی متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں میری باتوں پر کوئی پشیم نہیں تھا۔ ہندوستان میں ایسے کڑ، جنونی اور اتنا پسند ہندوؤں کی کی نہیں تھی۔

پنڈت اور پجاری دھرم کو اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے طرح استعمال کرتے تھے اس سے سب ہی لوگ واقف نہ تھے۔ پنڈت سوہراج کی خاموشی میری طرف تھی۔

روپ متی نے چائے کے کپ میز پر رکھ دیے۔  
 ”چائے پیو پنڈت جی۔“ میں نے ایک کپ اٹھا کر کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے پرچ پکڑی تو اس میں رکھا ہوا کپ قہقہہ لگا۔ پنڈت سوہراج کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔  
 ”گھبراؤ نہیں پنڈت جی۔ یہاں ہم تمہیں کچھ نہیں بگے۔ بلا پنڈت جی کو پانی پلاؤ۔“ میں نے کہا۔

بلا دوڑ کر پانی لے آئی۔ گلاس بھی پنڈت جی کے ہاتھوں میں قہقہہ رہا رہا تھا۔ پانی پینے کے بعد اس نے کہہ تک اپنے آپ پر قابو پایا۔ وہ یقیناً پچھتا رہا ہو گا کہ اپنی ماضی کے بارے میں ہمیں کیوں بتایا لیکن اس وقت اس کا سوال میں کر رہا تھا اور میں نے اس کے ماضی کی ایک بات اس کے حلق سے اگولی تھی۔

چائے پینے کے دوران میں ہی ٹھاکر بھی اٹھیا۔ بلا اور بھی ہمارے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی پنڈت سے بات کرنے لگیں۔ پنڈت سوہراج کو کچھ حوصلہ ملا اور اس نے اپنے حواس پر قابو پایا۔

”میرے ماتھے پر کچھ لگا دو مہاراج۔ بہت کٹ (تکلیف) رہا ہے۔“ اس نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی دیر رک جاؤ۔ تمہارے سارے کٹ“ ہو جائیں گے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

ٹھاکر کی بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں پنڈت کی طرف دیکھا لیکن اس نے شاید اس بات پر غور نہ کیا۔

”ہم باقیں کر رہے تھے کہ باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور صرف ایک منٹ بعد انسپکٹر پانڈے اور کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ انہیں دیکھ کر پنڈت سوہراج چیخ اٹھا۔ اس نے صوفے سے اٹھ کر چھٹی طرف چلا گیا۔ لگانے کی کوشش کی مگر ٹھاکر نے اس کی ٹانگ پر اور وہ صوفے سمیت پیچھے الٹ گیا اور پھر پولیس والوں اسے ہلنے کا موقع نہیں دیا۔“

”بڑا اناٹا ہے (ظلم) کیا آپ نے مہاراج۔“ پنڈت سوہراج ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اور تم نے زندگی میں اب تک جو کچھ کیا ہے وہ نیا ہے“ ٹھاکر نے جواب دیا اور انسپکٹر کی طرف (انصاف) سے لے جائے انسپکٹر پانڈے۔ اس سے آپ اور بھی بہت کچھ پوچھ سکتے ہیں اور یہ آپ کو بہت کچھ بتائے گا۔“

انسپکٹر نے شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ پنڈت سوہراج کو لے کر چلے گئے۔ میں ابھی ہوئی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔“ وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا ”باہر جا کر میں نے گیس ہاؤس کے لٹی فون سے انسپکٹر پانڈے کو اطلاع دے دی۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا ”میں بھی جہان ٹھاکر پولیس اچانک یہاں کیسے پہنچ گئی۔“

ہم دیر تک پنڈت سوہراج کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔  
 ”کیا تمہارے خیال میں پنڈت نے دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہو گا۔ اپنے آپ کو بھانے کے لیے اس نے ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”وہ جس صورت حال سے دوچار تھا اس کے تحت وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور پھر دارا اور بلونت کو کسی ایسی ہی جگہ پر پناہ دل سکتی ہے جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور واقعی ہم نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان پھاڑیوں میں کالی کا کوئی مندر ہے جہاں انسانی جانوں کی بیعت دی جاتی ہے۔“

”انسانی جانوں کی بیعت!“ روپ متی اچھل پڑی۔  
 ”ہاں۔“ پنڈت سوہراج نے بتایا تھا کہ اور کے قریب پھاڑیوں میں کالی کا کوئی مندر ہے جہاں ہر سال میلہ لگتا ہے اور ایک ہفتے کے دوران میں کم از کم تین انسانوں کو کالی کے چروں پر قربان کیا جاتا ہے اور پنڈت کے کہنے کے مطابق دارا اور بلونت سنگھ اسی طرف گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔“

”تو پھر ہمیں کل صبح ہی ان کے تعاقب میں روانہ ہو جانا چاہیے۔“ جاگتی بولی۔

”ابھی نہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”ابھی وہ جگہ دیران ہے۔ انہیں ہماری آمد کا پتا چل جائے گا۔ دو چار دن بعد جب یا تریوں کی آمد شروع ہوگی تو ہم بھی پہنچ جائیں گے۔“

بارش رک گئی تھی۔ ہم ہٹ سے نکل کر لان میں آگئے۔ دھلے اور کھڑے ہوئے پودے بڑے ہلکے لگ رہے تھے۔ بارش سے موسم بھی خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔

شام سات بجے کے قریب ٹھاکر اور روپ متی کھانا لینے کے لیے شہر کی طرف چلے گئے۔ اگرچہ بچن میں پورا راشن اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اور تین عورتیں بھی تھیں لیکن یہ تینوں صرف چائے اور کالی بنانے کی حد تک ہی رہی تھیں۔ ہٹ کا لازم ابھی تک اسپتال میں پڑا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو ہمیں کھانے کی بھی پریشانی نہ ہوتی۔

جاگتی، بلا اور میں لان ہی میں بیٹھے رہے۔ ساڑھے آٹھ بج گئے۔

روپ متی اور ٹھاکر ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ شکر اور بھگت وغیرہ کو دیکھنے اسپتال چلے گئے ہوں گے۔

نوبے کے قریب پولیس کی ایک جپ ہٹ کے سامنے آکر رکی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ جپ میں صرف ڈرائیور تھا۔ وہ اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف آگیا۔

”ٹھاکر جی کی موٹر کا۔۔۔ ایکسپرنٹ ہو گیا ہے۔ انسپکٹر پانڈے نے آپ کو اسپتال بلایا ہے۔“ ڈرائیور نے قریب پہنچ کر کہا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جاگتی اور بلا بھی اچھل پڑی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے ایک دم دھواں ہو گئے تھے۔

”اوہ!“ میں بولا ”کیسے ہیں وہ دونوں؟“  
 ”آپ اسپتال چل کر دیکھ لیجئے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے دوسے آئے گئے۔ اگر کوئی معمولی حادثہ ہوتا تو پولیس کے ڈرائیور کو بھیج کر ہمیں نہ بلوایا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ حادثے کی نوعیت کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔

جاگتی نے ہٹ کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور ہم دوڑ کر جپ پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیور ہم سے پہلے ہی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

اسپتال کے راستے میں سڑک کا ایک موڑ گھومتے ہوئے مجھے ٹھاکر کی پجاری نظر آئی۔ وہ بالکل پکلی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے حادثے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔

اسپتال میں ٹھاکر ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر اور

بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ہوش میں ہی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ گیا۔ قریب کھڑی ہوئی نرس نے اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کی مگر ٹھاکر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ٹھاکر کو دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ اس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔

”یہ سب کیسے ہوا ٹھاکر۔ روپ متی کہاں ہے۔ کیسی ہے وہ؟“ میں نے تلخی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔  
 ”وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کا بہت خون ضائع ہو چکا ہے۔ اگر اسے خون نہ ملا تو وہ مر جائے گی۔“ ٹھاکر نے کہا۔

میں آپریشن تھیٹر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر تھیٹر کے سامنے والی راہداری میں مل گیا۔ اس نے بتایا کہ روپ متی کو خون کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کوئی بڑا اسپتال نہیں ہے۔ یہاں بلڈ بینک نہیں ہے اور نہ ہی شہر میں کوئی بلڈ بینک ہے جہاں سے خون حاصل کیا جاسکے۔

”میرا خون لے لو ڈاکٹر۔“ میں نے بازو آگے کر دیا۔  
 ”میرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ چھوڑ لو اور روپ متی کی زندگی بچاؤ۔“

”پلے گروپ ٹیسٹ کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر بولا ”میرے ساتھ آئیے۔“

بلا جاگے اور ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گئے اور ہمارے ساتھ وہ بھی لیبارٹری میں آگئے۔ پلے جاگے اور بلا نے اپنا بلڈ گروپ ٹیسٹ کروایا۔ ان کے گروپ مختلف تھے اور خوش قسمتی سے میرا بلڈ گروپ روپ متی کے خون سے مل گیا۔

مجھے بیڈ پر لٹا دیا گیا اور تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد نیڈل میری نرس میں لگائی گئی تو اچانک ہی میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ میں نے بازو میں لگی ہوئی سوئی کھینچ دی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔ میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دوں گا۔“

”کیا؟“ ٹھاکر میری طرف دیکھ کر چیخا۔ اسے شاید میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

”میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا ٹھاکر۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے کوئی اور بندوبست کرو۔“ میں نے کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ٹھاکر بولا ”تم روپ متی کو خون دینے سے انکار کر رہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس کی زندگی بچا سکتے ہو۔“

”نہیں ٹھاکر۔ میں اپنا خون نہیں دے سکتا۔“ میں نے

جواب دیا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم ایسے موقع پر روپ متی کی مدد کرنے سے انکار کر دو گے۔“ ٹھاکر نے میرے چہرے پر نظر سبھاتے ہوئے کہا ”وہ روپ متی ہے۔ اس نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کیا کیا مصیبتیں نہیں بھگیں اس نے تمہارے لیے اور اب جبکہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے تو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔ میں تمہیں اپنا احسان فراموش نہیں سمجھتا تھا۔“ ٹھاکر جذبات میں آ رہا تھا۔

”اگر روپ متی کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ روپ متی کو بچاؤ و جان۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ بچاؤ اسے۔“ وہ میرے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

”میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا ٹھاکر۔ میں نے جواب دیا اور یہ بات کہتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے رکھا ہو۔ ”بلا۔ بتاؤ ٹھاکر کہ بتاؤ کہ میں روپ متی کو اپنا خون کیوں نہیں دے سکتا۔“

بلا بھی چونک گئی اور پھر شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ ٹھاکر کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئی۔

چند منٹ بعد ٹھاکر واپس مڑا تو میری آنکھوں سے ہنسنے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھ سے پلٹ گیا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی چکی ضبط کر سکا تھا۔

”میں احسان فراموش اور نمک حرام نہیں ہوں ٹھاکر۔“ میں نے بھی اسے اپنی باتوں میں لپیٹ لیا ”تم لوگوں کے احسانات تو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ تم لوگوں کے لیے تو میں اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں لیکن میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا۔ میرے خون کا پتلا

قطرہ اس کے خون میں شامل ہوتے ہی وہ ختم ہو جائے گی۔ میں کتنا بد قسمت ہوں کہ زندگی کے ان نازک ترین لمحات میں اپنی محنت کے کام نہیں آسکے۔“

”میں سمجھ گیا ہوں۔“ ٹھاکر نے میری پیشانی پر ہاتھ دیتے ہوئے کہا ”بلا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا اور کچھ سخت شبد (الفاظ) کہہ دیے تھے مجھے معاف کر دینا میرے دوست۔“

”معافی تلانی بعد میں ہوتی رہے گی۔“ میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا ”پلے ہمیں روپ متی کی زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ دقت نہیں ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔“ ٹھاکر بولا ”یہاں کوئی

بلڈ بینک نہیں ہے۔ جے پور کے کسی بلڈ بینک سے خون منگوایا جائے تو اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے اور اس وقت تک روپ متی۔“

”نہیں۔ ہم روپ متی کو مرنے نہیں دیں گے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”یہ اتنا بڑا شہر ہے، ہزاروں لوگ آباد ہیں یہاں۔ کسی ایک آدمی کے خون کا گروپ تو مل جائے گا۔ تم نہیں روکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

میں تقریباً دوڑتا ہوا اسپتال کے برآمدے میں گیا۔ برآمدے کے سامنے وسیع و عریض کیمپاؤنڈ تھا جس میں چند ماہ دار درخت بھی تھے جن کے نیچے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے ٹھکانے کی بیچیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان بیچوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں اور اس کے آس پاس بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ چھ سات آدمی ایک جگہ پر

جھڑکی صورت میں کھڑے تھے اور اس جھڑکی میں انسپکٹر باؤ نے بھی نظر آیا۔ وہ اس حادثے کے دو چشم دید گواہوں کے بیان نوٹ کر رہا تھا۔

”بھائیو! ذرا میری بات غور سے سنو۔“ میں نے بیچڑوں کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے کہا۔ لوگ فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ انسپکٹر باؤ نے بھی مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا ”ایک انسان موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے حادثے میں زخمی ہوئے والی دیوی کو خون کی ضرورت ہے۔ آپ میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کا بلڈ گروپ اس سے مل جائے گا۔ ہم خون کی ایک بوتل کے لیے

خدا کا شکر دینے کو تیار ہیں۔ قیامت نہیں تو انسانی ہمدردی کے نام پر خون کی صرف ایک بوتل، ایک سچ اور کھرے انسان کی زندگی بچا سکتی ہے۔“

انسپکٹر باؤ نے میرے قریب آگیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”یہ وہ عظیم انسان ہے جس نے اس شہر کو اور دور دراز کے قصبوں اور دہاتوں میں رہنے والے لوگوں کو گنگولی چوہدری جیسے عنایت سے نجات دلائی ہے۔ یہی ہے وہ مہمان (مہتمم) آدمی جو گنگولی جیسے راکھشس کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا جنگل میں گھس گیا تھا۔ اس نے گنگولی چوہدری اور اس کے گروہ کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔

میں اس کا چشم دید گواہ ہوں اور آج۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اور آج اپنی دوست کی جان بچانے کے لیے اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس مہمان آدمی پر ثابت کر دو کہ ہم بھی احسان فراموش

نہیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو پلے ہی پیش کر چکا ہوں لیکن بد قسمتی سے میرا بلڈ گروپ اس دیوی کے خون سے نہیں ملتا۔ تم لوگوں میں کون ہے جو اس دیوی کی جان بچانے کے لیے اپنا

خون دان (خون) کرے۔“ تقریباً ایک دو تین آدمی ہمارے سامنے آگئے تھے۔ وہ کسی قیمت کے بغیر خون دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے صرف ہاتھ کر سٹگھک نامی کسی سورما نے گنگولی چوہدری کو ٹھکانے لگایا تھا اور اب وہ سورما ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اسپتال کے کیمپاؤنڈ میں موجود ہر شخص روپ متی کی زندگی بچانے کے لیے خون دینے کو تیار تھا۔

”یہ تو چٹکار ہو گیا بہت سگھ۔“ ٹھاکر مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گیا ”میں نے بہت سے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے مگر کوئی خون کا ایک قطرہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔“

”یہ انسپکٹر باؤ نے کا حکم کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”اگر وہ میرے نام کے ساتھ گنگولی چوہدری کا حوالہ نہ دیتا تو شاید کوئی بھی آگے نہ آتا۔ اب تم اپنے بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرو اور میں اپنے خدا سے دعا کروں گا کہ روپ متی بچ جائے۔“

”میں بھی خدا ہی سے دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے خدا ہمیں باؤس نہیں کرے گا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

ایک گھنٹے بعد روپ متی کو خون کی پہلی بوتل لگ چکی تھی۔ چھ آدمیوں کا بلڈ گروپ مل گیا تھا۔ جن میں سے چار کو روک لیا گیا اور باقی سب کو رخصت کر دیا گیا۔ جن دوسرے دو آدمیوں کو رخصت کیا گیا تھا انہوں نے اپنے گھروں کے پتے دے دیے تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں کئی بھی وقت بلایا جاسکے۔

ہمیں آپریشن تھیٹر میں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک ڈاکٹر کو شاید ٹھاکر کا خیال آگیا اور وہ اسے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور نرس کو سختی سے ہدایت کی کہ اسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ نرس نے ٹھاکر کو بیڈ پر لٹا دیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بھئی۔ میری چتا (نکڑ) مت کرو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”آپ نے بہت جگہ مار کر لیا ٹھاکر جی۔ اب آپ کو آرام

نہیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو پلے ہی پیش کر چکا ہوں لیکن بد قسمتی سے میرا بلڈ گروپ اس دیوی کے خون سے نہیں ملتا۔ تم لوگوں میں کون ہے جو اس دیوی کی جان بچانے کے لیے اپنا

خون دان (خون) کرے۔“ تقریباً ایک دو تین آدمی ہمارے سامنے آگئے تھے۔ وہ کسی قیمت کے بغیر خون دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے صرف ہاتھ کر سٹگھک نامی کسی سورما نے گنگولی چوہدری کو ٹھکانے لگایا تھا اور اب وہ سورما ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ آگے بڑھ کر

مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ میرے ہاتھوں اور میری پیشانی پر بوتے دے رہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اسپتال کے کیمپاؤنڈ میں موجود ہر شخص روپ متی کی زندگی بچانے کے لیے خون دینے کو تیار تھا۔

”یہ تو چٹکار ہو گیا بہت سگھ۔“ ٹھاکر مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گیا ”میں نے بہت سے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے مگر کوئی خون کا ایک قطرہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔“

”یہ انسپکٹر باؤ نے کا حکم کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”اگر وہ میرے نام کے ساتھ گنگولی چوہدری کا حوالہ نہ دیتا تو شاید کوئی بھی آگے نہ آتا۔ اب تم اپنے بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرو اور میں اپنے خدا سے دعا کروں گا کہ روپ متی بچ جائے۔“

”میں بھی خدا ہی سے دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے خدا ہمیں باؤس نہیں کرے گا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

ایک گھنٹے بعد روپ متی کو خون کی پہلی بوتل لگ چکی تھی۔ چھ آدمیوں کا بلڈ گروپ مل گیا تھا۔ جن میں سے چار کو روک لیا گیا اور باقی سب کو رخصت کر دیا گیا۔ جن دوسرے دو آدمیوں کو رخصت کیا گیا تھا انہوں نے اپنے گھروں کے پتے دے دیے تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں کئی بھی وقت بلایا جاسکے۔

ہمیں آپریشن تھیٹر میں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک ڈاکٹر کو شاید ٹھاکر کا خیال آگیا اور وہ اسے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور نرس کو سختی سے ہدایت کی کہ اسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ نرس نے ٹھاکر کو بیڈ پر

لٹا دیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بھئی۔ میری چتا (نکڑ) مت کرو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”آپ نے بہت جگہ مار کر لیا ٹھاکر جی۔ اب آپ کو آرام

نہیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو پلے ہی پیش کر چکا ہوں لیکن بد قسمتی سے میرا بلڈ گروپ اس دیوی کے خون سے نہیں ملتا۔ تم لوگوں میں کون ہے جو اس دیوی کی جان بچانے کے لیے اپنا

خون دان (خون) کرے۔“ تقریباً ایک دو تین آدمی ہمارے سامنے آگئے تھے۔ وہ کسی قیمت کے بغیر خون دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے صرف ہاتھ کر سٹگھک نامی کسی سورما نے گنگولی چوہدری کو ٹھکانے لگایا تھا اور اب وہ سورما ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ آگے بڑھ کر

مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اسپتال کے کیمپاؤنڈ میں موجود ہر شخص روپ متی کی زندگی بچانے کے لیے خون دینے کو تیار تھا۔

”یہ تو چٹکار ہو گیا بہت سگھ۔“ ٹھاکر مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گیا ”میں نے بہت سے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے مگر کوئی خون کا ایک قطرہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔“

”یہ انسپکٹر باؤ نے کا حکم کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”اگر وہ میرے نام کے ساتھ گنگولی چوہدری کا حوالہ نہ دیتا تو شاید کوئی بھی آگے نہ آتا۔ اب تم اپنے بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرو اور میں اپنے خدا سے دعا کروں گا کہ روپ متی بچ جائے۔“

”میں بھی خدا ہی سے دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے خدا ہمیں باؤس نہیں کرے گا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

ایک گھنٹے بعد روپ متی کو خون کی پہلی بوتل لگ چکی تھی۔ چھ آدمیوں کا بلڈ گروپ مل گیا تھا۔ جن میں سے چار کو روک لیا گیا اور باقی سب کو رخصت کر دیا گیا۔ جن دوسرے دو آدمیوں کو رخصت کیا گیا تھا انہوں نے اپنے گھروں کے پتے دے دیے تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں کئی بھی وقت بلایا جاسکے۔

ہمیں آپریشن تھیٹر میں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک ڈاکٹر کو شاید ٹھاکر کا خیال آگیا اور وہ اسے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور نرس کو سختی سے ہدایت کی کہ اسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ نرس نے ٹھاکر کو بیڈ پر

لٹا دیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بھئی۔ میری چتا (نکڑ) مت کرو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”آپ نے بہت جگہ مار کر لیا ٹھاکر جی۔ اب آپ کو آرام

بلک کو رانے مجھے ڈس لیا تھا اور وہ بے چارہ خودی پٹا ہر  
سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔“

• ”اوہ! جاگتی چوک سی گئی۔“

”اگر میں خود اپنی زبان سے کہتا کہ میرے خون میں زہر  
ملا ہوا ہے تو ٹھاکر میری بات پر یقین نہ کرتا اس لیے میں نے  
بلا سے کہا تھا کہ وہ ٹھاکر کو بتا دے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو بڑی سنگین صورت حال ہے۔“ جاگتی بولی۔  
کبھی مجھے تمہارے خون کی ضرورت پڑ گئی تو۔“

”تمہیں ایسی کوئی امید نہیں رہ گئی چاہیے۔“ میں نے  
اس کی بات کاٹ دی۔ ”چلو۔ اب اندر چلیں۔ میں نے ٹھاکر  
سے تو بچھو پوچھا ہی نہیں۔“

ہم کمرے میں آگئے۔ کمرے میں ایک اسٹول اور دو  
کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر بلا بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ  
کر وہ کرسی سے اٹھ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”ہاں میرے دوست۔ اب بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“  
میں نے ٹھاکر کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس  
طرف آتے ہوئے میں نے تمہاری گاڑی دیکھی تھی۔ اس کا  
اکلا حصہ تو بالکل چپکا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس قدر  
خونناک حادثے کے بعد۔“

”ہم زندہ کیسے بچ گئے۔“ ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے  
میری بات پوری کر دی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد  
”پارش کی وجہ سے بڑکیں بھیجی ہوئی تھیں مگر میری گاڑی کا  
رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ ایک موٹر میں نے جیسے ہی گاڑی  
گھمائی، مخالف سمت سے ایک تیز رفتار ٹرک کو آتے دیکھ کر

میں نے پورے زور سے بریک لگا دیے۔ میری طرف  
دروازہ شاید لاک نہیں تھا۔ جھٹکا گئے سے دروازہ کھل گیا  
اور میں نیچے گر کر سڑک پر چھٹکا چلا گیا۔ پیچھے سے آئے والے  
ایک کار مجھ سے ٹکرا کر رگ گئی اور وہ ٹرک زوردار ٹکرتے

پیارو کو گھٹینا ہوا اور ٹرک لے گیا اور پھر اس کے بعد مجھے  
ہوش نہیں رہا۔ سر پر لگنے والی چوٹ نے مجھے بے ہوش کر  
تھا۔ یہاں اسپتال میں ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرے ساتھ  
پیارو میں سوار عورت کی حالت بہت نازک ہے۔ خون بہت

زیادہ ضائع ہو جانے سے اس کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔  
”اس دوران میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ انسپکٹر پانڈے  
مجھے دیکھ کر بدحواس سا ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک اڈیٹر  
تمہیں اطلاع دینے کے لیے دوڑا دیا۔ مجھے روپ متی کی خبر

تھی۔ اس کے لیے خون کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے  
پانڈے خون دینے کو تیار تھا مگر اس کا بلڈ گروپ نہیں ملا۔“

”تم نے روپ متی کو اپنا خون دینے سے انکار کیوں کیا  
تھا؟“ وہ رابدراری میں ایک جگہ رک کر بولی ”تم تو خون دینے  
کے لیے لپٹ گئے تھے پھر اچانک کیوں بھاگ کھڑے ہوئے؟“

”بات یہ ہے جاگتی۔“ میں نے اور ہر اوروں کو دیکھتے ہوئے کہا  
”تمہیں یاد ہے شاؤن پمپل میں ٹینک کے دوران میں جب  
ہم صبح سویرے ماسٹرینگ پانی کے ساتھ مہاڑی پر یوگا کی مشق  
کیا کرتے تھے اور ایک روز ماسٹرینگ پانی نے اپنے آپ کو  
سانپ سے ڈسوا لیا تھا اور۔“

کی ضرورت ہے۔“ نرس نے مسکراتے ہوئے کہا ”دیوی جی  
کی چننا آپ بالکل نہ کریں۔ بلڈ کا بندوبست ہو گیا ہے۔ آدھا  
خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گی اور آپ لوگ۔“

اس نے باری باری ہماری طرف دیکھا ”آپ لوگ انہیں بیڈ  
سے نہ اتارنے دیں۔“

نرس باہر آئی تو جاگتی مجھے بھی ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے  
آئی۔

”تم نے روپ متی کو اپنا خون دینے سے انکار کیوں کیا  
تھا؟“ وہ رابدراری میں ایک جگہ رک کر بولی ”تم تو خون دینے  
کے لیے لپٹ گئے تھے پھر اچانک کیوں بھاگ کھڑے ہوئے؟“

”بات یہ ہے جاگتی۔“ میں نے اور ہر اوروں کو دیکھتے ہوئے کہا  
”تمہیں یاد ہے شاؤن پمپل میں ٹینک کے دوران میں جب  
ہم صبح سویرے ماسٹرینگ پانی کے ساتھ مہاڑی پر یوگا کی مشق  
کیا کرتے تھے اور ایک روز ماسٹرینگ پانی نے اپنے آپ کو  
سانپ سے ڈسوا لیا تھا اور۔“

”اور وہ سانپ مر گیا تھا۔“ جاگتی نے میرا جملہ مکمل  
کر دیا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا ”بعض خاص جڑی بوٹیوں کے  
استعمال سے ماسٹرینگ پانی کے خون میں اتنا زہر بھر گیا تھا کہ  
نہایت زہریلا سانپ بھی اسے ڈسنے ہی مر گیا تھا۔“

”مگر تم۔“ کیا تم بھی۔“ جاگتی کی آنکھیں وحشت سے  
پھیلنے لگی تھیں۔

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”تمہیں یاد ہو گا کہ  
کچھ عرصے تک کھانے میں صبح کوئی ایسی چیز بھی دی جاتی تھی  
جس کے لیے تمہیں منع کر دیا جاتا تھا۔ اس خوراک میں مجھے  
وہ جڑی بوٹیاں استعمال کرائی گئی تھیں جن سے میرے خون  
میں زہر شامل ہو گیا۔“

”تم نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور غالباً  
بلا کو بتا رکھا تھا اور اس نے ٹھاکر کو الگ لے جا کر بتایا  
ہو گا۔“ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

”ہمیں شاؤن ٹیبل سے آئے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے لیکن  
مجھ سے اس سلسلے میں کبھی بات نہیں کی اور بلا سے چار دن  
کی ددستی میں تم نے اسے اپنے پارے میں سب کچھ بتا دیا۔  
آخر اس چھوٹری میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ تم  
نے اس کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی۔“

”تم پھر پزیر سی سے اتر رہی ہو۔“ میں نے مسکراتے  
ہوئے کہا ”مجھ پر بھی یہ انکشاف صرف تین دن پہلے ہوا تھا  
جب انسپکٹر پانڈے اور بلا کی موجودگی میں جنگل میں ایک

تین اور آدمی بھی تیار ہو گئے تھے مگر ہر ایک کا بلڈ گروپ مختلف تھا۔ میں اسپتال میں موجود دوسرے لوگوں کی منتیں کرتا رہا مگر کوئی بھی تیار نہیں ہوا اور پھر تم لوگ آگے۔ تمہارا بلڈ گروپ مل گیا تھا مگر جب تمہیں بیڈ پر لٹایا گیا تو تین وقت پر تم نے انکار کر دیا۔

”مجھے افسوس ہے ٹھاکر۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”میں اپنی روپ متی کے کسی کام نہ آسکا۔ اس کے لیے جان لٹا دینے کا دعویٰ کرنے والا اس کی زندگی بچانے کے لیے خون کا ایک قطرہ نہیں دے سکا۔“

”ایسا نہ کووید ان۔“ ٹھاکر نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”صرف اور صرف تمہاری وچ سے روپ متی کی زندگی بچنے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ تم واقعی مہمان ہو وچ ان۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے غصے میں تمہیں جو کچھ کہا اس پر مجھے بیشہ شرمندگی رہے گی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”غصے اور جذبات میں اگر تم نے ایک اور دلچسپ انکشاف کیا تھا جس پر میں بے حد خوش ہوں۔“

”کیا انکشاف؟“ وہ ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”روپ متی کے بارے میں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم اس کے لیے جس طرح پاگل ہو رہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم روپ متی کو کتنا چاہتے ہو۔“ ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے کن انکیوں سے ہمارا اور جانکی کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس کے جذبات آنسو بن کر اٹھ پڑے۔

”ٹھاکر! نہیں میرے دوست۔“ میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگا۔ ”روپ متی ٹھیک ہو جائے گی۔ تم نے نرس کی بات نہیں سنی تھی۔ خون کا بندوبست ہو جانے سے آدھا خطرہ مل گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“

جانکی اور ہیلہ بھی اسے تسلیاں دیتے لگیں۔ ٹھوڑی دیر بعد میں کمرے سے نکل کر آپریشن جمیٹری طرف آ گیا۔ اس وقت اگرچہ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن آپریشن جمیٹر کے سامنے والی راہداری اور برآمدے میں اب بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔

روپ متی کو خون کی دوسری بوتل لگائی جا چکی تھی۔ اس طرح خون دینے والے دو آدمی رخصت ہو گئے تھے۔ اس اسپتال میں چند ٹکٹوں کے لیے بھی خون محفوظ رکھنے کا کوئی

اختتام نہیں تھا۔ اس لیے باقی دو آدمی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی آپریشن جمیٹر کے سامنے لگا۔

ٹھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر آپریشن جمیٹر سے باہر آئے۔ اسے روک کر روپ متی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ ”وہ ابھی بے ہوش ہے اور اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے بہت اہم ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”خطرے کی کوئی بات؟“ میں نے سوالیہ لٹا ہوا اس کی طرف دیکھا۔

”نی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بہر حال ہمیں آئندہ رکھنی چاہیے۔“ ڈاکٹر میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

میں اس کمرے میں آ گیا جہاں ہلکت وغیرہ پڑے۔ تھے۔ انہیں بھی اس حادثے کا پتا چل گیا تھا اور وہ تیز جاگ رہے تھے۔ ان کے چروں پر افسردگی تھی۔ میں سمجھا کہ ان کے پاس بیٹھا اور پھر ٹھاکر کو لے کرے میں آ گیا۔

”کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہماری فیملی کے افراد اس اسپتال کے پانچ بستروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔

ٹھاکر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ ہم باہر باتیں کر رہے تھے کہ انسپکٹر پانڈے آ گیا۔ وہ ٹھاکر کا بیان دے چاہتا تھا اور ٹھاکر اس قابل تھا کہ اپنا بیان دے سکتا تھا۔ انسپکٹر پانڈے نے یہ بھی بتایا کہ اس حادثے کے بعد ٹرک دہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ سارسکا کے دونوں طرف شاہراہ پر واقع شہروں کی پولیس کو فون پر اطلاع دی جا چکی ہے۔ وہ ٹرک پکڑ کر نہیں جاسکے گا۔ اسے ہمیں نہ کیوں پکڑا جائے گا۔

انسپکٹر پانڈے کافی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں وہ بار بار میری طرف دیکھتا رہا اور میری بہت جرات کی داد دیتا رہا۔ اس نے ٹھاکر کو، جنگل میں مجھے سانپ کے ڈسنے کا واقعہ بھی بتایا۔

”میں تو حیران رہ گیا تھا۔“ وہ کہہ رہا تھا ”مگر آپچہ زہریلا سانپ ان شرمین جی کو ڈسنے کے بعد خودی مارتھا۔“

”ہاں۔“ ٹھاکر بولا ”بعض لوگوں کا خون قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ زہریلے کینزے کو ڈسے اور سانپ کا زہر ان پر اثر نہیں کرتا اور پھر اپنا خون کسی کو دے بھی نہیں سکتے۔“

”ہاں۔ یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔“ انسپکٹر پانڈے

بولا۔ انسپکٹر پانڈے کے جانے کے بعد ٹھاکر نے اس سلسلے میں مجھ سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور مجھے مجبوراً اسے سب کچھ بتانا پڑا کہ میرا خون اس قدر زہریلا کیوں ہوا تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں ہر ٹھوڑی دیر بعد آپریشن جمیٹر کی طرف کا ایک چکر لگا آتا۔ ڈاکٹر روپ متی کو آپریشن میں رکھے ہوئے تھے لیکن فی الحال وہ کوئی بات فیملی طور پر نہیں کہہ سکتے تھے۔

روپ متی کو خون کی تیسری بوتل لگی ہوئی تھی۔ خون بڑی تیزی سے اس کے جسم میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ چوتھا آدمی اس وقت بھی راہداری میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا رہا۔ میں واقعی ان لوگوں کا احسان مند تھا۔ انہیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ میں نے ٹنگوئی چوہدری اور اس کے کردہ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ میری خاطر روپ متی کو خون دینے کو تیار ہو گئے تھے اور چوتھا آدمی اس وقت بھی اسپتال میں بیٹھا ہوا تھا کہ نجانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ میں نے اس سے کھانے چائے کا دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ اسپتال کے ایک ملازم سے کھانا منگوا کر کھا چکا ہے۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ لادے گا۔

ہم نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ روپ متی اور ٹھاکر بازار سے کھانا لانے کے لیے ہی نکلے تھے کہ یہ خوفناک حادثہ پیش آ گیا۔ پہلے تو ہمیں کھانے پینے کا ہوش تک نہیں رہا تھا لیکن صورتحال اب کچھ اطمینان بخش ہوئی تھی تو بھوک کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

راجو ناٹی اس شخص نے بتایا کہ شرمین ایک ایسی جگہ ہے جہاں رات بھر رونق رہتی ہے اور ریسٹورنٹ وغیرہ کھلے ہوتے ہیں۔ میں نے اسے دو سو روپے نکال کر دے دیے کہ پہلے خود کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کچھ کھا پی لے اور پھر ہمارے لیے کچھ لے آئے۔ وہ خود ہی وہاں سے روانہ ہو گیا اور میں ٹھاکر کو لے کر رہے ہیں آ گیا۔

○●○

روپ متی کو خون کی چار بوتلیں لگ چکی تھیں۔ ”دوپہرا وہ بیٹے کے قریب اسے ہوش آیا تو ڈاکٹر نے یہ طور پر اسے دیکھنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے منع کر دیا کہ ہم شام سے پہلے اسے نہیں دیکھ سکتے۔“

وہ پورا دن ہم نے اسپتال میں گزارا۔ رات آٹھ بجے

کے قریب روپ متی کو بھی ٹھاکر والے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ اسپتال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پرائیویٹ روزمرہ کے اس لیے روپ متی کے لیے بھی اس کمرے میں بیڈ لگا دیا گیا تھا اور ایک کوچ اینڈنٹ کے لیے بھی ڈال دیا گیا تھا۔

روپ متی کی حالت خاصی ابتر تھی۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سینے، سرو اور دوسری ٹانگ پر بھی پٹیوں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں نے راستے میں پچا دو دیکھی تھیں۔ ٹھاکر کی خوش قسمتی تھی کہ اپنی طرف کا دروازہ کھل جانے سے وہ اچھل کر باہر گر گیا تھا اور اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ حادثہ اس قدر خوفناک تھا کہ روپ متی کا زندہ بچ جانا ہی ایک معجزہ تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کم از کم تین مہینے ضرور لگیں گے۔ ٹانگ اور بازو کے پلستر کے لیے ڈاکٹر نے چھ ہفتوں کا وقت دیا تھا۔

وہ رات بھی ہم نے جاگتے ہوئے گزار دی تھی۔ روپ متی کو بولنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ ہم آپس میں بھی سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے تاکہ وہ دھڑک نہ پڑے۔

ٹھاکر نے اگلے ہی روز ڈسچارج لے لیا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر نے ہم سب کو بھی اسپتال سے بھگا دیا۔ صرف ایک اینڈنٹ کو رہنے کی اجازت تھی اور یہ ڈسچارج کی جگہ اور ہمارے سنبھال لی تھی۔ ان میں سے ایک دن کے وقت اسپتال میں رہتی اور دوسری رات کو۔ میں اور ٹھاکر بھی دن میں ایک دو مرتبہ چکر لگاتے تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ حادثے کے تیسرے روز وہ ٹرک تو شہر سے بیس میل دور بے پور کی طرف جانے والی سڑک پر کھڑا مل گیا تھا البتہ ڈرائیور فرار ہو گیا تھا اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔

ٹھاکر اب ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو آزادی سے حرکت دے سکتا تھا۔ ہمیں دارا اور بلونت سنگھ کی بھی کچھ تھی جو الور کی پہاڑیوں میں کالی کے مندر کے آس پاس کہیں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اگلا ہفتہ شروع ہوتے ہی شہر میں ٹرک بڑھ گیا تھا۔

پہاڑیوں میں کالی کے مندر پر ہر سال جگنے والا میلہ ایک ایسا راز تھا جس سے ساری دنیا تو واقف تھی لیکن سرکار اور پولیس بے خبر تھی۔ بے پور کی طرف سے آنے والے یاتریوں کے جتنے کے جتنے الور کی پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ دوسری طرف بھرت پور اور دہلی وغیرہ سے بھی یاتری

اس طرف آ رہے تھے لیکن پولیس بالکل ”بے خبر“ تھی کہ اس طرف میلہ لگنے والا ہے اور پہاڑیوں کے غار میں واقع کالی کے چٹوں میں انسانی جانوں کی سمیٹ دی جانے والی ہے۔

میں بھی پریشان تھا اور ٹھاکر بھی۔ دارا اور بلونت سنگھ کو گھبرے کا یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن روپ متی کی وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہو گیا تھا۔

روپ متی اب بات کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اس روز شام کو اس نے کہہ دیا کہ ہم اس کی فکر نہ کریں۔ اسپتال میں اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ ہلا اور جاگتی بھی موجود ہیں لیکن جاگتی ہمارے ساتھ جانے پر بعد بھی لیکن ظاہر ہے ہم ہلا کو ہٹ میں اکیلے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اور بالآخر یہ طے ہوا کہ ہلا روپ متی کے پاس اسپتال میں رہے اور ہم تینوں اپنے مشن پر روانہ ہو جائیں۔ بھگت سنگھ بھی اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ دیکھ بھال کی کچھ ذمہ داری اس نے قبول کر لی اور یہ بندوبست ہونے پر میں بھی کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔

اگلے روز ہلا اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چند چیزیں بیک میں ڈال کر اسپتال لے آئی۔ میں ٹھاکر اور جاگتی اس روز زیادہ تر شہر کے مختلف بازاروں میں گھومتے رہے۔ اس مرتبہ ہم اندھا دھند چڑھائی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ہم تینوں نے پوری رات بیٹھ کر پلاننگ کی تھی اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم تینوں بھی سادھوؤں کے ہمیں میں جائیں گے کہ اس طرح ہم کسی شک کی زد سے بچیں گے۔

وہ رات ہم نے اپنے ہٹ میں گزار دی۔ اگلا دن بھی کچھ تیاریوں میں گزارا۔ دوپہر کو ہم نے اسپتال کا چکر لگایا اور ہٹ میں گئے تو حوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ٹھاکر نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور سب سے پہلے میرے سر کے بال قبچھی سے کاٹ دیے اور پھر دوسرے کام میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو اچھل پڑا۔ میرا سر ایسا تھا جیسے کسی کھیت میں مازہ مازہ لے چلا گیا ہو۔ قبچھی سے بال کاٹنے ہوئے ٹھاکر نے نفاست کا خیال بالکل نہیں رکھا تھا۔ کسی آوارہ گرد سادھو کا حلیہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ماتھے پر اوپر نیچے تین سفید افقی ایک انگی جوڑی لکیریں۔

درمیان والی لکیر زمین وسط میں سرخ نیلا دوٹوں کانوں میں بندے۔ ہندوں کے لیے کان چھدوانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بازار میں کلب والے بندے مل گئے تھے جنہیں کانوں کی لو سے چپکا لیا گیا تھا۔ ٹھاکر نے میرے دونوں

رخساروں پر بھی سفید سے ایک ایک دھاری بٹائی تھی۔ اس طرح میرا حلیہ بڑی حد تک بدل گیا تھا۔ مجھے مختصر انداز میں دھوئی بھی باندھنی آئی تھی۔ دھوئی کا بنایا ہوا لٹیرہ پر ڈال کر اس کے دونوں کناروں کی گردن کے چتے پر لٹکانا بھی جب کہ میری پشت پر بندھی۔ اب میں واقعی سادھو بن گیا تھا اور کوئی مجھے وجدان کی حیثیت سے آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

کمرے سے باہر آکر میں نے دونوں کلائیوں میں دو آہنی کڑے بھی پہن لیے۔ ایک ہاتھ میں چیتل کا چھوٹا ڈنڈا اور دوسرے ہاتھ میں تقریباً ایک انچ موٹا اور ڈیڑھ فٹ لمبا گول ڈنڈا پکڑ لیا۔ ڈنڈے کو میں نے اس طرح پکڑا کہ اس ایک سر اٹھتی ہوئی چھوٹا ہوا انگلیوں کی گرفت میں تھا اور ڈنڈے کا بالی حصہ بازو کے ساتھ کسی تک چلا گیا تھا۔ انگلی کی حرکت سے ڈنڈا آہستہ آہستہ بازو میں پٹنے ہوئے آہستہ آہستہ کڑوں پر پہننے لگا۔ اکثر سادھو اس طرح ڈنڈے سے کڑوں بجا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔

ٹھاکر جاگتی کے بال بھی کاٹنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں دانی۔ شاؤن لیمپل کی طرف جاتے ہوئے جین کے خٹے میں سرخ دوران میں بھی جاگتی سمجھی ہوئی تھی اور بہت لمبے ہڈیوں کے بال اتنے لمبے ہوئے تھے۔

جاگتی کے بال کھرا کر چڑیا کے گھونسلے کی طرح پہن دیے گئے۔ ٹھاکر نے اس کا حلیہ بھی لگا ڈیا تھا اور جب وہ پلاننگ ساڑی اوٹ پٹانگ انداز میں لپیٹ کر کمرے سے نکلی تو وہ کسی مندر کی داسی ہی لگتی تھی۔ ایک ٹھٹھا ٹھاکر نے اپنے آپ پر لگا دیا۔

چھبجے کے قریب ہم ہٹ سے باہر آ گئے۔ دوواڑے والا لگا کر جاگتی ایک ایسی جگہ پر رکھ دی گئی جس کے بارے میں ہلا کو بھی بتایا گیا تھا۔

ہم تینوں کسی کی نظر میں آئے بغیر ہٹ سے نکل کر سرخ کی طرف چلے گئے۔ راستے میں ہمیں جو بھی ملتا تھا بڑا کر پر نام (سلام) کرنا کہ ہم سادھو تھے اور عام لوگوں کا فرض تھا کہ ہمیں پر نام کریں۔

ہم تینوں کے کندھوں پر ایک ایک تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔ جو میں ہماری ضرورت کی چیزوں کے علاوہ بننے ہوئے چنے اور کدو کی ڈلیاں بھی تھیں کہ سادھو لوگ ایسی ہی چیزوں پر حیران کرتے تھے۔

سرخ پر ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ فضا میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے دکان

کے لیے خاص طور پر اس وقت کا انتخاب کیا تھا کہ الور کی ہاڑیوں میں چٹیں تو اندھرا ہو چکا ہو۔

ایک گاڑی کو آتے دیکھ کر ٹھاکر سرخ کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ سرخ رنگ کا فوڑا ایک ایک رنگ تھا جو ٹھاکر سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ ایک ایک رنگ کے ساتھ والی بیٹ پر ایک بھاری بھر کم آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے گود میں چھ سات سال کی عمر کے ایک بچے کو بھی سنبھال رکھا تھا۔ ایک ایک کے پچھلے حصے میں دو غور میں اور تین مروٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ ایک ہی قبیلے کے مہرتے جو پورے کالی کے مندر کی طرف جا رہے تھے۔

ٹھاکر چند منٹ ڈرائیور سے بات کرنا رہا پھر ہمیں اشارہ کیا اور ہم پچھلے آکر ایک ایک پر سوار ہو گئے۔ جاگتی غورقوں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں اور ٹھاکر پچھلے کی طرف آگئی پانچ مار کر بیٹھ گئے اور ایک ایک رنگ کی حرکت میں آ گئے۔

ٹھاکر کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پہاڑی کی طرف جانے والے موڑ تک پہنچنے میں چالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی رفتار کم ہو گئی۔ ان چھوٹی پہاڑیوں کے بعد ایک میل تک ریگ زار اور اس کے بعد پھر پہاڑیاں۔ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کے توڑی ہی پر دو بہت کم پہاڑیوں کے درمیان اس وسیع و عریض میدان میں پہنچ گئے جہاں جا بجا مشعلیں جل رہی تھیں۔ کئی جگہوں پر چھوٹا دیان اور چھوٹے نیچے نصب تھے جن کے سامنے پڑوسکس روشن تھے۔ آس پاس کی پہاڑیوں پر بھی جگہ جگہ مشعلوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

اس میدان میں جگہ جگہ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں جن کے قریب چھوٹا دیان یا نیچے نصب تھے۔ ایک ایک والوں نے اپنے لیے ایک ٹھٹھا تلاش کر کے ایک ایک رنگ رکھ لیا اور ہم ان کا ٹھٹھا لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

مشعلیں منظر تھا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے ہر طرف میں چلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ سب کچھ بہت چڑا سرگرم تھا جیسے ہم کسی اور دنیا میں آ گئے ہوں۔

میرے ذہن میں پہلے کا تصور کچھ اور تھا۔ جیسے ”کھیل مٹائے طریمیاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دے گی۔ یہ پوجا بیٹھ تھا۔ یہاں ایسی تقریبات کی ضرورت نہیں تھی تاہم رقص و سرود کی محفلیں ہر طرف جمی ہوئی تھیں۔

میں سو رہے پوجا شروع ہونے والی تھی۔ راجستھان کے مختلف شہروں میں کی مذہبی تہوار اور میلے ہوتے تھے ہم

تینوں ایک ایک ٹرک سے اتر کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ہم کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے آسانی سے مندر کے اندر پہنچا جاسکے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ دارا اور بلونت سنگھ سے مندر کے اندر یا اس کے آس پاس ہی ملاقات ہو سکے گی۔

ہر طرف سے دھول تاشوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جگہ جگہ رقص و سرود کی محفلیں بھی ہوئی تھیں۔ کئی لوگ اپنے اپنے ساتھ طوائفوں کو لے کر آئے تھے۔ بعض طوائفیں کسی کی دعوت کے بغیر آئی ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنی محفلیں بجا رکھی تھیں۔

ہم بالآخر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں رک گئے۔ یہاں بھی ایک زوردار محفل جمی ہوئی تھی۔ بیسیوں لوگ دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دو آدمی دھول بجا رہے تھے۔ ایک چٹنا بجا رہا تھا۔ دو ادھڑ عروڑیں ٹھٹھا بجا رہی تھیں۔ دو جوان اور خوبصورت لڑکیاں نیم عریاں لباس میں رقص کے نام پر اچھل کود کر رہی تھیں۔ ایک سادھو بھی جوش میں آکر میدان میں کود پڑا اور ان لڑکیوں کے ساتھ بے معنی اچھل کود کرنے لگا۔ ایک اور سادھو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چند لمحے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میرے ساتھ کھڑی ہوئی جاگتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا وسط میں لے گیا۔ جاگتی پہلے تو ہچکچائی لیکن پھر وہ بھی اس سادھوؤں کے ساتھ اچھل کود کرنے لگی۔ جاگتی بہت اچھی رقصہ تھی لیکن یہ رقص کے مظاہرے کا موقع نہیں تھا۔ بے معنی اچھل کود پر ہی داخل رہی تھی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے کچھ لوگ ان پر فوٹ نچا کر رہے تھے۔

اب باقاعدہ ہڑونگ شروع ہو گئی تھی۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر جاگتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا وہاں سے دور لے گیا۔ وہاں سے تقریباً بیس گز دور جاکر ہم بڑے بڑے پتھروں کے قریب بیٹھ گئے۔ اچھل کود سے جاگتی کا سانس پھول گیا تھا۔

ہم سے تقریباً سو گز آگے وہ پہاڑی تھی جہاں کالی کے مندر والا غار تھا۔ اس طرف سے بھجن گانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”اس وقت تو ان لوگوں کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”رات اسی جگہ گزار لو۔ صبح ہوتے ہی ہم ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔“

ہم پتھروں سے نیک لگائے باتیں کرتے رہے۔ کسی طرف سے بھجن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، کسی طرف

دھول پینے جا رہے تھے اور کسی طرف سے ہنگاموں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ یہ بنگا رات کے پچھلے پیر تک جاری رہے۔ میں کبھی اونٹنی لگتا اور کبھی چونک کر متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا۔ ٹھاکر بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا البتہ۔ چاکی ہم دونوں کے درمیان زمین پر بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر شور کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رات کا اندھیرا رخصت ہو چکا تھا اور دن کا ابلا پھینا شروع ہو گیا۔ ”جے کالی“ اور ”جہڑک بلی“ کے فلک شگاف نظروں سے فضا گونج رہی تھی۔

جاگی اور ٹھاکر بھی جاگ گئے۔ چند لمبے بعد حواس بحال ہونے لگے اور پھر ہم اٹھ کر مندر والی پاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ مندر والے غار کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کوئی بھجن گا رہا تھا۔ کوئی دونوں ہاتھ ماتھے کے قریب جوڑے آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور کوئی والمانہ انداز میں رقص کر رہا تھا۔

ہم لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہم ابھی غار سے دور ہی تھے کہ دھول تاشے بننے لگے۔ لگتا تھا جیسے دھول بجانے والوں پر جنون طاری ہو گیا ہو۔ غالباً بیکیوں دھول تھے جو پوری قوت سے پیٹے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جے کالی اور ”جہڑک بلی“ کے فلک شگاف غبرے گونج رہے تھے۔

ہم غار کے سامنے پہنچ گئے مگر اندر جانے کا موقع نہ مل سکا۔ بے پناہ رش تھا۔ ہم تینوں سٹ کر چٹان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اندر جا رہے تھے۔ کچھ لوگ باہر آ رہے تھے۔ ایک ہڈت لوگوں کو دھکیلتا ہوا باہر نکلا تو اس کے خون آلود ہاتھ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ اس کے ماتھے پر بھی خون سے نیلا لگا ہوا تھا۔ مجھے اپنا دل سینے میں ڈبٹا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی بے گناہ کو کالی کے چروں میں ذبح کیا جا چکا تھا۔

ہم نے اندر داخل ہونے کی کوشش ترک کر دی اور وہاں سے کچھ دور پیچھے ہٹ گئے۔ اب غار سے برآمد ہونے والے ہر شخص کے ماتھے پر خون کا سرخ نیلا نظر آ رہا تھا۔ ہم ایک چٹان کے سامنے بیٹھ گئے اور لوگوں کو آتے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ عجیب کیفیت تھی۔ لوگوں پر جنون

ساخاری تھا۔ عجیب ظالمانہ رسم تھی۔ ایک انسان کو چڑھ مورتی کے سامنے ذبح کر کے رقص کیا جا رہا تھا۔ خوشامیز جاری تھی۔ اس سے پہلے میں نے دھول پور میں سنی کی رقص دیکھی تھی جب ایک بیوہ ہونے والی حسین لڑکی کو اس کے پی کی لاش کے ساتھ زندہ جلایا گیا تھا۔

ان ظالمانہ رسموں پر اگرچہ پابندی لگی ہوئی تھی لیکن چوری چھپے کسی نہ کسی صورت میں یہ رسمیں اب بھی جاری تھیں۔ نہایت کڑ اور انتہا پسند پنڈت سیدھے سادے لوگوں کو بھڑکاتے تھے کہ اگر انہوں نے ان قدیم رسموں کو ترک کر دیا تو دیوتا ان پر عذاب نازل کر دیں گے اور وہ تباہ ہو جائیں گے۔

انسان چاند پر پہنچ گیا تھا اور مریخ پر کندیں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سائنس اتنی زیادہ ترقی کر چکی تھی کہ ہر چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی لیکن مذہب کے حوالے سے لوگوں کے بعض طبقے جنونی کیفیت میں مبتلا ہو رہے تھے وہ اپنے مذہب کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھے صرف ہندو ہی نہیں، دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بعض طبقے بھی نہایت انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ لکیر کے قہقیرے ہوئے تھے۔ صدیوں پرانی ذکر سے ایک انچ ادھر ادھر کر تیار نہیں تھے۔ سائنسی ترقی کو وہ خرافات سمجھتے تھے۔ البتہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ دنیا کو ایک بار پھر پتھر کے زمانے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

وہوب تیز ہو رہی تھی لیکن غار کے سامنے لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میدان میں بھی، طرف لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع تھے۔ دھول بج رہے تھے۔ رقص ہو رہا تھا۔ ”جے کالی“ کے غبرے لگ رہے تھے۔ ہم ادھر ادھر گھوم رہے۔ جہاں بھی ہمیں پیلا کپڑوں والا کوئی سادھو نظر آتا، ہم اس طرف چل پڑتے لیکن ہرگز مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔

دوپہر کے بعد تین بجے کے قریب ہمیں غار کے اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ باہر شدید گرمی تھی لیکن اندر اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔

غار بہت بڑا تھا۔ اس میں بیک وقت کم از کم دو ہزار افراد سما سکتے تھے اور اس وقت بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

ہم لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ غار کے دیواریں تانہوار تھیں۔ کہیں پتھر یا ہر کو ابھرے ہوئے تھے اور کہیں اندر کی طرف کوئی پگھلا سا بنا ہوا تھا۔ چھت اور دروازے

دیواریں مشلوں کے دھوکے سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ غار کے آخر میں ایک بہت بڑے چوڑے پر کالی کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ اس کے سامنے چوڑے پر ناریل، مٹھائی، پھل اور ایسی بہت سی چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر میں سونے کے لاتعداد زیورات بھی نظر آ رہے تھے۔ عورتیں اپنے زیورات اتار اتار کر بیٹھ چڑھ رہی تھیں اور تین چار پنڈت بار بار ان چیزوں کو سمیٹ کر چوڑے کے پیچھے کسی جگہ لے جا رہے تھے۔ لوگ مورتی کے سامنے چوڑے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے چروں پر مل رہے تھے۔ اس جگہ کالی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک انسان کو ذبح کیا گیا تھا۔ لاش وہاں سے ہٹادی گئی تھی۔ چوڑے پر کہیں کہیں خون کا کوئی دھبہ لگا ہوا تھا۔ صبح سے آنے جانے والے لوگوں نے اپنے ہاتھوں پر ٹیکے لگانے کے لیے ہاتھ رگڑ رگڑ کر سارا خون صاف کر دیا تھا۔

میں نے کالی کی مورتیاں پہلے بھی دیکھی تھیں لیکن اس مورتی کو دیکھ کر دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ یہ مورتی تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ یہ مورتی تیار کرنے والے نے واقعی بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔

کالی کی آنکھیں دہشت زدہ انداز میں مٹھائیوں سے اُلی پڑ رہی تھیں۔ اس کی سرخ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ کندھوں سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں ڈوری سے شلوک دو تھاپاں لٹکی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں تینہ تھا۔ یہ تینہ اور کالی کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے۔ مورتی کی ہچھاتیان پر ہنہ تھیں اور گلے میں سونے اور موتیوں کی مالا میں تھیں۔ ایک مالا سب سے مختلف تھی اور یہ مالا انسانی کھوپڑیوں سے تیار کی گئی تھی۔ دو کھوپڑیاں ایک طرف، دو دوسری طرف اور ایک درمیان میں جمی جو سینے سے نیچے پیٹ پر جمی ہوئی تھی۔ اس مالا میں کھوپڑیوں کے ساتھ پتیل کے سونے ہوئے پتے بھی تھے۔ مورتی کے بدن کا زیریں حصہ بھی برہنہ تھا۔

لوگ مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پر نام کرتے، کوئی نہ کوئی چڑاس کے قدموں میں ڈالتے، چوڑے کو چھو کر انگوٹھے سے پیشانی پر نیلا لگاتے اور آگے بڑھ جاتے۔

اس صورت حال سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کالی اپنے عام کاروں میں خوشیاں بانٹتی تھی یا نہیں لیکن پنڈت اور بیکاری یقیناً بہت خوشحال تھے۔ کالی صرف انہی پر مہربان تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ ہمیں یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ سادھو، پنڈت اور بیکاری

تو بہت نظر آتے تھے مگر دارا یا بلونت نگھ سے ملتا جتنا کوئی چرو دکھائی نہیں دیا تھا۔

ہم غار سے باہر آ گئے۔ دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اور اب پھر مغرب کی طرف سے بادل اٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم اپنے شکاری تلاش میں ادھر ادھر گھومتے رہے اور بالآخر ایک چٹان کے سامنے بیٹھ گئے۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔“ جاگی نے کہا۔

میدان میں جگہ جگہ پانی کے ٹینکر بھی کھڑے تھے۔ پاتریوں کی سہولت کے لیے بے پانی اور سے لایا گیا تھا۔ کوئی ٹینکر خالی ہو تا تو اس کی جگہ دوسرا آ جاتا۔

”وہ اس طرف ایک ٹینکر کھڑا ہے۔ میں پانی لے کر آتا ہوں۔“ میں نے کندھے پر لٹکا ہوا ٹھیلہ اتار کر زمین پر رکھ دیا اور ڈول اٹھا کر تقریباً سو گز دور ٹینکر کی طرف چل پڑا۔

وہاں آٹھ دس افراد کھڑے تھے۔ اپنی باری آنے پر میں ٹینکر کے باپ سے ڈول بھرنے لگا تو ایک اور سادھو بھی اپنا ڈول لے کر آگے جھک گیا۔ وہ میرے بالکل ساتھ جڑا ہوا تھا اور چو میرے چہرے کے قریب تھا اور پھر دوسرے ہی لمبے میں ایک سرگرمی سن کر چونک گیا۔

”شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مندر والی چٹان کی پچھلی طرف مجھ سے ملنا بہت ٹھک۔“

آواز نسوانی تھی۔ میں نے گردن جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ بسے میں سادھو سمجھا تھا وہ عورت تھی۔ اس نے لباس سادھوی والا ہی پنن رکھا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اس نے مجھے ہمت سنگھ کے نام سے پکارا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے جانتی تھی لیکن اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔

اچانک میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ پنڈت سو بھراج نے بتایا تھا کہ دارا اور بلونت نگھ کے ساتھ سادھو کے ہمیں میں ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔

”مجھے اس طرح گھور کر مت دیکھو۔“ اس نے ایک بار پھر سرگرمی کی۔ ”پانی بھرا دو ریمال سے چلے جاؤ۔ میرا پیچھا کرنے کی کوشش مت کرنا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مندر والی چٹان کی پچھلی طرف پہنچ جانا۔“

میں نے اپنا ڈول بھر لیا اور اس کی طرف دیکھنے بغیر اپنے راستے پر چل دیا۔ توڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے مجھے



ہمت سنگھ کی حیثیت سے پہچان لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میرا ایک اب اتنا اچھا نہیں تھا اور اگر یہ لڑکی دارا اور بلونت سنگھ کی ساتھی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کی نظروں میں آچکے تھے اور اب وہ بھی بائیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ چھپ کر ہم پر حملہ کرتے یا چوری چھپے یہاں سے بھی ہٹا کر جاتے۔

لیکن اس لڑکی نے مجھے مندر والی چٹان کی پچھلی طرف کیوں بلایا تھا۔ کیا ہمیں دیکھ لینے کے بعد انہوں نے کوئی منصوبہ بنالیا تھا اور اس لڑکی کے ذریعے مجھے چٹان کی پچھلی طرف ہٹا کر مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے پانی کا ایک کھونٹ بھرا اور ڈول کو جلدی سے پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ٹینکر دھوپ میں کھڑا تھا اور پانی بھی گرم تھا۔ میں ٹھاکر اور جاگی کے قریب بیٹھ گیا اور ڈول جاگی کی طرف بڑھا دیا۔ پانی گرم سہی لیکن بہر حال ہم تینوں کے حلق تر ہو گئے تھے۔

میں نے جاگی اور ٹھاکر کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں اچھل پڑے۔

”یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔“ ٹھاکر نے کہا ”اور اگر یہ وہی لڑکی ہے تو ہمیں کیسے جانتی ہے۔ وہ کون ہو سکتی ہے؟“

”یہ معلوم کرنے کے لیے شام کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے“ ٹھاکر بولا۔

”اندھیرا ہونے دو ٹھاکر پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اپنے تجلیے میں سے بھنے ہوئے پنے اور گڑ نکال کر کھانے لگا۔

○☆☆○

مگرے یا دلوں نے پورے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ مندر کے اندر کالی کی پوجا ہو رہی تھی اور باہر لوگ اپنے ہی جہنم میں مبتلا تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو کیا ہوگا لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ ان مہا بڑیوں میں لاتعداد اچھوٹے بڑے عمارتے جو بارش میں لوگوں کو ہٹا دے سکتے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن ہو رہی تھیں۔ ہم اپنی جگہ سے اٹھ کر مندر والی چٹان کی طرف آگئے۔ ہم میں سے ملے ہوا تھا کہ میں اس لڑکی کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف اٹھتا جاؤں گا۔ جاگی اور ٹھاکر الگ الگ کچھ فاصلے پر میرے پیچھے آئیں گے۔ ٹھاکر نے کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ان دونوں کے پاس ہتھول موجود تھے جو انہوں نے اپنے اپنے لباس میں چھپا رکھے تھے اور میرے پاس خنجر تھا جو میں نے پنڈلی پر بندھ رکھا تھا۔

چٹان کی پچھلی طرف پہنچنے سے پہلے ہی ہم الگ الگ ہو گئے۔ میں نے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ اس چٹان کی پچھلی طرف تقریباً سو گڑ کے فاصلے پر ایک اور مہا بڑی تھی۔ اس طرح یہ ایک درہ مابین گیا تھا لیکن اس طرف ان چٹانوں میں کوئی تارو ٹیڑھ نہیں تھا اس لیے اس طرف یا تریوں کی آبادی نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے مندر والی چٹان کے سامنے کے رخ پر ڈیرے بنائے تھے۔ اس درے کے آخر میں ایک جگہ دو ٹیڑھ مشعلیں جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

میں اندھیرے میں سنبھل کر چل رہا اور پھر اچانک رک گیا۔ وہ بجلی سی سرگوشی دائیں طرف سے ابھری تھی۔ میں نے غصا انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ پنڈلی کے نیچے سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور آواز کی طرف بڑھنے لگا۔

”اس طرف ہمت سنگھ۔“ میں یہاں ہوں۔“ وہ سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ اسی لڑکی کی آواز تھی۔

میں اس طرف مڑ گیا۔ ایک انسانی ہیولا چٹان کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا، اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک کھوہ میں داخل ہو گئی۔ یہ دراصل ایک کشادہ دراڑ تھی جو پانچ پچھٹ آگے جا کر بائیں طرف ختم ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہیں پہنچی۔

آگے راستہ بند تھا اور یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بن گئی تھی۔ اگر باہر سے دو آدمی بھی آجاتے تو میں آسانی سے مارا جاسکتا تھا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے اس لڑکی کا ہاتھ میرے

ہاتھ میں تھا۔ اس نے ٹٹول کر خنجر کو دیکھا پھر سرگوشی میں

بولی۔ ”اس خنجر کو میان میں رکھ دو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟“ میں نے بھی سرگوشی میں کہا ”اگر میرے ساتھ دھوکا ہوا تو اس خنجر سے تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔“

”کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ مجھ پر دھوکا اس (یعنی) کو۔“ اس نے جواب دیا ”میں تمہاری مدد رہوں۔ میرا نام امبر ہے اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا تم ان دونوں کے ساتھ ہو؟“ میں نے نام لے کر بغیر پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ ”وہ دونوں مجھے بلیک میل کر رہے ہیں اور دو دھمکیاں دے کر مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ وہ لوگ یہاں بھی ایک خاص مقصد کے تحت آئے ہیں۔“

”کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ اس سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ اسے کس سلسلے میں بلیک میل کیا جا رہا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا ”یہ اتفاق ہے کہ آج دن میں میں نے تم لوگوں کو مندر میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا۔ دوسرے کون ہیں؟“ میں نے نہیں جانتی۔

”مجھے کیسے پہچانا؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے دائیں کان کی لو کے پیچھے سیاہ قلعہ ہے۔“ مندر کے برابر۔“ امبر نے جواب دیا ”جب تم تینوں مندر کے اندر محکم رہے تھے تو ہم تینوں بھی تم لوگوں کے پیچھے ہی تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان تین چار گڑ کا فاصلہ تھا اور سچ میں بہت سے لوگ تھے اتفاق سے میری نظر تمہارے کان پر پڑ گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتے تو شاید اب تک تمہارا قصہ پاک ہو چکا ہوتا۔“

”بہر حال۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”وہ اپنے دھیان میں تھے۔ ان کے سازشی ذہن کوئی اور ہی منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں ان سے الگ ہو کر تم لوگوں کے پیچھے لگ گئی اور بالآخر خرب تم ٹینکر سے پانی لینے آئے تو میں بھی تمہارے قریب پہنچ گئی۔“

”مندر سے نکلنے کے بعد تو ہم دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے تھے۔“ میں نے کہا۔

”میں تم لوگوں کے پیچھے تھی۔“ اس نے جواب دیا ”تم

تینوں چٹان کے سائے میں بیٹھے تھے تو میں اس وقت بھی تم سے رابطہ کر سکتی تھی لیکن مجھے شبہ تھا کہ میری نگرانی نہ ہو رہی ہو۔“

”وہ تمہارے آس پاس نہیں تھے تو نگرانی کرنے والا کون ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ یہاں اکیلے نہیں ہیں۔“ امبر نے جواب دیا ”میں آئے کے بعد انہوں نے کم سے کم تین آدمیوں کو اپنے ساتھ بلالیا ہے۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی میری نگرانی بھی کر رہا ہو۔ بلونت سنگھ کو مجھ پر پوری طرح اعتماد نہیں ہے لیکن مجھے انہوں نے اپنے منصوبے میں شامل رکھا ہے۔ بڑی گھناؤنی سازش کر رہے ہیں وہ دو لوگ۔“

”سازش کے بارے میں بعد میں پوچھوں گا لیکن پہلے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتی ہو۔ میرا نام کیسے جانتی ہو لیکن ایک منٹ!“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”اس دراڑ میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ میری دوست اور ٹھاکر باہر کہیں کھڑے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہم یہاں سے نکل کر کسی اور جگہ پر بیٹھ کر بات کریں گے۔“

”اگر ان میں سے کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیں گے۔“ امبر نے جواب دیا۔

”ہم روشنی کی طرف نہیں جائیں گے۔“ میں نے کہا ”ان چٹانوں میں تو دن کے وقت بھی کسی کو تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ رات کے اندھیرے میں کون دیکھ سکے گا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔“

میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف چلنے لگا۔ ہم اندر داخل ہوئے تھے تو آگے پیچھے تھے اور اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ امبر میرے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس کے گداز بدن کے لمس نے ایک لمحے کو میرے اوپر سنسنی سی طاری کر دی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور اسے ساتھ لیتا ہوا اس کھوہ سے باہر آ گیا۔

اس وقت ہوا میں کسی قدر خشکی تھی۔ میں مگرے مگرے سانس لیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ درے کے دائیں طرف جہاں مشعلیں جل رہی تھیں وہاں کچھ لوگوں کے سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بائیں طرف ایک پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر میں نے اس طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا اس پتھر کو جان بوجھ کر ٹھوک رہی تھی۔ میں نے ہونٹ سکینے کر ہوئے سے سنبھلی۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ ہیلے ایک بڑے پتھر کی آڑ سے نکل کر ہماری طرف آئے لگے۔

وہ جاگتی اور ٹھاکر تھے۔

”ہمیں کسی محفوظ جگہ کی ضرورت ہے ٹھاکر! جہاں ہم بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کر سکیں۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”کسی جگہ کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔“ امبر نے دوبارہ کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن غاہر ہے میں اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ امبر نے کہا ”میں نے مشکل وقت کے لیے ایک پناہ گاہ تلاش کر رکھی ہے۔ ہم وہیں چلتے ہیں۔“

ہم اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک اور ٹنگ سے دورے میں سے ہوتے ہوئے دوسری پہاڑی کی پچھلی طرف آگئے۔

اس پہاڑی میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے غار تھے اور کسی کسی غار میں مشعل یا پینڈو میکس کی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ہمارے ٹھیلوں میں اگرچہ ٹارچیں موجود تھیں مگر ہم نے ٹارچ روشن کرنے کے بجائے اندھیرے ہی میں رہنا مناسب سمجھا تھا۔ ہم امبر کے پیچھے پیچھے ایک ٹنگ سے

راستے پر پہاڑی کے اوپر چڑھتے رہے تقریباً پچاس فٹ اوپر جا کر وہ گنڈنڈی ایک بہت بڑے پٹائی پتھر کے پیچھے مڑ گئی تھی۔

یہاں پہنچ کر ٹھاکر نے ٹھیلے میں سے ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ امبر نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور آگے چلتے ہوئے ہمیں راستہ دکھاتی رہی۔

میں فٹ مزید اوپر جا کر ہم ایک غار میں داخل ہو گئے۔ امبر نے ٹارچ کی روشنی میں غار کے دبائے کے قریب ہی اندر کی طرف ایک پتھر پر رکھی ہوئی پاچس اٹھائی۔ ٹارچ ٹھاکر کے

حوالے کر دی اور دیا سلتی جلا کر دیوار میں لگی ہوئی ایک مشعل روشن کر دی۔

غار صاف ستھرا تھا مگر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پاچھ افراد آسانی سے اس میں رہ سکتے تھے اور غالباً پہلے بھی کچھ لوگ

یہاں رہتے رہے تھے۔

روشنی ہونے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ غور سے امبر کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لانا باندہ چھوڑ کر بدن، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، چہرے کے

نقوش بڑے نظر قریب تھے۔ اس نے پیلے رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی لیکن ملاؤز اس قدر مختصر تھا کہ نظریں اس کی

طرف اتختے ہوئے شرتائی تھیں۔

اور جاگتی تو اتے دیکھتے ہی اچھل پڑی تھی۔ وہ اس طرح

امبر کو دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ لیکن امبر کی نظروں میں کوئی حیرت نہیں تھی۔

وہ روپ متی کی دوست ڈاکٹر راوہا کی بھانجی تھی۔ ہو سکتا ہے میں نے بھی اسے کبھی دیکھا ہو لیکن مجھے اس کاچہ

یاد نہیں تھا البتہ امبر نے مجھے یاد رکھا تھا اور میرے کان کی

کے پیچھے مل سے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

”ہاں۔ اب بتاؤ کیا قصہ ہے۔ وہ لوگ ہمارے خلاف کون سی نئی سازش تیار کر رہے ہیں؟“ میں نے سوالیہ لٹا ہوں

سے امبر کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہم سب غار کے فرش پر بیٹھ چکے تھے۔ یہ غار واقعی پر لحاظ سے محفوظ تھا۔ سامنے پٹائی

پتھر ہونے کی وجہ سے اسے نیچے سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

”وہ سازش تم لوگوں کے خلاف نہیں ہے۔“ امبر نے جواب دیا ”میں یہ تو معلوم ہے کہ تم لوگ سارکامیں

موجود ہو۔ جب تنگولی چوہدری تمہاری ایک ساتھی کو اغوا کر لے گیا تھا اور بعد میں ہم بھی جنگل میں گھس گئے تھے تو

دونوں بہت خوش ہوئے تھے کہ ہمیں یوں کے بھٹ میں گھس کر تمہارا زندہ واپس آنا ممکن نہیں تھا لیکن جب تم ہلا کر

واپس آگئے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ تم لوگ جس بہت

میں ٹھہرے ہوئے تھے اس پر حملہ کرنا بہت آسان تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتے تھے لیکن

اسنے آپ کو تم لوگوں کے سامنے ایک سپر وٹھیں کرنا چاہتے

کیونکہ وہ ایک اور سازش تیار کر رہے تھے۔“

”ہم ایسی سازش کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ جو کالی کے مندر پر میلہ لگا ہوا ہے نا یہاں ہفت ہر ہزاروں لوگوں کی آمد رفت جاری رہتی ہے۔ تم نے میدان

میں لاقعد اوچھ چٹائی گاڑیاں دیکھ کر اندازہ لگایا ہوگا کہ یہاں کیسے کیسے دھن وان (دولت مند) لوگ آتے ہیں۔ یہ لوگ

نقدی کے علاوہ بہت قیمتی چیزیں کالی کے چرنوں میں بیٹھ کر لے

کرتے ہیں۔ میرے جواہرات، خالص سونے کے زیورات، سونے کی مورتیاں اور بہت کچھ۔ اس ایک ہفتے کے دوران

میں یہاں لاکھوں روپے نقد اور کروڑوں روپے کے خزانے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ کل رات وہ سب

کچھ اڑا کر میاں سے روٹیکر ہو جائیں۔ ان کے ساتھ سارے شہر کا غذا وریودھن بھی شامل ہے۔ دو اور آدمیوں کا

نے بندوبست کیا ہے۔“

”اوہ! میرے اور ٹھاکر کے منہ سے بیک وقت

پنڈت سو بھراج کا اس میں کیا کردار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

قریب پہنچ چکی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے جاگتی کو اس

آوی کے ساتھ چھوڑا دیوں اور گاڑیوں کی دوسری طرف پہاڑی کے دامن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

میں بڑی تیزی سے گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اسٹیشن وگن کے قریب پہنچ گیا اور اگلے پینے کا والوڈیا کر اس میں تنکا بٹھسا

دیا۔ بلی سی آواز کے ساتھ ٹائڈ ہوا خارج ہونے لگی۔ میں اس طرف کے پچھلے پینے کے قریب چلا گیا اور اس ٹائڈ کے

والو میں بھی تنکا بٹھسا دیا۔

میں اسٹیشن وگن کے چاروں پیروں کی ہوا نکالنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف کچھ فاصلے پر لوگ موجود تھے اس لیے باقی

دو پیروں کا خیال ذہن سے نکال کر وہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد جاگتی واپس آگئی۔ وہ آدمی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

”کیا ہوا۔ اسے مار تو نہیں دیا؟“ میں نے جاگتی کے قریب آنے پر سرگوشی میں پوچھا۔

”یڈا دیا ہے حراسی کا۔ آدھے گھنٹے تک ہوش میں آجائے گا۔“ جاگتی نے جواب دیا ”بڑا حراسی ہے۔ ایک دم پھینک لے گا۔“

ہم اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے۔ انپکنڈ پانڈے ہمیں اس جگہ نظر نہیں آیا تھا جہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے ٹھاکر کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ

سکا تھا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر مندر والے غار کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ہماری نظریں مندر میں آنے جانے والے لوگوں پر لگی

ہوئی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے انپکنڈ پانڈے کو دو آدمیوں کے ساتھ مندر میں جاتے دیکھا۔ اس کے تقریباً

آدھے گھنٹے بعد انپکنڈ پانڈے ایک آدمی کے ساتھ واپس آیا۔ ان کا تیسرا ساتھی مندر کے اندر ہی رہ گیا تھا۔

مندر میں لوگوں کی آمد رفت بدستور جاری تھی۔ رات ایک بجے کے قریب دو اور آدمی مندر میں داخل ہوئے۔ وہ

دونوں صورتوں ہی سے چھپے ہوئے بد معاش لگتے تھے۔ اس کے تین چار منٹ بعد تین سادھو اندر داخل ہوئے ہوئے نظر

آئے اور ان تین سادھوؤں میں ایک امبر بھی۔

اشارہ کرنا ہوا اٹھ کر مندر میں چلا گیا۔ اس کے ایک منٹ بعد جاگتی اور مندر میں چلا گیا۔ اس کے ایک منٹ

مطلوں کی کچکپائی ہوئی روشنی میں کالی کی مورتی بہت سی

بہت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مندر میں کئی لوگ موجود تھے۔ کوئی دونوں

ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔ کوئی آلتی ہاتھ مارے بیٹھا ہوا تھا اور کوئی لوگا کے اسٹالس میں بیٹھا ہوا جا کر رہا تھا۔

میں جس آدمی کے قریب رہا تھا وہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ چہرے کے سامنے جڑے ہوئے تھے۔

میں مجلس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا لیکن امبرا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ ٹھاکر کالی کی

مورٹی والے چوڑے کے قریب کھڑا تھا اور جاگتی اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ مورٹی کے قریب اس وقت کوئی

پنڈت یا پجاری نہیں تھا البتہ پوجا کرنے والے چند لوگ کھڑے تھے۔

ٹھاکر نے اشارہ کیا تو میں فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ٹھاکر اور جاگتی مورٹی والے

چوڑے کے پیچھے جا چکے تھے۔ میں نے قدم اٹھاتا ہوا چوڑے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں جو بھی تھا، اسنے دھیان

میں مکن تھا۔ میں نے لحاظ لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور چوڑے کے پیچھے رہ گیا۔

چوڑے کی پچھلی طرف چٹان میں ایک تنگ سی دراڑ تھی۔ دو آدمی آسانی سے اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے

دیکھتے ہی جاگتی اور ٹھاکر اس دراڑ میں داخل ہو گئے۔ میں بھی اندر گھس گیا۔

تقریباً دس قدم آگے جا کر دراڑ میں طرف مڑ گئی تھی اور اس طرف ذرا سی روشنی نظر آرہی تھی۔ جاگتی کے پیچھے

میں جیسے ہی اس طرف مڑا، ٹھنگ کر رک گیا۔ تین چار قدم آگے ایک پجاری فرش پر پڑا ہوا تھا اور ٹھاکر اس پر جھکا ہوا

تھا۔ میں جاگتی کو ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔ پجاری کا ایک ہاتھ ٹھاکر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔

میں نے پجاری کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس کی گردن پر ایک مخصوص کس کو ٹوٹل کر دیکھا اور مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ

اس کے جسم اور روح کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلاتے ہوئے پجاری کا

ہاتھ چھوڑ دیا۔

مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ دارا اور اس کے ساتھی اس غار میں پہنچ چکے

تھے ان دراڑوں سے آگے غالباً کوئی ایسی جگہ بھی جہاں مندر کے پروہتوں نے خزانہ جمع کر رکھا تھا اور دارا وغیرہ اس

سلسلے میں غالباً پہلے ہی بت سی معلومات حاصل کر چکے تھے اس لیے سیدھے اندر تک پہنچ گئے تھے۔

ٹھاکر جب سر ہا ہوا تو اس کا پتول لباس سے نکل کر اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ جاگتی نے بھی پتول نکال لیا تھا اور میں نے بھی پینڈی پر بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

چند گز آگے جا کر یہ دراڑ ایک بار پھر ہمیں طرف مڑ گئی تھی۔ آگے کشادہ جگہ تھی اور بائیں طرف کی چٹان میں ایک اور راستہ نظر آ رہا تھا جس کی دوسری طرف روشنی جھلک رہی تھی۔

یہ غار قدرتی تھی۔ ان کی بناوٹ میں کہیں بھی انسانی ہاتھوں کا دخل نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ان غاروں سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

اس راستے کی دوسری طرف کچھ آوازیں سن کر ہم محتاط ہو گئے۔ میں نے دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دوسری طرف ایک کشادہ غار تھا جہاں چار مشعلیں روشن تھیں۔ غار کے عین وسط میں ایک پینڈت کی لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ پرہیز تھا۔ پیٹ کٹا ہوا تھا اور اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کی شہ رگ بھی کٹی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس خون بکھرا ہوا تھا۔ اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور پینڈت زمین پر پڑا تھا۔ وہ زندہ تھا اور اس کے ہاتھ پرہیز نہ ہوئے تھے۔

غار میں پانچ افراد تھے۔ ایک امبر جو راستے کے قریب ہی قدرے بائیں طرف کھڑی تھی۔ بلونت سنگھ اور دارا۔ ان کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ یہ وہی غنڈے تھے جنہیں میں نے دارا وغیرہ سے پہلے مندر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان دونوں نے ایک بوری کا کتہ کھول رکھا تھا اور بلونت سنگھ قریب ہی انبار سے سونے کے زیورات اور سونے کی مورتیاں اٹھا اٹھا کر بوری میں ڈال رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ گردنوں کی دولت تھی۔ ایک طرف کرنسی نوٹوں کا ڈھیر بھی لگا ہوا تھا۔

دارا ان کے قریب کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پینڈت کو اس نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

میں نے دارا کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت بدلا ہوا

نظر آ رہا تھا۔ وہ باقاعدگی سے سر مٹا کر وانے کا عادی تھا لیکن اب اس کے بال کندھوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ بے ترتیب داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ اگر مجھے پہلے سے اس کے بارے میں پتا نہ ہوتا تو میں اس طے میں اسے نہیں پہچان کر تھا۔ وہ پہلے سے کچھ فریب بھی ہو گیا تھا۔ مجرب چوہدری آنکھیں اور سادھوؤں والے لباس میں وہ سادھوئی لگ رہا تھا۔

میں نے گردن سمجھا کر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کیا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

”یہ سب کچھ میں نے چھوڑ دو اور ہاتھ اٹھا کر کھڑت ہو جاؤ۔“ ٹھاکر کی کڑی ہوتی آواز غار میں گونجی۔

وہ سب اچھل پڑے لیکن ہاتھ کسی نے اوپر نہیں اٹھائے تھے۔

”اوسہ تو تم لوگ بھی ہو۔“ دارا ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے جبکہ بلونت سنگھ وغیرہ کے چہرے دھواں ہو گئے تھے ”کوئی بات نہیں۔“ دارا نے بات جاری رکھی ”میںاں بہت کچھ ہے حصہ بانٹ لیں گے تم لوگوں کے حصے میں اتنی دولت آئے گی کہ نال ہو جاؤ گے۔“ دارا یہی سمجھا تھا کہ ہم بھی اس دولت کے پکڑ میں یہاں آئے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا۔

”تمہارا تھیل اب ختم ہو چکا دارا۔“ میں نے کہا ”کالی کے مندر کا یہ غار اب تمہارا مقبرہ بنے گا۔ بہتر ہے کہ اب اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“ دارا اچھل پڑا۔

”اوسہ تم ہو۔“ اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی ”اپنے بارے میں کیا خیال ہے یہ غار تمہارا مقبرہ بن سکتا ہے۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ کہاں پھنس گئے ہو۔“

میں نے تو نہیں البتہ ٹھاکر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور غار کی اس بد حواسی سے دارا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دارا نے اپنا خنجر بوری قوت سے ہماری طرف کھینچ مارا۔ میں غار کو دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ خنجر ہمارے اوپر نہ ہوا چٹان سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔

ٹھاکر نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ گولی گزرا اور دیوار پر لگی۔ وہ دونوں بد معاش اور بلونت سنگھ سب کچھ چھوڑ کر غار کی چھیلی طرف بھاگے ان

”تم آتے جاؤ؟“ امبری آنکھیں چمک اٹھیں۔

”ہم نے بھی تھوڑا بہت ہوم ورک کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میںاں سے لوٹ مار کرنے کے بعد یہ لوگ دھول پور میں پینڈت سوہراج کے ہاں پناہ لیں گے۔ چند روز وہاں گزارنے کے بعد کسی اور طرف نکل جائیں گے۔“ امبر نے کہا۔

”اب انہیں پینڈت سوہراج کے ہاں بھی پناہ نہیں ملے گی لیکن بہرحال یہ اپنے منصوبے پر کب عمل کریں گے؟“

”نکل رات۔“ امبر نے جواب دیا۔

”نکل رات کیوں؟ ابھی تو میلہ ختم ہونے میں کئی روز باقی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”نکل کالی کے چروں پر دو سرا بلیدان (قربانی) کیا جائے گا۔“ امبر نے جواب دیا ”دوسرے بلیدان کے بعد لوگوں کی دلچسپی بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری بجینٹ پر سب سے زیادہ چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور ان کا منصوبہ ہے کہ کل رات ہلا بول دیا جائے انہوں نے اپنی گاڑی بھی تیار کر لی ہوئی ہے۔“

”اور وہ گاڑی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسے پتے سے پتا نہیں چلے گا۔ وہاں جا کر دکھانی پڑے گی گاڑی۔“ امبر نے جواب دیا ”ان کا ایک آدمی گاڑی کے آس پاس موجود رہتا ہے۔“

”اور اب یہ بتاؤ کہ یہ لوگ تمہیں کس سلسلے میں بلک رہے ہیں؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ جھپٹے جھپٹے جیسی ہو گئی ”یہ بتانا ضروری نہیں لیکن معاملہ ایسا ہے کہ اگر پولیس جان لے تو میری باقی زندگی نیل میں گزرے گی۔“

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”میں واپس جاؤں گی۔“ امبر نے جواب دیا ”وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اگر انہیں شبہ ہو گیا تو گز بو رہاں گی۔“

”انہوں نے کہاں ڈیرا بجا رکھا ہے؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”مندروں کے سامنے والی پہاڑی پر، میدان کی دوسری سمت ہوئے۔“ امبر نے جواب دیا ”میں لوگ اگر چاہو تو یہاں رہ سکتے ہیں۔“

”پتا ہے ہم بھی تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ چلیے۔“

”ہیں۔“ میں نے کہا اور ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مشعل بجھادی گئی اور ہم تالچ کی روشنی میں پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ پہاڑی کی دوسری طرف ہم نے اپنی رفتار کم کر لی۔ جبکہ امبر تیز رفتار قدم اٹھاتے ہوئے آگے چلتی رہی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہم اوپر اوپر گھومتے رہے۔ جنگل میں مشکل کا سامنا تھا۔ ہر طرف رقص و سرور کی محفلیں جی ہوئی تھیں۔ کئی بنگسوں پر نیم برہنہ رقص ہو رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح اڑاکی جاری تھی۔ بعض لوگ شراب کے نشے میں دھت ہو کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ میلوں غیلیوں میں بے ہودگیاں تو ہوتی ہیں مگر کالی کی پوجا کا یہ میلہ کھلی عیاشی کا اڈا بھی تھا۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

اور پھر وہی بات ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔ اچانک ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ ہم نے ایک نیکر سے پانی کے تینوں ڈول بھر لے اور غار کی طرف واپس چل پڑے۔ آسمان سے برسنے والی موٹی موٹی بوندیں اب باقاعدہ بارش کی صورت اختیار کرنے لگی تھیں اور جب ہم غار میں داخل ہوئے تو بارش میں اچھی خاصی تیزی آچکی تھی۔

اگر امبر سے ملاقات نہ ہوتی تو ہم بھی اس وقت تیز بارش میں بھجک رہے ہوتے لیکن بہرحال، ہم اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ تھے اور بارش سے بھی۔

○☆☆○

میری آنکھ ”جے کالی“ اور ”بجربگ ملی“ کے فلک شگاف نعروں کی آواز سے کھلی تھی۔ اس میدان اور ہمارے درمیان اگرچہ تین سو فٹ اونچی پہاڑی حائل تھی لیکن نعروں کی آوازیں یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میرے دل پر ایک دم اداسی چھا گئی تھی۔ میں صبح سویرے بلند ہونے والے ان نعروں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ایک اور بے گناہ کو پتھر کی موتی کے سامنے ذبح کر دیا گیا تھا۔

جاگتی اور ٹھاکر بھی جاگ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی افسردگی کے آثار نمایاں تھے۔ ٹھاکر اپنا پانی کا ڈول اٹھا کر غار کے دہانے پر چلا گیا۔ اس نے پہلے کالی کی اور پھر مندر پر پانی کے چھینٹے دیئے۔

تقدیماً ایک گھنٹہ بعد پتھروں کے لوتھنے کی آوازیں کر میں چوکے گیا اور آڑ سے جھانک کر دیکھا تو امبر اوپر آ رہی تھی۔ جب وہ غار میں داخل ہوئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نینکر کے قریب ملوں گا۔“  
نے کہا۔

امبر مندر کی طرف چلی گئی اور میں لوگوں کے بیچ  
راستہ بناتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔  
اور پھر دن کا باقی حصہ ہم نے اسی غار میں گزارا  
ہوئے گزارا۔

○☆☆○

سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ امبر نے ہمیں بتا دیا تھا  
لوگ کیا کرنا چاہتے تھے۔ امبر کے علاوہ ان کی تعداد  
دارا، بلونت، سکھ، درپودھن اور اس کے دو ساتھی۔  
کے مطابق ان کے ایک آدمی کو اسٹیشن دینگن کے قریب  
تھا جبکہ دوسروں کو باقی کارروائی مکمل کرنی تھی۔  
آدھی رات کے وقت مندر کے اندر لوگوں کی  
ہوتی تھی اور وہ بھی پوجا پٹھ میں مگن رہتے تھے۔  
میدان میں جگہ جگہ نیش و دشا کی محفلیں جلتی جاتی تھیں۔  
ڈھول تاشے بجتے تھے جن کے شور میں کان بڑی آواز  
سنائی نہیں دیتی تھی اور مندر کے اندر کسی قسم کی  
کارروائی کرنے کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت  
مناسب تھا۔

اس وقت غالباً رات کے دس بجے تھے۔ ہم اس  
کے وامن میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں دو روز پہلے  
وقت آرام کیا تھا۔ میں نے ٹھاکر کو وہیں بیٹھے رہنے کو  
چاکی کو ساتھ لے کر اس طرف چل پڑا جہاں اسٹیشن  
اور دو سری گاڑیاں کھڑی تھیں۔

راستے میں ایک جگہ چاکی نے مجھے ہاتھ سے  
روک لیا اور ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ ہم  
میں گزرنے والے پر رقص کی محفل بھی ہوئی تھی۔  
لباس میں دو لڑکیاں اچھل کود کر اپنے جیسوں کو  
کر رہی تھیں۔ شراب لٹھرائی جا رہی تھی اور لوگ  
لڑکیوں پر ٹوٹ نچھاور کر رہے تھے اور عین سامنے  
پانڈے کھڑا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ وہ بھی کالی  
والوں میں سے تھا اور ظاہر ہے وہ بھی پوجا کے لیے  
تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھا۔  
چاکی کے ساتھ ایک طرف ہٹا چلا گیا۔

اسٹیشن دینگن کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا  
بلونت کا آدمی سیٹ پر نیم دراز بیٹھ کر کش لگا رہا تھا۔  
چاکی کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹا چلا گیا اور ایک  
میں رک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ چاکی اسٹیشن

”اس وقت تم نے یہاں مگر غلطی نہیں کی؟“ میں نے  
امبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر انہیں پتا چل گیا تو؟“  
”اسٹیشن پتا نہیں چلے گا۔“ امبر نے میری بات کاٹ دی  
”وہ دونوں مندر میں کھڑے یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج کالی کے  
چرنوں پر دولت کا کتنا بڑا انبار لگتا ہے۔ آج وہ سرا بیلدا ان ہے  
اور دوسرے بیلدا ان پر سب سے زیادہ بیعت دی جاتی ہے۔“  
وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”میں اس لیے آئی ہوں  
کہ تم لوگوں میں سے کسی کو ان کی گاڑی دکھا سکوں۔“  
”چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ میں فوراً ہی تیار  
ہو گیا۔

امبر کے ساتھ باہر نکل کر میں نے اوپر دیکھا۔ بارش  
رات ہی کو کسی وقت رک گئی تھی۔ آسمان پر اب بھی بادلوں  
کے کلوے تیر رہے تھے اور بارش کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔  
امبر مجھ سے تقریباً بیس گز آگے چل رہی تھی۔ اس کا  
رخ اس طرف تھا جہاں ایک پہاڑی کے دامن میں لاتعداد  
گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کے آس پاس پھولداریاں  
اور نیچے بھی لگے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر لگتا تھا  
جیسے رات کی بارش نے سب کچھ ٹپٹ کر دیا ہو۔

امبر سرخ رنگ کی ایک اسٹیشن دینگن کے قریب رک  
گئی۔ فوراً ہی ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر اس کے  
قریب آگیا۔ اس آدمی نے دینگن کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں  
اندر بیٹھ گئے۔ میں ایک گاڑی کی آڑیں کھڑا اس طرف دیکھتا  
رہا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ آدمی امبر کو  
پانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ امبر نے جھٹکا دے کر  
اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی اور اس کی  
طرف ہاتھ ہلا کر قہقہہ لگاتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔

میں نے اسٹیشن دینگن دیکھ لی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا  
امبر کی طرف چلے لگا۔ لوگ ہجوم در ہجوم مختلف جگہوں پر  
کھڑے تھے۔ ڈھول تاشوں کے شور میں کان بڑی آواز سنائی  
نہیں دے رہی تھی۔ میں امبر کے قریب پہنچ کر اس کے ساتھ  
چلے لگا۔

”ان کے پروگرام کے بارے میں تم نے نہیں بتایا؟“  
میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ہم دونوں سادھو  
تھے اور کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

”سوچ ڈوبنے کے تھوڑی دیر بعد پانی کے اس ٹیلے  
نینکر کے قریب ملوں گی۔ ان کا ارادہ رات کے پچھلے پیر  
کارروائی کرنے کا ہے۔ ان کا جو بھی فاسل پروگرام ہوگا،  
تمہیں بتا دوں گی۔“

نگرانی شروع کر دی تھی اور جب تم لوگوں نے پنڈت سوبھراج کو میرے حوالے کیا تو اس نے بتایا کہ تم لوگوں کو تین سادھوؤں کی تلاش ہے۔ اس دوران میں ٹھاکر اور اس کی دوست کو حادثہ پیش آیا اور پھر چند روز بعد میرے ایک آوی نے اطلاع دی کہ تم سادھوؤں کے لباس اور ایسی چیزیں خریدتے پھر رہے ہو جو صرف پنڈتوں اور سادھوؤں ہی کے کام آسکتی ہیں۔ مجھے شبہ ہوا اور میں نے اپنا ایک آوی تم لوگوں کے پیچھے بھی لگا دیا جس نے رپورٹ دی کہ تم لوگ بھی اس طرف آچکے ہو۔

”میں اپنے آدمیوں کو لے کر کل یہاں پہنچ گیا تھا اور اتفاق سے کل ہی میں نے تم لوگوں کو دیکھ لیا تھا مگر جان بوجھ کر قریب نہیں آیا۔ درپودھن اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا واردات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان پنڈت جی کو اعتماد میں لے کر اپنے خدشے کا اظہار کیا اور مندر کو اندر سے بھی دیکھ لیا۔ پچھلے عمار کے اندر وہ خفیہ راستہ بھی میری نظروں میں آگیا۔

”جس وقت درپودھن اور اس کے ساتھی مندر میں داخل ہوئے، میرا ایک آوی وہاں موجود تھا۔ میں اس وقت یہاں سے۔۔۔ کچھ دور اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے مجھ تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا اور جب میں اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچا تو اندر وہ عمار میں فائرنگ شروع ہو چکی تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہاں ایک لڑکی اور ایک پنڈت کی لاش اور یہ پنڈت جی بندھے پڑے تھے۔

”میں نے فوراً ہی اپنے کچھ آدمیوں کو باہر پھاڑی کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہ اوپر جا کر ان کا راستہ روک سکیں مگر میرے آوی غلط راستے پر نکل گئے۔ وہ پھاڑی پر اس راستے سے تقریباً سو گز دور نکلے تھے لیکن انہوں نے دو آدمیوں کو ایک طرف دوڑتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرے آدمیوں نے پیچھا کیا تو انہوں نے فائرنگ شروع کر دی اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، تم لوگ دیکھ چکے ہو۔“ انسپکٹر پانڈے چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”مجھے نہیں معلوم تم لوگ ان سادھوؤں کا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔ ان کی ساتھی لڑکی کی لاش عمار میں پڑی ہے۔ ایک سادھو کی لاش اس طرف ملی ہے۔ میرا سادھو کہاں ہے؟“

”وہ فرار ہو گیا۔“ میں جلدی سے بول پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ٹھاکر دارا کے بارے میں اسے بتا دے۔ دارا بہت عرصے بعد میرے ہاتھ لگا تھا اور میں اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا اور میرا حساب تو بہت لمبا تھا۔

”آؤ۔ ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔ آپ بھی آئیے۔“ انسپکٹر پانڈے نے اس پنڈت سے کہا جسے دارا پانڈے نے باندھ کر ڈالا تھا۔

مندر کے سامنے تو جھوم لگا ہوا تھا لیکن اندر مزید سادھو لباس پولیس والے تھے۔ تمام لوگوں کو باہر نکال دیا تھا۔ دیران عمار میں کالی کی مورچی کچھ اور بھی جیت باقی رہی تھی۔

چوتھے کے پیچھے پہنچتے ہی انسپکٹر پانڈے نے ہار روشن کر لی اور جیسے ہی ہم دوسرے عمار میں مڑے، دروازہ کھلا۔ وہاں اس پجاری کی لاش پڑی ہوئی تھی جسے غار پر داخل ہوتے ہوئے ہم بھی دیکھ چکے تھے۔

”اس پجاری کو یہاں نگرانی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ کوئی غیر متعلق آوی اندر تک نہ جاسکے۔“ انسپکٹر پانڈے نے لاش پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ”درپودھن اور اس کے ساتھیوں نے اندر داخل ہونے کے لیے پہلے اسے کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“

ہم عمار کے اندر آ گئے۔ ”ان پنڈت جی کے کہنے کے مطابق پنڈت آدمی نے ان ڈاکوؤں کے خلاف مزاحمت کی کوشش کی تھی مگر ایک سادھو نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ ڈالا۔ ان پنڈت جی نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا تو انہیں لے کر ڈالا گیا اور سادھو کے لباس میں یہ لڑکی۔“

”یہ اپنے ہی ایک ساتھی کی گولی کا نشانہ بنی تھی۔“ نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے پنڈت جی نے میری آنکھوں پر سر ہلادیا۔

”پنڈت جی تم لوگوں کے بے حد شکر گزار ہیں۔“ پانڈے بولا ”تم لوگوں کی مداخلت سے سمیٹ میں ملایا۔“ خزانہ لٹنے سے بچ گیا۔

پنڈت جی نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔ ”ایک بات اور انسپکٹر۔“ میں نے کہا ”تم اس علاقے کی تحقیقات کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ کسی انجھن میں نہیں پہنچتا تھا۔

”کیسی تحقیقات؟“ انسپکٹر پانڈے بولا ”سرکار کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کوئی میلہ لگا ہے اور کالی کے پنڈتوں میں انسانوں کی سمیٹ دی جاتی ہے۔ یہاں نہ کوئی میلہ ہے نہ کوئی لڑکی ہوئی ہے۔ پولیس اور سرکار اس سے بالکل لاعلم ہے۔“

میرے منہ سے بے اختیار مگر سانس نکل گیا۔

”تحقیقات کا مطلب یہ ہوتا کہ کالی کے چرنوں پر دی جانے والی انسانی سمیٹ کو بھی سامنے لایا جاتا۔ اب تک دو انسانوں کی سمیٹ دی جا چکی تھی اور قانون کی نظروں میں یہ بھی قتل تھا۔ بات سامنے آنے سے ہو سکتا تھا کسی قسم کے ہنگامے شروع ہوجائے اس لیے قانون کا ان واقعات سے لاعلم رہنا ہی بہتر تھا۔“

”تو پھر ان لاشوں کا کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میلوں ٹھیلوں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“ انسپکٹر پانڈے نے کہا ”کوئی تیار ہو کر مر جاتا ہے۔ کوئی کسی کی دشمنی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ لوگ کسی معمولی بات پر آپس میں بھی لڑ پڑتے ہیں جس کا نتیجہ کسی ایک کی موت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اور ان پھاڑیوں کے پیچھے ایک شمشان گھاٹ بھی ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا ”یہی لاشوں کو اس شمشان گھاٹ میں لے جا کر ان کا کیرا کرم کر دیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے اپنے بندے یہاں گزر جاتے ہیں وہ لاشوں کو ساتھ نہیں لے جاتے۔ یہی پران کا کیرا کرم کر دیتے ہیں اور ان کے نام کی پوجا بھی ہو جاتی ہے اور یہ لوگ تو دیسے بھی لاوارث تھے۔ انڈیا ڈی حاصل کرنے کا دعوے دار کوئی نہیں ہے۔“

”لیکن یہ پنڈت؟“ میں نے پنڈت کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”پنڈت جی کے وارث ہم ہیں نا۔ ان کا کیرا کرم ہم کریں گے۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔

میل سمجھ گیا کہ انسپکٹر پانڈے یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں جہاں کچھ قتل ہوئے تھے ان کی ہوا بھی ان پھاڑیوں سے باہر نکلتی اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس میلے میں شریک کوئی نہیں ان پھاڑیوں سے باہر جا کر کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں کرے گا۔

انسپکٹر پانڈے نے اپنے کچھ آوی اندر بلا لیے جولا میں اٹھا کر باہر لے گئے۔

”ہاں پنڈت جی۔“ انسپکٹر پانڈے اب پنڈت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”آپ کے حساب میں یہ سارا مال ختمے کا ہو گا؟“ ”ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہم کسی حساب لگا رہے تھے۔“ پنڈت نے جواب دیا ”ختمے تک ہم نے جو نقد رقم گنی وہ ساڑھے بارہ لاکھ کے قریب تھی۔ اس کے بعد بھی نقد رقم ان کی جیبوں میں ہی نہیں تھی اور یہ زیور اور سونے کی مالیتیں میرا خیال ہے یہ سونا چندہ کلو سے زیادہ ہو گا۔ انڈیا ڈی حاصل کرنے کا بھڑا ہے اس سے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“

”بہت قیمتی خزانہ ہے یہ اور آپ لوگوں نے اس کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا۔“ انسپکٹر نے کہا ”اسی لیے ان لوگوں کو اندر آنے کا موقع مل گیا مگر بھگوان کی کیا (مہمانی) اور کالی ماں کے چنگار (جبرہہ کرشمہ) سے سب کچھ بچ گیا لیکن اب کسی اور کو ایسا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”میرے دو آدمی یہاں رہیں گے اس عمار کے اندر۔ دو کالی ماں کی مورچی والے چوتھے کے پیچھے اس عمار کے داخلی راستے پر اور دو پھاڑی کے اوپر جہاں باہر نکلنے کا راستہ ہے اور باقی چار آوی مندر کے سامنے رہیں گے۔“

”دو (بھنے بادہ) (شکر)۔“ پنڈت نے ہاتھ جوڑ دیے ”بڑی کیا ہے آپ کی مہاراج۔ میں صبح سارے پنڈتوں کو جمع کر کے اس کی سرکشا (دیکھ بھال۔ حفاظت) کا بندوبست کرا دوں گا۔“

”جب تک آپ کا بندوبست نہ ہو یہ بیوک (خدمت گار) یہاں موجود رہیں گے۔“ انسپکٹر نے پولیس اہل کاروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پنڈت نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم لوگ مندر سے باہر آ گئے۔ انسپکٹر پانڈے تو اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ہم اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔

ہمیں اس عمار تک پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹا لگ گیا۔ غار میں چلنے والی مشعل کی روشنی دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ ٹھاکر آگے تھا اور میں چند قدم پیچھے۔ ٹھاکر اوپر پہنچ چکا تھا اور پھر اس کی چیخ سن کر مجھے اپنا دل کنٹینوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ غار کے دہانے کے سامنے پہنچ کر میں اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

دارا غائب تھا اور جاگی غار کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مشعل کی روشنی میں اس کے سر کے پاس زمین پر خون بھی نظر آ رہا تھا۔

مجھے سچے میں اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں غار کے دہانے پر کھڑا غار کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی جاگی کو دیکھتا رہ گیا۔

اس صورت حال نے مجھے حیرت مند ہوا اس کردار تھا۔  
میں غار کے دہانے پر کھڑا پچی پچی سی نظروں سے فرش  
پر بڑی ہوئی بے حس و حرکت جاکلی کو دیکھ رہا تھا۔ مشعل کی  
نکلیاں زور روشنی میں یہ منظر بڑا خوفناک تاثر دے رہا تھا۔  
قریب کھڑے ہوئے ٹھاکر نے میرے بازو کو چھوا تو میں جیسے  
ہوش میں آگیا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی  
لمحے چلا نکال کر جاکلی کے قریب پہنچ گیا۔  
جاگلی کے سر کے قریب زمین پر خون کا ایک چھوٹا سا  
تالاب بن گیا تھا۔ اس کے بال "ایک کان اور گردن بھی خون  
آلود تھی۔" آنکھیں بند تھیں اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ  
سے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ میں ایک کھٹنا زمین پر ٹھاکر  
اس کے قریب بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔  
زیر و مہتاب ہاتھ کا وہ زندہ تھی۔  
"ٹھاکر!" میں یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا  
ہو گیا "تم اسے دیکھو، ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔" میں  
اس محدود کو دیکھتا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔  
میں نے ایک طرف پڑے ہوئے خیلے میں سے ٹارچ  
نکالی لی اور غار سے باہر نکل آیا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں  
تقریباً دوڑتے ہوئے اس تنگ سے راستے سے نیچے آگیا جس  
سے ہم اوپر گئے تھے۔  
پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر میں رک گیا اور ابھر اُدھر  
دیکھتے ہوئے سوئے لگا کہ ایک لنگڑا آدمی اپنی جان بچانے کے  
لیے کتنی دور اور گرس طرف جاسکتا ہے۔  
میدان کی طرف جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔  
اس طرف لوگوں کی اپڈل جگہ ہوئی تھی۔ اگر وہ لنگڑا تو ہوا  
اس طرف جاتا تو دوسروں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ اس میں  
شبہ نہیں کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت تھی لیکن زخمی حالت  
میں مدد کے لیے کسی کے پاس جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ خود  
پھنس جاتا۔ وہ اس طرف نہیں جاسکتا تھا۔ اسے ان پہاڑیوں  
کے کسی غار ہی میں پہنچا لیا جاسکتا تھا۔  
میں میدان کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں  
دوڑا اور ٹارچ کی روشنی میں ابھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دار اور  
جاگلی کو اس غار میں چھوڑ کر جانے کے بعد ہمیں واپسی میں دو  
گھنٹے لگے تھے لیکن یہ واقعہ ہمارے جانے کے فوراً ہی بعد  
پیش نہیں آیا ہوگا۔ جاگلی کے سر کے قریب زمین پر جمع خون  
تازہ تھا۔ اگر اس کے سر پر دو گھنٹے پہلے ضرب لگائی گئی ہوتی تو  
خون جم چکا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ میں پچیس منٹ "اور  
میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں پچیس منٹ میں

دارا کتنی دور جاسکتا ہے۔  
میں تقریباً آدھے گھنٹے تک اس پاس کی پہاڑیوں پر  
اسے تلاش کرتا رہا لیکن اس سے کچھ نہیں چلا۔ رات  
اندھیرے میں ان پہاڑیوں میں کسی کو تلاش کرنا  
نہیں تھا۔ دوسری طرف مجھے جاگلی کا بھی خیال تھا۔ میں  
کی تلاش ترک کر کے اس غار میں واپس آگیا۔  
جاگلی ہوش میں آچکی تھی اور ٹھاکر نے ایک خیل  
سے کھڑا نکال کر اس کے سر پر پتی باندھ دی تھی۔ جاگلی  
سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور  
گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ آواز سن کر اس نے  
آنکھیں کھول دیں۔ ٹھاکر بھی سوالیہ نگاہوں سے میری طرف  
دیکھنے لگا۔  
"رات کے اندھیرے میں ان پہاڑیوں میں اسے  
کرنا ممکن نہیں" میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
"خلعت سمجھو اس پر" ٹھاکر بولا "جاگلی کے سر پر  
شدید ہے۔ خون بہتا اگرچہ بند ہو گیا ہے لیکن اسے فوراً  
امداد کی ضرورت ہے۔ میدان میں دو تین بجوں پر میدان  
کیمپ بھی ہیں۔ اسے وہاں لے کر چلو۔"  
"پنا سامان سمیٹو اور یہ ٹارچ سمیٹو۔ میں جاگلی کو  
ہوں" میں نے یہ کہتے ہوئے ٹارچ ٹھاکر کی طرف بڑھا دی۔  
ٹھاکر تھملا سمیٹنے لگا۔ میں نے جبکہ کر جاگلی کو اٹھایا  
اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی اور اس کا جسم اُپ  
ڈھیلارہ گیا تھا۔  
میں ٹھاکر کے پیچھے ٹارچ کی روشنی میں تنگ سے تنگ  
راستے پر پیر رہت جانے سے دو مرتبہ گرتے گرتے پنا  
ہوا اور جگہ پر آتے ہی میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔  
میدان میں اب بھی جگہ جگہ شعلیں روشن تھیں  
مختلف سمتوں سے موسیقی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔  
لوگ بھول گئے تھے کہ چند گھنٹے پہلے یہاں چھ قتل ہوئے تھے۔  
"تم یہاں روکو۔" میں اس طرف دیکھتا ہوں "ٹھاکر  
مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔" اس طرف میں نے منع ایک  
دیکھا تھا۔ میں جا کر معلوم کرتا ہوں۔  
"رکنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی تمہارے ساتھ  
چلتے ہیں۔ کسی سے معلوم کر لیں گے" میں نے جواب  
ٹھاکر کے پیچھے پیچھے چلا رہا۔  
بالآخر ہم اس پھولدار اری کے پاس پہنچ گئے جس کے  
ایک پاس پر ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی سرخ  
والا سفید جھنڈا لگا ہوا تھا۔ پھولدار اری کافی کشادہ تھی۔

میں اس جگہ والے چار سنگل بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بیٹہ پر  
ایک سادھو شرم کا آدمی کوٹ کے بنی لیٹا بیڑی کے کش لگا رہا  
تھا۔ باقی تین بیٹے خالی تھے۔ پھولدار اری کے اندر کی طرف  
شروع ہی میں ایک چھوٹی میز تھی اور دونوں طرف کرسیوں پر  
بیٹھے ہوئے دو آدمی آتش کھیل رہے تھے۔ میز کی دوسری  
طرف کڑی کا ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔  
میں نے جاگلی کو ایک بیٹہ پر ڈال دیا۔ ان دونوں آدمیوں  
نے ہماری طرف دیکھا اور دونوں میں سے کسی نے بھی آتش  
کے پتے ہاتھ سے نہیں چھوڑے تھے۔ ویسے محل صورت  
سے ان دونوں میں سے کوئی بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔  
"تم میں ڈاکٹر کون ہے؟" ٹھاکر نے انہیں گھورتے  
ہوئے کہا۔  
"ڈاکٹر تو ادھر بجا رکھا رہا ہے۔ ہم تو انہیں اس کرنے کے  
لے اور بیٹھے تھے۔ ویسے چھوڑی کو کیا ہوا ہے؟" ان میں  
سے ایک نے پوچھا۔  
"پہاڑی سے گر گئی تھی۔ سر میں چوٹ لگی ہے" ٹھاکر  
نے جواب دیا۔  
"روٹی ہم کو چڑھا جاتا ہے" دوسرا آدمی بولا "ایسا کیوں  
نہیں بولا کہ چھوڑی کو پکار لے کیا تھا اور؟"  
اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹھاکر کا زوردار  
مکھنا اس کے جڑے پر لگا اور وہ چیختا ہوا کرسی سمیت پیچھے  
اٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ایک نیا ہنگامہ شروع  
ہو جائے گا اور میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو اس ہنگامے سے  
نور آگنا ہونے کے لیے تیار کر لیا تھا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔  
مکھنا کھانے والا اٹھ کر وہاں سے اس طرح بھاگا تھا جیسے  
ایک لمبے کی بھی تاخیر ہوئی تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔  
"دوسرا آدمی بھی بدحواس ہو کر اٹھ گیا تھا۔ اس نے  
اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آتش کے پتے بھی نیچے پھینک  
دیا۔  
"شانتی۔ شانتی مہاشے جی!" وہ فوراً ہی بول پڑا "وہ  
آپ کو چاہا ہے۔ اچھا ہوا آپ نے اسے ایک ہاتھ بڑھ دیا۔  
آپ ادھر بیٹھو۔ میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔" اس نے جلدی  
سے اٹھی ہوئی کرسی بھی سیدھی کڑی۔  
"جلدی سے بلا کر لاؤ۔ کہاں ہے ڈاکٹر؟" ٹھاکر کے حلق  
سے غزب ہوتی گئی۔  
"وہ آدمی فوراً ہی پھولدار اری سے نکل کر ایک طرف  
ڈوڑا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے  
تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک

ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جس نے سفید دھوٹی اور زرد رنگ کا کرتہ  
پہن رکھا تھا۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی ایک مالا بھی  
تھی۔ ہاتھ پر سرخ ٹیکا بھی لگا ہوا تھا اور اگرچہ نکلیں شیو تھا  
لیکن غالباً دو دن سے شیو نہیں بنایا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ  
اٹھا کر ہمیں پر نام کیا اور فوراً ہی جاگلی کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
اس نے کرتے کی جب سے چابیوں کا چھانکا نکال کر ایک  
چابی منتخب کر کے کڑی کے صندوق کا تالا کھولا اور صندوق  
میں سے کچھ چیزیں نکال کر میز پر رکھنے لگا۔  
سب سے پہلے اس نے قیمتی اٹھا کر جاگلی کے بچہ پال  
کاٹ دیا۔ بائیں کان سے تقریباً دو انچ اونچ ڈیڑھ انچ لمبا  
زخم لگا تھا۔  
"لگتا ہے کسی تیز دھار چیز سے ضرب لگائی گئی ہے۔  
بالوں نے پھانسیا لیکن پھر بھی گھاؤ خاصا گہرا ہے" ڈاکٹر زخم کا  
معائنہ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ "میں تو تین صرف فرسٹ  
ایڈی دے سکتا ہوں۔ گھاؤ پر ٹانگے لگیں گے اور اسے فوری  
طور پر شمر کے اسپتال لے جانا ہوگا۔"  
میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان تو پہلے ہی تھا۔  
آنکھوں میں مزید تشویش ابھرتی۔ شرجانے کے لیے ہمارے  
پاس کوئی سواہی نہیں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں انسپکٹر  
و نوڈ پانڈے کا خیال ابھر آیا۔  
"ٹھاکر ہے ڈاکٹر۔ تم اس وقت ہماری جو بھی مدد کر سکتے  
ہو، ضرور کرو" میں نے کہا "اور ٹھاکر، تم یہیں روکو۔ میں ابھی  
آتا ہوں۔"  
میں پھولدار اری سے نکل کر اندر کی طرف بھاگنے لگا۔  
مجھے یقین تھا کہ انسپکٹر پانڈے مندر ہی میں ہوگا اور وہ ہماری  
مدد ضرور کرے گا۔  
مندر میں یا تریوں کا رش تھا۔ موسیقی کی آوازیوں کے  
ساتھ کالی کے بچن گانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی  
تھیں۔ یا تریوں کے اس جھوم میں انسپکٹر پانڈے کو تلاش  
کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔  
"میری دوست پہاڑی سے گر گئی تھی" اسے سر پر شدید  
چوٹ آئی ہے" میں نے اس کا سامنا ہوتے ہی کہا "ہمیں اس  
وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"  
"مجھ سے جو ہو سکے گا کروں گا۔ کو" میں تمہاری کیا سیوا  
کر سکتا ہوں۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔  
"جاگلی کو شمر لے جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت  
ہے" میں نے کہا۔ "اگر اسے فوری طور پر اسپتال نہ لے جایا  
گیا تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔"

”کہاں ہے وہ“ چلو میرے ساتھ!“ انسپکٹر پانڈے نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے اپنے ایک آدمی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم میڈیکل کیمپ والی پھولداراری میں پہنچے تو ڈاکٹر جاگی کے زخم کی ڈرننگ کرچکا تھا۔ انسپکٹر پانڈے نے ڈاکٹر سے ایک دو باتیں کیں اور پھر اپنے آدمی کو گاڑی لینے کے لیے بھیج دیا۔

پانچ منٹ بعد پولیس کی جیپ پھولداراری کے پاس آکر رکی۔

”تم لوگ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں مندر میں جا کر پراثر تھا کرتا ہوں کہ دیوی جی جلدی اچھی ہو جائیں“ انسپکٹر پانڈے نے کہا۔

جاگی اس وقت ہوش میں تھی۔ اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر انسپکٹر پانڈے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے جاگی کو گود میں اٹھا کر جیپ کی پیچلی سیٹ پر لٹایا اور خود اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور ہر طرف ریت اڑ رہی تھی۔ دوسروں کا حلیہ دیکھ کر میں اپنے بارے میں بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔

میدان سے نکل کر پہاڑی کی دوسری طرف آتے ہی جیپ کی رفتار تیز ہو گئی۔ جیپ کو لٹنے والے جھٹکوں سے جاگی کراہ اٹھی۔ اس کے لیے سیٹ پر سر رکنا ممکن نہیں تھا۔ میں جاگی کی سیٹ پر اٹھا اور اس کا سر اپنی گود میں... رکھ لیا تاکہ اسے کم سے کم جھٹکے لگ سکیں۔

پہاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر آتے ہی جیپ طوفانی رفتار سے سارنگ کی طرف دوڑنے لگی۔ وہ پولیس کا ڈرائیور تھا اور اس قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت سڑک سنسان تھی اور اسے تیز رفتار میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

ہم آدھے وقت میں سارنگ پہنچ گئے۔ جیپ اسپتال کے سامنے پہنچ کر رکی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ڈاکٹر کو بھی کمرے بلانا پڑا تھا۔ ٹھاکر روپ متی اور بللا کو بھی اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا کیونکہ وہ اس وقت سو رہی تھیں اور انہیں ڈسرب کرنا مناسب نہیں تھا۔

ایک گھنٹے میں ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہوا۔ جاگی کے زخم پر سات ٹانگے لگے تھے اسے آنکھیں بھی لگا دیا گیا تھا اور وہ نیند میں چل گئی تھی۔ میں اور ٹھاکر امیر جی روم کے

باہر راداری میں بیڑی ہوئی بیچوں پر لیٹ گئے۔ مجھے اندر کے اس مذاق پر بھی آ رہی تھی۔ ہمارے پر پوار کے پاس اس اسپتال میں داخل تھے۔ ہم دارا اور بلونت سنگھ کی باتیں میں یہاں آئے تھے اور یہ مہم ہمارے لیے بڑی مشکل ہوئی تھی۔

ٹھاکر تو بیچ پر لیٹے کے تھوڑی ہی دیر بعد سو گیا تو دارا

جاگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں دارا کو سمجھنے میں بار پھر غلطی کر گیا تھا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ توڑی اور میرا خیال تھا کہ جاگی اسے کوئی حرکت نہیں کرے گی لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا تھا۔ اگر ہمیں میں واپس بیچنے میں مزید دیر ہو جاتی تو جاگی ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ تو جاگی کے ہوش میں آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ دارا نے اسے کس طرح زخمی کیا تھا اور وہ کس طرح اسے بھاگا تھا؟ میں کسی سبب کچھ سوچتے ہوئے سو گیا۔

صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اسپتال میں لوگوں آمدورفت شروع ہو گئی۔ ہمیں بھی اٹھ جانا پڑا۔ میں امیر جی روم میں جا کر دیکھا، جاگی بھی جاگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زروئی کھنڈری تھی۔ مجھے دیکھ کر اس ہونٹوں پر ہریت خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

”کیسی ہو؟“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہوئے پوچھا۔

جاگی پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ اسی وقت ایک نر کمرے میں داخل ہوئی اور فیر پچر لینے کے لیے اس تھراپیٹر جاگی کے منہ میں ڈال دیا۔ چند منٹ بعد نرس جانے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔

”اب مریض کی کیفیت کیا ہے؟“

”زیادہ ترقی نہیں کی بات تو نہیں ہے۔ گھاؤ ٹھیک“ میں چند روز تو لگیں گے۔“ نرس نے جواب دیا۔

”ڈاکٹر کس وقت آئے گا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”آٹھ بجے!“ نرس نے جواب دیا۔

”کیا یہ یہیں رہے گی؟“ میں نے جاگی کی طرف دیکھا۔

”کوئی کرا خالی نہیں ہے۔ انہیں تھوڑی دیر بعد

میں منتقل کر دیا جائے گا۔“ نرس نے جواب دیا۔

دارا کی حالت میں چند روز پہلے دیکھ چکا تھا۔ اپنا ماحول تو ویسے ہی وحشت ناک ہوتا ہے لیکن سرجنوں میں تو داخل ہوتے ہی کراہیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ”ہماری ایک اور مریض بھی اس اسپتال میں

میں نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اسے بھی دارا کے بجائے اسی کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔“

نرس میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ ”ایک نہیں۔ آپ نے تو کئی مریض ہیں اس اسپتال میں۔ میں سسٹر سے بات کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا تو انہیں اسی کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔“

میں نرس کے ساتھ ہی امیر جی روم سے باہر آ گیا۔ باہر کی راداری میں نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب متی والے کمرے میں چلا گیا ہوگا۔ میں اس طرف

لے کے لیے دوسری راداری میں حڑا تو سامنے سے آئی۔ آئی بلال مجھے دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ برتن

دارا روہ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف جا رہی تھی۔

”رے بہت سنگھ“ اس کے لیے میں حیرت تھی ”یہ کیا

کار کا ہے۔ واپس کب آئے“ جاگی اور ٹھاکر کہاں

”جاگی تو ادھر ہی ہے اور میں ٹھاکر کے بارے میں تم

دریافت کرنے والا تھا۔ کیا وہ تمہارے کمرے میں نہیں

”میں نے پوچھا۔

”نہیں“ ٹھاکر گئی ”ادھر تو نہیں ہیں اور جاگی دیدی کہاں

”اس نے پوچھا۔

”وہ بات دراصل یہ ہے کہ۔“ میں اسے بتاتے ہوئے

”ہاتھ“ جاگی زخمی ہے اور امیر جی روم میں بیڑی ہے۔

لوگ رات کو یہاں آ گئے تھے۔“

”کیا ہوا جاگی دیدی کو؟“ بللا کا چہرہ ایک دم دھواں

”یوگ۔“

”سب کچھ لگ گئی تھی۔ اب کچھ بہتر ہے اور روپ

”کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے سے بہت اچھی ہیں۔ جاگی دیدی کو کیا ہوا، کیسے

زخمی ہوئی وہ؟“

”پہاڑی کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں اسے روپ

ہاتھ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ میں اسی طرف

”میں نے پوچھا۔

”میں نے پوچھا۔

”میں نے پوچھا۔

”میں نے پوچھا۔

”میں نے پوچھا۔

طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں ہوا“ بس یوں لگتا ہے جیسے تم کسی کھدائی سے برآمد ہوئے ہو۔“ یہ جملہ روپ متی کے بجائے بللا نے کہا تھا۔

ہم تین دن ریگستانی پہاڑیوں میں رہے تھے جہاں ہر وقت ریت اڑتی رہتی تھی اور ان تین دنوں میں ہمیں نماے کا تو کیا، منہ دھونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اپنے کپڑوں کو دیکھ کر میں اپنی حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا اور پھر میں نے ٹھاکر اور دوسرے لوگوں کو بھی دیکھا تھا۔ بللا نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں یقیناً ایسا لگ رہا ہوں گا جیسے کسی کھدائی سے برآمد ہوا ہوں۔

میں نے روپ متی کو جاگی کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے پر بھی افسردگی سی چھا گئی۔ بللا تو بہت مضطرب ہو رہی تھی۔ وہ جاگی سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔ اس کی بے گلی دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ جلد سے جلد جاگی کے پاس جانا چاہتی تھی۔

میں روپ متی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی آ گیا اور اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی کہ صبح ہوتے ہی ٹھاکر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ صبح اٹھتے ہی مٹ پر چلا گیا تھا۔ بللا کو مٹ سے اسپتال منتقل کرنے کے بعد اس روز جب ہم میلے کے لیے روانہ ہونے لگے تھے تو مٹ کی چایاں ایسی جگہ پر رکھ دی گئی تھیں کہ بعد میں اگر بللا کو بھی وہاں جانا ہوتا تو اسے پریشانی نہ ہوتی اور ٹھاکر صبح اٹھتے ہی وہاں چلا گیا تھا اور نہادھو کر بالکل فریش ہو کر آیا تھا۔

ہم پانچ گھنٹے کے بعد روپ متی سے کمرے سے نکل گئی تھی اور پھر پندرہ میں منٹ بعد باہر سے کسی نے کمرے کا دروازہ پوری طرح کھول دیا اور دو دروازہ اشریچ کو کھولنے ہوئے اندر لے آئے۔ باہر کھڑی ہوئی بللا تیزی سے آگے آگئی اور نرس کے ساتھ مل کر جاگی کو خالی بیڈ پر منتقل کر دیا۔ دارا و نر خالی اشریچ کو کھولنے ہوئے باہر لے گئے۔

”اب میں چائے بنا کر لاتی ہوں“ بللا نے ایک طرف میز پر رکھے ہوئے برتن اٹھا لیے اور مسکراتے ہوئے باہر چل گئی۔ جب تک اس نے جاگی کو نہیں دیکھا تھا، بہت بے چین رہی تھی اور اب وہ قدرے مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ روپ متی اور جاگی کو اس نے سہارا دے کر بٹھا دیا اور چائے کے کپ ان کے ہاتھوں میں تھا کہ خود بھی جاگی کے بیڈ پر آتی پالتی مار کر بیٹھ



گئی۔ کیا اب تم بات کر سکتی ہو۔ جمیں بولنے میں تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے جاگی کی طرف دیکھا۔

”ہاں، زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی، جاگی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر شروع ہو جاؤ“ میں نے کہا ”دارا تو بے ہوش تھا اور میں نے اس کی ایک ٹانگ بھی توڑ دی تھی۔ وہ تمہیں زخمی کو کے کیسے فرار ہو گیا؟“

”میں غار کے دہانے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرا رخ باہر کی طرف تھا، جاگی نے کتنا شروع کیا۔ اس دوران میں میں نے کئی بار مرکز دارا کی طرف دیکھا تھا۔ ذرا بڑھ کتنا گزر گیا۔ وہ مسلسل بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ ختم ہی تو نہیں ہو گیا۔ یہی سوچ کر میں اسے دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ میں نے اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کے لیے جیسے ہی اس کے سینے پر ہاتھ رکھا، اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ میں اس کے اوپر سے قلابازی کھاتے ہوئے دوسری طرف گری۔ میرے سینے سے پہلے یہ وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تمہارا دیا ہوا پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر کے قریب سے گزر گئی۔ دارا نے مجھے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے میری کلائی پر کھڑی پستیلی کاؤا کر کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر گر گیا۔

”دارا نے پستول اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے پستول کو ٹھوکر مار کر اسے دارا کی پہنچ سے دور کر دیا۔ دارا نے میرا گلا دوپٹ لیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے غار کے دہانے کے قریب آ گئے۔ اس دوران میں میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک ٹانگ کو زیادہ حرکت دے رہا تھا۔ میں نے اس کی مضبوط ٹانگ پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ دارا چیخ اٹھا۔ اس نے دوسری ٹانگ سے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں سینے کی کوشش کر رہی تھی کہ دارا ایک پتھر اٹھا کر حملہ آور ہوا۔ میں نے پہنچے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ پتھر میرے سر پر لگا۔ میں لڑکھڑکھ کر پست کے مل گری۔ میری آنکھوں کے سامنے پہلے تو نیکی پہلی چنگاریاں بجتی رہیں اور پھر چھوڑ دہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگی پھر بولی ”کہاں گیا وہ۔ کچھ پتا چلا اس کا؟“

”نہیں“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”اسے مجھے میں ایک

بار پھر مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ لنگڑا ہونے کے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پہاڑیوں میں غار کے سر حال، ہم وقت پر واپس پہنچ گئے تھے اور ہمیں اسٹین پائپر ہمارے کام آ گیا۔ اگر اس کی سہولت ہمیں یہاں لانے میں بڑی مشکل ہوئی۔

”اسٹین پائپر سے ملاقات ہوگی تو میں ذرا شکر یہ ادا کروں گی۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ“ جاگی نے کہا ”آج وہاں کالی کی پوجا کا آخری دن ہے۔ میرا کہ دوپہر تک وہ بھی واپس آجائے گا“ میں نے جواب چائے پینے کے بعد میں ہٹ کی طرف جانے لگا۔ میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ وہ بھی تین دنوں ہی میں رہ رہی تھی۔ اسے اپنے کپڑے وغیرہ لینے اور کام بھی تھا۔ اس نے ملے پڑے اور فالتو چیزیں ڈال لیں اور ہم دونوں اسپتال سے باہر آ گئے۔ اسپتال کے گیٹ سے نکلتے ہی ہمیں اتور کشال نے چند منٹ میں ہمیں ہماری منزل پر پہنچا دیا۔ چابیوں کا پچھا ہٹ کے برآمدے میں ایک بندہ پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چابیاں اٹھا کر دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہو گئے میں نے فوراً ہی اپنے کمرے میں دروازہ بند کر لیا۔ ہاتھ روم میں آکر آئینے میں اپنے جائزہ لیا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ واقعی رہا تھا جیسے کسی کھدائی سے برآمد ہوا ہوں۔

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی اپنے کمرے سے اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہکا بھکا محسوس کر رہی تھی۔ دروازہ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں پانی کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا اور ایک صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اب تک باپسیاں ہی آئی تھیں۔ دارا ایک بار پھر ہاتھ ٹکر نکل گیا تھا۔ آئے کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ روپ متی کو اس کے بلونت سکھ سے نجات مل گئی تھی لیکن میرا دل میں کچ نکلا تھا۔ ہندوستان میں اسے بلونت سکھ سے کون کون سے فرق نہیں پڑتا۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کئی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ دارا بہت چالاک اور عیار آدمی تھا۔ اس میں ٹائیگر اور پیڈو جیسے بد معاشوں کو اپنا چلن پھیلانے اور چچی فاک جیسے گینگسٹر اس کے اشاروں پر جانے

تھے ہندوستان کے پنڈت اور غنڈے تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے۔ دارا ان سے کام لینے کا گڑ جانتا تھا۔ ایک پنڈت سکھ مرگیا تو کیا ہوا۔ اسے تو قدم قدم پر بلونت سکھ جیسے لوگ مل جاتے تھے۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ سن کر میرے خیالات منتشر ہو گئے میں نے گردن جھکا کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر قلع میں آ گیا اور میں اپنے آپ کو کھنکھراتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وہ بلا تھی ”اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ بلا کو میں نے پہلے ہی کئی مرتبہ نیم عاں لباس میں دیکھا تھا“ اس وقت اس نے جو نہایت مختصر سلاساں پہن رکھا تھا وہ میری نگاہ میں نہیں آ سکا تھا البتہ اسے دیکھ کر میں کچھ دیر کے لیے تواسن لینا ہی بھول گیا تھا۔

وہ بہت حسین تھی۔ نرم و نازک کوئل سی قدرت کے ہاتھوں بہت احتیاط سے تراشا ہوا بدن اور رنگت ایسی جیسے میوے میں گلابی رنگ گھول دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں تاروں جیسی چمک اور ہونٹوں پر بڑی دلچسپ سی مسکراہٹ تھی۔

اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی بالٹی تھی جس میں دھلے ہوئے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے بالٹی پھینک رکھ دی۔

”بہت شکریہ“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”تھوڑی سی مدت کو اور یہ کپڑے باہر دھوپ میں ڈال دو۔“

میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر ایک دم اچھل پڑا اور اس کی طرف سے نظرس چراگنے کی کوشش کرنے ہوئے بالٹی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

باہر کپڑے سکھانے کے لیے کوئی رسی وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے تمام کپڑے لان میں گھاس پر پھیلا دیے۔ ان میں ہلا کے اپنے کپڑے بھی تھے اور روپ متی کے بھی۔ میں خالی بالٹی لے کر اندر آیا تو بلا اپنے کمرے میں جا چکی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بالٹی دروازے کے اندر کی طرف رکھ دی اور واپس آکر صوفے پر لیٹ گیا۔

میں نے کچھ کی وہ رات یاد تھی جو ہم نے ایک غار میں گزار دی تھی۔ بلا نے اس رات آپے سے باہر ہونے کی کوشش کی تھی۔ شاید یہ بھی ہمک جانا لیکن میں نے بڑی مہارت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اسے بھی دلدل میں گرے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد کمر میں جاگی اور روپ متی کی موجودگی میں بلا کو کبھی ایسی کوئی حرکت کرنے کا موقع

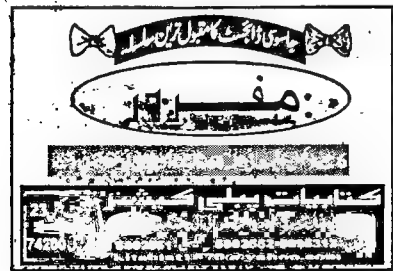
نہیں ملا تھا اور آج اسے کچھ آزادی مل گئی تھی۔

بلا بہت مصوم لڑکی تھی۔ جسمانی طور پر تو وہ ایک بھرپور جوان لڑکی تھی لیکن ابھی اسے اتنا شعور حاصل نہیں ہوا تھا کہ اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتی۔ وہ زندگی کو ایک کھیل سمجھ کر اس سے کھیلنا چاہتی تھی اور وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ ایسا کھیل شروع ہو جائے تو اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔

لینے لینے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چھپتی رات بھاگ دوڑ میں مگر زخمی تھی اور میں ایک منٹ کو بھی نہیں سو سکا تھا اور پھر صبح پانچ بجے میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو نظر سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پورا دن سوئے میں گزر گیا تھا۔

ہم ہٹ سے نکلے تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سڑک پر آتے ہی ہمیں آنور کشال گیا اور ہم چند منٹ میں اسپتال پہنچ گئے، کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ اسٹین پائپر جارحی داس اور اسے اپنی بھنڈاری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے لیکن تھے تو بہر حال پولیس آفیسر۔ انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا جھکا تھا اور میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ لوگ جاگی کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں ہم نے اسٹین پائپر کو یہی بتایا تھا کہ جاگی پہاڑی سے گر گئی تھی اور پتھر لگنے سے سر پرچٹ گئی تھی اور یہاں اسپتال میں بھی یہی کہانی سنائی تھی۔ پولیس کا ایک آدمی ہی ہمیں اسپتال چھوڑ کر گیا تھا۔ میں تو صبح نو بجے کے قریب بلا کو لے کر چلا گیا تھا اور ممکن ہے بعد میں اسپتال کی انتظامیہ ہی نے پولیس کو اس سلسلے میں اطلاع دی ہو اور شاید یہ دونوں آفیسر اسی سلسلے میں



پوچھ گچھ کے لیے یہاں آئے تھے۔

لیکن میرا ہی خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا تھا۔

”بھنڈاری صاحب ایک بہت دلچسپ خبر لے کر آئے ہیں۔“ ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور میرا خیال ہے وہ خبر گنگولی چوہدری والے کیس کے سلسلے میں ہوگی“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور مجھے اپنی بات پر خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ان دونوں پولیس آفیسروں کو دیکھ کر میں نے گنگولی چوہدری کے بارے میں تو کچھ سوچا بھی نہیں تھا لیکن لاشوں میں وہی ہوئی یہ بات اچانک ہی ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

”گنگولی چوہدری سے بھی زیادہ دلچسپ!“ ٹھاکر بولا۔

”گنگولی چوہدری کے حوالے سے کبھی ایک خبر ہے“

”بھنڈاری نے کہا“ آپ کو یاد ہو گا کہ گنگولی چوہدری کا ایک سا بھئی زخمی ہو کر جنگل میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب ہماری تازہ ترین اطلاع کے مطابق چند روز جنگل میں ایک بھیل قبیلے میں چھپے رہنے کے بعد وہ کوٹ پتلی کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اطلاع یہ ہے کہ وہ اس علاقے کے نائی گرامی ڈاکو چورن سنگھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ پولیس سے گنگولی چوہدری اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لے سکے۔ پولیس کے علاوہ تمہارا نام بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔“

”کیا یہی وہ دلچسپ خبر ہے جسے سنانے کے لیے آپ لوگوں نے یہاں آنے کی زحمت کی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے بھنڈاری اور انسپٹر جارجسنی داس کی طرف دیکھا۔

”نہیں“ وہ دوسری خبر ہے“ ان دونوں کے بجائے ٹھاکر بولا۔

”شاید آپ لوگ مجھے تجسس میں رکھنا چاہتے ہیں“ میں نے کہا۔ میں ان کے ”سہیلی بوجھ پیکلی“ والے اس انداز سے کچھ ابھین سی محسوس کرنے لگا تھا۔

”انسپٹر پانڈے کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کا مال اور نقدی لے کر فرار ہو گیا ہے۔“ ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا! میں اس طرح اچھل پڑا جیسے میرے پیروں کے قریب بم پھٹ پڑا ہو“ تم شاید مذاق کر رہے ہو۔“

”یہ اطلاع مجھے ان پولیس آفیسروں نے دی ہے اور یہ حضرات اس سلسلے میں ہم سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

یہ واقعی مذاق نہیں تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ انسپٹر پانڈے ایک ڈسے وار، فرض شناس اور بڑے آفیسر تھا۔ کئی روز پہلے جب گنگولی چوہدری کی موت یا تریوں کو اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے تو انسپٹر پولیس کی کارروائی میں پیش پیش رہا تھا اور پھر پولیس یارڈی بھی وہی لے کر جنگل میں گیا تھا۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا قلع قمع کرنے میں اس نے کارروار ادا کیا تھا۔ آخری دن جب گنگولی چوہدری سے فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی تو وہ انسپٹر پانڈے کی قریب عین وقت پر وہاں پہنچ کر میری جان بچائی تھی۔ میں زندگی کے نازک اور سنگین ترین لمحات سے دوچار تھا۔ پانڈے ہی نے میری مدد کی تھی ورنہ شاید گنگولی چوہدری بجائے میری لاش جنگل میں پڑی مڑی ہوئی۔

انسپٹر پانڈے جنگل میں دو دن ہمارے ساتھ جنگل میں گزارے گئے ان دونوں کے دوران میں ہم نیم عریاں لباس میں رہی تھی مگر انسپٹر پانڈے کی شراعتنا یہ تھی کہ اس نے بھی نظر بھر کر بھی ہلا کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر چند روز پہلے جب ٹھاکر اور دوپ کا ایکسپریٹ ہوا تھا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی وہاں بیچانے میں بھی اس نے اہم ردول ادا کیا تھا۔ ٹھاکر کی جان بچانے کے لیے اسپتال میں لوگوں سے خون قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ لوگ سامنے میری اپیل بھی بے اثر ثابت ہوئی تھی اور پھر پانڈے ہی تھا جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو بتایا تو میں ہوں جس نے ان لوگوں کو گنگولی چوہدری سے نجات دلائی تھی۔ میں اگر کسی بات کھتا تو شاید اتنا اثر نہ ہوتا یا لوگ یقین ہی نہ کرتے لیکن انسپٹر کے الفاظ نے انہیں سمجھو ڈر رکھ دیا تھا اور لوگ خون کے لیے لاش میں لگ گئے تھے اور کل رات ہی قیامت کہ اس نے جاگتی حالت دیکھ کر ہمیں آدمی رات وقت اپنی جیب پر شریچھنے کا بندوبست کیا تھا۔ اگر وہ زندہ نہ کرتا تو جاگتی حالت بڑجاتی۔

ایک فرض شناس ڈسے وار اور شریف پولیس یہ اس قسم کا دوسرا آدمی تھا جو میری نظروں میں سنگاپور میں انسپٹر جیاگک شوے جی اب بھی یاد تھا۔ وہ ہے کہ انسپٹر پانڈے سے مل کر مجھے انسپٹر جیاگک شوے تھا۔ اگر انسپٹر جیاگک شوے کے بارے میں اندازہ کرتی جاتی تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔ ہندوستان کی پولیس میں

پانڈے بھی تو ایسا ہی تھا جو مثالی کردار کا مالک تھا اور اس وقت اس کے بارے میں جو بات کسی جاری تھی اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے“ اے سی پی بھنڈاری کی توجہ میں اپنے خیالات سے چونک گیا وہ کہہ رہا تھا۔ ”انسپٹر پانڈے ہمایوں میں واقع کالی کے مندر میں دو ہینڈلوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہاں سے کروڑوں روپے مالیت کے زیورات، سونے کی سورتیاں، بیجھت میں دی جانے والی دوسری چیزیں اور لاکھوں روپے کی نقدی لے کر فرار ہو گیا ہے اس کے ساتھ پولیس کے تین آدمی اور بھی ہیں اور وہ اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔“

”یقین نہیں آ رہا“ میرے دماغ میں اب بھی سننا نہت ہو رہی تھی ”آپ کو کیسے پتا چلا اور یہ اطلاع کب ملی؟“

”آج دوپہر دو بجے کے قریب“ بھنڈاری نے جواب دیا ”جو کاشیل گزشتہ رات آپ لوگوں کو یہاں لے کر آیا تھا اسے صبح واپس جانا تھا لیکن صبح اس کی جیب خراب ہو گئی۔ کوئی بڑا ہی نقص تھا۔ جب کا انجن کھولنا پڑا تھا اور اس کا شیل کی قسمت بھی اچھی تھی کہ وہ واپس نہیں جاسکا تھا۔“

”پھر آپ کو انسپٹر پانڈے کے بارے میں اطلاع کیسے ملی؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

انسپٹر پانڈے چھ آدمیوں کو لے کر یہاں سے گیا تھا ایک سب انسپٹر، ایک حوالدار اور چار کاشیل۔ آج دوپہر دو بجے کے قریب دو کاشیل بڑی خستہ حالت میں یہاں پہنچے تھے ساری بات انہوں نے ہی بتائی تھی۔

اے سی پی بھنڈاری نے مجھے خاموش رہا پھر ان کاشیلوں سے سنی ہوئی باتوں کی تفصیل بتانے لگا۔ اس کے کہنے کے مطابق کل پچاس بیڑوں والے مندر میں کالی کی پوجا کا آخری دن تھا۔ انسپٹر پانڈے نے کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے اپنے آدمی مندر میں تعینات کر رکھے تھے۔ وہ خود سب سے قریب سب انسپٹر کے ساتھ مندر کی پچھلی طرف عمارت چلا گیا جہاں سب کچھ جمع کیا جاتا ہے۔ دو آدمیوں کو اس نے پہاڑی پر اس جگہ بھیج دیا تھا جہاں مندر سے نیچے اتر کا خفیہ راستہ نکلتا ہے۔ ایک آدمی کو اس نے مندر کے گیت پر اور دوسرے کو مندر والے چوڑے کے چھتہ اندرونی عمارت کی طرف جانے والے راستے پر تعین کر دیا تھا اور اسے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندرونی عمارت کی طرف نہ آنے دیا جائے۔

اس وقت اندرونی عمارت میں دو ہینڈلوں بھی تھے جو وہاں جمع شدہ دولت کا حساب لگا رہے تھے۔ پانڈے اور سب انسپٹر کو اندرونی عمارت میں گئے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ٹھکانے والے کالی کے مندر سے آئے ہوئے ایک ہینڈلو نے اندر جانے کی کوشش کی تو چوڑے کے پیچھے کھڑے ہوئے کاشیل نے اسے روک لیا جبکہ وہ ہینڈلو اندر جانے کے لیے بھنڈ تھا۔

ہینڈلو کی خمد سے مجبور ہو کر کاشیل بھی اس کے ساتھ عمارت کے اندر چلا گیا۔ عمارت کے پچھلے حصے میں قدم رکھتے ہی وہ دونوں بد خواص ہو گئے۔ دو ہینڈلو عمارت میں اس طرح پڑے ہوئے تھے کہ ان کے گلے کٹے ہوئے تھے اور ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا جبکہ انسپٹر پانڈے اور سب انسپٹر غائب تھے اور عمارت میں جمع کیا جانے والا مال و زر اور نقد رقم بھی غائب تھی۔ کیس ایک ہنگام تک نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ ٹھکانے (موجودہ کوئل کنا) سے آیا ہوا وہ ہینڈلو ایک دن پہلے جب مندر کو لوٹنے کی ایک ناکام کوشش ہو چکی تھی، اپنی آنکھوں سے وہاں دولت کے انبار دیکھ چکا تھا۔

ہینڈلو اور اس کا شیل کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انسپٹر پانڈے اور اس کا سا بھئی سب انسپٹر عمارت کے اندر ہینڈلوں کو قتل کر کے مال و زر اور نقدی لوٹ کر خفیہ راستے سے فرار ہو چکے ہیں۔

ہینڈلو چیخا ہوا باہر آ گیا۔ وہ کاشیل بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ خوف سے تھر تھرا کاپ رہا تھا کہ لوگوں کو جب پتا چلے گا کہ یہ واردات پولیس والوں نے کی ہے تو وہ انہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ہینڈلو کی چیخ پکار سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ ہر شخص عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کاشیل کسی طرح مندر سے باہر آ گیا اور مندر کے گیت پر متعین اپنے ساتھی کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ دو بجے کے قریب یہاں پہنچے اور صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ہماری اطلاع کے مطابق انسپٹر پانڈے کو سب انسپٹر جلدیش، حوالدار منگل سنگھ اور ایک کاشیل کے ساتھ نیلے رنگ کی ایک کار میں الور سے دہلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔“

”کیا انسپٹر پانڈے اور اس کے ساتھی وہاں سرکاری ڈیوٹی پر تھے؟“ میں نے بھنڈاری کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ”ہم سرکاری طور پر وہاں کسی کی ڈیوٹی نہیں لگا سکتے کیونکہ۔“

”کیونکہ یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے کہ ان پہاڑیوں میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور اس کالی کے چرنوں پر انسانی جانوں کی بھیشت دی جاتی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹے ہوئے کہا۔

”آپ جانتے ہیں لوگ دھرم کے معاملات میں کتنے حساس ہوتے ہیں“ مسٹر بھنڈاری نے کہا ”یہودی کے چرنوں پر انسانی جان کی بھیشت صریح قتل ہے لیکن وہ کیا ہے کہ ان پنڈتوں کو کچھ تیناؤں کی حمایت حاصل ہے۔ تین سال پہلے ان کے خلاف کیس بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن سرکار پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ یہ کیس واپس لینا پڑا اور ویسے بھی یہ لوگ بھیشت کے لیے ان لوگوں کو پکڑ کر لاتے ہیں جن کا کارور نہایت گھناؤنا ہوتا ہے چور، ڈاکو، غنڈے، بد معاش اور وہ قاتل جو قانون کو پکڑے کر سزا سے بچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوسروں کی زندگیوں برباد کر دیتے ہیں لیکن خود ہر سزا سے بچے رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ان پنڈتوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور قانون کو بھی ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”عجیب منطق ہے“ میں نے کہا ”گویا قانون نے اجازت دے رکھی ہے کہ دھرم کے نام پر جس کو چاہو پکڑ کر ذبح کر ڈالو؟“

”یہ بات نہیں ہے بہت سنگھ جی!“ مسٹر بھنڈاری نے کہا ”بعض معاملات میں قانون کو پیچم پوٹی کرنی پڑتی ہے۔ بہر حال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ آپ ہماری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ ہم تو تھک چکے ہیں۔ دوسروں کی انگلیوں کے اشاروں پر تاپنے والے ہمارے پاس تو اتنے اختیارات بھی نہیں ہیں کہ میٹلے میں آنے والوں کو پہاڑیوں میں داخل ہونے سے روک سکیں۔“

”حیرت ہے“ آپ اختیارات کی بات کر رہے ہیں۔ مجبوریوں کا رونا رو رہے ہیں“ میں نے چڑ کر کہا ”ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پولیس والوں کے پاس لامحدود اختیارات ہیں۔ ایک معمولی سا کانسٹیبل بھی کسی راجا کو سڑک پر ہٹا کر سکتا ہے اور۔“

”آپ اس بحث میں مت پڑیں بہت سنگھ جی!“ بھنڈاری نے مجھے ٹوک دیا۔

”ٹھیک ہے یہ آپ کا مسئلہ ہے“ میں نے کہا ”بھی ٹھاکر جی نے بتایا تھا کہ آپ ہم سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”جی ہاں!“ بھنڈاری سنبھل کر بیٹھ گیا ”آپ لوگ بھی

وہاں موجود تھے اور آپ لوگوں نے مندر میں ڈیکڑی واردات کو ناکام بنایا تھا جس میں دوسادھو ہمارے سٹنڈ ایک مرد اور ایک عورت۔ ان کے علاوہ بھی تین چار ہلاک ہوئے تھے۔“

”ہمارا ان ہلاکتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے“ میں نے کہا۔

”میں ان ہلاکتوں سے آپ کا کوئی تعلق ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا“ بھنڈاری مسکرایا ”لیکن مجھے کچھ اطلاعات پہنچی ہیں ان کے مطابق آپ کو معلوم تھا کہ وہ اس قسم کی کوئی واردات ہونے والی ہے اور اس سے پہلے آپ نے دھول پور کے پنڈت سوبھراج نامی ایک شخص انسپکٹر پانڈے کے حوالے کیا تھا۔ اس کا اس معاملے سے تعلق تھا؟“

”یہ بات آپ اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟ میں۔ چھٹی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔“

”منظر پوچھ لیتا“ بھنڈاری بولا ”بشرطیکہ وہاں ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونک گیا۔

”آج صبح سویرے ایک سنتری کو قتل کر کے وہ حوالہ سے فرار ہو گیا ہے“ بھنڈاری نے جواب دیا۔

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ چند لمحوں خاموشی کے بعد میں نے کہا ”بات دراصل یہ ہے کہ بھنڈاری“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں ”میں دارا نامی ایک ایسے آدمی کی تلاش کر رہی تھی جو ہمارے ساتھ فرار کر چکا ہے۔ اس نے پورے میں ٹھاکر جی کے رہنمائی کو بھی آگ لگو کر تباہ کر دیا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں تھے ہمیں پتا چلا کہ وہ اپنے دو مرگروں کے ساتھ سادھوؤں کے ہمیں میں سارسا آیا ہوا ہے۔ ہم اس کی تلاش میں ملے آئے تھے کہ بیچ میں گنگولی چوہدری والا واقعہ پیش آیا۔ ہماری ایک دوست بھی اس پلیٹ میں مگنی بنے چھڑانے کے لیے ہمیں بہت کشت اٹھانا پڑا۔ بہر حال اس واقعے سے تھکے کے بعد ہم نے اپنے اصل کام کی طرف توجہ دی تو سمجھا؟“

کہ وہ سادھو دھول پور کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔ ”وہ تینوں سادھو ہمارے پیچھے سے پہلے دھول پور چلے گئے تھے۔ ہمارا سامنا پنڈت سوبھراج سے ہو گیا جس نے انکشاف کیا کہ ان تین سادھوؤں میں ایک عورت بھی ہے۔ میں نے ذرا غصے کی تو پنڈت سوبھراج کل گیا۔ اس نے بارے میں کچھ ایسے شخصی خیر انکشافات کیے کہ میں

چھوڑ نہیں سکتا تھا۔“ میں چند لمبے خاموش رہنے کے بعد پنڈت گڑھ کی اس نوعمر لڑکی کے بارے میں بتانے لگا جو سوبھراج اور بلونت سنگھ کی ہوس کی بھیشت چڑھ گئی تھی۔ اس تفصیل کے بعد میں نے واقعات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ان تین سادھوؤں میں ایک تو وہ خوبصورت دراز قامت لڑکی تھی جس کا نام امیر تھا۔ وہ ہماری ایک عزیزہ ڈاکٹر رادھا کی بھانجی تھی۔ دارا اور بلونت سنگھ نے اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی تھی بلاخر بلونت سنگھ کے ہاتھوں ماری گئی۔ دوسرا ہمارا مطلبہ آدمی دارا اور تیسرا بلونت سنگھ تھا۔ بلونت سنگھ خود نوعمر لڑکی کے قتل میں ملوث ہونے کے باوجود پنڈت سوبھراج کو بلیک میل کر رہا تھا۔ پنڈت سوبھراج ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ تینوں سادھو پہاڑیوں میں کالی کے شیلے میں گئے ہیں۔ وہاں ان کا کوئی بڑی واردات کرنے کا ارادہ ہے اور اس کے بعد وہ دھول پور واپس آکر چند روز اس کے ہاں پناہ لیں گے۔“

”میں نے پنڈت سوبھراج کو انسپکٹر پانڈے کے حوالے کر دیا کہ چوتھ گڑھ میں اس لڑکی کے قتل کے بارے میں تحقیقات کرے۔ اس سے اگلے ہی روز ٹھاکر جی اور ان کی دست روپ جتنی کو حادثہ پیش آیا اور ہم کئی روز تک کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکے اور پھر ہم بھی سادھوؤں کے ہمیں میں شیلے میں پہنچ گئے۔ ہمارا ہمیں بدلے کا مقصد یہ تھا کہ دارا اور اس کے ساتھی ہمیں پہچان کر بھاگ نہ جائیں۔ اسی دوران میں وہاں انسپکٹر پانڈے سے ملاقات ہو گئی اور وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ کے آدمی آپ کو بتا چکے ہیں۔“

”کیا انسپکٹر پانڈے نے یہ بتایا تھا کہ وہ سرکاری ڈیوٹی پر ہے؟“ میرے خاموش ہونے پر بھنڈاری نے پوچھا۔ انسپکٹر جارجی داس اس دوران میں خاموش ہی بیٹھا رہا تھا اور ٹھاکر نے بھی ہم دونوں کی گفتگو کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا اور اس نے بتایا کہ وہ پوچا کے لیے آیا ہوا ہے۔ مندر کے پیچھے والے غار میں جو کچھ بھی ہوا تھا اس کے بعد انسپکٹر پانڈے نے اس غار کے حفاظت کی ذمہ داری لے لی تھی اور مجھے اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ اب وہاں ایسی کوئی گزیر نہیں ہو سکے گی۔ اسی دوران میں رات کو ہماری یہ دوست“ میں نے بائیں کی طرف اشارہ کیا ”مہاڈی سے مرکز زخمی ہو گئی اور انسپکٹر پانڈے نے بڑی مہربانی کی کہ ہمیں اپنی جیب میں برآمد کر دیا۔“

میری اس کہانی میں تھوڑا سا جھوٹ بھی شامل تھا، دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں۔ کیونکہ ان دونوں کے بارے میں اگر اصل بات بتادی جاتی تو ہمارے لیے کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ بلونت سنگھ اگرچہ ٹھاکر کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن میں نے اس کی ہلاکت بھی پولیس کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ وہاں قانون بھی بے بس ہو گیا تھا تو ہمیں اپنے آپ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اے سی بی بھنڈاری اور انسپکٹر جارجی داس کافی دیر تک مجھ سے اور ٹھاکر سے سوالات کرتے رہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ہم بھی انسپکٹر پانڈے کے ساتھ اس ڈکیتی میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

”مسٹر بھنڈاری!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”پہاڑیوں میں لگنے والا یہ میلہ کسی سرکاری ریکارڈ میں نہیں ہے۔ آپ کا قانون بھی اس سے قطعی لاعلم ہے۔ تین دنوں کے دوران میں ان پہاڑیوں میں کم از کم دس افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ تین کو تو کالی کے قدموں میں ذبح کیا گیا اور باقی پولیس یا انسپکٹر پانڈے اور اس کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ قانون ان دس ہلاکتوں کو نظر انداز کر رہا ہے تو مندر میں ڈکیتی کی واردات کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ کیا کوئی جانے والی وہ دولت دس گیارہ انسانی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے؟“

”میلہ ریکارڈ پر نہیں ہے لیکن کالی کا مندر اپنا دھوم دھمکتا ہے“ بھنڈاری نے جواب دیا ”ہم شیلے کے حوالے سے ان ہلاکتوں کو سرکاری کاغذات پر نہیں لاسکتے لیکن مندر میں ہونے والی ڈکیتی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی تحقیقات تو ہمیں کرنی پڑے گی۔ چار یا پانچ پنڈت اس وقت بھی میرے دفتر کے سامنے دھرتا رہے کہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ان پنڈتوں اور پجاریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دولت کو ان کے دھرم میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ کالی کے اس مندر میں تین پنڈتوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ ان کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا گیا لیکن دولت لٹ جانے سے ان کی سیاری جا رہی ہے۔“

”ہم اس سلسلے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں“ ٹھاکر نے پہلی مرتبہ زبان کھولی ”ہم جو کچھ جانتے تھے وہ آپ کو بتاوا۔ ہم کسی کے دل کا حال تو نہیں جانتے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ انسپکٹر پانڈے نے پہلے ہی سے ایسا کوئی منصوبہ

بنارکھا ہے۔

”ٹھیک ہے ٹھاکر جی!“ ہنڈاری مگر سانس لیتے ہوئے بولا ”آپ لوگوں کو زحمت دی۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا ”اپنا خیال رکھنا بہت سنگھ جی۔ گنگولی چوہدری کا زندہ بچ جانے والا آدمی تو پھر تمہارے لیے کسی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”شکر ہے! میں خیال رکھوں گا“ میں نے جواب دیا۔ ان کے جانے کے بعد بھی ہم دیر تک انسپکٹریاؤں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے واقعی بڑی شدید حیرت ہو رہی تھی۔ پانڈے جیسا فرض شناس اور ذمے دار آفیسر۔ لیکن پھر دولت ایسی چیز ہے جس کی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ بڑے بڑے نیک اور دیانت دار لوگ اس شہری جال میں پھنستے ہیں تو نکل نہیں پاتے۔

پانڈے انسپکٹر تھا۔ اس کی خواہ بھی محدود ہوگی اور وہ رشوت بھی نہیں کھاتا تھا۔ اس کا بھی دل چاہتا ہو گا کہ اس کے پاس سب کچھ ہو۔ وہ چاہتا تو رشوت لے کر اپنی خواہشات پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا اور پھر مندر میں زرد جوہر کے انبار دیکھ کر شاید اس کی نیت بدل گئی تھی۔

ہو سکتا ہے اس نے پہلے سے مندر کو لوٹنے کا منصوبہ بنارکھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دولت کا ڈھیر دیکھ کر اچانک ہی اس کے دل میں اسے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ اس نے اپنے بھروسے کے آدمیوں سے بات کی اور وہ بھی آمادہ ہو گئے۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی دولت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا میرے خیال میں بہت برا ہوا تھا۔ انسپکٹریاؤں کے کوہکے کر میرے ذہن میں ایک مثالی پولیس آفیسر کا جو خوبصورت تصور قائم ہوا تھا وہ ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور ہو گیا تھا۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ مزید سارسکا میں رہے ٹھاکر کی تباہ شدہ بچاؤ پیلے ہی سے پور بھیج دی گئی تھی۔ جاگتی اور روپ حتیٰ اب بڑی حد تک ٹھیک ہو چکی تھیں۔ ان کے زخم مندمل ہو رہے تھے اور اب انہیں صرف آرام کی ضرورت تھی اور یہ آرام گھر جا کر بھی ہو سکتا تھا۔

اور پھر ایک روز صبح سویرے ہم سب لوگ بس پر سوار بنے پور جا رہے تھے۔

○☆☆○

زندگی میں جیسے ٹھہراؤ آیا تھا۔ کوئی لپٹل نہیں تھی۔ کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ وہی معمول کے شب و روز۔ وہی بزار کن یکسانیت۔ لگتا تھا جیسے زندگی کی ساری دلچسپیاں ختم ہو گئی ہوں۔

بے پور آنے کے بعد جو ہنگامے شروع ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے تھے۔ روپ متی کی زندگی میں جو بھونچال آیا تھا وہ گزر گیا تھا۔ اس کا دشمن ختم ہو گیا تھا لیکن میرا دشمن ایک بار پھر مجھے غامدے کیا تھا۔

ہم پھر ٹھاکر کی اس نیلے والی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس مرتبہ تو بلا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہماری عہم موجودگی میں روپ متی کی ملازمہ مندری ہمیں رہ رہی تھی۔ واپس آئے تو روپ متی اور جاگتی کو زخمی دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ سارسکا میں بلا نے ان دونوں کی بڑی خدمت کی تھی اور اب یہ ذمے داری مندری نے سنبھال لی تھی۔ ٹھاکر کا ایک دوست ڈاکٹر بھی پور دوسرے دن انہیں دیکھ لیتا تھا۔

میں دن بھر یا تو کھڑکیں ہی پڑا رہتا ہوں۔ ٹھاکر کے ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتا۔ ٹھاکر نے کہا تھا کہ میں ان دونوں میں سے ایک جگہ سنبھال لوں اور مستقل میں رہوں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو صرف چند روز اور یہاں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکے۔ مجھے یقین تھا کہ دارا مندروں کے حصار سے باہر نہیں لٹکا تھا۔ اسے کسی مندر ہی میں پناہ مل سکتی تھی اور کسی ایسے آدمی کی تلاش میں نے بے پور کے مندروں کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ کبھی بلا میرے ساتھ ہوتی اور کبھی میں اکیلا ہی مندروں میں گھومتا رہتا۔

ہمیں سارسکا سے واپس آنے ہوئے شاید دسواں دن تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں اس وقت ٹھاکر کے ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ اگلاؤں میزوں پر ہی گلاب بیٹھے ہوئے تھے۔

کچن کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی تو میں کاؤنٹر سے اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ کک اور اس کا اسٹنٹ ابھی میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف شکایت کرنے لگے تھے۔ اسٹنٹ ایک نو عمر لڑکا سا تھا۔ داڑھی مونچھ ابھی نہیں آئی تھی۔ گوری رنگت اور گول منوں سا چہرہ ملک نے اس کے گال پر پٹائی بھری تھی جس پر وہ لڑکا ہتھ سے اکھیرا تھا۔ میں نے ڈانٹ

ڈنٹ کر دونوں کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ کچن سے باہر آتے ہوئے ڈنٹ کی ایک میز پر ایک جوڑے کو بیٹھے دیکھ کر میں بائیں طرف کی کچن میں گیا تھا تو یہ میز خالی تھی۔ یہ گلاب بیٹے کے بعد یہاں آکر بیٹھے تھے اور وہ دونوں آئے سانس کی برے بیٹھنے کے بجائے ایک دوسرے کے برابر کر سیں کر سیں بیٹھے تھے اور مرنے اپنا ایک ہاتھ عورت کی پشت پر رکھا ہوا تھا۔

اس عورت کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ گوری رنگت پر نیلے رنگ کی ساڑھی بچ رہی تھی۔ وہ سڈول جسم کی مالک ایک حسین عورت تھی۔ ڈارک براؤن لہریں دار بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد کی عمر بھی پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی اور میں ٹھنڈا کسی کو دیکھ کر تھا۔ اس کے سر کے بال چھوٹے تھے جو سلیٹے سے بنے ہوئے تھے۔ اس کی رنگت گندمی اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سونے کی ایک چین گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ لاکٹ کی جگہ تقریباً ایک انچ لمبی اور نصف انچ چوڑی سونے کی پلیٹ بھی تھی جس پر کچھ کندہ تھا۔ اس کی گردن پر ذرا دائیں طرف ایک انچ لمبے زخم کا نشان تھا۔

اس شخص نے بھی میری طرف سرسری سے انداز میں دیکھا۔ عورت کی پشت سے ہاتھ ہٹایا اور دیگر کو اشارہ کیا جو اسی طرف آ رہا تھا۔

میں کاؤنٹر کے پیچھے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بار بار اس شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں سے اس کا چہرہ اگرچہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک الجھن کی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے اس شخص کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہو لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی گردن پر زخم کا وہ نشان میرے ذہن میں ابھرنے لگا کہ اس کا نام اس نشان کے حوالے سے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور پھر میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ قہار آگیا کہ زخم کا وہ نشان میں نے کس کی گردن پر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پینڈت سوہراج کا نام ابھرا تھا۔

میں آنکھیں بند کر کے چشم تصور سے پینڈت سوہراج کو

دیکھنے لگا۔ بات زیادہ پرانی تو نہیں تھی۔ چند روز پہلے ہی تو دھول پور میں پینڈت سوہراج سے ملاقات ہوئی تھی اور میں بجلا اس ملاقات کو کیسے بجلا سکتا تھا۔ پینڈت سوہراج کا پیکر میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ مخصوص انداز میں بندھی ہوئی دھوٹی، بھم کے بالائی حصے پر پیلے رنگ کی چادر جس پر جابجا لفظ ”اوم“ چھپا ہوا تھا۔ پیروں میں کٹڑی کی کھڑاؤں، ”نچا سر“ ماتھے پر سفید نقشہ۔ اس سے ذرا اوپر درمیان سرخ ٹیکا اور دونوں رخساروں پر بھی اوپر سے نیچے سیندور سے لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور قدرے پھوٹی تھیں۔ دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ وہ صورت ہی سے کڑے متعصب اور کینہ پرور ہندو لگتا تھا۔ اس کی گردن پر ذرا دائیں طرف تقریباً ایک انچ لمبا پرائے زخم کا نشان بھی تھا۔

دیگر کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمجھا تھا شاید مجھے نیند آ رہی ہے۔ وہ کسی گلاب کا بلبل لے کر آیا تھا۔ سو کے نوٹ میں سے بلبل کی رقم کاٹ کر میں نے باقی پیسے پلیٹ میں رکھ دیے اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر کچن کی طرف چل پڑا۔

دیتر نے ان دونوں لی میز پر کافی سرو کر دی تھی۔ میں ان کی طرف دیکھ کر بغیر کچن میں چلا گیا اور ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا جہاں سے میں اس شخص کو دیکھ سکتا تھا لیکن میں اس کی نظروں میں نہیں آ سکتا تھا۔

اس رخ سے روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں چند لمحوں اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر میں اپنے آپ میں سنسنی کی لہرں سی دوڑتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ اب اس میں شے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ پینڈت سوہراج ہی تھا لیکن اب اسے پینڈت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے اپنا حلیہ تبدیل کیا تھا۔ بے ترتیب داڑھی موچھیں صاف کر دیئے تھے اس کے چہرے پر بڑی تبدیلی آ گئی تھی اور باقی کی دوسری چیزوں نے پوری کر دی تھی۔ اس کی بدن مہیں آنکھیں اگرچہ کالی تھیں لیکن آج کل تو آنکھوں کی رنگت تبدیل کرنا بھی کچھ مشکل نہیں رہا تھا۔ نیلے رنگ کے کونٹیکٹ لینسنز نے اس کی آنکھوں کی رنگت بھی بدل دی تھی۔ اس نے گھنے سر پر یقیناً وگ لگا رکھی تھی۔ چند روز میں بال اتنے بڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کے کانوں میں اگرچہ بالیاں نہیں تھیں لیکن سوراخوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

وہ سوہراج ہی تھا اور مجھے اس کی ہمت کی داد دینی

پڑی۔ ہم نے اسے سارے میں انٹیکسٹ یا نڈے کے حوالے کیا تھا کہ کئی سال پہلے چتوڑ گڑھ میں سوہراج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی معصوم لڑکی کی ہلاکت کی تحقیقات کیا جائیں۔ لیکن چند روز پہلے وہ سارے کے پولیس اسٹیشن میں ایک سنتری کو قتل کر کے حالات سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے تو اتنی دور چلے جانا چاہیے تھا کہ پولیس اس کی گرو کو بھی نہ پاسکے لیکن وہ بے پروا پیش کر رہا تھا جبکہ سارے کے یہاں سے صرف دو ڈھائی گھنٹوں کے فاصلے پر تھا۔ وہ واقعی حوصلہ مند آدمی تھا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ چند توں والا بھی ختم کر دینے سے اس کے گلے میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ اسے چنڈ سوہراج کی حیثیت سے کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا اور میری نظروں میں بھی وہ محض اتفاق سے آگیا تھا۔ اگر اس کی گردن پر زخم کا وہ نشان دکھائی نہ دیتا تو شاید میں بھی اسے نہ پہچان سکتا۔ زخم کا وہ پرانا نشان ہی میرے جیش کا باعث بنا تھا اور میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں بھی دوسرے اس کے سامنے سے گزرا تھا۔ کہیں اس نے بھی تو مجھے نہیں پہچان لیا؟

میرے خیال میں اس نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دھول پور میں جب ہمارا آتنا سامنا ہوا تھا تو میں بھی سادھو کے بھیس میں تھا اور اب میرا حلیہ بھی اس سادھو سے بہت مختلف تھا۔ اس نے یقیناً مجھے نہیں پہچان تھا۔ اگر پہچان لیا ہوتا تو وہ اس عورت کے ساتھ اس طرح اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں نہ لے رہا ہوتا۔

میں ایسے لوگوں کے بارے میں خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ جو لوگ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب ہوں یا کسی اور وجہ سے پکڑے جانے کا خوف ہو یا کسی دشمن کی طرف سے وار کا اندیشہ ہو۔ ایسے لوگ لاکھ حلیہ بدل لینے کے باوجود چونا اور چوس رہتے ہیں اور کسی مشتبہ شخص کو دیکھ کر وہاں گھٹنے کے بجائے فرار کا راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں خود بھی کئی مرتبہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا۔

”کیا چاہیے سر؟ آپ کو کسی چیز کی تلاش ہے؟“

شیفت کی آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اوہ! کچھ نہیں“ میں نے بات بنائی ”یونہی دورا تمہاری اس راج دھانی کا معائنہ کر رہا تھا۔“

میری اس بات پر شیفت بھی مسکرایا۔ کچن میں اور بھی کئی خاندان اور دوسرے ملازم موجود تھے اور غالباً کسی کو یہ

شبہ نہیں ہوا تھا کہ میں کچن میں کیوں آیا تھا۔ میں چنڈے وہاں کھڑا دھڑا دھڑا دیکھتا رہا جیسے واقعی کچن کا معائنہ کر رہا ہوں۔ پھر سامنے والے دروازے سے ہال میں آئے کے بجائے پہلو کے دروازے سے نکل گیا۔

اس طرف ایک تنگ سی راہداری تھی جو آگے جا کر اس کشادہ راہداری سے مل جاتی تھی جہاں اوپر ہوٹل میں جانے کے لیے زینہ تھا اور اس زینے کے نیچے ریسٹورنٹ میں آنے کے لیے بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔

اس دروازے سے اندر داخل ہوا تو کاونٹر کے قریب ٹھاکر کو کھڑے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”اچھا ہوا تم آگے ورنہ آج ایک شکار ہاتھ سے نکل جاتا“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

”کیا مطلب؟ کیا تم نے شکار کھینا بھی شروع کر دیا ہے؟“

ٹھاکر مسکرایا۔ ”لیکن میں زیادہ دور یہاں نہیں دوں گا۔ بار گاڑی میں بلا بیٹھی ہوئی ہے اسے کچھ شائبہ کرنی تھی۔

تین گھنٹے سے مجھے پورے شہر میں گھما رہی ہے۔ ایک چڑ گھاٹ دروازے سے خریدی جا رہی ہے تو دوسری چیز بھائی

ٹھاکر مارگ سے اور تیسری چیز کے لیے سوائے ڈیوڑھی کی طرف دوڑ لگائی جا رہی ہے اس لڑکی نے تو مجھے بری طرح

تھکا دیا ہے۔ میں تو تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ بارہ بجے یہاں کے معاملات پر کاش کے حوالے کر کے گھر آجانا۔ ویسے تم کس

شکار کی بات کر رہے ہو۔ کسی ڈیوڑھی سے تو تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ کون ہے وہ؟“

”چنڈ سوہراج!“ میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ اچھل پڑا۔

”چونکو نہیں“ میں نے کہا ”وہاں طرف سینڈ لاسٹ ٹیبل پر ایک کپل بیٹھا ہوا ہے۔ اس عورت کو تو میں نہیں

جانتا کہ کون ہے مگر وہ آدمی چنڈ سوہراج ہے اس کا بلہ بہت بدلا ہوا ہے۔ اسے پہچانا آسان نہیں۔ میں نے کئی

کرتی ہے۔ وہ سوہراج ہی ہے۔“

ٹھاکر نے بالکل غیر محسوس انداز میں اس طرف دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں“ یہ وہی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”تم یہاں کاونٹر پر بیٹھو اور گاڑی کی چابی مجھے دو۔“

اور وہ جانے۔ بلونت نگہ بھی اب ختم ہو چکا ہے اور۔“

”دارا ابھی زندہ ہے“ میں نے اس کی بات کاٹ دی

”ہو سکتا ہے یہ دارا کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ ایسے لوگ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی ایک دوسرے کے بارے میں

بت کچھ جانتے ہیں۔“

”سوچ لو۔ کسی نئی مصیبت میں مت پھنس جانا“ ٹھاکر

بولا۔

”معتبتوں سے گزر کر ہی تو سکھ اور شائچی کا راستہ ملتا

ہے“ میں نے جواب دیا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر دروازہ

کھول کر باہر نکل گیا۔

بارنگ ایریا کی بائیں طرف فٹ پاتھ کے ساتھ ٹھاکر کی

نلی کار ٹھکڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھ

گیا۔ بلا تیز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی اور

جس میں نے غور سے بلا کی طرف دیکھا تو میرے ہوش اڑ

گئے۔

وہ ایک مختصر سا بلاؤز اور مٹی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔

سیٹ پر بیٹھے سے اس کا اسکرٹ سمٹ کر کچھ اور اوپر ہو گیا

فٹ ایک براہمن چنڈ کی اس بنی کو دیکھ کر مجھے واقعی حیرت

ہوئی تھی۔ اس کا بس جینا تو کپڑوں کے یہ جیتھرے بھی بدن پر

جانے کا کلف نہ کرتی لیکن یہ نعمت تھا کہ یہ گھر سے نکل کر

کسی طرح ٹھاکر جیسے شریف انسان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اگر

کس اور کے ہتھے چڑھ جاتی تو اس کا شہر ہو چکا ہوتا۔

”تم گاڑی چلائی ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”بہت اچھی طرح۔ بلکہ تم سے زیادہ اچھی طرح“ بلا

نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے تم اسٹیرنگ سنبالو۔ میں پیچلی سیٹ پر

بیٹھا ہوں“ میں ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر

آیا اور پیچلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”پیچلی سیٹ پر کیوں بہت سنگھ جی۔ میرے قریب بیٹھے

کی مت نہیں ہے کیا؟“ اس نے شوخ لہجے میں کہا اور اپنی

سیٹ سے ٹھک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور انجین اشارت

کرنے لگا۔

”انجین بند کر دو اور اندر کی جی بھی بجھا دو۔“ میں نے

کیا۔“

”کیا بات ہے بہت سنگھ جی۔ روشنی سے ڈر لگ رہا ہے

بلا نے کہا۔ اس کے لیے کی شوخی پر قرار تھی اور

یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“

”کی الحال نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر میں بھی پیچھے آجاؤں؟“ اس نے کہا۔

”اس سیٹ پر کانٹے چھ رہے ہیں کیا؟ آرام سے بیٹھی

رہو“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”ڈانٹا بھی جانتے ہو“ بلا ڈھٹائی سے مسکراتی پھر بولی

”کیا بات ہے ٹھاکر کی کا انتظار ہے کیا؟“

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”ابھی تھوڑی دیر میں ایک

عورت اور ایک مرد ریسٹورنٹ سے نکلیں گے۔ اگر وہ کسی

ٹیکسی یا رکشا وغیرہ میں بیٹھے تو ان کا تعاقب کرنا ہے مگر بڑی

ہوشیار رہی۔ انہیں شبہ نہ ہونے پائے۔“

”تمہیں دلچسپی کس سے ہے؟ عورت سے یا مرد سے؟“

بلا نے کہا۔ پھر جلدی سے بولی ”لیکن شاید میرا یہ سوال ہی

غلط ہے تمہیں کسی عورت سے دلچسپی کیوں ہونے لگی البتہ

میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ وہ مرد کون ہے؟“

”چنڈ سوہراج“ میں نے جواب دیا۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“ بلا نے پوچھا۔

”سارے کا میں ٹھاکر اور روپ مٹی کا ایکسی ڈنٹ ہونے

سے ایک روز پہلے ہم“ دارا اور بلونت سنگھ کی تلاش میں

دھول پور گئے تھے۔ بلونت سنگھ وغیرہ تو ہمارے چنڈے سے پہلے

ہی وہاں سے نکل چکے تھے البتہ چنڈ سوہراج سے ایک

یادگار ملاقات ہوئی تھی اس نے کچھ ایسے انکشافات کیے

تھے کہ ہمیں اسے پولیس کے حوالے کرنا پڑا اور اس روز

اسپتال میں اسے پی سی بیٹھاری نے تمہارے ساتھ ہی بتایا

تھا کہ چنڈ سوہراج ایک سنتری کو قتل کر کے حالات سے

فرار ہو گیا تھا اور یہی چنڈ سوہراج اس وقت ایک حسین

عورت کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا کافی پی رہا ہے۔“

”میری ایک بات مانو بہت سنگھ جی!“ بلا میری طرف

دیکھتے ہوئے بولی ”انا جیون بلاؤجہ جو کوں میں مت ڈالو۔ یہ

معاہدہ پولیس کے لیے چھوڑ دو۔ وہ خود ہی اسے تلاش کر لیں

گے۔ تم کیوں کٹ اٹھاتے ہو؟“

”وہ چاہے چھ قتل اور بھی کر دے تو مجھے پروا نہیں ہوگی

لیکن یہ واحد شخص ہے جس سے دارا کے بارے میں کچھ

معلوم کیا جاسکتا ہے“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ!“ بلا نے کہا ”پھر تو میں جہنم تک اس کا پیچھا

کرنے کو تیار۔“

”جہنم میں نہیں۔ ہمیں اس دنیا ہی میں اس کو پکڑنا

ہے“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

بلا سے باتیں کرتے ہوئے میں بار بار ریٹورٹ کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید بلا نے سوچا ہو کہ میں اس کے لباس کی وجہ سے اسے نظر انداز کرنے کے لیے پچھلی سیٹ پر آیا ہوں لیکن میرے پچھلی سیٹ پر آنے کی دو وجوہات تھیں۔ سوہراج اتنا بے پروا بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے تعاقب پر توجہ نہ دیتا۔ مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھ کر اسے کسی قسم کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اگر ایک خوبصورت لڑکی پیچھے آ رہی ہو تو اس پر زیادہ شبہ نہیں ہوتا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مجھے نہ دیکھ پائے اس لیے میں نے کار کی اندر کی بنی بھی آف کرادی تھی۔

میں منٹ مگر رہ گئے۔ اس دوران میں دو تین گاہک ریٹورٹ میں داخل ہوئے تھے اور ایک جوڑا بار بھی نکلا تھا۔ پانچ منٹ اور گزر گئے۔ ریٹورٹ کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس مرتبہ سوہراج کو اس عورت کے ساتھ برآمد ہونے دیکھ کر میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں ہی وہ“ میں نے دھیمے لہجے میں بلا کو بتایا ”لیکن ابھی انجن اشارت مت کرنا۔ انہیں کچھ دور نکل جانے دو۔“

بلا بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت اور سوہراج سڑک پر آگیا تو وہیں رک کر کسی ٹیکسی وغیرہ کا انتظار کریں گے یا مخالف سمت میں تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جائیں گے لیکن وہ بلا سے نکلنے کے بعد پارکنگ ایریا کی طرف مڑ گئے اور سرخ رنگ کی ایک فیٹ کار کے قریب رک گئے۔ عورت نے اپنے کندھے پر ہلکے ہوئے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر سوہراج کی طرف بڑھا دیا۔ سوہراج ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور جھک کر پیچھے سیٹ کے دروازے کی لاک تاب اٹھادی۔ وہ عورت بھی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

دو منٹ بعد سرخ فیٹ پارکنگ ایریا سے نکل کر سڑک پر آگئی اور ہماری گاڑی کے قریب سے گزر گئی۔ میں جھک کر پیچھے ہو گیا تھا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے ہماری کار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

بلا نے کار کا انجن اشارت کر کے اسے ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹھاکر ریٹورٹ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

اس وقت پونے بارہ کا وقت تھا۔ اسٹیشن روڈ پر اچھا خاصا ٹریفک تھا اور بلا بڑی ہوشیاری سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے سرخ فیٹ اور اپنے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو گز

کا فاصلہ رکھا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ کسی کے تعاقب کے لیے بہت مناسب فاصلہ تھا۔

سوہراج کی کار ایک اور سڑک پر محوم کر ہوئی تھی۔ اشوک کی طرف جانے والی سڑک پر مڑی۔ اس سڑک پر کچھ ٹریفک تھا اس لیے تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اشوک ہوٹل سے آگے سوائے سے جھک جاتی وہ سٹ وائوڈ کس روڈ کی طرف مڑتے ہی بلا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ نے درمیانی فاصلہ کچھ اور بڑھا دیا۔ اس سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا اور اندیشہ تھا کہ سوہراج کو تعاقب کا شبہ ہو جائے۔

وائوڈ کس روڈ آگے جا کر نروان مارگ سے مل جائے تھی لیکن وہاں تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سوہراج کی فیٹ دائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر مڑی تھی۔ اس طرف رہائشی بنگلے تھے اور کئی گلیاں تھیں۔

بلا نے کار اس طرف موڑنے سے پہلے ہی ہیلڈ لائٹس بجا دیں۔ اگلی کار ہم سے تقریباً دو سو گز آگے تھی اور پھر کار ایک گلی میں مڑی۔ بلا نے عقلمندی یہ کہ کار گلی میں گھمانے کے بجائے موڑ پر روک لی اور انجن بند کر دیا۔

میں کار سے اتر کر تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار نرانے بنگلے کی دیوار کی آڑ سے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ تقریباً پچاس گز آگے وہ کار ایک بنگلے کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ اس کی ہیلڈ لائٹس روشن تھیں اور وہ عورت کار سے اتر کر بنگلے کا گیٹ کھول رہی تھی۔

سرخ فیٹ بنگلے میں داخل ہو گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ میں گلی میں چلتے ہوئے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا اور تھوڑی دور آگے جانے کے بعد واپس آگیا۔ بنگلے کے گیٹ اور برآمدے کی بنی نہیں چلائی گئی تھی لیکن برآمدے کے ساتھ دائیں طرف والی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ گلی کے موڑ سے چوتھا بنگلا تھا۔ واپس آکر میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بلا نے میرے پیچھے ہی انجن اشارت کر دیا تھا۔ ”آگے والی گلی میں موڑلو“ میں نے اشارہ کیا۔

کار اس گلی سے آگے نکل کر بنگلے کی پیچھے والی گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے اختتام پر دائیں بائیں سڑک تھی اور سامنے پارک تھا۔ میرے اشارے پر بلا نے کار دائیں طرف موڑ پارک کے بنگلے کے ساتھ ایک درخت کے نیچے روک کر انجن بند کر دیا۔

”تم کار ہی میں بیٹھی رہو۔ ڈرو کی تو نہیں؟“ میں نے اپنی

طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اب مجھے ڈر نہیں لگتا اور اس وقت تو۔“ اس نے ڈش بورڈ کا خانہ کھول کر اس میں رکھا ہوا پستول نکال لیا اور پر اعتماد لہجے میں بولی ”اور اس وقت اگر کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو گولی سے اس کا دل آڑا دوں گی۔“

”یہ پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ میں چونک گیا۔

”ٹھاکر جی نے رکھا تھا اور مجھے بھی بتا دیا تھا“ بلا نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں کار سے اتر آیا۔ بلا نے دروازہ اندر سے لاک کر کے کار کی پارکنگ لائن بجھادی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ پستول اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔ اس کے پاس پستول کی موجودگی سے مجھے بھی اطمینان ہو گیا تھا۔

میں گلی میں چلتے ہوئے اس بنگلے کی پشت پر آگیا۔ سوہراج اور اس عورت کے بارے میں میں اب بھی الجھن کا شکار تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ ریٹورٹ میں ان دونوں کو دیکھ کر میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ کوئی عکاسی عورت ہے لیکن کار میں بیٹھنے سے پہلے اس عورت نے برس میں سے کار کی چابی نکال کر جس طرح سوہراج کے حوالے کی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے تعلقات نہ نہیں ہیں۔ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ سوہراج تو دھول پور میں رہتا تھا۔ یہاں کسی عورت سے اس کا کیا تعلق؟ میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرا ذہن الجھتا گیا۔

بنگلے کی عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اندر کی طرف ٹائریل کے دو چار درخت بھی نظر آرہے تھے۔ میں دیوار کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے والی قطار کے بنگلوں کی پشت بھی اسی طرف تھی۔ یوں بھی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گلی میں سناٹا تھا اور تاریکی بھی۔

میں نے جھک کر بیڈی پر بندھے ہوئے خنجر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ میرا پانا خنجر تو کالی کے مندر دالی پاڑیوں ہی میں کس کر گیا تھا اور بے پور آنے کے بعد مجھے ایک نیا خنجر خریدنا پڑا تھا۔

دیوار پر جھپٹنے اور دوسری طرف کودنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ یہاں کالی کھلی جگہ تھی اور جا بجا گارڈینیا کے پودے لگے ہوئے تھے جن کی شاخیں اوپر سے کات کر چھریوں جیسی شکل دے دی گئی تھیں۔ زمین پر خشک

پتے پکھرے ہوئے تھے۔

بنگلے کے دونوں طرف کشادہ گلیارے سے تھے اور وہاں بھی دیواروں کے ساتھ ساتھ پودے لگے ہوئے تھے۔ پچھلی طرف غالباً تین کمرے تھے لیکن تمام کھڑکیاں تاریک تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں سامنے والے رخ پر کسی کمرے میں تھے۔

اس طرف ایک دروازہ بھی تھا جو بند تھا۔ میں دبے قدموں اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ خشک پتے میرے پیروں کے نیچے آکر چر مار رہے تھے۔ میں بہت محتاط ہو کر آگے چلتا رہا۔

دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلا ہوا بائیں طرف والے گلیارے میں آگیا۔ اس طرف ایک کھڑکی میں روشنی تھی۔ اندر کی طرف اگرچہ نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا لیکن ایک طرف چند انچ کے قریب پردہ ہٹا ہوا تھا۔ میں نے بیٹھے سے آنکھ لگا دی۔

یہ بند روم تھا۔ وہ عورت ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی لیکن آئینے میں اس کا سامنے کا رخ نظر آ رہا تھا۔

سوہراج بیڈ کی پٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے لیکن ان میں کسی کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی اس لیے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

وہ عورت اپنے بدن پر بے ہوئے زیوراتار رہی تھی۔ پہلے اس نے کانوں کے جھمکے اتار کر اپنے سامنے ڈرائنگ ٹیبل پر رکھے پھر نیکیلیں اتارا اور آخر میں چوڑیاں اور انگوٹھیاں اتار کر رکھ دیں۔ سر کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر بالوں کو ہلکا سا جھکا دیا اور برش پھیرنے لگی۔

”تم کپڑے بدل لو۔ میں کچن میں جا رہا ہوں۔ چائے کا موڈ ہو رہا ہے“ سوہراج یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز بلند تھی اور الفاظ میری سمجھ میں آ گئے تھے۔

سوہراج کمرے سے نکل گیا۔ وہ عورت بھی برش ڈرائنگ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی ہو گئی اور ساڑی کے بل کھولنے لگی۔ اس نے ساڑی اتار کر پھینک دی اور پھر بلا ڈر بھی اتار دیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گردن پر چوڑیاں ہی رہ گئیں ہوئے محسوس ہونے لگیں۔ وہ آئینے کے سامنے قدرے آگے جھک کر دائیں کندھے پر انگلی سے نٹل کر کچھ دیکھنے لگی پھر سر ہٹا دی ہوئی تو اس کا ہاتھ جینی کوٹ پر پڑ گیا۔

اور پھر ٹھیک اسی لہجے میں اپنے عقب میں خشک پتوں کے چرنے کی آواز سن کر میں تیزی سے پیچھے مڑا لیکن مجھے دیر



ہو چکی تھی۔ سوہراج نے ڈنڈے سے میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وار میرے بائیں کندھے پر پڑا اور میں بے اختیار کراہ اٹھا۔

اب بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ انہوں نے شاید کھڑکی کے قریب میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور سوہراج نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے بھانسنے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت جانتی تھی کہ میں کھڑکی سے جھانک رہا ہوں۔ اس نے محض اس لیے کپڑے اتارنا شروع کر دیے تھے کہ میں اس کی طرف متوجہ رہوں اور سوہراج اپنا کام کر گزرے۔

سوہراج نے دوسرا وار کرنے کے لیے ڈنڈا سرے اوپر اٹھایا۔ میرے کندھے پر اگرچہ زور وار ضرب لگی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے مجھے ہی حملہ کیا، میں نے اس کا دایاں بائیں کلائی پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کی بھل میں زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

سوہراج اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی چٹائی اور دوسرا گھونسا اس کی کمری کے نیچے مارا۔ اس مرتبہ وہ کراہ اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر میری پٹائی پر ٹھوکر مار دی۔ وہ لیدر شوژ پینے ہوئے تھا۔ جوتے کی تخت ٹو ہتھوڑے کی طرح ہڈی پر لگی اور میں ناچ کر رہ گیا۔ سوہراج نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اچھل کر سائیڈ کک رسید کر دی۔ میں نے کک روکنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہتھوڑے جیسی ضرب میرے پلو میں لگی اور میں لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا۔

یہ کک کھاتے ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میرا مقابلہ کسی سڑک چھاپ غٹے سے نہیں ایک ماہر مارشل آرٹسٹ سے تھا۔ دھول پور میں اس سے دو دو ہاتھ ہو چکے تھے۔

سوہراج نے دوسری کک لگائی جسے میں نے بڑی پھرتی سے ہلاک کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اچھل کر ایک اور کک لگائی لیکن میں نے اس کا یہ حملہ بھی ناکام بنادیا اور پھر وہ بے در پے کک پر کک لگا مارا اور میں اس کی ہر کک ہلاک کرنا رہا اور بالآخر مجھے بھی جوانی کا کارروائی کا موقع مل گیا۔

میری پہلی راؤنڈ باؤس کک اس کے بائیں بازو پر کئی اور کندھے کے درمیان لگی۔ وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے اس پر حملے کرتا رہا۔ اس نے میری ایک دو ککس بڑی خوب صورتی سے

ہلاک کی تھیں لیکن اس کے باوجود اسے جوانی کا کارروائی کا موقع نہیں مل سکا۔

مجموعاً دووں ایک دوسرے پر حملے کرتے ہوئے جنگ کے عقبی حصے میں آگئے تھے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گارڈینیا کے تراشے ہوئے پودے لگے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی وہ فلائنگ کک لگانے کے لیے ہوا میں اچھلا لیکن میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر ہوا میں ہی اچھال دیا۔ وہ فلا باؤس کھاتے ہوئے ایک پودے کے اوپر کرا اور شاخیں دبے سے وہ دوسری طرف لڑھک گیا۔

میں سنبھل کر اس کے اوپر جاگرا اور اسے گھونسلوں کی باؤں پر رکھ لیا۔ سوہراج کی پٹائی کترے ہوئے میں اپنے استادوں کا رہا ہوا سبق بھول گیا تھا کہ۔۔۔ حرف کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ اس کی پٹائی کے جوش میں مجھے اس وقت یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ سوہراج یہاں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

میں سوہراج کے سینے پر سوار تھا۔ اوپر میں نے اس کے جڑے پر گھونسا مارا، اوپر میرے سر دھماکا ہوا۔ میرے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے پہلے بجلی کا کڑا سا لپکا پھر رنگ برنگے گتے ذرات ناچنے لگے۔ میں نے سر کو زور وار جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے نیچے دبے ہوئے سوہراج نے مجھے ایک طرف اچھال دیا۔

میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک ہیوے کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ وہ عورت دونوں ہاتھوں میں ڈنڈا اٹھا لے کر مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ میرے سر پر بھی اسی نے ڈنڈے سے حملہ کیا تھا۔

اس مرتبہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کا حملہ روکنے کی کوشش کی۔ ڈنڈا میرے ہاتھ پر لپکتے ہوئے سر پر لگا اور اس مرتبہ میں اپنے حواس پر قرار نہیں رکھ سکا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈھنسا چلا گیا۔

میں شاید زیادہ دیر تک بے ہوش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ ہوش میں آیا تو میں ایک کمرے میں قایلین پر پڑا ہوا تھا۔ یہ غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ گرا خاصا بڑا تھا۔ صوفوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ سامنے ایک صوفے پر سوہراج کے ساتھ وہ عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر چینی کوٹ اور اوپر بلیک رنگ کا مختصر سا انڈر وئیر تھا۔ وہ اگرچہ خود بھی نہایت خطرناک تھی لیکن اس وقت سب سے زیادہ خطرناک جہ سیاہ رنگ کا وہ پتول تھا جو اس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر سوہراج ایک جھٹکے سے اٹھ

کھڑا اور میرے کولے پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

”میں نے تمہیں اس وقت دیکھ لیا تھا جب تم جنگ کی عقلی دیوار سے اندر کو دے تھے۔“ اس کے لہجے میں جلی سی غراہت تھی۔ ”سب سے پہلے میں یہ جانتا چاہوں گا کہ تم کون ہو۔ دیکھنے کے لیے تم پولیس والے تو نہیں لگتے۔“

”پولیس کا خوف تو اسے ہوتا ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہارے اس جیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم کسی معاملے میں پولیس کو مطلوب ہو اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تم پولیس سے کیوں خوف زدہ ہو پٹنڈت سوہراج!“

”کیا؟“ وہ اچھل پڑا۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا اور پھر میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ”تم میری اصلیت جانتے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن اس سے پہلے میں یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ تم کون ہو؟“

”ہمت جلد بھول گئے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چند روز پہلے ہی تو دھول پور میں ہماری دھواں دھار ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں پولیس کے حوالے کیا تھا لیکن تم ایک سنزری کو قتل کر کے حوالات سے بھاگ نکلے۔ اس بدلے کے طور پر میں تم پولیس کو تو دھوکا دے سکتے ہو، میری نظروں کو نہیں۔ میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“

”اوہ!“ سوہراج کا چہرہ دھواں ہوا۔ ”وہ چند لمحے کمری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر چل پڑا۔ اس مرتبہ اس کی ٹھوکریں زیادہ زوردار تھیں۔ ایک مرتبہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اس پر چملا ٹنگ لگا کر اسے دو بج لیا۔ اسی لمحے وہ عورت صوفے سے اٹھ کر میری طرف لپکی۔ اس نے پتول کے دتے سے میرے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن وار میرے کندھے پر پڑا۔ میں کراہ اٹھا اور سوہراج کو میری گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ دونوں میری ٹھکانی کر رہے تھے۔“

”بس بس۔ ہمت ہو چکی۔ اب چھوڑ دو اسے۔“

یہ آواز سن کر ان دونوں کے ہاتھ پیر مشنی انداز میں رک گئے اور اس آواز نے تو مجھے بھی چونکا دیا تھا لیکن اسی لمحے غالباً غیر ارادی طور پر سوہراج کی ٹانگ حرکت میں آئی تھی۔ اس کی ٹھوکر میرے پلو پر پڑی اور میں کراہ اٹھا۔

”میں نے کہا نا بس کرو۔۔۔ بچے کی جان لو گے کیا؟“

دروازے میں کھڑی ہوئی بلا نے کہا اور پھر اس عورت کو قلاب کر کے بولی۔ ”اے! چھٹک چھو۔ اپنے ہاتھ سے پتول

پھینک دو۔“

اس عورت نے پتول ٹال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دوتے سے میرے جسم پر فزین لگاتی رہی تھی۔ وہ بلا کو دیکھ کر یقیناً بد حواس سی ہو گئی تھی۔ جب کوئی ایسی صورت حال ہوتی ہے تو آدمی یقیناً کنفیوز ہو جاتا ہے اور کوئی سیدھی سادی بات بھی فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ عورت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی کیونکہ پتول ابھی تک اسی انداز میں پکڑا ہوا تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی۔

اچانک فضا ناگزیر آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں اس عورت کی چیخ بھی ابھری تھی۔ بلا کی چلائی ہوئی گولی اس کے پیچ سے تقریباً ایک فٹ دور قایلین پر لگی تھی اور وہ عورت چیختے ہوئے اچھل کر رہاں سے دو قدم دور ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھ سے پتول بھی چھوٹ کر گر گیا تھا۔

”چھی چھی۔“ بلا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کتنی بے شرم ہو تم۔ ایسے کپڑے پہن کر غیر محودوں سے کبڈی کھیلتی ہو۔ جاؤ۔ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آؤ۔“ اس نے پتول سے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کے چہرے پر خوف کے ساتھ آنکھوں میں شدید ابھین کے اثرات بھی نظر آتے لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے جانے کو کہا گیا تھا۔ اس نے جیسے ہی قدم اٹھایا بلا نے چیخ اٹھی۔ ”ارے نہیں۔ میںیں رک جاؤ۔ باہر جا کر کیس تم کوئی گزربوند کرو۔ اس صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ بیٹھو۔“

بلا نے آخری لفظ اس قدر زور سے چیخ کر کہا تھا کہ وہ عورت بری طرح گزربو گئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی بلکہ وہ صوفے پر گر گئی تھی۔ اس کا چہرہ خوف کی شدت سے پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

میں حیرت سے بلا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہمت کم گو لڑکی تھی اور ہمت سنجیدہ گفتگو کرتی تھی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسی کم عمر لڑکی اس قدر سنجیدہ کیسے ہو سکتی ہے اور اس وقت تو وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی لیکن بہر حال، وہ جیسی بھی تھی اس وقت اس نے بازی پلٹ دی تھی۔

”اب تمہاری باری ہے ہمت سگھ۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس جعلی پٹنڈت کو اتنی مار لگاؤ کہ اپنا نام بھول جائے اور اس حرفہ کی اب تم فکر مت کرنا۔ یہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھے گی۔“



میں اچانک ہی کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں گھوم گیا۔ اچھلتے ہی میں نے اپنی ایک ٹانگ سمیٹ لی تھی اور دوسری ٹانگ پھیلا کر زوردار کنگ لگائی۔ میرے بچے کا نچلا حصہ سوہراج کی گردن پر لگا اور وہ الٹ کر صوفے کے قریب گرا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کر دوبارہ اس کی طرف لپکا تو اس نے جھپٹے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

”تھوڑے تھوڑے“

میں میکا کی انداز میں رک گیا۔  
”میں نہیں جانتا تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو۔“ سوہراج بولا ”تم اپنے دوست کے ساتھ بلونت سگھ کے بارے میں پوچھنے دھول پور میرے پاس آئے تھے اور اس وقت بھی تم نے میری پٹائی گروی تھی۔ اگر بلونت سگھ سے تمہاری کوئی دشمنی ہے تو اس کا بدلہ مجھ سے کیوں لے رہے ہو۔ میں تو خود اس کا ڈاسا ہوا ہوں۔“

”میں تو تمہیں بہت ہمدرد سمجھتا تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”اس روز دھول پور میں تم نے مارشل آرٹ کے بہت شاندار ہاتھ دکھائے تھے لیکن تم تو بالکل بچسبے نکلے۔ ایک ہی لنگ میں ناک آؤٹ ہو گئے۔“

”میں بلاوجہ کسی سے دشمنی نہیں چاہتا اور تمہیں تو میں جانتا بھی نہیں۔“ سوہراج نے جواب دیا ”اگر تمہیں بلونت سگھ سے کسی بات کا بدلہ لینا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میری بربادی کا ڈسے دار بھی وہی ہے اگر تم چاہو تو ہم دونوں اس کے خلاف لگے جوڑ کر سکتے ہیں۔“

میری نظریں سوہراج کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اگرچہ نہایت کینہ خصلت تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کی بربادی کا ڈسے دار بھی بلونت سگھ ہی تھا۔ اس روز دھول پور میں سوہراج نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک شریف انسان تھا لیکن بلونت سگھ کی دوستی اسے غلط راستے پر لے گئی تھی اور وہ ایک سنگین جرم میں ملوث ہو گیا تھا۔ پولیس تو اس لڑکی کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن بلونت سگھ اسے بلیک میل کرتا رہا تھا اور سوہراج کو اس سے بچنے کے لیے پنڈت کا روپ دھارنا پڑا تھا لیکن بلونت سگھ نے اسے دور دراز دھول پور جیسے گاؤں میں بھی تلاش کر لیا تھا۔

سوہراج سے میری بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں تو

اس سے دارا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کالی کے مندر والی پہاڑیوں کی طرف جانے سے پہلے دارا اور بلونت سگھ تین چار روز سوہراج کے پاس رہے تھے۔ ہو سکتا ہے بلونت یا دارا نے اس کے ساتھ کوئی پروگرام بنایا ہو۔ سوہراج کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا تھا کہ اسے ابھی تک بلونت سگھ کی موت کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”میری بھی تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا تھا اور یہ باتیں خوشگوار ماحول میں بھی ہو سکتی ہیں۔ اٹھو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گزبہ کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی کو گولیاں چلانے کا بہت زیادہ شوق ہے۔“

”کوئی گزبہ نہیں ہوگی۔“ سوہراج نے اٹھتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا ”سوہراج دوستی کا بھوکا ہے۔ کئی اور کھری دوستی۔ دوست بن کر دکھاؤں گا اور تمہارے لیے اپنا جیون بھی قربان کر دوں گا۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بڑی گرم جوشی تھی اس کے انداز میں۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ گردن سلاتے ہوئے بولا۔

”بڑے کڑے ہاتھ ہیں تمہارے۔ میری تو ہڈیاں تنک۔۔۔“

”کوکڑا اٹھی ہیں۔ کہاں سے سیکھا؟“  
”یہ فن کیکنے کی ابتدا بنگال سے ہوئی اور آخری سبق شاولن نیپل سے حاصل کیا لیکن ابھی بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”شاولن نیپل!“ وہ اچھل پڑا ”میں بھی شاولن نیپل جانا چاہتا تھا لیکن بیڑا غرق ہو بلونت سگھ کا۔ اس نے مجھے دلدل میں دھکیل دیا۔ پتا نہیں کیسے کیسے پہنچے دیکھتے تھے۔ سب چکنا چور ہو گئے۔“

”ایسا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا ”آوی جو سوچتا ہے بیش پورا نہیں ہوتا۔“

”ایک منٹ۔“ وہ بولا ”اگر تم اجازت دو تو لاجوئی جکی میں جا کر چائے بنا لائے۔“

”جب میں تمہارے بیڑے روم کی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا تو اس وقت تم بھی اس سے چائے بنانے کے لیے کمر کھین کی طرف گئے تھے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ! تو تم نے سن لیا تھا۔“ وہ مسکرایا ”لیکن اس کے باوجود تم ہمارا دکھا گئے۔“

”تمہاری اس لاجوئی نے حزب ہی ایسا استعمال کیا تھا کہ

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی مار کھا جاتا۔ بہر حال اب یہ چائے بنانے کے لیے کچن میں جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

میرا ابھی تک ہسپتال بدست دروازے میں کھڑی تھی۔ لاجوئی اس کے قریب سے گزری تو میرا مسکراتے ہوئے راستے سے ایک طرف ہٹ گئی اور لاجوئی کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی۔

”یہ لاجوئی کون ہے اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے سوہراج کی طرف دیکھا۔  
”تین سال پہلے میں ٹھوکر سن کھاتا ہوا ہے پور آیا تھا تو لاجوئی ہی نے مجھے سارا دیا تھا۔“ سوہراج نے جواب دیا

”اس روز میں جین مندر میں چلا گیا تھا جہاں ایک پنڈت سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ کئی پنڈتوں نے مل کر مجھے بری طرح پیٹ ڈالا اور اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ میں زخمی تھا۔ لوگ میرے قریب سے گزرتے رہے لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ لاجوئی بھی اس وقت مندر میں موجود تھی۔ یہ مجھے اٹھا کر سناں اپنے کمرے لے آئی۔ ڈاکٹر کو بلا کر میرا علاج کروایا اور میری بڑی خدمت کی۔“

”ان دنوں بھی میں بیماری ہی کا روپ دھارے ہوئے تھا اور پولیس سے بچنے کے لیے مندروں ہی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لاجوئی کو بچانے کس طرح میری باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ میں پولیس سے چھپنے کی کوشش کر رہا ہوں اور پھر مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑا۔“

”لاجوئی نے مجھے اپنا حلیہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اپنی داڑھی وغیرہ منڈوانی پڑی۔ پتا نہیں لاجوئی کو میرے اندر ایسی کیا بات نظر آئی تھی کہ وہ مجھے اٹھا کر اپنے کمرے لے آئی تھی۔ وہ شاید ہمدردی کا جذبہ تھا لیکن اس میں بدترجیب تبدیلی آئی تھی۔ ہمدردی کے بجائے کوئی اور جذبہ اس کے سینے میں جنم لے رہا تھا۔“

”میں تین مہینے لاجوئی کے ساتھ اس جنگے میں رہا۔ میں بہت کم باہر نکلا اور وہ بھی رات کے وقت۔ اور پھر ایک رات میں لاجوئی کے ساتھ ایک ٹائٹ کلب چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے بلونت سگھ کو دیکھ لیا۔“

”اور پھر اس کے بعد میں گھر سے نہیں نکلا۔ میں نے ایک بار پھر اڑم میو جینس بڑھانا شروع کر دیں۔ مزید دو مہینے بعد میں نے سر بھی منجھا کر دیا۔ میرا حلیہ اگرچہ بڑی حد تک بدل چکا تھا لیکن میرے لیے جے پور میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر پنڈتوں والا روپ دھارا اور

سار کا چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک مندر میں پناہ ملی گئی اور ایک سال بعد مجھے دھول پور والا مندر مل گیا۔ میں اس دوران میں پنڈت ہی کے ہمیش میں یہاں بھی آتا رہا۔ میں دھول پور کے مندر کو اپنے لیے محفوظ ترین جگہ سمجھتا تھا لیکن ایک روز سار کا کے بازار میں بلونت سگھ سے آسنا سامنا ہو گیا۔ پتا نہیں اس کم بخت نے کس طرح مجھے پہچان لیا تھا۔

”اس کے ساتھ ایک لونڈیا اور ایک سادھو بھی تھا۔ انہیں چند روز کے لیے پناہ چاہیے تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے انکار کیا تو وہ پولیس کو میرے بارے میں بتا دے گا حالانکہ وہ بھی اس جرم میں اتنا ہی ملوث تھا جتنا میں ہو سکتا تھا۔ میں اپنا سکون برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں پناہ دینے کا وعدہ کر لیا لیکن میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے واپس آنے سے پہلے مندر چھوڑ کر سناں آجاؤں گا کیونکہ یہی میرے لیے ایک جائے پناہ تھی لیکن سچ میں تم لوگ ٹھیک پڑے اور تم نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا اور وہاں سے بھاگنے کے لیے مجھے ایک پولیس والے کی جان لینا پڑی۔ یہ میری زندگی کا پہلا جرم ہے جو میں نے دانستہ طور پر کیا تھا۔“

”پولیس کو اس پنڈت کی تلاش ہوگی جو ایک سنتری کو قتل کر کے بھاگا ہے۔ یہاں آتے ہی میں نے اپنا حلیہ بدل لیا۔ آنکھوں میں کوئی کینٹ لینس لگانے سے میری آنکھوں کی رنکت بھی بدل گئی لیکن حیرت ہے تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟“

”تمہارے زخم کے اس نشان سے۔“ میں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا ”جب تم لاجوئی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کافی پیتے گئے تھے تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ تمہارا یہ نشان دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا۔“ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس ریسٹورنٹ سے میرا بھی کوئی تعلق ہے ”تم نے بتایا کہ بلونت اور اس کے ساتھی تمہارے پاس واپس آنے والے تھے؟“

”ہاں۔ ان کا پروگرام یہی تھا۔“ سوہراج نے جواب دیا ”بلونت سگھ کا ساتھی وہ بدیہی سادھو بہت حرامی تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ انہوں نے کوئی خاص منصوبہ بنا رکھا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر انہیں اس طرف آنے کا موقع نہ ملا تو وہ ہر دار کی طرف نکل جائیں گے۔“

”ہر دار۔ یہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ ہر دار ہندوؤں کا کوئی مقدس مقام ہے لیکن آج تک اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کراہی جگہ پر آیا۔

میں سوہراج سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتوں میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ضرور لگ جائے گا۔

”تم بلونت سنگھ کو کیسے جانتے ہو اور اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“ سوہراج نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔  
”بلونت سنگھ دراصل راج کمار کی روپ متی کا دوست تھا اور۔“

”راج کمار کی روپ متی کا دوست!“ سوہراج کے لیے میں حیرت تھی۔

”ہاں یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔“ میں نے کہا ”میں سمجھتا ہوں کہ بلونت کے باپ کے پاس بھی دولت کی کمی نہیں۔ وہ زندگی بھر اپنے باپ کی دولت پر عیش کر سکتا تھا لیکن وہ فطرتاً کینہ آدمی تھا۔ اس کی نظریں ہمیشہ دوسروں کے مال پر رہتی تھیں۔ اس نے راج کمار کی روپ متی سے دوستی بھی اسی لیے کی تھی کہ اس کی دولت پر عیش کر سکے اور۔“

”اور راج کمار کے حسن و شباب سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔“ سوہراج نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ روپ متی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

”روپ متی ایک آزاد منش عورت تھی۔“ میں نے کہا ”اور اس کی یہ روش ہی اسے غلط راستے پر لے گئی تھی۔ اسے لوٹ کا مال سمجھ لیا گیا تھا۔ گویا وہ بہتی گنگا تھی جس میں ہر شخص ہاتھ دھوئے گا خزانہٴ منہ تھا اور جب میں راج کمار کی روپ متی کے حلقہٴ احباب میں داخل ہوا تو اس کے بہت سے دوست مجھ سے ناراض ہو گئے کیونکہ میں روپ متی کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روپ متی کے دو ذاتی ملازم اور بلونت سنگھ میری ان کوششوں سے بے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ بلونت سنگھ سے دشمنی کی اصل وجہ کیا تھی ”ان تینوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”روپ متی کے ذاتی ملازم دونوں سنگھے بھائی تھے۔ دھرمیش اور راج سنگھ۔ وہ دونوں روپ متی کے کزن بھی تھے لیکن ان دونوں نے روپ متی کو اپنی جائیداد سمجھ لیا تھا۔ مجھ سے پہلے بازی کے نتیجے میں وہ دونوں اپنے انجام کو پہنچ گئے اور۔“

”ایک منٹ!“ اس مرتبہ لاجوتی نے مجھے ٹوک دیا ”تم بہت سنگھ تو نہیں؟“

”یوپی میں ہے اور بہت دور ہے۔“ سوہراج نے جواب دیا۔

”لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ بلونت سنگھ کہاں ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔  
”کہاں؟“ وہ سوالیہ لگا ہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔  
”جہنم میں۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔  
”کیا۔؟“ وہ اچھل پڑا۔

”جہنم اس چمچے لوگوں کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

اس کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”گویا اب مجھے اس سے نجات مل گئی۔“

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ ملا اور لاجوتی کمرے میں آگئیں۔ لاجوتی نے کپڑے بدل لیے تھے اور اس نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اب اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا لیکن آنکھوں میں ابھرنے والا ہستور تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور ایک کپ اٹھا کر پہلے میری طرف بوجھایا اور دوسرا سوہراج کو دے دیا۔ وہ تیسرا کپ ہلا کی طرف بوجھاتے ہوئے بولی۔

”بیٹھ جاؤ دیدی۔ تم کھڑی کیوں ہو؟“  
”دیدی!“ ملا نے زوردار قہقہہ لگایا ”میں تو آپ سے بہت چھوٹی ہوں۔ آپ مجھے دیدی کیوں کہہ رہی ہیں۔ ہلا کہہ کر پکارتے۔“

”اچھا۔ ملا رانی بیٹھ جاؤ اور چائے پیو۔“ لاجوتی بولی۔  
ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان میں بھی مفاہمت ہو چکی تھی۔ میز سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے میری نظریں سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئیں جس کی سوئیاں ایک بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ وقت دیکھتے ہی مجھے ٹھاکر اور جاکنی وغیرہ کا خیال آیا۔ وہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب اسٹینڈ پر ٹیل فون بھی رکھا ہوا تھا جس کے قریب ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھا اور فون کا ریپور اٹھا کر ٹھاکر کے ہوٹل کا نمبر ملائے لگا۔ ٹھاکر ابھی تک ہوٹل میں ہی تھا اور ہمارے لیے پریشان تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر پہنچ جائیں گے۔ کریڈل ٹیپ کر گے میں نے حویلی کا نمبر ملایا اور جاکنی کو بھی اپنی خیریت کی اطلاع دے

ترین مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ہاڑیوں اور جنگلوں میں گھرے ہوئے اس چھوٹے قصبے کو OF THE WORLD YOGA CAPITAL بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے لوگ یوگا کا اسرار علم سیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

اس بڑھ بھکشو کی باتوں سے میرے جذبات کچھ اور بھی بھڑک اٹھے۔ اب مجھ سے وقت گزارے نہیں مگر تاتھا۔ میں نے اور سو بھراج نے چپکے ہی چپکے تیار شروع کر دی اور پھر اپنی روانگی سے ایک روز پہلے میں نے تھاکر کو اعتماد میں لے کر بتا دیا کہ میں ہر دو روز چار بار ہوں۔

”ہر دو روز“ تھاکر چونک گیا، ”مگر تم تو ہندو نہیں ہو۔ کیا کرو گے وہاں جا کر وہاں تو ہر طرف مندر ہی مندر ہیں۔“

”اور انہی مندروں میں مجھے دایا کے ملنے کی توقع ہے۔“ میں نے کہا، ”اس کے علاوہ سنا ہے ہر دو روز سے چند میل کی دوری پر رشی کیش میں یوگا کا بہت بڑا مرکز ہے۔ میں وہاں بھی جانا چاہتا ہوں۔“

”اور تمہاری وہ جو چیتھی ہے جاگتی؟“ تھاکر بولا، ”وہ تو میری جان کھاجا کے گی۔ بویاں نوج لے کی میری اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بلا بھی تمہارے بغیر سانس نہیں لے سکتی اور وہ جو ہے راج کماری روپ متی جی۔ وہ بھی تم پر جان چڑھتی ہے۔ بہت پریم کرتی ہے تم سے۔ میں ان تینوں آفتوں سے کیسے نمٹوں گا۔ وہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“

”روپ متی تو تم سے پریم کرتی ہے تھاکر جی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ”بہت چاہتی ہے وہ تمہیں اور میں جانا ہوں، تم بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میری مانو تو اب تم دونوں ایک ہو ہی جاؤ۔“

تھاکر کا چہرہ اس طرح سرخ ہو گیا جیسے وہ کوئی لڑکی ہو اور میں نے اس کے پریم کا نام لے کر اسے چھیڑ دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ گرا سانس لیتے ہوئے بولا، ”تم ہر دو روز سے واپس آ جاؤ تو اس سلسلے میں سوچوں گا۔ ویسے تم کب جا رہے ہو؟“

”کل سپر۔“ میں نے جواب دیا، ”سو بھراج نے پنک ٹی ایکسپریس پر دہلی کے لیے سٹیشن تک کوا لیا ہیں۔“

”اوہ!“ تھاکر چونک گیا، ”سو بھراج جی تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟“

”ہاں۔ صرف سو بھراج۔ وہ قابل اعتماد آدمی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ تھاکر نے گہرا سانس لیا، ”تمہارے بعد جو کچھ بھی ہوگا، بھگت لوں گا اور تمہیں میرے یہ بال بہت اچھے لگتے ہیں نا۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، ”واپس آ کر اگر تمہیں میرے سر پر کوئی بال نظر نہ آئے تو افسوس مت

میں ڈال چکا ہے۔“

یہ باتیں بھی بڑی عجیب مخلوق ہیں۔“ سو بھراج مسکرایا، ”جس مرد کو اپنا مان ہیں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دینا کو تیار ہو جاتی ہیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔“

”لا جوتی کے آجانے سے ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اس نے ہمارے سامنے چائے کے کپ رکھ دیے اور باری باری ہمارے چہروں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کون کی خاص بات ہو رہی تھی؟“

”میں۔“ سو بھراج بولا، ”ہم یہ بات کر رہے تھے کہ ہاوری ڈاکٹر زیادہ حسین ہے یا جیما مانی۔ اب یہ فیصلہ تم ہی کو کرنی ہے ان دونوں میں زیادہ حسین کون ہے؟“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ان دونوں میں زیادہ حسین کون ہے البتہ یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ ان دونوں سے زیادہ حسین تو میں ہوں۔“ لا جوتی نے جواب دیا۔

”اور یہ فیصلہ ہی صحیح ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہم نے اگرچہ جیما مانی اور ہاوری ڈاکٹر کے ناموں کی آڑ لے کر بات کی تھی لیکن میرے خیال میں لا جوتی اتنی بے وقوف نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم کسی خاص موضوع پر بات کر رہے تھے اور وہ بات اس سے چھپانا چاہتے تھے لیکن اس نے اصل بات جاننے کے لیے اصرار نہیں کیا تھا۔

اس سے اگلے روز ریسٹورنٹ میں ایک بڑھ بھکشو سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک اور آدمی کے ساتھ کافی بیٹے آیا تھا اور وہ دونوں کاؤنٹر کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ ان کی باتیں سن کر میں بھی متوجہ ہو گیا۔ بھکشو اس آدمی کو یوگا کے بارے میں پتا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں وہ کبھی تن کر بیٹھ جاتا اور اشاروں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا۔

میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی میز پر گیا۔ کہیں پر بات یوگا یا مارشل آرٹس کی ہو رہی ہو اور میں اس میں دلچسپی نہ لیں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ زندگی بھر کے تجربے سے یہ بات مارت دیکھنے میں آئی تھی کہ بڑھ بھکشو اور ہندو یوگی یوگا میں جتنی باتیں ملتی ہیں ان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں نے بھی ہاتھ دیکھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یوگا تن کر بیٹھ جانے اور انہیں اسرار علم سے جسے کہتے ہیں اس کے لیے ایک عمر چاہیے۔

باتیں بھکشو نے بھی یوگا کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں اور چند باتیں اس نے اگلے سے میں نے کیں تو وہ پنک کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے بتایا کہ ہر دو روز رشی کیش کو دنیا بھر میں یوگا کا سب سے بڑا اور اہم

اور وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور بلا ٹینجزر سیٹ پر بیٹھ کر اٹھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

میرے اندر ایک نئی بے چینی جنم لے چکی تھی۔ میں نے تھاکر سے ہر دو روز کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ ہر دو روز ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے اور ہر ہندو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ وہاں جانا ضروری سمجھتا ہے۔

میں ادھر ادھر سے بھی لوگوں سے ہر دو روز کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مجھے پابوسی نہیں ہوئی اور میں نے بہت سی معلومات حاصل کر لیں۔

سو بھراج اور لا جوتی سے بھی میرے اچھے دوستانہ تعلقات استوار رہے۔ چکے تھے اور پچھلے ایک مہینے کے دوران میں کئی مرتبہ ان سے مل چکا تھا۔ کبھی بلا میرے ساتھ ہوتی اور کبھی میں اکیلا ہی چلا آتا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

ایک روز میں نے سو بھراج سے ہر دو روز کے بارے میں بات کی تو وہ فوراً ہی میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔ وہ بے ہوئے ملنے میں یہاں اگرچہ بڑی حد تک محفوظ تھا لیکن دل کو ایک دھڑکا تو لگا ہوا تھا۔ سر پر خوف کی ایک تلوار تو لٹک رہی تھی اس لیے وہ بھی یہاں سے دور چلے جانا چاہتا تھا۔

”لیکن ایک بات ہے۔“ سو بھراج نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگرمی میں کہا، ”ہمیں کسی کو بتائے بغیر یہاں سے جانا ہوگا۔ نہایت خاموشی سے۔“

”تو کیا تم مجھے ہو کہ ہم بیٹھا باجے کے ساتھ رخصت ہوں گے؟“ میں نے کہا۔

”تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔“ سو بھراج نے کہا، ”یہ لا جوتی ہے نا۔ اگر اسے پتا چل گیا تو یہ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو جائے گی اور میں اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ نجانے وہاں ہمیں کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔“

”یہی صورت حال میرے ساتھ بھی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ”دو بلا میں میرے ساتھ بھی لپٹی ہوئی ہیں۔ بلا اور جاگتی کو پتا چل گیا تو وہ کسی بھی حالت میں مجھے نہیں جانے دیں گی۔ جاگتی کو تم نہیں جانتے۔ وہ مجھے ایک قدم نہیں ہٹنے دیتی۔ میری وجہ سے کئی مرتبہ اپنا جیون خطرے

”ہاں۔ میرا نام بہت سنگھ ہے۔“ میں نے کہا، ”اور تم میرے نام سے واقف ہو تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوگی۔“

”جی بہت سنگھ جی۔ بہت کچھ۔“ لا جوتی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اور میرا خیال ہے اب ہمیں تم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ آج تم جیسے آدمی کے درشن ہو گئے۔ آپ تو بڑے مہمان ہیں۔ مبارک ش۔“

”شکریہ۔“ میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا، ”بلونت سنگھ ہم سے انتقام لینے کے لیے ایک ایسے شخص سے مل گیا جو میرا ذلی دشمن تھا۔ میں اس کی تلاش میں تھا اور اتفاق سے وہ بھی یہاں بے پور میں موجود تھا۔ ان دونوں نے ہمارے خلاف کیا کیا سازشیں نہیں کیں اور کہاں کہاں محاذ نہیں کھولے۔ ہم انہی کی تلاش میں سارے کھائے تھے۔ وہاں سے مندر والی ہاڑیوں میں پہنچ گئے۔ وہاں بلونت سنگھ تو مارا گیا اور دارا بھی میرے ہاتھ اٹھ گیا لیکن وہ میری دوست کو زخمی کر کے فرار ہو گیا۔“

”اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔“ میرے خاموش ہونے پر سو بھراج نے کہا، ”جب وہ دھول پور میں میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے تو پھر گیارہ راج نام کے کسی رشی (نیک، پرہیزگار، عابد۔ زائد) کے بارے میں بات کر رہے تھے جو پہلے سے پور میں تھا لیکن کچھ عرصے پہلے ہر دو روز چلا گیا تھا۔ بلونت سنگھ نے کہا تھا کہ اگر وہ لوگ دھول پور واپس نہ آسکے تو ہر دو روز چلے جائیں گے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا، ”بلونت سنگھ مارا گیا اور مجھے یقین ہے کہ دارا اس لوڈیا کو لے کر۔ ہر دو روز چلا گیا ہوگا۔ میرے خیال میں۔۔ ہر دو روز جیسی دور دراز جگہ ہی اس کے لیے محفوظ ہو سکتی ہے۔“

”ان کے ساتھ جو لوڈیا تھی وہ بھی ماری گئی بلکہ اسے تو دارا ہی نے گولی ماری تھی۔“ میں نے کہا۔

”اوہ!“ سو بھراج کے منہ سے بے اختیار نکلا، ”تو پھر یقین کر لو کہ وہ ہر دو روز ہی گیا ہوگا۔“

”لیکن میرا خیال ہے کہ فی الحال تو سب سرستھ، الور یا قرب وجوار میں کسی جگہ چھپا ہوگا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی تھی اور وہ ٹکڑی ٹانگ کے ساتھ اتنا طویل سفر نہیں کر سکتا۔“

کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر ہم دارا اور ہر دو روز کے بارے ہی میں باتیں کرتے رہے۔ ہم میں دوستی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ میں ان دونوں کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا

کرنا۔

”میں اتنی لمبی مدت کے لیے تو نہیں جا رہا کہ۔“  
”بات لمبی مدت کی نہیں۔“ ٹھاکر نے میری بات کاٹ دی ”تم مجھے تین بلاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا رہے ہو۔ میرے بال نوپنے میں تو انہیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“

میں اس بات پر قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ میرے بعد وہ تینوں واقعی ٹھاکر کی بوئیاں نوچ لیں گی۔

”اور دیکھو۔“ ٹھاکر نے کہا ”اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دینے میں دیر مت کرنا۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔“

”اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں تمہیں ضرور اطلاع دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

میں نے اور سو بھراج نے اپنے الگ الگ بیک تیار کر لیے تھے۔ اپنی میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی تھی اور یہ دونوں بیک ہم نے ٹھاکر کے ہوٹل ہی میں رکھے ہوئے تھے۔

ہنگ سٹی ایکسپریس اپنی نوعیت کی ایک منفرد ٹرین تھی۔ راجستھان میں ہر سال سات آٹھ لاکھ غیر ملکی سیاح آتے تھے اور یہ ٹرین صبح بچے دہلی سے روانہ ہو کر دوپہر کے وقت بے پور پہنچتی تھی۔ سہ پہر چار بجے بے پور سے روانہ ہو کر رات کو دہلی واپس آجاتی۔ موسم کے مطابق اس ٹرین کے ٹائم ٹیبل میں ردوبدل بھی ہوتا رہتا تھا۔ دو سو ستر کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں پانچ گھنٹے لگتے تھے۔

رات نو بجے کے قریب ہم دہلی ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہو رہی تھی۔ میں کاغذات کے بغیر غیر قانونی طور پر ہندوستان میں میم تھا۔ طیارے کے حادثے کے بعد اگر میں پولیس سے رابطہ کر لیتا تو ہمیں پاکستان بھیجنے کا بندوبست ہو سکتا تھا لیکن رگستان میں جہاز کے حادثے کے بعد حالات نے اس طرح پلٹا کھینچا تھا کہ ہم ہندوستان کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ بے پور میں اجنبی لوگوں سے ہماری دشمنیاں بھی چلیں اور کچھ شخص دوست بھی ملے اور ان دوستوں ہی کی وجہ سے ہم قانونی الجھنوں سے بچے رہے تھے لیکن اب میرے وہ دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سو بھراج میرے ساتھ تھا لیکن وہ بھی اس شہر میں اجنبی تھا اور ظاہر ہے کسی اجنبی جگہ پر دل میں انجانے سے دوسرے ضرور جنم لیتے ہیں۔

ہم ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں گئے۔ دہلی کی سیر کا ہمارا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہمیں تو یہاں صرف رات

گزارنی تھی۔ صبح نہیں دہرا دوں چلے جانا تھا جہاں سے ہم میسوری کے لیے روانہ ہو جاتے۔

دہلی سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر میرٹھ شہر آباد ہے۔ وہ شہر ہے جہاں سے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا آغاز ہوا تھا۔ میرٹھ سے تقریباً سو میل آگے ساہنپور میں ٹرین رکی تو آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ وہ اسٹیشن آگے ایک مال گاڑی پڑی سے اتر جائے اس لائن پر ریلوے ٹریفک معطل ہو چکا ہے اور ٹرین کم از کم پچ گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔

ہم چھ گھنٹے انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری طر اور بھی بہت سے مسافر ٹرین سے اتر کر لاری اڑے کا رخ کر گئے۔

دو ہزار میٹر لمبا اور ہالیا کے قدموں میں آیا دو ہزار ایک بڑا اور بارونٹی شہر ہے۔ اس سے صرف پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر خوب صورت بل اسٹیشن میسوری واقع ہے۔ ہم نے دہرا دون میں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور لاری اڑے ایک بس سے اتر کر دوسری بس پر سوار ہو گئے۔

پینتیس گھنٹیں کلومیٹر کا فاصلہ تین گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔ پہاڑی راستے نہایت دشوار گزار اور سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دہرا دون سے کچھ فاصلے پر نئی مال بھٹ اس سے تھوڑا ہی آگے ہندوستان کی سرحدیں ایک طرف نیپال اور دوسری طرف چین میں تبت سے ملتی ہیں۔ نئی مال سے دہرا دون تک ایک دیلی بجلی ہوئی ہے جہاں دنیا کے خوفناک ترین درندے پائے جاتے ہیں۔

دہرا دون شمال میں ہندوستان کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے اور یہاں ایک بہت بڑی ملٹری اکیڈمی بھی ہے۔ ایک بس سے اتر کر دوسری بس پر سوار ہونے کے درمیان تقریباً پڑھ گھنٹا ہم چائے وغیرہ پینے کے لیے یہاں رکے تھے۔ میسوری پہنچتے ہوئے شام ہو گئی۔

یہاں کی اتھم ہوٹل تھے لیکن ہمیں کہیں بھی جگہ نہیں ملی۔ تقریباً دو گھنٹے ایک ایجنٹ کے ساتھ کھونٹے کے بعد ایک راجیوٹ کیسٹ ہاؤس میں کمرال گیا۔ یہ کیسٹ ہاؤس شہر کے مرکز سے دور ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں کچھ غیر ملکی سیاح بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ دن بھر کے سفر نے مجھے بڑی طرح تھکا دیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ستر لیتے ہی ہو گیا اور پھر مجھے کچھ ہوٹل نہیں رہا۔

☆

ہم دوپہر تک میسوری میں رہے اور پھر ایک بس پر سوار ہو کر ہرودار کے لیے روانہ ہو گئے۔ بس مسافروں سے بھرا

تھی۔ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ گنگوتری کی یاترا کے لیے جا رہے تھے۔ ہر بس کا یہی حال تھا۔ ہماری بس میں تین چار پنڈت اور پجاری بھی سوار تھے جو اونچی اور بھاری آوازوں میں بھجن اور اشلوک گارہے تھے۔

چوبیس کلومیٹر کا یہ فاصلہ بھی ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ ہالیا کے قدموں میں بھرا ہوا یہ شہر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑیوں پر اور پہاڑیوں کے دامن میں رنگ پرنگی چھتوں والی چھوٹی چھوٹی عمارتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے پس منظر میں ہالیا کی وہ برف پوش چوٹیاں تھیں جہاں سے ندی نالوں کی صورت میں بننے والا پانی ہرودار کے دامن میں گنگوتری کے مقام پر ایک باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ یہی گنگا تھا جس کے پانی کو ہندو دھرم میں مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ لگا کے پاک پانی میں غسل کر لینے سے سارے گناہ واصل ہاتے ہیں۔

میرے خیال میں ہرودار اور گنگوتری کو ہندوؤں کا مکہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ہندوؤں میں گنگا جل کو اس طرح مقدس اور متبرک مانا جاتا ہے جیسے ہم آپ زم زم کو متبرک سمجھتے ہیں۔

میرے خیال میں اس دریا کا نام ”گنگا“ بھی شاید اس لیے رکھا گیا کہ پہاڑوں سے ندی نالوں کی صورت میں بننے والا پانی گنگوتری نامی گاؤں کے قریب ایک باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہاں اس دریا کا پائت کیسٹ تو بہت چوڑا ہے اور گیس ایک ننگ پہاڑی نالے کی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ نشیب کی طرف بہتا ہے اس کا پائت باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ٹھاکر نے ٹھیک کا تھا۔ ہرودار مندروں کا شہر تھا۔ یہاں انہی مندروں کے بڑے مندر تھے اور اگر دارا یہاں آیا تھا تو انہی مندروں میں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

لیکن سب سے پہلے ہمیں اپنا ٹھکانا بنانے کی فکر تھی اور ٹھکانے کا تلاش کر لیتا مشکل ہی لگ رہا تھا۔ یہاں اگرچہ ہزاروں ہائی ہوٹل، سرائے اور کیسٹ ہاؤسز بھی تھے لیکن وہ تقریباً سب بچے کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑا سا ٹھکانا پانی تھا۔ موسم اگرچہ بہار کا تھا مگر شمال میں ہائی کی برفانی چوٹیوں سے اترنے والی ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ اگر کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے تو ہم رات کی سردی میں ٹھہر کر رہ جائیں گے۔ سو بھراج نے کہا۔

”دو سائے ایک دھرم شالا کا پور ڈنگا ہوا ہے۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ اگر وہاں رات گزارنے کی جگہ مل جائے تو۔“  
”جائز۔ وہاں بھی قسمت آزمائو۔“ میں نے مگر سانس لینے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔  
سو بھراج سڑک پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں یاتریوں کے لیے کئی دھرم شالے بھی تھے یہ دھرم شالے دراصل ان غریبوں کے لیے تھے جن کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ ہو لیکن یہاں بھی دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے دولت مند ہندو یاتریوں نے قبضہ ہمارا کھا تھا۔ ان دھرم شالوں کے پنڈتوں کی بھی پانچوں کھی میں اور سرکاری میں تھے۔ ہم نے کئی جگہ قسمت آزمائی کی مگر لیکن ہر جگہ ہمیں ہری جھنڈی دکھادی گئی تھی۔  
سو بھراج دھرم شالا کے گیٹ میں غائب ہو چکا تھا اور میں موڑ پر کھڑا دھرا دھرا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے چونک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے مگر سانس نکل گیا۔  
وہ ایک اوجڑ عمر عورت تھی۔ قد لمبا اور بالوں میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ رنگت گوری اور چہرے کے نقوش اب بھی جاذب نظر تھے۔ جوانی میں وہ یقیناً بہت حسین رہی ہوگی۔ اس نے ہولدار پر کڑے کا کھانگرا بن کر کھانا اور اوپر آتش لگائی رنگ کی ایک چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کے بدن کا سائے کا حصہ تو چھپ گیا تھا کہ نہ ہر ہند تھی۔ اس کی پیشانی پر سرخ رنگ لگا ہوا تھا اور گلے میں کئی ہلالائیں تھیں۔ کانوں میں چوڑیوں جتنی بڑی چاندی کی ہالیاں تھیں اور ایک کالی میں بھی چاندی کا کڑا نظر آ رہا تھا۔  
اس شہر میں بھکاریوں کی بھی کئی نہیں تھی اور میں اسے بھی کوئی بھکار ہی سمجھتا تھا۔ میں نے جب میں ہاتھ ڈال کر ایک سک نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔  
”میں بھکارن نہیں ہوں شرمینا جی۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”تو پھر کون ہو تم شرمستی جی۔“ میں نے اسے گھورا۔  
”میں بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم دونوں سر چھپانے کی کسی جگہ کی تلاش میں اور ہرا دھرا مارے مارے پھر رہے ہو۔“ اس عورت نے جواب دیا ”تمہارا وہ بڑا سانسے والے دھرم شالا میں یہی معلوم کرنے گیا ہے۔ ابھی دیکھنا وہ منہ دکھانے واپس آجائے گا۔“  
”کیا تم دیر سے ہمارا پیچھا کر رہی ہو؟“ میں نے ایک بار پھر اسے گھورا۔

”دو سائے ایک دھرم شالا کا پور ڈنگا ہوا ہے۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ اگر وہاں رات گزارنے کی جگہ مل جائے تو۔“

”جائز۔ وہاں بھی قسمت آزمائو۔“ میں نے مگر سانس لینے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

سو بھراج سڑک پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں یاتریوں کے لیے کئی دھرم شالے بھی تھے یہ دھرم شالے دراصل ان غریبوں کے لیے تھے جن کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ ہو لیکن یہاں بھی دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے دولت مند ہندو یاتریوں نے قبضہ ہمارا کھا تھا۔ ان دھرم شالوں کے پنڈتوں کی بھی پانچوں کھی میں اور سرکاری میں تھے۔ ہم نے کئی جگہ قسمت آزمائی کی مگر لیکن ہر جگہ ہمیں ہری جھنڈی دکھادی گئی تھی۔

سو بھراج دھرم شالا کے گیٹ میں غائب ہو چکا تھا اور میں موڑ پر کھڑا دھرا دھرا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے چونک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے مگر سانس نکل گیا۔

وہ ایک اوجڑ عمر عورت تھی۔ قد لمبا اور بالوں میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ رنگت گوری اور چہرے کے نقوش اب بھی جاذب نظر تھے۔ جوانی میں وہ یقیناً بہت حسین رہی ہوگی۔ اس نے ہولدار پر کڑے کا کھانگرا بن کر کھانا اور اوپر آتش لگائی رنگ کی ایک چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کے بدن کا سائے کا حصہ تو چھپ گیا تھا کہ نہ ہر ہند تھی۔ اس کی پیشانی پر سرخ رنگ لگا ہوا تھا اور گلے میں کئی ہلالائیں تھیں۔ کانوں میں چوڑیوں جتنی بڑی چاندی کی ہالیاں تھیں اور ایک کالی میں بھی چاندی کا کڑا نظر آ رہا تھا۔

اس شہر میں بھکاریوں کی بھی کئی نہیں تھی اور میں اسے بھی کوئی بھکار ہی سمجھتا تھا۔ میں نے جب میں ہاتھ ڈال کر ایک سک نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”میں بھکارن نہیں ہوں شرمینا جی۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کون ہو تم شرمستی جی۔“ میں نے اسے گھورا۔

”میں بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم دونوں سر چھپانے کی کسی جگہ کی تلاش میں اور ہرا دھرا مارے مارے پھر رہے ہو۔“ اس عورت نے جواب دیا ”تمہارا وہ بڑا سانسے والے دھرم شالا میں یہی معلوم کرنے گیا ہے۔ ابھی دیکھنا وہ منہ دکھانے واپس آجائے گا۔“

”کیا تم دیر سے ہمارا پیچھا کر رہی ہو؟“ میں نے ایک بار پھر اسے گھورا۔

”یہی سمجھ لو۔“ وہ بولی ”ان دھرم شالوں پر تو دھن والوں کا قبضہ ہوتا ہے اور یہ سالے پندت بھی بہت حرامی ہیں۔ خوب دھن کما لے ہیں۔“

”کیا تم یہی بتانے کے لیے ہمارا پیچھا کر رہی تھیں؟“ میں نے کٹھا۔

”ہاں۔ اور میں تمہارا مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ! میں اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی رہائی ہوئی، سرائے یا گیسٹ ہاؤس کی ایجنٹ تھی۔ کوئی ہوئی، سرائے یا گیسٹ ہاؤس؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک چھوٹی سی کنیا ہے جہاں تم لوگوں کو رات گزارنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ باہر رہو گے تو ٹھہر جاؤ گے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور اس کنیا میں رہنے کا ایک رات کا کام کیا لو گی؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ اس نے کہا ”ویسے جو تمہارے من میں آئے صبح نندا دیوی کے مندر میں بیٹھ چڑھاؤ۔“

میں حیرت سے اس کی صورت تنکے لگا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تو بڑے بڑے دین دھرم والے پیسے کی ہوس میں مرے جا رہے تھے مندر جیسے مقامات پر بھی دیوی دیوتاؤں کے بجائے پیسے ہی کی پوجا جاتی تھی اور یہ سادھو قسم کی عورت ہمیں کسی لالچ کے بغیر اپنی ٹائیس رات گزارنے کی اجازت دے رہی تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ ہو سکتا ہے دارا یہاں پہنچ گیا ہو۔ ہم دوسرے یہاں گھوم رہے تھے میں اپنی اصل شکل صورت میں تھا۔ ممکن ہے دارا نے مجھے دیکھ لیا ہو اور مجھے پھانسنے کے لیے اس سادھو عورت کے ہمیں میں ایک تیار کیا ہو۔

”اگر تم ہمیں اپنی کنیا میں جگہ دے دو گی تو خود کہاں رہو گی؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”میری کنیا میں بہت جگہ ہے اور من میں بھی۔“ اس نے جواب دیا۔

باتیں کرتے ہوئے میری نظریں آشرم کی طرف اٹھ گئیں۔ اس عورت نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سوہراج دھرم شالا کے دروازے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ واقعی نکلا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے وہاں سے بھی ہری جمنڈی دکھا دی گئی تھی۔

”دیکھا۔ میں نے کہا تھا تاکہ تم لوگوں کو کس جگہ ملے گی۔“ اس عورت نے کہا۔ اس نے بھی سوہراج آشرم سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا ”میرے ساتھ بیڑ میری کنیا میں۔“

”کہاں ہے تمہاری کنیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس طرف۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”سے گنگوڑی بھی زیادہ دور نہیں ہے۔“

سوہراج سڑک پار کر کے ہمارے قریب پہنچا تو وہ ”صبر“ پیچھے آجاؤ۔“ کہتے ہوئے ایک طرف چل پڑا۔ سوہراج نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اسے اشارہ کرتے ہوئے اس عورت کے پیچھے چلے گا۔

”کون ہے یہ اور ہمیں کہاں لے جا رہی ہے؟“ سوہراج نے سرگوشی میں پوچھا۔

”یہی کنیا میں۔“ میں نے جواب دیا ”وہاں چل کر پوچھیں گے کہ یہ کون ہے اور ہم پر اتنی مہمان کیوں ہے؟“

”ایسی جگہوں پر دھوکے بازوں اور لیڈروں کی بھی گڑبڑ ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ عورت ہمیں پھانسنے کی کوشش لے جا رہی ہو جہاں سے ہمارے لیے واپسی کا کوئی راستہ ہے۔“

”مجھے لوٹے جانے کا نہیں بلکہ ایک اور شہ ہے۔“

نے کہا اور پھر دارا کے بارے میں اپنے اندیشے کا اظہار کرنے کا اور پھر آخر میں کہا ”اب تو چلے رہو۔ جو ہو گا وہ جاتے گا۔“

ہم اس عورت کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ہم اس ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔

شہر کی آبادی بکھری ہوئی تھی۔ ہم گلیوں سے نکل کر اس طرف آگے جہاں عمارتیں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں۔ کسی پہاڑی پر کوئی مندر تھا اور کسی پہاڑی کے اوپر

میں کوئی پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس یا مکان۔

سوہراج اب مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ کچھ دیر وہ پہاڑوں کے پیچھے چھپ جانے والا تھا۔ وہ عورت بھی ایک ایسی جگہ پر آئی جہاں مکان وغیرہ ایک دوسرے

بست دور دور تھے۔

وہ عورت لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک گئی جو دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا۔ اس پاس چڑ کے چند درخت تھے اور پتہ رہا میں کڑ آج ایک غمناک پہاڑی والا تھا۔ اس کا خفاف پانی ڈوبے ہوئے سونے کی روپکی کنوئیں میں جھک رہا تھا۔ ایک طرف کچھ لوگ

تھے۔ وہ غالباً ایک ہی قبیلہ تھی۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ دو عورتیں کپڑوں سمیت پانی میں بیٹھی ہوئی تھیں اور باتوں سے اپنے سروں پر پانی ڈال رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دس گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اور ایک اور بزرگ عمر آدمی بھی کھڑے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ بلا بھی اسی دیہاتی کا حصہ ہے جس کے پانی کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور یہ سب لوگ اس پاک پانی میں اپنے گناہ دھو رہے تھے۔

ہمارے ساتھ آنے والی عورت نے چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چالی نکالی اور مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ہم دونوں باہر کھڑے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ اس مکان کے اطراف میں سو سو گز کے فاصلے تک کوئی اور مکان وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ہمیں اور پہنچانے کا کوئی منصوبہ بنایا گیا تھا تو اس کے لیے بہتر جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پہاڑی نالے پر غسل کرنے والے لوگ اب واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

”ارے! تم باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آ جاؤ۔“

اس عورت کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے سوہراج کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں حیرت سی ابھر آئی۔

اس عورت نے مجھے کنیا کہا تھا وہ لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک مکان تھا جو اندر سے تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ قومی تاج میں تین کمرے تھے اور یہاں اس نے کیوہ سین کا لباس پہنا ہوا تھا اور دیگر ساتھ ساتھ لٹے ہوئے دو کمروں کے دروازے بھی اس کمرے میں کھلتے تھے۔

یہ کمرہ بڑا تھا۔ اس کے ایک حصے میں آتش دان بنا ہوا تھا جس کے آس پاس کچھ برتن وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ دائیں طرف ایک کمرہ بھی تھا جس میں پانی سے بھری ہوئی ایک ہائی ریم ہوئی تھی اور کمرے کے باہر ایک منڈکا تھا جس کے ذمے پر ایک گھاس بھی اونٹن چاڑھا تھا۔

کمرے میں بھیر کے بالوں سے بنا ہوا ایک منہ بچا ہوا تھا جس پر تین چار آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔

”جو گھوم لوگ۔“ میں چائے بناتی ہوں۔“ عورت نے کہا اور آتش دان کے قریب بیٹھ گئی۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کندھوں پر لگے گھاس میں سے ٹانگیں آگے کو پھیلائی تھیں۔ وہ عورت مونڈی کا کھول گئی تھی۔

تقریباً تین منٹ بعد چائے تیار ہو گئی تو اس نے ایک

ایک پیالی ہمارے سامنے رکھ دی اور خود بھی ہمارے سامنے آتی پاتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک پیالی اپنے قریب رکھ لی تھی۔

”یہ کنیا تمہاری ہے؟“ میں نے لفظ کنیا پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اس کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آگئی ”پہلے میں اس کا بھڑا دیتی تھی پھر میں نے اسے خرید لیا۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا ”اور ہمیں یہاں کس لیے لائی ہو؟“

”تم لوگوں کو رات گزارنے کے لیے جگہ کی تلاش تھی اس لیے یہاں لے آئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا ”اور یہاں کیوں لائی ہوں؟ یہ بھی بتا دوں گی۔ پہلے اطمینان سے چائے پیو۔“

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا البتہ بار بار کن آنکھیں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جوانی میں یقیناً بہت حسین رہی ہوگی لیکن اب تو اس کا شہنشاہ ہوا سا لگ رہا تھا۔

میں اپنی پیالی اٹھا کر جانے کی بجلی بجلی چسکیاں لینے لگا۔ وہ عورت ہمارے سامنے بالکل پوگا کے انداز میں آتی پاتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی کمر تھی ہوئی لگتا تھا جیسے وہ

بیشہ اسی انداز میں بیٹھنے کی عادی ہو۔

سوہراج چائے ختم کر کے باہر چلا گیا۔ وہ عورت اب بھی خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر میں کچھ الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ ہمارے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوئی تو اس طرح مطمئن اور پرسکون نہ ہوتی۔ اس پر کچھ نہ کچھ گھبراہٹ ضرور طاری ہوتی لیکن وہ بالکل پرسکون

تھی۔

”تم کون ہو؟“ میں نے ایک بار پھر سوال کیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک اور سوال بھی آیا۔ کہیں یہ کوئی شکاری عورت تو نہیں؟ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ شکاری عورتوں کا حلیہ اس طرح اجڑا ہوا

نہیں ہوتا۔ وہ تو مردوں کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے آپ میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ستر سال کی بڑھیا بھی ہوگی تو وہ میک اپ کے سہارے جوان بننے کی

بھرپور کوشش کرے گی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔

”تم نے مجھے بچانا نہیں وجدان!“

اس کی زبان سے ایسا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی گردن پر چوٹیاں سی رہتے ہوئے محسوس ہونے لگی اور سنسنی کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ہندوستان کے اس



چرا پتہ ہم کبھی بیٹی کی لاش سے پتہ کر چھٹی کبھی شوہر کی لاش سے اور بالآخر وہ مندر سے نکل کر کسی نہ کسی طرح شہر پہنچ گئی۔ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ وہ خود بھی شہید زخمی تھی اور پولیس والوں کو شہید حیرت تھی کہ وہ اس حالت میں یہاں تک پہنچی کس طرح تھی۔ چرا پتہ کو اسپتال بھجوا کر پولیس کی ایک باری مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔

دو نوں لاشوں کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ پولیس نے رپورٹ درج کر لی تھی مگر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ چڑا ریم اسپتال میں پڑی تھی۔ اس کے سر کا زخم تو زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا کہیں پیٹ میں لٹکے والے گھاؤ کی وجہ سے وہ بیس یا بیس روز تک بستر سے نہیں اٹھ سکی۔

پولیس کا خیال تھا کہ وہ خنوں پنڈت پکڑے جانے کے خوف سے ہر دور سے بھاگ گئے تھے اور اگر وہ ہر دور میں موجود تھے بھی تو کسی مندر میں چھپے ہوئے ہوں گے۔ یہاں چھوٹے بڑے بیسیوں مندر تھے اور مندر میں کسی پنڈت پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

چرا پر تپم چلنے کے قابل ہوئی تو اس نے اپنے طور پر ان پنڈتوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ صبح سے رات تک مندروں میں گھومتی رہتی اور بالآخر ایک روز اس نے گنگوتری مندر میں اس پنڈت کو دیکھ لیا جو اس طوفانی رات میں، ویران مندر میں اس کی بیٹی پلوی کو بازو سے پکڑ کر بچھتے ہوئے لے جا رہا تھا۔

وہ پوچھا کا وقت تھا۔ گنگوتری مندر میں بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ چڑا پریم دھکے کھاتے ہوئے آگے تک پہنچی تھی۔ اس پنڈت کو دھکے کر دہ لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھی اور جب اس جگہ پر پہنچی تو وہ پنڈت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اندر کی طرف کسی دروازے میں غائب ہو گیا تھا۔ چڑا پریم اسے تلاش کرتی رہی لیکن وہ دروازہ نظر نہیں آیا۔

پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے اپنے اطمینان کے لیے وہ مسلسل تین دن تک اس مندر میں جاتی رہی۔ اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ اور اس بندت کو دیکھا مگر اس مرتبہ بھی وہ پہلے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ چڑا کو ہر حال یقین ہو گیا کہ وہ بندت اس مندر میں پناہ لے ہوئے ہے۔ جب اس کے دوسرے ساتھی یا تو ہر دور سے بھاگ گئے تھے یا دوسرے مندروں میں پناہ لے ہوئے تھے۔

چرا پریتیم نے پولیس کو گنگوٹری مندر میں اس پنڈت کی موجودگی کی اطلاع دے دی۔

گنگوڑی کو ہندوستان کی چار اہم ترین تہالیکی یا ترائوں میں ایک اہم اور مقدس ترین مقام حاصل ہے۔ دوسری اہم اور دھارمک یا ترائیں بدری تاتھ، کیدار تاتھ اور لڑکھوڑی ہیں۔ ان چاروں کے مجموعے کو ہندو دھرم میں ”چار دھرم“ کہا جاتا ہے۔

گنگوڑی مندر کے تقدس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں تھا کہ چڑا پتیم کی نشان دہی پر پولیس مندر پر دھاوا بول کر اس مندر کو گرفتار کر لے لی۔ لیکن چڑا پتیم بھی آرام سے بیٹھے والی نہیں تھی۔ اس نے پولیس کے اعلیٰ ترین افسروں سے رابطہ کیے اور بالآخر اس کی نشان دہی پر پنڈت کو مندر سے باہر نکال کر راستہ میں لے گیا لیکن وہ پنڈت زیادہ دیر تک پولیس کی حراست میں نہیں رہ سکا تھا۔ گنگوڑی مندر کا بدولت رخنہ پنڈتوں کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے غورزی ہی دیر بعد سیکڑوں بچاریوں اور پنڈتوں سے پولیس اسٹیشن کا محاصرہ کر لیا۔

ہندوؤں اور چجاریوں نے یہ بیان دیا کہ یہ تاری جس طوفانی رات کا ذکر کر رہی ہے اس رات وہ ہندو گنگوتری مندر میں موجود تھا بلکہ۔ اس سے کئی روز پہلے بھی وہ مندر سے باہر نہیں گیا تھا اور اس طوفانی رات کے کئی روز بعد بھی گنگوتری مندر سے باہر نہیں نکلا۔ اس سارے عرصے میں وہ ایک عجب میں مصروف رہا تھا۔

پولیس اس پنڈت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ اگر محض چتر پتریم کے بیان پر اسے حراست میں رکھا جاتا تو کیسوں پنڈت اور پجاری ہنگامہ شروع کر دیتے جس کا قابو ناممکن ہوتا۔

اس پنڈت کو چھوڑ دیا گیا۔ چار پرستم تھملا کر رہ گئی۔ اس کی بیٹی اور شوہر کا قاتل اس کے سامنے تھا۔ اس نے پولیس کو اس کی نشان دہی کر دی تھی لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ تھمرا رہا وہ تزاوی سے دیندار تھا۔

میرا دیور بھی اسے وارادت کی اطلاع ملے گا۔  
 سے یہاں آگیا۔ "چترا ریت کسہ رہی تھی" وہ کسی دوسرے  
 کی چٹھی بھی لے کر آیا تھا لیکن اس پر بھی پولیس نے قاتلوں  
 کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ میرا دیور مجھے اپنے ساتھ  
 سنگاپور واپس لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے قسم کھائی تھی کہ  
 جب تک گنگا کے اٹھل پانی کو اپنی معصوم بیٹی اور شوہر کے  
 قاتلوں کے خون سے آلودہ نہ کر دوں یہاں سے نہیں جاؤں  
 گی۔ میرے پاس دولت کی بھی نہیں۔ یہاں ایسے بہت سے  
 لوگ موجود ہیں جو دس بیس ہزار روپے لے کر کسی کو بھی  
 مرنے نہ دیتے۔ گنگا کے پاس بھی ان قاتلوں کو اپنے

نور سے ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ میں اس  
نک تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک اپنی بیٹی اور  
میں ایک دوسرے کے لئے نہ لے لوں۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ  
 رنگِ مال کی تصویر بننا ہوا تھا۔ اس کی کہانی سن کر مجھے واقعی

وہ بے نیاز ہو گیا۔ وہ کہتا تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ ”جڑا پریم  
 کی طرح پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں تمہیں پہچانتے  
 ہو۔ غلطی کر رہی ہوں لیکن میرا من کہہ رہا تھا کہ تم وہی ہو۔  
 مجھے تمہارا اچھا شروع کر دیا۔ میں سمجھ گئی کہ تم لوگوں کو  
 بائبل کی تلاش ہے اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمہیں کہیں  
 بائبل نہیں ملے گی۔ دو ڈھائی گھنٹوں تک تمہارا اچھا کرنے  
 کی کوشش میں نے تم سے رابطہ کر لیا۔ تمہاری باتیں سن  
 کر مجھے یقین کر لیا کہ تم لوگوں میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی  
 نہیں کی اور تمہارے کلمات کے کہ اب میں اپنے آپ کو وہ

میں سمجھی جو چننے پہلے تھی۔ ختم تھا اور بے یارو  
 مددگار اب مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر ایک نئی طاقت آگئی  
 ہے۔ لیکن تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔  
 ایک مسلمان کانگوتری میں کیا کام؟

ہزار پریم کا آخری جلد اس کو سوہراج بھی چوہکے  
 کیا دے دئے ہت سنگھ کے نام سے جانتا تھا۔ اس نے مجھے  
 دلاؤ کے کبج میں بھی دیکھا تھا اور یہ بھی جانی گیا تھا کہ میں  
 امن کو سے ٹھاکر بھانوت سنگھ اور روپ متی کے ساتھ رہ  
 رہا ہوں۔ وہ مجھے ہندو ہی سمجھتا تھا لیکن اس وقت میرے  
 سلطان ہونے کے انکشاف پر اس کی ٹہن جیسی چھوٹی  
 ٹھیکیں بچہ اور سکڑی تھیں۔

”عبادت گاہ کا قلع کسی بھی دھرم سے ہو، سب کے لئے کھلا احرام ہوتی ہے۔“ میں نے چرا پر تیم کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

ہندوستانی عبادت گاہیں! یہ مقدس مقام۔ انہیں تو  
 ہندوستانی بھائیوں نے عمارت کے اڑے بنا رکھا ہے۔ چراہے  
 بھائیوں نے یہ عمارت جو کہ ہوا وہ میں کیسے بھول  
 سکتی ہوں۔ ہندوستانی عبادت گاہیں! یہ مقدس مقام۔  
 انہیں تو ہندوستانی بھائیوں نے عمارت کے اڑے  
 بنا رکھا ہے۔ چراہے بھائیوں نے یہ عمارت جو کہ  
 ہوا وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ سوچا کہ اگرچہ یہ ایک مقدس مقام ہے، لیکن یہاں پر بھی لوگ بے پرواہی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں پر بھی لوگ بے پرواہی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں پر بھی لوگ بے پرواہی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

”یہ سب کچھ واقعی افسوس ناک ہے“

میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا اور اس کے ساتھ موضوع بدل کر چاچا خشونت سنگھ کے بارے میں بات کرنے لگا۔ جب میں تھالی لینڈ سے سنگا پور واپس آیا تھا تو مجھے چل گیا تھا کہ چاچا خشونت سنگھ اور رجنی چاچا کا اغفال کیا ہے۔ ان کی چھوٹی بیٹی اڑٹا کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ اڑٹا ہی سے مجھے پتا چلا تھا کہ چاچا خشونت سنگھ نے میرے بیٹے کی ڈائری لاہور میں اپنے کسی دوست کو بیچ دی تھی۔ اڑٹا نے مجھے اس کا نام اور پتا بھی سمجھا دیا تھا کہ میں جب لاہور جاؤں تو وہ ڈائری اس سے لے لوں۔ میں جاگتی کے ساتھ سنگا پور سے لاہور جانے کے لیے ہی روانہ ہوا تھا لیکن ابستان کے ریگزار میں ہوائی جہاز کے حادثے نے میرا راستہ بدل دیا اور میں دارا کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ بے راہ قدم مجھے کہاں لے جائیں گے اور اب چڑا پریم کی کہانی بھی میری کہانی میں شامل ہو رہی تھی۔

”میں کھانا تیار کروں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔“ چڑا پر یتیم نے کہا ”سامنے ندی بہہ رہی ہے۔ تم لوگ باہر تو منہ ہاتھ دھو آؤ۔“

وہ ایک کنستریٹ ٹرے میں چاول نکال کر چھنے لگی۔ میں  
ورسہ بھراج ہٹ سے نکل کر ندی پر آگئے۔

”تم نے پہلے تو نہیں بتایا تھا کہ تم مسلمان ہو؟“  
مومہراج نے کہا۔ اس وقت ہم دونوں ندی کے کنارے پر بیٹھے  
ہوئے تھے۔ اس کا بدلا ہوا الجھ میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا  
تھا۔

”میں نے اپنے بارے میں سب کچھ تمہیں بتا دیا تھا  
 موائے نام کے“ میں نے جواب دیا ”اور اس رات جب  
 ٹوٹن ٹگھ اور دارا کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو میں نے  
 تمہیں بتایا تھا کہ ان دونوں نے جے پور کے ہندوؤں اور  
 پجاریوں کو میرے اور روپ متی کے خلاف بھڑکا کر ہندو مسلم  
 ساد کوانے کی کوشش کی تھی۔ ان ہنگاموں کی ساری  
 تفصیل تو تمہیں لاجوتی نے بھی بتائی تھی۔“

”ہاں۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے“ سو بھراج نے جواب دیا  
 ”بہر حال اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تمہاری طرف  
 دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور دوستی کسی دین و دھرم کی پابند نہیں  
 ہوتی۔“

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ سردی بھی اچھی خاصی تھی اور پھر چارپتی کی آواز سن کر ہم اندر آ گئے۔ اس نے فرش پر بچے ہوئے نمند پر ہی دسترخوان بچھا دیا تھا۔ چلیٹوں کے ساتھ اس نے وال اور چادلوں والی دونوں



پتیلیاں بھی دسترخوان پر ہی رکھ دی تھیں۔

کھانے کے دوران میں زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ اس کے بعد مہرادر اور مہر کی باتیں کرتے رہے۔ سوہراج اوجھنے لگا تھا۔ اس وقت اگرچہ صرف نویں بجے تھے لیکن گناہ رات آجھی سے زیادہ بیت چکی ہو۔

”تمہیں نیند آ رہی ہے سوہراج بی۔“ چڑا پرہم نے پوچھا ”اس کمرے میں بستر لگا ہوا ہے اندر جا کر سو جاؤ۔“ اس نے اٹھ کر دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

لیپ کی روشنی اس کمرے کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ وہاں بھی منہ بچھا ہوا تھا اور دو تین کبل پڑے ہوئے تھے۔ سوہراج اس کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور کبل اوڑھ لیا۔

”آؤ ہم اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ بہت دنوں بعد تو کوئی اپنا ملا ہے۔ تمہارے سامنے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر دوں گی۔“ چڑا پرہم نے اٹھ کر باہر والا دروازہ بند کر دیا اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

لیپ ایسی جگہ رکھا ہوا تھا کہ تینوں کمروں میں روشنی کی ضرورت کو پورا کر رہا تھا۔ اس کمرے میں بھی منہ بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک کبل پڑا ہوا تھا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دونوں پیر آگے کو پھیلا لیے۔ چڑا پرہم کے سامنے آئی پاتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کی کمر لنگھیں سیدھی تھی اور سینہ تباہ ہوا تھا۔

”لگتا ہے تمہیں یوگا سے بہت دلچسپی ہے۔ تمہاری بیٹھک کا یہ آسن۔“

”یوگا سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔“ اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی ”میں سنگا پور میں شادی سے پہلے اور بعد میں بھی مشق کیا کرتی تھی۔ کئی سال تک یوگا کی مشقیں کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی ہے لیکن میں ایسا نہیں کہوں گی۔ یوگا تو ایک پراسرار علم ہے جسے سمجھنے کے لیے پورا جیون بھی کم ہے۔ چند آسن سیکھ لینے سے اپنے آپ کو یوگا کا ماہر نہیں کہنا جاسکتا۔ میں نے ابھی کچھ نہیں سیکھا۔ بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔“

”آبادی سے دور ویرانے میں اس کانچ میں اکیلے رہتے ہوئے ہمیں ڈر نہیں لگتا جبکہ تمہارے دشمن بھی شاید آس پاس منڈلا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میں اکیلی کب ہوتی ہوں۔“ چڑا پرہم نے جواب دیا ”میاں کے رہنے والے میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ میں دن بھر مندروں اور

بازاروں میں گھومتی رہتی ہوں اور شام ہونے سے پہلے کسی یا تری فیلی کو لے کر آجاتی ہیں۔ دور دراز کے گوشے سے آنے والے یا تری رہائش کے لیے پریشان ہوتے ہیں جب کسی فیلی کو میاں لے کر آتی ہوں تو وہ بہت ہوتے ہیں اور آج تو اتفاق سے تم لے گئے۔ میرے اندر نئی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔ لگتا جیسے میرا کوئی اپنا تھا مجھ لے گیا ہو۔“

چڑا پرہم سے میری کبھی ایسی ملاقات نہیں ہوئی تھی یا در رکھا جاسکتا۔ اس کے کہنے کے مطابق جن دنوں چاچا خشونت سکھ کے ہاں پناہ گزیں تھا انہی دنوں وہی تین مرتبہ وہاں آئی تھی مگر مجھے یاد نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا۔ چاچا خشونت سکھ اور اس کے گھروالوں کے درمیان میں بھی اس سے کچھ اپنائیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ”تم نے بتایا نہیں۔ تم میاں کیسے آئے ہو اور تمہارا ساتھ یہ سوہراج کون ہے؟“ چڑا نے پوچھا۔

پہلے میں نے اسے سوہراج کے بارے میں بتایا تھا۔ ہوائی جہاز کے حادثے کے بعد کے واقعات بتائے گا اور میں بولا۔

”میری اطلاع کے مطابق دارا میاں آچکا ہے۔ دارا ہے۔ وہ بھی مندروں ہی میں چھپتا پھرتا رہا ہے۔ اب بھی تمہاری طرح قسم کھا رہی ہے کہ جب تک اس اپنے ہاں باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لے لوں گا اس وقت چین سے نہیں بیٹھوں گا اور دنیا کے آخری کوئے تک پہنچا کر لوں گا۔“

”تم نے میاں کے مندروں اور پنڈتوں کو دیکھا ہے اور پھر بھی کہتے ہو کہ یہ مقدس عبادت گاہیں ہیں۔“ وہ خاموش ہونے پر بولی۔

”عبادت گاہوں کا تو اس میں کوئی تصور نہیں ہے۔“ عبادت گاہوں کا یہ مندر واقعی مقدس مقامات ہیں۔ ضرور میں نے کہا ”یہ مندر واقعی مقدس مقامات ہیں۔ دھرم چاریوں کا ہے جنہوں نے ان کے تقدس کا خیال رکھا اور ان عبادت گاہوں کو اپنے گناہوں کے مقاصد سے استعمال کر رہے ہیں۔ بہر حال۔“ میں ایک لمحے کو خاموش پھر بولا ”تم کئی مہینوں سے میاں ہو۔ مندروں میں رہتی ہو۔ بہت سے پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے میں جان چکی ہوگی۔ پر گھیا راج نامی کسی پنڈت کے بارے میں جانتی ہو؟“

”کیا کہا۔ پر گھیا راج۔! یہی نام لیا نام ہے؟“ چڑا پرہم نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر سستی کے آثار آئے تھے۔

”ہاں۔ پر گھیا راج۔“ میں نے جواب دیا ”میں نے اپنے

کئی نہیں۔ صرف نام سنا ہے اور یہ پنڈت پر گھیا راج ہی ہے۔ دارا اس کے پاس یا تو آچکا ہے یا آئے۔“ میں نے اس نام پر کیوں چونک کر نہیں؟ میں سوالیہ ہیں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میری روشنی ہے جس نے میری معصوم بچی کو پامال کر کے کھاٹا بنا دیا تھا۔“ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ”میری درندہ میرے شوہر کا قاتل ہے جو آج ان دنوں سے زندہ رہا ہے۔“

”اوہ! اس مرتبہ میں اچھل پڑا!“ اگر یہ وہی پنڈت گھیا راج ہے تو اطمینان رکھو۔ اس سے تمہاری بیٹی اور بچہ کے خون کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ قانون اس کا کچھ نہیں گاڑ سکا تو کوئی بات نہیں۔ ہم اپنی عدالت لگائیں گے۔“

”مجھے یقین تھا کہ تم ہی میری مدد کرو گے۔“ چڑا پرہم کا بھائی ہو گیا ”تمہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے آپ میں ایسی طاقت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں جانتی ہوں۔“

”میں نے تمہیں شہر کا خون رانگا نہیں جائے گا۔ ان نادلوں کو سکون ضرور ملے گا۔“ چڑا پرہم کی بات پر مجھے پہلے بھی یقین تھا اور اب یہ یقین اور زیادہ مضبوط ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی اور شوہر کو پنڈت گھیا راج اور اس کے دوسرے ساتھیوں ہی نے قتل کیا اور جب کئی روز بعد چڑا نے اسے شناخت کر لیا تو پورے اسے خشک اپنے ایک ساتھی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو بچانے کے لیے وہ دھرم کوچہ لے لے کر آئے تھے اور دھرم کے نام پر شروع ہونے والی کسی لڑائی آسانی سے قابو نہیں پایا جاسکتا اور اسی لیے پولیس کو منہ بچھا راج کو چھوڑنا پڑا تھا اور میں یہ بھی جانتی تھا کہ میرا اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور وہ اپنی گناہوں کی مرگ جگمگاتی رہے گا۔

دارا کے دوست ایسے ہی لوگ ہو سکتے تھے جنہیں ہندو انسانیت سمجھ کر نہ گزری ہو۔ دارا مجھ سے بچنے کے لیے بہت جلد بھاگ کر ہندوستان آ گیا تھا اور اتفاق سے دارا کے حادثے نے مجھے بھی ہندوستان پہنچا دیا اور وہی سستی سے دارا بھی میری نظروں میں آ گیا۔ وہ مجھ سے پہچاننا تھا۔ مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے پہلے میرے خلاف کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو پہلے میرے قتل کے لیے پنڈتوں اور پجاریوں سے حوالے کی تھی لیکن وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کی برسات اس پر اتنی رہی تھی۔ کالی مندر والی میاڑیوں میں وہ میرے ہاتھ آ بھی گیا تھا لیکن

ایک مرتبہ پھر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بے پور میں دوبارہ پنڈت سوہراج سے ملاقات ہو گئی اور اس سے ایک مہرے کے بعد اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ پنڈت پر گھیا راج کے بارے میں انکشاف سوہراج ہی نے کیا تھا اور میں اس امید پر میاں چلا آیا تھا کہ دارا پناہ لینے کے لیے پنڈت پر گھیا راج ہی کے پاس آئے گا اور اتفاق سے میاں آتے ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ پر گھیا راج دارا سے بھی زیادہ خوفناک درندہ ہے۔

میں پنڈت پر گھیا راج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن چڑا پرہم نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ دارا کی طرح انسان کے قالب میں خوں خوار بھیڑیا تھا۔

میں اور چڑا پرہم ویر تک باتیں کرتے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور چڑا پرہم اسی طرح تن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک کھاکھرا اور ایک چادر جسم پر ڈال رکھی تھی اور اس چادر کے نیچے کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے قریب پڑا ہوا کبل اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”تو یہ کبل اوڑھ لو۔“ کہیں سردی لگ رہی ہوگی۔ ”سردی تو تمہیں بھی لگ رہی ہوگی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ کبل تم اوڑھ لو اور میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ آج میں تمہیں رات بھر نہیں سونے دوں گی۔ بہت دنوں بعد اپنا کوئی ملا ہے۔ میں رات بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔“ وہ اٹھ کر سامنے والے کمرے میں چلی گئی اور آتش دان میں آگ جلا کر چائے بنانے لگی۔

میں نے کبل اپنے اوپر ڈال لیا اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھا رہا۔ چندہ میں منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ ایک پیالی میری طرف بڑھا دی اور دوسری اپنے قریب رکھ لی۔

”تم بھی کبل اوڑھ لو۔ سردی لگ جائے گی۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے کبل کا ایک کونچا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے گھور کر میری طرف دیکھا تو مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نیم عریاں تھی اور میں اسے اپنے کبل میں لپیٹنے کی دعوت دے رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور کبل کو کھول کر دونوں پھیلا دیا۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ میں اس کے بدن کی حرارت محسوس کر رہا تھا لیکن نہ تو میرے دل کی دھڑکن سے رہا ہوئی اور نہ ہی سینے میں کوئی اچھل پیدا ہوئی۔

رات دھیرے دھیرے جیتی رہی اور ہم باتیں کرتے رہے۔ میں بار بار پنڈت پر گھیا راج کا ذکر کر کے اس کے زخموں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا اس لیے میں جان بوجھ کر اس موضوع سے دور ہی رہا اور زیادہ تر سنگاپور کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سنگاپور کی یادوں سے میرے ذہن ہرے ہو رہے تھے اور سینے میں پیدا ہونے والی کک بست ابھی لگ رہی تھی۔ یہ کک ہمیشہ سے تھی اور میرے ذہن بھی کبھی مندرل نہیں ہوئے تھے۔ میں ان باتوں کو کبھی نہیں بھولا تھا۔ وہ گھر اور اس میں بیٹے مسکراتے چہرے کتنا سکون تھا ہماری زندگیوں میں۔ باپ کی شفقت، ماں کی مانتا۔ لیکن وارے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس نے میری زندگی میں انگارے بھردیے تھے اور اب وہ کئی برسوں سے مجھ سے بچنے کے لیے بھاگتا پھر رہا تھا اور میں موت کا سایہ بن کر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دارا شاید اب تھک گیا تھا۔ میں چھتا سورج تھا اور وہ دھلتا سایہ۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی اور ہندوستان کے اس دور دراز کونے میں، ہمالیہ کی ترائیوں میں وہ پناہ کی تلاش میں ہی آ رہا تھا یا آدکا تھا لیکن میں نے بھی ملے کر لیا تھا کہ ہمالیہ کی یہ گود اس کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوگی۔

سنگاپور کی یادوں نے مجھے اداس کر دیا۔ چڑا پریم بھی شاید سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے موضوع بدل دیا اور یوگا کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

”یہ ہر دوار ہے۔ سے WAY TO GOD GATE بھی کہا جاتا ہے۔ گنگوڑی سے لگے جنم لینا ہے۔ گنگوڑی ہندوؤں کا سب سے اہم اور مقدس ترین مقام مانا جاتا ہے۔ جس طرح مسلمان حج کے لیے مکہ جاتے ہیں اسی طرح ہندو بھی زندگی میں کم از کم ایک بار گنگوڑی یا تارکو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ یہاں سے صرف چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر رشی کیش ہے۔ وہ جگہ میسوری اور نیپالی تال سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ رشی کیش کو یوگا کا گھر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

”دنیا کے کونے کونے سے لوگ یوگا سیکھنے کے لیے وہاں آتے ہیں۔ وہاں ہمیں لاتعداد مندر بھی ملیں گے اور بدھوں کے اسٹوپے بھی۔ ہندو یوگی اور بدھ بھکشو یوگا کے استاد سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں اس پر اسرار علم پر عبور حاصل ہے۔ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ ایسے کارنامے کس طرح انجام دے لیتے ہیں کہ جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”تم رشی کیش گئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”پلیوی اور اپنے

شوہر کندن لال کے قتل کے بعد جب مجھے اسپتال سے ملی تھی تو میں نے پر گھیا راج اور اس کے ساتھیوں کی شروع کر دی تھی۔ میں لوگوں کو ان کے طے ہونے پر بھیج دیتی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ ان میں سے ایک کے طے ہونے پر ایک پنڈت رشی کیش کے ایک مندر میں موجود ہیں۔ رشی کیش پہنچ گئی اور تقریباً ایک ہفتے تک اس کی تلاش کرتی رہی۔ وہ پنڈت تو مجھے نہیں ملا لیکن بھکشو سے ملاقات ہو گئی تھی۔ میں اس سے کچھ پوچھی لیکن میرا دھیان نہیں لگا۔ تاہم اس کی باتوں نے جان لیا تھا کہ وہ اس پر اسرار علم کے بارے میں معلومات رکھتا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔  
”ضرور ملوں گا۔“

”اس کا نام گوتم بھوش ہے۔ چڑا پریم نے کچھ عرصے پہلے ہی تبت سے آیا تھا۔ تبت ان پرانوں کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے لیکن راستہ ان اور خطرناک ہیں کہ کوئی اس جانب جانے کی ہمت نہ کرے۔“

”اگر من میں کچھ پالینے کی لگن ہو تو راج کھنیاں اور خطرات کوئی معنی نہیں رکھتے۔“ جواب دیا۔

چڑا پریم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی اور اس کے سخت ریاضت کرنی پڑی تھی۔ میں نے اپنے اندر پر اسرار قوت پر قابو پایا تھا۔ یوگا مجھے اس حد تک جس کی ضرورت تھی اور اب چڑا کی باتیں سن کر میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اور میں نے ملے کر ملے تو اس میدان میں بھی کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے تبت سے آنے والے بدھ بھکشو کو نام ذہن نشین کر لیا تھا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ نیچے کی طرف پھٹے پھٹے پائیلٹ ٹائلٹ چل رہی تھی۔ کہ مجھے رات بھر چکا گئی اور مجھ سے باتیں کر لیں اب وہ اوجھٹے لگی تھی۔ میں بڑی آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ طرح اسے اوڑھا دیا اور دوسرے کمرے میں سو بھراج دونوں کھیل اوڑھے گھر کی نیند سو گیا۔ کھیل میں گھس گیا اور کچھ دیر بعد میری نیند ہوئے لگیں۔

پنڈت پر گھیا راج کو انسان سمجھنا انسان کی بہت بڑی عقل تھی۔ وہ شکل و صورت ہی سے ورنہ لگتا تھا۔ لمبا قد، بھاری بھر کم جسم، سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے جنہیں تین چار پھیلاؤں میں سیننے کی کوشش کی گئی تھی۔ وادی میں اور سو پھیلاؤں کے بال اس طرح لے ہوئے تھے کہ منہ کا دباؤ تلاش کرنا مشکل تھا۔ ناک سمو سے کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ جن سے صاف لگتا تھا کہ وہ نشہ کرنے کا مادی ہے۔ اس کا سینہ بھی رینچہ کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دھوئی ہاتھ رکھی تھی اور جسم کے بالائی حصے پر بلی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو ایک کندھے سے بار بار پھل رہی تھی۔

میں اور سو بھراج، چڑا پریم کے ساتھ اس مندر میں آئے تھے۔ ہمیں تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا اور پھر وہ اپنا کمرے مندر کے پچھلے حصے میں سے کسی طرف سے نکل کر سامنے آیا تھا۔ چڑا پریم اس کی نشان دہی کر کے فوراً ہی وہاں جا پہنچی۔

مندر میں یا تریوں کا ہجوم تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ دیتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ میں اور سو بھراج ایک طرف کھڑے پنڈت پر گھیا راج کو دیکھتے رہے۔ میں نے سو بھراج کو بتا دیا تھا کہ یہی وہ پنڈت ہے جس نے اپنے دو دوسرے پنڈتوں کے ساتھ مل کر چڑا پریم کی معصوم بیٹی کو بے آہد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کے شوہر کندن لال کو بھی بھجوں کے پے در پے وار کر کے ہلاک کر دیا تھا اور یہی وہ پنڈت پر گھیا راج ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔

سو بھراج کو مندر میں پر گھیا راج کی مگرانی پر چھوڑ کر میں ہرودار کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ یہاں کئی مندر تھے۔ میں ہر مندر میں جھانکتا اور دارا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میرے خیال میں یہ حماقت ہی تھی۔ دارا حلیہ تبدیل کرنے کا ماہر تھا اور محض طے کی بنا پر اسے تلاش کر لینا ممکن نہیں تھا۔

دولن گزر گئے اور پھر اچانک ہی ہرودار کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ یوں تو ہزاروں کی تعداد میں یا تری روزانہ یہاں آتے جاتے تھے لیکن اس روز اچانک ہی یا تریوں کی آمد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”کرائے، وہ ملز اور گیسٹ ہاؤسز۔“ کہیں جگہ نہیں رہی تھی۔ لوگ کھلی جگہوں پر پڑے تھے۔ متحول یا تری اپنے ساتھ چھوٹے خیمے اور پھولداریاں لے کر آئے تھے۔ پنڈت، ماہر اور پجاری بھی سیکڑوں کی تعداد میں چلے آ رہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اگلے اتوار کو سو بھراج بہن ہونے والا ہے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن ہندو دھرم میں

بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خاص یوگا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جو تہی اور پنڈت اپنے حساب کتاب میں مصروف ہو جاتے ہیں اور پجاری جاپ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس روز صبح کیارہ بجے کے قریب میں اور چڑا پریم گنگوڑی کی طرف چلے گئے۔ یوں تو دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ایسے گھاٹ بنے ہوئے تھے جہاں گنگا جل میں غسل کرنے والوں کا رش لگا رہتا تھا لیکن گنگوڑی کا وہ مقام جہاں مختلف سمتوں سے ہزاری ندی نالوں کا پانی آ کر گرتا ہے وہاں بہت زیادہ بھیڑ نہیں۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اس جگہ چٹانوں کے ساتھ ایک بہت لمبا چوڑا پنڈت تالاب بنا ہوا تھا جس میں نیچے اترنے کے لیے پنڈت سیدھیان بھی بی بی ہوئی تھیں۔ اس طرف پہاڑوں سے آنے والا پانی اس وسیع و عریض تالاب میں گرنا اور دوسری طرف بہ کر دوسرے پانی میں مل جاتا۔ اس طرف بھی پہاڑوں سے مختلف سمتوں سے آنے والا پانی جمع ہو کر نیشی کی طرف بہتا تھا اور ذرا آگے جا کر اس کا پانی ایک باقاعدہ دریا کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جسے گنگا کی جنم بھومی بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس تالاب کے ساتھ ہمارا اور کشادہ جگہ تھی اور اس سے آگے عمودی چٹانیں تھیں جن میں لاتعداد گہکھائیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سب گہکھائیاں اور غار قدرتی تھے جو صدیوں میں پانی کے کٹاؤ سے معرض وجود میں آئے تھے۔ کئی غار اور گہکھائیاں ایسی تھیں جن میں پانی نہیں تھا اور وہاں یا تریوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ تاہم لاتعداد گہکھائیاں ایسی تھیں جن میں پہاڑوں کے اندر ہی اندر سے آنے والا تیز رفتار پانی پر شور آواز سے بہہ رہا تھا۔ یہ غار اور سرنگیں پہاڑوں میں بہت اندر تک چلی گئیں۔

اس وسیع و عریض تالاب پر بہت رش تھا۔ تالاب کے اندر بھی لوگ بھرے ہوئے تھے اور کشادہ میزبانی پر بھی لوگ ایک دوسرے پر گویا بڑھے۔ رہے تھے۔ نئے، عمو اور عورتیں سب ایک ہی جگہ غسل کر رہے تھے۔ بعض عورتیں نیم عریاں تھیں، بعض نے اگرچہ لباس پہن رکھے تھے لیکن ہیکے ہوئے لباس جسم سے چپک کر انہیں برہنہ کر رہے تھے مگر کسی کو ہوش نہیں تھا۔ تالاب کے کنارے پر بھی لوگ ہجوم در ہجوم جمع تھے۔

ٹھیک پارہ بجے سورج گرہن شروع ہونے والا تھا۔ یہ جزوی سورج گرہن تھا جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہتا اور ہر ہندو کی خواہش تھی کہ وہ اس وقت یوگا میں مصروف ہو یا گنگا جل میں غسل کر رہا ہو تاکہ اس کے سارے گناہ دھل جائیں۔

میں چڑا پریم کے ساتھ ایک طرف کھڑا افتخاری کا یہ

منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک ہٹا کٹا آدمی لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے تالاب کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آیا۔ اس نے سفید دھوٹی باندھ رکھی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر کوئی کتہ وغیرہ نہیں تھا البتہ ایک سفید کپڑا اوڑھنے کی طرح بند کر کے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ لمبا قد، توانا جسم، مضبوط ہاتھ پاؤں، گنجا سر اور ماتھے پر قشقہ۔ وہ کوئی پنڈت یا پجاری نہیں تھا لیکن اس کے طے اور انداز و اطوار سے لگتا تھا کہ وہ دھرم کے معاملے میں بہت کٹر ہے۔ وہ لوگوں کو ادھر ادھر دھکے دیتا راستہ بناتے ہوئے تالاب میں اتر گیا اور تقریباً وسط میں پہنچ کر رک گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر زیر لب کچھ بدیدانے لگا پھر چلوں میں پانی بھر بھر کر اپنے اوپر ڈالتا رہا۔ اس دوران میں وہ بار بار سورج کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے سورج پر ٹپکی طرف سیاہ دھبہ پڑنا شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں اشوک اور جھین وغیرہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

تالاب کے وسط میں کھڑا وہ آدمی کچھ زیادہ ہی پر جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ کبھی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی اپنے گھٹے سر پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگتا اور کبھی دونوں ہاتھ اوپر پھیلا کر چھینٹنے والے انداز میں کوئی جھین گانے لگتا یا اشوک پڑھنے لگتا۔

نجانے کیا بات تھی کہ اتنے بڑے جھوم میں میری توجہ اسی ایک شخص پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں تو ہر شخص اپنے اپنے انداز میں ہو جا کر رہا تھا لیکن اس شخص کی حرکتیں کچھ زیادہ ہی دلچسپ لگ رہی تھیں۔

سورج پر سیاہ دھبہ گہرا گیا تھا۔ روشنی کم ہو گئی تھی۔ لوگوں کے اشوک پڑھنے اور جھین گانے کی آوازیں بلند ہوتی گئیں اور پھر آدھے گھنٹے بعد گرہن لوٹنا شروع ہوا۔ میری نظرس تالاب کے دوسرے کنارے پر تین باوردی پولیس والوں کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ابھی ابھی وہاں نمودار ہوئے تھے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا جس کے ہاتھ میں رپو اور تھا۔ باقی دو کانسٹیبل رائٹلس سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ تینوں مجلس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور پھر ایک کانسٹیبل نے چھینٹے ہوئے تالاب کے وسط میں اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سب انسپکٹر نے بھی اسے دیکھ لیا اور پچیسوں کی پوری قوت سے چیخا۔

”آشوتوش! اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم گھبرے میں آچکے ہو۔ بچ کر نہیں جا سکو گے۔“

تالاب کے وسط میں کھڑے ہوئے آشوتوش نامی اس شخص نے چونک کر پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ اس کے

چہرے پر وحشت سی ابھرائی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چھینٹے ہوئے تالاب کے اس کنارے کی طرف آنے کی کوشش کرنا جہاں ہم کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر نے رپو اور والا ہاتھ لگا کر اٹھا کر ہوائی فائر کر دیا۔ پہلے فائر پر شاید لوگوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے فائر پر چھلکی سی چیخ گئی۔

تالاب میں بھی لاتعداد لوگ تھے۔ پانی آشوتوش کے سینے تک تھا۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر فرد کو ہاتھ مار کر دھکا دے کر ہٹا کر آگے بڑھتا رہا۔ اس کے منہ سے عجیبی آوازیں نکل رہی تھیں جنہیں کوئی معنی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ پولیس والے تالاب کے کنارے پر دوڑنے لگے۔ کنارے اگرچہ فٹ پاتھ کی طرح کشادہ تھے لیکن لوگوں کی بھیر لگی ہوئی تھی۔

”آشوتوش رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ سب انسپکٹر لوگوں کو دھکے دے کر راستہ بناتے ہوئے پہنچا۔ لیکن آشوتوش جانتا تھا کہ پولیس والے اس پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ وہاں سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ بھلکہ ڈیڑھی ہوئی تھی۔ گولی کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔

آشوتوش تالاب کے کنارے پر آگیا۔ اس کی دھوٹی اور گلے میں دوڑنے کی طرح پڑے پڑے کپڑے سے بھی پانی بھر رہا تھا۔ وہ ایک جگہ پر رک گیا اور پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔

ایک ٹانگ کٹنے کی طرح اٹھالی۔ ایک ہاتھ بھینچو کی طرح منہ پر رکھا اور چھینٹے ہوئے منہ سے عجیب آوازیں نکالنے لگا۔ یہ حرکت عام طور پر بچے کسی کو چڑانے اور طیش دلانے کے لیے کرتے ہیں۔

آشوتوش کی اس حرکت پر مجھے اس کے ذہنی توازن پر بھی شبہ ہونے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ یہ حرکت دہرائی اور ایک ہاتھ میں دھوٹی پکڑ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بالکل وحشی بن گیا تھا۔ اس نے نو دس سال کی عمر کے ایک بچے کو ٹھوکر مار کر دوڑ کر دیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کیا معاملہ ہے اور پولیس اسے کیوں پکڑنا چاہتی ہے۔

میں آشوتوش کے راستے سے ہٹ گیا مگر چڑا بچہ ان کی زد میں آگئی۔ اس نے چڑا کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر میری طرف اچھال دیا۔ چڑا چھینٹے ہوئے میرے اوپر آئی اور ہم دونوں زمین پر گر گئے۔ آشوتوش وحشیانہ انداز میں چھینٹے ہوئے چٹان کے ایک غار میں گھس گیا۔ اس دوران میں پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے چڑا کو سارا روے کر اٹھا دیا تھا اور میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے آفیسر یہ پاگل کون ہے؟“ میں نے سب

انسپکٹر سے پوچھا۔ انسپکٹر نے قاتل ہے۔ دو جوان لڑکیوں کا مڑ کر چکا ہے۔ ایک تیسری لڑکی اس کے قبضے میں ہے جسے یہ قتل کرنا چاہتا ہے۔ انسپکٹر نے جواب دیا اور پھر جلدی جلدی میں جو تفصیل بتائی وہ بڑی خوفناک تھی۔

انسپکٹر کے کہنے کے مطابق آشوتوش کا تعلق راجستان کے شراب پگڑھ سے تھا۔ وہ چار سراسر قوتوں کو تھوکر مارنے کے لیے مختلف قسم کے جاپ کرتا رہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک پنڈت کے ہتھے چڑھ گیا تھا جس نے اسے ایک ایسا جاپ بتایا جس پر عمل کر کے ابدی حیات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس جاپ پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تین سورج گرہن پر چودہ سالہ تین کواری ناپوں کی بیجنت دی جائے۔ تاہم ہونے کی صورت میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ آشوتوش اب تک دو لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ یہ تیسرا سورج گرہن تھا۔ اس نے ایک چودہ سالہ کواری لڑکی کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ جسے وہ عین اس وقت ہلاک کرنا جب گرہن ختم ہونے کے آخری لمحات میں ہوتا۔

”ہم اس کی تلاش میں تھے۔“ سب انسپکٹر کہہ رہا تھا۔ ”لیکن وہ بھاگ گیا اگر اسے نہیں پکڑا گیا تو وہ اس لڑکی کو ہلاک کر دے گا۔“

”ارے رو کو اسے۔“ چڑا پر تہم چیخی ”وہ میری بیٹی کو مار ڈالے گا۔ رو کو اسے۔“

میں نے چونک کر چڑا پر تہم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو بچلی گئی۔ اسے بے آہو کر کے ہلاک کیا گیا تھا اور اب کسی اور کی بیٹی کو ذبح کیا جائے والا تھا۔

سب انسپکٹر اپنے آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اس غار میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور چڑا نے بھی میرے پیچھے دوڑ لگا دی۔ یہ چٹان زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ تقریباً سو گز آگے ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ کھلی جگہ بھی پتیل ساٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے آگے بلند بنائیں نہیں۔ ان میں بھی کئی سرنگیں تھیں۔ ایک سرنگ میں داخل ہونے والا پانی ندی کی صورت میں چٹان کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا آگے جا کر تالاب کی دوسری طرف کسی جگہ سے گزرتا تھا۔ میں نے پولیس والوں کو ایک سرنگ میں گھسنے دیکھا تو میں دوسری سرنگ کی طرف دوڑا۔ چڑا بھی میرے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھی۔

سرنگ خاص سی طویل تھی جو آگے جا کر ایک اور سرنگ سے مل گئی تھی جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ یہ سرنگ بہت کشادہ

تھی۔ پانی چھ میٹر تھا اور اطراف میں خشک جگہ تھی۔ میں اور چڑا دو بار کے ساتھ ساتھ آگے چلتے رہے۔ آگے ننگ اور کشادہ سرنگوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ ہمالیہ کی برقیانی چوٹیوں سے بننے والے پانی نے ان چٹانوں کو اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا اور یہ عمل دو چار سال میں نہیں صدیوں میں اس حد تک پہنچا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان چٹانوں کو اندر ہی اندر کاٹنے کا پانی کا عمل اب بھی جاری تھا جس کا نتیجہ مزید کئی صدیاں گزرنے کے بعد سامنے آئے گا۔

ان سرنگوں میں اندھیرا نہیں تھا۔ کہیں کہیں چٹانیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور دم دم روشنی سرنگوں کے اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ پانی بڑی تیزی سے ان سرنگوں میں بہہ رہا تھا۔ پانی کی رفتار اور اس کا شور اعصاب پر وحشت سی طاری کر رہا تھا۔ بعض سرنگوں میں تو پانی اس قدر زیادہ تھا کہ ان میں داخل ہونا اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینے کے مترادف تھا۔ ایسی جگہوں پر ہمیں راستہ بدل کر کسی اور سرنگ میں داخل ہونا پڑا۔

پولیس والوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس طرف چلے گئے تھے اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ آشوتوش کے پیچھے آکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے بھٹک دیا۔ ایک لڑکی کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ ایک جنونی کے جنون کی بیجنت چڑھنے والی تھی اور شاید اس کی زندگی کے چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

میں جلد سے جلد آشوتوش کو تلاش کر لینا چاہتا تھا لیکن ہم ان سرنگوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ میں ایک اور سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ کے کنارے پر کچھ جگہ اونچی تھی اور نیچے طوفانی رفتار سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں چٹانی دیوار کے ابھرے ہوئے پتھروں کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ چڑا مجھ سے دو تین قدم پیچھے تھی۔ اگر ہم میں سے کسی کا پیر پھسل جاتا تو تیز رفتار پانی تنگی کی طرح ہمیں ہما کر لے جاتا۔ چڑا بھی اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھی اور بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔ اگلے موڑ پر پہنچ کر ہم رک گئے۔

”یہ۔ یہ آواز سنیں تم نے؟“

چڑا کی کیکپائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا اور پھر وہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی شخص ایک انگلی منہ میں ڈال کر اسے حرکت دیتے ہوئے بیچ رہا ہو۔ بالکل بچوں جیسی حرکت۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آشوتوش تھا۔ تالاب سے بھاگتے ہوئے بھی اس نے ایسی ہی حرکت کی تھی۔ اس آواز کا مطلب تھا کہ ہم آشوتوش کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ہم

دوسری ٹرنگ میں مڑ گئے۔ یہ ٹرنگ زیادہ طویل نہیں تھی۔ دوسری طرف روٹنی دکھائی دے رہی تھی اور پھر دھول کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا جنہی انداز میں پوری طاقت سے دھول بجا رہا تھا اور ظاہر ہے وہ آتشوتش کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

غار کے وہانے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ سامنے کھلی جگہ تھی اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دھول کی آواز بائیں طرف سے آرہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے جھانک کر اس طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے سینے میں اپنا سانس رکنا محسوس ہونے لگا۔

وہ بہت کھلی جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف سنگلاخ چٹانیں کنوئیں کی دیواروں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ بائیں طرف پتھر پر ایک جوان لڑکی رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا سر نکلتا تھا اور منہ میں کپڑا غصا ہوا تھا اور آتشوتش گلے میں دھول نکلتے اسے پوری طاقت سے پیٹنے ہوئے اس پتھر کے چاروں طرف ناچ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ سے چیخیں جیسی آوازیں نکالتا اور بار بار سراٹھا کر اوپر دیکھتا۔

میں نے ذرا اور آگے بڑھ کر اوپر دیکھا۔ سورج سر پر تھا۔ گرہن سے سورج راجو سیاہ دھبہ بڑھ گیا تھا وہ آدھے سے زیادہ ختم ہو گیا تھا۔ گرہن پوری طرح ختم ہونے میں دس بارہ منٹ باقی تھے اور اس لڑکی کی زندگی کی صحت بھی اتنی ہی رہ گئی تھی۔ گرہن مکمل ہونے کے آخری لمحات میں اسے بے دردی سے موت کے لمحات اتار دیا جانے والا تھا۔

چڑا پر ہم نے بھی آگے جھک کر وہ غرناک منظر دیکھا۔ اگر میں جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو اس کی چیخ آتشوتش کو ہماری موجودگی سے آنکھ کر دیتی۔

میں متلاشنگاہوں سے اوجھڑا دھڑکتے لگا۔ سامنے والی بعض ٹرنگوں میں تیز رفتار پانی کے بہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا کسی ٹرنگ کے اندر پانی بلندی سے گر رہا تھا۔ اس کھلی جگہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کسی ٹرنگ سے ایک فٹ چوڑی نالی کی صورت میں پانی باہر جاری بہہ رہا تھا جو کھلی جگہ پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے قریب جمع ہو کر زمین کے اندر کہیں غائب ہو رہا تھا۔

میرے سامنے حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے چڑا پر ہم کو سرگوشی میں کچھ ہدایات دیں اور آتشوتش دھول بجاتے ہوئے چپے ہی دوسری طرف مڑا۔ میں ٹرنگ سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے ایک بڑے پتھر کے پیچھے پہنچ گیا اور پھر مجھے اس سے آگے والے پتھر کے پیچھے پہنچنے کا موقع مل گیا۔

اب میں اس تیسرے پتھر کے پیچھے پہنچ چکا تھا جس سے قریب ٹرنگ سے آنے والا پانی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ آتشوتش سے میرا فاصلہ اب دس گز سے زیادہ نہیں تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آتشوتش کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ پتھر بندھی ہوئی لڑکی کے چاروں طرف دھول بھیلنے اور تپنے ہوئے وہ بار بار اوپر دیکھ رہا تھا۔ اب میں اس لڑکی کو بھی پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے ہلکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بے پناہ دہشت تھی۔ آتشوتش جس طرف جاتا، اس کی نظریں بھی گھوم جاتیں۔ وہ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی البتہ سر کو زوردار سے جھٹک رہی تھی۔

میں اوجھڑا دھڑکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے اگلے پتھر تک جانے کا موقع مل جائے تو میں آتشوتش پر حملہ کر کے اسے گرفت میں لے سکتا تھا اور پھر میں نے چپے ہی اس پتھر کی طرف چھلانگ لگائی آتشوتش نے مجھے دیکھ لیا۔

اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھول گے سے اتار کر پھینک دیا اور ایک ڈنڈا اٹھا کر وحشیانہ انداز میں چیخے ہوئے میری طرف لگا۔

میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے چپے ہی حملہ کیا، میں نے ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں پر دوکار اسے گرفت میں لے کر پوری قوت سے آگے کی طرف بھگا دیا۔ آتشوتش کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور آگے کو قدام بازی کھاتا ہوا گر کر زمین پر اٹھنے میں بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

وہ اترتا بیٹھنے کی طرح ڈکڑا ہوا میری طرف لگا۔ اس کے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر لگی۔ وہ مجھے دھکیلنے کے لیے گیا۔ میں پیچھے پتھر سے ٹکرایا تو زوردار جھٹکے سے مجھے ہونٹ گیا۔ چپے میرے اندر کا سارا ستم مل کر رہ گیا۔ آتشوتش چپے بہت گیا اور پیٹ پر سر سے ایک اور ٹکر ماری۔ وہ تیسری ٹکر مارنے کے لیے پیچھے ہٹا تو میں اپنے آپ کو سنبھال کر پوری قوت سے اس پر حملہ آور ہوا۔ میرا گھونسا اس کے سینے پر لگا وہ ایک جھٹکے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے گھونسا مارنا چاہا تو میں..... اس کا وار روک کر کھائی دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اسے موڑتا چلا گیا۔ آتشوتش دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی کھائی کو ایک ہاتھ میں پکڑے رکھا اور اس کی گردن پر زوردار گھونسا مار دیا۔ وہ منہ کے بل پیچھے گر گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹانگ چلا دی۔ اس کا سر پیچھے گھٹنے کے پیچھے لگا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ لوکڑا ہوتے ہوئے اس کے اوپر گرا۔ اس دوران میں نے چڑا پر ہم کو ٹرنگ سے نکل کر اس پھرتی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔

یہاں جس پر وہ لڑکی بندھی ہوئی تھی۔ آتشوتش نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر اچھال دیا۔ میں پست کے بل پتھروں پر گرا، میرا دماغ جھٹکا اٹھا۔ آتشوتش دھاڑتے ہوئے چڑا کی طرف لگا۔ اس نے چڑا کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ چڑا بھی چپا اٹھی۔

آتشوتش نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میری نظریں بھی اٹھ اٹھیں۔ سورج کے چمکے کنارے پر سیاہی کی بہت مدد ملی تھی کیرہ مٹی تھی۔ آتشوتش دونوں ہاتھ سینے پر مار کر دھینک کی طرح چپٹا اور پھرتی دوسری طرف جا کر پیچھے جھک گیا اور جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی کوارد دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ وہ پھرتی اس طرف آگیا جہاں سے پتھر پڑی ہوئی لڑکی پر وار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر جلد بازی میں میرا عیر چھوٹے ہوئے پتھروں پر رہا اور میں پھر گر گیا۔

آتشوتش نے ایک بار پھر سورج کی طرف دیکھا اور زوردار دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے بلند کر لیا۔ میں اٹھ کر آتشوتش کی طرف لگا لیکن چڑا پر ہم مجھ سے زیادہ تیز ثابت ہوئے۔ وہ بھی زمین پر پڑا ہوا ڈنڈا اٹھا کر آتشوتش کی طرف لگی تھی۔ آتشوتش کے منہ سے عجیب سی زوردار آواز نکلی اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکی کی گردن پر کوارد کا وار کرنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دیتا، چڑا نے اس پر حملہ کر دیا۔ ڈنڈا بڑے زور سے آتشوتش کے سر پر لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہہ لگا۔

آتشوتش دھڑکی شریک کی طرح دھاڑتے ہوئے پیچھے مڑا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور چڑا کو ساتھ لیتا ہوا دور جا کر آتشوتش نے گھومتے ہوئے بڑی قوت سے کوارد چلائی تھی۔ اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چڑا کی گردن اڑ جاتی یا کوارد کی زد میں آکر میرا پاؤں ڈکٹ جاتا۔ آتشوتش کے سر پر لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی۔ خون اس کی گردن کو تر کرتا ہوا کندھے پر بہہ رہا تھا۔ اس پر خون طاری تھا اور اس کا چہرہ کچھ اور بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر کوارد کو اوپر اٹھا کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ میرے ہاتھ سے چڑا کے ہاتھ سے ڈنڈا بھی چھوٹ گیا تھا جو اسے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے ڈنڈا اٹھا کر لینے ہی لینے خون قوت سے آتشوتش کی ٹانگوں پر وار کیا۔

میرا یہ حربہ کارگر رہا۔ آتشوتش چیختا ہوا پیچھے گر گیا۔ پنڈلی پر ہم نے لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی۔ اس مرتبہ کوارد اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں پھرتی سے لوکڑا ہوا گیا اور آتشوتش پر ٹھوکریں برسائے لگا۔ ایک موقع پر اس نے میرا عیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

میں لوکڑا کر پست کے بل گرا۔ آتشوتش اٹھ کر کوارد کی طرف لگا لیکن میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اب ہم ایک دوسرے سے متعلق گھٹا ہو گئے تھے۔ آتشوتش کے حلق سے بھیر پڑے جیسی غرائشیں نکل رہی تھیں۔ اس میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا دور لے گیا اور میرا سر ایک پتھر سے ٹکرائے لگا۔ میرا دماغ بل کر رہ گیا۔

میں نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آتشوتش نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر اترتا بیٹھنے کی طرح ڈکڑا کرتے ہوئے میری طرف بڑھا لیکن اس مرتبہ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے طاقتور اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ میں نے اچھلتے ہی ایک ٹانگ اندر کی طرف سمیٹ لی اور دوسرے پیر کی ٹک اس کے سر پر لگائی۔ میں نے مونے سول کے جو گز پہن رکھے تھے۔ گگ اس کی پشتانی پر لگی۔ کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا لیکن میں نے اسے پھٹنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر پے در پے ٹھوکریں برساتا رہا۔ وہ بہت سخت جان تھا یہ اس کا جنون تھا کہ میری ہر ٹک کھانے کے بعد بھی وہ ڈکڑا کرتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

ایک مرتبہ اسے میرے قریب آنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کھلی پھینکی سے اس کے چہرے پر وار کیا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ نکلا۔ وہ بڑے زور سے چیخا تھا مگر اس کے خون کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

خون میں تر اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر میری طرف لپکنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں نے ہوا میں اچھل کر پیروں سے اس کی گردن پر نیک لاگ لگا دیا اور اپنے آپ کو جھٹکے سے ایک طرف گرایا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی گرا۔

میں پیچھے گرتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی چلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ آتشوتش اٹھ کر ایک بار پھر میری طرف لگا۔ اور اسی وقت نفا ایک فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی آتشوتش کی بھیانک چیخ بھی چٹانوں میں گونج اٹھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور وہ لوکڑا رہا تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہی سب اسپنڈر اوپر لوہے والے چند گز کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ سب اسپنڈر کے ہاتھ میں ریلوور تھا۔

آتشوتش کوئی کھانے کے بعد بھی نہیں گر تھا۔ وہ بری

طرح دباڑ رہا تھا۔ پھر وہ مڑ کر اس پتھری طرف بڑھنے لگا جہاں چڑا اس لڑکی کے ہاتھوں کی رسیاں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چڑا نے اس کے منہ میں غصہ ہوا کپڑا نکال دیا تھا اور وہ لڑکی بھی بری طرح بچ رہی تھی۔

آشوتوش کے لیے شاید ایک گولی کافی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر نے دو سرا فائر کیا۔ اس مرتبہ گولی آشوتوش کے سر کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ کئے ہوئے درخت کی طرح لہراتے ہوئے گر گیا۔

آشوتوش کے جسم کو بار بار جگے جگے جھٹکے لگتے رہے اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ خشم ہو چکا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ سو رہا ہو۔

سب انسپکٹر دونوں پولیس والے دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئے جب کہ میں دوڑ کر اس پتھر پر چڑھ گیا اور اس لڑکی کے پیروں کی رسیاں کھولنے لگا۔ چڑا اس کے ہاتھ کھول چکی تھی۔ اس نے اپنی چادر اس لڑکی پر ڈال دی۔ لڑکی اس کے ساتھ پلٹ کر سسکیاں بھرے لگی۔ اس کا ہم کاپ رہا تھا۔

میں پتھر سے اترا تو مجھے وہ کپڑا نظر آیا جو آشوتوش نے لمبائی کے رخ پر یہ کر کے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے وہ کپڑا اٹھا کر اس کی تمیں کھول دیں۔ وہ ایک بوری چادر تھی جو میں نے چڑا پر ڈال دی اور آشوتوش کی لاش کے قریب آگیا۔

”شکریہ شریمان جی۔“ سب انسپکٹر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے بروقت میاں نہ پہنچ جاتے تو یہ ورنہ اس لڑکی کو ختم کر دیتا۔“

”یہ لڑکی کون ہے۔ اس کے وارثوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ ایک ہفتے پہلے اپنی فیملی کے ساتھ میاں آئی تھی۔“ انسپکٹر نے بتایا۔ ”اس کے دوسرے ہی روز لاپتا ہو گئی۔ اس کے باپ نے تھا نے میں رپورٹ کھوا دی تھی اور پھر ہمارے ایس بی صاحب نے آشوتوش کا فائل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ یہ پچھلے دو سوچ کر بہن کے موقعوں پر بھی ایسی وارداتیں کر چکا ہے اور ایس بی صاحب کو یقین تھا کہ اس لڑکی کو بھی اسی نے اغوا کر کے پہاڑوں میں کہیں چھپا رکھا ہوگا۔ ہم اس کی تلاش میں تھے اور آج صبح دس بجے ہمیں اطلاع ملی کہ اسے گنگوتری میں دیکھا گیا ہے۔ فوراً ہی اس کی تلاش شروع کر دی گئی اور پھر یہ میری نظروں میں آ گیا لیکن یہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہم ان پہاڑیوں میں سرنگوں کے اندر کھوکھ رہ گئے اور اگر آپ میاں نہ پہنچ جاتے تو بے چاری لڑکی ماری جاتی۔ آپ کا بھی بہت شکریہ دیوی جی۔“ آخری

الفاظ اس نے چڑا کی طرف دیکھ کر کہے تھے جو لڑکی کے ساتھ لپٹا ہوا بیٹھی تھی۔

”میری ایک مدد اور۔“ شریمان جی۔ ”سب انسپکٹر طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک کانسٹیبل کو آپ کے ساتھ لے کر آ رہا ہوں۔ آپ اس لڑکی کو ہر دوڑا تھا ہے۔ یہ چڑا نے اس کے سب لوگ دیوی جی کو جانے دیے ہیں۔ آپ اسے رکنے کی ضرورت نہیں اور اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ سے اور ان دیوی جی سے رابطہ کر لیں گے۔“

”فحیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں جواب دیا۔

میں نے اپنی شرت اتار کر چڑا کی طرف اچھال دی۔ وہ لڑکی کو لے کر پتھری کی دوسری طرف اتر گئی۔ چڑا جب وہ محسوس کر ہمارے سامنے آئیں تو اس لڑکی نے شرت پہن رکھی تھی اور چڑا والی چادر دھوئی کی طرح رکھی تھی۔ آشوتوش والی سفید چادر چڑا نے لپٹ لی تھی۔ ہم اگلے گھنٹے بعد سرنگوں سے نکل کر باہر آئے۔ صورت حال دیکھ کر دیکھی تھی۔ ہزاروں یا تری گنگوتری غسل اور پوجا میں مصروف تھے۔ کسی کو بتا نہیں چلا تھا کہ ہالیہ کی گود میں کھلیا جانے والا ایک خونی ڈراما اپنے اپنے پہنچ چکا تھا۔

کانسٹیبل ہمارے ساتھ تھا۔ ہم گنگوتری سے نکل کر ہر دوڑا تھا آگئے۔ ہمیں تقریباً آدھا گھنٹہ تو وہاں رہنا پڑا اور پھر ہم اس لڑکی کو پولیس کی تحویل میں دے کر چڑا کے کالج میں آگئے جہاں وہ لپٹا ہوا تھا۔ میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ کم بخت آشوتوش میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے جس طرح رکھ رکھا تھا اسے میرے تنک یاد رکھوں گا۔

میں کالج میں آتے ہی بستر پر گر گیا تھا۔ میرا چہرہ گھبرا گیا تھا اور سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا تھا۔ چڑا نے مجھ سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ کرائڈر چلی گئی چند منٹ بعد باہر نکلی تو اس نے پتھری کی دوسری چادر اوڑھ رکھی تھی۔

”میں چائے بناتی ہوں۔ کھایا تو ہم نے کچھ نہیں بھی نہیں چاہ رہا۔ سرؤکھ رہا ہے بہت شدت سے پریم آتھن کے سامنے بیٹھ چکی ہے بیٹھ گئی۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ بھوک واقعی نہ رہی تھی البتہ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے چڑا کی طرف دیکھا۔ وہ دیکھ کر گنگوتری میں سب سے بڑا تھا کہ وہاں سال کی ایک کنواڑی لڑکی کھانے والا ہے تو وہ اس طرح تڑپ اٹھی تھی۔ اس طرح

میں روک رہا تھا۔ وہ میری بیٹی کو مار ڈالے گا۔“ چڑا اپنی جوان بیٹی کے ساتھ لپٹا ہوا بیٹھی تھی اور وہ ہمیں چاہتی تھی کہ کسی اور کے ساتھ نہ بیٹھیں۔ میں نے اسے لڑکی کو رسیوں سے کھول کر اس کے اپنے ساتھ لپٹایا تھا وہ منظر بھی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چڑا نے ہانپنے کی آواز دی تو میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چڑا میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے ہم اس لڑکی کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر آشوتوش کے بارے میں بات کرنے لگے۔

”اگر ہم اس لڑکی کو نہ بچا لیتے اور آشوتوش اس کی بین کر دیتا تو کیا واقعی اسے حیات بامدی مل جاتی۔ وہ موت نہ دے دیتا؟“ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ چڑا نے جواب دیا۔ ”لیکن اتنا باتیں ہوں کہ ہمارے یہ ہندو مذہب اور پجاری پراسرار قوتیں مائل کرنے کے لیے چاہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ منطقی علوم کے باہر ہوتے ہیں۔ کوئی قوت حاصل کرنے کے لیے چاہ کر دیتا ہے اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی سمجھتے بھی دینی پڑتی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ چائے کی ایک دو چٹکیاں لیں اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”چاہ کر کے کچھ دے دیتے ہوتے ہیں۔ جتنی بڑی قوت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انہی قوتیں حاصل کر بھی لیتے ہیں اور بعض اہم ہونے کے بعد دوبارہ چاہ شروع کر دیتے ہیں۔ میں سمجھ کر کہتی کہ تیری لڑکی کی سمجھت دینے کے بعد آشوتوش کو اپنے گناہ کے مقصد میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن اتنا یاد رکھ کر کہتی ہوں کہ ناکام ہونے کے بعد وہ اپنا چاہ دوبارہ شروع کر دیتا۔“

”اسے کیسے پتا چلتا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا؟“ میں نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کانچ کے قریب رک گئیں۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا اور پھر وہ کانسٹیبل دروازے کے سامنے نمودار ہوا جو گنگوتری سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔

”چڑا دیوی جی۔ کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اس نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور پھر چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں دو عورتیں تھیں اور دو مرد۔ تین چہرے تو ہمارے لیے اچھے تھے لیکن چوتھے چہرے کو شکایت کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے ہم نے آشوتوش سے بچایا تھا۔ اسی عمر کے مرد اور عورت لڑکی کے ماں باپ تھے اور تیسرا جوان آدمی لڑکی کا بڑا بھائی تھا۔

انہیں دیکھ کر ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان چاروں نے ہمارے پیچھے اور عاجزانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”ہماری بیٹا کی جان بچا کر آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے اسے ہم جیون بھر نہیں بھول سکتے۔“ لڑکی بیٹا کے باپ نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی اور آنکھیں بھگ رہی تھیں۔

”ہم نے اگر بیٹا کو کسی راہوں سے بچایا ہے تو کسی پر احسان نہیں کیا۔ نہ بیٹا اور نہ آپ پر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک انسان ہونے کے ناطے یہ ہمارا فرض تھا جسے ہم نے پورا کیا۔“

”آپ بہت مہمان ہیں۔“ بیٹا کے باپ نے کہا۔ ”ہمیں شرمیستی جی کے بارے میں پتا چلا ہے۔ ان کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بھگوان ان کے من کو شانتی دے۔“

”مجھے سکون مل گیا۔“ چڑا نے آگے بڑھ کر بیٹا کو اپنے ساتھ لپٹایا اور اس کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دینے لگی۔ ”مجھے راحت مل گئی۔ میری بیٹی مجھے مل گئی۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

میں نے پہلی مرتبہ بیٹا کو غور سے دیکھا۔ وہ بے حد حسین بھی اور چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم بروقت اس کی مدد نہ کرتے تو اس کا یہ حسین وجود خاک و خون میں لوٹ چکا ہوتا۔

کانسٹیبل انہیں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ وہ لوگ بھی بیٹھ گئے، چڑا نے ان کے لیے بھی چائے بنائی تھی۔ باتوں میں پتا چلا کہ وہ لوگ مراد آباد کے رہنے والے تھے جہاں ان کا برتن کا کاروبار تھا۔ بیٹا کے باپ بدری تھے نہ بتایا کہ کوئی پراسرار آدمی پچھلے تین مہینوں سے بھاگا کچھ کر رہا تھا۔ بیٹا نے گھر والوں سے شکایت بھی کی تھی اور ایک مرتبہ آشوتوش کو بیٹا کا پیچھا کرتے ہوئے پکڑا بھی گیا تھا۔ آشوتوش اس

وقت پنڈت کے بہوہ میں تھا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اسے تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں

آیا۔ ایک ہفتہ پہلے بدری ناتھ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہر دو رات آیا۔ اس کا خیال تھا کہ دو دن یہاں پوجا پٹھ کے بعد وہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔ اگلے ہی روز بدری ناتھ نے پنڈت آشوتوش کو بھی ہر دو رات میں دیکھا تو زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ گنگا کی جنم بھومی تھی۔ مقدس مقام تھا۔ پنڈتوں اور سادھو سنتوں کے لیے تو اس جگہ میں ایک خاص کشش تھی۔ پنڈت آشوتوش بھی گھومتا پھرتا یہاں آیا ہو گا لیکن اگلے ہی روز سیتا غائب ہو گئی۔ پہلے اسے اپنے طور پر تلاش کیا گیا اور پھر پولیس میں رپورٹ درج کرا دی گئی۔ بدری ناتھ نے پولیس کو پنڈت آشوتوش کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔

”اب کیا خیالات ہیں آپ کے؟“ چڑا نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم کل صبح پوجا کے لیے گنگوتری مندر جائیں گے اور اس کے فوراً بعد واپس چلے جائیں گے۔ مراد آباد۔“ بدری ناتھ نے جواب دیا اور جب سے وزٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھادیا “اگر کبھی مراد آباد آتا ہو تو سیدھے ہمارے غریب خانے پر آجائے“ اور پھر اس نے جب سے فونوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ”ہم آپ کے احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتے۔ یہ ایک جھوٹی سی بیعت قبول کیجئے۔“

میں نے چڑا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اسے بہت دکھ پہنچا ہو۔ میں نے فونوں کی گڈی اٹھا کر بدری ناتھ کے ہاتھ میں تھما دی۔ ”ہم نے کسی لالچ میں آپ کی بیٹی کی جان نہیں بچائی تھی۔ آپ یہ رقم اپنے پاس رکھئے اور گھر پہنچ کر اسے غریبوں میں بانٹ دیجئے۔“

اور پھر شام چھ بجے کے قریب جب وہ رخصت ہونے لگے تو چڑا نے ایک بار پھر سیتا کو اپنے سینے سے لگایا اور دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ پھر سیتا مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”آپ ہمارے گھر ضرور آجئے بھیا!“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس ایک لفظ ”بھیا“ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے ماں باپ کا اٹھتا تھا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ کسی لڑکی نے مجھے کبھی بھائی نہیں کہا تھا اور اب سیتا نے بھیا کہہ کر مخاطب کیا تو میرے انگ انگ میں کیف و سرور کی ایک لہری دو ٹوٹی چلی گئی۔ میں نے پھر سیتا کو اپنے ساتھ لپٹالیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

”ضرور آؤں گا۔ میں تم سے ملنے کے لیے ضرور آؤں گا۔“

وہ لوگ چلے گئے اور میں دیر تک بیٹا کے بارے سوچتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور پھر رات لپ پھیلانے لگی۔

کھانا کھانے کے تھوڑی سی دیر بعد چڑا پتھر قریب ہی لیٹ کر سو گئی۔

میں بھی اٹھ کر باہر آ جاتا اور کبھی کبھی بیٹا جاتا۔ مجھ پر عجیب سی بے چینی طاری ہو رہی تھی۔ صبح سے گنگوتری مندر گیا ہوا تھا۔ اسے شام تک واپس چاہئے تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

سروئی بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک کپل چڑا پتھر اور دو سرا خود آڑھ لیا۔ دقت دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔

آدھی رات کے بعد کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ چڑا بھی جاگ

سو بھراج نہیں آیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر اور انتظار پھر سو بھراج کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میرا سن گنگوتری مندر کی طرف تھا۔

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہندوؤں میں مصروف تھے گنگوتری مندر سے تقریباً پانچ سو فٹ ایک جگہ چند لوگوں کا جھلٹھلاٹھا ہوا تھا۔ میں غیبا راؤ کی لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور پھر وہ

ہی لمبے میرا دل اچھل کر طعن میں آ گیا۔ زمین پر سو بھراج کی لاش پڑی تھی۔ اس کا زخاں

تھا۔ پیٹ بھی چرا ہوا تھا اور آستین باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کے دو سرے حصوں پر بھی لالہ لالہ لالہ لالہ

لاش کے آس پاس کہیں بھی خون کا ایک قطرہ نہیں آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے کہیں اور لاش لاش یہاں پھینک دی گئی تھی۔

”ہری اوم۔ ہری اوم۔“ ایک آدمی بڑبڑایا۔ ”ہری اوم۔ ہری اوم۔“ ایک آدمی بڑبڑایا۔ ہاتھ میں پتیل کی گڑوی تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ نے گڑوی میں انگلیاں بھگو کر سو بھراج کی لاش پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور ”ہری اوم“ ہری اوم“ کی گردان کر کے ایک طرف چلا گیا۔

ہجوم بڑھ رہا تھا۔ میں سو بھراج کی لاش سے غاہر کے بغیر پیچھے ہٹ گیا یا لکلی انجنیوں کی طرح۔

سو بھراج کا یہ بہیمانہ قتل میرے لیے چٹام شروع ہو جانے کا اور میں اس کھیل کو انجام تک پہنچانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔



ہنڈت سوہراج کے اس سہانہ قتل نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور میں جانتا تھا اسے اس طرح بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارنے والا بھی ایک ہنڈت تھا۔ دھرم چاری۔ یہ لوگ ایسے ہی کردار کے مالک تھے۔ مندروں کے گتھاسن پر بیٹھ کر بیٹی اور بھلائی کا پرچار کرتے تھے اور انہی مندروں کو انہوں نے قتل گاہیں اور عیاشی کے اڈے بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی ان سرگرمیوں میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا اور اب بھی میں بڑے دثوق سے کہہ سکتا تھا کہ سوہراج ان کی نظروں میں آیا ہو گا اور یہ بات بھی میں پورے دثوق سے کہہ سکتا تھا کہ سوہراج کو مندر میں کسی جگہ قتل کر کے اس کی لاش ویران سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ہنڈت پر گھیا راج اکیلا نہیں تھا۔ اس گھناؤنے فعل میں اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ ممکن ہے وہی دو ہنڈت یا ان میں سے کوئی ایک جنہوں نے چڑا پریم کی بیٹی اور شوہر کو قتل کیا تھا اس کے ساتھ ہو۔ واپس جاتے ہوئے میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ہو گا۔ انہیں سوہراج پر کسی قسم کا شبہ ہوا ہو گا اور وہ کسی طرح اسے مندر کے خانے میں یا کسی اور جگہ لے گئے ہوں گے۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس سے پوچھ کر بھی کی ہوگی۔ اس پر تشدد بھی کیا ہو گا۔ سوہراج اگرچہ خاصا سخت جان واقع ہوا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یاد تھا جب میں اور شکر اسے دھول پور سے لے گئے تھے اور بھول کے جنگل میں اس سے دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تو پہلے تو وہ مقابلے پر اتر آیا تھا لیکن میرے دو چار ہاتھ کھانے کے بعد اس نے اگل دیا تھا کہ دارا وغیرہ ہماڑیوں میں کالی کے مندر کی طرف گئے ہیں اور چند ہفتے پہلے جب میں ہلا کے ساتھ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے جنگل پر پہنچ گیا تھا تو اس روز بھی اس نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے تھے اور گزشتہ رات دو ہنڈتوں کے ساتھ چڑھ گیا تھا جنہوں نے اسے اوجیر کر رکھا تھا۔ ہنڈت پر گھیا راج نے اس سے ضرور پوچھا ہو گا کہ وہ کس کے ہتھ پر اس کی عمرانی کر رہا ہے۔ زیادہ تشدد و تہمتیں نہ بچنے کے لئے اس نے میرے بارے میں بتا دیا ہو گا جس کا مطلب تھا کہ اب میں بھی محفوظ نہیں تھا اور مجھے بھی اپنا بندوبست کر لینا چاہئے تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں چڑا کی کنیا پر پہنچ گیا۔ شاید میرے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جس سے چڑا نے

صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔

”تمہاری صورت پر بارہ کیوں رہے ہیں؟“ وہ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی ”سوہراج کا کچھ پتا نہیں چلا؟“

”سوہراج کو مار دیا گیا ہے۔ میں اس کی اوجھڑی ہوئی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں“ میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اوہ! یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ”یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوا لیکن اس کا قصہ بہر حال ختم ہو چکا ہے اور۔“

”تم فوراً پولیس کو اطلاع دے دو“ وہ میری بات کانٹے ہوئے بولی ”پر گھیا راج کے ساتھ اب کسی قسم کی رعایت نہیں ہونی چاہئے۔“

”ٹھیک کہتی ہو“ ایسے درندوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر ہاتھ کون ڈالے گا؟“ میں نے کہا ”اس کا تجربہ تو ہمیں خود بھی ہو چکا ہے۔ تم نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ پولیس کو اس کی نشاندہی کی تھی لیکن کیا ہوا؟ پولیس نے ان دھرم چاریوں کے سامنے کھٹے ٹیک دیے اور یہاں تو ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سوہراج کو ہنڈت پر گھیا راج یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہے۔ تم اپنی بیٹی اور بچے کے قتل کی چشم دید گواہ تھیں مگر تمہیں جھٹلایا گیا اور یہاں محض شک اور منہوئے کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کیسے ہو سکتی ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو“ چڑا گرا سانس لیتے ہوئے بولی ”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں خود ہی کوئی کارروائی کرنی ہوگی۔“

”ہاں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا ہو گا“ میں نے جواب دیا ”ممکن ہے سوہراج نے میرے یا ہم دونوں کے بارے میں انہیں بتا دیا ہو اور وہ لوگ۔“

”ایک منٹ!“ چڑا نے میری بات کاٹ دی ”تم نے بتایا تھا کہ سڑک پر جہاں لاش پڑی ہوئی تھی وہاں یا اس جگہ کے آس پاس خون نہیں تھا۔“

”ہاں۔ اور میں پورے دثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے کسی اور جگہ قتل کیا گیا تھا اور لاش سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اسے کسی گھٹنے پہلے قتل کیا گیا تھا“ چڑا نے کہا ”ہو سکتا ہے وہ رات کے ابتدائی حصے میں ان کے ہاتھ لگ گیا ہو اور آدھی رات کے قریب اسے قتل کر کے

لاش ویران سڑک پر ڈال دی گئی۔ جب لاش سڑک پر پھینکی گئی تو اس کا خون جم چکا تھا اور۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر لکیریں سی ابھرنی لگیں۔

”کیا تمنا ہوتی ہے؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر اسے آدھی رات کے لگ بھگ بھی قتل کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ کچھ تو اس سے بھی بہت پہلے کی گئی ہوگی“ چڑا نے جواب دیا ”میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی ”اگر انہیں ہمارے

بارے میں معلوم ہو بھی گیا تھا تو ان کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ رات ہی کو کسی وقت اس کنیا پر حملہ کر کے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں“ میں نے کہا ”لیکن ہو سکتا ہے ہمارا ری ایکشن جاننے کے لئے انہوں نے فوری طور پر کوئی کارروائی نہ کی ہو۔ ایسے لوگ بڑے خطرناک

ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں خاموش پارک ایک دو دن بعد وہ کوئی کارروائی کریں۔ بہر حال، ہمیں اب محتاط رہنا پڑے گا۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو“ چڑا نے کہا اور اٹھ کر آتش دان کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر وہ دوبارہ اسی جگہ پر آگئی۔ چائے پینے کے دوران میں بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

”نوج گئے تھے۔ کچھ آوازیں سن کر میں دروازے سے باہر آیا۔ وہ آٹھ دس افراد تھے جن میں مرد عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہ ہمارے سامنے والی ندی کے ساتھ ساتھ

چلے ہوئے تقریباً سو گز آگے جا کر روک گئے۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا اور دھڑکیٹا ہوا پھر اندر آگیا۔

مزید آگے گئے بعد چڑا معلومات حاصل کرنے کے لئے شکر کی طرف چلی گئی۔ اس نے کنیا کی ایک چالی مجھے دے دی

جی میں کنیا میں اندر بیٹھے رہنے کے بجائے باہر گھومنے لگا۔ بہت سے لوگ اٹھان (فلس) کے لئے اس ندی پر بھی آ رہے تھے۔ یہ ندی تقریباً نصف میل آگے جا کر جہاں نما بڑے بڑے

پتوں میں گھومتے ہوئے دریا کے دبانے پر جا رہی تھی۔

میں آس پاس کی چٹانوں پر گھومتا رہا۔ یہاں درختوں کی بھی بہت سی تھیں اور خود درختوں کی بھی۔ بعض جھاڑیوں میں رنگ برنگ پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ چٹانوں

میں ایک چمچر سا بنا ہوا تھا۔ چار آدمی ترچھی لکڑیاں کھڑی

کر کے ان پر شاخوں اور جھاڑیوں کا سائیاں بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے جھاڑیوں ہی کا بستر بچھا ہوا تھا۔ آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہاں کسی کی رہائش ہوگی۔ سادھو اور ہنڈت آبادی سے دور پر سکون جگہوں پر جاپ وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے کسی نے اسی مقصد کے لئے یہ سائیاں بنا رکھا ہو لیکن اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس وقت دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ میں ہماڑیوں میں گھومتے گھومتے ٹھک سا گیا تھا۔ کچھ دیر آرام کی غرض سے سائیاں کے نیچے لیٹ گیا۔

وہ چٹان ہماڑیوں کے اور ایسی جگہ پر تھا جہاں سے اس ندی کا کچھ حصہ اور چڑا پریم کی کنیا بھی نظر آ رہی تھی۔ میں

جھاڑیوں کے بستر پر کھٹ کے بل لینا اس طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک آدمی کو اس کنیا کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے دیکھ کر

میں چونک سا گیا۔ اگرچہ سامنے والی ندی کی طرف اور بھی بہت سے لوگوں کی آمد رفت تھی مگر کیڑے لباس کی وجہ

سے وہ آدمی دوسروں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ہماڑیوں ہی میں سے کوئی ہو اور محض تجسس کی بنا پر اس

کنیا کے ارد گرد منڈلا رہا ہو لیکن پھر چاچا تک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

کیڑے لباس والا وہ شخص ہنڈت پر گھیا راج کا فرستادہ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ شاید میرے بارے میں معلومات حاصل

کرنا چاہتا ہو اور یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کنیا میں کون کون ہے مگر کنیا کو تالا لگا ہوا تھا۔

کیڑے لباس والا وہ شخص کنیا کے دور جا چکا تھا اور پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں کالی دیر تک کنیا کی

طرف دیکھتا رہا لیکن نہ تو کیڑے لباس والا وہ شخص دوبارہ نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور مشتبہ شخص دکھائی دیا۔

دھوپ اگرچہ تیز تھی مگر موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سائیاں کے نیچے سائے میں لیٹے ہوئے ہوا کے جھوکے بڑے فرحت بخش لگ رہے تھے۔ ہوا کی تھکیوں سے میری آنکھیں بند

ہوئے لگیں اور تھوڑی دیر بعد میں اٹا غافل ہو گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو سورج مغرب میں پہاڑی کی چوٹی پر جھمک رہا تھا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں

اپنی جگہ پر سکت ہو گیا۔ کیڑے لباس والا وہی شخص چڑا کی کنیا کی کھڑکی کے پاس کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں کسی روز سے اس کنیا میں رہ رہا تھا اور مجھے ابھی طرح معلوم تھا کہ دن یا رات کے وقت کبھی کوئی کھڑکی



نہیں کھولی گئی تھی۔

جس جگہ میں بیٹھا تھا، کنیا کا فاصلہ وہاں سے سوز کے قریب تھا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ خاموشی سے جا کر اس شخص کی گردن دو بچ لوں مگر بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو اس ارادے پر عمل کرنے سے باز رکھ سکا تھا۔ اب میرا یہ شبہ قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ اس شخص کا تعلق مخالف پارٹی سے ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اس شخص کو دوپہر دو بجے کے قریب کنیا کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ دوبارہ اس وقت نظر آیا تھا جبکہ سورج غروب ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ وہ کوئی یا تری نہیں ہو سکتا تھا۔ یا تری تو گنگا جل میں اٹھان کرتے تھے اور مندروں کی یا تریا کے چکر میں گھومتے رہتے تھے۔

صبح سے اب تک کئی یا تری اس ندی پر آئے اور واپس گئے ہوں گے لیکن وہ شخص تقریباً ساڑھے چار بجے گزرنے کے بعد بھی اس جگہ پر موجود تھا جبکہ آس پاس کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کنیا کا بچہ تھا۔ گھیرے لباس والا وہ شخص کافی دیر تک کھڑکی کے اندر جھانکتا رہا اور پھر کھڑکی بند کر کے شہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔

میں بھی اس چٹان سے اتار آیا اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے کنیا کی طرف چلنے لگا۔

سورج اس وقت غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ کی الوداعی کرنیں شہر کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔ میں تیز تیز چلتے ہوئے کنیا کے سامنے والے رخ پر آگیا۔ ندی بھی دیران تھی اور آس پاس کسی ذی روح کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف آنے والے یا تری سورج غروب ہونے سے بہت دیر پہلے ہی واپس چلے جایا کرتے تھے۔

کنیا کو ٹال گاٹا ہوا تھا۔ میں نے گھوم کر پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ وہ شخص کافی آگے چل چکا تھا۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سوبراج نے مرنے سے پہلے انہیں ہمارے بارے میں بتادیا تھا۔ رات کو انہوں نے کوئی کارروائی کرنا مناسب نہیں سمجھا ہو گا اور ہو سکتا ہے موقع ہی نہ ملا ہو لیکن دن میں انہوں نے کنیا کی نگہ رانی شروع کرادی تھی۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے شاید وہ لوگ یہ جان لینا چاہتے تھے کہ اس کنیا میں اور کون کون ہے۔ گھیرے لباس والا وہ شخص یقیناً اسی کا آدمی تھا۔ اگر وہ کوئی چور ہو تا تو اس چوری کی نیت سے آس پاس منڈلا رہا ہو تا تو اس وقت تو اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے

ایک کھڑکی بھی کھول لی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اندر داخل ہو سکتا تھا لیکن وہ چوری کی نیت سے وہاں نہیں آیا تھا۔

وہ شخص کافی آگے نکل گیا تھا۔ سورج بھی غروب ہو چکا تھا لیکن میں نے اس شخص کو نگاہوں سے اور جمل میں ہونے والا مناسب فاصلے سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے میں ہزار پریم کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

وہ صبح دس بجے کے قریب معلومات حاصل کرنے کے لیے شہر کی طرف گئی تھی اور اب تک واپس نہیں آئی تھی اور پھر یہ بات بھی محکم کی میں خود پہاڑیوں میں گھومتا رہا تھا اور کنیا کی طرف نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے دن میں کسی وقت چڑا کنیا میں آئی ہو اور مجھے نہ پا کر شہر واپس چل گئی ہو۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کس چڑا بھی تو ان کے بچے نہیں چڑھ گئی۔ وہ شخص جس طرح اطمینان سے کنیا کے آس پاس منڈلا رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت بھی ملتی تھی۔ بہر حال میں نے اس شخص کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ شخص پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے آبادی میں داخل ہو گا۔ شہر میں برقی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔

مین بازار میں پہنچ کر وہ شخص کچھ دور تک چلتا رہا اور پھر ایک اور تنگ سے بازار میں داخل ہو کر ایک آشرم کے دروازے میں غائب ہو گیا۔ یہ ایک پرانا سا دھندلا مکان تھا جسے آشرم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ دروازہ بھی عام مکانوں کی طرح تھا۔ اس کے اوپر آشرم کا بورڈ لگا دیا گیا تھا اور وہ بورڈ بھی خاصا پرانا ہو چکا تھا۔

اس تنگ سے بازار میں خاصا رش تھا۔ زیادہ تر دکانیں گفٹ آشرم کی تھیں۔ بہت سی دکانیں موتیوں سے بھی بھری ہوئی تھیں۔ ہر دروازے والے اور واپس جانے والے یا تریوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ہر چیز میاں سے مل جاتی تھی۔ واپس جانے والے اپنے عزیزوں کے لیے تحائف کی خریداری زیادہ تر اسی بازار میں کرتے تھے۔

میں آشرم کے سامنے سڑک کی دوسری طرف رک گیا۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی پوری والا ایک ٹھکانا تھا۔ پوریوں تلے جانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں اس ٹھیلے کے قریب آگیا۔ اور بھی کئی لوگ کھڑے پوریوں کھا رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ اچار اور چٹنی سے گرم گرم پوریوں کھاتے ہوئے طبیعت خوش ہو گئی۔

اس دوران میں میری نظریں مسلسل آشرم کے دروازے پر لگی رہیں۔ بہت سے لوگ آشرم میں آ جا رہے تھے لیکن گھیرے لباس والا وہ شخص نظر نہیں آیا تھا۔ پوریوں کھانے کے بعد بھی میں کھیلنے کے قریب کھڑا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ شخص آشرم کے دروازے پر نمودار ہوا لیکن ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ چار پانچ آدمیوں نے اسے روک لیا۔ ان لوگوں کا ہاتھیں کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بات پر جھگڑ رہے ہوں۔ میں بھی سڑک پار کر کے ان کے قریب پہنچ گیا۔ میاں کوئی میرا صورت شناس نہیں تھا اس لیے پہچان لے جانے کا خوف نہیں تھا۔

ان لوگوں کی باتوں سے مجھے گھیرے لباس والے اس شخص کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ سوامی پرمانند تھا۔ وہ اس آشرم کا فکشی تھا اور جو لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے وہ اسی آشرم میں رہائش پذیر تھے اور اس سے اپنا سامان کے چوری ہونے کی شکایت کر رہے تھے۔

”اس ٹولس بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ اپنے سامان کی حفاظت خود کریں۔ چوری وغیرہ کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔“ سوامی پرمانند نے دروازے کے ساتھ دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کیا ”اب اگر سامان چوری ہو گیا ہے تو اس کے ذمہ دار ہم تو نہیں ہیں۔ تم لوگوں کو اپنے سامان کی حفاظت کرنی چاہیے تھی۔“

سوامی پرمانند ان لوگوں سے جان چمڑا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ کوئی کچھ دور تک اس کے ساتھ گئے پھر واپس لوٹ آئے۔ دھنکی میں مجھے سوامی پرمانند کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ شیوا باقاعدگی سے بنائے کا عادی تھا لیکن موچیس خاصی بڑی تھیں۔ گنجا سر مگر درمیان بالشت بھر چڑیا تھی۔ دونوں کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی سونے اور چاندی کی کئی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے کھینے چڑے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو مختلف صفات کے حامل چنوں سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔

میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ مختلف سڑکوں پر پناہ لہا۔ اس کا رخ گنگوتری مندر کی طرف تھا اور بالآخر میرا منہ داخل ہوا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ مندر کی کشادہ میزچیں پر لا تعداد بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ گھوم پھر کر پھول بیچ رہے تھے۔ ان میں اور بھی تھیں جو مندر میں آنے والے یا تریوں کا راستہ

روک کر پھول بیچ رہی تھیں۔ ایک دہلی پتی اور دھیر عمر عورت ایک ٹوکری میں پھول، ناریل اور مٹھائی بیچ رہی تھی۔ اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں پہلو ہٹا کر نکل گیا۔

مندر کے اندر خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ میں سوامی پرمانند کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ سامنے ایک اونچے چوترے پر تقریباً دو فٹ اونچا کالے رنگ کا گول پتھر رکھا ہوا تھا جس پر سفید رنگ سے چرے کے نقوش بنے ہوئے تھے۔ اس کے آس پاس پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا اور سامنے چوترے پر لوگ بیٹھتے کی جانے والی چیزیں رکھتے جا رہے تھے۔

سوامی پرمانند اس چوترے کی چھٹی طرف ایک بٹے کئے پنڈت کے قریب کھڑا نظر آگیا۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور پھر پیچھے ہٹنے ہوئے ایک راہداری میں غائب ہو گئے۔ میں اس طرف لپکا تو دو ادھیر عمر عورتوں نے مجھے روک لیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تھالیاں تھیں اور دونوں تھالیوں میں ناریل، مٹھائی وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔ ”بیٹا۔ رام جی کا پر سادہ۔“ ایک عورت نے تھالی میرے سامنے رکھی۔

میں نے ہنسی کی دلی میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا تو ذکر منہ میں رکھا اور جب آگے بڑھا تو سوامی پرمانند اور دوسرا پنڈت غائب ہو چکا تھا۔

میں مندر کی راہداریوں میں چکراتا رہا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میں دوبارہ مندر کے مرکزی ہال میں آگیا۔ کچھ دیر وہاں ادھر ادھر گھومتا رہا اور پھر باہر نکل بیڑھیوں پر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

اب یہ بات طے شدہ تھی کہ سوامی پرمانند پنڈت پر گھیا راج ہی کا آدمی تھا اور اسے میرے اور چڑا پریم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہی کنیا کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ چڑا کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اب مجھے اس کی طرف سے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔

سوامی پرمانند کے بارے میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ آشرم کا فکشی تھا اور اسے بہر حال آشرم میں واپس جانا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رات اسی مندر میں گزار دے لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سوامی پرمانند مندر کے ایک سائیز ڈور سے نکلے ہوئے نظر آیا۔

وہ دروازہ مرکزی گیٹ سے تقریباً پندرہ فٹ بہت کر تھا۔ اس طرف یا تریوں کی آمدورفت نہیں تھی اور وہ دروازہ شاید مندر میں رہنے والے پنڈتوں اور پجاریوں کے لیے ہی

مخصوص تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا سوامی پرمانند کو سیر میزوں سے اترتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ سیر میزوں پر تڑپ رہے تھے گز آگے جا دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے جانے کے لیے میں نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، کسی نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

وہ ایک بچان تھا۔ تھی۔ تو بے جیسی کالی رنگت، سفید بال اور سر سے پیر تک گھروے رنگ کی چادر میں لپیٹی ہوئی۔ چہرے اور کسبئی تک ہانوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ پہلی عورت تھی جسے میں نے اس طرح مکمل طور پر لباس میں چھپے ہوئے دیکھا تھا۔ سیاہ چہرے پر آنکھوں کے چمکتے ہوئے سفید دیدے اور موتیوں جیسے دانت بڑا خوفناک اور چراسرا ناثر رہے رہے تھے۔

جبکہ مانگنے کے لیے لوگ عجیب و غریب حلقے دھار لیتے ہیں۔ باتریوں کو بے وقف بنا کر ان کی سیڑیوں کا بوجھ بٹا کر کرنے کے لیے عجیب و غریب جھکڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ میں اسے بھی کوئی ایسی ہی عورت سمجھا تھا جس نے غالباً جبکہ مانگنے کے لیے یہ بہرہ و دھار رکھا تھا۔

”ارے کیا ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے ایک جھپٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”شناخت رہو۔ گھبراؤ نہیں۔“ بھکارن نے جواب دیا ”خود پر ضبط کر دو رنہ بنانا بھیل بکڑ جائے گا۔“

میں نے آواز سن کر چونک گیا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ چڑا پر تم تھی اور میں نے محض آواز سے اسے پہچانا تھا۔

”اوہ تم! میرے منہ سے نکلا۔ جلدی چلو ورنہ وہ نکل جائے گا۔“

”لیکن وہ تو ابھی تک اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ تم کس کی بات کر رہے ہو۔“ چڑا نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوامی پرمانند وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں دارا کی بات کر رہی ہوں۔“ چڑا نے جواب دیا ”وہ اس وقت مندر میں موجود ہے۔“

”اوہ!“ میں اچھل پڑا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی ”کہاں ہے وہ؟“

”اُو۔“ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ چڑا نے یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف کھینچنے لگی۔

لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کئی لوگوں نے ہمارے گزرتے بھی دیکھا تھا مگر کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہم سیر میزوں سے اتر کر کچھ دور تک چلتے رہے پھر ایک تنگ سے راستے پر مڑ گئے۔ چند گز آگے کھلی جگہ تھی جہاں پہاڑوں سے آنے والا پانی جمع ہوتا اور اس طرف مندر دیواروں کو چھوتے ہوئے دوسری طرف بہہ رہا تھا۔ ہر طرف کے کنارے ایک پتھر بیٹھ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا اور پاس کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ ہم اطمینان سے بات کرتے تھے۔

”ہاں۔ اب بتاؤ۔“ میں نے چڑا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ دارا مندر میں موجود ہے۔ ہر مطلب ہے تم نے اسے کیسے پہچانا؟“

”تم نے دارا کا جو حلیہ بتایا تھا وہ اس پر بالکل فٹ پڑا ہے۔“ چڑا نے جواب دیا ”تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ کسی دہریہ پر تم نے اس کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ ایک بیساکھی ہے۔ سہارے چلا ہے لیکن لگتا ہے اس کی ٹانگ پوری طر مفلوج نہیں ہوئی۔ کسی وقت بیساکھی بٹا کر وہ اس ٹانگ پر بوجھ ڈالتا ہے۔“

میں اپنے آپ میں سسنی کی عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سو بھرجان کا خیال درست نکلا تھا۔ دارا بالآخر فریاد پہنچ ہی گیا تھا۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتا نہ چلا تو اس کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ اس نے شاید یہی سوچا ہوگا۔ زندگی انہی مندروں میں گزار دے گا لیکن شاید وہ بھول گیا تھا کہ میں موت کا سایہ بن کر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

”اس کے ساتھ اور کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کے ساتھ اور کون یہاں آیا ہے لیکن پنڈت پر گھیا راج کا ساتھ ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ دارا کو میں نہیں جانتی لیکن راج کے بارے میں بتا چکی ہوں کہ انسانیت نام کی کوئی شے اسے چھو کر نہیں گئی۔ وہ درندہ ہے۔ خون خوار بھیڑیہ۔“

”دارا اس سے بھی زیادہ خون خوار درندہ ہے۔“ میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”تم نے غلطی کی۔“

غائب ہو اور میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ یہ سب جگہ میں اس کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو گیا۔

”مجھے معلومات حاصل کرنے کے لیے مندر سے اندر جانا تھا۔“ چڑا نے جواب دیا ”یہاں پنڈت، بچاری اور تکر بندو بھی طرح طرح کے سوانگ بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ اگر میں اپنے اصل میں ہوں

بچے تو تم پہچان لیا جاتا۔ اس لیے مجھے اپنے بدن پر کالک ملنی پڑی۔ اس طرح میں مندر کے اندر تک چھپنے میں کامیاب ہوئے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ”آج دو بجے کے قریب جب میں یہاں سے ہوتے جانے والی تھی تو مندر میں پر گھیا راج کے ساتھ اس کا ایک گروہ کچھ کرچوک کئی۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں دارا کا خیال ابھرا۔ جلد ہی تھا جو تم نے بتایا تھا۔ اس شخص کو دیکھنے کے بعد میں نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔“

”دارا اور پر گھیا راج کچھ دیر ہال میں رہے اور پھر اندر چلے گئے۔ میں بھی انہیں مندر کی راہداریوں میں تلاش کرنے لگی لیکن وہ نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے اور پھر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایک پنڈت مل گیا جو کھانے پینے کا کچھ سامان اٹھائے جا رہا تھا۔ اس نے کچھ سامان میرے حوالے کر دیا اور اسی طرح مجھے اندر جانے کا موقع مل گیا۔“

”وہ دارا ہی ہے۔ ان پنڈتوں کے ساتھ مل کر پیش کر رہا ہے وہ درجی۔ اچھے کھانے، شراب اور خوب صورت لڑائیاں میں دن بھر ان کے ساتھ رہی۔ میری کالی رنگت نے مجھے بچالیا۔ اگر میں اپنے اصل رنگ و روپ میں ہوتی تو میں بھی ان دنوں سے نہیں بچ سکتی تھی۔“

”میں نے پنڈتوں اور بچاریوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن ابھی تک نہیں کیا تھا مگر اس کا پتلا تجربہ اس وقت ہوا جب ایک مندر میں میری بیٹی کی عزت کو تار مار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور میرے شوہر کو بھی قتل کیا گیا اور دوسری مرتبہ آج دیکھا کہ دھرم کا پرچار کرنے والے پنڈت اور بچاری کس طرح دارا کو اپنی کراپے پکڑوں سے باہر ہو رہے تھے۔ وہ جوان لڑکیوں کو اس طرح مہینڈ ڈر رہے تھے جیسے خوں خوار بھیڑیہ اپنے شکار کے بچے ادا چھڑتے ہیں۔“

میں تو ہر وقت شرم سے پانی پانی ہوتی رہی۔ کئی بار دل چاہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ان کے بارے میں جانتے نہ تھا۔ وہاں ٹھہری رہی پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ”دارا مسلمان ہے لیکن وہ ان پنڈتوں کے ساتھ اس طرح رہا ہے جیسے خود بھی ہندو ہو۔“

”دارا بہت چالاک ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”اسے لوگوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ وہ دھرم کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”مال سو بھرجان کے بارے میں کیا معلوم ہوا۔ اس کی جان

کس نے لی؟“

”دارا کل شام کو یہاں پہنچا تھا۔“ چڑا نے جواب دیا ”اس نے مندر میں داخل ہوتے ہی سو بھرجان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے پوری طرح نہیں پہچان سکا تھا لیکن تنگ میں پر گھیا تھا۔ اس نے پنڈت پر گھیا راج کو اس کے بارے میں بتا دیا اور پر گھیا راج کے آدمی اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔“

”ان لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ سو بھرجان آسانی سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ اتے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا اور بالآخر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے تمہارے اور میرے بارے میں بتا دیا۔“

”انہوں نے سو بھرجان کو ہلاک کر ڈالا اور اس کی لاش مندر سے دور ویران سڑک پر پھینکوا دی۔ دارا کا خیال تھا کہ انہیں رات ہی کو ہماری کینیا پر حملہ کر دینا چاہیے تھا مگر پر گھیا راج نے اس کی مخالفت کی۔ میری بیٹی اور قتل کے حوالے سے اس کا نام پولیس کی لسٹ پر آچکا تھا۔ اگر میری کینیا پر حملہ کر کے تمہیں یا مجھے ہلاک کر دیا جاتا تو پولیس کو قاتل کے بارے میں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آتی اس لیے پنڈت پر گھیا راج نے یہ منصوبہ بنایا کہ فی الحال ہماری نگرانی کر کے ہماری سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جائے اور تمہیں ختم کرنے کے لیے بعد میں کوئی اور منصوبہ بنایا جائے۔“

”لیکن دارا کو کیسے شبہ ہوا کہ سو بھرجان میرے ساتھ ملا ہوا ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ سب کچھ مجھے ان کی باتوں ہی سے معلوم ہوا ہے۔“ چڑا نے جواب دیا ”دارا سو بھرجان کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ اس نے پنڈت پر گھیا راج کو اس کے بارے میں بتایا تو پنڈت نے اسے اٹھوا لیا۔ دارا کی زندگی کا اٹھارہاں اس بات پر تھا کہ یہاں اسے کوئی پہچانتے والا موجود نہ ہو لیکن یہاں سو بھرجان کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ پر گھیا راج کے ذریعے اس سے نہایت حاصل کرنا چاہتا تھا اور جب سو بھرجان کو دارا اور پنڈت پر گھیا راج کے سامنے لے جایا کیا تو پوچھ گچھ کے دوران میں سو بھرجان نے یہ انکشاف کیا۔ تم بھی دارا کی تلاش میں یہاں پہنچ چکے ہو اور اس طرح دارا کو نہ صرف تمہارے بارے میں پتا چل گیا بلکہ سو بھرجان کو بھی اپنی زندگی بے ہمت دھونے پڑے۔“

”اور تم جانتی ہو میں جس شخص کا تعاقب کر رہا تھا وہ کون ہے؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ چڑا نے فنی میں سر ہلایا تو میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”وہ شر

دنیا کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ شام کے وقت اس نے ایک کمرے کی عقی کھڑی کھول کر اندر بھانکا بھی تھا۔ اسے کھانا کے آس پاس دیکھ کر مجھے اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ شام کے بعد جب وہ شہر کی طرف واپس آیا تو میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ پہلے آشرم گیا تھا اور پھر یہاں آیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے مندر کے اندر رہنے کے بعد وہ واپس جا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا کہ تم نے مجھے روک لیا۔

”اب اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ چڑانے جواب دیا ”یہ لوگ جب تک مندر کے اندر ہیں، ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح باہر نکالنا ہو گا۔“

”یہ اتفاق ہے کہ میرے اور تمہارے دشمن اکٹھے ہو گئے ہیں اور دونوں خوں خوار درندوں کی طرح نہایت خطرناک ہیں۔ ان سے ختنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”اب یہاں بیٹھنا بے کار ہے۔ واپس چلو۔“ چڑانے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہم دونوں کا ساتھ چلنا مناسب نہیں ہے۔ اگر اب مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا گیا تو کوئی گز بڑ ہو سکتی ہے۔ تم آگے چلتی رہو۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔“

چڑا مندر کی طرف چلی گئی۔ میں بھی کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ مندر کے سامنے پہنچ کر چڑا شہر کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ میرے اور اس کے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں اس کے ساتھ مل گیا۔

”ہم کچھ دور تک اکٹھے ہی چلتے رہے۔ اس وقت رات کے نو بجتے والے تھے۔ ایک موٹر پہنچ کر میں رک گیا۔ ”تم جاؤ۔ میں ذرا بازار کی طرف سے ہو کر آتا ہوں۔ کچھ کھانے کو لے آؤں۔“ میں نے کہا۔

چڑا ہانڈیوں کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی اور میں بازار کی طرف چل پڑا۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ سے کھانا پک کر دیا۔ بازار سے کچھ اوپر چرس خریدیں اور کھانا کی طرف چل پڑا۔

دن کے وقت تو اس طرف لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی لیکن اس وقت یہ راستہ سنسان پڑا تھا۔

میں ابھی کھانا سے چند گز دور ہی تھا کہ ایک بلیکی ہی نسوانی چیخ سن کر چوک گیا۔ یہ آواز کھانا کی طرف سے آئی تھی اور اسے بچانے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

تھی۔ وہ چڑا کے چیخنے کی آواز تھی۔

کھانا کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ اس طرف راستہ اندر داخل ہوتا مناسب نہیں تھا۔ میں دہلیز پر چلتے ہوئے کھانا کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ ہر طرف سنسنائی دور دور تک کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار دکھائی نہ دے رہے تھے لیکن کھانا کے اندر جو ڈراما ہو رہا تھا اس اندازہ لگانے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی۔

میں پچھلی کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جہاں سے شام کو سوامی پرمانند نے جھانک کر دیکھا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پیشے سے آنکھ لگا دی۔ یہ وہی کھڑکی تھی رات کو میں سوایا کرتا تھا۔ یہ کھڑکی خالی تھا البتہ دروازے کی دوسری طرف آتش دان والے کمرے میں دکھائی دیتا تھا۔

منظر بڑا سنسنی خیز اور خوفناک تھا۔

اس کمرے میں چڑا کے علاوہ دو آدمی تھے اور وہ دونوں خوفناک صورتوں والے بچاری تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر ہاتھ دھڑکتے تھے جیسا ان کے جیون کا بیشتر حصہ جنگلوں میں گزارا ہوا۔

میں سے ایک نے چڑا کے بازو موڑ کر اسے پیچھے سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ چڑا کے بدن پر اب وہ چادر نہیں تھی۔

چھوٹے ذریعے سے مجھے گھنٹوں سے گردن تک اس کا بدن اپنی اصل رنگت میں تھا جبکہ گردن سے اوپر چہرہ پورے ہاتھ اور گھنٹوں سے پیروں تک کی رنگت سیاہ تھی۔

دوسرا بچاری چڑا کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر بڑے خوفناک اثرات تھے۔

”گردن کی ہمت کھس ہوں گے۔“ وہ پہلے اور گت واہتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا ”اسے جب پتا چلا کہ کالے مندر والی جو لونڈیا زن بھرا اس کی نظروں کے سامنے رہی ہے وہ ابھرا کی طرح حسین ہے وہ تو بہت کھس ہوں گے۔“

”کھو! پہلے اپنا تو منہ میٹھا کر لے۔“ اس بچاری نے جس نے چڑا کو گرفت میں لے رکھا تھا، گردن کو الٹا کر چڑا کے منہ سے لیتا ہی رہتا ہے۔ آج ہم بھی کچھ لیں۔“

”پہلے اس سے پوچھ لو میں اس کا پرہیز کیا ہے۔“

بچاری نے جواب دیا۔ جسے کھو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا وہ چڑا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہاں تو چڑا دیوی۔ بہت نازک دلچالے تم نے۔“

تمہارا بھید کھل گیا ہے۔ پتا دو تمہارا پرہیز کیا ہے۔“

جس کی ہمارے گردو گشتاں ہے۔ ورنہ تم جانتی ہو۔“

ساتھ کیا ہو گا۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ چھوڑ دو مجھے۔“ چڑا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”تم لوگوں نے میری مصمص بیٹی اور میرے شوہر کو مار ڈالا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارے منہ اور غلیظ خون سے لگنے کے پورے پانی کو بھی گند اکروں گی۔“

”نا تم نے سمجھو۔“ کھو نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے ہکا ساقہ لگایا ”یہ تیری ہمارے لوہے لگنا جل کر گند کرے گی۔ پر یہ یہ نہ جانے ہے کہ ہمارا خون تو گند جل سے بھی زیادہ پورے ہے۔“

”اس کا منہ تو دھلاؤ کھو۔ چٹا لو گے تو تمہارا بھی منہ کالا ہو جائے گا۔“ کھو نے کہا۔

”ہاں۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی اس کا کھڑا دھلاتا ہوں۔ ویسے اپنا منہ بھی تو پہلے ہی کالا ہے۔ ایک بار اور کالا کر لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔“ کھو یہ کہتے ہوئے کمرے کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں پانی کا ٹنکا رکھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ میری نگاہوں سے اوچھل گیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپنگ بیگ پھینک دیے۔ ان کے ذہن پر رکھ دیے اور احتیاط سے کھڑکی کو لے لگا۔ یہ کھڑکی شام کو سوامی پرمانند نے کھولی تھی اور پھر اس کے پٹ بھینڈ دیے تھے اور اس وقت مجھے کھڑکی کو لے کر سامنے ڈھرائی بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں کھڑکی کے فریم پر چڑھ رہا تھا کہ کھو پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر سامنے آیا۔

”لے منہ دھو لے۔ تیرا اصل روپ تو دیکھیں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے پانی چڑا کے منہ پر پھینک دیا۔

چڑا کے منہ سے بلی کی چیخ نکلی۔ اس کے چہرے پر کھڑا ہوا رنگ پانی کے ساتھ برنگ تھا۔ وہ ڈھرائی چلی تو اس کے پیچھے کھو نے اس کے ہاتھ پکڑے اور مضبوطی سے پکڑ لیے۔

”چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو۔“ وہ چیخ کر ”ایک عورت پر ظلم کرتے ہوئے تم لوگوں کو شرم آتی جا رہی ہے۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اپنے اس پرہیز کے بارے میں تاکہاں ہے۔“ کھو نے اس کی ہانوں کو مروڑتے ہوئے کہا ”وہ مرو ہوتا تو تمہیں اکیلے چھوڑ کر بھاگ نہ جاتا۔ خیر۔ اس کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے۔ پہلے تیرے ساتھ تو۔“

”میں کیا شیطانوں!“ میں نے گونج دار آواز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے اندر چلا گیا کہ ”تمہیں انتظار کا کٹھنسل اٹھانا پڑے گا۔ میں آیا ہوں اور اب تم دونوں تیار

ہو جاؤ۔“

میں اچھل کر چچ والے دروازے کے قریب آیا تھا۔

ان دونوں نے بیک وقت میری طرف دیکھا۔ ایک لمبے کو تو یوں لگا جیسے ان دونوں کے دونا کو چکر گئے ہوں لیکن پھر ان دونوں نے حیرت انگیز طور پر بہت جلدی اپنے آپ پر قابو پایا۔ کھو نے اچانک ہی چڑا پر تیرم کو پوری قوت سے میری طرف دیکھ لیا۔

چڑا لڑکھائی ہوئی مجھ سے کھرا گئی۔ اس کے منہ سے بلی کی چیخ نکلی۔ میں نے چڑا کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس سنبھلنے کے میں بھی ایک لمبے کو گز بڑا گیا تھا اور پھر میرے سنبھلنے سے پہلے ہی کھو اور کھو نے بیک وقت دو مختلف سمتوں سے مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں چڑا کا ساتھ لے کر بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا اور تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کھو اور کھو میری ہی بھونک میں ایک دوسرے سے کھرا گئے۔ ان کے سر آپس میں کھرا گئے تھے۔ ان دونوں میں کسی کے منہ سے چیخ بھی نکلی تھی۔

میں نے چڑا کو اپنے سے الگ کیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی ایک زوردار سائیڈنگ بھونک سے رسید کر دی۔ کھو کی نگاہ تکی تھی۔ کھو پیچھے ہٹے ہوئے کھو سے کھرا گیا اور وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع دینے بغیر ان پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے رہے مگر میری ہر ٹھوکرا ان میں سے کسی نہ کسی کو چیتنے پر مجبور کر دی پتا تو کھو کھو کا داؤ چل گیا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار بھونکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پٹ کے بل گر گیا۔ کھو نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر میرے اوپر چلا گیا۔

میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر اسے پیروں پر روکا اور پوری قوت سے دوڑ اچھال دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے کھرا کر گرا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی کھو بھی چلا گیا لگا چکا تھا۔ میں اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ بھاری چٹان کی طرح میرے اوپر گر گیا۔

وہ کم بہت خاصا بھاری بھونک تھا۔ ایک لمبے کو تو مجھے اپنا سانس کھٹکا ہوا محسوس ہوا لیکن پھر میں ایک گھٹنا سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے پیچ میں ٹھوک لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے کھٹنے سے اسی انداز میں دوبارہ ٹھوک لگائی۔ اس مرتبہ وہ بڑی طرح بلبلایا۔ میں نے دوسری ٹانگ بھی سمیٹ لی اور اسے پیروں پر اٹھا کر پیچھے کی طرف اچھال

دیا۔ وہ میرے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے بھد سے پیچھے کی طرف گرا۔

میرے اٹھنے تک وہ دونوں بھی اٹھ گئے اور اترنا بیٹھنے کی طرح پھنکارے ہوئے میری طرف بڑھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں میں سب پناہ طاقت بھری ہوئی تھی لیکن وہ لانے کے فنی سے واقف نہیں تھے جبکہ مجھے ان پر یہ فوجیت حاصل تھی کہ میں مارشل آرٹس میں مہارت رکھتا تھا۔

ان دونوں کے انداز بڑے خطرناک تھے۔ وہ مجھے گرفت میں لینا چاہتے تھے اور میں جانتا تھا کہ اگر ان کے قابو میں آگیا تو وہ میری ہڈیوں کا سرمہ بنادیں گے۔ میں اس طرح پیچھے ہٹنے لگا لیکن ان سے خوف زدہ ہو رہا ہوں۔ تین قدم پیچھے ہٹنے ہی میں طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے ذہل لگ لگائی تھی۔ میرا ایک پیر بھڑو کے منہ پر اور دوسرا گھرو کے سینے پر لگا تھا۔ وہ دونوں ہلکاتے ہوئے پیچھے الٹ گئے۔

اور پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ چڑا پریم جو اب تک چچ والے دروازے کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ بڑی تیزی سے اٹھ کر آتش دان کی طرف پلکیں جھپکیں۔ پرتوں میں سبزی کاٹنے کی لمبے پھل والی چھری پڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو سمجھ سکتا، چڑا نے چھری اٹھا کر بھڑو پر حملہ کر دیا۔

منہ پر میری لگ گئے سے بھڑو کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا اور وہ قدرے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ناک اور منہ پر تھا۔ چڑا نے خوفناک انداز میں پیچھے ہٹے چھری پوری قوت سے اس کے بائیں پهلوی میں امار دی۔

بھڑو پیچھے ہٹے منہ کے بل گرا۔ چڑا نے چھری اس کے جسم سے باہر کھینچ کر دوبارہ حملہ کر دیا۔ یہ وار بھی بھڑو کے پهلوی پر پڑا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بھڑو کی طرح ہلکا اٹھا۔ اس کے جسم پر لگنے والے دو زخموں سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ زمین پر لوٹے ہوئے جیسے ہی سیدھا ہوا، اس مرتبہ چڑا نے چھری اس کے سینے میں اتار دی۔

گھرو ایک طرف پڑا دہشت زدہ سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور پھر وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے اٹھ کر پیچھے ہٹے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں بھی چڑا پریم کے خون کو دیکھ رہا تھا۔ گھرو کی چیخ سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بھی گھرو کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ گھرو کا پیر میرے ہاتھ میں

آگیا۔ وہ دروازے سے نکل آیا۔ دروازہ باہر کی طرف نہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گھرو بھی گرا اور اس کا پیچھے ہٹنے سے چھوٹ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو سکے، اس نے چھلانگ لگا کر اسے چھاپ لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پتھروں پر گر پڑے۔ گھرو کو اس دوران میں کئی مواقع ملے تھے وہ اگر چاہتا تو میں گردن مروڑ سکتا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو چڑا کر کے کھانسی کو شش میں تھا۔ بھڑو کا شہر دیکھ کر اس پر بری طرح فزع سوار ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو چڑا کر کے کھانسی کی لیکن اس مرتبہ اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آگئی۔

میں نے گھرو کی گردن کو بازو کی پلٹ میں لے کر کھانسی۔ وہ گرفت چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن میرے بازو کا لگایا ہوا نیک لاک چھڑا ناممکن نہیں تھا۔ اس کی پشت میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی یہ کوشش بھی محکم کسی طرح اپنے پتھروں پر کھڑا ہو سکے لیکن پتھروں میں ایذا زدہ رگڑنے سے سوا وہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اور پھر مجھے وہ موقع مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اس کی گردن کو زوردار جھکا دیا۔ خاصی موٹی گردن تھی۔ جھکا گئے سے وہ چچ اٹھا تھا لیکن میرا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک اور جھکا دیا اور پھر تیسرے جھکے پر "کڑکائی" آواز ابھری۔

گھرو بری طرح جھلا۔ اس کے حلق سے خرخرات کی دہلی دہلی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اور پھر اس نے چڑا پیچھے ہٹے کھانسی سے باہر آگئی۔ خون آلود چھری اس کے بائیں

میں تھی۔ ہم جس جگہ پر تھے وہاں کھلے ہوئے دروازے سے بے پیر کی مدد ہم سی روشنی پہنچ رہی تھی۔ چڑا نے آتے ہی گھرو کے منہ پر لگا دیا۔ چھری اس کے پیٹ میں اتر گئی۔ میں نے گھرو کی گردن کو ایک اور جھکا دیا اور اسے چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ گھرو کو میں نے چڑا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ پتھروں پر بری طرح لوٹ رہا تھا اور چڑا چھری سے اس پر پڑے دروازے کی طرف گری رہی تھی۔ اس پر جنون طاری تھا۔ اس نے اپنی ٹانگوں کے ہاتھوں اپنی بیٹی اور اپنے شوہر کو اسی طرح قتل کرنے دیکھا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ بیٹی اور شوہر کا قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑے گی اور میں نے اسے یہ سبق فراہم کر دیا تھا۔

گھرو ختم ہو چکا تھا لیکن چڑا کے جنون میں کوئی کمی نہیں

تھی۔ وہ اب بھی چھری سے پے در پے اس پر وار کر رہی تھی۔ "چڑا رک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا "وہ ختم ہو چکا ہے۔ چھوڑ دو اسے۔"

"میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ نکلے کر دوں گی اس کے۔" چڑا نے بھی چیخ کر جواب دیا اور گھرو کے مردہ جسم پر تل جاری رہ گئی۔

میں نے پیچھے سے چڑا کو اپنی ہاتھوں کی پلٹ میں لے لیا۔ وہ چچ چچ کر اپنے آپ کو چڑا لانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں اسے کھینچے ہوئے وہاں سے دور ندی کی طرف لے گیا۔

چڑا کی یہ کانچ یا کھانسی آبادی سے بہت دور تھی۔ ستانے میں چچ کا رکی آوازیں اگرچہ دور تک پہنچی ہوں گی اور کہیں نہ کہیں سنائی دے گی لیکن مجھے یقین تھا کہ تحقیق حال کے لیے کوئی اس طرف نہیں آئے گا اور پھر کھانسی کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی دشوار ہو گا کہ چھیننے کی یہ آوازیں کس طرف سے آئی ہیں اس لیے کم از کم اس وقت یا فوری طور پر کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

میں چڑا کو کھینچے ہوئے ندی پر لے گیا۔ اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ایک طرف ڈال دی اور اس کے منہ پر پانی کے جھینے مارنے لگا اور پھر وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ وہ کھانسی دیر تک کمرے کمرے سانس لیتی رہی پھر میرے ساتھ پلٹ کر سکیاں بھرے گئی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا اور جب اس کی سکیاں بھریں تو میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کر دیا۔

"آج میرے من کو کچھ تسکین مل گئی۔" وہ اب بھی کمرے کمرے سانس لے رہی تھی "لیکن پوری تسکین اس وقت ملے گی جب میں اس تیسرے دہندے بننے پر گھیا راج کوئی اسی طرح موت کے کھاٹا اتار دوں گی۔"

لیکن اس سے پہلے ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے

چڑا ان لاشوں کو ندی میں پھینکنا چاہتی تھی تاکہ اپنی قسم پوری کر سکے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ لاشیں پانی میں بہہ کر زیادہ دور تک نہیں جا سکیں گی۔ آگے جا کر اس ندی کا پانی چوڑا ہو گیا تھا اور پانی کے بہاؤ کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ مزید برآں آگے ندی میں بڑے بڑے پتھر بھی تھے اور کناروں پر جھانپاں بھی پھیں جن کی شاخیں پانی کے اندر تک پہنچی ہوئی تھیں وہ لاشیں ان جھانپوں اور پتھروں میں انک جاتیں اور کل دن میں کسی بھی وقت ان کا پتا چل سکتا تھا جبکہ میرے ذہن میں کچھ اور منصوبہ تھا۔

کانچ میں آکر ہم نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں جا بجا خون پھیلا ہوا تھا جہاں بھڑو کی لاش پڑی تھی۔ خون صاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کانچ میں ہر جگہ اور ہر چیز پر ہماری انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ پولیس اگر تحقیقات کرتی تو ہمیں قاتل ثابت کرنے میں آئیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ بہرہے بھی پولیس کے لیے انجین نہیں تھے چڑا پریم تو اپنی بیٹی اور شوہر کے قتل کے خوالے سے پہلے ہی پولیس سے رابطے میں تھی اور میں بھی تیس مار خان بنا ہوا تھا۔ سورج گرہن والے دن ہم نے گنگوٹری کے بہاؤی غاروں میں بدری ناتھ کی نو جوان بیٹی سیتا کو پندت آشوتوش سے بچایا تھا اور پولیس والے ہمارے بے حد مشکوک و ممنون ہوئے تھے اور پولیس پر یہ احسان اب ہمارے لیے خصوصاً میرے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ پولیس والے جان گئے تھے کہ میں چڑا کے ساتھ رہ رہا ہوں اور اب چڑا کے ساتھ مجھے بھی تلاش کیا جانا لازمی تھا۔

اس کانچ سے اپنے جرم کا ہر ثبوت مٹانا ہمارے لیے ضروری تھا تاکہ ہم سانسے بھی رہیں تو کم از کم پولیس ہم پر قتل کا شبہ نہ کر سکے اور میں نے چڑا کو سمجھا دیا تھا کہ ثبوت کس طرح مٹائے جاسکتے ہیں۔

میں نے گھرو کی لاش بھی باہر سے اٹھا کر کانچ میں بھڑو کی لاش کے قریب ڈال دی۔

چڑا اپنے کمرے میں کھس گئی جہاں ایک طرف اس کا سوٹ کیس پڑا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھول کر چند کپڑے ایک تھیلے میں بھر لیے۔ میں نے بھی دوسرے کمرے میں جا کر اپنے کمرے ہوئے کپڑے اپنے بیگ میں ٹھونس لیے۔

"شر کا رخ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے چڑا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ رات ہمیں ہانڈوں میں ہی گزارنا پڑے گی۔ صبح کسی ایسی جگہ کا بندوبست کریں

گے جہاں ہم چند روز تک محفوظ رہ سکیں۔  
 ”ایک ایسی جگہ ہے۔“ چڑانے کہا ”تم وہ کھیل اٹھاؤ۔  
 ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“

ایک کھیل چڑانے بھی اٹھایا تھا۔ دوسرا میں نے نہ کر کے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ میں نے وہ کھڑی بھی اندر سے بند کر دی۔ چڑا کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔  
 میں نے جتا ہوا لیپ اٹھالیا۔ چڑا باہر جا چکی تھی۔ لیپ کا ڈمکن کھول کر پہلے میں نے ان دونوں لاشوں پر تیل چھڑکا پھر تینوں کمروں میں تیل کے چھینٹے دیئے لگا۔  
 لیپ میں تیل کے چند ہی قطرے بچے تھے۔ اس کی بقی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے اس کا شیشہ اتار کر نیچے پھینک دیا اور لاشوں کے قریب ایک کپڑے پر جتا ہوا لیپ پھینک دیا۔

کپڑے کو فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ میں جلدی سے باہر گیا۔  
 اور دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ چڑا دروازے سے چند قدم دور کھڑی تھی۔  
 ”کس طرف جانا ہے؟“ میں نے قریب پہنچ کر پوچھا اور چڑانے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف چلے گئے۔ تقریباً سو گز دور نکلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کالج کی عقی کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ اندر آگ پھیلنے لگی تھی۔ یہ مختصر سی عمارت لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھی اور میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں ہی پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آجائے گی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے اس جرم کے تمام ثبوت مٹ جائیں گے۔

ہم تیز تیز چلے رہے۔ ہمارا رخ بلندی کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چڑا ہانپنے لگی۔ اس وقت ہم کالج سے تقریباً نصف میل دور نکل آئے تھے چڑا کی وجہ سے مجھے رک جانا پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں تھے جتا ہوا مکان اگرچہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس طرف نفا میں نارنجی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

پانچ چھ منٹ وہاں رکنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ ہم پہاڑیوں میں بدستور بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ بلندی ’بڑھ اور گھٹنے درختوں کی وجہ سے سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے چڑا سے اس کا تھملا لے لیا اور اس کا کھیل کھول کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔ کھیل کی وجہ سے چڑا کو کپٹے میں مزید دشواری پیش آ رہی تھی۔ چڑانے ایک ہاتھ سے اپنے بدن پر لپٹے ہوئے کھل کے دونوں کنارے پکڑ

رکھے تھے اور اس کا دوسرا ہاتھ میں نے تمام رکھا تھا اور اسے تقریباً کھینچے ہوئے لے جا رہا تھا۔

ہم تقریباً تین گھنٹے تک رک رک کر چلے رہے اور ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ چڑا زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگی اور میں بائیں طرف خنثی میں دیکھنے لگا جہاں دور دور تک ٹھنکی ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم پہاڑیوں میں چلے ہوئے شہر کی دوسری طرف نکل آئے تھے اور ہر دور شہر میں سے تقریباً تین میل دور خنثی میں تھا۔

ہمیں تقریباً بیس منٹ تک اس جگہ رکنا پڑا اور بالآخر ایک بار پھر آگے روانہ ہو گئے۔ پہاڑیوں میں اونچے نیچے راستوں پر چلنا خاصا دشوار کام تھا اور تاریکی میں تو اور بھی مشکل پیش آ رہی تھی۔ کئی مرتبہ بڑے بڑے پتھر ہمارے پیروں کے نیچے سے پھسل کر ڈھلان پر لڑھکے ہوئے دور تک چلے گئے تھے میں نے چڑا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

مزید دو گھنٹے چلنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ ہم جب کالج سے روانہ ہوئے تھے تو اس وقت تقریباً نو بجے کا وقت ہو گا اور میرے خیال میں اب تین تو سو رہے ہوں گے۔ پہاڑیوں پر چلنے چلنے چڑا بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سردی بھی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف آندھیرے تھے اگر میں اسے کھیل نہ اڑھاتا تو وہ ٹھنک رہا ہوتا۔

میں چڑا کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا رہا جس سے میں اس نیچے پر پہنچا تھا کہ یہ پہاڑی راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ اس وقت بھی گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے مجھے نظروں سے اڑھاتا دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور ایک چٹان سے آتشبار کی طرح پانی گر رہا تھا۔ وہ چٹان بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی اور آتشبار بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پانی ایک بڑے پرتالے کی صورت میں نیچے گر رہا تھا اور جمع ہونے یا ندی کی صورت میں آگے بے گئے وہاں پتھر کی زمین کے اندر غائب ہو رہا تھا۔ یہی پانی چٹانوں کے اندر ہی اندر بہتا ہوا انگور کی کے مقام پر کہیں نہ کہیں سے باہر نکل آتا تھا۔

اس آتشبار سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک چٹان کے پیچھے دو سری چٹانیں ایک تنگ سا غار تھا۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر چڑانے مجھ سے تھملا لے لیا اور اس کے اندر نکل کر ایک نارنج کال لیا۔  
 میں نے چڑا کے ہاتھ سے نارنج لے لی اور اس کی

روشنی میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش بالکل بھابھا تھا۔

پہلے سے اس غار کے بارے میں جانتی تھیں؟ میں نے سوال کیا تو وہ طرف دیکھا۔

”میں کئی مرتبہ یہاں آچکی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پہلی مرتبہ تو میں خض افتاق سے اس طرف نکل آئی تھی۔ ان دنوں یہاں ایک سادھو جا پ رہے ہیں۔ میں اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آئے گی اور پھر ایک روز جب یہاں آئی تو وہ سادھو غائب ہو چکا تھا۔ شاید اس کا جا پ پورا ہو گیا تھا اور وہ کہیں چلا گیا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”اندرا چلو۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

دو چٹانوں کی درجہ سے یہاں ایک دہ سانس گیا تھا جس سے تھوڑا آ رہی تھی۔ جب تک ہم پہاڑیوں پر چڑھتے رہے تھے خون کی گردش تیز رہی تھی اور سردی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب ایک دم سردی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ ہم غار کے اندر آ گئے۔ میں نے اپنا ٹیکہ کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

چڑا ابل اڑھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے شاید زیادہ سردی چھ گھنٹے تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کھل کا کچھ حصہ اس کے اوپر ڈال دیا لیکن چڑا کی سردی کم نہیں ہوئی اور وہ مسلسل کانپتی رہی اور بالآخر میرے ساتھ پٹ گئی۔ میں نے دونوں کھل ملا کر لپیٹ لیے۔

چڑا میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے رانٹ بچ رہے تھے اور جسم میں جیسے بھونچال سا آیا ہوا تھا لیکن بالآخر وہ پرسکون ہوئی چلی گئی۔

چڑا شاید سو گئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے۔ ان حالات سے چھٹکارا کب ملے گا اور یہ فعل غارت کب ختم ہوگی؟ کیا میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہا تھا؟ کیا میری زندگی میں کبھی ٹھنڈا نہیں آئے گا اور میں اسی طرح حالات کی مٹلاہم لہروں پر بہتا رہوں گا؟

میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرا دماغ الجھتا گیا۔ کئی ایسے مواقع آئے تھے کہ میں نے ان ہنگاموں سے الگ ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میرے دشمنوں نے مجھے کبھی بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ میرے زخموں کو کبیرا گیا تھا اور قدم توڑا تھا۔ یہ احساس دلایا گیا تھا کہ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو مجھے یہ ظلم بھی برداشت کرنا پڑے گا۔

میں یہ ظلم برداشت کرتا رہا۔ میرے زخم بہتے ہوتے رہے۔ بار بار میری نظروں میں وہ منظر گھوم جاتا جب میرے ماں باپ کو میرے سامنے نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور یہ احساس بھی مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف ڈٹے رہنے پر مجبور کرتا رہا کہ مجھے ان معصوم لوگوں کے قتل کا بدلہ لینا ہے جنہیں ان کی بے گناہی کی سزا دی گئی تھی۔

میری زندگی میں کوئی رات ایسی نہیں آئی تھی جب میں سکون کی نیند سوا ہوں۔ یہ رات بھی ایسی ہی تھی۔ مجھے ایک بار پھر موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی لیکن میں اس مرتبہ بھی بچ نکلا تھا اور اپنی طرح ظلم کا شکار ایک بے گناہ عورت کے ساتھ اس غار میں پڑا سردی سے ٹھنک رہا تھا۔

ہالہ کی گود میں یہ رات میرے لیے بڑی اذیت ناک ثابت ہو رہی تھی۔ دھیمان بنانے کے لیے میں مختلف حوالوں سے سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں جاگتی کا خیال ابھر آیا۔ جاگتی روپ سنی، بھلا اور ٹھاکر، ٹھاکر تو جانتا تھا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں لیکن جاگتی وغیرہ بالکل نا علم تھیں۔ انہوں نے تو واقعی ٹھاکر کی بوئیاں نوچ لی ہوگی۔ اتنے روز سے میں نے ٹھاکر کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی اور یقیناً وہ بھی پریشان ہو گا۔

رات کے آخری پر سردی بڑھ گئی۔ میں اپنے اندر بھی کپکپاہٹ سی محسوس کرنے لگا چڑا اگرچہ میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں کھلوں کو اچھی طرح لپیٹا اور چڑا کو اپنی بانوں میں سمیٹ لیا کہ شاید اس طرح سردی کا احساس کچھ کم ہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھر۔ میں چڑا کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا اور آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میرے اندر جی کی پراسرار قوت بیدار ہونے لگی۔ میرے اندر کی کپکپاہٹ بندر تیز کم ہوئی چلی گئی اور میں بالکل پرسکون ہو گیا۔

سردی کا احساس مٹنے ہی میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی وادی میں آ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں اکیلا ہی یہاں پر لیٹا ہوا تھا۔ دونوں کھل میرے اوپر بڑے ہوئے تھے۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور دن کی روشنی غار کے اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے لینے لینے گردن گھما کر باہر اڑھ دیکھا۔ چڑا غار میں نہیں تھی۔

میں نے اپنے اوپر سے کھل ہٹا کر ایک طرف پھینک

آتش فشان ۱۸۲ حصہ ۵ -



چنچا "اس سادھو کو باہر نکال۔ گراکوں (گاہکوں) کو پریشان کرنا ہے۔"

دیڑ لاکھ میڑوں کے درمیان گھومتے ہوئے ہماری طرف آگیا اور قریب پہنچ کر سادھو کا بازو پکڑ لیا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

"ایک منٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر لڑکے کو روک دیا اور سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھوک لگ رہی ہے۔ بھوہن کرو گے؟"

سادھو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس کے لیے ایک پلیٹ دال چاول لاؤ۔" میں نے لڑکے سے کہا اور سادھو کو اشارہ کیا۔

وہ بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بٹھ گیا۔ ترشول میز کے ساتھ ٹکا کر کھڑا کر دیا اور پائلی کرسی کے قریب فرش پر رکھ دی۔ ایسے غلط آدمی کو تو دور سے دیکھ کر ہی کراہیت محسوس ہوتی تھی لیکن میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا تھا اور میری اس سادھو سے ہمدردی بلا وجہ نہیں تھی۔

ہم اپنا کھانا ختم کر چکے تھے۔ چند منٹ بعد ہی لڑکے نے سادھو کے سامنے چاولوں کی پلیٹ رکھ دی اور اس سادھو نے جس طرح چاول کھائے وہ میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے لیے دوسری اور تیسری پلیٹ بھی منگوائی گئی۔ چڑا اس دوران میں منہ پھیرے بیٹھی رہی۔

کسی گندے اور غلط سادھو کو اس طرح اپنے پاس بٹھانا اور اس کی سیوا کرنا کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے سادھوؤں کو بہت قوتوں والا اور پہنچا ہوا سمجھا جاتا تھا اور لوگ ان کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد سادھو نے چائے پی پی لی اور پھر میں اسے لے کر ہوٹل سے باہر آگیا۔ میں اس سے جوابات کرنا چاہتا تھا اس کے لیے وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ ہم ہوٹل سے نکل کر سڑک پار کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ سادھو زمین پر آہنی پائلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

"یہاں کہاں رہتے ہو۔ میرا مطلب ہے کون سے مندر میں؟" میں نے پوچھا۔

"سادھوؤں کا کوئی بکا امتحان نہیں ہوتا۔" اس نے بے ترتیب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم آج ہی بنارس سے آئے ہیں۔ گنگوتری کی یا ترا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ تم نے ہماری سیوا کی بالکل ہم بہت خوش ہوئے۔"

"آپ جیسے مہاراشٹر کی سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے مہاراج۔" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ہم آپ کی اور

بھی سیوا کریں گے۔ آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔" سادھو نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔

"تمہاری اچھا اوش (خواہش یقیناً) پوری کریں گے۔ مانگ کیا مانگتا ہے بالک؟" اس نے خاموش ہو کر معنی خیز لگا ہوں سے چڑا کی طرف دیکھا پھر دم لمبے میں بولا۔

"میں سمجھ گیا۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔ گھر کا آئین سونا ہے۔ اولاد دانتے ہو؟"

میں نے پرہیز کی طرف دیکھا۔ شرم یا غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں مہاراج۔" میں نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ایک اور معمولی سا کام ہے۔ وہ کرو تو ہم تمہاری بہت سیوا کریں گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پانچ پانچ روپے والے دو سکے اس کے ہاتھ میں تنھا دیے۔

"بول۔ کیا بولتا ہے؟" اس نے دونوں سکے پیتل کی بائلی میں ڈال لیے۔

میں جواب دینے سے پہلے چند لمحے خاموشی سے چڑا کی طرف دیکھتا رہا پھر سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لمبے میں بولا۔

"آپ میری بات کا برا مت سامنے مہاراج لیکن بات ایسی ہے کہ کسے بغیر بھی چارہ نہیں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "چند روز پہلے ایک پنڈت مہاراج ہمارے گھر کی ایک کنیا (لڑکی) کو درغلا کر لے گئے تھے۔ ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ پنڈت مہاراج ہماری کنیا کے ساتھ گنگوتری مندر میں چھپا ہوا ہے اور پرگھیا راج ناٹی ایک پنڈت کا مہمان ہے۔ ہم مندر میں ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے۔ آپ ہمیں یہ پتا کر کے بتا دیں کہ وہ پنڈت مہاراج اور کنیا اب بھی مندر میں ہیں یا نہیں۔ بس مہاراج اتنی سی بات ہے۔"

"اتنی سی بات ہے۔ بہت بے وقوف ہو تم بالکل۔" سادھو نے کہا "تین پلیٹ چاول، ایک کپ چائے اور دس روپوں میں اتنا بڑا کام کرنا چاہتا ہے۔ میں چند مہینوں بعد یہاں ضرور آتا ہوں اور پنڈت پر گھیا راج کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بڑا حرامی آدمی ہے۔ اگر اسے مجھ پر شک بھی ہو گیا تو میری چڑی اتروا دے گا۔ پتہ چتا (فکر) نہ کرنا۔ کام اوش (ضرور) ہوگا۔ لا۔ سو کا پنا نکال۔" اس نے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

اس کی باتیں سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ تو میری کچھ جڑی نہیں تھا۔ کام کی نوعیت کو تو فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ اس نے صرف سو روپے کا مطالبہ نہ کیا۔ بڑا دو ہزار بھی مانگ سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چڑی کی طرف دیکھا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر ملا کر ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ایک بات ہے سادھو مہاراج۔" میں نے کہا "پنڈت پر گھیا راج کسی اور کو۔" "نہیں رہو مورکھ (بے وقوف)۔" اس نے میری بات کا ردی "اس حرامی کے تو آپ کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ یہ کام ہو جائے کہ بعد پانچ سو روپے اور لوں گا۔ یہ سو روپے نہیں پتہ لیا ہے۔"

وہ اتنی بہت خرابی تھا۔ اپنا رٹ بڑھا رہا تھا لیکن میں نے غالی بھری۔

"ہم شام کو چھ بجے اسی ہوٹل میں ملیں گے۔" میں نے ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا اور وہی راہ۔ نارائن کے گھر لے گیا ہوا ایک طرف چل پڑا۔

"تم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔" چڑا نے اس کے ہاتھ کے بعد کہا "یہ پنڈت سادھو اور پیاری ایک سی تھیلی کے پٹے ہیں۔ اگر اس نے پنڈت پر گھیا راج کو ہمارے پاس لے جاتا تو۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔" میں نے اس کی باتوں سے انکار کیا تھا۔ "میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس نے جو الفاظ استعمال کیے تھے ان سے تم نے بھی اندازہ لگالیا کہ وہ پنڈت پر گھیا راج سے اسے کتنی نفرت ہے۔ اس کی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دبدب رہے۔ جبکہ پر گھیا راج کے بڑے مندر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسے یہ بھی دکھ ہوگا کہ پنڈت پر گھیا راج تو عیش کر رہا ہے جبکہ وہ خود گھوڑ کر کھانا کھا پھر اپنے اہلخانہ کو۔ وہ پر گھیا راج کو ہمارے بارے میں بہت کم باتیں ہو سکتا ہے کہ وہ آئندہ بھی ہمارے کام میں رکھ لیا۔ ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

ٹھیک ہے لیکن ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔" چڑا نے کہا "میرا خیال تھا کہ ہم ایک دو گھنٹے میں واپس چلے جائیں گے۔ لیکن اب جو بے شک یہاں رہنا پڑے گا۔" اس نے کہا "میں دوران میں ہم قریب و جوار کی دکانوں سے اپنی اشیاء خریدیں گے اور کسی جگہ بیٹھ کر وقت گزار

دیں گے اور اس دوران میں ہم لوگوں سے برسوں رات والے واسطے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگے۔ ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے کچھ لوگوں کو دیکھ کر میں ٹھک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن ان چہروں کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

وہ ہمارے کھانوت سنگھ اور اس کے ساتھ جاگتی روپ متی اور بلا تھیں۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور قریب آکر وہ جس طرح مجھ سے ملے وہ مظهر چڑا پرہیز کے لیے خاصی حیرت اور پریشانی کا باعث بنا تھا۔

ان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ لوگ میری تلاش میں تین دن سے یہاں آئے ہوئے تھے اور آٹھروں، ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں میرا حلیہ بتا کر مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

ٹھاکر نے اس طرف سے جس طرف سے ہم آئے تھے، پہاڑی کے دامن میں ایک کانچ کرائے پر لے لیا تھا۔ ویسے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں یہاں آتے ہی کانچ مل گیا تھا جبکہ لوگ خوار ہوتے پھرتے تھے اور کھلے آسمان کے نیچے مظہر مظہر کر راتیں گزارنے پر مجبور تھے۔

وہ کانچ مادواڑی کے اس ہوٹل سے، جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا تقریباً ایک میل کے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں تھا۔ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر کچھ اور بھی کانچ تھے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہاڑی سے اتر کر ہم اس طرف سے گزر کر آئے تھے۔

کانچ دو بڑے کمروں اور ایک رسوئی پر مشتمل تھا اور انہوں نے یہاں چائے وغیرہ بنانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ کانچ میں آنے کے فوراً ہی دیر بعد روپ متی چائے بنانے کے لیے کچن میں لگی تھی۔ جاگتی اور بلا میرے دامن میں جس طرح چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر چڑا گویا الجھ کر رہ گئی تھی۔

روپ متی کو چائے لانے میں دیر نہیں لگی اور چائے کی چمکیوں کے دوران ہی میں، میں نے انہیں چڑا پرہیز کے بارے میں بھی بتا دیا اور انہیں اب تک کی صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"اگر دارا ہمیں ہے تو اس مرتبہ اسے بچ کر نہیں جانا چاہیے۔" میرے خاموش ہونے پر ٹھاکر نے کہا۔ "وہ ہمیں ہے اور گنگوتری مندر میں چھپا ہوا ہے۔ میں



نے ایک سادھو کو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ شام چھ بجے اس سادھو سے ملاقات ہوگی تو کچھ پتا چلے گا۔

”رہنے کا کہاں بندوبست کیا ہے تم نے؟“ ٹھاکر نے پوچھا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس نے مکن اکھیوں سے چڑا پریم کی طرف بھی دیکھا تھا۔

”برسوں رات تک تو میں چڑا کے کانچ میں تھا لیکن دارا نے ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس رات اس کے دو آدمیوں نے کانچ پر حملہ کر دیا اور۔۔۔ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے برسوں رات کے بارے میں بتانے لگا اور آخر میں کہا ”دو راتیں ہم نے پناہیوں پر ایک غار میں گزاری ہیں لیکن اب ہر حال“ ہمیں ٹھکانا تو مل ہی گیا ہے۔“ میں ڈرہا ڈرہا دیکھنے لگا۔

”برسوں رات۔“ ٹھاکر میرے خاموش ہوتے پر بولا ”کانچ کو آگ لگنے کے بعد شہر کے بہت سے لوگ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم اس وقت مین بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ کانچ مکمل طور پر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اگلے روز پتا چلا کہ لمبے سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں لیکن پولیس ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکی تھی۔ البتہ کسی بچی اور اس کے کسی بڑی کا نام لیا جا رہا ہے۔“

میں نے مسکرا کر چڑا پریم کی طرف دیکھا اور پھر جاگی کی طرف دیکھنے لگا اس کی بھون تن گئی تھیں۔

”چڑا پریم میرے ایک مہل چاچا خوشونت سنگھ کی بیٹی ہے۔ یہ سنگا پور سے یہاں آئی تھی اور۔۔۔“

”بس۔“ جاگی نے مجھے ٹوک دیا ”اب میں جان گئی کہ یہ کون ہے۔“ جاگی نے یہ جملہ بات کو ختم کرنے کے لیے ادا کیا تھا۔

اور پھر موضوع بدل گیا۔ ٹھاکر کی باتوں سے یہ تو پتا چل گیا کہ اس رات ہمارے کانچ کے جل جانے کے بعد اگلے روز لمبے میں سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں اور میرا اور چڑا کا نام لیا جا رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ پولیس نے ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کی تھی۔ آیا پولیس کی نظروں میں ہم دونوں جل کر راکھ ہو گئے تھے یا ہمیں آتش زنی اور قتل کا طرم ٹھہرایا جا رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے نیچے شہر میں ایسے لوگوں سے رابطہ کرنا تھا جو اس سلسلے میں کچھ زیادہ جانکاری رکھتے ہوں اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ پولیس ہمیں تلاش کر رہی ہو۔ میں اور چڑا رسک لے کر

پناہیوں سے اتر آئے تھے اور خوش قسمتی سے ہر گھبراہٹ سے بچا تھا۔ چڑا کو اب فی الحال باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے یہ رسک لینا تھا۔

ٹھیک چھ بجے میں اور ٹھاکر کانچ سے نکل کر شہر روانہ ہو گئے۔ چند منٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تو میں کے قریب پہنچ کر میں اور ٹھاکر الگ الگ ہو گئے۔ اگرچہ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا لیکن ایسے لوگوں پر پورا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ احتیاط ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

ٹھاکر ہوٹل کے سامنے سوک کی دوسری طرف رہا اور میں ڈرہا ڈرہا دیکھتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ وقت یہاں زیادہ رونق تھی۔ ہوٹل کے اندر بھی کوئی نہیں تھی۔ فلمی گانوں کے شور میں کان پڑی آواز سننے دے رہی تھی۔

میں ہوٹل میں داخل ہو کر ڈرہا ڈرہا دیکھنے لگا۔ اسی میز پر بیٹھا ہوا تھا جہاں دو سپر کو ہم نے کھانا کھایا تھا۔ میز پر دو آدمی اور تھے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ سامنے چادلوں کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی اور وہ بڑی بڑی چادروں کا چول کھا رہا تھا۔ میں اس کے قریب جانے کے بجائے اور میز پر بیٹھ گیا۔ ویش لڑکے نے پوچھے بغیر میرے چائے کا کپ لا کر رکھ دیا۔

چائے بہت بد مزہ تھی لیکن مجھے چینی پڑی۔ مین دوران میں بار بار اس سادھو کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ ختم کرنے کے بعد سادھو نے جب اٹھا کر منہ سے لگا دیا تو مجھے ہاتھ اپنے کرتے کے دامن سے پوچھنے پوچھنے لگا۔ ڈرہا ڈرہا دیکھنے لگا۔ دو سپر کو بھی اس نے یہی حرکت کی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا تاکہ سادھو مجھے دیکھ سکے۔ اندازہ درست نکلا۔ سادھو مجھے دیکھنے سے ایک لمحے سے کرکھڑا ہو گیا۔ میں اس دوران میں کاؤنٹر پر بیٹھ جانا سادھو عقل مند آدمی تھا۔ میں نے بے نیچے کانٹے کے لیے میں ہاتھ ڈالا تو وہ بھی میرے قریب پہنچ گیا۔

”ہم نے بھونج (کھانا کھانا) کیا ہے۔ یہاں سے دے دو بالک۔ رام بھلی کرے گا۔“ اس نے میرے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بھیک مانگنے والا تھا۔ میں نے پہلے تو ٹھوکر کرا کر اس کی طرف دیکھا پھر پیسے بھی دے دیے اور ہوٹل سے باہر نکلا۔ سادھو نے پہلے ہی باہر آچکا تھا۔ وہ ”ہری اوم ہری اوم“ بکراتے ایک طرف جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا ہوا۔

مزبور جاکر سادھو رک گیا۔ ”اس نے میرے سامنے پانچ سو روپے نکال بالک۔“ اس نے میرے بڑا کٹھن بٹھا دیا۔ ”تمہارے کارن (وجہ سے) ہمیں بڑا کٹھن دینا پڑا۔“

”میں نے کچھ کے بغیر جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کے قریب رکھ دیے۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی ہمارے قریب پہنچا تھا۔ سادھو اسے دیکھ کر کچھ ہچکچا۔

”اس کی چٹامت کرو۔ یہ اپنا ہی بندہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم موت خالق کرنے کے بجائے پونا شروع کرو۔“

”خساری شکل ابھی انت (ختم) نہیں ہوئی بالک۔“

”میں نے اسے گھورا۔

”یہ کہہ کر میں میاں سے سیدھا سنگوڑی مندر گیا تھا۔“

”یہ کہہ کر میں نے مندر کے تمام پنڈتوں اور پجاریوں سے پوچھا۔ تمہارے لیے جانکاری ہے کہ پنڈت پر گھیا ان اپنے ستر (دوست) کے ساتھ کل صبح سویرے ہی مندر سے چلا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چھوکر کی گئی تھی۔“

”اوس کہاں گئے ہیں وہ لوگ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ جانکاری نہیں لی بالک۔“ سادھو نے جواب دیا ”پر یہ پتا ہے کہ وہ لوگ بڑی عکالت میں وہاں سے گئے تھے۔“

”ٹھیک ہے سادھو مہاراج۔ اب تم جاسکتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”وہی اور سید بالک۔“ سادھو نے پوچھا۔

”ہم نہیں مہاراج۔ دھننے باد (شکریہ)۔“ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”سادھو“ ہری اوم ہری اوم۔ نارائن نارائن کی پوجا کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں نے اس سے مزید پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ جس طرح شروع ہی ہوا تھا اسی طرح ختم ہوا۔ چل کر ہمارے لیے خطاب ثابت ہو گیا۔ میں نے اسے چھ سو روپے دیے تھے اور میری یہ بات سن کر اس نے کچھ کم از کم یہ پتا تو چل گیا تھا کہ دارا ہمارا ہی سنگوڑی سے چلے گئے تھے۔ وہ کہاں گئے تھے؟

”میں نے اسے گھورا۔

”میں نے اس سادھو کو بھی بھگا دیا۔ اس کے ذریعے یہ پتا چلا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”یہ سادھو قابل اعتماد نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ان کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا اور ہاں۔ یاد آگیا۔“ میں ایک دم اچھل پڑا۔

”کیا ہوا؟ کیا یاد آگیا۔“ ٹھاکر نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”سواری پر باندھ۔“ میں نے کہا اور پھر اسے سواری پر باندھ کے بارے میں بتانے لگا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ ٹھاکر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”ابھی چلو۔ اس کام میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

جاگی وغیرہ کو کچھ ہدایات دینے کے بعد میں اور ٹھاکر کانچ سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مین بازار تک پہنچنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے اور بازار میں خاصی رونق تھی۔ آشرم والی گلی تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں سواری پر باندھ بھی ان لوگوں کے ساتھ غائب نہ ہو گیا ہو لیکن یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ تقریباً آگیا تھا۔ آشرم سے باہر آیا ہے اور اس کی واپسی میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا ہے اور دو گھنٹے بھی لیکن ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ایک طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ میں نے اشارے سے ٹھاکر کو بتا دیا۔ سواری پر باندھ اکیلا ہی تھا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے آ رہا تھا۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر اسے آشرم میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک لیا۔ میں سامنے آنے کے بجائے دوسری طرف کھڑا رہا تھا۔

ٹھاکر چند منٹ سواری سے باتیں کرتا رہا پھر وہ آشرم کے سامنے سے ہوتے ہوئے اس گلی میں آگے چلے گئے۔ میں کچھ فاصلہ دے کر ان کے پیچھے چلا رہا۔

وہ دونوں اگلی گلی میں مڑ کر رک گئے۔ اس طرف دکانیں وغیرہ نہیں تھیں۔ رہائشی مکان تھے اور لوگوں کی آمدرفت بھی بہت کم تھی۔ میں جیسے ہی ان کے قریب پہنچا، سواری پر باندھ میری صورت دیکھ کر اچھل پڑا۔

”تس۔ تس۔“

”کیوں۔“ مجھے دیکھ کر کزنٹ لگ رہا ہے کیا؟“ میں نے کہا۔ مجھے دیکھ کر وہ جس طرح بد خواص ہوا تھا اس سے مجھے اندازہ لگا ہے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ مجھے جانتا تھا۔ میں کئی روز سے چڑا پریم کے ساتھ رہ رہا تھا اور پھر

سبحان نے بھی مرنے سے پہلے ان لوگوں کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ لوگ غالباً میری نگرانی بھی کرتے رہے تھے۔ اس طرح میرا چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

"تجسس تم مجھے دھوکے سے کہیں لے جا رہے تھے۔"

سوامی، ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ "مہمہ میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گا۔"

"میرا یہ کھلو تا تم سے زیادہ شور مچا سکتا ہے۔" ٹھاکر نے پستول نکال لیا "خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے رہو۔ اگر کوئی گزرب کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

"میں نہیں جانتا، تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔"

سوامی ہلکائی "میں تم لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔ مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہم تمہیں جانتے ہیں اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر ٹھاکر کی طرف متوجہ ہو گیا "تم اسے لے کر چلو ٹھاکر۔ میں دوسری طرف سے ہو کر آتا ہوں۔ اگر یہ راستے میں کوئی گزرب کرے تو آواز دینا اس کی کھوپڑی۔"

"چلو سوامی جی۔" ٹھاکر نے اسے اشارہ کیا۔

وہ دونوں گلی میں آگے کی طرف چلنے لگے اور میں واپس آگیا۔ مین بازار میں آکر میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔ ہمیں شاید دوبارہ بازار کی طرف آنے کا موقع نہ ملتا اس لیے میں نے یہ چیزیں خرید لی تھیں کہ رات کو فائدہ نہ کرنا پڑے۔

ٹھاکر اور سوامی پرمانند مجھ سے پہلے ہی کالج میں پہنچ چکے تھے۔ سوامی، چڑا پریم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ مجھ کا ٹھاکر کی شکل میں پھنس گیا ہے۔

میں نے شاہک بیک جاکھی کے حوالے کر دیے اور ہم سوامی کو لے کر کالج سے باہر آگئے۔ سوامی کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اس کے لیے کالج جیسی جگہ مناسب نہیں تھی۔ قرب و جوار میں اور بھی کالج تھے۔ شور سن کر کوئی اس طرف آسکتا تھا۔

ہم کالج کی پچھل طرف سے ہو کر پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ ٹھاکر نے سوامی کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے بھی اسے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پیر دکھائیں تھا اور بڑا تائیں تھا۔

تقریباً ایک میل دور نکل آنے کے بعد ہم ایک جگہ

رک گئے۔ یہ ایک مسلح چٹان تھی۔ اس کے اطراف ہر گھرے کھدے تھے اور ان سے آگے بلند پہاڑیاں تھیں۔ پرمانند سے پوچھ گچھ کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ اس نے چٹنے کی آواز پہاڑیوں میں گونج سکتی تھی لیکن کسی کی طرف تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لے کر آئے؟"

اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم سے کچھ جانکاری چاہیے سوامی جی۔"

"اگر تم ہماری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے اور اگر تم نے اڑی کی تو تمہاری لاش غولے کر کے یہاں پھینک دیں گے۔ بیٹھو یہ رات دعوت اڑاتے رہیں گے۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" سوامی نے پوچھا۔

"مجھے اور شرمیستی چڑا کو دیکھ کر تو تم سمجھ گئے ہو۔ ہم کون ہیں۔ تمہارے گردنے چڑا پریم کی بیٹی اور شرمیستی موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن پولیس اس کا پتہ نہیں پا سکی۔ چند روز پہلے میرے ایک دوست کو قتل کر کے ان کی اور مڑی ہوئی لاش سڑک پر پھینک دی۔ وہ دونوں پہلے گئے چڑا کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی لیکن ہمیں مارنے کے بارے میں جو دو شیطان بھیجے تھے وہ جل کر بھسم ہو گئے۔ تمہارا گنگوڑی مندر سے کہیں اور چلا گیا ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم کسی کی بات کر رہے ہو۔" سوامی پرمانند نے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس کے منہ پر وار گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیختے ہوئے لڑکھڑکھنے ہٹا تو ٹھاکر کا سامنے کا ایک دانت اکھڑ گیا۔ ہونٹوں سے خون کی دھار نکلی تھی۔

"کچھ یاد آیا۔"

"میں نہیں جانتا کون سا گرو۔" اس نے کراہتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

میں نے پیرے دو تین گھونے اور جڑ دیے۔

"کھڑا کر زمین پر گرا تو میں نے ایک دو ٹھوکریں بھی مار دیں۔"

"میں پنڈت پر گھیا راج کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "اس نے ایک اور جڑی بھی آہوا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے جانتے ہو۔ بتاؤ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ وہ لوگ گنگوڑی مندر میں ہیں لیکن میرا"

"سوامی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا! میں نے ایک اور ٹھوکر مار دی۔"

"سوامی، تمہارے کالج کی نگرانی کیوں کرتے رہے۔ شام کو کالج کی کڑی سے جھانک کر کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ بتاؤ؟"

"وہ وہ راصل۔"

"میں نے اس کی بات کاٹ دی

"میں سوامی جی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی

"میں نے تو بھی بے خبر رہا ہوں نہ غافل۔ اگر وہ سروں کی طرح اپنی ہوتا تو کب کا مارا جا چکا ہوتا۔ اس رات گھبرا اور بھیجیو کو بھانپا تھا ہمیں ٹھکانے لگانے کے لیے لیکن وہ دونوں خود ہی جاں میں پھنس گئے۔ ان کی موت ہی انہیں بچھ کر وہاں لے گئی تھی۔ اور تم ان لوگوں سے الگ نہیں ہو۔ تم سب بچ جاتے ہو۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" سوامی پرمانند اچانک ہی تن کر کڑا ہوا گیا "لیکن میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے گرو کے بارے میں ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں پوچھ سکو گے۔"

"گرو۔" میں نے کہا "مجھے ایسے لوگ ایتھے لگتے ہیں جو صورت حال کو فیس کرنا جانتے ہوں۔ اب تم سے بات کرنے میں حوا نہ گا۔ کہاں گئے ہیں وہ لوگ؟"

"میں نہیں جانتا۔" سوامی نے جواب دیا۔

میں نے ایک دم آگے بڑھ کر اسے زوردار گھونسا لگا دیا۔ یہ گھونسا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ لڑکھڑکھنے ہٹا تو ٹھاکر نے اسے سجال لیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بھڑکتے ہوئے لڑکھڑکھنے سے اس کے پیٹ پر گھونسا مارا۔ وہ دوہرا ہوا تو ٹھاکر نے مجھ سے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ وہ چیختے ہوئے سیدھا ہو گیا اور ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ ٹھاکر نے اس کے سینے پر گھونسا مار دیا۔ وہ اٹنے قد میں لڑکھڑکھنے ہوئے میری طرف آیا تو میں نے اسے سنبھال لیا۔

اور پھر تقریباً دس منٹ تک وہ میرے اور ٹھاکر کے بیچ لڑا رہا تھا۔ میری طرف آتا تو میں اسے لگ رہید کر دیتا۔ ٹھاکر کی طرف جاتا تو وہ اسے ٹھوکر یا گھونسا لگا کر میری طرف ہٹاتا تھا۔

آخری مرتبہ ٹھاکر کا گھونسا کھا کر وہ لڑکھڑکھتے ہوئے پستول کے بل گرا تو میں ہوا میں اچھلا اور پستول کے بل اس کے سینے پر گرا۔ اس کی چیخ بڑی خوفناک تھی لیکن مجھے اس پر رحم نہیں آیا۔ ایسے لوگوں پر مجھے ذرا بھی ترس نہیں تھا۔ وہ دونوں کی زندگیوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے تھے۔ ان کی موت کے گھاٹ اتار کر مونچھوں پر اس طرح تاؤ

دیتے تھے جیسے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

میں ایک بار پھر اچھلا۔ اس مرتبہ میرا ایک پیر اس کے سینے پر اور دوسرا اس کے کندھے پر پڑا تھا۔ پہاڑیاں اس کی چیخوں سے گونج رہی تھیں لیکن ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اول تو اس کی چیخیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتی ہوں گی اور اگر بہت دور کسی نے سنا بھی ہو تو رات کے وقت پہاڑیوں کی طرف آنے کی بہت کوشش نہیں کر سکتا تھا۔

وہ زمین پر پڑا ترپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ایک بازو پکڑ کر پیر اس کے کندھے پر رکھ دیا اور بازو کو زوردار جھٹکا دیا۔ "ٹھکر" کی آواز سے اس کے کندھے کا جوڑا اکھڑ گیا۔ اس کی چیخ پہاڑیوں میں باز گشت پیدا کرنے لگی۔

"تم بہت سخت جان ہو۔" میں نے اس کا دوسرا بازو پکڑ کر کندھے پر پیر رکھنے ہوئے کہا "لیکن میں تمہارے جسم کا جوڑا لگ کر دوں گا اور اس وقت تک تمہیں نہیں چھوڑوں گا جب تک زبان نہیں کھولو گے۔"

زوردار جھٹکے سے میں نے اس کا دوسرا کندھا بھی اکھڑا دیا۔ پہاڑیاں ایک بار پھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھیں۔ میں اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور وہ پانی سے نکالی ہوئی پھل کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔ وہ واقعی بہت سخت جان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو تھیں یہاں تک چیختے سے پہلے ہی یا تو زبان کھول دیتا یا ختم ہو چکا ہوتا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر اوپر اٹھا دیا اور جاگھ کر پیر رکھ کر اس کی ٹانگ کو اٹھاتا چلا گیا۔

"رہ۔" رک جاؤ۔ ایڈو کے لیے رک جاؤ۔" وہ ایک ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا "ب۔ بتاتا ہوں۔ رک جاؤ۔"

میں نے اس کی ٹانگ ایک بلکے سے جھٹکے سے چھوڑ دی۔ اس کے لیے یہ جھٹکا بھی کافی تھا۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

"جلدی بتاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے مجھے۔" میں نے اس کے سینے پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ۔ وہ لوگ سکری مندر گئے ہیں۔" وہ رک رک کر بولا "یہ درست ہے کہ پیرسوں رات پنڈت پر گھیا راج اور اس کے حریف پنڈت ٹھکانے گھبرا اور بھیجیو کو تمہیں اور اس کی عورت چڑا کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھیجا تھا۔ پنڈت پر گھیا راج کو اس ناری سے خطرہ تھا۔ اس کی بیٹی اور بیٹی (شوہر) کے قتل کے الزام میں پولیس اس کا پتہ نہیں لگا سکی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ عورت زندہ رہے گی،

نہرے کی تلوار اس کی گردن پر لٹکی رہے گی۔ دوسری طرف پنڈت سنگھ کو تم سے خطرہ تھا۔ وہ تم سے چھپتا پھرتا رہا ہے اور اس کا خیال تھا کہ وہ میاں تم سے محفوظ رہے گا لیکن تم میاں بھی پہنچ گئے۔ مندر میں سو بھراج نام کا ایک آدمی اس کے ہاتھ لگ گیا جس نے مار کھا کر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور انہوں نے سو بھراج کو قتل کر کے لاش سڑک پر پھینکا دی۔

”ایک طرف وہ دونوں شیطان اس مندر میں جمع ہو گئے تھے اور دوسری طرف ان دونوں کے بدترین دشمن بھی آپس میں مل گئے تھے۔ وہ تم دونوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور بھیرو اور گہرو کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تم دونوں کو ختم کر دیا جائے لیکن۔“ وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں اس کے بولنے کا خطرہ پر۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ بھیرو اور گہرو کی دہائی کے خنجر تھے۔ اوم نام کا ایک تیسرا آدمی بھی دور رہ کر ان کی نگرانی کر رہا تھا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو ان کی مدد کر سکے۔ اوم کو اس عورت کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور وہ بھی سمجھتا رہا کہ بھیرو اور گہرو تم دونوں پر حاوی ہو رہے ہیں لیکن جب کانچ میں آگ لگی تو اس نے تم دونوں کو پیچھے ہٹا دیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اوم دوڑتا ہوا کانچ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ اس وقت تک کانچ کے اندر آگ پھیل چکی تھی۔ اس نے بھیرو اور گہرو کی لاشوں کو جلتے ہوئے دیکھا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

”پنڈت پر گھیا راج اور پنڈت سنگھ کو جب اوم سے صورت حال کا پتا چلا تو وہ دونوں بری طرح بدحواس ہو گئے۔ پنڈت سنگھ نے پر گھیا راج کو بتایا کہ تم انسان نہیں شیطان ہو اور ہر مرتبہ اس کے حملوں سے بچتے رہے ہو اور اب تم ان لوگوں کو نہیں چھوڑو گے۔“

”وہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ صبح بونے سے پہلے ہی گنگوتری سے نکل گئے۔ صرف دو آدمی جانتے ہیں کہ وہ سکری مندر گئے ہیں۔ ایک میں اور دوسرا گنگوتری مندر کا بدہت پنڈت رام دیال۔“

”سکری مندر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میاں سے تقریباً سو کلومیٹر دور اونچے پہاڑوں میں۔ اس سے آگے ہمالیہ کا برفانی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔“

سوئی پرمانند نے جواب دیا۔

”ان کے ساتھ اور کون ہے اور مندر میں کتنے لوگ ہیں

جوان کا ساتھ دے سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میاں سے صرف ایک چھوٹا سا گروہ ان کے ساتھ ہی ہے۔ پنڈت سنگھ ہی اپنے ساتھ لایا تھا۔“ سوئی پرمانند نے جواب دیا۔ ”سکری مندر ایک بہت پرانا مندر ہے۔ وہاں صرف دو پجاری رہتے ہیں۔ راستہ بہت ٹھنڈا اور دشوار ہے۔ اس لیے بہت کم یاتری اس طرف جاتے ہیں۔ ان کے پاس میں بھی یاتری لگن نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار دو چار نوجوان یاتری شخص ہم جونی کے شوق میں اس طرف چلے جاتے ہیں۔“

”پنڈت سنگھ کو جانتے ہو وہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ پنڈت پر گھیا راج نام ہے۔ ان دونوں کی ملاقات راجستان کے کسی مندر میں ہوئی تھی۔ میاں اگر اس نے پر گھیا راج کو بتایا تھا کہ راجستان پہاڑوں میں واقع کالی کے مندر میں کوئی درگھنا (درواہ) ہو گئی تھی اور تم نے اس کی ٹانگ توڑنے کی کوشش کی تھی اور اس نے بے ہوش ہو جانے کا ٹانگ کر کے اپنے آپ کو بچایا تھا۔“

”اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔“ سوئی نے جواب دیا۔

”تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ پنڈت سنگھ ہندو نہیں ہے۔ وہ نہ تو پنڈت ہے اور نہ ہی یہ اس کا اصل نام ہے۔“

”مسلمان ہے اور۔“

”کیا؟“ سوئی پرمانند چیخا ”ایک مسلمان دھرم“

”شٹ (براد) کر رہا ہے۔“

”تم کون سا دھرم کی سیوا کر رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”پنڈت پر گھیا راج اور تم جیسے لائق اور دھرم چاری اپنے اپنے جو دھرم کو بدام کر رہے ہیں۔ تم لوگوں کا اصل دھرم تو ہے شراب اور عورت ہے۔ تم ہی لوگوں نے مندر میں پوز (پاک) بنگوں کو عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے۔ ایک بنگ پر مسلا کر تم جیسے بے دھرم پنڈتوں کے ساتھ مل گیا ہے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر حال میں اس معاملے پر تم نے بحث نہیں کروں گا۔ تم نے ہمیں جو جانکاری دی ہے اس سے

لے بہت بہت شکریہ۔ اب تم بھی ترک (دوڑ) گئے۔“

روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میاں سے تھوڑی

(نجات) ہونے والی ہے۔“

”تک۔ کیا مطلب ہے؟“ وہ چیخا ”کیا تم مجھے ارادہ

گے؟“

”تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنی زندگیوں کے خطرے میں نہیں

والے۔“ میں نے کہا۔

”پیشور کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“ وہ ایک بار پھر چیخا ”تم

نے جو کچھ پوچھا میں نے بتا دیا۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟“

”میں نے کہا تاکہ تمہیں زندہ چھوڑ دینے سے ہماری

زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی اور ہم یہ خطرہ مول نہیں لینا

چاہتے۔“ میں نے کہا۔

میں نے ٹھاکر کو اشارہ کیا۔ اس نے سوئی پرمانند کو

دونوں پہلوں سے پکڑ لیا اور میں نے ہاتھوں سے اس کے

دونوں بازو تو بے کار ہو چکے تھے البتہ وہ ٹانگیں چھڑانے کی

کوشش کر رہا تھا لیکن ٹھاکر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

ہم اسے چٹان کے کنارے پر لے آئے سوئی پرمانند

بری طرح چیخ رہا تھا۔ ہم نے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے دو تین

بھولے دیے اور پھر پوری قوت سے اسے کھنک کی طرف

اچھال دیا۔

سوئی پرمانند کے منہ سے ٹھنک والی وہ آخری چیخ بہت ہی

خفناک تھی جو پریک چٹانوں میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔ وہ

کھٹنا کھٹنا کیڑوں کی گھبراہٹ کی طرح دیر بعد اس کے

گرنے کی بھد کی آواز سنائی دی تھی اور پھر اچانک سنا

چھلکایا۔

”خس کم جہاں پاک!“ میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے

کہا۔ ایک زندہ انسان کو کیڑوں کی فٹ گہرے کھنک میں دھکیلتے

ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن

کے اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

دھرم اور انسانیت کے نام پر کلک کا دینا تھا۔ ایک ایسا دھبا

تھے نہ مٹانے کے لیے صرف یہی طریقہ اپنایا جا سکتا تھا۔

کی پہاڑ پر چڑھنا آسان ہوتا ہے لیکن اترنا بہت مشکل

اور رات کی تاریکی میں تو یہ کام اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔

تھوڑے پاس ٹارچ وغیرہ نہیں تھی۔ ہم بہت سنبھل سنبھل کر

پہاڑوں سے اترتے رہے اور بالآخر تقریباً ایک گھنٹے بعد کانچ

میں پہنچ گئے۔

جاگی وغیرہ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ہمارے

انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ شاپنگ بیگ بھی میز پر ویسے ہی

رکھے ہوئے تھے جن میں کھانا تھا۔ روپ متی

بہت کھینچتی ہی شاپنگ بیگ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی اور

پکوانے کے سامنے ہاتھ دھوئے کے لیے ایک طرف لگے ہوئے

ٹھنکے کھانا کھا رہے تھے۔

○●○

راستہ دشوار ہی نہیں بہت خطرناک بھی تھا اور اب سوئی پرمانند کی کسی ہوئی یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ یاتری اس طرف کیوں نہیں آتے تھے۔ میاں تو وہی سہم جو آسکتا تھا جسے ہمالیہ کی کوئی چوٹی سر کرنے کا شوق ہو لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ مذہب کے ٹکے داروں کو ایسی جگہوں پر مندر بنانے کا کیا شوق تھا جہاں کوئی جا ہی نہ سکے۔

یوں تو ہندوستان کے ہر شہر میں قدم قدم پر مندر نظر آتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں مندروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہر دور اور اس سے ملتی علاقوں رشی کش، ہری کی دونوں دلی، سکری، وادی، تال، گرکھ، کیدار، تال، کیدار، تال، تال اور بدری تالہ دلی اور اس کے ساتھ ہماچل پردیش میں چھ ہزار سے زیادہ مندر موجود ہیں۔ ان میں کچھ مندر تو سیکڑوں سال پرانے ہیں، کچھ کھنڈر بن چکے ہیں اور لاتعداد مندر ایسے ہیں جہاں سال کے بارہ مہینوں میں یاتریوں کی آمد و رفت رہتی ہے لیکن بہت سے مندر ایسے ہیں جہاں بھی کبھار ہی کوئی یاتری جاتا ہے۔ ایسے مندر یا تو کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں یا آبادی سے اتنی دور ہیں کہ کوئی یاتری اس طرف جانا پسند نہیں کرتا۔

سکری کا شمار بھی ایسے ہی مندروں میں ہوتا تھا۔ یہ مندر نہ صرف آبادی سے دور تھا بلکہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی بہت خطرناک تھا۔

ہم اپنی تیاری مکمل کر کے صبح سات بجے کانچ سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ چڑا پریم اور جاگی بھی تھیں۔ یہ دونوں بہت خد کر کے ہمارے ساتھ آئی تھیں جبکہ ہلا اور روپ متی کو کانچ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

جاگی اور چڑا پریم کی وجہ سے ہمیں راستہ طے کرنے میں مزید مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ وہ کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہیں تھا۔ سنگھار چٹانوں کے بیچ ایک تنگ سی گینڈہ نڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔

جاگی اور چڑا پریم کی طرح بائ رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے ہمیں بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ بعض جگہوں پر تو راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف عمودی چٹان اور دوسری طرف گہرے کھنڈ۔ معمولی سی غفلت موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ چڑا اور جاگی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں کہ ان کم پختوں کو ایسی جگہ پر مندر بنانے کا کیا شوق ہوا تھا جہاں تک پہنچنا بھی جان جو کھوں کا کام تھا۔

جس وقت ہم کانچ سے روانہ ہوئے تھے سورج طلوع

ہو چکا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی لیکن پھر ایک آسمان پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ ہم جیسے جیسے بلندی کی طرف جا رہے تھے، ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی اور خنکی بڑھ رہی تھی اور اب بادلوں کی وجہ سے خنکی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی جگہ سے ہمیں ہمالیہ کی وہ بلند چوٹیاں بھی نظر آجائیں جو عرف سے دھمی ہوئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہوگئی تو ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ پہاڑی علاقوں کے موسم کا اعتبار نہیں ہوتا اور یہ تو ہمالیہ کا سلسلہ تھا۔ ہم ہمالیہ کی گود میں تھے۔ اگر بارش ہو جاتی تو سیلابی پانی کے ریلوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے ایک مرتبہ ٹھاکر کو مشورہ بھی دیا تھا کہ واپس چلے جائیں اور ان دونوں (جاگتی + پریم) کو چھوڑ کر اگلے روز دوبارہ اس طرف آئیں لیکن ٹھاکر کبھی میری طرح ضدی تھا۔ اس نے یہ کہہ کر میرا مشورہ مسترد کر دیا تھا کہ اب جو ہوتا ہے، آج ہو ہی جائے۔

ٹھاکر ہم سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے چار پریم پھر جاگتی اور سب سے آخر میں میں تھا۔ اس وقت ہم تنگ سے راستے سے گزر رہے تھے جس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرا کھد۔ نیچے قیقن گہرائی میں درخت اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے پودے ہوں۔ چڑا کے پیر کے نیچے سے اچانک ہی ایک پتھر پھسل گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کی چیخ سن کر ٹھاکر بڑی تیزی سے پیچھے ہٹا اور عقاب کی طرح لپک کر اس نے چڑا کو بازو سے پکڑ کر چٹان کی طرف بھیج دیا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چار سیکڑوں فٹ گہرے کھد میں گر چکی ہوتی اور ہم وہاں بیٹھے اس کا نام کر رہے ہوتے۔

چڑا ٹھاکر سے لپٹ گئی تھی اور ٹھاکر ایک ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھا رہا تھا۔ جاگتی بھی قریب پہنچ گئی اور اس نے چڑا کو ٹھاکر کے انگ کے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

ہمیں تقریباً پندرہ منٹ وہاں رکا پڑا اور پھر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ٹھاکر نے چڑا کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور میں نے جاگتی کو سنبھال رکھا تھا۔

ہم اس خطرناک راستے سے آگے نکل آئے۔ اس سے آگے راستہ کشادہ اور بڑی حد تک محفوظ تھا۔ ہم کچھ دیر کے لیے وہاں رک گئے اور پھر دہری ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آسمان پر بادل گہرے ہو گئے تھے اور ہلکی ہلکی بوند باندی ہونے لگی تھی۔ ہم ایک چٹان کی اوٹ میں ہو گئے۔

ہلکی بوند باندی اچانک ہی تیز ہو چلا اور میں بدل گئی لیکن

تین چار منٹ بعد جس طرح اچانک بارش شروع ہوئی تو اسی طرح اچانک رک بھی گئی۔ بارش رکتی ہی ہم آگے بڑھ گئے۔

ہمیں ہمالیہ کی گود میں سفر کرتے ہوئے چار پریم پورے تھے۔ سوائی پرمانند نے بتایا تھا کہ سنگری مندر تقریباً کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگر میدانی علاقہ ہو تو فاصلہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں طے ہو جاتا مگر سلسلہ بلندی اور دشوار راستے کی وجہ سے ہمیں اتنا وقت لگ گیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ہمیں تیز بارش نے گھیر لیا۔ اس مرتبہ ہمیں ہمیں پہاڑ کی جگہ مل گئی اور بارش بھی اس بار تقریباً پندرہ منٹ تک ہوئی رہی۔

بارش رکی تو ہم پھر آگے چلے گئے۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ ایک چٹان کے گرد گٹے راستے پر گھوم کر جیسے ہی ہم اوپر پہنچے، ٹھاکر نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں روکنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ہونٹوں پر انگ رکھ دی۔

میں جاگتی کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا اور ٹھاکر کے برابر پہنچ کر سامنے دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں جیت سے پھیلی چلی گئیں۔ سامنے سنگان چٹانوں کے بیچ میں بن وسیع و عریض پتھریلا میدان تھا جس کے وسط میں چوٹ اونچے چوڑے پر مندر بنا ہوا تھا۔

یہ چوڑہ بھی بہت کشادہ تھا۔ مندر کی عمارت جنوں سے بنی ہوئی تھی اور یہ پتھرائی چٹانوں کو توڑ کر تراشے گئے تھے۔ عمارت کے اطراف میں بھی چوڑے پریم اور پتھر عریض جگہ تھی۔ چوڑے پریم کے لیے چھ کشادہ میزبان تھیں۔

مندر کی عمارت بہت پرانی تھی۔ اوپر سے کل کابینہ سا حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ چوڑے اور میزبانوں پر بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آ رہے تھے۔

مندر کی عمارت نیچے سے چوکور تھی اور اوپر سے بٹ پلو تھی۔ عمارت میں گئے ہوئے پتھروں پر جا بجا مورچوں کی ہونٹیں تھیں۔

ہماری نظروں کے بالکل سامنے مندر کا محرابی دروازہ تھا۔ محراب بہت بڑی تھی لیکن اس میں کوئی پتھر نہ تھا۔ کسی اور طرف کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ جہاں روشنی اندر تک پہنچ رہی تھی لیکن اس ہال کے اندر عمارت کے آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر

نہیں آ رہا تھا۔

عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ نیچے سے اوپر تک تعداد چھوٹی چھوٹی کمریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ مورچوں کے درمیان ان کمریوں میں سے کسی کمری میں اگر کوئی کھڑا ہو تو اسے دیکھ لینا دشوار تھا لیکن میں گہری نظروں سے ان کمریوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چوڑے پریم کے واسطے طرف بالکل آخر میں چٹان سے لی ہوئی ایک اور چھوٹی سی عمارت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ عمارت تین یا چار کمریوں پر مشتمل ہوگی اور کسی زمانے میں یہاں کس کے لیے استعمال ہوئی ہوگی لیکن اس وقت تو اس طرف بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس عمارت کے ساتھ ہی پہاڑی پر جانے کے لیے میزبیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ چند میزبیاں تھیں جو چٹان کو کٹ کر بنائی گئی تھیں۔ اس سے اوپر چار پانچ فٹ چوڑا راستہ تھا جو اوپر کھینچا گیا تھا۔ اس طرف سبزہ تھا اور اس راستے پر جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے اوپر قد آدم پورے اور درخت تھے۔

”میں تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔“ ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سوائی پرمانند نے ہمارے ساتھ دھوکا تو لیا کیا۔“

”بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو موت کے سامنے جوت بولنے کی ہمت کر سکیں۔“ میں نے جواب دیا ”وہ جانتا تھا کہ موت بولنے سے اس کی جان نہیں بچ سکے گی۔ وہ لوگ جیٹا نہیں آئے ہیں۔ مندر کا وہ چوڑہ دیکھ رہے ہو۔ تقریباً چھ فٹ اونچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس عمارت کے نیچے یہ غار ضرور ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ وہیں ہوں۔“

”تو پھر آگے چلا جائے یا میں رک کر کسی کے باہر آنے کا انتظار کریں؟“ ٹھاکر نے کہا۔

”آگے ہی جانا پڑے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ چٹان کی آڑ سے نکل آئے۔ میں اور ٹھاکر چلے گئے۔ جاگتی اور چڑا ہمارے پیچھے چل رہی تھیں۔ چوڑے پریم میں کبیں کبیں چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پتھر پڑے تھے۔ ہم ان گڑھوں سے بچتے ہوئے مختار انداز میں قدم بڑھتے رہے۔ ٹھاکر نے پتھروں نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

کے اندر پہنچے پاس اگرچہ پتھروں نہیں تھیں لیکن پتھروں کے بائیں جانب ایک بڑی کمری کے ساتھ خیر بندھا ہوا تھا جسے میں کسی بھی نام چوڑے پریم کے لیے رک کر ادھر ادھر

دیکھا اور مندر میں داخل ہو گئے۔ باہر سے مندر کی عمارت اگرچہ زیادہ بڑی نہیں لگتی تھی لیکن اندر ہال خاصا بڑا تھا۔ بالکل سامنے والی دیوار کے قریب تین مربع فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا چوڑہ تھا۔ اس چوڑے پر کسی زمانے میں کوئی مورچی رہی ہوگی لیکن اب وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا سا پتھر بڑا ہوا تھا۔ اس چوڑے کے پیچھے ایک کشادہ دروازہ تھا۔ مندر کے اندر چاروں دیواروں میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا جبکہ دوسرے کمروں کے دروازے سلامت تھے اور بھڑے ہوئے تھے۔

ہم ہال میں داخل ہو کر رک گئے۔ بیچ میں ایک پتھریلا ستون تھا جو چھت تک چلا گیا تھا۔ اس ستون پر بھی چاروں طرف مورچیاں بنی ہوئی تھیں اور دیواروں پر بھی مورچوں کی شبیہ ابھری ہوئی تھی۔

دو منزلوں تک دو کشادہ بالکونیاں تھیں جن کے سامنے ریلنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ ریلنگ کئی جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں کئی منٹ تک ہال کی دیواروں، بالکونوں اور ان دروازوں کو دیکھتا رہا پھر ٹھاکر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میرا خیال ہے“ وہ ہمیں دیکھتے ہوئے فرمایا ”ہم نے کما۔“

”خانی کا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے سامنے ہیں۔ یہ آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے۔“

ہال میں آواز گونجتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پہلی منزل کی بالکونی پر دارا اور پنڈت پر گھیا راج کھڑے تھے۔ دارا کے ساتھ ایک خوب صورت اور جوان لڑکی تھی۔ اس نے بھی ساڑھی کی طرح کا کپڑا پہن رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی آئے گے۔“ دارا کہہ رہا تھا۔ ”دو روحوں سے پیچھا کرتے ہوئے اس کھیل کا فیصلہ ہو ہی جائے آج کے بعد کوئی آسیب میرا پیچھا نہیں کر سکے گا اور ٹھاکر!“ آخر میں اس نے ٹھاکر کو مخاطب کیا ”تم نے اس شیطان کا ساتھ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں اب تک جو نقصان پہنچ چکے ہیں ان سے تم نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اب تمہارا بھی انت (انتقام) ہونے والا ہے۔ پتھروں پر پیٹک دو اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میرے پتھروں میں اتنی گولیاں ہیں کہ دو دو تو تم لوگوں کے حصے میں آ ہی جائیں گے۔ پیٹک دو پتھروں۔“ آخر میں دارا کی آواز ہال میں گونج اٹھی تھی۔

ٹھاکر نے میری طرف دیکھا اور پتول پھینک دیا۔  
دارا ایک بیساکھی کا سہارا لے کھڑا تھا۔ اس نے بائیں  
ہاتھ سے بیساکھی سنبھال رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں پتول  
تھا۔

”نیو۔ نیچے جاؤ اور ان کی تلاشی لو۔ ہم بھی آرہے  
ہیں۔“ دارا نے اپنے پیچھے کسی کو اشارہ کیا۔  
ایک اور آدمی ایک لمبے کوہمارے سامنے آیا اور پچھلی  
طرف کہیں غائب ہو گیا۔ دارا ہم پر پتول تانے لگا رہا۔  
تقریباً ایک منٹ بعد ہال میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور  
وہی آدمی برآمد ہوا جس کی ہم نے صرف ایک جھلک دیکھی  
تھی۔

وہ بھی انہی کے قبل کا آدمی تھا۔ اس نے گہرے رنگ  
کے کپڑے کی دھوئی باندھ رکھی تھی۔ ایک پہلی چادر پشت پر  
ڈال رکھی تھی جس کے دو کناروں کو آگے سینے پر لا کر گردے  
رکھی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلا ہوا تھا۔ بے حد  
مضبوط جسم، سرخ آنکھیں اور بے ترتیب داڑھی مونچھیں۔

اس نے آتے ہی سب سے پہلے زمین پر پڑے ہوئے  
پتول پر قبضہ کیا پھر ٹھاکر کی پشت پر پتھچ کر اس کا لباس  
تھپتھپانے لگا۔ ٹھاکر کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس  
طرف سے مطمئن ہو کر نیو نام کا وہ پنڈت میری پشت پر آیا  
اور اوپر سے نیچے تک میرے جسم کو تھپتھپانے لگا۔ اس کا  
ہاتھ میرے گھٹنوں سے نیچے نہیں کیا تھا جس پر میں نے  
اطمینان کا سانس لیا۔ اگر اس کا ہاتھ میری پنڈلی تک پہنچ جاتا  
تو میرا خنجر بھی مجھ سے جدا ہو جاتا۔

نیو ہماری تلاشی لیتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ محتاط نہ بھی  
ہوتا تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بالکل پکڑا دارا ہمیں پتول  
کی زد پر لے ہوئے تھا۔ نیو چڑا کی طرف بڑھا تو وہ جیتنے ہوئے  
دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”میرے شر (بدن) کو ہاتھ مت لگانا۔ دیں کھڑے  
رہو۔“

”اس کو چھوڑ دو نیو۔ اس کی تلاشی ہم یوں گے۔“  
دارا کے ساتھ کھڑے ہوئے پنڈت پر گھیا راج نے چیخ کر کہا۔  
اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔

نیو ہمارے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہم  
چاروں کو پتول کی زد پر لے رکھا تھا۔ دارا وغیرہ بالکل سی  
غائب ہو گئے تھے اور پھر ایک ڈیڑھ منٹ بعد وہ نیچے والے  
دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پنڈت پر گھیا راج اور  
آخر میں وہی لڑکی دروازے سے باہر آئی تھی۔ اس کی عمر

تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونٹوں پر  
کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی ہر جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں  
میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے۔  
میراں بھی آؤ گے۔“ دارا نے میرے سامنے کھڑے ہونے  
ہوئے کہا۔ اس کے پتول کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔  
واقعی بد روح ہو۔ میں جہاں بھی جانا ہوں تم میرے پیچھے  
جاتے ہو۔ ہر دور میں صرف دو آدمیوں کو معلوم ہے کہ  
میراں آئے ہیں اور تم ان دونوں میں سے کسی تک نہیں  
سکتے۔ اس کے باوجود تم نے۔“

”ان دونوں میں سے صرف ایک باقی رہ گیا ہے۔ میں نے  
اس کی بات کاٹ دی۔“ سوای پرانند جنم میں پہنچ چکا ہے۔  
اب تمہاری باری ہے اور تم بے بات ذہن میں رکھ لو کہ اس  
مرتبہ میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ آج تھارے  
درمیان جو کچھ بھی ہوگا، فیصلہ کن ہوگا۔ اب ہم دونوں  
سے ایک رہے گا۔ میں یا تم۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آج فیصلہ ہو ہی جائے۔“  
دارا نے کہا۔ ”یہ تمہاری زندگی کی آخری گھڑاں ہیں اور  
تمہارے ساتھ ان لوگوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور مجھے ان  
کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔“

”افسوس تو ہمیں ان سیکڑوں بے گناہوں کا بھی نہیں  
ہوا جنہیں تم اب تک موت کے گھاٹ اتار چکے ہو لیکن  
اب جنہیں ان سب کا حساب دینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔  
ان خوفناک لمحات کو اب تک نہیں بھولا ہوں جب میرے  
ماں باپ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور پھر خانی کو بھی  
اسی طرح مار ڈالا گیا۔ ان کے علاوہ سیکڑوں بے گناہ تمہارے  
ہاتھوں اپنی زندگیاں گنوا بیٹھے۔ تمہیں کسی کا افسوس نہیں  
ہوا۔ تم تو لاشوں پر کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے تھے۔ تم نے مجھے  
ایک لمحے کو بھی چین سے کہیں مٹنے نہیں دیا اور جب میرے  
قدم زمین پر ٹکے تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی مدد  
کر لیا تھا کہ جب تک اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن نہیں  
مروڑ دوں گا، سکون سے نہیں بیٹھوں گا اور اب فیصلہ کی گئی  
آن پہنچی ہے۔ تم میں کبھی اتنا حوصلہ نہیں رہا کہ سامنے  
مقابلہ کر سکو۔ تم نے مجھے بھاگنے ہی میں اپنی عافیت بھی  
لیکن آج میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ تم دونوں  
کو پھنسنے والے یہ لوگ تمہاری حفاظت کر سکیں گے اور نہ  
ہی یہ پناہ تمہیں نہاد دے سکیں گے۔“

”میں بھی تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں دوں گا۔“ دارا  
تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونٹوں پر  
کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی ہر جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں  
میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

”میں بھی والا چیز زمین پر نکالتے ہوئے کہا۔“ آج یہ قصہ بیشہ  
کے لیے ختم ہو جائے گا۔“

اس نے پتول والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ ٹھاکر نے میری  
طرف دیکھا اور پھر نیچے کی طرف دیکھنے لگا جس نے ہم سب کو  
پتول کی زد پر لے رکھا تھا۔  
میں نے نظریں دارا کے پتول والے ہاتھ پر جمادیں۔  
اس وقت دارا سے سینے کے لیے میں نے اپنے اندر کی  
اسرار قوت سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے پیٹ میں  
ہاتھ کے قریب گریں ہی پڑتے ہوئے محسوس ہوئیں اور پھر  
ایک دم یوں لگا جیسے میرے اندر سے کوئی چیز اوپر کو اٹھ رہی  
ہو۔

میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ آنکھوں کے حلقوں میں  
جہل میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا۔ میری نظریں دارا  
کے پتول والے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔  
دارا کا ہاتھ پوری طرح آگے کو نکلا ہوا تھا پھر اس کا بازو  
آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹنے لگا۔ میں نے ایک لمحے کو اس کے  
چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور آنکھوں  
میں عجیب سی وحشت نظر آئی۔

اس ایک لمحے سے فائدہ اٹھا کر اس نے ہاتھ پھر آگے  
کر لیا تھا۔ اس کی انگلی زنجیر پر تھی اور پھر وہ انگلی آہستہ  
آہستہ حرکت کرتے ہوئے زنجیر سے ہٹ گئی اور اس کے  
ہاتھ ہی اس کی منہلی بھی آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی۔ اب  
پتول اس کی منہلی پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے  
ہاتھ کو جھٹکا اور پتول نیچے گر گیا۔

پنڈت پر گھیا راج اور نیو نے بھی حیرت سے یہ قماش  
دیکھا۔ دارا نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پتول  
نیچے پر تانا تھا لیکن پتول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ نیو کے  
چہرے پر تو ہوا بھائی سی ڈانٹے لگی تھیں۔ میں نے ہندو پنڈتوں  
اور بکالیوں کے بارے میں بہت سنا تھا کہ وہ پراسرار قوتیں  
مائل کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں۔ نیو شاید یہی  
سمجھا تھا کہ میں بھی کچھ ایسی ہی قوتوں کا مالک ہوں۔ اس کی  
نیت اور وحشت سے فائدہ اٹھانے اٹھایا۔

ٹھاکر نے بڑی پھرتی کا سہارا کر کے ہوئے نیو کے پتول  
پر جا کر اسے خود بھی اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔ ٹھاکر نے اس پر  
دارا ایک دم سے دھکیلتے ہوئے دور لے لیا۔

میں نے ہاتھ جوڑے ہوئے میں آگیا تھا۔ اس نے بیساکھی  
میں سے حملہ کر دیا۔ میں نے بیساکھی کا وار کلائی پر روکا اور

دوسرے ہاتھ سے بیساکھی کو گرفت میں لے کر زوردار جھٹکا  
دیا۔ دارا بھی بیساکھی کے ساتھ آگے کی طرف کھینچ آیا۔ میں  
نے جھٹکا دے کر بیساکھی کو چھوڑ دیا تھا۔ دارا منہ کے بل زمین  
پر گر گیا لیکن اس نے سینے میں بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ  
کیا تھا۔

دارا نے اٹھ کر ایک بار پھر بیساکھی سے حملہ کر دیا۔ اس  
مرتبہ بھی میں نے وار ہاتھوں پر روکا۔ ہم دونوں میں بیساکھی  
کے لیے قوت آزمائی ہونے لگی۔

دارا نے میری ٹانگ پر ٹھوکر ماردی۔ میں لڑکھڑا کر نیچے  
گرا۔ بیساکھی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ دارا نے  
موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کھلاڑے کی طرح بیساکھی کو سر  
سے اوپر اٹھا کر حملہ کر دیا۔ میں تیزی سے لوٹ لگا کر ایک  
طرف ہٹ گیا۔ دارا ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر چلے کرتا  
رہا اور میں فرش پر لوٹ لگا ہوا اس کے حملوں سے بچنے کی  
کوشش کرتا رہا اور بالآخر مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بیساکھی  
کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ دارا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ  
سکا اور میرے اوپر سے ہوتے ہوئے منہ کے بل گرا۔

میں لوٹ لگا کر اٹھ گیا اور دارا کو ٹھوکروں پر رکھ لیا  
لیکن دارا ایسا نہیں تھا کہ دیر تک مار کھا سکتا۔ اس نے میرا  
چہرہ پکڑ کر گرانے کی کوشش کی۔ میں تو نہیں گرا البتہ دارا کو  
اٹھنے کا موقع مل گیا۔

دارا میرے سامنے ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا  
مفلوج چہرہ بھی زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ اس وقت اسے دیکھ کر لگتا  
تھا جیسے اس کی ٹانگ میں کوئی نقص نہ ہو اور وہ پوری طرح  
قائم میں نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے برستے  
ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے اچانک ہی لباس کے  
اندروں ہاتھ ڈال کر خنجر نکال لیا۔

”تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔“ اس  
کے حلق سے بھیڑے جیسی غراہٹ نکلی۔ ”اب تمہاری کوئی  
حقیقی (قوت) کام نہیں آئے گی۔ تمہاری موت تمہارے باپ  
سے زیادہ خوفناک ہوگی۔“

باپ کے نام پر یوں لگا جیسے میرے دل پر گھونسا لگا ہو۔  
ایک لمحے کو وہ خوفناک منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا  
جب میرے باپ پر خنجروں سے وار کیے جا رہے تھے۔

دارا نے خنجر سے حملہ کر دیا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی  
اور پھر خنجر کے لیے ہم میں کھینچا تانی ہونے لگی۔ دارا نے  
ایک بار پھر دی حیرت استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس  
کے پیر کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی تھی لیکن میں سنبھل گیا تھا۔

ہیں نے ایک ہاتھ سے دارا کی خنجر والی کلائی تھامے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بغل کے نیچے زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ دارا تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اس کے پیر چھپے ہی زمین پر گئے۔ میں نے ان کا گھونسا گرا دیا۔

خنجر اب بھی دارا کے ہاتھ میں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو زمین پر رگیدنے لگے۔

دوسری طرف بھی گھسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر اور نیو لڑتے ہوئے مندر سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی غرائشیں اور اٹھانچ کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

ہنڈت پر گھیا راج جاگتی اور چڑا کو رگید رہا تھا۔ اس میں گینڈے کی طرح طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ تو تین آدمیوں کے بس کا بھی نہیں تھا اور اس وقت تو اس کے مقابلے پر دو عورتیں تھیں۔ چڑا تو لڑائی بھڑائی والی عورت نہیں تھی۔ بیٹی اور پتی (شوہر) کے قتل کا انتقام اسے بھڑکائے ہوئے تھا اور جاگتی۔ اسے تو مارشل آرٹ میں خاصی مہارت حاصل تھی لیکن اسے کوئی وار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی وہ دونوں پر گھیا راج سے لپٹ جاتیں اور کبھی پر گھیا راج ان پر گھونٹے اور ٹھوکریں برسائے لگتا۔ اس مار دھاڑ میں چڑا کی قیص پھٹ گئی تھی لیکن اسے شاید اس کی پروا نہیں تھی۔

دارا نے اس وقت مجھے اپنے نیچے دبوچ لیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی میری گرفت میں تھا۔ اس نے خنجر سے میرے سینے پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا وار روک لیا اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اوپر سیدھا ٹھیل دیا اور اسی لمحے میری نظر پر گھیا راج کی طرف اٹھ گئی۔

چڑا پر تیرا اپنا سرد دونوں ہاتھوں میں پکڑے زمین پر لوٹ رہی تھی اور جاگتی بھی پشت کے بل پڑی ہوئی تھی اور ہنڈت پر گھیا راج ترشول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس پر حملہ کرنے کے لیے پر قول رہا تھا۔

پر گھیا راج ارنابھیسے کی طرح پھنکارتے ہوئے جاگتی پر حملہ آور ہوا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ ترشول اور جاگتی کے سینے کے بیچ چنچا کا فاصلہ دو گنا تھا کہ میں پر گھیا راج سے ٹکرا گیا اور اسے لپٹے ہوئے دوسری طرف جاگرا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ترشول جاگتی کے سینے میں بیوست ہو چکا ہوتا۔

میں اٹھ کر پر گھیا راج کی طرف لپکا لیکن اسی وقت دارا نے میرے اوپر چھلانگ لگادی۔ دارا مجھے رگیدتے ہوئے دور تک لے گیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گھٹم گھٹا

ہو گئے۔

دارا میرے نیچے دبوچا ہوا تھا۔ میں اس کی گردن کو کھنڈ میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ چڑا کی چیخ سن کر چھوٹ پڑا۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو کانپ اٹھ گیا۔

ہنڈت پر گھیا راج کا ترشول اس کے سینے میں پڑ گیا تھا۔ پر گھیا راج نے ترشول ایک جھٹکے سے باہر پھینچا تھا۔ سینے سے خون کی تین دھاریں بہہ نکلیں۔ وہ لو لڑا کر چڑا کے بل گر گئی۔ پر گھیا راج نے اس پر ایک اور حملہ کر ترشول اس مرتبہ بھی دے تک چڑا کے سینے میں بیوست ہو گیا۔ چڑا کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔

میں نے دارا کو چھوڑ کر ہنڈت پر حملہ کرنے کی کوشش کر دی۔ مگر دارا نے میری ٹانگ پکڑ لی اور میں لو لڑا کر اس کے قریب ہی گر گیا۔ دارا جو تک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ چڑا پر تیرے ترشول کے دے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور پر گھیا راج دے کو زور زور سے جھٹکے رہا تھا۔

میں اپنے آپ کو دارا سے چڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس دوران میں جاگتی اٹھ کر کی پرنڈے کی طرح ہوا میں اڑتے ہوئے ہنڈت پر گھیا راج کی طرف لپکی۔ اس کی ذیلی فلاٹنگ کلک پر گھیا راج کے سینے پر لگی۔ وہ ڈکراتے ہوئے پیچھے گرا۔ ترشول چڑا کے سینے میں رہ گیا تھا۔

ہنڈت پر گھیا راج جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جاگ نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوائی اچھلی۔ اس مرتبہ بھی اس کی کلک ہنڈت کے سینے پر لگی۔ ہنڈت پھر بلبلاتے ہوئے گرا اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہنڈت پر گھیا راج جیسے ہی اٹھتا جاگتی کی فلاٹنگ کلک اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتی۔

پانچ ٹھوکریں گھما کر ہنڈت پر گھیا راج بیڑھال ہو چکا تھا۔ اس نے آخری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی تو جاگتی کی کلک اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر زخمی ہو گیا۔ اس کی ٹانگ اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔ مسلسل چھ فلاٹنگ کلک لگاتے جاگتی بھی ہانپ گئی تھی۔

میں اپنے آپ کو دارا کی گرفت سے چڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دم بخود ہو چکی تھی۔ اس نے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ کبھی سے اس کے سر پر ضربیں لگنے لگی۔ اس دوران میں میری نظر ایک بار پھر چڑا پر تیر کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے

بغل کو دے سے پکڑ کر اپنے سینے سے کھینچ لیا تھا۔ اس کے سینے پر کئی جگہوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں لیکن وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور لو لڑکراتے ہوئے ہنڈت پر گھیا راج کی طرف بڑھی۔

پر گھیا راج پشت کے بل پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ تھکا چڑا کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف اور دشت سے پھیل گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔ مجھے مت مارو۔ بھگوان کے لیے مجھے مت مارو۔ "وہ

میں نے یہ اردوں کیونکہ تم بھگوان کے اوتار ہو۔ "چڑا کے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا اور قدم لو لڑکراتے تھے۔ اس نے ترشول کو دونوں ہاتھوں میں اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ "تم نے جب میری پھول سی ٹانگ میں کا شھر (بدن) اڑا دیا تھا۔ میرے بے گناہ شوہر پر خنجر سے وار کیے تھے اس وقت ہمیں خیال نہیں آتا تھا کہ وہ بھی انسان ہیں۔ میں نہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی پر گھیا راج۔ تم۔ تم انسان نہیں بھگوان ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

دارا پھر چڑا پر تیر نے جیتنے ہوئے پوری قوت سے وار کیا۔ ترشول دے تک پر گھیا راج کے پیٹ میں اتر گیا۔ پر گھیا راج کی جینوں سے مندر گونج اٹھا۔ چڑا نے ترشول باہر پھینچ کر ایک اور وار کیا اور پھر گھیا راج پر جنون طاری ہو گیا۔ وہ ترشول سے پر گھیا راج پر دے دے وار کرتی رہی۔ پر گھیا راج کی آنکھیں ہیٹ سے نکل کر باہر ٹھکرائی تھیں اور پھر شاید چڑا کی ہمت جواب دے گئی۔ اس وقت ترشول ہنڈت پر گھیا راج کے سینے میں بیوست تھا۔ چڑا کے دونوں ہاتھ دے پر تھے اس کے ہاتھ دے پر پھسلنے لگے اور وہ نیچے جھکتی چلی گئی۔

دارا اب بھی جو تک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ اٹھ گیا۔ مجھے چھوڑ کر ہنڈت دور بڑے ہوئے پستول کی طرف لپکا لیکن اسی وقت جاگتی نے لپک کر اسے ٹھوکر مار دی۔ دارا لپٹ کر مندر کے دروازے کی طرف لپکا۔

دارا نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ غصے میں اسے پھلو پر پے در پے چند گھونٹے مارے۔ اس نے گروے میں دو دو کی شدید ضربیں اٹھنے لگی تھیں۔ اندر سے اس کی آنکھیں پھٹنے ہوئے چڑا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ

سے بے اختیار گر کر سانس نکل گیا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ ہنڈت پر گھیا راج بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے گردن گھما کر اُدھر اُدھر دیکھا۔ دارا باہر بھاگ گیا تھا اور جاگتی بھی اس کے پیچھے گئی تھی۔ میں کھڑے ہو کر چند لمحے اپنا پہلو سلا رہا اور پھر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ٹھاکر ابھی تک نیو سے گھٹم گھٹا تھا لیکن وہ اس پوزیشن میں تھا کہ نیو اب اس سے بچ نہیں سکتا تھا۔

دارا میدان کے آخر میں اس چھوٹی عمارت کی طرف بھاگ رہا تھا جس کے ساتھ ہی چنان کاٹ کر بیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور ان سے آگے اوپر جانے کا ٹک سارا تھا۔ جاگتی بھی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ میں نے بھی اس طرف دوڑ لگا دی۔ دارا حسب معمول پھر راہ قرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے ملے کر لپکا تھا کہ اب اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔

دارا بیڑھیاں چڑھ کر پتھر لے راستے پر پہنچ چکا تھا۔ بارش کی دھج سے اس ڈھلان پر ہلکا سا پانی بہہ رہا تھا۔ دارا چند قدم اوپر گیا تھا کہ اس کا پیڑ بھاڑیوں میں الجھ گیا۔ وہ پھسلنے ہوئے تین چار فٹ نیچے آیا پھر اوپر چڑھنے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے اس کی پھرتی دیکھ کر کوئی ایسی حیرت ہو رہی تھی۔

وہ ابھی دو تین قدم اوپر چڑھا تھا کہ جاگتی نے اسے پیر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ دارا پھر چند فٹ نیچے آ گیا۔ اس نے دوسری ٹانگ چلا دی۔ ٹھوکر جاگتی کے کندھے پر لگی۔ دارا کا پیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جاگتی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے پتھری بیڑھیاں پر آن گری۔

میں جاگتی کے قریب سے گزرتے ہوئے دارا کے پیچھے دوڑا۔ وہ اس دوران میں تقریباً پچاس فٹ اوپر پہنچ چکا تھا۔ نیچے چھوٹوں اور بھاڑیوں میں میرا پیر بھی بار بار پھسل رہا تھا۔ میں کبھی بھاڑیاں پکڑ کر اور کبھی چھوٹوں کے سارے اوپر چڑھتا رہا۔ ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا تو جاگتی بھی میرے پیچھے آ رہی تھی۔

تقریباً سو فٹ مزید اوپر جا کر دارا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں نے صرف ایک بات سوچ رکھی تھی کہ اگر دارا آج میرے ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ اس سے کبھی سامنا نہیں ہو سکے گا۔

اس ٹک سے پتھر لے راستے کے اختتام پر ایک مختصر سا میدان تھا جس کے دو اطراف میں چٹانیں تھیں۔ تیسری سمت وہ تھی جہاں سے ہم اوپر آئے تھے اور چوتھی سمت



ایک چٹان تو بالکل عمودی تھی جس کے اوپر سے پانی کا پرتلا سا گر رہا تھا۔ یہ پرتلا پتھروں میں گر رہا تھا اور پانی وہیں زمین میں غائب ہو رہا تھا جبکہ دوسری چٹان ایسی تھی کہ اس پر آسانی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ اس چٹان پر جھانپاں بھی تھیں اور اکا کا کوا اونچے درخت بھی جو اوپر تک چلے گئے تھے اور دارا اسی چٹان کی طرف دوڑ رہا تھا۔

میں پوری قوت سے دوڑنے لگا اور اس پہاڑی پر چند گز  
اور جا کر اسے پکڑ لیا۔ دارا کی نیم منقطع ٹانگ میرے ہاتھ میں  
آگئی تھی۔ میں اسے نیچے پھینک دیا۔ وہ دوسری ٹانگ سے مجھے  
ٹھوکریں مارنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں اپنا چہرہ اس سے  
بچاتا رہا۔

ہم دونوں جھاڑیوں میں لڑھکتے ہوئے نیچے آگئے۔ دارا نے سنبھلا ہی مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں بڑی بھرتی سے اپنے آپ کو بچا لیا اور اچھل کر ڈبل سائیڈنگ اس کے پیٹ پر باری۔ وہ فحشہ ہوئے نیچے گرا اور وہ جیسے ہی سنبھلا میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھل کر گھوم گیا۔ اسپننگ اس کی پسیلوں پر لگی۔ وہ لڑکھا گیا۔ اس کے گرنے سے پہلے میں نے ایک اور سائیڈنگ رک رکھ کر دی۔

دارا بھائیوں میں گرا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدے ہوئے دور تک لے گیا۔ اس دور ان میں دارا کو موقع مل گیا۔ اس نے مجھے پیروں پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔

میرے خیال میں میرے اور دارا کے بیچ برسوں سے جاری لڑائی کے فیصلہ کن لمحات آج سمجھے تھے۔ میں جھاڑیوں میں پشت کے بل گرا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے چٹون کا پانچواں ٹکڑا خرچ کر ختم کر لیا۔

دارا اس رقت مجھ پر حملہ کرنے والا تھا لیکن میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر روک گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔

میں آگے بڑھا تو وارا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ وارا کو فرار تلاش کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے میرا وار روک لیا اور بڑی مضبوطی سے میری کلائی کو گرفت میں لے لیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کتھنی پر نیچے کی طرف ضرب لگائی۔ اس نے ہلکا کر میری کلائی چھوڑ دی۔ وہ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے خنجر سے وار کر دیا۔

دارا نے اس مرتبہ بھی حملہ روکنے کی کوشش کی تھی مگر

کامیاب نہیں ہو سکا۔ خنجر دستے تک اس کے بچے پر چوست ہو گیا۔ دارا کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں نے جھگڑے اس کے سینے سے خنجر کھینچ لیا۔ خون کا فوارہ اڑنے کے سینے سے بہہ نکلا۔ میں نے ایک اور دارا کیا اور اس نے سینے میں ایک اور سوراخ بنادیا۔

اس مرتبہ دارا اپنے تئوں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔  
 کھڑا کر پست کے بل بھاریوں میں گرا۔ میں نے چھانک کر  
 دی اور اس کے سینے پر ایک اور وار کر دیا اور پھر بھڑک کر  
 طاری ہو گیا۔ میں دارا پر پڑے درپے خنجر کے وار کرنا پہلے  
 میری آنکھوں کے سامنے مختلف چہرے گھومتے رہے۔  
 ماں، میرا باپ، ماشرو پھانک، تھائی اور بھانے کن کن  
 معصوم اور بے گناہ لوگ تھے جو اس خون خوار میرے  
 ہاتھوں موت کا شکار ہو چکے تھے۔

میرا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا اور پھر اچانک پٹ سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

وہ ٹھاکر تھا جو مجھے پکڑ کر کھینچنے ہوئے وہاں سے دور گیا۔ چنان کے کنارے پر جا کر بھی کھڑی تھی۔ غمناک لے کر اس کے قریب رک گیا۔ میں زمین پر بیٹھ کر اپنے گھر میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میرا ازلی دشمن، میرے ماں باپ کا قاتل آج میرے پاس اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ میری قسم پوری ہو گئی تھی۔ ام اگر مجھے موت بھی آجاتی تو وہاں نہیں تھی۔

جاگتی اور ٹھکار بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔  
میرا کندھا تھپتھپا رہا تھا اور جاگتی میرے بالوں میں انگلیاں  
پھیر رہی تھی۔ آجاکل آہٹ سن کر ہم تینوں چونک گئے اور  
جب میں نے گردن کھما کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر معلق ہو گیا۔

دارا میرا خنجر ہاتھ میں پکڑے لڑکھڑاتے ہوئے اس طرف آ رہا تھا۔ میرا خنجر دسے تک پیٹ اس کے پیٹ پر رہ گیا تھا۔ میں نے اس خنجر سے اتنے وار کیے تھے کہ اس کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ اس خنجر پیٹ سے نکال لیا تھا وار حملہ کرنے کے لیے تھوڑی طرف سے آ رہا تھا۔ آنتیں اس کے کٹے ہوئے پیٹ سے نکل کر پھرتی ہوئی تھیں۔

جاگتی اسے دیکھ کر چنچ اٹھی۔ ہمارے اوپر درمیان صرف تین چار گز کا فاصلہ تھا۔ ٹھاکر جھٹے ایک طرف لے گیا۔ جاگتی نے بھی اٹھ کر ایک طرف کوشش کی لیکن پتھروں پر اس کا پیرو بہت گیا اور وہ ٹھاکر

بے مل مری اور اس سے پہلے کہ وہ انھہ کر پوری طرح  
 نہ کہہ سکا، اس کے سر پر ہنسی چکا تھا۔

دارا کا چہرہ بہت ہی نازک اور باریک تھا۔ وہ خفاک عفریت کی طرح جاگتا تھا۔ حملہ آور ہوا۔ سنبیلے کی کوشش میں جاگتی ایک بچہ بھڑک کر لڑائی دارا کے ہاتھ میں پڑا ہوا خنجر اس کے پیٹ پر گرا۔

جاگتی کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں اور شکر اٹھ کر ان کی طرف لپکے۔ دارا چاچا کی سے لپٹ گیا اور اسے اپنے ساتھ بہتے ہوئے چٹان کے کنارے کی طرف لے گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ میں نے اپنی جگہ سے چھٹاٹک مارا۔

دارا کی ٹانگ میرے ہاتھ میں اتر نکل گئی۔ دارا جاگتی کو  
ساتھ لہٹائے کھڑے عین کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ میں  
ایک بار پھر جھلاٹ لگا دی۔ اس مرتبہ دارا کا ایک پیر  
ہے ہاتھ میں آیا لیکن اس کا دوسرا پیر زمین چھوڑ چکا تھا۔  
جاگتی کو ساتھ لے چٹان کا کنارہ چھوڑ چکا تھا۔ میں اس کے  
ہاتھ رست رہا لیکن اچانک ہاتھ کے میری ٹانگ پکڑ لی۔  
ایک جھٹکے سے رک گیا۔ دارا کا پیر میرے ہاتھ سے نکل

جانگی کی وہ آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو ہالیہ کی  
جانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

غلام تھے پکڑ کر رکھتے ہوئے کھڑے کنارے سے پیچھے  
 گلیہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن  
 ارانے مجھے بڑی سختی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس  
 قدر کہ غلام کر میری ٹانگہ نہ پکڑ سکتا تو میں بھی ان دونوں کے  
 قوت میں کمرائیوں میں پہنچ چکا ہوتا۔

میرا دل منہ بعد ٹھکانے مجھے چھوڑ دیا اور ہم  
تیس پانچ گھنٹے جھانکنے لگے۔ تقریباً دو سو فٹ گہرائی  
میں باگی کی خشک لاش پڑی ہوئی تھی۔ میرا دماغ  
کھل گیا۔ انھوں کے سامنے تاری جھانے لگی۔ میں اپنی  
پٹائی کوڑے کوڑے لہرایا تو ٹھکانے بڑی تیزی سے مجھے  
چھینے لگا۔

میں نے انہیں بے جا جان ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے  
 ایک ہی تصویر ہوتی جا رہی تھی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔  
 نور کی بانوں میں جھول گیا تھا۔

○★○

ہاں تو اس آدمی گھنٹے بعد بحال ہوئے تھے۔  
 ارا واقعی شیطان تھا۔ عفریت۔ جس نے مرے

ہوئے بھی ایک انسان کی جان لے لی تھی۔ وہ خوفناک منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میں جاگتی کو نہیں بچا سکا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روئے لگا۔ ٹھاکر نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور مجھے دلاسا دینے لگا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔

میرا اور جاگتی کا ساتھ کئی سال رہا تھا۔ تھائی کی طرح اس نے بھی میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور بالآخر جان بھی دے دی تھی۔

ہم تقریباً دو گھنٹے تک ان پہاڑوں میں بیچے اترنے کا  
 راستہ تلاش کرتے رہے لیکن چٹانیں بالکل عمودی تھیں۔  
 دو روزہ تک کہیں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے بیچے  
 اترنے کی کوشش کی جاسکتی۔ ایک جگہ رہیں نے اترنے کی  
 کوشش کی تھی مگر خاک نے مجھے روک دیا تھا۔ کسی بھی طرف  
 سے بیچے اترنے کی کوشش کا خدوشی کے مترادف تھا۔

ہم پھر اسی جگہ پر آئے اور میں کنارے پر جبکہ کر بیٹھے تھے لگا۔ دو سو فٹ نیچے چٹروں پر جا کر کی لاش تو نظر آ رہی تھی۔ اسے کپڑوں سے شناخت کیا جاسکتا تھا لیکن دارا کی لاش کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بھی کسی پتھری کی آڑ میں یا جھاڑیوں میں نہ ہوگی۔

میں دیر تک جاگتی کی لاش کو دیکھتا رہا۔ اس نے میرے لیے جان دے دی تھی لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پارہا تھا کہ اس کی آخری رسومات انجام دے سکوں۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ ٹھاکر نے مجھے سہارا دے کر اٹھالیا۔ میں نے آخری مرتبہ جانکی کی لاش کی طرف دیکھا اور ٹھاکر کے ساتھ دھڑلان اترنے لگا۔

جب ہم ڈھلان کے انقطاع پر پتھری سیز جیوں پر پہنچے تو  
بارش تیز ہو چکی تھی۔ ہم مندو کی طرف دوڑنے لگے۔ نیو کی  
بارش میدان میں پڑی تھی۔ بارش کے پانی کے ساتھ اس کا  
خون میدان میں دور تک بہہ رہا تھا۔

مند میں دو اور لاشیں ہماری فخر تھیں۔ ہڈت پر گھیا  
راج کے سینے میں اب بھی ترشول چوست تھا۔ اس کے  
غریب ہی چڑا پریم کی لاش بڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی  
ور شوہر کا انتقام لے لیا تھا اور خود بھی اس باپی سنسار سے  
ست دور چلی گئی تھی۔

باہر بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ بارش کے شور میں چانک ایک اور آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ٹھانکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ اس



نے بھی وہ آواز سن لی تھی جس نے مجھے چونکایا تھا۔  
بارش کے شور میں یہ اندازہ لگاؤ شمار تھا کہ سکیوں  
کی وہ آواز کس طرف سے آ رہی تھی اور پھر اچانک ہی  
میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔  
مجھے وہ خوب صورت لڑکی یاد آگئی جسے ہم نے دارا وغیرہ  
کے ساتھ اس مندر میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ہٹاکر  
کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر چند لمبے میری طرف دیکھا ہا پھر ادھر  
اُدھر دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔  
”اے! کہاں ہو تم؟ سامنے آ جاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں  
کہیں گے۔“

ٹھاکر کچھ دیر مجھس نگاہوں سے اُدھر اُدھر دیکھا رہا پھر  
دیوار کے قریب اس چوڑے کی طرف بڑھنے لگا جس پر  
مورتی کا ٹوٹا ہوا پتھر ہوا تھا۔ ٹھاکر گھوم کر اس چوڑے کی  
دوسری طرف چلا گیا۔ وہ جھک کر میری نگاہوں سے اوچھل  
ہو گیا اور جب واپس آیا تو وہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ ٹھاکر  
نے اس کا ایک بازو پکڑ رکھا تھا۔

وہ بے حد حسین لڑکی تھی لیکن خوف سے اس کا چہرہ  
مر جھا گیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جس سے اندازہ  
ہوتا تھا کہ وہ دیر سے رو رہی تھی۔ ہم نے مندر کے اندر  
داخل ہونے کے ٹھوڑی دیر بعد اسے بالگونی میں دارا کے  
ساتھ دیکھا تھا اور پھر یہ ان کے ساتھ نیچے بھی آئی تھی اور  
جب لڑائی شروع ہوئی تھی تو میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا  
اور وہ بھی شاید ڈر کر اس چوڑے کے پیچھے چھپ گئی تھی اور  
آخر وقت تک نظر نہیں آئی تھی۔

ہمارے جانے کے بعد اس نے شاید یہ لاشیں دیکھی  
تھیں اور خوف زدہ ہو کر پھر چوڑے کے پیچھے بیٹھ کر رونے  
لگی تھی۔ اگر اس کی سسکیاں سنائی نہ دیتیں تو شاید اب بھی  
ہمیں اس کا خیال نہ آتا۔

وہ سردی اور خوف سے ہولے ہولے کاب رہی تھی۔  
ٹھاکر اسے لے کر ستون کی دوسری طرف بیٹھ گیا تاکہ لاشوں پر  
اس کی نظر نہ پڑ سکے جس میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ ٹھاکر  
اسے تسلیاں دے رہا تھا کہ ہم سے اسے ڈرنے کی کوئی  
ضرورت نہیں۔ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ لڑکی اپنی بیانی کیفیت پر قابو  
پاسکی تھی۔ ہم نے اسے وہیں ستون کے قریب بیٹھ چھوڑ دیا  
اور چڑا پر تیم کی لاش اٹھا کر ایک کمرے میں فرش پر ڈال دی  
اور دروازہ بند کر دیا۔ یہاں نہ تو کڑیاں تھیں اور نہ ہمارے  
پاس ماچس کہ اس کی چتا تیار کر کے آخری رسم ادا کی

جاسکتی۔ ہم نے اس کی لاش کمرے میں ڈال دی تھی۔  
جانوروں کی خوراک بننے سے بچی رہے۔  
ہم اس لڑکی کو لے کر مندر سے باہر آگئے۔ بارش  
بھی ہو رہی تھی۔ ہم دروازے کی عراب میں کھڑے رہے۔  
اس لڑکی کی سردی لگ رہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگ  
بیٹھ گئی۔

ٹھاکر برسی ہوئی بارش کو دیکھ رہا تھا اور میں اس پر  
سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اوپر کی دو منزلوں پر  
کمرے ہیں اور وہ لوگ پہلی منزل کے دو کمروں میں کھڑے  
ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک کمرے کی کوئی نہ  
دیکھ لیا تھا اور ہمارا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔  
میرے اندازے کے مطابق اس وقت ہمیں پتا نہ  
تھے مزید آدھے گھنٹے بعد بارش بند ہو گئی۔ ہم نے پکارا  
انتظار کیا اور بالآخر وہاں کسی کے لیے روانہ ہو گئے۔  
ہم میدان سے گزر کر اس راستے کی طرف جا رہے  
جہاں سے آئے تھے لیکن لڑکی نے ہمیں اس طرف جانے  
روک دیا۔

”ہم لوگ اس طرف سے آئے تھے یہ بتانا  
راستہ ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے راستے کے بارے میں اس سے ایک سوال  
کے اور پھر اسے اشارہ کرتے ہوئے ہم اس کے پیچھے  
چلنے لگے۔ یہ راستہ کافی کشادہ تھا۔ کئی جگہوں پر اگرچہ  
اور خطرناک موڑ تھے لیکن ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں  
آئی۔ ایک دو مقامات پر ہمیں پٹانوں پر بھی چڑھنا پڑا تھا۔  
راستہ اگرچہ طویل بھی تھا لیکن مجموعی طور پر اس راستے  
سے کہیں بستر تھا جہاں سے ہم مندر کی طرف گئے تھے۔  
خیال تھا کہ مندر کی طرف جاتے ہوئے ہم غلط راستے پر  
گئے جس سے نہ صرف ہمیں خاصی دشواریاں پیش آئی تھیں  
بلکہ وقت بھی بہت لگا تھا۔ یہ راستہ طویل ہونے کے باوجود  
تین گھنٹے میں پھاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔

دن کا اجالا شام کے اندھیرے کی آغوش میں  
تھا۔ شب میں بکھرے ہوئے شریک جہاں جگہ دی تھی۔  
آسمان پر اب بھی کمرے بادل تھے اور کسی بھی لمحے مزید بارش  
ہو سکتی تھی۔

اس لڑکی کا نام دیگوتی تھا۔ میں راستے میں اس سے  
باتیں کرتے ہوئے آیا تھا۔  
”لگتا ہے تمہارا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے۔  
تم اس شیطان کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں متھرا کی رہنے والی ہوں۔“ دیگوتی نے جواب دیا  
”ہم پرہمن خاندان سے ہیں۔ میرے پانی بھی پنڈت ہیں۔  
ان کی بت مانی جاتی ہے۔ لوگ ان کا ست احترام کرتے  
ہیں۔ مجھے بھی دھرم سے بہت لگاؤ تھا۔ میں بھی گوتی بن کر  
دھرم کی سیوا کرتا جانتی تھی۔ پانی نے میری حوصلہ افزائی کی  
اور میں مندر میں رہنے لگی۔“

”چند روز پہلے پنڈت ٹھاکر ہمارے مندر میں آیا۔ اس کی  
ایک ٹانگ مفلوج ہو رہی تھی۔ اس وقت پانی بھی مندر ہی  
میں موجود تھے۔ سیلائی پنڈت اور پجاری مندر میں آتے رہتے  
تھے لیکن پانی نے بھی ایسے لوگوں کو مندر میں ٹھہرنے کی  
اجازت نہیں دی تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک الگ آشرم  
بنایا گیا تھا۔ انہیں وہیں بھیج دیا جاتا لیکن پنڈت ٹھاکر نے  
نجانے کیسے پانی کو رام کر لیا اور اسے مندر میں نہ صرف  
رہنے کی اجازت دے دی بلکہ اس کی ٹانگ کے علاج کے لیے  
ڈاکٹر کا بھی بندوبست کر دیا۔ یوں تو مندر کے تمام پجاریوں کو  
علم دیا گیا تھا کہ پنڈت ٹھاکر کو دیکھ بھال کریں لیکن دو گویوں  
کو خاص طور پر اس کی سیوا (خدمت) کے لیے مقرر کر دیا۔

ان میں ایک ساترئی بھی اور دوسری میں۔  
”پندرہ روز میں مجھے پتا چل گیا کہ پانی پنڈت ٹھاکر سے  
اتنا زیادہ متاثر کیوں تھے۔ پنڈت ٹھاکر نے پانی کو بتایا تھا کہ  
جے پور میں ایک مسلمان نے ہندو راہنماری کو اپنی رکھیل بنا  
رکھا تھا۔ اس بات پر جے پور میں ہنگامے بھی ہوئے تھے۔  
پانی بھی ان ہنگاموں سے واقف تھے۔ پنڈت ٹھاکر نے پانی  
کو بتایا تھا کہ وہ ایک ایسا منصوبہ بنا رہا ہے کہ آئندہ کسی  
مسلمان کو کسی ہندو ناری کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات  
نہ ہو۔ اس نے پانی کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی ٹانگ اسی  
مسلمان نے توڑی تھی۔“

”پانی کو مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔ ان کا بس  
نہیں چلنا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو مٹا دیں۔  
پنڈت ٹھاکر ان کا ہم خیال تھا اور یہی وجہ تھی کہ پانی اسے  
بہت پسند کرنے لگے تھے۔“

”پنڈت ٹھاکر کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی۔ وہ بیسا کھی کے  
سارے چلنے لگا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ چند مہینوں بعد وہ بیسا کھی  
کے بغیر بھی چلنے لگے گا۔“

”پانی پنڈت ٹھاکر کی شرافت کے بھی قائل ہو گئے  
تھے۔ میرے اور ساترئی کے علاوہ اور بھی کئی گویاں اس کی  
فطرت پر مامور تھیں لیکن پنڈت ٹھاکر نے بھی آنکھ اٹھا کر  
ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔“

”پنڈت ٹھاکر نے ہر دور آنے کا پروگرام بنایا تو میں بھی  
تیار ہو گئی۔ گنگوتری یا تارا میری زندگی کی سب سے بڑی  
خواہش تھی۔ پانی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہیں  
اطمینان تھا کہ میں پنڈت ٹھاکر کے ساتھ جا رہی ہوں جو مجھے  
پتہ چل گیا تھا۔ لیکن۔“ دیگوتی خاموش ہو گئی۔ میں بھی  
اس کے ساتھ خاموشی سے چلا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس  
نے دوبارہ کہا شروع کیا۔

”لیکن گنگوتری پہنچ کر پنڈت ٹھاکر کی اصلیت آشکارہ  
ہو گئی۔ اس رات پنڈت ٹھاکر اور پنڈت پر گھیا راج نے خانے  
والے کمرے میں بیٹھے دارو پی رہے تھے۔ انہوں نے  
دوسرے سیوکوں (خادموں) کو باہر بھیج دیا تھا۔ میں پنڈت  
ٹھاکر کے ہیرو رہی تھی۔ اس کی یہ سیوا میں پہلے بھی کیا کرتی  
تھی لیکن اس رات اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے اوپر  
گرالیا۔ پہلے تو میں نے کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا لیکن  
جب اس کی دست درازی بڑھنے لگی تو میں نے مزاحمت  
شروع کر دی۔“

”میرا خیال تھا کہ پنڈت پر گھیا راج اسے روکے گا لیکن  
وہ بھی میرے ساتھ دست درازی کرنے لگا تو میں بد خواص  
ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑا کر اس کمرے سے بھاگنے کی  
کوشش کی مگر پنڈت ٹھاکر نے مجھے روک لیا۔“

”میں جیتی رہی مگر مندر کے خانے میں میری چیخیں  
سننے والا کون تھا اور اس رات یہ انکشاف بھی ہوا کہ پنڈت  
ٹھاکر ہندو نہیں مسلمان تھا۔ اس نے اپنے کسی دشمن سے  
بیچنے کے لیے یہ سواگ بھرا ہوا تھا اور پر گھیا راج جیسے دھرم  
کے خدا اس کا ساتھ دیتے رہے تھے۔“

”اور پھر مجھے پتا چل گیا کہ پنڈت ٹھاکر دراصل کون  
ہے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کا دشمن بھی ہر دور پہنچ  
گیا ہے اور پھر ایک رات وہ ایک آوی کو پکڑ لائے جس سے  
کچھ پوچھنے کے لیے یہ پناہ نشدہ دیکھا گیا اور جب وہ ختم ہو گیا تو  
اس کی لاش مندر سے دور پھینکوا دی۔“

”اگلے روز ان کے دو آوی مارے گئے۔ انہیں جلا کر  
بھسم کر دیا گیا تھا۔ پنڈت ٹھاکر بری طرح خوف زدہ ہو گیا اور  
پھر پنڈت پر گھیا راج ہی اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ اس کا  
خیال تھا کہ یہاں ان کا سراغ نہیں لگایا جائے گا۔ چند روز  
بعد پنڈت ٹھاکر کا دشمن بھی مایوس ہو کر ہر دور اسے چلا جائے  
گا تو وہ گنگوتری واپس آجائیں گے لیکن شاید ان کی موت ہی  
انہیں گھبرائے اور ان مندر میں سے آئی تھی۔“ وہ خاموش  
ہو کر کمرے کمرے سانس لینے لگی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ ہماری حالت ایسی نہیں تھی کہ بازار کا رخ کر سکتے۔ اس لیے آبادی سے دور رہ کر چلتے رہے۔ ٹھاکر خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے ہوئے ہماری باتیں سن رہا تھا لیکن جب ہم ایک سڑک پر پہنچے تو وہ رک گیا اور دیگاوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہاں جاؤں۔“ دیگاوٹی نے جواب دیا۔ ”میں اس مندر میں نہیں جانا چاہتی جہاں دھرم کی سیوا کی آڑ میں میری عزت لوٹی گئی تھی۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد میں اپنے گھر بھی نہیں جانا چاہتی۔ کیا منہ دکھاؤں گی اپنوں کو۔“

”ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔ بے پور۔“ ٹھاکر نے کہا۔

دیگاوٹی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ اس کے دل میں یقیناً اندیشے اور دوسوے ہوں گے لیکن کالج میں روپ متی اور بلا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

روپ متی اور بلا کو جب چڑا اور جاگی کے بارے میں بتا چلا تو وہ دونوں مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ میرے اور جاگی کے لگاؤ کے بارے میں جانتی تھیں۔ میرے ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ گئے اور میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میری وہ رات بڑی اذیت میں گزری۔ میں نے اگرچہ اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا لیکن اس کے لیے مجھے کتنا طویل فاصلہ طے کرنا پڑا تھا یہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔ کتنی لاشوں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ خون کی کتنی ندیاں پار کی تھیں میں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ مجھے بڑے اچھے دوست اور ہمدرد ملے تھے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے مجھ سے جھٹتے گئے۔ جاگی کو مجھ سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ بیشہ میرے ساتھ رہی تھی۔ اس نے کبھی بھی مجھے اکیلے باہر نہیں جانے دیا تھا اور اب مجھے اکیلا چھوڑ کر بیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

رات بھر میرا ذہن انہی خیالات میں الجھا رہا۔ اس رات کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کسی کا دل ہی نہیں چاہا تھا۔

ہوری تھی۔ میں اس وقت ان لوگوں سے الگ تھک رہتا تھا۔ دیگاوٹی سب کی باتیں سنتی اور سب کے چہرے دیکھتی رہی تھی۔ اس وقت وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی۔

”جاگی کون تھی؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ جو پنڈت پر گھیا راج کے ہاتھوں۔“

”وہ چڑا پر تھ تھی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ کئی سینے پہلے اپنے شوہر اور جوان بیٹی کے ساتھ جاتا رہا۔ اس کی بیٹی تھی۔ پنڈت پر گھیا راج اور اس کے دو بچپنوں نے اس کی بیٹی کی عزت کو تار تار کر دیا۔ باپ نے بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”اسی گنگوڑی مندر میں؟“ دیگاوٹی بولی۔

”نہیں۔ اس روز وہ تینوں پہاڑیوں میں ایک مندر کی پاترا کرنے کے لیے گئے تھے۔ بارش شروع ہو گئی اور انہیں رات اسی مندر میں پرکنا پڑا۔“ میں نے کہا اور پنڈتوں کی خاموشی کے بعد اسے چڑا پر تھ کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگا۔ ”اس کے سینے میں انعام کی آگ بھڑک رہی تھی۔“ میں آخر میں کہہ رہا تھا۔ ”پنڈت پر گھیا راج کے دو بچپنوں نے اس رات اس کے کالج میں جل کر ختم ہو گئے تھے اور کل پر گھیا راج اس کے ہاتھوں مارا گیا۔“

”اور جاگی؟“ دیگاوٹی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے وہ تمہاری بیٹی (بیوی) تھی؟“

”نہیں۔ جاگی میری دوست تھی۔ ہمارا کئی برسوں کا ساتھ تھا۔“ میں نے کہا۔

”تم کون ہو؟“ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ”پنڈت نگہ سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

”وہ میرے ماں باپ کا ہتیار (قاتل) تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسا کہ تم جان چکی ہو، وہ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ کئی سال پہلے اس نے سنگاپور میں میرے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں کسی لمحہ بچ گیا۔ میں دارا کے اس جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہتا تھا اور میں اس سے چھپتا بچ رہا تھا۔ مجھے جس نے بھی پناہ دی اسے اس شیطان نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جاگی بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی جس نے میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔“

”پہلے میں دارا سے چھپتا رہا تھا اور جب میں زمین؟ قدم بچانے کے قاتل ہوا تو دارا مجھ سے بچنے کے لیے جاننا رہا۔ جاگی نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور بالآخر اس نے بھی

اپنی جان لٹا دی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ کبھی نہیں۔“

میرا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ روپ متی بھی اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے مجھے اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا۔

ٹھاکر مجھے اٹھا کر باہر لے گیا۔ ہم دیر تک درختوں کے نیچے بیٹھے رہے۔ تازہ ہوائے خوشگوار اثر ڈال رہا تھا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ٹھاکر ناشتے کا سامان لینے کے لیے بازار چلا گیا۔

تین دن گزر گئے۔ میں اس دوران میں کالج سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ ٹھاکر روپ متی اور بلا کے دل بھی جیسے مجھ سے گئے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر کالج ہی میں رہے۔ دیگاوٹی بھی خاصی ساڑھ ہوئی تھی۔ دارا اور پنڈت پر گھیا راج کی حقیقت جاننے کے بعد اسے بھی ان جیسے لوگوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ تو خود اس تجربے سے گزر چکی تھی۔ ان کی ہوس کا شکار ہو چکی تھی۔ اسے کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود تل چلی تھی۔ اس طرح ابڑ کر اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے ٹھاکر کی پیشکش قبول کر لی اور ہمارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس سے اگلے روز میں نے بھی اپنے ان دوستوں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اس وقت میری بات سن کر وہ سب ہی چونک گئے تھے۔

”راج کمار روپ متی جی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارا زر خرید غلام ہوں۔ میں تمہاری کوئی سیوا نہیں کر سکا نہ ہی وہ قیمت ادا کر سکتا ہوں لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا جس پر میرا خیر مجھے ملامت کرتا رہے اس لیے میری خواہش ہے کہ تم مجھے آزاد کر دو۔ زندگی رہی اور قسمت نے ساتھ دیا نہیں اپنی قیمت پکانے کی کوشش کروں گا۔“

”ہمت سنگھ!“ روپ متی کے چہرے کا رنگ ایک دم خیر ہو گیا اور پھر وہ امانت انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میری بیٹائی اور گالوں پر بوسہ دیتی رہی پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری آنکھوں میں بھجائے ہوئے پانی کی کہہ رہے تھے۔ ”تم نے تمہارا حساب ہے جسے میں بے باق کرنا چاہتا ہوں۔“

جیون کے راستے بدل دیے۔ مجھے گناہ کی دلدل سے نکال کر اس مقام پر لاکھڑا کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تم بہت مہمان ہو ہمت سنگھ۔ میں تمہارے احسانوں کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گی لیکن۔ لیکن۔“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔“

”مجھے جانا ہی ہو گا روپ متی جی۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا مشن پورا ہو گیا ہے۔“ روپ متی نے کہا۔ ”تم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے ماما پاپا (والدین) کے ہتیاروں (ہاتھوں) کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دو گے، جین سے نہیں بیٹھو گے تمہارے سارے دشمن زک (جنم) میں پہنچ چکے ہیں۔ اب تمہارے لیے ایسا کوئی کام نہیں رہا۔ تم نے بہت کشت اٹھائے ہیں۔ اب کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہ کر آرام کرو اور پھر کوئی بڑی شے شروع کر دو۔ ٹھاکر اپنا ہوٹل تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہے۔“

”نہیں روپ متی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں کے تو پہلے ہی مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں گردن نہیں اٹھا سکتا اور پھر میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا۔ میرے دل میں ایک کانٹا باقی رہ گیا ہے۔ میں اسے بھی نکال دینا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ روپ متی نے مجھے گھورا۔ ”دارا ہی اصل آدمی تھا جسے تم نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اب کون سا کانٹا رہ گیا ہے؟“

”دارا تو جین کی بساط پر ایک مہرا تھا جس کے ہاتھوں میرے ماں باپ قتل ہو گئے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ان مہروں کو حرکت دینے والا اصل شیطان تو ابھی باقی ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ روپ متی نے پوچھا۔

کوئی فائدہ نہیں۔ تم ہمارے ساتھ بے پور چلو اور سب کچھ بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کی کوشش کرو۔“  
 ٹھاکر بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا۔ اس نے مجھے روکنے کے لیے یہ پیشکش بھی کر دی کہ ہوش کے علاوہ نیلے والی جوبلی بھی مجھے دینے کو تیار ہے۔  
 ”میں تمہاری مہربانیوں اور محبت کو کبھی نہیں بھول سکوں گا ٹھاکر۔“ میں نے کہا ”لیکن مجھے مجبور مت کرو۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”کہاں جاؤ گے؟“  
 ”نی الحال تو میں رشی کیش جاؤں گا۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد پنجاب کی طرف نکل جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔“ ٹھاکر نے کہا ”میں جانتا ہوں کہ نہ تو ہوا کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاسکتی ہیں اور نہ ہی بگولوں کو قید کیا جاسکتا ہے لیکن کم از کم آج کا دن تو ہمارے پاس رک جاؤ۔ کل ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں کل روانہ ہو جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر وہ پورا دن ہم نے کانچ ہی میں گزارا۔ ٹھاکر صرف دوپہر اور رات کا کھانا لینے کے لیے بازار گیا تھا۔ وہ رات بھی ہم نے گاتے ہوئے گزاری۔ دیگاؤں بھی ہماری باتوں میں پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ سب سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس کے اطمینان اور بے تکلفی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے دل سے ہر قسم کا خوف نکل گیا تھا۔

بلا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ یوں تو میرے جانے کے فیصلے سے روپ متی اور ٹھاکر بھی اداس تھے لیکن بلا کی کیفیت کچھ اور تھی۔ اس نے ایک مرتبہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن میں نے ہر مرتبہ اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ محبت کے سیلاب کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں ہوتا لیکن میں بلا کو ہر وقت یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ جس راستے پر چلے گی کوشش کر رہی ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ میری باتوں کا بلا پر اثر ہوا تھا یا نہیں؟ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ پریشان ضرور ہوگی۔

ہم رات بھر جاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح ناشتے کے بعد ہم لاری اڑے پر آگئے۔ اس وقت

آٹھ بجے تھے۔ رشی کیش کی ایک بس چاچا کی تھی اور دوسری نو بجے جانے والی تھی۔ میں نے ٹکٹ لے لیا اور ہم ایک چھوٹے پریشہ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنا بیگ گود میں رکھ لیا تھا۔ ٹھاکر نے مجھے اچھی خاصی رقم دے دی تھی جو کی نوڈ تک میرے کام آسکتی تھی۔

رشی کیش جانے والے بہت سے مسافر لاری اڑے پر موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ ان میں عرب بھی تھے اور عورتیں بھی۔

رشی کیش یوگا کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دنیا بھر سے لوگ یوگا سیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ یوگا صرف ورزش ہی نہیں ہے تو سمندر کی طرح بہت گہرا اور بہت گہرا علم تھا اور اس پر اسرار علم کو سیکھنے کی جستجو لوگوں کو دنیا کے دور دراز گوشوں سے یہاں پہنچ لاتی تھی۔

بس کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے۔ میں بھی اپنے دو ستوں سے رخصت ہونے لگا۔ ان سب نے بڑی گرم جوشی سے مجھے ہینے سے لگا کر بھیجا۔ سب کی آنکھیں پھلکی ہوئی تھیں۔ بلا غیظ نہیں کر سکی اور آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں پر بہ نکل۔

ان سے رخصت ہو کر میں بس میں آگیا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ دو غیر ملکی اگر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی اور دوسرا اوجیز عمر مرہو۔ ان کا تعلق یورپ کے کسی ملک سے تھا۔ بس میں ان کے اور ساتھی بھی تھے جو دوسری سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

بس حرکت میں آئی تو میں ٹھاکر وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ سب بھی ہاتھ ہلا رہے تھے۔ بس آگے نکل آئی۔ میں اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد بس ہرودار کی شری حدود سے نکل کر رشی کیش کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

سڑک کے دونوں طرف مہاڑیاں بنزے سے لدی ہوئی تھیں۔ دھلاؤں پر رنگ بڑے پھولوں کی گویا چادریں کا چھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے تھالی لینڈ میں چپانگ رائے اور چپانگ سین کے پہاڑی علاقوں میں بھی سڑک کیا تھا۔ اسی طرح بنزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، مسکن ہوئی وادیاں اور سنگلاخی ہوئی ندیاں لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ حالیہ کی تباہیوں میں واقع یہ خطہ اس سے کس زیادہ حسین تھا۔

رشی کیش ہرودار سے اگرچہ صرف چوبیس کلومیٹر کے

فاصلے پر واقع ہے لیکن بل کھاتا ہوا راستہ بہت خطرناک تھا۔ کس بلندیوں تھیں، کہیں پستیاں اور کہیں نہایت خطرناک موڑ۔ ڈرائیور کی معمولی سی غفلت بس کے مسافروں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

چوبیس کلومیٹر کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ شہر بھی بازوؤں پر بکھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ مندر دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑیوں پر اور ان کے وادوں میں بنے ہوئے مکان بہت بے گل رہے تھے۔

رشی کیش کالاری اڈا زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا میدان اور اس کے اطراف میں ٹھیکری ہوئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں۔ زیادہ تر عمارتیں لکڑی کے تختوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔

میں بس سے اتر کر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا۔ چائے پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھے گوتم بھوش کو تلاش کرنا ہے۔ یہ وہی یوگی تاجس کے بارے میں مجھے چڑا رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے تک میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر لاؤنجر پیسے دیتے ہوئے میں نے گوتم بھوش کے بارے میں دریافت کیا تو اس شخص نے کندھے اچکا دیے۔

”یہاں تمہیں قدم قدم پر یوگی ملیں گے۔ کسی ایک شخص کے بارے میں سب لوگ نہیں جانتے۔“ اس شخص نے کہا ”وہیے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم ادھر ادھر گھومنے کے بجائے بھوت ناتھ آشرم چلے جاؤ۔ وہاں ویرول کو پوچھ لیتا۔ وہ گائیڈ ہے اور بہت سے یوگیوں کو جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے، تمہیں گوتم بدھ کے بارے میں بتا دے۔“

”گوتم بدھ نہیں۔ گوتم بھوش۔“ میں نے نام کی تصحیح کی۔  
 ”وہی وہی۔“ اس شخص نے کہا ”یہاں سے نکل کر بائیں طرف چلے جاؤ۔ کسی سے بھی پوچھ لینا، آسانی سے بھوت ناتھ آشرم پہنچ جاؤ گے۔“

میں ریسٹورنٹ سے نکل کر بائیں طرف چل پڑا۔ ہر دوڑ کے مقابلے میں زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں پہاڑ بھی زیادہ تھیں۔ میں بیک کندھے پر لٹکا کر ایک طرف نظر آئے تھے۔ اس چھوٹے شہر میں مجھے کئی قومیتوں کے لوگ بھی تھے۔ کئی ایسے غیر ملکی، مسلمان، ہندو، عیسائی، بہت سے غیر ملکی ملک کے لوگ۔ کئی ایسے غیر ملکی بھی نظر آئے تھے جو میری طرح گھوم رہے تھے۔

یوگا کا مرکز ہونے کے علاوہ رشی کیش کو مندروں اور آشرم سراؤں کا شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں قدم قدم پر مندر تھے اور آشرم تھے۔ لاتعداد چھوٹے چھوٹے رہائشی ہوٹل اور ریسٹورنٹ کیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ مجھے کئی جگہ ہوٹلوں اور کیسٹ ہاؤسز کے ایجنٹوں نے روکا تھا لیکن رہائش کے لیے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرنے سے پہلے میں یوگی گوتم بھوش کو تلاش کر لینا چاہتا تھا۔

بھوت ناتھ آشرم تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک پہاڑی کے وادوں میں چھوٹوں اور لکڑی کے تختوں کی دو منزلہ عمارت خاصی بڑی تھی۔ نیچے چارنٹ تک چھوٹی دیواری تھی اور اوپر سارا کام لکڑی کا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک مندر بھی تھا۔ بھوت ناتھ دراصل اس مندر ہی کا نام تھا اور یہ آشرم بھی اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

آشرم کے چھوٹے سے دفتر میں تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ چوکی کے سامنے بیٹھا ہوا باریک موچھوں والا شخص اس آشرم کا نشی تھا۔ میں نے ویرول کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے باہر کی طرف اشارہ کر دیا۔

باہر آشرم کے سامنے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر ایک ڈھابا سا بنا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا ایک بڑا سا کہن تھا جو لکڑی ہی کے ستونوں پر زمین سے تقریباً تین فٹ اونچا تھا۔ اس کے اندر دوکان دار بیٹھا ہوا تھا اور باہر ایک آدمی کھڑا اس سے باتیں کرتے ہوئے بڑی کے کش لگا رہا تھا۔

وہ ویرول تھا جو فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ویرول کا گائیڈ تھا لیکن اس کے پاس لائسنس نہیں تھا اور وہ گھوم پھر کر اپنے گاہک تلاش کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ ایسا سیاح سمجھا تھا جسے اس کی خدمات درکار تھیں لیکن جب میں نے اس سے یوگی گوتم بھوش کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے چہرے پر ایسی چھائی۔

”وہ تو تین دن پہلے دھرم شالا چاچا ہے۔ اگر اس کے ڈیرے پر جانا چاہو تو میں تمہیں وہاں پہنچا سکتا ہوں۔ پانچ روپے دینے پڑیں گے۔“ ویرول نے کہا۔  
 ویرول نے زیادہ مایوسی تو مجھے ہوئی تھی لیکن بہر حال، میں نے اس کے ساتھ جانے کی ہائی بھلی اور جب سے پانچ روپے کا ایک سکہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تمنا دیا۔

گوتم بھوش کا ڈرا دیاں سے خاصا دور تھا۔ یہ بھی لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک کہن تھا۔ ویرول راستے میں مجھے مندروں اور دوسری چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس

طرح اس نے میری معلومات میں اضافہ کر کے پانچ روپے وصول کرنے کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔

اس کہیں میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایک ہندو تھا اور دوسرا بدھ بھکشو۔ میں دیر تک بھکشو سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ گوتم بھوش دھرم شالا چاچکا ہے اور اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے مجھے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ میں چاہوں تو یوگا کیلئے کے لیے اس کی شاگردی اختیار کر سکتا ہوں۔

”ٹھیک ہے اگر ضرورت محسوس کی تو میں دوبارہ تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

میں شکر کی طرف واپس آ گیا۔ لاری اڑے پر پہنچ کر دھرم شالا کی بس کے بارے میں معلوم کیا تو بتا چلا کہ میاں سے کوئی بس سیدھی دھرم شالا نہیں جاتی۔ بلکہ مجھے شملہ جانا پڑے گا۔ رات وہاں گزارنے کے بعد اگلے روز صبح دھرم شالا کی بس لے لی۔

مجبوری تھی۔ مجھے کم از کم یہ رات تو رشی کیش میں گزارنی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر میاں کوئی باہر یوگی مل جائے تو چند روز ہمیں رہ جاؤں گا۔

میاں یوگیوں کے کئی سینٹرز تھے۔ میں مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ کئی سینٹروں پر یوگا کی مشق کے کئی دلچسپ مناظر بھی دیکھے۔ ایک ہندو یوگی آہنی کیلوں کے بستروں پر رہتا تھا۔ ایک یوگی کو ایک ٹانگ پر کھڑے دیکھا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ صبح بچے سے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے اور شام چھ بجے تک اسی طرح کھڑا رہے گا۔ ایک اور یوگی کو سر کے بل کھڑے دیکھا۔ ان کے علاوہ مختلف یوگی مختلف آسنوں میں نظر آئے۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا اور اس کے بعد ایک بار پھر کسی یوگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک جگہ میں ایک بوڑھے ہندو یوگی کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ خاصا بوڑھا تھا۔ اس کے بدن پر ایک مختصر سے لنگوٹ کے علاوہ لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مختلف شعبے دکھا رہا تھا۔ میں دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا اور جب وہ اپنی شعبے بازی سے فارغ ہوا تو میں اس کے قریب زمین پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ برقی روشنیاں بجناک اٹھی تھیں۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا اور کھانا کھاتے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ دو چار روز یہاں رہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کھانا کھانے کے بعد میں کسی گیسٹ ہاؤس کی تلاش کرنے چل پڑا۔ آٹھروں، ہٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کی میاں کی نہیں تھی۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ٹھٹک کر رک گیا اور پھر جیسے ہی پیچھے مڑا، اچھل پڑا۔ وہ سونیا تھی!

سونیا کو میاں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دور دراز خطے میں کسی کا ہاتھ سے ملاقات ہو سکتی ہے اور جانکار بھی وہ جو میرے قریب بلکہ بہت قریب رہ چکا ہو۔

سونیا کے چہرے کے تاثرات ابھی کچھ عجیب سے تھے اسے بھی یقیناً میاں مجھ سے ملاقات کی توقع نہیں تھی۔

سونیا سے میری آخری ملاقات تقریباً تین مہینے پہلے پور میں ہوئی تھی۔ میں نے جاگتی کو اس کے بارے میں بتایا تھا لیکن ان دونوں کا آپس میں سامنا نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں بلونت سنگھ، رامو بد معاش اور اس کے گروگن سے ہماری غرضی ہوئی تھی۔ ہم اگرچہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کے ساتھ رہ رہے تھے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے لیکن جب رامو بلونت سنگھ اور دارا جیسے کینے و شمنوں سے مقابلہ چل رہا ہو تو اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ نہیں سمجھا جاسکتا۔ میں ماضی کے تجربات نہیں بھولا تھا۔ دارا نے بیش چھپ کر دارا کرنے کی کوشش کی تھی اور بے پور میں بھی اسی سوچ کے چپنی نظر میں نے ٹھاکر کی جوبلی کے علاوہ کسی اور محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی ہنگامہ صورت حال میں وہاں پناہ لے سکیں اور اس مقصد کے لیے میں نے سونیا کو ایک خطرناک رقم بھی دی تھی تاکہ وہ کسی مکان کا بندوبست کر سکے لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ سونیا اس کے بعد ملاقات ہی نہ ہو سکی۔

ہم بلونت سنگھ اور دارا کے تعاقب میں سار کا پل گئے۔ جہاں چوہدری ڈاکو کے آدمی بلا کو اٹھا کر لے گئے۔ کئی روز اس مہم میں لگ گئے۔ ڈاکو بلا کے ساتھ کئی اور بیادوں کو بھی اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے۔ پولیس ان کے منہا ہوں کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے میں بالکل ناکام رہی تھی اور بالآخر میں اکیلا جنگل میں گھس گیا تھا اور ایک زبردست معرکے کے بعد میں نے نہ صرف بلا اور دوسرے لوگوں کو چھڑا لیا بلکہ خطرناک ڈاکوؤں کے اس گروہ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ گنگولی چوہدری میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ نے سیکڑوں مربع میل کے علاقے

میں پناہ پھیلا رکھی تھی۔ کوئی بہت محفوظ نہیں تھی۔ لوگ خوف و ہراس میں زندگی گزار رہے تھے لیکن میرے ہاتھوں اس گروہ کے خاتمے سے لوگوں کو خوف و وحشت سے نجات مل گئی۔

ہم بلونت اور دارا کی تلاش میں سار کا گئے تھے لیکن وہاں ہماری اپنی انجینس بڑھتی رہیں۔ جنگل سے بلا کی رہائی اور چوہدری کے گروہ سے نکلنے کے بعد روپ متی اور ٹھاکر ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ ٹھاکر کو زیادہ چوہدری نہیں آتی تھی لیکن روپ متی کی جان کے لالے بڑھ گئے۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے ہم نے کیا چھ نہیں کیا تھا۔

اسی دوران میں ہمیں پتا چلا کہ بلونت اور دارا اصل رتھ کے قریب پھاڑیوں کی طرف چلے گئے ہیں جہاں کالی کے مندر میں انسانی جانوں کی بیعت دی جاتی ہے۔ روپ متی کی حالت سبھل گئی تھی۔ میں جاگتی اور ٹھاکر، دارا کے تعاقب میں کالی کے مندر کی طرف چلے گئے۔ وہاں ایک معمر کے میں بلونت مارا گیا اور دارا جاگتی کو زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ پولیس کا ایک نمائندہ ڈنٹے دار اور فرض شناس (میری نظروں میں) آئمر کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کا مال لوٹ کر فرار ہو گیا۔

سار کا سے واپس آ کر بے پور میں ہماری کچھ اور مصروفیات رہیں۔ اس دوران میں ہمیں نے کئی مرتبہ سونیا سے ملنا چاہا تھا لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی مسئلہ آؤے آتا رہا اور پھر ہینڈ سوبھراج سے ملاقات ہو گئی جس نے پٹنے کے بعد میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور پھر میں اور سوبھراج دارا کی تلاش میں ہر دور آ گئے۔

ہر دور میں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ جان چکے ہیں اس لیے ہم مزید تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ دارا کو ہم رسید کرنے کے بعد بلا، روپ متی اور ٹھاکر جیسے خلائوں سے رخصت ہو کر میں رشی کیش چلا آیا تھا۔ میرا غرض تھا کہ میاں کچھ عرصہ یوگی گوتم بھوش کے پاس رہ کر کچھ کام حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے بعد پنجاب سے نہ ہوا ہوا عرصہ یاد کر کے پاکستان پہنچ جاؤں گا جہاں لاہور میں چوہدری نواز علی سے اپنے والدین کا پرانا حساب چکانا تھا۔ والدین کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔

مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ یوگی گوتم بھوش میاں سے باجکا ہے اور اب سونیا کو اپنے سامنے دیکھ کر میری

مایوسی حیرت میں بدل چکی تھی بلکہ سونیا کو میاں دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔

”اے! تم یہاں کیا جھک مار رہی ہو۔“ میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ موسم میں خنکی ہونے کے باوجود وہ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔

”میں سوال میں تم سے کر سکتی ہوں۔“ سونیا یہ کہتے ہوئے والدین انداز میں مجھ سے لپٹ گئی اور میرے گالوں اور پیشانی پر پٹا بٹ پٹے دینے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ مسکراتی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی کے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں سربراہ بوس و کنار کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو اور جاگتی کہاں ہے؟“ اس نے مجھ سے الگ ہو کر کہا اور مجھس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

جاگتی کے نام پر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ سونیا نے میرے چہرے سے میری کیفیت کو بھانپ لیا۔

”کیا بات ہے جاگتی کا نام سن کر تم خاموش کیوں ہو گئے۔ وہ ٹھک تو ہے؟“ وہ بولی۔

”جاگتی مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ دو۔۔۔ بہت دور جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوئی۔“ میرے لہجے میں بھی افسردگی نمایاں تھی۔

”اوہ! کیا ہوا اسے؟“ سونیا بھی ایک دم افسردہ ہو گئی۔

”آؤ۔۔۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ہم اسی ریسٹورنٹ میں آ گئے جہاں سے کچھ دیر پہلے میں کھانا کھا کر نکلا تھا۔ میں نے کافی منگوائی اور کالی کی چٹکیوں کے دوران میں اسے جیتے ہوئے واقعات اور جاگتی کے بارے میں بتا رہا۔ سونیا سے بھی جاگتی کا طویل ساتھ رہا تھا۔

جاگتی کی موت کا سن کر وہ بھی رنجیدہ ہو گئی۔

”تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے۔“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ”تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ کسی کے ساتھ آئی ہو یا۔۔۔“

تھیں پھر اس یوگی نے مشورہ دیا کہ وہ رشی کش جلی جائے یہاں کی آب و ہوا سے بھی اس پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس ہندو یوگی نے یہاں اپنے گرد کا پتا بتا دیا تھا۔ ہم تقریباً ایک ہفتے سے یہاں ہیں اور تمہ۔“ اس نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا ”میرا خیال ہے تم کچھ دیر پہلے ہی یہاں آئے ہو۔ شاید آخری بس سے جو پانچ بجے کے قریب یہاں پہنچی ہے۔“

”میں صبح گیارہ بجے کے قریب یہاں آیا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”یہاں رہائش کا بندوبست کرنے سے پہلے میں ایک یوگی کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں بتا چلا ہے کہ وہ دھرم شالا جا چکا ہے۔ اب مجھے رہائش کے لیے کسی جگہ کی تلاش تھی۔“

”اب تمہیں کوئی جگہ تلاش نہیں کرنی پڑے گی۔“ سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں اپنی پاس کے ساتھ ایک کالج میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ کالج کافی کشادہ ہے اور میرا خیال ہے تمہارے وہاں آجائے سے شوہا دیوی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے اس سے تمہارا عاتبانہ تعارف کرا رکھا ہے۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔“

”تو پھر چلو۔ صبح سے ان اوچے نیچے راستوں پر پھرتے ہوئے تھک گیا ہوں اور کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ سونیا ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے آئی تھی کہ مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ریسٹورنٹ سے نکلنے کے بعد اس نے ایک ڈھابے سے مطلوبہ چیزیں خریدیں اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلا رہا۔

وہ کالج وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ اس پہاڑی پر بھی چڑا اور چار کے درختوں کی ہمتاں تھیں۔ مل کھاتے ہوئے راستے کے دونوں طرف رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی خود رو جمائیاں تھیں۔ وہ کالج تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر تھا جبکہ وہ راستہ کالج کے قریب سے گزرتے ہوئے مزید اوپر چلا گیا تھا۔ پہاڑی پر اوپر بھی ٹھوڑے ٹھوڑے فاصلے پر اور بھی کالج اور ہٹ تھے۔ درختوں میں کہیں کہیں ان کا شجر میں جلتی ہوئی روشنیاں اچھی لگ رہی تھیں۔

سونیا والا کالج ایک کھلی جگہ پر تھا۔ آس پاس کی جگہ یا تو درختوں سے محروم تھی یا درخت کاٹ ڈالے گئے تھے۔ تغیر کے حوالے سے یہ کالج بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ چار فٹ تک پتھروں کی دیواریں اور اس سے اوپر لکڑی کے

تختے۔

اس کالج کے تین کمرے تھے۔ ایک نشست گاہ اور دو بیڈ رومز۔ نشست گاہ میں ایک کافی ٹیبل، ایک عارضہ سا صوفہ سیٹ اور تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سونیا نے وہاں بٹھا کر دائیں طرف والے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی پاس شوہا بھی تھی۔

جے پور میں سونیا سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ جس ہوٹل میں وہ کام کرتی ہے اس کی مالکین ایک بیوہ عورت ہے۔ بیوگی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک بوڑھی عورت کا تصور ابھرا تھا لیکن اسے دیکھ کر میں چونے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز قامت، چھریا بدن، چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے لیکن پڑھوگی اس کے حسن کو مٹا کر رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑھی پن رکھی تھی۔ جو اس کے پیوہ ہونے کی نشان دہی کر رہی تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام (سلام) کیا ”بیٹھو نا۔ کھڑے کیوں ہو۔“ میں صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بھی میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ کر بات جاری رکھتے ہوئے ہوئی ”سونیا نے مجھے جے پور میں تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ تمہارے ساتھ واقعی بہت انیائے (ظلم) ہوا ہے۔ میں نے سونیا سے کہا تھا کہ تمہیں میرے پاس لے کر آئے لیکن تم نے دوبارہ سونیا سے بھی رابطہ نہیں کیا جس سے وہ بہت پریشان رہی تھی۔“

”کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے میں سونیا سے بھی رابطہ نہیں کر سکا تھا۔“ میں نے کہا ”میں ان دنوں جے پور سے باہر ہی رہا اور واپس آیا تو چند روز بعد مجھے ہر دور آنا پڑا۔ آج صبح یہاں آیا ہوں۔“

”ابھی سونیا بتا رہی تھی کہ تم رہائش کے لیے کوئی جگہ ہاؤس تلاش کر رہے تھے۔“ شوہا نے کہا ”کیٹ ہاؤس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں بڑی مختصر نشست ہے۔ تم یہاں رہ سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں بھی ڈھارس رہے گی۔ ہمیں اکیلی سمجھ کر۔“

”کوئی مسئلہ؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پرسوں رات۔“ شوہا کے بجائے سونیا نے جواب دیا۔ ”پرسوں رات کوئی ہمارا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”میں نے کئی سے شور مچا دیا تو وہ بھاگ گیا۔“

میں نے جب تک میں یہاں ہوں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا ”لیکن میں بھی زیادہ دنوں تک یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے دراصل ایک یوگی کی تلاش ہے جو دھرم شالا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے اس کے پیچھے جانا پڑے۔“

جو تم بھوش کے تذکرے کے ساتھ ہی ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ شوہا نے خوابی کا شکار تھی۔ اسے بائی بلڈ پریشر تھا۔ سانس کی تکلیف بھی تھی اور دل کی مریضہ بھی تھی۔ وہ اگرچہ ان تکالیف کا ایلیو پیٹنک علاج بھی کر رہی تھی لیکن کسی بھر دے نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ان بیماریوں کے علاج کے لیے کسی یوگی کی خدمات حاصل کرے۔ پہلے اس نے جے پور ہی میں ایک یوگی کی خدمات حاصل کیں اور پھر یہاں آئی اور تقریباً ایک ہفتے سے یوگی ویراج کی ہدایات کے مطابق شیو آسن پر عمل کر رہی تھی۔ خون کے دباؤ کو نارمل رکھنے کے لیے یوگا میں اس سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔

شوہا مجھ شام پندرہ بیس منٹ کے لیے یہ ورزش کر رہی تھی۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اسے رات کو سونے کے لیے خواب آور گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ رات کو کوئی کھائے بغیر سونکھ کی میٹھی نیند سوتی تھی۔

آج کے مشینی دور میں انسان افزا تفری کا شکار ہے۔ جذباتی غلطیوں نے اسے ادھ موا کر رکھا ہے۔ کسی کے پاس ان اوقات میں کہ اپنی صحت پر قرار رکھنے کے لیے وقت طلب ورزشیں کر سکے لیکن یوگا کی ورزشوں پر کم سے کم وقت میں اور زیادہ آسانی سے عمل کر کے اپنے آپ کو چاق و چوبند اور تندرست و توانا رکھا جاسکتا ہے۔

یوگا کی یہ ورزشیں نئی نہیں، ہزاروں سال سے ان پر عمل ہو رہا ہے اور یوگا صرف ورزشوں کا نام ہی نہیں، ایک فن اور سندھ کی طرح گہرا اور پُر اسرار علم ہے اور یہ پُر اسرار علم ہزار ہا سال سے سادھوؤں، یوگیوں اور راہبوں سے بڑے پُر اسرار علم کو عام لوگوں سے پیشہ خفیہ رکھا گیا۔ صرف خاص ہی اس سے فائدہ اٹھاتے رہے اور یہ علم عام آدمی کی دسترس سے دور رہا۔

یوگا کی مشقیں آج سے نہیں، ہزار ہا سال سے لاکھوں انسانوں کو روشن ضمیری کی دولت سے مالا مال اور سپر نارمل صلاحیتوں سے بیکس کر چکی ہیں۔ سانس کی مشقیں یوگا کی مشقوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس دم کی مشق انسانی

قوت میں غیر معمولی حرکت پیدا کرتی ہے۔ ایک پُر اسرار قوت ریڑھ کی ہڈی کی چمکی یت میں سانپ کی طرح کندلی مارے خوابیدہ حالت میں ہوتی ہے۔ سانس کی مشقوں سے یہ قوت بیدار ہو کر دماغ کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔ یہ بڑا ٹھنکن مرحلہ ہوتا ہے۔ بھی کبھی یہ قوت آزاد ہو کر انسان کے دماغی اور اعصابی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ مشقیں کسی ماہر استاد کی نگرانی ہی میں کی جائیں۔

ہو سکتا ہے، کچھ لوگ اس سے اختلاف بھی کریں لیکن اس حقیقت سے تو بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اسے بے پناہ قوتیں بھی عطا فرمائیں۔ بعض قوتیں تو ایسی ہیں جن سے ہر کوئی واقف ہے لیکن بعض قوتوں کو انسان سے پوشیدہ رکھا اور انسان کو یہ قدرت بھی دی کہ وہ مختلف ریا مشقوں سے اپنے اندر پوشیدہ ان قوتوں کو اجاگر کر سکے۔

یوگا کے ماہرین نے ان ہی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے تجربات کیے اور انسان کے اندر بے شمار پُر اسرار پوشیدہ قوتوں کا سراغ لگایا اور کئی قسم کی ریاقتیں ایجاد کیں جن کے ذریعے جسم کے ہر عضو کو کنٹرول کیا اور یہاں تک کمال حاصل کر لیا کہ جب دل چاہا، دل کی حرکت بند کر کے ایک معین مدت کے لیے مصنوعی موت طاری کر لی۔

چھٹی حس کے بعد انسان میں اور بھی کئی حسیں موجود ہیں جو بعض اوقات خود بخود اور بعض اوقات مشقوں سے بیدار کی جاسکتی ہیں اور پھر فطرت کے خلاف بھی کام کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ خلاف فطرت اس کام کے بعد ازاں بڑے بھیاک نتائج سامنے آتے ہیں۔

شوہا حیرت سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹ سے بول پڑی۔ ”سونیا۔ یوگی مہاراج کی کل سے چھٹی کر دو۔ ہم پرسوں جے پور واپس جا رہے ہیں۔ تمہارا یہ دوست بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔“

”یوگی مہاراج کی چھٹی کیوں کر دی جائے دیدی؟“ سونیا حیرت سے بولی۔

”اب مجھے کسی گرو کی ضرورت نہیں۔“ شوہا نے کہا ”میں نے تمہارے دوست و جدان کو گرو مان لیا ہے۔ مجھے دشواری ہو گیا ہے کہ یہ بھی بہت دھارمک یوگی ہے اور یہ میرا علاج کر سکتا ہے۔ اب مجھے کسی اور یوگی کی ضرورت نہیں۔“ ”نہیں شوہا جی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”میں یوگا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو خود کچھ سیکھنے کے لیے

یہاں آیا ہوں۔ آپ کو تو ماہر یوگی کی ضرورت ہے۔ آپ یہاں اپنی مشقیں جاری رکھیے۔ اس وقت آپ جو مشقیں کر رہی ہیں وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو بتدریج دوسری مشقیں بھی کرائی جائیں گی اور آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔  
”تو ٹھیک ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں تم ہمارے ہی پاس رہو گے“ شوبھانے کہا۔

اور پھر باتوں ہی باتوں میں یہ انکشاف ہوا کہ دھیراج نامی جس یوگی سے شوبھا راہنمائی حاصل کر رہی تھی وہ پانچ سو روپے ہفتہ معاوضہ لے رہا تھا اور ایک مہینے کا معاوضہ ایلڈوائس لے چکا تھا۔ وہ صرف دو وقت مشق کرواتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ صبح اور پندرہ بیس منٹ شام کو۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے شوبھا سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بتانے لگی کہ اس کا شوہر ڈاکٹروں کے شریا ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس کے رشتے داروں نے ہمدردی نہ کرنا دیکھا ہے اس کی جائداد بھتیانے کی کوشش کی تھی۔ اسے بڑے سبز باغ دکھائے تھے لیکن وہ کسی کی باتوں میں نہیں آئی۔ اس کے پیٹھ نے زبردستی اس بلڈنگ پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ شوبھا کو بلڈنگ سے نکال دیا گیا تھا لیکن شوبھانے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے پاس شوہر کا وصیت نامہ موجود تھا جس میں شوبھا کو اس کی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ شوبھانے اپنے پیٹھ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور شوہر کا وصیت نامہ بھی عدالت میں پیش کیا۔ اس طرح شوبھا کو اپنے شوہر کی جائداد مل گئی۔

یہ بلڈنگ گرائے پر اٹھی ہوئی تھی جسے شوبھانے خالی کروا لیا اور گراؤنڈ فلور پر ایک معیاری کافی ہاؤس قائم کر کے اوپر کے حصے پر رہائش اختیار کر لی۔ اسے کچھ مخلص لوگ بھی مل گئے تھے جو نہ صرف اخلاقی طور پر بلکہ کاروبار میں بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس طرح شوبھانے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور وہ بڑی ثابت قدمی سے زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔

شوبھا کی کمائی ان ہزاروں عورتوں سے مختلف نہیں تھی جو تیارہ جانے کے بعد ظلم و ستم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ بعض ہمت ہار کر حالات کے سامنے سر جھکا دیتی ہیں اور بعض سینہ تان کر میدان میں اتر آتی ہیں۔ شوبھا کا شمار بھی ایسی ہی عورتوں میں ہوتا تھا جو زندگی کے آخری لمحوں تک بھی

حکمت تسلیم نہیں کرتیں۔

شوبھا کی بارہ بجے کے قریب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور سونیا کچھ دیر بیٹھک ہی میں بیٹھ رہے تھے۔ سونیا اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے دونوں کپ میز پر رکھ دیے اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ہوئی۔

”تم کافی ہو۔ میں کپڑے تبدیل کر لوں۔“

سونیا کمرے میں چلی گئی۔ میں کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ اس نے کافی واقعی بہت خوش ذائقہ بنائی تھی۔ کوئی چڑھنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میرا خیال تھا یہ آواز کچن کی طرف سے آئی تھی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ میری نظریں کمرے کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

کمرے کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور سونیا عین سامنے کمرے میں کھڑی اپنے جسم پر سے لباس اتار رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور دماغ میں سنسنات سی ہونے لگی۔

سونیا کا دھیمان دوسری طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے کمرے میں جان بوجھ کر کوئی چڑھ گرائی تھی اور غافلانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

میں اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ میری نظریں دروازے کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ مجھے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کمرے کے سانس لینے لگا۔ وہ منظر میرے ذہن میں گھوم گیا جب گولڈن ٹرائی اینٹھل کے ایک غار میں اسی سونیا نے مجھے بچھاڑ دیا تھا اور اب یہ وہی سونیا تھی جو ایک بار بھر میرے راستے میں آگئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے سونیا کے ساتھ یہاں آکر غلطی تو نہیں کی!  
”ارے! جو گئے کیا؟“

سونیا کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھ کر میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن تب تک ایسا کر سکتا تھا۔ مجھے دوبارہ آنکھیں کھولنا پڑیں۔

سونیا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے شب خواب کا باریک لباس پہن رکھا تھا جس سے اس کا بدن جھک رہا تھا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور فاسد خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

”بہت جھٹکے ہوئے لگ رہے ہو۔“ وہ میرے سامنے اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔



”ہاں۔ آج سارا دن اونچے نیچے راستوں پر گھومتا رہا ہوں۔“ میں نے اپنا کافی کاپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

سونیا نے بھی اپنا کپ اٹھا لیا اور کافی کی چٹکیاں لیتے ہوئے کچن انڈیکس سے میری طرف دیکھتی رہی۔

باتیں کرتے ہوئے رات کا ایک بج گیا۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن سونیا کو شاید نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ مجھے بھی جگاتے رکھنا چاہتی تھی۔

”تمہیں نیند آ رہی ہے۔“ بالآخر وہ اٹھتے ہوئے بولی ”تم اندر میرے بیڈ پر سو جاؤ۔ میں یہاں صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔“

”میں صوفے پر ٹھیک ہوں۔ تم اپنے بستر پر آرام سے سو جاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔

میں چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ سونیا بھی میرے ساتھ ہی آئی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار پر بھارتی فلمی اداکاراؤں کی نیم عریاں تصویریں چسپاں تھیں جو کسی بیگزین سے کٹائی گئی تھیں۔ سونیا ایسی بد ذوق نہیں تھی کہ کمرے کو ایسی چیزوں سے سجاتی۔ ہو سکتا ہے ان سے پہلے جو کرائے دار یہاں رہا ہوں۔ یہاں پندرہ رہے ہوں۔ یہ ان کا ذوق ہو۔

دوسری دیوار پر لگی ہوئی کھوٹی پر سونیا کے تین چار جوڑے کپڑے لٹکے ہوئے تھے اس کے ساتھ ہی ہاتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ہاتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔

سونیا بستر کی چادر درست کر رہی تھی۔ بیڈ پر دو کبل تھے جنہیں اٹھا کر اس نے کرسی پر رکھ دیا تھا۔ چادر درست کر کے اس نے ایک کبل بیڈ پر رکھ دیا اور دوسرا اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”رات کے آخری پریماں اچھی خاصی سردی ہو جاتی ہے اگر تم ایک کبل میں سردی محسوس کرو تو۔“

”مجھے سردی نہیں لگے گی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”تم چاہو تو۔“ دوسرا کبل بھی لے جاسکتی ہو۔“

سونیا مجھے کھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے کمرے کی بٹی بجادی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دن بھر گھومتے سے میں بہت تھک گیا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ ”مئی، ڈیڈی، چاچا پر آپ سنگھ، ہمارا“ تھائی، جاگتی اور کئی چہرے میری نظروں کے سامنے گھومتے چلے گئے۔ رنگینی اور سرور تھا۔ لوہ انہوں نے ہمارا کتنا

ساتھ دیا تھا۔ سونیا بھی چپانگ رائے سے ہماری بارہائی میں شامل ہوئی تھی۔ اس کی ماں پولیس میں تھی لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی کرپشن کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد ہی سونیا پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس کی ماں کرپٹ تھی اور شہنشاہ کے خلاف ایک گھناؤنی سازش میں شریک تھی۔ ماں کے گناہوں کا پرہیز (کفارہ) کرنے کے لیے وہ ہمارے ساتھ مل گئی تھی اور گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی ہمارے ساتھ گئی تھی جہاں قدم قدم پر موت سے ہمارا سامنا ہوتا رہا تھا۔

گولڈن ٹرائی اینگل سے نکل کر جب ہم پہنچے تو سونیا بوا اور ہوفا کے ساتھ ہندوستان کی طرف نکل گئی تھی اور میں جاگی کے ساتھ شاؤلن ٹیمپل کے راستے پر چل پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سونیا سے دوبارہ بھی ملاقات نہیں ہوگی لیکن وہ بے پور میں مل گئی اور اب بے پور سے سیکنڈ میل دور ہالہ کی گود میں بھی وہ اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر مجھے مل گئی تھی۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں جو کچھ ہوا وہ مجھے یاد تھا اور مجھے اب تک اس پر ندامت تھی لیکن سونیا کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اس نے بے پور میں بھی کوشش کی تھی اور یہاں بھی گولڈن ٹرائی اینگل والے واقعے کو دہرانے کی کوشش میں تھی لیکن میں اسے دوبارہ ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگے۔

میری سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔



آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ صبح کے سات بج رہے تھے سونیا میرے لیے چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ اس وقت خاصی سردی تھی اور سونیا نے شمال اوڈھ رکھی تھی۔ مجھے چائے دے کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکلا۔ رات کو شوبھانے بتایا تھا کہ یوگی دھیراج صبح سات بجے آتا ہے لیکن آج وہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور پھر آج نہ آئے۔ میں سونیا کے ساتھ شوبھا کے کمرے میں آیا۔ وہ یوگی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی تاکہ اپنی مشق شروع کرے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ”آپ شیو آسن کی مشق کر رہی ہیں نا شوبھائی۔“ میں نے کہا۔ شوبھانے انہماک میں سر ہلایا تو میں نے کہا ”بچہ

آج مشق آپ کو میں کروا دیتا ہوں۔ میں یوگا کے بارے میں اتنا علم تو رکھتا ہوں کہ کسی کو یہ بے ضرر مشق کروا سکوں۔ آپ یہاں لیٹ جائیے۔“ میں نے فرش پر پچھی ہوئی ردی کی طرف اشارہ کیا۔ شوبھا کرسی سے اٹھ کر ردی پر لیٹ گئی اور میں اسے ہدایات دیتے لگا ”آپ کو یہ آسن بنانے میں دشواری پیش نہیں آتی چاہیے۔ بالکل سیدھی لیٹنے۔ آپ کی اینڈیاں ملی ہوئی ہوں۔ پھیلیاں پھیلا کر ہاتھوں کا رخ اوپر کی طرف رکھیے اور آپ آنکھیں بند کر لیں۔“ شوبھا ایک ہفتے سے یہ پریکٹس کر رہی تھی۔ اسے میری ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں مسلسل بول رہا تھا ”آپ آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تمام توجہ سیدھے پیڑ کے انگوٹھے پر مرکوز رکھیں اور یہ تصور کریں کہ آپ کے پیڑ کے انگوٹھے کا تاؤ ختم ہو رہا ہے۔“ میں تو بڑا ایک منٹ تک خاموش رہا اور پھر ہدایات دینے لگا ”آپ کے انگوٹھے میں تاؤ نہیں رہا۔ اب آپ انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی پر توجہ مرکوز کریں اور یہ تصور کریں کہ اس انگلی کا تاؤ ختم ہو رہا ہے۔ بالکل ٹھیک۔ اب باری باری دوسری انگلیوں کے بارے میں بھی یہی تصور کیجئے۔“

”آپ دوسرے پیڑ کی طرف آجائے اور انگوٹھے سے شروع کر کے اس ترتیب سے اس تصوراتی عمل کو دہرائیے۔ اب ایک بار پھر سیدھے پیڑ کی طرف آجائیں اور پینڈلی پر توجہ مرکوز رکھیں اور اب دوسری پینڈلی کا تاؤ بھی اسی طرح ختم کر دیجئے۔“

”آپ سیدھی ٹانگ کو لمبے تک اور پھر الٹی ٹانگ کو لمبے تک۔ اس کے بعد پیٹ اور پیٹے پر توجہ مرکوز کریں اور یہ تصور کرتی رہیے کہ تاؤ ختم ہو رہا ہے۔ ٹھیک۔ اب ہاتھوں اور بازوؤں کی باری ہے۔ ان کا طریقہ بھی یہی ہے۔ گردن، چہرے، ٹانگ، کان، آنکھیں اور جسم کے ہر حصے کا تاؤ اس طرح تصور میں ختم کیجئے۔ اب آخر میں دماغ کی طرف آجائے۔ دماغ کا تاؤ ختم کرتے ہوئے یہ نقطہ دہرائی رہیے۔“

میرے پیڑ کے دماغ پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میرا دماغ بالکل پرسکون اور آزاد ہے۔ یہ جملے چاچہ جو مرتبہ دہرائیے۔ اور اب دوبارہ یہ عمل سیدھے پیڑ کے انگوٹھے سے شروع کر لیں۔ ٹھیک ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ یہ عمل جاری رکھیے۔“

میں نے شوبھا کو یہ مشق بیس منٹ تک کرائی اور پھر اسے اٹھا دیا۔

”آپ کو کبھی دل کا دورہ تو نہیں پڑا شوبھائی؟“ میں نے

پوچھا۔ ”بھی ایسی قوت نہیں آتی لیکن انجانا کی تکلیف تو ہے۔“ شوبھانے جواب دیا۔

”ایسی صورت میں بہتر ہوگا کہ شیو آسن کی اس مشق کو آپ اپنی عادت بنالیں۔“ میں نے کہا ”آج صبح وشام جاری رکھیے۔ کم سے کم پندرہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ تو سہ منٹ لیکن اپنے کمرے سے مشورہ ضرور کر لیں۔ دل کے مریضوں اور خون کے دباؤ کو نارمل رکھنے کے لیے اس سے بہتر یوگا کی اور کوئی مشق نہیں ہو سکتی۔ اگر اس مشق کو عادت بنالیا جائے تو کبھی دل کا دورہ نہیں پڑ سکتا۔“

”تم تو کہتے تھے کہ سیکھنا چاہتے ہو لیکن۔“ شوبھانے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”لیکن تم نے تو ایک ماہر یوگی کی طرح مجھے یہ مشق کرائی ہے۔ یوگی ہمارا جی جیسے یہ مشق ایسے ہی کراتے ہیں۔“

”یہ بہت معمولی اور ابتدائی مشق ہیں جو میں نے شاؤلن ٹیمپل میں سیکھی تھیں۔ اصل یوگا تو بہت دور ہے جو میں سیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تو کیا یوگا کی بھی کئی قسمیں ہیں؟“ شوبھانے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”بے شک۔“ میں نے جواب دیا ”ایک تو منتر یوگا ہے جس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ روحانی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے کس قسم کی ریاضتوں یا چار کی ضرورت ہوتی ہے۔ راج یوگا سے لاشعور کے درجے سمجھ لے جاسکتے ہیں اور پراسرار ذہنی قوتیں بیدار کی جاسکتی ہیں۔ کنڈلینی یوگا سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے پچھلے حصے میں جو پراسرار قوت محو خواب ہے اسے کس طرح بیدار کیا جائے۔ یہ وہ پراسرار قوت ہے جس پر قابو پاکر اور بھی لاتعداد طلسماتی قوتوں کو قبضے میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان پراسرار قوتوں کا غلط استعمال تباہی اور بربادی کا باعث بنتا ہے۔ ہندو پنڈت اور یوگی عام طور پر اس پراسرار قوت کو تسخیر کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں لیکن بہت کم لوگ کامیاب ہوا کرتے ہیں۔ جتھے یوگی، یوگا کی وہ قسم ہے جس کے مختلف آسنوں پر عمل کر کے اپنے آپ کو جسمانی طور پر تندرست، صحت مند اور چاق و چوبند رکھا جاسکتا ہے۔ ہتھ یوگی سے نہ صرف مختلف بیماریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے بلکہ چہرے پر پٹریاں اور جسم پر بڑھانے کے اثرات کو بھی روکا جاسکتا ہے۔ یہ جو آپ

شیو آسن کی مشق کر رہی ہیں جتھ یوگ ہی کی ایک قسم ہے۔ ہم ابھی یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ یوگی دھیراج بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی اپنے تاجیرے آتے پر شوبھا سے معذرت کی اور جب آسن کی تیاری کے لیے کہا تو شوبھا نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اس وقت کی مشق تو وہ کر چکی ہے۔ یوگی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں بھی مسکرا دیا۔ اس یوگی کی عمر ساٹھ اور پینتھ کے درمیان رہی ہوگی۔ دہلا چلا جسم، تمام نیس ابھری ہوئی اور ڈیاں تک گئی جاسکتی تھیں۔ اس نے صرف دھونی ٹنگٹو گئے انداز میں ہانده رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”اگر میں سمجھنے میں غلطی نہیں کر رہا تو تم وہی نوجوان ہو جو گوتم بھوش مہاراج کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟“ اس نے میرے چہرے پر نظرسن جماتے ہوئے کہا۔

”میں انچل پڑا“ آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”پیشان مت ہو۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”نکل رات دیو دل میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ گوتم بھوش مہاراج میرے گرد ہیں۔“

”اوہ۔“ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”مگر وہ تو کل مجھے کسی اور جگہ پر لے گیا تھا جہاں سے پتا چلا کہ گوتم بھوش دھرم شالا جا چکے ہیں۔“

”درویل بڑا پاپی ہے۔“ یوگی دھیراج بدستور مسکرا رہا تھا۔ ”آج اگر تم باہر نکلو گے تو وہ انہیں تلاش کر لے گا اور باتیں بنا کر تمہاری جیب سے پھر کچھ پیسے نکلا لے گا۔ اس کا دھندا ایسی ہے خیر! تم گوتم بھوش مہاراج سے ہی کیوں ملنا چاہتے ہو۔ یہاں اور بھی سیڑیوں یوگی ہیں۔ جن کے پاس لوگ بہت دور دور سے آتے ہیں۔“

”میں بھی بہت دور سے آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس میں شبہ نہیں کہ یہاں بڑے بڑے ماہر فن یوگی موجود ہیں لیکن گوتم بھوش۔“

”میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”مگر وہ مہاراج دھرم شالا نہیں گئے۔ یہیں ہیں۔ رشی کیش میں۔ تم آج شام ان سے مل سکتے ہو۔“

”کہاں؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں شام کو یہاں آؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔“

دھیراج نے کہا اور پھر یوگا کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ یوگی دھیراج کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس

بہت کچھ ہے۔ میں نے بھی اگرچہ شاؤلن نیپل سے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن دھیراج کی باتیں سن کر میں اپنے آپ کو غفلت کتب سمجھنے لگا اور میں واقعی طفل کتب تھا۔ میں یہاں سے کچھ سیکھنے اور لینے ہی کے لیے تو آیا تھا۔

بہت بہت در تک یوگا کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر ہمارا موضوع شعور اور لاشعور کی طرف مرکب گیا۔

”یوگا کی طرح لاشعور بھی ہمارے اندر کی ایک پراسرار قوت ہے جس کے بارے میں جانتا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی علم اور لاشعور کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جب ہم یوگا کی بات کرتے ہیں تو ہم لاشعور کو اس سے الگ نہیں کر سکتے۔“

یوگی دھیراج کہہ رہا تھا۔ ”ہم میں سے کسی نے بھی لاشعور کو دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بعد حقائق در ہونے اور ہر جہت اثرات کی بنا پر ہم اس کے وجود کو محسوس ضرور کرتے ہیں۔“

”ہم میں سے ہر شخص لاشعور کا حامل ہے کہ لاشعور ہمارے نظام نفس، نظام ہضم، حرکت قلب اور دیگر تمام جسمانی و ذہنی اعمال و افعال پر ان دیکھی حکومت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اسٹور دوم ہے جہاں ہماری سوئی ہوئی یادوں کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ ہمارا لاشعور ہی ہماری تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا تعین کرتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کو ایک دہشت انگیز خواب میں تبدیل کر کے ہمیں خوف زدہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ زندگی کو ہمارے لیے زیادہ خوشگوار اور فرحت انگیز بنا کر ہمیں شاد اور مسرور بھی کر سکتا ہے۔“

دھیراج خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”لاشعور کی دریافت سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم بیشہ اپنی تقدیر کے کامیاب مالک نہیں بن سکتے۔ ایک ناپید اور نامعلوم قوت ہمیں اکثر و بیشتر ہدایت دیتی رہتی ہے چنانچہ ہمارے لاشعور کی ذہن میں جو کچھ موجود ہے اس کی آگاہی کے ساتھ اس پر عمل قابو حاصل کر لینا ہمیں زندگی کی سرقتوں سے بھنکار کر سکتا ہے کیونکہ لاشعور ہماری تخلیقی قوت اور ہمارے تخیل کی بنیاد کا سرچشمہ ہے۔“

”تخلیل نفس ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے انسان اپنے ذہن و دماغ کا افسانہ اور اک حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسا فن بھی ہے جس کی مدد سے کوئی شخص اپنے لاشعور کی احساسات سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح لاشعور میں مقید جذبات آزاد ہو جاتے ہیں اور انسان

ان تمام دکھوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ اہم رہے ہوں۔ تخلیل نفس کی تخلیق نے انسان کے لیے یہ امکان پیدا کر دیا ہے کہ وہ ان جذبات اور احساسات کی عکاسی کر سکے جو اس کے لیے تکلیف اور دکھ کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ مسائل پیدا کر لیتا ہے۔“

”لاشعور سے آگاہی کا علم انسان کے سخت رویے، بارہانہ پن، خوف اور نقصانات کے دکھ پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور انسان کی مختلف تحریکات اور توانائیوں کا رخ مثبت امور کی طرف موڑتا ہے۔ یہ علم اس عام اور مشترک ذہنی خلل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو ہر شخص کے دماغ کی سطح کے نیچے موجود ہے۔ اس نظریے نے ثابت کر دیا ہے کہ انسانی فطرت تبدیل ہو سکتی ہے اور لاشعور کی آگاہی کے ذریعے انسان اپنے آپ کو ماضی کے غلط خوف سے اور ہر طرح کے ڈر سے آزاد کر سکتا ہے اور ڈر اور خوف ہی وہ چیز ہے جو ہمیں کسی عمل سے دور رکھتی ہے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

میری نظرسن اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ شوبھا اور سونامی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں صحیح جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے بدھ بھنگو گوتم بھوش کی تلاش تھی اور دھیراج اس کا چیلہ تھا اور اس کے پاس بھی بہت کچھ تھا۔

”اب میں ایک بار پھر یوگ کی طرف آتا ہوں۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”اگر ہمیں اپنے لاشعور کے بارے میں جانکاری ہو جائے تو یوگ ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ یوں تو یوگ کی بہت قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم جتھ یوگ اور راج یوگ ہے۔

”جتھ یوگ کا تعلق انسانی شریر (بدن) سے ہے۔ یعنی یہ کہ اپنے شریر کو کیسے تندرست و توانا رکھا جائے اور اسے نارویوں سے کیسے بنایا جائے جبکہ راج یوگ کا تعلق براہ راست دماغ سے ہے۔ یعنی اپنے دماغ کو کیسے کنٹرول کیا جائے۔ ہمارے اندر جو پراسرار قوتیں خوابیدہ ہیں انہیں کیسے بیدار کیا جائے اور منفی جذبات اور خرابی رنجانات سے کیسے بچا جائے۔“

”یوگ میں یہی دو بڑے کتب ہائے فکر ہیں اور ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جتھ یوگ کے ماہرین کہتے ہیں کہ راج یوگ اس کی ہمسر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان کے کہنے

کے مطابق انسان کا جسمانی لحاظ سے تندرست ہونا کافی ہے۔ اگر دماغی طور پر سست بھی ہوں تو اس سے زندگی متاثر نہیں ہوگی۔ دوسری طرف راج یوگ کے ماہرین راج یوگ کو کوئی افضل و برتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق اگر کوئی شخص دماغی لحاظ سے نارمل ہے اور اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو چکی ہیں تو وہ شخص ان قوتوں کے بل بوتے پر اپنے شریر کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ ذہن بیمار نہیں ہے تو شریر بھی بیمار نہیں ہو سکتا۔ ان ماہرین کے نظریے کے مطابق دماغ تندرست ہو تو شریر پر کوئی تیاری حملہ آور نہیں ہو سکتی۔

پنجابی (PATANJALI) کو فادر آف یوگا کہا جاتا ہے۔ یہ مہا یوگی تین ہزار سال پہلے چندر گپت کے زمانے میں ہوا تھا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ یوگ کو اس کی نگرانی میں مندر تحریر میں لایا گیا تھا۔ پتھلی کو بھی جتھ یوگ سے اختلاف تھا اس لیے اس کی کسی بھی تحریر میں جتھ یوگ کا ذکر نہیں ملتا۔

”یوگ کے ان دونوں شعبوں کے ماہرین کے اختلافات اپنی جگہ لیکن سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر کوئی انسان رہ جیسی طاقت رکھتا ہے مگر اس کا دماغ خالی ہے تو اسے کامیاب انسان نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے برعکس ایک بالکل کنٹرول و نجیف آدمی، جس کے لیے دو قدم چلنا بھی مشکل ہو، اسے چلتی پھرتی لاش کہا جائے مگر وہ ذہنی طور پر بیدار ہے۔ بڑے مخفی قوتوں کا مالک بن چکا ہے لیکن اس شخص کی زندگی بے کوئی معنی نہیں رکھتی۔“

”ہمارے لیے اہم شخص وہ ہے جو جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا، صحت مند ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ دماغی لحاظ سے بھی چاق و چوبند اور بے پناہ قوت ارادی کا مالک ہو۔ اپنے دماغ اور مخفی قوتوں پر اسے پورا کنٹرول حاصل ہو، معاملے کو فہم و فراست اور عقل و دانش سے سلجھنا ہو۔ جہاں طاقت کی ضرورت ہو وہاں دماغ کی نگرانی میں طاقت ا مظاہرہ بھی کرنا ہو۔ اس کے تمام مظاہر عقل کے دائرے میں رہتے ہوئے بالکل معتدل اور معقول ہوں تو یہ شخص پہنچتا ہے سوہمن (SUPER HUMAN) کھلانے کا حق دار ہے۔“

”جتھ یوگ اور راج یوگ ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ تم کو کوئی بھی شاخ کسی انسان کو برتر انسان نہیں بنا سکتی۔ پہلے جتھ یوگ سے اپنے آپ کو جسمانی طور پر مضبوط اور طاقت ور بنایا جائے اور اس کے بعد راج یوگ پر عمل کرتے ہوئے دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ان کے منفی جذبات و دھارا انہیری مقاصد کی طرف موڑا جائے۔“

”کوئی بھی علم سہل نہیں ہوتا۔ راج پوک تو بہت گہرا اور بہت ہی پراسرار علم ہے۔ اس میں مراٹے کا بھی بڑا دخل ہے۔ مراٹہ ایک ایسا عمل ہے جس میں آنکھیں، کان اور منہ بند کر کے تمام تر توجہ اپنے من کی طرف مبذول کر دی جاتی ہے۔ ہمارا من کیا ہے؟ ”من“ کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہمارے اپنے اندر ایک بے حد وسیع و عریض دنیا قائم ہے جس کی ہم نے کبھی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ مختلف مرقیوں اور زیریا مشینوں اور جاپ سے ہم اس دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ اس کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس پراسرار جزیرے کی خاک چھانٹتے ہیں۔ اس کے غاروں اور بھول بھلیوں کو کھنگالتے ہیں اور اگر ہمارے سر گرد کا ہاتھ نہ ہو تو ہم یک دم بھی سکتے ہیں۔

”قدرت نے ہمیں بے شمار قوتوں سے نوازا ہے۔ بے پناہ طاقتیں ہمیں عطا فرمائی ہیں لیکن ہمیں اپنے اندر چھپی ہوئی بے پناہ قوتوں کا علم ہی نہیں ہے کیونکہ ہم نے کبھی ان پر توجہ ہی نہیں دی۔ ہم تو صرف مادی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ عالی شان محلات، ہرے بھرے باغات، مرغین، غذائیں، شوخ و شنگ حسینائیں، راگ رنگ کی محفلیں، ہم نے انہی سب چیزوں کو زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ہمارے اندر جو ایک عظیم الشان سلطنت موجود ہے اور جس کے ہم خود بادشاہ ہیں، وہ کیسی ہے؟ اس کے محلات، اس کے باغات کیسے ہیں؟ اس میں کیسی کیسی پراسرار وادیاں ہیں، کیسی کیسی خوب صورت گھاٹیاں ہیں۔ اس پراسرار دنیا کے تاریک غاروں میں کیسی کیسی جھلملاتی روشنیاں ہیں اور یہ دنیا کتنی پراسرار اور رہنمائی ہے۔ یہ جاننے کی ہم نے کبھی زحمت ہی نہیں کی۔“

پوک دھیراج ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس مرتبہ خاموشی کچھ زیادہ طول کھینچ گئی اور بالآخر اس نے دوبارہ کنا شروع کیا۔

”یہ سب کچھ جاننے کے لیے محنت کرنی پڑے گی۔ بعض لوگ محنت سے گھبراتے ہیں اور آدھے راستے ہی سے ہٹا جاتے ہیں۔ بات لگن، محنت اور حوصلے کی ہے۔ ساگر کی موجوں کو دیکھو جو سنگلاخ چٹانوں سے بار بار ٹکراتی ہیں اور واپس آجاتی ہیں۔ بظاہر ان کی جدوجہد بے بنیاد نظر آتی ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت میں ان ہی موجوں نے چٹانوں کے اندر پوسٹیں ہو کر انہیں گہرا کر دیا ہے۔ زندگی میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور وہ بھی سچائی، ایمان داری، ظہور اور خود اعتمادی کے ساتھ ہو تو کامیابی

ضرور قدم چومے گی۔“

پوک دھیراج اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلا ہوں۔“ وہ بولا ”میں شام کو آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں اور مجھے خوش اس (یعنی) ہے کہ تمہارے اوپر جاؤ گے۔ حال ہی کی چیزوں سے بھی اوپر۔“

پوک دھیراج چلا گیا۔ وہ میرے اندر ایک نئی آلہ بھڑکایا تھا اور میں مجسم تصور سے اپنے آپ کو ہال کی چوٹیوں سے بھی اوپر اڑتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

میں نے شاید ٹیبل میں ماسٹر پنگ پائی سے پوکا پرچی بہت سیکھا تھا لیکن میری وہ مشق جس میں دم اور صحت کے حوالے سے تھیں۔ کسی پراسرار شق کے حصول کا خیال ذہن میں نہیں تھا۔ اس وقت تو میری تمام تر توجہ مارشل آرٹس پر مرکوز تھی۔ میں اس فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری چیزیں میرے لیے معنی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان چیزوں کے بارے میں مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا جتنی مجھے اس وقت ضرورت تھی۔ پوکا کی چند خاص مشقوں کے علاوہ مجھے مرقا اور ارتکا کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا۔

لاشعور کو اجاگر کرنے کی بھی تھوڑی بہت تربیت دی گئی تھی۔ لیکن اب پوکا کے حوالے سے پوک دھیراج کی باتیں سن کر میری آتش شوق بھڑک اٹھی تھی اور میں نے اس میں بھی کچھ شدید۔ حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شدید۔ کالظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ کوئی علم مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ انسان زندگی بھر بھی اگر سیکھتا رہے تو مکمل ہی رہتا ہے۔

کوئی بھی علم سطحی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علم اتنا گہرا اور اتنا پراسرار ہوتا ہے کہ طالب علم جیسے چھوٹے بڑھتے ہیں اس پر ایسے ایسے سنسنی خیز انکشافات ہوتے ہیں کہ اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ذہن ایسا باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے لیکن اس کے لیے حقیقت کو جھٹلانا بھی آسان نہیں ہوتا۔

پوکا بولا۔ ”مارشل آرٹس میں انسان کے اندر پوشیدہ پراسرار قوتیں ”جی“ کی قوت کا بڑا چھپا ہے۔ اس میں کچھ نہیں کہ انسان کے جسم میں ناف کے نیچے پوشیدہ قوت واقعی بہت

پراسرار ہے اور ہر مارشل آرٹسٹ جی کی اس پراسرار قوت کے حصول کے خواب دیکھتا ہے لیکن اس میں بھی لاکھوں میں ایک آدمی ہی محض مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس حوالے سے بہت خوش قسمت

سمجھتا ہوں کہ میرا شمار بھی دنیا کے چند ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے اندر جی کی اس پراسرار قوت کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ میں کوئی شی نہیں بگاڑ رہا بلکہ یہ کنا پانتا ہوں کہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، کسی بھی عمل تک پہنچنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بڑے کھن اور غرار راستوں سے گزرتا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بڑی لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ثابت قدمی سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ معمولی سی لٹریچر ہاٹ سٹارے کیسے دھڑے پر پائی پھونکتے ہیں اور محض پرچنے کا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔

میں نے بھی جی جی کی پراسرار قوت حاصل کرنے کے لیے ہلی کھائیاں بھڑاشت کی ہیں۔ بڑی ریاضت کی ہے۔ میری کمالی میں میرے ماسٹر کو کبھی بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے مجھے نبھائے رکھا اور میرے پایہ استقلال میں لغزش نہیں پڑا ہونے دی اور میری لگن بھی تھی جو اس پر خار راستے پر لٹکان لٹکان مجھے آگے لے جاتی تھی اور بالآخر میں نے اپنے اندر پوشیدہ ہزاروں پراسرار قوتوں میں سے ایک ”جی“ پر عمل غور پر قابو پایا۔ مگر چاہتا تو یہ پراسرار قوت حاصل ہوجانے کے بعد اپنے آپ کو سیر میں ثابت کر سکتا تھا۔ اپنے ہاتھ دولت کے انبار لگا سکتا تھا۔ کسی بھی شخص کو اپنے قوتوں پر چنگیز بھگور کر سکتا تھا لیکن میرے دل میں کبھی ایسی کوئی قوت خواہش نہیں ابھری۔ میرے دل میں کبھی کوئی

پناہ نہیں ہوئی۔ خیالات بھی پرانہ نہیں ہوئے۔ میں سراسر قوت کو قدرت کی ایک امانت سمجھ کر اپنے پائے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے جب بھی استعمال کیا مجھے مقتد کے لیے ہی استعمال کیا اور پراسرار جی ہر لمحے یاد ہے۔ شاید ٹیبل میں جب ایک جنازہ کی قوت کرنی تھی تو ایک آدمی لے کے نیچے جا بیٹھا تھا۔ بے ادب اس کے اوپر سے آہنی گاڑو بٹانے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ ذہنی گاڑو اپنی جگہ سے تل کر نہیں دے

پتا تھا اور پھر پوکا میرے اندر یہ تحریک اٹھی کہ مجھے اس شخص کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے وہ آہنی گاڑو اٹھالیا اور اس کے نیچے دبے ہوئے آدمی کو نکال لیا گیا۔

میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی۔ میں اپنی جسمانی قوت کے مطابق ہی وزن اٹھا سکتا تھا مگر میں نے وہ وزنی آہنی گاڑو ایک ہاتھ سے بڑے آرام سے اٹھالیا تھا جسے کسی آدمی تل کر لیا بھی نہیں سکتے تھے۔

وہ دراصل میرے اندر جی کی وہی پراسرار قوت تھی جو اعجاز کی لے کر بیدار ہوئی تھی اور میرے ہاتھوں سے ایک ایسا کام کروا دیا تھا جس کا میں تو کیا دوسرے بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب مجھے بھی احساس ہوا کہ میرے اندر وہ خفیہ قوت بیدار ہو چکی ہے جس کے لیے میں طویل عرصے سے بڑی کٹھن ریاضت کر رہا تھا۔

اور اب پوکا جس کے بارے میں ماسٹر پنگ پائی نے بھی بتایا تھا کہ یہ بڑا پراسرار علم ہے اور اس علم کے ذریعے بھی انسان کے اندر پوشیدہ بے پناہ پراسرار خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے زندگی کو خوش گوار بنایا جاسکتا ہے۔ میں کچھ عرصے اور وہاں رہتا تو ماسٹر پنگ پائی ہی سے اس علم کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش کرنا لیکن اس وقت تو میرا سینہ انتقام کی آگ سے تپ رہا تھا۔ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کرنے کے بعد جلد از جلد دارا کو تلاش کر کے اپنے انتقام کی آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔

دارا کا قصہ ختم کرنے کے بعد میں لاہور جانا چاہتا تھا لیکن لاہور میں چودری نواز علی کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ابھی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ دقت کی ڈور کو ڈھیل دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہردار میں رہتے ہوئے میں نے کئی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں کو دیکھا تھا جو بھوک پیاس اور موسم کی شدتوں سے بے نیاز ایک مختصر سا لنگوٹ باندھے

پوکا کی ریاضت یا جاپ میں مصروف تھے۔ اگر آپ کو کبھی کبھی ہمالیائی سلسلے میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو آپ کو جگہ جگہ ایسے دلچسپ منظر دکھائی دیں گے۔ آبادی سے دور ویرانوں میں، پہاڑوں کی گھاٹوں میں، کسی شیشاں گھاٹ میں یا گنگا کے کنارے ایسے ہندو یوگی، پنڈت اور سادھو نظر آئیں گے جو شدت کی سروی میں صرف ایک لنگوٹ باندھے تنگ دھڑنگ اپنے پوک کی تپا میں مصروف نظر آئیں گے لیکن یہ ہندو یوگی پنڈت اور سادھو حصول علم کے لیے نہیں اس علم کے اسرار سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے

اندر کی براسرار قوتوں کو قابو کرنے کے لیے جاپ کرتے ہیں۔ انسان کے اندر کی یہی وہ براسرار قوتیں ہیں جن پر قابو پا کر ہمالیہ کو بھی اپنے قدموں میں جھکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ ہندو یوگی اور پنڈت کسی نیک مقصد کے لیے یہ تپا نہیں کرتے۔ ان کے توارادے ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ انہی ننگ دھڑنگ یوگیوں کو دیکھ کر میرے اندر بھی یوگا سے کچھ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اس رات یوگا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے چتر پریم نے بھی میرے اس شوق کو کچھ ہوا دی تھی۔ اس نے بدھ یوگی کو تم جوش کے بارے میں بتا کر میرے جذبہ شوق کو میر کیا تھا۔

یہ میں جانتا تھا کہ یوگ کی جنم بھوی ہندوستان ہے لیکن اس نے پرورش تبت کی بدھ عبادت گاہوں میں پائی تھی۔ بدھ بھکشوؤں نے ہندوستان سے یہ علم سیکھا اور تبت میں اسے درجہ کمال حاصل ہوا۔ انسان کے اندر خوابیدہ خفیہ طاقتوں کو ابھارنے کے لیے بدھ راہبوں نے نت نئی ریاضتیں ایجاد کیں۔ یہ ریاضتیں یا جاپ بے پناہ کٹھن اور وقت طلب تھیں مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اس علم کے اسرار سے پردے اٹھاتے رہے۔

کٹھن ریاضتوں سے بدھ راہبوں نے اپنے اندر پوشیدہ کئی براسرار قوتوں کو زیر کر لیا۔ وہ مختلف ریاضتوں کے ذریعے اپنے اوپر وقتی طور پر مصنوعی موت طاری کر سکتے ہیں۔ کیا یہ اس فن کا کمال نہیں کہ ایک شخص شخص ایک لکھوت پہن کر صفری سنی کر ڈیہ درجہ حرارت پر برف پر لیٹا رہتا ہے لیکن نہ تو اس کا خون جتا ہے اور نہ ہی اس کے جسم کا درجہ حرارت گرتا ہے۔ ان خاص مشقوں کے ذریعے انتہائی ناموافق حالات میں بھی جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ وہ انتہائی گرم درجہ حرارت جس پر انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے لیکن اپنے آپ پر مصنوعی موت کی مشق میں مہارت رکھنے والے اس سے بھی دس بارہ سینی کر ڈیہ زیادہ درجہ حرارت پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

یوگ کا یہ کمال صرف بدھ راہبوں ہی نے حاصل نہیں کیا۔ ہندو یوگیوں نے بھی اس پر دسترس حاصل کی لیکن ایسے ہندو یوگی خال خال ہی ملتے ہیں اور یوگی دھیراج کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی کہ اس کے پاس ہمت کچھ ہے اور میرے لیے دلچسپی کی بات یہ تھی کہ وہ ایک ایسے بدھ راہب کا چیلہ تھا جس کے بارے میں چتر پریم نے بھی مجھے بتایا تھا کہ وہ واقعی گرو ہے۔

یوگی دھیراج کی باتوں نے میری آتش شوق کو کچھ اور بھی بھڑکا دیا تھا اور میں نے کچھ عرصہ وہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

تاکہ اس سے کچھ حاصل کر سکوں۔

دھیراج کے جانے کے بعد میرے دیر تک اس کے پاس میں باقیں کرتے رہے پھر سونا اٹھ کر کانچ کے پتھر سے کچن میں چلی گئی اور کچن کی طرف سے کچھ ہی دیر بعد اسے اور پر اٹھنے تلے کی خوشبو آنے لگی۔

اس دوران میں شوبھا دیوی سے میں باقیں کر رہا تھا۔ شوبھا بتا رہی تھی کہ اس نے یہ ڈیکو، میڈیکانچ دو ہزار روپے ماہوار کرانے پر حاصل کیا تھا اور کچھ برتن بازار سے خریدے اپنے پکانے کھانے کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ اس طرح ہمت سی زمتوں سے بچ گئے تھے۔ سونیا نے کی ہندو جاپ کھانے بنانا سیکھ لیے تھے اور شوبھا بتا رہی تھی کہ سونیا نے بڑی خدمت کرتی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی میں سونیا نے دروازہ نمودار ہو کر بتایا کہ ناشتا تیار ہو چکا ہے۔ ہم اس کے بیٹے آگے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ صوفیوں کی کرسیوں کے درمیان اگرچہ سینئر فیملی موجود تھی مگر سونیا وہ میز بٹائی تھی اور صوفے اور کرسیاں بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر کر دیے تھے۔ بیچ میں دروازے کا فرش تھا جس پر نے وسر خوان بچا کر ناشتا کرا دیا تھا۔ کھانے پر اٹھنے والے آلیٹ بھی تھا اور دوسری پلیٹ میں ہات فرائی انڈیا تھے۔ ان کے ساتھ ایک کنوری میں وال تھی اور بغیر گ۔ ایک چٹائی۔

یوگا کی مشقوں میں مرغن اور ہماری غذاؤں کھانے ممانعت تھی اور یہ وال اور چٹائی شوبھا کے لیے تھی۔ پر اٹھے اور انڈے میرے اور سونیا کے لیے تھے۔ ہندو بھی ماس خور نہیں ہوتے اور مجھے بھی سبزیوں اور وال دے کھانے کی عادت سی ہو گئی تھی اور اس وقت کا ناشتا زبردست تھا۔ میرا ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ گوشت خوردگی پابندی صرف ان ہندوؤں تک محدود رہ گئی تھی جو درجہ قریب تھے جبکہ آج کے دور میں اکثر ہندو بھی باقاعدہ گوشت کھانے لگے۔ ناشتے کے دوران میں اس وقت خوری کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے شوبھا دیوی ایک بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔

”میں گوشت سے پرہیز نہیں کرتی۔ سبھی سبھی گوشت بھی کھا لیتی ہوں۔“ اس نے کہا ”ہندو گوشت اس لیے نہیں کھاتے کہ اسے مقدس سمجھتے ہیں لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہی ہندو گائے یا بکریوں ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں کہ چھیرہ اس کے گلے پر تپنا مزے کی بات ہے۔“

بات تو واقعی مزے کی تھی لیکن میں اس موضوع پر بحث میں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں ابھی شوبھا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ گاؤں میں اور قسائی کی بات سے اگرچہ کچھ براہ راز ہو گیا تھا لیکن جتنے میری کون سی بات اسے بری لگتی تھی اس لیے میں نے یہ موضوع ہی بدل دیا تھا۔

اس کے بعد ہم کانچ سے باہر آکر کھلی فضا میں کرسیوں پر بیٹھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور ہوا ہلکی سی تھی۔ چنانچہ اس پہاڑی پر زمین کی سطح سے تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس سے اوپر بھی چند کانچ نظر آ رہے تھے۔ ایک چٹرا راست پہاڑ پر بل کھاتا ہوا اوپر تک چلا گیا تھا۔ یہ راستہ اتنا کشادہ تھا کہ دو کاریں پہلو پہ پہلو آسانی سے چل سکتی تھیں۔ اس سڑک کے علاوہ سانپ کی طرح بل کھاتی والی کچھ گلیاں تھیں جن سے اوپر اٹنے جانے کا فاصلہ کم ہو جاتا تھا۔

شوبھا دیوی دل کی مرہض تھی۔ پہاڑی پر چڑھنا اس کے لیے مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی، وہ درجہ ہزار کی طرف گئی تھی اور اس کے لیے بھی باؤں مرتبہ کراے کی موٹر منگوائی تھی۔ اس کا زیادہ وقت ان کے آس پاس شملتے ہوئے یا آرام کرتے ہوئے گزرتا تھا۔

”یہ ہمت اچھی جگہ ہے۔“ وہ اور ہر اوردہ دیکھتے ہوئے کہہ دیتی تھی ”میں سوچ رہی ہوں کہ اگر یہاں جگہ مل جائے تو یہ یوگی جاکو فروخت کر کے یہاں ایک شان دار گیسٹ ہاؤس بنوا دوں۔ کاروبار بھی چلا رہے گا اور محنت افزا ماحول بن جائے گا۔“

”ہمت اچھا آئیڈیا ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن کیا آپ یہاں رہ سکیں گی؟“

”کیا کیوں؟“ شوبھا نے کہا ”سونیا میرے پاس ہے۔ ہم دونوں نے اس کو اپنا سب کچھ مان لیا ہے اور مجھے یہ بات ہے کہ یہ بھی مجھے بھی چھوڑ کر نہیں جائے گی۔“ وہ ہنس کر سونیا کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی دیدی۔“ سونیا نے کہا ”میں اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔“

”اگر واقعی آپ سنجیدہ ہیں تو میرا ایک دوست اس کے پاس آپ کی ہمت مدد کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا ”اسے ایک کام بتا دیجئے۔“ گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ ”لون“ آپ کے لیے ہمت کا آمد ثابت ہو سکتا ہے۔“ شوبھا نے سوائے گاہوں سے میری طرف

دیکھا۔

”تھا کہ بھانوت سنگھ۔“ میں نے جواب دیا ”آپ نے بے پور میں اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ بہت معروف شخصیت ہے۔“

”وہ دکر م ہوٹل والا تھا کہ۔“ شوبھا بولی ”اسے کون نہیں جانتا لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق؟“

”وہ کل تک ہر دوار میں میرے ساتھ تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”وہ بہت اچھا انسان اور بہت مخلص دوست ہے۔ میں کئی مہینے بے پور میں اس کے پاس رہا ہوں۔ اس کی دوست راج کماری روپ متی۔“

”تم روپ متی کو بھی جانتے ہو۔“ شوبھا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی ”وہ تو بے پور کی بڑی معروف اور متاثرہ شخصیت ہے۔ معاف کرنا وہ۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں شوبھا دیوی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی ”لیکن روپ متی اب متاثرہ شخصیت نہیں رہی۔ اب وہ بہت بدل گئی ہے۔“

”اس کے بارے میں تو آئے دن سنے آئینڈ لڑنے میں آتے رہے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے بے پور کے پنڈتوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ وہ کئی مسلمان مرد کے ساتھ۔“ اور وہ مسلمان میں ہوں۔“ میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

”کیا؟“ وہ اچھل پڑی اور اس طرح دیکھنے لگی جیسے میری بات کا تین نہ ہو۔

”یہ درست ہے۔“ میں نے کہا ”بات کا بتگڑ بنانے میں بعض لوگوں کو بہت ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ بات وہ نہیں تھی جس کا چرچا ہوا تھا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ بلونت سنگھ نامی ایک بدعاش جو اپنے آپ کو چتر گڑھ کا راج کمار کھاتا تھا اسے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اس کے خلاف روپ متی کی مدد کی تھی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے پورا قصہ سناتے لگا۔ غلاموں کی منڈی والا حصہ میں نے گول کر دیا تھا۔ شوبھا بڑی دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں آخر میں کہہ رہا تھا ”بات صرف اتنی سی تھی۔ بد قسمتی سے میرا ایک ازلی دشمن بھی بلونت سنگھ کے ساتھ مل گیا تھا۔ ہمارے خلاف ان کے پاس ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر مجاز کھولا جاسکتا۔ انہوں نے پنڈتوں کو ہمارے خلاف بکرا دیا کہ ایک مسلمان مرد ایک ہندو عورت کو زبردستی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ بات دھرم کی ہو تو لوگ بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ وہ اصل بات جانتے کی کو شش نہیں کرتے۔ دھرم کی آڑ لے کر لوگوں کو بھڑکانا بہت آسان ہوتا ہے۔ میرے اور

روپ متی کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔  
 "ہمارے خلاف وہ پنڈت اور پجاری تھے جنہوں نے خود  
 دھرم کو برباد کر رکھا تھا۔ مندر جیسے پوتر استخوانوں کو عیاشی کے  
 اڈے بنا رکھا تھا۔ ان کے اپنے کروت کالے تھے۔ ہمارا وہ  
 کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ اس کے برعکس وہ خود تباہ و برباد  
 ہو گئے۔"

"ٹھاکر بھانوت سنگھ راج کماری روپ متی کے سٹورگ  
 باشی پتی کا دوست ہے۔ اس نے اس معاملے میں ہماری بڑی  
 مدد کی۔ وہ ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اگر آپ یہاں گیسٹ  
 ہاؤس اور ریسٹورنٹ بنانے کے معاملے میں اس کی مدد لینا  
 چاہیں گی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔"

"اب مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" شوہانے مسکراتے  
 ہوئے کہا "تم ہو سونیا ہے، ٹھاکر روپ متی ہیں تو مجھے کیا  
 پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"میں تو سیلانی آدمی ہوں۔" میں نے کہا "میرا کوئی  
 بھروسہ نہیں کب چلا جاؤں البتہ سونیا تو آپ کے پاس رہے  
 گی اور روپ متی اور ٹھاکر بھی آپ کے پاس ہوں گے۔ اگر  
 آپ گیسٹ ہاؤس بنانے کے معاملے میں واقعی مجید ہیں تو  
 پروگرام بنائیجئے۔ ٹھاکر کو یہاں بلایا جاسکتا ہے یا ان سے آپ  
 کی ملاقات ہے پور میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"اب تو سنجیدگی سے سوچنا ہی پڑے گا۔" شوہانے  
 مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن۔۔۔ تم کہاں جاؤ گے ہمیں  
 چھوڑ کر؟"

"میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔" میں نے جواب دیا "میری  
 منزل کا کوئی نشان نہیں ہے۔ میں تو پتا نہیں کب تک اور  
 کہاں کہاں بھٹکتا رہوں گا۔"

سونیا اس دوران میں اٹھ کر اندر جا چکی تھی۔ ہم ابھی  
 باتیں کر رہے تھے کہ وہ تیار ہو کر باہر آ گئی۔ اس نے وہی کل  
 شام والا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

"دیدی! ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔ اگر آپ کو جانا  
 ہو تو گاڑی منگوا لی جائے؟" سونیا نے قریب آ کر کہا۔  
 "نہیں بھئی۔ فی الحال میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں  
 ہو رہا۔ تم لوگ جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" شوہانے  
 جواب دیا۔

میں نے کرسی چھوڑ دی اور پھر پانچ منٹ بعد میں اور  
 سونیا پہاڑی کی بل کھاتی ہوئی کچھ پڑی پر اتر رہے تھے۔  
 اس وقت شملہ اور ہرودا کی طرف سے آنے والی دو  
 بسیں اڈے پر آ کر رکی تھیں اور زیادہ دقت نواح میں تھی۔

ان بسوں کے مسافروں میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔  
 ملکی سیاحوں کی ہر پارٹی میں ایک دو خوب صورت اور جوان  
 لڑکیاں ضرور شامل تھیں۔

میں سونیا کے ساتھ کچھ دیر بازار میں گھومتا رہا۔  
 نے کچھ سودا سلف خریدے اور کالج کی طرف واپس چلا گیا۔  
 میں آزادانہ طور پر کچھ دیر گھومتا چاہتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تو میں بازاروں میں گھومتا رہا۔  
 پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ شہر کے اطراف کی پہاڑیوں پر  
 مندروں کی بھرمار تھی۔ ہر تھوڑے فاصلے پر کوئی نہ کوئی مندر  
 ضرور نظر آتا تھا۔

کئی جگہوں پر غیر ملکی سیاحوں کی ٹولیاں ڈبے جھانکے  
 آئیں۔ جیسے بچانے کے لیے ان لوگوں نے رہائش گاہ  
 انتظام کر رکھا تھا۔ کسی پارٹی نے تو باقاعدہ خیمہ گاڑ رکھا تھا۔  
 بہت سی پارٹیاں ایسی تھیں جنہوں نے محض چھوٹا دایاں  
 رکھی تھیں۔

میں سہ پہر تک آس پاس کی پہاڑیوں پر گھومتا رہا۔  
 بالآخر کالج واپس آ گیا۔ سونیا اور شوہانے اس وقت بھی کافی  
 کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سونیا مجھے دیکھتی  
 اٹھ گئی۔

"ارے کہاں رہ گئے تھے تمہیں۔ میں تمہارے لیے  
 کھانا گرم کرتی ہوں۔"

"کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ چائے چلے گی۔" میں نے  
 اس کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سونیا کالج میں چلی گئی۔ پہلے اس نے ایک کرسی لاکر  
 وہاں رکھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔  
 ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ غیر ملکی سیاحوں کی ایک بڑی  
 اس طرف نکل آئی۔ ان میں تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔  
 ان میں سے ہر ایک نے کندھے پر بیک لاد رکھا تھا۔ وہ لوگ  
 شاید پہاڑی پر مزید اتر جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں دیکھ کر  
 گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک کوئی نہ  
 کھلی جگہ پر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور پھر  
 لوگ ہماری طرف آ گئے۔

ان میں ایک آدمی کلین شیو تھا۔ دو کے چہرے پر  
 ترتیب داڑھیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کی عمر پچیس سے  
 زیادہ نہیں تھی۔ وہ تینوں ٹی شرٹس اور نیچر زپنے پہنے تھے  
 ان کے ساتھ دونوں لڑکیاں بے حد خوب صورت تھیں۔  
 ایک کی عمر سترہ اٹھارہ سال اور دوسری کی بیس سال  
 رہی ہوگی۔ ان میں سے ایک نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی تھی۔

فری اور دوسری نے نہایت مختصر نیکر اور اوپن شرٹ پہنی  
 ہوئی تھی جس کے اوپر کے دو ٹیٹے کھلے ہوئے تھے اور سامنے  
 کٹا ہوا شخص بڑے اطمینان سے گریبان کے اندر تک  
 ہانک رہا تھا۔

"پلو!" قریب آ کر کلین شیو والے نے باری باری  
 باری طرف دیکھا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز  
 ہوئیں۔ "اگر ہم یہاں کیمپ لگائیں تو تم لوگوں کو کوئی اعتراض  
 نہیں ہوگا؟"

میں نے شوہانے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں  
 الجھن سی تھی۔

"یہ لوگ ہمارے لیے کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کریں  
 گے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اردو میں کہا۔

"کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کریں گے البتہ یہ فائدہ ضرور  
 ہوگا ہمارا بڑوس آباد ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے کیمپ  
 لگائیں۔" شوہانے جواب دیا۔

میں نے ان سیاحوں کو اجازت دے دی کہ وہ جہاں

چاہیں "اپنا کیمپ لگائیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔  
 وہ ہمارا شکر یہ ادا کر کے کھلی جگہ پر ادھر ادھر ہونے  
 لگے اور بالآخر ہمارے کالج سے تقریباً پچیس گز کے فاصلے پر  
 بڑے بڑے پتھروں کے بیچ میں انہوں نے کیمپ کے لیے جگہ  
 منتخب کر لی۔ اس جگہ کیمپ لگانے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ہوا  
 سے بچ سکتے تھے۔

انہوں نے اپنے بیک کھول لیے اور کام میں مصروف  
 ہو گئے اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر وہاں پیرا شوٹ کے  
 کپڑے کا ایک خیمہ نظر آ رہا تھا۔ اس خیمے کے اندر پانچ چھ  
 آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پیرا  
 شوٹ کا یہ خیمہ انہوں نے اپنے ایک بیک میں سے برآمد کیا  
 تھا۔

ان یورپین سیلانیوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ خانہ  
 بدوشوں کی طرح دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ نہ  
 ٹھکر کی فکر نہ وطن کی یاد۔ ان لوگوں کا کوئی وطن ہوتا ہی  
 نہیں۔ جہاں پڑاؤ ڈال دیا وہی جگہ عارضی وطن بن گئی۔  
 ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر / ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ایک سال کریں

اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب

قیمت 150 روپے

ڈاک خرچ 25 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر / ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ایک سال کریں

74200 رپی 5802551 5802552 589531

75500 رپی 74200 رپی 5802551 5802552 589531

75500 رپی 74200 رپی 5802551 5802552 589531

تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ ہم لوگ کانچ میں آگئے اور تھوڑی ہی دیر بعد یوگی دھیراج بھی پہنچ گیا۔ وہ شوبھا کو شیو آسن کی مشق کرانے لگا تو میں بھی قریب بیٹھا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

مشق ختم کرانے کے بعد وہ ہر نیک مجھ سے باتیں کرتا رہا اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم پہاڑی سے اتر کر بازار میں آگئے اور مختلف راستوں سے گھومتے ہوئے شہر کی دوسری طرف ایک اور پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔

وہ کانچ خاصا بڑا تھا۔ وسطی کمراتو کسی بڑے ہال کی طرح تھا۔ اس ہال میں کئی لوگ تھے جو یوگا کی اپنی اپنی مشقیں کر رہے تھے۔ دھیراج مجھے کانچ کے اوپر ایک کمرے میں لے گیا۔

بدھ یوگی گوتم بھوش کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار مہاراج اور ماسٹرینگ پانی یاد آگئے تھے۔

گوتم بھوش کی عمر پچاسی سال سے کم تو کسی طرح نہیں ہوگی۔ وہ نگڑی پر ایک چوکر پر آلتی پالتی مارے اس طرح سیدھا بیٹھا تھا کہ اس کی کمر اور گردن ایک ہی لائن میں تھی۔ ذرا سا بھی خم نہیں تھا حالانکہ اس عمر میں کمر کان بن جاتی ہے اور چہرہ نگڑی کے جانے کا تاثر دینے لگتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک بھی لکیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اس کا سر جھکا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کا قد چھ فٹ سے لگتا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔ اس کے پیٹنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ عام شخص اسے آلتی پالتی ہی کہہ سکتا تھا لیکن وہ بدھ آسن کا انداز تھا۔ (بدھ آسن کو گول آسن یا لوٹس پوچر بھی کہتے ہیں) بالائی گھٹنا موڑ کر پیردائیں ران پر جاگ کے قریب اور وایاں گھٹنا موڑ کر بائیں ران پر جاگ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور بازوؤں میں معمولی سا خم بھی نہیں تھا۔

اس کے سامنے کچھ بھی ہوئی درمی پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ انہیں کوئی لیکچر دے رہا تھا۔ ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے دوسرے لوگوں نے توباری باری ہماری طرف دیکھا تھا مگر گوتم بھوش نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ لگتا تھا جیسے اسے ہمارے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی ہو۔

یوگی دھیراج نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں بھی درمی پر بیٹھے ہوئے ان آدمیوں کے پیچھے بدھ آسن بنا کر بیٹھ

گیا۔ میرے قریب ہی دھیراج نے بھی یہی آسن اختیار کیا تھا۔

بدھ آسن یوگا میں ایک بہت ہی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے جسم میں غددوں کی نشوونما ہوتی ہے جس سے بارہ موزیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے دل، پیچھڑوں، منہ، جگر اور کلی کی کارکردگی پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ریزہ کی بڑی جسم کو صحت مند رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور ستراسی یا اس سے بھی زیادہ عمر میں آدمی اپنے آپ کو جوان محسوس کرتا ہے۔ مراقبے اور ارتکاز کی مشقوں میں بھی عام طور پر یہی آسن اختیار کیا جاتا ہے۔

دس منٹ گزر گئے اور پھر گوتم بھوش نے مگر اسانی لینے ہوئے یہ نشست ختم کر دی اور پیرتوکی سے نیچے نکالے درمی پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی نشست ختم کر دی اور اوٹھ کر باہر جانے لگے مگر میں اپنی جگہ پر اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

یوگی دھیراج اپنی جگہ سے اٹھ کر گوتم بھوش کے قریب چلا گیا اور اسے مدھم لہجے میں میرے بارے میں بتانے لگا۔ گوتم بھوش نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور مقناطیسی کشش تھی۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ عام آدمی کے لیے اس سے نظریں ملانا ممکن نہیں تھا لیکن میں پلکیں جھپکاتے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا۔ اس وقت مجھے ماسٹرینگ پانی یاد آیا تھا جس نے جس بنی کے ذریعے میری آنکھوں میں بے پناہ قوت پیدا کی تھی کہ میں سانب کی طرح پلکیں جھپکاتے بغیر گھٹنوں اپنے مقابل کی آنکھوں میں جھانک سکتا تھا۔ تربیت حاصل کر رہا تھا تو ماسٹرینگ پانی طلوع آفتاب سے ایک گھنٹا پہلے پہاڑی پر بسکون اور کھلی فضا میں مجھے راتوں اور مراقبے کی مشقیں کرایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جس بنی کی مشقیں بھی ہوتی تھیں۔

مشق افق پر جب سرخی پھیلنے لگتی تو میں یکاچم آسن اختیار کر کے پہاڑی چوٹی پر اس جگہ نظریں جھکا دیتا تھا جس سے سورج طلوع ہونے والا ہوتا اور جب سورج طلوع ہوتا تو میری نظریں خود بخود اس آتش کو لے کر مرکوز ہوجاتی اور میں یہ تصور کر لیتا کہ سورج کی توانائی آنکھوں کے سامنے میرے اندر منتقل ہو رہی ہے۔

شروع میں یہ پریکٹس صرف پانچ منٹ تک محدود رہی

اور پھر پہنچنے اس میں ایک ایک منٹ کا اضافہ ہونے لگا۔ اور پھر میں مجھے خاصی دشواری پیش آتی تھی۔ کبھی آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگتی اور کبھی بالی پیٹنے لگتا لیکن مجھے ماسٹرینگ پانی سے استاد کی رہنمائی حاصل تھی اس لیے میں نے بہت جلد ان دشواریوں پر قابو پایا۔

انسان کے اندر پوشیدہ برسر اور غیر مرئی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے مختلف مشقیں اور ریاضتیں کی جاتی ہیں۔ ان میں جس بنی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس بنی سے آنکھوں میں ایسا برسر اور مقناطیسی چمک پیدا ہوجاتی ہے کہ کوئی عام آدمی اس سے نظریں نہیں ملا سکتا۔ اس سے نہ صرف دوسروں کو متاثر کیا جاسکتا ہے بلکہ ٹیلی ویژن کی دت کو بھی جاگایا جاسکتا ہے۔

میں اس وقت یوگی گوتم بھوش کو کسی قسم کا چیلنج نہیں کر رہا تھا لیکن مجھے کیا بات تھی کہ میری نظریں گویا اس کی نظریں سے چمک کر رہ گئی تھیں۔ گوتم بھوش نے سیدھا ہاتھ اٹھار دینے والے انداز میں انھیں تو میرے دماغ کو ایک بار پھر جھٹکا سالگا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور اب میں پلکیں جھپک رہا تھا۔

بدھ یوگی گوتم بھوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "کمال سے آئے ہو؟" اس نے جلی جلی بندی اور اردو ٹپا بھلا۔

"بہت دور سے۔" میں نے جواب دیا "کچھ لینے آیا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں تم نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔" اس نے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی "تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ جو ارادہ کر لیتے ہو اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ میں نے اندر اور بھی بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ کی کوئی سیکنڈ ہاں۔"

"گرو سے۔" میں نے کہا "میں نے کچھ وقت شاؤلن میں گزارا ہے جہاں ماسٹرینگ پانی سے مارشل آرٹس ثابت حاصل کی اور۔"

"ماسٹرینگ پانی!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی اٹھ کر دوڑ پڑا۔"

"ماسٹرینگ پانی۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "میں نے ماسٹرینگ پانی سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کے ایک پیپل کی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے اس کی

طرف دیکھا "سیوا تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں۔ میں آپ سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ماسٹرینگ پانی کی آتما ہمیں میرے پاس کچھ گہمت خوش ہو رہی ہوگی۔"

"ماسٹرینگ پانی کی آتما!" میں اچھل پڑا "آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ چند مہینے پہلے ماسٹرینگ پانی کا انتقال ہو گیا تھا۔

ماسٹرے انتقال کی خبر سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں دارا کے عقاب میں دنیا بھر کی آوارہ گردی کرتا رہا تھا اور مجھے کہیں سے ماسٹرینگ پانی کے انتقال کی خبر نہیں کی تھی۔ ماسٹر

کا چہرہ میری نظریں میں گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراج وانگ دنگ یائے کا خیال بھی میرے ذہن میں ابھر آیا۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت ان کی عمر پچھتر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کئی برس گزر گئے تھے اور پتا نہیں وہ ابھی زندہ تھے یا اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

بہر حال یہ دو ہستیاں ایسی تھیں جنہیں میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ انہی کی محبت اور محنت سے میں اس قابل ہوا تھا کہ نہ صرف اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکوں بلکہ دنیا والوں کو اپنے وجود کا احساس بھی دلا سکوں۔

میں مطمئن ہو گیا کہ ٹھیک جگہ پر آیا تھا۔

ہم دیر تک ماسٹرینگ پانی کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر ہمارا موضوع بدل گیا اور اب ہم یوگ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"یوگا کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "اور ہندو فلسفے کے مطابق لفظ "ادھم" کو سب سے مقدس و محرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ آتما یا برہما کا نشان بھی ہے چنانچہ مختلف جاپ اس لفظ سے کیے جاتے ہیں۔ جاپ کے دوران میں انسان دنیا و ماضیا سے بے خبر ہوجاتا ہے اور اس پر ایک قسم کی محویت طاری ہوجاتی ہے لہذا اس محویت کے عالم میں جاپ کرنے والے کی غیر معمولی قوتیں بیدار ہونا شروع ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں یوگی بہت سی غیر مرئی قوتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ہندو یوگی اسے اوم کا کمال سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یوگا کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ کوئی بھی یوگی اپنے دھرم کے متبرک ترین نام سے جاپ کر کے کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

"کسی بھی ریاضت یا جاپ میں دھرم کو نظر انداز نہیں



کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ جنہوں نے فلسفہ ریاضت کے ذریعے مختلف مذاہب کی بنیاد ڈالی، راجے مہاراجے تھے۔ ان کے راج ان کے نظریات کے فروغ میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوئے لیکن وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ ان سے ادھر بھی ایک ایسی ہستی موجود ہے جسے قوت کا پرچمہ کہا جاسکتا ہے۔

”تین ہزار سال قبل چند رگت کے دو میں پیدا ہوئے  
والا چٹنگلی نامی شخص نہ صرف لوگ کا بچہ اچھا بنانا تھا بلکہ  
اس کی تیسویں کو بھی مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ چٹنگلی نے خدا  
کے وجود پر زور دیتے ہوئے انسان کو اس کے فعل کا مختار بنا کر  
باد کرایا کہ وہ ریاضت کا لمحہ کے ذریعے اپنے اندر خدائی  
صفات پیدا کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ  
اپنی ذاتی صفات کو مٹا کر خواس کو رو کر دے تاکہ روح عظیم  
سے جا ملے۔ انسان فعل کا خود مختار ہے۔ وہ چاہے تو اپنے  
آپ میں خدائی صفات پیدا کر سکتا ہے۔“ گوتم بھوش چند  
لحوں کو خاموش ہو کر میری طرف دیکھتا رہا پھر بات جاری  
رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”جیسا کہ تم جانتے ہو کہ انسان میں بے پناہ پراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں۔ بعض قوتیں تو بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے حاصل ہو جاتی ہیں لیکن بعض قوتیں مختلف محنتیں، ریاضتوں اور مشقوں کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہیں۔“

”ماہرین لوگ نے ان پوشیدہ اور پراسرار قوتوں کو منکشف کرنے کے لیے نئے نئے تجربات کیے۔ بموک پیاس سے اپنے آپ کو نڈھال کیا اور عرصہ دراز تک اپنے آپ کو اذیتیں دیتے رہے اور بالآخر ان مخفی اور پراسرار قوتوں کا سراغ لگایا اور انھیں اجاگر کرنے کے طریقے بھی وضع کیے۔ انہی پوشیدہ قوتوں میں ایک نہایت پراسرار اور زبردست قوت گندہی ہے۔“

گوتم بھوش ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس بار اس کی خاموشی قدرے طویل کھینچ مچی اور بالآخر وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ماہرین یوگ کے کہنے کے مطابق ہماری ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں ایک ناگن کنڈلی مارے سو رہی ہے۔ مختلف جاپ اور ریاضتوں سے جب اس پر ضرب لگائی جاتی ہے تو یہ جاگ اٹھتی ہے اور بیدار ہونے کے بعد ریڑھ کی ہڈی میں پوشیدہ نوس اور پٹھوں کے ذریعے دماغ کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ اس سفر کے دوران میں کئی پڑاؤ آتے ہیں جنہیں یوگا کی اصطلاح میں کنول یا چکر کہا جاتا ہے۔ وہ ناگن یا

ہر اسرارِ قوت ان پڑاؤ سے گزرتے ہوئے بلاخبرِ خاموشی کے لئے  
 جسے تک پہنچ جانی ہے جہاں ملاح ہوتا ہے چنانچہ جہاز  
 قوت یعنی کنڈلی کا ملاپ دماغ کے مخصوص حصے سے ہوتا  
 ہے تو اس وقت انسان کے قلب کا دواؤں کا کل نہیں ہے  
 قلب سے مراد گوشت کا وہ ٹھکانہ نہیں جو ہر انسان کے سینے  
 میں دھرتا ہے بلکہ قلب سے مراد ”عزکروں“ ہے  
 ملاپ کے بعد لوگ کی مشاہدے کی قوت بڑھ جاتی ہے  
 پورے طور پر اپنے قلب اور جسم سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور  
 اس کا جسم مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آ جاتا ہے اور اس  
 اسے حیرت انگیز کام کئے جاسکتے ہیں جن کا عام آدمی تصور  
 نہیں کر سکتا۔“

گوتم بھوش ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس نے درجن  
کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دھیراج کی داہلی ایک  
منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے بھی اشارے ہی سے گوتم بھوش  
کو کچھ بتایا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ گوتم بھوش نے میل  
طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کنا شروع کیا۔

”اس پر اسرار قوت کندہ لکھی کہ بیداری کے بعد بولنے جسم سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے اور وہ جسم کے جڑوں عضو کو کنٹرول میں لے آتا ہے۔ اس وقت انسان کے کنبے میں بے شمار قوتیں آجاتی ہیں۔ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے اور پہاڑ پر چل سکتا ہے۔ بھوک و پیاس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور برسوں بغیر کھانے پینے محض نفساً سے خوراک حاصل کر کے زندہ رہ سکتا ہے۔ سردی گرمی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور وہ واقعی مافوق الفطرت بن جاتا ہے۔“

”ریڑھ کی ہڈی سے دماغ تک کے سفر کے دوران  
کنڈلی رستے میں کس کس پڑاؤ پر رکتی ہے اور اپنے  
پوشیدہ اس پر اسرار قوت کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے؟  
میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا اور مجھے خوش اس کے نتیجے

اس پر اسرار سفر میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ میں نے اور میرا  
 جو تم بھوش اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اور میرا  
 بھی اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ یہودی ہال میں اس وقت بھی  
 لوگ بیٹھے ہوئے اپنی اپنی مشغولتوں میں مشغول تھے۔  
 ایک یورپی مرد اور دو عورتیں بھی شامل تھیں۔  
 جو تم بھوش وہیں رک گیا۔ اس نے میرے سامنے  
 دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی کا جھوا جس کا مطلب یہ تھا کہ  
 کی ملاقات ختم۔

یوگی دھیراج کانیج کے باہر والے دروازے پر پہنچ کر بیٹے کو دیکھ کر کہنے لگے کہ میرے ساتھ آیا۔ اسے یہ جان کر بیٹے نے

پہلے ہی میں اس کے کروے کروے چیتا ہوں۔  
 کا کچ کے دروازے پر ہم نے ایک دوسرے کو پرنام کیا  
 اور میں وہاں سے چل پڑا۔ میرے اندازے کے مطابق اس  
 دن ساڑھے دس کا وقت تھا۔ خنکی بہت بڑھ گئی تھی۔  
 بارش کی رونق بھی اجڑ چکی تھی۔ تاہم کہیں کہیں  
 ریڑس ملے ہوئے تھے۔  
 میں جب اپنے کا کچ پر پہنچا تو مکیا رنج چکے تھے۔ شوہرا  
 دیکھ سوچنے لگی اور سوچا میرے انتقال میں جاگ رہی تھی۔  
 ”اے! کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں تو پریشان ہو گئی  
 تھی۔“ سونانے کہا۔

پیشانی کیسی؟“ میں نے جواب دیا ”میں کوئی بچہ تو ہوں  
نہیں، جو راستہ بھٹک جاتا۔“

”راستہ بھٹکنے کی بات نہیں ہے۔“ سوینا بولی ”یہاں رہنے کی دوا داتیں ہوتی رہتی ہیں۔ غنڈے اور بد معاش کوئی کھدروں میں گھاٹ لگائے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اکیلے آدمی کو کچھ کر چھٹ پڑتے ہیں۔ چند یوں کے بچے کسی کومت کے گھاٹ آنا دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ہم جب سے یہاں آئے ہیں اس وقت سے اب تک یہاں اسی طرح قتل کی دوا دواتیں ہوتی ہیں۔“

”یہ اتفاق ہے کہ مجھے راستے میں کوئی رازن یا بد معاش نہیں ملا۔ شاید آئندہ کبھی ملاقات ہو جائے۔“ میں نے مرنے پر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”چائے پیو گے؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے

اجما۔

”ہاں۔ طلب تو ہو رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”چائے نہیں۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔ بہت دیر سے  
 ٹرانسجیمل چہارہ تھا اور میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“  
 ہنسا کرتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی اور میں اسے جاتے  
 ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ شبِ خوابی کے لباس میں تھی۔ باہر اگرچہ خاصی ٹھنڈی تھی لیکن دواڑے اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے باہر کے اندر کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ پیروں سے جو گرمی اُڑت ہوئے مجھے اچانک ہی ان غمگین سیاحوں کا خیال آیا جو کبھی فضا میں چھوڑ دیوں یا غیظوں میں پڑے ہوئے تھے لیکن پھر میں نے سرجھٹکا دیا۔ ان کی زندگیاں گھروں سے باہر کی گزرتی ہیں اور اس قسم کی تکلیفوں کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ انہوں نے سروی کے بچاؤ کا جو کام کیا ہے اس کی ہمدردی ضرور کر رکھا ہوگا۔

مک سینٹر فیملی پر رکھ دیے اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تمہارے نئے پڑوسیوں کا کیا حال ہے؟“ میں نے اپنا  
مک اٹھا کر چسکی لیے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے جانے کے کٹھوڑی دیر بعد دو افراد یہاں آئے تھے۔ ایک وہ لڑکی جس نے نیکر پن رکھی تھی اور دوسرا اس کا واڑھی والا تھی۔“ سونیا نے جواب دیا ”یہ لوگ پیرس سے آئے ہیں اور ایک دو روز یہاں رہ کر دھرم شالا کی طرف چلے جائیں گے تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے میں انہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

دیکھا۔  
”وہ لوگ سردی سے ٹھہر رہے ہوں گے۔“ سونیا بولی۔  
”یہ تمہارا خیال ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ان کے پاس سردی سے بچاؤ کا پورا بندوبست ہوگا۔ یہ لوگ سیلینک میگزائن کے ساتھ رہتے ہیں اور یہ سیلینک میگزائن اتنے گرم ہوتے ہیں کہ سردی لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”پھر بھی کھلی نغمائیں۔۔۔“ وہ بولی۔  
 ”تو پھر ایسا کرو کہ انہیں یہاں لے آؤ۔“ میں نے کافی  
 کی چسکی لیتے ہوئے کہا ”وہ لوگ یہاں کمرے میں سو جائیں  
 گے اور ہم باہر گھوم پھر کر رات بتا دیں گے۔“  
 ”اب ایسی بھی ہمدردی نہیں ہے مجھے ان سے۔“ سونیا  
 نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

میں نے صرف مسکرائے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کافی پینے کے بعد میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ سوینا خالی گک اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

میں کمرے میں اگر بستر لٹ گیا اور پانچویں کی طرف ہوا اکمل کھول کر اسے اوپر ڈال لیا۔ میرا خیال تھا کہ سونا بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی جائے گی لیکن وہ میرے کمرے میں آگئی۔ تھنڈے پانی سے مک دھونے سے وہ ایک دم سردی محسوس کرنے لگی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے لڑھکھڑا دیکھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی بھی پڑی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے گی لیکن وہ سرے ہی لے دھ لچھل کر بیڈ پر آگئی اور میرے کمرے میں کھس گئی۔ میں ایک دم حواس باختہ سا ہو گیا۔ میں نے اپنے کسی کو کشش کی تو وہ مجھ سے پلٹ گئی۔



”اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گی۔ شوہرا اٹھ کر آجائے گی اور وہ تمہارے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں لے گی۔ آرام سے لیٹے رہو۔“ اس نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بستر پر گرا دیا۔

سونیا نے بڑی خوفناک دھمکی دی تھی۔ اگر اس کی تیز آواز سن کر شوہرا آجاتی تو وہ قصور وار مجھے ہی سمجھتی۔ ایسے معاملات میں مجرم مرد کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو کوئی سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرنا کہ عورت بھی کسی مرد کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کر سکتی ہے۔

میں نے سونیا کو گھور کر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ آگئی۔

”کیا تم مجھے ہو کہ میں واقعی شور مچا دوں گی۔“ وہ بولی لیکن کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے پاس بیٹھ سکوں۔“

”اپنی دوستی کے ناتے میں تمہیں اس حق سے محروم نہیں کروں گا لیکن اس حق کے معاملے میں مجھے تم پر بھروسہ نہیں رہا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں تمہیں کھانا نہیں جاؤں گی۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”لیکن اگر شوہرا جاگے گی اور اس نے ہمیں اس طرح دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گی! میں نے کہا۔“

”شوہرا کی آنکھ صبح چھ بجے سے پہلے نہیں کھلے گی اور ویسے اطمینان رکھو۔ تمہارے بارے میں اس کے خیالات بہت مختلف ہیں۔ آج وہ تمہاری باتوں سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں اس کے بارے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

میں گھراسانس لیتے ہوئے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور کبیل اپنے اوپر سے ہٹا دیا تاکہ اتفاق سے شوہرا کی آنکھ کھل جائے اور وہ اپنے کمرے سے نکل کر اس طرف آجائے تو اسے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔

”کیا بتانا چاہتی ہو؟“ میں نے گردن کھما کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شوہرا بے پور میں اپنی جائیداد بیچنے اور یہاں گیسٹ ہاؤس کھولنے کے معاملے میں خاصی سنجیدہ ہے۔“ سونیا نے جواب دیا۔

”کوئی بات ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”دوپہر کو بھی بات ہوئی تھی اور شام کو تمہارے جانے کے بعد بھی۔“ سونیا نے جواب دیا ”تمہاری باتوں سے اسے کافی حوصلہ ملا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جس

کی وجہ سے وہ بے پور سے نکلنا چاہتی ہے۔“ ”کوئی خاص بات؟“ میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بے پور کا ایک سیاست دان دیش کھ بہت عرصے سے شوہرا کو پریشان کر رہا ہے۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”وہ بیٹن پست سے ٹیک لگا کر کمرے دراز ہوئی تھی اور میرے پاس بات یہ تھی کہ اس نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہیں تھی ”یوگا سے علاج تو ایک بہانہ ہے۔ وہ دیش کھ سے چھپ کر رہا آئی ہے۔“

”کب تک چھپی رہے گی۔ ایک دن تو اسے واپس جانا ہی ہوگا۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”لیکن دیش کھ اسے کیوں پریشان کر رہا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے؟“

”پہلے تو دیش کھ کی نظریں شوہرا کی پرانی پر تصویر سونیا نے جواب دیا۔ ”کافی ہاؤس والی بلڈنگ کے علاوہ ملہار روڈ پر اس کا ڈیڑھ ایکڑ کا ایک پلاٹ بھی ہے جس پر بیٹن پلاٹ بنا ہوا ہے۔ یہ پلاٹ شوہرا کے شوہر نے بہت عرصے پہلے خریدا تھا اور اس کے گرد چار دیواری اٹھا کر چھوڑ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مناسب وقت پر بیچ دیا جائے گا لیکن زندگی نے اسے موقع نہیں دیا۔“

”شوہرا نے یہ پلاٹ اپنے ایک جانے والے کو بغیر کرائے کے وے دیا جس پر اس نے بیٹنوں کا پلاٹ بنایا۔ شوہرا کا خیال تھا کہ اس طرح اس کے پلاٹ کی حفاظت بہت آگئی اور ضرورت کے وقت اسے خالی کرا لیا جائے گا لیکن تقریباً ایک سال پہلے گوالے کو پلاٹ خالی کرنے کو کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے پولیس کی دھمکی بھی دی تھی لیکن اس کے چند ہی روز بعد دیش کھ شوہرا کے پلاٹ پر ہتھیار کیا۔“ سونیا خاموش ہو گئی۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ اس نے انگلیں سمیٹ کر کبیل اچھی طرح پلٹ لیا۔ ”اس وقت میں بھی وہاں موجود تھی۔“ وہ کہہ رہی تھی ”میں نے بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ شوہرا کو دیکھ کر دیش کھ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ تم نے شوہرا کو دیکھا ہی ہے۔ کتنی حسین ہے۔ وہ سادگی میں بھی اس کا حسن قیامت خیز ہے۔ میک اپ اور دوسرے کمزوریوں میں تو وہ اور بھی قیامت بن جاتی ہوگی۔ بہر حال، دیش کھ کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک دیکھ کر میں بھی دل ہل گئی تھی۔“

”دیش کھ نے شوہرا سے کہا کہ اس کے پلاٹ پر جس گوالے نے بیٹنوں کا پلاٹ بنا رکھا ہے وہ اس کا آدمی ہے اس لیے اسے وہاں سے بنانے کی کوشش نہ کی جائے اس

بندھن کی آہستہ تھا۔ وہ شکل و صورت سے بھی غذا ایسی لگتا ہے اور اس نے غنڈوں کی فوج بھی پال رکھی ہے۔ دیش کھ کا غم ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنے رہنے سے بھرپور پر اپنا زمانہ اٹھاتے ہیں اور ساری کاموں کی آڑ میں گھٹاؤ نہ دینے کرتے ہیں۔ شرم میں دلائی شراب اور منشیات کی دھندلے دیش کھ کا کنٹرول ہے۔ ایک دو اور پارٹیاں بھی آج یہ دھندلا کر رہی ہیں لیکن دیش کھ نے ان سب کو دبا رکھا ہے۔

”اپنی دونوں ایک اخبار نے اس کے کالے دھندوں کی تفصیل شائع کی تھی۔ اس کے ایک ہفتے بعد اخبار کے دفتر کو آگ لگادی گئی۔ ایڈیٹر کو اس کے دفتر میں قتل کر دیا گیا اور اس پر پوری ادھڑی ہوئی لاش بھی ایک سڑک پر پڑی ہوئی تھی جس نے اس کے خلاف وہ رپورٹ مرتب کی تھی۔ بے یوگ لوگ جانتے تھے کہ اخبار کے دفتر اور پریس میں آتش زدگی اور ایڈیٹر اور رپورٹر کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن پولیس نے دیش کھ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس نے برعکس اس کی مخالفت پارٹی کے چند آدمیوں کو پکڑ کر ان کی دھمکی کر دی۔ بہر حال۔“ سونیا نے گھراسانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔

”شوہرا نے ایک بار پھر گوالے کو پلاٹ خالی کرنے کو کہا اور اس کے انکار پر وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ پولیس کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ دیش کھ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے انہوں نے شوہرا کو ٹال دیا اور گوالے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔“

”اس کے دو دن بعد دیش کھ ایک بار پھر شوہرا کے پلاٹ پر ہتھیار کیا اور اس کا پلاٹ خریدنے کی پیشکش کی۔ اس نے بات کی اتنی کم قیمت لگائی تھی کہ اس پر سوچنا بھی وقت اور اتنی ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت وہ پلاٹ کم سے کم گوالے کو روپے ایلٹ کا ہے اور دیش کھ اسے صرف پانچ لاکھ کی آفر دے رہا ہے۔ اس نے اپنے غنڈوں کے ذریعے شوہرا پر دباؤ ڈالی اور ان شروع کر دیا۔ کافی ہاؤس میں اسے دن تو بچھوڑ ہونے لگی۔ پولیس کو ان واقعات کی اطلاع دی جاتی لیکن شوہرا کے ساتھ قانون کے محافظوں کا دیکھنا ہی معاذ اللہ تھا۔ وہ انہماک کو دبانے کی کوشش کرتے۔ دیش کھ کا دباؤ بڑھتا رہا۔ شوہرا نے راجا صاحب سے مدد مانگی۔ یہ وہی سابق راجا ہے جس کا علاج شوہرا کے شوہر نے کیا تھا اور اس نے خوش ہو کر کافی ہاؤس والی بلڈنگ کے خلاف دیکھ کر اس کی راجا صاحب کے دباؤ کی وجہ سے پولیس

نے وہ پلاٹ خالی کر دیا لیکن دیش کھ تھلا اٹھا۔ ”ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کارروائی کے بعد دیش کھ دیک کر بیٹھ جاتا لیکن اس قسم کے لوگ آسانی سے کسی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ دیش کھ بھی بھڑکیا اور شوہرا کو ہراساں کرنے کے لیے نیت سے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگا۔“

”وہ سیاست داں ہے۔ اس کی گمبیر ہے۔ اس کا بھی اثر و رسوخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ غذا ایسی ہے۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنی شکست نہیں مانتے۔ اس نے ایک اور چال چلی۔“

”کیسی چال؟“ سونیا کے خاموش ہونے پر میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”چند مہینے پہلے وہ ایک بار پھر شوہرا کے فلیٹ پر آیا تو یکسر بدلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ دیش کھ، شوہرا کے لیے بہت سے تحائف لے کر آیا تھا اور ان تحائف میں جیولری کا ایک قیمتی سیٹ بھی تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں شوہرا کو شادی کی پیشکش کی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھی اور انہیں ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔“

”دیش کھ نے اسے سوچنے کے لیے ایک مہینے کا وقت دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے غلط فیصلہ کیا تو اسے سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔“

”اس بات کو میں مہینے گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں دیش کھ خود تو اس کے فلیٹ پر نہیں آیا لیکن وہ بار بار فون کرتا رہتا ہے۔ چند دن پہلے اس نے فون پر خری مرتبہ دھمکی دی تھی کہ اگر شوہرا نے جواب نہیں دیا تو وہ اسے اپنے آدمیوں کے ذریعے اٹھوالے گا اور جب تک کوئی اس کی مدد کو آئے گا اس وقت تک وہ شوہرا کے ساتھ بہت کچھ کر چکا ہوگا۔“

”میں شوہرا کو بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ وہ بہت شریف عورت ہے۔ خوب صورت ہے، عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ دھرم کے معاملے میں اتنی کڑی نہیں ہے۔ اسے دوسری شادی کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن دیش کھ جیسے شخص سے تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ آدمی ہے جو کپڑوں کی طرح عورتیں بدلتا ہے۔ ایسے لوگ شادی کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ شوہرا جانتی ہے وہ اسے شادی کا پتلا کھیل دے رہا ہے۔ اس کی نظریں دراصل شوہرا کی جائیداد، خصوصاً اس پلاٹ پر ہیں۔ شوہرا کے حسن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک جاگ اٹھتی ہے لیکن

میں جانتی ہوں شوہا سے اس کا دل بہت جلد بھر جائے گا اور اس دوران میں جب وہ دھوکے سے یا دھونس دھمکیوں سے شوہا کی جائداد پر قابض ہو جائے گا تو اسے اٹھا کر سڑک پر پھینک دے گا۔

”دیش کھ سے بچنے کے لیے ہی شوہا چوری جیسے پھیاں آتی ہے۔ کل گیسٹ ہاؤس یا ریسٹورنٹ کی بات ہوئی تھی۔ اس معاملے میں وہ اب بہت خبیثہ ہے اور اس کا خیال ہے کہ بے پور کی حاکم اور فروخت کرنے کے لیے تمہارے دوست ٹھاکر سے مدد لے گی۔ شوہا سمجھتی ہے کہ یہاں وہ محفوظ رہے گی۔ بے پور میں وہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگتے دے گی کہ کہاں گئی ہے۔“

”یہ اس کی خام خیالی ہے کہ میاں دییش کھ کے شر سے محفوظ رہے گی۔“ میں نے بیا کے خاموش ہونے پر کہا ”دارا کو شاید تم بھول چکی ہو۔ اس گندی فطرت کے لوگ نہ خود چین سے بیٹھے ہیں نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہیں۔ دارا نے ہمیں کتنا پریشان کیا تھا۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس نے کہیں بھی ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ نہ بہر حال شوہا اگر یہ سمجھتی ہے کہ وہ میاں محفوظ رہے گی تو میں اس کے دل میں کوئی وسوسہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں ٹھاکر سے کہہ دوں گا۔ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا لیکن میرے خیال میں شوہا اگر بے پور ہی میں رہے تو ٹھاکر بہتر طور پر اس کی مدد کر سکے گا۔“

”میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“ سونیا نے جواب دیا ”وہ دییش کھ سے خوف زدہ ہے۔ ایک اہلی عورت اس جیسے لوگوں کے خلاف کر بھی کیا سکتی ہے۔ بے پور میں رہتے ہوئے اسے ٹھاکر کا سہارا تو بہت ہوگا اور وہ اپنے بچے کے دوست راجا سے بھی مدد لے سکتی ہے لیکن بات تو یہی ہے۔ جب تک کوئی اس کی مدد کو آئے گا شوہا کا کام ہو چکا ہوگا اس لیے وہ اتنا دور چلی جانا چاہتی ہے کہ دییش کھ کی نظر اس تک نہ پہنچ سکے۔ اس نے شاید بہت پہلے سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میاں چوری جیسے چھپے آئی ہے۔ اس کے کافی ہاؤس کے قیصر کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شوہا یہ سوچ کر ہی یہاں آئی ہو کہ صورت حال کا جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کرے گی اور کل اس نے تمہارے سامنے اس کا تذکرہ بھی کر دیا اور تم نے کاروباری حوالے سے اپنی رائے بھی دے دی اور ٹھاکر کے تعاون اور انداز کی امید بھی دلا دی لیکن اصل بات وہی ہے جو میں نے بتائی ہے۔ وہ دییش کھ کی نظروں سے دور رہنا چاہتی ہے۔“

”لیکن اس نے شاید یہ نہیں سوچا کہ اس دنیا میں تو ہم قدم پر دییش کھ جیسے لوگ ہیں جو اس کا بیٹا حرام کر گئے۔“ میں نے کہا ”عورت خوب صورت ہو جو ان پر ہوا ہو اور اس کے پاس بے حساب دولت بھی موجود ہو تو تو اس کے پجاری مہوار خور گرگھروں کی طرح اس کے آس پاس منڈلانے لگتے ہیں۔“

”ایک بات کہوں؟“ سونیا میری طرف دیکھنے لگی۔ ”بولو۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے لیے اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا۔ تم میاں کیوں نہیں رہ جاتے؟“ سونیا نے کہا ”شوہا کو بھی اچھا لگتا ہے کہ اب۔“

”نہیں سونیا۔“ میں نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا ”میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہ سکوں گا۔“ ”نی الحال تو تم یہیں ہونا۔“ سونیا نے کہا ”ٹھیک ہے ہم پھر کسی وقت بات کریں گے۔ ہو سکتا ہے صورت حال دیکھتے ہوئے تم اپنا خیال بدل دو۔“

”اس وقت تو مجھے خینڈ آرہی ہے۔“ میں نے کہا ”وڑا رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی جاکر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔“

اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ سونیا بغیر کسی ٹیل و جت کے بہتر سے اٹھ کر شوہا والے کمرے میں چلی گئی۔ اپنا بہتر گزشتہ رات ہی اس کمرے میں نے گئی تھی۔ میں نے بہتر لٹ کر کمرے میں سوچنا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

رات کو دیر سے سونے کے باوجود میری آنکھ مجھ سے ہلکی سی گئی۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ میں بہتر سے نکلا اور کالج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ کچھ دیر تک رات کو اچھا لگا رہا اور پھر ایک جگہ پر بیٹھ کر سانس کی سن کرنے لگا۔ میں نے اس وقت بھی بیٹھنے کے لیے پے پیٹھ پر آسن اختیار کیا تھا۔ یوگا کی لاتعداد خشون میں یہ آسن اختیار کیا جاسکتا تھا۔

جیسے ہی سورج طلوع ہوا، میں اپنی مشق ختم کر کے کالج کی طرف واپس آیا۔ واپسی پر میں بڑے بڑے چھوٹی چھوٹی میں غیر ملکی سیاحوں کے خیمے کے قریب سے گزرا تھا۔ خیر چاروں طرف سے بند تھا اور اندر خاموشی تھی۔ ظاہر ہے لوگ سلیپنگ بیگز میں دبے دبے خینڈ سو رہے ہوں گے۔ ٹھیک سات بجے یوگی دھیراج آیا۔ وہ شوہا کو اس کے

کمرے میں مشق کروا رہا لیکن میں اس کے سامنے نہیں آیا اور اپنے کمرے میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا چائے پیتا رہا۔ سونیا بھی میرے سامنے بیٹھی چائے کی چٹکیاں لے رہی تھی۔

شوہا سے میری ملاقات ناشتے پر ہی ہوئی تھی لیکن اس وقت کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں خود سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور میرا خیال تھا کہ سونیا نے رات کو مجھ سے جو بات کی تھی، شوہا سے ابھی تک ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

ہم ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ گٹار کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ان غیر ملکی ٹورسٹوں کا خیال ابھر آیا۔ کل جب وہ لوگ یہاں آئے تھے تو کسی ایک کے پاس میں نے گٹار بھی دیکھا تھا اور پھر تھوڑی سی دیر بعد فٹائیں ایک ناگوار سی بو محسوس کر کے میں چونک گیا۔ یہ بو میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ سونیا اور شوہا نے بھی یہ بو محسوس کر لی تھی۔ شوہا تو ناگوار سے انداز میں اپنے تختے کوڑنے لگی۔

”یہ یہ یو کیسی ہے؟“ وہ اُدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”تمہارے پردوس میں جو لوگ آکر آباد ہوئے ہیں وہ وہاں رہ رہے ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ شوہا شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی لیکن سونیا کے ہونٹوں پر خفیف کی مسکراہٹ اُٹھ گئی تھی۔

میں کالج سے باہر آیا اور نشتے چھلکا چکا کر فٹائیں کچھ موش کی کوٹھنل کرنے لگا اور پھر ٹھٹھ والے انداز میں ان بڑے بڑے پتھروں کی طرف چلنے لگا جن کی دوسری طرف ان فیرکیوں کا خیرہ نصب تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ان کا ڈرامی والا ایک ساتھی ایک چتر بیٹھا گٹار بجا رہا تھا اور باقی چاروں خیمے کے سامنے نٹن، ہر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے چرس پی رہے تھے۔ ٹھٹھ والی لڑکی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چلم تھی جس میں ٹھٹھ کے ساتھ چرس پھری ہوئی تھی۔ اس کے نیچے ایک ایک گڑھا لگا ہوا تھا۔ لڑکی نے چلم کو دونوں ہاتھوں میں پکڑیں اور پوری قوت سے سانس اندر کوکھینچنے لگی۔

ایک غمگین لڑکی کے بعد اس نے سلفی اپنے ہاتھوں کی طرف بڑھادی اور تڑھال سی ہو کر زمیں بوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ وہ زمین پر بے ہوش پڑی ہوئی گریے گریے سانس لے رہی تھی۔

وہ باری باری کٹھ لگاتے رہے۔ میں پتھری آڑ میں کھڑا تھا اس لیے وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں جب ان کے سامنے آیا تو اس وقت سلفی دوسری لڑکی کے پاس تھی۔

انہوں نے مجھے دیکھ لیا لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ دوسری لڑکی نے سلفی کو دکھا کر مجھے بھی دعوت دی۔ میں ان کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور باری باری ان کی شکلیں دیکھنے لگا۔

یہ منظر میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ تھائی لینڈ میں خصوصاً بنگاک میں قدم قدم پر ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ امریکی اور یورپین بھی محض منشیات کی طلب میں دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ان ممالک کا رخ کرتے ہیں جہاں چرس اور ہیروئن جیسی منشیات آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔

ان لوگوں کا تعلق بھی اسی قبیل سے تھا۔ ان میں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا تعلق لندن سے تھا جبکہ باقی تینوں فرانس کے رہنے والے تھے۔ سڑکے دوران میں ہی یہ لوگ آپس میں مل گئے تھے اور اس طرح باجماعت آوارہ گردی کر رہے تھے۔ منشیات کی طلب انہیں ہندوستان لے آئی تھی۔ ہندوستان میں انہوں نے اپنا سفر بیکس سے شروع کیا تھا اور کل شام یہاں پہنچے تھے۔ ان کا ارادہ ہمارا چل پڑییش کی طرف جانے کا تھا، جہاں بقول ان کے ”دنیا کی بہترین چرس ملتی تھی۔“

میں بھی ایک عرصے سے ہندوستان میں رہ رہا تھا لیکن یہاں منشیات کے حوالے سے میری معلومات صفر کے برابر تھیں لیکن ان ہمسایوں کو ایک ایک بات کا علم تھا۔ انہیں پتا تھا کہ پوست کی کاشت کن علاقوں میں ہوتی تھی اور سب سے اچھی چرس یا ہیروئن کہاں مل سکتی تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق پوست جتنی زیادہ بلندی پر کاشت ہوگی، چرس اور ہیروئن کی کوالٹی اتنی ہی زیادہ بہتر ہوگی اور یہ لوگ چرس اور ہیروئن کی اعلیٰ کوالٹی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمارے پڑییش کی طرف جارہے تھے۔ وہاں چرس کی خرید و فروخت اور اس کے استعمال پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ چرس یا ہیروئن کسی بھی دکان یا ڈھابے سے بغیر کسی دشواری کے خریدی جاسکتی تھی۔

ہم جیسے لوگ جب سفر نکلتے ہیں تو سب سے بڑی پریشانی زاوراہ کی ہوتی ہے۔ ہمیں سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ سڑکے دوران میں ہم کہاں گئے کہاں سے؟ ہمیں گھر کے کہاں اور

دوسرے اخراجات کیسے پورے ہوں گے لیکن یورپین بیسوں کو ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ اپنا بینک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ بیسوں کے ہر گروپ میں کوئی نہ کوئی خوب صورت اور جوان لڑکی ضرور ہوتی ہے اور یہی خوب صورت لڑکی ان کے لیے ہر بینک کی حیثیت رکھتی ہے جسے جب چاہا اور جہاں چاہا کیش کروایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں۔

اس گروپ کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں جوان اور حسین تھیں۔ اس لیے ان لوگوں کو اخراجات کی بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھا گپ شپ کرتا رہا۔ انہوں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔ چائے کا ایک گھونٹ پھل نہیں پیا تھا لیکن چرس کا زہر بے دھڑک اپنے پیچھے پڑوں میں اتار رہے تھے۔ سٹوکی کے کش لگانے کے بعد اب انہوں نے چرس بھرے سگریٹ سلگ لیے تھے اور اُدھر اُدھر بیٹھے کش لگا رہے تھے۔ اس دوران میں نیکرو والی لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے اپنی شرٹ کا ایک اور بٹن کھول لیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف جھنکے گی۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ بھی میری طرف بڑھا دیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کانچ کی طرف واپس آگیا۔

سونیا اور شوہا کانچ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک خالی کرسی میرے لیے بھی رکھی ہوئی تھی۔ ناشتے کے دوران میں ہم نے چائے نہیں پی تھی۔ سونیا کانچ میں جا کر چائے بنا لائی اور چائے پیتے ہوئے میں انہیں ان غیر ملکی ٹوریسٹوں کے بارے میں بتاتے لگا۔

انہی باتوں کے دوران میں سونیا نے رات والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس طرح مجھے شوہا کے بارے میں اس سے براہ راست بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے صرف ایک سوال کیا تھا اور شوہا ہلٹ پڑی تھی۔ وہ رکے بغیر اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس طرح دلش کھ کے شرے محفوظ رہ سکیں گی؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”شاید ایسا نہ ہو۔“ شوہا نے جواب دیا۔ ”لیکن میرے غائب رہنے سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ وہ شیطان مجھے بھلا دے گا اور عرصے بعد جب کبھی ہمارا آسنا سامنا ہو تو ہوسکتا ہے وہ۔“

”دلش کھ جیسے بدکردار لوگ دولت اور عورت کو ہنس بھولتے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بہر حال، اگر آپ اس میں اپنا کوئی مفاد سمجھتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج ہی ٹھاکرے سے فون پر بات کر کے اسے یہاں بلا لیتا ہوں۔ وہ آپ کو بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔“ ”ٹھیک ہے۔ تم ٹھاکر کو یہاں بلا ہی لو۔ میں اس سے بات کروں گی۔“ شوہا نے کہا۔ گویا وہ بے پور میں اپنی جامدادی پتچے اور یہاں رشی کیش میں میٹل ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

اس دوران میں سونیا سودا سلف لینے کے لیے بازار چلی گئی۔ اس نے مجھے بھی چلنے کو کہا تھا لیکن اس وقت میرا نہیں جانے کا مود نہیں تھا۔ میں وہیں بیٹھا شوہا سے باتیں کرتا رہا اور پھر شوہا بھی اٹھ کر کانچ میں چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی ٹیکر اور اوپن شرٹ والی وہی لڑکی آگئی اور میرے بے تکلفی سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کافی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی اور پھر میں نے اسے بھگا دیا۔

میں کرسی سے اٹھنا چاہتا تھا کہ شوہا کانچ سے باہر آگئی۔ اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ٹھاکر آئی تھی۔ کپڑے بھی بدل لیے تھے۔ وہی سفید ساڑی اور سفید بلاؤز۔ ساڑی کا پلوٹے لٹکا ہوا تھا اور سر کے لیے بال اس نے تولیے میں لپیٹ رکھے تھے۔

میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور کچا بات تو یہ ہے کہ اسے اس طرح بغور دیکھنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا تھا۔ وہ بیوہ ضرور تھی لیکن عمر زاوہ نہیں تھی اور اس کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ لانا بدگاہ لڈن پادام جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں گلاب کی پتیوں جیسے سرخ ہونٹ، لمبے سیاہ بال اور بدن کی رنگت ایسی جیسے میدے نما گلابی رنگ گھول کر بنایا گیا ہو۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ کم بخت دلش کھ بنے جھاڑ کر اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو اسے دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھرتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کچھ نے مذہبانہ انداز میں اسے بدل کی بات بھی کہہ دی ہو لیکن انکار سن کر دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی ہو۔ یہ ہمت تو دلش کھ میں پیدا ہوئی تھی اور وہ اس کے درپے آزار ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شوہا کے حسن و شباب کے ساتھ اس کی دولت میں ہر شخص بہت دلش کھ کی سیاست دانا تھا۔ اس کے بارے میں ہر شخص بہت

توجہ نہ کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا۔ شوہا بھی جانتی ہوگی کہ میں نے کوالے کے ذریعے اس کے پلاٹ پر قبضہ کر لیا اور اس کی تھی تو شوہا کو خبر ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے اور اب وہ اس سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ شوہا نے مجھے اپنی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہ! کچھ نہیں۔“ میں گڑبڑا سا گیا۔ شوہا نے جرح نہیں کی اور کرسی اٹھا کر دھوپ میں بیٹھ گئی۔ اس وقت اگرچہ گیارہ بج چکے تھے لیکن زہر دھوپ بہت بھل اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں ان بیسوں کو جنوں کی آڑ سے برآمد ہوتے دیکھ کر چونک سا گیا۔ انہوں نے اپنے اپنے بینک کندھوں پر لا دھڑکے تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے وہ چند لمحوں کو رک گئے۔ کلین شیو والے نے بتایا کہ وہ شملہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے دھرم شالا کی طرف نکل جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد سونیا بھی سو والے کر آگئی اور میں اٹھ کر اسی سرسبز ساڑی پر اُدھر اُدھر گھومتے لگا۔ کانچ کے عقب میں تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی تھی۔ میں پانی میں پیر کر بیٹھ گیا اور اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

شام کی چائے میں نے سونیا اور شوہا کے ساتھ پی اور پچاس بازار کی طرف نکل گیا۔ بازار میں کئی بیک فون شاپیں تھیں۔ میں ایک دکان پر رک گیا۔ دکان کیا تھی، سڑک کے پوز پر لکڑی کا ایک بڑا سا کین بن تھا۔ وہاں ایک لمبی سی میز تھی جس پر تین ٹیلی فون میٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے ایک لمبی سی تینچہ بھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک لمبی تھی جس پر اس فون شاپ کا مالک بیٹھا ہوا تھا۔ اس بین میں ایک طرف بوتھ بھی بنا ہوا تھا اس میں بھی دیوار کے ساتھ ایک لمبی فون سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس بوتھ میں ایک نن لکڑی اور کرفون پر بات کر سکتا تھا۔

میں میز پر رائٹنگ پیڈ اور بال پین بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے ٹھاکر کا نمبر لکھ کر پین کرکسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔

”تپ پور کا نمبر ہے۔ لائن ملنے میں کتنی دیر لگے گی؟“ ”لائن تو ایک سیکنڈ میں مل جائے گی مگر پچاس روپے میں لگے۔“ اس نے نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کتنے منٹ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”منٹ کی کوئی پابندی نہیں۔ آرام سے بات کر لیتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ نمبر ملا۔“ میں اس فون پر بات کروں گا۔“ میں نے بوتھ کی طرف اشارہ کیا اور جب سے پچاس روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ٹرنک کال صرف پچاس روپے میں اور وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی حالانکہ ٹرنک کالز میں ایک ایک منٹ کا حساب ہوتا ہے اور بڑی منگنی کالز ہوتی ہیں۔ یہ سب کرپشن کا کمال تھا۔ پی سی او اور پیلی فون ایکسیچینج والے ملی جھگت سے ایسے دھندے کر رہے تھے کہ کمالی تو ان لوگوں کی ہوا اور پھر سرکار کو اٹھاتا پڑے۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لائن ملنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے اور پھر اس نے مجھے بوتھ کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے بوتھ میں داخل ہو کر نمبر پر منگوا رہا ریسور اٹھایا۔

کال ٹھاکر نے ریسور کی تھی۔ وہ میری آواز سننے ہی چمک اٹھا۔ میں پہلے تو ٹھاکر سے خیریت دریافت کرتا رہا پھر جلد ہی اصل موضوع پر آگیا اور اسے شوہا کے بارے میں بھی بتا دیا۔

”بہتر ہوگا کہ تم ایک دو دن کے لیے یہاں آ جاؤ۔ تم لوگوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں روپ منی اور بلا کر لے کر ایک دو روز میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ دونوں بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ بس تمہارے ہی نام کی مالا چھتی رہتی ہیں۔ ملا تو ہمیں بہت پریشان کرتی ہے کہ ہم نے تمہیں جانے ہی کیوں دیا تھا۔ وہ جب تمہارے بارے میں سنے گی تو بہت خوش ہوگی۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ ”میں انتظار کروں گا۔“ میں نے اسے اپنا پتہ سمجھا دیا اور فون بند کر کے بوتھ سے باہر آیا۔ ”مہاراج۔“ آپ کو جب بھی فون کرنا ہو، یہاں آ جایا کریں۔ ڈومیسٹک کال پچاس روپے اور انٹرنیشنل صرف سو روپے۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ اپنے دوستوں اور گھر والوں سے جتنی دیر چاہیں بات کریں۔“

”شکریہ مہاراج۔“ میں نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”جب بھی کہیں کال کرنے کی ضرورت پڑی، میں ہمیں آؤں گا۔“ فون شاپ سے نکل کر میں کچھ دیر بازاروں میں گھومتا

رہا اور پھر گوتم بھوش کے کانچ اٹھیا۔ یہاں لوگ مختلف مشقوں میں مشغول تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ مشقوں سے فارغ ہو کر کافی دیر گوتم بھوش سے گپ شپ ہوتی رہی اور پھر یہ طے ہوا کہ اگلے روز صبح مجھے کنڈلی کی ریاضت شروع کرنی چاہیے۔

اس روز بھی میں رات گیارہ بجے کے قریب اپنے کانچ واپس آیا تھا۔ شربھا سوچا کہ سچی البتہ سونا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔

اگلے روز صبح ہی میں گوتم بھوش کے پاس پہنچ گیا۔ میرے لیے ایک الگ کیمین نما کمرے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اصل چاب شروع کرنے سے پہلے میں نے سانس کی ایک دو مشقیں کیں اور پھر پدم آسن اختیار کر کے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے گوتم بھوش نے مجھے بڑی تفصیل سے بتا دیا تھا کہ ریزہ کی ہڈی کے نیچے پوشیدہ آتشیا ناگن یا کنڈلی کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے اور پوری ریاضت کے دوران میں کیسے کیسے مرحلے پیش آتے ہیں۔

گوتم بھوش کے کہنے کے مطابق ریاضت پر عمل کرتے ہوئے ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد اچانک بجلی سی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور یوگ کرنے والا اس روشنی میں نما جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ یوگی اپنے آپ کو ہوا میں معلق محسوس کرتا ہے جیسے زمین سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو اور جب ریاضت سے توجہ ہٹتی ہے تو وہ اپنے آپ کو زمین پر بیٹھے ہوئے پاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب اور ناقابل یقین قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور پھر وہ مرحلہ بھی آ جاتا ہے جب ریزہ کی ہڈی کے آخری سرے سے کوئی چیز اوپر کی طرف رینگنے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی کنڈلی یا آتشیا ناگن یا اس پر اسرار قوت کی بیداری کا نقطہ آغاز ہے۔ جیسے ہی یہ پر اسرار قوت بیدار ہوتا شروع ہوتی ہے انسان کے اندر لاشعوری مزاحمت بھی شروع ہو جاتی ہے "ارے چھوڑو۔ یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ یہ تو سادھوؤں کے کام ہیں۔ تم تو اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہو۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔" اس قسم کے لاشعوری خیالات حملہ آور ہوتے رہتے ہیں اور دراصل یہی وہ وقت ہوتا ہے جب زیادہ یک سوئی اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدم توجہی سے سارا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے جب یوگ کرنے

والے کو اپنا جسم سکڑنا اور سنہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ جسم میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تو اس پر اسرار قوت کا کرشمہ ہے جو ریزہ کی ہڈی میں بدستور اوپر کی طرف سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یوگی روشنی کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ پانی کی طرح روشنی کی لمبوں کے تجزیے کرتے رہتے ہیں۔ یوگی اپنے آپ کو ایک نئی اور پر اسرار دنیا میں محسوس کرتا ہے جہاں کی ہر چیز انوکھی ہے۔ ریاضت ختم کرنے پر سب کچھ غائب ہو جاتا ہے لیکن ریاضت جب دوبارہ شروع کی جاتی ہے تو یوگی ایک بار پھر اس پر اسرار دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے جب یوگی اپنے آپ کو بالکل مفلوج اور بے دست دیا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ میں جان نہ رہی ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور یوگی اپنے آپ کو ہلکا چمکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذہنی قوتیں وسعت اختیار کرنے لگتی ہیں اور ریزہ کی ہڈی میں لمبیں بدستور اوپر کی طرف رینگنے ہوئے محسوس ہوتی رہتی ہیں۔

اور پھر ایک اور نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ بھوک پان غائب ہو جاتی ہے۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بالکل الگ تنہا گھبراہٹ کو دل چاہتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس پر اسرار دنیا کی سیر کی جائے۔ بعض اوقات نیند اڑ جاتی ہے اور بے چینی کی سی کیفیت طاری رہنے لگتی ہے لیکن چند روز بعد یہ کیفیت تو ختم ہو جاتی ہے البتہ ایک نئی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ مرحلہ بہت زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔ ریاضت یا چاب میں دل نہیں لگتا۔ خیالات کو یکسو کرنا بے حد مشکل لگتا ہے اور وہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر یوگی بہت بار جائے تو ساری محنت پانی پھر جاتا ہے۔ تاہم کوشش جاری رکھی جائے تو یکسوئی حاصل ہوتے ہی وہ پر اسرار شعلی ریزہ کی ہڈی کے نیچے ایک بار پھر اوپر کی طرف رینگنے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس موقع پر کانوں میں عجیب خرفناک اور گرجن دار آوازیں گونجنے لگتی ہیں جیسے ہماؤ ٹوٹ رہے ہوں۔ جسم بدستور ہوا محسوس ہوتا ہے حالانکہ جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یوگی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی پر اسرار قسم کے چکر میں پھنس گیا ہو اور اس چکر سے نکلنا اس کے بس میں نہ ہو۔ اب ایک نیا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بھوک پان

غائب ہو جاتی ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے اور ستر پر لیٹنے کی صورت میں ریزہ کی ہڈی میں کرنٹ سا محسوس ہوتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور چہرے سے وحشت سی برتنے لگتی ہے۔ اس دوران میں وہ پر اسرار قوت بدستور اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات سانس کے پھارنے کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں شاید اسی لیے اس پر اسرار قوت کا نام کنڈلی شعلی رکھا گیا ہے۔ اس پر اسرار قوت کی حرکت روز بے روز ہوتی رہتی ہے اور وہ ریزہ کی ہڈی میں راست بناتے ہوئے دماغ کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

اور پھر وہ آخری مرحلہ آتا ہے جب یوگی طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسے خوف کے سائے گھیرنے لگتے ہیں۔ چہرہ زرد کال پٹیکہ ہوئے اور جسم میں آگ سی لگتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ یوگی برسوں کا پیار نظر آتا ہے۔ اس دوران میں وہ پر اسرار قوت بدستور اوپر کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے اور جب یہ دل میں سے گزرتی ہے تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔

اور پھر یہ مرحلہ بھی گزر جاتا ہے۔ جسم کی توانائیاں آہستہ آہستہ بحال ہونے لگتی ہیں۔ یہ پر اسرار قوت جسم کے جس جس عضو سے گزرتی ہے اسے بیدار کرتی چلی جاتی ہے اور جب یہ کنڈلی یا پر اسرار قوت دماغ میں پہنچتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پورا وجود روشنی میں نما گیا ہو اور یوگی اپنے آپ کو نیا انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر وہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

"گرو کی رہنمائی کے بغیر اس طرح کے چاب خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "اس لیے جب بھی تم کو کوئی پریشانی یا غیر معمولی بات محسوس کرو مجھے بتا دینا۔ چاب کے دوران میں خوراک کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ میں تمہیں ساتھ ساتھ بتاتا ہوں گا۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔ ویسے مجھے دشواری ہے کہ تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

گوتم بھوش اس کیمین نما کمرے سے نکل گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تپتیا شروع کر دی۔ گوتم بھوش نے مجھے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ ریزہ کی ہڈی کے نیچے بیٹھے میں خوابیدہ اس پر اسرار قوت کو بیدار کرنے کے لیے کس طرح تشریں لگانی چاہیے گی۔

میں چار روز گزر گئے۔ میری ریاضت جاری رہی اور اس دوران میں میری معمول کی سرگرمیوں میں بھی کوئی فرق

نہیں آیا۔ ٹھاکر کو فون کیے ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے اور وہ چھٹا دن تھا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ہم کانچ میں شوبھا والے کمرے میں بیٹھے چائے پیئے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے بہت سے قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر ایک آواز سن کر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ ٹھاکر کی آواز تھی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ وہ ٹھاکر ہی تھا۔ اس کے ساتھ روپ متی اور ہمارا بھی تھی۔ وہ تینوں مجھ سے اس طرح ملے جیسے بدلتوں سے پتھرے ہوئے ہوں۔ ہلا کی آنکھوں میں تو آنسو آگئے تھے۔

سونا اور شوبھا بھی روپ متی اور ہمارے اسی انداز میں ملی تھیں۔ شربھا کی ان سے اگرچہ پہلے کئی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن روپ متی بے پور کی ایک معروف ہستی تھی۔ اسے تو شہر کا ہر شخص جانتا تھا۔ شوبھا نے ٹھاکر سے مل کر بھی بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"آپ لوگ کب آئے۔ اس وقت تو کوئی بس نہیں آتی؟" سونا نے پوچھا۔

"ہم لوگ دوپہر کو یہاں پہنچے تھے۔ بہت تھکے ہوئے تھے۔ گیٹ ہاؤس میں جاتے ہی سو گئے۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"گیٹ ہاؤس کیوں ٹھاکر جی؟" شوبھا بولی "یہ کانچ موجود ہے نا۔ اس میں اتنی گنجائش تو ہے کہ سب لوگ سما سکیں۔"

"بات یہ ہے شوبھا جی۔" ٹھاکر نے کہا "میں نے سوچا سوٹ کیس اٹھائے کہاں گھومتے پھرں گے۔ پہلے کسی ٹھکانے کا بندوبست کر لیا جائے پھر تسلی سے آپ لوگوں کو تلاش کریں گے۔"

"اب تو آپ یہاں پہنچ گئے نا۔" شوبھا بولی "اب آپ لوگ واپس نہیں جائیں گے۔ صبح سونا گیٹ ہاؤس سے سامان لے آئے گی۔"

"جئے، ٹھیک ہے۔ ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔" ٹھاکر مسکرایا۔

"ہمارا یہ ٹھکانا تلاش کرنے میں دشواری تو پیش نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے پتا اس قدر تفصیل سے سمجھایا تھا کہ ہمیں کسی اور دروازے پر دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ گیٹ ہاؤس سے نکلنے کے بعد سیدھے ہمیں آکر رکے

ہیں۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔  
سونا ہلا کے قریب بیٹھی باتیں کر رہی تھی پھر وہ اٹھ کر  
بچن میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ چائے  
پینے کے دوران میں باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ٹھاکر اور  
شوہا ذاتی طور پر ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے مگر ان کا  
برزنس ایک ہی تھا۔ وہ وہ فلٹنگ کے برزنس کے بارے میں  
بات کرتے رہے۔

”یہ جگہ بھی اچھی ہے۔“ ٹھاکر کہہ رہا تھا ”میں دو تین  
مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ یہاں سرائے، گیسٹ ہاؤسز  
اور ہوٹل تو بے شمار ہیں مگر کوئی ڈھنگ کا ہوٹل یا گیسٹ  
ہاؤس نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بھی یہاں ہوٹل بنانے  
کے بارے میں سوچا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے اس طرف  
توجہ نہیں دے سکا تھا۔“

”تو پھر آپ کا کیا خیال ہے؟“ شوہانے سوالیہ نگاہوں  
سے اس کی طرف دیکھا ”مگر یہاں کوئی معیاری گیسٹ ہاؤس  
اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ بنایا جائے تو اس کی کامیابی کے  
کتنے فیصد امکانات ہیں؟“

”اس قسم کے برزنس کبھی فیل نہیں ہوتے۔“ ٹھاکر نے  
جواب دیا ”میرا پروگرام تو یہ تھا کہ ایک معیاری رہائشی  
ہوٹل کے ساتھ ایک باسٹل بھی بنایا جائے۔ لوگ دور دراز  
کے علاقوں سے یہاں یوگا کیلئے آتے ہیں۔ ہر شخص  
کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایسے ہوٹل میں رہائش  
اختیار کر سکے۔ سستے گیسٹ ہاؤسز اور سرائے وغیرہ میں انہیں  
وہ سہولتیں نہیں ملتیں جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ میرا  
پروگرام یہ تھا کہ ہوٹل کا ایک ایک کمر دو دو آدمیوں کے  
لیے مخصوص رکھا جائے۔ کرایہ بھی کم ہوگا اور انہیں  
مناسب سہولتیں بھی ملیں گی لیکن یہ لمبا کام ہے۔ آپ ان  
بکجیٹوں میں کہاں پر ہیں گی۔ ایک معیاری گیسٹ ہاؤس اور  
اس کے ساتھ ریسٹورنٹ ایک آئیڈیل پروگرام ہے۔ اس  
سلسلے میں مجھ سے جو بھی ہو سکے گا وہ میں آپ کے لیے کروں  
گا۔“

”شکریہ ٹھاکر جی۔“ شوہانے کہا ”لیکن اس کے لیے  
سب سے پہلے ہمیں یہاں کوئی مناسب جگہ دیکھنی ہوگی۔“  
”وہ ہم دیکھ لیں گے۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”میں دو چار  
دن یہاں رہوں گا۔ ہم گھوم پھر کر دیکھ لیں گے۔ جگہ تلاش  
کر لیں گے۔“

”اور ٹھاکر جی۔“ شوہانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
کہا ”جے پور میں میرا پلاٹ اور کافی ہاؤس ہے۔ اس کا

بندوبست بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ دراصل میں اب بالکل  
نہیں جانا چاہتی۔ میں آپ کو یاد آف اٹارنی دے سکتی  
ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں، میری جائیداد کو ذمہ  
آف کر دیں۔ اس شرٹ سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔“  
”کافی ہاؤس اور وہ بلڈنگ تو مجھے میں نے خرید لیا۔“  
ٹھاکر نے سکرٹاتے ہوئے کہا ”آپ اس کی جو قیمت لگا سکتی  
وہ میں دوں گا۔ اس میں کوئی بارگیننگ نہیں ہوگی اور وہ  
پلاٹ۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ سے قیمت لگوانی ہوگی اور  
وٹواس کیجئے۔ میں اس میں بھی آپ کو کوئی نقصان نہیں  
ہونے دوں گا۔“

”وٹواس!“ شوہا بولی ”آپ نے عجیب بات کہہ دی  
ٹھاکر جی۔ وجدان کے ہوتے ہوئے مجھے کیا پروا ہو سکتی ہے  
آپ میرے لیے جو بھی کریں گے، ٹھیک ہی کریں گے۔“

”وجدان تو میرا ہے ہیرا۔“ ٹھاکر مسکرایا ”میں نے تو  
اسے کہا تھا کہ میرا ہوٹل یا ریسٹورنٹ سنبھال لے لیکن یہ  
نہیں مانا۔ چلے اچھا ہے آپ کے ساتھ رہے گا۔ آپ دونوں  
سے ملاقات کے زمانے ہمیں بھی کبھی کبھی یہاں آنے کا موقع  
مل جایا کرے گا لیکن وجدان نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ آپ

دیش کھ سے خوف زدہ ہیں اور اس کی وجہ سے جے پور چھوڑنا  
چاہتی ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ  
آپ جے پور ہی میں رہیں۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی بالی کا  
لال آپ کی طرف آگے اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اس دیش کھ کو  
میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو تھوڑا سیٹ فٹزا ہے۔  
رام کھنجا یا زار اور گھاٹ دروازہ کے علاقے کی دکانوں سے بیٹا  
وصول کیا کرتا تھا اور آئے دن پٹا تھا۔ لوگوں سے بھی اور  
پولیس سے بھی۔ وہ تو پریم چند راٹھور نے اسے اٹھا دیا لیکن  
اسے بھی کیا ملا؟ دیش کھ کی وجہ سے اسے ذلت اٹھانی پڑی  
اور آخر اسی نمک حرام کے ہاتھوں مارا بھی گیا لیکن راٹھور  
ہی نے اپنی آستین میں پلٹے والے اس سانپ کو دودھ پلا پا کر  
اینا طاقت ور بنا دیا تھا کہ پولیس راٹھور کے قتل کے الزام میں  
بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی۔ دراصل راٹھور

کی زندگی میں ہی اس دیش کھ نے اپنے بچے زمین میں اس  
مضبوطی سے گاڑ لیے تھے کہ اسے ہلانا مشکل ہو گیا تھا۔“  
”مجھے اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔“ شوہانے کہا ”وہ تو  
بھگوان ہلانا کرے راجا صاحب کا۔ اگر وہ پولیس کسٹریپر ہوا  
نہ ڈالتے تو یہ شیطان میرا پلاٹ بھسم کر جاتا۔ میں نے تو  
ہے کہ اس نے میرے پلاٹ پر کئی منزل پلازا تعمیر کرانے کے  
لیے نقشہ بھی بنوایا تھا۔“

”لیکن محض دیش کھ کے خوف سے جے پور چھوڑ کر  
آپ بہت بڑی غلطی کر رہی ہیں شوہا جی۔“ ٹھاکر نے کہا۔  
”آپ تو اس شرٹ سے جی اٹھ چکا ہے۔“ شوہانے گہرا  
سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”یہ جگہ مجھے پسند آگئی ہے۔  
پروا نہ رہی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ مینے میں ایک چکر تو  
لگا رہا ہے۔“

”میں ایک بار پھر کوں گا کہ دیش کھ کا خوف ذہن سے  
کل دیں۔“ ٹھاکر نے کہا ”میں وہاں موجود رہوں گا۔ اس  
کے تعلقات کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں، وہ کتنا ہی طاقت ور  
کیوں نہ بن گیا ہو، اس نے غنڈوں کی کتنی ہی بڑی فوج کیوں  
نہ بنائی ہو مگر میں بھی ایسے لوگوں سے غمنا جانتا ہوں۔ میں  
غنڈوں کی اس سے بھی بڑی فوج جمع کر سکتا ہوں۔ اس نے  
کبھی آپ کی طرف میلی آگھ سے بھی دیکھا تو اسے جے پور تو  
کیا پورے ہندوستان میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

”نہیں ٹھاکر جی۔“ شوہانے کہا ”میں نے جے پور  
والیں نہ جانے اور یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“  
”ٹھیک ہے۔“ ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کے  
ساتھ ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

شوہا دو بجے تک ہمارے پاس بیٹھی رہی پھر سونے کے  
لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہم لوگ لاڈلج میں تھے۔ میں  
نے ہلا اور روپ متی سے کہا تھا کہ وہ سونا ہالے کمرے میں  
سو جائیں مگر انہوں نے اس جگہ سے اٹھنے کا نام نہیں لیا۔  
مومنے اور کریساں ہٹا دی گئیں۔ اس طرح در پی پر اتنی جگہ  
بن گئی کہ ہم سب وہیں نیم دراز ہو گئے۔ سونا کمرے سے  
کمل اٹھائی گئی جو ہم نے بیروں پر ڈال لیے۔

چار بجے تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی روپ متی  
سونا کو جے پور میں میری سرگرمیوں کے قصے سنانے لگتی اور  
کبھی سونا مسکراتی لہند والی میری کہانیاں اسے سنانے  
لگتی۔ روپ متی کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ میں نے  
غنائی لینڈ کے شمشاد کے خلاف ایک خوفناک سازش کو ناکام  
بلا تھا اور میرے لیے اب بھی تھائی سرکار کی طرف سے یہ  
دیش بڑا قرار ہے کہ میں جب جاپوں وہاں جا کر کوئی برا عمدہ  
سنبھال سکتا ہوں۔

اور پھر جاگن کی باتیں شروع ہو گئیں۔ سونا انہیں بتا  
رہی تھی کہ جاگن کی کس طرح مجھ پر جان چڑھتی تھی۔ اس  
دستان میں تھائی کا ذکر بھی آیا۔ میں اسے کہنے بھول سکتا تھا۔  
سونا نے اس کی یاد تازہ کر کے میرے زخموں کو چھیر دیا تھا۔  
مجھ چار بجے تک باتیں ہوتی ہیں۔ ٹھاکر تو بہت پہلے ہی

اوتھنے لگا تھا۔ ہلا اور روپ متی ایک لمبے سفر سے تھکی ہوئی  
تھیں لیکن یہ بہت تھکی کہ چار بجے تک جاگتی رہی تھیں اور  
بالا خر وہ بھی اوتھنے لگیں۔ میں ٹھاکر کے قریب لیٹ گیا اور  
سونا نے بھی ہلا کے قریب جگہ سنبھال لی۔

صبح چھ بجے میری آنکھ کھلی گئی۔ سونا بھی جاگ گئی۔  
اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے میرے لیے ہکا  
سانا شات تار کر دیا۔ میں نے بچن ہی میں چوکی پر بیٹھ کر ناشتہ کیا  
اور پھر بڑی آہستگی سے کالج سے نکل گیا۔

صبح ناشتے کے بعد جو گنگ اور کبی واک اگرچہ صحت کے  
اصولوں کے خلاف تھا لیکن میں پہاڑیوں پر دور تک چکر لگاتا  
رہا۔ مجھے جگہ جگہ کئی یوگی جاپ اور مختلف مشقوں میں  
مصروف نظر آتے تھے۔ میں نے بھی ایک جگہ بیٹھ کر تھوڑی  
دیر سانس کی مشق کی اور پھر گوتم بھوش کے کالج پہنچا اور  
اس کے تھوڑی سی دیر بعد اپنی ریاضت شروع کر دی۔

دس بجے میں اپنے کالج واپس پہنچا تو شوہا اور ٹھاکر باہر  
کریسوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا اور  
سونا نے کالج سے برآمد ہو کر چائے کی ایک پالی میرے ہاتھ  
میں بھی تھما دی۔ ہلا اور روپ متی ابھی تک سو رہی تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب وہ دونوں بیدار ہوئیں تو میں اور  
ٹھاکر اس وقت بازار کی طرف جا رہے تھے۔

ہم دونوں پورا دن شر کے گرد نواح میں گھومتے رہے۔  
ہم نے دو تین جگہوں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جگہیں شر کے مرکز  
سے زیادہ دور بھی نہیں تھیں کہ کسی کے لیے وہاں پہنچنا مشکل  
ہو۔ ان میں ایک جگہ مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ وہ  
تقریباً پانچ سو فٹ اونچی پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع  
چھریلا سامیان تھا جس کے ایک طرف نشیب میں تاجہ نگاہ  
سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان کے عقب میں  
پہاڑی میں تقریباً تیس فٹ چوڑی ایک دراڑ بھی جہاں تقریباً  
سو فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ جہاں پانی گرتا تھا وہاں  
ایک لمبا چوڑا تالاب سا بن گیا تھا اور اس تالاب کا پانی ایک  
چھوٹی ندی کی صورت میں نشیب کی طرف بسر رہا تھا۔

ایک چھریلا راستہ شر کے نواح سے یہاں تک آتا تھا۔  
اس راستے پر اگرچہ گاڑی وغیرہ نہیں چل سکتی تھی لیکن  
یہاں سڑک بنائی جا سکتی تھی۔

میرے خیال میں یہ گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے  
لیے ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ اس آبشار کو گیسٹ ہاؤس اور  
ریسٹورنٹ کی حدود میں شامل کر کے اسے خوب صورت بنایا  
جا سکتا تھا۔

”یہ جگہ مجھے بھی پسند آئی ہے۔“ ٹھاکر نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ”لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم شوبھا کو بھی یہ تمام جگہیں دکھادیں تاکہ وہ بھی کوئی رائے دے سکے۔“

”یہی مناسب رہے گا۔“ میں نے کہا۔  
واپس آتے ہوئے ہم ایک ڈھابے کے سامنے بیٹھ گئے جہاں چائے کا بھی بندوبست تھا۔ یہاں بیچنوں پر چند گاہک اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم لڑکے نے ہمارے سامنے چائے لا کر رکھ دی۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ٹھاکر نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے یوگا کی ایک مشق شروع کر رکھی ہے۔ تم اسے جاپ کر سکتے ہو۔ اس کے مکمل ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ کپ اگرچہ میلا سا تھا لیکن پہلی چسکی لیتے ہی اندازہ ہو گیا کہ چائے بڑی خوش ذائقہ تھی۔

”میں نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ بے پور میں ہو مل یا ریسٹورنٹ سنبھال لو لیکن تم نے منع کر دیا۔“ ٹھاکر نے کہا ”اب تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ یہاں رہ جاؤ۔ شوبھا کے پاس۔ وہ بڑی اچھی عورت ہے اور تم سے بہت متاثر ہے۔ تم یہاں رہ جاؤ گے تو اسے بھی ڈھارس رہے گی۔“

”کسی ایک جگہ تک کر بیٹھنا شاید میرے مقدر میں نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میرا کام ابھی ادھورا ہے۔ اسے مکمل کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر موقع ملے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔“

”سونیا کی باتوں سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بہت عرصے تمہارے ساتھ رہی ہے اور بے پور میں بھی اس سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے لیکن بے پور میں تم نے بھی اس کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”بے پور میں سونیا سے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوئی تھی۔“ میں نے جواب دیا ”میں اس رات کافی بے چین کے خیال سے کافی باؤس گیا تھا اور وہاں سونیا کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ ایک دو ملاقاتیں اس کے بعد بھی ہوئی تھیں اور میرا خیال تھا کہ میں اسے تم لوگوں سے ملواؤں گا لیکن ان دنوں ہم بلونت ٹکے والے معاملے میں الجھے ہوئے تھے اور پھر ہم سارے چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد نہ تو سونیا سے میری ملاقات ہوئی اور نہ ہی میں اسے تم لوگوں سے ملوا سکا اور پھر جس روز میں یہاں رشی کشن پہنچا ہوں اس روز شام کو اتفاق سے سونیا

سے آتنا سامنا ہو گیا۔ وہ مجھے کالج میں ملے آئی جہاں شوبھا سے ملاقات ہوئی۔

”شوبھا کے بارے میں سونیا نے مجھے دوسرے دن بتایا تھا اور پھر اس سے اگلے روز شوبھا سے براہ راست بات ہوئی۔ وہ دیش کھ سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ بے پور واپس نہیں جانا چاہتی۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی۔“ ٹھاکر نے میرے خاموش ہونے پر کہا ”دیش کھ کو یوں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کینے آوی ہے۔ اس کے غائب ہونے کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھری نہیں بیٹھارے گا اور کبھی نہ کبھی اسے تلاش کرنے لگے گا۔ شوبھا نے نہ سوسن ہے۔ اس کا خیال آسمانی سے دل سے نہیں نکالا جاسکتا اور پھر اس کے ساتھ کروڑوں کی دولت بھی ہے۔ اس کا بڑا ہیکر کا وہ پلاٹ ہی کم سے کم بیس بائیس کروڑ کا ہو گا۔ کافی باؤس والی بلڈنگ اور ہوا محل کے قریب رام نگر بازار کے چوراہے پر ایک بڑا مکان اور اس کے نیچے تین وکٹیں بھی ہیں۔ کروڑوں کی جائداد ہے یہ۔ اور دیش کھ جیسا شخص اس دولت کے لیے نہ تک بھی کسی کا پیچھا کر سکتا ہے۔ اگر شوبھا بے پور میں رہتی تو اسے کچھ تحفظ فراہم کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہم سے تقریباً تین دن کے فاصلے پر آگئی ہے کسی ایئر جی میں فوری طور پر اس کے پاس پہنچا بھی نہیں جاسکتا۔“

”لیکن وہ اب یہیں رہتے رہندے ہیں۔ یہاں بھی اس کی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ بندوبست تو کرنا ہی پڑے گا۔“ ٹھاکر نے کہا ”سائنس لیتے ہوئے کہا“ آؤ اب چلیں۔“ ٹھاکر مجھ سے پہلے بیچ سے اٹھ گیا۔ اس نے چائے کے پیے ادا کیے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے ساتھ چلے ہوئے بولا ”تمہارے لیے ایک مسئلہ پیدا ہونے والا ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے گردن جھکا کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بلا۔“ ٹھاکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی ”وہ کتنی ہے کہ اب تمہارے پاس ہی رہے گی۔ جہاں تم جاؤ گے تمہارے ساتھ جائے گی۔“

”یہ تو واقعی ایک مسئلہ ہو گا۔“ میرے لیے میں تشویش نمایاں تھی ”میرا کوئی بھروسہ نہیں کہ میں کب کس طرف نکل جاؤں اور میرے ساتھ کس وقت کیا مارڈ پیش آجائے۔ میں اسے اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے پھر سکتا۔“ پلٹے ٹھاکر اسے کسی نہ کسی طرح واپس لے جاتا۔ ”میں چند لمحوں کو خاموش

ہو پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”بلا بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت باری بہت معصوم اور بہت بھولی بھالی۔ اگر میرا کہیں تک پہنچے گا ارادہ ہوتا تو اسے ضرور اپنے ساتھ رکھتا لیکن میں توسلانی ہوں۔ میرا پنا کوئی بھروسہ نہیں۔ اسے کس طرح اپنے ساتھ ساتھ لے پھروں گا۔ اس کے علاوہ۔“

”اس کے علاوہ کیا؟“ ٹھاکر نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”میرے سر پر نخواست کے سامنے منڈلا رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”جس نے بھی میرا ساتھ دیا مارا گیا۔ چاچا رب تب ٹکھ تھا، جاگتی اور نجانے کون کون۔ مجھے تو ان کے ہاتھ اور چہرے بھی یاد نہیں رہے۔ تم خود کتنا نقصان اٹھا چکے ہو۔ روپ متی کو میری وجہ سے کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھانی ہیں۔ یہ سب کچھ تو تمہارے ساتھ اور تمہارے سامنے ہوا ہے اور اب تم چاہتے ہو کہ میں بلا کو اپنی نخواست کے پردوں میں سیٹھ لوں۔“

”وہ واقعی نخواست کا سایہ تھا جو کئی برسوں سے تمہارے سر پر منڈلا رہا تھا۔“ ٹھاکر نے کہا ”لیکن اب نخواست کا وہ سایہ فنا ہو چکا ہے۔ اب تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ تمہارے آگے پیچھے خوف یا نخواست کا کوئی سایہ نہیں رہا۔ اب تمہیں اپنے بارے میں جھجکی سے سوچنا ہو گا۔ یہ زندگی آوارہ گردی میں تو نہیں گزارا جاسکتی۔ میری باتوں کا برا مت ماننا وچان۔ میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر ہی بات کر رہا ہوں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم سب تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ روپ متی کو تم نے جس طرح سنبھالا دیا ہے وہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں تو اس سے باؤس ہو گیا تھا لیکن تم نے اپنی شرافت اور اپنے کردار سے اسے جس طرح زندگی کی دلیل سے نکالا ہے وہ ایک بہت بڑا جھکا رہ ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا بھی نہ کرتا بلکہ وہ بھی اپنی لگاؤ میں ہاتھ دھوتا اور پھر بھلا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ جنگل میں دو دن تمہارے ساتھ رہی ہے۔ مجھے روپ متی نے بتایا تھا۔ بلا نے جنگل میں رہتے ہوئے بے قابو ہونے کی کوشش کی تھی مگر تم نے اسے جس طرح سنبھالا وہ قابل تعریف ہے اور یہ تمہاری شرافت ہے کہ بلا تمہارے ہی نام کی مالا پہنتی ہے۔ چند روز پہلے جب اسے یہ پتا چلا کہ ہم تمہارے پاس آ رہے ہیں تو تم اس کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اب اگر تم نے اسے واپس بھیج دیا تو وہ مرجائے۔“

”وہ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تم ایک جگہ

نک جاؤ۔ یہاں ہم ہیں شوبھا ہے۔ یہ سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم ہمارے ہو۔ تمہیں اب فیصلہ کر لینا چاہیے۔“

”ہم کا بیچ بیچ گئے اور ہماری گفتگو کسی بیٹے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔“

اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے اور یوگی دھیراج شوبھا کو یوگا کی مشق کروا کے واپس جا رہا تھا۔ اس سے ہماری ملاقات ہٹ سے چند گز کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پر نام کیا۔ خیر عافیت دریافت کی اور وہ رخصت ہو گیا۔

سونیا کچن میں کھانا پکانے کی تیار کر رہی تھی اور بلا بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ کام چھوڑ کر فوراً ہی ہماری طرف آگئی اور جب میں صوفے پر بیٹھا تو وہ بھی میرا بازو کچڑ کر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی شوبھا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

رات کے کھانے کے بعد پھر ہماری محفل جی۔ ٹھاکر نے شوبھا کو بتایا تھا کہ ہم آج کچھ جگہیں دیکھ کر آئے ہیں۔ ایک جگہ ہم دونوں کو پسند ہے اور کل کسی وقت شوبھا کو بھی ساتھ لے جا کر دکھادیں گے اور پھر کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس جگہ کو خریدنے کی کوشش شروع کر دی جائے گی۔

صبح ناشتے کے بعد سونیا بازار جا کر کرائے کی کار لے آئی اور ہم سب اس میں لد کر بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم نے شوبھا کو وہ تمام جگہیں دکھادیں جنہیں ہم نے گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے قیام کے لیے گزشتہ روز منتخب کیا تھا۔ آخر میں آبشار والی پہاڑی کے دامن میں آگئے۔ یہاں گاڑی کا راستہ نہیں تھا اس لیے ہمیں ایک لمبا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا پڑا تھا۔

آبشار سے چند گز کے فاصلے پر چند یورپین بچی بیٹھے چرس بھرے سگریٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں اور اچھے عمر اور جوان مرد بھی۔

”یہ اس قوم کے افراد ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ مذہب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔“ ٹھاکر نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر برا سامنہ بناتے ہوئے کہا ”لیکن ان لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تہذیب انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ یہ چرس اور ہیروئن کی طلب میں دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے ہیں۔“

”اسی قوم نے تو اس خطے پر بھی طویل عرصے تک حکمرانی کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور اب بھی یہ اپنے آپ کو ہمارا آقا اور ہمیں اپنا



غلام سمجھتے ہیں۔" ٹھاکر نے کہا "یہ لوگ جو ہمارے سامنے بیٹھے ہیں، چر سی اور موالی ان لوگوں سے بات کی جائے تو پتا چلے گا یہ اپنے آپ کو ہم سے برتر سمجھتے ہیں۔"

"اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ٹھاکر۔" میں نے کہا "ان کے ہندوستان سے جانے کے بعد بھی یہاں آباد قوموں نے اپنے آپ کو نہیں سنبھالا۔ متحدہ اور متحد ہونے کے بجائے ان میں نفرتیں بڑھتی گئیں اور بہت سے معاملات تمہارے سامنے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ان سے برتر تو نہیں کہہ سکتے۔"

"میں تو ایسے ہوں۔" ٹھاکر نے مگر اسانس لیتے ہوئے کہا "ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوتا تو انہیں باہر سے آکر ہم پر حکومت کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔"

"ارے بھئی تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے۔ مجھے کچھ بتاؤ۔ سمجھاؤ تو سہی۔"

یہ شوبھا کی آواز تھی۔ ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ٹھاکر اسے بتانے لگا کہ اگر یہ زمین مل گئی تو گیسٹ ہاؤس کس طرف بنایا جائے گا اور ریٹورنٹ کس طرف۔

"یہ آتشبار بھی اوپن ائیر ریٹورنٹ کا ایک حصہ ہوگا۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے بتا رہا تھا "ریٹورنٹ کی عمارت اس طرف ہوگی اور گیسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کے لیے وہ بہترین جگہ ہے۔" اس نے دوسری طرف اشارہ کیا "اور اس نشیب کے کنارے پر ریلنگ لگا کر اس کے ساتھ ساتھ بھی پختہ روش اور سرسبز لان بنایا جائے گا اور اس طرف پورا قطعہ لان پر مشتمل ہوگا جس میں حوض اور فوارے بھی ہوں گے آپ تین تین کریں شوبھا جی۔ اگر یہ جگہ مل گئی اور میری پلاننگ کے مطابق کام ہوا تو یہ اس واوی کا سب سے حسین اور سب سے باوقف گیسٹ ہاؤس اور ریٹورنٹ ہوگا۔ لوگ دور دور سے یہاں آیا کریں گے۔"

"سب کچھ آپ ہی کو کرنا ہے ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "اس جگہ کو خریدنے کا بندوبست مل گئی تو نقشہ اور اس کے بعد تعمیر سب آپ ہی کے منشا کے مطابق آپ کی نگرانی میں ہوگا۔ ویسے یہ جگہ مجھے پسند آئی ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ اگر گنجائش نکلی تو میں اپنی رہائش کے لیے بھی ایک طرف کوارٹرز بنوا لوں گی۔"

"کو ارنز!" ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی "ارے اس طرف اس کارنر میں ایک خوب صورت کوٹھی بن سکتی ہے۔ بس آپ تو یہ پراپتھنا کیجئے کہ یہ جگہ ہمیں مل جائے۔" ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹے تک اس جگہ اور اس کے آس

پاس گھوم پھر کر جائزہ لیتے رہے اور پھر واپس آ گئے۔ دیہر کا ٹکھانا ہم نے بازار کے ایک ریٹورنٹ میں کھایا تھا۔

روپ متی اور ٹھاکر دو دن مزید رہ کر چلے گئے لیکن ہمیں رہ گئی۔ ٹھاکر نے شوبھا کی بے پوروالی جائداد کو ڈیپوز آف کرنے کے لیے بھی ایک بروکر ام بنالیا تھا۔ اس نے چند روز بعد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔

میری ریاضت معمول کے مطابق جاری تھی۔ میں نے اس میں کوئی ناغہ نہیں ہونے دیا تھا۔ میں روزانہ صبح مندرہ وقت پر یوگی کوتم بھوش کے کالج میں پہنچ جاتا۔ اس ریاضت کے علاوہ بھی میں نے مختلف بلکی پچھلی مشقیں جاری رکھی تھیں۔

بللا کی وجہ سے مجھے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی لیکن میں اس سے بے رخی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت معصوم تھی۔ اور میں اس کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانچا تھا۔ دوسری طرف سونیا بھی۔ اس نے بھی بائیس کے حوالے سے مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی بھی کہ ہندوستان میں آکر ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر اسے شوبھا جیسی عورت مل گئی تھی۔ سونیا اس سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی بنا سکتی تھی۔

ٹھاکر اور روپ متی کو گھمے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس روز میں اور سونیا بازار سے واپس آ رہے تھے۔ ہم دونوں کے پاس کچھ سامان تھا جس سے چلنے میں خاصی دقت پیش آ رہی تھی۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں سر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ سونیا کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔" سونیا نے جواب دیا "ایک گھنٹا پہلے میں نے اسے بننے کی دکان پر دیکھا تھا جہاں سے ہم سو الے رہے تھے پھر آدھے گھنٹے بعد وہ دوسری جگہ بھی نظر آیا تھا اور اس وقت بھی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ تم ایک دم سے پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ ہم کوئی چیز لینے کے بائ سامنے والے ڈھابے پر رک جائیں گے۔ اس وقت تم ات دیکھ سکو گے۔ ورنہ آئین کی چیزے کی کالی دیکھ پنے ہوئے ہے۔"

”ٹھیک ہے۔ آرام سے چلتی رہو۔“ میں نے جواب دیا ”ہو سکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہو۔ اس شخص سے بار بار آنا سامنا اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ جس طرف ہم جا رہے ہیں اسے بھی اوھر رہی جانا ہو۔“ وہ دھابا ہم سے تقریباً پچاس گز آگے دو راستوں کے سنگم پر تھا۔ وہاں سے ایک راستہ تو ہمارے کانچ والی پہاڑی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ دائیں طرف درختوں میں ہوتے ہوئے ایک اور پہاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طرف بھی کانچ تھے اور ایک گیسٹ ہاؤس بھی تھا۔

میں نے دھابے سے خشک دودھ کا ایک پیٹ خریدی اور اسی دوران میں مجھے اس شخص کو دیکھنے کا موقع بھی مل گیا جو ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رک گیا تھا اور بیڑی کے کس لگاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

درمیانے قد کا وہ آدمی کھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ اس کے بالوں بھرے سینے پر جھول رہا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ لیکن شیوہ تھکر سر کے بال لیے تھے جو پٹیا کی صورت میں گردن پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔

میں نے دھابے پر جان بوجھ کر دیر لگا دی۔ میں اس دوران میں کن اکٹھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس طرح مجھے اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔

وہ چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اسے میں اپنا دشمن بھی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن وہ صورت سے تو بد معاش ہی لگتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ہو سکتا ہے وہ محض سونیا کی وجہ سے ہمارے پیچھے لگا ہو۔ سونیا کم بخت تھی بھی تو بہت حسین۔ اس نے بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس طرح وہ خود لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھی اور یہ بد معاش شاید کسی موقع پر اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ مجھے تو شاید اس نے لگا ہوں میں ہی نہیں رکھا ہوگا۔ اس قسم کے غنڈے حسین عورتوں کے سماجی مردوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بڑے خود خود اپنے آپ کو بہت طاقتور سمجھتے ہیں اور انہیں بڑا اھم سمجھتے ہوتا ہے اپنے آپ پر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مرکو ایک دو ہاتھ مار کر مفلوج کر دیں گے اور عورت کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے ذہن میں بھی شاید کوئی ایسی ہی بات تھی۔ میں نے کوھر ادھر دیکھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ اب صرف پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر چمک رہی تھی جبکہ وادی میں سرسبز اندھیرا چھیلنے لگا تھا۔ میں نے سونیا کو اشارہ کیا اور ہم اپنے اپنے شاینگ بیگز اٹھا کر آگے چلنے لگے۔ اب اس میں خشک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شخص ہمارا پیچھا ہی کر رہا تھا لیکن میں اس کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ابھی تک ہمیں کسی طرف بھی پریشان نہیں کیا تھا۔ سونیا کو چھیڑا بھی نہیں تھا۔ کوئی آواز نہ نہیں کسا تھا۔ میں کس بنیاد پر اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے پاس کیا ثبوت تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے بھی اسی طرف جانا ہو جس طرف ہم جا رہے تھے۔ میں نے زندگی کا بہت کچھ نہیں راستے طے کیا تھا۔ بہت مشکل اٹھائی تھیں۔ یہاں چند لمحے سکون کے میرے آئے۔ تھے۔ یہ میری زندگی کا عارضی پڑاؤ تھا اور میں یہاں کسی سے چھٹکے بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اور سونیا باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ پہاڑی پر درختوں کی وجہ سے شام کا دھند لکاچھ زیادہ گہرا لگ رہا تھا اور ویسے بھی اب تو اندھیرے کو گہرا ہونا ہی تھا۔ آس پاس کے کانچ میں تیاں جل اٹھی تھیں۔

ہم پہاڑی کے بل کھاتے ہوئے کشادہ راستے طے کرتے کی طرف مڑ گئے جو پودوں میں مل کھاتے ہوئے ہمارے کانچ کی طرف چلا گیا تھا۔ پیچھے آگے جانے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو تین منٹ بعد وہ آدمی اسی کشادہ راستے پر سیدھا آگے کو نکل گیا تھا۔

کانچ کے برآمدے کی جی بل رہی تھی۔ بلا اور شوبا برآمدے ہی میں کرسیاں ڈالے بیٹھی ہوئی تھیں۔ بلا نے اٹھ کر ہمارے ہاتھوں سے شاینگ بیگ لے لیے اور اندر چلی گئی۔

کانچ کی طرف آنے والا راستہ مل کھاتا ہوا تھا اور اس راستے کے دونوں طرف قد آور پودے تھے۔ کانچ کے برآمدے میں بیٹھا ہوا آدمی کشادہ راستے پر آنے جانے والے کسی شخص کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن باہر کا کوئی آدمی چاہے تو پودوں میں چھپ کر بڑی آسانی سے کانچ کی نگرانی کر سکتا تھا۔ میں برآمدے میں بیٹھا ساٹھ دیکھتا رہا لیکن نہ تو کوئی

ہیولا دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی آہٹ سنائی دی۔ باہر کھلی فضا میں بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن خشکی بڑھ گئی تھی اور پھپھوں نے بھی یلغار کر دی تھی۔ ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔

شوبھا نے شاید میرے چہرے سے میرے بارے میں کچھ اندازہ لگایا تھا اور میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ پچھلے ایک دو روز کے دوران میں وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اس نے شاید یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ گفتگو کے دوران میں جب میرے والدین یا بھائی اور باقی کا ذکر ہوتا تو میرے چہرے پر ادا سی چھجائی تھی اور پچھلے دو تین دنوں کے دوران میں تو میں خود اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کبھی لگتا جیسے میری کوئی فتنی چیز کھو گئی ہو اور کبھی میں خود بیٹھے بیٹھے کھو جاتا۔ اس وقت میں شوبھا کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بلا ہمیں چائے بنا کر دے گئی تھی اور وہ سونیا کے ساتھ کچن کے کاموں میں مصروف تھی۔

”میں دو تین دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ بھیجے بھیجے رہے لگے ہو۔“ شوبھا نے چائے کی چمکی لے کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس سے پہلے تو میں نے تمہیں بیش بہا کچھ بھیجے ہوئے دیکھا ہے لیکن جب بھی کبھی جاگتی وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو ایک دم اداس ہو جاتے ہو۔ تم خوش رہا کرو نا۔ تم بیٹھے مکرانے ایتھے لگتے ہو۔“

”تمہیں مکرانے چہرے تو سب کو ایتھے لگتے ہیں لیکن میری خوشیاں تو بچانے کہاں کھو گئی ہیں۔“ عجیب سی وحشت اور بے چینی رہنے لگی ہے۔ ”میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔“ شوبھا نے کہا ”خوشی تو ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جب کوئی انسان خوش ہوتا ہے تو اسے دنیا کی ہر چیز حسین لگتی ہے لیکن جب انسان اندر سے اداس ہوتا ہے تو دنیا کی خوب صورتی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جب من کا موسم پر کیف دہا رہا ہو نا ہے تو باہر کا موسم خود بخود سر رگنے لگتا ہے۔ یاد رکھو، خوشیوں کو کوئی پلیٹ میں سجا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کرنا بلکہ ہمیں خود ہی خوشیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوتا سکے کیونکہ ایک روز یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں خود بخود بڑی خوشیوں میں بدل جائیں گی۔“

”بیشہ خوش رہنے کی کوشش کرو اور دوسروں کو بھی خوش رکھو۔ دوسروں میں خوشیاں بانٹنے سے خوشیاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی جاتی ہیں۔ وہ باتیں جن کے یاد کرنے سے دل کو تکلیف پہنچتی ہے ان باتوں کو بھلانے کی کوشش کرو۔“

کیونکہ بار بار کریدنے سے زخم بھرتا نہیں بلکہ ناسور بن جاتا ہے اسی لیے ہمیں ہر لمحہ خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے اور زندگی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہونا چاہیے۔“ وہ خاموش ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”میرے حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہوگا لیکن اس کے باوجود میں خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میری یہ ایک پریشانی دور ہو جائے تو دیکھنا میں کس طرح بدلتی ہوں۔ پتی کے زندہ رہنے تک میں نے بڑی بھرپور زندگی گزار دی ہے۔ ان کے بعد بس انہی کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے سوا مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔“

شوبھا کا لیکچر خاصا طویل ہو گیا تھا۔ میں بھی دوسروں کو ایسے ہی لیکچر دیا کرتا تھا۔ خود بھی تھک دوسروں کو کسبھی رہنے کی تلقین کرتا تھا اور اب شوبھا، وہ مجھے لیکچر دے رہی تھی۔ بیشہ خوش رہنے کا شعور دے رہی تھی۔ گزرے ہوؤں کو بھول جانے کی تلقین کر رہی تھی لیکن خود سوگ کی سفید چادر میں پٹی ہوئی تھی اور سوگ کی یہ سفید چادر پتی کی یاد کو اس کے دل میں نازہ رکھتے ہوئے تھی۔

”آپ شاید مجھے تسلی دینے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں حالانکہ آپ نے خود یہ سفید ساڑی۔“ میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے اچانک ہی خیال آ گیا کہ ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔

”یہ سفید ساڑی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”محض دنیا کو دکھانے کے لیے ہے۔ اس کے لیے تو میں نے بھی اپنا من مار رکھا ہے لیکن اب میں اس سے عاجز آگئی ہوں۔ میرا دل بھی بدل چاہتا ہے کہ میں بھی دنیا کے بنگاموں میں حصہ لوں۔ رنگینوں میں رنگی جاؤں اور۔“

”اور میرا خیال ہے آپ کا دیا ہوا لیکچر مجھے دہرانا چاہیے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ شوبھا نے ہلکا اقبالہ لگا دیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی ہلکا خالی کپ لینے آئی تو ہم بھی اٹھ کر لاؤنج میں آ گئے۔ سونیا کچن میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ بلا ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ اب ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا تھا۔ اسی دوران میں سونیا بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”آگے مجھے میں کھانا تیار ہو جائے گا۔“ اس نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شوبھا سر ہلا کر رہ گئی اور پھر وہ شاکر کے بارے میں بات

کرنے لگی۔ اسے شہر کی شخصیت بہت پسند آئی تھی۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے بلکی سی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ لڑھکا ہو اور میرا خیال تھا کہ وہ آواز کسی اور نے نہیں سنی تھی کیونکہ ان میں سے کسی کے چہرے پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن میں اس آواز کو اپنا واہسہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولا۔

”اب باتوں کا سلسلہ یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ میں ہاتھ روم سے ہو کر آؤں تو ہم یہ سلسلہ وہیں سے جوڑیں گے جہاں سے نوا تھا۔ بس چند منٹ۔“ میں نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا اور قدرے جھک کر چلتے ہوئے شوبھا والے کمرے میں گھس گیا۔ اس طرح میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میرے پیٹ میں شدید قسم کا موز آٹھ رہا ہے۔

شوبھا والے کمرے میں آکر میں نے بیچ کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا اور اسے سیدھا ہو کر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا اور میرا رخ اسی طرف تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے بولٹ بنایا اور آہستہ آہستہ دروازہ کھولنے لگا۔ سونپا لاؤنج والے کمرے میں عین سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ابھی نے مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا جس سے شوبھایا بلال کو کسی قسم کا شبہ ہو سکتا۔

میں کمرے سے نکل کر دوپے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کانچ کی چھیلی طرف بڑھنے لگا۔ پھر لڑھکنے کی وہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔

میرا شبہ درست نکلا۔ ایک انسانی ہیولا کھڑکی کے قریب کھڑا اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لاؤنج ہی کی عجبی کوئی تھی لیکن اندر کی طرف دبیز پردہ پڑا ہوا تھا اور اس شخص کو شاید اندر دیکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ بار بار جگہ بدل رہا تھا اور پھر ایک جگہ اس نے آنکھیں شیشے کے ساتھ پیکا دیں۔ وہاں کوئے سے شاید پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور اسے اندر دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں پیچھے سے جا کر اس کی گردن دبوچ لوں گا لیکن میں کارنگھوم کر بیٹھ ہی آگے چھا۔ میرا پیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ پتھر پر شور آواز سے لڑھکتے ہوئے دور چلا گیا۔

وہ آدمی ایک دم سیدھا ہو گیا اور پھر مجھے دیکھتے ہی اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ وہی آدمی تھا جو شام کو بازار سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اس وقت تو وہ آگے نکل گیا تھا اور اب موقع پا کر کانچ کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ پلک جھپکنے کی دیر میں مجھ سے تقریباً بیس گز آگے نکل گیا اور پھر شاید اس کا پیر جھانپوں میں الجھ گیا تھا۔ وہ لڑھکا کر گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں دوڑتے ہوئے پوری قوت سے اچھلا اور ہوا میں اڑتے ہوئے اس کے اوپر جا گرا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے جھاڑیوں میں ڈھیر ہو گیا۔

اس نے اپنے آپ کو چھڑا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے گرفت میں لینے کی کوشش میں میرا ہاتھ اس کی گردن پر جھونپ ہوئی چٹیا پر پڑ گیا۔ اب کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا۔

میں نے چٹیا کو منہ میں لے کر زور سے جھٹکا دیا۔ وہ کراہ اٹھا اور پھر شاید تکلیف کی پروا کیے بغیر اس نے اپنے سر کو زوردار جھٹکا دے کر چٹیا کو میری گرفت سے چھڑا لیا اور پلٹ کر اندھا دھند ہاتھ چلا دیا۔

اس کا گھونسا میری گردن پر لگا۔ میں لڑھکا گیا۔ شہلے سے پہلے ہی دو سر گھونسا کھڑی پر لگا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ اس کے تیسرے وارے سے پیچھے کے لمبے میں تیزی سے نیچے جھک گیا۔ اس مرتبہ اس شخص کا وار خالی گیا اور وہ اپنی جگہ پر گھوم کر رہ گیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ کراہ کر دھرا ہو گیا۔ میں نے کسی توقف کے بغیر ایک دو گھونے اور بڑ دیے۔ وہ پیٹ پکڑے جیسے ہی مزید نیچے جھکا۔

میں نے اس کی گردن پر دو ہتھ جما دیا۔ وہ منہ کے بل میرے قدموں میں گرا اور اس کے ساتھ ہی اسے موقع بھی مل گیا۔ اس نے میرے دونوں پیروں پر کڑو دار جھٹکا دیا۔ میں پشت کے بل گرا۔ وہ مجھ سے پہلے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے شہلے کا موقع دے بغیر میرے جسم پر ٹھوکریں برسائے گا اور پھر ایک ٹھوکر مارنے کی کوشش میں اس کا پانچواں پھل گیا۔ وہ لڑھکا دیا تو مجھے شہلے کا موقع مل گیا اور اس مرتبہ میں نے اسے ٹھوکر مار رکھ لیا۔

میری ہر ٹھوکر اور میرا ہر گھونسا اسے بلبلانے پر مجبور کر دیتا۔ میں نے ایک چوہ سے اس کے کندھے پر وار کیا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا تھا اور میرا یہ چوہ کھانڈے کی طرح اس کی

ہڈی کی ہڈی پر لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ نیچے سر کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں لیکن وہ موقع پا کر اٹھ گیا اور اندھا دھندلات کھڑا دی۔ ٹھوکر میری ہڈی پر لگی۔ میں کرا رہے ہوئے ایک ٹانگ پر باج کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شخص حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے اوپر گرا۔

اس کی ایک ٹانگ میری گرفت میں آگئی تھی اور وہ زور دار جھٹکے دیتے ہوئے اپنی ٹانگ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں کانچ کی طرف سے بلال اور سونپا کی آوازیں سنائی دیں۔

”وہ جان! کہاں ہو تم۔ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے اصر؟“

یہ سونپا کی آواز تھی۔ انہوں نے میرے حریف کی چیخ اور اٹھانچ کی آوازیں سن لی تھیں۔ بلال اور سونپا شاید اسی طرف دوڑی آ رہی تھیں۔

ان دونوں کی آوازیں کی وجہ سے میری توجہ ایک لمحے کو ہٹی تھی جس سے اس شخص کو موقع مل گیا۔ اس نے زور سے میرے کندھے پر دوسرے پیر کی ٹھوکر ماری۔ اس کی ٹانگ میری گرفت سے نکل گئی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ مجھ سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا رہا لیکن وہ قدرے آگے دوڑا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں اس کے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور میں اس آواز کا تعاقب کر رہا تھا۔

اور پھر چاک میرا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ میں منہ کے بل گرا۔ یہ بھی قسمت تھا کہ میں جھاڑیوں ہی میں گرا تھا۔ اگر پتھوں پر گر کر اتنا اچھی خاصی چوٹ آسکتی تھی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ شخص تاریکی میں بہت دور نکل گیا تھا اور عین ممکن تھا وہ اب تک پھاڑی کے دامن میں پھنچ چکا ہو۔ اب اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بلال اور سونپا مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر اس طرف چل پڑا۔ وہ دونوں مجھے کانچ سے دس بارہ گز دور ہی مل گئے۔

”کیا ہوا۔ کون تھا وہ؟“ سونپا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

”وہی تھا جس نے شام کو ہمارا پیچھا کیا تھا۔ بھاگ گیا حرا۔“ میں نے ایک طرف ٹھوکتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی بہت سنگھ؟“ بلال چلتے چلتے مجھے ٹٹولنے لگی۔

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ کوئی چوٹ نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔

ہم کانچ کے قریب پہنچے تو شوبھا بھی اپنے کمرے کے باہر والے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے بھی سوالات کی پوچھا کر دی۔

”پتا نہیں کون تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پکڑنے کی کوشش کی تو بھاگ نکلا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ کوئی باہر کھڑا کھڑکی سے جھانک رہا ہے؟“ شوبھا نے پوچھا۔ اس وقت ہم اندر آ گئے تھے۔

”جب ہم یہاں پہنچے باتیں کر رہے تھے تو میں نے کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنی تھی اور اس وقت مجھے باہر کسی کی موجودگی کا شبہ ہوا تھا۔“ میں نے کہا اور پھر اس کے آگے کی بات بتانے لگا۔

”مگر وہ تھا کون اور اس طرح کھڑکی سے کیوں جھانک رہا تھا؟“ شوبھا نے کہا۔ اس کے لیے میں تشویش نمایاں تھی اور میرا خیال ہے وہ معاملے کی یہ کو بیچ رہی تھی۔

”پتا نہیں کون تھا۔“ میں نے جواب دیا ”شام کو جب ہم بازار سے لوٹے تھے تو اس وقت اس نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ سونپا نے میری توجہ تو دلائی تھی مگر میں نے زیادہ پروا نہیں کی تھی اور وہ اسی راستے پر اوپر چلا گیا تھا۔“

”یہ۔ یہ آدمی ایک دو مرتبہ کافی ہاؤس میں بھی آیا تھا۔“ سونپا نے بتایا۔

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔

”جے پور میں جب دیش کھ سے معاملہ چل رہا تھا تو پسیل مرتبہ میں نے اسے دیش کھ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ ایک دو مرتبہ کافی ہاؤس میں آیا تھا۔“ سونپا نے کہا۔

”اوہ۔“ میں اس انکشاف پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”تم نے شام کو یہ بات کیوں نہیں بتائی جب وہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا؟“

”اس وقت یہ بات میرے ذہن میں بھی نہیں رہی تھی۔“ سونپا نے جواب دیا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آئی۔ شام کو ہمارا تعاقب محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ غنڈا دیش کھ کا آدمی تھا اور اسے

شوہا کی تلاش تھی۔ سونیا چونکہ شوہا کے کافی ہاؤس میں کام کرتی تھی اور شوہا کے ساتھ وہ بھی ہے پورے غائب تھی اسی لیے اسے یہاں دیکھ کر اس نے سونیا کا تعاقب شروع کر دیا تھا کہ اس کے ذریعے شوہا کا پتا چلا سکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ رشی کیش میں اس شخص کی موجودگی محض اتفاق تھی یا وہ شوہا کی تلاش میں خاص طور سے یہاں آیا ہوا تھا؟ دلش کھ کو میں نے پرکھا نہیں تھا لیکن شوہا اور شاکر سے اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دارا سے بھی زیادہ کینہ اور گھٹیا آدمی تھا۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنی بار نہیں مانتے۔

شوہا کے حسن و شباب کے ساتھ کمزوری کی جائداد بھی تھی۔ دلش کھ آسانی سے اس کا چپھا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ شوہا کے بے پورے غائب ہوجانے کے بعد دلش کھ نے اس کی تلاش میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اسے یہاں شوہا کی موجودگی کی ہینک مل گئی ہو اور اس کی تلاش میں اپنا ایک آدمی یہاں بھی بھیج دیا ہو یا اس شخص کی یہاں آمد محض اتفاق ہو اور اس نے سونیا کو دیکھ کر اس کا چپھا شروع کر دیا ہو تاکہ شوہا کی موجودگی کی تصدیق کر سکے۔

اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ آدمی بچ کر نکل گیا۔ اگر سونیا شام ہی کو اس کے بارے میں بتا دیتی تو میں اس کا کچھ ایسا بندوبست کرتا کہ وہ واپس نہ جاسکتا۔ اب صورت حال کچھ تشویش ناک ہو گئی تھی۔ میں نے شوہا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔

”اگر یہ دلش کھ کا آدمی ہے تو اب کیا ہو گا؟“ شوہا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بلی کی...

تھرراہٹ تھی۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ ہمیں ذرا احتیاط کرنی پڑے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

ایک بات میرے ذہن میں بھی تھی اور وہ یہ کہ یہ جگہ اب ہمارے لیے محفوظ نہیں تھی۔ ہمیں کسی اور جگہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ شخص اکیلا ہی تھا یا اس کا کوئی دوسرا ساتھی بھی اس شہر میں موجود تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے کچھ دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

مگر اب بھی بار بار میرے جسم کو ٹھل کر دیکھ رہی تھی کہ مجھے کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ اس شخص کے چند گھوڑے مجھے پڑے تھے۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن ظاہر ہے میری یہ

تکلیف دوسروں کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

گیارہ بج گئے۔ ہم نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد سونیا نے دروازے پر دسترخوان بچا دیا اور کھانا لگائے لگی۔

ہم نے تو پھر بھی تھوڑا بہت کھایا لیکن شوہا کے ملنے سے توالہ نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے یہاں چند روز سکون سے گزارے تھے لیکن اب اس کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ ہم نے زبردستی اسے کچھ کھانا کھلا دیا۔

اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے۔ مجھے شبہ تھا کہ اگر اس شخص کا کوئی اور ساتھی بھی رشی کیش میں موجود ہو تو یہ رات ہمارے لیے بھاری ہو سکتی تھی لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا اور وہ رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح حسب معمول میں یوگی گوتم جھوش کے کانچ پہنچ گیا۔ اپنی مشق کی اور دس بجے کے قریب واپس آیا۔ شوہا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور انجانے سے خوف سے چہرے پر زور سی کھنڈ رہی تھی۔ میں ناشتا کر کے دوبارہ شہر کی طرف آگیا اور مکان کی تلاش شروع کر دی۔

مجھے باپوسی نہیں ہوئی۔ سہ پہر چار بجے تک میں نے نین چار مکان دیکھ ڈالے۔ ایک بنگلا مکان مجھے پسند آیا تھا۔ یہ بنگلا نہ تو زیادہ عجیب آبادی میں تھا اور نہ ہی وہاں آبادی زیادہ چھدری تھی۔ اس علاقے میں زیادہ تر بنگلے یہ تھے۔ یہ بنگلے مختلف شہروں کے رہنے والے ان دولت مند لوگوں کے تھے جو گرمیوں کا سیزن یہاں آکر گزارتے تھے۔ کچھ بنگلے مقامی لوگوں نے بھی بنوا رکھے تھے۔ یہ بنگلا ایک مقامی آدمی ہی کا تھا۔ بازار میں اس کی گرین گروسری اور پھلوں کی ایک دکان بھی تھی۔ وہ بے نامی اس شخص سے میری ملاقات ایک پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے ہوئی تھی۔

تین بیڈ رومز کے اس بنگلے کا لان خاصا وسیع تھا اور اس کی چار دیواری بھی خاصی اونچی تھی اور سب سے بڑی سمولت یہ تھی کہ یہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا اور ٹیلی فون کی وجہ سے زیادہ گریہ دینا پڑا تھا۔

اسی روز میں نے یوگی دھیراج سے کہہ کر حفاظت کے لیے دو آدمیوں کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔ وہ دونوں نیپالی تھے۔ ایک درمیانے قد کا تھا اور دوسرا قدرے نکلے ہوئے قد کا مالک تھا۔ وہ دونوں چہروں ہی سے خزانہ لگتے تھے اور ان دونوں کے پاس پستول بھی موجود تھے۔ میں نے یہ جان کر کوشش نہیں کی تھی ان کا یہ اسلوا سنسن یا تھ تھا یا نا تھ۔ مجھے بہرحال اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ مجھے تو کام

پاسی تھا۔

یہ بنگلا ڈیکور، میڈ تھا۔ تینوں بیڈ رومز میں اور لاؤنج میں ضروری فرنیچر موجود تھا۔ میں نے کچھ اور سامان بھی ڈلوایا تھا۔ یہ سارا بندوبست کرتے ہوئے مجھے بار بار بازار کی طرف جانا پڑا تھا۔ اس دوران میں میری نظرس اس شخص کو بھی غافل کرتی رہی تھیں لیکن وہ مجھے کیس بھی دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کوئی اور مشتبہ آدمی نظروں میں آیا تھا۔

میں جب کانچ واپس پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ میں صبح میں بھی ایک مرتبہ اُدھر آیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ سامان وغیرہ بیک کر لیں۔ ہم آج رات ہی یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔

میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سونیا وغیرہ نے تمام تاریاں کھل کر لی تھیں۔ سامان وغیرہ بیک کیا جا چکا تھا۔ کھانے پینے کے کچھ برتن ابھی بچے میں تھے۔ میں نے دن بھر کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھی میرا صرف چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔

سونیا چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے میں زیادہ تر شوہا سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بے چاری بہت خوف زدہ بھی اور میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ بلا بھی اسے بتا رہی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ میں نے کس طرح بے پور میں راموچے بد معاش کو مارا تھا اور پھر سارے کس جنگل میں لنگولی چوہدری ڈاکو کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

چائے پینے کے بعد سونیا نے وہ برتن بھی دھو کر بیک کر لیے۔ اب ہم لوگ یہاں سے رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن مجھے گاڑی کا انتظار تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے کرائے کی ایک گاڑی کا بندوبست کر لیا تھا اور اسے آٹھ بجے کے قریب یہاں آنے کا کہہ دیا تھا۔

سات بجے یوگی دھیراج بھی آگیا لیکن شوہا آج یوگا کی کلاس کے موڈ میں نہیں تھی۔ یک سوئی اور ذہنی سکون نہ ہو سکا تھا۔ میں نے اس کو یوگا کی پریس کے لیے تو عمل کر دیا۔

غٹک آٹھ بجے گاڑی آگئی۔ یہ نوپوٹاپک اپ تھی۔ ملتان لاد کر سونیا اور میرا پیچھے ہی بیٹھ گئیں اور میں شوہا کے پیچھے بیٹھ گیا۔ کانچ کو مالالگا کر چالی میں نے اپنے پاس بیٹھ کر رکھی۔ یہ چالی کل صبح کانچ کے مالک کو واپس کر دی تھی اور اتفاق سے شوہا نے یہ کانچ بھی اسی پراپرٹی ایجنٹ

کے توسط سے لیا تھا جس نے مجھے وہ والا یہ بنگلا دلایا تھا۔ رات دس بجے تک ہم اس بنگلے میں سامان سیٹ کر چکے تھے۔ ایک کمر شوہا کو دے دیا گیا۔ ایک کمر سونیا اور میرا نے قبضہ کر لیا اور تیسرا کمر میرے حصے میں آیا۔ میرا اور شوہا کا کمر اساتھ ساتھ تھا اور صبح میں دروازہ بھی تھا۔ شوہا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس نے صبح کا دروازہ کھول دیا تھا۔

ہمارے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دونوں نیپالی گارڈز بھی پہنچ گئے تو شوہا کو کچھ تسلی ہوئی۔ مجھے بھی اسی سیٹ اپ سے اگرچہ قدرے اطمینان ہو گیا تھا لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ہم نے یہاں شفٹ ہونے میں کسی قسم کی رازداری سے بھی کام نہیں لیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ شرارتا چھوٹا تھا کہ کسی کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا تھا اور ویسے بھی ظاہر ہے ہم جو ہیں گھنٹے گھر میں چھپ کر نہیں بیٹھے رہ سکتے تھے۔

اس رات کھانا میں ہوٹل سے لے کر آیا تھا۔ شوہا نے کل رات کے بعد پہلی مرتبہ رغبت سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا۔ چائے کے دوران میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ شوہا کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اس نے یہاں گیٹ ہاؤس اور ریٹورنٹ کا جو پروگرام بنایا تھا اس پر اب عمل نہیں ہو سکے گا۔

”کیوں۔ ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں دلش کھ کی وجہ سے بے پور سے بھاگ کر یہاں آئی تھی۔“ اس نے جواب دیا ”اس نے یہاں بھی میرا کھوج لگالیا ہے۔ وہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔“

”یہ صورت حال وقتی ہے۔“ میں نے کہا ”اگر بے پور میں ہماری ملاقات ہوئی ہوئی تو یہ ختم ہو چکا ہوتا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ یہاں گزر پڑنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ پہلے تو وہ اکیلی سمجھ کر جھیمس پریشان کرتا رہا ہے لیکن اب تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم ہیں نا! اب اسے سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا ہو گا۔“

”ہم نے جو پروگرام بنایا تھا کیا اس پر عمل ہو سکے گا؟“ شوہا نے پوچھا۔

”کیا رکاوٹ ہے اس میں؟“ میں نے کہا ”میں نے کہا تھا کہ وقتی پریشانی ہے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اٹھ کر باہر آگیا۔ دونوں نیپالی گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ گیٹ کے اندر اور باہر دونوں طرف کیبن بنے ہوئے تھے۔ بے قد والا سریندر اندروالے کیبن میں بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا درمیانے

قد والا رابندر باہر والے کیمین میں تھا۔ میں نے پہلے سریندر کے ساتھ ٹھوم پھر کر اندر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ چار دیواری تقریباً چھ فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر کانٹوں والے تاری باز لگی ہوئی تھی۔ دیواروں کے اندر کی طرف قدر آور دوسے تھے لیکن ان پودوں کی شاخیں پکلی اور پلک دار تھیں۔ ان پر کسی کے چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس جنگل کی بیچیلی طرف خالی جگہ تھی۔ دائیں طرف ایک بنگلا تھا لیکن دونوں بنگلوں کے بیچ تقریباً پندرہ فٹ جگہ خالی تھی۔ اس طرح ایک گلی سی بن گئی تھی۔ بائیں طرف دو تین پلاٹوں کی جگہ خالی تھی۔ اس کے بعد ایک بنگلا تھا اور پھر کچھ جگہ خالی تھی۔ سامنے بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ کوئی بھی بنگلا ایک دوسرے سے ملا ہوا نہیں تھا۔

میں رابندر کے ساتھ دیر تک باہر کی صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ان دونوں کو مختلف ہدایات دینے کے بعد اندر آ گیا۔ میرے اندر آنے کے فوراً ہی بعد سونیا نے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ عقبی دروازہ تو اس نے لاک کر کے اس کے سامنے ایک بھاری صوفہ رکھ دیا تھا۔ ٹیلی فون لائن ہی میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ریسپورٹ اٹھا کر سب پور میں ٹھاکر کا نمبر ملائے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں موجود ہوگا۔ میں نے ریسٹورنٹ کا نمبر ملایا اور کال ٹھاکر ہی نے ریسپونڈ کی تھی۔

میں نے ٹھاکر کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کانچ سے اس جنگل میں منتقلی کا بھی بتا دیا اور ٹیلی فون نمبر بھی نوٹ کروا دیا۔

”ٹھکراؤ نہیں۔“ اس نے میری پوری بات سننے کے بعد کہا ”میں یہاں دیش کھ کے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔ اس کے بارے میں جیسے ہی کچھ پتا چلا“ میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“

”میں تو نہیں شوبھا گھبرا رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”وہ کچھ اب سیٹ ہو رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ شاید اسے یہاں سے بھی بھانپا نہ دے۔“

”وہ دیش کھ گئے ڈر سے کب تک اور کہاں تک بھاگتی رہے گی۔ اس سے کوئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ میری بات کراؤ اس سے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

میں نے شوبھا کو بلا کر ریسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔ شوبھا تقریباً دس منٹ تک ٹھاکر سے بات کرتی رہی پھر ریسپورٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کچھ دیر ٹھاکر سے بات کی اور پھر

فون بند کر دیا۔

وہ رات بھی تقریباً جاگتے ہوئے گزری تھی۔ میں نے اگرچہ حفاظت کا معقول بندوبست کر لیا تھا لیکن شوبھا کے ذہن میں اب بھی کچھ خوف تھا۔ اگر وہ شوبھا کا معاملہ نہ ہوتا اور صرف سونیا یا بھلا میرے ساتھ ہوتی تو مجھے یہ سارا تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایسا مفلوج یا اپاہج نہیں تھا کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے گن مینوں کی ضرورت پڑی اور ویسے میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ میں نے نہایت معقول حفاظتی انتظامات کر لیے تھے لیکن اگر کچھ ہونا ہوگا تو میں اور دونوں گن مین بھی اسے نہیں روک سکیں گے۔

دو تین دن گزر گئے۔ شوبھا کے چہرے کا رنگ بھی اب پھر گیا تھا۔ اس کے گالوں پر پھر سرخی نظر آنے لگی تھی۔ اس کا خوف بتدریج دور ہو رہا تھا اور وہ ایک بار پھر پہلی طرح چمکنے لگی تھی۔

اور پھر اس دن تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں حسب معمول صبح چھ بجے ریاضت کے لیے پوگی کو تم بوش کے کانچ چلا گیا تھا جہاں سے میری واپسی دس بجے کے قریب ہوئی۔ سونیا سے تو ان ہی میں ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی عورت تم سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہے۔“ سونیا نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا ”پتا نہیں تم کب سے چھپ چھپ کر اس سے ملتے رہے ہو۔ ہم تو بھی تم نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔“

”کون عورت؟“ میں گڑ بڑا سا گیا ”میں یہاں کسی عورت کو نہیں جانتا اور نہ ہی کسی سے ملتا رہا ہوں۔ کون ہے وہ؟“

”اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ جا کر دیکھ لو۔“ سونیا نے جواب دیا۔

میں برآمدے والے دروازے سے اندر آ گیا۔ سونیا بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ لائن میں عین سامنے والے صوفے پر بھلا بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی چمکنے لگے۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور میں صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ اس نے سرمئی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔

میں جھٹکنے ہوئے آگے بڑھا اور جیسے ہی سامنے پہنچا وہ عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے دماغ میں ایک زور دار دھماکا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ شوبھا تھی۔ سرمئی ساڑی اس کے گورے بدن پر خوب کھل رہی تھی۔ جگہ سے میک اپ نے اس کے حسن میں بے حد نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جس نے کل تک سوگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

سرمئی ساڑی پر ایک بالشت چوڑا خوب صورت بارڈر تھا۔ سیلوئس بلاؤز خاصا مختصر تھا۔ اس نے سونے کا خوب صورت لاکٹ اور ہلکے بندے پہن رکھے تھے۔ وہ ایک بھرپور جوان اور حسین عورت تھی۔ بلاؤز میں اس کا شباب گویا چمکا رہا تھا۔ میرے لیے اس پر نظرس نکانا مشکل ہو گیا اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر دیش کھ اس کے لیے مرنے مارنے کو تیار تھا تو مجھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس عورت کے لیے تو سلطنت بھی لٹائی جاسکتی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اب اپنی زندگی کو اس طرح ضائع کیوں کرتی رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسے شوہر کی موت کا بہت صدمہ ہو گا لیکن چند روز پہلے کانچ میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جانے والوں کے لیے اپنی زندگی کو روگ نہیں لگایا جاسکتا۔ بن باس لے لینا یا اپنی زندگی کو بچ دینا تو اپنے ساتھ ہی بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عورت کو عیش و عشرت میں زندگی گزارنا چاہیے یا وہ شیخ محفل بنی رہی لیکن اسے اتنا حق تو حاصل ہو کہ وہ زندگی کی خوشیوں میں سے اپنا حصہ وصول کر سکے۔

میرے سامنے کھڑی ہوئی شوبھا نے نمسکار کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت نظر آ رہی تھی۔ گراں اس وقت میرا دل یہ کیوں چاہتا تھا کہ میں آگے بڑھ جاؤں اس لیے باندھوں میں سمیٹ لوں لیکن میں بڑی مشکل سے اپنا اس خواہش پر قابو پا سکا تھا۔

”گدا!“ میں مسکرا دیا۔ ”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے انکس ہے کہ آپ کا انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی لیکن بہر حال دیر آید درست آید۔“

تم میری اس بات پر ان تینوں نے قہقہہ لگایا اور جب منہ می تو میں نے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو کیا یہ خیال کیسے آ گیا؟“

”میں کئی روز سے اپنا حلیہ بدلنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اس روز میں نے تمہیں تو لمبا چوڑا لیکچر سنا دیا تھا لیکن بعد میں اپنے بارے میں سوچتی رہی کہ میں خود ان باتوں پر کس حد تک عمل کر رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

”میں جب بے پور سے نکلی تھی تو یہ طے کر لیا تھا کہ جہاں بھی جاؤں گی، اس اداسی اور افسردگی سے نجات حاصل کر لوں گی۔ میں اپنے بہت سارے کپڑے اور زیور ساتھ لے کر آئی تھی لیکن بہت نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں کی باتوں سے ڈر لگتا تھا لیکن جب سے اس جنگل میں آئے ہیں یہ دونوں میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔“ اس نے بھلا اور سونیا کی طرف اشارہ کیا ”اور پھر میں نے بھی سوچا کہ پوری زندگی تو سوگ میں نہیں گزارا جاسکتی۔ دھرم بھی دھوا (بیوہ) عورت پر یہ پابندی نہیں لگاتا کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔ یہ عورت پر منحصر ہے کہ وہ مرنے والے بچی کی یاد کو بننے سے لگائے رکھے یا نہ پھاڑ جیسی زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا سہارا تلاش کر لے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے اپنے بچے سے بہت محبت تھی۔ اس نے مجھے زندگی میں بہت خوشیاں دیں۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی لیکن کسی کی یادوں کے سہارے تو زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”میں سبے پور میں بہت سی ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جنہوں نے دھوا ہونے کے بعد دوسری بلکہ اس کے بعد تیسری شادی بھی کر لی۔ دھوا عورت کے لیے شادی نہ کرنا کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ دولت مند طبقے میں تو سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ دھرم کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے طرح طرح کی ٹاپوس لکھنی جاتی ہیں اور پنڈت بھی ان دھن والوں کا ساتھ دیتے ہیں لیکن چٹلے اور غریب طبقے پر ساری پابندیاں عائد رکھی جاتی ہیں۔ ان کا کوئی قدم عام ڈگر سے ہٹ جائے تو ان کا حقہ بانی بند کر دیا جاتا ہے اور۔۔۔“

”کئی بحث میں جانے کی ضرورت نہیں شوبھا جی۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”آپ مجھے یہ بتائیے کہ کیا آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی کو نظروں میں نہ لایا ہے؟“

”نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ شوبھا جلدی

تے بولی۔ اس کا چہرہ کچھ اور گل گول ہو گیا تھا "ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو بس۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا "تو پھر کیوں نا آج دوپہر کا کھانا باہر ہو جائے۔ میاں ایک اچھا ریستورنٹ بھی ہے۔ پریم نورس۔ یورپین اور چائینیز کھانے بہت اچھے بنے ہیں وہاں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن۔"

"لیکن دیکھ کچھ نہیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "ایک بار باہر نکلگو تو ساری جھجک اور خوف دور ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو۔" شوہا نے میری بات مان لی۔

"ارے بھئی۔ ہمیں دس منٹ کا وقت دو۔ ہم بھی تیار ہو جائیں۔" سونیا نے جلدی سے کہا۔

وہ دونوں فوراً ہی اپنے کمرے میں گھس گئیں اور دروازہ بند کر لیا۔ میں شوہا کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ میری نظرس بار بار شوہا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میری نظروں میں میل نہیں تھا نہ ہی من میں کوٹ بھی لیکن نجانے کیوں میرے سینے میں گد گد سی ہونے لگی تھی اور دل چاہتا تھا تے دیکھتا رہوں۔

ٹھیک دس منٹ بعد سونیا اور بلا بھی تیار ہو کر کمرے سے نکل آئیں اور اس کے دو تین منٹ بعد ہم بنگلے کے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ میں نے سریندر اور راہندر کو کچھ ہدایات دیں اور ہم ایک طرف چلنے لگے۔

بازار زیادہ دور نہیں تھا۔ شوہا ہمارے ساتھ پہلی مرتبہ اس طرح آزادی سے باہر نکلی تھی اور بہت خوش تھی۔ ہم کافی دیر تک بازاروں میں گھومتے رہے۔ ایک چکر لاری اڑے گا بھی لگایا۔ شوہا انجانا کی مریضہ تھی۔ اس کی وجہ سے ہمارے چلنے کی رفتار بہت سست رہی تھی۔

دو بجے کے قریب ہم پریم نورس ریستورنٹ میں پہنچ گئے۔ بہت کشادہ ہال تھا۔ مناسب فاصلوں پر میز سجھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ ہٹا کبین بنے ہوئے تھے۔ اوپر بھی وسیع بالکونی تھی اور وہاں بھی میز سجھی ہوئی تھیں اور کبین بھی تھے۔ بنگلے ہال میں اگرچہ ایک دو میز خالی تھیں لیکن ہم اوپر بالکونی میں آگئے اور ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں سے نیچے آدھ رفت کے دروازے پر بھی نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ اس ریستورنٹ میں اگرچہ متاعی فابک بھی تھے مگر زیادہ آدھ رفت یورپین سیاحوں کی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میاں چائینیز اور یورپین کھانے دستیاب تھے۔

ریستورنٹ میں سروس کے لیے حسین اور خوب صورت لڑکیاں تھیں۔ اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس یہ خوب صورت لڑکیاں گاہکوں کی سیوا کے لیے بڑی مہارت اور چمکی سے ادھر ادھر آتا رہی تھیں۔ ایک ویٹریس ہماری میز پر بھی آگئی اور ہم نے تین چار مختلف ڈشوں پر مشتمل چائینیز کھانے کا آرڈر دے دیا۔

ریستورنٹ سے نکل کر ہم پھر بازاروں میں گھومنے لگے۔ ضرورت کی چند چیزیں بھی خریدیں اور واپس آگئے۔ شوہا کی جھجک اور خوف دور ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں ہمیں کوئی ایسا آدمی بھی نظر نہیں آیا تھا جس پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا۔ شوہا ایک بار پھر گیٹ ہاؤس اور ریستورنٹ کے منصوبے بنانے لگی تھی۔

اس کے تیسرے دن ہم پھر پریم نورس ریستورنٹ میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ اس وقت پہلا بھی ساڈی میں تھی اور شوہا نے بھی نیکی بیڑھا ڈی پن رکھی تھی۔ اس ساڈی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ سونیا حسب معمول اسکرٹ بلاؤز میں تھی۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ہم ریستورنٹ سے نکل کر کھلے ہوئے گیارہ بجے کے قریب کو بھی پہنچ گئے۔ گیٹ کے باہر کبین میں کرسی پر بیٹھا ہوا نیپالی گاؤ راہندر ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

"صاحب جی۔ آپ کے دو مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں بڑی عزت سے اندر بٹھا دیا ہے۔" اس نے باؤی باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

"دو مہمان!" میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا پھر میرے ذہن میں اچانک ہی شاکر اور روپ متی کا خیال ابھر آیا "اوسہ جے پور سے آئے ہیں؟" میں نے سوالیہ لنگاہوں سے راہندر کی طرف دیکھا۔

"جی صاحب۔ مہمان لوگ ایسا ہی بولا۔ جے پور سے آنے کا ہے۔" راہندر نے جواب دیا۔

ہم گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو سریندر نے بھی اٹھ کر سلام کیا۔

"خفا کر اور روپ متی آئے ہوں گے۔" شوہا نے کہا۔ "ان کے سوا کون ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا "تم دن پہلے خفا کر سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس وقت تو اس نے میاں آنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔" "ہو سکتا ہے وہ ہمیں سررازدہنا چاہتے ہوں اس لیے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔" بلا نے کہا۔

ہم آہستہ آہستہ والے دروازے میں داخل ہوئے تو میں ٹک کر گر گیا۔

مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔ سامنے ہی صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ کئی مرتبہ اخباروں میں اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔

میں نے مڑ کر شوہا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم ڈارڈیا تھا جیسے سارا خون پڑ گیا ہو۔ سونیا اور بلا کے چہروں پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ دونوں سچی ہوئی نظروں سے دیکھ کر شوہا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

دیش کھ صورت ہی سے غنڈا لگتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب مڑ ضرور رہا ہوگا۔ کسرتی بدن، سر پر گول ٹوپی جس پر رنگین دھاکوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ٹوپی کسی قدر زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں گال پر بننے کے دانے کے برابر کالا مس تھا۔ وہ یا قاعدی کے شیویناے کا عادی تھا۔ بائیں مونچھیں جو کسانوں سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں انہیں ٹاپ ٹکوارٹ مونچھیں کہا جاتا تھا۔

دیش کھ نے جینز کی پتلون اور اوپن شرٹ پن رکھی تھی جس کے اوپر کے ٹخن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی ٹوٹی سی چین نظر آ رہی تھی۔ وہ تینا (سیاست داں) تھا اور بہت خیال میں کسی سیاست داں کو اس قسم کا طبع زیب نہ آتا تھا لیکن پھر یہ بات بھی سہی کہ وہ بنیادی طور پر غنڈا تھا۔ اس کی فطرت تو نہیں بدل سکتی تھی۔ وہ صوفے پر آلتی پالتی بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا دوسرا ساتھی درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا تھا۔ صورت سے وہ بھی چھٹا ہوا بد معاش لگتا تھا۔

"واہ شوہا دیوی۔" وہ اپنی جگہ پر پھلو بدلتے ہوئے دیش کی ہی ہوس بھری نظرس شوہا کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی "میاں اگر تو خوب پر مڑنے نکال لیے۔ روپ بھی دھنوب کا نکالا ہے۔ یہ لوٹا اچھا لیا ہے کیا۔ ہم میں کیا ہے؟"

"اے! کون جو تم اور یہ کیا یوگا کر رہے ہو؟" میں نے ہنسنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"بھئی بھئی! وہ بھول کر ہے۔" دیش کھ پھلو بدلتے ہوئے "تو ہم کا نہیں جانت ہو۔ تینا ہوتا ہے۔ لانا ٹانگ سے بھڑکی گرا دوں گا۔ تو چپکا کھڑا رہ۔ ہم شوہا سے بات نہ بہا ہوں۔"

"پہلے تو میں تمہاری نینا کی نکال دوں۔" میں نے بھی غرا کر کہا اور شوہا کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا "سنا ہے تم بہت بڑے غنڈے ہو۔ لوگ تمہارا نام سن کر کا پتہ نہیں۔ تمہیں تمہاری شامت ہی میاں کھینچ لالی ہے۔ اب تم اپنے بیروں پر چل کر میاں سے نہیں جاسکو گے۔"

"ارے کتنے کی طرح کیا بھولکت ہو۔" دیش کھ نے کہا۔ وہ اب بھی صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا جبکہ اس کا وہ سرا ساتھی مجھ پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھا "ہمارا تمہارا کوئی دشمنی نا ہی ہے اے۔ ہم اس کو لینے آیا ہوں۔ شوہا کو۔ بہت عیش کر لیا تم نے اس کا ساتھ۔ اب اتے ہمار خوالہ کر دو۔ ہم میاں سے چلا جاؤں گا۔"

"یہ درست ہے کہ پہلے میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اچھے تھے لیکن تم نے اس گھر میں داخل ہو کر دشمنی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو۔"

"کیا دیکھتے رہے ہو راٹکڑا!" دیش کھ نے میری بات کاٹ کر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا "لوٹوڑے کو بتا ہم کون ہوتے ہیں اور میاں کیوں آیا ہوں۔ اس کو یہ بھی بتا کہ شوہا ہماری ہے۔ اس نے اب تک اس کے ساتھ جو عیاشی کر لی وہ ہم ناف کرت دیوں ہوں۔ چل۔ بتا دے اس کو۔ ہم شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر سار جھین یوت والا ہوں۔"

راٹکڑا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جینز کی پتلون پر بغیر آستین کی چمڑے کی بیٹھ پن رکھی تھی۔ بازوؤں کے سلسلے ابھرے ہوئے تھے۔ سینے اور چہرے پر زخموں کے کئی نشان تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ لڑتے ہوئے ہی گزرا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرخی بھی نظر آ رہی تھی۔

وہ صوفے سے اٹھ کر بنے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھا اور دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ میں اس طرح آگے کو جھکا جیسے اس کی ٹانگوں سے لپٹنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تیزی سے نیچے جھکا لیکن میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے سیدھا ہو کر اس کی ٹھوڑی پر کھٹنے سے زوردار ضرب لگا دی۔ وہ گرا پڑے ہوئے سیدھا ہوا تو میں نے اپنی جگہ پر اچھل کر اس کے سینے پر فلا ٹنگ ٹنگ لگا لی۔

ٹنگ اس کے سینے پر لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈھیر ہو جائے گا مگر وہ محض لوٹا کر رہ گیا تھا۔ میں پھر اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے ہوا میں کھوم کر ٹنگ لگا لی تھی۔ میرے دانتیں پیر



کا بچہ گدی کی طرف سے اس کے دائیں کندھے کے جوڑ پر لگا۔ اس مرتبہ وہ کراہ کر دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں اسے سینٹلے کا موبع نہیں دیتا جانتا تھا۔ اس مرتبہ میں نے فلائنگ کلک کے بجائے وہیں کھڑے کھڑے لٹو کی طرح گھوم کر اسپن کلک لگائی۔ یہ ضرب اس کے پلو پر لگی۔ وہ اس مرتبہ بھی کرنے کے بجائے گھوم کر گر گیا۔ وہ ایک ہاتھ پلو پر رکھے بیچے جھکا تو میں بھی تیزی سے بیچے جھک گیا اور اسے کندھے پر اٹھا کر صوفے کی طرف اچھال دیا۔

راگنڈیش کھ کے اوپر گرا۔ دیش کھ بیچ اٹھا۔ وہ دونوں صوفے سمت پیچھے الٹ گئے۔ میں بھی چھلانگ لگا کر صوفے کی پچھلی طرف بیچ گیا۔ دیش کھ کی ٹوٹی دور جاگری تھی۔ اس کے بال اتنے بڑے نہیں تھے کہ ٹٹھی میں آسکتے۔ میں نے اسے شرٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے کولے پر ایک زوردار ٹھوک مار دی۔ وہ لاٹھڑاتے ہوئے منہ کے بل صوفے کی دوسری طرف گرا۔ میں بھی چھلانگ لگا کر واپس اسی طرف آیا۔

دیش کھ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب تک پہنچتا، میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھلا۔ میری دونوں ٹانگیں اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ اس طرح میرا سر نیچے کی طرف ہو گیا تھا۔ دیش کھ نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے پلوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اگر اس کی گرفت جم جاتی تو میری خیریت خطرے میں پڑ جاتی لیکن میں نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اپنے آپ کو آگے کی طرف جھٹکا دیا۔

دیش کھ میرے اوپر سے ہوتے ہوئے پورے قد کے ساتھ اپنی فلا بازی کھا کر پشت کے بل سینئر ٹیل پر گرا۔ میری ٹاپ شیش کی تھی۔ شیش ایک زوردار چھانکے سے ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی دیش کھ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی تھی۔

میں فوراً ہی سینھل گیا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ راگنڈ ہاتھ میں جا تو لے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے دونوں پیروں پر روک کر پوری قوت سے دوسری طرف اچھال دیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

راگنڈ بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کو موقع نہیں دیا۔ میں نے زوردار راؤنڈ ہاؤس کلک لگادی جو اس کی ہینڈل کی پچھلی طرف لگی۔ وہ چیختے ہوئے بیچے گرا۔ میرا

خیال تھا اس کی ہینڈل کا گوشت پھٹ گیا تھا۔

دیش کھ اس دور میں ان اٹھ چکا تھا اور وہ ایک بار پھر جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس مرتبہ بھی اسے موقع نہیں دیا۔

میری سائڈ کلک اس کے بازو پر لگی اور پھر میں نے اسے نکلنے کا موبع نہیں دیا اور کلک پر کلک لگاتا چلا گیا۔ اسی دوران میں راگنڈ بھی سینھل کر میری طرف لپکا تھا لیکن میں اس سے غافل نہیں تھا۔ میری ایک ہی اسپن کلک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں پھر دیش کھ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرا ایک پلو پھر بیچ اس کے جڑے پر لگا۔ وہ بیچ اٹھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسی جگہ ایک اور بیچ لگایا۔ اس مرتبہ اس نے خون ٹھوکا تو اس کے ساتھ ایک دانت بھی تھا۔

”مارو۔ مارو اسے۔ اور مارو۔“

یہ شوبھا کی آواز تھی۔ میں نے اسے کمرے میں بھینچا لیکن وہ باہر نکلی تھی۔ ان دونوں کو میرے ہاتھوں نے پکڑ کر اس کا حوصلہ بڑھا تھا اور وہ بیچ بیچ کر میرا حوصلہ بھاری تھی۔

مجھے واقعی اس کے چیختے سے مزید حوصلہ ملا تھا۔ میں نے دیش کھ اور راگنڈ کو ایک بار پھر ٹھوکوں پر رکھا تھا۔ شوبھا کے جی میں جانے کیا آئی کہ وہ بھی میدان جنگ میں کود پڑی اور پھر بلا بھی اس سے پیچھے نہیں رہی تھی۔ ان دونوں نے ٹوٹی ہوئی سینئر ٹیل کے پائے بھینچ لیے تھے اور ان دونوں کی اس طرح دھناتی کردی تھیں جیسے دھوبی گھاٹ پر بھی پڑے کوٹ رہی ہوں۔

سونیا باہر دوڑ گئی تھی۔ وہ دونوں نیپالی گن مینوں کو لے آئی۔ نیپالی گن مینوں نے یہ صورت حال دیکھی تو راگنڈ اور دیش کھ پر بل پڑے۔ میں نے بلا اور شوبھا کو پیچھے بھینچ لیا۔ شوبھا بری طرح پھری ہوئی تھی۔ میں اسے ہاتھوں کی پٹ میں لے کر کمرے میں آگیا۔

”چھوڑ دو مجھے۔“ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بیچ رہی تھی ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مار دو اسے۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ مجھے سنو؛ ٹانگ رکھا تھا اس نے۔“

”ہوش میں آؤ شوبھا۔“ میں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ ”اسے حواس قابو میں رکھو۔ اب وہ تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔ باہر مت آنا۔“ میں اسے کمرے میں چھوڑ کر لپک کر باہر آیا۔ سریندر

نے اپنا پستول نکال لیا تھا اور راگنڈ راتوں اور گھونٹوں سے ان دونوں کی دھناتی کر رہا تھا۔

”ہیں۔ چھوڑ دو اب انہیں۔“ میں نے چیخ کر کہا ”گھر جاتے ہوئے تمہاروں کی اتنی ہی سیوا کاٹی ہے۔“

سریندر اور راگنڈ مشینیں انداز میں رک گئے اور پھر میری ہدایت پر راگنڈ ان کی تلاشی لینے لگا۔ دیش کھ کی ہینڈل کی جیب سے پستول برآمد ہوا جسے لڑائی کے دوران میں وہاں رکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

راگنڈ کے پاس سے کوئی آتشیں اسلحہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے پاس دی جا تو تھا جو اب ٹوٹی ہوئی میز کے قریب دری پر اٹھا۔ راگنڈ نے وہ جا تو بھی اٹھا لیا۔

”کیا خیال ہے نیتاجی۔“ میں نے دیش کھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس حالت میں تمہاری تصویر کھینچ کر انباروں میں چھپا دی جائے تو کیسی رہے؟“

”تیرا داؤ چل گیا ہے لونڈے۔“ دیش کھ کے منہ سے آواز بھی بھٹک نکل تھی ”ہم اب بھی کتا ہوں کہ شوبھا کو میرے حوالے۔“

اس کی کھوپڑی پر لگنے والی میری ٹھوک سے اس کے آخری الفاظ بیچ میں بدل گئے تھے۔

”اب اگر تمہاری زبان پر شوبھا کا نام آیا تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔“ میں نے اسے ایک اور ٹھوک مارتے ہوئے کہا ”تم شوبھا کو جس طرح پریشان کرتے رہے ہو مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے لیکن اب اگر تم نے شوبھا کی طرف میلی ہاتھ سے بھی دیکھا تو آٹھیں نکال دوں گا اور تمہارے ہاتھ پکڑ کر کٹوں کو کھلا دوں گا۔ تم بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔“

”بول۔ بول۔ بول۔“ دیش کھ نے دری پر خون ٹوٹے ہوئے کہا ”یہ جان لے اے کہ شوبھا میری ہے۔ دنیا کی کوئی شئی اسے مجھ سے نہیں بچا سکتی۔ وہ۔“

اس کے آخری الفاظ ایک بار پھر بیچ میں بدل گئے۔ پتا نہیں شوبھا کس وقت کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے ہاتھ بٹ پڑا ہوا میز کا پایہ پوری قوت سے اس کے کندھے پر مارا تو راگنڈ پھر درپے اس پر ضرش لگاتی رہی۔ دیش کھ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دری پر لوٹا رہا لیکن شوبھا کا ہر وار اسے چیخ پر مجبور کر دیتا۔ میں نے لپک کر شوبھا کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا تھا۔

”ٹھوکا تو تم نے لوٹ کا مال سمجھ رکھا ہے۔“ وہ جینی ”خف ہے تمہاری مروا لگی پر!“ اس نے دیش کھ کے منہ پر

ٹھوک دیا ”کنزور اور بے سہارا عورتوں پر دھونس جتا کر اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے۔ ایک مرد سائے آیا تو تمہاری ساری مروا لگی نکل گئی۔ تم۔۔۔“ اس نے ایک بار پھر ٹھوک دیا۔

”مروا لگی تو ہم تمہیں دکھاؤں گا۔“ دیش کھ بولا۔ وہ واقعی بہت ڈھبٹ اور بہت بے غیرت تھا۔ اتنی پٹائی ہونے کے بعد بھی اسے غیرت نہیں آتی تھی۔

”بہتر ہے کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ”میں تمہیں ایک موبع دے رہا ہوں۔ یہ پہلا اور آخری موبع ہے۔ آئندہ اگر تم نے شوبھا کے راستے میں آنے کی کوشش کی تو تم اپنے پیروں پر چلنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔“

”دیکھ لوں گا۔“ تیرے کو بھی دیکھ لوں گا۔“ دیش کھ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس کو چھوڑنے کا مت صاحب۔“ سریندر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس لوگ کو پولیس کسٹڈی میں دینے کا ہے نا۔“

”نہیں۔ اس مرتبہ انہیں جانے دو لیکن اگر آئندہ کہیں آس پاس نظر بھی آئیں تو آواز نا گویوں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک بولنے کا ہے صاحب۔“ سریندر نے کہا اور دیش کھ کو شرٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھا دیا ”چل اٹھ۔ تم تو ہم کو بولنے کا تھا کہ بیکم صاحب کا رشتے دار ہو اس لیے ہم تم کو عزت کے ساتھ اندر بٹھاؤ۔ کوئی چیز تو چوری نہیں کیا ہو؟“

”تم ہماری تلاش لے چکے ہو۔“ دیش کھ نے تینٹکے سے اپنا کالر چھڑا لیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ہم چلتا ہوں۔“

”چلے بھی جاؤ۔“ میں نے غصے میں کہا ”اور ہاں۔ اپنا یہ دانت بھی اٹھا کر لے جاؤ۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور راگنڈ کو اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ راگنڈ لنگڑاتے ہوئے چل رہا تھا۔ اس کی ہینڈل کی پچھلی طرف لگنے والی میری راؤنڈ ہاؤس کلک سے گوشت پھٹ گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ آٹھ دس دن بلاش کروانا رہے گا۔ دیش کھ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ چکا تھا اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بتا چکا ہوں کہ اس قسم کے

غذوں کی ساری طاقت ان کے گردوں میں ہوتی ہے۔ وہ خود کسی کے ہستے چڑھ جائیں تو چند ہاتھ کھا کر ہی تدمسوں پر گر جاتے ہیں اور گردن گزرا کر رحم کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ دیش کھ اس لحاظ سے دوسرے غذوں سے مختلف ثابت ہوا تھا کہ بری طرح بننے کے بعد بھی وہ ہاتھ جوڑ کر گزرا یا نہیں تھا بلکہ آخری وقت تک سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا تھا۔

میں بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ بلا بھی میرے ساتھ تھی۔ سریندر اور راہندر دیش کھ اور راغز کو دھکے دیتے ہوئے گیت سے باہر لے آئے اور ان کے کالھوں پر لاتیں رسید کر کے چھوڑ دیا۔

وہ دونوں گلی کے آخر میں موڑ پر کھڑی ہوئی ایک کار کے قریب رک گئے۔ جب ہم بازار سے واپس آئے تھے تو اس کار کے قریب سے گزرے تھے مگر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ بعد انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر کار پر شور آواز کے ساتھ مخالف سمت میں چلی گئی۔

میں نے راہندر کو گیت پر ہی چھوڑ دیا اور سریندر کو اشارہ کرتے ہوئے اندر آگیا۔ سونیا اور شوہا اسی جگہ پر کھڑی تھیں جہاں میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ شوہا کی ساڑی کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر لگتا جیسے اس نے صرف دھوئی اور بلاؤز پن رکھا ہو۔ میں اس کے سامنے رک گیا۔ وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سونیا، بلا اور سریندر کی موجودگی کی پروا کیے بغیر والمانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی اور میرے رخساروں اور پیشانی پر پٹا چٹ بوتے دینے لگی۔

”تم واقعی بہت بہادر اور حوصلہ مند ہو۔“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولی ”دیش“ تم کو یہاں دیکھ کر تو میری روح فنا ہو گئی تھی۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ شاید۔“

”ہمارا انت ہونے والا ہے۔“ میں نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

”ہاں ہاں۔ میں تو کانپ کر رہ گئی تھی۔“ اس نے سر ہلا دیا۔

”میرا ہمت تنگ بہت ہمت والا ہے ویدی۔“ بلا بول پڑی ”مجھے یاد ہے جب سارسکا میں ڈاکو مجھے اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے تو یہ اکیلا ان ڈاکوؤں کے پیچھے جنگل میں آگیا اور ڈاکوؤں کے سردار کو اس طرح خنجر کرا اور اچھل اچھل کر مارا کہ وہ منظر میں آج بھی نہیں بھول سکتی۔“

”باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہاں کی صفائی ہو کر جائے۔“ میں نے کہا۔

سریندر پہلے ہی اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا اس نے اٹے ہوئے صوفے اور کرسیاں سیدھی کر دیں اور فنی ہوئی میز اور شیشے کے کٹلے اٹھائے لگا۔

بلا اور سونیا بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ سریندر نے شیشے کے کٹلے اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ سونیا ایک پانی میں پانی اور پرانا کپڑا لے آئی۔ سریندر کپڑا بھگو کر درختوں کے دھبے صاف کرنے لگا۔ اس نے دیش کھ کا ٹوٹا ہوا ڈانت بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دیش کھ چار پونے روز تک اپنے جبروں کی سزا کی ضرور کرے گا۔

صفائی میں پون گھنٹا لگ گیا۔ صفائی کے دوران میں درختوں سے دیش کھ اور راغز کی سونے کی زنجیریں بھی لی تھیں۔ لڑائی کے دوران میں زنجیریں ان کے گلوں سے نوٹ کر کڑی تھیں۔ میں نے ایک جین سریندر کو اور دوسری راہندر کو انعام کے طور پر دے دی۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے پستول اور چاقو میں نے سریندر سے لے لیا تھا۔ ان دونوں نے پھر اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔

سونیا نے ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ کافی بنا کر لے آئی۔ اس وقت واقعی چائے یا کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس دوران میں شوہا بار بار میرا جسم ٹٹول رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ مجھے چوت تو نہیں لگی۔

”تم نے انجین یہاں سے چلے جانے کا موقع دے کر اچھا نہیں کیا۔“ شوہا نے کہا ”وہ دھمکی دے کر گیا ہے اور پھر آئے گا۔“

”اب اگر وہ آیا تو اپنے پیروں پر چل کر نہیں لکھتا؟“ ہی واپس جانے لگا۔ میں نے جواب دیا ”کیونکہ آج تم نے بھی اپنے دل کی کچھ بھڑاس نکال لی۔ اب تمہارے دل میں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔“ غذوں سے ڈرا جائے ڈوڈا ہی زیادہ دہاتے ہیں۔ ان سے شیشے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ آج تم نے دیکھ لیا۔“

”ہاں۔ اب میرے دل میں کوئی خوف نہیں رہا۔ اب میں اسے معاف نہیں کر دوں گی۔“ شوہا نے جواب دیا۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم سب اچھل پڑے۔ بلا قریب بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ جھا کر ریسور اٹھالیا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر تمنتاہت سی آگئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی کی کال ہو سکتی ہے اور پھر اس نے ریسور میری طرف بڑھا دیا۔

”ویدی روپ متی ہے۔“ اس نے بتایا۔

میں نے ریسور لے لیا۔ چند لمحے روپ متی سے بات کرنا پھر خاکلائن پر آگیا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا۔

”میں اپنے ایک آدمی کے ذریعے دیش کھ کی نگرانی کر رہا ہوں۔ لیکن وہ دن پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا۔ وہ بے پور میں تھا۔“ اس سے ہماری ملاقات ہو گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟ کیا وہ۔“

”ہاں۔ وہ یہاں پہنچ گیا ہے اور ایک بڑھ گھنٹا پہلے ہائی کوٹھی پر آیا تھا۔ ہم نے اس کی مناسب تواضع کر دی۔ تم امید ہے اسے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“ میں نے کہا اور پھر اسے آج کے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

”اوہ! ٹھاکر نے کہا ”میری ضرورت ہو تو آجاؤں؟“

”نی اٹھال نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”ابھی تو کئی روز تک وہ اپنی جوئیں سہلا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے رشی کشی ہی لگائیں چھا رہے یا کہیں اور چلا جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ واپس ضرور آئے گا اور اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں ان کا گلوں گا۔“

”اگر کوئی تو میں ایک دو آدمی بھیج دوں۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”نہیں۔ میں نے یہاں بندوبست کر لیا ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فوراً تمہیں اطلاع دوں گا۔“ میں نے جواب دیا اور پھر دھیر دھیر منہ منگلوں کے بعد فون بند کر دیا۔

میں فون بند کر کے شوہا وغیرہ کو ٹھاکر سے ہونے والی نظروں سے اگھارنے لگا اور پھر اس رات بھی ہم دیر تک سو کر رہے۔ شوہا اسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی یعنی وہ اپنی ساڑی کا پلو زمین پر پڑا ہوا تھا اور میری نظرس بار بار اس طرف اٹھ رہی تھیں۔

میں بچے کے قریب سب سے پہلے بھلا اٹھ کر اپنے سر میں فنی اور پھر شوہا بھی اٹھ گئی۔ میں نے باہر آکر راہندر اور راہندر کو ہوشیار رہنے کی ہدایات دیں اور اندر آکر ان کے کھڑکیاں بند کر دیں۔ اگرچہ آج کی رات فون کی طرف سے کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی لیکن زیادہ کامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ہوٹائی میں کمرے میں جا چکی تھی۔ میں بھی اپنے کمرے کیلے میں جھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ جسم ختمے بعض

حصوں میں درد بھی ہو رہا تھا۔ راغز اور دیش کھ سے یہ لڑائی اگرچہ چند ہفتے میں منٹ تک ہی محدود رہی تھی لیکن اس دھواں دھار لڑائی نے میرا انجینڈر ہلکا کر دیا تھا۔ میری زندگی دشمنوں کے خلاف لڑتے ہوئے کڑی تھی لیکن آج کی لڑائی سب سے برقی رفتار تھی جس کا فیصلہ چند منٹ ہی میں ہو گیا تھا اور اس دوران میں میں نے اپنے دو طاقت ور حریفوں کو ایک لمحے کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اگر میری طرف سے ذرا بھی سستی یا غفلت ہوتی تو شاید اس لڑائی کا نتیجہ مختلف ہوتا۔

صبح کارواں اڑھ کھلا ہوا تھا اور پردہ لٹکا ہوا تھا۔ شوہا والے کمرے میں بی بی جل رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی بی بی بجھا دی اور بستر پر گر گیا۔ بستر لینے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں بڑبڑا کر اٹھ گیا۔ شوہا میرے پلنگ پر بیٹھی میں بائیں دبا رہی تھی۔

”ارے شوہا جی۔“ میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں ”یہ آپ کی کاروری ہیں؟“

”مجھے اپنے محسن کی سیوا سے محروم نہ کرو۔“ شوہا نے کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی ”تم نے میری خاطر اپنا جیون ڈاؤن لگا دیا اور کیا مجھے انتہائی حق نہیں کہ میں تمہاری ذرا سی سیوا کر سکوں۔ تمہارے پیر دہاتے ہوئے مجھے بڑا سکون مل رہا ہے۔ آرام سے لیٹے رہو۔“

”نہیں شوہا جی۔“ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ”مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بھی تھکی ہوئی ہیں۔ آپ جا کر سو جائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔“

”تم ٹینڈ میں کراہ رہے تھے۔ آواز سن کر ہی تو میں آئی تھی۔“ شوہا نے کہا ”ہو سکتا ہے تمہیں لڑائی میں کچھ چوٹیں بھی آئی ہوں لیکن بعض اوقات تھکن کے کارن بھی آدمی ٹینڈ میں کرا رہے لگتا ہے۔ میں تمہاری ٹانگیں دبانے لگی تھی تاکہ تمہیں کچھ سکون تو ملے لیکن تم اٹھ کر بیٹھ گئے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں شوہا جی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم نے آج کمال ہی کر دیا وجدان۔“ اس نے کہا ”میں تو ڈر گئی تھی۔ وہ دہاتے اور تم اکیلے۔ اگر تمہیں پتہ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتی لیکن تم نے جس طرح ان کی ہڈیوں کی سنگائی کی ہے اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی خوشی بھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ان دونوں کو اس طرح ڈھیر کر دو گے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”سونیا نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ

پہلے تو روزانہ رات کو خٹار کا فون آتا رہا پھر اس میں ایک دن کا وقفہ آگیا۔ وہ دیش کھ کی وجہ سے ہمارے لیے پریشان تھا۔ خٹاکو دیش کھ کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے شبہ تھا کہ دیش کھ چند روز کہیں دیکر رہے گا اور پھر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرے گا۔ خٹاکو یہ اندیشہ اس لیے بھی تھا کہ دیش کھ جے

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا۔ یہاں پر  
 لیے کھانا ایک کروا لیا گیا۔ ہم صبح تو بچے سے کھوم رہے تھے  
 اور اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ سو اب وہاں پر  
 تھک گئی تھیں اس لیے ہم نے واپس لے کے لیے تھیں۔  
 ٹیکسی مختلف راستوں پر گھوم رہی ہوئی۔ ٹیکسی کی طرف  
 آگئی۔ یہ بارونق علاقہ تھا۔ ہماری ٹیکسی نے چبھ چبھائی۔

پراس کی آجاس کی پروا کے بغیر دوسرے آدمی سے لپٹ  
 ہو کر ان میں سے کسی سے بھی دو آدمی اتر آئے تھے  
 وہ لوگ کوئی کسی سے کھینچ کر اپنی کار کی طرف گھٹٹ رہے  
 تھے۔ میرا بھی پیٹھ سے ہواحت کر رہی تھی۔ میں اس  
 سے ہوا پیر ایک آدمی کے پیروں میں الجھا اور میں۔۔۔  
 تھوٹے منہ کے بل گرا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا  
 تھی کہ کوئی اور آدمی میری طرف سے آگیا۔

انہیں بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔  
ان دونوں کا خیال آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر  
بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی  
گئی۔ چیخ کی آواز سن کر ایک نرس اور اس کے ساتھ بلانا  
دوڑتے ہوئے میرے قہر بے پہنچ گئیں۔ بلانا بچانے کب سے  
واردے کے آخر میں نرس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بیٹے سے  
نرس کے شکم کے آگے آ کر بیٹھ گیا۔

کی کوشش کرنے لگیں۔

”ارے ارے کہاں جا رہے ہو۔ لیٹے رہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ بھلا نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میں بھلا۔“ میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں یہاں لیٹ کر آرام نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ شہر ہوا اور سونیا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ بھلا بولی ”تم دو گھنٹوں بعد ہوش میں آئے ہو۔ وہ لوگ پتا نہیں اب تک کتنی دور جا چکے ہوں گے اور پھر تم زخمی ہو۔ دیکھو تمہارے پورے جسم پر تیل پڑے ہوئے ہیں۔“

”مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں بید سے اتر آیا۔ ”آؤ۔ میرے ساتھ چلو بھلا۔ ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔“

اس دوران میں ایک ڈاکٹر بھی وارد میں آیا۔ اس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

یہ چھوٹا سا اسپتال ہمارے بیچکے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی وہاں تک چل کر آئے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ جسم کے ہر حصے میں ٹھیکس اٹھ رہی تھیں۔ سر میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ اگر بھلا مجھے سارا نہ دینے ہوئے ہوتی تو میں راستے میں کئی بار گرنا اور یہاں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے ایلیٹ ڈیٹر کو ٹیلی فون کیا۔ روشن نامی اس شخص سے میری اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ وہ ہر اپریل کے علاوہ کاروں کی خرید و فروخت اور کرائے پر دینے کا کاروبار بھی کرتا تھا۔

”ہیلو روشن۔“ میں نے ریسپور پر اس کی آواز سنتے ہی کہا ”مجھے ایک گاڑی چاہیے۔ بہترین حالت میں ہو اور لمبے سفر کے لیے کارآمد ہو۔ ہاں ہاں۔ میں ٹھیک ہوں اور سنو۔ کار کی ٹینگی فل ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ تم اس کی پروا مت کرو۔ اگر کار واپس نہ آئی تو میرے دوست ہٹا کر ہاتھوں سے تمہیں اس کی پوری قیمت مل جائے گی۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

میں نے فون بند کر دیا اور ہاتھ روم میں گھس کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ میرا طبع اس قدر بڑا ہوا تھا کہ مجھے اپنے آپ کو پہچانتے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبہ تھا۔ داہن اجڑا بھی سو جا ہوا تھا۔ کندھے پر دونوں طرف شدید ٹھیکس اٹھ رہی تھیں۔ کولے میں بھی تکلیف تھی اور سر پر بھی گھومنا بڑا ہوا تھا۔ ان

ظالموں نے بری طرح میری دھنائی کی تھی۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر سوجے ہوئے جڑے اور خراب پر لوٹن لگایا اور کپڑے بدل کر باہر آیا تو بھلا چائے بنا کر بیٹھ گیا اور اس وقت میں واقعی چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

چائے کا کپ لیتے ہوئے میں نے بھلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا وہ دیر تک روتی رہی ہو اور مجھے چہرے پر تھی کہ وہ اس وقت اپنے آپ پرے قابو پائے ہوئے تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی خاموشی سے کچے دیکھتی رہی۔ میں چائے ختم کر کے اپنے کمرے میں آیا اور تھیلے میں اپنے کپڑے ٹھونسنے لگا۔

”یہ بھی اسی میں ڈال لو۔“ بھلا کی آواز سن کر میں بیچے مڑا۔ وہ بھی غالباً میرے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے اپنے کپڑوں کے دو جوڑے میری طرف اچھال دیے۔ میں سیدھا جا بھر کر کھڑا ہو گیا۔

”بھلا!“ میں نے اس کے چہرے پر نظرسجالتے ہوئے کہا ”ان کی تلاش میں جانے مجھے کہاں کہاں ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ تم آج کی رات یہاں گزار کر صبح پر چلی جاؤ۔ مجھے کہیں موقع ملا تو میں فون پر شہادت بات کر لوں گا۔“

”تم میرے بغیر جاسکو گے؟“ بھلا نے کہا ”میں بہت شک۔ میں تمہیں اسکیلے نہیں جانے دوں گی۔ بالکل نہیں۔“ ”میرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی منزل نہیں ہے۔ میں نے کہا۔“ میں تو بیش ہی سے خطرات میں کھرا ہوا ہوں۔ ان طاغوتی قوتوں سے لڑتے ہوئے عرصہ گزر گیا۔ حیرت و اس بات پر ہے کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں۔ اب میں اس پر نکل رہا ہوں وہ پہلے سے کہیں زیادہ ٹھنسن اور خطرناک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی۔“

”میں بہت شک۔“ وہ وہالانہ انداز میں مجھ سے بات گئی ”تم بیش دو دوسروں کے لیے لڑتے رہے ہو۔ دوسروں کے لیے اپنے جیون کو خطرے میں ڈالے رکھا اور اب تم ہی موت کے اندھے کوئیں میں چلا گیا لگتا ہے جا رہے ہو۔ تم کے لیے؟ دو دوسروں کے لیے؟ تا؟ تو کیا کسی دوسرے کو؟“ میں نے کہا کہ وہ چند قدم تک تمہارا ساتھ دے سکے نہیں۔ تمہیں اسکیلے نہیں جانے دوں گی۔“ ”ایک بایا۔ میں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے اسے کوشش اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ میرے ساتھ جانے پر ہند رہی۔“

”تم مجھے کمزور مت سمجھو۔“ وہ کہہ رہی تھی ”جاگنے کے ذمہ دار تمہارا ساتھ دیا اور بالآخر اپنا جیون تمہارے لیے جیت کر دیا۔ سو ایک سے تمہارے ساتھ ہے۔ اس نے تمہارے لیے کیا کیا۔ میتھیں نہیں اٹھائی ہوں گی لیکن میں نے اس کے چہرے پر کبھی بھی گھبراہٹ نہیں دیکھی۔ شہرہا نہیں بہت بند کرنے لگی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کہیں نہیں جانے دے کی اور میں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”کیا تم مجھے ان سے کمزور سمجھتے ہو۔ لیکن کہ میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں ہوں گی۔ اس وقت میں میری ضرورت ہے اور میں تمہیں اسکیلے نہیں جانے دوں گی اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب میں یہ تمہیں کی کہ تم پر ہوجو رہی ہوں یا تمہارے راستے کی رکاوٹ بن رہی ہوں تو میں خاموشی سے اپنا راستہ بدل لوں گی اور تمہیں اسکیلے چھوڑ دوں گی۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے کچھ کہنے کے بجائے اس کے کپڑے بھی تھیلے میں ٹھونس لیے۔ بھلا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور وہ ایک بار پھر مجھ سے مل گئی۔ میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور تھیلہ بھلا کے حوالے کر دیا کہ وہ اس میں ضرورت کی اور چیزیں ڈال لے۔ میں اس کمرے سے نکل کر لالچ میں گیا۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ مجھے واقعی آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ میرے پورے بدن میں ٹھیکس اٹھ رہی تھیں۔ بات کرنے کے لیے مجھے بھی پوری طرح نہیں کھل رہا تھا لیکن میں جو کچھ بھی کر رہا تھا اپنی قوت ارادی کے بل پر کر رہا تھا۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر فون کا ریسپور اٹھالیا اور بے پور میں ٹھاکر کا نمبر ملائے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ٹھاکر نے ہی ریسپو کی تھی۔ میں نے ایک دور بھی ہبلوں کے تبادلے کے بعد ٹھاکر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”اوہ!“ ٹھاکر بولا ”اس کے ساتھ اور کون لوگ تھے؟“ ”وہ خود نہیں تھا۔“ میں نے جواب دیا ”میرا خیال ہے اس نے یہ کام کرائے کے غنڈوں سے کرایا ہے جنہوں نے جیون پر نقاب چڑھا رکھے تھے۔ رشی میس میں تو ایسا کوئی دل والا غنڈا نہیں جو اتنی سنگین واردات کا ارتکاب کر سکے۔ میرے خیال میں اس نے ہرودا ریا دہرادون سے ان غنڈوں کا خدمت حاصل کی ہوں گی اور وہ ہو سکتا ہے اس وقت وہ خود ہرودا ریا دہرادون میں بیٹھا رہا ہو۔ بہر حال میں ان کے پیچھے جا رہا ہوں۔“ اس موقع پر ٹھاکر نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا ”تم کچھ مت بولو ٹھاکر میں

تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ البتہ تمہیں میرے جانے کے بعد یہاں آکر ایک دو کام کرنے ہوں گے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ بھلا میرے ساتھ جا رہی ہے۔ میں ابھی فون پر بائیں کر رہا تھا کہ ہر اپنی ایجنٹ روشن لال پہنچ گیا۔ میں نے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا اور پھر فون پر ٹھاکر کو اس کے بارے میں بتانے لگا اور پھر میں نے فون بند کر دیا۔

میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر اس وقت پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ روشن لال نے اس موقع پر ماسٹ کا اعلان کیا۔

”گاڑی لے آئے؟“ میں نے موضوع بدل کر سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا ”گاڑی دیکھنے میں اگرچہ پرانی لگتی ہے لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں ہے۔ بہاڑی راستوں پر ٹھیک بالکل پریشان نہیں کرے گی۔ ٹینگی فل کروا دی ہے۔ اس کے علاوہ ڈی میں پٹرول سے بھرے ہوئے بائج بائج ٹینک والے تین کین بھی رکھوا دیے ہیں۔ پانی کا مشینہ اور کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی پچھلی سیٹ پر رکھوا دی ہیں۔ تمہیں راستے میں ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔“

”شکر ہے روشن لال۔“ میں نے کہا ”میں نے بے پور میں اپنے دوست سے کہہ دیا ہے۔ وہ چند روز میں یہاں آئے گا۔ اگر ایک ہفتے تک میں واپس نہ آیا تو وہ اس بیچکے کار اور تمہاری گاڑی کا حساب کوئے گا۔ احتیاطاً تم بھی اس کا فون نمبر لکھ لو۔“ میں نے اسے ٹھاکر کا فون نمبر لکھوا دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”میں نے ان میں سے ایک کار کا نمبر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ڈی این کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ کیا تم بتا سکتے ہو یہ سیرل نمبر کہاں کا ہے؟“ ”یہ تو دہرادون کا نمبر ہے۔“ اس نے کہا۔

”میرا بھی خیال تھا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”مگر قصہ کیا تھا۔ کون لوگ تھے وہ؟“ روشن نے پوچھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں کہانی ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”زندہ رہا اور واپس آ گیا تو ضرور بتاؤں گا۔ ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہوں گے؟“

”سننے میں تو یہی آیا تھا کہ وہ لوگ ہرودا ریا کی طرف فرار ہوئے تھے۔ لوگوں نے پولیس تھانے کا گھبراؤ کر لیا تھا کہ ان کا پیچھا کیا جائے لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔“

”پولیس ایسے موقعوں پر کوئی کارروائی نہیں کرتی اور ایسی سنگین وارداتیں پولیس کے تعاون کے بغیر کی بھی نہیں جاسکتیں۔“ میں نے کہا۔

”عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو گھوس (درشت) کھلا دیا گیا تھا تاکہ وہ مداخلت نہ کرے۔“ روشن لال نے کہا ”اور ویسے بھی یہاں کے تھانے کا انچارج بہت حرامی آدمی ہے۔“

”تھانے پر روشن لال جی۔“ میں نے کہا ”اس بنگلے کی چابی میں آپ کو دے کر جا رہا ہوں۔ تھانہ بھانوت سنگھ آجائے تو اس سے سارا حساب کر لیتے۔“

”آپ ان کے پیچھے جارہے ہیں؟“ روشن کے لہجے میں حیرت تھی ”آپ کی اپنی حالت اچھی نہیں ہے۔ ویسے بھی شام کا اندھیرا چھا رہا ہے۔ رات کے وقت ان خطرناک پہاڑی راستوں پر سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔“

”پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا ”اس سے پہلے کہ میرے اور ان کے درمیان وقت کی فلیج مزید وسیع ہو جائے۔ میں ان تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔“

میں نے ہلکا سا اشارہ کیا۔ وہ تھملا اٹھا کر باہر نکل گئی۔ میں نے بتایں بھانکر دو روزہ بند کر دیا اور چابی روشن کے حوالے کر دی۔ گیٹ پر نیپالی محافظ موجود تھے۔

”آپ ان سب کا حساب کر دیتے روشن لال جی اور اگر مناسب سمجھیں تو ایک آدمی کی ڈیوٹی یہاں لگائے رکھیں۔ گھر کی حفاظت ہوتی رہے گی۔“ میں نے کہا۔

”میں سارا انتظام کر لوں گا۔ آپ چننا نہ کریں۔“

روشن لال نے کہا۔

گاڑی گیٹ کے سامنے موجود تھی۔ چابی اسٹیشن میں لگی ہوئی تھی۔ روشن لال نے بتا دیا کہ گاڑی کے کاغذات بھی ڈیش بورڈ میں رکھے ہوئے ہیں۔

ہملا نے تھملا پھینچ سیٹ پر ڈال دیا اور آگے پینچر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے روشن لال سے ہاتھ ملایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی کھاتے ہی انجن اشارت ہو گیا۔ اس کی ہموار آواز سے مجھے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ انجن واقعی بہترین حالت میں تھا۔ میں نے روشن لال کی طرف دیکھ کر ہاتھ ملایا گاڑی آگے بڑھادی۔

شہر کی حدود سے نکلنے ہی میں نے رفتار بڑھا دی۔ پہاڑوں میں ہل کھاتے ہوئے دوسرے ہی موڑ پر سامنے سے آنے والی بس کو دیکھ کر میں نے رفتار کم کر کے کار کو بالکل سائیڈ پر لے لیا۔ یہ ہر دوڑ کی طرف سے آنے والی آخری بس تھی جو سات بجے رشی کیش کے اڈے پر پہنچ جاتی۔ شام

کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان پہاڑی راستوں پر سفر کرنا نہایت خطرناک تھا اسی لیے شام کے بعد اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ہماری طرح کسی مجبوری کے تحت سفر کرنا ہوا بات تھی۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے بیٹ لائٹس جلا لی تھیں۔ اندھیرے میں چمکراتی ہوئی ہیڈ لیمپس کی روشنی بازار ہمارا تاثر دے رہی تھی۔ میں مبتلا ہو کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اپنی سیٹ پر سڑکی ہوئی سی بیٹنی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے پٹکے سے تاثرات تھے۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہر دوڑ شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ لب سڑک چوگی ٹاکے پر مجھے کار روک لی گئی۔ سڑک پر جیسٹر لگا ہوا تھا۔ کار رکتے ہی سڑک کے کنارے پر پنی ہوئی کوٹھری سے ایک آدمی نکل کر سامنے آ گیا۔ میں نے کار کے اندر کی ہی جلا دی۔ اس نے قریب آکر پہلے ہمیں پھر کار کی پچھلی سیٹ پر دیکھا اور آگے جا کر سڑک پر پنی ہوئی لوہے کی زنجیر گرادی۔ میں نے کار آگے بڑھادی اور پھر چانک ہی ایک اور خیال کے تحت اس شخص کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک لی۔ رشی کیش سے ہر دوڑ کی طرف آنے والا یہی ایک واحد راستہ تھا اور چوگی کے جیسٹر کی وجہ سے ہر گاڑی کو یہاں روکنا پڑتا تھا۔ یہ شخص اگر شام سے پہلے بھی یہاں ڈیوٹی پر تھا تو اس نے ان لوگوں کو یہاں سے گزرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔

”سنو۔“ میں نے اس شخص کو مخاطب کیا ”تم کتنے بجے سے یہاں ڈیوٹی پر ہو؟“

”میں تو چوبیس گھنٹے یہاں ڈیوٹی پر رہتا ہوں سرکار۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم پرتین بجے کے بعد رشی کیش کی طرف سے دو کاریں اس طرف آئی تھیں ان میں دو آدمیوں کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک کار کا نمبر میں تمہیں بتا سکتا ہوں کیا تمہیں؟“

”مجھے کسی کار کا نمبر تو یاد نہیں ہے سرکار مگر ان عورتوں کو میں نے دیکھا تھا۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”مجھے اس لیے یاد ہے کہ ان میں سے ایک کار میں راہن بٹنا ہوا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ دونوں عورتیں پیادیں اور انہیں اسپتال لے جا رہے ہیں۔“

”اوہ!“ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے جانتا تھا ”راہن کون ہے۔ کہاں رہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”راہن کو تو سارا شہر جانتا ہے سرکار۔ وہ ادھر کا دارا

”اس شخص نے جواب دیا ”وہ سرائے داروں اور جیت ہاؤس داروں سے بہتا لیتا ہے۔ اس کی منظوری کے بغیر کوئی یہاں دھندا نہیں کر سکتا۔“

میں نے سونیا اور شہنا کے حلقے بتا کر پوچھا تو اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ ان کاروں میں میں دو عورتیں تھیں جو بے ہوش پڑی ہوئی تھیں۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے ان دونوں کے یقیناً بے ہوش کر کے رکھا گیا ہوگا۔ میں نے بائیں طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی سسٹی کے اثرات ابھر آئے تھے۔ میں نے چوگی ٹاکے کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

اچھا ہی ہوا کہ میں نے چوگی ٹاکے پر چڑھ لیا تھا۔ اس طرح ہماری بہت بڑی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ کم از کم ایک سرائے تو مل گیا تھا۔ چوگی ٹاکے کے کینے کے مطابق راہن یہاں کا مشورہ معاش تھا۔ اس جیسے شخص کا نمبر نامعلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اگر وہ نہ بھی ملا تو اس کے کسی گھر کے سے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ راہن قابو آئے تو اس سے دلش کہہ کا پتا معلوم کیا جاسکتا تھا۔

بازاروں میں روٹتی تھی۔ میں نے کار ایک گیٹ میں موڑ کے ایسی جگہ پر کھڑی کر دی جہاں کسی قدر اندھیرا تھا اور زیادہ لوگوں کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ سامنے بازار تھا۔ اس طرف البتہ خاصی روٹ تھی۔

”ہم نے دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا تھا اور تمہارے لیے کھانا لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں یہ سانحہ پیش آیا۔“ میں نے بائیں طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا اور اب نونج رہے ہیں۔ تم یہیں کار میں بیٹھ رہو۔ میں کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔“

”میں نہیں چاہ رہا۔ ویسے کھانے پینے کا سامان تو پیچھے بھی رکھا ہوا ہے۔“ ہمارے کہا۔

”اوہ! اتے تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ میں نے کہا اور سیٹ کے اوپر سے جبکہ کر پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی پوٹلی اٹھال۔

پلاسٹک کا ڈبچہ والا باؤل تھا جس میں پوری مرغی لاسٹ کی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے ساتھ چار پانچ ٹوری ٹان شے پچیس سیٹ پر ایک ٹکڑوں والی نوکری بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں پھل وغیرہ رکھے ہوئے تھے مجھے سمجھتے ہیں کہ انہیں لکھی کہ روشن لال نے دو سٹڈ پکٹن اور ٹان کسی ہوٹل سے خرید کر ایک کدوائے تھے۔

ہم کار میں بیٹھنے کھانا کھاتے رہے۔ جڑے اور دشوار کی ہڈی پر سوجن کی وجہ سے مجھے نوالہ چبانے میں

خاصی تکلیف ہو رہی تھی لیکن پیٹ میں کچھ نہ کچھ ایندھن ڈالنا ضروری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ڈرائیونگ سیٹ پر سیدھا بیٹھ رہنے سے میری حرکتیں کی طرح اکڑ گئی تھی اور پورا جسم دکھ رہا تھا لیکن میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک آرام نہیں کروں گا جب تک سونیا اور شہنا کو چھڑا کر دلش کچھ کھا کر نہ لگاؤں۔

کھانے کے بعد میں قریبی ہوٹل سے چائے لے آیا۔ چائے پینے کے بعد ہی خواہش پچھ بھال ہوئے تھے۔

ہر دوڑ میرے لیے ابھی نہیں تھا۔ میں کئی روز یہاں رہ چکا تھا۔ تقریباً تمام راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں کار اشارت کر کے پچھلی سڑک پر لے آیا۔ یہاں ٹریفک بہت کم تھا اور میں نے کار کی رفتار کم کر رکھی تھی۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس طرف نکل آیا جہاں ذرا آگے بنایا اور تھانہ کوغیرہ کے ساتھ کالج میں ٹھہرا تھا۔

”اس طرف ایک گیٹ ہاؤس ہے۔“ ہمارے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔

میں نے کار اسی سڑک پر گھما دی اور تقریباً دو سو گز آگے جا کر تارائن گیٹ ہاؤس کے سامنے کار روک لی۔ خاصا بڑا گیٹ ہاؤس تھا۔ گیٹ پر اور اندر لان میں رنگ برنگی رویشیاں بٹکا کر دی تھیں۔ میں ہلکا کو کار میں بیٹھ رہنے کا اشارہ کر کے نیچے اتر آیا اور پٹے پٹے قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

لان ایک بارونٹی اوپن ایئر ریسٹورنٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں بھری والی دوش پر چلتے ہوئے عمارت میں داخل ہو گیا۔ برآمدے سے اندر داخل ہوتے ہی کشادہ راہداری تھی جہاں استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے ہال تھا اور اس ہال میں بھی خاصی روٹ نظر آ رہی تھی۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیر عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نقش و نگار بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں بڑی حسین رہی ہوگی۔ میں کاؤنٹر کے سامنے رک گیا۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر کادوباری مسکراہٹ آگئی لیکن میرا حلیہ دیکھ کر وہ چونک کر بغیر ہمیشہ رہ گئی تھی۔

”سوری سر۔“ وہ بولی ”اگر آپ کو کمرے کی ضرورت ہے تو میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی کی۔ البتہ کل ایک کمرہ خالی ہونے والا ہے۔ اگر آپ۔۔“

”مجھے کمرہ نہیں چاہیے۔“ میں نے اس کی بات پوری ہونے نہیں دی ”مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے اور میں جانتا

ہوں کہ تم اس کے بارے میں بات نہ کی ہو۔  
 "کون؟" اس نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف  
 دیکھا "کس کو پوچھ رہے ہو؟"  
 "راہن! میں نے کہا۔"

یہ نام سننے ہی اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر  
 مجھے گھور کر دیکھنے لگی۔

"سوری سر۔ میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں  
 جانتی۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے

بولی۔ "دیکھو میڈم!" میں نے اس کے چہرے پر نظرس جما  
 دیں "میں نے کہا تھا کہ تم اسے جانتی ہو۔ وہ تم سے بھتا

وصول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے اس کے بارے میں بتا دو تو میں  
 خاموشی سے میاں سے چلا جاؤں گا۔ دوسری صورت میں

تمہارا یہ خوب صورت گیسٹ ہاؤس صبح تک کھنڈ رہن جائے  
 گا۔" اس کا چہرہ ایک بار پھر دھواں ہو گیا۔

"تم اس کو کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیوں ملنا چاہتے ہو اس  
 سے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا یہ چہرہ دیکھ رہی ہو۔" میں نے انگلی سے اشارہ کیا  
 "میرے جسم پر اور بھی ایسے بہت سے نشان ہیں اور میں

راہن سے ان کا حساب چکانا چاہتا ہوں۔"  
 "لگتا ہے تم پہلے ہی اس سے بہت نقصان اٹھا چکے

ہو۔" وہ بولی "راہن بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کا تجربہ  
 تھمیس ہو چکا ہے۔ بہتر ہے مزید پنگا مت لو اور جہاں سے

آئے ہو خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔"  
 "میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔" میں نے کہا

"اس کا پتا تاری ہو گیا۔"  
 "ایک منٹ!" اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔ چند لمبے مختاط

نگاہوں سے اُدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر رازدارانہ لہجے میں بولی  
 "میں تمہیں اس کا پتا بتا دوں گی لیکن۔"

"اطمینان رکھو۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔" میں نے  
 اس کی بات کاٹ دی۔

"پاروٹی آشرم۔" وہ ایک بار پھر مختاط نگاہوں سے  
 اُدھر اُدھر دیکھنے لگی "اس نے ایک سال سے پاروٹی آشرم پر

قبضہ جمار کھا ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے۔"  
 "اور یہ پاروٹی آشرم کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گاندھی مارگ کے آخر میں درختوں میں لٹرا ہوا ایک  
 مکان ہے۔ تین چار کمروں کا ہو گا۔" اس نے بتایا "چند سال

پہلے یہ مکان ایک دولت مند آدمی نے خرید کر اپنی سو رگ  
 باشی جتنی کے نام پر آشرم بنا دیا تھا لیکن ایک سال پہلے نجانے

کس طرح راہن نے اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ آشرم اس کے  
 تصرف میں ہے۔ ایک دو گھر گئے اس کے ساتھ رہتے ہیں۔"  
 "شکریہ شریستی جی۔" میں نے کہا "لیکن اگر تم نے

اسے میرے بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کی تو۔"  
 "نہیں نہیں۔ میں کسی سے کچھ نہیں بولوں گی۔" وہ

جلدی سے بولی "دوپے تم مجھے شکل و صورت اور مختصر  
 شریف آدمی لگتے ہو۔ بہتر ہے اس جیسے حرامی آدمی سے تجیز

چھاؤ کر کے بجائے واپس چلے جاؤ۔"  
 "شکریہ۔" میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور

بارہنگل آیا۔  
 مجھے یقین تھا کہ گیسٹ ہاؤس کی مالک یہ عورت راہن

کو میرے بارے میں اطلاع نہیں دے گی۔ غنڈوں سے ہر  
 کوئی پریشان رہتا ہے۔ ہر شخص ان سے دور ہی رہنا پسند کرنا

ہے۔  
 بلا مار میں بیٹھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی مجھے

دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ میں نے اینٹریزنگ  
 کے سامنے بیٹھ کر انہی اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کچھ معلوم ہوا؟" بلا مار نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔  
 "راہن گاندھی مارگ کے ایک آشرم میں رہتا

ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے اس عورت سے  
 حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔

"گاندھی مارگ کا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں چڑا پٹم  
 کے ساتھ کئی مرتبہ اس طرف آچکا تھا۔ وہیں سے ایک راستہ

گنگوڑی کی طرف بھی جاتا تھا۔  
 اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ ملازمتی

آبادی سے ہٹ کر تھا اور یہاں زیادہ لوگوں کی آمد و رفت بھی  
 نہیں تھی۔ پاروٹی آشرم تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری

پیش نہیں آئی۔ درختوں میں گھرا ہوا یہ مکان بھی آبادی سے  
 کافی ہٹ کر تھا۔

میں نے کار کو مکان سے دو در درختوں کے نیچے روک کر  
 انجن بند کر کے تکیاں بھی بجا دیں۔ بلا مار بھی میرے ساتھ

جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اسے وہیں روک دیا اور مختاط  
 میں سے دیل کھ دلا پتھول نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے

ہوئے بولا۔  
 "اگر میں چندہ میں منٹ تک مکان سے باہر نہ آؤں یا

تم کوئی گروہ محسوس کرو تو اندر آ جانا اور کوئی بھی مزاحمت کی  
 کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

خیر آری تھی۔ یہ مکان دو منزلہ تھا اور اوپر کی ایک دو  
 منزلیں میں بھی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔  
 مکان کا گیت خاصا بڑا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک چھوٹا

دروازہ بھی تھا۔ گیت اور دروازہ دونوں بند تھے۔ میں نے  
 غنڈوں سے بھٹا کر دیکھا۔ صحن میں تاریکی تھی لیکن

میں گیت کی جگہ کسی روشنی تھک رہی تھی۔  
 میں گیت پر چڑھ کر اندر داخل ہونے کے بارے میں

سوچ رہی رہا تھا کہ صحن میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آڑ  
 میں گھڑا ہوا گیا۔ وہ آواز چھوٹے دروازے کے قریب آکر

رک گئی اور پھر اندر سے دروازے کا آہنی بولٹ ہٹائے  
 جانے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک

نئی بار نکلا۔  
 میں اس آدمی پر جھپٹ پڑا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ

پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں اسے گرفت میں لینے کی  
 دوش کر رہا تھا کہ وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ  
 ایک دم گڑبگڑا گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا مگر اس سے پہلے

کہ وہ اپنے دفاع میں یا میرے خلاف کوئی کارروائی کرتا یا نہ  
 کرتا تو آواز نکالنا، میں عقاب کی طرح اس پر بھجنا اور اسے

پناہ گرفت میں لے لیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا  
 تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ اس کی گردن میرے سیدھے بازو کی

بٹھ تھی۔  
 وہ بری طرح چل رہا تھا۔ میں اس کی گردن پر دباؤ

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

بھارتی لگا۔ میرے پاس زیادہ قوت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ  
 تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو

میں سوچتا۔ میں گیت میں داخل ہو کر ایک لمبے کورڈ اور پھر  
 صحن پار کرتے ہوئے اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جہاں  
 روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

انہی میں چند قدم دوڑ رہی تھا کہ دروازہ کھلا اور میں پوری  
 طرح کمرے سے آنے والی روشنی میں نمکایا۔ کمرے سے

برآمد ہونے والا آدمی مجھے دیکھ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔  
 "اے۔ کون ہو تم۔" اس دروازے کا قاتل شخص نے یہ

کہنے کے ساتھ ہی اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔  
 لیکن میں نے اس کا ہاتھ جیب تک نہیں پہنچا دیا۔ میں

کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے اوپر جا کر ا۔  
 ہم دونوں دروازے سے نکلا کر کمرے کے اندر گرے تھے۔

مجھ سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں  
 میں گرتے ہوئے اس شخص کے نیچے دب گیا تھا۔

اس شخص نے بڑی تیزی سے میرے مضروب جڑے پر  
 دو تین گھونے جڑ دیے۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا لیکن میں نے

اسے مزید موقع نہیں دیا اور بائیں ہاتھ کی پھٹی پوری قوت  
 سے اس کی ناک پر مار دی۔ وہ ہلکا اٹھا۔ اس کی ناک سے

خون بہہ نکلا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اسے اپنے اوپر  
 سے ایک طرف کر دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کے

چہرے پر تیز توڑ گھونے بڑھائے۔ لیکن میں زیادہ دیر تک  
 اپنے نکلے جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ اس نے مجھے پیروں پر اٹھا

کر پیچھے اچھال دیا اور سنبھل کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی  
 لیکن میں نے اپنے آپ کو اس کی زود سے ہچکایا اور بڑی بھرتی

سے لپٹ کر اس کی گردن کو بازو کی لپٹ میں لے لیا۔ اس  
 نے دونوں ہاتھ میری کلائی پر بٹھادیے اور گرفت چھڑانے کی

کوشش کرنے لگا لیکن یہ میرا پسندیدہ ڈاؤ تھا اور میرا کوئی  
 حریف آج تک اس سے بچ نہیں سکا تھا۔

"راہن کہاں ہے؟" میں نے اس کی گردن پر دباؤ  
 ڈالتے ہوئے کہا "جلدی پتاؤ ورنہ گردن توڑ دوں گا۔"

"وہ۔ وہ اوپر ہے۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی  
 آواز نکلی "تھمتھم یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔"

"اور وہ حرام زادہ کہاں ہے۔ دیل کھ؟" میں نے  
 دوسرا سوال کیا۔

"سم۔ مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔  
 "راہن کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔ وہ لونڈیا۔" گردن پر میرے بازو کے دباؤ کی وجہ  
 سے آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔  
 "اور کون ہے؟"  
 "لک۔ کوئی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔



میں اس کی گردن پر دباؤ بڑھانے لگا۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کے ساتھ بری طرح لاتیں چلا رہا تھا۔ اس کی گردن پر میرا دباؤ بڑھتا گیا اور پھر میں نے زوردار ہتھکا دیا۔ کڑک کی آواز ابھری اور میں نے دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اس کے حلق سے خراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بری طرح ترپ رہا تھا۔ میں اس کے سرے کا انتظار کرنے کے لیے وہاں رکائیں۔

کمرے سے نکل کر میں رادھن کو دھڑکھینے لگا اور پھر برآمدے کی دوسری طرف ادھر جانے کی سیڑھیاں نظر آگئیں۔ میں دوڑتے ہوئے سیڑھوں پر چڑھتا چلا گیا۔

اوپر بھی تین چار کمرے تھے۔ دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا اور نیچے سے روشنی بہتک رہی تھی۔ میں نے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمانے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر کچھ نظر نہیں آیا اور پھر میں سیدھا ہو کر زور زور سے دروازہ دھڑکھڑانے لگا۔

”دن ہے بس۔ کیا ہوا؟“ اندر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”دروازہ کھولو داد۔ پولیس نے گھیرا ڈال لیا ہے۔“ میں نے چیخے ہوئے کہا۔

میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اندر سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ اس کے ساتھ ہی میرا گھونسا اس شخص کے منہ پر پڑا جس نے دروازہ کھولنے ہی باہر آنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چیخے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے جڑے پر ایک اور زوردار گھونسا بجا دیا۔ اس مرتبہ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور پشت کے بل گر گیا۔

میں نے بڑی پھرتی سے جبکہ کراہتی پینڈل پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا لیکن وہ میرے منٹے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم یہاں تک پہنچے ہو۔“ اس کے حلق سے جھنجھکی سی خراہٹ نکلی ”رادھن کے ڈیرے پر آکر کوئی زندہ واپس نہیں گیا۔ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔“ ”موت کس کی آئی ہے؟“ یہ فیصلہ ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ ”میں نے جواب دیا ”اگر تم زندہ

رہتا جانتے ہو تو یہ بتا دو کہ دلش مکھ کہاں ہے اور وہ کونسی لڑکیاں کہاں ہیں؟“

”دلش مکھ شوبھا کو لے کر المورا چلا گیا ہے۔ لڑکی اس نے مجھے وان کر دی تھی۔ وہ سال تو بچی تھی۔ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اب تم آگے بڑھو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔“

”نہیں آئے گا رادھن۔“ میں نے کہا۔ ”وہ خود شکار ہو چکے ہیں اور اب تمہاری باری ہے۔“

رادھن کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے ابھر کر اور اندر والے دروازے کی طرف دوڑا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر وہ دروازے سے ٹکرا گیا۔ دروازے کی ٹکڑے وہ پیچھے کر

میں نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن میرا جبر نہیں ہوئی وری میں اٹھ گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھڑا کر ایک کرسی سے ٹکرایا۔

کرسی سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ خنجر بھی میرے ہاتھ سے نکل کر گر گیا تھا۔

رادھن نے ایک کمرے کا خنجر اٹھایا اور مجھ پر حملہ ہوا لیکن میں اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ اس نے مجھ

نے ہاتھ پر روکا۔ اس کی کلائی میری گرفت میں آئی۔ میں نے اس کا دھڑکا ہوا ہاتھ بھی گرفت میں لے لیا اور اسے پیچھے

لگا۔

اس دوران میں میری نظرس پانچ کی طرف اٹھ گئی جہاں سونیا بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لپاس لگا ہوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہو گا۔

میں رادھن کو دھکیلے ہوئے پیچھے سے لایا اور پھر ایک ہی اس نے میری ٹانگ میں اڑنگ لگا دیا۔ میں لڑکھڑا کر

کے بل سونیا والے بیڈ پر گرا۔ رادھن کی کلائی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

رادھن نے خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھا کر حملہ کیا۔ میں بیڈ

پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

میں تو اس منٹے سے بچ گیا لیکن رادھن کا خنجر میرے

سندھ پڑی ہوئی سونیا کے سینے میں دسے تک پہنچا جس سے

میں جیٹی جیٹی سی نظروں سے سونیا کو دیکھ رہا تھا جس سے

سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔

اگر میں خنجر کے وار سے بچنے کے لیے لوٹ نہ لگتا اور اگر میں کو روکنے کی کوشش کرتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی

میں نے بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر رادھن کا خنجر والا

ہاتھ موڑ دیا۔ خنجر ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے ہٹا تو سونیا کے

سینے سے خون کی ایک اور دھار بہہ نکلی۔

سونیا کے بدن سے ہٹا خون دیکھ کر میری آنکھوں میں

خون اتر آیا۔ میں نے اس کا بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا

دیا اور انگوٹھے کا ناخن اس کی کلائی کی کس میں پست کر دیا۔

رادھن آہستہ آہستہ اپنے جسم کو سمیٹ رہا تھا اور پھر

اچانک ہی اس نے ایک زوردار جھٹکے لے کر مجھے گرانے کی

کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس مجھے موقع

مل گیا اور میں نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ

اٹلی ٹلی بازی کھانا ہوا بیڈ کے دوسری طرف جا کر۔ خنجر اس

کے ہاتھ سے نکل کر بیڈ پر گر گیا تھا۔

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ سونیا کے سینے پر دو

جگہوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے

لگ رہے تھے۔ اس نے ایک آخری جھٹکا لیا اور ساکت

ہو گئی۔

میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ رگوں

میں خون کھول رہا تھا اور سینے میں جیسے آگ سی بھری ہوئی تھی۔

میں نے رادھن پر چھلانگ لگا دی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔

مجھ پر خون سا طاری ہوا ہوا تھا۔ میں نے رادھن پر گھونٹوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی اور اسے بیڈ کے دوسری طرف کھلی جگہ پر لے آیا۔ رادھن سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ ایک مرتبہ اس نے باہر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی ٹانگ میری گرفت میں آگئی۔ وہ منہ کے بل ایک کرسی پر گرا۔ اس کا منہ کرسی کے پتھر سے ٹکرایا تھا۔ وہ بے اختیار رنج اٹھا تھا۔

میں نے اسے ایک بار پھر گھونٹوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ لولہمان ہو رہا تھا۔ وہ ہر مرتبہ اپنے آپ کو چھڑا کر باہر بھاگنے کی کوشش کرتا مگر میں اسے پکڑ لیتا۔ وہ

وہاں ہاتھ کا دباؤ کم ہو گیا اور مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اس کا بازو موڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی جھٹکا سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ایک اور ضرب لگائی۔ یہ وار بھی کارگر ثابت ہوا اور وہ اچھل کر سونیا کے سینے پر گرا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک ایک بار پھر سونیا کے سینے میں پست ہو گئی۔ سونیا کے جسم کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

میں نے بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر رادھن کا خنجر والا

ہاتھ موڑ دیا۔ خنجر ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے ہٹا تو سونیا کے

سینے سے خون کی ایک اور دھار بہہ نکلی۔

سونیا کے بدن سے ہٹا خون دیکھ کر میری آنکھوں میں

خون اتر آیا۔ میں نے اس کا بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا

دیا اور انگوٹھے کا ناخن اس کی کلائی کی کس میں پست کر دیا۔

رادھن آہستہ آہستہ اپنے جسم کو سمیٹ رہا تھا اور پھر

اچانک ہی اس نے ایک زوردار جھٹکے لے کر مجھے گرانے کی

کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس مجھے موقع

مل گیا اور میں نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ

اٹلی ٹلی بازی کھانا ہوا بیڈ کے دوسری طرف جا کر۔ خنجر اس

کے ہاتھ سے نکل کر بیڈ پر گر گیا تھا۔

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ سونیا کے سینے پر دو

جگہوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے

لگ رہے تھے۔ اس نے ایک آخری جھٹکا لیا اور ساکت

ہو گئی۔

میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ رگوں

میں خون کھول رہا تھا اور سینے میں جیسے آگ سی بھری ہوئی تھی۔



راوہن اس شہر کا بہت بڑا بد معاشی تھا۔ یہاں کا دادا تھا۔ شہر کے سارے گیسٹ ہاؤسز سے بستا وصول کرتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر یہاں کوئی شریف آدمی کام دھندا نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ اس کے نام سے کام دیتے تھے لیکن اس کی ساری بد معاشی اور دادا گیری ناک کے راستے نکل گئی تھی۔ وہ مدیے کے لیے اپنے کرگوں کو پکار رہا تھا۔

راوہن نے گھٹنے سے میری ٹانگوں کے سچ ٹھوک لگائی۔ میں لڑکھڑاک کر پیچھے ہٹا۔ اس نے موقع پا کر ایک طرف چھلانگ لگادی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس مرتبہ اس نے بیڑ کی طرف چھلانگ لگائی تھی جہاں سونپا کے برہنہ جسم کے قریب خنجر برا ہوا تھا۔ راوہن خنجر اٹھا کر بڑی تیزی سے میری طرف پلٹا تھا۔ اگر میں غافل ہوتا تو خنجر میرے سینے میں پھوسٹ ہو چکا ہوتا لیکن میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اپنی ہی جھوک میں آگے نکل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے جھپٹنے کا موقع دیکر بغیر اسے دو بچ لیا۔ میں اپنے دونوں بازو اس کی بٹلوں کے نیچے سے نکال کر ہاتھ اس کی گردن پر لے آیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ اس طرح اس کی گردن میرے گھٹنے میں آگئی تھی اور اس کے دونوں بازو بھی میرے داؤ کی گرفت میں تھے۔

اسی لئے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔  
اس کے ساتھ ہی کسی کے دہانے کی آواز میرے کانوں سے  
نکرائی۔ میں نے گردن ہٹھا کر دیکھا۔ وہ اداہن ہی کا کوئی  
آدی تھا جو کمرے میں داخل ہو کر خنجر تانے بیچے پر حملہ آور  
ہو رہا تھا لیکن اسی لئے فضا فار کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس

راہو میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بار باہر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے دواڑے کے قریب اسے دبوچ لیا اور اسے نیچے کر کے اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کا خون آلود چہرہ مست بھیجاںک منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے زخموں پر رکھ دی۔

”آ۔ آ۔ المورا۔“ اس کے حلق سے بھٹکیا۔  
آواز نکلی تھی۔

”تم اسے کب سے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”بہت عرصے سے۔“ راوہن نے جواب دیا۔ ”میں بھی  
راجستان سے کسی لڑکی کو ساتھ لے کر آتا تھا اور میں بھی  
اسے لڑکیاں سلانی کرتا تھا۔ یہاں ہر دو اور میں لڑکیوں کی  
ضمیمیں۔ ملک کے کوئے کوئے سے پاڑی یہاں آتے ہیں۔ ان  
میں خوب صورت لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایسی جہوں پر  
لڑکی کو اٹھانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں  
مندرول کے بعض بیڑے بھی ہمارے بہت کام آتے ہیں۔  
مندرول کو اٹھا کر نینسی پال یا المورا جہاں دیں کہ ہوتا ہے پوچھ  
دیا جاتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بتا  
رکھے ہوئے بولا ”اس مرتبہ دیں کہ وقت سے پہلے آج  
اس نے بتایا کہ اس مرتبہ رشی کشیہ سے ایک عورت کو اٹھا  
ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھے جاس بزار دیا ہے  
دیے تھے۔ تمہاری وجہ سے ہمیں خاصی مشکل پیش آئی تھی۔“

”وہ وہ دونوں اس کے ساتھ راجستان سے آئے تھے۔“ راہن نے جواب دیا ”وہ بہت بڑا گناہ آدی ہیں۔ تم دیش کھ سے تک نہیں پہنچ سکو گے لیکن اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں اس کے خلاف تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”دیش کھ سے تو میں منٹ لوں گا لیکن تم جیسے حرامی کو زندہ چھوڑنا میری شہرت میں نہیں ہے۔“ میں نے یہ کہنے کے ساتھ ہی پوری قوت سے اس کے زخروں پر خنجر پھیر دیا اور اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔

بلا، سونپا پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بلا کے ہاتھ میں تھا۔ لہڑی چادر خون سے تر ہو رہی تھی۔ میں نے بلا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ وحشت اور آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے سونپا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نبض ٹٹولنے کی کوشش کرنے لگا پھر میں نے ہاتھ اس کے جڑوں کے نیچے گلے پر رکھ دیا۔ میری انگلیاں اس کے گلے کو مختلف جگہوں سے ٹٹولتی رہیں لیکن کسی بھی حرکت پر تحریک محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے ملا کی طرف دیکھا۔ اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے اور وہ مجھ سے لپٹ کر چکیاں بھرنے لگی۔ میں بھی اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکا۔

میں میلا کو لے کر کمرے سے باہر آیا اور جب ہم بیڑھیاں اتر رہے تھے تو سامنے دور سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ گاڑی اسی طرف آ رہی تھی۔ میں نے بلدا کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے بیڑھیاں اترنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر میلا کا پیروٹھ گیا۔ وہ جھپٹتی ہوئی پیچہ کر گئی۔ میں نے جب کراے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ایک بار پھر بج اٹھی۔

میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ گاڑی کافی دور تھی۔ وہ اگرچہ اس آٹھرم کی طرف ہی آ رہی تھی لیکن اس کا رخ تدرے پائیں طرف تھا۔ وہ راستہ ذرا سا محسوس کر آٹھرم کی طرف آتا تھا۔ راستے کے اس خم کی وجہ سے ہم اس گاڑی کے بیڑے سمیٹنے کی روشنی کی زد میں آنے سے منع کئے تھے۔

”جلدی سے پیٹ جاؤ۔“ میں بلا کو چھوڑ کر سامنے سے گھومتا ہوا ڈائریکٹ سیٹ کی طرف لپکا۔ اس کار میں آنے والے بھی یقیناً رادھن ہی کے آدمی تھے اور میں جانتا تھا کہ آئرم کے اندر کی صورت حال دیکھ کر وہ پاگل ہو جائیں گے اور ظاہر ہے ہمارا بیچھا کرنے کی کوشش کریں گے۔

”وہ دیکھو۔ اس طرف کوئی گاڑی کھڑی ہے۔“

”تم اندر جاؤ۔ میں اس گاڑی کو دیکھتا ہوں۔“ یہ دوسری آواز تھی۔

وہ شخص ہماری طرف دوڑا۔ میں نے انجین اشارت کر دیا اور کار کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ وہ شخص ہماری طرف دوڑ رہا تھا۔ فاصلہ تقریباً سو گز کے قریب تھا۔ میں نے کار کو تیزی سے دائیں طرف گھما دیا اور ایکسیلی ریٹر پر کار بڑھا دیا۔ اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ پہلی گولی کار کی پچھلے وینڈل شیلڈ کے ایک کونے میں لگی اور شیشے میں سوراخ کرتی ہوئی کھڑکی سے نکل گئی۔

میں درختوں میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے بعد دو فائر اور ہوئے تھے لیکن کوئی گولی ہماری کار تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

کار درختوں سے نکل کر سڑک پر آگئی، میں نے اسے بائیں طرف گھما دیا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہماری کار شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سڑک پر شنا تھا۔ اس وقت اس سڑک پر ٹریفک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ میں تیز رفتاری سے کار دوڑاتا رہا۔ ہم نے اس آئرمیں یا راہنہ بد معاش کے اڈے پر چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ پانچویں لاش سونیا کی تھی۔ راہنہ اور اس کے گرگے بد معاش تھے۔ شہر والوں کی زندگیوں کے لیے عذاب بنے ہوئے تھے۔ امن و امان کے لیے مستقل خطہ تھے۔ ان کی موت سے شہر والوں کو کچھ عرصے کے لیے سکون ضرور ملے گا مگر ان کا قتل بہر حال جرم تھا۔ کسی عام آدمی کو ان کے جرائم کی سزا دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کسی مجرم کو سزا دینا صرف قانون کا کام تھا لیکن اس ملک میں قانون کتنا بے بس تھا؟ وہ میں دیکھ چکا تھا۔ بے پور میں روپ متی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس نے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی لیکن قانون کو تو ان لوگوں نے خرید لیا تھا جو قانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور آج دن میں کیا ہوا تھا؟ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شوہا اور سونیا کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ وہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن تھا۔ لوگوں نے تھانے جا کر اس واردات کی اطلاع بھی دی۔ فائرنگ کی آوازیں تھانے تک بھی سن گئی تھیں لیکن قانون کے محافظوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رہتی تھی۔ میں دو گھنٹے اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا تھا لیکن قانون کے کسی محافظ نے اگر میری خبر تک نہیں لی تھی۔ بعد

میں بھی کسی نے مجھ سے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ سونیا اور شوہا کو اغوا کرنے والے کون لوگ تھے؟

کوئی بڑا جرم قانون کے رکھوالوں کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دیش کپہ نے بھی یہ واردات کرنے سے پہلے قانون کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور محافظوں کے ہاتھ دولت کی زنجیر سے باندھ دیے تھے۔

میں نے خود ان لوگوں کا سراغ لگایا تھا۔ میں اگر پولیس کے پاس جاتا تو بھی راہنہ اور اس کے آدمیوں کا پتہ نہ بگڑتا۔ وہ بد معاش آدمی تھا۔ طاقت ور تھا۔ پولیس والے بھی اس کی طاقت سے خائف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گیٹ ہاؤسز والوں سے بھتاکیں وصول کرتا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف کیوں ہوتا؟ قانون کے محافظ اس کے جرائم سے پردہ پوشی کیوں کرتے؟ اگر قانون کے یہ رکھوالے فرض شناس اور ایمان دار ہوتے تو راہنہ بد معاش کیوں بننا۔ جرائم کیوں ہوتے؟ راہنہ اور اس کے گرگے مارے گئے تھے۔ دو شریف عورتوں کو بھرے بازار سے اغوا کر لیا گیا تھا تو قانون کے محافظوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رہتی تھی۔ اب راہنہ جیسا بد معاش اور اس کے گرگے مارے گئے تھے تو شہر میں قیامت مچ جائے گی۔ پولیس کا ہر فرد قانون کی تلاش میں راہنہ اور دوڑتا ہوا نظر آئے گا۔ ممکن ہے وہ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر بھی توجہ دیں اسی لیے میں جلد سے جلد شہر سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

بلا اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا بایاں پیرہا رکھا تھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے صرف ایک دو مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا لیکن بات نہیں کی تھی۔ میرے سینے میں پچھل سی پچی ہوئی تھی اور دماغ میں جھگڑتے چل رہے تھے۔ سونیا کی دردناک موت نے مجھے سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ میرے پرانے ساتھی ایک ایک کر کے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ تھائی۔ جاکی اور اب سونیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میرے بدن کا ایک اور حصہ مجھ سے الگ ہو گیا ہو۔

سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی ہاڑیاں اور گھنے جنگل تھے۔ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نے تاریکی میں ایک سرنگ سی بنا دی تھی اور لگتا تھا جیسے ہم ایک طویل اور ختم نہ ہونے والی سرنگ میں سفر کر رہے ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم روڑ کی نامی ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک سڑک سارنپور "انبالہ" چندی گڑھ اور

پنجاب کی طرف چلی گئی تھی جبکہ دوسری سڑک گلینہ خاص پور اور رامپور سے ہوئی ہوئی بریلی اور لکھنؤ وغیرہ کی طرف جاتی تھی۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ہستی سائے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے کار کی رفتار کم کر دی تھی۔ ہستی کے ایک دو آوارہ کتے بھونکتے ہوئے ہماری کار کے پیچھے لگ گئے تھے لیکن میں نے ان کی پروا نہیں کی۔ کتوں کا تو کام ہی راہ گیروں پر بھونکتا ہوتا ہے۔

میں بلی رفتار سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے محتس نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک ذیلی سڑک پر روشنی دیکھ کر میں نے کار اس طرف موڑ دی اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس طرف ایک بننے کی دکان کھلی ہوئی تھی میں نے دکان کے سامنے کار روک لی۔

دکان میں دو آدمی بیٹھے تھے کہ کش لگا رہے تھے۔ ان میں ایک تو دکان دار تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ میں کار سے اتر کر دکان میں داخل ہو گیا اور پر نام کر کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دروازہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر اندر سے دکان بہت بڑی تھی اور بقول ٹھکے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک مل سکتا تھا۔ ایک طرف شیٹوں پر ایلو پیٹنی کی ادویات بھی جچی ہوئی تھیں۔

”کیا چاہیے مہاراج۔ کس چیز کی تلاش ہے آپ کو؟“ دکان والے نے پوچھا۔

”وہ دراصل میری بچی کے پیر میں موج آگئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مرہم وغیرہ ہوتا ہے۔“ میں کہتے ہوئے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”مرہم تو مل جائے گا۔ پر موج آئی ہے یا چوٹ لگی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پیر بہت گیا تھا اور۔“

”تھارائن۔“ دکان دار نے میری بات کاٹ کر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ”بھیا کو دیکھ لے۔ وہ سامنے موڑ میں بیٹھی ہے اور یہ مرہم لے جا۔ لگا کر پٹی باندھ دیتا۔“ اس نے ایک ڈبیا تھارائن کی طرف بڑھادی پھر میری طرف دیکھ کر بولا ”تھارائن رامپور میں پہلوانی کیا کرتا تھا۔ اب تو سب چھوڑ دیا۔ عرصے سے یہاں رہ رہا ہے۔“

تھارائن کے ساتھ میں بھی دکان سے باہر آ گیا۔ میں نے پونجریٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور بلا کو اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ تھارائن دروازے کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور بلا کا پیر ٹٹل کر دیکھنے لگا۔ اس نے پیر کو ایک دو ہلکے

ہلکے جھٹکے بھی دیے۔ بلا سسکایاں بھر کر رہ گئی۔ ”موج نہیں آئی۔ ہلکا سا جھٹکا لگا ہے۔ میں ماش کر رہا ہوں ٹھیک ہو جائے گی۔“ تھارائن نے کہا اور مرہم سے ہتھکڑی ماش کرنے لگا۔

بلا پچھلا ہونٹ دانتوں میں دبائے تکلیف ضبط کر کے کی کوشش کرتی رہی۔ تھارائن نے ماش کر کے اپنے کندھے پر پڑا ہوا پٹکا آٹا اور اسے چھڑ کر پیر پر پٹی باندھ دی۔ ”صبح اس مرہم سے پھر ماش کر لیتا۔ بھیا ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے کہا۔

بلا نے ڈبیا اس سے لے لی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں تھارائن کے ساتھ دکان میں آ گیا اور ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف مجھے کبیل بھی در در رکھے ہوئے نظر آئے۔ یہ آدمی کے پیلام شدہ کبیل تھے۔ میں نے دو کبیل لے لیے۔

دکان دار نے کبیلوں کے پیسے تولے لیے لیکن مرہم کے پیسے نہیں لیے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ایسے ہمدرد اور نیک لوگ بھی موجود ہیں جنہیں اجنبیوں سے بھی ہمدردی ہوتی ہے۔ ”شریمان جی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آدمی رات کو اتنا لمبا سوتے؟“

”ہم رام پور سے آرہے ہیں۔“ میں نے کہا ”راتے میں گاڑی خراب ہو گئی جس وجہ سے دیر ہو گئی۔ ہمیں ہرمال صبح سے پہلے پہلے ہر دور پر پٹنا ہے۔ اس لیے رات میں بھی سفر جاری رکھتے ہوئے ہیں لیکن آپ لوگ اس وقت دکان کیوں کھولے بیٹھے ہیں جبکہ ہستی کے سب لوگ گمری نیند سو رہے ہیں۔“

”رام پور سے آنے والی ٹرین بھی آج چار گھنٹے لیت ہو گئی ہے۔“ دکان والے نے جواب دیا۔

اور پھر اس کی باتوں سے پتا چلا کہ دور کی ایک چھوٹا سا ریلوے جنکشن ہے۔ آٹھ بجے رام پور سے چند گھنٹے پہلے والی ٹرین یہاں سے گزرتی ہے۔ اس کی بہن اور بہنوں اس ٹرین سے آنے والے ہیں۔ اس کا گھر بھی دکان کے پیچھے ہے۔ اس لیے وہ دکان کھولے بیٹھے ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ آگے تھا۔ اس طرف بعض دکانیں اور ایک ادھ بوش ضرور کھلا ہوگا۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ المورا جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو گلینہ شہر سے جی سڑک ہے جو رام پور شہر تک چلی گئی ہے۔ اس سے آنے المورا جانے والی سڑک ابھی زیر تعمیر ہے لیکن زیادہ ٹھیک

اس طرف سے جاتا ہے۔ دو سرائے اس ہستی سے المورا کی طرف جاتا ہے۔ یہ سڑک کہیں کی ہے اور کہیں کی لیکن مجھے جگہوں کی وجہ سے یہ راستہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ان جگہوں میں خوں خور اور دندے بکھرتے پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے لوگ دن کے وقت بھی اس طرف سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

میں ان کا شکریہ ادا کر کے کار میں واپس آ گیا اور انجن اشارت کر کے کار کو پورس میں لیتا ہوا سڑک پر لے آیا اور اسے اس طرف موڑ دیا جس طرف سے ہم آئے تھے۔ المورا کی طرف جانے والا راستہ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میں نے ان لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ ہم رام پور سے آئے تھے اور ہر دور جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کسی وقت یہاں سے ہمارے بارے میں پوچھا جائے تو ہمارا سراغ نہ لگایا جاسکے اور دیوے بھی اب ہم ہر دور کی طرف ہی جا رہے تھے۔

اس سڑک پر تقریباً ایک میل آگے جا کر میں نے کار راہیں طرف موڑ دی۔ یہ سڑک اگرچہ پختہ تھی لیکن زیادہ کدھ نہیں تھی۔ چند میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ہی کدھ بجل شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کار میں بیٹھے ہوئے دونوں کبیل بلا کے حوالے کر دیے تھے۔ اس نے ایک کبیل اپنے اوپر لیٹ لیا تھا اور دوسرا گود میں رکھا ہوا تھا۔

آج میں دیش کدھ اور اس کے ساتھیوں نے رشی کیش میں میری اچھی خاصی دھنائی کی تھی پھر طویل سفر اور انہم میں راہن اور اس کے آدمیوں سے مار پیٹ۔ اس وقت میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے پتھوں میں تکلیف شروع ہو گئی تھی لیکن میں اپنی توجہ ارادی سے بل بوتے پر اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

مجھے سیٹ پر بار بار پلو بدلنے دیکھ کر بلا نے دو سرا کبیل کھل کر میرے اوپر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ شور بھی مچا تھا کہ اگر راستے میں کوئی ہستی آئے تو ہم کھٹکنا دیکھنے وہاں رک کر آرام کر لیں لیکن میں نے اس وقت تک آرام نہ کرنے کی قسم کھائی تھی جب تک دیش کدھ کی گردن نہ موڑ دلا۔

ہم اس جگہ میں ملیوں دور آچکے تھے۔ اچانک کار کا انجن جھکے کھانے لگا۔ میں گیسر بدل بدل کر اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کار کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر وہ رگم رگم

”اس کم بخت کو بھی... میں خراب ہوتا تھا۔“ میں دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر مارے ہوئے بڑبڑایا۔

”پٹرول تو ختم نہیں ہو گیا؟“ بلا نے کہا۔

بلا کی بات سننے ہی میں اچھل پڑا اور میری نظریں بے اختیار ڈیش بورڈ کی طرف اٹھ گئیں۔ فیول پٹانے والی سوئی زیر پور رکی ہوئی تھی۔ ہم جب رشی کیش سے روانہ ہوئے تھے تو روشن لال نے کار میرے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے ٹینک فل کروا دیا ہے۔ ٹینک میں کتنے گیلن پٹرول آتا تھا اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا لیکن ہم شام چھ بجے سے سفر کر رہے تھے۔ رشی کیش سے ہر دور وہاں سے دور کی اور دور کی سے اس جگہ میں کم و بیش پچاس میل کا فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ پٹرول کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ راستے میں مجھے کہیں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ پٹرول ختم بھی ہو سکتا ہے۔ ہر دور میں راہن کو حلاش کرنے سے پہلے پٹرول ڈلوایا جاسکتا تھا۔ ہر حال یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کار کی ڈکی میں پانچ پانچ گیلن والے تین کین رکھے ہوئے تھے۔

میں نے اپنے کندھوں پر سے کبیل ہٹا دیا اور انہیں میں سے کی رنگ نکال کر پیچھے اتر آیا۔ کار کا دروازہ کھولتے ہی رخ ہوا کا جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تھا اور ایک لمبے کوئیں کپکپا کر رہ گیا تھا۔

جگہ بہت تنگ تھی۔ سڑک کے کنارے تک خود رو پورے اور جھانپاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اوپر درختوں کی شاخیں اس طرح آپس میں ملی ہوئی تھیں کہ آسمان پر چھتے ہوئے ستارے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں تو دن کے وقت دھوپ بھی زمین تک نہیں پہنچتی ہوگی۔ ہر طرف گہری تاریکی طاری تھی۔ حشرات الارض کی آوازیں اس تاریکی میں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ اچانک ہی مجھے دور کی سے اس بوڑھے دکان دار کی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس جگہ میں خوفناک درندے بکھرتے پائے جاتے ہیں اور لوگ ان درندوں کے خوف سے دن کے وقت بھی سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور یہ تو رات کا آخری پیر تھا۔ درندوں کے خوف سے میں ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔

میں نے ڈکی کھول کر پہلے پٹرول کا ایک کین نکالا اور ٹینک کا ڈھکنا کھول کر اس میں پٹرول انڈیل رہا تھا کہ پتوں اور جھاڑیوں کی کڑکڑاہٹ کی آوازیں نہ سن کر اچھل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار یک سیٹ کی طرح کی بچی میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ پٹرول کا کین میرے ہاتھ سے گرتے گرتے

بچا۔ جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔  
دو جانور گاڑی کے سامنے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں  
سڑک کے ایک طرف سے دوڑتے ہوئے دوسری طرف  
تاریک جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ ایک دوسرے کے پیچھے  
دوڑنے والے وہ جانور جنگلی بلی یا لومڑی سے زیادہ بڑے نہیں  
تھے۔

میں نے باری باری تینوں کین کا پیٹرول ٹینکی میں اندھا  
آخری کین سڑک پر ہی پھینک دیا، ٹینکی کا ڈھکنا بند کیا اور  
ڈکی کا ڈھکنا کر اکرنہ کر لیا۔

”کیا ہوا؟“ بلا نے میری طرف دیکھا ”شاید تم ان  
جانوروں سے ڈر گئے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”یہ تو  
بے ضرر جانور تھے۔ ان کی جگہ درندے بھی ہو سکتے تھے۔“  
”تو کیا ہوا۔ تم تو بہت اچھے مارشل آرٹسٹ ہو۔“

”ہاں۔ میں تو بہت اچھا مارشل آرٹسٹ ہوں مگر افسوس  
تو اس بات کا ہے کہ جنگلی درندے مارشل آرٹ نہیں  
جانتے۔ بہر حال، تمہارا پیر کیسا ہے؟“

”اس مہربان کی مالش سے تکلیف حیرت انگیز طور پر کم  
ہو گئی ہے۔ اب تو میں کمبل کے اندر پیر کو آہستہ آہستہ  
حرکت بھی دے رہی ہوں۔“

”زیادہ حرکت مت دینا۔ بس اسی طرح کمبل پیٹ کر  
آرام سے بیٹھی رہو۔ بلکہ بہتر ہے تم سو جاؤ۔“ میں نے انہیں  
اشارت کرتے ہوئے کہا۔

گاڑی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں نے بھی اپنے  
کندھوں پر کمبل ڈال لیا تھا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس دکان پر  
مجھے یہ کمبل نظر آگئے تھے۔ بصورت دیگر سڑی میں سفر کرنا  
مشکل ہو جاتا۔

اس خطرناک اور تاریک جنگل میں ہمارا سفر جاری رہا۔  
کئی مرتبہ بعض جانوروں کو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں  
سڑک پر یا اس کے آس پاس دیکھا تھا لیکن ہمیں کوئی  
ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا۔

صبح پانچ بجے کے قریب ہم ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہ  
بستی سڑک کے دائیں طرف قدرے ہٹ کر تھی جبکہ دوسری  
طرف تقریباً پچاس گز لمبی جگہ تھی اور اس سے آگے ڈھلان  
پر دھان کے کھیت تھے جن کے پرلی طرف تاحہ نگاہ گھٹا جنگل  
پھیلا ہوا تھا۔

بستی میں ایک آدھ ہی کچا مکان دکھائی دے رہا تھا جبکہ  
باقی سب جھونپڑے تھے۔ گھاس پھوس اور درختوں کی

شاخوں سے بنے ہوئے گول جھونپڑے جیسے بڑے بڑے  
پالے اوندھے رکھے ہوں۔ اور وسط میں ایک ایک فٹ  
تک بانسوں کی کچھیاہنگلی ہوئی تھیں۔ ہر جھونپڑے کے  
گرد جنگل جھاڑیوں اور درختوں کی موٹی موٹی شاخوں سے  
باندھ لگی ہوئی تھی۔

ہماری کار جیسے ہی بستی کی حدود میں داخل ہوئی دو کون  
نے بھونکتے ہوئے ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے لاکر  
رفار پیلے ہی کم کر دی تھی۔ بستی میں سڑک کی طرف دو  
جھونپڑوں میں شاید دکانیں بنی ہوئی تھیں اور دونوں  
جھونپڑوں کے اوپر کوکا کولا کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ انہی  
سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ دکانیں یا ڈھابے ہیں۔  
دونوں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ڈھابے کے  
سامنے کار روک لی۔ کتے بھی ہمارے پیچھے رک گئے۔ کچھ دور  
بھونکتے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔

ڈھابے کا مالک ایک اچھڑ عمر آدمی تھا۔ اس نے ابھی  
ابھی دکان کھولی تھی اور اپنی چیزیں درست کر رہا تھا۔ میں کار  
کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

”چائے لے گی کا کا؟“ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔  
”ضرور لے گی مہاراج۔ پردس منٹ انتظار کرنا پڑے  
گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کر لیتے ہیں۔ دو چائے بنا دو۔“  
میں نے کہا۔

بلا بھی نیچے اتر آئی اور ہم ڈھابے کے آس پاس ٹپٹے  
لگے۔ میں نے بلا کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ اپنے منسوب  
پیر پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر چل رہی تھی۔ ڈھابے کے مالک نے دو  
فولڈنگ کرسیاں نکال کر رکھ دیں۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ  
گئے۔

چائے تیار ہونے میں دس کے بجائے بیس منٹ لگے  
تھے۔ دکان دار کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ہم رات  
ہی رات میں روڑ کی طرف سے سفر کرتے ہوئے آئے ہیں۔  
”اس علاقے میں رات کو کوئی سفر نہیں کرنا مہاراج۔“  
اس نے بتایا۔ اس جنگل میں شیر اور چیتے بھرت پائے جاتے  
ہیں۔ لوگ تو دن کے وقت بھی اس طرف سفر کرتے ہوئے  
ڈرتے ہیں۔“

اور پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے بتایا کہ یہاں سے چند  
میل آگے رانی کھیت نام کا بلی اسٹیشن ہے۔ ایک بس پانچ  
بجے رانی کھیت سے روڑ کی لیے روانہ ہوتی ہے جو پونے  
سات بجے کے قریب یہاں پہنچتی ہے۔ بس کے آنے سے

پہلے اسے اپنی دکان تیار کرنی پڑتی ہے۔

اس کی باتوں سے ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔  
یہاں کی کھاؤں کا علاقہ تھا جو ہزاروں مربع میل تک پھیلا ہوا  
تھا۔ دنیا کے خوب صورت اور خطرناک ترین جنگلات اس  
فلے میں پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں دوسرے درندوں  
کے علاوہ شیر اور چیتے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ چیتے اور  
شیر آئے دن ان جنگلوں میں آباد انسانی بستیوں میں تباہی  
پھیلاتے رہتے ہیں۔ جب کسی شیر یا چیتے کے منہ کو انسانی  
ڈون لگ جاتا ہے تو سیکڑوں مربع میل تک انسانی بستیوں میں  
خوف ہراس پھیل جاتا ہے۔

اسی وادی کھاؤں میں بنی تال، میسوری، رانی کھیت اور  
الورا جیسے خوب صورت بلی اسٹیشن ہیں جہاں گرمیوں کے  
موسم میں ہزاروں کی تعداد میں سیاح سیو تفریح کے لیے  
آتے ہیں۔

اس بستی سے رانی کھیت تک پختہ سڑک تھی۔ دن کی  
روشنی میں جنگل سے آئے ہوئے پہاڑی راستوں پر سفر کرتے  
ہوئے واقعی مزہ آگیا۔

ہمالیہ کی تراشوں میں تقریباً آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر  
واقع رانی کھیت رشی کشیش سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اونچی نیچی  
’ٹرائیں‘ بھری ہوئی پختہ اور لکڑی کے تنکوں سے بنی ہوئی  
’ٹرائیں‘ ایک دو مختصر شاہجنگ سینٹروں، ریسٹورنٹ اور کیسٹ  
باکسز۔ سب سے زیادہ باوقوف جگہ لاری اڈا تھا جس کے  
اطراف میں شاہجنگ سینٹروں بھی تھے۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی اور ہم  
’ڈونل اتر کر ریسٹورنٹ میں آگئے۔ موسم میں خشکی تھی۔  
اگرچہ دھوپ چڑھ آئی تھی مگر زیادہ رونق نہیں تھی۔ ایسی  
جگہوں پر تو لوگ آرام سے سو کر اچھٹے ہیں اور نوبت کے بعد  
نہانا دونوں میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔

ناشتے کے بعد ہم نے تقریباً ایک گھنٹے تک اسی  
’ریسٹورنٹ‘ میں بیٹھ کر آرام کیا۔ رات بھر کے سفر نے مجھے  
بہت ناخوش کیا تھا۔ بلا بھی اگرچہ راستے میں اونگھتی رہی  
لیکن ممکن اس کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں۔

ایک پیٹرول پمپ سے میں نے نہ صرف کار کی ٹینکی فل  
کرائی بلکہ دو دنوں خالی کین بھی بھرا کر ڈکی میں رکھ لیے۔  
اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے تیسرا لین جنگل میں  
کھل پھینک دیا تھا۔

اس پیٹرول پمپ سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ الورا دواہاں  
سے تقریباً دو گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور سڑک پختہ ہے۔

راستے میں لب سڑک کچھ بستیاں بھی ہیں جہاں سے ہمیں  
ضرورت کی چیزیں مل سکتی ہیں۔

پیٹرول پمپ سے نکل کر بتائے ہوئے راستوں پر کار  
دوڑا تاہو میں المورا کی طرف جانے والی شاہراہ پر آگیا اور  
رفار بڑھا دی۔

اس سڑک پر کوئی ماہر ڈرائیور ہی گاڑی چلا سکتا تھا۔  
میں روپ متی کا شکر گزار تھا کہ اس نے بے پور میں مجھے  
ڈرائیونگ سکھا دی تھی۔ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی ہوتی  
تو اس وقت میں دیل کھ کے تعاقب میں یہاں تک نہیں  
آسکتا تھا۔ سڑک پر بعض جگہ عمودی پٹانیں اور دوسری

طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈے تھے۔ موڑ ایسے خطرناک کہ ذرا  
سی غلطی تحت التری میں پہنچا سکتی تھی۔ میں رات بھر کا جاگا  
ہوا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ مسلسل سیٹ پر  
بیٹھے رہنے سے کمر تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ اگر ہم رانی  
کھیت کے ریسٹورنٹ میں گھٹنا بھر آرام نہ کرتے تو میرے لیے  
گاڑی چلانا مشکل ہو جاتا۔ میں بلی رفاہ سے اور بہت محتاط

ہو کر کار چلا رہا تھا۔ اس طرح ہم نے یہ فاصلہ دو کے بجائے  
ڈھانکی گھنٹوں میں طے کیا۔ المورا میں داخل ہوتے ہی میں  
نے ایک گیسٹ ہاؤس کے سامنے کار روک لی۔

میرا خیال تھا کہ ہم یہاں چائے وغیرہ پر کتنا زہم ہوں  
گے اور پھر دیل کھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے لیکن  
بلا بعد تھی کہ ہمیں چند گھنٹے یہاں ضرور آرام کرنا چاہیے  
اور پھر یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں ایک کمرہ بھی مل گیا  
جو اسی وقت خالی ہوا تھا۔

بلا نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے آرام کی اشد ضرورت تھی۔  
کمرے میں آتے ہی میں بستر پر گرا تو پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔  
میری آنکھ سے پیر چار بجے کھلی تھی۔ بلا بھی میرے بستر  
پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میں چند منٹ بستر پر لیٹا بھت کو  
گھور رہا تھا پھر اٹھ کر باتھ روم میں کھس گیا۔ اس وقت بھی  
بدن کا جوڑو ڈھک رہا تھا۔

میں کافی دیر گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ گرم  
پانی سے جسم کی غور ہو رہی تھی اور بڑا سکون مل رہا تھا۔  
میں کپڑے پہن کر باہر آیا تو بلا بھی جاگ گئی تھی۔ وہ  
بیڈ پر بیٹھی متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس  
کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لگتا تھا جیسے اس کے دماغ  
پر اب بھی نیند کا خمار طاری ہو۔

”تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔“  
اس کا لہجہ بھی خوابیدہ سا تھا۔

”میں تو بیس تھا۔ تم شاید کہیں اور پہنچی ہوئی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تمہارا پیار کیا ہے؟“

”اب تو ٹھیک ہے۔ کوئی تکلیف بھی نہیں ہو رہی۔“ وہ پیر کو پکڑ کر دوسرا دھڑکنے لگی ”میرا خیال ہے کوئی نس چڑھ گئی تھی۔ ماش اور آرام کرنے سے ٹھیک ہو گیا۔ اب بالکل تکلیف نہیں ہو رہی۔“

”اچھا تو اب بہت آرام ہو چکا۔“ میں نے کہا ”پانی گرم ہے۔ تم بھی نہالو۔“ کسل مندی دور ہو جانے کی پھر ہم شوہا کی تلاش میں نکلیں گے۔“

بلا کچھ دیر بیٹھ پڑی اذیتیں رہی اور پھر اتر کر ہاتھ دھو کر کی طرف چل پڑی۔ میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا پیر بالکل سیدھا پڑ رہا تھا اور میرا خیال ہے اس میں اب کوئی تکلیف بھی نہیں رہی تھی۔

بلا مجھے ہی ہاتھ دھو میں مٹی میں کمرے کے ایک کونے میں آتی پانی مار کر مارتے میں چلا گیا۔ دونوں سے میں نے اپنی یوگا کی مشق نہیں کی تھی اور اس ریاضت کو جاری رکھنے کا یہ فی الحال کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ گرو کی موجودگی کے بغیر میں اس ریاضت کو جاری بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن مراقبہ ایک مختلف چیز تھی۔ اس کی ریاضت تو میں پہلے بھی کر چکا تھا۔

آدھے گھنٹے کے مراقبے میں اپنے آپ کو بالکل ہشاش بشاش اور تروتازہ محسوس کرنے لگا۔ میرے اندر ایک نئی توانائی آگئی تھی۔ مراقبے کا یہی تو کمال ہے۔ تھوڑی سی ریاضت سے ہی انسان کے اندر چھپی ہوئی توانائیاں انگڑائی لے کر پیدا رہوئے لگتی ہیں۔

بلا تیار ہو گئی تھی۔ وہ بھی تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔

ہم کمرے سے نکل کر ڈاننگ روم میں آگئے۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ ہمیں ایک ایسی میز مل گئی جہاں دو عورتیں پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے ہمارے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ ہی انتہا کیا گیا۔

کاؤنٹر بل دیتے ہوئے میں کھانا لے گیا۔ کیشوری مندر کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اتفاق سے ہم اسی کے نواح میں تھے اور وہ مندر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل کا فاصلہ تھا۔

آدھے میل تک تو گاڑی نے ہمارا ساتھ دیا۔ اس سے آگے گاڑی کا راستہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بہت سی

گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم نے بھی کار ایک طرف کھڑی کر دی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔

تنگسہ سے راستے سے گزر کر پہاڑی کے دوسری طرف کھانا لے گیا۔ کیشوری مندر تھا۔ یہ مندر بہت بڑا تھا اور لوگ دور دور سے یا تار کے لیے یہاں آتے تھے لیکن ہمارا رخ مندر کی طرف نہیں تھا۔ ہم مندر کے پہلو میں ایک اور ٹنگ سے راستے سے گزرتے ہوئے پچھلی طرف آگئے اور اس طرف کا منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے تھالی لینڈ میں بھی بہت سے حسین قدرتی مناظر دیکھے تھے مگر حالیہ کی گود میں یہ منظر دیکھ کر تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

بہزہ اور رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی پر تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ گنگا تھاپے سفید روشنی چادر اوپر سے نیچے تک پھیلا دی گئی تھی۔ نیچے جہاں پانی گر رہا تھا ایک چھوٹی سی جمیل معرض وجود میں آئی تھی اور ایک کشادہ ندی جمیل سے نکل کر تھیب کی طرف بہ رہی تھی۔ چاروں طرف بہزہ بہزہ پھولوں کا قلعہ اور لوگ مختلف جگہوں پر ٹیبلوں کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ندی کے پانی سے کھیل رہے تھے اور کچھ آبشار کے قریب کھڑے تھے۔

ایک اور دلچسپ منظر یہ تھا کہ جس جگہ آبشار گر رہا تھا وہاں پانی کی چادر کے نیچے پہاڑی میں ایک تنگ سی کھدائی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس پہاڑی کے ساتھ تنگ سے راستے پر چلے ہوئے پانی کی چادر کے نیچے اسی کھدائی سے گزر کر جمیل کے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس دلکش منظر کو قدرت کا ایک حسین شاہکار کہا جاسکتا تھا۔ لوگ یہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے اور پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ہم چمک مٹانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ ہمیں اس کالج کی تلاش تھی جہاں دلش کھ چھپا ہوا تھا۔

آبشار کے گرد نواح میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی کالج تھے۔ بعض کالج تو باقاعدہ بنگلوں کی طرح تھے۔ ان کی تعمیر بھی پختہ تھی اور ان کے ارد گرد پائونڈری وال بھی تھی۔ میں اور بلا سرخ چھت اور نیلی دیواروں والا کالج تلاش کرتے رہے۔ مختلف جگہوں پر سرخ گھریل والے دو تین کالج نظر آئے تھے مگر ایسا کوئی کالج دکھائی نہیں دیا تھا جس کی دیواریں بھی نیلی ہوں۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی دم

دھرنے لگی۔ تفریح اور چمک کے لیے آئے ہوئے لوگ واپس جانے لگے۔ بلا نے بھی واپسی کی تیار شروع کر دی لیکن میں اس وقت تک اپنی تلاش جاری رکھنا چاہتا تھا جب تک دن کی روشنی ساتھ دے رہی تھی۔

میں جمیل سے نکلنے والی ندی کے ساتھ ساتھ تھیب کی طرف چلے لگا۔ تقریباً سو گز آگے ایک پلایا تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ پل نہیں تھی۔ درختوں کے دو موڑے تھے ساتھ ساتھ ندی پر ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ اس طرح پیدل چلنے والوں کے لیے ندی کے اوپر ایک گزرگاہ سی بن گئی تھی جسے ہمارا پلایا بھی کہا جاسکتا تھا۔

ندی کے دوسری طرف بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کالج اور بنگلے تھے لیکن اب اندھیرا گرا ہو گیا تھا۔ بعض کالج اور بنگلوں کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی لیکن باہر کی تاریکی فضا میں مطلوبہ کالج کی تلاش جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کھانا مندر یا میں طرف پیچھے رہ گیا تھا۔ مندر کے گھر پر سرخ بتی جل رہی تھی اور گیت کی روشنائی بھی یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ دو سو گز مزید آگے چلنے کے بعد ندی پر ایک کشادہ اور پختہ پل نظر آئی جس پر سے دو کاریں پہلو پہلو آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ اس کے دونوں طرف کشادہ راستے تھے۔ انہیں پختہ سڑک نہیں کہا جاسکتا تھا مگر گاڑیوں کی بکثرت آمد رفت سے سڑک کی طرح ایک باقاعدہ اور پختہ راستہ بن گیا تھا۔ ہم پل پار کر کے دوسری طرف آگئے اور اس کشادہ راستے پر چلے رہے۔ اس دوران ایک ہمارے عقب سے اور دو سامنے سے آئے والی گاڑیاں بھی قریب سے گزری تھیں۔ پتہ نہ پانڈی کی طرف جانا ہوا یہ راستہ پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر بہت آگے اس سڑک سے جاملتا تھا جو شرے مندر والی پہاڑی کی طرف چلی گئی تھی۔ ہماری گاڑی اس پہاڑی کے دوسری طرف تھی۔

بلا ٹھیک گئی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ مسلسل چلے رہے تھے اس کے پیر میں بھی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر چلا تا ہوا اس پر چھریلے میدان میں آگیا جہاں ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

مندر اور آبشار کی طرف سے آنے والے بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے لیکن تین چار گاڑیاں اب بھی موجود تھیں۔ میں اپنی کار کے قریب رک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب صورت حال میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مندر اور

آبشار کی طرف جانے والا اصل راستہ وہی تھا جس طرف سے ہم واپس آئے تھے۔ پلایا والا راستہ تو ندی کے دوسری طرف کھڑے ہوئے کالج اور بنگلوں کی طرف چلا جاتا تھا لیکن پلایا سے پہلے ایک کشادہ راستہ مندر اور آبشار کی طرف بھی جاتا تھا۔ اس طرف کے کالج میں رہنے والے وہی راستہ استعمال کرتے ہوں گے۔ جس راستے سے ہم آبشار تک گئے تھے وہ اگرچہ قریب پڑتا تھا لیکن اس طرف سے گاڑی نہیں جاسکتی تھی۔

ہم گیت ہاؤس واپس آگئے۔ تقریباً تین گھنٹے اونچے نیچے راستوں پر پیدل چلے رہنے سے بلا کے پیر میں ہلکی سی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ بیٹھ رہی تھی ایک ہاتھ سے ہولے ہولے پیر کو دبا رہی تھی۔ میں نے خیلے میں سے مرہم کی ڈبیا نکال لی اور اس کے سامنے بیٹھ رہ بیٹھ گیا۔

”لاؤ۔ تمہارے پیر پر ماش کر دوں۔“ میں نے کہا ”مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ تمہیں اتنا زیادہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔“

بلا نے خاموشی سے وہ پیر آگے کر دیا۔ میں نے ڈبیا کھول کر انگلی پر مرہم لگایا اور اس کے ٹخنے کے آس پاس لٹے لگا۔ بلا نے شلوار کا پانچواں اور چھٹا لٹا۔ میں اب چاروں انگلیوں سے ماش کر رہا تھا۔ پیر کے اوپر جہاں پانچوں انگلیوں کے جوڑے ہیں، ٹخنے پر دونوں طرف اور ذرا اوپر پینڈی کی طرف۔ بلا کے منہ سے ہلکی ہلکی سکایاں ہی نکل رہی تھیں۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاتھ کے دباؤ سے اسے تکلیف محسوس ہو رہی ہے اور پھر اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا ہوا۔؟“ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے جو تک جانا پڑا۔

بلا کے چہرے پر سسٹنی کے عجیب سے تاثرات تھے اور آنکھوں میں سرخی کے دورے تیر رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور آگے میری طرف بھٹکنے لگی۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے سمجھوڑ دیا۔

”ہوش میں آؤ بلا اور پیروں پر کھیل ڈال لو تاکہ ہوا نہ لگے۔“ میں بیٹھ سے اتر کر کھڑا ہو گیا ”میں ہاتھ دھو کر چائے منگوا تا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کریں گے اور پھر نوجے کے قریب کھانا کھانے کے لیے چلیں گے۔ کھانا ہم یہاں نہیں کسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔“

بلا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے خشکی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کھل اسنے اور کچھ کچھ کرینڈ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ میں اس کے غصے کو نظر انداز کرتا

ہوا ہاتھ روم میں گھس گیا۔

ویر کو کمرے میں بلانے کے لیے کوئی بیل وغیرہ نہیں تھی۔ چائے کا آرڈر دینے کے لیے مجھے خود ہی کاؤنٹر پر جانا پڑا۔ کاؤنٹر اس وقت ایک خوب صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی رنگت اگرچہ سالوں سے مگرچہ کے نقوش بڑے غصہ کے تھے۔ بڑا چارم تھا اس میں۔

میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ وادی کماؤں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”یہ دنیا کی خوب صورت ترین ویلی ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی ”یہاں کئی بلی اسٹیشن ہیں جہاں کرمیوں میں خوب رونق رہتی ہے۔ یہاں سے آگے کو شانی، سچ تاتھ اور اس سے آگے دھیمو کوری اور دیوال کی طرف نکل جاؤ تو پندوری گلشیر اور پیپس ہزار چھ سو پیپس فٹ بلند تندا دیوی کی برف پوش چوٹی کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ کماؤں ویلی کے گنے جنگلات تیروں، پیتوں اور دوسرے خطرناک درندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں کے ساتھ جم کارٹ کا نام بھی زندہ رہے گا۔ جم کارٹ کو جانتے ہو نا؟“

”نہیں میڈم!“ میں نے نفی میں سر ہلادیا ”بد قسمتی سے میں اس نام سے واقف نہیں ہوں۔ کیا یہ بہت بڑی شخصیت ہے؟“

”جم کارٹ شکاری ہے۔“ اس عورت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”آدم خور شیروں کا شکار اس کی ہالی ہے۔ کماؤں ویلی اس کی شکار گاہ ہے۔ وہ درجنوں خوں خوار اور آدم خور خیلوں کو ہلاک کرچکا ہے۔ کماؤں ویلی میں لاقعد اور چھوٹی چھوٹی بستی ہیں۔ جہاں کے لوگ جم کارٹ کو دیوتا مان سمجھتے ہیں۔“

”کیا آپ بھی اس شخص سے ملی ہیں۔ میرا مطلب ہے جم کارٹ سے۔“ میں نے پوچھا۔

”کئی مرتبہ۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا ”وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ کیا تمہیں بھی شکار سے دلچسپی ہے؟“

”ہاں لیکن میں کسی اور قسم کا شکار کرتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”جس طرح جم کارٹ اپنے شکار کا دور تک پہنچا کرتا ہوگا اسی طرح میں بھی اپنے شکار کا دور بلکہ بہت دور تک پہنچا کرتا ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے ایک شکار کیا ہے جس کا میں کئی سال سے پہنچا کر رہا تھا۔“

”اوہ!“ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ”وہ کون سا درندہ تھا جس کا تم کئی درشنوں سے پہنچا کرتے رہے۔“

”بد روح! میں بد روحوں کا شکاری ہوں اور درندوں کا چچا کرتا ہوں۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ!“ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسی دوران ویر نے آگرتا ہوا کہ چائے میرے کمرے میں پہنچائی جا چکی ہے۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ٹمکین حیز کو انجمن میں جھٹکا چھوڑ کر کمرے کی طرف چل پڑا۔ چائے کا گنے کے بعد میں جان بوجھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہاں رہا تھا تاکہ اس دوران بلا کا غصہ فرو ہو جائے۔

میں کمرے میں آیا تو چائے کی ٹرے تائی پر رکھی ہوئی تھی اور بلا اسی طرح بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر چائے پانی۔ کتلی اور دودھ دانی میز پر رکھ دی۔ دونوں کپ ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھا کر بلا کے سامنے بیڈ پر آتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ایک کپ اٹھا کر بلا کی طرف بڑھا دیا۔

”وو چائے پیو۔“ میں نے کہا ”گرم ہونے کے باوجود چائے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دماغ میں بھرے ہوئے بخارات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔“

”تم بہت ستاتے ہو مجھے۔“ بلا نے کپ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لیے میں شکوے کی جھلک نمایاں تھی۔

”دیکھو بلا۔“ میں نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا ”ایک روز بے پور میں میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں جانتا ہوں تم مجھے بہت چاہتی ہو مگر چاہت کی انتہا جسوں کا انصال تو نہیں۔ یہ تو ایک بہت پور جذبہ ہے۔ ان جذبوں میں لغویت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک بار کھٹ آجائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر رہ سکتے ہیں اور دوستی کے جذبے تو پریم سے بھی زیادہ پور ہوتے ہیں۔ اگر تم اس جذبے کا اظہار کرو گی تو تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

میں بولا رہا اور بلا خاموشی سے سنتی رہی۔ چائے ختم ہونے کے بعد میں نے خالی کپ اس سے لے کر کمرے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میں اس کے سامنے بیٹھا بائیں کرتا رہا اور پھر دروازے پر دستک کی بجلی سی آواز سن کرش بیڈ سے اٹھ گیا۔

وہ ویر تھا جو خالی برتن لینے کے لیے آیا تھا۔ ویر کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر دیا اور بلا کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری باتوں سے بلا کے چہرے کا رنگ بدلتے لگا۔ اس کے چہرے پر خوشنما غائب ہو گئی اور وہ پھر

ہلکی طرح جھپٹنے لگی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب ہم تیار ہو کر کمرے سے نکل آئے۔ بلا تین دن سے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھی اور میرے کپڑے پر اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ اس راجستانی لباس میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے اگرچہ رانی کھیت میں کار کی ٹمکی فل کروالی تھی۔ پانچ پانچ گیلن کے دو بھرے ہوئے کین بھی ڈکی میں رکھے ہوئے تھے لیکن ایک پیٹرول پمپ دیکھ کر میں نے کار روک لی اور رانی کھیت سے یہاں تک جتنا پیٹرول استعمال ہوا اتنا ہی ٹمکی میں ڈلوالیا۔

ہم کافی دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ موسم میں خشکی ہونے کے باوجود شاہنگ سینٹروں پر خاصی گھما گھمی تھی۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی اور ہم نے آکر ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ ریسٹورنٹ کے اندر کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ بعض میزیں ایسی تھیں جن پر ..... ایک یا دو سٹیشن خالی تھیں۔ دائیں طرف والی میز سے ایک آدمی اور دو عورتیں انجمن تویم نے آگے بڑھ کر اس میز پر قبضہ کر لیا اور ویر کو بلا کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔

میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک آدمی دروازے میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ایک ایسی میز کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک کرسی خالی تھی۔ کرسی ٹھیک کر بیٹھے ہوئے اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی نظریں میری طرف بھی اٹھ گئیں۔ نچائے کیا بات تھی کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ خستہ ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا تھا۔

کرسی پر بیٹھے کے بعد بھی وہ کن انجمنوں سے بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس پر شبہ ہوا۔ کوئی بات ضرور تھی جو مجھے دیکھ کر وہ شخص بد حواس ہو رہا تھا۔ اسی دوران ویر نے اس کے سامنے چائے رکھ دی تھی۔ اس نے کپ اٹھایا تو اس کے ہاتھ میں بجلی سی کپکپاٹ تھی۔ چائے چھلک گئی۔ اس نے کپ دوبارہ پیرچ میں رکھ دیا اور ایک بار پھر کن انجمنوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

شکل صورت سے تو وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ کیوں ہو گیا تھا جیسے اس نے بہت دیکھ لیا ہو۔

اس میز پر دو عورتیں اور ایک ادیبز عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بھی اس شخص کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ ادیبز عمر آدمی نے آگے جھک کر کچھ کہا مگر مجھے جواب میں وہ شخص بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ چائے پیئے ہوئے بھی اس نے دو تین مرتبہ میری طرف دیکھا تھا۔

اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ رشی کیش میں جن لوگوں نے شوہا کو اغوا کیا تھا ان تمام نے چروں پر مامک چڑھا رکھے تھے۔ میں کسی کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ ان کے تعاقب میں ہر دورا پہنچتے ہی اتفاق سے چونکی خمر سے رادھن کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ رادھن کے تین اور آدمی جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے وہ بھی رشی کیش کے حملہ آوروں میں شامل تھے اور یہ شخص۔ میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ یہ لوگ مجھے مرہ سمجھ کر پھینک آئے تھے اور اب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ بد حواس ہو رہا تھا۔ یقیناً یہی بات تھی۔ ورنہ میں کوئی بہت تو نہیں تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اس طرح خوف زدہ ہو گیا تھا۔

اس شخص نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔ کاؤنٹر پر پیسے دے کر باہر نکلے ہوئے بھی اس نے مرکز میری طرف دیکھا تھا۔

”بلا۔“ میں نے نشو پیر سے ہاتھ پوچھتے ہوئے کار کی چابیوں کا گچھا اس کی طرف سرکا دیا۔

”وہ آدمی جو ابھی اس ٹیبل سے اٹھ کر گیا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ دلش کھ کا آدمی ہے اور اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ تم کھانا ختم کر کے گیٹ پاس چلی جانا۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے واپسی میں دیر ہو جائے مگر تم پریشان مت ہونا۔“

”مم۔“ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ بلا نے کہا۔ وہ مجھے ایک دم بد حواس ہو گئی تھی۔

”میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو بلا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نہیں کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔ تمہارے پیر میں پہلے ہی تکلیف ہے۔ ہو سکتا ہے تم میری مدد کرنے کے بجائے میرے لیے مسئلہ بن جاؤ۔ اس لیے تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں اور وہ آدمی کوئی اور ہو۔ ایسی صورت میں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔“ بلا نے کہا۔ میں نے جیب سے کچھ رقم بھی نکال کر بلا کے حوالے



کردی اور سیٹ چھوڑ دی۔ رینٹورنٹ سے نکلے ہی میں دروازے کے بالکل ساتھ بیٹے ہوئے بان سگریٹ کے کیبن کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس شخص کو زور تھک کی شرٹ سے پہچان لیا۔ وہ بائیں طرف تقریباً پچاس گز آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔ میں موقع پاتے ہی دوڑ کر سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا اور لوگوں کی آڑ لیتا ہوا اس کا پیچھا کرنے لگا۔

وہ شخص جلد ہی شرکی حدود سے نکل گیا۔ اس کا رخ اسی طرف تھا جس طرف ہم دن میں کھانا مندر اور آبشار کا چکر لگا کر آئے تھے۔ اس طرف اندھیرا تھا اور مجھے تعاقب کرنے میں آسانی ہو رہی تھی۔

وہ اسی کشادہ راستے پر جا رہا تھا جس سے ہماری واپسی ہوئی تھی۔ میں اس راستے کے بالکل کنارے بڑے پتھروں اور قد آدم پودوں کی آڑ میں چل رہا تھا اور میری یہ احتیاط کام آگئی تھی۔ سامنے مندر والے موڑے اچانک ہی ایک کار اس راستے پر مڑی تھی۔ زور شرٹ والا وہ شخص تو کار کے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگیا لیکن میں فوراً ہی پودوں میں دبک گیا۔

میں اس وقت تک پودوں کے پیچھے چھپا رہا جب تک وہ کار میرے قریب سے گزر کر دور نہیں نکل گئی۔ میں پودوں کی آڑ سے نکل آیا۔ قدموں کی ہلکی آہٹ بتا رہی تھی کہ وہ شخص اس دوران کافی آگے نکل چکا تھا۔ میں تیز تیز لپٹے۔ میرے پیروں میں جو گزرتے اس لیے آواز زیادہ نہیں ابھر رہی تھی۔

لیپا پر پہنچ کر میں رگ گیا۔ یہاں گہری تاریکی تھی اور وہ شخص نگاہوں سے اوچھل ہو چکا تھا لیکن قدموں کی ہلکی آہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس آواز کا تعاقب شروع کر دیا۔

لیپا سے قریب ترین کانچ تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر تھا جس کے دروازے پر نہایت مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیل رہی تھی۔

میں اس کانچ کے پھلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ قدموں کی آواز بائیں طرف سے آرہی تھی۔ میں بھی اس طرف چلا رہا اور پھر چند چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ شخص اصل راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ اختیار کر رہا تھا۔

تعاقب کا یہ سلسلہ تقریباً دس منٹ اور جاری رہا اور ایک کانچ کی آڑ سے نکلے ہی مجھے دوبارہ جھاڑیوں میں دبک جانا پڑا۔ وہ شخص وہاں سے تقریباً بیس گز آگے ایک بنگلے کے

گیٹ کے سامنے کھڑا کال بیل کاٹن دبا رہا تھا۔

بنگلے کے گیٹ پر بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں دیوار پر نیلا رنگ دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ اس شخص پر میرا شبہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ دیش کھ لای آئی تھا اور مجھے دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہوا تھا کہ رینٹورنٹ سے نکل کر سیدھا اس بنگلے پر آیا تھا۔ اس نے شاید مجھے اپنا پیچھا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ سیدھا یہاں نہ آتا۔

کال بیل کی آواز سنائے میں دو رنگ پھیل گئی تھی۔ چند منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور وہ شخص تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک منٹ بعد میں نے ایک اور آوی کو دروازے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک وہاں کھڑا دھرا دھرا دیکھا رہا اور پھر سر ہلا ہوا اندر چلا گیا اور گیٹ بند ہو گیا۔

میں اس کے بعد بھی تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑا رہا اور پھر جھاڑیوں سے نکل کر دبے قدموں اس بنگلے کے عقبی سمت بڑھنے لگا۔

بنگلے کی دیوار چھ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پھیل دیوار پہاڑی سے ملی ہوئی تھی۔ میں اس پہاڑی پر سے ہوا ہوا دیوار پر آگیا اور بڑی آہستگی سے اندر کی طرف کود گیا۔ اندر کی طرف کیا باریاں تھیں اور پودے لگے ہوئے تھے۔ جی جگہ پر کودنے سے آواز زیادہ نہیں ابھر رہی تھی۔ میں چند لمبے وہاں کھڑا رہا اور پھر ٹھنکروں کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ آواز سامنے والے کمرے سے آئی تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا اور کھڑکی کے قریب رگ گیا۔

کھڑکی کے اندر کی طرف پردہ کھینچا ہوا تھا لیکن ایک کونے سے مجھے جھانکنے کا موقع مل گیا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی جو قالین پر منہ سے ٹیک لگائے بیٹھے ایک شخص پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن لڑکی جب سیدھی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا جس میں چہرہ گھونٹ رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لڑکی قالین پر بیٹھے ہوئے شخص کو اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہی تھی۔

اس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ خوب صورت نقش و نگار اور رنگت گوری تھی۔ اس نے لباس بھی بہت مختصر سا پہن رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں پائسل تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میں نے ٹھنکروں کی جو مدھم سی آواز سنی تھی وہ اس پائسل کی تھی۔ میں اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کامیاب نہیں ہو سکا۔

میں دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور گھوم کر دوسری طرف آگیا۔ اس طرف بھی ایک کمرے میں مدھم نیلگوں روشنی نظر آرہی تھی۔ اندر شاید ٹائٹ بلب جل رہا تھا۔ اس کھڑکی کا دروازہ ایک بالشت کے قریب ہٹا ہوا تھا۔ میں نے شیشے سے آکھ لگا دی۔

اندر کا منظر دیکھ کر میں چونک گیا۔ بیڈ پر کوئی عورت سو رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ کپٹیاں سلگ اٹھیں۔ مدھم نیلگوں روشنی میں شوبھا کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

وہ بیڈ کے بل بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کا زریو ہم بتا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے اور گہری نیند سو رہی ہے۔

میں نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آیا اوپر سے گھوم کر پرآمدے والے دروازے سے اندر گھس جاؤں اور شوبھا کو اٹھا کر بھاگ نکلوں لیکن یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔

ہر دوامی رادھن نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ دیش کھ کے ساتھ دو آدمی تھے جو راجستان ہی سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ ایک کو تو میں نے دیکھ لیا تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں تک آیا تھا اور دو سراسر ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہوا اس نیم عریاں عورت کے ہاتھوں سے شراب پی رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ دیش کھ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن تیسرا آدمی ابھی تک میری نظروں میں نہیں آ سکا تھا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دروازہ قامت آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ تھی جس میں خوش رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب رگ گیا اور جھک کر سرخ کی سوئی شوبھا کے بازو میں پیوست کر دی۔ شوبھا کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ سرخ کا مارا سیال شوبھا کے بازو میں منتقل ہو گیا۔ اس شخص نے انجکشن کی جگہ پر شوبھا کے بازو کو ذرا سا مسلا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شوبھا بے ہوش تھی۔ اسے انجکشن کے ذریعے مسلسل بے ہوش رکھا جا رہا تھا۔ وہ آدمی چہرے سے

کسی طرح بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا لیکن آج کل تھوڑی سی کوشش سے انجکشن لگانا سیکھا جاسکتا تھا اور ایسے انجکشن بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ادویات حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

بہر حال یہ صورت حال میرے لیے خاصی تشویش ناک تھی۔ شوبھا کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے نکالنا بڑا مشکل تھا۔۔۔۔۔ لیکن ظاہر ہے میں بایوس ہونے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ مجھے شوبھا کو ہر صورت میں اس وحشی کے چنگل سے نکالنا تھا۔

میں دبے قدموں چلا ہوا دوبارہ اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے آگیا جہاں اس نیم عریاں لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس مرتبہ پردے کی جھری سے آکھ لگا کر اندر جھانکا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ سامنے ہی زور شرٹ والا وہ آدمی موجود تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ وہی آدمی تھا جس نے شوبھا کو انجکشن لگایا تھا اور نیم عریاں لباس میں وہ لڑکی تھی جو اس وقت سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی۔ پہلی شرٹ والے کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

”آئی دیر تک خاموش کیوں رہے تھے۔ کہاں دیکھا تھا اسے؟“ یہ گہرے جھری ہوئی آواز اس شخص کی تھی جس کا چہرہ میں ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا لیکن میں نے آواز سے اسے پہچان لیا۔ وہ دیش کھ ہی تھا۔

”ایک ہوٹل میں سرکار۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”وہ ایک چھوکی کے ساتھ بھوجن کر رہا تھا اور وہ چھوکی۔“

”کون تھی وہ؟“ دیش کھ کی آواز گونجی۔ ”جے پور کے پنڈت رام سروپ کی بیٹی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”کیا کو اس کر رہے ہو۔ بھگت تو نہیں بی رکھی تم نے؟“ دیش کھ چپٹا ہوا آگے آگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

”میں سچ کہتا ہوں سرکار۔“ پہلی شرٹ والے نے جواب دیا ”ایک مرتبہ آپ کے کہنے پر ہم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ٹھار ٹھار ہاتھوں سے شرن (ناہ) میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد سرکار نے ہی روک دیا تھا کہ اس کو ذرا کونہ چھیڑا جائے۔ آج تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا سرکار۔ وہ اپنے راجستانی لباس میں تھی اور وہ تو ہمراہ ہے



سرکار ہیرا۔ میری مانو تو اسے بھی اٹھوا ہی لیں۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تو اسے ہمیں دان (ٹکے میں دینا) کر دیتا۔ آخر وہ لونڈیا بھی تو سرکار نے رادھن کو دان کھادی تھی۔

”سمپت“ دیش کھ نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا ”تم ابھی جا کر پتا کرو کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اور کون کون لوگ ہیں۔ اگر وہ اکیللا ہو تو ختم کر دو اسے اور بلا کو اٹھا لاؤ یہاں۔ سارے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز جہاں مارو۔ وہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا اور پران تمہ۔“ وہ پہلی شرت والے کی طرف گھوم گیا۔

میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میں یہ نہیں سن سکا کہ اس نے پران سے کیا کہا تھا۔ میں نے جھک کر پتلون کے پائنتے کے نیچے ہنڈی پر بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کا دستہ زور سے گھڑی کے پیشے پر دے مارا۔

چھانکے کی زوردار آواز ابھری۔ شیشے چٹکا چور ہو کر بکھر گیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر ہاتھ ڈال کر چٹنی بنادی اور کھڑکی کھول کر وہ ایک طرف کھینچ دیا اور دونوں ہاتھ چوٹھ پر لگا کر بڑی پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔

”نہیں دیش کھ۔ میری تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود یہاں موجود ہوں۔“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ وہ سب بدحواس ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

”کچن اے۔ مار ڈالو۔ زندہ نہ بچ کر جائے۔“ دیش کھ چیخا اور اس نے خود باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے کھڑکی پر سے چھلانگ لگا دی۔ میرا اندازہ کسی قدر غلط نکلا۔ میں دیش کھ کے اوپر تو نہیں گرا لیکن میری لات اس کے کولے پر لگی تھی۔ وہ چیخا ہوا لڑکھڑاکر گر گیا۔

میں فوراً ہی شبھل گیا لیکن اس دوران پران اور سمپت میرے اوپر چھلانگ لگا چکے تھے۔ سمپت نے میرے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اس کے فوراً بعد میں نے خود کو ان کی گرفت سے چڑا لیا اور پران کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ پران اس لڑکی پر گرا جو ایک طرف سہی کھڑی تھی۔ وہ خوف ناک انداز میں چیختے ہوئے پران کے ساتھ ہی نیچے گری۔ میں شبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سمپت نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی اور مجھے دھکیلا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرا سر دیوار

سے ٹکرایا اور دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر جمادیے اور اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ کھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ اچھل پڑا۔ مجھے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کا موقع مل گیا۔

دیش کھ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن اسی وقت پران اور سمپت نے بیک وقت میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میں نے لوٹ لگا کر نیچے کی کوشش کی تھی لیکن سمپت نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ مجھے بڑی طرح رکھ رہا تھا۔ ایک موقع پر مجھے داؤ لگانے کا موقع مل گیا۔ میں نے ایک ٹانگ سمپت کے پیچ اس کے پیٹ پر جمادی اور اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میں نے اسے پوری قوت سے اچھال دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ قریب ہی وہ لڑکی بھی دیوار کے ساتھ تکی کھڑی تھی اس نے اپنے دونوں بازو پیٹ پر پھینک رکھے تھے اور اس کے منہ سے خوف زدہ آوازیں نکل رہی تھیں۔

دیش کھ اور پران کمرے سے نکل چکے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کی تو سمپت نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس نے پشت کی طرف سے بایاں بازو میرے گلے پر پھینک دیا تھا اور دائیں ہاتھ سے میرے پبلو پر زوردار گھونسے مار رہا تھا۔ ہر ضرب مجھے براہ راست کر دے پر لگتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے بازو پر جمادیے اور گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ میرا زور خراب رہا تھا اور سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں اس کے بازو پر دونوں ہاتھ جمائے آہستہ آہستہ آگے جھلنے لگا۔ اسی طرح سمپت میری پشت پر لٹا چلا گیا اور پھر میں گھٹنوں کو جھکا ہوا ایک جھگڑے سے آگے جھکا۔ سمپت میرے اوپر سے غلا بازی کھاتا ہوا پشت کے بل نیچے گرا۔ میں ایک ہاتھ سے گلا سلانا ہوا بڑی تیزی سے اٹھ گیا لیکن سمپت نے لینے لینے ٹانگ جلا دی۔ ٹھوکر میرے گھٹنے کے پیچھے لگی اور میں بعد سے نیچے گر گیا۔

اسی وقت باہر کسی گاڑی کا اجنبی اشارت ہونے اور جھگڑے کا گیت کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دیش کھ بھاگ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تو سمپت مجھ سے

پٹ گیا۔

ہم ایک بار پھر ایک دوسرے سے گھٹھ گھٹا ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کم بخت جو تک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ میں نے کھنی سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ گیا لیکن سمپت نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف بچھا۔ اس مرتبہ میں نے بڑی تیزی سے نیچے جھک کر اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور سر سے اوپر لے جا کر پوری قوت سے اچھال دیا۔

نیچے گرتے ہوئے سمپت کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ جب میں برآمدے والے دروازے سے نکلا تو سرخ رنگ کی ایک کار جھگڑے کے گیت سے نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی لیکن کار بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی اور جب میں گیت پر پہنچا تو کار تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی تقریباً پچاس گز دور جا چکی تھی اور اس کی عقبی سرخ بتیاں لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔ کار کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے مز کر کے آگے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اور جب میں شوہا والے کمرے میں داخل ہوا تو ایک جھگڑے سے رک گیا۔ مجھے اپنا دل لپٹنوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بغل خالی تھا۔ وہ کم بخت دیش کھ شوہا کو کار میں ڈال کر لے گیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ دم پلٹ پڑا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ سمپت خنجر تانے دھاڑتا ہوا میری طرف لپکا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ خون میں تر ہو رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں میرا ہی خنجر تھا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا میں نے اس کا وار روک لیا۔ اس کی کلائی میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں آگئی۔ میں نے پوری قوت سے بائیں طرف جھکاؤ دیتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑاکر بند پر گرا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

میں نے سمپت کو اپنے کا موقع نہیں دیا اور بند پر چڑھ کر اس کی گردن دو بوج لی۔

”وہ کہاں گئے ہیں۔ جلدی بتاؤ ورنہ میں تمہاری گردن موڑ دوں گا۔“ میرے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

سمپت مجھ سے زیادہ قد آور اور طاقتور تھا لیکن اس کی گردن میرے مخصوص داؤ کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنے

آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ چیخ اٹھا۔

”میں تمہیں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔“ میں ایک بار پھر غرایا ”بتاؤ وہ کہاں گیا ہے۔ ورنہ ایک ہی جھٹکا۔“

”بس۔ بتاتا ہوں۔“ وہ چیخا۔

میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنا سیکھ کر دیا۔

”تنت۔ تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ دیش کھ یہاں ہے۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“ میں نے کہا ”لیکن میں تمہاری یہ خواہش پوری کر دینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ سب سے پہلے میں نے ہر دار میں رادھن کا سراغ لگایا۔ وہ بھی اپنے آپ کو بہت بڑا مدعا سمجھتا تھا اس نے سونیا کو مار دیا۔ وہی لڑکی جو دیش کھ نے اس کے حوالے کی تھی۔ میں سونیا کی موت کا اصل ذمے دار دیش کھ کو ہی سمجھتا ہوں اور اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رادھن نے بھی تمہاری طرح آڑی کی تھی۔ اسے اپنے گروں پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن تین آدمی ضائع کرانے کے بعد اس نے بتایا کہ تم لوگ اس طرف آئے ہو۔ ہم دونوں رات بھر جنگوں اور پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے آج صبح ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ایک گھنٹا پہلے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے پران میری نظروں میں آ گیا۔ میں اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر اس طرح بدحواس ہو گیا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

مجھے اس پر شک ہوا اور میں اس کا پچھا کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ مجھے افسوس ہے دیش کھ بچ کر نکل گیا لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ بتاؤ وہ کہاں گیا ہے؟“ میں نے ایک بار پھر اس کی گردن پر دباؤ ڈال دیا۔

”بس۔ بتاتا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر چیخا۔ میں نے دباؤ کم کر دیا۔ وہ رک رک کر بولا ”یہاں اس کا دوسرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ وہ نئی ٹال کی طرف نکل گیا ہوگا۔ وہاں۔“ وہاں بھی اس کا کایج ہے۔ وہ وہیں گیا ہوگا۔“

”نئی ٹال میں کس جگہ۔“ کایج کہاں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

وہ رک رک کر کایج کا پتا سمجھانے لگا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ بھوت نہیں بول رہا تو میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ بری طرح جھلنے لگا لیکن میں نے اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جب تک اس کی گردن کی ہڈی نہیں توڑ دی۔ میں اسے چھوڑ کر بیٹھ سے کود گیا۔ وہ کٹے ہوئے بکری



”ہاں۔ اسی وقت۔“ میں نے کہا ”دیش کھ بھی نیی تال ہی گیا ہے۔ میں اسے سنبھلے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔“

بلا اپنی چیزیں سمیٹنے لگی اور میں اسے اس واقعے کی تفصیل بتاتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اس گیسٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے۔ میں نے گیسٹ ہاؤس کے بیچر کو بتایا تھا کہ ہمیں ایک ہوٹل میں جگہ مل گئی ہے جہاں ہمارے کچھ اور جاننے والے بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔

المورا میں بھی لاتعداد مندرا اور آشرم تھے۔ شہر سے باہر ایک مندر کے قریب پہنچتے ہی گاڑی کا انجن پھر گڑ بڑ کرنے لگا۔ مندر سے کچھ دور گاڑی رگ گئی۔ میں نے دیش بورڈ پر مختلف ڈائریکٹریکٹ کیا اور پھر نیچے اتر کر بونٹ اٹھا دیا۔

ریڈی ایٹر میں پانی نہیں تھا۔ بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہ بھی غصیت تھا کہ ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ ورنہ انجن پیز بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے بونٹ کھلا چھوڑ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آس پاس اگر کوئی ندی تھی بھی تو اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ڈکی میں سے خالی ڈبا نکال لیا اور بل کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرنا ہوا مندر کی طرف چل پڑا۔

سڑک سے تقریباً پچاس گز ہٹ کر بہت بڑا مندر تھا۔ گیٹ اگرچہ بند تھا مگر سامنے جیاں جل رہی تھیں۔ سڑک سے ایک پینتہ راستہ مندر تک چلا گیا تھا۔ میں مندر کے سامنے رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ایک آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ آواز ابا میں طرف سے آئی تھی۔ میں تیزی سے اس طرف مڑ گیا۔

”کیا دیکھ رہے ہو مورکھ۔ کس چیز کی تلاش ہے؟“ وہ دروازہ قامت ہٹا کتا بیماری تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول بھی تھا۔ وہ بیماری نبجانے کس طرف سے نکل کر وہاں گیا تھا۔

”جل مہاراج“ میں نے کہا ”ہماری گاڑی کے ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ میں پانی کی تلاش میں اس طرف آیا ہوں۔“

”ادھر ندی ہے۔ وہاں ہمیں جل مل جائے گا۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا ”پر اس سے کہاں سے آئے ہو؟“ ”ہم نیی تال جا رہے ہیں مہاراج۔ ایک ایمر جنسی ہے۔ ہمارا صبح سے پہلے وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”نیی تال جانے کا یہ راستہ بند ہو گیا ہے مورکھ۔“ بیماری نے کہا ”آج شام سے ذرا پہلے یہاں سے بیس میل

آگے پہاڑی کا ایک تودہ سڑک پر گر جائے سے راستہ بند ہو جائے گا۔ صاف کرنے میں کم از کم دو دن لگیں گے۔“ ”اوہ۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کوئی اور راستہ نہیں ہے مہاراج؟“

”ہے۔ دو سراسر راستہ ہے۔“ بیماری نے سر ہٹاتا ہوا سے دو کلو میٹر پیچھے چلے جاؤ۔ وہاں ایک راستہ پہاڑوں میں جاتا ہوا ملے گا۔ وہ راستہ اگرچہ زیادہ اچھا نہیں ہے مگر تھوڑا پانچ کلو میٹر آگے جا کر وہ کچا راستہ کی سڑک سے مل جائے گا۔ وہ سڑک نیی تال کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس طرح تمہارا سفر اگرچہ طویل ہو جائے گا مگر تمہیں کوئی کشت نہیں اٹھانا پڑے گا۔“

میں نے بیماری کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں جا کر ندی سے ڈبے میں پانی بھرا اور کار کی طرف واپس آ گیا۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کے بعد میں نے بل کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

انجن ٹھنڈا ہونے تک ہمیں کم از کم آدھا گھنٹا کھڑے رہنا پڑا اور پھر میں نے بونٹ بند کر دیا اور انجن اشارت کر کے گاڑی کو واپس کھمکھایا۔

دو کلو میٹر پیچھے آکر وہ راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ تنجائ درختوں میں گھرا ہوا وہ دروازہ جھاڑیوں سے پنا پڑا تھا۔ جھاڑیاں وہی ہوتی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے بھی یہاں سے کچھ گاڑیاں گزری ہیں۔

کار کی رفتار بہت کم تھی اور مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ پانچ کلو میٹر کا یہ فاصلہ کوئی آدھے گھنٹے میں طے ہوا اور بالآخر ہم پینتہ سڑک پر پہنچ گئے۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔

بہت ہی تنجائ اور خوفناک سفر تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم مکسٹار پہنچ گئے۔ جو رات کے اس سے تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم رکے بغیر اس قصبے سے نکل گئے۔ مزید دو گھنٹوں کے بعد ہم بھیموالی نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ رات کا آخری پر تھا اور یہاں بھی سناٹا تھا۔

بھیموالی سے ایک سڑک کاٹھ گودام اور دوسری نیی تال کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے کار کا سامنے نیی تال کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

مجمعات بچے کے قریب ہم نیی تال کے نواح میں پہنچے اور ایک آشرم سے ذرا آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے پارک روک لی۔ دیش کھ پر حملہ آور ہونے سے پہلے میں نے اپنی بیچ کر لینا چاہتا تھا۔

ریسٹورنٹ میں ہلکا سا ناشتا اور گرم گرم چائے سے وہاں کسی قدر بحال ہو گئے۔ ملا بھی اس سفر میں بیٹھا جاگتی ہی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

تقریباً آدھا گھنٹا مزید اسی ریسٹورنٹ میں رکنے کے بعد وہاں آکر بیٹھ گئے۔ ایک پیٹرول پمپ سے میں نے نیپکی ڈرائیو آگے نبجانے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا ہے اور میں پیٹرول کے پمپ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اب میں پوری طرح سے تیار تھا اور دیش کھ کو سنبھلنے کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ المورا میں سمجھنے سے پہلے چو پتا بتایا تو میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے ہم اس جگہ پہنچے تو صبح کے فوج رہے تھے۔

پہاڑی کے دامن میں یہ بھی ایک خوب صورت ہنگامہ تھا۔ اس کے آس پاس اور بھی جنگلے اور کالنج تھے۔ دیش کھ نے جنگلے کا گیٹ بند تھا۔ میں نے کار گیٹ کے عین سامنے روک لی۔ میں نے ہر قسم کی احتیاط کو بلائے طاق رکھ دیا تھا۔

میں نے انجن بند کر دیا۔ ملا کو کار میں بیٹھنے رہنے کا کہا اور خود نیچے اتر کر گیٹ کے قریب پہنچ کر بھری سے دیش کھ لگا۔

ایک ڈیڑھ خاصا وسیع تھا لیکن اندر کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہ آئی تھی۔ دیش کھ ہم سے تقریباً دو گھنٹے پہلے المورا کاٹھا تھا۔ اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس نے اس نے اپنی کار بیٹنگ کے پیچھے ایک ڈیڑھ میں ٹھہری کی حالت میں المورا سے نکلنے کے بعد کوئی اور راستہ اختیار کیا تھا۔ ایک نیک یہاں پہنچا ہی نہ ہو۔

میں ذرا پیچھے ہٹ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بجلی کے کھالوہ کی فون لائن بھی نظر آ رہی تھی۔ جس کا یہ تھا کہ اس جنگل میں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ میں نے کار گیٹ کے ستون پر کال بیل کاٹن دیا دیا اور انگلی ہاتھ تک نہیں ہٹائی جب تک برآمدے والا دروازہ نہ کھلے۔

کار گیٹ کی بھری میں سے جھانک رہا تھا۔ برآمدے

والے دروازے سے برآمد ہونے والا آدمی ادھڑ عمر تھا اور طبعی سے کڑ بندو لگتا تھا۔ دھوتی اور کھدرا کا کرتہ۔ گنجائش مانتے پر تشدد اور کھوپڑی پر پچھلی طرف چٹیا کی طرح مٹھی بھر بال۔

”کون ہے بھایا۔ آتا ہوں۔ صبر تو کرو۔“ وہ اونچی آواز میں بولتا ہوا برآمدے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف آ گیا۔ اس نے جیسے ہی ذیلی دروازہ کھولا میں نے اس کے جڑے پر زور دار گھونسا جڑ دیا۔

وہ چیخ کر لوٹھکڑا ہوا پیچھے ہٹا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اندر داخل ہو کر دھڑے دروازہ بند کر دیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھک کر اپنا خنجر نکال لیا۔

”گگ۔ کون ہو تم مہاشے۔ گگ۔ کیا بات ہے۔“ وہ کھلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔ ”اندر کون ہے۔ دیش کھ کہاں ہے؟“ میں نے غراتے ہوئے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

”گگ۔ کوئی نہیں مہاراج۔ اندر کوئی نہیں ہے۔“ وہ گھٹکیا۔

قاریبین کے ذوق بھی نڈر  
ایک شاہکار معاشرتی ڈاویل

# دشمن کی ہتھیاری

ہاں کی گیند سے گئے ہیں وہاں کی گیند سے گئے ہیں

اس نے پتے پانی پکا پکا پکا...!!!  
جس مندر کی بات کہ وہاں سے ہارے جیت گئی۔

لاہور کے ایک طلسمی شاہکار

میں نے اپنے آپ کو ایک شہر کا شہر بنایا

کتابیات پبلکیشنز

میں نے اپنے آپ کو ایک شہر کا شہر بنایا

74200 فون 5802551-5898312 فون 5802551-5898312 فون 5802551-5898312

ایکے کے لئے 75500

”اندر چلو۔“ میں نے اسے دھکا دیا۔

بنگلے میں واقعی کوئی نہیں تھا اور نہ ہی ایسے کوئی آثار نظر آئے تھے جس سے پتا چلتا کہ یہاں کوئی آیا ہوگا۔

”دیش کھ کا یہاں اور کوئی ٹھکانا ہے؟“ میں نے اس شخص کے سینے پر خنجر کی نوک رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مہاراج۔ وہ جہج ہی آتے ہیں یہیں آتے ہیں لیکن آپ کون ہیں اور کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ شخص خوف زدہ لہجے میں بولا۔

میں جواب دینے کے بجائے چند لمحوں کے لیے اسے غور تار رہا اور پھر اسے ٹھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ کوئی بات چپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں ابھی اس کی دھناتی کر رہا تھا کہ بلا دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ بدحواس ہو رہی تھی۔

”وجدان بھاگو۔ وہ لوگ نکل گئے۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی چیختی۔

”کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں نکل گئے؟ یہ بنگلا تو خالی پڑا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ سامنے والی سڑک سے آئے تھے۔“ بلا اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”بنگلے کے سامنے ہماری کار دیکھ کر انہوں نے اپنی گاڑی دور ہی روک لی۔ میں اپنی کار سے اتر کر باہر کھڑی تھی۔ دیش کھ کے ساتھ

وہ آدمی بھی تھا جسے تم نے المورا کے ریٹورنٹ میں دیکھا اس نے میری طرف اشارہ کر کے چیخ کر کچھ کہا اور دیش کھ نے گاڑی تیزی سے واپس گھمائی۔ جلدی چلو۔ وہ کہیں دور نکل جائیں گے۔“

میں نے اس شخص کو ایک زوردار دھکے سے پیچھے گرا دیا اور بلا کے ساتھ باہر کی طرف دوڑا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر دیش بورڈ کے اوپر ڈال دیا اور انہیں اشارت کرنے لگا۔ اسی دوران بلا مجھ اپنی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی اور اگلے موڑ پر اسے بلا کی تان کی موٹی سمت میں موڑ دیا۔

المورا والے بنگلے میں ”میں نے سرخ رنگ کی کار دیکھی تھی اور دیش کھ اسی کار بردہاں سے فرار ہوا تھا۔ وہ ہم سے دو گھنٹے پہلے المورا سے نکلا تھا اور تقریباً تین گھنٹے بعد یہاں پہنچا تھا اور بنگلے کے سامنے ہماری کار دیکھ کر فرار ہو گیا تھا۔ میں جبکہ گاڑی روک کر دیش کھ کی سرخ کار کے

بارے میں پوچھتا رہا اور بالآخر ہم سرے نکل کر کالھ گوام کی طرف جانے والی شاہراہ پر نکل آئے کالھ گوام نیپال کی سرحد کی طرف ایک بڑا قصبہ تھا۔ وہاں سے ایک سڑک نیپال کی سرحد کی طرف اور ایک سڑک رامپور اور بریلی وغیرہ کی طرف چلی گئی تھی۔

اس پختہ شاہراہ پر آتے ہی میں کار کی رفتار بڑھا چلا گیا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ نین ٹال بیچتے ہی میں نے کار کی نیکی فل کروالی تھی اور اب مجھے پیٹریول کی بھی فکر نہیں تھی۔

اس شاہراہ پر تقریباً بیس میل کا فاصلہ ہو چکا تھا اور پھر مجھے دیش کھ کی کار نظر آئی۔ وہ سرخ کار ایک موڑ لے کر پہاڑی کے دوسری طرف چلی گئی تھی۔ راست آگے بڑھتی خطرناک تھا۔ جبکہ ایک اچھے موڑ پر تھیں مگر ایسی ہی بدتر ہیر کا دیاؤ بڑھانا چلا گیا۔

سرخ کار ایک بار پھر نظر آئی۔ فاصلہ بتدریج کم ہوا تھا اور پھر یہ فاصلہ پچاس گز کے قریب رہ گیا اور اس وقت میں نے پران کو کار کی کھڑکی سے باہر جھٹکے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پیٹریول تھا اور دوسرے ہی لمحے اس کا پیٹریول شلے آگئے۔

پہلی گولی میرے اور بلا کے درمیان وینڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ بلا چیختی ہوئی پیچھے جگ لگی۔ دوسری گولی نے بھی بلا کے سامنے وینڈ اسکرین میں سوراخ کیا تھا۔ اگر بلا سیٹ پر نہ جھٹکتی تو یہ گولی وینڈ شیلڈ میں سوراخ کرنے کے بعد بلا کی پیشانی میں بھی سوراخ کر دیتی۔

سڑک کے ایک طرف عمودی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف ڈھلان تھی۔ یہ ڈھلان اگرچہ زیادہ خطرناک نہیں تھی لیکن نیچے بہت دور پھیلی ہوئی وادی تک چلی گئی تھی۔

ایک اور گولی کار کے فینڈر پر لگی۔ میں نے پران کے بغیر ایکسیلی ریڈر پر ہیر کا دیاؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اچانک زوردار دھماکا ہوا اور کار لرز گئی۔ اس مرتبہ گولی اگلے ہانڈ پر لگی تھی۔ اور ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ کار بری طرح لہرائی گئی۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا اور وہ سڑک سے جھٹ کر ڈھلان پر اترنے لگی۔

ڈھلان پینتالیس یا پچاس کے زاویے پر تھی۔ کار کی رفتار میلوں دور تک چلی گئی تھی۔ ڈھلان پر آتے ہی کار کے بھی ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ ایک دم تیز لگنے سے کار کے الٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ بلا بری طرح چڑی تھی اور میں آہستہ آہستہ بریک لگاتے ہوئے کار کو سنبھالنے کی کوشش

کر رہا تھا اور بالآخر تقریباً دو سو گز نیچے آکر میں کار کو بھاڑیوں میں روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

”پچھ آؤ۔ جلدی کرو۔“ میں چیخا۔ بلا نے روانہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ میں نے ہینڈ بریک بھی لگا دیے اور کار کا روانہ کھول کر آہستگی سے نیچے اتر آیا۔ میرا خیال تھا کہ کار پھر ڈھلان پر لڑھکنے لگے گی مگر اس کے پیچھے بھاڑیوں میں پھنس گئے تھے۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ سرخ کار بہت دور چٹانوں کے ساتھ ساتھ سڑک پر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور پھر وہ ایک موڑ گھوم کر لگا ہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں مگر سانس لے کر بلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا ہو رہا تھا۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپانے لگا اور پھر اسے الگ ہٹا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

صورت حال نہایت تشویش ناک تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ڈھلان زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ اگر ڈھلان عمودی ہوتی تو کار کے پرے نیچے اتر جاتے اور ہمارا بھی خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

کار میں اسٹینپن نہیں تھی۔ ہوتی بھی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کار کو اس پڑھائی پر ڈرائیو کرتے ہوئے تقریباً دو سو گز اوپر لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کار کا اور ہمارا ساتھ نہیں نکلا تھا۔ میں نے تھملا اور کمبل نکال لیے اور پھر ہم دونوں پڑھائی چڑھنے لگے۔

مجھے دیش کھ کے نکل جانے کا بہت افسوس تھا۔ شومہا بھی اس کے ساتھ تھی۔ المورا والے بنگلے تک تو میں نے خود لکھا تھا کہ اسے بے ہوش رکھا گیا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش نا ہوگی لیکن کس حال میں؟ کاش! میں دیش کھ کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔

خنجر کی پڑھائی پر چڑھنا خاصا دشوار کام تھا۔ بلا ہانپ رہی تھی۔ اس کا پیڑ بار بار بہت جاگتا۔ میں نے تھملا بھی ٹھہرے سے لٹکایا ہوا تھا اور دونوں کمبل بھی اٹھا رکھے تھے۔

بہت قریب ایک گھنٹے میں سڑک پر پہنچے تھے۔ بلا ایک فٹ سے نیچے لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں اس کی قریب ہی بیٹھ گیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو پہاڑوں میں پھنسی ہوئی وہ کار ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

”کیا ہم سارا دن یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس دیرانے بلا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ پختہ اور بڑی سڑک ہے۔ یہاں بسوں کی آمد و رفت بھی ضرور ہوگی۔“ میں نے سڑک پر دونوں طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہمیں انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی بس یا کوئی اور گاڑی یہاں سے ضرور گزرے گی۔“

اور پھر ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بیس پینٹس منٹ بعد فضا میں موٹر کے انجن کی گر گر کر کی آواز سنائی دینے لگی اور تھوڑی دیر بعد ہی نین ٹال کی طرف سے آنے والی ایک بس پہاڑی کا موڑ گھوم کر سامنے آئی۔ میں سڑک کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ بس مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔

یہ بس کالھ گوام جاری تھی اور اس میں کئی سیٹیں خالی تھیں۔ ہم بس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور اور بس کے کئی مسافروں نے شیب میں ہماری کار کو دیکھ لیا تھا۔ کند کڑنے اس حوالے سے پوچھا بھی تھا۔

”ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”کار سنبھلی نہیں اور ڈھلان پر اترتی چلی گئی۔ بڑی مشکل سے دور جا کر اسے روکنے میں کامیاب ہو سکا۔ کار سے تو اب ہاتھ دھوئے ہی پڑے ہیں۔ شکر ہے ہماری جانیں بچ گئیں۔“

میں نے کالھ گوام کے ٹکٹ لے لیے۔ ہمارے ساتھ والی سیٹ پر ایک لمبا ترنگا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سانولی رنگت اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ وہ خاصا اسارت اور خوب رو

**ایک شاطر کی زندگی کا سلسلہ**

**شاطر**

پہلی کتاب 50 روپے | دوسری کتاب 23 روپے

**کتابیں شاطر کی زندگی کے بارے میں**

- شاطر کو شہر اور انعام یافتہ مصنف کیلئے انعام نے اپنے خاص اعداد میں تحریر کیا ہے۔
- ایک ایسی دلچسپ بنگلہ آراؤشی نیز داستان جس میں قدیم اندک سچس اور طرطر قیامت آرائی ہے۔

کتاب کی قیمت بذریعہ چیک وارفٹ  
مٹی آؤری لائنڈ چیک رسالہ دیکھیں

**کتابیات بلا کی شاپ**

74200



آدمی تھا۔ اس نے گرے کھر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔ وہ مشتبہ نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی بلا کی طرف اور پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ جس طرح مجھ سے سوالات کر رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ اس کا تعلق پولیس ہی سے ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ بلا میری چتی ہے۔ اپنا نام میں نے ہمت سنگھ ہی بتایا تھا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ہماری شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی اور ہم تین ہفتے پہلے سیرو تفریح کے لیے نکلے تھے کہ آج یہ حادثہ پیش آگیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میری باتوں سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ کرید کرید کر پوچھتا رہا اور میں مناسب جواب دیتا رہا۔

بس پہاڑوں میں آباد مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رکتی ہوئی کاٹھ گودام پہنچ گئی۔

میں بس سے اتر کر بلا کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ میں جگہ جگہ لوگوں سے سرخ کار کے بارے میں بھی پوچھتا رہا اور بالآخر ایک پیٹرول پمپ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی وہ کار جس میں پچھلی سیٹ پر ایک بیمار عورت بھی بڑی تھی، نیپال کی سرحد پر واقع تنک پور نامی گاؤں کی طرف گئی ہے۔ میں نے دیش مکھ اور شو بھاگے چلے پائے تو پیٹرول پمپ کے سروس بوائے نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس کار میں اس نے پیٹرول بھرا تھا۔

تنک پور یہاں سے چونٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا لیکن نیپال کی سرحد سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تنک پور ایک چھوٹی بستی تھی۔ کاٹھ گودام سے تنک پور کے لیے صرف دو بمیں چلتی تھیں۔ ایک صبح آٹھ بجے اور دوسری دوپہر دو بجے۔ دوسری بس آدھا گھنٹا پہلے نکل چکی تھی۔ اس وقت ڈھانی بج رہے تھے۔ ہمیں اس سڑک پر لفٹ ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور ایک رہائشی ہوٹل میں آگئے۔ نہایت گھٹیا ہوٹل تھا۔ کمرے مرغی کے ڈبوں کی طرح چھوٹے تھے۔ سنگل بیڈ کے کمرے کا کرایہ بھی ڈبل بیڈ کے برابر وصول کیا گیا۔ بہر حال، ہماری مجبوری تھی۔ ہمیں آج کا دن اور رات گزارنی تھی۔ یہاں بھی میں نے بلا کو اپنی چتی ہی بتلایا تھا۔

بلا کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر پر گر گئی۔ میں نے

دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں ایک چھوٹی پٹائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے تھیلا اور کبل ایک کرسی پر رکھ دیے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بلا سوچکی تھی۔ میں بھی کرسی پر بیٹھ بیٹھے اونگھنے لگا۔ ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ کرسیوں اور بیڈ کے درمیان فرش پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں کبل بچھا کر سو جاتا۔ یوں بھی فرش اتنا گندہ تھا کہ کبل بچھانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ نیند بڑی شدت سے آرہی تھی۔ میرے لیے کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر میں کرسی سے اٹھ کر بلا کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے دوسری طرف کمرے کے لے لی اور آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔



دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹوٹے ہوئے پہلے بجلی کا سوئچ آن کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی دوران دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ میں نے اوپر کی کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کے بیروں کو دیکھ کر میرا دماغ بھٹا گیا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”کیوں اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہے ہو۔“

”سرکار۔ دو گھنٹوں میں چھ بار دروازہ بجایا ہوں۔“ ڈیڑھ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا ”سیٹھ بولا ایک بار اور کوئس کرو پھر پولیس کو بلاؤ۔ سرکار۔ ادھر لوگ آتا ہے نہ کر کے سوتا ہے تو پھر اس کا لاس اٹھانا پڑتا ہے۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”نام کیا ہوا ہے؟“

”آٹھ بجے نا سرکار۔“ میرے نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ سیٹھ کو بولو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور ہاتھ روم کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ ادھر۔ آخر میں۔“ ڈیڑھ نے راہداری میں ایک طرف اشارہ کر دیا پھر بولا ”چائے دوائے پینے کا ہے یا نہیں۔“

”میں بتا دوں گا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سننا بہت ہو رہی تھی جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ ہم تین بجے اس کمرے میں آئے تھے اور ایسے غافل ہو کر سوئے تھے کہ کسی

مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں تم۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ اٹھنے والے کب مجھے کہاں لے جائیں گے۔“ بلا نے میری بات کاٹ دی ”آئندہ مجھے واپس جانے کے لیے مت کہنا۔ میں نے تمہیں اپنا جیون ساتھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”تم تو سیریس ہو گئیں۔“ میں نے اسے گھورا۔

”تم بھی تو ہر جگہ مجھے اپنی چتی بتا رہے ہو۔“ وہ مسکرا دی۔

”اس لیے کہ لوگ ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ کر سکیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے یہ سمبندھ (تعلق) اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ سدا رہے تو۔“

”اگر تمہارے قبیل کے لوگوں کو پتا چل گیا تو ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بغل میں لیے گھوم رہا ہے تو جانتی ہو کیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اس بات کو طول نہیں دیتا چاہتا تھا۔ اسی لیے موضوع بدل دیا۔ ایک دکان سے میں نے کچھ پھل خریدے اور ہم ہوٹل واپس آگئے۔“

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں اس لیے تڑنگے فحش کو استقبال کاؤنٹر کے سامنے کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ جو بس میں بھی مجھ سے اٹنے سیدھے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس نے اس وقت بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ رشی کیش جانے سے پہلے ہردوار میں میرے ہاتھوں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند میل دور پہاڑوں میں واقع مندر سے پنڈت پرگیا راج ایک

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

پترا پریم کے جٹے ہوئے کا بیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور پترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند

اور پجاری اور پترا پریم کی لاشیں بھی مل گئی تھیں اور پولیس کو ہمارے آگ میں جل کر مرجانے کے حوالے سے ہمارے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا اور پھر تین چار روز پہلے بھی ہردوار میں رادھن بد معاش اور اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خفیہ پولیس کا یہ لبا ترنگا آدمی میری ہی تلاش میں نکلا ہو اور اتفاق سے میں اس کی نظروں میں آگیا۔ شاید وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میرے بارے میں تصدیق کر لینا چاہتا تھا اور اس وقت ہوٹل کے نیچر مالک سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بلا کے چہرے پر بھی میں نے تشویش کے آثار دیکھے تھے۔

”تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا۔“ بلا نے سرگرمی سے سب سے

میں کہا ”وہی جو ہمیں بس میں ملا تھا اور اوٹ پناہگ باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں بھی تھا۔ جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور اب یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ پولیس کا آدمی ہے۔“

”مجھے بھی اس پر یہی شبہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہاں سے بھاگنے کی کوئی کوشش بے کار ہوگی۔ ہمیں بہر حال محتاط رہنا پڑے گا۔“

میرا خیال تھا کہ وہ شخص ہمارے کمرے تک آنے کی کوشش کرے گا۔ اٹنے سیدھے سوالات کر کے ہمارے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میں نے خنجر نکال کر ایک سیب کاٹا اور دو ٹکڑے بلا کی طرف بڑھا دیے۔ بلا بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور میں کرسی پر پھل کھاتے اور مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔

اس رات بلا بھی دیر تک جاگتی رہی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ رات کو کسی وقت ہمیں گھیرنے کی کوشش جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت دھیرے دھیرے گزر رہا۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے



آدی تھا۔ اس نے گرے کھر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔ وہ مشتبہ نظروں سے کبھی میری طرف دیکھا اور کبھی ہلاک کی طرف اور پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ جس طرح مجھ سے سوالات کر رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ اس کا تعلق پولیس ہی سے ہے۔

و روازہ بند کر دیا۔ کمرے میں ایک چھوٹی سی تپائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے پھیلا اور کبل ایک کرسی پر رکھ دیے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں تم۔"

اور بچاری اور چڑا پریم کی لاشیں بھی مل گئی تھیں اور پولیس کو ہمارے آگ میں جل کر مرنے والے کے خوالے سے ہمارے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا اور پھر تین چار روز پہلے بھی ہر دو آدمیوں میں راہنہ بدعاش اور اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خفیہ پولیس کا یہ لمبا زنگا آدمی میری ہی تلاش میں نکلا ہو اور اتفاق سے میں اس کی نظروں میں آگیا۔ شاید وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میرے بارے میں تصدیق کر لیتا چاہتا تھا اور اس وقت ہوئی کہ شجریا مالک سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

❖ اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں ❖  
جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

جاسوسی ڈراما گھسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

# آتش افشان



6

فیصل آباد کا تہلکہ خیز سلسلہ  
جاسوسی ڈراما گھسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ  
آتش افشان



# آتش فشان

نظم و تم کے شعلوں میں جلنے والے ایک محصور ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

راوی: وجدان علی تحریر: اقبال کاظمی

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینہ میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشان کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر حرکت اس کے لئے نئے نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ یہ رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا گناہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے دیانتہ میں ڈھلنے والی تھی۔

اس فشانے پر طبع کا جمال جو اپنا کئی آدمیوں کی زندگی بچاتا ہے

کمرے تھے اور ایک سائے کو میں نے دوسرے کمرے کے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ لیکن میری چھٹی حس مسلسل مجھے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر اتفاق سے اس وقت ہوٹل کا کوئی مہمان اپنے کمرے سے نکل آئے تو مجھے یہاں کھڑے دیکھ کر کیا سوچے گا۔ ہو سکتا ہے وہ چور چور کا شور مچاتے ہوئے مجھ سے لپٹ جائے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کمرے سے اٹھاؤ اور غراہٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ صورت حال کا اندازہ لگانے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بھڑکی سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی تو اندر سے کوئی شخص دھڑ سے دروازے سے نکلا۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

اندر سے مار پیٹ اور غراہٹوں کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔

کمرے کے اندر کا منظر بڑا سنسنی خیز اور خوفناک تھا۔ دو آدمی جن کے چہروں پر شائبہ لگے ہوئے تھے ایک آدمی کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور بچنے والے اس آدمی کو دیکھ کر میرے دماغ میں سنسنی ہی ہونے لگی۔ یہ وہی لمبا ترنگا آدمی تھا جس پر مجھے پولیس والا ہونے کا شبہ تھا۔ وہ سیلینگ سوٹ میں تھا۔

اچانک ایک آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے سامنے کی راہداری میں کوئی بیز کر رہی ہو۔ میں نے اٹھ کر آہٹ کی سے دروازہ کھولا اور باہر جھانک لگا۔

راہداری میں بائیں طرف بدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور دائیں طرف جس طرف ہاتھ روم تھا، ایک کھلا آلتا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی انسانی بیولا بڑی تیزی سے ہاتھ روم میں گھسا ہو۔

ہو سکتا ہے وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا کوئی ایسا شخص ہو جسے اس وقت ہاتھ روم میں جانے کی ضرورت پیش آگئی ہو اور راہداری میں رکھا ہوا کھلا اس کے پیر کی ٹھوک سے گر گیا ہو لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ میں نے آہٹ کی سے دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس قسم کے چھوٹے ہوٹلوں میں چوری کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ایک منٹ بعد میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ایک سایہ ہاتھ روم کے قریب راہداری میں دائیں طرف مڑنا نظر آیا۔ اس طرف بھی چند کمرے تھے۔

میرے شک کو تقویت مل رہی تھی۔ کسی جگہ کسی گڑبڑ کے آثار نظر آئیں اور میں خاموش بیٹھا رہوں؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے سے باہر آگیا اور دروازہ بند کر کے آہٹ کی سے باہر سے کنڈا لگا دیا اور دے قدموں ہاتھ روم کی طرف چلنے لگا۔ راہداری کے موڑ پر پہنچ کر میں رکاوٹ جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس راہداری میں بھی

ایک نقاب پوش کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ بار بار حملے کر رہا تھا۔ سلیپنگ سوٹ والا دروازہ قامت آدمی نہ صرف دوسرے نقاب پوش سے منہ رہا تھا بلکہ خنجر کے حملوں سے بھی بچ رہا تھا۔

لبے قد والے پر اگرچہ مجھے شبہ تھا کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے لیکن اس سے مجھے اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور اس وقت وہ جس خطرناک صورت حال سے دوچار تھا، میری ہمدردی کا مستحق تھا۔

خنجر والے نقاب پوش نے ایک بار پھر حملہ کرنے کے لیے ہاتھ اڑھا دیا۔ میں نے لپک کر اسے گرفت میں لے لیا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ اوپر ہی اٹھا رہا گیا۔ میں نے اسے گھما کر چھوڑ دیا۔ وہ کرسی سے گر کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ کرسی کی پشت اور سیٹ کے درمیانی خلا میں چلا گیا۔ میں نے اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اس طرح جھٹکے لگنے سے اس کا چہرہ بار بار کرسی سے ٹکرا رہا تھا۔

میں نے اس کے بازو کو موڑا تو خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ میں خنجر اٹھانے کے لیے جیسے ہی جھکا اس شخص نے اٹنے کے ہاتھ سے زوردار گھونسا میری گردن پر رسید کر دیا۔ میرے منہ سے کراہی نکل گئی اور میں مزید نیچے جھٹکا چلا گیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میری گرفت سے چھوٹ گیا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اس شخص نے میری گردن سے ذرا نیچے شولڈر بلینڈز کے درمیان ربڑ کی بڈی پر ایک اور زوردار گھونسا جڑا۔ یہ ضرب ہتھوڑے کی طرح دہنی تھی لیکن میں اس وار کو برداشت کر گیا اور بڑی تیزی سے پلٹ کر اپنے حریف پر حملہ آور ہوا اور اسے گھولنے مارا ہوا دوسری دیوار تک لے گیا۔

اور پھر اسی لمحے کمرافٹری آواز سے گونج اٹھا۔ میرے ہاتھ رک گئے۔ میرا حریف بھی ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سلیپنگ سوٹ والے لمبے ترنگے آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا نقاب پوش حریف لڑکھڑاتا ہوا بیڈ کے دوسری طرف ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے پر عین دل کے مقام سے شرت پر خون کا دھبا نمودار ہو کر پھیلا چلا گیا تھا۔

میرے حریف نے یہ صورت حال دیکھی تو باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے ساتھ لیتا ہوا دروازے سے باہر راہداری میں گرا۔ سلیپنگ سوٹ والا بھی چھلانگ لگا کر کمرے سے باہر

آگیا اور نقاب پوش پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ "ہمت سنگھ! چھوڑ دو اسے۔ اب یہ کہیں نہیں جائے گا۔" سلیپنگ سوٹ والے نے کہا اور پھر نقاب پوش کو مخاطب کرتے ہوئے غرایا "اٹھ کر دیواری کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔"

میں اس نقاب پوش کو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور پھر اسی وقت دھڑا دھڑ مختلف کمروں کے دروازے کھلنے لگے۔ پورے ہوٹل میں شور مچا گیا۔ لوگ اس راہداری میں جمع ہونے لگے۔ ہوٹل کا نیچر بھی آنکھیں ملتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"کیا ہوا؟ یہ گولی کیسے چلی تھی اور؟" وہ آگے بڑھا تو صورت حال دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ "پولیس کو فون کرو نیچر۔ کہنا یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔ فوراً پہنچیں۔" سلیپنگ سوٹ والے نے کہا۔ "قتل۔ قتل۔" نیچر بھلا گیا "کون قتل ہوا۔ لاش کہاں ہے؟"

"لاش کمرے میں ہے۔ تم جا کر پولیس کو فون کر دو۔" اس شخص نے کہا۔ نیچر واپس بھاگ گیا۔ قتل کا سن کر وہاں جمع ہونے والے لوگ بھی اپنے اپنے کمروں کا رخ کرنے لگے۔ سلیپنگ سوٹ والے نے نقاب پوش کی تلاشی لی اور اسے ہٹکیتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

"ہمت سنگھ! اس کا نقاب اتار دو اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دو۔" وہ شخص بولا۔

میں نے ایک اونٹنی غلام کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے چہرے پر وہ نقاب دراصل ایک موزہ تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے موزہ اس کے سر پر سے کھینچ لیا اور اس سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

"دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور ہٹنے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔" سلیپنگ سوٹ والے نے اسے زوردار ٹھوکہ مارتے ہوئے کہا اور وہ بیٹھا ہوا دیوار کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے تھے۔

"تمہارا ٹھکانہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ہمت سنگھ۔" سلیپنگ سوٹ والا میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اگر تم بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیتے۔" "قتل۔ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" میں نے

پوچھا۔ "ہمت شاید بھول گئے ہو کہ میں تم لوگوں کے ساتھ بس میں سفر کر چکا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تمہاری جتنی نے تمہیں کئی بار اس نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام میرے لیے غیر معمولی تھا۔ اس کے مجھے یاد رہا۔ ویسے تمہاری جتنی۔"

"وہ کمرے میں ہے اور میں نے دروازے کو باہر سے سنا لگا رہا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "گولی کی آواز اور شور اس نے بھی سنا ہو گا۔ وہ ضرور پریشان ہو رہی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس نے کہا "میں اس معاملے سے منہ کر تم سے ملوں گا۔ ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں کمرے سے باہر آگیا۔ راہداری میں اب بھی کئی لوگ جمع تھے۔ ایک دو آدمیوں نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن میں جواب دیے بغیر تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اس شخص نے کہا تھا کہ اس معاملے سے منہ کر رہی تھی مجھ سے ملاقات کرے گا لیکن مجھے یقین تھا کہ پولیس اسے قتل کے الزام میں دھر لے گی اور اس کے بعد شاید وہ اپنے وکیل سے بھی ملاقات کر سکے گا تو حالات کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر۔

بلا جاگ رہی تھی اور خاصی پریشان تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر میری طرف نکلی۔

"کیا ہوا؟ فائز کی آواز کیسی تھی اور تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔ "وہ نقاب پوشوں نے اس شخص کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جس پر ہمیں بھی شبہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا؟" بلا اچھل پڑی "اس ہوٹل میں۔ وہ اس وقت یہاں کیا کر رہا تھا۔"

"وہ اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔" میں نے کہا "ہم تو تین بجے اپنے کمرے میں بند ہو کر سو گئے تھے اور رات آٹھ بجے میرے نے ہمیں جگایا تھا پھر ہم باہر چلے گئے تھے۔ اسے اس ریوٹنٹ میں بھی دیکھا جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور پھر اس ہوٹل کے استقبال کاؤنٹر پر بھی۔ اگر ہم پانچ گھنٹے سوکر وقت ضائع نہ کرتے تو ہمیں پتا چل جاتا کہ وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ بہر حال۔" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟" بلا میرے خاموش

ہونے پر پولی "کیوں گئے تھے مجھے چھوڑ کے۔" "جنس کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میرا کسی معاملے میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ایک خطرناک صورت حال دیکھ کر اپنے آپ کو روک بھی نہیں سکا۔"

ہماری باتیں جاری تھیں۔ ہوٹل میں لوگوں کے آنے جانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی اُدھا گھٹنا بھی نہیں گزرا تھا کہ پولیس آگئی۔ میں بھی سارا کودروازہ اندر سے بند کر لینے کی ہدایت دیتا ہوا کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف چل دیا۔

نصف درجن مسلح پولیس والے تھے۔ جنہوں نے لوگوں کو دور ہٹا دیا تھا۔ مجھے بھی روک لیا گیا لیکن سلیپنگ سوٹ والے نے مجھے دیکھ کر آگے بلا لیا۔

اس نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر پولیس انسپکٹر کو دے دیا۔ انسپکٹر نے کارڈ دیکھا اور کھٹ سے سلیوٹ بھاڑ دیا۔ اس کے ماتحتوں نے بھی ایڑیاں بجا دیں اور رانٹلیں جھکائیں۔ میرا خیال تھا کہ پولیس آتی ہے ای سے ہتھکڑی پٹنا دے گی لیکن پولیس والے تو اسے سلیوٹ کر رہے تھے۔

"ہمت سنگھ!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم اپنے کمرے میں چلو۔ میں فارغ ہو کر وہاں آتا ہوں پھر آرام سے بات کریں گے۔"

میرا خیال تھا کہ مجھے گواہی وغیرہ کے لیے روکا جائے گا میرا بیان لیا جائے گا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

پولیس والے اپنی کارروائی مکمل کر کے لاش اٹھا کر لے گئے۔ چڑے جانے والے نقاب پوش کو بھی پولیس ہتھکڑی لگا کر لے گئی تھی۔ اس وقت چار بج چکے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہی شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اظہارِ قاسے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔ بلا بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر سمت گئی اس نے کبیل اچھی طرح اڈھ لیا تھا۔ میں اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گیا اور اس شخص کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کر دی۔

اس کے بارے میں میرا کم از کم یہ شبہ درست نکلا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے تھا لیکن دوسرے شبہات غلط ثابت ہوئے کہ وہ ہماری نگرانی کر رہا ہے۔ وہ سی لی آئی کا آفیسر اعظم خان تھا۔ اس کا عہدہ اگرچہ انسپکٹر تھا لیکن آفیسر آن اسٹیشن ڈیوٹی پر ہونے کی وجہ سے اسے بے پناہ اختیارات حاصل تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس کا کارڈ دیکھ کر اس کا ہم

رتبہ انسپکٹر اسے سلیوٹ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔  
اعظم خان ہمارے کمرے میں آنے سے پہلے منیجر کو  
چائے کے لیے کہہ کر آیا تھا۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ بعد  
چائے بھی آگئی۔ چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ  
بھی جاری رہا۔

انسپکٹر اعظم خان کی کمائی بڑی دلچسپ تھی۔ وہ بیس سال  
کی عمر میں کانٹینبل کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔  
ساتھ ہی اس نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور پرائیویٹ  
امتحان دے کر تعلیمی میدان میں بھی آگے بڑھتا رہا۔

وہ ایک ذستے دار، فرض شناس اور دلیر پولیس اہلکار  
ثابت ہوا تھا۔ انہی صفات کی بنا پر وہ ترقی بھی کرتا رہا اور  
بالآخر وہ انسپکٹر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ وہ ماسٹرز کرنے کے بعد  
کرنٹلواٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر چکا تھا۔ وہ  
جراثیم پیشہ افراد کی نفسیات سے خوب واقف تھا اور مشکل  
سے مشکل کیس کو حل کرینے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔

اسے تین مرتبہ انسپکٹر سے اوپر کے عہدے پر ترقی دی  
گئی لیکن اس نے ہر مرتبہ یہ ترقی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔  
اس کا موقف تھا کہ وہ دفتر میں بیٹھ کر کوئی کام نہیں کر سکے گا۔  
اس کی صلاحیتوں کو ذمہ لگ جائے گا۔

اعظم خان کو سی بی آئی میں بھیج دیا گیا اور او ایس ڈی  
بنا کر اس کے اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس نے اپنی  
ذہانت اور دلیری کے بل بوتے پر کئی اہم ترین کیس حاصل  
کیے تھے۔ سی بی آئی میں خدمات انجام دیتے ہوئے اس کا  
واسطہ ایسے سیاست دانوں سے بھی پڑا تھا جو کرپشن کی دلدل  
میں دھنسے ہوئے تھے۔ اسے دھمکیاں بھی دی گئیں۔ سیاسی  
دباؤ بھی ڈالا گیا لیکن وہ نہ تو دھمکیوں سے مرعوب ہوا اور نہ  
ہی کسی دباؤ میں آیا۔ ملک کے جس حصے میں اس کی ضرورت  
ہوتی اسے وہاں بھیج دیا جاتا اور وہ ہمیشہ ہی سرخ رو ہوا۔

کچھ عرصے پہلے حکومت کو اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع  
ملی تھی کہ گھنٹوں میں ایک ایسے جراثیم پیشہ گروہ کی سرگرمیاں  
بڑھ رہی ہیں جو نیپال میں سیاسی انتشار پیدا کر کے ہندوستان  
اور نیپال کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس گروہ  
کو بانگ کانگ کی خوفناک مافیا تنظیم تریاڈ کی حمایت بھی  
حاصل ہے۔ تریاڈ (TRIAD) کی تنظیم دراصل نیپال کے  
بعض علاقوں میں افیون کی کاشت پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتی  
تھی۔

اس جراثیم پیشہ گروہ کا منصوبہ یہ تھا کہ افرا تقری پیدا  
کر کے دونوں ملکوں کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کیا جائے۔ اس

طرح ان لوگوں کو یہاں قدم جمائے کا موقع مل جائے گا۔ وہ  
گروہ اپنے آدمی سیاست میں داخل کر دے گا۔ اس منصوبے  
میں بعض سیاسی شخصیات کا قتل بھی شامل تھا۔ ان میں نیپال  
کے علاوہ ہندوستان کی بعض سیاسی شخصیات کے نام بھی شامل  
تھے جو وقتاً فوقتاً ذاتی یا سرکاری دعووں پر نیپال جاتے رہتے  
تھے۔

انسپکٹر اعظم خان ان دنوں چند ہی گڑھ میں تعینات تھا۔  
اسے اسی گروہ کا سراغ لگانے کے لیے گھنٹوں جانے کے  
احکامات دے دیے گئے۔ نیپال کی پولیس کو بھی اس سے  
تعاون کے احکامات مل چکے تھے۔

انسپکٹر اعظم خان اگر چاہتا تو چند ہی گڑھ سے دہلی جاتا  
اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر گھنٹوں پہنچ جاتا لیکن رازداری  
کے خیال سے اس نے سفر کا دو سرا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ  
چندی گڑھ سے بذریعہ ٹرین انبالہ سے ہوتا ہوا سہارن پور آیا  
تھا اور اس سے آگے بسوں کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اسے تنگ  
پور سے سرحد پار کر کے نیپال میں داخل ہونا تھا۔ سرحد پار  
کر کے بھی اسے ایکسٹول میل کا سفر بیسوں کے ذریعے ہی طے  
کرنا تھا۔

اس کے پروگرام اور دوا بھگی کو اگرچہ رازداری میں  
رکھا گیا تھا لیکن دشمنوں کو کسی طرح بتا چل گیا تھا اور اسے  
سرحد پار کرنے سے پہلے ہی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی  
لیکن میری مداخلت سے نہ صرف اعظم خان کی جان بچ گئی تھی  
بلکہ اس کا ایک دشمن مارا گیا تھا اور دوسرا پکڑا گیا تھا جس  
سے وہ بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔

”تم نے نہ صرف میری جان بچائی بلکہ ہندو سرکار پر بھی  
بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا ”میں ذاتی طور پر تو  
شاید اس کا بدلہ نہ آتا مگر سکون لیکن کوشش کروں گا کہ  
ہندو سرکار سے تمہارے لیے کچھ۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ  
دی۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہا تھا کہ میرے ہاتھ خون سے  
رنگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں درجنوں آدمی میرے ہاتھوں  
مارے جا چکے ہیں۔ اگر وہ میری اصلیت جان لیتا تو شاید میرا  
انتا احسان مند نہ ہوتا بلکہ مجھے جیل کی سلاخوں کے چبچبے پہنچا  
کر خوشی محسوس کرتا۔

”تمک ہے۔“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا ”میں نے تو  
تمہیں اپنا دشمن سمجھ کر اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اب  
تم بھی کچھ بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بیٹی ہے اور تم نے اپنے  
بارے میں جو کچھ بتایا وہ درست ہے؟“

میں اچھل پڑا۔ بلا بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔  
”بس میں تم سے ملاقات ہوئی تھی تو مجھے شک ہو گیا تھا  
کہ تمہارا تعلق پولیس یا کسی ایجنسی سے ہے اور میرا یہ شبہ  
درست نکلا۔“ میں نے کہا ”اور تم نے ہمارے بارے میں جو  
اندازہ لگایا ہے وہ بھی درست ہے۔ بلا میری بیٹی نہیں  
دوست ہے۔“

”دوست!“ وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی بلا کو دیکھنے  
لگا ”میرا خیال ہے یہ دوستی کچھ زیادہ ہی گہری نہیں؟“  
”متم غلط سمجھ رہے ہو۔ بلا میری دوست ہے، رکھیل  
نہیں اور نہ ہی میں اسے بھگا کر لایا ہوں۔ یہ بچے پور کے ایک  
بہت بڑے اور مشہور پنڈت رام سروپ کی بیٹی ہے اور ہم  
سرو تفریح کے لیے نہیں ایک مشن پر نکلے ہوئے ہیں اور  
جب تک یہ مشن پورا نہیں ہوتا ہم چین سے نہیں بیٹھیں  
گئے۔“

”کیا میں اس مشن کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔“  
اعظم خان نے کہا۔

”وہ مشن۔“ میں نے بلا کی طرف دیکھا اور پھر اعظم  
خان کی طرف رخ کر کے بات جاری رکھی ”بچے پور کا ایک  
بد معاش ایم بی بلا کی بہن کو اغوا کر کے بھاگا ہوا ہے۔ ہم  
اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ نئی نال میں وہ ہمارے ہاتھ آتے  
آتے رہ گیا تھا۔ یہاں اگر پتا چلا کہ وہ تنگ پور کی طرف نکل  
گیا ہے ہمیں بس نہیں مل سکی جس وجہ سے ہمیں رات  
یہاں رہنا پڑا۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ نیپال کی طرف جانے کا  
ارادہ رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے کچھ مشکلیں  
پیدا ہو سکتی ہیں لیکن ہم اس شیطاں کا پیچھا نہیں چھوڑیں  
گے۔“

”بچے پور کا ایم بی۔“ اعظم خان بڑبڑایا ”تم دیش کھ کی  
بات تو نہیں کر رہے؟“

”ہاں دی۔“ میں ایک دم بول پڑا ”تم جانتے ہو  
اسے؟“

”دیش کھ کو کون نہیں جانتا۔“ اعظم خان نے گہرا  
سانس لیا ”چند مہینے پہلے مجھے دہلی میں اس کا فائل دیکھنے کا  
موقع ملا تھا۔ سرکار ایسے تمام ایم پیٹرو اور سیاست دانوں پر  
نگاہ رکھے ہوئے ہے جو کرپشن میں ملوث ہیں۔ افسوس کی بات  
یہ ہے کہ ہمارے بیشتر سیاست دان گند کی دلدل میں دھنسے  
ہوئے ہیں اور بعض تو اس معاملے میں بہت بدنام ہیں اور ان  
میں دیش کھ سر فرست ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر  
بولا ”اس کا فائل خاما ختم ہو چکا ہے۔ چند مہینے پہلے کسی

عورت کے حوالے سے اس کا ایک اور اسکینڈل سامنے آیا  
تھا۔ وہ کوئی دولت مند بیوہ ہے جس کے پلاٹ اور دوسری  
جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے یہ اس سے زبردستی شادی کرنا  
چاہتا تھا۔ سرکار اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والی ہے  
اور میرا خیال ہے یہ یہ کیس انسپکٹر گھوسے کو دیا جانے والا  
تھا۔“

”یہ دولت مند بیوہ دی ہے جسے وہ رشی کشی سے اغوا  
کر کے لے گیا ہے۔ یعنی بلا کی دیدی۔“ میں نے کہا۔ میرے  
اس انکشاف پر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے اسے  
شوہا کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو ضروری سمجھا۔ اس  
میں کچھ مبالغہ اور جھوٹ بھی شامل تھا لیکن انسپکٹر اعظم خان  
ایک گھاگ آدمی تھا۔ وہ اس کیس کے بارے میں بہت کچھ  
جانتا تھا اور اس نے میرا ایک جھوٹ پکڑ لیا تھا۔

”تم نے بتایا تھا کہ بلا پنڈت رام سروپ کی بیٹی ہے۔“  
وہ بولا ”اس طرح یہ شوہا کی بہن تو نہیں ہوتی۔ اس کی تو۔“  
”مجھے شوہا دیدی نے ہی پالا ہے۔“ مجھ سے پہلے بلا  
بول پڑی ”شوہا دیدی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنے  
پاس لے گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی سگی بہنوں کی طرح مانتی تھی۔  
میں بھی اسے بہت مانتی ہوں۔ وہ شیطان اگر اسے نیپال کی  
طرف لے گیا تو۔“

”تم فکر مت کرو۔“ اعظم خان نے اس کی بات کاٹ  
دی ”اگر اس نے نیپال کا رخ کیا تو سیدھا گھنٹوں جانے کا اور  
میں جانتا ہوں گھنٹوں میں وہ کہاں ملے گا۔“

”لیکن ہم گھنٹوں کیسے جا سکیں گے ہمارے پاس تو۔“  
”میں ہوں نا۔“ انسپکٹر خان نے میری بات کاٹ دی  
”میں تم لوگوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم نے میری زندگی بچا  
کر مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اس کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا  
لیکن اس معاملے میں تمہاری تھوڑی بہت مدد کر سکتا ہوں اور  
تمہارے کسی کام اگر مجھے خوش ہوگی۔“

ہم ابھی بائیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک کی  
آواز ابھری۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے  
اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک پولیس کانٹینبل کو دیکھ کر  
چونک گیا۔

”کھان صاحب کو ملنے کا ہوں۔“ کانٹینبل نے کہا۔  
میں نے دروازہ کھول دیا۔ کانٹینبل نے اندر داخل ہو کر  
انسپکٹر اعظم خان کو سلیوٹ کیا۔  
”کیا بات ہے کانٹینبل۔“ کیسے آئے ہو۔ اس نے کچھ  
بتایا؟“ اعظم خان نے پوچھا۔

”اس نے آتما ہتیا (خودکشی) کر لیا سرکار۔“ کانٹیل نے جواب دیا۔

”کیا؟“ اعظم خان ایک دم اچھل پڑا۔

”اس کے پاس کوئی زہر ہلا کیسول تھا سر جسے اس نے نگل لیا۔ اس کو بچانے کا بہت کوشش کیا۔ ڈاکٹر کو بلایا مگر وہ مریا۔“ کانٹیل نے بتایا۔

”تم لوگ آرام کرو۔ میں آتا ہوں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے اس سے کچھ معلوم ہونے کی توقع تھی لیکن بہت کمزور ہو گئی۔ بہر حال میں آتا ہوں توڑی دیر میں اور ہم آج ہی کسی وقت تک پورے روانہ ہو جائیں گے۔“ پہلی بس آٹھ بجے روانہ ہوئی ہے یہاں سے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ میں بندوبست کر لوں گا۔“ وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کانٹیل نے مڑ کر بلایا کی طرف دیکھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور بلا کے قریب پلنگ پر لیٹ گیا۔ رات بھر کرسی پر بیٹھے رہنے سے میں تھک گیا تھا اور کچھ دیر لیٹ کر کمر سیدھی کر لیتا چاہتا تھا۔ بلا بھی لیٹ گئی اور کھل اور کھینچ لیا۔ ہم کچھ دیر تک انکیز اعظم خان کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

دروازے پر دستک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بلا بھی جاگ گئی تھی میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ وہی پولیس کانٹیل تھا۔

”کھان صاحب بولا آپ لوگ تیار ہو جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد یہاں سے جانے کا ہے۔“ اس نے میرے کندھے کے اوپر سے کمرے میں بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم تیار ہیں گے۔“ میں نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

اس وقت نو بج رہے تھے۔ آٹھ بجے والی بس تو نکل چکی تھی لیکن انکیز اعظم خان نے کچھ تو انتظام کیا ہی ہو گا۔

ہم نے آٹھ گھنٹے میں تیار کی مکمل کر لی۔ کچھ وقت ناشتے میں لگا۔ میں نے ہوٹل کا بل بھی چکا دیا۔ ہم انکیز اعظم خان کا انتظار کرنے لگے۔ سو اس بجے کے قریب ہوٹل کے ایک ملازم نے آکر بتایا کہ ہمیں لینے کے لیے پولیس کی جیب آچلی ہے۔ ہم اپنے کھل اور کھینچا اٹھا کر باہر آ گئے۔

وہ پولیس کی کھلی جیب تھی۔ اسٹیشنرنگ کے سامنے مقامی پولیس کا وہی انکیز بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر

اعظم خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہی کل والا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ہم نے تو تین چار گھنٹے آرام کر لیا تھا لیکن لگتا تھا کہ خان کو ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

چیچے والی سیٹیں آنے سے سامنے تھیں۔ ایک سیٹ پر دو کانٹیل آٹو ٹیکر رانگھلے سنبالے بیٹھے تھے۔ میں اور بلا سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے اور جیب حرکت میں آ گئی۔

قصبے کی حدود سے نکلنے ہی جیب کی رفتار تیز ہو گئی۔ اعظم خان اپنی سیٹ پر چیچے کی طرف مڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار اس بات پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا کہ پکڑے جانے والے حملہ آور سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور میں اپنی جگہ پر سوچ رہا تھا کہ وہ گروہ کس قدر طاقت ور ہو گا۔ مجھے ایسی باتوں کا تجربہ تھا۔ ایسے ہر گروہ کے چیچے کوئی نہ کوئی بڑی طاقت ضرور ہوتی ہے۔ تھائی لینڈ میں شمشادہ کے خلاف سازش کرنے والے گروہ کو گولڈن ٹرائی انگل کے جنرل کھورات کی پشت پناہی حاصل تھی اور ایسی طاقتیں بلاوجہ کسی گینگ کی پشت پناہی نہیں کرتیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ جنرل کھورات شمشادہ کا تختہ الٹنے کے بعد تھائی لینڈ میں منشیات کی تجارت پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تھائی لینڈ کو راہداری کے طور پر استعمال کر کے وہ

آزادی سے پوری دنیا میں منشیات کا زہر پھیلا سکتا تھا لیکن میں نے ان کا یہ گھناؤنا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا اور نیپال میں تریاؤ نامی تنظیم کسی گروہ کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ اس جرائم پیشہ گروہ کے مقاصد کچھ بھی ہوں لیکن تریاؤ کے عزائم واضح تھے۔ نیپال کے بیشتر اور خصوصاً جنوبی پہاڑی علاقے اور اس سے ملنے ہوئے بھارت کے شمالی علاقے، جن میں کچھ علاقہ بولی کا اور اس کے ساتھ ہماچل پردیش کا علاقہ شامل تھا۔

پوست کی پیداوار کے لیے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ یہاں دنیا کی بہترین آفیون، چرس اور ہیروئن تیار ہوتی تھی۔ نیپال کے علاوہ ان علاقوں کی سرحدیں تبت اور چین سے بھی ملتی تھیں اور تریاؤ انہی علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے نیپال میں افراطی تفری پھیلانے کے لیے اس گروہ کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس جیسی تنظیمیں بے پناہ وسائل کی مالک ہوتی ہیں۔ انکیز اعظم خان کے پروگرام اور روایتی لوگرچہ نہایت خفیہ رکھا گیا تھا لیکن انہوں نے بتا چلایا تھا اور اسے نیپال کی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس پر اس طرح کے مزید حملے بھی ہوں گے۔

یہ سب سیاسی مکمل تھے۔ کوئی دولت سمیٹنے کے پیکر میں تھا، کوئی اپنے گرد طاقت جمع کرنا چاہتا تھا اور کوئی طاقت کے بل بوتے پر اپنے ملک کی سرحدوں کو پھیلانے کے پیکر میں تھا۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اپنے ارد گرد کے حالات سے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں کئی مہینوں سے ہندوستان میں تھا اور یہاں کی سیاست اور یہاں کے حالات سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا۔

یہاں رہتے ہوئے یہ بات میں نے جانی تھی کہ ہندوستان کے حکمران شروع ہی سے اپنے ملک کی سرحدوں کو وسعت دینے کی کوشش میں تھے اور وہ ان کوششوں میں بتدریج کامیابیاں حاصل کرتے رہے تھے اور ان کی یہ گھناؤنی کوششیں اب بھی جاری تھیں۔ انہوں نے طاقت کے بل بوتے پر گوا کی آزاد ریاست پر قبضہ کیا۔ سکم اور بھوٹان پر بڑور طاقت تسلط بنایا۔ ایک طرف آسام اور اور دوسری طرف کشمیر میں نصف صدی سے لڑائی جاری تھی۔ ان دونوں خطوں کے باشندے ہندوستان کے لیے لوے کا پتا بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف نیپال تھا۔ یہاں ہند سرکار کی پالیسی مختلف تھی۔ یہاں دوسری کی آڑ میں پیر پھیلائے جا رہے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہندوستان کا عمل دخل بڑھ رہا تھا۔ معیشت پر تو بھارت کے ہندو مکمل طور پر قابض ہو چکے تھے۔

نیپالی عوام بھارتی حکمرانوں کی اس گھناؤنی سازش سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔ ان میں بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ نیپال کے مختلف شہروں میں بھارت کے خلاف مظاہرہ ہوتے رہتے تھے اور جہاں تک میرا خیال تھا اس وقت بھی کوئی ایسی ہی صورت حال تھی۔ ممکن ہے کوئی نیپالی تنظیم مکمل کر سامنے آگئی ہو۔ بھارت کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور اسے جرائم پیشہ گروہ کا نام دے کر اس کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔ بہر حال، صورت حال کچھ بھی ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو دلش مکھ کی تلاش تھی اور اتفاق سے اعظم خان سے ملاقات ہو گئی تھی جو اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ مجھے کسی اور معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

کاٹھ گودام سے تقریباً بیس کلومیٹر آگے چور گھیا نامی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ بستی ہائی وے کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک کے کنارے پر دکانیں اور کئی چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے۔ جن کے سامنے کھلی جگہوں پر بھی میزیں اور کرسیاں چھپی ہوئی تھیں۔

انکیز نے جیب ایک ہوٹل کے سامنے روک لی۔ یہ

بستی کاٹھ گودام تھا جس کی حدود میں تھی اور انکیز اس طرف کے دورے کرتا رہتا تھا۔ جیب رکے ہی ہوٹل کا مالک دوڑ کر وہاں پہنچ گیا۔

”دھن بھگ! ہمارے۔“ وہ پر نام کرتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں خوشامد کی جھلک نمایاں تھی ”پرہا سیے سرکار۔ بھوجن ہو گایا جائے یا ٹھنڈا چلے گا۔“ وہ کندھے پر پڑا ہوا چٹا کارٹریک میز اور کرسیاں صاف کرنے لگا۔

”چائے پلاؤ رکھو صرف چائے اور جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔“ انکیز نے کہا۔ ”ابھی حاضر کرتا ہوں سرکار۔“ رگھو نے جواب دیا۔

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ دونوں کانٹیل جیب کے قریب ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ دس منٹ بعد رگھو خود چائے لے کر آیا۔ دو پیٹریوں میں ٹیک، پیمشیاں اور بکٹ وغیرہ بھی تھے۔ انکیز نے کانٹیلوں کو بلا کر چائے کے دو کپ اور ایک پلیٹ ان کے حوالے کر دی۔ میں نے چائے کا ایک کپ بلا کی طرف بڑھادیا اور دوسرا خود اٹھا لیا۔

ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ ہماری میز کے گرد لوگوں کا جگمگنا سا لگ گیا۔ ایسی چھوٹی بستیوں میں تھانے دار کو راجا سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ اپنی فریادیں لے کر جمع ہو رہے تھے۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی بلا کو اشارہ کیا اور کرسی سے اٹھ گیا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہاں کم از کم آدھا پون گھنٹا ضرور لگ جائے گا اور میں اس دوران کچھ معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

میری نعت رانگال نہیں گئی۔ ایک ہوٹل سے پتا چل گیا کہ کل یہاں سے سرخ رنگ کی ایک موٹر گزری تھی جس میں ایک تیار عورت اور دو آدمی تھے۔ انہوں نے اسی ہوٹل پر رک کر چائے پی تھی۔ ہوٹل کے مالک اور ملازم نے اس تیار عورت اور ان دونوں آدمیوں کا جو حلیہ بتایا اس سے تصدیق ہو گئی کہ وہ شو بھان اور دلش مکھ ہی تھے۔

خلاف توقع پندرہ بیس منٹ بعد ہی انکیز جیب میں بیٹھ گیا اور پھر ہمارے بیٹھے ہی جیب حرکت میں آ گئی۔

چند میل تک میدانی علاقہ تھا۔ پہاڑیاں بہت دور تھیں لیکن کچھ اور فاصلے طے ہونے کے بعد ہم ایک بار پھر پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ سڑک ان پہاڑیوں میں مل کھائی ہوئی جاری تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور جیب لہر اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی فضا تر تڑا ہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ بائیں

طرف کی پہاڑی سے جیب پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ ایک گولی نے جیب کا آگے کا ایک ٹائمر برسٹ کر دیا تھا اور دوسری گولی میرے اور بلا کے درمیان سے گزرتی ہوئی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک کانٹینبل کے بائیں بازو میں لگی تھی۔ وہ کانٹینبل چیخا ہوا اچھل پڑا تھا۔

انسپکٹر نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے جیب کو سڑک سے اتار کر ایک چٹان کے قریب روک لیا۔ بلا بری طرح چیخ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چھلانگ لگا دی اور جیب اور چٹان کے درمیان دیک کر بیٹھ گیا۔

اعظم خان، انسپکٹر اور دونوں کانٹینبل بھی چھلانگ لگا کر جب سے اتر گئے تھے بازو زخمی ہونے کے باوجود اس کانٹینبل نے رائل سنبل لی تھی۔

”وہ سامنے پہاڑی پر۔“ انسپکٹر چیخا۔ اس کے پاس اگرچہ رپوالور موجود تھا مگر اس نے بھی اپنی سیٹ کے پاس رکھی ہوئی آٹومیک رائفل اٹھالی تھی۔

دونوں کانٹینبل اور انسپکٹر اندھا دھند پہاڑی پر فائرنگ کر رہے تھے۔ جہاں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔

اور پھر ایک کانٹینبل اور انسپکٹر دوڑتے ہوئے پہاڑی پر چڑھ گئے زخمی کانٹینبل وہیں رگ گیا تھا۔ اعظم خان ہمارے قریب جیب کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا اور خالی ہاتھ گن میوں کا پیچھا کرنا حماقت ہی ہوتی اور اعظم خان اتنا احمق نہیں تھا۔

انسپکٹر اور کانٹینبل تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آئے۔ کانٹینبل نے ایک آدمی کو کندھے پر لا کر کھاتھا۔

وہ لاش تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ اس کے خون سے کانٹینبل کی شرٹ بھی سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے وہ لاش ہماری سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دی۔

”دو تھے۔“ انسپکٹر نے خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ایک پہاڑیوں میں فرا ہو گیا۔ دوسرا آپ کے سامنے پڑا ہے۔“

اعظم خان لاش کے کپڑوں کی تلاش لینے لگا لیکن کچھ رقم اور چار بیڑیوں کے سوا کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔ اس رقم میں دو نوٹ نیپالی کرسی کے تھے جس سے ہر حال یہ طے ہو گیا کہ یہ حملہ بھی اعظم خان پر ہی ہوا تھا اور میرا اندازہ درست نکلا تھا کہ اس پر ایسے قاتلانہ حملے اور بھی ہوں گے اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس مرتبہ بھی بچ گیا تھا۔ پہلی گولی اس طرف کے آگے والے ٹائمر لگی تھی جس کی طرف وہ بیٹھا ہوا تھا۔ نشانہ یقیناً اسے ہی بنایا گیا ہو گا لیکن گولی اس

سے دو تین فٹ کے فاصلے پر ٹائمر لگی تھی۔ ہم بھی لیٹ میں آگئے تھے لیکن ہماری بھی خوش قسمتی تھی کہ بال بال بچ گئے تھے۔ جیب کی باڈی پر اس طرف کئی گولیاں لگی تھیں۔

دوسرا کانٹینبل جیب کا ٹائمر تبدیل کرنے لگا۔ خان نے زخمی کانٹینبل کے بازو پر اپنے دھماکے سے پٹی باندھ دی تھی لیکن اس کے زخم سے خون رس رہا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی اور یہ طبی امداد اسے ایک گھنٹے سے پہلے نہیں مل سکتی تھی۔

ٹائمر تبدیل ہونے کے بعد ہمیں بیٹھے کو کہا گیا تو بلا جیب پر چڑھتے ہوئے بھجک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے تاثرات تھے سیٹوں کے درمیان وہ لاش پڑی تھی اور بلا جیسی لڑکی کے لیے لاش پر پیر دکھ کر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اعظم خان نے صورت حال کو تازہ لیا اور بلا کو اپنی سیٹ پر بٹھا کر خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

جیب ایک بار پھر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ انسپکٹر والی رائفل اعظم خان نے لے لی تھی اور دونوں کانٹینبل بھی چاق و چوبند بیٹھے سڑک کے اطراف میں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پہاڑیوں سے نکل گئے۔ آگے کسی حد تک میدانی علاقہ تھا۔ پہاڑیاں بہت دور نظر آ رہی تھیں اور میرا خیال ہے کوئی بھی پہاڑی تین چار ہزار فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ تاہم ان کے پیچھے شمال کی طرف یہ پہاڑی سلسلہ بتدریج بلندی اختیار کرتا چلا گیا تھا۔

کسی حادثے یا ناخوشگوار واقعے سے دوچار ہونے بغیر ہم مزید چالیس منٹ بعد تک پورے پتھ چلے گئے۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ انسپکٹر نے جیب اسپتال کے سامنے جا کر ہی روک لی تھی۔

انسپکٹر جیب سے اتر کر دونوں کانٹینبلوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ بلا اعلیٰ سیٹ پر بیٹھی رہی۔ میں اور اعظم خان بھی نیچے اتر آئے۔ اسپتال میں آنے والے لوگ جیب میں پڑی ہوئی لاش دیکھ کر رکنے لگے اور بہت جلد وہاں بھٹکنا لگ گئے۔ تقریباً دس منٹ بعد کانٹینبل کے ساتھ اسپتال کے دو ملازم اسٹریچر لے کر آگئے اور لاش کو اسٹریچر ڈال کر لے گئے۔ جیب کے پچھلے حصے میں خون پھیلا ہوا تھا اور لمبیاں بھینسا رہی تھیں۔ میں نے بلا کو اشارہ کیا۔ وہ بھی جیب سے اتر آئی۔

ہم اسپتال کے گیٹ کے اندر کی طرف ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر اپنے کانٹینبلوں کے ساتھ تقریباً

آدھے گھنٹے بعد اسپتال سے برآمد ہوا تھا۔ زخمی سپاہی کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”آپ لوگ ہوٹل میں جا کر آرام کیجئے۔ میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔ جیب بھی صاف کروانی ہے۔ پچھلی طرف خون بکھرا ہوا ہے۔“ انسپکٹر نے خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور زخمی بازو والے کانٹینبل کو ہمارے ساتھ کر دیا۔

نیپال کی سرحد پر واقع یہ قصبہ بیس چیکپس ہزار کی آبادی پر مشتمل تھا۔ پہلی بھیت سے بھی ایک یا دو سڑک یہاں تک آتی تھی اور ایک پتھر سڑک نیپال کی سرحد کے دوسری طرف بھی چلی گئی تھی۔ بارونق قصبہ تھا۔ پرانی طرز کی عمارتیں تھیں۔ ہم کانٹینبل کے ساتھ مختلف بازاروں میں گھومتے ہوئے ایک ہوٹل میں آگئے۔ یہ ہوٹل پرانی طرز کی ایک حویلی نما عمارت میں بنا ہوا تھا۔ چار دیواری کے اندر وسیع و عریض کھانا بند تھا۔ جس نے کچھ حصے پر گھاس لگی ہوئی تھی اور باقی حصے میں مٹی اڑ رہی تھی۔ حویلی کی دو منزلہ عمارت بہت بڑی تھی۔ نیچے اوپر کئی کمرے تھے۔ نیچے اور بلا کو جو کرا ملا وہ اوپر والی منزل کی راہداری کے مین آخر میں تھا۔ کمرے کے سامنے ایک کشادہ بالکونی تھی جس کے اوپر سائینا سا بنا ہوا تھا۔ اس بالکونی میں بیٹھ کر سامنے دور تک بازار کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس کمرے میں ہاتھ روم بھی تھا اور ہمیں باہر راہداری میں کسی جگہ ہاتھ دھو کے سامنے لائن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

انسپکٹر اعظم خان کو گراؤنڈ فلور پر کرا ملا تھا۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں یہ اس قصبے کا سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ اسی لیے یہاں سب سے زیادہ روٹن تھی۔

ایک گھنٹے بعد اعظم خان سے ہماری ملاقات ڈائننگ روم میں ہوئی۔ ڈائننگ روم بھی خاصا بڑا تھا اور میزیں کرسیاں بھی سلیپے سے لگی ہوئی تھیں۔ یہاں کا کھانا بھی لذیذ تھا۔

کھانے کے بعد اعظم خان کہیں چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم چاہیں تو شہر میں گھوم پھر لیں لیکن رات نو بجے کے بعد ہم اپنے کمرے ہی میں رہیں کیونکہ عین ممکن ہے ہم لوگ رات ہی کے کسی حصے میں سرحد پار کر جائیں۔

کھانے کے بعد ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ بلا کو بیڈ پر لیٹ مگی اور میں بالکونی میں بیٹھ کر سامنے بازار کا نظارہ کرنے

لگا۔ بڑا بارونق بازار تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھ جھ پر سستی سی طاری ہو جانا کرتی تھی۔ میں اٹھ کر اندر آیا۔ بلا بھی خزانے لے رہی تھی۔ بیڈ کالی کشادہ تھا۔ میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔

پانچ بجے کے قریب بلا نے مجھے جگا دیا۔ اس نے نما کر کپڑے بدل لیے تھے اور خاصی تازہ دم لگ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک بستر پر اٹھتا رہا پھر اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے ساری تھکاوٹ اور کسل مندی دور ہو گئی۔

چھ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے نکل کر بازار میں آگئے۔ اس وقت بھی بڑی گھما گھمی تھی۔ گاہکوں میں زیادہ تر دھماکی قسم کے لوگ تھے۔ جو اس پاس کی بیٹیوں سے آئے ہوئے تھے اور اب انہیں واپس جانے کی جلدی تھی۔

ہم ٹھٹھکے ہوئے قصبے کے مرکزی چوراہے پر آگئے اور پھر چوراہے کے دوسری طرف ایک دکان کے سامنے سرخ رنگ کی ایک کار کھڑے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ یہ وہی کار تھی۔ نمبر بھی وہی تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہاں اس کار کی موجودگی کا مطلب تھا کہ دیش کھ بھیجی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اسے ابھی تک سرحد پار کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ میں نے بلا کو اس طرف متوجہ کیا تو اس کے چہرے پر بھی سنسنی سی پھیل گئی۔

ایک جوان عورت دکان سے نکل کر کار میں بیٹھ رہی تھی۔ میں بلا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا چوراہا خاصا بڑا تھا اور اس وقت یہاں بڑی گھما گھمی تھی۔ ہر قسم کا ٹریفک تھا۔ موٹریں بھی تھیں۔ سائیکل رکشا بھی۔ آٹے اور تیل گاڑیاں بھی۔ میں بلا کا ہاتھ پکڑے اسے گھنپتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک سائیکل سوار بلا سے ٹکرایا۔ بلا چیختی ہوئی سڑک پر گر گئی۔ سائیکل سوار بھی گرا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

”اندھی ہو۔“ نظریں نہیں آتے۔ پتھر سڑک کے۔“ میرے گھونٹنے سے اس کا جلد مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ چیخا ہوا پھر ڈھیر ہو گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی گردن مروڑ دیتا۔ میں بلا کا ہاتھ پکڑے ٹریفک سے بچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وہ کار حرکت میں آکر آگے روانہ ہو چکی تھی۔ میں چوک کے عین بیچ میں تھا اور کوئی نہ کوئی گاڑی راست روک دیتی تھی۔ میں کی مرتبہ کسی کاریا رکشا وغیرہ سے ٹکرایا تھا۔

ڈرائیور چیخ کر برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک بار تو میں ایک تانکے کے کھوڑے سے ٹکرا گیا اور بلا تانکے کے سینے کے نیچے آتے آتے پٹی تھی۔ وہ خوف زدہ انداز میں چیخا اٹھی تھی۔

اور جب ہم چوراہے کے دوسری طرف پہنچے تو وہ سرخ کار تقریباً سو گز آگے موڑ گھوم کر گناہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اکیلا ہوتا تو شاید اس کار کے پیچھے دوڑ لگا دیتا لیکن بلا میرے ساتھ تھی۔ لوگ پہلے ہی عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر ہم دوڑنا شروع کر دیتے تو پتا نہیں کیا صورت حال ہوتی۔

تقریباً دو منٹ بعد ایک آٹو رکشا ہمارے قریب آکر رکا۔ دو عورتیں اتر رہی تھیں۔ میں نے بلا کو رکشے میں دھکیلا اور خود بھی اچھل کر بیٹھ گیا۔

”کدھر جانے کا ہے ماسے۔“ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپن ادھر پہلے چائے پینے کا ہے پھر کدھری جائیں گا۔“

”چائے بعد میں پی لینا۔ جلدی چلو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”مونڈا کو بھگا کر لایا ہے کیا؟ پولیس پیچھے لگا ہے؟“

ڈرائیور نے کہا ”نیچے اتر جاؤ۔ ہم کدھری نہیں جانے کا۔“ میں نے پتلون کے پانچے سے خنجر نکال لیا ”رکشا آگے بڑھاؤ۔ جلدی۔ ورنہ۔“ میں نے خنجر کی نوک اس کے کندھے پر رکھ دی۔

ڈرائیور ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے رکشا اشارت کرنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

”تیز چلاؤ اور آگے موڑ رہا میں طرف گھمایا۔“ میں نے اپنی سیٹ پر آگے جھکتے ہوئے کہا۔

رکشا کی رفتار تیز ہو گئی۔ بائیں طرف والی سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا لیکن سرخ کار کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ڈرائیور کو رکشا زیادہ تیز چلانے پر اکساتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں دائیں بائیں کی سڑکوں اور گلیوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

تقریباً نصف میل آگے آکے بائیں طرف کی ایک سڑک پر اس سرخ کار کی جھلک نظر آئی۔ وہ تقریباً دو سو گز آگے ایک اور موڑ پر گھوم رہی تھی۔

”ادھر۔ اسی طرف۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ رکشا آگے نکل چکا تھا۔ روکتے روکتے بھی وہ چند رہے مگر آگے نکل گیا۔ ڈرائیور نے اسے گھما کر اس سڑک پر موڑ

دیا۔ دو سو گز آگے جا کر میرے کہنے پر اس نے رکشا اس طرف موڑ لیا جس طرف وہ کار گئی تھی۔

یہ کشادہ گلی تھی۔ دونوں طرف پرانی طرز کے حویلی نما بڑے بڑے مکان تھے لیکن گلی دور تک خالی نظر آ رہی تھی۔ سرخ گاڑی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر اس طرف اٹھ گئی۔ ایک آدمی گیٹ بند کر رہا تھا اور گیٹ کے اندر وہ سرخ کار نظر آئی۔ میں نے کچھ آگے جا کر رکشا رکوا لیا اور دس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں دے دیا۔ ڈرائیور نے عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور رکشا بھگا کر لے گیا۔

میں راستے بھر اسی عورت کے بارے میں سوچتا رہا تھا جو چوراہے پر ایک دکان سے نکل کر کار میں بیٹھی تھی۔ وہ جوان عورت تھی اور اس نے ساڑی پن رچی تھی۔ میں یکنی سوچتا رہا کہ وہ کون ہو سکتی ہے اور دیش کھ سے اس کا کیا تعلق ہوگا لیکن۔ دیش کھ جیسے لوگوں کو ایسی عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے یہ عورت اس کی جاننے والی ہو اور دیش کھ نے اس کے گھر میں پناہ لے رکھی ہو۔

”آؤ۔“ میں نے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے بلا کو اشارہ کیا۔

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“ بلا کے لمحے میں وحشت تھی۔ ”یہ اچھا موقع ہے۔“ میں نے کہا ”وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم اس طرح ان کے سر پر پہنچ جائیں گے۔ میں انہیں سنبھالنے کا موقع دیے بغیر ان پر بھٹ بڑا چاہتا ہوں۔“

”سماعت مت کرو۔“ بلا نے کہا ”ہم نے ان کا ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔ انہیں کوئی شبہ بھی نہیں کہ وہ ہماری نظروں میں آگئے ہیں۔ اس وقت بہتر یہی ہے کہ ہم واپس چلیں اور اعظم خان کو صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ وہ پولیس کے ساتھ یہاں ریڈ کرے گا تو یہاں سے کسی کو بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔“

”میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے کہا۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر میں نے جھری سے اندر بھانکا۔ وہ عورت برآمدے میں کھڑی تھی اور ڈرائیور کار کی پچھلی سیٹ سے کچھ پیٹ وغیرہ اتار رہا تھا جس شخص نے گیٹ کھولا تھا وہ بھی قریب ہی کھڑا تھا۔

میں زور زور سے گیٹ دھڑھڑانے لگا۔ وہ شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف آ گیا۔ اس نے چھوٹا دروازہ

کھول کر جیسے ہی باہر بھانکا میں نے اس کے منہ پر زور دار گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیخ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ میں چھلانگ لگا کر اندر آ گیا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ بلا بھی میرے پیچھے ہی اندر آئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ ہوٹل سے نکلنے وقت پستول اپنے لباس میں چھپایا تھا۔

”اے! اکون ہو تم لوگ۔ تھمو۔ تمہاری تو۔“ ہٹا کتا ڈرائیور دباڑتا ہوا میری طرف لپکا۔

وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اس کے منہ پر اٹلے ہاتھ کا تھپڑ جڑ دیا۔ وہ بھی چیخا ہوا لڑکھڑا گیا۔

برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت یہ صورت حال دیکھ کر بدحواس ہو گئی اور چیختی ہوئی دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

”بلا۔ تم انہیں سنبھالو۔ میں اندر دیکھتا ہوں۔“ میں چیختا ہوا برآمدے کی طرف دوڑا۔

دروازے کے دوسری طرف ایک مختصر سی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک وسیع ہال تھا۔ یہاں قالین بچھا ہوا تھا اور شان دار فرنیچر موجود تھا۔ وہ عورت ہال میں کھڑی چیخ کر کسی کو پکار رہی تھی۔ قالین پر دو نوجوان لڑکیاں اور ایک کم سن لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تینوں بھی مجھے دیکھ کر چیخنے لگے۔ اس دوران دائیں طرف کی راہداری سے ایک بوڑھا آدمی دوڑتا ہوا سامنے آ گیا۔ اس نے دھوئی اور کتہ پن رکھا تھا۔ وہ سختی سا چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ سفید موچیں، گنجا سر اور ماتھے پر تلک۔ آنکھوں پر مونٹے شیشوں کی عینک تھی۔ اسے گاندھی کا ڈبلی کیٹ کما جاسکتا تھا۔ وہ بھی مجھے اور میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ میں نے لپک کر ایک جوان لڑکی کو بائیں بازو میں پلیٹ کر خنجر اس کے گلے پر رکھ دیا۔

”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ گلا کاٹ دوں گا اس کا۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

اسی دوران بلا بھی ڈرائیور اور دوسرے آدمی کو پستول کی زبردستی کھینچ کر اندر آئی۔

”ٹھک۔ کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“ گاندھی کی صورت والا بوڑھا آدمی ہٹکایا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

”تم کہاں ہیں وہ لوگ۔ جلدی بتاؤ ورنہ میں اس کا گلا کاٹ دوں گا۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”کون کہاں ہیں۔“ بوڑھے نے ادھر ادھر دیکھا ”ہم سب تو یہاں ہے۔ ہمارا پورا پرپورا (خاندان) تمہارے

سامنے ہے۔“ ”میں دیش کھ اور اس عورت کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”دیش کھ۔“ بوڑھے کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی ”یہاں کوئی دیش کھ یا کوئی اور عورت نہیں ہے۔“

”ان کا خیال رکھو بلا۔“ میں نے لڑکی کو پھوڑ دیا ”مگر کوئی گز بڑی کو خش کرے تو گولی سے اڑا دیتا۔ میں دیکھتا ہوں۔“

بلا نے ان سب کو ایک طرف کر کے پستول کی زبردستی لیا۔ میں دوڑتا ہوا سامنے والی راہداری میں گھس گیا۔ اس راہداری میں دو کمرے تھے اور دونوں خالی تھے۔ دو کمرے ہال کے دوسری طرف تھے۔ ان میں بھی کوئی نہیں تھا میں زینے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اوپر والی منزل پر بھی ایسا ہی ایک ہال اور چار کمرے تھے مگر وہ تمام کمرے بھی خالی تھے۔ میں ہال کا پیچھے والا دروازہ کھول کر عقبی ٹیرس پر گیا اور ٹیرس کے آخری سرے پر جا کر عقبی لان میں بھی بھاگ لیا۔ لان بھی سنسان تھا۔ کسی کمرے میں بھی ایسے آثار نظر نہیں آئے تھے جس سے اندازہ ہو تاکہ کوئی آخری تقری میں یہاں سے بھاگا ہوگا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ہم نے اس قدر اچانک یہاں ہلا بولا تھا کہ کسی کو بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل سکتا تھا۔

میں نیچے آ گیا۔ وہ سب لوگ ایک طرف جمع تھے اور بلا نے انہیں پستول کی زبردستی رکھا تھا۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔

کم سن لڑکا گاندھی کی شکل والے بوڑھے سے اور دونوں لڑکیاں اس عورت سے لپٹی ہوئی تھیں جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک آئے تھے۔ ان سب کے چہروں پر خوف کے سائے رقص کر رہے تھے۔ ڈرائیور اور چوکیدار بھی قالین پر سسے ہوئے بیٹھے تھے۔

”ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ میں نے بوڑھے اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر تم ہٹاؤ کہ دیش کھ اور اس عورت کو کہاں چھپایا ہے تو ہم تم لوگوں کو چھوڑ دیں گے۔ بصورت دیگر میں ایک ایک کو کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

”ہم کسی دیش کھ کو نہیں جانتے۔“ بوڑھے نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا ”تم دونوں کسی اچھے اور شریف گھرانے سے لگتے ہو۔ تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم کسی دیش کھ کو نہیں جانتے۔ نہ ہی یہاں کوئی آیا ہے۔“



”جھوٹ بولتے ہو تم؟“ میں چیخ اٹھا ”اگر تم دیش کھ کر نہیں جانتے ہو تو اس کی گاڑی تمہارے گھر میں کیوں ہے؟ بتاؤ کہاں ہے وہ؟“

”اوہ!“ بوڑھے کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا ”دھیرج دھیرج۔“ وہ بولا ”اب میں سمجھ گیا۔ تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ خنجر اور پستول ہٹالو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں بتانا ہوں کہ یہ گاڑی ہمارے گھر میں کیوں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔“

میں نے میلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی الجھن تھری رہی تھی۔ ”بیٹھ جاؤ بھیا۔“ اس عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں واقعی غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ غلط فہمی شاید اس گاڑی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کریں گے۔“

میں نے ایک بار پھر میلا کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کرتا ہوا ایک صوفے کے کنارے پر ٹک گیا۔ میلا بھی مجھ سے ذرا ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس عورت اور بوڑھے کے چہرے پر اطمینان سی آگئی لیکن دونوں لڑکیاں اور نو عمر لڑکا اب بھی خوف زدہ تھے۔ وہ لوگ کبھی بھی صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔

”تم لوگ باہر جاؤ اور۔“

”نہیں۔ کوئی یہاں سے اٹھ کر نہیں جائے گا۔“ میلا نے بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے ایک دم پستول تان لیا۔ بوڑھا شاید ڈرائیور اور چوکیدار کو وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔

”ڈرو نہیں بنیا۔“ بوڑھے نے کہا ”میں وعدہ کر چکا ہوں۔ ہم میں سے کوئی کسی قسم کی گڑبگڑ نہیں کرے گا اور ویسے بھی نوکروں کے سامنے کوئی بات کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

میلا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان دونوں کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔

”برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔“ بوڑھے نے انہیں حکم دیا ”اور کوئی ایسی حرکت مت کرنا جو کسی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔“

وہ دونوں باہر چلے گئے تو بوڑھا میری طرف متوجہ ہو گیا ”ہاں بیٹا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ تم دونوں اس قدر غصے میں کیوں ہو؟“

”پہلے میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ اگر تم کسی دیش کھ کو نہیں جانتے تو اس کی گاڑی تمہارے گھر میں کیوں ہے؟“

”کیا یہ گاڑی چوری کی ہے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا ”میں تو یہ جانا چاہتا

ہوں کہ۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔“ بوڑھے نے میری بات کاٹ دی ”یہ گاڑی میرے بیٹے نے نکل ہی کسی سے خریدی تھی۔ بیٹے والا ضرورت مند تھا۔ اس لیے سستی دے دی۔“

”تمہارا بیٹا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آج صبح نکل چلا گیا ہے۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں بہت بڑا آفیسر ہے۔ میرا خیال ہے جس شخص سے اس نے گاڑی خریدی تھی وہ اسے جانتا تھا۔ میں نے اس شخص کو نہیں دیکھا تھا لیکن گاڑی کے کاغذات موجود ہیں اور اتفاق سے میں نے ابھی تک وہ بھی نہیں دیکھے۔“

”کیا میں وہ کاغذات دیکھ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ کاغذات دکھا دو مالا بیٹی۔“ بوڑھے نے اس عورت سے کہا۔

وہ عورت اٹھنے لگی تو میں نے اسے ٹوک دیا ”تم نہیں۔ اس لڑکی کو بھیج دو۔“

مالا گہرا سانس لے کر رہ گئی ”تم جاؤ رادھا۔“ اس نے اپنے دائیں طرف بیٹھی ہوئی لڑکی کو اشارہ کیا ”کاغذات میری ڈرائنگ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہوئے ہیں۔“

رادھا اٹھ کر راداری میں ایک کمرے میں چلی گئی۔ اسے واپس آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے کاغذات میری طرف بڑھا دیے۔ رجسٹریشن بک میں میں روپے کے اسٹامپ پیپر پر لکھی ہوئی ایک رسید بھی تھی۔

پہلے میں نے رجسٹریشن بک دیکھی۔ یہ کارڈیش کھ کے نام پر تھی اور بے پور میں رجسٹرڈ تھی۔ اس میں نمبر بھی وہی تھا جو کارڈ کی پلٹ پر لکھا ہوا تھا۔ وہ رسید دیش کھ کی طرف سے تھی۔ اس رسید کے مطابق اس نے اپنی یہ کار پر کاش آمد کو بیس ہزار روپے میں فروخت کر دی تھی۔

”کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی تھی کہ تین لاکھ کی کار بیس ہزار میں گھسے ل گئی۔“ میں نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ کار چوری کی ہے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ کاغذات درست ہیں لیکن یہ کار اغوا اور قتل جیسی سنگین وارداتوں میں استعمال ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”پرکاش آئند میرے بتی ہیں۔“ اس عورت نے کہا ”انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ جس سے انہوں نے کار خریدی ہے وہ راجتھان کا کوئی نیا (ڈزیر) ہے جسے وہ اچھی طرح

جانتے ہیں۔ دہلی میں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ نیپال جا رہا تھا۔ اسے فوری طور پر رقم کی ضرورت تھی اس لیے وہ اتنے سستے داموں میں یہ کار میرے بتی کے ہاتھ بیچ گیا۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ نہ تو یہ کاغذات غلط تھے اور نہ ہی یہ لوگ جھوٹ بول رہے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ منزل ایک بار پھر میرے قدموں تلے سے نکل گئی تھی۔ دیش کھ صرف ایک دن پہلے نیپال کی طرف فرار ہو گیا تھا اور ظاہر ہے وہ شوہا کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔

”ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو جو تکلیف پہنچی اس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ لوگ۔“

”کیا تم اصل بات نہیں بتاؤ گے۔“ بوڑھے نے کہا ”تم نے ابھی کہا تھا کہ یہ کار اغوا اور قتل جیسی وارداتوں میں استعمال ہوئی ہے۔ کیا تم دونوں کا تعلق پولیس سے ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا ”آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں کہ یہ کار سنگین وارداتوں میں استعمال ہوئی ہے اور ہم اس سلسلے میں اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔“

”تم لوگ کون ہو اور اس شخص کو تلاش کیوں کر رہے ہو۔ کیا تم بتانا۔ دیش کھ۔“ بوڑھے نے کہا۔

”دیش کھ راجتھان کا نیا ہے اور بہت بد معاش آدمی ہے۔ وہ میلا کی دیدی کو اغوا کر کے لے گیا ہے اور ہم کئی روز سے اس کا پتہ نہیں کرتے ہوئے آج یہاں پہنچے ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ اس طرف آیا ہے اور نیپال کی طرف فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بازار میں یہ کار نظروں میں آگئی لیکن۔“ میں خاموش ہو گیا۔

اسی دوران رادھا اپنی ماں کا اشارہ پا کر پھر کسی طرف چلی گئی تھی۔ میں بوڑھے سے باتیں کرتے ہوئے اسے شوہا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ شوہا اور سونیا کا ذکر کرتے ہوئے میری آواز رندھ گئی تھی۔ میلا کے چہرے پر بھی افسردگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مالا اسے کرسی سے اٹھا کر اپنے پاس لے آئی اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس دوران رادھا چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔ پھلا کپ اس نے میری طرف بڑھایا پھر دوسروں کو چائے دینے لگی۔

”ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ بوڑھے نے اتفاق سے اس کا نام بھی کنکدن لال تھا، ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا اور مالا تو بلا کو سینے سے لپٹا لے اسے تسلیاں دے رہی تھی کہ اس کی دیدی ضرور ملے گی۔“

”یہ کب اور کہاں سے ملا تھا؟“ میں نے پوچھا ”اور تمہیں اس کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”میں آج سہ پہر تھانے میں انسپٹر سے باتیں کر رہا تھا تو میں نے اس سے دیش کھ کے بارے میں پوچھ لیا۔ وہ سیاست دان ہے اور راجتھان کا ایم پی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید

وہ سب برآمدے تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ بوڑھے کنکدن لال نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ ہمیں گاڑی میں ہونٹ چھوڑ آئے۔ ہم کار میں بیٹھ گئے اور کار جو چلی سے نکل کر سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر مسکرا رہا تھا کہ ہم رشی کیش سے جس کار کا تعاقب کرتے ہوئے آئے تھے اس وقت بڑے اطمینان سے اسی کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ہم ہونٹ پیٹنے تو نونج رہے تھے۔ اعظم خان استقبالیہ لاونج میں بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

”ارے کہاں چلے گئے تھے تم لوگ۔ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ ہمیں دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہم شام کو ہونٹ سے نکلے تو اتفاق سے ہمیں دیش کھ کی کار نظر آگئی۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں بولا ”اور تم بے چینی سے ہمارا انتظار کیوں کر رہے تھے؟“

”دیش کھ کا دوست پران پولیس کی حراست میں ہے۔ وہ زخمی ہے اور اسپتال میں زیر علاج ہے۔“ خان نے کہا۔

”اوہ!“ میں اچھل پڑا ”اس سے پتا چل سکتا ہے کہ دیش کھ نیپال میں کہاں جانے گا۔ چلو۔ میں ابھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

آدھے گھنٹے بعد ہم اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں موجود تھے۔ وارڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صرف دس بیڈز تھے۔ پانچ ایک طرف پانچ سامنے۔ پران دائیں طرف والی لائن کے تیسرے بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وارڈ کے دروازے پر ایک مسلح کا کنسیل بیٹھا ہوا تھا اور ایک کا کنسیل پران کے بیڈ کے سامنے بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا اسے الگ کمرے میں نہیں لے جایا جاسکتا۔“ میں نے اعظم خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔“ خان نے جواب دیا ”یہ دیش کھ کے ہاتھوں زخمی ہوا ہے۔ اس کے بارے میں رضا کارانہ طور پر ہی سب کچھ جانے کو تیار ہو جائے گا۔“

”یہ کب اور کہاں سے ملا تھا؟“ میں نے پوچھا ”اور تمہیں اس کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”میں آج سہ پہر تھانے میں انسپٹر سے باتیں کر رہا تھا تو میں نے اس سے دیش کھ کے بارے میں پوچھ لیا۔ وہ سیاست دان ہے اور راجتھان کا ایم پی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید

یہاں کے لوگ بھی اسے جانتے ہوں اور کسی نے اسے دیکھا ہو۔ انکپڑے بتایا کہ اس نے دیش کھ کو تو نہیں دیکھا البتہ وہ کل رات اپنے ایک آدمی کو زمینی کر کے نیپال کی طرف بھاگ گیا ہے۔ میں انکپڑے کے ساتھ فوراً یہاں چلا آیا۔ اس نے جو کمائی سنائی ہے تمہارے لیے یقیناً پچسپ ہوگی۔ تم خود ہی پوچھ لو۔

میں ہڈ کے قریب بیچ پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے پران سے شوبھا کے بارے میں دریافت کیا۔

”وہ ٹھیک ہے اور ابھی تک محفوظ ہے۔“ پران نے جواب دیا ”پتلے اسے دواؤں کے زیر اثر بے ہوش رکھا جاتا تھا لیکن اب اسے گن پوائنٹ پر رکھا جا رہا ہے اس کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہیں۔ وہ کسی وقت بھی بکلی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے بھی بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہر وقت خلا میں گھورتی رہتی ہے۔ اس کے سامنے کھانا رکھ دو تو کھا لیتی ہے۔ اس نے خود سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔“

”وہ حرامی اسے نیپال لے گیا ہے۔ تمہارے خیال میں وہ کہاں جائے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”کھنڈو۔“ پران نے جواب دیا ”وہاں اس کا ایک پرانا دوست روتی رہتا ہے۔ وہ کاروباری آدمی ہے اور ہندوستان بھی آتا رہتا ہے۔ دیش کھ نے کل ٹیلی فون پر اسے بتا دیا تھا۔“

”روی کھنڈو میں کہاں رہتا ہے۔ اسے کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کبھی کھنڈو نہیں گیا لیکن دیش کھ نے بتایا تھا کہ کانتی پاتھ میں اس کا ہوٹل ہے۔ ہوٹل کا نام مجھے یاد نہیں۔“ پران نے جواب دیا۔

”کیا روی کا بھی سیاست سے کوئی تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ پران نے نفی میں سر ہلایا ”وہ ادھر کا دادا ہے۔ بعض سیاست داں اس کے دادا میں ہیں۔ وہ کئی مرتبہ دیش کھ کے پاس ہے پورے آچکا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ روی نے دیش کھ سے کہا تھا کہ ہندوستان میں جب بھی اس پر مصیبت کا وقت آئے وہ کھنڈو آجائے۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھے گا۔“

”تمہارے ساتھ یہ سب کیسے ہوا؟“ میں نے پوچھا ”سنا ہے تم تو بہت عرصے سے اس کے ساتھ تھے اور اس کے خاص آدمیوں میں سمجھے جاتے تھے۔“

”میں اس وقت سے دیش کھ کے ساتھ ہوں جب وہ ایک معمولی اور سڑک چھاپ غنڈا ہوا کرتا تھا۔“ پران نے جواب دیا ”پھر وہ راٹھور کے پاس آگیا۔ میں اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا۔ دیش کھ نے راٹھور کے ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس طرح وہ راٹھور کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ دیش کھ چالاک آدمی تھا۔ رفتہ رفتہ راٹھور پر حاوی ہونا چلا گیا اور پھر ایک روز اس نمک حرام نے راٹھور کو بھی قتل کر دیا اور اس کی جائداد اور برنس پر قابض ہو گیا۔ دولت ہاتھ آتے ہی وہ سیاست میں بھی کود پڑا۔ وہ بہت ہاتھ پیر پھیلا چکا تھا۔ آدھے سے زیادہ شہر میں اس کے جوئے اور منشات کے اڈے تھے۔ اس کے گرگے شہر بھر میں بستا وصول کرتے تھے۔ طوائفیں بھی اس کے کنٹرول میں تھیں۔ ایم بی بننے کے بعد وہ کچھ اور پھیل گیا۔ پولیس میں بھی اس کا حکم چلنے لگا۔ کوئی فرض شناس اور ایمان دار آفیسر اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیتا تو اس کا تاولہ کرا دیا جاتا یا اسے راستے سے ہٹا دیا جاتا۔ وہ دو پولیس آفیسروں کو اپنے گرگوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔“

میں توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہو کر کچھ دیر گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر کہنے لگا۔

”میں نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا۔ ہر آڑے وقت میں اس کے کام آیا۔ شوبھا کے معاملے میں بھی میں پیش پیش تھا۔ وہ شوبھا کے پلاٹ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن راجا صاحب کی مداخلت سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور پھر یہ پٹی میں نے ہی اسے بڑھائی تھی کہ اگر وہ شوبھا سے شادی کر لے تو وہ پلاٹ ہی نہیں شوبھا کی ساری جائداد اس کے قبضے میں آجائے گی۔“

”اس کے لیے اسے اپنے آپ کو بدلتا ہوگا۔ ایک اچھا انسان بن کر اپنے آپ کو شوبھا کے سامنے پیش کرنا ہوگا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے یہاں بھی وادائیں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ شوبھا کو دھمکیاں دیں۔ شوبھا خوف زدہ ہو کر غائب ہو گئی۔“

”دیش کھ اسے تلاش کرتا رہا۔ اس نے کافی ہاؤس کے فیچر اور ملازموں پر تشدد کر کے بھی اس کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن کسی کو علم نہیں تھا کہ شوبھا کہاں چلی گئی ہے اور پھر دیش کھ کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ شوبھا رشی کیش میں موجود ہے اس کا وہ آدمی تم سے پتہ کر گیا تھا اور پھر دیش کھ ہردوار پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے چند غنڈے ساتھ لیے اور رشی کیش پہنچ کر شوبھا کو اٹھالیا۔ نہیں وہ مردہ سمجھ کر

چھوڑ گیا تھا لیکن المورا میں تمہیں دیکھ کر میں بھی خوف زدہ ہو گیا تھا۔“

”وہ تمہارے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ المورا سے بھاگنے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے گا۔ تم موت کے سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر تم سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو شوبھا کو چھوڑ دے لیکن وہ شوبھا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور بالآخر کل یہاں اس نے اپنی گاڑی چن دی اور کل رات ہی سرحد پار کر کے نیپال چلا گیا۔“ پران ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اسے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ چند لمبے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بولا۔

”مجھے اس نے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ جو آدمی ہمیں سرحد پار کرانے کے لیے آیا تھا اس کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ دیش کھ نے پہاڑیوں میں گاڑی رکوائی اور ہمارے مجھے نیچے اتار کر فائرنگ کر دی۔ مجھے دو گولیاں لگیں۔ ایک سینے میں اور ایک پیٹ میں۔“

”دیش کھ سرحد کی طرف فرار ہو گیا۔ میں تقریباً ایک گھنٹا پہاڑیوں میں پڑا اور پھر مجھے معلوم نہیں میں پہاڑیوں سے نکل کر آبادی تک کس طرح پہنچا۔ میں ایک سنسان سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ ہوش آیا تو یہاں موجود تھا۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس مرتبہ خاموشی کا وقت کچھ طویل ہو گیا اور بالآخر پہلے سے بھی زیادہ دم بجے میں کہنے لگا۔

”میں زندہ رہوں یا مڑاؤں۔ اس کی اب مجھے پروا نہیں لیکن دیش کھ کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے تم اس تک پہنچ جاؤ گے۔ اسے مزید تمہارا کام ہے۔“ میں روی اور دیش کھ کے بارے میں مزید سوالات کرتا رہا لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میں بیچے سے اٹھ گیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم اپستال سے نکل رہے تھے۔

اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے ساتھ چلتی ہوئی بلا باربار مجھے کہنی سے ٹوکے مار رہی تھی اور میرا خیال ہے۔ اعظم خان نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ایک ریٹورٹ کی طرف مڑا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بلا کے چہرے پر بھی رونق سی آئی تھی۔ اس وقت مجھے جاگنی یاد آئی۔ اس سے بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی اور یہی صفت میں نے بلا میں بھی نوٹ کی تھی۔

کھانے کے بعد ہوٹل پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ میں جاتے ہی اپنے بستر گر گیا۔ پران کی باتیں اس وقت بھی میرے دماغ میں سننا نہٹ سی پیدا کر رہی تھیں۔ دیش کھ شوبھا کو لے کر سرحد پار کر گیا تھا۔ پران کے کہنے کے مطابق شوبھا ابھی تک اگرچہ دیش کھ کے شرے محفوظ رہی تھی لیکن اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں پران نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میں پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جس نوع کے حالات سے دوچار تھی اس کے پیش نظر کچھ ایسی ہی توقع کی جاسکتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کا دماغ نہ پلٹ جائے اور اس سے پہلے کہ شوبھا کو کوئی ناقابل حلانی نقصان پہنچ جائے اسے ہر صورت میں دیش کھ کے چنگل سے چھڑانا تھا۔

دیش کھ ایک رات پہلے سرحد پار کر گیا تھا۔ اس طرح وہ ہم سے چوبیس گھنٹے آگے نکل گیا تھا اور میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سرحد پار کرنے کا موقع کب ملے۔ اعظم خان کی صورت میں ایک امید بندھی تھی لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کو خان نے کہا تھا کہ شاید آج رات۔

دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ میں ایک جھپٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بلا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

اسی دوران دستک کی آواز دوبارہ ابھری۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اعظم خان تھا۔

”سو گئے تھے؟“ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”آج کل نیند شاید ہم سے روٹھ گئی ہے۔ تم اس وقت۔“

”ہم جا رہے ہیں۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”تم لوگ تیار ہو جاؤ۔ اس وقت ڈیڑھ بج رہا ہے۔ ٹھیک دو بجے تمہیں حویلی کے برآمدے میں ہونا چاہیے۔ دو بجے کے بعد کسی بھی وقت گاڑی ہمیں لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم چند منٹ میں نیچے آجائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

اعظم خان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر دیا۔ بلا اچھل کر بیٹھ سے اتر گئی تھی۔ دوپہر کو یہاں آنے کے بعد ہم نے کپڑے بدلے تھے۔ میلے کپڑے ابھی تک ہاتھ روم میں ٹنگے ہوئے تھے۔ بلا وہ کپڑے اٹھا کر تھیلے میں ٹھونسنے لگی اور میں کبل سے کرنے لگا۔ پہاڑی علاقوں میں رات کے وقت سروی بڑھ جاتی تھی۔ اس طرح یہ کبل ہمارے لیے بہت اہم ہو گئے تھے اور میں یہ کبل چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم دو بجے سے پہلے ہی اپنا سامان لے کر ہوٹل کے برآمدے میں پہنچ گئے۔ ہوٹل کا ایک ملازم کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر وہ اٹھ گیا۔ برآمدے میں کچھ اور بھی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بلا کر اشارہ کیا اور ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک دو بجے اعظم خان بھی آیا۔ اس نے اپنا شوذر بیگ ہمارے قریب رکھ دیا اور برآمدے سے نکل کر حویلی کے چھانک کی طرف چلا گیا۔

میں منٹ بعد چھانک کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنا دی۔ اعظم خان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہمارے قریب آیا اور ہم اپنا سامان اٹھا کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ سیاہ رنگ کی بڑی لینڈ کروزر تھی۔ پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں سفر کے لیے اس سے بہتر کوئی اور گاڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اور ملا کو سب سے پیچھے والی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ اعظم خان ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ درمیان کی سیٹ خالی تھی۔ ڈرائیور نے خان کی طرف دیکھا اور گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

شروعی طور پر سنان اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اگر کوئی بڑا شہر ہوتا تو اس وقت بھی سڑکوں پر اکا دکا گاڑیوں کی آمدورفت ضرور ہوتی لیکن رات کے اس سے تنگ پور کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے جن پھر گیا ہو۔ البتہ ایک موٹر دو تین کتوں نے بھونکتے ہوئے گاڑی کا تعاقب ضرور کیا تھا لیکن تھک کر خود ہی چھٹا چھوڑ دیا تھا۔

گاڑی شیرے سے نکل کر اس سڑک پر آگئی جو سرحد کی طرف چلی گئی تھی۔ سرحد کا فاصلہ شہر کے مرکز سے چند کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ وہاں چوکی تھی اور دن کے وقت پاسپورٹ کے ذریعے سرحد پار کرنے والوں کی باقاعدہ آمدورفت رہتی تھی لیکن شام چھ بجے اس چوکی کے چھانک بند کر دیے جاتے تھے۔

تقریباً دو کلومیٹر اس سڑک پر آگے جانے کے بعد ہماری گاڑی دائیں طرف ایک کپے راستے پر مڑ گئی۔ یہ راستہ آگے جا کر پہاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ گاڑی اس پتھر پیلے راستے پر چلی رفتار سے چلتی رہی اور بالآخر ایک جگہ رک گئی۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ گاڑی کی تمام بقیات بھی بجھا دی گئی تھیں۔ ڈرائیور پار پار لکڑی پر بندھ ہوئی الیکٹرک لائٹ روشن کر کے اندر نمودار ہونے والی نہایت مدھم روشنی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک تین بجے سامنے بہت دور قدرے باندی پر شعلہ

سا جھکا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے سگریٹ سلگانے کے لیے دیا سلائی یا لائٹر جلا دیا ہو۔ وہ شعلہ فوراً ہی بجھ گیا تھا۔ ڈرائیور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اس طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ شعلہ وقفے وقفے سے تین مرتبہ جھکا۔ ڈرائیور نے انجن اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہیڈ لمپس یا گاڑی کی کوئی اور جی نہیں جلائی گئی تھی۔ گاڑی اندھیرے میں ہلکی رفتار سے چٹانوں میں ٹل کھاتے ہوئے راستے پر چلتی رہی۔ لگتا تھا جیسے یہ راستہ ڈرائیور کا خوب اچھی طرح دیکھا بھلا ہوا اور وہ انھیں بند کر کے بھی گاڑی چلا سکتا ہو۔

تقریباً پندرہ منٹ تک یہی صورت حال رہی۔ گاڑی ہلکی رفتار سے چلتی رہی۔ آگے چھلان شروع ہو گئی تھی اور پھر اچانک ہی ڈرائیور نے ہیڈ لمپس روشن کر دیے اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

”ہم نے سیما (سرحد) پار کر لی ہے۔“ اعظم خان نے پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ایک گھنٹے بعد ہم جو نیا پانی پہنچ جائیں گے۔“

”جو نیا پانی!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اے۔۔۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ہم کچھ دیر وہاں رکیں گے اور پھر دوسری گاڑی پر آگے روانہ ہو جائیں گے۔“ اعظم خان نے بتایا۔

ہم اس وقت جو نیا ریخ کے پہاڑی علاقے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یہاں پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں تھیں۔ تاہم شمال کی طرف بڑھتے ہوئے یہ پہاڑیاں بتدریج بلندی اختیار کرتے ہوئے عظیم ہمالیہ کی صورت اختیار کر جاتی تھیں جبکہ جنوب کی طرف بتدریج میدانی علاقہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر بھارت کی سرحد تھی جس کے دوسری طرف اتر پردیش (وپی) کا علاقہ تھا۔

تنگ پور سے جو نیا پانی کا علاقہ ساتھ پیٹھ کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔ ہم تقریباً سو گھنٹے میں جو نیا پانی پہنچ کے تھے۔ یہ بستی بھی سانے میں ڈوبی ہوئی تھی مگر گاڑی بستی کی طرف جانے کے بجائے اس سے دو کلومیٹر پہلے ہی دائیں طرف ایک کپے راستے پر مڑ گئی اور مزید تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بہت بڑے چھانک کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور کو ہارن بجانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاڑی رکنے کے تین سیکنڈ بعد چھانک کھل گیا اور ڈرائیور گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔ یہ بہت بڑا احاطہ تھا۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔

احاطے میں جا بجا اونچے درخت نظر آ رہے تھے اور احاطے کے بالکل آخر میں ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ میں اسے حویلی ہی کہوں گا۔ گاڑی حویلی کے کشادہ برآمدے کے سامنے رک گئی۔ جہاں پہلے بھی سطور کھڑی ایک کار کھڑی تھی۔

دو آدمی تاریکی میں کسی طرف سے نمودار ہوئے اور ہم لوگ گاڑی سے اتر آئے۔ سرحد پار کرنے کے بعد سے بلا مسلسل اونگھتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہم نے اپنا سامان گاڑی ہی میں چھوڑ دیا۔ ہمیں حویلی کے ایک وسیع کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک بھاری بھر کم طویل قامت آدمی ہمارا منتظر تھا۔

وہ نیپالی تھا۔ سفید تنگ موری کا پاجامہ، شیردانی کی طرح کالا کٹ جو ٹخنوں تک تھا اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی چائے آئی۔ اس کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے۔ لگتا تھا انھیں ہماری آمد کی اطلاع تھی اور سارے انتظامات پہلے ہی سے کیے گئے تھے۔ چائے ختم ہونے کے بعد اس شخص نے نیپالی زبان میں اعظم سے کچھ کہا اور اعظم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ اس کمرے میں جا کر کچھ آرام کرو۔ ہم لوگ صبح سات بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔“

میرے منہ سے بے اختیار کمراسائش نکل گیا۔ ہمارے اور پیش کمرے کے بیچ وقت کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا اور مجھے شوہا کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بے بسی میرے آڑے آ رہی تھی اور ظاہر ہے اس صورت حال میں کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں شان دار اور آرام دہ بستر لگا ہوا تھا۔ اس وقت ساڑھے چار بجتے والے تھے۔ ہمارے پاس آرام کے لیے تقریباً ڈھائی گھنٹے کا بستر آوندھ کر سوئی اور میں ایک آرام کر سی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

ساڑھے چھ بجے ہمیں جگا دیا گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ناشیا کیا اور سوا سات بجے ہم روانہ کیے گئے۔ تیار ہو گئے۔ اس مرتبہ سطور کھڑواری کا سفر کے لیے منتخب کی گئی تھی۔ وہ دروازہ قامت نیپالی، ہمارا میزبان پرندہ ہمارے ساتھ تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ اسی نے سنبھالی تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ اعظم نے سنبھال لی تھی اور ملا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہمارا سامان کاری ڈکی میں رکھ دیا گیا تھا۔

جو نیا پانی زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ رائل والڈ لائف ریج تھا جو کئی میل آگے بھارت کی سرحد

تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وسیع و عریض جنگل ہاتھیوں کی افزائش نسل کے لیے مخصوص تھا اور یہاں ہاتھی کا شکار انسانی قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔

پختہ اور کشادہ سڑک جنگل کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر پہاڑی سلسلہ تھا جو شمال کی طرف بتدریج بلند ہوتا چلا گیا تھا۔

نیپال میں جگہ جگہ بدھ عبادت گاہیں تھیں اور ہندوؤں کے قدیم تاریخی مندر تھے۔ اس کے علاوہ کئی نیشنل پارک پرندوں اور جنگلی جانوروں کے ریزروائرز تھے جہاں جنگلی حیات کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ غیر ملکی سیاح بھی بڑی تعداد میں ان مقامات پر سیرو تفریح کے لیے آتے تھے اور اسی لیے سڑکوں اور راستوں پر خاص توجہ دی گئی تھی تاکہ سیاحوں کو آمدورفت میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

تقریباً سو دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم دوسرے قریب تیل پانی نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میلوں تک پھیلا ہوا پرندوں کا ریزروائرز اور اس سے آگے نیشنل پارک تھا جو میلوں آگے تک چلا گیا تھا۔

دوسرے کھانا ہم نے تیل پانی کے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہو گئے۔

بڑا سرسبز اور خوب صورت علاقہ تھا۔ سڑک بھارت کی سرحد کے متوازی چل رہی تھی۔ اس کے دوسری طرف پونی کا صوبہ تھا جسے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ کہیں ہم سرحد کے بالکل قریب پہنچ جاتے اور کہیں میلوں کا فاصلہ حائل ہو جاتا۔

شام پانچ بجے کے قریب ہم ہڑال پہنچ گئے۔ یہ متوسط درجے کا شہر تھا اور یہاں اتر پورٹ بھی تھا۔ اس شہر سے تقریباً پچاس کلومیٹر جنوب میں بھارت کی عین سرحد پر ہما تھا بدھ کی جنم بھومی لیکن نامی قصبہ تھا اور شاید اسی وجہ سے ہڑال شہر میں بھی بدھ بتکھت بڑی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ لیکن جانے والی سڑک سدھارتھ ہائی وے پر ٹریفک کی آمدورفت زیادہ تھی۔

ہڑال میں ہم نے ایک ہوٹل میں پراڈ وال دیا تھا۔ مجھے اور ملا کو ہوٹل میں چھوڑ کر اعظم اور بریندر انہیں چلے گئے تھے لیکن چھ بجے کے قریب وہ دونوں واپس آ گئے۔ بریندر تو ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھا رہا تھا اور اعظم ہمارے کمرے میں آ گیا۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم تان سین جا رہے ہیں۔“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے تان سین کا نام سن رکھا تھا۔ وہ تو کوئی کلاکار تھا۔ سنا ہے اس کے گلے میں برا سوڑا تھا۔ وہ جب گانا تھا تو کائنات کی ہر شے ساکت ہو جاتی تھی مگر اعظم خان پتا نہیں کس تان سین کی بات کر رہا تھا۔

”میں سمجھا نہیں۔ تان سین۔“

”ارے بھی شہر کا نام ہے جو یہاں سے چالیس پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شکار دیش کھ تان سین میں واقع نارائن مندر میں موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے نکل جائیں ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔“

میں ایک جھپٹے سے اٹھ گیا۔ میں نے بیروں کو آرام پہنچانے کے لیے جو گزراتا رہ رکھے تھے مجھے جو گز رہنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ بلا مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہوٹل سے باہر آنے میں بھی ہمیں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

برہندرا کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا ہوا تھا۔ انجین اشارت تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔ شہری حدود سے نکل کر کار شمال کی طرف جانے والے پائی وے پر دوڑنے لگی۔ اس طرف پہاڑوں میں یہ پائی وے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر دور پوکھارا نامی شہر تک چلی گئی تھی۔ بھارت کی سرحد پر واقع لیکن قصبے سے پوکھارا تک یہ سڑک سدھارتھ پائی وے ہی کہلاتی تھی۔ اس وقت ہم شمالی سدھارتھ پائی وے پر سفر کر رہے تھے۔

اس پائی وے پر بھی اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ پورا نیپال پہاڑوں پر مشتمل ہونے کے باوجود پوری طرح آباد تھا۔ ہر چند گلوبل ٹرک کے بعد کوئی نہ کوئی بستی موجود تھی۔ پہاڑ سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے جہاں نشیبی علاقے تھے وہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ پہاڑوں میں بھلوں کے باغات تھے۔ ترائیوں میں سال میں دو مرتبہ دھان کی فصل ہوتی تھی۔ تمام قصبے، شہر اور گاؤں پختہ سڑکوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ حالیہ کے اس دیس میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر بڑے اور درمیانے شہروں کے درمیان ہوائی ریل بھی تھے۔

دھون اور لاگر نامی قصبوں میں رے بغیر کار شمال کی طرف سفر کرتی رہی۔ یہ سڑک بتدریج ہندی کی طرف چلی گئی تھیں۔ کہیں کہیں نشیب بھی تھے۔

بڑال سے روانگی کے چند منٹ بعد ہی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر کار کے ہیڈ لمپس

کی متحرک روشنی بڑا پر اسرار اثر دے رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم تان سین پہنچ گئے۔ یہ بھی ایک بڑا قصبہ تھا۔ نارائن مندر کی وجہ سے یہاں بھی سیکڑوں یا تریوں کی آمدورفت تھی۔ اچھا بارونق قصبہ تھا۔

برہندرا نے کار ایک سرائے کے سامنے روک لی۔ بلا کو سرائے میں چھوڑ دیا گیا۔ کار بھی وہیں چھوڑ دی گئی تھی۔ ہم تینوں پیدل ہی ایک طرف چلے گئے۔

نارائن مندر زیادہ دور نہیں تھا۔ بہت بڑا مندر تھا۔ اس وقت اگرچہ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے لیکن مندر میں خاصی رونق تھی۔ باہر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

برہندرا نے ہمیں گیٹ کے قریب رکنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک پنڈت بھی تھا۔ عجیب ہیئت تھی اس پنڈت کی۔ پیشانی کوئی باشت بھر جوڑی تھی۔ کھنچی کھوڑی کے پچھلی طرف بالوں کی جھار تھی۔ داڑھی صاف تھی لیکن مونچھیں خاصی بڑی تھیں۔ کانوں میں سونے کے بالے اور ناک میں بھی دونوں نچھتوں کے بیچ میں سونے کی بالی تھی۔ ناک میں ایسی بالیاں میں نے راجستھان میں عورتوں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ پنڈت نے گیروے رنگ کی دھوتی پن رچی تھی۔ پیٹ بٹنے کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا اور گلے میں رنگ برنگی کئی مالائیں تھیں۔ وہ جب سانس لیتا تو یوں لگتا جیسے سانپ پھنکار رہا ہو۔

ہم اسے مندر کے گیٹ سے ہٹا کر دور ایک تاریک گوشے میں لے گئے۔

”تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو پنڈت رگھو ناتھ۔“

برہندرا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”نی الوقت تو تمہیں مجھ سے کوئی خلوہ نہیں لیکن اگر تم نے ہماری باتوں کا ٹھیک جواب نہ دیا تو تمہاری پائی زندگی بیل میں گزرے گی۔ ساگر ماتھا کی پولیس ابھی تمہیں بھولی نہیں ہے۔“

”حکم کرو مہاراج۔ ہم تو تمہارے واس ہیں۔“ پنڈت رگھو ناتھ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ کچھ اور تاریک ہو گیا تھا۔

”یہاں انڈیا سے کچھ لوگ آئے ہیں۔“ برہندرا نے کہا ”ایک اویسر عمر آدمی اور ایک بیار عورت۔“ اس نے دیش کھ کا حلیہ بتایا ”دو آدمی مقامی ہیں۔ بد معاش۔ اچکے۔ وہ لوگ مندر میں آئے ہوئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ۔“

گیت کی طرف سے بہت کم روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی۔ میری نظرس پینڈت رکھونا تھ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ برہندرا کی بات سن کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو متحیر ہو گیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

”وہ لوگ آئے تھے سرکار۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا ”مندر میں پینڈت بھوج کے پاس آئے تھے ان کے ساتھ روئی کے دو آدمی تھے۔ پر وہ ایک گھنٹا یہاں ٹھہر کر چلے گئے۔“

”کب آئے تھے اور کہاں گئے؟“ برہندرا نے پوچھا۔

”چار بجے آئے تھے سرکار۔ پانچ بجے کاٹ منڈو (کھنڈو) چلے گئے۔“ پینڈت نے جواب دیا۔

”سوچ لو پینڈت۔“ برہندرا نے اس کے چہرے پر نظرس جمادیں ”اگر تمہاری یہ بات غلط ثابت ہوئی اور وہ لوگ مندر ہی میں یا تان سین شہر میں موجود ہوتے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا کیا مشرکوں گا۔“

”میں کچھ رہا ہوں سرکار۔“ پینڈت نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے ”میں آپ کے سامنے کوڑ (بھوٹ) نہیں ماروں گا۔ وہ لوگ کاٹ منڈو چلے گئے۔ روئی کے پاس ملیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ لیتے ہیں لیکن تم ایک گھنٹہ تک مندر کے اندر نہیں آؤ گے۔“ برہندرا نے کہا۔

”ٹھیک ہے سرکار۔ میں یہیں دھرنا جمالیتا ہوں۔“

پینڈت وہیں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ہم مندر میں آگے کئی اور واسوں اور داسیوں سے بھی پوچھا گیا۔ کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ صرف ایک داسی سے یہ پتا چلا کہ دوپہر کے بعد ایک عورت اور تین آدمی پینڈت بھوج کے پاس آئے تھے۔ عورت بیمار تھی۔ اس داسی نے انہیں پینڈت بھوج کے استھان میں تو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ باہر جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیے تھے۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ تک مندر میں معلومات حاصل کرتے رہے پھر باہر آگئے۔

”وہ لوگ نکل گئے۔“ برہندرا نے مندر سے باہر آتے ہوئے کہا ”اب کھنڈو ہی میں ان کا کچھ پتا چلے گا۔“

ہم لوگ کھانا کھانے کے لیے بازار کے ایک ریٹونرٹ میں رک گئے۔ ان دونوں نے طے کر لیا تھا کہ رات تان سین ہی میں گزار کر صبح سویرے یہاں سے روانہ ہوا جائے۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے بلا کے لیے کھانا پیک کر لیا۔ برہندرا اور اعظم خان مجھے سرائے کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے رات کہیں اور گزارنے کا فیصلہ کیا

تھا۔

بلا تھکی ہوئی تھی اور شاید وہ سو گئی تھی۔ کئی مرتبہ کھٹ کھٹانے کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا تو میں نے اس کے سامنے میز پر کھانا رکھ دیا۔

یہ کمر ا اگرچہ کشادہ تھا لیکن بیڈ ایک ہی تھا اور غنیمت تھا کہ اس کے ساتھ ہاتھ روم بھی تھا۔ لکڑی کا دروازہ دوپٹ کا پرانے طرز کا تھا جس پر درمیان اور اوپر زنجیر والی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔

یہ سرائے شاید بہت قدیم تھی اور اس میں کوئی جدید تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا جس کے چاروں طرف قطاروں میں کمرے بنے ہوئے تھے کمروں کے سامنے طویل برآمدے تھے۔ وسط میں میدان تھا۔ جس میں گھاس لگا دی گئی تھی اور درمیان ایک مختصر سا حوض بنا کر فوارہ بھی لگا دیا گیا تھا۔ جس کے آس پاس تین چار لکڑی کے کھمبوں پر بلب بھی روشن تھے اور اس وقت کچھ لوگ ٹیبلوں کی صورت میں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔

کئی دن کے اس طویل سفر نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہمارا یہ سفر بھی ختم نہیں ہو گا۔

میں نے دروازہ بند کر کے کنڈے میں لوہے کی مڑی ہوئی وہ سلاخ پھنسا دی جو پہلے ہی سے کنڈے کی زنجیر میں لٹکی ہوئی تھی۔ اس مڑی ہوئی سلاخ سے گویا تالے کا کام لیا جا رہا تھا۔

کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد بلا بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا صورت حال کا تجزیہ کرتا رہا۔ پچھلے چارپانچ دنوں میں ہم نے سیکڑوں میل کا سفر کر لیا تھا لیکن ہم اب بھی بے تیل و مرام ہی تھے۔ اپنی منزل سے بہت دور۔

باہر لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بلا کی طرف دیکھا۔ وہ سوچتی تھی۔ اس کے بال ٹکھڑے ہوئے تھے اور چہرے پر بے پناہ معصیت تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آ رہا تھا کہ بلا وجہ جو کھوں میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر اپنے گھر پر ہوتی تو اس وقت آرام وہ بستر سکون کی بیشی نیند سو رہی ہوتی۔ سو تو وہ اس وقت بھی رہی تھی لیکن وہ نیند میں بھی بے چین تھی۔

میں نے ہاتھ روم کی جی بجھا کر دروازہ چنداچ کے قریب کھلا چھوڑ دیا اور کمرے کی جی بجھا کر ملا کے پیلو میں بستر پر لیٹ گیا اور اس کے بعد مجھے بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

صبح پانچ بجے کے قریب دستک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اعظم خان تھا۔

آتش فشاں 33 حصہ 6

”ہم کھانے والے کمرے میں بیٹھے ہیں۔“ اعظم نے کہا ”تم لوگ تیار ہو کر وہیں آ جاؤ۔ ہم کچھ بجے روانہ ہو جائیں گے۔“

اعظم واپس چلا گیا۔ ان دونوں نے رات پتا نہیں کہاں گزار دی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر کے بلا کو جگا دیا اور آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر ہم سرائے کے دفتر سے ملحق کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں برہندرا اور

اعظم کے علاوہ دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کمرے سے ملحق کچن تھا۔ برہندرا اٹھ کر کچن میں چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ملازم کے ساتھ ناشتالے کر آیا۔

ناشتے کے بعد سو اچھ بجے کے قریب ہم تان سین سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت سورج نہیں نکلا تھا۔ فضا میں دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر ہم سدا جھارت ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے تقریباً سو کلومیٹر دور پوکھارا کی طرف جاتے تو وہاں سے مشرق کی طرف پر تھوڑی دیر کا رخ کرتے اس طرح کھنڈو پہنچنے کے لیے ہمیں مزید ڈھائی سو میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا لیکن تان سین سے نکل کر چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد برہندرا نے کار مشرق کی طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ ہزاریوں میں مل کھاتی ہوئی یہ سڑک کہیں پختہ تھی اور کہیں پٹی۔

ہم دریائے کالی گند کی کے ساتھ ساتھ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے دوسرے ذرا پہلے مندر ہائی وے پر نکل آ گئے۔ چند کلومیٹر آگے تا نا ان گڑھ شہر تھا لیکن ہم وہاں نہیں رکے۔ اس سے چند کلومیٹر آگے ہجرت پور شہر تھا۔ جہاں انرپورٹ بھی تھا۔

ہم ہجرت پور میں صرف ایک گھنٹے کے تھے۔ کھانا کھانے کے علاوہ گاڑی میں پیڑول بھی ڈلوایا گیا اور پھر اس سڑک پر تقریباً نوے کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم تری بھون ہائی وے پر آ گئے۔ یہاں سے کھنڈو صرف ایک سو تیس کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

ہم نے تری بھون ہائی وے پر شمال کی طرف سفر جاری رکھا اور بالآخر سپہ پانچ بجے کے قریب تھان کوٹ پہنچ گئے۔ تھان کوٹ، کھنڈو سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوب صورت آبادی تھی۔ برہندرا نے کار آبادی سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں ایک خوب صورت جگہ کے سامنے روک لی۔ ہارن بجاتے ہی جھنگل کا گیت کھل گیا اور برہندرا کا کار کو اندر لیتا چلا گیا۔ برآمدے کے سامنے پہلے بھی نیلے رنگ کی ایک چھوٹی کار کھڑی تھی۔ برہندرا نے اپنی کار اس کے پیچھے روک لی اور انجین بند کر دیا۔

آتش فشاں 33 حصہ 6

اس وقت برآمدے والے دروازے سے ایک خوب صورت عورت کو برآمدہ ہوتے دیکھ کر میری آنکھوں میں الجھن سی تھ گئی۔ اس کی عمر پچیس چھپیس سال ہوگی۔ اس نے نیپالی لباس پہن رکھا تھا۔ برہندرا سے وہ بڑی گرم جوشی سے ملی تھی۔ ہمارا استقبال بھی اس نے بڑی گرم جوشی سے کیا تھا۔

وہ میٹھنا تھی۔ برہندرا کی دوست جو ایک اوجیز عمر ملازم کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ رسمی تعارف کے بعد میٹھنا نے فوراً ہی ہماری خاطر مدارات شروع کر دی۔ اس نے ملازم کو بازار بھیج کر کیک پیٹیاں اور پھل وغیرہ منگوا لیے اور چائے کے ساتھ یہ سارے لوازمات ہمارے سامنے پیش کر دیے۔

چائے کے دوران اور اس کے بعد بھی برہندرا زیادہ تر میٹھنا ہی سے باتیں کرتا رہا تھا اور پھر تقریباً سات بجے کے قریب وہ اعظم خان کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔

”ہم کھنڈو شہر جا رہے ہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے رات کو دیر سے آئیں یا صبح سے پہلے نہ لوٹ سکیں۔ تم لوگ یہاں آرام سے رہو۔ یہاں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم کھنڈو میں دیش کھ اور روئی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ ایک سو دو دن بعد شوہا تم لوگوں کے ساتھ ہوگی۔“

برہندرا نے میٹھنا کو بھی ہمارا خیال رکھنے کو کہا اور اعظم کے ساتھ باہر چلا گیا۔

جب ہم تنگ پور سے سرحد پار کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ہماری باگ ڈور اعظم خان کے ہاتھ میں تھی لیکن سرحد پار کر کے جوڑیا پانی سے یہ باگ دوڑ برہندرا نے سنبھال لی تھی اور اب ہم اسی کے ڈسپونل پر تھے۔

ان کے جانے کے بعد میٹھنا رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ کبھی وہ خود مصروف ہو جاتی، کبھی ملازم کو ہدایات دیتے لگتی اور کبھی ہمارے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔ بالآخر اس نے ایک کمرہ ہمیں دے دیا کہ ہم نماز وحوکر تسکین اتار لیں اور نازہ دم ہو جائیں۔

رات کے کھانے پر بھی میٹھنا خوب چبکتی رہی۔ وہ واقعی بہت خوش اخلاق اور مخلص عورت تھی۔ اسے یہ فکر کھلے جارہی تھی کہ ہماری خدمت خاطر میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

میٹھنا سے خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ کھانے کے بعد ہم بڑے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اعظم خان نے ہمیں برہندرا کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میرا

آتش فشاں 33 حصہ 6

اندازہ تھا کہ اس کا تعلق نیپال کی خفیہ پولیس سے ہے اور اب میکلہنا کی باتوں سے اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ خفیہ پولیس میں لیڈی انسپکٹر تھی۔

میکلہنا کی اپنی کمائی بڑی دلچسپ تھی۔ ذات پات ہندو دھرم میں ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے ہندوؤں کو اپنے قریب نہیں چھٹکنے دیتے۔ انہیں بچ اور لہجہ گردانا جاتا ہے۔ دھرم پر برہمن قابض ہیں۔ بچ ذات کا کوئی ہندو پنڈت نہیں بن سکتا لیکن مندروں میں دیوتاؤں اور پنڈتوں پجاریوں کی سیوا کے لیے بچ ذات کی لڑکیوں کو ہی گوبی، واسی یا جوگن بنایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے خوب صورت لڑکیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہ خوب صورت گویاں اور دایاں مندروں میں کسی دیوی یا دیوتا کے نہیں بلکہ برہمن پنڈتوں اور پجاریوں کے کام آتی ہیں۔ وہی ان سے سیوا کراتے ہیں اور وہی انہیں استعمال کرتے ہیں۔

بعض لڑکیوں کو دس گیارہ سال کی عمر میں ہی مندر کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ کسی دیوی یا دیوتا سے ان کی شادی کر دی جاتی ہے اور اس شادی کے بعد وہ کسی مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ تاہم مندر کے پنڈت اور پجاری آزادی سے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب وہ ان کے لیے بے کار ہو جاتی ہے، کسی کام کی نہیں رہتی تو اسے مندر سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ سڑکوں پر بھیک مانگ کر اور جسم بچ کر اپنا پیٹ پاتی ہے۔

بڑے بڑے دولت مند لوگ بھی مندروں کی ان خوب صورت گویوں اور دایاؤں سے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں۔ وہ پنڈتوں کی مٹھی گرم کر کے ان دایاؤں کو اپنے مشرت کدوں میں لے جاتے ہیں اور جی بھر جانے کے بعد انہیں واپس مندر میں پہنچا دیتے ہیں تاکہ ان جیسا کوئی دوسرا عیاش آدمی ان کے حسن و شباب سے اپنی ہوس کی آگ بجھائے۔ میکلہنا بھی چودہ سال کی عمر میں گھنٹو کے نارادیوی مندر میں آئی تھی۔ وہ تین سال تک مندر کے پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کرتی رہی۔ اس نے شر کے غمی دولت مندوں کی ہوس کی آگ بھی بجھائی اور پھر ایک دن انسپکٹر بریندر کی نظروں میں آگئی۔ انسپکٹر بریندر مندر کے پروہت کو ایک معقول رقم دے کر اسے لے آیا۔ بریندر اگرچہ شادی شدہ تھا لیکن اس کی بیوی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کوئی مرد کسی گوبی جوگن یا واسی کو مندر سے لے کر آتا ہے تو بیوی ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوتی ہے۔ بریندر کی بیوی نے بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

بریندر نے میکلہنا کو کچھ عرصے اپنے گھر پر رکھا اور پھر تھان کوٹ کے اس جنگلے میں لے آیا۔ وہ اس سے باقاعدہ شادی نہیں کر سکتا تھا لیکن میکلہنا کی سال سے اس کے پاس رہ رہی تھی اور بریندر اس کے تمام اخراجات دیوبے کرنا تھا۔ وہ تنگی اپنی بیوی کے پاس رہتا اور کبھی یہاں میکلہنا کے پاس۔ میکلہنا نے بھی دفاتر شادی کی حد کر دی تھی۔ اس نے دوسرے مرد کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شاید ایک ہی کھوٹے سے بندھے رہنے میں عافیت سمجھی تھی۔

سمیہارہ بچ مجھے بدلا صوفے پر بیٹھے بیٹھے اور گھر رہی تھی۔ دن بھر کے سفر نے مجھے بھی بری طرح تھک دیا تھا اور مجھے بھی نیند کے جھوٹے آ رہے تھے اور بالآخر میکلہنا کو بھی ہماری حالت پر رحم آ گیا اور ہم کمرے میں آگئے۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

وہ رات کا پچھلا سہرا تھا۔ نسوانی چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے بدلا کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں گھری نیند سو رہی تھی۔ اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ میں اس نسوانی چیخ کو اپنا واہمہ سمجھ کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ نسوانی چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ چیخ کی آواز اسی جنگلے کے کسی کمرے سے آئی تھی۔ چیخ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی فائز کی آواز بھی گونج اٹھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ بدلا بھی جاگ گئی تھی وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ رابداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بدلا کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور بند سے چلا نکلا۔ دروازے کی طرف دوڑا۔ میرے دماغ پر ابھی تک نیند کا خمار تھا اور تیز سننا ہٹ ہو رہی تھی۔

میں جیسے ہی رابداری میں پہنچا سامنے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تینہ تھا جسے اس نے سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا اور وہ وحشیانہ انداز میں دھاوا بول رہا تھا۔ کرنے کے لیے میری طرف لپک رہا تھا۔

میرا دماغ سن ہو گیا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا حملہ آور کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ دیش کھ تھا جو تینہ سر سے بلند کیے بھر پر حملہ آور ہو رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا جسم پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ موت میری طرف لپک رہی تھی اور میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

دیش کھ کا تینہ بڑی تیزی سے نیچے آ رہا تھا اور اس کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔

میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر لاوا کھولنے لگا ہو۔ یہ کھول ہوا اور میرے پیٹ سے سینے کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ کچھ جسم کو ایک زوردار جھکا لگا اور میرا لباس ہاتھ بے میرے جسم اور اٹھ گیا۔ دیش کھ کا تینہ والا ہاتھ برق رفتاری اختیار کر رہا تھا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ رکاوٹ بن گیا۔

دیش کھ کی تینہ والی کلائی میری گرفت میں تھی۔ اسے شاید اس کی توقع نہیں تھی کہ میں وار روک لوں گا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درد نکلی تھی مگر آنکھوں میں ایک لمحے کو الجھن ہی تھی۔

”میں تمہیں زخم نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ میری گرفت چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غرایا ”تمہارے سبب میرا سب کچھ برباد ہو گیا۔ تم بچ میں ٹانگ نہ اڑاتے تو شوہا کے ساتھ اس کی پر اپنی پر بھی میرا تعلق ہو چکا ہو مگر تم۔“

”یہ تمہاری بھول ہے دیش کھ۔“ میں نے جواب دیا ”ماحقہ پر سیاست کا نہیں لگانے سے آدمی بھگوان نہیں بن جاتا۔ تم بھول گئے تھے کہ مخلوقوں کے ساتھ بھی کوئی ایسی عینی طاقت ضرور ہوتی ہے جو ان کی مدد کرتی ہے۔ بھگوان نے شوہا کی مدد کے لیے مجھے بھیج دیا تھا۔ تم شوہا کو لے بھاگے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو۔“

”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے شوہا کو مجھ سے کوئی نہیں جھین سکتا۔“ وہ ایک بار پھر غرایا ”میں تمہیں تان سین ہی میں ختم کر دیتا مگر روکی کی ضد بھی کہ تمہیں گھنٹو تک آنے دیا جائے۔ تم لوگ تان سین کے ناراض مندر میں پنڈت رکھو ہاتھ سے پوچھ رہے تھے تو ہم اس وقت مندر کے غائبانے میں موجود تھے مگر رکھو ہاتھ نے بڑی خوب صورتی سے تم لوگوں کو بے وقوف بنا دیا۔ میں اسی رات سرائے میں گھس کر تمہیں ختم کر دیتا چاہتا تھا مگر روکی نے مجھے روک دیا۔ وہ چھوٹی سی جگہ ہے ہم نظروں میں آجاتے۔ پہلے تم میرے پیچھے لے ہوئے تھے لیکن تان سین سے ہم نے تمہارا پیچھا شروع کر دیا۔ تمہارے وہ دونوں گرد گھنٹو میں مصروف ہیں۔ یہاں تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

دیش کھ نے جھکا دے کر تینے والا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کے اس

بازو کی بغل میں زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنی جگہ پر اچھلا۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی اس کے اس بازو پر بٹھایا اور زوردار جھکا دیتے ہوئے نیچے بٹھتا چلا گیا۔

دیش کھ میرے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتے ہوئے پشت کے بل فرش پر گر کر اٹھرا۔ اس نے پھرتی سے لوٹ لگاتے ہوئے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ تینہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکلا تو میں نے پیچھے سے ایک زوردار ٹھوکر بٹھادی وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا مگر بڑی پھرتی سے پلٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور پوری قوت سے اسے موڑتے ہوئے خود بھی گھوم گیا۔ اس طرح وہ میری پشت پر آ گیا اور اس کا وہ بازو میرے کندھے کے اوپر سے آگے نکلا ہوا تھا۔ میں نے دو تین جھٹکے دیے تو تینہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے سامنے گر گیا۔

میں ایک بار پھر اس کے بازو کو جھکا دیتے ہوئے نیچے جھکا۔ وہ پھر میرے اوپر سے قلابازی کھاتے ہوئے پشت کے بل گرا۔ اس مرتبہ میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

دوسری رابداری کے ایک کمرے سے میکلہنا کی گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ فائز کی وہ آواز بھی پہلے اسی طرف سے آئی تھی۔ میں میکلہنا کی مدد کو پہنچنا چاہتا تھا مگر دیش کھ مجھ سے پلٹ گیا۔

اس نے پیچھے سے مجھے گرفت میں لے لیا تھا۔ دونوں ہاتھ میرے سینے پر پٹے ہوئے تھے اور وہ دباؤ بڑھا رہا تھا۔ مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں اس کی گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس نے میری ہڈیوں پر دباؤ بڑھانے کے ساتھ میرے کندھے پر دانت گاڑ دیے۔

وہ واقعی بھینسا تھا۔ اس کے دانت کندھے پر میرے گوشت میں گڑے جا رہے تھے۔ تکلیف کی شدت سے میں ہلکا اٹھا اور اسی لمحے میکلہنا چیتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

میکلہنا شب خوابی کے لباس میں تھی جو پھٹ چکا تھا۔ اس کے پیٹ اور سینے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بری طرح سے دھوکھا رہی تھی۔ اس نے ہال میں ایک کرسی کا سہارا لے کر سنبھلنے کی کوشش کی تو اسی وقت اس کے کمرے سے ایک لمبا ترنگا آدمی برآمد ہوا۔ اس کے بائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا



اور دائیں ہاتھ میں خنجر تھا جس سے خون نچک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دردوں سے بھی زیادہ درد کی تھی۔ وہ میٹکنا پر حملہ آور ہوا۔ میٹکنا نے چپٹے ہوئے پنجے کی کوشش کی مگر خنجر بائیں شولدر بلڈ کے قریب اس کی پشت میں بیوست ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چھ بڑی خوفناک مٹی۔

اس سے پہلے کہ اپنے ارادے پر عمل کرتا میرے سر پر سا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچا اٹھے۔ میں نے پھینکنے کی کوشش کی مگر... میرا ذہن تاریک ہو جاتا چلا گیا۔

○☆☆○

ہوش مجھے نیکو اسپتال میں آیا تھا۔

یہ اسپتال شہر کے جنوبی علاقے تریپور سوار میں واقع تھا۔ اس سے آگے شہر کی گلیاں آبادی والا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اسپتال کے ساتھ ہی وزارت ہیلتھ کے دفاتر بھی تھے بعض دیگر وزارتوں کے دفاتر بھی اسی علاقے میں تھے دریائے بھاگ متی کے کنارے پر آباد یہ شہر کاسب سے رہائشی علاقہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس طرف شہر کے دور دراز مندر کی رہائش تھی۔ بڑے بڑے بنگلے تھے کشادہ سڑکیں تھیں اور زندگی کی ہر وہ سولت موجود تھی جس کی ایسے پڑ علاقوں میں توقع کی جاسکتی ہے۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی میری آنکھوں کے سامنے دیر تک دھند سی بھاتی رہی۔ کانوں میں سنسنات کی آوازیں محسوس ہو رہی تھیں۔ میں آنکھیں کھولے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ چند منٹ بعد دھند چھٹنے لگی اور میرے حواس بحال ہونے لگے۔

میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے اور میں یہاں کیسے پہنچا تھا۔ میں نے اپنے اطراف میں دیکھنے کے لیے ہر کوئی حرکت دی تو دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ درد کی ٹیس میرے سر کے پچھلے حصے میں بچھ چلی گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار رکا رہا ہوئی اور کراہ کی آواز سن کر ہی سفید براتی پونٹ فارم میں لمبوس وہ لڑکے کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر گئے اندازہ لگائے میں دھڑا کر پیش نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں سفید ڈریس والی وہ لڑکی نرس تھی اور میں اسپتال میں تھا۔ ”ممم مجھے کیا ہوا ہے؟ کون لایا ہے مجھے یہاں؟“ میں نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مجھے بولنے میں گت تکلیف ہو رہی تھی اور دماغ میں ایک بار پھر دھماکے ہونے لگے تھے۔ میرا ایک ہاتھ بے اختیار سر پر پڑ چکا تھا۔ اس وقت پتا چلا کہ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”تم اسپتال میں ہو۔“ نرس نے کہا ”چھ مٹکناں ہو۔“ ہوش میں آنے پر آرام سے لیٹے رہا۔ میں ڈاکٹر کو بلا دیا۔

نرس تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں دیدے گھماتا ہوا

ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ میرے سامنے والی دیوار بالکل سیاہ تھی۔ دائیں طرف دروازہ تھا اور بائیں طرف ایک کشادہ کونڈی تھی جس کے سامنے نیلے رنگ کا پردہ پھیلا ہوا تھا۔ پردے پر باہر سے روشنی پڑتے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ اس مرتبہ میرے بائیں کندھے پر بھی درد کی شدید لہریں اٹھی تھیں۔ میں نے آہستہ سے گردن گھما کر دیکھا۔ بائیں کندھے پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پورے کندھے اور اس کے ساتھ گردن میں اوپر تک شدید کھینچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا تو دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بے حس و حرکت ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دماغ میں سنسنات پھیلنے جاری تھی اور پھر تدریج میں پرسکون ہوتا چلا گیا۔

اور پھر میں سوچے بغیر یہ رہ گیا کہ میرے جسم پر پٹیاں کیوں بندھی ہوئی ہیں۔ میں زخمی کیسے ہوا تھا اور مجھے اسپتال کون لایا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اچانک ہی میرے دماغ میں گھما کا سا ہوا اور مجھے سب کچھ یاد آیا۔

میں شہو کا دیش لکھ کے کھٹے سے چھڑانے کے لیے اس کا پتھا کرتے ہوئے نیپال پہنچا تھا۔ میرے ساتھ بلا بھی تھی اور اعظم خان نام کا بھارتی خفیہ پولیس کا ایک آفیسر اس سلسلے میں ہماری مدد کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک موقع پر میں نے اعظم خان کی جان بچائی تھی اور اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے اس نے ہماری مدد کا وعدہ کیا تھا۔ وہی ہمیں سرحد پار کروا کر نیپال لایا تھا۔ نیپال کے ایک سرحدی قصبے میں بریدر نام کے ایک اور آدمی سے ملاقات ہوئی تھی جس کے پاس میں بعد میں پتا چلا کہ وہ بھی نیپال خفیہ پولیس کا آفیسر ہے۔

ہم مکمل طور سے چند میل دور تھان کوٹ میں تھے۔ بریدر ہمیں اپنی دوست میٹکنا کے بنگلے پر چھوڑ کر اعظم خان کے ساتھ مکمل طور چلا گیا تھا اور پھر اس رات ایک نسوانی چچا اور فاکڑی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔

اس کے بعد جیسے جیسے مجھے یاد آتا رہا میری حالت غیر ہوتی گئی۔ اس لیے ترانے شخص نے شخصوں کے وار کر کے میٹکنا کو بری طرح گھاس کر دیا تھا۔ میں اسے بجانے کے لیے دوڑا تو دیش لکھ نے بلا پر بیٹھے سے حملہ کر دیا تھا۔ میں نے دیش لکھ سے تینہ چھین لیا اور وہی تینہ اس کے سینے میں

بیوست کرنا چاہتا تھا کہ میرے سر پر ہارٹ لوت پڑا۔ اس کے بعد مجھے ہوش میں رہا اور ہوش آیا تو میں یہاں اس حال میں پڑا تھا۔

میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ میٹکنا اور بلا کا خیال آتے ہی میں تڑپ اٹھا ”وہ دونوں کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں؟“ میں اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر اٹھ گیا اور بیڈ سے اترنا چاہتا تھا کہ دروازہ کھلا اور تین افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو وہی نرس تھی جو کچھ دیر پہلے باہر گئی تھی۔ ایک ڈاکٹر تھا اور تیسرا آدمی... اعظم خان تھا مجھے بیڈ سے اترتے دیکھ کر نرس تیزی سے آگے بڑھی۔

”رے ارے! کہاں جا رہے ہو۔ لیٹ جاؤ۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔“ وہ مجھے آنکھوں سے پکڑ کر لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

ڈاکٹر اور اعظم خان بھی قریب آگئے۔ ڈاکٹر نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لٹا دیا۔

”آرام سے لیٹے رہو۔ زیادہ حرکت کرو گے تو زخم کھل جائے گا۔“

”وہ کہاں ہیں۔ کیسی ہیں وہ دونوں۔ بلا اور میٹکنا۔“ میں نے رک رک کر کہا۔

”وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ آرام سے لیٹے رہو۔“ یہ بات ڈاکٹر کے بجائے اعظم خان نے کہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے آرام سے لیٹے رہنے کی تلقین کرنے لگا۔

ڈاکٹر نے کن آنکھوں سے اعظم کی طرف دیکھا اور میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹول ٹٹول کر پوچھنے لگا کہ مجھے کہاں تکلیف ہے۔ میرا تو پورا جسم دکھ رہا تھا۔ ہر جگہ جیسے بل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر مجھ سے باتیں کرتا رہا پھر اس نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے نیپالی زبان میں کچھ کہا۔ نرس فوراً ہی باہر نکل گئی لیکن اس کی داہنی میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ مٹی تھی جس میں زور رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ اس نے میرے بازو میں انجکشن لگا دیا اور خالی سرنگ بیڈ کے نیچے بڑے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینک کر چارٹ میں کچھ اندراج کرنے لگی۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ اعظم خان بیڈ کے قریب کھڑا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے میرا ایک ہاتھ اب بھی اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ میرا سر بھاری ہونے لگا۔ جسم ڈھیل پڑ گیا۔ اعظم خان کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور پھر میرے دماغ پر دھند سی طاری ہونے لگی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو اس دقت بھی دماغ پر بوجھل بن تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیلی ہوئی تھی جو پندرہ بج چلتی چلی گئی اور کچھ دیر بعد میرے حواس کام کرنے لگے۔ میں نے آہستہ سے گردن کھٹا کر دیکھا۔ نرس کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور اس سے ذرا پیچھے کوچ پر اعظم خان سو رہا تھا۔ مجھے حرکت کرتے دیکھ کر نرس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اعظم خان کو بھی جگا دیا۔ اعظم خان جلدی سے اٹھ کر میرے قریب پہنچ گیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب۔ کیا محسوس کر رہے ہو؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بہتر ہوں۔“ میں نے تھابت بھرے لہجے میں جواب دیا ”کندھے اور سر میں تکلیف ہے۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔“

”تمہیں ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ نرس نے میرے اوپر جھکتے ہوئے کہا ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اگر زخم کھل گیا تو زبرد ہو جائے گی۔“

”وہ وہ دونوں۔“

”وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔“ اعظم خان نے میری بات کاٹ دی ”کافی یا چائے پوئے؟“

”کافی بیوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اعظم خان نے نرس کو اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ اعظم کرسی پیچھے کر میرے قریب بیٹھ گیا۔

”تمہیں بولنے میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے بولنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔“

میں نے کہا۔

”پولیس تمہارا بیان لینا چاہتی ہے لیکن ہم نے فی الحال انہیں منع کر دیا ہے۔“ اعظم خان نے کہا ”پولیس والے اس وقت تک اس کمرے میں قدم نہیں رکھیں گے جب تک تم بیان دینے کے قابل نہیں ہو جاؤ گے لیکن اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ سب کچھ کیسے ہوا۔ وہ کون لوگ تھے؟“

”دیش کہ۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ!“ اعظم کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”میں سمجھا تھا شاید۔“

”شاید کیا۔؟“ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

”اوہ!“ اعظم کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”میں سمجھا تھا شاید۔“

”شاید کیا۔؟“ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

حملہ ہوا تھا اور تم نے میری جان بچائی تھی۔“ اعظم نے کہا ”دوسرا حملہ اس دقت ہوا تھا جب ہم کاٹھ گودام سے نکل پور کی طرف آرہے تھے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ایک اہم مشن پر نیپال آ رہا تھا اور یہ مشن انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا لیکن دشمنوں کو پتا چل گیا۔ وہ برصورت میں مجھے نیپال آنے سے روکنا چاہتے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ برینڈ راہم نیپال کی خفیہ پولیس میں اسپیئر ہے۔ یہ مجھے لینے کے لیے تیل پانی تالی اس سرحدی قصبے میں پہنچا ہوا تھا۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ ہم پر راستے میں پھر کوئی حملہ ہو گا لیکن ہم خیریت سے تھا کوٹ پہنچ گئے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میں صبح پانچ بجے نارائن چور ڈسٹرکٹ میں واقع پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک خفیہ میٹنگ میں تھے کہ برینڈ راہم کی دوست میٹھکنا کے بیٹے پر حملے کی اطلاع ملی۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے دشمنوں کو کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ میں اس بیٹے میں موجود ہوں۔ ہو سکتا ہے ان کے کسی تجربے ہیں بیٹے میں داخل ہوتے تو دیکھا ہو لیکن مجھے اور برینڈ راہم وہاں سے نکلے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ حملہ دراصل ہم پر ہوا ہے لیکن تم نے ایک اور دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ کیا وہ واقعی دیش کھ کے آدمی تھے؟ میرا مطلب ہے تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟“

”دیش کھ خود ان کے ساتھ تھا۔ اس لیے غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کیسے پتا چلا کہ فر لوگ اس بیٹے میں موجود وہ وہ تو خود تم سے پہنچنے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔“ اعظم خان نے کہا۔

”تان سین میں پنڈت رکھو تاہم نے ہمیں بلف با تھا۔“ میں نے جواب دیا ”جب ہم نارائن مندر میں ان لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور پنڈت رکھو ناٹو ہمیں ان کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا رہا تھا تو دیش کو اور اس کے ساتھی مندر کے زخانے میں موجود تھے۔“

پنڈت رکھو تاہم کے قریب میں آگئے اور ان کی تلاش ترک کر دی۔

”صبح دیش کھ اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا اور انہیں ہمارے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا۔ ان کا کوئی آدمی شاید بیٹے کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اسی رات تک تو ہم میٹھکنا سے باہر نہیں کرتے رہے تھے اور پھر سونے کے لیے چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر سو رہا ہوں گا کہ

میٹھکنا کی بیٹی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔“

”تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

”اوہ!“ اعظم کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”میں سمجھا تھا شاید۔“

”شاید کیا۔؟“ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

”اوہ!“ اعظم کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”میں سمجھا تھا شاید۔“

”شاید کیا۔؟“ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

”اوہ!“ اعظم کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”میں سمجھا تھا شاید۔“

”شاید کیا۔؟“ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

”اوہ!“ اعظم کے منہ سے گمراہی نکل گیا ”میں سمجھا تھا شاید۔“

خاموش ہو کر کمرے کے سامنے لیٹ گیا۔ اعظم خان کمری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا ”میٹھکنا بری طرح کھانسل ہو چکی تھی۔“ میں نے بالا خر کھنا شروع کیا ”بلا بھی زخمی ہوئی تھی۔ میں نے کسی اور کمرے سے فائرنگ کی آواز بھی سنی تھی۔ میں دیش کھ کی طرف سے وار کرنا چاہتا تھا کہ میرے سر پر زور دار ضرب لگی اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔“

”کیوں نہیں۔ وہ کس حال میں ہیں؟“

”میں تم سے کوئی بات نہیں چھاؤں گا۔“ اعظم خان کمرے کے سامنے لیٹے ہوئے بولا ”تم ایک باہمت اور دلیر آدمی۔“

”بات کو ابھانے کی کوشش مت کرو خان۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”جلدی بتاؤ وہ دونوں کیسی ہیں؟“ اعظم

جس انداز میں بات کر رہا تھا اس سے میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات جنم لینے لگے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

”میٹھکنا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ اس نے گمراہی سے کہا ”سناں لیتے ہوئے جواب دیا ”تم خود بتا چکے ہو کہ وہ شدید زخمی تھی اور بلا۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میٹھکنا سے میری ملاقات اگرچہ صرف چند گھنٹوں کی تھی لیکن اس نے جس طرح ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا جس خلوص اور چاہت اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔

اس کی موت کا سن کر میرے دل پر ایک ٹھونس سا لگا اور بلا کے بارے میں وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کو مسٹر خان۔“ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اپنی آواز بھی کسی گمراہی سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ”میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میں نے بدترین حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ میں نے بہت کچھ سنا ہے اور بہت کچھ سننے کی ہمت رکھتا ہوں۔“

”بھلا شدید زخمی ہے اور اس کی حالت تشویش ناک ہے۔“ اعظم خان نے جواب دیا۔

میرے دانت پیچھے گئے۔ سر میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے۔ میری مٹھیاں بھی پیچھی ہوئی تھیں۔ اعظم خان نے آگے بھٹک کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”موصلاً رکھو دوست۔“ وہ بولا ”ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق بلا کے لیے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اگر اس نے یہ چوبیس گھنٹے گزار لیے تو اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ خدا سے دعا کرو۔ دل سے مانگی ہوئی دعا ضرور پوری

ہوتی ہے۔“

”میں نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کافی پلا دوں۔“ وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں خودی لوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

نرس تیرا کپ کے کرکری پر بیٹھ گئی۔

دیش کھ نے میرے ہاتھیں کندھے پر دانت گاڑے تھے اور شاید وہاں سے بولی نوجلی تھی۔ میرے کندھے پر گردن اور ہاتھیں بازو میں تکلیف تھی۔ یہ بازو تو تنے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ دایاں بازو البتہ ٹھیک تھا۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے گرم کافی سے مجھے خاما سکون ملا۔

اعظم خان بھی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

”مقامی پولیس کو میٹھکنا کے کسی پرہیز نے فون پر فائرنگ اور چیخوں کے سننے جانے کی اطلاع دی تھی۔“ وہ کہہ رہا تھا ”پولیس پہنچی تو دو آدمی وہاں سے فرار ہو گئے۔ البتہ ان

ہوتی ہے۔“

میں آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایک بات اور۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”بلا تمہیں بہت تنگ کر رہا ہے لیکن میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟“

”کیا مطلب؟“ میں اچھل پڑا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

”ڈاکٹر بھاکر نے تمہیں چیک کرنے کے لیے تمہارے کپڑے اتار دیے تھے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ بات صرف ڈاکٹر بھاکر پر بند رہنا اور مجھے معلوم ہے کہ تم مسلمان ہو اور۔“ اسی لمحے دروازہ کھلا اور نرس نے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اعظم خان نے فوراً ہی بات بدل دی ”اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔“ وہ کہہ رہا تھا

”ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ برینڈ راہم کو جی سی مقامی پولیس اسٹیشن کی طرف سے اطلاع ملی، ہم ہیڈ کوارٹر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔“ وہ خاموش ہو کر نرس کی طرف دیکھنے لگا

جس نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی اور بیڈ کے بائیں طرف پہنچ کر وہ چرخی چھانے لگی تھی جس سے بیڈ کا سرانے والا حصہ اوپر اٹھ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیڈ کو مزید اوپر اٹھانے سے روک دیا۔ نرس نے میرے قریب آ کر تکیہ میرے پیچھے درست کر کے رکھ دیا اور زانی ٹیبل پیچھے کر بیڈ کی طرف کر دی۔ زانی کا ٹیبل والا حصہ بیڈ کے اوپر میرے سینے کے برابر آ گیا۔ نرس نے کافی کا ایک کپ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا اعظم خان کو تھما دیا۔

”میں اپنے ہاتھ سے آپ کو کافی پلا دوں۔“ وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں خودی لوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

نرس تیرا کپ کے کرکری پر بیٹھ گئی۔

دیش کھ نے میرے ہاتھیں کندھے پر دانت گاڑے تھے اور شاید وہاں سے بولی نوجلی تھی۔ میرے کندھے پر گردن اور ہاتھیں بازو میں تکلیف تھی۔ یہ بازو تو تنے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ دایاں بازو البتہ ٹھیک تھا۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے گرم کافی سے مجھے خاما سکون ملا۔

اعظم خان بھی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

”مقامی پولیس کو میٹھکنا کے کسی پرہیز نے فون پر فائرنگ اور چیخوں کے سننے جانے کی اطلاع دی تھی۔“ وہ کہہ رہا تھا ”پولیس پہنچی تو دو آدمی وہاں سے فرار ہو گئے۔ البتہ ان

ہوتی ہے۔“

میں آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایک بات اور۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”بلا تمہیں بہت تنگ کر رہا ہے لیکن میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟“

”کیا مطلب؟“ میں اچھل پڑا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

”ڈاکٹر بھاکر نے تمہیں چیک کرنے کے لیے تمہارے کپڑے اتار دیے تھے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ بات صرف ڈاکٹر بھاکر پر بند رہنا اور مجھے معلوم ہے کہ تم مسلمان ہو اور۔“ اسی لمحے دروازہ کھلا اور نرس نے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اعظم خان نے فوراً ہی بات بدل دی ”اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔“ وہ کہہ رہا تھا

”ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ برینڈ راہم کو جی سی مقامی پولیس اسٹیشن کی طرف سے اطلاع ملی، ہم ہیڈ کوارٹر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔“ وہ خاموش ہو کر نرس کی طرف دیکھنے لگا

جس نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی اور بیڈ کے بائیں طرف پہنچ کر وہ چرخی چھانے لگی تھی جس سے بیڈ کا سرانے والا حصہ اوپر اٹھ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیڈ کو مزید اوپر اٹھانے سے روک دیا۔ نرس نے میرے قریب آ کر تکیہ میرے پیچھے درست کر کے رکھ دیا اور زانی ٹیبل پیچھے کر بیڈ کی طرف کر دی۔ زانی کا ٹیبل والا حصہ بیڈ کے اوپر میرے سینے کے برابر آ گیا۔ نرس نے کافی کا ایک کپ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا اعظم خان کو تھما دیا۔

”میں اپنے ہاتھ سے آپ کو کافی پلا دوں۔“ وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں خودی لوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

نرس تیرا کپ کے کرکری پر بیٹھ گئی۔

دیش کھ نے میرے ہاتھیں کندھے پر دانت گاڑے تھے اور شاید وہاں سے بولی نوجلی تھی۔ میرے کندھے پر گردن اور ہاتھیں بازو میں تکلیف تھی۔ یہ بازو تو تنے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ دایاں بازو البتہ ٹھیک تھا۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے گرم کافی سے مجھے خاما سکون ملا۔

اعظم خان بھی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

”مقامی پولیس کو میٹھکنا کے کسی پرہیز نے فون پر فائرنگ اور چیخوں کے سننے جانے کی اطلاع دی تھی۔“ وہ کہہ رہا تھا ”پولیس پہنچی تو دو آدمی وہاں سے فرار ہو گئے۔ البتہ ان

کا ایک ساتھی زخمی حالت میں پڑا گیا۔ اسے کوئی لگی تھی۔ پچھلے کمرے میں میگھنا کے ملازم کی لاش بھی ملی اسے کوئی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ میگھنا، بلا اور ہمیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ میگھنا شدید زخمی تھی اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا۔ پولیس ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کرپائی کہ یہ ڈیوٹی کی واردات تھی یا کوئی اور معاملہ تھا۔ بریڈر کی وجہ سے پولیس والے میگھنا کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہیں چند ایسے دولت مندوں پر شبہ ہے جو باغی میں اسے پریشان کرتے رہے ہیں لیکن ابھی تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ہم پولیس کو بتانا نہیں چاہتے تھے کہ یہ حملہ مجھ پر یا بریڈر پر کیا گیا ہوگا۔

”کیا اس آدمی نے کچھ نہیں بتایا جسے زخمی حالت میں گرفتار کیا گیا تھا؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ”وہ بھی اسپتال پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ختم ہو گیا تھا۔“ اعظم خان نے جواب دیا ”اس کی جیب سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی لہذا یہ معاملہ ابھی ابی رہا لیکن اب تمہاری باتوں سے کچھ وضاحت ہو گئی ہے۔“ ”اور میرا خیال ہے کہ وہ لہا ترنگا آدمی“ جس نے میگھنا پر خنجر سے وار کیا تھے ”روی تھا۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”دیش کہ بے بتایا تھا کہ وہ مجھے تان سین ہی میں ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن روی نے اسے کوئی کارروائی کرنے سے منع کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں کھنڈو میں کوئی کارروائی کرنا زیادہ آسان ہوتا اور یہاں پہلا موقع ملے ہی وہ اپنی کارروائی کر گزرے۔ مجھے میگھنا کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ بے چاری ہماری وجہ سے ماری گئی۔ نہ ہم اس کے بچنے پر آتے اور نہ ہی۔“

”موت کا ایک دن مقرر ہے۔“ اعظم خان نے میری بات کاٹ دی ”بہر حال“ تمہاری باتوں سے ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ حملہ آور کون تھے اور حملے کا مقصد کیا تھا۔ اس سے پولیس کو اپنی کارروائی میں آسانی ہوگی۔“

”بریڈر کا کیا حال ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ بہت اب پیٹ ہے۔“ اعظم خان نے جواب دیا ”میگھنا کی موت نے اسے گہرا دکھ پہنچایا ہے۔ اسے اس بات کا بھی صدمہ ہے کہ اس کے مہمان بھی حملہ آوروں کی کارروائی سے محفوظ نہیں رہے۔ یہ نیپالی بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ مہمانوں کو بھولنا کا اوتار سمجھتے ہیں۔ ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے

ہیں۔ مہمانوں کی توہین تو وہ برداشت کر ہی نہیں سکتے اور یہاں تو معاملہ توہین سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس نے تم کھائی ہے کہ جب تک حملہ آوروں کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ نہیں اتار دے گا“ چپن سے نہیں بیٹھے گا اور تمہارے بیان کے بعد اسے حملہ آوروں کی تلاش میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ روی کو وہ آسانی سے تلاش کر لے گا۔“

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور بریڈر ڈاکٹر پر بھاگ کر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نرس جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میرے سامنے سے کافی کا خالی کپ اٹھالیا۔

بریڈر کے ہاتھ میں پھولوں کا گلہز تھا جس کے ساتھ ”کیٹ ویل سون“ کا کارڈ بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کے حوصلے کی داد دینی پڑی۔ وہ اپنی ایک عزیز ترین ہستی کا کیا کرم کر کے آیا تھا اور مجھے پھولوں کا گلہز پیش کر رہا تھا۔

بریڈر دو سری کرسی گھومت کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بیڈ کے دوسری طرف آیا اور میرے کندھے کی پٹی کھولنے لگا اور تب یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ مجھے اسپتال میں آئے ہوئے آج سیراؤں تھا۔ جب مجھے یہاں لایا گیا تھا تو میں بے ہوش تھا۔ مجھے اٹھارہ گھنٹوں بعد ہوش آیا تھا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد پھر بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر گھنٹوں بعد آنکھ کھلی تھی اور یہی وہ موقع تھا جب میں نے بے وقت سے اتر کر کمرے سے باہر جانے کی کوشش کی تھی اور اس وقت مجھے دیشیم کا انجشن لگا دیا گیا تھا۔

کندھے کی پٹی کھول کر ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کیا۔ میں نے گردن کے پھون اور بازو میں کھنچاؤ کی شکایت کی۔ ڈاکٹر نے دو اور غبرگہ لگا کر پٹی ڈرنک کر دی اور سر کی پٹی کھولنے لگا۔ میرے سر پر گیارہ ٹانگے لگے تھے۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق مجھے کئی روز اسپتال میں رہنا تھا۔ مجھے زیادہ بولنے بھی منع کر دیا گیا تھا۔ بلا بھی اسی اسپتال کے کسی اور کمرے میں تھی۔ میں نے اس سے ملنے کی اجازت چاہی تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔

”آج نہیں۔“ اس نے کہا ”تم کل شام کو اسے دیکھ کر آگے۔“ ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد نرس بھی باہر مل گئی تھی اور تب اعظم خان بریڈر کو دیش کہہ کے بارے میں بتانے لگا۔ ”اوہ!“ اس نے بھی حیرت کا اظہار کیا ”اس کا مطلب

ہے کہ یہ سب کچھ پنڈت رگھوناتھ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر وہ نہیں دیش کہہ دیتا تو ہوتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔ یہ پنڈت پنڈت نہایت مکار ہوتے ہیں۔ مجھے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا تجربہ ہو چکا ہے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے اس کی بات کا تین کیوں کر لیا تھا۔ بہر حال اب اس کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اگر تم بہتر محسوس کر رہے ہو تو انیسٹر چندر بھان کو بلا لیا جائے۔ وہ تمہارا بیان لیتا چاہتا ہے تاکہ اس کیس کی باقاعدہ تفتیش شروع کی جاسکے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا اور اس کے تقریباً آٹھ گھنٹے بعد انیسٹر چندر بھان میرے کمرے میں موجود تھا۔ مجھے ایک بار پھر شروع سے اس واقعے کی تفصیل دہرائی پڑی۔ انیسٹر چندر بھان سچ سچ سوالات بھی کر رہا۔

بیان میں میرا نام بہت سنگھ ہی لکھا گیا تھا اور میں نے یہ بھی بتا دیا کہ دیش کہہ بندوستان سے ایک عورت کو اغوا کر کے لایا ہے۔ چنے چنے چڑانے کے لیے میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ میرے بیان کا یہ حصہ آندوی ریکارڈر لکھا گیا تھا۔ میں نے میگھنا کو قتل کرنے والے کے لیے تڑگے جس آدمی کا طبع تھا تھا وہ روی تھا۔ دیش کہہ کا دوست جس کے پاس وہ بندوستان سے بھاگ کر پناہ لے لیا تھا۔

بریڈر اور اعظم خان بھی انیسٹر چندر بھان کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ نرس میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ وہ مجھے کھنڈو کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

نرس کی عمر چوبیس سال رہی ہوگی۔ اس کا قد لاٹا، رنگت کسی قدر سانولی لیکن چہرے کے نقوش اور جسم کی ساخت پرکشش تھی۔ وہ بدمعاش کی بیوہ کا تھی۔

میں تین دن سے اسپتال میں تھا اور ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق میرا زیادہ وقت بے ہوشی میں ہی گزرتا تھا اور اتفاق سے جب بھی میں ہوش میں آیا تھا میں نے ایامتی نامی اس نرس کو دیکھا تھا حالانکہ رات کو دوسری نرس ڈیوٹی پر آجایا کرتی تھی لیکن میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

اگلے روز شام کو مجھے بلا سے ملاقات کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت ایامتی ہی کی ڈیوٹی تھی۔ وہ مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر کمرے سے باہر لائی تو دروازے کے دواں بائیں کمرے ہوئے دو مسلح کانسٹیبل بھی ہمارے پیچھے چلے گئے۔ اسپتال کی یہ راہداری کافی کشادہ اور طویل تھی۔ اسے

دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسپتال کتنا بڑا ہوگا۔ ہم ایک دو سری راہداری میں آگئے جس کے اختتام پر بہت کشادہ لابی تھی۔ اس لابی میں اسپتال کا استقبال کاؤنٹر بھی تھا۔ بڑے سلیٹے سے کرسیاں اور بیچ رگے ہوئے تھے جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ٹکریٹ کے گملوں میں پودے لگے ہوئے تھے۔

لابی میں ایک طرف اوپر جانے کے لیے کشادہ زینہ تھا اور اس کے ساتھ ہی تین لفٹیں تھیں۔ ایامتی ایک نمبر لفٹ کے سامنے رک گئی۔ میں دباؤ سے ہی دروازہ کھل گیا اور وہ وہیل چیئر کو دھکیلے ہوئے اندر لے آئی۔ دونوں پولیس والے بھی اندر آگئے۔

لفٹ بہت کشادہ تھی۔ یہ لفٹ دراصل وہیل چیئر زاور اسٹریچر پر مریضوں کو اوپر لانے کے لیے مخصوص تھی جبکہ عام لوگوں کے استعمال کے لیے دوسری دو لفٹیں تھیں۔

تیسری منزل پر ہم لفٹ سے باہر آگئے۔ کشادہ راہداری میں نرسوں، ڈاکٹروں اور کچھ دوسرے لوگوں کی آمدرفت تھی۔ چند گز آگے بائیں طرف کی راہداری کے آخری دروازے کے ساتھ دو مسلح کانسٹیبل کھڑے تھے۔ نرس کے اشارے پر ایک کانسٹیبل نے دروازہ کھول دیا اور نرس وہیل چیئر کو دھکیلے ہوئے اندر آگئی۔ ہمارے ساتھ آنے والے کانسٹیبل باہری رک گئے تھے۔

سامنے بیڈ پر بلا پڑی تھی۔ چہرے کے علاوہ اس کا پورا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک نرس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ فوراً ہی اٹھ گئی۔

ایامتی نے وہیل چیئر بیڈ کے قریب کر دی۔ آہٹ سن کر بلا نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر چمکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ہاتھ چادر سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”دیکھو بھوت سنگھ۔“ اس کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔

میں کوئی جواب دینے کے بجائے اس کے چہرے کو ہلکا رہا۔ اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ بلا کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔

مجھے صرف چند منٹ وہاں رکنے دیا گیا تھا اور پھر ایامتی میری کرسی دھکیلے ہوئے مجھے باہر لے آئی۔

اس رات میں نے دوسری نرس کو پہلی مرتبہ اپنے کمرے میں دیکھا۔ وہ بونے سے قد کی گوری جتنی رنکٹ کی مالک دیکھی پہلی سی لڑکی تھی۔ وہ بھی بدھ مت کی پیروکار تھی۔ اس روز نہ تو اعظم خان آیا اور نہ ہی بریدر کی صورت دکھائی دی۔ اگلے دن بھی ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ تیسرے روز صبح جبکہ نرس مایا متی مجھے ناشتا کروا رہی تھی انسپکٹر اعظم خان دروازے میں نمودار ہوا۔ وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی سرخی تھی جیسے رات جاگ کر گزار دی ہو۔ نرس نے فوراً ہی اسے بھی چائے بنا کر دے دی۔

”ان کا کچھ پتا چلا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پولیس کارروائی کر رہی ہے۔“ اعظم خان نے جواب دیا ”روٹی تو شہر ہی میں کسی جگہ رو پڑا ہے لیکن دیش کھ کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ پنجاب کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے۔ بہت جلد ان کا سراغ لگایا جائے گا۔“

”پنجابور کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کھنڈو سے چند کلومیٹر آگے ایک دوسرا شہر ہے۔“ اعظم خان نے جواب دیا ”تم اطمینان رکھو۔ وہ لوگ بچ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ انسپکٹر چندر بھان ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میں اور انسپکٹر بریدر اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتے کیونکہ دوسری طرف ہمارا کھیل بھی شروع ہو چکا ہے۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن میں نے گریڈ نہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اعظم خان تقریباً ایک گھنٹے تک میرے پاس رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔

دو دن اور گزر گئے اس دوران میں بریدر صرف ایک مرتبہ چند منٹ کے لیے آیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے معاملے میں ابھی کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی کیونکہ وہ اپنے معاملات میں الجھ کر رہ گئے تھے اور ظاہر ہے میں ان پر دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ ان کی یہ مہربانی کیا کم تھی کہ یہاں مجھے ہر طرح کا آرام اور تحفظ حاصل تھا۔ اگر اعظم خان سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید میرے لیے نیپال کی سرحد پار کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ نیپال میں آتے ہی اعظم خان کے توسط سے بریدر سے ملاقات ہو گئی تھی اور میں ان بہت سی مشکلوں سے بچ گیا تھا جو بغیر کانفرنس کے کسی ملک میں داخل ہونے کی صورت میں پیش آسکتی ہیں۔

اس سے اگلے روز نرس مایا متی ڈیوٹی پر آئی تو اس کے

چہرے پر گھبراہٹ اور آنکھوں میں وحشت سی بچک رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ان ہنگاموں میں دو آدمی مارے گئے ہیں اور کئی زخمی ہوئے ہیں جنہیں شہر کے مختلف اسپتالوں میں داخل کرایا گیا ہے۔

مایا متی کے کہنے کے مطابق یہ ہنگامے کھنڈو میں بھارتی سفیر کے اس بیان کے بعد شروع ہوئے تھے جس میں نیپال عوام کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کیے تھے اور عوام احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے ان کا مقابلہ تھا کہ بھارتی سفیر کو فوراً ملک سے نکال دیا جائے۔

پولیس کی بھاری نفری نے بھارتی سفارت خانے اور سفیر کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لے لیا تھا لیکن عوام بھگتے ہوئے تھے۔ انہوں نے سفارت خانے کی عمارت پر پھراڑ شروع کر دیا۔ پولیس نے جہوم کو منتشر کرنے کے لیے پلے لائے چارج کیا اور پھر گولی چلا دی جس سے دو آدمی مارے گئے اور اس طرح ہنگامے پورے شہر میں پھیل گئے جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے ہیں۔

ہنگامے دو دن تک جاری رہے۔ نیپال کی حکومت نے بھارتی سفیر کے تنازعہ بیان پر باقاعدہ احتجاج کیا تھا اور سفیر کو وہیں کھنڈو کے اندر اندر ملک چھوڑنے کا حکم بھی دے دیا گیا تھا لیکن یہاں بھی ہندو حکمرانوں کی ذہنیت کام کر رہی تھی۔ سارا الزام پر پس پر تعویب دیا گیا کہ بھارتی سفیر کے بیان کو کھلا رنگ میں اور توڑ موڑ کر پیش کیا گیا تھا لیکن سفیر بھارتی حکومت کی طرف سے نہ تو معذرت کی گئی اور نہ ہی بھارتی سفیر کو واپس بلایا گیا۔

ان دو دنوں میں بریدر آیا اعظم خان سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے اور اس دوران میں اسپتال نہیں آئے تھے۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میرے زخم مندمل ہو رہے تھے لیکن ہلاک کی حالت بدستور تھی۔ میں دن میں کم از کم ایک مرتبہ ہلا سے ملنے کے لیے اس کے کمرے میں جا جاتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے رونا آتا تھا۔ اس کے زخم میں پس پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر اگرچہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا لیکن میں مطمئن نہیں تھا لیکن ظاہر ہے کہ میں کچھ کر بھی نہیں تھا۔

تین دن مزید گزر گئے۔ میری حالت کافی بہتر تھی۔ کدھے کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا اور پٹی کھول دی گئی تھی۔ سر کے زخم میں بخور ہی بہت تکلیف تھی اور ڈاکٹر کے

فرام کی ہیں۔“

”ہوسکتا ہے تمہارا بیان درست ہو۔“ میں نے اس کی بات سے اختلاف نہیں کیا۔

”وہیے ایک بات بتاؤ۔“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ”مگر اسپتال میں تھے تو اس وقت بھی میں نے یقین نہیں کیا تھا کہ تمہارا نام بہت سنگھ ہو سکتا ہے۔“

”کیوں۔“ یقین نہ کرنے کی وجہ؟“ میں نے اسے گھورا۔

”جب تمہیں اسپتال لایا گیا تھا تو تم بے ہوش تھے۔ تمہارے شر پر زخم چپک کرنے کے لیے ڈاکٹر پر بھاگنے تمہارا حاشہ کیا تھا تو میں بھی اس کے ساتھ تھی۔“ اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوه!“ میں نے جھنجھپ کر نظریں جھکا لیں۔

اور پھر میں نے موضوع بدل دیا۔ ہم ایک بار پھر اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے حوالے سے گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اس خبر میں مایا متی یا رتا کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ پولیس نے گمان کال کوئی معلومات کا ذریعہ سمجھ لیا تھا اور سام سنگ نے فون پر پولیس کو جو کچھ بتایا تھا وہی پریس کو جاری کر دیا تھا۔ بہر حال مصورت حال خواہ کچھ بھی ہو احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم دو چار روز تک رو پڑا ہی رہیں۔ سام سنگ نے رتا یا مایا متی کا نام اس لیے نہیں لیا تھا کہ شاید اس طرح وہ مایا متی کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دنیا کے خطرناک ترین انسان تھے۔ معمولی سے ٹک پر بھی کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ یقیناً مایا متی کو دھوکے میں رکھ کر اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ تاکہ اس کو گرفت میں لے کر میرے بارے میں معلوم کر سکیں۔

تین دن گزر گئے۔ مایا متی نے تو مگر سے قدم تک باہر نہیں نکالا تھا البتہ میں صبح ڈھابے پر جا کر اخبار اور ضرورت کی چیزیں لے آتا۔ پہلے دن کے بعد اخبار میں اس واقعے کے حوالے سے کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔

اس دوران میں میری ناک اور جڑے کی سوجن بہت کم ہو گئی تھی اور مایا متی بھی اپنے آپ کو پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ دن میں کم از کم تین مرتبہ مزیم سے اس کی باتیں ہوتی۔ وہ نرس تھی۔ اس کے گھر میں ایسی ادویات موجود تھیں جو ایسے موقعوں پر کام آسکتی تھیں۔

میں نے شیو بھی بوجھنا شروع کر دیا تھا تاکہ میرے ملنے

میں بخور ہی بہت تبدیل آسکے ان تین دنوں کے دوران میں مایا متی اپنی ایک نرس دوست کو فون کر کے ہلا کے بارے میں معلوم کرتی رہی تھی۔ ہلا میرے لیے پریشان تھی لیکن میرے لیے یہ اطلاع اطمینان بخش تھی کہ اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی۔

پانچویں روز پھر ایک چھوٹی سی خبر اخبار میں شائع ہوئی۔ اس خبر کے مطابق شہر کے دو گروہوں میں تصادم ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی مارا گیا تھا جس کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ ہنگام کے بد معاش اور منشیات کے اسمگلر ویدان کا ساتھی ہے۔ اس روز اخبار کا ادارہ یہ بھی اس خبر کے حوالے سے تھا۔ ادارے میں کھنڈو میں ویدان جیسے شخص کی موجودگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس شخص کو تلاش کر کے اس کی سرگرمیوں کا قلع بقیہ کیا جائے۔

صورت حال خاصی سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے پھنسانے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی۔ اس رات سام سنگ اور یثودھرنے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ یثودھ سام سنگ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اس کا قتل میرے کھاتے میں لایا گیا تھا اور اب دو گروہوں کے تصادم میں ایک آدمی مارا گیا تھا جسے میرا ساتھی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور پولیس اور عوام کو میرے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ پولیس میرے پیچھے لگ جائے اور میں یہاں نکلنے نہ پاؤں۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سام سنگ یہاں اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی آئے ہوں گے اور یہاں بھی اپنے ہی قبیل کے لوگوں سے ان کے گھرے رابطے تھے رتا کے بارے میں مایا متی بتا چکی تھی کہ وہ ناگ پال کے لیے کام کر رہی تھی۔ ناگ پال اسے اپنے آدمیوں کی دل جوئی اور مہمانوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ سام سنگ کا ناگ پال سے رابطہ تھا اور دوسری طرف روی سے بھی اس کا رابطہ تھا۔ اس رات مجھے ریٹورنٹ میں دیکھ کر وہ فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا تھا اور ہو سکتا ہے اس نے ٹیلی فون کر کے یثودھ کو دباں بلایا ہو یا ممکن ہے یثودھ اسی علاقے میں کہیں موجود ہو اور جب میں مایا متی کے ساتھ ریٹورنٹ سے نکلا تو ان دونوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی اور اب ایک اور قتل۔

میں نے اعظم خان اور بریدر سے رابطہ کرنے کا فیصلہ

کے مطابق مجھے اب اسپتال میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ڈاکٹر کی اطلاع میرے لیے خاصی تشویش ناک تھی کہ مجھے اسپتال سے ڈسچارج کیا جا رہا تھا۔ بریندر اور اعظم خان کا تین دن سے کچھ پتا نہیں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسپتال سے نکلنے کے بعد کہاں جاؤں گا اور بلا کا کیا ہوگا۔

میں پورا دن اس پریشانی میں مبتلا رہا اور پھر اسی شام اعظم خان اور بریندر ابھی آگئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر مجھے ڈسچارج کر رہا ہے تو بریندر نے کہا۔

”میرے خیال میں اب تمہیں اسپتال میں بڑے رہنے کی ضرورت تو نہیں۔ آرام تو تم گھر پر بھی کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر کی طرف سے مجھے اطلاع مل گئی تھی اسی لیے تو میں آیا ہوں کہ تمہیں گھر بھیجے کا بندوبست کیا جاسکے۔“

”کیا اسی بنگلے میں جہاں۔“

”نہیں۔ وہ جگہ اب تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔“ بریندر نے میری بات کاٹ دی ”تمہارے لیے دوسری جگہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ وہاں تم کسی مداخلت کے بغیر آرام بھی کر سکو گے اور آزادی سے تھوڑا بہت گھوم پھر بھی سکو گے۔“

”اور بلا کا کیا ہوگا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ بریندر نے جواب دیا ”وہ ابھی چند روز اسپتال ہی میں رہے گی اور پھر اسے بھی تمہارے پاس بھیج دیا جائے گا۔“

”اور ان کا کچھ پتا چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ ہم اپنی داخلی مصروفیات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکے لیکن مجھے امید ہے کہ اب چند روز میں ان کا بھی سراغ لگایا جائے گا۔“ بریندر نے کہا ”میرے آدمی آج رات کسی وقت تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔“

وہ دونوں تقریباً آدھے گھنٹے تک میرے پاس بیٹھے رہے اور پھر ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

رات گیارہ بجے ایک پست قامت آدمی کانٹیل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جوگندر کے نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے ایک تھپلا میری طرف بڑھا دیا۔

”ہاتھ روم میں جا کر کپڑے بدل لو۔ ہم تھوڑی دیر میں

یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

میں کچھ کے بغیر تھپلا لے کر لمحہ ہاتھ روم میں گھر گیا۔ تھپلے میں تنگ پائینے کا سفید پاجامہ، کھدر کا سفید کمرے اور کالا ہاف کوٹ تھا۔ جس نے اسپتال کے کپڑے اتار کر کھوٹی پر ٹانگ دیے اور یہ کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ جوگندر کے پاس پلاسٹک کے ایک تھپلے میں ہوائی چپل بھی تھے جو اس نے میرے سامنے رکھ دیے۔

میں نے اسپتال سے رخصت ہونے سے پہلے بلا سے ملنے کی خواہش کی تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر آ گئے۔

بلا جاگ رہی تھی۔ نرس کرسی پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ میں دس منٹ سے زیادہ وہاں نہیں رکا۔ بلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دیتا رہا اور پھر جوگندر کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔

بہت بڑا اسپتال تھا۔ آمدورفت کے لیے اس کے دو بڑے گیٹ تھے لیکن جوگندر کسی گیٹ کی طرف جانے کے بجائے راہداریوں میں گھومتے ہوئے اسپتال کی پچھل طرف آ گیا۔ وہ دونوں کانٹیل بھی ہمارے ساتھ تھے جو ہر وقت میرے کمرے کے دروازے پر موجود رہتے تھے۔

اس طرف ایک چھوٹا گیٹ تھا۔ اس گیٹ پر بھی ایک دربان موجود تھا لیکن اس نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم گیٹ سے باہر آ گئے۔

اس طرف تقریباً تین فٹ چوڑی سڑک تھی جس کے دوسری طرف بہت بڑا پارک تھا لیکن اس وقت پارک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سڑک پر بھی روشنی کا کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ بجلی کے کھمبے تو موجود تھے لیکن یہ شریلب یا تو ٹوٹ چکے تھے یا فیوز ہو گئے تھے۔ بائیں طرف بہت دور کسی کھمبے پر ایک بلب ٹنڈا ہونے دکھائی دے رہا تھا۔

گیٹ سے نکلنے پر بائیں طرف سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ جوگندر نے آگے بڑھ کر کار کا پیچلا دروازہ کھول دیا۔ میرے بیٹھے کے بعد اس نے پولیس والوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی حرکت میں آئی۔ نہ تو ڈرائیور نے جوگندر سے کچھ پوچھا تھا اور نہ ہی جوگندر نے ڈرائیور کو کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ڈرائیور جانتا تھا اسے کہاں جانا ہے۔

گاڑی دو تین سڑکوں پر گھومنے کے بعد پیکالی بھیروامند

کے قریب سے گزر کر تریپور اور ٹیکو ڈسٹرکٹ کو ملانے والی سڑک پر نکل آئی۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا جوگندر مجھے بتاتا ہوا روڈ پر نکل کر ہم کس کس علاقوں سے گزر رہے ہیں۔ وہ سڑکوں بار بار تھا کہ ہم کس کس علاقوں سے گزر رہے ہیں۔ وہ سڑکوں اور راستے میں پڑنے والی بڑی بڑی عمارتوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔

دیرانے بھاگ متی بار کر کے ہم لٹ پور PUR LALIT کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہ کشادہ سڑک چوک سے ہوتی ہوئی سیدھی قدیم شاہی محل اور دربار اسکو انز کی طرف چلی جاتی تھی۔ اگرچہ رات کے بارہ بجتے والے تھے مگر اس علاقے میں خاصی رونق تھی۔ لگتا تھا ابھی شام اتڑی ہو۔ تمام رہنموسر اور کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہماری کار دربار اسکو انز سے گزر کر ماہڈھا عبادت گاہ کی طرف نکل گئی اور اس سے تقریباً نصف میل آگے رنگ روڈ کے قریب ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور کو صرف ایک مرتبہ ہارن بجانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ عین کھل گیا اور وہ کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

یہ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی پہلے سے موجود تھا۔ جوگندر نے سکھانامی اس شخص کو میرے بارے میں ہدایات دیں اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”سکھا آپ کا خادم ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف اس سے کہہ دیں۔“

”شکریہ۔“ میں نے کہا ”فی الحال تو میں کالی کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔“

جوگندر نے سکھا کی طرف رخ کر کے صرف میرے لیے ایک کپ کالی بنانے کو کہا اور پھر مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”آئیے میں آپ کو کمرہ دکھا دوں۔“

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس بنگلے میں تین بیڈ رومز تھے۔ ہر بیڈ روم ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وہ مجھے اس بیڈ روم میں لے آیا جو دوسرے کمروں سے قدرے بڑا تھا اور اس میں ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک کرسی پر اپنا بیگ اور کرسی کے نیچے اپنے جوگندر اور بلا کے سینڈل دیکھ کر میں چنگے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ہمارے سامان پہلے ہی یہاں پہنچا دیا گیا تھا اور یہ پہلے ہی سے طے تھا کہ اسپتال سے فارغ ہو کر ہمیں یہیں لایا جائے گا اور اسی لیے ہمارے لیے ڈبل بیڈ والے کمرے کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن فی الحال میں اکیلا ہی یہاں آیا تھا۔

ہم دوبارہ لاؤنج میں آ گئے۔

”ٹھیک ہے سر۔“ جوگندر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”آپ کالی پی کر آرام کیجئے۔ میں چلتا ہوں اور یہ۔“ اس نے جیب سے کافی کا ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ وہ ادویات ہیں جو آپ کو اسپتال میں استعمال کرائی جا رہی تھیں۔ آپ ان کا استعمال جاری رکھیے۔“

میں نے لفافہ اس سے لے لیا۔ جوگندر نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا۔ وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا اور ٹھیک اسی وقت سکھا بکن سے برآمد ہوا تھا۔ اس نے کالی کا کپ سینئر نیبل پر رکھ دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ جوگندر کی گاڑی جیسے ہی باہر نکلی وہ گیٹ بند کر کے اندر آیا۔

میں کمرے میں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ فرش پر سینیٹیک قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی مناسب ہی تھا۔ ایک طرف چھوٹی میز پر ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور کپ اٹھا کر بجلی بجلی چسکیاں لیتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

میرے لیے صورت حال نہایت سہجی تھی۔ میں خود زخمی تھا اور بلا اسپتال میں پڑی تھی جس کے بارے میں مجھے زیادہ تشویش تھی۔ ہم شوبھا کو دیش کھ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے اور ہمارے آتی ہی دو بے گناہ مارے گئے تھے شاید میرا سایہ ہی منوس تھا۔ جہاں جاتا تھا قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ یہاں آنے کے پہلے ہی دن دو قتل ہو گئے تھے۔ اب آگے پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔

یہاں اگرچہ مجھے اعظم خان اور بریندر جیسے بااثر پولیس افسروں کی حمایت حاصل تھی لیکن میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میں اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا عادی نہیں تھا لیکن مجبور یہی تھی کہ میں خود بھی زخمی تھا اور بلا بھی، بریندر اور اعظم خان اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ابھی تک دیش کھ اور روی کا سراغ نہیں لگ سکے تھے۔ دس بارہ روز ہو چکے تھے اور میں شوبھا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک لاؤنج میں بیٹھا انہی سوچوں میں غلغلہا رہا۔ میں نے ایک دو مرتبہ نوٹ کیا تھا کہ سکھا ایک طرف قالین پر بیٹھا بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اچانک ہی خیال آ گیا کہ وہ میری ہی وجہ سے یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے دیوار پر گئی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ سکھا بھی میرے پیچھے ہی آیا تھا۔

”میری وجہ سے تم بھی جاگ رہے ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے تو نیند نہیں آ رہی۔ تم جاگ رہے ہو۔“

”سنگھا کچھ کے بغیر بیڈ کے سامنے والی دیوار کے قریب رک گیا۔ اس دیوار میں تین مربع فٹ کی ایک الماری بنی ہوئی تھی جس کے پت بند تھے۔ اس نے الماری کے دائیں طرف والے پینل پر لگا ہوا سفید رنگ کا ایک مٹن دبا دیا۔ الماری کے دونوں پٹ اسپلٹ ونڈو کی طرح اطراف میں سمٹ گئے۔“

اندر ایک ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک خانے میں کئی ویڈیو کاسٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ سنگھا نے ٹی وی کی سائیڈ میں رکھا ہوا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

”نیند نہیں آ رہی تو ٹی وی سے دل ہلایئے۔ اس وقت چینل نمبر سات پر بڑے اچھے پروگرام آتے ہیں۔ اگر اس دوران میں کسی چیز کی ضرورت محسوس کریں تو مجھے آواز دے کر بلائیں۔“

”نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم جاگ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

سنگھا کے جانے کے بعد میں اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دائیں طرف ڈرننگ ٹیبل بھی تھی جس پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کسی عورت کی آمد رفت بھی رہتی ہے۔ میٹھکانے بتایا تھا کہ برینڈر شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ایک الگ مکان میں رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اسی کا گھر ہو اور برینڈر نے میری وجہ سے اپنی بیوی کو چند روز کے لیے کہیں اور بھیج دیا ہو۔

میں نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ ذہن پریشانیوں کی آماجگ بنا ہوا ہو تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کچھ دیر تک کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ریموٹ کنٹرول کا مٹن دبا کر ٹی وی آن کر دیا۔

اس کمرے کی سیٹنگ میں کچھ باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ مثال کے طور پر ٹی وی والی وہ الماری ایسی جگہ بنائی گئی تھی کہ بیڈ پر لیٹے لیٹے آرام سے ٹی وی دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے نیچے کا سہارا لے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لیا اور ریموٹ کنٹرول کے مٹن دبا دیے۔ زیادہ تر بھارتی چینلر تھے۔ میں چند منٹ ایک چینل کا کوئی پروگرام دیکھتا اور پھر دوسرا چینل لگا دیتا۔ چینل سات لگتا ہے میرا داغ بھگ

سے اڑ گیا۔ بہت ہی گندا اور بے ہودہ پروگرام تھا۔ یہ بھی انڈیا ہی کا کوئی چینل تھا۔ میں پہلے بھی کسی جگہ جتا چکا ہوں کہ بے حیائی اور بے غیرتی میں انڈیا والے یورپ اور امریکا کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گئے تھے اور یہ چینل بھی ان کی بے غیرتی کی عکاسی کر رہا تھا۔ میں نے ٹی وی بند کر دیا اور سوپنے لگا کہ سنگھا نے مجھے یہ دلچسپ پروگرام دیکھنے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟ خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی تلاش کر لیا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ مجھ جیسا جوان اور تنہا آدمی شاید اس قسم کی چیزوں سے دل بہلانا پسند کرتا ہو۔

میں نے بیڈ سوچ آف کر کے جی بجا دی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

تیسرے دن شام کے بعد نرس مایامتی میرے سر کی پٹی تبدیل کرنے کے لیے پہنچ گئی۔

”تمہیں کس نے یہاں آنے کے لیے کہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اپنے مریض کا چچا اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جائے۔“ مایامتی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا تمام مریضوں کا اسی طرح چچا کیا جاتا ہے؟“ میں نے اسے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ”یہ تو ڈیپنڈ کرتا ہے۔ اچھا آؤ۔ میرے سامنے بیٹھو۔ تمہاری ڈرننگ تبدیل کر دوں۔“

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ میری پشت پر کھڑے ہو کر پٹی کھولنے لگی۔

”میرا خیال ہے اب ڈرننگ کی ضرورت تو نہیں۔“ وہ زخم پر اٹلی پھیرتے ہوئے بولی ”زخم تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب صرف احتیاط کی ضرورت ہے۔“

”اگر ڈرننگ کی ضرورت نہیں تو رہنے دو۔“ میں نے سر کے زخم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اچھا۔ اب یہ بتاؤ تمہارا آج شام کا لیا پروگرام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

میں کئی روز تک اسپتال میں رہا تھا اور اس دوران مایامتی سے اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کھنڈوسے تقریباً سو کلومیٹر دور آرٹیکوہائی وے پر واقع سن کو سی بازار نامی چھوٹے سے قصبے کی رہنے والی ہے۔ کھنڈوس میں وہ ایلی بلی رہتی تھی۔ یہاں اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا جس میں اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی رہتی تھی جو کسی سرکاری آفیسر کی سیکریٹری تھی۔

”جیسا مطلب؟“ مایامتی نے میرے چہرے پر نظرس جما دیا۔

”مطلب یہ کہ میں ہڈیاری کی حد تک بور ہو چکا ہوں۔“ تنہائی سے غمراہ لگا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ کم از کم آج کی شام تم میرا ساتھ دو۔ ہم دونوں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھا سکیں گے اور۔“

”اور اس کے بعد؟“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”اس کے بعد میں تمہیں تمہارے فلیٹ پر چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ مگر سانس لیتے ہوئے بولی ”اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی خوشی ملتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن پہلے مجھے اپنے فلیٹ پر جانا پڑے گا۔“

”کیوں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کپڑے بدلنے ہوں گے۔ اس لباس میں تو میں بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔“ اس نے کہا۔

”بالکل اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ میں نے اسے اور سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ شام کو ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اسپتال سے نکلنے سے پہلے لباس تبدیل کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے کمرے کے کھڑکے اسکرٹ اور سیلوسیل بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ بھی گھٹنوں سے کچھ اوپر تھا۔

”تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ صرف چند منٹ لگیں گے۔“ میں اسے ہال میں چھوڑ کر کمرے میں آیا اور دروازہ بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے کا پھر جو کڑ پڑنے اور کمرے سے باہر آیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں اپنے بیگ میں سے کچھ رقم لینا نہیں بھولا تھا۔

اس وقت شام کے آٹھ بجنے والے تھے۔ مایامتی کے ساتھ میں نے یہ تفریح کے لیے پروگرام نہیں بنایا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت بڑھ چڑھ کر رہا تھا اور پچھلے دو دن سے سوچ رہا تھا کہ اب مجھے بھی اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دینی چاہیے۔ ان دو تین دنوں کے دوران میں میں نے سنگھا سے شہر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ایک مرتبہ تو میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ سنگھا کو ساتھ لے کر شہر میں نکل چلوں لیکن سنگھا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوگا۔ اتفاق سے مایامتی

آگئی تھی۔ اسے ڈاکٹر پر بھار کرنے میری ڈرننگ تبدیل کرنے کے لیے بھیجا تھا اور ڈاکٹر پر بھار کو کو برینڈر کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ وہ میرا خیال رکھے۔ میں نے مایامتی کو دیکھ کر ہی باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا اور مایامتی تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد تیار ہو گئی تھی۔

ہم بیٹگلے سے نکل کر کچھ دور تک پیدل چلتے رہے پھر میں نے ایک سائیکل رکشا روک لیا۔ یوں تو ایک دو خالی ٹیکسیاں بھی ہمارے قریب سے گزری تھیں لیکن میں نے سائیکل رکشا کو ترجیح دی تھی۔ اس طرح میں شہر کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو سکتا تھا۔ رکشا بڑی خوب صورتی سے چلایا گیا تھا۔ اوپر محراب کی طرح خوب صورت چھت بنی ہوئی تھی۔ یہ چھت محض رکشا کی سجاوٹ کے لیے تھی کیونکہ اس سے نہ تو دھوپ سے بچا جاسکتا تھا اور نہ ہی بارش سے۔

رکشا کی سیٹ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بالکل بڑک بیٹھے تھے اور میں نے محسوس کیا تھا کہ مایامتی نے کچھ جان بوجھ کر کبھی اپنا بوجھ میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کنارے کی طرف دبا دیا۔ مایامتی کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

رکشا بان اور میزمر لیکن ہٹا سکتا آدمی تھا۔ مایامتی نے اسے کاتنی ہاتھ (روز) کا کہہ دیا تھا۔

ہم جو دھاگٹھ سے دریا پار کر کے شالیا مندر کے قریب سے ہوتے ہوئے تری بھون پونو ریشی کے پہلو سے گزر کر کاتنی ہاتھ پر آگئے۔ یہ سڑک تریپور مارگ سے شروع ہو کر شہر کے دوسرے سرے پر لیکھ ہاتھ مارگ تک چلی گئی تھی۔ شہر کی تمام قابل ذکر بڑی بڑی عمارتیں اور شاہنشاہ سینٹروں اس سڑک پر یا اس کے آس پاس واقع تھے۔ کاتنی ہاتھ دیکھ کر مجھے ہلکا کاٹھوسم وٹ روڈ یاد آیا۔ اس کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کاتنی ہاتھ کے ایک طرف منجنان آبادی کا علاقہ تھا۔ اسے قدیم شہر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بعض کشادہ سڑکوں کے ساتھ تنگ اور پر بھوم بازاروں اور گلیوں کا ایک جال سا تھا جو چاروں طرف میلوں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندوؤں کے لاتعداد مندر اور بدھ عبادت گاہیں بھی اسی علاقے میں واقع تھیں۔

مایامتی مجھے ہر چیز کے بارے میں بتا رہی تھی۔ یہ جنرل پوسٹ آفس ہے، یہ لٹری اسپتال اور یہ جیبرا اسپتال۔ وہ سامنے رہتا پارک ہے اور اس کے ساتھ رانی پوکھی اور وہ سامنے دائیں طرف ٹیٹل تھیٹر ہے۔ اس سے ذرا آگے چلے



جائیں تو کماری چوک ہے۔

مایا متی اس سڑک پر اور اس کے آس پاس واقع بڑے بڑے ہوٹلوں کی نشان دہی بھی کر رہی تھی۔ پورا شہر روشنوں سے جگمگا رہا تھا۔ مایا نے رکشا منتقل جھیرے کیلے ہی بائیں طرف آسن جہاں روڈ پر مڑا لیا۔ اب ہم نیکان آبادی والے علاقے میں آگئے تھے۔ مایا متی ایک ایک چیز کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ شہر کی قبریاں دیکھنے کے لیے آیا ہوں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ میں بڑی توجہ سے سڑکوں کے نام اور راستے ذہن نشین کرنا جا رہا تھا۔

دربار چوک پر مایا متی نے رکشا رکوا لیا۔ میں نے اتر کر کرایہ ادا کیا اور مایا متی کے ساتھ ایک طرف چلے گئے۔ یوں تو اس وقت شہر کے ہر چوک، ہر سڑک اور ہر موڑ پر روشنی تھی لیکن دربار اسکو اتر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی رات نہیں ہوتی۔ ہم گنگا پاتھ سے ہوتے ہوئے فریک اسٹریٹ پر آگئے۔ یہاں چند اچھے ریستورنٹس تھے۔ فاسٹ فوڈ کی بے شمار دکانیں تھیں۔ خوراک میں زیادہ تر چھلی اور بعض پرندوں کا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ میزوں سے بھی طرح طرح کی لذیذ ڈشیں تیار ہوتی تھیں۔ چھلی سے بھی کئی طرح کی ڈشیں تیار ہوتی تھیں اور اس وقت تو پورے بازار میں کئی ہوئی اور کونوں پر بھونی جانے والی چھلی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

مایا متی میرا ہاتھ پکڑے ایک ریستورنٹ میں داخل ہو گئی۔ اچھا معیاری اور انٹرکنٹیننٹل ریستورنٹ تھا۔ بیشتر میزں اگرچہ بھری ہوئی تھیں مگر شور شرابا بالکل نہیں تھا۔ ہر میز پر مردوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی لڑکی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے لباس بھی ایسے تھے کہ نظرس بے اختیار اس طرف اٹھ جاتی تھیں۔

ایک میز خالی ہوئی تو ہم نے فوراً اس پر قبضہ جمالیا۔ اس کے چند سینکڑے بعد ہی ساتواں رنگت والی ایک جوان و میٹرو بھی ہمارے سر پر نازل ہو گئی۔ مایا متی نے اپنی پسند کا آرڈر دے دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہماری میز پر کھانا سرو کیا گیا۔ دو قسم کی چھلی تھی اور بنگے کا گوشت تھا جو کئی طرح کوکلوں پر بھونا گیا تھا۔ میں نے بنگے کے گوشت کو تو ہاتھ نہیں لگایا البتہ میں چھلی پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ چھلی واقعی بہت لذیذ تھی یا کئی روز تک اسپتال کا پرہیز کیا کھانا کھانے کے بعد پہلی مرتبہ چٹ پٹی چیز کھائی تھی اس لیے مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ اپنے قریب ایک نرس آواز سن کر میں چوک گیا۔

”ہیلو مایا۔“

”ہیلو رتنا۔“ مایا متی نے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مایا متی کی طرح کم عمر تھی۔ رنگت گوری چنی اور چہرے کے نوچ بھی دل فریب تھے۔ سب سے زیادہ کشش اس کے نظر تھی۔ اس نے بلاؤز بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ سامنے کوکلوں کی شکل کی اضافی کوشش کے بغیر نہایت آسانی سے بلاؤز اندر دھونے لگتا تھا۔ رتنا کے سرخ ہونٹوں پر پتھر کی طرح مسکراہٹ تھی۔

رتنا کیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک آدمی بھی تھا اور اس آدمی کی صورت دیکھ کر میرے دل میں سا سا جھجکا اور شدید سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈیوں پر دوڑتی چلی گئی۔

وہ شخص بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ میں نے اسے سامنے سے بھی پہچان لیا تھا۔ اس لیے اس نے وہاں پہچان لیا تھا لیکن اس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے بھاگ لپٹے میں عافیت بھی تھی۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھوں۔ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن مایا متی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا۔ آپ میں جھجھکی اور اپنی نظرس اس کے چہرے پر آ گئی تھی۔ یہ اطمینان بھی تھا کہ رتنا مایا متی کی دوست تھی اور سام دیں۔ میرے اندر کی صلاحیتیں بیدار ہو رہی تھیں۔ سب سے زیادہ رتنا کے ساتھ تھا۔ بعد میں کسی بھی وقت رتنا سے اس میری وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی جس نے مجھے پچھلے کئی روز کے بارے میں پوچھا جاسکتا تھا۔

بکری کے پینے کی طرح بڑول بنائے رکھا تھا۔ میں اب راست اس شخص کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک میری نظروں کی تاب نہ لاسکا اور پلکیں پچھلے ہوئے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا اور پھر رتنا کا ہاتھ پکڑ کر ”آؤ مس رتنا، دیر ہو رہی ہے۔ تم بھول گئی ہو؟“

دس بجے ایک جگہ پر پہنچا ہے۔

رتنا نے چوک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا دیکھا۔ چھڑانے کی کوشش کی مگر میں نے دیکھ لیا کہ اس کے اس شخص کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

”ہم تو یہاں کھانا کھانے آئے ہیں مسٹر سام۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ تم سے زیادہ تمہیں ایک دم کوئی اور بات کیسے یاد آگئی۔ کیا اب بھوک نہیں لگ رہی؟“ رتنا نے یہ کہتے ہوئے مسکرائی۔ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بھول گیا تھا۔“ سام سب نامی اس شخص کو جواب دیا ”دیر ہو گئی تو گزر ہو جائے گی۔ کھانا ہم دینا“

”کھانا کھا رہے تھے کہ اپنے قریب ایک نرس آواز سن کر میں چوک گیا۔“

”ہیلو مایا۔“

”ہیلو رتنا۔“ مایا متی نے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مایا متی کی طرح کم عمر تھی۔ رنگت گوری چنی اور چہرے کے نوچ بھی دل فریب تھے۔ سب سے زیادہ کشش اس کے نظر تھی۔ اس نے بلاؤز بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ سامنے کوکلوں کی شکل کی اضافی کوشش کے بغیر نہایت آسانی سے بلاؤز اندر دھونے لگتا تھا۔ رتنا کے سرخ ہونٹوں پر پتھر کی طرح مسکراہٹ تھی۔

رتنا کیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک آدمی بھی تھا اور اس آدمی کی صورت دیکھ کر میرے دل میں سا سا جھجکا اور شدید سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈیوں پر دوڑتی چلی گئی۔

وہ شخص بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ میں نے اسے سامنے سے بھی پہچان لیا تھا۔ اس لیے اس نے وہاں پہچان لیا تھا لیکن اس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے بھاگ لپٹے میں عافیت بھی تھی۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھوں۔ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن مایا متی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا۔ آپ میں جھجھکی اور اپنی نظرس اس کے چہرے پر آ گئی تھی۔ یہ اطمینان بھی تھا کہ رتنا مایا متی کی دوست تھی اور سام دیں۔ میرے اندر کی صلاحیتیں بیدار ہو رہی تھیں۔ سب سے زیادہ رتنا کے ساتھ تھا۔ بعد میں کسی بھی وقت رتنا سے اس میری وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی جس نے مجھے پچھلے کئی روز کے بارے میں پوچھا جاسکتا تھا۔

بکری کے پینے کی طرح بڑول بنائے رکھا تھا۔ میں اب راست اس شخص کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک میری نظروں کی تاب نہ لاسکا اور پلکیں پچھلے ہوئے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا اور پھر رتنا کا ہاتھ پکڑ کر ”آؤ مس رتنا، دیر ہو رہی ہے۔ تم بھول گئی ہو؟“

دس بجے ایک جگہ پر پہنچا ہے۔

رتنا نے چوک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا دیکھا۔ چھڑانے کی کوشش کی مگر میں نے دیکھ لیا کہ اس کے اس شخص کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

”ہم تو یہاں کھانا کھانے آئے ہیں مسٹر سام۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ تم سے زیادہ تمہیں ایک دم کوئی اور بات کیسے یاد آگئی۔ کیا اب بھوک نہیں لگ رہی؟“ رتنا نے یہ کہتے ہوئے مسکرائی۔ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بھول گیا تھا۔“ سام سب نامی اس شخص کو جواب دیا ”دیر ہو گئی تو گزر ہو جائے گی۔ کھانا ہم دینا“

”میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”تم اسے کیسے جانتی ہو۔ میرا مطلب ہے رتنا کو؟“

”رتنا بھی میرے ساتھ اسپتال میں نرس تھی۔“ مایا متی نے جواب دیا ”اس کی ڈیوٹی زیادہ تر انجینل وارڈ اور پرائیویٹ رومز میں ہوتی تھی جہاں دولت مند مریض ہی داخل ہوتے ہیں۔ رتنا کو اسپتال کی سب سے دولت مند نرس سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک ریٹائٹ گاڑی بھی تھی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کے پاس دولت کماں سے آتی ہوگی۔“ وہ

چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”اور پھر اس نے ایک بہت دولت مند مریض کو پھانسل لیا اور اسپتال کی نوکری چھوڑ دی۔ ہمارا خیال تھا کہ رتنا اس دولت مند شخص سے شادی کر لے گی لیکن وہ نہیں اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ سیاست میں رہ کر کوئی شخص خوب بے وقوف نہیں بننا بلکہ دوسروں کو بنانا ہے۔ اس میں سیاست داں نے بھی رتنا کو بے وقوف بنایا تھا۔ کچھ عرصے اس سے کھیلتا رہا اور پھر اسے دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اب وہ اس کے دوستوں اور مہمانوں کا دل بھلاتی ہے لیکن رتنا بہت خوش ہے کیونکہ

دل بھلاوے کے ساتھ اسے دولت بھی مل رہی ہے۔ پچھلے دنوں سنا تھا کہ اس نے گورکھ میں ایک خوب صورت لاج خرید لیا ہے۔“

”گورکھ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر شمال میں۔“ مایا متی نے جواب دیا ”خوب صورت مل اسٹیشن ہے۔ وہاں رائل پیلس اور قلعہ بھی ہے۔ نیپال کی رائل فیملی گریموں میں چند ہفتے وہیں گزارتی ہے۔“

”رتنا کے دوست سیاست داں کا کیا نام ہے؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”ناگ پال۔“ مایا متی نے جواب دیا ”اس نے انسانوں کے روپ میں واقعی بہت سے ناگ پالے ہوئے ہیں۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”کیا وہ اسمبلی کا ممبر بھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں لیکن وہ اسمبلی کے کسی ممبر پر مقرر کیا گیا۔“ مایا متی نے کہا ”اس نے اپنے گرو بہت طاقتور کر رکھی ہے۔ اسے تم نیپال کا بال ٹھاکرے کہہ سکتے ہو۔ جب چاہے جگہ سے جگہ کو کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پچھلے دنوں جو جگہ سے ہوتے تھے، اُسے اب میں بھی اسی کا ہاتھ تھا مگر تم اس قدر کرید کیوں کر رہے ہو؟“ مایا متی نے میرے چہرے پر نظرس جمادیں۔

”کچھ نہیں۔ یونہی۔ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے۔“ میں نے جواب دیا اور نگھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور سوچ زیادہ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے دماغ میں جھگڑے چل رہے تھے۔ جب ہم بورت کے سرحدی قصبے تک پور میں تھے تو انسپکٹر اعظم خان نے بتایا تھا کہ ایک خاص گروہ نیپال میں گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ نیپال اور بھارت کے تعلقات میں دراڑیں آجائیں۔ ہو سکتا ہے جرائم پیشہ لوگوں کا وہ گروہ اتنا زیادہ طاقت ور نہ ہو لیکن اسے تریاؤ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ تریاؤ TRIAD اگرچہ بانگ کانگ کی مافیا تنظیم تھی جسے اس وقت دنیا کی سب سے خوفناک تنظیم سمجھا جاتا ہے اور میں جانتا تھا کہ تریاؤ کا جہل کھوراث جیسے خطرناک ترین لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔

انسپکٹر اعظم خان کے کہنے کے مطابق تریاؤ نیپال میں اس جرائم پیشہ گروہ کی پشت پناہی کر کے نیپال کی انتہائی میں اپنے آدمی پھینکا چاہتی ہے تاکہ نیپال کے شمال مغربی علاقوں تک اس کی رسائی ہو سکے جہاں دنیا کی بہترین افواج پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے وہ علاقے بھی ملتے تھے جو پست کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ اور اب سام سنگ کو یہاں دیکھ کر انسپکٹر اعظم خان کے خیالات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ سام سنگ یقیناً اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں موجود ہوں گے لیکن سام سنگ مجھے دیکھ کر کھٹک گیا تھا۔

اتفاق سے سام سنگ کا تعلق بھی ایسے آدمی سے تھا جسے نیپال کی سیاست میں نرمل میکر کہا جاسکتا تھا۔ مایامتی نے ناگ پال کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے تو ایسی ہی رائے قائم کی جاسکتی تھی۔

میں نے سام سنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور فی الوقت میری نظروں میں رہتا ہی ایسی ہستی تھی جو اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی تھی اور فوری طور پر رتا کے بارے میں مزید کوئی سوال کرنا مایامتی کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی میں دیش کھ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ وہی تو میرا اصل مشن تھا۔ اسے میں کیسے بھول سکتا تھا۔ دیش کھ، دوی کی پناہ میں تھا اور وہ دونوں روپوش تھے۔ پولیس ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن میں نے انہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ رتا ہی سے دوی کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہو سکے گا۔

ریٹورنٹ سے نکل کر ہم ٹھلے ہوئے اندر اچکر طرف آگئے۔ دس بجنے والے تھے لیکن ساری دکانیں ہوئی تھیں۔ دکانوں کے سامنے ہانکوں نے ڈیرے بنائے تھے فٹ پاتھ اور سڑک کا بیشتر حصہ تو ان ہانکوں نے رکھا تھا۔

میں ایک ہانک کے کہیں کے پاس رک گیا۔ آریو جیولری جی ہوئی تھی۔ میں نے ایک خوب صورت سر خرید کر مایامتی کو دیا تو وہ کھل اٹھی۔

”اے ہاتھ سے باندھ دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے رست بیٹھا اس کی کلائی پر باندھ دیا۔ اہ قبت اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن مایا اس کچھ پر ہمت ہوئی تھی۔

ہم ہیل ٹول کی طرف جانا چاہتے تھے لیکن آگے بند تھا۔ دو تین گاڑیاں اس طرح پھنس گئی تھیں کہ پیچھے ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ ایک کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر جس سے پیدل چلنے والوں کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔

”اس طرف سے آؤ۔ اس کلائی سے نکل چلے۔“ مایامتی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف کھینچنے لگی۔ ہم بازار کے عقب میں آکاش مندر والی گلی میں چلے گئے۔ اس مندر کا مرکزی دروازہ دوسری طرف ڈچپل کی طرف واقع ہے۔ تنگ سی گلی سنسان بڑی تھی۔ اندر تھا۔ سامنے مونڈ پر بدھم روکشی کا بلب جل رہا تھا لیکن روشنی یہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مایامتی ایک اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے گلی کے سامنے گلی کا موڑ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔

طرف سے بھی ایک آدمی گلی میں آ رہا تھا۔ ہمارے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مڑ کر ایک عورت اور ایک مرد تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر پیچھے بھی آ رہے تھے۔ غالباً یہ لوگ بھی ہماری طرح بازار سے نہجے کے لیے اس طرف آ گئے تھے۔

میں مایامتی سے باتیں کرتے ہوئے چلا رہا۔ مایا میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ میرے ساتھ چلی ہوئی تھی۔ سامنے سے آنے والا آدمی ہمارے قریب تھا۔ وہ گلی کے عین وسط میں چل رہا تھا۔ وہ مزید قریب پہنچنے لگا۔ مایامتی کو دباتے ہوئے ایک طرف ہٹا چاہا تو وہ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

قریب پہنچ کر اس شخص نے اپاکا ہی میرے

گھونسا مار دیا۔ مجھے لگا جیسے میری ناک پر کسی وزنی ہتھوڑے سے زور دار ضرب لگائی گئی ہو۔ میرا دماغ پھینچنا اٹھا۔ ہاتھوں کے سامنے نیلی نیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ ایسا ہی جیسے ہونے بیچے گر گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں سنبل سکتا، پیچھے سے آنے والے آدمی نے بھی میری گردن پر زور دار گھونسا رسید کر دیا۔ میں کراہتے ہوئے آگے کو گرنے لگا تو سامنے والے شخص نے زوردار ٹھوکر لگا دی۔

ٹھوکر میرے سینے پر لگی۔ میرے منہ سے چیخ نکلی گئی۔ میں اچھل کر سیدھا ہوا تو دوسرے آدمی نے ایک اور گھونسا رسید کر دیا۔

میں سنبلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ان دونوں نے مجھے چھاپ لیا تھا۔ ان کے گھونٹوں اور لاقوں سے مجھے سنبلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مایامتی کی چیخوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے عقب سے آنے والے آدمی کی ساتھی عورت مایامتی کی دھناتی کر رہی تھی۔

اب مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ تقریباً ایک گھنٹا پہلے ریٹورنٹ میں سام سنگ سے سامنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ مایامتی کی جانکار ایک سابق نرس رتا بھی تھی۔ سام سنگ فوراً ہی وہاں سے کھٹک گیا تھا۔ اس نے رتا سے کہیں اور کھینچنے کا بہانہ کیا تھا لیکن اب بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ کہیں جانے کے بجائے وہ ریٹورنٹ کے آس پاس ہی کہیں موجود رہا تھا اور غالباً فون کر کے اپنے کسی ساتھی کو بلایا تھا۔ وہ ریٹورنٹ سے ہی ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ پارونٹ بازاروں میں انہیں ہمارے خلاف کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن اس سنسان اور تاریک گلی میں انہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔

اندھیرے میں ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ان دونوں میں ایک سام سنگ تھا اور وہ عورت یقیناً رتا تھی جو مایامتی کی پناہی کر رہی تھی۔

میں کچھ دیر تو ان سے پتہ نہ چلا لیکن پھر مجھے موقع مل گیا۔ میرے پیچھے ٹھوکر سامنے والے آدمی کی پٹائی کی پٹائی پر لگی۔ وہ کراہتے ہوئے ایک ٹانگ پر تانچ کر رہ گیا۔ میں نے اسے سنبلنے کا موقع دیے بغیر اس کے منہ پر زوردار پیچ رسید کر دیا اور اس کے ساتھ ہی بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرا آدمی مجھے لگ لگاتے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا پیچ پکڑ کر پیچھے اچھال دیا۔ وہ لڑکھڑا کر کرا اور جب اٹھنے کی

کوشش کر رہا تھا تو میری کک اس کی پیلیوں پر پڑی اور وہ چیخ اٹھا۔

اور پھر میں نے ان میں سے کسی کو سنبلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں پر وہ حربہ استعمال کر رہا تھا جس کی اس وقت ضرورت تھی۔ ایک کو لگ اور دوسرے کو پیچھے میری ایک کک رتا کو بھی لگی جو مایامتی کو رمید رہی تھی۔ وہ جیتنے ہوئے دوسری طرف اٹھ گئی۔

سام سنگ نے چاقو نکال لیا۔ چاقو کھلنے کی ”کررر“ کی آواز سن کر ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ اترتا سینے کی طرح ڈکراتے ہوئے میری طرف لڑکا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس کی پیشانی پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے اٹھ گیا۔ چاقو بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑنے ہوئے دور جا کر اٹھا۔

فلائنگ کک لگانے کے بعد میں بھی پیچھے گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبل گیا۔ دوسرا آدمی اس دوران میں مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ میں نے اسے ہاتھوں پر سنبل کر دور اچھال دیا اور اٹھ کر اس پر چھلانگ لگا دی۔

میں اس کے سینے پر سوار اس کا گلا دپونے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک چیخ ہوئی تو آواز سنائی دی۔

”بہمت شگ، بچو!“

یہ مایامتی کی آواز تھی۔ میں نے ایک سیکنڈ کے بڑا رویں حصے میں اس آواز میں پوشیدہ ہدایت پر عمل کیا اور اپنے حریف کو چھوڑ کر ایک طرف لوٹ لگا دی اور اسی لمحے زمین پر پڑے ہوئے میرے حریف کی خوفناک چیخ گونج اٹھی۔

سام سنگ چاقو سے مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ مایامتی نے بروقت مجھے خبردار کر دیا۔ میں تو ایک طرف لوٹ لگا کر چاقو کی زو میں آنے سے بچ گیا لیکن سام سنگ کا چاقو زمین پر پڑے ہوئے میرے حریف کے سینے میں دسے تک پوسٹ ہو چکا تھا۔

سام سنگ بدحواس ہو گیا۔ وہ چاقو اس کے سینے میں پوسٹ چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔ اسی وقت میں نے سنبل کر اسے زوردار فرنٹ کک لگا دی۔ وہ جیتنے ہوئے زمین پر گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر مجھ پر حملہ کرے گا لیکن وہ حملہ کرنے کے بجائے اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ رتانے بھی اس کے پیچھے ہی دوڑ لگا دی۔

مایامتی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھی۔

”تم ٹھیک ہونا مایا۔ زیادہ چوٹ۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ کراہی ”سر پر چوٹ لگی ہے مگر میں ٹھیک ہوں۔“

اس نے ایک ہاتھ سر سے ہٹالیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے بھی گھوم کر زمین پر پڑے ہوئے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست تھا اور وہ تڑپ رہا تھا۔

اسی وقت سامنے کے موڑے گلی میں تین چار افراد داخل ہوئے۔ ان میں کوئی عورت بھی تھی جس کے قمقمے کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

”اس طرف آجاؤ۔ اس گلی میں۔“ مایامتی میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑی۔

ہم پہلو کی ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ یہ گلی بہت تنگ اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک طرف مندر کی دیوار تھی اور دوسری طرف مکانوں کی عقبی دیوار۔ ان مکانوں کے دروازے دوسری طرف کشادہ گلی میں تھے۔

یہ تنگ اور تاریک گلی تقریباً پچاس گز طویل تھی۔ ابھی ہم نے نصف راستہ طے کیا تھا کہ عقب سے ایک خوفناک نسوانی چیخ سنائی دی۔ دوسری گلی میں آنے والوں نے گلی میں پڑے ہوئے اس شخص کو دیکھ لیا تھا جس کے سینے میں چاقو پیوست تھا۔ میں مایامتی کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگا۔

ہم ایک کشادہ گلی میں نکل آئے یہاں قدرے روشنی تھی اور کچھ لوگوں کی آمدورفت بھی تھی۔ میں نے مایامتی کی طرف دیکھا۔ رتا سے دھینکا مشتقی میں اس کا ہاڈو پھٹ گیا تھا اور بال اٹھے ہوئے تھے۔ میری قمیص کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ گریبان نیچے تک کھلا ہوا تھا۔ بال بھی بھرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے یہ ملنے ہمیں لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنا سکتے تھے۔

مایامتی ایک طرف چلتی رہی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم گلیوں ہی گلیوں میں چلتے ہوئے کیڑا کیل کے مین روڈ پر نکل آئے۔ اس طرف دوکانیں بھی اکا دکا ہی تھیں اور زیادہ لوگوں کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔ مایامتی بار بار اپنے جسم کے مختلف حصوں کو سسلا رہی تھی۔ میرا خیال تھا رتنا نے اس کی اچھی خاصی ہینکائی کر دی تھی۔

مایامتی نے ایک خالی ٹیکسی روک لی۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھے تو ڈرائیور نے گردن گھما کر مشتبہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ مایامتی نے ڈرائیور کو باغ بازار کا کہہ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

ٹیکسی کیل ٹول اور آسن ٹول کے علاقوں سے ہوتے

ہوئے کاتقی ہاتھ عبور کر کے رتیا پارک کے ساتھ باغ بازار کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ یو ہوٹل سے ذرا آگے نکل کر مایامتی نے ٹیکسی روکالی۔ میں نے میز پر دیکھ کر کراہی ادا کیا اور ہم دونوں پیدل ہوٹل کی طرف چلتے گئے۔ وہ ٹیکسی آگے جا کر بائیں طرف مڑ گئی۔

مایامتی نے ایک اور ٹیکسی روکالی۔ اس ٹیکسی کے ذریعے ہم ریشا پتھر پر آگے اور پھر ایک سائیکل رکشا پر بیٹھ کر کالی کا استھان نامی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں بڑے بڑے بنگلے تھے جی اور چھوٹے مکان بھی۔ رکشا چھوڑ کر ہم کافی دیر تک پیدل چلتے رہے اور بالآخر ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ بنگلا نما یہ مکان دوسرے مکانوں سے قدرے الگ تھلک تھا۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور گیٹ پر کالا گا ہوا تھا۔

”دیوار سے کوڈر اندر سے چھوٹے دروازے کا کنڈا کھول دو۔“ مایامتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا ”یہ کس کا مکان ہے۔ اگر چوری کے الزام میں دھر لے گئے تو؟“

”کوئی کچھ نہیں کے گا۔“ مایامتی نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ گلی کافی کشادہ تھی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ کا وقت ہو گا۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک کر دیوار پر چھا اور دوسری طرف کوڈر چھوٹے دروازے کا کنڈا کھول دیا۔ مایامتی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے برآمدے کی طرف چلے گئے۔

برآمدے میں پہنچ کر مایامتی ایک دیوار کو ٹٹولنے لگی اور پھر ”جھن“ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ کوئی چیز نیچے گری تھی۔ مایامتی کے ساتھ میں بھی جھک کر فرش پر ٹٹولنے لگا اور پھر چابیوں کا وہ گھما میرے ہاتھ میں آگیا جو اوپر سے گرا تھا۔ میں نے گھما مایامتی کے حوالے کر دیا۔

مایامتی نے برآمدے والے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر بتی جلا دی اور پھر آگے بڑھ کر دوسری بیتاں بھی جلاتی چلی گئی۔ وہ جس طرح اس مکان میں گھوم پھر رہی تھی اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ مکان اور اس کی کوئی چیز اس کے لیے اچھی نہیں تھی۔

”آؤ تم یہاں کیوں رک گئے۔“ اس نے برآمدے والا دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

”یہ مکان۔“

”پتا ہی ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیت سی مسکراہٹ اچھٹی تھی ”یہ مکان میرے تاؤ کا ہے۔ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے تھے پھر گاؤں چلے گئے۔ میں صرف ویک اینڈ پر یہاں آجاتی ہوں۔ ایک دو دن بڑے سکون سے گزر جاتے ہیں۔“

یہ مکان دو بیڑہ موزار اور ایک مختصر سے لاؤنج پر مشتمل تھا۔ مناسب فرنیچر بھی موجود تھا اور کچن میں بھی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

مایامتی مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ یہاں بیڈ پر کچھ کتا ہیں اور کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی جس پر ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مایامتی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

مایامتی کے چہرے اور گردن پر چند خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یہ غالباً رتا کے خانخوں کا کامل تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر بھی گومڑا سا بھرا آیا تھا۔ وہ خراشوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہاتھ سے دائیں طرف سینہ بھی دبا رہی تھی۔

میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میری ناک پکڑا بن گئی تھی اور بائیں طرف کا جڑا بھی سوجا ہوا تھا۔ مایامتی نے آئینے میں مجھے دیکھا اور اٹھ کر دیوار کے شیشے پر رکھا ہوا ایک ڈبا انا کر لے آئی۔ یہ میڈیکل باکس تھا۔ اس نے ایک ٹیوب نکالی اور انگلی پر کریم نکال کر میری پھولی ہوئی ناک اور جڑے پر لگانے لگی۔ اس نے دوسری ٹیوب سے اپنے چہرے اور گردن کی خراشوں پر کریم لگائی اور پھٹا ہوا ہاڈو انا کر دیا۔ وہ جس طرح بار بار اپنا سینہ دبا رہی تھی اس سے پتا چلتا تھا کہ اس کے سینے پر اچھی خاصی ضرب لگی تھی۔ اس نے دبی ٹیوب اٹھائی جس سے میری ناک اور جڑے پر کریم لگائی تھی اور جب وہ ہاڈو کے نیچے کا رٹوڑ اور پڑا اٹھانے لگی تو میں وہاں سے ہٹ گیا۔

میں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں جھانکنے لگا۔ چند منٹ بعد مایامتی کمرے سے برآمد ہوئی تو وہ لباس بھی تبدیل کر چکی تھی۔ میں اس وقت لاؤنج میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کچن میں گھس گئی اور چند منٹ بعد چائے بنا کر لے آئی جس میں پاؤڈر ملک استعمال کیا گیا تھا۔

”میں اس کتیا کو چھوٹوں می نہیں۔“ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی ”مجھے خیال نہیں تھا کہ وہ بد معاشوں کے ساتھ رہ کر خود بھی بد معاش ہو گئی ہے۔ اس نے پرانی

دوستی کا بھی خیال نہیں کیا۔ کم بخت نے اس طرح مارا اور نو چاکھوٹا ہے کہ میرے بدن کا جو ڈھول کر رہ گیا ہے۔“ میں نے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھیلا لباس پہنے ہوئے تھی جس کا مطلب تھا کہ اب وہ اس گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ میں کچھ کتنے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تمہارا ویلٹ کہاں ہے؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے پاس ہے۔“ میں نے جب سے ویلٹ نکال کر اسے دکھایا۔

”اس کا مطلب ہے انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔“ وہ بولی۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو؟ انہوں نے ہمیں کیوں گھیرا تھا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں لوٹنے کے لیے۔“ مایامتی نے کہا ”وہ غنڈوں کے ساتھ مل کر آج کل شاید یہی دھندا کر رہی ہے۔ اس نے سمجھا ہو گا کہ شاید میں نے کوئی بہت دولت مند ٹاکس پھانسا ہے۔ چیل میں جی سات گھر چھوڑ کر ادرات کرتی ہے لیکن اس کیمنی نے تو حد کر دی۔ میں اسے ایسا مزہ پکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔“

مایامتی کی باتوں نے مجھے کسی حد تک چونکا دیا تھا لیکن میں نے اس معاملے میں زیادہ جرح نہیں کی۔ ”کیا تم سمجھتی ہو کہ انہوں نے ہمیں لوٹنے کے لیے حملہ کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“ وہ بولی ”دولت کی ہوس نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ کسی دن وہ ماری جائے گی۔“

”اس آدمی کو پہلے بھی بھی تم نے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ چھٹی ناک والا جو ریٹورنٹ میں اس کے ساتھ آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور یوں بھی رتا تو بہت دنوں بعد نظر آئی تھی۔ ”مایامتی نے جواب دیا۔ ”تمہیں یاد ہے میں ریٹورنٹ میں تم سے رتا کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا اور تم نے میری اس جرح کا مطلب بھی غلط سمجھا تھا۔“

”تو اب مطلب سمجھا دو۔“ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور اپنا سینہ سسلا نے لگی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے چوٹ کچھ زیادہ ہی گہری لگی تھی۔

”وہ آدمی کوئی رہزن نہیں ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا ”اس کا تعلق دنیا کی خطرناک ترین مافیا تنظیم تریاڈ سے ہے اور وہ راہزنی کی معمولی وارداتوں کے لیے تھائی لینڈ سے یہاں نہیں آیا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ اچھل پڑی۔  
”تم نے اسپتال میں اسپیکٹر اعظم خان اور بریندرا کو پاتیں کرتے سنا تھا۔“ میں نے کہا ”یہاں نیپال میں ایک بہت خوفناک سازش جنم لے رہی ہے بلکہ اس گھناؤنی سازش پر عمل شروع ہو چکا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ اس کی نظرس اب بھی میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔  
”تیرا ایک بہت بڑی مافیا تنظیم ہے اس کا ہیڈ کوارٹر اگرچہ بنگ کانگ میں ہے لیکن اس کی جڑیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پوری دنیا میں منشیات کی سپلائی پر اس کا کنٹرول ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے تیراڈ کے بارے میں بتانے لگا۔ ”آخر میں“ میں کہہ رہا تھا ”یہی خوفناک تنظیم تیراڈ اب نیپال میں اپنے قدم جما چاہتی ہے۔ نیپال کی ایک جرائم پیشہ تنظیم سے اس کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس میں کچھ سیاست دان بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ سیاست میں اپنے آدمیوں کو اوپر لاکر اس ملک میں منشیات کی پیداوار پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ قتل و غارت ان کے لیے معمولی بات ہے۔“

”یہ تو بریندرا جیسے پولیس والوں کا درد سر ہے۔ تمہارا ان معاملات سے کیا تعلق؟“ مایامتی نے کہا ”تم اپنی کسی دوست کو کسی بدعاش کے قتل سے بچانے کے لیے یہاں آئے ہو۔ اس آدمی نے تم پر حملہ کیوں کیا تھا؟“

”ان لوگوں سے میرا کچھ پرانا حساب چل رہا ہے اور آج اتفاق سے وہ شخص میرے سامنے آ گیا تھا۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تھائی لینڈ کے واقعات کے بارے میں بتانے لگا ”میں نے کولڈن ٹرائی اسٹنل میں گھس کر جنرل کھوراث کو ہماری نقصان پہنچایا تھا۔ وہ بہت عرصے تک مجھے تلاش کرتا رہا تھا لیکن میں تھائی لینڈ سے نکل گیا تھا اور مختلف ملکوں میں گھومتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں۔ اس واقعے کو اگرچہ بہت عرصہ بیت چکا ہے مگر ایسی باتیں آسانی سے نہیں بھلائی جاسکتیں۔ یہاں سام سنگ سے آسمان سامنا ہونے اور ہم پر اس حملے کا مطلب یہ ہے کہ پرانا کھیل دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔“

میری باتیں سن کر مایامتی جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔  
”کیا تمہارا یہ مکان محفوظ ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے بارے میں اور کون جانتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“ مایامتی نے کہا ”میں اپنے ساتھ کام کرنے والی دوسری لڑکیوں سے کچھ مختلف واضح ہوئی ہوں۔ دوسری لڑکیاں دیکھ لینا اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتی ہیں اور میں یہاں آرام کرنے آئی ہوں۔ مطالعہ کرتی ہوں۔ یہاں کوئی میری ختمانی میں مغل نہیں ہوتا۔ میرے اس گوشہ عایت کے بارے میں میری کوئی دوست نہیں جانتی اس لیے تو میں یہاں آئی ہوں۔ مجھے شبہ تھا کہ رات کو کسی وقت رتنا غنڈوں کو لے کر میرے فلیٹ پر پہنچ جائے گی اسی لیے میں یہاں آئی۔ یہاں ہم محفوظ ہیں۔ تمہارے لیے بھی فی الحال اس جگہ میں جانا مناسب نہیں ہے۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ ہم چند روز بڑے اطمینان سے یہاں رہ سکتے ہیں۔“

”اور تمہارے کام کا کیا ہوگا۔ تمہیں تو ڈیوٹی پر جانا ہوگا نا۔“ میں نے کہا۔  
”کل تو میری چھٹی ہے۔“ مایامتی نے جواب دیا ”میں اپنی دوست کو فون کر دوں گی کہ وہ میری ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے دے۔ اس کے بعد جو حالات ہوں گے ان کے مطابق قدم اٹھایا جائے گا۔“

میں خاموشی سے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ ویسے تو بریندرا والا وہ بنگا بھی میرے لیے محفوظ تھا لیکن وہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا جبکہ یہاں مایامتی کے توسط سے حالات سے باخبر رہ سکتا تھا۔ بریندرا اور اعظم خان اپنے معاملات میں اچھے ہوئے تھے۔ پچھلے تین دنوں سے انہوں نے میری خبر تک نہیں لی تھی جبکہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے دوست کی ضرورت بھی تھی جو میری مدد کر سکے اور اتفاق سے مجھے مایامتی مل گئی تھی۔ آج جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مایامتی ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دے گی۔

ہم دیر تک لاؤنج میں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مایامتی بار بار بے چینی سے پہلو بدلتی رہی تھی۔

”تمہیں بیٹھنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ویسے بھی ایک بج چکا ہے۔ کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“

”دوسرے کمرے میں بستر لگا ہوا ہے۔ تم بھی جا کر سو جاؤ۔“ مایامتی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

مایامتی اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں دوسرے کمرے میں آیا۔ یہاں بیڈ بچھا ہوا تھا اور دو دریاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر ایک کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ ناک اور جڑے میں تکلیف کی وجہ سے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ مجھے بلا کے بارے میں بھی پریشانی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ میں جب تک اس سے دور رہوں گا وہ محفوظ رہے گی۔ سام سنگ سے اچانک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اسپتال میں داخل رہا ہوں اور میری دوست اب بھی اسپتال میں موجود ہے۔

میں دیر تک سام سنگ کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ اسے کھنڈ میں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی کہ وہ اپنے گھاناؤنے مشن کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں گے۔ مجھ سے تو محض اتفاقاً سامنا ہو گیا تھا اور پہلے ہی موقع پر اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتا ہو لیکن اسے اپنی جان کے کالے پڑے تھے۔ مجھے مارنے کے چکر میں اس کا خیبر اپنے ہی ساتھی کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اور اسے سر پر رکھ کر بھاگن پڑا تھا۔ اب پتا نہیں وہ آدمی زندہ بچا تھا یا مر گیا تھا۔ بہر حال کھیل شروع ہو چکا تھا۔

میری کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔  
وہ رات کا بیچلا پیر تھا۔ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں خوابیدہ سی نظروں سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ میری آنکھ بلاوجہ نہیں کھل سکتی تھی۔  
اور پھر اچانک کراہنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے بستر چھوڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ کراہنے کی آواز مایامتی والے کمرے سے آرہی تھی۔ میں تیز قدم اٹھاتے ہوئے مایامتی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

مایامتی بستر پر آڑی تر چھپی پڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور وہ بری طرح جھل رہی تھی۔  
”اے! کیا ہوا؟“ میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

”جب۔ بہت شدید درد۔ ہو رہا ہے۔“ مایامتی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے رک رک کر کہا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے اور وہ ایک ہاتھ سے سینے کو دبائے ہوئے تھی۔  
”اگر تم اجازت دو تو میں۔“ میں کہتے کہتے رک گیا۔

”وہ۔ وہ تم (مریم) مل دو۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا۔ اسے سانس لینے میں کچھ تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیوب اٹھالی۔ مایامتی نے اس طرف سے قیص اور اٹھا دی۔ سینے پر نپاؤ بھاڑا ہوا تھا اور سوچن بھی نمایاں تھی۔ مجھے سمجھے میں دیر نہیں لگی کہ اسے زوردار ضرب لگی تھی جس سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ میں نے ٹیوب سے کمرے کریم نکالی اور اس سے ہلکی ہلکی مالش کرنے لگا۔ مایامتی کچھ دیر کراہتی رہی پھر بتدریج پرسکون ہوئی چل گئی۔ میں نے قیص درست کر کے کمبل اس پر ڈال دیا اور ہاتھ روم میں ہاتھ دھو کر بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کچھ سکون ملا۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اس کتیا نے کمبے سے خدیں لگائی تھیں۔ میں چھوڑوں گی نہیں اسے۔“  
”فی الحال تو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا ”گوشت اندر سے پھٹ گیا ہے۔ تمہیں ٹھیک ہونے میں بھی دو چار روز لگیں گے۔“

”ہاں۔ میں جانتی ہوں اور یہ چند روز تمہیں ہی تکلیف اٹھانی پڑے گی حالانکہ تمہاری حالت بھی اچھی نہیں ہے۔“ مایامتی نے کہا ”مجھے افسوس ہے۔ تم پہلی مرتبہ میرے گھر آئے اور میں تمہاری خدمت کرنے کے بجائے تم سے خدمت لے رہی ہوں۔“

”دوستی میں کسی پر کوئی احسان نہیں کیا جاتا۔“ میں نے جواب دیا ”ویسے تمہیں بولنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ آرام سے لیٹ رہو اور سونے کی کوشش کرو۔“  
”مجھے نیند نہیں آرہی۔“ وہ بولی ”تم میرے پاس بیٹھے رہو۔ پتا نہیں تم سے اتنی انپائیت کیوں محسوس ہونے لگی ہے۔“

”یہ تمہارے غلوں کی نشانی ہے۔“ میں نے کہا۔ جس انداز سے گفتگو کا موضوع تبدیل ہو رہا تھا اس سے مایامتی کے بارے میں میرے دل میں نئے خدشات جنم لینے لگے۔ مایامتی بھی عورت ہی تھی۔ اس نے اسپتال میں میری بڑی خدمت کی تھی۔ وہ سب کچھ اگرچہ اس کی ذہنی میں شامل تھا لیکن دل کو پھٹتے ہوئے کتنی دیر لگتی ہے۔ اس وقت مجھے یہ اندیشہ تھا کہ بات کچھ آگے نہ بڑھ جائے اسی لیے میں اسے تلقین کر رہا تھا کہ اسے بولنے میں تکلیف ہوتی ہے اس لیے وہ زبان کو کم سے کم حرکت دے اور آرام سے لیٹ رہے اور سونے کی کوشش کرے۔

مجھے اگرچہ اب خند نہیں آ رہی تھی لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ”اوٹھتے“ پا کر مایا متی نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور پندرہ بیس منٹ بعد وہ واقعی سو گئی تھی۔

میں صبح سویرے شمال اوڑھ کر گھر سے نکل گیا۔ رات کو اس طرف آتے ہوئے دوسری گلی کے موڑ پر میں نے ایک ڈھابا دیکھا تھا۔ محلے میں واقع اس قسم کی دکانیں رات کو دیر تک کھلی رہتی ہیں اور صبح بھی جلدی کھل جاتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ ڈھابا کھلا ہوا تھا۔ میں انڈے، ڈبل روٹی اور ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں لے کر پیسے دے رہا تھا کہ موڑ سائیکل پر اخبار کا ہار آیا۔ یہ ہار اس ڈھابے پر کچھ اخبار دے جایا کرتا تھا جو دن بھر میں بک جایا کرتے تھے اخبار نیپالی زبان میں تھا۔ اس پر لکھا ہوا ایک بھی لفظ اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا لیکن صفحہ اول پر ایک تصویر دیکھ کر میں نے ایک اخبار خرید لیا۔

مایا متی ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے چائے بنا کر اسے چگایا تو وہ کراہ اٹھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے سینہ دبا یا۔ میں نے اسے سارا دے کر بیڈ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور چائے کا کپ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”نوو گرم گرم چائے پی لو۔ کچھ سکون ملے گا۔“  
”عجیب بات ہے“ مایا متی نے مسکرانے کی کوشش کی  
”پہلے نرس مریض کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اب مریض نرس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔“  
”اسی کو تو کہتے ہیں کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔“ میں نے کہا۔ مایا متی نے کپ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

چائے ختم کر کے میں نے وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی تصویر پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ وہ ایک ایسے آدمی کی تصویر بھی جو مرکز پر ہذا ہوا تھا اور اس کے سینے میں خنجر جو بوس تھا۔ یہی تصویر دیکھ کر میں نے اخبار خرید لیا تھا۔ تصویر کے نیچے کپشن اور اس کے ساتھ خبر لکھی گئی تھی کہ چرسے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔

”میں نے تمہیں یہ اخبار اس لیے نہیں دیا کہ اس تصویر کو دیکھ کر خوف سے کانپنا شروع کر دو۔“ میں نے اس کے چرسے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اس تصویر کے حوالے سے؟“

مایا متی نے ایک بار پھر خبر پڑھی پھر اس نے جو کچھ بھی

بتایا وہ بہت دلچسپ تھا ”یہ شہر کے مشہور غنڈے روٹی کے ایک گڑھے بیٹھوھر کی لاش کی تصویر ہے جو گزشتہ رات ہنگام کے ایک مشہور بد معاش وجدان کے ہاتھوں ایک لڑائی میں مارا گیا۔ بیٹھوھر کا ایک ساتھی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے پولیس کو فون پر بتایا تھا کہ وجدان ہنگام کا بہت بڑا بد معاش اور منشیات کا اسٹور ہے۔ نیپال کی پولیس نے ٹھنڈیڈ میں اس کی موجودگی کو کچھ اچھا شکون قرار نہیں دیا۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

خبر واقعی دلچسپ تھی۔ پولیس کو فون پر یہ بیان دینے والا سام سنگ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا اور اس میں سب سے زیادہ دلچسپی کی بات تو یہ تھی کہ پولیس نے اس مقام کال پر اعتماد کرتے ہوئے وجدان کی تلاش بھی شروع کر دی تھی۔  
”رات کو تم نے بتایا تھا کہ تم بہت عرصہ ہنگام میں رہ چکے ہو اور سام سنگ نامی وہ شخص بھی ہنگام ہی کا رہنے والا ہے جس سے رات کو تصادم ہوا تھا۔“ مایا متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پولیس کو ٹیلی فون پر یہ اطلاع بھی اسی نے دی ہوگی لیکن یہ وجدان کون ہے؟ سام سنگ نے اسے پھنسانے کی کوشش کیوں کی ہے؟“

”اس لیے کہ وہ مجھے بہت تنگ کے نام سے نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے پولیس کو وہی نام بتایا جو اسے معلوم تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ تم۔“  
”ہاں۔ میں ہی وہ شخص ہوں جسے سام سنگ نے اپنے بیان میں ہنگام کا بہت بڑا بد معاش اور اسٹور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح پولیس میرے پیچھے لگ جائے گی اور۔“

”یہ خبر بڑھ کر میں سمجھ گئی ہوں کہ حالات کا رخ کس طرح موڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ مایا متی نے کہا ”میں تو یہ سوچ کر کانپ رہی تھی کہ اس نے اپنا جرم تمہارے سر پر صوب دیا ہے اور پولیس تمہاری تلاش شروع کر دے گی۔“  
”اس نے کوشش تو یہی کی ہے۔“ میں نے کہا ”اور مجھے پولیس پر حیرت ہے کہ انہوں نے اس کے بیان کا یقین کس طرح کر لیا حالانکہ عام طور پر پولیس اس طرح کی گمان اطلاعات برقیں ہی نہیں کرتی۔“

”ہو سکتا ہے اس میں بھی پولیس کی کوئی حکمت عملی ہو۔“ مایا متی نے کہا ”ممکن ہے اس طرح وہ اس شخص کو روشنی میں لانا چاہتے ہوں جس نے پولیس کو یہ اطلاعات

کر لیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر پولیس میرے پیچھے لگ گئی تو میرے لیے مشکلات بڑھ جائیں گی اور میں بھی دیش کھ تک نہیں پہنچ سکوں گا۔

مجھے بریدار کے جس بیگلے میں بھیجا گیا تھا وہاں اگرچہ ٹلی فون موجود تھا لیکن مجھے اس کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی مجھے قاتل پاکر پریشان ضرور ہو رہے ہوں گے۔ مجھے حاش بھی کر رہے ہوں گے لیکن میں یہاں چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے مایا متی سے بات کی تو اس نے بھی میری تائید

کی۔ ”بریدار کا نمبر معلوم کرنا کیا مشکل ہے۔“ اس نے کہا ”میں ابھی پتا لیتی ہوں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آ گئی۔  
اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور ہم لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مایا متی نے فون کا ریسیور اٹھا کر اپنی اسی دوست نرس کا نمبر ملایا اور چند منٹ بات کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے دوبارہ فون کیا اور دوسری طرف سے بتایا جانے والا نمبر ایک کانڈ پر فون کر لیا اور ریسیور رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ہے۔ انسپکٹر بریدار ساڑھے آٹھ بجے اس نمبر پر موجود ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، ہم ساڑھے آٹھ بجے فون کریں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر ساڑھے آٹھ بجے جب اس نمبر پر فون کیا گیا تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کال کسی اور آفسر نے ریسیور کی تھی لیکن میں نے اپنا نام (ہمت تنگ) بتا کر بریدار سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو فوراً ہی اس سے لائن ملا دی گئی۔

”اے ہمتائے تم کہاں قاتل ہو۔ تم تو پریشان ہو گئے ہیں۔ پورے شہر میں تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ تم ٹھیک تو ہونا۔“ بریدار نے میری آواز سننے ہی کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”معاملہ کچھ ایسا تھا کہ اطلاع نہیں دے سکا۔ انسپکٹر اعظم خان کہاں ہے؟“

”میرے پاس بیٹھا ہے۔“ بریدار نے کہا اور پھر ٹھوڑی دیر بعد ریسیور انسپکٹر اعظم کی آواز سنائی دی تھی۔

انسپکٹر اعظم خان سے پہلے میں نے ہلا کے بارے میں دریافت کیا اور پھر اس رات کے واقعے کے بارے میں بتا کر اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ اعظم خان نے پوچھا۔

”صحیح لوکیشن تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ کالی کے استھان کا کوئی علاقہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کالی کا استھان۔“ دوسری طرف سے یہ نام دہرایا گیا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انسپکٹر اعظم کی آواز سنائی دی ”اس علاقے میں کالج اور ہاؤس ہے کیا تم وہاں آ سکتے ہو؟“

”یہ ہاؤس میں نے دیکھا تو نہیں ہے لیکن تلاش کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا ”میں ٹھیک نو بجے اس ہاؤس میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”میں پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور چند اور رسی جملوں کے تبادلے کے بعد ریسیور رکھ دیا اور مایا متی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انسپکٹر اعظم نو بجے کالج اور ہاؤس میں میرا انتظار کرے گا۔ یہ ہاؤس اسی علاقے میں ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے۔“

”میں اس سے کافی فاصلے پر ہے لیکن کوئی بھی رکشیا یا ٹیکسی والا ہمیں وہاں پہنچا دے گا۔“ مایا متی نے جواب دیا۔

”تمہیں نہیں صرف مجھے۔“ میں نے کہا ”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اگر وہاں یا راستے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو۔“

”ٹھیک ہے۔“ مایا متی نے گہرا سانس لیتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی اس لیے اس نے میرے ساتھ جانے پر رضامندی نہیں کی۔

میں پونے نو بجے گھر سے نکل گیا۔ میرا شیو بڑھا۔ ہوا تھا اور ناک اچھی تک کسی حد تک پھولی ہوئی تھی۔ دو تین گلیاں گھوم کر میں روڈ پر آئی تھی مجھے سائیکل رکشال کیا۔

میں نے راستوں کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا تاکہ واپسی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ بیس منٹ میں، میں کالج ہاؤس کے سامنے پہنچ گیا۔ میں اگرچہ پانچ منٹ لیٹ ہو چکا تھا لیکن ہاؤس کے آس پاس کھلتے ہوئے میں نے پانچ منٹ اور ضائع کر دیے۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں دراصل یہ دیکھ لینا چاہتا تھا کہ آس پاس کوئی مشتبہ آدمی تو موجود نہیں لیکن مجھے ایسا کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

ہاؤس کے آس پاس کا علاقہ خاصا بارون تھا۔ یہ رہائشی ہاؤس بھی بہت بڑا تھا۔ گیٹ کے اندر پارکنگ ایریا میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں برآمدے میں پہنچ کر ریسیورنٹ کی طرف مڑ گیا۔

ریسیورنٹ میں خاصا رش تھا لیکن انسپکٹر اعظم کو تلاش

”کھنڈو پہنچتے ہی تم لوگوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا۔ اس سے میں پریشان ہو گیا تھا۔ ہر حال“ اسپتال میں میں بیمار سے تمہارے بارے میں کیرد کیرد کر پوچھتا رہا۔ اس سے مجھے جے پور کے حوالے سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ میں نے جے پور میں خاکہ بھانوت سنگھ کو فون کر کے تمہارے بارے میں معلوم کیا اور پھر بنگاک پولیس سے بھی فون پر رابطہ کیا۔ وہاں سے تمہارے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا وہ حیران کن ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے حوالے سے بنگاک سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بتانا رہا ”اس روز اخبار میں تمہارا نام پڑھا تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔“ وہ کہہ رہا تھا ”میں نے فوراً ہی متعلقہ پولیس اسٹیشن سے رابطہ کیا تو بتا چلا کہ کسی گمنام آدمی نے فون کر کے پولیس کو تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے سمجھے میں دیر نہیں گئی کہ تمہیں فریم کیا جا رہا ہے تاکہ ایک طرف پولیس تمہارا پیچھا کرتی رہے اور دوسری طرف وہ لوگ تمہاری ناک میں رہیں۔“

”پاکل یہی بات ہے“ میں نے کہا۔ اس نے میرے بارے میں جس طرح تحقیقات کی تھی اس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی ”اس رات سام سنگ کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ریتا نام کی لڑکی ایسا مٹی کی دوست ہے میرا خیال تھا کہ میں بعد میں ریتا سے سام سنگ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اس کے وہ ٹھنڈے بعد ہی انہوں نے ہمیں گھبرنے کی کوشش کی۔ سام سنگ نے فحشرے حملہ تو مجھ پر کیا تھا لیکن اس کا اپنا ہی سامی زو میں آگیا۔ اگلے روز اخبار سے پتا چلا کہ مقتول روٹی کا آدمی تھا۔ اس طرح یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ سام سنگ کے ساتھیوں کو یہاں ناک پال اور روٹی جیسے لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔“

”مقامی لوگوں کی حمایت اور تعاون کے بغیر باہر کا کوئی آدمی ایسے گناہ کے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ انسپٹر اعظم خان نے کہا ”کچھ آدمی ہماری نظروں میں بھی آئے ہیں اور بریدرا کے آدمی ان کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں۔ ہم انہیں یہاں قدم جمائے نہیں دیں گے ہمیں صرف موقع کا انتظار ہے۔“

”دیش کھ کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس طرف سے غافل نہیں ہوں۔ ایک دو دن میں اس کا پتا چل جائے گا۔“ اعظم خان نے جواب دیا ”لیکن

کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بریدرا بھی تھا۔ وہ دونوں مجھے دیکھتے ہی اپنی میز سے اٹھ کر میری طرف آگئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہم ریسٹورنٹ سے نکل کر ایک ملحقہ کمرے میں آگئے۔ اس وسیع کمرے میں ایک دوسرے سے فاصلے پر چار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ تین میزوں پر تو کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ناؤ نوش میں مصروف تھے جو کھانا میز خالی تھی۔ ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے ایک ویٹریس نے اس میز تک ہماری رہنمائی کی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میز خالی رکھی گئی تھی۔ بریدرا نے ویٹریس کو کافی کے لیے کہہ دیا اور ہم میز کے گرد کرسیوں پر بٹھ گئے۔

”سنگھانے بتایا تھا کہ تم اس نرس کے ساتھ کیس گئے تھے اور پھر نوٹ کر نہیں آئے۔ وہ نرس بھی غائب ہے۔“

بریدرا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اور تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ۔“

”ہاں۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔“ میں نے انگلی سے ناک سلاتے ہوئے کہا اور پھر اس رات پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا ”آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ تریاڈ کے لوگ یہاں قدم جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سام سنگ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تریاڈ کا رکن ہے اور ایک موقع پر پہلے بھی میری اس سے جھڑپ ہو چکی ہے۔“

”میں جانتا ہوں مسٹر وجدان۔“ اعظم خان نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم نے گولڈن ٹرائی اینگل میں گھس کر جنرل کھوراث کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا کے آخری کوئے تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ یہ لوگ آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“

انسپٹر اعظم کے منہ سے اپنا اور گولڈن ٹرائی اینگل کا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اعظم خان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ”میں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔“ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”مجھے تم پر اس وقت شبہ ہو گیا تھا جب تم ہلا کے ساتھ ایک ویران جگہ پر بس میں بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم اس لڑکی کو بھگا کر لائے ہو لیکن جب تم نے ہوٹل میں میری جان بچائی تو مجھے اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ اگر تم لڑکی کو بھگا کر لائے ہوئے تو اس قسم کے واقعات سے دور ہی رہتے اور پھر تم نے دیش کھ کے بارے میں بتایا تو میں سمجھ گیا کہ تم وہ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ اسی لیے میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔



مایا متی کہاں ہے؟ وہ بھی اسی روز سے غائب ہے۔  
”وہ محفوظ ہے۔“ میں نے جواب دیا اور پھر مایا متی کے بارے میں بتانے لگا۔

اینگلو بریڈر اور اعظم خان ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جانتا چاہتے تھے لیکن میں نے بتانے سے انکار کر دیا۔

”بستر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہی رہیں۔“ میں نے کہا ”میں اپنے طور پر بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کے ساتھ رہا تو نہ صرف باندھ ہو جاؤں گا بلکہ ان کی نظروں میں بھی آ جاؤں گا۔ اسی لیے۔“

”سمجھ گیا۔“ بریڈر نے میری بات کاٹ دی ”لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ہاتھوں کوئی ایسا سنگین جرم نہ ہوئے بائے کہ ہم تمہیں تحفظ فراہم نہ کر سکیں۔“

”آپ مطمئن رہیے مسٹر بریڈر۔“ میں نے کہا ”میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ قانون کو مجھ سے کوئی شکایت ہو۔“

”اور میرا یہ کارڈ رکھ لو۔“ بریڈر نے جیب سے وزینگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا ”تمہیں فون پر رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ اگر میں ان میں سے کسی نمبر پر نہ ملوں تو پیغام چھوڑتا۔“

”شکریہ۔“ میں نے کارڈ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

ہاتوں کے دوران میں ہم کافی کی چسکیاں بھی لیتے رہے اور پھر جب میں ہوٹل سے باہر نکلا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہوٹل سے باہر آنے کے بعد میں تقریباً آدھا ٹھنڈا اس علاقے میں ٹھٹھا رہا اور پھر ایک سائیکل رکشا پر سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ رکشا میں نے دو ہی چھوڑ دیا اور گلیوں میں پیدل چلتے ہوئے مکان تک پہنچ گیا۔

گیٹ کو میں باہر سے کھڑا لگا گیا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ پورے گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ مایا متی نے شاید اکیلی ہونے کی وجہ سے ساری بتیاں جلا رکھی تھیں۔

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا، دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ کوئی نوک دار چیز میری گردن کو چھوئے لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک غراہٹ میری سماعت سے ٹکرائی۔

”ہاتھ ادبر اٹھاؤ اور کوئی حرکت مت کرنا۔“

میں پیچھے گھومنا چاہتا تھا لیکن اسی لمحے راہداری میں دائیں طرف سے مایا متی سامنے آئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔

اس کے پیچھے ایک آدمی تھا جس نے بائیں بازو سے مایا متی کو لپیٹ میں لے رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک مایا متی کے گال کو چھو رہی تھی۔

میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا اور میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

”آگے بڑھو!“ میرے پیچھے کھڑا ہوا شخص ایک بار پھر بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اس کے ساتھ ہی میری گردن پر نوک کا زہا بڑھ گیا۔ اس کی چپین سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ خنجر یا چاقو تھا۔ ”ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی کا گلا کاٹ دیا جائے گا۔“

میں قدم اٹھاتے ہوئے کمرے کے وسط میں آ گیا۔

میرے ہاتھ بدستور سر سے اوپر تھے۔ پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے میرے لباس کو تھمتھ کر میری تلاش کی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرا خنجر بھی اس رات بریڈر کے بیگ سے ہی رہ گیا تھا جب دیش کھ اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کیا تھا۔

”تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ اس طرح کسی کے گھر میں کھنسنے کا کیا مطلب ہے۔“ میں نے سامنے والے شخص کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا جس نے مایا متی کو روک رکھا تھا۔

مایا متی کے چہرے پر خوف اور کرب کے لمبے لمبے تاثرات تھے۔

میری گردن پر سے چاقو کی نوک ہٹ گئی اور وہ شخص بھی میرے سامنے آ گیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ وہ سام سنگ تھا۔

”اس رات تم بچ گئے تھے۔“ سام سنگ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”غلطی میری تھی کہ میں نے اپنے حواس پر قابو نہیں رکھا تھا اور میرا ہی سامی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور پھر تم گھر کے سرے سیٹوں کی طرح غائب ہو گئے۔ ہم پورے شہر میں تمہیں تلاش کرتے رہے لیکن تم لوگوں کا پتا نہیں چلا۔ وہ تو رات کی عقل کام کر گئی جس نے بتایا کہ تمہاری یہ دوست مایا متی بھی نرس ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ کھینے لگی ہو اور اس کی کوئی دوست جاتی ہو کہ یہ تمہیں کہاں لے جاسکتی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہم نے کئی نرسوں سے معلوم کیا۔ سب نے یہی کہا کہ ہو سکتا ہے مایا متی تمہیں ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلی گئی ہو۔“

صرف ایک نرس نے یہ انکشاف کیا کہ مایا متی کا یہاں کوئی خفیہ ٹھکانا بھی ہے جہاں وہ ویک اینڈ گزاراتی ہے۔ یہ بات ہمیں آج ہی معلوم ہوئی تھی۔

”آج ہم نے مایا متی کے قلیٹ پر ہلا بول دیا۔ قلیٹ میں اس کے ساتھ رہنے والی لڑکی پہلے تو مجھ بتانے کو تیار نہیں ہوئی لیکن وہ ہاتھ پڑتے ہی اس نے زبان کھول دی۔ اس لڑکی کے کہنے کے مطابق مایا متی ہر ویک اینڈ پر غائب ہو جاتی تھی۔ اس نے مایا متی سے کئی مرتبہ پوچھا کہ وہ ویک اینڈ پر کہاں جاتی ہے مگر اس نے کبھی کبھی نہیں بتایا۔ اس لڑکی کو شاید تھا کہ مایا متی ویک اینڈ اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ گزاراتی ہے۔ جنس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز اس نے مایا متی کا پتہ کیا اور اس مکان کو دیکھ لیا لیکن اسے بڑی باپوسی ہوئی تھی کہ مایا متی ویک اینڈ کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں بلکہ اس مکان میں تنہا رہ کر گزاراتی ہے۔ اس طرح ہمیں بھی اس مکان کا پتا چل گیا لیکن وہ لڑکی ابھی کسی اور کو اس مکان کے بارے میں نہیں بتا سکے گی۔“

”کیا مطلب!“ میں نے اسے گھورا۔

”تم تو ہمیں بتا چکی تھی کہ تمہارے ہم محتاط رہنے کے عادی ہیں۔“ سام سنگ نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں نے تو سرنگا سے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا معقول بندوبست کر دے تاکہ وہ کسی اور کے سامنے زبان نہ کھول سکے لیکن اس کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی بھاری ہے۔ اس نے صرف چند سیکنڈ ہی اس کے گلے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اگر وہ لڑکی سانس لینا بھول گئی تھی تو میرے خیال میں اس میں سرنگا کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔“

میں کانپ کر رہ گیا۔ ایک بے گناہ لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن ان لوگوں سے رحم کی توقع نہیں تھی۔ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا ان کی ہالی تھی۔ معمولی سی بات پر کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان جیسے لوگوں کے لیے بہت معمولی بات تھی۔

”دیکھو سام سنگ!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”تمہیں میری تلاش تھی۔ میں تمہیں مل گیا۔ مایا متی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو جانتی تھی کہ میں کون ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔ تمہیں جو بھی کھیل کھیلنا ہے میرے ساتھ کھیلو۔ اسے جانے دو۔“

”تمہارے ساتھ تو ہم کسی اور طرح غنیمت سمجھ لیں تو اس کے ساتھ کھیلنا جائے گا۔“ سام سنگ نے دھڑائی سے مسکراتے ہوئے کہا ”ایسی حسین لڑکی آسانی سے ہاتھ آجائے تو اس سے دستبردار نہیں ہوا جاسکتا۔ آسانی سے بھی کیوں۔“

ہم تو بڑی جدوجہد کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔“ میں چند لمحے سام سنگ کی طرف دیکھتا رہا۔ ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر درنگی نمایاں تھی۔

”جنرل کھورٹ نے بت دوور تک تمہارا پیچھا کیا تھا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”لیکن تم سنگاپور پہنچ کر فرار ہو گئے۔ تم جس جہاز پر سفر کر رہے تھے وہ ہندوستان میں کسی جگہ گر کر تباہ ہو گیا۔ چند مسافر زندہ بچے تھے اور تم ان میں نہیں تھے۔ جہاز کے تباہ ہونے سے بہت سے لوگ زندہ جل گئے تھے جن کی لاشیں بھی شناخت نہیں ہو سکی تھیں اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ تم بھی مرجائے والوں میں شامل ہو گئے لیکن۔ اس رات ریسٹورنٹ میں تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”لیکن تم جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے تم واحد شخص ہو جو گولڈن ٹرائی اینگل سے زندہ بچ کر نکل گئے تھے۔ برا اور چین تک تمہارا پیچھا کیا گیا۔ تم پر بار بار حملے ہوتے رہے اور تم ہر بار بچتے رہے۔ تم واقعی بہت ڈھبٹ آدمی ہو۔ ہوائی جہاز کے حادثے میں بھی بچ گئے۔ تمہیں شاید کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ہم لوگ نیپال میں قدم بھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور تم فوراً یہاں پہنچ گئے۔ تمہیں جنرل کھورٹ کی طاقت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بڑی بڑی حکومتیں آج تک اس کا راستہ نہیں روک سکیں تو تم کیا تیر مار لو گے۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں ایک لیبارٹری تباہ کر کے فرار ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہت طاقت ور ہو۔ تمہاری موت ہی اب تمہیں یہاں پہنچ لائی ہے۔“

”تمہیں اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”میں تو نیپال میں کسی اور مقصد سے آیا تھا لیکن یہ شخص اتفاق ہے کہ تم سے سامنا ہو گیا۔ جس طرح تمہاری لینڈ میں جنرل کھورٹ کو میرے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اسی طرح اسے یہاں بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔“

”جنرل کھورٹ کو تو ابھی ہم نے تمہارے بارے میں اطلاع بھی نہیں دی۔“ سام سنگ نے کہا ”چانگ لی کا خیال ہے کہ جنرل کھورٹ کو تمہارے بارے میں اطلاع دینے کے بجائے تمہارا سر پلٹ میں سجا کر اس کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ زیادہ خوش ہوگا۔ اس لیے ہم نے ابھی تک۔“

”چانگ لی کون؟“ میں اسے نوک کر ابھی ہوئی نظروں

سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے دماغ میں سنسنی ہوتی گئی تھی۔ یہ نام مجھے کچھ جانا پڑا تھا۔  
 ”تم شاید چانگ سائمن کے اس ریٹائرڈ پولیس آفیسر کو بھول چکے ہو جو وہاں جنرل کھورٹ کے لیے کام کر رہا تھا۔“  
 سام سنگ نے جواب دیا ”وہ ریڈ کے دوران میں پولیس کی گرفت میں بھی آگیا تھا لیکن رشوت دے کر فرار ہو گیا تھا۔ جنرل کھورٹ اپنے وفادار کو پاپس نہیں کرتا۔ جنرل نے اسے نیپال کے مشن کا چیف بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ میں جب تمہیں اس کے سامنے پیش کروں گا تو وہ بہت خوش ہوگا۔“  
 میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے یہ اگوا لیا تھا کہ یہاں ان کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا اور انہوں نے کسی اور کو بتایا بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔  
 میں نے سام سنگ کے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی مایامتی کو گرفت میں لیے ہوئے تھا اور اس کے خنجر کی نوک مایامتی کے گال میں چبھ رہی تھی۔ مایامتی میری وجہ سے پہلے ہی بہت تکلیف اٹھا چکا تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی اور نقصان اٹھانا پڑے۔  
 میری نظر اس شخص کے مخبر والے ہاتھ پر جم گئیں۔ وہ شخص اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس کی انگلیاں خنجر کے دتے پر آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگیں۔  
 اس کی مٹھی کھلتی جا رہی تھی۔ مجھے اس طرف متوجہ پا کر سام سنگ نے بھی اسی طرف دیکھا اور ایک دم چیخ اٹھا۔  
 ”کیا کر رہے ہو سرنگا۔ خنجر تمہارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔“  
 سرنگا کو ایک جھرجھری سی آگئی۔ اسی لمحے اس کی مٹھی چوڑی طرح کھل گئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہی مایامتی بھی تڑپ کر اس کے گتے سے نکلی اور جھک کر خنجر اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں یا سام سنگ کچھ سمجھ سکتے، مایامتی نے خنجر کا ایک بھرپور وار کیا۔ خنجر سرنگا کے پیٹ میں پھنس گیا۔  
 سام سنگ بھی جیسے ہوش میں آگیا لیکن اس کے پوری طرح سنبھلنے سے پہلے ہی میں اپنی جگہ پر اچھلا۔ میری کک اس کے خنجر والے ہاتھ پر لگی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتے ہوئے صوفے کے پیچھے گر گیا۔  
 سام سنگ ایک دم بدحواس ہو گیا تھا لیکن میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے اسے ککس مارا رہا۔

سام سنگ نے ایک مرتبہ موقع پا کر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اسے دروازے تک بھی نہیں پہنچنے دیا اور اسے ایک مرتبہ پھر ککس پر رکھ لیا۔  
 دوسری طرف مایامتی نے خنجر کے پے در پے وار کر کے سرنگا کو بری طرح کھٹل کر دیا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ مایامتی میں ایسا چالاک ہی اتنا حوصلہ اور اتنی طاقت کیسے آگئی تھی لیکن سچ ہے کہ کسی بات کا خوف جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہ ایک انتہائی قوت میں بدل جاتا ہے۔  
 میں نے سام سنگ کو اٹھا کر پوری قوت سے پٹخ دیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ چیختے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔  
 میں نے ایک ہیر اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس کا ہیر پکڑ کر ٹانگ سیدھی اٹھا دی۔  
 ”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ چانگ کی کہاں ہے اور تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو البتہ یہ ضرور جانا چاہوں گا کہ دلش کھ کہاں ہے؟“ میں نے اس کی ٹانگ کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔  
 ”مہ۔ میں کسی دلش کھ کو نہیں جانتا۔“ سام سنگ کراہا۔  
 ”تم جانتے ہو۔“ میں نے ٹانگ کو ایک اور جھٹکا دیا ”وہی دلش کھ جو دی کے پاس انڈیا سے آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔“  
 ”او۔ وہ میتی دیوی کے ایک بچے میں ہیں۔“ اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”پورا پتا بتاؤ۔“ میں نے اس کی ٹانگ کو ایک اور جھٹکا دیا۔  
 سام سنگ چیخ اٹھا اور پھر اس نے بچکے کا پتا بھی بتا دیا۔  
 ”تری بھون اتر پورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر امیریش آؤس سے ذرا پہلے بائیں طرف ایک سڑک مڑتی ہے۔ اسی سڑک پر بدھ کا ایک چھوٹا سا اسٹوپا ہے۔ اس اسٹوپا کے سامنے گلی میں دائیں طرف تیسرا انگلا ہے۔ اس کا گیٹ سفید اور سرخ رنگ کا ہے۔ دلش کھ اس عورت کے ساتھ وہیں چھپا ہوا ہے۔“  
 ”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ایک۔ صرف ایک۔“ سام سنگ نے جواب دیا۔  
 میں نے ایک اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اس کی ٹانگ چھوڑ دی اور بڑی تیزی سے جھک کر اس کی کینٹ پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ سام سنگ کراہ کر ایک طرف الٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کم از کم ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں

آئے گا۔  
 میں لپک کر مایامتی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ایک طرف بیٹھی بانپ رہی تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا لباس بھی خون آلود تھا۔ سرنگا قاتلین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے جسم پر دو تین جگہوں سے خون بہہ رہا تھا۔  
 میں نے مایامتی کے ہاتھ سے خنجر چھین کر ایک طرف پھینک دیا اور اسے وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے حواس کو بھی نہیں ہو۔ اس کا چہرہ بالکل پتھری طرح ہوا تھا۔ اثرات سے عاری۔  
 ”تم یہاں بیٹھو۔ میں ان لوگوں کو دیکھ لیتا ہوں۔“ میں نے مایامتی کو بیڈ پر بٹھانا چاہا تو وہ چیختے ہوئے مجھ سے پلٹ گئی۔ وہ صرصر کاٹ رہی تھی۔ اس نے پتا نہیں کس طرح ہمت کر کے سرنگا پر خنجر سے پے در پے وار کیے تھے لیکن ایک بار پھر خوف عود کر آیا تھا۔  
 ”وہ۔ وہ مر گیا۔ میں نے اسے مار دیا۔“ وہ ہلکائی۔  
 ”وہ مرا نہیں زندہ ہے۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا ”درد نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“  
 میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ ہٹا کر بیڈ پر بٹھا دیا اور کمرے سے باہر آگیا۔  
 سرنگا ابھی زندہ تھا۔ وہ خون میں تر تھا اور اس کے چاروں طرف بھی خون ٹپکا ہوا تھا۔ میں چند لمحے صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر میری سمجھ میں ایک ہی بات آگئی تھی۔ میں نے جب سے بریندرا کا دیا ہوا کارڈ نکالا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔  
 کال کسی لڑکی نے ریسیور کی تھی۔  
 ”مسٹر بریندرا ابھی ابھی آئے ہیں اور مصروف ہیں۔ آپ نمبر دے دیجئے۔ وہ فاسخ ہوں گے تو میں پیغام دے دوں گی۔“ اس نے میری بات سن کر کہا۔  
 ”میرا نام ہمت سنگھ ہے۔“ میں نے کہا ”ان سے کہنا امیر جی ہے جلدی فون کریں۔“ میں نے نمبر بھی کھوا دیا اور فون بند کر دیا۔  
 ”ٹھیک پانچ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ انسپکٹر اعظم خان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔  
 ”کیا بات ہے وجدان۔ خیریت؟“  
 ”نور بڑھو گی ہے خان صاحب۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتادی۔  
 ”اوہ!“ وہ بولا ”کہاں ہو تم۔ مجھے پتا بتاؤ۔ ہم فوراً وہاں

پہنچ رہے ہیں۔“

میں نے اسے اس مکان کا پتا سمجھا دیا اور فون بند کر کے مایامتی کے کمرے میں آگیا۔ وہ بیڈ کی پٹی پر کم صم سی بیٹھی تھی۔  
 ”میں نے بریندرا کو فون کیا تھا۔“ میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا ”انسپکٹر خان سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ لوگ کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“  
 مایامتی کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔  
 تقریباً بیس منٹ بعد گلی میں گاڑیاں رکنے کی آواز سنائی دی تو میں جلدی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ ایک بریندرا کی گاڑی تھی اور دوسری پولیس کی دین۔ پولیس والے اتر کر ادھر ادھر کھڑے ہو گئے۔ میں بریندرا اور اعظم خان کو اندر لے آیا۔ بریندرا کے دو ماتحت بھی اندر آگئے تھے۔ سام سنگ ابھی تک بے ہوش تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑی پہنا دی۔ بریندرا جبکہ سرنگا کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”یہ ابھی زندہ ہے۔ اسے دین میں ڈال کر اسپتال پہنچا دو اور اسے اٹھا کر میری گاڑی کی کچنل سیٹ پر ڈال دو۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے سام سنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔  
 پولیس والے ان دونوں کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ میں مایامتی کو کمرے سے نکال کر لے آیا۔ وہ اب بھی خوف سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔  
 ”پریشان مت ہو مایامتی۔“ بریندرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ بلکہ سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب آگے جو کچھ ہوگا اسے ہم سنبھال لیں گے۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔“  
 ”اب تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔“ اعظم خان نے کہا ”اگر تم چاہو تو کل سے اسپتال میں اپنی ڈیوٹی انجام دے سکتی ہو۔“  
 ”میرا خیال ہے ابھی یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا ”یہاں آنے سے پہلے سام سنگ اور سرنگا مایامتی کی ایک دوست کو بھی گھاکھوٹ کر موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ اس کی لاش شاید اب بھی فلیٹ میں پڑی ہوگی یا ممکن ہے اس علاقے کی پولیس کو اس کا پتا چل گیا ہو۔“  
 ”اوہ!“ بریندرا اچھل پڑا ”یہ کب کی بات ہے اور فلیٹ کہاں ہے؟“

سام سنگ نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ میں نے بریدر کو بتا دیا۔ اس نے مایامتی سے غلیٹ کا پتا دریافت کیا اور بولا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔ تم ایک دو دن بیس رہ کر آرام کرو۔“

وہ لوگ چلے گئے۔ میں ان کے ساتھ گیٹ تک آیا تھا۔ گلی میں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے ایک دو آدمیوں نے صورت حال معلوم کرنا چاہی تو بریدر نے بے کمرہ کران کی تسلی کروئی کہ اس گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے اور بروقت اطلاع ملنے پر کارروائی کر کے انہیں پکڑ لیا گیا ہے۔

ان کے جانے کے بعد میں گیٹ بند کر کے اندر آ گیا۔ سب سے پہلے مایامتی کے خون آلود کپڑے تبدیل کروائے اور پھر لاؤنچ والے کمرے سے قالین اٹھا کر ہڑال دیا اور فرنیچر خون کے وجہ صاف کرنے لگا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور جگت میں ہوا تھا کہ مجھے خود حیرت ہو رہی تھی۔ رات دو بجے کے قریب ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ میں نے کچن میں جا کر خود کافی بنائی اور دونوں مکے لے کر مایامتی والے کمرے میں آیا۔

اس کے چہرے پر اب بھی سسٹنی کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے کافی کا مک پکڑا تو ہاتھ بھی ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ میں اس کی تسلی کے لیے ہاتھیں کرتا رہا کہ ریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ معاملہ اب بریدر اور اعظم خان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خود ہی منٹ لیں گے۔

ایک گھنٹے بعد جب میں اپنے کمرے میں جانے لگا تو مایامتی نے مجھے روک لیا۔

”میں کمرے میں آگئی نہیں رہوں گی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ بولی۔

”ڈر کس بات کا۔ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ٹھیک ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے میں اپنا بستر بھی بیس لے آتا ہوں۔“

میں دوسرے کمرے سے اپنا بستر لے آیا اور بیڈ کے قریب قالین پر بچھا دیا۔ مایامتی اصرار کرتی رہی کہ میں پینک پر لیٹ جاؤں۔ وہ نیچے بچھائے ہوئے بستر پر لیٹ جانے کی ٹیکن میں اپنے بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مجھے نیند صبح چار بجے سے پہلے نہیں آسکی تھی۔

اگلے دن خاموشی سے گزر گیا۔ اخبار میں سرنگا اور سام سنگ کے بارے میں کچھ نہیں چھپا تھا۔ ان دونوں کی گرفتاری کو راز میں رکھا گیا تھا۔

گزشتہ رات سرنگا سے دھنگا مشتی سے مایامتی کے سینے میں ایک بار پھر تکلیف شروع ہو گئی تھی اور مجھے ایک بار پھر اس کے سینے پر مہم کی ناش کرنی پڑی تھی۔

وہ پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ میں ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے صرف ایک مرتبہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس کے بعد میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔

رات دس بجے کے قریب اعظم خان پہنچ گیا۔ ”تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دیش کھ کا پتا چل گیا ہے۔ وہ۔“

”وہ میتھی دیوی کے علاقے میں ایک مکان میں چھپا ہوا ہے۔ شوہا بھی اسی کے ساتھ ہے اور ان کے ساتھ صرف ایک آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ!“ اعظم خان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تو تمہیں بھی پتا چل گیا ہے۔“

”میں نے کل رات ہی سام سنگ سے معلوم کر لیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کے آنے سے پہلے میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اس مکان پر ہلا بول دینا چاہیے۔“

”تمیں بھی یہی سوچ کر آیا تھا۔“ اعظم خان نے کہا۔ ”مجھے سام سنگ نے آج بتایا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک آدمی کو میتھی دیوی میں اس مکان کی عمرانی کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں خود بھی ابھی اسی طرف سے ہو کر آ رہا ہوں۔ دیش کھ اسی مکان میں روپوش ہے۔ وہ ایک مرتبہ بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ البتہ ایک نیپالی کو دو تین مرتبہ مکان میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ مکان کی عمرانی کرنے والے نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ دیوی کا آدمی ہے۔“

”آج دن میں آپ لوگوں نے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”سام سنگ کے کسی اور آدمی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“ اعظم خان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی۔“

”اس کا ایک اور ساتھی بھی یہاں موجود ہے۔ چائنگ لی۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تھا لی لینڈ کا ایک سابق پولیس آفیسر ہے۔ ڈیوی پر رہتے ہوئے بھی وہ جرنل کھوراث کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور رہتا رہا ہونے کے بعد بھی اس کے لیے خدمات انجام دیتا رہا۔ ایسے ہی بے ضمیر لوگ اپنے ملک

کی بنیادوں کو دیمیک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ چائنگ لی بہت خطرناک آدمی ہے۔ یہاں دیوی اور ناگ پال سے ان لوگوں کے رابطے ہیں۔ ناگ پال سے شاید ان کا کوئی معاہدہ بھی ہوا ہے۔“

”کیسا معاہدہ؟“ اعظم خان نے پوچھا۔

”جرنل کھوراث انہیں برسرِ اقتدار آنے میں مدد دے رہا ہے اور ناگ پال اس کے بدلے میں انہیں پوست کی کاشت والے علاقوں میں قابض ہونے کا موقع دے گا۔ اس علاقے میں ہیروئن تیار کرنے کی دو تین فیکٹری پہلے ہی کام کر رہی ہیں۔ جرنل کھوراث ان لوگوں کو بے دخل کر کے اپنی جدید ترین فیکٹریاں لگانا چاہتا ہے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟“ اعظم خان نے مجھے گھورا۔

”میں ان لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”سام سنگ نے تمہارے سامنے ابھی تک زبان نہیں کھولی لیکن میں گزشتہ رات اس سے بہت کچھ اگلا چکا ہوں۔ آپ کو یہاں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ نیپالی سرکار کے خلاف جو سازش ہو رہی ہے اسے ناکام بنایا جائے۔ میں یہاں کی سیاست کو نہیں سمجھتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اگر ناگ پال کی قوت توڑ دی جائے تو یہ سازش خود بخود ختم ہو جائے گی لیکن اتنا خیال رہے کہ ناگ پال کو جرنل کھوراث جیسے شخص کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس نے اس خطرے پر قبضہ جمانے کے لیے اپنے خزانے کے منہ کھول رکھے ہوں گے اور آپ جانتے ہیں دولت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔“

”مجھے ان مشکلوں کا احساس ہے لیکن یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ برائی زیادہ عرصے تک نہیں پنپ سکتی۔“ اعظم خان نے کہا۔ ”یہاں ناگ پال جیسے ذہریلے ناگ ہیں تو بریدر جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد ان حالات پر قابو پالیں گے۔“ انسپکٹر اعظم خان نے کہا۔

”دیش کھ کی طرف کس وقت چلنا ہے؟“ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

”ابھی چلتے ہیں۔“ اعظم خان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اسی لیے یہاں آیا تھا کہ تمہیں بھی ساتھ لے چلوں گا۔“ میں نے یہاں آتے ہوئے اپنے ایک آدمی کو یہاں کا فون نمبر دیا تھا۔ مجھے ایک کال کا انتظار رہا۔

اور وہ کال ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آئی تھی۔ اعظم خان نے صرف دو منٹ بات کی اور فون بند کر کے کھڑا

ہو گیا۔

”چلو۔ اب چلیں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

میں نے مایامتی کو ہدایت کر دی کہ وہ دروازہ اندر سے لاک کر لے اور میری آواز پہچانے بغیر دروازہ نہ کھولے۔

اعظم خان کی گاڑی میں ایگریٹیشن آفس بلڈنگ والے چوراہے پر پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہم اس چوراہے سے سیدھا آگے نکل گئے اور اسٹوپا سے تقریباً پچاس گز آگے جا کر اعظم خان نے گاڑی روک لی۔

اس وقت بارہ بجتے والے تھے۔ ہم کار سے اتر کر واپس آ رہے تھے کہ ایک آدمی اسٹوپا سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ بہت قامت نیپالی تھا۔ وہ اعظم خان کا وہی آدمی تھا جو مکان کی عمرانی کر رہا تھا۔

”تھوڑی دیر پہلے دیوی بھی آیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔“ اس آدمی نے بتایا۔ ”اس کی گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی ہے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور تو نہیں آیا؟“ اعظم خان نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس شخص نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔“

”تم پچھلی گلی میں چلے جاؤ۔ کوئی اس طرف سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو گولی مار دینا۔“ اعظم خان نے کہا۔

وہ آدمی پچھلی گلی میں چلا گیا۔ میں اور اعظم خان سامنے والی گلی میں داخل ہو گئے۔ تیسرے بنگلے کے سامنے سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ بنگلے کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔

پہلے میں دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے اندر گودا اور دیوار کے قریب لگے ہوئے پودوں کی آڑ میں دب گیا۔ ایک منٹ بعد اعظم خان اندر کی طرف کودا تو برآمدے کی طرف سے ایک گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”اے۔ کون ہے اُدھر۔ رک جاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز بھی گونج گئی۔ میں نے برآمدے کی طرف سے شعلہ لپکتے ہوئے دیکھا تھا۔ جواب میں اعظم خان نے بھی گولی چلا دی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی برآمدے کی طرف سے چیخ کی ایک خوفناک آواز ابھری اور ایک آدمی دھڑام سے نیچے گرا۔

میں دوڑتے ہوئے برآمدے میں پہنچ گیا۔ اعظم خان کی گولی اس شخص کی کھوپڑی میں لگی تھی اور وہ فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں نے جبکہ کر اس شخص کے ہاتھ سے پستول

فائزنگ کی آواز کے ساتھ ہی اندر کھلبلی سی بچ مٹی تھی اور پھر ایک کھڑکی سے فائزنگ شروع ہو گئی لیکن ہم محفوظ ہی رہے۔ اندر جو کوئی بھی تھا "اندھا دھند فائزنگ کر رہا تھا۔"

اعظم خان بھی برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں ستونوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔

"تم ہمیں روکو۔ میں اس طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔" اعظم خان نے سرگوشی میں کہا اور برآمدے سے نکل کر دیوار کی آڑ میں ہوتے تیزی سے دوسری طرف دوڑ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی لڑکی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں برآمدے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسی لمحے دروازہ کھلا اور اندر سے نکلنے والا شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔ ہسپتال بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا کر اٹھا۔ مجھ سے کمرانے والا شخص بھی میرے اوپر گرا تھا۔ میں نے اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ پھسل کی طرح میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا وہ شخص دوڑتے ہوئے بیٹنگ کی کیا ڈنڈ وال پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے بھی اسی طرف چھلانگ لگا دی۔

وہ شخص باہر کود گیا تھا۔ میں گیت کھول کر باہر نکلا تو وہ شخص گلی کی تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں بیٹنگ میں واپس آیا۔

اندر کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا۔ راہداری میں ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ سر میں لگنے والی گولی سے اس کا پیچھا بھی بہہ نکلا تھا۔ اس کے چاروں طرف خون کھرا ہوا تھا اور ہسپتال اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے کچھ دور رتا ایک کونے میں سٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے بدن پر لباس پرانے نام ہی تھا۔ چہرے پر زردی تھی اور وہ خوف سے ہر تھر کا پ رہی تھی۔ میری صورت دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے سامنے کچھ اور بھی گہرے ہو گئے۔

"مگر نایا مٹی یہاں ہوتی تو تم سے اس رات کا بدلہ ضرور لیتی۔" میں نے رتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اسے جو چوٹ لگائی ہے وہ اب تک جمیل رہی ہے۔ شکر کرو وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔"

رتا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ تھر تھرا کر رہ

گئے۔ میں اعظم خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو راہداری کے عین سامنے لاؤنج میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

"وہ عورت کہاں ہے؟" میں نے ایک بار پھر گھورتی ہوئی نظروں سے رتا کی طرف دیکھا۔

رتا نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور جب میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لے ہوں۔

سامنے بیڈ پر شوہا پڑی ہوئی تھی۔ وہ بیڈوں کا ڈھانچا بن کر رہ رہی تھی۔ رخسار چمکے ہوئے اور آنکھیں اندر کود رہی تھیں۔ چند سینے سے نکلے ہوئے کتے شان دار عورت تھی اور اب پتھر کر رہی تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں بیگم گئیں۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور پھر میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ شوہا کو اس حالت میں دیکھ کر تجانے کیوں مجھے تھائی یاد آئی اور پھر بے اختیار میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

شوہا نے کچھ دیر مجھے اپنے سینے کے ساتھ پیچھے رکھا پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور جب میں سیدھا ہوا تو چادر سے باہر نکلا ہوا اس کا برہنہ بازو دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ بازو پر کئی ایسے نشان نظر آ رہے تھے جیسے متعدد انجکشن لگائے گئے ہوں۔ میں نے اس کا دوسرا بازو اٹھا کر دیکھا۔ اس پر بھی ایسے ہی نشانات تھے اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ اسے دن میں دو مرتبہ مارفین اور پیٹھ پھینک دینے کے انجکشن لگائے جاتے تھے۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں تھائی کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا تھا۔ اسے ہیروئن استعمال کرائی جاتی تھی۔

میں نے اسے اٹھانا چاہا تو چادر ہٹ گئی۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ اس پر چادر ڈال دی اور کمرے میں لڑھراؤ دھر دیکھنے لگا۔ شوہا میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے کچھ کے بغیر ایک الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے آگے بڑھ کر الماری کھول دی۔ اس میں مردانہ کپڑوں کے ساتھ دو تین زنانہ جوڑے بھی لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے ایک جوڑا ننگر سے اتار لیا۔

"تم خود سے پہن لو گی یا۔" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

شوہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا رہا۔ رتا اب بھی ایک کونے میں سٹی بیٹھی تھی۔ اعظم خان اب بھی فون پر بات کر رہا تھا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف آیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"روٹی!" اعظم خان نے جواب دیا۔

باہر برآمدے میں جو شخص اعظم خان کی گولی سے ہلاک ہوا تھا وہ بیانی تھا جس کا مطلب تھا کہ جو شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ دیش کھ تھا۔ اعظم خان کا وہ آدمی جسے بیٹنگ نے پھیل کر بھجوا دیا تھا، ابھی اندر آچکا تھا اور برآمدے والے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

"میں نے پتھر ڈالا تو فون کر دیا ہے۔ وہ فورس لے کر پہنچے ہی والا ہے۔" اعظم خان نے بتایا پھر بولا "وہ کہاں ہے میرا مطلب ہے؟"

"شوہا اس کمرے میں ہے۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا "اس کی حالت بہتر نہیں ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال بھجوانا ہوگا۔"

"پتھر ڈالا ہے تو اس کا بندوبست کرتے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ دیش کھ نکل جانے میں کامیاب ہو گیا لیکن پتھر ک کہاں جائے گا۔" اعظم خان نے کہا پھر کونے میں بیٹھی ہوئی رتا کی طرف دیکھنے لگا "چلو اٹھو۔ کپڑے پہنو۔ ابھی تمہارے سرال والے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ کپڑے کہاں ہیں تمہارے؟"

"اس کمرے میں۔" رتا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اور جب دوسرے کمرے میں داخل ہو کر رتا نے دروازہ بند کرنا چاہا تو اعظم خان بڑی تیزی سے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد مجھے رتا کی چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔

ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ اعظم خان نے رتا کے پیچھے کمرے میں چھلانگ کیوں لگائی تھی۔ کمرے کی عقبی سمت کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور غالباً رتا نے اس طرف سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

اعظم خان نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ رتا تھپڑ

کھانے کے بعد ایک بار پھر تھر تھرا کر کانپنے لگی تھی۔ اس نے کپڑے پہن لیے اور اعظم خان کے اشارے پر ایک طرف بیٹھ گئی۔

میں نے شوہا والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ بھی کپڑے پہن چکی تھی اور بستر پر بیٹھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے بہت کٹ (مشکلات) اٹھایا ہے شوہا لیکن اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

شوہا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ تھر تھرا کر رہ گئے۔ اعظم خان بھی اندر آیا۔ اس نے ایک دو منٹ شوہا سے بات کی اور پھر باہر نکل گیا۔

مزید پندرہ منٹ گزر گئے۔ باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن اندر داخل ہونے کی کسی نے جرأت نہیں کی تھی۔

اور پھر پولیس سائینز کی آوازیں کر اعظم خان برآمدے میں چلا گیا۔ اس کے سامنے باہر کا گیت کھول دیا۔ پتھر ڈالا اور کئی پولیس والے اندر آ گئے۔ رتا کو دو پولیس والوں کے حوالے کر دیا گیا۔

پندرہ منٹ بعد مجھے اور شوہا کو ایک پولیس جیپ میں بٹھا کر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ دو مسیح پولیس والے بھی ہمارے ساتھ تھے۔

اسپتال میں شوہا کا فوراً ہی ٹریٹ منٹ شروع کر دیا گیا۔ کئی روز بعد اس رات مجھے بلا سے بھی ملنے کا موقع مل گیا۔ وہ سو رہی تھی لیکن ڈیوٹی پر موجود نرس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بلا جاگ گئی۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھے چھوڑ کر جا چکے ہو۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ وہ پہلے سے بہت بہتر ہو چکی تھی۔

"تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔ میں تو شوہا کی تلاش میں تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ پتا چلا اس کا؟" بلا نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ مل گئی ہے اور اس کو اسپتال لے کر آیا ہوں۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ! کیا ہوا اسے؟" بلا بولی "کہاں ہے وہ۔ میں ابھی اس سے ملوں گی۔"

"اس کی حالت بہتر نہیں ہے۔ صبح مل لیانا۔" میں نے جواب دیا اور بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں تقریباً آدھے گھنٹے تک بلا سے باتیں کرتا رہا اور پھر اچانک ہی مجھے مایامتی کا خیال آگیا۔ میں بلا سے دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ کچھ دیر شوہر کے پاس رکھا ڈاکڑ نے اسے انجکشن لگایا تھا اور اس پر غنودی کی طاری ہو رہی تھی۔

میں مایامتی کے مکان پر واپس پہنچا تو تین بچے والے تھے۔ مایامتی خوف کی وجہ سے ابھی تک جاگ رہی تھی اور اس نے گھر کی ساری بیتیاں جلا رکھی تھیں۔ میری آواز پہچاننے کے بعد ہی اس نے دروازہ کھولا تھا۔

کئی روز سے کچھ ایسی ہی سرگرمیاں تھیں کہ رات کے آخری پہر تک بھاگ دوڑ رہتی تھی۔ نیند بھی پوری نہیں ہوتی تھی اور تسکین بھی ہو رہی تھی۔ مایامتی کو میں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ میری دوست مل گئی ہے۔ اس کے تھوڑی سی دیر بعد میں ہسپتال پہنچا تو مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

○☆☆○

کئی روز گزر گئے۔ بلا کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اس کا زخم منديل ہو چکا تھا۔ بس ذرا احتیاط کی ضرورت تھی۔ تاہم شوہر اسپتال ہی میں تھی۔ اسے کئی روز تک علاج کی ضرورت تھی۔ مایامتی بھی اپنے فلیٹ پر منتقل ہو چکی تھی اور اس نے ڈیوٹی بھی جوائن کر لی تھی۔ بریدرانے یہ مہربانی کی تھی کہ ایک آدمی اس کی حفاظت پر مقرر کر دیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پولیس کے دو آدمی سادہ لباس میں اس کے لیے وقف کر دیے گئے تھے۔ ایک دن میں اس کے آس پاس موجود رہتا اور دو سرات کو اس کے فلیٹ کی نگرانی کرتا۔

میں اور بلا آرٹیکو روڈ پر دریائے دھولی کھولا کے کنارے ایک اور مکان میں منتقل ہو گئے تھے (نیپال میں ہے) شمار چھوٹے بڑے دریا ہیں اور یہاں کو کھولا کہا جاتا ہے) یہ مکان ایک خوب صورت کالج کی طرح تھا اور اس کے گرد ایک وسیع کھانا بڑھی تھا۔ اس کا بندوبست بریدرانے ہی کیا تھا اور مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ کالج محکمہ پولیس کی ملکیت تھا جسے کبھی کبھار مسلمانوں کے لیے ڈاک چنگے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور عام طور پر یہ خالی ہی رہتا تھا۔ یہاں بریدرانے ہمارے لیے ایک آدمی کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ اوجیز عمر کا شاید ایک اچھا خاندان بھی تھا۔ بریدرانے ہی کے توسط سے میں نے ایک چھوٹی کار بھی کرائے پر لے لی تھی۔ ان تمام انتظامات کے علاوہ اگلے ہی روز آسن جمال روڈ پر واقع ایک دکان سے میں نے ایک خنجر بھی خرید لیا تھا۔ خنجر کے بغیر میں اپنے آپ کو احمورا سمجھتا تھا۔

روی کی ہلاکت کے بعد ان لوگوں کی سرگرمیاں پک ہو گئی تھیں۔ دلش کھ، ناگ پال سے جا ملا تھا۔ سام سنگر بریدرانے اور اعظم خان نے اس طرح غائب کیا تھا کہ اگر بارے میں پتہ نہ ہو تو اس میں نہیں آ رہا تھا۔

گاڑی مل جانے کے بعد مجھے کھوٹے بھرنے میں آزادی مل گئی تھی۔ میں کبھی بلا کو ساتھ لے کر شہر گھومتا رہتا اور کبھی اکیلا ہی نکل جاتا۔ جب میں اکیلا ان علاقوں میں نکل جاتا جہاں قدم قدم پر غنودوں بد معاشوں سے سامنا ہونے کا احتمال رہتا تھا۔ مجھے دراصل کچھ ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو روی اور ناگ کے کسی مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی روز اپنے وطن سے مخلص بھی ہوں۔

اس رات میں ریڈلائٹ اسیا میں تھا۔ گاڑی میں دو ایک کشادہ سڑک پر ایک بڑے شاہنگ سینٹر کے پار لاٹ پر چھوڑ دی گئی اور اندھیری گلیوں میں پیدل چلے گئے۔ بالآخر ایک ٹھکانے میں ریٹورنٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ یہ اسکن بزنس کا اسیا تھا۔ منشیات بھی یہاں بکلا فروخت ہو رہی تھی۔ بد معاش اور ریزن بھی شکار کی گئی میں بھرتے رہتے تھے۔ یہاں معمولی معمولی باتوں پر جالڑ پتول نکل آتے تھے۔ اس علاقے میں کھوٹے ہوئے تھے۔ بہت جلد اندازہ لگایا کہ یہاں منشیات فروشوں اور غنودوں کے کئی گروہ سرگرم عمل تھے۔ مجھے بھی منشیات فروخت ایجنٹوں نے ایک دو جگہوں پر روکنے کی کوشش کی تھی مگر کئی کترا کر نکل آیا تھا۔

ریٹورنٹ میں بھی ایک دو منشیات فروش بیٹھے تھے۔ تھوڑی سی دیر بعد ایک نو عمر لڑکا میری میز پر آیا تھا۔ اس نے مجھے ہیروئن کی پڑیا دکھا کر ستے داموں خرید کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ ”شاب جی۔“ اس نے آگے جھکتے ہوئے مدد مانگ کر کہا ”ہونڈیا مالٹا ہے تو بھی ہم کو بولنے کا ہے نا۔ ایک ڈاک ان چٹ فٹ کلاس۔“

میں نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ ”تو فوراً رو کر کرنے کو آیا شاب جی۔“ لڑکے نے گھورا ”نشہ نہیں۔ لونڈیا نہیں۔ تو اوپر کیا لینے کو آیا؟“ وہ لڑکا اٹھ کر چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ بارہ ماہ عمر کے اس لڑکے کا مستقبل کیا ہو گا؟

میں ریٹورنٹ میں بیٹھا بد مزہ چائے کی چمکیاں ہاتھاکہ باہر دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔

ایک دوسرے کو گندی گالیاں دیتے ہوئے سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ دور رہنے لگے۔ وہ دونوں صورتوں ہی سے بد معاش لگ رہے تھے۔ ایک قدرے نفلتے ہوئے قد اور صحت مند جسم کا مالک تھا جبکہ دوسرا درمیانے قد و قامت کا اور دھلا پتلا سا آدمی تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ اپنے حریف سے زیادہ تیز و طرار لگ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر ان کی لڑائی باتوں سے آگے بڑھی تو وہ پٹ جائے گا۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ دراز قامت غنڈے نے اپنے تیز باریک تھا۔ دبلے پتلے غنڈے نے غفلت میں ایک تھپوٹ کھایا تھا لیکن اس کے بعد اس نے اپنے حریف کی جو درگت بنائی وہ قابل دید تھی۔

ہٹا کٹا غنڈا مار کھا کر پاپا ہو گیا اور پھر یہ دھمکی دیتے ہوئے بھاگ گیا کہ وہ اپنے باپ کی حلال کی اولاد ہے تو ہیں کھڑا رہے۔

میں دو دواڑے کے قریب والی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دھلا پتلا غنڈا میری میز پر آکر بیٹھ گیا۔ ”بھاگ گیا سالا۔“ وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا ”ناگ پال کے سامنے میں جی رہے ہیں حرامی۔ اپنے اندر اتنا دم ختم نہیں کہ دن نو دن مقابلہ کر سکیں۔ اب کیا ہے اپنی ماں کے کھنسر کو بلانے۔ اپن بھی آج بوت پتا ہوا ہوں۔ ایک آدھ کا گردن تو ڈکری جائے گا اور سر۔“

ناگ پال کا نام سن کر میں جو کچھ بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ مفتی سادہ معاش ناگ پال کا حریف تھا۔ ممکن ہے اس کا اپنا کوئی ٹیگٹ ہو یا اکیلا ہی ہو لیکن اس کی دلیری، حوصلہ اور لڑنے کا انداز مجھے پسند آیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس جنگ کا آخری مرحلہ دیکھ کر ہی یہاں سے اٹھوں گا۔

”چائے پیو سوبھا دادا۔ وہ بھاگ گیا۔ اب نہیں آئے گا۔“ ہوٹل کے دیگر نے اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔

”جب تک وہ حرامی نہیں آئے گا ہم بھی اور ہٹا ہوں۔“ سوبھا دادا نے کپ اٹھاتے ہوئے کہا ”تم لوگ گواہ رہنا۔ سوبھا دادا بھائی گناہیں ہے۔ میں سالا ناگ پال حرامی سے نہیں ڈرتا۔“

وہ بولا ”ہاں اور میں دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر آوے کھٹے بعد اس کا حریف واپس آگیا۔ اس کے ساتھ اس کی طرح کے دو بچے کئے غنڈے اور بھی تھے۔ سوبھا اٹھ کر ریٹورنٹ سے باہر چلا گیا۔ وہ ان لوگوں کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک گالیوں اور دھمکیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور پھر وہاں ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ میں بڑی دلچسپی سے سوبھا کو لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی خوب صورتی سے داؤ بیچ استعمال کر رہا تھا۔ اس کے بدلے حریف نے خنجر نکالا تو پک بھینکنے کی دیر میں وہ خنجر سوبھا کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔

ایک موقع پر سوبھا ان کے قابو ہو گیا۔ دو آدمیوں نے اسے اس طرح گرفت میں لیا کہ وہ تقریباً بے بس ہو کر رہ گیا تھا جبکہ تیسرا آدمی خنجر اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔

مجھے ہٹا کٹا کا وہ خوفناک منظر یاد آیا جب میں تھائی کے ساتھ اندرا راجت ہوٹل گیا تھا اور ٹائیگر کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ ہمارا ج کے آدمی ہماری مدد کو پہنچ گئے تھے اور ٹائیگر کے آدمیوں نے مارٹر پھونکا کہ اسی طرح موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

میں نے اور اور دیکھا۔ لوگ دور دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو سکا۔ ایک اچھا اور کارآمد آدمی بے موت مارا جا رہا تھا۔

میں ایک ہی چھلانگ میں ریٹورنٹ سے باہر آیا۔ وہ آدمی سوبھا پر حملہ کرنے کے لیے خنجر والا ہاتھ سرے اوپر اٹھا چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ وار کرتا، میں اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بھیڑیوں کی پوری قوت سے مل (YELL) کیا تھا۔ مارشل آرٹ میں یہ بھی ایک کمال ہے کہ حریف پر حملہ کرتے ہوئے دھاڑنے کی آواز اس کا حوصلہ پست کر دیتی ہے۔

میں پوری قوت سے ہوا میں اچھلا تھا۔ میری فلائنگ کنگ اس کے منہ پر لگی اور وہ ہلپلاتے ہوئے پیچھے الٹ گیا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ میں بھی نیچے گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبل گیا۔ میرا یہ حملہ اس شخص کے لیے اگرچہ بالکل غیر متوقع تھا لیکن وہ فوراً ہی اٹھ گیا تھا۔ میں نے سنبلنے کا موقع دے بغیر ایک اور فلائنگ کنگ لگا دی اور پھر پے درپے اسے لٹک لگا دیا۔

سوبھا اب بھی ان دو آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ ان دونوں نے اسے پیچھے سے جکڑ رکھا تھا۔ سوبھا آہستہ آہستہ آگے کو جھکنے لگا اور پھر اس نے اپنے آپ کو آگے کی طرف زوردار جھکا دیا۔ وہ دونوں اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے پشت کے بل زمین پر گرے۔

سوبھا فوراً ہی سنبل گیا تھا۔ اس کا ایک حریف اٹھنے

کی کوشش کر رہا تھا لیکن سوما کی زور دار ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر پڑی اور وہ بلبلاتے ہوئے الٹ گیا۔  
یہ عمل چند منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ میں اور سوما ان تینوں کو بار بار زمین چاٹنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سوما کا اصل حریف جس سے شروع میں جھگڑا ہوا تھا، زیادہ تر میرے بہتے چڑھا رہا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے وہ شخص میرے سامنے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سوما نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

”آج میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔“ وہ ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا ”اس حرامی ناک پال سے بھی کہہ دینا کہ آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔ میں اس حرامی کو بھی زمین چٹا دوں گا۔“  
وہ شخص اٹھ کر ایک طرف بھاگ گیا۔ سوما میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”شکر ہے دوست۔“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا ”تم میرے لیے اجنبی ہو لیکن جس طرح تم نے میری جان بچائی ہے میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا لیکن کیا تم نے مجھے کوئی غلطی نہیں کی؟“  
”نہیں دوست۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔“ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے جواب دیا ”تم جیسے دلیر اور حوصلہ مند آدمی کے کام بکرم مجھے خوش ہوئی۔“

”یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“ وہ بولا ”ناگ پال اپنے آپ کو اس دیش کا راجا سمجھنے لگا ہے مگر بے توہی اچکا جب کترا۔ دولت آجانے سے آدمی کی فطرت تو نہیں بدل جاتی۔ بہر حال آؤ۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پیو۔“

ہم ریسٹورنٹ میں آگئے۔ دینر نے پوچھے بغیر ہمارے سامنے چائے رکھ دی۔ اب دور دور کھڑے ہوئے لوگ بھی قریب آنے لگے تھے۔ سوما کو تو تقریباً سب ہی لوگ جانتے تھے۔ بہت سے لوگ مجھے بھی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ بغیر ہڈی ایک جیب ریسٹورنٹ کے سامنے آکر رکی۔ اس میں آٹھ دس غنڈے بھرے ہوئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ہاکی تھی کسی کے ہاتھ میں تینہ اور کوئی لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔

میں حتمًا ہو گیا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید یہ انہی لوگوں کے آدمی ہیں جو مار کھا کر بھاگے ہیں لیکن یہ سوما کے آدمی تھے۔

”میں تو دہلی بازار میں تھا سوما دادا۔“ ایک لمبا غنڈا آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں تینہ تھا۔ جیسے ہی اطلاع ملی میں ان لوگوں کو لے کر چلا آیا۔ کون سے لوگ کہاں گئے ہمیں بتاؤ۔ ہم ان کے ٹکڑے کر کے پھینک دیں گے۔“

”بھاگ گئے وہ حرامی۔ اس ٹائیگر نے انہیں مارا بھاگا دیا۔“ سوما نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر میرے بارے میں بتانے لگا کہ اگر میں مداخلت نہ کرتا آج مارا جاتا۔

وہ سب لوگ میرے سامنے جھک گئے۔  
”تم لوگ جاؤ۔“ سوما نے کہا ”اب کئی روز تک حرامی لوگ اپنے زخم چاٹنے رہیں گے اور اس کے بعد ہی کرنے کی سوچیں گے اور پھر جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم لوگ اپنا اپنا کام کرو۔“

وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹا مزید بیٹھے رہے اور پھر میں اٹھ گیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے سوما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم سے کچھ باتیں کرنے کو بھی چاہتا ہے۔“  
ہم ریسٹورنٹ سے نکل کر چلتے ہوئے اس طرف گئے جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر سوما کو پیئرز سیٹ پر بٹھایا اور پھر اوپر سے گھوم کر ڈرائیو سیٹ پر آیا۔

میں سوما کو مایا سٹی والے مکان میں لے آیا۔ ایک چالی میں نے مایا سٹی سے پہلے ہی لے لی تھی۔ سوما کو پچانے میں میں نے غلطی نہیں کی تھی۔ غنڈا ضرور تھا مگر منشیات کی خرید و فروخت سے اسے نفرت تھی۔ کتنا ہی نام گئے اس غنڈے سے سوما کی لڑائی اس بات پر ہوئی تھی۔ کتنا ہی تعلق ناگ پال کے گروہ اور ناگ پال کا اصل بڑس منشیات ہی سے متعلق تھا۔

کے گروہ کے لڑکے وہاں گھوم پھر مگر منشیات فروخت نہ تھے اور کتنا ہی ان لڑکوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ سوما نے منع کیا تھا کہ اپنے لڑکوں کو میاں سے لے جائے اور اپنا پر جھگڑا بڑھ گیا تھا۔

وہ ناگ پال کے آدمی تھے جو پٹ کر گئے تھے اور یقین تھا کہ بات یہیں ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ معاملہ آگے گا۔ ناگ پال کو جب پتا چلے گا تو وہ خاموش نہیں رہے۔ اتفاق یہ تھا کہ میں بھی اس معاملے میں ملوث ہو گیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ مجھے سوما جیسا آدمی مل گیا تھا۔

میں کام لے سکتا تھا۔  
سوما سے کھل کر باتیں ہوئیں۔ اسے میں نے بتا دیا کہ یہاں کیا سازش ہو رہی ہے اور جزل کھوراٹ یہاں پوسٹ کی کاشت والے علاقے پر کس طرح قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اسے سام سنگ اور چانگ لی کے بارے میں بھی بتا دیا جو ناگ پال کی اس معاملے میں مدد کر رہے تھے۔ ”اچھا۔ وہ چینی۔“ سوما نے کہا ”مجھے اس پر پہلے ہی پتہ تھا۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا لیکن تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”میرا بھی ان سے کچھ پرانا حساب چل رہا ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تھا لیٹنڈ میں منشیات کی اسمگلنگ کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتانے لگا۔ ”میں یہاں دیش کھ کے تعاقب میں آیا تھا۔“ میں نے اس تعاقب کا پس منظر بھی بتا دیا اور آخر میں اسے سام سنگ سے آہنا سامنا ہونے کے بعد سے اب تک کے واقعات بتاتے لگا۔

”ہم دونوں کا راستہ ایک ہی ہے۔“ میرے خاموش ہونے پر وہ بولا ”تم جس طرح اس لڑائی میں کود پڑے تھے اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتے ایسے حالات میں ہر کوئی دور بھٹاتا ہے لیکن تم نے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔ آج سے ہماری دوستی بنی۔ تم آؤ اب مجھے دو گے تو یہ سوما اپنی جان بھینگی پر لے کر پہنچ جائے گا۔“

”مجھے صرف ایک معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔  
”حکم کرو۔“ وہ بولا ”مجھے کسی آزمائش میں پیچھے نہیں پڑاؤ گے۔“

”ان کا منصوبہ بہت خطرناک ہے۔“ میں نے کہا ”گولڈن ٹرائی اینگل کا جزل کھوراٹ یہاں بھی اپنے قدم جما چاہتا ہے تاکہ یہاں بھی ہیروئن کی فیکٹریاں لگا سکے۔ اس نے ناگ پال جیسے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے جو اس کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔“ میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر اسے بتانے لگا کہ وہ لوگ کس طرح یہاں اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ ”موت کے یہ سوداگر ہشت پائی طرح پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔“ میں کہہ رہا تھا ”ظاہر ہے ہم پوری ممکن ہو اس سیلاب کو نہیں روک سکتے لیکن جس حد تک ممکن ہو اس حد تک کوشش تو کر سکتے ہیں۔ یہ تمہارا دیش ہے۔ تم اور تمہاری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ چاہیں

گے کہ یہاں کے لوگ اس زہر سے محفوظ رہیں۔ میں اتنا چاہتا ہوں کہ یہاں ان کے قدم نہ جھنپے پائیں۔ اگر خیال میں ان کے قدم جھمکے تو اس کے بعد وہ انڈیا کے شمالی خطے کی طرف بڑھیں گے۔ ہمارا چل رہا دیش کا علاقہ بھی پوسٹ کی پیداوار کے لیے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ وہاں بھی چرس و افیون وغیرہ سرعام فروخت ہوتی ہے۔ منشیات کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جزل کھوراٹ اس صورت حال سے فائدہ اٹھائے گا اور خیال کے بعد اس کے قدم اسی خطے کی طرف اٹھیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اسے یہیں روک دیا جائے اور آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ سوما نے کہا ”مجھے بتاؤ کیا کرنا ہوگا۔ میرے پاس ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو میرے ایک اشارے پر آگ بھی کود پڑیں گے۔ آج سے وہ سب تمہارے ڈیپوڈل پر ہوں گے۔ تم ٹھم کو۔“

”فی الحال تو ناگ پال اور اس کے غیر ملکی مسلمانوں جنہیں تم چینی سمجھ رہے ہو کی نگرانی کی ضرورت ہے۔ دیش کھ بھی ناگ پال کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ میرے سامنے بازی ہار گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ فی الحال ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جائے۔“

”تم فکر مت کرو۔“ سوما نے کہا ”میں اپنے سارے آدمیوں کو حرکت میں لے آؤں گا۔“

”اس طرح گڑبگڑ ہو جائے گی۔“ میں نے کہا ”دو چار ڈیپن آدمیوں کو منتخب کر کے ان کی ڈیوٹی لگا دو جو روزانہ شام کو تمہیں رپورٹ دیتے رہیں۔ میری اور تمہاری ملاقات ہر دو دن رات گیارہ بجے اسی مکان میں ہوگی اور ہم آپس میں تبادلہ خیال کر لیا کریں گے۔“

سوما نے میرے اس پروگرام سے اتفاق کیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری اس روز کی ملاقات ختم ہو گئی۔ سوما کو رخصت کرنے کے بعد میں تقریباً آدھا گھنٹا مزید اسی مکان میں ٹھہرا رہا اور پھر دو آدمیوں کو نالے لگا کر چاہیوں کا گچھا میں نے برآمدے میں اسی طاق میں رکھ دیا جہاں سے اس رات مایا سٹی کو اٹھانے ہوئے دیکھا تھا۔

جب میں اپنی گاڑی پر وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ دیرائے دھونی کھولا کے کنارے پر وہ ڈاک بنگلا بھی اگرچہ کالی کا امتحان کے ہی علاقے میں تھا۔ اس سے ذرا آگے آرٹیکو روڈ تھا جس کے دوسری طرف تھا پتھالی کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں اگر چاہتا تو گلیوں ہی گلیوں



میں ہوتے ہوئے ڈاک بنگلے تک پہنچ سکتا تھا لیکن گھٹا دربار (شاہی محل) کے قریب سے میں نے گاڑی کا رخ پر تھوڑی پچھت (روڈ) کی طرف موڑ دیا۔

بحور کالی مندر والے چوراہے پر میں نے ایک دکان سے کچھ پھل خریدے اور... کار کو وہاں سے آریکو روڈ کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح مجھے ڈاک بنگلے تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

کار کی آواز پر گٹ کاشا نے کھولا تھا۔ میں پر آمدے کے سامنے کار روک کر اندر داخل ہوا۔ بلا لاؤنج میں ایک صوفے پر نیم دراز اوکھ رہی تھی اور سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔

میں نے بھلون والی نوکری سینئر ٹیبل پر رکھ دی اور ٹی وی بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بلا نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹی وی کی آواز شاید اس کے لیے نوری کا کام دے رہی تھی۔ آواز بند ہوتے ہی وہ جاگ گئی تھی۔

”ارے! بہت دیر لگا دی تم نے بہت سنگھ۔ کہاں رہ گئے تھے۔“ بلا انکڑائی لیتے ہوئے بولی ”بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔“

میں نے بلا کو جواب دینے کے بجائے کاشا کو آواز دے کر کھانا لگنے کو کہا اور اپنے کمرے میں ٹھس گیا۔

پچھت روم میں منہ ہاتھ دھو کر میں نے پکڑے بھی بدل لیے اور جب لاؤنج میں واپس آیا تو کاشا سینئر ٹیبل پر ہی کھانا لگا رہا تھا۔

کھانے کے دوران میں ’میں بلا کو بازار میں ہونے والی لڑائی اور سوما سے ملاقات کی تفصیل بتاتا رہا۔

”کیا وہ بھروسے کا آدمی ہے۔ عین وقت پر دھوکا تو نہیں دے گا؟“ بلا نے کہا۔

”میں کسی کو پہچاننے میں غلطی بہت کم کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”سوما کو پہچاننے میں بھی میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی جان تو بے دے گا لیکن مجھ سے دھوکا نہیں کرے گا۔“

کھانے کے بعد ہم دیر تک ٹی وی پر فلم دیکھتے رہے۔ نپال میں دو طبقے آباد تھے۔ ہندو اور بڑھ مت لیکن ہندو نہ صرف مکمل طور پر معیشت پر چھائے ہوئے تھے بلکہ ان کا کلچر بھی نمایاں تھا۔ شہر میں بھی بڑھ کے بیروکار تھیں۔ قد ادیں نظر آتے تھے لیکن ان کی اکثریت دیہی علاقوں میں آباد تھی۔ وہ بہت سادہ لوگ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔

سیاست سے بھی انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ الکی چیزوں سے الگ تھلگ بھی نہیں تھے۔

معاشرے پر عمومی طور پر ہندو ازم کی چھاپ نمایاں تھی۔ ٹی وی پر بھی زیادہ تر انڈین چینلز ہی کے پروگرام دکھائے جاتے تھے اور سنیماؤں میں بھی زیادہ تر انڈین فلمیں ہی چلتی تھیں۔

اس وقت ٹی وی پر جو فلم چل رہی تھی، خاصی دلچسپ تھی۔ جب فلم ختم ہوئی تو میں نے گردن کھما کر بلا کی طرف دیکھا تو وہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر بچھڑ دیا۔ ٹی وی بند کیا اور بلا کو کمرے میں لاکر بستر پر گرانا دیا اور خود سوئے کمرے میں آیا۔

میں اگرچہ الگ کمرے ہی میں سوتا تھا لیکن صبح جب آنکھ کھلتی تو بلا کو اپنے بیڈ پر پائنٹی کی طرف پڑے ہوا پاتا۔ تپا سیں وہ کس وقت اپنے کمرے سے نکل کر میرے پر آجاتی تھی۔

شوہا کے مل جانے کے بعد مجھے ذہنی طور پر سکون نصیب ہوا تھا اور میں نے ایک بار پھر یوگا کی پریکٹس شروع کر دی تھی اور مراقبہ بھی کیا کرتا تھا۔

صبح سویرے اٹھ کر میں کچھ دیر مراقبہ اور یوگا کی پریکٹس کرتا پھر گاڑی پر دوبار مارگ کی طرف نکل جاتا جہاں رت پارک میں بھی ٹھوڑی دیر یوگا کی مشق کرتا پھر جو ٹنگ اور لاہ ساز کرتا اور سورج طلوع ہونے کے بعد پارک کی دو طرف کاغذی پچھت سے ہوسٹے ہوئے اسپتال پہنچ جاتا۔

شوہا کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی اور وہ بڑی تیز رفتاری سے رو بہ صحت ہو رہی تھی۔ اس سے ابھی تک میری طبیعت بات چیت نہیں ہو سکی تھی لیکن اس روز شام کو جب میں بلا کے ساتھ اسپتال آیا تو ٹنگو کا سلسلہ چل نکلا۔ شوہا کو اس بات پر حیرت تھی کہ ہم اسے بچانے کے لیے دلش کھ کاغذ کرتے ہوئے کھنڈو تک آگئے تھے اور پھر اسی روز ٹنگو دوران میں بلا نے سونیا کے بارے میں بتا دیا تو شوہا کا ایک دم دھواں ہو گیا۔

”بے چاری۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ابھی لڑی تھی۔“

ماحول پر سوگوار سی طاری ہو گئی۔ ہم بہت دیر سونیا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں اور بلا آٹھ بجے اسپتال سے نکلے۔ سیلوپ ہوٹل میں کھانا کھایا اور دس بجے کے قریب اپنے ڈاک پر واپس پہنچ گئے۔ ہمارے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔

بلا نے ٹی وی آن کر دیا اور ریٹو کنٹرول کے بٹن دبا کر اپنا بیڈ کا پیچیل تلاش کرنے لگی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

برہندر اور اعظم خان کی طرف سے پچھلے تین چار دن سے کوئی اطلاع نہیں کی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ٹیلی فون پر برہندر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ دفتر میں موجود نہیں تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بخار کی طرف گیا ہوا ہے۔ انسپٹر اعظم خان کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

پونے گیارہ بجے کے قریب میں مایا سنی کے مکان پر جانے کے لیے روانہ ہو گیا اور میں ٹھیک گیارہ بجے وہاں پہنچ گیا تھا۔

سوما بھی عام طور پر ٹھیک گیارہ بجے ہی وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ سوا گیارہ بج گئے لیکن سوما نہیں آیا۔

سازے گیارہ بجے فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں اس وقت پر آمدے میں کھڑا تھا۔ اندر آیا تو تیسری مرتبہ گھنٹی بج چکی تھی۔ میں نے بلا کو یہ خبر نوٹ کر رکھا تھا۔ برہندر اور اعظم خان کے پاس بھی یہ خبر موجود تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس کی کال ہو سکتی تھی۔ میں نے ریسپور اٹھایا تو ایک جانی پہچانی سی آواز سنا دی۔ میں اس آواز کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ آواز دوبارہ میری سماعت سے گزرائی۔

”میں سوما بول رہا ہوں ماشرو۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟“

”ہاں سوما۔“ میں نے جلدی سے کہا ”میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تمہیں یہاں کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟“

”تم بھول گئے ہو ماشرو کہ میں روزانہ تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“ سوما نے جواب دیا ”میں اکثر ٹیلی فون کے قریب والی کرسی پر بیٹھا رہا ہوں اور ٹیلی فون سیٹ پر نمبر لکھا ہوا ہے۔“

”سمجھ گیا۔“ میں اس کے مشاہدے اور قوت حافظہ کی داد دیتے بغیر نہیں رہا۔ ”کونو خیریت؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس وقت کھاک ٹاور کے قریب اپنا پورنا ریٹورنٹ سے بول رہا ہوں۔ دلش کھ کے ایک آدمی کو میں نے قاپو میں کیا ہوا ہے۔ اسے تمہارے مکان پر لانا مناسب نہیں ہے۔ تم یہاں آ جاؤ۔ اس شخص سے کچھ کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ریسپور رکھ دیا اور برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں کار کو مختلف گلیوں میں گھماتے ہوئے دوبار مارگ کی طرف گیا۔ دوبار پچھت سیدھی کھاک ٹاور چوک تک چلی گئی تھی۔

اپنا پورنا ریٹورنٹ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں کار سے اتر کر ریٹورنٹ کی طرف چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک آدمی نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک ایک نپالی تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے جنہیں تقریباً دو انچ چوڑے الاسٹک بیڑے کے ذریعے سینے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ نیلی جینز اور نی شرت پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں بھی نیلے رنگ کا رول بندھا ہوا تھا۔ ٹھوڑی پر چند بال تھے اور آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

”میرے ساتھ آؤ ماشرو۔“ اس شخص نے کہا ”سوما یہاں نہیں ہے۔ وہ رت پارک میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ ”رت پارک!“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ شکار نے کچھ ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی تھی۔ ”اس شخص نے جواب دیا ”سوما اسے رت پارک کی طرف لے گیا ہے۔ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہیں وہیں لے آؤں۔“

میں نے ایک بار پھر فورے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اب میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ان آدمیوں میں سے ایک تھا جو اس رات جپ پر... ریڈ لائٹ ایریا کے ریٹورنٹ میں سوما کے پاس آئے تھے۔

میں نے اسے کار میں بٹھالیا اور کار کو گھماتے ہوئے دوبارہ دوبار پچھت کی طرف لے آیا۔

رت پارک تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے کار سڑک کے کنارے پر کھڑی کر دی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ دوسری طرف سے وہ آدمی بھی اتر چکا تھا۔ ہم دونوں پارک میں داخل ہو گئے۔

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دس بجے تک اس پارک میں بڑی رونق رہتی تھی۔ مناسب فاصلوں پر لگے ہوئے کھوپڑیوں پر برقی بلب بھی جگمگاتے تھے لیکن اس وقت تاریکی اور سناٹا تھا۔

میں اس شخص کے پیچھے پیچھے چلا رہا۔ ایک جگہ قد آدم

پودوں کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور پھر اچانک ہی اس نے پودوں کی دوسری طرف چلا نکلا۔ گادی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔

”علقت تو ہن پر۔“ مجھے اپنے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز ابھری اور اس مرتبہ ایک آوی چیخ اٹھا تھا۔

میرا ساتھی پودے چلا نکلا کرواپس آگیا۔

”میں سمجھا تھا شاید کوئی ہماری عمرانی کر رہا ہے۔“ اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا ”یہ سارے دھندے بھی رات کو پارکوں ہی میں ہوتے ہیں۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ کن دھندوں کی بات کر رہا تھا۔ پارک میں کافی آگے جا کر وہ درختوں کے ایک سچ کے قریب رک گیا۔ اس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا کھڑا تھا جس کی کھڑکی سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ غالباً پارک کے نگران کا کمرہ تھا۔

ہم جیسے ہی آگے بڑھے ”ایک آوی پودوں سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن میرے ساتھی کو پہچان کر وہ راستے سے ہٹ گیا۔ ہم دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک طرف باغیانی میں استعمال ہونے والی چیزیں پڑی تھیں۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے کلمے لکھ کرے ہوئے تھے۔ کمرے میں سیلن اور کھاد وغیرہ کی ناگوار سی بو بھری ہوئی تھی۔

کمرے میں تین آدمی تھے۔ ایک سوبا، دوسرا اس کا ایک لمبا ترنگا ساتھی جس کے ہاتھ میں خم دار بلینڈ والا تیتھ تھا اور تیسرا آدمی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی اچھی خاصی خاطر واضح بھی کی گئی تھی۔

سوبا مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”سوری ماسٹر“ وہ بولا ”اے تمہارے ٹھکانے پر لانا مناسب نہیں تھا۔ اس وقت یہی مناسب جگہ نظر آئی تھی اسی لیے ہم اسے یہاں لے آئے۔“

”کچھ بتایا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ تو ہے۔“ بانی تم پوچھ لو۔“ سوبانے جواب دیا۔

اور پھر اس شخص نے جو کچھ بتایا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق ناگ پال، دیش کھ اور چانگ کی نے اپنے خطرناک منصوبے کو حتمی شکل دے دی تھی اور وہ چند روز میں اس پر عمل کرنے والے تھے۔ اس ابتدائی مرحلے

میں ہندوستان سے آنے والی ایک شخصیت کو قتل کر دیا جائے۔ جس شخص کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا وہ اتنا اہم تو نہیں تھا لیکن ہندوستان میں لوگ بھلا کب ممبر ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستانوں نے نیپال کو اپنی کالونی سمجھ رکھا تھا۔ اس قسم کے لوگ آزادی سے یہاں آتے رہتے تھے۔ کسی کو لوگوں نے تو یہاں جا کر ادیس بنا رکھی تھیں اور ان کے کاروبار بھی تھے۔

ہندوستان کے ہمارے لال لال بانی جس شخص کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا وہ ایک ہتھ بند کھنڈو پختہ والا تھا۔ کھنڈو کے نواحی علاقے میں اس کی ایک شاندار کوئی بھی تھی اور اس نے یہاں بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سوبائی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”اس کا کیا کیا جائے؟“ سوبانے زمین پر پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا ”یہاں اس کی چھٹی گروی جائے؟“ اس نے مخصوص انداز میں گلے پر ہاتھ پھیرا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن اسے کم از کم اس وقت تک مضر عام پر نہیں آنا چاہیے جب تک ہماری لال کھنڈو سے واپس نہیں چلا جاتا۔“

”ٹھیک ہے ماسٹر“ سوبانے کہا ”اے اس وقت تک ایسی جگہ پر رکھا جائے گا جس کے بارے میں اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔“

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ زمین پر پڑے ہوئے اس شخص کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ میں اور سوبا بھی کمرے سے باہر آگئے۔ سوبانے حق جلتی رہنے دی تھی۔

البتہ دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا تھا۔

میں سوبا کے ساتھ چند منٹ وہاں کھڑا رہا پھر سوبا اپنے آدمیوں کے پیچھے کانتی روڈ کی طرف چلا گیا اور میں وہاں ہاتھ کی طرف آگیا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

یہ دیوار روڈ اور کانتی روڈ کے درمیان بہت بڑا پارک تھا۔ اس کے سامنے دیوار روڈ کی طرف بس اسٹاپ بھی تھا۔ میں چونکہ روزانہ صبح سویرے یہاں آیا کرتا تھا اس لیے اس پارک کے بیشتر حصوں سے واقف ہو گیا تھا۔

میں پختہ روشوں پر چلنے کے بجائے پارک کے اس سے کی طرف جا رہا تھا جہاں درختوں کی بہتات تھی۔ میں اپنی درختوں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔

میں مڑے مڑے جا۔ سنبھل کر پیچھے دیکھا تو رک گیا اور مرکز میں مڑے دیکھنے لگا جس سے ٹھوکر لگی تھی۔

اس جگہ پر پارک کے جنگل کے ساتھ ایک تنگ چمن گز تھا جس پر اسٹاپ سے کانتی روڈ تک چلی گئی تھی۔ یہ مرکز کی بجلی کے کھمبے پر چلنے والے بلب کی بہت مدھم سی روشنی دہاں تک پہنچ رہی تھی۔

میں اس چمن گز کو دیکھ کر چونک گیا جس سے ٹھوکر کرتے مڑے جا تھا۔ وہ چیز بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ میں جب کراسے دیکھنے لگا۔ وہ ٹھوس کرشل کا انسانی مجسمہ تھا بلکہ مجھے کچھ سے نیچے کا دھڑ تھا۔ میں نے اسے ٹٹل کر دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تین چار گز کے فاصلے پر مجھے کاہر کا دھڑ بھی بڑا ہوا تھا۔

یہ کسی عورت کا مجسمہ تھا جو ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کرشل کا یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ اس جگہ کہاں سے آیا تھا۔ میں اس پارک کے بیشتر حصوں سے واقف تھا۔ پارک میں شاہ نیپال اور ملکہ رتا کے چتر کے مجسمے تو دیکھتے تھے لیکن کرشل کا یہ مجسمہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہاں روشنی بہت بجلی تھی۔ چہرے کے نقوش نظر نہیں آتے تھے اس لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ ملکہ کا مجسمہ تھا یا کسی دیوی کا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کرشل کا یہ مجسمہ کہیں سے چوری تو نہیں کیا گیا؟ ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ کوئی شخص اسے کہیں سے چور کر لیا ہو پھر شاید کسی خوف کی وجہ سے اسے یہاں پھینک کر بھاگ گیا۔ پھینکنے سے مجسمہ ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

اس مجسمے کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ اس کا شمار نوادرات میں بھی ہو سکتا تھا۔ اسے یہاں چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ ابھی تو یہ صرف دو ٹکڑے ہی ہوا تھا۔ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو مزید ٹوٹ پھوٹ ہونے سے ضائع ہو سکتا تھا۔

میں نے جھک کر وہ مجسمہ اٹھالیا۔ ایک حصہ ایک بغل میں اور دوسرا دوسری بغل میں۔ دونوں حصے خاصے وزنی تھے۔

پارک سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار کے قریب گیا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو چوری کے الزام میں دھڑ لیا جاؤں۔

میں نے مجسمے کے دونوں حصوں کو کار میں پیچھے رکھ دیا۔

دونوں حصے سیٹ پر پورے نہیں آئے تھے ایک حصہ سیٹ پر رکھا اور دوسرا اس کے آگے فٹ سیٹ پر رکھنا پڑا تھا۔

میں بہت بجلی رفتار سے کار چلا تا رہا تاکہ جھٹکا لگنے سے مجسمے کو کھینچ نہ بیٹھے اور مزید ٹوٹ پھوٹ نہ ہو۔

جب میں نے کار روکی تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں ڈاک جنگلے جانا چاہتا تھا جہاں میرا بھی موجود تھی لیکن میں مایا متی والے مکان پر پہنچ گیا تھا۔ مجھے راستے میں بالکل احساس نہیں رہا تھا کہ کس طرف جا رہا ہوں۔ بہر حال میں نے یہی سوچ لیا کہ اس مجسمے کو یہاں رکھ کر ڈاک جنگلے چلا جاؤں گا اور صبح سب سے پہلے بریدر سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں بتاؤں گا تاکہ یہ بتا چلا یا جائے کہ یہ مجسمہ کہاں سے چوری کیا گیا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر ٹیکٹ کھولا اور پھر کار کو اندر لے آیا۔

میں نے مجسمے کے دونوں حصے کار سے نکال کر مایا متی والے کمرے میں پہنچا دیے اور انہیں بیڈ پر ڈال کر دونوں حصوں کو آپس میں ملائے لگا۔ وہ مجسمہ اس طرح ٹوٹا تھا جیسے بیڈ سے کٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ میں نے انہیں آپس میں ملایا تو وہ بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔ کہیں اور کوئی خراش تک نہیں آئی تھی۔

میں سیدھا ہو کر اس مجسمے کو دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ قد ساڑھے پانچ فٹ کے لگ بھگ۔ اگر وہ زندہ عورت ہوتی تو اس کا بدن بڑا گداز ہوتا۔ چہرے کے نقوش نمایاں پرکشش، موٹی موٹی آنکھیں جو پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور لگتا تھا ان میں بے پناہ کرب بھرا ہوا ہو۔ بال لمبے تھے جو پیچھے پشت تک چلے گئے تھے۔ پیر کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک وہ ایک مکمل اور بھرپور عورت تھی۔

لگتا تھا جیسے کرشل کی چٹان کو تراش کر یہ مجسمہ تیار کیا گیا ہو۔ مجسمہ ساز نے اس کی تیاری میں بڑی محنت اور مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی نادر شاہکار تھا جسے یقیناً میوزیم سے چرایا گیا تھا اور چور کسی وجہ سے خوف زدہ ہو کر اسے پارک میں پھینک گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ صبح سب سے پہلے بریدر کو اس کے بارے میں اطلاع دوں گا۔

میں سر سے پیر تک گہری نظروں سے اس مجسمے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا جوڑ اگرچہ آپس میں مل گیا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر جوڑ پر بال سے بھی باریک گیرسی نظر آ رہی تھی

آتش فشاں ﴿۶۶﴾ حصہ 6

تھا کہ کوئی عورت کسی تکلیف سے ہولے ہولے کرا رہی تھی۔

میں کمرے کی طرف مڑ گیا اور پہلا قدم اندر رکھتے ہی اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور دل کپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ عورت کا وہ خوب صورت کرشل کا مجسمہ بیڑ پر پڑا ہوا تھا۔ نہیں... کرشل کا مجسمہ نہیں۔ وہ عورت تھی۔ زندگی سے بھرپور عورت۔ میں نے اس کا کرشل کا جسم پہلے ہی دیکھا تھا لیکن اب وہ بے جان کرشل نہیں، گوشت و پوست کی زندہ عورت تھی۔ رنگت ایسی جیسے دودھ میں ہلکا سا گلابی رنگ ملا دیا گیا ہو۔ سرخ احمرس ہونٹ اور سینے کا لپکا سا زیروم اس میں زندگی کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں چہرے پر کرب کے جھلکے سے آگاہ تھے اور وہ ہولے ہولے کرا رہی تھی۔ وہ بے لباس تھی اور اس طرح پشت کے بل بالکل چپ لیٹی ہوئی تھی جس طرح میں نے اس مجسمے کو لایا تھا۔ اس کے پیٹ پر ایک طرف سے دوسری طرف تک وہ اسکاچ ٹیپ اب بھی موجود تھا جو میں نے مجسمے کو جوڑنے کے لیے چپکایا تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید میں کوئی بھیاک خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے یہاں کرشل کے ایک ٹوٹے ہوئے مجسمے کو لایا تھا اور اس وقت میرے سامنے ایک نہایت حسین و جمیل عورت لیٹی کسی تکلیف سے کرا رہی تھی۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسا ملکوتی حسن اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے ایک انگلی دائتوں میں دبائی۔ میں نے انگلی پر دانت کچھ زیادہ ہی زور سے گاڑ دیے تھے۔ میں انگلی کو دوسرے ہاتھ سے سسلانے لگا۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا تھا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔

اس گلابی اور گدا زدن پر نظرسنکا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے بیڈ پر ایک طرف پڑی ہوئی چادر کھول کر اس کے جسم پر ڈال دی۔ اس کا چہرہ نہیں ڈھکا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عورت کی آنکھیں حسین ہوں تو لوگ بہنی کی آنکھوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہنی کی آنکھیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں لیکن ان آنکھوں کے سامنے تو جیسے بہنی کی آنکھیں بھی بچ نظر

آئیں۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جنہیں بے اختیار چوم لیں دل چاہتا تھا لیکن میں اپنی اس خواہش پر عمل نہیں کر سکا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ اداسی اور کرب تھا۔ میں زیادہ تک ان آنکھوں میں جھانکنے کی تاب نہ لا سکا۔

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاید کچھ کہہ تھا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ میں نے اس کے جسم کی ہوتی چادر کی طرف دیکھا۔ پلو میں چادر کے نیچے حرکت ہوئی پھر اس کا ہاتھ چادر سے باہر نکل آیا۔ اس نے بے طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا۔ میں اس مطلب سمجھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں بڑا درد کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ میرا جسم جھنجھٹا اٹھا۔ یہ کیفیت مزہ ایک لمحے کو رہی تھی۔ اس کے بعد میں نارمل ہو گیا تھا۔ میں ہولے ہولے اس کا ہاتھ سسلا رہا تھا۔ لمبی خوب انکھیاں مگداز تھیلی اور گول گلابی۔ اس کا ہاتھ میں زندگی بھرپور حرارت موجود تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے احمرس ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

وہ میرا ہاتھ چادر کے اندر لے گئی اور جب اس نے میرا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا تو مجھے بے اختیار تھر تھری سی آواز آئی۔ دل ایک بار پھر کپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ میرا وہاں یا خواب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کرشل کا جان مجسمہ تھا۔ وہ زندگی کی حرارت سے بھرپور حسین اور جوان عورت تھی۔ میرا ہاتھ اس کے بدن کا گدا زدن محسوس کر رہا تھا۔

اس نے میری انگلی پیٹ پر اس جگہ رکھ دی جہاں اسکاچ ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ میری انگلی کو اپنے بدن کے گدا زدن پر جوڑ کر آگے پیچھے حرکت دینے لگی۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور ٹیپ کے اوپر انگلی سے اس کو جوڑ کر سسلانے لگا۔ کبھی کبھی نظرس اس کے چہرے کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر بھی اب وہ کرب نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ ہاتھ روک لیا تو ایک عجیب سی آواز مجھ سماعت سے ٹکرائی جیسے شہد کی مکھیاں اپنے جھنڈے میں جھنڈ رہی ہوں اور اس جھنڈا سنسناہٹ میں نہایت مدھم مدھم اور شدت سے مٹی سی سرگوشی سنائی دی۔

”ہاتھ کیوں روک لیا۔ سسلاتے رہو۔ مجھے برا سلا کر رہا ہے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں

بند تھیں اور ہونٹ لے ہوئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ کانوں میں شہد کی طرح رس گھولتی ہوئی وہ مدھم مدھم سرگوشی اسی کی تھی۔

میرا ہاتھ پھر حرکت کرنے لگا۔ میں اسکاچ ٹیپ کے اوپر ہونے انگلی پھیرتا رہا اور پھر اس نے چادر اپنے اوپر سے ہٹا دی۔ پیٹ تک اس کا جسم برہنہ ہو گیا۔ میری نظرس جھک گئی۔

”پہنی اتار دو۔“ شہد کی مکھیوں کی جھنجھٹ میں شہد جیسی مٹی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی ”پہنی اتار دو اور زخم کو سسلاتے ہو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے لب لے ہوئے تھے البتہ آنکھیں مٹی ہوئی تھیں۔ ان خوب صورت آنکھوں میں کرب اور اداسی کے بجائے تشکر کے جذبات تھے۔

میں فورے آگے جھک گیا اور اسکاچ ٹیپ اس طرح ہٹانے لگا جیسے زخم سے پٹی ہٹا رہا ہوں۔ میں بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ ٹیپ ہٹاتا رہا جیسے اندیشہ ہو کہ بے احتیاطی سے زخم نہ چھل جائے۔ پوری طرح ٹیپ ہٹانے کے لیے ایک مرتبہ میں نے اسے اونٹنہا بھی دیا تھا۔

ٹیپ ہٹانے کے بعد میں نے ایک بار مرتبہ پھر غور سے دیکھا۔ اس کے پیٹ پر یا پھیلتی طرف کوئی معمولی سا نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ملکوتی حسن کی مالک اس عورت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کرشل کا وہی مجسمہ تھا جسے میں دو ٹکڑوں میں ریتا پارک سے اٹھا کر لایا تھا اور اسے جوڑنے کے لیے میں نے ٹیپ چپکا دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کے جسم پر چادر ڈال دی۔ سینے پر چادر درست کرتے ہوئے دوسری مرتبہ نظرس اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار پر پڑ گئیں۔ پہلی مرتبہ میں نے وہ ہار اس طرح دیکھا تھا کہ وہ مجسمے کے کرشل ہی کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ وہ الگ سے کوئی چیز نہیں تھی لیکن اب وہ ہار جسم سے الگ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر چادر درست کی تو میری انگلی سے ٹکرا کر وہ ہار اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ وہ ہوتی نہیں تھا۔ چھپے سے پھرتے جو سنہری لڑی میں پروئے ہوئے تھے وہ یقیناً نہایت قیمتی پتھر تھے۔ ان کی رنگت اگرچہ سیاہ تھی لیکن ان میں نیلا بلیک کی بھی جھلک تھی۔ درمیان انگوٹھے کے ناخن کے برابر اسی رنگت کا چپٹا پتھر تھا۔ اس پر شاید کچھ لکھا ہوا تھا لیکن وہ تحریر اس قدر باریک تھی کہ اسے پڑھنے کے لیے مجھ بے حد سے کی ضرورت تھی۔

میں اس کے چہرے کو کتنے لگا۔ گلابی رنگت اب سرخی میں بدل چکی تھی اور آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک عود کر آئی تھی۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور اب میں بھی پلک جھپکے بغیر اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ مقناطیسی کشش تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مقناطیسی لہرس آنکھوں کے راستے میرے پورے جسم میں پھیلتی چلی جا رہی ہوں۔ مجھے اپنا دل خزاں رسیدہ تھے کی طرح کا پتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جسم کا جوڑ جوڑ جیسے ہل کر رہ گیا۔ اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا جو شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ گلتا دماغ کی سیس جیسے الائنسک کے تاریکی طرح کھینچ چلی جا رہی ہوں لیکن میں نے پلکیں نہیں جھپکیں۔ نہ ہی نظرس ہٹائیں۔

اس کی نظرس جیسے میری نظروں میں مگزی ہوئی تھیں۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا اور پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میرے جسم کو زوردار جھٹکا لگا اور پھر میں پر سکون ہوتا چلا گیا۔ دماغ کی نسوں کا تناؤ کم ہو گیا اور اعصاب کی کشیدگی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ تاہم اس دوران

مشہور صنعت ضیاء تسمیہ بلگرامی کی اور مشہور صنعت

ایران افروز و تجارت بینہ 2 دار و کتابت کتب

اسلام کے عام شریعتیں کے لکچر اور پڑاؤات

کتابوں سے زیادہ دلچسپ

کتابوں سے زیادہ افراتفر

تقریباً 150 روپے

اولیے کے اکرام جو متارہ شد و بدایت تھے

ضیاء تسمیہ بلگرامی نے انہیں اپنے قلم مستقل مضمون بنایا ہے۔

دو روپے میں ایک کتاب صرف 325 روپے کا نامی آرڈر سال کریں

23 ستمبر

74200

کراچی

1263

2000

2000

میں میرا جسم پسینے میں تر ہو چکا تھا اور میں اپنے چہرے اور پیشانی پر بھی پسینے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔

”شکر ہے میرے دوست!“ وہی کانوں میں رس گھولتی ہوئی مدھم مدھم سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی، ”تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

تمہاری تلاش میں بھٹکتی رہتی۔“

لباس تھا اور یہ عجیب لباس تھا۔ سینے پر جسم سے چپکا ہوا اور اس سے نیچے بتدریج ڈھیلا ہوتا ہوا ایکسی کی طرح پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس میں باریک باریک بے شمار چٹنٹیں تھیں۔


  
**اردو زبان کی اولین بین الاقوامی ماسٹران**
  

  
**43** حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں

تمام حصے ایک ساتھ منگوانے پر بجائی قیمت - 2300/- روپے

یہ حکایت بزرگوں کی زندگی کے ذائقے پر مبنی اردو کا  
 ایک ادیبانہ گہرائی سے لکھی ہوئی کہانی ہے

کتابیات پبلی کیشنز  
 پوسٹ بکس 23، کراچی 74200  
 فون: 5802552-5895313-5802551  
 فیکس: 5802551  
 63-C فیئر 11/1، کینڈیشن ڈی ایچ ایس، کینڈیشن روڈ  
 (مختصر کالونی میں اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

Copyright © 2000



میا۔

کانی بتاتے ہوئے ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ میاں سے بھاگ جاؤں لیکن پھر میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ میں ایسا بزدل بھی نہیں تھا اور پھر وہ کوئی ایسا چیز تو نہیں تھی جس سے ڈرا جائے وہ مافوق الفطرت ہستی ضرور تھی لیکن اس کا اندازہ دوستانہ تھا۔ میں نے کرشل کے مجسمے کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑوں کو جوڑا تھا اور وہ انسان کا روپ دھار گئی تھی۔ وہ میری شکر گزار تھی کہ میری وجہ سے اسے نئی زندگی ملی تھی۔ مجھے اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں تھا اس لیے مجھے اس سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

میں کمرے میں آکر بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی کی چسکیاں لپیٹے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن وہ اس وقت تک کچھ نہیں بولی جب تک میں نے کپ خالی کر کے میز پر نہیں رکھ دیا۔ اس نے اشارہ کیا تو میں کرسی سے اٹھ کر بلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مجھے اپنے جسم میں برقی لہریں سی کوئی ہولناکی محسوس ہونے لگیں۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نظروں کا تصادم ہوتے ہی میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے اس کے لب خاموش تھے لیکن اس کی گنگناہٹ ہوئی سرگوشی جیسی آواز میری سماعت سے نکلا رہی تھی۔

”میں نیلگری ہوں۔“ وہ خاموش زبان سے کہہ رہی تھی ”میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی گچھاؤں میں رہتی ہوں۔ وہ برف پوش چوٹیاں ہزاروں سال سے میرا رہن میرا ہے۔ میں نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی وہ ہفتی ہوں جسے ہر کوئی حاصل کرنا چاہتا ہے یہ وہ شیش ہزاروں برسوں سے ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈت، جوگی اور یوگی مجھے حاصل کرنے کے لیے زندگی بھر چاہتے ہیں۔ چونکہ ایک ایک پل بڑی کھٹانیاں اور تپتیاں میں گزارتے ہیں مگر مجھے پانے کی حسرت من میں لیے ہی اس سنسار (دنیا) سے سدھار (رخصت) جاتے ہیں۔ وہ ادھارا ستہ بھی نہیں ملے کر پاتے۔ کوئی جل کر مجسم ہو جاتا ہے، کوئی پانی میں ڈوب کر مر جاتا ہے اور کوئی خوف سے مر جاتا ہے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ میں ہلکے جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کی متناظری لہریں برقی رو کی طرح میرے وجود میں پھیل رہی تھیں۔ میرا رواں رواں اس کی خاموش آواز سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ان کی نیٹوں میں کھوٹ تھی۔ وہ مجھے حاصل کر کے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہزاروں برسوں میں کوئی بھی نیلگری یا جوگی ایسا نہیں تھا جو کسی نیک مقصد کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہو۔ سب کی نیٹوں میں فتور تھا۔ ہر کوئی حکمرانی کے خواب دیکھتا رہا لیکن ان کے سینے بھی بچپانہ ہو گئے اور وہ خود بھی نشٹ (باتہ) ہو گئے۔“

”تم پہلے غصے ہو جاؤ اپنے لیے نہیں دوسروں کے فحشی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ تم نے اب تک جو کچھ مجھے دوسروں کے لیے کیا۔ تم نے تپتیاں کی تو دوسروں کے کھٹانیاں برداشت کیں تو دوسروں کے لیے اور جب تم مجھے حاصل کرنے کے لیے رشی کیش میں جا پ شروا اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے۔ تم ایک دوا (دوا) شیطان کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس کا چھکارا ہوئے میاں تک آگئے تم نے اپنا جان بھی جاری رکھا۔“ میں پہلی مرتبہ اپنے ایک چاہنے والے کو دیکھنے لے نیلگری کی برف پوش چوٹیوں سے نیچے اتری ہوں۔ ہمیں تلاش کر رہی تھی کہ ایک بیری (دھن) نے مجھے جا کر لیا۔ میں اس سے چھپنے کے لیے کرشل کے مجسمے میں گئی لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے عکڑے کر کے جانا چاہتا تھا لیکن پارک میں ہمیں دیکھ کر وہ بھاگ گیا۔ اپنی سچائی کی بدولت بہت کم وقت میں ریاضت کے جسم پر پہنچ چکے ہوں وہ اس سے ابھی بہت دور ہے۔ ہو سکتا ہے اسے نہ دیکھا ہو لیکن ہمیں دیکھ کر اس پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ بھاگ نکلا۔

”یہ تمہارے اندر کی گنگ تھی کہ تم مجھے اٹھا کر لے آئے اور یہ تمہارے من کی سچائی تھی کہ تم نے یہ شر (جسم) کے دونوں حصوں کو ملا کر ان پر پٹی لپیٹ دیا۔ میں اس بیری کی دشمنی سے بچ گئی۔“

”وہ بیری کون ہے؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”تم اسے جان لو گے۔“ نیلگری نے جواب دیا۔ ”تمہارے قریب ہے۔ تمہارے آس پاس ہے۔ اس کے میں کھوٹ ہے۔ وہ مجھے حاصل کرنے کے لیے نہیں تھپانے کی کوشش کرے گا۔“

”وہ کون ہے؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”تم بہت جلد جان لو گے۔“ وہ بولی ”میں ابھی تپتیاں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ تمہارا جا پ ابھی پورا نہیں ہوا۔ تم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے ہو۔ میں تو یہ دیکھنے کے

ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے اتری تھی کہ وہ کون ہے جو مجھے حج دل سے نکال رہا ہے لیکن وہ بیری۔ اس نے مجھے بڑا کٹ (تکلیف) دیا ہے۔ تم اسے تباہ نہیں کر سکتے تو وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ اس کے پاس بہت سی قوتیں ہیں۔ وہ مجھے حاصل کر کے مسان کھٹکی والا بننا چاہتا ہے۔ وہ میرے لیے جا پ کر رہا ہے۔ ابھی تم سے بہت دور ہے۔ اگر اس کا جا پ تم سے پہلے پورا ہو گیا تو وہ مجھ پر قبضہ کر لے گا اور۔“

”اور کیا۔؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”اور اس سے آگے مت پوچھو۔“ وہ بولی ”اس اور سے آگے جانی ہے۔ بربادی ہے۔“

”کیا میں اسے روک سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ تم اسے روک لو گے۔ تمہارے پاس اور بھی قوتیں ہیں۔ تم ان قوتوں سے کام لو گے تو اسے روک لو گے اور اگر تم نے غفلت کی تو وہ تمہیں روک دے گا۔ تمہارے بیچوں میں نیلگری ڈال دے گا۔“

نیلگری بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ اس کی باتیں بھی اس کی طرح پراسرار تھیں۔ اس کی نظریں میرے چہرے سے ہٹ گئیں۔ میں نے بھی گردن کھٹا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ دن کا بہت ہلکا سا اجالا پھیل رہا تھا۔

نیلگری نے دوبارہ میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اس نے میرا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور مجھے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنے لگی۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ سنسناہٹ پورے بدن میں پھیلی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ ان دیکھی لہروں کی صورت میں آنکھوں کے راستے میرے اندر ساری ہو۔ میں اپنے آپ میں عجیب سی لہلہ محسوس کرنے لگا۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی۔ اس کے احسرس ہونٹ میری پیشانی کو چھونے لگے۔ مجھے لگا جیسے میری پیشانی پر دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔ میرے دماغ پر دھند سی چھانے لگی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

اور جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پر بڑا ہوا تھا۔ میرا جسم بستر پر بڑا ہوا تھا۔ میں بڑا ہوا تھا۔ وہاں نہ نیلگری تھی اور نہ ہی کرشل کا وہ خوب صورت مجسمہ۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ لیکن کرشل کا وہ ٹوٹا ہوا مجسمہ تو میں پارک

سے اٹھا کر لایا تھا۔ وہ تو خواب نہیں تھا پھر وہ مجسمہ کہاں گیا؟ میں بستر سے اٹھ رہا تھا کہ میرا ہاتھ نیکے کے قریب کسی چیز سے ٹکرایا اور جب میں نے گردن کھٹا کر دیکھا تو میرے دماغ میں زوردار دھماکا ہوا اور شدید سردی کی ایک لہر میری ریزہ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ سنسناہٹ پورے بدن میں پھیلی چلی گئی۔ میں محسوس نظروں سے نیکے کے قریب پڑی ہوئی اس چیز کو دیکھ رہا تھا۔

وہ سیاہ چپے پتھروں کا ہار تھا جو نیلگری کی خوب صورت گردن کی زینت بنا ہوا تھا!

**خدا لیاں خن**

مضبوط جلد

خدیجہ صوفی

سورجی

میر (ع) غالب (ع) مبین (ع) اور (ع) دان (ع)

\* ان چار ”خدا لیاں خن“ کی زندگی سے وابستہ چوڑا لپے والے راز!

قیمت 200 روپے \* ڈاک خرچ 25 روپے

\* طلبہ اور شائقین ادب کے لئے بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب

\* 72000



مجھے اپنا دل ایک بار پھر کپٹنیوں میں دھونکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ خون کی گردش تیز ہو گئی اور پورے جسم پر چوڑیاں سی بیٹھنے لگیں۔ میں متوحش نظروں سے اس مالا کو دیکھ رہا تھا جو میرے چہرے کے سامنے میرے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں لٹکی ہوئی تھی۔

یہ وہ مالا تھا۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہی مالا میں نے نیگلری کی خوب صورت گردن میں دیکھی تھی۔ نیگلری۔ کرشل کا ٹوٹا ہوا مجسمہ جو میں ایک پارک سے اٹھا کر لایا تھا اور وہ مجسمہ ایک حسین انسانی پیکر میں داخل کیا تھا اور یہ مالا اس کی گردن میں تھی۔

نیگلری حسین تھی۔ بہت حسین۔ اس نے اپنے بارے میں ایک عجیب اکتشاف کیا تھا۔ وہ ہالہ کی برف پوش چوٹیوں کی باسی ایک بہت مسلمان تھی جسے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں سال سے جنت کی یوگی اور بہت سے لوگ جاپ اور تپا کر رہے تھے لیکن کوئی آج تک ادھارا ستہ بھی طے نہیں کر پایا تھا۔

رشی کش میں بدھ یوگی گوتم بھوش نے اگنی ناگ پر قابو پانے کے لیے مجھے ایک یوگ بتایا تھا اور میں نے تپا شروع کر دی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ کسی شکتی پر قابو پانے کے لیے جنت اور یوگی جاپ کے دوران کیا منتر پڑھتے ہیں۔ مجھے بھی گوتم بھوش نے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن پہلے روز جب میں یوگ کا آسن اختیار کر کے بیٹھا تھا تو میرے دل سے بے اختیار اللہ کا نام نکلا تھا اور پھر میں جب بھی جاپ پر بیٹھا دل ہی دل میں اللہ کا ورد کرتا رہتا۔ اس کے سوا کوئی اور منتر بھی میرے دل میں یا میری زبان پر نہیں آیا تھا۔

میرے جاپ میں بھی کبھی باقاعدگی نہیں رہی تھی لیکن شاید یہ اللہ کا پاک نام تھا جو مجھے منزل کے قریب لانا چلا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں اپنے اندر کچھ بھی ہوئی اگنی ناگ کی شکتی پر قابو پانا چاہتا تھا لیکن میرے دل میں کوئی ہوس نہیں تھی۔ نہ تو مجھے زن کی ہوس تھی نہ ذر کی۔ میں کسی حسین عورت کے حصول کے لیے یہ منتر نہیں کر رہا تھا نہ ہی میں دنیا پر حکومت کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں تو برائیوں کے خلاف ایک جنگ لڑ رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ میں اس دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کروں لیکن میں اکیلا تھا اور دنیا برائیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان خود رو کانٹے دار جمالیوں کی طرح جو قدم قدم پر پیروں سے لپٹ کر راستہ روک رہی تھیں لیکن مقام شکر تھا کہ اس غار زار میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو میرا سارا بننے رہے اور میں آگے

بڑھ رہا تھا۔

میں نے جب وہ یوگ شروع کیا تھا تو میرے دل میں ایسی کوئی نیت نہیں تھی کہ میں یہ مسلمان شکتی حاصل کر کے دنیا کو اپنے قدموں پر جھٹکے پر مجبور کروں گا۔ میری ریاضت اور جاپ میں جس طرح عدم توجہی اور طویل وقفے آرہے تھے اس حساب سے تو مجھے اسی جگہ پر ہونا چاہیے تھا جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بابرکت نام تھا جو مجھے اس راستے میں آگے لیتا چلا گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگنی ناگ بہت مسلمان تھی اور میں نے اب تک لوگوں سے جو کچھ بھی سنا تھا اس کے مطابق باقی تمام شکتیاں اس کے سامنے کچھ تھیں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ میں نے بھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ میں تو اپنے ہی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ میں تو شوبھا کو چھڑانے کے لیے دلش کہ جیسے بد معاش کا چچا کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا اور ہمارے حالات کچھ اس قدر پیچیدہ ہو گئے تھے کہ مجھے کسی اور طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ بے چاری میٹھنا میری وجہ سے ماری گئی۔ میں خود شدید زخمی ہوا اور بلا موت کے منہ سے لوٹ کر آئی۔

حالات کی گھیرتا سے مجھے ذرا ساموئق ملا تھا اور میں نے اپنی یوگ کی ریاضت دوبارہ شروع کر دی تھی۔ اسی دوران میں جزل کھوراک کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ سام سنگ کو انسپکٹر بریڈر نے اپنی تحویل میں لے کر اس طرح غائب کر دیا تھا کہ جیسے اس دنیا میں اس کا نام و نشان ہی نہ رہا ہو۔

گزشتہ رات مجھے سو مانے فون کر کے بلایا تھا کہ اس نے دلش کھ کے ایک آدمی کو پکڑا ہے۔ دلش کھ کے اس آدمی سے کچھ کام کی باتیں معلوم ہو گئی تھیں اور وہاں سے واپس آتے ہوئے مجھے پارک میں کرشل کا ٹوٹا ہوا مجسمہ ملا تھا جسے میں اٹھا کر گھر لے آیا تھا اور وہ مجسمہ ایک زندہ عورت کا روپ دھار گیا تھا۔ اس نے اپنا نام نیگلری بتایا تھا اور اس نے جو اکتشافات کیے تھے وہ سنسنی خیز تھے۔ نیگلری ہی وہ پراسرار شکتی تھی جس کے حصول کے لیے لوگ ہزاروں سال سے جاپ کر رہے تھے۔ تپا کر رہے تھے اور کھٹنیاں جھیل رہے تھے لیکن کوئی ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن گزشتہ رات وہی مسلمان شکتی ایک حسین ترین عورت نیگلری کے روپ میں میرے گھر میں موجود تھی۔

شاید یہ ایک ایسا حسین سپنا تھا جو ہر شخص دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے بھی رات کو شاید کوئی خواب دیکھا تھا۔ کرشل کا بے جان مجسمہ انسانی روپ کیسے دھار سکتا ہے لیکن حقیقت کا بھٹانا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ نیگلری واقعی انسانی روپ میں یہاں موجود تھی۔ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مالا محسوس ثبوت فراہم کر رہی تھی کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔

وہ مالا میرے ہاتھ میں تھی اور میں متوحش نظروں سے ان چپے پتھروں کو دیکھ رہا تھا جن کی رکت اگرچہ سیاہ تھی لیکن ان میں بنیاد کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ کوئی بھی پتھر ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن سے بڑا نہیں تھا اور ہر پتھر کی موٹائی دو ملی میٹر سے زیادہ نہیں تھی تاہم درمیان کا پتھر ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کے برابر تھا۔ یعنی دوسرے پتھروں سے قدرے بڑا۔ ان سب پتھروں کو بڑی مہارت سے ایک مخصوص انداز میں تراشا گیا تھا اور اس سے بھی زیادہ مہارت کی بات یہ تھی کہ ان تمام پتھروں میں چوڑائی کے رخ پر باریک سوراخ کیے گئے تھے جن میں نہایت باریک سنہری تار داخل کر کے انہیں پرویا گیا تھا۔ ان پتھروں کی تعداد اکیس تھی۔ دس ایک طرف، دس دوسری طرف اور درمیان میں وہ بڑا پتھر تھا جس پر انہی زبان کی کوئی تحریر کندہ تھی۔ وہ تحریر اس قدر باریک تھی کہ محض عدسے کے بغیر اسے نمایاں کرنا ممکن نہیں تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ وہ مسلمان شکتی ایک حسین عورت کے روپ میں رات بھر میرے پاس رہی تھی۔ جسے حاصل کرنے کے لیے دنیا والوں نے سکھ چین جج رکھا تھا۔ مجھے وہ محلات یاد آ گئے جب اس نے مجھے اپنے اوپر جھکا کر اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے تھے۔ میں ایک... جھجھکی لے کر رہ گیا۔ مجھے پیشانی کا وہ حصہ اب بھی اگا رہے کی طرح دکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور پھر میرا ہاتھ بے اختیار پیشانی پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں شکتی ہوئی ہنسی کی آواز گھونکی جیسے جلتنگ بج اٹھے ہوں۔

میں اچھل پڑا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر کرے میں دیکھنے لگا۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ شکتی ہوئی ہنسی کی وہ مدھری آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور پھر وہ آواز بتدریج تحلیل ہوتی چلی گئی۔

وہ کہاں غائب ہو گئی؟

میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا۔ کیا وہ واقعی انسان کے اندر کی وہ مسلمان شکتی اگنی ناگ تھی۔ جو نیگلری کے روپ میں مجھے دیکھنے کے لیے میرے پاس آئی تھی؟ کیا کل رات پارک میں اس ٹوٹے ہوئے کرشل کے مجسمے کا میرے سامنے آ جانا محض اتفاق تھا؟ کیا یہ سب کچھ حقیقت تھی اور وہ واقعی نیگلری تھی یا میں کسی پراسرار طاقت کی چکر میں پھنس رہا تھا۔

وہ جلتنگ جیسی قہقہے کی مدھری آواز ایک بار پھر کمرے کی فضا میں بکھر گئی۔ میں نے ایک بار پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ آواز اس مرتبہ بھی چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور پھر پہلے کی طرح فضا میں تحلیل ہو گئی۔

اس مرتبہ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر تیز دھوپ تھی جس سے ایک لمبے کو میری آنکھیں چکا چوندی ہو گئیں۔ میں نے پردہ برابر کھینچا اور کمرے کی دیوار پر لگی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب آخری مرتبہ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تھا تو اس وقت دن کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تھی اور نیگلری نے مجھے اپنے اوپر جھکا کر میری پیشانی پر ہونٹ ثبت کیے تھے تو میرے دماغ پر دھند سی چھانے لگی تھی اور میری آنکھیں بند ہوئی چلی گئی تھیں۔ میں شاید مگرمی نیند سو گیا تھا اور اب آٹھ بج چکی تھی تو گیارہ بج رہے تھے۔

میں نیگلری کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لاؤنج میں فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں خواب سے بیدار ہوا ہوں۔

وہ مالا اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اسے نیکی کی طرف اچھاننا ہی چاہتا تھا کہ شد کی عیوں کی جھنجھٹاہٹ میں ایک سرگوشی میری سماعت سے نکل آئی۔

”اس مالا کی حفاظت کرنا۔“

میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے ایک بار پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا البتہ بہت بھیننی خوشبو میرے نشتوں سے نکلا رہی تھی۔ عجیب سی مسکون خوشبو تھی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ خوشبو شروع ہی سے کمرے کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

لاؤنج میں فون کی کھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ مالا میرے ہاتھ میں

تھی۔ میں ٹیلی فون کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور ریسور  
اٹھایا۔

”ہمت سنگھ۔ سو رہے تھے کیا؟“ ہیلو کے جواب میں بلا  
کی آواز سنائی دی۔

”اے۔ ہاں۔ میں سو رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ میری  
آواز میں ہلکی سی بھلاہٹ تھی۔

”کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ بلا نے  
کہا۔

”ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آتا ہوں آدھے گھنٹے  
میں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے کچھ شبہ ہے ہمت سنگھ۔“ بلا کی آواز سنائی دی  
”تمہاری آواز کچھ عجیب سی لگ رہی ہے۔ رات کو تم نے

فون کیا تھا تو اس وقت بھی تمہاری بات سن کر مجھے شبہ ہوا تھا  
کہ کہیں تم نے دارو تو نہیں لیا اور۔“

”تم جانتی ہو مجھے شراب اور کسی بھی قسم کے نشے سے  
شدید نفرت ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اچھی طرح جانتی ہوں۔“ بلا نے جواب دیا ”لیکن  
رات کو جب تم نے فون پر یہ کہہ کر بڑی دھواں دھار بارش

ہو رہی ہے اور تمہاری گاڑی کے دو ٹائر بھی فلیٹ ہو گئے ہیں تو  
مجھے تم پر شبہ ہوا تھا کہ شاید تم نے ترکم میں آکر دارو پی لیا  
ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔“ میں نے کہا۔  
”گاڑی کے ٹائر فلیٹ ہونے والی بات تو سمجھ میں آتی

ہے لیکن بارش اور وہ بھی دھواں دھار بارش۔ مجھے بڑی  
حیرت ہوئی تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور تم

بارش کی بات کر رہے تھے۔“  
”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا بلا۔“ میں نے کہا

”گزشتہ رات بارش اتنی زور دار تھی کہ میں باہر نہیں نکل  
سکا اور اسی لیے میں نے تمہیں فون کروا تھا تاکہ تم پریشان نہ

ہو۔“  
”اور اس کے بعد تم نے اپنا فون ایجنج رکھا۔“ بلا

نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں بار بار فون کرتی رہی لیکن ہر  
مرتبہ تمہارا فون اینج ملا۔ میں نے چھ بجے بھی فون کیا تھا۔

اس وقت بھی۔“  
”ایک منٹ بلا!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”فون

بند مت کرنا۔ میں تھوڑی دیر بعد تم سے بات کرنا ہوں۔“  
میں نے فون کا ریسور میز پر رکھ دیا اور باہر والے

دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں پہنچا تو

میرا دماغ بھٹک سے اڑ گیا۔ باہر تیز دھوپ چمک رہی تھی۔  
آسمان پر کہیں بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دے

رہا تھا۔  
میں نے کار کی طرف دیکھا تو سسٹنی کی ایک لمبیری

ریڑھ کی بڑی میں سرایت کر گئی۔ اگلے دو نوں ٹائر سافٹ نظر  
آ رہے تھے۔ کوئی بھی ٹائر فلیٹ نہیں تھا۔ دونوں میں پوری

ہوا بھری ہوئی نظر آ رہی تھی اور کہیں بارش کے نشان بھی نظر  
نہیں آ رہے تھے۔ رات کو جس طرح دھواں دھار بارش

ہوئی تھی اس کے پیش نظر تو ان گن میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہوا  
چاہیے تھا لیکن زمین خشک تھی۔

میرا دماغ بری طرح پکڑا رہا تھا۔ میں نے اندر آکر فون  
کا ریسور اٹھایا۔

”ہیلو بلا۔“ میں آدھے گھنٹے میں آ رہا ہوں۔“  
میں نے ریسور رکھ دیا۔ وہ بار بار بھی میرے ہاتھ میں

تھا۔ کمرے میں آکر میں نے ایک بار پھر اس مالا کو ڈرنک  
ٹیبیل پر رکھنا چاہا لیکن اس پر اسرار سرگوشی کا خیال آیا۔ میں

نے وہ بار گئے میں ڈال لیا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔  
میرا دماغ سگ رہا تھا۔ پورے بدن میں بھی جیسے آگ

لگی ہوئی تھی۔ میں کپڑے اتار کر ٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔  
فصنڈے پانی کی دھار میرے سر پر زری تھی۔ میرے دماغ کی

پیش بند رج کم ہوئی گئی تھی۔  
اس دوران میں رات کے واقعات کے بارے میں

سوچتا رہا۔ میں نے یہاں سے جانا چاہا تھا تو میرے پیر من من  
کے بھاری ہو گئے تھے۔ ایک قدم اٹھانا دو بھر ہو گیا تھا پھر کار

کے اگلے دو نوں ٹائر فلیٹ ملے تھے اور پھر دھواں دھار بارش  
شروع ہو گئی تھی اور میں نے بلا کو فون کروا تھا کہ رات کو

نہیں آسکوں گا۔  
میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے

تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ نیلگری نے کہا تھا کہ اس نے مجھے یہاں  
روکا تھا۔ اگر میں چلا جاتا تو وہ رات بھر تکلیف میں رہتی اور

فنا ہو جاتی۔ نیلگری سختی سختی تھی۔ مہمان سختی۔ اس نے یہاں  
سے میرے جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے اور مجھے

رات کو یہاں رکنا پڑا تھا لیکن۔ میں نے ٹیلی فون تو ایجنج  
نہیں رکھا تھا اور میرا کہنے کے مطابق وہ رات بھر فون

کرتی رہی تھی اور مجھے چھ بجے بھی فون کیا تھا تو لائن ایجنج  
ملی تھی۔ لیکن اب لائن ٹل گئی تھی۔

تو کیا اس میں بھی نیلگری کی سختی کام کر رہی تھی۔  
جب تک یہاں رہی بلا کہ یہاں کا فون ایجنج ملا رہا اور

نیلگری چلی گئی تو شاید پہلی ہی کوشش میں بلا کو لائن مل گئی  
تھی۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا میرا ذہن الجھتا گیا۔ ہاتھ روم  
سے نکل کر میں نے دوسرے کپڑے پہنے اور باہر گیا۔ اس

کے چند منٹ بعد میں اس کار میں ڈاک نیلگری کی طرف جا رہا تھا  
جس کے دو ٹائر رات کو فلیٹ نظر آئے تھے۔ مکان کو آگ لگا کر

میں نے چابی برآمدے میں اسی جگہ رکھ دی تھی۔ آج ویک  
اینڈ شروع ہو رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ ملا متی بھی آج یہاں

ظہور آئے گی۔  
مجھے بلا کے پاس پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں

لگے۔ میں جیسے ہی کار سے اترا وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے  
میرے سر پر سیگ نکل آئے ہوں یا اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ

ہو رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا اور اپنا چہرہ میرے  
چہرے کی طرف لانے لگی۔ میں گڑبڑا سکتا۔

”کیا کر رہی ہو۔ کاٹھا سامنے کھڑا ہے۔“ میں نے پیچھے  
ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا اسے آج پھر

پرانہ دہر رہا ہے۔  
”ایک منٹ رک جاؤ۔“ اس کے لیے میں درشتی

تھی۔ اس نے قدرے آگے جھک کر میرا منہ سونگھا اور پھر  
مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی ”ٹھیک ہے۔ میں سمجھی تھی کہ تم

نے پتا شروع کر دی ہے۔“  
”اوہ!“ میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا ”اندر چلو۔

میں نے ابھی ناشتا نہیں کیا۔ میں سمجھ گیا تم کیا جانا چاہتی ہو  
لیکن معدہ خالی ہو تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔ پہلے ناشتا پھر کوئی

اور بات۔“  
کاٹھالان میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ بلا نے آواز

دے کر اسے ناشتا تیار کرنے کو کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر  
آئی۔ وہ لاؤنج میں ہی بیٹھنا چاہتی تھی لیکن میں اسے بند روم

میں لے آیا اور اسے بیڈ پر ڈھیل کر خود کرسی پر بیٹھ گیا۔  
”رات کو بارش کہاں ہوئی تھی۔“ اس نے مسکراتے

ہوئے میری طرف دیکھا۔  
”چند منٹ انتظار کرلو۔ سب بتا دوں گا کہ بارش کہاں

اور کیسے ہوئی تھی۔“ میں نے جواب دیا ”کل رات سے اب  
تک اسٹینڈر ٹیکمیا برینڈر اسے تو کوئی رابطہ نہیں ہوا؟“

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اسٹینڈر اعظم کا فون آیا تھا۔“ بلا  
نے جواب دیا ”اس کا فون آنے کے بعد ہی تو میں نے تمہیں

فون کیا تھا۔ کوئی خاص بات؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری  
طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں۔ بہت ہی خاص بات ہے۔“ میں نے جواب دیا  
”کل رات سو مانے دیش مکھ کے ایک آدمی کو پکڑا تھا جس

نے ایک بہت ہی خوفناک منصوبے کا انکشاف کیا ہے۔ اگر  
ان کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو بڑی گڑبڑ ہوگی۔ یہاں خون

ریڑھ بنگا سے شروع ہو جائیں گے بے گناہ لوگ مارے جائیں  
گے اور اس گڑبڑ کا فائدہ ناگ پال اور جنرل کھوراث کے

آدمی اٹھائیں گے۔“  
ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ کاٹھا ٹرے اٹھائے

کمرے میں داخل ہوا۔ بلا نے سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا اخبار  
اٹھا کر بیڈ پر بچھا دیا۔ کاٹھا نے ٹرے اس پر رکھ دی اور باہر

چلا گیا۔ ٹرے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بلا نے بھی ابھی تک  
ناشنا نہیں کیا تھا۔

ناشتے کے دوران گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ میں  
اسے بتا رہا تھا کہ ہندوستان کی لوک سبھا کا ایک ممبر بہاری

لال چند روز بعد یہاں آنے والا ہے اور یہاں اسے قتل  
کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ کھنڈو اور دیل میں پہلے ہی ٹلسل

چل رہی تھی۔ کھنڈو میں ایک ہندوستانی سیاست داں کے  
قتل کے بعد جو صورت حال سامنے آئے گی وہ خاصی تشویش

ناک ہوگی اور اس کے بعد ان کے منصوبے کا اگلا مرحلہ زیادہ  
خطرناک ثابت ہوگا۔

”یہ سارا منصوبہ جنرل کھوراث کا ہے۔“ میں کہہ رہا تھا  
”اس نے یہاں اپنے قدم بھانے کے لیے منصوبے پر عمل

شروع کر دیا ہے۔ ناگ پال اور دیش مکھ جیسے بے ضمیر اس  
کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ ہر ملک میں ایسے لوگ موجود

ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک کی سلامتی کو داؤ پر  
لگا دیتے ہیں۔ اسٹینڈر خان اور برینڈر کو اس منصوبے سے

آگاہ کرنا بہت ضروری ہے تاکہ پیش بندی کر کے صورت حال  
کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔“

”اور وہ بارش والی بات؟“ بلا ایک بار پھر مسکراتی  
ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے شاید اب بھی

شبہ تھا کہ رات کو میں نے شراب پی رکھی تھی۔  
”شاید تم میری بات کا یقین نہ کرو لیکن اب میں تمہیں

جو کچھ بھی بتانا چاہ رہا ہوں اس میں ذرا بھی غلط بیانی نہیں  
ہوگی۔ ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے اور گزشتہ رات مجھ پر جو

کچھ جتی ہے وہ محض حقیقت ہے۔ بالکل اسی طرح جس  
طرح تم اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہو۔“ میں نے کہا۔

”تم جس پیداکرنے کی کوشش کر رہے ہو یا۔“ وہ  
میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی ”تم جانتے ہو میں

نے کبھی تمہاری کسی بات پر شبہ نہیں کیا۔ بہر حال، اب شروع ہو جاؤ۔ میں سننے کو بے چین ہو رہی ہوں۔“

میں چند لمحوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے روتا پارک میں ملنے والے کرشل کے نوٹے ہوئے جیسے کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جیسے جیسے بات کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سسٹنی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آ رہا ہو لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔

”تمہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا لیکن یہ دیکھو۔“ میں نے قیص کے ٹکڑے کھول کر اسے اپنے گلے میں بڑا ہوا ہار دکھایا۔ ”یہ۔۔۔ یہ ہار نیلگہری کے گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔ صبح جب وہ غائب ہوئی تو یہ ہار بستر پر آ رہا تھا۔“

”اوہ!“ اس کے منہ سے بے اختیار لگتا ”کیا میں یہ مالا دیکھ سکتی ہوں۔“

میں نے وہ ہار گلے سے اتار لیا۔ یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہوں کہ جب سے یہ ہار میں نے گلے میں ڈالا تھا مجھے اس کے لمس سے ایک عجیب سی حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت میں نے ہار اتار کر ہلا کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو انگاروں کی طرح چپ رہا ہے تم نے گلے میں کیسے پہنا ہوا تھا۔“ وہ ہاتھ کو آہستہ آہستہ جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔

”شاید تمہارے من میں کوئی کھوٹ آگئی تھی۔“ میں نے مالا اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور پتا نہیں یہ مالا کہاں سے اٹھا لائے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار تمہاری باتوں پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ گزشتہ رات تم کسی آوارہ لڑکی کو وہاں لے گئے تھے اور اس کے ساتھ خوب وارد بھی ہوا تھا۔ سوری ہمت سگھ۔“ وہ نزامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی ”مجھے تمہارے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔“

”لو۔ اب اس ہار کو دیکھو۔“ میں نے کہا ”اب تمہارا من صاف ہو گیا ہے۔ اب یہ تمہیں انگارے کی طرح چپا ہوا نہیں لگے گا۔“

بلا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے مالا

اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس مرتبہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ مالا کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھنے لگی پھر اسے میری طرف بڑھا دیا۔

”ستہ پن لو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”یہ ایک مردانہ شہتی کی طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔ بلکہ تمہاری سچائی کا انعام ہے۔ مجھے یقین ہے یہ مالا آگے چل کر تمہارے بہت کام آئے گی۔“

ہم دیر تک نیلگہری کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں تقریباً رات بھر جاگا تھا۔ صبح آکر چند گھنٹے سو گیا تھا لیکن میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

میں بستر لیٹا تو مالا اٹھ کر باہر چلی گئی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور پھر کچھ دیر بعد میں نیند کی آغوش میں چل گیا۔

میں شام پانچ بجے بیدار ہوا تھا۔ کچھ دیر تک پلنگ پر رہا اینٹھتا رہا پھر اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے ساری کسل مندی دور ہو گئی۔

میں تیار ہو کر کمرے سے نکل رہا تھا کہ بلا سے کرا گیا۔ وہ کمرے میں آ رہی تھی۔

”اوہ۔“ وہ گڑبڑ سی گئی ”میں تمہیں جگانے کے لیے آ رہی تھی۔ آؤ۔ لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کاشا چائے بنا رہا ہے۔“

”انسپکٹر اعظم کیا بریڈر کا فون تو نہیں آیا تھا؟“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”دوپہر تین بجے کے قریب بریڈر کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تم سو رہے ہو۔ اس نے جگانے کو مٹا کر دیا۔“ بلا نے بتایا۔

”مجھے جگا دیتیں۔“ میں نے کہا ”تم جانتی ہو میں اس سے ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔“

”اس نے کہا تھا کہ وہ پانچ بجے کے لگ بھگ دوبارہ فون کرے گا۔ اسی لیے تو میں تمہیں جگانے کے لیے آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے توڑی دیر میں اس کا فون آجائے۔“ بلا نے جواب دیا۔

ہم لان میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ گیٹ کے سامنے نیپ آکر کی اور پھر ایک منٹ بعد بریڈر اور انسپکٹر اعظم غائب سامنے موجود تھے۔ وہ ہمارے پاس لان ہی میں بیٹھ گئے اور اس کے دس پندرہ منٹ بعد کاشا ہم سب کے لیے چائے لے آیا۔

چائے کے دوران ہی میں نے انہیں دیش کھ اور ناگ پال کے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

”ہمیں بھی اپنے تجویزوں سے کچھ ایسی اطلاع ملی ہے۔“ انسپکٹر اعظم نے میری بات سننے کے بعد کہا ”لیکن ہماری لال کا نام سامنے نہیں آیا۔“ انہم اطلاع یہ ہے کہ چند روز کے اندر اندر ہندوستان کے ایک اہم لیو کو ٹھنڈو میں قتل کر دیا جائے گا۔ نئے بنیاد بنا کر ہنگامے شروع کر دیے جائیں گے۔

بہر حال انہم معلوم ہو جانے سے ہمیں گائیڈ لائن مل چکی ہے۔ ہم آج ہی معلوم کر لیں گے کہ ہماری لال یہاں کب آ رہا ہے۔“

”اور وہ جیسے ہی رپورٹ پر جہاز سے اترے گا ہم اس کی عمرانی شروع کر دیں گے۔“ بات بریڈر نے کہی تھی۔

”اور دیش کھ کے بارے میں کوئی رپورٹ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔“ بریڈر نے جواب دیا ”دو کی موت کے بعد وہ ناگ پال کے پاس چلا گیا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں اپنی وزارت داخلہ کو رپورٹ بھیج دی ہے اور اگلے امید ہے کہ یہ رپورٹ کل صبح تک وزارت خارجہ کے دفتر میں پہنچ جائے گی اور وزارت خارجہ بھارتی سفر کو اپنے دفتر میں طلب کر کے اسے دیش کھ کی ٹاپنڈیہ سرگرمیوں سے آگاہ کر دے گی۔“

”ڈی آئی اے۔“ میں نے کہا ”لیکن میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔“

”لیکن ہماری حکومت کی طرف سے احتجاج تو ریکارڈ ہو جائے گا۔“ بریڈر نے کہا۔

”ہاں۔ یہ بات تو درست ہے۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ چائے کے دوران اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے انہیں روتا پارک سے ملنے والے کرشل کے جیسے اور نیلگہری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انہیں ایسی کوئی بات بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ اس کے چند منٹ بعد ہم بھی شوبھا سے ملنے کے لیے اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسپتال میں مریضوں سے ملنے کے لیے وقت مقرر تھا لیکن ہمارے لیے کوئی باندی نہیں تھی۔ شوبھا پرائیویٹ دوم میں تھی اور اس کی حفاظت کے لیے بھی دو پولیس والے ہر وقت کمرے کے سامنے موجود رہتے تھے۔

ہمارے بارے میں انہیں ہدایت تھی کہ ہم جب چاہیں شوبھا کے پاس جاسکتے ہیں۔

شوبھا کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور وہ بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہو رہی تھی۔ انسپکٹر بریڈر نے اسے تعلقات سے کام لیتے ہوئے نرس مایامتی کی ڈیوٹی بھی اسی کے کمرے میں لگوا دی تھی۔ مایامتی کی ڈیوٹی اگرچہ شام چھ بجے ختم ہو جاتی تھی لیکن وہ رات دس گیارہ بجے تک شوبھا کے پاس رہتی تھی۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو مایامتی بھی دوسری نرس کے ساتھ کمرے میں موجود تھی۔ وہ اپنی یونیفارم اتار کر گھر کے کپڑے پہن چکی تھی اور اس نے منہ ہاتھ دھو کر چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے تک شوبھا کے پاس بیٹھے رہے اور جب وہاں سے رخصت ہوئے تو مایامتی بھی ہماری ساتھ تھی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ دربار مارگ کے علاقے میں رتا ہوٹل میں کھانا کھا کر مایامتی کو اس کے فلیٹ پر ڈراپ کرتے ہوئے اپنے ڈاک بنگلے کی طرف نکل جائیں گے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے تقریباً پون گھنٹے میں رتا ہوٹل پہنچ سکے تھے۔ عام حالات میں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں طے ہو سکتا تھا لیکن اس وقت شہر کی تمام سڑکوں پر ٹریفک کی بھرا رہی تھی۔ جگہ جگہ ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات تو چند منٹ کا فاصلہ ٹریفک جام کی وجہ سے گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔

رتا ہوٹل کے ریسٹورانٹ میں بھی اس وقت رونق شباب پر تھی۔ کوئی میز خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم ہال کے دروازے کے قریب کھڑے تجسس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ مایامتی اور بلا کو اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے ایک طرف لپکی۔

ایک میز خالی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور گاہک وہاں تک پہنچ سکے ہم اس میز پر قابض ہو گئے۔ اس طرف سرور کرنے والی ویٹریس بھی ہماری اس پھرتی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

ہم نے ویٹریس کو اپنی اپنی پسند کے کھانے نوٹ کر دے دیے اور میں تجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہماری میز پر کھانا سرو ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

کھانے کے دوران ایک موقع پر بلا کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ وہ متوجش نظروں سے میری پشت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں اس کی کیفیت دیکھ کر چونک گیا۔ ”وہ۔ وہ تمہارے پیچھے تیری میز پر انسپکٹر پانڈے۔“

بلا کہتے کہتے رک گئی۔  
انسپکٹر پانڈے کے نام پر میری آنکھوں میں الجھن سی  
تیر گئی۔ فوری طور پر اس نام کی شناخت میرے ذہن میں نہیں  
آئی تھی لیکن جب میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ساری بات  
میری سمجھ میں آئی۔  
اس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔  
فرخ نکت داڑھی، باریک مونچھیں، پیچھے کوہنے ہوئے سر کے  
بال، آنکھوں پر گولڈن فریم کی عینک اور قیمتی لباس۔ وہ انسپکٹر  
پانڈے ہی تھا جو عرصہ پہلے راجستان میں سارسکا کے قریب  
پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے نوڈوں روپے کی نقدی اور  
مند پر بھجنت میں چڑھانے والے طلانی زورات لے  
کر فرار ہو گیا تھا اور ہندوستان کی پولیس اس کی تلاش میں  
ٹانگ ٹوئیاں مارتی رہ گئی تھی۔  
اس نے اگرچہ اپنا حلیہ بدل لیا تھا لیکن ہم اسے کیسے  
بھول سکتے تھے۔ اس بدلے ہوئے حلیے میں بھی بلا نے فوراً  
ہی اسے پہچان لیا تھا۔ بلا جب سارسکا کے جنگل میں ڈاکوؤں  
کے قبضے میں تھی تو میں اسے چھڑانے کے لیے جنگل میں گھس  
گیا تھا اور بعد میں انسپکٹر پانڈے بھی پولیس فورس لے کر  
جنگل میں داخل ہو گیا تھا اور پھر ڈاکوؤں کے گروہ کے قلعہ قلع  
اور اس گروہ کے سرغنہ گنگولی چوہدری کو موت کے گھاٹ  
اتارنے کے بعد انسپکٹر پانڈے دو دن تک ہمارے ساتھ جنگل  
میں رہا تھا۔ اس کے بعد جب تھا کر بھانوت سنگھ اور روپ  
مٹی کا ایک سیڈنٹ ہوا تھا تو انسپکٹر پانڈے ہی اس حادثے کی  
تفتیش کر رہا تھا اور ہمارا اکثر اس سے ملنا جلتا رہتا تھا اور پھر  
اس کے تقریباً ایک ہفتے بعد وہ پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے  
دولت لے کر فرار ہو گیا تھا۔  
اور اب وہ اگرچہ بہت عرصے بعد نظر آیا تھا لیکن ہم  
اسے کیسے بھول سکتے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں  
آئی تھی کہ ہندوستان کی پولیس انسپکٹر پانڈے کو تلاش کیوں  
نہیں کر سکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ عرصے ہندوستان ہی  
میں کہیں روپوش رہنے کے بعد نیپال آ گیا تھا۔  
انسپکٹر پانڈے اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوب  
صورت لڑکی بھی تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال کے لگ  
بھگ رہی ہوگی۔ تھی تو وہ نیپالی لیکن اس کی رنگت نکھری  
ہوئی اور چہرے کے نقوش بڑے دل فریب تھے۔ اس نے  
سیلیولس بلاڈز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔  
وہ دونوں بھی کھانا کھا رہے تھے۔ انسپکٹر پانڈے کے ہاتھ  
میں نوالہ تھا اور اتفاق سے اسی وقت اس کی نظرس بھی میری

طرف اٹھ گئیں۔ نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔  
اس کے چہرے پر ایک رنگ سا اگر گزر گیا اور آنکھوں میں  
وحشت سی بھر گئی۔  
میں اپنی جگہ سے اٹھ کر پانڈے کی میز پر پہنچ گیا۔ اس  
کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ وہ ایک سابق  
پولیس آفیسر تھا۔ اس کا بڑا دیدہ تھا لیکن اس وقت مجھے  
اپنے سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا حالانکہ میں قانون کا  
محافظ نہیں تھا۔ نہ ہی اسے پکڑنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا  
لیکن۔ احساس جرم ہی بہت برا خوف ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا  
کہ وہ ایک سنگین جرم کر کے بھاگا ہوا ہے اور پکڑے جانے  
کے خوف نے اس کے دل پر لرزہ طاعاری کر دیا تھا۔  
”اطمینان سے کھانا کھاؤ۔“ میں نے اس کے شانے پر  
ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”گوئی پریشانی نہیں۔ بعد میں کسی جگہ بیٹھ  
کر اطمینان سے بات کریں گے اور سنو۔ مجھ سے ملے بغیر جانا  
مست۔“ میرا لہجہ نادل تھا اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ  
بھی تھی لیکن اس کی سامنے لڑکی کی آنکھوں میں الجھن سی  
تیر گئی تھی ”بیلو ہئی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا  
”ہم پرانے دوست ہیں۔ بہت عرصے بعد آنا سامنا ہوا ہے۔“  
تم لوگ آرام سے کھانا کھاؤ۔ بعد میں ملیں گے۔“  
میں اپنی میز پر گیا اور کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں نے  
پانڈے کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت کسی حد تک معمول پر  
آئی تھی لیکن آنکھوں میں کسی قدر وحشت بدستور موجود  
تھی۔ میں نے اس لڑکی کے سامنے اسے اس کے نام سے  
مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ یہاں نجانے کس نام سے رہ رہا تھا۔  
اس کے اصل نام کا انکشاف اس کے لیے کسی قسم کی  
الجھنیں پیدا کر سکتا تھا اور پھر میرا لہجہ اور انداز بھی دوستانہ  
ہی رہا تھا۔ میں دراصل پانڈے کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔  
اسے دیکھ کر تو اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا  
تھا۔ پانڈے یہاں میرے کام آ سکتا تھا اور میں نے فوری  
فیصلہ کر لیا تھا کہ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے  
پانڈے کو دوست بنایا جائے۔ دیش گھ راجستان سے ایم ل  
تھا اور پانڈے کا تعلق بھی راجستان ہی سے تھا۔ اسی  
حوالے سے وہ میرے بہت کام آ سکتا تھا۔  
”وہ پانڈے ہی ہے نا؟“ بلا نے میری طرف دیکھتے  
ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔  
”ہاں۔ وہی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا  
”کھانے کے بعد کسی اور جگہ پر بیٹھ کر ہماری باتیں ہوں گی۔“  
”وہ کون ہے؟“ مایا مٹی نے بھی ایک سوال کر ڈالا۔

”ہرانا دوست ہے۔ اتفاق سے آنا سامنا ہو گیا ہے۔  
بت دلچ آدمی ہے۔“ میں نے جواب دیا اور پھر ہم  
خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔  
ہمارا کھانا ابھی جاری تھا کہ بلا نے آگے جھپکتے ہوئے  
سر کوئی کی۔  
”وہ ہل ادا کر کے اٹھ رہے ہیں۔“  
”کھراؤ نہیں۔ وہ کہیں نہیں جائے گا۔“ میں نے بھی  
سر کوئی میں جواب دیا۔  
میں نے غلط نہیں کہا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے پانڈے اس  
لڑکی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔  
”ہم کافی شاپ میں جا رہے ہیں۔ تم لوگ وہیں آ جانا۔  
کافی اسٹے ہی پیئیں گے۔“ پانڈے نے میری طرف دیکھتے  
ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جس  
کا مطلب تھا کہ وہ اپنے آپ پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا پھر  
اس نے بلا کی طرف دیکھا۔  
”بیلو پوئی جی۔ کیسی ہو؟“  
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں مہاراج۔“ بلا  
نے جواب دیا۔  
”بالکل ٹھیک۔“ پانڈے بولا ”بہر حال، تم لوگ کافی  
شاپ میں آؤ تو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ اور پھر وہ  
میرے کندھے پر جھک گیا ”میرا نام چترجن ہے۔ بھولنا  
نہیں۔“ اس کی سرکوشی اتنی ہلکی تھی کہ میں بھی بشکل آواز  
سن سکا تھا۔  
پانڈے اس لڑکی کے ساتھ میزوں کے درمیان چکراتا  
ہوا ہال سے نکل گیا۔ اس کے تقریباً چند منٹ بعد ہم نے  
بھی کھانا ختم کر کے ہل ادا کیا اور ہال سے باہر آ گئے۔ وسیع و  
عریض لابی کے بائیں طرف ایک کشادہ راہداری تھی جہاں  
چندر گفٹ شاپیں بھی تھیں۔ اس راہداری کے بالکل آخر میں  
کافی شاپ کے الفاظ چمک رہے تھے۔  
ہم دکانوں میں سبجے ہوئے سامان کو دیکھتے ہوئے کافی  
شاپ میں داخل ہو گئے۔ یہ بھی خاصا وسیع ہال تھا۔ یہاں کئی  
میزیں خالی تھیں۔ کافی شاپ میں رش نہ ہونے کی ایک وجہ  
یہ بھی تھی کہ ڈاننگ ہال میں کھانے سے فارغ ہونے والے  
بچتر لوگ ہوٹل کے ٹائٹ کلب کا رخ کر رہے تھے۔ اس  
طرف صرف وہی لوگ آ رہے تھے جنہیں بے ہنگم اچھل کود  
اور پر شور موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔  
انسپکٹر پانڈے اس لڑکی کے ساتھ کھڑکی کے ساتھ والی  
ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو ان دونوں نے اٹھ کر

ہمارا استقبال کیا تھا۔ پانڈے نے مدھمالا کے نام سے اس  
لڑکی کا تعارف کرایا۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کی طرف  
دیکھا۔ وہ خاصی حسین تھی۔ سیلیولس بلاڈز اور اسکرٹ بھی  
گھنٹوں سے اوپر تھا۔ اس کی بائیں کلائی میں سونے کا ایک  
کرزا تھا اور دائیں کلائی میں ایک خوب صورت اور قیمتی  
مروانہ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے بلا کے بعد مایا مٹی کا  
تعارف کرایا تو پانڈے مسکراتے ہوئے بولا۔  
”دوبی جی سے ملاقات ہو چکی ہے لیکن انہیں شاید یاد  
نہیں۔“  
”مجھے ہے!“ مایا مٹی کے لیے میں حیرت تھی۔  
”آپ تو لوگوں کے چہرے یاد نہیں رکھ سکتیں لیکن ہم  
آپ کو نہیں بھول سکتے۔“ پانڈے نے مسکراتے ہوئے  
جواب دیا ”میں چند مہینے پہلے بنیاد ہوا تھا اور پورا ایک ہفتہ  
ہسپتال میں رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکڑوں کی دی ہوئی  
کڑوی کیسلی دواؤں سے زیادہ آپ کی سیجائی مریضوں کے  
من میں جیون کی جوت چمکاتی ہے۔“  
پانڈے کی اس بات پر مایا مٹی نے صرف مسکراتے ہی  
اکتفا کیا تھا۔  
ہماری ان باتوں کے دوران ہی ایک سائوبلی سی ویٹریس  
نے ہمارے سامنے اسپرٹو کافی سوکڑی تھی۔ کافی کی  
چمکیوں کے دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ میں  
پانڈے کو چترجن کے نام سے ہی مخاطب کرتا رہا تھا۔ پانڈے  
نے روپ مٹی اور ٹاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں بھی پوچھا  
تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم سارسکا میں تھے تو انسپکٹر  
پانڈے کے ساتھ ہمارے چند روز بڑے اچھے گزرے تھے۔  
میں شاید پہلے بھی کسی یہ بتا چکا ہوں کہ سارسکا میں پانڈے ہی  
ایک ڈسے دار اور فرض شناس پولیس آفیسر نظر آیا تھا لیکن  
آخر میں اس نے جو حرکت کی تھی اس پر تو میں آج تک  
حیران تھا اور اب طویل عرصے بعد اس سے سامنا ہوا تھا تو  
میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس نے ایسی گھناؤنی  
حرکت کیوں کی تھی کہ اس کی زندگی بھر کی نیک نامی گندگی میں  
غرق ہو کر رہ گئی تھی۔ پانڈے نے بھی شاید میری اس بے  
چینی کو محسوس کر لیا تھا۔  
”اگر آپ تینوں خواتین اجازت دیں تو ہم دونوں ذرا  
الگ بیٹھ کر باتیں کر لیں۔“ اس نے باری باری بلا  
وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
جواب میں ان تینوں نے مسکراتے ہی اکتفا کیا تھا۔  
ہم نے اپنے اپنے کونے اٹھائے اور ہال کے پہلو کے دروازے

سے نکل کر لان میں آگئے۔ یہاں بھی میزوں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ رنکین چھتریاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ صرف دو میزیں ایسی تھیں جن پر دو جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی چار میزیں خالی تھیں۔ ہم اس کھڑکی سے ذرا ہٹ کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہم کھڑکی کے راستے بلا وغیرہ کو بھی دیکھ سکتے تھے۔

”میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو پانڈے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب تم شروع ہو جاؤ۔ اور یہ بتاؤ کہ تم نے ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی تھی اور اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟“

”گھناؤنی حرکت! پانڈے کے منہ سے مگر اسانس نکل گیا۔“ سب سے پہلے تو مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم نے بدحوالا کے سامنے میری لاج رکھ لی اور کوئی ایسی بات نہیں کی کہ اسے مجھ پر شک کا موقع ملتا۔“

”ظاہر ہے تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ بلکہ میں تو تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے زخمی جانی کو شرم بجوانے کے لیے فوری طور پر چپ کا بندوبست کر دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اے! تمہاری اس دوست کو تو میں بھول گیا تھا۔ کیسی ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ اب ہمارے بیچ نہیں رہی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ! کیا وہ اس دن؟“

”نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”اس کے وہ زخم تو ٹھیک ہو گئے تھے۔ کئی مہینوں بعد ہر دور میں اسی شیطان سے تصادم ہو گیا تھا جس کی تلاش میں ہم سارسکا کی پہاڑیوں والے مندر تک گئے تھے۔ بہر حال، یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر بھی سناؤں گا۔“

”مجھے افسوس ہوا۔“ پانڈے نے کہا۔

”میں تم سے کچھ سننے کا منتظر ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔“ پانڈے مسکرا دیا ”ابھی تم نے کہا تھا کہ یہ بہت گھناؤنی حرکت تھی۔ ٹھیک کہ تم نے لیکن میں سال کی پولیس سروس میں مجھے کیا ملا تھا۔ میں نے کئی بار اپنی زندگی داؤ پر لگائی۔ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے بد معاشرے، چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلے کیے۔ میرے جسم پر گولیوں کے کم از کم نصف درجن نشان ایسے ہیں جو میری فرض شناسی، دیانت داری اور بہادری کا ثبوت ہیں لیکن ان میں برسوں میں عوام اور حکومت نے

مجھے کیا دیا۔ صرف چار ہزار روپے مہینہ تنخواہ۔ میری فرض شناسی اور بہادری کی گواہی تو تم بھی دو گے۔ میں نے کبھی اپنے فرض سے غفلت نہیں کرتی۔ میں جرم نامہ پیش لوگوں کے ساتھ کسی لڑائی میں مارا جاتا تو میری بہادری اور فرض شناسی کے گم گئے گائے جاتے۔ مجھے بعد از مرگ ایذا رزوا جانا اور اڑا کر خوش قسمتی سے میں موت سے بچ کر اپنی سروس پوری کر لیتا تو رینائرمنٹ پر میرے ہاتھ میں چند ہزار روپوں کا چیک تھا۔ وہ تھا اور بس۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے اگر وہ گھناؤنی حرکت کی تھی تو کیا بڑا کیا تھا۔ کیا میرے دل میں ارمان نہیں تھے۔ میری خواہشات نہیں تھیں؟ کیا میں چار ہزار روپے مہینے کی تنخواہ میں اپنا قیمتی لباس پہن سکتا تھا۔ کسی ایسے بڑے ہوٹل میں قدم رکھنے کی جرات کر سکتا تھا۔ نہیں میرے دوست۔“ اس نے گہرا سانس لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”دو ایسے بھی وہ دولت میں نے کسی کے گھر سے نہیں چرائی تھی۔ وہ تو مندر کا مال تھا۔ میں نہ چراتا تو مجھ سے بڑے چور وہاں موجود تھے۔ وہ سب کچھ ہرب کر جاتے۔ یہ پنڈت اور پجاری ہ کیا سیدھا (خدمت) کرتے ہیں وہ جتنا (عوام) کی؟ بلکہ وہ تو جتنا کو دھرم کے نام پر بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے انہیں لوٹ رہے ہیں۔ عیش کرتے ہیں وہ لوگ۔ اگر میں نے اس بستی لگا میں ہاتھ دھو لیے ہیں تو کیا جرم کیا ہے۔“

”ہاں واقعی تم نے بھگوان کے گھر میں چوری کر کے کوئی جرم نہیں کیا لیکن۔“

”بھگوان۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”میں کسی دھرم و دھم کو نہیں مانتا۔ میں نے جب یہ منصوبہ بنایا تھا تو میرے ساتھیوں نے مجھے بت ڈرایا تھا کہ کالی کا غضب مجھے تباہ کر دے گا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کالی کا غضب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں عیش کر رہا ہوں اور تمہیں ایک اور حربے کی بات بتاؤں۔ اس سے تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ پنڈت اور پجاری لوگ دھرم سے کتنے غفلت ہیں۔“

”دھرم سے ان پنڈتوں اور پجاریوں کے خلوص کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا ہے لیکن میں تمہاری بات ضرور سنا چاہوں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سارسکا سے فرار کے بعد میں پورا ڈیڑھ مہینہ گورکھ پور کے ایک مندر میں روپوش رہا تھا۔“ پانڈے نے کہا۔

اس انکشاف پر مجھے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ پانڈے نے جو واردات کی تھی، وہ ایسی نہیں تھی کہ دھرم چاری اور

قانون کے محافظ اسے آسانی سے فراموش یا نظر انداز کر دیتے۔ پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کی نقدی اور زیورات لوٹنے کے علاوہ اس کے ہاتھوں اس مندر کے دو تین پنڈتوں کے قتل بھی ہوئے تھے۔ اس طرح ایک طرف قانون کے محافظ اور دوسری طرف پنڈت پجاری کی نگاری کتوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ہندوستان بھر کے چھوٹے بڑے تمام مندروں کو اس واردات سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور سارے ہندوستان کے پنڈت اور پجاری بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں تھے اور بقول اس کے وہ ایک مندر ہی میں پناہ لیے ہوئے تھا۔

”مجھے مندر میں پناہ دینے والا بھی ایک پنڈت ہی تھا۔“ پانڈے نے کہا ”وہ جان گیا تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی پورے ہندوستان کی پولیس اور پنڈتوں کو تلاش ہے لیکن ان کی ایک موٹی سی گڈی نے اس پنڈت کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس کا دھرم چار رخصت ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے نہ صرف اپنے مندر میں پناہ دی بلکہ میرے لیے شراب اور لڑکیوں کا بندوبست بھی کر رہا تھا۔“

”وہ پنڈت مجھے میری حفاظت کے حوالے سے خبریں دیتا رہا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے بڑی آسانی سے پکڑا سکتا تھا لیکن اسے کیا ملتا؟ شاید دس ہزار روپے انعام کے طور پر مل جائے لیکن میں نے اسے دو لاکھ روپے دیے تھے۔ چھوٹے سے مندر کے اس پنڈت نے اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ میرا محافظ بن گیا۔“

”اس پنڈت نے نہ صرف میری حفاظت کی بلکہ میرے عیش و آرام کا بھی خیال رکھا۔ ڈیڑھ مہینے بعد جب میری تلاش کا غلط کم ہوا تو اس پنڈت نے ہندوستان سے نکلنے میں بھی میری پوری مدد کی۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”گورکھ پور نیپال کی سرحد سے زیادہ دور نہیں۔“ پانڈے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”نیپال کی عین سرحد پر لیکن نام کا وہ قصبہ ہے جہاں مامتا بھائی نے جنم لیا تھا۔ بدھ کی اس جنم بھوی کی زیارت کے لیے بدھ بھکشو بڑی تعداد میں گورکھ پور کے راستے اس طرف آتے رہتے ہیں۔ اس پنڈت نے مجھ پر رقم خرچ کر کے میرے لیے جعلی کاغذات بنوا دیے اور مجھے بکشوؤں کے ایک قافلے میں شامل کر دیا۔ بدھ بکشو بننے کے لیے مجھے گنج بھی ہونا پڑا تھا۔ بہر حال، میں بکشوؤں کے اس قافلے میں شامل ہو کر بڑی آسانی سے

سرحد پار کر کے لیپن پہنچ گیا۔ ایک دن وہاں رہا اور پھر کھنڈو تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں چند روز میں بھکشو ہی کے بھیس میں ایک اسٹوپا میں رہا اور پھر بھکشو والا لباس اتار کر شرکے کھنجان اور کھنیا ترین علاقے میں ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔

”میرے پاس بے حساب دولت تھی اور مجھے دولت خرچ کرنے کی کوئی غلبت نہیں تھی۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شاہ خرچی مجھے لوگوں کی نظروں میں مشتبہ بنا سکتی ہے۔ اس لیے میں بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔“

”میں ہر چند مہینوں بعد ٹھکانے بدلتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں کے حساب سے میرے مالی حالات میں تبدیلی آتی گئی اور بالا خرچہ عرصہ پہلے میں نے بوداتھ میں ایک پرانا حویلی نما مکان خرید لیا جو برسوں سے ویران پڑا تھا۔ اس وقت تک میں شرم میں اپنی حیثیت اور شخصیت مستحکم کر چکا تھا۔ کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہوا کہ میں در حقیقت کون ہوں۔ اس پرانے حویلی نما مکان پر دو لاکھ روپے اور خرچ کر کے میں نے اسے اپنی جنت بنالیا۔ تم دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”یہ بوداتھ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شر سے چند میل دور شمال کی طرف ایک بڑی پرسکون اور خوب صورت جگہ ہے۔“ پانڈے نے جواب دیا ”وہاں ایک بہت بڑا بدھ اسٹوپا بھی ہے۔ دولت مند لوگوں کا علاقہ ہے۔ حویلی اور محل نما مکانات ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر ہیں کہ کسی کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”تم شاید ابھی تک شر سے باہر نہیں نکلے۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ کھنڈو ویلی شر کے اطراف میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ دریا ہیں، مگنکاتے جھرنے ہیں، آبشار ہیں۔ یہاں تمہیں فطرت کے ایسے حسین مناظر دکھائی دیں گے کہ تمہیں حیرت ہوگی۔ بدھ لوگ زیادہ تر شر سے باہر اسی وادی میں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں اور۔“

”یہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اسے ٹوک دیا ”ہندوستان کا قانون تو شاید تمہیں بھول گیا ہو لیکن کیا وہ پنڈت اور پجاری بھی تمہیں بھول چکے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں وہ تمہاری تلاش میں یہاں نہیں آئے ہوں گے؟“

”وہ لوگ مجھے واقعی نہیں بھولے۔“ پانڈے نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”یہ پنڈت اور پجاری۔ ان کا تو دھرم ہی جیسے ہے۔ وہ اس چوٹ کو اتنی آسانی سے کیسے بھول

سکتے ہیں۔ اس واقعے کو اگرچہ کئی ماہ بیت چکے ہیں لیکن انہوں نے میری تلاش ختم نہیں کی۔ بلکہ تلاش کا یہ دائرہ بھارت سے نکل کر دوسرے ملکوں تک پھیل گیا ہے۔ مجھے مینے پہلے برما کے سرحدی علاقے میں میرے ایک ساتھی کو پکڑایا گیا تھا۔ کالی کے مندر سے مال لوٹ کر فرار ہونے والے ہم چار آدمی تھے۔ ایک میں۔ دوسرا سب انسپکٹر تیسرا ایک ہیڈ کانٹیل، چوتھا حوالدار تھا۔ فرار کے اگلے ہی روز ہم سے بانٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ ہیڈ کانٹیل چھ مہینے پہلے برما کے سرحد قصبے سے پکڑا گیا۔ اس سے کچھ برآمد نہیں ہو سکا لیکن پجاریوں نے اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بارے میں یہ سب کچھ اخبارات میں چھپا تھا۔

”تمہیں پہلے آسن ٹول کے علاقے میں واقع ایک مندر کے قریب ایک ایسا سادھو میری نظروں میں آیا تھا جسے عرصہ پہلے میں نے سارسکا میں دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں میرا یہ شبہ درست ثابت ہوا کہ وہ میری اور سب انسپکٹر جگدیش کی تلاش میں ہی یہاں آیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو بار میاں میری تلاش میں یہاں آچکی تھیں۔

”میں اپنی حویلی میں محصور ہو کر رہ گیا۔ انتہائی اہم ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتا۔ پندرہ دن بعد جب میرے ایک آدمی نے بتایا کہ وہ سادھو واپس جا چکا ہے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔“

”گویا تمہارے دل میں اب بھی ان کا خوف ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”یہ خوف تو کبھی نہیں نکل سکتا۔“ پانڈے نے جواب دیا ”تمہیں دیکھ کر بھی میرا دل کانپ اٹھتا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید تم بھی میری تلاش میں یہاں آئے ہو لیکن تمہاری باتوں سے مجھے قہر آٹھ اطمینان ہوا۔“

”لیکن اگر واقعی ایسا ہو تو۔۔۔؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”ناممکن۔“ پانڈے نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا ”مجھ سے پہلے تم کالی کے مندر کی اس دولت تک پہنچ چکے تھے اور تمہیں موقع بھی حاصل تھا۔ تم آکر چاہتے ہو وہ ساری دولت لے کر فرار ہو سکتے تھے اور کسی کو بتا بھی نہ چلا اور ہم بھی ٹاپے رہ جاتے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تمہیں دولت کا لالچ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس واقعے سے پہلے کئی روز تک میرا تمہارا ساتھ رہا تھا۔ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بڑی حد تک سمجھ چکا تھا۔ ہماری یہ ملاقات محض

اتفاق ہے اور تمہارے بارے میں تو میں دعوے سے کمرہ لکھ ہوں کہ تمہارے دل میں دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ یہاں کسی سلسلے میں آئے ہو؟“ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”تم اگرچہ اپنے ملک کی پولیس کو بھی مطلوب ہو اور دھرم کے شیعہ داروں کو بھی لیکن میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔“ ”میں تمہارے اعتماد کو نہیں ٹھیکے لگنے دوں گا۔ کوہ کیا معاملہ ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”دیش کھ کو جانتے ہو۔ راجستان کا ایم پی؟“ میں نے کہا۔

”اس حرامی کو کون نہیں جانتا۔“ پانڈے نے جواب دیا ”چند روز پہلے میں نے اسے یہاں دیکھا تھا۔ رومی نامی ایک مقامی غنڈے کے ساتھ لیکن ایک روز اخبار میں پڑھا کہ رومی ایک مجرّم میں مارا گیا ہے۔ دیش کھ بھی اس کے بعد نظر نہیں آیا۔ شاید انڈیا بھاگ گیا ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دراصل میں ہراس شخص سے دور رہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جس کا تعلق راجستان سے ہو لیکن تم اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”وہ انڈیا فرار نہیں ہوا کھنڈو ہی میں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اسی کا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ اس نے میری ایک دوست کو ہرواد میں قتل کر دیا تھا اور دوسری دوست کو اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا جسے میں نے اس کے گھٹنے سے چھڑایا لیکن دیش کھ غائب ہو گیا۔ اس سے ابھی مجھے کچھ حساب کرنا ہے اس لیے اب بھی میں اس کی تلاش میں ہوں اور یہاں کی پولیس بھی اسے ڈھونڈ رہی ہے کیونکہ دیش کھ نے کھنڈو آتے ہی اپنا کھانا کھول لیا تھا۔ اس کے حساب میں کم از کم چار افراد قتل ہے۔“

”پولیس کو اس سے منٹے دو۔“ پانڈے نے کہا ”تم نے اپنی دوست کو اس کے گھٹنے سے چھڑا لیا۔ یہی قیمت ہے بہتر ہے کہ اب اس سے دوری رہو۔“

”ناگ پال کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”ہمت سکھ۔“ اس نے مجھے گھورا ”معلوم ہوتا ہے یہاں آکر تم نے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پیر پھیلا لیے ہیں۔ جانتے ہو ناگ پال کون ہے؟“

”ایک زہریلا سانپ۔“ میں نے جواب دیا ”مار آستین۔ اس دھرتی نے اسے جہنم دیا۔ اسے پالا۔ اسے زندگی

دی۔ عزت دی، دولت دی اور وہ اپنی اس دھرتی ماں کو کیا صلہ دے رہا ہے؟ دھرتی تو ماں سان ہوئی ہے پانڈے اور وہ ناگ پال غیروں کے ہاتھ اپنی اس ماں کا سودا کر رہا ہے۔“ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی ”تم نے بھارت کی سرزمین پر جرم کیا اور تم اس سے انکار نہیں کرو گے کہ اس سرزمین نے تمہیں بہت کچھ دیا تھا۔ تم ایک جرم کر کے وہاں سے بھاگ آئے لیکن تم اپنے وطن کی مٹی کو تو نہیں بھول سکتے۔ تمہاری جڑیں تو اب بھی اسی مٹی میں ہیں۔ تم نے اپنے پیش و آرام اور دولت حاصل کرنے کے لیے ایک جرم تو کیا لیکن تم اس دھرتی کا سودا تو نہیں کر سکتے کیونکہ تم اب بھی اس مٹی سے جڑے ہوئے ہو لیکن یہ ناگ پال۔ یہ تو واقعی آستین کا سانپ ہے جس میں بے پناہ زہر بھرا ہوا ہے یہ دشمنوں کے ہاتھ اپنی ہی ماں کا سودا کر رہا ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے ناگ پال کے بارے میں وہ سب کچھ بتانے لگا جو اب تک مجھے معلوم ہوا تھا ”اور یہ دیش کھ بھی آج کل اسی کے پاس ہے۔ یہ لوگ نہایت گھٹاؤنے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں انہیں آزاد چھوڑنا چاہیے؟“

”میں نے ایک جرم ضرور کیا ہے لیکن اپنے وطن کی مٹی سے نا انصافی تو نا۔“ پانڈے نے جواب دیا ”دیش کھ کو میں بت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ غذا گروہی اور بد معاشی کی طاقت پر ایم پی بنا تھا۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا تھا اور وہ ایم پی کے رتبے کی پروا کے بغیر ایسی گھٹاؤنی حرکتیں کرتا رہا۔ دولت کے حصول کے لیے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن دھرتی ماں کا سودا۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے بے ضمیر شخص کو تو زندہ زمین میں کا ڈھنسا چاہیے۔“

میں گہری نظروں سے پانڈے کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اس نے کالی کے مندر کی دولت ضرور لوٹی تھی لیکن وہ اپنا دھرتی کا نذرانہ نہیں تھا۔

میں دیر تک اس سے ناگ پال اور دیش کھ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”میں تمہارا ساتھ دوں گا اور مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔ ویسے تمہارے پاس کوئی پلان ہے؟“

”بال۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”تم ذکیتم اور قتل جیسے جرم کے بعد انڈیا سے فرار ہو کر آئے ہو اور دیش

کھ اور ناگ پال کو ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔“ ”کیا مطلب؟“ پانڈے نے مجھے گھورا۔

”ان دونوں تک پہنچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

”اچھا آئیڈیا ہے۔“ وہ بولا ”اگر انہیں شبہ ہو گیا تو میری جان بھی جاسکتی ہے لیکن اب مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔ میں ایک دو دن بعد تم سے رابطہ کروں گا لیکن کہاں اور کیسے؟“

”میں جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہوں انہیں اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ تم مجھے اپنا ٹونو سہرود۔ میں دقتاً فوقاً تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔ ویسے اگر کوئی ایمر جنسی ہو تو تم سوما کو اطلاع دے سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”سوما۔ وہ نیڈی بد معاش۔“ پانڈے بولا۔

”ہاں وہی۔ وہ بھی۔“

”میں اسے جانتا ہوں۔“ پانڈے نے میری بات کاٹ دی ”میرا ان لوگوں سے اگرچہ کبھی کوئی رابطہ نہیں رہا لیکن ایسے لوگوں کے بارے میں معلومات رکھتا ہوں۔ ایسے دو چار آدمی میرے پاس بھی ہیں جو کسی مشکل وقت میں میرے کام آسکتے ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے پانڈے جی۔“ میں نے کہا ”اب ہم مل کر ان شیطانی قوتوں کا مقابلہ کریں گے۔“

پانڈے نے بڑی کرم جوئی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہم دونوں جب اپنی جگہ سے اٹھے تو میری نظریں بے اختیار کافی شاپ کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ٹیبل خالی تھی۔ بدلا وغیرہ میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

”وہ تینوں کہاں چلی گئیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے پانڈے کی طرف دیکھا۔

”وہ بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی ہوں گی اور میرا خیال ہے اب وہ ہمیں ٹائٹ کلب میں ملیں گی۔ آؤ۔ دیکھتے ہیں۔“ پانڈے نے کہا۔

کافی شاپ والے ہال سے گزرتے ہوئے پانڈے نے کافی کابی ادا کر دیا اور پھر لابی میں سے ہو کر ہم ٹائٹ کلب کی طرف آ گئے۔

ٹائٹ کلب کی مستیاں عروج پر تھیں۔ ایک نیم عریاں رقصہ موسیقی کی تیز دھنوں پر میزوں کے درمیان تھرک رہی تھی۔ پانڈے کا خیال درست نکلا تھا۔ وہ تینوں بھی ایک میز پر بیٹھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بدلا وغیرہ اٹھ کر



ہماری طرف آنے لگیں۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ میں نے پانڈے سے پوچھا۔ میرا اشارہ مدھولا کی طرف تھا۔  
”یہ یہاں کے ایک طاقتور شخص کی بیٹی ہے۔ اس سے ملاقات کی تفصیل... خاصی طویل ہے پھر کسی وقت بتاؤں گا۔“ پانڈے نے جواب دیا۔

وہ تینوں ہمارے قریب آگئیں۔ مدھولا نے پانڈے کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم سب لوگ لابی سے ہوتے ہوئے باہر آگئے۔

پارلنگ میں پانڈے کی کار دکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اور ایسی قیمتی کار تو اب اس کے لیے بہت معمولی چیز تھی۔ وہ دونوں ہم سے ہاتھ ملا کر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ میں، بللا اور مایا متی کے ساتھ پارلنگ کے دوسرے سرے پر کھڑی اپنی کرائے کی کار کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت ہم میں سے ایک نے پایا تھا کہ مایا متی رات ہمارے ساتھ رہے گی اور صبح وہیں سے اپنی ڈیوٹی پر چلی جائے گی۔

مایا متی کی وجہ سے اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے۔ زیادہ تر شوبھا کے بارے میں باتیں ہوئی رہی تھیں۔ مایا متی کے خیال میں شوبھا کو دس پندرہ دن مزید اسپتال میں رہنا پڑے گا۔

مایا متی صبح سویرے ہی اسپتال چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں دیر تک سویا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو بللا حسب معمول پلنگ پر میرے پیروں کی طرف آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔

تین دن روز گزر گئے۔ اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ چوتھے روز صبح اسپتال میں انسپکٹر اعظم سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا۔

”ایک ایسا آدمی ہماری نظروں میں آگیا ہے جس کے ذریعے ہم دیش تک پہنچ سکتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔  
”کون؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ایک سابق انڈین پولیس آفیسر و نو پانڈے ہے۔“ اعظم خان نے جواب دیا۔ ”اس کا تعلق راجستھان سے ہے۔ کئی سال پہلے وہ سارسکا کی پہاڑیوں میں گالی کے مندر سے دولت لوٹ کر بھاگا تھا اور دو تین آدمی بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کل رات اسے کال دھرا کے علاقے میں

ایک ایسی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے جو ناگ پال کی ملکیت ہے۔ بریدر کے آدمی کئی روز سے اس عمارت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ بریدر کو اپنے ایک آدمی سے جیسے ہی پانڈے کے بارے میں اطلاع ملی اس نے پانڈے کی نگرانی کا جتنی حکم دے دیا لیکن اس عمارت سے نکلنے کے بعد پانڈے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ اسے بھی شاید اپنی نگرانی کا شبہ ہو گیا تھا۔“

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ انسپکٹر پانڈے کا پولیس کی نظروں میں آ جانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں نے دیش کھ اور ناگ پال پر پانڈے کے ذریعے ہاتھ ڈالنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں گڑبڑ ہو سکتی تھی لیکن یہ بھی اچھی بات تھی کہ پانڈے کو اپنی نگرانی کا پتا چل گیا تھا اور وہ پولیس والوں کو چھلاوے کے غائب ہو گیا تھا۔

اعظم خان کے جانے کے قعود ہی دیر بعد میں بھی بللا کو شوبھا کے پاس جھوڑ کر اسپتال سے نکل آیا اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میری کار شہر کے شمالی علاقے میں واقع ٹانگلیں دربار کے قریب سے ہوتی ہوئی بودا تھ کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

مجھے پہلی مرتبہ شہر سے باہر نکلنے کا موقع ملا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ میلوں دور تک پھیلی ہوئی کھنڈروں کی جہد حسین تھی۔ جس طرح نیپال قدرتی حسن سے مالا مال ہے اس طرح اس کی تاریخ بھی خاصی دلچسپ ہے۔ دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹیاں رکھنے والا یہ ملک صدیوں تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اس کی جدید تاریخ کا آغاز اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ۱۶۶۹ء میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے شمالی ہند کے راجپوتوں کو ان پہاڑوں میں دھکیل دیا تھا۔ ایک گورکھا سردار نے قابیلیوں کو جمع کر کے اپنی حکومت قائم کر لی اور اس طرح یہاں شاہ خاندان کے دور کا آغاز ہوا۔ اس خاندان نے ایک سو پچیس سال تک یہاں حکومت کی اور بالآخر ۱۹۵۰ء میں ایک انقلاب کے بعد یہاں جمہوریت معرض وجود میں آئی اور شاہ مندر کو نیپال کا آئینی بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

انقلاب سے پہلے سو سو سال کی تاریخ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ یہاں رانا خاندان ہی برسرِ اقتدار رہے۔ حکمران طبقہ تو بہت دولت مند، مضبوط اور طاقت ور تھا لیکن عوام زبوں حالی کا شکار تھے۔ عوام کی اکثریت کے پاس نہ تن ڈھانچے کو کپڑے تھے اور نہ ہیٹ بھرنے کو کھانا۔ ظلم و تشدد سے کبھی انہیں سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ حقوق کا

مطالبہ کرنے والوں کو سرعام تشدد کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ زندگی کی تمام سہولتیں اور عیاشیاں حکمران طبقے کے لیے مخصوص تھیں۔

وزارت عظمیٰ کا عہدہ اے کلاس رانا کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ راجا کی پہلی اور خاندانی بیوی کا بیٹا اے کلاس رانا کہلاتا تھا۔ دوسری بیویوں سے ہونے والے بیٹے بی بی کلاس میں آتے تھے۔ جبکہ دستاؤں سے ہونے والی اولاد کو سی کلاس سمجھا جاتا تھا۔ انہیں کسی قسم کی مراعات حاصل نہیں تھیں۔ تاہم اس تیسرے درجے سے تعلق رکھنے والے مرد اپنی سخت اور ذہانت سے فوج میں زیادہ سے زیادہ کمرل کے عہدے تک پہنچ سکتے تھے۔ جبکہ اے کلاس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو براہِ راست جنرل کے عہدے پر تعینات کیا جاتا تھا۔

دلچسپی کی بات یہ تھی کہ حکمران نہ صرف کئی کئی شادیاں کرتے تھے بلکہ لاتعداد وراثتوں سے بھی دلی بھلاتے تھے۔ ان کی اولاد بھی اسی حساب سے ہوتی تھی۔ رانا جنگ بھادری کی اولاد کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ راناؤں کی اولاد کی اس صورت حال نے بھی عام لوگوں پر مایوسی طاری کر رکھی تھی۔ اتنے لاتعداد راناؤں کے ہوتے ہوئے عام آدمی کو آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔

حکمرانوں کی ان جائز اور ناجائز اولادوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک ایسا شخص عدلیہ کا چیف جسٹس تھا جس نے اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی اور اپنا نام لکھنا بھی نہیں جانتا تھا اور اس زمانے میں فوج کا کمانڈر انچیف بھی ایک ایسا ہی شخص تھا جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ فوج کی ٹریننگ کیا ہوتی ہے۔

نیپال میں اکثریت گورکھوں کی ہے۔ میں فیصد آبادی بدھ کے پیرو کاروں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر شہروں سے دور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں اور کس مہر کی کا شکار ہیں۔ دھرم کے لحاظ سے یہاں ہندو ازم کا غلبہ ہے اور ہندوستان کی بنیاد قوم اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھا رہی ہے۔ نیپال کے قانون میں ایک انسان کے قاتل کو تو معافی مل سکتی ہے لیکن گائے کی ہتیا کرنے والے کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کے لیے معافی یا قید کی سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں ہندوؤں اور باہمیوں کی بھی بہتات ہے۔ باہمیوں کی افزائش نسل کے لیے تو باقاعدہ میٹنگ پارک قائم کیے گئے ہیں اور انہیں بھی پورا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے جبکہ ہندوؤں کو

بھی قانونی تحفظ حاصل ہے۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا بڑی احتیاط سے کار چلا رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں ہندوؤں کی کچھ زیادہ ہی بہتات تھی۔ وہ درختوں پر اچھلتے کودتے، ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے بار بار سڑک پر آ رہے تھے۔

پہاڑی رہو اسٹینڈا دور سے ہی نظر اٹھا جس کی پانڈے نے نشان دہی کی تھی۔ اس پہاڑی کے قریب سے گزر کر میں نے کار کو بائیں طرف ایک اور سڑک پر موڑ دیا۔ یہ تنگ سی سڑک بتدریج تنگ کی طرف چلی گئی تھی۔ ایک جگہ میں نے کار روک لی۔ وہاں سے بائیں طرف ایک تنگ سارا سہ ایک سرسبز نیلے کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں وہ حویلی نما مکان دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔

میں نے بھانک کے سامنے گاڑی روک کر بارن بھایا تو تھوڑی سی دیر بعد ایک اجیر عمر نیپالی عورت نے ٹیگٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر بھاگنا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو وہ مجھے دہن رکھنے کا اشارہ کر کے اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے ٹیگٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی اندر لے جا کر روک لی۔

بہت بڑی اور بہت شان دار حویلی تھی۔ بھانک سے آگے تقریباً دو ایکڑ پر مشتمل لان تھا۔ جس میں حوض بھی تھا اور اس میں فوارہ بھی لگا ہوا تھا۔ لان کے آخر میں وہ شان دار عمارت تھی جس کے پورچ میں پانڈے کی کار کھڑی تھی۔ ایسی حویلیاں میں نے سبے پور میں دیکھی تھیں۔ پانڈے بھی راجستھان ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے بھی ایسی بہت سی حویلیاں دیکھی ہوں گی اور کسی ایسی حویلی میں رہنے کے خواب بھی دیکھے ہوں گے اور اپنے ان خوابوں کی تعبیر اسے نیپال میں ملی تھی۔

نیپالی عورت نے عمارت کے پچھلی طرف اشارہ کر دیا۔ میں عمارت کے پہلو سے گزرتا ہوا پچھلی طرف پہنچا تو ٹھنک کر رک گیا۔ اس طرف بھی بہت بڑا سرسبز لان تھا جس کے وسط میں سو ٹھنک پول تھا۔ پانڈے پول سے نکل کر بدن پر ایک بڑا سا تولیا لپیٹ رہا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھاس پر مدھولا پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر دو نہایت مختصر سے جیتھڑے تھے اور میرا خیال ہے وہ کچھ دیر پہلے ہی تالاب سے نکل کر وہاں لیٹی تھی۔ اس کے بدن پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کبھی اس نے وہاں سے اٹھنے یا اپنے بدن پر تولیا لینے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر خفیف سی

مسکراہٹ اچنی تھی۔

پانڈے نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اسے لیتا ہوا وہاں سے کچھ دور چلا گیا جہاں بالسی کی کچھ پیچوں کی ایک میز اور چند کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔

”تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔“ پانڈے نے کہا ”لیکن میرے خیال میں یہاں تمہاری آمد بلاوجہ نہیں ہو سکتی۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔“

”ہاں۔ یہی سمجھ لو۔“ میں نے جواب دیا اور اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ عمارت کا ایک دروازہ اس طرف بھی تھا جس کے سامنے کشادہ برآمدہ تھا ”کل رات۔“ میں نے دوبارہ پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کل رات تم کال دھرا گئے تھے شاید دیش کھ سے ملنے کے لیے۔“

”اوہ!“ پانڈے اچھل پڑا ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ اس نے جھپتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہلے میں تم سے کچھ سننا چاہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”کل رات دیش کھ سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔“ پانڈے نے جواب دیا ”جس رات رتنا ہوٹل میں تم سے ملاقات ہوئی تھی اس سے اگلے ہی روز میں نے دیش کھ سے ملاقات کی کو مشن شروع کر دی تھی۔ میرا پیغام تو اسی روز اس تک پہنچ گیا تھا لیکن ملاقات سے پہلے وہ میرے بارے میں تسلی کر لیتا چاہتا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ میں وہی پانڈے ہوں جو ہندوستان بھر کے پجاریوں، بیزنٹوں اور پولیس کو مطلوب ہے تو اس نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔“

”میں نے بھی اسے ایک من گھڑت کمائی بنا دی کہ یہاں بھی میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ کچھ لوگ یہاں بھی مجھے تلاش کر رہے ہیں اور مجھے خطرے سے بچنے کے لیے اس کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ دراصل میں اس کی ہمدردیاں حاصل کر کے اسے اس حصار سے باہر نکالنا چاہتا ہوں جو ناگ پال نے اس کے گرد قائم کر رکھا ہے اور وہ حصار بہت مضبوط ہے اسے توڑنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے میں کو مشن کروں گا کہ دو چار روز میں اسے باہر لاسوں۔“

”لیکن تمہیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔“ میں نے جواب دیا ”یہ ساری باتیں تم سے ٹیلی فون پر بھی ہو سکتی تھیں لیکن تمہیں خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے میں نے خود یہاں آنا ضروری سمجھا۔“

”میں نے ساری زندگی پولیس میں گزار دی ہے اور میں اس قسم کے خطرات سے بخوبی آگاہ ہوں۔“ پانڈے نے کہا

اور برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔

میری نظرس بھی اسی طرف اٹھ گئیں۔ نیپالی ملازمہ ایک ٹرے اٹھائے اسی طرف چلی آ رہی تھی جس میں لیونیز کے تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ٹرے ہمارے سامنے میز پر رکھ دی۔

”مدھومالا کا گلاس وہیں لے جا کر دے دو۔“ پانڈے نے اشارہ کیا۔ نیپالی ملازمہ نے ایک گلاس اٹھایا اور مدھومالا کی طرف چلی گئی۔

”میں اس خطرے کی بات نہیں کر رہا جو تم سمجھ رہے ہو۔“ میں نے گلاس اٹھا کر ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”تو سمجھ؟“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں اسے پولیس کے خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا لیکن اس وقت برقی کوندے کی طرح یہ خیال آیا تھا کہ اگر میں نے اسے پولیس کے خطرے سے آگاہ کر دیا تو شاید وہ کوئی ہمانہ کر کے پیچھے ہٹ جائے اور اب جبکہ وہ دیش کھ تک پہنچ چکا تھا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور گزر پڑ ہو جائے۔

”کس خطرے کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

”وہ بات یہ ہے کہ۔“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا ”دیش کھ کو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ دولت کا پجاری ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا اور کیا کچھ نہیں کر رہا۔ میری دوست شوہا ہے پور میں بڑے سکون کی زندگی گزار رہی تھی۔ شہر کے وسط میں اس کا ایک بہت بڑا خالی پلاٹ بھی تھا اور دیش کھ وہ پلاٹ ہتھیانا چاہتا تھا۔“ میں نے مختصر طور پر اسے شوہا کے بارے میں بتایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”تم نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بات اس کے علم میں آگئی ہے کہ تم کالی کے مندر سے گزروں کی دولت لوٹ کر بھاگے ہوئے ہو اور دیش کھ اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا ”لیکن میں بھی کچھ کالیاں نہیں کھلیا ہوں۔ پولیس میں میری زندگی ان جیسے حرامیوں سے منبتے ہوئے ہی گزری ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ میرے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گا۔“

”ایک بات اور۔“ میں نے کہا ”یہاں کی پولیس بھی اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ تمہیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔“

ایسا نہ ہو کہ تم بھی پولیس کی نظروں میں آ جاؤ۔“

”مجھے اس بات کا بھی احساس ہے۔“ پانڈے نے ”مجھے رات میں دیش کھ سے ملنے کے لیے ہی جواب دیا۔ مجھ میں اس بلڈنگ میں گیا تھا۔ دو گھنٹوں بعد باہر نکلا تو کال دھرا کی اس بلڈنگ میں وہ پولیس ہی کا آدمی تھا لیکن میں اسے سمجھنے پر آمادہ ہو گیا کہ ایک آدمی میری نگرانی کر رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ پولیس ہی کا آدمی تھا لیکن میں اسے چھوڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ گزشتہ رات میں وہاں گیا تھا؟“

”میں بھی سوبھا کے آدمیوں کے ذریعے اس عمارت کی عمارتی کوا رہا ہوں۔“ میرے ذہن میں فوراً یہی بات آگئی ”مجھے رات ہی کو یہ اطلاع مل گئی تھی۔ اس وقت تو میں اسی لیے یہاں چلا آیا ہوں کہ تم سے کچھ سبب ہو جائے گی اور میں تمہاری یہ حویلی بھی دیکھ لوں گا۔“

”بہت اچھا کیا۔“ پانڈے نے اپنے گلاس کا آخری گھونٹ بھرے ہوئے کہا ”آؤ۔ تمہیں حویلی دکھاؤں۔ میں نے کسی ایسی حویلی کے بڑے خواب دیکھے تھے لیکن پولیس کی نوکری میں رہتے ہوئے تو میں صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔“

”اور کالی دیوی نے تمہارے خوابوں کو تعبیر دے دی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں لان سے اٹھ کر عمارت میں آ گئے۔ پانڈے گھوم پھر کر حویلی دکھانے لگا۔ کئی کمرے تھے۔ صرف چند کمرے ایسے تھے جنہیں سائزو سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ باقی کمرے خالی تھے اور بھی کئی کمرے تھے وہاں بھی چند کمرے آراستہ تھے اور باقی خالی تھے حویلی کے اوپر بعض کمرے ایسے تھے کہ ان کی کھڑکیوں سے وادی میں دور دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔

”یہ حویلی مجھے بہت سستی مل گئی تھی۔ صرف پانچ لاکھ میں۔“ پانڈے بتا رہا تھا اور اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اتنی بڑی حویلی صرف پانچ لاکھ روپے میں ”یہ حویلی تقریباً تین سال سے ویران پڑی تھی۔“ پانڈے نے کہا ”اور مشہور تھا کہ یہاں آسپے نے ڈیرا بٹھا رکھا ہے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق یہاں کچھ پر اسرار واقعات بھی رونما ہوئے تھے۔“

رات کو یہاں سے روئے، مین کمرے اور بیچوں کی آوازیں سنائی دیتی۔ لوگ دن کے وقت بھی اس طرف سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے جب میں نے اس حویلی کو خریدنے کا فیصلہ کیا تو میرے جاننے والوں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔ مختلف پر اسرار واقعات کا حوالہ دے کر مجھے ڈرایا لیکن میں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا اور پانچ لاکھ میں اس

کا سودا کر کے دو ڈھائی لاکھ روپے اوپر لگا دیے۔ یہاں کام کے دوران کچھ ایسے عجیب انکشافات ہوئے کہ اگر اس حویلی کے پہلے مالک کو پتا چل جائے تو اسے خالی کرانے کے لیے شاید وہ مجھ پر مقدمہ کر دے۔“

”کیسے انکشافات؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سننے میں آیا تھا کہ تین سال پہلے ڈاکوؤں نے اس حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔“ پانڈے نے کہا ”گھر والوں نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا لیکن وہ سب کے سب مارے گئے۔ دو ڈاکو بھی ہلاک ہوئے حویلی کے مالک کا نوجوان بیٹا اس رات یہاں نہیں تھا۔ وہ کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا اور رات کو وہیں رہ گیا تھا۔“

”اس واقعے کے بعد وہ کچھ عرصے تک ذہنی طور پر مفلوج رہا پھر بتدریج نارمل ہوتا چلا گیا لیکن اس نے حویلی میں آنے سے انکار کر دیا۔“

”دو سال گزر گئے اور پھر رات کے وقت اس حویلی سے عورتوں کے مین کمرے“ روئے اور بیچوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور یہ مشہور ہو گیا کہ حویلی پر بد روحوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ لوگ دن کے وقت بھی اس طرف آنے سے ڈرتے گئے۔ اس طرح یہ حویلی ویران پڑی رہی۔ اسے بھوتوں کا مسکن قرار دے دیا گیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس حویلی پر بد روحوں کا نہیں ڈاکوؤں کا قبضہ ہو گیا تھا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس زمانے میں ڈاکوؤں کے ایک خطرناک گروہ نے شہر اور نواحی علاقوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ لوٹ مار اور قتل و غارت کے بعد پھاڑوں میں غائب ہو جاتے اور پولیس والے ٹاپے رہ جاتے۔ وہ ڈاکو۔“ پانڈے نے ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اور وہ ڈاکو ایک خفیہ راستے سے اس حویلی میں آ جاتے۔ پولیس کو بھی شبہ بھی نہیں ہوا کہ ڈاکو اس آسپے ذہ حویلی میں پناہ لے سکتے ہیں۔“

”اگر کسی اور کو ان باتوں کا علم نہیں ہے تو تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے جھپتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جن دنوں میں یہاں کام کروا رہا تھا تو ایک جگہ بجلی سی کھدائی کے دوران بجلی کا ایک تاری میری نظروں میں آ گیا۔ میں زمین میں دفن اس تاری کو اکھاڑا چلا گیا اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ ان تاریوں کے ذریعے حویلی میں چاروں

طرف خفیہ مقامات پر لاؤڈ اسپیکر لگائے گئے تھے اور یہ خانے میں ایک جگہ ٹیپ ریکارڈ پر بین کرنے، رونے اور چیخوں کا کیسٹ لگا دیا جاتا۔ ان لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے یہ آوازیں چاروں طرف گونجنے لگتیں۔

”جب میں نے یہ حویلی خریدی تو اس سے صرف تین مہینے پہلے ڈاکوؤں کا وہ گروہ کسی وجہ سے اپنا یہ ٹھکانا چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ انہی دنوں پولیس کا ڈاکوؤں کے اس گروہ سے تصادم ہو گیا تھا جس نے عرصے سے شہر اور اس کے نواح میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اس مقابلے میں سات ڈاکو مارے گئے تھے حویلی میں ان پوشیدہ تاروں اور خفیہ لاؤڈ اسپیکروں کی دریافت کے بعد مجھے دو اور دو چار کا حساب لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں کچھ ڈاکو مارے گئے تھے اور کچھ خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس طرح یہ آسیب زدہ حویلی مجھے مل گئی۔ لوگ حیران ہیں کہ بد روحوں نے مجھے کوئی نقصان کیوں نہیں پہنچایا۔ بعض لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں تو میں یہی جواب دیتا ہوں کہ میں ان سے بڑا آسیب ہوں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ میں نے کہا ”جو شخص کالی کے مندر سے خزانہ لوٹ سکتا ہے اس سے بڑا آسیب اور کون ہوگا۔“

ہم ابھی تک اوپر ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں ایک راہداری سے گزر کر دوسری طرف آیا۔ یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ اس طرف بھی ایک کشادہ میسر بنا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی میسر سے نیچے جھانکا، ٹھک کر رک گیا۔ مدھملا تالاب کے نیپکوں پانی میں پشت کے بل تیر رہی تھی۔ میں چیخے بھٹ گیا۔

”نیچے آکر بھی کچھ دیر تک میں پانڈے سے باتیں کرتا رہا پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجین اشارت کر کے کار کا رخ گیٹ کی طرف بٹھرایا۔ پانڈے نے آگے جا کر گیٹ کھول دیا اور میں اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا گاڑی کو باہر نکال لے گیا۔“

جب میں اسپتال واپس پہنچا تو دوسرے بارہ بج رہے تھے اور بلا وہیں موجود تھی۔ میں بھی کچھ دیر وہاں رکا اور پھر ہم شوبھا سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

ڈاک بنگلے پر پہنچنے ہی میں نے ٹیلی فون پر بریدر یا انسپکٹر اعظم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ میں نے ان کے لیے پیغام

چھوڑ دیا۔

پانڈے سے ملاقات کے بعد میرا ذہن بری طرح تھا۔ پانڈے دیش کھ تک پہنچ گیا تھا اور دوسری پولیس کی نظروں میں بھی آ گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ آپس میں ٹانگا ہو جائے۔ میں پانڈے کو پولیس میں بتانا چاہتا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر بات بدل دی کہیں بدک نہ جائے لیکن میں سمجھتا تھا کہ اب اس کے بارے میں بتانا ضروری ہو گیا تھا کہ پولیس بھی ٹانگ پال یا دیش کھ کا ساتھی سمجھ کر دھڑک میرے خیال میں اب پانڈے ہی ایسا شخص تھا جو پانڈے پال کے حصار سے نکال سکتا تھا۔

شام چوبیس بجے کے قریب وہ دونوں ڈاک بنگلے پر ”تمہارا پیغام ملا تھا۔ کوئی خاص بات؟“ خان نے سوال کیا۔ میں نے کہا ”صبح اسپتال میں ملاقات لان میں بیٹھے جانے پڑے تھے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا ”صبح اسپتال میں ملاقات تو تم نے پانڈے نام کے ایک آدمی کے بارے میں بتائی۔ گزشتہ رات کال دھرا کے علاقے میں تمہارے آدمی دے کر غائب ہو گیا تھا۔“

”ہاں۔ وہ بھی انڈین پولیس کو مطلوب ہے۔ کل رات نظر آ گیا تھا۔ رات کو تو وہ ہمارے آدمی دے کر بھاگ گیا لیکن ایک دو دن میں وہ ہمارے ہاتھ لگا۔ آج اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی۔ ہم جلد ہی اس کے ٹھکانے کا پتا لگائیں گے۔“

”میرا خیال ہے اس پر گھرائی ختم کر دی جائے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ انسپکٹر اعظم نے مجھے گھورا اور دیش کھ کی طرف دیکھنے لگا۔

”دیش کھ ٹانگ پال کی پناہ میں ہے اور پولیس ٹانگ پال کے کسی ٹھکانے پر چھاپا مارنے سے گھبرائی ہوئی ہے۔ پانڈے دیش کھ کو ٹانگ پال کی پناہ نکال سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ انسپکٹر اعظم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”متم بہت پورہ جا کر دیکھو کیا معاملہ ہے۔ میں یہاں موجود ہوں۔“

دیش کھ کے قتل کی خبر سن کر انسپکٹر اعظم خان بھی اچھل پڑا تھا اور پھر اس نے وہاں رگ کر وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ٹرنبل سے نکل کر پارکنگ ایریا کی طرف دوڑ پڑا۔

بہت پورہ شہر کا وسطی اور مہیاں آبادی کا علاقہ تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کی زیادہ سرگرمیاں بھی ایسے ہی علاقوں میں رہتی تھیں لیکن اس وقت وہ علاقہ اس لحاظ سے سنان پڑا تھا کہ تمام کافینیں بند تھیں۔ پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور لوگ ادھر ادھر کونوں کھدروں میں کھڑے تھے۔

مگنا ہاتھ سے بائیں طرف ایک اور سڑک پر مڑتے ہی اعظم خان نے جیب روک لی۔ یہ قدرے کشادہ سڑک تھی جس کے دائیں بائیں کئی گلیاں پھوٹی تھیں۔ یہاں لاتعداد ریسٹورنٹس اور شراب خانے تھے۔ ایک دو تھڑا کلاس قسم کے ٹائٹ کلب بھی تھے۔ اس علاقے میں اسکن بزنس بھی ہوتا تھا اور منشیات فروشوں کے ایجنٹ بھی گھومتے رہتے تھے لیکن یہاں سڑک پر پولیس والوں کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم مارتون کی بالکونیوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ کئی دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور سامان بکھرا ہوا تھا۔

ایک شراب خانے کے سامنے سڑک پر چار لاشیں پڑی تھیں جن میں ایک لاش دیش کھ کی تھی۔ دو لاشوں کے جسموں پر پولیس کی وردیاں نظر آرہی تھیں اور چوتھی لاش کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بھی کوئی غنڈا ہی تھا۔

ایک سب انسپکٹر اعظم خان کو دیکھتے ہی قریب آیا۔ ہم جیب سے اتر کر لاشوں کے قریب پہنچ گئے۔ دیش کھ کی لاش گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ سڑک پر چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔

”یہ سب کیا ہوا۔ کیسے ہوا؟“ اعظم خان نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

”متم فزک اسٹریٹ کی طرف گشت پر تھے ہمیں اطلاع ملی کہ کچھ غنڈوں نے اس طرف لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ میں اپنے آدمیوں کو لے کر اس طرف آیا تو درجن بھر غنڈے دکانوں میں لوٹ مار کر رہے تھے اور یہ۔“ اس نے دیش کھ کی لاش کی طرف اشارہ کیا ”یہ ایک نکلی جیب پر کھڑا غنڈوں

کو احکامات دے رہا تھا۔ میں نے ایک دکان لوٹنے والے غنڈوں کو روکنے کی کوشش کی تو اس شخص نے گولی چلا دی۔ میرا ایک سپاہی زخمی ہو کر گر گیا۔ میں نے بھی اپنے آدمیوں کو فائرنگ کا ارادہ دے دیا۔

”میرے ساتھ چھ آدمی تھے۔ ان سے پہلے لوٹ مار کرنے والے درجن بھر غنڈوں نے ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔ میرے دو جوان فائرنگ کی زد میں آ گئے۔“ اس نے سرک پر فٹ پاتھ کے قریب پڑی ہوئی پولیس والوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا ”اور پھر اسی کے ایک آدمی کی فائرنگ سے یہ چھٹی ہو کر گر پڑا۔“ اس مرتبہ اس نے دیش کھ کی طرف اشارہ کیا ”اس کے گرتے ہی غنڈے جپ پر سوار ہو کر زبردست فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔“

”اسے جانتے ہوئے یہ کون ہے؟“ میں نے دیش کھ کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”یس سر۔“ سب انسپکٹر نے کہا ”یہ انڈیا کا ایک ایم پی ہے جو غیر قانونی طور پر یہاں آیا ہوا ہے۔“

انڈین ایم پی کا لفظ سن کر میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں سنسنی مچ رہی تھی۔ میں نے اعظم خان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہا تھا جو میرے ذہن میں تھا۔

ناگ پال کا منصوبہ بڑا خوفناک تھا۔ اسی رات سو جانے دیش کھ کے جس آدمی کو پکڑا تھا اسی نے اکتشاف کیا کہ وہ لوگ ہندوستان سے آنے والے ایک ایم پی کو قتل کر کے کھنڈوں میں انتشار پھیلا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری لال کا نام سننے میں آیا تھا اور اعظم خان اور بریدرا نے اپنی تمام تر توجہ ہماری لال کی طرف مبذول کر دی تھی اور جب ہماری لال کا جنازہ تری بھون اتر پورٹ پر اترنے والا تھا تو بازار میں دیش کھ کو قتل کر دیا گیا تھا۔

صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا تھا۔ پولیس کی تمام تر توجہ ہماری لال کی طرف تھی اور ناگ پال نے کسی طرح دیش کھ کو باہر نکال کر پولیس سے بھڑا دیا تھا اور اپنے ہی ایک آدمی کے ہاتھوں دیش کھ کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ جبکہ ان کا ایک اور آدمی پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا اور پولیس کے دو آدمی غنڈوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

میں آیا تھا۔ وہ غذا اگر دی ”ڈیٹیوں“ انگو اور قتل کی وارداتوں میں ملوث تھا۔ رشی کش اور ہر دور میں ایسی وارداتوں کا مرکز ہوا تھا اور ایک عورت کے کمرے نیپال گیا تھا۔ یہاں اس کی آمد غیر قانونی تھی۔ انڈیا کا ایک ایم پی کی تھانے یہاں قتل کر دیا گیا تھا۔ گورنمنٹ بھی نیپال میں اس کے غیر قانونی داخلہ تاویلیں پیش کر سکتی تھی۔ نیپالی سرکار کو اس کے قتل کے الزام ٹھہرا سکتی تھی۔

دوسری طرف ناگ پال اس موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ بلکہ اس نے تو جان بوجھ کر یہ موقع پیدا کیا تھا۔ انسپکٹر کے بیان کے مطابق فائرنگ میں پہلے دیش کھ کی طرف سے ہوتی تھی اور بالآخر دیش کھ کو قتل کر کے ایک آدمی نے چھلنی کیا تھا۔ گویا یہ سب کچھ پہلے سے تھا کہ اگر دیش کھ پولیس سے جھڑپ کے دوران بھاگ جائے اسے ہر صورت میں ختم کر دیا جائے۔

میں نے اعظم خان کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا کہ چہرے پر بھی ایک لمحے کو سنسنی کے سائے لگے۔ مجھے سنسنی نظروں سے اڑھ رہی دیکھنے لگا۔ کئی دکانیں کھلی تھیں۔ اچھی خاصی توڑ پھوڑ مچی تھی اور سامان دکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر بھی بکھرا ہوا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ اعظم خان اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ دیش کھ کی لاش کو فوری طور پر سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اعظم خان سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا اعظم خان کی جب میں نے ہوئے سیلور فون کی ٹھنکی بجتے لگی۔ اس نے فون جب سے نکال لیا۔ وہ بریدرا کی کال تھی۔ وہ مہاراج گج میں ہماری لال کی کوٹھی کے قریب سے بول رہا تھا۔ ہماری خیریت سے اپنی کوٹھی پہنچ گیا تھا۔

اعظم خان نے اسے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ چار بجے منٹ تک فون پر بریدرا سے بات کرتا پھر رابطہ منقطع کر کے اس نے دو خیم جگہوں پر فون بچے پھر فون بند کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بریدرا یہاں آ رہا ہے اور میں نے ایسپر لینسز کے بھی فون کر دیا ہے۔ ان لاشوں کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا دیا جائے گا۔“

سرکاری اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ منٹ میں دو ایسپر لینسز پہنچ گئیں۔ چاروں لاشوں کو اٹھا کر ہٹا دیا گیا۔ چند پولیس والے بھی ان کے ساتھ تھے۔

مجھے سمجھ گیا تھا کہ بعد دکان دار جو آس پاس کی دکانوں میں بھاگے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ باہر آنے لگے۔ اور دیش کھ کی لاشوں سے نکل رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اعظم خان کو کھیر لیا تھا۔ ہر شخص اسے کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دکان دار اپنا سامان سینٹے لگے۔

دیش کھ کی لاش کی طرف سے ناگ پال کے غنڈے تھے جو دو جہوں پر کھڑے آئے تھے اور کسی اشتعال کے بغیر انہوں نے توڑ پھوڑ اور لوٹ مار شروع کر دی تھی اور دیش کھ ایک کھلی جگہ پر کھینچ کر اپنے آدمیوں کو اشتعال دلا رہا تھا۔ ناگ پال کو نیپال کا بال تھا کر کے کہا جاتا تھا۔ وہ جب پاتا شر کے کسی بھی حصے میں بنگا سے شروع کر دیتا اور شر بند کر دیتا۔ بنگاموں کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پولیس اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کھیراتی تھی کیونکہ اس کے پیچھے ڈرگ مافیا کی بہت بڑی طاقت تھی۔ غنڈوں کی ایک فوج تھی جو جدید ترین اسلحے سے لیس تھے۔ ماضی میں ایک دو مرتبہ اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس پر اس کے غنڈوں نے پورے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ لوگ بھی اس کے خلاف زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن آج یہاں پر موجود ہر شخص اس کے خلاف کھل کر بول رہا تھا۔

مزید چندہ میں منٹ بعد بریدرا بھی پہنچ گیا۔ بریدرا لوگوں سے پوچھ کچھ کر رہا تھا کہ اس دوران اسے فون پر ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی۔

ناگ پال کے سسٹم غنڈے اسپتال سے دیش کھ کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے اور بھوتاتی جی کے مرکزی چوراہے پر لوگوں کو کھینچا جا رہا تھا۔ ان کا پورگرام یہ تھا کہ دیش کھ کی لاش کو جلوس کی صورت میں پورے شہر میں گھمایا جائے گا اور لوگوں کو اشتعال دلا کر ان کے دلوں میں سرکار کے خلاف نفرت کو ابھارا جائے گا۔

بھوتاتی جی کا علاقہ اگرچہ وہاں سے کافی دور تھا لیکن بہت پورہ کی دکانیں ایک بار پھر بند ہونے لگیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کرنے لگے کیونکہ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ بنگا سے شروع ہو گئے تو پورا شہر ان کی لپیٹ میں آجائے گا۔

میں اعظم خان کے ساتھ بھوتاتی جی کی طرف روانہ ہو گیا۔ رانی پوکھی اور رتیا پارک کے درمیان کافی پاتھ کا وہ

بہت بڑا چوراہا مکمل طور پر مسلح غنڈوں کے قبضے میں تھا۔ اگرچہ پولیس بھی بڑی تعداد میں موجود تھی لیکن میں جانتا تھا کہ جب بنگامہ شروع ہو گا تو پولیس بھی کچھ نہیں کر سکے گی۔ چوراہے کے وسط میں ایک ٹرک پر چان باندیش کھ کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس پر بڑا ہسفیڈ کپڑا خون سے داغ دار تھا۔ دوسرے ٹرک پر بنے ہوئے ایسے ہی پلیٹ فارم پر ناگ پال کھڑا تھا اس کے ساتھ نصف درجن مگن مین بھی تھے۔ انہوں نے آٹومگ رائفلیں اس طرح تان رکھی تھیں کہ کسی بھی لمحہ فائر کھول سکتے تھے۔ ان دونوں ٹرکوں کے آس پاس بھی لاتعداد مگن مین موجود تھے۔

ناگ پال کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ کروت تو اس کے بال ٹھاکرے جیسے تھے ہی حلیہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ میں نے بے چارے پر میں بال ٹھاکرے کوئی دی کے ایک پروگرام میں دیکھا تھا اور اب ناگ پال کو دیکھ رہا تھا۔ اسے بال ٹھاکرے کی ڈبلی کیٹ کمنا نظر نہیں ہوگا۔

چھوٹ کے قریب ”ڈاکٹر ابدن“ پہلے رنگ کا لہار کرے، سفید دھوٹی۔ ہاتھ پر تشبیہ، گلے میں تین گبی سی مالیں، ایک مال تنبیج کی طرح ہاتھ میں تھی۔

ناگ پال اگرچہ بہت ٹھہرے ہوئے لمبے میں لوگوں سے خطاب کر رہا تھا لیکن اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بچھا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے اس کے منہ کے سامنے بیگافون تھام رکھا تھا جس سے اس کی آواز دور تک پھیل رہی تھی۔

زہر آلود تقریر کرنے کے بعد ناگ پال ٹرک سے اتر گیا۔ جلوس آگے بڑھنے لگا تو پولیس نے اسے روک لیا۔ پولیس کے کچھ اور ذمے دار آفیسر بھی وہاں موجود تھے جو بار بار بیگافون پر لوگوں سے منشر ہونے کی اپیل کر رہے تھے لیکن جلوس پولیس والوں کو دھکیلتا ہوا آسن ٹول کے مرکزی چوراہے پر پہنچ گیا۔ اس چوراہے سے مختلف سمتوں میں چھ بازار نکلتے تھے اور یہاں بہت بڑا مندر بھی تھا۔

پورا علاقہ بند تھا۔ جڈنوں کی بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف زدہ تھا۔

پولیس نے ایک بار جلوس کو روکنے کی کوشش کی۔ مظاہرین نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لیے بالاکاشی چارج کیا اور آسنو گیس کے گولے پھینکے جانے لگے اور پھر جھوم میں سے کسی نے پہلی گولی چلائی۔

مظاہرین نے دکانوں کے شر توڑ کر لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ پولیس کو دور رکھنے کے لیے باقاعدہ فائرنگ کی جاری

تھی اور پھر پولیس نے بھی فائر کھول دیا۔  
اعظم خان مجھے کھینچتا ہوا دور لے گیا۔

”اب تمہارا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔“ وہ مجھے ایک گلی کی طرف دھکیلے ہوئے بولا ”تم ڈاک بنگلے جینے کی کوشش کرو۔ میں بعد میں کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔“ بلوائی تمام بازاروں میں پھیل رہے تھے۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ آسویس فضا میں پھیل گئی تھی جس سے آنکھوں میں مریض سی لگ رہی تھیں۔

میں تنگ اور آڑی ترجمی گلیوں میں ہوتا ہوا اندرا چوک کی طرف نکل آیا۔ یہ علاقہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اندرا چوک سے اونٹن روڈ پر آتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ پہلے تو وہ کہیں جانے کو تیار نہیں تھا لیکن آرنیکو روڈ کا نام سن کر اس نے مجھے بھالایا۔ شہر کی گنجائش آبادی سے نکل کر کاغذی پاتھ سے آگے پر تھوی پاتھ چوک اور اس سے آگے کا علاقہ عام طور پر ہنگاموں سے محفوظ رہتا تھا اور اسی لیے ٹیکسی ڈرائیور اس طرف آنے پر تیار ہو بھی گیا تھا۔

پست قامت نیپالی ڈرائیور اس قدر تیز رفتاری سے ٹیکسی چلا رہا تھا جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ فضا میں خوف و ہراس ضرور تھا لیکن ڈرائیور کی تیز رفتاری کی وجہ کوئی خوف نہیں تھا۔

اگر آپ کو کبھی کھٹنڈو جانے کا اتفاق ہوا ہو تو نیپالی ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں یہ دلچسپ بات آپ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ٹیکسی کی تیز رفتاری سے میٹر بھی تیز چلتا ہے اور زیادہ کرایہ بنتا ہے حالانکہ یہ بات تو ایک بے وقوف بھی سمجھتا ہے کہ کسی مخصوص فاصلے تک ٹیکسی خواہ تیز رفتاری سے چلائی جائے یا بکی رفتار سے میٹر اتنا ہی کرایہ بنائے گا۔

پر تھوی چوک سے آگے... کچھ کا کھولا (دیر) پار کر کے آرنیکو روڈ پر آتے ہی میں نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے ایک طرف چل پڑا۔ پولیس کا ڈاک بنگلا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

ہنگاموں کی اطلاع یہاں پہنچ چکی تھی اور بلا خاصہ پریشان تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر طمانیت سی آئی۔

”ہنگامے کیوں شروع ہو گئے اور تم کہاں تھے؟“ بلا نے پوچھا۔

”دیش مکھ کو قتل کر دیا گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”دیش مکھ یا بھاری لال کو۔ پولیس اس کی حفاظت نہ کر سکی۔“ بلا نے کہا۔

”پولیس کو بلف کیا گیا ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا ”یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔ یہ آگ ناگ پال کے بھڑکانے پر اور میرے سمجھتا ہوں یہ اپنی آسانی سے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔“ ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ دیش مکھ ختم ہو گیا تھا۔ دھرتی کا بوجھ کچھ لگا ہوا تھا لیکن مجھے اندازہ اس بات کا تھا کہ میرے ہاتھ اس کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

شام کے وقت میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کیا تو پتا چلا کہ ہنگامے شہر کے کچھ اور علاقوں تک پھیل گئے تھے۔ پولیس ناگ پال کو گرفتار کرنے کے لیے چھاپے مار رہی تھی لیکن وہ آگ بھڑکانے کے بعد بد پوش ہو گیا تھا۔ رات کو بھی شہر کے مختلف علاقوں میں بلوائیوں اور پولیس کے بیچ آگ بھڑکی جاری رہی۔ وقفے وقفے سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

صبح ہوتے ہی ہنگاموں کا زور بڑھ گیا۔ دس بجے کے قریب کاشانے بتایا کہ پر تھوی چوک بھی ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ اس چوک کے عین وسط میں کالی کا بت بڑا بندر تھا۔ بلوائیوں نے اس مندر کو لوٹ کر آگ لگا دی تھی۔ بلا ہنگامے میں ایک چپاری بھی مار گیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب برینڈر کا فون آیا۔ اس نے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہم ڈاک بنگلے سے باہر نہ نکلیں۔

میرے ذہن میں اچانک ہی پانڈے کا خیال آیا۔ پرسوں دوپہر کے بعد سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ میں فون کے قریب آیا اور ریسپورڈر اٹھا کر اس کا نمبر لانا لگا۔

لائسنس ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال بدھوالا نے رجب کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرتے رہنے پر متحضر تھی اور بڑے مشکل سے اس نے پانڈے کو فون پر بلایا تھا۔

”ارے تم کہاں ہو ہمت سنگھ۔ میں تو تمہارے بہت پریشان ہوں۔ سو ما سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہو رہا۔“ پانڈے نے میری آواز سننے ہی کہا۔

”میں فی الحال تو محفوظ ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”لیکن ہنگامے بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔“

”ہم اس وقت کہاں پر ہو؟“ پانڈے نے پوچھا۔  
”میں نے پولیس ڈاک بنگلے کا نام لیے بغیر اسے اپنی لوکشن کا پتہ تو اس کی چٹنی ہوئی آواز سنائی دی۔“  
”خوارنگ دہاں سے۔“ کھنڈا دیوار اور اس کے آس پاس واقع وزارت داخلہ کے دفاتر اور پریم کورٹ کو گھیرے میں لیا جانے والا ہے۔ اس مرتبہ ناگ پال کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ تم بلا کو لے کر فوراً میری طرف آ جاؤ۔“

”لیکن پورا شہر بند ہے اور۔“  
”تمہیں شہر کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”رنگ روڈ کی طرف سے نکل کر تری بھون انزپوٹ کے اوپر سے ہوتے ہوئے تم پودا تھ کی طرف آ سکتے ہو۔ راستہ لمبا ضرور ہے لیکن بالکل محفوظ ہے۔ تم فوراً یہاں پہنچنے کی کوشش کرو اور ابھی بہت سی باتیں ہیں جو ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔“

”تھک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”مگر نکلنے کا موقع نہ ملا تو فون کرووں گا۔“

میں نے ریسپورڈر رکھ دیا اور بلا سے مشورہ کرنے لگا۔ اسے ہنگاموں سے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے جب یہ پتا چلا کہ وہ جگہ شہر سے بہت دور پھاڑیوں میں محفوظ مقام پر ہے تو وہ فوراً لے جانے کو تیار ہو گئی۔

میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کیا۔ اتفاق سے اعظم دہاں موجود تھا۔ پہلے تو میں اس سے شہر کے حالات کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔ اس کے کہنے کے مطابق صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔ کھنڈو میں بھارتی سفیر کے بیان نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں نیپالی سرکار کو دھمکی دی تھی کہ کھنڈو میں پولیس کے ہاتھوں ایک انڈین ایم پی کے قتل پر بھارت سرکار خاموش نہیں بیٹھے گی۔ نیپال سرکاری نے اگرچہ بھارتی سفیر کے اس بیان پر احتجاج کیا تھا اور اس امر کی وضاحت بھی کر دی تھی کہ دیش مکھ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوا تھا۔ یہاں اس کی سرگرمیاں بھی مجبوز اور غیر قانونی تھیں اور وہ پولیس کے ہاتھوں نہیں ایک جھڑپ کے دوران اپنے ہی مشنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن بھارت سرکار اس وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی نیپال کے احتجاج کو بھی زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس کے برعکس بھارتی میڈیا نے اس واقعے کو خوب اچھالا جا رہا تھا۔ سٹیلائیٹ چینل پر بھارتی سیاست دانوں کے بیانات بھی کھنڈو میں ان ہنگاموں کے پھیلاؤ کا باعث بن رہے تھے۔

”ایک خاص بات جس کے لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے۔“ میں نے اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا ”تھوڑی دیر پہلے پانڈے سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ ہنگامے ہمارے علاقے کی طرف مزید پھیل گئے اس لیے ہمیں اس کے ہاں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ بلا ان حالات سے خاصی پریشان اور خوف زدہ ہے۔ وہ تو یہاں سے جانے کو تیار ہے۔ میں نے سوچا تم سے بھی مشورہ کر لوں۔“

”میں خود غم لوگوں کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔“ اعظم خان نے جواب دیا ”پر تھوی چوک پر کالی کے مندر کو نذر آتش کیے جانے کے بعد ہنگاموں کا زور اس طرف بڑھ گیا ہے۔ سیکریٹریٹ اور دیگر تمام سرکاری دفاتر بھی اسی طرف ہیں۔ بلوائی ان سرکاری عمارتوں پر حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ پولیس کا ڈاک بنگلا بھی زد میں آ سکتا ہے جہاں تم لوگ ٹھہرے ہوئے ہو۔ اگر وہاں سے نکلنے کا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور تم جہاں بھی جاؤ مجھے اطلاع دے دینا یا اس نمبر پر پیغام چھوڑ دینا۔“

”تھک ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں یہاں سے نکل جائیں گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ریسپورڈر رکھ دیا۔ بلا کمرے میں تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ اپنے کپڑے سوٹ کیس میں ڈال رہی تھی۔ اس نے میرے بھی تین چار جوڑے ڈال لیے اور چند ضروری چیزیں رکھنے کے بعد سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولی۔

”چلیں!“

”تو کیا تم نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے نا۔“ بلا نے کہا۔

”تو چلو۔ میں بھی تیار ہوں۔“ میں نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس اٹھالیا۔

”کاشا پر آمدے میں تھا۔ اس نے ٹیلی فون پر اعظم خان سے میری باتیں سن کر اندازہ لگایا تھا کہ ہم یہاں سے جانے والے ہیں۔ اس لیے میرے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا اور برآمدے سے اتر کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔“

کاشا نے سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ میں اسے محتاط رہنے کی ہدایات دیتا ہوا ڈرائیور کاشا کو دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ بلا بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ

پکی تھی۔

کاشا نے گیت کھول دیا۔ میں نے گاڑی باہر نکالنے ہوئے کاشا کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی کو بائیں طرف موڑ دیا۔

آرتیکو روڈ پر آکر میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ یہی سڑک دھولی کھلا (درا) پار کر کے سیدھی بھٹکا پور کی طرف چلی گئی تھی لیکن ہمیں دھولی کھولا تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دریا سے پہلے ہی میں نے کار کو بائیں طرف والے راستے پر موڑ دیا۔

یہ سڑک تری بھون انز پورٹ کے پچھلی طرف پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی بودا تھ اور اس سے آگے شمال میں مہادیو مندر کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ وادی میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں بھی تھیں۔

دریائے بھاگ متی پار کر کے ہم بائیں طرف مڑ گئے اور پھر بودا تھ میں حویلی کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

یہ راستہ اگرچہ بہت طویل تھا لیکن محفوظ بھی تھا۔ ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں راستے میں بار بار ہلا کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ وہ پورے راستے خوف زدہ سی رہی تھی لیکن جب میں نے حویلی کے پھاٹک کے سامنے کار روکی تو اس کے چہرے پر غمازیت سی آگئی۔

بارن کے جواب میں پھاٹک میں پہلے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی پھر پورا پھاٹک کھل گیا اور میں گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔

پانڈے اور مدھومالا ہمارے استقبال کے لیے برآمدے میں موجود تھے۔ مدھومالا نے بھی گرم جوشی سے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا تھا۔ حسب معمول اس کے بدن پر مختصر لباس تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب بے پور میں ہلا سے میری نئی نئی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح مختصر لباس پہنا کرتی تھی اور بہت عرصے بعد اس میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ ڈھنگ کا لباس پہننے لگی تھی۔ مدھومالا کے دماغ کی بھی شاید کوئی گرہ ڈھیلی تھی۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ہم وسیع و عریض لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ پانڈے کے کہنے پر نیپالی خادمہ نے چائے بنا کر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے ہم شکر کی صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ پانڈے کے خیال میں یہ ہنگامے ابھی مزید کئی روز جاری رہیں گے کیونکہ ناگ پال اس بار کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ خود تو

کسی جگہ روپوش تھا لیکن اس کے زیریں بجھے ہوئے بیان روزانہ اخبارات میں شائع ہو رہے تھے۔

”تم تو ان کے سرکل میں داخل ہو چکے تھے۔ شاید معلوم ہو کہ ناگ پال کہاں چھپا ہوا ہے؟“ میں پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت لاؤنج میں صرف ہم دونوں رہ گئے تھے۔ مدھومالا، ہلا کو حویلی دکن کے لیے لے گئی تھی۔

”نہیں۔“ پانڈے نے جواب دیا ”اس نے کچھ محفوظ ٹھکانے بنا رکھے ہیں اور اس کے چند خاص دوست کے سوا ان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ البتہ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جس روز یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا، وقت میں بھی دیش کھ کے ساتھ تھا۔ ہنگامہ شروع ہونے توڑی دیر پہلے ناگ پال کا ایک آدمی مجھے دہاں سے نکال گیا تھا۔“

”کیا مطلب!“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔

”بعد میں ناگ پال کے اس آدمی دینا تھ نے مجھے تھا کہ یہ منصوبہ ناگ پال ہی کا تھا کہ جس روز ایم لی ہلا لال یہاں پہنچنے والا ہو اسی روز دیش کھ کو موت کے گم اتار دیا جائے اور اس کے قتل کا الزام پولیس پر قوی ہنگامے شروع کر دیے جائیں۔ تمام تیاری پہلے ہی سے کر لی گئی تھی۔ دیش کھ کو ناگ پال ہی نے آدھ کیا تھا کہ ایک گینگ کے ساتھ بسنت پورہ میں ہنگامہ شروع کرے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ پولیس کی بسنت پورہ کے ہنگامے کی طرف منبذل ہو جائے گی تو وہ پارٹی اس وقت ہماری لال کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ جب وہ انز پورٹ سے نکل رہا ہوگا۔“

”دیش کھ کہہ چم جو بڑا ہوا تھا لیکن ناگ پال کی نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ یہ ہلا اہتمام اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا گیا۔ دراصل۔“ پانڈے چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات رکھتے ہوئے کہنے لگا ”دراصل دیش کھ، ناگ پال پر ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے روی اور اس کے دو بھائی اور بچے

ساتھ ہی مارے گئے تھے۔ ناگ پال اس سے بچنے چاہتا تھا اور اس لیے بھی اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ پال کو کسی طرح چتا چل گیا تھا کہ ایم لی ہماری لال آنے والا ہے۔ اس نے ہماری لال کا نام استعمال کیا۔ اصل منصوبہ یہی تھا کہ پولیس ہماری لال کی حفاظت

میں ہوگی اور دوسری طرف دیش کھ کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ دیش کھ جو اجماع پیش سہی لیکن وہ ایم لی کو تھا اور ہنگامے شروع کرنے کے لیے یہ بنیادی کافی تھی۔“

”ناگ پال واقعی بہت چالاک آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر دیش کھ، ناگ پال کے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو میں کسی وقت موقع پا کر اسے ٹھکانے لگا دیتا۔“ پانڈے نے کہا۔ پانڈے کی اس بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ پانڈے نے کچھ کہنے کے بجائے ابھی ہوئی نظروں سے اس میں زبان کے طرف دیکھا رہا۔

”بہن کھ واقعی مہاراجی آدمی تھا۔“ پانڈے کہہ رہا تھا ”یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ سارے کی پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے خزانہ لے کر میں ہی جا گا تھا۔ وہ مجھ سے یہ خزانہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون پر بے پور میں پنڈت موہن داس سے میرے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور پھر موہن داس کو بھی یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نہیں جانتا موہن داس کون ہے لیکن اس کے ہاں کے ساتھ پنڈت کا لفظ ہی اس کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ سلا دیش کھ مارا گیا ورنہ میرے لیے پریشانی پیدا ہو جاتیں۔“

”لیکن میرا خیال ہے کہ جنہیں دیش کھ کی موت کے بعد مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کہا ”پنڈت موہن داس نامی کوئی شخص اگر یہاں آنے والا ہے تو وہ ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔“

”مجھے اس کا احساس ہے۔“ پانڈے نے جواب دیا ”لیکن میں مطمئن اس لیے ہوں کہ میرے اس ٹھکانے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔ نہ دیش کھ کے آدمیوں کو اور نہ ہی ناگ پال کے آدمیوں کو۔“

”لیکن ہمارا وہ مدد جو جس نے ہمیں یہ سب کچھ بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہ بھی میرے اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ پانڈے مسکرایا۔

”لیکن تم باہر تو لگو گے جنہیں آسانی سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے اس کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔“ پانڈے مسکرایا ”میں جب باہر نکلنے کے لیے میک اپ کوں گا تو تم مجھے بھی نہیں پہچان سکو گے۔“

”اگر ہم لاؤنج میں بائیں کرتے رہے اور مدھومالا“

ہلا کو حویلی دکھاتی رہی اور پھر اچانک ہی ہلا کی چٹکی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آواز حویلی کے پچھلی طرف سے آئی تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر اس طرف دوڑ پڑے۔

حویلی کے عقبی برآمدے میں پہنچتے ہی میں رک گیا اور پھر میرے حلق سے بے اختیار رقتہ اڑا۔ مدھومالا نے ہلا کو سونٹنگ پول میں دھکا دے دیا تھا اور اب خود بھی پانی میں چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے پانڈے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا اور ہم دونوں پھر اندر آ گئے۔

○●○

ہمیں اس حویلی میں رہتے ہوئے چار پانچ روز ہو گئے۔ اس دوران اسپیکٹر اعظم خان اور بریندر سے میرا فون پر مسلسل رابطہ رہا تھا۔ ان سے نہ صرف شوبھا کے بارے میں بلکہ شکر کی صورت حال کا بھی پتا چلتا رہا تھا۔ ہنگامے دم توڑ چکے تھے اور شہر بند رنج سکون پڑ رہا تھا۔

اور پھر اس روز شام سے ذرا پہلے پانڈے نے شہر جانے کا پروگرام بنالیا۔ اس نے جو میک اپ کیا وہ واقعی بڑے کمال کا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس میک اپ میں میں بھی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ نہ صرف اس کا چہرہ بدل گیا تھا بلکہ وہ سٹلے سے بھی نیپالی لگ رہا تھا۔ سفید جوڑی دار پاجامہ اس پر چھلدار کر کے اور کالے رنگ کا ہاف کوٹ۔ سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی تھی جس پر گولڈن ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ اس نے کاشیکٹ لینسنر گاڑ کر آنکھوں کا رنگ بھی بدل لیا تھا۔ میں بھی پانڈے کے ساتھ ہویا۔ یوں تو مدھومالا اور ہلا بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں لیکن ہم نے انہیں ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔

پانڈے کی گاڑی بہت شان دار تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ گاڑی اس نے چند مہینے پہلے خریدی تھی۔ اس کا ایک جاننے والا کچھ منافع دے کر یہ گاڑی خریدنا چاہتا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

شہر کے حالات بڑی حد تک پر سکون تھے۔ ہم ہری گوا ڈسٹرکٹ کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ اس علاقے کی تقریباً ساری وکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ریسٹورنٹس بھی آباد تھے۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی لیکن نفسا میں ٹینشن بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

اس وقت سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ پانڈے نے اپنی سار روڈ سے آگے لال دربار کے قریب ایک اینڈ جٹی ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی۔ یہ ایک بڑا



ربانسی ہو مل تھا۔ اس کا اپنا ایک پارکنگ لائ بھی تھا لیکن پانڈے نے گاڑی پار ہی روک لی تھی۔ مجھے گاڑی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے وہ خود نیچے اتر کر اپنے تئ قدم اٹھاتا ہوا ہو مل میں داخل ہو گیا۔

وہ چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ بھی نیپالی لباس میں تھا۔ وہ دونوں کار کی چیمبلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں بھی اپنی سیٹ پر اس طرف مگھوم گیا۔

وہ دینا تھوڑا تھا۔ پانڈے کا وہی دوست یا مخبر جس نے اسے دلشکھ کے بارے میں خبردار کیا تھا اور بعد میں بھی ناگ پال کے بارے میں ٹیلی فون پر اسے اطلاعات فراہم کر رہا۔ مجھے یاد آیا کہ سپر چارج کے قریب ہی پانڈے ٹیلی فون پر اسی کے باتیں کرتا رہا تھا۔

”کون بات میں ہو سکتی تھی۔ اب ذرا تفصیل سے  
 بتاؤ وہ کون لوگ ہیں اور کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ پائندے  
 نے اس کے چہرے پر نظر فرس جاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ تین آدمی ہیں۔“ دینا ناتھ نے جواب دیا ”لیکن  
 ناگ پال سے ملاقات کے لیے ایک ہی آدمی آیا تھا جس نے  
 اپنا نام دین دیا تھا۔“

”تاگ پال کہاں ہے؟“ پانڈے نے اسے ٹوک دیا۔  
 ”نارا دیوی روڈو پال بلڈنگ میں۔“ دیتا ناتھ نے جواب دیا۔  
 ”دین دیال کو تاگ دیال ہی کا ایک قریبی آدمی ہے کہ آیا تھا۔ دین دیال نے تاگ پال کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ تھیں چلا کر اس کے حوالے کرے تو وہ مندر سے لوٹی ہوئی دولت کا آدھا حصہ اسے دے دے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کہنے لگا ”دین دیال جب وہاں سے رخصت ہوا تو میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ وہ کھاک ٹاور کے قریب ایک ٹھہر کھاس ہوسٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔“

”میں ناگ پال کے بارے میں سننا چاہتا ہوں۔ اس نے دین دیال کو کیا جواب دیا تھا؟“ پانڈے نے پوچھا۔  
”اس کا جواب واضح نہیں تھا۔ اس نے دین دیال کو انتظار کرنے کو کہا تھا۔“ دینا ناتھ نے جواب دیا۔  
”ان کی ملاقات کب ہوئی تھی؟“ پانڈے نے پوچھا۔  
”کل رات کو۔“ دینا ناتھ نے جواب دیا ”دین دیال نے کہا تھا کہ وہ دیش کھی کی طرف سے اطلاع ملنے پر یہاں آئے ہیں۔ میں تو تمہیں کل رات ہی بتانا چاہتا تھا مگر میرے پاس تو تمہارا فون گزربھی نہیں ہے۔“

”میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔“ پائڈے نے کہا۔  
 پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر گیا۔ اس نے  
 بورڈ کا خانہ کھول کر بڑی مالیت کے چند نوٹ نکال کر پائڈے  
 کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ”یہ معلوم ہوا کہ تم ضروری سیٹ  
 لوگوں میں کیا ذیل ہوتی ہے۔ میں کل صبح تمہیں فون  
 کیا۔“

دینا تاتھ نے نوٹ جب میں ٹھونے اور کارتے اپنے  
ہاتھوں نے انجی اشارت کر کے گاڑی آگے بڑھادی۔  
گاڑی کے باہر کی طرف گئے ہوئے سائیڈ مرر کو دیکھا۔  
میں دینا تاتھ کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا گاڑی  
کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ایک موڑ محسوس کرنا ہی تھی کہ گاڑی  
نکل گئی۔

مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں آیا تھا اور جب میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو پانڈے کے ہونٹوں پر خفہ مسکراہٹ آگئی۔

”میرا پولیس کا بیس سال کا تجربہ ہے“ وہ بولا۔  
انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے اندر تک جھانک لے  
ہوں۔ دینا نا تھ کے بارے میں، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں  
کہ یہ مجھے دھوکا نہیں دے گا۔“

”بعض اوقات چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔  
 بہر حال، یہاں تمہاری ملاقات شاید پہلے سے طے تھی۔  
 اس نے تمہیں پہچانا کسے؟“

”میں تو اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن وہ نے  
نہیں پہچان سکا تھا۔ میں نے ہی اپنی شناخت کرائی تھی۔  
اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پائے نے گاڑی ایک دو جھوسوں پر روک کر پکڑ لیا۔  
 خریدیں۔ ان میں بڑھیا شراب کی دو بوتلیں بھی تھیں۔  
 تھیں۔ جب اس نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو تین نے گاڑی  
 اسپتال کی طرف مڑوا لی۔

اس وقت آٹھ بجنے والے تھے۔ مایا متی کی ڈوب لیا۔  
ختم ہو چکی تھی لیکن وہ اس وقت بھی اسپتال میں موجود تھی۔  
وہ مجھے راپداری ہی میں مل گئی تھی۔ جب میں کمرے  
داخل ہوا تو شوہنا مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔ شہر کے حالات  
وجہ سے پچھلے دنوں وہ بھی خاصی پریشان رہی تھی۔  
میں پانڈے کو گاڑی میں چھوڑ آیا تھا اس لیے میں  
شوہنا کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھا۔  
شوہنا کیلئے اسپتال میں تھی۔ واپسی پر ہم پر تھوکی پانی  
طرف سے گزرے تو پانڈے نے حک کے قریب

یوں کہ ایک طرف سے ایک اور لوگ بھی جمع تھے۔  
 چوک کے وسط میں بھدرا کالی کا مندر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔  
 چوک کا زانچا رہ گیا تھا جس میں کیسیں کیسیں سے اب بھی  
 اس کے کلکس اٹھ رہی تھیں۔

دعوتِ شریعت جس طرف سے بھی گزرے تھے کئی جگہوں پر  
اس قسم کے مناظر دیکھنے کو ملے تھے اور مجھے یہ سب کچھ دیکھ  
کر دکھ ہوا تھا۔ چند لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے پورے  
شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ کئی بے گناہ مارے گئے

تھیں۔ آرنیکو روڈ سے گزرتے ہوئے میں نے کار پولیس کے  
ڈاک بنگلے کی طرف مڑوالی میں کاشا کی خریدت دریافت کرنا  
چاہتا تھا لیکن قریب پہنچتے تو میرا دل گویا دھڑکنے لگا۔  
ڈاک بنگلہ بھی لے کر ڈاکس میں چکا تھا۔ دو پولیس والے ایک  
درخت کے نیچے بیٹھے شاید اس بے گے کی حفاظت کر رہے تھے۔  
میں نے ان سے کاشا کے بارے میں دریافت کیا تو بتا چلا کہ وہ  
ڈاک بنگلے پر حملے میں زخمی ہو گیا تھا اور پولیس اسپتال میں زیر  
علاج ہے۔

ہم کھوکھلا دھوا کے ساتھ ساتھ رام شاہ پاتھر ہوئے  
ہوئے جتنی سارو ڈھیر نکل آئے وہاں سے بانڈے نے گاڑی  
دوسری طرف موڑ دی اور اس طرح مختلف علاقوں سے  
ہوئے توئے ہم شکر کے نواح میں پودا تھک کی طرف جانے والی  
مڑک پر مل گئے جب ہم حویلی پہنچے تو ساڑھے نو بج رہے  
تھے۔

حویلی میں ایک نئے چرے کو دکھ کر میں ٹھک گیا۔ اس آدمی کا تہ چنٹ تو ضرور رہا ہوگا۔ کسرتی بدن مضبوط ہاتھ تھے اور ٹھمری ہوئی رحمت۔ اس کے سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے اور چرے کے نقوش میں کسی حد تک چیزیں جیسی مشابہت تھیں۔ اس نے پانی جینز اور چمڑے کی بغیر آئین کی جینک پن رکھی تھی جس کے سامنے بٹن کھلے ہوئے تھے اس کا سبز بالوں سے بھرا ہوا تھا اور گلے میں سیاہ رنگ کا ایک دھکا چڑا ہوا تھا جس میں قریب قریب متعدد گریں لگی ہوئی تھیں۔

”یہ کون ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے پانڈے کی طرف دیکھا۔

شیریا۔ "پانٹے نے جواب دیا "مردھو ملا کے باپ کا ملازم ہے۔ کبھی کبھی یہاں آجاتا ہے۔"

ہم کار سے اتر کر برآمدے میں آگئے۔ شیریا نے ہم دونوں کو سلام کیا اور ہمارے لیے اندر جانے کے لیے دروازہ

کھول دیا۔ اس کا انداز فدیہ مانہ تھا۔ اس سے میں نے فوراً ہی انداز لگا لیا کہ وہ بڑا شعلیق اور خدمت گزار قسم کا آدمی ہے۔

مرد عموالا اور بیلا کمرے میں تھیں۔ آواز سن کر وہ بھی لاونچ میں آگئیں۔ نیپالی ملازم نے بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ ہانڈے نے اثبات میں سر ہلادیا اور نیپالی ملازم میز پر کھانا لگانے لگی۔ شربا بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

جب میں اسپتال میں داخل تھا اور بعد میں بھی مایوسی کے ساتھ رہ رہتا تھا تو وہ مجھے خیال کے بارے میں دلچسپ باتیں بتاتی رہتی تھی۔ اس نے مجھے شیرپا فیملے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ خیال کی بارہ ملین آبادی میں شیرپا قبیلوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور یہ نسل رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی عکڑیوں میں بکھرے ہوئے شیرپا قبائلی خیال کے بلند برف پوش پہاڑوں پر آباد ہیں۔ سردیوں کے موسم میں بھی یہ لوگ صحیح سمندر سے کم از کم ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر رہتے ہیں اور گرمیوں کے موسم میں یہ لوگ نقل مکانی کر کے سولہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی تک چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت سختی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان خطرناک پہاڑی راستوں پر، جہاں ایک عام آدمی قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، یہ شیرپا قبائلی بے خوف و خطر بندروں کی طرح اچھلتے کودتے چلے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں سرائے سنڈ ہٹیری نے ۲۹۰۲۸ فٹ بلند مائونٹ ایورسٹ کی چوٹی کو سر کیا تو اس کے ساتھ نارگائے تیانگ نامی آدمی ایک شیرپا ہی تھا۔ یہ دونوں دنیا کے پہلے انسان تھے جنہوں نے دنیا کی بلند ترین چوٹی کو پہلی مرتبہ سر کیا تھا۔ آج بھی کوہ پیا مائونٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا عزم کرتے ہیں تو سامان اٹھانے کے لیے شیرپا قبیلوں ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس وقت کھانے کے دوران شیرپا فیملی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ غصے جو اس وقت ہمارے سامنے موجود تھا اس کا اصل نام لا جوت تھا۔ وہ بھی ہماری باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا اور اپنے فیملی کی بعض دلچسپ رسموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”ہم سے زیادہ دلچسپ تو ستانگ قبیلہ ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ قبیلہ بہت کی سرحد کے قریب تقریباً بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر ستانگ نامی علاقے ہی میں آباد ہے۔ یہ لوگ اگرچہ مدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی بعض رسمیں مدھ کے بیرو کاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ستانگ قبیلے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی آبادی میں

زیادہ تعداد مردوں کی ہے۔ عورتوں کی تعداد ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ”وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ کن آنکھوں سے بللا اور مدھولا کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میرا شادی بیاہ کے رسم و رواج دنیا سے بالکل مختلف ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی مرد یہ بدادشت نہیں کر سکتا کہ اس کی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ رات گزارے لیکن متانگ قبیلے کی عورتیں دو دو تین تین اور بعض اوقات چار چار شادیاں کرتی ہیں لیکن شوہروں کا آپس میں کوئی بھگڑا نہیں ہوتا۔ وہ بڑے اتفاق سے مل جل کر رہتے ہیں اور مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ متانگ ہی میں آباد بعض قبیلے ایسے ہیں جن کی شادی کی رسمیں ان سے بھی مختلف اور زیادہ دلچسپ ہیں۔“

”وہ بھی دو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”اس قبیلے میں ایک لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے تو اسے اپنے شوہر کے بھائیوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شوہر کی طرح اس کے بھائیوں کا بھی لڑکی پر اتنا ہی حق ہوتا ہے۔ لڑکی کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ البتہ اسے یہ دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ اس کے پیٹ میں پٹنے والے بچے کا باپ ان بھائیوں میں سے کون ہے۔“

”خاصا مشکل کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”عورتوں کے حصے میں تو ہمیشہ مشکل کام ہی آتے ہیں۔ عیش تو مرد کرتے ہیں۔“ مدھولا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ لاجپوت شیرپا برتن سینے اور دوہونے میں بھی نیپالی ملازمہ کی مدد کرتا رہا پھر وہ ہمارے لیے کافی بنا کر لے آیا۔ اس نے کافی کے مکے ہمارے سامنے رکھے اور خود قالیں پر آئی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور باتوں کا سلسلہ ایک بار پھر چل نکلا۔ شیرپا نیپال کے اونچے برف پوش پہاڑوں میں آباد مختلف قبیلوں کے بارے میں یہ دلچسپ باتیں بتاتا رہا اور ہمیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں رہا اور جب گھڑی کی طرف دیکھا تو دو بج رہے تھے۔ مدھولا اور بللا تو بچانے کب وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چل گئی تھیں۔ ان دونوں میں خوب گاڑھی جھنجھٹے لگی تھی اور وہ دونوں رات کو سوئی بھی اٹھی ہی تھیں۔

مجھے بھی جنابیاں آنے لگی تھیں اور پھر کچھ دیر بعد میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

○☆☆○

دو دن اور گزر گئے۔ اس دوران صرف ایک بڑے اعظم خان سے ٹیلی فون پر میرا رابطہ ہو سکا تھا۔ وہ اور نیز ناگ پال والے معاملے میں مصروف تھے اور اعظم خان نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں فی الحال پانڈے کی حویلی میں رہوں۔

پانڈے بھی ٹیلی فون پر دینا تھا کہ رابطہ رکھے۔ تھا لیکن دن دیال وغیرہ کے بارے میں اسے مزید کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

پانڈے خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

اس رات میں اور پانڈے دیر تک لان میں بیٹھے رہے۔ چاندنی میں ارد گرد کا ماحول بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔ ہمارے گفتگو کا موضوع ناگ پال ہی تھا۔ دلش ختم ہو چکا تھا۔ جس مشن پر اس کے پیچھے آیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔

اس کے چنگل سے چھڑا لیا گیا تھا۔ دلش بھی کچھ ایسے الجھن پہنچ چکا تھا۔ اصولی طور پر مجھے شوہا کو لے کر ہندوستان واپس چلے جانا چاہیے تھا لیکن میرا کچھ اور نئے مسائل سامنے آ گئے تھے اور مجھے جیسا خدا کی فوج دار ان سے نظریں نہ چرا سکتا تھا۔ انیسواں اعظم خان نے شوہا والے معاملے میں میری بڑی مدد کی تھی۔ وہ اسے ایک مشن پر مبراں تھا تھا۔

مجھے ان سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ناگ پال میرا بہت اونچا سیاسی کھیل، مکمل رہا تھا اور مجھے صرف ان معاملات سے دلچسپی تھی جن کے لیے یہ کھیل کھلا جا رہا تھا اور بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ جزل کھوراث کو کم از کم اس خطے میں اس گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا جس کے لیے راہ ہموار کی جارہی تھی لیکن ان بنگاموں کی وجہ سے سارا گز بڑھو گئی تھی۔ میں شہر سے دور اس حویلی میں دیک کر رہ گیا تھا۔ سوما وغیرہ سے بھی میرا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ پانڈے کو ناگ پال سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔

چانگ لی کے بارے میں بھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ کئی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ یہ سب کچھ سچے ہوئے میں نے حویلی سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے روز پانچ بجے کے قریب میں اکیلا ہی اپنی گاڑی حویلی سے نکل گیا۔ شہر کی رونق لوٹ آئی تھی۔ لوگ کچھ بھول گئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنا کابو کیا۔ شوہا اب پہلے سے بہتر تھی۔ اس کے چہرے

ی سرخی بھی نظر آنے لگی تھی۔ میں ساڑھے سات بجے تک شوہا کے پاس بیٹھا رہا اور جب واپسی کے لیے روانہ ہوا تو یامامتی بھی میرے ساتھ تھی۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی بھر لیا مٹی کو اس کے قہقہے پر چھوڑا اور میں ریڈ لائٹ ایریا کی طرف نکل آیا۔ جہاں پہلی مرتبہ سوما سے ملاقات ہوئی تھی۔ سوما اس علاقے میں نہیں تھا تاہم اس کے ایک اور آدمی سے سامنا ہو گیا جو مجھے گھناؤنا چوک پر لے آیا۔

سوما اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نہایت گھٹیا سا ریسٹورنٹ تھا اس کے اوپر نئی جڑی مکانات تھا جس میں رکشوں کی بھٹی قائم تھیں۔ تو واپسی ہوئی میں آدھ رات کے لیے الگ راستہ تھا لیکن ریسٹورنٹ کے اندر سے بھی راستہ موجود تھا۔

میں سوما سے باتیں کر رہا تھا کہ زینے سے دو آدمیوں کو اترنے دیکھ کر چونک گیا۔ ایک تو لمبا ترنگا اور دوسرا کٹا آدمی تھا۔ سر پہ آٹھ گھنٹیں سرخ اور موچیں اس طرح چھپے وار تھیں جیسے گھروں کی کڑیاں چپکے رکھی ہوں اور دوسرا آدمی دینا تھا تھا۔ پانڈے کا تجربہ اور دوست۔ دراصل میں اسی کو دیکھ کر چونکا تھا۔

دینا تھا نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس لیے ترنگے آدمی کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ میرے دماغ میں سنسنیٹ ہی ہونے لگی۔ دوسرا لمبا ترنگا آدمی یا تو دین دیال تھا یا اس کا ساتھی لیکن دینا تھا کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اندر ہی اندر کیا کچھڑی پک رہی ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ دینا تھا واپس آئے تو مجھے دیکھ لیں۔ سوما کو لے کر اٹھ گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ہم اس علاقے سے بہت دور ایک اور ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔

”اب سب سے پہلے تمہیں چانگ لی کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔“ میں نے سوما کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”وقت گزر گیا تو انہیں یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔“

”میں نے اس جینی کا ٹھکانہ معلوم کر لیا تھا لیکن اسی روز مجھے شروع ہو گئے اتفاق سے کل میں اس طرف گیا تھا کہ کڑیاں گھبرا کر اٹھ گیا ہے۔ میں ایک دو دن میں معلوم ہو کر میری تمہیں کہاں اطلاع دی جائے۔“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

”تم مجھے اپنا کوئی ایسا پتہ دو جہاں روزانہ کم سے کم ایک گھنٹا خود موجود رہو۔“ میں نے کہا۔

”میں روزانہ شام چھ سے آٹھ بجے کے دوران اس نمبر پر موجود رہوں گا۔“ سوما نے ایک کانڈ پر نمبر لکھ کر میری طرف بڑھا دیا ”یہ دربار اسکوائر کے ایک ریسٹورنٹ کا نمبر ہے۔ میرا متنازعہ تو مجھے فوراً ہی ملایا جائے گا۔“

”ایک بات اور۔“ میں نے کانڈ جب میں رکھتے ہوئے کہا ”دینا تھا کو جانتے ہو؟“

”ہم پہلے جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے میں نے اسے وہاں دیکھا تھا اور میرا خیال ہے تم اسی کی وجہ سے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔“ سوما نے کہا۔

”ہاں۔ ٹھیک سمجھے۔ وہی دینا تھا۔“ میں نے کہا ”اپنا ایک آدمی اس کی عمرانی پر لگا دو۔ میں اس کی سرگرمیوں سے آگاہ رہنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ کام تو میں آج ہی سے شروع کر دیتا ہوں۔ وہ رات نو بجے کے بعد عام طور پر اندر اچوک کے آس پاس ہی رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ میں نے سیٹ چھوڑ دی اور سوما سے ہاتھ ملا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سوما وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

میری گاڑی شہر سے نکل کر دینا تھا کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس وقت فوج رہے تھے۔ یہ سڑک بالکل سنسان تھی۔ پورے راستے میں صرف ایک گاڑی سامنے سے آئی ہوئی تھی۔

حویلی والے راستے پر مڑتے ہی میں نے کار روک لی۔ چاندنی رات میں اونچے ٹیلے پر حویلی کا ہیولا بڑا پراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ اگر ایسے میں اچانک ہی عورتوں کے بین کرنے، رونے اور جھنجھٹے کی آوازیں سنائی دیتے لگیں تو بتائی ہو جائے۔ میں کافی دیر حویلی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس رات میں نے پانڈے کے سامنے دینا تھا کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں سی ابھر آئیں۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ دینا تھا ہی تھا۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میں جو چہرہ ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہوں اسے کبھی نہیں بھولتا۔“ میں نے جواب دیا ”دینا تھا کو اس شخص کے ساتھ دیکھ کر مجھے شبہ ہی نہیں نہیں ہو گیا ہے کہ وہ تمہارے خلاف

اور فوراً ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔  
چچ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے  
طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب  
ہوئے نیند میں چپٹی ہوئی لیکن وہ پرسکون اور گرمی نیند  
تھی۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا  
ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میرے دماغ میں سنسناہر  
ہو رہی تھی۔ وہ نسوانی چیخ شاید میرا واہمہ تھی۔ میں  
لیٹ گیا لیکن اسی لمحے چچ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔  
واہمہ نہیں تھا۔ چلے ہال سے نیپالی ملازمہ کے چپنے کی  
سناکی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اٹھانچ کی آواز  
سنائی دینے لگی۔

میں ایک جھٹکے سے سٹی سے اٹھ گیا۔ بلا بھی بل  
جاگ گئی تھی۔  
”ٹھیک۔ کیا ہوا؟“ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے  
اُدھر دیکھنے لگی۔  
”شی!“ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے  
رہنے کا اشارہ کیا ”پتوں کہاں ہے؟“ میرا لہجہ بھی سرگرم  
تھا۔

”وہ تو دیکھو ہے۔ سوٹ کیس میں۔“  
جواب دیا۔

چچنے سے چیخنے اور اٹھانچ کی آوازیں بدستور سنائی  
دیتی تھیں۔ مجھے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں  
کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میں نے بلا کو کمرے ہی میں  
اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر  
لمحے فائر اور اس کے ساتھ ایک نسوانی چیخ کی آواز  
نیپالی ملازمہ کی چیخ تھی۔ بدحوالا کے چیخنے کی آواز  
بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

میں ہال میں دبے قدموں بالکونی کی طرف بڑھے  
ریٹنگ کے قریب پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا لیکن وہاں  
دکھائی نہیں دیا۔ میں زینے کی طرف آگیا۔ چند لمحوں  
کرمیں نے بالکونی کی پست کے نیچے جھانکا تو مجھے اہل  
کے بجائے کپڑوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ تین آدمی تھے اور میرے خدشات بالکل  
ثابت ہوئے تھے۔ ان میں ایک رونا تھا۔ دو مرد  
ترنگ دین دیال جس کے ساتھ رونا تھا کہ بدستور  
ہوئے دیکھا تھا۔ تیسرا آدمی بھی لبا ترنگ تھا لیکن اس  
میرے لیے اجنبی تھا۔

کوئی سازش کر رہا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تو تم بھی کرو  
گے کہ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ہر شخص دولت  
حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تم نے دولت کے لیے اپنی ساری زندگی  
کی نیکیوں پر پانی بھیر دیا تھا۔ تم جیسا فرض شناس اور دیانت  
دار شخص دولت کے لالچ میں آسکتا ہے تو رونا تھ جیسے شخص  
کی کیا حیثیت ہے۔ وہ لوگ تو ہیں ہی دولت کے پجاری۔  
چرس اور ہیروئن بیچنے والے ایک ایک روپے کے لیے  
لڑنے والے۔ انہیں صرف اور صرف دولت سے محبت ہے۔  
کسی کی زندگی کی انہیں کوئی پروا نہیں۔ پچھلے دنوں اس شہر  
میں جو کچھ بھی ہوا ہے سب کچھ دولت کی ہوس میں ہی تو ہوا  
ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔

”رونا تھ تو ناگ پال کا ایک معمولی سا کارندہ ہے۔  
ایسے لوگ تو جلدی لالچ میں آجاتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ  
دین دیال نے رونا تھ کو لالچ دیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے  
کوئی حصہ لے ہو گیا ہو اور رونا تھ ان کا ساتھ دینے کو تیار  
ہو گیا ہو۔ میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تھا تو اپنے  
خدشات کا اظہار کر دیا تھا اور اب پھر تمہیں خبردار کر رہا  
ہوں۔ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ پانڈے نے گمراہی سے لیا ”اس کا  
کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ میں کل ہی۔“

مدھومالا اور بلا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے جملہ  
مکمل نہیں کیا اور پھر میں نے بھی موضوع بدل دیا۔

اس رات کھانے کے بعد مدھومالا پانڈے کو لے کر  
اپنے کمرے میں ٹھکس گئی اور میں بلا کو لے کر اور ایک  
کمرے میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد شینا بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ  
مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہانپ رہا تھا اور اس کی زیادہ گھپ  
شب میرے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب قالین پر  
الٹی پالٹی مار کر بیٹھ گیا اور نیپال کے برف پوش پہاڑوں میں  
آباد مختلف قبیلوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ  
کرنے لگا۔

بارہ بجے کے قریب شینا بچے چلا گیا تو میں نے کمرے کا  
دروازہ کھولا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر خفیہ میں دور تک  
چھلی ہوئی وادی کو دیکھنے لگا۔ چاندنی رات میں وادی کا یہ منظر  
دلچسپ بھی تھا اور دل فریب بھی۔

میں کافی دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر مڑ کر بیڈ کی  
طرف آگیا۔ بلا سوچتی تھی۔ وہ اس طرح آڑی ترچھی چھلی  
ہوئی تھی کہ میں لیٹنا چاہتا تو اسے ایک طرف ہٹانا پڑا۔ میں  
نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سینی پر لیٹ گیا

ان میں سے ایک نے پانڈے کو ہسپتال کی زور پلے رکھا تھا۔ دین دیال نے شیرپا کو پیچھے سے اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا انجیر شیرپا کی گردن کو چھو رہا تھا۔ دینا تھ نے مدھملا کر گرفت میں لے رکھا تھا۔ مدھملا کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔

”تم بہت چالاک بناتے تھے پانڈے۔“ دینا تھ کہہ رہا تھا ”میں تو پورے خلوص سے تمہارے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا تھا لیکن تم نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ دین دیال نے جب بتایا کہ معاملہ کروڑوں روپے کے خزانے کا ہے تو میرا ایمان بھی ڈانٹاں ڈول ہو گیا۔ ہمارا ایمان ہی کہاں ہے ہم تو دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ جہاں چمک و کھلانی دی اسی طرف مڑ گئے۔“

”تم مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں اپنے اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن۔ تم یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟“ پانڈے نے کہا۔

”تھوڑی سی عقل میری کھوپڑی میں بھی ہے جسے میں کبھی کبھی استعمال کرتا ہوں۔“ دینا تھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”تم نے مجھے اپنے کسی ٹھکانے کے بارے میں کبھی نہیں بتایا لیکن اس رات میں نے تمہاری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا اور پھر وہ پہلے رجسٹریشن آفس سے تمہارا پتا معلوم کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہم تو کل ہی یہاں آجائے لیکن یہ مہاشے کچھ اور تسلی کر لیتا چاہتے تھے۔“

”تمہارے لیے اب ایک ہی راستہ ہے انپکڑ پانڈے“ دینا تھ کے خاموش ہوتے ہی دین دیال بول پڑا ”کھانی کے مندر سے لوٹی ہوئی دولت ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے یہ حوالی کار اور لونڈیا تمہارے پاس ہی رہے گی۔ ہم تمہیں چند لاکھ کی بیسٹ بھی دے دیں گے تاکہ تمہیں سڑکوں پر ہاتھ پھیلا کر بھیک نہ مانگنی پڑے۔ انکار کی صورت میں پہلے اس لونڈیا کا شر خراب کیا جائے گا۔ تمہارے سامنے اور پھر تم۔ تمہیں ہم آسانی سے نہیں ماریں گے اس وقت تک نہیں مرنے دیں گے جب تک تم لونڈا ہوا خزانہ ہمارے حوالے نہیں کر دو گے۔“

”تم میرے ٹکڑے بھی کر ڈالو تو میں خزانہ تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔“ پانڈے نے جواب دیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک اور آدمی بیڑھیوں کے نیچے والے کمرے سے نکل کر سامنے آیا۔ اس کا چہرہ میں نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ بھی اپنے دوسرے دونوں ساتھیوں کی طرح عجیب

عظیم تھا۔

”وہ نیچے کسی کمرے میں نہیں ہے۔ اس کی آواز سماعت سے غلطی“ وہ یقیناً مجھے تلاش کر رہا تھا۔“ اس کی آواز ”اوپر جا کر دیکھ پنڈت موہن۔“ دینا تھ نے کہا۔

پنڈت موہن بیڑھیوں کی طرف گھوم گیا۔ اس میں بھی ہسپتال تھا۔ اس طرف مڑتے ہی اس کی نظر اٹھ گئی تھیں۔ میں اس کی نظروں سے چھپا نہیں رہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے چپے ہوئے بڑی تیزی سے ہاتھ اور اٹھا کر گولی چلائی۔ اندھا دھند چلائی گئی گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

پنڈت موہن کو دو سرفاز کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور زبردستی کے اوپر سے ہوتا ہوا پنڈت موہن کے اوپر گرا۔ اسے ساتھ لیتا ہوا قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ پنڈت موہن کے سر سے نہ صرف نچل چکی تھی بلکہ ہسپتال ہی اس کے ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔

صورت حال ایک دم بدل گئی۔ پنڈت موہن کی کچھ فازی آواز نے دین دیال کو دیکھ کر ایک لمحے کو بدحواس کر دیا تھا۔ شیرپا اور پانڈے نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ پانڈے اپنے حریف پر بھجوانے اس کے حریف کے ہسپتال والے ہاتھ پر لگی اور ہسپتال ہوا میں ان بیڑھیوں پر جا کر۔ وہ دونوں آپس میں ختم کھڑے ہوئے۔

شیرپا نے بھی اپنے حریف کو پلٹ دیا تھا۔ دین دیال کے اوپر سے قلابازی کھانا ہوا پلٹ کے بل واپس آئے۔ شیرپا اٹھ کر اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا کہ دینا تھ نے مدھملا کر اس کی کھوپڑی پر زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ لڑکھانا ہوا پیچھے گرا۔ دین دیال کا انجیر کچرچر اس کے ہاتھ نہیں رہا تھا لیکن اس نے شیرپا پر چھلانگ لگا دی۔ ان کے ہاتھ دینا تھ بھی شیرپا کی طرف بھجوا تھا۔ شیرپا بڑی خوب صورت سے ان دونوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

میرا حریف پنڈت موہن مجھ سے اس طرح چلتا ہوا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ جھلکا گیا۔ پنڈت موہن میرے اوپر سے قالین پر گرا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو موہن نے بڑے بڑے میرے سینے پر زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ پشتمل کے بل گر گیا۔ موہن نے دین دیال والا انجیر

مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس وقت دونوں کنبیاں زمین پر ٹکائے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنڈت موہن نے خنجر کو تلواری کی طرح پکڑ کر میرے سینے پر وار کیا۔

اور پھر جو کچھ بھی ہوا وہ جرت انگیز تھا۔ خنجر میرے سینے پر لگا تو چھانٹنے کی ایسی آواز سنائی دی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو۔ پنڈت موہن کے ہاتھ کو بھی اسی طرح زوردار جھٹکا لگا تھا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ وہ خود بھی چپے اٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت ابھر آئی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے گلے کی طرف اٹھ گیا۔ میری انگلیاں اس پر اسرار ملا کو پھونکنے لگیں جو نیلگر کی اس روز اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گئی تھی۔

پنڈت موہن نے بھی میرے گلے میں سیاہ پتھروں کی وہ ملا دیکھ لی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت پھیلنے لگی تھی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے نیچے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں اسے رگید آچلا گیا۔

شیرپا نے دین دیال کی گردن اپنے سیدھے بازو کے شکنجے میں دبا لی تھی۔ طاقت قد قوت میں وہ دونوں ایک جیسے تھے لیکن دین دیال اس کے مقابلے میں کچھ کمزور پڑا تھا۔ اس کی دوج شاید یہ تھی کہ وہ شراب پینے کا عادی تھا اور شیرپا نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ وہ شراب اور کسی اور نشے کے کبھی قریب نہیں گیا تھا۔ دینا تھ بھی شیرپا پر بار بار حملہ کر رہا تھا لیکن شیرپا کی لاتیں بھی چل رہی تھیں جس وجہ سے دینا تھ اپنے حلقوں میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

پانڈے اپنے حریف سے ٹھنسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شراب نے پانڈے کو بھی اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ اس کا حریف اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ پانڈے کو بری طرح رگید رہا تھا لیکن ایک مرتبہ پانڈے کو موقع مل گیا۔ اس نے اپنے حریف کو دوڑا اچھال دیا اور یہ پانڈے کی بد قسمتی تھی کہ اس کا حریف صوفے کے قریب اس جگہ گرا تھا جہاں ہسپتال بڑا ہوا تھا۔ پانڈے نے متنبہ کر اس پر چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن اس کا حریف ہسپتال اٹھا چکا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی چلا دی۔

شیرپا نے دین دیال کی گردن موڑ دی تھی۔ وہ ایک طرف پڑا خواب کر رہا تھا۔ اسی دوران پنڈت موہن نے مجھے سر سے اوپر اٹھا کر ایک طرف اچھال دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں دیوار سے ٹکرا کر گروں گا لیکن مجھے پھون لگا جیسے کسی تادیہ

قوت نے مجھے سنبھال لیا ہو۔ میں بڑے آرام سے بیروں کے بل زمین پر آیا تھا جیسے میں نے خود کسی اونچی جگہ سے چھلانگ لگائی ہو اور یہ وہی موقع تھا جب پانڈے کے حریف نے اس کے سینے میں گولیاں اتاری تھیں۔

”خبردار۔“ پانڈے کے حریف کی چیخنی ہوئی آواز سنائی دی۔ گولی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میں اس وقت پنڈت موہن کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس شخص نے ایک بار پھر چرچ کر مجھے خبردار کیا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کروں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہسپتال کا رخ میری طرف کر دیا لیکن ٹھیک اسی لمحے ہال کی نصاب ایک بار پھر فازی کی آواز سے گونج اٹھی۔

یہ گولی بلا نے چلائی تھی جو بالکل نی سے اتر کر زمین پر آگئی تھی اور اس نے زمین پر پڑا ہوا پنڈت موہن والا ہسپتال اٹھا کر فازی کر دیا تھا۔ گولی اس شخص کی ٹانگ پر لگی تھی جس نے مجھے ہسپتال کی زور پلے رکھا تھا۔ بلا نے ایک اور گولی چلا دی۔ اس مرتبہ اس کا نشانہ خالی گیا۔ وہ شخص لنگڑا تا ہوا لیکن میں کھس گیا۔

پنڈت موہن نے بھی اس طرف دوڑ لگا دی تھی۔ دینا تھ نے بھی ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن شیرپا نے اسے روک لیا اور اسے گھسیٹا ہوا ایک صوفے کے پیچھے لے گیا۔

لیکن کی طرف سے چلائی جانے والی ایک گولی مدھملا کی ٹانگ پر لگی جو ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی میں ایسا وقت پہلے بھی نہیں آیا تھا۔ وہ خوف سے سر تھرکانپ رہی تھی۔ ٹانگ پر گولی لگی تو وہ چیخنی ہوئی نیچے گر گئی۔

بلا نے بھی بیڑھیوں سے چھلانگ لگا دی۔ بلا بہت عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ پہلے وہ بھی مدھملا ہی کی طرح تھی۔ ناز انھوں نے والی لیکن سارے کھنگل میں پیش آنے والے واقعے کے بعد تو وہ ایک دم بدل گئی تھی۔ رشی کیش سے شوہا اور سونیا کے اغوا کے بعد ہر دار میں اس نے غنڈوں پر جس طرح گولیاں چلائی تھیں وہ ایک قابل تعریف بات بھی اور اس وقت بھڑا گویا وہ فارم میں آئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں میں ہسپتال تھامے لیکن کے سین سامنے آگئی اور بے در پے زیر گرد بائی چلی گئی۔ اس تا بہ تو فازی رنگ سے بچنے کے لیے پنڈت موہن نے لیکن کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

بچن میں مٹی کے تیل کا چلو استعمال ہوتا تھا۔ کیرو سین کا ڈرم بچن کے دروازے کے باہر کی طرف دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ ہمارے چلائی ہوئی آخری گولی اس ڈرم میں گئی۔ تیل کی دھار بہہ نکلی جس نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ بچن کے سامنے آگ بڑی تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ بلا اس آگ کی پروا کیے بغیر دوڑ کر بچن کے قریب پہنچ گئی۔ دروازہ بند ہی تھا۔ اس نے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ فرش پر ہوتا تیل دروازے کے بچن کے اندر داخل ہونے لگا۔ اس طرح آگ کے شعلے اندر بھی پہنچ گئے تھے۔ اندر سے دروازہ دھڑھڑایا جانے لگا۔

شیرپا نے دینا تھک کو چھوڑ کر مدھولا کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ دینا تھک نے ہال کے عقبی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ شیرپا مدھولا کو کندھے پر لاد کر باہر کی طرف دوڑا۔ آگ بڑی تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ میں نے چنگ کر بلا کو باہر نکل جانے کو کہا اور دینا تھک کو کھینچا ہوا میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔

شیرپا نے مدھولا کو عمارت سے دور لے جا کر گھاس پر ڈال دیا اور دوڑا ہوا پورچ میں پہنچ گیا۔

”صاحب جی۔ اپنا گاڑی نکالو۔ دور لے جاؤ۔ گیٹ کی طرف۔ جلدی کرو۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے چنگ کر کہا اور پانڈے والی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

میں نے دینا تھک کو بلا کے حوالے کر دیا اور دوڑا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور آجی انشورٹ کر کے اسے رپورس کر کے میری پیچھے گیٹ کی طرف لپٹا چلا گیا۔ شیرپا بھی اپنی گاڑی پہنچنے لے آیا تھا۔

حولی کے ہال میں آگ پھیل گئی تھی۔ مٹی کا ہوتا ہوا تیل جہاں بھی پہنچا تھا وہاں اس نے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ اندر سے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پانڈے اور نیپالی ملازمہ کی لائیں بھی اندر ہی تھیں۔ انہیں باہر نکالنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں پوری حویلی آگ کی لپیٹ میں آجائے گی۔

میری کار کی ڈک میں ایک رسی موجود تھی۔ میں نے رسی نکال کر دینا تھک کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت ہم جہاں گئے کماں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جہما کا سا ہوا۔ مایا متی کا مکان موجود تھا اور وہ مکان ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت

ہو سکتا تھا۔

”صاحب جی!“ شیرپا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ پہلی... کاٹنگ سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے اسے کپڑے باندھ دیا ہے لیکن اس کا علاج ضروری ہے۔ آپ اپنا گاڑی پرینڈ کر ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔“

میں نے پانڈے والی گاڑی کی طرف دیکھا۔ مدھولا سیٹ پر نیم دراز تھی۔ اس نے دانت بھیچ رکھے تھے۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

”کہاں چلو؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ ہمارے پیچھے آؤ۔“ شیرپا نے یہ کہتے ہوئے حویلی کا چھانک کھول دیا اور پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آجی انشورٹ کر دیا۔ بلا بھی دوسری سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ حویلی کے اندر آگ پھیل چکی تھی شعلے اب کھڑکیوں سے باہر لپک رہے تھے۔ پیش سے شیشے چنگ کر ٹوٹ رہے تھے۔ کھڑکیوں کے جھنڈے کی آوازوں اور شعلوں کی بھر بھراہٹ میں پیڈل موہن اور اس کے ساتھی کی چیخوں کی آوازیں دب گئی تھیں یا پھر وہ جل کر بھسم ہو چکے تھے۔

حولی کے چھانک سے باہر نکل کر میں نے شیرپا کی گاڑی کو آگے نکلنے کا راستہ دیا اور اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

دونوں گاڑیاں پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ان خطرناک راستوں پر شیرپا بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کی وجہ سے مجھے بھی اپنی کار کی رفتار تیز رکھنی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ یہ راستہ وہ نہیں تھا جس سے میرا مشر آنا جانا رہتا تھا۔ دائیں بائیں پہاڑیوں میں کئی تنگ سے راستے تھے اور اگر شیرپا کسی ایسے راستے پر مڑ جاتا تو میرے لیے اسے تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

شیرپا کی گاڑی ایک طویل چکر کاٹ کر دریائے بھاگ متی کی طرف نکل آئی تھی۔ دریا کی طرف مڑتے ہوئے میں نے گردن گھما کر پہاڑیوں کی طرف دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس طرف آسمان پر گویا آگ لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے ان پہاڑیوں کے بیچ میں کسی جگہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ حویلی میں لگی ہوئی آگ کے شعلوں کی سرفی نے اس طرف کی فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

دونوں گاڑیاں بھاگ متی کے کنارے کے ساتھ ساتھ

ایک ٹاہوار سے راستے پر دوڑتی ہوئی پشاپانی تھک ڈسٹرکٹ میں گوری کھاٹ مندر کی طرف نکل آئیں۔ دریائے بھاگ متی تک روڈ کے ساتھ ساتھ لٹ پوری کی طرف چلا گیا تھا اور شیرپا کی گاڑی تکسٹل روڈ کی طرف مڑ گئی تھی اور پھر راکل پل کے قریب لازم روڈ سے ہوتے ہوئے ہم سوبھانا تھک کی طرف نکل آئے۔

یہ بھی شر کا پوش علاقہ تھا۔ بڑے بڑے جنگل تھے۔ ایک بت بڑے بدھ اسٹوپا کے قریب سے گزرتے ہوئے شیرپا کی کار ایک کشادہ گلی میں داخل ہو کر ایک جنگل کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ میں نے بھی گاڑی اس کے پیچھے روک لی۔ رات کا آخری پیر تھا۔ ہمیں شہر میں سے گزرتے ہوئے بھی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی اور یہ تو رات کی علاقہ تھا۔ یہاں تو بالکل سناٹا تھا۔ شیرپا نے دو تین مرتبہ کار کا ہارن بجایا تو جب کہیں ایک بوڑھے نے گیٹ کھولا تھا۔ اس کے جنم پر مخصوص نیپالی لباس تھا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

یہ بت بڑا بھلا تھا۔ دونوں کاریں آگے پیچھے رک گئیں۔ میں آجی بند کر کے پیچھے اتر آیا۔ شیرپا نے مجھ سے پہلے ہی اپنی گاڑی سے اتر کر مدھولا کو گود میں اٹھالیا تھا۔ ہم دونوں اس بوڑھے نیپالی سے پہلے ہی برآمدے سے ہوتے ہوئے ہال میں آگے۔ شیرپا نے مدھولا کو ایک صوفے پر لٹا دیا اور ٹیلی فون کی طرف لپکا۔

میں مدھولا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دائیں ٹانگ کو پکڑ رکھا تھا۔ گولی گھسنے سے چھ سات انچ اوپر ران میں لگی تھی اور گوشت میں پوست ہو گئی تھی۔ شیرپا نے اس جگہ اگرچہ پی باندھ دی تھی لیکن خون رس رہا تھا۔

شیرپا نے فون کا ریسپونڈنٹ دیا اور غصے میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو فون کر رہا ہے۔

”وہ ڈاکٹر کم بخت یا تو سوبا ہے یا گھر پر نہیں ہے۔ کال ریسپونڈ نہیں ہو رہی۔“ شیرپا بولا۔

”میری گاڑی سے دینا تھک کو اٹھا کر اندر لے آؤ۔ میں ڈاکٹر کا بندوبست کرتا ہوں۔“ میں یہ کہتے ہوئے باہر گیا۔

بلا اس وقت تک گاڑی سے اتر کر برآمدے میں آچکی تھی۔ شیرپا نے پچھلی سیٹ پر بندھے ہوئے دینا تھک کو اٹھالیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر آجی انشورٹ کیا اور گاڑی

کو گیٹ کی طرف رپورس کر میں ہی لپٹا چلا گیا۔ شر کی سٹان سڑکوں پر تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ وہ نکال ڈسٹرکٹ میں سپر مارکیٹ کے قریب مایا متی کے فلیٹ تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مایا متی مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی۔ ”کیا بات ہے خیریت۔ بلا تو ٹھیک ہے نا۔“ اس کے لیے میں نیند کا خمار تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”بلا ٹھیک ہے۔ ایک اور ایمر جیسی ہے۔“ میں نے کہا اور مختصر طور پر اسے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بولا ”تمہارے پاس کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں ضرور ہوں گی جس سے گولی نکالنے میں مدد مل سکے۔ اب جلدی سے میرے ساتھ چل پڑو۔“

مایا متی الماری کھول کر ضروری چیزیں بیگ میں رکھنے لگی۔ وہ فلیٹ میں اکیلی تھی۔ اس کے ساتھی کو تو کئی روز پہلے دیش کھ کے آدمیوں نے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔

ضروری چیزیں بیگ میں ڈالنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگی اور اس کام میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے اور اس کے دو تین منٹ بعد ہماری گاڑی تیز رفتاری سے سڑکوں پر دوڑی تھی۔

اس وقت پانچ بج چکے تھے۔ سڑکوں پر اب اکاؤنٹا گاڑیاں بھی نظر آنے لگی تھیں لیکن مجھے شیرپا والی کو بھی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

مدھولا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ زخم سے خون اگرچہ زیادہ نہیں بہا تھا لیکن خوف زیادہ تھا جس نے اسے بڑھال کر دیا تھا۔

مدھولا بھی اس وقت شب خوابی کے لباس میں تھی۔ یہ میکسی قسم کا لباس تھا جس کا ایک حصہ خون آلود ہو گیا تھا۔ مایا متی نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے پاس گھر میں ایسی چیزیں موجود تھیں جو اس وقت کام آ رہی تھیں۔ خاص طور پر تو کل انستھسیا کا انجکشن تو بہت کام دے رہا تھا۔

بلا مدھولا کے پاس اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کی نظرس اپنے زخم کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ جبکہ میں اس آپریشن میں مایا متی کی مدد کر رہا تھا اور شیرپا زخمی بھیڑیے کی طرح غرائی ہوا اس پاس ہی شل رہا تھا۔

مایا متی تیز دھار نشتر کی مدد سے زخم کو اندر سے کریدتی رہی۔ گولی گوشت میں آڑی ہو کر پھنس گئی تھی اور اسے

نکلنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مایامتی تجربہ کار نرس تھی۔ وہ کئی نازک آپریشنوں میں اسپتال کے سرجن کی مددگار رہی تھی۔ اس کا اسپتال کا تجربہ اس وقت کام آیا اور وہ یہ آپریشن کرنے میں بھی کامیاب رہی۔ گولی نکل آئی۔ ڈریسنگ کے بعد مدھومالا کو کمرے میں لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ مایامتی نے اسے ایک اور آنکھیں لگا کر دیا جس کے تھوڑی سی دیر بعد وہ بینڈ کی آنکھ میں بیچ گئی۔

”اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ مایامتی نے کہا ”میں شام کو اگر دیکھ لوں گی۔ چند روز آرام کی ضرورت ہے۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

مایامتی نے ناشتا ہمارے ساتھ ہی کیا اور جب وہ جانے لگی تو شیرپا پتیارہو گیا۔

”چلو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں۔“

شیرپا کو داپس آنے میں تقریباً پون گھنٹا لگا تھا۔ میں اس وقت لان میں درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا بگلا تھا۔ ایک طرف مصنوعی مٹائی بنی ہوئی تھی جس پر جا بجا پورے لگے ہوئے تھے اور پانی کا ایک ٹھنڈا برہہ رہا تھا۔ شیرپا نے اندر جا کر مدھومالا کو دیکھا اور پھر میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ہم مدھومالا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ شیرپا اس کے لیے بہت پریشان تھا اور میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ اب اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ جلد اچھی ہو جائے گی۔

”وہ کون لوگ تھے؟“ شیرپا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا ”تمہاری ان سے کیا دشمنی تھی؟“

”ان کی دشمنی مجھ سے نہیں پانڈے سے تھی۔ وہ تینوں انڈیا سے آئے ہوئے پڈت تھے۔ ان کے ساتھ دینا ناٹھ ہمیں کارہنہ والا ہے۔ اس سے میں نے کچھ حساب کتاب کرنا ہے لیکن تم پانڈے کے بارے میں کیا جانتے ہو اور یہ بگلا کس کا ہے؟“

”یہ بگلا مدھومالا کے باپ کا ہے۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار ہے۔ پٹاڑوں میں اپنے قبیلے کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔ چند مہینے پہلے پانڈے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی جو مدھومالا کی وجہ سے دو کئی ملاقات ہوئی تھی جو مدھومالا کی وجہ سے دو کئی ملاقات ہوئی تھی۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور پھر اسے ان لوگوں کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں ”میں کہہ رہا تھا“ نیپال کے لوگ بہت سادہ لوح ہیں۔ یہ لوگ محنت و مشقت پر یقین رکھتے ہیں لیکن یہ لوگ ان کے خون میں ہیروئن کا زہر بھر کر ان کی زندگیوں کو خنجر زینا چاہتے ہیں۔ دینا ناٹھ اسی گروہ کا آدمی ہے۔ جو افغانی سے ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں اسی سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر چلو۔ دیر کیوں کر رہے ہو۔“ شیرپا ایک جھٹکے سے

نکلا کر کھڑا ہو گیا ”اس سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو اور پھر اس کا کھانکھٹ کر لاؤ۔ پٹاڑوں میں پھینک دیں گے۔“

اور پھر میں سوال پوچھتا رہا اور شیرپا دینا ناٹھ کی توضیح کرتا رہا۔ ایک موقع پر دینا ناٹھ نے بھی شیرپا کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا۔ شیرپا کا نکلا ہوا ہنٹ بھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔

”مجھے ہاتھ مار کر بتا چکا تھا کہ تم نے“ شیرپا غرایا ”اب مجھے غصہ آئے گا اور میں تمہاری کچھ سیوا کر سکوں گا۔“

اور پھر شیرپا کو واقعی غصہ آگیا۔ وہ دینا ناٹھ پر تباہ توڑ حملے کرتا رہا۔ بھی اسے اٹھا کر پٹختا اور کبھی اس پر لاقوں اور گھونسو کی بارش کر دیتا۔ دینا ناٹھ واقعی بہت سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس کی چیخیں نہ خانے میں گونجنی رہیں اور بالآخر اسے زبان کھولنی ہی پڑی۔

اس نے جو کچھ بھی بتایا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق ناگ پال کے دو آدمی ہنگاموں کے دوران جنوبی نیپال کی طرف چلے گئے تھے جہاں بیدادی کے قریب ہندوستان کی شمالی ریاست جہا چل پر دیش کی سرحد ملتی ہے۔ وہ لوگ ہندوستان سے ہیروئن کی پہلی باقاعدہ کھیپ لے کر کھنڈو آنے والے ہیں۔ ہیروئن کی یہ کھیپ دھول گمری کے پہاڑی سلسلے میں واقع شاہی شکار گاہ رائل دھرتی ہنٹنگ ریزرو کے قریب پی کے مقام پر پہنچائی جائے گی۔ جہاں سے اسے قسطوں میں کھنڈو منتقل کیا جائے گا۔

دینا ناٹھ کے کہنے کے مطابق ناگ پال کے کچھ آدمی جن کے ساتھ جہل کھورات کے بھی دو آدمی موجود ہیں، کئی روز پہلے اس سرحدی علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔ جہاں پوست بکثرت کاشت ہوتی ہے۔ وہ لوگ اس علاقے میں ہیروئن کی فیکٹری لگانے کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

”ناگ پال اور چانگ کی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ناگ پال تو یہیں ہے اور چانگ کی دو آدمیوں کے ساتھ بی بی گیا ہوا ہے جہاں وہ جہا چل پر دیش سے آنے والی ہیروئن کی کھیپ وصول کرے گا۔“

”تو ہیروئن لائی جا رہی ہے؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”نہیں۔ کچھ پانچ سو کلو۔“ دینا ناٹھ نے جواب دیا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پانچ سو کلو ہیروئن سے تو کھنڈو کی پوری آبادی کو موت کی نیند سلایا جاسکتا تھا۔

”وہ لوگ ہیروئن لے کر کب پدی پہنچیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”چانگ کی کہاں ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

”میں نہیں جانتا۔“ دینا ناٹھ نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں تم آسانی سے زبان نہیں کھولو گے لیکن تم جیسے بے ضمیر اور بے دین لوگوں کا علاج میرے پاس ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے جہزے پر نذر آور گھونسا رسید کر دیا۔

دینا ناٹھ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ وہ آستین سے خون پونچھنے لگا لیکن اسی وقت شیرپا نے اس کی کٹیش پر گھونسا مار دیا۔ دینا ناٹھ ایک بار پھر پچھا تھا۔

”صاحب جی۔ آپ سوال پوچھو۔ دیر کا کام میں کرتا

”چانگ کی کہاں ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

”میں نہیں جانتا۔“ دینا ناٹھ نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں تم آسانی سے زبان نہیں کھولو گے لیکن تم جیسے بے ضمیر اور بے دین لوگوں کا علاج میرے پاس ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے جہزے پر نذر آور گھونسا رسید کر دیا۔

دینا ناٹھ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ وہ آستین سے خون پونچھنے لگا لیکن اسی وقت شیرپا نے اس کی کٹیش پر گھونسا مار دیا۔ دینا ناٹھ ایک بار پھر پچھا تھا۔

”صاحب جی۔ آپ سوال پوچھو۔ دیر کا کام میں کرتا



”اس مینے کی چھ تانچ کو۔“ دینا ناتھ نے جواب دیا  
 ”اس کے دو دن بعد ڈیڑھ سو کلو ہیروئن کی پہلی قسط کھنڈو  
 پہنچادی جائے گی اور شہر میں ہیروئن کا جو سیلاب آئے گا اسے  
 کوئی نہیں روک سکے گا۔“

”عقل مند لوگ تو ہی ہوتے ہیں جو سیلاب آنے سے  
 پہلے ہی بند باندھ لیں۔“ میں نے کہا ”ہمیں پتا چل گیا ہے  
 اس لیے اب ہیروئن کا یہ سیلاب کھنڈو کی طرف نہیں آئے  
 گا اور تم۔“

”اس کے ساتھ اب میرا حساب باقی ہے۔“ شیرپا نے  
 میری بات کاٹ دی ”کوواری سردار کو اگر پتا چل گیا کہ اس  
 کی بیٹی کو ناگ پال کے کسی آدمی نے گولی مار کر زخمی کیا ہے تو  
 وہ اپنے پورے فیملے کے ساتھ ناگ پال پر چڑھ دوڑے گا۔ شہر  
 میں ایک بار پھر خونیں ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔ کئی بے گناہ  
 لوگ بھی مارے جائیں گے۔ اس لیے میں کو شش کروں گا کہ  
 سردار کو اس واقعے کی اطلاع نہ ملنے پائے۔ بعد میں کسی  
 وقت پتا چلے گا تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔“

”تو پھر اس کا کیا کرؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنادوں گا۔“ شیرپا نے ہنستے ہوئے  
 جواب دیا ”تم اوپر چلے جاؤ صاحب جی۔ میں اس کو دیکھ لیتا  
 ہوں۔“

میں چند لمحے شیرپا اور دینا ناتھ کی طرف دیکھتا رہا پھر اوپر  
 گیا۔ کمرے میں جھانک کر دیکھا تو بلا اور دھومال اس وقت  
 بھی سو رہی تھیں۔ میں نے بوڑھے نیپالی کو چائے کے لیے  
 کہہ دیا اور باہر آکر درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 تھوڑی ہی دیر بعد بلا بدحواسی کے عالم میں دوڑتی ہوئی  
 باہر آگئی۔

”یہ۔ یہ چیخوں کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔“ وہ  
 وحشت زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔  
 ”گھبراؤ نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”شیرپا نے خانے میں  
 دینا ناتھ کے ساتھ بانسنگ کی مشین کر رہا ہے۔“

”اوہ!“ بلا نے کہتے ہوئے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔  
 اس کے تھوڑی ہی دیر بعد بوڑھا نیپالی دو کپ چائے  
 لے آیا۔ اس نے غالباً بلا کو کبھی آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔  
 خانے سے دینا ناتھ کی چیخوں کی آواز میں بھی سن رہا  
 تھا۔ میں پچیس منٹ بعد آوازیں بند ہو گئیں اور پھر شیرپا  
 برآمدے والے دروازے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس  
 نے کندھے پر ایک بوری لاد رکھی تھی جس کا منہ رسی سے  
 بندھا ہوا تھا۔ بوڑھا نیپالی بھی دوڑتا ہوا اس کے پیچھے ہی باہر

آگیا تھا۔ اس نے کار کی ڈکی کھول دی۔

شیرپا نے بوری ڈکی میں ڈال دی اور بوڑھے سے پکڑ کر  
 ہوا ہمارے پاس آگیا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا اس کے لیے بھی  
 چائے لے آیا تھا۔ شیرپا کا چہرہ تاثرات سے بالکل عاری تھا۔  
 میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ڈکی میں رکھی جانے والی بوری میں  
 کیا ہو سکتا ہے۔

”کیس جارہے ہو شیرپا؟“ بلا نے اس کی طرف دیکھتے  
 ہوئے پوچھا ”اس بوری میں کیا ہے جو تم نے کار کی ڈکی میں  
 رکھی ہے؟“

”دینا ناتھ کی لاش۔“ شیرپا نے سپاٹ لیجے میں جواب  
 دیا۔

بلا ایک دم اچھلی۔ کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر  
 نیچے گر گیا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بانگیا روکنے کی کوشش  
 کی مگر اسے ہتے ہو گئی۔ میں اپنا کپ میر پر رکھ کر تیزی سے  
 اس کی طرف لپکا۔ شیرپا بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کو  
 آواز دے کر ٹھنڈا پانی منگوایا اور بلا کے سامنے دو زانو ہو کر  
 بیٹھ گیا۔

”معاف کرنا ایم صاب!“ وہ معذرت آمیز لیجے میں بلا  
 ”مجھے آپ کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پر کیا  
 کروں۔ میں بہت سدا آدی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ  
 نے پوچھا بوری میں کیا ہے۔ میں نے بتا دیا۔ آپ تو بہت ہمار  
 عورت ہو۔ مجھے کیا پتا آپ کا طبیعت خراب ہو جائے گا۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“ میں نے شیرپا  
 کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے  
 آثار ابھر آئے تھے۔

بوڑھا نیپالی پانی لے آیا تھا۔ بلا نے کھلی کی۔ منہ پر  
 چھیننے مارے اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ شیرپا چند لمحے اس کی طرف  
 دیکھتا رہا پھر اندھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس  
 نے بوڑھے کو گیت کھولنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ گاڑی کا انجن  
 اشارت ہوا اور وہ حرکت میں آگئی۔ اس کے پیچھے بلا بھی نظر گئی۔

میں تھوڑی دیر تک بلا کے ساتھ لان ہی میں بیٹھا رہا  
 پھر اسے وہیں چھوڑ کر ہال میں آگیا اور فون کا ریسور اٹھا کر  
 پولیس ہیڈ کوارٹر کے نمبر لمانے لگا۔ انسپٹر اعظم خان کو معلوم  
 تھا کہ میں پانڈے کی حویلی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ حویلی میں  
 آتش زدگی کی اطلاع تو صبح سویرے ہی شہر پہنچ گئی ہوگی اور  
 ظاہر ہے پولیس بھی وہاں گئی ہوگی۔ اعظم خان کو جب پتا چلا  
 ہوگا تو وہ بہت پریشان ہوا ہوگا۔  
 اعظم خان چند منٹ پہلے ہی دفتر پہنچا تھا۔ میری آواز

سننے ہی پہنچا تھا۔  
 ”ارے کہاں ہو تم! بلا کہاں ہے؟“  
 ”ہم محفوظ ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”مجھے افسوس ہے  
 کہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے تمہیں اطلاع نہیں دے سکا تھا۔“  
 ”کیا ہوا۔ حویلی کو آگ کیسے لگی تھی۔“ اعظم خان نے

پوچھا۔  
 ”اب صورت حال کیسی ہے۔ میرا مطلب ہے حویلی کی  
 آگ۔“  
 ”بہت خوفناک آگ تھی۔“ اعظم خان نے بات کاٹ  
 دی ”پوری حویلی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ ابھی تک لمبا نہیں  
 ہٹا جا سکا۔ شبہ ہے کہ اس لیے میں کچھ لاشیں بھی دبی ہوئی  
 ہیں۔“

”پانچ لاشیں۔“ میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی  
 خاموشی کے بعد اسے ان پنڈتوں کے بارے میں بتانے لگا جو  
 پانڈے سے پرانا حساب کرتے آئے تھے ”آگ محض اتفاق  
 سے لگی تھی۔“ میں آخر میں کہہ رہا تھا ”لیکن نیپالی ملازمہ  
 اور پانڈے کو اس سے پہلے ہی گولیاں مار کر ہلاک کیا جا چکا  
 تھا۔ ہم لوگ ہرقت حویلی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے  
 تھے۔ ہم اس وقت سوما ناتھ کے علاقے میں اسٹوپا کے آس  
 پاس ایک جنگل میں موجود ہیں۔ تمہارے لیے ایک اور  
 ڈکپ اطلاع ہے لیکن ایک گھنٹے بعد میں خود تم سے ملوں  
 گا۔“

”تم کا تپا ہاتھ کے قریب سدا رہتے ہوئل آجاؤ۔ ایک  
 گھنٹے بعد میں بھی پہنچ جاؤں گا۔“ تفصیل سے بات ہو گئی۔  
 اعظم خان نے کہا۔

میں نے فون بند کر دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد شیرپا وہاں  
 آگیا۔ اس کی واپس پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ میں نے  
 اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ دینا ناتھ کی لاش کو کہاں پھینک کر  
 آیا تھا۔

دھومال بھی جاگ گئی تھی۔ استعصیا کا اثر زائل  
 ہوتے ہی ناگ میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ مایا متی ایسے  
 ہی موقع کے لیے کچھ گولیاں دے گئی تھی۔ بلا نے اسے دو  
 گولیاں کھلا دیں۔ جن سے درد میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔  
 ایک گھنٹے بعد میں کاتپا ہاتھ سے ملحق ایک ذیلی سڑک پر  
 واقع سدا رہتے ہوئل میں انسپٹر اعظم کے ساتھ بیٹھا ہوا  
 تھا۔ اس کے ساتھ برینڈر ابھی تھا۔ میں ایک بار پھر انہیں  
 حویلی میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔  
 ”حویلی کی آتش زدگی کا پچھلے دنوں پیش آنے والے

واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ میرے پاس ایک اور  
 اطلاع ہے جو ناگ پال وغیرہ کے حوالے سے تمہارے لیے  
 کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔“  
 ”مثلاً؟“ اعظم خان نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف  
 دیکھا۔

”ناگ پال کے آدمی جنوب کے ہماڑی علاقے میں  
 جہاں پوست کی کاشت ہوتی ہے، ہیروئن کی فیکٹری لگانے کے  
 امکانات کا جائزہ لینے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ  
 گولڈن ٹرائی اسٹیل کے جزل کھوراث تھے بھی دو آدمی ہیں  
 اور یہ بات میں نے تمہیں شروع میں بتائی تھی کہ جزل  
 کھوراث یہاں پوست کی کاشت والے علاقوں پر قبضہ کرنے  
 کے منصوبے بنا رہا ہے اور ناگ پال جیسے بے تمیز لوگ اس  
 منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے اس کی مدد کر رہے ہیں۔  
 اب یہ سوچنا تم لوگوں کا کام ہے کہ ان کے اس منصوبے کو  
 کس طرح ناکام بنایا جا سکتا ہے۔“

”تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی کہ ناگ پال کے آدمی  
 اس طرف جا چکے ہیں۔“ یہ سوال برینڈر نے کیا تھا۔  
 ”کچھ شخص قسم کے لوگ میرے لیے بھی کام کر رہے  
 ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”سوما کے بارے  
 میں پہلے بھی پتا چکا ہوں۔ وہ ناگ پال کا بدترین حریف ہے اور  
 اس کی ناگ میں رہتا ہے۔ یہ اطلاع مجھے اس سے ملی تھی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ برینڈر اگرا سانس لیتے ہوئے بولا  
 ”جنوب میں دیپال اور سیل گڑھی میں ہمارے دو بڑے  
 مضبوط پولیس اسٹیشن ہیں۔ پوست کی کاشت بھی زیادہ تر انہی  
 علاقوں میں ہوتی ہے۔ اس سے پچاس ساٹھ کلو میٹر آگے  
 بھارتی ریاست ہماچل پردیش کی سرحد ملتی ہے۔ میں آج  
 رات ہی ان دونوں پولیس اسٹیشنوں کو اطلاع دے کر ان  
 علاقوں کی نگرانی شروع کروا دیتا ہوں۔ ماکہ مشتبہ افراد پر نگاہ  
 رکھی جا سکے۔“

”اگر شروع ہی میں ان پر کاری صرب لگا دی جائے تو وہ  
 لوگ اپنے قدم نہیں جماسکیں گے۔ ایک بات اوست۔“ میں  
 نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں چار  
 تانچ کو وصول کری رینج میں واقع رائل دھرتی سنٹک  
 ریزرو کی طرف جارہا ہوں۔ واپس میں ایک دو دن لگ جائیں  
 گے۔“

”وہاں تمہارا کیا کام ہے۔“ اعظم خان نے مشتبہ نظروں  
 سے میری طرف دیکھا ”وہ سنٹک ریزرو تو رائل فیملی کے  
 لیے ہے۔ کسی عام آدمی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں

ہے۔

”میں جانوروں کا شکار کھیلنے نہیں جا رہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”سنا ہے اس شکار کا کچھ آپ پاس بھی کسی جگہ پر چھپا رکھا ہے؟“ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”کیا گڑبڑ ہے۔“

”کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس مرتبہ بریدار نے مجھے غوراً۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جھوٹ بولا ”لیکن اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تمہیں اطلاع دینے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”میرا یہ کارڈ اپنے پاس رکھ لو۔“ بریدار نے جیب سے اپنا ڈینٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا ”کوئی گڑبڑ ہو تو بلا تاخیر وہاں کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کر لیتا۔ وہ لوگ تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔“

”لیکن میں دھڑپن میں نہیں رہوں گا۔ میری منزل تو اس سے بہت آگے ہے۔ ہر حال میں کارڈ رکھ لیتا ہوں۔ شاید کہیں اور کام آجائے۔“ میں نے جھجکتے ہوئے اس سے کارڈ لے کر جیب میں ڈال لیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہماری یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ میں وہاں سے اسپتال چلا گیا اور تھوڑی دیر شوہا کے پاس بیٹھ کر واپس آ گیا۔ جب میں کمرے سے نکل رہا تھا تو مایا متی نے کہا کہ وہ دھو ہلا کو دھو کھینچنے کے لیے شام کو آئے گی۔

اسپتال سے نکل کر میں کافی دیر تک بازاروں میں گھومتا رہا۔ کئی جگہوں پر کچھ دیر کے لیے رکا بھی۔ ہر شخص کی زبان پر بودا تھ میں حویلی کی آتش زدگی کا ذکر تھا لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ حویلی میں آگ کیسے لگی تھی۔ ایک دو جگہوں پر یہ دلچسپ باتیں بھی سننے میں آئیں کہ یہ سب ان بد روحوں کی کارستانی تھی جنہیں اس دولت مند شخص نے کسی طرح وہاں سے نکال دیا تھا اور گزشتہ رات وہ بد روحوں واپس آ گئی تھیں اور انہوں نے سب کچھ جلا کر رکھ کر ڈالا تھا۔

ہاں۔ وہ پڑت بد روحوں سے بھی زیادہ خوفناک تھے جو عرصے سے سابق پولیس انسپکٹر پنڈے کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور بالآخر اسے جلا کر بھسم کر ڈالا تھا اور خود بھی اس آگ میں بھسم ہو گئے تھے۔



چار دنوں میں دھو ہلا کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی لیکن وہ ابھی چل پھر نہیں سکتی تھی اور پھر اس روز جب میں نے انہیں بتایا کہ ہم ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف جا رہے ہیں تو وہ

ملا کے چہرے پر اداسی چھائی۔ شیرا بھی افسردہ سا ہو گیا۔ ”میں ایک بات بتانا ہوں آپ کو صاحب جی۔“ جلدی سے بولا ”تم اتنا مشکل سفر مت کرو۔ موسم بھی اچھا نہیں ہے۔ آپ کو داری چلے جاؤ۔ ہمارا بیلے کے ٹھیلے میں یہ گاؤں چائنا روڈ پر ہے۔ وہاں سے تم ساگر ماٹا کا نظارہ کر سکتے ہو۔“

گاہ بہت سے نورٹ ساگر ماٹا (ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی) کا نظارہ کرنے اور دھری جاتے ہیں۔ آپ بھی ادھر ہی جاؤ۔ سوار کو داری کو پتا چلے گا کہ تم اس کا بیلے کے پاس سے کیا ہے؟ وہ بہت خوش ہو گا۔ تمہارا بہت خاطر کرے گا۔“

”نہیں شیرا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میرا ہم دھولی بازار جائیں گے۔ ایک دن وہاں قیام کرنے کے بعد واپس کھنڈو سے ہوتے ہوئے ایورسٹ کا رخ کریں گے۔“

اور پھر اس شام میں اور بلا ان سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت مایا متی بھی وہاں موجود تھی۔ میں نے اسے دھو ہلا اور شوہا کا خیال رکھنے کو بھی کہہ دیا تھا۔

اس وقت شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شرے نکل کر میں نے گاڑی کا رخ جنوب میں پر تھوکی ہائی وے کی طرف موڑ دیا۔ کیونکہ دھولی کی طرف میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پر تھوکی ہائی وے پہاڑوں میں تل کھاتی ہوئی گور کھائی شرکی طرف چلی گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کی رات سے پہلے ہم دوسو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے پوکھارا پہنچ جائیں گے اور رات کا باقی حصہ وہاں گزار کر اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

آج گھنٹے بعد سورج غروب ہو گیا۔ میں نے کار کے بڑے لمپس روشن کر دیے اور اس تل کھاتی ہوئی سڑک پر ٹریفک سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا مناسب حد تک کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

ہم رات گیارہ بجے کے قریب پوکھارا پہنچ سکے تھے۔ کھنڈو کے بعد یہ نیپال کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ یہاں ہوائی اڈا بھی تھا۔ ہندیا وہیں مندر کی وجہ سے بھی یہاں لوگوں کی آمد رفت زیادہ تھی۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی ہندو مندروں کی یاترا کے لیے پورے ملک میں گھومتے رہتے تھے۔

بازاروں میں اس وقت بھی خاصی رونق تھی۔ بعض علاقے تو ایسے تھے جہاں دن کا گھانا ہوتا تھا۔ دولت مند لوگ ٹائٹ کلبوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں رنگ رلیاں منانے تھے اور محنت کش اور غریب لوگ مندر بھر کام کاج کی تھکن اتارنے کے لیے رستہ زانوں اور ایسے جھوٹے ہوٹلوں میں جمع رہتے تھے جہاں رقص اور موسیقی کا پروگرام بھی ہوتا

تھا۔ ایک سب چائے کافی یا تازگی کے ایک بیگ کے ساتھ یہ فضا رقص و موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور اسی لوگ رقص کی بہت بڑی عیاشی سمجھے تھے۔

کونڈی کی بہت بڑی عیاشی سمجھے تھے۔ ہمیں درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کرا ل گیا۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے دوران میں ویٹر سے دھڑپن جانے والے راستے کے بارے میں بھی دریافت کرتا رہا۔ ویٹر نے ہمیں یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ کھانے کے بعد ہم تفریح سے لطف اندوز ہونا چاہیں تو تیسری منزل پر واقع ٹائٹ کلب میں جاسکتے ہیں۔ ہوٹل میں قیام پذیر مسافروں سے کوئی ایکسٹرا چارج نہیں لے جاتے۔

ہمیں رہائش کے لیے جو کرا ملا تھا وہ ساتویں منزل پر تھا اور ڈائنگ ہال دوسری منزل پر۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ہم تیسری منزل پر آگئے۔ زندگی کے ہنگامے یہاں عروج پر تھے۔ ایک ہال میں جوڑا ہو رہا تھا۔ کوئی بھی میز خالی نہیں تھی۔ ہر میز پر گھڑا لگا ہوا تھا۔ نیم عراں لباس میں لڑکیاں بھی معقول تعداد میں موجود تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو شکار کی تلاش میں ایک میز سے دوسری میز کے گرد گھوم رہی تھیں۔

اس ہال میں شور بھی بہت تھا اور سگریٹوں کا دھواں بھی اس طرح بھرا ہوا تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ہم دوسرے ہال میں آگئے۔ یہاں کی فضا قدرے مختلف تھی۔ میزوں پر گلاب بیٹھے ہوئے تھے۔ خوب صورت ویٹریس گاہکوں کو شراب اور دیگر مشروبات سرو کرتی پھر رہی تھیں۔

تیز موسیقی کی دھنوں میں ایک رقصہ نمحر رہی تھی۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ ایک میز پر ہمیں بھی جگہ مل گئی۔ ویٹریس جیسے ہی ہماری طرف آئی بلا نے اسے کافی کے لیے کہہ دیا۔

پہلی رقصہ سٹیج کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک اور رقصہ نے لے لی۔ وہ کچھ دیر تک اسٹیج پر ڈانس کرتی رہی پھر فلور پر آ گئی اور میزوں کے درمیان گھرنے لگی۔ یہ رقصہ خاصی شرخ و چٹیل تھی اور گاہکوں کے دل بھانے کے لڑجاتی تھی۔ وہ کسی کے گال پر چٹکی بھرتی، کسی کی ٹھوڑی کو چھوئی، کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکتی اور کسی کو آنکھ سے اشارہ کرتی ہوئی نکل جاتی۔

کافی ختم ہوتے ہی میں نے بلا کو اشارہ کیا اور ہم وہاں سے اٹھ کر لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر اپنے کمرے میں آگئے۔ ہمارا کمرہ اراہاری کے آخر میں تھا جس کی کونڈی سے شرے اس طرف کے حصے کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ بلا کچھ دیر میرے قریب کھڑی رہی پھر بیڈ پر لیٹ گئی اور میں بدستور

سو گیا۔

آتش فشاں

کونڈی کے سامنے کھڑا شرکی جھنگاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔

میں آنے والی صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جزل کھوارٹ نے یہاں بھی قدم جمائے شروع کر دیے تھے۔ وہ اس پر سکون اور ہر امن خفے کو بھی گولڈن ٹرائی اینگل بنا دیتا چاہتا تھا۔ یہاں کی خوشگوار فضا میں بھی زہر گھول دیتا چاہتا تھا۔ اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا تھا۔ بڑی بڑی حکومتیں بھی اس کے سامنے بے بس ہو کر گر گئی تھیں۔ بعض حکومتوں کے مفادات اس سے وابستہ تھے اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی سے انچپاتی تھیں۔

موت کے ان ہر کاروں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے والوں کی تعداد تو بہت کم تھی البتہ ناگ پال جیسے بے غیر لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ ایسے لوگ ہر جگہ بڑی تعداد میں مل جاتے تھے جو چند گھنٹے کے لیے اپنی ماں جیسی دھرتی کا سوندا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

میں عرصے سے موت کے ان سوداگروں سے برسرِ پیکار تھا۔ میری جنگ کی ابتدا میرے ماں باپ کے قتل سے ہوئی تھی۔ شاید بات وہیں ختم ہو جاتی لیکن دارا جس طرح میرا پیچھا کرتا رہا تھا اس سے میرے دل میں نفرت بڑھتی گئی۔ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے کئی بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پہلے میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا رہا پھر جب میں پلٹ کر حملہ آور ہوا تو دارا پناہ ڈھونڈنے لگا۔ اسے پناہ بھی ایسے لوگوں کے پاس ملی جو اس سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

دارا ختم ہو گیا لیکن برائی ختم نہیں ہوئی۔ اس کی جڑیں تو زمین کے اندر ہی اندر پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس برائی کو ختم کرنا مجھے جیسے آگے آگے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی اور میں نے بھی تہہ کر لیا تھا کہ جب تک دم میں دم ہے اس برائی کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ ہدی کے ان ٹھیکے داروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں اور میں درندوں کی طرح مار دھاڑ کرتا پھر رہا ہوں لیکن میں ایسے لوگوں کو پتا دیتا چاہتا ہوں کہ کسی برائی کے خلاف لڑنا بھی بہت بڑا جہاد ہے اور میں نے اس جنگ کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔

میں دیر تک کونڈی کے سامنے کھڑا یہی سب کچھ سوچتا رہا

پھر مرکز دیکھا تو بلا بند پر آڑی تر جمی بڑی سوچکی تھی۔ اس بند کے علاوہ کمرے میں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی ٹیبل تھی۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہیں سو سکتا تھا۔ بند ڈبل تھا۔ دو آڑی آرام سے سو سکتے تھے لیکن بلا اس طرح پھیل کر سو رہی تھی کہ دوسرے کے لیے جگہ نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کر دیا اور بند کے کنارے پر لیٹ گیا۔ صبح سات بجے میری آنکھ کھل گئی۔ بلا مجھے سے پہلے ہی جاگ چکی تھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نوبچے کے قریب ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ آدھے گھنٹے تک شہر کی سڑکوں پر ٹھونکنے کے بعد ہم کاشا کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ یہی سڑک بگلا نک اور بنی سے ہوتی ہوئی دھرتی کی طرف چلی گئی تھی۔

دھرتی وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ سڑک اگرچہ پختہ تھی مگر زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ بعض مقامات پر تو سڑک اس قدر تنگ تھی کہ سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے سڑک کے انتہائی کنارے پر رکتا پڑتا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ لاکڑا کا پرائیویٹ کاروں اور کھٹار اسی بسوں کی آمد و رفت تھی۔

کاشا نامی قصبے کا ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا بھی تھا۔ غرت کے باوجود لوگ دور دراز کے علاقوں تک آمد و رفت کے لیے ہوائی جہاز پر سفر کرنے پر مجبور تھے۔

کاشا میں ٹھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے اور بگلا نک میں رے کے بغیر فاصلے طے کرتے ہوئے بنی نامی قصبے تک پہنچ گئے۔ یہ قصبہ سڑکوں کے سگم پر واقع تھا۔ یہاں سے ایک سڑک تقریباً پچیس ہزار فٹ بلند آنا پور نامی برف پوش چوٹیوں کی طرف چلی گئی تھی۔ انا پور نامی اس پار جین کی سرحد پر متانگ نامی وہ قبیلہ آباد تھا جس کی عورتوں کے بارے میں شہرپا نے پچسپ حکایات سنائی تھیں لیکن ہمیں اس طرف نہیں جانا تھا۔

بنی سے دوسری سڑک رائل، ہنڈنگ ریزرو کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ شاہی شکار گاہ میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرف گھنے جنگلات تھے جن میں ہاتھیوں کے علاوہ شیر، چیتے، سانپ، بھڑ اور دوسرے درندے بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ اس شکار گاہ میں عام لوگوں کے داخلے پر پابندی تھی۔

نیپال کے دوسرے پر آنے والی اعلیٰ غیر ملکی شخصیات کو شکار کی تفریح کے لیے یہاں لایا جاتا تھا۔

شکار گاہ کے کنارے پر دھرتی نامی وہ قصبہ تھا جس کے نام سے یہ شکار گاہ موسوم تھی۔ راستے میں کئی چھوٹی چھوٹی بستیائیں تھیں۔ یہ سب بدھ مذہب کے پیروکار تھے جو ان پہاڑوں میں بڑی شخص زندگی گزار رہے تھے۔

دھرتی زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ اس کی آبادی دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ یہاں ایک پولیس اسٹیشن بھی تھا۔ یہ پولیس اسٹیشن دراصل شاہی شکار گاہ کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ باک غیر متعلق لوگ اس جنگل کا رخ نہ کر سکیں۔ اس وقت دو بجتے والے تھے۔ میں نے کار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک لی۔ وہ ایک چھوٹا سا مال تھا جس میں سالوورہ سی میز اور جموٹی ہوٹلی بیچر رکھی ہوئی تھیں۔ گاڑیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس قصبے کی آبادی بھی زیادہ تر بدھ پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ پہاڑوں کے واسطے میں چاول کاشت کرتے تھے۔ چاول کی کاشت ہی ان کا ذریعہ معاش تھی۔

اس ہوٹل میں ہمیں بھی دال چاول ہی کھانے کو ملے تھے۔ ابھی ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک پرانی سی موٹر سائیکل ہوٹل کے سامنے آکر رکی۔ وہ ایک پولیس والا تھا جس کے جسم پر سلوٹ زدہ پہلانی سی وردی تھی۔ لگتا تھا یہ وردی کئی روز سے اس کے جسم سے الگ نہ ہوئی تھی۔ وہ موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر کے ہوٹل میں داخل ہوا اور دھڑا دھڑکیے بغیر چلا ہوا سیدھا ہماری میز کے قریب آیا۔

پولیس والے کی جرح خاصی تکلیف دہ اور طویل تھی۔ ہمارے پاس کسی قسم کے کاغذات نہیں تھے اور پولیس ہمارے لیے پریشانی پیدا کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے برینڈر کا کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کھانا ختم کر کے ہم اس پولیس والے کے ساتھ پولیس اسٹیشن آگئے۔ یہ پانچوہوں سے بنی ہوئی ایک مختصر سی عمارت تھی اور اس پولیس اسٹیشن کا عمل صرف چھ الپکاروں پر مشتمل تھا۔ اس ٹھانے کا انچارج ایک بھاری بھر کم آفیسر تھا جس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ بڑا کھرت تھا اور لمبے میں بھی درشتی تھی۔ اس نے مجھ سے کاغذات طلب کیے تو میں نے انپکچر برینڈر کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کارڈ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ابھرن سی تیر گئی۔ اس نے نیپالی زبان میں اپنے ایک ماتحت سے کچھ کہا۔ وہ فون کا ریسپورڈ اٹھا کر غبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں

لگی۔ وہ چند سیکنڈ کسی سے بات کرتا رہا پھر اس نے ریسپورڈ آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔

آفیسر تقریباً پانچ منٹ تک فون پر بات کرتا رہا۔ اس دوران اس نے دو تین مرتبہ برینڈر کا نام بھی لیا تھا پھر اس نے ریسپورڈ رکھ دیا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ اس کے لمبے میں ایک دم مٹھاس سی آگئی تھی۔

”گٹا ہے تم لوگ یہاں شکار کھیلنے آئے ہو۔ تمہارے پاس اسلحہ کن سا ہے؟“ اس نے پوچھا اور پھر بلا کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے اور ہمارا شکار کھیلنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”مم ٹورسٹ ہیں اور رقم کوٹ سے ہوتے ہوئے نیپال پارک کی طرف جانا چاہتے ہیں۔“

آفیسر نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور پھر بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں ہونے لگیں۔ اس نے ہماری خدمت خاطر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پانچ بجے کے قریب جب ہم روانگی کے لیے تیار ہوئے تو وہ پریشان سا ہو گیا۔

”ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سورج غروب ہو جائے گا۔ راستے بڑے محدود ہیں۔ رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ تم لوگ آج رات یہاں آرام کرو۔ صبح سویرے روانہ ہو جانا۔“

”رات ہم رقم کوٹ یا موسی کوٹ میں گزارنا چاہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ ان پولیس والوں نے ہمیں اس طرح رخصت کیا جیسے ہم ان کے بہت قریبی دوست ہوں۔

قصبے سے نکلتے ہی میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور رقم کوٹ کی طرف جانے والی سڑک پر تقریباً بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کا رخ دائیں طرف ایک کچی سڑک پر موڑ دیا۔ یہ راستہ شکار گاہ کے جنوب کی طرف واقع پدی قصبے کی طرف چلا گیا تھا۔ یہی وہ قصبہ تھا جہاں چانگ کی چھا بیٹھا تھا اور اگلے روز اس کے آدی ماہی پر دیش کی طرف سے پانچ سو کلومیٹر ہونے لے کر آنے والے تھے اور میں ان کا راستہ روکنا چاہتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ موت کے منہ میں چھلا گئے جا رہا ہوں لیکن میں خطرات سے نہیں ڈرتا تھا۔ میری تو زندگی ہی

موت کے حصار میں گزری تھی۔ خطرے کا لفظ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ بلا کو میں ساتھ نہیں لانا چاہتا تھا لیکن اس نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ مجھے اکیلے مرنے بھی نہیں دے گی۔

پدی جنگل کے بالکل کنارے پر آباد تھا اور پختہ سڑک سے ”جہاں سے ہم مڑے تھے“ فاصلہ پچیس چالیس کلومیٹر کے قریب تھا۔ اس طرف بھی درختوں کی بہتات تھی۔ راستہ ہائیویں میں مل کھانا ہوا اور بھائیوں سے انا پڑا تھا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ کار کا کوئی ٹائر جواب نہ دے جائے۔ پٹرول کی بیٹھک پھر نہیں تھی۔ میں نے دھرتی کے سپ سے نیکی قل کو والی تھی اور ڈکی میں بھرے ہوئے دو فاضل مین بھی موجود تھے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کا دھندلا پھیلتا چلا گیا۔ قصبے سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بلند جگہ پر میں نے کار روک لی۔ بائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دریا تھا اور دائیں طرف گھنے درخت تھے۔ یہاں سے وہ پل بھی نظر آ رہا تھا جہاں سے دوسری طرف سے آنے والی سڑک قصبے کی طرف چلی گئی تھی۔ یہی وہ سڑک تھی جہاں سے چانگ لی کے آدمیوں کو گزرتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر وہ لوگ قصبے تک پہنچ گئے تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے میں نے انہیں قصبے سے باہر ہی روکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کچھ دیر تک اونچی جگہ پر کھڑا صورت حال کا جائزہ لیتا رہا پھر دوبارہ کار میں بیٹھ گیا۔

دریا کا پل پار کر کے میں نے کار سڑک سے ہٹا کر منجھان درختوں میں روک لی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس علاقے کے نقشے کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ قصبے کی طرف جانے والے یہی دو راستے تھے۔ اگر وہ کسی تیسری سمت سے نکل گئے تو پھر مجھے بھی اپنا پروگرام بدلنا پڑے گا۔

بلا بھی نیچے اتار آئی تھی۔ وہ کار کے آس پاس مشنٹی رہی۔

اندھیرا جیسے جیسے گہرا ہو رہا تھا وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ بلا کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں بھی اعلیٰ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار کی اندر کی جی جی جی جی ہمارے چاروں طرف سناٹا تھا۔ حشرات الارض کی آوازیں واقعی دل پر وحشت سی طاری کر رہی تھیں۔ ہم دونوں وقت گزارنے کے لیے باتیں کرتے رہے لیکن وقت تو کسی طرح کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

اور پھر وہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ بلا نے بھی وہ

آواز سن لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھری تھی۔ میں غور سے اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کوئی وہبے قدموں ہماری طرف آ رہا ہو۔ پیروں کے نیچے خشک پتے بے سے چرچاہٹ کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کار کی اندر کی جی بجادی۔ پتلون کا پانچپنچ اٹھا کر خنجر نکال لیا اور گہری نظروں سے کار کی پچھلی طرف دیکھنے لگا۔ گھیر تاریکی میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا بہت محتاط انداز میں وہبے قدموں کار کی طرف آ رہا تھا۔

میں نے بلا کو بے حرکت بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور کار کے ساتھ جھک کر پچھلے پٹے کے قریب آ گیا اور گہری نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے روشنی پھیل گئی ہو۔ مجھے دور دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر کار کے اندر جھانکا۔ بلا بھی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ اس وقت پانی کی بوتل منہ سے لگائے ہوئے تھی پھر اس نے بوتل منہ سے ہٹا کر ڈھلکا بند کر دیا اور خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی لیکن ٹھیک اسی وقت میں نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔

پتوں کی چرچاہٹ کی آواز سن کر میں اس طرف متوجہ ہو گیا اور پھر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ ایک بھیڑیا تھا جو دے قدموں کار کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اُدھر اُدھر دیکھا اور قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے دے مارا۔

پتھر بھیڑیے کے سر پر لگا۔ وہ ایک دم اوپر اچھلا اور پھر کتے کی طرح چپاؤں پھاؤں کرتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی کار سے بلا کے چپنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ بلا بھیڑیے کی آواز سے ڈر گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”ارے کیوں چیخ رہی ہو۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا ”وہ کوئی کتا تھا یا بھیڑیا۔ ایک ہی چوٹ کھا کر بھاگ گیا۔“

میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکلی

گئی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”اب کیا ہوا؟“ میں نے کہا ”میرے سر پر سینک لگ آئے ہیں کیا؟“

”تنت۔ تمہاری آنکھیں۔“ وہ خوف زدہ انداز میں ہلکائی۔

”کیا ہوا میری آنکھوں کو؟“ میں نے پوچھا۔

”تنت۔ تمہاری آنکھیں بلی کی طرح چمک رہی ہیں۔“ اس کے لہجے میں خوف اب بھی برقرار تھا۔

”اوہ!“ میں ایک دم چونک گیا۔ میں ایک بار پھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف اگرچہ گہری تاریکی تھی مگر مجھے ہر جگہ صاف نظر آ رہی تھی۔ میں بلی کے بارے میں جانتا تھا کہ اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلور کی طرح چمکتی ہیں اور وہ گہری تاریکی میں بھی دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیا میرے اندر بھی یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ میں اندھیرے میں بلی کی طرح دیکھ سکتا تھا۔

بلا اب بھی وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ میری آنکھوں میں اتنی چمک کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جبراکا سا ہوا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب شاؤلن ٹیپل میں مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور کہانیاں کے فرار کے بعد میں اپنے ایک دوست کے گھر میں تھا اور چائے پینے کے دوران میز پر رکھا ہوا کپ میری نظروں کی قوت سے اپنی جگہ سے سرک گیا تھا۔ وہ میری چی کی قوت کا کمال تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت بھی ہوا تھا جب چیانگ رائے سے واپسی پر بنگاک انزورٹ سے بھی ہمیں ایک بندوین میں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور میری نظری قوت سے دین کے دروازے کا ٹالٹ ٹالٹ گیا تھا۔

چی میں بڑی برا سراور قوتیں پوشیدہ تھیں لیکن میں نے کبھی ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بیشاپانی قوت بازو پر بھروسا کیا تھا۔ تاہم کبھی بھکاریہ برا سراور قوت از خود میری مدد کو آجاتی تھی۔ جیسا کہ اس وقت ہوا تھا اور میری آنکھوں میں اس قدر قوت پیدا ہو گئی تھی کہ میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ چند روز پہلے سینگر کی جیسی مسان تھی میرے سامنے آ گئی تھی۔ ایک خفین عورت کی صورت میں۔ وہ جس طرح برا سراور انداز میں میرے سامنے آئی تھی اسی طرح برا سراور انداز میں غائب

بھی ہو گئی تھی۔ البتہ وہ اپنی مالا کا تختہ چھوڑ گئی تھی اور یہ سیاہ چپوں کی مالا اس وقت بھی میرے گلے میں تھی جب پانڈے کی حویلی میں بندت موہن نے خنجر سے مجھ پر حملہ کیا تھا اور یہ وار میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا نے روکا تھا۔ یہ برا سراور مالا اب بھی میرے گلے میں موجود تھی۔ میری انگلیاں خیر ارادی طور پر مالا کے پتھروں کو چھونے لگیں اور پھر ہار کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں لیکن کچھ دیر پہلے میری آنکھوں میں پیدا ہونے والی وہ برا سراور روشنی غائب ہو چکی تھی اور میرے چاروں طرف اندھیرا پھیلنا ہوا تھا۔

میں نے کار کی اندر کی جی بجادی۔

”اب میری آنکھیں کیسی ہیں؟“ میں نے بلا سے پوچھا۔

”حیرت انگیز۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ”آپ تو مجھے ان آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی۔“

بلا کا خوف دور ہو گیا تھا۔ میں نے ہوا کی آمدورفت کے لیے کار کے دونوں طرف کے شیشے گرا دیے تھے لیکن کسی نے ٹھیک کہا ہے انتظار کی گھڑیاں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ دینا ہاتھ نہ بتایا تھا کہ چانگ لی کے وہ آدمی رات اور صبح کے درمیان کسی وقت پدی پچپنیں گے اور ابھی تو رات کے دس ہی بجے تھے۔ ویسے میرے خیال میں ان لوگوں کی پلاننگ بہت عمدہ تھی۔ سیکڑوں میل دور سے سنان راستوں پر سفر کرتے ہوئے ہیروئن یہاں تک لے آتا پڑے کمال کی بات تھی۔ راستے میں نہ تو کسی کو شبہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی چینگ کا اندیشہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں پولیس کی چوکیاں ضرور ہوں گی لیکن چھوٹی چوکیوں پر تعینات پولیس والوں کو رشوت دے کر راستے سے ہٹا دینا بڑی بات نہیں تھی۔

دھرچن کی ایک دکان سے میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے لی تھیں۔ بلا نے وہ تھیلہ نکال لیا اور ایک چھوٹا ایک ٹکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ دوسرا اس نے خود لے لیا۔

کھانے کے بعد ہم کچھ دیر تک کار کے آس پاس کھلی جگہ پر ٹپکتے رہے اور پھر کار میں بیٹھ گئے۔

بلا پچھلی سیٹ پر بیٹھی اور تھکتی رہی اور میں کبھی نیچے اتر کر کھانے لگا اور کبھی پھر کار میں بیٹھ جاتا۔

ساز سے تین بجے کے قریب ایک آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ گر گر کر کی وہ دم سی آواز اس دیرانے میں کسی

گاڑی کی موجودگی کی نشان دہی کر رہی تھی۔ خانے میں یہ آواز بھی قریب سے آئی ہوئی محسوس ہوئی اور کبھی بہت دور سے۔

میں نے بلا کو دنگا دیا۔ اس نے بھی وہ آواز سن لی۔ میں نے دروازہ کھول کر بلا کو نیچے اتار لیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کی پشت کار سے لگا دی۔ وہ گھٹنوں تک اسکرٹ اور اوپر بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے بلاؤز کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر زور وار جھٹکا دیا۔ بلاؤز کے سارے بٹن ٹوٹ گئے۔ بلا ایک دم چیخ اٹھی۔

”ارے۔ ارے۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا بد تمیزی۔!“

میں نے اس کے چپنے کی پروا کیے بغیر اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا اور بلاؤز کی ایک آستین بھی پھاڑ دی۔ اس کا کندھا بھی برہنہ ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے اسکرٹ کے ایک طرف کے چاک کو دونوں کناروں سے پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ چاک اوپر تک کھٹکا چلا گیا۔ بلا مجھ پر گھونے برسا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ چیخ رہی تھی۔

”چھوڑو مجھے تم پاگل ہو گئے ہو۔ وحشی ہو تم۔“

”اس طرح چپنے ہوئے اچھی لگتی ہو۔“ میں نے اس کی دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

میرے کان اب بھی گاڑی کے انجن کی اس آواز پر گئے ہوئے تھے جو اب بہت واضح ہو گئی تھی۔ میں نے گردن ہٹھا کر اس طرف دیکھا۔ سڑک پر درختوں میں چمکتی ہوئی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

”اب تم اس طرف بھاگنا شروع کر دو۔ چپنے ہوئے۔ تیزی سے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے بلا کو سڑک کی طرف دھکیل دیا۔

بلا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی لیکن وہ میری بات سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح چپتی ہوئی سڑک کی طرف بھاگ کھڑی ہو گئی تھی۔ رات کے آخری پیر آبادی سے میلوں دور جنگل میں ایک جوان اور خوب صورت عورت کا اس طرح نظر آنا کہ اس کا لباس پہنا ہوا ہو اور وہ خوف سے چیخ رہی ہو کسی بھی شخص کو متاثر کر سکتا تھا اور وہ شخص فوری طور پر یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ کوئی ناک بھی ہو سکتا تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ بلا درختوں سے نکل کر سڑک کی طرف بھاگ رہی تھی اور پھر وہ کار بھی نجان درختوں سے

نکل کر سامنے سڑک پر پہنچی تھی۔

بلا سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ بلا اب اس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھی۔ اسی لمحے فضا میں بریکوں کی چرچاہٹ کی تیز آواز گونجی۔ گاڑی بلا سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ بلا سڑک پر گری اور اٹھ کر ایک بار پھر جھپٹے ہوئے دوڑنے لگی۔

میں بھی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ اسی لمحے گاڑی کے دونوں طرف کے دروازے کھلے اور دو آدمی بیچے اتر آئے ان میں سے ایک نے لپک کر بلا کو پکڑ لیا اور دوسرا پھول تان کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”اے رک جاؤ۔ گولی مار دوں گا۔“ وہ چیخا اور ساتھ ہی اس نے مجھے ڈرانے کے لیے ہوائی فائر بھی کر دیا تھا۔

”تم کون ہو۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ وہ میری جانی ہے۔“ میں نے بھی چیخ کر کہا۔

”یہ جھوٹ بولتا ہے۔“ بلا چیخی ”یہ مجھے اغوا کر کے لایا ہے۔ ہم رات گزارنے کے لیے یہاں رک گئے تھے۔ میں نے تم لوگوں کی گاڑی کی روشنی دیکھی تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ پچاؤ مجھے اس شیطان سے۔“

”کیوں مہاشے۔“ پھول والا غریبا ”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

”ٹھیک ہے میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں۔ تم لوگ مداخلت کرنے والے کون ہوتے ہو۔ اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو بڑا اب تمہارے حوالے نہیں ہوگی۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔ جس نے بلا کو سنبھال رکھا تھا ”یہ لڑکی اب ہماری پناہ میں آگئی ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ جینے سے یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ یہیں تمہاری لاش گرادیں گے۔“

”ہاتھ میں پھول ہے۔ اسی لیے بہت بہادر بنے ہو۔“ میں نے کہا ”مرد کے بچے ہو تو خالی ہاتھ آؤ۔ تم دونوں کی لائیں یہاں بڑی ہوں گی۔“

”سندرا!“ پھول والا طیش میں آ گیا۔ اس نے اپنا پھول جب میں ٹھونس لیا ”تم اس لڑکی کا خیال رکھو۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔“

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ صرف دو ہی تھے۔ ان کے ساتھ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ پھول والا دونوں ہاتھ پھیلا کر

میری طرف بڑھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلا۔ میری فلائنگ کلک اس کے سینے پر لگی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے گر پڑا۔ میں نے سنبھل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ کچھ دیر تک اسے سڑک پر رگیدتا ہوا پھر اس پر ٹھوکروں کی بارش کروی لیکن وہ بھی جلد ہی سنبھل گیا۔

میں اس پر تباہ توڑ حملے کرنے لگا۔ مجھے اعتراف تھا پراکندہ اس میں طاقت بھی تھی اور وہ لڑائی کے فن سے بھی واقف تھا اور وہ بھی بڑے اچھے اور دھڑاچے استعمال کر رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے بھی اچھل کر مجھے فلائنگ کلک مارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنے آپ کو بچا گیا تھا۔

میرے حریف نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ میں نے بھی بڑی بھرتی سے اپنا ہتھکڑ نکال لیا۔ اس نے مجھے ہی پھول والا ہاتھ سیدھا کیا میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گر پڑا۔ میرا ہتھکڑ اس کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی انگلی سے ڈنگر دب گیا تھا۔ گولی میرے سر کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بازو پر خنجر کے دوسرے وارے پھول تان کر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اس کا دوسرا سامھی سندرا جس نے بلا کو سنبھال رکھا تھا اسے چھوڑ کر میری طرف لپکا لیکن اسی لمحے بلا کی غزائی ہوئی آواز فضا میں گونجی۔

”رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گی۔“

بلا کے ہاتھ میں پھول تھا جو اس نے بڑی ہوشیاری سے سندر کی جیب سے نکال لیا تھا۔ سندرا کے چہرے پر ہلکی سی جھلک گئی۔ اس نے بلا کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن بلا کے بعد ویکرے ڈنگر دہائی چلی گئی۔ تین گولیاں سندرا کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میرے نیچے دبے ہوئے حریف نے مجھے ایک طرف دھکیل کر اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن میں نے اسے زیادہ دور نہیں جانے دیا۔ سڑک کے کنارے سے چند گز آگے جھاڑیوں میں اسے جالیا۔ اس کی گردن میری گرفت میں آگئی اور میں نے اسے اس وقت ہی چھوڑ دیا تھا جب اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔

میں اسے چھوڑ کر بلا کی طرف آ گیا۔ ”میں اپنی گاڑی لے کر آتا ہوں۔ تم یہیں رکو۔“ میں کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف دوڑ گیا۔

گاڑی وہاں لانے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں گئے تھے اور پھر میں اور بلا دوسری گاڑی سے ہیروئن کے پیکٹ نکال

نکال کر اپنی گاڑی میں رکھنے لگے۔

دس دس کلک کے پچاس پیکٹ تھے۔ ڈکی بھرجانے کے بعد ہم نے کچھ پیکٹ پچھلی سیٹ پر ڈال دیے۔ بلا نے اپنا پیکٹ اٹھا کر آگے والی سیٹ پر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے ابھی اشارت کیا اور کار کو دریا کی مخالف سمت میں دوڑا دیا۔

”اگر تم اپنی اچھی اداکاری نہ کرتیں تو؟“ ”میرا کال ابھی تک دکھ رہا ہے۔ بڑے زور کا تھپہ مارا تھا۔ تم نے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”اگر تھپہ نہ مارتا تو اس ڈرائے میں حقیقت کا رنگ نہ آتا۔ بہرحال مجھے افسوس ہے۔“ میں نے کہا۔

بلا نے گود میں رکھا ہوا ایک کھول کر دوسرے کپڑے نکال لیے۔ بیک پچھلی سیٹ پر پھینک دیا اور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کپڑے بدلنے لگی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد کار دوبارہ پختہ سڑک پر آگئی۔ جس جگہ یہ سارا ڈراما ہوا تھا وہاں سے پوری بستی تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگی۔ چانگ لی وغیرہ کو معلوم ہو گا کہ ان کے آدمی ہیروئن لے کر پہنچنے والے ہیں۔ وہ ان کے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔ رات کے سناٹے میں قوافل کی آواز دور تک گونجتی ہے۔ ہو سکتا ہے فائرنگ کی آواز انہوں نے بھی سنی ہو۔ اگر وہ صورت حال معلوم کرنے اس طرف آئے تو انہیں دریا کے کنارے قریب دو لاشیں اور ایک خالی گاڑی ملے گی۔ وہ یقیناً ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور میں ان سے پہلے ہی ان پھاڑوں میں کم ہو جانا چاہتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا رخ کس طرف تھا۔ کئی سڑک پر کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے کار کو دریا کے ساتھ ایک کپے راستے پر موڑ دیا۔ ایسے ہی راستے ہمارے لیے محفوظ تھے۔

ہم دریا کے ساتھ ساتھ کئی میل دور نکل آئے پھر اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور کار لہرا گئی۔ بلا اوٹھ رہی تھی۔ دھماکے کی آواز سے وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

کار کا اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ میں کار روک کر نیچے اتر آیا۔ کار کی ڈکی میں ایک فاضل ٹائر موجود تھا اور وہ فاضل ٹائر نکالنے کے لیے پہلے ڈکی میں بھرے ہوئے پیکٹ نکالنے پڑے۔

ٹائر تبدیل کرنے اور ہیروئن کے پیکٹ دوبارہ ڈکی میں رکھنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے پانچ میلن والا پیٹرول کا ایک کین بھی بیسکی میں انڈیل لیا تھا۔

دریا کے ساتھ ساتھ مزید ایک گھنٹے تک سفر جاری رہا۔ اب دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ وہ تنگ سارا ستہ بتدریج بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ نیچے دپا ہوا تھا۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ سامنے سے کوئی اور چھوٹی کار بھی آجاتی تو کر اس کرنا مشکل ہو جاتا۔

ایک موڑ کاٹتے ہوئے ایک بار پھر زوردار دھماکا ہوا۔ اس مرتبہ آگے کا دوسری طرف کا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ کار لہرا گئی اور دائیں طرف کی چٹان سے ٹکرا کر جھپٹے آئے گئی۔ میں نے بریک پڈل دیا لیکن یہ جان کر میں کاب اٹھا کہ بریک کام نہیں کر رہا تھا۔ کار جھپٹے ڈھلان کی طرف جاری تھی۔ ”بلا۔“ کار سے اترو۔ چھلانگ لگا دو!“ میں چیخا ”جلدی کرو۔“ کار کھڈ کی طرف جاری ہے۔ بریک کام نہیں کر رہی۔

بلا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ میں کار کا رخ سیدھا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا پھٹا ایک پسہ کنارے سے اتر گیا اور پھر کار کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں رہا۔ کار کے پچھلے دونوں پسے کنارے سے اتر چکے تھے میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بار چھلانگ لگا دی لیکن میں بھی کھڈ کے عین کنارے پر گر پڑا۔ میں نے ایک پتھر کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن پتھر اکھڑ گیا۔

کار فلا بازیاں کھاتی ہوئی عمودی ڈھلان پر سیکڑوں فٹ نیچے پڑے ہوئے دریا کی طرف جاری تھی اور اس کے پیچھے میں ڈھلان پر لڑھکتا ہوا جا رہا تھا۔

میرا سرا یک پتھر سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی چلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبا چلا گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں بلندی سے پستی کی طرف گرتا جا رہا تھا جہاں موت آنکوش داکے کھڑی تھی۔

سپیس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

**طالوت**

تقریباً 50 روپے (تین فی حصہ)

3 حصوں میں (مکمل)

23 روپے (تین فی حصہ)

کے ساتھیوں کے ساتھ

میرے ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ دور کھڑے تھے اور کچھ قریب کھڑے رکوع کے بل جیسے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سب چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ دھند میں لینے ہوئے۔

ایک نسوانی چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ بہت ہی صبح و صبح چہرہ تھا لیکن اس حسین چہرے پر پاس 'افسردگی اور آنکھوں میں وحشت سی بھری ہوئی تھی۔

میں بے حس و حرکت پڑا چند لمحے اس کی وحشت زدہ سی آنکھوں میں گھانٹتا رہا اور جب اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تو سر کے پچھلے حصے سے اٹھنے والی درد کی شدید لہر مجلی کی لمبوں کی طرح میری پوری کھوپڑی میں پھیلی چلی گئی اور میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ میرے کراہنے کی آواز اور چہرے پر نمودار ہونے والے کرب سے اس حسینہ کے چہرے پر غم کے سائے کچھ اور بھی گہرے ہو گئے اور تب مجھے احساس ہوا کہ میرا سر اس کی گود میں تھا۔ ایک ہاتھ اس نے میرے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بار بار میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے میں نے دانت بھیجنے لے اور آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد کی لہر اس اب بھی لپک رہی تھی اور دماغ میں بلبکے بلبکے سے دھماکے ہو رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر دیدے گھما کر اپنے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ میری نظروں کے سامنے چھائی ہوئی دھند بترج پھینٹنے لگی اور ان کے چہرے واضح ہونے لگے۔ ان میں پیشتری نظروں میں جتنس تھا جیسے وہ کوئی عجب دیکھ رہے ہوں۔

میں نے ایک بار پھر اس حسینہ کے چہرے کی طرف دیکھا جس کی گود میں میرا سر رکھا ہوا تھا اور پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس نے ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر دبا دیا۔

"آرام سے لینے رہو بہت سنگھ۔" اس لڑکی کے لہجے میں افسردگی تھی "تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ خون بہت بہہ چکا ہے۔ بستی کا کھیا دیہ (حکیم) کو بلائے گیا ہے۔ اس کے آنے تک آرام سے لینے رہو۔"

بہت سنگھ۔! یہ نام میرے دماغ میں گونجی ہی پیدا کرنے لگا۔ اس لڑکی نے مجھے ہی مخاطب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میرا نام بہت سنگھ تھا لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ واقعی میرا نام تھا۔

میں نے اپنا بدن ڈھیلّا چھوڑ دیا اور ایک بار پھر اطراف

کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گھٹیاں چٹوں والا بڑا قد آور اور بھلا ہوا درخت تھا جس کے سائے میں وہ خوب صورت لڑکی مجھے گود میں سینے بیٹھی تھی۔ میرے ارد گرد جو لوگ کھڑے تھے ان کے چلنے بڑے عجیب تھے۔ مردوں کے جسموں پر چوڑے نمائے لباس تھے۔ ان کے بال لمبے اور گولڈن کلر کے تھے۔ کسی نے پشیا بنا رکھی تھی اور کسی کے بال کندھوں پر اور کسی کے پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے ناک میں ایک طرف اور کسی نے دونوں طرف بالیاں پن رکھی تھیں۔ ان کے کانوں میں بھی بالیاں نظر آ رہی تھیں۔

عورتوں کے چلنے مردوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کے جسموں پر لباس مختصر تھے۔ بدن کے نچلے حصوں پر گھٹنوں سے اور چادر لپی ہوئی تھی جس کی سائڈ میں چاک تھا۔ جسم کے بالائی حصے پر مختصر سا کپڑا اندھے پر ہوتا ہوا اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ سینے کا آدھا حصہ برہنہ ہو رہا تھا اور پشت تو بالکل ہی برہنہ تھی۔ ان کے سروں کے بال قریب سے کٹے ہوئے تھے۔ یہاں کسی حجام کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان عورتوں نے ایک دوسرے کے بال شاید خود ہی کٹیے وغیرہ سے کائے تھے۔ صرف ایک عورت ایسی تھی جس کے بال کندھوں تک بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بعض عورتوں نے ناک میں تختیاں پن رکھی تھیں اور بعض کے کانوں میں بالیاں تھیں۔ ایک دو عورتوں کی کانوں میں سونے کی چوڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چوڑیاں خاصی موٹی اور بے دھنکی سی تھیں۔

بچوں نے بھی تختوں تک لمبے چوٹے پن رکھے تھے اور وہ سب کے سب سمجھے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں کون لڑکی ہے اور کون لڑکا۔

میں ابھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سب لوگ میرے لیے اجنبی تھے اور شاید میں خود بھی اپنے آپ سے اجنبی تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی۔ میں یہاں کیسے آیا تھا اور وہ لڑکی کون تھی جس نے میرا بچہ کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ یہ لڑکی دوسروں سے بالکل عیا مختلف نظر آ رہی تھی۔

میں صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سامنے کھڑے ہوئے لوگ ادھر ادھر بیٹھے گئے اور پھر دو آدمی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میرے سامنے آ گئے۔ ان میں ایک کی عمر بیٹالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ دروازہ قامت اور گھٹا ہوا جسم اس نے زور و رنگ کا چوہہ پن رکھا تھا۔ ناک کے دونوں تختوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور

دونوں کانوں میں بھی چوڑیاں کی طرح بڑی بڑی بالیاں لگی ہوئی تھیں۔ سر کے گولڈن بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بستی کے سینے کے لیے دو تین انچ چوڑی کپڑے کی بستی بنائی ہوئی تھی۔

بستی کے ساتھ دو سرا آدمی عجیب ہیٹ کا تھا۔ اس کی عمر پانچ سے ساڑھے نو سال کی ہوگی۔ اس نے سیاہ رنگ کا چوہہ سترے رنگ کا چوہہ پر۔ جھریاں اس کثرت سے تھیں جیسے پتھر کا تھانہ چہرے پر۔ اس جھروں بھرے چہرے پر کڑی نے جالان رکھا ہو۔ اس جھروں بھرے چہرے پر کڑی نے آنکھیں عجیب سا سرا سا اثر دے رہی تھیں۔ چوڑی چوڑی آنکھیں کے چھلکے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کی اس کا کھیا دیہ کے ہونٹوں کے کناروں پر باریک مونچھیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ہونٹوں کی طرح لگی ہوئی تھیں۔ اس کے کندھے پر چوڑی کا ایک سیلا سا سیلا لٹکا ہوا تھا۔

وہ اس بستی کا وید (حکیم) تھا اور اسے یہاں لے کر آنے والا تھا تھا۔ وہ دونوں میرے سامنے بیٹھ گئے۔ وید نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا اور میری پشت پر بیچ کر میرے سر کے زخم کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے انگلیوں سے سر کو ہلکا ہلکا کر کے دماغ میں تھپتھپائی گئیں۔

اس نے قیلم میں سے قیمتی نکال کر میرے سر کے بال کاٹنے اور پھر ایک ڈنیا میں سے خیال سے رنگ کا مرہم نکال کر زخم پر لگانے لگا اور پھر پٹی اس زور سے باندھی تھی جیسے میرا سر آگنی کھینچے میں کس دیا ہو۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کھیا سے کچھ کما اور اپنا تھپا کندھے پر لٹکا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ کھیا میرے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر نظروں جمائے میرے چہرے کو نکھار رہا پھر غصے ہوئے ہوا رہے میں کچھ کہنے لگا لیکن ان لوگوں کی طرح وہ زبان بھی میرے لیے اجنبی تھی۔ ایک نظر بھی میرے لیے نہیں پڑا۔ وہ اس لڑکی کی طرف مڑ گیا جواب تک مجھے سارا دے ہوئے تھی۔ وہ لڑکی بھی شاید کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

کھیا نے کندھے اٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے زانوؤں پر داسے اور بے بسی سے اپنے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کھڑا ہوا ایک آدمی دوسروں کو ادھر ادھر مٹاتا ہوا آگے آگیا۔ اس کے سر کے بال گردن پر پھیلے ہوئے تھے۔ دوسروں کی طرح اس کی ناک میں بالیاں تھیں۔ کھیا البتہ داسی کان میں چوڑی کی طرح ایک بڑی بالی لپی ہوئی تھی۔ وہ بھی کھیا کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس سے باتیں کرتا رہا پھر میرے ساتھ بیٹھی ہوئی خوب

صورت لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کھیا کہہ رہا ہے کہ اسے ساتھی کو بستی میں لے چلو۔ وہاں تم لوگوں کے لیے ایک چھوٹی سی کاندوست کر دیا گیا ہے۔ جب تک تمہارا ساتھی ٹھک نہیں ہو جاتا، تم لوگوں کو بستی ہی میں رہنا ہوگا۔ تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

اس شخص نے یہ الفاظ نوٹی پھوٹی انگریزی، نیپالی اور ہندی میں کہے تھے۔ مفہوم بہر حال سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لڑکی نے میری طرف دیکھا اور میرا بازو پکڑ کر کھڑے ہوئی۔ ہمارے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ بھی ادھر ادھر بیٹھے گئے۔ میں نے اپنے اطراف میں دیکھا۔ ہم اس وقت درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی پر تھے۔ یہ پہاڑی کافی دور تک ہوا رہی اور اس سے آگے نمودار نہیں تھیں جو بلندی کی طرف اٹھتی چلی گئی تھیں۔ پہاڑی کی دوسری طرف نشیب میں دیا بہہ رہا تھا اور ڈھالی میں سونے نیچے دیا کے کنارے پر وہ بستی تھی جو میں چاہیں بے ترتیب چھوڑ دوں پر مشتمل تھی۔ پہاڑی سے ایک تنگ سی پگڈنڈی اس بستی تک چلی گئی تھی۔ ہمارے ارد گرد جمع لوگ اب اسی پگڈنڈی کی طرف جا رہے تھے۔

کھیا اور وہ آدمی بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس آدمی نے خوب صورت لڑکی سے کچھ کما اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس کا نام سبھا ہے بہت سنگھ۔ یہ پوچھ رہا ہے کہ تم اپنے پیروں پر چل سکو گے یا تمہیں گود میں اٹھالیا جائے۔" "میں چل رہا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مگر تم مجھے بہت سنگھ کہہ کر یوں مخاطب کر رہی ہو۔ کیا میرا نام بہت سنگھ ہے۔ تم کون ہو۔ تم نے میرا سراپا گود میں کیوں رکھا ہوا تھا؟"

"اورہ!" اس لڑکی کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا جیسے کوئی شدید ذہنی دھچکا لگا ہو۔ آنکھوں کی وحشت کچھ اور بڑھ گئی "سنگھ۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہکلائی "مہم میں بلا ہوں اور تم بہت سنگھ۔ ہم دونوں۔" اسی لمحے سبھا نے مڑ کر کچھ کما اور وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم آہستہ آہستہ اس پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ میں اگرچہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا لیکن قدم زمین پر رکھنے سے سر میں دھک سی پیدا ہو رہی تھی جس سے وہ رہ کر دماغ میں تھپتھپائی رہی تھیں۔

کچھ لوگ ہمارے آگے چل رہے تھے اور کچھ پیچھے البتہ



وہ لڑکی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جس نے اپنا نام بلا بتایا تھا۔ اس نے اب بھی میرا ایک بازو تھام رکھا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی کرب نمایاں تھا۔

بہتی کے قریب کچھ اور لوگ بھی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے لیکن ہمیں دیکھ کر ان میں سے کوئی آگے نہیں بڑھا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور وہ سب عجیب سی نظروں سے مجھے اور میرے ساتھ آنے والی بلا کو دیکھ رہے تھے۔

جھوپڑوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن بہتی دریا کے ساتھ دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ جھوپڑے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ ہمیں بھی دریا کے رخ پر واقع ایک کشادہ جھوپڑے میں پھنسا دیا گیا۔ یہ جھوپڑا بھی دوسرے جھوپڑوں کی طرح اوندھانے ہوئے پالے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک مشرق کے رخ پر اور ایک مغرب کے رخ پر۔ دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے اور اندر خاصی روشنی ہو رہی تھی۔

ایک طرف پاک کی کھال کا گدا بچھا ہوا تھا جس میں غالباً درختوں کے خشک پتے بھرے ہوئے تھے کھانا اور سب اشیاء ہمارے ساتھ ہی اندر آئے تھے۔ سبائے مجھے گدے پر لٹا دیا۔ کھانے سب سے کچھ کما۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس دوران میں کھانا جھوپڑے ہی میں موجود رہا تھا۔

سبائے ایلیمینک کے دو گلاس اٹھا رکھے تھے۔ اس نے ایک گلاس بلا کے حوالے کر دیا اور دوسرا میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک بازو سے مجھے سہارا دے کر اٹھا رکھا تھا۔

وہ گرم دودھ تھا جس میں غالباً ہلدی کی آمیزش تھی کیونکہ دودھ کی رنگت نہ صرف قدرے پیلی تھی بلکہ اس میں ہلدی کا ذائقہ واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے چند گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس ہونٹوں سے ہٹا دیا لیکن سبائے اس وقت تک بار نہیں مانی جب تک دودھ کا آخری قطرہ بھی میرے حلق میں نہیں پڑا تھا۔

”اس سے تمہیں سکون ملے گا۔“ سبائے انگریزی اور ہندی کے ملے جلے الفاظ میں کہا ”اب تم آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں نیند آجائے گی اور جب تم بیدار ہو گے تو اپنے آپ کو بہتر محسوس کرو گے۔“

میرے سر میں زخم سے اٹھنے والی ٹیٹوں کے علاوہ بدن

جوڑو جوڑو رکھا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے بری طرح دھڑک دیا ہو لیکن یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ مجھے کیا ہوا تھا؟ میں زخمی کیسے ہوا تھا اور اسے سامنے سب سے بڑا سوال یہ نشان یہ تھا کہ میں کون ہوں؟ کون سی جگہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ میرے سامنے ہوئی بلا نا ہی یہ خوب صورت لڑکی کون ہے؟

میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے سینے اٹھنے لگیں۔ دھماکے سے ہونے لگے۔ آنکھیں بند کر لیں اور دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دیر میں دماغ پر غوغوی سی طاری ہونے لگی۔ بلا اور میرے قریب ہی بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بہت دور سے آتی ہوئی مدھم مدھم سی آوازیں میری سانس پر ٹپکتی رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا لیکن پونے بہت بھاری ہو رہے تھے۔ آنکھیں کھول کر دیکھ کر میں کھل کھل کر ہنس پڑا اور پھر میرے ذہن پر سنا سنا سا گانا

دوبارہ آنکھ کھلی تو جھوپڑے میں مشعل کی روشنی ہوئی تھی۔ تقریباً تین فٹ لمبی وہ مشعل جھوپڑے کی دیوار کے قریب زمین میں کڑی ہوئی تھی۔ اس میں کی چلی جل رہی تھی جس کی پلکی سی بو جھوپڑے کی دیوار پر واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی لیکن نہایت حیرت انگیز یہ بھی کہ مشعل کے جلنے سے کسی قسم کا دھواں نہیں نکلتا تھا۔

مدھم مدھم سرگوشیوں کی آوازیں کر رہی تھیں۔ گردن کھٹک رہی تھی۔ اسی طرح کے ایک پر بلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی دو زانو بیٹھی ہوئی تھی۔ جسم کے نچلے حصے پر دھون کی طرح مختصر سا کپڑا لپٹا ہوا تھا جبکہ جسم کے بالائی حصے پر پلے پلے کپڑے سے اس کے سینے کا ایک طرف کا بالائی حصہ

اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سرخ و سفید رنگت، صحت مند جسم اور موٹی موٹی آنکھیں۔ چہرے کے نقوش بھی بڑے دلکش تھے لیکن اس نے اپنا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ ناک کے دونوں تھنوں میں چھوٹی بالیاں تھیں اور بال اس طرح کئے ہوئے تھے کہ ان کی دھڑکیاں اور کھینچاؤں سنائی دیتی تھیں۔ اس کے بال پتھر سے کئے ہوئے اور ڈھنک کا لباس پہن رکھا ہوا تھا۔ بہت زیادہ پرکشش ہو سکتی تھی۔

مجھے ہوش میں آنے دیکھ کر وہ خاموشی سے باہر چلی گئی اور بلا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

”وہ میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے نرم لمبے میں بولی بولیا محسوس کر رہے ہو۔ سر کا

دور کیا ہے؟“ تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“

”تم کون ہو۔ تمہیں مجھ سے نظر نہیں جھکاؤ۔“ میں نے اس کے چہرے پر ایک بار پھر کرب کے تاثرات ابھر اس کے چہرے پر اچھائی ہوئی تھی۔ میں بلا ہوں۔ ہم دونوں آئے۔“ مجھے بچانو بہت تھی۔

”ہم کون ہیں؟“ میں نے اس کی بات ”تم نے اپنا نام پہلے ہی بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات ”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات ”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات

”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات ”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات

”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات ”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات

”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات ”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات

”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات ”میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“ میں نے اس کی بات

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔



دروازہ بند کر دیا۔ کٹڑے کے ساتھ چڑے کا ایک لمبا ساختہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس نے وہ فیتہ کٹڑے میں ڈال کر دو تین منٹ دے کر گرہ لگا دی۔ دوسری طرف کا دروازہ بھی اسی طرح بند کیا اور میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ وہ اچانک ہی اسے طرح کپکانے لگی تھی جیسے سردی چڑھ گئی ہو۔ میں نے اپنے پیروں کی طرف پڑے ہوئے دونوں کبیل کھول لیے اور میرے کچھ کٹنے سے پہلے ہی بلا کبیل میں مٹھ گئی۔ اس کا بدن واضح طور پر کپکپا رہا تھا۔ میں نے باقی دو کبیل بھی اٹھا کر اس کے اوپر ڈال دیے۔ صرف ایک کبیل ایسا تھا جو میں نے بھی جڑوی اوڑھ رکھا تھا۔

بلا کا سر میرے گھٹنے پر لگا ہوا تھا۔ وہ چاقو کی طرح دھری ہو کر کنبوں میں دبی ہوئی تھی اور پھر اچانک اس کی سسکیوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ بلا رو رہی تھی لیکن میں نے اسے جھپٹنا مناسب نہیں سمجھا۔

بلا روتے روتے سو گئی۔ میں نے اس پر کبیل درست کر دیے اور خود بھی کبیل لپیٹ کر اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔

تین فٹ کی بلندی تک جھونپڑے کی دیوار پتھروں سے بنائی گئی تھی اور اس سے اوپر نکلیاں کھڑکی کر کے درختوں کی خشک شاخوں اور جھاڑیوں سے دیواریں بنائی گئی تھیں۔ ان دیواروں پر اندر اور باہر کی طرف یا کھال ڈال دی گئی تھی اور ان کھالوں کی وجہ سے یہ جھونپڑے بارش اور ہوا سے محفوظ ہو گئے تھے۔

سب نے ٹھیک کہا تھا کہ رات کو سردی بڑھ جائے گی۔ جھونپڑے کے دونوں دروازے اگرچہ بند تھے لیکن ان میں کچھ جھلیاں سی رہ گئی تھیں جن سے ہوا کی آمدورفت جاری تھی اور اس ہوائے جھونپڑے کی فضا خاصی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے سرد خانے میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ بلا نے اگرچہ تین کبیل اوڑھے ہوئے تھے لیکن وہ اس طرح مٹی ہوئی تھی کہ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے اور کبھی بھی قوہ سوتے ہی میں کپکانے لگتی تھی۔

میں جھونپڑے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا رات بھر مٹی سوچتا رہا کہ میں کون ہوں؟ ملا کون ہے اور میں اس کے ساتھ ان پھاڑوں میں سفر کیوں کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں کبھی سنسناہٹ اور کبھی دھماکے ہونے لگتے لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ دماغ میں شدید سیس اٹھنے لگتی اور میں ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے زور زور سے سر جھٹکنے لگتا۔ وہ رات کا آخری پر تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت اور سناٹا

تھا۔ کنبوں میں دبی ہوئی بلا کے بہت نیچے ٹھکانوں کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن اچانک آواز سن کر میں چونک گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے چند چھوٹے چڑے کے پیروں سے ٹکرا کر لڑکھے ہوں۔ اس کے بعد ایک دوسرے جیسا سناٹا تھا۔

میں تسبیح کر بیٹھ گیا اور کسی قسم کی آواز سننے کو شش کرنے لگا۔ دو تین منٹ گزر گئے اور پھر سناٹے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ بالکل یوں لگا جیسے زمین پر غبار ہوئے چھوٹے چھوٹے چھوٹے چھوٹے پر کوئی شخص بہت احتیاط سے چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں سانس روکے بیٹھا رہا۔ وہ آواز جھونپڑے کے مشرقی دروازے کے قریب رک گئی۔ ایک بار پھر غار کی چھانکی اور اس مرتبہ مجھے چونک جانا پڑا۔ جھونپڑے کا دروازہ بہت آہستگی سے حرکت کر رہا تھا۔ دروازے کے نیچے تقریباً ایک انچ کا خلا تھا۔ میرا خیال تھا باہر کوئی جانور دروازے کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے انسانی انگلیاں دروازے کے اس خلا میں داخل ہو گئیں۔

میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ باہر کا جانور نہیں انسان تھا جو دو انگلیاں دروازے کے خلا میں داخل کر کے چڑے کا فیتہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنی سیدھی پنڈلی پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور سنسناہٹ ہونے لگی۔ جیسے تیز آندھیاں چل رہی ہوں۔ میرے لاشعور سے کوئی بات ابھر کر سامنے آنا چاہتی تھی۔

دماغ میں سوئیوں کی چھین سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہاتھ کی انگلیاں پنڈلی کو ٹٹول رہی تھیں اور پھر میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہاتھ پیٹھ گیا اور آنکھیں کھول دیں۔ میری نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ دونوں انسانی انگلیاں اب بھی دروازے پر چڑے کا فیتہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”اے کون ہے باہر کون ہے؟“ میں نے ایک جھٹکے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے ان دونوں انگلیوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی پتھر پر دوڑتا ہوا دور چلا گیا ہو۔ چند لمحوں بعد پھر سناٹا ہو گیا۔

ملا میری آواز سے جاگ گئی تھی۔ ”کیا ہوا بہت ٹھیکہ؟“ اس نے دشت

نہوں نے میری طرف دیکھا۔ ”جی نہیں کون تھا۔ ہاتھ اندر ڈال کر دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں نے جواب دیا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”مہانے خنوار بھی کر دیا تھا کہ رات کو جنگلی جانور اس طرف پھرتے رہتے ہیں۔“

”جانور نہیں کوئی انسان تھا۔“ میں نے جواب دیا ”وہ ہاتھ اندر ڈال کر دروازے کا فیتہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اس قبیلے کے لوگ بظاہر بہت شریف لگتے ہیں لیکن کسی کا ہوسا نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ بلا نے کہا ”تم کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو بہت ٹھیکہ۔ میں نے ابھی تک انہیں تمہارے اور اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ لوگ ہمیں تو رست سمجھ رہے ہیں جو بھٹک کر اس طرف نقل آئے ہیں۔ اگر انہیں ہماری اصلیت کا پتا چل گیا تو جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ کسی مذہب آبادی سے بیکوں میل دور اجنبی لوگوں میں گھرے ہوئے ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ اپنی یادداشت کو واپس لانے کی کوشش کرو۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ میں نے بے بسی سے سر جھٹکا۔

بلا مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اسے اپنے الگ کرنے کے بجائے اس کا نڈھال تھپتھانے لگا۔ ”کیا ہوگا بہت ٹھیکہ؟“ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ میرے ہاتھ کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

رات کا آخری پر بھی بیت رہا تھا۔ بلا کبھی اونگھنے لگتی اور کبھی میرے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرتے لگتی۔

گرہیں کھول کر دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک بخت بستہ جھونکا جھونپڑے میں داخل ہوا اور میں ایک لمحے کو کپکپا اٹھا۔

دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ مشرقی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر سرخی پھیل رہی تھی پھر سورج نکل آیا اور دھوپ کی رو بہنکی کر میں جھونپڑے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر تک پہنچنے لگیں۔

بلا ایک کبیل لپیٹ کر دروازے کے سامنے دھوپ میں بیٹھ گئی۔ میں بھی دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ بستی کے لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ بستی میں ادھر ادھر لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد تھوب ہمارے جھونپڑے میں آگئی۔ اس نے وہی رات والا مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ گھٹنوں سے اوپر دھوپ کی طرح لپٹی ہوئی چادر جس کے ایک طرف اوپر تک چاک تھا اور جسم کے بالائی حصے پر بھی اس کا لباس مختصر تھا۔ اس وقت میں نے پہلی مرتبہ توجہ

سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی ہڈی دار عورت تھی۔ تھوب نے مسکرا کر پہلے ملا کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آتے لیکن مفہوم واضح ہو گیا۔ وہ یقیناً میری خیریت دریافت کر رہی تھی۔ جواب میں میں نے بھی مختصر مسکرائے پر ہی اکتفا کیا۔

تھوب نے بلا کو اشارہ کیا اور بلا اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ جھونپڑے کے کھلے ہوئے دروازے سے وہ کچھ دور تک مجھے نظر آتی رہیں پھر ایک طرف مڑ کر میری نگاہوں سے او جھل ہو گئیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تین چار بچے دروازے کے سامنے آکر جھونپڑے میں جھانکنے لگے۔ میں ان کے لیے عجوبے ہی تھا۔ گزشتہ شام سب نے بتایا تھا کہ ان کی یہ بستی کسی بھی مذہب آبادی سے بیکوں میل دور ہے۔ قبیلے کے لوگ ان اونچے پہاڑوں سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ صرف چند لوگ سال میں ایک مرتبہ مویشی اور اناج وغیرہ لے کر کسی شہر میں جاتے ہیں۔ یہ قبیلہ عام گزرگاہ سے بھی ملیں دور ہے۔ اس طرف سیاحوں کی آمدورفت بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا سیاح اس طرف آ نکلتا ہے تو یہ لوگ اسے عجوبے ہی سمجھتے ہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد تھوب اور بلا واپس آ گئیں۔ وہ دریا کی طرف سے آئی تھیں۔ بلا نے منہ دھو لیا تھا اور وہ مین کے ایک ڈبے میں میرے لیے پانی لے آئی تھی جسے اس نے جھونپڑے کے باہر رکھ دیا تھا۔

تھیوب، بلا کو جھونپڑے کے سامنے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بلا کے اشارے پر میں اٹھ کر باہر آیا اور ڈبے سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھوئے لگا بلکہ بلا میرا منہ دھلا رہی تھی۔ ہم وہیں جھونپڑے کے سامنے دھوپ میں بیٹھ گئے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تھیوب ہمارے لیے ناشتے آئی۔ جو کی روٹی، تھوہ اور ایک کا بھنا ہوا گوشت تھا۔ یہی ان لوگوں کی خوراک تھی۔

ہم ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ سببا اور کھیا بھی دید کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ میں نے ناشتا چھوڑ دیا۔ دید نے میرے سر کی ٹھولی اور دیاہارہ وی مرہم لگا کر پی کس دی۔ سببانے شاید اسے میری یادداشت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ نئی باندھ کر دیا۔ سببانے مجھ سے کچھ باتیں پوچھتا رہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی حادثے کے باعث یادداشت ختم ہو جاتی ہے لیکن ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی اور معمولی حادثے سے یا کوئی غیر معمولی بات یاد دلانے سے تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔“

دید اور کھیا چلے گئے البتہ سببا وہاں بیٹھا رہا۔ وہ مجھے اپنے اس تارنگ قبیلے کے بارے میں بتاتا رہا تھا جو اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی چند بستیوں کی صورت میں قرب و جوار کی پہاڑیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ قبیلہ صدیوں پہلے جنت سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ بنیادی طور پر بدھ کے پیروکار تھے لیکن ان کے دھرم میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں بلکہ بنیادی طور پر کسی دھرم کا وجود ہی نہیں رہا تھا۔ ان کے ہاں کسی عبادت کا تصور نہیں تھا۔

سببا تقریباً دو گھنٹوں تک وہاں بیٹھا رہا پھر مجھے لے کر بستی کی سرکرائے لگا۔ زیادہ تر مرد بستی سے باہر پہاڑیوں کے دامن میں کھیتوں پر چلے گئے تھے۔ عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ تمام جھونپڑوں کے دو دروازے تھے۔ ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف۔ اس طرح جھونپڑوں کے اندر بھی ہوا اور روشنی کا معقول انتظام ہو گیا تھا۔ جھونپڑے بہت صاف ستھرے تھے۔ فرش کی لپائی پوانائی کا بہت خیال رکھا گیا تھا۔ کئی جھونپڑوں میں تو عورتیں اب بھی گارے سے فرش کی لپائی کر رہی تھیں۔

یوں تو تمام جھونپڑے بڑے بڑے اور کشادہ تھے تاہم کھیا کا جھونپڑا سب سے بڑا تھا۔ بعض جھونپڑے اندر سے دو

یا تین حصوں میں تقسیم تھے۔ ہر جھونپڑے کے سامنے جہت کر چھوٹے سے چولہے بنے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی ڈبوں یا مختلف برتنوں میں پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ میں جس طرف سے بھی گزرتا، عورتیں مسکرا کر سلام میری طرف دیتیں اور بچے تو مستقل ہمارے پیچھے ہوتے تھے۔ سببا ایک جھونپڑے کے سامنے رک گیا۔ ”یہ تھا پا کا جھونپڑا ہے۔“ اس نے بتایا ”عورتوں کے حوالے سے اسے اس بستی کا سب سے امیر شخص سمجھا جاتا ہے۔ اس کے قبضے میں پانچ عورتیں ہیں اور وہ سب کی اس وقت تمہارے سامنے موجود ہیں۔“

میں حیرت سے ان پانچ عورتوں کو دیکھنے لگا جو جھونپڑے کے اندر اور اس کے آس پاس اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں لیکن ان کا مالک تھا یا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کے بارے میں سببانے بتایا کہ وہ کسی کام سے گئی ہے۔ پہاڑی کی دوسری طرف والی بستی میں چلا گیا ہے۔

وہ پورا دن کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر گزر گیا۔ زیادہ تر تھیوب اور دوسری عورتوں کے ساتھ رہی تھی۔ کا اندازہ چھیننے سے تھوڑی دیر پہلے بلا جھونپڑے میں آئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سببا بھی آیا۔ وہ ہمیں ایک اور جھونپڑے میں لے گیا۔ بلا نے آج دن میں اسے بتا دیا تھا۔ گزشتہ رات کسی نے ہمارے جھونپڑے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی اور شاید اسی لیے سببانے ہمارا جھونپڑا تبدیل کر دیا ہے۔

ہمارا یہ نیا جھونپڑا قدرے بڑا تھا اور اس کے اندر دوسرے جھونپڑے بھی تھے۔ سببا کے خیال میں اس ”گنجان“ آبادی میں ہمیں کوئی پریشان کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

اس رات سببا بھی ہمارے پاس دیر تک بیٹھا رہا۔ جانے سے پہلے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ آج رات ہمیں کوئی پریشان کرنے کی کوشش نہ کرے۔ سببا کا کتنا درست ثابت ہوا تھا۔ اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ صبح ناشتے کے بعد میں اکیلا ہی شلتا ہوا دریا کی طرف چلا گیا۔ بلا حسب معمول تھیوب اور بستی کی عورتوں کے ساتھ تھی۔ دریا بستی سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا۔ کنارے پر پہنچ کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلا ہوا کانٹا نکل گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں واپس آ رہا تھا تو ایک جگہ تھوڑا سا جھاڑیوں میں سرسراہٹ سن کر رک گیا اور تجسس بڑا۔ وہاں دھڑکتے ہوئے میرا خیال تھا، کوئی جانور ہوگا۔ غلوں سے اور عورتوں کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ لیکن ایک طرف وہ عورتوں کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میں جھک کر بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں زیریں لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جسم کے بالائی حصے نیم پرہیز تھے۔ ان دونوں کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن ان کے ہونٹوں پر مکرہت بڑی خطرناک تھی۔ وہ دونوں چند لمحے میرے چہرے کو دیکھ رہی تھیں پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگیں۔ ان کے خطرناک ارادے بھانپنے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ان کے ہونٹوں کی مکرہت گرمی ہو گئی۔ وہ دونوں پھیلنا شروع کر دیں اور قدرے جگہ کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگیں۔ ان کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی مرنے کو گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

”اے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس وقت میرے دماغ میں سنسنات ہو رہی تھی۔ سببانے مجھے اپنے قبیلے کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس قبیلے کی عورتیں کسی وقت اس قدر خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔“

اے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے میرا ہر ایک پتھر سے گرا گیا۔ میں لوکڑا کر رہ گیا۔ توازن بگڑ گیا تھا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور پشت کے بل زمین پر گرا۔ یہ بھی غصہ تھا کہ کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ زمین پر ٹک گئے تھے۔

دونوں خوں خوار لمبوں کی طرح مجھ پر جم پڑیں۔ وہ قبیلے کا رہی تھیں اور میں چیخ رہا تھا اور پھر اچانک ایک گونج دار آواز سن کر ان دونوں نے مجھے چھوڑ دیا اور اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔

میں نے گردن کھما کر دیکھا۔ ایک جانب سببا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ وہ بڑے غصیلے انداز میں ان دونوں عورتوں سے کچھ کہتا رہا۔ وہ خاموش کھڑی رہیں۔ ان کے چہروں سے مایوسی جھلکتی تھی۔ میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ میں ان کی ”دشمن“ نے میری قیاس تار تار کر دی تھی۔

سببانے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں تمہاری ہی نشانیں اس طرف آتا تھا۔ میں اپنے قبیلے کی عورتوں نے اس پہلو کے بارے میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔“ اس نے

رک کر ان دونوں عورتوں سے کچھ کہا۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے جھاڑیوں میں غائب ہو گئیں۔ سببا مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اچھے ہوئے کپڑے میں استنفا کر کیا۔

”کیا بات ہے تم میری تلاش میں کیوں آئے تھے؟“ میں نے اپنی پٹی ہوئی شرٹ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بستی میں ایک اجنبی آیا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ سببانے کہا۔

”اجنبی! مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

اور پھر ہم دونوں بستی میں آ گئے۔ بستی میں داخل ہوتے ہی بلا دوڑتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

”دبی ہوا جس کا ذرہ تھا ہمت سنگھ۔“ اس نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی ”وہ آدمی اگرچہ ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ چانگ لی یا ناگ پال کا آدمی ہے۔“

”ناگ پال!“ میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس نام سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں آ سکا۔ میں سر جھٹک کر رہ گیا۔

سببا کے کہنے کے مطابق وہ اجنبی کھیا کے جھونپڑے میں میرا فخر تھا لیکن سببا پہلے مجھے ایک اور جھونپڑے میں لے گیا۔ یہاں دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سببانے ایک عورت سے کچھ کہا جس نے جھونپڑے میں ایک طرف رہی پر دنگا ہوا براؤن رنگ کا ایک چوغہ اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پھٹی ہوئی قبض اتار کر وہ چوغہ پن لیا اور سببا کے ساتھ جھونپڑے سے باہر آیا۔

جب ہم کھیا کے جھونپڑے میں داخل ہوئے تو میرا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ جھونپڑے میں ایک طرف تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچا ایک چوڑا ہوتا ہوا تھا جو لمبا کی چوڑائی میں ایک پلنگ کے برابر تھا۔ اس چوڑے پر کھیا اور دید کے علاوہ وہ اجنبی بھی بیٹھا ہوا تھا جو مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ لمبے قد اور چہرے جسم کا مالک تھا۔ نیلی لباس اور سر گرول ٹوپی بھی تھی۔ اس کے گال غیر معمولی طور پر پھولے ہوئے اور آنکھیں چھوٹی تھیں جن میں عیاری کی جگہ نمایاں تھی۔ یہ شخص پہلی ہی نظر میں مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بڑی کینہ توڑ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کچھ کہنا چاہا مگر دید نے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور میرے سر کی پٹی ہونے لگا۔

زخم کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے تھیلے میں سے ڈیبا نکالی اور زخم پر مرہم لگا کر دوبارہ بٹی باندھ دی اور پھر اس اجنبی کو اشارہ کیا کہ وہ مجھ سے بات کر سکتا ہے۔

”میرا نام یونکر ناتھ ہے۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے ایک میلا سا رومال نکالتے ہوئے اپنا تعارف کرایا ”میں ٹورسٹ آفیسر ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔ ان میاؤں میں سفر کرنے والوں کی دیکھ بھال کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بتاؤ۔ اب تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے یا نہیں؟“

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ شخص مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ اوٹ پانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کرنے کے بجائے وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔ چند رسمی سی باتوں کے بعد اس نے بتایا کہ وہاں سے بیس میل دور سڑک کے کنارے نیلے رنگ کی ایک کار کھڑی ہوئی ملی ہے جو ٹورازم کے علاوہ قافی دفتر میں موجود ہے۔ وہ مجھ سے اس کار کی شناخت کرانا چاہتا تھا کہ وہ میری ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے بعد کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اس کا یہ سوال ہی احمقانہ تھا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔“

وید جی نے مجھے آرام کا مشورہ دیا ہے۔ ”میں نے کن انکھیوں سے وید کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں وید جی سے مشورہ کر لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور وید کی طرف دیکھتے ہوئے بتاتی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں اس زبان میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر یونکر ناتھ میری طرف متوجہ ہو گیا ”وید جی نے کہا ہے کہ میں تمہیں کل اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے میں کل بھی تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گا۔ تم اگر کوئی کار شناخت کرانا چاہتے ہو تو اسے یہاں کیوں نہیں لے آئے؟“ میں نے جواب دیا۔ بجائے کیا بات تھی کہ اس اجنبی کی نظریں مجھے سویوں کی طرح اپنے جسم میں چسپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”کار یہاں نہیں لائی جاسکتی۔ اس کا بانی راؤ ٹوٹا ہوا ہے۔ میں پرسوں آؤں گا یا پھر اس سے اگلے دن۔ میں تمہارے صحت یاب ہونے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ میں پھر آؤں گا۔“ وہ شخص یہ کہتے ہوئے اٹھ کر دوڑاڑے کی طرف بڑھ گیا۔ بلا کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا۔ اس نے بڑی عجیب سی نظروں سے بلا کو دیکھا اور پھر جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

یونکر ناتھ چلا گیا لیکن میرے لیے کچھ اور الجھن ہو گئیں۔ بجائے کیا بات تھی کہ میں اس کی موجودگی کو عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

وید بھی جا چکا تھا اور کھیا بھی۔ جھونپڑے میں ہم مزید چار افراد ہٹ گئے تھے۔ میں ’بلا‘ سہا اور کھیا کی پوکے چوتھے پر میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

”یہ کون تھا ہمت سنگھ۔“ بلا میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے بولی۔ ”یاد کرنے کی کوشش کرو۔ یہ کون تھا ہمارے گرد خطرات منڈلاتا شروع ہو گئے ہیں۔ اپنے ذہن زور سے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم خیریت سے یہاں سے نکل سکیں۔“

”میں نہیں جانتا یہ شخص کون تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ میں نے جواب دیا اور اٹھ کر جھونپڑے سے باہر نکلا۔

بلا بھی میرے ساتھ ہی جھونپڑے سے باہر نکلا لیکن اسے تعجب پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور میں کھیا جھونپڑے سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے بڑے ہوئے چم پر بیٹھ گیا۔ میں یونکر ناتھ نامی اس شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک آوی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔ اس کے خون آلود ہاتھ دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی ایک اسٹریچر اٹھاتے بستی میں داخل ہوئے۔ یہ کوئی باقاعدہ اسٹریچر نہیں تھا۔ کوئی کی دو موٹی موٹی شاخوں کو ایک دوسرے سے قاصلے پر رکھ کر پودوں کی پتی اور لپک دار شاخوں سے باندھ کر اسٹریچر بنا کر لیا گیا تھا اور اس اسٹریچر پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ لاش پر کئی جگہ زخم نظر آ رہے تھے۔ اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

وہ لوگ لاش کو کہیں دور سے اٹھا کر لائے تھے۔ ان کے ساتھ چار پانچ آدمی اور بھی تھے۔ اسٹریچر کھیا جھونپڑے کے سامنے رکھ دیا گیا۔ بستی میں موجود لوگ وہاں بھی ہوا شروع ہو گئے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ لاش کا چہرہ دیکھتے ہی میں بدحواس سا ہو گیا۔ وہ یونکر ناتھ تھا جو حکمہ ٹورازم کے آفیسر کی حیثیت سے مجھ سے ملتا تھا۔ ابھی میں لاش کو اچھی طرح دیکھ بھی پایا تھا کہ سب بھی وہاں پہنچ گیا۔

”تم اپنے جھونپڑے میں جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تم ملاقات کروں گا۔“ سمبا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے وہاں سے

ایک طرف ہٹا دیا اور آدمیوں کو لاش اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں اپنے جھونپڑے میں آیا اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ جھونپڑوں کے درمیان مختصر سے میدان میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ عورتیں اور بچے بھی۔ انہی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بلا تیز قدم اٹھاتی ہوئی جھونپڑے میں داخل ہوئی۔

”ہاں! بدحواسی اور خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔“ اس نے میرے ”تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”تھیوب کہہ رہی تھی کہ ہمیں اب اس بستی سے نکال دیا جائے گا۔“

”کیوں؟“ انہوں نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کر لیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہی وحشت انگیز تھا کہ ہمیں اس بستی سے نکالا جائے والا ہے۔ اجنبی جگہ۔ اجنبی لوگ۔ اپنے آپ سے انہی! میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

یونکر ناتھ مرکا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ مرے سے پہلے وہ جس آخری انسان سے ملا تھا وہ تم ہو۔“ بلا نے دم جمے میں جواب دیا۔

”میری ملاقات کا اس کی موت سے کیا تعلق؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ بس وہ لوگ کہتے ہیں کہ تم آخری شخص ہو جس سے یونکر ملا تھا۔ میں تھیوب کے پاس جا رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد آؤں گی۔“ بلا تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرا دماغ بری طرح چکر رہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ مجھ سے ملاقات کے بعد اگر یونکر ناتھ مر گیا تھا یا کسی نے اسے قتل کر دیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں اپنی انہی ذہنی الجھنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سمبا کا انتظار کرنے لگا اور سمبا تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ مجھے اس بستی سے نکالا جا رہا ہے؟“ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”ہاں ہمت سنگھ۔“ وہ بولا ”ہمارے قبیلے کے لوگ بہت توہم پرست ہیں۔ یہاں برسوں سے اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ بہت کم ہو اور امن پسند لوگ ہیں اور۔“

”وہ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یونکر ناتھ اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا۔ اس لیے اس کی موت کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ گویا میں کسی شیطانی قوت کے زیر اثر ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے

کہا ”یونکر کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟ اسے قتل کیا گیا تھا یا کوئی حادثہ؟“

”اس کی موت کی وجہ کوئی نہیں جانتا۔ اس کی لاش بستی سے تقریباً ایک میل دور پہاڑیوں میں اس کی جیب کے قریب پڑی ہوئی پائی گئی تھی جس پر زخموں کے لائقہ و نشان تھے اور زبان بھی کٹی ہوئی تھی۔ اس پاس اس کی جیب کے پیسوں کے سوا اور کسی قسم کے نشان نہیں ملے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہو کہ اسے کسی نے قتل کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے اس کی موت کو پر اسرار قرار دیا جا رہا ہے اور۔“

”اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے کیونکہ وہ آخری مرتبہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔“ میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

سمبا نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک نظریں جھکا کر کھڑا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری دوست بلا، تھیوب کے ساتھ رہے گی اور تم اپنے جھونپڑے سے باہر نہیں نکلو گے۔ شام کا اندھیرا چیلنے کے بعد تمہیں دوسری بستی میں منتقل کر دیا جائے گا۔“

”دوسری بستی میں؟ کیا مطلب؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ بستی یہاں سے چند میل دور پہاڑیوں میں واقع ہے۔ وہاں تم محفوظ رہو گے۔“ سمبا نے جواب دیا۔

”کیا یہاں مجھے کوئی خطرہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس قبیلے کے لوگ صلح جو اور امن پسند ہیں لیکن اس قسم کا غیر معمولی واقعہ ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اس لیے تمہارے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں دوسری بستی میں بھیج دیا جائے۔ تم وہاں محفوظ رہو گے۔“

سمبا چلا گیا اور میں ایک بار پھر الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ قبیلے کی توہم پرستی کے بارے میں سن کر میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ بستی کے لوگ مجھے کسی پر اسرار شیطانی قوت کے زیر اثر سمجھ رہے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ یہاں میری موجودگی کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن۔ میں یہ بستی اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میری یادداشت نہ لوٹ آئے یہاں سے کہیں اور جانے کے لیے میری یادداشت کا بحال ہونا میری ضروری تھا۔ آخر میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ اور یہاں کس طرح پہنچا اور بلا سے میرا کیا تعلق ہے؟ ذہن پر بوجھ ڈالنے سے میرا سر دھنکے لگا اور میں کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

میں دن بھر اپنے جھونپڑے سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے منع کر دیا گیا تھا۔ بلا اگرچہ مستقل طور پر میرے جھونپڑے میں نہیں ٹھہری لیکن اس کی آمد رفت جاری رہی۔ وہ بہت بد حواس اور خوف زدہ تھی۔ وہ جب بھی جھونپڑے میں آتی، چند منٹ رکتی اور پھر واپس چلی جاتی۔ اس مرتبہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تھک چکی اور دوسری عورتوں کے توسط سے یہ کوشش کر رہی ہے کہ کھلیا کو اس بات پر آمادہ کر لیا جائے کہ ہمیں اس بستی سے کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

سہ پہر کے قریب میں نے پیشاب کے لیے جھونپڑے سے باہر جانا چاہا تو ایک آدمی نے مجھے روک لیا۔ اس نے کچھ کہا تھا لیکن بتیجی زبان کا ایک لفظ بھی میرے لیے نہیں پرکھا جبکہ وہ خود بتیجی کے سوا کوئی اور زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے بتایا تو اس نے جھونپڑے کے اندر آکر ایک کڑکی طرف اشارہ کر دیا اور مجھے مجبوراً اس کڑی میں جا کر فراغت حاصل کرنی پڑی۔

وہ چاند کی چودھویں شب تھی۔ غروب آفتاب کے فوراً ہی بعد چاند طلوع ہو گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سمبا جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بلا بھی تھی اور پھر صرف دو منٹ بعد میں اور بلا، سمبا کے ساتھ بستی سے نکل رہے تھے۔

چاندنی رات میں آس پاس بکھری ہوئی وادی کا منظر بڑا دل فریب تھا۔ اگر میں ذہنی طور پر اپ سیٹ نہ ہوتا اور نا گفتہ با صورت حال سے دو چار نہ ہوتا تو اس منظر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش ضرور کرتا۔

سمبا مجھے اس بستی کے بارے میں بتا رہا تھا جہاں ہم جا رہے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ بستی چٹانی غاروں میں آباد تھی۔ بعض غار قدرتی تھے جبکہ بیشتر چٹانیں کاٹ کر بنائے گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ بستی زیادہ سے زیادہ دو چار میل کے فاصلے پر ہوگی لیکن ہم ان پہاڑوں میں پرہیز راستوں پر تقریباً چار گھنٹوں تک چلتے رہے اور بالآخر اس پر اسرار بستی میں پہنچ گئے۔

میں اسے پر اسرار ہی سمجھتا تھا کیونکہ کوئی جھونپڑا یا مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ساری آبادی پہاڑی غاروں میں تھی۔ ان غاروں کے سامنے ایک جگہ چھوٹے سے میدان میں آگ کا بہت بڑا لاد روشن تھا اور کئی لوگ اس لاد کے ارد گرد جمع تھے۔ ان میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں اور گیارہ بارہ سال سے اوپر کی عمر کے بچے بھی۔

سمبا ایک لمحے کو ان لوگوں کے قریب رک گیا تھا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چاندنی رات میں ہلکے غاروں کی یہ بستی واقعی بہت پر اسرار لگ رہی تھی۔ میرے خیال میں یہ غار چٹانوں میں صدیوں کی محنت و ریت کے بعد معرض وجود میں آئے تھے اور شاید یہ لوگ بھی بہت عرصے سے ان غاروں کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے۔

ایک چٹان پر چڑھ کر ہم ایک غار میں داخل ہو گئے۔ غار تیزی طور پر انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے کا راستہ ایک مکان کے عام دروازے کی طرح تھا۔ دونوں طرف چٹانوں کو تراش کر ستون بنائے گئے تھے۔ اندر سے یہ غار دس یا دس فٹ کے ایک کمرے کے برابر تھا۔ اس کی دیواریں گھردری تھیں۔ پیچھے کی طرف ایک تنگ سارستہ تھا۔ ایک دیوار میں مشعل لگی ہوئی تھی جبکہ دوسری دیوار کے قریب ایک گدا بچھا ہوا تھا۔ اس پر کھل بھی پڑے ہوئے تھے۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ سمبا نے کہا ”میں تم آرام نہ کر سکتے ہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ بلا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ابرو والی چمک نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ذہن پر گہری تاریکی کے بجائے دھند سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دھند میں مجھ سے ابھر رہے تھے۔ اچانک اپنے بازو پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں اچھل پڑا۔ وہ بلا تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی جیسے کسی بات پر خوفزدہ ہو۔

”تم لوگ تھک گئے ہو گے۔ آرام کرو۔“ سمبا نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا ”آج پورن ناشی (پورے چاند) کی رات ہے۔ چاند کی چودھویں شب۔ آدھی رات کو یہاں جن گومپا آنے والا ہے۔ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ تم لوگ بھی اس سے مل کر خوش ہو گے لیکن اگر نہ بھی ملنا چاہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آرام سے یہاں پڑے رہنا۔ اب تم ملاقات ہوگی۔“ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر کلا اور باہر طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں ان کو تم لوگوں کے لیے کھانا نہ کر نہیں آئے گا۔ تھوڑی دیر بعد سامنے والے میدان میں ایک کاکوشت بھوتا جائے گا۔ تم لوگ بھی وہاں جا کر اپنا تھکا وصال کر لیتا۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر غصہ کی مسکراہٹ آگئی۔

مسا کے جانے کے بعد میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ مسا کی ایک طرف ایک کی کھال کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ دروازے کے وقت اس پردے کا ایک دوسری طرف کے ستون خدوت کے ”دروازہ“ بند کیا جاسکتا تھا۔ ایک طرف دیوار میں پتھر کا ”دروازہ“ بند کیا جاسکتا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ گدا بچھا ہوا تھا جس پر تین چار کھل پڑے ہوئے تھے۔ مسا کے قریب ہی لکڑی کے ایک ٹک میں بانی بھرا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک پتھر پر ایلو منیم کا ایک میلا سا برتن تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گدا بچھا ہوا تھا۔ گدا بچھل کا تھکا ہوا تھا۔ مسا کی ایک اور پانی کا یہ ٹب اس غار کی کھال کا تھکا ہوا تھا۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر دیوار میں مشعل لگی ہوئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر وہ مشعل اتار لی اور غار کی پچھلی طرف تک سے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ بلا بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ اب بھی خوف زدہ تھی اور اس نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔

وہ تنگ سارستہ دراصل ایک دراڑ تھی جو تقریباً پندرہ گز لمبی تھی۔ اس کی طرف مڑی تھی اور اس طرف روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس طرف بھی ایک قدرے چھوٹا غار تھا۔ اس میں بھی دیواریں تھیں جو ہمارے غار میں تھیں۔ یعنی ایک گدا بچھل اور دروازے کے قریب پانی کا ایک چوٹی برتن۔ تاہم دیوار کے ساتھ دامن سے بائیں بندھی ہوئی ایک رسی پر کچھ پڑے ہوئے تھے۔ اسے اس دیوار میں بھی ایک دراڑ نظر آ رہی تھی۔ ہم اس دراڑ میں داخل ہو کر ایک تیسرے غار میں پہنچ گئے۔

اب مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ چٹانوں سے اندر ہی اندر یہ قدرتی غار ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے چٹانوں کے اندر واقع یہ غار کسی زمانے میں پانی کی گزرگاہ رہے ہوں لیکن پھر پانی نے راستہ بدل لیا اور ان قایم کیوں نے ان غاروں کو اپنا مسکن بنالیا۔ ایک جگہ رک کر میں نے بلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ اس نے میرا بازو دبا کر دامن ہٹنے کا اشارہ کیا۔ میں نے مزید آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور وہیں سے واپس لوٹ آیا۔

اپنے غار میں داخل ہوتے ہی میں ٹھک کر رک گیا۔ بلا خوف زدہ ہی ہو کر میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ سامنے گدے پر اس شخص کو بیٹھنے دیکھ کر تو میرا دماغ ٹھک سے اڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو میں اندازہ نہیں لگا سکا

تھا کہ وہ کوئی انسان ہے یا جانور۔ اس کے سر کے بال داڑھی اور مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں انگوروں کی طرح دھبہ دھبہ تھیں۔ پیلے پیلے چوڑے دانت بے حد خوفناک تھے۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ وہ یقیناً مسکرایا ہوگا لیکن اس طرح اس کا چہرہ کچھ اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ مشعل کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں وہ شخص خاصا پر اسرار لگ رہا تھا۔

اس وحشی نما انسان کے جسم پر بھی پیلے رنگ کا چونہ تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھا دانت کو ستا رہا پھر اٹھ کر ہمارے سامنے آگیا۔ اس کی نظریں بلا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اور پھر اس نے اچانک ہی وہ حرکت کی جس کی کم از کم مجھے توقع نہیں تھی۔ اس نے اچانک ہی بلا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بلا کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ وحشی بلا کو اپنے ساتھ پھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہونٹ اس کے چہرے پر جمائے کی کوشش کر رہا تھا اور بلا مزاحمت کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

”بچاؤ۔ ہمت نہ گھٹا۔ اس وحشی سے بچاؤ مجھے!“ بلا چیخی۔

اس وحشی کے حلق سے ”خرخراہٹ“ کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ایک لمحے کو تو میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور پھر صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں ایک قدم آگے بڑھا تو وہ شخص بلا کو کھینچتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں بھی پھرتی سے آگے بڑھ گیا۔ مشعل میں نے ایک طرف پھینک دی۔ ایک ہاتھ سے بلا کو پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ اس شخص کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلے لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن بلا کی دونوں ہاتھیں اب بھی اس کی گرفت میں تھیں۔ میں نے ہاتھ پھینکا کہ بھلی سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔

ضرب خاصی زوردار لگی تھی۔ وہ بکمرے کی طرح ڈکراتا ہوا ایک قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بلا کا ایک بازو چھوڑ دیا۔ میں نے تھیلے کا موخ دیے بغیر بالکل اسی انداز میں ایک اور ضرب لگا دی۔ اس مرتبہ چوٹ اس کی ناک پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا اور اس نے بلا کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا۔ اپنے ہاتھ پر خون دیکھ کر



غار کے سامنے ڈھلان تھی۔ پتھریلی زمین پر گرتے ہوئے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے

وہ دونوں میرے اس اشارے کا جانے لگا۔  
 کہ ان کے ہونٹوں پر افسانہ مسکراہٹ اُٹھ  
 گئی۔ ایک میری طرف دیکھتے ہوئے تیرے لیے  
 بھراؤن دونوں ہاتھ گرا دیے اور حُر کے تیرے  
 ہونے اپنے ساتھیوں کے قریب چلے گئے۔ اس  
 گھر سے مخاطب ہوا تھا "اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا  
 کہ مجھے اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے آگے  
 بڑھ گئے اور زمین پر گرنے ہوئے خوشی کے آنسو

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے وہ پہلے ہی کہی ہوئی بات کہا کہ اگر وہ پانچ سو آدمی مل کر بیلہ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے تو میں اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ہی بیلان خانے میں نے نارمار کرادھ موار کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جب میں اور بیلہ اندر ہی اندر عافوں میں گھوم رہے تھے تو یہ شخص میدان میں الاؤ کے پاس سے اٹھ کر ہمارے درمیان آیا تھا شاید اپنے ساتھیوں پر اپنی بھادری کا عرب دہاڑا پٹا رہا تھا۔ اس کا خیال ہو گا کہ مجھے مار پیٹ کر بیلہ کو مجھ سے بھیج کر لے جائے گا لیکن وہ خود ہی میرے ہاتھوں پر ہی ٹپک گیا تھا اور اس کے سامنے ہی اسے اٹھا کر بستی سے باہر نکل آئے تھے گویا بندوں کی یہاں کوئی قدر نہیں تھی۔

مجھے بیلہ پر ترس بھی آرہا تھا۔ اگر اس وقت میں نہ ہوتا تو وہ اس کی گتیا پانچا کر دیتا۔ بیلہ بار بار مجھے کچوکے لگا رہی تھی کہ میں اپنے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کروں۔ اس کی ضرورت نہ رہی تھی کہ میں یاد نہیں آرہا تھا۔

”دیکھنا تو چاہیے۔“ میں نے کہا ”ممکن ہے وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔“

میری اس بات پر وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف

دیکھنے لگی لیکن بہر حال وہ میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ ہم غار سے نکل کر ڈھلان اترنے لگے۔ وہ بھکشا غائب ہو چکا تھا البتہ میدان میں الاؤ کے قریب اب بھی دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک آدمی نے سامنے والی چٹان کی طرف اشارہ کر دیا۔

ہم سامنے والی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ ہمارے غار سے اس پہاڑی کا فاصلہ ایک فرلانگ کے لگ بھگ تھا۔

وہ غار زمین سے تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ وہاں زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ ایک طرف دیوار میں لگی ہوئی ایک مشعل جل رہی تھی اور غار کے آخر میں ایک اور کشادہ راستہ نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں اس طرف بڑھتے رہے۔ ہمارے نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں چہرے پر وحشت تھی اور وہ خاصی سہمی ہوئی تھی۔ ہمارے غار میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اسے خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

وہ سرنگ تقریباً تین گز طویل تھی۔ اس کے اختتام پر بھی روشنی نظر آ رہی تھی اور جب ہم سرنگ کی دوسری طرف پہنچے تو وہ منظر دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

وہ بہت کشادہ غار تھا بلکہ اسے غار کہنا مناسب نہیں تھا۔ چاروں طرف عمودی چٹانیں تھیں اور اوپر چھت نہیں تھی۔ آسمان پر چمکا ہوا چاند نظر آ رہا تھا اور شاید اس قلعے کی پوری آبادی اس غار میں جمع تھی۔ صرف عورتیں اور مرد تھے۔

ایک دیوار کے ساتھ تقریباً تین فٹ اونچا چوڑا تھا جس پر دس بارہ افراد بیٹھ سکے تھے اور قصبے کے سارے لوگ اس چوڑے کے سامنے جمع تھے۔

چوڑے کی پہچلی طرف ایک اور تنگ سی سرنگ تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس سرنگ سے دو آدمی برآمد ہوئے۔ ان کے پیچھے چند عورتیں تھیں اور پھر ان کے بعد جو آدمی نمودار ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

مجھے ہنکاک کا ہنرت رکھنا تھا یاد آ گیا جس نے ہنکاک شہر سے باہر آ شرم بنا رکھا تھا جو دراصل عیاشی کا اڈا تھا اور دارا نے اس آ شرم میں بنایا ہی تھی۔ وہ آ شرم جرائم کا اڈا بھی تھا جو ہمارے ہاتھوں جل کر راکھ ہو گیا تھا اور بعد میں ہنرت رکھنا تھا بھی تھائی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اس شخص کا حلیہ ہنکاک کے ہنرت رکھنا تھا سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ لہذا قد، بھاری، بھر پور جسم، ہتھیار جس کے پچھلے حصے پر تقریباً ایک بالشت لگی چلیا تھی۔ آنکھیں

انگاریوں کی طرح دیک رہی تھیں۔ داڑھی اور مونچھ بال اس طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے کہ منہ کا بازو کر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ یہ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کندھوں اور بازوؤں گتے بال نظر آ رہے تھے۔ اس نے اسکرٹ کی طرح نیکر پہن رکھی تھی جو گھٹنوں سے کافی اونچی تھی۔ رنگ برنگ موتیوں کی مالا میں بڑی بڑی موتی تھیں۔ وہ نہایت غلیظ اور گندا آدمی تھا۔ منہ سے نکلنے والی داڑھی کے بال گیلے ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کر آتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ نیم برہنہ عورتیں وائیں بائیں سے اپنی بانسوں کی پلٹ میں لے کر اسے دے رکھا تھا۔ وہ اپنا بوجھ کبھی ایک عورت پر ڈالتا اور دوسری عورت پر۔

وہ چوڑے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ دونوں عورتیں بازوؤں سے لپٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ چوڑے کے سامنے ہوئے لوگ بڑی عقیدت بھری نظروں سے اس کی طرف رہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اس قلعے کا کوئی روحانی پیشوا تھا لیکن سب سے زیادہ بات نہیں کسی تھی۔

چن گومپا کچھ دیر انگاروں جیسی سرخ آنکھوں سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے دو بار اشارہ کیا۔ وہ دونوں عورتیں اٹھ کر چوڑے پر بیٹھ گئیں۔ چن گومپا نے اپنا ایک پیر آگے کو پھیلا دیا۔ وہ دونوں اس کا پیر چائے لگیں۔ اس کا اشارہ پا کر ایک اور آدمی چوڑے پر آگئی اور اس کا دوسرا پیر چائے لگی اور پھر اور عورت۔ وہ اس کی داڑھی کے بال اور بالائے ہوئے ہونٹ چائے لگی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔ گومپا نہایت غلیظ آدمی تھا لیکن یہ عورتیں بڑی عقیدت پرے جوش و خروش سے اس کے پیر اور جسم کو چاہتی تھیں۔ اس نے شاید ان کے اذیان کو اس قدر خراب کر دیا کہ وہ اس کے اشاروں پر اس کے سامنے جھک رہے تھے۔ چوڑے کے عقب سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ اس نے مجھے ہونٹے گوشت سے لبرز ایک بڑا سا طشت دیا تھا۔ چن گومپا پیر سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے اس کے سامنے رکھ دیا۔

چن گومپا نے مجھے ہونٹے گوشت کا ایک بڑا سا اٹھالیا اور اٹھوں سے کٹ کٹ کر کھانے لگا۔ اس کا

کھانے کا انداز بھی بڑا گھناؤنا تھا۔ اس کے منہ سے ”چچا چچ“ کی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کتا بڈی چار رہا ہو۔ گومپا کے ارد گرد بیٹھی ہوئی عورتیں بڑی لپٹائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ گومپا نے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے چوس کر ایک طرف اگل دیا۔

آپ پاس بیٹھی ہوئی عورتیں اگلے ہوئے گوشت کے اس ٹکڑے پر اس طرح جھپٹ پڑیں جس طرح کتا بڈی پر جھپٹا ہے۔

گومپا کے منہ سے اگلا جانے والا گوشت کا وہ ٹکڑا کسی سے ہاتھ تپا نہیں لیکن وہاں ایک اور دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ وہ چاروں پانچوں عورتیں ایک دوسرے سے جھگڑا کر رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ہی ان کے لباس آثار مار ہو چکے تھے۔

اچانک ہی گومپا کے منہ سے ایک گونج دار آواز نکلی۔ اس نے بجائے کیا کہا تھا کہ وہ عورتیں ایک دم ایک دوسرے سے الگ ہٹ گئیں۔ گومپا تیز لہجے میں ان سے کچھ کہتا رہا پھر طشت میں پڑے ہوئے گوشت کے پارچے اٹھا اٹھا کر چوڑے کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اچھالنے لگا۔

لوگ کتوں کی طرح ان پر جھپٹ پڑے۔ یہ ہنگامہ تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ میں نے ہمارے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے اثرات تھے۔ اب گومپا شاید کوئی بھاشن (خطبہ) دے رہا تھا۔ ہر شخص بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ابھی اس کا بھاشن جاری ہی تھا کہ چوڑے کے پیچھے سے برآمد ہونے والے ایک آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے ہمارے غار میں ہمارے دست درازی کی کوشش کی تھی اور میرے ہاتھوں پنا تھا اور لوگوں نے اسے اٹھا کر بستی سے باہر پھینک دیا تھا۔

اس شخص اور گومپا کے ملنے میں تھوڑا ہی فرق تھا۔ وہ جھک کر گومپا کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں ہماری طرف اٹھ گئی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ تھا اور گومپا سے ہمارے ہی بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

گومپا نے بھی ہماری طرف دیکھا۔ اس کی نظریں ہمارے چہرے سے پھسلتی ہوئی میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے نگاہیں ملے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سالگا اور پورے جسم میں سنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں زیادہ دیر

تک اس کی نظروں کی تاب نہ لاسکا اور رخ بدل لیا۔ اسی لمحے گومپا کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

دو آدمی اٹھ کر ہماری طرف لپکے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا، وہ ہمارا کو اٹھا کر چوڑے کی طرف لے گئے۔ ہمارے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ہی طرح چن رہی تھی۔

چوڑے پر وہ جانور نما انسان ہمارے لپٹ گیا اور اسے بری طرح جھونڈنے لگا۔

”بہت سنگھ!“

ہمارا کی چیخ سن کر میں جیسے ہوش میں آ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں دوڑتا ہوا چوڑے پر پہنچ گیا اور اس وحشی کو بالوں سے پکڑ کر ایک طرف کھینچ لگا۔ اس نے ہمارا کو پھوڑ کر اچانک ہی میرے سینے پر گھونسا رسید کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے سینے پر دھڑکی ہوئی ہو۔ اس نے ضرب لگائی گئی تھی۔ مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، اس نے میرے سر پر گھونسا مارا۔

میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی نیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور گھونسلوں اور لاقوں سے میری تواضع کرتا رہا۔

ہمارا ایک طرف کھڑی چیخ رہی تھی۔ چوڑے کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ بھی چیخ چیخ کر میرے حریف کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے پہلے اس شخص کو میرے ہاتھوں پٹنے کے بعد اٹھا کر بستی سے باہر پھینک دیا تھا اور اب میرے خلاف اسے شہ دے رہے تھے۔

اور پھر مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ میرا بھلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون بہنے لگا تھا۔ خون کا ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا اور پھر مجھ پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔ میں نے اس وحشی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ پہلے اسے اٹھا کر چوڑے پر پٹ دیا اور پھر اس پر لاقوں اور گھونسلوں کی بارش کر دی۔

چوڑے پر موجود تنگ دھڑنگ عورتیں چیختی ہوئی ادھر ادھر بھاگ گئیں اور میں اس وحشی کو پورے چوڑے پر لوٹا تا رہا۔ لوگ اب بھی چیخ چیخ کر میرے حریف کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ چن گومپا بھی چیخ رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر رینگنے کی طرح تاج رہا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے موقع مل گیا اور میں نے گومپا کو اٹھا کر چوڑے سے نیچے پھینک دیا۔ اس کی بھینک چیخ غار میں گونج اٹھی تھی۔

اور پھر ایک دم ایسا سنا چھا گیا جیسے وہاں زندگی کا وجود

ہی منٹ گیا ہو مگر یہ سنا تاؤ وہ دوپرتک پر قرار نہ رہ سکا۔ دو تین آدمی چیتے ہوئے میری طرف لپکے لیکن گومپا کی دباؤ سن کر رک گئے۔

میں اس وحشی کو بھی چوترے سے نیچے پھینک دیا تھا۔ وہ زمین پر بڑا کر رہا تھا۔ گومپا نے چیخ کر لوگوں سے کچھ کہا اور میری طرف مڑ گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرے دماغ میں سننا نہایت سی ہونے لگی اور میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔

گومپا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس مرتبہ یوں لگا جیسے میرے دماغ میں سویاں سی چھ رہی ہوں۔ میں نے ایک بار پھر سر کو جھٹکے دیے۔

گومپا پر بری طرح جھنجھلاہٹ سی طاری ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سرے اوپر اٹھا کر چیتے ہوئے کچھ کہنے لگا مگر اس کا ایک لفظ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔

ایک تنگ دھڑنگ عورت اپنی جگہ سے اٹھ کر ”گومپا۔ گومپا۔“ چیتے ہوئی اس کی طرف لپکی۔ وہ اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی۔ گومپا نے ٹانگ کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ عورت چیتے ہوئی دور جا گری۔

گومپا چیتا دباؤ نہا ہوا چوترے کی پچھلی طرف تنگ سے راستے میں داخل ہو گیا۔ میرے ہاتھوں دو سری مرتبہ پٹنے والا وحشی بھی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑا۔

گومپا کے جاتے ہی صورت حال بدل گئی۔ چند آدمی میری طرف گھومنے تان کر چیتے چلائے لگے لیکن کوئی آگے نہیں بڑھا۔ تاہم دو تنگ دھڑنگ عورتیں ہلا کی طرف لپکی تھیں لیکن ان دونوں ہتھکڑوں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر ان عورتوں کو ایک طرف دھکیل دیا اور مجھے اور ہلا کو بانہوں سے پکڑ کر اس طرف دوڑ پڑے جس طرف سے ہم اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے لیکن کوئی آگے نہیں آیا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔

ہم اس غار سے باہر آگئے۔ میدان میں اب بھی الاؤ روشن تھا اور تین چار آدمی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے غار میں آگئے۔ وہ دونوں ہتھکڑی بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ میں ان سے گومپا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں میری زبان نہیں سمجھتے تھے۔

وہ دونوں ہمیں غار میں چھوڑ کر چلے گئے۔

ہلا نے مکمل اوڑھ لیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھا گومپا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے ملنے سے میں نے یہ تو اندازہ لگالیا تھا کہ گومپا کا تعلق اس قبیلے سے نہیں تھا۔ وہ بعض پر اسرار قوتوں کا مالک تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عرصہ پہلے وہ بھی بھٹک کر اس طرف آنکلا ہو اور اپنی ان پر اسرار قوتوں کے بل بوتے پر ان لوگوں کو اپنے قابو میں کر لیا ہو لیکن میرا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ قبیلے کے سب لوگ اس کے زیر اثر نہیں تھے۔ ان دو ہتھکڑوں کو اس کے مخالفین میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ سب بھی تھا جس نے بتایا تھا کہ جن گومپا ایک دلچسپ آدمی ہے جس کا مطلب تھا کہ وہ گومپا کا پیروکار نہیں تھا۔

گومپا نے جس طرح ان لوگوں کے اذہان کو مسخر کر رکھا تھا وہ واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ اسے تو کچھ کرکرات محسوس ہوتی تھی لیکن عورتیں جس طرح اس کے پیروچاٹ رہی تھیں وہ کم از کم میرے لیے انتہائی خیر خیز تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ گومپا بعض پر اسرار قوتوں کا مالک تھا اور اس نے یہ پر اسرار قوتیں مجھ پر بھی آزمائے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اس کا سامنا کرتے ہوئے میرے دماغ کو بار بار جھٹکے لگنا۔ سوئیوں کی جبین محسوس ہونا اور دماغ اور پورے جسم میں سنسنی پھیل جانا۔ وہ اپنی کسی پر اسرار قوت سے بار بار مجھ پر حملے کرنا تھا لیکن شاید میرے اندر بھی کوئی ایسی قوت موجود تھی جو اس کے ان حملوں کو ناکام بنا رہی تھی۔

میرے اندر وہ کون سی قوت ہو سکتی تھی؟ میرے دماغ میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ میں اچھل پڑا۔ مجھے لگا جیسے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے کوئی بات ابھر کر سامنے آنا چاہتی ہو لیکن ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

ہلا میرے ملنے پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ میں رات بھر جاگتا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ گومپا یا اس کے حواری کوئی گزربھ کر نے کی کوشش نہ کریں لیکن وہ رات کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر گزر گئی۔

صبح ایک ہتھکڑی ہمیں ایک اور غار میں لے گیا۔ وہاں دوسرا ہتھکڑی بھی بیٹھا تھا۔ یہ غار کافی کشادہ تھا اور چوڑوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں پوری گھر گرجتی کا سامان موجود ہے۔

میں اور ہلا ایک گلدے پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ہی ایک عورت غار کے اندر دھنکی سے برآمد ہوئی۔ اس نے ایک پنکٹ ہمارے سامنے رکھ دیا جس میں یاک کا بھنا ہوا

تازہ گوشت اور قوہ تھا۔ وہ خود بھی دو زانو ہو کر ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ ان دونوں میں سے ایک ہلکھٹو ہمارے قریب بیٹھ گیا اور دو سرا ہر چلا گیا۔

اس وقت صبح کے فوج رہے تھے۔ ہم ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ سب کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہیں چونک گیا۔

”ایک آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ سب نے کہا ”وہ صبح سویرے ہماری بستی میں آیا تھا۔ میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ اپنے آپ کو تمہارا شناسا ہوتا ہے۔“

”میرا شناسا!“ میں نے حیرت سے کہا اور پھر بلا کر وہیں چھوڑ کر غار سے باہر آیا۔

غار کے دہانے سے چند گز دور ایک وراز قامت آدمی ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا جسم قدرے بھاری بھر کم تھا۔ اس نے جینز اور ڈیم کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے اور لباس سے وہ بیانی نہیں لگتا تھا۔

”میرا نام تری دیو ہے۔“ اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا ”میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چند ضروری باتیں پوچھنا تھیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں۔“

سب ہمیں اسی غار میں چھوڑ کر چلا گیا جہاں ہم نے رات گزار رہی تھی۔

”میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔“ میں نے اس کے سامنے گدے پر بیٹھتے ہوئے کہا ”تمہیں سب اور بستی والوں نے بتا دیا ہوگا کہ ایک حادثے کے بعد میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں۔“

”میں کسی حادثے کے بارے میں نہیں یوگندر ناتھ نامی اس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو کل صبح دوسری بستی میں تم سے ملا تھا اور تم سے ملاقات کے کچھ ہی دیر بعد اسے پہاڑوں میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔“ تری دیو نے کہا۔

”اے۔۔۔ لیکن میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا اور کسی کار کی شناخت کے سلسلے میں کہیں لے جانا چاہتا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ کسی انجانے خوف کی لہر میرے پورے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔

”تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یوگندر ناتھ کا فورا زم کے ٹھکے سے کوئی متعلق نہیں تھا۔“ تری دیو نے جواب دیا ”میں اس وقت تمہیں زبان کھولنے پر مجبور نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ یوگندر ناتھ سے تمہاری کیا بات چیت ہوئی تھی؟“

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں کچھ

دیر تک اپنے بے ربط تخیل پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اسے بتانے لگا کہ یوگندر ناتھ سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یوگندر نے دوبارہ آنے کے لیے کہا تھا۔ تری دیو بڑی گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں غلط بیانی سے تو کام نہیں لے رہا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو؟“ میں نے سوال دیا۔

”ضرور۔“ تری دیو نے جواب دیا ”اس کا اصل نام موتی لال تھا۔ وہ ہندو تھا اور اس کا کسی ٹھکے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دراصل منشیات کا اسمگلر تھا اور اس کی بھانجہ سرکرمیا خاص وسیع تھیں۔ وہ قتل کی کئی وارداتوں کے سلسلے میں بھی کھنڈو پولیس کو مطلوب تھا لیکن اچانک ہی غائب ہو گیا۔ اس کا کھنڈو سے یہاں آنا اور تم سے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بستی اس کے لیے بہت اہم تھی۔“

اب مرچکا ہے اور تمہیں کچھ یاد نہیں لیکن میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ تم اس کے لیے اسے اہم کیوں تھے؟“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ میرے

لبے میں بے بسی تھی۔

”کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری لاش بھی یوگندر ناتھ کی طرح پہاڑوں میں کہیں پڑی ہوئی ملے۔“

میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھے واقعی اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سب غار میں داخل ہوا۔

”تمہارے اس ممان کا کہنا ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں ہے۔“ تری دیو نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ درست ہے۔“ سب نے جواب دیا ”اس کی یادداشت کھو چکی ہے اور ہمارے قبیلے کا دید اس کا علاج کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ملا نام کی ایک لڑکی ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے یا اس کے بارے میں اس وقت تک کچھ نہیں بتائے گی جب تک اس کے ساتھی کی یادداشت نہیں لوٹ آتی۔“

”بہر حال“ میں پھر آؤں گا۔“ تری دیو نے کہتے ہوئے اٹھ گیا ”اور مشرمت سنگھ۔ بہتر ہوگا کہ تم جلد سے جلد اپنی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرو۔“ تری دیو نے یہ کہتے ہوئے اس انداز میں میری طرف دیکھا جیسے اسے شبہ ہو کہ میں اپنی یادداشت کھوجانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔ وہ عجیب

سی لگا ہوں سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

”سب ابھی یہی آیا۔“ کہتے ہوئے غار سے نکل گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تری دیو کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس نے بتایا تھا کہ یوگندر ناتھ منشیات کا اسمگلر تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ منشیات کے ایک اسمگلر کا ٹھکے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یوگندر ناتھ میرے پاس کیوں آیا تھا؟

کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا سر دھکنے لگا اور میں بھی اٹھ کر غار سے باہر آیا۔

میں پتھروں والے غار میں آیا۔ ملا وہاں نہیں تھی۔ بکھڑے بتایا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اس غار سے چل گئی تھی۔ میں اپنے غار کی طرف واپس آ رہا تھا کہ سب اور وید

آتے ہوئے دکھائی دے۔

غار میں آکر وید نے میرے سر کی پٹی تبدیل کی اور مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں سب کو یہاں پیش آنے والے رات کے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

سب نے جن گویا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ واقعی بعض پر اسرار قوتوں کا مالک تھا۔ کئی سال پہلے کسی طرف سے بھٹکتا ہوا

یہاں آیا تھا۔ اس نے ایک دو آدمیوں کو اپنی اس پر اسرار قوت سے تسخیر کر لیا اور پھر اس کا حلقہ پھیلنے لگا لیکن قبیلے کے

زیادہ لوگ اس کے خلاف تھے۔ وہ اسے یہاں سے نکالنا چاہتے تھے لیکن چونکہ اس نے بھی اپنے کچھ حمایتی پیدا کر لیے تھے اس لیے کسی تصادم سے بچنے کے لیے اس معاملے کو جوں

کا توں چھوڑ دیا تھا۔ بہر حال، سب نے مجھے اور خاص طور پر بلا کو اس سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

سب چلا گیا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ گدے پر لیٹا تو

خندہ نہ دھج گیا۔

سب نے مجھے جستجو کر دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ غار میں مشعل جل رہی تھی۔ میرے ذہن پر خندہ کا شمار تھا لیکن سب

نے جو خبر سنائی وہ بڑی دھماکا خیز تھی۔

بلا لاپتا تھی!

سب بلا لاپتا سے کیا مطلب؟ میں بری طرح چونک گیا۔

”میدان کی دوسری طرف درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے کے جھنڈ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لباس سے وہ آدمی

کوئی ہندو ہی لگتا تھا لیکن وہ ساہو اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے بعد سے بلا کو نہیں دیکھا گیا۔“ سب نے جواب

دیا۔

”تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں جگا دیا تھا۔“ میں نے

کہا۔

”میں دن بھر کھیا کے کاموں میں مصروف رہا تھا۔ مجھے

بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی معلوم ہوا ہے۔“ سب نے جواب

دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے یوگندر ناتھ کی موت کا منظر

گھوم گیا۔ کہیں بلا بھی! نہیں نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔

بلا کے بارے میں ایسا نہیں سوچا جا سکتا۔ وہ جرائم پیشہ

لوگوں کی آلہ کار نہیں ہو سکتی۔ اسے یقیناً اس آدمی نے اغوا

کیا ہوگا جو مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ بلا کے ذریعے دباؤ

ڈال کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا ہوگا۔

”کیا اسے پہاڑوں کی طرف تلاش کیا گیا ہے۔ میرا

مطلب ہے۔“ کسی انجانے خوف سے میں اپنا جملہ مکمل

نہیں کر سکا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ سب نے جواب دیا

”میں اب چند روز سے کچھ پر اسرار قسم کے واقعات رونما ہونے

لگے ہیں۔“

”کیا ان پر اسرار واقعات سے میرا کوئی تعلق ہو سکتا

ہے؟“ میں نے انہی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”صورت حال خاصی پیچیدہ ہے۔“ سب نے جواب دیا

”میں اب لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پر اسرار واقعات کے ذمے

دارم ہو۔“

میں ایک بار پھر خیالوں میں گھوٹا۔ مجھے یہاں آئے

ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے اور اس عرصے میں ایک آدمی

پر اسرار طریقے سے ہلاک ہو چکا تھا اور میری اپنی ساتھی لاپتا

تھی اور بد قسمتی سے وہ دونوں آخری مرتبہ مجھ سے ہی ملے

تھے۔ لوگوں کے خیال میں، میں کسی پر اسرار شیطانی قوت کے

ذریعہ اثر تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا یہ یقین

بڑھتا ہوا جا رہا تھا کہ ان پر اسرار واقعات سے میرا کوئی تعلق

ہے۔ وہ مجھے قصور وار سمجھ رہے تھے۔

میں سب کے ساتھ غار سے باہر آیا۔ سامنے ہی وہ

دونوں ہلکھٹو چند آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ دو عورتیں

بھی تھیں۔ ان سب کے چہروں پر فکرمناں تھا۔ وہ سب

بہر دانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بلا کی

پر اسرار گشتگری پر سب ہی پریشان تھے اور پھر بلا کی تلاش

مردوع ہو گئی۔ لوگ دو دو تین تین کی فزیوں کی صورت میں

پہاڑوں میں پھیل گئے۔ سب اور ایک ہلکھٹو میرے ساتھ

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہم ہاتھوں میں مشعلیں لیے غاروں میں گھومتے رہے۔ یہ غار چٹانوں کے اندر ہی اندر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ بعض غار سرنگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور بعض بالکل الگ تھک تھے۔ ان غاروں میں رہنے والے کئی اور لوگ بھی بلا کی تلاش میں ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔

آدھی رات تک تلاش جاری رہی لیکن ملا کو ملنا تھا نہ ملی۔ میں اور سمبا واپس اسی غار میں آگئے۔ سمبا کو شام کو اپنی بستی واپس جانا تھا لیکن بلا کی گمشدگی کی وجہ سے وہ بھی میرے پاس ہی رک گیا تھا۔ ہم رات کے آخری پر تک بیٹھے بلا ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ تری دیو بھی پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ سمبا اٹھ کر غار سے باہر چلا گیا۔ تری دیو میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”مجھے بلا کی گمشدگی کا افسوس ہے“ تری دیو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”صدیوں پرانے یہ غار بڑے پراسرار ہیں۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک رات پہلے تم جن گویا سے مل چکے ہو۔ اس جیسا پراسرار شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تم اگر چاہو تو میں اب بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اگر تمہاری یادداشت برقرار ہوتی تو تم مجھے فوراً پہچان لیتے۔ ہماری پہلی ملاقات تقریباً ایک مہینہ پہلے کھنڈوں میں ہوئی تھی۔ میں اسے باقاعدہ ملاقات تو نہیں کوں گا۔ میں اس وقت دیش کھ کی طرف تھا اور ہم ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن اب ہم میں دوستی ہو سکتی ہے۔“

”کھنڈوں۔ حریف۔ دیش کھ۔“ میرے دماغ میں آندھیاں ہی چلنے لگیں۔

”نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں۔“ میں بے بسی سے سر جھٹکتے لگا ”مجھے بالکل یاد نہیں۔ ماضی کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں رہی۔“

”میرے خیال میں تمہیں اتنا یاد ہو گا کہ چند روز پہلے تمہارے ایک دوست کی حویلی کو آگ لگا دی گئی تھی اور تمہارا دوست سابق پولیس انسپکٹر پانڈے بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہو گیا تھا اور صرف تین چار دن پہلے تم ہی کے قریب ناگ پال اور چانگ کی دو آدمیوں کو قتل کر کے پانچ سو گلو ہیروئن کے اڑے تھے۔“ اس نے میری آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے کہا۔ گویا اسے شبہ تھا کہ میں اپنی یادداشت کھوجانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔

”ناگ پال۔ چانگ کی۔ پانچ سو گلو ہیروئن۔ میں بالکل نہیں سمجھا۔“ مجھے اس کی باتوں سے ابھن کی محسوس ہونے لگی تھی۔

”اب مجھے کھل کر بات کرنی پڑے گی۔“ تری دیو نے کہتے ہوئے محتاط نگاہوں سے غار کے دروازے کی طرف دیکھا ”تم اپنی ایک دوست کو چھڑانے کے لیے دیش کھ کو چھپا کر دے ہوئے ہندوستان سے کھنڈوں آئے تھے۔ تم بھی اگرچہ غیر قانونی طور پر بنگال میں داخل ہوئے تھے لیکن وہ پولیس آفیسر تمہاری مدد کر رہے تھے۔ دیش کھ نے ناگ پال کے پاس پناہ لی لیکن چند ہی روز بعد ناگ پال اسے اپنے لیے بوجھ سمجھنے لگا۔ اس نے دیش کھ کو مورا دیا۔ اس طرح اس کے دو مقاصد پورے ہو گئے۔ اسے دیش کھ سے بھی نجات ملی گئی اور کھنڈوں میں ہنگامے شروع کرنا کے اسے اپنے بدیشی آقاؤں کی راہ ہموار کرنے میں بھی مدد ملی۔“

”تم اپنی دوست کو دیش کھ کی قید سے نجات دلانے کے لیے اصولی طور پر ہمیں ہندوستان واپس چلے جانا چاہیے تھا لیکن تم اس چینی کا قصہ بھی پاک کرنا چاہتے تھے جو ناگ پال کی مدد سے اس دیش میں ہیروئن اور دیگر منشیات کی تجارت پر قابض ہونا چاہتا تھا۔“

”تمہیں کسی طرح اطلاع مل گئی کہ ناگ پال کے آدھی جنوبی علاقے سے پانچ سو گلو ہیروئن لے کر آ رہے ہیں اور ہیروئن کی یہ پہلی بڑی کھپ و وصول کرنے کے لیے چانگ کی اپنے آدمیوں کے ساتھ کھنڈوں سے ڈھائی تین سو میل پڑی نامی بستی میں موجود تھا لیکن تم نے پڑی سے آگے نکل کر ان دونوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر پانچ سو گلو ہیروئن پر قبضہ کر لیا۔“

”وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح پورے ملک میں جستجو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید تم ہندوستان کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرو گے اس لیے ان کی تمام تر توجہ سرحد کی طرف ہے۔ یہ بات ابھی تک ان کے ذہن میں نہیں آئی کہ تم پہاڑوں میں کسی دور دراز کی بستی میں پناہ لیے ہوئے ہو۔“

”اگر تم یادداشت کھوجانے کا ڈھونگ ختم کرو اور اسی ہیروئن میں سے آدھا حصہ دینے کا وعدہ کرو تو میں بغافلت سرحد پار کر دوں گا۔ ہندوستان پہنچا سکتا ہوں۔“

”تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مجھے بچہ

یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے ایک بار پھر بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

”دوے تمہاری یہ کیفیت کب تک درست ہو جائے گی؟“ تری دیو نے مشتہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وید جی کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے دو چار روز میں میری یادداشت لوٹ آئے اور اس میں غیر معینہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ!“ تری دیو نے کہا ”میں پھر کسی وقت تم سے ملاقات کروں گا۔ اپنے ذہن پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے تمہیں کچھ یاد آجائے۔“

تری دیو کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد سمبا غار میں آگیا۔ میں اس وقت شدید ذہنی ابھن میں مبتلا تھا۔ دماغ پر چوٹیوں کی ریگ رہی تھیں سمبا چرے کے تاثرات سے میری اندرونی کیفیت کو بھانپ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ بلا آخر کئی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے اسے تری دیو سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر سمبا بری طرح چونک گیا۔

”ہیروئن!“ اس نے نظریں میرے چہرے پر جمادیں ”صورت حال خاصی پیچیدہ ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔ وہ لوگ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔“

”پولیس!“ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ”یہاں سے تقریباً تین میل دور کالی کوٹ نامی گاؤں میں پولیس کی ایک چوکی ہے۔“ سمبا نے بتایا ”وہ لوگ قبائلی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے اور اس طرف کبھی کوئی پولیس والا آیا بھی نہیں لیکن یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ہمیں پولیس کو اطلاع ضرور دینی چاہیے۔ میں بخشو کو یاگ (YAK) لے جاؤں والا جیتی تیل کو روانہ کر دیتا ہوں۔ تمیں میل کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں لیکن ان پہاڑوں میں راستہ بہت دشوار اور خطرناک ہیں۔ وہ شام تک وہاں پہنچ جائے گا اور میرا خیال ہے کل صبح تک کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر یہاں واپس آجائے گا۔ میں بخشو کو دیکھتا ہوں۔ اسے اسی روانہ کر دیتا چاہیے۔“ سمبا تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں سترے لیٹ گیا۔ میرا دماغ بری طرح چکر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ صورت حال نہ صرف پیچیدہ بلکہ نہایت سنگین بھی تھی۔ اگر پولیس کو پتا چلا گیا کہ میں ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہوں تو میرا ٹھکانا

جیل کے سوا اور کہیں نہیں ہو گا۔ اس تصور ہی سے میں لرز اٹھا۔ ملا لاپتا تھی یا شاید وہ بھی صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے غائب ہو گئی تھی۔ میرے لیے بھی بچاؤ کا ایک ہی راستہ تھا۔ فرار!

میں وقت گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی دن بھر بلا کی تلاش بھی جاری رہی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ میں اپنے غار میں آکر لیٹ گیا۔ سمبا آج پھر وہیں رہ گیا تھا لیکن رات کو وہ میرے پاس نہیں رہا تھا۔

میں بار بار اٹھ کر غار سے باہر جھانک رہا تھا بار بار آخر جب سناٹا چھا گیا تو میں غار سے باہر آیا اور محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا میدان کی طرف چلے لگا۔

اچانک اسی طرف سے کوئی پتھر پڑنے کی آواز سن کر میں جلدی سے ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے دب گیا۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا ہوا لیکن نہ تو کوئی آہٹ سنائی دی اور نہ ہی کوئی نظر آیا۔ میں پتھر کی آڑ سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پہلی چنگاریاں سی ناچ اٹھیں۔ سر پر گرنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا اور لہرانا ہوا نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔



جہاں میری آنکھ کھلی وہ تقریباً بارہ فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑا ایک ہماڑی غاری تھا۔ چھت اس قدر نیچی تھی کہ قدرے لمبے قے کے آدمی کا سر چھت کو چھو سکتا تھا۔ ایک طرف دیوار کے قریب ایک چوڑا تھا جس پر ٹین کا بنا ہوا ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس چراغ میں بھی کسی قسم کی چربی جل رہی تھی۔ گاڑھے دھوئیں کے ساتھ غار میں ناگوار سی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے قریب ہی پانی سے بھرا ہوا ایک برتن بھی پڑا ہوا تھا۔ میری ایک کلائی آہنی کڑے میں جکڑی ہوئی تھی جس سے منسلک زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں لگے ہوئے ایک ہک میں پھنسا ہوا تھا۔

چند لمحوں تک تو کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی پھر رفتہ رفتہ صورت حال واضح ہونے لگی۔ رات کو غار کے سامنے والے میدان میں میرے سر کی پشت پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا گیا تھا اور اب میں ایک قیدی تھا لیکن میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا تھا کہ مجھے قید کرنے والا کون تھا۔

میں کچھ دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا پھر اٹھ کر اس قید

خانے کا جائزہ لینے لگا۔ ذخیرہ خاصی لمبی تھی۔ میں اس حد تک آگے بڑھتا رہا جس حد تک ذخیرہ اجازت دے رہی تھی۔ یہ غار شاید پہلے بھی قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ایک طرف کپڑوں کے چند چھترے اور غلامت کا ذخیرہ نظر آ رہا تھا۔ جس سے شدید نفص اٹھ رہا تھا۔

میں دوسری طرف گھومنا ہی چاہتا تھا کہ کوئی نے میں کوئی چیز چسکی ہوئی دیکھ کر رک گیا۔ میں نے چوتھے پر بڑا ہوا چراغ اٹھالیا اور آگے بڑھنے لگا اور پھر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

روشنی میں چمکنے والی چیز دھوپ کا وہ چشمہ تھا جو گزشتہ روز میں نے تری دیو کی آنکھوں پر دیکھا تھا۔ اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور فریم درمیان سے مڑا ہوا تھا۔ میرے لیے خوف زدہ ہونے کی بات یہ تھی کہ ٹوٹا ہوا وہ چشمہ ایک انسانی ہاتھ کی گرفت میں تھا جس کا پانی حصہ دیوار کے پیچھے تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بلا تھی۔

دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو حقیقت جوں کی توں میرے سامنے موجود تھی۔ بلا کا مردہ جسم آڑی ترچھی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس نار نار اور جسم پر چھوٹے بڑے زخموں کے لاتعداد نشان نظر آ رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ مرنے سے پہلے اس پر بہت تشدد کیا گیا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ بلا کی اذیت ناک موت کا ذمہ دار صرف اور صرف میں تھا۔

میں ذرا اور آگے بڑھا تو میرے دماغ کو ایک بار پھر شدید جھٹکا لگا۔ اس تنگ سی دراڑ میں بلا کی لاش سے تین چار گز آگے تری دیو کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا زخرا کا ہوا تھا اور اس پاس خون بکھرا ہوا تھا جو کمرسہا ہوا تھا۔ میں اس دراڑ سے باہر آ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بلا کو بستی سے غائب کرنے والا تری دیو تھا لیکن یہاں کوئی اور بھی تھا جس نے تری دیو کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

میرے دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ سر پر جہاں ضرب لگائی گئی تھی وہاں درد کی شدید تپیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سر میں دھماکہ ہو رہے ہوں پھر اچانک ہی میرے دماغ میں روشنی کا ایک کوند سا لپکا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے ماضی کی طرف لوٹنے لگا۔

میری کوئی ہوئی یادداشت لوٹ رہی تھی۔ جیتے ہوئے

واقعات تاریکی سے ابھر کر سامنے آنے لگے خیالات اور یادوں کے اس جھوم میں میرا دماغ دکھنے لگا۔ میں بار بار سر کو جھٹکتے لگا کہ ذہن کا پوچھ کی طرح ہو سکے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ماضی کی ایک ایک تصویر ذہن پر واضح ہوئی جاگتی گئی۔

آخری بات جو بالکل واضح ہو کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ میں اور بلا، چانگلی کے دو آدمیوں کو ختم کر کے پانچ گز پر ہیروئن پر قبضہ کر کے اپنی گاڑی پر پی ڈی ٹی اس گاڑی سے دور نکل جانا چاہتے تھے جہاں چانگلی اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ رات بھر ہانڈوں میں سفر کرتے ہوئے ہم جھانے لگاں نکل آئے تھے اور پھر کار کا وہ حادثہ بھی واضح طور پر ذہن میں ابھر آیا۔ آخری بات جو مجھے یاد تھی وہ یہ تھی کہ میری کار ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے دیکھا کی طرف جاری تھی اور میں بھی کار کے پیچھے ڈھلان پر لڑھکتا ہوا اور پھر میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا۔ اس کے بعد مجھے پکایا نہیں رہا تھا۔

تاریک قبیلے کی اس بستی میں سب سے پہلے یونگرہ ناف نے اپنے آپ کو نورازم کا آفسر ظاہر کر کے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ کسی کار کی شاخت کے بہانے مجھے اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد یونگرہ ناتھ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا پھر تری دیو سامنے آیا۔ وہ اپنے آپ کو میرا شناسا ظاہر کر کے مجھ سے ہیروئن کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اور اب بلا اور تری دیو کی لاشیں میرے سامنے تھیں۔ بلا کو میری ساتھی سمجھ کر تری دیو نے اغوا کیا تھا۔ اس پر تشدد کر کے ہیروئن کے بارے میں اس سے کچھ پوچھا جاتا تھا لیکن بلا تشدد کی تاب نہ لا سکی اور ختم ہو گئی اور پھر کسی اور نے تری دیو کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آ رہی تھی کہ یونگرہ ناتھ اور بلا کو تری دیو نے قتل کیا تھا لیکن یہ سوال بہت اہم تھا کہ تری دیو کو ہلاک کرنے والا کون تھا؟

یونگرہ ناتھ اور تری دیو کے بارے میں مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ انہیں کسی طرح یہ پتا چل گیا تھا کہ میں چانگلی کے آدمیوں سے ہیروئن چھین کر لے جھاگا ہوں اور وہ لوگ مجھ سے ہیروئن چھیننا چاہتے تھے۔

بہت دیر سوچنے کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تو میں نے سر جھٹک کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ یہاں میں تیر ختم ہو رہا تھا کیونکہ روشنی کم ہو گئی تھی۔ میری کلائی پٹی ہوئی پھٹکری خاصی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں ان

پتھ کو کم سے کم حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ تکلیف زیادہ نہ ہو۔

ساتھ میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا لیکن پھر اچانک باہر کسی جگہ دھک سنائی دی۔ وہ ہماری قدموں کی آواز تھی جو کچھ بہت قریب آئی جاری تھی۔ بلا خنجر کے دھانے کے سامنے پہنچ کر وہ آواز رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹانگی کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں چند لمحوں اور میں نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔

”بہت بھادور بننے کی کوشش کر رہے تھے بستی کے راج کو بھول جاؤ اور ذرا میرے اس سہمان خانے میں بھی رہ کر دیکھو۔“

یہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے ایک چن گومپا، دوسرا دی جانور نما آدمی جو دو مرتبہ مجھ سے پٹ چکا تھا۔ اس نے تیرے آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ وحشی نے اس آدمی کو زوردار دھکا دیا اور وہ لڑکھاتا ہوا عمار کے وسط میں آن کر۔

وہ سہا تھا جس کے ہاتھ پٹ پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹنسا ہوا تھا۔ سہا کی حالت دیکھ کر میں لرزا تھا۔ اس کی پیشانی سے بننے والا خون اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کے ساتھ مار پٹ بھی کی گئی تھی۔ میں چند لمحوں وحش نظموں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر چن گومپا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تو مجھے اغوا کرنے والے تم تھے لیکن سہا کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

”تم ہمارا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔ اسے یہاں لانا میرے لیے یوں بھی سود مند ثابت ہو سکتا ہے کہ بستی میں اب ہمیں تلاش کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ تمہارے غائب ہونے پر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا۔“ گومپا نے جواب دیا۔ اس کے بعد سے ہونٹوں پر بڑی کربسہ سی مگر اہم ہو گئی تھی۔

”لیکن بلا نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ اسے اس بے رحمی سے کیوں ہلاک کیا گیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”اس پر بوسا کا دل گیا تھا۔“ اس نے اپنے ساتھی سے پوچھ لی لیکن بلا خنجر اس کے قابو آ ہی گئی۔ ویسے وہ تفرقت تک بڑی نازک سی لگتی تھی لیکن بڑی جان دار نکلی۔ اسے پناہ تک مزاحمت کرنی رہی۔ آخر میں تو تری دیو نے بھی پناہ کی کوشش کی تھی۔ بوسا نے اس کا بھی قصہ تمام

کر دیا کیونکہ تری دیو کا زندہ رہنا بھی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور بلا تو ویسے بھی تمہاری ساتھی تھی۔ تمہارے ہر راز سے بھی واقف ہوگی۔ ہم اس سے وہ راز اگلوانا چاہتے تھے لیکن میں پھر کون گا کہ وہ بڑی سخت جان تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہیں اگلا۔

”میں۔۔۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم تو سب کچھ جانتے ہو!“ چن گومپا نے طنز سے لہجے میں کہا ”ہم تمہارا راز غمی سے معلوم کر لیں گے۔“

”مم۔۔۔ میں کیسے جانتا ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ تم جانتے ہو میں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہوں۔“ میں نے چوچکا کھاتے ہوئے کہا۔ میں گومپا پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے۔

”ہوں۔“ گومپا نے مجھے گھورا ”میں تم سے علیحدگی میں بات کروں گا۔“ اس نے بوسا کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سہا کے منہ میں ٹنسا ہوا کپڑا نکال دیا اور پھر آگے بڑھ کر میری پھٹکری بھی کھول دی۔ میں دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی سلانے لگا۔

”تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی گومپا۔“ سہا نے اسے دھمکی دی ”بستی کے لوگوں کو بہت سگھ اور بلا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ بلا کو تم نے ختم کر دیا ہے۔ بہت سگھ کی گمشدگی پر لوگ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ تم کسی طرح بچ نہیں سکو گے۔ ویسے بھی تمہاری مجرمانہ اور غیر اخلاقی سرگرمیاں جس طرح بڑھ رہی ہیں وہ بھی اب بستی کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوئی جا رہی ہیں۔“

”میری مجرمانہ اور غیر اخلاقی سرگرمیاں۔“ گومپا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”جی تو اب ابتدا ہوئی ہے سہا۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس بستی کی عورتیں کس طرح میرے اشارے پر بے لباس ہو کر میرے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں اور مرد میرے پیرو چائے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ابھی تو چند لوگ میرے اشاروں پر رنج رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب بستی کے لوگ مجھے بچدے کریں گے۔ میرے اندر کی ہمتی انہیں مجبور کر دے گی۔“

اندر کی ہمتی کے نام پر میں چونک گیا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ مجھے یاد آ گیا کہ ایک رات پہلے اس نے مجھ پر بھی اپنی وہ ہمتی آزمائے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس وقت تو مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ میرے اندر بھی کوئی ہمتی موجود ہے۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ



گومپا کو اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی اور اب میں اپنے حواس میں آچکا تھا۔

”یہ تمہاری خام خیالی ہے گومپا۔“ سمساکے بجائے میں نے جواب دیا ”میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن تم نے ان لوگوں کی زندگیوں کو جس طرح جنم بنا رکھا ہے اس کی سزا تمہیں بھگتی پڑے گی۔ اب تمہاری کوئی شکتی کام نہیں آئے گی۔“

”ادھو۔“ گومپا کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے نظریں میرے چہرے پر جمادیں۔

میں بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا اور پلک جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

گومپا کھڑے کھڑے لکڑا گیا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔

”بومبا۔“ وہ دہاڑا ”اے باہر لے کر چلو۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میرے اندر کتنی شکتی ہے اور میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”تم کچھ بھی نہیں کر سکتے گومپا۔ تم زندگی بھر ہمیں اپنا قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتے۔“ میں نے کہا۔

”میں یہ لوگ نہیں پاؤں گا لیکن تم لوگوں کو اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ دنیا میں تمہارا نام تک نہیں رہے گا۔“ گومپا نے جواب دیا اور بومبا کو اشارہ کیا۔

بومبا نے میرے بازو پر گرفت جمادی۔ ہم مختلف سرنگوں سے ہوتے ہوئے غار سے باہر ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔

باہر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چاروں طرف سے عمودی چٹانوں میں گہرے ہوئے ایک چھوٹے سے میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چھوٹے بے

ہوئے تھے۔ تین چار جگہوں پر مٹھیل مل رہی تھیں۔ ایک طرف دھکتے ہوئے کونوں کا ڈھیر تھا۔ اس کے دائیں بائیں لکڑیوں کے اسٹینڈ تھے جن پر لوہے کا ایک موٹا سیرا رکھا ہوا

تھا اور لوہے کے اس سریے پر ہاڑی بکرا یا ایسا ہی کوئی جانور بٹکا ہوا تھا جو نیچے دیکھتے ہوئے کونوں پر سوٹ ہو رہا تھا۔

ایک تنگ دھڑنگ عورت تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سریے کو گھما رہی تھی تاکہ کبکے کا گوشت چاروں طرف سے سوٹ ہو سکے۔ ایک دوسری عورت کسی اور کام میں مصروف تھی۔ ان دونوں کا تعلق نارنگ قبیلے ہی سے تھا اور

ان کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے غار میں گومپا نے ایک بار پھر مجھ پر

اپنی شکتی آزمائے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پٹانزم کا

ماہر تھا۔ اس نے پٹانزم ہی سے ان لوگوں کے اذان سکڑ رکھے تھے اور قبیلے کے سیدھے سادے لوگ اس کو اس کی

پراسرار شکتی سمجھ بیٹھے تھے اور گومپا کی اسی پراسرار قوت کے بل بوتے پر وہ کتوں کی طرح اس کے پیچ چلانے پر مجبور

تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ گومپا نے ایک اسٹول کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی دوسرے اسٹول پر بیٹھ گیا ”میں ایک بات تم

واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ مجھ سے تعاون کرو گے تو فائدے میں رہو گے اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ میں نہ تو کوئی تمہاری

مدد کو آئے گا اور نہ ہی تم میں اس سے فرار ہو سکتے ہو۔ اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں سچ اگوا تا بھی جاتا

ہوں۔“

”لیکن مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“

”تمہیں سب کچھ یاد آجائے گا۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر گومپا نے باتوں ہی باتوں میں اپنے بارے میں جو انکشاف کیا وہ بہت ہی سنجیدہ نظر

وہ کھنڈو کا رہنے والا تھا۔ بد معاشی اور غش گردی کے حوالے سے شہر کے بعض علاقوں میں اس کی بڑی دھاک

بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پٹانزم کا بھی ماہر تھا۔ وہ جرائم اور دوا گیری میں اپنے اس علم سے بھی فائدہ اٹھا رہا تھا۔

پانچ سال پہلے اس کا ایک مخالف گروہ سے تصادم ہو گیا۔ اس تصادم میں گومپا کے ہاتھوں تین آدمی مارے

گئے۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تھا لیکن وہ بھاگ نکلا۔ کچھ عرصہ وہ شہر کے نواح میں واقع بدھوں کی ایک چھوٹی سی بستی

میں روپوش رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اب شہر کاں کرنا خطرے سے خالی نہیں تو وہ دھول گری کی طرف فرار ہو گیا

اور پھاڑوں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھٹکا ہوا اس طرف انکلا۔

نارنگ قبیلے کی یہ بستی اس کے لیے ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ شہر کی تہذیب سے قطعی آ آشنا یہ سیدھے سادے لوگ

بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے گومپا کو ان (عظیم) سمجھ کر بنا دیا۔ گومپا کچھ عرصے تک قبیلے کی مختلف بستیوں میں گھومتا رہا پھر غاروں والی اس بستی کو مستقل ٹھکانے کے طور پر منتخب کر لیا اور اپنی پٹانزم کی قوت سے ان پر اثر انداز ہونے لگا۔ سب سے پہلے اس نے بومبا کو اپنے

قابول کیا۔ دو طاقت بومبا بستی کا سب سے طاقت ور آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس تین عورتیں تھیں اور اس نے

تینوں کو گومپا کی خدمت میں پیش کر دیا۔

گومپا آہستہ آہستہ پیر پھیلنا آ گیا۔ اس نے پٹانزم کے ذریعے کئی لوگوں کو اپنا مطیع بنالیا لیکن بستی کے بہت سے

لوگ ذہنی طور پر مضبوط تھے۔ وہ اس کے داؤ میں نہیں آئے۔

کچھ لوگ گومپا کو بستی سے نکالنا چاہتے تھے لیکن بہت سے لوگ اس کے حلقے میں بھی شامل ہو چکے تھے۔ اسے

زبردستی بستی سے نکلنے کی کوشش کی جاتی تو ہنگامہ ہوتا، قتل و غارت ہوئی تاہم گومپا پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ پہلے کی

طرح آزادی سے قبیلے کی بستیوں میں نہیں گھومے گا۔ غاروں والی بستی میں وہ ہرپونم (بورے چاند) کی رات اس غار میں

آتا تھا جہاں دوسرے لوگ بھی جمع ہو جاتے اور رات بھر اخلاص سے گری ہوئی حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا۔ گومپا نے ان

کے ذہنوں میں یہ بات بخادی تھی کہ یہی اصل زندگی ہے۔ یہ لوگ کسی دھرم یا اخلاقیات کے پابند نہیں تھے اس لیے گومپا

انہیں بھٹکانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”میں یہاں بڑے سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔“ گومپا میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”تم دیکھ چکے ہو کہ یہ لوگ

کس طرح کتوں کی طرح میرے پیچ چلانے ہیں لیکن تری دیو نے یہاں آکر میرے من میں الجھ چا دی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے گومپا کی طرف دیکھا۔

”تری دیو بھی کھنڈو کا رہنے والا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے

جنہوں نے کئی سال پہلے کھنڈو میں منشیات کو متعارف کرایا تھا۔ اس سے پہلے اس ملک کے لوگ ایسی چیزوں کو جانتے

بھی نہیں تھے۔“ گومپا نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”میں یہاں تری دیو کو دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا۔ میرا

خیال تھا کہ شاید وہ بھی پولیس سے بچنے کے لیے بھاگا ہے اور پناہ کی تلاش میں بھٹکا ہوا اس طرف انکلا ہے لیکن اس نے

تمہارے بارے میں جو کہانی سنائی وہ بڑی دلچسپ تھی۔ پانچ سو کلویہوئن!“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

میں اسی لمحے ایک چھوٹے سے دوسری طرف کوئی پتھر اٹھنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ گومپا کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

وہ صبح اٹھا کر اس کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

اس وقت مجھے بھی پہلی مرتبہ اس جگہ کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں شاید کسی قدیم عمارت کے کھنڈرات تھے۔

کچھ اونچی شکستہ دیواریں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی ٹوٹا ہوا ستون بھی نظر آ رہا تھا۔

”شاید کوئی جانور تھا۔“ گومپا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”بہر حال“ تری دیو نے مجھے تمہارے بارے میں بھی بتایا تھا۔

تم واقعی بہت بہادر آدمی ہو۔ کسی شیر کے منہ سے نوالہ چھین لینا آسان نہیں ہوتا لیکن تم نے واقعی بڑی ہمت کا ثبوت

دیا۔ پانچ سو کلویہوئن کے لیے تو میں اپنی یہ راجدھانی چھوڑنے پر بھی تیار ہو گیا۔ تری دیو نے مجھے قطعی قطعی کالاج دیا تھا لیکن مجھے اس کی یہ شرط پسند نہیں آئی۔ تری دیو سے

ایک دن پہلے پوگنڈر تاتھ نام کا ایک آدمی اور تری دیو بھی تمہاری تلاش میں یہاں آچکا تھا۔ اسے تری دیو نے تم کھڑا کیا۔

”بقول تمہارے“ تم اپنی یادداشت کھینچے ہو۔ تری دیو تم سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے کہنے

پر تمہاری ساتھی بلا کو اٹھالیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زبان کھول دے گی اور بومبا بھی اس سے اپنے من کی آش (دل) خواہش (پوری کرے گا لیکن وہ بڑی سخت جان ثابت ہوئی۔

بومبا نے تو اپنی آشاپوری کر لی لیکن ہیروئن کے حوالے سے اس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ اب تم مجھے بتاؤ

گے کہ وہ ہیروئن کہاں ہے؟“

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا۔ میں ابھی تک اندھیرے میں اس طرف دیکھ

رہا تھا جہاں سے پتھر اٹھنے کی آواز سنائی دی تھی اور پھر میں نے ایک لمحے کے لیے دو چٹانوں کے درمیان ایک ہولے کو

معلق دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے گومپا کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”تو پھر مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“ وہ رال سے بھری ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ”بومبا دو

مرتبہ تمہارے ہاتھوں پٹ چکا ہے لیکن وہ اتنا کمزور اور بزدل نہیں کہ تیسری مرتبہ بھی پٹ جائے۔ یہ جان لو کہ بومبا

تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں!“ میں تقریباً جج اٹھا ”جب میں کچھ جانتا ہی نہیں تو تشدد کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ میں

خاموش ہو کر گومپا کے چہرے کو کھنکے لگا جہاں درندگی اور بربریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بلا کی سچ شدہ لاش میری

آنکھوں کے سامنے گھوم گئی جو گومپا اور بومبا کی بربریت کا واضح ثبوت تھی لیکن میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی

ہو زبان نہیں کھولوں گا۔

”تم نے اس دنیا میں بہت عیش کر لیا۔“ گومپا نے کہا  
”اب تمہاری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ میں  
تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا لیکن تمہیں اس  
وقت تک مرنے نہیں دوں گا جب تک تم زبان نہیں کھولو  
گے۔“

”اگر۔۔۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں کچھ جانتا ہوں تو؟“ میں  
نے کہا۔

”تم مجھے ہر وہ بات بتاؤ گے جو میں جانا چاہتا ہوں۔“  
گومپا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”اور میں یہ بتاؤں گا بھی ضروری  
سمجھتا ہوں کہ میں بومبا کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔“ اس  
نے خاموش ہو کر بومبا کو اشارہ کیا۔

سرور کی ایک لمبی ریشہ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔  
میں سمجھ گیا کہ گومپا مجھے کسی بھی حالت میں معاف نہیں  
کرے گا۔ وہ ہچ اگلوٹے کے لیے واقعی میرے جسم کا ریشہ  
ریشہ الگ کر دے گا۔ بومبا دو مرتبہ مجھ سے ہٹ چکا تھا۔ وہ  
میرا لحاظ نہیں کر سکتا تھا۔

دیو قامت وحشی بومبا نے چڑے کے ایک فیتے سے  
میری دونوں کلانیاں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیں کہ  
چڑے کا فیتہ مجھے گوشت میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہونے  
لگا پھر اس نے میرا سر پکڑ کر گردن کو ایک طرف موڑا۔ مجھے  
گردن کی ہڈی ٹوٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بومبا نے ایک  
زوردار جھکاؤ سے گردن چھوڑ دی۔ میرے منہ سے چیخ نکل  
گئی اور میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔

مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں کوئی مزاحمت  
کیے بغیر کس قدر آسانی سے ان کا شکار بن گیا تھا۔ وہ تعداد  
میں صرف دو تھے اور میں بڑی آسانی سے ان دونوں کی  
گردنیں موڑ سکتا تھا لیکن میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ بومبا  
نے بڑے اطمینان سے میرے ہاتھ باندھ دیے تھے اور میری  
گردن کو جھٹکے دے رہا تھا۔ میرے دماغ میں شدید سنسنائٹ  
ہو رہی تھی اور شاید سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو  
کر رہ گئی تھیں۔

”میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں۔“ گومپا کی  
آواز سنائی دی۔ ”بیرونی کماں ہے؟“

”مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے  
کراتے ہوئے جواب دیا۔

گومپا نے بومبا کو اشارہ کیا۔ اور ٹھیک اسی لمحے کسی  
طرف سے ”دھپ“ کی آواز سنائی دی۔ گومپا ایک جھٹکے سے

اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بجائے کہاں سے  
اعشاریہ تین اٹھ کا ریو الو نکال لیا اور مارچ اٹھا کر آواز کی  
سمت دوڑ پڑا۔

میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی۔  
میں تو بومبا کو دیکھ رہا تھا جو میرے اوپر جھکا جا رہا تھا۔ اس نے  
میرے ایک ہاتھ کی انگلیاں پکڑ لیں اور دوسرے ہاتھ سے  
ذہن پر پڑا ہوا پلاس اٹھالیا۔ میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے  
سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ میری انگلیوں کے ناخن چھیننا چاہتا  
ہے لیکن میں اسی وقت ”دھپ“ کی ایک اور آواز سنائی دی  
اور کسی نے جلتی ہوئی ایک شعلہ اٹھا کر ایک جھوٹے پیر  
پھینک دی۔

بومبا مجھے چھوڑ کر اس طرف بھاگا۔ میرا دماغ بالکل  
ماؤف ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا  
ہو رہا ہے۔ اچانک پشت کی طرف سے ایک سرگوشی سنائی  
دی۔

”بہت سنگھ۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟“  
آواز بلاشبہ سمبا کی تھی۔ میرے دماغ کو ایک جھکا سا لگا

اور میں اٹھ کر آواز کی سمت دوڑ پڑا۔ اگرچہ جھوٹے پیر میں  
آگ لگ چکی تھی لیکن جس طرف سے آواز آئی تھی اس  
طرف مارا کی تھی۔ میں جیسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے ستون کے  
قرب پہنچا، کسی نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچتا ہوا ایک اور  
غار میں داخل ہو گیا۔

وہ سمبا تھا۔ ہم دونوں اندھوں کی طرح غار میں ٹھوکریں  
کھاتے ہوئے بالآخر ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ بھی کھنڈر  
کا ایک حصہ ہی تھا۔ ہمارے سامنے پتھروں کی کشادہ میزبیاں  
تھیں۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی مدھم روشنی میں نیچے  
ایک جیب کھڑی نظر آ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پینچ کر اپنے  
لگا۔

”ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ نیچے شاید تری دیو  
کی جیب کھڑی ہے۔ اگر گومپا بومبا ہم سے پہلے جیب تک  
پہنچ گئے تو ہمارے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔“

سمبا میرا بازو پکڑ کر میزبیاں اترنے لگا۔ ایک جگہ ہم  
ایک دیوار کی آڑ میں رک گئے۔ سمبا شیشے کے ایک ٹکڑے  
سے میری کلانیوں پر بندھا ہوا چڑے کا فیتہ کاٹنے لگا۔ یہ تری  
دیو کی ٹوٹی ہوئی عینک کا شیشہ تھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی عینک میں نے  
ملا کر لاش کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں  
لگی کہ غار کے اندر سمبا نے اپنے ہاتھوں پر بندھی ہوئی دی  
کس طرح کافی ہوگی۔

چند سینکڑے بعد ہم دیوار کی آڑ سے نکل کر پھر نیچے اترنے  
لگے۔ آخری میزبیاں سے زمین کا فاصلہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور  
وہاں سے پتھریں تھیں فٹ آگے جیب کھڑی تھی۔ سمبا میزبیاں  
سے نیچے کود گیا۔ میں جھلانگ لگانے کے بجائے پتھری میزبیاں  
کا کنارہ پکڑ کر ٹنگ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاتھ جھوڑا، انصاف  
دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ دائیں طرف بلندی سے  
آنے والی گولی میرے بالکل قریب پتھر پر لگی۔ پتھر کا ایک ٹکڑا  
اڑ کر میری گردن پر لگا اور اسی دقت میں نے نیچے جھلانگ لگا  
دی۔ سمبا مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دیوار کے ساتھ چپک  
گیا۔

دائیں طرف چٹان پر کھڑا ہوا گومپا صاف نظر آ رہا تھا۔  
وہ ریو الو سے جیب پر فائرنگ کر رہا تھا۔ پہلے جیب کی دھڑ  
شید ڈوٹی اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ جیب کا ایک ٹکڑا  
گولی کی زد میں آکر پھٹ گیا تھا۔ اس دھماکے کے فوراً ہی بعد  
گومپا بھی چٹان پر سے غائب ہو گیا۔

”سمبا۔ تم اس طرف سے جاؤ۔ میں اس طرف سے  
جاتا ہوں۔“ انہیں گھیرنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ دونوں یہاں  
سے نکل گئے تو ہمیں والوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے  
ہیں۔“ میں نے کہا۔

سمبا نے فوراً ہی ایک طرف دوڑ لگا دی اور میں بھی  
دوڑتا ہوا ایک چٹان پر چڑھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اس طرف  
نکل آیا۔

گھاس پھوس کا وہ جھونپڑا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ تاہم  
کبیں کبیں سے اب بھی شعلے اٹھ رہے تھے۔ دوسرے  
جھونپڑے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے آگ کی زد میں آنے  
سے محفوظ رہے تھے۔ وہ دونوں تنگ دھڑنگ غار میں ایک  
جھونپڑے کی دوسری طرف چٹان کے قریب بیٹھی ہوئی  
تھیں۔ شعلوں کی مدھم سی روشنی میں ان کے چہروں پر خوف  
اور وحشت کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔

میں ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا  
پھر آگے بڑھتا ہی چاہتا تھا کہ ٹھنک کر رک گیا۔ ان عورتوں  
کے قریب ہی چٹان کی ایک دراڑ سے گومپا برآمد ہوا۔ وہ  
انسان نہیں رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریو الو تھا۔  
اور شعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ بہت ہی بھیانک لگ رہا  
تھا۔ اس نے نیچے کران عورتوں سے کچھ کہا اور وہ دونوں اس  
دراڑ میں گھس گئیں۔

گومپا کو دیکھ کر میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ ہمارے  
سانہ لاش میری نظروں کے سامنے کھوم گئی اور پھر مجھے

یوں لگا جیسے میرے سینے میں لاوا سا کھولنے لگا ہو۔ میری  
کلنیاں سلگ اٹھیں۔

میرے حواس بھال ہو رہے تھے۔ بے بسی اور بے  
چارگی کی وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی جو کچھ دیر پہلے تک میرے  
اوپر طاری تھی اور جس نے مجھے بکری کے بچے کی طرح ہزدل  
بنارہا تھا تھا۔

میں پتھری کی آڑ سے نکل کر چٹان کے کنارے پر آ گیا۔ دنیا  
کا وہ غلیظ ترین آدمی گومپا ریچھ ہی کی طرح چلنا ہوا اس طرف  
جارا تھا جہاں وہ جیب کھڑی تھی۔ اس نے فائرنگ سے جیب  
کو اگرچہ ناکارہ بنا دیا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ شاید ہم پھر  
بھی جیب کی طرف جانے کی کوشش کریں گے اور وہ ہمارا  
راستہ روکنے کے لیے اس طرف جارہا تھا۔

میں تقریباً دس فٹ کی بلندی پر تھا۔ گومپا ریچھ کی طرح  
دوڑتا ہوا جیسے ہی میری زد میں آیا، میں نے پتھریوں کی پوری  
قوت سے دباڑتے ہوئے اس پر جھلانگ لگا دی۔

گومپا میری دھاڑ سن کر ہی گڑبڑا گیا تھا۔ اس سے پہلے  
کہ وہ ٹھٹھکتا، میں اس کے اوپر نیچے چکا تھا۔ میرے دونوں پیر  
اس کے کندھوں پر پڑے۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل آگے کو  
گرا۔

گرا تو میں بھی تھا لیکن چونکہ میں نے از خود جھلانگ  
لگائی تھی اس لیے مجھے سنبھلنے میں ایک سینکڑے زیادہ نہیں  
لگا۔ گومپا کی صورت حال مختلف تھی۔ وہ منہ کے بل گرا تھا۔  
اسے چند معمولی چوڑیں بھی آئی تھیں۔ ویسے بھی وہ بھاری  
بھرم کر آدمی تھا۔ وہ فوری طور پر نہیں اٹھ سکا اور اس صورت  
حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اس کی کھوپڑی پر دو تین  
ٹھوکریں رسید کر دیں۔

اور بالآخر وہ اٹھ گیا۔ ریو الو اس کے ہاتھ میں نہیں  
تھا۔ وہ تو اس کے گردنے ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔  
گومپا کو اٹھ کر سنبھلنے میں ایک سینکڑ لگا۔ میں پوری  
قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا میں اسے ٹھانک لگ لگانا  
چاہتا تھا لیکن اس نے بڑی پتھری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے  
بے دردی سے پکڑ کر اچھال دیا۔

میں پہلو کے بل پتھروں پر گرا۔ گومپا نے مزید حیرت  
انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے اوپر جھلانگ لگا دی۔  
میں بڑی تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر ایک  
لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میں گوشت کے اس بھاڑ کے نیچے  
دب جاتا اور پھر شاید میرا زندہ بچنا مشکل ہو جاتا۔  
گومپا اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل گرا۔ اس نے

سنہلنے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی کہ وہ وزنی ہتھوڑے کی طرح میری گردن پر پڑا اور میں بے اختیار کر اٹھا۔

گو مپا مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اس کے سر کے پچھلے حصے پر بابت بھرلی ہاتھوں کی چٹیا میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں چٹیا کو زور دے کر دھکے دیتے لگا۔ گو مپا بری طرح چیخ رہا تھا۔

میں اس کے اوپر سے اٹھ گیا اور چٹیا کو پیچھے کھینچتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی پیچھے کو جھک رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے کئی سے میری پسیلوں پر ضرب لگائی اور پھر بڑی پھرتی سے وہ آگے کو جھٹکا چلا گیا۔ میں اس کے اوپر سے الٹی فلا بازی کھاتے ہوئے سامنے گرا۔

چٹوں پر گرنے سے میری سر پر چوٹ لگی تھی لیکن میں بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گو مپا حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا لیکن میں نے موقع نہیں دیا اور اس پر پے در پے ٹھوکریں برسائے لگا۔

لیکن ایک موقع پر گو مپا کا داؤ چل گیا۔ اس نے مجھے پانوں کے حصار میں لے کر بیٹنے کے ساتھ پیچھے لیا۔ اس کم بخت میں بلا کی طاقت بھری ہوئی تھی۔ میں اس کی پانوں کا حصار توڑنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ لگتا تھا جیسے فوادی ٹکٹے میں جکڑا گیا ہوں۔

وہ ریچھ کی طرح مجھے اپنے سینے کے ساتھ دبا رہا۔ میرا سانس گھٹنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن اس کی پانوں کا حصار نہیں توڑ سکا۔ میرے دونوں بازو پلوؤں میں جھول گئے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے دم سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اگر پھر صورت حال کچھ دیر اور برقرار رہی تو میری زندگی کا خاتمہ یقینی تھا۔

گو مپا نے مجھے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ایک موقع بھی مل گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہتھیلیوں سے اس کی دونوں کینٹیوں پر زوردار ضرب لگائی۔

یہ ضرب اگرچہ گو مپا کی ہواشت کے مقابلے میں زیادہ زوردار نہیں تھی لیکن نیچے خاطر خواہ نکلا۔ میں نے بلا توقف ایک اور وار کیا۔ اس مرتبہ گو مپا کراہ اٹھا اور پھر تیزی ضرب پر میری پشت پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا، دو تین قدم پیچھے ہٹ کر ایک دم ہوا میں اچھلا اور اس

کی کھوپڑی پر زوردار لگ بھادی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی سینے پر ہاتھ رکھے جھٹکا چلا گیا۔ مجھے سینے پر اب بھی شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا اور سانس گھٹ رہا تھا۔ گو مپا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسے حرکت کرتے دیکھ کر میں سنہل گیا۔ میرا خیال تھا، وہ مجھ پر حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی تو میں اچھل پڑا۔

گو مپا اگرچہ خاصا بھاری بھر کم تھا لیکن وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس دروازے میں گھس گیا جہاں وہ دونوں عورتیں غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اگر ایک مرتبہ لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا تو رات کے وقت ان چٹانوں اور غاروں میں اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔

وہ دروازہ خاصی طویل تھی اور اس کی دوسری طرف وہ چھوٹا سا میدان تھا جہاں چپ کھڑی تھی۔ اس طرف سبھا اور بومبا ایک دوسرے سے ٹھٹھک رہے تھے۔ وہ دونوں عورتیں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بیٹھی ہوئی ایک طرف دوڑی جا رہی تھیں۔

گو مپا اب اپنے آپ کو بچا کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن میں اسے ایسا کوئی موقع نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بلا کا قاتل تھا۔ معصوم اور بے گناہ ہلاک جو جس طرح موت کے گھاٹ اتار گیا تھا وہ ایسی بات نہیں تھی کہ اسے آسانی سے فراموش کر دیا جاتا اور اس کے قاتلوں کو معاف کر دیا جاتا۔

گو مپا مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ میں دوڑتے ہوئے ہوا میں اچھلا اور اس کے اوپر جا رہا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کی چٹیا پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے اس کا چہرہ چٹوں سے ٹکرانے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔

اس نے مجھے ایک طرف گرا دیا اور اٹھ کر ایک بار پھر ایک طرف کو بھاگ نکلا لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اسے چند قدم سے زیادہ دور نہیں جانے دیا اور میں نے اسے ٹھوکر مارا۔

خون میں تر اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ ہمایا ہو گیا تھا۔ وہ ہر ٹھوکر پر بلبل اٹھتا لیکن مجھے اس پر زور بھی رحم نہیں آیا۔ ایسے بے رحم اور سفاک لوگ کسی رحم اور ہمدردی کے مستحق نہیں ہوتے۔ بلا کی لاش وہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی اور میرا جنون بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں پے در پے اس پر ٹھوکریں برس رہا تھا۔

اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ میں تیزی سے گھوم گیا۔ میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا تھا لیکن سبھا کی صورت دیکھ کر میرا ہاتھ مستحکم انداز میں رک گیا تھا۔ سبھا مجھے کھینچتا ہوا چند قدم دور لے گیا۔

”اگر یہ ختم ہو گیا تو ہم بستی والوں پر کس طرح ثابت کر سگے کہ بلا کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے۔“ سبھا نے کہا۔ ”انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ انہیں بستی والے سزا دیں گے۔“

میں بڑی مشکل سے اپنے جنون پر قابو پا رہا تھا۔ میں نے گو مپا کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ ماسا بڑا کراہ رہا تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر بومبا بھی چٹوں پر پڑا کراہ رہا تھا۔

سبھا ان عورتوں کو بھی تلاش کر کے لے آیا اور پھر ہم بومبا اور گو مپا کو بھی ٹھوکریں مارتے ہوئے جمونپوں کی طرف لے آئے۔ ایک جمونپہ را تو بل کر راکھ ہو چکا تھا۔ کہیں کوئے دیکھ رہے تھے اور کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ سبھا نے جتنی زبان میں ان دونوں عورتوں سے کچھ کہا اور وہ ایک جمونپہ میں گھس گئیں۔ سبھا نے مجھے دہن رکھ کر کہا اور خود چٹانوں میں ایک تنگ سے راستے پر غائب ہو گیا۔

سبھا کی دایبھی تقریباً چند ہر منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے کندھے پر بلا کی لاش اٹھا رکھی تھی جسے اس نے ایک جمونپہ کے سامنے چٹوں پر لٹا دیا۔ میں قریب پہنچ کر ٹھنڈوں کے بل بیٹھ گیا اور بلا کی لاش کو دیکھنے لگا۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ لاش کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس پر کس قدر تشدد کیا گیا تھا۔

سبھا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے وہاں سے اٹھا کر کچھ دور لے گیا۔

”ان دونوں آدمیوں کی لاشیں ہم اس غار میں چھوڑے جارہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”بلا کی لاش کو دیکھ کر بستی کے لوگ ان کے خلاف خاموش نہیں رہیں گے اور میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ صبح تک ہم بستی میں پہنچ جائیں گے۔

”یہ جگہ بستی سے کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہم تو کل سارا دن اور برسوں رات بھر بلا کو تلاش کرتے رہے تھے اس طرف تو ہم نہیں آئے تھے۔“

”ان بھاڑوں میں ایسی بے شمار جگہیں ہیں جہاں پورا قبیلہ چھپ سکتا ہے۔ ویسے یہ جگہ بستی سے تقریباً دس میل دور ہے۔ اس نے پتا نہیں کہاں کہاں عیاشی کے اڈے بنا

رکھے ہیں۔“ سبھا نے جواب دیا۔

اس نے ان دونوں عورتوں کو بھی جمونپہ سے باہر بلا لیا۔ وہ دونوں جمونپہ میں رکھے ہوئے لباس پہن چکی تھیں لیکن لباس کے باوجود وہ برہنہ تھیں۔

مجھے گو مپا کا رپو الوور بھی مل گیا تھا جو میں نے سبھا کے حوالے کر دیا۔ بلا کی لاش کو اٹھاتے ہوئے میری نظریں گو مپا کی طرف اٹھ گئیں۔ میرے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ میں ایک دم سیدھا ہو گیا اور گو مپا کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر مار دی۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف الٹ گیا۔

”تھماری کھٹی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر تم نے دوبارہ ایسی کوئی کوشش کی تو بھیجا نکال دوں گا تھماری کھوپڑی سے۔“ میں اسے پسیلوں پر ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

سبھا نے بھی اسے دو چار ٹھوکریں رسید کر دی تھیں اور پھر ان دونوں کو رپو الوور کی زد پر لے کر ایک طرف کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔

چند منٹ بعد ہی ہمارا یہ مختصر سا قافلہ بھاڑوں میں تنگ سے راستوں پر چلنے لگا۔ سب سے آگے گو مپا اور بومبا تھے۔ ان کے پیچھے دونوں عورتیں اور آخر میں، میں اور سبھا چل رہے تھے۔ بلا کی لاش کبھی سبھا اٹھالیتا اور کبھی میں۔

بھاڑوں میں دس میل کا فاصلہ خاصا طویل ثابت ہوا تھا۔ جب ہم بستی میں پہنچے تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ بلا کی لاش میدان میں ایک درخت کے نیچے رکھ دی گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے لوگ غاروں سے نکل نکل کر ہمارے گرد جمع ہونے لگے۔ سبھا چیخ چیخ کر بستی والوں کو گو مپا اور بومبا کے کرتوتوں کے بارے میں بتاتے لگا۔

بلا کی لاش دیکھ کر لوگ پھر گئے اور ان دونوں پر ٹوٹ پڑے۔ گو مپا اور بومبا پر حملہ کرنے والوں میں گو مپا کے وہ خیل بھی شامل تھے جو اس کے پیچھا کرتے تھے لیکن بلا کی لاش دیکھ کر وہ اس کے سحر سے آزاد ہو گئے تھے۔ میں اور سبھا کو شش کے باوجود گو مپا اور بومبا کو بستی والوں کے عتاب سے نہیں بچا سکتے۔ کچھ ہی دیر بعد ان دونوں کی بچی ہوئی لاشیں میدان میں پڑی تھیں اور پھر کچھ لوگ وہ لاشیں بھی اٹھا کر لے گئے۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم کھیا کی اس بستی کی طرف روانہ ہو گئے جہاں حادثے کے بعد ہمیں لایا گیا تھا۔ غار والی بستی کے بہت سے لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ بلا کی لاش کو ایک خود ساختہ اسٹریچر پر ڈال دیا گیا تھا۔

ہم دوسرے کے بعد ہی اس بستی میں پہنچے تھے۔ بستی کے سارے لوگ جمع ہو گئے۔ تھیوب اور دوسری عورتیں ہلا کی لاش کے قریب بیٹھ کر بین کرنے لگیں اور پھر شام سے ذرا پہلے دریا کے کنارے ہلا کی چٹا کو نذر آتش کر دیا گیا۔

اس کے بعد بھی میں تین دن اس بستی میں رہا۔ ایک روز دوسرے کے وقت اچانک ہی مجھے نیلگوڑی والی مالا کا خیال آ گیا۔ وہ مالا نہ میرے گلے میں تھی اور نہ ہی ان گزرے ہوئے دنوں کے دوران میں ہلا نے اس کا کوئی ذکر کیا تھا۔ اچانک ہی مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے سب سے پوچھا۔ ”دریا کے کنارے ڈھلان پر جہاں میں بے ہوش ہوا تھا وہاں سے مجھے کون اٹھا کر لایا تھا؟“

”میں تھا اور تین چار آدمی اور تھے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ سب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”میرے گلے میں ایک مالا تھی۔ سیاہ پتھروں کی۔“ میں نے کہا۔ میرا ہاتھ بے اختیار گلے پر پہنچ گیا تھا۔

”میں نے سیاہ پتھروں کی کوئی مالا پہنے کے کسی آدمی کے پاس نہیں دیکھی۔“ سب نے جواب دیا ”اگر کسی نے تمہارے گلے سے وہ مالا اتاری ہو تو کسی نے کسی کے پاس ضرور نظر آ جاتی لیکن کیا وہ مالا بہت قیمتی تھی۔ تم اس کے لیے خاصے پریشان نظر آ رہے ہو۔“

”ہاں۔ وہ مالا میرے لیے واقعی بہت قیمتی ہے۔ اتنی قیمتی کہ اگر وہ میرے پاس موجود ہوتی تو شاید ہلا کی جان نہ جاتی۔ اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

سب ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو ”وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں سے مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا گیا تھا؟“ ”اس طرف۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہے۔“ سب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”چلو۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اور سب بستی سے نکل کر دریا کی طرف آ گئے اور پھر کنارے کے ساتھ ساتھ پتھروں پر چلنے لگے۔

ایک میل کا وہ فاصلہ طے کرنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ بالآخر ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ وہاں ایک طرف نشیب میں دریا تھا۔ اس جگہ دریا کا پانی زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن گہرائی بہت زیادہ تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ دوسری طرف عمودی ڈھلان تھی جو تقریباً چار سو فٹ اوپر تک چلی گئی تھی۔

”ہلا نے بتایا تھا کہ تمہاری کار وہاں سے ڈھلان پر لوٹتی ہوئی اس جگہ دریا میں گری تھی۔“ سب نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ”ہم نے تمہاری کار تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں گہرائی کتنی زیادہ اور پانی کی رفتار کتنی تیز ہے۔ تیز رفتار پانی کار کو بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا ہو گا۔“

میں دریا کی طرف دیکھنے لگا۔ پانی طوفانی رفتار سے نشیب کی طرف بہ رہا تھا۔ اتنے تیز بہاؤ میں تو کوئی چٹان بھی نہیں رک سکتی تھی۔ کار تو جانے کہاں غائب ہو گئی ہوگی۔

”اور وہ جگہ کون سی ہے جہاں میں بے ہوش پڑا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس طرف۔ وہاں۔“ سب نے بلندی کی طرف اشارہ کیا۔

ہم بڑے بڑے پتھروں پر پھلتا گئے ہوئے اوپر چڑھنے لگے اور پھر میں ٹھک کر رک گیا۔ ایک جگہ پتھروں میں کار کا ایک پیرا پڑا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اوپر سے پتھروں پر لوٹھتے ہوئے یہ پیرا الگ ہو گیا ہو گا۔ میں نے وہ پیرا اٹھا کر دریا کی طرف اچھال دیا اور سب کے ساتھ پھر اوپر چڑھنے لگا۔ ”تم یہاں بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور دیکھو وہ شاید تمہارا جو ہے۔“ سب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ میرا ہی سیدھے پیر کا جوتا تھا۔ بستی میں جب مجھے ہوش آیا تو اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا تھا کہ میرے پیر میں کوئی جوتا تھا یا نہیں لیکن اب میری یادداشت بحال ہو چکی تھی اور میں نے اپنا یہ جوتا پہچان لیا تھا جسے میں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ سب نے بتایا کہ میرے دوسرے پیر کا جوتا بھی بستی کے کسی جھونپڑے میں موجود ہے۔

میں تجسس نگاہوں سے اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ یہاں پتھروں میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ اگر وہ مالا کھل کر میرے گلے سے یہاں گری گئی تھی تو اسے تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے جھس میں سوئی تلاش کرنے کی کوشش کی جائے لیکن مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی تلاش و جستجو کے بعد میں دائیں طرف مڑا ہی تھا کہ میری آنکھوں پر چمک سی پڑی۔ میں ٹھک کر رک گیا اور اس طرف دیکھنے لگا اور پھر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ سیاہ پتھروں کی وہ مالا جھاڑیوں میں پڑی تھی اور دھوپ میں اس کا مرکزی پتھر چمک رہا تھا۔ اسی چمک نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

میں نے وہ مالا اٹھائی تو ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے بہت بڑے جسم میں سستی کی لہریں سی دوڑ گئی ہوں اور پھر مجھے اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس ہونے لگی۔

مجھے میرے قریب آ گیا تھا۔ میں اس وقت مالا کو ہلکے کر دیکھ رہا تھا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ مالا میرے گلے سے کیوں نکلی تھی۔ اس کا کب کھل گیا تھا۔ میں نے مالا گلے میں ڈال کر کب بند کر لیا اور مسکرا کر سب کی طرف دیکھنے لگا۔

”جہاں ہوا تمہاری گمشدہ چیز مل گئی۔ اگر نہ ملتی تو تم سے زیادہ شاید مجھ سے اسے افسوس رہتا۔“ سب نے کہا ”کیا یہ مالا واقعی بہت قیمتی ہے؟“

”ہاں۔ اتنی قیمتی کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔“ میں نے جواب دیا اور ہم دونوں پتھروں پر نشیب کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک جگہ میں نے مڑ کر اوپر دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی بلندی سے لڑھکنے کے بعد میں زندہ کیسے بچ گیا تھا۔ دریا کے پاس پہنچ کر میں ایک بار پھر مڑ گیا اور دریا کے باؤں کے ساتھ ساتھ کئی دور تک چلا رہا۔ پانی بہت تیز رفتار اور مت گہرا تھا۔ میری کار کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیز رفتار پانی نہ جانے اسے کہاں سے کہاں لے گیا ہو گا۔ کار میں رکھی ہوئی پانچ سو گلوہروں پلاسٹک کے ٹیبلز میں تھی۔ وہ پھیلے واٹر پروف نہیں تھے۔ یہی روکنے ضائع ہو گئی۔

سب کے ساتھ واپس آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کھنڈوں میں ناگ یا پال چانگنی کے ساتھ میرا یہ ہیرا باقاعدہ تصادم تھا جس میں انہیں بڑی ذبردست چیت لگی تھی۔ پانچ سو گلوہروں۔ یہاں اس کی مالیت پانچ سو گلوہروں سے کہ زیادہ تھی اور انٹر نیشنل مارکیٹ میں تو اس کی قیمت کہیں ہزار زیادہ رہی ہوگی لیکن اس کے لیے مجھے بھی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ ہلا بہت معصوم اور بہت بھولی بھالی لڑکی تھی۔ میرے عشق میں اس نے اپنی زندگی کا ڈپر لگا رکھی تھی اور بالآخر اپنی جان لٹا دی تھی۔

میں تین دن مزید نارنگ قبیلے کی اس بستی میں رہا۔ پیر کے لوگوں نے میری خدمت اور دل جوئی میں کوئی کسر نہ کیا۔ یہ واقعی بہت سیدھے سادے لوگ تھے۔ ان کی بد قسمتی تھی کہ گومپا جیسا بدعاش ان کے بیچ میں نہ تھا اور وہ اپنے شعبدوں سے قبیلے کے چند لوگوں کو ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اب انہیں گومپا جیسے ٹیڈنا سے بھی نجات مل چکی تھی۔ وہ اپنی ہوس کی وجہ سے

مارا گیا تھا۔ تری دیو سے ملاقات کے بعد اس کی باتیں سن کر گومپا کے دل میں لالچ لگا۔ یہ نہ ہوتا تو شاید اس کا یہ سلسلہ چلتا رہتا لیکن برحال باطل کو ایک دن تو ختم ہونا ہی تھا اور وہ ختم ہو گیا تھا۔

مالا مل جانے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس روز شام کو وید نے میرے سر کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے بالکل تندرست قرار دے دیا تھا حالانکہ صبح جب میں سب کے ساتھ دریا کی طرف جا رہا تھا تو میرے زخم میں شدید تکلیف تھی۔ چلتے ہوئے اپنے ہی پیروں کی بجلی سی دھک سے یوں لگتا تھا جیسے دماغ میں دھماکے ہو رہے ہوں۔

سر پر چوٹ لگنے کے بعد سے میں آرام سے تو نہیں بیٹھ سکا تھا۔ وید بھی بار بار تشویش کا اظہار کرتا رہا تھا اور مجھے مکمل آرام کرنے کا شور دیتا رہا تھا لیکن میں تو ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکا تھا۔ آج صبح میرا خیال تھا کہ اس زخم کی وجہ سے شاید مجھے کئی روز تک اس بستی میں رہنا پڑے گا۔ دریا کی طرف جاتے ہوئے بھی میں سر میں تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن نیلگوڑی کی وہ مالا مل جانے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ لگتا جیسے میرے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی ہو۔ مالا کا لمس مجھے زندگی کی حرارت دل رہا تھا۔

اسی روز شام کو وید جی نے میرے سر کی ہڈی کھول کر زخم کا معائنہ کیا تو وہ حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔ اس نے زخم کی جگہ کو ٹپوٹ کر اور دیکھا کر بھی دیکھا تھا لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی اور پھر وید جی نے اعلان کر دیا تھا کہ مجھے اب کوئی تکلیف نہیں رہی۔ میرا زخم بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔

میں اس سے اگلے ہی دن بستی سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کھیا نے مجھے روک لیا۔ کھیا کے کہنے کے مطابق میں نے ان کے قبیلے کو ایک شیطان سے نجات دلائی تھی اور وہ میرا شکر یہ ادا کرنے کے لیے ایک جشن کا اہتمام کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے قبیلے کی تمام بستیوں کو اطلاع دے دی گئی تھی۔

نارنگ قبیلے کی کل آبادی دو ڈھائی ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی جو چھوٹی چھوٹی گلوہروں کی صورت میں ان پہاڑوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہر بستی دوسری سے پانچ دس میل کے فاصلے پر تھی۔ راستے نہایت خطرناک اور دشوار تھے لیکن اس کے باوجود تمام بستیوں کے لوگ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔

تیسرے دن صبح ہی لوگ اس بستی میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ دریا کی سمت میدان میں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ شام تک وہاں میلے کا ساماں بچا ہوا چھٹا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میدان میں لاتعداد مشعلیں روشن ہو گئیں اور پھر چاند بھی طلوع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کھیلنے بچن شروع ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہ جنگ جو قبیلہ نہیں تھا لیکن وہ اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے۔ آپس کی زور آزمائی کرنا ان کی کھٹی میں شامل تھی۔ عورتوں کے حصول کے لیے ان میں دلچسپ مقابلے ہوتے رہتے تھے اور اس وقت بھی ان میں زور آزمائی کے مقابلے ہو رہے تھے۔

تھپا (پانچ بیویوں کا شوہر قبیلے کا امیر ترین آدمی) نے دوسری بستی کی ایک خوب صورت لڑکی کے حصول کے لیے اس کے مرد کو چیلنج کر دیا۔ تھپا کے قبضے میں پہلے ہی پانچ عورتیں تھیں لیکن شاید وہ اپنے گھر میں خوب صورت عورتوں کی فوج تیار کرنا چاہتا تھا۔

اس لڑکی کا مرد درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ جبکہ تھپا اس کے مقابلے میں بہت کچھ ختم تھا۔ بظاہر مقابلے کے لیے ان کی جوڑی نہیں بنتی تھی لیکن مائٹا نامی اس شخص نے تھپا کا چیلنج قبول کر لیا اور ٹم ٹھوٹک کر میدان میں اتر آیا۔

سب لوگوں کا خیال تھا کہ تھپا جیت جائے گا لیکن پانچ منٹ میں مائٹا نے تھپا کو جیت کر دیا۔ اس طرح تھپا کو اپنی ایک عورت سے محروم ہونا پڑا اور پھر ایک نئے کے اندر اندر تھپا اپنی تمام عورتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کی پانچوں عورتیں مائٹا کے قبضے میں جا چکی تھیں۔

بست سے لوگ تھپا کے گرد جمع تھے۔ وہ اس سے ہمدردی جتلا رہے تھے اور تھپا منہ لٹکانے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی دنیا لٹ چکی تھی اور وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اور پھر ایک عورت میدان میں آکر چنچ چنچ کر کچھ کہنے لگی۔ اس نے دو مرتبہ میری طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ یہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک تھی جنہوں نے اس روز مجھے دریا کے کنارے پر گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ادھر ادھر گھومتے ہوئے بڑے پر جوش انداز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ میں نے قریب بیٹھے ہوئے سمبا سے دریافت کیا۔

”یہ تمہارے لیے دوسری عورتوں کو چیلنج کر رہی ہے۔ سمبا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میرے لیے“ میرے دماغ میں زور دار دھڑکنے لگی۔

”لیکن میں تو کسی کی ملکیت نہیں ہوں۔“

”مقابلے میں جو عورت جیت گئی تم اس کی بیوی بن جاؤ گے اور پھر یہ اس عورت کی مرضی ہے کہ وہ تمہیں کر دے یا اپنے قبضے میں رکھے۔“ سمبا نے جواب دیا۔

”عجب احمقانہ بات ہے۔“ میں نے کہا۔ میرے میں گزرتے ہوئے واقعات ابھر آئے جب ہمارا راجستان کے ریگستان میں گرا تھا اور کم تکہ ہمارے اس کے ساتھیوں نے ہمیں پکڑ کر غلام کر دیا تھا۔

بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا لیکن طریقہ کار مختلف تھا۔ اس عورت کا چیلنج قبول کرتے ہوئے ایک اور میدان میں اتر آئی اور پھر ان میں مقابلہ شروع ہو گیا۔

خون خوار بیویوں کی طرح غرائی ہوئی ایک دوسرے پر حملہ ہوئی تھیں۔

مقابلہ خاصا دلچسپ تھا۔ وہ دونوں میدان میں دو سرے کو رگید رہی تھیں۔ ان کے حلق سے عجیب غرائش خارج ہو رہی تھیں۔

یہ مقابلہ خاصا دلچسپ تھا اور تقریباً آدھے گھنٹے جاری رہا۔ جیت اسی کی ہوئی تھی جس نے میدان میں دو سروں کو چیلنج کیا تھا اور پھر چند منٹ بعد وہ ایک بار کی دوسری عورتوں کو چیلنج کر رہی تھی اور اس مرتبہ وہ میدان میں اترتی تھی اسے دیکھ کر قبیلے کے سب کی حیرت زدہ سے رہ گئے تھے۔ کھیا اور سمبا سمیت بعض انھہ کرکھڑے ہو گئے تھے اور بڑی حیرت زدہ کی نظروں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں بھی ایک جھجکتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جھنجھٹے میں سب سے زیادہ حیرت مجھے ہوئی تھی۔ میرے دل سے دھماکے سے ہورہے تھے۔

وہ نیلگہ تھی۔ قبیلے کی عام عورتوں کے جیسے نہ اس کے جسم پر بھی ویسا ہی لباس تھا۔ سر کے بال اس کے لیے تھیں اور بدستیلی سے کئے ہوئے تھے۔ اس کی صورت آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکرات تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میرا ہاتھ اپنے گلے میں بڑی ہوئی مالا پکچھ گیا۔

میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

بکلی ہی تھی۔ اس روز مایامتی والے مکان سے غائب بننے کے بعد آج وہ کابلی عورت کے روپ میں میرے اپنے کئی تھی اور میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت میں گرا تھا۔

”یہ یہ کون ہے؟“ میں نے سمبا سے پوچھا۔ یہ سوال برادری طور پر میری زبان سے نکل گیا تھا۔

”ہم نہیں۔“ سمبا نے جواب دیا ”اس کا حلیہ اور لباس ہمارے قبیلے کی عورتوں جیسا ہے لیکن یہ ہمارے قبیلے کی نہیں ہے۔“

میں نے اسے دیکھا۔ اس کے تمام ہتھیوں میں گھومتا رہتا ہوں اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نیلگہ ہی تھی جو میری مدد کے لیے یہاں پہنچ گئی تھی۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک روز ڈال ابھرا۔ کار والے حادثے میں اگر وہ مالا میرے غلے سے لڑکھاتی تو اس کے بعد خوشگوار واقعات بھی پیش نہ آتے۔ نیلگہ یقیناً میری مدد کو پہنچ جاتی اور بلا کو بھی اپنی جان سے بچھڑے ہوئے پڑتے۔

ابھی اس نے حرف کو دیکھ کر پہلے مقابلے کی فاتح عورت لڑائی کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا۔

میرا حال مقابلہ شروع ہوا۔ پہلے گندالی نے ہی حملہ کیا لیکن نیلگہ نے اٹھا کر اسے پکڑ لیا۔ وہ کئی فٹ دور جا کر لڑی۔ اس کے منہ سے چنچ نکل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر دوبارہ نیلگہ کی طرف لپکی۔

اور پھر لوگوں نے یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ گندالی اپنی زین کو ایک مرتبہ بھی نہیں چھو سکی تھی۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچتا تھا کسی بھی قوت نے اسے اٹھا کر پکڑ لیا ہو۔ اس کی جین فٹا میں گونجتی رہیں۔ بعض لوگ چنچ چنچ کر اور تالیاں بجا کر نیلگہ کو داد دیتے رہے اور بعض وحشت زدہ سی غول سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

یہ مقابلہ چند منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا تھا۔ گندالی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔ نیلگہ نے فاتحانہ انداز میں چادوں طرف دیکھا پھر وہ اپنے سر پر گندالی کی بیوی کے قریب آگئی۔ چند لمحے میرے سامنے کھڑی رہی پھر ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی چھٹی طرف چلی گئی۔ سمبا اور کھیا وغیرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نیلگہ دھڑکتے میں غائب ہو چکی تھی۔



لاکڑے دن میں مارا نگ قبیلے سے روانگی کے لیے تیار

ہو گیا۔ میرے ساتھ سمبا، تھپا اور ایک بھکشو سارا نوک کے علاوہ تھیوب بھی جانے کو تیار تھی۔ کوئی بھی مذہب آبادی اس بستی سے کم سے کم ساتھ سفر کرنے کے فاصلے پر تھی۔ راستے نہایت پر پتھر، کھن، اور خطرناک تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اکیلا کبھی بھی کسی بستی تک نہیں پہنچ سکوں گا اسی لیے یہ لوگ میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے تھے۔ اس طرح ہماری تعداد پانچ ہو گئی تھی۔

میں ان پہاڑوں سے بالکل واقف نہیں تھا۔ البتہ سمبا سال میں ایک آدھ مرتبہ مذہب بستیوں کی طرف جاتا رہتا تھا۔ اس کے خیال میں واپسی کے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہم ان پہاڑوں میں تقریباً چالیس میل کا سفر کر کے دلی کوٹ پہنچیں۔ یہ بستی یوگا ریج میں بریدر راگھر اور پیکٹل پارک کے درمیان واقع تھی۔ دلی کوٹ سے ہم بریدر راگھر کا رخ کرتے اور وہاں سے تقریباً چالیس میل مزید آگے جا کر ہمیں وہی ہائی وے مل جاتی جو ٹھٹھنڈو سے انڈیا کی سرحد پار کی طرف چلی گئی تھی۔ انظم خان اور بلا کے ساتھ میں اسی طرف سے خیال میں داخل ہوا تھا۔

سمبا کے خیال میں یہ راستہ میرے لیے محفوظ نہیں تھا۔ یوگندر ناتھ اور تری دوپاسی طرف سے اس بستی تک آئے تھے جبکہ میری تلاش اب بھی جاری تھی اور چانگ کی یا اس کے آدمیوں سے کہیں بھی آسنا سامنا ہو سکتا تھا اس لیے سمبا کا خیال تھا کہ ہمیں پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے پیکٹل پارک کی طرف جانا چاہیے۔ وہاں سے پیکٹل پارک کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہم دھول گری کی طرف نکل سکتے تھے۔ اس طرف دھول گری اور انا پورنا کے پہاڑی سلسلے ہیں سے چھبیس ہزار فٹ تک بلند تھے۔ راستے نہایت خطرناک تھے لیکن یہ اس لحاظ سے محفوظ تھے کہ میرے دشمنوں کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔

ہمارے پاس سواری کے لیے پانچ یاک تھے اور مجھے یاک پر چھوڑا دیا اور کھانے پینے کا سامان لا دیا گیا تھا۔ ان تیار یوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ہم کسی بہت طویل سفر پر جا رہے ہوں اور بعد میں ثابت بھی ہو گیا کہ یہ سفر واقعی بہت طویل تھا۔ دیکھنے والا اور مشکل تھا۔

ہم صبح سویرے بستی سے رخصت ہوئے تھے۔ دوپہر تک رکے بغیر سفر کرتے رہے اور بالآخر ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹا آرام کیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا ہمارا سفر جاری رہا۔

پانچویں روز ہم دھول گری کے تقریباً بائیس ہزار فٹ

بلند سلسلہ کوہ کی دوسری طرف دریا کے کنارے پر آباد کھوٹ نامی ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بھی بدھوں کی بستی تھی۔ ان لوگوں نے ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

کھوٹ گاؤں نامی یہ بستی متانگ کی طرف جانے والی شاہراہ سے تقریباً ستر میل کے فاصلے پر تھی اور ستر میل کا یہ فاصلہ طے کرنے میں ہمیں دو دن لگے تھے اور بالآخر ہم جویم سون نامی بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بستی اس شاہراہ پر واقع تھی جو ایک طرف سرحد کے قریب واقع متانگ قصبے سے ہوتی ہوئی سرحد پار کر کے تبت میں داخل ہوجاتی تھی اور دوسری طرف پوکھار تک چلی گئی تھی جہاں سے کھٹمنڈو یا نیپال کے بعض دوسرے شہروں کا رخ کیا جاسکتا تھا۔

جویم سون نام کی یہ بستی سطح سمندر سے تقریباً چوبیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس سے آگے پوکھار کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک طویل درے سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاہراہ اور دریا نے گندائی اس درے میں ساتھ ساتھ چلنے ہیں۔ درہ نیلا کشادہ وادی کی طرح عیوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ایک طرف دھول گری اور دوسری طرف انا پورنا کے پہاڑی سلسلے واقع ہیں۔ یہ برف پوش پہاڑی چوٹیاں چھپیں ہزار فٹ کی بلندی تک چلی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر یہ وہ اس قدر تنگ ہوجاتا ہے کہ اس پر کسی سرنگ کا گمان ہونے لگتا ہے۔

جویم سون سے روانہ ہونے کے تیسرے دن ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی تھی۔ ایک سڑک چینی کی طرف اور دوسری پوکھار کی طرف چلی گئی تھی۔ ہم نے پوکھار کی طرف جانے والے راستے کا انتخاب کیا تھا۔

اب ہمیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ہم اونچے پہاڑوں سے نکل کر اس علاقے میں آگئے تھے جہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد لوگ جدید تہذیب سے کسی حد تک آشنا تھے۔

گیارہویں دن ہم پوکھار پہنچ گئے۔ ہم نے شہرے دور دریا کے کنارے پر ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ وہ رات ہم نے وہیں بسر کی تھی۔ سہا تو اگلے روز واپس جانا چاہتا تھا جبکہ میں انہیں کھٹمنڈو تک لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ لوگ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب وہ واپس جانا چاہتے تھے۔ گیارہ دن کے سفر نے ہم سب کو بہی طرح تھکا دیا تھا۔ میرے لیے اب پریشانی یہ تھی کہ میں کھٹمنڈو تک کیسے

پہنچوں گا۔ میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ سہا وغیرہ کو کچھ تحائف بھی دینا چاہتا اور اسی لیے اپنے ساتھ کھٹمنڈو تک لے جانا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں سے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ لوگوں کو وہیں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔

پچھلے میں بائیس دنوں میں میرا حلیہ بڑی حد تک چمکا تھا۔ سر کے بال بے تحاشا بڑھ گئے تھے۔ رازم جھنگیوں کی طرح بوچی ہوئی تھی۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتا اور راستے پر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر پیلے توڑے میں گھسنے ہی نہیں دیا گیا لیکن جب میں نے کھٹمنڈو کا بریڈر کا نام لیا تو کانسٹیبل نے نہ صرف مجھے اندر جا اجازت دے دی بلکہ ایک سب انسپکٹر سے بھی ملادیا۔ سب انسپکٹر نے مجھے چیف انسپکٹر کے پاس پہنچایا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیل سے نہیں صرف یہ بتایا کہ میں انسپکٹر بریڈر کا دوست ہوں تو وہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ کھٹمنڈو انسپکٹر بریڈر سے فون پر رابطہ کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ انسپکٹر بریڈر سے تقریباً آدھے گھنٹے بعد رابطہ ہوا تھا۔ میری آواز سننے ہی وہ اچھل پڑا۔

”تم کہاں ہو۔ ہم تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا ”پچھلے دنوں پدی کے قریب جنگل میں دو قتل ہو گئے تھے اوسے“

”ایک منٹ!“ میں نے اسے ٹوک دیا ”میرے ساتھ کچھ بھی ہوا اس کی تفصیل میں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔ الحاح مجھے ایک اور مسئلہ درپیش ہے اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”کہو کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے ساتھ تاراناگ قبیلے کے کچھ لوگ ہیں اوسے۔“

”راگنہ۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

قبیلہ تو پورا اسے سیکڑوں میل دور اونچے پہاڑوں میں ہے۔ تمہوں کیسے۔“

”میں نے کہا نا کہ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔“ اس نے میں نے اس کی بات کاٹ دی ”مجھے اس وقت جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ اچھا۔“

”ٹیلی فون چیف کو دو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

بریڈر نے کہا۔ میں نے فون کا ریسیور چیف انسپکٹر کو دے دیا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک بریڈر سے بات کرتا رہا پھر ریسیور جو میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی پھر اس نے ایک انسپکٹر کو طلب کیا۔ اس سے کچھ کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب انسپکٹر کے ساتھ جا کر اپنے دوستوں کو شہر لے آئے۔ یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کروایا جائے گا۔ وہ ایک دو روز یہاں آرام کریں۔ اس کے بعد انہیں عزت و احترام سے رخصت کروایا جائے گا۔“

میں انسپکٹر کے ساتھ ایک بڑی اسٹیشن دیکھن میں دریا کے کنارے پڑاؤ پر پہنچا تو سہا وغیرہ کچھ حیران بھی ہوئے اور بہتان بھی۔ ہم انہیں شہر کے ایک ہوٹل میں لے آئے۔ ان کا سامان اور ایک دو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیے گئے تھے جس ہوٹل میں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا وہ کادان سراے قسم کا تھا اس لیے ان کے پاک وغیرہ کا بھی بندوبست ہو گیا۔

انسپکٹر نے ہوٹل کے مالک کو بھی ہدایت کر دی کہ ان مہمانوں کے آرام اور طعام کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ میں بھی انہی لوگوں کے ساتھ رہ گیا تھا۔ انسپکٹر ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس نے فونوں کی ایک موٹی سی گڈی میرے ہاتھ میں تھما دی اور پھر کہا کہ اگر مزید رقم کی ضرورت ہو تو ہیڈ کوارٹر میں چیف انسپکٹر کو فون کرو۔

میں نے سہا وغیرہ کو دو دن مزید وہاں روکا۔ چیف انسپکٹر کی دی ہوئی رقم سے میں نے ان سب کے لیے بہت سے تحائف خریدے۔ بستی کے کھیا، وید اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے بھی تحائف خریدے گئے تھے اور بالآخر جوتے بوزوہ لوگ منج سویرے دھرتی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب انہیں دھول گری کی طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دھرتی کی طرف سے وہ پانچ دن میں اپنی بستی پہنچ سکتے تھے۔

ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد میں نے ہیڈ کوارٹر میں چیف انسپکٹر سے ملاقات کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک بی بی بڑھ کر کھٹمنڈو کے لیے روانہ ہو گیا۔ چیف انسپکٹر سے ملاقات کے بعد مجھے یہ پیش بھی کی تھی کہ میں اگر پسند کروں تو سہا وغیرہ پر مجھے کھٹمنڈو بھیج سکتا ہے لیکن میں نے بس تقریباً دو سو کلومیٹر کا سفر چھ گھنٹوں میں سے دو۔

بس تھان کوٹ پہنچی تو شام ہو چکی تھی۔ یہ قصبہ کھٹمنڈو سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

شہر سے چھ کلومیٹر دور کیرتی پور میں بس ایک بار پھر رک گئی۔ ایک آدمی بس کے اگلے دروازے سے سوار ہوا اور آگے آنے کے بجائے وہیں کھڑا تجسس لگا ہوں سے بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو گھورنے لگا اور میں اس شخص کو دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔

وہ یوگی گوتم بھوش تھا۔ وہی یوگی گوتم بھوش جس سے میں نے رشی کیش میں یوگا سیکھنا شروع کیا تھا۔ میں اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی نظریں بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہروں سے پھٹتے ہوئے میرے چہرے پر جم گئیں۔ اس سے لگا ہوں کا قصاص ہوتے ہی میرے دماغ کو ایک شدید جھجکا لگا اور میرا پورا جسم جھنجھٹا اٹھا۔

گوتم بھوش کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میری طرف بائیں پھیلا کر

چچا اٹھا۔ ”تمہارا جہت تھک! میں تمہارے ہی انتظار میں یہاں کھڑا تھا۔ تمہاری منزل آگئی ہے۔ آؤ۔ نیچے اتر آؤ۔“ مجھے حیرت کا ایک اور جھکا لگا۔ اس طے میں تو شاید میرے اقربا مجھے بھی نہ پہچان سکتے لیکن گوتم بھوش نے پہلی ہی نظریں مجھے شناخت کر لیا تھا اور مجھے یہ جان کر حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ میرے ہی انتظار میں یہاں کھڑا تھا اور مجھے بس سے اترنے کا حکم دے رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو میرے دماغ کو ایک بار پھر جھکا سا لگا اور پھر ذہن پر سنا سا چھا گیا۔ میں کتنا چاہتا تھا کہ میں یہاں نہیں اتر سکتا۔ بعد میں کسی وقت اس سے ملوں گا لیکن میری زبان جیسے گنگ اور سوچنے بجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں خاموشی سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور گوتم بھوش کے پیچھے بس سے اتر گیا۔ بس فوراً ہی آگے روانہ ہو گئی تھی۔

”مجھے تمہاری دوست بلا کے پھنچنے کا افسوس ہے۔ اس کے ساتھ دافنی بہت ظلم ہوا تھا۔“

گوتم بھوش کی زبان سے بلا کی دردناک موت کا سن کر میں اچھل پڑا۔ بلا کی موت یہاں سے سیکڑوں میل دور اونچے پہاڑوں میں اس جگہ واقع ہوئی تھی جہاں جدید تہذیب کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ لوگ غاروں اور جھونپڑوں میں پتھروں کے دور کی زندگی گزار رہے تھے۔



وہاں رونما ہونے والا کوئی معمولی یا غیر معمولی واقعہ دنیا والوں کی نگاہوں سے اوچھل ہی رہتا تھا۔ میرے یا ملا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں صرف تارنگ فیملی کے لوگ ہی جانتے تھے اور ہمارے وہاں رہتے ہوئے فیملی کے کالونی فرو بستی سے باہر نہیں گیا تھا۔ میں سب وغیرہ کے ساتھ گیارہ دن میں اس بستی سے پوکھارا پہنچا تھا۔ راستے میں کئی بستیاں بڑی تھیں مگر کسی سے یہ نہیں سنا تھا کہ تارنگ فیملی میں کیا ہوا تھا لیکن سیکولر میل دور گوتم بھوش سب کچھ جانتا تھا۔

”جیران مت ہو۔“ گوتم بھوش نے میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا ”تم تھکے ہوئے ہو۔ طویل سفر نے تمہارے ذہن کو بھی متاثر کیا ہے۔ آؤ۔ کہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔“

میں جواب دینے کے بجائے محروڑہ سے انداز میں گوتم بھوش کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میرے ہماگ جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے استخوانی ہاتھ کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس کی انگلیاں میری کلائی میں گڑی جاری تھیں۔

میرے حواس جیسے خقل ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ گوتم بھوش مجھے کہاں لے کر جا رہا ہے۔ چونکا تو میں اس وقت جب میرے دماغ میں اچانک ہی سنسناہٹ ہونے لگی۔ یہ سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور پھر کان کے قریب کہیں کی ”جھنسناسٹ“ سی سنائی دینے لگی۔ ”ملا کی حفاظت کرنا۔ یہ فیض تمہیں برکا رہا ہے۔ اگر تم اس کے قریب میں آگئے تو برباد ہو جاؤ گے۔“

اس سرگوشی نے میرے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہی شدید ڈوبی ہوئی آواز تھی اور یہ آواز نیلگہ کی سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے خبردار کر رہی تھی۔ میں نے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور یوں کو حرکت دیے بغیر ذہنی طور پر نیلگہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میرے حواس بالکل کام نہیں کر رہے۔ میری مدد کرو نیلگہ۔“

”اس کے قبضے میں کئی قوتیں ہیں۔“ نیلگہ کی سرگوشی سنائی دی ”میں ابھی تمہاری نہیں ہو سکی ہوں۔ میرے اور تمہارے بیچ ابھی کچھ فاصلہ باقی ہے۔ میں فی الوقت محل کر اس کے مقابلے پر نہیں آسکتی اور نہ ہی عملی طور پر تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔ اس نے تو میرا ذہن مفلوج کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے پاس اور بھی ہمتی ہے۔ بہت بڑی ہمتی۔“ نیلگہ نے پھر سرگوشی کی ”اپنی اسی ہمتی سے کام لو جس کے

لیے تم نے بہت عرصے تک ریاضت کی ہے اور پھر تمہارے پاس سچائی کی ہمتی ہے۔ بہت سے کام لو۔ اگر تمہیں اپنے امتحان پرنے کی قوتیں بھی تم سے رابطہ نہیں کر سکیں گی۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ گوتم بھوش نے مگور کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی۔ میں اپنا ہاتھ جھڑانے کی کوشش کرنے لگا تو اس کی آنکھوں میں ابھری سی تیرمگی۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک لگا۔ مجھے اپنے دماغ میں سونیاں سی جھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میری مزاحمت وہ توڑنے لگی۔

”ادھ۔ سمجھ گیا۔“ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی ”سمجھ گیا، کیا چننے روک رہی ہے۔ لائیے ملا کے دے دے جو تو نے اپنے گلے میں پن رکھی ہے۔“

میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے گلے کی طرف اٹھ گیا۔ میری انگلیاں ملا کے موتیوں کو چھونے لگیں۔ میرے ہاتھ اس طرح جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کے ٹنگے مار کر چھو لیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرا دماغ بھی جھنجھٹا اٹھا تھا۔

گوتم بھوش بھی اچھل پڑا۔ اس کے چہرے کے اثرات ایک دم بدل گئے۔ آنکھوں میں وحشت سی ابھرنی لگی۔ مرتبہ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

ہم دونوں کی نگاہوں کا تصادم کئی لمحوں تک جاری رہا۔ گوتم بھوش ایک لمحے کو اس طرح بھر جھری لے کر رہ گیا جیسے شدید سرو کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو اور پھر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ نیلگہ میری پشت پر کھڑی تھی لیکن میرے اندر ”جی“ کی قوت بھی کام کر رہی تھی۔ میں نے بیشہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کیا تھا اور برے سے برے وقت میں بھی جی کی قوت سے کام نہیں لیا تھا لیکن اب یہاں صورت حال کچھ اور تھی۔ یہاں معاملہ انسانی اختیار سے باہر ہو رہا تھا اور گوتم بھوش کسی پر اسرار قوت کے ذریعے مجھے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے وہ ملا حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں نیلگہ نے پہلی روز

خبردار کر دیا تھا کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ اس نے پہلی ہی لمحہ وار رنگ دی تھی کہ یہ ملا مجھ سے چھیننے کی کوشش کی جائے گی اور چھیننے کی کوشش کرنے والا میرے لیے اتنی نہیں ہوگا۔

اور یوں گوتم بھوش مجھ سے ملا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے پر اسرار علم کے ذریعے یہ معلوم کر لیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں۔ وہ راستے میں کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا اور مجھے بس سے اترا کر نچانے کہاں لے جا رہا تھا کہ نیلگہ نے مجھے خبردار کر دیا اور میں نے ہمت

اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔

”یہ ملا مجھے دے دو۔“ گوتم بھوش نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہا ”اس کے لیے میں نے بہت کٹ اٹھائے ہیں۔ بہت لمبا سفر کیا ہے۔ لاؤ یہ ملا مجھے دے دو۔“

”تم میرے استاد ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ تم بہت بے وقوف بھی ہو۔“ میں نے کہا ”اس ملا کو حاصل کرنے کے لیے بڑی تیاریاں کرنی پڑی ہے اور تم اس کی اہمیت سے بھی واقف ہو۔ اس کے باوجود یہ سمجھتے ہو کہ میں یہ ملا آسانی سے تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اگر تم میں اتنی ہمتی ہے تو میرے گلے سے اتار لو یہ ملا۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں روکوں گا۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے میرے گلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میری نظرس اس وقت اس کے پیروں کے قریب زمین پر جم گئی تھیں۔ اس کا ہاتھ میرے گلے میں پڑی ہوئی ملا سے صرف دو انچ دور رہ گیا تھا کہ وہ اچانک ہی چٹکا ہوا اچھل پڑا اور پیروں کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔ وہ کسی ایک جگہ کھڑا نہیں رہ سکا۔ اسی طرح اچھلتا رہا جیسے پیروں کے نیچے دھنکتے ہوئے انگارے۔ مجھ گئے ہوں۔

وہ مجھ سے کئی گز دور ہٹ گیا تھا۔ اب وہ پیر نہیں جھٹک رہا تھا۔

”میں جا رہا ہوں گوتم بھوش اور میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا۔“ میں نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں اس وقت کیرتی پوری کی آبادی سے کم از کم دو میل دور ویران پہاڑیوں پر تھا۔ نیچے شیب میں آبادی کی ٹھٹھاتی ہوئی سی دوشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر گوتم بھوش کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں پیروں کو پھلانگتا ہوا شیب میں اترنے لگا۔ ابھی میں نے تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک طرف سے غراہٹ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ شاید کوئی بھینسا تھا جو مجھے اپنا غدار سمجھ کر غرا رہا تھا اور پھر اس کے قریب ہی ایک اور بھینسا کیس سے نمودار ہوا۔

جس کا پٹ اٹھ دیرانے میں بھیرے اپنے شکار کو گھیر کر سے کا پٹ اس کے نیچے اوجھڑتے ہیں ”میں اس کے تصور ہی سے کھچ اٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔“

”وہ بھیرے بھی غرا تے ہوئے میرے پیچھے لپکے۔ میں ان بھیروں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن ان قاتلوں نے بھی شاید میرا پیچھا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔“

ایک مرتبہ مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میرا تعاقب دو بھیروں نے شروع کیا تھا لیکن اب ان کی تعداد پانچ یا چھ ہو گئی تھی۔ ان میں ایک بھینسا سب سے آگے تھا اور باقی چند گز پیچھے۔ سب سے آگے والا بھینسا بھی مجھ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا اور وہ یہ فاصلہ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک جگہ مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

سینے پر گرا۔ میں نے دوبارہ اس پتھر کو پکڑا۔ ایسا کرتے ہوئے میری انگلیاں بھی ملا سے چھو گئیں۔ وہ بھینسا قریب آ گیا تھا۔ صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر وہ پتھر پوری قوت سے بھیرے کی طرف دے مارا۔

پتھر بھیرے کے سر پر لگا۔ ایک خوفناک انسانی چیخ ویرانے میں گونجی اور بھینسا زمین پر گر کر ترپنے لگا۔

انسانی چیخ کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ایک لمحے کو تو میں بد حواس سا ہو گیا تھا کہ شاید میرا مارا ہوا پتھر اس طرف آنے والے کسی آدمی کو لگ گیا ہو۔ ابھی شام کا ابتدائی حصہ ہی تھا اور یہ جگہ بستی سے زیادہ دور بھی نہیں تھی لیکن پتھر تو بھیرے ہی کو لگا تھا اور وہ پتھروں پر ترپ رہا تھا۔

میں نے بھیرے کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی سنسنی کی لہر میرے پورے جسم میں دوڑنے لگی۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ زمین پر ترپتے ہوئے بھیرے کی ہیبت بدل رہی تھی۔ پہلے اس کا چہرہ بگڑنا شروع ہوا۔ چہرے کے نقش اور ہیبت بتدریج بدلتی چلی گئی اور پھر وہاں ایک نیا چہرہ ابھرنے لگا۔

وہ انسانی چہرہ تھا۔ مجھے اس کے نقوش کچھ شناساے لگے لیکن اس وقت ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا کہ اس چہرے کو شناخت کر سکا۔ بھیرے کے جسم کے دوسرے حصے بھی بتدریج تبدیل ہو رہے تھے۔

اس سارے عمل میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔

پتھروں پر اب بھیرے کے بجائے ایک انسان پڑا ترپ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ رکھا تھا جہاں سے خون کی دھار بہہ رہی تھی اور پھر اس کے ہاتھ جیسے ہی چہرے سے ہٹے ”میں لرزا اٹھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ہینڈ ڈیجراج تھا۔ گوتم بھوش کا چیلہ جو رشی کیس میں شوبھا دپتی کو یوگ کی مشق کروایا کرتا تھا۔

یوں ڈیجراج زمین پر پڑا بڑی خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے پتھر لگنے

کے بعد دوسرے بھیڑیے بھاگ گئے تھے۔ ان کا دور دور تک کہیں نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

دیران نے اپنی جگہ سے اس طرح حرکت کی جیسے مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا ہو لیکن وہ لوکاؤں کا ڈھیر ہو گیا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب سی آوازیں نکلنے لگیں۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ میرا پتھر اس کی پیشانی پر لگا تھا اور پیشانی سے بننے والے خون نے اس کے چہرے کو بہت بھیاک بنا دیا تھا۔

بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں گوتم بھوش سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگا تھا اور بھیڑیوں سے بچنے کے لیے میں نے ایک بھیڑیے کو پتھر مار دیا تھا۔ وہ بھیڑیا زخمی ہو کر گرا تھا اور انسانی روپ اختیار کر گیا تھا۔ میں چند لمحے زخمی دھیراج کی طرف دیکھا رہا پھر ایک طرف سے چھڑوں کے لڑکنے کی آوازیں کر چوک گیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگا لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور ہستی کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہستی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں ایک بار دوق بازار میں پہنچ گیا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہر طرف خوب چل پل تھی۔ میرا حلیہ بہت ہی اتر ہو رہا تھا۔ لمبا سا چوڑے بے تماشا بڑے ہوئے بال اور داڑھی۔ میں جس طرف سے بھی گزرتا لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھنے لگتے لیکن میں ان کی نظروں کی پروا کیے بغیر ایک طرف چلتا رہا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ میرے چلنے میں میرے ارادے کو بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ میں بازار سے نکل کر گلیوں میں گھومتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔

اس گلی میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھنا نہیں دیتا تھا۔ اچانک اندھیرے میں مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں لڑکھا کر گرا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ٹٹل کر دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے اچھل پڑا۔ وہ کوئی مردہ کتا تھا یا کوئی اور جانور۔ میں اٹھ کر پھر آگے چلنے لگا۔

یہ تاریک گلی شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی چلی گئی۔ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ تاریکی بہت گہبیر تھی۔ کسی طرف روشنی کی معمولی سی کرن بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جب میں اس گلی میں داخل ہوا تھا تو دونوں طرف مکان تھے لیکن اب مکانوں کے بجائے دونوں طرف پیٹ اور سیدھی دیواریں تھیں جو اوپر تک اٹھتی چلی گئی تھیں۔

میں اس سرنگ نما گلی میں دوڑتا رہا لیکن یہ سرنگ گلی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اچانک میری چیز سے ٹکرا کر لڑکھا گیا۔ مجھے لگا تھا جیسے اندھیرے میں کسی دیوار نے میرا راستہ روک لیا ہو۔ میں نے دونوں بازو سامنے کو پھیلا دیے اور اندھوں کی طرح ٹٹول ہوا آگے بڑھنے لگا لیکن میرے سامنے نہ کوئی دیوار تھی نہ کوئی رکاوٹ۔ میں آگے بڑھتا رہا اور پھر رک گیا۔

میرے دماغ میں آنسوئیاں سی چل رہی تھیں۔ ناہانہ جو میرے دجہ میں پھیلتا جا رہا تھا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک بار دوق بازار سے اس گلی میں داخل ہوا تھا لیکن لگتا تھا جیسے زمین کی گہرائیوں میں کچھ ہو۔ نہ کہیں روشنی تھی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں عجیب سے طاغوتی جکر میں پھنس گیا تھا جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیطان فتنی تھیں جو چاروں طرف سے مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں رک گیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ کسی ٹکٹے سے آزاد ہو گیا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے اندر مراقبے اور ارتکاز کی قوت لوٹ آئی۔ میں آنکھیں بند تھیں لیکن میرے ارد گرد کا ماحول روشن ہو گیا تھا۔ میرے چاروں طرف ویران تھا۔ آبادی وہاں سے بہت دور تھی۔ میں شاید بدحواسی میں دوڑتا ہوا آبادی کی دورانی طرف بہت دور دور پانے میں نکل آیا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ماحول جوں کا توں برقرار تھا۔ میں مرکز آبادی کی طرف دوڑنے لگا۔

اسی بار دوق بازار کے قریب ایک گلی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ سامنے بازار میں لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ میں بے تماشا اس طرف دوڑ رہا تھا اور پھر اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر میں گر پڑا۔

دوسرے ہی لمحے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ایک عورت کی لاش تھی جس سے ٹکرا کر میں اس کے اوپر گرا ہوا اتفاق سے میرے ہاتھ اس کے گلے پر پڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا، شوری آوازیں آ رہی تھیں۔ شور مچاتے ہوئے لوگ میرے ارد گرد ہورہے تھے۔

صورت حال بڑی عجیب تھی۔ میں ایک عورت کی پر پڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر تھے اور وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔

صورت حال کی عجیبی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ سڑک پر پڑی ہوئی نیم برتنہ ایک عورت کی لاش اور میں اس طرح پڑا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر تھے اور گردن کی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ صورت حال مجھے اس عورت کا قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔

میرے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ شور مچا رہے تھے۔ ان کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں حواس باندھنا سوچ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ انجانے خوف اور دہشت نے جیسے مجھے بے جان سا کر کے رکھ دیا تھا اور میں عجیب سی نظروں سے اپنے ارد گرد کو دیکھ رہا تھا۔

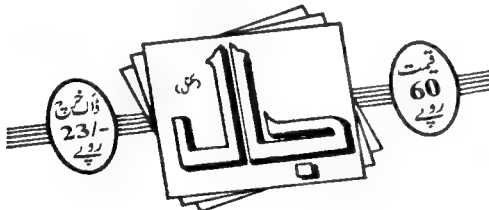
میرے دماغ میں طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک آدمی نے چیخ کر کچھ کہا اور پھر آگے بڑھ کر میری کھوپڑی پر زور مار کر ٹھوکر ماری۔

میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ میں اچھل کر لاش پر سے ایک طرف گر گیا۔ سر ٹھوکر کٹنے میں ہی جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے صورت حال کی نزاکت کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ مجھے بڑی آسانی سے قابل ثابت کیا جاسکتا تھا۔

اس بات کے درجنوں گواہ موجود تھے کہ میں اس عورت کے سینے پر سوار اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ میرے دماغ میں اچانک ہی دھماکا سا ہوا۔ میرے بھاء کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں لیکن شاید میں احمقوں کی جنت میں رہتا تھا جو اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ میرے ارد گرد درجنوں لوگ جمع تھے اور بعض تو غصے میں پھربے ہوئے تھے۔ یہاں سے بھانکنا تو درکنار وہ مجھے ہلے کا مونچ بھی نہ دیتے۔

میرا موخر الذکر خیال درست ثابت ہوا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر میری پسلیوں پر ٹھوکر ماری۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ اس شخص کی دوسری ٹھوکر بڑنے سے پہلے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخ کر لوگوں کو بتانے لگا کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے اس عورت کو قتل نہیں کیا لیکن میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سب بچلے بچلے کے نیپالی تھے۔ لباس اور حلیوں سے مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے لگتے تھے۔ ان میں کوئی بھی بڑھا کھسا نہیں لگتا تھا جو میری بات سمجھ سکتا کیونکہ میں اپنے دفاع میں جو کواں بھی کر رہا تھا وہ انگریزی زبان میں تھی۔

## ایک سنسنی خیز سرگزشت



ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون۔ ہے اور کہاں سے آیا ہے

کتاب کی قیمت: مجمع ذاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز

74200

Email: kitabiat1970@yahoo.com 5802551 فکس 5802552-5895313

اور پھر جوم میں ایک آدمی کو دیکھ کر میری آواز اس طرح ساکت ہو گئی جیسے حلق میں روٹی کا گولہ ٹھوس دیا گیا ہو۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ یوگی دھیراج تھا جس کے سر سے اب بھی خون رس رہا تھا اور اس کا چہرہ بھی خون آلود تھا۔ اس کے بدن پر پیلے رنگ کے لٹکوت کے سوا لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

یوگی دھیراج لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے گیا اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ ستر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ تیرکی طرح سیدھا کھڑا تھا اور اس کی آواز بھی بڑی باث دار تھی۔

چلتے ہوئے وہ کبھی اپنے پیٹے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتا، کبھی لاش کی طرف اور کبھی ہاتھ لہرا کر مختلف سمتوں میں اشارے کرتا تھا۔ وہ نیپالی اور ہندی زبان میں بات کر رہا تھا۔ جتنی زبان کے ایک آدھ لفظ بھی اس کی زبان سے نکل رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر ہندی زبان کے الفاظ ہی استعمال کر رہا تھا اور اس کا منہ سمجھ کر میں کانپ کر رہ گیا۔

دھیراج چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا تھا کہ میں اس عورت کو دھوکے سے سنسان جگہ پر لے گیا۔ عورت کو جب صورت حال کی یقینی کا احساس ہوا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اسے پکڑ زمین پر گرادیا اور اس کے گلے سے سیاہ پتھروں کی جتنی مالا اتار لی۔ وہ عورت موقع پر کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلی۔ میں نے اس کا پتھا کیا اور اس کی گلی میں آکر اسے پکڑ لیا۔ گلی اس وقت سنسان تھی۔ عورت نے چپنے کی کوشش کی تو میں نے اسے زمین پر گر کر اس کا گھاگھونٹ دیا۔

”اس میرا بے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ لوگوں کو اشتعال دلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ منظر تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ اس کے سینے پر سوار اس کا گھاگھونٹ رہا تھا۔ یہ عورت مر چکی ہے۔ یہ قابل ہے۔ ہتیارا ہے۔“

”یہ جھوٹ بولتا ہے!“ میں نے ہندی زبان میں چیخ کر کہا۔

”جھوٹا میں نہیں یہ ہے۔“ یوگی دھیراج بھی چیخا ”جب یہ اس عورت کو ہلکا پھلکا کر دہرائے کی طرف لے جا رہا تھا تو میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی جس پر اس نے مجھے پتھر مار کر زخمی کر دیا۔ دیکھو۔ دیکھو۔ یہ رہا وہ پتھر جس سے اس نے میرا سر پھاڑا تھا۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خون آلود پتھر میری لوگوں کو دکھایا ”اگر میں جھوٹا ہوں تو اس کی تلاشی لو۔ سیاہ پتھروں کی وہ جتنی مالا اس کے گلے میں موجود

ہے جو اس نے اس غریب عورت سے چھینی تھی۔“ میں لرزہ کر رہ گیا۔ دھیراج نے بڑی گہری چال بازی ظاہر ہے وہ مالا میرے گلے میں موجود تھی۔ اب ساری میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں واقعی طاغوتی پکڑ میں پکڑ تھا۔ یوگی گوتم بھوش اور دھیراج مجھ سے نیلگہ کی بی بی مالا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس مالا کو نیلگہ کی بی بی بھی کما جا سکتا تھا اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھ پر کچھ تو قہم بھی کر دیا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ میں ان کی قوتیں حصار سے بھاگ نکلا تھا لیکن انہوں نے ایک بار بار گھیرنے کی کوشش کی تھی اور اس مرتبہ انہوں نے وہ طریقہ استعمال کیا تھا۔ جو ان کی براسرار قوتوں سے خطرناک تھا۔ درجنوں لوگوں نے مجھے اس عورت کے پیچھے سوار دیکھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر تھے ظاہر ہے لوگ بھی سمجھ رہے تھے کہ اس عورت کو نہیں قتل کیا تھا۔ میرے گلے میں مالا کی موجودی دھیراج کی کمال تصدیق کر دیتی اور لوگ کسی طرح بھی میری بات کا یقین کرتے۔

دو آدمی میری طرف بڑھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے لگا لیکن پیچھے بھی لوگ موجود تھے۔ میرے پیچھے لگنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے دھیراج کی طرف دیکھا۔ اس ہونٹوں پر بڑی کمرہ مسکراہٹ تھی۔

آگے بڑھنے والے دونوں آدمیوں نے چاکا سی ہیز طرف چھلانگ لگا دی۔ میں نے چپنے کی کوشش کی لیکن آدمی پیچھے سے بھی مجھ پر جھٹ پڑے تھے۔ میں اپنے آپ بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دھشوں کی طرح مجھ پر پٹ پٹ گئے تھے۔ میرا چوہہ تار تار ہو گیا۔ ایک آدمی نے اندر وار جھٹکا دیا۔ پٹنا ہوا چوہہ میرے جسم سے الگ ہو گیا۔ میرے گلے میں نیلگہ کی سیاہ پتھروں کی وہ مالا اب صاف نظر آ رہی تھی۔

”دیکھو۔ دیکھو۔!“ دھیراج چیخا ”میری بی بی وہاں جانے لگا۔“ میں نے اس غریب عورت سے چھینی تھی۔“ اس کے گلے سے۔“

ایک آدمی نے مالا کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہاں طرح اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے کسی ناویدہ ہاتھ نے پوری قوت سے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ میں نے دھیراج کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور آنکھوں میں دھش کی آواز

آئی۔ ایک اور آدمی آگے بڑھا لیکن اسی وقت پولیس کی ایک گاڑی گلی میں مڑ کر جوم کے قریب رک گئی۔ گاڑی سے ایک سی سائزن بھی بھاگتا۔ لوگ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کئی پولیس والے گاڑی سے اتر کر ہادی طرف لپکے۔

تین چار آدمی میرے قریب کھڑے رہے تھے۔ دو نے مجھے ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا تاکہ میں بھاگنے کی کوشش نہ کروں۔ پولیس والے قریب آئے تو مجھے ان کے حوالے کر دیا گیا اور ایک آدمی تیز تیز جیلے میں انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

لوگ ایک بار پھر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن اس مرتبہ وہ سب دور دور ہی کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کے اس انداز سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ لوگ ابھی بھی خامے مشغول تھے۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دھیراج کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس پارٹی کا انچارج ایک انسپکٹر تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ مشغول لوگ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اس نے سرسری سے انداز میں سڑک پر پڑی ہوئی عورت کی لاش کی طرف دیکھا۔ دو کانشیلوں کو اپنے پاس روک لیا اور باقی پولیس والوں کو مجھے پولیس اسٹیشن لے جانے کا حکم دیا۔

پولیس کی گاڑی میں چار مسلح کانشیل تھے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر پھنسی لگا دی گئی تھی۔ پولیس والوں نے مجھے اپنے درمیان بٹھالیا اور گاڑی حرکت میں آئی۔

میں قسمت کی ستم گردی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ آج صبح تک میں پوکھارا میں پولیس چیف کا سامنا تھا۔ یہی خوب خاطر مدارات کی جاتی رہی تھی۔ ایک دو روز پہلے تو پولیس چیف کی طرف سے ایک بھاری رٹم بھی دی گئی تھی تاکہ میں اپنے قبائلی ساتھیوں کی خاطر تواضع کر سکوں اور ان کے لیے تحائف خرید سکوں اور اب میں پولیس کی وزارت میں تھا اور میرے ہاتھوں میں پتھریاں تھیں۔

میں اپنے ساتھی بیٹھے ہوئے پولیس والوں کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ لوگ مجھے کوئی قہم بھی نہ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی کہ میں کون پتھر کا کمال سے آیا ہوں اور وہ عورت کون تھی جس نے مجھ سے قہم کیا تھا لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔

پولیس کی گاڑی میں سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی پر کیوں کی تیز چڑچاہٹ کی آواز سے رک گئی۔ زوردار جھٹکا لگنے سے میں اپنے ساتھ والے کانشیل کے اوپر گر گیا۔ وہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دوسری طرف الٹ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانشیل بھی ایک طرف الٹ گئے تھے۔ جبکہ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا چوتھا کانشیل میرے اوپر الٹ گیا تھا۔

میں جس کانشیل پر گر گیا تھا اس نے مجھے دھکا دے کر اٹھا دیا۔ سینٹینے کی کوشش کرتے ہوئے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

پولیس وین کا راستہ بغیر جھٹ والی ایک جیب نے روکا تھا اور نصف درجن نقاب پوشوں نے جیب سے اتر کر پولیس وین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان سب کے پاس آئرننگ رائفیں تھیں۔

”خوددار!“ ایک نقاب پوش دھاڑا ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ اپنی رائفیں پھینک دو۔ کسی نے بھادری دکھانے کی کوشش کی تو پھینکی کر دیا جائے گا۔“ گاڑی کو زوردار جھٹکا لگنے سے کانشیلوں کے ہاتھوں

بجائے زبان بند رکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد ہی پولیس کو بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس طرح قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ انسپکٹر برہندرا اور اعظم خان کو اطلاع ملے گی تو وہ لوگ اس پولیس اسٹیشن پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ میں نے پولیس والوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا البتہ اس عورت کے بارے میں ضرور سوچتا رہا جس کی لاش سے ٹھوکر کھا کر میں اس کے اوپر گر گیا تھا۔

وہ کون تھی؟ اسے کس نے قتل کیا تھا؟ کیا اس لاش سے میرا کلرنا نکل اٹھا تھا یا پنڈت دھیراج کی کوئی سازش تھی؟ وہاں اس کی موجودگی اور اس کی باتوں سے تو اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ میرے خلاف ایک جال پھیلایا گیا تھا۔ دھیراج کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ لوگ مجھ سے نیلگہ کی مالا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ گوتم بھوش اور دھیراج یہ مالا حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور کسی اور موقع پر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی پر کیوں کی تیز چڑچاہٹ کی آواز سے رک گئی۔ زوردار جھٹکا لگنے سے میں اپنے ساتھ والے کانشیل کے اوپر گر گیا۔ وہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دوسری طرف الٹ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانشیل بھی ایک طرف الٹ گئے تھے۔ جبکہ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا چوتھا کانشیل میرے اوپر الٹ گیا تھا۔

میں جس کانشیل پر گر گیا تھا اس نے مجھے دھکا دے کر اٹھا دیا۔ سینٹینے کی کوشش کرتے ہوئے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

پولیس وین کا راستہ بغیر جھٹ والی ایک جیب نے روکا تھا اور نصف درجن نقاب پوشوں نے جیب سے اتر کر پولیس وین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان سب کے پاس آئرننگ رائفیں تھیں۔

”خوددار!“ ایک نقاب پوش دھاڑا ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ اپنی رائفیں پھینک دو۔ کسی نے بھادری دکھانے کی کوشش کی تو پھینکی کر دیا جائے گا۔“ گاڑی کو زوردار جھٹکا لگنے سے کانشیلوں کے ہاتھوں

بجائے زبان بند رکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد ہی پولیس کو بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس طرح قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ انسپکٹر برہندرا اور اعظم خان کو اطلاع ملے گی تو وہ لوگ اس پولیس اسٹیشن پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ میں نے پولیس والوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا البتہ اس عورت کے بارے میں ضرور سوچتا رہا جس کی لاش سے ٹھوکر کھا کر میں اس کے اوپر گر گیا تھا۔

وہ کون تھی؟ اسے کس نے قتل کیا تھا؟ کیا اس لاش سے میرا کلرنا نکل اٹھا تھا یا پنڈت دھیراج کی کوئی سازش تھی؟ وہاں اس کی موجودگی اور اس کی باتوں سے تو اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ میرے خلاف ایک جال پھیلایا گیا تھا۔ دھیراج کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ لوگ مجھ سے نیلگہ کی مالا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ گوتم بھوش اور دھیراج یہ مالا حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور کسی اور موقع پر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی پر کیوں کی تیز چڑچاہٹ کی آواز سے رک گئی۔ زوردار جھٹکا لگنے سے میں اپنے ساتھ والے کانشیل کے اوپر گر گیا۔ وہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دوسری طرف الٹ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانشیل بھی ایک طرف الٹ گئے تھے۔ جبکہ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا چوتھا کانشیل میرے اوپر الٹ گیا تھا۔

میں جس کانشیل پر گر گیا تھا اس نے مجھے دھکا دے کر اٹھا دیا۔ سینٹینے کی کوشش کرتے ہوئے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

پولیس وین کا راستہ بغیر جھٹ والی ایک جیب نے روکا تھا اور نصف درجن نقاب پوشوں نے جیب سے اتر کر پولیس وین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان سب کے پاس آئرننگ رائفیں تھیں۔

سے تو پہلے ہی رانٹلیں جھوٹ گئی تھیں۔ باقی دو نے بھی رانٹلیں گاڑی کے فرش پر پھینک دیں اور ہاتھ اٹھا دیے۔  
 ”اسے نیچے اتار دو۔“ اس نقاب پوش نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ ایک نقاب پوش رانٹل تانے جپ کے قریب گیا اور مجھے نیچے اتارنے کا حکم دیا۔

میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ کسی سارے کے بغیر اٹھنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔ وہ نقاب پوش مجھے دھکے دیتا ہوا اپنی جپ کی طرف لے گیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کبھی بور اگرچہ کمٹنڈو شہر کا نواحی علاقہ تھا۔ شہر کے مرکز سے اس کا فاصلہ چند کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا لیکن اس علاقے کا پولیس اسٹیشن آبادی سے ذرا بہت کر تھا اور جہاں پولیس کی گاڑی روکی گئی تھی اس سڑک پر تو ٹریفک کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔

مجھے سمجھے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس کی گاڑی مجھے اغوا کرنے کے لیے روکی تھی مگر لیکن یہ نقاب پوش کون تھے اور مجھے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑانا چاہتے تھے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ کیا یہ بھی گوتم بھوش یا پنڈت دھیراج کی کوئی چال تھی؟ لیکن یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں بعض برا سراہ قوتوں کے مالک تھے۔ مجھے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کوئی اور طریقہ بھی اختیار کر سکتے تھے لیکن اچانک ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ اس طرح طاقت کے زور پر مجھے پولیس کی حراست سے چھڑا کر شاید وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہوں کہ میرا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے اور میرے گروہ کے آدمیوں نے مجھے پولیس سے چھڑایا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور کسی سارے کے بغیر جپ پر چڑھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نقاب پوش نے مجھے اٹھا کر جپ کے فرش پر بیٹھایا۔ میں پہلو کے بل گر کر اور میرے بائیں کندھے پر اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔

میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نفا تر تزاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ تر تزاہٹ کی اس آواز میں انسانی چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں نے پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔

تمام نقاب پوشوں کی رانٹلیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے

پولیس والوں پر شعلے اگل رہی تھیں۔ چند سیکنڈ کے اندر چاروں کا تعصیل اور ڈراما شروع ہو گیا۔ ایک نقاب پوش نے چچا کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ لوگ جپ کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈراما شروع ہوا۔ اسٹریٹنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور جپ کا آئینا اشارہ ہی تھا۔ حکم دینے والا نقاب پوش ڈراما شروع کرنے ساتھ اٹل ہونے پر بیٹھ گیا اور باقی دوڑتے ہوئے جپ کے پچھلے حصے پر ہو گئے اور جپ ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی۔ اس جپ کی سینیٹیں بھی آٹنے سامنے تھیں اور میں ان سینیٹوں کے بیچ میں فرش پر پڑا تھا۔ وہ نقاب پوشوں کے میرے جسم پر تھے۔ میں نے ذرا سی لوٹ لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک نقاب پوش نے رانٹل کاٹ میری کھوپڑی پر کر دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی دکھ کرنے لگیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنا چلا گیا۔



میرے دماغ میں ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی میں کافی پر تک ہے کہ حرکت پڑا رہا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی تھی۔ مجھے لگا تھا یا تو میری بینائی ختم ہو چکی تھی یا میں کسی قبر میں پڑا تھا لیکن میں مردہ نہیں تھا۔ سر میں اٹھنے والی درد کی نیٹیں زندگی کا دے رہی تھیں۔

دماغ میں درد کی شدت ذرا کم ہوئی تو میں نے ہڈی اٹھانے سے اپنے جسم کو حرکت دی اور ہاتھوں پر زور دے کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دو باتوں کا انکشاف میرے لیے خاصا اطمینان بخش ثابت ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ میں زندہ تھا اور میری یادداشت بھی بحال تھی اور دوسری بات یہ کہ میری بینائی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میں جس جگہ پڑا ہوا تھا وہاں اندر بہت دیر تھا۔ لیٹے رہنے کی پوزیشن میں، میں اپنے اطراف کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا لیکن اٹھ کر بیٹھا تو بائیں طرف بہت دور آسمان پر ٹھنڈے ہوئے ستارے دکھائی دے رہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے ہاتھ بھی آزاد تھے۔ مجھے جسمانی یا ذہنی طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اچھی طرح بات تھا کہ کبھی بور میں اس عورت کی لاش ہنگامے کے بعد پولیس والے مجھے تھانے لے جا رہے تھے۔ راستے میں نقاب پوشوں نے پولیس کی گاڑی پر حملہ کر کے مجھے پولیس سے چھڑا لیا تھا اور میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے

بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ وہ نقاب پوش کون تھے انہیں مجھ سے کیا بھرو دی تھی اور انہوں نے مجھے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا تھا؟ کئی سوالات میرے دماغ میں پھرا رہے تھے لیکن فی الوقت کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا لیکن ایک بات یہ ہر حال تھی کہ یہ لوگ میرے ہم دردمیں تھے۔ اگر ہمدرد ہوتے تو اس طرح کسی اندھیری قید میں نہ ڈال دیا ہوتا۔ میں کچھ دیر تک کھوپڑی سلانا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے ذہن کو ٹوٹا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جہاں سے ٹھنڈے ہوئے ستاروں کی مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

فرش پر بیٹھے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی کشادہ کراٹھ جس کا فرش پتھر یا اور کھردرا تھا۔ میں کسی چپانے کی طرح انہوں میں سے کسی کے بل آگے بڑھتا رہا اور پھر میرا سر ایک دیوار سے ٹکرایا۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی۔ میں کچھ دیر تک پیشانی سلانا رہا اور پھر اندھوں کی طرح ہاتھ آگے کو پھیلا دیے۔

میرے ہاتھ دیوار سے ٹکرائے اور میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے اس جگہ کے بارے میں اندازہ لگانے میں مزہ آسانی ہو گئی۔ یہ کوئی کمر تھا اور میں ایک کشادہ کمر کی کے سامنے کھڑا تھا جس میں ہر جگہ انچ کے فاصلے پر دو دو گالوں کو لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دیوار کو ٹوٹنے سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ دیوار یا یہ عمارت بڑے پائے تھیں۔

میں آہنی سلاخوں کو پکڑ کر ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہ سلاخیں بڑی مضبوط تھیں۔ میں نے کوشش ترک کر لی اور باہر دیکھنے لگا۔ تاریکی میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مدھم سی روشنی میں پہاڑوں کے ہولے دکھائی دے رہے تھے اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری بھی نہیں آئی کہ یہ عمارت آبادی سے بہت دور ویرانے میں واقع تھی۔

میں کچھ دیر کھڑی سے باہر دیکھتا رہا اور پھر دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ گہری تاریکی میں اس قید خانے کے بارے میں مجھے معلوم کرنے کی کوشش کرنا بیکار تھا۔

میں دیوار سے ٹک لگائے، آگے کی طرف ٹانگیں بٹھائے بیٹھا گزرتے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اچانک ہی مجھے نیلگی کی مالا کا خیال آیا اور میرا ہاتھ بڑھتا ہوا اپنے گلے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچانک رنٹل میں آ گیا۔

مالا میرے گلے میں نہیں تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پہلی مرتبہ مالا مجھ سے جدا ہوئی تھی تو مجھے بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ مالا مجھ سے چھن گئی تھی اور دوسری بستی میں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب پھر مالا غائب تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ کیا مالا گوتم بھوش یا پنڈت دھیراج کے قبضے میں چلی گئی تھی؟ وہ اس کے لیے کوشش کر چکے تھے اور پنڈت دھیراج نے مجھے قتل کے پکر میں پھنسانے کی کوشش بھی کی تھی اور پھر نقاب پوشوں نے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا۔

لیکن نہیں۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ اگر مالا ان کے قبضے میں پہنچ چکی ہوئی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ میں وہ مالا واپس لینے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ تو پھر مالا کہاں گئی؟

یہ سوال میرے ذہن میں بار بار گونج رہا تھا۔ ممکن ہے نقاب پوشوں کی جپ میں کبھی گھس کر ہو یا کسی نقاب پوش نے میرے گلے سے اتار لی ہو۔ اس کا پتا تو اسی وقت چل سکتا تھا جب نقاب پوش مجھ سے دوبارہ رابطہ کرے۔

میرے دماغ میں ایک بار پھر یہیں اٹھنے لگیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا اور پھر پتا نہیں کس وقت میں اودھ گھ گیا۔

میری پسلیوں پر لگنے والی وہ ٹھوکری بڑی زوردار تھی۔ اس سے نہ صرف میری آنکھ کھل گئی بلکہ میں بری طرح بلٹا اٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، ایک اور ٹھوکری پڑی اور میں فرش پر لڑکھ گیا۔

مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔ تیسری ٹھوکری کے سے پہلے میں پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دن کی روشنی پچھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے راستے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میرے سامنے دو آدمی تھے ایک تو وہ تھا جس نے مجھے ٹھوکریں ماری تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں آؤٹریک رانٹل بھی سنبھال رکھی تھی۔ دوسرا دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھی رانٹل تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں اس نے پینٹل کی ایک گول تھالی اٹھا رکھی تھی جس میں پانی کا گلاس، ایک کپ چائے اور ذیل روٹی کے ٹکڑے چار پیس رکھے ہوئے تھے۔  
 ”کب تک سو رہے ہو گے نواب صاحب؟“ میرے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے مجھے ایک اور ٹھوکری مارنے کی

کوشش کرتے ہوئے غرا کر کہا۔ میں اچھل کر اس کی ٹھوکر سے بچ گیا۔

وہ دونوں نیپالی تھے۔ جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا اس نے چوڑی دائرہ کمر کا جامہ پہن رکھا تھا۔ اوپر ہاف کوٹ قسم کی کوئی چیز تھی جس کے بن شہروانی کی طرح اوپر تک بند تھے۔ سر سیاہ رنگ کی گول نیپالی ٹوپی بھی تھی۔ پیروں میں موگرز تھے اس کے چہرے پر بڑی کرختگی تھی۔

دوسرا آدمی بھی نیپالی ہی تھا۔ اس نے جینز ڈیم کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بن بھی کھلے ہوئے تھے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر کھالی ایک طرف رکھ دی۔

”تم تیسری مرتبہ یہاں آئے ہیں۔“ میرے سامنے کھڑا ہوا شخص غرایا ”پاس کا حکم تھا کہ کہیں ناشا کرا دیا جائے۔ اگر پاس کا حکم نہ ہوتا تو تمہیں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیا جاتا۔ ناشا کرو۔ ہم آگے بڑھ کر آئیں گے۔“

وہ دونوں باہر چلے گئے اور دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ باہر سے کوئی مضبوط لٹکا لگائے جانے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا دھرا دھرا دیکھتا رہا۔ یہ خاصا بڑا کمرہ تھا اور پھت بھی تقریباً بیس فٹ اونچی تھی۔ میرا یہ اندازہ بھی درست نکلا تھا کہ یہ عمارت بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ پھت پر البتہ نالوں کی طرح کے چھوٹے پتھر تھے ہر چہ اچھے کے فاصلے پر کلڈی کی بلیاں تھیں جن پر پھت کی نائلیں چبئی گئی تھیں۔

کلڈی کا دروازہ بہت بھاری اور مضبوط تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک تنگ سارا ستھ تھا۔ میں نے اس طرف جا کر اندر جھانکنا چاہا تو ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرف سے شدید تعفن اٹھ رہا تھا۔ یہ ٹھوڑی سی جگہ غالباً ہاتھ دھو کے طور پر چھوڑی گئی تھی۔

کمرے کا فرش بھی پتھروں کا تھا اور یہ پتھر جگہ جگہ سے ٹوٹ اور اکھڑ چکے تھے۔ ہوا کی آلود رفت کے لیے دی ایک کشادہ کلڈی تھی جس میں ہر چہ اچھے کے فاصلے پر دو اچھ سوئی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

یہ عمارت پہاڑیوں میں کسی دوسرے ان جگہ پر واقع تھی۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی قدیم حویلی ہو اور یہ کمرہ پہلے بھی شاید قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔

کھڑکی کے راستے تیز دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میرے پاس اگرچہ کھڑی نہیں تھی لیکن اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ گیارہ بجے کا وقت ضرور ہوگا۔

وہ دونوں آدمی میرے لیے ناشتا رکھ کر بیٹھے  
میں ان سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟  
پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا گیا تھا؟ گزشتہ  
پولیس کے خلاف کارروائی کے دوران میں ان سے  
اپنے جرمے تھاہوں میں چھپا رکھے تھے لیکن اس وقت  
آدمی میرے کمرے میں آئے تھے انہوں نے مجھ سے  
کمرے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔  
گزشتہ رات ان نقاب پوشوں نے مجھے چھڑانے  
پولیس کے خلاف جو کارروائی کی تھی اس نے مجھے رازدار  
دیا تھا۔ مجھے پولیس کے قبضے سے چھڑانے تک کی کارروائی  
بیڑے پر سکون انداز میں ہو گئی تھی۔ وہ اگر چاہے قہر  
والوں کی رانٹیں جھین لیتے اور گاڑی کے ٹائرس  
تاکہ تعاقب کا اندیشہ نہ رہتا لیکن انہوں نے تمام  
والوں کو جس بے رحمی سے گولیوں سے بھون کر رکھ دیا  
اس سے تو میں بھی کانپ کر رہ گیا تھا۔  
مجھے بھی انہوں نے بے ہوش کر دیا تھا اس لیے  
اندازہ نہیں تھا کہ پولیس والوں کی ہلاکت کے بعد ہم  
کتنی دیر تک سڑک پر رہے لیکن یہ بات سہرا لے  
کہ یہ عمارت شہر سے میلوں دور پہاڑوں میں کسی ایسی  
جگہ تھی جہاں پولیس آسانی سے نہ پہنچ سکتی ہو۔  
میں کافی دیر تک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا  
جو پتہ رہا پھر دروازے کے قریب رہا وہاں تھالی اٹھا کر  
کے قریب لے آیا اور گرد آلود فرش پر آہنی پائیاں  
لیا۔  
چائے بغیر دودھ کی تھی۔ ڈبل روٹی کے چار سلاٹ  
تھے۔ میں نے گلاس اٹھا کر پہلے گلی کی پھر پانی کے ایک  
گھونٹے اور ڈبل روٹی کھانے لگا۔  
ناشتا کر کے میں نے تھال دوبارہ دروازے کے قریب  
کھ دی اور کھڑکی کے سامنے کھڑا دیر تک باہر کا نظارہ  
بہا۔ یہ کمرہ عمارت کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ چھائی  
میں چائیس گز کے فاصلے پر پتھروں ہی سے بنی ہوئی تصویر  
رنگی دیوار نظر آرہی تھی اور اس کے پیچھے دو دروازے  
سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔  
اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا  
کہ میں دور بود ناتھ کے علاقے میں ایک پتھر  
ہوئی بھی کسی ایسی ہی جگہ پر واقع تھی۔ کیا یہ عمارت  
تھا ہی کے علاقے میں واقع ہے؟ میں نے اپنے چہرے  
ملاخوں کے ساتھ دیکھا اور اندازہ باس دیکھنے کی کوشش

لے کر لگا لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ہاڑیوں پر کوئی اور عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں کوئی کے سامنے سے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر ٹیبلہ ہر طرف ٹانھا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ یہ عمارت غالباً بہت بڑی تھی اور وہ بہت پوش غالباً اس عمارت کے کسی دور افتادہ حصے میں تھے۔ لیکن ان کی طرف سے بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

وقت دیر سے دیر سے گزرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میرے حفاظوں میں سے کوئی نہ کوئی اس طرف ضرور آئے گا لیکن دوپہر اصل گئی اور کسی نے اس طرف کارخ نہیں کیا۔ ان کے پاس نے شاید انہیں صرف صبح کے ناشتے کا حکم دیا۔ دلوں پر کھانے کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی کیونکہ ناشتا دینے کے بعد سے اب تک کسی نے اس طرف حاکم کر دیکھا تک نہیں تھا۔

مجھے پاس لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ٹھکر تھا لی رہا ہوا گھاس اٹھایا۔ اس میں پانی کے ایک ڈھونڈ پیئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہی سانس میں وہ پانی گھٹس میں اتر لیا اور دوبارہ اپنی جگہ پر ٹانگیں پٹا کر بیٹھ گیا۔

آوی کسی کام میں مصروف ہو تو پوریت یا محسن کا احساس نہیں ہوتا لیکن بیکاری بذات خود بہت بڑی مشقت بناتی ہے۔ میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ محسن میرے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے ادنگھ گیا۔

اور پھر اچانک ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بیچوں کی آواز تھی جو اس عمارت میں کسی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ میرے دماغ میں سنسنائی سی ہونے لگی۔ پہلے تو میں نے اپنا اہم سمجھا تھا لیکن دوسری مرتبہ بیچوں کی آواز سنائی دی تو میں اچھل پڑا۔ وہ آواز بھی قریب سے آتی ہوئی محسن ہوتی اور بھی دور سے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس عمارت کے کسی حصے میں کسی شخص کا شور کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

میں اٹھ کر کوئی کے قریب کھڑا ہو گیا اور ان بیچوں کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

بابر شام کا دھند کا سا پہلنے لگا تھا۔ جبکہ میرے میں اندھیرا ہو گیا ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی سمجھوں نے بھی یلغار



آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟  
آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت  
 ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا  
 کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے  
 کے لیے سیلی پیٹھی اور ہینا نرم کی طرح  
 مشقیں نہیں کرنا پڑتیں؛

جدید اور سائنسیک اصولوں پر مبنی حیرت انگیز کتاب

مفتاح السید

آپ کی شخصیت میں انوکھا نکھار پیدا کر دیگی  
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

اس کتاب کا مطالعہ کیجئے

اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجئے !

قیمت 40 روپے \* ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی، وانہ کریں

100-100000-100

RECEIVED

U.S. DEPARTMENT OF JUSTICE

FEDERAL BUREAU OF INVESTIGATION

WASHINGTON, D. C. 20535

NOV 10 1964

100-100000-100

کردی تھی۔ میرے بدن کا بالائی حصہ برہنہ تھا اس لیے مجھ  
نمائت آزادی سے میرا خون چوس رہے تھے۔  
چیننے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ پتا نہیں وہ کون تھا  
جسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور یہ لوگ کون تھے جنہوں نے  
مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا اور پانچ پولیس والوں کو  
بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔  
ناشادینے کے بعد وہ لوگ شاید مجھے بھول گئے تھے۔  
اب شام ہو رہی تھی اور کسی نے اس طرف جھانک کر دیکھا  
تک نہیں تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا کہ یہ  
لوگ کون تھے اور مجھے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا گیا  
تھا۔  
مجھے مزید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد باہر  
قدموں کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر دروازے پر لگا ہوا  
کھٹکا ہٹا دیا گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ دروازہ کھلا اور اسی  
نیپالی کی صورت دکھائی دی جس نے صبح مجھ پر ٹھوکریں برسائی  
تھیں۔ اس کے پیچھے دو اور آدمی رانٹیلیں سنبھالے کھڑے  
تھے۔ وہ چروں ہی سے چبھے ہوئے بد معاش لگ رہے تھے۔  
”اے اٹھو۔“ اس نیپالی نے کمرے میں داخل ہوتے  
ہوئے تھکانہ لہجے میں کہا ”چلو۔ تمہارا ایک دوست تم سے  
ملنا چاہتا ہے۔“  
”میرا دوست؟“ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میں غیر  
آرادی طور پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
اس نیپالی نے مجھے رانٹل کی زد پر لے رکھا تھا۔ باہر  
کھڑے ہوئے دونوں غنڈوں کی رانٹیلیں بھی میری طرف  
اٹھی ہوئی تھیں۔  
باہر ملگا سا اندھیرا تھا لیکن دور تک کی چیزیں ابھی  
صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس کمرے کے سامنے جھاڑیوں سے  
اٹا ہوا وسیع و عریض میدان تھا۔ کئی ایک زرد آونچی فصلیں میں  
گھرا ہوا تھا اور میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ یہ کوئی  
قدیم حویلی تھی۔ حویلی کی عمارت دائیں طرف کافی فاصلے پر  
تھی۔ بیشتر حصے اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے لیکن اندازہ لگایا  
جاسکتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ بہت شان دار عمارت رہی  
ہوگی۔  
یہ حصہ حویلی کی اصل عمارت سے بالکل الگ تھلگ  
تھا۔ پانچ چھ کمرے تھے جن کے سامنے کشادہ برآمدہ بھی تھا  
جس کا فرش ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔  
عمارت کا یہ حصہ غالباً قید خانے کے طور پر ہی استعمال  
ہوا تھا۔ میں جس کمرے میں قید تھا وہ اس بلاک کے آخر میں

تھا۔ اس کے ساتھ کے دو کمروں کے دروازے ٹانگے  
آخری کمرے کے سامنے ایک گن میں کھڑا تھا۔  
دھکیلے ہوئے اسی طرف لے جایا جا رہا تھا۔  
اس کمرے کے سامنے پہنچ کر نیپالی گن میں نے  
پر زور دار لالت رسید کر دی اور میں لڑکھٹا ہوا کمرے  
اندھرا کر رہا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔  
سنبھلنے سے پہلے ہی دروازہ دھڑکنے سے بند ہو گیا۔  
میں منہ کے بل گر گیا تھا اور میری پیشانی پتھر کی  
سے ٹکرائی تھی جس سے کھال پھٹ گئی تھی اور خون رے  
تھا۔ میں ہاتھ کی پست سے پیشانی پونچھتے ہوئے مجھے یہ  
ہوا ”مجھے اپنا دل لپٹیوں میں دھڑکنے ہوا محسوس ہونے لگا۔  
کمرے میں ایک مشعل روشن تھی اور بائیں دیوار  
دیوار کے قریب ایک آدمی اونڈھا پڑا ہوا تھا۔ دیوار اور  
آلود فرش پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ اس آدمی  
بدن پر جینز تھے جبکہ بالائی حصہ برہنہ تھا اور اس پر بھی  
کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔  
اس آدمی کا سرخ دوسری طرف تھا۔ میں اپنی پٹا  
بھول کر چپائے کی طرح چلا ہوا تیزی سے اس کی طرف  
بڑھا۔ اس نیپالی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مجھے میرے کمرے  
سے ملانا چاہتے ہیں۔ پست پر بکھرے ہوئے اس شخص  
گو لڈن بال دیکھ کر میں الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ وہ کون  
ہے۔  
قریب پہنچ کر میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔  
آدمی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے اس کی  
اپنی طرف پلٹ دیا اور اس کے ساتھ ہی میں لڑا تھا۔  
وہ سہا تھا۔  
اس کے پیروں اور ہاتھوں کے انگوٹھوں کے پانی  
اکھڑے ہوئے تھے۔ انگوٹھے سوچ رہے تھے اور ان  
بنا ہوا تھا۔ سینے پر بھی کئی زخم تھے جیسے گوشت کو کسی  
آلے سے کاٹا گیا ہو۔ سبکی آنکھیں بند تھیں۔ اس  
چہرے پر کرب کے آثار آتے جیسے مجھ پر کرہ گئے تھے۔  
”سہا۔ سہا۔“ میں اسے کندھوں سے پکڑ کر  
”آنکھیں کھولو سہا۔ میں بہت تنگ ہوں۔ سہا۔“  
”کھولو۔“  
سہا بڑی مشکل سے آنکھیں کھول پایا تھا۔  
آنکھوں میں بھی دیرانی تھی۔ مجھے پہچاننے میں بھی  
خاصی دشواری پیش آئی تھی۔  
”تنت۔ تم۔ ٹھیک۔ بہت۔ تنگ۔“ اس کے

”میں تنگ ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”تم ان کے  
بچے کیسے چڑھ گئے۔ یہ لوگ تم سے کیا چاہتے ہیں؟“  
”تنت۔ تم۔ تم۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ بہت تنگ۔“  
”دولا۔ یہ۔ یہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“  
”میری فکر مت کرو۔“ میں نے کہا ”تم ان کے ہاتھ  
کیسے لگے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ تم سے کیا چاہتے ہیں؟“  
”وہ۔ وہ۔ وہی جو۔ تم سے چاہتے ہیں۔“ سہا نے  
رک رک کر جواب دیا۔  
”میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔  
سہا کمرے سانس لیتے ہوئے چند لمحوں تک خاموشی  
سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ رک رک کر  
بتانے لگا کہ وہ ان لوگوں کے بہتے کیسے چڑھا اور یہ کون لوگ  
تھے اسے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی اسی لیے وہ بہت  
رک رک کر بات کر رہا تھا۔  
سہا نے جو کچھ بھی بتایا اسے سن کر میں کانپ اٹھا۔ اس  
کے کہنے کے مطابق دو دن پہلے جب وہ پوکھارا میں مجھ سے  
رضعت ہوئے تھے تو دوسرے کے وقت دریا کے کنارے پر  
انہوں نے پراڑا ڈال دیا تھا۔ ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد وہ  
لوگ رواں گئی کی تیار کر رہے تھے کہ ایک جیپ پر سوار چار  
پانچ آدمی وہاں پہنچ گئے۔ وہ نیپالی تھے اور ان کے ساتھ  
نارنگ قبیلے کے بھورن نامی ایک آدمی کو دیکھ کر چونک گئے  
تھے۔ بھورن گھوما کے چیلوں میں سے ایک تھا جو گھوما اور  
بومبا کے انجام کے بعد قبیلے سے غائب ہو گیا تھا۔  
سہا کے کہنے کے مطابق یہ خطرناک لوگ میری اور ہلا  
کی تلاش میں دھول گری کی بھری ہوئی بستیوں میں گھوم  
رہے تھے کہ ان کی ملاقات بھورن سے ہوگئی۔ بھورن  
انہیں نارنگ قبیلے تک لے گیا جہاں کھانے انہیں بتایا کہ  
ہلا تو ہلاک ہو چکی ہے۔ تاہم میں قبیلے کے کچھ لوگوں کے  
ساتھ وہاں سے جا چکا ہوں۔ وہ لوگ میری تلاش میں دھول  
گری کی بستیوں میں ہمارے بارے میں پوچھتے ہوئے دریاے  
موڑی کھولا کے کنارے پر آباد ہیکو نامی بستی میں پہنچ گئے۔  
وہاں سے انہیں پتا چلا کہ چند روز پہلے بستی والوں نے ہمیں  
ایک قافلے کی صورت میں پوکھارا کی طرف جاتے ہوئے  
دیکھا تھا۔  
اتفاق سے جس رات یہ لوگ پوکھارا پہنچے اس سے  
ایک روز صبح سویرے سہا اور اس کے ساتھی پوکھارا سے  
رضعت ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو بھی صبح ہی پتا چل سکا تھا۔

یہ لوگ فوراً ہی ان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے اور دوسرے  
کے ذرا بعد انہیں دریائے موڑی کھولا کے قریب پایا۔  
ان لوگوں کو میری تلاش بھی۔ مجھے ان کے ساتھ نہ پا کر  
وہ لوگ سہا اور اس کے ساتھیوں سے میرے بارے میں  
پوچھتے رہے۔  
سہا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے تھے کہ کوئی گڑبڑ ضرور  
ہے اور پھر بھورن ان کے ساتھ تھا جو ان کے شک کی  
تصدیق کے لیے کافی تھا۔ سہا اور اس کے ساتھیوں نے  
انہیں میرے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ ان  
لوگوں نے انہیں لالچ بھی دیا۔ یہ یقین دلانے کی کوشش بھی  
کی کہ وہ میرے دوست ہیں لیکن سہا کو کسی گڑبڑ کا اندازہ  
ہو گیا تھا کیونکہ بستی میں بھی پوگندرتا تھا اور تری دیوانی دو  
آدمی میری تلاش میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے  
آپ کو میرا ہر حال ظاہر کیا تھا۔ پوگندرتا تھا تو بستی سے واپس  
جاتے ہوئے پر اسرار طور پر ہلاک ہو گیا تھا اور تری دیو کو بعد  
میں گھومناے ہلاک کر دیا تھا۔ ان دو واقعات کے پیش نظر  
سہا کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بھی میرے دوست یا ہمدرد  
نہیں ہو سکتے۔  
سہا کو پانچ سو کلہ ہیروں کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا  
اس لیے وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بھی مجھ سے ہیروں کے  
بارے میں ہی پوچھنا چاہتے ہوں گے اس لیے سہا اور اس  
کے ساتھیوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو میرے  
بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔  
وہ پہلے تو سہا وغیرہ سے نرمی اور پار محبت سے میرے  
بارے میں پوچھتے رہے لیکن جب اس طرح مقصد میں کامیابی  
نہیں ہوئی تو تشدد کا راستہ اپنایا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے  
تعبیب کو پکڑ لیا۔ دو آدمیوں نے اس کے ساتھ زیادتی کرنے  
کی کوشش کی تو سہا کے قافلے میں شامل بدھ بھنشاو  
پچانے کے لیے پکا تو اسے گولیوں سے بھون دیا گیا۔  
تارنگ قبیلے کے مرد ایک دوسرے کی عورتوں کو دینے  
کے لیے آپس میں مقابلے تو کرتے ہیں اور عورتیں بھی دینے  
والے مردوں کے ساتھ جانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔  
ہمارے والے مرد اپنی عورت کو فلاح کے حوالے کرنے میں  
کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے لیکن قبیلے کی کسی عورت کو  
اس طرح رسوا کیا جائے یہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا  
ہے۔  
سہا اور تھا پتا بھی تعبیب کو پچانے کے لیے ٹوٹ پڑے۔  
تھا پتا بھی گولیوں سے چھلنی ہو گیا اور سہا ان کے قابو میں



آگیا۔ اسے مارا کر ادھ موا کر دیا گیا۔ اس کی موجودگی میں تھیوب کے ساتھ زیادتی کی گئی اور اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بالآخر اس نے اپنی جان دے دی لیکن میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

بھکشو سارا نوک، تھیوب اور تھاپا کی لاشیں دریا میں پھینک دی گئیں اور سب کو وہ لوگ پکھا رالے آئے۔ چھٹی رات وہ لوگ پکھا رالے میں تھے اور آج دوپہر یہاں پہنچے تھے۔ سب کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

یہاں آتے ہی سب کو پتا چل گیا کہ گزشتہ رات میں بھی ان کے قابو میں آچکا تھا اور یہاں آئے کے ٹھوڑی ہی دیر بعد ان کا ایک آدمی سب کے قابو میں آگیا اور سب نے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی۔ وہ لوگ سب پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور پھر انہوں نے سب سے ہیروئن کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ جب میں ان کی ہستی میں پہنچا تھا تو پانچ سو کلو ہیروئن میرے پاس موجود تھی جسے میں نے نہیں چھپا دیا تھا اور سب کو وہ جگہ معلوم بھی جہاں ہیروئن چھپائی گئی تھی۔

سب نے بتایا کہ وہ ہیروئن دریا میں بہہ گئی تھی۔ اس مرتبہ وہ اگرچہ بچ بول رہا تھا لیکن انہوں نے سب کی بات کا یقین نہیں کیا اور اسے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ پہلے چاقو سے اس کے سینے اور جسم کے دوسرے حصوں پر چر کے لگائے گئے اور پھر زہور سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کے انگوٹھوں کے ناخن اکھاڑے گئے۔

سب اگرچہ کبھی کتنا رہا کہ ہیروئن دریا میں بہہ گئی تھی اور وہ بچ کر رہا تھا لیکن کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور اسے تشدد کا نشانہ بناتے رہے اور پھر مجھے اس کمرے سے نکال کر یہاں لے آیا گیا تھا تاکہ سب کا حشر دیکھ کر میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ پہلے پوگندر ہاتھ اور تری دیو تارا انگ فیملی کی ہستی میں پہنچے تھے۔ وہ دونوں کھنڈو کے غنڈے اور منشیات فروش تھے۔ انہیں کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ میں چانگ کی کے آدمیوں کو قتل کر کے پانچ سو کلو ہیروئن لے اڑا تھا اور وہ لوگ مجھے تلاش کر کے اس ہیروئن پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے اور اب یہ لوگ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی کوئی تیسری پادری تھی جسے اس ہیروئن کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور یہ لوگ بھی ہیروئن حاصل کرنے کے چکر میں تھے۔

پانچ سو کلو ہیروئن۔ جس کی مالیت کروڑوں ڈالر تھی اور اتنی بڑی رقم کے لیے تو درجنوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا۔ ہیروئن کے اسمگلروں کو تو میں دیکھ بھی موت کا سودا کر سکتا تھا۔ یہ لوگ موت ہی تو بیچتے تھے۔ انسانی زندگی کی ان کے قریب کوئی قیمت نہیں تھی۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تو ان کرنسی نوٹوں کو حاصل تھی جو ہیروئن کے بدلے ملتے تھے۔ دولت ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا اور دولت ہی ان کا دھرم۔ یہ دنیا کے سفاک ترین لوگ تھے۔ ان کی سفاکی کے مظاہرے ہی تھی لیڈز میں بھی دیکھ چکا تھا۔ سنگاپور اور ہندوستان میں بھی کئی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئی تھیں اور اب سب میرے سامنے تھا۔ اس کے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اسے جس طرح ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا تھا وہ ان کی بے رحمی اور سفاکی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سب کو اس حالت میں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ دل تو چاہتا تھا کہ ان لوگوں کے گلے کر دوں جنہوں نے سب کو اس حالت میں پہنچایا تھا لیکن میں خود بھی ان کا قیدی تھا۔

مجھے سب کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ میری ہمدردی میں سچائی کے راتے پر چلنے والے نہ جانے کتنے بے گناہ لوگ ان دردوں کا شکار ہو چکے تھے۔

سب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے کندھوں سے ہلایا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ "تنت۔۔۔ تم بھاگ جاؤ بہت سگتے۔" اس نے رک رک کر کہا "یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ انہوں نے سب کو مار ڈالا۔ تمہیں بھی مار ڈالیں گے بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں سب۔" میں نے کہا "میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں تم پر ہونے والے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا ان سے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم زندہ رہو گے اور اپنی آنکھوں سے ان کا حشر دیکھو گے۔"

"تنت۔۔۔ تم بھاگ جاؤ۔ بہت۔۔۔" سب کے لب خاموش ہو گئے اور آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ اس کے سینے کا ہلکا سا زہر ویم پتا رہا تھا کہ وہ زندہ تھا۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے فوری طور پر طبی امداد ملنی ضروری تھی لیکن میں خود قید میں تھا اور اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے آنکھیں سے گرد آلود فرش پر اٹھایا۔

ٹھیک اسی وقت باہر قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے رک کر دیوار میں پھنسی ہوئی مشعل اٹھائی۔ اس مشعل میں ٹپکی جانور کی چربی جل رہی تھی جس سے ناکواری بو اٹھ رہی تھی۔

میں مشعل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ قدموں کی آواز دروازے کے قریب آکر رک گئی اور پھر باہر سے ہماری کھٹکا ہٹایا جانے لگا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ میں ایک پٹ کی آڑ میں تھا۔ پہلے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں را نقل سنبھال رکھی تھی۔ وہ پیسے ہی آگے بڑھا "میں نے مشعل سے اس کے سر پر حملہ کر دیا۔"

ضرب تو اس کے سر پر نہیں لگ سکی تھی لیکن مشعل کے بالے میں چلنے والی چربی کے کچھ چھیننے انگاروں کی طرح اڑ کر اس شخص کے چہرے پر گرے۔ وہ چیخا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ را نقل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ گئے تھے۔

اس کا دوسرا ساتھی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر وہ اچھل پڑا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا "میں نے اس پر بھی چلتی ہوئی مشعل سے حملہ کر دیا۔" وار اس کے کندھے پر پڑا۔ میں اسے زیادہ نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے ساتھی سے نواہ پھرتا نکلا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر را نقل کا زہر کر دیا۔

گولیوں کی پوچھ مار سامنے والی دیوار پر پڑی۔ میں نے مشعل بیٹھ کر دیوار کی تیزی سے را نقل کو ٹال سے پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھایا۔ را نقل کی ٹال سے ٹپکنے والی گولیاں چھت سے گرائے گئیں۔

میں نے را نقل پر اس وقت تک گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک اس کا میگزین خالی نہیں ہو گیا۔ را نقل سے گرفت ہٹا کر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے گرفت اسی طرح مضبوط رکھی اور نیچے بیٹھا چلا گیا اور پھر میں نے پوری قوت سے اپنے آپ کو پیچھے کی طرف کرا دیا۔

میرا حریف میرے اوپر سے الٹی فلا بازی کھانا ہوا پٹ سے ٹپک کرے کے وسط میں گرا۔ میں بھی بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر اٹھ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے دوسرے آدمی کی کھوپڑی پر زور دار ٹھوکر سید کر دی جو اپنی را نقل اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا۔ وہ شخص ٹھوکر کھا کر ہلکا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ میری دوسری ٹھوکر پہلے حریف کو گلی تھی جو را نقل اٹھانے کے لیے لپکا تھا۔ وہ دوبارہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میں را نقل کی طرف لپکا لیکن دوسرے حریف نے میری ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ میں منہ کے بل گر گیا لیکن میں نے جلدی سے دونوں ہاتھ فرش پر نکا دیے تھے اور پھر اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

میرے دونوں حریف بھی کھڑے ہو چکے تھے۔ وہ حملہ آور ہونے والے انداز میں آگے بڑھے اور یہی ان کی غلطی تھی کہ وہ بیک وقت آگے آ رہے تھے۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا۔ میں نے ڈبل فلاٹنگ کلک لگائی تھی اور دونوں کو نشانہ بنایا تھا اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ میرا ایک ہر ایک حریف کے سینے پر اور دوسرا ہر دوسرے کے چہرے پر لگا تھا۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر پیچھے گرے تھے لیکن جس کے چہرے پر کلک لگی تھی وہ تو تڑپتے ہوئے بکسے کی طرح ہلکا ہٹا تھا۔

میں بھی نیچے گرا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا تھا۔ جس شخص کے سینے پر کلک لگی تھی وہ بھی سنبھل چکا تھا۔ وہ اڑتا بیٹھنے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مجھے سر سے کھرا رہا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ کر اس کی گردن اپنے بازو کی لپٹ میں لے لی اور اسے زور سے جھٹکے دینے لگا۔

وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ میرے اس نہایت خطرناک داؤ میں آ گیا تھا جس سے آج تک کوئی نہیں بچ سکا تھا۔

میں خود بھی نیچے بیٹھ گیا اور اپنے پیروں کی اڑیاں نوٹنے ہوئے فرش میں چھٹائیں۔ وہ شخص اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بری طرح چل رہا تھا لیکن میری گرفت ایسی نہیں تھی کہ اس سے نجات حاصل کی جاسکتی۔

میرا دوسرا حریف جس کے چہرے پر فلاٹنگ کلک لگی تھی، اٹھ کر میری طرف لپکا اور اس نے میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی لیکن ان ٹھوکروں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو سکا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر دوسرا آدمی

دروازے کی طرف لپکا۔ وہ غالباً تین چار آدمی تھے جو فائرنگ کی آواز سن کر حویلی کے دوسرے حصے سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔

میرے دوسرے حریف نے چیخ کر ان سے کچھ کہا اور وہ سب کمرے میں ٹھس آئے۔ ان سب کے پاس اگرچہ رائفلس تھیں مگر ان میں سے کسی نے بھی رائفل استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ میرے جسم پر لائیں اور گھونسنے پر سامنے لگے۔ دو آدمی میرے بازو کی گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیکن مجھ پر بھی جنون طاری تھا۔ جیسے جیسے تشدد بڑھ رہا تھا، میرے جنون میں بھی شدت آ رہی تھی۔ میرے جسم کی ساری طاقت جیسے بازوؤں میں سمٹ کر آ رہی تھی۔ اس کی گردن پر میری گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کو زور زور سے جھٹکے بھی دینے شروع کر دیے تھے۔

ایک بات میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھے جان سے نہیں ماریں گے۔ یہ لوگ جو کوئی بھی تھے انہوں نے بڑی مشکل سے مجھے تلاش کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ اب تک آٹھ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ پانچ وہ پولیس والے جن کی حراست سے مجھے چھڑا گیا تھا اور تین سبائے ساتھی۔ سب ابھی موت و حیات کی نفس کشی میں جٹا تھا۔ ان لوگوں کے جرائم کی فہرست اس سے بھی کہیں زیادہ طویل ہو سکتی تھی۔ یہ لوگ دولت کے پجاری تھے۔ پانچ سو کلو ہیروئن کے پیچھے بہت بڑی دولت تھی۔ یہ لوگ مجھے اس وقت تک زندہ رکھنے کی کوشش کرتے جب تک انہیں امید کی کوئی معمولی سی کرن بھی دکھائی دیتی رہتی۔

میرے شکار کی مزاحمت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی گردن کو ایک دو مزید جھٹکے دیے اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھب سے نیچے گرا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ قیامت سے پہلے نہیں اٹھ سکے گا۔ اسے دوسرے ہی اٹھاؤں گے۔ دو جلاو اب بھی میرے جسم پر لائیں اور گھونسنے پر سامنے رہے تھے۔ دو آدمی اس شخص کو گھسیٹے ہوئے دور لے گئے تھے جس کی میں نے گردن موڑ دی تھی۔ میں نے اپنے اوپر حملہ کرنے والے ایک آدمی کو بازو سے پکڑ کر زوردار جھکا دیا۔ وہ جیتا ہوا اپنے سامنے سے ٹکرایا اور دوسری طرف گر گیا۔ اسی لمحے دروازے کی طرف سے ایک دھاڑی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے پرل۔ چھوڑ دو اسے۔ اگر یہ ختم ہو گیا

تو پاس تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“  
”اس نے ہری کیش کو مار دیا ہے۔ گردن توڑ دی ہے اس کی۔“ پرل نامی اس شخص نے بھی جیتنے ہوئے جواب دیا۔

”چھوڑ دو اسے۔ میں کہتا ہوں، چھوڑ دو۔“ دروازے میں کھڑا ہوا شخص ایک بار پھر دہرایا۔  
اسی مرتبہ اس کی دہاڑ کا رگڑ ثابت ہوئی اور مجھ پر لائیں اور گھونسنے پر سامنے ہو گئے۔ وہ چاروں الگ الگ ہٹے اور مجھ پر رائفلس تان لیں۔ ان میں سے دو تو بری طرح ہانپ رہے تھے۔

میں فرش پر اونڈھا پڑا تھا۔ میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ غلاموں نے بری طرح دھناتی کر ڈالی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اٹھ کر سیدھا ہو سکا تھا۔

دروازے میں وہی چوڑی دار پاجامے اور ہاف کورٹ والا نیپالی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی آٹومیک رائفل تھی۔ اس نے طائرانہ نگاہوں سے کمرے کی صورت حال کا جائزہ لیا اور دو آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں ہری کیش کی پاؤں اٹھا کر باہر لے جاؤ۔ اگر یہ واقعی مرچکا ہے تو اس کی لاش حویلی کے چھانک سے باہر لے جا کر جھاڑیوں میں ڈال دو اور اگر زندہ ہے تو۔“

”یہ مرچکا ہے۔“ ان دونوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی آنکھیں اور زبان بھی باہر نکلی ہوئی ہے۔“

”ٹھیک ہے لے جاؤ اسے اور وہ۔“ نیپالی نے بے حس و حرکت پڑے ہوئے سبائی کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ ابھی زندہ ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔  
”اوکے!“ نیپالی بولا۔ ”ہری کیش کی پاؤں اٹھا کر حویلی سے باہر لے جاؤ اور تم۔“ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ ”ہمارے ساتھ چلو۔ پاس تم سے ملنا چاہتا ہے۔ تم دونوں کی وجہ سے آج ہمارے دو آدمی کو ہو گئے ہیں لیکن ہمارے پاس آرمین کی کمی نہیں ہے۔ دیے پاس تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔“  
تم جیسے بہادروں کی قدر کرتا ہے۔ اگر تم نے تعاون کیا اور اس کی باتیں مان لیں تو تمہیں سے تمہیں اس سینڈیکٹ میں کوئی بڑا عمدہ مل جائے اور اگر تم نے بات نہ مانی اور بااں کے سامنے بھی بی بی رویہ اختیار کیا تو یقین کرو پاس تمہارا“  
”شر کرے گا کہ دنیا کانپ اٹھے گی۔“

”کیا کرے گا تمہارا پاس۔ مجھے مار ڈالے گا۔“  
موت سے نہیں ڈرتا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”موت نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پاس کے خیال میں کسی انسان کے لیے موت کوئی سزا نہیں ہے۔ موت سے تو کوئی (نبات) ہو جاتی ہے۔ کسی کو سزا دینے کے لیے پاس کے پاس بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً اس نے کچھ خوں خوار بھیج دیے ہیں۔ پال رکھے ہیں جنہیں عام طور پر بھوکا رکھا جاتا ہے۔ اگر کسی زندہ انسان کو بکری کی طرح کھونسنے سے باندھ کر وہ کھوے اور خوں خوار بھیج دیے اس پر چھوڑ دیے جائیں تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس شخص کا انجام کیا ہو گا۔ مرنا تو اسے بہر حال ہو گا لیکن موت سے پہلے اس پر جو جیتے کی کیا تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو؟“

میں کانپ کر رہ گیا۔ سبائے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس سے جانت ہو گیا تھا کہ یہ دنیا کے سفاک ترین انسان تھے۔ ایک شخص کو اذیت پہنچانے کے لیے اس کے ہم پر تیز دھار آٹے سے چرے لگائے گئے۔ اس کے ناخن ادمیرے گئے اور اب یہ مجھے بھوکے، خوں خوار بھیجیوں کے سامنے ڈالنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

پرل اور دو سرا آدمی اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ انسان کی ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ وہ ان کا ساتھی تھا۔ ان کے لیے لڑنا تھا۔ رہا اور انہی کے لیے میرے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اس کی لاش اس طرح باہر پھونکائی جا رہی تھی جیسے وہ انسان نہیں تھا۔

”چلو۔“ اس نیپالی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اب اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

میں نے فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے سبائی کی طرف دیکھا۔ ایک آدمی نے زمین پر بڑی ہوئی مضطرب اٹھا کر دوبارہ دوایر میں لگے ہوئے بک میں پھنسا دی تھی۔ مضطرب کی لرزتی ہوئی دھمکی میں سب کا خون آلود چہرہ بہت بے امید لگ رہا تھا۔ ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ ایک آدمی نے دروازہ بند کر کے اس میں کھٹک لگا دیا تھا۔ دروازہ پر اپنی طرز کا بہت عجیبی طرح کی طرف اس کے دونوں پنوں میں دو ٹکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور تقریباً چار انچ موٹی ایک اور ٹکڑی ان میں اس طرح پھنسا دی گئی تھی کہ اسے ہٹانے بغیر اندر سے دروازہ نہیں کھولا جاسکتا تھا۔

حویلی کی اصل عمارت وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ وہ لوگ مجھے رائفلس کی زد میں لے لیے اس طرف چلتے رہے۔ اندر گرا ہوا گیا تھا۔ دو تین بجوں پر مجھے پتھروں سے ٹھوکر

لگی تھی اور ایک مرتبہ تو میں گرے کرتے بچا تھا۔ حویلی کی عمارت کے بیشتر حصے اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے لیکن اس کے صاف نیچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ بہت شان دار عمارت رہی ہوگی۔ سامنے کے رخ پر ایک کشادہ پر آمدہ تھاجس کے سامنے ایک کھلی چھت والی چپ اور دو دیگر شان دار گارڈیاں کھڑی تھیں۔ ہم کئی عمارت کے اندر جبکہ جبکہ مضطرب روشن تھیں۔ ہم کئی راہروں میں سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

یہ کمرہ کم سے کم تین فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ چاروں دیواروں پر دو دو مضطرب روشن تھیں اور کچھ ایسی چیزیں نظر آ رہی تھیں جو اذیت رسائی میں استعمال ہوتی تھیں۔ چھت پر کھڑے لگے ہوئے تھے جن کے ساتھ لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جب یہ حویلی آباد تھی تو یہ کمرہ عقوت خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا اور اب بھی اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔

ایک طرف چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز بڑی تھی۔ میز پر بھی اذیت رسائی کے کچھ آلات پڑے ہوئے تھے۔ مجھے ایک اسٹول پر بیٹھا دیا گیا۔ دو آدمی مجھ پر رائفلس تانے کھڑے رہے جبکہ نیپالی ایک اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے اور ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ ناگ پال تھا۔  
دوسرا چہ میرے لیے انجینی تھا۔ وہ دونوں میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ناگ پال کو اب تک صرف اخبار میں شائع ہونے والی تصویروں میں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ دور سے دیکھنے کا موقع ملا تھا یا پھر انڈیا میں، میں نے بال ٹھاکرے کو بھی کئی مرتبہ نی دی دیکھا تھا۔ ناگ پال اور بال ٹھاکرے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ نہ کرداروں میں نہ جسامت میں اور نہ لباس میں۔ ایک لمحے کو تو میرے ذہن میں یہ شبہ بھی ابھرا تھا کہ یہ کہیں بال ٹھاکرے تو نہیں۔

ناگ پال کو اپنے سامنے دیکھ کر ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ یہ کوئی تھڑ پائی نہیں تھی جس نے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا۔  
”تمہارے بارے میں سنا تو بہت کچھ تھا لیکن مجھے یقین

نہیں آتا تھا۔" ناگ بال میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک تھی "لیکن تم نے جو کچھ بھی کیا وہ میرے لیے واقعی حیرت انگیز ہے۔ لوگ تو ناگ بال کے راستے میں آتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ اس کا نام سن کر تھر تھر کاہنے لگتے ہیں اور تم؟" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اور تم نے نہ صرف ناگ بال کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا بلکہ پانچ سو گلو ہیروئن بھی لے گئے۔ اسے کہتے ہیں شیر کے منہ سے نوالہ چہیننا۔ کوئی ذی ہوش انسان ایسا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن تم نے یہ سب کچھ کر دکھایا۔ بہت بہادری کا ثبوت دیا ہے تم نے۔ تم بہت بڑے سورا ہو اور ناگ بال کو ہمیشہ ایسے سوراؤں کی تلاش رہی ہے جو موت سے بچہ آزمائی کرنا جانتے ہوں اور ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے میرے ایک آدمی کی گردن بھی موڑ دی ہے۔ اس قید خانے میں آکر تو بڑے بڑے سوراؤں کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے لیکن تم نے نہ صرف اپنے حواس برقرار رکھے بلکہ تم میں اب بھی اتنا ہی دم خم ہے۔"

"مطلب کی بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"چانگ لی نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن میں اس کی باتوں کا یقین کرتے ہوئے ہٹکیا رہا تھا۔" ناگ بال نے کہا "ہنگام میں ٹانگیر اور پیڈرو کے ٹینگ کو جڑ سے اٹھاڑ بیٹینا، تھائی لینڈ سے جہاز کھوراث کے قدم اکھاڑ دینا اور گولڈن ٹرائی اگلش میں ٹھس کر تباہی پھیلانا اور زندہ بچ نکلنا۔ یہ کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا لیکن اب یہاں جو کچھ ہوا ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے چانگ لی کی باتوں پر یقین کرنا ہی پڑے گا۔ ناگ بال کے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر پانچ سو گلو ہیروئن چھین لے جانا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کوئی بہت بڑا ٹینگ بھی یہ کام نہیں کر سکتا لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کارنامہ تم نے ایک ہی انجام دیا ہے۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ میرے آدمیوں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا اس پر مجھے افسوس ہے۔ میں ایک چیکنش تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اسے قبول کر لو تو تمہیں سینڈ کیٹ میں ایک بڑا عمدہ مل سکتا ہے۔"

میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس غصوت خانے میں لاکر سینڈ کیٹ میں کسی بڑے عمدے کی چیکنش کا مطلب میں سمجھتا تھا۔ انکار کی صورت میں

افزیت رسائی کے یہ تمام آلات شاید مجھ پر آزمائے جاتے۔ "میں نے تمہاری تمام باتیں سن لی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لیجے میں جواب دیا "چانگ لی نے میرے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے لیکن یہاں توگ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ یہاں میرا کسی ایسے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔" "کیا یہ غلط ہے کہ تم دیش کھ کا پتہ چھارتے ہوئے انڈیا سے یہاں آئے تھے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی تردید نہیں کروں گا۔" میں نے جواب دیا "وہ میری ایک دوست کو اغوا کر کے لایا تھا۔ یہاں میں نے اپنی دوست کو اس کے گھنے سے جھڑا دیا اور وہ بعد میں تمہارے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میرا اور دیش کھ کا معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ انڈیا کے ایک مفور پولیس انسپکٹر پانڈے سے تمہارے گھرے رابطے تھے اور تم چند روز اس کی حویلی میں رہے بھی ہو؟" ناگ بال نے کہا۔

"پانڈے سے میری ملاقات اتفاقاً طور پر ہو گئی تھی۔" میں نے کہا "وہ ایک شریف اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی اور وہ ہندوستان سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔ یہاں اس سے میری ملاقات محض اتفاقاً تھی۔ اس کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"سومبا سے بھی تمہارے گھرے تعلقات ہیں۔" ناگ بال نے کہا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ "سومبا ایک سڑک چھاپ ڈنڈا تھا۔ اسے میں جب چاہتا چھمکری طرح چنگی میں مسل سٹکا تھا لیکن تم نے اسے بہت بڑا دواوا سمجھ لیا اور۔"

"سومبا ایک شریف آدمی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اگر تمہارا اس سے کوئی بھگڑا ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے تو اسے غنڈوں سے بچانے کے لیے اس کی مدد کی تھی۔"

"میں بات صرف یہیں تک نہیں ہے۔" ناگ بال بولا "تم نے اس کے ساتھ اور بھی بہت سے منصوبے بنائے تھے اور تمہیں یہ اطلاع بھی سومبا ہی نے دی تھی کہ ہمارے آدمی پانچ سو گلو ہیروئن لے کر آرہے ہیں۔"

ناگ بال کی اس بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا لیکن چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ "جب مجھے اپنے آدمیوں کے قتل اور ہیروئن کے چھینے جانے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلے میں نے سومبا ہی کو پکڑا تھا۔ مرنے سے پہلے اسے یہ اگنا ہی پڑا تھا کہ اس نے تمہیں ہیروئن کے بارے میں بتایا تھا۔ تمہاری تلاش شروع ہوئی تو پتا چلا کہ اس واقعے سے ایک روز پہلے تمہیں پکھار کر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مزید تحقیق پر دھڑپن میں بھی تمہیں دیکھے جانے کی اطلاع ملی۔ اس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا جس نے ہمارے آدمیوں کو قتل کر کے پانچ سو گلو ہیروئن غائب کر دی تھی۔"

وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا اس کی ہر بات میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ مجھے یہ جان کر بھی بہت دکھ ہوا کہ سومبا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ان خوں خوار ہیروئنوں نے اسے بھی ختم کر دیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دھڑپن میں تمہاری موجودگی کا ثبوت ملنے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم جاوا کوٹ سے ہوتے ہوئے دریائے بھیرے کے ساتھ ساتھ راکل بیٹش پارک یا اس کے قریب نیپال گاؤں سے ہوتے ہوئے کسی جگہ سے انڈیا کی سرحد پار کرنے کی کوشش کرو گے۔ ہم نے زیادہ توجہ اس طرف دی اور تمام سرحدی راستوں پر پہرے بٹھا دیے لیکن کئی روز گزرنے کے بعد بھی تمہارا سراغ نہیں ملا۔"

"پھر ہمیں یہ دلچسپ اطلاع ملی کہ یوگندر ناتھ اور تری دیو کو بھی پوٹا ریج کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ دونوں مہاراجی آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے مال پر ہی چھینے رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد ہم نے پوٹا ریج کی طرف توجہ دی اور ان بلند پہاڑوں میں آباد بیٹیوں میں پوچھتے ہوئے تارنگ قبیلے تک پہنچ گئے اور وہاں سے پتا چلا کہ تم وہاں سے نکل چکے ہو۔"

"ہمیں تمہاری دوست بدلا اور یوگندر ناتھ اور تری دیو کی موت کی بھی خبر مل گئی اور اس قبیلے سے نکلنے کے دوسرے ہی دن تارنگ قبیلے کا ایک آدمی مل گیا جسے تمہاری تلاش کے سلسلے میں میرے آدمی ساتھ لے گئے اور پھر میرے آدمی دھول گری کے بلند اور دشوار ترین پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے پکھار انک آ گئے۔"

"پکھار انک پتہ کے اگلے روز میرے آدمیوں کو پتا چل

گیا کہ تمہارا قافلہ صبح سویرے ہی وہاں سے جنوب کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ میرے آدمیوں نے سہ پہر کے قریب دریائے موڈی کھولا کے کنارے اس قافلے کو جالیا مگر تم اس قافلے میں نہیں تھے۔"

"تارنگ قبیلے سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ بڑے سخت جان ثابت ہوئے۔ سین افراد نے اپنی جائیں دے دیں مگر تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرے آدمی اس قافلے کے چوتھے آدمی کو لے کر پکھار آ گئے جہاں انہوں نے یہ معلوم کر لیا کہ اس قافلے کو جنوب کی طرف روانہ کرنے کے بعد تم بھی ایک بس پر سوار ہو کر ٹھنڈی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ہم نے فوراً ہی کیرنی پور میں راستے کی ناکا بندی کر دی لیکن ہمیں پتا چلا کہ ایک بدھ یوگی تمہیں بس سے اتار کر لے گیا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ یوگی کون تھا اور تم سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ہم نے تمہاری تلاش جاری رکھی اور پھر یہ پتا چلا کہ تم ہزار میں ایک عورت کو قتل کرنے کے الزام میں رتے ہاتھوں پکڑے گئے ہو اور جب پولیس والے تمہیں تھانے لے جا رہے تھے تو ہمارے آدمیوں نے تمہیں پولیس کی حراست سے چھڑا لیا اور اب۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں "میں نے ابھی تک تم سے اس ہیروئن کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تاہم تمہیں ایک پرنش چیکنش کر رہا ہوں۔ اگر تم وہ ہیروئن ہمارے حوالے کر دو تو ہم اس کا چوتھائی حصہ تمہیں دینے کو تیار ہیں۔ تم چاہو تو اپنے حصے کی ہیروئن رکھ کر باقی ہمارے حوالے کر دو اور جہاں چاہو جاسکتے ہو۔ ہم تمہارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کریں گے اور چاہو تو اپنے حصے کی قیمت لے سکتے ہو۔ نقد۔ اسی وقت۔ میرے آدمی تمہیں بحفاظت تمہاری منزل تک پہنچا دیں گے۔"

ساری باتیں کھل کر سامنے آ گئی تھیں۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور میں جانتا تھا کہ سچ بول کر بھی میری جان چھوٹنے والی نہیں تھی کیونکہ اس ہیروئن کا ثواب کوئی وجود ہی نہیں رہا تھا۔

"میں تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گا۔" میں نے کہا "یہ بالکل درست ہے کہ تمہارے آدمیوں کو موت کے گھاٹ میں نے ہی اتارا تھا اور ہیروئن بھی میں ہی لے گیا تھا لیکن اس ہیروئن کا اب کوئی وجود نہیں رہا۔ میری کاروبار میں گر گئی تھی اور ساری ہیروئن پانی میں بہہ گئی۔"

”اگر اس بیرون کا وجود نہیں رہا تو تمہارا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔“ ناگ پال نے کہا۔ اپنے زمانے کے لوگ تشدد کے بہت سے طریقے جانتے تھے۔ آج کے دور میں کسی کی زبان کھلوانے کے لیے اگرچہ نئے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں لیکن میرے خیال میں پرانے طریقے اب بھی ان سے زیادہ موثر ہیں۔ یہ چیزیں دیکھ رہے ہو؟“ اس نے کمرے میں مختلف چیزوں کی طرف اشارہ کیا ”یہ کھوکھٹا کی حویلی ہے کھوکھٹا اس علاقے کا راجا تھا۔ اسے دنیا کا سفاک ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنے دشمنوں کو ایذا رسانی کے لیے ایسے طریقے ایجاد کیے تھے کہ اس کی عقل اور ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کا یہ حقیرت خانہ ہی دراصل اس کے راج کی کاسیائی کی شانیت بنا ہوا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، بڑے دبدبے سے راج کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد بیٹے نے شکشا سن سنبھالا۔ وہ ایک نرم دل اور شریف آدمی تھا۔ اس کے باپ کے دشمنوں نے اسے ایک مینے سے زیادہ راج نہیں کر سنبھالا اور اس کی لاش کے ٹکڑے پوری وادی میں پھیلا دیے۔ اس دنیا میں شریف لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں صرف طاقت کے زور پر زندہ رہا جاسکتا ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا ”میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔ میں تمہیں صرف تین منٹ دے رہا ہوں۔ اگر تمہیں میری پیشکش قبول ہو تو ٹھیک ہے۔ دوسری صورت میں۔“

”میں نے کہا تھا، وہ بیرون ضائع ہو چکی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”اس لیے اس موضوع پر بحث بیکار ہے۔ تم اپنی جو کارروائی کرنا چاہتے ہو کرو۔“

”نیکو۔“ ناگ پال نے چوڑی داریاں کھولیں اور ہاف کوٹ والے شخص کی طرف دیکھا ”وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ اس سے معلوم کرو بیرون کہاں ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اسے اس وقت تک نہیں مرنے چاہیے جب تک یہ کچھ بتا نہ دے۔“

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ کالا اس کے پاس کیسے پہنچی تھی! گزرے ہوئے واقعات میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ نقاب پوشوں نے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے بعد مجھے اپنی جیب میں پھینک دیا تھا اور ایک نقاب پوش نے میرے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں کسی نقاب پوش کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اب مجھے یقین کر لینا پڑا کہ نیکو بھی ان میں شامل تھا۔ ممکن ہے جیب کے سفر کے دوران میں ہی اس کی نظر میرے گلے میں پڑی ہوئی کالا پر پڑ گئی ہو یا جب مجھے حویلی کے قید خانے میں ڈالا گیا تھا تو یہ کالا اس وقت نیکو کی نظروں میں آئی ہو اور اس نے کالا میرے گلے سے اتار کر اپنے گلے میں پہن لی اور وہ یقیناً اس کالا کی اہمیت سے واقف نہیں تھا۔

”اب ساری کمائی تمہارے سامنے آچکی ہے۔ تم سب کو۔“ نیکو میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”تم یہ بھی جان چکے ہو کہ انسانی زندگی کی ہمارے نزدیک ایک اہمیت نہیں ہے۔ ہم صرف اور صرف دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ اگر تم شرافت سے وہ پانچ سو کو بیرون ہمارے حوالے کر دو تو فائدے میں رہو گے۔ بصورت دیگر میں تمہارے سر (بدن) کی بیرون بنا دوں گا۔“ بات کرتے ہوئے وہ غالباً غیر ارادی طور پر گلے میں پڑی ہوئی کالا کو بھی چھو رہا تھا اور پھر اس نے وہ کالا بھی گلے سے اتار کر میز پر ٹوپی کے قریب رکھ دی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم لوگ میری کسی بات کا یقین نہیں کرو گے۔“ میں نے جواب دیا ”اس لیے جو بھی کارروائی کرنا چاہتے ہو شروع کرو۔“

نیکو چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس نے میرے چہرے پر ہگوسٹا مارنے کے لیے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ نیکو کے چہرے پر عجیب سے اثرات ابھر آئے وہ کلائی چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی حرکت میں آیا لیکن وہ ہاتھ بھی میری گرفت میں آ گیا۔

میں اس وقت تک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نیکو اپنے بازو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے اسے پیچھے وھلچلے ہوئے دونوں ہاتھ جھونے دیے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور اسی لمحے اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا لیکن ان کا یہ حملہ

اس قدر اچانک تھا کہ میں اپنے آپ کو بچا نہیں سکا۔ ان دونوں نے مجھے ہانپوں سے گرفت میں لیا۔ نیکو سنبھل کر تیزی سے میری طرف لپکا۔ پہلے اس نے سر سے میرے سینے پر ٹکرایا اور پھر میرے پیٹ پر کھونے پر سارے لگا۔ مجھے پون کچھ میرے پیٹ پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔ میں تکلیف کی شدت سے ہلکا اٹھا۔ میرے دماغ کو اچانک ہی ایک جھٹکا سا لگا اور میں اپنے اندر واضح طور پر ایک تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ میرا پیٹ پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا اور نیکو کے کھونے اب مجھ پر کوئی اثر نہیں کر رہے تھے۔

نیکو ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے پیچ کر کچھ کہا اور وہ دونوں آدمی مجھے ہانپوں سے پکڑ کر پوری قوت سے سمجھتے ہوئے آگے لے چلے۔ وہ میرا سر دیوار سے ٹکراتا چاہتے تھے۔

مجھے ہی وہ دیوار کے قریب پہنچے۔ میں نے اپنا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا اور دونوں پھر آگے نکل کر دیوار پر ٹکڑے اور پوری قوت سے دیوار کو کھینچنے ہوئے الٹی تلا بازی کھا گیا۔

میں ان کی گرفت سے نکل گیا۔ وہ دونوں بدحواس سے ہو گئے۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے ان دونوں کے بال پکڑ کر سرائیک دوسرے سے ٹکرا دیے۔ ایک تو چھٹا ہوا نیچے گرا۔ دوسرے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اسے زوردار سائیڈ لکک رسید کر دی۔ وہ بھی ہلکاتا ہوا اپنے ساتھی کے اوپر گرا۔ کنگ لگانے کے بعد میرا جیس اس جگہ پڑا جہاں فرش ٹوٹا ہوا تھا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی نیکو نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

نیکو مجھے بری طرح رگید رہا تھا لیکن مجھے موقع مل گیا اور میں نے اسے پیروں پر اچھال دیا۔ اس وقت اس کے دونوں ساتھی میری طرف لپکے تھے۔ نیکو ان کے اوپر گرا اور وہ تینوں ڈھیر ہو گئے۔

میں نے اٹھ کر میز کی طرف چھلانگ لگا دی۔ نیکو کے ایک ساتھی نے میری ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔ میں منہ کے بل گرا لیکن میں اٹھ کر ایک بار پھر میز کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ نیکو میرے آڑے آ رہا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نیکو کا ایک ساتھی اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا تاکہ مجھے اس کمرے سے باہر نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔ نیکو بھی میرے سامنے بائیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن میں دروازے کا رخ

کرنے کے بجائے اچھل کر میز کے قریب پہنچ گیا اور ٹوپی کے قریب پڑی ہوئی نیلگی کی کالا اٹھا کر اپنے گلے میں پہن لی۔ کالا میرے گلے میں آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر ایک نئی توانائی بھرنی ہو۔ اس کے ساتھ ہی نیلگی کی سرگوشی میری ساعت سے ٹکرائی۔

”تمہیں کتنی بار سمجھانا پڑے گا کہ تمہارے اندر بھی ایک مہمان شہتی موجود ہے۔ تم اس سے کام لینا کیوں بھول جاتے ہو۔ اس وقت اگر میں تمہارے اندر اس شہتی کو نہ ابھارتا تو یہ لوگ تمہارا بھرتا بنا دیتے لیکن اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان کی تھوڑی بہت مرمت کر دو اور اپنے دوست کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ مالا کی حفاظت کرنا۔ گوتم بھوش اور سادھو میرا بی بی الحال رشی کیش واپس چلے گئے ہیں لیکن وہ اس کالا کو حاصل کرنے کے لیے تم پر دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔ اس وقت تمہیں محتاط رہنا ہو گا۔“

میرے کان میں شدید کیچھوں کی جھنجانا بہت ستور سنانی دے رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے سببا والے کمرے میں میری دھناتی ہوئی تھی۔ میرے جسم کا جوڑو ڈھک رہا تھا لیکن اب اچانک ہی میرے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے ان تینوں کو اٹھا کر رخ ہٹا دیا۔ کالا میرے گلے میں آجائے کے بعد گویا مجھے ایک نئی شہتی مل گئی تھی۔

نیلگی نے ٹھیک کہا تھا کہ میں اپنے اندر کی شہتی سے کام لینا بھول جاتا ہوں۔ دیے میں اپنے اندر ”چی“ کی قوت سے بے خبر نہیں تھا۔ اس شہتی سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے تھے لیکن میں نے پہلے ہی روز فیصلہ کیا تھا کہ اس شہتی سے اس وقت کام لوں گا جب اس کی ضرورت ناگزیر ہوگی۔ اپنی حفاظت کے لیے میں نے ہمیشہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کیا تھا۔

نیکو اور اس کے دونوں ساتھی حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں مجھے موقع ملنے ہی یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن میں نے میز پر پڑی ہوئی کالا اٹھا کر گلے میں پہن لی تھی اور بڑے اطمینان سے وہاں کھڑا تھا۔

نیکو نے پیچ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا اور وہ دونوں میری طرف لپکے۔ میں نے بڑی پھرتی سے میز اٹھا کر ان پر بڑے ماری۔ میز خاصی وزن کی تھی۔ ایک کا سر پھٹ گیا۔ وہ چھٹا ہوا ایک طرف گر گیا۔ دوسرا میز کے نیچے دب گیا تھا۔

نیلگی کی آنکھیں وحشت سی پھیلتی چلی گئیں۔ اس نے لپک کر زمین پر پڑی ہوئی ایک رات نکل اٹھائی۔ میں چند لمحوں کے فاصلے پر اس کے سامنے تھا۔ ہمارے درمیان کوئی آڑ نہیں

تھی۔ ٹیکو نے زبردیا دیا۔ ٹھیک اسی لمحے اس کے ہاتھ کو جھکا لگا۔ رائفل کی نال اوپر کی طرف اٹھ گئی اور لاتعداد گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ٹیکو کی انگلی اس وقت تک زبردیا سے نہیں ہٹی تھی جب تک میگزین خالی نہیں ہو گیا تھا۔ وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے جھپٹ کر ٹیکو سے رائفل چھین لی اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر لٹھ کی طرح کھڑا کیا۔ رائفل کے بٹ کی ضرب ٹیکو کے گھٹنے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ایک سامی قریب آیا تو وہ بھی رائفل کی زد میں آیا۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی۔ تیسرا آدمی اٹھ کر چیخا ہوا اندرونی دروازے کی طرف دوڑا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اس دروازے کی دوسری طرف ایک کشادہ اور طویل راہداری تھی جس سے اور بھی راہداریاں دائیں بائیں کو نکلتی تھیں۔ وہ شخص مدد کے لیے چیخا ہوا ایک اور راہداری میں مڑ کر غائب ہو گیا۔ میں اس کی چیخوں اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازوں کے سہارے اس کا پیچھا کرتا رہا لیکن وہ راہداریوں کی ان بھول بھلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

میں جیسے ہی ایک راہداری میں مڑا، ٹھنک کر رک گیا۔ سامنے ہی ناگ پال اور اس کے ساتھ وہ آدمی کھڑا تھا جو اس کے ساتھ عقیدت گاہ میں آیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالتھ تھے اسی دوران میں وہ آدمی بھی ایک دروازے سے برآمد ہوا جو چیخا ہوا عقیدت خانے سے بھاگا تھا۔ وہ اس وقت بھی چیخ کر ناگ پال سے کچھ کہہ رہا تھا۔

”رائفل پیچنک دوہمت سنگھ اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم میاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔“ ناگ پال نے چیخ کر کہا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ رائفل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔

”یہ تمہاری بھول ہے ناگ پال۔“ میں نے جواب دیا

”اپنے آدمیوں کا حشر تم نے کیا کیا۔ تم لوگ میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنے آپ کو سریندر کر دو۔“

”میں سریندر کر دوں؟“ ناگ پال غرایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے زبردیا دیا۔

میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا بکھر گئی لیکن موتی زمین پر مرنے کے بجائے میرے جسم کے مختلف حصوں پر چپک گئے۔ ناگ پال اور اس کا سامی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے اور گولیاں میرے جسم پر انہی جگہوں پر لگ رہی تھیں جہاں

جہاں مالا کے پتھر چپکے ہوئے تھے۔

ناگ پال کا سامی تو خوف زدہ انداز میں چیخا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا اور ناگ پال اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا وحشت زدہ انداز میں میری طرف دیکھتا رہ گیا۔

میں نے رائفل کو لٹھ کی طرح کھڑا کر اس کے پہلو میں ایک زوردار ضرب رسید کر دی۔ ناگ پال بلبلاتا ہوا گر ا اور پس نے بھی ایک طرف دوڑ لگا دی۔

کئی راہداریوں میں پھرانے کے بعد میں اس عمارت کی پچھلی طرف آیا۔ اس طرف جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور گہری تاریکی تھی۔ میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا اور بالآخر قید خانے والے بلاک کی طرف آیا۔ اس بلاک کے اوپر سے محکمہ کر سامنے کی طرف آتے ہوئے میں نے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔

سبا والی کو غصی کا دروازہ کھولنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر مشعل جل رہی تھی۔ میں دوڑ کر سبا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا اور گردن آگود فرس پر پشت کے بل پڑا ویران سی نظروں سے بھرت ہو چکا تھا۔

”کیسے ہو سبا۔ کیا تم اٹھ سکتے ہو؟“ میں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھنے سے کہا۔

سبا کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آئی۔

”مم مجھے چھوڑ دو بہت سنگھ۔ تھ۔ تم بھاگ جاؤ۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“ میں نے کہا اور مزید جھک کر اسے ہاتھوں پر اٹھایا اور دروازے کی طرف لپکا۔

جولی کی عمارت کی پچھلی طرف شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ناگ پال اور اس کے آدمی مجھے اس طرف تلاش کر رہے تھے۔ میں نے جولی کے برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی جہاں ایک چپ اور دو کاربن کھڑی تھیں۔

اصلی طور پر مجھے اس علاقے سے دور ہی رہنا چاہیے تھا لیکن میں برآمدے کی طرف جا کر بہت بڑا رسک لے رہا تھا اور یہ رسک لیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس پر اسرار جولی اور اس علاقے سے نکلنے کے لیے مجھے سواری کی ضرورت تھی اور برآمدے کے سامنے تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔

میں دوڑتا ہوا سب سے قریب والی سیاہ لینڈ کروزر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ لینڈ کروزر دیکھ کر طرح کشادہ ہوئی اور اس کے دروازے بھی لاک نہیں تھے۔ میں نے بڑی آہستگی سے

بھلا دروازہ کھول کر سبا کو سیٹ پر لٹا دیا اور تیزی سے محکمہ کڑ آگے والے دروازے سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ٹوٹلے لگا۔

تین میں چالی گئی ہوئی تھی۔

میں چالی کھانا ہی چاہتا تھا کہ برآمدے کی طرف سے ناگ پال کی چیخیں سنائی دی۔

میں نے بندی خانے کی طرف دیکھ کر جانے نہ پائے۔

میرا ہاتھ رک گیا اور میں برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔

دو انسانی ہولے برآمدے میں کھڑے تھے ان میں سے ایک برآمدے سے اتر کر قید خانے کی طرف دوڑ گیا جبکہ دوسرا برآمدے ہی میں کھڑا رہ گیا۔ وہ یقیناً ناگ پال تھا۔

دو منٹ بعد قید خانے کی طرف سے اپنے آدمی کے چپنے کی آواز سن کر ناگ پال بھی برآمدے سے نکل کر اس طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جیسے ہی نگاہوں سے اوٹ چلے گئے انہیں نے ان کیٹن کی گھادی اور ریورس میگزین میں ڈال کر گاڑی کو پیچھے لے جانے لگا۔

”وہ بھاگ رہا ہے۔ گولی مار دو۔ روکو اسے۔“

یہ ناگ پال کے چپنے کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ شروع ہو گئی۔

میرے کانوں میں کھینوں کی جھنجھاہٹ سی سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور نیلکی کی مالا مجھے اپنے گلے میں جھولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نیلکی اب تک میری حفاظت کے لیے موجود تھی لیکن اب وہ جا چکی تھی۔ اس کی وجہ سے میں ایک بہت بڑی مصیبت سے نکل تو آیا تھا لیکن ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوا تھا۔ میں لینڈ کروزر کو تیز رفتار سے پیچھے لیتا چلا گیا۔

اسی وقت دو اور انسانی ہولے برآمدے میں نمودار ہوئے اور ان کی رائفلیں شعلے اگلنے لگیں۔ ایک گولی ونڈ اسکرین کے مین وسط میں لگی اور شیش توڑتی ہوئی پچھلی اسکرین میں سوراخ غرنی ہوئی نکل گئی۔

میں نے لینڈ کروزر کو روکا اور میگزین بدل کر ایکسپلوزیو رینجر پر کاڑھا ڈال دیا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیرنگ پر ہاتھیں رکھ کر بھاگنے لگا۔ گاڑی کا رخ اب جولی کے بھانکے کی طرف تھا جو کھلا ہوا تھا۔ میں نے ہیڈلائٹس بھی آن کر دیں اور رفتار بڑھا کر چلا گیا۔ عقب سے گولیاں برس رہی تھیں۔

میں دوڑتا ہوا سب سے قریب والی سیاہ لینڈ کروزر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ لینڈ کروزر دیکھ کر طرح کشادہ ہوئی اور اس کے دروازے بھی لاک نہیں تھے۔ میں نے بڑی آہستگی سے

نیل ٹیک بھی محفوظ ہی رہا تھا۔

بھانکے سے نکلنے ہی تک سا پتھرا راستہ تھا جو ڈھلان کی طرف چلا گیا تھا۔ گاڑی طوفانی رفتار سے اس ڈھلان پر دوڑ رہی تھی اور میرے ہاتھ سختی سے اسٹیرنگ پر تھے ہوئے تھے۔

غیب میں یہ سڑک کافی دور تک سیدھی چلی گئی تھی۔ میں نے ابھی زیادہ فاصلے نہیں کیا تھا کہ سامنے لگے ہوئے آئینے میں روشنی کی چمک دیکھ کر جھک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی تھی اور آئینے میں نظر آنے والی چمک اسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کی تھی۔

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ غیب ختم ہو گیا تھا اور اب سامنے چڑھائی تھی جو تقریباً دو سو گز کی بلندی تک چلی گئی تھی۔ چڑھائی کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑی سے فائرنگ شروع کر دی گئی۔

چڑھائی کے اختتام پر ایک مسطح میدان سا تھا اور کچھ آگے جا کر وہ پتھرا راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک راستہ سیدھا چلا گیا تھا اور دوسرا دائیں طرف کچھ آگے جا کر چٹانوں میں داخل ہو جاتا تھا۔ میں نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔

کسی زمانے میں یہ راستہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتے ہوں گے لیکن ظاہر ہے اس زمانے میں کاریں نہیں ہوں گی کہ ان راستوں کو پختہ سڑکوں کی طرح ہموار بنانے کی ضرورت پیش آتی۔ پتھر لے راستے پر گاڑی کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے اور مجھے سبکی پریشانی تھی۔

”سبا۔ تم ٹھیک ہونا؟“ میں نے پیچھے گردن گھما کر چپنے ہوئے پوچھا۔ جواب میں سبا کی صرف کراہیں سنائی دی تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ تھا۔

وہ راستہ آگے جا کر چٹانوں میں داخل ہو گیا تھا اور ان چٹانوں میں کئی سمتوں میں راستے نکلنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اصل راستہ کون سا ہے۔ جو راستہ ذرا کشادہ نظر آتا ہے گاڑی کو اس طرف گھما دیتا۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ جس راستے پر میں جا رہا ہوں وہ آگے جا کر بند نہ ہو جائے یا چاکا ہی کوئی ایسا کھنڈ نہ آجائے جس میں گر کر گاڑی کے ساتھ ہمارے بھی پرچے اڑ جائیں۔

میں تقریباً دو گھنٹوں تک پہاڑوں میں اونچے نیچے اور غیر ہموار راستوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ کئی مقامات پر میں حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں

کس طرف جا رہا ہوں اور یہ اجنبی راستے مجھے کس طرف لے جائیں گے میں کسی آبادی تک پہنچ پاؤں گا یا انہی پہاڑوں میں جھٹکتا رہوں گا۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ گاڑی کا انجن پتھو لے لینے لگا۔ میری نظریں بے اختیار رفیول بتانے والے ڈائل کی طرف اٹھ گئیں اور میں کاپ کر رہ گیا۔ سوئی زیر و پر ساکت ہو چکی تھی۔ ٹینک میں پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ گاڑی اس وقت ڈھلان پر جاری تھی۔ میں نے انجن بند کر دیا۔ یہ ڈھلان کافی دور تک چلی گئی تھی۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی خود بخود رک گئی۔ اتفاق سے جس جگہ گاڑی رک گئی وہاں سامنے ہی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کچھ بلندی سے گرہا ہوا پانی کا جھریا دکھائی دے رہا تھا۔

میں چند لمبے سیٹ پر بیٹھا رہا اور پھر نیچے اتر کر موحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ جگہ آبادی سے نہجانے کتنی دور تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو کسی نہ کسی طرف جا سکتا تھا لیکن میرے ساتھ سبھا تھا جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے لیے چلنا تو کیا اپنے پیروں پر کھڑے ہونا بھی مشکل تھا۔

میں کچھ دیر تک کھڑا اور انے میں چاروں طرف دیکھتا رہا پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر سبھا پر جھک گیا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ میں نے گاڑی کی پھت کی جی جلا دی۔

سبھا کے چہرے پر زردی کھڑ رہی تھی۔ ہونٹوں پر پتھریاں سی جی ہوئی تھیں۔

”کیسے ہو سبھا؟“ میں نے پوچھا۔

سبھا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے پتھریوں زدہ ہونٹوں پر پھٹکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”میرے لیے تم نے بلا وجہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ مجھے چھوڑ دو اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو۔“ اس نے رک رک کر جواب دیا۔

”میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں سبھا۔“ میں نے کہا ”تم ان درندوں کی پہنچ سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ اب وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمیں دن طلوع ہونے تک یہیں رہنا پڑے گا تاکہ پتا چل سکے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ مجھے صرف تمہاری پریشانی ہے۔ تمہیں جلد سے جلد طبی امداد ملنا بہت ضروری ہے۔“

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ان پہاڑوں میں طبی امداد کہاں۔ میرے پیچھے کی کوئی امید

نہیں۔“ سبھا نے کہا۔

”میں نے اپوس ہونا نہیں سیکھا سبھا۔“ میں نے کہا ”مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور مل جائے گا۔“ ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے پانی لے کر آتا ہوں۔ مجھے بھی پاس لگ رہی ہے۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور آخری سیٹ کی پچھلی طرف جہاں ڈکی کے طور پر استعمال ہونے والی تھوڑی سی جگہ تھی، کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس میں پانی لایا جاسکے اور پھر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس جگہ کچھ اور چیزوں کے علاوہ پٹرول کے دو کین بھی پڑے ہوئے تھے اور دونوں میر بند تھے۔ وہ قدیم حویل بھی کسی آبادی سے یقیناً بہت دور تھی۔ انہوں نے اس طرف آمدورفت کے لیے فاضل پٹرول کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ ایک فاضل ٹانر، ایک رسا اور چند اور چیزوں کے علاوہ شراب کی ایک بوتل بھی پڑی تھی۔

میں بوتل اٹھا کر جھرنے پر آگیا۔ پہلے خود پانی پیا اور پھر بوتل دھو کر اس میں پانی بھریا اور گاڑی میں آگیا۔

سبھا دو تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں لی سکا تھا۔ میں نے بوتل اس کے قریب ہی رکھ دی اور نیچے اتر کر ٹینک میں پٹرول ڈالنے لگا۔

اور اس کے چند منٹ بعد ہماری گاڑی ایک بار پھر پہاڑوں میں گھوم رہی تھی۔ میرا تعاقب کرنے والے نے خانے کمال رہ گئے تھے لیکن اس بات کا اندیشہ بہر حال موجود تھا کہ ان پہاڑی راستوں کی بھول حیلوں میں ان سے سامنا نہ ہو جائے۔ گاڑی میں دس گیلن مزید پٹرول ڈالا گیا تھا اور یہ پٹرول ختم ہونے سے پہلے پہلے کسی ایسی جگہ پہنچنا ضروری تھا جہاں ہمیں پناہ مل سکے اور سبھا کی مرہم پٹی ہوسکے۔

دو گھنٹے اور گزر گئے۔ پہاڑوں میں کسی ہستی کے آثار دکھائی نہیں دے سکے۔ کم از کم تین مقامات پر مجھے راستہ بند ملا تھا اور گاڑی کو واپس موڑنا پڑا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ پٹرول ختم ہو گیا۔ گاڑی رک گئی۔ میں انجن بند کر کے پچھلی سیٹ پر آگیا۔ بوتل اٹھا کر پہلے سبھا کو پانی پلایا اور ایک دو گھنٹہ خود بھی پھر۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ صبح ہونے کا انتظار کیا جائے۔ آنے والی صبح کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ہمارے لیے اس کے دامن میں کیا تھا۔ میں سبھا سے پیچھے والی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ میرا جسم بھی بری طرح دکھ رہا تھا۔ حویل کے قید خانے میں ان کم بختوں نے دل کھول کر

میری دھنائی کی تھی اور اب ان چوٹوں میں تکلیف شروع ہوئی تھی۔

میں سیٹ پر نیم دراز سبھا سے بائیں کرتا رہا اور پھر میرے دماغ پر بھی غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پلکیں بند کے پوچھ سے جھپٹے لگیں اور میں کوشش کے باوجود آنکھیں کھلی رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں براہ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے دوسری سیٹ پر جھک کر سبھا کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سینے کا ہلکا سا زبردوم اس میں زندگی کا پتا دے رہا تھا۔ وہ سو رہا تھا یا بے ہوش تھا؟ میں نے اسے چھینڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ بوتل اٹھا کر پانی کے ایک دو گھونٹ پے اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

ہماری گاڑی چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر کھڑی تھی اور اس سے آگے گاڑی لے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر پٹرول نہ بھی ختم ہوتا تو مجھے یہاں سے گاڑی واپس لے جانا پڑتی۔

میں چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گیا۔ دوسری طرف کھلی جگہ پر ٹکٹے ہی میں ٹھنک کر رک گیا۔ خیب میں دریا بہہ رہا تھا جس کی دوسری طرف بہت دور تک ایک سرسبز و شاداب وادی پھیلی ہوئی تھی اور میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ دریا کے کنارے ٹیلا نما ایک اونچی جگہ پر پکڑا قسم کی ایک عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ اس عمارت کے پیچھے ایک چٹان تھی جو کافی بلندی تک چلی گئی تھی۔

میں غور سے اس طرف دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی کوئی دیران عمارت تھی لیکن چند لمحوں بعد ہی ایک انسانی بیولا اس عمارت سے نکل کر دوسری طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بیولا میں اسی لیے کسوں کا کہ مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ صرف زرد لباس کی جھلک دکھائی دی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بیولا بھی دوسری طرف ڈھلان پر غائب ہو گیا۔

زرد لباس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی بدھ مجھو تھا۔ میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہتا رہا لیکن اور کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ وہاں اگرچہ ہمارے لیے خطرہ بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں چٹان کے ساتھ ساتھ اوپر اوپر گھوم کر نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ بالآخر تقریباً پچاس گز آگے

مجھے ایک تنگ سارا راستہ نظر آیا۔ یہ دراصل ایک کناؤں سا تھا جو پانی کے بہاؤ سے بن گیا تھا لیکن اس راستے پر آسانی۔ اتر جا سکتا تھا۔

میں گاڑی کے پاس واپس آگیا۔ سبھا بھی جاگ چکا تھا۔ میں نے اسے اس پکڑا کے بارے میں بتایا اور پانی کی بوتل اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ ایک دو گھنٹہ بھرنے کے بعد اس نے بوتل بٹادی۔

میں نے سبھا کو سارا دے کر سیٹ سے اٹھایا اور کندھے پر لا کر چٹانوں کے درمیان اس تنگ سے راستے کی طرف چلنے لگا۔

چٹان سے اتر کر دریا کے کنارے پر چلے ہوئے اونچی جگہ پر واقع اس پکڑا تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ وہ کوئی بہت قدیم بدھ عبادت گاہ تھی۔ عمارت کے بعض حصے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے مگر اس کی حالت ایسی زیادہ خستہ بھی نہیں تھی۔

میں عبادت گاہ کے سامنے کھڑا اوپر اوپر دیکھ رہا تھا۔ میری زیادہ توجہ اس طرف تھی جہاں زرد لباس والے اس آدمی کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس طرف درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ڈھلان کے اختتام پر ایک چھوٹا سا کھات بنا ہوا تھا جہاں ایک چھوٹی کشتی بھی موجود تھی لیکن وہ آدمی کیسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ آدمی کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کشتی کے آس پاس دریا میں بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے؟“ میں نے عبادت گاہ کی طرف رخ کر کے پکارا لیکن نہ تو کوئی جواب ملا اور نہ ہی کوئی سامنے آیا۔

میں نے سبھا کو کندھے سے اتار کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اس کی ٹانگیں آگے کو پھیلا دیں۔ اس کے دونوں پیر پھول کر کپا بنے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی بھی یہی صورت حال تھی۔ اس کے سینے پر بھی چھوٹے چھوٹے زخم تھے اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھا۔

”میں نے ایک آدمی کو اوپر دریا کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ میں نے کہا ”تم یہاں بیٹھے رہو۔ میں اسے تلاش کر کے لاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری کچھ مدد کر سکے۔“

سبھا نے سر ہلا دیا اور میں ڈھلان پر دریا کی طرف اترنے لگا۔ یہ بھی دراصل ایک سنگلاخ چٹان ہی تھی جو دور سے دیکھنے پر ریت کا ٹیلا لگتی تھی۔ اس میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی



دراڑیں تھیں جہاں جھانپاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ البتہ دریا والی ڈھلان کی طرف درخت زیادہ تھے۔

وہ چھوٹا سا گھاٹ بھی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ جہاں پانچ چھ چھوٹی کشتیاں کھڑی کی جاسکتی تھیں تاہم دریا کے کنارے کے ساتھ دور تک وہ چٹان اس طرح کٹی ہوئی تھی کہ ایک طویل پلیٹ فارم سا بن گیا تھا۔

میں گھاٹ پر کشتی کے قریب کھڑا اور دھر دیکھنے لگا لیکن وہ آدمی مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ مجھے حیرت تھی وہ کہاں غائب ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کہیں وہ میرا دواہمہ تو نہیں تھا!

میں واپس لوٹ رہا تھا کہ اوپر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز سن کر چونک گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی عورت تھی جو چیخ چیخ کر کسی کو پکار رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اوپر گیا اور پھر تھک کر رک گیا۔

سبا کے قریب ایک نوجوان لڑکی کھڑی عبادت گاہ کی طرف رخ کیے چیخ چیخ کر کسی کو پکار رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی ایک چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کی پشت پر ہندو تھی اور لمبے سیاہ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی لمحے عبادت گاہ کے برآمدے میں ایک اور عورت برآمد ہوئی۔ اس نے بھی نیلے رنگ کی چادر سازی کی طرح لپیٹ رکھی تھی لیکن جسم کا بیشتر حصہ برہنہ تھا۔ وہ اگرچہ ادھیر عمر تھی لیکن خاصی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے چیخ کر سبا کے قریب کھڑی ہوئی لڑکی سے کچھ کہا اور ساتھ ہی ہاتھ سے اشارہ بھی کیا تھا۔

وہ لڑکی تیزی سے گھوم گئی اور مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوف کے آثار ابھر آئے میرے اور اس لڑکی کے بیچ آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی ذہنی طور پر ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے کے نقوش اگرچہ تبتی عورتوں جیسے تھے لیکن آنکھیں ہلکی کی طرح موٹی اور سیاہ تھیں۔ نیلی چادر اس نے بھی اگرچہ سازی کی طرح لپیٹ رکھی تھی لیکن سینہ پوری طرح نہیں ڈھک پایا تھا۔

وہ چند لمحے دھشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر دھشت زدہ بہنی ہی کی طرح عبادت گاہ کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اور برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت سے لپٹ کر چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگی۔ وہ سبا کی طرف ہاتھ سے بار بار اشارے بھی کر رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف چلا گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھا رکھے تھے تاکہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکیں۔

وہ دونوں اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ قریب پانچ کرشمے نے باری باری ان کا جائزہ لیا۔ ان دونوں کے چوہوں میں بڑی مشابہت تھی اور میں دعوے سے کہہ سکتا تھا ان میں ماں بیٹی کا رشتہ تھا۔ میں ہندی زبان میں ادھیر عمر کی عورت کو بتانے لگا کہ میرا سامنی زخمی ہے اور ہمیں ان لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔

ان کی زبان اگرچہ تبتی تھی لیکن وہ عورت تھوڑی بہت ہندی بھی سمجھتی تھی۔ وہ دونوں میرے ساتھ سبا کے قریب آگئیں۔ سبا کی حالت دیکھ کر وہ ادھیر عمر عورت بھی کانپ اٹھی تھی۔ اس نے لڑکی سے کچھ کہا اور لڑکی دیا کی طرف ڈھلان پر دوڑتی چلی گئی جس طرف سے میں اوپر آیا تھا۔

”اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے اندر لے چلو۔“ ادھیر عمر عورت نے تبتی اور ہندی کے ملے جلے الفاظ میں کہا۔

میں نے جبکہ کر سبا کو کندھے پر لا دیا اور اس عورت کے پیچھے چلتا ہوا عبادت گاہ میں داخل ہو گیا۔

دور سے یہ عمارت چھوٹی لگتی تھی لیکن اچھی خاصی بڑی تھی۔ بال بہت وسیع تھا۔ وسط میں ایک چوترے پر سمانہادہ کا سرخ پتھر سے تراشا ہوا تقریباً تین فٹ اونچا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ فاسٹنگ بھا (فائدہ زدہ بھا) کا یہ مجسمہ بڑی مہارت سے تراشایا گیا تھا۔ پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پلپلاں بڑی آسانی سے گئی جاسکتی تھیں۔

وہ عورت ہال کی دائیں طرف ایک کشادہ راہداری میں مڑ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ایک اور راہداری میں گھوم کر وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے کا دروازہ عمارت کی تھالیں اس میں کوئی پت وغیرہ نہیں تھا۔ فرش پر ایک طرف پاک کی کھال کا بستر بچھا ہوا تھا اور کچھ اور چیزیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ پچھلی طرف ایک کھڑکی بھی تھی جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔

اس عورت نے اشارہ کیا تو میں نے سبا کو بڑی احتیاط سے پاک کی کھال کے بستر پر لٹا دیا اور پھر وہ عورت مجھے دہانے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

”میں نے کہا تھا کہ انسان کو کسی بھی حالت میں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے سبا کے خون آلود بالوں میں

انگلیاں بھرتے ہوئے کہا ”خدا نے ہماری فریاد سن لی۔ اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ جواب میں سبا نے صرف مکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کمرہ خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دو دیواروں کے ساتھ ایک رسی بندھی ہوئی تھی جس پر چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کھڑکی میں بھی کوئی چوکنٹ پینٹ وغیرہ نہیں تھا۔ بس دیوار میں کھڑکی کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ یہ کمرہ عبادت گاہ کی عمارت کے پیلو میں واقع تھا۔ عمارت کے ساتھ بالکل عمودی ڈھلان تھی جس کے اختتام پر ایک مختصر سی راہی پھیلی ہوئی تھی جس میں کچھ موٹی چرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور دو افراد تیز تیز چلتے ہوئے دائیں طرف جا رہے تھے۔ ان میں ایک تو نیلی چادر والی وہی لڑکی تھی جو میں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی اور دوسرا زرد چادر والا وہ آدمی تھا جسے میں نے سب سے پہلے چٹان پر سے دیکھا تھا اور پھر وہ نگاہوں سے اوچھل ہو گیا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک جھانپوں میں نظر آتے رہے پھر ایک چٹان کے پیچھے لگا ہوں سے اوچھل ہو گئے۔ میں کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر دیکھتا رہا اور پھر آہستہ سن کر پیچھے مڑ گیا۔ وہ عورت الیومیم کے دو گلاس اٹھائے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں کھڑکی سے بہت کراس کے قریب آیا۔

عورت سبا کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں گلاس فرش پر رکھ دیے۔ ان میں دودھ تھا۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے کل صبح ناشتے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گلاسوں میں دودھ دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی۔ سبا نے بھی بجائے کب سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

میں نے سبا کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے ایک گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ آدھا لادھ لپکا اس نے گلاس ہٹا دیا لیکن میں نے زبردستی اسے پورا دودھ پلا دیا۔ اسے بستر پر لٹا کر میں نے دوسرا گلاس اٹھایا۔

میں نے گلاس خالی کر کے فرش پر رکھا ہی تھا کہ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں اس وقت بھی دھشت ہی بکھری ہوئی تھی۔

”وہ شخص دریا سے تھکا دھرتی اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ سر منجا اور چوکھن شیو تھا۔ گلے میں سرخ پتھر کے موتیوں والی

ایک مالا بھی تھی۔ وہ بھکھو تھا اور یقیناً نیلے لباس والی لڑکی کا باپ اور اس ادھیر عمر عورت کا شوہر تھا۔ وہ ہمارے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے سبا کے چہرے کے نقوش سے غالباً اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بھی اسی کے قبیل کا ہے۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔

سبا تبتی زبان میں اسے کچھ بتاتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سبا نے بھکھو کو کیا کہانی سنائی تھی۔ وہ جب خاموش ہوا تو بھکھو نے قریب کھڑی ہوئی لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بول ٹی جس میں لمبے سے رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا اور ایک چوڑے منہ والی بول تھی جس میں ہرے رنگ کی کریم تھی۔ بھکھو نے لڑکی سے مزید کچھ کہا اور لڑکی نے ناگوں کے قریب اپنی چادر اوپر اٹھا کر باشت بھر کر ڈا ایک گولا بھاڑ کر بھکھو کی طرف بڑھا دیا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اگر چاہتی تو کسی اور کپڑے سے بھی اتنا سا گولا جاسکتی تھی لیکن یہ شاید اس کا بعد رومی کا جذبہ تھا کہ اس نے اپنے جسم کا لباس بھاڑ دیا تھا۔

بھکھو نے باشت بھر کپڑے سے کٹی ٹکڑے بھاڑ لیے اور سیال والی بول کھول کر ایک گولا اس میں تر کر کے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے سبا کا ایک ہاتھ چکھ لیا۔ بھکھو سیال میں بیٹھکے ہوئے گولے سے اس کے انگوٹھے کا زخم صاف کرنے لگا۔ سبا بری طرح چیخ اٹھا۔ وہ اپنا ہاتھ جھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے اسے مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔

وہ کوئی بہت ہی ختم ختم کا پتھر نما سیال تھا جس سے سبا کے زخم صاف کیے جا رہے تھے اور سبا بری طرح زپ اٹھا تھا۔ تاہم زخم صاف کرنے کے بعد ہرے رنگ کا مزہم لگایا گیا تو وہ بہتر رنج پر سکون ہوتا چلا گیا۔

دونوں ماں بیٹیاں چیزیں سمیٹ کر وہاں سے جا چکی تھیں۔ بھکھو ہمارے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

وہ تعویذی تھا اور کئی سال سے اپنی بیوی بھیر جانی اور بیٹی دھنو کے ساتھ اس کھڈا میں رہنا پسند کرتا تھا۔ وہ بھکھو نہیں تھا لیکن طویل عرصے سے اس عبادت گاہ میں خدمات انجام دے رہا تھا۔

یہ عبادت گاہ کئی سو سال پرانی تھی۔ پہلے اس طرف تجارتی قافلوں کی باقاعدہ گزرگاہ ہوا کرتی تھی اور یہ عبادت گاہ بھی آباد تھی لیکن پھر چاکا بنی ہلندی پر بننے والے دریا نے اپنا رخ بدل لیا اور پہاڑی کے دامن میں آباد چھوٹی سی بستی کو بھی بھا لے گیا۔ اس کے بعد یہ عبادت گاہ ویران

ہو گئی۔  
تھوہی کے کہنے کے مطابق ہر سال جولائی کے وسط میں یہاں ایک میلہ لگتا تھا۔ لوگ دور دور سے مسافر ہوا کے اس جتنے کے درشن کے لیے آتے تھے جو اس عبادت گاہ کے پیچھے والی چٹان کے اندر چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ میلے کے دنوں میں یہاں چند روز کے لیے رونق ہو جاتی تھی اور کچھ آدمی بھی ہو جاتی تھی۔

تھوہی کے کہنے کے مطابق وہ تقریباً پندرہ سال پہلے بھرا گندہ نامی شہر سے بھاگ کر کھنڈو آیا تھا۔ وہ ایک کسان تھا اور بھیرہ گندہ میں ایک جاگیردار کے پاس ملازم تھا۔ ایک روز جاگیردار نے اس کی خوب صورت بیوی کو دیکھ لیا اور اسے ختم کر کے اگلے روز وہ اپنی بیوی کو اس کی حویلی پہنچا دے۔

جاگیردار بہت سنگ دل اور عیاش آدمی تھا۔ اس کے علاقے کی کوئی حسین عورت اس کی دسترس سے محفوظ نہیں تھی۔ وہ اراضی کی طرح حسین عورتوں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

تھوہی جانتا تھا کہ اس کی بیوی ایک مرتبہ جاگیردار کی حویلی چلی گئی تو اس وقت تک اسے باہر نہیں نکلتے نہیں دیا جائے گا جب تک جاگیردار کو کوئی دوسری عورت پسند نہیں آجاتی۔

تھوہی کی بیٹی دھنکی عمر اس وقت صرف چھ سال تھی۔ وہ اسی رات اپنی بیوی بھیرہ جانی اور بیٹی کو لے کر بھیرہ گندہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور کھنڈو پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کھنڈو ایک برا شہر تھا اور یہاں اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا لیکن چند ہی روز بعد اس نے جاگیردار کے دو آدمیوں کو بازار میں دیکھ لیا۔

ان دنوں شہر سے تقریباً تیس میل دور بدھ نیل کنڈ نامی اس عبادت گاہ پر میلہ لگا ہوا تھا۔ تھوہی اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر یہاں آ گیا۔

میلہ ختم ہو گیا۔ لوگ واپس جا رہے تھے لیکن تھوہی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دیا کے کنارے ایک چھوٹا داری میں ٹھہرا رہا۔ عبادت گاہ کے بوڑھے بھکشو نے انہیں دیکھا تو عبادت گاہ میں لے آیا۔ تھوہی نے اسے اپنی کہانی کہہ سنائی۔ بھکشو نے انہیں عبادت گاہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔

چند مہینوں بعد بھکشو بیمار ہو گیا۔ تھوہی اور بھیرہ جانی نے اس کی بہت خدمت کی لیکن وہ جاگیر نہ ہو سکا۔ بھکشو کے انتقال کے بعد یہ عبادت گاہ تھوہی نے نبھالی۔

اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ سال بھر بڑی سہولت سے گزارا ہو سکتا تھا لیکن تھوہی نے وقت گزارنے کے لیے دیا کے کنارے چٹان کی دوسری طرف تھوہی سی زمین پر کھیتی باڑی شروع کر دی اور کچھ مویشی بھی پال لیے۔

بدھ نیل کنڈ کی یہ عبادت گاہ بھاگ متی کی طرف جانے والی سڑک سے تقریباً پانچ میل ہٹ کر تھی اور اس طرف عام لوگوں کی آمد رفت نہیں تھی۔ تھوہی سودا سلف لینے کے لیے مینے میں ایک بار شہر جاتا تھا۔ اس نے ایک کشتی بھی بنائی تھی۔ پانچ میل کا یہ فاصلہ وہ اس کشتی پر دیا میں طے کرتا۔ ہالی دے کے قریب ایک چھوٹی سی کشتی تھی جہاں سے شہر آمد رفت کے لیے سب مل جاتی تھی۔

تھوہی کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں رہتے ہوئے گیارہ بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی بھیرہ جانی بوڑھی اور بیٹی دھنکی جوان ہو چکی تھی۔ یہاں آنے کے بعد دھنکی اور بھیرہ جانی دو چار مرتبہ ہی شہر کی تھیں۔ دھنکی اپنی ماں کی طرح حسین تھی اور تھوہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی برے لوگوں کی نظروں میں آجائے۔

تھوہی پہلے تو مجھ سے بھی بد کا ہوا سا رہا لیکن جب میں نے بتایا کہ ہم بھی اپنے دشمنوں سے بچتے پھر رہے ہیں تو وہ ہمیں یہاں اس وقت تک پناہ دینے کو تیار ہو گیا تھا جب تک سب ملنے کے قابل نہ ہو جاتا لیکن اس ایک دن بلکہ چند گھنٹوں ہی میں نہ صرف تھوہی بلکہ اس کی بیوی اور بیٹی بھی مجھ سے بے تکلف ہو چکی تھی۔

بھیرہ جانی کی عمر پچیس لیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکتی تھی لیکن وہ اب بھی بے حد حسین تھی۔ دھنکی کو اس کی جوانی کی تصویر کما جاسکتا تھا۔

صبح سبھی کرم پرانی کے بعد بھیرہ جانی نے ہمیں ٹھکانا بنا کر بھی کرایا تھا۔ جوار کی روٹی پہاڑی بکے (کپڑے کی روٹی) کا تھلا ہوا گوشت اور چائے گوشت وہ کھا کر رکھ لیتے تھے جسے ضرورت کے مطابق مختلف طریقوں سے کھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

ناشتے کے تھوہی دیر بعد سہا سہا تھ۔ میں اور تھوہی کچھ دیر اس کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے اور پھر ہم دونوں عبادت گاہ سے نکل کر دیا کے کنارے کھیتوں کی طرف آ گئے۔ تین چار کھیت تھے جن میں جوار اور بنیال وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ عبادت گاہ کے چھپل طرف والی ٹھکانا مویشیوں کے لیے مخصوص تھی۔ کانے دار تادوں کی بانڈا کر اس گھاتی کو محصور کر دیا گیا تھا۔ مویشیوں کو بھر دیا جاتے

بچے۔ گھاتی ہی ان مویشیوں کا بازار بھی تھی۔  
شام کو جب میں تھوہی کے ساتھ عبادت گاہ واپس آیا تو وہاں کمرے میں نہیں تھا جہاں صبح اسے لٹایا گیا تھا۔ وہ اس کمرے میں تھا اور دھنکی اس کے پاس بیٹھی بائیں رزی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہنسی اٹھ گئی۔  
ماتے مجھے بتایا کہ دونوں ماں بنیال اسے اٹھا کر یہاں لائی تھیں۔ اسی کمرے میں میرے لیے بھی الگ بستر بچھا ہوا تھا۔ رات کا کھانا ہم نے سب کے پاس بیٹھ کر کھایا اور اس کے تھوہی دیر بعد تھوہی مجھے عبادت گاہ دکھانے کے لیے لے گیا۔ عبادت گاہ کا بیرونی حصہ تو وہ تھا جہاں فاسٹنگ بدھا کا بھر تھا۔ اس عبادت گاہ کا پچھلا حصہ چٹان سے ملا ہوا تھا۔

باہر سے محسوس اور سنگھٹا نظر آنے والی یہ چٹان اندر سے مکمل تھی۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ ہالی کی دوسری طرف ایک تنگ سی راہداری سے تھا۔

اندروں داخل ہوتے ہی میں وحشت زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ یہ ناہیاں پچاس ساٹھ فٹ لمبا اور غالباً اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کے مین وسط میں بدھ نیل کنڈ کا وہ مجسمہ تھا جو ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ یہ چٹان تقریباً تیس فٹ اونچی تھی اور اس کا گھیر بھی بدھ فٹ سے کم نہیں تھا۔

میں نے تھوہی کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور اسے اوپر اٹھا کر غور سے مجھے کو دیکھنے لگا۔ اس مجھے کو سبک تراشی کا ایک نادر شاہکار کما جاسکتا تھا۔

مجھے حیرت تو اس چٹان پر تھی جس سے مجسمہ تراشا گیا تھا۔ اسے باہر سے اندر لانا تو ممکن نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ہمارے عمار کے اندر قدرتی طور پر اسی جگہ موجود ہو۔ غار کی دیواروں پر بھی انسانی ہاتھوں کو مٹائی کا دخل نظر آ رہا تھا۔

ایسی بلند قامت مجھے کو دیکھ کر عجیب سی وحشت طاری ہو رہی تھی۔ غار کی دیواروں پر بھی جگہ جگہ پتھر تراش کر مجھے اٹھائے گئے تھے۔

تھوہی نے میرے ہاتھ سے مشعل لے لی اور اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلا رہا۔ غار کے آخر میں ایک تنگ سی راہداری تھی جس میں دو آدمی بٹھکے ہوئے تھے۔ پتھر چل سکتے تھے اور تقریباً دس گز آگے چٹان کے اندر راہداریوں کا گویا نیلا سا بچھا ہوا تھا۔ کوئی انجینی ان بچھل حلیوں میں داخل ہو کر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

واپس آتے ہوئے ہم پھر بدھا کے عظیم القامت مجھے سہاں رک گئے۔  
”بھکشو! اپنا زندگی میں کئی بار مجھے ان راہداریوں میں

لا چکا ہے۔ ان راہداریوں میں کچھ ایسے راز پوشیدہ ہیں جو میں تمہیں بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔ اس وقت میں تمہیں ایک ایسے راز سے آگاہ کر رہا ہوں جو بھکشو نے اپنی موت سے دو دن پہلے مجھے بتایا تھا۔“ تھوہی نے کہا اور پھر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ مشعل کی قمر کی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ اس وقت بہت ہی پر اسرار لگا رہا تھا ”مجموع سے ہمارے ساتھ وہ مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم ایک شریف النفس انسان ہو اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ میں جو راز تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ تمہارے سینے تک ہی محدود رہے گا۔“

”ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
تھوہی مشعل کی روشنی میں بدھا کے مجسمے کے پچھلے حصے کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے پیچھے جھک کر مجسمے کے بائیں ہری کی پڑی کی جگہ پتھر کو دبایا پھر حرکت دوسرے پیر کے ساتھ بھی کی اور وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میری آنکھیں حیرت سے پچھلی چلی گئیں۔

مجسمے کے دونوں پہلوں کے درمیان تقریباً چار فٹ کا فاصلہ تھا اور یہ جگہ بھی محسوس چٹانی پتھر پر مشتمل تھی لیکن اب وہاں اتنی چوڑی کھڑکی نظر آ رہی تھی جس سے ایک آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ پتھر کے دونوں حصے سلائیڈنگ ڈور کی طرح دائیں بائیں سرک گئے تھے۔

تھوہی اس کھڑکی میں داخل ہو گیا اور مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہوا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھکا لگا بدھا کا مجسمہ بھی اندر سے کھوکھلا تھا اور اتنی جگہ تھی کہ تین چار آدمی ساتھ مل کر آسانی سے کھڑے ہو سکتے تھے جبکہ دائیں طرف نیچے اترنے کے لیے تنگ سی بیڑھیاں تھیں۔

تھوہی نے مجسمے کے اندر لگا ہوا ایک آہنی بک کھینچ دیا۔ وہ کھڑکی بند ہو گئی جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ باہر کھڑا ہوا کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پتھر کے اس مجسمے کے اندر دو زندہ انسان موجود ہیں۔

بارہ بیڑھیاں اتر کر ہم بے خانے میں پہنچ گئے۔ یہ بیڑھیاں سیدھی نہیں تھیں۔ سچ میں ایک موڑ تھا۔ موڑ گھومنے کے بعد آخری بیڑھی سے جیسے ہی نیچے قدم رکھا، میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔

یہ بھی بہت بڑا ہال بلکہ غار تھا۔ بیڑھیوں سے چند قدم آگے مسافر بدھا کا کوئی دس فٹ اونچا مجسمہ تھا جو مشعل کی روشنی میں سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ تھوہی نے بتایا کہ یہ

بجسہ ٹھوس سونے کا تھا۔ عار کی دیواروں پر بھی کہیں کہیں چمک نظر آ رہی تھی۔

ہم عار میں دائیں طرف ایک تنگ سی سرنگ میں مزگئے تقریباً بیس فٹ آگے جا کر یہ سرنگ اس قدر تنگ ہو گئی کہ جبک کر چلنا پڑ رہا تھا اور جیسے ہی ہم سرنگ کی دوسری طرف چلی چکے پڑے، مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہ خاصا بڑا عار تھا اور اس کی دیواریں مشعل کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔

”یہ ہے وہ راز جو اس عبادت گاہ کے بخشو نے مرے سے پہلے مجھے بتایا تھا۔“ توغوبی نے کہا۔ وہ عار کے وسط میں رک گیا اور مشعل کی روشنی میں چاروں طرف اشارے کرتے لگا۔

میری حالت واقعی بہت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے زندگی میں بہت دولت دیکھی تھی۔ تھائی لینڈ میں بھی اور ہندوستان کے مندروں میں بھی لیکن سونے کا پہاڑ ایسا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے کوئی ایسی چیز دیکھنے کو ملے گی۔ سونے کی چمک سے میری آنکھیں چمکا چوند ہو رہی تھیں۔

میں نے توغوبی کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور محسوس پھر کر چمکتی ہوئی چٹانوں کو دیکھنے لگا۔ زمین پر بھی سونے کے لاتعداد چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھ کر دیکھا۔ دیواروں کو بھی چھو کر دیکھا۔ وہ سونا ہی تھا۔ اس میں پتھر کی آمیزش بہت کم تھی۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اگر یہ سونا مارکیٹ میں لے آیا جائے تو دنیا میں طوفان آجائے۔ نپال دنیا کا امیر ترین ملک بن جائے اور اگر لوگوں کو بتا چل جائے کہ اس عبادت گاہ کے چمچے سونے کا پہاڑ ہے تو شاید اس چٹان کے دامن میں بننے والے دریا میں پانی کے بجائے انسانوں کا خون بہنے لگے۔

میں مشعل ہاتھ میں لے چاروں طرف گھومتا رہا۔ بہت بڑا عار تھا اور چھت بھی زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ دو تین اطراف میں سرنگیں بھی تھیں اور ان سرنگوں کی تانہوار دیواریں بھی سونے ہی کی تھیں۔

”آؤ۔ اب واپس چلیں۔“ توغوبی نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے مشعل لے لی۔

ہم اس عار سے نکل کر دوسرے حصے میں آ گئے جہاں مہاتما بدھ کا سونے کا مجسمہ استادہ تھا۔

”سونے کا یہ بہاڑ صدیوں پہلے دریافت ہوا تھا اور بدھا کا یہ مجسمہ بھی اسی زمانے میں بنایا گیا تھا۔“ توغوبی نے سونے

کے مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”آخری دور میں بخشو نے مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ یہ راز جو سینہ خقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ بدھ کے بیرو کار بہت صبر اور امن پسند لوگ ہیں اور اس دھرم کے سیوک (مختص) سمجھتے ہیں کہ اگر یہ سونا عام لوگوں کی دسترس میں آجائے تو یہاں خون کی ندیاں بننے لگیں گی۔ اس سونے کو لوگوں بھلائی کے لیے نہیں دنیا کی تباہی و بربادی کے لیے استعمال کیا جائے گا اس لیے اسے آج تک راز ہی رکھا گیا ہے۔ اس عبادت گاہ کا محافظ بخشو مرے سے پہلے کسی ایسے کوئی کو اس راز سے آگاہ نہ کریتا ہے جو قابل اعتماد ہو اور اس راز کو اپنے تک ہی رکھ سکے۔“

”کیا دنیا کا کوئی اور شخص اس راز سے واقف نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہر دور کا دلائی لاما اور اس کے چند بہت قریبی ساتھی اس راز سے واقف ہوتے ہیں۔“ توغوبی نے بتایا ”توغوبی ساٹھ سال پہلے چند اور لوگوں کو بھی کسی طرح اس راز کا پتہ چل گیا تھا۔ انہوں نے اس عبادت گاہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن انہیں یہاں سے سونے کی ایک ڈلی نکالنے کا بھی موقع نہیں مل سکا۔ وہ کسی بات پر آپس ہی میں لڑکر ختم ہو گئے۔ اب لائیں عبادت گاہ کے باہر والے میدان میں بٹھری ہوئی مٹی جنہیں کئی روز تک بیٹھریئے کھاتے رہے۔“ توغوبی چند لوگوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میں جب یہاں آیا تھا تو اس کے چند مہینوں بعد بخشو بیمار ہو گیا۔ اس نے مرے سے پہلے مجھے یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے انتقال سے چند گھنٹے پہلے دو اور بخشو یہاں آئے تھے۔ وہ بہت در تک بیمار بخشو سے راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے اور جب بخشو کا انتقال ہو گیا تو مسمان بخشوؤں نے اس کا کپڑا کم کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتے یہاں رہے اور پھر مجھے آہستہ وے کر چلے گئے۔“

”ہر سال پہلے دو بخشو یہاں آتے ہیں۔ چند روز رہے ہیں اور مجھے آہستہ وادے کر چلے جاتے ہیں۔ ہر سال ان بخشوؤں کا آہستہ وادے کی نشان دہی کرتا ہے کہ انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ میں بخشو نہیں ہوں۔ میں تو اپنی بیوی کی عزت اور اپنی جان بچانے کے لیے بھروسہ کرتا ہوں۔ مجھے دیکھا کہ یہاں آیا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے دنیا کے سب سے بڑے راز کا امین بنایا جائے گا۔ اب مجھے ان شخص کا انتظار ہے جس کے سامنے میں اپنے سینے کا بوجھ کر سکوں اور یہاں سے چلا جاؤں۔“

”لیکن تم نے مجھے اس راز سے آگاہ کیوں کیا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظرں جماتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے اس کے بہت شریف نظر آتا ہوں لیکن میرا کردار بہت سادہ ہے اور تم نے مجھے براعتاد کر کے غلطی کی ہو۔ یہ بھی بتا ہے کہ میں تمہیں قتل کر کے لاش اس نے خانے میں بیک دول اوپ۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ توغوبی نے مسکراتے ہوئے بیانات کاٹ دی ”یہ مالا تمہیں کہیں راستے میں پڑی ہوئی نہیں ملی ہوگی۔“ اس نے میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا کی زینا اشارہ کیا۔

میں اچھل پڑا۔ اس مالا کی حقیقت کے بارے میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

”بہاڑ سال سے اس عبادت گاہ میں رہتے ہوئے میں نے بھی کچھ حاصل کیا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”مجھے یہاں ایسی شے ملی ہے کہ میں دوسروں کے اندر جھانک نہاؤں۔“ صبح جب تم سے سامنا ہوا تھا تو تمہارے گلے میں ہلا دیکھتے ہی میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا تھا اور میں نے ملے اندر بہت دور تک جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ اگر تم پر لے کر سامنا ہی نہیں ہوتا تو تمہارے دوست کی مہم پٹی کرنے کے بعد ایک پاک تم لوگوں کے حوالے کر تا اور یہاں سے رخصت کر دیتا لیکن یہ مالا کسی دھوکے باز اور بد کردار شخص کو نہیں مل سکتی۔ یہ مالا دھرم پر تم سے آگاہ ہوئی ہے لیکن ہر بار نہیں دلائل ملتی کیونکہ اس کے حق دار صرف تم ہو۔“

”تمہارے پاس کیا شے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے پیروں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔“ توغوبی نے جواب دیا ”آؤ۔ اب اوپر چلتے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“

مہا بدھا کے چٹانی مجسمے سے باہر آ گئے۔ اس نے وہ خفیہ راستہ چھانچ کر دکھایا جس طرح کھولا تھا۔

میں نے جبکہ کر سمجھا کہ بندھ کر اٹھ کر اٹھا۔ اسی وقت بھیر جانی اور دھنوکے میں داخل ہوئیں۔ توغوبی نے جج کر پیوی سے کچھ کہا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بھیر جانی جلدی سے ہمارے بستر سینے لگی۔

میں در تک جاگتا رہا اور ناگ پال وغیرہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ قدیم حویلی یہاں سے کتنی دور اور کس طرف تھی۔ گزشتہ رات ہم گاڑی پر پانچ چھ گھنٹوں تک سفر کرتے رہے تھے۔ میں نے توغوبی کو بھی اس حویلی کے بارے میں بتایا تھا لیکن اسے بھی کوئی علم نہیں تھا کہ وہ حویلی کس طرف اور کتنی دور ہو سکتی ہے۔

گزشتہ رات جب ہم حویلی سے فراہ ہوئے تھے تو ایک اور گاڑی بھی ہمارے تعاقب میں نکلی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ رات بھر پہاڑوں میں ہمیں تلاش کرتے رہے ہوں اور دن میں بھی ہماری تلاش جاری رہی ہو لیکن اس طرف ابھی تک کوئی نہیں پہنچا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ عبادت گاہ اس حویلی سے بہت دور تھی اور ہمارے لیے محفوظ بھی۔ میں نے اس وقت تک یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا جب تک سب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں خیندی کی آغوش میں پہنچ گیا۔

پھر جب مجھے کندھوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

”کیا بات ہے کیا ہوا؟“ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے توغوبی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

”اٹھو۔ جلدی کرو۔“ وہ بولا ”تمہارے دشمن یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اپنے دوست کو خانے میں لے چلو۔ جلدی۔ وہ لوگ کسی بھی لمحے عبادت گاہ میں پہنچ سکتے ہیں۔“

میں ایک جھپٹے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کڑکی سے باہر دھوپ نظر آ رہی تھی۔ بہت چمکیل اور روشن مٹی لیکن یہ وقت نگارہ کرنے کا نہیں تھا۔ میں سبکی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

میں نے جبکہ کر سمجھا کہ بندھ کر اٹھ کر اٹھا۔ اسی وقت بھیر جانی اور دھنوکے میں داخل ہوئیں۔ توغوبی نے جج کر پیوی سے کچھ کہا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بھیر جانی جلدی سے ہمارے بستر سینے لگی۔

دھنوکے میں ہمارے ساتھ تھی۔ عبادت گاہ کے پچھلے حصے میں پہنچ کر توغوبی نے بدھا کے مجسمے کے پیچھے پہنچ کر وہ خفیہ راستہ کھولا اور چلتی ہوئی مشعل دھنوکے کے ہاتھ میں تھما کر اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ بھینکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

”اندروں سے راستہ بند کر لو بہت تنگ۔“ توغوبی نے مجھے

مطالب کرتے ہوئے کہا "اور خود سے باہر آنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ لوگ چلے جائیں گے تو میں خود ہی آکر تادوں گا۔"

میں نے مجھے کے اندر آہنی کڑا کھینچ دیا۔ راستہ بند ہو گیا میں مڑ کر دھنکی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ مجھے کے اندر اس خفیہ راستے سے وہ بھی پہلی مرتبہ واقف ہوئی تھی۔

"ہم یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔ نیچے اترو۔" میں نے کہا۔

خانے میں بھاگنا بھاگنا سوئے کا مجسمہ دیکھ کر دھنکے چہرے پر وحشت اور سراسیمگی بڑھ گئی۔ اب مجھے یقین کر لینا پڑا کہ وہ اس خانے میں پہلی مرتبہ آئی تھی۔

"یہ؟ یہ؟" وہ کچھ کستا جا رہی تھی مگر بظاہر کہہ گئی۔

"تمہارا باپ بہت پہلے سے اس خانے سے واقف تھا۔ اس نے رازداری کے خیال سے تم لوگوں کو نہیں بتایا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"کیا اسے ہم پر اعتماد نہیں تھا؟" دھنکی بھوسیں تن گئیں۔

"یہ بات نہیں ہے دھنو۔" میں نے کہا "بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اپنے آپ سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ یہ راز اگر تم لوگوں سے چھپایا گیا تھا تو اس کی بھی کوئی وجہ ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے سب کو بڑی آہستگی سے دیوار کے قریب فرش پر اٹا دیا۔

سوئے کا وہ عظیم القامت مجسمہ دیکھ کر سب کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل چکی گئیں۔ اس نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ مجھے کے سامنے جوڑ دیے۔

دھنو گھوم پھر کر بھاگے اس طمائی مجھے کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے مشعل لے کر دیوار کے ایک سوراخ میں پھنسا دی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ غلطی ہوئی چٹان کے اس حصے میں چل جائے جہاں سوئے کی کان تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا اور خود بھی سب کے قریب دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا "وہ کون لوگ تھے کیا تم نے دیکھا تھا انہیں؟"

"ہاں۔ پہلے میں نے ہی دیکھا تھا۔" دھنو نے میرے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے نشست کا انداز ایسا تھا کہ مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا "میں نمانے کے لیے دریا پر گئی تھی۔ دریا کی دوسری طرف پہاڑی

پر شور مچانے والی اس مشین کو دیکھا تو دایں بھاگ کر اس نے شور مچانے والی اس مشین کا جو طبلہ تیار کیا مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کون سا قسم کی مشین ہے یا کون سا قسم کا طبلہ ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا اور باہم لوگوں کو یہاں سے اسے لے گیا پہلے بھی اس طرح لوگ یہاں آتے رہے ہیں۔

میں نے پوچھا۔

"مجھے کبھی۔" دھنو نے اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں کے علاوہ جب بھی کوئی اس طرف آتا ہے یا گئے اس طرح کہیں نہ کہیں پھپھاتا ہے پتا نہیں بابا کو کس بات خوف ہے؟"

"تمہیں دوسروں کی نظروں سے چھپا کر وہ جیسے چاہتا ہے۔" میں نے جواب دیا "تم جیڑی ایسی ہو کہ دیکھ کر کسی کی نیت میں بھی شور آسکتا ہے۔"

"مجھے کوئی کھانا جانے کا کیا؟" اس نے مجھے گھورا۔

"یہی سمجھ لو لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔" میں نے کہا۔

دھنو چند لمبے خاموش رہی پھر سب کی طرف جھک کر ان سے باتیں کرنے لگی۔

میں وہاں بیٹھنے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے اور پھر وہی جس کا اندیشہ تھا۔ دھنو نے مشعل اٹھالی اور اٹھ کر چلے گئی۔ وہ مجھے کے اطراف میں گھوم پھر کر بڑی گہری نظر سے اسے دیکھ رہی تھی اور پھر وہ اس طرف چلی گئی۔ اس طرف جانے سے میں اسے روکنا چاہتا تھا۔ میں اس کی چٹان کو اس طرف دوڑا تھا۔

دھنو مشعل ہاتھ میں اٹھائے پھٹی پھٹی سی نظروں چادروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ؟ یہ کیا ہے؟" اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

"اسی راز کی حفاظت کے لیے تمہارا بابا اس عبادت میں زندگی گزار رہا ہے۔" میں نے کہا "اور میں سمجھتا ہوں کہ سکتا ہوں کہ تم اپنے باپ کے اس راز کو راز ہی رکھو۔"

میں دھنو کو ہاتھ سے پکڑ کر دایں لے آیا۔ اس نے آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر ہستی کے آثار تھا۔ اگرچہ بہت سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اٹھارہ انیس سال ہونے کے باوجود وہ صرف دو چار مرتبہ ہی شہر کی عبادت زندگی اس عبادت گاہ میں گزری تھی لیکن اس پر وحشت کی قدر و قیمت سے وہ بھی واقف تھی۔

میں دھنو کو باتوں میں لگا کر اس کا دھیان اس طرف سے

بٹھاتا تھا لیکن یہ کوئی ایسی چیز تو نہیں تھی جس سے آسانی سے جان ہٹایا جاسکتا۔ وہ بار بار اسی موضوع پر بات کرنے لگتا۔ شاید اس بات کا بھی دھک تھا کہ اس کے باپ نے اسے کبھی اس راز سے آگاہ نہیں کیا تھا اور ایک آجی کو بھی یہی بات ہی ملاقات میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں اسے بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ توہنجی نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا نہیں کیا تھا۔

میں باتوں میں دقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا لیکن دھنو اچانک ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پیٹ پر ہاتھ پڑتے ہوئے بول۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں اوپر جا کر دیکھتی ہوں وہ کچھ کھائے یا نہیں۔"

"نہیں۔ تم اوپر نہیں جاؤ گی۔" میں نے کہا "تمہارے باپ نے کہا تھا کہ ہم خود اسے خانے سے باہر نہیں نکالیں گے۔"

"لیکن مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" وہ لنگر بول۔

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے جاگنی یاد آگئی۔ وہ ابھی بھوک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"اجھا۔" میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "تم ہمیں انجمن میں اوپر جا کر دیکھنا ہوں۔ شاید آوازوں سے کوئی اندازہ ہو جائے۔"

میں میز صوف کی طرف بڑھ گیا۔ دھنو مشعل لے کر نیچے کھڑی رہی۔

بھاگنے کے بجائے کے پیٹ میں پہنچ کر میں نے دیوار سے ٹک لگا دیا کہ اگر کوئی اس ہال میں موجود ہو تو شاید کوئی آواز سنائی دے جائے اور پھر ایک جگہ چپک سی دیکھ کر میں ہلکے دیو۔

دھنو نے جھوٹا سوراخ تھا جس سے باہر کی روشنی نظر آنی تھی۔ میں نے اس سوراخ سے آنکھ لگا دی اور لاکھوں سال سے مجھے جو تک جانا پڑا۔

توہنجی کے ساتھ دو آدمی تھے ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا تھا۔ اس کا نام میں نہیں جانتا تھا لیکن یہ حوالی میں ان آدمیوں میں شامل تھا جنہوں نے میری وحشت کی بات توہنجی کے ہاتھ میں مشعل تھی اور ان دونوں کے ہاتھوں میں آئینہ رکھ رکھتے تھے۔ توہنجی کے چہرے کو کچھ راز اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

اس کا ایک جڑا سوجا ہوا تھا اور بائیں آنکھ کے نیچے بھی سیاہ دھبہ نظر آ رہا تھا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ یہ سوچ کر ہی میں کانپ اٹھا تھا کہ انہوں نے بھیریا جی کا کیا حکم کیا ہو گا۔ وہ اگرچہ اور جڑ عمر تھی لیکن بڑی حسین عورت تھی۔ ان جیسے بھیریاؤں سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ کچھ مجھ کے لیے مار پیٹ ہی کر اٹھا کیا ہو گا۔ ایسے لوگ تو عورتوں کو مال غنیمت سمجھتے تھے اور بھیریا جی بہر حال ایک خوب صورت عورت تھی۔

وہ لوگ صبح آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے اور میرے حساب سے اب دوپہر ہونے والی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی پر تشدد کے بعد بھی شاید انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ ہم یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے بھی عبادت گاہ کے اس حصے کی تلاشی لے چکے ہوں لیکن وہ اپنا اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔

دس پندرہ منٹ تک باہر دم سی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس سوراخ سے اب روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں بڑی آہستگی سے بیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ دھنو نے کچھ پوچھنا چاہا تھا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم سب کے قریب آ گئے۔

"وہ لوگ ابھی تک عبادت گاہ میں موجود ہیں۔" میں نے سب کو اور پھر دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شاید چند گھنٹے یا آنے والی رات بھی یہیں بیٹھ کر راتنی پڑے۔"

"میں تو بھوک سے مر جاؤں گی۔" دھنو نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "وہ یقیناً شریف لوگ نہیں ہوں گے۔ اگر انہوں نے بابا یا ماں کو کوئی نقصان پہنچایا تو۔"

دھنو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری نظر خود بخود جھک گئی۔ توہنجی کی حالت میں دیکھ چکا تھا لیکن دھنو کو کچھ بتا کر اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میرا یہ اندازہ غلط نکلا کہ ہمیں رات بھی بھاگنے کے قدموں میں اسی خانے میں گزارنی پڑے گی کیونکہ مزید ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد توہنجی نے خانے میں آ گیا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر دھنو نے انتظار چھوڑ دیا۔ میں نے بھی اسے قریب سے دیکھا تو ایک لمبے کو تو کانپ کر رہ گیا۔ اس کی بائیں آنکھ تقریباً بند ہو رہی تھی اور جڑا سوجا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔

"وہ لوگ جا چکے ہیں۔ اب تم لوگ اوپر آ سکتے ہو۔" توہنجی نے کہا۔ وہ بائیں بول رہا تھا۔

دھنواس سے لپٹی ہوئی تھی۔ باب کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔ وہ تیز لہجے میں مسلسل کچھ بول رہی تھی اور توپچی بار بار اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا تھا۔

میں نے سب کو کندھے پر لا دیا اور ہم خانے سے باہر آ گئے۔

انجام بھی بہت برا ہوتا ہے۔  
 ”انہیں یہاں سے مٹائے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے“ میں نے پوچھا۔

تو غنی بڑی گھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا  
 اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اٹھ کر  
 میرے باہر چلا گیا۔  
 اس کے آدھے گھنٹے بعد میں کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔  
 اس نے وہ گھائی نظر آ رہی تھی جو مویشیوں کے لیے  
 مخصوص تھی۔ وہاں مجھے تو غنی نظر آیا لیکن تو غنی ہی دیر  
 وہ گھائیوں سے او بھل ہو گیا۔ اس کے تو غنی ہی دیر بعد  
 میرا دریا کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ قد آدم  
 بڑوں میں مجھے نیلی چادر کی جھلک بھی دکھائی دی۔ میرا  
 ہاتھ دھو رہا تھا جو مویشیوں کو پانی پلانے کے بعد دریا کی  
 تیز بہاؤ میں ہونے لگا رہا تھا۔

مجھے شوہا یاد آجاتی تھی اور اس وقت بھی شوہا مجھے بڑی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔  
مجھے کھنڈروں سے نکلے ہوئے ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ شوہا ان دنوں اسپتال میں تھی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ اسپتال ہی میں یا کہیں اور؟ میں نے پایا تھی کہ اگرچہ اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا لیکن وہ کس حال میں تھی؟ کچھ کنسٹنٹ مشکل تھا۔

کر رہا تھا۔ یہ مرہم انہی ہماڑوں میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا تھا جس کے دو تین مرتبہ لگانے سے ہی زخم بھر جاتے تھے لیکن سب کو اس مرہم سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا بلکہ زخم خراب ہوتے جا رہے تھے۔

چوتھے روز میں شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر بریندر اسے مل کر سب کو شہر لے جانے کا بندوبست کروں گا لیکن تعویجی نے مجھے روک دیا کہ ہر طرف مجھے تلاش کیا جا رہا تھا اور ان حالات میں میرا یہاں سے کسی اور طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ تاہم وہ خود شہر جانے کو تیار ہو گیا۔

تعویجی راشن وغیرہ لینے کے لیے مہینے میں ایک بار شہر جاتا رہتا تھا۔ شہر کے راستوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ میں نے اسے انسپکٹر بریندر کے بارے میں سب کچھ سمجھا دیا اور صبح آٹھ بجے کے قریب وہ کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ میں اور دھونگھا ٹاپر کھڑے دیر تک کشتی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

وہ دن میں نے سب کے پاس رہ کر ہی گزارا۔ وہ خاصی تکلیف میں تھا۔ دھون بار بار ہمارے کمرے کے پکڑ لگا رہی تھی۔ وہ بھی سب کے لیے خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ کبھی وہ ہمارے پاس بیٹھ جاتی اور کبھی باہر چلی جاتی۔

شام سے ذرا پہلے وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمایاں تھی۔

”کیا ہوا کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سانے والی ہماڑیوں پر شور مچانے والی ایک مشین اس طرف آ رہی ہے۔“ اس نے اشارے سے بتایا۔

میں اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا اور ڈھلان پر درختوں میں چھپ کر سانے والی ہماڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی گاڑی کے انجن کی بلکی سی آواز تو سنا لی دے رہی تھی لیکن وہ گاڑی ابھی تک گاڑیوں میں نہیں آئی تھی۔ دھون بھی میرے قریب کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر کوئی مشتبہ گاڑی ہوئی تو دھون، بھیر جانی اور سب کو خانے میں پناہ دوں گا اور خود صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ گاڑی سامنے آئی۔ وہ بغیر ہڈی جب تھی اور اس پر زرد رنگ کا بھنڈا دیکھ کر میرے منہ سے مکرر سانس نکل گیا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تعویجی اور میرے بچے پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ اگر انسپکٹر بریندر اس کے ساتھ کسی گاڑی پر آیا تو وہ گاڑی پر زرد رنگ

کا کپڑا بھنڈے کی طرح باندھ دے گا۔

ہماڑیوں میں چکرائی ہوئی وہ جپ کبھی نگاہوں سے اوچھل ہو جاتی اور کبھی سانے آجاتی۔ جپ میں تین آدمی سوار تھے دو آگے اور ایک پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے والا فرد لباس کی وجہ سے بچان میں آ رہا تھا۔ وہ تعویجی تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ جب ڈھلان کے نیچے مڑ کر گئی۔ میں درختوں کی آڑ سے نکل کر تیزی سے اس طرف بڑھا۔ انسپکٹر بریندر کے ساتھ ڈاکٹر نارائن کو دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ ڈاکٹر نارائن بھی اسی اسپتال میں تھا جہاں پہلیوں زیر علاج رہا تھا۔

انسپکٹر بریندر اچھے سے اس طرح گلے ملا تھا جیسے دونوں سے چھڑے ہوئے بگے بھائی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نارائن نے بھی بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جپ میں رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھالیا۔ تعویجی جپ سے اتر کر تیز قدم اٹھاتا ہوا عبادت گاہ کی طرف چلا گیا۔

دس منٹ بعد ہم سب والے کمرے میں موجود تھے ڈاکٹر نارائن نے اس کے زخم صاف کیے تعویجی ایک ابر کپاؤ نڈر کی طرح اس کی مدد کر رہا تھا۔

”ہاتھوں اور پیروں کے زخم بگڑ چکے ہیں۔ باقاعدہ علاج ہونا ضروری ہے ورنہ۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر۔“ انسپکٹر بریندر نے کہا ”میں جانا ہوں اس کا باقاعدہ علاج اسپتال ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس وقت تو تم جو کچھ کر سکتے ہو وہ کرو۔ صبح ہم اسے اسپتال لے چلیں گے۔“

”میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔“ ڈاکٹر نارائن نے جواب دیا اور ڈھون کی ڈرننگ کرنے لگا۔

اس رات ڈاکٹر نارائن سب والے کمرے میں سوتا تھا اور میں اور انسپکٹر بریندر عبادت گاہ کے برآمدے کی بیڑیوں پر بیٹھ بائیں کرتے رہے۔

انسپکٹر بریندر کے کہنے کے مطابق جس روز میں نے دھرتی نامی قبیلے سے وہاں کے پولیس اسٹیشن کے ذریعہ اس سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اس سے اگلے ہی روز اس پولیس آفیسر سے اسے پدی کے قریب دو آدمیوں کے قتل کی اطلاع بھی مل گئی تھی اور پھر اسے یہ بھی بتا چل گیا تھا کہ وہ بھارت کے آدمی تھے جنہیں قتل کر کے پانچ سو کو بیرونی زمین کی

بھارتی زمین میں دفن کر دیا گیا تھا۔ اس نے انہی آدمیوں کی شناخت بھی کر لی تھی۔

بریندر کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ اس نے

راہی دھرتی اور پدی کے پولیس آفیسروں کو اطلاع دے دی کہ مجھے تلاش کر کے میری حفاظت کی جائے۔

انسپکٹر بریندر کے لیے یہ اطلاع خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی کہ جس روز پدی سے دو تین میل دور یہ واقعہ رونما ہوا تھا اس رات چانگ کی جپ پدی میں موجود تھا لیکن اگلے ہی روز وہ برسرِ اسرار طور پر پدی سے غائب ہو گیا تھا اور پھر بریندر کے لیے یہ اطلاع بھی بڑی سنسنی خیز تھی کہ ناگ پال بھی اپنے کچھ آدمیوں کو لے کر پدی کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ علاقہ اگرچہ انسپکٹر بریندر کے دائرہ کار میں نہیں تھا لیکن وہ مجھے اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ موت کے فرشتے میرے تعاقب میں روانہ ہو چکے ہیں۔ اس نے بھی پولیس کی ایک پارٹی تیار کر کے اس طرف روانہ کر دی تاکہ مجھے تلاش کر کے حفاظت کھنڈلے دیا جائے۔

پولیس پارٹی بھی مجھے تلاش کرتی رہی۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ شاید میں انڈیا کی سرحد پار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس تلاش کے دوران جاڑا کوٹ نامی بستی کے قریب ناگ پال کی پارٹی سے تصادم بھی ہو گیا تھا جس میں ایک پولیس والا زخمی ہوا تھا اور ناگ پال کی پارٹی کا ایک آدمی مارا گیا تھا۔

پولیس والے بھی ناگ پال کی طرح میری تلاش سے ایس ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میں ہمارے ساتھ انڈیا کی سرحد پار کر گیا ہوں اور پھر جب پوکھارہا کے پولیس چنچ کے قریب سے بریندر سے میری بات ہوئی تو اسے اطمینان ہوا تھا۔

انسپکٹر بریندر کو ہمارا موت کا سن کر افسوس ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ پدی میں دو آدمیوں کے مارے جانے اور پانچ سو کو بیرونی زمین میں دفن کیے جانے سے ناگ پال گویا پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس کے آدمیوں کو قتل کر کے بیرونی زمین والا کون ہے۔ سب کا یہ خیال تھا کہ ناگ پال کی سرگرمیوں کے خلاف میرا ساتھ دے رہا تھا اس لیے ناگ پال نے اسے بے رحمی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کا ایک اور آدمی بھی ناگ پال کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

میرا سب کے آدمی بھی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اس نے بڑے بڑے زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن وہ ناگ پال کے گروہ سے تھیں۔ اس طرح شہر میں ایک خوفناک ٹینگ وار شروع ہوئی جس میں دونوں طرف کے کم از کم چار آدمی مارے گئے

تھے کم از کم پندرہ روز تک شہر تقریباً بند رہا تھا۔ پولیس بڑی مشکل سے اس صورت حال پر قابو پاسکی تھی۔ درختوں غنڈوں اور بد معاشرلوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا۔

”ناگ پال حسب معمول ایک بار پھر روپوش ہو گیا ہے۔“ انسپکٹر بریندر کا کہنا تھا ”چار پانچ روز پہلے کا کافی پانی دے پر اس کے تین آدمی ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ تباہ شدہ جپ سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئی تھیں جس سے اندازہ لگایا گیا کہ ناگ پال بھی اس طرف ہماڑوں میں کسی بستی میں روپوش ہے۔ اسے مختلف بستیوں میں تلاش کیا جا رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”وہ کسی بستی میں نہیں، ایک بہت قدیم حویلی میں پھنسا ہوا ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا اور پھر اس حویلی کے بارے میں بتائے لگا۔

”ان ہماڑوں میں جگہ جگہ تمہیں ایسی قدیم حویلیاں ملیں گی۔“ انسپکٹر بریندر نے کہا ”یہاں سے جہت تک ان ہماڑوں میں لاتعداد راجدھانیاں ہوا کرتی تھیں۔ جاگیرداروں اور سرداروں کی حکمرانی تھی اس خطے پر۔ عوام تو جموں پٹنوں اور کچھ گروہوں میں رہتے تھے اور سرداروں نے اپنے لیے مضبوط قلعے اور شان دار حویلیاں بنا رکھی تھیں۔ اب تم بائیں، کس حویلی کی بات کر رہے ہو!“

”میں واقعی اس حویلی کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا ”ہم رات کے وقت وہاں سے فرار ہوئے تھے اور رات ہی رات میں لینڈ کرور پر سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے وہ گاڑی اب بھی وہاں چٹانوں میں موجود ہے۔ اس میں پیڑوں ختم ہو گیا تھا۔“ میں نے ان چٹانوں کی طرف اشارہ کیا جہاں اس روز گاڑی چھوڑی تھی اور اس کے بعد سے میں اس طرف نہیں گیا تھا۔“ اور وہ گاڑی ناگ پال کی ہے۔“

”ناگ پال کی!“ اس نے جرت سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے کیرتی پور میں پیش آنے والے واقعے اور اپنے پکڑے جانے کے بارے میں بتائے لگا۔

”پہلے اس حویلی میں ناگ پال کے آدمی مجھے تنہا کا نشانہ بناتے رہے۔ اس وقت تک ناگ پال سامنے نہیں آیا تھا۔ بعد میں وہ سب کو بھی پکڑ کر یہاں لے آئے۔ سب کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا وہ تم کو دیکھ کے ہوا اور پھر اس رات ناگ پال کی گاڑی پر مجھے وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کے ایک دن بعد ناگ پال کے تین آدمی ہمیں



تلاش کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ تو غبی نے ہمیں غاروں میں چھپا دیا تھا۔ ان بد بختوں نے میرے بارے میں پوچھنے کے لیے تو غبی پر بھی تشدد کیا اور اس کی بیوی کے ساتھ بھی زیادتی کی۔ وہ تینوں ویسے تھے جو واپس جاتے ہوئے کافی روڈ پر حادثے کا شکار ہو گئے۔" میں نے کہا لیکن بریندر نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے اس حادثے کا کیا کیسے چلا۔

"ناگ پال کی سرگرمیاں اب خطرناک حد تک بڑھ گئی ہیں۔" بریندر نے کہا "وہ بعض قبائل کو بغاوت پر اکسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے سیدھے سادے ہیں اور اندیشہ ہے کہ ناگ پال کی زہر بھری باتیں ان کے اذہان کو پرانہ نہ کر دیں اس لیے ناگ پال اور اس کے قریبی ساتھیوں کی گرفتاری کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کی تلاش جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک روپوش نہیں رہ سکے گا۔"

ناگ پال! میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ایسے ہی لوگ اپنے گھر اور اپنے ملک کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی ذات اور اپنے مفاد سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اپنی جو بد راہی کے لیے وہ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ناگ پال کے بارے میں تو پہلے ہی سنا تھا کہ وہ مہاراجا آدی ہے اور پھر اسے جہل کھوراث جیسے آدمی کا آئینہ دیا گیا تھا۔ اس کی شر پر ناگ پال زیادہ جھیل گیا تھا اور اب وہ قبائلیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قسم کی بغاوتیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جن کا کوئی کاز نہ ہو لیکن جان و مال کا نقصان تو بہر حال ہوتا ہی ہے۔

میں اور بریندر دیر تک ناگ پال کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر موضوع بدل گیا۔ میں نے شوہا کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ شوہا اب بالکل ٹھیک ہے اور مایامتی کے ساتھ رہ رہی ہے۔

"ہم نے تو اسے کہا تھا کہ وہ انڈیا واپس چلی جائے۔ اب وہاں اسے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن وہ تمہارے اور بھلا کے بغیر واپس جانے کو تیار نہیں۔ اور تم دونوں کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ تم لوگوں کے لیے بہت پریشان ہے۔ اسے بھلا کے بارے میں پتا چلے گا تو بہت دکھ ہوگا۔"

بھلا کا کہہ تو مجھے بھی تھا۔ تھائی، جاگی اور بھلا۔ ان تینوں کوشا میں سے کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ کمرے میں اگرچہ بھیرجانی نے ہمارے لیے بھی پاک کی کھالیں بچھا دی تھیں

لیکن ہم دونوں برآمدے کی میزچوں پر ہی بیٹھے۔ ہمارے چاروں طرف سناٹا تھا۔ تاریکی بھی اتنی گہری نہ تھی کہ آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بریندر اس میزچوں پر ہی دراز ہو کر اوجھلے لگا۔

وقت دھیرے دھیرے رنگ رہا تھا اور پھر میں بھی ٹھیک اوجھل گیا تھا۔

آہستہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ دن کا دم سا ہلکا پھیل رہا تھا لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر حوضان پر دیا کی طرف چلے گیا۔

میں گھاٹ پر پانی میں بیٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نظریں بائیں طرف اٹھ گئیں۔ تقریباً بیس پچیس گز آگے دیا کے کنارے پر مخمجان جھاڑیوں پر نیلے رنگ کا کوئی پتہ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کل شام یا دن میں کسی وقت دھوا بھیرجانی نے یہ پتہ ڈھو کر یہاں ڈالا ہو گا اور اسے اٹھانے کا عمل مکمل ہو گیا ہو۔

میں اٹھ کر جھاڑیوں کی طرف چلے گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے جھاڑیوں پر پڑا ہوا وہ کپڑا اٹھایا۔ وہ دھوا بھیرجانی کی ساڑی نما چادر تھی۔ اس سے آگے جھاڑیوں پر ایک اور کپڑا چادر پڑی ہوئی تھی۔ وہ چادر اٹھانے کے لیے میں آگے بھا ہی تھا کہ جھاڑیوں سے آگے شراب کی آواز سنائی دی۔

میں نے اس طرف دیکھا تو میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ دھوا اور بھیرجانی جھاڑیوں کے قریب ہی رہا کے پانی میں کھڑی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ان کے رخ دو سری طرف تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دونوں چادریں وہیں چھوڑ دیں اور جھاڑیوں میں دھک کر رینگتا ہوا گھاٹ پر واپس آ گیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے لائے لگا۔

پندرہ میں منٹ بعد دونوں ماں بیٹیاں اس طرف سے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان دونوں نے چادریں پٹ رکھی تھیں۔ بالوں سے پانی چڑ رہا تھا۔ دونوں میرے قریب رک گئیں اور پھر دھوا میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی شوخی مسکراہٹ تھی۔

مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دھوا نے اچانک مجھے دھکا دے کر پانی میں گر دیا اور کھڑے ہو کر بچوں کی طرح تپا۔ بجانے لگی۔ اس کے قہقہے بڑے زوردار تھے۔ بھیرجانی بھی ہنس رہی تھی۔

دھوا کی اس معصوم سی شرارت پر میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں ہنسی ہوئی چلی گئیں اور میں

دھک دیا میں بھیرجانی کی کرتا رہا۔

تو بچے کے قریب ہم عبادت گاہ سے رخصت ہو رہے تھے۔ دھوا کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ بھیرجانی بھی افسردہ سی نظر آ رہی تھی۔

تو غبی بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اسے اگلی بستی سے اگلی بستی واپس لانی تھی جو وہ صبح وہاں چھوڑ گیا تھا۔ واپسی پر وہ بریندر کے ساتھ چپ رہا تھا اور کشتی وہیں بستی کے گھاٹ پر نہ گئی تھی۔

سہا کو جب کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں اور تو غبی اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ نارائن اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور بریندر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بریندر اسادالاس میں تھا اور جب پر بھی پولیس کا کوئی ٹھکان نہیں تھا۔ اس پر زور رنگ کے کپڑے کا بھنڈا اب بھی لگا ہوا تھا۔

تقریباً پندرہ گھنٹہ پہاڑی راستوں پر چکرانے کے بعد جب پانی دے پر واقع بستی میں پہنچ کر رگ گئی۔ تو غبی نے سہا کی بیٹی پٹی پٹو اور مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ بریندر نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ دو چار دن میں ہم سے ملنے کے لیے ضرور آئے گا۔ تو غبی کو ڈراپ کر کے جب پانی دے پر آ گئی اور تیز رفتاری سے کھنڈو کی طرف دوڑنے لگی۔

جب تقریباً ایک گھنٹہ بعد شرعی حدود میں داخل ہوئی گئی۔ میں ایک مینے بعد واپس آیا تھا اور شرعیتے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا حالانکہ میری عدم موجودگی میں یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

جب شرعی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی اسپتال کے کپڑاؤں میں داخل ہو کر رک گئی۔ سہا کو ایک اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا۔

"اس کا خیال رکھنا نارائن! بریندر نے کہا "ہم شام کو ایک گھر آئیں گے۔"

میں نے بھی سہا کو تسلی دی کہ اب وہ بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ میں اس سے ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔

جیسا اسپتال سے نکل کر شرعی مختلف سڑکوں پر گھومتی رہا تو کالی کا استھان ڈسٹرکٹ کی طرف آگئی اور جب جب تھا تو اس کے مکان کے سامنے رکی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ مایامتی۔ اسنے اس مکان کے بارے میں بھی کسی کو نہیں بتایا تھا اور پھر اچانک مجھے یاد آ گیا کہ بریندر نے عبادت گاہ میں مجھے بتایا تھا کہ شوہا اسپتال سے رخصت ہونے کے

بعد مایامتی کے ساتھ رہ رہی ہے۔

"کوشش کرنا کہ تم گھر سے باہر نہ نکلو۔ میں شام کو کسی وقت آؤں گا۔" بریندر نے کہا اور جب پر لگا ہوا زور بھنڈا اتار کر میری طرف بھنڈا "اور یہ اپنے پاس ہی رکھ لو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب حرکت میں آکر آگے بڑھ گئی۔ میں اس وقت تک اس کی طرف دیکھتا رہا جب تک وہ اگلا موڑ گھوم کر گھاٹوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ میں گھوم کر مکان کے گیٹ پر دستک دینے لگا۔

گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ مایامتی کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی لیکن میں جیسے ہی آگے بڑھا وہ پیچ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اے۔ ہو۔ کون ہو تم؟" وہ غصے میں چلائی۔

مجھے مایامتی کے اس طرز عمل پر بڑی حیرت ہوئی لیکن پھر اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آئی۔ میں تقریباً ایک مینے تک منڈب دینا سے دور ایسے لوگوں میں رہا تھا جو جدید تہذیب سے قطعی نا آشنا تھے اور اس ایک مینے کے دوران میں میں بھی ان جیسا ہی ہو گیا تھا۔ بے حد بڑھے ہوئے سر کے بال بے ترتیب داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح آہٹ میں اٹھے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ میں صرف جینز پہنے ہوئے تھا جبکہ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔

"سوری مایامتی۔" میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ اسے عرصے بعد مجھے دیکھو کی تو تڑپ کر بیٹنے سے لگا لگی لیکن تم نے تو مجھے پہچانے سے ہی انکار کر دیا۔ ٹھیک ہے۔ میں۔"

"اے تم! مایامتی پیچھا آگئی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے سے اندر بھیج لیا اور واقعی میرے بیٹے سے پٹ گئی۔" یہ کیا بھلا بنا رکھا ہے؟ کہاں غائب ہو گئے تھے اور بھلا کہاں ہے؟ تم دونوں کی وجہ سے ہم تو اس قدر پریشان ہیں گئے۔" وہ رک کر دروازے سے باہر دیکھنے لگی "بھلا کہاں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟"

"بھلا اب ہم میں نہیں رہی مایامتی۔" میں نے افسردگی سے جواب دیا۔

"کیا۔" وہ ایک دم سناٹے میں آگئی "کیا مطلب۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"جی کمانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "بعد میں بتاؤں گا۔ اندر چلو۔ شوہا کیسی ہے؟"

"شوہا دیدی اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ تم دونوں کے لیے پریشان رہتی ہے۔ وہ بھلا کا سننے کی تو اسے بہت دکھ ہوگا۔"

آؤ۔ اندر آؤ۔" مایا متی کا لہجہ بھی افسردہ تھا۔ ہم برآمدے میں بیٹھے ہی تھے کہ شوہا دروازے میں نمودار ہوئی اور ٹھنک کر رک گئی۔ چند لمحے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر وہ امانہ انداز میں آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"شوہا دیدی۔ یہ کیا کر رہی ہو۔"

"کیا تم مجھے ہو کہ میں اپنے محسن کو نہیں پہچان سکتی۔" شوہا نے مایا متی کی بات کاٹ دی اور پھر مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی "بلا کہاں ہے؟"

مجھے یقین تھا کہ شوہا بھی سب سے پہلے بلا ہی کے بارے میں پوچھے گی۔ میں نے مایا متی کو بتا دیا تھا تو شوہا سے چھپانے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے مایا متی کی طرف دیکھا اور مایا متی نے بہت دھیمے کیے میں شوہا کو بتا دیا کہ بلا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

شوہا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ میں اور مایا متی اسے اندر لے آئے۔

ہم بہت دیر تک بلا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مایا متی چائے بنا کر لے آئی اور اس کے ساتھ ہی ہمارا موضوع بھی بدل گیا۔ میں انہیں اپنے بارے میں بتا رہا تھا کہ میں اتنا عمرہ کہاں غائب رہا تھا اور مجھ پر کیا پابندی تھی۔

میں نے پہلی مرتبہ شوہا کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر سرخی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کم اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

"جاؤ۔ اپنا حلیہ درست کرو۔ دوپہر ہو رہی ہے۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ مایا۔ تم جلدی سے کھانا تیار کرلو۔" شوہا نے پہلے مجھے اور پھر آخری الفاظ مایا متی کی طرف دیکھتے ہوئے کئے تھے۔

"تمہارے کپڑے اور کچھ چیزیں اب بھی میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ آؤ۔ پہلے وہ چیزیں تمہیں دکھا دوں۔" مایا متی کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

وہ مجھے اس کمرے میں لے آئی جہاں پہلے میری رہائش ہو کر تھی۔ یہ کمرہ اب شوہا کے استعمال میں تھا۔ بیڈر اس کے کچھ کپڑے بکھرے ہوئے تھے جنہیں مایا متی نے اٹھا کر ایک کرسی پر ڈال دیا اور دیوار کے ساتھ استادہ الماری کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اس میں میرے کچھ کپڑے بڑے سلیقے سے تہہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ ایک دروازہ میں شیونگ کا سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ میں شیونگ کا سامان اور کپڑے اٹھا کر باہر روم میں نکلی گئی۔

میں ایک گھنٹے بعد باہر روم سے نکلا تو اپنے آپ کو ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ داڑھی مونچھیں تو میں نے سناڑ کر لی تھیں لیکن سر کے بال خود سے نہیں کاٹ سکتا تھا۔ دیکھ کر وہ دونوں ہی مسکرا دی تھیں۔

کھانے کے بعد مجھے شوہا والے کمرے ہی میں بیٹھ کر لپٹ گیا اور جو سوچا ہوں تو رات نو بجے سے پہلے میری آنکھیں کھل سکی تھیں۔ مایا متی نے بتایا کہ شام کو بریڈ اور انشیکڑا اعظم آئے تھے لیکن انہوں نے مجھے جگانے سے منع کر دیا تھا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں یہاں آکر بریڈ اور اعظم خان جیسے سچے اور مخلص آدمی مل گئے ہیں۔ مجھے یہاں سے بڑا حوصلہ ملا ہے۔" شوہا نے کہا۔

"خوش قسمتی تو تمہاری ہے کہ نئی تال سے نکل پڑی طرف آتے ہوئے راستے میں انشیکڑا اعظم خان سے ملاقات ہو گئی تھی۔" میں نے کہا "اگر یہ ہم سے نہ ملا ہوتا تو ہم مرہ یار کر کے خیال میں داخل نہ ہو پاتے اور دیں کھ جتانے تمہارا کیا سڑ کر ڈالتا۔"

"شکر گزار تو مجھے واقعی تمہارا ہونا چاہیے۔" شوہا ہلکی "اگر تم سے رشتی کیش میں ملاقات نہ ہوئی ہو تو دل کھ میری ساری جائیداد اٹھ کر مجھے واقعی مار ڈالتا۔ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی اور وہ بے چاروں ہلا۔۔۔ بھگوان اس کی آتما کو شافی دے۔ میں اسے بھی نہیں بھول سکوں گی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

"رشتی کیش پر یاد آ گیا کہ کئی روز پہلے یوگی گوتم بھوش سے ملاقات ہوئی تھی۔ ویراج اور گوتم بھوش یاد ہیں نا تمہیں؟" میں ان کے تذکرے پر چونک سا گیا تھا "گوتم بھوش سے ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"یہ شاید ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔" شوہا نے جواب دیا "میں مایا متی کے ساتھ جگن ناتھ مندر گئی تھی۔ وائیک؛ ہم جیسے ہی مندر کی بیڑیوں سے اترے وہ ہمیں راستے میں کھڑا مل گیا۔ تم سے بہت ناراض لگتا تھا۔ بہت شکایت کر رہا تھا۔"

"میرے بارے میں کوئی خاص بات؟" میں نے سالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ کہہ رہا تھا تم راستے سے ہلک مجھے ہوا۔۔۔ بھی کہہ رہا تھا کہ تم نے اس کی کسی مالا پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ مالا اسے واپس کر دی جائے ورنہ وہ تمہیں سخت

دے گا۔" شوہا چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر میرے پاس نظرں جماتے ہوئے پوچھا "تم تو ایسے نہیں ہو کہ بچہ چڑھ کر کہو۔ وہ کون سی مالا ہے؟"

"میں نے شرٹ کا بٹن کھول کر مالا اسے دکھائی تھی۔ جس کے پیچھے ایک بہت بڑا راز پوشیدہ ہے اور حاصل کرنے کے لیے ان دونوں شیطانوں نے مجھے قتل کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"میں سمجھی نہیں؟" شوہا نے ابھی ہوئی نظروں سے اٹھ کر طرف دیکھا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گی شوہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن کچھ کہ وہ دونوں یوگی انسان نہیں شیطان ہیں اور وہ ہر طرف سے مجھ سے بے مالا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ایک بہت ہی خوفناک قسم کی کوشش کر چکے ہیں جس کا نام ہونے کے بعد گوتم بھوش نے تمہیں کوئی بیڑی مانے کی کوشش کی تھی۔ یہ شکر ہے کہ اس نے تمہیں کوئی غلام نہیں بنایا۔ مجھے اب اس کا بعد ویرت کرنا ہی پڑے گا۔"

"وہ مجھے کوئی نقصان شاید اس لیے نہیں پہنچا۔" کا کہ اس درجن ناتھ مندر میں کوئی متزی بھی آیا ہوا تھا اور لا تعداد پتلی والے دیان موجود تھے۔" شوہا نے بتایا۔

"اس جیسے شیطان پولیس کی پروا نہیں کرتے اور شاید پتلی ان کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتی۔" میں نے جواب دیا "جہاں تم اپنا ذہن مت الجھاؤ۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

اور پھر اس رات میں نے شوہا کو مشورہ بھی دیا تھا کہ نہ گاؤ نہ (دل کھ) نہ ختم ہو چکا ہے۔ اب اسے ہندوستان چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلی جائے وہاں وہ بھانوت گھ اور دوپ متی موجود ہیں اور اسے اپنا کام پورا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں لیکن شوہا اپنی اس ضد پر قائم رہی کہ وہ میرے بغیر ہندوستان نہیں جائے گی اور میرا دل بھانا بھی مشکل تھا۔ میرے سامنے ایک بہت وسیع محاذ کھڑا ہوا تھا۔ جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جاتا "میں یہاں سے نہیں ہٹتا تھا۔"

اپنے اصرارات ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مایا متی کی آج پہلی بار صبح اسی ڈیوٹی پر جانا تھا اس لیے وہ اٹھ کر اسے ملنے چلی گئی۔ شوہا چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ سو جاؤں۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹ جائے گی

لیکن میں نے ایسا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ایک تیسرا کمرہ بھی موجود تھا جہاں کلیدی کا ایک تخت اور کچھ فالتو چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ ٹیلگری کا کرشل کا۔۔۔ ہوا جگمگ میں نے اسی کمرے میں تخت پر لا کر ڈالا تھا۔

میں اس کمرے میں آگیا۔ اس کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میری نظریں تخت کی طرف اٹھ گئیں جس پر بستر بچا ہوا تھا۔ میں چشمہ تصور سے تخت پر کرشل کے مجھے کو دیکھنے لگا اور پھر سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں حالانکہ دن میں کئی گھنٹے سوچا تھا لیکن اس وقت بستر پر لیٹنے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

وہ رات کا آخری پر تھا۔ سوئے میں مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سینے پر بوجھ سا پڑا ہوا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ میرے سینے پر سے بوجھ ہٹ گیا۔ میرا خیال تھا شوہا ہوگی لیکن وہ چہرہ مجھے ہی میں اچھل پڑا۔

وہ ٹیلگری تھی جس کا ہاتھ میرے سینے پر رکھا ہوا تھا لیکن میری آنکھ کھلتے ہی اس نے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ وہ مجھ سے ڈرا ہٹ کر کوٹ کے بل لیٹی میرے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ملوثی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر میں بدحواس سا ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور شخص بے ربط ہونے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن ٹیلگری اسی طرح کوٹ کے بل لیٹی رہی۔ اس نے سر کی قدر اور اٹھا کر ہتھیلی پر ٹکا رکھا تھا۔ اس کا لیٹنے کا یہ انداز بڑا منفرد تھا۔ مجھے بچپن میں دیکھی ہوئی ایک فلم قلم طوطہ یاد آئی۔ الرتھ نیل نے اس فلم میں ملکہ مصر کا رول کیا تھا اور اس کے لیٹنے کا انداز بھی یہی تھا اور اس انداز کو بڑی شہرت ملی تھی۔

"تختہ تمہ۔" میں ہلکا کر رہ گیا۔ یہ شاید اس کے حسن کا دبہہ تھا کہ آواز میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی "تختہ۔ ٹیلگری تم تو واپس چلی گئی تھیں!"

"ہاں۔ لیکن مجھے تمہاری اس دوست کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔"

ٹیلگری کی رس گھولتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بھی بیڈ سے اٹھ کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئی "وہ شیطان رشتی کیش سے واپس آ گیا ہے۔ اس نے تمہاری دوست شوہا پر وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بروقت وہاں پہنچ گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک لمحے کو بھی تمہاری دوست کو تنہا نہیں چھوڑا۔ گوتم بھوش اس کے بعد بھی

کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اسے شوہا کے قریب نہیں آنے دیا۔ وہ دست بھنجالایا ہوا ہے اور یہ مالا ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ مالا اس کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے ذریعہ وہ آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتا ہے۔ جب تک یہ مالا تمہارے گلے میں رہے گی، تم اس کے حملوں سے بھی بڑی حد تک بچے رہو گے اسی لیے تو میں بار بار کہتی ہوں کہ اس کی حفاظت کرو۔ بے پروائی تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔

”شکریہ نیلگی۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا ”کیا اب تم بیس رہو گی؟“

”نہیں۔ میں واپس جا رہی ہوں لیکن میں نے تمہاری دوست کی حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ شیطان اب اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

نیلگی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا لیکن میرے جسم میں جیسے اتنی سخت نہیں رہی تھی۔ نیلگی بیڈ کے قریب آکر میرے اوپر جھک گئی اور پھر اس کے ہونٹ میری پیشانی کو چھونے لگے۔ مجھ پر سرور کی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ نیلگی سیدھی ہوئی تو میں اس وقت بھی پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی ملگنی مسکراہٹ اور آنکھوں میں پراسرار چمک تھی۔ وہ پیچھے ہٹتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی اور پھر نگاہوں سے اوچھل ہو گئی۔

کمرے میں ایک مسکور کن سی خوشبو رہ گئی تھی۔ میں کمرے کمرے سانس لیتا رہا۔ میرے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں جیسے حواس میں آگیا۔ کمرے کی فضا میں اب بھی مسکور کن سی مہک رہی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے قریب آگیا اور باہر دیکھنے لگا۔

رات کا اندھیرا رخصت ہو رہا تھا۔ بہت دھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں کافی دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر بستر پر لیٹ گیا۔ نیلگی کے ہونٹوں کا لمس میں اب بھی پیشانی پر محسوس کر رہا تھا۔

دوبارہ غیظ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نیلگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ گزشتہ رات جب شوہا نے گوتم بھوش کے بارے میں بتایا تھا تو اسی وقت مجھے کسی گویہ کا احساس ہو گیا تھا کہ گوتم بھوش شوہا کو گھنے میں کر کے مجھ سے یہ مالا حاصل کرنا چاہتا ہو گا لیکن نیلگی بدوقت دہاں پہنچ گئی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

باہر سے آہٹ سن کر میں نے بھی بستر چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر نکلا تو یاما متی برآمدے والا دوبارہ صراحت کی۔ اس نے کھڑکیاں بھی کھول دیں تاکہ مالا کو اندر آسکے۔

”ارے! تم جاگ گئے۔“ وہ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

”میں تو بہت دیر سے جاگ رہا ہوں۔ تمہاری بات کر کے یہ باہر آگیا۔“ میں نے لاؤنج میں صوفے پر ہوئے کہا ”چائے پلاؤ۔“ بہت دیر سے طلب ہو رہی ہے۔

”ابھی بناتی ہوں۔“ یاما متی کچن کی طرف جانے لگی۔

تقریباً دس منٹ بعد یاما متی چائے بنا کر لے آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت چھ بجنے والے تھے۔ پورے لاؤنج میں ایک سوکھی رہتی تھی لیکن عام طور پر میں ساڑھے پانچ بجے وہ اٹھ جاتا کرتی تھی۔ چائے کی کڑواہٹ اپنے کمرے میں چلی گئی اور چند منٹ بعد تیار ہو کر واپس آگئی اور کچن میں کھس کر ناشتا تیار کر لگی۔ اس نے ناشتے کے لیے مجھ سے بھی پوچھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

پونے سات بجے یاما متی چلی گئی اور میں برآمدہ کمرے میں ڈال کر بیٹھ گیا۔

نوبے کے قریب شوہا بھی باہر آگئی۔ وہ غانا کا نیا پہلے جاگ گئی تھی اور تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی گئی۔ ”یاما متی تو سات بجے سے بیدار ہی چلی گئی ہوگی۔ تم ناشتا کیا نہیں؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ابھی نہیں۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

شوہا اندر چل گئی اور پھر تقریباً پون گھنٹے بعد اس نے آواز دے کر مجھے بھی اندر بلا لیا۔ کافی ٹیبل پر ناشتا لگا ہوا تھا۔ پراسٹے اگرچہ انڈیا کے نقشے کی طرح آؤسے تھوڑے تھے مگر بہت دار اور بڑے تھے۔ ساتھ ساتھ میں انڈوں کا آلیٹ تھا۔ اس کے ساتھ میٹھے نے چائے بھی بنائی تھی۔

”یاما متی بہت اچھی لڑکی ہے۔“ شوہا کہہ رہی تھی۔ ”اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ اپنا دل میں بھی یہاں کھڑی ہے۔“

”ہاں۔“ یاما متی واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر یاما متی، انپکٹر اعظم اور بریڈرا کے بارے میں بات کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں موضوع بدلتے بدلتے پہلے پانچ بجے کا ڈر بھی آیا اور ویش کھ کا بھی۔ ویش کے ذکر کے پر راویکا کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس فیصل کی وجہ سے اسے اتنے کٹ اٹھانے پڑے۔

یاما متی غور سے بحث اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ ”تم رات کو گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کے بارے میں بات کر رہے تھے۔“ شوہا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ناگنا یا تم نے اس کا ذکر کیا تھا اس سے لگتا ہے کہ تم اس کی ملاقات خوشوارما محل میں نہیں ہوئی تھی اور یہ مالا باہر ہے۔“

”میں تمہیں صورت حال سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتا۔“ میں نے کہا ”اس روز مندر کے سامنے گوتم بھوش تمہاری ملاقات محض اتفاق نہیں تھی۔ وہ بڑا شیطان ہے۔ اس کے پاس کچھ پراسرار قوتیں ہیں۔ وہ تمہیں گرفت میں لے کر مجھ سے یہ مالا حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

شوہا کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ ہندو تھی۔ یوگیوں اور پنڈتوں کے بارے میں اس نے بھی کچھ سن رکھا تھا کہ کس طرح یہ لوگ پراسرار قوتیں مل کر کے اپنے گناہوں کے مقاصد کے لیے دنیا کو تباہی کی لہر چلا رہے تھے۔

”تمہارا مطلب ہے یہ مالا بھی۔“

”ہاں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”ہندو دیو مالا میں ہلکی کوب سے بڑی ہتکتی سمجھا جاتا ہے۔ یوگی اور ہندو مت ہزاروں سال سے اس ہتکتی کو حاصل کرنے کے لیے بہکتے آ رہے ہیں لیکن بیٹوں کی کھوت کی وجہ سے کوئی ناپسندیدہ مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا جبکہ ہزاروں لوگ مارے گئے ہیں تباہ ہو رہے ہیں۔“

”یوگی گوتم بھوش بھی نیلگی کے حصول کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بھی رشی کیش میں ایک پتہ بتایا جس پر میں نے عمل بھی شروع کر دیا لیکن اس نے مجھے علم نہیں تھا کہ وہ میرے توسط سے نیلگی تک پہنچا۔“

”یوگیوں اور وہ مجھے دھوکا دے کر وہ ہتکتی مجھ سے چھین لے گئے۔ اتفاق سے مجھ میں تمہارا واقعہ پیش آگیا اور مجھے یہاں واقعہ پیش آیا جو میرے لیے نہایت پراسرار بھی تھا۔“

”میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے رتا

پارک میں لٹے والے کرشل کے شکستہ مجسمے کے بارے میں بتانے لگا۔ شوہا بڑی حیرت سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

”اس روز جگن ناتھ مندر کے سامنے نیلگی نے پہنچ جاتی تو گوتم بھوش تمہیں اپنی قوتوں کے جال میں جکڑ لیتا۔“ میں کہہ رہا تھا ”اور یہ ہے وہ مالا جسے حاصل کرنے کے لیے گوتم بھوش اتنا بے چین ہو رہا ہے۔“ میں نے مالا گلے سے اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟“ وہ مالا کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج صبح نیلگی یہاں آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کب کیا۔“ شوہا ہلکا کر رہ گئی ”وہ تمہارے پاس آتی ہے؟“

”یہ میری نیک نیتی کا صلہ ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”میرے من میں پراسرار قوتیں حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ عرصہ پہلے میں نے بڑی کشن ریاضت سے جی کی قوت حاصل کی تھی۔ میں جانتا ہوں جی کی پراسرار قوت سے بڑے بڑے کام لے جاسکتے ہیں۔ دنیا پر حکمرانی کی جاسکتی ہے لیکن میں نے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اس پراسرار قوت کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ اسے دوسروں کی بھلائی کے لیے ہی استعمال کیا ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ نیلگی جیسی ہتکتی بھی میرے قریب آگئی ہے لیکن وہ ابھی میرے تابع نہیں ہوئی۔ اس کے لیے جا ب جا کھل کرنا ضروری ہے اتفاق کہ لوکہ میں نے نیلگی کو گوتم بھوش کے حملے سے بچایا تھا اور اس کا کرشل کاٹنا ہوا مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا اور اسے نیپ سے جوڑ دیا تھا۔ اس وقت میں کرشل کے اس مجسمے کی حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ میں تو محض اسے جوڑ کر دیکھنا چاہتا تھا اور میرا یہی عمل میری غلطی بن گیا اور نیلگی کو کوئی زندگی مل گئی۔ وہ مجھ پر مہربان ہوئی اور میری اس نیکی کے صلے میں وہ میری مدد کر رہی ہے۔“

شوہا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے لیے شاید یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو کیا رہنے والے تھے باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

”میں اسپتال جا رہا ہوں۔ واپسی میں شاید کچھ دیر ہو جائے۔ تم پریشان مت ہونا۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ شوہا بھی اٹھ گئی ”اکیلی یہاں پڑی بور ہوتی رہوں گی۔ تمہارے ساتھ ذرا محوم پھر آؤں گی۔ بس تیار ہونے میں تھوڑی دیر لگے گی۔“ شوہا نے پہلے برتن وغیرہ دھو کر رکھے اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد وہ کمرے سے باہر نکلی تو میں اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو سانس لینا بھول گیا۔ ادھیر عمر ہونے کے باوجود وہ بے حد حسین تھی۔ دو انچ چوڑے سیاہ بارؤ والی آف وانٹ ساڑی اس پر خوب بیچ رہی تھی۔ اگر اس نے ہلکا سائیک اپ بھی کر لیا ہوتا تو اس کا حسن کچھ اور نکھر آتا۔

شوہا بیوہ تھی۔ اسے میں نے ہمیشہ سفید ساڑی میں ہی دیکھا تھا اور آج پہلی مرتبہ ساڑی کی رنگت میں بہت معمولی سی تبدیلی نظر آئی تھی۔ رشی کشیش میں ایک مرتبہ اس موضوع پر میری اس سے گفتگو ہوئی تھی۔ ہندوستان میں ’میں نے بہت سی ایسی بیوہ عورتوں کو دیکھا تھا جو اپنی پسند کے رنگین کپڑے پہنتی تھیں‘ سیک اپ بھی کرتی تھیں اور زیور بھی استعمال کرتی تھیں۔ شوہا بھی یہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن جبک مانع تھی۔ وہ لوگوں کی باتوں سے ڈرتی تھی اور آج لباس میں بہت معمولی سی تبدیلی خوش آئند تھی۔

”اس ساڑی میں اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ اب تو بہت کم بیوہ عورتیں سفید لباس پہنتی ہیں۔ وہ زمانہ بیت گیا جب بیوہ ہوجانے والی ہندو عورت شوہر کی لاش کے ساتھ ہی جل کر مٹا کرتی تھیں۔ اب تو بیوہ عورتیں دوسری شادی کر کے سکون کی زندگی بسر کرتی ہیں۔“ شوہا کچھ نہیں بولی۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھینچی رہی۔

کل شام الماری میں سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے وہاں مجھے تھوڑی سی رقم بھی رکھی ہوئی مل گئی تھی جس کے بارے میں بعد میں پایا مٹی نے بتایا تھا کہ وہ رقم میری ہی تھی اور اس وقت باہر نکلنے سے پہلے میں نے وہ رقم اٹھا کر جب میں ڈال لی تھی۔

گھنٹوں سے نکل کر ہم مین روڈ پر آ گئے جہاں کچھ دیر بعد ہی ہمیں ایک سائیکل رکشال کیا۔ گھنٹہ دو کے سائیکل رکشے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ انہیں بڑی خوب صورتی سے سجایا جاتا ہے۔

ہسپتال کے سامنے ہم نے رکشا چھوڑ دیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر سے ہمیں یہ معلوم کرنے میں بھی دشواری پیش نہیں

آئی کہ سب کون کون رکھا گیا تھا۔

سباز جزل وارڈ میں تھا۔ یہ وزنگنگ آرمز میں لے لیے ہمیں وارڈ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا اور انٹیچس وارڈ کی طرف کے ڈیوٹی روم میں آ گیا۔ صبح میں نے پایا مٹی کو سباز کے پاس بتا دیا تھا۔

پایا مٹی ڈیوٹی روم میں موجود تھی۔ ہم دونوں کو بار دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”دیڈی! یہ ساڑی تم پر کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“ شوہا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جواب میں شوہا نے صرف مسکرائے ہی اٹھا تھا۔

”میں صبح سباز سے ملی تھی۔“ پایا مٹی میری طرف دیکھ کر ہونے بولی ”اسے اچھا ہونے میں بہت دن لگیں گے۔ تم ہو اس سے؟“

”نہیں۔ ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہیں دے گئی۔ شام کو دوبارہ پیکر لگائیں گا۔“

”شام تک اسے انٹیچس وارڈ میں منتقل کر دیا جائے لیکن تم اگر چاہو تو میں تمہارے ساتھ وارڈ میں چلوں۔ پایا مٹی بولی۔

”نہیں۔ شام ہی کو مل لیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ہم کچھ دیر وہاں رکے اور پھر پایا مٹی سے رخصت ہوا ہسپتال سے باہر آ گئے۔

میں شوہا کے ساتھ مختلف بازاروں میں گھومتا رہا۔ علاقہ کوئی طرف جانے سے گریز کیا جہاں ناگ پال۔ غنڈوں سے سامنا ہونے کا احتمال تھا کیونکہ میں شوہا کو ایسے معاملے میں نہیں گھیننا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک بڑے قسم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر کل ڈال علاقے میں ایک ساڑی ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ بہت سی دکان تھیں اور یہاں صرف ساڑیاں اور متعلقہ چیزیں تھیں۔ شوہا جبک رہی تھی لیکن میں نے اپنی پسند کے لیے دو ساڑیاں خرید لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ کپڑے بلاؤز اور چٹنی کوٹ بھی مل گئے تھے۔

بازار میں محوم پھر کچھ اور شاپنگ بھی کی۔ کھانا بھی ہم نے ایک ریسٹورنٹ ہی میں کھایا اور پھر گھر آ گئے۔

میں سباز سے ملنے کے لیے اس روز شام کو بھی نہ جاسکا۔ تاہم رات نو بجے کے قریب انکسپکٹر برینڈر آ گیا۔

”ہم نے پہاڑوں میں وہ حویلی تلاش کر لی ہے۔“ برینڈر نے گفتگو کے دوران میں کہا ”لیکن چند شدہ لاشوں کے سوا ہمیں وہاں کچھ نہیں ملا اور ہم نے مدھ نسل زندگی عبادت گاہ کے عقب میں چٹانوں میں کھڑی ہوئی ناگ پال کی وہ گاڑی بھی نکھالی ہے جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا۔“

”وارڈ ناگ پال کا پتا نہیں چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ شاید اسی پہاڑوں میں کسی اور حویلی میں منتقل ہو گیا ہے۔ بہرحال اس کی تلاش جاری ہے اور ہم جلد ہی اس کا سراغ لگائیں گے۔“ برینڈر نے جواب دیا ”شہر میں اس کے کچھ آدمی دوبارہ سرگرم عمل ہو رہے ہیں۔ انہیں پتا چل گیا ہے کہ تم وہاں آ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں اس لیے۔“

”اس لیے کیا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سادہ لباس میں اپنے دو آدمی یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ بارہ کرہی مکان کی نگرانی کریں گے۔“ برینڈر نے کہا۔

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا ”اگر اتفاق سے کوئی ایسی بات ہوئی تو یہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ میں فوراً تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس والوں کی موجودگی سے اس علاقے کے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔ ویسے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک دو روز یہاں رہنے کے بعد سوبھا ناتھ کے علاقے میں واقع مدھولا والے جنگل میں منتقل ہو جاؤں جہاں میرا بھی موجود تھا اسی لیے میں نے انکسپکٹر برینڈر کو اس مکان کی نگرانی کے سلسلے میں ٹال دیا تھا۔

شوہا کی طرف سے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ نیگلری نے اس کی حفاظت کا وعدہ کر لیا تھا۔ میں اسے گھر پر چھوڑ کر آزادی سے نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ ناگ پال میری تلاش میں تھا اور مجھے چانگ کی کی تلاش تھی۔ میں اگرچہ ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک چانگ کی کے قدم یہاں سے نہیں اکھاڑوں گا اس وقت تک جین سے نہیں بیٹھوں گا۔ چانگ کی کے یہاں سے بھاگ جانے یا اس کے خاتمے کے بعد جزل کھوراث کو اس طرف کا رخ کرنے کے لیے بہت کچھ سوچنا پڑتا۔ یہاں سے جزل کھوراث کے قدم اکٹڑ جانے کے بعد ناگ پال اکیلا رہ جاتا اور یہاں کے لوگ اس سے بخوبی نمٹ لیتے۔

اگلے تین دنوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

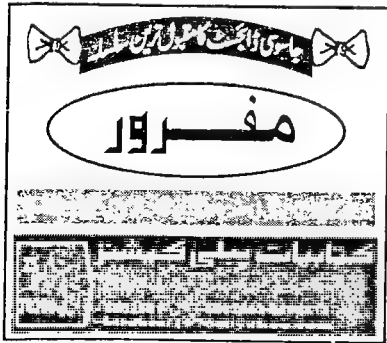
ایک روز صبح پایا مٹی اپنی ڈیوٹی پر جانے لگی تو میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد اپنا سامان پیک کر لے اور اپنے فلیٹ پر منتقل ہو جائے۔ ہم بھی رات ہی کو مدھولا کے ہاں چلے جائیں گے۔

اس رات پایا مٹی کو اس کے فلیٹ پر چھوڑ کر میں اور شریس سوبھا ناتھ کے علاقے میں واقع مدھولا کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ کال تیل کے جواب میں جس شخص نے گیٹ کھولا تھا وہ میرے لیے ابھی تھا۔ میں نے مدھولا کا نام لیا۔ وہ چند لمبے ابھی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا پھر اندر آنے کے لیے راست چھوڑ دیا۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ میں اور سباز برآمدے میں اگر رک گئے۔ اس شخص نے اشارہ کیا اور ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

ہال میں قدم رکھتے ہی میں اچھل پڑا۔ شیریا صوفوں کے درمیان قالین پر بندھا ہوا تھا۔ مدھولا صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر اگرچہ کھلے ہوئے تھے مگر وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا۔ ہمارے ساتھ آنے والے آدمی نے مجھے زور دار باتیں رسید کر دی۔ میں کراہتا ہوا لڑکھڑا کر شیریا کے قریب گرا۔ اسی وقت صوفوں کے پیچھے چھپے ہوئے دو آدمی اٹھ کر سامنے آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ تیسرے آدمی نے بھی ’جو ہمیں باہر سے لے کر آیا تھا‘ اپنے لباس میں سے خنجر نکال کر اس کی نوک شوہا کے پہلو سے لگا دی تھی۔

میں قالین پر پڑا وحشت نظروں سے ان تینوں آدمیوں کو دیکھنے لگا۔ چوں کہ وہ تینوں چھپے ہوئے مدھولے ہی لگتے تھے اور کسی سے انسانیت اور شرافت کی توقع نہیں کی جاسکتی



”اوہو تم!“ یہ اس شخص کی آواز تھی جو مدھولا والے صوفے کے پیچھے سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خنجر تھا جس کی نوک مدھولا کی گردن کو پھوس رہی تھی۔ مدھولا کا چہرہ خوف سے بالکل زرد ہو رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ایسے ہی ایک سسٹی خیز تجربے سے گزر چکی تھی اور اسے ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ وہ زخم اگرچہ اب ٹھیک ہو چکا تھا لیکن وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ نہیں ویسا ہی کوئی اور سنگین تجربہ نہ دہرایا جائے۔

”چھا ہوا تم بھی یہاں آگئے۔“ وہ شخص میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ دونوں ہمارے ہاتھوں مارے جاتے تو مجھے افسوس ہوتا۔ خاص طور پر یہ خوب صورت گڑیا۔ یہ تو تھینکے کے لیے ہے۔ دل بھلانے کے لیے۔ اس پر تو ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔“

”کون ہو تم لوگ؟“ میں نے پوچھا۔ وہ چہرے سے اگرچہ میرے لیے انجینی تھے لیکن میں جان چکا تھا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔

”تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ہم کون ہو سکتے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہمیں کئی روز پہلے اطلاع مل گئی تھی کہ تم وہاں آچکے ہو۔ ہمارے آدمی تمہاری تلاش میں تھے لیکن تمہارا سراغ نہیں مل رہا تھا اور پھر مجھے ہی خیال آیا کہ شہر سے غائب ہونے سے پہلے تمہیں اس حینہ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ہم تمہارے بارے ہی میں پوچھنے کے لیے یہاں آئے تھے لیکن یہ دونوں کچھ بتانے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اچھا ہوا تم یہاں آگئے اور ان کی جان بچ گئی ورنہ یہ دونوں ہمارے ہاتھوں خراج ہو جاتے۔“

میں اپنے قریب پڑے ہوئے شیریا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اس قدر آسانی سے ان کے قابو میں کیسے آگیا تھا۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ وہ تینوں مسمان بن کر آئے تھے اور انہوں نے دھوکے سے شیریا کو گرفت میں لے لیا تھا۔

”ہم ایک شرط پر ان کی جاں بخشی کر سکتے ہیں۔“ وہی شخص میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تم کوئی گڑبگ کیے بغیر ہمارے ساتھ چلو گے اور یہ لڑکی بھی ضمانت کے طور پر ہمارے ساتھ جائے گی۔ بعد میں اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ ظاہر ہے ان لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم بلاوجہ کسی کے خون سے ہاتھ نہیں رننا چاہتے۔ اگر تمہیں ہماری یہ شرط منظور ہو تو۔“

”نہیں۔ ہمیں تمہاری کوئی شرط منظور نہیں۔“

یہ آواز شوہما کی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان غنڈوں کے سرغنہ سے باتیں کرتے ہوئے میں نے وقتی طور پر اسے فراموش کر دیا تھا۔

”اوہو۔ مینڈی کو بھی زکام ہو گیا۔“ سرغنہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنز سے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے تمہیں ساتھ لے جانے کی بات نہیں کی۔ دینے تم بھی اس لڑکی سے کم نہیں ہو۔“

”تم کسی کو بھی ساتھ نہیں لے جا سکو گے۔“ شوہما نے کڑے لہجے میں کہا۔ میں شوہما کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کمزور دل کی عورت تھی۔ لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والی۔ بے پور میں دیش کھ کی دھمکیوں سے ڈر کر اس نے شرعی چھوڑ دیا تھا لیکن دیش کھ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور رشی کیش سے اسے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ وہ طویل عرصے تک اس کی قید میں رہی تھی اور اس نے بڑے دکھ جھیلے تھے۔ پچھلے خوفناک تجربے کے پیش نظر اسے تو خاموشی سے دیکے رہنا چاہیے تھا لیکن وہ ایک دم بدل گئی تھی اور ان بد معاشوں کو چیلنج کر رہی تھی۔

”اے!“ اس کے ساتھ کھڑا ہوا بد معاش غرایا۔ ”تم اپنی زبان بند رکھو ورنہ خنجر اندر کر دوں گا۔“

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے خنجر پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈال دیا تھا۔ خنجر کی نوک شوہما کے پیلو پر رکھی ہوئی تھی۔ دباؤ پڑنے سے شوہما کی جلد کا وہ حصہ تقریباً نصف انچ اندر کی طرف دب گیا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اتنے دباؤ سے تو اس کی جلد میں سوراخ ہو جانا چاہیے تھا اور اس سے بھی زیادہ شدید حیرت اس وقت ہوئی جب شوہما بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے حریف کی خنجر والی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

وہ شخص بری طرح بلبلا اٹھا۔ شوہما اس کی کلائی کو موڑتی چلی گئی۔ وہ شخص دہرا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر شوہما کے پیروں کے قریب گر گیا تھا۔

”اے۔ اے۔ چھوڑو اسے۔ یہ کیا کر رہی ہو؟“ مدھولا کے پیچھے کھڑا ہوا غنڈا بیچنا پھر وہ خنجر مان کر شوہما کی طرف لپکا۔

صورت حال بدل گئی تھی۔ شوہما نے اپنے حریف کو بے بس کر دیا تھا اور اب مدھولا کو بھی فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جس غنڈے نے اسے خنجر کی نوک پر لے رکھا تھا وہ اب شوہما کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرے پیر کی ٹھوک اس شخص کے پیٹ پر لگی جو شوہما کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر اس پر جھلانگ لگادی۔

شوہما کے حریف کا داؤد چل گیا۔ اس نے شوہما کی ٹانگوں کے پیچ میں گھسنے سے ٹھوکر مار دی۔ شوہما بلبلا اٹھی۔ وہ پیٹ پکڑے دہری ہوئی چلی گئی۔ اس کے حریف نے زمین پر پڑا ہوا خنجر اٹھالیا اور شوہما پر حملہ آور ہوا لیکن اسی لمحے مدھولا اپنی جگہ سے اچھلی اور ہوا میں اڑتی ہوئی اس شخص کے اوپر جا گری۔ وہ شخص منہ کے بل آگے کو گرا۔ اس کا سر آگے بڑی ہوئی کرسی سے ٹکرا گیا تھا۔ پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون بہہ لگا تھا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

مدھولا ایک بار پھر ہوا میں اچھلی اور پیروں کے بل اس شخص کے اوپر گری۔ وہ شخص پھر بچ اٹھا۔

شوہما بھی تسلسل چلی تھی۔ اس نے خنجر اٹھالیا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس تیسرے بد معاش کی طرف لپکی جو خنجر تانے مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ شوہما کے پیر کی ٹھوک اس کے پیٹ پر لگی اور وہ ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ شوہما دو ٹکڑے شیریا کے قریب پہنچ گئی اور جھک کر ایک ہی جھٹکے سے اس کی کلائیوں پر بندھی ہوئی رسی کاٹ دی۔

شیریا بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک غنڈے کو سنبھال لیا۔ ایک غنڈا میری گرفت میں تھا اور تیسرے کو شوہما اور مدھولا نے سنبھال رکھا تھا۔ مجھے ان دونوں پر حیرت ہو رہی تھی کہ ان میں اتنا حوصلہ کیسے آگیا تھا۔ یہ یک طرفہ لڑائی تھی جو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی۔ ہم نے ان تینوں کو مار مار کر ادھموا کر دیا تھا۔ شیریا نے ان تینوں کو باندھ کر ڈال دیا۔

اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ ٹانگ پال اور چانگی نے اپنے گروہ میں یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص مجھے پکڑ کر ان کے سامنے پیش کرے گا یا میرے بارے میں کوئی نشان دہی کرے گا اسے میں لاکھ لاپے انعام دیا جائے گا۔

ٹانگ پال کے گروہ کے اکثر آدمی میری تلاش میں تھے۔ بعض تو میری تلاش میں ہماڑوں میں آباد چھوٹی چھوٹی بستیاں میں ٹھک رہے تھے اور بعض کو میرے شہر پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔

غنڈوں کی اس پارٹی کا سرغنہ روہن تھا۔ اس کو کسی

طرح معلوم ہو گیا تھا کہ پدی کی طرف جانے سے پہلے میں اس جگہ میں مقیم تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے یہاں آگیا۔ یہ لوگ مسمان بن کر آئے تھے۔ انہوں نے دھوکے سے شیریا کو بے بس کر دیا اور مدھولا کو خنجر کی نوک پر رکھ کر میرے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ سلسلہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ میں شوہما کے ساتھ دھاؤں پہنچ گیا۔

مجھے شوہما کی جرات پر بڑی حیرت ہوئی تھی لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا اور شوہما کی باتوں نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔

شوہما کے کہنے کے مطابق یہاں کی صورت حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا لیکن پھر اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے کوئی غیبی قوت اسے اکسار رہی ہو اور پھر اسی نے وہ سب کچھ کر ڈالا جس کی اس جیسی کمزور دل عورت سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

مجھے نیلگی کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے شوہما کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ نیلگی ہی نے اس کے اندر اتنا حوصلہ پیدا کیا تھا اور اسے جارحیت پر آمادہ کیا تھا اور شوہما کو دیکھ کر مدھولا کو بھی حوصلہ ملا تھا۔

شیریا کا خیال تھا کہ ان تینوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں صحن میں غسی جگہ دفن کر دینی چاہئیں لیکن میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ بلاوجہ کسی کے خون میں ہاتھ رننا مناسب نہیں تھا جبکہ انہیں زندہ رکھ کر ان سے کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

میری بات شیریا کی سمجھ میں آگئی اور ہم اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں ان تینوں کو باندھ کر ڈالا گیا تھا۔ شیریا نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اور روہن کے ہاتھ کھول دیے۔

”میرا تو خیال تھا کہ تم تینوں کو قتل کر کے لاشیں زمین میں گاڑ دی جاؤں لیکن میرا یہ سنا بھی بہت رحم دل ہے۔ یہ تم لوگوں کو قتل کرنے کے حق میں نہیں بلکہ زندہ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ بغیر کوئی نقصان پہنچائے۔“ شیریا اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا اور یہ خنجر غالباً روہن ہی کی ملکیت تھا۔

”شرط کیا ہوگی؟“ روہن نے ابھی ہوئی نظروں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”شرط زیادہ کڑی نہیں ہے۔“ شیریا بولا۔ ”ہمیں ٹانگ پال اور چانگی کے بارے میں بتادو کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔“

”ہاں۔ اس کے لیے اس سے زیادہ محفوظ اور کوئی جگہ  
پناہ لیے ہوئے ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہے تھے۔ شیرپا کے پاس پستول موجود تھا جبکہ میں نے روہنا

ان میں ایک نور ایسی ہماری طرف لپکا۔ میں نے اس سے بھی  
وہی سوال کیا۔ ہنستی مائی کا نام سن کر اس کے چہرے کے

پوچھا۔ ”بستی میں ہوں مہاراج۔ آپ لوگ ٹھیک جگہ



آئے۔ پسند کیجئے۔ بستی کی پرپاں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ذرا اور پہلے آجاتے تو بستی اچھی جیزیں مل جاتیں۔ پورے کھنڈوں میں بستی کی شہرت ہے۔ قدر دان تو شام سے پہلے ہی۔“

”بند کرو بکواس۔“ شیرپا نے اسے ڈانٹ دیا ”ہم عیاشی کے لیے نہیں آئے۔ یہاں اور کون ہے؟“

”بستی کے کوٹھے پر اور کون ہو سکتا ہے ہمارا۔ پر تم ڈانٹتے کیوں ہو۔ پولیس والے ہو کیا؟“ بستی نے یہ کہتے ہوئے مخصوص انداز میں نالی بجائی۔

”ہاں۔ ہم پولیس والے ہیں اور ہمیں ایک مجرم کی تلاش ہے۔“ شیرپا نے کہا ”ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ ہمیں چھپا ہوا ہے۔“

”ہائے رام!“ بستی کے منہ سے کراہ سی خارج ہو گئی ”دیکھ لو ہمارا۔ خود دیکھ لو۔ یہاں میری بریوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دو کھنڈے آئے تھے۔ وہ بھی بھاگ گئے۔“

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کیا روہن نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ شیرپا کی مزید مار سے بچنے کے لیے ہمیں یہاں کا پتا بتا دیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ مذاق کیا تھا یا یہاں اگر ہم کسی فریب کا شکار ہو رہے تھے لیکن بہر حال میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

”شیرپا۔ تم یہیں روکو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر بستی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”چلو۔ میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“

بستی کے چہرے پر ایک لمحے کو تغیر سامنودار ہوا پھر اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو لیا۔

یہ پورا فلور بستی کے قبضے میں تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پانچ چھ کمرے تھے۔ پچھلی طرف ایک کشادہ بالکونی تھی۔ دائیں طرف ایک رابڈاری تھی۔ وہاں سے ایک تنگ سائز اوپر جانے کے لیے تھا اور ایک زینہ نیچے جانے کے لیے۔ اس عمارت کے پیچھے تنگ سی گلی تھی۔ رابڈاری میں دائیں طرف بھی ایک دروازہ تھا جس پر ٹالا لگا ہوا تھا۔

”اس کمرے میں کیا ہے۔ ٹالا کھولو۔“ میں نے بستی کو اشارہ کیا۔

”یہ ہمارا کمرہ نہیں ہے ہمارا۔“ بستی نے جواب دیا ”یہ زینے کا دروازہ ہے۔ اوپر کوئی اور رہتا ہے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

میں چند لمحے بستی کو دیکھتا رہا پھر واپس آیا۔

میں اور شیرپا باہر نکلے تو بستی کی پرپاں نے زوردار تہ

لگایا تھا۔ شیرپا تیزی سے پیچھے مڑا۔ ان کے قدموں کو یکدم بریک لگ گیا۔ میں شیرپا کو بازو سے پکچتا ہوا یا ہارے لے گیا۔

”دھوکا ہو گیا ہمارے ساتھ۔“ ان اندھیری اور گندمی گلیوں سے باہر آکر میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تم نے غلطی کی باس۔“ شیرپا بولا۔ وہ بیجنر سیٹ پر بیٹھا گیا ”اس کم بخت روہن اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔“

”وہ اب بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔“ میں نے انجن اشارت کر کے کار آگے بڑھا دی۔

اس وقت واقعی شدید بورت ہو رہی تھی بلکہ مجھے اپنے آپ پر تاناؤ آ رہا تھا کہ میں نے روہن کی بات پر یقین کیوں کر لیا تھا۔

نیا باجاری کی طرف گھومتے ہوئے میں نے گاڑی اشار ہوٹل کے گیٹ کی طرف موڑ دی۔ میں اس وقت جائے گا کی کافی شدید طلب محسوس کر رہا تھا۔ شیرپا نے بھی ایک کپ کافی کے خیال سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

گرما گرم کافی سے ذہن کو واقعی کسی حد تک سکون ملا تھا۔ کافی پینے کے بعد بھی ہم کافی پر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور جب ہوٹل سے باہر نکلے تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ شیرپا نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ پولیس اسٹیشن کی طرف سے ہوتے ہوئے چلیں۔ خیال برا نہیں تھا۔ روہن کو اس جھوٹ پر کم از کم سرزنش تو کی جاسکتی تھی۔

پولیس اسٹیشن کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا اس لیے اسٹیرنگ میں نے شیرپا کے حوالے کر دیا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن وہاں کی صورت حال ہماری توقع سے بالکل مختلف تھی۔

تھانے میں پہنچ کر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ روہن ہنگامے سے توڑ پھوڑ اور کم از کم پانچ آدمیوں کے قتل کے الزام میں پہلے ہی سے پولیس کو مطلوب تھا (ناگ پال کے گروہ کے تقریباً ہر آدمی پر اس قسم کے سنگین جرائم کے الزامات تھے) جو پولیس آفیسروں اور اس کے ساتھیوں کو مدھومالا والی کوٹھی سے لایا تھا وہ اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن تھانے میں آنے کے تقریباً بیس منٹ بعد وہاں آنے والے ایک اور آفیسر نے اسے پہچان لیا۔ اس کا اصل نام روہن بھی نہیں تھا۔ زبانی پوچھ گچھ کے دوران میں ہی روہن نے جب سے ایک کیپول نکال کر منہ میں ڈال لیا۔ کیپول نکلنے کے فوراً بعد ہی اسے خون کی الٹیاں ہونے لگیں۔ آئے فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ اس کی

لاش اس وقت بھی اسپتال میں پڑی تھی جبکہ روہن کے دوسرے دو ساتھیوں کو جامہ تلاشی کے بعد لاک میں بند کر دیا گیا تھا اور کسی بھی شخص کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہمارے لیے صورت حال خاصی مایوس کن تھی۔ تھانے میں کھلی پچی ہوئی تھی۔ میں نے اس آفیسر سے ملنے کی کوشش کی جو روہن اور اس کے ساتھیوں کو مدھومالا کی کوٹھی سے لے کر آیا تھا لیکن پتا چلا کہ وہ اسپتال گیا ہوا تھا جہاں روہن کی لاش کے پوسٹ مارٹم کا انتظام ہو رہا تھا۔ ہم کوٹھی پر واپس آگئے۔ اس وقت ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ مدھومالا اور شوہا جاگ رہی تھیں۔ ہم انہیں کچھ تاکر نہیں گئے تھے اس لیے وہ ہمارے لیے خاصی پریشان ہو رہی تھیں۔ تین بجے تک ہم لاؤنج ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہماری عدم موجودگی میں مدھومالا اور شوہا ایک دوسرے سے خاصی بے تکلف ہو چکی تھیں۔ مدھومالا اسے سلائے کے لیے بھی اپنے ہی کمرے میں لے گئی تھی۔

پڑی کی طرف جانے سے پہلے جب میں اور ملا یہاں رہے تھے تو شیرپا سرون کو وارڈ میں سوایا کرتا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ کوٹھی ہی کے ایک کمرے میں سوئے لگا تھا۔ مدھومالا نے کوٹھی کی حفاظت کے لیے اپنے قبیلے سے دو آدمی بھی منگوا لیے تھے۔ وہ دونوں گنگے بھائی تھے۔ پچھلے دنوں گاؤں میں ان کی والدہ کا ریمانٹ (انتقال) ہو گیا تھا اس لیے وہ واپس چلے گئے تھے اور شیرپا کے کہنے کے مطابق کل پرسوں تک قبیلے سے تین آدمی مزید یہاں آنے والے تھے۔

میں اور شیرپا لاؤنج ہی میں لیٹ گئے۔ میں صوفے پر راز ہو گیا تھا اور شیرپا قالین پر سو گیا تھا۔

”جس مات بے شیرپا نے مجھے سمجھو کر دیا۔“

”کیا بات ہے کیا ہوا؟“ میں اس طرح جگمگاتے جانے پر گڑبڑا گیا۔

انسپکٹر برینڈر کا فون ہے۔ وہ پولیس اسٹیشن پر تمہارا انتظار کر رہا ہے جہاں رات کو روہن نے خودکشی کی تھی۔“

مجھے اٹھ کر تیار ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس دوران میں شیرپا بھی نہ صرف تیار ہو گیا تھا بلکہ اس نے چائے بھی بنائی تھی۔ چائے پینے کے بعد میں نے شوہا کو بلایا اور اسے بتا دیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

پولیس اسٹیشن کی صورت حال بہت تشویش ناک تھی۔ کل پولیس اہلکار عمارت کے باہر بھی مستعد اور چاق و

جوبند کھڑے تھے۔ عمارت کا گیٹ اور دیواریں اس طرح چھپتی نظر آ رہی تھیں جیسے یہاں گولیوں کی بارش کی گئی ہو۔ گیٹ پر پچھتیں پولیس والوں نے ہمیں اندر نہیں جانے دیا۔ انسپکٹر برینڈر کو اطلاع بجھوائی پڑی جو خود باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔

عمارت کے گیٹ کے سامنے سڑک پر اور عمارت کے اندر بھی کئی جگہوں پر خون کے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔

انسپکٹر برینڈر نے جو کہانی سنائی وہ بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ میرے اور پاپے کے لیے یہ اس لیے بھی زیادہ سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی کہ نرزش رات ہم جس بات کو روہن کا مذاق سمجھتے تھے وہ حقیقت تھی۔ یعنی چانگ کی ریڈ لائٹ اس میں بستی بائی کے کوٹھے پر موجود تھا۔

انسپکٹر برینڈر کے مطابق اسے نہایت خفیہ ذرائع سے وہاں چانگ لی اور اس کے دو ساتھیوں کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ برینڈر نے رات دو بجے پولیس بانی کے ساتھ وہاں چھاپا مارا۔ چانگ لی اور اس کے ساتھی بستی کے کوٹھے کے اوپر والی منزل پر موجود تھے۔ عجبیہ رابڈاری میں جو دروازہ مقفل دیکھ کر میں لوٹ آیا تھا دراصل وہی اوپر جانے کا زینہ تھا۔ انسپکٹر برینڈر نے وہ ٹالا توڑ دیا اور دوسرے ہی لمحے اوپر سے ان پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔ پولیس نے بھی جواب میں فائر کھول دیا۔

چانگ لی کا ایک آدمی مارا گیا تھا جبکہ دوسرا چانگ لی کے ساتھ دوسری چھت پر کود کر فرار ہو گیا تھا۔ بستی اور اس کا ایک ساتھی بھی پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اور پھر صبح چار بجے ناگ پال کے درجن بھر مسلح آدمیوں نے اس پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا۔ ناگ پال کو رات ہی کو بستی کے کوٹھے پر چھاپے اور اسپتال میں روہن کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اس کے دو آدمی پولیس کی حراست میں تھے جنہیں چھڑانے کے لیے پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا گیا تھا۔

اس حملے میں وہ دونوں قیدی مارے گئے تھے۔ ناگ پال کے آدمیوں نے تھانے میں گھس کر انہیں حوالات سے نکال لیا تھا لیکن پولیس نے شدید مزاحمت کی اور ان دونوں قیدیوں کے علاوہ انہیں چھڑانے والوں میں سے بھی تین آدمی ہلاک ہو گئے تھے جبکہ پولیس کے دو آدمی بھی جان ہار گئے تھے اور تین زخمی ہو گئے تھے۔

تھانے پر حملے کی اطلاع بیڈ کو راز کر دی گئی تھی۔ انسپکٹر برینڈر اسی وقت بیڈ کو راز پر پناہ تھا۔ اطلاع ملنے ہی وہ بھی

نفری لے کر یہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے ایک اور تھانے کی نفری یہاں پہنچ چکی تھی۔ جب برینڈر یہاں پہنچا تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی آگئے تھے۔ چھ بجے تک لاشیں بھی اٹھوا دی گئی تھیں اور یہ کیس انسپکٹر برینڈر کو دے دیا گیا تھا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ چانگ لی، بستی بائی کے کوٹھے میں چھپا ہوا ہے؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ”کل دن میں ایک مکان پر چھاپے کے دوران میں ایک ایسا آدمی ہمارے ہاتھ لگا تھا جس نے ٹھوڑی دُکری کے استعمال کے بعد یہ راز فاش کیا تھا کہ چانگ لی کہاں ہے۔ میں نے دن ہی میں بستی کے مکان کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ رات کو مجھے اطلاع ملی کہ تم اور شیریا بھی وہاں گئے تھے۔ وہاں جانے کی کوئی خاص وجہ؟“ برینڈر نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”اس سے پہلے میں نے تمہیں فون کیا تھا مگر تم اپنے آفس میں موجود نہیں تھے۔“ میں نے جواب دیا ”میں تمہیں چانگ لی ہی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ رہن، وغیرہ، پولیس کے حوالے کرنے کے بعد میں نے خود چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور شیریا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا لیکن میں نے اس دروازے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی جس پر ہاتھ لگا ہوا تھا اور یہی میری غلطی تھی جس پر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن یہ بستی کون تھی؟“

”اے بہت اونچی چیز سمجھا جاتا تھا۔“ برینڈر نے جواب دیا ”ہمارے اس چھوٹے سے ملک میں بہت سی برائیاں جنم لے چکی ہیں۔ ہم جنس پرستی بھی یہاں بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال سے میری جس کے لوگ زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ بیگزے زیادہ تر اغلیا سے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں انہوں نے یہ دھندا شروع کر رکھا ہے۔“

”بستی چند سال پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے چند اور ہم جنسوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک گروپ بنالیا اور خود ان کا گرو بن بیٹھا۔ انڈیا سے بھی وقتاً فوقتاً ایسے لوگ آتے رہے۔ یہاں آتے ہی وہ بستی سے رابطہ کرتے۔“

”ہمارے بعض سیاست دان، سرکاری افسران اور دولت مند طبقے سے تعلق رکھنے والے بااثر لوگ بھی اس برائی میں مبتلا ہیں۔ بستی نے ایسے بہت سے بااثر لوگوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ ان تعلقات سے فائدہ اٹھا کر بستی نے منشیات فروشی کا دھندا بھی شروع کر دیا۔ دو سال پہلے

پولیس نے اسے پکڑا تھا مگر انہی بڑے لوگوں کی وجہ سے پولیس کو اسے چھوڑنا پڑا لیکن اس کے گردہ کو تہتر کر دیا گیا۔“

”کچھ عرصے بعد بستی نے دوبارہ اپنا اڈا بنالیا۔ اس نے اگرچہ منشیات کا دھندا چھوڑ دیا تھا لیکن ایسے لوگوں سے اس کے تعلقات بدستور تھے۔“

”بستی تقریباً چار مہینے پہلے میری نظروں میں آیا تھا۔ اسے ناگ پال کی حوٹلی میں آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ ناگ پال کی سرگرمیاں اس وقت کسی حد تک محدود تھیں اسی لیے میں نے بستی پر بھی توجہ نہیں دی۔“

”چند روز پہلے مجھے اطلاع ملی کہ ناگ پال کے گردہ سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں کو برا سراہ طور پر بستی کے کوٹھے پر آتے جاتے دیکھا گیا ہے لیکن اس وقت بھی میں نے یہ سوچ کر زیادہ توجہ نہیں دی کہ یہ لوگ عیاشی کے لیے آتے ہوں گے لیکن کل دن میں یہ انکشاف ہوا کہ چانگ لی بستی کے کوٹھے پر پناہ لیے ہوئے ہے۔ روپوشی کے لیے چانگ لی نے واقعی ایسی جگہ کا انکشاف کیا تھا جس پر شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن بالاخر اس کا راز فاش ہو ہی گیا۔ میرے آدمی اس معاملے کو پوری طرح پینڈل نہیں کر سکے اور اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔“

”مجھے روہن نے چانگ لی کے بارے میں بتایا تھا۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”لیکن جب میں شیریا کے ساتھ وہاں پہنچا تو بیگزوں کی فوج دیکھ کر میں سمجھا تھا کہ روہن نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا اور مزید مارے بچنے کے لیے اس نے ہمیں بستی کا پتا بتا دیا تھا اور اسی لیے میں واپس چلا آیا تھا۔ واپسی پر ہم تھانے کی طرف چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ میں روہن سے پھر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن وہاں صورت حال بدلی ہوئی تھی اور اب یہ سب کچھ سمجھنے میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا ”ایک رات میں تین خوفناک واقعات رونما ہوئے ہیں۔ میری تو عقل کم نہیں کر رہی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ برینڈر نے کہا ”ناگ پال کے حوالے سے اب حکومت نے بھی اپنی پالیسی بدل دی ہے۔ اس کے گرد گھبراہٹ نکال جا رہا ہے۔ اب اسے کوئی رعایت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ ذرا ابلج ہی ختم ہو جائے گا۔“

”مجھے یہاں کس لیے بلایا تھا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سب کچھ بتانے کے لیے۔“ برینڈر نے جواب دیا ”تمہیں کچھ عرصے کے لیے پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم اکیلے ہوتے تو میں زیادہ پریشان نہ ہوتا۔ میں تمہارے ساتھ شوہما بھی ہے اور اب تم ایک ایسی جگہ پر چلے گئے ہو جہاں ایک اور عورت بھی موجود ہے۔ مدھومالا ایک قابلِ سزا کی بیٹی ہے۔ اس نے اگرچہ اپنے تحفظ کے لیے کبھی حکومت سے رابطہ نہیں کیا لیکن اب ہمیں اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔ سادہ لباس میں ہمارے دو آدمی مدھومالا کی کوٹھی پر پہنچ گئے ہوں گے۔ وہ باہر دے کر کوٹھی کی نگرانی کریں گے۔ رات کو ان کی جگہ دوسرے آدمی پہنچ جائیں گے۔“

”مدھومالا کے قبیلے کے کچھ آدمی بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہ۔“

”اب میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔“ برینڈر نے میری بات کاٹ دی ”تم ان قابلِ سزا آدمیوں کو نہیں جانتے اس میں شبہ نہیں کہ یہ لوگ حکومت سے بہت تعلق ہیں۔ تعاون بھی کرتے ہیں لیکن جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو حکومت ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور پھر آج کل تو ناگ پال جیسے شیطان حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ عین ممکن ہے ناگ پال ہی مدھومالا کو کوئی نقصان پہنچانے کے بعد اس کے باپ کو حکومت کے خلاف اسانے کی کوشش کرے اس لیے ایسی کسی صورت حال سے بچنے کے لیے مدھومالا کو کوٹھی کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

ہماری ان باتوں کے دوران میں شیریا خاموش بیٹھا رہا تھا۔ میں اور برینڈر کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے اور پھر میں اٹھ گیا۔

جب ہم کوٹھی واپس پہنچے تو گیارہ بج رہے تھے۔ شوہما اور مدھومالا میں لاشیں پھینچی ہوئی تھیں۔ ہم بھی ان کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دو ہی منٹ بعد گیٹ پر دستک ہوئی تو شیریا اٹھ کر باہر چلا گیا اور پھر اس نے مجھے بھی اشارے سے بلایا۔

سادہ لباس میں پولیس کے دو آدمی آئے تھے۔ صرف اپنے آپ کو روشناس کرانے کے لیے انہوں نے ہمیں باہر بلایا تھا۔ چند منٹ ہم سے گپ شپ کرنے کے بعد ان میں سے ایک دائیں طرف چلا گیا اور دوسرا بائیں طرف۔

دونوں بڑی بوریت میں گزرا۔

رات نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ شیریا قریب تھا ”اس نے ریسپورڈ اٹھالیا۔ وہ کچھ دیر بات کرنا رہا پھر ٹھٹھے اشارہ کیا۔“

”تمہاری کال ہے۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسپورڈ اس سے لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر برینڈر ہوگا کیونکہ میرے بارے میں صرف اسی کو معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں یا پھر مایا ممتی ہو سکتی تھی لیکن ریسپورڈ پر سنائی دینے والی وہ آواز میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔

”میں گول بول رہا ہوں۔“ وہ شخص کہہ رہا تھا ”سو مہا کا دوست۔ تمہیں یاد ہوگا کس۔“

”ہاں ہاں۔ مجھے یاد آگیا۔“ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟“

”تم پہلے بھی یہاں رہ چکے ہو اور آج دن میں‘ میں نے تمہیں شیریا کے ساتھ دیکھا تھا۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”کون؟ کیا کتنا چاہتے ہو۔ کوئی خاص بات؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں اس چینی کی تلاش ہے نا جو گزشتہ رات ریڈ لاسٹ ایریا میں پولیس کے گھیرے سے فرار ہو گیا تھا؟“ گول نے کہا۔

”ہاں۔ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”آج شام کو ناگ پال کا ایک بہت قریبی آدمی میری نظروں میں آگیا تھا۔“ گول نے جواب دیا ”مجھے اس پر شبہ ہوا اور میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا جو ہنومانے کھولا کے کنارے پر واقع ایک پرانے مندر تک جاری رہا۔ وہ چینی بھی اس مندر میں موجود ہے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے اور کہاں پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ مندر بھگتا پور کے راستے میں ہے۔“ گول نے جواب دیا ”اس چینی کے ساتھ صرف ایک آدمی ہے جس کا میں نے تعاقب کیا تھا۔ اگر تم چاہو تو میں۔“

”تم اس وقت کہاں پر ہو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں آرنیکو روڈ پر باہر محل والے موٹر پوریا ریسٹورنٹ سے بول رہا ہوں۔ تم اگر آنا چاہو تو۔“

”میرا انتظار کرو۔“ میں نے ایک بار پھر اس کی بات

کاٹ دی ”مجھے وہاں تک پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔“ گول نے کہا ”پولیس کو ساتھ لے کر مت آنا۔ زیادہ لوگ ہوں گے تو وہ محتاط ہو جائیں گے اور پولیس کے طریقہ کار سے ویسے بھی تم واقف ہو۔“  
 ”میں اکیلا آؤں گا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

گول کی آخری بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس نے مجھے پولیس کو ساتھ لانے کو منع کیوں کیا تھا؟ میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں کیا جا رہا؟ گول کو میں خبر سے تو پہچانتا تھا۔ سوما کے ساتھ کئی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن ٹیلی فون پر اس کی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ تصدیق کیے بغیر میدان میں کود پڑا اگرچہ خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔  
 شیریا کو جب میں نے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔ ایک سے دو بھلے۔ شیریا ایک دلیر اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ آزمودہ کار تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ وقت پڑنے پر پیچھے نہیں ہٹے گا۔

میں نے بھی ہنڈلی کے فیتے میں خنجر لگا لیا۔ شیریا نے بھی پستول چیک کر کے جیب میں ڈال لیا۔ میں نے شوہا کو بھی بتا دیا کہ ہم کس مشن پر جا رہے ہیں۔ شوہا اس بات پر بعد بھی کہ میں خود ایسا کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے اننگلینڈ پر بندرا کو آگاہ کر دوں۔ پولیس اس معاملے سے خود ہی نمٹ لے گی لیکن میں اس قسم کی کامیابی کا سرا اپنے سر پر باندھنا چاہتا تھا۔ یہ عہد تو میں نے کر رکھا تھا کہ جزل گھوڑا کے آدمیوں کو یہاں قدم نہیں بھانے دوں گا۔

گول کی کال نوبت کے قریب موصول ہوئی تھی۔ ہم شر کے شمال میں تھے جبکہ ویرا ریسٹورنٹ شر کے جنوبی حصے میں واقع تھا۔  
 شیریا ڈرائیونگ کر رہا تھا اور میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ شر کی سڑکوں پر زندگی کے بنگاے شباب پر تھے ہر طرف چل پل نظر آرہی تھی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی رنگ روڈ پر آگئی اور وہاں سے آرٹیکو روڈ پر راج مارگ کی طرف مڑ گئی۔ یہی سڑک سیدی بھنگا پور کی طرف جاتی تھی۔  
 شر کی حدود سے تقریباً دو کلومیٹر آگے ایک موڑ پر باہر محل نام کی ایک قدم عمارت تھی۔ اس تاریخی عمارت کی وجہ

سے آس پاس کچھ آبادی بھی ہو گئی تھی۔ اس طرف بچہ اور پرانی عمارتیں اور کھنڈرات بھی تھے جنہیں دیکھنے کے لیے سیاح اس طرف آتے رہتے تھے لیکن شام کا اندھیرا چھینے کے بعد سیاحوں کی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی۔

ویرا ریسٹورنٹ سڑک کے موڑ پر ہی تھا۔ مقامی آبادی کی وجہ سے اس وقت یہاں خاصی رونق تھی۔ شیریا نے ریسٹورنٹ سے ذرا آگے گاڑی روک لی اور جب میں گاڑی سے اتر کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو پونے دس بج رہے تھے۔

گول مجھے دروازے کے قریب ہی ایک میز پر نظر آیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ اس نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔  
 ناگ پال کے ہاتھوں سوما اور اس کے دو تین آدمیوں کے قتل کے بعد اس کا گردہ منتشر ہو گیا تھا۔ بعض لوگ تو یہ شر ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے اور بعض اپنے طور پر زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور شاید گول بھی انہی میں سے ایک تھا۔

گول کے پاس موٹر سائیکل تھی لیکن اسے میں گاڑی کی طرف لے آیا تو شیریا کو دیکھ کر وہ کچھ جڑ بڑسا ہوا تھا۔ میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور شیریا گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔

گاڑی اس علاقے سے نکل کر مین روڈ پر بھٹکا پور کی طرف دوڑنے لگی۔ تقریباً پانچ کلومیٹر آگے دیرائے ہونامنے تھا جو آگے جا کر وائیں طرف ہماڑیوں میں مڑ گیا تھا۔

چاندنی رات میں آس پاس کا منظر بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن ایسے دل فریب مناظر سے لطف اندوز ہونا شاید میری قسمت ہی میں نہیں تھا۔ میں شاید جمالیاتی حس سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ میرا ذہن تو ہر وقت جنگجک خیالات کی آماجگ بنا رہتا تھا۔ کسی حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کا میرے پاس وقت ہی کب تھا۔

”گاڑی کی بیڈ پیس اور اندر کی جی بھی بچاؤ شیریا۔“ گول نے کہا ”اور آگے چل پار کرنے کے بعد گاڑی کو دائیں طرف موڑ لیتا۔“

دیرا پر یہ چل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بل پار کرتے ہی شیریا نے گاڑی دائیں طرف موڑ دی۔ یہ ایک کچا رات تھا جو دیرائے ساتھ ساتھ چلا گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار بھی کم کر پڑی تھی۔ تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مندر کی عمارت کا وہ بیولا دکھائی دینے لگا۔ چاندنی رات میں عمارت کا

وہ بیولا پراپر اسرار دکھائی دے رہا تھا۔  
 ”ہیس۔ اس طرف گاڑی روک لو۔“ گول نے ایک طرف اشارہ کیا۔

شیریا نے گاڑی کی رفتار کم کر کے اسے گمنان درختوں میں لے جا کر جھاڑیوں میں روک کر اچھن بند کر دیا اور ہم تین گاڑی سے اتر آئے۔ دروازے کھولنے اور بند کرنے میں ہم نے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔  
 مندر کی وہ عمارت وہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھی۔ چاندنی رات میں وہ عمارت خاصا پر اسرار منظر پیش کر رہی تھی۔ ہم گول کے پیچھے درختوں میں چلتے رہے اور عمارت سے تقریباً مائیں گز کے فاصلے پر رک گئے۔

”اس عمارت کا مین گیٹ دریا کی طرف ہے۔“ گول نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیاں لیجے میں کہا ”لیکن ایک دروازہ اس طرف بھی ہے۔ جس طرف مندر کے پچھلے حصے میں یہ خانے کا راستہ ہے۔ وہ چینی اس خانے میں ہے۔“

عمارت میں داخل ہوتے ہوئے ہم خاصے محتاط ہو گئے۔ شیریا نے پستول نکال لیا تھا۔ گول کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آرہا تھا۔

مندر کی ٹوٹی پھوٹی یہ عمارت غالباً صدیوں پرانی تھی۔ اندرونی کھینچناٹا طاری تھا۔ اوپر کی طرف کئی ٹوٹی ہوئی دیوار سے مدھم سی چاندنی عمارت کے اندر بھی پہنچ رہی تھی اور فرش پر چاندنی کا وہ دھبہ پراپر اسرار تاثر دے رہا تھا۔

اس کھنڈر نما عمارت میں کسی طرف آہٹ سن کر میں ٹھک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا پتھر لڑھکا ہو۔  
 ”گوئی جانور ہوگا۔“ گول نے سرگوشی کی ”اس طرف چلتے رہو۔“

گول آگے اور ہم اس کے پیچھے چلتے رہے۔ آگے اعلان تھی۔ صاف لگ رہا تھا جیسے ہم زمین کے سینے میں اتر رہے ہوں۔ گول نے ایک بار پھر رکنے کو کہا۔ اس وقت ہم تقریباً مائیں فٹ نیچے آچکے تھے۔  
 ہم تینوں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے اب آگے راستہ ہوا کرتا تھا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک بار پھر رک گئے۔ میں نے دیوار کی دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ آگے کو ایک مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ اس متحرک روشنی کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس طرف کوئی مشعل جل رہی تھی جس کی لوہو سے کپکپا رہی تھی۔

”اس راہداری میں بائیں طرف وہ کمرہ ہے جہاں روشنی ہو رہی ہے۔“ گول نے سرگوشی کی ”وہ چینی اسی کمرے میں ہے۔ وہ دو سرا آوی بھی اسی طرف۔“ گا۔

ٹھک اسی وقت عقب میں ڈھلان کی طرف سے ایک بار پھر کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ گول کے بارے میں بھی میرا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ فون پر اس نے بتایا تھا کہ اس نے جس شخص کا تعاقب کیا تھا اسے اس مندر میں داخل ہوتے دیکھا تھا لیکن گول اس مندر میں داخل ہو کر جس طرح ہمیں یہاں تک لایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مندر کے اندرونی راستوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔

ہم اس راہداری میں مڑ گئے۔ میں نے پتلون کے پانسے سے خنجر بھی نکال لیا تھا اور یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تو کم از کم گول تو میرے ہاتھ سے زندہ نہیں بچ سکے گا۔

ہم اس کمرے کے قریب رک گئے۔ کسی زمانے میں یہاں کوئی مضبوط قسَم کا دروازہ بھی رہا ہو گا لیکن اب تو چوکھٹ بھی غائب تھی۔ بے پور میں مجھے کئی مندر دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کے نیچے نہ صرف یہ خانے تھے بلکہ ایسے خفیہ راستے بھی تھے جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہاں بھی کوئی خفیہ راستہ ضرور ہوں گے۔

میں نے دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور بائیں طرف ایک شان دار بیڈ بچھا ہوا تھا۔ اس سے آگے ایک کافی ٹیبل اور تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر چائیکلی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے دو سری کرسی پر نیم عریا لباس میں ایک عورت تھی۔ میز پر شراب اور سوڈے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں شراب کے گلاس نظر آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ پلانے کا دورا بھی شروع ہوا تھا۔

میری آنکھوں میں ایک لمحے کو ابھرنی سی تیر گئی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اس آدمی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا گول نے تعاقب کیا تھا۔ چائیکلی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ باہر میں نے درجہ پتھر لڑھکنے کی آواز سنی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ شخص باہر کسی جگہ موجود ہو اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔ بہ حال اب اوکھلی میں سر دیا جا چکا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ موصول سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

گول نے مجھے اشارہ کیا تو میں خنجر سنبھالے دروازے

میں داخل ہو گیا۔ شیرا بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ چانگ لی کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ اس طرح اچھلی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ خوف سے اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا تھا۔ شراب کا گلاس بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شراب اس کے اوپر گری گئی۔

چانگ لی نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل پرسکون تھا۔ لگتا تھا جیسے ہماری آمد اس کے لیے غیر متوقع نہ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر آنے والی خفیف سی مسکراہٹ نے میرے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ تاہم وہ عورت میرے ہاتھ میں خنجر اور شیرا کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر خوف زدہ ہوئی تھی۔

”دلیل کم۔“ چانگ لی میری طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا ”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ بستی کے کوٹھے پر میرا اور تمہارا آتنا سامنا نہیں ہو سکا تھا لیکن یہاں سے تم واپس نہیں جاسکو گے۔“

”ہاتھ اوپر اٹھا لو چانگ لی۔“ میں نے کہا ”تمہارے دن پورے ہو چکے ہیں۔ تمہارا کھیل ختم ہو۔“

میری سر پر بڑے والی زوردار ٹھوکر مارنے میرا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ میں لڑکھڑاکر آگے گرا۔ شیرا بھی کراہتا ہوا آگے کو گرا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا جو فرش پر لڑھکا ہوا چانگ لی کے پیروں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ چانگ لی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے جھک کر وہ پستول اٹھالیا۔

میں کمرے کے وسط میں منہ کے بل گر گیا تھا۔ خنجر میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے گردن گھما کر دیکھا۔ گول کے بارے میں میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خفاہٹ آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس نے شیرا کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔

”مجھے تم پر پہلے ہی شبہ تھا گول۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں نفرت نمایاں تھی ”افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نے اپنے گرو سوبا سے کچھ نہیں سیکھا جس نے اپنی جان دے دی لیکن سچائی کا دامن نہیں چھوڑا۔“

”وہ بے وقوف تھا۔“ گول نے ہنستے ہوئے جواب دیا ”مصل مند تو وہی ہوتا ہے جو حالات کا رخ دیکھ کر قدم اٹھاتا جانتا ہو۔ میں نے بھی وہی کیا جو ان حالات میں مجھے کرنا چاہیے تھا۔“

”تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو۔“ میں نے کہا ”تم نہیں جانتے۔۔۔“

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر دائیں طرف دیکھا۔ پہلے میں نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس طرف بھی ایک تنگ سادہ روزانہ تھا جہاں سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ سامنے والی کھڑکی میں بھی ایک آدمی نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔

ہمارے خائنوں کی تعداد اب چار ہو گئی تھی۔ وہ ہم عیاں لڑی اور چانگ لی اس تعداد میں شامل نہیں تھے۔ لڑی تو ویسے ہی خوف سے ہر تھر کا پ رہی تھی۔ اس سے کئی مقابلے کی توقع نہیں تھی۔

”خنجر پھینک دو اور تم دونوں سامنے والی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔“ چانگ لی نے میری اور شیرا کی طرف دیکھتے ہوئے پستول سے اشارہ کیا ”کل رات تمہیں بستی کے مکان میں دیکھ کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میں تمہاری ذہانت کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم نے جس طرح میرے اس ٹھکانے کا پتا لگایا وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے اور تم سے پیچھا چھڑانا ہم ضروری تھا۔ اس کے لیے میں نے گول کو چارے کے طور پر استعمال کیا اور تم بڑی آسانی سے یہاں پہنچ گئے اور تم یہاں بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ پیسے سے ہریز کو خریدنا جاسکتا ہے۔ انسان بھی۔ ہر انسان کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ میں نے گول کی قیمت لگائی تو یہ ہمارے ہاتھ تک گیا اور ہمیں یہاں لے آیا۔ تم سے تو برا لمبا جوڑا حساب کرنا ہے۔ پانچ سو گلو ہیروئن۔۔۔ اپنے آدمیوں کے قتل کو میں بھول سکتا ہوں لیکن پانچ سو گلو ہیروئن کو نہیں لیکن تمہارے ساتھ حساب کتاب شروع کرنے سے پہلے میں گول کا حساب کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تمہیں یہاں لا کر اس نے بہت بڑا کام کیا ہے اور یہ انعام کا مستحق ہے۔ جامو!“

اس نے آخری الفاظ گول کے قریب کھڑے ہوئے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے ادا کیے تھے۔ جامو یقیناً اسی شخص کا نام تھا۔ چانگ لی نے کہا ”گول کو انعام دے کر فاسف کردو جامو۔“

جامو، گول کی طرف مڑا۔ اس نے بڑی تیزی سے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر ٹیگر دیا دیا۔ کرا گولی کی آواز ادا گول کی چیخ سے گونج اٹھا۔ گولی گول کی پیشانی میں لگی۔ اس کے ہونٹے درخت کی طرح لہرنا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ

سے نکل کر قریب ہی گر گیا تھا۔

”بزداری کا انعام تو یہی ہوتا ہے۔“ چانگ لی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس نے اپنے پاس سے بھی غدار کی سی تھی۔ اگر یہ اپنے پاس کوڑھ کا نہ دیتا تو وہ بھی نہ مارا جاتا۔ اس وقت ہم نے اسے زندہ رکھا تھا کیونکہ اس سے ایک دو اور کام لینا پاتے تھے۔ سب سے بڑا کام تو یہ تھا کہ یہ ہمیں یہاں لے آیا۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس جیسے لوگوں کا انجام تو یہی ہوتا چاہیے تھا۔ یہ اپنے دوستوں سے اور اپنے کاڑ سے وفائیں کر سکا ہمارا وفادار کیسے رہتا۔“

”بہت اچھا کیا تم نے۔“ میں نے کہا ”اگر تم اسے معاف کر دیتے تو میں اسے سزا ضرور دیتا۔“

”اب تم دونوں اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔“ چانگ لی نے پستول سے اشارہ کیا ”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہ جگہ تو ہم نے آج کے اس پروگرام کے لیے منتخب کی تھی۔ ہماری اصل منزل تو ریور ویلی میں واقع وہ حویلی ہے جہاں ناگ پال، ہمارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں نے خنجر ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اٹھتے ہوئے کن انکھیں سے شیرا کی طرف دیکھا۔ گول کی لاش شیرا سے چند فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی اور پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ شیرا کی نظریں پستول پر تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔

دروازے کے قریب کھڑے ہوئے جامو نے شاید کچھ اندازہ لگالیا تھا۔ وہ گول کا پستول اٹھانے کے لیے جھکا تو ٹھیک اسی وقت شیرا نے سانپ کی سی سرعت سے اپنی جگہ سے لوٹ لگا دی۔ اس کے پیروں کو جامو کے سینے پر پڑی۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ شیرا نے بڑی پھرتی سے زمین پر پڑے ہوئے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ پستول ہاتھ میں آتے ہی اس نے ٹیگر دبانے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

میں نے بھی وقت ضائع کیے بغیر اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور ہوا میں اڑتا ہوا چانگ لی کے اوپر جا گرا۔ شیرا والا پستول اگرچہ چانگ لی کے ہاتھ میں تھا لیکن اسے ٹیگر دبانے کا موقع نہیں مل سکا۔

میں چانگ لی کو ساتھ لیتا ہوا کرسی سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ وہ عورت بھی پیچھے ہوئی اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ اسے غالباً چانگ لی کا دل بھلانے کے لیے یہاں لایا گیا تھا لیکن اس خطرناک صورت حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

چانگ لی کا یہ کہنا بھی درست ہو سکتا تھا کہ مجھے یہاں سے دینے کے لیے اس جگہ کا انتخاب وقتی طور پر کیا گیا تھا لیکن یہاں کے انتظامات دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں تھا کہ اس سے پہلے بھی یہ جگہ استعمال ہوتی رہی تھی۔

چانگ لی میرے پیچھے دب گیا تھا۔ وہ لٹکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے دبوچ لیا۔ اسی لمحے کھڑکی کی طرف سے غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”چھوڑو مسٹر۔ پاس کو چھوڑ دو ورنہ گولی مار دوں گا۔“ لیکن میں نے چانگ لی کو نہیں چھوڑا۔ میں اسے اس طرح رگید رہا تھا کہ اپنے آپ کو اس کی آڑ میں رکھوں تاکہ اس کے کسی آدمی کی گولی مجھے نشانہ نہ بنا سکے۔

شیرا نے جامو کو پہلے ہی فائر میں ڈھیر کر دیا تھا لیکن وہ خود سنبھل نہیں پایا تھا کہ اندرونی دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے فائر کرنے کے بجائے پستول سے شیرا کے کندھے پر ضرب لگائی۔ شیرا کراہ اٹھا۔

کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا آدمی بھی چھلانگ لگا کر اندر آ گیا۔ وہ مجھ پر پستول کے دتے سے وار کرنے کے لیے ادھر ادھر تاننے لگا لیکن میں اسے موقع نہیں دے رہا تھا۔ میں چانگ لی کو گرفت میں لے لے ادھر سے ادھر لوٹ لگا رہا تھا۔ اور پھر چانگ فضا ترخا ہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ فائرنگ کی یہ آواز کھڑکی کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز بھی گونج اٹھی۔

”خنجر! پولیس نے اس مندر کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔“

چانگ لی کے دونوں ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ کھڑکی کی طرف سے دو آدمی کو در اندر آگے۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ دونوں وہی تھے جنہیں مدھولا کی گولی کی گھرائی پر تعینات کیا گیا تھا۔ میں نے بھی چانگ لی کو چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ چانگ لی بھی ہاتھ اٹھاوے گا لیکن اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور دروازے کی دوسری طرف راہداری میں جا گرا۔ اندھیرے میں ایک طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں بھی قدموں کی آواز پر اس طرف دوڑ پڑا۔

ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے مندر سے باہر آگئے۔ چانگ لی مندر کی چھتھی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ مجھ سے دس بارہ گز آگے تھا۔ اس طرف تو درگنجان بھاٹیاں تھیں

اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ان جھاڑیوں میں غائب نہ ہو جائے۔ میں نے بھی اس طرف دوڑ لگا دی۔

میں نے چانگ لی کو جھاڑیوں میں چالیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں اسے بچہ دیر تک جھاڑیوں میں رگیدتا رہا لیکن بالآخر وہ میری گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا۔

اس مرتبہ ہم جس جگہ گرے تھے وہاں پانی پھیلا ہوا تھا۔ چانگ لی میرے پیچھے دب گیا تھا لیکن اس نے مجھے بیروں سے دور اچھال دیا۔ میں پشت کے بل پانی میں ڈوبی ہوئی جھاڑیوں میں گرا۔ میرا خیال تھا کہ چانگ لی ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن اس مرتبہ اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی اور پیٹنے پر سوار ہو کر دونوں ہاتھوں سے میرے منہ پر گھونسلوں کی بارش کر دی۔

میرے دونوں جڑوں پر کھونٹے پھنوسوں کی طرح برس رہے تھے لیکن ایک موقع پر میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اسے نیچے کی طرف پھینکے گا۔ چانگ لی میرے اوپر جھٹکا چلا گیا۔ میں نے موقع ملنے ہی اس کے چہرے پر سرے زوردار ٹکرماری۔

ٹکرماری کی ناک پر لگی۔ وہ چیخ اٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی میری گرفت میں تھے۔ میں نے اسے اپنی طرف پھینچتے ہوئے ایک اور ٹکرماری اور اسے ایک طرف اچھال دیا۔

چانگ لی شڑپ کی آواز سے جھاڑیوں کے اندر پانی میں گرا۔ میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چانگ لی کو سنبھلنے کا موقع دے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

جزل کھوراث کے آدمیوں سے طویل عرصے تک میرا واسطہ رہا تھا۔ پہلے تھائی لینڈ میں اور پھر گولڈن ٹرائی ۱۔ ٹنگل میں۔ یہ لوگ خون خوار بھیڑیوں سے کم نہیں تھے۔ تھائی لینڈ کے سرحدی قصبے چینگ سائین میں تو ایک مرتبہ چانگ لی سے بھی آمناسامنا ہو چکا تھا۔ اس میں اب بھی بلا کی طاقت بھری ہوئی تھی لیکن گزرے ہوئے وقت نے اس پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ڈالا تھا اور اب اس میں وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اب وہ جم کر مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی جان بچا کر بھاگنے کی فکر میں تھا۔

چانگ لی کو ایک بار پھر موقع مل گیا۔ اس نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا اور اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے

اٹھ کر اس کے پیچھے چھلانگ لگانا چاہی تو پانی میں میرا پیر پھسل گیا۔ میں پشت کے بل گر گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔

چانگ لی اس دوران میں پیچھے تیس گز دور نکل چکا تھا۔ اس کے کپڑے اور جوتے بھی پانی میں بھیجے ہوئے تھے اور شاید اسی لیے اس سے بھی زیادہ تیز نہیں دوڑا جا رہا تھا۔ میں نے جلد ہی اسے چالیا۔

اس مرتبہ میں نے اسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر لاتوں اور گھونسلوں کی بارش کرتا رہا۔ اس دوران میں ایک آدمی دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔

وہ ان دو پولیس والوں میں سے ایک تھا جو ہماری مدد کے لیے بروقت مندر میں پہنچ گئے تھے۔ اس نے بھی چانگ لی کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چانگ لی کی چیخیں ویرانے میں گونجتی رہیں اور بالآخر وہ مواسا ہو کر گر گیا۔

میں نے جھک کر چانگ لی کو گریبان سے پکڑنا چاہا تو اس نے اچانک ہی میرے جڑے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ میں کراہتا ہوا لٹکڑا گیا۔ میرے قریب کھڑا ہوا پولیس والا اس پر پل پڑا اور اس وقت تک چانگ لی پر ٹھوکریں برساتا رہا جب تک وہ ایک بار پھر بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔

پولیس والا چند لمبے کھڑا ہوتا رہا پھر جھک کر چانگ لی کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جینکٹ کی اندرونی جیب سے پستول برآمد ہوا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ چانگ لی نے پستول استعمال کیوں نہیں کیا تھا اور پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی۔ مندر کے خزانے سے وہ بدحواسی کی کیفیت میں بھاگا تھا اور پھر یا ہر آکر میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ ہو سکتا ہے بھاگ دوڑ میں اسے پستول نکالنے کا خیال نہ رہا ہو یا اسے موقع ہی نہ ملا ہو۔

چانگ لی بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال دیے اور اسے جھاڑیوں میں کھینچے ہوئے مندر کی طرف لے جانے لگے۔

دوسرا پولیس والا اور شریا چانگ لی کے دوسرے دو آدمیوں کو مندر سے باہر لے آئے تھے۔ وہ عورت بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ خوف سے تھر تھرا کانپ رہی تھی۔ گول اور جامو وغیرہ کی لاشیں نہ خائے ہی تھیں چھوڑ دی گئی تھیں۔

چانگ لی کوئی دس منٹ بعد ہوش میں آسکا تھا۔ ہم ان سب کو پستولوں کی زد پر اس جگہ لے آئے جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ کار سے چند گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں ایک جیب بھی موجود تھی۔

ان سب کو باندھ کر جیب میں ڈال دیا گیا۔ اس دوران

میں ایک پولیس والا بتا رہا تھا کہ جب میں اور شریا اپنی کار پر کونھی سے نکلے تھے تو انہیں کسی گز بڑا کاشہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے جیب پر ہمارا پیچھا شروع کر دیا اور سیلوٹرون پر ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی تاکہ کونھی کی نگرانی کے لیے دوسرے آدمیوں کو بھیج دیا جائے۔

چانگ لی اور اس کے ساتھیوں کو جیب میں ڈالنے کے بعد اس پولیس والے نے سیلوٹرون نکال لیا اور ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے صورتحال سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ چند منٹ فون پر بات کرتا رہا پھر فون بند کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہم انہیں لے کر ہیڈ کوارٹر جا رہے ہیں۔ آپ لوگ اپنی کونھی پر چلے جائیے۔ انسپٹر بریندرا بعد میں آپ سے رابطہ کریں گے۔“

”اور ان لاشوں کا کیا ہو گا؟“ میں نے مندر کی طرف دیکھا۔

”پولیس کی ایک پارٹی یہاں آجائے گی۔ ان لاشوں کا بندوبست بھی وہی لوگ کریں گے۔“ پولیس والے نے جواب دیا۔

میں اپنی کار کی طرف ہوتے ہوئے جیب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چانگ لی کے قریب رک گیا۔ اس کے پیر بھی بندھے ہوئے تھے اور ہاتھ بھی پشت پر سی میں جکڑے ہوئے تھے۔

”میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا چانگ لی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جزل کھوراث کے آدمیوں کو یہاں قدم نہیں جمائے دوں گا۔ پہلے میں نے بیرونی کی بڑی کھپ پر قبضہ کیا اور اب تمہیں پولیس کے حوالے کر رہا ہوں۔ جزل کھوراث نے اس خپلے کے حوالے سے جو منصوبے بنائے تھے وہ خاک میں مل چکے ہیں۔“

”تمہاری خوش فہمی ہے۔“ چانگ لی نے کہا ”ہیروئن کی ایک کھپ پکڑے جانے سے یا دو چار آدمی مارے جانے سے جزل کھوراث کے منصوبے متاثر نہیں ہوتے۔ پانچ سو کلومیٹر کے لیے ایک چٹکی کے برابر ہے۔ اس ہیروئن کے پکڑے جانے سے نہ تو وہ قلاش ہوا ہے اور نہ ہی اس کے آدمیوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ جب تک ناگ پال جیسے لوگ اس ملک میں موجود ہیں جزل کھوراث کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ میرے پکڑے جانے سے منصوبہ ختم نہیں ہو گیا۔ تمہیں کیوں کہ بہت جلد ہی پورا خطہ ہمارے قبضے

میں ہو گا۔ یہاں کے سیاست داں اور حکمران بھی ہماری مرضی پر چلیں گے۔“

”تم لوگوں کا یہ گھناؤنا منصوبہ کبھی پورا نہیں ہو گا۔“ میں نے جواب دیا ”یہاں سوما جیسے عجب وطن اور بریندرا جیسے فرض شناس آفسروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بہر حال یہ وقت بتائے گا کہ یہاں کامیابی انسانیت کی ہوتی ہے یا تم جیسے شیطان قدم جمائے میں کامیاب ہوتے ہیں۔“

میں اپنی کار کی طرف آگیا۔ شریا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں پیچڑی لٹ پٹت ہو رہا تھا۔ میں نے پچھلی سیٹ پر ڈرا ہوا ایک کپڑا اٹھا کر پیچڑی سیٹ پر ڈال دیا اور اس پر بیٹھ گیا۔

پہلے جیب حرکت میں آئی اور اس کے پیچھے ہماری گاڑی۔

رنگ روڈ سے جیب ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑی اور شریا نے اپنی کار دوسری سڑک پر ٹھکادی۔ جب ہماری کار کونھی میں داخل ہوئی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میری حالت دیکھ کر مدھومالا اور شوبھا مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ میں لاؤنج میں رکے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں جسم پر تو لیا پیٹ کر ہاتھ روم سے برآمد ہوا۔ الماری سے کپڑے نکال کر پہنے اور لاؤنج میں آگیا۔ شریا مدھومالا اور شوبھا کو اس مشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

مدھومالا چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی چمکیوں کے دوران میں بھی ہم یہی باتیں کرتے رہے اور پھر پڑھ بچے کے قریب فون کی کھنٹی بجی تو میں نے اٹھ کر ریمپور اٹھا لیا۔ ریمپور اٹھانے سے پہلے میرا اندازہ تھا کہ یہ انسپٹر بریندرا کی کال ہو گی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ کال انسپٹر بریندرا ہی کی تھی لیکن اس نے جو خبر سنا لی تھی وہ بڑی خوفناک تھی۔

ناگ پال کے آدمیوں نے رنگ روڈ پر مہاراج بنج کے قریب جیب پر حملہ کر کے چانگ لی کو جھڑپا لیا تھا۔ اس جھڑپ میں دونوں پولیس والے مارے گئے تھے۔

میری ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ ناگ پال کے آدمیوں کو چانگ لی کے پکڑے جانے کی اطلاع کیسے ملی تھی اور انہیں کیسے پتا چلتا تھا کہ چانگ لی کو جیب پر پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس جھڑپ میں دونوں پولیس والوں کے علاوہ وہ

فیصلہ کر لیا۔ میں نے مدھوالا کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

”اگر تم ان لوگوں کی وجہ سے کچھ الجھن محسوس کر رہے ہو تو میں انہیں واپس بھیج دیتی ہوں۔“ مدھوالا نے کہا۔

”نہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے کوئی پریشانی نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”تم میرے حالات سے واقف ہو۔ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں یا دوسرے بے گناہ لوگوں کو کوئی نقصان پہنچے اس لیے میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ویسے ہم تم سے ملنے رہیں گے اور فون پر بھی ہمارا آپس میں رابطہ رہے گا۔“

شیرپا بھی میرے اس فیصلے سے کچھ جزیبہ سا ہو گیا تھا لیکن اس نے ہمیں روکنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ میں نے اسپتال فون کر کے ماما کو بتا دیا کہ دوپہر کے بعد ہم اس کے مکان میں چلے جائیں گے وہ میرے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے بتا دیا کہ مکان کی چابی وہیں لے گی جہاں پہلے رکھی رہتی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے مدھوالا وغیرہ کے ساتھ ہی کھایا اور پھر ہمارا سوٹ کیس شیرپا نے گاڑی میں رکھ لیا۔ میرے اور شوہنہ کے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں ایک ہی سوٹ کیس میں تھیں۔

دلی بازار سے کانچ ہول کی طرف گھومنے کے بعد میں شیرپا کو رات بتاتا رہا۔ اس طرح ماما متی کے مکان تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

میں نے راستے میں ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خرید لی تھیں جو میں نے اور شیرپا نے اٹھ کر اندر پہنچا دیں۔ شیرپا پہلی مرتبہ ہمارے ساتھ یہاں آیا تھا۔ وہ کھوم پھر کر مکان کو دیکھتا رہا اور پھر تھوڑی سی دیر بعد واپس چلا گیا۔

یہاں آنے کے بعد میں نے فون پر انسپکٹر برینڈر کو بھی اطلاع دے دی۔ اس سے کچھ تاخیر خبریں بھی مل چکیں لیکن چانگ لی کے معاملے میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے رپورٹ ملی میں اس حوالی کا سراغ تو لگایا تھا لیکن وہاں انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ چانگ لی کی تلاش کے لیے میں نے ایک بار پھر میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی شام پانچ بجے کے قریب ہم اسپتال پہنچ گئے۔ اسپتال میں سب سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اسے پرائیویٹ روم میں منتقل کیا جا چکا تھا اور اتفاق سے یہ کمرہ بھی ماما متی ہی کے چارج میں تھا۔ سب کے ہاتھوں اور بیویوں کے زخم بکڑ چکے تھے اور ماما متی کے کسنے کے مطابق اس کے زخم

عورت اور چانگ لی کا ایک ساتھی بھی مارا گیا تھا جبکہ حملہ آور چانگ لی اور ایک آدمی کو چھڑا کر لے گئے تھے۔ ایک پولیس والا اسپتال جانے تک زندہ رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ فائرنگ کے تبادلے کے دوران میں چانگ لی بھی زخمی ہوا تھا۔ اسے شاید پیٹھ اور ٹانگ میں گولیاں لگی تھیں۔

برینڈر اسے فون پر بات کرتے ہوئے اچانک ہی مجھے مندر میں چانگ لی سے ہونے والی گفتگو یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رپورٹ ملی جانے والے ہیں جہاں کسی حویلی میں ناگ پال ان کا منتظر تھا۔ میں نے انسپکٹر برینڈر کو اس بارے میں بتا دیا۔

”ہو سکتا ہے وہ لوگ چانگ لی کو رپورٹ ملی میں واقع اس حویلی میں لے گئے ہوں!“ میں نے کہا۔

”رپورٹ ملی میں واقع حویلی۔“ انسپکٹر نے کہا۔ اس کے لمبے میں سوچ کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”رپورٹ ملی تو بہت لمبا چوڑا علاقہ ہے۔ اس طرف بھی کئی قدیم حویلیاں ہیں۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ چانگ لی کس حویلی کی بات کر رہا تھا۔ بہر حال“ میں صبح تم سے بات کروں گا۔“

برینڈر نے فون بند کر دیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر شوہنہ کے قریب بیٹھ گیا۔

رات ہی کو دو بجے دوسرے سادہ لباس والے کوٹھی کی گھرائی کے لیے پہنچ گئے تھے اور صبح گیارہ بجے کے قریب مدھوالا کے قبیلے کے چار افراد بھی پہنچ گئے۔ ان میں تین مرد اور ایک عورت تھی۔ عورت نکلتے ہوئے قد اور صحت مند جسم کی مالک تھی۔ اس کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ تینوں مرد بھی دراز قامت اور دلکش نقش و نگار کے مالک تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ مدھوالا کے قبیلے کے لوگ بہت حسین اور خوب رو تھے۔

مردوں کو کوٹھی کے سروٹھ کو اردر میں ٹھہرایا گیا جبکہ باندی نام کی اس عورت کو کوٹھی کے اندر جگہ دی گئی تھی۔

آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے اپنی ڈسے داریاں سنہیل لی تھیں۔ باندی جس طرح کام میں مصروف ہو گئی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پہلے بھی یہاں آتی رہی تھی اور اس کوٹھی کے نقشے سے خوب اچھی طرح واقف تھی۔

دو دن بعد میں نے اندازہ لگالیا کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں بہت سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی اس لیے میں نے ماما متی والے مکان میں واپس جانے کا



ٹھیک ہونے کے لیے کم از کم ایک مہینے کا وقت درکار تھا۔ ہم سات بجے تک اسپتال میں رہے۔ مایا میا کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ وہ نئی نرس کو چارج دے کر ہمارے ساتھ ہی اسپتال سے نکلی تھی۔ میں نے ان دونوں کو ایک ٹیکسی پر بٹھا کر گھر کی طرف روانہ کر دیا اور خود شہر کے وسطی علاقے میں اندرا چوک کی طرف آ گیا۔ یہ شہر کے ان علاقوں میں سے ایک تھا جہاں شام ہوتے ہی غذا عناصر کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو ایسے ہی کسی علاقے میں مل سکتا تھا لیکن ایک دو جگہوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ درگنا نام کا وہ شخص دربار اسکواری کی طرف لے گا۔ میں ماہن ٹول کے علاقے سے ہوتا ہوا دربار اسکواری کی طرف آ گیا۔

درگنا کمار کی منزل کی بدھ عبادت گاہ سے ذرا آگے بسنت پورہ کے ایک تھڑکاس ریٹورنٹ میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ اس نے مجھے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہاں بیٹھ کر اس سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہم فریک اسٹریٹ پر ایک اور ریٹورنٹ میں آ گئے۔ یہ ذرا مزگا ریٹورنٹ تھا اور یہاں گاؤں کی آمد رفت بھی محدود ہی رہتی تھی۔

درگنا سے میری پہلی ملاقات سوہا کے توسط سے ہوئی تھی۔ وہ کرنی کا ناجائز دھندا کرتا تھا۔ اس سے پہلے وہ بھی منشیات ہی کے کاروبار سے وابستہ تھا لیکن سوہا سے ملاقات کے بعد اس نے منشیات کا بزنس چھوڑ کر کرنی کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں تھا۔ ہمیشہ اکیلے ہی کام کرتا تھا۔

”کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟“ میں نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”اعتماد ہی تو اپنا دھندا چل رہا ہے۔“ درگنا نے جواب دیا ”جراثیم پیشہ ہیں تو کیا ہوا۔ پر اسے بھی کچھ اصول ہیں اور سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کسی کو دھوکا دے کر اس کے اعتماد کو ٹھیس مت پہنچاؤ۔“

”مجھے سوہا جیسا ایک کھرا آدمی ملا تھا لیکن افسوس کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔“ گوئل نے مجھے دھوکا دیا۔ اب مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جس پر میں بھروسہ کر سکوں۔“ میں نے کہا۔

”اپنی جان بھی چلی جائے گی تو تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تم کام تو بتاؤ؟“ درگنا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھادیا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چہرے کے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اسے بتانے لگا کہ میں اس کا کام لینا چاہتا ہوں۔

”کام خطرناک ہے۔“ درگنا نے کہا ”مگر آئیے اسے جانچ لیں۔“ ناگ پال باہل ہو چکا ہے اس نے اس کی اپنی راجدھانی قائم کر رکھی تھی۔ یہاں اس کا کلرک سیاست دان، منتزی اور بڑے بڑے سرکاری آفیسر کے سامنے سر جھکانے کھڑے رہتے تھے۔ اس کے اشارے پر شہر بند ہو جاتا تھا لیکن جب سے انسپکٹر اعظم کے یہاں آئے ہو اس کے سارے معاملات گز رہے ہیں۔ اس نے ہیروئن کی سپلائی کا بہت بڑا منصوبہ بنایا لیکن شہماری وجہ سے اس منصوبے کا سنیاٹاں ہو گیا۔ لیکن شخص ہو جس نے اسے اتنا نقصان پہنچایا ہے۔ چند روز پہلے نے اس کے چینی دوست کو بھی پکڑا دیا تھا لیکن وہ لوگ اسے چھڑا کر لے گئے۔ مجھے حیرت ہے کہ قحط اب تک کیے ہوئے ہو۔ ناگ پال تو اپنے دشمن کو چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہنے دیتا۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”ناگ پال جیسے لوگوں کا کوئی گوار نہیں ہوتا۔ انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ ان کے کسی فعل سے کسی اور کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے گرد چاروں طرف کر لیتے ہیں۔ دہشت اور مار دھاڑ کے بل بوتے پر دھوکا دھاگ بٹھا کر اپنا کام نکالتے ہیں۔ ایسے کام عام طور پر ہمارے وصول کرنے سے شروع ہوتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں ان کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے تو یہ ناگ پال بن جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان لوگوں کو روکنے کے لیے ان کی کار طریقہ استعمال کیا جائے۔ شرافت کی زبان تو یہ لوگ سمجھ نہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ روکنے کے لیے اپنے ہاتھ استعمال کرنے پڑتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی شرافت میں مار تو کھا لیتے ہیں مگر ان غنڈوں اور بدعاشوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے اور اس طرح ناگ پال لیتے ہیں۔“

”یہی مسئلہ ہے۔“ درگنا نے کہا ”شریف لوگ ذلت میں۔ وہ۔“

”میں نے شرافت چھوڑ دی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”یہ بات میں نے بہت عرصہ پہلے محسوس کی تھی۔ غنڈوں اور بدعاشوں کے سامنے شرافت کا مظاہرہ کرنا نہیں

”میں نے کہا“ مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے

”اس چینی کا سراغ لگانا ہے۔“ میں نے کہا ”اگرچہ تم پر انہیں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا لیکن اس میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے تمہیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ درگنا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اگر پتا چل جائے تو تمہیں کہاں اطلاع دی جائے؟“

میں نے مایامتی کے مکان کا فون نمبر پتا دیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد میں اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر ریٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ کاؤنٹر کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کافی کا ٹل بھی ادا کر دیا تھا۔

فریک اسٹریٹ سے نکل کر گنگا پتھ بکرشل ہوٹل کے قریب مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی پر میں نے دلی بازار تک سفر کیا۔ وہاں سے آگے کچھ دور تک ٹیکسی چلتا رہا اور پھر ایک سائیکل رکشا پر بیٹھ کر گھر پہنچ گیا۔

اس وقت دس بجنے والے تھے۔ شوہا اور مایامتی کھانا کھا رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اس رات مجھے ڈھنگ سے نیند نہیں آ سکی۔ مایامتی اور شوہا ایک ہی کمرے میں سو گئی تھیں اور میں اس کمرے میں لینا تھا جہاں پہلے مایامتی سویا کرتی تھی۔ مجھے ڈھنگ سے نیند نہیں آئی تھی۔ کبھی آنکھ گنتی تو چوک کر بیدار ہو جاتا۔ رات کے آخری پر میری آنکھ کھلی تو یوں لگا جیسے کوئی نایابہ قوت مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا رہی ہو۔

میں کمرے سے باہر آ گیا۔ مجھ پر اس وقت عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اس وقت نہ میں جاگ رہا تھا نہ سو رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے مجھے ٹرانس میں لے رکھا ہو۔ میں اسی کیفیت میں چلتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جہاں لکڑی کا تخت بچھا ہوا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے جھکا سا لگا اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ سامنے تخت پر کوئی لینا ہوا تھا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باوجود میں اس بیوے کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ عجیب سا بیولا تھا جیسے چاند کی دودھیا روشنی سے انسانی پیکر معرض وجود میں آ گیا ہو۔ وہ کسی عورت کا بیولا تھا۔ بدن کے نشیب و فراز بہت واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

میں نے انگلی دائیں تلی دی۔ میرے منہ سے ”سی“ کی ہلکی سی آواز نکل گئی۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ نہایت مدہم روشنی کے اس بیوے

میں سے بہت مدھم کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر کبھی ابھرتے اور کبھی لہریں انہیں منادیتیں لیکن میں نے اسے بچان لیا۔ وہ نیلکی تھی۔

نیلکی کا چاندنی کے پیکر میں ڈھلا ہوا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور مجھے یہ احساس بھی بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بے چین سی تھی۔ اس کے چہرے کے غیر واضح نقوش بھی اس کی بے چینی کی نشان دہی کر رہے تھے۔ میں تخت کے قریب پہنچ کر آہستگی سے آگے کو جھکا تو میرے گلے میں پڑی ہوئی نیلکی کی مالا نیچے گر گئی اور اس کے ساتھ ہی چاندنی کے پیکر میں ڈھلا ہوا وہ نیلا کپڑا پر سکون جھیل کی سطح پر ہلکی سی لہروں کی طرح حرکت کرتے ہوئے سمٹنے لگا اور بالآخر ایک نقطے کی صورت اختیار کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اتنی دیر تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں چند لمبے بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر ٹوٹے ہوئے دروازے کے ساتھ والی دیوار کے قریب پہنچ گیا اور جی بھلا دی۔ بستر خالی تھا۔ تاہم میری مالا بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر مالا اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کب کھل جانے سے مالا میری گردن سے گر گئی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ کب کس طرح کھل گیا تھا۔

میں نے مالا گلے میں ڈال لی اور وہاں اپنے کمرے میں جانے کے بجائے تخت پر لیٹ گیا۔ میرا ذہن خاصا اٹھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر روشنی کے ہولے کے روپ میں واقعی نیلکی تھی تو اس نے مجھ سے کوئی بات کیوں نہیں کی تھی۔ پہلے جب بھی کبھی اس پاس نیلکی کے رجب کا احساس ہوتا تھا تو کانوں میں اس کی سرگوشی ضرور سنائی دیتی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ روشنی کے بیولے کی صورت میں میرے سامنے آئی تھی اور خاموشی سے غائب ہو گئی تھی۔

صبح میں دیر تک سویا رہا۔ مالا مٹی تو صبح سویرے ہی ڈھونڈ پر چلی گئی تھی اور شوہا نے مجھے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو تین دن گزر گئے۔ جاگت کی کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ درگا روزانہ ٹیلی فون پر مجھے رپورٹ دیتا رہا۔ میں اور شوہا شام کے وقت اسپتال کا چکر بھی لگا آتے۔ مجھے دیکھ کر سب کے چہرے پر رونق سی آ جاتی۔ چوتھے دن میں نے پھر نیلکی کے ہولے کو دیکھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اتنی بے چین اور مضطرب کیوں ہے۔ اس

روز بھی وہ رات کے آخری پراس کمرے میں نظر آئی اور کچھ کے بغیر تاریکی میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی پراس رات بھی اس طرح ہو سکتی تھی۔ نیلکی کو بہت بڑی سختی تھی جسے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں سال سے کوششیں ہو رہی تھیں۔ یہ سناں شکتی اس طرح بے کل ہو سکتی ہے؟

دو دن اور گزر گئے اور پھر اس رات دس بجے قریب درگا نے فون پر اطلاع دی کہ جاگت کی روایتی اشتہاتی کے اس بار ادھیرائے ہوئے کے قریب ایک کونے میں مقیم ہے جہاں اس کا علاج ہو رہا ہے۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ جاگت کی ہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سوفیہ۔“ درگا نے جواب دیا ”شمر کے جس ڈاکٹر نے اس کا علاج کروایا جا رہا ہے اس کا اسسٹنٹ آج شام میرے پاس پانچ ہزار امریکی ڈالر کے کرنسی نوٹ بیچنے کے لیے آئے۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا کہ اس نے نوٹ کہاں سے لیے تو اس نے بتایا کہ اس کا ڈاکٹر ایک تین کا علاج کر رہا ہے جو کسی جھگڑے میں زخمی ہو گیا تھا۔ یہ امریکی ڈالر کے نوٹ اس نے ڈاکٹر کو فیس کے طور پر دیے تھے۔ اس سے میں نے باتوں ہی باتوں میں اس کو بھی کچھ پتا چل گیا اور اس کے جانے کے بعد میں نے موٹر سائیکل پر اس علاقے کا دورہ کیا۔ اس کو بھی کے سامنے ناگ پال کے دو آدمی پیرا رہے ہیں۔ یقیناً اندر بھی کچھ لوگ موجود ہوں گے اس لیے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جینی اسی کو بھی میں ہے۔“

”ٹھیک ہے درگا۔“ میں نے کہا ”اب تم اس کو بھی کی طرف نہیں جاؤ گے۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ اس اطلاع پر میرے دل میں منفی کی لہریں سی دوڑنے لگی تھیں۔ میں اس وقت اکیلا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر میں نے فون کا رسیور اٹھایا اور پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈال کر نہ لگا۔

انسپکٹر بریندرا سے رابطہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں گئی تھی اور اتفاق سے انسپکٹر اعظم خان بھی وہاں موجود تھا۔ جب میں نے جاگت کی بارے میں بتایا تو یہ اطلاع میرے لیے خاصی منفی خیر ثابت ہوئی کہ انسپکٹر بریندرا کو بھی کونسی میں جاگت کی کی موجودگی کی اطلاع مل چکی تھی اور کونسی پر چھاپا مارنے کی تیاری ہو رہی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ۔۔۔“ تقریباً ایک گھنٹا پہلے وہ ڈاکٹر ہماری گرفت میں آ گیا تھا۔ ”جاگت کی کا علاج کر رہا ہے۔“ بریندرا نے میری بات کاٹ کر ”تفصیل بعد میں بتاؤں گا لیکن تم اپنے مکان سے باہر نہ نکلو گے۔“

میں مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن بریندرا نے فون بند کر دیا۔ میں نے رسیور رکھ دیا اور لاؤنج سے نکل کر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی سی دیر بعد شوہا مجھے میرے پاس آ کر بٹوے کی طرح مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اس مازہ صورت حال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا

مجھے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میری بے چینی بڑھتی رہی تھی۔ میں بریندرا کی طرف سے کسی اطلاع کا منتظر تھا لیکن ایک بج تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔

شوہا اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اس سے اپنے لیے ایک چائے بنوائی۔ مالا مٹی پہلے ہی سوچیں تھی۔ میں اکیلا کمرے میں بیٹھا چائے پیتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ دو بج گئے۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ بے چینی زیادہ بڑھنے لگی تو میں اندر آ گیا اور فون کا رسیور اٹھا کر ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈالنے لگا۔ لائن ملنے میں دیر نہیں لگی لیکن وہاں بھی اسی طرح کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر سے کہہ کر ہاتھ دھسے ہی کوئی خبر آئے۔ مجھے فون پر اطلاع دے دی جائے۔

میں اس وقت صوفے پر نیم دراز اونگھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی کی آواز سے بڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے لپک کر رسیور اٹھا لیا۔ انسپکٹر بریندرا کی نوازی میری سماعت سے ٹکرائی تو میں سنبھل گیا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم جاگ رہے ہو گے۔“ بریندرا نے میری آواز سننے کی کہا۔

”میں اتنا اہم ہو تو مجھے نیند کیسے آ سکتی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میں تو اس کا روروائی کا رزلٹ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ کیا رہا؟“

”جاگت کی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“ بریندرا نے جواب دیا ”میں نے تمہاری طرف جیب سمجھ دی ہے۔ اسپتال جانے کے بعد ہمیں ساری تفصیل بتا دوں گا۔ جیب تمہارے ہاں پتی سی والی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ میں پتو اور کتا دوسری طرف سے لائن منقطع ہو گئی۔

میں نے رسیور رکھ دیا اور اپنی جگہ پر آکر جوگز رہنے لگا۔ میں بیٹھے باندھ رہا تھا کہ باہر کوئی گاڑی آ کر رکی۔ میں نے پرآمدے میں آکر دیکھا۔ گیٹ کے سامنے پولیس جیب کڑی تھی اور ایک باوردی کا نشیمل جیب سے آکر گانا کال بیل بجانے کے لیے گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر کال بیل بجانے سے منع کر دیا اور شوہا والے کمرے میں آ گیا۔ شوہا بستر آڑی تر چھٹی پڑی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ پہلے میں نے ایک دو مرتبہ ہولے سے پکارا پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلا دیا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ گئی۔

”میں اسپتال جا رہا ہوں۔ تم اٹھ کر دروازہ بند کر لو۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”کیوں کیا ہوا! مالا مٹی کہاں ہے؟“ وہ بدحواس ہو گئی۔

”سب ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”مالا مٹی اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ انسپکٹر بریندرا کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے اسپتال بلایا ہے۔“

شوہا کے دماغ پر اب بھی نیند کا شمار طاری تھا۔ وہ میری بات سمجھ سکی تھی یا نہیں لیکن اٹھ کر میرے ساتھ آ گئی۔ پولیس کی جیب گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ دو سب کا نشیمل بھی موجود تھے۔ میں اس وقت تک جیب کے پاس کھڑا رہا جب تک شوہا نے باہر کا گیٹ بند کر کے اندر جا کر برآمدے والا دروازہ بھی بند نہیں کر لیا۔

اسپتال پہنچنے میں میں پچیس منٹ سے زیادہ نہیں گئے۔ اسپتال میں پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ پولیس کے کئی اعلیٰ افسران بھی نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر بریندرا نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ انسپکٹر اعظم بھی تھا۔ انسپکٹر اعظم سے میری ملاقات کئی روز بعد ہوئی تھی۔

انسپکٹر بریندرا مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ تمام لاشیں سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور تمام چادروں پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

بریندرا نے جھک کر ایک لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ جاگت کی تھا۔ چادر پر کئی جگہوں پر خون کے دھبے تھے۔ میں نے چادر کو ناپکڑ کر اسے پوری طرح سے بنا دیا۔ جاگت کی کی لاش بالکل چھنی ہو رہی تھی۔ اس کے جسم پر کم از کم تین گولیاں لگی تھیں۔ باقی چار لاشوں میں سے دو جاگت کی کے ساتھیوں کی اور دو پولیس والوں کی تھیں۔ ہم اس کمرے سے باہر آ گئے۔ بریندرا بتا رہا تھا کہ زخمی

ہونے کے باوجود چانگ لی نے پولیس کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک کانٹیل جاس گیا تھا۔ جس پر دوسرے پولیس والوں نے اسے چھنی کر دیا تھا۔

”فون“ تفصیل سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ ”میں نے کہا“ تمہیں اس کو بھی میں چانگ لی کی موجودگی کی اطلاع کیسے ملی تھی؟“

”ایک خبر کے ذریعے۔“ برینڈر نے جواب دیا ”ہمارا ایک خبرشام کو اندرا چوک کے ایک ریستورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ درگا بھی وہاں موجود تھا۔ وہ کرنی کا غیر قانونی کاروبار کرتا ہے۔ ایک آدمی اس سے پانچ ہزار امریکی ڈالر کیش کروا کر لے گیا تو ہمارے خبر کو اس پر شبہ ہوا۔ ہمارے تجربے اس کا پتہ چھانک دیتے ہیں۔“

”اس کو بھی پرچھا مارا گیا تو پتا چلا کہ وہاں ایک ڈاکٹر تھا وہ ڈاکٹر کا نائب تھا۔ ڈاکٹر سے پوچھ گچھ کے دوران میں یہ سسٹی خیر انکشاف ہوا کہ وہ ایک زخمی چینی کا علاج کر رہا ہے اور یہ کرنی نوٹ اسے فیس کے طور پر لے رہے تھے۔“

”پولیس کے طریقہ کار سے تم واقف ہو۔ بعض اوقات تو وہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر تو سیدھا سادا اور شریف آدمی تھا۔ دھمکیوں سے ڈر کر اور ہماری فیس کے لالچ میں آکر وہ اس زخمی چینی کا علاج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا کہ وہ زخمی چینی کون تھا اور اس کا علاج کروانے والے کون تھے۔“

”چانگ لی کے بارے میں تصدیق ہوجانے کے بعد ہم چھاپا مارنے کی تیاری کر رہے تھے کہ تمہارا فون آگیا۔ اب میں تم سے معلوم کرنا چاہوں گا کہ تمہیں اس کا پتا کیسے چلا تھا؟“

”درگا سے۔“ میرے جواب پر برینڈر اچانک سا گیا۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر اسے درگا کے بارے میں بتانے لگا۔

”بھرا۔“ برینڈر اب گہرا سانس لیتے ہوئے بولا ”اس ڈرامے کا ایک سین ختم ہو گیا۔ اب ناگ پال رہ گیا ہے۔ اسے بھی ہم قدم نہیں بنانے دیں گے۔ وہ یا تو ٹنگ چھوڑ کر بھاگ جائے گا یا اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔“

پانچ لاشوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کوٹھی پر مقابلے کی نوعیت کیا رہی ہوگی۔ کئی آدمی زخمی ہوئے تھے جو پولیس کی نگرانی میں زیرِ علاج تھے۔

مجھ جبکہ کے قریب میں پولیس جیپ پر ہی واپس آ رہا

تھا کہ باغ بازار سے گزرتے ہوئے سڑک کے عین وسط میں یوگی گوتم بھوش کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ گوتم بھوش سڑک کے عین وسط میں کھڑا تھا اور جیپ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”روکو۔ جیپ رکو۔“ میں ایک دم چیخ اٹھا۔ میرے اس طرح چیخنے پر ڈرائیور بدحواس ہو گیا۔ اس نے پوری قوت سے بربک لگا دیا۔ جیپ بریکوں کی تیز چراہٹ کی آواز کے ساتھ سڑک پر ٹھوکر کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا سر؟“ ڈرائیور نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانٹیل بھی زوردار جھٹکا لگنے سے اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرائے گئے تھے۔

”وہ۔ وہ جیپ کے نیچے پکڑا جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”سانے تو کوئی بھی نہیں ہے۔ سڑک دور تک خالی پڑی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔

سڑک واقعی دور تک خالی تھی۔ میرا دماغ محوم گیا۔ میں نے گوتم بھوش کو سڑک کے عین وسط میں کھڑے دیکھا تھا۔ اگر میں جیپ نہ رکھتا تو وہ پکڑا جاتا لیکن وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ سڑک دور تک خالی تھی۔ تاہم تقریباً میں گز آگے ایک کتا سڑک پر ایک طرف سے دوسری طرف ٹھٹھا ہوا جا رہا تھا۔

”وہ۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“ میں متوحش سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سر؟“ ڈرائیور نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ کیسے میں کہا ”آپ شاید رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو نیند کا جھوک لگایا ہو اوس۔“

عقب سے ہمارا تیز آواز سن کر ڈرائیور اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دودھ کی سپلائی والا ٹرک تھا۔ ہماری جیپ سڑک کے وسط میں آئی تھی۔ ترجیحی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے انہیں اشارت کیا اور جیپ کو حرکت میں لے آیا۔

میں راستے بھر میری سوچا رہا کہ کیا واقعی میں جیپ میں بیٹھے بیٹھے اوٹھ گیا تھا اور کوئی پتہ نہ دیکھ رہا تھا لیکن وہ پتہ نہیں تھا۔ میں نے جاگتی آنکھوں سے گوتم بھوش کو جیپ کے سامنے سڑک کے وسط میں کھڑے دیکھا تھا لیکن وہ پکڑا جیپ کی دیر میں کہاں غائب ہو گیا تھا؟

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ گھر پہنچا تو کیا حتیٰ جاگ چکی تھی اور ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے

تھ میں نے بھی جانے کا ایک کپ پیا اور اس کے جانے کے بعد دوڑا۔ بند کر کے اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ شوبھا نے مجھے جھجھوڑ کر جگا دیا۔ ”آٹھ بج رہے ہیں بدحواس سا جا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ میں جاگ بستر پر تھا اور وہ مجھے جھجھوڑ کر اپنے آپ سے الگ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا کہ تو میں بستر پر صبر ہو گیا۔ شوبھا اچھل کر بیڈ کے رے پر چلی گئی اور اپنے جسم پر شب خاں کا لباس درست کرتے ہوئے خشکی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ہمت سنگھ۔“ شوبھا کی آواز میری سماعت سے گزرتی تو میں نے آنکھیں کھول دیں ”تم تو ایسے نہیں تھے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”ننگ۔ کچھ نہیں شوبھا۔“ میں ہکھلایا ”مجھے نہیں علم میں یہاں کیسے آیا تھا۔ میں۔ میں تو اپنے کمرے میں رہا تھا اوس۔“

”شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ شوبھا نے اگے بڑھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

مجھے تو بخار تھا اور نہ ہی طبیعت خراب تھی لیکن چند دہانے میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ کچھ عجیب سے واقعات میرے ساتھ پیش آرہے تھے۔ پچھلے چند روز کے دوران میں دو تین مرتبہ میں نے نیلگری کا ہندلا سا ہویلا دیکھا تھا اور آج صبح سڑک پر جیپ کے عین سامنے گوتم بھوش کھڑا نظر آیا تھا لیکن درحقیقت وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے پیچ کر جیپ رکوا لی تھی اور مجھے پولیس والوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا تھا اور اب میں شوبھا کے سامنے شرم و ندامت سے کنا جا رہا تھا۔

”رات کے آخری پر تم نہیں گئے تھے۔“ وہ کہہ رہی تھی ”واپس کب آئے تھے؟“

”مجھ کو کچھ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کنا کیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اب گیارہ بج رہے ہیں۔ تم زرا کمرے سے نکلو تو مجھے بدل لوں پھر ناشتا پکارتی رہی ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے شوبھا۔“ میں نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے دیکھتے ہوئے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ سب کیسے ہوا۔“ میری نظروں میں تمہارے لیے بڑا احترام نہیں ملے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے میری بات کاٹ دی ”شاید تم نیند میں اٹھ کر آگئے ہو گے۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ مجھے تمہاری نیند پر کوئی شبہ نہیں۔ اب تم باہر جاؤ۔ میں کپڑے بدل لوں۔“

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ چند لمحے خالی خالی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ روم میں گھس گیا۔

میں دیر تک ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا جس سے میرے دماغ کی تیش کسی حد تک کم ہو گئی۔

میں لاؤنج میں آیا تو شوبھا کچن میں تھی۔ میں وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن اب بھی الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں پھر کسی طاغوتی چکر میں تو نہیں پھنس گیا تھا۔ یہ خیال آتی ہے میرا ہاتھ بے اختیار اپنے گلے پر پڑ گیا۔ مالا میرے گلے میں موجود تھی۔

شوبھا ناشتا تیار کر کے لے آئی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔

”رات کو تم کہاں گئے تھے؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہسپتال۔“ میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے یاد تھا کہ صبح چار بجے باہر جانے سے پہلے میں نے اسے جگا کر دیا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں لیکن وہ شاید اس وقت نیند میں تھی اور میری بات کو سمجھ نہیں سکی تھی ”چانگ لی گزشتہ رات پولیس مقابلے میں مارا گیا۔“ میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی سے اسے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا ”میں نے وعدہ کیا تھا کہ جزل کھوراث کے یہاں قدم نہیں بننے دوں گا۔ اس کے آدمی مارے جا چکے ہیں۔ ناگ پال کے قدم بھی اکڑ گئے ہیں۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ جزل کھوراث اگر دوبارہ یہاں قدم بھانا چاہے گا تو اس کے لیے بہت لمبا عرصہ درکار ہوگا۔ اس طرح میرا کام ختم ہو چکا ہے اور اب ہمیں یہاں سے کوچ کی تیاری کرنی چاہیے۔“

”کہاں؟“ شوبھا نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہندوستان۔“ میں نے جواب دیا ”تمہیں بے پور چھوڑ کر میں پاکستان چلا جاؤں گا۔“

”پاکستان کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”پاکستان میرے مرحوم ماں باپ کا وطن ہے اور میں

نے بھی نہ مٹی سے جنم لیا تھا اور بد قسمتی سے دو تین ماہ کی عمر میں مجھے اپنے ماں باپ کے ساتھ وہاں سے نکلتا ہوا تھا۔ میں تو پاکستان جانے کے لیے ہی بچے پور میں ٹھاکر اور روپ مٹی سے رخصت ہوا تھا لیکن رشی کیش میں تمہاری وجہ سے حالات کارخ بدل گیا اور میں یہاں تک چلا آیا۔“

طرز عمل کچھ اور ہوتا۔ اب تو وہ مجھ سے اٹھارہ ہمدردی کر رہے تھے۔

شوبھا مجھے بازو سے پکڑے پارک سے باہر لے آئی۔ گیٹ سے نکل کر چند قدم چلنے کے بعد ہی ہمیں ایک نیکی ملی گئی جس میں بیٹھ کر ہم گھر آ گئے۔

”اسی سبب پر مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا جب میں نے اس سے بعض اٹھتا ہوا محسوس کیا تھا۔“ شوبھانے لاؤنج میں داخل ہو کر صوفے پر گرتے ہوئے کہا ”چرے پر کتنی معصومیت تھی لیکن کتنا خبیث نکلا۔“

”اور کیا دیکھا تم نے؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اور کیا دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔“ وہ بولی ”وہ تمہاری مالا چھین کر بھاگا تھا اور پھر کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گیا تھا۔ ویسے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ کس قدر تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کا حلقہ یقیناً چکوں اور جب کتروں کے گرگوں سے ہے۔ ایسے لوگوں کو تو بچپن ہی سے ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بڑا ہو کر یہ بچہ بہت سمجھا ہوا بجرم بنے گا۔“

میرے منہ سے گرا سانس نکل گیا۔ شوبھانے اس سبب ہی کو دیکھا تھا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں دیکھ سکی تھی اور میں بھی اسے کچھ بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد مالا مٹی بھی پہنچ گئی۔ اس نے کپڑے بدل کر سب سے پہلے چائے پائی۔ چائے پیتے ہوئے وہ سب کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے زخم اب بہتر ہونے لگے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سبھا مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میری وہ رات بڑی بے چینی میں گزری تھی۔ میں بار بار پارک میں پیش آنے والے اس واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ صبح میں نے گوتم بھوش کو جپ کے سامنے دیکھا تھا اور اب پارک میں اس کا بیولا نظر آیا تھا جبکہ اس نے اپنی کسی ہشتی کے ذریعے مجھے نیلگری کی مالا سے محروم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نیلگری ہی نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنادیا تھا۔

بے درپے ان پر اسرار واقعات کے پیش آنے سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے اور میں بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکوں گا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ گوتم بھوش کھنڈوں میں موجود ہے اور وہ ہر قیمت پر یہ مالا مجھ سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اور پھر اس رات میرے لیے وہ خواب بھی بڑا عجیب ثابت ہوا تھا۔ میں ہمالیہ کی ترائیوں میں ٹھہک رہا تھا۔ میرے ساتھ شوبھا بھی تھی، شریا بھی اور دھنوبھی۔ ہم گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہمیں بھی ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر نظر آتے اور کبھی عین ترین گراؤں میں۔ ایک موقع پر میں نے گوتم بھوش کو ایک غار میں گھیر لیا۔ وہ غار بہت تاریک تھا اور زمین کی عین ترین گھراؤوں تک چلا گیا تھا۔ گھبر تاریکی میں اگرچہ ہاتھ کھاتے بھائی نہیں دیتا تھا لیکن گوتم بھوش مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی چھپتا، مجھے صاف نظر آ جاتا۔ وہ بھانگا پھر رہا تھا۔ اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور پھر کسی ناہیدہ قوت نے میرا راز روک لیا۔ میں پیچھے ہٹنے لگا۔

صورت حال بدل گئی تھی۔ گوتم بھوش پوری قوت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا تھا اور میں اس سے بچنے کے لیے مسلسل پسپائی اختیار کر رہا تھا۔ میں ایک چٹان پر چڑھا چلا گیا۔

اچانک ہی کسی طرف سے چند خوں خوار بھیلے نمودار ہوئے۔ وہ میری طرف لپک رہے تھے۔ میرے نے اور بھیلوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ نیکیے وراثت نکالے میری چڑھاؤ کرنے کے لیے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ میں اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا اور پھر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

میں تاریک خلا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ اپنی چیخوں کی بازگشت مجھے چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ میری چیخوں میں شیطانی قہقروں کی آوازیں شامل ہوئیں۔ میں گوتم بھوش کو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بے بسی پر ہنسنے لگا رہا تھا۔

اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ کسی ناہیدہ قوت نے مجھے گرنے سے روک لیا تھا۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ میرے چاروں طرف تاریک خلا تھی۔ اوپر بھی اور نیچے بھی لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پختہ فرش پر کھڑا ہوں۔

میں نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گوتم بھوش اب بھی پہاڑ کی چوٹی پر موجود تھا۔ اس کے چرے پر تشویش ابھرتی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ ایک بہت بڑے پتھر کو دھکیل کر غائب ہو گیا۔ چٹان نما وہ پتھر ہی تھی سے میری طرف آ رہا تھا۔ فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ پتھر کی زمیں آنے سے بچنے کے

لیے میں نے ایک طرف جھلانگ لگا دی۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔ اپنی کراہوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں خوش نظروں سے اوھر اوھر دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک تو میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میں کہاں ہوں پھر رفتہ رفتہ حواس غالب ہونے لگے۔ میں اپنے کمرے میں تھا اور تخت سے گر کر پختہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ گرنے سے میرے کندھے پر چوٹ لگی تھی جس میں تکلیف ہو رہی تھی۔

میرا جسم سینے میں تر ہو رہا تھا۔ میں زمین سے اٹھ کر بہت بیٹھ گیا۔ کمرے میں نیلگوں روشنی کا لمبہ جل رہا تھا۔ میں مدھم سی روشنی میں بھی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی صاف نظر نہ آ رہی تھی۔ اس وقت صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ کمرے کی کوڑی بھی کھلی ہوئی تھی لیکن باہر کی فضا میں ابھی تاریکی تھی۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ زنج میں سے بوتل نکال کر ٹھنڈا پانی پیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں بستر پر نیم دراز دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو میرا حلقے تھی کہ گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کھنڈوں میں موجود تھے اور گوتم بھوش ہر قیمت پر مجھ سے نیلگری کی مالا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مالا کی وجہ سے میری اور گوتم بھوش کی دشمنی شروع ہو چکی تھی اور نیلگری نے شروع ہی میں یہ بات مجھ پر واضح کر دی تھی کہ بڑکے میں نے ابھی اپنا جاپ پورا نہیں کیا اس لیے وہ کھل کر نیکی مد نہیں کر سکے گی۔ تاہم وہ میری مدد کر رہی تھی اور اسی نے یہ مالا بھی غالباً مجھے اس لیے دی تھی کہ میں گوتم بھوش کے متعز سے محفوظ رہوں۔

نیلگری نے مجھ سے کہا تھا کہ گوتم بھوش بھی دو میرے بڑا دل لوگوں کی طرح اسے حاصل کرنے کے لیے مختلف ہپ کر رہا ہے لیکن نیت میں کوٹ کی وجہ سے وہ ابھی منزل سے بہت دور ہے جبکہ میں منزل کے قریب پہنچنے والا تھا کیونکہ میں نیت میں کوئی کوٹ نہیں تھا۔ میں کوئی سختی اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں دوں کی بھلائی کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ نیلگری نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر وہ گوتم بھوش جیسے بد نیت آدمی کے قبضے میں چل گئی تو وہ دنیا میں بتائی ہوئی دسے گا اور اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اپنی ریاضت مکمل کروں تاکہ وہ میرے قبضے میں آجائے۔ یہی حفاظت کے لیے اس نے مجھے اپنی مالا بھی دے دی تھی۔

میں اگرچہ باقاعدہ ریاضت نہیں کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود گوتم بھوش مجھے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اور اپنے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا۔ شاید وہ بھی جانتا تھا کہ میں اس سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا اسی لیے وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن نیلگری کی مالا میرے پاس ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی وار مجھ پر کارگر نہیں ہو سکتا تھا اسی لیے وہ سب سے پہلے مجھے اس مالا سے محروم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ پنڈت دھیراج اس کا چیلنا تھا اور میں جان گیا تھا کہ اس کے لیے پنڈت دھیراج کی حیثیت پالتو کتے سے زیادہ نہیں تھی۔

میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے یوگا کی مشق کی تھی اور یوگی گوتم بھوش نے مجھے شکستوں کے جگر میں ڈال دیا تھا۔ میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن غیر ارادی اور لا شعوری طور پر میرے قدم اس راستے پر اٹھتے چلے گئے تھے اور اب میں شاید اتنا آگے نکل چکا تھا کہ واپسی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گئی تھی۔ ان پنڈتوں اور یوگیوں کو میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ بے پور میں ان سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ لوگ آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ میں جان گیا تھا کہ اب اگر چاہوں بھی تو آسانی سے اس طاغوثی پتھر سے نہیں نکل سکوں گا۔ اپنے آپ کو بچانے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ میں وہ مالا نیلگری کو لوٹا دوں یا گوتم بھوش کے حوالے کر دوں لیکن میں اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ گوتم بھوش اس کے بعد بھی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ پنڈت قسم کے لوگ اپنے دشمن کو کبھی زندہ نہیں رکھتے۔

دن کا دم سا حال ابھیل رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے اور تازہ ہوا میں گمرے گمرے سانس لینے لگا۔

مالا مٹی کی اس روز چھٹی تھی اس لیے وہ بھی دیر تک سوئی رہی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ بچنے کے قریب اپنے لیے چائے بنا کر برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔

میں نے ابھی چائے ختم نہیں کی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں اٹھ کر لاؤنج میں آیا اور فون کا ریسیور اٹھالیا۔ وہ انکیلڑ بریدر کا کال تھی۔

”کیا تم ہیڈ کوارٹر آ سکتے ہو؟“ اس نے میری آواز سن کر کہا۔

سے پر واقع بستی کے گھاٹ پر پہنچی تھی۔ ”بریندر اکہ رہا تھا لوگوں نے پولیس چوکی پر اطلاع دے دی۔ اس بستی کی

چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے مجھے سختی سے ہدایت کا بھی کیا۔

میں نے دھنوکے بسم پر لپٹی ہوئی چادر پر خون کے دھبے  
 منظر سے تھے۔

کچھ نہیں بتایا۔ صرف تم سے بات کی تھی۔“



”اور بہتر ہو گا کہ اس سلسلے میں خاموش ہی رہتا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”وہ ایک ایسا راز ہے جس کی حفاظت کے لیے تمہارے باپ نے جان دے دی۔ تمہاری جان بھی جاسکتی ہے اس لیے اس سلسلے میں اپنی زبان بندی رکھنا۔“

دھونے اثبات میں سر ہلادیا۔

سہ پہر کے قریب انسپکٹر بریدر نے اطلاع دی کہ دھون کے والدین کی لاشیں ایک فلاحی ادارے کے حوالے کی جا چکی ہیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے آخری رسومات ادا ہوں گی۔ دھون اگر چاہے تو ان میں شرکت ہو سکتی ہے۔ میں نے دھون کو بتایا تو وہ فوراً ہی تیار ہو گئی۔ میں وقت مقررہ پر اسے بتائی ہوئی جگہ پر لے گیا۔ شہر سے باہر وہ بڑے بڑے پتھر کا راون کا شمشان گھاٹ تھا۔ تین ہفتھوؤں کے علاوہ وہاں چند آدمی اور تھے۔ دھون اپنے ماں باپ کے چہرے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بڑی مشکل سے اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ دونوں پتاؤں کو آگ دکھانے کے بعد ایک ہفتھو نے مجھے اشارہ کیا اور میں دھون کو لے کر واپس آ گیا۔

شمشان گھاٹ شہر سے کافی دور تھا۔ شہر کی آخری آبادی اور شمشان گھاٹ کے درمیان ایک پتھریلا میدان تھا جہاں جھانپاں بھی بکثرت تھیں۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ تاہم سامنے بہت دور شہر کی عمارتوں کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم اس میدان کے وسط میں تھے کہ اچانک یہ تیز ہوا چلنے لگی۔ دھون نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہوا کی تندی بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ہوا ہمیں پیچھے دھکیلتی رہی تھی۔

گردوغبار اذکر فضا میں پھیل رہا تھا۔ تاریکی ایک دم گہری ہو گئی۔ شہر کی روشنیاں بھی اب دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سامنے سے ایک گولا بڑی تیزی سے ہماری طرف آرہا تھا۔ تاریکی کے باوجود اس گولے کی چمکائی ہوئی دھول صاف نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا گردوغبار کا مینار آسمان کی بلندیوں تک چلا گیا ہو۔

میں اس گولے کی زد سے بچنا چاہتا تھا لیکن دھون کا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری۔ اس کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی وقت ہم گولے کی زد میں آ گئے۔ میں نے دھون کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن ہوا اسے دھکیلتی ہوئی دور لے گئی۔ میں اس کے پیچھے لگا لیکن گولے نے اسے

اوپر اٹھا دیا۔

دھون بڑی طرح چیخ رہی تھی۔ میں اس سے بے خبر تھا لیکن تھوڑا سا بڑی تیزی سے اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ گولے کے عین بیچ میں پھری کی طرح چمکاتے ہوئے تھے۔

اس تیز اور تند ہوا میں ایک شیطانی قہقہے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم ایک جگہ رک گئے۔ دھون نے اپنی اندر سے آ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گولے کا اوپر بہت بلندی پر گوتہ بھوش کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید میری بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔

ایک لمحہ۔ صرف ایک لمحہ گزرا اور میری نظریں ان گولے پر مرکوز ہو گئیں اور پھر وہ گولا گردش کر آیا۔ گولے اٹھے تھے۔ وہ گوتہ بھوش کی حرکت تھی۔ جگہ پر رک گیا۔ اس کے اندر دھون بدستور پھری کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کے آواز میں اس طرح بھیجی تھی کہ اس کا سارا ہوجہ میرے اوپر آہستہ آہستہ نیچے آتے ہوئے زمین پر ٹپک گئی۔ میں نے بھی اپنا ایک بازو اس کی سرکے گرد محاسل کر دیکھا۔ گوتہ بھوش کا ہیولا فضا میں تحلیل ہو گیا اور گولا بھی بدستور منتشر ہوتا چلا گیا۔

دھون زمین پر بڑی چیخ رہی تھی۔ میں نے دو ذرا اس کا بازو پکڑا اور آبادی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دھون نے مانی پکڑ رکھی تھی جس سے اسے دوڑنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی لیکن میں اسے پکڑتا ہوا دوڑتا رہا۔

گوتہ بھوش کو اس ویرانے میں وار کرنے کا موقع مل گیا تھا اور میں جلد سے جلد ویرانے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ گوتہ بھوش پے در پے جس طرح مجھ پر حملے کر رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اس وقت اس نے شاید جان بوجھ کر دھون کو ہی نشانہ بنایا تھا۔ شاید اس کا خیال ہو کہ میں ڈر کر یا گھبرا کر مارا اس کے حوالے کر دوں گا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ میں بے ہوش ہوتا تو اس دنیا سے میرا نام و نشان مٹ چکا ہوتا۔ دنیا کے سفاک ترین انسانوں سے میرا مقابلہ ہو چکا تھا اور وہ میری نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ گوتہ بھوش مجھے ڈر کرنے کے لیے اگر اپنی پراسرار شکتی استعمال کر رہا تھا تو اس حلقے میں بھی کسی دامن نہیں تھا۔ میرے اندر بھی ایک قہقہہ جوں نے طویل عرصے کی ریاضت اور کٹھنائیوں کی محنت سے طے کرنے کے بعد حاصل کی تھی۔ جسے کوئی معمولی قوت نہیں تھی۔ انسان کے اندر بھیجی ہوئی اس قوت سے توڑنا یا بالادیا جاسکتا تھا۔ میں نے بھی اس قوت کو استعمال کیا

بریدر نے بتایا کہ صبح پولیس کی پارٹی بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ پر بھیجی گئی تھی وہ واپس آ گئی ہے۔ وہاں سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی البتہ عبادت گاہ کے برآمدہ اور اندرونی حصے میں ماسما بدھ کے مجستے کے ارد گرد خون کے دھبے لے ہیں۔

بریدر نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ جب تک کوئی اور بددوست نہیں ہو جاتا، دھون ہمارے پاس رہے گی۔ مجھے دھون کو اپنے پاس رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن عبادت گاہ پر کسی کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ وہاں تھوڑی سی کھیتی باڑی تھی، مویشی بھی تھے جن کی دیکھ بھال ضروری تھی۔ بریدر نے وعدہ کیا کہ وہ کوئی نہ کوئی بددوست کر لے گا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر عبادت گاہ میں بدھا کے عظیم القامت سونے کے مجستے اور سونے کی اس کان کی تھی جس کا راز صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آرہا تھا۔ انسپکٹر بریدر اور اعظم خان اگرچہ فرض شناس اور دیانت دار آفیسر تھے لیکن اس راز کے لیے میں ان پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا تھا جو اس راز کو مرثیہ دم تک اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکے اور میں جانتا تھا کہ ایسا آدمی تلاش کرنا آسان نہیں تھا جو سونے کے پھاڑ کو اپنے سینے میں چھپا سکے۔

دھون کی وجہ سے میرا سارا پروگرام اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ اگر دھون کے والدین کو قتل نہ کیا گیا ہوتا تو دھون یہاں نہ آتی ہوتی تو میں شوبھا کے ساتھ ہندوستان جا چکا ہوتا لیکن دھون کی وجہ سے مجھے اپنا پروگرام بدلنا پڑا تھا۔

ادھر پولیس اور ناگ پال کے بیچ آنکھ چھوٹی کا کھیل جاری تھا۔ پولیس بھی ناگ پال کو کھیرے میں لے لیتی اور بھی وہ پولیس کو نچا کر رکھ دیتا۔ بہرحال یہ کھیل جاری تھا لیکن میں اس سے قطعاً لا تعلق ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے وعدے کے مطابق جزل کھوراث کے آدمیوں کو یہاں قدم نہیں جمانے دیا تھا۔ چانگ کی موت کے ساتھ ہی یہ قصہ ختم ہو گیا تھا۔ ناگ پال اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔ جزل کھوراث اگر دوبارہ یہاں قدم جمانا چاہے گا تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہو گا۔ ناگ پال کے ساتھ پولیس کا کھیل جاری تھا اور میں دھون کی وجہ سے الجھ کر رہ گیا تھا۔

تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں ترم بھوش کی طرف سے بھی کوئی غیر معمولی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ میں ایک مرتبہ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا بھی چکر لگا کر آیا تھا۔

مونیوں کی دیکھ بھال کے لیے انسپٹر بریندر نے وقتی طور پر کچھ انتظام کر دیا تھا۔ دو آدمی وہاں رہ رہے تھے لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ وہاں کچھ ایسے لوگ رکھے جائیں جو مستقل طور پر وہاں رہائش بھی اختیار کر سکیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ مایا متی ابھی ڈیوٹی سے نہیں آئی تھی۔ میں 'شوہا' اور دھو کے ساتھ پر آمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر گریٹ کھول دیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر بدھ بھکشو تھا، ایک ادھیڑ عمر عورت، ایک نو عمر لڑکی اور ایک لڑکا تھا جس کی عمر نو دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کے چروں سے ٹھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ لگتا تھا وہ کوئی لہسا سفر کر کے آئے تھے۔

بھکشو کی بغل میں ایک میلا سا تھیلہ دیا ہوا تھا جو خاصا پھولا ہوا تھا جبکہ عورت نے بھی کندھے پر ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی۔ لڑکی کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی۔ اس کے کندھے پر بھی ایک تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔

میں ابھی ہوئی نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں کہیں اور جانا تھا اور بھول کر یہاں آگئے تھے لیکن اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

کہیں یہ لوگ تھوخی کے جانے والے تو نہیں تھے ہو سکتا ہے کہ دھونا انہیں جانتی ہو۔

"ہم دلائی لاما کے دیش سے آئے ہیں۔ دھرم شالا سے۔ کیا تم ہمیں اندر آنے کو نہیں کہو گے؟" بھکشو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دھرم شالا اور دلائی لاما کا نام سن کر میں چونک گیا۔ تبت سے جلا وطنی کے بعد بدھ مت کے روحانی پیشوا نے ہندوستان میں پناہ لی تھی اور وہ طویل عرصے سے ہندوستان کی شاہی ریاست تھانپل پر دیش کے صدر مقام دھرم شالا میں رہائش پذیر تھا۔ یہاں اسے وہ تمام مراعات حاصل تھیں جو کسی جلا وطن بیڈ آف ایٹھ کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ دلائی لاما کی وجہ سے تبت سے ہجرت کر کے آنے والے ہزاروں پناہ گزین بھی دھرم شالا اور اس کے قرب و جوار کے شہروں میں آباد تھے اور اب تو ان کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

مجھے تھوخی کی باتیں یاد آگئیں۔ جب میں ان کے پاس عبادت گاہ میں رہا تھا تو تھوخی نے بتایا تھا کہ عبادت گاہ کے یہ خانے میں بدھا کے سونے کے بجائے اور سونے کی کان کا

راز دلائی لاما اور اس کے چند قریبی ساتھی جانتے تھے اور بھکشو بھی دھرم شالا سے آیا تھا اور اس نے بھی دلائی لاما کو لیا تھا۔

میں نے راست چھوڑ دیا اور وہ لوگ اندر آگئے۔ وہ نے بھکشو کو پہچان لیا۔ اس نے بتایا کہ یہ بھکشو گے پرہم میں کئی مرتبہ دھرم شالا سے یہاں آچکا ہے۔ وہ ہفتہ دس دن ان کے پاس عبادت گاہ میں رہتا تھا اور پھر واپس چلا جاتا تھا۔ عبادت گاہ میں قیام کے دوران میں وہ اور تھوخی عبادت گاہ کے اندر جا کر کئی کئی گھنٹوں تک غائب رہتے تھے۔

میرے دل میں کچھ عجیب سا خیال ابھر رہا تھا۔ کہیں وہ تو نہیں جس کا مجھے انتظار تھا؟

فوراً ہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ وہ بیٹے سے اتر کر سیدھے بیٹھ گئے اور ظاہر ہے انہیں رات بھی یہیں گزارنا ہی تھی۔ ان کی شب بھری کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔ لاؤنج میں سے صوفے اور کرسیاں ہٹا دی گئیں۔

مایا متی بھی ان مہمانوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ میرے دل میں بھی اس بھکشو کے بارے میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ بچے آئیں پاس کسی مشتبہ اجتماعی کو دیکھ کر دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگتے تھے۔

اس رات میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر دیکھ رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ سن کر پیچھے مڑا۔ وہ بھکشو تھا جو دروازے میں کھڑا مجھ سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ میں نے اسے اندر بلا لیا اور ہم دونوں تخت پر بیٹھ گئے۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم گہجے میں کہا۔

"کو۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دلائی لاما تمہارا شکر گزار ہے کہ تم نے اتنے عرصے اس راز کی حفاظت کی جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چھپ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ تمہاری چونک گیا۔ دلائی لاما کو کیسے پتا چلا کہ میں اس راز سے واقف ہوں لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں وہ بہت سی پر اسرار باتیں ابھر آئیں جو دلائی لاما سے منسوب کی جاتی ہیں۔ تبت کے پر اسرار علوم کا وہیے ہی دنیا بھر میں شہرہ ہے لیکن بہت سے علوم ایسے ہیں جو صرف اعلیٰ ترین مذہبی شخصیات تک محدود ہیں۔ صرف انہی چند بہتوں کو یہ پر اسرار علوم سکھائے جاتے ہیں جنہوں نے دھرم اور حکومت کی یاگ ڈور سنبھالی ہو۔ ان بہتوں میں دلائی لاما کے علاوہ صرف چند اور لوگ شامل ہوتے ہیں۔"

پر اسرار علوم اس طبقے تک محدود رہتے ہیں اور انہیں بڑی رازداری سے اگلی نسلوں کو منتقل کیا جاتا ہے۔

"جس روز تھوخی اور اس کی بیوی کو قتل کیا گیا تھا، دلائی لاما کو اس روز پتا چل گیا تھا۔" بھکشو کہہ رہا تھا۔ اس کی جگہ کسی ایسے آدمی کو بھیجنے کی ضرورت تھی جو اس راز سے واقف ہو اور اس کی حفاظت کر سکتا ہو۔ میں دلائی لاما کے انجی کی حیثیت سے تھوخی سے وقتاً فوقتاً رابطہ رکھتا تھا۔ میں ان دنوں بنکاک میں واٹ ٹریسٹ میں تھا۔ مجھے پیغام ملا تو میں فوراً ہندوستان واپس آ گیا اور دھرم شالا پہنچتے ہی مجھے یہاں آنے کا حکم دیا گیا۔"

واٹ ٹریسٹ کے نام پر میں چونک گیا۔ بنکاک میں اس عبادت گاہ سے تو میری بھی بت سی یادیں وابستہ تھیں۔ میںیں تو مہاراج سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی جب چاچا راتپ سنگھ کو اس عبادت گاہ کے اندر گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا اور قیمت نے مجھے مہاراج کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

مہاراج کا ریمانٹ (انتقال) ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن بہت سے لوگ ابھی وہاں موجود تھے۔ میں نے ان میں سے کچھ کے نام لیے تو بھکشو اچھل پڑا اور پھر ہم بہت دیر تک واٹ ٹریسٹ اور وہاں کے مختلف لوگوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بھکشو کے بارے میں تو میرے دل میں پہلے ہی کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان باتوں کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔

"میں اگر چاہتا تو سیدھا وہاں جاسکتا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا "لیکن تم سے مل کر تمہارا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر پتہ میرے ساتھ رہتا چاہے تو اسے ساتھ لے چلوں۔"

"اچھا ہوا تم آگئے۔" میں نے کہا "میں بہت غم مند تھا لیکن اب میرے سرے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ یہ تو دھو سے معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہے۔ ویسے میرے خیال میں وہ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہنا پسند کرے گی۔ اس کا باب برسوں پہلے کسی دوسرے شرے آیا تھا اور یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔ تم لوگوں کی وجہ سے اسے بڑا سارا رہے گا۔"

لیکن صبح دھو سے بات ہوئی تو اس نے ان لوگوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ چند روز میں وہ شوہا سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی اور مستقل طور پر اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ یہ ایک نئی مشکل آن پڑی تھی لیکن یہ مسئلہ اس طرح

حل ہو گیا کہ شوہا اسے ہندوستان لے جا کر اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہو گئی تھی۔

میں نے صبح سویرے ہی انسپٹر بریندر کو بھی بھکشو کے بارے میں اطلاع دے دی اور اسے بتا دیا کہ وہ اپنے کنبے کے ساتھ بدھ مت کی عبادت گاہ پر رہنے کو تیار ہے۔

اس دوپہر ہم لوگ ایک انٹینشن وگین پر لمبہ کدھ نیل کنڈی عبادت گاہ پر پہنچ گئے۔ یہاں قدم رکھتے ہی دھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شوہا نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔

انسپٹر بریندر ابھی ہمارے ساتھ تھا لیکن وہ وہاں پہلے سے موجود اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ہم سے الگ تھلک ہی رہا تھا۔ دھو نے بھکشو کو کھیتوں، مونیوں اور ہر چیز کے بارے میں سمجھا دیا۔ ان کا سارا سامان میںیں رہا تھا۔ دھو نے کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا اور بھکشو اور اس کے گھر والوں کو اجازت دے دی کہ وہ ہر چیز استعمال کر سکتے ہیں۔

میں اور بھکشو موقع پا کر عبادت گاہ کے پچھلے حصے میں چلے گئے تھے۔ بھکشو نے بدھا کے مجھے سے اندر ذنیہ راستہ کھولا اور ہم یہ خانے میں اتر گئے۔

"دلائی لاما نے اجازت دی ہے کہ تم یہاں سے جتنا سونا چاہو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔" بھکشو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گر مجھے سونا لے جانا ہوتا تو مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا "یہ سب کچھ میرے اختیار میں تھا۔ میں چاہتا تو۔"

"دلائی لاما نے ٹھیک کہا تھا۔" بھکشو نے گہرا سانس لیتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

"کیا۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کہ تم کچھ قبول نہیں کرو گے۔" بھکشو نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے تک یہ خانے میں رہنے کے بعد باہر آگئے۔ کسی کو ہمارے اتنی دیر غائب رہنے کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

شام سے ذرا پہلے ہم بھکشو اور اس کی فیملی سے رخصت ہو کر وگین میں بیٹھ گئے۔ دھو بڑی حسرت بھری نظروں سے عبادت گاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی کا طویل عرصہ یہاں گزرا تھا۔ ایک ایک چیز سے اس کی یادیں وابستہ تھیں اور میں جانتا تھا وہ آسانی سے ان یادوں کو فراموش

نہیں کر سکے گی۔

کئی روز تک دھنوں پر اداسی طاری رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ وہ بڑی شوخ و چٹیل اور شریر سی لڑکی تھی۔ جب ہنس چند روز ان کے ساتھ عبادت گاہ میں رہا تھا تو مجھے اس کی شونیوں اور شرارتوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔

ماں باپ کی موت کے بعد اس پر جو قوطیت طاری ہوئی تھی وہ اب ختم ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ رہی تھی۔

دھنوں بھی بڑی حسین۔ سڈول جسم اور لمبا قد۔ عبادت گاہ میں تو میں نے اسے جسم پر صرف ایک چادر لپیٹے ہوئے ہی دیکھا تھا لیکن یہاں وہ ہر قسم کا لباس پہننے لگی تھی۔ وہ بڑی جامہ زیب تھی۔ اس پر ہر لباس اچھا لگتا تھا۔ ساڑی تو اس پر خوب چلتی تھی۔

میں نے انسپکٹر برینڈرا کو بتا دیا تھا کہ اب میں ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ شوہا کو ویش کھ اغوا کر کے لایا تھا۔ میں اور ملا انسپکٹر اعظم کے ساتھ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے یہاں جرائم پیشہ گروہ کے خلاف قانون سے تعاون کیا تھا۔ میری بات صرف انسپکٹر برینڈرا تک ہی نہیں رہی تھی۔ بہت اوپر کے لوگ بھی مجھے جان گئے تھے۔ برینڈرا چاہتا تھا کہ ہماری واپسی قانونی طور پر ہو۔ میں نے اسے دھنوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور ان دنوں وہ ہمارے کاغذات تیار کر رہا تھا۔

اس دوران میں نہ تو نیلگری سے کسی قسم کا رابطہ ہوا تھا اور نہ ہی گوتم بھوش کی صورت دکھائی دی تھی اور کوئی غیر معمولی واقعہ بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گوتم بھوش یا تو مجھ سے مایوس ہو کر میرا پیچھا چھوڑ گیا تھا یا وہ کسی موقع کے انتظار میں تھا۔ یہ بات میں جانتا تھا کہ چند لوگ آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

نیلگری تو ایسی شہنشاہی جیسے حاصل کرنے کے لیے متعدد لوگ کٹ اٹھا رہے تھے۔ تپتیا کی جاری تھی اور کھٹناٹیاں برداشت کی جا رہی تھیں۔ گوتم بھوش بھی نجانے کب سے یہ سارے کشت (مشکلات) اٹھا رہا تھا۔ وہ آسانی سے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اسے یہ توقع بھی ہوگی کہ وہ منزل پر پہنچنے والا ہے لیکن میں بیچ میں نچک رہا تھا۔ اس رات رتیا پارک میں کرشل کا ٹوٹا ہوا مجسمہ لمبائی غضب ہو گیا تھا۔ نہ وہ مجسمہ ملتا اور نہ میں اس پکڑ میں پھنستا۔ ہمارے کاغذات مکمل ہو گئے۔ ہمارے لیے دو دن بعد

کی تاریخ میں ہوائی جہاز بروہلی کے لیے سینیں بک کر وادی گئیں۔ اس فلائٹ کے شیڈول کے مطابق ہم سپر چار بجے واپس پہنچ جاتے اور ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ اسی شام دہلی ریلوے اسٹیشن سے پنک سٹی ایکسپریس پر سوار ہو کرے پور روانہ ہو جائیں گے۔ (پنک سٹی ایکسپریس روانہ صبح چھ بجے دہلی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوتی ہے اور دو سو ستر کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے پانچ گھنٹے بعد دوپہر گیارہ بجے پور پہنچ جاتی ہے۔ پھر شام چار بجے پور سے روانہ ہو کر رات نو بجے واپس دہلی پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری پنک سٹی ایکسپریس انہی اوقات کے مطابق پور سے دہلی اور دہلی سے پور کے درمیان چلتی ہے)

اگلا دن ہم نے شاپنگ کرتے ہوئے گزارا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ راج کماری روپ متی اور دوسروں کے لیے بہت سے تحائف خریدے تھے۔ شوہا واپس جانے کے خیال سے بہت خوش تھی جبکہ دھنوں پر عجیب سسٹنی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی ساری زندگی ایک عبادت گاہ میں گزری تھی۔ اس کے لیے تو یہ شرمیلی انجینی تھا۔ بارہ چودہ برسوں کے عرصے میں وہ صرف چند مرتبہ ہی تو شر آئی تھی۔ اس کے لیے یہاں کے لوگ بھی انجینی تھے اور اب وہ ایک نئے دیش جاری تھی جہاں کی ہر چیز اس کے لیے انجینی ہوگی۔

ہسپتال میں سب سے ہماری ملاقات بڑی جذباتی ثابت ہوئی تھی۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انسپکٹر برینڈرا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا پورا خیال رکھے گا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا تو اسے جیپ پر اس کے قبیلے میں پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ کھنڈوبی میں رہنا چاہے گا تو اس کے لیے روزگار کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔

اگلے روز جہاز کی پرواز سے ایک گھنٹہ پہلے ہم ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ برینڈرا اور انسپکٹر اعظم سادہ لباس میں ہمیں الوداع کہنے آئے تھے۔ وہ ہمیں ایئر پورٹ پر چھوڑ گئے تھے۔ تاہم مایامی اس وقت تک ہمارے ساتھ موجود رہی تھی جب تک ہم ڈیپارچر لاؤنج میں داخل نہیں ہو گئے تھے۔ وہ نہ صرف دھنوں اور شوہا سے ملنے کی بھی بلکہ مجھ سے بھی اپنٹ کر اسی نے اس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہم جہاز میں اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ روانگی میں چند منٹ باقی تھے۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک وین بڑی تیز رفتاری سے ٹارمک (TARMAC) پر دوڑتی ہوئی جہاز کی طرف آ رہی تھی۔ اس وقت جہاز کی

پڑھیں بٹائی جا رہی تھیں۔ وین جہاز کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں نصف درجن آدمی وین سے اترے۔ ان سب کے پاس آئوٹریک رافٹس تھیں۔

پڑھیاں دوبارہ جہاز سے لگادی گئیں۔ وین سے اترنے والے مسلح آدمی اب میری نظروں میں نہیں رہے تھے لیکن دو منٹ بعد جہاز کا دروازہ کھلا اور دو مسلح آدمی اندر گھس آئے۔ دو آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے آگے والے حصے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی رافٹیں تان لی تھیں۔ دو آدمی وہیں دروازے کے پاس رک گئے۔ دو آدمی آگے بڑھ آئے۔ ساتویں آدمی کے پاس ریو لور تھا۔

مسافروں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ کسی کو سوچنے کا موقع تک نہیں مل سکا تھا۔ اس صورت حال نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔

ریو لور والا دو گن میٹوں کے ساتھ مسافروں کے چروں کو گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مسافروں کو وارننگ دے دی گئی کہ کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ ہر شخص اپنی سیٹ پر سہا بیٹھا تھا۔

میں شوہا اور دھنوں کی ہی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ریو لور والا ہماری سیٹوں کے قریب رک گیا۔ اس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میری طرف ریو لور تان لیا اور جیج گراپے آدمیوں سے کچھ کہا۔ چار گن مین دوڑ کر قریب آ گئے اور انہوں نے ہم میٹوں کو رافٹوں کی ذپرے لیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ ریو لور والے نے ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ ہم ایک ایک کر کے سیٹوں سے باہر آ گئے۔ ایک گن مین نے ہمارے جسموں کو تھپتھا کر ہماری تلاشی لی اور پھر رافٹوں کی ذپرے ہمیں جہاز سے اتار دیا گیا۔ ہمارا سامان بھی ان لوڈ کر دیا گیا تھا۔

اس صورت حال نے مجھے بری طرح بد خواص کر دیا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میرے ہاتھ پشت پر لے جا کر پھنک دی گئی اور مجھے دھکیل کر روں میں بٹھا دیا گیا۔ دھنوں اور شوہا کو بھی وہیں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ تاہم انہیں پھنکنا نہیں لگائی تھیں۔ وہ چھ کے چھ مسلح آدمی ہمارے ساتھ اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ ہم ان کے درمیان دب کر رہ گئے۔ ہمارا سامان بھی وہیں کی چھت پر رکھ دیا گیا تھا۔ وین حرکت میں آ کر کچھ دیر تک ٹارمک پر دوڑتی رہی اور پھر ایک گیٹ سے ہوئی

ہوئی ٹرمینل کی عمارت سے باہر آئی۔ عمارت سے باہر سڑک پر آتے ہی مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنا سر جھکائے رکھوں اور باہر دیکھنے کی کوشش نہ کروں۔

وین تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک دوڑتی رہی۔ اس میں بائیں ٹریفک کا شور سنا دے رہا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ ہم شہری کے کسی علاقے میں سفر کر رہے تھے لیکن پھر ٹریفک کا شور بتدریج کم ہوا گیا اور بالآخر وین رُک گئی۔

ہمیں نیچے اتار لیا گیا۔ یہ کوئی حوالی نما پرانی عمارت تھی۔ اس کی چار دیواری تفصیل کی طرح اونچی تھی۔ عمارت اگرچہ بہت شان دار تھی لیکن لگتا تھا برسوں سے اس پر رنگ روغن کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ کچھ لوگوں کو فوجی وردیوں میں دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ اس حوالی نما عمارت میں فوج کا کوئی دفتر قائم تھا۔ باہر سے دقتاً فوجی گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ عمارت شہری حدود میں ہی واقع تھی۔

میں نے ایک بار پھر پوچھنا چاہا کہ ہمیں کیوں پکڑا گیا ہے لیکن جواب میں میرے سینے پر ایک زوردار کھونسا جڑ دیا گیا تھا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میں نے دھنوں اور شوہا کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے بھی خوف سے پیلے پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں رافٹوں کی ذپرے عمارت کے اندر لے آیا گیا۔ کئی راہداریوں میں مڑنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ ریو لور والا ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی اور پھر ہمیں اندر لے جایا گیا۔

یہ کمر خاصا وسیع و عریض تھا۔ فرش پر تالین بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بہت بڑی آئین ٹیبل تھی جس کے پیچھے درمیانے قد کا ایک ہماری ہم عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر تن اور شکل بل ڈاگ جیسی تھی۔ جہڑوں کے نیچے گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا سوٹ بڑا عجیب سا لگا رہا تھا۔ وہ چند لمبے کینے توڑ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر شوہا اور دھنوں کی طرف دیکھنے لگا۔ دھنوں کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

اس دفتر میں دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چروں پر بھی کڑی نگرانیوں تھیں۔ میرے ساتھ آنے والے نے مجھے کی طرف دیکھتے ہوئے

کچھ کہا۔ مگنا ایک بار پھر گہری نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحوں میں کچھ باتیں کرتے رہے اور پھر مجھے نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ کن میں ہمیں کمرے سے باہر لے آئے۔

ہم ایک بار پھر مختلف راہداروں میں چلتے رہے اور ایک اور سلاخوں والے دروازے پر رک گئے اور اس وقت یہ جان کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ شوہا اور دھونو میرے ساتھ نہیں تھیں۔ انہیں غالباً راستے ہی میں کسی اور طرف لے جایا گیا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔

یہ کرا اٹھ بانی آٹھ فٹ تھا۔ چھت بہت اونچی تھی۔ مدھم روشنی کا ایک بلب چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ پچھلی طرف کافی اونچائی پر ایک مختصر سا روشن دان تھا جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

دو کن میں میرے ساتھ کوٹھری میں گھس آئے تھے۔ ایک نے میری تلاشی لی۔ جیبوں میں جو کچھ تھا وہ نکال لیا اور پھر میرے گلے سے مالا بھی اتاری گئی۔ اس وقت میں نے گردن جھٹک کر مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔

”یہ ساری چیزیں امانت کے طور پر ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔ اگر تم بے گناہ ثابت ہوئے تو سب کچھ واپس کر دیا جائے گا۔“ اس شخص نے کہا پھر میری ہتھکڑی کھول دی اور مجھے جوتے اتارنے کو کہا گیا۔

”میرا جرم کیا ہے۔ آخر ہمیں اس طرح کیوں پکڑا گیا ہے؟“ میں نے زمین پر بیٹھ کر جو گڑا تارتے ہوئے پوچھا۔

”بہت بھولے بنے ہو۔“ اس شخص نے کہا ”یہ ملٹری انٹیلی جنس کا ہیڈ کوارٹر ہے اور تمہیں جاسوسی کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔“

”جاسوسی!“ مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا ”شاید تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”انٹیلی جنس بغیر کسی ثبوت کے کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔“ اس شخص نے کہا ”ساری باتیں جب تمہارے سامنے آئیں گی تو تمہیں بھی پتا چل جائے گا کہ ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔“

وہ دونوں باہر نکل گئے اور کوٹھری کے سلاخوں والے دروازے کو مالا لگا دیا گیا۔ میں نے ان سے شوہا اور دھونو کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کوئی جواب دے بغیر چلے گئے۔ میں سر پکڑ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک نئی

محبت آن پڑی تھی۔ مجھ پر جاسوسی کا الزام دیا ہی منہ نہ تھا۔ میں کس کے لیے جاسوسی کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی اور کے دھوکے میں مجھے پکڑا گیا ہے۔ ممکن ہے وہ شخص اسی جہاز میں ہو جسے یہ لوگ پکڑنا چاہتے تھے۔ غلط فہمی کی وجہ سے میں ان کے قابو میں آ گیا اور وہ بچ کر چلا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں برہنہ اور وغیرہ میرے بارے میں بتائیں گے تو ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی اور یہ مجھے چھوڑ دیں گے۔

میں شوہا اور دھونو کے بارے میں سوچنے لگا۔ انہیں بھی شاید کسی اور کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان سے بھی میرے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ان پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے۔

کمرے میں پیشاب کی بو سے میرا دماغ پھنسا جا رہا تھا۔ میں دروازے کے قریب بیٹھ گیا تاکہ تازہ ہوا میں سانس لے سکوں۔ میں نے ایک مرتبہ سلاخوں سے منہ لگا کر اذرا دھر جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں طرف طویل راہداری تھی اور غالباً سنسان پڑی تھی۔

سامنے والی دیوار کے اونچے روشن دان سے دن کی روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا روشنی مدھم ہوتی چلی گئی۔

شام ہو چکی تھی۔ روشن دان کے باہر اندھیرا تھا۔ چھت پر چلنے والا بلب غالباً ساٹھ واٹ کا تھا۔ اس کی روشنی بہت کم تھی۔

لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھے اس کوٹھری میں بند کر کے بھول گئے ہوں۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ کوٹھری شاید عمارت کے کسی آخری حصے میں واقع تھی اور اس طرف کسی کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری وحشت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ نیلگہ کی مالا مجھ سے چھن گئی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ غلط باتوں میں نہ پہنچ جائے۔

اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں سب کچھ برداشت کر لیتا لیکن اب قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس ملک کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ دنیا کے ان سفاک اور خطرناک ترین انسانوں سے انہیں نجات دلائی تھی جو اس ملک اور اس کے معصوم عوام کو تباہی کے غار میں دھکیلتا چاہتے تھے لیکن مجھے اس کا کیا صلہ دیا گیا تھا۔ ایک ناکوردہ جرم میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد کسی نے

خبرک نہیں لی تھی۔

اب مجھ میں برداشت کا یارا نہیں رہا تھا۔ مجھے شوہا اور دھونو کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ ان کے ساتھ بتائیں کیا سلوک کیا گیا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ وہ لوگ انہیں بھی کسی کوٹھری میں بند کر کے بھول گئے ہوں۔ میں نے بالآخر خرجی کی قوت کو استعمال میں لانے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن۔۔۔ چند لمحوں بعد ہی میں دہل کر رہ گیا۔ میں اپنے آپ کو اندر سے بالکل کھوکھلا محسوس کر رہا تھا۔ ایک گہرا سناٹا تھا جو میرے وجود کے اندر طاری تھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے اندر اس پر اسرار قوت کو ابھارنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

میری وحشت بڑھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ کہیں میں اپنے اندر کی اس قوت سے محروم تو نہیں ہو گیا؟ لیکن نہیں۔ یہ کوئی جیب میں پڑا ہوا سکہ تو نہیں تھا جو کہیں کھو گیا ہو۔ یہ قوت تو میں نے بڑی محنت اور ریاضت سے حاصل کی تھی لیکن میں اپنے آپ کو کھوکھلا سا کیوں محسوس کر رہا تھا؟ نیلگہ کی مالا بھی میرے پاس نہیں رہی تھی۔ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سناٹے میں قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں دروازے کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ آواز قریب آتی گئی اور ایک منٹ بعد دو گن میں سامنے آ گئے۔ انہوں نے دروازے کا ٹالا کھولا اور مجھے کوٹھری سے نکال کر دیکھ دیتے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ ان دونوں نے مجھے راہنظروں کی ذور لے رکھا تھا۔

وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے آئے تھے جہاں ایک میز کے پاس دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی چروں سے بہت سفاک اور درندہ صفت لگ رہے تھے۔ مجھے ان کے سامنے ایک اسٹول پر بٹھا دیا گیا۔ دونوں گن میں دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

اس کمرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ کوئی عقوت خانہ تھا۔ ایذا رسانی کے جدید آلات نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف دیوار کے قریب بیچ پر ہمارا وہ سامان بھی کھرا پڑا تھا جو ہمارے آتا رہا تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سامان کی تلاشی لگائی تھی۔ سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس جو میں نے ایک دن پہلے ٹھکانے کے لیے خریدا تھا اندر سے اوڑھا پڑا تھا۔ وہ دونوں انٹیلی جنس آفیسر تھے۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پتھروں کو بھی زبان کھولنے پر مجبور

”یہ درست ہے کہ میرا اصل نام وجدان ہے لیکن باقی دو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ غلط ہے۔ میں نہ کوئی ایجنٹ ہوں اور نہ ہی کسی منصوبے کے تحت یہاں آیا تھا۔ میں تو اپنی دوست شوبھا کو بچانے کے لیے دلش کھ کا تعاقب کرتے ہوئے آیا تھا۔ شوبھا بھی تمہاری تحویل میں ہے۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔ پولیس انسپٹر اعظم خان بھی میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔“

”ہم بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔“ اس شخص نے کہا ”یہ کاغذات تمہارے برف کس کے خفیہ خانے سے برآمد ہوئے ہیں۔“ اس نے میز کی دراز سے کاغذات کا پلندہ نکال کر دکھایا ”اس میں شہر نہیں کہ انڈیا سے ہماری حکومت کے تعلقات دوستانہ ہیں لیکن ہندوستان پر بھی ہمیں بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے بوش دوستی کی آڑ میں ہماری پشت میں چھرا گھونسنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اپنی گٹھائوں کو ششوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ سکر، گوا، آسام سب اس کی دوستی کا شکار ہوئے ہیں۔ ہندوستان ایک ایسا اڑوا ہے جو اپنے دوستوں کو بھی اپنی پلیٹ میں لے رہا ہے لیکن نیپال، بھارت اس کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ تم اگر یہ کاغذات لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمیں واقعی ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ ہم یہ جانتا چاہتے ہیں کہ یہاں تمہارے ساتھ اور کون کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک بتا دو گے تو ہم تمہیں سرکاری گواہ بنا کر تمہاری سزا میں کچھ کمی کر سکتے ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا ”یہ برف کس میں سے کل ایک دکان سے خریدا تھا اور ان کاغذات کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ درست ہے کہ میں غیر قانونی طور پر نیپال میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں میں نے اس ملک کے مفاد میں کام کیا ہے۔ ایک ایسی سازش کو ناکام بنانے میں قانون کی مدد کی ہے جو اگر کامیاب ہو جاتی تو یہاں ایک بہت ہی خوفناک طوفان آجاتا۔ تم لوگ پولیس انسپٹر برینڈر اور دوسرے حکام سے دریافت کر سکتے ہو۔“

”وہ بھی ہمزہ یافتہ کرلیں گے۔“ اس مرتبہ لمبے قد والا بولا ”یہ کاغذات تمہیں کس نے دیئے تھے؟“

”میں ان کاغذات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

میں نے جواب دیا ”یہ برف کس میں نے اپنے ایک دوست کو تحفے میں دینے کے لیے بازار سے خریدا تھا۔ مجھے ان کاغذات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“ بات کرتے کرتے اچانک ہی مجھے یاد آگیا کہ کل جب میں ایک دکان دار کو

برف کس دکھانے کو کہا تھا تو دکان دار کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں برف کس اپنے دوست کو تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے چند برف کس دکھائے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں واقعی بہت اچھا برف کس لینا چاہتا ہوں تو شام کو آجاؤں اور شام کو جب میں دوبارہ وہاں گیا تو اس نے مجھے یہ برف کس دے دیا تھا۔

میں نے انٹیلی جنس آفیسروں کو یہ بات بتادی لیکن انہوں نے یقین نہیں کیا۔ وہ ایک گھنٹے تک مجھ سے سوالات کرتے رہے اور میں وہی جواب دیتا رہا۔ درمیانے قد والے نے اچانک ہی اٹھ کر میرے منہ پر زوردار گھونسا مار دیا۔ یہ حملہ اچانک ہی ہوا تھا۔ میں چیخا ہوا اسٹول سمیت پیچھے الٹ گیا۔ اس شخص نے سنبھلنے کا موقع دینے بغیر میرے جسم پر گھونسلوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی اور ٹھوڑی دیر بعد دوسرا بھی اس ”کابو خیر“ میں شامل ہو گیا۔ وہ دونوں حسب توقع مجھ پر لائیں اور گھونسنے پر ساتے رہے۔

وہ دونوں شاید تھک گئے تھے۔ انہوں نے دروازے میں کھڑے ہوئے گن میٹوں کو حکم دیا۔ انہوں نے رائفلیں میز پر رکھ دیں اور میرے ہاتھ پر پست پر لے جا کر پھٹکڑی ڈال دی اور میرے پیروں کو بھی ایک ایک رسی سے باندھ دیا۔ رسی کا دوسرا سرا پھٹت پر لگے ہوئے ایک کٹڈے سے گزر کر ایک دیوار کے ساتھ ٹک میں بندھا ہوا تھا۔ دونوں گن مین رے کو کھینچنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں الٹا نکلا ہوا تھا۔ میرا سر زمین سے تقریباً تین فٹ اوپر تھا۔

پست قامت آدمی ایک بار پھر میرے جسم پر گھونسنے پر ساتے لگا اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی باکسر ٹیکس بیک پر باکسنگ کی مشق کر رہا ہو۔ اس کے گھونسنے بھاری ہتھوڑوں کی طرح میرے پیٹ پر برس رہے تھے۔ ہر ضرب پر میں چیخ اٹھتا۔

میں تقریباً بیس منٹ تک الٹا نکلا رہا پھر مجھے فرش پر ڈال دیا گیا۔ لگتا تھا جیسے جسم کا سارا خون میرے سر میں جمع ہو گیا ہو۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید بینائی ختم ہو گئی تھی۔

چند منٹ بعد میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے۔ بینائی بھی آہستہ آہستہ لوٹ آئی لیکن میں کوئی چیز صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نظروں کے سامنے اب بھی وحشت مچھائی ہوئی تھی۔

لمبے قد والا پھر اپنے سوالات دہرانے لگا اور میرے جواب بھی وہی تھے۔ اس مرتبہ مجھے اٹھا کر لوہے کے ایک

ایسٹینڈر کھڑا کر دیا گیا جو صلیب کی شکل کا تھا۔ میرے بازو میں بائیں ٹکلی ہوئی آہستہ پلیٹوں پر بکڑ دینے لگے اور چپلی خرف لگا ہوا ایک مٹن دیا گیا۔ میرے دونوں بازو اطراف میں کھینچے گئے۔ کچھ دیر تک تو میں برداشت کرتا رہا لیکن پھر میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے کندھوں کے جوڑا کھڑ جائیں گے۔

دراز قامت انٹیلی جنس آفیسر میرے سامنے کھڑا سوالات دہراتا رہا اور میں ”نہیں نہیں“ کرتا رہا۔ اس نے مٹن میں لگا ہوا مٹن دیا دیا۔ آہستہ پلیٹیں آہستہ آہستہ نکلیں اور میری بانسوں کا تاج بھی بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔

رات بھر وقفے وقفے سے میرے ساتھ یہ ہوتا رہا۔ یہ میری قوت ارادی تھی کہ میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا اور اب تک زندہ تھا۔ وہ رات کا آخری پیر تھا جب مجھے ایک ہیڈلٹ پہنا دیا گیا۔ مجھے کرسی پر بٹھا کر میرے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے تاکہ میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکوں۔ ہیڈلٹ کے ساتھ بجلی کے تار منسلک تھے۔ اس کا پلگ پچھلی دیوار کے سائٹ میں لگا دیا گیا۔ سوچ آن ہوتے ہی ہیڈلٹ میرے سر پر تنگ ہونے لگا۔ میرا سر آہستہ نکلنے میں کسا جا رہا تھا۔ کھوپڑی چبھنے لگی۔ میں چیخا رہا۔ میری آخری چیخ بڑی خوفناک تھی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر بھینچ چلی گئی اور میرا سرا ایک طرف ڈھلک گیا۔

ہوش آیا تو میں اسی کوفٹری میں پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی کافی دیر تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اور پھر دھند سی چھائی رہی۔ کئی منٹ بعد دھند بتدریج جتنے گئی اور روشن دان سے چمکتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ میری آنکھوں اور کندھوں کے جوڑ میں شدید درد تھا۔ کھوپڑی بھی کچھ جاتی تھی۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں شدید ٹیکس نہ اٹھ رہی ہوں۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا تھا۔ میں نے آنکھیں کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ اٹھا۔ میرے جسم کا جوڑ جو شدید احتجاج کرنے لگا تھا۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بدلے جس حرکت پڑا رہا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے کھوپڑی اب بھی آہستہ نکلنے میں جکڑی ہوئی ہو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ذہن کو کبھی آزاد چھوڑ دیا۔

اگرچہ میری اپنی حالت نہایت ابتر تھی لیکن دھن اور شوبھا کا خیال بھی مجھے پریشان کیے ہوئے تھا۔ نہ جانے ان دونوں کے ساتھ انہوں نے کیسا سلوک کیا ہو گا اور وہ کس حال میں ہوں گی۔ انسپکٹر برینڈر کا ہمارے بارے میں بتا چلا تھا یا نہیں اور کیا وہ اس معاملے میں ہماری کوئی مدد کر سکیں گے۔ میں جانتا تھا کہ میں بے گناہ ہوں۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن میرے خلاف ایسی گٹھائوں کی سازش کرنے والا کون ہو سکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جنرل کھورٹ کا نام ابھرا۔ میں نے اسے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ سب سے پہلے تھا کی لینڈ سے اس کے قدم اکھاڑے تھے۔ پھر گولڈن ٹرائی الٹنگ میں اس کی بہبودن کی ایک لیبارٹری تباہ کرنے کے علاوہ اس کے کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ اس کے آدمی میرے تعاقب میں لگے رہے تھے۔ شاؤلن ٹیبل میں بھی مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی بار بار کوشش کی گئی تھی لیکن میں ہر بار... پختہ رہا تھا اور اب یہاں بھی میں نے اسے بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ وہ یہاں جو منیٹ ورک قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اسے میں نے تس تس سنس کر دیا تھا۔ یہاں بھی اس کے دو آدمی میری وجہ سے مارے گئے تھے۔ سام سنگ اور چانگ لی کا شمار اس کے اہم ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ جنرل کھورٹ کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اس نے بہت پائی طرح پوری دنیا کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر جگہ اس کے گرے موجود تھے۔ یہاں چانگ لی اور سام سنگ ختم ہو گئے تھے تو کیا ہوا۔ ناگ پال تو ابھی زندہ تھا اور آزاد بھی تھا۔ میرے خلاف اس سازش میں یقیناً انہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ یہ لوگ مجھے رات سے بٹانا چاہتے تھے۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ قہقہے کی آواز سن کر چونک گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشن دان کی طرف نظر اٹھتے ہی مجھے اپنے سینے میں دل دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ پھٹ دھیراج تھا جو روشن دان کی دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اس طرف کوئی کارلس وغیرہ ہو یا وہ ہوا میں معلق ہو۔ اس کے بدن پر حسب معمول ایک مختصر سا لنگوٹ تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا۔

”ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے بالک۔“ اس نے کہا ”تمہیں کما تھا ناکہ ہمارے راستے میں مت آؤ۔ گرو نے بھی تمہیں بہت سمجھایا لیکن تم نہیں مانے۔ تمہیں راستے سے

ہٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا بالکل۔

”تو یہ تمہاری شرارت تھی؟“ میں نے کہا۔

”گرو تو یہاں سے بہت دور جا پڑ بیٹھا ہے۔ یہ میری شرارت ہے۔ ہاں۔ تم اسے شرارت ہی کہو گے۔ ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، بہت بھیاں ہوگا۔“

”یہ پریشانی وقتی ہے پنڈت دھیراج۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”تم دونوں میرے انتقام سے بچ نہیں سکو گے۔ یہاں سے نکلنے ہی سب سے پہلے میں تمہارا ہی بندوبست کروں گا۔“

”اپنے آپ کو بچانے کی سوچو مورکھ۔“ پنڈت دھیراج بولا ”تمہیں اس مالا بھر ٹھنڈا تھا۔ اب یہ مالا میرے قبضے میں ہے۔ تم کچھ نہیں کر سکو گے۔“ اس نے ایک ہاتھ روشن دان کی سلاخوں سے اندر داخل کر دیا۔ اس کی استخوانی انگلیوں میں نیلگری کی مالا بھنسی ہوئی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس پنڈت کے ہاتھ میں مالا دیکھ کر میرا دماغ سلگ اٹھا تھا۔

”یہ۔ یہ مالا تم نے کہاں سے لی؟“ میں نے کہا۔

”یہ دینا ہے مورکھ۔ ہر شخص دھن کی پوجا کرتا ہے۔“ پنڈت دھیراج نے جواب دیا ”میں نے اس آئینہ کو چند سو روپے رشوت دے کر یہ مالا لے لی ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟

تم کچھ نہیں کر سکو گے مورکھ! جو کچھ کریں گے، ہم کریں گے۔“

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں اور پھر اچانک ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ سینے میں لاوا سا کھول رہا تھا۔

میں اپنے آپ میں ایک تبدیلی واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ میری نظریں پنڈت دھیراج کے استخوانی پنجے پر مرکوز ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں پیش بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی ہوں۔

پنڈت دھیراج ایک بار پھر قہقہے لگنے لگا۔ شاید وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا لیکن اچانک ہی اس کے قبضے بھیاںک جج میں بدل گئے۔ اٹک کے ایک شعلے نے اس کے استخوانی پنجے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مالا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر کی طرف گر گئی۔ چند منٹ پہلے تک میں اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل بھی نہیں تھی لیکن مالا نیچے گرتے ہی میں حیرت انگیز طور پر اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ روشن دان میں لگی ہوئی آہنی سلاخوں کے باوجود پنڈت

دھیراج نے کوٹھری کے اندر جھلنگ لگا دی تھی لیکن میرا ہاتھ اس سے پہلے مالا تک پہنچ گیا تھا۔

اب میں مکمل طور پر حواس میں تھا۔ میرے اندر کا کھوکھلا پن ختم ہو گیا تھا اور میرے اندر کی وہ قوت بھی لوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور میرے اندر کی اس پراسرار قوت نے شعلے بن کر پنڈت دھیراج کے ہاتھ کو جھلسایا تھا اور نیلگری کی مالا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی جو اب میرے قبضے میں آچکی تھی۔

پنڈت دھیراج کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں نے اچانک ہی اسے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ کتے کی طرح پنج اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس کی بہت بدل گئی۔ وہ کتا بن گیا۔ میں اس پر ٹھوکریں برساتا رہا اور وہ چیخا ہوا کوٹھری میں ادھر ادھر دوڑتا رہا۔ وہ دروازے کی آہنی سلاخوں سے ٹکرایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر اندرونی حصے کی طرف دوڑے گا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سلاخوں سے باہر نکل گیا۔ سلاخیں چار چار گانچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کتے کے باہر نکل جانے سے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ پنڈت دھیراج تھا۔ پراسرار شہتی کا مالک۔ وہ روشن دان کی ٹنگ سی سلاخوں سے اندر آ گیا تھا تو اس کے لیے اور باتیں کیا معنی رکھتی تھیں۔

وہ کتا راہداری میں ”چھاؤں چھاؤں“ کرتا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ میں نے مالا گلے میں ڈال لی اور دروازے کے قریب فرش پر لیٹ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

میں اپنے آپ میں توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ ہم کل دوسرے کھانا کھا کر

ایز پورٹ جانے لگے تھے اور یہ دوسرے دن کی دوپہر ہو چکی تھی۔ گویا تقریباً چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے اور اس دوران میں مجھے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں دیا گیا تھا۔

میں آنکھیں بند کر کے فرش پر پڑا رہا اور پھر راہداری میں قدموں کی آواز سن کر چونک گیا۔ قدموں کی ان آوازیوں سے اندازہ لگا دیا جاسکتا تھا کہ وہ کئی آدمی تھے۔ میں کسی نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ تفتیش کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگا۔ تفتیش کا مطلب تھا تشدد اور مار پیٹ۔

قدموں کی آواز قریب آتی گئی۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ چند سیکنڈ بعد کئی افراد دروازے کے سامنے آکر

رکے ان میں انسپٹر بریندرا اور اعظم خان اور پولیس کے دو اعلیٰ افسروں کو دیکھ کر میں جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس گروپ میں اٹھلی جنس کے تین افسران بھی تھے۔ ایک تو وہی بچے تند والا تھا جس نے مجھ پر تشدد کیا تھا۔ دوسرا میرے لیے انجینی تھا۔ تیسرا ایل ڈاگ کی شکل والا وہی بھاری بھر کم تھا جس کے سامنے مجھے سب سے پہلے پیش کیا گیا تھا اور غالباً اس کے حکم پر مجھے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس گروپ کے پیچھے دو اور آدمی تھے جنہوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔

دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ لوگ اندر گھس آئے۔ انسپٹر بریندرا اور اعظم خان تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قریب آئے۔ بریندرا کی آنکھوں میں چنگاریاں سی سلگنے لگی تھیں۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر اور اٹھلی جنس کا سربراہ تیز لے میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ پولیس آفیسر خامے غصے میں تھا۔

اسٹریچر دروازے کے سامنے راہداری میں رکھ دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے پیروں پر چل کر جاؤں گا لیکن جب کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ اٹھا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ اعظم خان اور بریندرا نے مجھے سہارا دے کر اسٹریچر پر لٹایا۔

مجھے اس پراسرار حویلی (اٹھلی جنس ہیڈ کوارٹر) سے سیدھا اسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں مایا تھی مجھے دیکھ کر دبشت زدہ رہ گئی۔ میرا علاج فوراً ہی شروع ہو گیا تھا۔

اس کے کئی گھنٹوں بعد جب میں مکمل طور پر اپنے حواس میں تھا تو انسپٹر بریندرا نے مجھے بتایا کہ جس دکان سے میں نے بریف کیس خریدا تھا، گڑ بڑ وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ چرائے جانے والے نیپال کے سرکاری راز اسی طرح انڈیا بھیجتے تھے۔ وہ بریف کیس میرے حوالے کیا گیا تھا جس کے خفیہ خانے میں کاغذات چھپے ہوئے تھے۔ انڈیا بھیجتے ہی ان کے آدمی کسی نہ کسی طرح وہ بریف کیس مجھ سے لے لیتے۔

بریندرا نے بتایا کہ وہ دکان دار اور اس کی نشان دہی پر تم اور بھارتی ایجنٹ پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے بیان دیا تھا کہ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو مجھے بھی اندھیرے میں رکھ کر میرے توسط سے بریف کیس میں چھپے ہوئے کاغذات انڈیا بھیجنا چاہتے تھے۔

انسپٹر بریندرا کو میری گرفتاری کا پتا آج صبح چلا تھا۔ اس نے اپنے افسران اعلیٰ کو اطلاع دی اور مجھے چھڑانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔

شوہا اور دھن کے ساتھ اگرچہ مار پیٹ نہیں کی گئی تھی لیکن انہیں ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ انہیں الگ الگ رکھ کر ان سے بھی میرے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ انہیں طرح طرح کے لالچ بھی دیے گئے تھے کہ اگر میرے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتا دیں تو ان کے ساتھ رعایت کی جائے گی لیکن انہوں نے بھی وہی سب کچھ بتایا تھا جو وہ جانتی تھیں۔ انہیں بھی میری طرح بھوکا سا پارکھا گیا تھا۔

ان دونوں کو بھی ایک دوسری گاڑی میں اسپتال لے آیا گیا تھا۔ انہیں چونکہ مارا جینا نہیں کیا تھا۔ وہ صرف خوف زدہ تھیں اس لیے انہیں مجھ سے الگ رکھا گیا تھا لیکن شام کے وقت انہیں بھی مجھ سے ملنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر وہ دونوں دہشت زدہ سی ہو گئی تھیں۔

شام سات بجے مایا تھی کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تو وہ ان دونوں کو ساتھ لے گئی اور مجھے تو ظاہر ہے کئی روز اسپتال ہی میں رہنا تھا۔

انسپٹر بریندرا اور اعظم خان کا بھی یہی خیال تھا کہ ناگ پال کے آدمیوں نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن اس دکان دار کی گرفتاری کے بعد ان کے لیے بات اس طرح واضح ہو گئی تھی کہ یہ انڈیا کے جاسوس کا ایک الگ ریکٹ تھا جو طویل عرصے سے یہاں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ ان کا طریقہ کار بڑا مختلف تھا اس لیے کوئی پکڑا نہیں گیا تھا لیکن یہاں بازی پلٹ گئی تھی۔ میرے معاملے میں چونکہ پنڈت دھیراج ملوث ہو گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ یہ تھا کہ مجھے پکڑا دیا جائے تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔ مجھے رات بھر تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ میں نے بریف کیس میں کاغذات کی موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ بریف کیس کہاں سے خریدا گیا تھا اس لیے بات کچھ دوسری طرف نکل گئی تھی اور اس طرح انڈین ایجنٹوں کا وہ ریکٹ پکڑا گیا تھا۔ کچھ لوگ روپوش ہو گئے تھے۔

مجھے اسپتال میں دس روز ہو گئے۔ مجھے علاج کی بہترین سولتیس مہیا کی گئی تھیں۔ میں اگرچہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہا تھا تاہم ڈاکٹر کا خیال تھا کہ مجھے دو چار دن اور اسپتال میں رہنا پڑے گا۔

اس دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ دھنو اور شوہا بھی روزانہ مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہیں۔

مزید تین دن بعد مجھے اسپتال سے رخصت کر دیا گیا اور



نورالامین رضوی صاحب کی ڈراما  
کدوئی میں رچ کر دہ کتاب



قیمت 45 روپے ••• ڈاک خرچ 23 روپے

مٹاپا..... دل سے دشمنی  
مٹاپا..... زندگی کا خاتمہ

کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں  
آپ کے ساتھ نہ ہوں۔

تو پھر جلدی کیجئے.....

حصاری صراف کدوئی کتاب

”مٹاپا اور اس کا سدا باب“ کا مطالعہ ضرور  
کیجئے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس  
پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول  
جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پستی منی آرڈر  
ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں



63-C فیروز ٹیکسٹائٹس D.H.A. بینک، روڈ، کراچی

بھوش آج کل پھر کسی جاب پر بیٹھا ہوا ہے لیکن وہ جاب ایسا  
نہیں ہے جو ہمارے لیے کسی فوری خطرے کا باعث بن سکے۔  
اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو مجھے فوراً ہی اس کی خبر ہو جاتی۔“  
”جاب تو کوئی نہ کوئی مل سکتی حاصل کرنے کے لیے ہی ہوتا  
ہے۔“ شوہا بولی ”ہو سکتا ہے گو تم بھوش اپنے قدم مضبوط  
کرنے کے لیے کوئی چھوٹا موٹا جاب کر رہا ہو۔ اس طرح اس  
کے ہاتھ پیر مضبوط ہو جائیں گے۔ وہ اپنے گرد شکستیاں کا  
حصار قائم کر لے گا اور پھر تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ بہتر ہے کہ  
تم اپنے اندر کی شکستیاں سے کام لے کر اسے روکیا نیلگی سے  
مدد حاصل کرو۔“

”نیلگی فی الحال اس سلسلے میں میری زیادہ مدد نہیں  
کر سکتی۔“ میں نے جواب دیا ”وہ کسی کو جاب سے روک بھی  
نہیں سکتی۔“

”لیکن وہ تمہاری مدد تو کر سکتی ہے۔ جہیں کوئی ایسا  
جاب مل سکتی ہے جس سے تم گوتم بھوش کو روک سکو۔“ شوہا  
نے کہا۔

”اں۔ یہ ممکن ہے“ وہ کسی اور طریقے سے میری مدد  
کر سکے لیکن۔ خیر میں نیلگی سے رابطہ کرنے کی کوشش  
کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم ابھی باہر باتیں کر رہے تھے کہ باہر گلیٹ زور زور  
سے دھڑھڑایا جانے لگا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف  
دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ دروازہ  
دھڑھڑانے جانے کا انداز بھی دوستانہ نہیں تھا۔ گلیٹ کے  
شور کی آواز سے دھونجی بیدار ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں  
میں عجیب سی وحشت ابھر آئی تھی۔

میں اٹھ کر باہر آ گیا اور جب میں نے گلیٹ کھولا تو اٹھ  
دس آدمی اندر گھس آئے۔ ان کے تیور ایسے نہیں لگ رہے  
تھے۔

”مایا متی کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک نے کڑت لہجے  
میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر بھی بڑی کرختگی تھی۔

”وہ کدواری گئی ہے۔ اپنے گاؤں۔ اس کے باپ کا  
دہانت (انفال) ہو گیا ہے لیکن تم لوگ کون ہو؟“ میں نے  
جواب دیا۔

”میں مایا متی کا باپ ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔  
مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر ہم پھنسا ہو۔ میرے دماغ میں  
دھماکے سے ہونے لگے اور میں وحشت زدہ کی نظروں سے  
اس پر نہ قامت شخص کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اسی روز شام کو انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان بھی آ گئے  
تھے۔ رات کا کھانا انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کھایا اور گیارہ  
بجے کے قریب واپس چلے گئے۔

میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ جب  
تہ ہمارے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا، دھونجی کچھ سہمی سہمی  
رہنے لگی تھی۔ اس کے دل میں کوئی خوف بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی  
میرے پاس بیٹھی رہتی تھی اور بھی شوہا کے ساتھ۔ وہ اکیلی  
بیٹھنے سے گھبراتی تھی۔

انسپکٹر اعظم اور بریندرا کے جانے کے بعد ہم شوہا  
والے کمرے میں آ گئے۔ میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے غم  
دراز تھا اور وہ دونوں میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم  
ایک بار پھر ہندوستان جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ بریندرا  
اور اعظم خان سے بھی اس موضوع پر باتیں ہوئی رہی تھیں۔  
بریندرا کا خیال تھا کہ مجھے اٹھ دس روز مزید آرام کر لینا  
چاہیے۔

دھونجی آزادی ترچھی لیٹ کر اوجھنے لگی تھی۔ ہماری  
مگر فوری کے موضوع پر اگرچہ کئی مرتبہ بات ہو چکی تھی۔  
شوہا کو اصل صورت حال کا علم نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھتی رہی  
تھی کہ ہمیں کسی غلط فہمی کی بنا پر پکڑا گیا تھا۔ اس وقت بھی  
اس نے اس موضوع پر بات شروع کر دی تو پہلی مرتبہ میں نے  
اسے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”میں اس پر اسرار چکر سے لگنا چاہتا ہوں۔“ میں کہہ  
رہا تھا ”لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ اگر اس والا  
سے دستبردار ہوتا ہوں تو نیلگی، گوتم بھوش اور پنڈت  
دھیراج جیسے لوگوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ ایک طرف وہ  
ہمیں انتقام کا نشانہ بنائیں گے تو دوسری طرف دنیا کو تباہی کی  
طرف دھکیلتے رہیں گے۔“

”اس کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے۔“ شوہا نے کہا۔  
”وہ کیا۔؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف  
دیکھا۔

”تم اپنا جاب مکمل کرو۔“ شوہا بولی ”اس طرح نیلگی  
مکمل طور پر تمہارے قبضے میں آجائے گی اور کوئی دوسرا اسے  
اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے گا جب تک وہ جاب مکمل  
نہ کرے اور نیلگی کے قبضے میں آجائے کے بعد تم گوتم  
بھوش کو جاب مکمل کرنے سے روک سکتے ہو۔“

”گھایا میرے پاس اس کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ  
جائے گا کہ میں اس پر اسرار شکستیاں کے ساتھ لڑا رہوں۔“  
میں نے کہا ”وہیے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ گوتم

اس روز ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔  
مایا متی ملازمت کے سلسلے میں شرم میں اکیلی رہ رہی تھی  
جبکہ اس کے والدین گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ کدواری نام  
کا یہ قصبہ چائنا روڈ پر تبت کی سرحد کے قریب کھنڈو سے  
تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔

جس روز میں اسپتال سے گھر واپس آیا اس کے ایک  
ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی مایا متی بھی پہنچ گئی۔ وہ بہت بدحواس ہو رہی  
تھی۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ  
میرے اسپتال سے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے  
گاؤں کا ایک آدمی آیا تھا جس نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ  
پہاڑ کے دامن میں کھیتوں میں کام کے دوران میں ایک  
پہاڑی توہہ گرنے سے اس کے باپ کا دہانت (انفال) ہو گیا  
ہے جبکہ اس کی ماں شدید زخمی ہوئی ہے۔ مایا متی اسپتال سے  
ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آئی تھی۔ اسے صبح گاؤں جانے کے  
لیے تیاری کرنی تھی۔

مجھے اس حادثے کا بہت افسوس ہوا۔ زیادہ افسوس اس  
بات کا بھی کہ میں ابھی ٹھیک طرح سے چل پھر نہیں سکتا تھا  
ورنہ مایا متی کے ساتھ ضرور جاتا۔

دن کا باقی حصہ مایا متی نے تیاری میں گزارا۔ وہ رات  
بھر روتی رہی اور اگلے روز صبح کی پہلی بس سے کدواری کے  
لیے روانہ ہو گئی۔

میں نے دن کا بیشتر حصہ بستر لیٹے ہوئے ہی گزارا تھا۔  
کسی وقت جسم کے کسی حصے میں اچانک ہی ایسی میٹیس اٹھنے  
لگتیں کہ میں تڑپ کر رہ جاتا۔ میری زندگی بھگاک دوڑ اور  
مار پیٹ میں گزری تھی۔ میں نے دوسروں پر تشدد کیا بھی تھا  
اور دوسروں نے مجھے تشدد کا نشانہ بنایا بھی تھا لیکن نیپالی  
انٹیلی جنس کے آدمیوں نے جس طرح میرے جوڑے لٹائے تھے  
وہ میرے لیے واقعی عبرت کا مقام تھا۔ چنانچہ وہ کون سی  
طاقت تھی کہ میں نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا۔ میری جگہ  
اگر کوئی اور ہوتا تو اس تشدد کے دوران میں بے گناہی کے  
بادو دس مرتبہ اعتراف جرم کر چکا ہوتا۔ میں بھی بے گناہ  
تھا۔ میں نے تشدد برداشت کر لیا لیکن کسی ایسے جرم کا  
اعتراف نہیں کیا جو مجھ سے سرزد ہوا ہی نہیں تھا۔ اگلے روز  
میرے اندر جی کی قوت لوٹ آئی تھی اور نیلگی کی مالا بھی  
مجھے واپس مل گئی تھی۔ پنڈت دھیراج کی سازش بھی بے  
غلاب ہو گئی تھی اس لیے یہ معاملہ ختم ہو گیا تھا اور اگر یہ  
سازش بے غلاب نہ ہوتی تو مجھے انٹیلی جنس والے میرا کیا  
حشر کرتے۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

مایا متی اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر گاؤں گئی تھی۔ خبر لانے والا اس کے گاؤں کا آدمی تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور نہ ہی کسی سے اس قسم کا مذاق کیا جاسکتا تھا۔ مایا متی نے بچپن ہی رات روئے ہوئے گزاری تھی۔ اسے اپنے ماں باپ سے بہت محبت تھی۔ وہ اکثر ان کا ذکر کیا کرتی تھی اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو خواہ ملے ہی اپنے باپ کے نام کچھ نہ کچھ رقم ضرور بھیجی کرتی تھی اور وقتاً فوقتاً ان لوگوں کے لیے تحائف بھی بھیجتی رہتی تھی۔ گزشتہ روز باپ کی موت کی خبر سن کر گھر آئی تھی تو بہت اپ سیٹ تھی۔ اس کی وجہ سے ہم بھی رات بھر گاتے رہے تھے۔ دھن اور شوہا اسے تسلی دلا سارہی رہی تھیں اور صبح ہوتے ہی وہ پہلی بس سے گاؤں روانہ ہو گئی تھی۔

کوداری کھنڈو سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہ صبح چھ بجے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سات یا آٹھ بجے والی بس مل گئی ہوگی۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن پہاڑی راستے بہت پر پیچ اور خطرناک تھے۔ ان بل کھاتے ہوئے راستوں پر بسیں زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کرتی تھیں لیکن پھر بھی وہ دوسرے ٹک ٹو اپنی منزل پر پہنچ ہی گئی ہوگی۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ اس کے باپ کو زندہ اپنے سامنے دیکھ کر میرے حواس مختل ہو رہے تھے۔ کیا گاؤں پہنچ کر مایا متی کی اپنے باپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی؟

یہ لوگ گاؤں سے کب روانہ ہوئے ہوں گے؟ خیال میں عام طور پر رات کے وقت لمبے سفر کی بسیں نہیں چلتیں اور ان لوگوں کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا جیسے لاری اڑے سے سیدھے بیٹیں آ رہے ہوں۔ میرا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر واقعی مایا متی کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا تو یہ شخص کون تھا۔ ایک مرتبہ مایا متی نے مجھے اپنا فیملی اہم بھی دکھایا تھا اور مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس کا باپ کچھ ایسا ہی تھا جو اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں کچھ دیر تک پست قامت اس شخص کے چہرے کو گھور رہا جس نے اپنے آپ کو مایا متی کا باپ بتایا تھا پھر میری نظریں اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کے چہروں پر پھرنے لگیں۔ طویل سفر سے ان سب کے چہروں پر اگرچہ تھکن کے آثار نمایاں تھے لیکن ان کے ارادے کافی خطرناک نظر آ رہے تھے۔

”ہوں۔“ وہ شخص خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا دو قدم آگے بڑھ آیا ”میں مایا متی کا باپ ہوں۔ دھرنند۔ مرا نہیں ہوں۔ میری جیون رکھا (زندگی کی فکر) بہت لمبی ہے پر تو نے اپنی باتوں سے میرے جیون کا انت (اختتام) کر دیا۔“ سچ بتا کون ہے تو اور میری پتلی (پتی) کو تو نے کہاں غائب کر دیا ہے اور تو نے اس مکان پر قبضہ کیوں کر کر لیا ہے؟“

”میں نے مکان پر قبضہ نہیں کر رکھا۔“ میں نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”مایا متی میری دوست ہے۔ ہم اس کی اجازت سے اس کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں۔ کل شام تمہارے گاؤں کے ایک آدمی نے اسپتال میں بتایا تھا کہ تم کسی پہاڑی توڑے کے نیچے پتھر کر مر گئے ہو۔ مایا متی بہت پریشان تھی۔ وہ آج صبح ہی گاؤں گئی ہے۔“

”جھوٹ بولتا ہے تو۔“ دھرنند غرایا ”ہم شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد گاؤں سے چلے ہیں۔ اگر مایا متی صبح یہاں سے روانہ ہوئی ہوتی تو اسے دوسرے ٹک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ بتا۔ تم نے میری پتلی کو کہاں غائب کیا ہے؟“

”میں۔ میں تھک کر رہا ہوں۔“ میرے حواس ایک بار پھر میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ ”تم لوگ اندر جا کر دیکھو۔ یہاں اور کون ہے۔“ دھرنند نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ دو کے بجائے چار آدمی دوڑتے ہوئے اندر چلے گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے دھن اور شوہا کے پیچھے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر وہ لوگ دونوں کو کھینچے ہوئے باہر لے آئے۔

دھرنند کے اشارے پر دو آدمیوں نے مجھے دبوچ لیا اور میری دھنائی کرنے لگے۔ میں اپنا دفاع کرتا رہا۔ جارحیت اختیار کرنے کی صورت میں معاملہ بگڑ جانے کا اندیشہ تھا جبکہ میرے خیال میں ممبرو قتل کا مظاہرہ کر کے بات کو سنبھالا جاسکتا تھا۔

وہ لوگ میری پٹائی کرتے ہوئے اس طرح شور مچا رہے تھے۔ جیسے بہت بڑا محاذ لگ گیا ہو۔ شور کی آواز سن کر کچھ پڑوسی بھی آگئے۔ کم از کم چار مہینوں سے مایا متی کے ساتھ میرا اس مکان میں آنا جانا تھا۔ میں مایا متی کے ساتھ کسی نئی روز یہاں رہا تھا۔ اس غلی میں رہنے والوں نے کئی مرتبہ مجھے مایا متی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ سب مجھے جاننے اور پہچاننے لگے تھے لیکن اس وقت ہر شخص نے مجھے پہچاننے سے انکار

کر دیا۔ دھرنند مجھے اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے اندر چلا گیا۔ اس کی دانتی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ ”میں نے پولیس کو فون کیا ہے۔“ وہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”معاملہ ابھی میرے ہاتھ میں ہے۔ پولیس کے آنے سے پہلے بتا دے کہ میری پتلی کہاں ہے تو میں تم لوگوں کو چھوڑ دوں گا۔ ورنہ پولیس تم لوگوں سے معلوم کر لے گی اور ایک بات سن!“ اس نے میرے بالوں کو پکڑ کر زوردار جھکا دیا ”اگر میری پتلی کو کچھ ہو گیا تو میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔“

”میری بات کا یقین کرو۔ تمہاری بیٹی تمہاری موت کی اطلاع پاکر آج صبح گاؤں چلی گئی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ایک بات پر بہر حال مجھے اطمینان ہوا تھا کہ اس نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ اس تھانے کے پولیس والے ظاہر ہے مجھے نہیں جانتے تھے لیکن اس طرح انسپکٹر بریندر کو اطلاع ہو سکتی تھی اور وہ اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتا تھا۔

دھرنند میری بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس دوران میں کچھ اور پڑوسی جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی پولیس کی ایک جیب پہنچ گئی۔ پولیس والوں کی تعداد چار تھی اور وہ چاروں بہت خراش لگ رہے تھے۔

پولیس باپ کی انچارج نے پوری توجہ سے دھرنند کی بات سنی۔ میں نے بھی اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ انسپکٹر بریندر کا حوالہ بھی دیا لیکن وہ انسپکٹر بریندر کے نام سے زیادہ متاثر نہیں ہوا۔

ہم تینوں کو دھکے دے کر جیب میں ٹھونس دیا گیا۔ دھرنند اور ایک اور آدمی جیب میں بیٹھ گیا اور چند منٹ بعد ہی ہم تھانے کی خوات میں بند تھے۔ ممکن ہے دھن اور شوہا کو ایک ہی کوٹھری میں بند کیا گیا ہو لیکن مجھے ان سے الگ رکھا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد مجھے آفیسر انچارج کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس سے پہلے دھرنند اپنی باتوں سے اسے میرے خلاف مضبوط کر چکا تھا۔ اس نے اس بات کا غدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ہم نے اس کی بیٹی کو قتل کر دیا ہے۔

آفیسر انچارج پہلے تو زبانی طور پر مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا پھر باتوں اور بیروں سے کام لے لگا۔ اس کا ایک ماتحت بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ میری چیخیں تھانے میں کوئی نہ رہیں لیکن

ان کی تفتیش ختم نہیں ہوئی۔ میں بار بار کہہ رہا تھا کہ انسپکٹر بریندر کو بلایا جائے یا کم از کم اسے اطلاع دے دی جاے لیکن لگتا تھا کہ اس تھانے کا کوئی بھی اہلکار انسپکٹر بریندر اسے نام سے واقف ہی نہیں تھا۔

”ایک بڑے آفیسر کا نام لے کر ہمیں تری دیتے ہو۔“ سب انسپکٹر نے میرے جڑے پر ایک اور گھونسا مارتے ہوئے کہا ”فکر مت کرو۔ ہم اسے بھی اطلاع دیں گے۔ پہلے ہم اپنی تفتیش تو مکمل کر لیں۔“

اور ان کی یہ تفتیش صبح تک جاری رہی۔ دس بارہ روز پہلے میں اپنی بیٹی جس کی مار کھا کر اسپتال میں داخل ہوا تھا اور اب یہ ایک نیا پتھر شروع ہو گیا تھا۔ ان کم بختوں نے مار مار کر میرا ہجر کر نکال دیا تھا۔

مجھے پھر حالات میں ڈال دیا گیا تھا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ٹھکانا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ بائیں طرف کا جڑا بھی پوری طرح ٹل گیا تھا۔

میں حالات کے گندے فرش پر پڑا اس صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کسی نے مایا متی کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ اس کے باپ کے مرنے کی جھوٹی خبر دی تھی لیکن وہ غائب کہاں ہو گئی؟ اسے تو دوسرے ٹک اسے اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کا باپ شام کو گاؤں سے روانہ ہوا تھا اور اس وقت تک مایا متی کاؤں نہیں پہنچی تھی۔ یہ پتھر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور مایا متی کو اس کے باپ کے مرنے کی اطلاع دی گئی اور آدھر گاؤں میں اس کے باپ کو کوئی جھوٹی خبر پہنچائی گئی۔ مایا متی غائب تھی اور ہماری شامت آگئی تھی۔

دوسرے ٹک کسی نے حالات میں جھانک کر دیکھا تک نہیں اور پھر چار بجے کے قریب یہ خوفناک اور سنسنی خیز خبر سننے کو ملی کہ کھنڈو سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر آگے ڈولو گھاٹ نامی قصبے سے مایا متی کی لاش ملی ہے۔ اسے بہت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ لاش ایک ویران جگہ پر پائی گئی تھی اور اس کے قریب ہی ایک سوٹ کیس بھی ملا تھا جس میں رنجی ہوئی چیزوں اور کاغذات سے مایا متی کی شناخت ہوئی تھی۔

مایا متی کا باپ دھرنند بری طرح بھرا ہوا تھا۔ پولیس نے مایا کی موت کی اطلاع دینے اور لاش کی شناخت کے لیے اسے تھانے بلایا تھا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی لاش شناخت کر لی تھی۔ واپس تھانے میں آکر اس نے چیخا پلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے قاتل گردان رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے

حوالے کروایا جائے۔

صورت حال اب بدل گئی تھی۔ پہلے ہم پر الزام تھا کہ ہم نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے مایا ممتی کو کہیں غائب کر دیا تھا اور اب سید جاسید حافل کا الزام لگایا تھا۔ اگرچہ میرے خلاف ابھی تک قتل کی باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کی گئی تھی لیکن لگتا تھا کہ مجھے پھانسنے کے لیے جال کو مزید مضبوط کیا جا رہا تھا۔

چوبیس بجے کے قریب مجھے پھر تفتیشی آفسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ پوچھ گچھ کے بہانے مجھے پھر تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن پولیس والے میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اس مرتبہ تو ایک پولیس والے نے اپنے ٹیلٹ سے میری کھال ادھیر زالی۔ ایک بار میں نے اس کے وارے پھینک دیے تو کوشش کی تو ٹیلٹ کا بکسل میرے سر پر لگا۔ سر پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

تفتیشی کرے سے حوالات کی طرف واپس جانے ہوئے مجھے دوسری طرف سے لایا گیا۔ اس طرف بھی حوالات کی کوٹھریاں تھیں۔ ایک کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں رک گیا۔ شوہا فرش پر ادھ موٹی سی پڑی تھی۔ اس کے کپڑے پھینے ہوئے اور بال بھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ پھولے ہوئے اور بائیں آنکھ تقریباً بند تھی۔ رخسار اور آنکھ کے اوپر پیشانی سوچی ہوئی تھی۔

دھونجی اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت بھی شوہا سے مختلف نہیں تھی۔ اسے بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کا لباس بھی پھینا ہوا تھا۔ سینے اور بازوؤں پر سرخ دھبے دکھائی دے رہے تھے جیسے ان جگہوں کو نوچا گیا ہو۔

ان دونوں کی حالت دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے جان بوجھ کر اس طرف سے لایا گیا تھا تاکہ میں ان کی حالت دیکھ کر اپنی ضد چھوڑ دوں اور قتل کا الزام قبول کر لوں۔

میں اس کوٹھری کے سامنے رکا تو پولیس والے نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شوہا گندے فرش پر آڑی طرح پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی دھونجی سر جھکی ہوئی تھی۔

میں نے بولے سے پکارا تو دھونجے جھکا ہوا سر اہستہ اہستہ اوپر اٹھایا اور پھر مجھے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر

کھڑی ہو گئی۔ وہ میری طرف لپکی تو لوکڑا کر گری اور پھر ایک ٹانگ کو گھٹیتی ہوئی دروازے کے قریب آگئی اور سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر مجھے اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں بھی سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے شانے پیچھے ہٹا دیا۔

”کیا یہ ہو گیا ہے تمہیں۔“ وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بولی ”ان درندوں نے کیا حال کر دیا ہے تمہارا۔۔۔؟“

”دھونجی! میرے ہونٹوں سے سسکاری سی نکلی۔ اس کی حالت مجھ سے بھی اتر چکی لیکن اسے اپنی نہیں میری فکر تھی۔ آواز سن کر شوہا نے بھی ہشکل آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکی تھی۔

”میری ایک بات سنو۔“ میں نے کہا ”تم دونوں میرے خلاف بیان دے دو۔ تم لوگوں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔“

”نہیں ہمت نکلے۔“ دھونجی بولی ”تم بے گناہ ہو۔ ہم نے بھی کوئی جرم نہیں کیا۔ نہ تو ہم کوئی ناکروہ جرم قبول کریں گے اور نہ تمہارے خلاف کوئی جھوٹا بیان دیں گے۔ ہمیں اگر سچائی کی سزا مل رہی ہے تو ہم کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگیں گے۔ لاڈ لڑھا۔“

وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکی۔ میرے پاس کھڑے ہوئے پولیس والے نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور مجھے دھکیلتا ہوا میری کوٹھری کی طرف لے آیا۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے زوردار دھکا دیا۔ میں لوکڑاتا ہوا منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی دھڑ سے سلاخوں والا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

وہ شام بھی گزر گئی۔ میں ادھ موٹا سا فرش پر پڑا رہا۔ میں بار بار اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ایک بات تو ملے تھی کہ یہ کوئی سازش تھی۔ میرے خلاف نہ سچی مایا ممتی کے خلاف۔ ایک طرف اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے باپ کا دسمانت (انتقال) ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اس کے باپ کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا گیا کہ میں نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے اس کی بیٹی کو غائب کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور تجاے کیا۔ یہ کہہ کر گیا ہوگا کہ وہ پیش میں آیا اور درجن بھر آدمیوں کو لے کر ایک ٹرک پر بیٹھ کر طویل سفر کرتا ہوا رات کے پچھلے پہر یہاں پہنچ گیا۔ میں شروع سے ہی سمجھتا رہا تھا کہ یہ کوئی غلط فہمی ہے۔ گاؤں پہنچ کر مایا ممتی کو صورت حال کا پتا چلے گا تو وہ فوراً

واپس آجائے گی اور اس طرح بات صاف ہو جائے گی لیکن وہ گاؤں پہنچی ہی نہیں تھی۔ بلکہ راستے ہی میں واقع ایک قصبے میں اس کی لاش ملی تھی۔ میں نے اس کی لاش نہیں دیکھی تھی لیکن ایک پولیس والے نے بتایا تھا کہ اسے بہت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کسی خیر دھار آلے سے کام لیا گیا تھا۔ اس کا پیٹ چاک کر دیا گیا تھا اور گلا بھی اوچھڑا دیا گیا تھا لیکن۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔ وہ تو بڑی اچھی لڑکی تھی۔ مسما تھی۔ دوسروں کے دکھ سہتی تھی۔ اس نے دھکی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ سب لوگ اس سے خوش تھے۔ اسے دعائیں دیتے تھے پھر اس کی بھولی میں موت کس نے ڈال دی؟ اس کی تو کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ کیا اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ سچائی کا ساتھ دیا تھا؟

اور دھونجی! مجھے اس کی باتوں پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ہماری شناسائی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی تو ہوئے تھے اور وہ میرے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار ہو گئی تھی۔ پولیس والوں نے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پولیس والے اس سے میرے خلاف بیان لینا چاہتے تھے۔ میں نے بھی اس کی سی مشورہ دیا تھا کہ میرے خلاف بیان دے کر اپنی جان چھڑائے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ کتنا عزم تھا اس کے لیے میں۔ وہ ظلم کے سامنے پٹان بن گئی تھی۔

آدھی رات کے قریب مجھے پھر تفتیشی کرے میں لے جایا گیا۔ میرے جسم کا جو جو ڈکھ رہا تھا۔ سر سے بننے والا خون جم چکا تھا اور دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

اس مرتبہ مار پیٹ کچھ کم اور پوچھ گچھ زیادہ ہوئی۔ پولیس والے مجھ پر دباؤ ڈالتے رہے کہ میں مایا ممتی کے قتل کا اعتراف کر لوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تھا تو اس کا اعتراف کیسے کر لیتا۔

”تم لوگ غلط رخ پر تفتیش کر رہے ہو۔“ میں نے کہا ”تشدد کے ذریعے مجھ سے اعتراف جرم کرانے کے بجائے تم لوگ کسی اور رخ پر کیوں نہیں سوچتے۔“

”مثلاً؟“ پولیس آفیسر نے مجھے گھورا ”تم ہی بتا دو کہ میں کیا کرنا چاہتا ہے؟“

”مجھ پر یہ الزام غلط ہے کہ میں نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے مایا ممتی کو غائب کر دیا تھا۔“ میں نے کہا ”سب لوگ جانتے ہیں کہ مایا ممتی میری دوست تھی اور میں کئی مہینوں سے

اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔“

”یہی باتیں دوستی کی آڑ میں ہی تو ہوتی ہیں۔“ آفیسر نے کہا۔

”یہ غلط ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں تو چند روز میں ہندوستان جانے والا تھا۔ تم لوگ انسپکٹر برینڈرا کو اطلاع کیوں نہیں دیتے۔ میں نے ایسے لوگوں کے خلاف یہاں کے قانون کی مدد کی ہے جو اس ملک کے معصوم عوام کو منشیات کے سیلاب میں غرق کرنا چاہتے تھے۔ انسپکٹر برینڈرا سب کچھ جانتا ہے۔ پولیس کے دوسرے اعلیٰ حکام بھی جانتے ہیں۔ تم انہیں اطلاع کیوں نہیں دیتے۔ میرے خلاف اس سازش میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے جنہیں میری وجہ سے نقصان پہنچا ہے لیکن اب بھی اگر تم لوگوں نے انسپکٹر برینڈرا یا دوسرے اعلیٰ حکام کو اطلاع نہ دی تو میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ تم لوگ بھی اس گھناؤنی سازش میں شریک ہو اؤ۔“

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی آفیسر کا گھوٹنا میرے جڑے پر لگا۔ میں لوکڑا کر پیچھے گرا۔ میرا دماغ جھنجھٹا گیا تھا۔ آفیسر میری طرف لگا۔ میں پشت کے بل فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے گریبان سے پکڑنے کے لیے جھکا تو میں نے لینے ہی لینے دونوں پیروں سے اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ چیخا ہوا پیچھے جا کر گرا۔

جو ہوا تھا، ہو چکا۔ ان پولیس والوں سے بھلائی کی توقع نہیں تھی۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے مزاحمت کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس وقت کرے میں دو اور بے گناہوں کو کٹھنیل بھی موجود تھے۔ میری یہ غیر متوقع حرکت دیکھ کر وہ دونوں میری طرف لپکے۔ میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں کسی بچے کا بھی مقابلہ کر سکتا لیکن اس وقت میرے اندر اچانک ہی ایک نئی طاقت ابھر آئی تھی۔

وہ دونوں کٹھنیل جیسے ہی قریب پہنچے، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میری ڈبل کلک نے ان دونوں کو ڈھیر کر دیا۔ سامنے کھڑا ہوا آفیسر خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا جیلٹ اتار رہا تھا۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ آن ڈیوٹی کسی باوردی پولیس والے پر ہاتھ اٹھانا سنگین جرم ہے لیکن میں نے گناہ تھا اور یہ پولیس والے تشدد کے ذریعے مجھ سے ایک ایسا جرم قبول کروانا چاہتے تھے جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں تھے۔ انہوں نے

صرف مجھے ہی نہیں، دو بے گناہ عورتوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ مجھے ”تنگ آمد جنگ آمد“ ہونے پر مجبور کیا تھا۔

آفسر نے یلٹ کا ایک سرا اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا اور بیک والی طرف سے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کا وار اپنے الے ہاتھ کی کلائی پر روکا۔ بیک دو بلی کھاکمیری کلائی پر لپٹ گیا۔ میں نے ہلکا سا جھکا دیا۔ آفسر ایک قدم آگے آیا تو میں نے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کے جڑے پر جڑا دیا۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے یلٹ کو پکڑ کر زوردار جھکا دیا اور اس کے ساتھ ہی اس مرتبہ اس کی بٹل کے نیچے گھونسا رسید کر دیا۔ وہ بلبلاتا اٹھا۔ یلٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اب یلٹ میرے قبضے میں تھا اور وہ تینوں میرے رحم و کرم پر۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ چڑھا دیا اور ان تینوں کی دھنائی کرنے لگا۔ وہ تینوں بیچ رہے تھے۔ یلٹ کے بیکل نے ان تینوں کھال اڑھنری تھی۔ آفسر کے منہ سے بھی خون بسنے لگا تھا۔ مجھ پر سب سے زیادہ تشدد اسی نے کیا تھا۔

وہ تینوں فرش پر لوٹ لگاتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ رحم کی ہبک مانگ رہے تھے لیکن مجھ پر تو جنون طاری تھا۔ میرا ہاتھ نہیں رک رہا تھا۔ باہر شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے خیال میں تھانے کا سارا عملہ اس کمرے کے سامنے جمع ہو گیا تھا۔ پہلے دروازہ زور زور سے دھڑھڑایا جاتا رہا پھر اسے توڑنے کی کوشش کی جانے لگی۔

دروازہ ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے آفسر کو فرش سے اٹھا کر اپنا ہاتھ اس کی گردن پر لپیٹ دیا اور اسے ڈھال بنا کر اپنے آگے رکھ لیا اور دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

دروازے کا پٹ ٹوٹ کر اندر کی طرف گرا۔ وہ کئی پولیس والے تھے۔ دو اندر گھس آئے۔ میں اسی وقت بیچ اٹھا۔

”رک جاؤ۔ آگے مت بڑھنا ورنہ اس کی گردن موڑ دوں گا۔“ پولیس والے رک گئے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ تھانے کا سارا عملہ اس کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ لوگ پچھلی پچھلی سی نظروں سے کمرے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دو پولیس والے فرش پر پڑے تھے اور ان کا آفسر میرے کنبھے میں تھا۔

”انسپیکٹر برینڈر کو فون پر اطلاع دو۔ اگر وہ آدھے گھنٹے میں یہاں نہیں پہنچا تو میں اسے جان سے ماراؤں گا۔“ میں نے بیچ کر کہا۔

”تم اپنے جرم کو مزید سنگین بنا رہے۔“

”بند کرو بکواس۔“ میں چیخا۔ ”انسپیکٹر برینڈر کو فون رو اور میں اسے کوٹھری میں لے جا رہا ہوں جہاں دو توں غور تیر بند ہیں۔ اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو اس کی گردن موڑ دوں گا۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔“

تمام پولیس والے سامنے سے ہٹ گئے۔ میں آفسر کو لے کر کمرے سے باہر گیا اور اسے گھٹینا ہوا اس راہداری میں گیا جس میں قیدیوں کی کوٹھریاں تھیں۔ آفسر کے گلے پر میری گرفت کچھ زیادہ ہی مضبوط تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلجی ہوئی تھیں اور اسے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔

تمام پولیس والے ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ دو تین نوے ناقلین تان رکھی تھیں۔ میں آفسر کو الے تانے دوں گھٹینا ہوا دھنوا اور شوپھا والی کوٹھری کے سامنے رک گیا۔ میرے کنبے پر ایک سنتری نے تالا کھول دیا۔ میں آفسر کو لے کر اندر داخل ہوا اور دوسرے ہاتھ سے سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔ سنتری یا ہرے تالا لگانے لگا تو میں بیچ اٹھا۔ ”تالا مت لگاؤ۔ میں بھاگوں گا نہیں لیکن اگر آدھے گھنٹے تک تم لوگوں نے برینڈر اور دوسرے آفیسرز کو نہیں بلایا تو اس کی گردن موڑ دوں گا۔“

دو پولیس والے ناقلین تانے راہداری میں کمرے رہے اور باقی وہاں سے ہٹ گئے۔ میں نے آفسر کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا۔

شوپھا اب بھی بے سدھ پڑی تھی۔ دھنویہ سب کچھ دیکھ کر وحشت زدہ ہی ہو گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپاتا ہوا شوپھا کے قریب بیٹھ گیا۔

”میں تم دونوں سے شرمندہ ہوں۔“ میں نے باری بادی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری وجہ سے تم لوگوں کو یہ تشدد برداشت کرنا پڑا۔ اگر تم لوگ شروع ہی میں۔“

”آگے ایک لفظ مت بولنا ہمت نکھ۔“ شوپھا نے میری بات کاٹ دی۔ ”یہ سب کچھ ہم نے صرف تمہارے لیے نہیں، سچائی کی لاج رکھنے کے لیے برداشت کیا ہے۔ ہماری جان بھی جلی جائے تو ہمیں پروا نہیں ہوگی۔“

”کاش! دوسرے لوگ بھی اس انداز میں سوچ سکیں۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور پولیس آفیسر کی طرف دیکھنے لگا جو ایک طرف پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

میں دھنوا اور شوپھا سے باتیں کر رہا تھا کہ آفسر نے بازے کی طرف چلا گیا لگا دی۔ میں نے دروازے کو سے بولٹ لگا دیا تھا۔ آفسر کا ایک ہاتھ دروازے کی نالی پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ بولٹ کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اپنی جگہ سے اچھل کر اس کے اوپر جا کر اور اسے سر رکھنے مارنے لگا۔ یہ آفسر اس وقت ہم تینوں بندگیوں کی ضمانت تھا۔ اگر یہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا تو میں والے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ اور ہمیں زندہ نہیں چھوڑتے۔“

راہداری میں کھڑے ہوئے پولیس والے بھی دوڑ کر بازے کے قریب پہنچ گئے۔ ایک نے میری طرف را نقل کیا۔

”چھوڑو اسے ورنہ گولی مار دوں گا۔“ وہ چیخا۔ ”تمہاری گولی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی البتہ ہمارے آفسر کے جسم میں سوراخ ہو جائے گا۔“ میں نے بیچ کر جواب دیا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تمہارے گولی چلانے سے تلے ہی اس کی گردن موڑ دوں گا۔“

پولیس والے نے را نقل بیچ کر لی۔ آفسر نے اب ہونہا تھا توں سے دروازے کی سلاخوں کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر لپیٹے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بیک کی ایک بٹل کے نیچے کھونٹے مارنے لگا۔ اس کی گرفت ٹپک ٹپک۔ میں اسے گھٹینا ہوا دروازے سے دور لے گیا۔ برفش پر بیٹھ دیا۔ دھنویہ ایک کر اس کے سر کے بال بڑھلے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔

”کیا ہے۔“ وہ چیخا۔ ”اس بد معاش نے مجھے مارا تھا۔“ میں نے دھنویہ کو پکڑ کر الگ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر کئی پر جنون طاری ہو گیا تو آفسر کو اس سے بچانا مشکل بنائے گا۔

اس دوران میں ایک سب انسپیکٹر بھی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔

”تم لوگ اپنے حق میں بہت برا کر رہے ہو۔“ اس نے نئی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے کہ ہمارے آفسر کو چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک بنائے گا۔“

”میں نے تم لوگوں کو آدھے گھنٹے کا وقت دیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر انسپیکٹر برینڈر اور دوسرے اعلیٰ پولیس افسر یہاں نہیں پہنچتے تو تمہارے اس آفسر کے جیون کا نشت (زندگی کا اختتام) ہو جائے گا۔“

”انسپیکٹر برینڈر! ہیڈ کوارٹر میں نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر پر بھی نہیں ہے۔ ہم اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس تک ہمارا پیغام پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے۔“ سب انسپیکٹر نے کہا۔

”کو شش کر کو کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس سے رابطہ ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

سب انسپیکٹر واپس چلا گیا۔ وقت گزر رہا تھا۔ سب انسپیکٹر ہر آدھے گھنٹے بعد ہمیں صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا کہ ابھی تک انسپیکٹر برینڈر اسے رابطہ نہیں ہو سکا۔

اور پھر تین بجے کے قریب انسپیکٹر برینڈر دو اور آفسرز کے ساتھ دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ وہ تینوں اندر آگئے۔ ہماری حالت دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ مجھے نہیں معلوم، پولیس والوں نے انہیں کیا بتایا ہو گا لیکن میری کمائی بہر حال ان سے مختلف تھی۔

اسی دوران میں تھانے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ پولیس کشتی اور چند اور اعلیٰ افسران بھی پہنچ گئے تھے۔

اب صورت حال بالکل پلٹ گئی تھی۔ میں نے پچھلے تین چار مہینوں کے دوران میں چند خطرناک مجرموں کی بیخ کنی کر کے حکومت پر احسان کیا تھا اور اعلیٰ حکام کو یہ بات بالکل پسند نہیں آتی تھی کہ میرے احسانات کا بدلہ اس طرح چکایا جائے۔

ہمیں تین دن تک غیر قانونی طور پر حراست میں رکھ کر تشدد کیا گیا تھا۔ ہمارے خلاف ابھی تک کوئی رپورٹ بھی درج نہیں ہوئی تھی۔ رپورٹ درج ہونے کی صورت میں بھی قانونی طور پر مجھے رات اس تھانے میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ آفسر سمیت کئی اہلکاروں کو معطل کر کے، ہم پر تشدد کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ہمارے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ہم تینوں کو بھی پولیس کی گمرانی میں اسپتال بھیج دیا گیا۔

اس وقت صبح ہونے والی تھی۔ مجھے دھنوا اور شوپھا سے الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ میرے زخموں کی مرہم پٹی کے بعد مجھے ایک انجکشن بھی لگا دیا گیا تھا۔

اس وقت مجھ پر غنودگی سی طاری تھی۔ میرے بندے کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی نرس اٹھ کر کھڑکی کے سامنے چل گئی۔ اس نے کھڑکی پر پڑا ہوا برے رنگ کا دیرپڑا ایک طرف سرکا دیا۔ تازہ ہوا کا جھونکا کمرے میں در آیا۔

نرس کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی پھر

”اس صورت حال سے میں نمٹ لوں گا۔“ میں نے کہا  
 ”تھاؤ“ ٹینکری میں بڑھاکا وہ عداوت گاہ کہاں ہے؟“  
 ”فوسہ دمیہ۔“ ٹینکری کی آواز کچھ اور دب گئی۔ اس کا  
 بالکل دھندلا گیا تھا ”میں جاری ہوں۔ پھیپھے۔۔۔ پھر آؤں

اب دیا "اس کے قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔" وہ کوئی بھی ہے، جلدی پکڑا جائے گا اوراں۔ کیا ٹمپولیس بیٹہ اور اڈر میں اسکلپر بیزنڈرا سے رابطہ کر سکتی ہو۔ اس سے کوئی فوری طور پر اسے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھر جی ہے۔

”میں سچ کی کہیں۔ اب کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے

کہا۔

”اوہ!“ مینا کشی گمراہ سانس لیتے ہوئے بولی ”میرے ہوتے ہوئے تو وہ ابھی تک نہیں آیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”تمہارے لیے کھانا آگیا ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے کھلا دوں تمہیں؟“

میں نے اثبات میں گروں ہلا دی۔

مینا کشی نے مجھے سارا دے کر بٹھا دیا اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے لگی۔ اس دوران میں انسپکٹر برینڈر ابھی آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آفیسر بھی تھا۔

”تمہارا شبہ درست نکلا۔“ برینڈر نے ہنڈ کے قریب رک کر میرے طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ انسپکٹر گھونٹا تھا ہے۔ اس کیس کا انچارج۔“

”تم کس شک کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میں دھپندر کی بات کر رہا ہوں۔“ انسپکٹر برینڈر نے جواب دیا۔ ”دھپندر کو آج دوپہر کے وقت حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“ مجھے سینے میں سانس روکنا ہوا محسوس ہونے لگا ”کیا مایامتی کو کسی نے قتل کیا ہے؟“

”نہیں۔“ برینڈر نے نفی میں سر ہلایا ”وہ قاتل نہیں ہے لیکن تمہارے خلاف جو سازش کی گئی تھی اس میں وہ بھی شریک تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تفصیل سے بتانے لگا۔

برینڈر کے کہنے کے مطابق یہ سازش دراصل ناگ پال کی تھی۔ میری وجہ سے اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ اس کے کئی آدمی مارے گئے تھے۔ میرے میاں آنے سے پہلے کھٹنڈو پر اس کا راج تھا۔ وہ میاں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے ایک اشارے پر پورا شہر بند ہو جاتا تھا۔ اعلیٰ ترین پولیس آفیسر دیگر سرکاری عہدے دار اور منتری (وزیر) بھی اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہوتے تھے لیکن میرے آنے کے بعد اس کا راج پات ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ سب سے زیادہ مطلوب مجرم تھا اور اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا لیکن اسے کیس پناہ نہیں مل رہی تھی۔ ایسی صورت میں وہ مجھے کس طرح معاف کر سکتا تھا۔

بار بار کی کوشش کے باوجود وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم میرے ساتھیوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ ناگ پال جانتا تھا کہ مایامتی سے میری دوستی ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے بھنسانے کے لیے یہ سازش تیار کی۔

مایامتی ہی کے گاؤں کے ایک آدمی کو کچھ رقم کا لالچہ دے کر مایامتی کے پاس بھیج دیا اور اس کے باپ کے صرغے اور اس کی ماں کے زخمی ہونے کی اطلاع دی۔ دوسری طرف مایامتی نے اس کے باپ کو بھی کھٹنڈو کی طرف روانہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

ناگ پال کے آدمی کھٹنڈو سے ساٹھ کلومیٹر دور ڈوڈو گھاٹ نامی جگہ میں موجود تھے۔ انہوں نے پہلے مایامتی کو کہہ کر بس سے اتار لیا کہ اسے باپ کے صرغے کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس کا باپ زندہ ہے اور اس وقت ڈوڈو گھاٹ میں موجود ہے۔

مایامتی کو بس سے اتار کر قصبے کے باہر ایک ویران عمارت میں لے جایا گیا جہاں ناگ پال کے آدمی اس کی عزت پر حملے کرتے رہے اور جب مایامتی کا باپ اپنے گھر سے کھٹنڈو جاتے ہوئے ڈوڈو گھاٹ پہنچا تو اسے بھی بس سے اتار کر اس ویران عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے چند آدمی اور بھی تھے۔ ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور دھپندر کو اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس کی بیٹی تھی۔

دھپندر کو الگ لے جا کر منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے یہ بھی دھکی دی گئی کہ اب تک تو اس کی بیٹی کی عزت ہی گئی ہے۔ انکار کی صورت میں اسے بیٹی کی جان سے بھی ہاتھ دھوئے دیں گے۔

بیٹی کو بچانے کے لیے دھپندر ان کے منصوبے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت رات تین بجے کے قریب کھٹنڈو پہنچا دیا گیا اور دھپندر نے مجھ پر الزام لگا کر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

تھانے کے انچارج کی وجہ سے گرم گرمی تھی۔ اس نے میری بات پر کان ہی نہیں دھرے اور مجھ پر تشدد شروع کر دیا گیا۔

اگلے روز ڈوڈو گھاٹ سے مایامتی کی لاش ملی۔ دھپندر نے اسپتال میں لاش شناخت کر لی۔ اس وقت ناگ پال کے آدمی بھی اسپتال میں موجود تھے۔ انہوں نے دھکی دی کہ اگر حقیقت دھپندر کی زبان پر آتی تو نہ صرف اسے بلکہ گاؤں میں اس کی بیوی کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دھپندر اپنی اور بیوی کی جان کے خوف سے خاموش رہا اور مجھ پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا۔ پولیس آفیسر دھونو، شوہرا اور مجھ سے اعتراف بزم کروانا چاہتا تھا لیکن ہم تینوں تشدد برداشت کرتے رہے اور جھوٹا الزام قبول نہیں کیا۔

آج دوپہر دھپندر کو حراست میں لیا گیا۔ دو چار ہاتھ دے کر ہی اس نے ساری کمائی پولیس کو سنا دی۔ ناگ پال کی ایک آدمی کی بھی حراست میں لیا گیا تھا جو دھپندر کی گھر پر تھا۔ اس نے بھی سب کچھ اگل دیا۔ اس کے مطابق اس رات مایامتی نے ناگ پال کے آدمیوں کی مدد سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی جس پر اسے بے دردی سے موت کے کھٹا اتار کر لاش ویرانے میں رکھ دی گئی اور لاش دریافت ہونے کے بعد مجھ پر قتل کا الزام کر دیا گیا۔

دھپندر اور ناگ پال کے آدمی کی گرفتاری اور ان کے سات سے میری پوزیشن واضح ہو گئی تھی اور اس کے لیے دھپندر اور ناگ پال کے آدمی کا نہیں بلکہ نیلگی کا شکر ادا تھا جس نے آج صبح سویرے مجھے دھپندر کے بارے میں خبردار کیا تھا۔ بہر حال، مجھے مایامتی کی موت کا بہت غم تھا اور دکھ تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

اس مرتبہ مجھے تین چار روز سے زیادہ اسپتال میں نہیں بٹھاوا۔ دھونو اور شوہرا بھی سنبھل چکی تھیں۔ ہم تینوں کو ایک ہی روز اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ انسپکٹر برینڈر ہمیں ان کوٹ کے اس مکان میں لے آیا جہاں شروع میں مجھے بٹھاوا گیا تھا۔ اس وقت اس مکان میں انسپکٹر برینڈر کی ملازمت رہا کرتی تھی۔ اس نے میری اور بیلا کی بہت خدمت کی تھی اور ایک رات جب دیش کھ اور اس کے بچوں نے اس مکان پر حملہ کیا تھا تو وہ بے چاری ماری گئی تھی۔

میاں ہمیں ایک اوجھڑ عمر نیپالی خادمہ بھی دی گئی تھی اور پولیس کے دو سادہ پوش بھی مشغل طور پر تعینات کر دیے گئے تھے۔

دھونو کو میں نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بڑھ نسل کنڈ مندر میں چلی جائے۔ وہاں بھکشو اور اس کے پیروں کے پیچھے اس کا خیال رکھیں گے مگر دھونو کسی طرح میرا مذاق چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئی۔

میاں میں زیادہ تر نیلگی کی برف پوش بیٹیوں میں کسی بڑے بچے میں مصروف تھا اور نیلگی شاید پھر کسی حصار میں نہ ہوئی تھی۔ پچھلی ملاقات پر میں اس سے بڑھاکا اس قدیم بات کاہ کا پتا نہیں پوچھ سکا تھا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ وہ بتا نہیں سکتا۔ اس عبادت گاہ کا پتا معلوم ہونا بہت ضروری تھا۔ اس روز نیلگی نے ایک بار پھر مجھے اپنے اندر کی شکتی

یاد دلائی تھی۔ ہو سکتا ہے گوتم بھوش کا چیلہ پنڈت دھیران میرے خلاف اب بھی سرگرم عمل ہو مگر میرے اندر کی وہ شکتی مجھے اس کے شر سے بچائے ہوئے تھی۔

میں نے رشی کشی میں شروع کیا جانے والا اپنا بار آتیش (یوگا کی ایک تکنیک اور خطرناک مشق) کا ریاضہ مکمل نہیں کیا تھا اور سچے دل اور کھری نیت سے جو تھوڑی بہت ریاضت کی تھی اس سے نیلگی میری طرف ملقت ہوئی تھی۔ اب مجھے فرصت تھی اس لیے میں نے وہ ریاضہ بدھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

دن میں مجھے جب بھی موقع ملتا، میں تھوڑی بہت مشق کر لیتا، تاہم آدھی رات کے بعد دھونو اور شوہرا جو سانس تو میں مکان کی پھست پر چلا جاتا۔ یہاں میں نے ایک کونے میں جگہ منتخب کر لی تھی۔ میں صبح کی روشنی پھیلنے تک یہاں مخصوص آسمن بنانے اپنی ریاضت میں مشغول رہتا۔ پہلے ایک دو روز تو مجھے اس طرح بیٹھنے میں تکلیف ہوئی کیونکہ میں نے بہت عرصے بعد یہ مشق شروع کی تھی لیکن پھر تکلیف کا وہ احساس بھی جاتا رہا۔

چند روز بعد ہی میں اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔

وہ رات کا آخری پرتھا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنی مشق پر بیٹھا تھا، اچانک یوں لگا جیسے آنکھوں کے سامنے روشنی کا گوند اسایک گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ رات بے حد تاریک تھی تاہم آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ میری نظرس سامنے بہت دور پہاڑ کی برف پوش چوٹی پر مرکوز تھی۔ اچانک سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا پہاڑی چوٹی کے عقب سے نمودار ہوا اور بتدریج پھیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس ابر پارے کے اندر بجلی کے کوندے سے لپک رہے تھے۔

سیاہ بادل کا وہ ٹکڑا پھیلتا جا رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے بارش اور آندھی کا بہت زبردست طوفان آنے والا ہے۔ طوفان کے آثار اگرچہ نمایاں تھے لیکن میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں یہاں سے اٹھ کر پیچھے چلا جاؤں۔

سیاہ بادل کا وہ ٹکڑا مزید پھیل گیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا ایک ٹکڑے کے سوا آسمان پر کہیں اور کوئی بادل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک اس میسب سیاہ بادل کے عقب میں ایک اور چیز



دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ روٹی کے گالے کی طرح سفید بادل کا ایک ٹکڑا تھا۔ سفید بادل کا یہ ٹکڑا ابھی برف پوش چوٹی کے عقب سے برآمد ہوا تھا اور اس کا حجم چند فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔

میں اس سفید ابر پارے کو دیکھتا رہا۔ نجانے مجھے یہ احساس کیوں ہوا تھا کہ سفید بادل کا وہ ٹکڑا آگے آنا چاہتا تھا مگر سیاہ بادل نے اسے روک رکھا تھا۔ سفید بادل کا وہ ٹکڑا اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میں اس وقت اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر کوئی نجانا سا احساس کرو میں رہا تھا۔

اچانک فضا گھرن گرج کی آواز سے گونج اٹھی۔ سیاہ بادل سمندر میں اٹھنے والی مہیب لہروں کی طرح پلٹ پلٹ کر سفید بادل کے ٹکڑے کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سفید ابر پارہ بجلی کے گوندوں کی طرح لپک لپک کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

عجیب صورت حال تھی۔ لگتا تھا جیسے آسمان پر دو مہیب قوتوں میں جنگ چھڑی ہو۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گھن گرج دہشت سی طاری کر رہی تھی۔ مجھے نجانے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ یہ بادل آپس میں نہیں ٹکرا رہے بلکہ نیکی اور بدی کی قوتیں آپس میں متصادم ہو رہی ہیں۔ میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ سیاہ رنگ کا مہیب بادل بدی کی علامت تھا اور چھوٹا سا سفید ابر پارہ نیکی کا مظہر تھا۔ نیکی اور بدی کی ان دونوں قوتوں میں آسمان کی وسعتوں پر زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ وہ سفید ابر پارہ جہم میں اگرچہ سیاہ بادل سے بہت چھوٹا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس جنگ میں فتح بالآخر اسی کی ہوگی۔ نیکی چاہے کتنی بھی چھوٹی ہو، بدی کی بڑی سے بڑی قوت پر حاوی ہو جاتی ہے۔

ابن دونوں قوتوں کی جنگ بڑی خوفناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ وسیع آسمان میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ گھن گرج اور بجلی کے کڑاؤں سے فضا دہل رہی تھی۔ وہ چھوٹا سا سفید ابر پارہ پلٹ پلٹ کر مٹنے کر رہا تھا۔ وہ ایک طرف سے حملہ آور ہوتا اور سیاہ بادل میں سوراخ کرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا۔

مہیب سیاہ بادل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ وہ بکھر رہا تھا لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ بکھرے ہوئے ٹکڑے دوبارہ متحد ہونے لگے۔ اس وقت وہ میرے سر کے عین اوپر تھے اور میں پورے انشاک سے یہ جنگ دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے سیاہ بادل کو برف پوش چوٹی سے بلند ہونے دیکھ کر میرے ذہن میں طوفان کا جو خیال ابھرا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ تیز ہوا کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جس میں بتدریج شدت آتی گئی۔

بادو باران کے اس خوفناک طوفان نے کائنات کو لپٹ میں لے لیا تھا۔ درو دیوار دہل کر رہ گئے۔ ہر چیز خس و خاشاک کی طرح اڑتی ہوئی نظر آنے لگی۔ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ کر کاغذ کے پر زوں کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ہوا کے طوفانی جھکڑ مجھے دھکیل رہے تھے لیکن میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا۔ لگتا تھا مجھے چھت کے ساتھ پلستر سے جوڑ دیا گیا ہو یا کسی غیبی قوت نے مجھے روک رکھا ہو اور مزید حیرت کی بات یہ بھی کہ میرے اوپر پانی کا ایک جینینا تک نہیں پڑا تھا حالانکہ میرے چاروں طرف پانی کی ہوجھاریں گر رہی تھیں اور چھت پر پانی کے ریلے بہ رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سفید بادل کا وہ ٹکڑا سیاہ بادلوں میں اس طرح گہرا ہوا تھا جیسے کوئی پھٹی سی ناؤ سمندر کی طوفانی لہروں میں پھنس گئی ہو۔ سیاہ بادلوں سے اٹھنے والی اونچی لہروں سے ابر پارے ریزہ ریزہ تھیں۔

میرے منہ سے بے اختیار اللہ ہو کا لہو بلند ہوا۔ یہ آواز بجلی کے کڑا کے کی طرح آسمان کی وسعتوں پر چاروں طرف پھیلتی چلی گئی۔ سفید ابر پارہ ابھی جیسے سنبھل گیا۔ اب وہ لپک لپک کر اپنے حریف (سیاہ بادل) پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ طوفان کا زور ٹوٹ گیا۔ ہوا کے جھکڑوں کی شدت میں بتدریج کمی آتی گئی اور موسلا دھار بارش بھی اچانک ہی رک گئی۔ سیاہ بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ٹکھرنے لگا اور چند منٹ بعد ہی اس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ آسمان کی وسعتوں پر ستارے چمکتے ہوئے نظر آنے لگے اور روٹی کے گالوں کی طرح وہ چھوٹا سا سفید ابر پارہ ہوا کے جھکڑوں پر تیر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر خفہ مندی کا احساس ہوتا تھا۔ میرے ہوتوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چونک گیا۔ سفید بادل کا وہ ٹکڑا ایک انسانی ہونے کی صورت اختیار کر گیا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا لیکن لگتا تھا دو دھیا چاندنی نے انسانی جیک کا روپ دھار لیا ہو۔

وہ ہوا تیرتا ہوا میری طرف آنے لگا اور پھر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ میرے ہوتوں کی مسکراہٹ واضح

نہی وہ ہوا اگرچہ واضح نہیں تھا۔ چہرے کے نقش نظر نہ رہے تھے لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ نیلگری تھی۔

میں چھت کے کونے پر اس جگہ بیٹھا تھا جہاں دو طرف سے اندر آپس میں ملتی تھی اسی طرح وہاں ایک ٹکڑا بن گئی اور نیلگری منڈیر کی دو سری طرف ہوا میں معلق کھڑی رہی۔

”وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے۔“ کانوں میں رس گھولتی ایک سرگوشیاں آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی قوتوں سے مفلوج کر کے مجھ تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھنے سے روک دو۔“

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے ہونے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نیلگری کی شمالی چوٹی اور تنکو جھیل کے درمیان پازوں میں بدھا کی گویا عبادت گاہ ہے۔“ نیلگری نے جواب دیا ”اس عبادت گاہ تک پہنچنے کا راستہ بہت تنگ اور خوفناک ہے۔ اس نے اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ کوئی دوسرا وہاں تک نہ پہنچ سکے لیکن تمہارے پاس شکتی ہے۔ تم وہاں پہنچ سکتے ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”اے جاب پر بیٹھے ہوئے چورہ دن ہو چکے ہیں۔ چھبیس روز باقی رہ گئے ہیں۔ تمہیں اس کا جاب مکمل ہونے سے پہلے اپنے عبادت گاہ سے نکالنا ہوگا۔ اگر اس کا جاب مکمل ہو یا تو۔“

”میں سمجھ رہا ہوں نیلگری۔“ میں نے اس کی بات لٹ دی ”محبتیں رکھو۔ میں تمہیں کسی ایسے شخص کی قید نہیں چاہتا۔ میں تمہیں مرہ بکا کر دینا پر تاجی نازل کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ نیلگری بولی ”جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں، میرے گرد حصار مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ آج بھی میں بڑی مشکل سے حصار توڑ کر یہاں آئی ہوں۔ اسے چل پنا گیا ہے کہ تم نے بھی اپنا جاب شروع کر دیا ہے۔ وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے۔ اگر تم پر اس بارش کا ایک جینینا بھی پڑنا تو تمہارا شریر (جسم) بھسم ہو جاتا۔ تمہیں اپنی حفاظت بھی کرنی ہوگی۔ وہ تمہیں روکنے کے لیے حملے کرنا ہے گا۔“ اب میں جاری ہوں۔ تمہیں بھی جلد سے جلد نیل سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“

نیلگری کا چاندنی میں ڈھلا ہوا ہوا آہستہ آہستہ فضا میں گہر ہوتا گیا۔ میں اسے دور رہتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دور بہت دور پہاڑی برف پوش چوٹی پر پہنچ کر وہ ہوا میری نگاہوں سے

اوجھل ہو گیا۔

مجھے ہلکا سا جھکا لگا۔ جیسے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بلایا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے آس پاس کوئی نہیں تھا اور پھر اچانک میں چونک گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں نے ایک بہت زبردست طوفان دیکھا تھا۔ موسلا دھار بارش اور طوفانی ہوا کے جھکڑ۔ درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھے تھے لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

دن کا مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ نہ کوئی درخت جڑ سے اکھڑا تھا اور نہ ہی کہیں سیلابی پانی نظر آ رہا تھا۔

میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ وہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آسمان پر بادلوں میں وہ جھڑپ طوفان بادو باران اور نیلگری کا ہوا اور پھر مجھے نیلگری کی باتیں یاد آئیں۔ گوتم بھوش اپنی پر اسرار قوتوں کے ذریعے مجھے میری ریاضت سے روکنا چاہتا تھا۔ نیلگری میری مدد کو پہنچ گئی تھی اور میرے اندر کی شکتی بھی کام آئی تھی۔ آسمان پر ہونے والی دو پر اسرار قوتوں کی خوفناک جنگ اور وہ طوفان میرے لیے تھا۔ دنیا والوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

نیلگری نے مجھے پیغام دے دیا تھا۔ گوتم بھوش کو جاب پر بیٹھے ہوئے چورہ دن ہو چکے تھے۔ صرف چھبیس دن باقی رہ گئے تھے۔ جاب مکمل ہونے سے پہلے پہلے اسے اس قدم برداشت گاہ سے باہر نکالنا تھا۔ اس کا جاب مکمل ہوجانے کی صورت میں نیلگری اس کے قبضے میں چلی جاتی۔ اس وقت نیلگری نیکی اور بھلائی کی علامت تھی لیکن گوتم بھوش کے قبضے میں جانے کے بعد یہی نیلگری تباہی اور بربادی کی دیوی بن جاتی۔

میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ مشقی افق پر سپیدی پھیلنے لگی تھی۔ میں نے اپنی ریاضت ختم کر دی اور اٹھ کر کچھ دیر چھت پر ٹھٹھار رہا اور پھر بیچے گیا۔ چھت پر آنے جانے کے لیے زینہ مکان کے اندر ہی سے تھا اس لیے مجھے نیچے آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

گھر کے اندر مگر اسانا تھا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ میں وہے قدموں چلا ہوا اپنے کمرے میں گیا لیکن جیسے ہی قدم اندر رکھا، ٹھک کر رک گیا۔

دھن میرے بستر پر سوری تھی۔ نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ میں چند لمحوں اس کی طرف دیکھا رہا پھر باہر گیا اور لاؤنج میں

پڑے ہوئے صوفے پر لیٹ گیا۔

نیلگی کی باتیں اب بھی میرے دماغ میں الجھ رہی تھیں۔ میں نے ہالیہ میں نیلگی کی برف پوش چوبیسوں کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ گوتم بھوش کا چاب قفل ہونے سے پہلے اسے گومپو کی بدھ عبادت گاہ سے باہر نکال سکوں۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میں اپنے آپ کو رسکون محسوس کرنے لگا اور پھر میری جلیبیں نیند کے بوجھ سے جھٹکنے لگیں۔

○☆☆○

رات کے نو بجے تھے۔

میں اس وقت تری دیدی مارگ میں سپر مارکیٹ کے قریب واقع ایشیا ہوٹل کی لابی میں بیٹھا انسپکٹر برینڈرا اور انسپکٹر اعظم خان کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دو گھنٹے پہلے ہی ٹیلی فون پر ان سے یہاں ملاقات طے کر لی تھی۔ نو بجے کا وعدہ تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

جب میں تیار ہو کر گھر سے نکل رہا تھا تو دوھو اور شوہا نے بھی میرے ساتھ آنا چاہا تھا لیکن میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔

میرے ساتھ جو پراسرار واقعات پیش آ رہے تھے ان کے بارے میں شوہا کسی حد تک جانتی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں تھی جسے کچھ بہتک بھی گلی ہو لیکن اب میں نے انسپکٹر برینڈرا اور اعظم خان کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ ان کے تعاون کے بغیر میں اپنی مہم پر روانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں کئی غیر ملکی سیاح بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر یورپین باشندے تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں جنہوں نے مختصر لباس پہنے ہوئے تھے۔

سوا نو بجے کے قریب انسپکٹر برینڈرا اور اعظم خان ہوٹل کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ میں نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا اور وہ سیدھے میری طرف آ گئے۔

انسپکٹر برینڈرا نے ویٹریس کو بلا کر کافی کے لیے کہہ دیا اور ہم اچھڑا دھر کی باتیں کرنے لگے۔ چند منٹ بعد ہمارے سامنے کافی سرو کی گئی۔

”کوئی خاص بات؟ کس لیے بلایا تھا تم نے؟“ برینڈرا نے کافی ٹاٹک اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے انڈیا جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا ہے اور نیپالی کی طرف جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”نیلگی!“ برینڈرا کے لمبے میں حیرت تھی ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”ہاں۔ یہی سمجھ لو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میں نے کچھ باتیں آج تک تم دونوں سے چھپائی ہیں۔ اس خیال سے کہ تم لوگ میرا مذاق نہ اڑاؤ لیکن تب صورت حال ایسی ہے کہ۔“

”گویا اب تم اس موڈ میں ہو کہ تمہارا مذاق اڑایا جائے۔“ اعظم خان نے مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

”ہاں۔ یہی سمجھ لو۔“ میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہیں رتنا بارک میں ملنے والے کرٹل کے ٹوٹے ہوئے جیسے سے لے کر اب تک پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ دونوں خاموشی اور پوری توجہ سے میری باتیں سنتے رہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اس دوران میں مجھ پر جو جھڑپیں نازل ہوئی رہی ہیں ان میں گوتم بھوش اور اس کے چیلے پنڈت ویراج کا ہاتھ ہے۔

”نیلگی بہت مہمان کشی ہے۔“ میں آخر میں کہہ رہا تھا ”گوتم بھوش ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک خاص چاب شروع کر دیا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو۔“

”تو کچھ نہیں ہو گا۔“ برینڈرا نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی ”ہندو دھرم میں ان پراسرار قوتوں کے بارے میں پڑھا سنا میں نے بھی بہت کچھ ہے لیکن ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ یہ تو پنڈتوں، یوگیوں اور سادھوؤں کے وعدے ہیں جو کچھ شیعہ دے دکھا کر لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ کوئی پڑھا لکھا اور عقل مند آدمی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میں تو تمہیں بہت ذہین اور عقل مند سمجھتا رہا ہوں لیکن۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر اچھل پڑا۔ جب اس نے یقین نہ کرنے والی بات کی تھی تو میں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ میری نظریں اس کے اس ہاتھ پر مرکوز ہو گئی تھیں جس میں اس نے کافی ٹاٹک پکڑ رکھا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ سے جوت گیا لیکن وہ زمین پر بھی نہیں گرا۔ ہوا میں تیرتا ہوا آگے کی طرف جانے لگا۔

برینڈرا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمبے وہ متحش نظروں سے فضا میں معلق کافی کے ٹکڑے کو دیکھتا رہا پھر اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن مگ ہوا میں تیرتا ہوا آگے کی طرف گیا۔ برینڈرا بھی ہاتھ پھیلائے اس کے پیچھے لگا۔

لابی میں بہت سے لوگ یہ دلچسپ اور حیران کن منظر

دیکھ رہے تھے۔ برینڈرا پورے ہال میں اس مگ کے پیچھے بھاگا رہا تھا۔ وہ جیسے ہی مگ کو پکڑنے کے لیے چھینا مگ آگے نکلا جاتا۔ یہ سنسنی خیز منظر دیکھ کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر ہلچل مچ گئی۔ دو پورچین عورتیں تو خوف زدہ ہو کر چل پھریں۔

مگ ہماری میز پر آکر ٹک گیا۔ برینڈرا نے مگ کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح پکڑ لیا جیسے اندیشہ ہو کہ وہ دوبارہ نہ نکل جائے۔ وہ خود صوفے پر بیٹھا تو اس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات تھے۔

”میں نے تم جیسے عقل مند آدمی کو بھی کبھی اس طرح فضا میں معلق کسی چیز کے پیچھے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دم لمبے میں کہا۔ برینڈرا کا چہرہ ہونٹن ہو رہا تھا۔ وہ چند لمبے میری طرف رکھا رہا پھر گمراہ سانس لیتے ہوئے اس نے ہاتھ مگ سے ہٹا لیے۔ شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ بہت سے لوگ اب بھی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

”تو یہ تمہاری حرکت تھی؟“ برینڈرا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ شاید تم اسے بھی شیعہ ہی کو لیکن وہ سامنے دیکھو اس انگریز عورت کو جو میز صوفوں سے اتر رہی ہے۔“

میں نے آٹھ سے اشارہ کیا۔ برینڈرا اور اعظم خان بھی اسی طرف دیکھنے لگے۔ دروازے پر اس انگریز عورت نے اسٹون واش جینز اور سفید سلیڈس کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کندھے پر براؤن لیدر بیگ لٹا ہوا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کاٹھا تھا۔ بیگ کے اسٹریپ مل پھنسا رکھا تھا اور بائیں ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اس نے پیچھے ہی آخری میز مگ سے نیچے قدم رکھا۔ اس کے بیگ سے گاڑھا سفید کھواں نکلنے لگا۔ اس عورت نے بیگ کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے بیگ سے آگ کا شعلہ لگا۔ عورت نے بدحواس ہو کر بیگ کندھے سے گرا دیا اور چلتی ہوئی ایک لابی میں موجود لوگ بھی اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ دو آدمیوں نے دو ڈکراس عورت کو تھام لیا جو اب بھی چل رہی تھیں۔ ایک آدمی بیگ کی طرف لگا۔ وہ پیر مار کر بیگ کی آگ بجھانا چاہتا تھا۔ اس نے پیر اوپر اٹھایا لیکن پیر اسے نیچے نہیں اٹھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گھٹنا تھام لیا جیسے کوئی زور وار چوٹ لگی ہو۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے۔

تھوڑے ایک ٹاٹک پر پیر اوپر اٹھا ہوا ہاں سے ہٹ گیا۔

بیگ کی آگ خود بخود بجھ گئی۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بیگ اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ بیگ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس پر آگ کا معمولی سا اثر بھی نہیں ہوا۔ وہ بیگ کو جھاڑتا ہوا اس انگریز عورت کے قریب آگیا اور بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ انگریز عورت نے ڈرتے ڈرتے بیگ پکڑ لیا۔ پہلے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اسے کھول کر اندر جھانکا۔ ایک ایک چیز کو نکل کر دیکھا اور پھر بیگ کندھے پر لٹکا کر بیوی دوڑانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

انسپکٹر برینڈرا اور اعظم خان پچھلی پچھلی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”یہ۔ یہ سب کچھ تم نے کہاں سے سیکھا؟“ برینڈرا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”تم اب بھی اسے شیعہ دے پاؤ ہی سمجھ رہے ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں نہیں یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں ایسی پراسرار قوتیں موجود ہیں جن سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ خود انسان کے اندر اتنی قوتیں ہیں جن کے بارے میں جان کر حیرت ہوتی ہے۔ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے کھن محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں نیت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ پنڈت، سادھو اور یوگی اپنے جیون کھٹائیوں اور تپسیا میں گزار دیتے ہیں۔ کامیابی لاکھوں میں کسی ایک کو ملتی ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”نیلگی بھی دراصل انسان کے اندر کی ایک ہمتی ہے اور بہت مہمان کشی ہے۔ ہزاروں سال سے لوگ اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لوگوں نے اپنے جیون برباد کر دیے لیکن اس کے قریب نہیں پہنچ سکے۔ میں نے کہا تھا تاکہ ایسی کوئی پراسرار ہمتی حاصل کرنے کے لیے نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ لوگوں کی نیتوں میں کھوٹ ہے جس وجہ سے وہ خود نقصان اٹھاتے ہیں۔ میری نیت میں کوئی توفر نہیں۔ کوئی برائی نہیں۔ میں نے شاولن نیپیل میں تھوڑے ہی عرصے کی ریاضت اور لگن سے اپنے اندر کی ایک بہت بڑی ہمتی پر قابو پایا جبکہ دوسرے لوگ برسوں سے اس کوشش میں ہیں اور کامیاب نہیں ہو سکے۔ میں نے اپنے اندر کی اس ہمتی کو ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کیا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ جس روز میری نیت

میں کھوت شامل ہوگئی... اس روز یہ شکتی مجھ سے چھین جائے گی اور یہ نیگلہ... میں ایک بار پھر خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بعض لوگ اب بھی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے کافی کاک بربندر کے ہاتھ سے لٹکا تھا اور وہ اس کے پیچھے ہال میں بھاگتا پھرتا تھا اور بالآخر وہ گک اسی میرے آکر ٹک گیا تھا اس لیے بعض لوگ اب بھی ہماری طرف متوجہ تھے۔

”نیگلہ بھی ایک ایسی ہی ممان شکتی ہے جو ہمارے اپنے اندر موجود ہے۔“ میں کہہ رہا تھا ”اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری یہ ریاضت پوری ہونے سے پہلے نیگلہ خود میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ گوتم بھوش کی نیت سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ میں جس نیگلہ کا ذکر کر رہا ہوں وہ ایک علامت ہے۔ اصل شکتی تو ہمارے اندر ہے اور میرے گلے میں یہ مالا۔“ میں نے گلے میں پڑی ہوئی مالا کو چھوا ”یہ کرشل کے اس ٹوٹے ہوئے جیسے کے گلے میں جسی ہے میں اٹھا کر اسے گھر لے گیا تھا۔ نیگلہ نے یہ مالا اپنے گلے سے اتار کر مجھے دے دی۔ لو دیکھو۔“ میں نے مالا اتار کر بربندر کی طرف بڑھادی۔

وہ الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا۔

”ایسا عجیب و غریب پتھر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

وہ بولا ”اور میں حرارت۔“

”یہ ایک زندہ انسان کی حرارت ہے۔“ میں نے کہا

”اس مالا میں جب تک یہ حرارت موجود رہے گی، مجھے نیگلہ کی آزادی کی خبر دیتی رہے گی۔ جس دن یہ حرارت ختم ہوگئی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کسی اور کے قبضے میں جا چکی ہے۔ ہزاروں لوگ اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گوتم بھوش اس دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ وہ صرف چوبیس پینس دن کے فاصلے پر رہ گیا ہے اور مجھے ہر صورت میں اسے روکنا ہے۔ وہ اس وقت نیگلہ کی برف پوش چوٹیوں میں گوپہ عبادت گاہ کے اندر چپ میں مصروف ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ گوتم بھوش اس عبادت گاہ میں ہے؟“ بربندر نے پوچھا۔

”نیگلہ خود میری رہنمائی کر رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا اس کی قوت سلب ہوتی جائے گی اور اس سے پہلے کہ وہ گوتم بھوش جیسے ہر معاش کے قبضے میں چلی جائے، مجھے وہاں پہنچنا ہے۔“

”نیگلہ میں یہ بُدھ عبادت گاہ کہاں پر ہے؟“ بربندر نے کہا ”نیگلہ دراصل دو چوٹیوں پر مشتمل ہے۔ نارتھ اور ساؤتھ۔ دونوں چوٹیوں ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر واقع ہیں اور ہر چوٹی چوبیس پینس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے جو سال کے بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پہاڑی چوٹیوں ماؤنٹ اوریسٹ سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اس طرف جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور پھر تمہارے ساتھ دو عورتیں بھی ہیں۔“

”یہ بُدھ عبادت گاہ نیگلہ نارتھ اور سٹکو جھیل کے درمیان کسی جگہ پر واقع ہے۔“ میں نے جواب دیا ”اور یہ ان دونوں عورتوں کا سوال تو میں ان میں سے کسی کو بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ ایک تو راستہ بہت تکھن ہے اور پھر نجانے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر میں اس قسم کے دوران میں اپنی زندگی ہار بیٹھا تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں کو کوئی نقصان پہنچے میری وجہ سے انہوں نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھائے ہیں اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ہر بلا سے محفوظ رہیں۔“

”اب تک کی صورت حال کے پیش نظر میں پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی تمہارا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں ہوگی۔“ بربندر نے مسکراتے ہوئے کہا ”ویسے تم مجھے کیا چاہتے ہو؟“

”میں زیادہ سے زیادہ ہر سوں میاں سے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”میرے بعد تم ان دونوں کو انڈیا بھیجے گا بدبو بست کر دینا۔ شوہا کی دہاں بہت پرانی ہے۔ ایک ہوئی بھی ہے۔ وہاں میرے کچھ مخلص دوست بھی ہیں جو انہیں سنبھال لیں گے۔“

”تھک ہے۔“ بربندر نے گمراہ سانس لینے ہوئے جواب دیا ”جو کوشش کروں گا لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں بلائیں میرے قابو میں آجائیں گی۔ ویسے اس کے علاوہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”مجھے تم جیسے مخلص دوستوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات اور۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جا دیں ”نیگلہ والی کمائی ایک بہت اچھا افسانہ ثابت ہو سکتی ہے لیکن اگر تم۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا!“

”اگر تم نیگلہ کی ایک جھک دکھا دو تو۔“ وہ بدستور

سکرا رہا تھا۔

”لاؤ یہ مالا مجھے دو۔“ میں نے اعظم خان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا کیونکہ وہ مالا اس وقت اسی کے پاس تھی۔ میں نے مالا لے کر گلے میں ڈال لی اور غیر محسوس انداز میں گھومتے ہو کر درمیان والے پتھر پر بیٹھ گیا۔ نیگلہ نے جب یہ مالا مجھے دی تھی تو اس وقت یہ بھی بتا رہا تھا کہ جب کبھی میں اس کی ضرورت محسوس کروں تو اس پتھر کو انگوٹھے سے ہولے ہولے مسل دوں لیکن آج تک میں نے اسے خود کبھی نہیں بلایا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ آج کل نیگلہ خود مصیبت میں گرفتار ہے۔ گوتم بھوش نے اپنی بعض قوتوں کے ذریعے اس کے گرد حصار قائم کر رکھا ہے۔ پتھر کو مسلے ہوئے میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ نیگلہ اس وقت وہ حصار توڑنے میں کامیاب ہو جائے۔

نیگلہ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ ہمارے دائیں طرف گول ستون تھا جس کے ساتھ پودوں کے گیلے رکھے ہوئے تھے اور مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ اس ستون کے اندر سے برآمد ہوئی ہو۔

وہ نیگلہ تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے پہلے روز دیکھا تھا۔ ہونٹوں پر وہی ملوٹی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی روشن ستاروں جیسی چمک۔ پہلی ملاقات کے بعد میں نیگلہ کے کھلے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس انسانی جڑیوں کی دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اچھل پڑا اور میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی تھی۔

ربندر اور اعظم خان اس طرح اچھل پڑے تھے جیسے ان کی سیٹوں کے نیچے کانٹے نکل آئے ہوں۔ ان دونوں کے چوڑے سرسٹنی کے عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مجھے سمجھے میں دیر نہیں لگی کہ نیگلہ انہیں نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک جھمکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے بھی اٹھ جانا پڑا۔

نیگلہ ہمارے قریب آئی۔ وہ جیسے ہوا میں تھر رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے رک گئی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے۔ اس نے بربندر کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر اعظم خان کی پیشانی پر بھی بوسہ دیا۔ گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ہوا میں تیرتی ہوئی اسی ستون کے قریب ہٹ کر لگا ہوں سے اوچھل ہو گئی۔

وہ دونوں اب بھی مبہوت سے کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بربندر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل

پڑا۔

کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ دونوں کے ہاتھ اپنی اپنی پیشانی پر تھے اور دونوں کے چوڑے سرسٹنی کے تاثرات نمایاں تھے۔ میں چونکہ خود بھی ایسی کیفیت میں مبتلا رہ چکا تھا اس لیے ان کی کیفیت کو سمجھنے میں بھی مجھے دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

”شاید اب تمہیں یقین آگیا ہو کہ میں نے تمہیں کوئی افسانہ نہیں سنایا تھا بلکہ ایک حقیقت بیان کی تھی۔“ میں نے بربندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بات کا یقین تو مجھے پہلے بھی تھا۔“ بربندر نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں تو اس شکتی کو دیکھنا چاہتا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے لوگ ہزاروں سال سے اپنی جانوں کی بازی لگا رہے ہیں۔ نیگلہ کو دیکھ کر تو میرا جی دل چاہنے لگا ہے کہ کوئی چاب شروع کر دوں۔“

”بہت ہو تو ضرور ایسا کرو۔“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”تمہیں بھی۔ ہم سے ایسی کھنائیاں برداشت نہیں ہو سکتیں۔“ بربندر نے جواب دیا پھر بولا ”مجھے حیرت ہے۔ اس لابی میں موجود لوگوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا حالانکہ نیگلہ کو دیکھ کر تو۔“

”وہ کسی کو نظر ہی نہیں آئی ہوگی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”وہ میری خواہش پر صرف تم دونوں کے سامنے آئی تھی۔“

”حیرت انگیز۔“ بربندر بولا ”بہر حال اب بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”وہی جو کہہ چکا ہوں۔“ میں نے کہا ”میں ہر سوں صبح سویرے میاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے بعد ان دونوں کو انڈیا بھیج دنا۔“

”انسپیکٹر اعظم دو چار دن میں واپس جانے والا ہے۔“ بربندر نے کہا ”کوئٹہ میں کس کا وہ دونوں اس کے ساتھ چلی جائیں۔“

”میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”تو چلو پھر تمہیں چھوڑ آئیں۔“ بربندر یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

علاقوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ابھی شام اتری ہو۔ بریدرانے ایک جگہ گاڑی روک کر کچھ پھل وغیرہ خرید لیے اور پھر گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی تھان کوٹ کی طرف جانے والی شاہراہ پر دوڑنے لگی۔

تھان کوٹ مرکزی شہر سے انتیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کبھی کبھار سامنے سے آتی ہوئی کوئی گاڑی نظر آ جاتی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں گھر پہنچ گئے۔ بریدرانے پھلوں کی نوکری شوہا کے ہاتھ میں تھادی۔ وہ دونوں اسی وقت واپس جانا چاہتے تھے مگر شوہا نے انہیں زبردستی چائے کے لیے روک لیا۔ ملازمہ اگرچہ مجبور ہوئی مگر وہ خود چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

چائے پینے کے بعد وہ لوگ زیادہ دیر نہیں رکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم کچھ دیر بائیں کرتے رہے پھر شوہا اور دھنو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں چھت پر آ گیا۔

آج آسمان پر شام ہی سے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن یہ وہ بادل نہیں تھے جن سے کسی قسم کا خوف محسوس ہوتا۔ میں کچھ دیر تک چھت پر ٹھٹھا رہا پھر اپنی مخصوص جگہ پر آسن جہاں بیٹھ گیا۔

اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ تاہم میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرتا رہا۔ بار بار یوں لگتا جیسے کوئی غیر مرئی قوت میری ریاضت میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو، مجھے دہاں سے اٹھانا چاہتی ہو لیکن میں نے اپنی توجہ نہیں بننے دی۔

اگلے روز میں دوپہر تک سو تاہا اور پھر اکیلا ہی بازار کی طرف نکل گیا۔ یہ وہی قصبہ تھا جہاں سب کے قبیلے سے واپس آنے کے بعد گوتم بھوش سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے بس سے اتار لیا تھا۔ وہ مجھے ہاتھوں میں لے گیا تھا

اور مجھ سے نیلگلی والی مالا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس کے حصار سے بھاگ نکلا تھا اور اس کے چیلے پنڈت دھراج نے مجھے ایک عورت کے قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ پولیس مجھے تھانے لے جا رہی تھی تو ناگ پال کے آدمی پولیس والوں کو قتل کر کے مجھے چھڑا کر ہاتھوں میں اس پر اسرار اور قدیم حویلی میں لے گئے تھے جہاں مجھے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ سب کا کو بھی پکڑ دوں لے جایا گیا تھا اور اگلی رات کو وہاں سے سب کو لے کر حویلی سے فرار ہو کر میں نیل کنڈ والی بدھ عبادت گاہ پر پہنچ گیا تھا جہاں دھنو اور اس

کے باپ سے ملاقات ہوئی تھی۔

ہاں۔ یہ وہی قصبہ تھاں کوٹ تھا جہاں اب میں آزادی سے بلا خوف و خطر گھوم پھر رہا تھا۔

میں نے بازار سے کپڑے کا ایک تھلا خرید اور ضرورت کی چیزیں بھی خرید کر تھلے میں بھر لیں۔ تھلا گھر کے قریب ہی ایک جگہ پر چھپا دیا اور گھر آ گیا۔ مجھے اگلے روز صبح سویرے یہاں سے نکل جانا تھا۔ دھنو اور شوہا کو بتائے بغیر اگر میں انہیں بتا دیتا تو ان کے بغیر کبھی بھی گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتا تھا۔

شام کو اعظم خان کا فون آ گیا کہ میں کل صبح نہ جاؤں۔ اس کے کہنے کے مطابق بریدرا اور وہ دو دنوں تک کرکل رات ہماری دعوت کرنا چاہتے تھے اس لیے میں کل کے بجائے پرسوں چلا جاؤں۔ میں نے اعظم خان کی بات مان لی۔

اس رات چھت پر ریاضت کے دوران میں کچھ عجیب و غریب اور غیر معمولی باتیں پیش آئیں۔ یوگا کی یہ ریاضت شروع کرنے میں گوتم بھوش ہی میرا گرو تھا اور اس نے مجھے متنبہ کیا تھا کہ اس جاپ کے دوران کچھ خوفناک اور بلا دینے والے واقعات رونما ہوں گے۔ کچھ براسرار قوتیں مجھے اس جاپ سے روکنے کی کوشش کریں گی لیکن میں اپنے آپ کو اکھڑنے نہ دوں اور اب وہ مرحلہ شروع ہو چکا تھا اور میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ بعض براسرار قوتوں کے ساتھ گوتم بھوش بھی میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس رات میرے ساتھ ایسے ہی عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے۔ کبھی مجھے لگتا، کوئی کتا میرے لباس کو دانتوں میں دبائے پیچھے کھینچ رہا ہے۔ کبھی کوئی بھیڑنا میرے سامنے آگروانت کوٹنے لگتا اور بار بار مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا۔

ایک بار تو وہ ہی ہو گئی۔ وہ ایک بڑھیا تھی۔ بت ضعیف اس کی عمر اتنی سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ چہرے پر اتنی جھریاں تھیں کہ کھڑکی کے جالے کا لگنا ہوا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچا۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ وہ بڑھیا افلاس اور غربت کی منہ بولی تصویر تھی۔ فاقوں نے اس کے جسم کو ہڈیوں کے ڈھانچے میں بدل دیا تھا اور ساری توانائی نچوڑی تھی۔

وہ زمین پر پڑی ہوئی ایک نوکری اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ننگوں کی بنی ہوئی وہ نوکری ایک برہنہ برات کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اسے چھاپڑی کہا جاسکتا تھا جس میں کچھ

رہی ہوئی تھیں۔ اوپر کالے رنگ کا ایک کپڑا بڑا ہوا تھا۔ بار بار کوشش کرتی لیکن اس سے وہ نوکری نہیں اڑی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھی۔ میں نے اس کی نظروں کا پیغام پڑھ لیا۔ وہ کہہ رہی تھی میں نے نوکری اپنے اس کے سر پر رکھوا دوں۔

میں نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے نوکری اٹھالی جو اب میری تھی۔ اس بڑھیا کے ہاتھ بھی نوکری پر تھے۔ میں نوکری اوپر اٹھا کر بڑھیا کے سر پر رکھنا چاہی تو بڑھیا نے ہدم نوکری میرے سر پر پلٹ دی۔ اس نوکری میں بدبودار بھٹ کے ٹوٹے اور خون بھرا ہوا تھا۔ میرا سر چہرہ اور راجہ بدبودار خون میں لتھڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں بڑھیا سے نیکی کے اس صلیکے کی وجہ پوچھ سکتا، اس نے برے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ پتھر اس قدر زوردار تھا کہ برادراں بھینچا اٹھا۔

میں اپنی جگہ رہی بل کر رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ میں بدحواس سا ہو کر ادھر ادھر کھینچا۔ نہ وہ بڑھیا تھی اور نہ وہ نوکری۔ میں نے سراٹھا کر پردہ کھلا۔ بادل پھٹ چکے تھے۔ ایک ستارہ ٹوٹ کر روکنی کی طرح چھوڑنا ہوا دوسری طرف بادلوں میں غائب ہو گیا۔

میرا ایک ہاتھ بے اختیار اپنے گال پر پہنچ گیا تھا۔ اس ہاتھ کے انگوٹھی ہاتھ میں بے پناہ قوت تھی۔ یہ سب کچھ کچھ عالم گویا میں ہوا تھا لیکن اس پتھر کا اثر میں اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔

رات کے آخری پارہ ایک اور خوفناک واقعہ پیش آیا۔ افوں خوار کتے آپس میں لڑتے ہوئے میری طرف آرہے تھے۔ انہوں نے اپنے ٹکیلے وانٹوں اور پنجوں سے ایک دوسرے کو بری طرح اڈھیر دیا تھا۔ وہ دونوں لوبانان ہو رہے تھے مگر شکست تسلیم کر کے بھاگنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ وہ افوں لڑتے لڑتے میرے قریب آ گئے اور اچانک ہی ان افوں نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میں چیخا ہوا ان سے بچنے کے لیے پیچھے گرا۔ وہ دونوں افوں خوار کتے میرے سینے پر سوار ہو گئے اور اپنی دھنسی بھول کر ٹکیلے وانٹوں اور پنجوں سے مجھے مبنوڑنے لگے تھے۔ میں ناست بچنے کے لیے زمین پر لوٹا اور بیچنا دیا۔

اور پھر دو آدمیوں نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ اس کے ہاتھوں کچھ نوسانی چیخوں کی آوازیں بھی میری سماعت سے فرائے لگیں۔

میرے حواس بحال ہوئے تو میں صوفے پر پڑا تھا۔

دھنو، شوہا، نیپالی ملازمہ اور مکان کی گمرانی پر مامور دونوں سادہ لباس پولیس والے میرے پاس کھڑے تھے۔

"کیا ہوا۔ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟" میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہم تمہاری چیخیں سن کر چھت پر گئے تھے۔" شوہا نے جواب دیا "تم چھت پر لوٹنے ہوئے پنج رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اپنے آپ کو کسی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اوہ!" میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مجھے ریاضت سے روکنے کے لیے کسی پر اسرار قوت کا یہ حملہ بڑا زبردست ثابت ہوا تھا۔ میں اس کے داؤ میں آ گیا تھا اور مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا۔

میری حالت سننے لگی تھی۔ دونوں پولیس والے باہر چلے گئے تھے۔ ملازمہ بھی اس دوران میں چائے بنا کر لے آئی۔ وہ چائے رکھ کر کچھ دیر کھڑی رہی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دھنو سامنے والی کرسی پر تھی اور شوہا صوفے پر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میری گردن پر سے ہوتا ہوا کندھے پر لگا ہوا تھا۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اس طرح فرش پر لوٹ لوٹ کر کیوں بیچ رہے تھے۔ کوئی ڈرواؤ خواب دیکھ رہے تھے؟"

"میں سمجھ لو۔ وہ بھیاک خواب ہی تھا۔" میں نے اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں اب بھی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"چھوڑ دو یہ سب کچھ۔" شوہا نے کہا "یہ سب کچھ پنڈتوں اور یوگیوں کے کھیل ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ جاپ اور جنت منتر کے چکر بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان میں جان بھی چلی جاتی ہے۔ ذرا سی غفلت سے جاپ کرنے والا بعض اوقات اپنے ہی جاپ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ میں بے پور کے ایک پنڈت کو جانتی ہوں۔ وہ ایک جاپ کے دوران میں ہی براسرار طور پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے زخمی شریر (بدن) کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی خون خوار درندے نے چیرھاڑ ڈالا ہو۔ تم اس چکر میں کیوں پڑ گئے۔ چھوڑ دو یہ سب کچھ اور ہندوستان چلنے کی تیاری کرو۔ ہم وہاں آرام سے زندگی گزاریں گے۔ میرے پاس بہت کچھ ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی ہمیں۔"

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں کسی لالچ میں یہ جاپ کر رہا ہوں؟" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف

دیکھا۔ وہ میرے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے کوئی لالچ یا ہوس نہیں ہے شوہا۔ میں تو ایک نیک مقصد کے لیے یہ جنگ لڑ رہا ہوں۔ ایک نیکی کو برائی کے قبضے میں جانے سے روکنے کے لیے۔ میں آدھے راستے سے واپس نہیں جاسکتا۔ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”غلطی میری ہی تھی جس سے میرے دشمن کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ کوئی ایسی کامیاب حرکت نہیں کر سکے گا۔“

شوہا نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اس کا لچکر شروع ہو گیا۔ وہ مجھے سمجھاتی رہی کہ مجھے یہ سب کچھ چھوڑ کر اب ہندوستان چلے جانا چاہیے۔ دھنواں دوران میں خاموش بیٹھی رہی۔ شاید ہماری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ شاید میں چھت پر بیٹھا رات بھر عبادت میں مشغول رہتا ہوں۔

”جاپ کو ادھر چھوڑنا زیادہ خطرناک ہو گا۔“ میں نے بھی شوہا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”ہندوستان چلے جانے سے دشمن سے ہمارا پیچھا نہیں چھوٹ جائے گا۔ یہ پراسرار قوتیں ارضی سرحدوں کی باہد نہیں ہوتیں۔ میری پسپائی کو بدلی سمجھا جائے گا اور مجھے نیست و نابود کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔“

”مجھے تم دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو۔ میں تمہیں کھوتا نہیں چاہتی۔“ شوہا نے کہا۔

”تو پھر اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ برائی کے خلاف اس یو (ژانی) میں میرے قدم نہ اکھڑنے پائیں۔“ میں نے کہا۔

میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ دھنواں اپنی جگہ پر بیٹھی اوٹھنے لگی تھی۔ میں نے ان دونوں کو ان کی خواب گاہ میں بھیج دیا اور خود بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔

بستر لینے کے بعد بھی مجھے دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ میں آج کی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک ہی رات میں مجھ پر پلے در پلے تین چار حملے ہوئے تھے اور آخری وار تو بہت ہی خوفناک تھا جس سے وقتی طور پر میرے قدم اکھڑ گئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دشمن کو وقتی طور پر کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن میرا حوصلہ تو پست نہیں ہوا تھا۔ میدان انچھوڑ کر بھاگنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب دشمن کے جھنڈوں میں نہیں آؤں گا اور گو تم بھوش کو اس کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

میں خواب میں بھی یہی سب کچھ دیکھتا رہا۔ دشمن میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور میں اس سے بچنے کے لیے بھاگتا تھا۔ میں ٹھوکر کھا کر گرا۔ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دشمن پوری قوت سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن ٹھیک اسی وقت آسمان سے بجلی کا ایک ٹونڈا سا لپکا۔ میرے گرد ایک صاعدا بن گیا۔ ایک چمکتا ہوا رستا تھا جس نے میرے گرد ایک دائرہ بنا دیا تھا۔ اس رستے میں سے بجلی کے کوندے لپک رہے تھے۔ مجھ پر حملہ آور ہونے والا دشمن کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا کر گرنا اور مایہ بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور پھر اچانک ہی اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے ارد گرد ایسا شور مچا دینے لگا جیسے کوڑوں کھیاں جھینسا رہی ہوں۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی کبھی نظر نہیں آئی لیکن جھینساہٹ کا شور بدستور سنانی دے رہا تھا۔ اسی شور میں چند الفاظ میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ عجیب و غریب اور ناقابل فہم الفاظ میرے ذہن سے گویا چپک کر رہ گئے تھے۔

میں جب بیدار ہوا تو دوسرا ہوری تھی۔ طبیعت میں عجیب بو بھل پن سا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ میں بار بار اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مجھے دشمن سے بچنے کی راہ دکھائی گئی تھی اور یہ راہ دکھانے والا کون تھا؟ نیلگہری یا میرے اندر کی اپنی قوت؟ وہ الفاظ اچھا شور سے ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔

میں نے شوہا وغیرہ سے اس خواب کا ذکر نہیں کیا۔ وہ پھر پریشان ہو جاتی۔ میں نے ان دونوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ برہنہ اور اعظم خان سے رات والے واقعے کا تذکرہ نہ کریں۔ دونوں محافظوں کو بھی سمجھا دیا گیا تھا۔

دن اسی طرح گزر گیا۔ شام آٹھ بجے کے قریب گاڑی ہمیں لینے کے لیے پہنچ گئی۔ برہنہ نے فون پر گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ لینڈ کرؤز تھی اور دو سادہ لباس پولیس والے بھی ساتھ تھے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔

ہم نو بجے کے قریب کھنڈوں میں کالی مانی کے علاقے میں واقع والا کلب پہنچ گئے جہاں اسپیکٹر برہنہ اور اعظم خان ہمارے منتظر تھے۔ یہ کلب اوپر اٹے ہوئے سے زیادہ دور نہیں تھا۔

برہنہ نے بڑی پر تکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ڈائننگ ہال کا ایک گوشہ ہمارے لیے مخصوص تھا جہاں دو میز ملا کر انتظام کیا گیا تھا۔ خوب صورت ویٹریوں نے

بریندر کا اشارہ پاتے ہی کھانا سرو کر دیا۔ کئی ڈشیں تھیں اور کھانا اس قدر افراط سے تھا کہ کم از کم میں آدمی شکم سیر ہو کر کھا سکتے تھے۔

میں اپنی ریاضت کی وجہ سے خصوصاً رات کو بہت کم کھانا کھاتا تھا لیکن بریندر کے اصرار پر اس روز کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا۔

کھانے کے بعد ہم کلب والے حصے میں آگئے۔ نیپال جیسے ملک پر ہندوستان کا اثر تھا اور یہاں بھی بے حیائی عام تھی۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں تو عیانت اور بے حیائی کے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آتے کہ شیطان بھی شرمنا جانا ہو گا۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں پروگرام کرنے والی رقاصائیں فن سے زیادہ اپنے جسموں کی نمائش کرتیں۔ بعض رقاصائیں تو رقص کے دوران بالکل بے لباس ہو جاتیں۔

جو لاکلب میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ کسی کو شرم دینا کا احساس تک نہیں تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور کبھی کبھی تو کوئی عورت بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر بیجان خیر موسیقی پر رقص کرنے لگتی۔

جو لاکلب میں یہ ہنگامے صبح تک جاری رہتے تھے لیکن ہم ایک بجے وہاں سے نکل آئے۔ اسی دوران میں موقع پا کر میں نے بریندر کو بتایا تھا کہ آج صبح سویرے میں نکل جاؤں گا۔

دو بجے کے قریب لینڈ کرورڈز نے ہمیں گھر پہنچا دیا۔ شوہا اور دھونے بھی کلب میں رقص کے ایک دو پروگراموں میں حصہ لیا تھا۔ صبح ان کے چروں سے نمایاں تھیں۔ وہ کپڑے بدلے بغیر اپنے کمرے میں جاکر بستر پر گر گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔

میں بچت پر آگیا۔ اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر میں نے تین بار وہ الفاظ دہرائے جو گزشتہ رات خواب میں میرے ذہن میں بٹھائے گئے تھے۔

میرے گرد ایک حصار بن گیا۔ وہ آگ کا دائرہ تھا۔ نہیں، آگ نہیں۔ وہ بجلی تھی جس سے کوئٹہ لپک رہے تھے۔

میں اپنے آسن پر بیٹھ گیا اور تمام تر توجہ اپنی ریاضت پر مرکوز کر دی۔ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن مجھے عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتی رہیں۔ نہایت خوفناک صورتوں والے عجیب و غریب جانور تھے جو میری طرف لپک رہے تھے

لیکن وہ اس روشن دائرے سے دور ہی رہے۔ دن کا دم سا اجالا پھیلنے لگا تو میں نے اپنی ریاضت کر دی۔ کچھ دیر بچت پر متمل رہا اور پھر پچھلے دن والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی گری نیند سو رہی تھیں۔

میں کچن میں آگیا اور برتنوں کی آواز پیدا کیے بغیر چائے بنائے لگا۔ نیپالی ملازمہ بھی اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ نو بجے سے پہلے کوئی بھی بستر نہیں چھوڑتا تھا اور میں اس وقت تک بہت دور نکل چکا ہوتا۔

چائے پینے کے بعد میں ایک بار پھر شوہا والے کمرے میں آگیا۔ ویر تک ان دونوں کے چروں کو دیکھتا رہا پھر باہر آگیا۔

میں کو خفی سے باہر نکلا تو دونوں پولیس والوں میں سے ایک سو رہا تھا جبکہ دوسرا جاگ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی مسکرا دیا اور ٹھٹھنے والے انداز میں ایک طرف چلنے لگا۔

مکان سے تقریباً دو سو گز دور میں نے جھاڑیوں میں چھا ہوا تھیلا نکالا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

پوکھارا کے لیے پہلی بس ساڑھے سات بجے روانہ ہوتی تھی اور ابھی سو اچھے تھے۔ گلیوں سے نکل کر سڑک پر آتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی جس نے پون گھنٹے میں مجھے بس اسٹاپ پر پہنچا دیا۔ دور کا سفر کرنے والے لوگ بس اسٹاپ پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے اور اپنی اپنی منزل کی طرف جانے والی بسوں پر سوار ہو رہے تھے۔ نیپال میں ریل نہیں چلتی۔ بسوں پر ہی سفر ہوتا ہے۔ آمدورفت کے کچھ اور ذرائع بھی ہیں لیکن زیادہ تر لوگ بسوں پر ہی سفر کرتے ہیں۔

پوکھارا کی طرف جانے والی بیس بھی اپنے اپنے لینڈ لائن میں لگی ہوئی تھیں۔ سب سے آگے والی بس کی نصف سے زیادہ سیٹیں بھر چکی تھیں۔ میں نے بھی بگ سے ٹکٹ خریدا اور بس میں سوار ہو کر کڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ دو مسافروں کی سیٹ تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ایک عورت میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے گردن ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دراز قامت، صحت مند اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ تیس اور پچیس کے بیچ لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے پنڈلیوں تک لمبا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کا گریبان اس قدر فراخ تھا کہ میں کسی اضافی پوشش کے بغیر اندر تک جھانک سکتا تھا۔ وہ عورت غالباً بڑھ تھی۔ اس کے پاس بھی کپڑے کا

ایک تھیلا تھا جس میں نچائے کیا کچھ بھرا ہوا تھا۔ تھیلا اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے تھیلا لے کر اوپر ریک میں اپنے تھیلے کے قریب رکھ دیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ غالباً شکر ہے ادا کرنے کے لیے کچھ کہا بھی تھا لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔

بس مقررہ وقت سے پہلے ہی بھر گئی لیکن اس کی روانگی مقررہ وقت پر ہی عمل میں آئی تھی۔

شہر کی سڑکوں پر رفتار بہت کم رہی لیکن شہر سے نکل کر پر تھوڑی ہائی وے پر آتے ہی بس کی رفتار تیز ہو گئی۔

بس جب تھان کوٹ پہنچی تو میں سمٹ کر بیٹھ گیا حالانکہ جانتا تھا کہ شوہا وغیرہ ابھی کمری نیند سو رہی ہوں گی لیکن نچائے مجھے یہ اندیشہ کیوں تھا کہ وہ میرا راستہ روک لیں گی مگر میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔

بس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف دوڑتی رہی۔ راستے میں کئی قبیلے اور بستیاں آتی رہیں۔ بس ہر بستی میں رکتی رہی اور مزید مسافر اس میں بھرے رہے۔

بس کے اندر مسافر آدھی بس کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ بچت پر بھی کوئی جگہ خالی نہیں رہی تھی۔ اس ہائی وے پر حالانکہ کئی بیس چلتی تھیں لیکن ہر بس کا یہی حال رہتا تھا۔ سیٹ اتنی کثافت میں تھیں تھیں کہ دو آدمی سولت سے بیٹھ سکتے۔ وہ عورت پہلے ہی میری طرف جھکی ہوئی تھی۔ کپڑے ہوئے مسافروں کے دباؤ کی وجہ سے وہ گویا میرے اوپر لدی جا رہی تھی۔ وہ زیادہ دباؤ ڈالتی تو میں گھور کر اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ جواب میں وہ مسکرا کر رہ جاتی۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ مجھے بڑی شدت سے نیند آرہی تھی۔ میری آنکھیں آدھی بند ہوئے جا رہی تھیں۔ میں کڑکی کے ساتھ دیا ہوا تھا۔ میرے ساتھ ٹیکسی ہوئی عورت بھی اونگھ رہی تھی۔ میری آنکھ جب بھی کھلتی، اسی عورت کا سرمیرے کندھے پر ہوتا۔

گھنٹہ دو سے پوکھارا صرف سو دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو یہ فاصلہ ڈھائی تین گھنٹوں میں طے ہو سکتا تھا لیکن یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ سانپ کی طرح ہل کھاتی ہوئی سڑک بتدریج بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ اور چڑھاؤ کی وجہ سے بس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

بس دو بجے کے قریب پوکھارا پہنچی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بھیڑ کیوں کی طرح بھرے ہوئے مسافروں کے اترنے کے بعد میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت

بھی اٹھ گئی اور جب میں نے کپڑے ہو کر اپنا تھیلا اٹھانے کے لیے اوپر ریک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میرا دماغ ٹھوم کر رہ گیا۔ میرا تھیلا وہاں نہیں تھا۔ میں نے ادھر، ادھر دیکھا۔ اس عورت کو دھکا دے کر سیٹ سے باہر نکلا اور دوسرے مسافروں کو دھکیلا ہوا بس سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بس اسٹاپ پر لاتعداد لوگ سامان اٹھائے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ مجھے کسی کے پاس ایسا سفید تھیلا نظر نہیں آیا جس پر بچھو کا خاکہ چھپا ہوا ہو۔ کوئی ایسا شخص بھی دکھائی نہیں دیا جس پر میں کسی قسم کا شبہ کر سکتا اور پھر ضروری نہیں تھا کہ کوئی شخص میرا تھیلا لے کر بیس پر اتار ہو۔ میں تو راستے بھر تقریباً اونگھتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، راستے کی کسی بستی میں اترنے والا کوئی شخص میرا تھیلا لے گیا ہو۔

میں بس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ میری وہ ہم سفر عورت بھی بس سے اتر کر میرے قریب آ کر رک گئی۔

”کیا بات ہے۔ تم بہت پریشان ہو؟“ اس نے ملی جلی ہندی اور نیپالی میں کہا۔

”کوئی مسافر میرا بیگ اٹھا کر لے گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ!“ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے ”سفر میں اپنے سامان کا خیال رکھنا چاہیے۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟“

”صرف دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”پر کسی گتے ہو۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ہوئی۔ ”ٹورسٹ ہو۔ سیر و تفریح کے لیے آئے ہو۔ کہاں جانا چاہتے ہو؟“

”میں نے جواب دیا ”بھدروی کا شہر۔“ وہ بے توجہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔“

”مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ کورچون میں رہتی ہوں۔ لاچاک تک ہمارا ساتھ رہے گا۔ کیوں نہ ہم یہاں کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اکٹھے ہی کسی بس میں بیٹھ جائیں۔ اکیلا آدمی تو رہ جاتا ہے۔ دونوں ساتھ ہوں گے تو باتوں میں وقت کٹ جائے گا۔“

”شکریہ۔“ میں نے جواب دیا ”میں آج کی رات پوکھارا ہی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ تم اپنا سفر جاری رکھ سکتی ہو۔“



میں ایک طرف چلنے لگا۔ نجانے کیوں اب اس عورت پر مجھے کچھ شہ سا ہونے لگا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ سیاح ہوں، سیاحوں کو لوٹنے کے لیے بھی بڑے عجیب و غریب ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ خوب صورت عورتیں تو بڑا موثر ہتھیار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ عورت بھی خوب صورت ہی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے کھنڈو ہی میں مجھے تازیلا ہوا اور جان بوجھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی حالانکہ اس وقت بس میں اور سیٹیں بھی خالی تھیں۔

کھنڈو کے مقابلے میں یہاں کا موسم زیادہ خوشگوار تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں سے بس بدل کر فوراً ہی اگلے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا لیکن تھیلے کی کشمکش کی وجہ سے آج کا دن اور رات میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بس اسٹاپ سے نکل کر کچھ دور تک پیدل ہی چلتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور دوبارہ شرکی آوارہ گردی شروع کر دی۔ اس دوران میں، میں نے ایک عدد تھیلہ، دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں بھی خرید لی تھیں۔ شہر میں گھومتے ہوئے ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہاں کے چف پولیس آفیسر سے ملاقات کر لی جائے۔ سب لوگ مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے تھے تو ان کی رہائش اور واپسی کے انتظامات کے سلسلے میں اس افسر نے میری بڑی مدد کی تھی۔

میں چف انسپکٹر سے ملاقات کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا لیکن وہ دفتر میں موجود نہیں تھا۔ میں کوئی پیغام چھوڑے بغیر واپس آ گیا۔

شہر میں گھومتے ہوئے میں نے کچھ معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تنکو جمیل تک جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں تا پانی (جہاں گرم پانی کے چشمے ہیں) کھاسا، سیانگ اور یخینی کی طرف ہوتے ہوئے دریائے کیا کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا تنکو جمیل تک چلا جاؤں لیکن یہ راستہ بہت طویل تھا۔ اس میں کم از کم تین دن لگ جاتے۔ دوسرا راستہ انا پور تا کے پہاڑی سلسلے میں سے ہو کر جاتا تھا۔ تھ بیک تک تو میں آسانی سے بسوں پر سفر کر سکتا تھا۔ اس سے آگے جمیل کی طرف جانے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی قافلہ مل جاتا۔ میں نے یہ دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے میں نے ایک گیسٹ ہاؤس میں رہائش کا بندوبست بھی کر لیا۔ یہ گیسٹ ہاؤس بنیادیں مندو کی طرف دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کے قریب وجوار

میں چند اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ یہ جگہ پر سکون بھی تھی اور بارون بھی۔

میں جس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا وہ دو منزلہ بھٹا نما عمارت تھی۔ اس کی مالکہ ایک اہلیہ عمر عورت تھی اور اس کی رہائش بھی اسی عمارت کے ایک کمرے میں تھی۔ مجھے دوسری منزل پر سامنے کی طرف کارز کا کمرہ ملا تھا۔ سامنے بہت خوب صورت اور وسیع لان تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر میزوں اور کرسیاں چھپی ہوئی تھیں۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لان میں چلے ہوئے برقی چمکوں کی روشنی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بعض پودوں کی شاخوں میں بھی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی جتیاں جل رہی تھیں۔

میں کچھ دیر تک کمرے میں بیٹھ رہا پھر کھانے کے وقت اٹھ کر باہر نکلا۔ ڈائننگ روم میں بھی اگرچہ کھانا ہو رہا تھا لیکن میں نے لان میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔

کھانے کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکھا۔ عجیب سی تھکن ہو رہی تھی۔ کئی روز بعد ایسا ہوا تھا کہ میں گیارہ بجے بستر پر لیٹ گیا۔ اس رات میں نے ریاضت بھی نہیں کی۔ بستر پر لیٹے ہی میں تیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

وہ شاید رات کا پچھلا سفر تھا۔ بلی کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ میں حرکت کیے بغیر آنکھیں پٹ پٹا کر جھٹک کر گھورتا رہا۔ دماغ پر تیند کا شمار ہونے کے باوجود میری چھٹی حس کسی غیر معمولی بات کی اطلاع دے رہی تھی۔ میں نے آنکھیں سے گردن کھٹاکر دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازہ بند تھا۔ میں نے گردن کھٹاکر دوسری طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں سننا ہٹ ہونے لگی۔ کھڑکی کا پردہ پوری طرح ہٹا ہوا تھا اور کھڑکی کے سامنے ایک انسانی ہولناکی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کوئی عورت تھی اور میری طرف پشت کیے کھڑی تھی اور اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

میرے ذہن میں نیلگی کی خیالی اہلیہ لیکن وہ اس طرح بے لباس ہو کر کبھی میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ تو چاندنی کا پیکر بن کر آئی تھی۔ یہ شاید میرا کوئی واہمہ تھا۔ میں نے دانتوں میں انگلی ڈالی۔ میرے منہ سے بلی کی آواز نکل گئی۔

وہ میرا واہمہ نہیں تھا اور نہ ہی میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازہ قائم عورت کھڑکی کے سامنے میری طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ میرے منہ سے ”سی“ کی بلی کی آواز

سن کر وہ میری طرف پلٹ گئی۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ وہی عورت تھی جو بس میں میری ہم سفر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔

میں نے بیڈ سے اٹھنا چاہا تو میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے۔ شدید سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی۔ میرے جسم پر بھی کوئی لباس نہیں تھا۔ میں متحش لگا ہوں سے اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بستر کی چادر سلی اور سٹنی ہوئی تھی۔ میرے اور اس عورت کے کپڑے پٹک کی پائنتی کی طرف پڑے تھے۔

وہ عورت نے اپنے قدم اٹھائے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھرپور جوان عورت تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

”ہیلو!“ وہ بیڈ کے بالکل قریب آ گئی۔

”تنت۔ نت۔“ میں نے جلدی سے بستر کی چادر اپنے اوپر لپیٹ لی ”تم یہاں کیسے۔“ میرا مطلب ہے، اندر کیسے آئیں؟“ میں بری طرح بدحواس ہو رہا تھا اور میرے منہ سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔

”حیرت ہے۔“ اس نے میری طرف جھٹکے ہوئے جواب دیا ”تم خود مجھے ساتھ لے کر آئے تھے۔ دو گھنٹے میں تمہارے بستر پر پہنچی رہی اور اب تم پوچھ رہے ہو کہ میں اندر کیسے آئی!“

”جھوٹ بکتی ہو تم۔“ میں چھلانگ لگا کر بستر سے اتر گیا اور چٹون اٹھا کر پہننے لگا۔ میرے دماغ میں آنند حیاں سی چل رہی تھیں۔ بڑی زبردست سننا ہٹ ہو رہی تھی۔ یہ بس میں میری ہم سفر ضرور تھی مگر سفر کے دوران میں ہم دونوں میں چند عام سے جملوں کے تبادلے کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی اور پھر پوچھا رہا تھا کہ ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے۔ اس وقت جب اس عورت نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی چیلنج کی تھی تو مجھے اسی وقت اس پر شہ ہوا تھا اور اب یہ شہ درست نکلا تھا۔ بس اسٹاپ پر اگرچہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے مگر اس نے مجھے تلاش کر لیا تھا لیکن مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ میرے بند کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھی اور کیا کہہ رہی تھی؟ وہ دو گھنٹے میرے ساتھ بستر پر لیٹی رہی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ مجھے خود خبر نہیں تھی۔ کیا میں اپنے آپ سے اتنا غافل ہو گیا تھا کہ اپنے اوپر گزرنے والے اتنے بڑے حادثے کی خبر تک نہیں ہو گئی تھی!

نہیں نہیں۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ دھوکے باز عورت تھی اور مجھے کسی پیکر میں پھنسانا چاہتی تھی۔

میں نے چٹون پن کر چادر ایک طرف پھینک دی اور بیڈ پر سے اس کے کپڑے اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیے۔

”میں نہیں جانتا کہ تم نے میرا سرخ کس طرح لگایا اور کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھیں۔ اب یہ لباس پنو اور نکل جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے۔“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ چند لمحوں میری طرف دیکھتی رہی پھر اچانک ہی مجھ پر چھلانگ لگادی۔ میں اس افاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مجھ سے پلٹ گئی اور کیلے ناخوں سے مجھے نوچنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ ہٹا کر بستر پر پھینک دیا۔ وہ پھر اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔

اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ سناٹے میں چیخوں کی آواز سن کر گیسٹ ہاؤس کے لوگ جاگ گئے کچھ ہی دیر بعد راہداری میں شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑھڑایا جانے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا، اس عورت نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کے بارے میں بتانے لگی۔ دو تین آدمی اندر گھس آئے۔ ایک آدمی نے چادر اٹھا کر عورت پر ڈال دی تھی اس نے اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور رو رو کر اپنی مظلومیت جتانے لگی۔

اور تب یہ انکشاف ہوا کہ کبھی نامی وہ عورت بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں میرے ساتھ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ اس وقت گیسٹ ہاؤس میں آئی تھی جب کھانے سے پہلے میں اپنے کمرے میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔

کبھی رو رو کر لوگوں کو بتا رہی تھی کہ وہ آج ہی کھنڈو سے آئی ہے۔ میں بھی اسی بس میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے راستے میں بھی اسے پٹانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔

”اگر مجھے پتا ہو تا کہ یہ بد معاش بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہے تو میں کبھی یہاں نہیں آتی۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی ”تھوڑی دیر پہلے کسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ٹھن سی محسوس ہونے لگی۔ میں تازہ ہوا کے لیے کمرے سے باہر نکلی تو اسی وقت یہ بد معاش بھی اپنے

کمرے سے نکلا تھا۔ مجھے یہاں دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے پہلے بس میں سفر کے دوران میں اپنے رویے کی معافی مانگی اور مجھے ہلکا پھلکا کر کے میں نے آیا۔ میں اس وقت بدحواسی کا شکار تھی۔ کسی سے باتیں کر کے اپنی گھبراہٹ دور کرنا چاہتی تھی۔ میں اس پر اعتماد کرتے ہوئے کمرے میں آگئی اور اس نے میرا جو حشر کیا ہے وہ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ میں تو اپنے بچے (شوہر) کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔

”یہ جھوٹ بولتی ہے۔“ میں نے جج کر کہا ”یہ بس میں میری ہم سفر ضرور تھی لیکن میں نے اس سے کوئی بدکاری نہیں کی تھی۔ میں سو رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، یہ میرے کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھی۔ کسی آہٹ سے میری آنکھ کھلی تو یہ۔“

”مارو اسے۔ سالا حرامی۔“ ایک آدمی چیخا ”یہ باہر سے آنے والے لوگ ہماری عورتوں کو لوٹ کا مال سمجھتے ہیں۔ مارو اسے۔“

اور پھر دو تین آدمی مجھ پر پل پڑے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ لوگ مجھے بچانے کے لیے بھی لپکتے تھے لیکن اس وقت تک میری ٹھیک ٹھاک دھنائی ہو چکی تھی اور پھر کسی نے مشورہ دیا کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

پولیس کو فون کر دیا گیا اور ایک گھنٹے بعد میں تھا نے میں موجود تھا۔ یہاں بھی ہر پولیس والا حسب توفیق میری تواضع کرتا رہا۔

وہ عورت بھی چند دوسرے لوگوں کے ساتھ تھا نے آئی تھی۔ اسے تو گیسٹ ہاؤس واپس بھیج دیا گیا لیکن اس بات کا پابند کر دیا گیا کہ پولیس کی اجازت کے بغیر وہ گیسٹ ہاؤس نہیں چھوڑے گی اور مجھے حالات میں بند کر دیا گیا کہ میری قسمت کا فیصلہ آفیسر انچارج ہی کرے گا جو اس وقت اپنے گھر پر سو رہا تھا۔

میں حالات کی کوٹھڑی میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ شاید میری قسمت ہی روٹھ گئی تھی جو کچھ عرصے سے میں اسی طرح مصائب کا شکار ہو رہا تھا۔ پولیس سے پنا تو گویا ایک معمول بن چکا تھا۔

میں پچھلی نامی اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چند گھنٹوں کا سفر ہی قیامت بن گیا تھا لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ پچھلی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ اس قسم کی

عورتیں عام طور پر پیسے کے لیے مردوں کو بھانستی ہیں۔ اس نے بھی مجھے ناک لیا تھا اور کسی طرح سراغ لگایا تھا کہ میں کہاں بھرا ہوا ہوں۔

کمرے میں میرا رویہ دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھ سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ میرے ڈانٹنے پر اس نے شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لیا۔ ایک جھوٹی کہانی بنا کر خود تو مظلوم بن گئی اور لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں اور میں سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

انسپکٹر منجھ بے گتے کے قریب تھا نے میں آیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ انسپکٹر کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی انسپکٹر تھا جو سہا اور اس کے ساتھیوں کی رہائش و خوراک کا انتظام کرنے کے سلسلے میں میرے ساتھ رہا تھا۔ میں نے تو فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا کیونکہ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت میرا حلیہ بہت گڑھا ہوا تھا۔ شیو اور سر کے بال بے تحاشا بوسے ہوئے تھے اور میرا لباس بھی مختلف تھا۔

میں انسپکٹر کے سامنے کھڑا تھا اور وہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ قریب کھڑا ہوا سب انسپکٹر اسے میرے جرم کی تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

”تم نے مجھے پہچانا نہیں آفیسر۔ میں بہت سنگھ ہوں۔“ بلاخر میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”نام سنا ہوا ہے۔“ وہ غرایا ”پہلے کس جرم میں پکڑے گئے تھے؟“

”میں انسپکٹر برینڈرا کا دوست ہوں۔“ میں نے کہا ”تمہیں یاد ہوگا، چند مہینے پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ساتھ کچھ قابل کی لوگ۔“

”اوہ تم!“ وہ اچھل پڑا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا ”لیکن یہ کیا قصہ ہے۔ کیا واقعی یہ درست ہے؟“

”یہ سب جھوٹ ہے آفیسر۔“ میں نے کہا اور پھر اسے پچھلی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

”وہ عورت کہاں ہے؟“ میری بات ختم ہونے پر اس نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

”گیٹ ہاؤس میں سر۔“ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”اسے لے کر آؤ اور پہلے ٹھنڈا پانی اور چائے

بھجواؤ۔“ انسپکٹر نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ سب انسپکٹر سلیوٹ کر کے فوراً ہی باہر نکل گیا۔ انسپکٹر نے مجھے کرسی پر بٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد چائے اور جگ میں

ٹھنڈا پانی آگیا۔ میں نے دو گلاس پانی پیا اور پھر بے تکلفی سے چائے کا پک اٹھایا۔ انسپکٹر بھی اپنا پک اٹھا کر چکیاں لے رہا تھا۔ ہم پہلے برینڈرا کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر انسپکٹر نے پناؤں میں سہا اور اس کے ساتھیوں پر حملے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ سہا زندہ ہے اور ٹھنڈو میں ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سب انسپکٹر پچھلی کو لے آیا۔ مجھے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”اس سے پوچھو کیا قصہ ہے؟“ انسپکٹر نے اپنے ماتحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جب تک یہ سچ نہ اگلے اس پچھلی کو غصے کے ساتھ الٹا دیکھ کر پکھا چلائے رکھو۔“

”میں۔ میں بتاتی ہوں سر۔ سب سب کچھ بتا دوں گی۔“ پچھلی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ پولیس کی مار کے خوف سے ہی کانپ اٹھتی تھی۔

پچھلی کے کہنے کے مطابق وہ ایک طوائف تھی۔ گزشتہ روز صبح پانچ بجے ایک آدمی اس کے گھر پر آیا تھا اور ایک بڑی رقم دے کر اسے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے لوگوں کے سامنے ذلیل کرے گی اور مجھے پوکھا راسے آگے جانے سے روکے گی۔ مجھے کسی ایسے معاملے میں الجھا دے گی کہ میں زیادہ سے زیادہ دن یہاں پھنسا رہوں۔

وہ شخص بس اسٹاپ تک اس کے ساتھ آیا تھا اور یہاں آتے ہی اس نے اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔ میں اس وقت بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دور سے میری نشان دہی کر کے چلا گیا تھا۔

پچھلی نے بس میں سفر کے دوران میں پہلے میرا بیگ چوری کر لیا۔ ایک جھوٹی سی ہتھی میں بس رکی۔ کچھ مسافر اپنا سامان لے کر اترے تو پچھلی نے میرا بیگ بھی نیچے پھینک دیا۔ لوگ یہی سمجھ کر وہ بیگ اترنے والے مسافروں کے سامان میں شامل ہے۔

پوکھا راسے پانچ کر اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی اور چھپ کر میرا چھپا کر رہی۔ اس نے بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں کمرے لیا اور اس خیال سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی کہ میری نظروں میں نہ آجائے۔

اتفاق سے اسے میرے ساتھ والا کمرہ ملا تھا۔ آدمی رات کے وقت جبکہ گمرانا تھا، وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ میں نے سونے سے پہلے دروازے کا ہتھی قفل اندر سے لاک کر لیا تھا۔ اس نے ہیر پین کی مدد سے باہر سے لاک کھول لیا اور اندر آگئی۔

میں تھکا ہوا تھا اور گہری نیند میں تھا۔ اس نے کلورو فارم میں بھگا ہوا رومال میری ناک کے سامنے لا کر فوراً ہی ہٹالیا۔ مجھے آہستگی سے ہلا کر دیکھا اور میرے کپڑے اتار کر ایک طرف ڈال دیے اور خود بھی کپڑے اتار کر میرے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔

کلورو فارم کا صرف اتنا اثر ہوا تھا کہ میں تقریباً دو گھنٹوں تک اٹنا قلیل رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر آہٹ پیدا کی اور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق میں اسے کمرے میں دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور اس کے بعد وہی ہوا جو وہ چاہتی تھی لیکن یہاں بازی چلتی دیکھ کر وہ خود بدحواس ہو گئی۔

اس نے اس شخص کا جو حلیہ بتایا تو میں اچھل پڑا۔ اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ ہنڈت دھیراج تھا جو خود تو میرے قریب نہیں آسکا تھا لیکن مجھے روکنے کے لیے اس نے ایک طوائف کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ مجھے کمپوٹ بڈھ عبادت گاہ جانے سے روکنا چاہتا تھا لیکن شاید میرے اندر کی توہیں بھی میری حفاظت کر رہی تھیں۔

اس روز بہر حال میں اپنے سفر پر روانہ نہیں ہو سکا۔ میں سب انسپکٹر کے ساتھ گیسٹ ہاؤس واپس آگیا۔ لوگوں کو جب اصل بات کا پتا چلا تو انہوں نے مجھ سے اپنے رویے کی معافی مانگی اور پچھلی کو برا بھلا کہنے لگے۔

میں ناشتا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سن کر میں بڑبڑا کر اٹھ گیا۔ دروازہ اس طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا کہ اگر کچھ دیر مزید نہ کھولا گیا تو اسے توڑ دیا جائے گا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دہرے کا بارہن رہے تھے۔

”کوئی نئی مصیبت؟“

میں بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو ایک نہیں دو مصیبتوں کو دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ انہیں دیکھ کر حقیقتاً میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

وہ شوہرا اور دھنوتیں۔ وہ دونوں مجھے دھکیلتی ہوئی اندر آگئیں اور والمانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئیں۔ دروازہ چوٹ کھلا ہوا تھا اور راہداری میں کھڑے ہوئے لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

”کیا تم ہم سے تنگ آگئے ہو جو اس طرح چوری چھپے وہاں سے بھاگے تھے۔“ شوہرا نے میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”تم ہمیں چھوڑنے کا خیال دل میں لاسکتے ہو لیکن ہم تجس نہیں چھوڑیں گے۔ تاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ دھونکا لہجہ رو دینے والا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ دیر تک مجھ سے لمبی رہیں پھر مجھے بیڈ پر دھکیل دیا۔ ”دھنو۔ تم اس کی اچھی طرح جرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ شوبھا یہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی میں تقریباً دس منٹ لگے تھے۔ اس نے ایک خلیا اٹھا رکھا تھا جسے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کرسی پر ڈال دیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد گیسٹ ہاؤس کی ایک دیوڑیں چائے لے آئی۔ چائے کے لیے شوبھا کہہ کر آئی تھی۔

وہ دونوں بڑے رجوش انداز میں گلے شکوے کر رہی تھیں کہ میں انہیں چھوڑ کر کیوں چلا آیا تھا؟ ”لیکن تم لوگوں کو میرے بارے میں پتا کیسے چلا اور سیدھی یہاں کیسے آ گئیں؟“ میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”عورت کے آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے بہت سنگھ جی۔“ شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اس رات بریندرا نے دعوت کی تھی۔ اگلے روز تم غائب ہو گئے تو مجھے شبہ ہوا۔ کل رات میں نے بریندرا کو گھیر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارے برادر گرام سے واقف ہے۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا پھر میرے آنسوؤں کو وہ کھل گیا۔ اس نے بتا دیا کہ تم کہاں جا سکتے ہو۔ اس نے ہمارے لیے گاڑی کا بندوبست کروا اور صبح سویرے دو آدمیوں کے ساتھ اس طرف روانہ کروا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”ہمارے ڈرائیور نے عقل مندی یہ کہ یہاں آتے ہی سب سے پہلے اس نے مقامی پولیس اسٹیشن سے رابطہ کیا۔ وہ کچھ اور معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اس پولیس اسٹیشن سے تمہارے بارے میں معلوم ہو گیا اور ہم سیدھے یہاں چلے آئے لیکن تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کس سے مار پیٹ ہوئی تھی؟“

”ایک عورت سے۔“ میں نے جواب دیا اور پھر اسے گزشتہ رات کے بارے میں بتانے لگا۔ ”کون ہے وہ۔ مجھے بتاؤ۔ میں اس کی ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گی۔ تم برا بھلا شرمناک الزام۔“ شوبھا بھڑک اٹھی۔ ”وہ پولیس کی حراست میں ہے۔“ میں نے جواب دیا

”لیکن قصور اس کا بھی نہیں ہے۔ وہ خود بھی شیطانی قوت کے زیر اثر تھی۔ یہ ساری شرارت دراصل ہینڈل دھیران کی تھی جو مجھے آگے جانے سے روکنا چاہتا تھا۔“

”لیکن تم کون سے خزانے کی تلاش میں جا رہے ہو جو وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے؟“ شوبھا بولی۔ ”وہ خزانہ ہی ہے۔ دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ۔ نیلگوری جس کے لیے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میں اسی لیے تم لوگوں کو بتائے بغیر کمرے نکلا تھا۔ یہ ایک خطرناک مہم ہے۔ اس میں جان جانے کا بھی خطرو ہو سکتا ہے۔ تم لوگوں نے میری خاطر پہلے ہی بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ۔“

”تم ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔“ اس مرتبہ دھونے میری بات کاٹ دی۔ میں نے دھون کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔

میرے لیے اب مجبوری یہ تھی کہ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں ان سے چوری چھپے نکلا تھا اور وہ میرے پیچھے چلی آئی تھیں۔ اگر میں آگے جا دیکھا تو اب بھی وہ میرا پیچھا کریں۔ انہیں کچھ سمجھانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ پورا دن ہم نے کمرے ہی میں گزارا۔ گیسٹ ہاؤس میں ایک بھی کمرہ خالی نہیں تھا۔ میں نے بوزمی مالک سے کہہ دیا کہ ہم تینوں اسی ایک کمرے میں رہ لیں گے۔ وہ اضافی کمرہ وصول کر لے۔

شام کو ہم شرکی سیر کو نکل گئے۔ اس دوران میں ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی خریدی گئیں۔ ایک دکان پر خریداری کے دوران میں مجھے ایک بہت اچھا خنجر نظر آیا۔ اس خنجر کے ایک طرف دھار تھی اور دوسری طرف باریک دندانے تھے۔ میں نے وہ خنجر خرید لیا۔ پنڈلی پر باندھنے والا چمڑے کا اسٹریپ بھی کھینچ کھوچکا تھا۔ ایک جفت سازی دکان پر بیٹھ کر میں نے اپنی مرضی کے مطابق اسٹریپ بھی بوا لیا اور خنجر کو اس میں اڑس لیا۔

رات کا کھانا بھی ہم نے بازار کے ایک ریستورنٹ میں کھلایا اور دس بجے کے قریب گیسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ اس پولیس انسپکٹر اور چیف انسپکٹر کو لان میں بیٹھے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ چیف انسپکٹر مجھ سے اس طرح ملا جیسے سا بھائی برسوں سے چھڑا ہوا ہو۔ گیسٹ ہاؤس کی مالکہ، ملازمین اور دوسرے

لوگ۔ یہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ”شام کو فون پر بریندرا سے بات ہوئی تھی۔“ چیف نے کہا ”اس نے بتایا تھا کہ تم لوگ نیلگوری کی طرف جانا چاہتے ہو۔ مجھے بتاؤ، میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کی محبت اور ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے ٹال دوں لیکن اچانک ہی خیال آیا کہ دن بڑی تیزی سے گزرتے جا رہے ہیں۔ بسوں پر سفر کرنے میں مزید وقت ضائع ہوگا اس لیے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

”نیلگوری۔“ میں نے گمراہ سانس لیتے ہوئے کہا ”ہماری منزل تو بہت دور نیلگوری کی برف پوش چوٹیوں میں ہے لیکن تم نٹ پیک تک جانے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔“ ”نٹ پیک۔ تمہارا مطلب ہے؟“ انا پورنا؟“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”لیکن اگر کوئی مسئلہ۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”تم لوگ کب روانہ ہونا چاہتے ہو؟“ ”کل صبح۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تھک ہے۔“ صبح سات بجے گاڑی یہاں پہنچ جائے گی۔“ چیف انسپکٹر نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔

چیف انسپکٹر بریندرا کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں پرائمری اسکول سے کالج تک کلاس فیوہر چکے تھے۔ پولیس میں بھی ایک ہی روز بھرتی ہوئے تھے۔ بریندرا کو ترقی کے لیے کئی مواقع ملے لیکن وہ کرسی پر بیٹھ کر کلرک کی طرح کام کرنے کے بجائے عمل و حرکت کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایکشن میں رہتا پسند کرتا تھا اس لیے ہر مرتبہ اس نے پرموشن حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ دونوں آدھی رات تک ہمارے پاس بیٹھے رہے اور پھر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ کمرے میں آکر بھی ہم تینوں دیر تک جاگتے رہے۔ دھون اور شوبھا بائیک پر لیٹ گئیں اور میں سیٹی پر دراز ہو گیا اور پھر باتیں کرتے کرتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ صبح بچے ہم اٹھ گئے۔ تیار ہو کر ناشتا کر رہے تھے کہ ہمیں لینے کے لیے گاڑی پہنچ گئی۔ وہ بہت شاندار اور وہیل ڈرائیو لینڈ کرورز تھی۔ پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں لیے سڑک کے لیے ایسی ہی گاڑیاں کامیاب رہتی ہیں۔ ڈرائیور کے

ساتھ سادہ لباس میں ایک اور آدمی بھی تھا۔ رخصت ہوتے وقت جب میں بل کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر پہنچا تو بوزمی مالک نے بل لینے سے انکار کر دیا۔ ”ہم چیف کے مہمانوں سے بل وصول نہیں کر سکتے۔“ بوزمی مالک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے بل نہیں لیا۔

شوبھا اور دھون گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی جس پر میں بیٹھ گیا۔ دوسرا آدمی سب سے پیچھے والی سیٹ پر تھا۔ گاڑی حرکت میں آکر پہلی رفتار سے شرکی سڑکوں پر گھونسنے لگی۔ دکانیں کھلتا شروع ہو گئی تھیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہمارے محافظ رامانے ایک دو جگہوں پر گاڑی رکوا کر کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ آخری مرتبہ گاڑی شرکے نواح میں ایک پٹرول پمپ پر روکی گئی۔ گاڑی کا ٹینک فل کروانے کے علاوہ دس دس لیٹر کے پانچ کین بھی پٹرول سے بھرا لیے گئے اور پھر گاڑی شرکے سے نکل کر پینگ جاک کی طرف جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

سڑک کشادہ اور بہت تھی۔ دیگر گاڑیوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ پینگ جاک فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن مسلسل چڑھائی کی وجہ سے یہ فاصلہ دو گھنٹوں میں طے ہوا۔ پینگ جاک ایک بڑا قصبہ تھا۔ وہاں سے پینٹ سڑک ٹوڈنا نامی قصبے کی طرف مڑ گئی تھی لیکن ہمیں جس طرف جانا تھا وہاں کی سڑک نہیں تھی بلکہ اسے سڑک کہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک پتھرا راستہ تھا جو پہاڑوں میں بل کھاتا ہوا بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں رہی تھی۔

پانچ بجے کے قریب ہم گھانا رنگ نامی بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک راستہ نٹ پیک کی طرف چلا گیا تھا اور دوسرا گورے پانی کی طرف۔ یہ راستہ پہاڑوں میں بل کھاتا ہوا میلوں آگے گرم پانی کے چشموں کے علاقے سے ہوتا ہوا دھول گری کے پہاڑی سلسلے کی طرف چلا گیا تھا۔

آسمان پر بادل تو صبح ہی سے ہو رہے تھے۔ ہم گھانا رنگ پہنچے تو بلکی ہوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ بستی کے کھیانے ہمیں آگے جانے سے منع کر دیا۔ ان پہاڑی علاقوں میں بارش کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ یہ خوشگوار بلکی ہوندا باندی موسلا دھار طوفانی بارش میں بھی بدل سکتی تھی۔ تیز بارش میں پانی سیلابی ریلوں کی طرح بہنے لگتا تھا اور آمد و رفت کے

راستے بھی پانی میں ڈوب جاتے تھے ایسے میں سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

یورپین سیاحوں کی ایک اور پارٹی بھی یہاں رک گئی تھی۔ اس پارٹی میں دو عورتیں اور تین مرد شامل تھے۔ ان دور دراز پہاڑی راستوں پر یا تو وہ لوگ سفر کرتے تھے جو ان پہاڑوں میں واقع پھوٹی پھوٹی بستیوں میں آباد تھے یا مسماٹ کے شوقین غیر ملکی سیاح اور ان میں بھی زیادہ تر یورپین باشندے ہوتے تھے۔

اس پھوٹی سی بستی میں ظاہر ہے کہ کوئی سرائے یا ہوٹل نہیں تھا۔ یورپین سیاحوں کو ایک مکان میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمیں بھی ایک مکان میں بچھا دیا گیا جو صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں ایک بوڑھا کاشت کار اپنی بیوہ بچی کے ساتھ رہ رہا تھا جس کی عمر پچیس چھیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

ایک کمرے میں وہ باپ بیٹی رہ رہے تھے۔ دوسرا ہمیں دے دیا گیا۔ ڈرائیور اور راما نے لینڈ کروزر ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

رات کا کھانا شام ہونے سے پہلے ہی کھالیا گیا تھا۔ بوڑھے کی بیٹی نے جاول ابال لے لے تھے کھانے کی کچھ چیزیں ہمارے پاس بھی تھیں۔ ہم نے ان میں سے کچھ چیزیں بوڑھے کے حوالے کر دیں اور کچھ پیسے بھی دے دیے تھے۔ بوڑھا خوش ہو گیا۔

رات کو تقریباً دو گھنٹوں تک فوفانی بارش ہوتی رہی اور پھر آسمان اس طرح صاف ہو گیا جیسے کبھی بادلوں کا نام و نشان ہی نہ رہا ہو۔

صبح ہم نوبے سے پہلے روانہ نہیں ہو سکے تھے۔ یورپین سیاحوں کی وہ پارٹی ہم سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی۔ اب ہمارا سفر خاصا دشوار ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ برساتی نالے اب بھی زور و شور سے بہہ رہے تھے۔ کئی جگہ سڑک بھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسی جگہوں پر ڈرائیور بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

ہمارا سفر دیرائے موڈی کھولا کے ساتھ ساتھ جاری تھا۔ تقریباً پچاس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں ہینکو نامی بستی میں ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ یورپین سیاحوں کی پارٹی بھی وہاں رکی ہوئی تھی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ بستی سے تقریباً ایک میل آگے ایک برساتی نالے کا ٹیل ٹوٹ گیا ہے اور جب تک نالے کا پانی نہیں اترے گا، ہم آگے نہیں جاسکیں گے۔

اس روز ہم ہینکو نامی اس بستی سے آگے نہیں جاسکے تھے۔ پہاڑی چوٹیوں پر پھر ابل نمودار ہونے لگے اور ہم دھماکتے رہے کہ مزید بارش نہ ہو۔

شام کے قریب نالے کا پانی اترتا شروع ہو گیا لیکن اس وقت بھی وہ تالا پار کرنے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

وہ رات بھی ہم نے اس بستی میں گزار دی۔ صبح ہم جلدی اٹھ گئے۔ یورپین سیاحوں کی پارٹی بھی روانگی کے لیے تیار ہو رہی تھی اور پھر ہم لوگ تقریباً اٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ ایک میل آگے وہ تالا تھا جس کا ٹیل ٹوٹا ہوا تھا۔ ٹیل سے بائیں طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر نالے کا پانی بہت چڑا تھا جس میں بہت ہلکا پانی بہہ رہا تھا۔

یورپین سیاحوں کی گاڑی نالے میں اتری تو ہم نے بھی اپنی گاڑی اس کے پیچھے ہی ڈال دی۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو کچھ میں تالا پار کرنا مشکل ہو جاتا مگر یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ نالے کی تہ میں بھی پھر پیچھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے یہ راستہ پار کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

ہم اس وقت دریا کے کنارے کے بالکل ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستہ بڑا خطرناک تھا۔ ایک طرف ساتھ سڑک فٹ نیچے ڈھلان میں دریا بہہ رہا تھا اور دوسری طرف سڑک کے بالکل ساتھ ساتھ ہزاروں فٹ بلند سٹلخ چٹانیں تھیں۔ وہ راستہ بھی اتنا چڑا تھا کہ دو گاڑیاں بمشکل ایک دوسرے کو کراس کر سکتی تھیں۔

یورپین سیاحوں کی وین بھی ہم سے تقریباً پچاس گز آگے جا رہی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تین فٹ اونچے ستون سے لگے ہوئے تھے۔ ان سے آگے ڈھلان شروع ہوجاتی تھی جو دریا تک چلی گئی تھی۔ اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ ہماری گاڑی کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ آگے جانے والی سیاحوں کی وین کا ایک ٹائمرسٹ ہو گیا تھا اور وین لہرائی ہوئی چٹان کی طرف کنارے پر رک گئی تھی۔

ہمارے سامنے ٹھپ تھا۔ اس دھماکے کی پر شور آواز سے ہمارا ڈرائیور بھی اس طرح اچھل کود حواس ہوا تھا کہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یہ ذرا سی غفلت خطرناک ثابت ہوئی اور گاڑی سڑک پر لہرائی ہوئی کنارے کے ایک ستون سے ٹکرا کر ایک دم مڑ گئی۔

چھپل سیٹ پر بیٹھی ہوئی دھن اور شوہا بری طرح چیخنے

لگیں۔ آخری سیٹ پر بیٹھے ہوئے راما نے پچھلا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔

گاڑی ڈرائیور سے بے قابو ہو کر تیزی سے دریا کی طرف ڈھلان پر اتر رہی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ڈھلان تقریباً پینتالیس کے زاویے پر تھی۔ اگر زیادہ عموماً ہوتی تو گاڑی اب تک تالا یا زیاں کھا چکی ہوتی۔

”گاڑی سنبھالو۔ بریک لگاؤ۔“ میں چیخ اٹھا۔

ڈرائیور نے اسٹیرنگ تو سنبھال لیا لیکن وہ اس قدر بد حواس تھا کہ اس نے بریک کے بجائے ایکسیلی ریٹر پر ہیر رکھ دیا۔ گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

میں نے سامنے دیکھا اور میرے دماغ کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ پنڈت دھیراج دریا کے پانی پر اس طرح کھڑا تھا جیسے پتھر فرش پر کھڑا ہو۔ اس کے بدن پر مختصر سا لنگوٹ تھا اور سر پگڑی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کو اس طرح پھینکا رکھے تھے جیسے کسی کو آغوش میں لینے کو تیار ہو۔

میں نے سر جھکا کر ڈرائیور کے پیروں کی طرف دیکھا۔ میرے پیٹ میں ناف کے قریب گہرں سی پڑنے لگیں۔ میرے اندر کی ہلکتی بیدار ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں سے مقناطیسی لہریں سی خارج ہونے لگیں۔ ڈرائیور کا کپڑا ایکسیلی ریٹر سے ہٹ گیا اور کچھ پلٹ خود بخود آہستہ آہستہ نیچے دبتے لگی۔

گاڑی کی رفتار کم ہو گئی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ دریا کا پانی اب صرف چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سامنے دیکھا۔ پنڈت دھیراج اب بھی پانی کی سطح پر کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں اب وحشت سی ابھرتی تھی۔

میں نے اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ہمارے درمیان اگرچہ تیس چالیس فٹ کا فاصلہ تھا لیکن لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے ایک ہاتھ کے فاصلے پر کھڑے ہوں۔

پنڈت دھیراج اس طرح لڑکھایا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں وحشت پھیل چلی گئی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نہیں پانی نکل رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پانی میں دھنس رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے چڑ رہا تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ پانی میں دھنسا رہا اور بالآخر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی پیٹلے رنگ کی پگڑی پانی کی سطح پر تیرتی رہ گئی تھی۔

میں نے پنڈت دھیراج کو اگرچہ اس کی شرارت کا مزہ چکھادیا تھا لیکن وہ اپنا کام بھی کر گیا تھا۔

دھن اور شوہا کی چیخوں میں سڑاپ کی پر شور آواز کے ساتھ لینڈ کروزر پانی میں اتر گئی۔ ڈرائیور نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اور پانی میں ہاتھ پیر مارنے لگا۔

لینڈ کروزر میں پانی بھرنے لگا اور وہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگی۔ میں اپنی سیٹ پر سے چھلانگ لگا کر پیچھے آ گیا۔

باہر پانی کے دباؤ کی وجہ سے میں بڑی مشکل سے دروازہ کھول سکا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی شوہا باہر جا کر اور ہاتھ پیر مارتے ہوئے چیخنے لگی۔

شوہا کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی اور شوہا کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

دھن بھی گاڑی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ ایک ماہر تیراک تھی۔ میرے پیچھے پر اس نے شوہا کو سنبھال لیا اور میں ڈرائیور کی طرف لپکا جو غوطے کھا رہا تھا۔

یورپی سیاحوں نے ہماری گاڑی کو ڈھلان پر اترتے اور پانی میں گرنے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی ڈھلان پر دوڑے آ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر ایک جوان عورت اور ایک مرد نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

وہ دونوں بھی اچھے تیراک تھے۔ ان کی مدد سے ہم ڈرائیور اور شوہا کو آسانی سے دریا سے نکال لائے۔

شوہا ٹھیک تھی۔ وہ محض خوف زدہ تھی۔ اسے یورپین عورت اور دھن نے سنبھال لیا تھا۔ ڈرائیور نے اچھے خاصے غوطے کھائے تھے۔ اس کے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا۔ یورپین آدمی جس نے اسے پانی سے نکالنے میں میری مدد کی تھی، اسے اونڈھانا کر اس کے پیٹ سے پانی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں حواس میں آ گئے تھے۔ ڈرائیور کو اب راما نے سنبھال لیا تھا۔ شوہا دھن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم سب دریا میں اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جہاں ہماری لینڈ کروزر رکی تھی۔ گاڑی اب دریا کی تہ میں بیٹھ چکی تھی اور پانی کی سطح بالکل پر سکون تھی تاہم ہماری کچھ چیزیں پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ ان میں ہمارے وہ دونوں بیک بھی شامل تھے۔

میں نے ایک بار پھر دریا میں چھلانگ لگا دی اور وہ دونوں بیک نکال لایا۔

ان سیاحوں کا تعلق فرانس سے تھا۔ وہ کوہ پیما تھے اور انا پورنا کی پہلی چوٹی سر کرنے جا رہے تھے۔ انا پورنا بہت طویل پہاڑی سلسلہ تھا۔ اس کی چھ چوٹیاں تھیں جن میں انا پورنا ڈن سب سے زیادہ بلند (تقریباً چوبیس ہزار فٹ) تھی۔ اس چوٹی کو سر کرنے کے بعد وہ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کرتے۔

دیر کے کنارے پر کھڑے وہ کر گاڑی کا کام کرتا ہے کار تھا۔ ہم ان پورچین سیاحوں کے ساتھ سڑک پر آگئے۔ ابھی تک انہوں نے اپنی گاڑی کا ٹائر تبدیل نہیں کیا تھا کیونکہ ٹائر برست ہوئے کے فوراً ہی بعد ہماری گاڑی کو حادثہ پیش آچکا تھا۔ سب لوگ اسے حادثہ ہی سمجھ رہے تھے لیکن میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا تھا۔

گوتم بھوش، نیلگری کو حاصل کرنے کے لیے چاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہر صورت میں یہ چاپ پورا کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں اسے چاپ پورا نہیں کرنے دوں گا۔ اس نے مجھے روکنے کے لیے اپنے جیبے جھوڑ رکھے تھے۔ پنڈت دھیراج اس کا خاص چیلہ تھا اور وہ مجھے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ بھی ایک ایسی ہی کوشش تھی۔ وہ ہمیں دریا میں غرق کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اگرچہ اپنی اس گھناؤنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا تاہم ہماری منزل کھولی کرنے میں کسی حد تک کامیاب ضرور ہوا تھا۔

ویگن میں کوہ پیما کی سامان بھرا ہوا تھا۔ چھت پر بھی کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ پانچ افراد وہ تھے اور پانچ ہی ہم تھے لیکن کسی نہ کسی طرح ہمارے جیبے کی گنجائش نکل آئی۔ میں نے پانی میں بیٹھے ہوئے اپنے دونوں بیگ ویگن کی چھت پر رکھ دیے تھے۔

ہم ہندو رنج بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ سطح سمندر سے تقریباً اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع میلوں دور تک پہلے ہوئے انا پورنا نیشنل پارک سے ہوتے ہوئے سر پہرے قریب ہم نٹ پیک پہنچ گئے۔ انا پورنا سلسلہ کوہ کی یہ پہاڑی چوٹی بھی سطح سمندر سے تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھی۔ اس کے دامن میں وہ بستی تھی جو ہماری منزل ٹھہری تھی۔ یہاں پر وہ سڑک بھی ختم ہو جاتی تھی۔ آگے تنکو جمیل یا نیلگری کی طرف جانے کے لیے کوئی باقاعدہ سڑک یا راستہ نہیں تھا۔

یہ بستی کافی بڑی تھی۔ انا پورنا نیشنل پارک کی سر کرنے اور اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی سر کرنے کے لیے غیر ملکی سیاح اس طرف آتے رہتے تھے اس لیے اس بستی میں سیاحوں کے

لیے کچھ سہولتیں بھی موجود تھیں۔

اس بستی میں سرائے نما دو ہوٹل تھے۔ ایک سرائے میں ہمیں دو کمرے مل گئے۔ یورپین سیاح دو سری سرائے میں چلے گئے تھے۔ سرائے میں آتے ہی ہم نے بیگ کھولی کر تمام چیزیں کھلی جگہ پر پھیلا دیں۔ کپڑوں سے ابھی تک پانی پڑ رہا تھا۔

یہاں اچھی خاصی سردی تھی۔ ہمارے پاس وہی کپڑے تھے جو بھگت چکے تھے لیکن ان میں بھی گرم کپڑا کوئی نہیں تھا۔ مختصر سے بازار کی ایک دکان سے ہمیں یاگ کی کھال کی جیکٹس مل گئیں۔

اگلے روز ایک بس واپس جانے والی تھی۔ ڈرائیور اور رام کو واپس بھیج دیا گیا۔ میں نے کل شام ہی کو تنکو جمیل کے لیے کسی قافلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دی تھی لیکن کوئی امید افزا خبر نہیں ملی تھی۔ صبح سرائے میں ناشتا کرتے ہی میں پھر اپنی اس مہم پر نکل کھڑا ہوا۔

کئی لوگوں سے رابطے کے بعد پتا چلا کہ دو دن بعد ایک قافلہ تنکو کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ مجھے رستوں نام کے ایک آدمی سے رابطہ کرنے کو کہا گیا جو یہ قافلہ تیار کر رہا تھا۔

رستو کی بستی کے ایک قبوہ خانے میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ وہ درمیانے قد اور ٹھٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ بدھا کا بیرو کا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ کوئی تجارت پیشہ آدمی ہوگا جو ان اونچے پہاڑوں میں آباد چھوٹی چھوٹی بستیوں میں مال تجارت لاتا اور لے جاتا ہوگا لیکن اس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ صرف رہتا تھا۔ نٹ پیک سے انا پورنا کی بلند ترین چوٹی، تنکو جمیل اور ماناگ میں دریائے راسیانڈی کے کنارے پر واقع بارگونا نامی ایک قدیم بڑھ عبادت گاہ تک جانے والے لوگوں کی رہنمائی کرتا تھا جس کے عوض اسے کچھ معقول معاوضہ مل جاتا تھا۔ اب یہ حالات پر منحصر ہوتا تھا کہ کس طرف جانے والا کوئی قافلہ پہلے تیار ہوتا ہے۔

اتفاق سے اس وقت تین افراد ایسے تھے جو تنکو جمیل کی طرف جانے کو تیار تھے۔ ان میں ایک اوجڑ عمر امریکی عورت تھی۔ وہ ایک مصنفہ تھی جو دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت پر کئی کتابیں لکھ چکی تھی۔ مارٹھا نامی یہ عورت دو مہینوں سے نیپال کی سیاحت پر تھی اور پچھلے تین دنوں سے

اس بستی میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ تنکو جمیل سے ہوتے ماناگ کی بارگونا بڑھ عبادت گاہ جانا چاہتی تھی جہاں سے وہ بس کے ذریعے کئی ماہ نامی قصبے کا رخ کرتی۔ وہاں بھی بڑھ کی دو تین قدیم عبادت گاہیں تھیں۔ چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد وہ ماناگ چلی جاتی جہاں دلچسپ رسمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے علاوہ ماناگ کے راجا اور مہارانی سے ملاقات کر کے اپنی کتاب کے لیے مواد جمع کرتی۔

مارٹھا کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ وہ ہندوستانی تھے۔ وہ دونوں مہم جو قسم کے آدمی تھے۔ طالع آزمائی ان کا پیشہ تھا۔ وہ ان علاقوں میں گھومتے رہتے تھے جہاں پہاڑوں میں ہفتی دھاتیں ملنے کی کچھ توقع ہوتی۔ ان کے خیال میں جمیل تنکو سے اور پورنا رنج میں سونے کے ذخائر موجود تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کا سراغ لگا کر انہیں دریافت کیا جاتا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے سکم میں بھی سنگ نام کے پہاڑوں میں سونے کے ذخائر دریافت کیے تھے لیکن سکم کے مہاراجا نے انہیں انعام سے نوازنے کے بجائے جیل میں ڈال دیا تھا لیکن تین مہینوں بعد وہ کسی طرح جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

رستو کی کے علاوہ ان تینوں سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھی جلد سے جلد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہتے تھے لیکن رستو کی بعد تھا کہ کم از کم دس آدمی ہوں تو وہ روانگی کے لیے تیار ہوگا۔

وہ لوگ دو چار روز مزید انتظار کر سکتے تھے لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ گوتم بھوش کو جاپ پر بیٹھے ہوئے بائیس روز ہو چکے تھے اور اسے مکمل ہونے میں صرف اٹھارہ روز رہ گئے تھے اور یہ جاپ مکمل ہونے سے روکنا ضروری تھا۔ ایک طرف پنڈت دھیراج اور اس کے بچہ (مؤکل، نصیبت، روح، بھوت وغیرہ) میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف قدرتی طور پر بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے جن سے میرا وقت ضائع ہو رہا تھا۔

اس رات میں نے مارٹھا سے بھی ملاقات کی اور جنسٹ اور پریم چند نامی ان دونوں اعلیٰ طالع آزمائوں سے بھی۔ جنسٹ چالیس کے لگ بھگ اور پریم چند پینتالیس کے قریب تھا۔ وہ دونوں دراز قامت اور کسرتی جسموں کے مالک تھے اور ان دونوں کے کروار کے بارے میں میرے ذہن نے کوئی اچھا تاثر قبول نہیں کیا تھا کیونکہ جب میں ان سے

ملاقات کے لیے سرائے میں ان کے کمرے میں پہنچا تو دھن بھی میرے ساتھ تھی۔ ان کے ساتھ اس وقت ایک مقامی قبائلی عورت بھی تھی جس کے بدن پر لباس برائے نام ہی تھا اور وہ دونوں شراب پیئے ہوئے اس کے ساتھ خش حرکات کر رہے تھے۔ دھن کو دیکھ کر ان کی سرخ آنکھوں کی سرفی کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔ میں نے رکی گفتگو میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد ہی اصل موضوع پر آیا۔

”میری اطلاع کے مطابق آپ لوگ تنکو جمیل کے اس پار پورنا رنج میں ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جس میں کئی ہفتے یا مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔“ میں باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”اور تقریباً ایک مہینے بعد سردیوں کے موسم کا آغاز ہونے والا ہے۔ تندر تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں جن سے برفانی طوفان کا خطرہ بھی رہتا ہے اس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس بستی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آگے جانے کی تیاری کی جائے؟“

”ہماری مہم سے تمہیں کیا دلچسپی ہے بھائی؟“ جنسٹ نے جواب تو مجھے دیا تھا لیکن اس کی نظریں دھن کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ہم بھی تنکو جمیل کی طرف جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا ”لیکن رستو کی کا کہنا ہے کہ جب تک قافلے میں دس افراد نہیں ہوں گے، وہ نہیں جائے گا۔ وہ تو لوگ ہوتے ہیں ہم اور ایک دہ امریکی عورت۔ اس طرح ہماری تعداد چھ ہو جاتی ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”مزید چار افراد کے انتظار میں کئی روز بھی لگ سکتے ہیں اور اگر موسم کے تیز بڑھنا شروع ہو گئے تو۔۔۔“

”صحیح تو ہمارا بھی ہوگا۔ پر کیا کیا جائے۔ وہ کم بخت رستو کی تیار ہی نہیں ہوتا۔“ پریم چند نے اپنے قریب کھٹا کر بیٹھی ہوئی عورت کی گمریں بازو حاصل کر کے اپنی طرف کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظریں بھی دھن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”اگر تم لوگ چاہو تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کیسے؟“ اس مرتبہ جنسٹ نے پوچھا۔ میں نے اس کے لیے سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ راجستانی ہے۔ ”اگر ہم لوگ مل کر مزید چار آدمیوں کا خرچہ میرا مطلب ہے فیس برداشت کر لیں تو رستو کی صبح ہی روانگی کے لیے تیار ہو جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ دونوں بات کرتے ہوئے بار بار دھنکی طرف دیکھ رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے میری تجویز مان لی لیکن وہ انکی میٹج جانے کو تیار نہیں تھے البتہ اس سے اگلے روز کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔

اس سرائے سے نکل کر ہم مار تھا کے پاس پہنچ گئے جو ایک مقامی قبیلے کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس نے بھی میری بات سے اتفاق کیا اور اپنے حصے کی رقم دینے پر تیار ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد میں دھنکو اور مار تھا رستوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری تجویز سن کر اس نے بھی فوراً ہی آمادگی ظاہر کر دی اور روانگی کی تیاری کے لیے کل کے دن کی مہلت مانگ لی۔

مجھے اطمینان ہو گیا۔ اگر جسونت اور مار تھا وغیرہ میری تجویز سے اتفاق نہ بھی کرتے تو میں اکیلا ہی رستوں کو چار آدمیوں کی فیس ادا کرنے کو تیار ہو جاتا۔

اس رات کئی روز بعد میں نے نیلگری کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بہت ہی دھندلا ہوا تھا۔

”وقت گزر رہا ہے۔“ اس کی کمزور سی آواز میری ساعت سے ٹکرانی ”جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ اس شیطاں کے قدم مضبوط ہو رہے تھے۔ میرے گرد بھی حصار مضبوط اور تنگ ہو رہا ہے۔ میری اپنی قوت سلب ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا جاپ مکمل کر لے اور میں تمہاری دسترس سے نکل جاؤں۔“

نیلگری زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ وہ مجھے صرف اتنا یاد دلانے آئی تھی کہ وقت ہاتھ سے ٹکھا جا رہا ہے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو اپنی ہی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا تھا تو اس نے مجھے اپنے آپ سے دور رکھنے کے لیے کچھ بندوبست بھی کیا تھا۔ اس کے پاس بھی بہت سی پراسرار قوتیں تھیں اور اس کے ہیرے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ میں ان رکاوٹوں کو توڑنا اور نقصان اٹھانا دستور آگے بڑھ رہا تھا۔

دوسرے دن ہم نے بھی کچھ مزید تیاری کر لی۔ تین عدد سلیڈنگ بیک کی خرید بھی اس تیاری میں شامل تھی۔ ایک کی کھال سے یہ سلیڈنگ بیک مقامی طور پر تیار کیے گئے تھے اور بڑی اچھی کو آتی تھی۔

یہ کوئی بڑی ہستی نہیں تھی جہاں یہ تفریح میں وقت

گزارا جاتا۔ زیادہ تر ہم سرائے میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہے تھے۔

شام کو رستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت مار تھا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ رستوں نے بھی اپنی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ یہ بھی ملے ہو گیا کہ ہم صبح سات بجے ہستی کے کھیا کے مکان سے ملتی ٹاؤن ہال کے سامنے پہنچ جائیں۔ یہ ٹاؤن ہال بھی دراصل کھیا کے مکان ہی کا ایک حصہ تھا جہاں وہ اپنے دو نائبین کے ساتھ اس ہستی کا نظام چلاتا تھا۔

ہم صبح سویرے ہی ٹاؤن ہال کے سامنے پہنچ گئے۔ اس وقت اچھی خاصی سردی تھی اس لیے ہم نے چوڑے کی نیپکس بھی پہن لی تھیں۔

مار تھا بھی تقریباً ہمارے ساتھ ہی وہاں پہنچی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک بیک تھا جسے اس نے اسٹریپ کی مدد سے پشت پر باندھ رکھا تھا۔

جسونت اور پریم چند ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ ان کو بلانے کے لیے ایک آدمی بھیجا گیا۔ ان دونوں کی وجہ سے ہم آدھے گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوئے۔ ہمارے اس قافلے میں رستوں کے علاوہ چھ افراد تھے جن کی سواری کے لیے چھوٹے گاڑے بنائے گئے تھے۔ سامان کے لیے تین بیک تھے۔ اس سامان میں راشن اور پانی کے خشکیوں کے علاوہ تین خیمے بھی تھے جو آسانی سے فوڈ ہو گئے تھے۔

اس قافلے میں سب سے آگے رستوں تھا۔ اس کے پیچھے ہم تینوں کے پیچھے تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ ایک بھی چل رہے تھے اور آخر میں دو چھوٹے چھوٹے اور پریم چند تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ وہ مسلسل سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

شروع کے ایک دو میل تک تو ہم ایک ہموار پتھر لے میدان میں سفر کرتے رہے اور پھر چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ راستہ سنگلاخ چٹانوں میں مل گیا تھا تو جا رہا تھا۔ ہم مسلسل ہلندی کی طرف سفر کر رہے تھے۔

رستوں نے بتایا تھا کہ نکلو جمیل تک دو دن کا راستہ ہے۔ کوئی ناگمانی حادثہ پیش آنے کی صورت میں سفر کی مدت میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

صبح جب ہم نٹ بیک سے روانہ ہوئے تھے تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن گیارہ بجے کے قریب بادل چھٹ گئے، آسمان صاف ہو گیا اور دھوپ چھٹنے لگی۔ ہمارے عین سامنے اتنا پورنا کی ہزاروں فٹ بلند برف پوش چوٹیاں تھیں۔ دھوپ میں برف آئینے کی طرح چمک رہی تھی

جس سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

دوسرے بجے کے قریب ایک جگہ پر ڈاؤ ڈال دیا گیا۔ اس جگہ چند درختوں کا ذخیرہ بھی تھا اور پانی کا چشمہ بھی۔ اس وقت تک ہم نے صرف گیارہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ ایک اور چٹانوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ وہ کھاس چرتے رہے اور ہم بھی کھانا کھانے لگے۔ مار تھا ہمارے ساتھ تھی جبکہ جسونت اور پریم چند الگ تھک بیٹھے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

مار تھا بڑی ہنس کھ اور خوش مزاج عورت ثابت ہوئی تھی۔ سفر کے دوران میں وہ ہمیں اپنی سیاحت کے قصے سناتی رہی۔

مار تھا کی عمر چالیس اور چیتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ لمبا قد، سڈول جسم، بھوری رنگت کے بال، ہلکی نیلی آنکھیں اور چہرے کے نقوش بھی بڑے دل فریب تھے۔

مار تھا میں اس وقت بھی جوان لڑکیوں جیسی کوشش تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ آگے ہم مسلسل نشیب کی طرف سفر کرتے رہے لیکن دو گھنٹوں بعد پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ راستہ بھی خاصا خطرناک تھا۔ ایک موقع پر تو جسونت اور پریم چند نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اس جگہ تقریباً پچاس گز تک راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف عمودی چٹائیں تھیں اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈے آٹھ دس فٹ چوڑے اس راستے پر چلنا صراطِ مستقیم پر چلنے کے مترادف تھا۔ جسونت اور پریم چند کا اصرار تھا کہ کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے لیکن رستوں کے کہنے کے مطابق میلوں دور تک کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

اس خوفناک راستے پر چلتے ہوئے ہمیں بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ہم سلاستی کی دعائیں مانگتے ہوئے چٹانوں کے ساتھ ساتھ پیڈل چلے رہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے فخر کی رتی پکڑ رکھی تھی۔

کسی حادثے کے بغیر ہم نے یہ صراطِ مستقیم پار کر لیا۔ اس کے بعد ہم مزید دو گھنٹوں تک اپنا سفر جاری رکھ سکے تھے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا اور شام کا دھندلا چھلنے لگا تھا۔

اس مرتبہ جس جگہ ڈاؤ ڈالا گیا اس جگہ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں پہلے بھی کیمپ کئے رہے ہیں۔ ایک چٹان کے پاس دو جگہوں پر پتھر رکھ کر چوڑے بنائے گئے تھے۔ کوئلے اور جلی ہوئی لکڑیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ ان چوٹوں سے ذرا بہت کر سکتی ہوئی لکڑیوں کا ایک ڈھیر بھی لگا

ہوا تھا۔

چاروں طرف بلند چٹانوں کے درمیان یہ جھوٹا سا میدان ڈاؤ کے لیے بڑی اچھی جگہ تھی۔ یہاں ایک چشمہ بھی تھا۔ رستوں ایک ایک سے سامان اتارتے ہوئے بتا رہا تھا کہ وہ نکلو جمیل کی طرف جانے کے لیے ہمیشہ یہی راستہ اختیار کرتا ہے اور رات گزارنے کے لیے اس جگہ ڈاؤ ڈالا جاتا ہے۔ آخری مرتبہ وہ تین مہینے پہلے اس طرف آیا تھا۔ خیمے لگانے میں، میں بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ ہمارے اور مار تھا کے خیمے ایک چٹان کی آڑ میں قریب قریب لگائے گئے تھے جبکہ رستوں اور جسونت وغیرہ کے خیمے وہاں سے کافی ہٹ کر لگائے گئے تھے۔

چاروں طرف بلند چٹانوں کی وجہ سے اگرچہ تیز ہوا رکی ہوئی تھی لیکن جیسے جیسے شام ڈھل رہی تھی سردی کی شدت میں اضافہ ہونا جا رہا تھا۔

سامان اتارنے کے بعد ایک اور ٹکڑے چھوڑ دیے گئے۔ رستوں پتھروں سے بنے ہوئے چولے کے پاس لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ میں نے جسونت سے مانچس لے کر چولے میں لکڑیاں جلادیں اور دوسرے کاموں میں رستوں کی مدد کرنے لگا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ تین چار مشعلیں جلا کر چٹانوں کی آڑ میں زمین میں گاڑ دی گئی تھیں۔ ان کی لرزتی ہوئی روشنی میں حرکت کرتے ہوئے ہمارے سائے بڑا پراسرار تاثر دے رہے تھے۔

رستوں کھانا تیار کر چکا تھا۔ ایلے ہوئے چاول تھے اور ایک کا خشک گوشت بنے توے پر تل لیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران میں جسونت اور پریم چند بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ کھانے کے دوران میں، میں وہ بار بار دھنکو اور مار تھا کی طرف دیکھتے رہے تھے۔

کھانے کے بعد رستوں نے برتن وغیرہ دھو کر سمیٹ لیے اور چولے پر لکڑیوں کا انار ڈال دیا۔ الاؤ روشن ہو گیا۔ ہم الاؤ کے گرد بیٹھ کر پیس پائینے لگے۔ مار تھا اس وقت بھی اپنی سیاحت کے قصے سنارہی تھی۔

رستوں ہم سے کچھ دور ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں ایک گیت اپنا شروع کر دیا۔ گیت کا مفہوم تو ہماری سمجھ میں نہیں آ سکا لیکن اس کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ چٹانوں میں بازو گشت سی پیدا کرتی ہوئی اس کی پر سوز آواز بھی بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھی۔

رات گیارہ بجے کے قریب مار تھا اٹھ کر اپنے خیمے میں



چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد دھنوبھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ دن بھر کے سفر کے دوران میں ان دونوں میں گہری دوستی ہو گئی تھی۔ مارتھا، دھنوبھی کے فیصلے کے رسم و رواج کے بارے میں پوچھتی رہی تھی۔

الاؤ کے شعلے ختم ہو گئے تھے۔ اب صرف کوئلے دھک رہے تھے۔ جسوت اور پریم چند بھی اپنے خیمے میں چلے گئے، میں اور شوہا کچھ دیر اور وہاں بیٹھے رہے پھر اپنے خیمے کی طرف آگئے۔ اپنے خیمے میں آنے سے پہلے میں نے مارتھا والے خیمے میں جھانک کر دیکھا۔ مارتھا مشعل کی روشنی میں ڈائری لکھ رہی تھی اور دھنوبھی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اپنے خیمے میں گیا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ شوہا اپنے سیلینگ بیگ میں گھس گئی تھی۔ میں بھی اپنے بیگ میں گھس کر اس کے قریب لیٹ گیا۔ یہ سیلینگ بیگ واقعی بڑے کام کی چیز ثابت ہوا تھا اور میں یہ بات بھی ضرور کہوں گا کہ ایسے شدید موسم میں سیلینگ بیگ میں سونے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ پتھروں پر دن بھر کے سفر سے ہم سب بری طرح تھک گئے تھے۔ شوہا تو لیتے ہی سو گئی تھی۔ میری بھی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اور پھر چرخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ نوانی چرخ سنائے میں باز گشت سی پیدا کرتی ہوئی معدوم ہو گئی۔ پہلے میں اسے اپنا واہمہ ہی سمجھا لیکن وہ چرخ دوبارہ سنائی دی تو میں بڑی تیزی سے سیلینگ بیگ کی زپ کھول کر اٹھ گیا۔ شوہا اب بھی گہری نیند میں تھی۔ میں خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل رہا تھا تو وہ چرخ تیسری مرتبہ سنائی دی۔

میں خیمے سے نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وائیں طرف چٹان کے قریب کچھ ہیولے ایک دوسرے سے جھمکتے نظر آ رہے تھے۔ مارتھا والے خیمے کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اندر مشعل جل رہی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

میں نے ان ہیولوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ جسونت اور پریم چند تھے جو دھنوبھی اور مارتھا کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ جسونت شاید دھنوبھی کو گھینٹا ہوا چٹان کی دوسری طرف لے گیا تھا۔ میں مارتھا کو چھڑانے کے لیے پریم چند کی طرف لپکا تو نفا اچانک ہی فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی پریم چند کی چیخ بھئی ہوئی آواز سنائی دی۔

”رک جاؤ۔ آگے بڑھے تو گولی مار دوں گا۔“

میں چلا گیا تھا۔ مارتھا مسلسل چیخ رہی تھی اور چٹان کی دوسری طرف سے دھنوبھی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

اسی دوران میں رستو کی بھی اپنے خیمے سے باہر گیا۔ ”کیا ہوا۔ یہ کون چیخ رہا تھا؟“ اس نے پوچھا۔ وہ پریم چند وغیرہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”وہ دونوں بد معاش مارتھا اور دھنوبھی لے گئے ہیں۔ اس چٹان کے پیچھے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”تم اس طرف سے آگے بڑھو۔ میں اس طرف سے جاتا ہوں۔“ رستو کی نے کہا اور چٹان کے ساتھ ایک طرف دوڑ گیا۔

میں بھی چٹان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ آڑے جھانک کر دیکھا تو وہ دونوں شیطان دھنوبھی اور مارتھا کو کھینچتے ہوئے آگے والی چٹانوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا، پریم چند نے فائر کر دیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے ایک پتھر کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور پتلون کا نیچا اٹھا کر خنجر نکال لیا۔

”اگر تم نے آگے آنے کی کوشش کی تو ان دونوں عورتوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گی۔“ پریم چند نے چیخ کر کہا ”تم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ کوئی آگے آنے کی کوشش نہ کرے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ان دونوں عورتوں کو چھوڑ دیں گے۔“

میں پتھر کی آڑ میں دیکھتا رہا۔ جسونت کافی آگے تھا۔ پریم چند نے ایک ہاتھ دھنوبھی کے گلے میں لپیٹ رکھا تھا اور وہ اسے تقریباً گھینٹا ہوا اٹھانے لگے۔ دونوں پیچھے ہٹا جا رہا تھا۔

چٹان کی دوسری طرف ایک ہیولا سا نمودار ہوا۔ وہ رستو کی تھا جو دوسری طرف سے انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں جسونت کی طرف بڑھ رہا تھا جو مارتھا کو گرفت میں لیے پچھلی چٹان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

رستو کی کا پیر کسی چھوٹے پتھر سے لکرایا۔ جسونت نے تیزی سے مرکز فائر کر دیا۔ رستو کی کے منہ سے خونخاک چیخ نکلی۔ وہ نیچے جھٹکا چلا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے حیرت انگیز طور پر وہ وہاں اڑتا ہوا جسونت اور مارتھا پر گر گیا۔

مارتھا بھی ان کے ساتھ نیچے گر گئی تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی گئی تھی۔ رستو کی اور جسونت جھمکتے ہوئے پریم چند ایک لمحے کو اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔ پریم چند نے بدحواس ہو کر فائر کر دیا لیکن بدحواسی میں

چلائی ہوئی گولی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا پریم چند سے لکرایا۔ وہ دھنوبھی کو ساتھ لیتا ہوا پشت کے بل گرا۔ دھنوبھی کراس کی گرفت سے نکل گئی۔ پریم چند نے لوٹ کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھ سے بچ نہیں سکا۔ سب سے پہلے میں نے اس کے دائیں کندھے کے جوڑ پر کھڑی بھٹی کا چوہ مارا۔ وہ چیخ اٹھا اور پتھروں بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر میں نے اس پر دو تین اور وار کیے جو خاصے کاری ثابت ہوئے لیکن ایک موقع پر اس کا داؤ چل گیا اور اس نے مجھے اچھال کر دوڑ پھینک دیا۔

میں پشت کے بل گرا۔ میرا سر ایک پتھر سے لکرایا تھا۔ میرا داغ بھجھتا اٹھا لیکن بالآخر اس کی گردن میری گرفت میں آئی۔ میں نے سارا داؤ اس کی گردن پر ڈال دیا۔

پریم چند اپنی گردن چھڑانے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا لیکن یہ میرا داؤ تھا جس کے بارے میں میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کوئی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

میں پریم چند کی گردن کو پے در پے جھٹکے دے رہا تھا لیکن سواری طرح اڑتی ہوئی اس کی گردن میں معمولی سی لچک بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ بھی آخر انسان ہی تھا اور گردن بھی لوہے کی تو نہیں تھی۔

”کڑک“ کی ہلکی سی آواز ابھری۔ پریم چند بری طرح چلا۔ اس کے حلق سے عجیب سی خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا اور پھر پے در پے جھٹکے دیتا چلا گیا۔ سواری طرح اڑتی ہوئی گردن میں اب ریر جیسی لچک پیدا ہو گئی تھی۔ چند مزید جھٹکے دینے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پتھروں پر پانی سے نکالی ہوئی پچھلی کی طرح ترنچنے لگا۔

اور پھر اسی وقت پے در پے فائرنگ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ تین گولیاں چلی تھیں اور اس کے ساتھ ہی پتھروں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

میں نے اس طرف دیکھا۔ جسونت دوڑتا ہوا چٹانوں میں غائب ہو گیا تھا اور رستو کی بھی اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی اسی طرف دوڑ لگا دی۔

”دوسرے حرامی کا کیا ہوا؟“

”ختم ہو گیا۔ اس کی لاش وہاں پڑی ہے۔“ میں نے اس طرف اشارہ کیا۔

مارتھا اور دھنوبھی دوڑ کر ہمارے قریب آئی تھیں۔ دھنوبھی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے مارتھا کو ہاتھ سے اپنی طرف کھینچ کر اس کا کندھا ہتھپتیا۔ وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ ”وہ۔ وہ زخمی ہے۔ اسے گولی لگی ہے۔“ مارتھا نے رستو کی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لمبے میں تھر تھراہٹ نمایاں تھی۔

میں فوراً ہی رستو کی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے پائیں بازو میں گولی لگی تھی جو گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ یہ گولی رستو کی کو اس وقت لگی تھی جب اس نے چٹان کی آڑ سے نکل کر جسونت پر چھلانگ لگائی تھی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمپ کی طرف آگئے۔ شوہا اپنے خیمے کے سامنے بدحواس کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکی۔ اس کی آنکھ ”آخری تین گولیوں کی آواز سن کر کھلی تھی۔ اسے جب صورت حال کا پتا چلا تو وہ کچھ اور بدحواس ہو گئی۔

رستو کی کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اسے مارتھا والے خیمے میں لے آئے۔ رستو کی کے سامان میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ میں دوڑ کر وہ کٹ نکال لایا۔ مارتھا فرسٹ ایڈ کی تربیت یافتہ تھا۔ اس نے زخم صاف کر کے بڑی مہارت سے ڈریسنگ کر دی۔ رستو کی اگرچہ بڑی بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس جھنڈے موسم میں کچھ دیر بعد ہی زخم اسے بے حال کر دے گا۔

میں نے اسے ہسٹری لٹا کر اس پر تین چار کسل ڈال دیے۔ مارتھا کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ بار بار ہمارا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ دھنوبھی اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ وہ شوہا کے کندھے سے سر نکالے بیٹھی تھی۔ اس وقت ہم لوگ ان دونوں بد معاشوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

”یہ ہندوستانی لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں۔“ مارتھا کہہ رہی تھی ”راجستھان میں بھی دو مرتبہ بد معاشوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں مرتبہ تم نہایت شریف لوگوں نے مجھے بچایا تھا۔“

رستو کی نے بتایا کہ تقریباً ایک سال پہلے بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ بھی دو ہندوستانی ہی تھے جو قافلے میں شامل ایک فرانسیسی لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ان

کا اگرچہ پیچھا کیا گیا تھا لیکن وہ دونوں مسلح تھے اور لڑکی کو مگن پوائنٹ پر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دوسرے دن اس لڑکی کی لاش پہاڑوں میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اس پر باربار مجربانہ حملے کیے گئے تھے اور بالآخر اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں بد معاش پہاڑوں میں کہیں غائب ہو گئے تھے اور بعد میں بھی ان کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

”جسوت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ واپس آئے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ رستوگی بولا ”اب وہ ہمارے قریب آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ہو سکتا ہے، ہم سے دور رہ کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہو یا ممکن ہے“ اکیلا ہی کسی طرف جانے کی کوشش کرے لیکن وہ ان اونچے پہاڑوں میں گھوم کر جانے لگا۔ کوئی اجنبی ان پہاڑوں میں اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسے اب موت کی آغوش میں ہی پناہ ملے گی۔“

”اور اس کے ساتھ ہی پریم چند کی لاش کا کیا کیا جائے۔“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”پڑی رہے ہو۔“ رستوگی نے سپاٹ لیجے میں جواب دیا ”اس کے جرم کی سنگینی کے پیش نظر اس کی لاش بھی ہماری کسی ہمدردی کی مستحق نہیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اب قابل علاقوں میں مرد اور عورت کے تعلقات کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ باہر سے آنے والے مرد بھی یہاں کی عورتوں سے ایسے تعلقات استوار کرتے ہیں تو اس پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن ایسے تعلقات میں عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ عورت کی رضامندی کے بغیر اگر شوہر بھی ایسی کوئی کوشش کرتا ہے تو اسے بہت کڑی سزا دی جاتی ہے۔ ان دونوں نے بھی مارا تھا اور دھوکا مرضی کے خلاف ان کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ ایک اپنے انجام کو پہنچ گیا اور دوسرا بھاگ گیا لیکن میں جانتا ہوں، وہ ان پہاڑوں کی قید سے فرار نہیں ہو سکے گا۔ اسے بھی اپنے جرم کی سزا ضرور ملے گی۔“

اس بھگوانے کے واپس آنے کا اگرچہ کوئی امکان نہیں تھا لیکن ہم بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ یہ ہوا کہ رستوگی اس خیمے میں سو جائے مارا تھا ہمارے خیمے میں دھنوا اور شوہا کے ساتھ سو جائے گی اور میں خیمے کے باہر بیٹھ کر براہوں گا۔

دھنو تو مارا تھا کے ساتھ خیمے میں چلی گئی اور شوہا تین چار کھل اٹھا کر میرے پاس آگئی۔ وہ اپنی نیند بڑی حد تک

پوری کر چکی تھی اور میرے ساتھ پرے داری کی ڈیوٹی دینا چاہتی تھی اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

سردی بہت شدید تھی۔ ہم نہ صرف اپنے اپنے سیلنگ بیگز میں گھسے ہوئے تھے بلکہ اوپر دو دو کھل بھی اودھ رکھے تھے اس کے باوجود سردی ہماری ہڈیوں میں اتاری جا رہی تھی۔ میں نے شوہا کو زبردستی خیمے کے اندر بھیج دیا۔ اس نے جاتے ہوئے ایک اور کھل میرے اوپر ڈال دیا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ چٹانوں کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ صاف لگ رہا تھا جیسے کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رستوگی نے جسوت سے پچھنا ہوا پتھول مجھے دے دیا تھا۔ میں نے پتھول والا ہاتھ سیلنگ بیگ سے باہر نکال لیا اور آنکھیں میاں بھاڑ کر تاریکی میں گھومنے لگا۔ وقفے وقفے سے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر دبے قدموں چلنے کی آوازیں تو سنائی دیتی رہیں لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا کسی کے سامنے آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔

اور پھر ہلکی ہلکی غراہوں کی آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ وہ آوازیں ایسی تھیں جیسے دو کتے ایک دوسرے پر غرا رہے ہوں۔ غراہوں کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہیں۔ غراہوں کے ساتھ ”چڑچڑ“ کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھیڑیے تھے جو شکار کی بوسگھ کر اس طرف آگئے تھے اور دعوت اڑا رہے تھے۔

ایک بار تو دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر اس طرف جاؤں لیکن پھر میں نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا اور اپنی جگہ پر دنگ بیٹھا رہا۔

میں اگرچہ اپنی ریاضت کے سلسلے میں راتوں کو بھی جاگنے کا عادی تھا لیکن دن کی روشنی نمودار ہونے سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے شوہا نے جگانا تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ ”اس طرف سے کچھ آوازیں آرہی ہیں۔“ شوہا نے میرے قریب بیٹھے ہوئے چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔ شاید بھیڑیے ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اچھل پڑا۔ کتوں کے غرائے اور ”چڑچڑ“ کی آوازیں میں نے پہلے بھی سنی تھیں لیکن اس وقت میرے دماغ پر غنڈ کی سی طاری تھی۔ مجھے یہ خیال تو آیا تھا کہ وہ کسی شکار پر دعوت اڑا رہے ہوں گے لیکن اس شکار کے بارے

میں نے نہیں سوچا تھا۔

میں نے اپنے اوپر سے کھل ہٹا دیے اور سیلنگ بیگ میں سے نکل آیا اور شوہا کو وہیں رکھنے کا اشارہ کر کے بان کی طرف دوڑ پڑا۔ جسوت والا پتھول میرے ہاتھ میں نہ چٹان کی دوسری طرف پہنچ کر میں اس طرح رک گیا کہ زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

اتھ دس بھیڑیے پریم چند کی لاش کو فوج رہے تھے۔ انہوں پر ہر طرف خون ٹپکا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ایک دو بھیڑیے خون خوار انداز میں غرائے لگے۔ میں نے ان پر گولی چلا دی۔ بھیڑیے چٹانوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے لیکن کچھ دور جا کر رک گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔

میں چند گز آگے بڑھا تو پریم چند کی لاش دیکھ کر بیٹ پڑ کر ہڑا ہو گیا۔ میں بڑی مشکل سے قے ضبط کر سکا تھا۔ پریم چند کی لاش بری طرح پھی ہوئی تھی۔ چوہ بھی مسخ ہو چکا تھا۔ بیٹ چاک تھا اور آنتیں بھی نکھری ہوئی تھیں۔

میں نے لاش سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا پریم چند کا پتھول اور اپنا خنجر اٹھایا اور ایک ہاتھ سے بیٹ دبائے دوڑنا ہوا واپس آگیا۔ چٹان کے قریب آکر مڑ کر دیکھا تو وہ بھیڑیے دوبارہ لاش پر حملہ آور ہو چکے تھے۔

میں نیپ کی طرف آیا تو مارا تھا اور رستوگی وغیرہ خیموں کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ فائر کی آوازیں کر جاگ گئے تھے۔ ”ہاں ہوا۔ گولی کس نے چلائی تھی؟“ رستوگی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”اس طرف کچھ بھیڑیے جمع ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور خیمے کے سامنے دنگ ہوا متحیزہ پڑ کر منہ سے لگایا۔ فٹپے پانی کے چند گھونٹ پینے سے میری حالت کسی حد تک سنبھل گئی۔ میں متحیزہ واپس کے ساتھ ٹانگ کر خیمے کے اندر آگیا۔ وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی چلے آئے تھے۔ مجھے اچانک ہی سردی چڑھنے لگی۔ میں دو تین کھل اودھ کر بستر پر لیٹ گیا۔

”کیا ہوا بہت سنگھ۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ شوہا بھی میوے قریب بیٹھ گئی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بس سردی چڑھ گئی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ اس وقت واقعی مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ ایک دم سے ایسی سردی کیوں چڑھ گئی تھی کہ میں تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ شوہا نے ایک اور کھل میرے اوپر ڈال دیا اور پھر وہ جسوت چھ کتے ہوئے باہر چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد شوہا سب کے لیے چائے بنا کر لے

آئی۔ اس وقت تک میں بھی اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال چکا تھا۔ گرم گرم چائے سے مجھے بڑا سکون ملا تھا۔ اس روز ہم دس بجے سے پہلے روانہ نہیں ہو سکے تھے۔ اس وقت تک میں نے کسی کو بھی اس چٹان کی طرف نہیں جانے دیا تھا۔ میں اس لاش کے بارے میں جب بھی سوچتا، مجھے اکیلا ہی آنے لگتی۔

آگے کا راستہ اور بھی خراب اور خطرناک تھا۔ ہماری رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس وقت ہم تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع گنگا پور نا کے درے میں سفر کر رہے تھے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی جو ہمیں مسلسل پیچھے دھکیل رہی تھی۔ درے سے نکل کر چار بجے کے قریب ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں چٹانوں میں کئی چھوٹے چھوٹے غار تھے۔ رستوگی نے بتایا کہ اس طرف سفر کے دوران میں وہ عام طور پر دوپہر بارہ بجے کے قریب یہاں پہنچ جایا کرتے تھے لیکن آج تینویز مخالف ہوا کی وجہ سے چار گھنٹوں کی تاخیر سے پہنچے تھے۔

یہاں گھاس اور جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پتھوں اور گھٹیاں شاخوں والے درخت بھی تھے۔ ٹھنڈوں وغیرہ کو درختوں کی شاخوں سے باندھ دیا گیا اور ہم لوگ ایک کشادہ غار میں آگئے۔

رستوگی کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہو جائیں گے لیکن غار میں آکر ڈھیر ہو جانے کے بعد کسی میں سفر جاری رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی لہذا رات اسی غار میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

سردی کی وجہ سے رستوگی کا زخم تکلیف دینے لگا تھا لیکن وہ بڑی برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد شوہا، دھنو اور مارا تھے اٹھنا وغیرہ تیار کرنے کی دے داری سنبھال لی۔ غار میں ایک طرف خشک کڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کونے اور بجھی ہوئی کڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ رستوگی نے بتایا کہ اس طرف سے گزرتے ہوئے وہ ہر پڑاؤ پر کڑیاں جمع کر کے ڈال دیتا ہے تاکہ آئندہ کام آسکیں۔

آگ روشن ہو جانے کے بعد غار کے اندر کا درجہ حرارت بھی تبدیل ہونے لگا۔

کھانا ہم نے شام ہونے سے پہلے ہی کھالیا اور پھر کھلوں میں دیکر باتوں میں وقت گزارنے لگے۔ اس دیرانے میں ظاہر سے چوری وغیرہ کا خطرہ نہیں تھا لیکن اس بھگوانے جسوت کی وجہ سے ہم کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جسوت خالی ہاتھ فرار ہوا تھا۔ ان کا سامان بھی ہمارے

ہی قبضے میں تھا۔ میں جسوت کے بارے میں سوچتا تو کانپ کر رہ جاتا۔ اس کے پاس وہی کپڑے تھے جو اس نے پہن رکھے تھے۔ شدت کی سردی میں گرم کپڑوں، جیکٹ اور کمبلوں کے بغیر رات گزارنے کا تصور ہی خوفناک تھا۔ ہو سکتا ہے وہ گزشتہ رات ہی سردی سے ہتھکڑ کر گیا ہو اور اس کی لاش بھی جھیلے چٹ کر گئے ہوں۔

یا ممکن ہے اتنا سخت جان ہو کہ شدت کی یہ سردی برداشت کر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے ہمارے بعد وہ کیمپ والی جگہ پر واپس آیا ہو اور ہمارے نقش قدم پر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔

انسان ہونے کے ناتمے مجھے جسوت سے ہمدردی تھی۔ اس نے جو حرکت کی تھی وہ بہت بری تھی۔ اگر وہ سامنے آ جاتا تو ممکن ہے میں اسے معاف کر دیتا لیکن کیا ہمارا اسے معاف کر دے کی جس کے اعتماد کو اس نے ہمیں پہچانی تھی اور جس کی عزت نفس کو مجروح کیا تھا؟ کیا رستو کی اسے معاف کر دے گا جس کی اس نے جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کا ضمیر تو ابھی تازہ ہی تھا۔

رات بیتی رہی۔ میں کبھی اوگھنے لگتا اور کبھی چوکس ہو کر بیٹھ جاتا۔ جب بھی میری آنکھ کھلی تھی میں نے رستو کی کو جاگتے ہوئے پایا تھا۔ وہ ایک شریف النفس اور ذمے دار شخص ثابت ہوا تھا۔ کل والے واقعے کے بعد وہ باتوں ہی باتوں میں کئی بار کہہ چکا تھا کہ اسے جسوت اور پریم چند جیسے بد معاشوں کو قافلے میں شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس سڑک کے دوران میں میں گوتم بھٹو کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیر اگرچہ راستے میں آتے رہے تھے لیکن اس حوالے سے میں بھی اپنے پیروں پر مضبوط تھا اس لیے کسی کو قریب آنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ مار تھا وغیرہ بھی سکون سے گہری نیند سوئی رہی تھیں۔ صبح ناشتے کے بعد مار تھانے سب سے پہلے رستو کی کاظم چیک کیا۔ ڈرائنگ تبدیل کی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب صرف باچے چھ گھنٹوں کا سفر رہ گیا تھا۔

پہلے چار گھنٹے تو سفر میں بہت دشواری پیش آئی لیکن پھر مشکلیں پیش آنے لگیں۔ ایک موقع پر ہمارا ایک یاک کھڈ میں لڑھک گیا۔ وہ راستہ بہت تنگ سا اور بھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ اچانک ہی خرگوش کی طرح کا کوئی چھوٹا جانور بھاڑیوں سے نکل کر بھاگا تو ایک یاک اور دو خیرمیدک گئے۔ خیرمیدک سنبھل گئے لیکن یاک کھڈ کے بالکل کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیروں کے نیچے سے پھر نکل گیا اور وہ عمدی

ڈھلان پر لڑھکتا ہوا سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ کی تہ میں پڑ گیا۔ اس یاک پر دو خیرمیدک اور ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں لڑی ہوئی تھیں۔ یاک سمیت سب کچھ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہاں کھڑے رہ کر ماتم کرنا بے کار تھا۔ لیے ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔

ہم صبح دس بجے روانہ ہوئے تھے۔ دو بجے کے قریب ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ آگے تقریباً دو گھنٹوں کا سفر رہ گیا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ رے بغیر سفر جاری رکھا جائے لیکن دھو اور مار تھا وغیرہ خچروں کی پشت پر مسلسل چار گھنٹوں کے سفر سے بری طرح تھک گئی تھیں اور کچھ دیر آرام کر لینا چاہتی تھیں۔

اس پڑاؤ کے دوران میں ہم نے کھانا بھی کھایا اور آرام بھی کر لیا۔ چار بجے ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد چٹانوں میں تنگ اور پر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے ہم جیسے ہی کھلی جگہ پر نکلے سامنے کا منظر دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

غیب میں ملیں دور تک سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وادی کی دوسری طرف بہت دور نیلگلی کی ٹلک بوس چوٹیوں پر جمی ہوئی برف دھوپ کی الوداعی کرنوں میں بیٹھی طرح چمک رہی تھی۔

وادی میں دائیں طرف بہت بڑی جھیل تھی۔ اس کا نیلگو پانی بھی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ جھیل کے کنارے پر وہ بستی تھی جو ہماری منزل تھی۔

جھیل اور بستی ہم سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ راستہ تقریباً ہموار اور بالکل ڈھلان تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے رستو کی نے ایک سفید کپڑا نکال کر ڈنڈے پر باندھ لیا اور اسے پرچم کی طرح لہرائے لگا۔

”یہ سفید جھنڈا لہرائے کا کیا مطلب؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے رستو کی کی طرف دیکھا ”کیا اس بستی میں ہمارے لیے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے؟“

”یہ تنکو قبیلہ ہے۔“ رستو کی نے جواب دیا ”یہ خطہ اور جھیل انہی کے نام سے موسوم ہے۔ یوں تو یہ بہت امن پسند اور صلح جو قسم کے لوگ ہیں لیکن ماضی میں ہمارے آنے والے لوگوں کی وجہ سے کچھ خج ترات کا شکار بھی ہوئے رہے ہیں۔ جس وجہ سے یہ لوگ بہت محتاط ہو گئے ہیں اور

باہر سے آنے والے ہر شخص کو حملہ آور سمجھتے ہیں۔“ ”ان کے اپنے رسم و رواج ہیں۔ یہ دنیا کے کسی اور قانون کو تسلیم نہیں کرتے۔ سردار کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے لیے قانون اور حکم کا درجہ رکھتا ہے اور دلچسپی کی بات

ہے کہ اس قبیلے کی سردار ہمیشہ ایک عورت ہی ہوتی ہے۔ ہر دو سال بعد ایک دلچسپ مقابلے کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ سرداری کے لیے مقابلے میں حصہ لینے والی عورت کاغیر شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔ کوئی شادی شدہ عورت سردار نہیں ہو سکتی لیکن اسے یہ حق حاصل ہے کہ قبیلے کے کسی بھی مرد کو اپنی خلوت گاہ میں طلب کر سکتی ہے۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس قبیلے کے بارے میں مزید معلومات سے آگاہ کرنا رہا اور پھر ہمارا یہ مختصر سا قافلہ رکت میں آ گیا۔

سب سے آگے رستو کی تھا جس نے سفید جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے مار تھا، دھو اور شربھا کے بچے تھے۔ ان کے ساتھ دو دونوں یاک بھی چل رہے تھے۔ سب سے آخر میں ہم تھا۔ ہمارا انداز بالکل ایسا تھا جیسے ٹکٹ خوردہ فوج کا کوئی دستہ فاتح کے سامنے ہتھیار ڈالنے جا رہا ہو۔

تنکو قبیلے کی معیشت کا دار و مدار کھیتی باڑی پر تھا۔ ڈھلان پر دور تک میڑھیوں کی شکل میں کھیت تھے جن میں دھان کی فصلیں لہلا رہی تھیں۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی اور پانی کی بھی کمی نہیں تھی۔ یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں حاصل کی جاتی تھیں اور درمیانی وقتے میں سبزیوں وغیرہ کاٹی جاتی تھیں۔

بہت سی بہت بڑی تھی جو جھیل کے کنارے پر دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہم جیسے جیسے قریب پہنچ رہے تھے، بستی کے مکان واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مکان نہیں جھوپڑے تھے، بعض جھوپڑے گول تھے اور بعض چوکور۔

ہم ابھی بستی سے تقریباً دو سو گز دور تھے کہ باچے چھ آدمی اچانک ہی درختوں سے نمودار ہوئے۔ ان کے لباس بڑے عجیب تھے۔ پینڈوں تک کسی جانور کی کھال سے بنے ہوئے اسکرٹ اور بغیر آستین کی جکٹیں جن کے آگے ہٹن وغیرہ نہیں تھے۔ ہٹنوں کا کام چمڑے کے قیتوں سے لیا گیا تھا۔

وہ تمام آدمی درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جیسوں کے مالک تھے اور ان سب کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے۔ رستو کی ان کے لیے ابجی نہیں تھا۔ ان سب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور وہ ہمارے دونوں طرف اس طرح چلنے لگے جیسے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہوا انہیں ہماری طرف سے حملہ کا خدشہ ہو۔

بستی میں داخل ہوتے ہی کچھ اور لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ اس طرح ہمیں جلوس کی شکل میں جھیل کے تین سامنے ایک بڑے جھوپڑے میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ بچے اور تین چار عورتیں بھی

ہمارے ساتھ جھوپڑے کے اندر آ گئی تھیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ تنکو قبیلے کی عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ قد آور، صحت مند اور حسین تھیں۔ مردوں اور عورتوں کے لباس میں بھی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ان کے اسکرٹ گھٹنوں تک یا اس سے اوپر تھے اور جسم کے بالائی حصے پر جانور کی کھال ہی کا پلاشت بھر چڑا نکڑا تھا جسے سامنے سینے پر لپیٹ کر فیٹوں کی مدد سے پشت پر گرہ لگا کر باندھ دیا گیا تھا۔ ان کی سرخ و سفید رنگت ایسی تھی جیسے خون چھلک رہا ہو۔

یہ علاقہ سطح سمندر سے تقریباً چوبیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ اچھی خاصہ سردی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ اتنی سردی میں یہ لوگ اس مختصر لباس میں کیسے زندہ تھے۔ رستو کی ہمیں اس جھوپڑے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ ایک آدمی نے آکر مشعل جلا دی اور عورتوں اور بچوں سے کچھ کتا ہوا واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ عورتیں اور بچے بھی باہر چلے گئے۔

میں بھی جھوپڑے سے باہر آ گیا۔ ایک آدمی یا کوس پر سے ہمارا سامان اتار رہا تھا۔ خیر وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ مار تھا وغیرہ بھی جھوپڑے سے باہر آ گئی تھیں۔ ہم چند قدم آگے بڑھ کر جھیل کے کنارے چٹانوں پر بیٹھ گئے۔ بہت دور دو کشتیاں جھیل کی پرسکون سطح پر تھیں جو کئی کنارے کی طرف آ رہی تھیں۔ جھیل کا دوسرا کنارہ پہاڑوں سے ملا ہوا تھا اور وہ پہاڑی سلسلہ بتدریج بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ انہی پہاڑوں سے بننے والے پانی سے یہ جھیل مرض وجود میں آئی تھی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارے آس پاس کھڑی ہوئی عورتیں اور بچے جا چکے تھے اور ہم وہاں اکیلے رہ گئے تھے۔ ہماری جو کیفیت تھی وہ تو بھی ہی لیکن مار تھا کے چہرے پر سسٹنی کے عجب سے تاثرات تھے۔ وہ مصطفیٰ تھی۔ اپنی نئی کتاب کے لیے مواد کی تلاش میں نکلی ہوئی تھی اور یہاں شاید اسے کچھ زیادہ ہی سسٹنی خیرموا لینے کی توقع تھی۔ مار تھا بڑا زہیل گی سیاحت بھی کر چکی تھی جہاں صدیوں پہلے انکا قدم آباد تھی۔ برازیل کے خطرناک اور مخمجان جنگلوں میں اب بھی ایسے قبیلے آباد تھے جن کے ہاں بڑی عجیب و غریب اور پر اسرار رسوم رائج تھیں۔ وہ انکا کی سرزمین سے بہت متاثر ہوئی تھی لیکن خیال اس کے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ یہاں قدم قدم پر اس کا حیرت انگیز واقعات سے سامنا ہو رہا تھا۔

مستانگ کے بارے میں مجھے شہر بہت کچھ بتا چکا تھا اور جب میں نے مار تھا کو بتایا کہ مستانگ قبیلے کی عورتیں تین تین شادیوں کرتی ہیں اور اس قبیلے کی موجودہ مہارانی بیک وقت تین شہزادوں کی بیوی ہے تو مار تھا اچھل پڑی۔ اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تھوڑے ہی دنوں میں تم وہاں جانے والی ہو۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستانگ قبیلے کے تین چار مرد تمہیں پسند کر کے بیک وقت تم سے شادی کر لیں اور۔“

”نہیں۔“ مار تھا جی اٹھی ”پلیز! چپ رہو۔ میں ایسا خوفناک مذاق پسند نہیں کرتی۔“

قریب چھٹی ہوئی دھن تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ سورج غروب ہونے پر نکلی بڑھ گئی تھی اور اندر میرا بھی گہرا ہو گیا تھا لیکن ہم لوگ وہیں بیٹھے رہے تقریباً ایک گھنٹے بعد رستو کی واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ رستو کے اشارے پر اس شخص نے ہمارا سامان اٹھا کر جمونپڑے کے اندر رکھ دیا۔ ہم بھی جمونپڑے کے اندر آ گئے۔

یہ ایک ہی بڑا سا کرا تھا۔ تین دیواروں کے ساتھ پنجوں کی طرح مٹی کے چوترے بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف اسٹول نما ایک چھوٹے چوترے پر ایک ٹھکانا بھی رکھا ہوا تھا جس کے دھکنے پر مٹی ہی کا پالہ بھی موجود تھا۔

فرش پر چٹائیاں پھینچی ہوئی تھیں اور ایک طرف پاک کی کھالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ رستو کی اپنے تندرست ہاتھ سے کھالیں اٹھا کر پھانے لگا تو میں بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا۔

”تم لوگ یہاں آرام کرو۔“ رستو کی اپنے سامان میں سے ایک تھیلہ اٹھا کر ہوئے بولا ”کھانے کے بعد سردار تم لوگوں سے ملاقات کرے گی۔“

”ہم سے ملاقات؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس بستی میں آنے والا ہر شخص سردار کا مہمان سمجھا جاتا ہے۔“ رستو کی نے جواب دیا ”اور مہمانوں کا سردار کی خدمت میں حاضری دینا بھی ضروری ہے۔ یہاں آنے والے ہر شخص کے لیے بستی کے اصولوں اور قوانین کی پابندی بھی لازمی ہے۔ سردار تمہیں خود بھی بتائے گی۔ یہاں کے لوگ یوں تو بڑے خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں لیکن بعض لوگ اجنبیوں کی آمد کو پسند نہیں کرتے اس لیے میں مشورہ دوں گا کہ سردار سے ملاقات سے پہلے تم لوگ اس جمونپڑے سے

نکل کر زیادہ دور مت جانا۔“

رستو کی چلا گیا۔ اس کی باتوں سے میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ اس نے جن بعض لوگوں کا ذکر کیا تھا ان کی وجہ سے ہمیں بڑی مشکلات بھی پیش آ سکتی تھیں۔

لیکن ہم اس بستی پر قبضہ کرنے تو نہیں آتے تھے۔ نہ ہی ہمارا یہاں حکومت کرنے کا کوئی ارادہ تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ہم جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں لیکن مجھے لگتا تھا کہ ہمیں کچھ دن یہاں رکنا پڑے گا۔

ہم فرش پر کچھی ہوئی کھالوں پر غم دراز باتیں کرتے رہے۔ تین دن کے اس طویل سفر نے ہم سب کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے میں اونگھنے لگا۔

اور پھر اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی آدمی اٹھ کر جمونپڑے سے باہر گیا تھا۔ وہ دراز قامت آدمی تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ وہ باہر نکل چکا تھا اور میں یہ بھی نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی۔

میں اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے لگا۔ میرا خیال تھا وہ کوئی چور تھا جو کوئی چیز چور کر لے جا رہا تھا۔

میں جمونپڑے سے باہر نکلا تو وہ دراز قامت شخص سیدھا جمیل کی طرف جا رہا تھا اور پھر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ جمیل میں آ رہا تھا اور پانی کی سطح پر اس طرح چل رہا تھا جیسے پختہ سوک پر چل رہا ہو۔

میں اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ شخص پانی کی سطح پر کئی گز آگے جا چکا تھا۔ میرے قدم بھی آگے اٹھنے لگے۔ میں بھی پانی کی سطح پر چل رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے قدم روٹی کے نرم گالوں پر پڑ رہے ہوں۔

اچانک وہ شخص ڈرک گیا۔ وہ میری طرف مڑا تو اس کی صورت دیکھ کر مجھے اپنا دل کپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ یوں گوتہ بھوش تھا!

اُس کے ہاتھ میں ایک انسانی کھوپڑی تھی جسے اس نے بالوں سے جکڑ کر لٹکا رکھا تھا۔ گردن سے نئی ہوئی کھوپڑی سے

خون بہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بھی خون نچک رہا تھا اور اس کے چہرے کے نقش دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ میرا چہرہ تھا! میں بھی خون پکاتے ہوئے اپنے چہرے کو اور کبھی گوتہ بھوش کو دیکھ رہا تھا۔ گوتہ بھوش کے ہونٹوں پر بڑی مکدہ سی مسکراہٹ تھی۔

فضا شیطانی قہقروں کی آواز سے گونج رہی تھی۔ میں متوحش نظروں سے کبھی گوتہ بھوش کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے اپنے چہرے کو اور کبھی گوتہ بھوش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گوتہ بھوش کے قہقہے اب مکھم گئے تھے۔ اس کی آنکھیں پٹیاں بھرتے لگیں۔

میں ایک سینکڑا اپنی جگہ پر کرا اور پھر گوتہ بھوش کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ میرے اندر ایک نئی توانائی اٹھ اٹھائیاں لینے لگی۔ کوئی غیر مرئی قوت مجھے آگے بڑھنے پر اکسارہی تھی۔

گوتہ بھوش میری طرف آ رہا تھا لیکن پھر کایک وہ رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے بجائے وحشت سی ابھرنے لگی۔ خوف اور وحشت کی وجہ سے چہرے کے تاثرات بھی بگڑنے لگے۔ وہ اٹل قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ پہلے وہ پانی کی سطح پر تھا لیکن اب اس کے پیر ٹخنوں تک پانی میں دھنس رہے تھے جیسے وہ کسی دلدل میں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اچانک وہ جی اٹھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر میری کھوپڑی میری طرف کھینچ ماری۔ میں پھر پانی سے جک کر اپنے آپ کو کھوپڑی کی زد میں آنے سے بچا گیا لیکن خون کے چھینٹے میرے چہرے گردن اور سینے پر پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے اوپر تیزاب انڈیل دیا ہو۔ میں بری طرح جی اٹھا۔

مجھے کسی نے ہانپوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور میں چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری مزاحمت بدتر بن کر زور پڑتی گئی۔ ایک آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

”کیا ہوا ہمت سنگھ! آنکھیں کھولو۔ آنکھیں کھولو ہمت سنگھ۔“

یہ الفاظ بار بار دہرائے جا رہے تھے۔ یہ مانوس آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک ہاتھ سے اپنا چہرہ گردن اور دوسرے ہاتھ سے سینہ سلا رہا تھا۔

میں ہستہر پڑا تھا۔ شوبھا نے مجھے ہانپوں کے حصار میں لے کر اپنے ساتھ پلٹا رکھا تھا۔ میرا جسم سینے میں شرا ہو رہا تھا۔ میں متوحش نظروں سے شوبھا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو میں صورت حال کو سمجھ نہیں سکا پھر میرے حواس بحال ہونے لگے میں اپنے آپ کو شوبھا کی گرفت سے چھڑا کر بیٹھ گیا۔ دھنواں مار رہا تھا جسے میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بھی تشویش نمایاں تھی۔ جمونپڑے کے

دروازے میں بھی ایک عورت اور دو آدمی کھڑے تھے۔ ”مہ! مجھے کیا ہوا۔ تم لوگ میرے گرد کیوں جمع ہو؟“ میں نے شوبھا وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے۔“ شوبھا نے جواب دیا ”تم اس زور سے چیخ رہے تھے کہ میں بھی کانپ کر رہ گئی تھی اور یہ دونوں بھی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔“ اس نے دھنواں مار رہا تھا کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”ہاں۔ شاید میں کوئی ڈراؤنا خواب ہی دیکھ رہا تھا۔“ میں نے کہا لیکن بتایا نہیں کہ وہ خواب کیا تھا۔

اور وہ خواب میرے ذہن پر گویا جک کر رہ گیا تھا۔ اس بھی ایک خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس خواب نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گوتہ بھوش یہاں میری آمد سے باہر ہو چکا تھا اور میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جاگ پر بیٹھے ہونے کے باوجود اس نے خود مجھے روکنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور یہ خواب میرے لیے گویا ایک وارننگ بھی تھا۔

جمونپڑے کے دروازے میں کھڑی ہوئی وہ عورت اور دونوں مرد کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ وہ بھی شاید نتیجہ گئے تھے کہ میں خواب میں ڈر گیا تھا۔ چند منٹ بعد رستو کی بھی آ گیا۔ وہ بھی کچھ گھبرا ہوا سا تھا۔ ہم سب کو خیریت سے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ وہ کسی دوسرے جمونپڑے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نے اسے میرے پیچھے کی اطلاع دی تھی اور وہ بد حواس ہو کر بھاگا آیا تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”دھنواں اور ہمت سنگھ میں کھڑی ہو رہی تھی۔ دھنواں نے ہمت سنگھ کو لپیٹ لیا تو یہ شکست کے خوف سے چیختے لگا تھا۔“

”کھڑی کیا ہوتا ہے؟“ رستو کی نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پنجاب کا ایک دلچسپ کھیل ہے۔ تمہارے ہاں بھی کھیلا جاسکتا ہے لیکن اس کا طریقہ اور تفصیل پھر کسی وقت بتاؤں گی۔ اس وقت تو بھوک سے جان نکل جا رہی ہے۔ کھانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“ شوبھا بولی۔

”کھانا بس تیار ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“ رستو کی یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی بھی تھی جس نے چاولوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سلطٹ اٹھا رکھا تھا۔ لڑکی نے جھک کر سلطٹ ہمارے درمیان چٹائی پر رکھ دیا۔ گرم گرم چاولوں سے بھاپ اور اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چاولوں میں گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ رستو کی بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا جبکہ وہ لڑکی واپس چلی گئی تھی۔

یاد آگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سنگ پور میں میری والدہ پندرہ دن میں ایک مرتبہ بکرے کے گوشت کا پلاؤ ضرور پکاتی تھی۔ یاد کے گوشت کے اس پلاؤ میں اگرچہ سالے وغیرہ پورے نہیں تھے لیکن پھر بھی بہت مزے دار تھا۔

کھانے کے بعد رستو کی خالی سلطٹ لے کر چلا گیا اور ہم بھی جھونپڑے سے باہر آکر کچھ دیر تک جمیل کے کنارے پر ٹہنتے رہے اور پھر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنا خواب یاد آگیا اور میں جمیل کی تاریک سٹل کو گھورنے لگا۔

خفگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دھنور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور شوبھا اور مارتھا ہم سے کچھ دور ایک دوسرے پتھر پر بیٹھی کہیں ہانک رہی تھیں۔

بستی میں لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خاصی بڑی بستی تھی اور میرے اندازے کے مطابق اس کی آبادی چار سے پانچ ہزار کے درمیان ضرور ہوگی۔ بستی کے لوگ دیر تک جانے کے عادی تھے اور میرے خیال میں یہاں کم از کم تین چار رہنمورث یا ایسی جگہیں ضرور تھیں جہاں لوگ بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہوں گے۔

باتوں اور قدموں کی آوازیں سن کر میں ایک طرف دیکھنے لگا۔ دو جھونپڑے آگے کچھ لوگ گلی سے نکل کر جمیل کی طرف آگئے تھے اور اب ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بستی کے کچھ لوگ ہمیں دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ یہاں آنے والے ابھی بستی کے لوگوں کے لیے تماشا ہی تو ہوتے تھے۔

ایک آدمی ان سے الگ ہو کر تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے آگیا۔ وہ رستو کی تھا۔ اس نے بتایا کہ قبیلے کی سردار کاٹی ہم سے ملے آئی ہے۔ میں ایک جھگٹے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مارتھا دنیہ بھی میرے قریب آگئیں اور ہم اپنے جھونپڑے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں سردار کے جھونپڑے میں لے جا کر اس کے سامنے پیش کیا جائے گا لیکن وہ خود ہی چلی آئی تھی۔ ہم نے جھونپڑے کے دروازے پر ان کا استقبال کیا

اور پھر اندر آگئے۔

کاٹی کو دیکھ کر ایک لمحے کو تو میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی تھی۔ میرا دعویٰ تھا کہ کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر ایک لمحے کو سانس لینا بھول جاتا ہوگا۔ دروازہ قامت، سڈول جسم، بچرے کے نقوش نمائیت دل فریب اور آنکھیں تو واقعی ایسی تھیں کہ اسے آہو چشم کا خطاب دیا جاسکتا تھا۔ یوں تو اس کے خوب صورت بدن کے ہر حصے سے دلکش چھوٹی ہونٹیں محسوس ہو رہی تھیں لیکن سب سے نمایاں اس کے خدوخال تھے۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ سینے میں بے اختیار گرد گردی کا احساس ہونے لگا تھا۔ گھٹنوں سے اور تک یاد کی کھال کا اسکرٹ اور بلاؤز بھی چمڑے ہی کا تھا جس سے اس کا سینہ پوری طرح ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ اس کی پٹ بالکل برہنہ تھی۔ اس کے بال شہد کی رنگت کے تھے جن میں کئی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں کے ہار تھے۔ کلائیوں میں بھی سب سے بڑے اور بالوں میں بھی دو سرخ پھول لگے ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں اور ایک مرد بھی۔ وہ دونوں عورتیں بھی کاٹی جیسا ہی لباس پہنے ہوئے تھیں اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہاں کے لوگ شدت کی سروری کس طرح برداشت کرتے تھے لیکن یہ بات بھی تھی کہ یہ لوگ موسم کی شدت کے عادی تھے۔

مرد نے ہاتھ میں ایک لمبی سی لاشی منیال رکھی تھی جس کے نچلے حصے میں تقریباً چھ انچ کی برچھی لگی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً کاٹی کا پاؤں گاڑا تھا جو دروازے کے قریب جم کر کھڑا ہو گیا تھا جبکہ کاٹی اور اس کی ساتھی عورتیں ہمارے ساتھ فرش پر بیٹھی ہوئی یاد کی کھالوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ کاٹی میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کے پیچھے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے اپنے میں اپنا دل ڈھپاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شوبھانے کن آنکھیں سے بڑی ممتی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

کاٹی کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور چٹائی پر بھی عجیب سی چمک تھی۔ کسی گروہ، ٹیلی یا ریاست پر حکمرانی کرنے کے لیے وہ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہانت اور طاقت اور کاٹی کے بارے میں میں پورے وقوف اور دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے پاس ذہانت کی کمی نہیں تھی۔ قبیلے میں اس کی سیاسی قوت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن حسن کی طاقت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے، اسی قوت اور ذہانت کے ثل

ہوتے رہو اس قبیلے کی سردار بھی بنی ہو۔ کاٹی یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ ہم کون ہیں یہاں کیوں آئے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ میں نے اسے مارا تھا کہ بارے میں بتا دیا کہ وہ مصنفہ ہے اور کتاب لکھنے کے لیے اس خطے کی سیاحت کر رہی ہے۔

”اور تم لوگ؟“ اس نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔

”ہم سلائی ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف منہ اٹھتا ہے، چل پڑتے ہیں۔ ایک دو دن یہاں رہیں گے پھر کسی اور طرف چل پڑیں گے۔“

”انسان سوچتا بہت کچھ ہے لیکن اپنی خواہشات کو پورا کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔“ کاٹی نے کہا۔

کاٹی کی اس بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ہم آسانی سے یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔

سفر کے دوران میں رستو کی نے تلو کو قبیلے کے بارے میں ہمیں چند اہم معلومات فراہم کی تھیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اس قبیلے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور دو سرے اہم بات یہ کہ اس قبیلے کی سردار بھی کوئی عورت ہی بن سکتی تھی۔ سردار کے لیے کنواری ہونا لازمی تھا۔ سرداری ملنے کے بعد وہ قبیلے کے کسی بھی مرد سے اپنی خواہشات پوری کر سکتی تھی۔ کسی عورت کو سرداری دو سال کے لیے ملتی تھی اور سرداری..... حاصل کرنے کے لیے ایک مقابلے کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا اور وہ مقابلہ کس قسم کا تھا؟ اس سلسلے میں رستو کی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

تاہم میری معلومات میں اتنا اضافہ ضرور کیا تھا کہ سردار کے انتخاب کے بعد دشمنیاں بھی شروع ہو جاتی تھیں۔ شکست کھانے والی عورت بعض لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر سردار کے خلاف سازشیں شروع کر دیتی تھی۔ کبھی یہ سازش کامیاب بھی ہو جاتی۔ سردار کو قتل کر کے شکست خوردہ عورت سرداری کا منصب سنبھال لیتی اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ یہ کوئی نیا حیران کن بات نہیں تھی۔ دنیا میں ہر جگہ یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے جا رہے تھے۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر اور کہیں بڑے پیمانے پر۔

کاٹی کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے حالات بھی سازگار نہیں تھے۔ اسے بھی دشمن کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

میں نے اسے یہ باتیں سناتے ہوئے کہا کہ اس کے حالات بھی سازگار نہیں تھے۔ اسے بھی دشمن کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

تھا۔

کاٹی تقریباً ایک گھنٹے تک ہمارے جھونپڑے میں رہی اور پھر واپس چلی گئی۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک غیر رسمی ملاقات کہا جاسکتا تھا۔ تاہم اس کی بعض باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ ہم کہیں اس کے دشمنوں کی دعوت پر تو یہاں نہیں آئے اور اس کے خلاف کوئی سازش کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے!

رستو کی بھی کسی اور جھونپڑے میں چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے ایک عورت ہمیں کچھ کہیں دے گئی تھی۔ ہم اپنی اپنی جگہوں پر کھل اڑھ کر لیٹے کاٹی ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات بیتی جاری تھی۔ باہر سناٹا تھا تاہم کبھی کبھی جھونپڑے کے سامنے سے کسی کے گزرنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

شوبھا اور دھنور سوچتی تھیں۔ مارتھا مشعل کے قریب کھلوں میں لیٹی بیٹھی ڈائری لکھ رہی تھی۔ مزید آدھے گھنٹے بعد اس نے ڈائری بند کر دی اور مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ہم کافی دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے پھر مارتھا بھی جمابھائی لینے لگی۔

وہ تینوں سوچتی تھیں۔ میں کھل میں دیکھا صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ گوتم بھوش کا چلہ پورا ہونے میں چودہ دن رہ گئے تھے۔ اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ میں اس کے قریب و جوار میں پہنچ چکا ہوں۔ وہ مجھے روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ میں جلد سے جلد نیلگری کے پہاڑوں میں پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن کاٹی سے ملاقات کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں سے نکلنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ باہر مکمل طور پر سناٹا تھا۔ میں بھی سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی بہت محتاط انداز میں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے سر ہانک کر دیکھا ہوا پتھول اٹھایا اور اپنی جگہ پر بے حس و حرکت لینا جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھا رہا۔

قدموں کی دہلی دہلی سی آواز قریب آئی تھی۔ میری نظرس دروازے پر مرکوز تھیں۔ آواز رک گئی اور دروازہ ایک ایک انچ کر کے آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ میں نے مارتھا وغیرہ کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں کھلوں میں دیکھ گری نیند سو رہی تھیں۔

پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ تو کیا یہ عورت بھی اسی نیت سے یہاں آئی تھی اور مجھے کسی ایسی جگہ پر لے جا رہی تھی جہاں کسی دوسرے کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔

وہ جھوٹے سے دو تین قدم آگے نکل کر رک گئی تھی۔ میں بھی اس کے قریب رک گیا اور ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرے ساتھ چلو۔“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ لمبے میں تھمنا نہ ضرور نہیں تھا۔ اسے دو تانہ انداز کہا جاسکتا تھا۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں کاشی کے طلب کیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس وقت!“ میرا دماغ گھوم گیا۔

”کاشی پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی کو بھی طلب کر سکتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے جھوٹے سے دروازے کی طرف دیکھا اور مزید جرح کیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ کاشی ٹھیلے کی سردار تھی۔ شام کو وہ میرے مل کر گئی تھی۔ وہ مجھے دن میں کسی وقت طلب کر سکتی تھی لیکن آدمی رات کے بعد اس طرح رازداری سے بلائے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔

تقریباً دس منٹ تک تاریک اور سنسان گلیوں میں گھومنے کے بعد ہم بستی کی دوسری طرف ایک بار پھر جھیل کی طرف نکل آئے۔ بستی کے آخری مکان سے تقریباً سو گز کے ایک بڑے مکان کا ہونا نظر آ رہا تھا۔ حویلی نما وہ مکان ایک نیلے پر ہوا تھا اور اس کی دیوار پر بھی کافی بلند تھیں۔

وہ عورت حویلی کے پھانک کی طرف جانے کے بجائے سفید کی بائیں طرف جا رہی تھی جہاں قد آدم جھاریوں کی بات تھی۔ میں اس عورت کے پیچھے پیچھے جھاریوں میں چلا رہا۔ وہ دیوار کے قریب ایک جگہ رک گئی جہاں کھڑکی کی طرح کا ایک دروازہ تھا۔ اس نے دروازے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ دوسری مرتبہ ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ پہلی مرتبہ ہاتھ مارنے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

میں پھر گردن گھما کر نیم وا آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا گیا اور پھر ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اندر آنے کے بجائے باہر ہی کھڑی آگے جھک کر جتنس نظروں سے جھوٹے سے دروازہ لے رہی تھی۔

اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سبزہ تھا لیکن اس نے جس انداز سے نیزہ پکڑ رکھا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔

وہ کمرے کے وسط میں رک کر ایک بار پھر جتنس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر میری طرف بڑھی۔ وہ ایک ہاتھ آگے بڑھا کر میری طرف جھکی۔ وہ غالباً میرے پیروں پر ہاتھ رکھ کر مجھے بلانا چاہتی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے اسے اور بھی خوف زدہ کر دیا تھا لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر فوری اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ایک انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک تھی جو کاشی کے ساتھ آئی تھیں۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور شوہا وغیرہ کی طرف دیکھتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں اپنے اوپر سے کبل ہٹا کر اٹھ گیا اور شوہا وغیرہ کی طرف دیکھا ہوا اس عورت کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھ گیا تھا۔ راستہ کے سناٹے میں یہ عورت یہاں کیوں آئی تھی اور مجھے اس طرح رازداری سے جھوٹے سے باہر کیوں لے جا رہی تھی۔ رستہ کی باتیں میرے دماغ میں بازگشت سی پیدا کرنے لگیں۔ اس ٹھیلے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک مرد کے حصے میں تین عورتیں آتی تھیں اور یہاں مخالف صنف سے تعلقات

♦ اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں ♦

جو کہ دسمبر 2003ء میں شائع ہوگا





میرزا حسن علی خان  
**آتش فشاں**

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اسے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا تھا اور انہیں "انصاف" کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن نیمپل میں فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اسے آتش و ابن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پاؤں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہو گئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی لٹکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قبر بن کر نازل ہوا اور انہیں حرف غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

**ظہیر علی عثمانی نے اپنے ایک عزیز اسی طرح کی زندگی بسر کی**

عورت نے ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اسے واپس آنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں گئے۔ ان نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جھونپڑوں پر مشتمل اس بستی کے پہلو میں پکی اینٹوں کی اس حویلی کو دیکھ کر ہی مجھے حیرت ہوئی تھی اور اندر آکر تو یہ حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

ہمیں اس بستی میں آئے ہوئے صرف چند گھنٹے ہوئے تھے۔ ہم نے صرف رات ہی چند لوگوں کو دیکھا تھا جو ہم سے ملنے کے لیے جھونپڑے میں آئے تھے۔ میں نے ہر مرد اور عورت کے جسم پر ایک کی کھال کا مختصر سارلباس دیکھا تھا لیکن اس کمرے میں آکر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں قدیم بغداد کے کسی محل میں آ گیا ہوں۔

اس وسیع و عریض کمرے کی بلند دیواروں کے ساتھ رنگ برنگے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چھپنی طرف دو بڑی بڑی محرابی کھڑکیاں تھیں۔ ان کے سامنے بھی باریک ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ شعلوں کی روشنی میں لہراتے ہوئے رنگ برنگے ریشمی پردے بڑا دل فریب منظر پیش کر رہے تھے۔

اس عورت نے پہلے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی اندر آ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس طرف بھی دیوار کے ساتھ قد آدم جھاڑیاں تھیں اور دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ راندہ آنے کے فوراً ہی بعد اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ دوسری طرف چلی گئی تھی۔

میرے ساتھ آنے والی عورت نے اشارہ کیا اور میں ایک بار پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

حویلی کی عمارت خاصی بڑی تھی۔ آگے کو نکلے ہوئے برآمدے میں ایک مشعل جل رہی تھی اور ایک عورت نیزہ سنبھالے وہاں بھی کھڑی تھی۔

ہم اندر داخل ہو کر ایک راہداری میں مڑ گئے۔ یہ راہداری خاصی طویل تھی۔ اس کے اختتام پر دائیں یا بائیں دو اور راہداریاں تھیں۔ یہاں بھی ایک عورت نیزہ سنبھالے کھڑی تھی۔ ہم اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بائیں طرف مڑ گئے۔

یہ راہداری زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر ایک اونچا دروازہ تھا۔ دائیں طرف دس فٹ طویل ایک اور کشادہ راہداری تھی۔ اس کے اختتام پر بھی ایک محرابی دروازہ تھا۔ ہر راہداری کے موڑ پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ ہم اس محرابی دروازے کے سامنے رک گئے۔ اس

میں دروازے کے قریب ہی کھڑا متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کوئی ذی نفس ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ اچانک ایک سرلی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔

”میں یہاں ہوں۔“

یہ آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ میں نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ کمرے کا ایک حصہ کشادہ حراب کی طرف پیچھے کو نکلا ہوا تھا جہاں غالباً کڑی کا ایک تخت رکھا ہوا تھا جس پر تہ درتہ پاک کی کئی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی ایک سلی چادر بھی۔ کاشی تخت پر نیم دراز تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ فطری یاد آگئی جو میں نے بچپن میں سگا پور میں دیکھی تھی۔ ملکہ قلو پھرہ کے لینے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

اس حراب کے سامنے ایک باریک سفید پردہ ہوا کے جھوکوں سے ہلکے ہلکے لہکے لہکے لہکے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا اور اس کے ساتھ ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔

کاشی نے لباس تو ضرور پہنا ہوا تھا لیکن اس لباس میں بھی وہ برہنہ تھی۔ اسے دیکھ کر میری نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس حراب میں کاشی اکیلی نہیں تھی۔ تخت کی پچھلی طرف دو اور عورتیں بھی کھڑی تھیں جنہیں میں پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔ کاشی نے انہیں اشارہ کیا اور وہ حراب کے پچھلی طرف کسی دروازے میں غائب ہو گئیں۔

”آؤ۔ رک کیوں گئے ہمت کٹھ؟“

کاشی کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ شاید کو جب یہ ہمارے جھوٹے پوسے میں آئی تھی تو رستو کی لہجہ میں کہہ کر میرا تعارف کرایا تھا اور یہ مجھے اجنبی کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہی تھی اور اب اپنا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھا پھر رک گیا۔ یہاں اس تخت کے سوا ایسی کوئی اور جگہ نہیں تھی جہاں میں بیٹھ سکتا اور تخت پر کاشی اس طرح نیم دراز تھی کہ میں اپنے اندر اس کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

”سمجھ گئی۔“ کاشی اٹھ کر تخت سے اتر آئی ”تم یہاں میرے ساتھ بیٹھنے سے بچکا رہے ہو۔ آؤ۔ سہان خانے میں بیٹھتے ہیں۔“

اس نے دائیں طرف کی دیوار کا ایک پردہ ہٹا دیا۔ دوسری طرف بھی ایک وسیع کمرہ تھا۔ فرش پر پاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی دیواروں پر ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ مشعلوں کی کچکپاتی ہوئی روشنی میں یہ منظر بھی بڑا

پراسرار اور خواب آلود تھا۔

کمرے کے وسط میں پرانی طرزی کا ایک گول میز بڑی ہوئی تھی جس پر خوب صورت طشتریوں میں پھل سجے ہوئے تھے۔ بعض پھل تو ایسے تھے جو اس علاقے (نیپال) اور اس سیزن میں نہیں ہوتے تھے۔ میز کافی بڑی تھی۔ اس کے ارد گرد پرانی طرزی کی مگر آرام دہ کرسیاں بھی بڑی ہوئی تھیں۔

کاشی نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک دیوار کی طرف دیکھ کر مائی بھائی۔ دیوار کے پردے میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک خوب صورت لڑکی ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس میں وہ گلاس اور ٹینے کی خم دار گردن والی ایک خوب صورت صراحی رکھی ہوئی تھی جس میں عنبی رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔

کاشی بھی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیچ میں میز حائل ہونے کے باوجود کاشی کے بدن کا ایک حصہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔

کاشی نے صراحی اٹھا کر دونوں گلاس لبریز کیے اور ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

”لو پو اور یہ پھل بھی کھاؤ۔“ وہ بولی ”مجھے افسوس ہے کہ میں رات کے اس سپر تمہاری زیادہ خدمت نہیں کر سکتی۔“

”مہم میں شراب نہیں پیتا۔“ میں نے کہا۔ اس وقت میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت شاید میں اپنے حواس ہی میں نہیں تھا۔

اس پراسرار ماحول نے مجھ پر عجیب سا محرطاری کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر کاشی کے حسن و شباب نے پوری کر دی تھی۔ وہ میرے خرم ہوش پر بھجیاں گرا رہی تھی اور میں بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

”یہ شراب نہیں ہے۔“ کاشی کی شیریں آواز میری ساعت سے ٹکرانی ”تمہارے لیے یہ مشروب پینا بہت ضروری ہے کیونکہ تم جسم پر مہم پر جا رہے ہو اس کے لیے تمہارے اندر ہمتی ہونی چاہیے۔“

میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ اسے کہتے چلا کہ میں کسی خاص مہم پر جا رہا ہوں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”یہ مشروب پی لینے سے تمہارے اندر ایسی ہمتی پیدا ہو جائے گی کہ نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی سروی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

”تم کون ہو؟“ میں ہکا کر رہ گیا ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی طرف جا رہا ہوں۔“

”میں نیلگری کی محافظ ہوں۔“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا ”نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کا راستہ اس طرف ہی سے جاتا ہے۔ کوئی شخص ہماری نظروں میں آئے بغیر آگے نہیں جا سکتا۔“

”لیکن ایک آدمی ایسا ہے جو وہاں پہنچ چکا ہے!“ میں نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ کاشی نے جواب دیا ”وہ مجھے دھوکا دے کر چلا گیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں نے ابھی تک اسے بچپن سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ان برف پوش پہاڑوں کی ملکہ نے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں لیکن میرے دشمنوں کو بھی تمہارے ارادوں کا پتا چل گیا ہے۔ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کریں گے۔“

کاشی کی باتیں سن کر میرے دماغ میں دھماکے سے ہورے تھے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھی اور اس کے دشمن بھی میرے ارادوں سے واقف ہو چکے تھے۔

”لو۔ یہ لیو۔ اس کے بعد ہم اطمینان سے وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے دیوار کے ساتھ بیٹھنے کے لیے ایک کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر پہلے صرف ایک چسکی لی۔ عتاب جیسی خوشبو تھی اور بہت لذیذ مشروب تھا۔ میں نے دوبارہ گلاس ہونٹوں سے لگایا تو پھر اسے اس وقت ہٹایا تھا جب اس کا آخری قطرہ بھی میں نے چوس لیا اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر کھولنا ہوا لاوا بھر گیا ہو۔ میرا جسم سینے میں شرابور ہونے لگا۔ میں نے چڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن میں نے جیکٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ قمیص کے نیچے پورے جسم پر مجھے چوٹیاں سی رہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ چوٹیں پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے والے ان لوگوں کو سردی کیوں نہیں لگتی تھی۔ یہ لوگ یقیناً مستقل طور پر یہ مشروب استعمال کرتے تھے۔

”تمہیں کچھ دیر بے چینی ہوگی۔“ کاشی اپنے گلاس سے چسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی ”یہ مشروب ان پہاڑوں میں پیدا ہونے والی قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے اور

ہماری غذا کا ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہماری روزمرہ کی غذا میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جو ہمیں دوسری شدت سے محفوظ رکھتی ہیں۔ آؤ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ وہ خالی گلاس میز پر رکھ کر اٹھ گئی۔

میں بھی اٹھ گیا۔ پسینے میں بیٹھنے کی قیص بھی اب مجھے بوجھل سی لگ رہی تھی۔ میں نے قمیص اتار کر پھیٹک دی اور کاشی کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

میرے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے کاشی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں پر رکھ دیے اور انگلیوں سے مسلانہ ٹولنے لگی۔ وہ اپنی انگلیوں کو گوشت میں گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے مسلانہ گوشت کی طرح نرم نہیں، پتھری طرح سخت تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب سی مسکراہٹ آگئی اور آنکھوں میں سرمئی کے ڈورے تھرنے لگے۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجھے قمیص نہیں اتارنی چاہیے تھی۔ کاشی کی انگلیوں کے لمس سے میرے دماغ میں بھی سنسناہٹ ہونے لگی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پایا اور سرک کر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔

”تمہارے دشمن کون ہیں اور میرے بارے میں کیسے جانتے ہو اور تم؟“

”نیلگری نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔“ کاشی بھی سنبل کر بیٹھ گئی ”یہ قبیلہ ہزاروں سال سے نیلگری کی حفاظت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ سرداری کے لیے منتخب ہونے والی عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک چاب مکمل کرے۔ ایکس روز کا یہ چاب مکمل ہونے کے بعد اس کا نیلگری سے رابطہ ہو جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم نے بھی وہ چاب کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا ”لیکن بعض شیطانی قوتیں اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور نیلگری ان کے قبضے میں نہیں جانا چاہتی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کا چہرہ دھندلا رہا ہے۔ چند روز پہلے میرا اس سے آخری رابطہ ہوا تھا۔ طاغوتی قوتوں نے اس کے گرد جال بن دیا ہے۔ حصار میں قید کر دیا ہے۔ اسے وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اس شیطانی کے قبضے میں چلی گئی تو وہی کچھ کرے گی جو اسے حکم ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر بھی

تباہی نازل ہو جائے گی۔ یہ جھیل ہماری بستی کو نگل لے گی۔“  
”وہ کون لوگ ہیں جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”شیواگ!“ کاشی نے جواب دیا ”اس گروہ کا سرغنہ شیواگ ہے۔ اس کے ساتھ اگرچہ چند ہی لوگ شامل ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ ایک پھلی بھی پورے جل (ملاپ) کو گندا کر دیتی ہے۔ شیواگ تمہارے ارادوں سے واقف ہو چکا ہے۔ وہ شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کرے گا بلکہ وہ اپنی کوششیں شروع کر چکا ہے۔ تمہیں روکنے کے لیے پہلے ایسی شرانگہ عائد کی جائیں گی جنہیں تم پورا نہیں کر سکو گے اور اگر تم نے ان شرانگہ کو پورا کر دیا تو اس کے بعد بھی تمہارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔“

”اب تک میرے راستے میں کئی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہی ہیں لیکن میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور آگے بھی جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔“ کاشی نے کہا ”تم آگے ضرور جاؤ گے لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارے پاس وقت کم ہے۔ صرف بارہ دن۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ صرف بارہ دن۔“ میں نے جواب دیا ”اور مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے ان بارہ دنوں ہی میں کرنا ہے۔“

بات کرتے ہوئے میری نظرس اسے لکڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ لکڑی کھلی ہوئی تھی۔ سفید باریک پردے ہوا کے جھونکوں سے اس طرح ہل رہے تھے جیسے سمندر کی پرسکون سطح پر ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی ہوں۔ پردہ اپنی جگہ سے سرکنا تو لکڑی کی دوسری طرف دن کا ٹکاسا جالا دکھائی دینے لگتا۔

کاشی نے بھی دیکھ لیا تھا کہ رات دم توڑ چکی تھی اور دن کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ اس نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تالی بجائی۔ وہی خوب صورت لڑکی برآمد ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے شیشے کی خوب صورت طشتی میں صرف ایک گلاس اٹھا رکھا تھا۔ اس میں ہرے رنگ کا شربت بھرا ہوا تھا۔ اس نے قریب آکر کاشی کی طرف دیکھتے ہوئے گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

کاشی نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ اس کا ذائقہ پہلے

والے مشروب سے مختلف تھا لیکن یہ بھی بے حد خوش ذائقہ تھا۔

مشروب پینے کے بعد بھی میں کاشی سے باتیں کرتا رہا۔ میرا سرو بھل ہونے لگا۔ اسی دوران میں کاشی کی وہ خادمہ جو مجھے حویلی میں لے کر آئی تھی، دوڑتی اور چیخیں چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے بالا۔ کیوں چیخ رہی ہو؟“ کاشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مفصلے لے لیے میں پوچھا۔

”شیواگ نے اپنے شیطانوں کے ساتھ حویلی پر حملہ کر دیا ہے کاشی۔“ پالانہی اسی عورت نے جواب دیا ”وہ اس طرف آ رہا ہے۔“

”اوہ!“ کاشی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی ”اس کی یہ ہمت۔۔۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔ تم ممان کو حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر لے جاؤ۔“

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کاشی مجھے شیواگ کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی اور میں بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ پالانے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچتا چاہتی تھی لیکن میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ گھٹنے دھرے ہوتے چلے گئے اور میں فرش پر ڈھیر ہو گیا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○●○

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے جھونپڑے میں بستر پر پڑا تھا اور میرے اوپر کی کبل لمبے لمبے ہوئے تھے۔ میرے بستر کے قریب مارتھا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہی تھی۔ مجھے حرکت کرتے باکر اس نے ڈائری بند کر دی اور میری طرف جھٹکے ہوئے ہوئی۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟“ میں اپنے اوپر سے کبل ہٹا کر اٹھ گیا ”کاشی اور پالانہ کہاں ہیں؟“

”کاشی اور پالانہ۔“ مارتھا کے لہجے میں حیرت تھی ”اوہ! شاید تم دھو اور شوہا کو پوچھ رہے ہو۔ وہ باہر دھوپ میں بیٹھی ہیں۔“

”میں قبیلے کی سردار کاشی اور اس کی خادمہ پالانہ کو پوچھ رہا ہوں۔ شیواگ نے حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ۔۔۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا“ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک

منٹ رکو۔ میں شوہا کو بلا کر لاتی ہوں۔“ مارتھا یہ کہتے ہوئے اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے صرف چٹون پہن رکھی تھی۔ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میری قیص اور جیکٹ بھی ایک طرف رکھی ہوئی نظر آ گئی۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ شیواگ اور اس کے آدمیوں نے جب حویلی پر حملہ کیا تھا تو میں وہیں تھا۔ میں بھی کاشی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن نجائے یکایک کیا ہوا تھا کہ میں بے جان ہو کر گر پڑا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے یہاں کون لایا تھا اور کاشی کس حال میں تھی!

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دھو اور شوہا مارتھا کے ساتھ اندر داخل ہو میں۔ وہ تینوں میرے قریب بیٹھ گئیں۔

”رات کو تم جھونپڑے سے نکل کر کہاں گئے تھے؟“ شوہا نے پوچھا۔

میں چند لمبے خاموش رہا۔ ان سے کچھ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے صاف سنا۔ بتا دیں کہ کاشی کی خادمہ مجھے بلا کر لے گئی تھی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا میں نے مختار الفاظ میں بتا دیا۔

”شیواگ اور اس کے آدمیوں نے حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔“ میں آخر میں کہہ رہا تھا ”لیکن نجائے مجھے کیا ہوا تھا کہ عین وقت پر میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ مجھے حویلی سے یہاں کون لایا تھا اور کاشی۔۔۔“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ شوہا نے میری بات کاٹ دی۔ وہ اس طرح میرے چہرے کو گھور رہی تھی جیسے میری دماغی صحت پر کسی شک کا شہ ہو۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟“ میں نے بھی اسے گھورا ”کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں؟“

”ہاں۔ اب تو یہ شب کچھ یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔“ شوہا نے جواب دیا ”یہاں نہ کوئی حویلی ہے اور نہ کسی نے حویلی پر حملہ کیا تھا۔ تم یہاں سے تقریباً دو سو گز آگے جھیل کے کنارے جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ تمہارے جسم پر صرف چٹون تھی۔ قیص اور جیکٹ تمہارے قریب ہی جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ صبح سات بجے جھیل کی طرف جانے والی ایک عورت نے ہمیں تمہارے بارے میں اطلاع دی تو ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے۔ بتائیں تم کب سے وہاں پڑے تھے۔ مجھے رز تھا کہ سردی سے تمہیں نمونیا نہ ہو جائے اس لیے میں نے تمہارے اوپر کی کبل ڈال

دے دیے تھے۔ تمہیں نمونیا تو نہیں ہوا لیکن سردی نے تمہارے دماغ پر اثر ضرور کیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے ہمارے سوجانے کے بعد رات کو تم بستی کے کسی قحبہ خانے میں چلے گئے ہو جہاں شراب پی کر تم بگ بگ گئے اور جھونپڑے کی طرف واپس آنے کے بجائے جھیل کی طرف نکل گئے اور رات بھر سردی میں وہاں پڑے رہے۔“

”کیا کب رہی ہو تم؟“ میں نے اسے گھورا ”تم جانتی ہو، مجھے شراب سے شدید نفرت ہے۔ میں نے کبھی کوئی اور نشہ بھی نہیں کیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ رات کو مجھے پالا بلا کر حویلی میں لے گئی۔“

”یہاں دور دور تک کسی حویلی کا وجود نہیں ہے۔“ شوہا نے میری بات کاٹ دی ”اور قبیلے کی سردار کاشی بھی کسی عالی شان حویلی میں نہیں، ایک جھونپڑے میں رہتی ہے جو بستی کے وسط میں واقع ہے اور وہ رات کو اپنے جھونپڑے ہی میں تھی۔“

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ میرے دماغ میں آنسو ہل سی چل رہی تھیں اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں رات کے واقعات کو کیسے بھول سکتا تھا۔ کاشی کی حافظہ یہاں آتی تھی اور میں اس کے ساتھ بستی میں سے ہوتا ہوا حویلی گیا تھا جہاں کاشی سے طویل ملاقات ہوئی تھی لیکن شوہا کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔

اچانک مجھے وہ مشروب یاد آ گیا۔ کیا وہ سب کچھ مشروب کی وجہ سے تھا لیکن وہ مشروب بھی تو میں نے حویلی میں جانے کے بعد ہی پیا تھا۔ مجھے رات کی ایک بات یاد تھی۔ کاشی نے نیلکڑی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں اور مجھے یاد دلایا تھا کہ گوتم بھوش کا جاپ ملل ہونے میں صرف بارہ دن رہ گئے ہیں اور مجھے یہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد تھا لیکن کیا وہ سب خواب تھا؟ شوہا کا کہنا تھا کہ یہاں دور دور تک کسی حویلی کا وجود نہیں اور کاشی کی رہائش بھی بستی کے ایک جھونپڑے میں ہے اور یہ کہ وہ رات کو اپنے جھونپڑے ہی میں تھی۔

باہر قدموں کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ ”شاید رستو کی کسی کے ساتھ آ رہا ہے۔“ شوہا نے سرگوشیاں لہجے میں کہا ”انہیں ایسی کوئی کہانی مت سناؤ ورنہ وہ لوگ تمہیں ناگوار سمجھیں گے۔“

میں شوہا کو گھور کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی رستو کی ایک اور آوی کے ساتھ کمرے

میں داخل ہوا اور جب رستوں کی اس کا تعارف کرایا تو میں اجماع ہوا۔ وہ شیواگ تھا۔

شیواگ کی عمر بیستالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ درمیانہ قد، گھٹا ہوا جسم، تنگ سر اور کانوں میں چوڑیوں کی طرح بڑے بڑے بالے تھے۔ چہرے پر کڑختی نمایاں تھی۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چھوٹی تھیں۔ اس شخص کو دیکھ کر یہی نظریں اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بہت کینہ پرور اور نہایت گھٹیا فطرت کا مالک ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کی باتوں سے بھی میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو دوسروں سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہو۔

اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ اسے اس بستی میں ہماری خاص طور پر میری آمد پسند نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں جلد سے جلد یہاں سے واپس چلا جاؤں۔

میرے ذہن میں کاشی کی باتیں گونجنے لگیں۔ گزشتہ رات پر اسرار ملاقات کے دوران میں اس نے بتایا تھا کہ شیواگ مجھے نیلگری کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا اور اب وہ باتیں سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ شیواگ کا گفتگو کا انداز دھمکی آمیز تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ کل صبح تک اس بستی سے واپس چلا جاؤں۔ اس کے بعد اگر میں یہاں رہا تو نقصان اٹھاؤں گا۔

”فیصلی کی سردار کاشی نے ہمیں یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا ”میں نہیں سمجھتا کہ سردار کے علاوہ کسی اور کو بھی احکامات جاری کرنے کا حق حاصل ہے۔“

”میں ہوں نا۔“ شیواگ نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ”کاشی نے جس طرح دھوکے سے سرداری حاصل کی ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔ اس کے چند حواریوں نے اسے سردار بنا دیا ہے لیکن میں نے اسے سردار تسلیم نہیں کیا۔ میں جب تک اسے اس منصب سے ہٹا نہیں دوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ سردار کو ایک مقابلے کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ جہاں مقابلہ ہو وہاں کسی دھوکے کا امکان نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”مقابلے کے علاوہ ایک اور شرط بھی ہوتی ہے۔“ شیواگ نے کہا ”سرداری کے لیے مقابلے میں شریک ہونے

والی ہر عورت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور کسی مرد کے ساتھ نہ رہی ہو لیکن کاشی کے بارے میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ کنواری نہیں تھی۔ اس قبیلے میں ایک ایسا آدمی موجود ہے جو یہ گواہی دے گا کہ مقابلے سے چند روز پہلے کاشی نے اس کے ساتھ رات گزاری تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”ہم لوگ صدیوں سے اپنی رسموں پر کاربند ہیں۔ ان رسموں سے بغاوت یا دھوکا دہی ہمارے قبیلے کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہماری نسل مٹ جائے گی۔ کاشی نے دھوکا کیا ہے جس کے نتیجے میں ہماری تنزیل کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس مرتبہ ہماری دھان کی فصل اچھی نہیں ہوئی اور جمیل کا پانی بھی چڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ اگر ہم نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ نہ کیا تو یہ جمیل ہماری بستی کو نکل جائے گی اور ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔“

”لیکن ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں بستی میں ٹھہرنے اور نیلگری کی طرف جانے کی اجازت دے کر کاشی نے دوسری بڑی غلطی کی ہے۔“ شیواگ نے جواب دیا ”یہ قبیلہ نیلگری کا محافظ ہے۔ ہم کسی کو ان برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتے جن کی ہم صدیوں سے حفاظت کر رہے ہیں۔“

”تم شاید بھول گئے ہو کہ ایک شیطان صفت شخص پہلے ہی اس طرف جا چکا ہے اور تم نے اس کی مدد کی تھی۔“ میں نے کہا۔

شیواگ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”وہ شیطان نہیں، بہت مہارش (عظیم انسان) ہے۔“ وہ قوتوں کا مالک۔ وہ نیلگری کی ممان غلطی حاصل کرنے کے لیے اس طرف گیا ہے۔ اس نے ہمارے قبیلے کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اسے نیلگری کی غلطی لگی تو ہمارے قبیلے میں خوش حالی آئے گی۔ ہماری نسل بڑھے گی اور۔“

”اور وہ ہمیں تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ یہ موضوع چھڑ گیا تھا تو میں نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا ”وہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے نہیں، تباہی کے لیے نیلگری کی غلطی حاصل کرنا چاہتا ہے اور میں۔“

”میں ہمیں کل صبح تک کی مصلحت دے چکا ہوں۔“ شیواگ میری بات کاٹتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”اگر تم نے کل تک یہ بستی نہیں چھوڑی تو انجام کے

ذمے دار تم خود ہو گے۔“ وہ چلا گیا۔ رستوں کی بھی اس کے پیچھے ہی جھونپڑے سے نکل گیا تھا۔ دھوا اور شوبھا پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھتے گئے۔ شوبھا نیلگری کی حقیقت سے واقف تھی لیکن دھوا اور مار تھا کہ لمبے سے بی بیائیں تھیں۔

مار تھا ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے آئی تھی۔ وہاں اس نے پنڈتوں، یوگیوں اور پر اسرار قوتوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا تھا۔ کچھ عرصہ مندروں میں بھی گزارا تھا اور اب یہاں پر اسرار قوتوں کی باتیں سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”کیا تم بھی پنڈت ہو؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے خیال میں شاید صرف پنڈت ہی پر اسرار قوتوں کے مالک ہو سکتے تھے۔ دھوا بھی ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”نیلگری اس برف پوش چوٹی کا نام ہے جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔“ میں نے مار تھا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ”میرا ایک دشمن وہاں چھپا ہوا ہے اور میں۔“

”شاید تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔“ راتھانے بات کاٹ دی اور میں نے بھی بات آگے نہیں بڑھائی۔

میں نے اٹھ کر قیصر پن لے لی اور جھونپڑے سے باہر آگیا۔ جبکہ پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اس وقت مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ یہ شاید اس مشروب کا اثر تھا جو گزشتہ رات کاشی نے مجھے پلایا تھا لیکن اس سلسلے میں میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ پالا رات کو مجھے حویلی میں لے گئی تھی جہاں کاشی سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے وہ خوش ذائقہ مشروب پلایا تھا جس سے میرے اندر لاوا سا کھولنے لگا تھا لیکن شوبھا کا کہنا تھا کہ مجھے جمیل کے کنارے چھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے پالایا گیا تھا اور دور دور تک کسی حویلی کا نام و نشان تک نہیں تھا لیکن اگر وہ سب خواب تھا تو وہ ساری باتیں میرے سامنے کیسے آ رہی تھیں جو میں نے ”خواب“ میں دیکھی تھیں۔ شدید سردی سے بچنے کے لیے اس قبیلے کے لوگ خاص قسم کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا وہ مشروب استعمال کرتے تھے۔ میں نے بھی اس مشروب کا ایک گلاس پیا تھا جس کی وجہ سے مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ کاشی نے بتایا تھا کہ شیواگ بعض شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے اور وہ مجھے نیلگری کی

طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا اور اس نے اپنی کوشش شروع کر دی تھی۔

گزشتہ رات میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اگر خواب تھا تو یہ ساری باتیں حقیقت بن کر میرے سامنے کیوں آ رہی تھیں؟ میں جیسے جیسے سوچتا میرا ذہن الجھتا گیا۔

میں کافی دیر وہاں کھڑا دھوپ میں جھکتے ہوئے جمیل کے پانی کو دیکھتا رہا پھر کنارے کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔

میں بستی اور جمیل کے درمیان چھاڑیوں میں چلتا ہوا بستی کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں رات کو پالا مجھے لے کر آئی تھی۔ بستی کے آخری جھونپڑے سے تقریباً دو سو گز آگے ایک بلند ٹیلا تو نظر آ رہا تھا لیکن اس طرف حویلی تو کیا، کسی چھوٹے سے جھونپڑے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ٹیلے پر اس کے آس پاس تہ آدم جھاڑیاں تھیں۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا ٹیلے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دو عورتوں کو ان چھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ اسی طرف آ رہی تھیں۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی۔

ان کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا پھر بستی کے باہر ہی باہر چلتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس طرف بستی سے آگے جھیتوں کا سلسلہ تھا۔ پہاڑی علاقوں میں قابل کاشت زمین ہمارا نہیں ہوتی۔ میں نے تھالی لینڈ میں بھی دیکھا تھا اور یہاں بھی دیکھی ہی صورت حال تھی۔ کھیت کشادہ میڑھوں کی طرح نیچے اوپر دور تک چلے گئے تھے۔

میں باہر ہی باہر گھومتا رہا۔ بستی کے باہر دور تک کوئی عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں بستی میں داخل ہو گیا۔ یہ بستی واقعی بڑی پلاننگ سے بنائی گئی تھی۔ کہیں بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ جھونپڑوں کے درمیان کشادہ گلیاں تھیں۔ گلیوں میں لوگوں کی آمد رفت تھی۔ زیادہ تعداد عورتوں ہی کی نظر آتی تھی۔ بعض عورتیں مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں بستی کے مرکزی چوراہے پر پہنچ گیا۔ میرا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا کہ اس بستی میں ریسٹورنٹ قسم کی ایسی جگہیں ضرور ہوں گی جہاں لوگ بیٹھ کر وقت گزارتے اور گپ شپ کرتے ہوں گے۔

چوراہے پر بڑی رونق تھی۔ ایک طرف جہاں میں کھڑا تھا، ریسٹورنٹ قسم کا ہال نما جھونپڑا تھا جس کے فرش پر پاک





نہیں لگی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی براسرار قوت شیواگ کی مدد کر رہی تھی۔ میں نے شیواگ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس کی پشت پر ایک ہیولا سا نظر آیا۔

میرا ہاتھ ایک انچ کے قریب مزید جھک گیا تھا۔ یہ شیواگ کی جسمانی قوت نہیں تھی جو میرا ہاتھ دبا رہی تھی۔ کوئی اور براسرار قوت اس کی پشت پر تھی جو مجھے شکست دینے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر اچانک میرے اندر بھی پھیل ہی چمٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے اندر انکڑائی لے رہا ہو۔

میرا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ شیواگ کی آنکھوں میں وحشت سی بگڑی۔ ہمارے بازو ایک بار پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ شیواگ پوری قوت استعمال کر رہا تھا لیکن اس مرتبہ وہ میرے ہاتھ کو معمولی سی حرکت بھی نہیں دے سکا۔

”تم اگر چاہو تو اپنے ساتھیوں سے مدد لے سکتے ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”اگر تم لوگ مل کر بھی اس ٹھیل میں مجھے شکست دے دو تو میں ایک گھنٹے کے اندر اندر ہستی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

شیواگ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس نے جیج کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ پہلے ایک اور پھر دوسرا آدمی بھی اس کی مدد کے لیے آگے آ گیا۔

وہ تینوں میرا بازو موڑنے کے لیے پوری قوت بروئے کار لا رہے تھے لیکن میرا بازو کھینچے کی طرح کڑا ہوا تھا۔ شیواگ کی پشت پر وہ ہیولا اب بھی موجود تھا اور اب تو وہ ہیولا میری نظروں کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا۔

جھروں بھرا چہرہ، سر کے بال لیے اور برف کی طرح سفید تھے اور چڑیا کے گھونسلے کی طرح بھڑے ہوئے تھے۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سفید تھے۔ مونچھیں بھاری بہت لمبی اور دونوں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داڑھی بھی چھان کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

میں شیواگ کو نہیں اس کی پشت پر اس ہیولے کو دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے بھی اپنے اندر کی قوت استعمال کرنا شروع کر دی۔ شیواگ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکنے لگے۔ وہ براسرار جھروں بھرا چہرہ ایک پچھلے بدحواس سا ہونا نظر آ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں جیسے پھٹی پڑ

رہی تھیں۔

میں نے اپنے ہاتھ کو ہلکا سا جھکا دیا۔ ان تینوں کے ہاتھ زمین پر لگ گئے۔ شیواگ کے دونوں ساتھی باڑی لکھا کر دور گرے تھے۔ شیواگ دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھیاں سلاتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت دوچند ہو گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ تو مذاق تھا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے عقارت آمیز لہجے میں بولا ”شام کو مقابلہ ہو گا۔ اگر تم نے ”نیلا کورا“ پکڑ لیا تو میں اپنی شکست تسلیم کر لوں گا۔“

اس کے الفاظ سے مجمع پر ایک لمحے کو سناٹا سا طاری ہو گیا۔ شیواگ اور اس کے ساتھی پرتختے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجمع میں گویا زندگی لوٹ آئی۔ میری فتح پر لوگ خوشی سے اچھلنے لگے۔ وہ دروازے پر قوت عورت جسے میں نے سب سے پہلے شکست دی تھی، آگے بڑھ کر تیزی سے جھکی اور دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے کندھے پر اٹھالیا۔ میں ہاتھ پیر مارا نہ کیا لیکن ان قبائلی عورتوں نے چوک پر میرا جلوس نکال دیا۔ میری فتح پر ان کی خوشی دیکھ کر شیواگ کے بارے میں ان کے جذبات کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

ہستی کے لوگ مجھ سے لپٹے جا رہے تھے ہر شخص اس طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا جیسے میں انہی میں سے ہوں اور میں نے ان کے لیے کوئی بہت بڑا سرگرم کر لیا ہو۔ دھونکی خوشی بھی قابل دید تھی۔ وہ بار بار مجھ سے لپٹ رہی تھی۔ اس کلب میں نہیں چلا تھا کہ مجھے اپنے اندر سمجھتی۔

میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے چنیدہ آزمائی میں اس فیملے کے ایک معتبر شخص کو شکست دی تھی۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوئی چاہیے تھیں لیکن سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ مقابلے کے درمیان بھی لوگ زیادہ تر میری ہی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے اور میری جیت پر تو وہ ناچ رہے تھے خوشیاں منا رہے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان کے دلوں میں شیواگ کے لیے کتنی نفرت تھی۔

یہ ہنگامہ ابھی جاری تھا کہ کاشی کی محافظ بالا کسی طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ دو نیزہ بردار مرد بھی تھے۔ بالا اور ان دونوں نیزہ برداروں کو دیکھ کر لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ بالا میرے سامنے آکر رک گئی۔

”تمہیں کاشی نے طلب کیا ہے ابھی اسی وقت۔“ اس کا لہجہ بالکل سیات تھا۔ میں بالا کے ساتھ چل پڑا۔ دھونکیو بھی آگے بڑھیں

توپالا نے انہیں روک دیا۔

”تم لوگ نہیں۔“ اس نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم لوگ نہیں ٹھہرو یا اپنے جموینوزے میں چلی جاؤ۔ کاشی ضروری سمجھے گی تو تم لوگوں کو بھی بلا لے گی۔“

دھونکے چہرے کے آثار اثرات مجھ سے لپکے وہ بولی کچھ نہیں۔ میں اور بالا ساتھ ساتھ تھے اور دونوں نیزہ بردار ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

کاشی کا جموینوزہ ہستی کے مرکزی چوک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ جموینوزہ دوسرے جموینوزوں کے مقابلے میں خاصا بڑا تھا۔ باؤنڈری وال نے اچھی خاصی جگہ گھیری ہوئی تھی۔ ایک محافظ بیرونی دروازے کی اندر کی طرف صحن میں موجود تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں نیزہ بردار بھی وہیں رک گئے اور میں بالا کے ساتھ تقریباً دس گز کا مزید فاصلہ طے کر کے جموینوزہ کے دروازے میں داخل ہو گیا جس کے سامنے پرآمدے کی طرح ساتباں بھی بنا ہوا تھا۔

یہ ہال نما کمرہ خاصا بڑا تھا۔ اس کی دائیں طرف ایک مختصر سی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک اور کمرہ تھا جس کے دروازے پر پاک کی کھال کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ بالائے پردہ ہٹا کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں رک گئی۔

میرے ذہن میں اس حویلی کا تصور ابھر آیا جس کی سیر میں نے گزشتہ رات کی تھی لیکن یہ جموینوزہ اس حویلی سے بہت مختلف تھا۔

یہ کمرہ بھی خاصا وسیع تھا۔ فرش پر پاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سنگل صوفے کی طرح لکڑی کی ایک بھدی سی کرسی پر کاشی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایسی ہی دو کرسیاں اور بھی بڑی تھیں۔

کرسی کی پشت اوپری تھی اور کاشی دونوں بازو ہتھوں پر ٹکائے بڑی ٹھنکت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہیں۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آگئی تھی۔ مجھے بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ فیملے کی سردار کے سامنے پیش ہونے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ تاہم کاشی نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ آگے بڑھایا تو میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کی پشت پر ہوسہ دیا اور موتو بانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ کاشی کل صبح ہمارے جموینوزے میں آچکی تھی۔ اس وقت اس کا انداز بے محظافہ تھا۔ رات کو۔ لیکن میں رات کا ذکر بار بار نہیں کروں گا۔۔۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس وقت مجھ پر کاشی کا

درب سا طاقی ہو رہا تھا۔

”جھینو۔“ اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں جھینو ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کاشی اس سرے میں اکیلی نہیں تھی۔ دائیں طرف ایک دروازے کے قریب ایک نوجوان خادمہ بھی کھڑی تھی۔ دروازے کے سامنے پروے کے بجائے رنگ برنگے موتیوں کی لاتعداد بھالیں لٹکی ہوئی تھیں اور یہی بھالیں پردے کا کام بھی دے رہی تھیں۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر دیوار کے قریب اسٹون کی طرح چوتھرے پر شیشے کا ایک بڑا سا منڈکا رکھا تھا جس میں رنگ برنگی پچھلیاں تیر رہی تھیں۔

کاشی نے دروازے کے قریب کھڑی ہوئی خادمہ کو اشارہ کیا وہ اندر چلی گئی اور تھوڑی سی دیر بعد لکڑی کی ایک طشتی میں عتابی رنگ کے مشروب سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آئی۔ دونوں گلاس اس نے کرسیوں کے درمیان رکھی ہوئی کافی ٹیبل قسم کی بھدی سی میز پر رکھ دیے۔ کاشی نے ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھادیا۔

”لو بیو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”اس کا ذائقہ تمہارے لیے اچھی نہیں ہے۔“

میں اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں رات کا منظر ابھر آیا۔ کاشی نے اسی طرح مجھے مشروب پیش کیا تھا۔ گویا گزشتہ رات اس سے میری ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ شان دار حویلی کمروں کی، یواروں اور کھڑکیوں پر لہراتے ہوئے رنگ برنگے وہ رہتی پرہیزہ وہ سب کچھ کیا تھا؟ اگر وہ خواب تھا تو کیا خواب میں نظر آنے والی ہستی بھی جانتی ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے کے روبرو موجود تھی۔ نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ تو پھر کاشی کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہ مشروب پہلے بھی پنی چکا ہوں۔

ہم میں ابھی گفتگو کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ کاشی مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وجہ اس کا وہ لباس تھا۔ گھٹنوں سے اوپر کھال کا اسکرٹ اور سینے پر سامنے پاک ہی کی کھال کا مختصر سا ٹکڑا۔

اچانک ایک چھٹکا سا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ کاشی بھی ایک لمحے کو بدحواس سی ہو گئی تھی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا اور مجھے اپنا دل کپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دیوار کے ساتھ چوتھرے پر رکھا ہوا شیشے کا منڈکا نوٹ کر بکھر گیا تھا۔ پانی چاروں طرف بہ گیا اور رنگ برنگی پچھلیاں

زمین پر ترسے لگیں۔

میری طرح کاشی بھی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کو دھواں ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ میں زمین پر تڑپتی ہوئی پھیلیں کو اٹھانے کے لیے لپکا تو کاشی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے بھیچتی ہوئی اس کمرے میں ٹھس گئی جس کے دروازے پر رنگ برنگے موتیوں والی جھالریں لگی ہوئی تھیں۔

یہ خواب گاہ بھی جس میں دائیں طرف لکڑی کے ایک تخت پر پاک کی کٹھالوں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ پیچھلی طرف ایک کشادہ کھڑکی تھی۔ اس کے سامنے بھی موتیوں والی جھالریں لگی ہوئی تھیں۔ پینٹ کے سامنے دو آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے چوڑا بنا ہوا تھا۔ کمرے میں ضرورت کی اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

”بیٹھو۔“ کاشی نے چوڑے کی طرف اشارہ کیا اور باہر کھڑی ہوئی خادمہ کو بلا کر دوسرے کمرے سے منگے کے نکلے اور پھیلیاں اٹھ لینے کا حکم دیا۔

کاشی پینٹ پر چڑھ کرشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”اس شیطان کو تیرا چل گیا ہے کہ تم یہاں آئے ہو۔“

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لیکن یہ کمرہ محفوظ ہے۔ یہاں اس کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب چاہے، تمہیں اس کمرے تک محدود کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ کاشی بولی ”غلطی میری تھی۔“

تمہارے یہاں آنے سے پہلے مجھے بندوبست کر لینا چاہیے تھا۔ بہر حال اس وقت ہم یہاں محفوظ ہیں اور اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔“

”کیا تمہیں یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی ہماری کوئی ملاقات ہوئی تھی؟“ میں نے نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ دراصل میں گزشتہ رات کی ملاقات کا حال جاننا چاہتا تھا۔

”ہاں۔ کل صبح تمہارے جھوپڑے میں ملاقات ہوئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں۔ اس کے علاوہ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کاشی نے جواب نہیں دیا۔ وہ میرے اس سوال پر محض مسکرا کر رہ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن ایک بات اور۔“ میں نے کہا۔ میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں ”شیواگ کو تم

سے کس بات پر اختلاف ہے؟“

”وہ نہایت کمینہ اور غیبت خیز شخص ہے۔“ کاشی نے جواب دیا ”کسی سے اختلاف کے لیے وہ کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کے ساتھ لوگوں کا رویہ تم نے آج دیکھ لیا۔ تم انہی سے ہو اور وہ اس قبیلے کا ایک فرد۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں مگر اس ہستی کے لوگوں نے ایک انجی کی جیت کا جشن منایا۔“

”اس کی وجہ بھی میں سمجھ سکتا ہوں لیکن وہ تم پر یہ الزام لگاتا ہے کہ سردار منتخب ہونے سے پہلے تمہیں۔“ میں ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ میں کھلے الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا ”میرا مطلب ہے، تم نے ایک اہم شرط پوری نہیں کی تھی جس کی وجہ سے قبیلے پر عذاب نازل ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے؟“

کاشی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”وہ شیطان ہر شخص سے یہی کہتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ اس کا اندازہ تم نے آج لگالیا ہو گا۔ اس کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں۔“

”لیکن اگر ایک بھونکی بات بھی بار بار دہرائی جائے تو اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے اور لوگ اس کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لوگ حقیقت کو سمجھتے ہیں۔“ کاشی نے کہا ”جس شخص کے حوالے سے شیواگ نے مجھ پر الزام لگایا تھا وہ بار بار اس کی تردید کر چکا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ شخص مرادہ صلاحیتوں سے محروم ہے اس لیے اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ وہ۔“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا پھوڑ دیا۔

”قبیلے کی بہت سی عورتیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔“ کاشی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”بہر حال، یہ ایک مختلف موضوع ہے اور تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنے مقصد پر توجہ دینی چاہیے جس کے لیے تم اتنا طویل اور ٹھنکن سفر کر کے آئے ہو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔“

میرے دماغ میں ایک بار پھر سنسنیٹ ہونے لگی۔ گزشتہ رات کی ملاقات خواب بھی یا حقیقت؟ اب وہ ساری باتیں دہرائی جا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ بہر حال، میں ان باتوں کو دہرانے کی کوشش

نہیں کروں گا۔ لب لباب یہ تھا کہ کاشی اور اس کا یہ قبیلہ صدیوں سے اس راستے کے محافظ کے فرائض انجام دے رہا تھا جو نیلنگی کی طرف جاتا تھا۔ نیکو جمیل کے کنارے پر آباد یہ قبیلہ ان برف پوش چوٹیوں کو بہت مقدس اور پوتر سمجھتا تھا اور ان کے عقیدے کے مطابق ان برف پوش چوٹیوں میں ایک ایسی مہمان خانیٰ خوابیدہ تھی جو اگر کسی غلط آدمی کے ہاتھوں میں چلی جاتی تو جمیل کا پانی اس ہستی اور قبیلے کو نکل جاتا۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ خفگی چونکہ مونٹ تھی اس لیے نیکو قبیلے کی سرداری کے لیے بھی ایک ایسی عورت کو منتخب کیا جاتا تھا جو کنواری ہو۔ سردار منتخب ہونے سے پہلے وہ کسی مرد کے پاس نہ لگتی ہو۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر یکایک ایک شیطان فطرت آدمی ان برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے میں کامیاب ہو گیا۔ شیواگ نے قبیلے کی رسموں سے بغاوت کر کے اس شیطان کی مدد کی تھی اور اس کی شیطانی قوتوں کے زیر اثر آ گیا تھا اور وہ کاشی کی مخالفت کر رہا تھا۔

قبیلے کی سردار منتخب ہونے والی عورت کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اکیس روز کا ایک جاپ کرے اور دراصل یہ جاپ ہی کاشی کو اب تک بچانے ہوئے تھا۔

ہماری گفتگو خاصی طویل ہو گئی تھی۔ میں اٹھ رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے ایک اور بات یاد آئی۔

”یہ نیلا کو برا کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس نے تمہیں چیخو کیا ہے۔“ کاشی بولی ”نیلا کو برا وہ زہریلا سناپ ہے جس کا کاٹنا پانی بھی نہیں مانگتا۔ اس سناپ کا زہر اس قدر سریع الاثر ہے کہ انسان کے جسم کو چھوتے ہی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور چند سیکنڈ کے اندر اندر جسم کو نکلے کی طرح سیاہ ہو جاتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”اہم ایک خاص عمل کے ذریعے زہر کے اثر کو روکا جاسکتا ہے اور شیواگ یہ عمل جانتا ہے۔ اسے جب بھی کوئی مشکل پڑتی ہے وہ اپنے حریف کو یہی چیخو دیتا ہے۔ حریف یا تو اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے یا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے میرا مشورہ ہے کہ تمہیں۔“

”مجھے اس کا یہ چیخو قبول ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

کاشی کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کاشی کے جھوپڑے سے نکل کر میں ٹھٹھا ہوا بستی کے مرکزی چوک پر آ گیا۔ بہت سے لوگ وہاں موجود تھے مگر شوبھا وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ میں اپنے جھوپڑے کی طرف چل پڑا۔ ایک عورت بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

”تم نے شیواگ کا چیخو قبول کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر تم چاہو تو میں شیواگ کو یہ چیخو واپس لینے پر آمادہ کر سکتی ہوں۔“

”اس کے لیے شرط کیا ہوگی؟“ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں اس کے حق میں اپنی ایک عورت سے دستبردار ہونا پڑے گا اور شام سے پہلے پہلے یہ ہستی چھوڑنی ہوگی۔ اس کے چند آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے جو تمہیں یہاں سے دو دن کی مسافت پر چھوڑ دیں گے۔“

”اس ہستی میں عورتوں کی کمی تو نہیں پھر اس نے میری ساتھی کسی عورت پر نظریں کیوں گاڑ رکھی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”اے تمہاری وہ عورت پسند آگئی ہے جو آج تمہاری جیت کی خوشی میں ناچ رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کا اشارہ دھنوک کی طرف تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قبیلے کی عورتیں بے حد حسین تھیں لیکن دھنوک بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ملوکی حسن کی مالک تھی۔ اس کی معصومیت نے بھی اسے کچھ زیادہ ہی حسین بنا دیا تھا۔

”تم شیواگ کی وکالت کیوں کر رہی ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”وکالت نہیں کر رہی۔ میں نے اس کا پیغام تم تک پہنچایا ہے اور اگر تم چاہو تو اپنی اس عورت کے بدلے تم مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”شیواگ کو شاید اپنی شکست کا خوف ہے اسی لیے وہ مجھے مقابلے سے دستبردار کرانا چاہتا ہے۔ تم نے اس کا پیغام پہنچا دیا۔“ شکر ہے! اس سے کہنا، میں شام کو چوک پر پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔

وہ عورت وہیں رک گئی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیز چلتا رہا۔

دھنوک وغیرہ جھوپڑے میں موجود تھیں۔ وہ مجھ سے کاشی

تے ہوئے والی اس ملاقات کے بارے میں سوال کرتی رہیں  
 اور میں نیگرمی کا ذکر بیچ میں لائے بغیر مناسب انداز میں ان  
 سے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔  
 دوپہر کا کھانا ہمیں جھونپڑے ہی میں پہنچا دیا گیا۔ کھانے  
 کے بعد مجھ پر غنڈو کی سی طاری ہوئے لی اور میں سو گیا۔  
 جب بیدار ہوا تو سپر ڈھل رہی تھی۔ جھونپڑے میں  
 کوئی نہیں تھا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ شوبھا اور مارتھا جمیل  
 کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر  
 دیکھا۔ دھونکس نظر نہیں آئی۔  
 ”دھونکس کہاں ہے؟“ میں نے شوبھا کے قریب رک کر  
 پوچھا۔  
 ”بستی میں کسیں گھوم رہی ہوگی۔“ شوبھا نے جواب دیا  
 ”آج اس نے یہاں کی لوگوں کو دوست بنالیا ہے۔ تمہارے  
 سوجانے کے بعد کو گنا نام کی ایک عورت یہاں آئی تھی۔ وہی  
 دھونکس اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“  
 میں کچھ ان کے قریب ہی ایک پتھر بیٹھ گیا۔ جمیل میں  
 بہت دور تین چار کشتیاں تیر رہی تھیں۔ یہ بستی کے ماہی  
 گیروں کی کشتیاں تھیں۔ مچھلی بھی قلیل والوں کی خوراک کا  
 ایک اہم جزو سمجھی جاتی تھی۔  
 میری نظریں ان کشتیوں سے آگے بہت دور ایک ٹاپو پر  
 جی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں وہ کوئی چھوٹا سا جزیرہ تھا  
 جس پر درخت بھی نظر آرہے تھے۔ اس جزیرے کے بارے  
 میں رستو کی نہ بھی مجھے بتایا تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی  
 اور بستی کے لوگ اس طرف جاتے بھی نہیں تھے۔  
 سورج جمیل کے اس پار پہاڑوں پر چھلنے لگا تھا۔ ہمیں  
 باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔  
 ”ارے یہ دھونکس کہاں نائب ہوئی؟“ میں نے ادھر ادھر  
 دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”میرا پتا نہ رہی ہوگی۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“  
 شوبھا نے جواب دیا۔  
 میں پھر جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔ ماہی گیروں کی کشتیاں  
 واپس آ رہی تھیں۔  
 سورج پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے چھب گیا تھا۔ کچھ دیر  
 تک افق پر سرخی تیری رہی اور پھر یہ سرخی شام کے دھندلے  
 میں ڈھلنے لگی۔ میں بار بار دھونکس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ  
 کوئی اتنی بڑی بستی تو نہیں تھی جس کی سیر میں کی گھنٹے لگ  
 جائیں۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔  
 شوبھا اور مارتھا کے چروں پر بھی اب پریشانی کے آثار تھے۔

آئے تھے۔  
 ہم تینوں وہاں سے اٹھ کر بستی میں آئے اور مختلف  
 گھروں میں گھومتے ہوئے مرکزی چوک پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت  
 سے لوگ جمع تھے۔ میں دھونکس تلاش کر رہا لیکن وہ کسیں نظر  
 نہیں آئی۔  
 مرکزی چوراہے پر چاروں طرف مشعلیں جل رہی  
 تھیں اور چوک کے عین وسط میں بنے ہوئے چوترے پر ایک  
 صندوق رکھا ہوا تھا جو پاک کی کھال سے ڈھکا ہوا تھا۔ لوگ  
 چوترے کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔  
 ”وہ وہ دیکھو، کو گنا کھڑی ہے۔“ شوبھا نے میرا بازو پکڑ  
 کر ایک طرف متوجہ کیا ”دھونکس اس کے ساتھ آگئی تھی۔ اس  
 سے معلوم کرو۔“  
 میں نے اس طرف دیکھا تو چوک گیا۔ یہ وہی عورت  
 تھی جس نے دوپہر کو مجھے شیواگ کے حق میں مقابلے سے  
 دستبردار ہونے کو کہا تھا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا اور  
 قریب پہنچ کر کو گنا کو بازو سے پکڑ لیا۔  
 ”دھونکس کہاں ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں  
 جماتے ہوئے کسی قدر کثرت لہجے میں پوچھا۔  
 مجھے دیکھ کر کو گنا غصہ سا ہوئی۔ اس کے چہرے پر  
 ایک رنگ سا اگر گڑ گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر  
 قابو پایا۔  
 ”کون دھونکس؟“ وہ ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف  
 دیکھنے لگی۔  
 ”میری دوست۔۔۔ جسے تم دوپہر کو اپنے ساتھ لے کر آئی  
 تھیں۔“ میں نے کہا۔  
 ”وہ وہ تو چلی گئی تھی۔ بستی کے باہر۔ اس طرف۔“  
 اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔  
 میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک آدمی اسے  
 بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔  
 میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں  
 دھونکس کی تلاش میں کسی اور طرف جاتا ایک شور سا مچا اور  
 ادھر ادھر پھیلے ہوئے لوگ بھی چوترے کے گرد جمع ہونے  
 لگے۔  
 شیواگ ڈھکے ہوئے صندوق کے قریب چوترے پر  
 کھڑا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی بھی چوترے پر چڑھ کر صندوق کی  
 دوسری طرف کھڑا ہو گیا اور دو منٹ بعد ہی کاشی بھی پالا اور  
 دو منٹ کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ قریب کھڑا ہوا ایک آدمی  
 نے نچڑکھڑا چوترے پر لے لیا۔

اس بوڑھے آدمی نے ادنیٰ آواز میں لوگوں کو مخاطب  
 کرتے ہوئے کچھ کہا اور صندوق پر پڑی ہوئی کھال اٹھا دی۔  
 مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ  
 صندوق نہیں، ایک بجنہ تھا اس کے چاروں طرف اور اوپر  
 بھی باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ اوپر والے حصے پر ایک اتنا بڑا  
 سوراخ تھا کہ ایک ہاتھ اندر ڈالا جاسکتا تھا۔ اس سوراخ پر  
 لکڑی کا ڈھکنا لگا ہوا تھا۔  
 بجنے میں کوئی درجن بھر ناگ بھرتاگ بچکا رہے تھے۔ ان  
 میں نیلے رنگ کا ایک کورا بھی تھا۔ اس کا پھلکا ہوا نیلا رنگ  
 آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا لیکن اس کے اندر وہ زہر بھرا  
 ہوا تھا کہ اس کے ڈس لینے سے آدمی کو دو سراسر سانس لینے کا  
 موقع بھی نہیں ملتا تھا۔  
 کوئی بھی سانپ لمبائی میں ڈھائی تین فٹ سے کم نہیں  
 تھا۔ وہ بل کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔  
 نیلے کورے کی لمبائی بھی ڈھائی تین فٹ کے قریب اور موٹائی  
 دو انچ کے قریب تھی۔ وہ ان سب میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔  
 ”ان میں ہر ناگ اس قدر زہریلا ہے کہ اگر بائیس کو  
 ڈس لے تو وہ بھی ڈھیر ہو جائے۔“ قریب کھڑے ہوئے  
 بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”نیلا کورا ان کا  
 شمشہہ ہے۔ اس کا زہر آن کی آن میں شکار کو راکھ کا ڈھیر بنا  
 دیتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر  
 نظریں جماتے ہوئے بولا ”پیلے شیواگ بجنے میں ہاتھ ڈال  
 کر نیلے کورے کو باہر نکالے گا۔ اسے دو منٹ اپنے ہاتھوں  
 میں رکھے گا اور پھر بجنے میں ڈال دے گا۔ اس کے بعد  
 تینیس بجنے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کورے کو باہر نکالنا ہوگا  
 لیکن اگر تم چاہو تو آخری لمحے پر بھی مقابلے سے دستبردار ہو  
 کر اپنی شکست تسلیم کر سکتے ہو۔“  
 ”میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے کاشی کی  
 طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر مسنی کے تاثرات  
 واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔  
 بوڑھے نے اعلان کیا کہ پہلے شیواگ بجنے میں ہاتھ  
 ڈال کر نیلے کورے کو پکڑے گا اور اس کے بعد انجینی کی باری  
 آئے گی۔  
 شیواگ آگے گیا۔ اس نے ڈھکنا اوپر اٹھا کر ہاتھ اندر  
 ڈال دیا۔ بجنے کے اندر کھلبلا تے ہوئے کورے اس کے  
 بازو سے لپٹنے لگے۔ اس نے نیلے کورے کو پکڑنا چاہا تو وہ مچھلی  
 کی طرح پھسل کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن بالآخر اس  
 نے نیلے رنگ کو گردن سے پکڑ کر بجنے سے باہر نکال دیا۔

اپنے بازو پر چھوڑ دیا۔ کورے۔۔۔ دو شاخہ زبان لہراتا ہوا اس کے  
 بازو کے ساتھ لپٹ کر اوپر کندھے کی طرف جانے لگا اور پھر وہ  
 گردن پر سے ہوتا ہوا دوسرے کندھے پر آگیا۔  
 ہمارے چاروں طرف بیسیوں لوگ کھڑے تھے مگر  
 خاموشی ایسی تھی جیسے وہاں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ لوگوں  
 کے چروں پر دشت اور سنسنی کے طے جلتے تاثرات نمایاں  
 تھے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے ”سانپ سو گھ جانا“ کا  
 محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔  
 دو منٹ گزر گئے۔ بوڑھے کے کہنے پر شیواگ نے ناگ  
 کو دوبارہ بجنے میں ڈال دیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر  
 فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔  
 ”اب نیلے کورے کو پکڑنے کی تمہاری باری ہے  
 انجینی۔“ بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دو بے اگر  
 تم چاہو تو شیواگ کے پیر چھو کر اب بھی مقابلے سے دستبردار  
 ہو سکتے ہو۔“  
 میں دو قدم آگے بڑھا کر بجنے کے پاس گیا۔ سوراخ  
 کا ڈھکنا اٹھا کر کاشی کی طرف دیکھا اور بجنے میں ہاتھ ڈال  
 دیا۔  
 کئی سانپ میرے بازو سے لپٹ گئے۔ ایک دو سانپ  
 ایسے بھی تھے جنہوں نے مجھے ڈسنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔  
 بازو پر دو تین جگہوں پر مجھے سوئی کی جھین کا سا احساس ہوا  
 تھا۔  
 میں نے نیلے کورے کو پکڑنے کے لیے اس کی طرف  
 ہاتھ بڑھایا تو وہ پھٹکارا ہوا پھن پھیلا کر میرے سامنے آدھے  
 قد سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم کا بائیں حصہ کنڈلی کی طرح بل  
 کھائے ہوئے تھا۔  
 میں آہستہ آہستہ ہاتھ کو اس کے سامنے ہلانے لگا۔ اس  
 نے حملہ کر دیا۔ ہاتھ کی پشت پر سوئی سی جھبی اور پھر میں نے  
 نیلے کورے کو گردن سے پکڑ کر بجنے سے باہر نکال لیا۔  
 اس وقت بھی ہر طرف گمراہ سناٹا چھا گیا۔ ہر چہرے پر  
 مسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔  
 میں نے نیلے کورے کو گلے میں ڈال کر دونوں ہاتھ اوپر  
 اٹھا دیے۔ ایک دم شور سا اٹھا۔ لوگ خوشی سے نعرے  
 لگانے لگے۔ میں نے کاشی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے  
 کھڑی تھی۔ شور سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر  
 اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے چلی گئی۔  
 نیلا کورا ہمارے کی طرح میرے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی  
 دو شاخہ زبان بار بار لپک رہی تھی۔ میں نے اسے گردن سے

پکڑ کر اپنے سے الگ کیا اور اسے گھما سنا کر ہوا میں اچھال دیا لیکن زمین پر گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے دوبارہ پکڑ لیا۔

نیلکا کو باج پانچ منٹ تک میری ہانپوں، گردن، سینے اور پشت پر رہتا رہا اور پھر میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ بچرے میں ڈال دیا اور جب مڑ دیکھا تو شیواگ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کاشی نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر پوسہ دیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگی۔ لوگوں نے نعرے لگا کر اس کی باتوں کا جواب دیا اور ”شیواگ، شیواگ“ کہتے ہوئے اوہ اوہ اور پھیل گئے۔ وہ شیواگ کو تلاش کر رہے تھے۔

کاشی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر پھینچتی ہوئی اپنے بھوپڑے میں لے آئی۔ مار تھا اور شوہا بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ کاشی کے محافظ باہری رک گئے تھے۔ تاہم بال اندر آگئی تھی۔

میرے بازوؤں پر جہاں جہاں سانپوں نے ڈسا تھا وہاں وہاں خون کے ننھے ننھے قطرے چپکنے لگے تھے۔ کاشی نے میری طرف دیکھا، میرا ایک بازو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور ہونٹ اس جگہ لگا دیے جہاں خون کا ایک قطرہ چمک رہا تھا۔

میں نے کاشی کو پیچھے ہٹانا چاہا مگر اس نے میرے تمام زخموں سے خون چوس لیا اور اس طرح لہانے لگی جیسے شراب کی کٹی بوتلیں چڑھا گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک دم سرخی بھر گئی تھی اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگی۔ وہ بدست شرابی کی طرح لہرا رہی تھی۔ میں اسے سمارا دے کر گھٹیتا ہوا خواب گاہ میں لے آیا اور اسے بستر پر لٹا دیا۔

میرے خون میں ان زہریلے سانپوں کا زہر شامل ہو گیا تھا جسے کاشی نے چوس لیا تھا اور اس پر زہر کا نشہ طاری ہو رہا تھا۔ کاشی کی اس کیفیت سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ زہر خورالی کی عادی تھی اور ناگوں کے زہر نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

شوہا کو بھی میں نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ میرے اپنے اندر اتنا زہر بھرا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی زہر مجھ پر اثر نہیں کر سکتا اور مار تھا تو یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غرق ہوئے جادری تھی۔ اسے اپنی کتاب کے لیے بہت سمنسی خیز دابل رہا تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟“ شوہا نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”سانپ کا زہر تم پر اثر انداز کیوں نہیں ہوا؟“

”یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا ”اس وقت تو میں دھوکے کے لیے پریشان ہوں۔ اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“

کاشی کے بھوپڑے سے نکلے ہوئے میں نے اس کو بھی بتا دیا تھا کہ دھوکہ دہرے غائب ہے۔ ہم اسے تلاش کرنے جا رہے ہیں۔

ہم پوری ہستی میں گھومتے رہے۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہستی کے ایک ایک گھر میں جھانک لیا گیا۔ ہر وہ جگہ جہاں ڈالی کی جہاں اس کے ملنے کی توقع ہو سکتی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا اور میرے لیے مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ مقابلے کے بعد سے شیواگ بھی غائب تھا۔

صبح جب کوٹکانے مجھے مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے کہا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ میں دھوکہ شیواگ کے حوالے کر کے اس ہستی سے چلا جاؤں تو اسی وقت شیواگ کے بارے میں میرے ذہن میں شہادت کے سانپ کللانے لگے تھے۔ دوپہر کو دھوکے غائب ہو جانے کے بعد یہ شہادت قوی تر ہوتے جا رہے تھے اور اب شیواگ کو بھی غائب یا کر میرے شہادت یقین میں بدلنے جا رہے تھے کہ دھوکہ گمشدگی میں شیواگ ہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

کئی لوگ جن میں قبیلے کی عورتیں بھی شامل تھیں، آدھی رات تک دھوکہ تلاش کرتے رہے اور جب ہم مایوس ہو کر اپنے بھوپڑے میں آگئے تو کچھ لوگ اس وقت بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ لوگ ہم سے اظہارِ ہمدردی کر رہے تھے اور بعض ڈھکے چھپے لفظوں میں اور بعض واضح الفاظ میں شیواگ کو ہی دھوکہ گمشدگی کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ شیواگ کی تلاش میں تو کچھ لوگ ہستی سے تقریباً ڈیڑھ میل دور شیواگ کی زمینوں پر واقع اس کے بھوپڑے کی تلاش بھی لے آئے تھے لیکن وہاں نہ شیواگ تھا اور نہ ہی دھوکہ۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ میں، شوہا اور مار تھا بھوپڑے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ ہستی میں ہر طرف سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دھوکہ کی اس پراسرار گمشدگی پر مار تھا تو پریشان تھی ہی، شوہا کی حالت بھی بہت غبر ہو رہی تھی۔ ان کا بہت طویل عرصے کا ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سکی بہنوں کی

طرح چاہتی تھیں۔ شوہا کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔ اچانک وہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی ہمارے بھوپڑے کی پچھلی طرف دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مار تھا اور شوہا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر محتاط انداز میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا لیکن دروازہ کھولنے میں مجھ سے تھوڑی سی بے احتیاطی ہو گئی۔ میرا پیر فرش پر پھینک دیا گیا۔ کھال میں الجھ گیا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں میرا ہاتھ دروازے سے ٹکرا گیا۔

سانے میں دروازے سے ٹکرانے کی آواز دور تک پھیلی تھی اور اسی وقت بھوپڑے کی پچھلی طرف کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور تیزی سے بھوپڑے کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ ایک ہیولا دوڑتا ہوا بائیں طرف تقریباً تیس گز آگے ایک اور بھوپڑے کے اوپر سے گھوم کر لگا ہوں سے او جھل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں قدموں کی آواز کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ایک موقع پر وہ ہیولا میری نظروں میں آ گیا لیکن ایک گلی میں گھس کر بھی نظروں سے او جھل ہو گیا۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز پر اس کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ انسانی ہیولا ہستی کی گلیوں سے نکل کر جھیل کی طرف آ گیا۔ جھیل کا یہ حصہ ہمارے بھوپڑے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے تعاقب کی وجہ سے اسے ہستی میں کہیں چھپنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس طرف آ کر شاید وہ جھاڑیوں میں کہیں غائب ہونا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے تقریباً چالیس گز آگے تھا۔ وہ چپتے کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ قیدِ آدم جھاڑیوں میں چھپ گیا تو میں اسے تلاش نہیں کر سکوں گا۔ میری ساری قوت ناگوں میں سمٹ آئی تھی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔

وہ ہیولا جھاڑیوں کا رخ کرنے کے بجائے جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور پھر اسے ایک جگہ رکتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس جگہ جھیل کے کنارے کے بالکل ساتھ ایک نشی نظر آرہی تھی جو پانی کی لہروں کے ساتھ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہی تھی۔ اسی نشی کی رسی شاید کنارے پر جھاڑیوں سے بندھی ہوئی تھی اور وہ ہیولا جھک کر

وہ رسی کھول رہا تھا۔

میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ وہ ہیولا رسی کھول کر نشی کو پانی کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہمارے درمیان دس بارہ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس ہیولے کے اوپر گر کر۔

وہ جھج میرے لیے بڑی حیرت انگیز ثابت ہوئی تھی اور جب پانی میں گرتے ہی میں نے اس ہیولے کو دبوچا تو اس جھج کے حوالے سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ میں جس کا تعاقب کر رہا تھا وہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ کوئی عورت اس قدر تیز رفتار بھی ہو سکتی ہے لیکن مجھے زیادہ دیر تک حیران ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس عورت کا بھرپور گھونسا میری کینٹی پر لگا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے ستارے سے نانے لگے۔

ہم اس وقت جھیل کے کنارے کے بالکل ساتھ تھے۔ پانی میری بندلیوں تک تھا۔ گھونسا کھا کر میں لڑکھڑایا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ مجھے زوردار دھکا دے کر پشت کے بل پانی میں گرادیا اور نشی کی طرف لپکی۔

میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ابھی نشی سے دو تین فٹ دور تھی کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں پانی میں ایک دوسرے سے ٹھٹھکتا ہو گئے۔

مجھے اعزاز کرنا پڑا کہ وہ عورت ہونے کے باوجود کسی مرد کی طرح طاقت ور اور پھرتلی تھی۔ ہم لڑتے ہوئے پانی سے نکل کر کنارے پر جھاڑیوں میں آ گئے۔

اس قبیلے کی لمبی ترنگی عورتوں کو دیکھ کر اندازہ تو ہوتا ہی تھا کہ وہ بڑی جفاکش قسم کی ہیں اور یہ پہلی عورت تھی جس سے مجھے اس طرح واسطے پڑا تھا۔ ایسی مردمار عورتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ ایک مرتبہ تو اس نے مجھے سرے اوپر اٹھا کر جھاڑیوں میں چننا دیا تھا۔

میں ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کی بہادری کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اگرچہ طویل مقابلے کی سکت رکھتی تھی لیکن میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جسم کر مقابلہ کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر پانی میں چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اسے نشی کے قریب پھینکنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ اس مرتبہ میں نے اسے اس طرح گرفت میں لیا تھا کہ اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ تاریکی کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا اور میرے دماغ میں سنسنی پھیل گئی۔

وہ کوٹھا تھی۔

”تو اس سازش میں تم بھی شریک ہو۔“ میں نے کوٹھا کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر گرفت میں لیے ”جناؤ دھونکناں ہے؟ اگر تم نے جواب نہیں دیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”تمہاری عورت شیواگ کے قبضے میں ہے لیکن میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ وہ کہاں ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ صبح ہوئے ہی یہ بستی چھوڑ دو۔ ورنہ۔۔۔“

میں نے اسے بات عمل کرنے کا موقع دیے بغیر اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر پانی میں غوطہ دیا۔ وہ جب سیدھی ہوئی تو بری طرح چیخنے لگی۔ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی نرمی اختیار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر اسے موقع مل جاتا تو اب تک مجھے موت کے گھاٹ اتار چکی ہوتی اور پھر یہی وہ عورت تھی جس کی وجہ سے دھونکی مصیبت میں مبتلا تھی۔ کوٹھا ہی دھونکو کی طرح ہلکا پھلکا اپنے ساتھ لے گئی تھی اور میں اس کا لحاظ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

”نن۔۔۔ نہیں بتاؤں گی۔“ اس نے چیخنے ہوئے کہا۔ میں نے اسے ایک اور غوطہ دیا۔ اس مرتبہ وقت ذرا زیادہ دیا۔ وہ پھلنے لگی تو میں نے اس کا سر پانی سے نکال لیا۔ پانچواں غوطہ کھانے کے بعد ہی وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوئی تھی۔

”دھ۔۔۔ وہ اسے جزیرے پر لے گیا ہے۔“ اس نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”اس جزیرے پر کوئی آبادی نہیں ہے۔ اس طرف کوئی نہیں جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہاں بد روحوں نے ڈیرے بٹھا رکھے ہیں۔ کئی برسوں سے وہ جزیرہ ویران ہے۔ شیواگ اسے وہیں لے گیا ہے۔“

”اس کے ساتھ اور کون کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہنگ کے سوا کسی اور کو میں نے اس کے ساتھ جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“ کوٹھا نے جواب دیا۔

”ابھی تم بھی وہیں جانے والی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ کوٹھا نے جواب دیا ”اس نے تمہاری خرابی کی ذمہ داری مجھے سونپ رکھی تھی۔ میں اس وقت جزیرے پر جانے کے لیے ہی اپنے جھونپڑے سے نکلی تھی۔ تمہارے جھونپڑے کی طرف سے گزرتے ہوئے اچانک یہی یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ تم لوگوں کی کچھ باتیں بھی سن لی جائیں اور یہی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ نہ میں اس طرف جاتی، نہ تمہیں میرا پیچھا کرنے کا موقع ملتا لیکن۔۔۔ تم ایک بات ذہن نشین کر لو۔

تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ ایک بہت بڑی ہتھی اس کی پشت پر ہے۔ وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی اس عورت کو بھول جاؤ اور اپنی کھال بچا کر میاں سے بھاگ جاؤ۔“

باتوں کے دوران میں، میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے کیونکہ اب مجھے اس سے کسی شرارت کی توقع نہیں تھی لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے موقع پا کر اچانک ہی کھلی پھینکی سے میری ناک پر زور دار ضرب لگائی۔ میں کراہتا ہوا لڑکھڑا کر پشت کے بل پانی میں گر گیا۔ یہ ضرب کسی دہائی کی طرح لگی تھی۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا اور ناک سے خون بہہ نکلا۔

کوٹھا نے کشتی کی طرف چھلانگ لگا دی جو اس دوران میں ہلکی لہروں پر بہتی ہوئی وہاں سے تقریباً دس بارہ فٹ دور جا چکی تھی۔ پانی میں ایک چھلانگ لگانے کے بعد وہ پھلکی کی طرح تیزی سے تیرنے لگی۔

میں نے بھی سنبھل کر چھلانگ لگا دی اور بڑی تیزی سے تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس جگہ پانی میرے سینے کے برابر تھا اور تیرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

ادھر کوٹھا نے کشتی پر ہاتھ ڈالا، ادھر میں نے پیچھے سے اس کا ایک پیر پکڑ لیا اور اسے پیچھے کھینچنے لگا۔ کوٹھا کشتی کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے میری طرف چلی۔ پانی میں اس کی یہ فلپ بازی حیرت انگیز تھی۔ وہ میرے اوپر آ رہی اور دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ کر سر کو پانی میں دبائے لگی۔

میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو پانی سے باہر نکالا۔ میرے اوپر کوٹھا کے پنج ایک بار پھر معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ کبھی وہ مجھے پانی میں دبا دیتی اور کبھی میں۔ لیکن بالآخر وہ پوری طرح میری گرفت میں آ گئی۔ میں اسے پانی میں غوطے دینے لگا۔ آخری مرتبہ میں نے اس کا سر پانی میں ڈبوایا تو پھر نہیں اٹھنے دیا۔ وہ پانی میں بری طرح چل رہی تھی لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہو گئی۔

میں اسے بالوں سے پکڑ کر پانی میں کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور اس کی لاش پانی سے نکال کر جھاڑیوں میں ڈال دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس طرح کسی عورت کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی بہادری نہیں لیکن میں اگر اس کا لحاظ کرتا تو وہ میرا ہی حشر کرتی۔

میں چند لمحوں کے کنارے پر بیٹھا رہا پھر پانی میں اتر کر کشتی کے قریب آ گیا۔ یہی کشتی درخت کے بہت بڑے تنے کو کھوکھلا

کر کے بنائی گئی تھی اور اس میں تین چار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کشتی کے اندر چپو بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کشتی میں بیٹھ کر چپو سنبھال لیے اور اسے تیزی سے گمرے پانی کی طرف کھینچے لگا۔

تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آج دن میں چونکہ میں نے وہ جزیرہ دیکھا تھا اس لیے محض اندازے کی بنا پر کشتی کا رخ اس طرف رکھتے ہوئے تھا۔

مجھے کشتی رانی کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے زندگی میں کبھی شوقیہ طور پر کشتی چلائی ہو لیکن یہ کشتی تو بہت مختلف تھی۔ درخت کا کھوکھلا تانبہ جس کا توازن برقرار رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کئی مرتبہ تو کشتی اٹلنے اٹلنے لگتی تھی لیکن میں نتائج کی پروا کیے بغیر تیزی سے چپو چلا رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد تاریکی میں جزیرے کا ہیولا دکھائی دینے لگا لیکن وہ اب بھی بہت دور تھا اور میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں تک پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹہ اور لگتا۔

جھیل کی سطح پر سکون تھی۔ مجھے چپو چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی لیکن اچانک ہوا کا رخ بدل گیا اور اس میں تیزی آتی گئی۔ پہلے تو ہوا پیچھے سے مجھے دھکیل رہی تھی لیکن اب سامنے سے میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے جھیل کی پر سکون سطح پر تیز لہروں اٹھنے لگیں۔ ہوا جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی، لہروں کی تندی بھی بڑھ رہی تھی۔

اور پھر وہ ہوا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ جھیل میں اٹھتی ہوئی لہروں سمندر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ کشتی کے آس پاس جھیل کا پانی دائرے میں گھومنے لگا۔ یہ صورت حال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں کشتی کو گردش کرتی ہوئی لہروں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سمندر خوفناک صورت اختیار کر گیا۔

کشتی بہت تیزی سے سمندر میں گردش کر رہی تھی۔ چپو میرے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ ایک چپو تو کشتی کے اندر گرا تھا اور دوسرا باہر چھوٹے ہی دیکھتے ہی لہروں میں غائب ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کشتی کے کناروں کو پکڑ رکھا تھا اور کشتی لٹکی طرح گھوم رہی تھی۔

کشتی الٹ گئی۔ میں پانی میں گر چکا تھا لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور کشتی کے کنارے کو ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ناپید ہوتے ہوئے پانی کے اندر نیچے کی طرف کھینچ رہی ہو۔ مجھے ایک دو غوطے بھی آئے لیکن میں نے کشتی کے کنارے پر مضبوطی سے گرفت جمائے

رکھی۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دو ناپیدہ قوتوں میں جنگ ہو رہی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا لیکن یہ احساس بہت قوی تھا کہ میرے آس پاس کسی قسم کی جنگ ہو رہی تھی۔ پھنکاریں اور غراہٹیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں بہت واضح طور پر یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ آپس میں برسرِ پیکار ناپیدہ قوتوں میں سے ایک میری مدد کرنا چاہتی تھی جبکہ دوسری میری غرقابی پر تلی ہوئی تھی۔

ان پر اسرار قوتوں میں یہ ناپیدہ جنگ دیر تک جاری رہی اور بالآخر سمندر کا زور ٹوٹ گیا۔ ہوا ٹھم گئی اور جھیل کی سطح بھی بتدریج پر سکون ہوئی چلی گئی۔

میں اچانک کشتی میں آ گیا اور تاریکی میں چاروں طرف گھومنے لگا۔ میں اس جگہ سے بہت پیچھے آ گیا تھا جہاں سمندر میں پھنسا تھا۔ میں نے کشتی میں پڑا ہوا چپو اٹھایا اور اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تیزی سے پانی کو پیچھے دھکیلے لگا۔ دوسرے چپو کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں ایک ہی چپو سے کام لے رہا تھا۔ کبھی دائیں طرف سے پانی کو پیچھے دھکیلتا اور کبھی بائیں طرف سے اور حیرت انگیز طور پر کشتی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور ہوا بھی اسے پیچھے سے دھکیل رہی تھی۔

جزیرہ اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ کشتی بہت تیزی سے جزیرے کے قریب پہنچ رہی تھی۔

میں نے ہاتھ روک لیے۔ جزیرے کا ساحل چند گز کے فاصلے پر تھا اور کشتی ہموار رفتاری سے اس طرف بڑھ رہی تھی جبکہ میں بڑی محتاط نظروں سے ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت بلند اور گنجان درخت تھے جو تیز ہوا سے بد روحوں کی طرح جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تیز ہوا اور درختوں کی شاخوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آوازیں دل پر وحشت سی طاری کر رہی تھیں۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ جزیرہ کتنا بڑا ہے اور وہ لوگ کہاں اور کس طرف ہو سکتے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کشتی کو ایک طرف کھینچنا شروع کر دیا۔

کشتی ساحل کی جھاڑیوں سے ٹکرا کر رک گئی۔ میں نے نیچے اتر کر رسی جھاڑیوں سے باندھ دی اور محتاط انداز میں اوپر کی طرف چلنے لگا۔

میں درختوں میں تقریباً نصف میل دور تک چلا گیا۔ یہ جزیرہ کسی بڑے نیلے کی طرح تھا جیسے کوئی پیالہ اونڈھا کر رکھا

گیا ہو۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور بعض جگہوں پر تو درخت اور قد آدم جھانپاں اس قدر گنجان تھیں کہ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

میں ایک جگہ رک گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں اور ان لوگوں کو کہاں تلاش کروں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کھڑے کھڑے حواس تہ کی کیفیت میں چلا گیا۔ ایسے موقعوں پر مجھے حواس تہ سے رہنمائی مل جاتی تھی اور اس وقت بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو تاریکی چھٹ گئی تھی بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ میری آنکھوں میں وہ قوت ابھر آئی تھی جو بلی کی طرح اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ میں اس حیرت ناک تجربے سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ گزر چکا ہوں۔

میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف نشیب میں اترنے لگا۔ اب مجھے راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور چلنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔ اچانک میں رک گیا۔ سامنے تقریباً سو گز دور درختوں میں ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں چند لمحے اس طرف دیکھتا رہا اور پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

درختوں کے درمیان ایک کھلا میدان سا تھا جہاں حویلی نما ایک عمارت نظر آ رہی تھی اور اس کے چائیک کے سامنے ایک مشعل جل رہی تھی۔

میں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ عمارت کے آس پاس کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے چائیک کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکتا۔ دیوار بھی بہت اونچی تھی جس پر چڑھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے اندر داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک قد آدم جھانپاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جھانپوں میں سانپ، بچھو اور دیگر زہریلے حشرات الارض رہتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں ان سے بچ کر چلتا رہا اور بالآخر ایک جگہ رک گیا۔

دیوار میں ایک دروازہ نظر آیا۔ وہ دروازہ کھڑکی سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہاتھ کے معمولی سے دباؤ سے دروازہ کھل

گیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ دوسری طرف بھی قد آدم جھانپاں تھیں۔ میں وہاں رک کر محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے وہ عمارت تھی جس کے آگے برآمدے کی طرح سائبان بنا ہوا تھا اور وہاں ایک مشعل جل رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ جھینگروں کے سوا کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا جس نے میرے اندر بے چینی پیدا کر دی تھی۔ میں جھانپوں سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میرے دماغ میں سنسنی سی ہوری تھی۔ میں جیسے آگے بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہی راہداریاں، ہر راہداری کے موڑ پر جلتی ہوئی مشعل اور وہی محرابی دروازے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس حویلی میں ہر راہداری کے موڑ پر ایک نیزہ بردار عورت بھی کھڑی نظر آتی تھی مگر یہاں کوئی نہیں تھا۔ کیا یہ وہی حویلی تھی جہاں پالا مجھے لے گئی تھی اور کاشی سے طویل ملاقات ہوئی تھی؟

میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ حویلی بستی کے قریب جھیل کے کنارے پر واقع تھی اور یہاں آنے کے لیے مجھے جھیل کے پانی میں طویل سفر کرنا پڑا تھا لیکن ویسا ہی ٹیلا دیوار میں کھڑکی نما دروازہ سائبان نما برآمدہ اور ویسی ہی کشادہ راہداریاں!

میں اس محرابی دروازے کے سامنے کھڑا تھا جس کی دوسری طرف کاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے بھاری دروازے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلنے لگا۔ سانپوں میں دروازے کے چرچانے کی آواز بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا چلا گیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جو خالی تھا تاہم ایک طرف مشعل جل رہی تھی۔ دائیں طرف ایک کمرے سے روشنی بھٹک رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگا اور پھر اچانک کوئی بھاری چیز میرے اوپر گری۔ میں بری طرح بد حواس ہو گیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نزل کھڑا کر گر گیا۔ وہ بوجھ بھی میرے اوپر ہی گرا تھا۔

وہ کوئی اور چیز نہیں بلکہ ایک آدمی تھا جس نے اوپر سے چھلانگ لگائی تھی۔ میرے اوپر یہ حملہ اچانک ہوا تھا اور میں اس کے نیچے دب گیا تھا لیکن میں نے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ٹھیک اسی وقت ایک آدمی نے اوپر سے میرے اوپر چھلانگ لگادی۔

میں ایک بار پھر اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ دونوں مجھ سے متحکم کھتا ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ دونوں نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی تیزی سے گرفت میں لے لیا تھا۔

اسی وقت سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی میری مزاحمت رک گئی۔ دروازے کے عین سامنے کمرے میں پلنگ پر دھوپٹ کے تل پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پلنگ کی پیٹوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور پیٹوں کی بھی یہی صورت حال تھی۔ اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا اور بیشتر جسم پر بند تھا۔ اس کے چہرے سینے اور پیٹ پر خراشوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ دھوکہ دیکھ کر اندازہ لگا جاسکتا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پلنگ کے قریب ہی ایک کرسی نما چوڑے پر شیواگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے کچھ زیادہ ہی پھولی لگ رہی تھیں۔ بے پناہ کینکری برس رہی تھی اس کے چہرے پر۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی کمرہ سی مسکراہٹ آئی تھی۔

دھونے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ بے پناہ کرب کے باوجود مجھے اپنے سامنے پا کر اس کے چہرے پر رونق سی آئی اور آنکھوں میں وحشت کی جگہ چمک نے لے لی۔

”مارو۔ مارو! الوان کو ہمت سکھ۔ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے!“ وہ چیخ اٹھی۔ وہ شاید اٹھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی مگر اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ وہ محض کسماکر رہ گئی۔

”ہمت سکھ!“ شیواگ نے تفقہ لگایا۔ ”وہ تو خود اس وقت بے ہمت ہو رہا ہے۔ تمہیں کیا بچائے گا اور ہمیں کیا مارے گا۔“

وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر میرے پیٹ پر زور دار گھونسا مارا۔ گھونسا ہتھوڑے کی طرح لگا۔ میں ہلکا اٹھا۔ ان دونوں

نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا۔

شیواگ نے دوسرا گھونسا مارا۔ یہ پہلے سے زیادہ طاقت ور تھا لیکن تیسرا گھونسا مارا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے ہاتھ کو بری طرح جھٹکنے لگا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس ہاتھ کی انگلیاں سلواتے ہوئے وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میرے پیٹ کے مسل پتھری طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر بے در پے میرے پیٹ پر گھونٹے برسانے لگا لیکن اس بار مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس شیواگ بار بار اپنا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔

”اب میری باری ہے شیواگ!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ”یل“ (Yell) کرتا ہوا پوری قوت سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے بازوؤں پر ان کی گرفت کچھ اور بھی مضبوط ہو گئی اور ان کی یہ کارروائی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ میں ان کے سارے پر اپنے آپ کو اوپر اٹھا لیا اور پھر میں نے دونوں پیر پوری قوت سے سامنے کھڑے ہوئے شیواگ کے سینے پر دے مارے۔ وہ ہلکا ہوا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل ڈھیر ہو گیا۔

ان دونوں نے میرے بازو مونے کی کوشش کی لیکن پیر زمین پر تلے ہی میں نے اپنے آپ کو دوبارہ اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ مجھے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب میں ان کے بس کا نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو پوری طرح اوپر اٹھالیا اور ان کے اوپر سے الٹی فلا بازی کھاتا ہوا ان کے پیچھے جا کر۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی گرے تھے لیکن میں ان سے پہلے سنبھل گیا۔

وہ دونوں اٹھ کر میری طرف لپکے۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور میری ذیل فلا ٹنگ کنگ نے انہیں پھر ڈھیر کر دیا۔ شیواگ میری طرف لپکا۔ اس وقت میں بھی زمین پر پڑا تھا۔ شیواگ نے میرے اوپر چھلانگ لگائی تو میں نے اسے اپنے پیٹوں پر روک کر پیچھے اچھال دیا۔ وہ ”بھدھ“ کی آواز سے گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

شیواگ کے دونوں آدمی ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے، میں بڑی پتھری سے نیچے بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک مجھ سے ٹکرا کر فلا بازی کھاتا ہوا اور جاگرا اور دوسرا میری ٹانگ سے الجھ کر



وہیں لڑکھڑا کر رہ گیا اور میں نے پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

میری ٹھوکر میں اسے پورے کمرے میں تاجپے پر مجبور کرتی رہیں۔ ایک موقع پر اس کے دوسرے ساتھی نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں اس شخص کو رگیدتا ہوا دیوار تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں، میں نے شیواگ کو ایک طرف پڑے ہوئے نیزے کی طرف لپکتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنے حریف کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ایک ہاتھ سے اسے دیوار کے ساتھ دبا کر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر گھونے برساتے لگا اور پھر اچانک ہی شیواگ کی دباؤ سن کر میں اپنے حریف کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شیواگ کا نیزہ میری پشت میں پیوست ہو جاتا۔ شیواگ پوری قوت سے حملہ آور ہوا تھا۔ نیزہ دیوار سے لگے ہوئے میرے حریف کے سینے کو چیرتا ہوا آئی انچ تک دیوار میں گھس چلا گیا تھا۔ اس شخص کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی ہلکانگ تھی۔

شیواگ کے چہرے پر بے پناہ خوف ابھر آیا۔ وہ بڑی وحشت زدہ سی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھ رہا تھا جو نیزے کے ساتھ دیوار میں ٹنگ گیا۔ شیواگ کا ہاتھ اب بھی نیزے کے دستے پر تھا۔

شیواگ نے نیزے پر سے ہاتھ ہٹالیا اور اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

”ہنگ پکڑو اسے۔ کاٹ ڈالو۔ زندہ مت چھوڑنا۔“  
اب تک کی صورت حال سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ حویلی میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے ایک ختم ہو چکا تھا اور اب میرے سامنے صرف دو رہ گئے تھے اور وہ دونوں بڑے پر جوش انداز میں میری طرف لپک رہے تھے اور یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جوش میں ہوش کام نہیں کرتا۔ میرے لیے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا بہترین موقع تھا اور میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

وہ جیسے ہی قریب پہنچے، میں نے ڈبل فلائنگ لگ سے انہیں دھیر کر دیا اور پھر انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں لاٹوں اور گھونسلوں سے انہیں پورے کمرے میں بچاتا رہا۔ ایک موقع پر ہنگ نے مجھے نیچے مگرا دیا۔ میں نے بڑی بھرتی سے چٹون کا پانچا اٹھا کر خنجر نکال لیا۔ اس پوری مم

کے دوران میں، میں نے پہلی مرتبہ خنجر نکالا تھا۔

ہنگ میرے اوپر چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں نے اپنے ہی لینے خنجر والا ہاتھ آگے کر دیا۔ ہنگ کی خوفناک چیخ سوج اٹھی۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اور خون کی دھار نے میرے جسم کو بھی آلودہ کر دیا تھا۔

ہنگ تڑپ کر میرے اوپر سے ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ میں نے خنجر کھینچ کر دوبارہ اس پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ بھی خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ شیواگ فرار ہو رہا تھا۔ میں نے ہنگ کے سینے میں پیوست خنجر ایک جھٹکے سے باہر کھینچا اور شیواگ کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں راہداروں میں دوڑتے ہوئے حویلی سے باہر گیا۔ شیواگ اس دیوار کی طرف دوڑ رہا تھا جس میں واقع کھڑکی نما دروازے سے گزر کر میں اندر آیا تھا۔

حویلی کے باہر قہ آدم گنجان جھاڑیاں تھیں۔ میری آنکھوں میں اگرچہ اس وقت بھی وہ روشنی موجود تھی جو تاریکی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن شیواگ جھاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ میں رک گیا۔ اس کا پیچھا کرنا بے کار تھا اور اس کے واپس آنے کی بھی توقع نہیں تھی۔ میں حویلی میں واپس آیا۔

اس کمرے میں دو لاشیں تھیں۔ ایک نیزے کے ساتھ دیوار پر لٹکی ہوئی تھی اور دوسری زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں دوڑتا ہوا سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دھنکی آنکھوں میں ایک بار پھر وحشت سی بھر گئی تھی لیکن مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ مسکرا اٹھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بندشیں کاٹ دیں۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”تم۔ تم ٹھیک ہو۔“ وہ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

”میں ٹھیک ہوں اوس۔“ اس نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ کیا اور ادھر ادھر کھینچنے لگا۔ یہ ویسا ہی کمراتا تھا۔ بالکل وہی جہاں پہلی بار کاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس رات کی ملاقات کوئی خواب تھا یا اس وقت میں کوئی خواب دیکھ رہا

تھا!

میں دھنکو کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ہلے آیا اور پھر تھوڑی سی دیر بعد ہم حویلی سے نکل کر جزیرے کے اس ساحل کی طرف دوڑ رہے تھے جہاں میں نے کشتی چھوڑی تھی۔

وہاں پہنچنے ہی میں رک گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہوئے گنگ کشتی غائب تھی۔

میری آنکھوں کے دیے مجھ گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اندھا ہو گیا تھا۔ وہ صلاحیت رخصت ہو گئی تھی جس سے میں بلی کی طرح اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اب پھر میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میں آنکھیں میاڑ میاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے جھاڑیوں کے ساتھ کشتی کی رسی کو باندھا تھا لیکن کشتی آس پاس کبھی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ”وہ... وہ دیکھو کیا ہے؟“ میرے قریب کھڑی ہوئی دھنکو نے گم۔ پانی کی طرف اشارہ کیا۔

نارے سے تقریباً سو گز آگے ڈرم کی طرح کی کوئی چیز پانی میں تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً کشتی ہی تھی۔ میں نے دھنکو کو جہن رکے کا اشارہ کیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی شراپ کی ایک اور زوردار آواز سن کر میں چونک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ کنارے پر جس جگہ میں نے دھنکو کو چھوڑا تھا وہاں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

”دھنکو! میں نے زور سے پکارا۔

اسی لمحے میرے بالکل قریب ہی دھنکو نے پانی سے سر اٹھایا۔

”میں یہاں ہوں۔“ اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔

میں بھول گیا تھا کہ دھنکو ایک بہت اچھی تیراک تھی۔ اس کی زندگی ایک ایسی عبادت گاہ میں گزری تھی جو دریا کے کنارے پر واقع تھی اور اس نے بچپن ہی میں دریا میں تیرنا سیکھ لیا تھا۔

ہم دونوں گہرے پانی کی طرف تیرتے رہے اور تیرتی ہوئی ڈرم نما اس چیز تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ کشتی ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہوا کے کسی تیز جھونکے کی وجہ سے جھاڑی کی شاخوں میں بندھی ہوئی رسی نکل گئی تھی اور کشتی بھکی لہروں پر تیرتی ہوئی کنارے سے اتنی دور نکل آئی تھی۔

میں نے پہلے دھنکو کو کشتی پر سوار ہونے میں مدد دی اور پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ میں نے چپو سنبھال لیا اور پانی کو تیزی سے پیچھے دھکیلنے لگا۔

دھنکو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ کوٹکا اسے سیر کروانے کے بہانے دوپہر کو جھوپڑے سے لے گئی تھی۔ کچھ دیر وہ بستی میں گھومتی رہیں اور پھر کوٹکا اسے بستی سے باہر بہت دور کھیتوں میں ایک جھوپڑے میں لے گئی۔ وہاں شیواگ اور اس کے دو ساتھیوں کو دیکھ کر دھنکو سمجھ گئی کہ اسے دھوکے سے وہاں لایا گیا ہے۔ اس نے جھوپڑے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر شیواگ وغیرہ نے اسے پکڑ لیا۔ اسے مارا پٹا، ہاتھ پیر باندھ دیے اور منہ میں پکڑا ٹھونس کر ایک طرف ڈال دیا۔

دھنکو نے بتایا کہ شام کے بعد کچھ آدمی اس طرف آئے تھے۔ شیواگ وغیرہ نے دور ہی سے ان کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دھنکو کو جھوپڑے سے نکال کر دور کھیتوں میں لے گئے تھے۔

اسے تقریباً دو گھنٹے کھیتوں میں رکھا گیا اور پھر شیواگ وغیرہ اسے جھیل پر لے آئے جہاں کنارے کی اونچی، نچلی جھاڑیوں میں ایک بڑی کشتی موجود تھی۔ یہ کشتی دو دروازوں کے کھوکھلے تنوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ وہ لوگ دھنکو کو اس کشتی پر ڈال کر اس جزیرے پر لے آئے۔

دھنکو کے کہنے کے مطابق، اس حویلی میں آنے کے بعد بھی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی جس پر اسے مارا پٹا گیا اور پلنگ پر ڈال کر باندھ دیا گیا۔

”شیواگ نے مجھے دھمکی دی تھی۔“ وہ کہہ رہی تھی ”کہ اگر تم کل دوپہر سے پہلے بستی سے نہ گئے تو وہ مجھے قتل کرے گا اور لاش کے ٹکڑے کر کے بستی میں پھینکوا دے گا۔“

”اگر وہ ایسا کرتا تو میں قیامت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔“ میں نے جواب دیا۔

میں چپو چلاتے ہوئے بار بار اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیواگ کی کشتی جزیرے کے ساحل پر کسی اور جگہ کھڑی ہوگی۔ حویلی سے فرار ہو کر وہ جزیرے پر نہیں رکا ہوگا۔ بستی کی طرف جانے کی وہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف جانے کی کوشش کرے لیکن جھیل کی سطح دور دور تک تاریک اور سنسان تھی۔ کسی اور کشتی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

واپسی پر کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں کشتی کو جمیل کے کنارے پر اسی طرف لے گیا جہاں کوٹنگا سے معرکہ ہوا تھا۔ کشتی کی رسی کو میں نے کنارے کی جھاڑیوں سے باندھ دیا اور ہم کنارے کے ساتھ ساتھ بستی کی طرف چلنے لگے۔

آبادی سے دور رہتے ہوئے ہم اپنے جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے مار تھا اور شوبھا کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہ دونوں ہمیں دیکھ کر اچھل پڑیں۔

ہم دونوں کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ شوبھا نے بیگ میں سے فوراً ہی ہمارے دوسرے کپڑے نکال دیے۔

”پہلے کپڑے بدل لو پھر بات کریں گے۔“ اس نے کہا۔

میں اپنے کپڑے لے کر باہر آ گیا۔ وہ رات کا آخری پیر تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے جھونپڑے کی آڑ میں کھڑے ہو کر کپڑے بدلے۔ کیلے کپڑوں کو گھاس پر پھیلا دیا اور اندر آ گیا۔ اس دوران میں دھونپی کپڑے بدل چکی تھی اور شوبھا نے اسے دو تین کبلوں میں دبا دیا تھا۔ اس کا سر کبلوں سے باہر تھا۔ دھونپی کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ شوبھا ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتی تھی۔ اسے ہماری بہت زیادہ فکر رہتی تھی۔ میں بھی شوبھا کے قریب بیٹھ گیا۔

”ہاں۔ اب بتاؤ تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہ تمہیں کہاں لے؟“ شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہارے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور مار تھا کاشی کے پاس غئی تھیں۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا تھا کہ تم خیریت سے ہو اور جلد ہی دھون کو لے کر واپس آ جاؤ گے۔ ہم واپس تو آ گئیں لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ہماری پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے، تم کسی کے پیچھے بھاگے تھے۔ کون تھا وہ؟“

”کوٹنگا۔“ میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہیں سب کچھ بتانے لگا۔ میں نے مار تھا کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کوٹنگا اور جزیرے کی حویلی میں دو آدمیوں کے مارے جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ دھونجی حویلی والے واقعے کے سلسلے میں خاموش ہی رہی تھی۔

مار تھا بڑی دلچسپی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ وہ آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکی تھی۔ خوفناک جنگلوں میں آباد خوں خوار قبائل میں بھی رہی تھی لیکن یہاں، ہمالیہ کی گود میں اسے جو کچھ دیکھنے اور سننے کو مل رہا تھا وہ دنیا کے کسی اور خطے میں اس نے

نہیں دیکھا سنا تھا۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ باہر قدموں کی ہلکی سی چاب سنائی دی۔ میں نے چونک کر اُدھر اُدھر دیکھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

دروازے سے نکلنے ہی میں کسی سے ٹکرا گیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے ہانپوں کی پلٹ میں لے لیا۔ نسوانی چیخ آواز نے مجھے پھر چوکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت بھی کوئی ہماری جاسوسی کرنے آیا تھا اور میں نے اسے بھاگنے کا موقع دیے بغیر گرفت میں لے لیا تھا لیکن اس مرتبہ مجھے شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ وہ کوئی جاسوس نہیں، قبیلے کی سردار کاشی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی محافظ پالا بھی تھی۔ وہ بھی اس صورت حال سے بدحواس ہو گئی تھی۔

وہ دونوں اندر آ گئیں۔ پالا تو تیز سے سنبھالے دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی اور کاشی بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے کاشی کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔

”میں جانتی ہوں۔“ وہ بولی ”کوئی باطل قوت سچائی کے سامنے قدم نہیں جما سکتی۔ تم دونوں کی مہماں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ شیطان کے پیروکار کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔“

”میں اس حویلی کے بارے میں جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کاشی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ضرور بتاؤں گی۔“ کاشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”صدیوں پہلے وہ حویلی تھکو قبیلے کی سردار کا مسکن ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ قبیلہ جمیل کے اطراف میں کئی چھوٹی بڑی بستیوں پر مشتمل ہو کر آتا تھا لیکن لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے جمیل کا پانی ان بستیوں کو نکلتا چلا گیا۔ صدیوں پہلے جمیل کے قبیلے کی سردار ایک عورت ہی ہوا کرتی تھی۔ وہی سارے نظام کو چلاتی تھی۔ سردار کے انتخاب کا طریقہ کار بھی وہی تھا جو آج بھی رائج ہے لیکن قبیلے کی بعض بستیوں کے لوگ اپنی اپنی بستی کی عورتوں کو سردار بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے روایات کو نظر انداز کر کے غلط راستے اختیار کیے گئے اور جب بھی ایسا ہوا وہ بستی غرق ہو گئی۔ جمیل کے پانی نے اسے نگل لیا۔“ وہ خاموش ہو کر اُدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”قبیلے کی سردار کو ملکہ کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اس جزیرے پر رہتی تھی جہاں مردوں کو جانے کی اجازت نہیں

تھی۔ سارا نظام عورتیں ہی چلاتی تھیں لیکن جیسے جیسے بستیوں جمیل میں غرق ہوتی گئیں، قبیلے کی روایات میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں۔ بد اعمالیاں بڑھتی گئیں۔ مرد بھی اجازت کے بغیر اس جزیرے پر جانے لگے۔

”ایک رات وہ سب کچھ ہوا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چند مرد چوری جیسے جزیرے پر آ کر حویلی میں گھس گئے۔ ملکہ کے محافظوں کو قتل کر کے انہوں نے حویلی پر قبضہ کر لیا۔ وہ کئی روز تک ملکہ کو ہوس کا نشانہ بناتے رہے اور پالا خرا سے قتل کر دیا۔ اس کے تین دن بعد ان سب مردوں کی لاشیں بھی جمیل میں تیرتی ہوئی ملیں۔ جزیرے پر ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی موت پر اسرار طور پر واقع ہوئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا، انہیں مارنے والا کون ہے؟“

”اس واقعے کے بعد لوگوں میں اتنا خوف و ہراس پھیلا کہ لوگوں نے اس طرف جانا چھوڑ دیا اور وہ جزیرہ ویران ہو گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہاں بد روحیں قابض ہو گئی ہیں۔“ ”بھی بھئی اس جزیرے سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن بستی کے لوگوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہاں کیا چیز ہو سکتی ہے۔“

”میرے سردار منتخب ہونے سے دو ہفتے پہلے رات کی تاریکی میں دو کشتیوں کو جزیرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے ہمت کر کے اپنی کشتیوں پر ان کشتیوں کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کشتیاں زور دار آوازوں کے ساتھ آگ کے شعلے اٹھنے لگیں۔ ہمارے آدمی خوف زدہ ہو کر واپس آ گئے۔ وہ اس قدر بدحواس ہوئے تھے کہ ایک کشتی الٹ گئی اور دو آدمی ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد لوگوں کے دلوں میں خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ اب تو جمیل میں مچھلیاں پکڑنے والے بھی اس جزیرے سے دور رہی رہتے ہیں۔“

”تم کبھی اس جزیرے پر گئی ہو؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن اس رات۔۔۔ میرا مطلب ہے جب پالا مجھے یہاں سے لے کر گئی تھی؟“

”یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی ”یہاں بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے ایسے پر اسرار واقعات جنم لیتے ہیں جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا اور ہم انہیں سمجھنا بھی نہیں سکتے اور کبھی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ۔۔۔ وہ

خاموش ہو کر رہتا تھا وغیرہ کی طرف دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”انسان کے اندر پر اسرار قوتوں کے جزیرے آباد ہیں۔ وہ ان پر قابو پا کر کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے لیکن اسے اندر کی تمام قوتوں پر قابو پانا ممکن نہیں۔ تاہم کبھی کوئی کسی قوت پر قابو پاتا ہے۔ ان میں ایک قوت ایسی بھی ہے جس کے بل بوتے پر دوسروں کو ایسے مناظر دکھائے جاسکتے ہیں جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”گویا وہ بھی کسی قوت کا مکمل تھا؟“ میں نے کہا۔

کاشی مسکرا کر رہ گئی۔

باہر شور کی آوازیں سن کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ دن کی روشنی جمیل چلی تھی۔ تقریباً سو گز آگے جمیل کے کنارے پر کھڑی دو عورتیں بری طرح جھج رہی تھیں۔ وہ عورتیں عین اس مقام پر کھڑی تھیں جہاں گزشتہ رات کوٹنگا سے میرا معرکہ ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں عورتیں کیوں چلا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص دوڑتے ہوئے ہماری طرف آیا اور کاشی کے سامنے رک کر تیز لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ کاشی نے جواب میں اس سے کچھ کہا اور وہ شخص ایک سمت بھاگ گیا۔

”کیا ہوا؟ کوئی گزربڑا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کاشی کی طرف دیکھا حالانکہ میں حقیقت حال سے اچھی طرح واقف تھا۔

”جمیل کے کنارے سے کوٹنگا کی لاش ملی ہے۔“ کاشی نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”لوگ خوف زدہ ہیں کہ کئی سال بعد ایسا ہوا کہ قبیلے کے کسی فرد کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔“

میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا ”انہیں کسی شہر ہے؟“ ”شہر!؟“ کاشی نے مجھے غور کر دیکھا ”ابھی کچھ طے نہیں ہوا لیکن وہ آدمی کہہ رہا تھا شیواگ قبیلے والوں کا جینا حرام کر دے گا۔ کوٹنگا شیواگ کی عورت تھی۔ وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ قبیلے کے لوگ شیواگ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم سے شکست کھانے کے بعد وہ اگرچہ بستی سے غائب ہو گیا ہے لیکن اس کے کچھ حمایتی اب بھی بستی میں موجود ہیں۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

”لوگوں سے کہہ دو کہ اب شیواگ اس بستی کا رخ نہیں کرے گا اور اس کے حمایتی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اس قبیلے کے لوگ بہت تو ہم پرست ہیں۔ وہ ہر بات کا مطلب اپنے طور پر اخذ کرتے ہیں۔ انہیں کوئی بات سمجھنا

بڑا مشکل کام ہے۔ بہر حال، تم لوگ اپنے جھونڈے میں رہو۔ میں جا کر معلوم کرتی ہوں۔“ کاشی نے کہا۔  
”میں بھی تمہارے ساتھ چلا ہوں۔“ میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

”نہیں۔“ وہ میری طرف مڑ گئی۔ ”تم یہیں رہو۔ تمہارا اس وقت وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ جو بھی صورت حال ہوگی، میں بعد میں تمہیں بتا دوں گی۔“

کاشی چلی گئی۔ میں شوبھا وغیرہ کے ساتھ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر ہم اندر آ گئے۔ دھونکبوں میں دیکھی سو گئی تھی۔ میں بھی ایک کبل اوڑھ کر سو گیا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد ہی میں بھی نیند کی آغوش میں پڑ گیا۔

میری آنکھ سے سیر سے پہلے نہیں کھل سکی تھی۔ اس وقت بستی پر سناٹا سا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے قریب ہی دوسرے کبل میں دیکھی شوبھا سو رہی تھی جبکہ مارتھا اور دھونکبوں میں بھی سو چکی تھیں۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کر باہر آیا۔

موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ عام طور پر اس وقت جھیل کنارے خاصی رونق رہتی تھی لیکن آج دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے جھونڈے کی پچھلی طرف چلا گیا اور ایک دو ٹگیاں گھوم کر واپس آیا۔ بستی پر ایسی طرح سناٹا طاری تھا جیسے یہاں زندگی کا وجود ہی مٹ گیا ہو۔ مجھے نہیں بھی بستی کا کوئی فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ بستی کے لوگ سب کچھ چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ میں اپنے جھونڈے میں واپس آیا۔

”بستی کے لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ سناٹا کیوں طاری ہے؟“ میں نے مارتھا اور دھونکبوں کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔

”آج صبح سے کوٹنگا کی موت کا سوگ منایا جا رہا ہے۔“ مارتھا نے جواب دیا۔ ”دوسرے کے وقت پالا یہاں آئی تھی۔ اس نے ہدایت کی تھی کہ ہم جھونڈے سے باہر نہ نکلیں۔“  
”لیکن بستی کے لوگ کہاں غائب ہیں؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”سب لوگ کوٹنگا کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔“ مارتھا نے بتایا۔ ”بستی سے باہر تقریباً دو میل دور پہاڑی کے دامن میں کوئی خاص جگہ ہے جہاں مرنے والوں

کی آخری رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ سب لوگ وہیں گئے ہوں۔ سوج غروب ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔“  
سوج غروب ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ مارتھا وغیرہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ پوری بستی کو ٹنگا کی موت کا سوگ منا رہی تھی۔ ہمیں کھانے کو کون پوچھتا!

میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ بستی کے کسی گھر میں کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔ ہو سکتا ہے، کہیں سے کھانے کو کچھ مل جائے۔ میں نے مارتھا اور دھونکبوں کو انتظار کرنے کو کہا اور جھونڈے سے نکل کر اوپر سے گھومتا ہوا بستی میں گیا۔ میرا رخ مرکزی چوراہے کی طرف تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں مٹی کے کسی نہ کسی فرد سے ملاقات ہو جائے گی اور ہمیں کھانے کو کچھ مل جائے گا لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔

مرکزی چوراہا بھی سناٹا تھا۔ میں وہاں کھڑا کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر میرے قدم خود بخود کاشی کے جھونڈے کی طرف اٹھنے لگے۔

جھونڈے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور محافظ بھی موجود نہیں تھے۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ صحن میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی نے مجھے چوروں کی طرح اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تو کہیں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے۔ میں نے کاشی یا پالا کو آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ مٹی کے گھر فرد بستی سے باہر تھا۔

میں نے برآمدے والا دروازہ کھولا تو دروازے کے چرچانے کی ہلکی سی آواز سنائی دے چکی تھی۔ میں رکے بغیر وہ بے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ کاشی والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے ایک آدمی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

یہ اتفاق مجھ پر اچانک ہی پڑی تھی۔ میں ایک لمحے کو بدحواس ہو گیا۔ سمجھنے سے پہلے حملہ آور میری کھوپڑی پر دو چار گھونسے لگا لگا تھا لیکن پھر میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ جیسے ہی حملہ آور ہوا، میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اچھال دیا۔ وہ کاشی کے پلنگ پر گر گیا۔ اس کا سر پلنگ کی پشت سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ بھی نکل گئی تھی۔

میں نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ بڑی پھرتی سے لوٹ لگا

کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں منہ کے بل پلنگ پر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا حملہ آور نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ میری پشت پر سوار ہو گیا اور بالوں کو منہ میں جکڑ کر میرے سر کو زور زور سے پلنگ کی پٹی پر مارنے لگا۔ میری پیشانی کی کھال پھٹ گئی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں سامنے نکال دیں اور پوری قوت سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں ناٹکیں بھی سینے لگا تھا اور بالآخر میں اسے اپنے اوپر سے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے ایک بار پھر مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی تیزی سے پلٹ کر اپنی ٹانگیں اس کی گردن پر پلٹ دیں اور زوردار جھٹکا دیا۔ وہ الٹ کر پلنگ سے نیچے گر گیا۔

میں حریف کی گردن چھوڑ کر تیزی سے چھلانگ لگا کر پلنگ سے نیچے آیا۔ وہ بھی اٹھ چکا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور میں ابھی تک اپنے حریف کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ شیواگ ہوگا لیکن اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ شیواگ درمیانے قد کا ماک تھا جبکہ اس شخص کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے نہ صرف اس کے حملے کو ناکام بنایا بلکہ اس کے پیٹ میں ایک زوردار رک بھی رسید کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر ہرا ہو گیا۔ میں نے جھک کر اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ ہلپلا تا ہوا سیدھا ہوا تو میں نے اسے گھونسلوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک زوردار رک اس کے سینے پر لگی تو وہ لڑکھاتا ہوا دیوار کے قریب گر گیا۔ جس جگہ وہ گر گیا تھا اس کے قریب ہی ایک مٹا سا ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا اس نے بڑی تیزی سے ڈنڈا اٹھا کر حملہ کر دیا۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے وار تو میرے سر پر کیا تھا لیکن ڈنڈا میرے پائیں کندھے پر لگا۔ میرے منہ سے گراہ نکلی۔ میں نیچے جھٹکا چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے میرے سر پر گویا ایٹم بم پھٹ پڑا۔ ذمے کا دوسرا وار میرے سر پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے رقص کرنے لگے اور پھر اندھیرے کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے تو راکر گرا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے جھونڈے میں پڑا تھا اور میرے ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ آنکھیں کھولنے کے

بعد بھی چند لمحوں تک میری نظروں کے سامنے دھند سی چھائی رہی۔ میں بار بار آنکھیں میچ مچانے لگا۔ دھند چھٹنے لگی اور وہ چہرے واضح ہوتے چلے گئے۔ ان میں ایک چہرہ کاشی کا بھی تھا۔

میں نے ایک جھپٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی تو دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ تکلیف سے میری آنکھیں خود بخود میچ نکلیں اور کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ اٹھایا۔

سر میں ہونے والے دھماکے کم ہونے تو تکلیف بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس مرتبہ میری نظر اس پر پڑی کہ بڑی بو میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال نیلے کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی طرح سفید تھے۔ چہرے پر جھروں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا جیسے کوئی نے جلا تان رکھا ہوا۔ اس کی گردن میں طوق کی طرح لوہے کا ایک کڑا پڑا ہوا تھا جس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کانوں میں بھی چوڑیوں کی طرح لوہے کے بالے لٹکے ہوئے تھے۔ ماچس کی تیلی سے ذرا بڑی ایک سلاخ ناک کے نتھنوں کے عین بیچ میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے بالائی حصے پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی جلد کو دیکھ کر صدیوں سے پائی چلتی ہوئی زمین کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ لاتعداد آؤڑی ترچھی لکیریں تھیں اس کے جسم پر۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر سو کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی لیکن اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حیرت انگیز طور پر زندگی کی بھرپور چمک موجود تھی۔

اس نے ایک ہاتھ میری گردن کے نیچے رکھ کر سر کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹی کا پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

مٹی کے پیالے میں ہرے رنگ کا مشروب تھا جس کا ذائقہ کرلے کی طرح کڑوا تھا۔ میں نے وہ پیالہ اپنے ہونٹوں سے دور ہٹانا چاہا لیکن بڑھیا نے میری کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہونے دی جب تک اس کڑوے مشروب کا آخری قطرہ بھی میرے حلق میں نہیں چلا گیا۔

وہ مشروب اگرچہ خالص ذائقہ تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے حلق سے اتارا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر میں اپنے آپ میں توانائی سی محسوس کرنے لگا۔ اس بڑھیا نے میرا سر دوبارہ نیچے نکا دیا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے سر کو ٹٹولنے

لگا۔ سر پر پی بندھی ہوئی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی دیر تک میرے حواس بحال نہیں ہو سکے تھے۔ میں اب بھی متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ میں یہاں کیوں پڑا تھا۔ میرے سر پر پی کیوں بندھی ہوئی تھی اور یہ لوگ میرے گرد کیوں جمع تھے؟

”کیسے ہوا اب ہمت سکھ؟“

یہ آواز سن کر میں نے دائیں طرف دیکھا۔ وہ شوہا تھی جو میرے اوپر جھک رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ میرا ذہن صاف ہوتا گیا اور مجھے سب کچھ یاد آیا۔

میں بستی میں گھومتا ہوا کاشی کے جھونپڑے میں گھس گیا تھا جہاں کسی نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میرے سر پر لگنے والی ضرب نے مجھے بے ہوشی کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا جس سے حملہ آور کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ بعد میں کاشی یا اس کے محافظ جھونپڑے میں آئے ہوں گے تو مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔

سر کے زخم میں انکلیف اگرچہ بدستور موجود تھی لیکن وہ کڑوا کیلا مشروب پینے کے بعد میں اپنے آپ کو بڑی حد تک بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ کمبل کے نیچے میرے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے گردن ٹھہرا کر شوہا کی طرف دیکھا۔

”یہ دیکھنے کے لیے تمہارے کپڑے اتار دیے گئے تھے کہ تمہارے جسم پر کوئی اور زخم تو نہیں ہے؟“ شوہا نے میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

”صرف میرے سر پر ضرب لگائی گئی تھی اس کے سوا کوئی چوٹ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ان لوگوں کو بناؤ یہاں سے۔ میں کپڑے پہننا چاہتا ہوں۔“

شوہا نے کاشی سے مددگرمی میں کچھ کہا اور کاشی نے کمرے میں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ ان میں تین آدمی تھے اور باقی عورتیں ہی تھیں۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی بڑھیا نے میری دائیں کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر اپنا میلہ سا تھیلہ سنبھالتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

کمرے میں اب صرف شوہا اور کاشی رہ گئی تھیں۔ دھنو اور مارا تھا بھی باہر جا چکی تھیں۔ شوہا نے ایک طرف بڑے ہوئے میرے کپڑے اٹھا کر قریب ڈال دیے۔ میں دیوار کی طرف رخ کر کے کبل اوڑھ لے کر اٹھ گیا۔ پہلے چٹون پتلی اور کبل ہٹا کر قیض پہننے لگا۔ چٹون پہننے ہوئے مجھے احساس

ہو گیا تھا کہ میری ہڈی کے ساتھ خنجر موجود نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر شوہا کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ بیلٹ اور خنجر وہاں رکھا ہوا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دھنو اور مارا تھا بھی اندر آگئی تھیں اور پالا نے بھی دروازے کے قریب اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ شوہا نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ سورج غروب ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ کاشی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

”میں یہ جانتا چوں گا کہ تم میرے جھونپڑے میں کیسے پہنچے تھے اور تم پر حملہ کس نے کیا تھا؟“ کاشی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

میں چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر میری نظریں اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی نیچے پڑ گئیں۔

”توبہ توبہ۔“ شوہا بڑبڑائی ”شرم بھی نہیں آتی۔ کس طرح دیدے بچا بچا ڈر گھور رہے ہو۔“

میں نے گھورتی ہوئی نظروں سے شوہا کی طرف دیکھا پھر کاشی کی طرف متوجہ ہو کر بتانے لگا کہ میں اس کے جھونپڑے میں کیوں گیا تھا۔

”وہ پہلے سے تمہارے کمرے میں موجود تھا۔“ میں کہہ رہا تھا ”میں جیسے ہی اندر داخل ہوا اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ میرے قابو میں آ جاتا لیکن اس نے ڈنڈے سے میرے سر پر حملہ کر دیا جس سے بے ہوش ہو گیا۔“

”وہ کون تھا۔ شیواگ؟“ کاشی نے سوا لیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”میں اندھیرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ شیواگ نہیں تھا۔ شیواگ درمیانے قد کا مالک ہے جبکہ حملہ آور طویل قامت تھا۔“ میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”تمہارے کمرے سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“ کاشی نے جواب دیا ”وہ جو کوئی بھی تھا چوری کی نیت سے نہیں آیا ہو گا۔ سردار کے جھونپڑے میں اجازت کے بغیر داخل ہونا سنگین جرم ہے اور اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ محض چوری کے لیے کوئی شخص اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

”اس کا مطلب ہے...؟“

”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔“ کاشی نے میری بات کاٹ دی ”عام حالات میں کسی کی نظروں میں آنے بغیر سردار کے جھونپڑے میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ آج چونکہ سب لوگ بستی سے باہر تھے اس لیے اس شخص کو اندر داخل

ہونے کا موقع مل گیا۔“

”کیا وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ کاشی نے کہا ”بستی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ شیواگ میرا دشمن ہے اور پھر میں نے کھل کر اس کے خلاف تمہاری حمایت کی ہے۔ قبیلے کے کسی فرد کے مقابلے میں ایک اجنبی کی حمایت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن شیواگ کے گرد اسے سب ہی واقف ہیں اس لیے تمہارے ہاتھوں اس کی شکست پر بھی لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور ظاہر ہے شیواگ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔

اس نے پہلے تمہیں سزا دینے کے لیے تمہاری عورت کو اغوا کیا۔ اس مرحلے پر بھی اسے تمہارے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹکا اور اس کے دو آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے۔“

میں اس انکشاف پر اچھیل پڑا۔ کوٹکا کے بارے میں تو کاشی میری باتوں سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں ماری گئی تھی لیکن جزیرے پر دو آدمیوں کی ہلاکت! ان کا تو میں نے کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا لیکن کاشی سے شاید کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

”جزیرے پر تمہارے ہاتھوں حریمت اٹھانے کے بعد اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔“ کاشی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی ”آج کا دن اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ وہ خود تو بستی میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اپنے کسی گرگے کو بھیج دیا جو میرے جھونپڑے میں چھپ کر میرا انتظار کر رہا تھا لیکن مجھ سے پہلے تم پہنچ گئے۔“

”میرے لوگ آسانی سے بھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔“ میں نے کہا ”جب تک ان کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نہ نچوڑ لیا جائے یہ لوگ۔“

”اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”یوں تو شیواگ کے کئی آدمی بستی میں موجود ہوں گے لیکن ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ میرے جھونپڑے میں داخل ہونے والا کون تھا۔“

”اس کے آدمیوں میں سے کسی ایک کی نشان دہی کر دو۔ میں اس سے معلوم کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں ایک دو دن آرام کی ضرورت ہے۔ کسی قسم کی بھاگ دوڑ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔“ کاشی اٹھتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ کوئی اہم بات ہوئی تو تمہیں اطلاع دوں گی۔“

کاشی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دو عورتیں ہمارے لیے کھانے آئیں۔ کل رات کے بعد سے کسی کچھ نہیں کھایا تھا۔ دھنو زیادہ ہی بے چین تھی۔ اس نے کسی سے پوچھے بغیر فوراً ہی کھانا شروع کر دیا۔

اس رات سر میں انکلیف کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ سکی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی وہ بڑھیا پھر پہنچ گئی۔ اس نے پتی کھول کر میرے زخم کا معائنہ کیا۔ دوسری پتی لگائی۔ ایک پالہ وہی کڑوا کیلا جوس پلایا اور آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔ اب ظاہر ہے مجھے آرام ہی نہیں ملتا تھا۔ جب تک میرے سر کا زخم ٹھیک نہ ہو جاتا، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ نہ تو مجھ پر حملہ کرنے والے شخص کا پتا چلا تھا اور نہ ہی شیواگ کا کوئی سراغ ملا تھا۔ تاہم یہ اطلاع میرے لیے دلچسپ ثابت ہوئی کہ شیواگ کے جو دو چار آدمی بستی میں موجود تھے وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔

وہ بڑھیا صبح باقاعدگی سے میرے زخم کی پٹی تبدیل کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کرلے کے ڈالتے جیسا کڑوا جوس بھی پلایا جا رہا تھا جس کے بارے میں پالا نے بتایا تھا کہ اس سے نہ صرف بدن کو توانائی ملتی ہے بلکہ یہ جوس کسی بھی قسم کا زخم خشک کرنے کے لیے بڑا کارآمد ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ میرا زخم بڑی تیزی سے مندمل ہو رہا تھا۔

وہ چاند کی پہلی رات تھی اور چاند کی ہر پہلی اور چودھویں رات کو قبیلے والے جشن منایا کرتے تھے۔ اس رات بھی جشن تھا۔

غروب آفتاب سے پہلے ہی بستی سے لوگ ہمارے جھونپڑے سے تقریباً سو گز آگے جمیل کنارے ایک کھلی جگہ پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد چاند نظر آتے ہی لوگ کانپنے لگے۔ لوگ بستی سے نکل نکل کر اس جگہ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پالا ہمیں بھی بلا کر لے گئی۔ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر رقص کر رہی تھیں۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ اچانک میں عجیب سی تھکن محسوس کرنے لگا۔ دماغ پر غودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے شوہا وغیرہ سے واپس چلنے کو کہا لیکن وہ لوگ وہاں رکنا چاہتی تھیں لہذا میں اکیلا ہی جھونپڑے میں واپس آیا۔

دن میں بھی زیادہ تر میں سویا ہی رہا تھا لیکن اس وقت

نہند کا شدید حملہ ہوا تھا۔ میری آنکھیں بند ہوئے جاری تھیں اور میں بڑی مشکل سے جھوپڑے تک پہنچا تھا۔ بستر پر گرے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

باہر سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے دماغ پر نیند کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا، کوئی بادیہ قوت مجھے زبردستی سو جانے پر مجبور کر رہی ہو۔ لوگوں کے شور کی معدوم ہوتی ہوئی آوازیں میں جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی وہ کسی کوئی کی گمراہی سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آواز اگرچہ بہت کمزور اور ہلکی تھی لیکن اس میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں ایک جھپٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ نیلگری تھی جو دروازے میں سے داخل ہو کر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ برسوں کی بیا رنگ رہی تھی۔ اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ چہرہ مرجھا گیا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل پر گھونسا لگا۔

”کیا بوا نیسری؟“ میں نے پوچھا ”تمہاری یہ حالت...“

”میری ساری قوتیں سلب ہو رہی ہیں۔“ نیلگری کی آواز بھی بے حد کمزور تھی ”وہ شیطان میرے قریب آتا جا رہا ہے۔ میرے گرد حصار تنگ ہو رہا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چھ دن کا فاصلہ رہ گیا ہے اور یہ فاصلہ بھی سمٹ گیا تو میں اس کے قبضے میں چلی جاؤں گی اور سب سے پہلے وہ مجھے تمہارے خلاف استعمال کرے گا۔ میں اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہوں گی۔“

میرے دماغ میں دھماکے سے ہورے تھے۔ چھ دن۔ صرف چھ دن۔ اس کے بعد سب کچھ بدل جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میری بیماری اور شیواگ کے پیکر میں کافی وقت ضائع ہو گیا تھا اور گوتم بھوش بھی تو چاہتا تھا۔

”نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ میں بڑ بڑایا اور پھر نیلگری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایسا نہیں ہو گا نیلگری۔ میں اس شیطان کو مزید آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ میں۔ میں آ رہا ہوں۔“

”جلدی کہو ورنہ۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔“ نیلگری کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اسی وقت شور کی آواز سنائی دی۔ قہقہے گونجنے لگے۔ قہقہوں کی آوازیں کہیں اور سسکیوں میں بدل گئیں اور پھر قہقہے۔ لگتا تھا جیسے سیڑوں پر دو حصے مل کر کچھ چلا رہی

ہوں۔ یہ آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے نیلگری کی طرف دیکھا۔ اس کا ہولا دھندلا رہا تھا۔ چاندنی جیسی دودھیا روشنی کا وہ ہولا بتدریج تاریکی میں تحلیل ہونا چلا گیا۔

نسوانی قہقہوں کی آوازیں کر ایک بار پھر میری آنکھ کھل گئی۔ دھن، شوہا اور مار تھا قہقہے لگاتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھیں۔

”ارے۔“ شوہا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں تو سمجھی تھی کہ تم سو گئے ہو گے!“

”سو گیا تھا۔ تم لوگوں کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر تم سمجھ دیر اور وہاں رکتے تو ایک بہت حسین منظر دیکھتے۔“ اس مرتبہ مار تھا نے زبان کھولی ”کاشی نے کیا خوب رقص کیا تھا۔ میں تو اسے زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ لگتا تھا جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ زمین پر تو اس کے پیر تلنے ہی نہیں تھے۔“

میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کاشی بہت حسین تھی اور یقیناً رقص بھی بہت اچھا کرتی ہوگی۔

مار تھا اور شوہا دیر تک آج کے جشن پر تبصرے کرتی رہیں۔ دھن لینے کے ٹھوڑی ہی دیر بعد سو گئی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر تک مار تھا اور شوہا کی آوازیں سماعت سے ٹکرائی رہیں اور پھر وہ آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ میں نیند کی وادی میں اترا چلا گیا۔

اگلا دن بڑی بے چینی میں گزرا۔ میں بار بار نیلگری کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ وقت واقعی بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نیلگری کی مدد کے لیے ہی تو نکلا تھا۔ یہ سارے کٹھ (مصائب) اسی کے لیے تو برداشت کر رہا تھا لیکن میرے مقابلے پر بھی تو کوئی مٹی کا مادہ نہیں تھا۔ گوتم بھوش ایسا ہو گیا تھا جس کے قبضے میں کچھ اور قوتیں بھی تھیں اور وہ اپنی قوتوں کے بل بوتے پر نیلگری کو قبضے میں لینے کے لیے جا پ کر رہا تھا اور اس کی وہی قوتیں مختلف صورتوں میں میرے ہاتھ میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھیں۔ گوتم بھوش کی کوشش تھی کہ میں اس کا جا پ مکمل ہونے سے پہلے اس تک نہ پہنچ سکوں۔ آج نیلگری کی حالت نے مجھے چونکا دیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب دنیا کی کسی طاقت کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دوں گا۔ اس روز میں نے دن کے وقت کاشی سے ملنے کی کوشش

کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم شام کو جب شوہا اور مار تھا بستی میں کھین گئی ہوئی تھیں، میں اور دھن جمیل کے کنارے پر بیٹھے باہمی کر رہے تھے کہ پالا نے کاشی کا پیغام دیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

میں نے دھن کو بستی کے چورہ پر چھوڑ دیا جہاں مار تھا اور شوہا بھی موجود تھیں اور خود پالا کے ساتھ کاشی کے جھوپڑے میں پہنچ گیا۔

”حسب معمول کاشی اپنے کمرے میں اکلی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی صریح تھی۔ ہم دونوں آٹنے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک شیواگ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ لپٹا ہو گیا تھا اور قبیلے کے لوگ دور دور تک اس کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔“

”تمہیں اب یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔“ کاشی نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا ”وقت بہت کم رہ گیا ہے اور تمہارا راست بہت کٹھن ہے۔ مزید تاخیر نہ صرف یہ کہ نیلگری کے لیے بلکہ تمہارے اور ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوگی۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی نیلگری سے رابطے میں تھی۔

”میں نے بھی یہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا ”بقول تمہارے راست کٹھن ہے اور۔“

”تمہاری وہ قوتیں عورتیں یہاں رہیں گی۔“ کاشی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ مار تھا بھی چونکہ ہمارے ساتھ آئی تھی اور ہمارے ساتھ ہی رہ رہی تھی اسی لیے شوہا اور دھن کی طرح اسے بھی میری عورت ہی سمجھ لیا گیا تھا ”تمہیں ان کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قبیلے کے لوگ ہوجاؤ۔ دو دن کا راستہ ہے۔ تمہارے پاس صرف تین دن باقی نہیں گئے۔“

”میں وہاں کس طرح پہنچوں گا۔ راستے کی کوئی نشان دہی۔“

”تمہارے اندر کی قوت تمہیں راستہ دکھائے گی۔“ کاشی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی ”وہیے تمہاری رہنمائی کے لیے توہان تمہارے ساتھ جائے گا۔ آج رات کو جب سرخ ستارہ جزیرے کے مین اوپر چمکتا ہوا نظر آئے گا، تم جھوپڑے سے نکل کر بستی کے شمال میں کالی چٹان کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ توہان تمہیں وہیں منتظر ملے گا۔“

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ پالا نے آکر کاشی کے کان میں کچھ کہا۔ کاشی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں نے توہان کو یہاں بلایا تھا۔ وہ آگیا ہے۔ تم بھی اس سے ملاقات کر لی لو۔“

کاشی کے اشارے پر پالا کمرے سے نکل گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دوبارہ اندر داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کا اس نے ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

اس آدمی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ دہلا پٹلا سا آدمی تھا۔ بائیں کی طرح لبا قد، گنجا سر، چہرے پر بھراں اور آنکھیں۔

اس کے چہرے پر آنکھیں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ آنکھوں کی جگہ تو کچھ نہیں لیکن لگتا تھا نوزادانہ، قدرت اس انسان کو تخلیق کرتے ہوئے آنکھیں بنانا بھول گئی ہو۔ آنکھوں کی جگہوں پر گوشت تھا۔ بالکل ہموار جیسے کھڑکیوں پر تختے لگا کر انہیں بند کر دیا گیا ہو اور یہ ستم رسیدہ چہرہ دیکھ کر ہی میں کانپ اٹھا تھا۔ اس کی عمر سترے لگ بھگ رہی ہوگی اور اس کے گلے میں بھی طوق کی طرح آہنی کڑا ہوا تھا۔

ٹھوڑی دیر پہلے کاشی نے کسی توہان نامی شخص کا ذکر کیا تھا جو نیلگری کی برف پوش چوٹیوں میں واقع اس قدیم بدھ عبادت گاہ تک میری رہنمائی کرنے والا تھا جہاں گوتم بھوش جا پ پر بیٹھا ہوا تھا اس بدھ عبادت گاہ کا نام ”گوتمپو“ تھا۔ چند منٹ پہلے ہی پالا نے توہان کی آمد کی اطلاع دی تھی اور پالا کے ساتھ بغیر آنکھوں کے اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں ابھرا تھا کہ یہ توہان ہو سکتا تھا۔ میرا خیال تھا یہ کوئی اور ہے اور توہان باہر کھڑا انتظار کر رہا ہوگا۔ بہرحال میں اس شخص کے لیے دل میں بے حد افسوس محسوس کر رہا تھا۔

”توہان سے ملو اجنبی!“

کاشی کی آوازیں کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ بغیر آنکھوں والا وہ شخص پالا کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ میں مڑکا بھی ہوئی نظروں سے کاشی کی طرف دیکھنے لگا۔

”توہان تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“ کاشی نے پالا کے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑتی چلی گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پایا اور یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کاشی میرے ساتھ شاید

بھٹکتا رہوں گا؟

اس رات مارتھا اور دھنوں سے باتوں کے دوران میں،  
میں بار بار ان کی طرف دیکھتا رہا اور نجانے کیا بات بھی کہ  
شوہا بھی میرے چہرے پر نظرس چپکائے بیٹھی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اگر ہم باتیں کرتے رہتے تو رات پونہی  
آنکھوں میں گزر جاتی جبکہ مجھے آدھی رات کے وقت یہاں  
سے نکل جانا تھا اس لیے میں نیند کا بہانہ کر کے کبل اوڑھ کر  
لیٹ گیا۔

ان تینوں کی باتوں کی آواز میری سماعت سے نکراتی  
رہی اور بالآخر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے  
بعد میں نے اپنے چہرے سے کبل ہٹایا۔ وہ تینوں سوچتی  
تھیں۔ میں نے آہستگی سے کبل اپنے اوپر سے ہٹا دیا اور  
دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔

بستی پر سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی  
نہیں دے رہی تھی۔ میں گلیوں میں چلتا ہوا شمال کی طرف  
بستی سے باہر آیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔

کالی چٹان بستی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ مجھے  
اس طرف جانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ تھیتوں کے  
درمیان تل کھاتی ہوئی ایک گینڈی اس کالی چٹان تک چلی  
گئی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس گینڈی پر چلتا رہا۔  
قبیلے کے لوگ اپنے مرنے والوں کی آخری رسوم بھی اس  
چٹان کے قریب ہی ادا کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا اس  
طرف کوئی قبرستان ہوگا جہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہوگا یا  
کوئی شمشان گھاٹ جہاں ہندوؤں کی طرح مردوں کو جلا دیا  
جاتا ہوگا۔

میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دھنوں اور  
شوہا کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ میرے اس طرح چلے  
آنے پر وہ کیا خیال کریں گی۔ دھنوں تو بچوں کی طرح رونے بیٹنا  
شروع کر دے گی لیکن یہاں سے آگے میں انہیں ساتھ نہیں  
لے جانا چاہتا تھا۔ راستہ خطرناک ہونے کے علاوہ یہ مجھ  
اندازہ نہیں تھا کہ آگے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا  
پڑے گا۔

مجھے اس کالی چٹان تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔  
گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ میں ایک جگہ رک کر اوہرا دھر  
دیکھنے لگا۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں رک  
رک کر آگے بڑھتا رہا۔

کسی خچر کے ہنسنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ  
کر اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی اور میں

کسی قسم کا مذاق کر رہی ہے۔ جو شخص خود آنکھوں سے محروم  
ہو وہ کسی دوسرے کی کیا رہنمائی کر سکے گا!

”تو بان بیٹاؤں سے زیادہ بیٹا اور داناؤں سے زیادہ دانا  
ہے۔“ کاشی کہہ رہی تھی ”قدرت نے اسے آنکھوں سے  
محروم رکھا لیکن اس کے اندر کی آنکھیں بہت روشن ہیں۔ یہ  
بصیرت کی روشنی میں وہاں تک دیکھ سکتا ہے جہاں تک  
بصارت کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ تم دونوں کا ساتھ خوب  
رہے گا۔ تم اپنے اندر کی قوتوں سے کام لو گے اور یہ اپنے  
اندروں کی روشنی سے تمہاری رہنمائی کرے گا۔“

تو بان نے پالا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور میرے سامنے  
آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ  
دیے۔ اس کی بند آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔  
دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے ان بند کھڑکیوں سے خارج  
ہونے والی مضاطہی لہریں میری آنکھوں کے راستے پورے  
بدن میں پھیل سی جانی لگی ہوں۔

”یہ بالا۔“ اس نے سیدھا ہاتھ میرے کندھے سے ہٹا کر  
گلے میں پڑی ہوئی مالا پر رکھ دیا۔ وہ مالا کے موتیوں کو اٹھوٹھے  
اور شہادت کی انگلی سے ٹٹول رہا تھا ”یہ تمہارے لیے نیلکری  
کا ایک انمول تحفہ ہے لیکن تم اس معاملے میں بھی اجنبی ہی  
رہے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو اس شیطان کو  
نیلکری کی پتر چوٹیوں کی طرف آنے کی ہمت نہ ہوتی لیکن  
خیر۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے  
بولا ”اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ وقت ابھی ہمارے ہاتھ میں  
ہے۔ ہمیں آج یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں کالی چٹان  
کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ پالا! مجھے باہر چھوڑ آؤ۔“  
اس نے مڑ کر ایک ہاتھ پالا کی طرف بڑھا دیا۔

میرے دماغ میں اب بھی دھماکے سے ہورے تھے۔  
گلے میں پڑی ہوئی مالا کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا  
لیکن تو بان جان گیا تھا کہ یہ نیلکری کا تحفہ تھا۔ اس نے  
میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے اور پھر اس کے ایک ہاتھ کی  
انگلیاں میرے گلے میں مالا کے موتیوں پر گئی تھیں اور ایک  
لمحے کو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہو لیکن اس  
کمرے سے باہر جانے کے لیے اس نے پالا کا سامرا لیا تھا۔

عجیب طرح کی سنسنی نے مجھے اپنی پیٹ میں لے رکھا  
تھا۔ اس کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکھا۔ اپنے  
جھونپڑے میں آکر بھی میں بار بار تو بان کے بارے میں سوچتا  
رہا۔ کیا وہ واقعی نیلکری کی برف پوش چوٹیوں تک میری  
رہنمائی کرے گا یا میں اس کے ساتھ زندگی بھر پھاڑوں میں



اس طرف بڑھتا چلا گیا۔

وہ دو خچر تھے لیکن ان کے آس پاس کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ٹوبان!“ میں نے خچروں کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔

”میں یہاں ہوں اجنبی۔“ دائیں طرف سے آواز سنائی دی اور ایک انسانی ہیولا تاریکی سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔

میرا خیال تھا کہ ٹوبان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو گا جو اسے ہاتھ سے پکڑ کر یہاں لایا ہو گا لیکن آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔

”وقت ضائع مت کرو اجنبی۔“ ٹوبان کی آواز میری سماعت سے نکل کرانی ”اب ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“

میں ایک خچر کی لگام پکڑ کر ٹوبان کے قریب لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے سہارا دے کر اس خچر پر سوار کراؤں گا اور خود دو سرے خچر پر سوار ہو جاؤں گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ٹوبان اپک کر دو سرے خچر پر سوار ہو گیا تھا۔ میں بھی اپنے خچر پر سوار ہو گیا۔

پگھلندی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ٹوبان کا خچر آگے تھا اور میرا خچر سترھ کائے اس کے پیچھے پیچھے چلا رہا۔

جھٹوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے کھلا میدان تھا جس سے آگے بہت دور پہاڑوں کے تاریک ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ اس میدان میں آتے ہی ٹوبان کے خچر کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ مجھے بھی اپنے خچر کی رفتار بڑھانی پڑی۔ خچر کی تنگی پیٹھ پر سفر کرنا کم از کم میرے لیے بہت کھن ثابت ہو رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

مجھے زیادہ حیرت ٹوبان پر ہو رہی تھی جس کا خچر مجھ سے کئی گز آگے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لگام تھام رکھی تھی اور خچر کی پشت پر بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

خچر تقریباً دو گھنٹوں تک اس پتھر کے میدان میں دوڑتے رہے اور جیسے ہی پہاڑی سلسلہ شروع ہوا، ان کی رفتار خود بخود کم ہو گئی۔ ٹوبان کا خچر اب بھی مجھ سے چند گز آگے تھا۔ مجھے قدرت کی اس ستم ظریفی پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ایک اندھا آنکھوں والے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

ان پہاڑوں میں ہمارا سفر رات بھر جاری رہا۔ ہم نہ صرف بتدریج بلندی کی طرف جا رہے تھے بلکہ راستہ بھی کھن سے کھن تر ہو جا رہا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو رات

کی تاریکی میں خطرناک راستوں پر سفر کرنے کی ہمت کبھی نہ کرتا لیکن ایک ایسا شخص مجھے راستہ دکھا رہا تھا جو آنکھوں سے محروم تھا۔ پورے راستے میں وہ کہیں ایک مرتبہ بھی نہیں ٹھنکا تھا۔

صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد بھی ہمارا سفر جاری رہا۔ ٹوبان کا خچر کبھی میرے برابر آ جاتا اور کبھی گز آگے نکل جاتا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب راستہ زیادہ خطرناک ہوتا تو ان کا خچر میرے برابر آ جاتا تھا۔

سورج نکل آیا۔ دھوپ کی کرنیں پھیلنے لگیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ چٹانوں کے درمیان بہت کھلی جگہ تھی۔ رات کی تاریکی میں سفر کے دوران میں چٹانوں کے پہلوؤں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن دن کی روشنی پھیلنے کے بعد آس پاس کے مناظر دیکھ کر حیرت کے مارے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ان پہاڑوں میں اگرچہ اونچے درخت نہیں تھے لیکن سبز بے تحاشا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگ پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ جس جگہ ہم ٹھہرے تھے وہاں بھی شفاف پانی کی ایک چھوٹی ندی کے آس پاس ہندو بندہ گھاس اور پھولوں کی چادر چھپی ہوئی تھی۔

ٹوبان نے اپنے خچر کی گردن سے بندھا ہوا ایک تھملا اتار لیا اور خچر کو کھلا چھوڑ دیا۔ رات بھر کے سفر سے خچر بھی تھک گئے تھے اور میری حالت کچھ زیادہ ہی اجڑ ہو رہی تھی۔ راجستھان میں، میں نے شوقیہ طور پر ٹھوڑے کی ٹھوڑی بہت سواری کی تھی لیکن آرام دہ زین پر ٹھوڑی دیر کو سواری کرنا اور بات تھی اور خچر کی تنگی پیٹھ پر رات بھر پہاڑی سفر کرنا دوسری بات۔ میرا جوڑو بڑھل کر رہ گیا تھا۔

خچر سے اتر کر میں گھاس پر لیٹ گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ٹوبان ندی کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد وہ میری طرف گھوم گیا۔

”تھک گئے؟“ وہ بولا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے مجھے دیکھ رہا ہو۔

”ٹھوڑے یا خچر کی تنگی پیٹھ پر کبھی سفر نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کھٹیا نیاں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔“ اس نے کہا ”مقصد اگر نیک ہو تو کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ لوہہ ٹھوڑی پیٹ پوجا کر لو تو ہم آگے چلیں۔“ اس نے تھملا میری طرف اچھال دیا۔

میں نے اٹھ کر پہلے منہ ہاتھ دھویا اور پھر تھملا کھول کر

اس میں جھانکنے لگا۔ اس میں مڑ کے بیٹھے ہوئے دانے تھے۔ گزشتہ رات کا کھانا اس سفر کے دوران میں ہضم ہو چکا تھا اور اس وقت مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ایک منہی دانے لے لیے اور تھملا ٹوبان کی طرف بڑھا دیا۔

”لو۔ تم بھی کھاؤ۔“ ٹوبان نے تھملا کی طرف ہاتھ بڑھا تو مجھے شرارت سوچی اور میں نے تھملا ایک طرف ہٹا دیا۔ ٹوبان کا ہاتھ اس طرف بڑھا تو میں نے تھملا وہاں سے بھی ہٹا دیا۔

”مذاق کر رہے ہو۔“ ٹوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میرے لاشعور میں شاید یہ ہو کہ میں اسے آزمانا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ آنکھوں سے محروم جو شخص رات کی تاریکی میں خطرناک پہاڑی راستوں پر میری رہنمائی کرتا آیا تھا۔ میں اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی بھول گیا تھا کہ گزشتہ رات سفر کے دوران میں کئی ایسے خطرناک مقام آئے تھے جہاں معمولی سی غفلت کسی کو سخت اثر کی میں پہنچا سکتی تھی اور ایسے ہر موقع پر ٹوبان نے میری رہنمائی کی تھی۔

”مجھے افسوس ہے ٹوبان۔“ میرے لبے میں ندامت تھی ”مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”میں نے برا نہیں مانا۔“ ٹوبان نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے تھملا لے لیا اور اس میں سے مڑ کے دانے نکال کر کھانے لگا۔

بیٹھے ہوئے مڑ کے دانے نمکین تھے جو کھانے میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ مڑ کھانے کے بعد میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ راستے بے حد خطرناک تھا۔ کہیں تنگ سی دراڑوں میں سے گزرتا پڑتا اور کہیں عمودی ڈھلوانیں تھیں۔

دن بھر کے بغیر ہمارا سفر جاری رہا۔ سہ پہر کے قریب ہم ٹھوڑی دیر کو ایک جگہ رکے اور پھر آگے روانہ ہو گئے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں ہمارے سامنے شب میں وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی جس کی دوسری طرف تیلگری کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے انہی پہاڑوں میں کہیں بدھ کی وہ قدیم عبادت گاہ گوپو تھی جہاں گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے برف پوش چوٹیاں نظری کا بجھی مسکن تھیں جہاں وہ بے

چھنی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم آج کی رات یہاں آرام کر لیں اور صبح اپنا سفر دوبارہ شروع کریں۔“ میں نے ٹوبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ ٹوبان نے نفی میں سر ہلادیا ”آدھی رات سے پہلے پہلے ہمیں وادی کی دوسری طرف پہنچ جانا چاہیے۔ اگر تم بہت تھک گئے ہو تو ہم چند منٹ یہاں آرام کر سکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ میں نے بھی نفی میں سر ہلادیا۔ میں اس ستر سالہ بوڑھے کے سامنے آپ کو بلکا ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا جو پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے خچر کی تنگی پشت پر ننان اشاپ سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ دس منٹ رکنے کے بعد ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ ہمارے سامنے ڈھلان تھی اور وہ وادی ملیوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹوں میں اس وادی کی دوسری طرف برف پوش پہاڑ کے وامن میں پہنچ جائیں گے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا تارک کہ خیر سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستان عبرت  
جو حالات کے جال میں پھنس کر جرأت

کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعام یافتہ شہر مصنف جبار ترقی کا سفر نامہ



کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز  
23 مارچ 2008ء  
74200  
5902552-5905343  
kitabiat1970@yahoo.com

ٹوبان آگے نکل چکا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بھیڑیا نہیں تھا جبکہ درجن بھر بھیڑیے دانت کھوستے اور غراتے ہوئے مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ یہ بھیڑیے۔۔۔ یہ بھی مجھے بدھ کی عبادت گاہ تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش تھی۔ یہ بھی کسی طاغوتی قوت کے نمائندے تھے جو صرف مجھے روکنا اور ختم کرنا چاہتے تھے جبکہ انہوں نے ٹوبان کا تعاقب ترک کر دیا تھا۔

میرے ذہن میں ابھرنے والے صرف اس ایک خیال نے صورت حال بدل دی۔ میری اندر کی تمام تر قوتیں میری آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ تین بھیڑیے بڑی شدت سے میرے اوپر حملہ آور ہو رہے تھے لیکن اچانک وہ رک گئے۔ مجھے ان کے پیروں کے قریب کچھ چنگاریاں سی ناچتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ چنگاریاں بڑی سرعت سے پھیلتی گئیں۔ بھیڑیے مجھ پر حملہ آور ہونا بھول گئے اور اچھل اچھل کر اپنے آپ کو ان چنگاریوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

وہ ننھی ننھی چنگاریاں دیکتے ہوئے انگاروں میں بدل گئیں۔ وہ خون خوار بھیڑیے اچھل رہے تھے۔ ان کے منہ سے اب غراہوں کے بجائے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

میری نظروں کا زاویہ بدل گیا۔ اب میں نے نظروں ہی نظروں سے ان بھیڑیوں کے گرد دائرہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ آگ کا دائرہ تھا جو ان خون خوار بھیڑیوں کو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ وہ حصار ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بھیڑیا باہر

بلور کی طرح ہنک رہی تھیں۔ دوڑنے کے ساتھ ان کی غراہوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

دونوں ٹپڑوں نے بھی خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے لیکن ظاہر ہے وہ نہ خیر تھے۔ ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

ٹوبان والا خیر مجھ سے چند گز آگے تھا۔ ٹوبان بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا اور ”اچھی تیز تیز“ ”چینا“ میں خیر کو تیز تر دوڑانے کے لیے اسے بار بار چاک کر رہا تھا۔

دو بھیڑیے میرے بالکل قریب پہنچ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے ایک بھیڑیا خیر کے برابر پہنچ گیا اور اچھل کر میرا پیر پکڑنے کی کوشش کی۔ اگر میرا پیر اس کے منہ میں آجاتا تو وہ اسے چبائی ڈالتا۔ میں نے دونوں ٹانگیں خیر کے پیٹ کے ساتھ پلٹ لیں اور بھیڑیے کے منہ پر چاک کر دیا۔

چاک کھا کر وہ بھیڑیا تو پیچھے رہ گیا لیکن دوسرا بھیڑیا قریب پہنچ گیا تھا جو خیر کی پچھلی ٹانگ پر دانت گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے چھڑی سے اس بھیڑیے پر بھی دو تین حملے کیے لیکن اس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

ٹوبان بھی ایسی ہی صورت حال سے دو چار تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ بھیڑیے اس سے کافی دور تھے اور جان توڑ کر دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے پیچھے آنے والے ایک بھیڑیے نے عقل مندی یہ کی کہ وہ دوڑتا ہوا میرے خیر سے آگے نکل گیا۔ تقریباً دس گز آگے جا کر وہ ”کا“ تیزی سے مڑا اور حیرت انگیز طور پر ہوا میں اچھل کر میری طرف حملہ آور ہوا۔

اس بھیڑیے کو سامنے دیکھ کر خیر بد گیا۔ وہ اگلے پیر اٹھا کر ہوا میں اچھلا۔ اس دوران میں سامنے سے ہوا میں اڑتا ہوا بھیڑیا میرے اوپر حملہ آور ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی بھی پھینک دی اور خیر کی لگام بھی چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بھیڑیے کو اپنے آنکھوں پر روکا۔

خیر میرے پیچھے سے نکل گیا تھا۔ میں پشت کے بل زمین پر گر کر۔ بھیڑیا میرے اوپر تھا لیکن میں نے اسے اپنے پیچھے اچھال دیا تھا۔

اس طرح خیر کی پشت پر سے گرنے سے مجھے ابھی خاصی چوٹ لگی تھی لیکن میں نے تھکے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میرے سامنے واقعی جسم کی بلا نہیں تھیں۔

جانا چاہیے۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھ سکتا اس نے اپنے خیر کو

ایڑھ لگا دی۔ خیر کھٹکھا ہوا۔ میں اگرچہ اس کی بات پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا لیکن ایک انجانا سا خوف اچانک ہی ذہن میں ابھر آیا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے کوئی بلا نظر نہیں آئی جو حملہ آور ہونے والی ہو لیکن ٹوبان بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ آنکھوں سے محروم تھا لیکن قدرت نے اس محرومی کے عوض اسے کچھ اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اندر کوئی ایسی اضافی جس بھی تھی جس سے وہ فضا میں سو گتہ کر صورت حال کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہ حس غالباً چھٹی حس سے بھی آگے کی کوئی چیز تھی۔

اچانک میں چونک گیا۔ کچھ ایسی آوازیں میری ساعت سے کھڑکی تھیں جیسے چند جانور ریوڑ کی صورت میں دوڑ رہے ہوں۔ یہ پراسرار آوازیں کبھی قریب سے سنائی دیتی کبھی بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی۔

”اجنبی! بھاگو۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟“

ٹوبان کی آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر اس طرف دیکھا تو وہ مجھ سے تقریباً سو گز آگے نکل چکا تھا۔ میں نے بھی اپنے خیر کو ایڑھ لگا دی۔

مکمل سفر سے اگرچہ خیر بھی تھکا ہوا تھا لیکن ایڑھ لگتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ شام سے پہلے ہم نے جہاں تھوڑی دیر کے لیے ڈاؤ ڈالا تھا وہاں میں نے ایک جھاڑی سے لمبی سی ایک شاخ توڑ لی تھی جو اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں تن کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ میں لگام تھی اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر خیر کو تیز دوڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ٹوبان کے برابر پہنچ گیا۔ وہ بھی خیر کو تیز سے تیز تر پھلانگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہماری کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے جسم کی بلا میں ہمارا پیچھا کر رہی ہوں۔

اور پھر میں نے ان بلاؤں کو دیکھ لیا۔ دوڑنے کی آوازیں سن کر ہی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس روکنا ہو محسوس ہونے لگا۔ غول بیابانی ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ خوف ناک بھیڑیے تھے اور تعداد میں کئی تھے۔ ان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی

خیر بھی مسلسل سفر سے تھک گئے تھے۔ ان کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں رہی تھی۔

سورج غروب ہو گیا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ سرمئی دھندلکے کی جگہ اندھیرے کی سیاہ چادر پھیلنے لگی اور پھر اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا کہ چند گز آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن خیر اطمینان سے چلتے رہے۔ لگتا تھا جیسے یہ راستہ ان کا دیکھا بھلا ہو اور وہ پہلے بھی اس طرف آتے رہے ہوں۔

پر ہول سناٹا دل برداشتہ سی طاری کر رہا تھا۔ میں نے دھیان بٹانے کے لیے ٹوبان سے باتیں شروع کر دیں لیکن وہ ”ہوں ہاں“ سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ عجیب آدمی تھا۔ کل آدمی رات کے وقت ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک چند جھلوں کے تارالے کے سوا ہم میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور اس وقت بھی وہ گفتگو سے اجتناب برت رہا تھا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

پورے سفر کے دوران میں میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ ٹوبان کبھی بھی اپنا خیر روک کر اس طرح نچھنے پھلانے پھلانے لگتا جیسے کچھ سو گتے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس حرکت کے بعد یا تو وہ اس راستے پر اپنا سفر جاری رکھتا یا مجھے اشارہ کرتا ہوا خیر کو کسی اور راستے پر موڑ دیتا۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ ہم مڑ کر بہت دور تک پیچھے آئے تھے اور پھر راستہ تبدیل کیا تھا۔

اس وادی میں سفر کرتے ہوئے تقریباً چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ ڈھلان ختم ہو چکی تھی۔ اب آگے ہموار علاقہ تھا۔ سامنے پہاڑوں کے پہوے اب بھی اتنے ہی دور تھے جتنے اس وادی کے شروع میں نظر آئے تھے۔

آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کے باعث تاریکی میں اب وہ پہلے جیسی گہیرا نہیں رہی تھی۔ راستہ بھی اب کسی حد تک صاف نظر آنے لگا تھا۔

اچانک ٹوبان نے خیر روک لیا اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سو گتے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بھی اپنا خیر روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹوبان خیر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف گھوم کر نچھنے پھلانگ رہا تھا پھر اچانک وہ سیدھا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرتے تھے جیسے اس نے کوئی خوفناک بات محسوس کی ہو۔

”بھاگو یہاں سے اجنبی!“ وہ اپنے خیر کی لگام سنبھالتے ہوئے بولا ”تھیل شروع ہو گیا۔ بلا میں ہم پر حملہ آور ہونے والی ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، ہمیں اس وادی سے نکل

**مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں**

**بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات**

**عظمت کے مینار**

قیمت 150/- روپے

ڈاک خرچ 25/- روپے

**مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی**

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 راجی نمبر 1

نکلتے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہ بھیڑیا تھا جس نے فخر سے آگے نکل کر میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ ایک اور بھیڑیے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی آگ کا دائرہ عمل ہو گیا۔ وہ بھیڑیے آگ کے دائرے میں محصور ہو گئے۔ وہ انگڑوں پر اودھرا دھڑک رہے تھے۔ ان کے منہ سے بڑی بھیاں نکلیں تو اڑیں نکل رہی تھیں۔ میں اس بھیڑیے کی طرف دیکھنے لگا جو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بہت دور نکل گیا تھا۔ ایک نیلے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ستاروں کی روشنی میں اس کا ہولنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے رو رہا تھا۔ سنائے میں اس کے رونے کی آواز پوری وادی میں پھیل رہی تھی۔

”جی! اب دیر مت کرو۔ نکل چلو یہاں سے۔“

میں نے مڑ کر آواز کی طرف دیکھا۔ ٹوبان مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا لیکن اس کی آواز مجھے اپنے بالکل قریب سے سنائی دی تھی۔

میں اٹھ کر اودھرا دھڑک دیکھنے لگا۔ میرا فخر بھی تقریباً گز دوڑ کر ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ پھر بدھ گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ پسینے میں بھیجا ہوا ہے۔

میں ایک کراس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اسے ہلکی سی ایڑھ لگا دی۔ ٹوبان میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے بھی اپنے چمچ کو ایڑھ لگا دی۔

میں نے پیچھے مڑ دیکھا۔ آگ کا دائرہ روشن تھا اور بھیڑیوں کے چیختے چلانے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم فخریوں کو دوڑاتے ہوئے وہاں سے میلوں دور نکل آئے لیکن اس بھیڑیے کے رونے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ روٹی اور بین کرتی ہوئی یہ آواز وادی میں چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ٹوبان اب بھی خاموش تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ”ہوں ہاں“ سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

ہمارا سفر رات بھر جاری رہا اور بالآخر ہم وادی سے نکل کر اونچے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ اب ہم پھر بلندی کی طرف سفر کر رہے تھے۔

رات کی تاریک دم توڑنے لگی۔ دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ ٹوبان فخر روک کر ایک بار پھر فضا میں کچھ سو گھنے کی کوشش

اٹھائی۔ ”ٹوبان کی آواز سن کر میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند گز پیچھے کھڑا تھا اور اس نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

”تمہیں اس پگھلنے والی سے گزر کر جانا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ راستہ صرف وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جو آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور تم میں حوصلے کی کمی نہیں۔ اب دیر مت کرو۔“

میرا خیال تھا کہ ٹوبان اس موقع پر بھی میری رہنمائی کرے گا اور برف کے پل پر قدم رکھنے میں بھی پہل وہی کرے گا۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

”میں یہاں سے آگے نہیں جا سکتا۔“ اس نے ایک بار پھر میرے خیالات پڑھ لیے۔ ”تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔ جاؤ۔ اب دیر مت کرو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

میں نے ٹوبان کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر اس بل صراط کی طرف دیکھنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خطرناک راستے کو دیکھ کر میرا دل خزاں رسیدہ ہے۔ یہی طرح کانپ رہا تھا۔ پل پر جی ہوئی برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ٹوبان کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے اثرات نہیں تھے۔ یہ شخص میرے لیے ایک عجوبہ ثابت ہوا تھا۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ خطرناک ترین راستوں پر میری راہنمائی کرتا ہوا مجھے یہاں تک لایا تھا اور اب اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ برف کے اس بل صراط نما راستے سے ڈر گیا تھا۔ یقیناً کوئی اور مصلحت تھی۔

میں نے آخری بار اس کی طرف دیکھا اور مڑ کر اس راستے کی طرف چلنے لگا۔ چٹان پر بھری ہوئی برف میرے پیروں کے نیچے ”کریچ کریچ“ کی آواز سے دب رہی تھی۔ میں چٹان سے اس پل پر آگیا۔ پہلا قدم رکھتے ہی میرا دل کانپ اٹھا۔ بے پناہ خوف محسوس ہونے کے باوجود میں نے دوسرا قدم آگے بڑھا دیا۔

چند قدموں تک برف نرم تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں ہوا براہ راست مار نہیں کر رہی تھی۔ میرے پیر ٹخنوں تک اس برف میں دھستے رہے۔

اور پھر وہ مرحلہ شروع ہو گیا جسے زندگی کا خوفناک ترین تجربہ کہا جا سکتا تھا۔ آگے برف سخت تھی اور شیشے کی طرح چمکتی تھی۔ اگر آپ کو کبھی ایسا تجربہ ہوا ہو تو آپ کو اندازہ

چٹان کو کٹ کر بنائی گئی بدھا کی یہ قدیم عبادت گاہ دل پر دھت سی عمارت کی طرح تھی اور اس سے زیادہ دھت بانگ وہ راستہ تھا جس سے گزر کر اس عبادت گاہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔

پچاس گز طویل وہ راستہ بل صراط تھا۔ تقریباً چھ فٹ چوڑی تھی ہوئی برف کی وہ دیوار عبادت گاہ والی چٹان تک چلی جاتی تھی۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر نیچے بھاگنا تو مجھے اپنا دل کنبیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دونوں چٹانوں کے درمیان یہ کھنڈ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ گہرا تھا اور تیز رفتار پانی طوفانی لہروں کی طرح اچھلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ برف کی اس دیوار میں بھی جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ میرے خیال میں دونوں چٹانوں کو ملانے والی برف کی اس دیوار کو ایک بل کتنا ہی مناسب ہوگا۔ ایک جگہ بل کی سطح سے تقریباً آٹھ فٹ نیچے بھی ایک بہت بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ زیادہ دھت پڑنے سے اس جگہ سے پل ٹوٹ بھی سکتا تھا۔

میں سیدھا ہوا کر سامنے پڑھ عبادت گاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ چٹان کا وہ غار اگرچہ قدرتی ہی تھا لیکن اس میں انسانی ہاتھوں کی صفائی بھی نظر آ رہی تھی۔ غار کا دہانہ محرابی تھا۔ اس کا اوپر والا حصہ زمین کی سطح سے تقریباً تیس فٹ بلند تھا اور وہ دہانہ اس قدر کشادہ تھا کہ دو بائیں پلو بہ پلو بہ آسانی گزر سکتے تھے۔ اس محراب نما دہانے کے دائیں بائیں دیواروں پر چٹان کو کٹ کر بدھا کے استاد مجسمے تراشے گئے تھے اور محراب کے اوپر عین وسط میں بھی اس کا سنگ بدھا کا تراشا ہوا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔

غار کے دہانے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اندر سے بھی بہت وسیع و عریض ہوگا لیکن اس کے اندر کیا تھا؟ اسی کا اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔

میں چٹان کے کنارے سے چند فٹ دور کھڑا مجسمے نظروں سے اودھرا دھڑک دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ عبادت گاہ والی چٹان تک پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ ضرور ہونا چاہیے لیکن دائیں بائیں دور تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں دونوں چٹانیں آپس میں ملتی ہوں۔ اس جگہ جہاں میں کھڑا تھا، دونوں چٹانوں کے درمیان فاصلہ تقریباً پچاس گز تھا جبکہ دائیں بائیں کہیں یہ فاصلہ کم ہو جاتا تھا اور کہیں زیادہ۔ درمیانی گہرائی بھی کہیں کم تھی اور کہیں زیادہ۔ گہرائی میں تیز رفتار پانی کو اچھلتے دیکھ کر میری رگوں میں بھی خون اچھلنے لگا تھا۔

”عبادت گاہ تک پہنچنے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے

ہوگا کہ چلتے ہوئے شیشے پر چلنا کتنا دشوار ہوتا ہے اور ستم یہ کہ یہاں تو ہوا بھی مجھے ایک طرف دھکیل رہی تھی۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، ہوا میں بھی تیزی آ رہی تھی۔ شیشے کی طرح جی ہوئی برف پر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک موقع پر تو میرا پیر پھسل گیا۔ پھسلنے کی کوشش کرتے ہوئے میرا توازن بگڑ گیا اور میں پش کے بل گر۔ میں بڑی تیزی سے کنارے کی طرف پھسل رہا تھا اور پھر چانک یوں لگا جیسے میں کسی ناویدہ دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ میں کنارے سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر رکھا تھا۔ میں نے متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن میرے آپس پاس کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار قوت تھی جس نے مجھے گرنے سے بچا لیا تھا۔

میں ایک بار پھر سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت تک میں تقریباً بیس گز آگے آچکا تھا اور پھر چانک ہی مجھے ایسے لگا جیسے برف کا وہ بل اپنی جگہ سے حرکت کر رہا ہو۔ میرے لیے قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا لیکن میں آگے بڑھتا رہا۔ چند قدم آگے بڑھتے ہی میں پھر رک گیا بلکہ میں نے جھک کر دونوں ہاتھ بھی برف پر جمادیے۔ اس وقت مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے برف ٹوٹ رہی ہو۔ بڑی خوفناک آواز سنائی دی تھی۔ میں چند لمحوں بے حس و حرکت چوبائے کی طرح کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اب میں بل کے وسط میں پہنچ چکا تھا اور اسی جگہ پر تھا جہاں سات آنحضرت نے برف کی اس دیوار میں بہت بڑا سوراخ تھا۔ یہاں ہوا بھی بہت تیز ہو گئی تھی اور پھر وہ ہوا جس کی میں توقع نہیں کر سکتا تھا بلکہ ایسی صورت حال کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ہوا میں اچانک ہی تیزی آ گئی تھی اور جی ہوئی برف کا وہ بل رے کے بل کی طرح زور زور سے ہلنے لگا۔ مجھے تھائی لینڈ کے پہاڑی علاقے میں ایک مرتبہ رے کے بل پر چلنے کا اتفاق ہوا تھا شاولن ٹپس میں بھی رے کا ایک بل تھا۔ جس پر تقریباً روزانہ ہی چلا کرتا تھا لیکن جی ہوئی برف کا یہ بل؟ اس کے اس طرح ہلنے پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

تیز ہوا سے بل بڑی تیزی سے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں پیر جمائے کھڑا رہا تھا۔ ایک ہی جگہ کھڑے رہنے سے پیروں کی حرارت سے اس جگہ برف میں گڑھے سے پڑ گئے تھے اور میرے پیر ایک طرح سے ان گڑھوں میں جم گئے تھے لیکن بل جس طرح جھول رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے کئی فٹ اوپر اچھال دیا اور جب میں دوبارہ بل پر گر کر اویسی آواز سنائی دی جیسے کوئی چٹان ٹخ رہی ہو۔ بڑی خوفناک آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں دل کر رہا۔ میرے پیروں کے نیچے بل ٹوٹ رہا تھا۔ برف کی بہت بڑی سل سلوموشن میں نیچے جھک رہی تھی جیسے درخت کی شاخ ٹوٹ کر آہستہ آہستہ نیچے جھک رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا اور پھر برف کی وہ سل میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔

میں بڑی تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ ڈیڑھ سو فٹ نیچے طوفانی لمبوں کی طرح چلتا ہوا پانی مجھے اپنی آغوش میں لینے کو تیار تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تمام تر توجہ مراعات پر مرکوز کر دی۔ یہ لمحائی مراقبہ سودمند ثابت ہوا۔ یہ میرا تجربہ تھا۔ میں نے جب بھی مراعات کا خیال کیا تھا، مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایسے موقع پر میرے اندر کی قوت نے میری مدد کی تھی۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں فضا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کھوپڑی پر ٹانگ دیا گیا ہو۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں فضا میں معلق گھڑیاں کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں نیچے طوفانی رفتار سے بہتے ہوئے پانی سے چند فٹ اوپر تھا۔ اٹھتی ہوئی لہریں کبھی کبھی میرے پیروں کو بھی چھو سکتی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے پانی کی وہ لہریں آگ کی لپٹوں میں بدل جاتیں۔

وہ آگ کا دریا تھا۔ لمبوں کی صورت میں اٹھتے ہوئے مہیب شعلے میری طرف لپک رہے تھے۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور تک چٹانوں کے نیچے آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ مہیب شعلے اچھل اچھل کر میری طرف لپک رہے تھے۔ ان کی پیش قدمی میں گویا پگھلا جا رہا تھا۔ شعلے مجھے نگل لینے کو لپک رہے تھے۔

اب صورت حال میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ جب میں جی ہوئی برف کے بل کے اوپر تھا تو ہوانے مجھے دھکیلنا شروع کیا تھا پھر وہ بل رے کے بل کی طرح ہلنے لگا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ تند اور تیز ہوا کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے اور جب بل میرے پیروں کے نیچے ٹوٹا تھا تو تب مجھے ذرا سی حیرت ہوئی تھی۔ ایک آدمی کے وزن سے بل کس طرح ٹوٹ سکتا ہے اور اب آگ کا یہ دریا۔ مجھے نگل لینے کو

لپکتے ہوئے شعلے؟ یقیناً مجھے رونے کی کوشش کی جارہی تھی۔ طاعون کی قوتیں مجھے تباہ و برباد کرنا چاہتی تھیں۔ میرے اندر کی قوت بیدار ہو چکی تھی۔ مہیب شعلے اب مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ شعلے میرے بدن سے ٹکراتے تو وہ پانی کی پجوار میں بدل جاتے۔

طاعون قوتوں کے حملوں میں تیزی آتی گئی۔ آگ کے مہیب شعلوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان سے مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا مگر بل کی جی ہوئی برف تیزی سے پھسلنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے تھیں کے کنارے پکڑ کر اوپر اٹھا رہا ہو۔ میں نے گردن گھما کر اوپر دیکھا۔ ٹوبان چٹان کے کنارے پر کھڑا کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے میری شرت کا کالر پکڑ رکھا تھا اور مجھے اوپر کھینچ رہا تھا۔

میرے اور ٹوبان کے بیچ تقریباً تیس گز کا فاصلہ تھا اور اس کا ہاتھ اتنا دراز ہو گیا تھا کہ اس نے مجھے شرت کے کالر سے پکڑ کر نیچے گرنے سے بچا لیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا گیا اور پھر اس ہاتھ نے مجھے اٹھنے کے بل کے دوسرے حصے پر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد وہ ہاتھ میری گردن سے ہٹ گیا۔ آگ کے شعلے اب بہت نیچے رہ گئے تھے۔ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے لیکن ان کی گرمی سے برف بڑی تیزی سے پھل رہی تھی اور برف کی دیوار آہستہ آہستہ نیچے پڑ رہی تھی۔

میں نے بدھ عبادت گاہ والی چٹان کی طرف دیکھا۔ عبادت گاہ کے دہانے پر قدرے اندر کی طرف ایک روشن پھولا سا دکھائی دیا۔ اس پھولے کے چرے کے نقش واضح نہیں تھے لیکن مجھے اس میں نیلگہری کی جھلک دکھائی دی تھی۔ برف کی دیوار میرے پیروں کے نیچے پھٹی جا رہی تھی۔ میں نے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کئی مرتبہ میرا پیر پھسلا لیکن میں سنبھل کر دوڑتا رہا۔

دوسری طرف چٹان کا کنارہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ برف کی دیوار میرے پیروں تلے سے نکل گئی۔ میں پوری قوت سے ہوا میں اچھلا اور پرندے کی طرح اڑتا ہوا کنارے کی طرف لپکا۔ ایک دم سامنے سے گرم ہوا کا ایک طوفانی جھونکا آیا جو مجھے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگا۔ میں ایک لمحے کو فضا میں معلق سا رہ گیا۔ جتنی ہوئی ہوا کا وہ جھونکا تیز و تند ہونے میں بدل گیا اور میں لٹکی طرح گھومتے لگا۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ جتنی ہوئی ہوا میرے

بدن کو جھلائے دے رہی تھی۔ میں اس گولے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی ناویدہ قوت میرے ہاتھوں اور پیروں کو گرفت میں لے کر انہیں رسی میں باندھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے ہاتھ پیر پھرانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک گولے کا زور ٹوٹ گیا۔ میں بلندی سے پھسلے ہوئے پتھر کی طرح تیزی سے نیچے گرنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں چٹان کے کنارے کے بالکل قریب گمراہی میں لپکتے ہوئے آگ کے شعلوں کی طرف گر رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ پیر ارا دی طور پر چٹان کی طرف دراڑ ہو گیا اور کنارے پر میری گرفت جم گئی۔

اب میں ایک ہاتھ کے سارے چٹان سے لٹکا ہوا تھا۔ جس پتھر پر میرا ہاتھ لٹکا تھا اس پر برف جمی ہوئی تھی اور میری انگلیاں آہستہ آہستہ برف پر پھسل رہی تھیں۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا، ڈیڑھ دو سو فٹ نیچے بدستور آگ کا دریا بہہ رہا تھا اور میری طرف لپکتے ہوئے شعلے بتدریج بلند ہو رہے تھے۔

میں نے دوسرا ہاتھ بھی کنارے پر جمادیا اور اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا گیا۔ ایک ٹانگہ دہری کر کے پہلے کھٹا کنارے پر نکلیا اور اپنے آپ کو ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ ابھی میں پوری طرح سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ میرے منہ پر زور دار گھونسا پڑا۔

وہ ناویدہ گھونسا ہتھوڑے کی طرح وزنی تھا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس وقت میں چٹان کے بالکل کنارے پر تھا اور میرا توازن بگڑ چکا تھا۔ میں کسی بھی لمحے نیچے آگ کے دریا میں گر سکتا تھا۔

فضا میں اچانک ہی قہقروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ خوفناک شیطانی قہقروں میں بازگشت پیدا کر رہے تھے۔ آوازیں سنگناں چٹانوں سے ٹکرا کر اکرلٹ رہی تھیں۔ میں پیچھے گرنے کے قریب تھا کہ سنبھل گیا۔ جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے سہارا دیا ہو۔ پشت پر ہاتھ رکھ کر آگے کو دھکیل دیا ہو۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کئی فٹ آگے جا کر منہ کے بل گر۔ میں نے دونوں ہاتھ بڑی پھرتی سے زمین پر ٹکا دیے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے یا میرا چہرہ خونی ہو جاتا۔ میں گرنے کے فوراً بعد ہی سنبھل گیا۔

قہقروں کی پراسرار آوازیں اب رونے اور بین کرنے کی آوازوں میں بدل گئی تھیں جیسے سیڑیوں بد روہیں ماتم

کر رہی ہوں اور بین کر رہی ہوں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو بیاں چٹان کے دوسرے کنارے پر اب بھی اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ ہمارے درمیان اگرچہ پیاس گز کے لگ بھگ فاصلہ تھا لیکن مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ میں واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔

میں عبادت گاہ کے داخلی راستے کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ یہاں زیادہ کشادہ جگہ نہیں تھی۔ چٹان کا کنارہ پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دوسری چٹان تک جانے والی برف کی دیوار پکھل کر پانی بن چکی تھی۔ میرے اور تو بیاں کے بیچ یہ طویل گہری کھاڑی حائل ہو چکی تھی اور اس گہری کھاڑی میں اب بھی آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ شعلے لپک رہے تھے۔ میری واپسی کا راستہ مسدود ہو گیا تھا یا مسدود کر دیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے 'میں بھی ناکام واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کم از کم اس وقت تک واپس جانے کا خیال دل میں نہیں لاسکتا تھا جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد مجھے واپسی کے راستے بھی مل سکتے تھے۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر عبادت گاہ میں داخل ہونے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ پانچ کشادہ سیڑھیاں بھی چٹان کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ میری توقع کے مطابق یہ عمارت وسیع تھا۔ چھت بھی بہت اونچی تھی۔ دیواروں کو تراش کر عظیم بدھا کے لائق اور مجسمے بنائے گئے تھے۔

غار کے اختتام پر تقریباً دس فٹ چوڑی راہداری تھی اور میرے خیال میں غار اس طرف کالی اندر تک چلا گیا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ اس غار میں اندھیرا نہیں تھا۔ جب میں نے دوسری طرف سے برف کی دیوار پر چلنا شروع کیا تھا تو اس وقت آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ غار کے باہر اب بھی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ کی وجہ سے غار کے دیواروں کے اندر ٹھوڑی دور تک روشنی تو ہوتی چاہیے تھی لیکن پورے غار میں آگے بھی تدم سا کالا تھا اور میرے خیال میں اس راہداری کی دوسری طرف بھی کوئی ایسی کھلی جگہ موجود تھی جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔

میں کچھ دیر اس جگہ پر کھڑا مجتھش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں راہداری کی طرف قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ بالکل ایسے ہی لگا تھا جیسے کسی کمرے میں بجلی ہوئی لائٹ بجھا دی گئی ہو۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا اور خوف کی شدت سے کانپ کر رہ گیا۔

گہری دھند عبادت گاہ کے سامنے جمع ہو رہی تھی۔ دھند کا رنگ پتلے سرمئی سا تھا پھر اس میں گہرا بن آ گیا اور بالآخر یہ دھند سیاہ رنگت اختیار کر گئی۔

سیاہ دھند کے دل ہی دل غار کے اندر آ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شدید سردی میری ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میرے اوپر کچی سی طاری ہو گئی اور باقاعدہ دانت بجنے لگے۔

میں پیچھے ہٹتا ہوا راہداری کی طرف بڑھتا چلا گیا لیکن نہ تو سردی کی شدت کم ہوئی اور نہ ہی دھند میں کمی آئی۔ میں غصے سے دہرا ہوا جا رہا تھا۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہونے لگی۔ اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کے بجائے میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اپنے بازو بھی سمیٹ لیے تھے اور گھٹنے بھی خود بخود سمٹ کر پیٹ سے لگ گئے تھے۔

شیطان قہقوش کی آوازیں ایک بار پھر غار میں گونجنے لگیں۔ طاغوتی قوتیں میری بے بسی پر ہنسنے لگی تھیں۔ وہ مجھے ہر صورت میں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتی تھیں۔ زیر کرنا چاہتی تھیں اور موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی تھیں۔

یوگی گوتم ہوش چاب پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چیلہ پنڈت دھیراج مجھے زیر کرنے کے لیے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے پاس بھی ایسی قوتیں ہیں جو اسے شکست سے دو چار کر سکتی ہیں۔

میرے اندر کی سب سے بڑی قوت تو "چی" تھی جسے میں نے شاؤن ٹیپل میں بڑی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا۔ سردی کی شدت سے میری قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ میرا سانس رک رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کر کے اپنی تمام تر توجہ "چی" کی طرف مبذول کر دی۔

میں اب بھی بخ بستہ دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن اب میرے جسم میں حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ میرے سانس کی رفتار نارمل ہو گئی۔ ٹانگیں اور بازو آہستہ آہستہ سیدھے ہونے لگے۔ میں خوابیدہ تھیر کی طرح انگڑائی لے کر سیدھا ہو گیا۔ میرے گرد لپٹی ہوئی کالی دھند پانی بن کر غار کے فرش پر بہنے لگی۔

"بھاکو ویدان۔۔۔ بھاکو۔۔۔"

ایک بار اسرار سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے میرے نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور یہاں میرا نام صرف نیلگری جاتی تھی۔ میرے کان میں سرگوشی کی بازگشت ختم

ہوتی ہی چٹانوں کے ٹوٹنے کی ہیبت ناک آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ غار کی چھت کا ایک حصہ بیٹھ رہا تھا۔ میں نے راہداری کی طرف دوڑ لگا دی۔

غار کی چھت کا وہ حصہ بیٹھ گیا۔ غار کے اندر بھی چٹانیں اس طرح ٹل رہی تھیں جیسے شدید زلزلہ آ گیا ہو۔ میں دوڑتا رہا۔ تقریباً بیس گز آگے جا کر یہ راہداری دامن طرف مڑ گئی۔ اس طرف مڑنے ہی میں ایک بار پھر مجھ پر دہشت سی طاری ہوں کی پھر پھڑپھڑانے ایک بار پھر مجھ پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ سیڑوں چگادڑوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چرو چھالیا اور پیچھے جھک گیا لیکن چرو چھالنے سے میں محفوظ نہیں ہو گیا تھا۔ چگادڑوں کا حملہ جاری رہا۔ ان کے کیلے دانت سویوں کی طرح میرے بدن میں پورے ہو رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو زور زور سے جھٹکنے دیتے لگا۔ کئی چگادڑ گوشت میں دانت گاڑے میرے جسم سے چپک ہوئی تھیں۔ میرے اندر کی قوت ایک بار پھر بیدار ہو گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میری ساری قوتیں سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئی ہوں۔

میں نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے صاف لگ رہا تھا جیسے میری آنکھوں سے لہریں سی خارج ہو رہی ہوں۔ میں نہ صرف اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا بلکہ آنکھوں سے خارج ہونے والی لہریں لیزر بھی کی طرح اثراتی ہوئی لائق اور چگادڑوں کو شکار کر رہی تھیں۔ جو بھی چگادڑ ان لہروں کی زد میں آئی راکھ بن کر بکھر جاتی۔ ایک وقت میں کئی کئی چگادڑ راکھ بن کر ڈھیر ہو رہی تھیں۔ میں اپنے بدن پر چپکے ہوئے چگادڑوں کو بھی نوچ نوچ کر جھینٹا رہا۔

غیر معمولی طور پر ایک بڑی چگادڑ بار بار مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ سیڑوں چگادڑ خاک کا ڈھیر بن چکی تھیں لیکن وہ ایک چگادڑ میری آنکھوں سے خارج ہونے والی لہروں کی زد میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ چگادڑ حساست میں چیل سے بھی بڑی تھی اور بڑی پھرتی دکھا رہی تھی۔ ایک موقع پر وہ میرے اوپر بیچنی قوتیں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف جھکتے ہوئے ہاتھ چلا دیا۔ میرا ہاتھ ٹھیک نشانے پر پڑا۔ وہ چگادڑ "جیس جیس" کی آوازیں نکالتی ہوئی مجھ سے چند فٹ دور زمین پر گر گئی لیکن وہ بڑی پھرتی ثابت ہوئی۔ فوراً ہی اثراتی ہوئی دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوئی اور اس مرتبہ اس کا ایک پر 'میری آنکھوں سے خارج ہونے والی لہروں کی زد میں آ گیا۔ اس کے برے شعلے خارج ہونے لگے اور وہ "جیس جیس" کی آوازیں نکالتی ہوئی پلٹ کر

ایک طرف غائب ہو گئی۔ اس بڑی چگادڑ کے غائب ہوتے ہی حیرت انگیز طور پر دوسری بچی پچی چگادڑ بھی غائب ہو گئیں اور غار میں گہرا سا تاری ہو گیا۔

گوتم ہوش اور پنڈت دھیراج کی پراسرار قوتیں مجھے روکنے کے لیے برسرِ کار تھیں لیکن میں انہیں مات دیتا ہوا مسلسل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اس راہداری کے اگلے موڑ پر ایک اور راہداری تھی جو مسلسل نشیب کی طرف چلی گئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پاتال میں اترا جا رہا ہوں لیکن اچانک ہی ڈھلان ختم ہو گئی اور اب میں راہداریوں کے ایک چوراہے پر کھڑا تھا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ بدھا کی یہ قدیم عبادت گاہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ پہلے غار میں مجھے دیواروں پر تراشے ہوئے بدھا کے مجسمے نظر آئے تھے۔ اس کے بعد تو غاروں اور سرنگوں کی بھول بھلیاں سی بنی ہوئی تھیں اور اب میں ایک چوراہے پر کھڑا تھا اور میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

میں جانتا تھا، یوگی گوتم ہوش عبادت گاہ کے انہی تہ خانوں میں کسی جگہ چھپ کر چاب پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی پراسرار قوتیں مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں لیکن میں یہاں تک آ گیا تھا اور یہ طے کر کے آیا تھا کہ اسے چاب پورا نہیں کرنے دوں گا۔

کوئی غلط راستہ مجھے منزل سے ملیوں دور پہنچا سکتا تھا اس لیے میں بہت احتیاط سے راستے کا انتخاب کرنا چاہتا تھا اور میں اس چوراہے پر کھڑا فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

نیلگری بھی انہی برف پوش پہاڑوں کے سینے میں کسی جگہ موجود بھی لیکن گوتم ہوش کے چاب نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ اسے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ جیسے جیسے چاب کی تکمیل کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔۔۔ اس کی قوت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

میں اس چوراہے کے وسط میں کھڑا یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ وہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور جب وہ آواز سمجھ میں آئی تو میں کانپ کر رہ گیا۔

وہ پانی کی لہروں کی آواز تھی۔ جیسے بھری ہوئی موجیں سنگھان چٹانوں سے سرنگھا رہی ہوں۔ میں متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر وہ خوفناک منظر میرے سامنے آ گیا۔

جس سرگ سے میں یہاں تک آیا تھا وہ میری طرف ڈھلان بھی اور اور کی طرف سے پانی کا ایک زبردست رولا طوفانی رفتار سے جھاگ اڑاتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں جب سے اس چٹان کے سینے میں داخل ہوا تھا کسی جگہ پانی کا ایک قطرہ تک نہیں دیکھا تھا۔ غار کے باہر دونوں چٹانوں کے چچ ڈیزھ دو سو فٹ کی گہرائی میں جو پانی بہا رہا تھا وہ بھی ٹھک کے دریا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مان لیا کہ وہ بہتی ہوئی آگ دوبارہ پانی بن گئی ہوگی لیکن اس پانی کے لیے ڈیزھ دو سو فٹ اوپر آنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ پراسرار قوتوں کا کھیل تھا۔ طاغوتی قوتوں نے میرے خلاف محاذ بنایا رکھا تھا۔ یہ پراسرار شیطانی قوتیں مجھے نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ گہرائی میں بہتے ہوئے پانی کو اوپر کھینچ لانا ان کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

جھاگ اڑاتا اور چٹانی دیواروں سے سر کھراتا پانی طوفانی رفتار سے میری طرف آ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچ سکتا پانی کا طوفانی رولا مجھ سے ٹکرا گیا۔ مجھے یوں لگے جیسے کوئی نہایت تیز رفتار ٹرین مجھ سے ٹکرائی ہو۔ پانی کا رولا مجھے اپنے ساتھ دھکیلتا ہوا دو سو فٹ لے گیا۔ کئی گز آگے جا کر میں سرگ کی دیوار سے ٹکرایا۔

میرا جو زوہل گیا۔ پانی کی لہریں مجھے اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھیں۔ سرگ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نہ تو میرے پیر زمین پر ٹک رہے تھے اور نہ ہی میں کسی دیوار کا سہارا لینے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میرا ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی نیلگہ کی مالا سے ٹکرایا اور میں نے غیر ارادی طور پر مالا کا بیج والا پھرتہ میں ڈال لیا۔ دو پھیر میری ناک کے تختوں پر جم گئے۔ اس طرح میرا سانس گھٹ جانا چاہیے تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ پانی کی لہروں نے مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں پوری طرح پانی میں ڈوب گیا تھا اور غوطے کھا رہا تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے چہرے پر گیس ماسک لگا رکھا ہو۔

پانی مجھے مسلسل اٹھا اٹھا کر پھینکا رہا اور بالآخر اس کا جنون کم ہو گیا۔ لہروں کا زور دم توڑنے لگا۔ میرے پیر بھی زمین پر لگ گئے اور میں ایک دیوار کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

پانی میری گردن سے سینے تک اگیا اور پھر بتدریج نیچے اترتا چلا گیا۔ اس کی پر ہول آواز بھی بتدریج معدوم ہوئی چل

گئی۔

ایک بار پھر گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ پانی مجھے دھکیلتا ہوا نچانے کہاں سے کہاں لے آیا تھا لیکن اس منظر نے میرے جسم میں سستی کی لہریں دوڑا دی تھیں۔

میں اس وقت بھی ایک سرگ ہی میں تھا۔ میرے سامنے والی دیوار میں زمین کی سطح سے تقریباً چار فٹ اوپر کھڑی کی طرح ایک راستہ سا بنا ہوا تھا اور اس کی دوسری طرف روشنی میں ایک جیسے کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔

میں اس کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

یہ بہت بڑا غار تھا جس کے عین اوپر ایک بہت بڑے سوراج کی طرح کا خلا نظر آ رہا تھا۔ سورج اس وقت عین سر پر چمک رہا تھا اور دو سو فٹ اس خلا کے راستے ہال نما غار میں بدھا کے ایک بہت بڑے مجسمے پر پڑ رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر مجسمے کے سامنے آیا۔

وہ اسانگ بدھا تھا۔ سنگتراش نے ایک سنگلاخ چٹان کو مجسمے میں ڈالنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ جیتا جاگتا انسان ہو۔

یہ مجسمہ کم از کم تیس فٹ اونچا ضرور رہا ہوگا۔ اس کے محیط کا اندازہ بھی اسی حساب سے لگایا جاسکتا ہے۔ پھٹ کے خلا سے دو سو فٹ اس کے عین اوپر پڑی تھی۔

میں کچھ دیر اس مجسمے کو دیکھا رہا اور پھر ایک دم پیچھے کی طرف پلٹ گیا۔ مجھے نفرتی کھٹکتی ہوئی ہنسی واضح طور پر سنائی دی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کھٹکتی ہوئی دلی دہی ہنسی کی وہ آواز مجھے چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”نیلگہ! میں چیخا“ نیلگہ! کہاں ہو تم۔ میں آگیا ہوں۔“

نچانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ وہی دلی ہنسی کی وہ آواز نیلگہ کی تھی۔ پہلے وہ آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی پھر ایک طرف سمت کی اور میں غیر ارادی طور پر اس طرف بڑھنے لگا جس طرف وہ آواز سمی جاتی تھی۔

میں بدھا کے مجسمے کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ دو سو فٹ اب بدھا کے مجسمے سے سرگ رہی تھی اور پھر اچانک ہی غار میں

اندھیا راسا چھا گیا۔

میں اس آواز کے پیچھے چلتا رہا۔ غار کے اختتام پر ایک موز تھا۔ میں جیسے ہی اس طرف بڑھا، ٹھٹک کر رک گیا۔ میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔

اس طرف بھی ایک کشادہ غار تھا جس کے وسط میں آگ کا ایک دائرہ تھا اور اس دائرے میں یوگی گوتم بھوش جاپ رہتا ہوا تھا۔ نہیں۔۔۔ بلکہ کھڑا تھا۔

پھر تم بھوش ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کی کمر میں معمولی سا خم بھی نہیں تھا۔ اس کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پسلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ سامنے جوڑ رکھے تھے۔ دائرہ میں اور مونیچوں کے بال اس طرح بڑھے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک مختصر سا لنگوٹ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ زندہ انسان نہ ہو، پھر کا کوئی مجسمہ ہو۔

پراسرار قوتوں پر قابو پانے کے لیے کیے جانے والے جاپ بڑے ٹھن ہوتے ہیں۔ بڑی تپش کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بڑی قوت ہوگی اس کے لیے اتنی ہی ٹھن جاپ ہوگا۔ نیلگہ کی حصول کے لیے میں نے بھی ایک جاپ شروع کیا تھا۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ کوئی لالچ نہیں تھا، کوئی اور ہوس نہیں تھی اور قدرت نے میرا جاپ مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے نیلگہ کے قریب پہنچا دیا تھا اور گوتم بھوش بھی نیلگہ کے حصول کے لیے جاپ کر رہا تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ تھی۔ ہوس تھی اسے طویل اور ٹھن راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ یہ آخری مرحلے کا ٹھن ترین جاپ تھا جس کے مکمل ہونے میں صرف دو سو باقی رہ گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ کھائے پئے بغیر تیس دنوں سے اس طرح ایک ٹانگ پر کھڑا رہا ہوگا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس نے پہلے ایسے جاپ کر رکھے تھے جن کی قوتوں نے اسے کھانے پینے اور نیند وغیرہ کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا تھا۔

میرے اور گوتم بھوش کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ عام حالات ہوتے تو میں بڑے اطمینان سے اس کی گردن مروڑ دیتا لیکن اب ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ رکھا تھا۔ وہ محض آگ کا دائرہ نہیں تھا۔ طاغوتی قوتوں کا چکر تھا جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور اس پکر کو توڑنا آسان نہیں تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھ گیا اور اسی لمحے ”دھب“ کی آواز سے کوئی چیز میرے سامنے گرئی۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میری آنکھوں میں وحشت سی پھیلتی چلی گئی۔

وہ کالی دیوی تھی۔ ہندوؤں کی کالی ماتا۔ جسے تباہی و بربادی کی دیوی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، اس کے قہر سے بچنے کے لیے اس کے چہروں پر انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے اور گوتم بھوش نے اسے بھی اپنی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔

کالی دیوی پر ہنر نہ تھی۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے ایک ہاتھ میں تیز تھا جس سے خون نچک رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک انسانی کھوپڑی تھی جس کے بال اس کی مٹھی میں بکڑے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے سیاہ موتیوں کی ایک مالا اور پتیل کے خشک پتوں کا ایک ہار تھا۔ ان پتوں کی ایک جھار اس کی کمر پیچھے لپٹی ہوئی تھی۔ کالی کی پھٹی پھٹی سی آنکھوں میں وحشت تھی اور زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون نچک رہا تھا۔

”واپس چلا جا مورکھ۔ (بے وقوف) میرے پجاری کو تنگ نہ کر۔ اسے اپنا جاپ پورا کر لے۔“

یہ سرگوشیاں آواز بار بار میری ساعت سے ٹکرا رہی تھی۔ کالی مجھے وارننگ دے رہی تھی۔ خبردار کر رہی تھی۔ مجھے نیست و نابود کر دینے کی دھمکی دے رہی تھی لیکن میں کسی کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔

میں نے ہندوستان کے مندروں میں کالی کے بہت سے مجسمے دیکھے تھے ہر جگہ اس کا یہی روپ تھا اور اسی خوفناک روپ میں مجھے بھی ڈرانے کے لیے وہ یہاں آگئی تھی۔ ”میرے راستے سے ہٹ جا کالی۔“ میں نے چیخ کر کہا ”میں جانتا ہوں، تمہاری طرح بہت سی شیطانی قوتیں اس راکشش کی پشت پر ہیں لیکن میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہاری قوت کو شکست دے کر میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جا۔“

”گستاخ۔“ غزاتی ہوئی آواز میری ساعت سے ٹکرائی ”مجھے دھمکی دیتا ہے۔ میں مجسمے تباہ و برباد کر دوں گی۔ آخری مرتبہ کہتی ہوں، میرے راستے سے ہٹ جا۔“

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھا رہا۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی سرخ آنکھوں سے بھی خون پھینکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ منظر بھی بڑا خوفناک ہو سکتا تھا۔ کالی کو اس غضب ناک حالت میں دیکھ کر عام آدمی کا تو کبھی جھٹ سکتا تھا لیکن میں عام آدمی نہیں تھا۔ میں اپنے اندر حوصلہ پیدا کر کے ایسی ہی طاغوتی قوتوں کا



مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا۔

میں نے اپنے گلے سے نیلگري والی مالا مالا رکھی اور اس کے دونوں سرے دونوں ہاتھوں کی پٹلیوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ حرکت دیتے لگا۔

کالی کا چہرہ غضب ناک ہو کر کچھ اور بھانک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے اب باقاعدہ چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور وہ چنگاریاں میری طرف لپک رہی تھیں لیکن میرے اندر کی قوت بھی بیدار ہو چکی تھی۔ کالی کی آنکھوں سے پھوٹنے والی چنگاریاں مجھ سے ایک فٹ آگے کسی نادیہ دیوار سے ٹکرا کر بجے کر رہی تھیں۔

کالی کے حلق سے خوفناک آواز نکلی۔ یہ آواز بادلوں کی گرج کی طرح غار میں پھیل گئی۔ ایک لمحے کو تو میں بھی وہل گیا لیکن میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

کالی کا سینے والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس نے پوری قوت سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بڑی چھتری سے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی نیلگري کی مالا سامنے کر دی۔ کالی کا تینہ پوری قوت سے مالا سے ٹکرایا اور فضا ٹھرا کر گئی۔ لگا تھا جیسے آسمانی بجلیاں آپس میں ٹکرائی ہوں۔ ایسے خوفناک کڑا کے کی آواز میں نے بھی نہیں سنی تھی اور ایسی چپک بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوئی اور پھر تاریکی چھائی۔ ایک لمحے کو تو میں یہ سمجھا تھا کہ شاید میری بصارت ختم ہو گئی ہے لیکن میری بینائی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا۔

اپنا یہ وار ناکام ہونے دیکھ کر کالی کچھ اور غضب ناک ہو گئی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں اور وہ شعلے میرے سامنے تپتی ہوئی نادیہ دیوار سے ٹکرا کر اسی کی طرف پھٹنے لگے۔ کالی نے اچھل کر اپنے آپ کو ان شعلوں سے بچایا اور ایک بار پھر سینے سے وار کیا لیکن یہ حملہ بھی پہلے کی طرح ناکام ثابت ہوا۔

”بھاگ جا مور کھ۔ (احق۔ بے وقوف) میں تجھے آخری موقع دے رہی ہوں۔“ کالی کی غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”میں بھی تجھے آخری موقع دے رہا ہوں۔“ میں نے جع کر جواب دیا ”جلی جا یہاں سے۔ ایسا نہ ہو“ تجھے اس بُد (لڑائی) میں شرمندگی اٹھانی پڑے اور تو اپنے بچپاروں کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے۔“

”مجھے دھمکی دیتا ہے۔“ کالی چیخی اور پھر چاک چاک سی اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انسانی کھوپڑی میری طرف

دے ماری۔

کسی نادیہ قوت نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ میں اڑ کھڑا کر پہلو کے بل گر ا۔ وہ انسانی کھوپڑی زناٹے کی آواز سے میرے اوپر سے گزرتی ہوئی سامنے والی دیوار پر لگی۔ ایک کان پھاڑ دینے والا خوفناک دھماکا ہوا اور دیوار کے پتھر ٹوٹ کر گرنے لگے۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت ہی پاور فل رائٹ فائر کیا گیا ہو۔

کالی ایک بار پھر اپنے سینے سے حملہ آور ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ وہ حملہ نہیں کر سکی۔ اس کا ہاتھ اس طرح رک گیا تھا جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے حملے کو اس طرح ناکام ہوتے دیکھ کر کالی کی آنکھوں میں دہشت کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ میرے لیے اچھا موقع تھا۔ میں نے بھی جوانی حملہ کیا۔ میری آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کسی آئینک رائل سے مسلسل فائرنگ کی جارہی ہو۔ کالی اچھل اچھل کر اپنے آپ کو بچاتی رہی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ کمر پر لپٹی ہوئی پیپل کے خشک پتوں کی جھال میری آنکھوں سے نکلنے والے انگاروں کی زد میں آ گئی۔ پتوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ کالی ناچنے لگی۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ جس طرف بھی جاتی کسی نادیہ دیوار سے ٹکرا جاتی۔ اس کا بدن اب پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اس کا ماس (گوشت) جل رہا تھا۔ گوشت جلنے کی بو پورے غار میں پھیل رہی تھی۔

کالی بڑھال ہو کر گر پڑی۔ اس کے بدن سے اٹھنے والے شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کالی کی بہت بھی بدلتے لگی۔ چند سینکڑوں بعد ایک مادہ بھڑبھڑے کی جلی ہوئی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ اس کے گلے سڑے بدن کو دیکھ کر مجھے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ کالی نہیں تھی۔ گوتم بھوش یا اس کے پیٹلے پنڈت دھیراج نے مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے اپنے کسی بے (موکل) کو کالی کے ہمیں میں میرے سامنے بھیجا تھا۔ وہ مجھے تباہ کرنے آیا تھا لیکن خود اس طرح برباد ہو گیا تھا کہ اسے دیکھ کر کھن آئے گی تھی۔

میں نے نیلگري کی مالا گلے میں ڈال لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں اتنا زبردست ہنگامہ ہوا تھا لیکن چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے گوتم بھوش کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی ایک ٹانگ پر اسی طرح کھڑا تھا۔

اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ اس کی موچوں کے بالوں کے نیچے ہونٹوں کی حرکت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھا لیکن اس طرح لڑکھا گیا جیسے میرے پیروں کی رسی میں الجھ گئے ہوں۔ میرا توازن بگڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں گر پڑا، کسی نے مجھے ساروے کر سنبھال لیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت کا شندیدہ جھٹکا لگا کہ وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔ بے حد حسین۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دراز قامت، سڈول اور عمداز جسم، اس کا سینہ کڑی کمان بنا ہوا تھا۔ اس کا لباس بھی ایسا تھا جسے لباس نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک اور سرخ ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

میرے ذہن میں نیلگري کا خیال ابھرا۔ اس کے چہرے کے نقوش تو میرے دل پر نقش تھے۔ یہ چہرہ اس سے مختلف تھا لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ نیلگري ایک مہمان (عظیم) قوت تھی۔ کوئی بھی روپ اختیار کرنے پر قادر تھی۔ ہو سکتا ہے اس وقت کسی مصلحت کے تحت وہ اپنی اصل شکل میں سامنے نہ آتا چاہتی ہو اور کسی اور حینہ کے روپ میں میری مدد کو آگئی ہو اور اس نے مجھے کرنے سے بچایا ہو۔

”آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ تم ٹھک گئے ہو۔ تھوڑا آرام کرو۔ اس طرف۔ وہاں۔“

ایک سرخی سی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ اس نے میز کی ٹھمر میں حاصل کر دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے نظریں جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھوش بابا حسن کی مالک تھی۔ ہونٹوں پر بڑی قابل مسکراہٹ تھی۔ اس کے گرد ابدن کا لکس میرے جسم میں سنسنی کی لہرں دوڑا رہا تھا۔ دل و دماغ پر عجیب سا سرور طاری ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے کٹھن کشاں کشاں لے جا رہی تھی۔ اس کا رخ غار کے ایک تاریک گوشے کی طرف تھا۔

میں آگ کے دائرے میں، غاب میں مشغول گوتم بھوش سے دور ہو رہا تھا۔ وہ حینہ مجھے لے کر ایک تاریک جگہ میں گھس گئی۔ یہاں سنگھان دیوار میں ایک دراڑ تھی اور جگہ اتنی کشادہ تھی کہ دو آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے

میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس حینہ نے مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بٹھرایا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس گچھا میں گھور تاریکی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے حسین و گداز بدن کا ایک ایک خط و خال مجھے نظر آ رہا تھا۔ میرے سامنے اس کے بیٹھنے کا انداز بھی برا خوفناک تھا۔

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ میرے اندر سنسنی کی لہرں پھیلی گئیں اور خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ دماغ پر خمار سا طاری ہو رہا تھا۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس تاریک گچھا سے باہر دیکھا۔ گوتم بھوش مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھ سے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

پہلے وہ سامنے بیٹھی تھی۔ اب میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کی حرارت میرے اندر آگ بھری رہی تھی۔ اس نے ایک بازو میری گردن کے پیچھے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے آہستہ آہستہ پیچھے دھکیلنے لگی۔ میں اس کی آغوش میں دراز ہوتا چلا گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لگتا تھا، مقناطیسی لہرں آنکھوں کے راستے میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہوں۔ میں گہرائیوں میں ڈوبے جا رہا تھا۔ اس کا گرم گرم سانس میرے ہونٹوں سے ٹکرا رہا تھا اور پھر چاک چاک ہی وہ خوفناک چیخ مار کر میرے اوہٹے اٹھ کر اور پشت کے بل پیچھے گری۔

وہ چیخ بہت خوفناک تھی۔ میرا دل دہل گیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ گردن گھما کر دیکھا تو وہ حینہ زمین پر پڑی تھی اور ایک عورت اس کے سینے پر سوار تھی۔ اس نے خوب صورت لڑکی کا لگا دو بج رکھا تھا اور پھر اس حینہ نے بھی اپنے سینے پر سوار عورت کے گلے پر ہاتھ ڈال دیا۔

ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ ان دونوں کی خونخوار قسم کی غراہٹوں کے علاوہ ایسی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے سیکڑوں بد روحمیں بین کر رہی ہوں۔

میں ابھی تک دوسری عورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی نیم بہنہ تھی اور وہ اس حینہ پر حاوی ہو رہی تھی جو مجھے کسی نئی دنیا کی سیر کرانے لے جا رہی تھی۔ مجھے حملہ آور عورت پر غصہ بھی آ رہا تھا جس نے عین وقت پر مداخلت کر کے کھیل کا رنگ بگاڑ دیا تھا۔

جب میں نے نیلگری کو دریافت کیا تھا تو مجھے وہ لمحات بھی یاد تھے جب اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کا لمس تو اب بھی مجھے یاد تھا۔ میں اس کے لیے خطرات سے ٹکراتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ کسی اور حسینہ کے روپ میں میرے سامنے آگئی تھی۔ شاید مجھے میری اب تک کی خدمات کا صلہ دینا چاہتی تھی لیکن یہ دوسری عورت۔۔۔ اس نے عین وقت پر کام لگا دیا تھا۔

ان میں وہیگا مشتاقی جاری تھی۔ دوسری بھاری بھر کم عورت اس حسینہ پر حاوی ہو رہی تھی۔ اس نے حسینہ کے بال پکڑ لیے۔ حسینہ کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ دوسری عورت اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے سر کے اوپر اس طرح گھما رہی تھی جیسے وہ کوئی بھرپور حسینہ نہیں معمولی سی گڑیا ہو اور پھر اس نے اسے پوری فوت سے دیوار کے ساتھ بچھڑا دیا۔

حسینہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ اس چیخ کی بازگشت پورے عمار میں گونج رہی تھی۔ وہ حسینہ دیوار سے ٹکرا کر ”جھد“ سے زمین پر گر گئی۔ حملہ آور عورت اس کے سینے پر پیر رکھ کر کھڑی ہوئی اور فاتحانہ انداز میں چیختی لگی۔ میں اب بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

حملہ آور عورت کچھ دیر بعد حسینہ کے سینے سے اتر گئی اور اس نے بیٹھ کر ایک بار پھر حسینہ کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور زور سے جھٹکنے دینے لگی۔

یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھکا لگا کہ زمین پر پڑی ہوئی حسینہ کا بدن سینے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیت بھی بدلتی گئی۔

وہ سیاہ رنگ کی بلی تھی۔ لمبے بالوں والی ایسی بلیاں میں نے کبھی لینڈ میں بکھرت دیکھی تھیں۔ اس کے جسم کو بری طرح جھٹکے رہے تھے۔ اس کے منہ سے ”میاؤں“ کی خوفناک آواز نکلتی اور وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔

حملہ آور عورت نے اس کے بال پھوڑ دیے۔ پلٹ کر میرا ہاتھ پکڑا، ایک جھٹکے سے اٹھایا اور مجھے پھینچتی ہوئی اس گھسا سے باہر لے گئی۔ میں اب تک اس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا لیکن گھسا سے باہر آنے ہی اس کا چہرہ میری نظروں میں آگیا اور میں اچھل پڑا۔

وہ کاشی تھی! تنکھ قیلے کی سردار۔

”تنتہ۔۔۔ تم۔۔۔؟“ میں ہلکا کر رہ گیا۔

”تم بال بال بچ گئے انجی۔“ کاشی نے مسکراتے ہوئے کہا ”اگر وہ چڑیل اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو تم جل کر

بھسم ہوجاتے اور کسی کو تمہاری راکھ بھی نہیں ملتی۔“

”نکروہ نیلگری۔۔۔؟“

”وہ نیلگری نہیں تھی۔“ کاشی نے میری بات کاٹ دی ”نیلگری اب مکمل طور پر اس کے حصار میں ہے اسی لیے تمہارے گلے میں پڑی ہوئی لالا نے بھی اس وقت کام نہیں کیا۔ وہ بے بس و مجبور بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے اور یہ چڑیل۔۔۔“ وہ ایک لمحے کو رک پھریات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ”گو تم بھوش بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہے صرف چند گھنٹوں کا سفر باقی رہ گیا ہے۔ تم اس کے سر پر پہنچ چکے ہو اور تمہیں روکنے کے لیے وہ اپنی تمام قوتوں کو کام میں لا رہا ہے۔ یہ اس کا بہت خوفناک حربہ تھا۔ حسین عورت۔۔۔ مدد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں جانتی ہوں عورت کے حوالے سے تمہارے دل میں کوئی میل نہیں ہے لیکن تمہارے ذہن کو مضحک کر دیا گیا تھا۔ تمہارے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر لی گئی تھیں۔ تم اس کے حسن و شباب کے سحر میں جکڑے گئے تھے۔ تم سلفی جذبات کے سیلاب میں بہنے والے تھے۔ وہ تم پر غالب آ رہی تھی۔ اگر اس کے ناپاک ہونٹ تمہارے ہونٹوں کو چھو جاتے تو تمہاری رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہوجاتی۔ گو تم بھوش تمہیں اس عورت کے ذریعے ناپاک کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ چڑیل اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو تم جل کر راکھ ہوجاتے اور سب کچھ ختم ہوجاتا۔“

میرے دماغ میں سنسانہٹ سی ہو رہی تھی۔ جکڑے چل رہے تھے۔ کاشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عورت کے معاملے میں مجھے اپنے کردار پر فخر تھا۔ صرف ایک مرتبہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی جس پر مجھے اب تک پچھتاوا تھا۔ سونیا کے بعد بھی کئی حسین سے حسین تر عورتیں میری زندگی میں آئی تھیں۔ روپ متی، بلا اور اب دھونکی مہینوں سے میرے ساتھ تھی۔ اسے بلاشاید دنیا کی حسین ترین لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ تنکھ قیلے میں تنک دھڑنگ حسین عورتیں میرے سامنے پھرتی تھیں۔ کاشی ان میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ میں گھنٹوں اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھا رہتا تھا لیکن میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی ناپاک خیال بھی نہیں آیا تھا مگر۔۔۔ وہ خوب صورت چڑیل مجھے تنہائی کے دہانے تک لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ صرف ایک ہلکا سا جھکا اور گلتا تو میں بقول کاشی ”خاک ہوجاتا۔“ راکھ کا ڈھیر بن جاتا لیکن عین وقت پر کاشی نے مجھے بچایا اور میرے لیے شدید حیرت کی بات یہ تھی کہ کاشی یہاں کیسے پہنچی!

”مجھے ٹوان کا پیغام ملا تھا۔“ اس نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا تھا ”وہ تمہاری مدد کے لیے خود اندر نہیں آتا چاہتا تھا۔ عبادت گاہ کے باہر بھی کسی ایک شخص کی موجودگی ضروری ہے اس لیے اس نے مجھے پیغام بھیج دیا اور میں بروقت یہاں پہنچ گئی۔ اگر مجھے۔۔۔“

کاشی بولتی رہی لیکن اب میں اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ میں تو حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ کاشی کی ہمتی یہاں سے کم از کم دونوں کی مسافت پر تھی۔ میں راستے کی جن گھنٹائیوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا اس کا اندازہ مجھے تھا اور کاشی کہہ رہی تھی کہ اسے ٹوان کا پیغام ملا تھا اور وہ فوراً ہی یہاں میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔ میں عجیب سے پکڑوں میں پھنس گیا تھا۔

کاشی مجھے بدھا کے جھٹکے کی طرف لے آئی۔ وہ جھٹکے کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور عجیب و غریب زبان میں چیخ چیخ کر کچھ بولنے لگی۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک بھی لفظ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر اس نے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیے۔ چند لمحے بازو پلوں میں دکانے کھڑی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کمرے کمرے سانس لینے لگی۔ اس کے ہاتھوں سے خارج ہوتی ہوئی بھاب صاف نظر آ رہی تھی۔

کاشی نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”آؤ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس شیطان کو اس کے حصار سے باہر نکال سکیں۔“

میں اس کے ساتھ اس طرف آگیا جہاں گو تم بھوش آگ کے حصار میں کھڑا تھا۔ اس وقت میں نے اس میں پہلی مرتبہ ایک تبدیلی واضح طور پر محسوس کی۔ بالوں میں چھپے ہوئے اس کے ہونٹ پہلے سے زیادہ تیزی سے ہلنے لگے تھے اور چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ اس کے سوا اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے بدستور ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔

کاشی نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا پھر اس نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ لیے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں میں کچھ بدبوائی ہوئی آگ کے حصار کے گرد پکڑ لگانے لگی۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے بھی اپنے اندر کی قوتوں کو مصروف کر دیا اور دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے دل سے بے اختیار ”اللہ ہو“ کی پکار نکلی اور میں انہی مقدس الفاظ کا ورد کرنے لگا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا جاپ تھا۔ یہی

حقیقی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ اس کے سامنے دنیا کی ساری قوتیں۔۔۔ بچ تھیں۔۔۔ میں آنکھیں بند کیے ”اللہ ہو“ کا ورد کرتا رہا۔

نفا اچانک ہی خوفناک چیخوں اور آہوں سے گونج اٹھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ عجیب و غریب قسم کی مخلوق کاشی کو گھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ واقعی عجیب مخلوق تھی۔ نہ انسان، نہ حیوان۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی انسان کی طرح دو ٹانگوں والا تھا لیکن اس کا سر کسی جانور کا تھا۔ کوئی جانور کی طرح چوپایہ تھا لیکن سر انسان کا تھا۔ چہروں کے نقش بے حد مکروہ اور خوفناک تھے۔ کسی کا سر اس کے جسم سے مختلف تھا۔ کسی کے بازو باشت بھر سے زیادہ لمبے نہیں تھے اور کسی کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ پھٹت تک پہنچ رہے تھے۔

اگرچہ وہ سب کے سب عجیب الخلق تھے لیکن ان میں ایک سب سے نمایاں اور آگ نظر آ رہا تھا۔ وہ انسان کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ جسم کا بالائی حصہ کسی چھوٹے جانور کی طرح تھا جو لمبے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور سر تیل کی طرح تھا لیکن آنکھیں حیرت انگیز طور پر چھوٹی تھیں جیسے آنکھوں کی جگہ مٹن ٹانگ دیے گئے ہوں۔ ٹانگیں غیر معمولی طور پر لمبی لیکن بازو غیر معمولی طور پر چھوٹے تھے۔ میرا خیال ہے اس کا کوئی بھی بازو ایک فٹ سے زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ اس کا ایک بازو بری طرح جلا ہوا تھا۔ اوپر کی کھال تو بالکل ہی جل چکی تھی اور جلا ہوا گوشت دیکھ کر بھن آتی تھی۔ اس کے سر پر بھی تیل کی طرح سینک تھے۔ ایک ایک فٹ لمبے اور نیکیلے یہ سینک آگے کو نکلے ہوئے تھے۔

یہ تمام حیوان نما انسان اور انسان نما حیوان کاشی کے آگے پیچھے ناچ رہے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے چلا رہے تھے۔ ان کی خوفناک آوازیوں سے فضا ذل رہی تھی لیکن کاشی کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہونٹوں میں کچھ بدبوائی ہوئی آگ کے دائرے کے گرد چکر لگاتی رہی۔

لمبے سینگوں اور تیل کی شکل والا وہ شیٹو گڑا اچانک ہی سامنے کی طرف سے کاشی پر حملہ آور ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے کاشی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں اچانک ہی اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس شیٹو گڑے کے اوپر گرا۔ وہ میرے ساتھ ہی گرا تھا لیکن حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ مجھ سے پہلے سنبھل گیا۔ میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے مجھے کئی شیٹو گنگوں نے گھیر لیا۔ وہ تھپتھپے لگاتے اور چیختے چلاتے میرے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجھے اپنا حصار نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی انسانوں سے دو بدو مقابلہ تو نہیں تھا جنہیں میں مار بھگاتا۔ یہ تو شیطانی قوتیں تھیں جو مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اپنے اندر کی قوت سے انہیں زیر کرنے کی کوشش کروں۔ میری کوتاہی سے کاشی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ وہ لوگ بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے لیکن کسی ناپیدہ دیوار سے ٹکرا کر رک گئے۔ لمبے سیٹگوں والا شیٹو گنگا بھی ناپیدہ دیوار سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور اٹھا دیے۔ اس کے جملے ہوئے بازو سے پیپ اور خون کے قطرے نچک رہے تھے۔ اس کے منہ سے اچانک ہی بڑی خوفناک چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلنے والے شعلے میری طرف لپکے۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ شعلے پیچھے دیوار سے ٹکرائے زوردار دھماکے ہوئے جیسے طاقت ور راکٹ داغ دیے گئے ہوں۔

غار کی دیواریں لرزا نہیں جیسے زلزلہ آیا ہو۔ میں نے اس شیٹو گنگے کی طرف دیکھا اور مجھے ہنسی آئی۔ وہ الٹا ہوا میں معلق تھا۔ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ وہ ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا جیسے کوئی ناپیدہ قوت اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جھلا رہی ہو اور پھر وہ ہوا میں اڑتا ہوا کئی فٹ دور دیوار سے ٹکرا کر ”بھد“ سے نیچے گرا۔

میری نظریں اچانک ہی گوتم بھوش کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے جسم کے کسی حصے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ سرخ آنکھوں سے بے پناہ قہر نچک رہا تھا۔ اس نے سیدھا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک چھوٹی سی کوری ہنڈیا بنانے لگا۔ اس کے ہاتھ پر آگنی۔ ہنڈیا کے منہ پر کالا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ گوتم بھوش نے ہنڈیا کو اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ اس پر کچھ چھونکا اور اسے پوری قوت سے میری طرف اچھال دیا۔ ہنڈیا بندھن سے نکل ہوئی گولی کی طرح میری طرف لپکی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر سیدھا ہاتھ آگے کر دیا۔

ہنڈیا میرے ہاتھ سے ٹکرا کر رک گئی۔ میں نے گوتم بھوش کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ وحشت پھیل گئی تھی۔ میری نظریں فضا میں معلق ہنڈیا پر ٹک گئیں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ہنڈیا کو پکڑ کر پوری قوت سے گوتم بھوش کی طرف اچھال دیا۔

ہنڈیا زوردار دھماکے سے کسی ناپیدہ دیوار سے ٹکرائی۔ ایک دم ایسا شور اٹھا جیسے کیڑوں بد رو میں پڑ رہی ہوں۔ گوتم بھوش کی آنکھوں میں وحشت بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ میری آنکھوں سے نکلنے والی لہریں ناپیدہ دیوار سے ٹکرائی رہیں اور اس طرح چنگاریاں نچنے لگیں۔ وہیں جیسے لوہے کی شیٹ پر ویڈنگ کرتے ہوئے چنگاریاں گر رہی ہیں۔

کاشی بدستور اپنے عمل میں مصروف تھی۔ وہ گوتم بھوش کے حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور شیٹو گنگے اسے روکنے کے لیے بار بار اس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ لمبے سیٹگوں والا شیٹو گنگا ایک بار پھر اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے نکلنے والے کئی سانپ میری طرف لپکے تھے لیکن یہ ناگ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو گئے۔

اچانک مجھے اپنی گردن پر اس جگہ جہاں نیلگی کی مالا میرے بدن کو چھو رہی تھی..... حرارت کا احساس ہونے لگا۔ اس عبادت گاہ میں داخل ہونے کے کچھ ہی دیر بعد ہی مالا بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ نیلگی کو گوتم بھوش کی قوتوں نے عمل طور پر بے بس کر دیا تھا لیکن اب مالا میں یہ حرارت اس میں زندگی کی حرارت کا پتا دے رہی تھی۔ میں نے مالا اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ پہلے اسے اپنے قریب آنے والے شیٹو گنگوں پر کوڑوں کی طرح برساتا رہا۔ وہ مالا جس شیٹو گنگے کے بدن کو بھی چھوئی وہ الگ کے شعلوں میں لپٹ جاتا۔

لمبے سیٹگوں والا شیٹو گنگا بھی مالا کی زد میں آیا۔ پہلی مرتبہ وہ چیخا گیا دوسری مرتبہ مالا کڑکتی اور لڑاتی ہوئی آسمانی بجلی کی طرح اس کے جسم پر پڑی۔ اس کا جسم بھی آگ کے شعلوں میں لپٹ گیا۔ وہ کچھ دیر اوہرا اوہرا دھڑ دھڑا مار پھر زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی خوفناک چیخیں فضا کو دھلا رہی تھیں۔ آگ کے شعلے پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ گوشت جلنے کی بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی شیٹو گنگے کی ہیبت بھی بدلنے لگی اور بالآخر اس نے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کر لی۔

وہ پنڈت دھیراج تھا جس کی قوتوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ جلی ہوئی لاش کی صورت میرے سامنے پڑا تھا۔

گوتم بھوش! میں نے یوگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جہار اکھیل ختم ہو رہا ہے۔ جاپ ختم کر کے حصار سے باہر آجاؤ ورنہ تمہارا انجام بھی اس پنڈت سے مختلف نہیں ہوگا۔“

گوتم بھوش کا چہرہ قہر و غضب کی علامت بن گیا۔ میں نے قسم کے لوگ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتے۔ گوتم بھوش نے بھی اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ایک بار پھر مجھ پر بھروسہ کر دیا۔ کسی ناپیدہ قوت نے مجھے اٹھا کر لیا۔ مجھے اپنا دل کنبیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں سنگلاخ دیوار سے ٹکراؤں گا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جائے گی لیکن میں دیوار سے ٹکرانے سے پہلے ہی فضا میں معلق ہو گیا اور پیروں کے بل اس طرح زمین پر گرا جیسے آٹھ دس فٹ اونچی دیوار سے از خود چھلانگ لگائی ہو۔

گوتم بھوش نے ایک بار پھر ہاتھ سامنے کو پھیلا دیا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک ترشول نمودار ہوا جس کا دستہ اس نے مٹھی میں پکڑ لیا اور ہاتھ سر سے بلند کر کے مجھ پر ترشول سے حملہ کرنا چاہا۔ اس کا ہاتھ تو بڑی تیزی سے نیچے آیا تھا مگر تھکمان سے نہیں نکلا یعنی ترشول اس کے ہاتھ ہی میں رہا۔

گوتم بھوش نے ایک بار پھر ہاتھ کو زوردار جھکا دیا لیکن ترشول اس مرتبہ بھی اس کے ہاتھ ہی میں رہا۔ میری نظریں اس کے ہاتھ پر مرکوز رہیں۔ وہ بار بار ہاتھ کو جھٹکنے دے رہا تھا لیکن ترشول اس کے ہاتھ سے نہیں نکل پا رہا تھا۔ یوگی گوتم بھوش کا چہرہ خوف و وحشت سے سیاہ پڑنے لگا۔ اس کے گرد دائرے کی آگ بھی ماند پڑ رہی تھی۔ اس کے حصار میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ حصار ٹوٹ رہا تھا۔ گوتم بھوش کی قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔

کاشی نے دائرے میں قدم رکھا تو جیسے زلزلہ سا آیا۔ گڑ گڑاہٹ کی میب آوازیں چاروں طرف سے سنائی دینے لگیں گوتم بھوش کا چہرہ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس نے آخری بار میری طرف دیکھا اور مخالف سمت میں چھلانگ لگا دی۔ ”جی جی! کاشی جی جی“ اسے روکو۔ اگر یہ بھاگ گیا تو غضب ہو جائے گا۔ ہم سب اس عبادت گاہ میں دفن ہو جائیں گے۔

گوتم بھوش غار کی راہداری میں گھوم چکا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ جب میں راہداری میں پہنچا تو گوتم بھوش غار کے اگلے حصے میں موڑ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا۔

گوتم بھوش کی ایک بہت بھیاںک چیخ مچ گئی۔ اس کا شریر (م) ایک بہت بڑے شعلے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ بری طرح چیختے لگا۔ وہ چیخیں تھیں یا میب بادلوں کی گھن گھن۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آوازیں سنائی دے لگیں جیسے جہاں میں ٹوٹ رہی ہوں اور پھر گڑ گڑاہٹ کی خوفناک آواز فضا میں ابھری اور گوتم بھوش سے چند گز آگے ایک بہت بڑی چٹان ٹوٹ کر گر گئی۔

اس طرف آگے جانے کا راستہ بند ہو گیا۔ گرد و غبار نے سیاہ بادلوں کی طرح فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریکی اس قدر گہری ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھنا نہیں دے رہا تھا۔ اس تاریکی میں وہ میب شعلہ تھا جو اوہرا اوہرا پھرتا رہا تھا۔ گوتم بھوش کی بھیاںک چیخوں اور بد روحوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں فضا کو دھلائے دے رہی تھیں۔ گڑ گڑاہٹ اور چٹانوں کی ٹوٹ پھوٹ کی میب آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”جی جی! بھاگو۔ اس طرف۔۔۔“ کاشی کی چیخیں ہوئی آواز سنائی دی۔

میں پیچھے مرکوز دڑا۔ کاشی راستے میں کھڑی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں دوڑتے ہوئے بدھا کے جھستے والے ہال میں پہنچ گئے اور چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے کی چٹان میب آواز کے ساتھ جھٹکنے لگی۔ بھت سے بڑے بڑے پتھر گرنے لگے۔ کاشی میرا ہاتھ پکڑے اسی طرف دوڑی۔ اس نے شاید یہ سوچا تھا کہ راستہ مکمل طور پر بند ہونے سے پہلے ہم باہر نکل جائیں گے لیکن ہم سے چند گز آگے ایک بہت بڑا پتھر بھت سے ٹوٹ کر گرا۔ اٹھنے والے گرد و غبار سے ایک بار پھر گہری تاریکی چھا گئی۔

کاشی کے ہاتھ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس کی آوازیں مختلف سمتوں سے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔

زمین کاب رہی تھی۔ کسی جگہ پر قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں کیس کھڑے ہونے کی کوشش کرتا تو لڑکھڑاتا۔ روئے اور بین کرنے کی خوفناک آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اسی لمحے گڑ گڑاہٹ کی خوفناک آوازیں اس میں چونک گیا۔ غار کی بھت بیٹھ رہی تھی۔ میں ایک طرف بھاگا لیکن ایک بہت بڑے پتھر سے ٹکرا کر گر گیا۔ میں فوراً اٹھ کر دوسری طرف بھاگا۔ اوہر بھی راستہ بند تھا۔ کاشی کی چیخیں ہوئی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی

محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے لیے کسی سمت کا تعین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سمت کا تعین کرنے کا کوئی قاعدہ بھی نہیں تھا۔ ہر طرف راستہ بند تھا۔

چھت سے مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھر گرنے لگے۔ ہاڑ بیٹھ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف چھلانگ لگادی لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے مجھے تھام لیا ہو۔ میں نے جس طرف چھلانگ لگائی تھی اس کی مخالف سمت ہوا میں اڑ رہا تھا۔

غار کی چھت بیٹھ گئی۔ چاروں طرف سے گولڈراہٹ کی خوفناک اور مہیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ہزاروں فٹ بلند ہاڑ زمین میں دھنسن رہا ہو۔ اڑنے والے گرد و غبار سے گہری تاریکی چھا گئی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نادیہ قوت مجھے پیچھے لیے جا رہی تھی اور پھر میں ”دھب“ کی آواز سے زمین پر گرا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور دوسرے ہی لمحے خوف سے کانپ اٹھا۔ ایک بہت بڑی چٹان میرے اوپر آ رہی تھی۔ میرے اوپر چٹان کے بیچ صرف چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میرے پیچھے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو قدرے رکھ کر مڑ کر پھوڑا اور اسی وقت بے اختیار میرے دل سے ”اللہ ہو“ کی پکار بھی نکلی تھی۔

میں منتظر تھا۔ کسی بھی لمحے اوپر سے گرنے والی چٹان مجھے کچل سکتی تھی لیکن ان نازک لمحات میں کسی نے مجھے ایک طرف کھینچ لیا۔ میرے ذہن میں کاشی کا خیال ابھر تھا۔ شاید اس نے مجھے پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ لیا تھا۔

گولڈراہٹ کی مہیب آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔ میں آنکھیں بند کیے بڑا رہا۔ وہ خوفناک آوازیں بہت دیر تک سنائی دیتی رہیں اور پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ مہیب اور اعصاب شکن سناٹا جیسے اس دنیا میں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ قیامت گزر گئی ہو اور اس نے ہر چیز کو فنا کر دیا ہو۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا سراٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا ہو۔ بڑا نرم و گداز مس تھا۔ زندگی کی حرارت سے بھی بھر۔ وہ بہت کون ہو سکتی تھی؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی پیشانی پر تپتے ہوئے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا۔

مجھے وہ رات یاد آگئی جب کھٹھنڈ کے رتیا پارک میں مجھے کرشل کے مجسے کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے ملے تھے اور میں کرشل کے ان ٹکڑوں کو گھر لے آیا تھا اور انہیں جوڑ کر ان کی ”مرہبائی“ کی تھی اور رات کے آخری پہر وہ مجسمہ دنیا

کی حسین ترین عورت کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ نہیں۔ وہ اس دنیا کی عورت نہیں تھی۔ وہ نیلگہ تھی۔ نیلگہ کی حسن کی مالک۔ وہ گوتم بھوش کی قوتوں کا شکار ہو رہی تھی اور میں نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ میری شکر گزار تھی اور رخصت ہونے سے پہلے اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ وہ ایسا ہی ناقابل فراموش کیف آگیاں کھینچنے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ نیلگہ تھی جس نے میرا سرانی گود میں رکھا ہوا تھا اور میرے اوپر بچھی ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہی نہیں پورا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس کے پورے وجود میں زندگی بس گئی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں وجدان۔“ نیلگہ کے ہونٹ ساکت تھے لیکن اس کی سرگوشی جیسی سریلی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی ”وہ شیطان ختم ہو گیا۔ تم نے ان طاغوتی قوتوں کو شکست دے کر مجھے بچا لیا۔ تمہاری نیت کے خلوص نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب تک بے دنیا قائم ہے میں تمہاری سلامتی کی دعا میں لگتی رہوں گی۔ تمہارے دشمن دیر پا ہوں گے اور خد کو کامرانی تمہارے قدم چومے گی لیکن۔“

”لیکن کیا نیلگہ؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”لیکن تمہاری نیت میں معمولی سی کھوت بھی تم سے یہ سب کچھ چین لے گی۔“ نیلگہ نے کہا ”اور میں جانتی ہوں کبھی نہ بھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب شیطانی قوتیں پھر تم پر حملہ آور ہوں گی اور تمہارے قدم اڑکھڑانے لگیں گے۔ میں تمہاری ثابت قدمی کے لیے دعا کرتی رہوں گی لیکن یہ سب کچھ مہر حال تمہارے ہی اختیار میں ہوگا۔“

”تمہیں تو اب کوئی خطرہ نہیں نیلگہ؟“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ نیلگہ نے جواب دیا ”صدیوں کے فاصلے تک کوئی ایسی بہت نظر نہیں آئی جس میں یہ ساری کھٹنیاں برواشت کرنے کی سکت ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی ”تم اپنا جاپ پورا کرو۔ میں تمہاری کنیز بن کر بیشک کے لیے محفوظ ہو جاؤں گی۔“

میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی طرف سے کاشی کی آواز سنائی دی۔

”اجنبی۔ کہاں ہو تم۔“ وہ مجھے پکار رہی تھی۔

”میں جا رہی ہوں۔“ نیلگہ کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

نیلگہ نے میرا سر اٹھائی سے زمین پر ٹکادیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ چند لمحے میرے سامنے کھڑی رہی پھر مجھے ہوا میں تیرنے لگی۔ وہ سامنے نیلگہ کی برف پوش چوٹی کی طرف جا رہی تھی اور پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

”اجنبی! کہاں ہو تم۔“ کاشی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”میں یہاں ہوں کاشی۔ اس طرف۔“ میں نے چیخ کر جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں اس وقت بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ کے مرکزی دروازے کے سامنے موجود تھا۔ کاشی دہانے کے اندر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور دوڑتی ہوئی والمانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ نیم رہنہ جوان اور حسین عورت مجھ سے لپٹی میری پیشانی اور میرے گالوں کے چٹا پٹ بوسے لیے جا رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور بدھ کو اس ساہوکار اور دھردل کھینے لگا پیسے کی نئی یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر نہیں لیا۔

میری نظریں دوسری چٹان کی طرف اٹھ گئیں جہاں ٹوٹاں کھڑا تھا۔ آنکھوں سے محروم اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ دونوں چٹانوں کے بیچ برف کا وہ بل انی جگہ موجود تھا جو آگ سے پھیل کر رہ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ گہرائی میں اچھلتا اور جھگا اڑا تا پانی بھی رواں دواں تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر میرے دماغ میں سنسنی سی ہونے لگی۔ وہ جو کچھ بھی تھا طاغوتی پکڑ تھا۔ برا سرا قوتوں کا کھیل تھا۔ مجھے روکنے کی کوشش تھی لیکن کوئی باطل قوت مجھے نہیں روک سکتی تھی۔ میں اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گوتم بھوش نیلگہ کو حاصل کرنے کے لیے جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے جاپ سمیت اسے ختم کر دیا تھا۔ اس کی تمام برا سرا قوتیں مٹ گئی تھیں۔ وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان طاغوتی اور باطل قوتوں کے خاتمے کے ساتھ ہی ہر چیز معمول کر گئی تھی۔ میں نے مرکز عبادت گاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دائیں بائیں چٹانوں پر بدھا کے ترشے ہوئے مجسے جوں کے توں موجود تھے اور اوپر درمیان بدھا کا انا لنگ مجسمہ بھی موجود تھا اور لگتا تھا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر

مسکرا رہا ہو پھر میری نظریں کاشی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بھی سر تاپا پیکر مسکراہٹ بنی ہوئی تھی۔

”کیا دیکھ رہے ہو اجنبی؟“ کاشی کے ہونٹ کچھ اور پھیل گئے۔

”ک۔ ک۔ کچھ نہیں۔“ میں گڑ بڑا سا گیا۔

”نیلگہ آزاد ہو گئی۔“ کاشی کے لہجے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا ”وہ آزاد تھی۔ آزاد رہے گی۔ بستی میں اس کی آزادی کا جشن منایا جائے گا۔ ایسا جشن جو اس سے پہلے بھی نہ منایا گیا ہو۔ اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ جشن کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

کاشی نے بات ختم کرتے ہی فربہ جوش میں ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر برف کے بل کی طرف چلنے لگی۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ دھوپ کی ترچھی کرکوں میں جی ہوئی برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ کاشی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ہم اس برف پر اس طرح چل رہے تھے جیسے کسی پارک کی پختہ روش پر منہل رہے ہوں۔

ٹوٹاں نے دونوں ہاتھیں پھیلا دیں۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور ہمیں آغوش میں لینے کے لیے ہاتھیں پھیلا دی تھیں۔ میں اور کاشی دوڑ کر والمانہ انداز میں اس سے لپٹ گئے۔ ٹوٹاں نے ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسے دیے اور پھر ہمیں اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

”تم مبارک باد کے مستحق ہو اجنبی۔ تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ نیلگہ کی یہ برف پوش چوٹیاں تم سے بہت خوش ہیں۔ دیکھو۔ دیکھو۔ یہ برفانی چوٹیاں کس طرح خوشی سے جھوم رہی ہیں۔“

اس نے ہاتھ سے ایک برف پوش چوٹی کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے وہاں کچھ دیکھ رہا ہو۔ میری نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔

نیلگہ کی وہ برف پوش چوٹی ہم سے اب بھی ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھی اور چوٹی کے مین اوپر ایک دلچسپ منظر ہماری توجہ کا منتظر تھا۔ برف کے سفید گالے اڑا کر فضا میں پھیل رہے تھے اور اس طرح گردش کر رہے تھے جیسے رقص کر رہے ہوں۔ خوشی سے جھوم رہے ہوں اور حیرت کی بات یہ بھی کہ برف کے گالے فضا میں ایک محدود حد تک تھے۔ چوٹی پر ہوا حالانکہ بہت تیز تھی لیکن وہ بکھر نہیں رہے تھے۔

وہ اڑتے ہوئے گالے سلختے گئے۔ آپس میں جڑتے گئے۔ وہ منظر بہت ہی دلچسپ تھا جب ان برف کے روٹی جیسے گالوں سے سمت کر ایک ہیوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ نیلگی بھی جو برف پوش چوٹی پر والمانہ انداز میں رقص کر رہی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ملوثی مسکراہٹ تھی۔

یہ دلچسپ منظر کافی دیر تک میری نظروں کے سامنے رہا اور پھر برف کے "وہ گالے فضا میں بھرتے گئے۔ نیلگی کا ہیولا بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

"اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے انجی۔" ٹوبان کی آواز سن کر میں اس طرف مڑ گیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کاشی کیس نظر نہیں آ رہی تھی۔ "کاشی کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ۔ اب چلیں۔" ٹوبان نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ میری بات کا جواب نہیں تھا لیکن مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ جس طرح نہایت پراسرار طور پر یہاں آئی تھی اسی طرح واپس چل گئی تھی۔

میرے منہ سے گمراہی نکل گیا۔ میں نے ٹوبان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہماری واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

○☆☆○

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں فخر چھوڑے تھے۔ وہ فخر بڑے تسلیق ثابت ہوئے تھے اور اب بھی اس جگہ کے آس پاس چر رہے تھے۔ رات اس جگہ گزارنے کے بعد ہم صبح سویرے ہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

واپسی کا سفر زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ ٹوبان حسب معمول میری رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کا فخر مجھ سے چند گز آگے تھا۔ میں کسی وقت برابر پہنچ کر اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو معمول کے مطابق وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہ بڑھتا۔

دوسرے دن شام کے وقت ہم اس وادی میں پہنچ گئے جہاں بھینڑوں کے غول نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میرا فخر بھی بڑے اطمینان سے چل رہا تھا اور میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کہیں پھر کسی طرف سے غول بیابانی نمودار ہو کر ہم پر حملہ نہ کرے لیکن میرے یہ خدشات بے بنیاد نکلے۔ وہ ایک طاغوتی چکر تھا جو ختم ہو چکا تھا اور اب اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ایک موقع پر میں اور ٹوبان ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں اب بھی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی سامنے بھینڑوں کا ایک غول نظر آیا۔ وہ تعداد میں دس بارہ تھے اور ایک ہی جگہ پر جمع تھے۔ میں نے بے اختیار اپنا فخر روک لیا۔ "چلے آؤ انجی۔" ٹوبان نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں بلکہ ایک دلچسپ منظر تمہاری نظروں کا ہنجر ہے۔"

میں نے فخر کو آگے بڑھا دیا۔ بھینڑوں کے اس غول اور ہمارے درمیان تقریباً دو سو گز کا فاصلہ تھا اور جیسے جیسے ہم قریب پہنچ رہے تھے "وہ منظر واضح ہو جاتا تھا۔ وہاں کوئی لاش پڑی تھی جسے یہ بھینڑے نوچ رہے تھے۔ بھینڑے منہ اٹھا اٹھا کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور ہم جیسے جیسے قریب پہنچ رہے تھے "وہ بھینڑے ایک ایک کر کے وہاں سے ہٹتے جا رہے تھے۔

اور جب ہم قریب پہنچے تو وہ منظر واقعی برا خوفناک تھا۔ وہ ایک نہیں، تین لاشیں تھیں۔ انسانی لاشیں جو ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر پڑی تھیں۔ دو لاشیں مردوں کی تھیں اور ایک کسی عورت کی۔

میرا خیال تھا کہ انہیں بھینڑوں کا شکار ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ بیشتر حصوں کا گوشت کھایا جا چکا تھا تاہم چرے ابھی تک اس قابل تھے کہ انہیں شناخت کیا جاسکتا تھا۔ ان میں ایک شیواگ تھا۔ دوسرے آدمی کا چہرہ بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے بستی میں دیکھا تھا لیکن اس کا نام معلوم نہیں تھا اور وہ عورت۔ وہ تو مجھ سے چند گز بھی لڑا چکی تھی۔ اس شام بستی کے چوک میں مجھ سے کئی عورتوں نے بچہ لایا تھا اور یہ عورت سب سے زیادہ جان دار ثابت ہوئی تھی اور یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے شباب کی جھلک دکھا کر میرا ہاتھ زمین سے لگانے کی کوشش کی تھی۔

یہ سب بدی کے نمائندے تھے۔ انہوں نے سچائی اور سادگی کا راستہ چھوڑ کر شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا انجام دیکھ کر میں کاپٹ اٹھا۔

آس پاس کی فضا میں شدید نفثن پھیلا ہوا تھا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے بھینڑے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رو رہے تھے۔ کچھ بھینڑے ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہمیں وہاں سے چل جانے کو کہہ رہے ہوں۔ میں نے ٹوبان کی طرف دیکھا۔ اس کا فخر مجھ سے کئی گز آگے جا چکا تھا۔ میں نے بھی اپنے فخر کو ہانک دیا۔

فخر کی پچھ پر سفر میری زندگی کا سب سے اذیت ناک تجربہ تھا۔ دو دن پہلے سفر میں گزرے تھے اور آج بھی دوسرے دن کی شام تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ اس کے بعد رات بھر سفر جاری رہا۔

صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہم ایک بار پھر روک گئے۔ میں فخر سے اتر کر ندی کے کنارے پر اکیلا۔ جی بھر کے پانی پیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

صبح کا دم سا جالا پھیلنے لگا تو میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب وہ جگہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میرے بائیں طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ کالی چٹان تھی جہاں نیلگی کے مشن پر روائگی سے پہلے ٹوبان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر ٹھٹھنے والے انداز میں چلتا ہوا کالی چٹان کی طرف آیا۔ ٹوبان بھی میرے ساتھ اس طرف آیا۔ چٹان کے رامن میں بت گمراہ تھا۔ میں نے اس کھڈ میں جھانک کر دیکھا تو کاب پ کر رہ گیا۔ وہ کھڈ بت لبا چوڑا تھا اور ہزاروں فٹ گہرائی تک چلا گیا تھا اور اس میں لاکھوں کی تعداد میں ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ انسانی ہڈیاں۔ کئی ثابت ڈھانچے بھی نظر آ رہے تھے۔

"یہ بستی کا قبرستان ہے۔" ٹوبان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا "بستی کا کوئی فروج جب مر جاتا ہے تو اس کی لاش ٹھٹھے مشروب میں بنلا کر اس کھڈ میں لڑھکا دی جاتی ہے۔ لاش پر موجود مٹھاس کی وجہ سے چبوتیاں اور دوسرے کیزے کوڑے اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بستی والوں کا عقیدہ ہے کہ کیزے کوڑے جتنی جلدی شریر (نسم) کو کھا جائے گا اس کی روح اتنی ہی جلدی عالم بالا میں واقع شانی جگہ میں داخل ہو جائے گی۔"

عالم بالا کا تصور دنیا کی قدیم قوموں میں بھی تھا اور یہ لوگ بھی اسے مانتے تھے۔ ہڈیوں کا یہ قبرستان دیکھ کر مجھے پارسیوں کا عقیدہ یاد آ گیا۔

پارسیوں کا اپنے مرنے والوں کو ٹھکانے کا طریقہ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ ان کا کوئی باقاعدہ قبرستان نہیں ہوتا۔ زمین سے کئی فٹ اوپر تک دیواریں کھڑی کر کے کٹواں سانبا دیا جاتا ہے جس پر آہنی سلاخوں کی چھت ڈال دی جاتی ہے۔ اسے وہ خرمہ یا سکوت گا کا نام دیتے ہیں۔ مردے کو نسلادھلا کر سلاخوں والے چنگ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ مرد اور خوریندے لاش کا گوشت کھا جاتے ہیں اور مردے کی ہڈیاں نیچے گرتی

رہتی ہیں۔ مرنے والے اپنے کسی عزیز کو سفر آخرت پر روانہ کرنے کا یہ طریقہ اگرچہ نہایت ظالمانہ ہے لیکن بہر حال یہ ان کا مذہبی عقیدہ ہے۔ اپنے مردوں کو ٹھکانے لگانے کا یہی طریقہ ٹکلو فیلے والوں نے بھی اپنا رکھا تھا۔ وہ اپنے مردوں کو اس گڑھے میں ڈال کر چلے جاتے تھے۔ چبوتیاں کیزے کوڑے اور جنگلی جانور اس کا گوشت نوچ کر کھاتے رہتے تھے اور ہڈیاں باقی رہ جاتی تھیں۔

اس گڑھے سے شدید قسم کی بو آرہی تھی۔ یہ نفیث تھا کہ ہوا کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہیں رہ سکا اور دوبارہ ندی کے کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔

دن کی روشنی اب واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ٹوبان بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر چلو سے چند گھونٹ پانی پیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک تنہے پھلا پیکا کر فضا میں کچھ سوگھتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب چلو انجی۔ وہ سب لوگ وہاں سے جا چکے ہیں۔" "کون لوگ کہاں سے جا چکے ہیں؟" میں نے ابھی ہوئی نظروں سے ٹوبان کی طرف دیکھا لیکن وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اچھل کر فخر پر بیٹھ گیا۔

میں بھی اپنے فخر پر سوار ہو گیا۔ اب ہماری منزل صرف دو کوس کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ ٹکلو فیلے کی وہ بستی جہاں شوہا اور دھنوی میری فخر تھیں۔ پتا نہیں، مار تھا بھی وہاں موجود تھی یا جا چکی تھی۔

منزل کی قربت کے احساس سے مجھ پر تھکن سی سوار ہونے لگی۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ جب منزل دور ہوتی ہے تو چلنے رہنے کا حوصلہ برقرار رہتا ہے لیکن جیسے جیسے منزل قریب آتی جاتی ہے "یہ حوصلہ بھی دم توڑنے لگتا ہے اور دل چاہنے لگتا ہے کہ پر لگ جائیں اور انسان اڑ کر منزل پر پہنچ جائے۔ میں بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور گری نیند سو جاؤں۔

ٹوبان کا فخر مجھ سے تقریباً دس گز آگے تھا۔ اس کا رخ بستی کی طرف نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ بستی کے باہر ہی باہر پہلو سے گزر کر جھیل کی طرف جانا چاہتا تھا۔

اس طرف جھیل کے کنارے پر دور تک شاہ بلوط کے درخت تھے۔ ہم بستی سے تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزرتے ہوئے جھیل کے کنارے درختوں میں پہنچ گئے۔ گزرتے ہوئے میں پاریاں بستی کی طرف دیکھا رہا۔ بعض جھونپڑوں کے دروازے بھی نظر آ رہے تھے لیکن مجھے اس طرف کسی ذی

روح کا نام دشنام تک دکھائی نہیں دیا تھا اگرچہ یہ بہت غیر فطری سی بات تھی کہ بستی کے کسی فروئے اپنے جموں پڑے سے نکل کر ہماری طرف دیکھا تک نہیں تھا حالانکہ ہماری آمد پر تو بستی میں شور مچانا چاہیے تھا لیکن وہاں سنا تھا۔ کیمبر سنا تھا۔ اس بستی سے زندگی کا نام دشنام تک مٹ گیا تھا۔ بستی بالکل سناٹا تھی۔

میں فجر سے اتر کر درختوں میں چلتا ہوا جمیل کے کنارے پر آیا۔ ڈوبان مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ دائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی کشتی نظر آ رہی تھی جس کی رسی کنارے کی جھڑیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ میں ڈوبان کے پیچھے پیچھے اس طرف چلنے لگا۔ ہم جیسے ہی کشتی کے قریب پہنچے، نچانے کہاں سے دو جوان لڑکیاں نمودار ہو کر ہمارے سامنے آئیں۔ ان کے جسموں پر وہی لباس تھا۔ پاک کی کھال کا مختصر سا کٹڑا پہنے کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور زیریں حصے پر مختصر سا چمڑے کا اسکرٹ۔

ان دونوں لڑکیوں کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ ڈوبان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی اور مجھے بھی باری باری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا۔

ڈوبان نے اپنا ہاتھ ایک لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کشتی پر سوار کرانے لگی۔ ڈوبان نے خطرناک ترین پہاڑی راستوں پر میری رہنمائی کی تھی اور کشتی پر سوار ہونے کے لیے وہ دونوں کھڑے ہوئے۔

دوسری لڑکی نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب تو مسکراہٹ سے ضرور دیا لیکن اس کا سہارا لینے کے بجائے خود ہی کشتی پر سوار ہو گیا تاہم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ بستی کے لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہ خوب صورت لڑکیاں ہمیں کشتی میں سوار کرا کے کہاں لے جا رہی تھیں۔ ڈوبان جس طرح بستی سے پہلو بچا کر سیدھا اس جگہ آیا تھا جہاں یہ کشتی ہماری مختصر تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں کہیں اور جانا ہے۔ گویا اسے پہلے سے پروگرام کا علم تھا لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پہلے سے کیسے جانتا تھا!

کشتی کافی کشادہ تھی۔ آٹنے سامنے دو نیمیں تھیں اور ہر سیٹ پر تین آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ میں اور ڈوبان ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں لڑکیاں کشتی کو دھکیل کر گہرے پانی میں لے آئیں اور اچھل کر کشتی پر سوار ہو گئیں۔ دونوں نے ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر چپو

سنبھال لیے۔

انہیں اس طرح اپنے سامنے بیٹھے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کپٹیاں سلگ اٹھیں اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسی وقت سورج طلوع ہو گیا۔ جمیل کے پانی میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ جمیل کے ہر سکون پانی پر چلتی ہوئی دھوپ کی سنہری کرنوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے الاؤ بک رہے ہوں۔

کشتی کا رخ جزیرے کی طرف تھا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ہم اس ویران جزیرے پر کیوں جا رہے ہیں۔ میں ان لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بستی کے بارے میں، بستی کے لوگوں کے بارے میں۔ شوہا، دھنو اور مار تھا کے بارے میں مکر وہ دونوں لڑکیاں میرے سامنے جس پوزیشن میں بیٹھی تھیں انہیں دیکھ کر میرا بتا بھی پانی ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لینے ہی میں عافیت سمجھی۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ میں آنکھیں بند کر بیٹھا رہا اور کشتی جمیل کی ہر سکون سطح پر بستی رہی۔ چپوؤں کی شراب شراب کی آوازیں مسلسل میری سماعت سے ٹکرانی رہیں۔

شور کی آوازیں سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منظر میرے لیے واقعی دلچسپ تھا۔ ہماری کشتی جزیرے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ساحل پر سیکڑوں لوگ کھڑے خوشی سے چیخ رہے تھے۔

کشتی کا رخ چٹان کو تراش کر بنائے گئے اس گھاٹ کی طرف تھا جہاں جہوم میں سب سے آگے اس قبیلے کی سردار کاشی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ دھنو، شوہا اور مار تھا کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے سیکڑوں تنگ دھڑنگ عورتیں، مرد اور بچے بھی موجود تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ سب لوگ میرے استقبال کو آئے تھے۔ وہ دونوں پہلے کاشی نے قبیلے کے لوگوں کو بتایا تھا کہ میں نے اس راکشش کو جلا کر بھسم کر ڈالا ہے جو ایک خطرناک جاپ کے ذریعے نیلگری کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ کوہسار کی ملکہ نیلگری اب آزاد تھی۔ اسے اب صدیوں تک کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کاشی نے، ان پر اسرار شیطانی قوتوں سے جنگ کا سارا کرپٹ مجھے دیا تھا حالانکہ اگر خود کاشی اور ڈوبان میری مدد نہ کرتے تو مجھے گوتم بھوش اور اس کی پر اسرار قوتوں پر اتنی آسانی سے فتح حاصل نہ ہوتی۔ اس پر اسرار جنگ میں میری کامیابی کی خوشی میں کاشی نے تین دن تک جشن کا اعلان کیا تھا اور جشن منانے کے لیے اس جزیرے کا انتخاب کیا تھا۔ قبیلے کی ساری آبادی اس ویران جزیرے پر منتقل ہو گئی تھی لیکن اب یہاں دیہاتی

نہیں رہی تھی۔ ہر طرف زندگی بھر پور انداز میں نظر آ رہی تھی۔ مجھے جلوس کی شکل میں اس حویلی میں لے آیا گیا جہاں سے میں دھنو کو چمڑا کر لے گیا تھا۔ یہ حویلی اس وقت ویران تھی۔ آج اب کابیرا کشتی لیکن اب یہاں زندگی کے بھرپور قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر طرف خوشیاں لوٹ رہی تھیں۔

دھنو، شوہا اور مار تھا بھی میرے ساتھ تھیں۔ ان تینوں کے ساتھ بھی خصوصی مہمانوں کا سالوک کیا جا رہا تھا۔

میری اور ڈوبان کی آمد کے ساتھ ہی جشن شروع ہو گیا تھا۔ جزیرے پر جگہ جگہ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ کرب دکھائے جا رہے تھے۔ کہیں بچے لڑائے جا رہے تھے اور کہیں دوسرے طریقوں سے زور آزمائی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ کوئی بھی ان مقابلوں میں حصہ لے سکتا تھا۔ ہر گروہ کی خواہش تھی کہ میں اور کاشی دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ ان کے ریتا (اکھاڑے) کو روٹی بخشیں۔ ہم ٹھوڑی ٹھوڑی دیر کے لیے ہر جگہ رکتے اور مقابلوں میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ کئی جگہ مجھے بھی بچہ آزمائی کے مقابلوں میں حصہ لینا پڑا۔

جزیرے پر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف دلچسپ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ کوئی تے ہوئے رے پر چل رہا تھا، کوئی منہ سے آگ کے گولے نکال کر دوسروں کو حیران کر رہا تھا اور کوئی بازی بازی دکھا رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کو میں نے کانٹوں کی بیج پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نکڑی کا ایک تخت تھا جس پر لاتعداد نکلیں تھکی ہوئی تھیں۔ ان کی نوکیں اوپر کی طرف تھیں اور وہ عورت نوک دار کیلوں کے بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی جیسے پھولوں کی بیج پر دراز ہو۔ ایک طرف اس سے بھی زیادہ دلچسپ کھیل دیکھنے میں آ رہا تھا۔

نکڑی کا ایک چوڑا تختہ سیدھا کھڑا تھا۔ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی اس تختے کے ساتھ اس طرح چبکی کھڑی تھی کہ اس کے دونوں بازو ذرا سے ترچھے دائیں بائیں ہتھ پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی آنکھوں پر سیاہ بنی باندھے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک اور لڑکی کھڑی تھی جس کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ٹشٹ میں تیز رفتار خنجر رکھے ہوئے تھے۔ وہ شخص ایک ایک خنجر اٹھاتا، تختے کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف نشانہ باندھتا اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر لڑکی کے بدن سے ایک انچ کے فاصلے پر تختے میں پیوست ہو جاتا۔ اس طرح خنجر لڑکی کے چاروں طرف تختے میں پیوست ہوتے گئے۔ آخری

خنجر تختے پر لگنے کے بعد اس شخص نے آنکھوں سے بنی کھول دی۔ لڑکی بھی تختے سے ہٹ کر اس کے قریب آگئی اور وہ دونوں ایک ہاتھ اٹھا کر داؤد غلب نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ کھیل تماشے دن بھر جاری رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ایک جگہ پر آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کر دیا گیا۔ مختلف مقامات پر لنگر کا اہتمام بھی تھا۔ لوگ جیسے جیسے کھانا کھاتے جاتے، الاؤ کے گرد جمع ہوتے جاتے۔

ہم نے کھانا حویلی میں کھایا تھا۔ حویلی بھی خوب کچی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ باہر کا موسم اگرچہ نہایت خوشگوار تھا اور ہلکی سی خشکی بھی ہو گئی تھی لیکن حویلی کے اندر لاتعداد مشعلوں کی وجہ سے کچھ حدت سی ہو گئی تھی۔ جب ہم حویلی سے نکل کر الاؤ کے پاس پہنچے تو وہاں کھیل شروع ہو چکا تھا۔ لگتا تھا جیسے قبیلے کی پوری آبادی اس جگہ پر جمع ہو گئی ہو۔ الاؤ کے گرد بہت بڑا دائرہ تھا اور اس دائرے کے وسط میں تین لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ دو تین آدمی ڈھول بجا رہے تھے۔

رقص کے مظاہرے جاری رہے۔ مختلف لڑکیاں آئیں، اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور پھر ان کی جگہ دوسری لڑکیاں آجائیں اور بالآخر وہ لمحہ بھی آجائیں گا لوگوں کو انتظار تھا۔ کاشی اپنی جگہ سے اٹھ کر میدان میں آگئی۔ آج اس کے جسم پر لباس بھی مختلف تھا۔ باریک لباس میں اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ اس نے ڈھول کی تھاپ پر رقص شروع کیا تو سناٹا سا چھا گیا۔ ڈھول کی تھاپ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر شخص کی نظریں کاشی پر مرکوز تھیں۔ رقص میں لمحہ بہ لمحہ تیزی آتی جا رہی تھی۔

اچانک میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ ایک اور لڑکی ہمارے قریب سے اٹھ کر کاشی کے ساتھ رقص میں شریک ہو گئی تھی اور وہ کوئی قبائلی لڑکی نہیں تھی۔ وہ انجی دھنو تھی۔ دھنو کو میں نے بھد نیل کنڈالی عبادت گاہ کے قریب دیر کے کنارے پر رقص کرتے دیکھا تھا اور اب اسے کاشی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ قبائلی رقص بہت مختلف تھا لیکن لگتا تھا جیسے دھنو نے بھی اس میں مہارت حاصل کر رکھی ہو۔

کاشی اور دھنو ایک دوسرے کے مقابلے پر تھیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ ان کے رقص میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

بڑا ہیجان نیز رقص تھا جو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا



اور جب رقص ختم ہوا تو فضا لوگوں کے شور سے گونج اٹھی۔ مجھے تو دھن پر حیرت ہو رہی تھی۔ کاشی کے سامنے اس نے ایک لمحے کو بھی اپنے آپ کو اناڑی ثابت نہیں ہونے دیا تھا۔

رات کے آخری پیر اس روز کی تقریبات ختم ہو گئیں۔ ہماری رہائش کے لیے بھی حویلی ہی میں بندوبست کیا گیا تھا۔ اگرچہ حویلی میں کئی کمرے تھے لیکن میں نے دھن اور شوہا کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے کو ترجیح دی تھی اور ظاہر ہے 'مارتا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کمرے میں اگر ہم تو اپنی اپنی جگہ پر ڈھیر ہو گئے اور مارتا اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔ جشن کے یہ بنگامے تین دن تک جاری رہے۔ قبیلے والوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قبیلوں کی زندگی میں ایسے مواقع کبھی بکھار ہی آتے تھے اور اس جشن کو تو "نیلگری کی آوازی کا جشن" کا نام دیا گیا تھا۔

یہ جزیرہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ویران پڑا تھا۔ اس قبیلے کے لوگ اگرچہ تو ہم پرستی کا شکار تھے لیکن یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ شیواگ دھن کو اغوا کر کے اس جزیرے پر لے گیا تھا اور شیواگ اور اس کے چند ساتھیوں نے جزیرے کو اپنی بد معاشیوں کا اڈا بنایا ہوا تھا، ان کے دلوں سے آسیب کا خوف نکل گیا تھا اور انہوں نے جزیرے کو پھر سے آباد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کاشی نے بھی اب جزیرے پر واقع حویلی ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرا کام ختم ہو چکا تھا اور میں اب جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کاشی اور قبیلے کے لوگ بعد تھے کہ ہم چند روز مزید یہاں رہیں۔

لیکن تاکے! بالآخر ہم وہاں سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ کئی کشتیاں تھیں جن پر قبیلے کے بہت سے لوگ سوار تھے۔ جس بڑی کشتی پر میں تھا اس میں دھن، شوہا، مارتا اور کاشی بھی تھی۔ کشتیوں میں سوار لوگ اونچی آواز میں الوداعی گیت گارہے تھے۔

میرے لیے حیرت کی ایک بات یہ تھی کہ جزیرے پر آنے کے بعد سے میں نے ٹوبان کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی تقریب میں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کاشی سے اس کے بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ ٹال مٹال گئی تھی اور مجھے افسوس ہوا کہ مارتا کے لیے میں رخصت ہوتے ہوئے اس سے نہیں مل سکا تھا۔

کشتیوں کا رخ قبیلے کی بستی کی طرف نہیں، جھیل کے

دوسرے کنارے کی طرف تھا۔ بہت بڑی جھیل تھی۔ کشتیوں کی رفتار اگرچہ خاصی تیز تھی لیکن اس کنارے تک پہنچنے میں تقریباً چار گھنٹے لگے تھے۔

جھیل کے اس کنارے پر دور تک گھٹا جنگل تھا۔ کشتیوں سے اتر کر ہم جنگل میں پیدل چلنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی ہاڑیاں تھیں جو قد آدم جھاڑیوں اور درختوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ہم جیسے ہی ایک ہاڑی کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف پہنچے، میں ٹھنک کر رہ گیا۔

سامنے ہی درختوں کے جھنڈ میں ایک چشمہ تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر پانچ خچر گھاس چر رہے تھے اور جتنے کے قریب ایک خچر جو شخص بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ ٹوبان تھا۔

میں دو ڈر آگے بڑھا تو ٹوبان نے بھی اٹھ کر بائیں پیلا دیں۔ میں والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ٹوبان نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو تجانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ مجھے آنکھوں سے محروم اس شخص پر ترس بھی آیا اور بے حد پیار بھی۔ قدرت نے اسے بے پناہ صلاحیتیں بخشی تھیں لیکن وہ اس دنیا کی رنگینیاں دیکھنے سے محروم تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں ٹھہرے رہے۔ کاشی نے ہم سب کو گلے لگایا۔ مجھے سے لپٹ کر اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے وہ نیلگری کے ہونٹوں کا لمس ہو۔

ہمارے ساتھ آنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ ان کے سر پر نیلغون کی آواز فضا میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم لوگ خچروں پر سوار ہو گئے۔ ٹوبان کا خچر آگے تھا۔ ہم بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے رہے۔ کاشی اور قبیلے کے دوسرے لوگ ایک اونچی جگہ پر کھڑے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا اور بالآخر وہ لوگ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

مارتا اور شوہا، ٹوبان کے حوالے سے پریشان تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آنکھوں سے محروم یہ شخص کہیں کہیں موت کے منہ میں نہ دھکیل دے لیکن میرے دل میں ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا اور جب میں نے انہیں ٹوبان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں بتایا تو انہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آیا تھا لیکن اس طویل سفر کے دوران میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ خود بھی انکشت بدندان رہ گئیں۔

ہمارا سفر دن بھر جاری رہا۔ کبھی فلک بوس ہواڑ ہمارا راستہ روک لیتے اور کبھی ٹھیب میں ملیوں دور تک پھیل جاتی اور اپنا ہمیں دعوتِ نظارہ دینے لگتیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم کئی ہاتھ نامی ایک بستی میں پہنچ گئے۔

یہ بہت بڑی بستی تھی اور یہاں بھی بدھا کی ایک بہت بڑی عبادت گاہ تھی لیکن عبادت گاہوں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک عبادت گاہ ہی کے پتھر میں کئی روز میری زندگی سے نکل گئے تھے۔ میں اصل راستے سے ہٹ کر کئی روز تک اس جھیل میں پڑا رہا تھا جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن مجھے بہر حال خوشی تھی کہ میری تپسیا راگیاں نہیں گئی تھیں۔ میں کسی کے کام تو آیا تھا۔

مجھے وہ دن یاد تھا جب کھنڈو کے رتنا باریک میں کرشل کے مجھے سے دو ٹکڑے ملے تھے اور یہ طاغوتی چکر اسی لمحے سے شروع ہو گیا تھا۔ اس سے اگلے روز کو تم بھوش سے آنا سامنا ہو گیا تھا اور اس نے اپنی قوتوں کے شعبے دکھانا شروع کر دیے تھے۔ اگر وہ میرے راستے میں نہ آتا تو شاید میں شوہا اور دھن کے ساتھ کھنڈو سے جا چکا ہوتا لیکن گوتم بھوش کی اس پٹ پٹا بازی سے نیلگری کی کمائی کل کر سامنے آگئی اور میں نے وہ کام کر ڈالا جو دنیا کا کوئی اور شخص نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا قافلہ ٹوبان کی رہنمائی میں بستی میں داخل ہو گیا۔ یہ بدھ مت لوگوں کی بستی تھی اور ٹوبان ان لوگوں کے لیے اچھی نہیں تھا۔ وہ جس طرف سے گزرتا، لوگ ہاتھ ہلا دیا کرتے۔ استقبال کرتے۔ ٹوبان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آجاتی اور جواب میں وہ بھی ہاتھ ہلا دیتا۔

دبائے تھوٹک کے قریب ہڈن ویلی کی طرف جانے والی پختہ سڑک کے کنارے یہ بستی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایک قصبہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بعض بازاروں کی سڑکیں بھی پختہ تھیں۔ ان بازاروں کو دیکھ کر کسی بہت قدیم بستی کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا اور میرا خیال ہے، یہ بھی کوئی قدیم بستی ہی تھی لیکن اس پر جدیدیت کی ہلکی سی چھاپ بھی نظر آ رہی تھی۔ قوہ خانے یا چائے خانے بکثرت تھے جن میں میزوں کرسیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

شام ہو چکی تھی۔ کانڈو میں لالٹین اور پیٹرو میکس قسم کی مٹیاں روشن ہو چکی تھیں۔ بازاروں میں بڑی رونق تھیں۔ یہاں ایسے لوگ بھی نظر آ رہے تھے جنہوں نے پورے لباس پہن رکھے تھے اور ایسے لوگ بھی دکھائی دیے جن کے لباس ٹٹکے قبیلے کے لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

یہ قصبہ چونکہ شاہراہ پر واقع تھا اس لیے بہت سی اور مستانگ کی طرف جانے والے غیر ملکی سیاح یہیں سے گزرتے تھے۔ سیاحوں کی بعض باتیں اور تعجب ستانے کے لیے گھنٹے دو گھنٹے یہاں رکتیں اور بعض باتیں یہاں رات بھر کے لیے رک جاتی تھیں۔ بستی کے دکان داروں کو ان غیر ملکی سیاحوں کی وجہ سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

ان علاقوں کی طرف آنے والے سیاح عام طور پر گروپس کی صورت میں سفر کرتے ہیں۔ وہ کھنڈو یا کسی قریبی بڑے شہر سے کوئی کوسٹیا کراسا لے کر حاصل کر لیتے جس سے انہیں سفر میں بڑی سہولت مل جاتی تھی۔ خچروں پر سفر کرنے والے سیاح بھی اس طرف سے گزرتے رہتے تھے۔ قصبے میں کئی رہائشی ہوٹل اور سرائے تھیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو دیکھ کر ہوٹلوں کے مالک ان کی طرف لپکتے تھے۔ انہیں طرح طرح کی ترغیبات دی جاتی تھیں۔

جب ہم قصبے میں داخل ہوئے تو کچھ لوگ ہماری طرف بھی لپکے تھے لیکن ٹوبان کو دیکھ کر ایسے لوگوں کے چروں پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

ٹوبان مختلف بازاروں اور گلیوں میں گھومتا ہوا ایک کشادہ گلے میں حویلی نما مہارت کے پھانک کے سامنے رک گیا۔ پھانک کے سامنے ایک دربان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ٹوبان کو دیکھ کر اندر دوڑ گیا۔ اس کی واپسی میں تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی بھی تھا جس نے افریقہ کے کسی قبائلی جنگ جو کی طرح اپنے جسم پر ہتھیار سجائے رکھے تھے۔ اس کا سر مہنگا اور کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ وہ لام سوم تھا۔ اس بستی کا سردار۔

اس نے آگے بڑھ کر بڑے احترام سے ٹوبان کو سارا وے کر خچر سے اتارا پھر ہماری طرف بڑھا لیکن ہم خود ہی خچروں سے اتر گئے۔ لام سوم نے پھانک کے اندر کی طرف منہ کر کے جھج کر کچھ کہا۔ چار پانچ خادم دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے خچران کے حوالے عموماً اور لام سوم کے ساتھ حویلی کے برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بہت بڑی حویلی تھی۔ کئی کمرے تھے۔ ہمیں مرکزی ہال کمرے میں لے جایا گیا جہاں فرش پر پاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور بیٹھے کے لیے بڑی بھدھی سی لیکن آرام دہ بڑی بڑی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہمیں بڑے احترام سے کرسیوں پر بٹھا دیا گیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد مختلف سمتوں سے لوگ نمودار ہونے لگے۔ ان

میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ ان کی صورتوں میں بیٹیوں جیسی کچھ شاہت تھی۔ ان میں عورتیں زیادہ حسین تھیں۔ ان کے لباس بھی ایسے تھے کہ نظریں خود بخود ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ان سب نے باری باری آگے بڑھ کر پہلے ٹوپان کو اور پھر ہمیں گالوں پر بوسے دیے تھے۔ یہ ممانوں کے استقبال کا ایک انداز تھا جو دنیا کی بیشتر قوموں میں رائج ہے۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد فرش پر بیچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا لگا دیا گیا۔ سب نے اٹھ کر ہی کھانا کھایا۔ ملازموں نے دسترخوان سمیٹ دیے۔ قوے کا دور چلا پھر ٹوپان اٹھ کر چلا گیا۔ دن بھر کے سفر سے ہم بھی تھکے ہوئے تھے۔ مہمان لام سوم نے ہماری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ اس نے ایک ادھیز عمر خادمہ کو اشارہ کیا جس نے ہمیں ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں بھی فرش پر پاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور چند کھیل بھی رکھے ہوئے تھے۔

ہم سب نے اپنے لیے جگہوں کا انتخاب کیا اور کھیل اڈھ کر کھیل گئے۔ ہم پر محض ضرور سوار تھی لیکن آنکھوں میں نیند کا نام روشن تک نہیں تھا۔ ہم کھیلوں میں دیکے لام سوم کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی پرکشش مسکراہٹ تھی۔ ہمیں اخلاقا اٹھ کر بیٹھ جانا پڑا۔

وہ دونوں لام سوم کی بیویاں تھیں۔ ایک درمیانے قد کی اکبرے بدن کی مالک تھی جبکہ دوسری خاصی دراز قامت اور صحت مند قسم کی عورت تھی۔ اکبرے بدن والی عورت کا نام شیمانا اور دراز قامت والی کا نام کوری تھا۔ ان سے باتوں کے دوران میں پتا چلا کہ لام سوم کی تین بیویاں اور ہیں جو اسی قصبے میں کسی دوسرے مکان میں رہتی ہیں۔ گنگو کے دوران میں یہ سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا کہ کوری مستانگ کی رہنے والی ہے اور اس کے دو شوہر اور بھی ہیں اور وہ دونوں مستانگ میں ہیں۔ کوری باری باری ایک ایک مہینہ ان تینوں کے پاس رہتی ہے۔

اس انکشاف پر شوہا اور مارتھا معنی خیز لگا ہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کوری نے اس سلسلے میں کئی سنسنی خیز انکشافات کیے تھے۔ مستانگ کی اکثر عورتیں تین تین چار چار شوہر رکھتی ہیں۔ شوہر آپس میں بھی نہیں لاتے تاہم عورت پر سب سے زیادہ حق اس مرد کا سمجھا جاتا ہے جس سے عورت کی پہلی شادی ہوئی ہو۔ کوری نے یہ بھی بتایا کہ وہ تین دن بعد مستانگ جانے والی ہے۔ مارتھا نے فوراً

ہی اس کے ساتھ پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ وہ تو پہلے ہی مستانگ ہی کی طرف جانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اب تو اسے ایک ایسی عورت مل گئی تھی جو اسے مستانگ قبیلے کے رسم و رواج کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی تھی۔

شیمانا اور کوری رات ویر تک ہمارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ ان کے جاتے ہی میں کھیل میں دیک گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہم اس قصبے میں دو دن رہے۔ اس دوران میں قصبے کے سیر سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔ قصبے کے مرکزی چوراہے پر ایک بہت بڑا اسٹوپا تھا۔ اس کے قریب ہی بسوں کا اڈا بھی تھا۔ سب سے زیادہ رونق اسی چوراہے پر تھی۔ یہاں دن میں دو بسیں مستانگ پانی وے کی طرف سے آتی تھیں اور دو ہی اس طرف جاتی تھیں۔ ان بسوں کے آمد و رفت کے اوقات بھی مختلف تھے۔

تیسرے روز صبح سویرے ہم اس قصبے سے رخصت ہوئے تو کوری بھی ہمارے ساتھ اس بس میں سوار تھی۔ تقریباً بیس میل کے فاصلے پر گڑھ پوہ تھا جہاں سے ایک بڑی مستانگ کی طرف اور دوسری تپانی کی طرف چل گئی تھی۔ یہاں گرم پانی کے چشمے تھے اس لیے اس بستی کا نام بھی تپانی تھا۔

ہم اس وقت سطح سمندر سے تقریباً چھس ہزار فٹ بلندی پر تھے۔ ہمارے چاروں طرف برف پوش چوٹیاں تھیں۔ سردی کی لہریں بڑیوں کے گودے تک میں اتار جا رہی تھیں۔ گاگ بنی نامی ایک بستی سے ہم نے مارتھا کو کوری کو مستانگ کی طرف جانے والی بس پر سوار کرایا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد ہم دوسری بس میں سوار ہوتا پانی طرف سفر کر رہے تھے۔

مختلف بستیوں میں رکتے اور کھانا قسم کی بسوں میں کرتے ہوئے ہم تین دن بعد پوکھار پہنچ گئے۔ ہم صدمہ پرانی تہذیب سے نکل کر ترقی یافتہ دور میں آگئے تھے جہاں جنگلاتی روشنیاں تھیں، زندگی کے ہنگامے تھے۔ زندگی ہنگامے تو وہاں بھی تھے لیکن کتنا فرق تھا دونوں میں۔ جہاں کے اندھیروں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ اخلاقی قدروں کے پاسدار تھے اور جدید تہذیب کی جنگلاتی روشنیوں میں سناٹے والے یہ لوگ اخلاقی اقدار کو پا مال کرنے میں ایک کی دیر بھی نہیں لگاتے تھے۔

یہاں ایک ہوٹل میں ہمیں ایک بڑا فیملی روم مل

ہم دو دن تک اس کمرے تک محدود رہ کر اپنی تسکین اتارتے رہے۔

اس سے اگلے روز صبح سویرے ہم کھنڈو کے لیے روانہ ہوئے لیکن کھنڈو جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ روانہ ہونے کے قریب جب بس تھان کوٹ کے اڈے پر رکی تو میں دوسرے کھنڈو کو اشارہ کرتا ہوا بس سے اتر گیا۔

دھنڈو اور شوہا کو اشارہ کرتا ہوا بس سے اتر گیا۔ ہم بس اسٹاپ سے انسپکٹر برینڈرا کے ہنگامے تک کا فاصلہ ہم نے پیدل ہی طے کیا۔ برینڈرا کے ملازم نے ہمیں پہچان لیا اور دروازے ہمارے لیے کھول دیے اور ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرنے لگا۔

کھانے کے بعد میں نے کھنڈو میں پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر لیا لیکن انسپکٹر برینڈرا آفس میں موجود نہیں تھا۔ میں نے پیغام دے کر فون بند کر دیا۔

کئی روز بعد مرغن قسم کا کھانا کھایا تھا۔ مجھ پر غوغا سی طاری ہونے لگی۔ میں اٹھ کر اسی کمرے میں آگیا جہاں پہلے سویا کرتا تھا۔ ان دنوں اگرچہ اس ہنگامے میں کسی کی رہائش نہیں تھی لیکن بیٹوں بیڑ ورمز میں بستر بچھے ہوئے تھے اور ہر چیز صاف ستھری تھی۔ گویا ملازم بڑا حرام نہیں تھا۔

بستر لیٹنے میں سویا تھا۔ شام سات بجے کے قریب میں خود سے نہیں جاگا بلکہ شوہانے مجھے جھنڈو کر گایا تھا۔

”کیا مصیبت ہے بھی۔ سوئے تو دو۔“ میں نے کورٹ بدل لی۔

”انسپکٹر برینڈرا ایک گھنٹے سے بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ شوہانے جواب دیا۔

برینڈرا کا نام سننے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دماغ پر اب بھی نیند کا غمار طاری تھا۔ میں نے سر کو ایک دو مرتبہ ہولے سے جھٹکا اور اٹھ کر کھانا روم میں گھس گیا۔

گھنڈے پانی کے غسل سے میرے حواس ٹھکانے آگئے نہاتے ہوئے میں نے ایک اور بات نوٹ کی تو چونک گیا۔ نیلگری کی مالا میرے گلے میں نہیں تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار کمراساں نکل گیا۔ نیلگری کی مالا اس وقت سے میرے گلے میں نہیں تھی جب سے ہم گوتم بھوش اور اس کی قوتوں کو تھاکہ کر کے نیلگری کی برف پوش چوٹیوں سے واپس لوٹے تھے۔ کئی روز سے میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا لیکن اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ گوتم بھوش کی قوتوں سے مقابلے کے آخری مرحلے میں، میں نے وہ مالا گوتم بھوش پر دے ماری تھی اور اس کے بعد مجھے اس مالا کا شش ہی

نہیں رہا تھا اور کئی روز بعد اب احساس ہوا تھا کہ وہ مالا مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔

میں نے مالا کا خیال ذہن سے نکال کر کپڑے پہنے اور باہر آگیا۔ انسپکٹر برینڈرا اور شوہا وغیرہ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی وہیں گیا۔

برینڈرا بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملا۔ میں نے شوہا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ برینڈرا کو تنگہ قبیلے کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی۔ دھنڈو بھی خاموش بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ملازم نے ہمارے سامنے چائے سرو کر دی میرا خیال تھا کہ وہ میرے ہی جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ چائے پینے کے دوران میں باتیں ہوتی رہیں۔ انسپکٹر برینڈرا پتا رہا تھا کہ ناگ پال بھی ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔ اس کے کئی ساتھی پولیس کے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے تھے۔ اس کے گروہ کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا تھا اور جو چینی (جزل کھوراث) کے ایجنٹ نیپال میں قدم جمائے کی کوشش کر رہے تھے ان کا بھی مکمل طور پر صفایا ہو گیا تھا۔ منشیات فروشوں کی چند چھوٹی چھوٹی باریاں رہ گئی تھیں۔ انہیں بھی آہستہ آہستہ ختم کیا جا رہا تھا۔ ان باریوں میں زیادہ تر انڈیا سے آئے ہوئے ہندو تھے جو نیپال کو منشیات کی نئی منڈی سمجھ کر قدم جمائے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں بھی ناگ پال جیسے لوگوں کی آشیرواد حاصل تھی لیکن ناگ پال کی موت کے بعد یہ لوگ بھی یتیم ہو گئے تھے۔ یا تو یہ ملک چھوڑ کر واپس انڈیا جا رہے تھے یا پولیس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے۔

یہ سب کچھ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں شوہا کو دلش کھ کے چنگل سے چمڑانے کے لیے اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا اور یہاں آکر میں موت کے ان سوداگروں سے الجھ گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ہیرو تو نہیں کہوں گا لیکن میرے توسط سے ایک ایسے گروہ کا خاتمہ ہو گیا تھا جو اس ملک کے بر سکون، امن پسند اور سیدھے سادے لوگوں کو جہنم میں دھکیلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

انسپکٹر اعظم خان کے بارے میں بات ہوئی تو برینڈرا نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ پہلے انڈیا واپس جا چکا ہے۔

”اب ہماری داپسی کا بندوبست بھی کرو۔“ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا ”میں اب ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ چند روز باہر رہ کر پاکستان چلا جاؤں گا۔“ ”ہندوستان یا پاکستان کیوں؟“ انسپکٹر برینڈرا نے میرے

چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”میں رہ جاؤ۔ یہاں تمہیں فرسٹ کلاس شہرت مل جائے گی اور تمہیں وہ ساری مراعات ملیں گی جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ زندگی بھر عیش کو گھر یہاں رہ کر۔“

”میں دوست۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میں سیلانی آدمی ہوں۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہ سکتا اور پھر پاکستان میرا وطن ہے اس میں شبہ نہیں کہ میں نے پرورش کیس اور پائی زندگی کیس اور گزری لیکن میرا خیر تو پاکستان کی مٹی سے ہی اٹھا تھا اور اب وہ مٹی مجھے بیکار رہی ہے۔ اب میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ خواہ چند روز کے لیے ہی سی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میرے ماں باپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور انہیں دیارِ خیر میں بھی نہیں جینے دیا گیا۔ میں ان لوگوں سے حساب برابر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے پہلے میرے ماں باپ کو اپنے پرکھوں (آبادیاد) کی سرزمین چھوڑنے پر مجبور کیا پھر دیارِ غیر میں بے وردی سے موت کے کھاتے اتار دیا۔ میں کئی بار پاکستان جانے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی جمہوری آڑے آتی رہی لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی جمہوری کو اپنے راستے کی دیوار نہیں بننے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بریندر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ یہاں تم نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں۔“

”نہیں دوست۔“ میں نے کہا ”یہ میرا بوجھ ہے۔ میں اکیلا ہی اٹھاؤں گا۔ تم نے جس چاہت اور محبت کا اظہار کیا ہے میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“

اس کے بعد ہمارا موضوع بدل گیا۔ باتوں میں ساڑھے آٹھ بج گئے۔ بریندر اگھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو۔ کھانا کھا لیں۔ ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ بڑے اچھے انڈین اور پاکستانی کھانے ملتے ہیں۔ وہ ریسٹورنٹ وراصل ایک پاکستانی ہی نے کھولا ہے۔“

”اتنی دور جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔“ میں نے جواب دیا ”میں کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔“

”چلو۔ میں سی۔“ بریندر نے کہا۔

اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم بریندر کی کار میں بیٹھ کر بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ ریسٹورنٹ بھی بہت اچھا تھا۔ کھانے کے بعد بھی ہم

دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔

آدھی رات کے قریب بریندر ہمیں بنگلہ پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ صبح گاڑی بھیج دے گا۔

صبح نہ صرف گاڑی آگئی بلکہ ڈرائیور نے ایک پھول دار بوڑھا بھی میرے حوالے کر دیا جو بریندر نے بھیجا تھا۔ اس میں بڑی مہارت کے کرنی ٹوٹ بھرے ہوئے تھے۔

ہم گیارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ دن بھر کھنڈروں میں پھرتے رہے۔ دوسرا اور رات کا کھانا بھی ہم نے اکیس ہوٹل ہی میں کھایا تھا۔ جب ہم بنگلے میں واپس پہنچے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

گھر آنے کے فوراً ہی دیر بعد ہی میں سوچا تھا۔ دو تین دن گزر گئے۔ بریندر ہمارے کاغذات تیار کر رہا تھا۔ میں نے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کے بجائے بائی روڈز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہم نے رانی روپ مٹی، ٹھاکر بھانوت اور دوسرے دوستوں کے لیے بہت سارے تحائف خریدے تھے۔ بریندر نے بھی ہمارے لیے بہت سے تحائف خرید لیے۔ اس نے تحائف سے بھرے ہوئے دو سوٹ کیس ہمارے حوالے کر دیے تھے۔

وہ دن بھی گیا جب ہم نیپال کو الوداع کہنے کے لیے تیار تھے۔ انسپکٹر بریندر نے ایک انٹرنیشنل مائیکرو بس کا بندوبست کیا تھا۔ دو مسلح گاڑی بھی ساتھ تھیں۔ انسپکٹر بریندر بھی ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔ صبح چھ بجے کے قریب مائیکرو بے بنگلے سے روانہ ہوئی اور اس کے ایک گھنٹے بعد تیز رفتار سے پر تھوپی ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

ہمارا راستہ وہی تھا جس سے اب تک میں کئی بار گزرا تھا۔ پر تھوپی ہائی وے۔ یہ نیپال کی سب سے بڑی شاہراہ تھی جہاں ہر قسم کا ٹریفک سب سے زیادہ ہوتا تھا اور زیادہ آبادی بھی اسی ہائی وے کے آس پاس تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی بڑی لاتعداد بستیاں تھیں جہاں رہنے والوں کی زیادہ تعداد وہاں کے بیروکاروں پر مشتمل تھی۔

ہم گیارہ بجے کے قریب پوٹھارہ پہنچے۔ یہاں پولیس سارا ہی عملہ انسپکٹر بریندر کو جانتا تھا۔ چیف انسپکٹر کو بھی اطلاع ہو گئی اور وہ اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں ہم چائے پینے کے لیے تھوڑی دیر کو روکے تھے۔ ہمارا پروگرام تو یہ تھا۔ چائے پی کر آگے روانہ ہو جائیں گے اور دوسرا کھانا سین میں کھائیں گے لیکن چیف انسپکٹر نے ہمیں دوسرے کھانے کے لیے روک لیا اور وہ ہمیں محکمہ پولیس کے

ہاؤس میں لے آیا۔ اس طرح ہمیں کچھ دیر آرام کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

دوسرے کھانے کے بعد ہم تین بجے کے قریب پوٹھار سے روانہ ہوئے۔ چیف انسپکٹر نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا تھا۔

اب ہم سداھارتھ ہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم شام سات بجے کے قریب نان سین پہنچ گئے۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ عام طور پر ڈیڑھ دو گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے لیکن پہاڑی علاقوں میں طے کھائی ہوئی سڑک پر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں رکھی جاسکتی اس لیے یہ فاصلہ تقریباً دو گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔

نان سین میں ہم صرف چائے پینے کے لیے روکے تھے۔ نان سین میں ہمیں ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہوائی واپس سے تقریباً اس کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہوائی واپس سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور یہ فاصلہ ہم نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کر لیا۔

ہوائی پہاڑی سلسلے اور میدانی علاقے کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ خوب صورت قصبہ قدرتی مناظر کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک پہاڑی اور میدانی علاقے کے درمیان انڈین سرحد کے ساتھ ساتھ سکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی تک پورے بھارتی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے اس سے آگے کاٹھ گودام اور نیپال وغیرہ کے جنگلات شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم اس راستے سے دیش کھ کا چھپچھ کرتے ہوئے نیپال میں داخل ہوئے تھے لیکن اب ہمیں ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے اتنا طویل راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہوائی سے ایک سڑک بھیر ہوا سے ہوتی ہوئی انڈیا کی سرحد پر واقع لم بن قصبے تک چلی گئی تھی۔ یہ قصبہ مسامتا بدھ کا جنم بھومی (جائے پیدائش) تھا۔ بدھ دھرم میں اسے مقدس ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔ ہوائی سے لم بن کا فاصلہ بھی پچاس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ مسامتا کے نام سے موسوم یہ سڑک سداھارتھ ہائی وے کہلاتی تھی۔

ہوائی سے آگے میدانی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز و شاداب خطہ تھا یہاں چھوٹے چھوٹے دریاؤں اور ندی نالوں کی بھی بہتات تھی۔ اس ہائی وے پر اگرچہ اچھا خاصا ٹریفک تھا لیکن انسپکٹر بریندر کو تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

رات دس بجے کے قریب ہم لم بن پہنچ گئے۔ اس وقت بھی قدیم طرز کے اس قصبے میں بڑی رونق نظر آ رہی تھی۔ ہر

طرف پہلی چادروں میں لپٹے ہوئے منجے سروں والے بھٹکھو نظر آ رہے تھے۔

اس قدیم قصبے میں کچھ جدید اور ماڈرن طرز کی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ رہائشی ہوٹلوں کی بھی بہتات تھی۔ زیادہ تر ہوٹل سرائے قسم کے تھے جہاں ایک کمرے میں کئی کئی بھٹکھو رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔

سرحد یہاں سے چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ شام چھ بجے سرحد بند کر دی جاتی تھی۔ اس لیے ہمیں رات لم بین ہی میں گزارنی پڑی۔ ہائی وے کے قریب ایک ہوٹل میں دو کمرے حاصل کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک کمرہ شوہرا اور دھنکو کو دیا گیا اور دوسرے کمرے میں بریندر اور میں آ گئے۔

ہوٹل کی عمارت دو منزلہ تھی۔ سامنے کے رخ پر بہت وسیع لان تھا اور پچھلی طرف کچھ فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا جس کی دوسری طرف کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہمارا کمرہ دوسری منزل پر تھا اور اس کی پچھلی طرف بھی ایک وسیع بالکونی تھی جہاں دو کرسیاں بھی بڑی ہوئی تھیں۔

دھنو اور شوہرا والا کمرہ ہمارے سامنے تھا۔ وہ کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد سو گئی تھیں۔ میں اور بریندر اریہ تک باتیں کرتے رہے اور پھر بریندر ابھی سو گیا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گزرتے ہوئے واقعات فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انسانی زندگی بھی کیا چیز ہے۔ حضرت انسان کو کس مقصد کے لیے زمین پر بھیجا گیا تھا۔ زمین پر تو روزِ اول ہی سے فساد شروع ہو گئے تھے جس کی بنیاد عورت اور زمین ہی بنی تھی اور یہ فساد آج تک جاری ہے۔ یہ دنیا کی مرتبہ تباہ ہو کر پھر آباد ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ اسے قدرتی آفات نے اجاڑا تھا اور کئی مرتبہ یہ خود انسانوں کے ہاتھوں اجڑی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور میرا دماغ چکرانا رہا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور کمرے میں بکھرا چل رہا تھا لیکن مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں بستر سے اٹھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر بالکونی میں گیا۔ چہرے سے ٹکرانے والا تازہ ہوا کا جھونکا بہت اچھا لگا۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سرگوشیوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑکھو کھاتا ساتھ والے کمرے کی بالکونی میں دو بدھ بھٹکھو بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی شاید میری طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور پھر سامنے

دوسری کرسی پر پھیلا لیے سامنے دریا کے کنارے پر چند مکانات تھے۔ ایک دو جنگوں پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ باقی مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دریا کی دوسری طرف بہت دور کھیتوں میں بھی ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے دریا نے کسی مزار پر کوئی دیا جل رہا ہو۔ میں اس غمگینی ہوئی روشنی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت اور سناٹا تھا اور اس سکوت میں میری سماعت سے وقفے وقفے سے ٹکرانے والی ہلکھٹوں کی آوازیں بواہر اسرار تاثر دے رہی تھیں اور پھر وہ سرگوشیاں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔

میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میری نظریں اب بھی کھیتوں میں بہت دور غمگینی ہوئی اس روشنی پر مرکوز تھیں۔ پتا نہیں، کتنا وقت گزر گیا۔ دماغ پر غنودگی ہونے کے باوجود میں نے ایک مرتبہ بھی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔

دیے کی وہ غمگینی روشنی پھیلنے لگی۔ اس کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اس نے تاریکی کے ایک بڑے حصے کو اپنے حصار میں لے لیا۔ روشنی کے اس ہالے کے عین بیچ میں روشنی کا ایک اور نقطہ چمکنے لگا۔ چاندنی جیسی دودھیا روشنی کا یہ نقطہ بھی پھیلتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دودھیا روشنی ایک انسانی ہیولے کی صورت اختیار کر گئی۔

اب میری نظریں روشنی کے اس ہیولے پر مرکوز تھیں۔ میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔

چاندنی کا وہ ہولا ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے جس کا ڈھیلا ڈھالا لباس ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھ رہے تھے۔

فاصلہ کم ہوا گیا اور اس ہیولے کے چہرے کے نقوش بھی واضح ہونے لگے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ نیلگی تھی۔

نیلگی کے ہونٹوں پر وہی ہلکوتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی ستاروں جیسی چمک تھی۔ وہ میرے قریب آگئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نیلگی کے ریش میں یہ تمہاری آخری رات ہے۔“ اس کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی ”میں تمہیں الوداع کہنے آئی ہوں اور تمہاری یہ امانت۔“ اس نے ایک ہاتھ آگے کر دیا۔ مخروطی انگلیوں میں وہی مالا لگی ہوئی تھی ”اے

تم بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ کو مپوہی میں بھول آئے۔ آؤ۔ میں اسے تمہارے گلے میں پستا دوں۔ یہ تمہیں یاد دلاتی رہے گی۔ کبھی گلے کو دل چاہے تو اس کا بڑا پتھر میں ڈال کر چوس لیتا۔ ویسے میں تمہارے آس پاس ہی رہا گی۔ اچھا ہو گا کہ تم اپنا جاپ مکمل کر لو۔ میں ہمیشہ کے تمہاری ہو جاؤں گی۔ لو۔ اب یہ گلے میں پین لو۔“

میں بے اختیار ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میں کچھ چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ نیلگی نے وہ مالا اپنے ہاتھوں سے میرے گلے میں پستا وہ سیدھی ہو کر چند لمبے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا اور آگے جھک کر میری پیشانی بوسہ شبت کر دیا۔ ایک عجیب سا سرور مجھ پر طاری ہو چلا گیا۔ نیلگی سیدھی ہو گئی۔

”میں چلتی ہوں۔“ اس کی سرگوشی ابھری اور وہ اپنے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ نیلگی ایک بار پھر روشنی کے اس ہالے میں داخل ہو گئی۔ اس کا چہرہ اب بھی مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس ہونٹوں پر اب بھی بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ چاندنی وجود سمٹنے لگا اور بالآخر ایک نقطہ میں تبدیل ہو کر گناہوں۔ او جھل ہو گیا۔ زرد روشنی کا ہالہ بھی سمٹتے ہوئے دیے غمگینی ہوئی لو میں تبدیل ہو گیا۔

اپنے کندھے پر بوجھ محسوس کر کے میں چونک گیا۔ کو مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میں بالکونی میں کزن پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اور اس کیلئے ہر بند را مجھے جگا رہا تھا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سامنے فاصلہ تک سرسبز لہلاتے ہوئے کھیت نظر آ رہے تھے اور وہ جا جہاں میں نے دیا جلتے دیکھا تھا وہاں ایک چھوٹا سا مکان نفا آ رہا تھا۔

”چھنچ رہے ہیں۔“ بریندر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”اٹھ کر تیار ہو جاؤ تو ناشتا کریں۔“

کرسی سے اٹھتے ہوئے میرا ایک ہاتھ غیر ارادی طور میرے گلے پر پہنچ گیا اور دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ نیلگی کی مالا میرے گلے میں موجود تھی۔

ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اطمینان سے تیار ہو کر ہم نے ناشتا کیا اور دس بجے۔ قریب سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ پارڈر پر پہنچنے میں ہمیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

سرحدی چوکی کے محافظ بھی انسپٹر بریدرا کی جان پہچان کے نکلے۔ چوکی کا انچارج کئی سال پہلے ٹھٹنڈو میں رہ چکا تھا۔ اس نے بریدرا کو پہچان لیا اور ہم سب کو گاڑی سے اتار کر چوکی کے ریسٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں پہلے مشروبات اور پھر چائے وغیرہ ہمارے واضح کی گئی۔

ہمارے پاس اچھا خاصا سامان تھا۔ چوکی کے محافظوں ہی نے ہمارا سامان اٹھا کر نو میز لینڈ پر رکھ دیا۔ انسپٹر بریدرا نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا اور ہم اپنا سامان اٹھا کر سرحد کی دوسری طرف آگئے جہاں ہمارا واسطہ بھارتی چوکی کے محافظوں سے پڑا۔ ہمارے سامان میں اگرچہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قانون کی زد میں آتی ہو لیکن بھارتی چوکی پر انسپکشن اور سکنز کے اہلکاروں کا رویہ مختلف تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم ان سے جان چمڑا سکے تھے۔

چوکی سے نکلنے ہی ہمیں بس مل گئی جس نے ہمیں گورکھ پور پہنچا دیا۔ ہم نے وہ دن اور اس کے بعد کی رات گورکھ پور ہی میں گزار دی اور اگلے روز صبح سویرے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے اور کھنڈو اور کانپور ہوئے ہوئے شام کے قریب آگرہ پہنچ گئے۔ اگرچہ شام کے بعد بھی آگرہ اور بے پور کے درمیان بسوں وغیرہ کی آمد رفت جاری رہتی تھی لیکن یہ رات ہم نے آگرہ میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دھنوکے لیے یہ سفر خاصا دلچسپ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی عمارتیں صرف ٹھٹنڈو میں دیکھی تھیں لیکن یہاں بڑے شہروں کے بیچ سفر کرتے ہوئے فلک بوس عمارتیں دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اس کے لیے سب سے حیرت انگیز چیز ٹرین تھی۔ نیپال میں تو ٹرین کا تصور ہی نہیں تھا۔ گورکھ پور سے کھنڈو تک ہم نے ٹرین ہی میں سفر کیا تھا اور اس سے آگے آگرہ تک کا فاصلہ بسوں میں طے ہوا تھا کیونکہ ٹرینوں کی آمد رفت کے اوقات مقرر تھے اور بس کسی بھی وقت مل سکتی تھی۔

آئندہ روز ہم آگرہ سے دہلی پہنچ گئے۔ رات دہلی میں گزرا رنے کے بعد دوسری صبح ہم بے پور جانے کے لیے ”پنک سٹی ایکسپریس“ میں سوار ہو گئے۔ مذکورہ ٹرین بے پور اور دہلی کے درمیان چلتی تھی اور دو سو ستر کلومیٹر کا یہ فاصلہ پانچ گھنٹے میں طے کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر موجود ایک قلی نے ہمارا سامان ایک بوکی میں پہنچا دیا۔ وہ چھ مسافروں کا کمپارٹمنٹ تھا۔ دو مسافر پہلے سے موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی جس نے دھوتی اور کرت پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی جس نے شوخ رنگوں والا راجستھانی

لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سر پر جڑی تھی لیکن اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ بوڑھے نے اس کے پیلو میں کتنی سے ٹوکا مارا تو اس نے جلدی سے گھونگٹ نکال لیا اور کھڑکی کی طرف سمت کر بیٹھ گئی۔ بوڑھا بھی سرک کر اس کے ساتھ جڑ گیا۔ میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھے میں دیر نہیں لگی کہ یہ جوان لڑکی اس بوڑھے کی بیوی تھی۔ یہ کھنڈو تھا کہ میں دوسری سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس طرح وہ لڑکی میرے سامنے تھی۔ بوڑھا اپنی سیٹ پر بار بار بے چینی سے پلو بدل رہا تھا اور لڑکی کو کنڈیاں مار رہا تھا۔ میں اس کی بے چینی کو دیکھ کر سمجھ گیا اور اس سیٹ سے اٹھ کر دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ کھڑکی والی سیٹ پر میں نے دھنوکو بٹھا دیا تھا۔

وہ دونوں بھی بے پوری جارہے تھے۔ میں نے راستے میں بوڑھے سے دوستی کر لی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ یہ لڑکی اس کی تیسری بیوی ہے۔ دو بیویوں کا وہ اپنے ہاتھوں سے کیا کرم (آخری رسومات) کر چکا ہے اور یہ تیسری شادی اس نے دو مہینے پہلے کی تھی۔ وہ تیسھوا بیوی کو اس کے میکے والوں سے ملوانے کے لیے جا رہا تھا۔ اس کا پروگرام ایک ہفتہ وہاں رہنے کا تھا اور اس نے بیوی کو اپنے ساتھ ہی لے کر واپس جانا تھا۔ اس بوڑھے کی صحت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ لڑکی دوھوا (بیوہ) نہیں ہوگی بلکہ یہ بوڑھا ہی اپنی اس تیسری بیوی کی چٹا کو بھی اپنے ہاتھوں سے آگ لگائے گا۔

ٹرین بے پور پہنچ گئی۔ ٹرین رکتے ہی پلیٹ فارم پر افزائش سی بچ گئی۔ بہت سے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بوڑھے اور اس کی نئی نوپلی دلسن کے استقبال کے لیے بھی کچھ لوگ موجود تھے لیکن ہمارے استقبال کے لیے کوئی نہیں تھا۔ میں نے بوڑھ مٹی یا ٹھاکر بھانوت کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ بہت عرصے سے میرا ان سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ گورکھ پور پہنچنے کے بعد پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ فون پر انہیں اطلاع دے دوں پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اچانک ان کے سامنے آکر انہیں سر پر اندر دنا چاہتا تھا۔

شوہا کا خیال تھا کہ اس کے مکان پر چلا جائے لیکن میں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس کا مکان کم از کم چھ مہینوں سے بند پڑا تھا۔ وہاں تو اب کھڑیوں نے جالے مان رکھے ہوں گے۔

”روپ مٹی کے ہاں پتلے ہیں۔ اس وقت وہ گھر پر ہی

ہوگی۔ ٹھاکر کو بھی ہم وہاں ملا لیں گے۔“ میں نے کہا۔ انہیں سے باہر آکر سامان ایک ٹیکسی پر لوادیا گیا۔ میں نے ڈرائیور کو روپ مٹی کی حویلی کا پتا دیا اور آگے پہنچرے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دھنوکو شوہا کی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ حویلی کے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکی تو اسی وقت گیٹ کا ذیلی دروازہ بھی کھلا۔ وہ مندری تھی جو بارنگل کرا بھی ہوئی نظروں سے ٹیکسی پر بدلے ہوئے سامان اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شوہا اور دھنوکو دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر ابھی تک اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں دروازہ کھول کر بیٹھے اترتا تو مجھے دیکھتے ہی مندری کا منہ اس طرح کھلے کا کھلا رہ گیا جیسے اس نے کوئی عجیب دیکھ لیا ہو پھر دوسرے لمبے وہ چپٹی ہوئی اندر کی طرف دوڑ گئی۔

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ لان میں کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ مندری کو چپٹے یا کدوہ سب مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک عورت جھنجھکے سے کرسی سے اٹھی۔ اس نے شان دار ساڑی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے ساڑی سنبھالے دوڑتی ہوئی میری طرف لگی اور والمانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ روپ مٹی تھی۔

روپ مٹی کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ وہ بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ لان میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اٹھ کر ہماری طرف آگئے لیکن وہ سب چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

روپ مٹی نے دھنوکو اور شوہا کا استقبال بھی بڑے پرجوش انداز میں کیا تھا۔ دونوں ملازم بھی مجھے آئے تھے۔ ان میں ایک شکر تھا جو ٹھاکر کی ٹیلے والی حویلی میں ہماری خدمت پر مامور تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے اچھا سا ہوا تھا لیکن جب میں نے دوبارہ روپ مٹی کی طرف دیکھا تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا۔

”میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ ٹھاکر کہاں ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسمکراتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی فون کرتی ہوں۔ وہ بھاگا ہوا آئے گا۔“ روپ مٹی نے بھی مسمکراتے ہوئے جواب دیا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی ”بلا کہاں ہے؟“

”بلا! میرے منہ سے مسمکرا سانس نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ بلا کو میرے ساتھ نہ دیکھ کر یہ سوال ضرور کیا جائے گا

”مجھے افسوس ہے روپ مٹی۔ میں بلا کی حفاظت نہیں کر سکا۔ وہ۔ وہ۔“

”اوہ!“ روپ مٹی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی ”تم لوگ اندر تو آؤ۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں کہ سب کو یہیں روک رکھا ہے۔ شکر! سامان آتا رہا اور ٹیکسی والے کو فارغ کر دو۔“ اس نے آخری الفاظ شکر سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

دوسرا ملازم جسونت تھا۔ ان دونوں نے مل کر سامان اتار لیا ٹیکسی والے کو کرایہ بھی جسونت نے ادا کر دیا تھا۔ ہم لوگ لان میں آگئے۔

”میرے دوستو!“ روپ مٹی اپنے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی ”میں آپ حضرات سے ایک ایسی ہستی کا تعارف کرانا چاہتی ہوں جس کا تذکرہ ہم تھوڑی دیر پہلے بھی کر رہے تھے۔ مجھے اور ٹھاکر کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اس ہستی کا بھی بڑا دخل ہے، تو ان سے ملنے یہ ہیں بہت سنگھ۔ میرے محسن اور مہمان دوست!“

سب لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان میں تین عورتیں اور چار مرد تھے۔ سب نے پہلے ہاتھ اٹھا کر پرنام (خصوصی سلام) کیا پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ایک خاتون تو میرے چن (باؤں) چھوئے کو بھی جھک گئی تھی۔

ہم وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے شوہا اور دھنوکو کا تعارف کر لیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس دوران میں سب لوگ بڑی گہری نظروں سے دھنوکو کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی۔“ روپ مٹی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”فنی الحال صرف یہ بتاؤ کہ کہاں سے آرہے ہو اور تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”اگر اطلاع دے دیتا تو ملاقات میں اتنا مزہ تو نہ آتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”تم بتاؤ۔ یہ وارادت“ کب ہوئی؟“ میں نے اس کی مانگ میں بھڑے ہوئے سیندور کی طرف دیکھا۔

”اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے دو ہفتے مزید انتظار کیوں نہیں کر لیا۔“ روپ مٹی نے جواب دیا ”تم بھی ہمارے بیاب میں شریک ہوتے تو رونق بڑھ جاتی۔“

”کوئی بات نہیں۔ اب رونق میلا کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔

مندری ہمارے لیے چائے لے آئی۔ اس کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ اس نے ہمارے سامنے چائے رکھی اور روپ

متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”میں نے جیاجی (بھتیجی) کو فون کر دیا ہے دیدی۔ (باجی) وہ آئے ہی والے ہیں۔“

”مندری کی بیٹی!“ روپ متی چچی ”تم نے سارا مزہ زرا کر دیا۔ میں ٹھاکر کو فون کر کے کوئی ایسی بات کہتی کہ وہ چکر جاتا اور یہاں آکر بہت گھٹ کو دیکھتا تو مارے خوشی کے بے ہوش ہو جاتا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ سارا مزہ کر کر کر دیا۔“

مندری بستی ہوئی چلی گئی۔ روپ متی پہلے بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اسے چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی تھی اور اب شاید وہ ایک دوسرے کے کچھ اور قریب آگئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مندری اس کی ملازمہ ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹھاکر بھی آیا۔ اس کے ملنے کے انداز میں بھی گرم جوش نمایاں تھی۔ وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتانے لگا کہ میں کون ہوں جبکہ روپ متی انہیں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ٹھاکر شوبھا سے بڑی گرم جوشی سے ملا تھا۔

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اب تک کے طویل سفر کی دھول نے ہمارے گلے لگا کر رکھے تھے اور کسی کو بھی ہماری حالت کا خیال نہیں آیا تھا۔ بالآخر میں نے ہی ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانی تھی۔

”اگر اجازت ہو تو ہم اپنے گلے درست کر لیں؟“  
 ”ارے۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ روپ متی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی ”آؤ۔ آؤ۔ اندر چلو۔ میں تم لوگوں کو غسل خانوں کا راستہ دکھاؤں۔“

ہم روپ متی کے ساتھ حویلی میں آگئے۔ ہمارا سامان پہلے ہی اندر پہنچا جا چکا تھا۔ شوبھا اور دھنوں نے اپنے اپنے بیگ کھول لیے اور میں اپنے بیگ سے کپڑے نکال کر ایک کمرے میں رکھ گئی۔

تقریباً پون گھنٹے بعد میں تیار ہو کر باہر نکلا۔ روپ متی اور ٹھاکر اس وقت بھی لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے مہمان جا چکے تھے۔ ٹھاکر اٹھ کر کچھ سے لپٹ گیا۔ ایک گھنٹا پہلے کی ملاقات سے شاید اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شوبھا اور دھنو بھی آگئیں۔ ان دونوں نے سائیاں پہنی تھیں۔ دھنو سڈول بھیم اور دراز قامت کی مالک تھی۔ برنس سفید رنگت پر نیلے رنگ کی ساڑی اس پر خوب بیچ رہی تھی۔ ٹھاکر بار بار کن انہیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے بھی بلا کے بارے میں سوال کر ڈالا میرے خیال میں روپ متی اسے بتا چکی تھی کہ بلا ابہ میں نہیں رہی۔

”جی کمانی ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ”بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں کچھ کئے کا حوصلہ نہ رہا۔“

ٹھاکر نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ مندری نے آواز نہ کیا۔ کھانا لگ چکا ہے۔ ہم لان سے اٹھ کر اندر آگئے۔ چوڑی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ مندری نے مختصر سے وقت میں بڑا زبردست اہتمام کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے لیکن کچھ دیر بعد ٹھاکر مجھے لے کر اٹھ گیا اور روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم لوگ گپ شپ کرو۔ ہم ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔“

ہم دونوں حویلی سے باہر آگئے۔ گیٹ کے سامنے ٹھاکر کی شان دار کار کھڑی تھی۔ میں پیئرس سٹریٹ پر بیٹھ گیا اور ٹھاکر نے اسٹیریئرنگ سنبھال لیا۔ کار حرکت میں آکر ایک گلیوں میں گھومنے کے بعد مین روڈ پر آگئی۔

میں بہت عرصے بعد بے پور آیا تھا۔ وہی کوپے بازار تھے، وہی رونق تھی، وہی کشادہ سڑکیں اور ان سڑکوں پر دو گھما گھمی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا مگر مجھے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔

کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی ایم آئی روڈ پر آکر ایک خوب صورت دو منزلہ بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ گراؤ فلور پر وہی کافی ہاؤس تھا جہاں سونیا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ شوبھا والا کافی ہاؤس تھا۔ میں نے کار سے اتار ہوئے بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ نیارنگ و روغن کیا ہوا تو اوپر کی منزل میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔ سامنے کے رخ جنازی سائز کے سٹڈ گلاس لگے ہوئے تھے۔ اس شیشی کی یہ تھی کہ اس میں صرف ایک طرف سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم اندر آگئے۔ یہ ہال بھی پہلے سے خاصا وسیع ہو گیا۔ غالباً پچھلا پورشن بھی ہال میں شامل کر لیا گیا تھا۔ داغ دروازے کی بائیں طرف دراز آگے اوپر جانے کا زینہ تھا۔ پر سنخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ہم اوپر آگئے۔

اوپر بھی ایسی ہی وسیع ہال تھا۔ مناسب فاصلوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ گول میز عام میزوں سے اونچائی کم تھیں اور ان کے گرد رکھی ہوئی کرسیاں اتنی آرام

تھیں کہ گھنٹوں بیٹھا جاسکتا تھا۔ روشنیوں کا انتظام بھی بہت عمدہ تھا۔ کہیں بھی تیز روشنی نہیں تھی۔ دیواروں سے مدہم موسیقی کی لہریں چھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ ہال بھی نیچے ہال کی طرح انٹرنیشنل تھا اور زیریں ہال کی طرح یہاں بھی کوئی میز خالی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گاہکوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

ہم زیریں ہال میں آگئے۔ کاؤنٹر پر ایک اڈیز عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹھاکر کو دیکھ کر اٹھنا چاہا لیکن ٹھاکر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ ”ہم دفتر میں بیٹھ سکتے تھے۔“ ٹھاکر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہال کی پچھلی طرف اشارہ کیا ”لیکن یہاں بیٹھنا کچھ اچھا لگتا ہے۔“

جب میں پہلی مرتبہ اس کافی ہاؤس میں آیا تھا تو یہاں ویٹریس کام کرتی تھیں لیکن اب کوئی بھی لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تمام مرد ویٹریس۔ سفید براق ڈریس میں وہ بڑے اسٹارٹ نظر آ رہے تھے۔ ٹھاکر نے ایک ویٹریس کو کافی کے لیے کہہ دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ شوبھا والا کافی ہاؤس ہے۔ میں نے اس کی اجازت کے بغیر اس میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔“  
 ”وہ تبدیلیاں مجھے نظر آ رہی ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن تم نے تو اس کافی ہاؤس کا سودا کر لیا تھا۔ تمہیں تبدیلیاں کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔“

”سودا زبانی ہوا تھا اور میں نے اسے کوئی اور ایجنسی بھی نہیں کی تھی۔“ ٹھاکر نے کہا ”دراصل پہلی مرتبہ رش کیش میں شوبھا سے بات ہوئی تھی تو واپس آتے ہی میں نے اس بلڈنگ پر کام شروع کروا دیا تھا۔ اوپر کی منزل پر فلیٹ کی طرح کمرے تھے جو میں نے تڑوا دیے۔ اس دوران میں اطلاع ملی کہ شوبھا کو دیش کھ اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں اس کے لیے پریشان تو بہت تھا لیکن یہاں میں نے کام جاری رکھا۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میں نے اس کافی ہاؤس کا افتتاح کر کے روپ متی کے نام سے اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ یہ فیجووی ہے جو شوبھا کے دور میں تھا۔ بینک اکاؤنٹ اگرچہ روپ متی کے نام پر ہے لیکن وہ صرف چیک پر دستخط کرتی ہے جبکہ سارا حساب کتاب سروپ چند کے ہاتھ میں ہی ہے اور میں سارے برنس کی نگرانی کرتا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ ویٹریس نے ہمارے سامنے کافی سوکھائی۔  
 ”مجھے یقین تھا، شوبھا کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ضرور واپس

آئے گی۔“ ٹھاکر نے اپنے سامنے رکھا ہوا نم اٹھاتے ہوئے کہا ”میں نے اس کا برنس اور سارا حساب کتاب امانت کے طور پر سنبھالا ہوا ہے۔ اب وہ آگئی ہے۔ اتنا صحیح سلامت اور تندرست دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ وہ چند روز آرام کر لے تو میں اس کی امانت اس کے سپرد کر دوں گا۔“

”میں نے دنیا میں بہت کم ایسے افراد دیکھے ہیں جو اپنے سینے میں ایسے جذبات رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا ”شوبھا یقیناً یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوگی۔“ میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے شوبھا کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح مرموز کر رہی ہے۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے لیکن کافی ہاؤس کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گاہکوں کی آمد و رفت اسی طرح جاری تھی۔ ٹھاکر بتا رہا تھا کہ رات دو بجے جب ریسیورنٹ بند کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی یہاں اسی طرح گاہک موجود ہوتے ہیں۔ انہیں معذرت کر کے بڑی مشکل سے باہر نکالا جاتا ہے۔

ایک بجے ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ٹھاکر نے فیجر سروپ چند کو کچھ ہدایات دیں اور ہم کافی ہاؤس سے باہر آگئے۔ اس سے آگے اسٹیشن روڈ پر ٹھاکر کا اپنا وکرم ہوٹل کا ریسیورنٹ بھی رات دو بجے تک کھلا رہتا تھا۔ واپس آتے ہوئے ہم کچھ دیر وہاں بھی رکے اور جب گھر پہنچے تو دو بج چکے تھے۔ دھنو سوچکی تھی لیکن شوبھا اور روپ متی جاگ رہی تھیں۔

”تم لوگ ایک گھنٹے کا کمہ کر آگئے تھے اور اب آرہے ہو؟“ روپ متی نے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت نمایاں تھی۔

”کافی ہاؤس میں بیٹھ باتیں کرنے لگے تو وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

ہم بھی وہیں بیٹھ گئے اور جب باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو واقعی وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے اپنی کمائی سامنے کے لیے اگرچہ کئی راتیں درکار تھیں لیکن میں رش کیش میں شوبھا کے اغوا سے لے کر اب تک کے واقعات نہایت مختصر طور پر بتا رہا تھا۔

اس دوران میں بلا کا ذکر بھی آیا تھا جس سے تھوڑی دیر کے لیے فضا سوگوار ہو گئی تھی۔

صبح چار بجے تک ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمارے سونے کا بندوبست اوپر کی منزل پر کیا گیا تھا۔ ہم دھنو نیچے ہی ایک کمرے میں سو گئی تھی اور اس وقت اسے جگانا



مناسب نہیں سمجھا گیا۔

روپ متی ہمیں اوپر لے آئی۔ کئی کمرے تھے اور سب کے سب آرامتہ۔ میں نے اس کمرے پر قبضہ کر لیا جہاں پہلے روپ متی رہا کرتی تھی اور میں بھی کئی روز تک اسی کمرے میں سویا تھا۔

شوہا اتنی بڑی حویلی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

”میں نے روپ متی کے بارے میں بہت قصے کہانیاں سنی تھیں لیکن یہ تو بہت مختلف ثابت ہوئی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی رانی روپ متی ہے جس کے بارے میں ہر روز ایک نئی کہانی سنی جاتی تھی۔“ یہ بات شوہا نے اس وقت کہی تھی جب ہم دونوں اوپر والے ہال میں کھڑے تھے اور اسی وقت روپ متی اس کمرے سے برآمد ہو رہی تھی جو شوہا کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس نے شاید شوہا کی بات سن لی تھی۔

”روپ متی کی شخصیت میں اس تبدیلی کے لیے مجھے بہت شک کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ اس نے کہا اور قریب آکر میرے کندھے پر سر رکھا کر کھڑی ہو گئی۔ ”یہ شخص اگر میری زندگی میں نہ آتا تو میں آج بھی لکڑی کی دلدل میں بڑی ہوئی۔ میں تو جہوں (زندگی) کے آخری لمحوں تک ہمت شکھ کا احسان نہیں بھول سکتی۔“

بات کرتے ہوئے روپ متی کی آنکھیں بھگ گئی تھیں۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کندھا پھینکیا۔

”زندگی میں اگر یہ خُش و فراز نہ ہوں تو جینے کا مزہ نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے دیکھ لو۔ کیسے کیسے مصائب سے دوچار رہا ہوں لیکن میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔“

”اسی لیے تو میں نے تمہارا نام ہمت شکھ رکھا تھا۔“ روپ متی بولی اور مجھے یاد آ گیا کہ مجھے یہ نام واقعی روپ متی نے ہی دیا تھا۔

”اب سونے کا ارادہ ہے یا رات کا باقی حصہ بھی یونہی کھڑے کھڑے باتوں میں گزار دو گی۔“ میں نے کہا۔

”سوری جی۔“ روپ متی مسکرا دی۔ ”ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح باتیں ہوں گی۔“

روپ متی نیچے چلی گئی۔ میں شوہا کے ساتھ اس کے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا اس سے باتیں کرنا رہا اور پھر اپنے کمرے میں گیا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ باقی سب لوگ مجھ سے پہلے جاگ چکے تھے۔ ٹھاکر توج سات بجے ہی

ہوٹل چلا گیا۔ یہ اس کی بڑی اچھی عادت تھی کہ اپنے کام کی طرف سے اس نے کبھی غفلت نہیں برتی تھی۔ وہ کاروبار پوری توجہ دیتا تھا۔

میرے جاگنے سے پہلے دھونو اور شوہا نے کھوم پور کی حویلی دیکھی تھی۔ دھونو کی زندگی تو ایک عبادت گاہ کی گزری تھی۔ شوہا اگرچہ بے پور میں ہی رہی تھی لیکن اس قسم کی محل نما حویلی میں آنے کا اس کا پہلا موقع تھا اور راجاؤں، مہاراجاؤں کی زندگیوں کے بارے میں بار بار جیرو کا اظہار کر رہی تھی۔ بے پور میں اگرچہ حویلیوں اور محلوں کی بھرمار تھی۔ اس نے تفریح کی غرض سے کئی محلات دیکھے بھی تھے لیکن کسی حویلی میں رہنے کی بات دوسری تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے ٹھاکر کا فون آ گیا۔ کچھ دیر روپ متی اس سے بات کرتی رہی پھر اس نے ریسپور میرے ہاتھ پر دے دیا۔ میں نے تقریباً دس منٹ اس سے بات کی اور پھر ریسپور رکھ دیا۔

”شوہا۔“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا عدم موجودگی میں تمہارا کافی ہاؤس بند رہا ہے۔ سنا ہے بلڈنگ کی حالت بھی بہت بری ہے۔ چلو ذرا دیکھ آئیں۔ اسے ٹھیک ٹھاک کرانے میں پیسہ بھی بہت خرچ ہو گا اور وقت بڑھتے لگے گا۔“

شوہا کی آنکھوں میں تشویش کی لہرں ابھر آئیں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم سب روپ متی کی چم بھاتی ہوئی گاڑی میں سوار ایم آئی روڈ کی طرف جا رہے تھے۔

گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے رکی تو کار سے اترتے؛ شوہا اس طرح ٹھک کر رک گئی جیسے زمین نے اس کے پکڑ لیے ہوں۔ وہ متوحش نظروں سے بلڈنگ کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

ٹھاکر کافی ہاؤس کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ ہمارے استقبال کے لیے وہ چند قدم آگے آ گیا اور جب اس کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے تو شوہا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ فیبر سروب چند نے بھی چن (قدم) کر اس کا استقبال کیا تھا۔ کافی ہاؤس میں اس وقت بھی بڑے میز خالی نہیں تھے۔ اوپر سے نیچے تک گھونٹے کے بعد ہم میں آگئے۔ دفتر بھی بہت کشادہ تھا اور شان دار فرنیچر۔

آرامتہ تھا۔ ہم سب صوفوں پر بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر بعد ایک ویٹرنے ہمارے سامنے کافی سرو کو دی۔

”آپ کے آجانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔“ ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ

اجازت کے بغیر میں نے اس بلڈنگ میں کچھ تبدیلیاں ہی کی ہیں۔ آپ کی امانت ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ ابھی اور اسی وقت اپنی یہ امانت سنبھال لیں۔ سارا حساب کتاب سروپ چند کے پاس موجود ہے۔ اکاؤنٹ روپ متی کے نام پر ہے جسے کل آپ کے نام منتقل کیا جا سکتا ہے۔“

”مجھے نہ تو اپنی آنکھوں پر یقین آ رہا ہے اور نہ ہی کانوں پر۔“ شوہا بولی۔ ”اس کافی ہاؤس کا تو تم سے سودا۔“

”وہ زبانی بات بھی اور میں نے آپ کو کوئی ادائیگی نہیں کی تھی۔“ ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے امانت سمجھ کر اس پرنس کو سنبھال رکھا تھا۔ اب یہ آپ کے سپرد ہے دیدی۔“

”نہیں بھیا، نہیں۔“ شوہا گویا پھٹ پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ چھوٹ چھوٹ کر رو رہی تھی۔ انسان بھی عجیب چیز ہے۔ خوشی بھی ملتی ہے تو دل بھر آتا ہے اور آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ روپ متی اور ٹھاکر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ روپ متی نے اسے بازو میں لپیٹ کر اپنے اوپر کھینچ لیا اور ٹھاکر اس کا کندھا پھینکیا۔

شوہا کافی دیر بعد اپنی کیفیت پر قابو پاسکی تھی۔ ”لیکن شوہا رہے کی کہاں؟ اس کے گھر کو تو تم نے کافی ہاؤس بنا دیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہمت شکھ۔“ روپ متی نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”اتنی بڑی حویلی کو میں نے اپنا مقبرہ نہیں بنانا۔ شوہا دیدی ہمارے ساتھ اسی حویلی میں رہے گی۔ اب تم کوئی ناشو شرمٹ چھوڑنا۔ سمجھے۔“

”سمجھ گیا اکن۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھٹ اپ!“ روپ متی چیختی ”اب میں تمہارے منہ سے مذاق میں بھی ایسی کوئی بات نہ سنوں۔“ سمجھے۔“

”سمجھ گیا اکن۔“ میں نے شرارت جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ کافی ہاؤس کا نظام جس طرح چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دیا جائے اور شوہا حویلی میں ان لوگوں کے ساتھ رہے گی۔ ٹھاکر بے دھونو کے بارے میں یہی طے ہوا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ رہے گی۔

شوہا، سروپ چند کے ساتھ ایک بار پھر اوپر سے نیچے تک کافی ہاؤس کا جائزہ لیتی رہی۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم کافی ہاؤس سے اٹھ کر وکرم ہوٹل میں آگئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے میٹل پر کھایا۔ چار بجے کے قریب ہم دھونو کو شہر کی سیر کرانے

کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹھاکر تو ہوٹل ہی میں رہ گیا تھا۔ کار میں شوہا آگے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اسٹیننگ روپ متی کے کنٹرول میں تھا اور میں دھونو کے ساتھ پیچھے بیٹھی رہی بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی بدلتی رفتار سے شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور بالآخر آٹھ بجے کے قریب ہم حویلی واپس آگئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ٹھاکر بھی پہنچ گیا۔

تمام معاملات طے ہو چکے تھے۔ میرے جانے کے بعد۔ روپ متی اور میرے تعلقات کے حوالے سے پنڈتوں کے کچھ ہنگامے جاری رہے تھے لیکن ٹھاکر اور روپ متی ان سے منٹے رہے اور ان کی شادی کے بعد بالآخر پنڈتوں کی زبائیں بند ہو گئیں۔

میں یہاں سے جانے کا پروگرام بنانے لگا تو دھونو نے ایک اور ٹھاکر کر دیا۔ وہ یہاں رہنے کو تیار نہیں تھی اور میرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ یہ میرے لیے ایک نیا مسئلہ تھا۔ روپ متی، شوہا اور ٹھاکر اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ مان کر نہیں دی اور بعد رہی کہ میں جہاں جاؤں گا وہ میرے ساتھ رہے گی اور بالآخر مجھے ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میں تو فوری طور پر یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا لیکن روپ متی اور ٹھاکر کچھ دنوں کے لیے مجھے روکنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں ان کی شادی میں شریک نہیں تھا اس لیے وہ میرے اعزاز میں ایک زوردار پارٹی دینا چاہتے تھے۔ اس سے اگلے ہی روز ٹھاکر کی ٹیلے والی حویلی میں پارٹی کے انتظامات شروع کر دیے گئے۔

دعوت کے لیے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے ٹیلے والی حویلی کی طرف جانے بھی نہیں دیا گیا۔ دعوت والے روز شام کو ہم وہاں پہنچے تو حویلی کو دیکھ کر میں انگشت بدندان رہ گیا۔ دروازہ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ حویلی کو دلن کی طرح سجایا گیا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ حویلی کے سامنے دور تک چمچاتی گاڑیوں کی قطاریں لگتی گئیں۔ روپ متی بھی ایک راج کمار کی تھی اور ٹھاکر بھانوت شکھ بھی ایک سابق ریاست کے دیوان کا بیٹا تھا۔ اس دعوت میں نہ صرف بے پور بلکہ راجستھان کی کئی سابق ریاستوں کے سابق راجے، مہاراجے، راج کمار، راجپوتانیاں، بڑے بڑے رئیس اور اعلیٰ سرکاری افسران مدعو تھے۔ یہی سب لوگ ان دونوں کی شادی میں بھی شریک تھے۔

اس وقت بھی شادی کا سہا ساں تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے ذوق برق لباس لہراتے نظر آ رہے تھے۔ حویلی کے وسیع

و عریض بال میں بھی انتظام تھا اور وسیع و عریض لان میں بھی میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ باوردی و میشر مشروبات سرو کرتے پھر رہے تھے۔

ہوٹوں اور ٹائٹ کلوں میں تو میں کئی مرتبہ جا چکا تھا لیکن اس قسم کی کسی شاہانہ گھریلو تقریب میں پہلی مرتبہ شریک ہوا تھا۔ میں اپنے آپ میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں اسی بے پور میں پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ پولیس شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں لگی رہتی تھی لیکن وہ سب کنور بلونت نکھ جیسے بد معاشوں اور متعصب پنڈتوں کی سازشیں تھیں اور اب روپ متی اور ٹھاکر بڑے فخر سے شہر کے معززین اور اعلیٰ سرکاری آفیسروں سے میرا تعارف کر رہے تھے۔

”ان سے ملنے۔ یہ ہیں بہت نکھ جن کے اعزاز میں آج کی اس دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔“

بے پور میں میرا نام اب بھی نہیں رہا تھا۔ بے پور میں تو بہت نکھ ایک افسانوی کردار بن چکا تھا۔ روپ متی اور ٹھاکر نے بھی اس نام کو افسانوی رنگ دینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ مجھے انسان نہیں دیتا سمجھتے تھے۔

لوگ مجھ سے ہاتھ ملانے میں بھی براؤ فر محسوس کر رہے تھے۔ ٹھاکر نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ دلش کھ جیسے بد معاش کو بھی ’نیپال تک پیچھا کر کے میں نے ہی قسم کیا تھا۔‘

دعوت طعام کے بعد رانگ رنگ کی محفل جم گئی۔ اگرچہ بے پور کی چوٹی کی رقاصاؤں اور گانے والیوں کو بلایا گیا تھا لیکن مہمانوں ہی میں درجنوں ایسی خواتین موجود تھیں جو اس فن میں ماہر تھیں۔ انہوں نے پیشہ ور رقاصاؤں کو آگے آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ خود روپ متی اور مندری کے رقص نے تو رنگ بجا دیا۔ دھونے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا بلکہ پچ تو یہ ہے کہ ساری محفل دھونی نے لوٹ لی تھی۔

یہ محفل رات کے آخری پیر تک جاری رہی۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ مجھے آج بھی یاد ہے، مہمانوں کی آخری نوٹی صبح پانچ بجے رخصت ہوئی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ہم جو سوئے ہیں تو شام تک ہوش ہی نہیں رہا۔

دو تین دن اور گزر گئے۔ اس دوران میں ٹھاکر یہ کوشش کرتا رہا کہ ہمارے کاغذات بن جائیں اور ہم قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان جا سکیں لیکن اس میں کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ کچھ قانونی رکاوٹیں تھیں۔ اگرچہ جعلی کاغذات بڑی آسانی سے بن سکتے تھے لیکن میں نے ٹھاکر کو منع کر دیا اور بالآخر ایک روز ہم نے وہاں سے رخصت ہونے

کا فیصلہ کر لیا۔

ٹھاکر نے کچھ لوگوں سے مل کر پورا پروگرام تیار کر لیا تھا۔ پاکستان کی سرحد کی طرف جانے کے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہم کراٹہ، ناگور، پٹھان سے ہوتے ہوئے جیلمیر جاتے اور وہاں سے چالیس کلومیٹر آگے کسی جگہ سے سرحد پار کرنے کی کوشش کرتے۔ دوسرا راستہ ’اجیر‘ مارواڑ اور دل واڑہ سے ہوتا ہوا ماؤنٹ آئو تک جانا تھا۔ وہاں سے آگے صوبہ گجرات میں داخل ہو کر دن کچھ کی طرف سے آسانی سے سرحد عبور کی جاسکتی تھی اور ٹھاکر نے جن لوگوں سے بات کی تھی انہوں نے بھی ہمیں یہی راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

روپ متی اور شوہا بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں لیکن ہم دونوں نے ہی انہیں سختی سے منع کر دیا۔ اس روز صبح پچ بجے ہم روانہ ہونے لگے تو بڑا وقت آئیز منظر تھا۔ شوہا اور روپ متی مجھ سے لپٹ کر اس طرح رو رہی تھیں جیسے ان کا کوئی اپنا بہت قریبی عزیز ان سے بیشک کے لیے رخصت ہو رہا ہو۔

ٹھاکر ایئر کنڈیشنڈ لینڈ کرورز بڑی شان دار تھی۔ دھونے پچھلی سیٹ پر تھی اور میں اگلی سیٹ پر جبکہ ٹھاکر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ٹھاکر نے احتیاطاً جنونت کو بھی ساتھ لے لیا تھا اور وہ سب سے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

گاڑی شہر سے نکل کر اجیر کی طرف جانے والی ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا لیکن ٹھاکر کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

دھونے کی زندگی پہاڑی علاقوں میں گزری تھی۔ اس نے میرے ساتھ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سفر کیا تھا اور اب اس صحرائی سفر سے بھی خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اجیر تک ایک سو دس کلومیٹر کا سفر ہم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر لیا۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں پانی میں رکنا پڑا۔ یہاں ہم نے کچھ دیر آرام بھی کیا اور پھر کے بغیر ہمارا سفر جاری رہا۔ پانی سے ڈرائیونگ کی ذمہ داری جنونت نے سنبھال لی تھی اور میں اور ٹھاکر بھی پیچھلی سیٹ پر آگئے تھے۔ دھونے پانی سیٹ پر نیم درازا اونگھنے لگی تھی۔

تقریباً پانچ سو بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم سہ پہر چار بجے کے قریب ماؤنٹ آئو پہنچ گئے۔ بد اخواب صورت بل اسٹیشن تھا۔ اس طرف سے ٹرین کی آمد رفت بھی تھیں لیکن

ایسٹن شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر دور تھا۔

ہماری منزل دن کچھ میں واقع ”سوئی گام“ نامی وہ گاؤں تھا جو پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمیں جس آدمی نے ساتھ سرحد پار کرنی تھی وہ آدمی سوئی گام ہی میں ہمارا منتظر تھا لیکن شام کے بعد اس طرف کا سفر کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے رات کو ہم نے ماؤنٹ آئو ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ماؤنٹ آئو میں یوں تو کئی بہت اچھے رہائشی ہوٹل بھی تھے لیکن ٹھاکر نے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا تھا۔

دن بھر کے سفر سے ہم تھک گئے تھے۔ رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا گیا اور گیارہ بجے کے قریب میں سوچا تھا۔

صبح ناشتا کر کے ہم نوب کے قریب اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ راستہ خاصا دشوار ثابت ہوا تھا۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کہیں تو سڑک ہی غائب تھی۔ ریگستان میں ہلکے جانے کا اندیشہ بھی تھا لیکن ایسا کوئی ساتھ پیش نہیں آیا اور ہم دوپہر کے قریب سوئی گام پہنچ گئے۔

دھرم چند کی حویلی گاؤں کے آخری سرے پر آبادی سے ذرا بہت کراوٹ تھی۔ ہم نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی جس شخص سے دھرم چند کے بارے میں پوچھا تو وہی ہمیں حویلی تک لے گیا تھا۔

حویلی کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں چاروں طرف سایہ دار درختوں کی بہتات تھی۔ ظاہر ہے، گاؤں کی یہ حویلی بے پور جیسی حویلیوں سے بہت مختلف تھی لیکن بہ حال دھرم چند گاؤں کا کھیا بھی تھا اور سب سے دولت مند آدمی بھی اس لیے اس کی حویلی گاؤں کے دیگر مکانات سے مختلف تھی۔

حویلی کے برآمدے میں دھرم چند نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ رام نام کا وہ آدمی بھی تھا جس نے ہمیں سرحد پار پہنچانا تھا۔ وہ دہلا پتلا بے قد کا آدمی تھا۔

ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کیا گیا تھا اور کھانے کے بعد ایک نوکر ہمیں مہمان خانے میں لے آیا۔ رام بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہ ہمیں پروگرام سمجھانے لگا۔

رام کے جانے کے بعد میں اور ٹھاکر تو باتیں کرتے رہے اور دھونے چارپائی پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد ہم ایک چپ میں سوار ہو گئے۔ ٹھاکر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دھرم چند کے ہاتھ کا کھیا ہوا ایک خط دے دیا جو سرحد کی دوسری طرف

ٹھاکر پارک نامی گاؤں میں پہنچ کر کشوری لال نامی ایک آدمی کو دینا تھا۔ کشوری لال یہ خط دیکھ کر مجھے پچاس سو روپے مالیت کی پاکستانی کرنسی دے دیتا۔ اس کے عوض ٹھاکر نے رقم یہاں دھرم چند کو دے دی تھی۔

چپ ریگستان میں ایک جگہ رک گئی۔ وہاں دس اونٹوں پر مشتمل ایک قافلہ ہمارا منتظر تھا۔ اس قافلے میں تین آدمی تھے۔ ان سب نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ اسمگلروں کی ایک پارٹی تھی جس کا سربراہ ہرش نامی ایک آدمی تھا۔ وہ بھی دہلا پتلا اور بے قد کا مالک تھا۔ وہ بار بار کھلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔

دھونے اور میں ٹھاکر بھانوت نکھ سے گلے ملے۔ یہ ہماری اودھائی ملاقات تھی۔

مجھے اور دھونے کو الگ الگ اونٹوں پر سوار کرا دیا گیا۔ ہمیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ ہم اپنے آپ کو اونٹوں پر کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔

میں نے غیر قانونی طور پر دنیا کے کئی ملکوں کی سرحدیں پار کی تھیں لیکن اونٹ پر سرحد پار کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ نیلگی کے پہاڑوں میں فچر کی تنگی پیٹھ پر طویل سفر کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن اونٹ پر سواری کی اور بات تھی۔

اونٹ جب اٹھ کر کھڑے ہوئے تو دھونے اختیار چنچ اٹھی تھی۔ ریگستان کے اس جہاز پر سفر کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب راجستان کے صحرا میں ہوائی جہاز کی تباہی کے بعد ہم ڈاکوؤں اور بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ہمیں اونٹوں پر بٹھا کر غلاموں کی منڈی تک لے جایا گیا تھا۔

ٹھاکر اور رام چپ کے پاس ہی کھڑے رہ گئے اور ہمارا قافلہ سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے آگے ہرش کا اونٹ تھا۔ اونٹوں کی رفتار بدتر تیز ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا اونٹ دھونے کے قریب کر لیا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے آگے کو جھک کر کجاوے بوی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے منہ سے ڈر ڈر سی آواز سن کر رہی تھیں۔

اچانک ہی کسی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ فائر کی آواز اگرچہ بہت دور سے سنائی دی تھی لیکن وہ سناتے میں دور تک پھیل گئی تھی۔

”جلدی۔ تیز۔“ ہرش چیخا۔

اونٹ ایک دم ہلکا کھڑے ہوئے۔ دھونے کے منہ سے

خونفک چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ اچھل رہی تھی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے بڑی مضبوطی سے کباوے پر گرفت جم رکھی تھی۔

فائرنگ کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو پارٹیوں میں ٹکرائی ہو اور خطرناک بات یہ تھی کہ فائرنگ کی وہ آوازیں بتدریج ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا ہم سرحد کے عین اوپر تھے۔ دھنوا اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکی اور اچھل کر اونٹ سے گر گئی۔ اس کے منہ سے بڑی خونفک چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے بھی اپنے اونٹ سے چھلانگ لگا دی۔

دوسرے اونٹ دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ہرمن یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اپنا اونٹ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دوڑتا ہوا دھنوکے قریب پہنچ گیا۔ وہ ریت پر پڑی چیخ رہی تھی۔

میں دھنوکو اٹھانے کے لیے بھٹکا ہی تھا کہ دائیں طرف بہت دور کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کی روشنی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بھی مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے سمجھے میں دو سر نہیں لگی کہ وہ سرحدی محافظوں کی جیپ تھی جن کا غالباً اس طرف اسٹروں کی کسی اور پارٹی سے ٹکراؤ ہو گیا تھا اور وہ جیپ ٹیلوں میں اچھلتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ میں نے دھنوکو کندھے پر ڈالا اور اس طرف دوڑ لگا دی جس طرف اونٹ گئے تھے۔

فائرنگ میں شدت آتی گئی۔ وہ جیپ بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ یہاں ریت سخت تھی اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ جیپ اچھل رہی تھی۔ اس کی روشنیوں کا رخ بھی بار بار بدل رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم ابھی تک روشنیوں کی زد میں نہیں آئے تھے لیکن پھر چاک جیپ کا رخ بدل گیا۔ میں نے ایک ٹیلے کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور دھنوکو ساتھ لے لے لڑھکا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت وہ ٹیلا جیپ کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی گولیوں کی ایک ہاڈھ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے ایک ہاتھ دھنوکے منہ پر رکھ دیا تھا ورنہ ممکن تھا وہ چیخ پڑتی۔

جیپ کچھ آگے نکل گئی۔ اس پر شاید لائٹ مشین گن نصب تھی جس سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں دھنوکو گرفت میں لیے ٹیلے کی آڑ میں لیٹا رہا۔

”بہت شکو!“

دائیں طرف سے ایک سرگوشی سن کر میں اچھل پڑا اور

مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔

”میں اس طرف ہوں۔“ وہی سرگوشی دوبارہ سنائی دی۔ ”ٹیلے کی آڑ میں بیٹھتے ہوئے اس طرف آ جاؤ۔ کھڑے ہوئے کی کوشش مت کرنا۔“

میں نے اس طرف کسی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ سکا لیکن بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا اس نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔ ہو سکتا ہے ٹھاکر نے ہرمن یا اس کے کسی ساتھی کو میرا نام بتا دیا ہو۔ میں نے دھنوکے کان میں سرگوشی کی اور آہستہ آہستہ آواز کی سمت رینگنے لگا۔ دھنوکے میرے ساتھ ساتھ سینے کے بل رینگ رہی تھی۔ تقریباً بیس گز پیچھے ایک اور ٹیلا تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا ایک انسانی ہونے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔

”جیپ مڑ کر واپس آ رہی ہے۔ جلدی سے آگے بڑھو۔“

میں دھنوکو گھٹینا ہوا اکنبھوں کے بل تیزی سے رینگنے لگا۔ جیپ لائٹ مشین گن سے فائرنگ کرتی ہوئی واپس آ رہی تھی۔ ہم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ جیپ کی ہیڈلائٹس کی روشنیوں اور لاتعداد گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ جیپ تیز رفتاری سے اس طرف چلی گئی جہاں اب بھی دو پارٹیوں میں مکرر جاری تھا۔

”تم دونوں ٹھیک ہونا بہت شکو؟“ اس ہونے نے ہمارے قریب آتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ وہ ہرمن ہی تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ میری ساتھی کو اونٹ سے گرنے سے شاید چوٹ لگی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جلدی سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔“ ہرمن نے کہا ”آدھا میل ادھر شاید دونوں طرف کے سرحدی محافظوں میں جھڑپ ہو گئی ہے۔ اگر پاکستانی محافظ اس طرف آگئے تو ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہمیں کم سے کم دوسو گز کا فاصلہ طے کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔“

”کیا تم چل سکتی ہو دھنوکے؟“ میں نے دھنوکے طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ کوشش کرتی ہوں۔“ دھنوکے نے جواب دیا۔

دھنوکے نے ٹھیکے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گئی۔

”شاید میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں نے جھک کر دھنوکو کندھے پر لاد لیا اور ہرمن کے

پیچھے دوڑ پڑا۔

ہم دور تک ٹیلوں کی آڑ میں بل کھاتے ہوئے دوڑتے رہے۔ پہلے تو ریت سخت تھی پھر آگے نرم ریت آ گئی۔

ہمارے پیڑھن رہے تھے اور دوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ ”سو کے بجائے ہم تقریباً چار سو گز تک دوڑتے رہے۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ ایک بڑے ٹیلے کے پیچھے پہنچ کر ہم رک گئے۔ وہاں تمام اونٹ اور ہرمن کے دونوں ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ اونٹ بھی سدھائے ہوئے تھے۔ اب تک ان کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی تھی۔ اگر عام اونٹ ہوتے تو انہوں نے بلبلایا کر آسمان سر اٹھالیا ہوتا۔

دھنوکے اونٹ پر اکیلے بیٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے میں نے اپنے ساتھ بٹھالیا اور ہمارا قافلہ رات کی تاریکی میں ایک بار پھر چل پڑا۔ رفتار اس مرتبہ بھی خاصی تیز تھی۔ دھنوکے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ گئی تھی اور دونوں بازو میرے سینے پر لیٹ رکھے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک اسی اس رفتار سے دوڑتے رہے اور پھر ہرمن کی ایک آواز پر ان کی رفتار کم ہو گئی۔ میرا الجھ جھڑھلا ہو چکا تھا۔ دھنوکے بار بار کراہ رہی تھی۔

ہمارا یہ سفر جاری رہا۔ میرا خیال تھا کہ ہم سرحد پار کرنے کے بعد کئی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ تاریکی بھی اب جھٹنے لگی تھی۔ دم توڑتے ہوئے اندھیرے میں بہت دور کسی کشتی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ صبح کا اجالا واضح ہو گیا اور ہمارے اوپر بستی کے بیچ میں فاصلہ بھی سمجھنا گیا۔

بستی سوئی ہوئی تھی لیکن بستی کے کتے جاگ رہے تھے۔ انہوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ ہمارا قافلہ بستی کے وسطی چوک سے گزر کر ایک حویلی کے چھانک میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی چھانک کھول دیا تھا۔

”آچہ۔“ ہرمن نے اپنے اونٹ سے چھلانگ لگاتے ہوئے ان دونوں میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ان دونوں کو کشوری لال کے مکان پر لے جاؤ اور پیر بخش! تم جھوکیوں کو بلا کر اونٹوں سے مال آڑو۔ آج جلدی کرو۔“ آخری بات اس نے دوسرے شخص سے کہی تھی۔

آچہ نامی شخص نے ہمارے اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ میں نے آڑ کر دھنوکے کو بھی سہارا دے کر آٹا لیا۔ اس کا ایک پیر سوچ کر پکا ہو رہا تھا۔ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ میں نے آچہ نامی اس شخص کی طرف

آتش فشانی 77 حصہ 7

دیکھا۔

”کشوری لال کے مکان پر۔ دو گلی آگے ہے مگر یہ چھو کر چلی گئی کیسے! اس کا تو پیر ہے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور جھک کر دھنوکو کندھے پر لاد لیا اور آچہ کے پیچھے حویلی سے باہر نکلیا۔

”یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے یہ گاؤں ہے؟“ ”نہیں پار کر۔“ آچہ نے میری بات پوری ہونے سے پہلے جواب دیا۔

آچہ نے بتایا تھا کہ ہمیں دو سری یا تیسری گلی میں جانا ہے لیکن ہم کئی گلیاں گھومنے کے بعد ایک مکان کے سامنے رکے تھے۔

تیسری دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ بھی خاصا بڑا مکان تھا۔ ہمیں ایک الگ تھلک کمرے میں پہنچا دیا گیا میں نے دھنوکو ایک چارپائی پر لٹا دیا اور آچہ کی طرف مڑ گیا۔

”میری ساتھی کے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ کسی دیدیا حکیم کا بندوبست ہو چکا ہے؟“

”سائیں، ابھی تو صبح بھی نہیں ہوئی۔ یہاں کے سارے لوگ سو رہے ہیں۔“ آچہ نے جواب دیا ”ابھی دن چڑھنے دو۔ کشوری لال کسی وید کا بندوبست کر دے گا۔ ابھی تم لوگ ادھر بیٹھو۔ میں جاتا ہوں۔ کشوری لال آئے گا تو اس سے بات کر لیتا۔“

آچہ چلا گیا۔ میں جھک کر دھنوکے پیر دیکھنے لگا۔ ٹخنہ پھولا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کے پیر پر ہاتھ رکھا وہ چیخ اٹھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے۔

دھنوکے چارپائی پر پڑی کراہتی رہی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے پیر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اسے حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ دھنوکے دانت بھینچنے لگے۔

میں نے اندازہ لگا لیا کہ فریڈرک نہیں ہوا تھا۔ اونٹ پر سے گرتے ہوئے پیر آڑا پڑ گیا تھا جس سے موج آگئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی کھلی کی طرف بھی کھلتی تھی جو اس وقت بند تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر چٹا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ غالباً سورج نکلنے والا تھا۔ کھلی کھڑکیوں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے آہستہ سن کر پیچھے گھوم کر دیکھا۔

درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی اندرونی

آتش فشانی 77 حصہ 7

دروازے سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی توند ٹکے کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ عمر کا اندازہ پچاس کے ٹک بھگ لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے سفید کھٹے کی دھوئی پاندھ رکھی تھی اور جسم کے اوپر والے حصے پر پیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی جس پر جگہ جگہ اوم چھپا ہوا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں خون کی طرح سرخ اور سرخ تھیں لیکن کھوپڑی کے پھلے حصے پر بالشت بھر چڑھا تھی۔ ماتھے پر نقشہ تھا اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں والی ٹیٹا لٹائی ہوئی تھیں۔

وہ اس قصبے کے بڑے مندر کا پنڈت کشوری لال تھا۔ ہندوستان کے پنڈتوں کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کے مندر جراثم اور عیاشیوں کے اڈے تھے۔ انسانیت کے خلاف سازشوں میں ان پنڈتوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور یہ کشوری لال پاکستان کے ایک سرحدی قصبے کے مندر کا پنڈت تھا۔ یہ بھی جراثم میں ملوث تھا۔ کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ وہ اسمگلروں سے ملا ہوا تھا اور اس غیر قانونی دھندے میں ان کا برابر کا شریک تھا۔

چندر رمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے اس کی توجہ دھنوکے پیر کی طرف مبذول کرائی تو اس نے آواز دے کر اندر سے ایک لڑکے کو بلا لیا اور اسے وید کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

”یہ نہیں چلے گا سائیں۔“ وہ دھنوکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا نہیں چلے گا؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ لباس بدلتا ہوگا۔“ اس نے دھنوکے کی طرف اشارہ کیا جس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی ”اس لباس میں یہ چھوڑی فوراً لوگوں کی نظروں میں آجائے گی۔ اس کے کپڑے بدلتا ہوں گے۔“

”بدل لے گی۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن کیا تم ہمارے لیے جانے پانی کا انتظام کر سکتے ہو؟“

”ہاں ہاں۔ ابھی سارا ہندوستان ہو جاتا ہے تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

میں چارپائی کے سامنے پڑی ہوئی ایک خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک نو عمر لڑکا ہمارے لیے ناشتالے آیا۔ دو برائے تھے اور دو گپ چائے میں دھنوکے کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ ٹرے اس کے سامنے چارپائی پر رکھ دی اور کرسی کھینچ کر خود بھی قریب ہو گیا۔

ناشتے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد وید آگیا۔ وہ پہلو اور ٹائپ بٹائکا آدمی تھا۔ اس نے دھنوکے پیر کو ٹٹول کر دیکھا اور بتایا کہ مروج آگئی ہے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اور جب اس نے مروج نکالی تو دھنوکے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وید نے کسی مرتبہ سے ماتش کر کے پتی پاندھ دی۔

وید چلا گیا۔ دھنوکے پیر پر بڑی بڑی سون ہوئی چلی گئی تھی۔ پنڈت کشوری لال کرسی پر بیٹھ گیا اور میں چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے سائیں۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟“ پنڈت کشوری لال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم کراچی جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی کسی اور طرف جانے کا سوچیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بات یہ ہے سائیں۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ”کراچی کے اخباریوں میں ہر روز ایسی خبریں چھپتی ہیں کہ انڈیا کی انٹیلی جنس ایجنسی ”را“ کے ایجنٹ پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی ایجنسیوں کے ایجنٹ بھی ہمیں بدل کر سرحدی بستیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ کسی کے گھر میں مسمان آجائیں تو انہیں شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ تم لوگ یہاں۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”میں خود بھی یہ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤں لیکن۔“

”اس چھوڑی کی وجہ سے تمہیں چند روز یہاں رکنا پڑے گا۔“ پنڈت نے کہا ”تم لوگوں کو یہاں رکھ کر میں کوئی فخرہ مول نہیں لے سکتا۔ یہاں ایک چھوٹی سی سرائے ہے۔ میں آج تم لوگوں کے لیے وہاں ہندوستان کردوں گا بلکہ آج دوپہر کے کھانے کے بعد۔“

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ کرا بھٹک کھم کا تھا جس کا ایک دروازہ گلی کی طرف بھی تھا اور دستک اسی دروازے پر ہوئی تھی۔

پنڈت کشوری لال نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو دو آدمی اندر داخل ہوئے انہیں دیکھ کر میرا دل اچھل کر قلع میں آگیا۔

وہ پولیس والے تھے!

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کوئی عام پولیس والے نہیں تھے۔ ان دونوں کا تعلق پاکستان رنجیز سے تھا۔ اس نیم عسکری فورس کے جوان ملک خانی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سرحد کے آ رہا غیر قانونی نقل و حمل پر نگاہ رکھنا ان کی اولین ذمہ داری ہوئی ہے اور یہ لوگ اپنی جان پر کھیل کر اس فرض کو نبھاتے ہیں جو بڑے فحش بات ہے۔

صورت حال اچانک سنگین رخ اختیار کر گئی تھی۔ ہمارے ساتھ ”سرمنڈواتے ہی اولے پڑے“ والا معاملہ ہو گیا تھا۔ اس افتاد نے دھنوکے بھی اٹھ کر بیٹھے پر مجبور کر دیا تھا۔ گزشتہ رات والے ”مصرے“ میں دھنوکے کھٹا بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اگرچہ حکیم نے اس کا تسلی بخش معائنہ کرنے کے بعد مزیم لگایا تھا تاہم اس کی تکلیف کو چند روز مزید رہتا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھی تو فحشے سے اٹھنے والی روح کش نہیں نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔

میں اپنی تمام تر توجہ کھلے ہوئے دروازے پر مرکوز کیے کھڑا تھا۔ دروازے کے اندر، بیٹھک نما کمرے میں پنڈت کشوری لال ہٹکا کھڑا آئے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پنڈت کی پشت میری جانب تھی مگر مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ دل مرا طے سے گزر رہا تھا۔ اس چتا کے بارے میں اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

دروازے میں کھڑے ”رنجیز“ کے جوانوں نے کشوری لال کے شانوں کے اوپر سے کمرے کا جائزہ لیا پھر ان کی عقابی نگاہیں ہم پر آکر ٹھہر گئیں۔ کشوری لال اس دوران میں صورت حال کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر آنے والوں کو داخلے کا راستہ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”سہارا (خیریت تو ہے۔ اتنی صبح اس کٹھ (تکلیف) کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔“

وہ دونوں پنڈت کی بات کا جواب دیے بغیر کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بیٹھک کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہ دونوں مسلح تھے۔ ایک جوان کے شوٹلر نیچر سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ آفیسر ریک تھا، دوسرے کی حیثیت ایک کانٹیل ایسی تھی۔ اسی جوان نے دروازہ بند کر کے کڈی لگائی تھی۔

اندروں آتے ہی کانٹیل نے ہمیں اپنی گھن کے نشانے پر رکھ لیا۔ آفیسر ریک سرحدی محافظ کے ہاتھ میں بھی پستول

تھا۔ تاہم اس نے اپنا پستول ہم میں سے کسی پر تانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہی شخص پنڈت کشوری لال سے مخاطب ہوتے ہوئے درشت لیجے میں بولا۔

”پنڈت جی! آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔“

”تمہارا جان! میں کچھ سمجھا نہیں۔“ کشوری لال نے اپنی دانت میں لاعلمی کی بھرپور اداکاری کرنے کی کوشش کی تھی۔

آفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا ”آج تمہاری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا پنڈت کشوری لال۔ ہم بہت دنوں سے تم پر نظر رکھتے ہوئے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق تم مختلف آشیہ کے ساتھ ساتھ انسانوں کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہو۔ لوگوں سے ہماری معاوضہ لے کر تم انہیں سرحد کے اس پار پہنچاتے ہو اور ادھر کے پتھریوں کو اوڑھ لاتے ہو جن میں زیادہ تر بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”مائی باپ!“ پنڈت کشوری لال نے فذویانہ لیجے میں کہا ”یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس قسم کے دھندے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو ایک سیدھا سادہ پنڈت ہوں۔ یہاں کے بڑے مندر کا کپجاری۔ میرا کام پوجا پٹھ ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“

پنڈت ابھی تک نہایت معقول انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ دونوں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر مل جائیں مگر ایسا ہوتا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

آفیسر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بولا تو اس کے لیجے میں بھی بھرپور کاٹ تھی ”پنڈت کشوری لال! پوجا پٹھ تمہارا فرض اور اسمگلنگ کا دھندا تمہارا پیشہ ہے۔ اوسے تم کہتے سیدھے سادے ہو یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے ہماری جانب دیکھا۔ دھنوکے چارپائی پر ہی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ میں پوری حاضر دماغی سے پنڈت اور سرحدی محافظ کے درمیان ہونے والی مکالمات کو سن رہا تھا۔ ہمارا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد وہ پنڈت سے مستفسر ہوا ”پنڈت جی! ان دونوں کا تعارف نہیں کرواؤ گے؟“

”یہ یہ دونوں میرے مسمان ہیں۔“ پنڈت لکت زدہ لیجے میں بولا۔

آفیسر نے پوچھا ”یہ دونوں کہاں سے آئے ہیں؟“

”وہ جی یہ دونوں مسمان ”دیاگاؤں“ سے آئے ہیں۔“

ہیڈ نے بوکھا ہٹ میں کسی سرحدی گاؤں کا نام لے دیا تھا۔ آفیسر اس کی بوکھا ہٹ سے شیر ہو گیا۔ اگلا سوال اس نے خاصے خوں خوار لیے میں پوچھا تھا۔

”آدنگ لال میں یہ لباس کب سے پہنا جانے لگا ہے؟“ اس کے ساتھ ہی آفیسر نے میرے اور دھنو کے لباس کی جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ دھنو جینز اور ٹی شرٹ میں لباس بھی بیک میں نے جینز کے اوپر چیک دار ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہم دونوں کے پاؤں میں جو گرز تھے۔

آفیسر کے پیچھے ہوئے سوال نے ہیڈ نے ہیڈ کو مزید گڑ بوا دیا۔ وہ آئیں بائیں شاہیں کرنے لگا۔ یہ صورت حال سراسر ہمارے خلاف جارہی تھی۔ ہم اس وقت جس بیٹھک نما کمرے میں تھے اس کا ایک دروازہ گلی کی جانب کھلتا تھا۔ سرحدی محافظوں نے اسی دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے جواب میں ہیڈ کشوری لال نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ آنے والوں کو وہاں ہماری موجودگی کے بارے میں کی اطلاع دی گئی تھی ورنہ اگر وہ معمول کی کارروائی کے لیے آتے تو ایک تو اتنی صبح دھاوا بولنے کی ضرورت نہیں تھی، دوسرے اس صورت میں وہ لوگ بیٹھک کے دروازے پر دستک دینے کے بجائے گھر کے داخلی دروازے کا رخ کرتے۔

میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی معمول کی کارروائی نہیں تھی۔ سرحدی محافظوں کو ہماری آمد اور کشوری لال کے گھر میں قیام کے بارے میں باقاعدہ اطلاع دی گئی تھی۔ میرا ذہن بہت تیز رفتاری سے اس اطلاع دینے والے خبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سوچ کی برق رفتاری کو صرف وہی افراد سمجھ اور محسوس کر سکتے ہیں جو غورو فکر سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں۔ انسانی ذہن ایک سینڈز میں بے بہا باتیں اور لاتعداد واقعات کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور تصور کی نگاہ سے انسان کو محسوس بھی کر سکتا ہے۔ میرا ذہن بھی اس وقت انتہائی مصروف ہو گیا تھا، سوچ کا پرندہ اپنی پوری بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔

انڈیا کی سرحد پر واقع ”سوئی گام“ نامی گاؤں تک ٹھکر بھانوت سنگھ خود ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ڈرائیور نما گارڈ، جسوت بھی تھا۔ سوئی گام میں ٹھاکر نے میرے اور دھنو کے گلے مل کر ہمیں الوداع کہا تھا۔ وہ جسوت کے ساتھ اپنی لینڈ کروڈر واپس چلا گیا تھا۔

ہمیں بحفاظت بارڈر پار کروانے کے لیے ٹھاکر نے گاؤں کے کھیا دھرم چند سے معاملہ طے کر رکھا تھا۔ دھرم چند

نے مجھے ہیڈ کشوری لال کے نام ایک رقعہ بھی دیا تھا جس کو بڑھنے کے بعد کشوری لال مجھے پچاس ہزار روپے کے پاکستانی ٹرنکی نوٹ دے دیتا۔ اس رقم کے برابر ٹھاکر نے دھرم چند کو انڈین کرنسی دی تھی اور ساتھ ہی اس کی ”خدمات“ کا بھی معاوضہ بھی دیا تھا۔ مذکورہ رقعہ ہندی زبان میں رقم کیا گیا تھا جس میں دھرم چند نے ہدایت کی تھی کہ ہیڈ کے ہمارے لیے کراچی پہنچنے کا محفوظ بندوبست بھی کرے۔ دھرم چند اور ہیڈ کشوری لال میں اس قسم کی کاروباری ”ڈیل“ ہوتی رہتی تھی۔ دونوں اپنی اپنی طرف کے لوگوں سے ہماری رقم وصول کر کے انہیں دوسرے کے حوالے کر دیتے تھے۔ سرحد کی دوسری جانب ایک دوسرے کے بندوں کو بحفاظت ٹھکانے لگانا ان کی ذمہ داری تھی جس کے لیے کسی قسم کے مالی لین دین کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ گویا یہ سب کچھ امداد باہمی کے تحت ہو رہا تھا۔

دھرم چند نے ہمیں ایک قافلہ کے ہمراہ کر دیا تھا۔ دس اونٹوں اور تین افراد پر مشتمل وہ قافلہ درحقیقت ایک اسلگر باری تھا۔ تینوں افراد سیاہ لباس میں لباس تھے جن میں ایک کی حیثیت سربراہ ایسی تھی۔ اس دبلے پتلے شخص کا نام ہرنس تھا۔ ہرنس نے اپنی جان جو ہم میں ڈال کر علی الصبح ہمیں پاکستان کی حدود میں واقع نگر پار کر کے اس سرحدی گاؤں میں پہنچا دیا تھا۔

ہرنس اور دھرم چند سے کسی قسم کی غداری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ اس نوعیت کے جرائم پیشہ لوگ زبان، اعتماد اور وعدے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس کی خاطر اپنی جان بھی گنوا دیتے ہیں۔

اب آجاکر دو افراد کی طرف شک جانا تھا۔ ان میں ایک آچر تھا اور دوسرا پیر بخش۔ ہرنس نے گاؤں میں داخل ہو کر بڑی جلدی کے ساتھ پیر بخش اور دو افراد سے پہلی ملاقات کی تھی۔ آچر کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے اور دھنو کو ہیڈ کشوری لال کے گھر پہنچا دے اور پیر بخش سے کہا تھا کہ وہ ملازموں کو بلا کر اونٹوں سے اسلگنگ کا سامان اتروالے۔ میرا ذہن کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آچر اور پیر بخش کی حیثیت ملازمین کی سی تھی۔ ان میں سے کوئی خبری کر سکتا تھا۔ زیادہ دھیان آچر کی طرف جارہا تھا کیونکہ وہی ہمیں کشوری لال کے مکان تک چھوڑنے آیا تھا۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سرحدی محافظ کی تیز آواز نے مجھے جو کچھ دیا۔ اب اس کے لیے میں درستی کے ساتھ ساتھ تندی بھی اٹھتی تھی۔ وہ کشوری لال سے مخاطب تھا۔

”ہیڈ! تمہاری آئیں بائیں شاہیں تمہیں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کرنے والی ہے۔“ وہ ہیڈ کے چہرے پر چڑھ جاتے ہوئے بولا ”ابھی تک تم نے میرے کسی سوال کا دو ٹوک اور واضح جواب نہیں دیا۔ اگر کچھ بکا بھی ہے تو لولا لکڑا اور نامعلوم۔“ آفیسر کا کج زہریلا ہونا چلا گیا ”میں جنہیں آخری وار تک دے رہا ہوں۔ ان دونوں کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ یہ ادھر سے ادھر آئے ہیں یا ادھر سے ادھر جانے والے ہیں؟“

”آپ یقین کریں مہاراج۔“ ہیڈ نے گھکیاتے ہوئے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی ”یہ دونوں میرے مہمان ہیں اور آدنگ لال سے۔“

ہیڈ کی منت آمیز وضاحت ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت آفیسر ریک سرحدی محافظ کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ ایک زنارے دار پھیر ہیڈ کے گال پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی آفیسر کی دباؤنی ہوئی آواز سنائی دی۔

”تم نے بہت بک بک کر لی ہیڈ۔ اب میری باری ہے۔“ آفیسر نے ہیڈ کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے کہا ”اور میں زبان سے زیادہ ہاتھ پاؤں سے کام لینے کا عادی ہوں۔“

ہیڈ دونوں ہاتھ جوڑ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید ہیڈ کی حالت اتنی خستہ نہ ہوتی مگر اس وقت وہ واقعی رٹنے ہاتھوں پڑا گیا تھا۔ وہ ہمارے بارے میں ایسی کوئی بھی وضاحت کرنے سے قاصر تھا جس سے سرحدی محافظ مطمئن ہو سکتے ہیڈ پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا۔

آفیسر ریک سرحدی محافظ کھانے والی نظر سے ہیڈ کو گھورتے ہوئے بولا ”پھر کیا ارادہ ہے کشوری لال! تمہیں سب کچھ بچھڑچھڑتا دو گے یا ہیڈ کو مار دے۔“

آفیسر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور معنی خیز نظر سے ہیڈ کو دیکھنے لگا۔ ہیڈ کانوں کا ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ”مائی باپ، جو پوچھنا ہے، ہمیں پوچھ لو۔ ہیڈ کو مار کر جانے کی ضرورت نہیں۔“

ہیڈ کی سراپستگی سے میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ آفیسر نے جس ”ہیڈ کو مار کر“ کا ذکر کیا تھا وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور تکلیف دہ جگہ ہوگی کیونکہ آفیسر کی بات سن کر ہیڈ کا چہرہ ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ میں صورت حال کی سنگینی کا احساس کر چکا تھا۔ آفیسر کی پر اعتماد پیش رفت اور ہیڈ کی مجرمانہ پسپائی ہمیں کسی بہت بڑی مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ یہ معاملہ ہیڈ کے بس کا

نہیں تھا اس لیے میں نے فوری طور پر مداخلت ضروری سمجھی۔

”آفیسر!“ میں نے شائستہ لہجے میں سرحدی محافظ کو مخاطب کیا ”ہم تمہارے ساتھ ہیڈ کو مار چکے کو تیار ہیں۔“

ہیڈ نے چونک کر خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھا، دونوں سرحدی محافظ بھی حیرت آمیز نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو میں پہلی مرتبہ شامل ہوا تھا۔ اس شمولیت کا سبب یہ تھا کہ میرا ذہن موجودہ صورت حال سے نشے کے لیے پوری طرح چاق و چوبند ہو چکا تھا۔ میں ہیڈ کے بھروسے پر کسی مصیبت کو گلے لگانے کو تیار نہیں تھا۔ آفیسر کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے ایک کمائی گھڑی تھی۔ یہ فرضی کمائی حقیقت کے بہت قریب بھی تھی۔ ہر بات میرے ذہن میں بہت واضح ہو گئی تھی چنانچہ میرا مطمئن نظر آنا کوئی اجنبی کی بات نہیں تھی۔

ہیڈ کشوری لال نے مرل سی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مورکھ! وہیانا بھی ہے، تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ہاں مورکھ (بے وقوف) کشوری لال!“ میں نے تسخیرانہ انداز میں کہا ”میں پوری طرح دھیان گیان میں ہوں۔ اگر یہ آفیسر اپنی تسلی کے لیے ہمیں ہیڈ کو مارنے لے جائے گا تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“ پھر میں آفیسر کی جانب متوجہ ہوا ”کیوں آفیسر! اگر میں ہمیں پیر آپ لوگوں کے سوالوں کے اطمینان بخش جواب دے دوں تو کیا پھر بھی تم ہمیں ہیڈ کو مارنے لے جاؤ گے؟“

”یہ تو تمہارا جوابات سننے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔“ آفیسر نے کہا۔

”کشوری لال بولا“ شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ ہیڈ کا اشارہ میری جانب تھا۔ دراصل ہیڈ کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گا۔ ”پاک رنجیز“ والوں نے بڑے نازک موقع پر اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں بھی یہ محسوس کر چکا تھا، غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں ہماری آمد کو سرحدی محافظوں سے چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔ اگر وہ ہماری تلاشی لیتے تو میرے لباس سے دھرم چند کا ربا ہوا رقعہ برآمد ہو جاتا جس کی تحریر ہمارے ہر من گھڑت جھوٹ کی قلعی کھول دیتی۔ میں نے ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک فرضی کمائی بنی تھی۔ اس توجہ کی میں اس لیے بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے وطن میں قدم رکھنے کے بعد کسی قسم کی ”مارا ماری“ نہیں چاہتا

تھا۔ جس تیزی سے سرحدی محافظ ہم تک پہنچ گئے تھے ان حالات میں مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ تاہم اس صورت میں پنڈت کشوری لال کے خلاف بین ثبوت سرحدی محافظوں کے ہاتھ آجاتے اور جان چھڑانے کی اس کی تمام کوششیں ناکامیاب ہو جاتیں۔ اس پاپی پنڈت کی دیکھیری کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔

کشوری لال نے بھٹائے ہوئے انداز میں میرے دماغ کے خراب ہونے کی بات کی تھی مگر میں نے اس کی بات پر توجہ دینے کے بجائے آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔  
”تم سوال کرو آفیسر میں جواب دیتا ہوں۔“  
میرے پر اعتماد لہجے نے آفسر کو حیرت زدہ ضرور کیا ہو گا۔ اس انجمن زدہ حیرت کے اثرات اس کے چہرے پر بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔

اس نے پوچھا ”تم دونوں کون ہو تمہارے نام کیا ہیں؟“  
”آفیسر! تم نے تو ایک ہی سانس میں تین سوالات کر ڈالے۔“ میں نے زرب لب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ دراصل میں اپنے طرزِ کلام سے مفاہمت اور بے تکلفی کی فضا قائم کرنا چاہتا تھا جس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔

وہ معتدل لہجے میں بولا ”تم بھی چاہو تو ایک ہی سانس میں جواب دے ڈالو۔“  
میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا ”ہم دونوں مسلمان ہیں ڈھاکا سے آئے ہیں اور ہمارے نام مراد اور کلثوم ہیں۔“

میرے اس جواب نے پنڈت کشوری لال کے ساتھ ساتھ دھنکو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تاہم دھنوں نے پلک جھپکے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ وہ اب کافی عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ میری ایک ایک ادا اور ایک ایک انداز کو جاننے اور پہچاننے لگی تھی۔ وہ ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ میں نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر وہ بیان جاری کیا ہے لہذا خاموش رہتے ہوئے دھنوں نے چہرے پر ایسے تاثرات سجالیے جیسے وہ میری بات کی تصدیق کر رہی ہو۔ یہ اس کی سمجھداری تھی۔

پنڈت دیدے مجھے تک رہا تھا۔ اس کی منگنا مٹا تو نہ کچھ اور گول ہوئی تھی۔ سرخ آنکھوں میں سفیدی کھنڈ گئی اور نفی میں گردن ہلانے کے باعث اس کے سر پر موجود بالشت بھر ضیا عجیب سے انداز میں پھرد رہی تھی۔ لگتا تھا

جیسے کوئی تما پتلی مٹھکہ خیر انداز میں رقص کر رہی ہو۔ بلا مبالغہ اس کے چہرے پر تیرہ بج رہے تھے مگر اس کے چہرہ طبع گل ہو چکے تھے۔

میرے جواب نے سرحدی محافظ کو بھی اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ محتاط لہجے میں بولا ”کیا تم دونوں غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے یہاں پہنچے ہو؟“

”تمہارا اندازہ درست ہے آفیسر۔“ میں نے کہا۔ میرا انداز بے باک تھا۔

”مگر کہاں ڈھاکا۔ اور کہاں گنگیار کر کا یہ سرحدی گاؤں؟“ آفیسر کے لہجے میں ابجھن تھی ”تمہاری بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”آفیسر! ڈھاکا بنگلہ دیش میں ہے اور گنگیار کر پاکستان میں۔ اس میں سمجھ میں نہ آنے کی کون سی بات ہے؟“

”میرا مطلب ہے ان دونوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں۔“ وہ بولا ”پھر تم لوگ۔“

میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا ”آفیسر! تمہاری یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ ان دو ملکوں کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں مگر ایک تیسرے ملک کی سرحدیں ان دونوں ملکوں سے ملتی ہیں۔ ہم اسی تیسرے ملک میں ٹھہرنے اور مصیبت بھرا سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔“

کتنے افسوس کی بات تھی کہ ایک جسم کے دو بازو ایک دوسرے سے کتنی دوری پر تھے۔ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش نہیں بنا تھا اس وقت چلی اور آج بھی دونوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتی تھیں اور نہ ہی یہاں ہنسنے والے لوگوں کے دل۔ جس کے لیے دونوں طرف کے لوگ قصور وار ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، مائیں یا نہ مائیں۔

وہ بخوبی سمجھ گیا کہ تیسرے ملک سے میری مراد انڈیا تھی۔ پنڈت کشوری لال کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”اور غیر قانونی طور پر بارڈر عبور کروانے میں تمہاری مدد اسی پنڈت نے کی ہوگی؟“

”تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”اس سلسلے میں غالب کردار دھرم چند نے ادا کیا ہے جو سرحد کے اس پار سوئی گام نانی گاؤں کا گھیا ہے۔“

آفیسر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ ان لوگوں کے کام کرنے کا یہی طریقہ کار ہے۔“  
اپنی بات ختم کرتے ہی آفیسر نے پنڈت کو گھورا۔ وہ جزیب

ہو کر رہ گیا۔ ایک ایک کر کے اس کے خلاف ثبوت جمع ہو رہے تھے۔ اس کا پتہ کارا کسی بھی طور ممکن نہیں تھا۔

آفیسر نے مجھ سے پوچھا ”تمہیں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“  
”مجبوری تھی!“ میں نے مختصر کہا۔

وہ قدرے سخت لہجے میں بولا ”کیا مجبوری تھی۔ کیا تم دونوں کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہو؟“

”قطعاً نہیں۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا ”ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم بنگلہ دیش سے بھی غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے انڈیا میں داخل ہوئے تھے۔“  
”مجبوری کی وضاحت کرو۔“ آفیسر نے کہا۔

میں نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی کے مطابق جواب دیا ”ہماری مجبوری تھی۔“ ”مستحکم کش فسادات“ ڈھاکا میں ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں کسی مذہبی معاملے پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی تھی جس کے نتیجے میں ہمارے گھر بھی لپیٹ میں آ گئے۔ ہم بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہمارے گھر کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ہم دونوں ڈھاکا سے چھپتے چھپاتے کھانا پیئے۔ یہاں سے ہم انڈیا کے شہر کلکتہ میں داخل ہو گئے پھر تین ماہ کا تکلیف دہ سفر کرتے ہوئے کلکتہ سے آسنسول، پنڈت، الہ آباد، کان پور، آگرہ، دہلی، بے پور، اجیر، ماؤنٹ آبو، رن کچھ سے ہوتے ہوئے انڈیا کے سرحدی گاؤں سوئی گام پہنچے جہاں سے گزشتہ رات اونٹنوں کے ذریعے یہاں گنگیار کر کے اس گاؤں میں آپ لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔“

میرا یہ بیان بڑی حد تک جٹی برج تھا۔ مثلاً یہ کہ ہم واقعی کان پور، آگرہ، دہلی، بے پور، اجیر، ماؤنٹ آبو، رن کچھ، سوئی گام و پنڈت سے گزر کر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے جھوٹ اور کج کی آمیزش سے اپنی کہانی کچھ اس طرح سیٹ کی تھی کہ اس پر ہر سننے والا فوراً یقین کر لیتا پھر میرے لہجے کا اعتماد بھی میری سچائی پر دلالت کرتا تھا۔ میری ”گوشتش“ کے بڑے مفید اور حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے تھے۔

آفیسر نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری بات پوری سنی اور حتمی لہجے میں بولا ”تمہاری کہانی دل کو لگتی ہے جو ان۔ تمہاری ایک ایک بات سے سچائی پختی ہے۔“

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور عجیب سی نظر سے دھنکو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں ہوس کے بجائے سائنس تھی۔ دھنکو پر حسن اور جوانی کچھ اسی طور ٹوٹ کر بری

تھی کہ دیکھنے والے کی نظر چپک کر وہ جاتی تھی پھر جینز اور نی شرٹ میں وہ کچھ زیادہ ہی قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس لیے آفیسر کے عمل کو رد عمل کہنا چاہیے۔

میں نے آفیسر کی نگاہ کا تعاقب کیا تو وہ جھینپ گیا پھر کھسکا ہوا کر مجھے لگے لگا۔ میں نے کہا ”دیکھ کر کیا آفیسر؟“  
وہ گڑ بڑائے لہجے میں بولا ”مگر ابھی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔“

”وہ بھی پوچھ ڈالو۔“ میں نے کہا۔  
وہ دھنکی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے کیا نام بتایا تھا اپنی ساتھی کا ہاں یاد آیا۔“ اسے دھنکو کا فرضی نام یاد آ گیا تو گلنے لگا ”تمہاری یہ ساتھی کلثوم ابھی تک منہ سے ایک لفظ نہیں بولی۔ ساری گفتگو تم ہی کر رہے۔“

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی اور خود کہا ”کلثوم بے چاری پیدا کنی ہو گئی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے زرم آئینہ نظر سے دھنکو دیکھا جس کے چہرے پر ایک سایہ سا آگڑ گڑ گیا تھا۔ تاہم اسی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ یہ اچھا ہوا کہ بات کرتے ہوئے آفیسر میری جانب دیکھ رہا تھا ورنہ دھنوں کے چہرے کے تاثرات سے وہ ٹھٹک سکتا تھا۔

اس موقع پر پنڈت کشوری لال کی حالت دیدنی تھی۔ وہ میرے اس پر اعتماد جھوٹ پر دل ہی دل میں اش اش برا بھلا ہو گا تاہم اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی تھی۔ وہ کوئی بھی بات کر کے اپنی راہ کے کانٹوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”آفیسر! ایک گونگا شخص ظاہر ہے، بات چیت نہیں کر سکتا۔ وہ مخصوص اشاروں ہی سے دوسرے کی بات سمجھتا ہے اور اپنی بات دوسرے کو سمجھاتا ہے البتہ کراہنے کی بات دوسری ہے۔“

کراہنے کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لیے بھی کر دیا تھا کہ جب سرحدی محافظ کمرے میں آئے تھے تو اس سے پہلے دھنکو اٹھ کر بیٹھی تھی اور ٹخنے کی تکلیف کے باعث اس کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی تھی۔

میں نے دھنکی جانب بولتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے وہ میری بات اور میرے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ اس کی غزالی آنکھوں نے بے زبان خاموشی مجھے بڑے واضح انداز میں بتایا کہ میں جیسا چاہتا ہوں، وہ ویسا ہی عمل کرے گی اور یہ کہ



وہ میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ اپنی یادداشت میں محفوظ کرتی جا رہی ہے تاکہ اسے عمل کے دوران میں کسی دشواری کا سامانہ کرنا پڑے۔

میں مطمئن ہو کر آفیسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مسٹر مراد! تمہارا اس گوگلنگی لڑکی سے کیا نات ہے؟“

میں نے جواب دیا ”ہندوئی کا رشتہ“ انسانیت کا ناتا اور دوستی کا تعلق ہے میرا کلثوم۔ میرے خیال میں یہ سب سے زیادہ مضبوط بندھن ہیں!“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ آفیسر تائیدی انداز میں گویا ہوا ”میں یہ جانا چاہ رہا تھا کہ آیا یہ تمہاری رشتہ دار ہے یا۔“

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھا اور بولا ”تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی ”بست اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“

وہ ایک مرتبہ پھر بڑی شوخ نظر سے دھنوک دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی کے ساتھ ساتھ ایک افسوس بھی موجود تھا جیسے گل کے ساتھ خار ہوتا ہے۔ شاید وہ اس بات سے دکھی ہو رہا تھا کہ اتنی دلکش اور پر شباب لڑکی گوگلنگی کیوں تھی!

وہ بے چارہ سولہ آنے درست سوچ رہا تھا۔ دھنوک کا گونگا پن، پھول کے ساتھ کانٹے والی بات ہی تھی۔ شاید چاند کا داغ بھی اسی کو کہتے ہیں!

میں نے بے تکلفی کی فضا قائم کر کے ماحول کی شدت کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ کانٹیل جس نے پہلے ہم لوگوں پر گمنان رکھی تھی۔ اب اس نے اپنے افسر کے اشارے پر گمن کی نال کا رخ ہماری جانب سے ہٹا لیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی دروازے سے لگا چوس کر کھڑا تھا جیسے اپنے افسر کا اشارہ ملے ہی وہ ہمیں گولیوں سے بھوننے میں کسی غفلت سے کام نہیں لے گا۔ اس کا آفیسر بھی خاصا مستعد تھا۔

میں نے اس موقع پر ایک اور چھلکھڑی چھوڑ دی۔ گن بردار کانٹیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے آفیسر سے سوال کیا۔ ”کیا تمہارا یہ ماتحت بھی گونگا ہے؟“

افسر نے زب لب مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے کہا ”جب سے تم لوگ آئے ہو اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں سمجھا شاید یہ بھی میری ساتھی کلثوم کی طرح قوت گویائی سے محروم ہے۔“

بات نہیں کیا بات تھی کہ اپنے وطن عزیز کی مٹی چھوتے

ہی میرے دل کا کوئی ٹکٹھنہ دیکھ واپس ہو گیا تھا۔ اپنے ملک کی فضا میں سانس لینا خاصا خوشگوار تجربہ ہو رہا تھا جس سے طبیعت میں ایک عجیب سی گدگدی کا احساس ہوتا تھا۔ میں ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان لوٹا تھا اور طویل عرصے تک قیام کا ارادہ نہ کرتا تھا۔ آگے جو خدا کی مرضی!

تھوڑی دیر کی ہی خوشی کے بعد آفیسر پھر سنجیدہ ہو گیا ”مسٹر مراد! تم ڈھاکہ میں کس کے رہنے والے ہو؟“

میں نے ایک محلے کا نام لے دیا جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دراصل سنگاپور میں ہمارے اسٹور پر کام کرنے والے ایک ملازم کا تعلق ڈھاکہ کے اسی محلے سے تھا اس لیے محلے کا نام مجھے یاد رہ گیا تھا جو اس وقت کام آگیا۔

میرے جواب نے آفیسر کو قدرے مطمئن کر دیا مگر وہ سوال کرنے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ اس نے دھنوک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اور تمہاری ساتھی یہ گوگلنگی لڑکی کلثوم؟“

”یہ میری محلے دار ہے، یعنی بڑوسی۔“ میں نے بتایا۔

”تم لوگوں نے بنگلہ دیش ہی میں کسین پناہ کیوں نہیں تلاش کی۔“ آفیسر بال کی کھال اتارنے پر کمر بستہ تھا ”پہلے انڈیا اور پھر پاکستان کا رخ کیوں کیا؟“

میں نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ گزشتہ رات ہم ”بی ایس ایف“ والوں کے ہتھے نہیں چڑھ گئے تھے ورنہ وہ ہمارا حشر خراب کر دیتے۔ ”بی ایس ایف“ یعنی بارڈر سیکورٹی فورس بھارت کے سرحدی محافظوں پر مشتمل ایک ادارہ ہے۔ جس طرح پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت ”ریجنز“ والے کرتے ہیں بالکل اسی طرح بھارت کی سرحدوں کی حفاظت ”بی ایس ایف“ والے کرتے ہیں۔ ہم برٹش کی رہبری میں ”بی ایس ایف“ والوں کی نظروں میں آئے بغیر رات کے اندھیرے میں خاموشی سے ریگستان کا وہ علاقہ عبور کر آئے تھے جو دونوں ملکوں کی سرحدوں کے درمیان واقع ہے۔ البتہ پاکستان میں اپنے پہلے پڑاؤ پر ہی یہاں کے سرحدی محافظ ہمارے سروں پر برکتاں پہنتے تھے اور اب ایک آفیسر مجھ سے، گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوالات کر رہا تھا۔

میں نے آفیسر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”جناب! جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ بس یوں سمجھیں ہم بھی پریشانی میں انڈیا کا رخ کر بیٹھے اور ایک طویل سفر طے کر کے اب یہاں پہنچ گئے ہیں۔“

میں نے اپنے لمبے میں درد اور غم کی کیفیت کو سمودیا تھا جس سے آفیسر خاصا متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا ”تم نے بتایا ہے کہ مسلم کش فسادات کے باعث تم لوگوں کو وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ آج کل پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی فضا خاصی گرم ہے۔ تم دونوں کو اس سلسلے میں کاپی پریشانیوں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہارا تمام تر سفر غیر قانونی ہے؟“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آفیسر۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”آج کل واقعی انڈیا میں مسلمان دشمنی خاصی عروج پر ہے مگر ہم نے اس آگ سے بچنے کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔“

”کیسا انتظام مراد؟“ آفیسر نے پوچھا۔

میں نے بتایا ”ہم نے اپنے نام ہندوانہ رکھ چھوڑے تھے۔ میں ونو اور کلثوم آشاہن کی تھی چنانچہ ہمیں مسلم دشمنی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“

”تم تو خامسے چلتا پڑھ قسم کے بندے ہو مسٹر مراد۔“ آفیسر نے مجھے گھورا۔

اس موقع پر پنڈت کشوری لال خاموش نہ رہ سکا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ”چلتا پڑھ قسم کے نہیں بلکہ یہ پکا راکش ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں والا نام اور پاکستان میں مسلمانوں والا نام مجھے اگر معلوم ہو نہ۔“

وہ اتنا کہ خاموش ہو گیا اور پریشانی سے سرحدی محافظوں کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ کوئی ایسی بات کہنے جا رہا تھا جو اسے مزید بھسانے والی ہوتی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہر برس لے اسے ہمارے بارے میں تفصیلات بتا دیتا تھا۔ تاہم میں نے ابھی تک کھیا دھرم چند کا رتھ کشوری لال کو نہیں دکھایا تھا۔ البتہ وہ اس دفعے کی، میرے پاس موجودگی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو ہمارے درمیان رقم کے بارے میں مختصر گفتگو ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی، دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ ہماری بات احموری رہ گئی تھی۔

آفیسر نے پنڈت کی جانب مڑتے ہوئے کہا ”اگر تمہیں معلوم ہو تاکہ مراد اتنا زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے تو تم اسے اپنے یہاں گھبرانے کا رسک نہیں لیتے۔ یہی کتنا چارہ رہے ہو نام؟“

پنڈت کشوری لال معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ آفیسر کے سوال کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اچانک بے

حد محتاط نظر آنے لگا تھا۔

آفیسر نے اپنے ماتحت سے کہا ”تم باہر سے باقی جوانوں کو بھی اندر بلا لاؤ اور اس گھر کے چپے چپے کی تلاشی لو۔“

آفیسر کی بات سے پتا چلا کہ سرحدی محافظوں کے کچھ ساتھی باہر گلی میں موجود تھے پھر باتوں ہی باتوں میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ باہر گلی کے کونے پر ان کی بیپ کھڑی تھی جس میں مزید تین مسلح افراد بیٹھے تھے۔

اگلے چند لمحوں میں وہ کانٹیل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر آگیا۔ تیسرا شاید ڈرائیور تھا جو بیپ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ تینوں مسلح سرحدی محافظ پنڈت کشوری لال کے گھر کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔

میں نے آفیسر سے پوچھا ”ہمارے لیے کیا حکم ہے آفیسر؟“

”تم ہمارے ساتھ بیڈ کوارٹر چلو گے۔“ اچانک اس کے لمبے میں سختی آگئی ”لیکن اس سے پہلے تم دونوں کی عمل تلاشی ہوگی۔“

”تلاشی!“ میں نے متذبذب نظر سے آفیسر کو دیکھا۔

”ہاں، جامہ تلاشی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا، پھر پوچھا ”تم لوگوں کا سامان وغیرہ کہاں ہے؟ پہلے سامان چیک کر اؤ پھر جامہ تلاشی ہوگی۔“

جامہ تلاشی کے ذکر پر بے اختیار میرا ہاتھ اپنی گردن پر چلا گیا پھر اس وقت میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ ٹینکری کا دیا ہوا تحفہ دھنوکا مالا میری گردن پر موجود نہیں تھی۔ میرا داغ گھوم کر رہ گیا۔ کل رات سے اب تک مجھے اس مالا کا خیال نہیں آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سوئی گام نامی گاؤں سے رخصت ہوتے وقت وہ مالا میری گردن پر موجود تھی۔

ہمارے لیے گزشتہ رات کا دشوار گزار اور تکلیف دہ سفر کسی بھیجانک خواب کے مانند تھا۔ اس دوران میں ہمیں اپنا خیال تک نہیں رہا تھا، مالا کی طرف دھیان کیسے جاتا۔ اب دھیان گیا تھا تو مالا میرے جسم پر سے غائب تھی۔ میں نے اضطرابی انداز میں اپنے پورے جسم کو ٹٹول ڈالا مگر مالا کی کوئی خبر نہ ملی۔ مجھے ایک لمحے میں یقین ہو گیا کہ وہ نادر الوجود مالا مجھ سے بچھڑ چکی ہے۔ میرے دل سے ایک آہ سی خارج ہوئی۔ مالا سے جدائی مجھے ایک بے نام سی کک میں جھلا کر گئی تھی۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔

یہ غنیمت تھا کہ آفیسر اس وقت میری جانب متوجہ نہیں

تھا۔ وہ ہمارے سامان کے بارے میں سوال کر کے کمرے میں متلاشی نظر سے اس سامان کو ڈھونڈنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے اندرونی جذبات اور چہرے پر ابھرتے والے تاثرات پر قابو پایا، مبادا آفسیر میری حالت دیکھ کر کسی شک میں مبتلا ہو جائے۔

میرا ذہن مسلسل مالا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نیگی کی سے ہونے والی آخری ملاقات کی ایک ایک تفصیل مجھے یاد تھی۔ مالا کی شہدگی کے بعد میرے تصور کے پردے پر نیگی کی ایک ایک بات، ایک ایک جملہ روشن ہو رہا تھا۔ مہاپوگی گوتم بھوش اور اس کے چیلے پنڈت دھیراج کو شرمناک شکست دینے کے بعد میں نے انہیں عبرت ناک موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ گوپو کی بدھ عبادت گاہ سے واپسی کے سفر میں ہم مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ”لمبین“ نامی قصبے میں بھی رکے تھے۔ اس قصبے کو گوتم بدھ یعنی لارڈ بدھا کی جنم بھومی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

لمبین میں نیگی نے مجھ سے آخری بات چیت کی تھی۔ وہ یک طرفہ گفتگو تھی۔ نیگی خاموش لبوں سے بول رہی تھی اور میں ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کی بدھ آواز سن رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد ملاقات تھی۔ اسی ملاقات کے دوران میں نیگی نے مجھ کو مالا دو بار دوسری دی تھی۔ میں اپنی غفلت میں گوتم بھوش سے مقابلہ کرتے ہوئے اس مالا کو گوپو کی قدیم عبادت گاہ میں پھنسا دیا تھا۔ ایک موقع پر میں نے یہ مالا پہنچ کر گوتم بھوش پر دے ماری تھی۔

نیگی نے یہ مالا اپنی مخروطی اظہار سے میری گردن میں پہنائے ہوئے کہا تھا ”وجدان! یہ مالا تمہیں میری یاد دلائی رہے گی۔ کبھی ملے کو دل چاہے تو اس کا بڑا پتھر منہ میں ڈال کر چوس لینا۔ ویسے میں تمہارے آس پاس ہی رہوں گی۔ تم اپنا چاپ مکمل کرلو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوجاؤں گی۔“ پھر وہ میری پیشانی پر ایک کیف اور بوسہ ثبت کر کے ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

پھر میرا ذہن نیگی کی یاد میں کچھ اور پیچھے چلا گیا۔ بدھ کی قدیم عبادت گاہ گوپو میں بھی اس نے میری ساعت میں ایک سرکاری سرکوش کی تھی ”وجدان“ تم نے گوتم بھوش جیسے شیطان کو ختم کر کے مجھ پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ تمہاری نیت کے خلوص نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے، میں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔ تمہارے دشمن زہریا ہوں گے اور فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی لیکن۔“

وہ اچانک خاموش ہو گئی تو میں نے مضطرب انداز میں پوچھا ”لیکن کیا نیگی؟“

اس نے بو خجل آواز میں جواب دیا تھا ”لیکن تمہاری نیت کی معمولی سی کھوٹ بھی تم سے یہ سب کچھ چھین لے گی اور میں جانتی ہوں۔ کبھی نہ کبھی یہی ایسا موقع ضرور آئے گا جب شیطانی قوتیں پھر تم پر حملہ آور ہوں گی اور تمہارے قدم لڑکھڑائے لگیں گے۔ میں تمہاری ثابت قدمی کے لیے دعا کرتی ہوں لیکن یہ سب کچھ بہر حال تمہارے ہی اختیار میں ہوگا۔ میں پھر تم سے یہی کہوں گی کہ تم اپنا چاپ مکمل کرلو۔ میں تمہاری کینزین کرپیش کے لیے محفوظ ہوجاؤں گی۔“

میں نیگی کے حسین اور دل نشیں تصور میں گھرایا ہوا تھا کہ آفسیر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ایک دیوار کی جانب اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا ”کیا وہ بیگ تمہارا ہی ہے؟“

میں نے آفسیر کے اشارے کا تعاقب کیا۔ اس نے بالکل درست بیگ کی نشان دہی کی تھی۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا وہ سفید بیگ ہماری تھا جس میں روزمرہ کی چیزوں کے علاوہ ہمارے کپڑے تھے۔ بیگ میں قابل اعتراض کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

میں نے آفسیر کے سوال کا مثبت جواب دیا ”ہاں“ یہ بیگ ہمارا ہی ہے۔“

دس منٹ تک وہ بڑے ماہرانہ انداز میں ہمارے بیگ کی تلاشی لیتا رہا پھر ہماری جانب بڑھتے ہوئے بولا ”اب تم دونوں باری باری جامہ تلاشی دو۔“

میں نے کہا ”آفسیر! میں مرد ہوں۔ تم بخوشی میری تلاشی لے لو لیکن میری ساتھی کلثوم ایک لڑکی ہے۔ اس کی جانب تلاشی کے لیے اگر کسی لیدی سرچر کا انتظام ہو جائے تو۔۔۔“

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا ”اس کی ضرورت نہیں۔“

”تو؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے کہا ”تو یہ کہ تمہاری ساتھی اپنے لباس کی تمام جیبیں الٹ کر دکھا دے۔ میں مطمئن ہوجاؤں گا۔“

آفسیر کی تجویز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک معتقل اور شریف النفس انسان تھا۔ میرے اشارے پر دھونے پہلے اپنی اپنی شرٹ کی منہی سی اکٹوتی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے الٹ دیا۔ یعنی جیب کے کپڑے کو باہر نکال کر الٹا دیا۔ وہ جیب بالکل خالی تھی۔ آفسیر نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

دھونے جو جینز پہن رکھی تھی اس کی جیبوں میں بھی

قابل گرفت چیز کوئی نہیں تھی۔ تاہم آفسیر کی تسلی کے لیے انہیں الٹا کر دکھانا ضروری تھا۔ جب دھونے نے یہ ”کوشش“ کی تو نیگی کی تکلیف نے اسے باقاعدہ کرانے پر مجبور کر دیا۔

”اس کے پاؤں میں کیا ہوا ہے؟“ آفسیر نے پوچھا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دھونے کے تختے پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا پھر کہا ”آپ لوگوں کی آمد سے کوئی ادھکا گھٹنا پہلے اس گاؤں کا حکیم کلثوم کے تختے کی موبج نکال کر گیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ چند روز تک اسے درد برداشت کرنا ہوگا۔“

دھونے کے جو گرز بھی اتروائے گئے اور موزوں تک کو الٹ کر دیکھ لیا لیکن کوئی ایسی چیز آفسیر کے ہاتھ نہ لگی جو ہمارے لیے پریشانی کھڑی کرتی۔

دھونے کی تلاشی کے بعد آفسیر مطمئن ہو کر میری جانب بڑھا۔ میرے لباس میں بھی ایسی کوئی شے نہیں تھی جسے قابل اعتراض کہا جاتا۔ البتہ دھرم چند کا دیا ہوا رقعہ آفسیر کو کسی شک میں ڈال سکتا تھا مگر میں اس رقعے کے حوالے سے اٹھنے والے تمام سوالات کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا اس لیے فکر مند کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم ٹھاکر بھانوت کی ہدایت اور مشورے کے مطابق اپنے ساتھ ایسی کوئی بھی شے لے کر نہیں آئے تھے جو کسی نازک موقع پر ہماری جان کا وبال بن جاتی۔

پہلے میرے جو گرز چیک کیے گئے اور اب آفسیر جامہ تلاشی لیتے ہوئے میرے بدن کو بھی ٹٹول رہا تھا۔ جب اس کے فولادی ہاتھ میری گردن پر پیچھے تو ایک مرتبہ پھر مجھے نیگی کی مالا کا خیال آ گیا۔ مالا کا زیاں میں کسی بھی طور پھیل نہیں سکتا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ مالا ریگستان کے کسی مقام پر میری گردن سے جدا ہو گئی تھی، خاص طور پر اس وقت جب فائرننگ کی آواز سن کر ہم اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم کیا! ہمارے اونٹ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

فائرننگ سرحدی محافظوں کی ایک جیب سے کی جا رہی تھی جن کا علاقہ کسی اسٹاک باری سے نکلا ہوا گیا تھا۔ جب پرکلی لائٹ مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ نکل رہی تھی جس کی آواز سے ہمارے اونٹ بدک گئے تھے پھر جب دھونے اپنے اونٹ سے پیچ کر گئی تو میں نے بھی اپنے اونٹ سے چھلانگ لگا دی تھی۔ ہم اپنی جان بچانے کے لیے ریت کے اوپے نیچے نیلوں میں گر پڑے آگے بڑھ رہے تھے ہریش اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنے اونٹ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ریت کے نیلوں میں اٹھنے لڑھکنے کے دوران میں وہ قیمتی مالا کسی طرح میری گردن سے نکل گئی تھی جس کا حصول اب تقریباً ناممکنات میں تھا۔ میں واپس ریگستان کے اس خطرناک حصے میں جاسکتا تھا اور نہ ہی وہ مالا از خود اڑ کر میری گردن تک پہنچ سکتی تھی البتہ نیگی کی سے کچھ بھی بعد نہیں تھا مگر میں اس وقت پیش آمدہ صورت حال سے برسرِ بیکار تھا۔ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں ایک جگہ تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ آفسیر کے سوالیہ جملے نے مجھے خیالات کی گہری سے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک کانڈ میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھ رہا تھا ”اس کانڈ پر ہندی زبان میں کیا لکھا ہوا ہے؟“

میں نے چونک کر آفسیر کے ہاتھ میں دبے اس کانڈ کو دیکھا۔ وہ پنڈت کشوری لال کے نام دھرم چند لکھا ہوا ہوا ہی رقعہ تھا جس کے مطابق پنڈت نے مجھے پچاس ہزار روپے دینا تھے۔ آفسیر وہ رقعہ میرے لباس سے برآمد کر چکا تھا۔

میں نے کہا ”آفسیر! میں تھیں پچاس ہزار روپے کے انڈیا کے سرحدی گاؤں سوئی گام کے لکھا دھرم چند نے ہمیں ادھر پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ یہ اسی کا دیا ہوا خط ہے۔ اس کے مطابق پنڈت کشوری لال ہمیں بحفاظت کراچی تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔“

میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا ذکر دانستہ گول کر دیا تھا۔ آفسیر غالباً ہندی تحریر کو پڑھنے سے قاصر تھا۔ وہ ناواقفیت کے انداز میں اس رقعے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد وہ رقعہ پنڈت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کشوری لال! اسے تم ہی پڑھ کر سناؤ۔“

کشوری لال نے بچپانے میں لے لیا۔ اس کے گریز آمیز انداز کو دیکھتے ہوئے رنجیز آفسیر نے کہا ”گھبراؤ نہیں، یہ کوئی زہریلا ساپ نہیں بلکہ کانڈ کا ایک ٹکڑا ہے جو تھیں ذرا سی بھی گزند نہیں پہنچائے گا۔“ پنڈت نے سسے ہوئے لہجے میں کہا ”میرے لیے تو کانڈ کا یہ پڑہ کسی خطرناک ناگ سے کم نہیں مہاراج۔“

”ہاں“ تم صحیح کہتے ہو۔“ آفسیر نے کہا ”اس رقعے کی تحریر تمہارے گالے کر تو توں کا تین ثبوت پیش کرے گی۔ واقعی یہ کانڈ تمہارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہونے والا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”لیکن پنڈت! کسی ہیرا پھیری کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ ایک ایک لفظ ٹھیک ٹھاک پڑھنا۔“

میں نے ہندوستان میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا جس کی وجہ سے میں ہندی رسم الخیا کو اچھی طرح پڑھنے، سمجھنے اور لکھنے لگا تھا۔ بول چال میں تو ہندی بڑی حد تک اردو کے مماثل ہے اس لیے مجھے بولنے اور سمجھنے میں کبھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کے تحت ہندی کے غیب الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔

کہتے ہیں، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایسا کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وقت پڑنے پر انسان مشکل سے مشکل کام بھی سیکھ ہی جاتا ہے۔ جو لوگ بچے ان پڑھ ہوتے ہیں، قسمت کی یاد دہی جب انہیں یورپ یا امریکا کے کسی ایسے ملک میں سیٹ کر دی جاتی ہے جہاں انگلش بولی جاتی ہو تو وہ قہورے ہی عرصے میں فر فرانگریزی بولنے لگتے ہیں۔

ہندوستانی لال نے وہ رقعہ پڑھ کر سنا۔ تاہم یہاں اس کی سازشاندہ ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ رقم کے معاملے میں ڈنڈی مار گیا تھا۔ میں نے تو کسی مصلحت کی بنا پر پچاس ہزار روپے کا ذکر نہیں کیا تھا مگر ہندو کی عیاری آمیز بے ایمانی پر میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

”ہندو! تم نے آفسر کی تنبیہ کو نظر انداز کر کے اپنے لیے گڑھا کھودا ہے۔“ میں نے کشوری لال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تک... کیوں۔“ وہ کلت زدہ لہجے میں بولا ”مم... میں نے ایسا کیا ہے؟“

میں نے تمہیں انداز میں کہا ”تم نے رقعے کے چند نہایت اہم مندرجات کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ یاد ہے آفسر نے اس سلسلے میں تمہیں وارننگ بھی دی تھی!“

میرے انکشاف پر آفسر نے نفرت آمیز نظر سے ہندو کشوری لال کو گھورا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہمارا ہندو ہندو پنڈت نے کہاں گڑبگڑ ہے؟“

میں نے اسے اصل بات سے آگاہ کر دیا۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھیل کر مجھے دیکھا اور کہا

”کیا تم ہندی تحریر پڑھ لیتے ہو؟“

میں نے مصلحت کے تقاضے کے پیش نظر نفی میں گردن ہلا دی ورنہ مجھے اندیشا کا کوئی خفیہ ایجنٹ بھی سمجھا جاسکتا تھا

جبکہ میں اب تک کے اپنے بیان میں خود کو بنگلہ دیش کا باشندہ ظاہر کر چکا تھا۔

آفسر نے سوال کیا ”پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ خط میں پچاس ہزار روپے پاکستانی کرنسی کا ذکر موجود ہے۔“

”سیدھی سی بات ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا

”دھرم چند نے یہ رقعہ میرے حوالے کرتے ہوئے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ چونکہ زبان کے دھنی ہوتے ہیں اس لیے میں نے دھرم چند کی بات کا اعتبار کر لیا لیکن۔“ میں نے ذرا توقف دے کر ہندو کو گھورا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”لیکن ہندو کی نازہ ترین چال کی کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس ”شعبے“ میں اس جیسی چیز کالی بھیریں بھی ہوتی ہیں۔“

میرے ہمراہی پر آنسوؤں کی رنگت کا مالک ہندو کشوری لال چیخ و ماب کھا کر رہ گیا۔ پچاس ہزار روپے کے ذکر پر آفسر خاصا چونکا اور محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے ہم سب کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے تمحیص لہجے میں کہا۔

”تم ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلو گے۔“

ہندو نے ہاتھ جوڑ کر باقاعدہ منت سماجت شروع کر دی مگر آفسر نے اس کی ایک نہ سنی اور حتی انداز میں کہا ”تمہیں جو بھی روکنا گا اور چھینا چلاتا ہے وہ ہیڈ کوارٹر میں جا کر شوق پورا کر لینا۔“

میں نے مقتدل لہجے میں آفسر سے پوچھا ”تم ہمیں کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟“

”میں تم دونوں کو اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”مگر میں نے تو تمہارے تمام سوالوں کے جواب دیے رہے ہیں۔“ میں نے قدرے برہم لہجے میں کہا۔

”اب تمہیں مزید جو کچھ بھی کہنا ہو“ اعلیٰ افسر کے ردیو کنا۔ ”وہ دو ٹوک انداز میں ہاتھ لراتے ہوئے بولا۔

”مگر تم۔“ میں نے کچھ کنا چاہا۔

”تو آکر مونس۔“ اس نے سختی سے میری بات کاٹ دی۔

میں جھنجھلا کر خاموش ہو گیا۔ ہندو کی عیاری سے میں خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا وہ آخر ہو کر رہی تھی۔ آفسر اپنی بڑی رقم کے ذکر پر محتاط ہو گیا تھا۔

بہر حال مجھ سے ایک غلطی ہو چکی تھی جس کی کسی موقع پر خوب صورتی سے تلافی کی ضرورت تھی۔ فی الحال آفسر سے بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔

اسی وقت خانہ تلاش لینے والے واپس آگئے۔ وہ خالی ہاتھ اور مایوس چہروں کے ساتھ ہندو کے گھر کے اندر دبی

حصے سے برآمد ہوئے تھے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان کے ہاتھ کوئی قابل اعتراض شے نہیں مل سکی تھی۔

ہندو کشوری لال واقعی ایک عیار اور چال باز شخص

تھا۔ اس نے اسمگلنگ کے مال کو گھر سے دور رکھا تھا۔ علی الصبح جب ہم گھر پہنچے تو برہمن کے ساتھ اس ہستی میں پہنچے تھے تو برہمن نے ہر شخص کو اونٹوں سے ”مال“ اتروانے کا حکم دیا تھا۔ اسمگلنگ کا وہ مال یقیناً کسی دوسرے محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا۔

”سر! ہم نے اس مکان کا کونا کونا اور چپا چپا دیکھ لیا ہے۔“ اس کا نشیل نے بتایا جو آفسر کے ساتھ ہی ہمارے سروں پر نازل ہوا تھا۔

میں اس سرحدی محافظ کا ذکر کا نشیل کے طور پر کر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نیم عسکری فورس یعنی ”ریجنلرز“ میں وہ کس عہدے پر فائز تھا البتہ پولیس میں اس حیثیت کے شخص کو کا نشیل اور آری میں سپاہی یعنی سوئزر کہا جاتا ہے۔

آفسر نے سخت لہجے میں دریافت کیا ”تو پھر؟“

کا نشیل نے کہا ”سر! ہمیں کوئی بھی قابل گرفت چیز نہیں ملی۔“

اس موقع پر ہندو کشوری لال چلایا ”ہمارا ج! دیکھ لیا آپ نے میں نے تو آپ کو بتایا تھا کہ میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ اسمگلنگ کے دھندے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔“ پھر وہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”اس بندے کے سلسلے میں مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے وہ آپ معاف کر دیں۔ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔“

آفسر نے ہندو کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا ”ان تینوں کو لے جا کر جپ میں بٹھاؤ۔ ہری اپ!“

حکم حاکم مرگ مفاجات۔ ہمیں گٹوں کے نشانے پر رکھتے ہوئے جپ میں سوار کروایا گیا جو کھلی کے سرے پر کھڑی تھی۔ جپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر ریجنلرز کا ایک جوان بالکل مستعد بیٹھا تھا۔ آفسر نے ریجنلرز سے ہاتھ جوڑ کر اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے جپ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکی تھی۔

میری معلومات کے مطابق ہماری منزل ریجنلرز کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ وہو خاص سہمی ہوئی تھی۔ اب تک اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ خاص طور پر جب سے میں نے اسے گونگا ظاہر کیا تھا، گلتا تھا وہ واقعی گونگ ہو چکی ہو۔

ہمیں جپ میں اگلے سرے پر بٹھایا گیا تھا یعنی ڈرائیونگ کیبن کے عین پیچھے۔ تینوں ریجنلرز کے جوان ہمارے بعد بیٹھے تھے یہ آئے سامنے کی دو سیٹیں تھیں۔ ایک سیٹ پر ”دھو“ میں اور ایک کا نشیل بیٹھا تھا جبکہ سامنے

والی نشست پر ہندو کشوری لال کے بعد دو کا نشیل موجود تھے۔ ہم سب اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ میرے عین سامنے وہ کا نشیل تھا جو آفسر کے ساتھ سب سے پہلے ہندو کے گھر پہنچا تھا۔ ہمارے سامن والا ایک جپ کے فرش پر رکھا تھا تاہم اس پر سرحدی محافظوں کی کا بندوق تھی۔

میں نے وقت گزاری اور اپنی معلومات کی خاطر اپنے دوہو بیٹھے کا نشیل سے بات چیت شروع کر دی۔

”بھائی! یہ تو بتاؤ، تم لوگوں کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے کتنا دور ہے؟“

میرا سوال بہت عام سا اور بر محل تھا اس لیے اس نے جواب دینے میں کوئی تردد نہیں کیا ”بھولا“ ”زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم چند رہ میں منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔“

میں نے پوچھا ”تمہارا جو آفسر جپ کی ریجنلرز سیٹ پر بیٹھا ہے اس کا عہدہ کیا ہے؟“

”وہ صوبے دار صاحب ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور تم لوگوں کا اعلیٰ افسر کون ہے؟“

”کپتان صاحب رحیم صاحب۔“

”کپتان صاحب کس قسم کے آدمی ہیں؟“

اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور کہا ”تم اپنی زبان ہندی رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔“

میں نے اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے کا نشیل کی ایک ”خفیہ حرکت“ کو نوٹ کر لیا تھا۔ مذکورہ کا نشیل نے مجھ سے بات کرنے والے کا نشیل کی پسیوں میں اپنی کہنی سے ٹوکا دیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھ سے زیادہ ”فزی“

ہونے کی ضرورت نہیں۔

میں نے بہت حد تک ہاری اور اپنے سامنے والے کا نشیل کو مخاطب کرتے ہوئے حاجت آمیز انداز میں کہا ”اچھا بھائی، بس ایک بات بتا دو۔ ہیڈ کوارٹر کے ذکر پر ہندو کشوری لال کا تپائی کیوں ہو گیا تھا۔ کیا وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور ڈراؤنی جگہ ہے؟“

جواب دینے کے بجائے کا نشیل نے مجھے بری طرح جھڑک دیا ”کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟“

”سنی ہے جناب۔“ میں تنجیدی سے بولا۔

”تو پھر اسے وہیان میں رکھو۔“ دوسرے کا نشیل نے دھمکی آمیز انداز میں کہا ”اگر اب تم نے کوئی سوال کیا تو تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔“

میں اپنے ساتھ کسی برے سلوک کی خواہش نہیں رکھتا تھا اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دھونو گونگ بنی

ہی ہوئی تھی، ناچار میں بھی گونگا بن گیا۔ یہ گونگوں کی ایک ایسی جڑی تھی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی تھی۔ اتنے خاصے ہتے بولتے، تھکے اٹھاتے دو انسانوں کو وقت کے جبر اور حالات کی مصلحت نے گونگا بن کر چپ بیٹھے پر مجبور کر دیا تھا۔

کانٹھیل کی فراہم کردہ معلومات کے بالکلس پندرہ بیس منٹ کے بجائے ہماری جیب ریت اڑاتی لگ بھگ آدھے گھنٹے میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔

ریجنرڈ کا ہیڈ کوارٹر ایک متروک حویلی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ اب کھنڈر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ بس دو تین کمرے استعمال کے قابل تھے جنہیں ریجنرڈ والوں نے ٹھیک ٹھاک کر کے اپنی چوکی قائم کر رکھی تھی۔ دراصل اسی چوکی کو ہیڈ کوارٹر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

ہمیں ایک کمرے میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ وہ ایک عام سا کمرہ تھا جس میں ایک میز کے سامنے چند آہنی کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک آہنی بیچ بھی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دفتری ضروریات سے زیادہ اٹھتے بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہم پر کڑی نظر رکھنے کے لیے ایک مسلح جوان کمرے کے دروازے میں امین بن کھڑا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد مجھے اس صوبے دار کی شکل دکھائی دی جو صبح پڑت کے گھر پہنچا تھا اور ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر مجھ سے کہا ”پکٹان صاحب! آپ دونوں کو یاد کر رہے ہیں۔“

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا ”پڈت کا کیا ہوا؟“

”پڈت کو بھول جاؤ۔“ وہ کھرت انداز میں بولا۔

”پھر بھی۔“

میں نے پڈت کشوری لال کے بارے میں جانتا جا ہا مگر صوبے دار نے میری بات کانٹے ہوئے کہا ”تمہیں صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پڈت کے ساتھ ہم اس کے ”شایان شان“ ہی سلوک کریں گے عکرم تم نے اگر پکٹان صاحب کے سامنے اپنی دروغ گوئی جاری رکھی تو سمجھ لو تمہارا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا۔“

صوبے دار کی دھمکی آمیز گفتگو سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ کھیل گڑبگڑا ہے۔ صوبے دار نے میری دروغ گوئی کا حوالہ دے کر مجھے یہ باور کرائے کی کوشش کی تھی کہ اس نے میری کہانی کو یقین کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے دھوکا اشارہ کیا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر

ہم صوبے دار کی معیت میں چلتے ہوئے اس کمرے سامنے پہنچے جس کے اندر پکٹان صاحب رجم ہو چکے تھے۔ صوبے دار نے کمرے کے دروازے پر مخصوص میں دستک دی اور ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کر دیا۔ ہم نے صوبے دار صاحب کے اشارے کی تعمیل کر کے صوبے دار کے عتب میں داخل ہوئے، ہی ہمارے عقب میں دو بند ہو گیا۔ یقیناً دروازہ صوبے دار نے بند کیا تھا۔ ہم نے صوبے دار رجم کی جانب متوجہ ہو گئے۔

پکٹان صاحب کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ نہایت متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرہ زبان اور تجربہ جھلکتا تھا۔ پکٹان کی کینٹیوں کے بال ہر ہونچے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک جہاں دیدہ، بردبار اور اپنے شے کا باہر دکھائی دیتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

پکٹان صاحب رجم کے اشارے پر ہم اس کی میز سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے اپنی میز پر چیزوں کی ترتیب بدلتا رہا پھر ہماری جانب دیکھتے ہوئے دو لمبے میں گویا۔

”تم لوگوں نے اپنے نام مراد اور کلثوم ہی بتائے؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا ”جی پکٹان صاحب۔“ وہ بڑے شفقانہ انداز میں بتانے لگا ”مسٹر مراد! رات سرحد کے اس بار ریگستان میں اسمگلروں کی ایک سے ہماری مذہبیز ہو گئی تھی۔“ وہ کچھ اس انداز میں بول رہا تھا جیسے ہم اس کے برائے شناسا ہوں۔ اپنی بات کو یاد رکھتے ہوئے اس نے کہا ”ہم نے اپنی جیب سے ان پر فائدہ کی تھی۔ لائٹ مشین گن سے برسنے والی گولیوں نے اسمگلروں کو وہیں ریت پر اس طرح ڈھیر کر دیا کہ ان کے سے آواز تک نہ نکل سکی۔“ ایک لمحے کے توقف سے نے اضافہ کیا ”یہ ایل ایم جی کی گولیاں اتنی ہی سفاک ہیں۔“

ہم خاموشی سے پکٹان صاحب رجم کو دیکھ رہے تھے دھوکا تو خاموش رہنے پر مجبور تھی کہ اسے گونگا ظاہر کیا، مگر میں بھی چپ چاپ بیٹھا پکٹان کو سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ”برخوردار! میں نے جس اسمگلر پائی کیا ہے وہ چار افراد پر مشتمل تھی۔ ان چاروں نے ہمارے جوانوں پر جوانی فائرنگ بھی کی تھی لیکن خدا کا شکر ہمارے جوانوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔“

اسمگلروں کے دو ساتھی ہماری فائرنگ سے موت کے گھاٹ اڑ گئے اور باقی دو۔“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے ہمیں دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے توقع ہو کہ میں فوراً بول آؤں گا لیکن میں نے اس کی توقع کے خلاف زبان سے ایک انھوں گا لیکن میں نے اپنے اندرونی جتنوں کو اس پر ظاہر نہیں کیا۔

”وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی دو میں سے۔“ وہ ایک بندی ابھی تک ہمارے ہتھے بولا۔

”یعنی ایک بندہ اور ایک بندی ابھی تک ہمارے ہتھے نہیں جا رہے۔“

اتنا کہ کروہ ثلوثی ہوئی نظر سے ایک مرتبہ پھر باری باری ہمارے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ دھوکا ”گوئی“ تھی۔ میں بھی ”گوئی“ بنا بیٹھا رہا۔

پکٹان صاحب رجم نرم آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا ”آج صبح ہمیں اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی کہ دو افراد غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ ان میں ایک مراد اور ایک عورت ہے۔ وہ دونوں پڈت کشوری لال کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ ایک لمحے کو توقف سے پکٹان نے اپنی میز کی دراز کھولی، ایک نظر اندر جھانکا، دراز کو بند کیا پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر بولا۔

”میں نے صوبے دار محمد رمضان کو فوراً پڈت کے گھر کی طرف روانہ کر دیا مگر نتیجہ ہماری توقع کے مطابق برآمد نہ ہوا۔ پڈت کے گھر پر ہم دونوں سے صوبے دار کی ملاقات ہو گئی۔ تم ہمارے مطلوبہ بندے تو نہیں ہو لیکن۔“

پکٹان ہنسنے کو ناہم چھوڑ کر مجھے نکلنے لگا۔ اس موقع پر میں نے بولنا ضروری سمجھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں کہا ”لیکن کیا پکٹان؟“

”لیکن۔“ وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا ”لیکن یہ برخوردار کہ تم دونوں غلط طریقے سے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہو۔ تمہارا یہ جرم نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔“

میں نے بیزار سے کہا ”میں اپنی مجبوری کی وضاحت کر چکا ہوں۔“

”یقیناً۔“ پکٹان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا ”تم سے پوچھ چکے ہیں کہ تم رپورٹ صوبے دار رمضان مجھے دے چکا ہے جس کے مطابق تم نے متعدد جھوٹ بولے ہیں۔ ہم تمہاری کہانی پر کسے یقین کریں گے؟“

”میں نے کون سے جھوٹ بولے ہیں؟“ میں نے

اکھڑے ہوئے لمبے میں کہا۔

”میں بتاتا ہوں کیونکہ یہ جانتا تھا ہمارا حق ہے۔“ پکٹان نے معتدل اور سنجیدہ انداز میں بولنا شروع کیا ”تمہارے بیان کے مطابق تم دونوں بگلہ دیش سے انڈیا اور پھر انڈیا سے پاکستان آئے ہو۔ بگلہ دیش میں مسلم کش فسادات میں تم دونوں کے گھروالے جان ہار گئے تھے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”برخوردار! میں نے بڑی دینا دیکھی ہے۔ پورے پاکستان کے علاوہ دنیا کے چودہ پندرہ ممالک میں مجھے رہنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے بگلہ دیش میں بھی تین سال گزارے ہیں۔“ ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا پھر گہمیر لمبے میں بولا ”تم دونوں کا رنگ و روپ، قد کاٹھ اور صحت و جوانی بگلہ دیش سے لگائیں کھائی پھر ہر ملک اور ہر خطے میں بسنے والوں کے کچھ مخصوص خال و خط ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی تم دونوں میں بنگالیوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میرا مشاہدہ اور علم یہ بتاتا ہے کہ تمہارا تعلق پاکستان یا ہندوستان سے ہے جبکہ تمہاری ساتھی تھائی لینڈ، چائنا یا تبت کی رہنے والی ہے۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟“

سوال کر کے وہ جواب طلب نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ پکٹان نے تو ہمارا ایکسرے کر ڈالا تھا۔ اس کی تجربہ کار نگاہ کی داد دینے کو دل چاہ رہا تھا مگر یہ موقع تفرق کا نہیں تھا۔ پکٹان کے انکشاف نے ہم دونوں کو پریشان کر دیا تھا۔ میں قدرے الجھ گیا۔ دھوکا بھی ہر اسان نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جب ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہ بولا تو پکٹان نے کہا ”مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ تمہارے چہروں کے تاثرات نے مجھے بتا دیا ہے کہ میرا قیاس صد فی صد درست ہے۔“

وہ چند لمحے اپنے دونوں ہاتھوں کو گھورتا رہا پھر دھیمے لمبے میں بولا ”مسٹر مراد! مجھے نہیں یقین کہ تمہارا نام مراد اور تمہاری ساتھی کا نام کلثوم ہے اس سلسلے میں بھی تم نے یقیناً دروغ گوئی سے کام لیا ہو گا۔ جو بچتا ہے، تم دونوں کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور تمہارے نام کیا ہیں۔ پاکستان میں تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟“

بات ختم کرتے کرتے پکٹان کے لمبے میں خاصی خنکی آ گئی تھی۔ اب وہ پہلے والا نرم خور و مرہبان افسر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ بڑی حد تک بچ بول کر ان

سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے کھکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا ”کپتان صاحب! آپ کا اندازہ بڑی حد تک درست ہے۔ میں پیدائشی طور پر پاکستانی ہوں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ سنگاپور میں گزرا ہے۔“ پھر میں نے دھوکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ میری دوست ہے، اس کے آباؤ اجداد کا تعلق تبت سے تھا۔“ اس کے بعد میں نے ناگفتی اور انتہائی ذاتی واقعات کو چھپاتے ہوئے کپتان کو اپنے اور دھوکے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں بعض واقعات پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی تھیں۔ برہنہ حال میں نے اسے ایک خاص حد سے آگے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میری زندگی کی کمائی کا لب لباب یہ تھا کہ میں شرکے خلاف حق کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ میرے اثر انگیز اور جامع بیان نے کپتان کو مطمئن کر دیا۔ اس نے بعض سوالات بھی کیے جن کے میں نے تسلی بخش جواب دیے۔ میں نے کپتان کو اپنے اصل نام بھی بتا دیے تھے۔ ظاہر ہے، دھوکا گھونگا پن، جی جی مجھے ”ختم“ کرنا پڑا تھا۔ میرے انکشاف پر کپتان نے نرمی سے کہا۔

”اس بات کا ہمیں صبح ہی پتا چل گیا تھا۔“

”صبح ہی؟“ میں نے انھیں زدہ نظر سے اے دیکھا۔

وہ زرب لب مسکراتے ہوئے بولا ”ہاں صبح ہی۔ ہمارے مجبر نے ہمیں بتایا تھا کہ زخمی لڑکی نے اپنے ننھے کی موج نکلوانے سے پہلے تم سے اور موج نکلوانے کے بعد حکیم جی سے کیا باتیں کی تھیں۔“

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ کپتان نے بات ہی ایسی کی تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا ”کیا وہی حکیم آپ کے لیے مجری کرتا ہے؟“

جب پنڈت کے گھر میں حکیم دھوکا ٹھنڈا دیکھنے آیا تھا تو اس وقت بینک نما کمرے میں میرے ”دھوکا اور کشوری لال“ کے سوا کوئی اور تھا فرد موجود نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے تو کوئی افکار مرہو نہیں سکتا تھا۔ آجاکر حکیم برہی مان نوٹی تھی پھر کپتان نے دھوکے کی حکیم سے بات چیت کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے سارا شک حکیم کی طرف ہی جاتا تھا۔

کپتان میرا سوال سن کر زرب لب مسکرایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ”تمہارا یہ سوال مجھ تک نہیں پہنچتا۔ تم اپنے طور پر جو بھی نتیجہ اخذ کرلو، تمہیں اس کا حق ہے۔ ماشاء اللہ، تم تو خاصے تجربے کار سیلانی اور مہم جو ہو۔“

کپتان نے بڑے مبہم الفاظ میں میری تعریف کی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی زبان سے حکیم کے تجربے پر اقرار نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اس کا انداز ہی میرے ہر مثبت جواب تھا۔ حکیم کے سوا اور کوئی شخص یہ تجربہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میں نے اپنے مطلب کی طرف کپتان کی توجہ دہانے کے لیے کہا ”اب ہمارے لیے کیا حکیم ہے۔ آپ لوگوں ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”تم دونوں کو مزید دو تین گھنٹے ہماری چوکی پر رکھا۔“ کپتان نے جواب دیا ”حکمہ جاتی ضروری کارروائی بعد آپ کو مقامی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”پولیس کے حوالے کیوں جناب؟“

”ہمارے بعد ان کا کام شروع ہوتا ہے اس لیے۔“

”تو اس کا مطلب ہے، آپ ہم سے مطمئن نہیں ہو؟“

”ایک حد تک مطمئن ہوئے ہیں۔“ کپتان صراحتاً نے مضبوط لہجے میں کہا ”بائی کا اطمینان مقامی پولیس وا کریں گے۔“

میں نے اچھے ہوئے انداز میں کہا ”میں کچھ سمجھاؤ جناب!“

”دیکھو بر خوار۔“ کپتان کا لہجہ پھر شفقانہ ہو گیا ”سرحدی محافظ ہیں۔ ہمارا کام وطن عزیز کی سرحدوں حفاظت کرنا ہے۔ ہم یہ کام نہایت تن دہی اور جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ اپنی ذہنیاتی کے مقام پر ہم بڑی پختہ نظر سرحد کی گراٹی کرتے ہیں۔ ہر قسم کی غیر قانونی نش و عمل آمد و شد کو روکنا ہمارا اولین فریضہ ہے اور اس فریضے کو ادائیگی کے دوران میں جو مجرم ہمارے ہتھے چڑھتے ہیں انہیں ضروری کارروائی کے بعد ہم اپنی رپورٹ کے مقامی پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں اس کے بعد ان کا شروع ہوتا ہے۔ وہ معاملے کی نوعیت اور جرم کی سنگین دیکھتے ہوئے پیش قدمی کرتے ہیں۔ ہمارا دائرہ کار صرف تک ہے۔ ملک دشمن اور قانون شکن حرکات و سکنات والوں کو ہم پکڑتے ہیں پھر انہیں مقامی پولیس والوں کے کر دیا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”ہم نے تو کوئی بھی ملک دشمن حرکت کی۔“

”تم کسی حد تک درست کہہ رہے ہو۔“ کپتان نے تاکید کرتے ہوئے بولا ”لیکن غیر قانونی طور پر کسی بھی

سرحد پار کرنا ایک سنگین جرم ہے چاہے یہ جرم کتنی بھی مجبوری کی حالت میں کیا جائے اس لیے تم دونوں کو پولیس کو فیس کرنا ہوگا۔“

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ایک فوری خیال نے مجھے سکون قلب سے نوازا تھا اور وہ اچھوتا خیال یہ تھا کہ ہمیں مقامی پولیس کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ آپ بھی یہ سوچ رہے ہوں گے کہ پولیس کی کسٹری میں جانے کو میں اچھوتا اور اطمینان بخش خیال کیوں کہہ رہا ہوں؟

دراصل بات یہ ہے کہ میں نے صبح سے دوپہر تک ریجنل والوں کے ساتھ اچھا خاصہ وقت گزارا تھا اور ان کے بارے میں میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان سے کسی قسم کی ساز باز ممکن نہیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم نے سرحد پار کر کے سرحدی قوانین کی پہلی خلاف ورزی کی تھی جو قانون شکنی کے ذمے میں آتی تھی۔ ریجنل والے نہایت ایمان دار اور فرض شناس ثابت ہو رہے تھے۔ میں ایک غیر قانونی حرکت کرنے کے بعد ان سے کسی قسم کی رعایت کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

ہاں البتہ، پولیس کا معاملہ دوسرا تھا۔ میں نے برصغیر پاک و ہند کی پولیس کی بہت ”تعریف“ سن رکھی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے انڈیا پولیس سے توجہ اور گرا واسطہ بھی رہا تھا۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا لہذا اس تناظر میں پولیس والوں کے پاس پہنچنے کے بعد ہمارے لیے آسانیاں پیدا ہونے کی امید کی جاسکتی تھی۔

میں نے کپتان صاحب رحیم سے پوچھا ”پنڈت کشوری لال کہاں گیا؟“

”وہ ہمارے قبضے میں ہے۔“ اس نے بتایا ”گزشتہ رات تمہارے قافلے والوں نے اونٹوں پر جو مال اسمگل کر کے بستی کے داخلی حصے میں واقع حویلی تک پہنچایا ہے، پنڈت نے اس کے بارے میں سب کچھ قبول کر لیا ہے۔ پنڈت کے دونوں آدمی آجے اور پیر بخش بھی ہماری تحویل میں آچکے ہیں البتہ تمہارے قافلے کا سربراہ ہرشن باھتھ سے نکل گیا ہے۔ اسمگلنگ کا مال برآمد کر لیا گیا ہے۔ پنڈت کے بارے میں بھی ایک سنسنی خیز رپورٹ تیار ہو رہی ہے۔ اسے بھی تم دونوں کے ساتھ ہی حوالہ پولیس کیا جائے گا۔“

کپتان کا انکشاف پر از معلومات تھا۔ مجھے اپنی رقم کا خیال آ گیا۔

”کپتان صاحب!“ میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا

”سوئی گام کے کھیا دھرم چند نے مجھے ایک رقعہ دیا تھا۔ جس میں۔“

”ہاں“ وہ رقعہ میں پڑھ چکا ہوں۔“ وہ قطع کلاہی کرتے ہوئے بولا ”صوبے دار محمد رمضان نے سب سے پہلے مجھے وہی خط دکھایا تھا۔ صوبے دار ہندی تحریر نہیں پڑھ سکتا لیکن میں اردو، انگریزی کے علاوہ سندھی، پنجابی، گجراتی اور ہندی زبان بھی بہت اچھی طرح لکھ پڑھ اور بول سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”اگر آپ نے وہ رقعہ پڑھ لیا ہے تو پھر آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ پنڈت نے مجھے پاکستانی کرکٹی میں پیاس ہزار روپے دے دیے ہیں۔“

”ہاں“ میں نے یہ بھی پڑھا ہے، پھر؟“

کپتان نے سواہیہ انداز میں جملہ ختم کیا تھا، میں نے کہا

”آپ یہ تو کہتے ہیں مجھے وہ رقم ہی دلا دیں۔“

”ناممکن!“ وہ قطعیت سے بولا ”ہمارا کام مجرم کو پکڑ کر مقامی پولیس کے حوالے کرنا ہے۔ تم یہ ”فرمائش“ پولیس والوں سے کرنا۔ وہاں پنڈت بھی موجود ہوگا۔ ممکن ہے، تمہارا کام ہو جائے۔ ویسے مجھے اس کی زیادہ امید نہیں ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ کپتان نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا ”ٹھیک ہے“ اب تم دونوں دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے صوبے دار کو بلا کر ہمیں اس کے حوالے کر دیا۔

صوبے دار محمد رمضان نے طنزیہ مسکراہٹ سے دھوکا دیکھا پھر میری جانب بٹکتے ہوئے پوچھا ”مسٹر مراد! کیا تمہاری ساتھی کلثوم ابھی تک گولی ہے یا اس نے بولنا سیکھ لیا ہے؟“ میں اس کے طنز کو سمجھ رہا تھا۔ صوبے دار کو یہ تو معلوم تھا کہ دھوکا تو گولیابی سے محروم نہیں لیکن وہ یہ بات ابھی نہیں جانتا تھا کہ ہم مراد اور کلثوم نہیں بلکہ وجدان اور دھوکا ہیں خیر بہت جلد اسے یہ پتا چلے والا تھا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا ”بھئی صوبے دار صاحب! آپ کے کپتان صاحب تو بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ انہوں نے میری ساتھی کو فر فر بولنا سکھا دیا ہے۔“ پھر میں نے دھوکے کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر کہا ”صوبے دار صاحب کو ذرا بول کر دکھاؤ۔“ دھوکے میرے سارے چل رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے پاؤں پر وزن ڈالنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔

وہ سمجھ گئی کہ میں شرارت کے موڈ میں ہوں۔ وہ کسی تیز رفتار مشین کے مانند اشارت ہو گئی۔ صوبے دار صاحب





یہ ایک لاشعوری کھٹکا تھا جو اب ختم ہو گیا ہے۔ لا رہا دکھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تم ایک مسلمان ہو۔ اب میرے دل میں کوئی خلش نہیں ہے۔

میں حیرت اور تعجب کے طے جلے تاثرات کے ساتھ اس کانچ کی گڑیا کو دیکھ رہا تھا۔ دھوکے چرے کی معصومیت نے اس کی دلکشی اور نظر فریبی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ اٹھارہ انیس سال کی ایک دراز قامت، سڈول جسم والی لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی ہلکی سی سیاہ آنکھیں خاموشی کی زبان بولتی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت نے اس کے حسن میں نازکی بھری تھی۔ اس پر اس کی شوخی، چٹپٹ اور شرارت آمیز آوازوں نے اس کے شاداب بدن کو پتھ لگا دیے تھے۔

میں نے کہا ”دھنو! میں کوئی شش کروں گا کہ تمہارے اعتماد پر پورا اتسکوں لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا“ میرے پاؤں میں بگولے بندھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتا میرا کون سا دن کہاں اور کون سی رات کہاں گزرے گی۔ زندگی مجھ سے ایک کڑا امتحان لے رہی ہے اس لیے تم مجھ سے کوئی بہت بلند امیدیں وابستہ نہ کرنا۔ آخر کو میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔“

”وجدان! میں نے اپنے روحانی پیشوا دلائی لاما کے اقوال کو اپنی روح میں اتارا ہے، دل میں بسایا ہے اور ذہن پر نقش کیا ہے۔“ وہ کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے بولی ”وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ انسان کو اپنے عزم کو بلندی کی انتہا سے زیادہ بلند اور ناممکنات سے زیادہ ممکن رکھنا چاہیے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اسے کامیابی نہ ہو تو انسان کا دل نہیں ٹوٹتا۔ وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں تھا۔“

”تمہارے دلائی لاما نے بڑی گہری بات کی ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”دلائی لاما نے تو تمہارے بارے میں بھی بڑی گہری باتیں کی ہیں وجدان۔ یاد ہے، میرے باپ تھوہی نے تمہیں عبادت گاہ کے تھانے کا راز کیوں بتایا تھا؟ وہ وقت بھی یاد کرو جب میرے ماں باپ کی موت کے بعد دلائی لاما کے پیچھے ہوئے سننے بدھ راہب، بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا چارج سنبھال رہے تھے تو انہوں نے تم سے کیا گفتگو کی تھی؟“

میں دھوکے اشارے بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ بڑے فخر و انبساط کی بات تھی کہ دلائی لاما نے مجھ پر اپنا بھروسہ اور اعتماد ظاہر کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں

تھی۔ یقیناً وہ میرے جوہر سے آشنا تھا۔

دھوکے نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا ”تم نے تو بہنو چھوڑ اور نیپال میں میری ہر قسم کی مدد کی ہے۔ یہ تو تمہارا اپنا کاروبار ہے۔ یہاں تو میں زیادہ محفوظ ہوں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو دھوکے۔“ میں نے کھانے والی چیز کو ایک جانب کھسکاتے ہوئے کہا ”پاکستان میرا اصل وطن ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ تم کپتان کی موجودی میں میری زندگی کی بیشتر کمائی سن چکی ہو۔ جو باتیں میں نے یہاں مجھ پر چھپائی ہیں وہ رفتہ رفتہ تم پر آشکار ہوتی رہیں گی۔“ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی ”میں اپنے والدین کو گود میں جب اس ملک سے گیا تھا تو میری عمر صرف دو ماہ کی تھی۔ والدین کو بڑی کسمپرسی کی حالت میں اپنا ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ اپنے گاؤں رکھا والی سے لاہور شہر پہنچے۔ پھر لاہور سے کراچی اور کراچی سے سکس پور چلے گئے۔ میں بارہ سال ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے بڑی بے دردی سے میرے ماں باپ کو قتل کر دیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن، میں مسلح ایک چکر میں ہوں۔ حالات اور قسمت جہاں لے جائے دوڑا چلا جاتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی پاکستان آنے کی کوشش کی تھی مگر ہمارا جواز ایکٹ میں پھنس گیا اور جواز کو بغیر لینڈنگ کرنا پڑی جس کے باعث میں انڈیا کے وسیع وسیع ریگستان میں چھپ گیا تھا اور اب۔“ میں نے ایک لمحے کو راکریک بو جھل سانس خارج کی اور کہا ”اور اب اپنے گھر کی ورتی پر قدم رکھا ہے تو ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“

دھوکے نے کہا ”وجدان، ہم دونوں کی کمائی میں آٹھ مہاشمت ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی ”ہم دونوں کے والدین کو ہمارے سامنے خاک خون میں لوٹا گیا، بس فرق اتنا سا ہے کہ ان انڈونگ اور دل دوز واقعات کے وقت تمہاری عمر بارہ سال تھی اور میں۔“

اٹھارہ سال کی ہوں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو دھوکے۔“ میرے لیے میں ادا کی

آئی۔ وہ بھی دل گرفتہ نظر آنے لگی۔ دھوکے بھی ماضی قریب کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اس انداز میں بڑی حد تک ایک صدمہ جاگنا ہے گزری تھی۔ وہ میری کیفیت کو ڈالنا چاہتی تھی۔ انداز میں سمجھ اور محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی بات؟ حد تک درست تھی کہ ہم کم و بیش ایک جیسے حالات میں جاتی رہی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک طرح دار حسینہ تھی۔ والدین سے محروم ہونے تھے۔

سمتے ہیں، حالات کی کشیدگی کو زبان کی شکستگی کاٹ دیتی ہے۔ شاید اسی فلسفے کے تحت دھوکے سے چھپ چھا کر کرنے تھی۔ وہ مراٹھا پھیل اور شر تو تھی ہی۔ دو چار شرارت آمیز جھجکوں کے بعد وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”وجدان! ایک بات پوچھوں، صحیح جواب دو گے؟“

”کی سنجیدگی میں مصروف ہیں کی جھٹک کیں نظر نہیں آتی ہی۔ میں نے تمہارے ہونے کے لیے میں کہا ”ہاں پوچھو گیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

اس نے پوچھا ”وجدان! کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

اس کا سوال بہت نازک اور اہم تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا ”ہاں“ میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں سے محبت کی ہے۔“

”میں بہت سے لوگوں کی بات نہیں کر رہی۔“

”میں تمہارے سوال ہی کا جواب دے رہا ہوں۔“

”پھر میں کسوں کی؟“ تم نے میرے سوال کو سمجھا ہی

”تم سمجھانے کی کوشش کرو۔“ میں نے معصومیت سے

آتش فشانی 97 حصہ 7

بعض اوقات تو میں ہجوم مددشاں میں رات و دن گھبراتا تھا۔ دھوکے نے میری زندگی کے ایک ایسے گوشے میں جھانک لیا تھا کہ میری یادداشت میں خیالات کا اہم کھل گیا تھا اور میں دماغ کی کھڑکی سے ماضی میں دیکھنے لگا تھا۔

تھائی وانگ میری زندگی میں آنے والی پہلی ناخبر تھی۔ میں اس کی دہری محبت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ ہماری عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا۔ اس نے مجھے ایک محبوبہ اور ایک ماں کے پیار کے امتزاج سے روشناس کرایا تھا۔ میں اس کی آغوش میں جا کر کبھی تو ایک ننھا بچہ بن جاتا تھا اور کبھی بھر پور مرد۔ میں آج تک اس کی محبت کے مزاج اور اسٹائل کو کچھ نہیں پایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس دو پہلو محبت سے ہمتا رہتے ہوئے کبھی میرے پاؤں نہیں ڈگ گئے تھے۔ ہماری طویل رفاقت کے دوران میں ہم دونوں سے کبھی کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس پر ہمیں بعد میں شرمسار ہونا پڑا ہو۔ تھائی میری سچی دوست تھی۔ اس نے میری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ گھر بار، کاروبار میری حمایت کی یادداشت میں تیار ہوا اور بڑا کروا لیا تھا اور بالآخر میری دوستی کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بھی دے دیا تھا۔

جانکی دیوی بھی ایک جاں نثار دوست ثابت ہوئی تھی۔ وہ پیسے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھی مگر میری دوستی نے اسے دردر کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ اسی درد ریزی میں خوش تھی پھر ایک موقع پر اسے بھی میری جنگ کے شعلوں نے نکل لیا تھا۔ وہ میری جیت کی خاطر اپنی جان بھاری تھی۔

نوہا اور رنگولی کا کردار بھی میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا اور رنگ سنت کی بیٹی کو میں کیسے بھول سکتا تھا؟ سونیا بڑی قیامت خیز اور طوفان آمیز لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے میرے ذہن کی دنیا میں جزوی سیدھ لگائی تھی جس پر میں ابھی تک نادم تھا۔ گولڈن ٹرائی ایشنل کی جانب جاتے ہوئے ”چیانگ ساکین“ کی ایک پہاڑی پہا گاہ میں، سونیا کے ساتھ قیام کے دوران میں میری زندگی میں وہ لمحات بھی آئے تھے جب میرے پایہ استقامت میں معمولی سی جنبش پیدا ہوئی تھی۔ اس حرکت نے مجھے پورے وجود سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

رائی روپ متی اور شوہانے بھی میری دوستی میں بہت مصائب اٹھائے تھے۔ مجھے بہت سنگھ کا نام روپ متی ہی نے دیا تھا۔ وہ مجھے ایک انسانی بیلام گاہ سے ہماری قیمت میں خرید کر لائی تھی۔ میں قانوناً اس کا ز خرید غلام تھا مگر اس نے مجھے سراسر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ میری حمایت اور دوستی کے جرم میں اس نے مجھ پر کے پندرتوں کی دشمنی مول لی تھی۔

آتش فشانی 97 حصہ 7

پھر بلا اور چڑا ریت تمھیں۔ ان دونوں نے بھی میرے لیے بہت قربانیاں دی تھیں بلکہ مجھ پر اپنی جانیں بھی قربان کر دی تھیں۔ ایسے جان نثار دوستوں کا زیاں مجھے بہت ستانا تھا۔ ان کے بارے میں سوچ کر دل خون ہو جاتا تھا لیکن زندگی ہے۔ ملے اور بچھڑنے کا عمل دائمی ہے۔ اگر آپ زندہ ہیں اور دنیا میں رہتے ہیں تو اس سے نجات ممکن نہیں۔ دھوکے شونیکار نے مجھے خیالات سے چو نکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی ”کہاں کھو گئے وجدان؟“

میرے کھوئے ہوئے دھیان کو دھوکے شیریں آواز نے تلاش لیا تھا۔ میں دماغی طور پر اس کے پاس حاضر ہو گیا۔ وہ میری ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولی۔

”گلتا ہے، تم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے!“

”ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔“

”کس سوچ میں گم تھے؟“

”یاد رفتگان میں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا ”تم مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں؟“

”سمجھ دار کو سمجھانا ناگہمی ہوتی ہے وجدان۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے مصنوعی حیرت سے کہا ”اچھا! تم کس سمجھ دار کی سمجھاری کی بات کر رہی ہو دھوکو؟“

وہ میرے چہرے کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اس سمجھ دار کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”پھر آیا کچھ سمجھ میں؟“

”بڑی حد تک۔“ وہ شرارت سے مسکرائی ”باقی بھی رفتہ رفتہ سمجھ ہی جاؤں گی۔“

دھوکہ مسکراتی تھی تو اس کی آنکھوں کی چمک میں کروں کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ تبتی نفوس کی حامل وہ شوق و شگ لڑکی پائے کی صفات کی حامل تھی۔ آواز کی شیرینی اور ریلیں اس کے کئے ہوئے ایک ایک لفظ سے جھٹکتا تھا۔ وہ بولتی تھی تو لگتا تھا شہد شہد ٹپک رہا ہو۔

”اچھی بات ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”اس نیک مقصد سے لگی رہو۔“

وہ شاک لہجے میں بولی ”اچھی بات نہیں ہے وجدان!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے ابھمن زدہ نظروں سے دیکھا۔

وہ بولی ”تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا!“

”اپنے سوال کو دہراؤ۔“ میں نے کہا۔

”تمہاری یادداشت اس قدر کمزور کب سے وجدان۔“ وہ روٹھنے کے سے انداز میں بولی پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ اپنی زندگی میں کسی لڑکی سے محبت کی ہے۔ میری مراد وہ فطری تعلق ہے جو ایک عاشق اور موش ورمیان ہوتا ہے یا ایک محبوب اور محب میں دیکھتے ہیں؟“

میں نے بے ساختہ کہا ”ایسی محبت کرنے کی تو زندگی مجھے کبھی فرصت ہی نہیں دی۔“

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میری زندگی میں اتنے چنھاؤ اور گھماؤ پھراؤ تھے کہ میں ”دل لگی“ سے آگے بڑھ سکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ”دل کی لگی“ کیا ہوتی کیونکہ میرے دل کو ابھی لگی نہیں تھی۔

اس سے پہلے کہ دھوکو کوئی اور سوال کرتی ”ایک پوش سرحدی محافظ کھانے کے برتن اٹھانے گیا۔ م خاصا گرم تھا اور پھر ہم ریگزار میں تھے۔ اس وقت میں حالیہ قیام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا بس یہ بتا تھا کہ پاکستان کے صوبہ سندھ کے جنوبی ضلع ”تھپارکر“ میں ہے۔

تھپارکر اسی ضلع کا ایک سرحدی قصبہ ہے جو بارڈر قریب ہونے کے باعث بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے اچار کے ساتھ توری روٹیاں کھا کر ایک گلاس پانی اپنے حلق میں اندر لیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد دوبارہ پیاس لگنے لگی تھی۔ اچار کے ساتھ روٹی کھانے پیاس بڑھ جاتی ہے۔ سرحدی محافظ برتنوں والی ٹرے۔

جائے لگا تو میں نے درخواست کی۔

”بھائی! اگر ناراض نہ ہو تو ایک ایک گلاس پانی اور پلا دو۔ سندھ کے اس صحرا میں حلق خشک اور زبان بن کر رہ گئی ہے۔“

میرا خیال تھا کہ محافظ ہمیں ہمارے بار بار کے ”نو“ کے پروگرام ”برکھری کھری سٹائے گا مگر اس نے چہرے کوئی اچھا برا اثر دے بغیر دو گلاس پانی مزید اکرہ۔ سامنے رکھا دیا اور خاموشی کے ساتھ کربے سے نکل گیا۔

دروازے پر کھڑا مسلح محافظ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اچھتی مگر محتاط نگاہ ہم پر ڈال لیتا تھا۔ ہم دونوں ایک دے سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پانی پینے کے بعد نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ دھوکے پانی والے گلاس کا پانی نہیں لگایا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر تکلیف کے

آئینے تنوش بھری آوازیں پوچھا ”کیا ہوا دھوکو؟“

میں نے مع دھوکے کے بخنے کی موج نکالنے کے بعد کوئی بد رنگ سر ہم لگا کر اچھی طرح مالش کر دی تھی اور ایک چھوٹی سی دھوپ میں وہ مرہم دے دیے دیا تھا جو تین چار روز تک دن میں تین مرتبہ لگانا تھا۔ مذکورہ مرہم وہیں پنڈت کشوری لال کے گھر میں رہ گیا تھا۔ پنڈت کے گھر سے آنے کے بعد دھوکے میرے کندھے کے سہارے اچھی خاصی چلت پھرت کی تھی جس کی وجہ سے بخنے پر درم آگیا تھا۔ درد کی وجہ سے گرمی

میں نے دھوکے سے کہا ”تم اپنا پاؤں اس کرسی پر رکھ۔“

ساتھ ہی میں نے اس کرسی کی جانب اشارہ بھی کیا جو ہمارے درمیان رکھی ہوئی تھی۔ دھوکے نے اپنی جینز کا پانچواں ذرا اٹھا کر معذوب پاؤں کرسی پر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں اس کا پاؤں اپنے ہاتھوں میں لے کر مہمانہ کرنے لگا۔ دھوکہ سرخ و سفید رنگت کی مالک تھی۔ اس کے سڈول بدن کے آنگ آنگ میں توازن تھا۔ پاؤں خوب صورت اور بناؤں میں اپنی مثال آپ تھے۔ میں نے بخنے کی ہڈی پر اپنے دائیں ہاتھ سے دائرہ وار مساج کیا۔ میرے ہاتھ کی حرکت سے یقیناً دھوکے درد میں اضافہ ہوا تھا اور اس نے تکلیف برداشت کرنے کے لیے دائیوں کو سختی سے پیچھڑکھا تھا۔

میں لگ بھگ تین منٹ تک کلاک دائرہ وار اپنی کلاک دائیں ہاتھ میں نے انگشت شہادت کو بخنے کی ہڈی کے عین وسط میں پست کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور پوری توجہ اس کے بخنے پر مرکوز کر دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہو پھر میں نے خاص طور پر اپنے دائیں بازو کو گرم محسوس کیا۔ کوئی غیر مرئی حرارت میرے بازو میں سڑ کر رہی تھی۔ اس کے سڑ کا رخ کندھے سے ہاتھ کی جانب تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے کندھے سے طاقتور حرارتی لہریں نکل کر بازو کے راستے میرے ہاتھ میں پہنچ رہی ہوں اور پھر انکشت شہادت سے ہوتے ہوئے وہ دھوکے بخنے میں جذب ہو رہی ہوں۔ حرارتی توانائی کی یہ ترسیل مجھے ایک عجیب سا مزہ بھی دے رہی تھی۔ چند لمحات تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر میرا بازو نارمل درجہ حرارت پر آگیا۔ میں

سمجھ گیا کہ ”کلام“ ہو گیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے دھوکے آنکھوں میں حیرت بکھوڑے لے رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لگتے زوہ آوازیں سرگوشی کی۔

”دن۔ وجدان۔ تھ۔ تم کوئی جادو۔ جانتے ہو؟“

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے انجانہ بٹے ہوئے کہا۔

وہ لرزاں لہجے میں بولی ”لاڑ بھاکا قسم! تم جادوگر ہو۔ بڑے لگی ہو۔ مہمان ہو۔ عظیم ہو۔ میں۔ میں۔“

جذبات کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا ”بات کیا ہے؟ کچھ منہ سے بھی تو بولو۔“

وہ بولی ”وجدان! میرے بخنے کا درد بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔“ پھر وہ اپنے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بیجان نیز لہجے میں کہنے لگی ”یہ دیکھو۔ یہاں کی سرخی اور درم بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ تم نے کیا بڑھ کر پھونکا ہے؟“

”میں نے کچھ بھی بڑھ کر نہیں پھونکا دھوک۔“ میں نے غصے سے بولے لہجے میں کہا ”جھاڑ پھونک میرے بس کی بات نہیں۔“

وہ دراصل ”جی“ کی قوت کا کمال تھا یا آپ اسے ”ارنگا زو جہ“ کا کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔ میرے بدن کی توانائی نے حرارت کی شکل اختیار کر کے دھوکے بخنے کا درد غائب کر دیا تھا اور اس کے درم میں بھی کمی آئی تھی۔ یہ ایک سیدھا سیدھا فزکس کا عمل تھا۔

میرے جواب سے دھوکے تشفی نہیں ہوئی۔ وہ خشک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”وجدان! تم بہت گہرے آدمی ہو۔ تمہاری اصلیت پرت در پرت دنیا کی نظر سے اوجھل ہے۔ تم جتنے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ ہو۔“

”تم بھی تو ایسی ہی ہو دھوک۔“ میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”کیا تم اس وقت مجھے پوری نظر آ رہی ہو؟“

وہ جانے میری بات کا کیا مطلب سمجھی، خود کو سینٹے ہوئے جلدی سے بولی ”تم بہت ماہر ہو باتیں بنانے کے۔ تمہیں میری بات کا جواب نہیں دینا نہیں دو گے۔ چاہے میں لاکھ کوشش کر لوں۔ لاڑ بھاکا قسم! میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی اس لیے تم سے اب تمہاری شکلیوں (توتوں) کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ تم اگر کسی بات کو راز میں رکھنا چاہتے ہو تو میں اسے افشا کرنے کی ضد نہیں کروں

گی۔

”یہ بات نہیں ہے دھنو۔“ میں نے نرمی سے کہا ”ابھی جو کچھ تمہارے سامنے پیش آیا ہے اس کی حقیقت کو چھپانے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم نے کوئی جاودیا بھڑا پھونک سمجھ رہی ہو وہ دراصل ”جی“ کی قوت کا کرشمہ ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے سوال کیا ”کیا تم جی کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“

اس نے مصو میت سے نفی میں گردن ہلا دی۔  
میں نے کہا ”جی“ انسانی جسم میں پوشیدہ ایک پراسرار اور مفید قوت کا نام ہے۔ یہ ہر انسان میں موجود ہوتی ہے مگر خوابیدہ حالت میں۔ اس کا تسکین یا آرام گاہ ناف کے نزدیک ہے۔ جو لوگ اپنی ریاضت اور کڑی مشقوں سے اسے بیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔“  
”تم اپنی ”جی“ کو بیدار کر چکے ہو؟“ دھنو نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔  
وہ بولی ”تو تم نے ابھی اسی ”جی“ کے ذریعے میرے نغنے کے ورد کو رفع کیا ہے؟“

میں نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلایا اور کہا ”یہ تو ”جی“ کا ایک معمولی سا شعبہ ہے۔ اس کے بل بوتے پر تو بہت سے ناممکن کام بھی کیے جاسکتے ہیں۔“  
وہ حیرت سے آنکھیں بھڑا کر مجھے تنکے لگی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”جی“ کو بیدار کرنے والی مشقیں تو انتہائی سادہ اور آسان ہیں لیکن ان کی تکمیل کے لیے کسی عامل کامل استاد کی نگرانی بہت ضروری ہوتی ہے۔ راہبر کے بغیر انسان بھٹک کر تارکی کے کسی عمیق غار میں بھی کھو سکتا ہے۔ استاد کی راہنمائی حاصل نہ ہو تو یہ سادہ اور آسان مشقیں انتہائی کٹھن اور دشوار گزار ہو جاتی ہیں۔“

دھنو پوری دلچسپی سے میری جانب متوجہ تھی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے سوال کیا ”وہ جان! تم نے ”جی“ کی پیداری کی مشقیں کون سے استاد کی نگرانی میں اور کہاں کی تھیں؟“

میں نے جواب دیا ”ماسٹر یونگ پائی کی نگرانی میں۔ یہ میرے دادا استاد بھی تھے۔ اب وہ میرے استاد مہاراج وانگ ونگ یائے کی طرح انجمنیائی ہو چکے ہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے یہ ریاضت ”شاولن ٹیچل“

میں کی تھی۔“

اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں ”کیا تم شاولن ٹیچل بھی جانتے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ہنسنا شروع کر دیا۔  
کوئی حرج نہ سمجھا اور کہا ”میں ایک طویل عرصے تک (تھائی لینڈ) میں مارشل آرٹس کے گرینڈ ماسٹر مارٹن وانگ ونگ یائے سے ان عسکری فنون کی تربیت لیتا رہا ہوں۔ پھر کی ہدایت پر میں ان کے استاد یعنی اسنے دادا استاد مہاراج پائی کے پاس مزید ٹریننگ لینے شاولن ٹیچل چلا گیا تھا۔ جو میں نے ٹنگ فو، ٹوگا، جمناسٹک اور مراٹے کے علاوہ بہت خفیہ روحانی ورزشیں اور مشقیں بھی کی تھیں اور پھر ایک بات سن کر بہت حیرت ہو گئی دھنو۔“

انتا کہہ کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا پتہ لیا۔ وہاں حیرت اور استعجاب کا سمندر موجزن تھا۔ میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے جس یوگی کو تم بھوش سے گوہو کی بدھ ہمارا گاہ میں زبردست طلسمانی مقابلہ کیا تھا وہ شیطان صفت پڑ بھی ماسٹر یونگ پائی ہی کا شاگرد تھا۔“

وہ جلدی سے بولی ”یہ واقعی عجیب بات ہے مگر میں کو ”گیا“ ایسا ہوتا ہے۔ ایک ہی استاد کے تمام شاگرد نہ تو ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی سب کے سب برے نکلتے ہیں۔“

”سارا تھیل ذہنیت کا ہے دھنو۔“ میں نے لطف انداز میں کہا ”انسان کی ذہنیت مثبت یا منفی ہوتی ہے۔ ذہنیت کے لوگ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں اور ذہنیت والے افراد وقتی فائدے کے سوا کچھ حاصل کر سکتے اور ان کا انجام بڑا دردناک اور عبرت انگیز ہوتا۔ جیسا کہ یوگی گوتم بھوش کا حشر ہوا۔ ہم دونوں ماسٹر یونگ کے شاگرد تھے۔ میں نے نیکی اور اثبات کی راہ اختیار کی۔ گوتم بھوش بدی اور نفی کے راستے پر گامزن رہا۔ نتیجے

طور پر وہ میرے ہاتھوں ٹھٹھٹ فاش کھانے کے بعد موت گھاٹ اتر گیا۔ فتح ہمیشہ نیکی کی ہوتی ہے دھنو۔ میری یاد رکھنا۔ ظلم اور بدی زیادہ دیر تک نہیں پھلتے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو وہ جان۔“ وہ تائیدی انداز میں ”میری زندگی کا محدود تجربہ بھی یہی ہے۔“

گرینڈ ماسٹر وانگ ونگ یائے، ماسٹر یونگ پائی اور ٹیچل کے ذکر نے دھنو کو ایک خاص قسم کے جوش اور دل میں جلا کر دیا تھا۔ اس کی خوشی اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے نے پوچھا۔

”دھنو! کیا تم بھی ”جی“ کی مشقوں میں کوئی دلچسپی رکھتی ہو؟“

”شاید نہیں۔“ ہانگل، مجھے بھی شدید خواہش ہو رہی ہے دھنو بول اٹھا۔  
”جی“ کی قوت کو بیدار کروں۔ ابھی تم نے ٹھوڑی دیر کے میرے تختے پر جو عمل کیا ہے یہ تو سیدھی سیدھی مسکائی ہے۔ اگر مجھے ایسی قوت حاصل ہو جائے تو میں بہت سے دھکی اور درد میں مبتلا بے کس لوگوں کی تکلیف کو راحت دے سکتا ہوں۔ کسی کے دکھ درد اور غم و الم کو بھٹا کتنی بڑی میں بدل دوں گی۔ جس قدر سکون قلب اور نیک ہے وہ جان! پھر اس سے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔“  
رومانی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔“  
ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے اپنی سانس درست کی پھر مجھ سے متضرع ہوئی ”وہ جان! کیا اس سلسلے میں تم میری راہنمائی کر سکتے ہو؟“

”ضرور۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔  
وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی ”واقعی، تم ایک عظیم ہستی ہو وہ جان! اور نہ اس دنیا کا دستور تو یہی ہے کہ جس کے پاس جو علم اور ہنر ہوتا ہے، وہ اس میں سے کسی کو ذرا سا بھی دینا نہیں کرے۔ یہ تنگ نظری، تنگی اور گھٹیا پن ہے۔“

”ہاں دھنو! اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔“ میں نے کہا ”حالانکہ علم اور ہنر کا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ ان کو بتنا زیادہ استعمال کیا جائے، یہ اتنے ہی پھیلتے پھولتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ اگر آپ کسی کو کچھ بتادیں گے یا کچھ سکھادیں گے تو اس سے آپ کے خزانے میں کوئی کی واقع ہو جائے گی۔ اگر آپ واقعی عالم، ہنرمند اور اپنے فن کے ماہر ہیں تو یاد رکھیے، آپ کا شاگرد ہمیشہ آپ سے بھیجی رہے گا۔ وہ بھیجی بھی آپ کو اور نیک یا نہیں پاس نہیں کرے گا کیونکہ جتنا وقت اسے ایک چیز کو سمجھنے اور سیکھنے ملے گا، اتنے ہی وقت میں آپ اس سے کہیں زیادہ علم اور فنی راستے طے کر چکے ہوں گے کیونکہ آپ اس سے زیادہ تجربہ کار اور مشاق ہوتے ہیں۔ بس شرط یہی ہے کہ آپ کے علم کا سفر جاری و ساری ہو۔ آپ نہیں کسی ایک مقام پر ٹھک کر بیٹھ نہ گئے ہوں۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے،

”فرت میں برکت ہے۔ پائی بھی ایک جگہ ٹھہر جائے تو اس میں طرح طرح کی آلائشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ٹھہرا ہوا علم بہت جلد زنگ پڑ جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے عالم کو چاٹ کر رکھ دیتا ہے۔“

”تمہاری ذات کا ہر پہلو دلکش و دل نشیں ہے

وہ جان۔“ دھنو نے مسرور لہجے میں کہا ”تم اگر ایک مصلح یا مبلغ ہوتے تو تمہاری شہریت بیانی و شہرہ بیانی کی آمیزش سے وجود پانے والی فتنگو دنیا کا پاسبان کر رکھ دیتی۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ساعت میں شدہ کھولتا ہوا سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔“

”یہ تمہارے نیک جذبات میں دھنو اور ہر خلوص خیالات ہیں۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا ”ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ مدبرانہ انداز میں بولی ”میں جانتی ہوں، ہمیشہ خالی برتن ہی ٹھککتا ہے۔ جو لوگ اندر سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنی بڑائی کی لن ترانی نہیں کرتے۔“

”تم تو اس وقت مجھے کوئی دانشور لگ رہی ہو۔“ میں نے تیز نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”کیا تمہارے اندر کسی فلسفی کی روح طبل کر گئی ہے؟“

وہ قدرے جھینپ گئی پھر بات بدلتے ہوئے بولی ”کیا وعدہ ہے نا! تم ”جی“ کی قوت حاصل کرنے کے لیے میں مجھے گائیڈ کر دو گے؟“

”کیا وعدہ۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
”اور میں مارشل آرٹس بھی سیکھوں گی!“  
”وہ بھی سکھا دوں گا۔“

”اور بھی اچھی اچھی باتیں۔“ وہ کسی بچے کی طرح چل رہی تھی۔

”ہاں بھئی! سب کچھ سکھا دوں گا۔ تم سیکھنے والی تو ہون۔“ میں نے کہا ”یاد رکھو! جب تک کوئی شخص سیکھنے کی کوشش نہ کرے یا سیکھنا نہ چاہے، دنیا کا بڑے سے بڑا استاد بھی اسے کچھ نہیں سکھا سکتا۔ شاگرد کی لگن جی اور محنت ہی ہو تو منزل خود چل کر قدموں کے پاس آ جاتی ہے۔“

”میرے اندر بہت لگن ہے۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں، وہ تو مجھے نظر آ رہی ہے۔“ بے ساختہ میرے من سے نکل گیا۔

وہ جھپ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی خفت کو کم کرنے کی خاطر کہا ”دھنو! تم بہت حوصلے والی لڑکی ہو۔ مجھے امید ہے، تمہاری لگن تمہیں ایک دن کسی نمایاں مقام تک پہنچا دے گی۔“

”مجھے نہیں کسی نمایاں مقام پر فائز ہونا۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولی ”میری دنیا تمہارے قدموں سے شروع ہو کر تمہارے قدموں میں ختم ہو جاتی ہے۔“

میں لاجواب سا ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

دھون بڑی عجیب لڑکی تھی۔ وہ صرف میری قیمت اور رفاقت کی خاطر اپنا ملک چھوڑ کر پاکستان چلی آئی تھی حالانکہ وہ اگر چاہتی تو میں نیپالی اسکیز پر بندرا سے کہہ کر اسے کھنڈو میں کیس بھی سیٹل کروا سکتا تھا پھر بے پور میں بھی روپ متی نے کوشش کی تھی کہ وہ اس کے پاس یا شوہا کے پاس رہ جائے مگر دھون کی سوئی بس ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جائے گی، چاہے میں اسے جہاں بھی لے جاؤں۔ نتیجے کے طور پر میں اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے آیا تھا۔ یہ معصوم صورت، غزالی آنکھوں والی گوری چٹی تبتی لڑکی میرا پیچھا آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس کے عزائم مجھے خاصے خطرناک دکھائی دے رہے تھے حالانکہ اس نے ابھی تک ایسی کوئی جنش نہیں کی تھی جس سے اس کے دل کا حال اور دماغ کا جال کھل جاتا لیکن وہ کیا کہتے ہیں۔ ہونہار بروا کے پکنے پکنے بات۔ میں دھون کی جانب سے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

پھر ہمارے درمیان زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ دھون نے مجھ سے پوچھا ”وجدان! تم نے بتایا ہے کہ جب تمہارے والدین نے پاکستان چھوڑا تو تم صرف دو ماہ کے تھے۔ تمہارے ماں باپ کو سنگاپور میں تمہاری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اب دنیا میں تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے، پھر تم کس غرض سے پاکستان آئے ہو؟“

”سب سے بڑی غرض تو وطن کی محبت ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”کافی عرصے سے میرا دل پاکستان دیکھنے کو چل رہا تھا۔ ایک مرتبہ کوشش بھی کی لیکن حادثاتی طور پر ہم راجستھان کے صحرا میں پہنچ گئے جس کی داستان میں تمہیں سنا چکا ہوں۔“ ایک لمبے کے لیے میں رکا پھر دھون کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مزید بتایا۔

”میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ میں اپنے وطن عزیز کا چپا چپا دیکھوں، خاص طور پر گاؤں ”رکھال والی“ جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ اگرچہ وہ میرے دشمنوں کا علاقہ ہے مگر میں کسی نہ کسی ہمیش میں اس گھر کا ویدار کرنا چاہتا ہوں جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔“

”رکھال والی گاؤں تمہارے دشمنوں کا علاقہ کیوں ہے؟“

دھون کے اس سوال پر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گاؤں کے بڑے چوہدری ملک رمضان نے میرے دادا

چوہدری حاکم علی کو کھیتوں میں شوث کیا تھا پھر یہ دشمنی نسل آگے بڑھی اور ملک رمضان کا بیٹا ملک نواز شریف میرے والد عابد علی کا دشمن بن گیا پھر دشمنی نے وہ جو حاصل کیا کہ میرے والد عابد علی اور ماں شکتی کو گاؤں سے کرلا اور اتنا بڑا مکر وہاں بھی ملک نواز شریف کا چچے خاص دارا کے تعاقب میں تھا۔ لاہور سے چھپتے چھپاتے وہ دونوں گود میں لے کر پہلے کراچی پہنچے اور پھر سنگاپور چلے گئے۔ نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ایک رات وہ انہ خون میں ہاتھ رنکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ازاں بعد دارا بڑے دھوکہ میرے پیچھے بڑ گیا تھا اور آخر کار میں نے اسے ہونہار ناک انجام تک پہنچا دیا تھا۔

میری بات سننے کے بعد وہ بولی ”وجدان! جیسا کہ تم رہے ہو میں سمجھتی ہوں“ اپنے آبائی گاؤں جانا تمہارے بہت خطرناک ہو گا۔“

”ہاں خطرناک تو ہو گا۔“ میں نے عجیب آواز میں ”میری تو ساری زندگی خطروں سے کھلتے ہوئے گزری۔ دھون۔ میں نے زندگی سے ایک سبق سیکھا ہے۔ اگر تو خطروں سے نہیں کھیلے گے تو خطرات آپ سے کھیلنے لگے۔ یہ کھیل تو کسی نہ کسی طور جاری رہتا ہی ہے اس میں بالکل مطمئن ہوں۔ وطن کی دھڑی پر قدم رکھنے کے میں اس قدر سرشار ہوں کہ بیان سے باہر ہے حالانکہ میں چاہتا تو انڈیا سے سیدھا سنگاپور چلا جاتا۔ وہاں ہمارا اب میرا ایک بہت بڑا ”شعبہ جاتی اسٹور“ ہے جو میں نے بوناٹنگ کے سپرد کر رکھا ہے۔ ”عابد علی اینڈ سن“ سنگاپور علاقے ”چائنا ٹاؤن“ کا ایک معروف ڈیپارٹمنٹ اسٹور جو ساگو اسٹریٹ پر واقع ہے مگر وطن کی محبت مجھے یہاں لائی ہے۔ کیا تمہارا اپنے آبائی علاقے تبت کی جانب ہل کدول میں چاہتا؟“

”بہت دل چاہتا ہے“ اس جنت نظیر اور حیرت آفرین تخت ارض کو دیکھوں۔“ وہ پر جوش لہجے میں بولی ”میں نے بس وہاں کی برائیاں اور خیر آئیز کمائیں ہی سہی ہیں۔“ میں نے کہا ”میں نے بھی تبت کے بارے میں بہت سنا سن رکھا ہے۔ دھون۔ میں زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ خیر اسراروں کی اس سرزمین کو دیکھنے جاؤں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی وجدان۔“ وہ بولی۔

”بشرط یہ کہ اس وقت تم میرے ساتھ ہو نہیں تو“ نے کہا۔

”فرط جذبات سے بولی“ لاڑو بدھا مجھے زندگی بھر ”تمہارے ساتھ رکھیں!“

تمہارے انداز دعاتی تھا۔ گویا وہ مامتا بدھ سے اس کا انداز کر رہی تھی کہ ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ہو جائے۔ درخواست کر رہی تھی کہ ہمارا اس کی زبان سے پھسل گئی اس کے دل کی خواہش بے اعتبار اس کی زبان سے پھسل گئی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا ”اس کے علاوہ مجھے ایک اور اہم کام نمٹانا ہے۔“

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا ”ملک نواز شریف اور میرے والد عابد علی کا دشمنی کی ایک بنیادی وجہ ہماری ملت کرنے کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا اور اس کی سونا اسمگل کرنے کی کوشش کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے کیوس انفرانٹری میں سونے کے بسکٹوں سے بھرے گئے تھے جو انہوں نے ایک حثروک کنوینس میں پیٹینک دیے تھے لیکن نواز شریف علی کے ہمارے دارا سے یہ بہانہ کیا کہ انہوں نے سونے والے تھیلے ریائے راوی میں پیٹینک دیے ہیں۔ یہ دیا پاکستان کے شہر لاہور کے نزدیک ہے۔“

”جہاں تم گڑے مرنے کاٹھارے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ ”کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔ ”تمہیں یہ ساری اہم باتیں تمہارے والد نے بتائی تھیں؟“ دھون نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا ”نہیں“ والد صاحب کی موت کے بعد مجھے اپنے گھر میں سے ان کی خفیہ ڈائری ملی تھی جس میں یہ تمام واقعات درج ہیں۔“

”وہ ڈائری کہاں ہے؟“ دھون نے پوچھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا ”لاہور میں“ میرے ایک حمن کے دوست کے پاس وہ ڈائری محفوظ ہے۔ میں لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی سے ملوں گا۔“

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی ”ہاں“ میں جانتی ہوں تمہارے حمن کا دوست اب تک محفوظ نہ ہوا تو؟“ ”تو کچھ نہیں۔“ میں بے پروائی سے بولا ”میں سونے کے حصول کی خاطر لاہور نہیں جا رہا۔ یہ تو ایک طرح کا ایڈونچر ہے یا دماغی کا شاختا نہ ہے۔“

وہ بات میں سر ملاتے ہوئے بولی ”ہاں“ میں جانتی ہوں وجدان! تم لاچی یا ہوس پرست نہیں ہو۔ بدھ نیل کنڈی عبادت گاہ میں جب سننے بدھ بھکشو نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ تم کچھ تو تہ خانے سے کچھ سونا اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو،

تو تم نے صاف انکار کر دیا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے“ ایسا ہی ہوا تھا۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”تمہارے انکار پر سننے بدھ بھکشو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے بارے میں دلائی لاما نے پہلے ہی یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ تم اس قدیم بدھ عبادت گاہ سے ایک تنکا بھی لے کر نہیں جاؤ گے۔“

مجھے یہ بات بھی اچھی طرح یاد تھی۔ بدھ نیل کنڈی عبادت گاہ کا چارج سنبھالنے والے بدھ راہب نے دلائی لاما کے حوالے سے کچھ اسی قسم کا تبصرہ کیا تھا۔ دلائی لاما کو بدھ مت کے پیروکار اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ تبت سے جلاوطنی کے بعد دلائی لاما نے ہندوستان کی شمالی ریاست ہماچل پردیش میں پناہ لی تھی۔ دھرم شالا کو ہماچل پردیش کے صدر مقام کی حیثیت حاصل ہے۔

دھون نے ڈائری کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایک طرح سے بالکل ٹھیک ہی سوچ رہی تھی۔ ایسا ہو جانا ممکنات میں سے تھا۔ صحیح صورت حال اور نازہ ترین حالات کا کلم تو لاہور پہنچنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

میرے والدین کی ہیمنانہ موت کے بعد مجھے اپنے گھر سے وہ خفیہ ڈائری ملی تھی۔ ان دنوں میرے والد سنگاپور میں فورٹ کیسنگ روڈ پر رہتے تھے۔ اسی گھر کے مین گیٹ پر میری ماں اور باپ کو موت کے گھاٹ اتار گیا تھا۔ میں ان کی موت کا منظر بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ازاں بعد میں نے سفاک قاتلوں کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

میرے والد صاحب کے ایک دوست پر تاب سنگھ سنگاپور کے علاقے ”ٹل انڈیا“ میں رہتے تھے۔ چاچا پر تاب نے جب دیکھا کہ میرے والدین کو قتل کرنے کے بعد قاتل ہاتھ دھو کر میرے پیچھے بڑ گئے ہیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ بنکا (تھائی لینڈ) لے آیا۔ میں نے یہ سفر سنگاپور سے بنکا تک براستہ ملائیشیا کیا تھا لیکن میرے دشمن پیچھا کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ چاچا پر تاب سنگھ نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچایا تھا اور میں مہاراج وانگ وانگ یائے کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔

سنگاپور سے روانگی سے قبل چاچا پر تاب نے والد صاحب کی خفیہ ڈائری اپنے ایک دوست خشونت سنگھ کے پاس امانت رکھوا دی تھی۔ خشونت سنگھ اپنی بیوی رجنی اور بیٹی ارملاکور کے ساتھ سنگاپور ہی میں رہتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب مجھے دوبارہ سنگاپور جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت خشونت سنگھ اور اس کی بیوی رجنی کا انتقال ہو چکا تھا۔

ارملا کو رک کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس کے باپ خوشونت سنگھ نے اپنی موت سے قبل وہ لاہور میں مقیم اپنے ایک دوست کو بھجوا دی تھی۔ ارملا نے مجھے اس شخص کا پتا بھی بتایا تھا جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔

میرے اور دھنو کے درمیان کافی دیر تک مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ ایک موقع پر میں نے کہا۔ ”دھنو! کیا تم اپنا نام تبدیل کر سکتی ہو؟“

”کیوں، میرے نام میں ایسی کیا خرابی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”خرابی تو کوئی نہیں ہے۔“ وہ بولی ”پھر تم مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ”بس، مجھے تم پر یہ نام اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا۔ دھنو چند لمحے گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی ”تو یہ تمہاری خواہش ہے کہ میں اپنا نام بدل لوں؟“

میں نے کہا ”ایسا ہی سمجھ لو۔“ ”تمہاری خواہش کی خاطر تو میں ہمالیہ سے ٹکرا سکتی ہوں وجدان۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی ”ایک نام کی کیا حیثیت ہے۔ تم نے تو میری زندگی بدل دی ہے، نام بھی بدل ڈالو۔“

”ٹھیک ہے، میں اس بارے میں سوچوں گا۔“ میں نے کہا۔

”تم میرا کیا نام رکھنا چاہتے ہو؟“ ”ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں کوئی خوب صورت سا نام ہو تو بتاؤ۔“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی ”نہیں وجدان! میں یہ نہیں کروں گی۔“ اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی، میں نے پوچھا ”تم کیا نہیں کرو گی؟“

”وجدان!“ وہ میرے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے بولی ”میرے ذہن میں چاہے کیوں خوب صورت نام موجود ہوں مگر میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ ”میری تو بات ہے وجدان۔“ ”مجھے بھی تو سمجھاؤ نا!“ میں نے حیرت سے اس شرارت کی پڑیا اور موم کی گڑیا کو کتے ہوئے کہا ”تم ابھی ہوئی باتیں کیوں کر رہی ہو؟“

وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی ”دیکھو وجدان! تم نے میرا نام تبدیل کرنے کی تجویز دی ہے۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ میرے لیے نیا نام بھی تم ہی منتخب کرو۔“

میرے سینے سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ دھنو! قدم پر اپنی زبان کا ثبوت دے رہی تھی۔ پتا نہیں وہ مجھ کو کیا سمجھ بیٹھی تھی۔ اس کی والمانہ عقیدت میں لمحہ بے لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو مجھے ذہنی طور پر ابھرنے میں جلا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ سب مجھ سے بہت نہ کر رہی ہو بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رہنمائی آگے بڑھ رہی ہو۔ صورت حال خاصی سنگین شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

میں نے کہا ”نفی الحال تو کوئی مناسب اور مفید ساہنہ مجھ سے نہیں رہا۔ میں اس بارے میں غور و فکر کروں گا۔“ ”میں انتظار کروں گی وجدان۔“ دھنو نے ایک سادہ سا جملہ بالکل سہل انداز میں کر مجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ بظاہر جتنی سیدھی آتی تھی ”اندھے اتنی ہی پیچیدہ تھی۔“

○☆☆○

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں ہمارے ”اعمال خانہ“ کے ساتھ اس چوکی سے متعلقہ تھانے پہنچا دیا گیا۔ متاثر پولیس کے حوالے کرنے کے بعد ریجنل ڈائریکٹر کے آفس میں گئے۔ ہم دونوں کے علاوہ پنڈت کشوری لال اور اس کے دونوں ساتھی آچر اور پیر بخش کو بھی پولیس کی تحویل میں دیا گیا تھا۔

میں اور دھنو حالات کے ایک کمرے میں تھے۔ پنڈت اور اس کے دونوں بندے دوسرے کمرے میں تھے۔ ریجنل ڈائریکٹر نے چوکی کے خفیہ گودام سے اسلگنڈ مال برآمد کر لیا تھا اور ہم پانچوں کے خلاف مکمل رپورٹ کرنے کے بعد ہی ہمیں اپنی چوکی سے ”رخصت“ کیا تھا۔ ہمیں حالات کے جس کمرے میں رکھا گیا تھا اس پر فرش پر بھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک مختصر سی چٹائی تھی۔ کسی زمانے میں وہ چٹائی اپنی اصل شکل و صورت ساز کے ساتھ وجود رکھتی ہوگی مگر اب اتنا زمانہ نہ کا علیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کا وجود خاصی حد تک سٹپکا تھا اس کی حالت سے کہہ نہ سالی جھلکتی تھی۔ جا بجا کچے پتے ہوئے تھے۔ مذکورہ ”چٹائی کی باقیات“ پر مشتعل یہ پتے کمرے کے ایک کونے میں پڑا اپنی بربادی پر آشکار تھا۔

میں نے اس چٹائی پر بیٹھ کر حالات کی تھنڈی دیوانہ ٹیک لگائی۔ دھنو بھی میرے قریب ہی ٹانگے پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے سے اس وقت بھی تکلیف جھلکتی اب سورج پوری طرح ڈوب چکا تھا اور فضا میں خشکی

تھی۔ صبح کا دن جس قدر جھلکا دینے والا ہوتا ہے، رات اتنی ہی خشک اور جمادینے والی ہوتی ہے۔ ابھی تو رات کا آغاز ہوا تھا۔ فضا میں بڑھتی ہوئی خشکی دھنو کے پاؤں کے درمیان اضافہ کر رہی تھی۔

میں نے اشارے سے دھنو کو اپنا پاؤں نزدیک لانے کو کہا۔ اس نے ایک لمبی سی کراہ کے ساتھ مضبوط پاؤں والی ہانگ کو سمیٹ لیا۔ اس طرح زخمی ٹخنے والا پاؤں میرے دائیں ہاتھ کے قریب آگیا۔ میں نے اس کے متورم ٹخنے پر ہولے ہولے اپنی انگلیوں سے مساج کرنا شروع کر دیا۔ اس طریقہ علاج کو ”پاس“ کہا جاتا ہے۔ آج کل یہ عمل ”رنگی“ کے نام سے بھی متعارف کروا دیا جا رہا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ قوت ارتکاز کی کرشمہ کاری ہے جس کے پس پردہ ”پچی“ کا فرما ہوتی ہے۔ یہ ایک مستند اور موثر دافع درد عمل ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دھنو شانت ہو گئی پھر وہ بھی کھسک کر میرے نزدیک آئی اور حالات کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اب اس نے اپنی ٹانگوں کو آئینی پالتی کی شکل میں ایک دوسرے کے اوپر چڑھا لیا تھا۔ دھنو کے دائیں ٹخنے میں چوٹ آئی تھی۔ اس حالت میں بیٹھتے ہوئے مضبوط پاؤں بائیں ران کے اوپر ٹیک گیا تھا۔ دھنو اب اپنے ہاتھ سے دھیرے دھیرے اسے سلار رہی تھی۔ اس نے اپنی کمر کو سیدھا رکھتے ہوئے آنکھوں کو بند کر رکھا تھا ”گویا وہ ”سیلف پاس“ کے عمل سے گزر رہی تھی۔

میں نے ایک بھجور پر نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ دھنو کے چہرے کی فطری مصحوبیت نے میرے دل میں گندگی سی بگادی۔ بے اختیار مجھے اس پر ہمارے آنے لگا۔ دو گھنٹے بعد ہماری طبی ہوئی۔ ایک کانسٹیبل نے آکر حالات کا رورازہ کھولا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”انچارج صاحب نے تم دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“ میں کوئی سوال کیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اٹھنے میں مدد دینے کے لیے دھنو کی جانب جھکا۔ اس مرتبہ دھنو نے بہت معمولی سا سہارا لیا تھا جس کا مطلب تھا اس کے ٹخنے کی تکلیف کافی حد تک رفع ہو چکی تھی۔

کانسٹیبل ہمیں تھانہ انچارج کے پاس پہنچا کر واپس چلا گیا۔ ہم دونوں مجرموں کی طرح تھانے دار کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ اس نے تنقیدی نظر سے ہمارا جائزہ لیا پھر اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی فائل پر دونوں ہاتھ رکھتے

ہوئے بولا۔ ”بابا، جاسوسی کرتے ہو؟“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ میں اس کے سوال پر کھول کر رہ گیا۔ تاہم میں نے ضبط کے دامن کو تھامے رکھا اور معتدل لہجے میں کہا۔

”تھانے دار صاحب! ہم جاسوس نہیں ہیں۔ ایک مجبوری نے ہمیں آپ کے قبضے میں پہنچا دیا ہے۔ آپ اپنی کارروائی جلد از جلد مکمل کرو اور ہمیں جانے دو۔“ پھر میں نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میری ساتھی کا پاؤں زخمی ہے، یہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔“

تھانے دار نے دھنو کو ٹوٹتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا ”تم بیٹھ سکتی ہو۔“

تھانے دار کی میز کے پاس ہی ایک چوٹی بیچ دھری تھی۔ دھنو اس ”تعمایت خروانہ“ سے استفادہ کرتے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئی۔ تھانے دار میری جانب متوجہ ہو گیا۔

”بابا، جب کوئی مجرم قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے تو وہ یہی کہانی سنا تا ہے۔ وہ خود کو بے بس لگا چار، مجبور اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ ہم اس کے عادی ہیں۔“

میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”ہم نہ تو مجرم ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی جاسوسی میں ملوث ہیں۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے ہمارے بارے میں۔“

”ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہوتی۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”ہم ریجنل ڈائریکٹر کو مکمل بیان دے چکے ہیں۔ وہ ہم سے مطمئن ہو گئے تھے۔ ہماری تفصیلی رپورٹ آپ کے پاس پہنچ چکی ہے پھر خواہ مخواہ ہمیں کیوں پریشان کیا جا رہا ہے؟“ وہ چند لمحوں تک مجھے ایسی نظر سے دیکھتا رہا جیسے میرے آریار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے گہمیر آواز میں کہا ”ریجنل ڈائریکٹر نے جو کچھ کیا، اسے تو بھول جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔“

”آپ کیا کرنے والے ہو تھانے دار صاحب؟“ ”میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو دشمن ملک کے جاسوسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔“ وہ کینہ توڑ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم دونوں ”را“ کے ایجنٹ ہو اور غیر قانونی طریقے سے باڈر پار کر کے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہو۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ میں نے تیز آواز میں کہا۔

وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا ”بابا“ زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری ساتھی کا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ تمہیں ایسی کھری کھری سناتا کہ تمہارا دماغ ”روشن“ ہو جاتا۔“

”تم وہ کھری کھری سنائی دو۔“ میں نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا ”اس طرح تمہاری یہ کھوٹی کھوٹی تو نہیں سننا پڑے گی۔“

میرے لہجے میں اس نے گستاخی کی سو گھگی۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا ”یہ تھانا ہے بابا۔ اور میں اس تھانے کا انچارج ہوں۔ زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ورنہ۔“ اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا ”ورنہ کیا ہو گا؟“

”بہت برا۔“ وہ سلگتی ہوئی آواز میں بولا ”بابا، تمہارے ساتھ بہت ہو جائے گا۔“

میں نے کہا ”ہمارے ساتھ اب تک صبح سے کون سا اچھا ہوتا آیا ہے۔“

”بابا، تم بولتے بہت زیادہ ہو۔“ تھانے دار نے تیز نظر سے مجھے گھورا ”اور تمہارا خون بھی بہت گرم ہے مگر تم نے ابھی...؟“

ایک مرتبہ پھر اس نے سوالیہ انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا ”آپ کو ہماری بے گناہی کا یقین کیسے آئے گا؟“ ”یقین دلا نا چاہتے ہو!“ اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا ”آپ نے ہماری رپورٹ تو پڑھ لی ہوگی۔ اس میں ایک رقعے کا ذکر بھی ہے بلکہ میرے خیال میں وہ رقعہ بھی فائل میں موجود ہو گا؟“

ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ نظر سے کرخت صورت تھانے دار کو دیکھا۔ وہ ذومعنی انداز میں گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا ”ہاں ہاں“ فائل میں رقعہ موجود ہے اور میں نے اسے پڑھا بھی ہے مگر تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”اس رقعے کے مطابق پنڈت کشوری لال مجھے پاکستانی کرنسی میں پچاس ہزار روپے دینے کا پابند ہے۔“ یہاں تک کہہ کر میں نے پھر تھانے دار کی طرف ایک خاص نظر سے دیکھا، وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دلچسپی غماضیگی جھلک رہی تھی۔

میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا ”مگر وہ رقم کشوری لال سے وصول کر کے آپ مجھے دینے کے بجائے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!“

میں نے اس مصیبت سے جان پھڑانے کی آسان ترین ترکیب آزمائے کا فیصلہ کر لیا تھا، گویا میں تھانے دار کو سیدھا سیدھا رشوت کی پیشکش کر رہا تھا۔ میں نے برصغیر کی پولیس کے بارے میں بہت سی کہانیاں اور قصے سن رکھے تھے۔ انڈیا کی پولیس کو تو میں اچھی طرح برت اور پرکھ چکا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں بھی اس جھگے کی وہی حالت ہے جو ہندوستان میں ہے۔

میری پیشکش پر تھانے دار کی آنکھوں میں ہنک پیدا ہوئی۔ پچاس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ یہ تو مردہ آنکھوں میں بھی زندگی کی چمک اجاگر کر سکتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تھانے دار مجھے کچھ مضطرب نظر آیا پھر قدرے سخت لہجے میں بولا۔

”تو تم مجھے رشوت پیش کر رہے ہو؟“ ”آپ جو بھی سمجھ لیں۔“ میں نے مبہم انداز میں کہا۔ وہ سوچ میں ڈگمگا پھر مجھے ٹنٹنی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ”تم کوئی چال چلنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟“

میں نے اسے کھن لگاتے ہوئے کہا ”جناب! آپ کے سامنے میں کیا چال چل سکتا ہوں۔ آپ طاقت ور اور با اختیار ہیں۔ میں آپ کے زیر حراست ہوں۔ یہ آپ کا تھانا ہے۔ آپ یہاں کے مختار کل ہیں۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ قید میں رہتے ہوئے میرے لیے وہ رقم کاغذ کے ٹکڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر مجھے پچاس ہزار روپے کے عوض آزادی مل جائے تو میں خوش خوش یہاں سے جاؤں گا اور آپ کا بھی بھلا ہو جائے گا۔“

ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے کھوجنے والی نظر سے تھانے دار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ تذبذب کے عالم میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ گویا وہ اس وقت کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے بھرپور چوٹ لگائی۔

”تھانے دار صاحب! پچاس ہزار روپے اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ اس سے آپ کے بہت سے دلدردور ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ آپ کو کیا تنخواہ دیتی ہوگی۔ آج کل تنخواہ میں کہاں گزرا رہا ہے۔ دو ماہ بعد عید آنے والی ہے۔ کیا اس موقع کو آپ ضائع کر دیں گے۔ گھر آئی ہوئی نکشی کو



دروازے سے لوٹنا عقل مندی نہیں تھانے دار صاحب!“  
میری بچنی چڑی باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔  
مجھے وہ نیم اتادہ نظر آنے لگا۔ میں نے ایک اور دروازہ چاہتے  
ہوئے کہا۔

”یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم جاسوس  
نہیں ہیں ورنہ ریجنرز والے ہمیں اتنی آسانی سے نہ  
چھوڑتے۔ ان کی عقلی نگاہیں سامنے والے کا یکسرے گردنی  
ہیں۔ ہم اپنی بعض مجبوریوں کے باعث غیر قانونی طریقے سے  
بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ ریجنرز  
والے ہمیں کلیئر کر چکے ہیں۔ اب سارا معاملہ آپ کے ہاتھ  
میں ہے۔ آپ بھی ”کلیئر“ کر دیں گے تو دونوں فریقوں کا  
فائدہ ہو جائے گا۔ آپ ہمیں تھوڑا سا زارہ دے دیں تاکہ  
ہم کراچی تک بے آسانی پہنچ جائیں۔ باقی ساری رقم۔“  
میں ادھر سے بٹلے پر اپنی بات ختم کر کے زیر لب  
مسکرایا۔

تھانے دار دھمے لہجے میں کہا ”بابا! یہ اتنا آسان نہیں  
ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“  
”آپ کے لیے آسان اور مشکل کیا ہے سائیں۔“ میں  
نے اس میں ہوا بھرتے ہوئے کہا ”کیس اس تھانے میں ہے  
اور آپ یہاں کے بادشاہ ہیں۔“  
وہ نیم رضامند ہوتے ہوئے بولا ”وہ تو ٹھیک ہے بابا! پھر  
بھی بہت سی باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔“  
”پوری رات پڑی ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا  
”تمام باتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں اور صبح ہمیں خوشی خوشی  
یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔“  
”ایک رات میں کیا ہو سکتا ہے!“ وہ الجھے ہوئے لہجے

میں بولا۔  
”پھر کتنا وقت چاہیے تمہیں؟“ میں اب کا رو باری  
انداز میں تھانے دار سے بات کر رہا تھا۔  
وہ بولا ”سب سے پہلے تو پنڈت کشوری لال سے رقم  
وصول کرنے کا مرحلہ ہے۔“

”آپ کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ میں نے  
اسے پانس پر چڑھاتے ہوئے کہا ”پولیس والے تو اگلی کے  
ماہر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی پنڈت اسٹنگ کے چکر میں بھی  
پھنسا ہوا ہے۔ آپ اس پر دیاؤ وال کریجاس ہزار تو کیا، کئی  
پچاس ہزار نکال سکتے ہو۔“ ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے  
اضافہ کیا ”آپ پتا نہیں، کس قسم کے تھانے دار ہو سائیں!  
اگر آپ کی کرسی پر میں بیٹھا ہوتا تو کب کی یہ ”ذیل“ مکمل

کر چکا ہوتا۔“

میری بات نے تھانے دار کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تھوڑا  
آہستہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”اچھا، ٹھیک ہے۔ میں  
پنڈت کو بلا کر اس سے بات کرتا ہوں۔“

میں مطمئن ہو گیا کہ اب ”بات بن“ جائے گی۔  
ہمیں دوبارہ حالات میں لے جایا جائے گا تو میں نے  
تھانے دار سے کہا ”سائیں! کیا آپ کی نگری میں ہم بھوکے  
پیاسے مرجائیں گے!“

اس نے نگاہ اٹھا کر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا اور کہا  
”کیا مطلب ہے آپ کا بابا؟“  
”مطلب یہ ہے سائیں کہ ہم نے دوسرے کے بعد سے کچھ  
کھایا یا نہیں۔“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے  
کہا ”بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے پینے کا کچھ  
بندوبست ہو جائے تو۔“

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ”ہاں  
ہاں، بابا! تمہیں رات کا کھانا ضرور دیا جائے گا۔“  
ہم مطمئن انداز میں کاشییل کے ساتھ چلتے ہوئے  
دوبارہ حالات میں آگئے۔ کاشییل نے دروازہ بند کر کے تلا  
لگایا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہمارا کھانا حالات میں پہنچا دیا گیا۔  
توری روٹیوں کے ساتھ کس سبزیوں کا سالن تھا جو کئی  
اناڑی یاوری کی ”ہنرمندی“ کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ منہ بولا  
اس طرح بھی کہ اسے کھانے کے بعد کھانے والا منہ سے کچھ  
نہ کچھ ضرور بولتا تھا۔ اور یہ بولنا، یاوری کی شان میں  
”تصدیے“ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ بہر حال، ہم نے مہر  
شکر کر کے کھانا اپنے معدوں میں اتار دیا اور پانی پینے کے بعد  
کھانے کے برتن حالات کے دروازے کے پاس رکھ دیے۔  
میں نے دوبارہ حالات کی دیوار سے ٹیک لگالی۔  
ہمارے پاس گھڑی نہیں تھی تاہم میرا اندازہ تھا کہ اس وقت  
رات کے دس بجے ہوں گے۔ مجھے امید تھی کہ تھانے دار  
پنڈت کو پٹانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

دھنوبھی خود کو خاصا ”ریلیکس“ محسوس کر رہی تھی۔  
اس کی فتنے کی چوٹ میں اب وردہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا  
پھر تھانے دار سے ہونے والی ملاقات بھی خاصی حوصلہ افزا  
ثابت ہو رہی تھی۔ اسی ذیل میں دھنوبھی مجھ سے پوچھا۔  
”وجدان! تمہارا کیا خیال ہے، تھانے دار تمہاری تجویز  
ماننے پر تیار ہو جائے گا؟“  
میں نے کہا ”مجھے تو پوری امید ہے۔ پنڈت کشوری لال

اس وقت تھانے دار کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ دم نہیں  
مار سکے گا۔ اس پر اسٹنگ اور غیر قانونی طور پر لوگوں کو بارڈر  
عبور کروانے کے عملین ترین الزامات ہیں۔ ان الزامات کے  
سلسلے میں ٹھوس ثبوت بھی موجود ہیں۔ اس وقت تھانے دار  
پنڈت سے ہر بات منوانے کی پوزیشن میں ہے پھر پنڈت کو کئی  
نفل و ناوار یا پھینچ قسم کا آدمی بھی نہیں ہے۔ وہ اس گاؤں  
کی ایک صاحب حیثیت شخصیت ہے۔ پچاس ہزار تو وہ خوشی  
خوشی تھانے دار کی پھیل رہا ہے۔ گالک میرا خیال ہے،  
تھانے دار اس سے کچھ زیادہ رقم نکالوانے کی کوشش بھی  
کرے گا۔ یہ پچاس ہزار تو پنڈت کو ہر صورت دینا ہی ہیں۔  
اس کے پاس یہ رقم ہماری امانت ہے۔“

دھنوبھی نے کہا ”ابا ہو جائے تو اچھا ہے۔“  
”ایسا ہی ہو گا۔ انشاء اللہ۔“ میں نے پورے وثوق سے  
کہا۔

وہ بولی ”وجدان! تمہیں کیا لگ رہا ہے۔ اپنے ملک  
میں داخل ہوتے ہی تم قدم قدم پر الجھنوں میں گھرتے جا رہے  
ہو؟“

”یہ وقتی پریشانی ہے دھنوبھی۔“ میں نے کہا ”بہت جلد  
اس ملک کی آزاد فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔“  
وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی ”وجدان! میں نے تمہاری  
دیکھا دیکھی کچھ کوشش کی ہے اور مجھے اس سے فائدہ بھی ہوا  
ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیسی کوشش اور کس قسم کا فائدہ؟“  
”تھوڑی دیر پہلے جب تم نے میرے فتنے کا سماج کیا تھا  
تو مجھے بڑا سکون ملا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”بعد  
میں، میں نے بھی اتنی پالتی مار کر آنکھیں بند کرنے کے بعد  
اپنی ساری توجہ فتنے پر مرکوز کر دی تھی اور اس سماج سے  
مجھے واقعی خاصی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔“

”ہاں! میں نے دیکھا تھا تمہیں ایسا کرتے ہوئے۔“ میں  
نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”رنکا تو مجھ سے ایسے  
چھوٹے موٹے شعبے دکھائے جاسکتے ہیں۔ چند روز کی مشق  
سے یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی جاسکتی ہے تاہم ”جی“ کی  
بیداری اور اس قوت کا استعمال ایک دوسری چیز ہے جس  
کے لیے باقاعدہ کسی جانکار کی نگرانی میں مشق کرنا پڑتی  
ہیں۔“

وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے دانستہ  
اس سے یہ بات چھپائی تھی کہ جب وہ اتنی پالتی مارے  
دھیان گیان میں مصروف تھی تو مجھے بے اختیار اس پر پیار

آ رہا تھا۔

میری بات کے مکمل ہونے پر دھنوبھی نے کہا ”وجدان! ہم  
ذرا اس مصیبت سے نکل جائیں پھر میں تمہاری نگرانی میں  
”جی“ کی مشقیں شروع کر دوں گی۔“

میں نے کہا ”دھنوبھی! اگر ہم اپنی پوری زندگی کا دیانت  
داری سے تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہماری  
زندگی کا زیادہ تر حصہ بد امنی، الجھن اور پریشانی میں گزرنا  
ہے۔ خوشی، آرام، سکون اور فراغت کے بہت کم لمحات  
ہمارے حصے میں آتے ہیں اس لیے ہمیں کسی تعمیری اور مثبت  
کام کا آغاز کرنے کے لیے کسی خاص موقع کا انتظار نہیں کرنا  
چاہیے۔ اس طرح ہم بہت سادہ ضائع کر دیتے ہیں چنانچہ  
ایک لمحے کی تاخیر سے تمہیں یہ نیک کام شروع کر دینا  
چاہیے۔ ممکن ہے، کل ہم آج سے زیادہ مصیبت زدہ  
ہوں۔“

”تم کتنا کیا چاہتے ہو وجدان!“ وہ حیرت سے مجھے دیکھتے  
ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”یہ ٹھیک ہے کہ یہاں حالات میں تم  
”جی“ کی بیداری کی مشقیں نہیں کر سکتی ہو اور خاص طور پر  
یہ وقت بھی غیر موزوں ہے کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم  
نے کھانا کھایا ہے۔ ”جی“ کی مشقیں ہمیشہ خالی پیٹ کی جاتی  
ہیں لیکن۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری  
رکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن کسی بھی پریکٹیکل سے پہلے تعمیری پڑھنا ضروری  
ہوتا ہے۔“

”ہاں! یہ تو ہم بالکل درست کہہ رہے ہو۔“ دھنوبھی جلدی  
سے بولی۔

میں نے کہا ”دھنوبھی! جب تک تمہیں پورے سکون سے  
مشقیں کرنے کا موقع نہیں ملتا، تم تھوڑی کوبی ازبر کرو۔ میں  
تمہاری تربیت ابھی سے شروع کر دیتا ہوں۔“  
وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور پوری توجہ میری آواز پر مرکوز  
کر دی۔

اسی وقت حالات کے دروازے پر وہ کاشییل نمودار  
ہوا جو ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے دروازہ  
کھولے بغیر خالی برتن حالات کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر  
ڈال کر اٹھا لیے۔ جب وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تو میں نے  
اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”سائیں! کیا پوری رات ہم بونی بیٹھے سردی سے  
محسوس رہیں گے۔ کوئی چادر یا کپل وغیرہ نہیں ملے گا

ہیں؟

رات جوں جوں بھگ رہی تھی، فضا کی خنکی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی تو پروا نہیں تھی۔ میں ایک لنگوٹ میں برف کی سل پر بیٹھ کر بجھی ہوئی رات نہایت سکون سے گزار سکتا تھا لیکن دھون اس قسم کی سختی سننے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ وہ سرد پہاڑی علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس نے بدھ نسل لکڑی عبادت گاہ میں سرد ترین موسم بھی برداشت کیا ہوگا۔ یہ قدیم بدھ عبادت گاہ ایک دریا کے کنارے واقع ہے اور پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ اگر کھنڈروں سے بھاگ متی کی جانب جائیں تو یہ بدھ عبادت گاہ ان دونوں مقامات کے درمیان سڑک سے چھ سات کلومیٹر ہٹ کر واقع ہے۔

لیکن یہاں مسئلہ دوسرا تھا۔ دن اور رات میں موسم کے تیز ربا لکل بالکل برعکس ہوتے تھے۔ صحرا کا دن انتہائی چلتا ہوا اور جھلسا دینے والا ہوتا ہے اور رات کا ابتدائی حصہ معتدل ہوتا ہے مگر جیسے جیسے رات آگے سرکتی ہے، ٹھنڈک بڑھنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ رات کے پچھلے پر شدید سردی ہو جاتی ہے پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ دھون کا ایک تختا بری طرح متاثر ہو چکا تھا اور وہ گزشتہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔ میں نے انہی تمام حقائق کی روشنی میں دھون کے لیے کسی اور دفنی کا بندوبست کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ کانٹیل نے میری بات کا ثبوت رد عمل پیش کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ چیک دار ایک بوسیدہ سی چادر لے کر میرے پاس آگیا۔

میں نے حالات کی سلاخوں میں سے وہ چادر پکڑ لی اور کانٹیل نے پوچھا ”تھانے دار صاحب کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے جواب دیا ”وہ پینڈت کشوری لال کے ساتھ کسی قسم کے مذاکرات کر رہے ہیں۔“

میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا کہ ان ”مذاکرات“ کی نوعیت کیا ہوگی۔

کانٹیل کے جانے کے بعد میں نے وہ خستہ حال چادر دھون کو اڑھادی اور ٹھنڈو کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑتے ہوئے کہا۔

”جی“ ”جی“ ”جی“ ایک غمور اگھڑائی لے کر بیدار ہو جائے تو پھر سب سے اہم مرحلہ اس کو سنبھالنے کا ہوتا ہے۔ وہ کسی سرکش گھوڑی کے مانند آسانی سے قابو میں نہیں آتی۔ اسے باقاعدہ لگام دینا پڑتی ہے ورنہ وہ دماغ کی طرف سفر کر کے بے انتہا تباہ کاری چا سکتی ہے جس میں سب سے زیادہ خطرہ مشقیں کرنے والے انسان کی جان کو ہوتا ہے۔“

دھون نے ایک جھرجھری کی اور بولی ”پھر تو یہ بہت خوفناک قوت ہے!“

”گھبراؤ نہیں۔“ میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بات جاری رکھی ”یہ خطرناک اور نقصان دہ صرف ان لوگوں کے لیے ثابت ہوتی ہے جو بغیر کسی راہنما کے الٹی سیڈھی مشقیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان نوجوانوں اور جوانوں کی ہے جو بازار میں موجود کتابوں کی مدد سے اس قوت کو تسخیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”تم آسانی کے لیے یوں سمجھ لو کہ ”جی“ کو بیدار کرنے والی مشقیں صرف اور صرف احتیاط اور مناسب راہنمائی کا تقاضا کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی باہر کی نگرانی میں یہ مشقیں کرے تو بے شک وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“

”جی کو بیدار کرنے میں کم و بیش کتنا عرصہ لگ جاتا ہے؟“ دھون نے ایک اہم سوال کیا۔

میں نے بتایا ”یہ مدت ہر شخص کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ دو ماہ سے لے کر دو سال تک لگ سکتے ہیں اور بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی بھر کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہر بار ناکام رہتے ہیں۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ دھون نے پوچھا۔

”دھون! ایک بات ذہن میں بٹھالو۔“ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”یہ سارا کھیل لگن اور ارٹ کا زکا ہے۔ جن لوگوں میں ان دو چیزوں یا ان میں سے کسی کے ایک چیز کا بھی فقدان ہوتا ہے، وہ ساری عمر سختی سے رہتے ہیں مگر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

دھون نے ایک اہم نکتہ اٹھایا ”وجدان! تمہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے میں کتنا عرصہ لگا تھا؟“

میں نے بتایا ”عرصہ بیس دن۔“

”یعنی دو ماہ سے بھی کم؟“ اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

میں نے کہا ”دھون! اس میں مجھ سے زیادہ کمال میرے استاد کا تھا۔ ماسٹر یوگ پانی بہت بلند پایہ روحانی و جسمانی علم

کا رہبر تھا۔“

”تم کتنے خوش قسمت ہو وجدان۔“ وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی پھر پر عزم انداز میں کہا ”خیر“ میں بھی کچھ کم خوش نصیب نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے جیسا دوست اور استاد حاصل ہو گیا ہے۔ میں بھی ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دکھاؤں گی۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

دھون کی آنکھوں میں سرخ زورے تیرنے لگے تھے۔ یہ نیند اور بے آراپی کا نتیجہ تھا۔ گزشتہ پوری رات ایک قسم کے ایڈونچر میں گزری تھی۔ ہم دونوں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکے تھے۔ میں خود بھی اپنے جسم میں تناؤ اور تنگی سی محسوس کر رہا تھا۔ تاہم میرا جاگتے رہنا ضروری تھا اس لیے میں نے دھون سے کہا۔

”رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ تمہیں سو جانا چاہیے۔“

”اور کیا تم جاگتے رہو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں! یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”تم بھی تو تھکے ہوئے ہو!“

”میری بات دو مری ہے۔“ میں نے کہا۔

”دوسری کیوں ہے؟“ وہ اپنی فطری شوخی سے بولی۔

”ہر بات بتانا ضروری نہیں ہوتا۔“ میں نے مٹھی سرزنش کی۔

اس نے پوچھا ”پھر کیا ضروری ہوتا ہے؟“

”تم باز نہیں آؤ گی دھون کی بچی!“ میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا ”بولنا بند کرو۔“

”بولنا بند کروں تو پھر کیا کروں؟“ وہ شرارت پر تلی بیٹھی تھی۔

میں نے جھٹ کر کہا ”سو جاؤ!“

اور وہ واقعی سو گئی۔



میری نظر ایلے کی لو پر بھی ہوئی تھی۔

رات کا اندیزہ ہوتا ہے، ایک کانٹیل یہ دیا حوالات کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں سختی دیوار سے سرنگے ایک ٹک دھکیلے کی لو کو دیکھ رہا تھا۔ میرے نزدیک ہی دھون بوسیدہ بنائی پر خستہ حال چادر اوڑھے گری نیند سو رہی تھی۔ اس وقت ہم جس صورت حال سے گزر رہے تھے وہ نہ تو اطمینان بخش تھی اور نہ ہی آرام دہ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

میری آنکھیں بھی بو جھل ہو رہی تھیں۔ مجھے ایک غمار کا سا احساس ہو رہا تھا۔ دیے کی لو دیکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دیے کی حرارت میری آنکھوں کے راستے جسم میں اتر رہی ہو۔ کچھ دیر میں اسی کیفیت میں رہا پھر مجھے اپنا بدن چلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ واقعتاً دیے کی لو سے خارج ہونے والی ”لائٹ انری“ میرے جسم میں اتر کر اس کا درجہ حرارت بڑھا رہی تھی۔

ایکایک مجھے یوں لگا جیسے دیے کی لو نے پھینا شروع کر دیا ہو۔ وہ سختی ی لو بڑی تیزی سے اپنے جسم میں اضافہ کر رہی تھی مگر اس کی شکل و ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ یہی کہا جا سکتا تھا کہ سختی لو نے دیو قامت اختیار کر لی تھی۔

میں لو کے بڑھتے ہوئے سائز کو بڑی خوبیت سے دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب تماشا شروع ہو گیا۔ اس دیو قامت لو میں سے ایک انسانی پیکر نمودار ہو رہا تھا۔ میں یک ٹک نظر جمائے اس پیکر کو کئے چلا جا رہا تھا۔ جب اس کے خدو خال نمایاں ہو گئے تو میرے سینے سے ایک گری سانس خارج ہوئی۔

وہ ملکوتی حسن کی مالک یتلگری تھی!

میں کھلی آنکھوں سے اس جسم حسن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آمد نے حوالات کے کمرے کو مکا دیا تھا۔ وہ سبک خرام قدموں سے ہوا میں چلتی ہوئی میرے نزدیک آئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر وہی دل نشیں مسکراہٹ تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکا تھا۔ میں اس کے کیف آور لمس کو بھی نہیں بھولا تھا۔ اس کے مرمریں بدن کی ایک ایک جنبش میری یادداشت میں نقش تھی۔

میرے قریب پہنچ کر وہ میرے چہرے پر جھک گئی پھر اپنے دو دھیا گداز ہاتھوں میں اس نے میرا چہرہ قہام لیا اور میری پیشانی پر اپنے شگرتی ہونٹ رکھ کر ایک طویل بوسہ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ بند آنکھوں کے پیچھے روشن ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے کوٹ کوٹ کھرچے ہوئے تھے جن سے خارج ہونے والی کرنیں میرے تصور کو جنگا رہی تھیں۔ میرے تصور کی دنیا اس کے لطیف بدن کی خوشبو سے بس گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی عطردان کھول کر رکھ دیا ہوگا۔

اسے گلاب یوں کی نرمی اور نازی کو میری پیشانی میں اتارنے کے بعد جب وہ سیدھی ہوئی تو اس کا انگ انگ مرکا رہا تھا۔ میں ان ناقابل فراموش اور انبساط آور لمحوں کی نشاط انگیزی کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

یتلگری کے نورانی پیکر میں زندگی اپنے ندو جز کے ساتھ

ہلکورے لیتی محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ بولی تو ایسا لگتا جیسے جلتے گنگ بجائے ہوئے۔

اس کی آواز اپنی تمام تر ننگی کے ساتھ سماعت کے راستے میری روح میں اتر رہی تھی۔ میں سرشاری کے عالم میں نیلگی کی مدھر آواز پر توجہ مرکوز کیے لیٹا تھا۔ اس نے سریلے لہجے میں کہا۔

”وجدان! ایک مرتبہ پھر میں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے اس غیبتِ خصلت کو تم بھوش کو ختم کر کے مجھے بیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے کیونکہ ہزاروں سال تک مجھے کوئی ایسی ہستی دکھائی نہیں دیتی جس میں اس راہ کی دشواریاں اور سختیاں جھیلنے کا یا رہا ہو۔ اب میں ہزاروں سال کے لیے امن و سکون سے رہ سکتی ہوں لیکن۔“ وہ ایک لوت اور اس ہوگی۔ اب وہ پیلے والی شلفیت نیلگی نہیں رہی تھی۔

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جگر پاش نظر سے مجھے دیکھا۔ میں تڑپ کر بولا۔

”لیکن کیا نیلگی؟“

اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میرے لیے یہ حیرت اور دکھ کی بات تھی۔ گو تم بھوش کی موت کے بعد نیلگی بڑی شاداں و فرحان رہنے لگی تھی اس لیے اس کی یہ دل گرفتگی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”لیکن وجدان!“ وہ دھکی لہجے میں بولی ”مجھے لگتا ہے، تم کبھی میری بات نہیں مانو گے۔“

نیلگی جب بولتی تھی تو اس کے ہونٹ ساکت رہتے تھے۔ بس اس کی سریلی سرگوشی میری سماعت تک پہنچتی رہتی تھی۔ سچ اس سرگوشی کا سریلہ پن اچانک غم و اندوہ میں ڈوب چکا تھا۔

میں نے بے قرار لہجے میں پوچھا ”میں سمجھا نہیں نیلگی؟ تم کتنا کیا جانتی ہو۔ میں تمہاری کون سی بات نہیں مانوں گا؟“

”میری دلی خواہش یہ تھی کہ تم اپنا چاب بھل کر لو تاکہ میں بیشہ بیشہ کے لیے تمہاری کینیز بن جاؤں مگر تم نے کبھی اس طرف دھیان دینے کی کوشش نہیں کی اور اب تو مجھے یہ اور بھی ناممکن نظر آ رہا ہے کیونکہ۔“

اس نے ایک مرتبہ پر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا ”اب ایسی کیا بات ہو گئی نیلگی؟“

”اب تم نے اپنی دھرتی پر قدم رکھ دیا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کچھ ہوتا ہے وجدان۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں نیلگی۔“ میں نے اچھے ہوئے انداز میں کہا ”ذرا وضاحت سے اور آسان الفاظ میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرو۔“

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر ساکت لبوں سے سرگوشیانہ انداز میں بتانے لگی ”وجدان! تم مسلمان ہو تمہاری رگوں میں مسلمان والدین کا خون ہے۔ مسلمان چاہے اور متروغیرہ کو اچھا نہیں سمجھتے اور جب سے تم نے اپنے ملک کی زمین پر قدم رکھا ہے، میں محسوس کر رہی ہوں تم اپنے باطنی سے نانا توڑتے جا رہے ہو۔ تمہارے اندر وہ مسلمان انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔ اب مجھے نہیں امید کہ تم کبھی اپنا چاب مکمل کرنے کی کوشش کرو اس لیے میں کلی طور پر تمہارے تصرف میں نہیں آسکوں گی لیکن۔“

”تم بار بار اپنی بات کو ادھورا کیوں چھوڑ دیتی ہو نیلگی؟“

”جھوٹو رہنے دو۔“ وہ جان چھڑانے لگی۔

”نہیں، تمہیں بتانا ہو گا۔“ میں نے اصرار کیا۔

وہ چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد بولی ”تم نے میری دلی ہوئی مالا کی بھی حفاظت نہیں کی۔“ اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

”وہ بات دراصل یہ ہے نیلگی۔“ میں نے جلدی سے کہا ”مالا کی گمشدگی میں میرا کوئی قصور نہیں۔ ہم ایک ایسا صورت حال سے دوچار تھے کہ ہمیں اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی ”میں جانتی ہوں مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ تمہیں اس زیاں پہ کوئی افسوس بھی نہیں ہو رہا۔ تم نے اس دوران میں ایک مرتبہ بھی شدت سے مالا کی جدائی کے بارے میں نہیں سوچا۔“

”میں اپنی اس کوتاہی پر تادم ہوں نیلگی۔“ میں نے خلوص دل سے کہا ”تم تو جانتی ہی ہو، ہم یہاں آتے ہی کن حالات کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ دوبارہ اس ریگزار میں جا کر مالا کو تلاش کروں۔“

”اس کی ضرورت نہیں وجدان۔“ وہ اداس مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی ”وہ مالا میرے پاس پہنچ چکی ہے۔“

میں اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا بخوبی جانتی ہوں۔“

”کہاں ہے وہ مالا؟“ میں نے بے سانس پوچھا۔

”میں نے بتایا نا، وہ میرے پاس ہے۔“

”مجھے نہیں دو گی؟“

”نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے قطعیت سے بولی۔

”کیوں ناراض ہو؟“

”میں تم سے ناراضی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”پھر بلا دینے میں تردد کیوں؟“

وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی ”تمہیں اس مالا کی حاجت نہیں ہے۔“

”کیا کسی کو دیا ہوا تحفہ واپس لیا جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی ”میں نے وہ مالا تم سے واپس نہیں لی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس تحفے کی حفاظت نہیں کر سکتے۔“

”اس کو تابی کے لیے میں ندامت کا اظہار کر چکا ہوں نیلگی۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”اگر اس سے تمہاری شفقت نہیں ہوتی تو میرے لیے کوئی سزا مقرر کرو۔“

وہ شامی لہجے میں بولی ”کیسی باتیں کرتے ہو وجدان! میں تمہیں کوئی سزا دینے کے بارے میں بھلا کیسے سوچ سکتی ہوں۔“

میری تو شدید ترین تنہا یہ تھی کہ تمہاری کینیز بن کر میں تمہارے قدموں میں رہوں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اب میں کسی دوسرے طریقے سے تمہارا قرب حاصل کرنی رہوں گی۔“

”تم تو بہت ڈرانے والی باتیں کر رہی ہو نیلگی۔“

”ذرو مت وجدان۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی ”ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تم مرد ہو، مرد کے بچے ہو۔ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرو۔“

”میں نے زندگی بھر مردانہ وار ہی حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قوت گزارا ہے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگی۔ تم یہاں تک جتنی ہو، تھامی کی ترائیوں میں مقیم ایک پر اسرار قوت ہو۔“

وہ اپنی صراحی وار گردن کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی ”ہاں میں بس کچھ جانتی ہوں۔ میں تھامی کی جتنی ہوں۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے عزت ہوگی اور سادھو اپنی زندگی مشکل اور کٹھن جاپوں کی نذر کر دیتے ہیں مگر چونکہ ان کی نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، وہ مجھے اپنی برتری منوانے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں، نوع انسانی کو اپنے قدموں میں جھکانے کے خواب دیکھتے ہیں اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے لیکن تم۔“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی پھر چند لمحوں بعد خود ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”تم نے مجھے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تم نے

مجھے ایک مکروہ شخص کے قبضے میں جانے سے بچایا ہے۔ میں اس کے لیے زندگی بھر تمہاری شکر گزار رہوں گی۔ تم نے کہا، مجھے تمہاری زندگی کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو گا۔

ہاں! میں تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جانتی ہوں۔ تم نے بچپن سے نوجوانی اور پھر جوانی تک ایک جنگ لڑی ہے بلکہ جنگ لڑ رہے ہو اور آجہ بھی زندگی بھر یہ جنگ لڑتے رہو گے۔ یہ نیکی اور بدی کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں بالآخر فتح نیکی ہی کی ہوتی ہے مگر کٹھن نیوں اور مشکلوں سے گزرنے کے بعد۔ وجدان! تم ایک سچے انسان ہو، نیکی کے علمبردار ہو اس لیے فتح و کامرانی اور نصرت و شادمانی بیشہ تمہارے قدم چوسے گی تمہارے۔“

وہ ایک مرتبہ پھر بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا وجود ساکت تھا لیکن جب وہ بولی تھی تو لگتا تھا، اس کے اندر کوئی ناپیدہ قوت، کوئی سرگرم حرارت موجزن ہو۔

اس کا ہر عضو خاموشی کی زبان بولتا تھا۔ وہ بات کے مفہوم اور اہمیت کے مطابق اپنے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی لے آتی تھی۔ کبھی وہ بہت غم زدہ اور لمول نظر آنے لگتی، دل گرفتہ اور آزرده دکھائی دینے لگتی، کبھی وہ سنجیدہ اور شکوہ کنان بن جاتی اور کبھی کبھی کھلی کھلی ہنسی ہوتی۔ اس کی سلکوتی مسکراہٹ سے پھول جھڑتے تھے اس کا انداز اپنے اندر رگل افشانی کی خاصیت رکھتا تھا، وہ ایک روح پرور نگارہ تھی،

حسن کی ہر ادا اس سے آشکارہ تھی۔

اس مرتبہ نیلگی کی خاموشی کو میں سہ نہ سکا، بے اختیار میں نے پوچھا ”تم نے، ٹھکر“ پر اپنی بات کو روک دیا ہے۔ کیوں نیلگی! ایسا کیوں؟“

وہ مدبرانہ انداز میں سنجیدہ ہو گئی پھر کسی مفکر کے لیے لہجے میں بولی ”وجدان! تم نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا تجربہ حاصل کر لیا ہے لیکن ایک شعبے کے بارے میں تمہاری معلومات مفکر کے برابر ہیں۔“

”وہ کون سا شعبہ ہے نیلگی؟“ میں متعجب نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

”وہ شعبہ ہے۔ عورت!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں الجھ گیا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تم عورت کے مزاج، اس کی فطرت، اس کی سرشت اور اس کی عادت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔“ وہ نفسیانہ انداز میں بولی۔

میں نے بدستور اچھے ہوئے لہجے میں کہا ”ذرا وضاحت کرو۔“

آتش فشانی ۱۱۱ حصہ ۱۱









سائیں بھی ہمارے ساتھ جائیں گے؟“

”نہیں“ وہ میاں سے سیدھا اپنے گھر جائیں گے۔“ میر بخش نے جواب دیا ”مٹھی تک ہم آپ لوگوں کو پہنچائیں گے۔“

میر بخش کا ساتھی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اسے اشارت کر چکا تھا۔ اس دوران میں رئیس خان کی بچارو حرکت میں آگئی تھی۔ میں اور دھونچیلے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار ہونے کا راستہ بھی عقبی سمت میں تھا۔

ہم گاڑی کے اندر بیٹھ چکے تو میر بخش نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا اور خود جا کر گاڑی کے اگلے حصے میں سبجوز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور مٹھی کی جانب ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

سامان کے نام پر ہمارے پاس وہی سفری بیگ تھا جس میں کیپڑوں کے علاوہ ہمارے روز مرہ استعمال کی چند چیزیں تھیں۔ تھانے دار نے یہ بے ضرر سامیگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اگر بیگ نہ بھی دیتا تو ہم خوش تھے۔ زادی سے بڑی نعمت دنیا میں اور کوئی ہو سکتی۔ ہمیں یہ آزادی مبلغ پچاس ہزار روپے کے عوض حاصل ہوئی تھی۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور وہ یہ کہ وہ رقم مجھے دی گئی تھی وہ رئیس خان نے اپنے پاس سے دی تھی۔ اس سے تو بیک بات ظاہر ہوتی تھی کہ تھانے دار نے ابھی پنڈت کشوری لال سے رقم وصول نہیں کی تھی۔ وڈیرے کو وہ رقم ملنے کی تمنا تھی جیسی اس نے اپنے پاس سے مجھے رقم ادا کر دی تھی۔ بعد میں پنڈت سے پچاس ہزار روپے لٹکوا کر وہ بیس ہزار اور تیس ہزار آپس میں بانٹ لیتے۔ تھانے میں بات چیت کے دوران میں میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس سلسلے میں تھانے دار سے پوچھوں لیکن پھر میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ دراصل ہمیں اس جھیلے سے نجات ملنے کی اس قدر خوشی تھی کہ میں کسی تردد میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اوکھلی میں سرورے دیا تھا تو پھر مہسولوں کا کیا ڈر!

راستے میں پہلے موڑ پر وڈیرے کی بچارو دائیں جانب مڑ گئی۔ ہماری گاڑی کی رفتار میں بدترج اضافہ ہونے لگا۔ میں اور دھونچیلے جھتکتے گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات پر غفلت کرنے لگے۔ یہ وقت ہم پر بہت بھاری گزرا تھا۔ ان گھنٹوں کی سنگینی اور سفاکی کو ہم کبھی فراموش نہیں

کر سکتے تھے۔

بات کرتے کرتے اچانک دھونچیلے کھانسی آئی، پھر اس کی کھانسی طویل ہونے لگی۔ میں نے بھی محسوس کیا جیسے گاڑی کی اندرونی فضا میں گھٹن سی در آئی ہو۔ وہ گاڑی ہر طرف سے بند تھی۔ انٹرکنڈیشنز ہونے کے سبب اسے انٹرناٹ کھول دیا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے بھی ٹھنک لگا اور سانس لینا، سوار محسوس ہونے لگا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ہمارے ساتھ کوئی ”کارروائی“ ہو چکی ہے۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں کوئی زہریلی چیز شامل ہو چکی تھی جو لمحہ بہ لمحہ ہماری سانسوں کو مشکل سے مشکل تر بن کر رہی تھی۔

دھونچیلے کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اب وہ ہاتھ پیر پکڑ کر اکڑی اکڑی سانس لے رہی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کیبن والے شیشے کو بجا کر گاڑی کے اگلے حصے میں بیٹھے ان دو افراد کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا لیکن لگتا تھا وہ پتھر کے بت بن گئے ہوں جو پلٹ کر دیکھنا نہ جانتے ہوں۔ مجھے اپنے سینے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دھونچیلے دم اور بے حواس ہو کر گاڑی کے فرش پر ڈھے گئے۔

میرے اندر مہم جوئی کی جتنی قوت باقی تھی اس کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے گاڑی کے عقبی دروازے میں نصب ہینڈل پر طبع آزمائی شروع کر دی لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی مجھ پر یہ رون فرسا انکشاف ہوا کہ وہ دروازہ لاک ہو چکا تھا۔ دراصل اس دروازے میں کوئی خود کار لاک لگا ہوا تھا۔ جب اس دروازے کو زور سے بند کیا گیا تھا تو وہ آٹومٹک لاک بند ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے جسم و جان کی یوری قوت صرف کر کے دروازے کے ہینڈل کو جھنجھوڑ ڈالا مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب میرے اعصاب اور حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں نفوذ شدہ اس زہریلی گیس نے میرے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی ہو۔

وہ موت کی پیام برسیاہ گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور میں زندگی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ میرا سفر روشنی سے تاریکی کی طرف تھا۔ ان نازک لمحات میں میرے ذہن میں جو خیال آیا وہ یہ تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس معصوم صورت، کانچ کی گڑبا دھوپر کی سی ہے؟ پھر میرا ذہن گری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

تاریکی موت ہی کا ایک روپ ہے۔

موت جتنی بے رحمی سے زندگی کو چاٹ جاتی ہے اتنی ہی بے دردی سے تاریکی روشنی کو کھٹک جاتی ہے۔ اندھیرے کی اندرونی کھیل درحقیقت زندگی اور موت کا کھیل ہے جس میں بہت جلد اس کی ہوتی ہے جو دوسرے پر بھاری پڑے اس پر بہت لے جائے۔

ہم جس ملک صورت حال سے دوچار ہوئے تھے وہ ہمارے لیے غیر متوقع اور ناگہانی تھی۔ دھونچیلے آنکھوں کے سامنے دم ہو کر سیاہ گاڑی کے فرش پر ڈھے گئی تھی جب کہ میں نے زندگی کی بازی جیتنے کے لیے آخری حد تک ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن میری پیش نہ چلی اور حالات کے جبر نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔

میں نہیں جانتا، یہ بے گانگی کب تک مجھ پر طاری رہی تھی اور اس دوران میں ہمارے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے نام ہوش میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ حواس پر چھائی ہوئی دھند دھیرے دھیرے زائل ہوئی تو میرا ذہن سوچنے لگتا تھا کہ قاتل ہوا اور میں اپنے گرد و پیش کو محسوس کرنے لگا۔

میرے جسم کو لگنے والے ہلکے ہلکے ہتھکڑے اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ میں کسی گاڑی میں محو سفر تھا گاڑی اور سفر کے خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ماضی قریب کا احوال روشن ہو گیا اور پھر یکے بعد دیگرے وہ ناخوش گوار واقعات یاد آئے گئے۔ میں ان ناگہانی واقعات کی ناخوش گواریت اور تلخی کو بھٹکا کیسے بھول سکتا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک سنگین دھوکا کیا گیا تھا۔ انسان ہمدردی اور سلوک کے واقعات تو بھول سکتا ہے مگر بے رحمی سفاکی اور دھوکا دہی کے واقعات کو فراموش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

جیسے جیسے میرے حواس بجا ہو رہے تھے، میں خود کو پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں اور دھونچیلے قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور سرحدی محافظوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ سرحدی محافظوں نے ضروری کارروائی کے بعد ہمیں ہمارے ”ہیڈ کوارٹر“ پنڈت کشوری لال کے ہم راہ مقامی پولیس کے قافلے ”روٹا“ پر منتقل کیا تھا۔ ان چاروں اچانک۔ ہم پر مہربان ہوئے اور ہمیں مبلغ پچاس ہزار کے عوض چھوڑنے پر تیار ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہمیں یہ حفاظت مٹھی تک پہنچانے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ ایک مقامی وڈیرا میں خان تھا انچارج کا حصہ دار تھا اور ہمیں اسی کے آدمیوں

کے ساتھ گھریا کر سے مٹھی تک جانا تھا۔

ہمیں ایک ایسولینس نمسیاہ گاڑی میں بٹھایا گیا تھا پھر ہمارے سفر کو شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمارے ساتھ وہ کچھ ہو گیا تھا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ سیاہ گاڑی مکمل طور پر انٹرکنڈیشنز تھی، ہمیں گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار کرایا گیا تھا جبکہ وڈیرے کے آدمی اگلے حصے یعنی ڈرائیونگ کیبن میں تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان مضبوط شیشے کی دیوار کا انتظام خصوصی طور پر کیا گیا تھا ورنہ عام طور پر ایسولینس میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ جب ہمیں اس سیاہ گاڑی میں بیٹھایا جا رہا تھا تو میرے خواب و خیال میں بھی کہیں یہ بات نہیں گئی تھی کہ ہمیں اس چوہے دان میں قید کیا جا رہا ہے۔ عقبی دروازے کے مقفل ہونے کا انکشاف تو اس وقت ہوا تھا جب مجھے زندگی بچانے کی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا، سفر کے دوران میں پہلے دھونچیلے ٹھکانا لگا تھا پھر وہ کھانسی لگی تھی پھر گاڑی کی اندرونی فضا میں مجھے بھی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی، اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس انٹرکنڈیشنز فضا میں کہیں سے کوئی زہریلی چیز داخل کی گئی تھی جو ہماری سانسوں کو گھٹا کر مشکل سے مشکل تر بنا رہی تھی۔ ڈرائیونگ کیبن میں موجود وہ دونوں افراد اس زہریلی شے کے ملک اثرات سے محفوظ تھے اور ہماری کپڑا کی سرکس فریاد پر کان دھرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دراصل یہ انہی کی کارستانی تھی۔ میں جس فضا کو زہر اکود سمجھا تھا وہ درحقیقت ہوش و حواس سے بے گانہ کر دینے والی فضا تھی، بے ہوشی طاری کرنے والی فضا، وہ دونوں بد معاش ہمیں بے ہوش کرنا چاہتے تھے اور اپنی اس مذموم کوشش میں وہ کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

اس خوف ناک خیال نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ کھلی آنکھوں سے میں نے جو پہلا منظر دیکھا وہ دھونچیلے سر پار پر مشتمل تھا، ہونڈ گاڑی کے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس پر کسمپرسی آئی ہو، دھونچیلے کیفیت نے میرے دل میں درد کی ایک لہر بگڑائی، مجھے یاد آیا، جب میں گاڑی کا عقبی دروازہ کھولنے میں ناکام رہا تھا اور ذہن تیزی سے تاریکی میں ڈوب رہا تھا تو ان نازک ترین لمحات میں میں دھونچیلے کے بارے میں سوچ رہا تھا اس وقت میں اس تشویش میں مبتلا تھا کہ اگر خدا نخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو دھونچیلے کیا کرے گی۔

میں اب مکمل طور پر ہوش و حواس میں آچکا تھا اور مجھے

یہ یقین ہو گیا تھا کہ خدا کا شکر ہے، مجھے ایسا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا، تاہم دھنوں کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ ضرور کچھ گڑبڑ ہے وہ آڑی ترجمی بے سدھ پڑی تھی۔ اسے چھوٹنے کے لیے میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سکتے میں رہ گیا۔

دھنوں کی جانب ہاتھ بڑھانے کی خواہش کو میں عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اس کوشش کے دوران میں مجھ پر یہ روح فرسا انگشاف ہوا کہ میں اپنے ہاتھ کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت نہیں دے سکتا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے دونوں ہاتھ الٹی بھٹکری میں مقید ہیں۔

میں نے تشویش ناک انداز میں دھنوں کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی کارروائی کی گئی تھی تاہم طریقہ کار زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب ٹائیکون کی مضبوط رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ انہیں زیادہ خطرہ مجھ ہی سے تھا۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ ہماری بے ہوشی کے دوران میں ہمارے ساتھ یہ کارروائی کی گئی تھی۔ جب انہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ ہم انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہے یا ان کے کسی عمل کا رد عمل ظاہر نہیں کریں گے تو انہوں نے گاڑی روک کر مجھے الٹی بھٹکری لگائی ہوگی اور دھنوں کے ہاتھ ٹائیکون کی ڈوری میں جکڑ دیے ہوں گے بعد ازاں گاڑی کا عقبی دروازہ دوبارہ مقفل کر کے گاڑی آگے بڑھا دی ہوگی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ہمیں اغوا کیا جا رہا تھا۔ اس طے شدہ بات کے ساتھ ہی ذہن میں جو پہلا سوال سر اُبھار رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اس لقمہ ووق صحرای میں ہمارا ایسا کون سا دشمن تھا جس نے ہمیں اغوا کروایا تھا اور کیوں؟

میرا خیال بار بار ریش خان کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ تھانے سے ہمیں اسی شخص نے ”نجات“ دلائی تھی اور اسی کے آدمیوں کے ساتھ ہم سفر روانہ ہوئے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ریش خان ہمیں کیوں اغوا کر رہا تھا وہ تو ہمارے سفر کے آغاز ہی ہم سے جدا ہو گیا تھا۔ ریش کے ایک آدمی میری بخش نے بتایا تھا کہ وڈیرا اپنی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا تھا اور ہمیں ان دونوں کے ساتھ گھبرا کر کے صدر مقام طبعی تک جانا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں مصروف تھا کہ ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند ذہن میں چمکا۔ کہیں ہمارے اغوا میں

ان دو افراد ہی کا ہاتھ تو نہیں؟ ممکن ہے؟ یہ دونوں اپنے پر یہ کارروائی کر رہے ہوں جس سے ان کا کوئی خاص فائدہ وابستہ ہو!

پھر مجھے وہ واقعات یاد آنے لگے جب تھانے میں ریش خان نے اپنا خوف دور کرنے کے لیے میرا ”چیک اپ“ کیا تھا۔ وہ میرے دائیں کان کے عقب میں کوئی سرخ لالائی تلاش کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی خون آشام اندر عفریت اس صحرای میں وارد ہو چکا ہے جس کے ساتھ اچھا خوب رو اور دل کش حینہ بھی ہے۔ وڈیرا میرے کان عقب میں جھانک کر سلی کرنا چاہتا تھا کیوں کہ دھنوں کے ساتھ میرے ساتھ ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔ وڈیرا میرے کان کے تنقیدی معائنے کے بعد مطمئن ہوا تھا۔ ان لوگوں کی ذہنی پسماندگی اور توہم پرستی کے بارے میں سوچ کر مجھے ایک مرتبہ پھر ہنسی آگئی۔

میں نے بے اختیار ڈرائیونگ کہیں کی طرف اپنی سی سی نگاہ ڈالی۔ وہ دونوں مردود سامنے دھیان رکھے اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔ میرے اندر بڑی سرعت یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے ان دونوں سے بے حد معاملہ ہے۔ ضرورت ہے۔ ممکن ہے، وہ گاہے گاہے بیک و فوروں ہمارا جائزہ لے رہے ہوں!

میں نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کے فرش پر بے سدھ دھنوں کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم میں حرکت نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ میری تشویش دو چند ہو گئی۔ میرے ذہن مختلف قسم کے خدشات سر اٹھانے لگے کہ خدا خواست دھنوں؟

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ میں اس سے ڈر کر سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنی موجودگی میں دھنوں کے ساتھ اوجھڑ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہونٹوں پر اگر اسے کوئی ملک گزند پہنچ جاتی تو میں خود کو بھی حاکم نہیں کر سکتا تھا۔

مجھ کچھ کرنا تھا۔ بہت کچھ کرنا تھا۔ دھنوں کے لیے اچھے، ہم دونوں کی یہ حفاظت آزادی کے لیے دھنوں کی بہت نازک تھی۔ اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سانس لے بھی رہی ہے یا نہیں۔ طویل اور لمبے ہوشی اس کے ذہن کے نازک اور حساس سیکڑ (Sensors) کوئی ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔

میں نے کن آنکھوں سے ڈرائیونگ کہیں کی طرف دیکھا، وہ دونوں بہ دستور وند اسکرین کے پار دیکھ رہے

ہمیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی دھنوں کی طرح گاڑی کے فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اپنے بدن کو لگنے والے ہچکولوں کی زمین دھیرے دھیرے دھنوں کی جانب سرکنا شروع کر دیا اور چند لمحات کے بعد میرا جسم دھنوں کے بدن کے ساتھ جا لگا۔ میں نے دھنوں کے لمس پر اپنی بھرپور توجہ مرکوز کر دی اور غور سے دھنوں کی دیر بعد میں اس خوش گوار نتیجے پر پہنچا کہ دھنوں میں زندگی کی حرارت موجود تھی۔ اس کی سانس بہت تھم تھم کر چلی رہی تھی۔ وہ اس وقت گہری بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس خیال نے مجھے قلبی تقویت پہنچائی کہ دھنوں زندہ تھی تاہم میری تشویش ابھی پوری طرح رفع نہیں ہوئی تھی۔ دھنوں کو بے خبری کی اس حالت میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ ہمیں جو صورت حال درپیش تھی اس سے نکلنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا ضروری تھا اور۔۔۔ ”اس عملی قدم“ کے لیے میرے ہاتھوں کا آزاد ہونا لازمی تھا۔ میں اپنے ہاتھوں سے پیوست بھٹکری سے پھٹکارا پانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ اپنی بائیں اور دو بائیں صلاحیتوں کا عام استعمال صرف اس وقت کروں گا جب جان پر بن آئے گی اور وہ بھی مثبت انداز میں درندہ داری مسائل سے نمٹنے کے لیے میں حتی الوسع داری کو کشش ہی کروں گا۔ سب سے پہلے میں اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو آزماؤں گا۔ جب معاملہ ان صلاحیتوں کے بس کا نہ رہا اور ضروری بھی ہو تو ٹھیک ہے، پھر میں اپنے اندر موجود ہر اسرار قوت ”جی“ سے ضرور کام لوں گا۔

میرے دونوں ہاتھ الٹی بھٹکری میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں اپنی جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس الٹی بھٹکری کو سیدھی بھٹکری میں بدل سکتا تھا۔

اور ہمسائے کی تربیت جی جی تھی۔ ہمسائے میں جسمانی ٹیک میں جو اہمیت حاصل ہے۔ خاص طور پر ”سرساٹ“ وغیرہ سے جو پورے جسم کو فضا میں ایک گولے کی شکل دیتا ہوتا ہے۔ اس طرح ریش خان میں بھی جب ”روٹنگ“ کی تھی۔ اس کے ایک بال کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ میں ”روٹنگ ٹیکنیک“ کو سیدھی بھٹکری میں لانے کے لیے میرا یہ فیصلہ قدرے رکی تھا۔ رکی۔۔۔ ٹیکنیک کے

حوالے سے نہیں بلکہ اس میں خطرہ اس بات کا تھا کہ ڈرائیونگ کہیں میں موجود ہمارے اغوا کنندگان کہیں میرے جسم کی حرکات و سکنات کو دیکھ نہ لیں۔

اس واضح خطرے کے باوجود بھی میں نے اپنے فیصلے پر عمل کا ارادہ کر لیا کیوں کہ کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی تھا۔ رسک کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ میں اپنی خاطر تو کسی مناسب موقع کا انتظار کر سکتا تھا مگر دھنوں کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں اس وقت امپریٹس نماسیہ گاڑی کے فرش پر دھنوں کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ذہن میں اس کارروائی کو دہرایا جس میں مجھے ”روٹنگ ٹیکنیک“ استعمال کرتے ہوئے۔۔۔۔۔ اپنے بھٹکری زدہ ہاتھوں کو سامنے کی طرف لانا تھا۔

سب سے پہلے مجھے سر سائٹ کے انداز میں اپنے پورے وجود کا ایک گولا سامنا تھا۔ گھٹنوں کو پیٹ کے اندر دھنسا نا تھا۔ ایزبوں کو کولھوں سے پیوست کرنا تھا اور گردن کو جھکا کر سینے میں دبانا تھا۔ اس کے بعد اپنی کمر کی بھرپور ٹیک کا استعمال کرتے ہوئے بھٹکری زدہ ہاتھوں کو کولھوں کے نیچے سے گزارتے ہوئے سامنے کی طرف لانا تھا۔ گویا کولھوں کو محور مان کر جسم کے گولے کا بازوؤں کے درمیان سے گزانا تھا۔ اس طرح کہ بھٹکری والا۔۔۔ ہاتھ میری پشت کے بجائے پیٹ پر سامنے کی طرف آ جائے۔ اس پوزیشن میں، میں بھٹکری سمیت بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔

میں نے ایک محتاط نگاہ ڈرائیونگ کہیں میں بیٹھے ہوئے ان دو افراد پر ڈالی پھر مطمئن ہو کر ”یکشن“ کے لیے تیار ہو گیا۔ فرش پر لیٹے لیٹے میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں اور اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں ”ایک قدم“ بھی آگے بڑھان، ایک زوردار دھکا ہوا۔

وہ ساعت ٹھنک دھکا گاڑی کا ٹائیر پھٹنے سے ہوا تھا۔ گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے فضا میں اچھلی پھر چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی بریک کی تیز چرچاہٹ بلند ہوئی۔ ٹائیر پھٹنے سے گاڑی کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی اس لیے ڈرائیور کو بہ حالت مجبوری بریک لگانا پڑا تھا۔

شاید ایسے ہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے، ”ہمت مردان“ مدد خدا۔ میں نے ایک مثبت اقدام کے لیے ہمت سے کام لینے کا آغاز کیا ہی تھا کہ قدرت نے مجھے اس ”کام“ کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لیے ایک منبری موقع فراہم

گاڑی بجی سڑک سے اتر کر صحرائی جھاڑیوں میں پھنس گئی تھی۔ میں اس دوران میں، بھنگولی والا ”ممرک“ مار چکا تھا اور اب دھوکے اوپر اس طرح پڑا تھا کہ نہ تو دھوکہ میرے بوجھ تلے دب سکے اور نہ ہی ذرا یوگ کین میں موجود افراد کو میرے بھنگولی والے ہاتھ نظر آئیں۔ میں نے نہایت مہارت سے اپنے وجود کو مطلوبہ ذرایے پر سیٹ کر رکھا تھا۔ میری آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ تقریباً ان معنوں میں کہ میں پلوں کی درز میں سے ذرا یوگ کین پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ جب میں دھوکے اوپر آیا تھا تو وہ خفیف سا کسمساں تھی شاید یہ اس جھٹکے کا رد عمل تھا جو ہمارے سینے سے گاڑی کو لگتا تھا، تاہم اس وقت دھوکہ دوبارہ ساکت ہو چکی تھی جو کوئی تلی بخش بات نہیں تھی۔

”میری نگاہ“ ڈراما یونگ کیمین کے پیشے پر جی ہوئی تھی۔ گاڑی رکے ہی وہ دونوں ڈراما یونگ کیمین سے باہر نکل آئے تھے یعنی وہ گاڑی سے نیچے اتر گئے تھے۔ ایک بات تو یہ تھی کہ ٹائر تبدیل کیے بغیر آگے سفر جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ گاڑی سے باہر نکلنے کے بعد وہ دونوں مجھے نظر نہیں آ رہے تھے تاہم ان کے قدموں کی چاپ اور باتوں کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ گاڑی کی عقبی جانب آ رہے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح چاندو بند ہو گیا اسی وقت میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی رفتار سے پیدا ہوا اور میں نے اپنی سوچ کے نتیجے میں بے اختیار گاڑی کے فرش پر سیٹوں کے نیچے نظر دوڑائی۔ میری متلاشی نظر فکرمجھکے میں اس چیز تک پہنچ گئی جس کے بارے میں میرے ذہن نے سوچا تھا۔

وہ گاڑی کا ایک فاضل ٹائر تھا جیسا کہ ہر گاڑی میں ایمرجنسی کی صورت حال کے لیے ایک اسپیر ٹائر رکھا جاتا ہے۔ مذکورہ ٹائرا اس سٹ کے نیچے رکھا تھا جس پر بے ہوش ہونے سے پہلے دھن دھن بھی ہوئی تھی۔ اب ایک بات یقینی تھی کہ گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے کے لیے انہیں گاڑی کے چھپلے حصے کو کھولنا پڑتا تھا جہاں فرش پر ہم دونوں بڑے تھے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ وہ جیسے ہی گاڑی کا عقبی دروازہ کھولتے، میں بھرپور "کارروائی" کر سکتا تھا۔ مجھے پورا دھن دھن تھا کہ میں جھکری لگے ہاتھوں کے ساتھ بھی بڑا ٹھیک تھا کہ ان سے نمٹ سکتا تھا۔ یہ بات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا کہ وہ دونوں تسلیم تھے تھے میں جب وہ دھڑیرا رئیس خان کے دائیں بائیں کھڑے تھے تو ان کے ہاتھوں میں میں نے کلا شکو میں دیکھی تھیں پھر جب وہاں سے

روانہ ہوئے تھے تو مجھی یہ ہتھیار ان کے پاس ہی تھے  
میں کسی بھی ایکشن کے لیے تیار تھا کہ ایک فورڈ  
نے مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے  
بستر پر ہو گا کہ پہلے انہیں گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے دیا  
تاکہ ازاں بعد مجھے وہاں سے روانہ ہوتے وقت کسی دعو  
کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں سانس روک کر روانہ ہو  
تھا کرتے لگا۔

چند کینڈہ بعد میری امید بر آئی۔ دروازے کے بالکل بائیں کونے کی آواز آئی پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ میری آنکھیں ابھریں۔ دروازے پر ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی پٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا: "میرے پاس ایک بات ہے۔" اس نے کہا: "میرے پاس ایک بات ہے۔" اس نے کہا: "میرے پاس ایک بات ہے۔"

ادھے ہٹنے کے اندر اندر گاڑی کا پشٹا ہوا غائب  
 کی جگہ صحیح سلامت ٹائر فٹ کر دیا گیا۔ اب میرے  
 وقت سر پر آن پہنچا تھا۔ مجھے ہی وہ مجروح ٹائر کو گاڑی  
 میں رکھ کر دروازہ بند کرنے لگے، مجھے حرکت میں آنا  
 بھی ہو جاتا اس سے منہا تھا۔

ٹائری تبدیلی کے دوران وہ دونوں آپس میں سندھی  
ت چیت بھی کرتے رہے تھے۔ میں سندھی زبان کو بول  
س نہیں سمجھتا تھا، ہم دس فی صد مفہوم میرے لئے  
— وہ دونوں اس ناگمانی افادہ پر جھلے ہوئے تھے۔ مجھے  
یا توں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ مقررہ وقت پر کب  
چنا چاہتے تھے اور ٹائپ کرنے کی وجہ سے وہ آدھا گھنٹا  
کے تھے۔

گاڑی کی عقبی سٹ پلٹے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔  
 سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایک ہی شخص تھا اس کے ساتھ  
 ایک بونگ کمبلن کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ یہ گاڑی  
 میں جانب کا دروازہ تھا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ  
 شاہد مشکوف برادر پینچر سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے  
 رات بھی صاف ہو گئی کہ مجروح ٹائر گاڑی میں رکھے  
 ڈرائیور کو آنا تھا اور وہی گاڑی کا عقبی دروازہ بند  
 کیا تھا۔

میرے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ظاہر ہے  
یہ مسلح شخص کی بہ نسبت بہتے آدمی سے نمٹنا آسان ہے۔

جیسے ہی ڈرائیور بیٹھے ہوئے ٹائز کو سیٹ کے نیچے کھسکا کر سیدھا ہوا، میں نے تھک گئی کا ایک بھرپور وار اس کے چہرے پر کیا۔ یہ ایک آہنی دوپٹہ تھا جس کی ٹو فانی ضرب نے ڈرائیور کو بلبلانے پر مجبور کر دیا۔

ذرا نیور کی درو میں ڈوبی ہوئی بیچ کر میز جس سے ایل  
جنگل سے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر اس دوران میں ذرا نیور کو اپنی  
ہاتھوں میں رکھ کر گاڑی سے اس طرح باہر پھینک چکا تھا جیسے  
کسی تپ سے گولا داغا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی میں خود  
بھاگنے لگا گاڑی سے باہر نکلتا تھا۔

گاڑی رکھنے سے ارنکند بستر میں کوئی الگ تفریق خرابی واقع ہو  
گئی تھی کہ اس نے خاموشی سے ”پپ“ سادھ لی تھی اسی  
لے ڈرائیور اپنی سائڈ کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا میرٹھ میں  
بھی اپنی سائڈ کا کیش گر لیا تھا اسی وجہ سے ڈرائیور کی  
”اہلاٹ“ اپنے تمام تر صوفی اثرات کے ساتھ میرٹھ کی  
ساتھ تک پہنچ گئی تھی۔

میں جب میر بخش کے سر پر پہنچا تو وہ گاڑی سے باہر آچکا تھا پھر محل اس کے کہ وہ کلا شیٹوں کا رخ میری جانب کرتا میں نے اس شیٹ پر لے کر ایک زوردار فرنٹ پیش لگ اس کے سینے پر رید کر دی۔ وہ چوڑے سینے کا مالک اور دراز قامت شخص تھا۔ پھر اس کے بدن کی مضبوطی میں بھی کوئی کلام نہیں تھا مگر میری کلک بھی کوئی عام سی ٹھوکر نہیں تھی۔ اس میں عمو وغصہ وافر مقدار میں شامل تھا۔

میر بخش گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جا۔ اس کا سر اسنیگ وھیل سے ٹکرایا مگر اس کا جسم رک نہیں۔ میری لگ کے زبردست ہش نے اسے لڑھکاتے ہوئے ڈرائیور سائڈ کے کھلے ہوئے دروازے سے گاڑی کی دوسری سمت رستیل زمین پر پہنچا دیا۔ ہم اس نے اس دوران میں کلا ٹکھنوف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

جب میر بخش ڈرائیونگ کیبن میں لوٹھک رہا تھا تو گاڑی کے وسیع ویسٹ بورڈ پر مجھے ایک کلاشکوف رکھی نظر آئی۔ یہ یقیناً ڈرائیور کا، شہیار تھا جسے میں نے گاڑی کے عقب میں لٹک بھگ بیس فٹ دور ریت میں اچھال دیا تھا۔

تجربہ کرنا تھا۔ اس وقت صحرائیں گیس کہیں جھاڑیوں کا وجود بھی نہ تھا۔ سر پر آسمان آگ برس رہا تھا۔ میں نے اپنے تمام کام میں لاتے ہوئے اندازہ لگایا کہ وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم علی الصباح تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔

مطلب تھا، ہم تقریبات گھنٹے بے ہوش رہے تھے، اور دھن تو ابھی تک گاڑی کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔

میں عقلی نظر سے میری بخش کو دیکھتے ہوئے اس کی جانب سے  
 بڑھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور کلا شکوف کو میری طرف  
 سیدھا کر چکا تھا۔ یہ بہت نازک لمحات تھے۔ اگر میں ایک منہ  
 کی بھی کوئی کر جاتا تو کلا شکوف سے نکلنے والی گولیوں کی  
 بوجھار مجھے چھلنی کر دیتی۔

میں نے جست بھر کر "پینڈا اسپرنگ" لگایا پھر فرنٹ سالٹ (FRONT SOMERSAULT) لگاتے ہوئے میرے پیش کے اوپر سے گزر کر اس کے عقب میں اپنے قدموں پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت مجھے اپنے جیسے کیوں کی "برڈر ہاٹ" سٹائی  
 دی۔ میں ایڈیٹر، ایڈیٹ ٹرن ہوا۔ وہ فارنگ میرٹن کی  
 کلائنکوف سے کی گئی تھی۔ اس نے اس جگہ کو نشانہ بنایا تھا  
 جہاں ہنڈ اسٹرک لگانے سے پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے واضح  
 طور پر نوٹ کیا کہ میرٹن نے میرے قدموں میں کویاں  
 برساتی تھیں۔ اس مقام کی ریت فضا میں اچھل گئی تھی۔

میر بخش کی اس "حرکت" پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ وہ مجھے جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ صرف زخمی کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ میری جان کا دشمن ہوتا تو فائرنگ کا رخ میرے سینے یا سر کی جانب ہوتا۔

میر بخش میری قلابازوں پر محو جرت تھا۔ اس نے میر  
قدموں میں فائزنگ کی تھی مگر میں پلک جھپکتے ہی اس کے  
عقب میں کچھ چاچا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔ میں نے اس کا  
وقت ایک لمبا سا شپ لے کر سائڈنگ اس کے پہلو میں  
رہید کر دی۔ سائڈنگ کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر  
مناسب جبرک کے ساتھ صحیح ٹائرنگ پر جائے تو مضبوط  
مضبوط مقابل کے قدم بھی اکھاڑ دیتی ہے۔

میر بخش اس ناگمانی افکار کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ تو حیرت سے میرا "دیدار" کرنے کی خاطر مزاحمتی کھیل اسے کیا خبر تھی کہ اسے یہ دیدار بہت "موزک" پڑے گا۔ میر سائڈنگ نے اس کے پہلو کی بھوپور مزاج پر سی کی اور زمین پر قابضانیاں کھاتے ہوئے مجھ سے چندہ قدم دور جا کر ایک مارشل آرٹسٹ کے مد مقابل اگر کوئی مارشل آرٹسٹ ہی ہو تو فی دافو جیج کا مظاہرہ نسبتاً آسان ہوتا ہے اس مقابلے میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے جو دیکھنے والوں کو بہت محظوظ کرتا ہے یہاں میر مقابلہ ایک جٹ قسم کے پہلو

سے تھا اس لیے میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا۔ مد مقابل کی "حرکات" کے مطابق میں بھی "توز" پیش کر رہا تھا۔

اس مرتبہ میر بخش کے ہاتھ سے کلا مشکوف چھوٹ گئی تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ کلا مشکوف اس کے نزدیک ہی ریت پر پڑی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھا اور سب سے پہلے کلا مشکوف کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس دوران میں، میں قدرے اس کے قریب پہنچ چکا تھا تاہم ہمارے درمیان اب بھی آٹھ دس فٹ کا زمینی فاصلہ حائل تھا۔

وہ اپنی کلا مشکوف کو مجھ پر تانتے ہوئے پھینکا "شرافت سے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ ورنہ!" اس کے ساتھ ہی اس نے دھمکی آمیز انداز میں کلا مشکوف کو حرکت دی۔

وہ سندھی لب و لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ تھانے میں یہ دونوں افراد بالکل خاموش کھڑے رہے تھے، جب ہم گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو اس وقت میں نے میر بخش سے وڈیرے کے بارے میں ایک سوال پوچھا تھا جس کا اس نے جواب بھی دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اب مجھ سے کوئی لفظ بولا تھا اور خاصا خطرناک بولا تھا۔

میں نے اپنی نظر میر بخش کے شانوں پر ٹکا کر رکھی تھی تاکہ وہ کلا مشکوف کو کوئی ملک حرکت دینے کا ارادہ کرے تو میں بروقت ہچاؤ کر سکوں۔ کسی بھی قسم کی فائٹ کے دوران میں اپنے مد مقابل کے جسم کے دو مقامات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اول اس کی کمر، دوم اس کے شانے یعنی کندھے۔ پاؤں اور ٹانگوں کی ہر حرکت کو کمر کی بدلتی ہوئی پوزیشن سے قبل از وقت جانا جا سکتا ہے، اسی طرح ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکت کو جانے کا مرکز کندھے ہیں۔ جو مارشل آرٹسٹ یا فائٹرز ان دو مقامات کو نگاہ میں رکھتا ہے وہ مد مقابل کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے کیوں کہ وہ دشمن کے وار سے پہلے ہی سمجھ جاتا ہے کہ وہ کون سی لگ مارنے والا ہے یا کون سا ہینڈ انیک کرنے والا ہے۔ اس جج منٹ میں اگر مہارت حاصل ہو جائے تو صرف سیلف ڈیفنس اور بلا ٹک کا سامرا لے کر کوئی بھی میدان مارا جا سکتا ہے۔

میں نے میر بخش کو یہ دستور اپنی نظر میں رکھتے ہوئے اس کی دھمکی کے جواب میں کہا "میر بخش! اگر میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کر دوں تو!"

"تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہو گا!"

"یہ تم مجھے جان سے مار دو گے؟" میں نے پوچھا۔

"جان سے نہ بھی مارا تو تمہارے ہاتھ پاؤں ضرور دوں گا" وہ معاندانہ نظریے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "پھر سارا عمر جاتی اور اپنا بچائی میں بسر کرنا!"

میں نے اسے ناؤ دلانے کی خاطر کہا "اگر مرد کے بچے تو ہتھیار بھیج دو اور خالی ہاتھ ایک ہتے کا مقابلہ کرو" میر بخش مضبوط جسم کا مالک پہلوان صفت شخص تھا۔ تو میرے جتنا سنگ کے کمالات نے اسے دو مرتبہ ریگسٹار ریت چھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کو برہم کرنے کے ساتھ ساتھ پوری طرح تولیاب بھی رہا تھا۔ میں اس قسم اسٹائن میں ریڈ الٹ تھا کہ اگر وہ مجھ پر فائرنگ کرنے لے لے ڈرا سی بھی جہش کرتا تو میں اس کے نشانے نہ کو شافی فائر سکتا تھا۔ اس لیے میں مطمئن تھا۔

وہ میرے نظریے تسلیم کر بولا "وہ جان! تم ہمیں غصہ دار کوئی حماقت کرنے پر نہیں اکسا سکتے، ہم جانتے ہیں، تم کو خطرناک ہو۔ تمہیں اگر ڈرا سی بھی ڈھیل دی گئی تو تم سوار ہو جاؤ گے!"

"اچھا!" میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں "جس میرے بارے میں یہ نادر معلومات کہاں سے حاصل ہیں؟"

"زیادہ بکواس نہیں کرو" وہ دہڑا "اور چپ چاپ جا گاڑی میں بیٹھو!"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے چونک کر میرے عقب میں دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں اس پوزیشن میں ایک دوسرے کے مد مقابل تھے سیاہ گاڑی ہمارے پہلو میں آگئی تھی۔ میرا رخ اسی جانب تھا جہر گاڑی کا رخ تھا یعنی ہم بخش کا چہرہ اس طرف تھا جہر سے ہم آئے تھے گویا وہ گانا کے عقب میں دیکھ کر چوٹا تھا۔

اس کے چونکنے کے انداز نے مجھے بات کی یہ تک پہنچا دیا۔ میں نے تھوڑی دیر قبل گاڑی کے عقبی حصے میں ڈرائیور کو باہر پھینک دیا تھا۔ یقیناً وہ اٹھ کر میری پشت پر چڑھ چکا تھا۔

میں نے ڈرائیور کی آمد کی آواز پر توجہ مرکوز کر کے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان حائل فاصلے کا لحاظ انداز لگایا پھر اس کی جانب دیکھے بغیر ایک "بیک فلیک" (BACK) کرتے ہوئے میں ہوا میں اچھلا اور میری دھمکی فلا ٹنگ لک ڈرائیور کی پیشانی پر لگی۔ اس کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چڑھانپتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔

بہ وہ زمین پر گر رہا تھا تو میں نے اس کے ایک ہاتھ بٹنی راڈ کی جھک دیکھی تھی جو چہرہ تھا تھے ہوئے اس کی جڑ سے ٹکرائی تھی۔ اس دہری چوٹ نے اسے گرنے کے بجائے ایک مرتبہ بھرتے پر مجبور کر دیا تھا۔

ڈرائیور نے کہیں سے آہنی راڈ نکال لی تھی اور میری بٹنی میں پشت سے حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن برسے بروقت عمل نے اس کے مذموم عزم کو ریت میں دل دیا تھا۔

"تم کوئی حرکت نہیں کرو گے!" میری سماعت سے بخش کی سرسراہٹ ہوئی آواز ٹکرائی۔

میں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور کہا "اگر میں رکت نہیں کروں گا تو پھر رکت کیسے پیدا ہو گی؟" وہ چکر بولا "تم اپنی ناپاک زبان بند رکھو اور میں نے تم سے جو کہا تھا اس پر عمل کرو!"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں میر بخش! میں نے کہا۔ وہ ابھن زدہ انداز میں بولا "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "میری کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ اگر میں حرکت نہیں کروں گا تو تمہارا حکم کس طرح مان سکوں گا۔ بغیر حرکت کے میں گاڑی میں کس طرح بیٹھ سکتا ہوں!"

میں بات کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس کی جانب سرک رہا تھا۔ وہ میرے عزم کو بھانپ گیا اور بیٹنی لہجے میں بولا۔

"تم نے اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں گولی چلاؤں گا میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا!"

میں نے کہا "نہ میں چالاک ہوں اور نہ ہی کسی قسم کی چالاکی دکھانے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھ سے خوف زدہ ہو جاؤ! کہ تمہارے ہاتھ میں ہتھیار بھی ہے"

"خود کو بے بس اور کم زور ظاہر کرنے میں تمہاری کوئی چال پوشیدہ ہے" میر بخش پھنکارتے ہوئے بولا "ورنہ تھوڑی دیر پہلے میں تمہاری دو ہتھیریاں دیکھ چکا ہوں اس سے بے خوبی انداز لگایا جا سکتا ہے کہ تم کتنے "سیدھے" ہو!"

میں نے کہا "اگر میں سیدھا نہیں ہوتا تو کیا تم لوگ اتنی آسانی سے مجھے اور میری ساتھی کو اغوا کر سکتے تھے؟ میں اگر ہتھیار ختم کا بندہ ہوتا تو تم لوگوں کو معصیت میں ڈال دیتا جب کہ تم لوگوں نے میری کلائیوں میں ہتھکڑی بھی ڈال رکھی ہے!"

"معصیت میں تو تم نے ہنس ڈال ہی دیا ہے" وہ کہہ کر توڑ ٹھٹھکتے ہوئے بولا "اس ہتھکڑی نے کبھی تمہارا..."

نہیں بگاڑا۔ تم کسی مداری کی طرح ہوا میں کرتب دکھا رہے ہو اور تمہارے ہاتھوں سے زیادہ تمہاری ٹانگیں چل رہی ہیں!"

یہ سچ ہے کہ میں نے ہتھکڑی لگی ہونے کے باوجود بھی جتنا سنگ اور لنگ فو کے کچھ ہاتھ ان دونوں پر آزما ڈالے تھے۔ میں نے گاڑی ہی میں الٹی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں بدل ڈالا تھا۔ اب میرے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب تھے۔ دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی کے مضبوط آہنی کڑے ڈب تھے۔

ان دونوں کڑوں کو ملانے والی زنجیری لہائی اتنی تھی کہ میں پہلو پہ پہلو اپنی دونوں ہتھیلیوں کو کیس بھی ٹکا سکتا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے "ہینڈ اسپرنگ" اور "بیک فلیک" کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ دونوں ہتھیلیاں گرم ریت پر جما کر کیا تھا۔ ویسے یہی کام میں ہتھیلیوں کے بجائے دونوں پنچرے سے بھی کر سکتا تھا اور فکر نہیں سے بھی۔ مجھے شانوں ٹیبل میں تربیت کے دوران میں انتہائی مشکل اور ٹھن "پالش ایس" بھی لگانا سیکھا گیا تھا۔

میں نے میر بخش کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "دیکھو میر بخش! کسی کے ہاتھ چلتے ہیں، کسی کی ٹانگیں اور کسی کی زبیاں۔ تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے!"

"تمہاری تو یہ تینوں چیزیں چلتی ہیں" وہ جلنے بھنے انداز میں بولا۔

میں نے ہنسنا انداز میں اسے دیکھا پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا اس کی نظر میرے ہاتھوں پر گئی اور وہ اچھل پڑا۔ میں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ وہ لگت زہ لہجے میں بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ تھکے کڑی تو تمہیں، الٹی لگائی گئی تھی۔؟"

"ہاں لگائی تو الٹی ہی تھی تم لوگوں نے" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ سیدھی کس طرح ہو گئی؟"

"جادو کے زور پر" میں نے کہا۔

"کیا تم جادو بھی جانتے ہو؟"

"ہاں" میں نے تحمل لہجے میں کہا "دکو تو مظاہرہ کر کے دکھاؤں!"

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "نہیں۔ نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہیں کوئی جادو اور وہ نہیں آتا۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے" پھر اس کا لہجہ سخت ہو گیا "میں تم سے آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں سیدھی طرح تم گاڑی میں جاؤ۔ بیٹھو ورنہ مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا!"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”میر بخش!“ تم دونوں جس راستے پر قدم رکھ چکے ہو اس کی منزل تو موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم اپنی جان کی فکر کرو۔ اگر زندہ بچاؤ گے تو راستہ اختیار کرنے کی نوبت آئے گی نا!“

اس قسم کے میرے کاٹ دار جملوں نے میر بخش کی رگ بد معاشی کو پھڑکا دیا۔ اس کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا، ”خون خوار لہجے میں بولا“ میں اب تک تم سے رعایت برت رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے آنکھیں دکھانے لگو“ پھر اس نے کلا شکوف کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے گاڑی کی جانب اشارہ کیا ”چلو“ اور گاڑی میں بیٹھو۔ ہم پہلے ہی بست لیٹ ہو چکے ہیں۔“

اسی وقت گاڑی کے عقبی حصے سے کسی کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ یقیناً وہ دھنوک آواز تھی جو گرمی کی شدت کے باعث ہوش میں آ رہی تھی۔ اس گاڑی کو صحرا میں کھڑے لگ بھگ ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ گاڑی کے انرکنڈیشنز نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا پھر عقبی دروازہ بھی کالی دیر سے کھلا ہوا تھا، گاڑی کے اندر کی رہی سہی کو لنگ بھی جاتی رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ ریت کی تیش اور آسمان سے برستی آگ نے دھنوک گرمی نیند کو اچاٹ کر دیا تھا۔ وہ گرمی نیند جو طویل بے ہوشی کی صورت میں اس کے جسم و جان میں اتر آئی تھی۔ دھنوک کے کراہنے کی آواز سن کر میر بخش چونک اٹھا تھا۔ اس اثنا میں میر بخش کا دایا ہینڈ ساسھی بھی خود کو جھاڑنا سلاتا ہمارے قریب پہنچ گیا تھا۔ میر بخش نے ڈرائیور ساسھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نواز علی! میں اس کو سنبھالتا ہوں۔ تم گاڑی کے اندر جا کر لوٹی کی جربو!“

مجھے میر بخش کی زبانی اس وقت پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ اس کے ڈرائیور ساسھی کا نام نواز علی تھا۔ میں نے نواز علی کے راستے میں جاں مل جاتی ہوئے ہوئے کہا۔

”رک جاؤ! اگر تم نے میری ساسھی کی سمت ایک قدم بھی بڑھایا تو ناخنیں چیر کر رکھ دوں گا!“

میر بخش عین جیسے میں بولا ”نواز علی! اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا نا، میں اس کو سنبھال۔“

اس کا جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ اسی وقت دو گاڑی کی عقبی جانب سے نمودار ہوئی۔ وہ دو لگاتے ہوئے قدموں سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ تانکیوں کی ڈوری میں بہ دستور بندھے ہوئے تھے۔

میں نے صورت حال کی پروا کیے بغیر چلا کر کہا ”دو گاڑی کے اندر پہل جاؤ۔ باہر کے حالات سازگار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دھنوک کی سمت قدم بڑھ دیا۔ مجھے اپنے عقب میں کلا شکوف برادر میر بخش کی چنگھاڑ سنا دی ”رک جاؤ نہیں لوگو! مار دوں گا!“

میں نے میر بخش کی دھمکی کو اہمیت نہ دی اور دھنوک گاڑی کے اندر جانے کا کہتے ہوئے خود بھی اس جانب قدمی جاری رکھی۔

میر بخش نے مجھے روکنے کے لیے میرے قدموں پر کلا شکوف کا برست مارا۔ تیز رفتار گولیاں ریت اڑانے لگیں۔ وہ کہیں کیوں کہ انہیں کسی کی زندگی چاہنے کی ذمہ داری نہیں دے گئے تھے۔ اس نے اپنی بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ میر بخش مجھے کوئی گزند نہیں پہنچاتا تھا ورنہ اتنے نزدیک سے اس کا نشانہ خطا ہونے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ بھی برست کی صورت میں میرے پیچھے لگے گا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں فوری طور پر نیچے پر پھینکا کہ وہ مجھے صحیح و سالم کہیں پہنچاتا چاہتے تھے کلا شکوفیں اور فائرنگ صرف مجھے کنٹرول کرنے کے لیے تھی۔

دھنوک نے میرے کہنے کے مطابق گاڑی کی جانب ہوا شروع کر دیا تھا اور مجھے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ نواز علی میر بخش جھوٹے ہتھیار استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رہا چنانچہ میں مکمل کھلا کر میدان میں آ گیا۔

میں نے اپنے قریب کھڑے نواز علی کی طرف دیکھا۔ مجھے روکنے کے لیے دونوں بازو آگے بڑھا چکا تھا۔ انہیں انداز ایسا تھا جیسے مجھے دوپٹے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے اپنے قدم پیچھے ہٹ کر اسے جھکا دی پھر نیچے بیٹھنے ہوئے گاڑی کے ”فرزٹ سوپ“ مار دی۔

وہ تکلیف کی شدت سے جھج اٹھا۔ میری ہینڈل نے نواز کی ہینڈل کے گوشہ پر ایک قیامت خیز ضرب لگی تھی۔ وہ ٹانگ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور سندھی زبان میں غفلت میں گونسنے لگا۔

مارشل آرٹس کے سینٹرز میں دو کھلاڑیوں کے درمیان جب فائٹ ہوتی ہے تو ہینڈل کے ہیلے (ہینڈل کی سائے بڑی) کی حفاظت کے لیے سین گارڈ استعمال کیے جاتے ہیں مگر اسٹریٹ فائٹ میں اس قسم کے ممکن نہیں ہوتا۔ میں تو شارلن نیپیل کا تربیت یافتہ تھا۔ انسانی جسم کو فواید میں ڈھالا جاتا ہے۔ میں نے بھی کسی قسم

میں کیا تھا خصوصاً اسٹریٹ فائٹ میں میرا ہارڈ فائٹ ہوتا تھا اور جب تک کوئی جان ہی کو نہیں آتا تھا۔ میں ایک نہیں کرتا تھا۔ ایک سچے مارشل آرٹسٹ کی پہچان بھی ہے۔

نواز علی کو زمین بوس ہوتے دیکھا تو میر بخش آپے سے باہر نکل آیا۔ وہ خون خوار انداز میں میری جانب بڑھا اور میرے قدموں کا نشانہ لے کر فائرنگ کر دی۔

میں اس کے ٹریگر دبانے سے پہلے ہی ہوا میں اچھل چکا تھا اور ”بیک سرسٹ“ لگاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ میر بخش کی فائرنگ کا بڑا بھیاں تھوڑے ہی وقت میں اس کی ایک کرب ناک جھج فضا میں بلند ہوئی۔ وہ میرے قدموں کے نزدیک ہی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ جب میرے قدم وہاں نہیں رہے تو وہ براہ راست گولیوں کی زد میں آ گیا۔ کلا شکوف کے ہلاکت خیز برست نے نواز علی کا جسم چٹائی کر دیا۔ اس کے مضروب و مجروح بدن نے ایک دو چوٹے چوٹے جھٹکے کھائے اور پھر ساکت ہو گیا۔ وہ اب اس تپتے ہوئے صحرا میں نہیں رہتا تھا۔ یہ بات صرف خدا ہی جانتا تھا کہ اس کی روح اب کسی ٹھنڈی جگہ پر تھی یا!

میر بخش وحشت زدہ نظر سے اپنے سانپ کی لاش کو تنک رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز کو اس نے اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حقیقت حال سے سب کچھ عیاں تھا۔ نواز علی کی خون آلود ہاتھ پر گورو کفن لاش سامنے موجود تھی۔ میر بخش اس چٹائی کو جھٹلا نہیں سکتا تھا اس لیے سکتے کی کیفیت میں کھڑا ایک تنک نواز کی لاش کو تنک رہا تھا۔

میں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے میر بخش کے قریب پہنچ گیا پھر میری سائڈ فائرنگ لگ اس کے سینے پر کسی وزنی پتھر کے مانند پڑی۔ ایک کرب ناک گراہ کے ساتھ وہ لوٹ کھڑا۔ میں نے اس کے چہرے پر آنکھ دو جھڑک دیا۔

وہ دو لگاتے قدموں کے ساتھ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے کلا شکوف چھوٹ گئی۔ اس مرتبہ کلا شکوف کالی فاصلے پر گر گئی تھی۔ وہ فوری طور پر اسے اٹھا نہیں سکتا تھا۔

وہ کلا شکوف کو کیا اٹھاتا؟ اسے تو اپنے اٹھنے کے لالے چپے ہوئے تھے کیوں کہ اس دوران میں میں اس کے سر پر چپکا تھا اور اس کی آنکھ کی ہر کوشش کو ناکام یاب بناتے ہوئے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر رہا تھا۔

فائرنگ کی آواز پر دھنوک ایک مرتبہ پھر گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ اس بار اس نے دیکھا تو بازی پلیٹ چکی تھی۔ صورت حال مکمل طور پر میرے کنٹرول میں تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں دھنوک کو سمجھایا کہ وہ ڈرائیونگ کین میں بیٹھ کر باہر کے حالات سے لطف اندوز ہو۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھی کلا شکوف کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا تھا۔

اس دوران میں میر بخش اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ لولہمان ہو رہا تھا۔ آہنی ہتھکڑی کی بھرپور ضرب نے اس کے چہرے کی کھال کو کئی جگہ سے اڑھڑایا تھا تاہم وہ اس کس نہری کی حالت میں بھی بارمانے کو تیار نہیں تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ آگے نکال رکھے تھے۔ انداز ایسا تھا جیسا مجھے دیکھنا چاہتا ہو۔ میں کھلے ہاتھ کا وار نہیں کر سکتا تھا مجھے ڈینس یا انیک دونوں صورتوں میں اپنے دونوں ہاتھ ایک ساتھ استعمال کرنا تھے۔ ہتھکڑی نے میرے دونوں بازوؤں کو قریب سے قریب سے ترکر دیا تھا۔

”حکم ہے“ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ بھائیوں کو دو بازوؤں سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ کاش۔۔۔ اے کاش“ اسلامی دنیا کا کوئی عالم کوئی مفکر کوئی فلسفی کوئی لیڈر کوئی ڈاکٹر کوئی آئینہ نگار کوئی سائنس دان ایسی ہتھکڑی ایجاد کر دے جو امت مسلمہ کے بازوؤں کو قریب سے قریب ترکر دے!

میر بخش نے دونوں ہاتھوں سے جھپٹا مار کر مجھے قابو کرنا چاہا مگر میں بجلی کی سی سرعت سے ہوا میں اچھلا اور ”فرزٹ سرسٹ“ کرتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا تاہم سنبھلنے میں مجھے تھوڑی تاخیر ہو گئی۔

اس دوران میں میری لمبائی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میر بخش عین میرے عقب میں پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا اس نے سندھ کی روایتی کشتی ”ملاکھرا“ کے انداز میں مجھے کمرے سے دوچ لیا۔

ملاکھرا درحقیقت شہ زوری آزمائے کا ایک انداز ہے۔ دونوں پہلوں ایک دوسرے کو شلواریوں کے نیچے میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور شہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حریف کو زمین پر گرانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو پہلوں دوسرے کو چپٹ کر لیتا ہے کامیابی اس کے حصے میں آتی ہے۔

میر بخش کے ذیل ڈول اور جھٹے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ملاکھرا کے کئی اکھاڑے جیتے ہوں گے اور اب تو وہ اپنے فن کا عملی مظاہرہ بھی کر رہا تھا۔ میں نے شلواریں نہیں

پہنی ہوئی تھی چٹاں چہ اس نے میری جینز کے بیلٹ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جم لیے تھے اور مجھے نیچے گرانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اس کی شدت زوری میں کوئی کلام نہیں تھا تاہم میں بھی کچھ گولیاں نہیں کھلیا ہوا تھا۔ شاؤٹس ٹیپل میں تمام اسٹوڈنٹس کو مختلف موڈز پر بھی دکھائی جاتی تھیں جن میں دنیا بھر کے ہر علاقے سے متعلقہ فنون حرب کی فلمیں ہوتی تھیں۔ اساتذہ کا کچھ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا اور ہمیں بتایا جاتا تھا کہ کسی دیوانہ کا کیا توڑ کیا جاسکتا ہے۔ یہ فی و دستاویزی فلمیں ایک مخصوص ہال میں دکھائی جاتی تھیں۔ ہمیں پریس نے دنیا کے عظیم ترین مارشل آرٹسٹوں کے فن پر مشتمل دستاویزی فلمیں بھی دیکھی تھیں۔

مجھے سب سے زیادہ "بروس لی" کا ذاتی اسٹاک "جینٹ کون ڈو" پسند آیا تھا۔ بروس لی کی فنی مہارت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور دل میں میں نے اسے اپنا آئیڈل مان لیا تھا۔

میربخش کی زور آزمائی جاری تھی۔ وہ حتی الامکان اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح مجھے زمین پر گرا دے۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونا میرے لیے چنداں مشکل نہیں رہا تھا تاہم میں اسے بھرپور موقع دیتا چاہتا تھا تاکہ اس کے دل میں ملال نہ رہے۔

اس نے پورے زور سے مجھے آگے دھکیلا۔ میں اس کی "خوابش" کے مطابق وہ قدم آگے کھسک گیا پھر اچانک ہی میں نے اپنے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میر بخش بھی زمین پر گرتے گرتے بچا تاہم میرے بیلٹ پر اس کی پکڑ سلامت رہی۔ اس کا ردوائی کے دوران میں اس کی ٹھوڑی میرے سر سے ٹکرائی تھی۔ میری کھوپڑی کا ٹوٹنا نہ بڑا البتہ ٹھوڑی پر لگنے والی چوٹ کے باعث اس کے منہ سے ایک سسکاری خارج ہوئی۔ پھر آن واحد میں اس نے مجھے جھٹکا دے کر فضا میں اٹھالیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی بھاری گٹھری کو زمین سے اٹھایا جاتا ہے۔ میں دونوں ہاتھوں کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی مجھے جمناسٹک کی ٹیکنیک کا سہارا لینا پڑا۔

میں میربخش کے کھاتے میں ہوا میں بلند تو ہو ہی چکا تھا۔ اس لیے میرا کام کچھ آسان ہو گیا۔ میں نے وہیں اپنی باڈی کو روک لیا اور "بیک سرسالت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے میربخش کے اوپر سے گزرتا گیا تاہم اس پر وار کے دوران میں میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کی گردن میں ڈال دیے تھے

کہ ہتھکڑی کی زنجیر اس کے نر خرسے پر لٹک کر رہی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر پھینکا چاہتا تھا لیکن میرے داؤ میں تھا۔

زنجیر کے دباؤ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے پھنسی پھنسی غراہٹیں برآمد ہونے لگیں۔ اس نے زنجیر پر ڈال رکھے تھے اور اپنی گردن کو آزاد کرانے کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اچانک ہتھکڑی کا پھندا اس کی گردن پر اور اس کی "شریف" پر "فرنٹ جریک کلک" پر ہتھکڑی میری ٹھوک میں ملا کا پیش تھا۔ میربخش دور تک نہیں لڑھکتا چلا گیا۔

میری ہتھکڑی کی آہنی ضرب سے اس کا چہرہ چلچلا لہان ہو چکا تھا اور کئی مقامات سے کھال پھٹ گئی تھی۔ جو وہ گرم ریت پر لوٹ لوٹ ہوا تو خون اکود چہرے کے ذرات وافر مقدار میں چپک گئے۔ جب وہ اٹھ کھڑا ہوا تو قدموں پر کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ بھیاک صورت کر چکا تھا۔

میں چاہتا تھا وہ منٹ میں اس کا قصہ پاک کر سکا۔ میں خواہ مخواہ کسی انسان کے خون میں اپنے ہاتھ نہیں چاہتا تھا۔ میربخش کے ساتھی ڈرائیور نواز کی مدد حاصل کرنے کے لیے مجھے ان کی نگاہ پر ہونا پڑا۔ وہ چکا تھا کہ وہ انھیں اغوا کسی اور شخص کے ہمارے ساتھ چٹاں چہ میرا اصل دشمن کوئی اور تھا۔ یہ سب اس کے چلنے چلنے سے تھا یا پھر کراہے کے بندے۔ میر بخش کو اس لیے بھی زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ میں نے ان کی زبان سے بہت کچھ اگلا تھا اور اس کی زبان کھلا کے لیے ٹھوڑی بہت "قاطر واری" تو ضروری تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں اس کے سر پر ہتھکڑیاں دھنلاتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ درجنوں ذرات اس کی آنکھوں میں بھی چلے گئے تھے۔

حالت بڑی وحشت ناک ہو رہی تھی۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے درمیان شکستہ لہجے میں کہتا تھا۔

میں نے ہتھکڑی خیر انداز میں کہا "میں یہ برا کس نے کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے تم کو اس کے حق میں؟"

وہ غراہٹ آہستہ آہستہ میں بولا "تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی لیے اتنا اکر رہے ہو۔ تمہارا بہت برا حشر ہونے والا ہے۔ اب بھی وقت ہے، شرافت سے گاڑی میں۔"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اڑی پر گھومتے ہوئے ایک زوردار وہیل کلک اس کے چہرے پر جڑی۔ اس کا زخمی چہرہ اور زخمی ہو گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے مجھے غصے سے لپٹ کر گلیوں میں تو لے لگا۔ جب اس کی ناپاک زبان پر میری سرخروہاں کا نام آیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔

میں نے لپٹ کے عالم میں اس پر تباہ توڑانیک شروع کر دیے۔ میں اسے ٹھوکوں میں اڑا رہا تھا اور اس کے جسم کے مختلف حصوں پر آہنی دوپٹے پر رہے تھے۔ ٹھوڑی دیر میں وہ بس ہو کر کسی حقیر بچے کی طرح میرے قدموں میں ڈھال ٹھوڑی دیر پہلے جو شخص میری ماں کو گالی دے رہا تھا۔ اب وہی مجھ سے رحم کی اپیل کر رہا تھا۔ اس کی ساری تن فن ماب ہو چکی تھی۔

وہ مت آہستہ لہجے میں گھگھایا "مجھے مت مارو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

"تمہیں کیوں نہ ماریں؟" میں نے غصے لہجے میں کہا۔ "کیا تم زندہ رہ کر کوئی عظیم الشان کارنامہ انجام دیتا چاہتے ہو؟ مجھے میرے معاشرے کے ناسوروں کو تیرے کے اندر گاڑ دینا چاہیے اور میں تمہارے ساتھ کچھ اسی قسم کا سلوک کرنے والا ہوں۔ اس صحرا کی جتنی ہوئی ریت تمہارے پر بند نہ کا مزاج پوچھنے کی تو مانی دادی آنکھوں کے سامنے گھوم جائے گی۔"

"دم سائیں" رحم "وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میں نے آئینہ کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ آپ بہت طاقت ور ہو۔ آپ فارغ ہو۔ میں اپنی شکست مانتا ہوں۔ میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں" پھر اس نے ہاتھ بڑھانے کا عملی مظاہرہ کیا۔

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے جوگر سے ایک بھرپور ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔

میں نے کہا "میرا دوستی ہمیشہ برابری کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ تم اس وقت میرے قدموں میں کسی مرل جو ہے کی طرح بڑے ہو چکے ہو۔" اس نے کہا "میں شرم نہیں کرتا۔"

وہ دوبارہ انداز میں بولا "سائیں! آپ مجھے دوست نہ

بناؤ، کوئی بات نہیں مگر مجھے اپنے قدموں سے دور نہ کر دو۔ میں اب آپ کا وفادار بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "وفاداریاں اتنی جلدی تبدیل نہیں ہوتیں۔" "سائیں" میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ کے اندر چھپے ہوئے ایک عظیم انسان کو تلاش کر لیا ہے۔ آپ مجھے وفاداروں میں شامل کر لو گے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔" میں نے اسے ٹیوٹی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقعی میرے وفاداروں میں شامل ہونا چاہتے ہو؟"

"ہاں سائیں" اس کے ہاتھ بہ دستور جڑے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "وفادار بننے کے لیے وفاداری کے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنی وفاداری ثابت کرنا پڑتی ہے۔"

"میں ہر امتحان ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں سائیں!" وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے کہا "اس ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟"

وہ ریک زار میں اپنے ساتھی ڈرائیور نواز علی کی لاش کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "چابی نواز کی جیب میں تھی۔" "چلو تمہاری وفاداری کی آزمائش شروع ہوتی ہے۔" میں نے معنی خیر انداز میں کہا۔

بندہ خاصا سمجھ دار تھا۔ وہ میرے لہجے کی معنی فیزی تک یہ آسانی پہنچ گیا۔ وہ گھٹنے ریت پر ٹیک کر کھاتے ہوئے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نواز علی کی لاش کی جانب بڑھ گیا۔ احتیاطاً میں بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے دہاں پہنچ گیا۔

نواز علی کی جیب سے ہتھکڑی کی چابی نکال کر میربخش نے میری کلائیوں کو آہنی بندش سے آزاد کر دیا۔ میں نے دونوں کلائیوں کو سلاتے ہوئے کہا۔

"اب یہی ہتھکڑی تم اپنے ہاتھوں میں پہن لو۔" وہ متذبذب نظریے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آزمائش میں پورا اترنے کے دعوے دار بھی ہو اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کر رہے ہو۔ مجھے تو تمہاری نیت میں کھوت کی آہٹیں لگتی ہے۔"

میرے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ وہ پورے وجود سے کانپ اٹھا۔ لڑتے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ۔ یہ بات نہیں ہے سائیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں" وہ اٹکتے ہوئے بولا "میں یہ ہتھکڑی



..... پس رہا ہوں۔“

پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو آہنی ہتھکڑی میں جکڑ لیا۔ میں نے ہتھکڑی کے لاگ بند کر کے چالی اپنی جیب میں ڈال لی اور کہا۔ ”چلو اب گاڑی میں چل کر بیٹھتے ہیں ابھی تمہاری وفاداری کو اور بہت سے کڑے مراحل سے گزرتا ہے۔“

وہ میرے حکم کی تعمیل میں گاڑی کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ میں نے ریت میں بڑی ہوئی میر بخش کی کھانکھوف اٹھالی۔ اسی آفتیں ہتھیاری ملک گولیوں نے نواز علی کا جسم پھینک کر کے اسے فاقے کھاتے آتا رہا تھا۔ اس کی لاش کسی لادارٹ کے لیے طرح جتنی ریت پر پڑی تھی۔

میں نے میر بخش کی کھانکھوف کو ڈیش بورڈ پر رکھ دیا پھر پہلی فرصت میں دھن کے ہاتھوں کی سائیکلو بندشیں کھولیں۔ ہاتھ آدہ ہوتے ہی وہ اپنی کلائیوں کو سسلانے لگی۔

صحر میں پرنے والی دھوپ نے قیامت مچا رکھی تھی۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق سوکھ کر کاٹا بن گیا تھا۔ دھن کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ میں نے میر بخش سے پوچھا۔

”گاڑی میں پانی دینے کا کیا بندوبست ہے؟“

”پانی بہت سائیں“ وہ ہتھکڑی لگے ہاتھ مخصوص انداز میں جوڑتے ہوئے بولا۔ پھر ڈرائیونگ کین میں موجود ایک واٹر کو لڑکی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تقریباً پورا بھرا ہوا ہے۔“

پہلے ہی کو لڑ میری نظر میں نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا، واٹر کو لڑ کے ساتھ ہی پھلوں کی ایک ٹوکری بھی رکھی تھی جس میں تازہ انگور، سیب اور سنگترے دکھائی دے رہے تھے۔ گویا وہ کھانے پینے کے مکمل لوازمات کے ساتھ گھر پار کر کے روانہ ہوئے تھے۔

ہم نے پہلے ایک ایک گلاس پانی پیا۔ ٹھنڈا پانی زیادہ مقدار میں ایک ساتھ پینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے پہلے دھن کو پانی پلایا، پھر پانی کا گلاس میر بخش کی جانب بڑھایا اور سب سے آخر میں خود پانی پیا۔

گاڑی کے باہر ٹھکر کا ریگستان کرلا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں تقریباً آدھے گھنٹے تک اسی جتنی ہوئی ریت پر نہرو آنا رہا تھا اس لیے اب مزید کھلے آسمان کے نیچے موجود رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے گاڑی کے انڈرکنڈیشننگ سسٹم میں تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی تو کام بن گیا۔ اس سے پہلے میرے حکم پر میر بخش گاڑی کی تمام چالیاں میرے حوالے کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی

کو اشارت کر کے ایک مناسب جگہ پر لگا دیا تھا اور اس کے بعد انڈرکنڈیشننگ سسٹم کا ”معائنہ“ کیا تھا اور وہ ٹھنڈا ”منت خوشامد“ کے بعد آدہ کار ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی اشارت ہی رہنے دیا اور کو لڑ سے ٹھنڈا پانی لے کر میر بخش ریت میں اٹا ہوا خون آلودہ چہرہ دھلایا۔ اس ”سفر کی“ دور میں وہ کئی مرتبہ سسکارا اور کراہا تھا۔

جب اس کی حالت ”قابل دید“ ہو گئی تو میں اسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ اس سے پہلے میں گاڑی کا عقبی دو اونڈ کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس وقت ہم تینوں ڈرائیونگ کین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب میں میر بخش سے تسلی بخش پوچھ رہا ہوں ارادہ رکھتا تھا۔

پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے دھن کو گاڑی کے پچھلے حصے میں آرام کرنے کی خاطر بیچ دیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا، دھن کی قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ میر بخش ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے مختلف مراحل ”پر زور زبردستی“ کی ضرورت بھی پیش آسکتی تھی۔ ان مناظر سے دھن کا دل ہلکا دماغ متاثر ہو سکتا تھا۔ وہ میری تجویز پر آرام کرنے گاڑی کے عقبی حصے میں چل گئی۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میر بخش! تمہاری وفاداری اب کڑی آزمائش سے گزرنے والی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔“

”میں تیار ہوں سائیں۔“ وہ خوشامد انداز میں بولا۔

آپ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“

میں نے پوچھا ”تم لوگ ہم دونوں کو اغوا کر کے کھال لے جانا چاہتے تھے؟“

”عمر کوٹ!“ اس نے جواب دیا۔

”عمر کوٹ!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”مگر تمہارے

ڈرائیو سائیں رئیس خان نے تو بتایا تھا کہ تم دونوں چھاپار کے صدر مقام ”مٹھی“ جا رہے ہو اور وہاں تک ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جاؤ گے۔“

وہ لاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ سے جھوٹ بولا گیا تھا سائیں۔“

”تو اس کا مطلب ہے، ہم مٹھی نہیں جا رہے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

میں اندرون سندھ کے علاقوں سے واقف نہیں تھا اس لیے میں نے پوچھا۔ ”کیا عمر کوٹ اور مٹھی ایک ہی سہما

واقعہ ہے؟“ وہ فی من سرہ لاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں سائیں! دونوں کا راستہ جدا جدا ہے اور رخ بھی الگ الگ ہے۔“

”اس وقت ہم عمر کوٹ سے کتنی دور ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”ہم آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ تین چوتھائی سفر تک گیا ہے۔“

”ایک چوتھائی باقی ہے۔“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”یہ کون سا مقام ہے جہاں ہم اس وقت موجود ہیں؟“

”یہ کوئی مقام نہیں بلکہ اسے صرف ریگستان کہا جا سکتا ہے۔“ وہ فہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم ٹھکر پار کر کے نکل

کر رہے ہیں، ٹیکو سٹر جیکسل، دھندرو اور چھاپرو سے

ہوتے ہیں یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس سے آگے دھرم سال

سے پھر ضلع عمر کوٹ کی حدود شروع ہو جائے گی۔“ ایک لمحے

کو لڑ کر اس نے وضاحتی انداز میں اضافہ کیا۔ ”بس یوں

سمجھیں سائیں، ریگستان کا یہ ویران علاقہ چار مقامات کے

درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں ”رام سر“ ہے، جنوب

میں ”تنگ تر“ ہے، جنوب مشرق میں ”چھاپرو“ ہے اور شمال

مغرب میں ”دھرم سال“ ہے۔“ ”تر“ کو مقامی لوگ گاڑ کر

”تنگ تر“ بھی بولتے ہیں جیسے ”تنگ تر“ کے رہنے والے اسے

”تنگ تر“ کہتے ہیں۔“

میر بخش اپنی معلومات سے مجھے حیرت زدہ کر رہا تھا۔ لگتا

تھا اسے پورے ٹھکر پار کا نقشہ زبانی یاد ہو۔ میں دوبارہ اس

کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”کیا تم لوگوں نے ہمیں ڈھیرا رئیس خان کے ایمپائر

اغوا کیا تھا؟“

”نہیں!“ اس نے نفی میں جواب دیا۔

”چھاپرو؟“

”ہم ڈھیرا اکبر سومو کے آدمی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”وہ عمر کوٹ میں رہتے ہیں۔ ہم نے انہی کے حکم پر تم لوگوں کو

اغوا کیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس سلسلے میں رئیس خان کا کیا کردار

ہوگا؟“

”اس نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔“

”تم نے پوچھا۔“ تمہارا ڈھیرا اکبر سومو ہمیں کیوں

بھڑکاتا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کی کیا دہشتی ہے؟“

”ڈھیرا سائیں آپ کا دشمن نہیں ہے۔“ میر بخش نے

جواب دیا۔

”تو کیا وہ ہمیں اغوا کروا کے کسی ان مٹ دوستی کا ثبوت پیش کر رہا ہے؟“ میں نے تڑپ سے کہا۔

وہ مبتدل لہجے میں بولا۔ ”یہ بات نہیں ہے سائیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

میر بخش نے بتایا۔ ”اصل میں ڈھیرا سائیں کے پاس

آج کل اس کا ایک دوست مہمان بن کر آیا ہوا ہے۔ ڈھیرا

سائیں اپنے دوست کو تمہارا تختہ دینا چاہتے ہیں۔“

اس کے جواب نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے شک آمیز

نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میر بخش! تم میرے ساتھ

کوئی چالاکی تو نہیں کر رہے ہو؟“

”نہیں سائیں“ وہ سراباں اٹھان گیا۔

میں نے کہا۔ ”میر بخش! اگر تم نے مجھے جگہ دینے کے

لیے کوئی جھوٹا بیانیہ جھوٹ بولا تو یاد رکھنا میں تمہارے جسم

کی کوئی بوٹی بوٹی کاٹ کر پتے صحر میں پھینا دوں گا۔ تم اندازہ لگا

سکتے ہو کہ جب ریگستان میں تمہارے گوشت کے کباب

بھونے جائیں گے تو وہ منظر کنٹادل دوز ہوگا۔“

وہ ٹھکر ٹھکر کانپنے لگا پھر سسے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”رم

سائیں! رحم۔ آپ نے مجھے سام بنایا ہے۔ میں آپ کے

سامنے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔“

”میں نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

”سام!“

”یہ ”سام“ کیا ہوتا ہے بھئی؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے ہاں جب کوئی

شخص کسی کو پناہ دیتا ہے تو پناہ لینے والے شخص کو ”سام“ کہا

جاتا ہے۔ آپ نے مجھے پناہ دی ہے۔ ایک بھونار کے قبضے

سے میری جان بچرائی ہے، مجھے نجات دلائی ہے۔“

میں میر بخش کی باتوں کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا

تھا۔ پتا نہیں اس نے کیوں یہ فرض کر لیا تھا کہ میں نے اسے

پناہ دی ہے اور کسی ظالم انسان کے چنگل سے بچھڑایا ہے!

میں نے اٹھتے ہوئے انداز میں سوال کیا ”تم کس ”بھونار“ کا

ذکر کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کس کی قید سے آزادی دلائی

ہے؟“

”سائیں!“ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے سادہ سے لہجے

میں بولا۔ ”بھونار ہمارے یہاں کا ایک لقب ہے۔ یہ ایسے

ڈھیروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ظالم ہوتے ہیں۔ ان

کی اپنی پرائیویٹ جیلیں ہوتی ہیں۔ وہ چوریاں اور ڈکیتیاں

کو لے لیتے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کو اپنے یہاں پناہ دیتے ہیں

اور ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا اور ہاروں پر بھی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کو علی الاعلان ”بھوتار“ کہا جاتا ہے۔ لوگ ان سے ملتے ہوئے ”سائیں بھم اللہ بھوتار“ اور ”حکم سائیں بھوتار“ کے نچلے ادا کرتے ہیں مگر وہ اس کا برا نہیں مانتے بلکہ فخر سے پہلے نہیں سالتے۔ وہ ”بھوتار“ کے لفظ کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔“

میں۔۔۔ حیرت اور دلچسپی سے میر بخش کی معلومات افزا باتیں سن رہا تھا۔ وہ سلسلہ کام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! وڈیرا اکبر سومو بھی ایک ”بھوتار“ ہے۔ اس کی اپنی پراویٹ نیل ہے۔ وہ ہم لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے۔ جراثیم پیشہ افراد سے اس کے رابطے رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں ”اس کا وہ دوست جس کی خدمت میں وہ آپ کا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے وہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں۔ وہ محض ہی سے کوئی غنڈا اور چمٹا ہوا بد معاش دکھائی دیتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ”سائیں وجدان! میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔ میں سچائی اور نیکی کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ اب میں وڈیرے کی جانب پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں عمر بھر آپ کا وفادار رہنا چاہتا ہوں۔

اتنا کہ کروہ خاموش ہو گیا اور امید افزا نظریے مجھے دیکھنے لگا۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں اکبر سومو کے کسی بد معاش ”مہمان نما دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وڈیرا میرا تحفہ اس کی خدمت میں کیوں پیش کرنا چاہتا تھا؟ اگر وڈیرے کو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی تو اس کے دوست کو مجھ میں کوئی دلچسپی تھی؟ یہی سب جاننے کے لیے میں میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، میر بخش“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے کوئی دروغ گوئی نہیں کر رہے ہو اور واقعی میرے وفادار بننے کے قابل ہو تو میں تمہیں ضرور ”سام“ بنا لوں گا۔

”آپ جس طرح چاہو“ اپنی تسلی کر سکتے ہو سائیں۔“ اس نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے پہلے تو وڈیرا اکبر سومو کے دوست کے بارے میں تعقیباً بتاؤ۔“

وہ شروع ہو گیا۔ ”سائیں! وہ شخص کوئی ہفتہ بھر پہلے پنجاب سے آیا ہے۔ لاہور کے کسی نزدیکی گاؤں سے اس کا

تعلق ہے۔ وہ آپ کی تلاش ہی میں یہاں پہنچا ہے۔ آپ کے بارے میں بہت زیادہ جان کاری ہے۔ اس وڈیرا سائیں کو بتایا تھا کہ تم آج کل میں خیر کار کاٹھن سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہونے والے ہو۔ یہاں امکان اس بات کا تھا کہ تم یا تو عمر کوٹ کی مشرقی سرحد ”کھوکھار پار“ کے مقام سے سرحد پار کرو گے یا پھر ”کھوکھار پار“ کے مقام پر تھمنا کر کے جنوبی حصے سے ملک میں داخل ہو گے۔ تمہیں گھیرنے کے لیے دو نمبریں تشکیل دی گئی تھیں۔ میں اور نواز علی ”نگر پارکر“ میں موجود تھے۔ ”کھوکھار پار“ نامی گاؤں ہماری مکمل نظر میں تھے جب کہ ”کھوکھار پار“ جانے والی ٹیم ”واسراہ“ اور ”بھیلارا“ پر رکھے ہوئی تھی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ تم نے گھریا کر سرحد پار کر کے پنڈت کشوری لال کے پاس قیام کیا ہے، نے فوراً وڈیرا سائیں تک تمہاری آمد کی اطلاع پہنچا دی۔ اکبر سومو نے ”کھوکھار پار“ کے ایک وڈیرے کو ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا پیغام بھجووا دیا۔“

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر کار پھر پرات جا رہے ہوئے بولا۔ ”ہمارا منصوبہ تو یہ تھا کہ ہمیں ان تمہاری ساتھی لڑکی کو پنڈت کشوری لال کے گھر سے اخراج دے جائے گا لیکن ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی تم لوگ ”ریجنر“ والوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ہمیں تم لوگوں کے تھانے پہنچنے تک انتظار کرنا پڑا۔ وڈیرا رئیس خان نے تھانے دار کے ساتھ ”میٹنگ“ کر کے تم لوگوں کو آسانی سے حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات آپ کے سامنے ہیں۔“

میرا ذہن اس وقت نوع بہ نوع سوالات کی تاجانہ ہوا تھا۔ وڈیرا اکبر سومو کا مہمان میرے لیے کسی لمحے سے ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ ”وہ“ کوئی شخص تھا جو میرا پروگرام سے مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ یہ میرے لیے بہت تشویش کی بات تھی۔ میر بخش نے بتایا تھا کہ اکبر سومو کا مہمان کا تعلق لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے تھا۔ لاہور کے نواح میں پائے جانے والے گاؤں میں صرف ایک گاؤں کے نام سے واقف تھا۔ صرف نام سے واقف تھا۔ ”دیکھا گیا نہیں تھا۔ میں اس گاؤں کی گلیوں اور کوچوں کے دیوارے کے لیے تو پاکستان آیا تھا۔ وہ گاؤں میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ مجھے اس کی مٹی“ اس کی آہ ہو رہی تھی۔ اس کی مٹی کی طرح فضا سے محبت تھی۔ یہی محبت مجھے پہنچ کر پاکستان لانی مٹی میں اپنے آبائی گاؤں، اپنی جنم بھومی ”موضع رکھان والا“

پہنچنے کے لیے جہنم و بے تاب تھا۔

”رکھان والا“ کے خیال سے میرا دھیان اپنے دیرینہ دشمن ملک نواز علی کی طرف چلا گیا۔ اسی حیثیت الااختش شخص کی وجہ سے میرے والد کو اپنی دھرتی ”اپنا گاؤں“ اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا۔ کسیں ملک نواز علی ہی تو مجھے گھیرنے کے لیے وڈیرا اکبر سومو کا مہمان بنائیں بیٹھا؟ میں جانتا تھا، رکھان والا کے چودہری ملک نواز علی کی پہنچت دور تک تھی۔ وہ ایک سکندر اسٹاکر تھا۔ اس کا باپ چودہری ملک رمضان بھی اسی مذموم دھندے میں لوٹ تھا کیا نواز علی کو اسٹاکنگ، غنڈا گردی اور بد معاشی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ یہ ظاہر وہ ایک بڑا زبیں دار تھا لیکن پردہ ہر برس کام میں اس کا ہاتھ شامل تھا۔

ملک نواز علی کے ایک ہر کارے ”دارا“ نے کئی سال تک مجھے کھلی کانچ چنایا تھا وہ میری جان کا دشمن ہو گیا تھا پھر جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور میں نے زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینا سیکھ لیا تو دارا مجھ سے چھپتا پھر لگا تھا۔ پہلے وہ میرے تعاقب میں تھا، پھر میں اس کی ناک میں رہنے لگا اور بالا خرچ میں نے اسے جنم واصل کر کے دم لیا تھا۔ دارا ہر ماں باپ کا قاتل تھا ”اسے دو زخم رسید کر کے مجھے بہت سکون ملا تھا“ میرے دل و جگر میں ایک ایسی ٹھنڈک آئی تھی جیسے شبنم کے شفاف قطرے اپنا ٹھنڈا گداز پھول کی پتوں کے پتے میں اتارتے ہیں۔

یہ ممکن تھا کہ نواز علی عمر کوٹ پہنچ گیا ہو۔ وہ بہت ڈانڈی تھا۔ اگر اسے میرے پروگرام سے آگاہی حاصل ہو گئی تھی تو اس میں الجھنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ بھاری دھڑکتے سونے کا ٹکڑا ابھی باقی تھا وہ لاچھی فطرت شخص مجھے آسانی سے بھلا نہیں سکتا تھا۔

میں نے بہت سہجھا کہ میر بخش سے اپنے ان اندازوں کی تبدیلی کر لوں۔ میں نے ملک نواز علی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے ”رکھان والا“ کو ”چھوڑا“ تو اس وقت میری عمر صرف دو ماہ تھی لیکن والد صاحب کی ڈانڈی میں درج معلومات سے میں نواز علی کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

تمہاری باتیں اگرچہ بہت معلومات افزا ہیں لیکن تم نے نئی بات مجھے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ”پھر میں نے خود ہی وضاحت کر دی۔“ میں نے تم سے وڈیرا اکبر سومو کے اس مہمان کے بارے میں پوچھا تھا جو مجھے ”حاصل“ کرنے

لاہور سے یہاں پہنچا ہے؟“

میر بخش نے جواب دیا۔ ”وجدان سائیں! میں اس شخص کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ جو مجھے معلوم تھا، وہ میں نے آپ کو بتایا دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سنی سنا ہے؟“

”صرف ایک بار دیکھا ہے سائیں۔“ اس نے بتایا۔

”اس کی عمر کیا ہوگی؟“

”میرے ہی پختی ہوگی سائیں۔“

میرے اندازے کے مطابق میر بخش تیس کے اربعہ قریب تھا۔ میں نے کہا۔ ”تمہاری عمر تو مجھے تیس سال لگتی ہے۔“

وہ بولا ”جی سائیں“ وڈیرا اکبر سومو کے اس مہمان کی عمر بھی تیس سال کے قریب ہی ہوگی۔“

وہ ملک نواز علی نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک نواز علی اس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق لگ بھگ پچاس سال کا ہو گا۔

اب میں ایک نئی کھٹکھٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ شخص اگر نواز علی نہیں تھا تو پھر کون ہو سکتا تھا۔ کسیں وہ بھی دارا کی طرح ملک نواز علی کا کوئی ”ٹھیک خوار“ تو نہیں تھا؟ دارا نے اگر مجھے ایک چوڑھائی دینا میں دوڑایا تھا تو وہ شخص میرے استقبال کے لیے عمر کوٹ پہنچ گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ آثار بتا رہے تھے کہ آنے والے وقت میں منت سنے ہنگامے میرے کھڑے تھے۔

میں نے میر بخش سے پوچھا۔ ”کیا تم اس شخص کا نام جانتے ہو؟“

وہ نفی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔ ”نہیں سائیں۔“

میں نے کہا ”میر بخش! تم نے بتایا ہے کہ وڈیرا رئیس خان نے تمہارے وڈیرا سائیں اکبر سومو کے کتنے پر تم سے بھرپور تعاون کیا تھا ورنہ اس ”معالے“ میں رئیس خان کا کوئی ہاتھ نہیں؟“

”جی سائیں“ میں نے آپ کو ایک جی بات بتائی ہے۔“

”کیا رئیس خان اور اکبر سومو کے درمیان دوستی پائی جاتی ہے؟“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ظاہر ہے سائیں“ یہ دونوں ایک ہی قماش کے وڈیرے ہیں یعنی دونوں ”بھوتار“ ہیں۔ جس طرح ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بھونپتا ہے اور اس سے بھرپور تعاون کرتا ہے بالکل اسی طرح

ایک بھوتارو دوسرے بھوتار کے ”کلام“ آتا ہے اس حوالے سے رئیس خان اور اکبر سومرو آپس میں گھرے دوست ہیں۔“

میر بخش صرف ایک دیسی پہلوان ہی نہیں تھا بلکہ اس میں عقل اور دانش بھی پائی جاتی تھی گویا وہ جسمانی اعتبار سے پہلوان تھا مگر ذہنی طور پر اس سے آگے کی کوئی چیز تھا۔ اب تک اس نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ اس کے کلام سے سچائی کی خوب اٹھتی تھی۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا تھا کہ میر بخش بہر بھروسا کیا جاسکتا تھا تاہم میں مزید تسلی کے لیے ابھی کچھ اور گھنٹا چاہتا تھا۔

”میر بخش!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر ہمارا انخوا ایک سوچے مجھے منصوبے کا نتیجہ تھا تو پھر وہ تھانے والا ڈراما کیا معنی رکھتا تھا؟“

”کوئی سا ڈراما سائیں!“ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نہ کہا۔ ”رقم کے ہزارے کا ڈراما۔“ وہ میرے الفاظ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! وہ سب کچھ تمہیں چکر دینے کے لیے تھا تاکہ تم ہم پر بھروسا کرنے لگو اور بے فکری سے ہمارے ساتھ چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کر دو۔“

”تو پچاس ہزار روپے کی تقسیم؟“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”سائیں! تھانے دار اور رئیس خان میں یہ طے پایا تھا کہ پنڈت کشوری لال سے ملنے والے پچاس ہزار روپے سیدھے سیدھے تھانے دار کی جیب میں جائیں گے جس کے بدلے میں وہ تم دونوں کو چھوڑ دے گا۔“

”اور وہ جو مجھے دس ہزار روپے دیے گئے تھے؟“ رقم کا خیال آتے ہی میں نے اپنی جیب کو مٹولا جس میں میں نے تھانے سے روانہ ہونے سے قبل استعمال شدہ نوٹوں کی وہ گڈی رکھی تھی۔ جیب کو چھوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ گڈی اب وہاں موجود نہیں تھی۔ سو سو روپے والے وہ استعمال شدہ نوٹ میری جیب سے نکال لیے گئے تھے۔

میں نے چونک کر میر بخش کی جانب دیکھا۔ وہ میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! وہ دس ہزار روپے وڈیرا رئیس خان نے آپ کو اپنے پاس سے دیے تھے جو وہ واپس لے گیا ہے۔“

”واپس لے گیا ہے؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ”کب؟“

میر بخش نے بتایا۔ ”سائیں! جب ہم تھانے سے ہوئے تھے تو رئیس خان کی پیجاو ایک موٹر سے ملے وہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔ بعد جب آپ لوگوں کو بے ہوش کیا گیا تو وڈیرا پھر بہت تھا۔ ہم نے آپ دونوں کے ہاتھوں کو باندھا اور دروازے خان کے حوالے کر دی۔ وہ اپنی رقم لے کر واپس چلا گیا۔ ہم نے گاڑی اپنی منزل کی جانب بڑھا دی تھی۔“

میں حیرت اور دلچسپی سے میر بخش کی انکشافی باتیں سن رہا تھا۔ اپنی بے ہوشی کے ذکر پر میں نے اس پر پوچھا۔ ”تم لوگوں نے ہم پر قابو پانے کے لیے ہمیں گمراہ ہوئی میں انار دیا تھا۔ اگر اسی بے ہوشی کے دوران میں۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی بولا۔ ”میں سائیں! ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا، بہت سوچ کر اور حساب کتاب سے کیا تھا۔ ہم آپ کی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جس نیند آور سے آپ دونوں کو بے ہوش کیا گیا تھا اس کا اثر زیادہ زیادہ بارہ گھنٹے تک رہتا ہے۔ آپ لوگ رات میں کئی ہوش میں آجاتے لیکن۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر کچھ رات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن سائیں! گاڑی کا غار بھٹ گیا تو گاڑی کو والے قیامت خیز جھکوں سے آپ کی نیند ٹوٹ گئی۔ آپ خبری کے عالم سے عالم باخبری میں آ گئے۔“

میں نے میر بخش کو یہ بتانا ضروری سمجھا کہ گاڑی کا بھٹنے سے کافی دیر پہلے میں بے ہوشی سے نکل آیا تھا اور ہاتھوں کو نسبتاً آزاد کرنے کا مکمل تصور کر چکا تھا۔ میر ہاتھ اگر کچھ کرنے کے قابل ہو جاتے تو میں پھر اپنے اور کے لیے بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ غار بھٹنے کے باعث گاڑی جیتنے والے جھکوں نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے طنز بھرے لہجے کہا۔ ”آپ لوگوں کو تو ہماری یہ ”باخبری“ بہت مشکل ہے۔ تم دل میں یہ ضرور سوچتے ہو گے کہ کاش گاڑی نہ بھٹتا اور نہ تم اس مصیبت میں گرفتار ہوتے۔ کھلا غلط کہہ رہا ہوں؟“

”شروع شروع میں تو میں نے ایسا ہی سوچا تھا سائیں! وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”لیکن پھر بعد میں میری سوچا گئی، میرے خیالات بدل گئے۔ قدرت کی طرف سے ہوا وہ میرے لیے زیادہ بہتر ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”سائیں! سیدھی سی بات ہے“ میر بخش نے جواب دیا۔ ”میں وڈیرا اکبر سومرو کے پاس دلی طور پر خوش نہیں تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔ میں نے جرائم کے خلاف ہوں مگر ہم جیسے لوگ من مانی نہیں کر سکتے اگر ہم ذرا سی بھی سرکشی دکھائیں یا ہماری کسی ادا سے بغاوت کی جھلک نظر آجائے تو بھوتار سائیں! ہم پر زمین ٹک کر سکتا ہے، ہم اس کے چنگل سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

وہ تھوڑی دیر رک کر متشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ جان سائیں! اللہ سائیں نے آپ کی شکل میں مجھے ایک شہری موقع فراہم کر دیا ہے۔ آپ کی مہمانی سے میں اکبر سومرو کے ظلم و جبر سے نجات پا سکتا ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنی چاکری میں لے لیں تو میں آپ کا بے دام غلام بن کر زندگی گزار دوں گا۔ میں جان گیا ہوں آپ بدی کے خلاف لڑنے والے ایک عظیم انسان ہو، اللہ سائیں آپ کو کامیابی دے گا۔ میرا مرنا جتنا اب آپ کے ساتھ ہے سائیں۔ جو حکم ہو آپ کا میں آنکھیں بند کر کے عمل کروں گا۔“

میں اطمینان بھری نظر سے میر بخش کو دیکھ رہا تھا۔ اس حوالے سے میں ہمیشہ خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ ظلم اور بدی کے خلاف اس کبھی حق نہ ہونے والی جنگ میں مجھے غلط، ہم درد اور نیک نیت لوگ ملتے رہتے تھے، بعد ازاں جو میرے دوستوں کی حیثیت حاصل کر لیتے تھے۔ مجھے آقا بننے کا شوق تھا اور نہ ہی کسی انسان کو غلام بنانے کی تمنا تھی۔ میں تمام مثبت طرز فکر رکھنے والے لوگوں سے دوستی کی بنیاد پر ملتا تھا اور میری انسانیت بھی ہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کی پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک مرتبہ پھر قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ اس بات کے آثار بہت واضح دکھائی دے رہے تھے کہ میر بخش میرے حلقے میں شامل ہونے والا تھا۔

میں نے میر بخش کی پوری بات سننے کے بعد کہا ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری باتیں صداقت کے معیار پر پوری اتریں تو میں نہ صرف تمہیں پناہ دوں گا بلکہ ہر ممکن تمہارے کام آنے کی بھی کوشش کروں گا لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔“

”وہ کیا سائیں؟“ وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”جب وڈیرا اکبر سومرو کو پتا چلے گا کہ تم

اس سے غداری کر کے میرے ساتھ مل گئے ہو تو وہ تمہارے اہل خانہ کی زندگی اجیرن کر دے گا۔ وہ جینا چاہیں گے تو جی نہ پائیں گے اور موت کی خواہش بھی برپا آئے گی۔“

”آپ اس بات کی فکر نہ کرو سائیں۔“ وہ مطمئن لہجے میں جلدی سے بولا۔

”کیوں بھی؟“

اس نے بتایا۔ ”میرا کوئی نہیں ہے۔ بس اکیلی جان ہوں۔ اور اس جان کو آپ پناہ دینے کا وعدہ کر چکے ہو سائیں اس لیے مجھے دنیا کی کوئی فکر نہیں رہی۔ ایک ظالم وڈیرے کی پشت پناہی حاصل ہونے سے ایک نڈر بہادر۔ اور ظلم و ستم کے خلاف کھلی جنگ لڑنے والے انسان کا ساتھ دینا ہزار درجے افضل ہے۔“

میں مطمئن ہو گیا۔ میر بخش کے ادا کیے ہوئے ایک ایک لفظ سے سچائی پختہ تھی۔ میں نے اس پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اچانک میرا خیال اس واقعے کی طرف چلا گیا جب تھانے دار نے مجھے کسی خون آشام بھیڑیا صفت انسان کی کمائی سنائی تھی جس کے ساتھ ایک خوب روڑی بھی دیکھی گئی تھی۔ ”وہ جوڑا“ اپنے شکار کا خون چوس کر اسے زندگی کی قید سے رہائی دلانے کا ”فریضہ“ انجام دے رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں میر بخش سے استفسار کیا تو وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”سائیں! اس کمائی میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں۔“

”پھر وہ جھوٹی کمائی مجھے کیوں سنائی گئی تھی؟“

”آپ کی اصلیت کی تصدیق کے لیے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”سائیں! آپ کو یاد ہوگا، وڈیرا رئیس خان نے اس خونی قاتل کی ایک واضح نشانی بتائی تھی!“

”ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”رئیس خان نے کہا تھا کہ اس خطرناک انسان کے دائیں کان کے پیچھے سرخ رنگ کا ایک ہلالی نشان ہے۔ بعد ازاں اس نے میرے دائیں کان کا تفصیلی جائزہ بھی لیا تھا۔“

”بالکل سائیں! ایسا ہی ہوا تھا۔“ میر بخش تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دراصل رئیس خان کی بتائی ہوئی مفروضہ قاتل کی وہ پہچان ایک جھوٹی کمائی تھی! ایک بہانہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کو یہ بہانہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نے بتایا نا، وہ آپ کی اصلیت کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔“

”لیکن میرے دائیں کلن کے پیچھے سرخ ہلالی نشان نہیں ہے؟“

”مور ہتھقل تو ہے نا!“

میں نے اچھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ سیاہ تو ہے۔“

”بس، وہ یہی سیاہی دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔“ میر بخش نے مجھے حیرت میں مبتلا کرتے ہوئے بتایا۔ ”اے بتایا گیا تھا کہ تمہارے دائیں کان کی لو کے پیچھے سور کی دال کے برابر سیاہی ہے اور تمہیں شناخت کرنے کے لیے یہی سب سے زیادہ مفید نشانی ہے۔“

میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔ ”وڈیرا ریش خان کو میرے بارے میں یہ بات کس نے بتائی تھی؟“

”وڈیرا سائیں اکبر سومرو نے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور وڈیرا سائیں کو یہ بات اپنے مہمان دوست سے پتا چلی تھی۔“

میں سانسے میں رہ گیا۔ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان اور میرا ”طلب گار“ وہ شخص میری توقع اور اندازے سے بھی زیادہ عجیبہ اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ میرے دائیں کان کی لو کے پیچھے واقع سیاہی تل کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے اور میرے دشمنوں میں تو صرف ایک شخص میری اس نشانی سے واقف تھا جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ شخص شیطان صفت، تکینہ، حصلت، اور نہ صفت اور

حیوان جبلت دارا تھا۔ دارا کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے اس کی عبرت ناک موت کا منظر یاد آگیا۔ میں نے اس قاتلوں کے قاتل اور موت کے سوداگر کو مار کر انسانیت پر احسان کیا تھا وہ نہ صرف میرے ماں باپ کا قاتل تھا بلکہ اس کے ہاتھ سیکڑوں بے گناہوں کے خون میں بھی رنگے ہوئے تھے اور اس کے پھیلانے ہوئے منشیات کے زہریلے جال نے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کو عبرت نگاہ بنا دیا تھا۔ ان ستم نصیب لوگوں کی گردنیں نشے کے تازیانہ پھندے میں جکڑی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہوئی سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔

دارا کے بارے میں بڑے وقتوں سے کما جا سکتا تھا کہ دنیا میں پائے جانے والے انسان نما شیطانوں میں وہ اول درجے پر ”قاتل“ تھا۔ میں نے اس معاشرتی ناسور کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں اس تارخ ساز دن کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ رشی کیش قبے سے کچھ آگے ہمالیہ کی گود میں ایک مقام

”گنگوتری“ کے نام سے موسوم ہے۔ دریائے گنگا کا آغاز ہی پہاڑی سلسلے سے ہوتا ہے اسی لیے گنگوتری کو ”گنگا کی سرسبز گلی“ کہا جاتا ہے۔ دریائے گنگا اور گنگا جل (گنگا کا پانی) ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس اور جبرک سمجھے جاتے ہیں۔ اسی ”گنگوتری“ کو (GATEWAY to GOD) بھی کہا جاتا ہے۔

گنگوتری کے ”سکری مندر“ میں میرے اور دارا کے درمیان ایک خون ریز معرکہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں میں نے اسے دو سو فٹ گہرے پہاڑی کھڈ میں پھینک کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس موقع پر میری دو ساتھی عورتیں جاگ اُڑ چڑا پر تھم بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں جب کہ دارا کے علاوہ اس کے دو ہم قماش ”نیو“ اور ”ہنڈت“ پر گھیا راج بھی جنم رسید کر لیے گئے تھے۔ تھا کہ بھانوت سنگھ نے میری پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ثابت قدمی سے دشمنوں کے واپس ہٹنے کیے تھے۔

اور اب۔۔۔ میرے سانسے جیٹا ہوا میر بخش یہ انکشاف کر رہا تھا کہ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان دوست میرے کلن کی اس نشانی سے واقف ہے جس کے بارے میں دارا کے سوا میرا اور کوئی دشمن کچھ نہیں جانتا تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے بھی معلوم ہو چکا تھا کہ۔۔۔ ”اے کاوہ“ ”مہمان دوست“ لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے آیا تھا۔ دارا اور ملک نواز شعلی کا تعلق بھی لاہور کے نواحی گھٹس ”کرکھال والی“ سے تھا۔ چنانچہ یہ سوجھا جا سکتا تھا کہ اکبر سومرو کے دوست کا کھ نواز شعلی سے کوئی تعلق ہو گا!

اگر یہ فرض کر لیا جاتا تو پھر یہ بات یقینی ہو جاتی تھی کہ دارا نے اپنی موت سے قبل، میری سیاہی تل والی نشانی کے بارے میں ملک نواز شعلی کو ضرور بتا دیا ہو گا۔

میں کچھ دیر تک میر بخش کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”تم کیا واقعی وڈیرے کے مہمان دوست کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے؟“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں سائیں، مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”میں نے اس کی بس ایک جھلک دیکھی ہے باقی باتیں سنائی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تم اس شخص کے چیلے کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

میر بخش نے اس شخص کا جو حلیہ بیان کیا اس کے مطابق وہ ایک ہٹا کٹا اور مضبوط جسم کا مالک انسان تھا۔ تہ اور تھا۔ آنکھوں میں ذہانت، جھلکتی تھی اور عمر گھٹک تھا

سال تھی۔ اس چیلے پر تو میر بخش بھی اتنی ہی صبر پورا کرتا تھا۔ وہ بھی صحت مند جسم کا مالک تھا، طاقت ور بھی تھا۔ قد بھی چھ فٹ کے قریب تھا، عمر میں بھی وہ اس شخص کے برابر ہی تھا۔ میر بخش کے بتائے ہوئے چیلے سے میں اس شخص کے بارے میں کوئی واضح اندازہ قائم نہیں کر سکا۔

میں نے کہا۔ ”میر بخش! تمہارے وڈیرے کا دوست تو خاصی اونچی چیز معلوم ہوتا ہے جو میرے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔“

”سائیں! اب میں وڈیرے کا آدمی ہوں“ اور نہ ہی وہ میرا وڈیرا سائیں ہے۔“

وہ برا سانسہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اکبر سومرو سے بر تعلق توڑ کر آپ کو اپنا آقا تسلیم کر لیا ہے۔ ہاں، یہ بات آپ کی بالکل درست ہے۔ وہ شخص واقعی بہت اونچی چیز ہے۔ اسی لیے تو وڈیرے کے بچنے پر اس کی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔ ”میر بخش! تم نے تمہاری دیر پہلے بتایا تھا کہ جب تم لوگوں کو پتا چلا کہ ہم ہارڈ کر اس کر کے ”ٹھکر مار کر“ کے سرحدی گاؤں میں داخل ہو چکے ہیں تو تم نے وڈیرا اکبر سومرو کو اس بارے میں اطلاع دی تھی۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ”تم نے اکبر سومرو تک ہماری آمد کی اطلاع کس طرح پہنچائی تھی؟“

”موباائل فون کے ذریعے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں اچھل پڑا۔ ”موباائل فون!“

پھر اس سے پہلے کہ وہ میری حیرت کو رفع کرنے کے لیے زبان سے ایک لفظ بھی نکالتا گاڑی کے ڈرائیونگ کبین میں کھین فون کی کھنٹی بج اُٹھی۔ کھنٹی کی آواز جچ چچ کر اپنی شناخت پیش کر رہی تھی کہ اس کا مخرج کوئی موباائل فون ہے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے میر بخش کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جو جوانی کا تاثر ابھر اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ وڈیرا اکبر سومرو کی کال تھی۔ اسی دوران میں میر بخش نے گاڑی کے ڈیش بورڈ کو کھول کر موباائل فون برآمد کر لیا تھا۔

”وہ خامسے بڑے سائز کا موباائل فون سیٹ تھا۔ اس زمانے میں موباائل فون کو پاکستان میں متعارف ہوئے چند

سال ہی ہوئے تھے اور نئے نئے فون سیٹ مارکیٹ میں نہیں آئے تھے جیسا کہ آج کل دکانوں میں اور اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں ”جے“ نظر آتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میر بخش فون آن کر کے گفتگو آغاز کرنا، میں نے تنبیہ کی تھی میں اس پر واضح کر دیا۔ ”سب ٹھیک ہے“ تم دونوں ہم لوگوں کو لے کر پہنچ رہے ہو۔“

میرے لہجے میں پوشیدہ دھمکی اور آواز کے اتار چڑھاؤ میں شامل لہجے نے میر بخش کے ذہن میں میرا مقصد نقش کر دیا تھا۔

میر بخش اور اکبر سومرو کے درمیان ٹھٹھ میں پانچ منٹ تک بات چیت ہوئی رہی۔ بعد میں میر بخش کی زبانی مجھے جو احوال معلوم ہوا اس کے مطابق ان کے درمیان کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ میں سندھی زبان کو پوری طرح نہیں سمجھتا تھا بس کچھ الفاظ کے معنی معلوم ہو جاتے تھے۔

”میر بخش! تم اس وقت کہاں ہو۔ تمہیں ”چھاچرو“ سے گزرے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک تم لوگوں کو ”دھر سال“ سے آگے نکل آنا چاہیے تھا۔“ اکبر سومرو نے بے چین انداز میں پوچھا تھا۔

اس کے بیان سے اندازہ ہوا کہ چھاچرو میں اس کا کوئی آدمی ضرور موجود تھا۔ جس نے ہماری سیاہ گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور دھر سال میں بھی اس کے کسی وفادار کی موجودگی کی بول رہی تھی۔

میر بخش نے جواب دیا تھا۔ ”سائیں بھوتارا! بس ہم دھر سال پہنچنے ہی والے ہیں۔“

”نہ بابا! اتنی دیر کیوں ہو گئی۔“ وڈیرے نے پوچھا۔

”غیرت تو ہے نا؟“

”سب خیریت ہے سائیں بھوتارا! میر بخش نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس چھاچرو اور دھر سال کے درمیان دیگستان میں اچانک گاڑی کا غار بھٹ گیا تھا۔ ہم نے غار تبدیل کر لیا ہے۔ بس اب روانہ ہوئے ہی والے ہیں۔“

سائیں نے پوچھا۔ ”وہ دونوں کیسے ہیں؟“

”پوری طرح بے ہوش ہیں سائیں بھوتارا!“

”ان پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔“

”ہم پوری طرح محتاط ہیں۔“

”میرے دوست کا دعویٰ ہے کہ وہ لڑکا وجدان بہت شاطر اور خطرناک ہے۔“ وڈیرا اکبر سومرو نے کہا۔ ”میں اس ”نامی گرامی“ لڑکے کو جلد از جلد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس

طرف سے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ میربخش نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ”آپ فکر نہ کرو سائیں بھوتار! ہم ان دونوں کو لے کر آپ کے پاس پہنچنے والے ہیں۔“

وڈیرے نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا تھا۔ میربخش موبائل فون ایک طرف رکھتے ہوئے سرا سید لہجے میں بولا۔ ”اب کیا ہو گا سائیں؟“ ”وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ”سائیں! آپ نے ہدایت کی تھی کہ میں وڈیرا اکبر سومو سے یہ کہوں۔۔۔ سب ٹھیک ہے، ہم تم دونوں کو لے کر عمر کوٹ پہنچ رہے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد ابھن زدہ لہجے میں گویا ہوا۔ ”میں نے آپ کی بات کے مطابق وڈیرے سے گفتگو کی ہے۔ کیا آپ واقعی مجھے عمر کوٹ وڈیرے کے بنگلے پر بھیجنا چاہتے ہو؟“ ”ہاں! میرا ارادہ تو یہی ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”مگر سائیں!۔۔۔“

اس نے پریشان ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے کہا۔ ”اگر مگر کچھ نہیں چلے گا میربخش۔ تمہیں وہی کرنا ہو گا جو میں کہہ رہا ہوں اور میں تم سے یہی کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے تم سیدھے وڈیرا اکبر سومو کے بنگلے پر جاؤ گے۔“ ”لیکن میں نے تو وڈیرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میربخش نے شکوہ کناس لہجے میں کہا۔ ”سائیں! آپ مجھے ”سام“ بنا چکے ہو۔ اس کے باوجود بھی؟“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میربخش! تم میری خدمت میں رہنے کے خواہش مند ہو نا۔ مجھے آقا بنایا ہے تم نے اور میرے ہر حکم کی تکمیل تم نے بے چون و چرا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو پھر یہ تردد کیوں؟“

”سائیں! کیا آپ بھی میرے ساتھ چلو گے؟“ اس نے ایک اہم سوال کیا۔

میں نے حوصلہ شکن جواب دیا۔ ”نہیں!“ ”آپ کے بغیر میں وڈیرا اکبر سومو کے پاس پہنچوں گا تو وہ میرا جو شتر کرے گا اس کا قصور ہی کرے کہ میری روح فنا ہو رہی ہے۔“ وہ نیکیا تے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ”میربخش! میری ایک بات ذہن میں بٹھاؤ۔ ظالم اور جابر شخص سے بھی ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند کرنا چاہیے۔ یاد رکھو، ظالم کے سامنے خاموش رہنا مظلوم کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔ تم تو بٹاؤ اللہ! جتنے خاصے صحت مند ہو، طاقت ور ہو پھر یہ بزدلوں والی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ تم جیسے ڈرپوک لوگوں کے لیے میرا پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”سائیں! میں نہ تو ڈرپوک ہوں اور نہ ہی بزدل۔“ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”بس بات اتنی سی ہے سائیں کہ میں اکیلا، وڈیرا اکبر سومو کا کچھ نہیں لگاؤں۔“

میں نے کہا۔ ”جب یہ سمجھو کہ سامنے والا تم سے طاقت، اختیار اور اقتدار میں کہیں زیادہ مضبوط ہے تو پھر حکمت عملی سے کام لینا چاہیے۔“ ”حکمت عملی!“ وہ ہونٹوں کی طرح منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے فہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دیکھو میربخش! جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے بالکل اسی طرح کسی چال باز کو اپنی چال سے کاٹا جا سکتا ہے۔ اسی کو حکمت عملی کہتے ہیں۔“ ”میں کچھ نہیں سمجھا سائیں!“ وہ مزید الجھ گیا۔

”میں سمجھتا ہوں۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میربخش! تم وڈیرا اکبر سومو کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے وڈیرے کی طاقت کا تو ذرا بھی نہیں بتاؤں گا۔ تم میری ہدایات پر عمل کرو گے۔ پھر دیکھنا، کس طرح سب مجزے کام سنور جاتے ہیں۔“

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ یہ میری ذات پر اس کے اعتراف کا نتیجہ تھا۔ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”سائیں! اس سلسلے میں آپ کی ہدایات کیا ہوں گی؟“

میں نے چند لمحے خاموش رہ کر بولنا شروع کیا۔ ”جیسا کہ میں نے بتایا ہے، کسی مفکار کو مفکاری ہی کی مار ماری جا سکتی ہے۔ میں بھی وڈیرا اکبر کو چالاکی اور ہنرمندی سے اپنے دام میں لاؤں گا۔“

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم اکیلے ہی وڈیرا اکبر سومو کے بنگلے پر پہنچو گے، ایک گھنٹی خیر اور خوفناک کمائی کے ساتھ۔ تم نہایت ہی ڈرے ہو انداز اور خوف زدہ آواز میں اسے بتاؤ گے کہ میں۔۔۔ یعنی وجدان علی کوئی خطرناک قسم کا جادو جانتا ہوں۔ جب تم گاڑی کا ٹائز بدل کر آگے روانہ ہوئے تو اسی وقت مجھے ہوش آگیا کہ پھر جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ تم لوگوں نے ہمیں اغوا کرنا ہے تو میں نے کالے نیلے پیلے۔ پتا نہیں کس رنگ اور تم

کے جادو کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ پہلے اس جادو کے زور پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے پر مجبور کیا۔ جب گاڑی رک گئی تو میں نے تمہیں زبردستی اس بات پر آمادہ کیا کہ تم ہم دونوں کو نہ صرف گاڑی کے پچھلے حصے سے نکالو بلکہ ہمارے ہاتھوں کو بھی بندش سے آزاد کر دو۔ تم نے نہ چاہتے ہوئے تحریک اثرات کے تحت میرے حکم کی تعمیل کی۔ اس موقع پر ڈرائیور نواز علی نے جو ان مرد کا مظاہرہ کرنا چاہا تو میں نے تمہارے ہاتھ میں موجود گلا شکوف سے فائر کرنا نواز علی کا قصہ پاک کر دیا۔ تم نے ہم دونوں کو زیر کرنے کے لیے ہمارے قدموں میں فائرنگ کرنا چاہی تو میں بار بار تمہارا نشانہ خطا کروا گیا۔ گولیاں ضائع ہوئی رہیں مگر تم میرا بال بھی بانگ نہ کر سکتے۔ اس طرح تم، یہاں ہونے والی فائرنگ میں استعمال شدہ گولیوں کا حساب دینے سے بھی بچ جاؤ گے۔“

میں تو ڈیرا کو روکا تو میربخش نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا وڈیرا میری اس کمائی پر یقین کر لے گا؟“

”اس کے باپ کو بھی یقین کرنا پڑے گا۔“ میں نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ”میں اس کے یقین کا مکمل بندوبست کر کے تمہیں رخصت کروں گا۔“ ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے کہا۔ ”گاڑی سے باہر آ جاؤ۔“

”کہاں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”تم نواز علی کی لاش اٹھانے میں میری مدد کرو گے۔“

”نواز علی کی لاش کو اٹھا کر کہاں لے جانا ہے؟“ وہ بھی گاڑی سے باہر آ گیا۔

میں نے کہا۔ ”اس گاڑی کے عقبی حصے میں ”پنٹا“ ہے۔“ ”میں نے درمیان۔“

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”تم وڈیرا اکبر سومو کو بڑے رقت آمیز انداز میں بتاؤ گے کہ جب میں نے تم لوگوں کو اپنے ٹرانس سے آزاد کیا تو تم جھوٹ جھوٹ کر روئے تھے۔ ازاں بعد تم نے نواز علی کی لاش کو اپنے چمچے کھڑے کر اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا اور سیدھے عمر کوٹ ٹرانس سے آزاد کیا تو خود آپ کہاں گئے؟“

”تم کہہ سکتے ہو کہ جب تم اپنے ہوش میں آئے تو ہم ”ڈرائیو“ ہو چکے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”جتنی میں تو جادوگر ہوں۔ کیس بھی غائب ہو سکتا ہوں اور اپنے ساتھ ساتھ اپنا سامی لڑکی کو بھی غائب کر سکتا ہوں۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کہانی تو خاصی سنسنی خیز ہے۔ اب یہ وڈیرے کے دماغ میں بھی اتر جائے تو اچھا ہے۔“

”ترے گی، حضور اترے گی میربخش!“ میں نے پروٹون لہجے میں کہا۔ ”یہ وڈیرے سائیں اور کسی بھی علاقے کے اندرون میں بسنے والے لوگ بہت تو ہم پرست ہوتے ہیں۔ جادو ٹوٹے اور تادیبہ قوتوں پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ دونوں دوست مجھے ایک خطرناک شخص تو قرار دے ہی چکے ہیں۔ اب ان پر جب میرا یہ جو ہر کھلے گا تو ان کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ پھر میرے ”جادو کی کمالات“ کے کچھ ثبوت بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اس لیے وڈیرا تمہاری وردناک کمائی پر کان دھرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

میربخش نے پوچھا۔ ”کیسے ثبوت وجدان سائیں؟“ ”نواز علی کی لاش“ میں نے میربخش کی مدد سے نواز ڈرائیور کی لاش کو گاڑی کے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ نیٹائیل کی ڈوری جس سے میری ساتھی کے ہاتھ باندھے گئے تھے اور۔۔۔ یہ پھٹکری!“ میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

”مگر یہ تو میرے ہاتھوں میں لگی ہوئی ہے۔“ ”میں اسے تمہارے ہاتھوں سے نکال دیتا ہوں۔“ میں نے چالی سے پھٹکری کھولتے ہوئے کہا۔

دھواں اس دوران میں حیرت بھری نظریں سے ہم دونوں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس وقت کسی اہم ”کارروائی“ میں مصروف تھا اس لیے اس کے بولنے کی ضرورت نہیں۔

میں نے میربخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کو! اب تو تم مطمئن ہو یا۔۔۔؟“

میں نے رانتہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

”سائیں! وڈیرا اکبر سومو نے ہنگامی حالات میں رابطے کے لیے مجھے موبائل فون دے رکھا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے، میں نے اتنے بڑے واقعے کی اطلاع اسے کیوں نہیں دی تھی۔ اس سوال کا میں کیا جواب دوں گا؟“

میں نے کہا۔ ”اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔“ وہ ابھن زدہ نظریں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی ابھن دور کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے پہلی فرصت میں وڈیرے کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہی تھی بلکہ

ملاقات کب اور کہاں ہوگی؟ یہ بات میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب ہم جاہوئے لگیں گے۔ وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”اب ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ ہمیں فوراً اپنا سفر شروع کرنا چاہیے۔“

اس نے پوچھا۔ ”آپ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گے سائیں یا میرے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں؟“

”تمہارے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں“ میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔ ”اور اب ڈرائیونگ بھی میں ہی کروں گا۔“

پھر میں دھنکی جانب متوجہ ہو گیا اور نواز علی کی لاش کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔ ”کیا تم اس کی موجودگی میں آرام سے رہ لو گے یا میں کسی اور قسم کی ”سینک“ کروں؟“

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ”وہ جان! تم فکر نہ کرو۔ میں اس قسم کے منظر سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ جب تمہارے قدم میں، میں نے اپنا قدم رکھ دیا ہے تو پھر فکر اور خوف کی کیا بات ہے۔ اب تو قدم قدم پر ایسے مناظر کا سامنا ہو گا۔ میں نے اب تک جتنا بھی وقت تمہارے ساتھ رہ کر گزارا ہے اس کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری زندگی بہت ہنگامہ خیز ہے۔ تم ہر وقت خطرات میں گھرے رہتے ہو اور جان بھری پر رکھ کر ان خطرات کا مقابلہ کرتے رہتے ہو۔ اگر تمہارے ساتھ چلنا ہے تو پھر دل کو مضبوط بنانا ہو گا۔“ اس نے ایک عجیب انداز میں میری آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”وہ جان! تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کتنی حوصلہ مند لڑکی ہوں۔ اگر میں کمزور دل ہوتی تو اپنے ماں باپ کی لاشوں کو دیکھ کر وہیں عبادت گاہ ہی میں جان دے دیتی۔ لیکن نہیں، وہ میرا حوصلہ، عزم اور مضبوطی ہی تھی کہ میں نے اپنی ماں بھیر جانی اور باپ بھونچ کی خون چکان لاشوں کو بدھ نل کنڈ کی عبادت گاہ سے کھنڈوشہ تک پہنچایا تھا۔“

دھنوبولتے بولتے جذباتی ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی جس واقعے کا ذکر کیا تھا اس کی اندوہ ناکی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ دھنوبولتے واقعی بہت بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور ازاں بعد بھی وہ میری خاطر کئی بار غم و تشدد کی فضا سے گزری تھی۔ اس کی مضبوطی اور آہن اعصابی مجھ پر آشکار ہو چکی تھی۔ میں اس کی قربانوں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

والدین کے ہیمنہ قتل کا واقعہ یاد کر کے اس کا دل بھرتا

تم تو اسی وقت اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب میں ”جاہوئے آپریشن“ میں مصروف تھا مگر میں نے تمہاری کوشش کو اپنے سحری اثرات سے ناکامیاب بنا دیا اور..... میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر میری بخش کو دیکھا اور اپنی بات مکمل کر دی۔ ”اور اس موبائل فون کو بے کار یعنی ناکارہ کر دیا۔“

”اوہ!“ وہ چونک اٹھا پھر پوچھا۔ ”تو کیا آپ واقعی موبائل فون کو برباد کرنا چاہتے ہو سائیں؟“

”ہاں“ یہ تو کرتا ہی پڑے گا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”اور یہ کام تمہارے ہاتھوں سے ہو گا۔ تم کلا شکوف کا ایک برسٹ مار کر اس موبائل فون کے پرچے اڑاؤ گے اور اس کی باقیات کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔“

وہ سرا سیمہ نظر سے مجھے نکلے گا پھر لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ”سائیں! یہ موبائل فون تو بہت قیمتی ہے“ سائیں کی بالکل نئی ایجاد ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تمہاری کم علمی ہے میری بخش۔ موبائل فون سائیں کی ایجاد تو ہے بلکہ اسے سائیں کا ایجاد کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ابھی ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ پاکستان میں بھی یہ چند سال پہلے متعارف کروایا گیا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اسے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور جہاں تک تمہارے اس ”نکلے“ کا تعلق ہے کہ یہ فون بہت قیمتی ہے تو میں یہ کہوں گا کہ بعض اوقات کمائی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے قیمتی چیزوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔“ پھر میں نے گاڑی کے فرش پر پڑی نواز علی کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ موبائل فون اس انسانی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے میری بخش؟“

وہ نواز علی کی خون چکان لاش کو دیکھ کر ایک جھرجھری لے کر رہ گیا اور بڑی شدت سے انکار میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ جب نواز علی میرے سحری اثرات سے تمہاری فائرنگ کا نشانہ بن کر موت کے منہ میں جا سکتا ہے تو پھر ایک موبائل فون کی حیثیت ہی کیا ہے!“ بات میری بخش کی سمجھ والی میں اتر گئی۔ اگلے چند لمحات میں اس نے میرے احکام کی تعمیل کر دی پھر پوچھا۔

”سائیں! اب آپ کہاں جائیں گے اور میری دوبارہ آپ سے ملاقات کب اور کیسے ہوگی؟“

میں نے کہا۔ ”ہم نئی الجال تو کیس نہیں جائیں گے۔ یہاں سے تمہارے ساتھ ہی آگے بڑھیں گے۔ ہماری آئندہ



تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں واضح طور پر رد کی ایک لہر کو اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے، اپنے ماں باپ کو خاک و خون میں لوٹنے ہوئے دیکھنا کتنا دل دوز اور جگر پاش منظر ہوتا ہے، یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ پیش دہیں ہوتی ہے جہاں پر آگ جلتی ہے۔

ہمارا یہ صدمہ مشترک تھا۔ دھنو کو جذباتی دیکھا تو مجھے بھی اپنے دل میں کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے بے اختیار دھنو کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے سینے کا تلاطم بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت ضبط کی آخری حد سے گزر رہی ہے۔ وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کے ضبط کا بندھن توڑنے کا سبب بن جاتا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں اس کے شانے تھپک کر خود سے الگ کر دیا پھر اضطرابی لہجے میں کہا۔

”تم یہیں بیٹھو دھنو، ہم آگے جا رہے ہیں۔“  
دھنو نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جو دل کے آریار ہو گئی۔ ہم دونوں گاڑی کا عقبی دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ کبین میں آگئے۔ میں نواز علی کی سندھو ٹی ٹی بھی اپنے ساتھ اٹھالیا تھا۔

”اس ٹی ٹی کا کیا کریں گے سائیں؟“ میرے پیش نے حیرت سے پوچھا۔  
”یہ کیوں گا۔“ میں نے وہ ٹی ٹی سر پر رکھتے ہوئے کہا اور گاڑی کو چلا کر پکی سڑک پر لے آیا۔ ”اب پہلی نظر میں دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ نواز علی ہی ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ اگرچہ میں بیٹھنے میں اس جیسا نہیں ہوں تاہم کام تو چلانا ہی پڑے گا۔“

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے ہتھ پتھ پتھ کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جب گاڑی تیزی سے گزر رہی ہو تو دیکھنے والوں کی نظر کسی کے جتنے پر کم ہی جاتی ہے۔ سب سے پہلے وہ چیز نگاہ میں آتی ہے وہ ”گٹ اپ“ ہے۔ وند اسکرین سے جو میرا جو گٹ اپ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے مطابق تو میں پہلی نظر میں سندھو ٹی ٹی لکوں گا نا!“

”آپ بہت عقل مند اور موقع شناس ہیں سائیں“ میرے پیش نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے یہ بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔“  
میں نے کہا۔ ”عقل مندی اور موقع شناسی وقت خود سکھا دیتا ہے میرے پیش! بس اس کا صرف ایک ہی تقاضا ہوتا ہے۔“  
”وہ کیا سائیں؟“

”وقت چاہتا ہے“ انسان اس کے ساتھ ساتھ چلے۔  
”یہ تو بہت ہی اہم بات تھی ہے آپ نے سائیں۔“  
آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ”لیکن اکثر انسان وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ یا تو وقت سے بہت آگے چلنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بہت پیچھے رہ جاتے ہیں چنانچہ وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ جواباً وہ اپنی ناکامیوں کو قسمت کی خرابی سے منتہی کر کے داویلا چاہتے رہتے ہیں۔“ ایک لمحے کو رمل کرکٹ نے اپنی بات مکمل کر دی۔ ”اور جو لوگ وقت کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں وقت ان کا راستہ بن جاتا ہے جو انہیں ان کی مقصود منزل تک لے جاتا ہے۔“

میرے پیش چند لمحوں تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”وہ جان سائیں! آپ کے ساتھ جو ”ٹی ٹی“ ہے وہ آپ کی کیا لگتی ہے؟“  
اس کا اشارہ دھنو کی جانب تھا۔ میں نے کہا ”وہ میری دوست لگتی ہے۔“  
”میرا مطلب تھا۔!“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں میرے پیش!“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”تم یہی پوچھنا چاہتے ہو نا، میرا دھنو سے کیا رشتہ ہے؟ تو سنو، یہ میری دوست ہے، ایک مخلص اور بے لوث دوست جو کسی بھی نازک موقع پر میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔ وہ میرے لیے بڑے بڑے دکھ اٹھا سکتی ہے، تکلف برداشت کر سکتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ مضبوط رشتہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟“

”نہیں سائیں“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”واقعی دوستی کا رشتہ تو بہت لاثانی اور قابل تعریف ہے۔“  
میں نے کہا ”میرے پیش! اگر دھنو میرے لیے اتنا آگے جا سکتی ہے تو میں بھی اس کی خاطر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ہم سب دوست ایک دوسرے پر جان نچاؤ کرتے ہیں۔ ہماری دوستی حقیقی معنوں میں دوستی ہوتی ہے۔“  
وہ کافی دیر تک متاثر کن انداز میں گردن ہلاتا رہا پھر بولا۔  
”سائیں! آپ کی دوست دھنو واقعی بہت بہادر ہے وند ایک خون آلودہ لاش کے ساتھ۔!“

اس نے دانستہ جملہ نامعلوم چھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی سختی کرتے ہوئے کہا۔

”میرے پیش! میری دوستی میں بہادری شرط ہے۔ میرے تمام دوست اس وصف سے مالا مال ہیں۔ ہم برائی ظلم، تشدد

اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف بڑی بے جگری سے سینہ سپر ہیں۔ میں کسی شخص کو آنکھیں بند کر کے اپنے دوستوں کے فٹے میں شامل نہیں کرتا بلکہ کسی کڑے امتحان میں ڈال کر اس کی آزمائش کرتا ہوں۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے۔“

”میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے سائیں؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”تم اپنے سابق مرنے والے ڈیرا اکبر سومرو کے پاس پہنچنے والے ہو، ایک ایسی کہانی کے ساتھ جو میری تخلیق کردہ ہے۔ میں نے اس کہانی کو اسٹیج کرنے کے لیے تمہیں کچھ ہدایات بھی دی ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کر کے دکھایا تو میں سمجھوں گا تم امتحان میں پاس ہو گئے۔“

وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں بولتے بولتے رکاوٹوں کے نیچے دیوار اور ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ ”سائیں! میں اس نے پُر عزم اور ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ ”سائیں! میں سرور کی بازی لگا کر آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

”شباباش“ میں نے تفریقی نظر سے اسے دیکھا۔ ”میرے پیش! اگر تم اس آزمائش میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر میں تمہیں بھی گلے لگاؤں گا۔ تم میرے دوستوں میں شمار کیے جاؤ گے غلام، نوکر چاکر اور ”سام“ وغیرہ پالنے کا مجھے شوق نہیں ہے۔“

اس کا سینہ جوش جذبات سے پھول گیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے وند اسکرین کے پار اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

”سائیں! اب ہم ”دھرمال“ سے گزرنے والے ہیں۔“

میں نے اس کی اطلاع سننے ہی گاڑی کی اسپید بڑھا دی اور گرد و پیش پر اپنی عقلمانی نگاہ رکھتے ہوئے ”زن“ سے دھرمال کو پہنچے چھوڑ آنا چلا گیا۔

”لفظ سائیں کا شکر ہے سائیں۔“ جب ہم کافی آگے آ گئے تو میرے پیش کی زبان سے اطمینان بخش کلمہ جاری ہوا۔  
میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔  
”میرے پیش! کیا ”چھاپرو“، ”بھئی ایسا ہی علاقہ ہے؟“  
”میں سمجھتا ہوں سائیں!“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ جانتا ہوں کہ ”چھاپرو“ کی آبادی بھی ”دھرمال“ کی طرح ہے؟“

”ہاں سائیں“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کم و بیش یہ دونوں گاؤں ایک جیسے ہی ہیں۔“  
میں نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ ”چھاپرو“ میں رکے بغیر ہی آگے بڑھ آئے تھے؟“  
”وہاں رکنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا سائیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تب پھر ڈیرا اکبر سومرو کو اس کرتا ہے۔“  
”بات سمجھ میں نہیں آئی سائیں!“

میں نے کہا ”تمہارے ساتھ ڈیرے کی موبائل فون پر جو گفتگو ہوئی تھی اس میں تمہارے بیان کے مطابق ڈیرے نے کہا تھا۔ میرے پیش! ”چھاپرو“ سے گزرے ہوئے ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک تو تمہیں ”دھرمال“ سے آگے نکل آنا چاہیے تھا۔ تم اس وقت کہاں ہوں؟“ میں نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے پیش! ڈیرے کی اس بات سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ ”چھاپرو“ میں موجود اس کے کسی آدمی نے تمہاری گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا جب کہ تم بتا چکے ہو کہ ان دونوں بستیوں کی آبادی ایک جیسی ہے۔ ”دھرمال“ کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈیرا اکبر سومرو صرف تم لوگوں کو اپنے ہاؤس میں رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کے کسی آدمی نے ہمیں وہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔“

”آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہو گا۔“ میرے پیش نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ ”میرے پیش! ہم کب تک عمر کوٹ پہنچ جائیں گے؟“

اس نے بتایا ”ضلع عمر کوٹ کی حدود تو آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد شروع ہو جائے گی تاہم عمر کوٹ کا شہری حصہ مزید آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد آئے گا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا۔ ”آپ کا کیا پروگرام ہے سائیں؟“

اس وقت سورج مغربی آفتاب پر جھک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چمک دار تھاں زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں سرخ رنگت اختیار کرنے والا تھا۔ پھر شام ہو جاتی۔ یعنی جب ہم ضلع عمر کوٹ کی حدود کو چھوئے، سورج اپنا آج کے دن کا سفر پورا کر کے مغرب میں منہ چھپا چکا ہوتا۔ میرے پیش کی بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ عمر کوٹ کے شہری حصے میں پہنچنے پہنچتے رات بھگ چکی ہوئی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ”میں تو اپنا پروگرام اس وقت بتاؤں گا جب مجھے یہ پتا چلے گا کہ دُور اکبر سومو کا بھگلا کس طرف ہے۔ میں دُورے اور اس مہمان دوست سے زیادہ دُور پر نہیں جانا چاہتا!“

”سائیں! دُورے کا بھگلا اور جاگیر عمر کوٹ شری مشرق سمت میں ہے۔“ میر بخش نے بتایا ”وہاں جانے کے لیے عمر کوٹ کی حدود میں داخل ہو کر مجھے سید سے رخ پر گاڑی موڑنا ہوگی جب کہ شہر میں داخل ہونے کے لیے سیدھا جانا پڑتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے، شہری حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہی تمہاری جانب (مشرق سمت) مڑنا ہوگا؟“

”جی سائیں“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا ”اس موڑ سے دُورے کے بھگلا تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟“

”لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے۔“

”اور موڑ سے شہر عمر کوٹ کتنے فاصلے پر ہے؟“

”وہاں سے دس پندرہ منٹ میں شہر کے وسط میں پہنچا جا سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”کیا تم ہمیں شہر کے اندر پہنچا کر اپنی آسکتے ہو؟“

”جو حکم سائیں“ وہ فرماں برداری سے بولا پھر پوچھا ”کیا آپ شہر میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”ہاں“ فی الحال تو یہی سوچا ہے۔“ اس کے سوال کے جواب میں میں نے کہا۔

”شہر میں کہاں رکھیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کسی ہوٹل وغیرہ میں“ میں نے بتایا۔

اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔ میں نے اس کیفیت کو جانپتے ہوئے پوچھا۔

”عمر کوٹ شہر میں ہوٹلوں کی کیا صورت حال ہے؟“

”ہوٹل ہیں سائیں مگر آپ کی شان کے مطابق نہیں“ اس نے بتایا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ سائیں کہ وہ عام سے ہوٹل ہیں“ اس نے جواب دیا ”آپ کے حساب سے تھوڑا کلاس کے جاسکتے ہیں۔“

میں نے کہا ”میر بخش! ہم اس وقت نہ تو کوئی حساب کتاب کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور نہ ہی میں اپنی کلاس بانٹنا چاہتا ہوں۔ بس کسی معقول سے ہوٹل میں ہمیں ایک کمرال

جائے تو گزرا رہا ہو جائے گا۔ کیا ایسا کوئی ہوٹل تمہاری نظر میں ہے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا ”ہاں سائیں“ ایسے ایک ہوٹل کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کو اس ہوٹل کے قریب چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“

”بس ٹھیک ہے“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

میر بخش نے پوچھا ”سائیں! آپ کے پاس رقم کی کیا پوزیشن ہے؟“

”رقم تو ہمیں تم دو گے میر بخش“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ضرور سائیں“ ضرور“ وہ جی برآمدگی لہجے میں جلدی سے بولا۔

میں نے محسوس کیا، وہ ایک مرتبہ پھر کچھ الجھ سا گیا تھا۔ میں نے پوچھا ”کیا بات ہے میر بخش! تم مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

”سائیں! میں آپ کی ساسھی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”تو اس میں الجھن یا فکر کی کون سی بات ہے؟“

اس نے غصیدہ لہجے میں بتایا ”سائیں! بی بی کالاس خاصا ماڈن ہے۔ وہ چیز اور فی شرٹ میں ملبوس ہے۔ عمر کوٹ یا کسی بھی چھوٹے شہر میں لڑکیاں اور عورتیں ایسا لباس نہیں پہنتیں۔“

”تو پھر؟“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

وہ بولا ”سائیں! میرا خیال ہے، آپ بہت جلد و سروں کی نظر میں آ جاؤ گے۔ ان ”دوسروں“ میں ممکن ہے دُور اکبر سومو کا بھی کوئی آدمی ہو۔ اس کے بعد آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ کیا پریشانیاں جنم لے سکتی ہیں۔“

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میر بخش! بہر حال، فوری طور پر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے کے بعد اس مسئلے کو حل کریں گے۔ دھوکا لپٹا دینا چاہیے گا۔“

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ میرے سفری بیگ میں ہمارے چند جوڑے کپڑے موجود تھے۔ اگرچہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سندھ کی تہذیب سے لگا تھا تاہم دھوکا اگر ساڑی زیب تن کر لیتی تو بات بن سکتی تھی۔ بیگ میں اس کی ایک ساڑی رکھی تھی جو رانی روپ متی نے اسے تحفے میں دی تھی۔ بچے پور میں قیام کے دوران میں روپ متی اور شوبھانے دھوکا زیادہ تر ساڑی پہننے پر ہی زور دیا تھا۔

میر بخش نے اپنی جیب میں سے مبلغ دو ہزار روپے کی رقم نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا ”سائیں! فی الحال تو یہاں۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔“

”یہ بھی بہت ہیں۔“ میں نے وہ رقم اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ”سائیں! جب آپ ہوٹل پہنچو گے تو اندھیرا چیل چکا ہوگا اس لیے زیادہ خطرے کی کوئی بات نہیں مگر دن کے اجالے میں آپ کو بہت احتیاط کرنا ہوگی۔ آپ کی ساسھی اور آپ اس ماحول میں بہت مختلف نظر آتے ہو اس لیے فوراً نظروں میں آ جاؤ گے۔“

میں نے کہا ”تم فکر نہ کرو۔ میں کوشش کروں گا، کل ہم بھی اپنا بیگ اپ تھیل کر لیں میں مقامی رنگ میں رنگنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”کیا آپ کافی عرصے تک یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو؟“

”فی الحال تو تین دن کے لیے ہوٹل میں کمرالوں کا“ میں نے کہا ”اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس مدت کو بڑھا لوں گا۔“

وہ تجویز آہستہ لہجے میں بولا ”سائیں! آپ کو اس لیے چوڑے کھیزے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم گاڑی اور گاڑی میں موجود تمام چیزوں کو یہیں کہیں دیرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس وقت ہم آزاد ہیں، کوئی ہمارا راستہ روکنے والا بھی نہیں ہے۔“

میں نے اسے ٹھوٹتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا تم ”امتحان وفاداری“ سے بچنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”نہیں سائیں“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”پھر مجھے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟“

وہ ہکا بکا رہ گیا ”کون سا میدان سائیں؟“

میں نے کہا ”وہ میدان میر بخش جو دُور اکبر سومو اور اس کے مہمان دوست نے میرے سامنے پھیلایا ہے۔ میں بھی تو ذرا دیکھوں دُورے کا وہ دوست کتنے پانی میں ہے جس نے مجھے گھیرنے کے لیے یہ لمبا چوڑا جال بچھایا ہے۔ اور جو یہ بھی جانتا ہے کہ میرے دائیں کان کی لو کے پیچھے سور کے برابر ساہل ہے“ میرا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا تھا ”میر بخش!“

میں نے ہنستے ہوئے ”ایک گرم سانس خارج کی اور سنساتے ہوئے لہجے میں کہا ”جو شخص میرے بارے میں اتنی اہم معلومات رکھتا ہے اور میرے استقبال کی خاطر وہ لاہور کے کسی نوابی گاؤں سے چل کر اس اپنے ہوئے ریگستان میں پہنچا

ہے اس شخص سے ”ملاقات“ کیے بغیر میں ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کے ”دیدار“ کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ تم دُورے کے بھگلا میں واپس آ کر کل مجھے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرو گے تو میں آئندہ کالا تختہ عمل تیار کروں گا۔ کل نہ آسکو تو برسوں آ جانا۔ میں پورے تین دن تک ہوٹل کے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”اگر تمہیں ہم ہوٹل میں نہ ملیں تو تم ہمارا انتظار کر لینا۔ ہم ہوٹل کے آس پاس ہی کہیں ہوں گے۔ زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ ہم ہوٹل میں مراد اور کلثوم کے ناموں سے ٹھہریں گے۔“

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

”میر بخش! ایک وقت تھا، جب میں اپنے دشمنوں کے آگے دوڑا کرتا تھا۔ وہ میری جان کے گایک بنے ہوئے تھے کیوں کہ میں اپنے والدین کے سپاہی قتل کا عینی شاہد تھا۔ میرے والدین کے قاتل مجھے بھی صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے لیکن میری خوش بختی مجھے بچاتی رہی اور میں حملہ آوروں کے ہر وارے زندہ بچ نکلا۔ میں اپنے دشمنوں سے بہ خوبی واقف تھا لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیوں کہ میں ابھی معصومیت کے ہندو لوں میں جھول رہا تھا۔ صغیر سنی نے میرے پاؤں میں بیش و ذنی نچر ڈال رکھی تھی۔ پھر قدرت نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ میری سچائی اور مظلومیت کا مجھے انعام ملا۔ اللہ کی مرضی سے اللہ کے چند بندوں نے مجھے ایسے کندہ ناتراش خراش کچھ اس انداز میں کہ میں آتش و آہن کا ایک ناقابل تسخیر شاہ کار بن گیا۔ وہ دن اور آج کا دن“ میں نے رک کر میر بخش کی جانب دیکھا جو بڑی محویت سے میری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہاں میر بخش! وہ دن اور آج کا دن“ میں اپنے دشمنوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہوں اور وہ کسی ”پسپا“ حریف کی طرح خود کو چھپاتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہاں سندھ کے ریگستان میں کوئی ”جبالا“ آگے بڑھ کر ”میرا استقبال“ کر رہا ہے۔ اور سیکڑوں میل کا طویل سفر کر کے وہ میری خاطر یہاں رکا ہوا ہے۔ میں اپنے ایسے جوشیے اور دلوالہ انگیز ”میزبان“ کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں۔ ذرا معلوم تو ہو، میری ”چاہت“ میں بے کل اور میری ”جستجو“ میں دشت نور دی کرنے والا وہ جی دار، دشمنوں کے کس قبیل سے تعلق

رکھتا ہے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں اس کے سینے میں کتنا دم ہے؟ میں پرکھنا چاہتا ہوں اس کے دماغ میں کتنا غصہ و غم ہے؟ میں برتنا چاہتا ہوں اس کے بارودوں میں کتنا خم ہے؟

اگر میرے بخش کا بس چلتا تو وہ میرے قدموں میں گر جاتا۔ اس وقت وہ مجھ سے بے انتہا متاثر نظر آتا تھا۔ اس کا اندرون اور بیرون سراپا نیا بنا ہوا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی اس کا لہجہ جذبات کی شدت سے بھیگا ہوا تھا۔

”سائیں وجدان! میں اپنے بخت پر بہت فخر محسوس کر رہا ہوں کہ قدرت نے مجھے آپ سے ملوا دیا ہے۔ آپ بہت عظیم انسان ہو“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا ”سائیں! آپ بے فکر ہو جاؤ۔ میں جی جان سے کوشش کر کے آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا۔ اور آپ کی مطلوبہ معلومات جلد از جلد آپ تک پہنچاؤں گا“

میں نے کہا ”فی الحال صرف اتنا ہی ہی کو جتنا میں نے کہا ہے“

”ٹھیک سائیں جو حکم سائیں“

اسی وقت ہم ضلع عمرکوٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ میں نے کہا ”میں گاڑی ایک طرف روک رہا ہوں۔ آگے ڈرائیونگ تم کرو گے!“

گاڑی روک کر ہم نے اپنی سیٹیں تبدیل کیں۔ اسی موقع پر میں نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر دھنوں سے بھی مختصر گفتگو کی اور اسے یہ پُر مسرت نوید سنائی کہ ہم بہت جلد ایک معقول ہوٹل میں پہنچنے والے ہیں اس لیے وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ تک سبک بھی درست کر لے ہمارا سہ ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔

میں نے پوچھا ”کراچی سے عمرکوٹ یا عمرکوٹ سے کراچی جانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟“

”مختلف گاڑیاں مختلف وقت لگاتی ہیں“ اس نے جواب دیا ”جو کوچر حیدر آباد سے ہو کر آتی جاتی ہیں وہ پانچ سے ساڑھے پانچ گھنٹے میں پہنچا دیتی ہیں جب کہ ڈائریکٹ آنے والی کوچر ساڑھے تین گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیتی ہیں۔“

میں نے پوچھا ”عمرکوٹ کی سب سے زیادہ مشہور چیز کون سی ہے؟“

”عمر ماروی!“ اس نے جواب دیا۔

”عمر ماروی!“ میں نے بڑبڑاتے والے انداز میں دہرایا۔

”جی سائیں عمر ماروی“ وہ قطعیت سے بولا۔ میں نے استفسار کیا ”عمر ماروی کیا چیز ہے بھئی؟“

”آپ نہیں جانتے سائیں؟“

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ معلومات کا دریا بہانے لگا۔

میرے بخش نے دس پندرہ منٹ میں ”عمر ماروی“ کی پوری کہانی تفصیل سے مجھے سنائی۔ یہ محبت کرنے والے دودلوں کی ایک لوک کہانی تھی۔ پنجاب اور سندھ کی سرزمین اور آب و ہوا و زمان و مکان میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ عمر ماروی کی رومانوی داستان نے مجھے بہت متاثر کیا۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک عمر ماروی زیر بحث رہی پھر میں نے میرے بخش سے پوچھا۔ ”تم ہمیں جس ہوٹل میں پہنچانے جا رہے ہو کیا وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ہے؟“

”نہیں سائیں“ اس نے نفی میں جواب دیا ”عمرکوٹ شہر میں کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔“

”کیا یہاں ٹرین نہیں چلتی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”چلتی ہے“ وہ سر ملاتے ہوئے گویا ہوا ”مگر کوئی مین لائن یہاں سے نہیں گزرتی۔ بس ایک چھوٹی ریلوے لائن ہے اور وہ بھی عمرکوٹ شہر سے ذرا بہت کر گزرتی ہے۔“ پھر وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میں نے جس ریلوے لائن کا ذکر کیا ہے وہ کھوکھرا پار“ بارڈر سے شروع ہو کر وارسا ہاؤس جوبوچرزی، نیا چھوڑ، ہاٹسیر، ڈبھوڑنا، وہیل، پتھورو اور شادی پٹی سے ہوتے ہوئے ضلع ”میرپور خاص“ میں داخل ہو جاتی ہے۔ عمرکوٹ شہر کو یہ ریلوے لائن بچ نہیں کرتی۔“

میرے بخش کی اس معلوماتی وضاحت میں صرف ایک ہی کام کی چیز تھی اور یہ تھی کہ عمرکوٹ شہر میں ریلوے اسٹیشن نہیں تھا۔

ہمارے درمیان اسی قسم کی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں اور ہم اس ہوٹل کے نزدیک پہنچ گئے جس کا ذکر میرے بخش نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔ وہ ہوٹل بس اسٹیشن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے نزدیک ایک پٹرول پمپ بھی تھا۔ وہ عمر کوٹ کا واحد ہوٹل تھا جس میں کمرہ بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ورنہ سرائے نما چارپائی ہوٹل تو کلائی تعداد میں تھے۔

ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرنا تھا اس کی زیریں منزل پر ”لعلام“ کا شعبہ تھا۔ ”قیام“ کے لیے اوپر کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں مطمئن تھا کہ ہمیں قیام کے لیے الگ کمرہ مل سکتا تھا۔ میرے بخش چاہتا تھا کہ خود ہمیں ہوٹل پہنچا کر آئے لیکن میں نے

اسے سختی سے منع کر دیا۔ میں نے گاڑی بھی ہوٹل سے مناسب فاصلے پر رکوٹی تھی۔ دراصل میرے بخش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ کسی ہوٹل میں داخل ہوتا۔ تھے ہوئے صحرا میں، میں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ خاصی حد تک درست کر لیا تھا تاہم چہرے پر چلنے والی چونوں کے نشان ایسے نہیں تھے کہ جنہیں آسانی سے چھپایا جا سکتا۔ میں نے آہنی ہتھکڑی کا دوپٹا اس کے چہرے پر رسید کر کے وہاں کی کھال کو کئی مقامات سے ”بغاوت“ پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے اور میرے بخش مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔ اب اسے میری ہدایات کے مطابق سیدھا دوپٹا اُٹھار کر سو کوٹے کے بنگلے پر جانا تھا اور۔۔۔ وہاں جو حالات ”پیش آتے“ ان کی روداد کل یا پرسوں یا ترسوں کو آکر مجھے سنانا تھی۔

میں اور دھنوں سبک قدموں سے چلتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔

وہ ہوٹل عمرکوٹ کے حساب سے درجہ اول پر فائز تھا تاہم میرے نزدیک وہ ایک ساتویں یا آٹھویں درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم استقبال پر پہنچے اور ایک ”ڈبل بنڈ“ روم کے لیے کلرک سے بات کی۔

استقبال کلرک نے سر سے پاؤں تک ہمارا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں خاصی طور پر دھنوں کا بصری ایکسے کرنے کی سعی دکھائی دیتی تھیں۔ میں خاموشی سے کلرک کی ”کارروائی“ دیکھتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہو گیا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے فرائض منصبی کا حصہ نہیں ہے۔ شکر ہے جلد ہی اسے اپنی ”اوقات“ کا ادراک ہو گیا تھا۔

وہ جلدی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا ”جی سائیں آپ کو کمرہ مل جائے گا۔“ پھر اس نے کمرے کا ایک دن کا کرایہ بتایا۔

میں نے میرے بخش کی دی ہوئی رقم میں سے تین دن کے کرایے کے پیسے نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا ”یہ تین دن کا کرایہ ہے۔ اگر اس سے زیادہ ٹھہرنا پڑ گیا تو مزید رقم دوں گا۔“

اس نے پوچھا ”آپ دونوں کے نام کیا ہیں؟“ میں نے اپنا فرضی نام ”مراد“ اور دھنوں کا فرضی نام ”کلوم“ لکھوا دیا۔ کلوم لکھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر دھنوں کے سراپا کو تشنگانے سے ٹٹولا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کون کی چیز نکلنے نہیں دے رہی۔

اُس تو دھنوں کا حسن اور جوانی ہی دیکھنے والی آنکھ کو بھو حیرت کرنے کے لیے کافی تھے پھر اس پر اس کے نقش و نگار اسے کسی اور ہی دنیا کا ظاہر کرتے تھے۔ کلرک کن آنکھوں سے دھنوں کا جائزہ لیتے ہوئے رجسٹر میں ہمارے فرضی نام درج کرنے لگا۔

جب وہ یہ کام کر چکا تو میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”آپ کا شناختی کارڈ؟“

ہمارے پاس شناختی کاغذات کے نام پر ایک پرزہ بھی نہیں تھا مگر میں نے اس حوالے سے اپنے ذہن کو پوری طرح تیار کر رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ”میاں اس قسم کی صورت حال پیش آسکتی ہے۔“

میں نے کہا ”چند روز پہلے میری جیب پر کسی جیب کترے نے ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ وہ میرا پرس اڑا لے گیا۔ شناختی کارڈ پرس میں تھا۔“

”کوئی اور کارڈ؟“ کلرک نے دھنوں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا ”جس سے آپ کی شناخت ہو سکے۔“

”کوئی نہیں“ میں نے مایوسی سے گردن ہلائی ”تمام کارڈز وغیرہ ای پرس میں تھے۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس نے دھنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ان کا شناختی کارڈ تو ہو گا؟“

”اس کی عمر ابھی اٹھارہ سال نہیں ہوئی“ میں نے جلدی سے کہا ”اس لیے کارڈ ابھی بنا نہیں۔“

”تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی سائیں!“

اس مشکل کو کسی اور طریقے سے ”آسان“ نہیں بنایا جا سکتا؟ میں نے معنی خیز انداز سے کہا اور لفظ ”آسان“ پر خاصا زور ڈالا۔

وہ میری بات کی یہ تک پہنچ گیا، دھنوں نے بولا ”تین دن کے قیام کے لیے پانچ دن کے حساب سے کرایہ دینا ہو گا۔“

”منظور ہے“ میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا ”یقیناً یہ دو دن کا اضافی کرایہ تو تمہاری جیب میں جائے گا۔ ہوں؟“ وہ آنکھ دبا کر بولا ”آپ تو خود سمجھ دار آدمی ہو!“

میں اس کی نیت کو سمجھ چکا تھا چنانچہ مزید دو دن کا کرایہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا ”رجسٹر میں تو تم تین دن کا قیام ہی ظاہر کرو گے نا؟“

”جی سائیں۔“

”اور شناختی کارڈ والی“ ”فار ملیٹی“ کو کس طرح پورا کرو

گئے؟

”یہ میرا کام ہے“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں اپنا کام بہت اچھے طریقے سے انجام دے لوں گا۔“

اپنے رجسٹر میں اندراج وغیرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے کمرے کی چابی ہمارے حوالے کی اور یہ نفس نہیں ہمیں ہمارے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ ہمیں کمرے کا معائنہ کروانے کے بعد اس نے کہا۔

”کسی بھی قسم کی کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے اشارہ کر دیں۔ آپ کا کام سمجھیں ہو گیا۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ”اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں ضرورت پڑے گی۔“

وہ ایک مناسب سا ”شکریہ“ ادا کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔

میں نے کمرے کے اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ عام سے سائز کا ایک کمرہ تھا۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بیڈ بچھا ہوا تھا، دوسری دیوار کے ساتھ بیڈ کے سرہانے کی سمت ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ میز اور کرسیاں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں تاہم کرسیوں پر کٹن اور میز پر میز پوش موجود تھا۔

کمرے کی تیسری دیوار میں باہتہ روم تھا اور چوتھی دیوار میں وہ دروازہ تھا جہاں سے ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تھے۔ جس دیوار کے ساتھ کرسیاں اور میز رکھی تھی وہاں ایک کھڑکی بھی تھی جس سے ہوٹل کی سامنے والی سڑک کو دیکھا جاسکتا تھا۔ میر بخش کو میں بتا چکا تھا کہ ہوٹل میں ہم کون سے فرضی ناموں سے قیام کریں گے تاکہ اسے ہم تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ بھی میں نے میر بخش کو چند موثر اور اہم باتیں اچھی طرح سمجھا دی تھیں۔

اس منہوس گاڑی کے ہچکولے دار سفر نے میرا ایک ایک جوڑا توڑ کر رکھ دیا ہے“ دھن دھڑام سے ڈبل بیڈ پر گرتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنا سفری بیگ چوبی میز پر رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر جو گرز کے تے کھولنے لگا۔ دھن دھڑام سے جو گرز اس کے پاؤں میں موجود تھے آرام دہ نظر دیکھتے ہی اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ خوب پھیل کر ڈبل بیڈ پر دراز ہو گئی تھی۔

میں نے جو گرز اپنے پاؤں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دھن! ہم گزشتہ دو تین روز سے مسلسل سفر میں ہیں اور سفر بھی ایسا تکلیف دہ اور اعصاب شکن کہ ذہنی اور جسمانی طور پر

ہمیں ایک بل بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر کیا ہوگا؟ کے اندر نہیں بے ہوش کرنے کے لیے مخصوص ٹکڑے استعمال کیا گیا۔ بے ہوشی کی اس کیفیت نے بھی تمہارے اعصاب کو توڑ پھوڑ دیا ہو گا۔ اب تو دل و دماغ میں مرز ایک خواہش ہو گئی کہ کہیں کسی آرام دہ اور سکون بخش سفر کر گزشتوں کی گہری اور بھرپور نیند لی جائے۔“

”وجدان! تم نے میرے دل کی بات کسی ہے“ دھن نے کڑوٹ بدل کر اوندھے ہوتے ہوئے کہا ”واقعی! میں اس وقت یہی سوچ رہی ہوں۔“

میں نے کہا ”میرے خیالات بھی تم سے زیادہ عقلمانی ہیں لیکن سونے سے پہلے ہمیں چند ضروری کام کما ہوں گے۔“

”کیا تم ہوٹل سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ہرگز نہیں“ میں نے کہا۔ ”رات کے وقت اس اجنبی جگہ پر مزے گشت کرنا مناسب نہیں ہو گا۔“

”پھر کون سے ضروری کام کا تم تذکرہ کر رہے ہو؟“ میں نے کہا ”سب سے پہلے تو ہمیں خوب اچھی طرح ہمارا دھو کر لباس تبدیل کرنا چاہیے، اس کے بعد کھانا کھا چاہیے۔ سونے کا ممبر اس کے بعد آئے گا۔“

آپنی بات ختم کرتے ہی میں نے سفری بیگ کھول لیا۔ اس بیگ میں ہمارے ”ٹائٹ ڈریس“ کے علاوہ چند چوڑی دو دوسرے کپڑے تھے۔ دھن کی ایک بنارس ساڑی بھی تھی جس کا رنگ نہایت ہی تیز اور چمکتا ہوا سا تھا اور وہ رنگ تھا۔ نارنجی!

میں نے بیگ میں سے دھن کا ٹائٹ گاؤن اور اپنا سلیپنگ سوٹ نکال کر بستر پر ڈال دیا۔ باہتہ روم میں استعمال کے لیے مخصوص چنبل باہتہ روم کے اندر موجود تھی۔ دھن خاموشی سے میری یہ کارروائی دیکھتی رہی۔ جب میں نے اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کی جانب دیکھا تو اس نے کہا۔

”وجدان! میں غسل کر کے گاؤن پہن لیتی ہوں مگر کھانا نہیں کھاؤں گی۔“

”وہ کیوں سمجھتی؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جب میں نے سہ پہر میں ”میر بخش اینڈ کمپنی“ پر قابو پایا تھا تو گاڑی میں موجود ٹھنڈے پانی اور تازہ پھلوں سے لذت کام و دہن کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے اور دھن نے سب گھڑے اور انگوڑے کر کھائے تھے۔ میں نے سوچا، ”خمن“ ہے ابھی دھن کو بھوک نہ لگی ہو اس لیے وہ کھانے سے انکار

کر رہی ہو۔

اس نے میرے سوال کا جواب دیا ”دراصل بدھ مت کے پیروکار سہ پہر کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔“

”یہ عجیب بات بتائی تم نے“ میں نے کہا ”وہاں سے پور میں تو ختم شام تک بلکہ رات گئے تک کھانا پینا جاری رکھتی تھیں؟“

”وہ سب میں نے اپنے میزبانوں کی خوشی کی خاطر کیا تھا“ اس نے بتایا ”میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ مجھے عجیب نظر سے دیکھیں۔ وہاں ایک مجبوری تھی۔ تمہارے سامنے نہ ڈکڑی مجبوری ہے اور نہ ہی تم سے کسی قسم کا پرودہ ہے اس لیے میں نے سوچا ہے آج کے بعد لا رڈ بدھا کی تعلیم کا خیال رکھوں گی۔“

میں نے کہا ”کھانے پینے کے حوالے سے میں نے یہ بات آج پہلی مرتبہ تمہاری زبان سے سنی ہے ورنہ میں نے بہت سے بدھ مت لوگوں کو اس کی پابندی کرتے نہیں دیکھا۔“

”ہاں“ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ وہ بولی ”دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو، جہاں اس کی پیروی کرنے والے نظر آتے ہیں وہیں اس مذہب کے ماننے والے کچھ ایسے افراد بھی ملیں گے جو اس کے اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہوں گے۔“

میں نے تائیدی انداز میں کہا ”تمہاری بات میں وزن ہے دھن! میرا مشاہدہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ چلو، آج تم میرا ساتھ دینے کے لیے کھانا کھاؤ۔ کل صبح سے تم اپنا پسندیدہ معمول اپنا لیتا۔“

وہ میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ٹائٹ گاؤن لے کر باہتہ روم میں گھس گئی۔ میں نے روم سروس سے کہہ کر کھانا کمرے میں ہی منگوایا۔ دھن کے بعد میں نے باہتہ لیا پھر ہم دونوں نے ڈش کر کھانا کھایا۔ مجھے تو بہت زور کی بھوک لگی تھی۔ دھن میرا ساتھ دینے بیٹھی تھی لیکن میری خوشی کی خاطر وہ بھی اچھا خاصا کھا گئی۔

کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور باتیں کرنے لگے۔ ہماری گفتگو میں غالب حصہ سیاہ گاڑی میں ہمارے اغوا سے متعلق تھا۔ دھن نے کہا۔ ”وجدان! مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ سب کچھ ہمارے ساتھ پیش آچکا ہے۔“

”ہاں! بعض واقعات کا بڑی مشکل سے یقین آتا ہے“ میں نے کہا۔ ”تمہارے سے پہلے میں بھی سونے کے بارے میں بڑی شبیدگی سے سوچ رہا تھا۔ چلو کوئی بات نہیں، اگر

آپ کھیں، بند کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”ہنو! زندگی میں بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو خواب جیسی لگتی ہیں اور بعض خواب حقیقت کا روپ دھار کر ہمیں گھیرے رہتے ہیں۔“

میں اس وقت چوبی کرسی پر بیٹھا تھا اور دونوں ٹانگیں میں نے بستر پر سیدھی رکھی ہوئی تھیں۔ دھن ٹیک لگائے بستر پر سیم دراز تھی۔ وہ اچانک سیدھی ہوئی اور میرے پاؤں پھوٹے ہوئے بولی۔

”لاؤ“ میں تمہارے پاؤں دبا دوں۔ تم تھک گئے ہو گے۔“

میں نے ایک جھٹکے سے پاؤں کھینچ لیے اور کہا ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”بتایا تو ہے تمہارے پاؤں دبانا چاہتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”تم نے تینے صبرا میں خوب ”مارا ماری“ کی ہے“ وہ لگاؤٹ سے بولی ”یقیناً تم بہت تھک گئے ہو گے۔“

میں نے کہا ”رات بھر گہری نیند لوں گا تو ساری تھکاوٹ اتر جائے گی۔“

وہ سمجھ گئی کہ میں اس سے ہرگز ہرگز پاؤں نہیں دباؤں گا۔ شبیدگی سے بولی۔ ”تم رات بھر گہری نیند کس طرح سو سکو گے وجدان!“

”کیوں؟“ میں نے ابھی ہوئی نظر سے اسے دیکھا ”کیا تم مجھے جگائے رکھنا چاہتی ہو۔“

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی ”میں کیا جگاؤں گی۔ ایک تہائی رات تو گزر گئی“ پھر اس نے وال کھاک کی جانب اشارہ کیا جہاں رات کے دس بج رہے تھے ”دو تہائی رات باقی ہے اور تمہاری گفتگو کی جولانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی دور دور تک تمہارے سونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس صورت میں تم رات بھر گہری نیند کیسے سو گے؟“

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا ”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے واقعی ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم سونا چاہو تو سوجاؤ۔“

”نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی“ وہ شوق سے بولی ”حالانکہ کمرے میں پہنچنے ہی ٹھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ شاید یہ نہانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک وجہ یہ چائے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم نے جو چائے پی ہے وہ خاصی اسٹرائٹ تھی۔“

میں نے کہا ”تمہارے سے پہلے میں بھی سونے کے بارے میں بڑی شبیدگی سے سوچ رہا تھا۔ چلو کوئی بات نہیں، اگر

عسل اور اسٹراگ چائے نے ہمیں ہشاش بشاش اور "فریش" کر دیا ہے۔ توجہ بھر کر باتیں کرتے ہیں۔ صبح ویر تک سو کر نیند پوری کر لیں گے۔"

دھونکو یہ تجویز پسند آئی پھر ہمارے درمیان ہمیں پیش آمدہ تازہ ترین حالات کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ دھونکو نے کہا۔ "میں سمجھ رہی ہو وجدان! تم نے اس علاقے میں قیام کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

"اگر خود ہی سمجھ رہی ہو تو اچھی بات ہے" میں نے کہا۔ "میں تمہیں سمجھانے کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ سب بہت ضروری ہے وجدان؟"

میں جانتا تھا دھونکو بدھ مت تھی۔ اس مذہب میں لڑائی بھڑائی کی سختی سے ممانعت کی جاتی ہے۔ کسی بھی جان دار کو مارنا گناہ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ بعض بدھ بھکشو تو راستہ چلتے ہوئے اپنی راہ کو جھاڑو وغیرہ سے صاف کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ کوئی چوہنی ان کے پاؤں کے نیچے آکر جان نہ گواہی دے۔ میں دھونکو کے مسئلے کو بڑی گہرائی تک سمجھ رہا تھا مگر میری زندگی کی اپنی ایک روش تھی، اپنا ایک مزاج تھا جس میں کسی حتمی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے کہا "دھونکو! تم نے اب تک میرے ساتھ رہتے ہوئے یہ جان لیا ہو گا کہ میری زندگی کس ڈھب پر گزر رہی ہے۔ اب تک تو تمہیں ان باتوں کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔"

"میں کوشش تو کرتی رہتی ہوں مگر۔" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا "بس یہ کوشش جاری رکھو۔ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

میں نے ہنسرے ہوئے لہجے میں کہا "دھونکو! ہر شخص اپنے مذہب، اپنے عقیدے سے مجبور ہوتا ہے۔ میں تمہاری مجبوری کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن درحقیقت حالات اور دنیا سے نظر چرانے کے مترادف ہے۔ اس دنیا اور دنیا میں بسنے والے لوگوں کی "ڈیمینڈ" کو دیکھنا پڑتا ہے، حالات اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑتا ہے اس لیے انسان اتنا

زرم دل بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ کبھی نرم، کبھی گرم۔ ہر رنگ اور انداز کو اپنانا پڑتا ہے۔ یہ تو اپنی بھائی جنگ ہے۔ اگر آپ کسی موزی کی سرکوبی نہیں کریں گے تو وہ آپ کو شدید ترین نقصان پہنچائے گا۔ میں نے شاؤن ٹیپل میں اور

باہر بھی بہت سے بدھ بھکشوؤں کو مارشل آرٹس کی تربیت لیتے ہوئے اور ان فنون کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے یہ "مارشل آرٹس" کیا چیز ہے؟"

میں سانس لینے کے لیے دوپل رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مارشل آرٹس کا سیدھا سیدھا اور واضح مطلب ہے۔ جنگی فنون یا فنون جنگ۔ جانتی ہو، جنگ کیا ہوتی ہے اور اس جنگ میں کیا ہوتا ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دھونکو دیکھا اور کہا "جنگ دو فریقوں کے درمیان ہونے والی "ماردھاڑ" ہوتی ہے جس میں انسان اپنی زندگی سے انحراف دھوئے ہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص کی جان لیتا ہے اس جنگ میں جو شخص حق پر ہوتا ہے اس کے فعل (جنگ) کو سراہا جاتا ہے اور جو شخص ناحق لڑائی بھگڑا اور دنگ فساد کرتا ہے اس کے فعل (جنگ) کی مذمت کی جاتی ہے۔ ذرا غور کریں، دونوں فریق ایک ہی عمل (جنگ) سے گزر رہے ہوتے ہیں مگر دونوں کے بارے میں الگ الگ تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جنگ کرنا بری بات نہیں بلکہ

ابہت اس بات کی ہے کہ آپ نے وہ جنگ کس "نیت" سے کی، کسی دوسرے انسان پر ہتھیار کس مقصد سے اٹھایا اور اپنے ہی جیسے کسی انسان کی جان کن حالات میں لی؟"

وہ ایک جذبہ کے عالم میں مجھے نکلے جا رہی تھی۔ میں نے مزید کہا "بھئی! میرے نزدیک تو سب سے اہم نیت "نیت" ہے۔ میں تمہارے مذہب اور عقیدے کے حوالے سے کوئی بحث و مباحثہ یا مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا نقطہ نظر میں نے تم پر واضح کر دیا ہے۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو تمہیں ان سب باتوں کی عادت ڈالنا ہوگی اور۔ تم خود بھی تو مارشل آرٹس سیکھنے کی خواہاں ہو۔؟"

"وہ تو میں خود حافظی کی خاطر سیکھنا چاہتی ہوں" وہ جیسی آواز میں بولی۔

پھر ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ حاکم ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "وجدان! ہم بھی جانے کس قسم کی باتوں میں الجھ گئے تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ۔ میں تمہارے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ جو مجھے نہیں معلوم وہ آج تم مجھے بتاؤ گے۔"

اس کی فرمائش پوری کرنے میں مجھے کوئی قیامت نظر نہ آئی چنانچہ میں اسے اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کرنے لگا۔ اسی قصے کہانی میں رات کے بارہ بج گئے، ہم دونوں کی آنکھوں میں سرخ دھڑے تیرنے لگے اور نیند کے خمار سے

بے ہوش ہونے لگیں۔

بہت مزید باتیں کرنا اپنی جان اور صحت کے ساتھ عظیم اس نیت دینی کرنے کے مترادف تھا۔ لہذا سو جانا ہم پر فرض نہیں کی طرح عائد ہو گیا تھا۔

میں نے ایک نکیلی اور کھل نما چادر اٹھا کر چوٹی میز کی باج جاتے ہوئے کہا "دھونکو! تم آرام سے پھیل کر بستر پر سو جاؤ۔ میں اس میز پر سو جاؤں گا۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی پھر بولی "تم ادھر بستر کیوں نہیں سوؤ گے؟"

"بس وہاں تم اکیلی ہی سو جاؤ" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے پوچھا "مجھے یہ ناراض ہو۔"

"نہیں، تم سے خفا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" اس نے اچھے ہوئے انداز میں پوچھا "اکیسی خاص مقصد کے تحت بستر سونا نہیں چاہتے؟"

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"وہ بات مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے، تم جان کر کیا کرोगی؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "میں نے پوچھا، کسی خاص مقصد کے تحت بستر پر سونا نہیں چاہتے تو تم نے؟" میں جواب دیا۔ اب خود ہی کہہ رہے ہو، کوئی خاص یا اہم بات نہیں ہے۔

وجدان! اکیسی نہیں مجھ پر اعتبار نہیں جو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

میں دھونکو نیلنگری کے "مینسٹرو" کے بارے میں کیا بتانا؟ دھونکو! میں اس سلسلے میں کسی سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حالیہ کی براسرار شتی ایک عجیب و غریب اور رکنین و سنگین چٹنی نما وارنگ وے کر مجھے ایک کڑے امتحان میں ڈال رہی تھی۔ دھونکو چوں کہ "تنگو جھیل" والے مشن میں میرے ہم راہ تھی اور "گرمیو" کی بدھ عبادت گاہ میں میری سرگرمیوں سے بھی کسی حد تک واقف تھی اس لیے وہ نیلنگری کے بارے میں ابتدائی معلومات تو رکھتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ خطرناک حد تک نہیں جانتی تھی۔

میں نے دھونکو کے شکوکے کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم غواہ اور کسی وہم میں نہ پڑو۔ میرا بستر پر نہ سونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ تمہیں اپنے ذہن کو پریشان کرتی پھیرو۔"

وہ بولی "ٹھیک ہے، میں اس سلسلے میں اب تم سے کوئی راز نہیں رکھوں گی لیکن اگر تم اس چوٹی میز پر بے سکونی کی

نیند سوؤ گے تو میں اس آرام دہ بستر پر بے فکری سے نہیں سو سکیں گی۔ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے اس صورت حال میں مجھے نیند ہی نہیں آئے گی۔"

میں ہرگز بے سکونی میں نہیں رہوں گا۔ میں نے کہا "میری تربیت اور عملی زندگی بڑے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے۔ بنگال میں مہاراج ونگ ونگ ونگ یائے کے ممتازیم میں، میں چٹانی بستر پر سوتا رہا ہوں۔ "چٹانی بستر" کا مطلب جانتی ہو؟" وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے خود ہی وضاحت کر دی "پتھر کا بنگال فرش اور پتھری کا نکیلی۔ بس یہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ میں تو دو کرسیاں جو زبردستی ان پر مزے کی نیند سو سکتا ہوں، میز تو پھر بھی کافی کشادہ ہے۔"

اس نے سمجھ لیا کہ میں نے جو سوچ رکھا ہے اس پر عمل کر کے رہوں گا چنانچہ عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ کوٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے میز کے ایک سرے پر نکیلی بچھایا اور کھل اوڑھ کر ناکھیں پھیلایں پھر دھونکو کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا وہ بڑی بڑی یاد رکھ پوک نہیں تھی۔ اس نے میرے ساتھ رہتے ہوئے بار بار ہمارا دی اور جرات مندی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ لڑائی بھڑائی اور خون ریزی کے خلاف تھی اور اس بنیادی سوچ کی وجہ اس کا مذہب تھا۔ بدھ مت میں کسی زندہ چیز کی جان لینا یا اسے ضرر شدید پہنچانا کسی بھی طور جائز نہیں سمجھا جاتا۔ گوتم بدھ برائی کے بدلے میں بھی بھلائی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ایک رفیق القلب اور ہم درد دل رکھنے والا انسان تھا۔ ظلم، نا انصافی اور تشدد کے خلاف تھا۔ نروان کی تلاش میں گوتم نے سخت و تاج کو پاؤں سے عمارت سے ٹھوکر ماری تھی۔

وہ کھل دستو کے راجا کا بیٹا تھا۔ راج کمار گوتم اگر محل میں رہتا تو اس کی زندگی عیش و آرام سے گزرتی۔ وہ جب تک محل میں رہا، ایسا ہوا بھی۔ مگر جب اس نے محل سے باہر کی تلخ ہوا، مصائب اور سفاک دنیا کا نظارہ کیا تو اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ اس نے محل کے عیش و سکون کو ٹھوکر ماری اور "سپانی" کی تلاش میں، جنگوں میں نکل گیا اور اس نے اپنی مطلوبہ سچائی کو پایا۔ "سدا ہارتھ گوتم بدھ" اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی زندگی دکھوں اور برائیوں سے عبارت ہے۔ ان مصیبتوں اور برائیوں کا سرچشمہ انسان کی "خواہش" ہے۔ انسان کو اگر معلوم ہو جائے کہ کون سی "خواہش" نیک ہے تو وہ برائیوں اور مصیبتوں سے بچ سکتا ہے۔ اور نیک "خواہش" تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسے آٹھ چیزوں

کو اختیار کرنا چاہیے۔ نیک خیالات، نیک ارادہ، نیک گفتاری، نیک چلن، نیک معاش، نیک عمل، نیک علم اور نیک تسکین۔ ایسی تسکین۔ جو دھیان گیان، مراۓ اور تصور سے حاصل ہو اور اپنے اندر بے خودی اور مسرت کا لازوال خزانہ رکھتی ہو۔

گو تم بدھ ایک "عارف" تھاتے۔ یعنی سیدھا راستہ تلاش کرنے والا۔ ہندی زبان میں اسے "سداھارتھ" کہا جاتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں انسانیت اور انسان کی بھلائی پوشیدہ ہے مگر وہ انسانی فطرت کے عین مطابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ بدھ مت کا آغاز ہندوستان کے شریمار سے سو میل شمال میں واقع ایک قصبے سے ہوا مگر اب یہ ہندوستان میں ناپید ہو چکا ہے البتہ "سری لنکا، تھائی لینڈ، کوریا، جاپان، چائنا، منگولیا اور تبت و نیپال میں اس مذہب کے پیروکار موجود ہیں۔

اس تناظر میں دھن کی ذہنی کیفیت اور دلی احوال کو یہ خوبی سمجھا جا سکتا تھا کیوں کہ بنیاد طور پر وہ برہما "لارڈ بدھا" کی پیروی کرتے تھے۔

پھر میرا ذہن موجودہ حالات کی طرف چلا گیا۔ میں اپنے اس "مطلب کار" کے بارے میں سوچنے لگا جو ڈیرا اکبر سومو کے بیگلے پر مہمان بن کر آیا ہے اور وہ ڈیرے سے اس کا دوستی کا رشتہ ہے۔ یہی سب سوچتے ہوئے جانے کس وقت میں نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

رات کے آخری پہرا چانک میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دھنو بستر پر موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کی تلاش میں کمرے میں نگاہ دوڑائی تو وہ مجھے اپنے بہت قریب دکھائی دے گئی۔ میں نے ایک جھنگلے سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔

دھنو میز کے قریب ہی پائنٹی کی جانب ایک کرسی پر بیٹھی اس طرح سو رہی تھی کہ اس کا سر میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں میرے پاؤں کے اوپر بھی آگئی تھیں۔ وہ اس وقت گہری نیند میں نظر آ رہی تھی۔ جانے کس وقت وہ بستر سے اٹھ کر میرے نزدیک آگئی تھی!

اس کے چہرے پر معصومیت پوری طرح چلی ہوئی تھی۔ میں نے بے آنکشی اپنے پاؤں کو سر کا گردھنوی ڈلفوں کے لمس سے آزاد کیا۔ میں اس کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم وہ جس بے ڈھنگے انداز میں سو رہی تھی وہ مجھے کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اسے جگا کر کہوں "جاؤ بستر پر

سو جاؤ۔ پھر میں نے سوچا "یہ تو اس کی نیند توڑنے کے مترادف ہوگا۔

میں چند لمحوں تک شش و پنج میں رہا پھر ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے دھنو کو کرسی سے اٹھا کر بستر پر لٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ سوچتے ہی میں نے کھٹک کے بغیر خود کو سمیٹا اور دھنو کے احتیاط سے میز کے اوپر سے نیچے اتر آیا۔ پھر میں نے دھنو کی کسی نازک آجینے کے مانند اپنے بازوؤں میں محفوظ کر کے نرم و گداز بستر پر بچھا دیا۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ دھنوی کھلی ہوئی آنکھوں کے پیچھے مجھے نیلکری مسکرائی نظر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہوں "وہاں مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟ میں تو آخری سانس تک تمہارے تعاقب میں رہوں گی۔"

میں نے زور سے سر کو جھٹک دیا۔ دھنو نے بوجھل نواز میں پوچھا "کیا ہوا وجدان؟"

"کچھ نہیں" میں بولکھلایا پھر کہا "تمہیں کیا ہوا تھا؟" اچھا خاصا بستر چھوڑ کر وہاں کرسی پر کیوں سو گئی تھیں؟ وہ نا آسودہ جہاں لیتے ہوئے بولی "مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو اس کرسی پر جا بیٹھتا ہوں۔ کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔"

"چلو اب سو جاؤ" میں نے کہا۔ "میں بستر پر اکیلی نہیں سو سکتی گی وجدان۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے پوچھا" کس بات کا ڈر لگ رہا ہے؟ کس چیز کا ڈر لگ رہا ہے۔ کمرے میں ایسی تو کوئی شے مجھے نظر نہیں آ رہی!"

"میں نے اپنے ڈر اور خوف کو بیان نہیں کر پاتا ہوں۔" وہ عجیب سے "الہجھن زدہ انداز میں بولی "تم بھی ہال میز پر جا کر سو گئے تھے اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

میں نے سوچا "دھنو کو سلاتے کے لیے کچھ نہ کچھ کوئی ذہنی بازی پڑے گی۔ میں نے اس مصلحت کے تحت کہا "میں اب یہیں بستر کے ایک کونے پر موجود رہوں گا۔ تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔"

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے بستر کی پائنتی پر پٹ گاہ کے ساتھ ٹکیہ کھرا کر کہ نیک لگائی اور نیم درازہ کیا پھر میں نے جاگتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی

میں نے محسوس کیا کہ اس کا سونے کا ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار اپنے سر کو چھونے لگتی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر کہا "اب کیا ہے؟"

"اب؟" وہ تو نہیں لگ رہا "وہ اپنی فطری معصومیت سے بولی "لیکن ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔" میں نے چونک کر "کون سا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "میرے سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔"

اس وقت ہمارے پاس اسپرن یا کوئی بھی درد کش دوا موجود نہیں تھی اور رات کے اس پہرا میرے منگوانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ میں نے دھنو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا سر دیا دیتا ہوں" کوئی دوا وغیرہ تو ہے نہیں۔

"تم وہ کیوں نہیں کرتے؟" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"دھنو! وہ جو تم نے میرے ننھے پر کیا تھا" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"کیا؟" جی! کی قوت سے سر کے درد میں حافقہ نہیں ہو سکتا؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے کہا "لاؤ اپنا سر" میں کچھ کرتا ہوں۔"

پھر میں اٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دھڑام سے اس نے اپنا سر میرے پیٹ پر رکھ دیا۔

میں نے بولکھلا ہٹ آمیز لہجے میں کہا "دھنو! یہ کیا کر رہی ہو؟"

"جو تم نے کہا" وہی کر رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک اٹھا۔

"تم نے کہا" لاؤ اپنا سر۔ میں اپنا سر لے آئی۔"

دھنوی وضاحت پر میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں نے ہتھیار ڈال دیے، پھر اس کے درد پر دھنو کے لیے کال اٹھائی کرنے لگا۔ اپنے بدن کی ہزار ہا حرارت کو اس کے تن میں اتارنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ پرسکون ہو کر آسودگی کی نیند میں ڈوب گئی۔



آئندہ روز ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا۔

گزشتہ رات ہم دیر سے سوئے تھے لہذا صبح تاخیر سے

آنکھ کھلی۔ اس وقت دوا گر گھڑی نو بج رہی تھی۔ گھنٹوں کے حساب سے نیند کے لیے ہمیں مناسب وقت مل گیا تھا اس لیے جب ہم بیدار ہوئے تو ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ جو تھوڑی بہت کرباتی رہ گئی تھی وہ غسل نے پوری کر دی۔

ہم نے باری باری ایک طویل ہاتھ لیا پھر ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد تیار ہو کر ہوٹل سے نکل آئے۔ اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ذرا کھوم پھر اپنے گرد پیش کا جائزہ لینا چاہتے تھے تاکہ اس اجنبی ماحول سے کچھ مانوسیت پیدا ہو جائے۔ ہم اس ارادے سے باہر نکلے تھے کہ دوپہر کا کھانا کھا کر ہی لوٹیں گے۔ ویسے ہم ہوٹل سے زیادہ دور جانے کا ریسک نہیں لے سکتے تھے کیوں کہ میرٹھ کی آمد کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔

دھنو نے تاریکی رنگ کی بناری ساڑی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ہیل والی سینڈل تھی۔ میں ڈریس پیٹ اور دھاری دار شرٹ میں لمبوس تھا پاؤں میں وہی جو گزرتے۔ دھنو چون کہ ساڑی کے ساتھ جو گزرا استعمال نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے سینڈل پہن لی تھی۔

دھنو کو کسی میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ قدرت نے بڑی فرصت اور فراغت میں اسے بنایا تھا۔ حسن و جوانی کا خزانہ عنایت کرتے ہوئے بھی دست قدرت نے بڑی فاضلی سے کام لیا تھا۔ اس کی ہرلی ایسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کسی کاہل کی محتاج نہیں تھیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو شرماتے والے نازک و گداز ہونٹ قدرتی سرخی سے مرتن تھے۔ اس کے سفید بدن اور طویل قامت پر ج کہ ہر لباس اپنی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کی معصوم صورت میں چھپی شوخی اور شرارت ماحول میں زندگی بھر دیتی تھی اور اس کی مترنم آواز روح میں سرمستی کھول دیتی تھی۔

ہم منسلکے ہوئے بس اسٹینڈ کی جانب نکل گئے۔ تھوڑی دیر تک بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے پھر نزدیک ہی ایک معقول سے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑے۔

جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا وہاں موجود ہر شخص گردن گھما کر دھنو کو دیکھ رہا تھا۔ راستے بھر میں یہی کیفیت رہی تھی۔ دھنو بھی یہی ایک قابل دید لڑکی۔ وہ ایک ایسا دل خوش کن نظارہ تھی جو دیکھنے والوں کی نظر کو ساکت اور قدیموں کو جاہل کر دیتا تھا۔

واپسی کے سفر میں مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی ہمارے



تغائب میں ہو گئے۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا تاہم میرا یہ احساس خالی از علت نہیں تھا۔ جلد ہی ثابت ہو گیا کہ میری چھٹی حس نے مجھے جس گائیڈ نہیں کیا تھا۔

ایک کھلی جیب دائیں پیلو سے گزر کر ہمارے سامنے سڑک پر رک گئی۔ بریک کی تیز آواز پر ہم نے چونک کر جیب کی طرف دیکھا۔ جیب میں تین افراد سوار تھے۔ شکل و صورت سے وہ تینوں چھپے ہوئے بد معاش نظر آ رہے تھے تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا ان میں ایک یا مین عرفی شاہ نامی غنڈا تھا باقی دونوں اس کے پیچھے تھے۔ یا مین شاہ جیب کی پیچر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈرائیونگ کے فرائض اتدو تا انجام دے رہا تھا جب کہ پچھلی سیٹ پر براجمان گن بردار شخص کا نام غلام رسول تھا۔

جیب چوں کہ اچانک روک دی گئی تھی اس لیے ہمارے دو قدم تسلسل میں اسی جانب اٹھ گئے اور ہم یمن اس کے قریب پہنچ گئے۔ ہم دونوں پیلو بہ پیلو اس طرح چل رہے تھے کہ دھون سڑک والی سائڈ پر تھی۔

جیب میں بیٹھے ہوئے غنڈے یا مین شاہ نے ہوس زدہ نظر سے دھوکو کو سر تاپا گھورا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا ”سامیں! پیدل کیوں چل رہے ہو۔ خود تھک رہے ہو اور ساتھ اس لڑکی کو بھی تھکا رہے ہو۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، ہم چھوڑ دیتے ہیں۔“

میں نے چال کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”بہت شکریہ، ہم خود ہی چلے جائیں گے۔“

”نہ بابا! اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے؟“ یا مین شاہ اپنی مونچھوں پر انکشت شہادت سے مساج کرتے ہوئے بولا ”ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کو کہاں جانا ہے۔“ میں نے کہا ”ہم نے جہاں بھی جانا ہے، چلے جائیں گے۔“

یا مین شاہ نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ وہ اپنی تجربہ کار نگاہ سے مجھے ناپنے تو لے کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگت والا ایک پست قامت شخص تھا۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم اور چہرے پر خباثت، آنکھوں میں کینکری جھلکتی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع اور انداز سے بھی لڑائی بھڑائی کا شوقین لگتا تھا۔ مجھے ان کے قماش کا تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا تاہم ناموں کے بارے میں بعد میں پتا چلا تھا۔

یا مین شاہ جب میرا جائزہ لے چکا تو بولا ”اس علاقے کے نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟“

”میں تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا“ میں اٹھڑے ہوئے لمبے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے، بابا تم ہمیں جانتے نہیں ہو؟“

”میں جانتا بھی نہیں چاہتا۔“

”بڑی گرمی ہے تمہارے اندر! یا مین شاہ نے، منہ، نظر سے مجھے دیکھا، پھر دھوکو کو کتے ہوئے بولا ”یہ کیوں تم ٹھار کھڑی ہے سامنے؟“

اس کے ساتھ ہی یا مین شاہ نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں دو عمل ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنی بات کرتے ہی دھوکو کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں پھرتی سے آگے بڑھا اور یا مین شاہ کے ہانڈو کو سے پکڑ لیا، منہ سے ایک لفظ ادا کیے بغیر میں نے اس کے گالے کو اپنے ہاتھ کی جکڑ میں دانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ میں پیچھے کرنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں جھڑا لگا۔

میرے زور لگانے کے جواب میں وہ بھی زور کر کے لگا جس کے نتیجے میں دھوکو کا بازو دھونے لگا۔ میں نے کو تکلیف سے بچانے اور یا مین شاہ کو تکلیف میں جھار کی خاطر ایک فوری ایکشن لیا۔ میں نے یا مین شاہ کو لپکا چھوڑتے ہوئے، اسی ہاتھ کا ایک میڈیم پیچ اس کے منہ پر دیا۔

دھوکو کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ڈرائیور سے جا کھڑا۔ اس کے چہرے پر مجھے تکلیف آخار نظر آئے۔ یا مین شاہ نے اپنے ہاتھ سے فوراً چھوٹا دیکھا اور جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا پالائی پر پھٹ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے رستے ہونٹ کو صاف کیا پھر ایک مخصوص انداز میں ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

اللہ داتا ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر جیب سے باہر دھونے جب صورت حال کی سنگینی کو محسوس کیا تو فوراً دبا تے ہوئے تھویش ناک لمبے میں بولا ”وجدان! ان جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ خواہ خواہ کسی چھٹ پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”یہ تو اب آسانی سے نہیں جان چھوڑیں گے۔“ میں نے دھوکو کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے مقتدل لمبے میں کہا ”تو میرے ہاتھ پاؤں میں سنسنی دوڑا رہے ہیں۔“ انہیں شرافت کا ابتدائی قاعدہ بڑھانا ہی پڑے گا۔ میری بات ابھی ختم ہوئی تھی کہ اللہ داتا

نے منہ سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں آگے بڑھ کر، اپنے گھونٹے سے میرے چہرے کا نشانہ لینے کی کوشش کی تھی۔

میں نے سر کی چمک کا استعمال کرتے ہوئے اپنے چہرے کو اٹھائی پیچھے ہٹا لیا۔ دو عمل کے طور پر وہ اپنی ہی بھونک میں سیدھا جھپڑ آ رہا۔ میں اس صورت حال کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ میں نے پیلو میں سرکتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

میں حسب توقع برآمد ہوئے۔ اللہ داتا منہ کے بل لہراتا ہوا جیب کے ہونٹ سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک روڈناک جی بلند ہوئی جس کی صدا نے یا مین شاہ کو جیب چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اس دوران میں اللہ داتا اپنے چہرے کو ٹوٹا ہوا سیدھا ہو چکا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتی ہی وہ بیجا کیفیت میں مبتلا ہو گیا اور بڑے جوش و خروش سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے لگائی دے کر اس کے پیٹ میں ایک نچی تلی سائڈ کلک جڑا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ یا مین شاہ نے فکرا کیا۔ یا مین شاہ نے پچھلا ہٹ کے عالم میں اللہ داتا کے منہ پر ایک زوردار پھیر مارا۔ پھر جھوٹا خوار انداز میں میری جانب بھاگا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام نما نفرت کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا ”ہماری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے لہذا اس منٹائے کو ختم کرو“ اور ہمیں جانے دو۔

”دشمنی تو اب پیدا ہو گئی ہے بابا۔“ وہ تیز نظر سے مجھے گھور رہا تھا۔ ”تمہارا آسانی سے ختم نہیں ہو گا۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ میں نے اس کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ دھوکو کی جانب جو میری پشت پر کھڑی تھی اشارہ کرتے ہوئے بولا ”اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”کیوں؟“ کیا یہ تمہاری جھڑی ہوئی کوئی رشتہ دار ہے؟

ہونٹ خاصا متورم ہو چکا تھا مگر ذہن کی خباثت اور آنکھوں کی بے حیائی میں فرق نہیں آیا تھا۔

میں نے کہا ”تمہارا یہ ناپاک خواب تو مرنے کے بعد بھی پورا نہیں ہو گا۔“

”مرو گے تم؟“ وہ سلگ اٹھا۔ اور ہمیں سب کے سامنے مرو گے۔“

وہ ایک چلتی ہوئی سڑک تھی۔ ہمیں آپس میں الجھتے ہوئے دیکھ کر بہت سے افراد رک گئے تھے اور دلچسپی سے ”تماشا“ دیکھ رہے تھے۔ تاہم ان کے ”مرو“ سے لگتا تھا کہ اگر وہاں کوئی واقعی مر رہا ہو تو وہ مداخلت یا بچ بچاؤ نہیں کریں گے۔

میں نے اتمام حجت کے طور پر یا مین شاہ سے کہا ”اچھی طرح سوچ لو۔ اگر ایک مرتبہ یہ میدان جم گیا تو پھر سراسر نقصان ہی ہو گا!“

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بازوؤں میں اپنے بازوؤں کے حلقے میں مجھے جکڑ لیا۔ اس کے بازوؤں میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی جس کا وہ بھرپور استعمال بھی کر رہا تھا۔ میں اس کے اس فوری عمل کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اس کے دام میں آ گیا۔ اب ”جواب“ لازم ہو گیا تھا۔ یا مین شاہ کی غنڈا گردی زبانی کلامی قابو میں آنے والی نہیں تھی۔

میرے دونوں بازو، اس کی بانسوں کی پلیٹ میں آگئے تھے اور وہ اپنے بدن کی پوری قوت سے میرا پچور ٹکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ قدمیں مجھ سے خاصا کم تھا اس لیے اس کی زور آزمائی کا نشانہ صرف اور صرف میرا پیٹ ہی بن رہا تھا۔ میں نے سڑک چھاپ غنڈوں سے منٹے ہوئے جتنی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ کوئی خطرناک ”ٹیک“ کیے بغیر ہی کام چلایا جائے اس صورت میں، میں ”سلف ڈیفنس“ اور ”جوڈو“ و فمہ کی ٹیکنیک کا زیادہ استعمال کرتا تھا۔ یہاں بھی میں نے یہی حکمت عملی اپنا رکھی تھی۔

میں نے فوراً اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا، نتیجے میں یا مین کی گرفت میرے بازوؤں پر کم زور ہو گئی۔ میں ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اٹھک بیٹھک میں نے کئی کی سی سرعت سے لگائی تھی اور یا مین کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ وہ حیران نظر سے مجھے کھنکے لگا۔ میں نے اس کی حیرت کو دو چند کرنے کے لیے اس کے پھیلے ہوئے چٹائی سینے پر ”پینڈ“ پٹش“ کا بوسہ دیا۔ یہ ایک اوپن ڈبل پینڈ پٹش تھا جس کی حقیقت کو صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو اسے استعمال میں

لائے ہوں یا پھر وہ لوگ جنہوں نے اس کا "مزمہ" چکھا ہوا! یامی شاہ کے قدم اکھڑ گئے اور وہ چار فٹ پیچھے سرک کے عین بیچ میں جا کر اس ذلت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کا غضب آسمان کو چھوئے لگا۔ وہ اپنے لباس کو سمیٹتے ہوئے اٹھا اور پھر نکار کر میری جانب بڑھا۔

اس نے کسی ارنا بیٹے کی طرح اپنے سر سے ایک زور دار ٹکڑے میرے پیٹ میں رسید کرنا چاہی میں اپنے قدموں پر فضا میں اچھلا اور مجھے فٹ کی بلندی کو چھو کر اوپس زمین پر آ گیا۔ اس دوران میں یامی شاہ میرے پیچھے سے گزر کر اپنی جیب کو "سلامی" دے چکا تھا۔ ٹکڑے مارے ہوئے اس کا چہرہ چون کر زمین کی طرف جھکا ہوا تھا اس لیے اپنی جھونک میں اس کی کھوپڑی ایک زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے جیب سے کرائی تھی۔

چوٹ کھا کر یامی شاہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکے کی مانند ڈکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ اپنے "ٹکڑے" کی یہ "عزت" افزائی اس کے چیلوں سے دیکھنے نہ لگی اور وہ وفا داری کے جوش میں مجھ پر پل پڑے۔

ڈرا سورا اللہ دتا میرے ہاتھوں پہلے ہی خاصی ہزیمت اٹھا چکا تھا لیکن یامی شاہ کا چچ ٹمک ادا کرنا بھی ضروری تھا تاہم وہ غلام رسول سے چند قدم پیچھے تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا تھا کہ وہ میرے قریب آنے سے کتر رہا تھا۔

غلام رسول نے کلا شکوف کو نال کی جانب سے تمام کر کسی لٹھ کی طرح اسے میرے سر پر آڑنا چاہا۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔ میں نے بائیں بازو سے "فیس بلاٹنگ" کی میرے بازو کا بیرونی حصہ غلام رسول کی کلائیوں سے کرایا اور کلا شکوف میرے سر کو چھونے سے پہلے ہی اس طرح ہوا میں معلق ہو گئی جیسے کسی جادوئی ہٹن کے ذریعے اسے رکنے کے احکام مل گئے ہوں۔

میں بلاٹنگ کی خاطر ایک اسٹیپ اندر آچکا تھا چنانچہ بلاٹنگ کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے ایک دھواں دھار گھونسا غلام رسول کی ناک پر رسید کر دیا۔ کلا شکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے دھنو کے قدموں میں جا گری۔

دھنو نے پہلی فرصت میں اس ملک ہتھیار قبضہ کر لیا تاہم میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر واضح کر دیا کہ وہ ہلاکت خیز آتشیں ہتھیار کو استعمال کر کے کسی حماقت کا ثبوت دینے کی کوشش نہ کرے۔ ان مقامی غنڈوں کے لیے سے خالی ہاتھ پاؤں ہی کافی تھے۔ دھنو نے میرا بھری پیغام

رسو کر لیا۔

غلام رسول میرا فولادی بیچ کھا کر زمین پر گر خاک چڑ رہا تھا۔ ماں باپ نے کتنے چاؤ سے اس کا نام "غلام رسول" رکھا ہو گا لیکن اس پر قیاس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر یامی کی جاگرتی کو ترجیح دی تھی۔ اس نے اس کے اس کی بد بختی پر مہر ثبت کر دی تھی۔ اب خاک ہی خاک! نصیب تھی۔ اسے زندگی بھر خاک چاٹنا ہی اور خاک سے خاک ہو کر خاک اوڑھ کر سوجانا تھا۔

جس دوران میں میری نظر غلام رسول پر جمی ہوئی تھی اللہ دتا نے پھر نی کی مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پیچھے سے "جیسا" ڈال دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ زور آزمائی شروع کرے میں نے کمر کو دائیں پہلو پر ٹوٹ کر کیا اور میری ایلو میٹک کسی نوک دار ہتھوڑی کی مانند اس کے گال پر پڑی۔ یہی کمر پر اس کے بازوؤں کے حلقے کی گرفت ذرا دھکیلی ہوئی میں نے یہ عمل بائیں پہلو پر جھک کر دائیں کمر سے دہرایا۔ اللہ دتا اپنے چہرے کو تمام کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا منہ پہلے ہی جیب کے پونٹ سے ٹکرا کر خاصی قوا مضرب چکا تھا۔ پھر اس کے پیٹ میں لگنے والی سائڈنگ کے اثرات بھی ابھی باقی تھے۔

میں اللہ دتا کو چھوڑ کر غلام رسول کی جانب متوجہ ہو گیا وہ زمین سے اٹھنے کے بعد میرے قریب پہنچ چکا تھا اور وہ آواز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف ہٹ کر ہوئی اس کی ٹانگ کو پاؤں سے پکڑ لیا پھر ایک زوردار دھون دیتے ہوئے اسے دائیں جانب گھما دیا۔ وہ بھڑکی کی طرح کھا کر دور جا کر۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ یامی شاہ کوئی خطرناک چلنے کا ارادہ رکھتا ہے میں نے اسے دھنو کی جانب ہونے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وہ دھنو کو اپنی گرفت میں لا کر کمزور بنانا چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمبا اسٹیپ لیا پھر "بیک فلک" کرتے ہوئے ہوا میں اچھلا اور "بیک سرسٹ" کرتے ہوئے شاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ وہ نفوں کی طرح منہ کھول کر سے میرا چہرہ کٹنے لگا۔

میں نے اس کی حیرت کو توڑنے کے لیے یہ آسانی دامن بازو کی پلیٹ میں اس کی گردن کو جکڑ کر نیچے کی جھکایا اور دائیں پاؤں کی اڑی اس کے ذہن کی طرف چہرے پر رسید کر دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلاتا تھا۔ اس پر اتنا گھبراہٹ نہیں کیا بلکہ اس کی گردن کو گرفت میں

ہوئے میں نے اپنے بازو کو "بیک رول" کیا اور یامی شاہ کو دھنسا اٹھاتے ہوئے پیچھے "ٹھوڑا" کر دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کرب ناک انداز میں بیچ اٹھا۔ وہ سیدھا بڑا ہی جیب کی آہنی باڈی سے ٹکرایا تھا اور اس بار اس کی گردن پڑ گئی تھی۔

یامی شاہ کے حواریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنے دھنو کو سمیٹتے سمیٹتے میرے سر پہنچ گئے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ کسی روایت سے کام نہیں لیا۔ انہیں اپنے کھلے ہاتھ پاؤں کی ضربات میں منسلک کر رکھ کر ان کے منٹ کے اندر ہی وہ دونوں اپنے اپنے کپتے زمین بوس ہوئے تھے۔ اب ان سے کسی قسم کے طرہ رساں متوہل کی بات نہیں تھی۔

میں ہاتھ بھاڑ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اپنے عقب میں ایک آواز سن کر چونک اٹھا۔ میں نے تین واحد میں ٹٹ کر دیکھا اور میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ یہی اللہ دتا اور غلام رسول سے تھوڑا تھا "اس دوران گھبراہٹ شاہ جیب میں پہنچ چکا تھا پھر اس کے اندر فطری بزدلی غارت وہاں سے سر پاؤں (بیکل ریشر پاؤں) رکھ کر دھنو پر مجبور کر دیا تھا۔

بزدل انسان نازک موقع پر اپنی جان بچانے کے لیے ہٹنے کی سعی اور عزیز سے عزیز ترین چیز کو بھی ٹیک جھکتے میں ہٹنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اللہ دتا اور غلام رسول تو اس کے ہاتھ تھے وہ اگر انہیں میرے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا تو اس میں اچھے کی کوئی بات نہیں تھی۔

دھنو کلا شکوف سمیت میرے قریب آگئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گن لے کر اسے ان کو دیا اور خالی ہتھیار ڈال دیں وہ "خاک نشینوں" پر پھینک دیا پھر دم ہاں رکے بغیر انہیں اپنے ہوش آگئے وہاں پر موجود لوگوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جس ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو ان کے دو بیچ تھے۔ میں نے ان کے کاندے سے لاک کر دیا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ کر بات بات پر ہنسنے لگے۔

دھنو نے کہا "جو کچھ بھی ہوا ہے، ٹھیک نہیں ہوا۔" "تم ٹھیک کسی ہو" میں نے تائید کی "مگر یہ سب کچھ یہ بات بھوری کرنا چاہا ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے غصے سا جو کوئی زیادتی ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔" "ہم ان کے جگہ پر ہیں اور ہمارے حالات اس بات کی اجازت

مشہور ترین چورک فیلوٹ جو بے قیمت چھوڑیں گراں قدر معاوضے پر چڑھتا ہے۔  
ان حیرت انگیز چوریوں کی کہانیاں جو دھنو توٹنا ڈانٹوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

گراں قدر معاوضے پر چڑھتا ہے۔



وہ لپٹ کر کہانی جن کو آپ بار بار دیکھیں گے اور لطف اندوز ہوں گے  
قیمت فی حصہ - 60/- روپے ڈاکٹر جی جی حصہ - 23/- روپے  
دونوں حصے ایک ساتھ منگانیے پڑا کر خرچ - 25/- روپے

کتابیات پبلشرز کمپنیز  
74200  
www.kitabiat.com

نہیں دیتے کہ ہم لوگوں سے اچھے نہیں اور اس طرح زیادہ سے زیادہ افراد کی نظروں میں آجائیں۔ تم نے دیکھا وہاں سڑک پر کتنے زیادہ افراد جمع ہو گئے تھے یہ واقعہ بہت جلد گروپش میں گشت کرنے لگے گا۔ لوگوں کی زبانوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہمارے لیے عن قریب کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے!

دھنوک کی تشویش بجا تھی۔ یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ آج جس نوجوان شخص نے یامی شاہ جیسے بد معاش کو دم دیا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا وہ کہاں اور کون سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ خاصی تشویش ناک صورت حال تھی۔

مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر دھنوک نے کہا ”وجدان“ ہمیں پہلی فرصت میں اپنا ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔

”تمہاری بات میں وزن ہے لیکن سروسٹ یہ ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یوں سمجھ کہ فی الحال ایسا کرنا مناسب نہیں“ میں نے کہا۔

وہ اب ثابت میں سر ملاتے ہوئے بولی ”ہاں یہ تو بات ہے“ پھر ایک طویل سانس لینے کے بعد اضافہ کیا ”دراصل حالات کی افرا تفری نے میرے ذہن کو اس طرف سے غافل کر دیا تھا۔“

ہم اس تازہ ترین صورت حال پر غور کرنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد دھنوک نے کہا۔

”وجدان! میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا ہے۔“

اس کے لیے کی مضبوطی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”کس قسم کا اہم فیصلہ؟“

وہ بولی ”میں جلد از جلد تم سے مارشل آرٹس سیکھنا چاہتی ہوں۔“

”اپنی حفاظت کے لیے؟“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

حفاظت کے لیے بھی اور سامنے والے کو مزہ چکھانے کے لیے بھی۔“

”اور... وہ تمہارا نظریہ... برائی کے بدلے میں برائی کرنے اور ظلم سہہ کر خاموش رہنے کا نظریہ کیا ہوا؟“

”اب چھوڑو نا“ ان باتوں کو وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

مجھے اس کے لیے سے پہلی مرتبہ سرکشی چھلک کر آئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سڑک پر پیش آنے والے مارے نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ میرا خیال تھا یہ تحریک سب پیدا ہوئی تھی اس کے اندر۔ میں نے اس نازک موقع پر اسے گریڈ نامناسب نہ سمجھا اور عام سے انداز میں کہا ”تمہارے جیسے تمہاری خوشی میں نے تو پہلے بھی انکار نہیں کیا اور اب بھی جان سے نہیں فتنوں ضرب و حب و کل کے لیے تیار ہوں۔“

وہ کبھی نہ انداز میں گویا ہوئی ”وجدان! میں نے تو رکھا ہے، اگر روم میں رہتا ہے تو وہی کرو جو روم کرتا ہیں۔“ پھر وہ میری آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرا روم (Rome) تو تم ہو وجدان! میں تمہارے روم میں رہنا چاہتی ہوں۔ اس لیے مجھے وہی کرنا ہے جو تم پسند ہے اور جو تم کرتے ہو“ ایک لمحے کے وقت سے اس بڑے مضبوط لیے میں اضافہ کیا ”لہذا مارشل آرٹس نا مٹ ہے!“

”مجھے تمہارے اس فیصلے سے خوشی ہوئی ہے دھنوک نے کہا۔

”اسی خوشی میں ملاؤ ہاتھ“ وہ اپنا نرم و ملائم دھماکہ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دھنوک کے ہاتھ کا گداز میرے احساس کو گدگدائے اس لطیف لمس نے میرے وجود میں جگنو بھر دیے تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

جھیل سی آنکھوں میں میرے لیے محبت کی لفظی قیامت محبت جو بے قدموں انسان کے اندر اتر آتی ہے اور اس احساس کو پھول کی طرح کوئل اور خوش بو کی طرح ہے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں دھنوک کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں تلخی نہیں تھی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔ ہاتھ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں شکل نہیں تھا۔

”اس نے مجھے چونکا کر دیا۔ ایک طویل جست بھر کر میں اس لذت سے باہر آیا اور حتیٰ لیسے میں کہا۔

”دھنوک! آج کے بعد تم ساحل ہو۔“

”ساحل؟ کیا مطلب؟“ وہ اس اچانک جملے سے الجھ گئی۔

میں نے کہا ”ساحل کا مطلب ہے، سمندر کا کنارہ۔“

”کی کوٹ۔ سی کوٹ۔“ وہ جلدی سے بولی ”لیکن تمہارا ”وہ تو میں سمجھتی ہوں“ وہ جلدی سے بولی ”لیکن تمہارا یہ کہنا کہ آج کے بعد میں ساحل ہوں۔ کیا معنی رکھتا ہے؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میں نے تم سے کہا تھا، تمہارا یہ نام ”دھنوک“ تم پر چلتا نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تمہارا نام بدل دوں گا اور تم نے مجھے اس کی اجازت بھی دے دی تھی۔“

”اوہ! اب سمجھی“ وہ اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”تو دھنوک! میں نے ابھی اسی وقت تمہارا نام ”ساحل“ رکھا ہے۔ آج کے بعد تم ساحل ہو۔ کو یہ نام جس کیس کا؟“

”تم نے تجویز کیا ہے اس لیے بہت اچھا ہے۔“

”اور ویسے؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”گوئیے بھی لفظ ”ساحل“ اپنے اندر وسیع معانی رکھتا ہے“ وہ خندیلی سے بولی۔

مجھے ہر لحاظ سے یہ نام پسند آیا ہے۔ اور خوشی اس بات کی ہے کہ یہ نام تم نے رکھا ہے۔“

”تھینک یو ساحل“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی فطری شوخی سے بولی ”شکریہ کس بات کا وجدان! یہ لفظ تو تم نے ہی مجھے پڑھایا ہے کہ دوستی میں ”تھینک یو“ کی بجائے نہیں دینا چاہیے۔“

میں اس شرات کی پڑیا کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر مسکراتے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے حالات حاضرہ کی طرف آتے ہوئے پوچھا ”وجدان! تم نے پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟“

اس سے پہلے کہ میں ساحل کو کوئی مناسب سا جواب دیتا ہوا ہوں۔ اس نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا ”میرے رومانے پر دستک ہونے لگی۔ ہم دونوں نے چونک کر دھنوک کے ساتھ دیکھا۔ ”کون ہو سکتا ہے؟“ ساحل نے دھنوک سے ناک انداز میں پوچھا۔

”یہ تو دروازے پر جا کر ہی معلوم ہو گا“ میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

وہ خندیلی سے بولی ”ذرا احتیاط سے وجدان۔“

میں نے بند دروازے کے قریب پہنچ کر بہ آواز بلند پوچھا ”کون ہے؟“

آواز اونچی تھی اس لیے باہر پہنچ گئی۔ دوسری جانب سے جو جواب ملا وہ اطمینان بخش تھا۔ میں نے میرے بخش کی آواز کو پہچانتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

جب وہ کمرے کے اندر آ گیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ساحل اس دوران میں بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ میں میرے بخش کی رپورٹ سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے میرے استفسار پر مختصر مگر جامع الفاظ میں وہاں پیش آنے والے حالات کے بارے میں بتا دیا۔

میرے بخش کے مطابق، ڈیڑا اکبر مرحوم اور اس کے مہمان دوست نے اس کی کمالی پر یقین کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے منسوب جاوڑی چکر پر ایمان لے آئے تھے تاہم وہ میری تلاش سے دست کش نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے جہاں جہاں میرے پائے جانے کے امکانات موجود تھے، اپنے آدی پھیلا دیے تھے اور بڑی سرگرمی سے مجھے ڈھونڈنا جا رہا تھا۔ یہ تمام ردعمل میری توقع کے خلاف اور تشویش ناک تھا۔

”سائیں! اللہ سائیں کا شکر ہے“ ڈیڑے کو میری کسی بات پر شک نہیں ہوا ”وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”دیکھا تم اس بات سے مطمئن ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں سائیں“

جواب دینے کے بعد اس نے میرے چہرے کی گیمبریا کو دیکھا اور پوچھا ”کیوں سائیں، کوئی گزربز ہو گئی کیا۔ آپ تو مطمئن نظر نہیں آ رہے ہوں!“

”کوئی گزربز اگر ہوئی نہیں تو عن قریب ہو جائے گی“ میں نے خندیلی سے کہا ”اور جہاں تک میرا تعلق ہے، میں واقعی مطمئن نہیں ہوں۔“

”سائیں! آپ تو عجیب بات کر رہے ہوں!“ وہ الجھ گیا۔

میں نے کہا ”میرے بخش! تمہارے ڈیڑے سائیں کا ردعمل قدرتی نہیں ہے۔ مجھے اس کے پیچھے کسی گہری سازش کے آثار نظر آ رہے ہیں۔“

وہ سرا سمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”کیسی سازش سائیں؟“

میں نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا ”میرے بخش! یہاں آتے ہوئے تم نے پوری احتیاط سے کام لیا ہے نا؟“

آتش فشاں (101) حصہ 7

آتش فشاں (101) حصہ 7

آتش فشاں (101) حصہ 7

آتش فشاں (101) حصہ 7

”جی سائیں“ میں پورے راستے جو کس رہا ہوں“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

کسں تمہارا خفیہ تعاقب تو نہیں کیا گیا؟“ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

وہ غصے سے بولا ”نہیں سائیں“ میں نے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی ہوٹل میں قدم رکھا ہے۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ۔“

میں میرنکس کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے قدرے مطمئن ہو گیا پھر اس سے پوچھا ”کیا تم کسی یا شاہ نامی بد معاش کو جانتے ہو؟“

وہ چونک اٹھا ”ہاں سائیں“ اچھی طرح جانتا ہوں ”کون ہے وہ شخص؟“ میں سیدھا ہوا کر بیٹھ گیا۔

میرنکس نے بتایا ”یامی شاہ میاں کا بہت بڑا بد معاش ہے۔ وزیر اکبر سومرو سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ وہ کئی مرتبہ وزیرے کے بیٹے پر جا چکا ہے۔ وہاں میں اس سے مل بھی چکا ہوں“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا ”لیکن سائیں! آپ یا شاہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”آج دوپہر میں ہمارا ”آمناسمانا“ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ واما غلام رسول نامی دو افراد بھی تھے۔ میں نے ان تینوں کو چھٹی کا دودھ یا دلا دیا۔ یا شاہ اپنے جیلوں کو پٹا بھونک رہے ہیں فرار ہو گیا۔“

”وہ! وہ متعلقہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”اس دنگا فساد کی نوبت کیوں آئی سائیں؟“

میں نے بتایا ”یامی شاہ نے میری ساتھی ساحل سے دست دراز کی کو شش کی تھی مجھ کو اس کی کو شش ناکامیاب بنانا پڑی۔ اسی پر بات بڑھ گئی اور پھر میدان کارزار گرم ہو گیا۔“

میرنکس نے بیڑہ دراز ساحل کو دیکھا اور اچھے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا ”سائیں آپ کی ساتھی کا نام تو دھن؟“

”ہاں“ یہ نام تھا اس کا کبھی ”میں نے میرنکس کی بات کی یہ تک پہنچتے ہوئے قطع کلامی کی اور کہا ”اب یہ ساحل ہے۔ صرف ساحل“

وہ اس تبدیلی نام پر کوئی تبصرہ کیے بغیر بولا ”سائیں! جو واقعہ آپ نے بتایا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے بیٹے پر آمد دھم کی وجہ سے یا شاہ بھی وزیرے کے دوست اور اس کے مشن سے آگاہ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے آپ کو پہچان لیا ہو۔“

”مجھے تو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوا“ میں نے مجبور سے کہا۔

میرنکس نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا ”سائیں! آپ فوراً یہ ہوٹل چھوڑ دینا چاہیے۔“

”ہم بھی یہی سوچ رہے تھے“ ساحل نے پہلی مرتبہ مجھ میں حصہ لیتے ہوئے کہا ”بس تمہارا ہی انتظار کر رہے“ پھر وہ بستر سے اٹھ کر ہمارے قریب آگئی۔

میں نے سڑی بیک کو سمیٹتے ہوئے کہا ”میرنکس! تمہارا انتظار تو اب باقی نہیں رہا۔ ہمیں جلد از جلد نکلنا پڑے گا۔“

میرنکس بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔ یہ دستک ایک گھٹنا پہلے میرنکس کی آمد پر ہونے والی دستک سے قطعی مختلف تھی۔

ہم تینوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمارے ذہنوں میں اس وقت کوئی نہ کوئی سننا آ رہا سوال ضرور موجود تھا جس کا مفہوم ایک ہی معنی دیتا تھا مگر کون ہو سکتا ہے؟

یہی بات میرنکس کی زبان سے پھسل گئی ”سائیں! اب کون آگیا؟“

”ہم تمہارے باپ ہیں! باہر سے ایک دباؤ آتی ہوئی آواز اندر پہنچی۔“

”اگر ہم نے دس سیکنڈ کے اندر دروازہ نہ کھولا تو اسی بے ہودگی سے ہم دروازہ توڑ کر اندر آجائیں گے“ اسی گونہ دار آواز میں دھمکی دی گئی۔

میں نے دروازے کے پولٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”میں دروازہ کھول دوں گا۔ تم یہ تو بتاؤ ہو کون اور میاں کیوں آئے ہو؟“

”ہمارا تعلق پولیس سے ہے“ جو اب بتایا گیا ”ہم میاں کیوں آئے ہیں؟ بات دروازہ کھلے پر بتائیں گے۔“

پولیس کا نام سن کر ہم قدرے مطمئن ہو گئے معاملہ ہمارے خدشات سے خاصا مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خوف ناک انداز میں ایک مرتبہ پھر دروازے کو دھڑھڑاتے، میں نے دروازہ کھول دیا۔

میں ثابت قدمی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اسی دوران میں اسی ”معیار“ کی ایک دستک مزید دریا جا چکی تھی۔ میں نے تھکمانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”کون ہے؟“

میں پکار کر رہ گیا تھا!

اس مردود کو تو میں نے بدست خود نکالے گھاٹ اتارا تھا۔ ہالیک کی خوش میں پیش آنے والا وہ خنیم واقعہ میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ میرا حافظہ اس تلخ اور ناقابلِ تلائی نشان پہچاننے والے ایسے کو کسی بھی صورت رخصت کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس سستی آمیز اور ہلاکت خیز مرکز میں اگر میں دارا جیسے معاشرتی ناسور کو جنم کا ایسا دھن بنانے میں کامیاب ہوا تھا تو دوسری جانب میری دو عزیز از بان ساتھی عورتوں نے بھی زندگی کی بازی ہاری تھی اور یہ اب کچھ اسی کہنے دارا کا کیا دھرا تھا۔

سیکنڈ کے چار دس حصے میں وہ المناک مناظر میری غورانی آنکھ میں گھوم گئے۔ ہالیک کے دامن میں گنگوڑی کے علاقے میں واقع سگری مندر کی اجازت ویران عمارت میں دارا اپنے خواروں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔ ہمارے درمیان ایک کھلی جنگ ہوئی تھی جس میں ہر طرح کا ہتھیار استعمال کیا گیا تھا۔ جاگی اور چڑا ہر تیم کی اندوہناک موت کے بعد مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا اور میں نے اپنا فخر دے تک دارا کے سینے میں پیوست کر دیا تھا۔ جب میں نے سچر کھینچا تو دارا کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹا تھا۔ مجھ پر وحشت سوار تھی اور میں دارا کے جسم کو بے درپے اپنے خنجر کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کے سینے میں جا بجا خنجر پیدا ہوئے تھے اور اس کا پیٹ بھی کھل گیا تھا۔ کئے ہوئے پیٹ میں سے آنتوں کا پچھا باہر نکل کر بھول رہا تھا۔ موت دارا سے چند سانوں کے فاصلے پر کھڑی تھی اور وہ عیار شیطان اس موقع پر بھی ایک چال چل گیا تھا۔ وہ زخموں سے چور جاگی کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے دو سو فٹ گہرے چٹائی کھد میں غار تھا۔ اس کی موت یقینی تھی۔ چھلنی سینے اور چاک شکم کے ساتھ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

یہ تمام خیالات بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن سے گزرے اور میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔ میرے سامنے کھڑا وہ بناکار دراز قامت شخص ہرگز ہرگز دارا نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی لمحے میرے پیلو میں کھڑے میرنکس کی وحشت آمیز سرکشی نے میرے خیال پر مہر تقدیق ثبت کر دی ”ابن سائیں“ یہ تو وزیر اکبر سومرو کا سہمان دوست میرنکس کے انکشاف نے مجھے چوکنے پر مجبور کر دیا۔ اکبر

سومرو کا سہمان دوست اور میرا طلب گار وہ شخص انہیں میں کے فرق سے دارا ہی تھا۔ دراز قامت، صحت مند اور مضبوط جسم۔ خال و خط میں دارا سے گہری مشابہت۔ چاق و چوبند اور عقاب نگاہ رکھنے والا۔ اس کی عمر اس وقت لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس نے بیو چنیز پر پولو کی کئی شرت پہن رکھی تھی اور کھڑے ہونے کے انداز سے لڑائی بھڑائی کا مشاق دکھائی دیتا تھا۔

وہ ہوٹل کے کمرے کے دروازے میں اکیلا نہیں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین افراد اور بھی تھے جو سندھ کے روایتی لباس میں تھے۔ وزیرے کے سہمان دوست کے دائیں ہاتھ پر یامین عرف یامی شاہ کھڑا معاندانہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بائی دو افراد میرے لیے بنے تھے جو تھوڑے فاصلے پر پیچھے کھڑے تھے۔ وہ دارا نما آدمی کے ساتھی نظر آتے تھے۔

میرنکس کی سستی خیز سرکشی پر جب میں نے چونک کر اس شخص کو دیکھا تھا تو اس کے لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”دارغ کو زیادہ تھکانے کی ضرورت نہیں۔ میں دارا نہیں ہوں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا ”تم دارا ہو بھی نہیں ہو سکتے“ اس کا مجھے کمال یقین ہے کیونکہ میں نے اس لعین کو اس جگہ پہنچ دیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ بہر حال تمہارا کون ہو؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ جڑوں کی جنبش سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ دارا کے بارے میں میرے اظہار خیال نے اسے سگایا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی تھی کہ وہ دارا کا کوئی بہت ہی قریبی شخص تھا۔ عین ممکن تھا، وہ اس کا جڑواں بھائی ہو۔ دارا سے اس کی عمر قدرے کم تھی۔ اس حساب سے وہ دارا کا چھوٹا بھائی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا ذہن کسی ”بہم شکل“ کی طرف بھی گیا تاہم میں نے اس خیال کو فی الفور اپنے ذہن سے ہٹا دیا تھا۔ ایسے اتفاقات عام طور پر نقش فکروں اور کائناتوں میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔

دروازے میں استادہ قد آور شخص دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھولے بند کرنے لگا۔ اس عمل کے دوران میں اس کے بازوؤں کے بائی پس (بجھلیاں) بے قرار سے ہلنے لگے۔ وہ کسرتی بدن کا مالک تھا کراس میں خلی کی کی نظر آتی تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار

شامل تھی۔

”تم نے دارا کو جہاں پہنچا دیا ہے، میں تمہیں اس سے بھی آگے پیچھے کر آؤں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں چوہدری صاحب کے سامنے پیش کرنا ہے۔ پہلے وہ اپنا حساب بے باقی کر لیں پھر میری باری آئے گی۔“

میں اس کی بات کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ سو ایلےجے میں پوچھا ”تم کس چوہدری کا ذکر کر رہے ہو۔ میرا اس چوہدری سے کیا کھانا چل رہا ہے؟“

”انجان بننے کی کوشش نہ کرو وجہ ان۔“ وہ پیش کے عالم میں بولا ”جب میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر تمہیں زندہ حالت میں چوہدری صاحب کے قدموں میں ڈالوں گا تو تمہاری ساری لالعلی دور ہو جائے گی۔“

میں نے معنوی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟“

”صرف نام ہی نہیں، میں تمہارا پورا شجرہ بھی گنوا سکتا ہوں۔“ وہ زہر خند لیےجے میں بولا ”تم وجدان علی بن عبد علی بن چوہدری حاکم علی ہو۔ رکھان والی میں پیدا ہوئے، سنگاپور میں پروان چڑھے، بنگال اور شاؤلن نیپیل میں مارشل آئرش کی تربیت حاصل کی اور ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں من مانیاں کرتے رہے۔ وہیں تم نے پرنس ڈے نکالے اور خود کو جانے کیا سمجھنے لگے۔“

میں نے مصنوعی حیرت کی اداکاری جاری رکھی اور کہا ”تم تو واقعی میری زندگی سے گہری واقفیت رکھتے ہو مگر ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا، نہ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ تمہیں کیا دشمنی ہے۔ تم میری تلاش میں یہاں کیوں آئے ہو؟“

”میں تمہاری ماں کا یا رہوں۔“ وہ اچانک مغفلت پر اتر آیا ”اور تمہاری اس بہن سے عقد ثالث کرنے آیا ہوں۔“ اپنی بات کے اقسام پر اس نے میری ساتھی ساحل کی جانب اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا، وہ ایسی برافروختہ کرنے والی باتوں سے میرے محل میں نصب لگانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے تاؤ لاکر کسی غلطی کی جانب لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے آگ لگا دینے والے بجلوں کے جواب میں نہایت ہی سادہ سے لہجے میں کہا۔

”اگر یہی تمہارا تعارف ہے تو تم نہایت ہی گھٹیا اور ذلیل شخص ہو۔ تم شکل صورت ہی میں نہیں بلکہ سیاہ کاریوں میں بھی دارا کا پر تو ہو۔“

دارا کے ذکر پر وہ تھملا کر رہ گیا اور دمکی میز پر لیےجے میں بولا ”اب اپنی گندی زبان پر میرے بھائی کا نام نہ اناؤ نہ ٹانگیں جبر کرکھو کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“

اس کا انکشاف میرے اندازے کے عین مطابق تھا۔ دارا کا بھائی ہی تھا۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد میں مزید عجیب ہو گیا اور اس کے ذمہوں پر چاٹ مسالے کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔

”چھوٹے شیطان“ میرے انداز۔۔۔ میں ساوگی اور بے پروائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ”اگر تم مجھے کتوں کے آگے ڈال دو گے تو پھر اپنے چوہدری کو کیا منہ دکھاؤ گے ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ پہلے تمہارا چوہدری مجھ سے کچھ حساب کتاب کرے گا پھر تمہاری باری آئے گی۔“

وہ دانت کچکاچکاتے ہوئے بولا ”بس اسی مجبوری نے میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے ورنہ میں تمہیں دن میں تارے نہ دکھا دیتا تو میرا نام بھی تارا نہیں۔“

”تو تمہارا نام تارا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سخت لہجے میں دریافت کیا ”تم تینوں شرافت سے ہمارے ساتھ وڈیرا سائیں کے بچنے پر چلے ہو یا پہلے تم لوگوں کی کچھ خاطر تواضع کر دی جائے۔“

میں نے طنزیہ انداز میں کہا ”تمہارا بھائی بھی ایسا ہی خواہش دل میں رکھتا تھا مگر وہ ہمیشہ مجھ ہی سے ”خاطر داری“ کروا تا رہا۔ تم ہمیں کسی قسم کی شرافت کے مظاہرے پر مجبور نہ کرو اور خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔“

”میں خاموشی سے اور خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں وجدان۔“ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ”میں کافی دنوں سے عمر کوٹ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ہمارے آدمیوں نے تمہارے پاکستان آنے کے بارے میں ہمیں پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ تم کبھی چوہدری صاحب سے ملے نہیں ہو اس لیے ان کی پہنچ سے آگاہ نہیں ہو۔ جس طرح ہمیں بھائی دارا کے ”حالات“ کا فوراً بتا چل گیا تھا اسی طرح ہم تمہاری نقل و حمل پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے ہمیں یہ بھی معلوم ہے، تمہاری اس ساتھی کا نام دھتو ہے اور اس کا تعلق بدھ مت سے ہے۔“

وہ اپنی دانست میں ان باتوں سے مجھے مرعوب یا متاثر کرنا چاہتا تھا لیکن میں اب وہ پہلے والا بچہ نہیں رہا تھا۔ زمانے کے سرو گردم نے مجھے جیتے جا رہا تھا۔ دارا کی باشر کالی ”تارا“ پہ نگاہ پڑتے ہی اور میر بخش کے اس انکشاف

کے بعد کہ وہ وڈیرا سائیں کا سہمان دوست ہے، میں یہی سمجھا تو کہہ دیا کہ ”میں تارا میر بخش کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں۔“ اس کے دست راست پر یامی شاہ کو ڈھکے دھکے تو تیرا ذہن کسی اور جانب چلا گیا تھا۔ آج دوپہر جب یامی شاہ نے ہماری مٹھ بھیج دی تھی تو ایک موقع پر ماہل نے مجھے میرے اصل نام سے پکار کر کہا تھا۔ ”وجدان! بے جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ خواہ مخواہ کسی پھندے میں نہ پنے کیا ضرورت ہے!“

ازان بعد میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ یامی شاہ وڈیرا اکبر دھوکے بچنے پر آجاتا رہتا ہے اور وہ وڈیرے کے سہمان بات کے مشن سے بھی آگاہ ہے۔ ممکن ہے، یامی شاہ ہی نے آراک میرے بارے میں اطلاع پہنچائی ہو۔ وہ میرے باطن کی طرح ذلیل و رسوا ہو کر اپنی چپ میں موقع بازی سے فرار ہوا تھا۔ اس سے اسی قسم کی حرکت کی ٹہنی کھسکتی تھی۔

یہ تمام خیالات اور امکانی باتیں نہایت ہی سرعت سے بہت ذہن سے گزر رہی تھیں۔ ظاہری طور پر میں تارا کے دھوکے اس سے حریفانہ مکالمہ کر رہا تھا۔

”تم میرے اور میری ساتھی کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو، میں اس کی تصدیق یا تردید نہیں کروں گا تارا۔“ لیکن بدستور اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا ”مجھے تمہارا چوہدری مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ وہ میرے فراق میں غافل رہا ہے۔“

”چوہدری صاحب کا نام ادب سے لو وجدان۔“ تارا نے دھمکی آمیز انداز میں کہا ”یہ تم نے کیا ”تمہارا چوہدری“ قرار دیا ہے۔“ نگاہ رکھی ہے۔ چوہدری نواز علی ہمارے نسب چوہدری صاحب ہیں۔ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی نہایت نہیں کر سکتا۔“

میں نے ترکی بہ ترکی کہا ”وہ میرا نہیں، تمہارا چوہدری بنائے لیے میں اسے ”تمہارا چوہدری“ کہہ رہا ہوں۔ اس نے انسانی کی کون سی بات ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے ”تمہارا“ ”خیر، تارا، چوہدری ملک نواز علی مجھ سے پہچانتا ہے۔“

”وہ تم سے ماضی کا حساب کرنا چاہتے ہیں۔“ تارا نے بہت نرم لہجے میں کہا ”تم نے اور تمہارے باپ نے ان دنوں نقصان پہنچایا ہے۔ کوڑوں روپے مالیت کے سونے بات نہیں بھرتے۔“

میں نے کہا ”میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ اگر تمہارا چوہدری مجھ سے کوئی برانا حساب صاف کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اسی نیت سے پاکستان آیا ہوں۔ چوہدری نواز علی بھی دشمنی کے کھاتے میں میرا بہت اوصار کھائے بیٹھا ہے۔ میں اس کے طلق میں انکی ڈال کر ایک ایک پالی وصول کروں گا۔ میں اپنے والدین کے سپہانہ قتل کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔“ میرا لہجہ جذباتی ہو گیا ”یہ ٹھیک ہے، مجھے اور میرے والدین کو درد کی ٹھوکریں کھلانے والا شخص تمہارا بھائی دارا تھا۔ وہی غلیظ انسان میرے والدین کی موت کا سبب بھی بنا مگر وہ تو دشمنی کی بٹا کا ایک چھوٹا سا مہم تھا۔ ان مہوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ تم بھی تو ایک آدمی سے مرے ہی ہو تارا!“

میں نے گھور کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب تب میں مجھ پر پل پڑے گا۔ خاص طور پر دارا کے ذکر پر اس کے جڑے پہنچ جاتے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تارا! تم جیسے تمام ناپاک مہوں کو حرکت دینے والا شیطان ملک نواز علی ابھی زندہ ہے جس نے میرے ماں باپ کو ان کی زمینوں اور گھر بار سے بے دخل کیا۔ انہیں گاؤں نہیں، شہر نہیں بلکہ اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں ماضی کے کھاتے میں لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا حساب لے کر پاکستان آیا ہوں۔ اور میرا پہلا مارٹن چوہدری ملک نواز علی ہے۔“ میں ایک لمحے کو رکھا مگر یہی سانس لیتے ہوئے کہا ”اچھا، تم سے ملاقات ہو گئی۔ تم چوہدری کے گماشتے ہو، اس کے مکملوں پر چلنے والے ایک حقیر کیڑے ہو۔ اس تک میرا پیغام پہنچاؤ۔ وہ اپنے ارد گرد فولا دی واپس اٹھوالے، محافظوں کے سلسلے دستے تعینات کر دے۔ میں بہت جلد اس کی گردن پر اپنے ناخن تھانے آ رہا ہوں۔“

”بند کر دے یہ بکواس۔“ تارا دباؤ کر بولا۔ اپنی اور اپنے چوہدری کی شان میں کہے ہوئے میرے الفاظ نے اسے جینچنے پر مجبور کر دیا تھا ”اگر اب تم نے اپنی زبان سے ایک بھی بے ہودہ لفظ نکالا تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔“

”میری زبان کو گدی ہی سے پیوست رہے دو اور اپنا راستہ بناؤ۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”ورنہ میں ہونٹ کے عمل کو بلا کر کہے۔“

”ہونٹ کے عمل کو بلاؤ یا مقامی پولیس کو۔“ یامی شاہ نے قطع کامی کرتے ہوئے پہلی مرتبہ لب کشائی کی ”مہم یہاں“ تمہیں لینے آئے ہیں اور لے کر ہی جائیں گے۔ اب نہ تو تیر

منحصر ہے، اپنے قدموں پر چل کر صبح سلامت جانا چاہو یا پھر۔۔۔؟

اس نے دانستہ جملہ ادھر اور اچھوڑ کر تار کی طرف دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ اس نے تار کے خیالات کی درست ترجمانی کی ہے یا نہیں۔

”یابی شاہ!“ میں نے اس کے نحوست مآب سیاہ چہرے پر سلگتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”تمہارے“ پھر“ کے بعد میں جملہ پورا کرتا ہوں۔ یا پھر میری طرح بیاں تڑوا کر دم دیا کر اور پیٹھ دکھا کر موقع سے فرار ہو جاؤ۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرے طنزیہ کلمات کو بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ وہ دوسرے کے وقت اپنے دو ساتھیوں کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ کر جس طرح اپنی کھلی جیب میں فرار ہوا تھا وہ بڑی ہی ایک عظیم مثال تھی۔ تاہم اس وقت تار کی موجودگی میں وہ اپنی ہزیمت کو بھول کر خواہ مخواہ کی اکڑو کھا رہا تھا۔

”وقت وقت کی بات ہوتی ہے وجدان۔“ یابی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا ”دوسرے کو تمہارا پلڑا بھاری تھا اس وقت ہمارا پلڑا بھاری ہے۔“

”یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ اس وقت تمہارا پلڑا بھاری ہے؟“ میں نے تشریح لہجے میں کہا۔

تار نے کہا ”جس پلڑے میں باٹ زیادہ ہوں وہی بھاری ہوتا ہے۔“

”اگر باٹ کھوکھلے ثابت ہو جائیں تو!“ میں نے یابی شاہ کی طرف اشاراتی نظر سے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا ”میں تمہارے اس بات کو تو ٹھوک بجا کر اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔“

میرے اس تبصرے پر یابی شاہ تھلا کر رہ گیا۔ تاہم اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔

تار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”زیادہ تقریریں بھانڈے کا شوق تم بچکے پر جاکر پورا کر لیتا۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ چلو آگے لو۔ باہر وہی گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”وہی گاڑی۔“ کے الفاظ پر زور دیتے ہوئے تار نے میری بحث کی طرف خوں خوار نظر سے دیکھا اور کہا ”تم جیسے نمک حرام کا جو حشر دہرا سائیں کریں گے اسے دیکھ کر لوگوں کے روٹنے کھڑے ہو جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے تھے، ہم نے تمہاری بچکانہ کمائی پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ بے

وقوف انسان! اکبر سوم کو فوراً شک ہو گیا تھا کہ تار سے جا ملے ہو اس لیے تمہیں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

ذریعہ دشمن کا شکار کیا جاسکے۔ ہمیں امید تھی کہ فرصت میں اپنے نئے آقا اور ہمارے دشمن سے مل سکیں۔ ایسا ہی ہوا اور میں تمہاری بے خبری میں تمہارا اتفاق ہوئے عمر کوٹ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تم نے پاؤں والی ریکٹر ٹرالی میں سفر کر کے خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا۔

تمہیں نہیں معلوم کہ تار کی آنکھوں میں کتنے کیرن ہیں۔ میں تمہاری دم پر پاؤں جھاکر یہاں پہنچا ہوں اور ہر نقدیق کے لیے راستے میں مجھے یابی شاہ مل گیا۔ یہ

سائیکس کو وجدان اور اس کی سامی دھوکے کے واسطے بتانے جا رہا تھا۔ میں نے کھلی جیب میں اسے دیکھ کر روک دیا اور جب اس کی بات سنی تو پھر یہاں پہنچنے میں ہم نے لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ عمر کوٹ پہنچ کر ہم میری بحث جتنی خفیہ تقاب کرتے ہوئے اس ہول تک پہنچے ہیں۔

تار کی وضاحت نے میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جواب فراہم کر دیے تھے۔ میری بحث انکشافات پر انگشت بندناں تھا۔ تار خاموش ہوا۔

لڑاں لہجے میں بولا۔

”تار سائیکس! آپ بتا رہے ہو کہ وہی گاڑی باہر آئے گی۔ تار ہی ہے۔ کیا یہ گاڑی ہے؟“

تار نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میری بحث پر اسی گاڑی کا ذکر ہے جس میں تم فرضی جادو کے ساتھ کل رات بچکے پر پہنچے تھے۔ وہی سائیکس! میری گاڑی!“

”اوہ!“ میری بحث نے متاستانہ انداز میں کہا ”سائیکس! اگر آپ اسی گاڑی میں میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے تو پھر کیا اس گاڑی نے کوئی سلیماں ٹوپی پن رکھی تھی۔ راستے بھر اپنے عقب میں دیکھتا آیا ہوں۔ اگر وہ سیاہی گاڑی میرے تعاقب میں ہوتی تو میری نظریں آئے ہوتی۔“

تار نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا ”وہ گاڑی اس نے تمہاری نظریں نہیں آئی کہ اب وہ سیاہ نہیں بلکہ سنہری ہے۔“

گاہ۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ تار اپنے کار ”بب“ وجدان کا بخار اترے گا تو دہرا سائیکس کے خوف سے کھپائیے پھوگے اور یہ وجدان۔“ اس نے جملہ نامعلوم چھوڑ کر مجھے حقارت سے دیکھا اور رخ لہجے میں بولا ”میں ابھی تمہاری نظر کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس کے حصول کی خاطر میں نے بہت پار پیٹے ہیں۔ آج بچکے پر پہنچ کر میں چودری صاحب کو فون کروں گا تو وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھیں گے پھر اکبر سوم کو کے توسط سے ان دونوں کو لاہور کے نواحی گاؤں ”رکھال والی“ پہنچانے کا بندوبست کیا جائے گا اور تم!“

تار نے میری بحث کو نفرت بھری نظر سے دیکھا اور حتی لہجے میں بولا ”تمہیں بچکے کے سامنے گردن تک زمین میں گاڑا جائے گا پھر تمہارے چہرے پر شہد مل کر خطرناک موزی کھلیں گی تم پر چھوڑ دی جائیں گی جو اپنے سببوں سے زیادہ تیز ڈنک دے کر درخت تمہارے چہرے کے گوشت میں اتارنا شروع کر دیں گی۔“

میں نے تار کو منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا ”دھمکی بازی میں تم اپنے بھائی سے کسی بھی طرح کم کہیں نہیں ہو مگر میں نے اس بد ذات کا جتنا برا انجام کیا تھا، تم اس سے بھی زیادہ عبرت ناک اختتام کو پہنچو گے۔ جب بساط بچہ ہی گئی ہے تو دوبارہ مقابلہ ہو گا۔“

”آج پتا چل جائے گا، تم میں کتنا دم ہے!“ تار نے مجھے گہری نظرتے کھورا۔

میں نے پٹائی لہجے میں کہا ”میں بھی یہ دیکھنے کے لیے بے قرار تھا کہ تم میں کتنا ضم ہے۔ آج میں تمہارے کس بل نکال کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔“

اس دھمکی آمیز گفتگو نے سب سے زیادہ ہراساں ساحل کو کیا تھا۔ وہ سرا سید نظر سے بھی مجھے اور بھی آنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں وہ سب کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ عبداللہ نامی شخص نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ عبداللہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ اس نے چھوٹی مگر خاصی دیز موٹو میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کی ناک کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی جھانپیاں رکھی تھیں۔

”تم میرے سبب مل نکالو گے!“ تار اتیر آمیز انداز میں بولا۔

”کیوں۔“ میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا ”کیا اس کام کے لیے تم نے کسی اور کو ٹھیکہ دے رکھا ہے؟“

تار نے اپنے عقب میں کھڑے ہوئے کسی دوسری شخص سے اشارہ کیا اور کہا ”یہ وہی شخص ہے جو بڑی دھمکیاں لگائے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اور وہی شخص نے تمہیں اس گاڑی میں بٹھائے ہوئے تھے۔ یہ وہی شخص ہے اور یہ دوسرا شخص عبداللہ ہے۔ یہ اس گاڑی میں آئے ہیں۔ اس انتخاب کی وجہ یہی ہے کہ اس نے کوئی نامی شخص کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک موٹو شخص نظر آ رہی تھیں۔ یقینی طور پر اس نے نفلی ایک موٹو شخص اتار دی تھیں اور اب اپنے اصلی طے سائیکس کو وجدان اور اس کی سامی دھوکے کے واسطے بتانے جا رہا تھا۔ میں نے کھلی جیب میں اسے دیکھ کر روک دیا اور جب اس کی بات سنی تو پھر یہاں پہنچنے میں ہم نے لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ عمر کوٹ پہنچ کر ہم میری بحث جتنی خفیہ تقاب کرتے ہوئے اس ہول تک پہنچے ہیں۔

تار کی وضاحت نے میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جواب فراہم کر دیے تھے۔ میری بحث انکشافات پر انگشت بندناں تھا۔ تار خاموش ہوا۔



وہ میرے کڑے کیلے جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں وجدان۔ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چل پڑو ورنہ مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

میں نے پیش آمدہ صورت حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا اور کامیابی ہی ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا ”تارا! شرافت اور خاموشی کے تمام امکانات تو معدوم ہو چکے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، ڈنکے کی چوٹ پر ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم وہ دوسرا طریقہ اختیار کر لو۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے ساحل کو کور کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایک مضبوط اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اس موقع پر تارا جیسے کچے پٹے سے کسی بھی گھٹیا حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

تارائے اپنا ایک ایسی حرکت کی جو مستند طور پر گھٹیا تھی۔ تاہم یہ میری توقع سے کہیں زیادہ پیچھے تھی۔ کسی بھی مو‘ خصوصاً شہ زور کو اس قسم کی ملکی حرکت زیب نہیں دیتی۔ تارائے اپنے لباس میں سے اعشاریہ تین آنچہ کیلی برا کا ایک پینل نکال کر کچھ پر تان لیا پھر یامی شاہ اینڈ کمپنی کا اشارہ کرتے ہوئے غصیلے لمبے میں دھاڑا۔

”ان دونوں حرام زادوں کو اتنا مارو کہ یہ زندہ رہیں مگر کیچڑوں سے بھی کتر ہو جائیں۔ ہم انہیں کسپہری کی حالت میں جینگے پر لے کر جائیں گے۔“

”واہ وا۔“ میں نے تالی بجاتے ہوئے تسخرانہ انداز میں کہا ”تم تو ارا سے بھی گئے گزروے ثابت ہو رہے ہو۔ ہم منتوں پر گن تان کر تم خود کو شہ زور ثابت کرنا چاہتے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایک صحت مند زرخے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہو۔“

وہ میرے انگڑا ہجملوں سے جل جھن کر سونٹ ہو گیا اور شدید رد عمل کے طور پر اس نے ساحل کی جانب جست بھری۔

ساحل کو میں نے مکمل اوٹ فراہم کر رکھی تھی۔ لہذا اس تک پہنچنے کے لیے تارا کو میرے پاس سے گزرنا تھا۔ میں پہلے ہی فریٹل ہارس پوزیشن میں اسٹانس بنائے کھڑا تھا۔ میں نے تارا کی جست کے جواب میں ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ لگ اس کے سینے پر رسید کر دی۔ میری لگ میں بے پناہ تھرسٹ تھا۔ تارا ہوا میں بیک ورڈ ایتھلا اور پشت کے بل دروازے سے نکلایا۔ اس نکلنے کے نتیجے میں پستول اس کے ہاتھ سے جھوٹ گیا تھا۔ یامی نے بجلی کی سی سرعت سے

مذکورہ پستول کمرے کے فرش پر سے اٹھالیا۔ تارا اپنے بڑے بھائی دارابی کی طرح تہ آور فر کا تہ چھ فٹ سے اٹھتا ہوا تھا۔ میں چھ فٹ دو انچ اونچ تھا۔ وہ خود پیش میرے برابر ہی تھا تاہم میری عمر پندرہ سالہ تھی۔ اسے تورا کر رہا تھا۔

اس نے سر کو جھٹک کر اپنے حواس بحال کیے۔ جانے والی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ اس دوران میں نے حق چھ گیری ادا کرتے ہوئے پینل واپس تارا کو اور اس کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے تارا کو مخاطب کرتے ہوئے سمجھانے لے میں بھی کہا ”ہماری آپس میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اپنے آدمیوں کو کیوں ہاتھ پاؤں سے مجروح کرنا چاہتے؟“ ”تم میرے بڑے بھائی کے قاتل ہو۔“ وہ غرا کر دشمنی کے کتے ہیں؟“

میں نے کہا ”تمہارا بھائی میرے والدین کا قاتل تھا۔ کی تباہی و بربادی کا ذمے دار تھا۔ اس نے مجھے دو ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے کئی ساتھی اور مکاری اور عیاری کی بجھینت چھ گئے۔ سیکورٹائٹل کا خون اس نے اپنے ہاتھوں پر مل رکھا تھا۔ میں نے شیطان کو جہنم رسید کر کے انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان ہے اور تم۔“

میں نے جملہ اوھو اور چھوڑ کر تارا کی آنکھوں میں اور آتشیں لمبے میں کہا ”اور تم بھی اگر اپنے ذمہ دار سے باز نہ آئے اور میرے کسی ساتھی کا بال بھی ہانکا تو کچھ لینا میں تمہیں بے بساک موت کے حوالے کرنے میں لگے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔“

تارا کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس چلا تو اٹھا۔ اس مرتبہ مجھ پر براہ راست حملہ کرنے کے بجائے نے یامی شاہ اینڈ کمپنی کو تحسانہ لمبے میں کہا۔ ”پانچوں کی طرح کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟“

تمہیں اس کی بکواس سننے کے لیے نہیں بولایا۔ تارا اور اس غیث کو چھٹی کا دو دھ یا دو لا دو۔“ حکم حاکم، مرگ مناجات کے تحت تارا کے ہاتھ ہمارے جانب بڑھے۔ میری اس تیزی سے حرکت صورت حال سے کرنٹ پکڑ چکا تھا۔ وہ مارشل آرٹس میں نہیں تھا تاہم لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھا۔ وہ وقت کسی بھی قسم کے متوقع حملے کے لیے بالکل چال تھا۔ کھڑا تھا۔

میں توقع کر رہا تھا کہ یامی شاہ میری طرف آئے لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کتر رہا تھا۔ میں اس کے احتراز کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ دوسرے کٹر پیلوڈ پپ کے نزدیک عین چلتی ہوئی سڑک پر میں نے اس کی جو گت بنائی تھی، وہ اس کی ”یاد“ کو ابھی تک اپنے بدن سے ”چپکائے“ ہوئے تھا۔

یامی شاہ نے میری بخش کا رخ کیا تو موسیٰ اور عبد اللہ میری جانب بڑھ آئے۔ میں نے ان کے قدموں کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ بھی کسی اسٹانس ہی کے لڑا کا تھے لہذا میں نے مارشل آرٹس کی مزید تکنیک میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ان کا استعمال کیا۔ عبد اللہ دراز قامت اور دلا پتلا تھا۔ وہ ہوا میں مکالماتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے مکے سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے سر کی ٹپک کو استعمال کرتے ہوئے چہرے کو لیفٹ جھک دی، عبد اللہ کا مکا میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر آگے بڑھ گیا تاہم اس عمل کے دوران میں عبد اللہ کا جسم میرے بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے اس کی کمر زبل پنڈ پس آزمایا۔ اس کے قدم آگے گئے اور وہ موسیٰ سے ٹکراتے ہوئے ٹوٹی طرح ٹھوم گیا۔

اسی اثنا میں موسیٰ مجھ پر چل پڑا۔ اس کا تہ زیادہ نہیں تھا تاہم جسمانی اعتبار سے وہ خاصا موٹا تازہ اور صحت مند تھا۔ وہ نہایت ہی غصیلے انداز میں اپنے تباہ توڑ مکوں سے میرے سینے کو نشانہ بنانے لگا۔

میں بیک فٹ پر حرکت کرتے ہوئے اس کے کلوں کو ہلاک کرنے لگا۔ اس کوشش میں ایک دو گھونٹے میرے جسم پر لگے بھی تاہم وہ زیادہ ضرر رساں ثابت نہیں ہوئے۔ میں نے موسیٰ کی ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے ایک چال چلی۔ حملے کے جوش و خروش میں اس نے اپنی گردن جھکا رکھی تھی جیسا کہ عام طور پر باکسر حضرات دفاعی پھیل کے دوران میں گردن جھکا کر چوہ پچھپاتے ہیں تاکہ حریف کے کھونٹوں سے محفوظ رہ سکیں۔

میں بکمال صورت حال قدرے مختلف تھی۔ موسیٰ دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ پھیل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کوئی غلطی سے فائدہ اٹھایا اور ایک ”ہمہ رخ“ میں اس کی کھوپڑی کے وسط میں رسید کر دیا۔

یہ ایک مخصوص قسم کا مکا ہوتا ہے اور بالکل ایک وزنی ہتھوڑے کے اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ ریڈرکس اور ٹاکٹر ٹیکٹکس میں عموماً اس پیچ کی افادیت کو استعمال کیا جاتا

ہے۔ میں نے موسیٰ کی کھوپڑی کو نشانہ بناتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کا ”ٹائل“ چھیننے پائے۔ اس احتیاط کے باوجود بھی وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو کھاتے ہوئے ایک کرب ناک پیچ مار کر زمین بوس ہو گیا۔ شاید میں نے پیچ میں زیادہ توانائی صرف کر دی تھی یا پھر موسیٰ ہی کم ہمت واقع ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑا تحفہ کی شدت سے کرا رہا تھا۔

اس دوران میں میری بخش اور یامی شاہ کے درمیان ایک خوفناک مہرکہ جاری تھا۔ وہ دو بے قابو سانڈوں کے مانند ایک دوسرے کو چپٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنیادی طور پر وہ سندھ کی رواجی کشتی ”ملا کھڑا“ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یامی شاہ، میری بخش پر حاوی آ رہا تھا۔ یامی شاہ ایک سکے بند بدعاش تھا۔ وہ تہ میرے مارشل آرٹس اور جمناسک نے اس کے حواس منتقل کر دیے تھے ورنہ وہ کسی سے کم نہیں تھا۔

میں میری بخش کی مدد کو آگے بڑھا تو عبد اللہ تارا کی طرح میری راہ میں استادہ ہو گیا۔ دلا پتلا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی لمبا نظر آتا تھا۔ اس مرتبہ عبد اللہ نے مجھ پر مکے سے حملہ نہیں کیا بلکہ اپنی ایک ہانگ کو میرے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے میرے نازک اعضا کو نشانہ بنایا تھا لیکن میں چونکہ اس کی طرف سے غافل نہیں تھا اس لیے میں نے بڑی سرعت سے لوڑ بلا ٹنگ کرتے ہوئے ”ٹکراس پنڈ“ پر اس کا وار روکا اور میکا کی انداز میں ایک نئی پی راونڈ ہانگ اس کے چہرے پر جڑ دی۔

عبد اللہ اپنے چہرے کو کھاتے ہوئے پیچھے ہٹا اور ایک سگاری لینے ہوئے چہرے کو دبانے لگا۔ وہ ٹوٹل کر یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میری لگ نے اس کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ نقصان تو پیچ چکا تھا، جب اس نے چہرے سے ہٹائے تو وہاں خون موجود تھا۔ اس کا بالائی ہونٹ پھٹ چکا تھا اور وہاں سے بڑی تیزی سے خون رس رہا تھا۔ میں عبد اللہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر میری بخش کی جانب بڑھ گیا۔

یامی شاہ نے میری بخش کو زمین پر گر لایا تھا اور اسے بری طرح رگید رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر یامی شاہ کے کار میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اسے میری بخش کے اوپر سے چھین لیا۔ جب یامی شاہ نے گردن سیدھی کر کے صورت حال کو جاننے کی کوشش کی تو میں نے ایک فولادی پیچ اس کی ناک پر رسید کر دیا۔

اس کی ناک سے لمبو جاری ہو گیا۔ شاید اس کا بانسا پھر گیا

تھا۔ اس کا چہرہ لولہمان ہو رہا تھا۔ میرے دل میں یای شاہ کے لیے بہت غصہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا اور پسپا کرتے ہوئے دیوار سے لگا دیا۔ دیوار سے پشت نکلتے ہی وہ کٹے ہوئے شیشے کے مانند زمین بوس ہو گیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہو۔

اسی لمحے مجھے ساحل کی چیخ سنائی دی۔ میں نے بجلی کی سی رفتار سے مڑ کر دیکھا۔ تارا ساحل کی پشت پر کھڑا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ساحل کے بالوں کو مضبوطی سے رچ رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں پتلے بونے پستول کی خوفناک ٹال ساحل کی گردن سے پیوست تھی۔ ساحل یقینی طور پر موت کے دہانے پر کھڑی تھی۔ کسی بھی لمحے اعتبار یہ تین آنکھ کی گولی اس کی گردن میں سے گزرتے ہوئے دوسری جانب ایک وسیع شکاف پیدا کر سکتی تھی۔ تارا نے ساحل کو اس طرح رچ رچ رکھا تھا کہ اگر بالفرض محال گولی چلنا بھی پڑ جائے تو وہ کئی طور پر محفوظ رہے۔

حالات اچانک سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔ تارا نے گھبرے لیے میں مجھے وارننگ دی ”وجدان! اگر دھنکی زندگی تمہیں عزیز ہے تو دی کرو، بوسیں کمر رہا ہوں۔ تمہیں ہر صورت میرے ساتھ ڈیرے کے نیچے پر جانا ہوگا۔“

”مجھے اپنی ساری زندگی اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ خود اپنی۔“ میں نے غصے سے بولے انداز میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی ”تم ساحل کو چھوڑ دو“ اس کی گردن سے ہٹل کی ٹال بٹا دو۔ ہم دوستانہ ماحول میں بھی معاملات طے کر سکتے ہیں۔“

”تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو۔“ وہ طنز پر لبے میں بولا ”دھنکو ایک لمحے کے لیے بھی فری نہیں کروں گا اور یہ تم نے دوستانہ ماحول کی کیا بات کی ہے۔ ہم انڈی دشمن ہیں، ہمیشہ دشمن ہی رہیں گے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”تمہاری اور تمہارے چودری ملک فوازش علی کی دشمنی میرے ساتھ ہے۔ تم ساحل کو یوں بیچ میں لا رہے ہو؟“

”یہ ساحل نہیں، دھن ہے۔“ تارا نے ہٹل کی ٹال کا دباؤ ساحل کی گردن پر بڑھاتے ہوئے کہا ”تم کبھی اسے کاٹھم بنالیتے ہو اور ابھی ساحل لیکن یاد رکھو، اس قسم کی چالیں ہم پر سب اثر ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے یہ بدھ مت کی پیرو کار ہے اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اسی لیے تم اس بھل میں دبائے پھرو رہے ہو۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس

نے اضافہ کیا ”یہ تم نے ٹھیک کہا، ہماری اصل دشمنی تم سے ہے مگر اس دشمنی کے راستے میں تمہارا جو بھی سامھی آئے گا، وہ ہماری دشمنی کا نشانہ ضرور بنے گا۔ گیروں کے ساتھ گھنہ پسے کی مثال تو تم نے سن رکھی ہوگی!“

میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح تارا کو باتوں میں لگا کر ساحل کی نجات کا راستہ نکال سکوں۔ وہ میرے مخالف بازی کے چھندے میں پاؤں ڈال چکا تھا۔ میں نے چھندے کو ٹھک کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں، میں اپنے اور تارا کے درمیان فاصلے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی فوری کارروائی کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔

میں نے عام سے انداز میں کہا ”مثالیں تو میں نے بہت سن رکھی ہیں تارا لیکن تمہاری بڑائی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔“

”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ غرایا۔

میں نے کہا ”تم ایک لڑکی کو گھنہ پوائنٹ پر رکھ کر مجھے کمزور بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ کوئی جوان مردی تو نہ ہوئی۔ میں نے تمہاری بہادری کے بہت سے نمائندہ قہے میرے بخش کی زبانی سنے ہیں مگر اب تمہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے وہ قہے کتنا نیاں بھوت کا پلندہ تھیں۔ اگر تم واقعی بامرد ہو تو پھر ساحل کو چھوڑ دو اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی شہ زوری کو آزمائو۔ میں بھی تو دیٹیوں، دارا کا چھوٹا بھائی کس پائے کا فائبر ہے!“

وہ میرے چڑھاوے میں کچھ زیادہ نہ آیا اور زہر لب مسکراتے ہوئے زہریلے لبے میں بولا ”وجدان! میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا مگر یہاں نہیں بلکہ نیچے پر پہنچ کر۔ ابھی میرے پاس کسی قسم کا میدان بنانے کی فرصت نہیں ہے۔“

میں تارا کو مزید باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا کہ میرے بخش نے میری اب تک کی ”محنت“ پر پانی پیہر دیا۔ یای شاہ کی گرفت سے آزاد کرانے کے بعد میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا تھا کیونکہ ساحل کی چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ تارا سے میری مکالمات کے دوران میں میرے بخش سنبھل چکا تھا اور اب حق دوستی نبھاتے ہوئے اس نے ایک ناش ”ٹھکی کر ڈالی تھی۔ وہ جوش جذبات میں آکر تارا پر چلا گیا تھا۔

میرے بخش کی اس اچانک حرکت پر تارا کے ساتھ ساتھ میں بھی ہول بھلا گیا تھا۔ تارا نے فطری رد عمل کے طور پر ساحل

کی گردن سے ہٹل بھا کر میرے بخش پر فائر کر دیا ایک زوردار دھماکا ہوا مگر میرے بخش فضا میں اچھل کر زمین پر گر گئے کے بجائے سیدھا تارا پر آیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میرے بخش کی قسمت اچھی تھی کہ وہ براہ راست گولی کی زد میں نہیں آیا تھا ورنہ اعشاریہ تین آنکھ کی ظالم گولی اس پر ظلم کے ہاڑ توڑ دیتی۔ تاہم وہ بالکل محفوظ جگہ نہیں رہا تھا۔ ہٹل سے نکلنے والی گولی اس کے دائیں بازو کو کندھے کے قریب سے چھو کر گزری تھی اور اسے قابل حلائی نقصان پہنچا گئی تھی۔ میرے بخش اپنا گھاس بازو تھام کر زمین سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اس موقع کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہر شے کو فراموش کرتے ہوئے تارا کو اپنی نگاہ میں رکھا اور اس کی ”خاطر تواضع“ شروع کر دی۔ وہ ساحل کے ساتھ ہی زمین پر گر رہا تھا۔ تاہم ہٹل ابھی تک اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں نے زمین پر گرے ہوئے تارا کے ہٹل بردار ہاتھ پر اپنے پاؤں سے ایک بھروسہ ٹھوکر ماری۔

ہٹل تارا کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے کونے میں چلا گیا۔ یہ ایک طرح سے اور بھی برا ہوا کیونکہ ہٹل جس مقام پر پہنچا تھا وہاں عبداللہ موجود تھا جو اپنے زخمی ہونٹ کو دبا کر خون بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے ہٹل کو اپنے قدموں کے قریب پایا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ ہٹل اٹھا۔ نے کے لیے فوراً زمین کی طرف جھک گیا۔

میں نے عبداللہ کے عرائم کو بھانپتے ہوئے طلق سے ”ٹیل“ کی تیز آواز نکالی اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے اس کی طرف آیا پھر اس سے پہلے کہ وہ زمین سے ہٹل اٹھا کر کوئی ایسی دھکی ”حرکت“ کرنا میری سائینڈ فلائنگ کلب اس کے جڑے پر پڑی۔ یہ عین وہی وقت تھا جب وہ ہٹل اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو رہا تھا۔

عبداللہ ہٹل سمیت ہوا میں اچھلا اور چوٹی کرسی پر جا گرا۔ اس کا بالائی ہونٹ میں پہلے ہی زخمی کر چکا تھا، اب صبرے پاؤں نے جو اس کے جڑے کی مزاح پر سی کی تو وہ دہری کیفیت میں مبتلا ہو کر گر کر اپنے لگا۔ میں نے اس کا پیچا نہ چھوڑا اور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور تارا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اٹھنے سے پہلے ہی کرسی کے عقب سے مجھ پر فائر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے زمین پر بیٹھے ہوئے بڑی سرعت سے بیک سوپ کی۔ میرے پاؤں کی اینڈی عبداللہ کی کنپٹی پر لگی جب کہ گھٹنے کے اندر دوئی حصے نے کرسی کو دوردھکیل دیا۔

کنپٹی پر لگنے والی چوٹ نے عبداللہ کو بے حال کر دیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس کا چہرہ در پے ہو کر یوں کا نشانہ بن رہا تھا۔ اس مرتبہ لگنے والی ٹھوکری بڑی ”ہکارگر“ تھی۔ ہٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار کے پاس جا پہنچا۔ عبداللہ زمین پر پڑا ترپ رہا تھا۔

دوسری جانب تارا اور میرے بخش میں ٹھن گئی تھی۔ میں نے ان کی جانب متوجہ ہونے سے ہٹل پر قبضہ نہ کیا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بہت تیزی سے ابھرا۔ مجھے ہٹل کے بل پر موجودہ صورت حال کو اپنے حق میں کر لینا چاہیے۔ میں نے یہ خیال مکمل ہوتے ہی ذہن کو جھٹک دیا۔

میں اپنے دل میں پختہ عزم کر چکا تھا کہ دشمنوں سے نبو آزما ہوتے وقت میں اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر انکشاف کروں گا اور جہاں یہ صلاحیتیں بالکل ناکامیاب ہو جائیں گی وہاں پھر کسی اور چیز کے بارے میں سوچوں گا۔ کئی اور سارے میں بھی میری روحانی قوتوں کو اولیت حاصل تھی۔ اسلئے وغیرہ کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا تھا۔

موجودہ صورت حال میں یہ ہٹل ہی سب سے زیادہ خطرناک اور مسلک ثابت ہو سکتا تھا جو اب میرے ہاتھ میں تھا۔ جس طرح سانپ کا زہر نکال دیا جائے تو وہ ایک حقیر کچھوے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، بالکل اسی طرح اگر کسی گھنہ میں سے گولیاں نکال لی جائیں تو وہ دھاتی ٹھکڑے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں رہتا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہٹل کا کلپ نکال کر اپنی جیب میں ڈالا اور خالی ہٹل کو ایک طرف پھینک دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو تارا، میرے بخش پر بھاری پڑ رہا تھا۔ میرے بخش کے زخمی بازو سے اب باقاعدہ خون جاری ہو گیا تھا اور کندھے پر سے اس کی قمیص سرخ و لکھائی دے رہی تھی۔ تاہم وہ تارا کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں نے میرے بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”گھبراؤ نہیں دوست! میں تمہاری مدد کو آیا ہوں۔“

وہ زیادہ جوش و خروش سے تارا پر نکلے کرنے لگا مگر میں نے دیکھا کہ میرے بخش کے انیک میں زیادہ دم نہیں تھا۔ اس کے بالکل تارا بڑی بے باکی سے اسے چومیں پہنچا رہا تھا۔ تارا کا ایک زبردست مکا کھا کر میرے بخش ڈگمگایا تو میں نے اسے کندھوں سے تھام کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”تم ساحل کا خیال رکھو میر بخش۔ میں اس سو نما سورا کو دیکھتا ہوں۔“

میں ٹانگیں اسٹائن میں قدم جما کر تارا کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اسی وقت مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ تارا بھی ایک مارشل آرٹسٹ تھا۔ میرے اسٹائن کے جواب میں اس نے فرسٹ ایڈی اسٹائن بنایا اور غراہٹ آمیز جیسے میں بولا۔

”وجدان! میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان یہاں ایک تکنیکی جنگ چھڑ جائے مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔“

”مجبور تو تم اس وقت ہو گے تارا جب اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔“ میں نے اس کے چہرے اور کمر کو بیک وقت نظر میں رکھتے ہوئے کہا ”تج میں تمہیں ”مجبور“ کا مفہوم بڑی وضاحت سے سمجھا دوں گا۔ بہر حال، مجھے تمہاری ایک ادا نے خوش کر دیا ہے۔“

”کون سی ادا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

میری نظر اس کی کمر کی ذرا سی جنبش کو بھی نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ فائٹ کے دوران میں کمر کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کا ہڈی مقابل اپنے ہاتھ یا پاؤں کو جو بھی حرکت دیتا ہے اس کا براہ راست تعلق اس کی کمزری ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کمر کی جنبشوں کو سمجھنا آتا ہو تو پھر آپ فوراً ہی جان سکتے ہیں کہ ہڈی مقابل آپ پر کس طور حملہ کرنے والا ہے۔ اس طرح آپ کو اپنے حریف پر قابو پانے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

میں نے تارا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مارشل آرٹس جانتے ہو۔ اب تم سے دو دو ہاتھ کرنے میں مزہ آئے گا۔“

”بھی فرصت ملی تو میں تمہیں یہ ”مزمہ چیکنے“ کا پورا موقع فراہم کروں گا۔“ وہ تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا ”ابھی کیا تم بٹیر لڑا رہے ہو جو تمہیں فرصت نہیں؟“

اس نے خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھا اور زبان سے کچھ بولنے کے بجائے اپنی بائیں ٹانگ کو حرکت دی۔ وہ لینٹ راؤنڈ ہاؤس میرے کندھے پر آزمائے کے موڈ میں تھا مگر میں اس کے گھٹنے کی جنبش کو ٹاڈ چاڑھا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے رائٹ کریڈنٹ کک اس کے چہرے پر جمادی۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے رائٹ ہینڈ سے اس کی راؤنڈ ہاؤس کک بلاک بھی کر دی۔ بلا کنگ اور کاؤنٹر ایک میں ایک روہم کا خیال رکھا گیا تھا چنانچہ میں نے صرف تارا کی کک سے بچ گیا

بلکہ اس کے چہرے پر چوٹ لگانے میں بھی کامیاب رہا۔ تارا ڈنگنگ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر تیار ہو کر ملے کرتے لگا۔ وہ ایک گرم مزاج شخص تھا۔ اس میں محلی خاصی کی پائی جاتی تھی۔ میں نے تارا کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے غصہ دلانے والی حرکات اپنانا اس کے فنی اور طاقت کا جلوس نکال دیا۔

تارا کسی زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ وہ اس کا حق بھی رکھتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک درندے کی صفات رکھتا تھا اور تھوڑی دیر پہلے میری کریڈنٹ کک نے اسے زخمی بھی کر دیا تھا۔

تارا نے میرے چہرے پر کبک بچ آزمائے کی کوشش کی۔ وہ واضح طور پر میری تھوڑی کوشش کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے فضا میں اچھل کر اس کے بچ کو اپنے ہاتھوں کی ”ایگل گرپ“ میں لیا اور دایاں گھٹنا اس کی تھوڑی پر رسید کر دیا۔

یہ ایک ”جواب آل غزل“ تھا۔ تارا نے میری تھوڑی کو مجروح کرنا چاہا تھا۔ میں نے جواباً اس کی تھوڑی کو ”مبارک باد“ پیش کر دی تھی۔ تارا کی زبان دانتوں سے لب کرکٹ گئی اور خون نے اس کے دہانے کو سرخ کر دیا۔ اس وقت وہ ایک مردار خود گدھ دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے اپنے دانتوں اور زبان کو بچنے والے نقصان کا احساس نہ ہو۔ اس نے حلق سے غراہٹیں خارج کرتے ہوئے مجھے فرٹ کک ماری۔ اس کے جوتے کا ٹکڑا میرے کندھے پر لگا۔ کک میں زیادہ جان نہیں تھی۔ میں نے آسانی سے سما اور اندر آتے ہوئے ایک فولادی چٹا اس کے سینے پر رسید کیا۔

تارا نے سنا کھاتے ہی میری کٹائی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر ایک مروڑا دیا اور میرے چہرے کو کسی حد تک زمین کی جانب جھکانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا اگلا ارادہ میں فوراً بھانپ گیا۔ وہ میرے چہرے پر ایک بھرپور ٹھوکرا اپنے پاؤں سے لگانا چاہتا تھا۔

میں نے اچانک جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے خود کو کسی بے جان شے کے مانند زمین پر گر دیا۔ رد عمل کے طور پر تارا اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اگر اس موقع پر وہ میرا ہاتھ چھوڑ دیتا تو اپنا توازن برقرار رکھ سکتا تھا لیکن اس نے تو میری کٹائی کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں دبوچ رکھا تھا جیسے کوئی بھوکا کتا ہڈی کو اپنے جڑے میں دبا رہا ہے۔

تارا اتر کر مجھ پر آیا مگر میں اسی لمحے رول کر کے تین فٹ آگے نکل گیا۔ میری گراؤنڈ روٹنگ سے تارا کے ہاتھوں کو

بک شدہ جھکا لگا۔ وہ اس وقت انتہائی غیر متوازن تھا چنانچہ بک شدہ کٹائی سے اس کی گرفت ختم ہو گئی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو تارا بھی پیش اپ لگا کر اپنے ذہن پر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دائیں پاؤں کو اس طرح حرکت دی جیسے میں اس کے قدموں یا پچھلی کو ٹھوکرا مارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ ایک طرح کی ہلف کک تھی۔ میں نے تارا کو ایک خوب صورت جھانسا دیا تھا۔ میرا پاؤں اپنے جسم کے انتہائی زیریں حصے کی جانب جاتے دیکھ کر وہ اپنے چہرے اور جسم کے بالائی حصے کے دفاع کی طرف سے ہاتھ بٹھکا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار پہلوؤں میں گر گئے تھے۔

اسی لمحے میری رائٹ فرنٹ ٹو سائڈ کک نے اس کے چہرے پر ایک طرفانی ضرب لگائی۔ اس کے قدموں کی جانب بڑھا ہوا میرا دایاں پاؤں ایک جرک کے ساتھ اوپر اٹھا تھا اور پاؤں کا بلڈ سیدھا تارا کی ناک پر جا لگا تھا۔

تارا کے دانتوں اور زبان سے تو پہلے ہی خون جاری تھا۔ اس نئی افتاد نے اس کی ناک سے خون کا فوارہ جاری کر دیا۔ اب وہ اپنے ناک منہ کا نہیں رہا تھا۔ وہ ڈنگ گاتے قدموں سے پیچھے ہٹا تو میں نے ایک طویل اسٹیپ لے کر رائٹ سائڈ کک اس کی کمر پر رسید کر دی۔

تارا قوت سے اٹھ بولے گولے کے مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے چوٹی میرے جاگرا۔ مذکورہ میزاس کے وزنی جتنے کی آمد اور کلراؤ کو برداشت نہ کر سکی اور ایک احتجاج آمیز آواز پیدا کر کے چاروں پاؤں سے زمین بوس ہو گئی۔ اب وہ میرا ایک تختے کی صورت اختیار کر چکی تھی جس کے ”مجدوح پاؤں“ اس کے ارد گرد پڑے ہوئے تھے۔ میرے چوٹی تختے پر مارا بے حس و حرکت پڑا نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کوئی شدید چوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر اسے ”اصل“ کر دیا تھا۔

میں نے طائرانہ نگاہ سے کمرے کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ وہاں خاصی اچھا بچا ہوا ہو چکی تھی۔ ایک گھٹلی بھی فائر کی گئی تھی مگر مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک بول کے مٹلے ٹپے کسی نہ مذہل نہیں کی تھی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ نوٹ والوں کو اس کمرے میں ہونے والی کارروائی کی کوئی خبر نہ ہو۔ ہاں، یہ عین ممکن تھا کہ وہ دانستہ چشم پوشی سے کام لے رہے ہوں اور کسی مصلحت کے تحت خاموش ہو گئے ہوں۔

میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ یامی شاہ وہاں کا معروف غذا

تھا اور ڈیرا اکبر سومو سے بھی اس کے گھرے روا ہوا تھے۔ تارا چونکہ ڈیرے کا مہمان تھا اس لیے اس کی اہمیت یامی شاہ سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ تارا اینڈ کمپنی کے معاملے میں ہوش والوں نے مکمل چپ سادھ لی تھی۔

تارا کے ساتھ آنے والے تینوں ڈشکروں کو میں نے کالنگ سودا سے دھو کر کمرے کے فرش پر ڈال دیا تھا اور وہ آڑھے ترچھے، اونڈھے سیدھے بڑے اپنے زخموں کی ”سنگائی“ کر رہے تھے۔ یامی شاہ پہلے بھی میرے ہاتھوں اپنی بے عزتی کو اچھا تھا اور اب ایک دیوار کے ساتھ بے ہوش پڑا تھا۔ باریک موچکوں والے مونے تازے موٹی کو میرے ایک ہی ”بھرخ“ نے لہا لٹا دیا تھا البتہ عبداللہ زخمی حالت میں ایک طرف پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ اس ٹیم کا سرغنہ یعنی تارا چاروں خانے چت پڑا تھا۔

میر بخش نے نجف آواز میں مجھ سے کہا ”وجدان سائیں! یہ اچھا موقع ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

اس نے ایک ہاتھ سے اپنے زخمی کندھے کو تھام رکھا تھا۔ تارا نے تھوڑی دیر پہلے اسے اچھی خاصی کٹ چڑھائی تھی۔ اگر اس کا بازو زخمی نہ ہوتا تو ممکن تھا وہ بھی تارا کو دو چار کر دے ہاتھ جڑ دیتا۔ میں نے اس کی حالت کے پیش نظر کہا۔

”پہلے میں تمہارے بازو کو دیکھ لوں۔“

”میرے بازو کو کچھ نہیں ہوا۔“ میر بخش دانتوں پر دانت جھامتے ہوئے بولا ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں ورنہ یہ شیطان ہمیں جانے نہیں دیں گے اگر یہ ہوش و حواس میں آگئے تو ہمارے فرار کی ہر راہ مسدود کر دی جائے گی۔“

اس کی آواز میں قناعت اور درد کی آمیزش تھی۔ ساحل نے ہمدردانہ لمحے میں کہا ”میر بخش! یہاں سے بہت جلد روانہ ہو جائیں گے مگر پہلے تمہارے بازو کا کچھ بندوبست کر لیں۔ اگر زیادہ خون بہہ گیا تو تمہارے اور ہمارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“

میں نے آگے بڑھ کر اس کے زخمی بازو کو قیص میں سے باہر نکل لیا۔ قیص کی آستین میر بخش کے کاموں تیز تر ہو چکی تھی۔ میں نے بغور کندھے کے زخمی حصے کا معائنہ کیا اور ایک اطمینان بھری سانس میرے سینے سے خارج ہو گئی۔ اعشاریہ تین آنٹھ کی گولی بازو کی جلد کو چھیتی ہوئی نکل گئی تھی۔ تاہم

تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر اس کے بازو پر کوئی پٹی وغیرہ باندھ دی جاتی تو خون کا رساؤ رک سکتا تھا۔

ساحل نے مکا کی انداز میں حرکت کی اور اپنا اسکارف سفری بیگ میں سے نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ اس نے شاید میرے ذہن کو بڑھایا تھا یہ اس صورت حال کا نتیجہ تھا جس سے ہم اس وقت دو چار تھے۔ کہتے ہیں، مصیبت کے دوران میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں بلکہ جسمانی طور پر تو وہ ناقابل یقین کارنامے بھی انجام دے لیتا ہے لیکن یہ سب کچھ اسی طور ممکن ہے جب انسان ان مشکل لمحات میں اپنے حواس کو قابو میں رکھے ورنہ عام طور پر دیکھتے میں یہی آتا ہے کہ کوئی افتادہ پڑتے ہی انسان سب سے پہلے اپنے ہوش و حواس کھوٹا ہے اور وہ اپنی عام صلاحیتوں کو بھی بروئے کار نہیں لاسکتا۔

میں نے ساحل کے ہاتھ سے اسکارف لے کر میری پٹی کے بازو پر ایک پٹی کی صورت باندھ دیا۔ اس عمل سے پہلے میں نے اس کا بازو آستین کے اندر سے گزار دیا تھا۔ میں نے اسکارف لپیٹتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ خون آلود آستین اچھی طرح چھپ جائے۔

اس دوران میں میری پٹی بلی کر اہوں کے ذریعے اپنی تکلیف کا اظہار کرتا رہا۔ میں نے اس کی ”مرہم پٹی“ کے بعد ساحل سے کہا ”تم فوراً وہ بیگ اٹھا کر میری پٹی کے ساتھ باہر نکلو۔ میں بھی آتا ہوں۔“

”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ وہ متوحش لہجے میں بولی۔

”میرے ارادے نیک ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں بے ہوش موسیٰ کی جانب بڑھ گیا۔

میربش نے کہا ”وہ ان سائیں! آپ کو جو کرتا ہے“ جلدی جلدی کر لیں۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ یہاں سے ہم تینوں ایک ساتھ ہی نکلیں گے۔“

میں کسی جرح بحث میں پڑنے کے بجائے بے ہوش موسیٰ کے پاس آ گیا۔ میں جانتا تھا ساحل اور میربش میرے بغیر وہاں سے نہیں گئے بھی نہیں پھر کسی قسم کی حکمرانی وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

باریک مچھوں اور میانے قد کا مالک موٹا تازہ موسیٰ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے ہنسنے نے شاید اس کے دماغ کے کچھ نشے گھل کر دیے تھے۔ میں بڑی سرعت سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ تارے کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ ایسبولینس نما گاڑی کو موسیٰ ہی چلا کر وہاں لایا تھا۔

تاہم اس دوران میں اس نے کنگ ساؤز نقلی موٹھی لگا کر تھیں۔ مجھے خائفانہ فصد امید تھی کہ گاڑی کی چابی اس کی کسی جیب میں ہوگی۔ ہمیں وہاں سے فرار ہونے کے لیے اس کی سواری کی ضرورت تھی، ایسبولینس نما گاڑی ہمارے لیے بہترین ثابت ہو سکتی تھی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد موسیٰ کی ایک اندرونی جیب سے چابیوں کا کچھال نکلا۔ رنگ میں موجود چابیوں کو دیکھ کر واضح ہو جاتا تھا کہ یہ اسی گاڑی کی چابیاں تھیں کیونکہ میں ان چابیوں کو پہلے بھی گزشتہ روز اپنے تجربے میں لا چکا تھا۔ میں چابیوں کا کچھال سمیٹ کر سیدھا کھڑا ہوا تو میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ میں نے سوچا، ہمیں اپنے تعلق کی راہ مسدود کرنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ۔

ایسا سوچتے ہی میں دیوار کے قریب ڈھیر یا شاہ کے پاس چلا گیا اور اس کی جیب ٹٹول کر جیب کی چابی نکال لی۔ یا شاہ اور موسیٰ اگرچہ زندہ تھے۔ تاہم اس وقت وہ کئی بے ہوشی میں تھے۔ انہیں ہوش میں آنے میں کم از کم دو گنٹے لگ سکتے تھے۔

کمرے سے رخصت ہونے سے قبل میں نے وڈیرا اکبر سومو کے دوست مسمان اور ابن شیطان تارا کی ”غیبت“ جاننا ضروری سمجھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ہنسنے پر چٹختے پر چاروں خانے چپ پڑا تھا۔ اس کے وجود میں کمی کی حرکت نہیں پائی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے سینے پر کان لگا کر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس کا دل بڑی معدوم اور دھیمی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ وہ بے حس و حرکت کیوں ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سر کے آس پاس کا جائزہ لیا تو یہی حیرت دور ہونے کا سامان نظر آ گیا۔

تارا میز کی چوٹی ”ہاپ“ پر چپ پڑا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے کے نزدیک ہی تازہ تازہ خون کا ایک چھوٹا سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تختے کا کوئی کوٹا یا پائے کوئی سرا اس کے سر کے عقبی حصے سے ٹکرا گیا تھا۔ اس چوٹ کے باعث تارا واقعی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہمارے فرار کے لیے حالات سازگار تھے۔

میں پیسے ہی تارے کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہوا، میربش نے اضطرابی لہجے میں کہا ”سائیں! آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی طاقت سے واقف نہیں۔ اگر ہم دیر کر دیں تو ہمارے لیے بے شمار مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“

”ہاں وہ ان۔“ ساحل نے تھدلی لہجے میں کہا ”میربش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے۔“

”اچھا بھئی، چلو۔“ میں نے ان دونوں کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

ساحل کے نزدیک پہنچ کر میں نے سفری بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسی وقت میربش تیزی سے چلتے ہوئے دیوار کے نزدیک گیا اور خالی پٹل اٹھا کر اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

”اس کا کیا کرے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بہت کام کی شے ہے سائیں۔“ وہ میرے نزدیک آتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ”خالی گن کس کام کی؟“

”یہ ابھی خالی ہے، بعد میں اسے بھر کر کام میں لایا جاسکتا ہے۔“ میربش نے کہا۔

وہ پٹل کو خالی کرتے ہوئے مجھے دیکھ چکا تھا ورنہ وہ مجھ سے یہ سوال ضرور کرنا کہ میں نے یہ کیوں کیا کہ گن خالی ہے!

میں اس خالی پٹل کو ساتھ لے کر جانے کے حق میں نہیں تھا مگر اس وقت میربش کی خواہش کو دیکھتے ہوئے میں خاموش رہا اور ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہم نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلیں گے اور کسی سے اچھے بغیر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔“

میربش نے کہا ”سائیں! میں تو ذرا یونگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ پھر اس نے دائیں بازو کو کندھے کے قریب سے چھوا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ”یہ ڈیوٹی میں سنبھال لوں گا۔ تم دونوں گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھو گے۔“

”ہم کس گاڑی میں جائیں گے وہ ان؟“ ساحل نے انتشار کیا ”چابیاں تو تم نے دونوں گاڑیوں کی حاصل کر لی ہیں۔“

میں نے کہا ”ہمارے لیے ایسبولینس نما گاڑی زیادہ محفوظ رہے گی۔ وہ ایک بند گاڑی ہے۔“

”اوہ، پھر یہی منوس سیاہ گاڑی!“ ساحل نے برا سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”اب وہ سیاہ کہاں رہی ہے ساحل!“

”اسے“ عارضی طور پر سرخ کانٹہ چپاں کر کے سرخ بنا دیا۔

دیا گیا ہے۔“ میربش نے کہا ”مگر ہمیں گاڑی کے رنگ اور ایک کے پتھر اور بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ ان سائیں کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ کبھی جیب کی یہ نسبت وہ بند گاڑی ہمارے لیے زیادہ مفید اور محفوظ ثابت ہوگی۔“

ہم ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے احتیاطاً کمرے کو لاک کر دیا۔ مجھے معلوم تھا، ہوٹل کا عملہ اس لاک دروازے کو بے آسانی کھول سکتا تھا مگر مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ ہمارے جانے کے بعد وہاں کیا ہوگا، یہ سوچنا قبل از وقت تھا۔

میں اگر چاہتا تو بے ہوش موسیٰ اور تارا کو زندگی کی قید سے رہائی دلا سکتا تھا اور نیم بے ہوش عبدالہ کو بھی مزید ضرر پہنچا سکتا تھا مگر مجھے ان کی جان لینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں وڈیرا اکبر سومو کے مسمان دوست یعنی تارا سے ملاقات کا صرف اس لیے مشتاق تھا کہ اس کے بارے میں میربش کی زبانی بہت کچھ سن لیا تھا۔ میں جانا چاہتا تھا کہ وہ شخص کس مقصد کی خاطر لاہور کے ایک نوابی گاؤں سے میری تلاش میں سندھ کے ریگستان کی ریگ جہان رہا تھا۔ لاہور کے کسی نوابی گاؤں کے ذکر پر میرا ذہن فوراً رکھان والی اور چودری ملک نواز علی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس سے میرے تصور میں کچھ خاکہ سا تو بن گیا تھا لیکن صورت حال کی وضاحت نہیں ہوتی تھی مگر تارا سے ”بگانی ملاقات“ کے دوران میں سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ چودری نواز علی مجھے کیوں اپنے پاس دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کروڑوں کی مالیت کے سونے کو بھول نہیں سکتا تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کے گھر سے روابط تھے اور وہ پاکستان میں میری آمد سے سگاہ ہو گیا تھا۔ اس نے تارا کو میرے ”استقبال“ کے لیے عمر کوٹ بھیج دیا تھا۔ مجھے ٹرپ کرنے میں تارا کا ذاتی مفاد بھی پوشیدہ تھا۔ وہ مجھ سے اپنے بڑے بھائی کے قتل کا ہسیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔

تارا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وڈیرا اکبر سومو اور چودری ملک نواز علی کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ انہیں ”فیملی ٹرم“ کے کھاتے میں فٹ کیا جاسکتا تھا۔ یہ دونوں اشخاص فیوڈلز تھے۔ دونوں کا مزاج اور زندگی گزارنے کے طور طریقے یکساں تھے اس لیے بھی وہ خاندانی طور پر ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ گئے تھے۔ انہیں ایک ہی خیل کے چنے بٹے بھی کہا جاسکتا تھا۔

یہ سارے حالات جاننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وڈیرا اکبر سومو کے بٹلے یا جاگیر پر جانے کی ضرورت

نہیں تھی۔ مجھے تو چوہدری نواز ش سے ایک دیرینہ حساب ہے باق کرنا تھا اور سونے کا شفا بھی نہ ملتا تھا۔ اس مقصد کی خاطر ہمیں فی الفور لاہور کی طرف روانہ ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پاکستان میں داخل ہوتے وقت یہی سوچا تھا کہ کچھ عرصہ کراچی میں گزاروں گا پھر لاہور کا رخ کروں گا مگر اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ وطن عزیز کی سرحد پار کرتے ہی ہم پر بے در پے افتادیں ٹوٹتی رہیں۔ پہلے ہم ”بجنورو“ کے ہتھے چڑھ گئے پھر نقلی پولیس کا ڈرا چلتا ہوا۔ اس کے بعد چوہدری کا کھیل شروع ہو گیا اور اب۔ اب ایک مرتبہ پھر نہیں فرار ہونے کا نادر موقع میسر آیا تھا۔ میں اس شہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ہم بجنورو غایت ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ وہاں ہوٹل کے سامنے وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ سرخ سرہوب والی سیاہ گاڑی آگے تھی، جبکہ یادی شاہ کی کھلی جب اس کے پیچھے کھڑی کی گئی تھی۔ ہمیں کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ہوٹل کے سامنے دو جن بھر افراد جمع ہو چکے تھے۔ تاہم ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی، وہ یہ کہ جب ہم ”بجنور“ سے نکلنا گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو ہوٹل کے عملے کے کچھ افراد ہمارے کمرے کی جانب دوڑے تھے۔

میں نے تو یہی طے کیا تھا کہ میر بخش اور ساحل کو گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھاؤں گا مگر عین وقت پر میر بخش نے ایک مفید بات میرے ذہن تک پہنچائی۔  
”وجدان سائیں! آپ مجھے بھی ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھنے دیں۔“  
”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا ”آپ اس علاقے میں پہلی مرتبہ آئے ہیں اس لیے یہاں کے راستوں اور مقامات کے بارے میں آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ آپ کی رہنمائی کے لیے ڈرائیونگ کیبن میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔“

اس نے پتے کی بات کہی تھی۔ میں نے قائل ہو کر اسے پنجنر سیٹ پر سوار کیا اور خود دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ساحل کو میں پہلے ہی گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھا چکا تھا۔ میں نے گاڑی کے انکشن میں چابی کھائی اور ایک لمبے کی تاخیر کے بعد گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

یہ وہی بند گاڑی تھی جس میں ہم گمراہ کر کے عمر کوٹ تک پہنچے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر گاڑی کا ٹائرم پھٹ گیا

تھا۔ وہاں میرے اور میر بخش کے درمیان زبردست مزاح ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں میر بخش کا ایک ساتھی نواز علی ہم بخش کی فائرنگ سے ہلاک ہو گیا تھا۔ میری جوان مری اور راہ راست کی مسافرت نے میر بخش کو اس قدر متاثر کیا کہ میرا بے دام کا غلام بننے پر تیار ہو گیا۔ تاہم میں نے اسے ایک آزمائش میں ڈال کر اپنا دوست بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میر بخش اس آزمائش میں پورا اترتا تھا۔

گاڑی بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ اس وقت سپر ڈھل چکی تھی اور شام کی آمد آگے گئی۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

”اس وقت ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“

وہ بولا ”وجدان سائیں! اس وقت ہم عمر کوٹ شہرے باہر نکلنے والے ہیں اور اتفاق سے گاڑی مین روڈ پر جا رہی ہے۔ یہ روڈ عمر کوٹ سے سیدھی میرپور خاص تک جاتی ہے۔“

پھر اس نے وضاحت کی کہ عمر کوٹ کی طرح میرپور خاص بھی سندھ کا ایک ضلع ہے، بلکہ میرپور خاص ڈویژن ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے پوچھا ”اس سڑک کے علاوہ عمر کوٹ سے کتنی سڑکیں نکلتی ہیں اور وہ کون کون سی سمت کو جاتی ہیں؟“

میں اپنی معلومات بڑھانے کی غرض سے سوال کر رہا تھا۔ میر بخش نے جواب دیا ”عمر کوٹ شہر سے چھ سات سڑکیں نکلتی ہیں جن میں سے اکثر پختہ اور ایک دو نیم پختہ ہیں۔ ایک نیم پختہ سڑک تو وہی ہے جس پر سفر کرتے ہوئے ہم دھرمسال سے یہاں پہنچے تھے۔ ایک سڑک سیدھی کھوکھراہ بارڈر تک جاتی ہے۔ ایک ”ڈیھو روٹا رو“ سے ہوتے ہوئے ضلع ساگھر میں داخل ہوتی ہے۔ ایک عمر کوٹ سے سیدھی مغرب میں ”سامارو“ سے گزر کر میرپور خاص چلی جاتی ہے اور ایک سڑک جنوبی سمت میں ”جی سر“ اور ”میتڈ“ وغیرہ سے گزرتے ہوئے میرپور خاص کے انتہائی جنوب میں قحط جاتی ہے۔“

میر بخش کی فراہم کردہ معلومات نے گرد و پیش کا مکمل نقشہ میرے ذہن میں ابھار دیا۔ میں نے اس سے پوچھا ”جس سڑک پر ہم جو سفر ہیں اس پر میرپور خاص سے پہلے کون کون سے مقامات آئیں گے؟“

”ابھی چند منٹ میں ہم ”صوفی فقیر“ نامی ایک مقام سے گزرنے والے ہیں۔“ اس نے بتایا ”اس کے بعد ”اکڑی“

”جے گھر“ شادی پٹی“ اور اس کے بعد ہم ضلع میرپور خاص میں داخل ہو جائیں گے۔ شادی پٹی نامی قصبہ عمر کوٹ اور میرپور خاص کی ملحقہ سرحد کے بہت قریب ہے۔ اگر ہم اسی طوائف بازار سے ڈرائیونگ کرتے رہے تو مغرب کے بعد شادی پٹی میں ہوں گے۔“

میں نے محسوس کیا کہ بات کرتے ہوئے میر بخش دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے بازو میں تکلیف بڑھ رہی ہے۔ میں نے پوچھا ”کیا بات ہے میر بخش؟“

”کچھ نہیں سائیں۔“ وہ پٹی والا بازو دباتے ہوئے بولا۔ میں نے کہا ”تم نہ بھی بتاؤ تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ تمہارے زخمی بازو میں تکلیف ہے۔“

وہ کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے وینڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔

میں نے ڈرائیونگ پر نگاہ مرکوز رکھتے ہوئے اس کا دھیان بنانے کی خاطر پوچھا ”میرپور خاص سے کراچی جانے کے لیے ہمیں کون سا روٹ اختیار کرنا ہوگا؟“

وہ بولا ”اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم میرپور خاص شہر میں پہنچیں گے جو کہ ضلع کا شمالی حصہ ہے۔ وہاں سے حیدرآباد اور پھر کراچی لیکن۔“

اس نے اسپید و میٹر کی جانب دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا ”لیکن کیا میر بخش؟“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری گاڑی میں پیٹرول بہت کم رہ گیا ہے۔“ وہ فیول بتانے والے ڈائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”میرپور خاص میں ہمیں ٹنکی مل کرانا ہوگی۔“

”کوئی ایس گے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”تمہارے پاس کچھ رقم تو ہوگی؟“

اس نے بتایا ”ہاں سائیں! میں آپ کی طرف آتے ہوئے اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ کم از کم دس ہزار روپے تو ہوں گے اس وقت میرے پاس۔“

”تم نے کل شام مجھے جو دو ہزار روپے دیے تھے ان میں سے کچھ رقم میرے پاس بھی بچی ہوئی ہے۔“ میں نے بتایا ”مگر خیال ہے؟“

”ابھی اتنا کہہ رہا تھا کہ میرپور خاص میں سڑک کھوکھراہ ہے۔“ پھر اس نے پوچھا ”آپ کا آگے کیا پروگرام ہے سائیں؟“

میں نے کہا ”فی الحال تو ہم کراچی جائیں گے۔ وہاں کچھ امر قیام کرنے کے بعد پھر لاہور جانا ہے۔“

”یعنی اب آپ ڈیرا اکبر سومو کی طرف نہیں جائیں گے؟“

”نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا ”میں جس مقصد کی خاطر ڈیرے کے چنگل پر جانا چاہتا تھا وہ مقصد تو پورا ہو گیا۔ اکبر سومو سے نہ تو میری کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی دوستی۔ میں تو وہاں اس لیے جا رہا تھا کہ اس کے مہمان دوست کا ”دیدار“ کر سکوں۔ وہ بے چارہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں سے، مجھ سے ملنے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ تارا نے ہوٹل تک پہنچ کر میرا کام آسان کر دیا۔ میں تارا اور اس کے مہمن سے بخوبی آگاہ ہو گیا ہوں اس لیے واپس جانے کی ضرورت نہیں۔“

اس کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ وہ بولا ”وجدان سائیں! آپ نے تو تارا کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی ہے۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوگا۔“

”وہ نکل کھڑا ہو یا نکل بیٹھ جائے یا پھر نکل لیت جائے“ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ”میں نے گاڑی کی اسپید کو کچھ اور بڑھاتے ہوئے کہا ”جب تک وہ ہمارے تعاقب کے قابل ہوگا، ہم اس کی پیچھے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔“ میر بخش نے کہا ”سائیں! ہمیں ہر صورت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یا می شاہ اور تارا جیسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔“

”ان کی ساری خطرناکی تو میں نے ہوٹل کے کمرے میں ناک کے راستے نکال دی ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”اگر آئندہ انہوں نے میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو یہی سہی سرکشی پوری کر دوں گا۔“

میر بخش نے اپنی دانست میں ایک اہم پہلو کی جانب میری توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ ”وجدان سائیں! جب ہم ہوٹل کے کمرے سے نکلے تھے تو تارا کا ایک ساتھی نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد دوسروں کو بھی ہوش میں لانے کی ترکیبیں آزمائے گا اور پھر ہوٹل کے باہر جو لوگ جمع تھے وہ۔“

”وہ ہمارے وہاں سے نکلے ہی کرے کی جانب بڑھ گئے جن میں ہوٹل کے عملے کے لوگ بھی شامل تھے!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”پنانچہ ہمیں اپنے تعاقب سے محتاط رہنا چاہیے۔ یہی کہنا چاہتے ہوئے؟“

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”سائیں! آپ نے تو ذرا اسی بات پر توجہ نہ رکھی ہے۔“

”رکھنا دیتی ہے میر بخش!“ میں نے کہا ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میں نے تو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور خون ریز صورت حال کا متحذو پار سامنا کیا ہے اور بیش حاشا دماغ رہا ہوں۔“

”ہاں سائیں۔“ وہ سر ہانپنے والے انداز میں بولا ”حاضر دماغی اس قسم کے معاملات میں بہت ضروری ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے امید ہے، تارا یا می شاہ اور موسیٰ میں سے از خود کوئی ہوش میں آنے والا نہیں۔ وہ مزید دو تین گھنٹے ”آرام“ فرمائیں گے۔ البتہ نیم بے ہوش یا نیم ہوش مند عبداللہ اور ہوش کے عملے سے چار بعد نہیں۔ وہ یقیناً بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی کوشش کریں گے۔ یا می شاہ وغیرہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔“ میر بخش تائیدی لہجے میں بولا ”میں تو سمجھتا ہوں، ہمیں جلد از جلد بہت دور نکل جانا چاہیے۔“

”ہوں۔“ میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے گاڑی کی اسپید ایک ممکنہ حد تک مزید بڑھادی اور کہا ”ہم اس گاڑی کو میرپور خاص پہنچ کر کسی ایسی جگہ چھوڑ دیں گے جس سے فوری طور پر نظر میں نہ آسکے۔ میں نے سوچا ہے، آگے کا سفر ہم کسی کسی وغیرہ میں کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔“

وہ اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولا ”سائیں! یہ آئیڈیا بہت اچھا ہے۔“ پھر چونکے والے انداز میں بولا ”اگر آپ میری بات مانو سائیں تو ہم اور بھی محفوظ سفر کر سکتے ہیں۔“

”ہاں کو، ہم کیا کتنا چاہتے ہو!“ اس نے کہا ”اس قدر فتنی گاڑی کو تو ہم میرپور خاص میں کہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے پھر ایک ٹرانسپورٹ سے ہم حیدر آباد تک سفر کریں گے اور حیدر آباد سے آگے نہیں کے ذریعے کراچی تک چلے جائیں گے۔“

”تمہاری تجویز میں جان ہے میر بخش۔“ میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا ”لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ اس وقت حیدر آباد سے کراچی کے لیے ہمیں نہیں مل جائے گی؟“

”سائیں! وہ یقین انداز میں بولا ”کراچی میں داخل ہونے والی آخری ٹرین ”شالیمار ایکسپریس“ سے جولا بور سے علی الصبح چلتی ہے اور لگ بھگ آدھی رات کو کراچی پہنچتی ہے۔ مجھے امید ہے، جب ہم حیدر آباد پہنچیں گے تو اس ٹرین کا وقت ہو چکا ہو گا۔ ہم بہ آسانی حیدر آباد اسٹیشن سے شالیمار پکڑ سکتے ہیں۔“

”پلیس دیکھتے ہیں، آگے کیا صورت حال پیش آتی

ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ”پہلے عموگ سے تو نکل جائیں۔“

میر بخش ایک مرتبہ پھر اپنے گھماکل بازو کو دبائے لگا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کے درمیں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر تکلف پروا شدت کی حد سے آگے گزر رہی تھی۔ ہم کافی دیر پہلے ”صوفی فقیر“ کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور ”اکڑی“ کے نزدیک پہنچنے والے تھے۔ اکڑی کے بعد ”شادی پلی“ کا سرحدی سفر تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر بدستور نظر مرکوز رکھتے ہوئے میر بخش سے گفتگو جاری رکھی اور کہا ”میر بخش! میں جانتا ہوں تم بازو کی تکلف کے باعث بڑی اذیت میں ہو لیکن تم فکر نہ کرو، میرپور خاص پہنچتے ہی میں سب سے پہلے تمہاری مرہم پٹی نکرواؤں گا۔ اس کے بعد ہی ہم آگے کا قصد کریں گے۔“

وہ بولا ”سائیں! اپنی تو آپ نے کر دی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے زخمی بازو کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”اگر مزید کچھ ضرورت ہوئی تو کراچی جا کر دیکھ لیں گے۔“

میں نے کہا ”میں باقاعدہ مرہم پٹی کی بات کر رہا ہوں۔ یہ اس کا رف تو جنگی حالات میں تمہارا خون روکنے کے لیے پاندھا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے، تم بچ گئے ورنہ گولی اگر تمہارے جسم کے کسی نازک حصے میں پیوست ہو جاتی تو اس وقت تم زندہ حالت میں میرے ساتھ سفر نہیں کر رہے ہوتے۔“

”اللہ سائیں کے کام بہت نرالے ہیں وجدان سائیں۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا ”اللہ جسے رکھے اسے کون چکے سائیں۔“

میں نے تصدیقی لہجے میں کہا ”یہ بات تو ہم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو میر بخش! میں بھی بارہا موت کے منہ میں جانے جاتے چکا ہوں۔ اس لیے بچا ہوں کہ میری زندگی ابھی باقی تھی۔ زندگی اس لیے باقی تھی کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ صاحب قدرت اور طاقت ور ہے۔ واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکے۔“

میں نے اپنی بات کے اختتام میں میر بخش کے الفاظ ویرائے تو وہ خوش ہو گیا بولا ”وجدان سائیں! وہاں ہوئی میں جب آپ تارا سے گفتگو کر رہے تھے تو چوہدری ملک نواز علی علی اور دارا کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھاری مالیت کے سونے کا تذکرہ بھی میں نے سنا تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتاؤ۔ اب تو سائیں، میرا بیٹا آپ ہی کے ساتھ ہے۔“

میں نے میر بخش کو ایک کڑی آزمائش میں ڈال کر دیکھا تھا۔ اس نے سچا دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا چنانچہ ہمتی سے اپنے والدین کی دشمنی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ دارا اور سونے کا ذکر بھی آیا اور میں نے تفصیل سے بتا دیا۔ ہر کارے دارا نے اس طرح میر بخش کو بتایا کہ چوہدری کے ہر کارے دارا نے اس طرح ایک طویل عرصے تک میرا بیٹا محال کیے رکھا تھا۔ سنگاپور، بنگال اور ہندوستان وغیرہ میں ہونے والے معرکے بھی زیر بحث آئے پھر ہمالیہ کی گود میں واقع سنگری مندر والا واقعہ بھی میں نے میر بخش کو بتایا۔ اس نے میرے جان نثار ساتھیوں کے بارے میں متعدد سوالات کیے اور میں اسے ان کا باجی، چڑا، پرہیز، شکار بھانوت سنگھ اور دیگر ساتھیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اسی دوران میں رات کا اندھا چرا پھیلنے لگا، ہم ”اکڑی“ نامی مقام کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب ”شادی پلی“ ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر مزید کچھ دیر بات چیت ہوئی رہی اور ہم ”شادی پلی“ سے گزر کر ضلع عمرکوٹ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اس سے آگے ضلع میرپور خاص کی حدود شروع ہو جاتی تھیں۔ اس ضلعی سرحد پر ہمیں رکنا پڑا۔ ہم سے آگے بھی آٹھ نو مختلف قسم کی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ آثار سے یہی لگتا تھا، وہاں کسی قسم کی چیلنگ نہ ہو رہی تھی۔

جیسے ہی میں نے ایک جیب کے پیچھے اپنی گاڑی روکی، میں چونک اٹھا۔ ضلعی سرحد پر مجھے پولیس کی بھاری جمیت نظر نہ آئی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں مجھے محسوس ہو گیا کہ وہاں پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔

میر بخش بھی صورت حال کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے مٹی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی اس نظریں سیکڑوں سوال تھے اور سب سے اہم سوال یہی تھا کہ آیا یہ ناکا ہمیں گھیرنے کے لیے لگایا گیا تھا!

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا ”تم گاڑی ہی میں بیٹھو۔ میں نیچے اتر کر سن لیتا ہوں۔“

اس وقت تک اندھا چرا خاسا گمرا ہو چکا تھا۔ میر بخش پلوں جانب دیکھتے ہوئے دھن دھن سے بولے ”وجدان سائیں! یہ سارا اہتمام ہماری خاطر ہے تو پھر اس صورت حال میں آپ کا حکم ہے؟“

”میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”ایک

بات تو طے ہے، ہمیں پولیس سے کوئی پنگا نہیں لینا چاہیے۔ پہلے کسی طرح میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ چیلنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔ اگر واقعی یہ ہماری خاطر ہے تو پھر پولیس والوں سے بات کر کے دیکھ لیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی۔“

میر بخش نے کہا ”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے، پولیس والوں کو اتنی جلدی ہمارے فرار کی خبر کس طرح ہو گئی اور عمرکوٹ سے اتنی دور میرپور خاص کے بارڈر پر انہوں نے ناکا لگایا ہے۔“

”تمہیں اس سلسلے میں قبل از وقت حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں میر بخش۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”ابھی یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ پولیس والے ہمارے ہی استقبال کے لیے یہاں موجود ہیں اور رہی یہ بات کہ انہوں نے بارڈر پر ناکا کیوں لگایا ہے تو اس کا سبب بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔“

میں ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے لگا تو میر بخش نے کہا ”سائیں! آپ نے ہوش کے کمرے میں ہسپتال کو خالی کر کے میگزین (کلپ) اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اگر آپ وہ میگزین مجھے دے دیں تو میں ہسپتال کو بھر کر ”منفی تر“ بنا سکتا ہوں۔“

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد گریلوں والا کلپ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور نیٹھی انداز میں کہا ”ٹھیک ہے، تم ہسپتال کو لوڈ کر لو لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اس کا استعمال انتہائی ناگزیر صورت حال میں کیا جائے گا اور وہ بھی ایک حد تک۔ میں خواہ مخواہ کسی انسان کی جان لینے کے حق میں نہیں ہوں اور خاص طور پر قانون کے مخالفوں سے تو ہمیں کوئی دشمنی مول نہیں لینا۔“

”آپ بے فکر رہو سائیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

جب سے میں نے گاڑی روکی تھی، سائل کو میں نے بے قرار پایا تھا۔ بیک ویو مرر میں، میں اس کے چہرے کے تاثرات کو بڑی وضاحت سے پڑھ چکا تھا۔ ہمارے درمیان موجود مضبوط شیشے کی وجہ سے بات چیت نہیں ہو سکتی تھی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ گاڑی سے اتر کر سائل کے پاس جاؤں اور اسے ہوشیار رہنے کی تاکید بھی کر دوں۔ ڈرائیونگ کیبن اور گاڑی کے پیچھے حصے میں ملکی لائٹ موجود تھی جس میں گاڑی کے اندرونی ماحول کو بہ آسانی دیکھا اور سمجھا جاسکتا تھا۔



میں نے اپنی سائڈ کا دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی گاڑی سے پاؤں باہر نکالا، کسی گمن کی سردنال میرے دائیں کندھے سے بیست ہو گئی۔ میں ایک لمحے کے لیے ستانے میں آگیا پھر اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو سمجھ پاتا نہایت ہی سفاک لہجے میں مجھے حکم دیا گیا۔

”شرافت سے اندر بیٹھو۔“

اس کے ساتھ ہی کندھے کو ٹال سے ٹوکا بھی دیا گیا۔ میں نے باہر نکلے ہوئے پاؤں کو واقعی ”شرافت“ سے گاڑی کے اندر پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص نے دھڑ سے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔

اب میں نے گردن گھما کر بغور اس شخص کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر سب لباس سے میں نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا۔ وہ اندھیرے سے اچانک ہی نمودار ہو کر میرے سر پر پتھنج کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلا شکوف بھی جو اب میرے کندھے سے ہٹ چکی تھی۔ تاہم اس کی نال کا رخ ہنوز گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف تھا۔

”تم زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو۔“ اس مسلح پولیس والے نے تحمانہ انداز میں کہا ”پیچھے دور تک ہمارے مسلح جوان موجود ہیں۔ تم فرار نہیں ہو سکو گے۔“ میں نے اس کے شانے پر بجے ”پھولوں“ سے اندازہ لگایا کہ وہ اے ایس آئی ریک کا پولیس افسر تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔

”اے“ ایس آئی صاحب! میں کہیں فرار ہونے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔“

”تم مجھے چکر نہیں دے سکتے۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”تپا نہیں، تم مجھے تنک کی نظر سے کیوں دیکھ رہے ہو۔“ میں نے کہا ”میں تو باہر نکل کر گاڑی کے پیچھے جسے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ہماری ایک ساتھی موجود ہے۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔“

وہ تنک لہجے میں بولا ”تمہیں جس کسی سے جو بھی ضروری بات کرنا ہے، وہ چیکنگ کے بعد کرنا۔ فی الحال چپ چاپ گاڑی کے اندر بیٹھے رہو۔“

”ٹھیک ہے سائیں۔“ میں نے نہایت فرماں برداری سے کہا ”اب میں میرا کوئی ساتھی گاڑی سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔ یلین یہ تو بتا دو، یہ چیکنگ وغیرہ کس سلسلے میں ہو رہی

ہے؟“

اے ایس آئی نے میرے برابر میں بیٹھے ہوئے میرے غلے کو بغور دیکھا۔ خدا کا شکر ہے، میرے بخش نے اس وقت گردن نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ساحل نے اس کے بازو پر پاندھنے کے لیے جو اسکاٹف دیا تھا وہ بھی نیوی میلو کلا کا تھا۔ چنانچہ پہلی نظر میں یہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کے بازو پر کوئی پٹی بندی ہوئی تھی۔ اے ایس آئی نے میرے بخش پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر گاڑی کے عقبی حصے میں جھانکنے لگا جہاں ساحل موجود تھی۔ اس سفر کے دوران میں گاڑی کا انڈیکسٹر آئن نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے حصے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی ہم جن حالات میں ہو مل سے نکلے تھے اس میں انڈیکسٹر کے آئن یا آف کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہم ”جو ہے“ جہاں ہے“ جیسا ہے“ کی بنیاد پر گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے۔ تاہم اس کے ساتھ میں نے گاڑی کو جیسے وہاں چھوڑا تھا، ہم اسے اسی حالت میں لے کر آگے بڑھ گئے تھے۔

اے ایس آئی گاڑی کے لحاظی محاسبانے کے بعد ”ریڈ الرٹ“ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی تنک سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے ہم میں اور گاڑی میں کوئی خاص بات نوٹ کی تھی جیسی وہ کلا شکوف کو بھی زیادہ احتیاط سے تھام کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے بدستور نرم لہجے میں اپنا سوال دہرایا ”سائیں! آپ نے بتایا نہیں، یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟“

”یہ بات تمہیں ڈی ایس پی صاحب بتائیں گے۔“

سپاٹ آؤ اڑیں گویا ہوا۔

”ڈی ایس پی صاحب کیوں؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے بتایا ”وہ اس لیے کہ یہ چیکنگ انہی کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔“

”مگر چیکنگ کس بات کی ہو رہی ہے؟“ وہ دامن بائیں محتاط نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ”ڈی ایس پی صاحب کو ایک گاڑی کی تلاش ہے۔ ایسی گاڑی جس میں تین افراد موجود ہوں۔ ایک لڑکی دو مرد۔“

اتنا کہہ کر اس نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کے عقبی حصے میں جھانکا۔ اے ایس آئی کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں کرید جاری رکھی۔ اس دوران میں ایک گاڑی کو

پک کر کے جانے کی اجازت دی جا چکی تھی۔ چنانچہ مجھے اپنی گاڑی کو تھوڑا آگے بڑھانا پڑا۔ اے ایس آئی اب مائل بہ متنگ نظر آ رہا تھا۔

میں نے دوبارہ گاڑی روکنے کے بعد اے ایس آئی سے کہا ”سائیں! اس گاڑی میں ہم بھی تو تین ہی ہیں۔ ایک لڑکی اور دو مرد۔ کیا تمہارے ڈی ایس پی صاحب کو ہماری ہی تلاش ہے؟“

”مگر تم لوگ ڈاکو ہو تو پھر تم ہی ڈی ایس پی صاحب کے مطلوبہ افراد ہو۔“ اس نے محتاط لہجے میں بتایا ”میں دو ڈاکوؤں اور ایک مغویہ کی تلاش ہے۔“

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اے ایس آئی کی بات سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ ”ٹانکا“ ہمارے لیے نہیں بلکہ ڈاکوؤں کی گرفتاری اور کسی مغویہ کی دستیابی کے لیے لگایا گیا تھا۔ میری طرح میرے بخش نے بھی سکون کی سانس لی۔ اب میں پہلے سے زیادہ پر اعتماد ہو چکا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سائیں! آپ بھی عجیب بات کر رہے ہو۔ کیا ہم آپ کو ڈاکو نظر آتے ہیں؟“

وہ غصے سے بولا ”نہ بابا، اگر کیوں رہے ہو۔ اگر تم لوگ ڈاکو نہیں ہو تو آرام سے بیٹھو۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ انہوں نے تو دو خطرناک ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے ناکا لگایا ہے جو ہمیں بدل کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”دو یہ مغویہ لڑکی کا کیا چکر ہے سائیں؟“ میں نے نرم لہجے میں کرید جاری رکھی۔

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا ”ممتاز نامی ایک لڑکی کو خطرناک ڈاکو منگل سنگھ نے اغوا کر لیا تھا جس کی رہائی کے عوض اس نے لڑکی کے باپ سے پچاس لاکھ روپے مانگے تھے لڑکی کا باپ ڈاکو دھمکیوں میں نہ آیا اور اس نے فی الفور پولیس سے مدد طلب کر لی۔ سننے میں آیا ہے، لڑکی کے باپ کو کوئی رشتہ دار پولیس میں ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی تھی۔“ ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”منگل سنگھ لڑکی کو اغوا کر کے کتنے نکلتا میں لے گیا تھا۔ پولیس نے وہاں پہنچ کر کامیاب چھاپا مارا مگر منگل سنگھ لڑکی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اب پتا چلا ہے، وہ ہمیں بدل کر میروپور خاص کی طرف نکلتا جا رہا ہے۔ اس کا ایک ساتھی بھی ہمراہ ہے اور وہ تینوں ایک گاڑی میں سوار ہیں۔“

اے ایس آئی نے اپنی بے دھیانی میں کافی مفید معلومات فراہم کر دی تھیں۔ ہمیں جو تنک ہوا تھا، معاملہ اس کے بالکل نکل گیا تھا۔ وہ ناکا ہمیں کھینچنے کے لیے نہیں بلکہ کسی منگل سنگھ نامی ڈاکو کو گرفتار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اندرون سندھ میں ہندو اچھی خاصی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کا مکمل دخل ہے۔ خاص طور پر انڈیا اور پاکستان کے بارڈر پر جو علاقے پائے جاتے ہیں وہاں ہندو اور مسلمان لگ بھگ برابر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض جگہ تو وہ مسلمانوں سے زیادہ طاقت میں ہیں۔

میں نے بھولے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”سائیں آپ کا عمدہ تو میں جان چکا ہوں۔ آپ اے ایس آئی ہو۔ ذرا یہ بھی بتا دو، آپ کا نام کیا ہے؟“ پھر میں نے ممکن لگاتے ہوئے کہا ”ویسے آپ کے بدن پر پولیس کی وردی خوب بیچ رہی ہے۔“

وہ خوش ہو گیا اور جوش بھرے لہجے میں پوچھنے لگا ”آپ کو میرے عمدے کا کیسے چلا تھا؟“

”سائیں! آپ کے شولڈر کے پھول بول رہے ہیں۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مجھے گاڑی تھوڑی اور آگے بڑھنا پڑی۔ ہماری گاڑی جس مقام پر کھڑی تھی وہ جگہ اندھیرے میں بھی جبکہ تاکے والے مقام پر کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اے ایس آئی کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔

میں نے اے ایس آئی کو یاد دلواتے ہوئے کہا ”سائیں! آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟“

”میں جشیہ ہوں۔“ وہ بولا ”اے ایس آئی جشیہ احمد۔“

میں نے پوچھا ”جشیہ سائیں! لٹا ہے، پولیس کی خاصی بھاری نفرتی یہاں موجود ہے!“

”ہاں سائیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”ڈی ایس پی صاحب تو ہیں ہی۔ ان کے علاوہ ”شاری پلی“ کا تھانہ انچارج، دو اے ایس آئی، ایک ایس آئی اور درجن بھر کانسٹیبل بھی اس مشن میں شامل ہیں جو سب کے سب مسلح اور چوکس ہیں۔ ایس پی عمر کوٹ کی جانب سے بڑے سخت آرڈرز آئے ہیں اسی لیے منگل سنگھ کی گرفتاری کے لیے ڈی ایس پی صاحب خود موقع پر موجود ہیں۔“

میں نے کہا ”اس تیاری سے تو لگتا ہے، منگل سنگھ ڈاکو

پولیس کے لیے بہت اہم ہے!“  
 ”بہت اہم سائیں۔“ اس نے تائید کی ”ممتاز نامی لڑکی  
 کسی صاحب حیثیت شخص کی بیٹی ہے اور اس نے پولیس میں  
 بہت اور سے سروس لگائی ہے۔ ویسے بھی پولیس منگل سگھ کو  
 کافی عرصے سے تلاش کر رہی تھی۔ اس کے کھاتے میں ڈکیتی،  
 اغوا اور قتل جیسی کئی سنگین وارداتیں لکھی ہوئی ہیں۔  
 پولیس نے سرگرمی دکھاتے ہوئے اس کے ڈبرے پر چھاپا  
 مارا تو وہاں اچھی خاصی مارا ماری ہو گئی جس کے نتیجے میں  
 منگل سگھ کے تین ساتھی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔  
 منگل سگھ اپنے ایک ڈاکو ساتھی کے ساتھ فرار ہونے میں  
 کامیاب ہو گیا۔ مغویہ ممتاز اسی کے قبضے میں ہے۔ پولیس نے  
 اپنی خفیہ تحقیق سے یہ معلوم کر لیا کہ منگل سگھ ہمیشہ بدل کر  
 عمر کوٹ سے میر پور خاص جانا جاتا ہے چنانچہ ایس پی صاحب  
 کے فوری احکام پر ڈی ایس پی صاحب نے دونوں اضلاع کی  
 سرحد پر ناک لگایا ہے۔“

اے ایس آئی جشید احمد ہماری جانب سے مطمئن تھا۔  
 اسے یقین تھا کہ ہم منگل سگھ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے  
 اسی لیے وہ مجھ سے کپ شپ کر رہا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ  
 منگل سگھ یا اس کے ساتھی سے ہماری آشنائی نہیں تھی اور  
 نہ ہی مارے قبضے میں ممتاز نامی کوئی لڑکی تھی۔ اگر ساحل کو  
 ممتاز فرض کر بھی لیا جاتا تو ایک مغویہ کو اتنی آزادی سے  
 گاڑی میں بیٹھنے ہونے نہیں ہونا چاہیے تھا پھر جب سے ہمیں  
 معلوم ہوا تھا کہ اس ”پیننگ“ کا ہماری ذات سے کوئی تعلق  
 نہیں ہے، اس وقت سے میں بڑے اعتماد کے ساتھ اے ایس  
 آئی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ہمیں ایک شعوری اطمینان حاصل  
 ہو چکا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو ٹوٹنا جاری رکھا اور پوچھا ”یہ  
 ڈاکو منگل سگھ کوئی سکھ ہے؟“ میں نے انجان بنے ہوئے اس  
 کی طرف دیکھا۔

”نہیں، منگل سگھ ہندو ہے۔“ اے ایس آئی نے بتایا۔  
 میں اور انجان بن گیا اور ابھمن زہ لہجے میں دریافت  
 کیا ”سگھ اور ہندو! یہ کیا پکڑے جشید سائیں؟“  
 اس نے میری معلومات اور توقع کے مطابق جواب دیا  
 ”سگھ ایک کاسٹ (ذات) ہے۔ سگھ کوئی ہندو بھی ہو سکتا ہے  
 اور کوئی سردار دہی بھی۔ منگل سگھ ہندو ہے۔ ادھر کرنزی کے  
 جنگلات میں اس نے اپنا ڈیرا بنا رکھا ہے۔ چوری، ڈکیتی اور  
 اغوا جیسے کئی مقدمات میں وہ ملوث ہے اور کبھی پکڑا نہیں گیا  
 لیکن اب پتہ چل کر نہیں جاسکے گا۔ اس کے تین ساتھی ہلاک

ہو چکے ہیں جبکہ چوتھا ساتھی اس کے ہمراہ ہے۔“  
 میں نے پوچھا ”سائیں! آپ بتا رہے ہو، منگل سگھ نے  
 کسی صاحب حیثیت شخص کی بیٹی ممتاز کو اغوا کر رکھا ہے  
 لڑکی کا باپ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟“  
 میں نے محسوس کیا کہ اب وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے  
 بورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آکٹھٹ آمیز لہجے میں  
 جواب دیا ”ممتاز کے باپ کا نام قاضی سلطان ہے اور وہ ”جی  
 سر“ میں رہتا ہے۔ ممتاز اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔“  
 ”کیا خیال ہے سائیں۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا  
 ”یہ قاضی سلطان نے اس معاملے میں پولیس کو ملوث کر کے  
 بے وقوفی کا ثبوت نہیں دیا۔ اگر وہ صاحب حیثیت اور مال  
 دار اسی ہے تو اسے بیٹی کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے  
 تھا۔ اور وہ بھی اکلوتی بیٹی۔ پچاس لاکھ کی رقم بیٹی سے زیادہ  
 قیمتی تو نہیں تھی؟“

اے ایس آئی جشید چونکہ پولیس والا تھا اس لیے  
 پولیس سے متعلق میرا اظہار خیال اسے کچھ زیادہ پسند نہ  
 آیا۔ برا سامنے بتاتے ہوئے اس نے کہا۔  
 ”سائیں! یہی بات تو آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں  
 آتی۔“

”کون سی بات جشید سائیں؟“  
 ”نہ بابا، آپ لوگوں نے پولیس کو پتا نہیں کیا سمجھ رکھا  
 ہے۔“ وہ بیزار سی سے بولا ”اگر قاضی سلطان نے بیٹی کی  
 واپسی کے لیے پولیس کی مدد حاصل کی ہے تو اس میں بے  
 وقوفی والی کون سی بات ہے۔ پولیس کا تو کام ہی عوام کی مدد کرنا  
 ہے۔“

میں نے کہا ”آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں، پولیس کا کام  
 عوام کی مدد بلکہ خدمت کرنا ہے مگر بے وقوفی سے میری مراد یہ  
 تھی کہ اس طرح ڈاکو منگل سگھ عیش میں ڈاکر ممتاز کو بھی مل  
 کر سکتا ہے۔ آپ بتا چکے ہیں اس کے کھاتے میں کئی قتل  
 لکھے ہوئے ہیں۔“

اس نے بغور میرا جائزہ لیا اور کہا ”گلتا ہے، ہمیں  
 ڈاکوؤں کی اغوا کنندگان کی نسیات وغیرہ سے زیادہ واقفیت  
 نہیں ہے بابا، اگر قاضی سلطان، منگل سگھ کا مطالبہ پورا  
 کرتے ہوئے اسے پچاس لاکھ روپے دے بھی دیتا جب بھی  
 منگل سگھ ممتاز کو زندہ نہ چھوڑتا۔ تم کو کچھ پتا نہیں ان  
 ڈاکوؤں کے بارے میں۔“

”ٹھیک کہتے ہو سائیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں  
 بلا دیا۔

اسی وقت اے ایس آئی کو ایک ایسی بات یاد آگئی جو  
 بت پہلے یاد آنا چاہیے تھی۔ وہ اب تک میرے سوالات  
 کے جواب دے رہا تھا حالانکہ پولیس افسر ہونے کے ناتے  
 اسے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دینا چاہیے تھی۔ پتا نہیں وہ  
 کس قسم کا اے ایس آئی تھا۔ خیر باتوں قسم کے افراد اس  
 طرح کی حافیتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ اے ایس آئی بلاشبہ  
 ایک باتوں شخص تھا جو میری باتوں میں لگ کر اپنے مقصد سے  
 ہٹ گیا تھا۔ اب وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا اور  
 اس نے پوچھا۔

”تم لوگ کدھر سے آ رہے ہو سائیں؟“  
 میں نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا ”ہم عمر کوٹ شرکی  
 طرف آ رہے ہیں۔“

”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“  
 ”میر پور خاص جائیں گے۔“ میں نے بتایا۔  
 اس نے مزید پوچھا ”عمر کوٹ کے رہنے والے ہو یا میر  
 پور خاص کے؟“

میں نے کہا ”عمر کوٹ میں میرے رشتے دار رہتے ہیں۔  
 میں ان سے مل کر میر پور خاص جا رہا ہوں۔“  
 ”اس کا مطلب ہے، میر پور خاص کے رہنے والے  
 ہو؟“ اے ایس آئی نے سوال کیا۔

میں نے بتایا ”میں دراصل کراچی کا رہنے والا ہوں۔  
 میر پور خاص میں بھی میرے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ میں  
 آج کی رات میر پور خاص میں ان رشتے داروں کے پاس  
 گزار دوں گا۔ کل صبح ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔“  
 ”کراچی میں آپ کیا کرتے ہو سائیں؟“

اے ایس آئی نے ایک خطرناک سوال کر ڈالا تھا لیکن  
 اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا کوئی طبعی بخش جواب  
 دیتا اس کی پکار پڑی۔ سندھی لب و لہجے میں کسی نے با آواز  
 بلند اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ اے ایس آئی جشید احمد اس  
 پکار کی جانب لپک گیا اور میں نے سکون کی سانس لی۔ اسی  
 وقت مجھے اپنی گاڑی کو تھوڑا اور آگے بڑھانا پڑا۔

میر بخش نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا  
 ”وہاں سائیں! یہ اے ایس آئی تو خوا خواہ چپک کر رہ گیا  
 تھا۔ خدا کا شکر ہے، دفع ہو گیا۔ میں تو دل میں پریشان  
 ہو رہا تھا۔ ویسے سائیں، ایک بات کا تو اطمینان ہو گیا۔“

”کون سی بات؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”کیا کہ یہاں کی ”پیننگ“ سے ہمارا کوئی تعلق  
 نہیں۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ میں نے تائید کی انداز میں کہا  
 ”اے ایس آئی اپنے باتوں بن میں ہمیں بہت مفید معلومات  
 فراہم کر گیا ہے۔ منگل سگھ اور ممتاز نامی لڑکی کی کمائی خاصی  
 اہم اور سنسنی خیز ہے۔ ایک بات یاد رکھنا میر بخش! اس نے  
 سواہیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت  
 کرتے ہوئے کہا ”اگر تم چاہتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ  
 رہو تو اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے باخبر رہنا بہت  
 ضروری ہے۔ اے ایس آئی نے پندرہ بیس منٹ تک جو کچھ  
 کہا ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ منگل سگھ کے  
 بارے میں حاصل شدہ معلومات کسی بھی مرحلے پر ہمارے کام  
 آسکتی ہیں۔“

وہ پوری بات سننے کے بعد بولا ”میں آپ کی نصیحت کو  
 ہمیشہ یاد رکھوں گا لیکن اس وقت تو میں اس بات پر خوش ہوں  
 کہ یہاں ہمارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ورنہ میں تو  
 سمجھ رہا تھا کہ تارا یا یا شاہ وغیرہ میں سے کسی کو ہوش انگیا  
 ہو گا اور انہوں نے خون کے ذریعے یا کسی اور طرح پولیس کو  
 ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔“

”اس حوالے سے ابھی زیادہ مطمئن ہونے کی ضرورت  
 نہیں۔“ میں نے کہا ”ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ ناکا اگر ہمارے  
 لیے نہیں لگا یا گیا تو کسی بھی وقت کسی ناخوشگوار صورت حال  
 سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔“

”آپ کیوں ڈرا رہے ہو سائیں!“  
 ”میں ڈرا نہیں رہا بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“  
 وہ ابھی ہوئی نظر سے مجھے کتنے لگا۔ میں نے کہا ”بھئی  
 بھی اور کسی بھی حال میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔  
 ہم جس راہ کے مسافر ہیں وہ اتنی پر توجہ و خیر ہے کہ اس پر  
 چلتے ہوئے کہیں بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے دشمنوں  
 کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں برتنا چاہیے۔“  
 ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔“ وہ  
 سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ”اب چند باتیں نہایت ہی اہم اور موقع  
 محل کی مناسبت سے ہو جائیں۔“ میرا جملہ ختم ہوا تو میر بخش  
 نے سواہیہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے پوچھا ”میر بخش! اے  
 ایس آئی جشید احمد کی آمد سے محل میں نے تمہیں اعشاریہ  
 تین آٹھ کی گولیوں والا کلپ دیا تھا، وہ کہاں ہے؟“

اس نے اپنی دائیں ران کے نیچے ہاتھ گھمایا اور مذکورہ  
 کلپ برآمد کرتے ہوئے بولا ”میں نے صورت حال کی  
 نزاکت کو بھانپتے ہوئے اسے چھپا دیا تھا۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔“ میں نے سناٹھی لہجے میں کہا پھر پوچھا ”اور وہ خالی پستول کہاں ہے؟“

اس نے اپنے لباس سے وہ پستول نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پستول اور گولیوں والا کلپ ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے دبا دیا اور میری بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔  
”تم نے جشید کی باتیں سن لی ہیں۔ اس وقت موقع پر ڈی ایس بی صاحب شادی پٹی کا ایس ایچ او، ایک ایس آئی، دو اے ایس آئی اور درجن بھر کانسٹیبل موجود ہیں اور ایک بات ذہن نشین کر لو کہ تمام افراد اے ایس آئی جشید کی طرح باتونی اور احق نہیں ہوں گے۔ اس نوعیت کا کوئی ایک ”پیس“ ہی ہوتا ہے لہذا۔“ میں نے جملہ ادھر اچھوڑ کر ایک طویل سانس لی اور کہا ”لہذا ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس سے کوئی بھی قابل اعتراض یا قابل گرفت شے بردہ نہیں ہونا چاہیے۔“

میرے بخش نے اثبات میں گردن ہلاتی، میں نے کہا ”اب میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں، اسے غور سے سنو اور ذہن میں نقش کر لو۔“

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر لہجے میں کہا ”میرا نام مراد ہے اور ساحل کا کلثوم اور تمہ۔ تم میری بخش ہی ہو۔“

میرے بخش نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے اپنا بیان جاری رکھا ”ڈی ایس بی اور ایس ایچ او بالی کی کھال اتاریں گے اور اگر ہمارے بیان پر انہیں کسی قسم کا شک ہو گیا تو وہ ہماری کھال کے بال بھی اٹا کر سکتے ہیں لہذا ہم سب کا بیان ایک جیسا ہونا چاہیے۔“

میرے بخش پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں اور ساحل یعنی مراد اور کلثوم آپس میں کزن ہیں اور کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے میر پور خاص آئے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ ڈیڑا اکبر سومرو سے ملنے عمر کوٹ آگئے۔ ڈیڑے سے بھی ان کی دور پار کی رشتہ داری نکلتی ہے۔ تم یعنی میرے بخش ڈیڑا اکبر سومرو کے ڈرائیور ہو اور ہم مہمانوں کو ڈیڑے کی گاڑی میں میر پور خاص چھوڑنے جا رہے ہو۔ راستے میں تمہارے بازو میں اچانک درد اٹھا۔ اس لیے میں یہ حالت مجبوری ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔ تمہارے درد والے بازو پر میں نے کس کس اے کراف بانڈ دیا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”اے۔ اے۔ آپ

نے تو فوراً کے فوراً ایک بہت اچھی اور بڑا اثر کمائی تیار کر لی ہے۔ سننے والا فوراً اس پر یقین کر لے گا۔ لگتا ہے، جیسے بالکل سچی کمائی ہو!“

”ہر کمائی سچی ہوتی ہے میرے بخش!“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا ”واقعات یا تو پیش آ رہے ہوتے ہیں یا پیش آ چکے ہوتے ہیں یا پھر پیش آنا ہوتے ہیں۔ یہ سب ماضی، حال اور مستقبل کا پتہ ہے۔“

میرے بخش عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس موقع کو نیتیت جانا۔ اے ایس آئی جشید لیٹ کر وہاں نہیں آیا تھا۔ میں نے آہستگی ہی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر آ گیا۔ ساحل کافی دیر سے صورت حال کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ”سب ٹھیک ہے“ کہہ کر اسے اطمینان تو دلایا تھا تاہم زبان کی تسلی بھی ضروری تھی۔

میں گاڑی سے اتر کر عقبی حصے کی کھڑکی کے پاس آیا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں ساحل کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ پولیس والوں کی پوچھ تاچھ کے جواب میں ہمیں کیا کہنا ہے۔ وہ بڑی معاملہ فہم اور ذہین لڑکی تھی۔ فوراً میری بات سمجھ گئی۔ میں مطمئن ہو کر ڈرائیونگ کین میں آ گیا۔

اے ایس آئی جشید اچھے نے جب دھکی آمیز انداز میں مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کو کہا تھا تو ساتھ ہی بھی بتایا تھا کہ پیچھے دو رنگ پولیس کے مسلح افراد موجود ہیں لہذا میرے فراہ کی ہر کوشش ناکامیاب بنادی جائے گی۔ میں نے اسی بات کی تصدیق کے لیے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ اگرچہ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا تاہم مجھے ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیے جس سے اے ایس آئی کے دھکی آمیز بیان کی تصدیق ہو سکتی۔ میں نے یہی سوچا کہ جشید نے محض رعب میں لانے کے لیے یہ بات کہی ہوگی۔ پولیس والے اس قسم کے جعلی عکس ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔

میں نے ساحل سے بات کرتے ہوئے اپنی آواز خاصی دھیمی رکھی تھی کیونکہ ہماری گاڑی کے پیچھے بھی دو گھڑیاں اگر رک چکی تھیں۔ ان میں ایک کار تھی اور دوسری پرائیویٹ بس جس میں بہت کم سواریاں تھیں۔ وہ مسافر بس آدھی سے زیادہ خالی پڑی تھی۔

میں نے جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، مجھے اپنی گاڑی کو مزید آگے بڑھانا پڑا پھر ہمارے درمیان حالات حاشہ اور آئندہ کے دیگر کام سے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

نہاخذ کر کے آدھے گھنٹے بعد ہماری گاڑی کی چیکنگ کی گئی۔ اب ہم اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں اچھی خاصی ٹریفک میں نے دیکھا، ڈی ایس بی صاحب اپنی سرکاری گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے چائے نوش فرما رہے تھے جبکہ شادی پٹی گاڑیوں کی چیکنگ کر رہا تھا۔ ہم سے ملنے والی جپ رخصت ہوئی تو مولیٰ تو نہ والا ایس ایچ او بے جا بڑھا۔ اس کی چال میں خاصی تیزی تھی اور وہ بالآخر سے ہماری گاڑی کو اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔

ہمارے قریب آ کر اس نے ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی پر تپ تپ بڑھائے اور مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں بے جا بڑھانے کو دل نہ دیا۔

ایس ایچ او (تھانہ انچارج) نے گاڑی کے اندر جھانکا میرے بخش کو بھی نیچے اترنے کا حکم دیا پھر اس نے گاڑی کے پچھلے حصے میں نگاہ دوڑائی۔ تاہم ساحل کو اس نے گاڑی کے دہانے پر دیا۔ اس کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔ ”گاڑی کے کاندھات اور اپنا ڈرائیونگ لائسنس ڈی۔ اس نے تھانہ لہجے میں کہا۔

اس دوران میں دو مسلح کانسٹیبل ہمیں اپنی منگوں کے ساتھ رکھ چکے تھے۔ صورت حال خاصی تازک تھی۔ پاس ڈرائیونگ لائسنس تو کیا، کوئی شناختی کارڈ بھی تھا۔ یہی کیفیت ساحل کی بھی تھی۔ تاہم گاڑی کے ذات ڈیٹیل بورڈ میں موجود تھے۔ میں نے ڈیٹیل بورڈ کا خانہ کھولا تو کاندھات نکال لیے پھر نہایت ادب سے انہیں ڈیڑا کراچی کی طرف بڑھا دیا۔

وہ گاڑی کو ڈیڑا اکبر سومرو کے نام رجسٹرڈ تھی۔ تھانہ ڈیٹیل نے کاندھات کا باریک بینی سے معائنہ کیا پھر میرے پاس ڈیڑا کراچی کے نام ”اکبر سومرو“ تو نہیں ہو سکتے۔

”نیک۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میرے بخش ہے۔“ میں نے میرے بخش کی طرف اشارہ کیا ”اس

سے میرے بخش ہے۔“ ڈیڑا اکبر سومرو کا ڈرائیور بھی ہے اور ڈیڑے کے چاکری بھی کرتا ہے۔  
”نیک۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میرے بخش ہے۔“ ڈیڑا اکبر سومرو کا ڈرائیور بھی ہے اور ڈیڑے کے چاکری بھی کرتا ہے۔  
”نیک۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میرے بخش ہے۔“ ڈیڑا اکبر سومرو کا ڈرائیور بھی ہے اور ڈیڑے کے چاکری بھی کرتا ہے۔

بخش اس گاڑی کا ڈرائیور ہے تو پھر تم ڈرائیونگ کیوں کر رہے تھے؟“

اس موقع پر میرے بخش نے جواب دیا ”سائیں!“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”عمر کوٹ سے آگزی نہ میں ہی گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے بعد میرے بازو میں اچانک درد اٹھا اور میں ڈرائیونگ کے قابل نہ رہا۔ مجبوراً مراد سائیں کو ڈرائیونگ کرنا پڑی۔ یہ دیکھیں۔“ میرے بخش نے اپنے بندھے ہوئے دائیں بازو کی طرف اشارہ کیا ”مجھے بہت شدید درد ہو رہا ہے۔ آپ اگر ہمیں جلدی جانے دو تو مہربانی ہوگی سائیں!“

”یہ کس قسم کا درد ہے میرے بخش۔“ تھانے دار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ”جس کی تکلیف کے آثار تمہارے چہرے پر نظر نہیں آ رہے؟“

”سائیں! برداشت کر رہا ہوں۔“ میرے بخش نے دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”درد میرا حال تو میرے دل کو ہی پتا ہے۔ یہ درد کبھی بھگتا ہوا جاتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا ہے مگر کوئی فائدہ ہوتا ہے، مرض ختم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ یہ اعصابی درد ہے۔“

تھانے دار نے اس کی وضاحت سننے کے بعد کہا ”تمہارے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس ہوگا؟“

میرے بخش ایک لمحے کے لیے گھبرایا پھر سنبھلے ہوئے بولا ”سائیں! جلدی میں، میں اپنا لائسنس جگے پر بھول آیا ہوں۔“

”کوئی اور شناختی کاندھ؟“

”نہیں سائیں۔“ میرے بخش نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس دوران میں تھانے دار چہیتی ہوئی نگاہ سے ہم تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمارے چہروں کے پیچھے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ مجھے اس کا ”دیکھنا“ تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس کی نظر کا خصوصی مرکز ساحل تھی۔

وہ میرے بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولا ”تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں، اور بھی کوئی شناختی کاندھ نہیں اور تم ڈیڑا اکبر سومرو کے ڈرائیور اور چاکر ہونے کے دعوے دار ہو۔ میں تمہاری بات کا کیسے یقین کر لوں؟“

میرے بخش سے کوئی جواب نہ بن پایا تو میں نے تھانے دار سے کہا ”سرا میں مانتا ہوں، میرے بخش اپنی کوتاہی سے ضروری کاندھات جگے پر بھول آیا ہے۔ آپ نہیں جاننے کی اجازت دے دیں تو مہربانی ہوگی۔“

اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے ٹٹولا پھر سوال کیا  
”تمہارا کیا نام ہے جوان؟“

میں نے اپنا نام مراد بتایا۔

اس نے پوچھا ”وہ لڑکی جو گاڑی کے پیچھے حصے میں بیٹھی  
ہے، تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”وہ میری کزن ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کا نام؟“

”کلوٹم!“ میں نے بتایا۔

”تم دونوں اس علاقے کے نہیں لگتے۔“ اس نے ایک  
مرتبہ پھر ہمارے چہروں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی اور  
پوچھا ”کیا کیس باہر آئے ہو؟“

میں نے جواب دیا ”ہم دونوں کا تعلق کراچی سے ہے۔  
میرپور خاص میں ہمارے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ ہم ان  
سے ملنے آئے تھے۔ یہاں عمر کوٹ کے وڈیرا اکبر سومو سے  
بھی ہمارے دیرینہ خاندانی مراسم ہیں اس لیے صبح اس طرف  
آگئے تھے۔ وڈیرا سائیں کا ڈرائیور میر بخش ہمیں میرپور  
خاص چھوڑنے جا رہا ہے۔ کل صبح ہم واپس کراچی چلے  
جائیں گے۔“

”میرپور خاص میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟“

”رتن آباد میں۔“ میں نے بتایا۔

پولیس والوں کے سوالات کا ”مقابلہ“ کرنے کے لیے  
میں نے میر بخش سے میرپور خاص کے کچھ علاقوں کے نام اور  
ان کے بارے میں سرسری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ انہی  
معلومات کی روشنی میں، میں نے ابھی تھانے دار کو جواب دیا  
تھا۔ ”رتن آباد“ میرپور خاص شہر کے قریب ہی تھا۔

”تمہارے پاس تو شناختی کاغذات ہوں گے؟“ تھانے  
دار نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا ”اتفاق سے نہیں ہیں۔“

”اور تمہاری کزن کلوٹم کے پاس؟“

میں نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

تھانے دار نے طنزیہ لہجے میں کہا ”اور یہ بھی ایک اتفاق  
ہے؟“

اس موقع پر میں نے صورت حال کو سنبھالنا ضروری  
سمجھا اور نہایت ہی شائستہ لہجے میں کہا ”تھانے دار صاحب!  
ہمارے شناختی کاغذات وغیرہ ہمارے سامان میں رکھے ہیں جو  
رتن آباد (میرپور خاص) میں ہمارے رشتے داروں کے گھر پر  
ہے۔ ہم صبح جلدی میں وہ کاغذات اپنے ساتھ رکھنا بھول گئے  
تھے۔“

میری وضاحت پر وہ شانت ہونے کے بجائے  
ہو گیا اور پھسلے لہجے میں بولا ”تم دونوں صبح گھر سے  
اپنے شناختی کاغذات ساتھ نہ رکھ سکے اور میر بخش  
سے آتے ہوئے اپنا لائسنس اور دیگر کاغذات بھول گیا  
یہ سب اتفاق ہے؟“

”آپ بلاوجہ ہم پر شک کر رہے ہیں تھانے دار صاحب  
! میں نے کہا۔

”بلاوجہ کے بچے!“ وہ دباؤ ”یہ کیا ہے؟“ اس سے  
ساتھ ہی اس نے ہماری گاڑی کی باڈی پر ایک زوردار  
رسید کی۔

”کیا ہے؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔  
تھانے دار نے گاڑی کی باڈی پر چسپاں سرنگ سے  
کاغذ کو کھنچا اور جیج سے مشابہ آواز میں بولا ”یہ بے تہا  
باپ ڈرا غور سے دیکھو۔“

میں ایک دم سائلے میں رہ گیا۔ میر بخش اور سارا  
کیفیت بھی مجھ سے ذرا مختلف نہیں تھی۔ گاڑی کی باڈی  
جہاں سے سرخ کاغذ کھنچا گیا تھا وہاں باڈی کا اصلی  
جھانک رہا تھا۔ ہم افراد نفی میں گاڑی کی اس ”تہذیب  
ذہن میں نہیں رکھ سکے تھے۔ ہمیں عمر کوٹ سے نکلنے کے  
چاہیے تھا کہ فوراً پوری گاڑی سے وہ سرخ کاغذ  
بھینکنے یا کھینچ ڈالنے کے نگران پتا میں اس طرف تھانے  
دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس غفلت نے ہمیں بری طرح  
دیا تھا۔

تھانے دار نے بھانپ لیا تھا کہ ہماری گاڑی پر کل  
وغیرہ چسپاں کیا گیا ہے اور اس نے اس کی عملی تصدیق  
کر دی تھی۔ اب وہ لکھا جانے والی سوالیہ نگاہوں سے  
دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پہنکارا ”اب تھانے  
دار کا یہ کاغذ بھی ایک اتفاق کے تحت تمہاری گاڑی سے  
گیا ہے اور اتنی مہارت سے چپکا ہے کہ اس نے پوری  
کو ڈھک کر سیاہ سے سرخ بنادیا ہے۔ کیوں! میں حیرت  
میں ہوں نا؟“

تھانے دار کے لہجے میں بڑی کٹ تھی اور وہ طنز  
سے مجھے گھور رہا تھا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری گاڑی  
میں نے صورت حال کو سنبھالنے کی ایک اور  
نگر تھانے دار نے میری بات کاٹ دی اور تحقیر  
میں بولا ”تمہیں جو بھی کہو اس کو ماننا ہے، ذکی ایس کی

کے سامنے کرنا۔

پھر اس نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ چار پولیس والے مستعدی سے ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ چاروں اسٹے سے لیس تھے۔ دو مگن بردار کاشییل پہلے ہی ہمیں ٹارگٹ بنائے ہوئے تھے۔ بعد میں آنے والے چار میں سے ایک ایس آئی (سب انسپکٹر) اور تین کاشییل ریک کے تھے۔ تھانے دار نے سب انسپکٹر سے کہا۔

”تم اپنی گمرانی میں گاڑی کی مکمل تلاشی لو۔ اس سے پہلے اس لڑکی کو باہر نکال کر ایک طرف کھڑا کرو۔ ہری اپ!“

سب انسپکٹر اپنے سینٹر کو سیلوٹ کر کے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ دو کاشییل بھی گاڑی کی طرف لپکے تھے۔ وہ خامے چار جانہ موڈ میں تھے۔

تھانے دار نے ایک کاشییل کو حکم دیا ”تم میرے پیش کے بازو پر بندھا ہوا کپڑا اکھلاؤ۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں!“ اسے کس قسم کا درد ہوتا ہے!“

ان احکام کے بعد تھانے دار میری جانب متوجہ ہو گیا ”تمہاری تلاشی میں خود لوں گا۔“

میں تلاشی سے نہیں گھبرا رہا تھا۔ میرے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہو سکتی تھی جسے قابل دخل اندازی پولیس کہا جاسکتا۔ میرے بونے میں کچھ رقم موجود تھی۔ یہ وہی رقم تھی جو کل رات میرے پیش نے مجھے دی تھی۔ ان دو ہزار روپوں میں سے میں نے ہوش کا کرایہ ادا کیا تھا پھر ہم نے کھانے وغیرہ میں استعمال کیے تھے۔

میری اصل پریشانی کی وجہ میرے پیش تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری گاڑی کی تلاشی۔ میرے پیش کے بازو کی پٹی اگر مکمل جاتی تو یہ بات سامنے آتا ضروری تھا کہ وہ اسکاٹف وہاں کیوں باندھا گیا تھا۔ میرے پیش کی قمیص کی وہ آستین شانے کے قریب سے خون میں لٹری ہوئی تھی اور دعوت دیتی تھی کہ بازو کا باریکٹ سے مشاہدہ کیا جائے۔ اگر میرے پیش کی آستین الٹ دی جاتی یا اس کا بازو آستین میں سے نکال کر دیکھا جاتا تو گولی کی ”کارستانی“ روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی۔

گاڑی کی تلاشی اس حوالے سے ہمارے لیے مضمر اور خطرناک ثابت ہو سکتی تھی کہ وہاں ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے اعشاریہ تین آٹھ کیلی براؤن ایک پستل اور دو ڈکلب مونیوڈ تھا۔ پولیس والے تلاشی کے دوران میں تمام سیٹوں کو الٹ پلٹ کر ضرور دیکھتے۔ اس کے علاوہ سیاہ گاڑی پر چپاں سرخ کانڈ کا ”عقدہ“ مکمل چکا تھا۔ اچانک بہت سی باتیں ہم پر

ایک ساتھ نازل ہو گئی تھیں جن سے فوری طور پر نکلنا دھمکانی نہیں دیتا تھا۔

میں اگر ہر احتیاط اور مصلحت کو بلائے تو اس صورت حال سے دو دو ہاتھ میرے لیے بچتا نہیں تھا مگر میں اپنی دھرتی پر کسی بھی صورت قانون میں نہیں لینا چاہتا تھا۔

جس دوران میں تھانے دار میری تلاشی کے ساحل کو گاڑی سے باہر نکال کر ایک طرف کھڑا کیا۔ دوسری جانب ایک کاشییل نے میرے پیش کے بازو پر اسکاٹف کھلا دیا۔ اس کے بعد ہی صورت حال ایسی ٹھیک ہو گئی۔ میرے پیش کی جامہ تلاشی سے دس ہزار روپے برآمد کر لیے گئے۔

تھانے دار کو میری جامہ تلاشی سے کچھ حائل ہو سکا۔ تاہم اس کی مایوسی کو اس کاشییل کی آواز نے میں بدل دیا جس نے میرے پیش کے بازو کا اسکاٹف کھلا دیا۔ ”سرا! یہ بندہ تو خفیہ ہے۔“ کاشییل نے جو پیشکار اعلان کیا۔

تھانے دار مجھے ایک مسلح کاشییل کے حوالے کر کے میرے پیش کی جانب بڑھ گیا اور اس کے زخمی بازو کا دیکھنے کے بعد زہر لے لیے میں استفسار کیا ”تو تمہارے اصل نام سے خون بھی نکلتا ہے؟“

ہمارا جھوٹ مکمل چکا تھا اس لیے میرے پیش نے توجیہ پیش کرنے کے بجائے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اسی وقت گاڑی کی طرف سے بھی ہمارے لیے بری خبر آئی۔ تلاشی لینے والے سب انسپکٹر نے مدد کے مع کلب برآمد کر لیا تھا اور بڑی مسرت کے ساتھ اسے تھانے دار کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”سرا! یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔“  
”بہت خطرناک مجرم کو۔“ تھانے دار نے کہا۔  
والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے ماتحتوں کو ”انہیں فوراً گرفتار کرلو۔“

ہمارے پاس گرفتاری دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہمارے بہت سے جھوٹ پکڑے گئے تھے اور ہماری جان سے چھپایا ہوا آتشیں اسلحہ بھی برآمد کیا گیا تھا۔ ہم راہ پر چلتے ہوئے ہمارے پاس کوئی جانے فرار نہیں بد معاشی یا سینہ زوری کے حق میں اس وقت خفیہ چنانچہ ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پٹا دی گئیں۔

ایک مرتبہ پھر گرفتار ہونا ہو چکے تھے۔

ہماری گرفتاری کے احکام صادر کرتے ہی تھانے دار نے سینٹر افسر ڈی ایس بی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ یقیناً وہ اس شخص سے کرتا دھرتا کو کوئی سنسنی خیز خبر سنانا چاہتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ڈی ایس بی فوراً ہی تھانے دار کے ساتھ ہمارے پاس گیا۔ تھانے دار نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”سرا! ہمیں جن تین افراد کی تلاش تھی وہ یہی ہو سکتے ہیں۔“

اس انکشاف نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ گویا پولیس والے ہم پر ڈاکو منگل سنگھ، اس کے ساتھی اور مفویہ ممتاز کا شک کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی کیونکہ کسی بھی طور ہمارا ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے تعلق نہیں تھا۔

ڈی ایس بی کو تھانے دار مختصر الفاظ میں ہماری غلط باتوں کے بارے میں بتا چکا تھا لہذا اس نے نفرت آمیز نظر سے ہمیں دیکھا اور تھانے دار سے کہا ”انہیں فوراً تفتیشی میں پھانسا کر بندوبست کرو۔ وہیں پر ان تینوں سے باری باری پوچھ گچھ کی جائے گی۔“

اس موقع پر میں نے احتجاج کرنا ضروری سمجھا اور ڈی ایس بی سے مخاطب ہوتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا ”سرا! آپ نہیں غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، ہم نے آپ لوگوں سے کچھ غلط بیانی کی ہے۔ اس میں بھی ہماری بہت سی مجبوریوں پوشیدہ ہیں۔ اگر آپ ہماری بات سلی اور اطمینان سے سنیں تو آپ کو ہماری بے گناہی اور مصیبت زدگی کا پتہ چلے گا مگر ہم ہرگز ہرگز ڈاکو نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارا جڑا کچھ افراد سے کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ ہے، ہم کسی مکمل ٹھیک ممتاز کو نہیں جانتے۔“

”دیکھا آپ نے سرا!“ تھانے دار جو پہلے لہجے میں ڈی ایس بی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ”یہ شخص منگل سنگھ اور ممتاز کا نام لے رہا ہے حالانکہ میں نے آپ سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمیں جن تین افراد کی تلاش تھی وہ یہی ہو سکتے ہیں۔ اسکاٹف اور ممتاز وغیرہ کا تو ہمیں ذکر نہیں کیا کیا پھر یہ شخص اسے اپنی لا تعلقی پر زور کیوں دے رہا ہے؟“

تھانے دار کی بات ڈی ایس بی کی سمجھ میں آئی۔ اس نے غور کر کے دیکھا اور پوچھا ”ہاں بھئی! انہیں کیسے پتا چلا کہ ہم نے یہاں منگل سنگھ ڈاکو کی گرفتاری کے لیے ناکا لگایا ہے؟“

مکمل غصے سے لہجے میں جواب دیا ”یہ بات مجھے

تھوڑی دیر پہلے آپ کے مجھے کے ایک ایس آئی نے بتائی ہے۔“

اس نے چونک کر تھانے دار کو دیکھا اور مجھ سے سوال کیا ”کون اے ایس آئی؟“

میں نے اے ایس آئی جشید احمد کا نام لے دیا۔

ڈی ایس بی نے تھوڑی سی غصے سے تھانے دار کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے کہا ”جی سر! اس نام کا ایک اے ایس آئی اس مشن میں شامل ہے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا ”اے ایس آئی جشید احمد نے تمہیں یہ بات کب اور کیوں بتائی تھی؟“

میں نے کہا ”جشید نے مجھے یہ بات کوئی آدھا گھنٹہ پہلے یہیں بتائی تھی جب ہماری گاڑی آٹھ نو دو سو سری گاڑیوں کے پیچھے آکر رکی تھی۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے مزید کہا ”اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اس نے مجھے یہ بات کیوں بتائی تھی تو اس کا سیدھا سیدھا جواب یہ ہے کہ میں نے اس سے پوچھا اور اس نے بتا دیا۔ بس!“

ڈی ایس بی نے تھانے دار کو حکم دیا کہ وہ فوراً اند کوہ اے ایس آئی کو وہاں حاضر کرے۔ تھانے دار موٹی ٹونڈ پر چٹلون سنبھالتے ہوئے ”میں سر! میں سر!“ کی گردان کرتے ہوئے وہاں سے کھٹک گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈی ایس بی میری جانب متوجہ ہو گیا۔

”تم نے اپنا نام مراد اور اپنی کزن کا نام کلثوم بتایا ہے جبکہ تمہارا ساتھی میرے پیش ہے۔ ان ناموں میں کس حد تک صداقت ہے؟“

میں نے ایک حد تک سچ بولتے ہوئے بتایا ”میرے پیش کا نام بالکل اصلی ہے جبکہ ہمارے نام فرضی ہیں۔ اس فرضیت کی بھی مقتول جو بات ہیں۔ اگر آپ ہماری مجبوریوں کا احساس کر لیں تو ہمیں بے گناہ پائیں گے۔ ہم کسی بھی طور کسی جرم میں ملوث نہیں ہیں۔“

”تمہاری مجبوریوں کی داستان تو میں بعد میں سنوں گا۔“ ڈی ایس بی نے سخت لہجے میں کہا ”ابھی تو آپ لوگوں کا بہوت کھانا ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی ہمیں بدل کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے مفویہ ممتاز کے محلے میں بھی ابھی خاصی تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔“

ڈی ایس بی کی پچھتاہٹوں سے مجھے بہت کوفت ہوئی۔ میں نے ہزاری سے کہا ”سرا! آپ تو ایک ذمہ دار اعلیٰ افسر ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ ہمارے بارے میں اس قسم

کی بات کریں گے۔

میرے پُر اعتماد بچے نے ڈی ایس بی کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے گہری نظر سے مجھے گھورا تاہم گنیمت آواز میں بولا ”تم میری کس بات کا ذکر کر رہے ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں ایسا کیا کہہ دیا ہے؟“

میں نے کہا ”سرا! ہم تینوں اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی سواک بھر رکھا ہے تو آپ کو نظر آجائے گا۔“

”میں تم سب سے باری باری تمہاری میں ملاقات کروں گا۔“ وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”پہلے میں اس چٹل خور اے ایس آئی کی تو خبر لے لوں۔“

جب تک تھانے دار اے ایس آئی جشید احمد کو تلاش کر کے لانا، میں نے مختلف سوال کر کے ڈی ایس بی سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ منگل سنگھ ڈاکو کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس کے نوجوان ساتھی کا نام گنڈا سنگھ تھا جس کی عمر کم و بیش بائیس سال بھی جبکہ مغویہ ممتاز اٹھارہ سال کی ایک دراز قامت لڑکی تھی۔ سب سے دلچسپ بات یہ بھی کہ منگل سنگھ اور اس کے ساتھی گنڈا سنگھ کو کسی نے نہیں دیکھ رکھا تھا اس لیے وہ انہیں صورت شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میری عمر گنڈا سنگھ کے اریب قریب تھی اور میری بخش منگل سنگھ کے برابر تھا جبکہ ساحل دراز قامت ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز کی ہم عمر بھی تھی۔ اس لیے ان کا ٹیک ہماری طرف جارہا تھا اور خاص طور پر اس صورت حال میں کہ ہماری گاڑی کا اصلی رنگ چھپانے کے لیے اس پر سرخ کانڈ چسپاں کر دیے گئے تھے، ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے سے ایک پستول اور گولیوں والا بھرا ہوا نیگزن برآمد ہوا تھا اور میری بخش کے بازو کے ڈیم کو چھپانے کے لیے ہم نے ایک فرضی دروازہ لکائی سنائی تھی۔

تھوڑی سی دیر میں تھانے دار نے اے ایس آئی جشید کو ڈی ایس بی صاحب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا ”سرا! جشید نے اپنی کوتاہی تسلیم کر لی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ اتنے خطرناک ثابت ہوں گے۔“

تھانے دار واضح طور پر اپنے اے ایس آئی کی حمایت میں بول رہا تھا۔ ڈی ایس بی نے اسے جھاڑا اور مضبوطی سے لے لیا۔ ”اگر یہ لوگ خطرناک ثابت نہیں بھی ہوتے تو کیا

اے ایس آئی کو یوں غیر متعلقہ لوگوں سے اس قسم کی اہم باتیں کرنے کا حق حاصل ہے؟“

”نہیں سر! بالکل نہیں۔“ تھانے دار نے تیزی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا ”کو تاہی تو بہر حال جشید سے ملتی ہے سر۔“

جشید احمد گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک

ٹائپنڈیدہ نظر ہم پر ڈالنے کے بعد اوپر نہیں دیکھا تھا۔ ڈی ایس بی نے سخت لہجے میں تھانے دار سے کہا ”جب کوئی شخص کو تاہی کرتا ہے تو اسے اس کی سزا بھی ملتی ہے۔“

”ضرور ملتی ہے سر!“ تھانے دار نے تاکید کی۔ ڈی ایس بی نے کہا ”میں یہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم اپنے اے ایس آئی کی کوتاہی کے لیے کون سی سزا تجویز کرتے ہو۔“ تھانے دار نے یہ الفاظ سنتے ہی سکون کی سانس لی۔ ڈی ایس بی نے مزید کہا ”اب تم ان تینوں کو دوبارہ میں منڈال میں انہیں پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ گا اور ہاں گاڑی کے باہر مسلح افراد کا پیرا پیرا دو تاکہ یہ نہیں فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ تھانے دار نے قدو دیا نہ لہجے میں کہا اور ہمیں دھکیلتا ہوا ڈی ایس بی کی پیپ کی طرف لے جانے لگا۔ وہ دوبارہ جیپ کے قریب ہی کھڑی تھی۔ پیچھے سے ڈی ایس بی نے کہا ”نہیں گاڑی میں بیٹھا کر تم باقی گاڑیوں کو جلد از جلد نشتانے کی کوشش کرو۔ سڑک پر زیادہ رش نہیں لگنا چاہیے۔“

تھانے دار ایک مرتبہ پھر ”یس سر“ کہتے ہوئے ہمارے ساتھ موبائل کی جانب قدم بڑھانے لگا جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس دوران میں سڑک پر ہماری گاڑی کے پیچھے کار اور برائے ویٹ بس کے عقب میں دو تین اور گاڑیاں آکر رک چکی تھیں۔ میں نے جب اپنی گاڑی کی طرف دیکھا تو مجھے حیرت میں نظر آئی۔ اڑان بعد معلوم ہوا کہ ڈی ایس بی کی ہدایت پر ایک پولیس اہلکار نے ہماری گاڑی کو سڑک سے اتار دیا تھا تاکہ پیچھے والی گاڑیوں کے لیے راستہ ہموار ہو سکے۔ ہماری گاڑی کو ڈی ایس بی والی جیپ سے تھوڑے فاصلے پر روک دیا گیا۔ جب ہمیں موبائل میں بٹھا دیا گیا تو ہم خاصے پریشان تھے۔ موبائل میں ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا تاہم موبائل سے باہر چار سناٹا اڑا ہوا نگرانی کے لیے مستعد کھڑے تھے۔ ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

میں بلکہ فکر مند تھا۔ بیٹھے بیٹھے ایک نئی مصیبت نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ ساحل اور میر بخش کے چہروں پر غم کی گہری پرجھائیں تھیں۔ چند لمحے ہمارے درمیان پادری رہی پھر میر بخش نے تشویشناک لہجے اور دھیمی آواز میں کہا۔

”وجدان سائیں! ہماری کمائی تو قلیل ہو گئی۔ اب کیا ہوگا؟“

”وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔“ میں نے سرگوشیاں سنا کر کہا۔

ساحل افسردہ لہجے میں بولی ”وجدان! تمہیں جلد از جلد کوئی نئی اور موثر کمائی سوچنا ہوگی ورنہ ہم خواہ مخواہ منگل سنگھ کے گھنے میں کسی بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ پہلے ہی

نارے حالات خاصے سنگین ہیں۔“

”ہاں سائیں! کچھ سوچو۔“ میر بخش نے کہا ”آپ ہی بہ حل نکال سکتے ہو۔“

میں اس بارے میں مسلسل سوچ بیچار کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں درجن ایک لمحے کے لیے بھی غفلت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ چش آمد صورت حال سے نکلنے کے لیے کوئی عمدہ اور شہد ہدف اپنی بنا بہت ضروری تھا ورنہ کسی بھی قسم کی تاخیر میں کیسے بہت بڑے وہاں میں ڈال سکتی تھی۔

چند منٹ بعد میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میرا ذہن ایک نئی اور زیادہ موثر کمائی تیار کر چکا تھا۔ میں نے کھنکھار کر کھانا کھا لیا اور مجھے لہجے میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی بھی لمحے یہ لوگ ہمارے گھر کی طرف آ سکتے ہیں۔ اس دوران میں سڑک پر ہماری گاڑی کے پیچھے کار اور برائے ویٹ بس کے عقب میں دو تین اور گاڑیاں آکر رک چکی تھیں۔ میں نے جب اپنی گاڑی کی طرف دیکھا تو مجھے حیرت میں نظر آئی۔ اڑان بعد معلوم ہوا کہ ڈی ایس بی کی ہدایت پر ایک پولیس اہلکار نے ہماری گاڑی کو سڑک سے اتار دیا تھا تاکہ پیچھے والی گاڑیوں کے لیے راستہ ہموار ہو سکے۔ ہماری گاڑی کو ڈی ایس بی والی جیپ سے تھوڑے فاصلے پر روک دیا گیا۔ جب ہمیں موبائل میں بٹھا دیا گیا تو ہم خاصے پریشان تھے۔ موبائل میں ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا تاہم موبائل سے باہر چار سناٹا اڑا ہوا نگرانی کے لیے مستعد کھڑے تھے۔ ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

”بہت بڑا اور فوراً عملی قدم اٹھانے والے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب میں بزدل اور غیر عملی ہو گیا ہوں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ گمز بڑا گئی۔

”پھر تمہارا کیا مطلب تھا ساحل؟“

”مہم میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ۔“ وہ جھپکتے ہوئے بولی ”وہاں ہندوستان اور نیپال میں تو تم بڑے سے بڑے پھندے میں فوراً کود پڑتے تھے اور پولیس والوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر اپنے ملک میں داخل ہوتے ہی تم بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہو اور ہر قدم چھونک چھونک کر اٹھانے لگے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ اگر اسی قسم کی صورت حال ہمیں انڈیا یا نیپال وغیرہ میں پیش آئی ہوتی تو کیا تم تب بھی اتنی ہی شرافت کا مظاہرہ کرتے؟“

میں نے ساحل کی پوری بات سنی اور زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اس کے احساسات کو غلط ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم میرے خیال میں وہ ایک قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ شاید وہ میری محتاط روی اور مصلحت اندیشی کو بزدلی کے خانے میں فٹ کر رہی تھی یا پھر وہ کسی قسم کی الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ میں نے اس موقع پر اس کی الجھن آمیز غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری سمجھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”دیکھو ساحل! زیادہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ تاہم میں یہاں پر یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان اور نیپال یا ہندوستان میں بہت فرق ہے۔ ان دونوں ملکوں میں میرا کلکڑا انٹرویو پیش تر خانوئی قوتوں سے ہوتا رہا یا پھر جرائم پیشہ پنڈتوں سے۔ وہاں کی پولیس ان لوگوں کے ہاتھوں میں کسی کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پولیس والے مجرموں کا ساتھ دیتے ہوئے ہماری راہ میں آتے تھے اور مجھے بھی چند تھقل اور ایمان دار پولیس افسروں کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے بعض پولیس والوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے کتراتا نہیں تھا مگر پاکستان میں۔“

میں نے جملہ ادھر اور اچھوڑ کر ایک طویل سانس لی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ساحل! ہم دونوں غیر قانونی طریقے سے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں اور ابھی تک ہمارے پاس اصلی یا نقلی کسی بھی قسم کی کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔ یعنی ہماری پوزیشن بہت نازک اور کمزور ہے۔“

میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر ساحل کی جانب دیکھا اور



سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”پاکستان میں داخل ہوتے ہی ہمارا واسطہ پاک ”ریجنز“ سے پڑ گیا۔ وہ تو ہماری خوش قسمتی سمجھ لو کہ پاکستان صالح کریم کو ہماری کمائی پر یقین آگیا اور اس نے ضروری کارروائی کے بعد ہمیں ہمتی پولیس کے حوالے کر دیا۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے اپنی خوش قسمتی ہی کوں گا کہ پولیس کے قبضے سے ہمیں دو ڈیرا اکبر سومو کے بندوں نے نکال لیا ورنہ پتا نہیں وہ ہمارا کیا حشر کرتے اس کے بعد ہم عمرکوٹ میں یا می شاہ اور تارا جیسے لوگوں سے نبو آزما رہے اور بالآخر یہاں ایک مرتبہ پھر پولیس والوں کے ”سمان“ بن چکے ہیں۔“

میں نے خاموش ہو کر باری باری ساحل اور میر بخش کو دیکھا پھر کہا ”ساحل! پاکستان میں آدے کے بعد جہاں بھی مجھے جرات اور بہادری آزمانے کا موقع ملا، میں نے اس کا مظاہرہ ضرور کیا ہے۔ جب پولیس والوں سے خواجواہ کا ٹکڑا میری سمجھ سے بالاتر ہے جبکہ وہ ہمیں کسی ذاتی دشمنی یا ”پیدا“ کے چکر میں بھی پریشان نہیں کر رہے۔ اب سیدھی اور سادی بات یہ ہے کہ میں پولیس والوں کو کسی طرح رام کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

”وجدان! تم تو دل پر لے گئے۔“ ساحل نے اپنے نازک ہونٹوں کو مسکراہٹ کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا ”میں نے تو بس ایک بات کہہ دی تھی۔“

”تم نے ایک بات کہہ دی تھی۔“ میں نے اسی کے الفاظ دہرائے ”اسی لیے میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔ میں ان نازک حالات میں کسی قسم کی غلط فہمی کو جنم دینے کے حق میں نہیں ہوں۔“

”کیا تم میری بات کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہو؟“ وہ قدرے شوخ ہوئی۔

میں نے کہا ”میں اپنے ہر ساتھی کی بات کو اہم سمجھتا ہوں۔“

وہ سنجیدہ ہو گئی ”آئی ایم سوری وجدان۔ میں نے اپنی بات سے تمہیں دکھ پہنچایا۔ دراصل موجودہ حالات نے مجھے خاصا پریٹ کر دیا ہے۔“

”ابھی تک تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے مجھے دکھ پہنچتا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ”مگر اب تمہیں“

میں نے جو سوچا ہے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تاکہ ہمارے بیان میں کسی قسم کا تضاد پیدا نہ ہو۔ ”وہ ہرگز گوش ہو گئے۔ میں نے کہا“ اب ہم نے ڈی ایس پی کو یقین دلاتے ہیں کہ میں اور ساحل کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام مقصود احمد اور ساحل کا نام بلی ہے۔ بلی قبیلہ طور پر چڑالی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چڑال سے کراچی منتقل ہوئی ہے۔“

ساحل کے نقش و نگار کے باعث میں نے اسے چڑالی دیکھا کیونکہ جینی، افغانی، چڑالی، تھالی اور تبتی افراد کے نقش و نگار میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیان میں سیاحتی کا عنصر بڑھ جاتا۔ میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم مجھے کراچی کے چند علاقوں کے نام بتا دو۔ کیا تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو؟“

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھے کراچی کے مشہور علاقوں کے نام بتا دیے۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں اور ساحل یعنی مقصود احمد اور بلی کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان کرن کاوش ہے۔ میں اپنے چچا ایوب خان سے ملنے میر پور خاص آیا ہوں۔ بلی کو نارنجی مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے وہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ تم! میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کیا ”تم میرے چچا کے ملازم ہو اور تمہارا نام میر بخش ہی ہے۔ جب میں نے اپنے چچا سے عمر ماروی کا تاریخی قلعہ دیکھنے کی فرمائش کی تو اس نے تمہیں ہمارے ساتھ عمر کوٹ روانہ کر دیا۔ ٹھیک ہے؟“

میرا مخاطب میر بخش تھا۔ اس نے میرے ”ٹھیک“ کا جواب اثبات میں دیا۔ کل شام میر بخش نے مجھے ”عمر ماروی“ کی رومانی داستان پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ عمر نے ”ماروی“ کو گنگ بھگ ایک سال تک اس قلعہ کے متعین رکھا تھا تاکہ اسے خود سے راضا و رغبت شادی کے لیے آمادہ کر سکے مگر ماروی اپنے منگیتر کے لیے بااثر ایک

ایک لمحے کو رک کر میں نے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”یہاں پر ہم یہ ظاہر کریں گے کہ میں یعنی مقصود نے مارشل آئرس کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے غنڈوں کے چٹا چٹا دیے۔ ایک مرحلے پر غنڈوں کے سرغنہ نے ہتھول نکال کر ہر فائر کر دیا جس کے نتیجے میں تم زخمی ہو گئے۔ اس بات میں بھی کسی قسم کی غلط بیانی شامل نہیں۔“

میر بخش نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ساحل پوری دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔ اس نے کراٹہ والے انداز میں کہا ”کہانی تو بہت جان دار ہے۔ اب میں یہ ضرور پوچھوں گی۔“

ساحل کے انداز نے مجھے خاصی تقویت پہنچائی۔ اس کے منہ سے زندہ دل کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ تو زخمی ہو چکا ہے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھی ”اب اس سے کتنا بڑا بھائی یہ ایک مثبت اور صحت مندر علامت تھی۔“

میں نے کہا ”میں ضرور بتاؤں گا کہ پھر کیا ہوا۔“ میں نے اپنے گھر کا رخ کر دیا۔ میں نے اپنے فن کے بل بوتے پر غنڈوں سے سرغنہ سے ہتھول چھین لیا اور ان کی ایسی معنی اور دھمائی کی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور

ہو گئے۔ وہ اس افرا تفری میں اپنی گاڑی بھی چھوڑ گئے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ وہ دوبارہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے وہ اپنے اور ساتھیوں کو بیچ کر کے وہاں لے آتے چنانچہ ہم نے موقع واردات سے فوراً رخصت ہونے کا فیصلہ کیا اور انہی کی گاڑی میں بیٹھ کر میر پور خاص کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے سیاہ گاڑی پر سرخ کانڈ کیوں چہاں کر رکھا تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور میں موجود کاندھات سے ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ڈیرا اکبر سومو نامی کسی شخص کی گاڑی ہے۔ ہمیں کسی ڈیرے شہرے سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہم تو جلد از جلد عمرکوٹ کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میر پور خاص میں داخل ہونے سے پہلے کسی جگہ اس گاڑی کو کھڑا کر دیں گے لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ مٹھوس گاڑی شادی کی والے تاکے پر ہمیں اس مصیبت میں گرفتار کر دے گی۔“

میں نے اپنی پلانٹ کی تفصیل ختم کرتے ہوئے ان دونوں کی جانب سوائے نظر سے دیکھا تاکہ ان کے ذہن میں اگر کوئی الجھن ہو تو وہ مجھ سے کہہ سکیں۔

”وڈنر حل“ ساحل نے تو یقینی انداز میں کہا ”یہ کمائی ضرور ہٹ ہوگی۔“

میر بخش ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا۔ میں نے کہا ”تم کیا کہتے ہو میر بخش؟“

وہ بولا ”سائیں! باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر پولیس والوں نے میر پور خاص والے آپ کے فرشی بچا ایوب خان کی تصدیق کر لیا تو؟“

اس نے سوائے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے جلدی سے کہا ”اول تو اس کی امید نہیں اور بالقرض محال اگر انہوں نے اتنی دور تک جانے کی کوشش کی تو پھر بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ موقع محل کی مناسبت سے کوئی داؤ مار لیں گے۔“

”ٹھیک ہے سائیں، جیسی آپ کی مرضی۔“ میر بخش نے فرماں برداری سے کہا ”بلکہ مرضی کیا سائیں۔ جو آپ کا حکم“ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

میں نے محسوس کیا ”میر بخش“ کی طور پر مطمئن نہیں تھا۔ میں نے کہا ”کیا ایحال جو میں نے آپ لوگوں کو کمائی سنائی ہے“ اسے ذہن میں بٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہماری کسی بات میں اختلاف یا تضاد نہیں پایا جانا چاہیے اور ہاں۔“

ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ”میرا چچا

ایوب خان میرپور خاص شہر میں سڑانے کی ایک دکان چلاتا ہے جب کہ اس کی رہائش رتن آباد میں ہے۔ ہم لوگ خانہ لائی سنار ہیں۔ لڑاچی میں ہمارا بھی جیولری کا ہی بزنس ہے۔

وہ دونوں اثبات میں سر ہلانے لگے۔ ساحل نے کہا ”جس طرح میرپور نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ پولیس والے تمہارے فرضی چچا کے بارے میں تفتیش کر سکتے ہیں اسی طرح میں بھی یہ کہوں گی کہ وہ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں تمہاری رہائش اور تمہارے جیولری کے بزنس کے بارے میں بھی متعدد سوالات کر سکتے ہیں۔“

”امکانات کی کمی نہیں“ میں نے کہا ”پولیس والوں سے کچھ بعید نہیں۔ وہ کسی بھی قسم کا سوال کر سکتے ہیں۔“ پھر میں نے میرپور کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا ”تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو۔ تمہیں یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ وہاں کی صرافہ مارکیٹ کس علاقے میں ہے۔“

”کراچی بہت بڑا شہر ہے سائیں۔“ میرپور نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بتایا ”انسانوں کا ایک سمندر ہے۔ وہاں کئی صرافہ مارکیٹیں ہیں۔ ویسے ڈیڑا اکبر سومو زیورات اور جیولری کی خریداری پیشہ ”صدر“ کے علاقے سے کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، صدر کی جیولری مارکیٹ چلی گی۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”کراچی میں صدر کی صرافہ مارکیٹ میں ہماری دکان ہے۔ کیا سمجھتے؟“

”بالکل سمجھ گئے۔“ دونوں بہ یک زبان بولے۔ اسی وقت ڈی ایس بی وہاں پہنچ گیا۔ تھانے دار اپنی توند کو تھنھلاتے ہوئے اس کے پیچھے تھا۔ ہماری موبائل سے باہر ڈی ایس بی نے تھانے دار سے مختصر بات کی جس کے بعد تھانے دار ہماری موبائل میں سوار ہو گیا۔ وہ موبائل کے اگلے حصے میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمیں کنٹرول کرنے کے لیے دو مسلح پولیس اہلکار موبائل کے پیچھے حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس سیشنک سے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہاں سے ہمیں کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔ پھر فوراً ہی میری اس سوچ کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ڈرائیور نے موبائل اشارت کی اور اگلے ہی لمحے وہ حرکت میں آچکی تھی۔

ہم تینوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے درمیان تھوڑی دیر پہلے جو کشمکش ہوئی تھی وہ بہت اہم تھی۔ اب ہمیں اسی پروگرام کی روشنی میں حرکت

کرنا تھی۔

پولیس موبائل کے تھک کر سوک پر آئی تو ہم نے اپنے پیچھے دو تھک دیکھا۔ رات نے اندھیرے میں جہاں تک میری آنکھوں نے کام لیا وہاں تک مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی اس کا مطلب یہی تھا کہ ناکے پر موجود تمام گاڑیوں کو نمنا کر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ناکہ منگل ٹرک ٹائی کسی ڈاکو کو گرفتار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری سے پہلے ناکہ ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر پولیس والے میرپور کو منگل سنگھ اور مجھے اس کا ساتھی گناہ سنگھ سمجھ رہے تھے تو عقد یہ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہونے والا تھا۔ یقیناً وہ ہمیں کسی تفتیشی سیل میں لے جانا چاہ رہے تھے۔ میں نے اپنی معلومات کی خاطر منگل پیر سے داروں سے دوستانہ انداز میں بات چیت شروع کر دی۔ وہ دونوں موبائل کی دونوں سیٹوں پر بالکل آخر میں بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں میں گفتگوں تھا۔ بالکل چوکس تھے۔

ایک سیٹ پر میں ساحل کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پ کے ساتھ والی سیٹ پر میرپور بیٹھا تھا۔ گویا میرپور اور ساحل آئے سائے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے سائے بیٹھے ہوئے پولیس والے سے پوچھا۔

”سائیں ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟“

”تھانے کے علاوہ تمہیں کہاں لے جائیں گے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”متعلقہ تھانیاں سے کتنی دور ہے؟“

”ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہماری گاڑی تو وہیں رہ گئی!“

”وہ بھی آجائے گی تم فکر کیوں کرتے ہو!“

”اور ڈی ایس بی صاحب؟“

”وہ اپنی ذاتی گاڑی میں آئیں گے۔“

میں نے معصومیت سے پوچھا ”سائیں، ہمیں تھانے کیوں لے کر جا رہے ہیں؟“

وہ چنگا اور قدرے پرہم لہجے میں بولا ”وہاں تمہاری دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سرن بلاؤ اور ذرے دی دیں چھائی گئی ہیں۔“ ”نئی سر“ سے چھ مہمان آنے والے ہیں۔ وہ تم سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوں گے۔“

پولیس والا اپنے رینک کے اعتبار سے اے ایس بی تھا۔ غالباً وہ ان دو اے ایس بی میں سے ایک تھا جو اس ناکے پر تعینات کیے گئے تھے۔ ایک اے ایس بی نے میں

معلومات حاصل کر چکا تھا جو اڑان بعد ڈی ایس بی کی اپنی اور بھی کا نشانہ بھی بنا تھا۔ میں نے اس کے بعد اسے ایس بی جوشید احمد کی شکل میں دیکھی تھی۔

میرے سامنے بیٹھا اے ایس بی شاید جوشید والے رانے کی وجہ سے بہت محتاط تھا۔ میں نے اس کی باتوں اور انداز سے بجا بھائی کہ وہ میرے گھسنے میں نہیں آئے گا چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

چند منٹ بعد ہم متعلقہ تھانے کے اندر پہنچ گئے۔ پولیس کے قواعد و ضوابط اور تفتیش کے طریقوں سے مجھے گہری واقفیت تھی۔ ہمیں شادی پٹی کے علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ لہذا تفتیش بھی شادی پٹی سے متعلقہ تھانے میں ہونا تھی۔ اگر ہوا واقعی منگل سنگھ سنگھ اور ممتاز ثابت ہو جائے (جس کا امکان صفر کے برابر تھا) تو پھر جی سر کے تھانے میں اطلاع پہنچائی جائے گی کیونکہ ممتاز کے اغوا کی رپورٹ جی سر کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی۔ باقی کارروائی اس کے بعد کی بات تھی۔

ہمیں تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس بی کی طلبی پر سب سے پہلے ساحل کو تفتیشی کرے میں لایا گیا۔ میں اور میرپور ساحل کی واپسی کا انتظار کرتے تھے۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد ہمیں ساحل کی صورت نظر آئی۔ میں خوش ہو گیا۔ ساحل کی حالت اور چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ سب خیریت گزری تھی۔ میں نے سنا، اگر اب وہ پوچھ گچھ کے لیے میرپور کو لے گئے تو مجھے ساحل سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن میری امید پر اوس پڑ گئی۔

جو پولیس والا ساحل کو لے کر حوالات کی طرف آیا تھا اس نے ہم دونوں کو حوالات سے باہر بلا لیا۔ اس دوران میں ساحل اس کے ساتھ باہر کھڑی تھی۔ ہمیں پولیس والے کے اشارے کی تعمیل کرنا پڑی کیونکہ وہاں دم مارنے کی جانیسیں تھیں۔ ایک مسلح نگران ہم پر موت کے فرشتے کی طرح تعینات تھا۔

ہم کھلے ہوئے دروازے سے باہر آئے، اسی وقت ساحل کو حوالات کے اندر دھکیل کر دروازے کو لاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں چلنے کو کہا گیا۔

میرپور اور میں گن پوائنٹ پر چلے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے۔ وہ غالباً ہیڈ کوارٹر تھا۔ مجھے وہیں بیٹھنے کو کہا گیا اور میرپور کو وہ پولیس والا اپنے ساتھ لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈی ایس بی ہم تینوں سے باری باری ملے گی۔ پتہ نہ پتہ

کرے گا اور وہ بھی اس طرح کہ فارغ ہونے والا اپنے دوسرے کسی ساتھی کو کچھ بریف نہ کر سکے۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم تینوں نے پولیس موبائل کے اندر ہی ایک پروگرام طے کر لیا تھا ورنہ اس طریقہ کار سے گزرتے ہوئے ہم کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاتے۔ تاہم ایک بات میرے لیے اطمینان بخش تھی اور وہ یہ کہ ساحل کی واپسی سے میں سمجھ گیا تھا، ہم پڑا کوؤں والا شبہ بہت جلد ختم ہونے والا تھا۔

میں چپکس منٹ کے بعد میرا بلاوا آ گیا۔ پولیس والا مجھے اپنے ساتھ لے کر ٹرانزل روم میں پہنچ گیا۔ میرپور وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، اسے واپس حوالات میں بھیج دیا گیا تھا۔

پولیس والا مجھے ڈی ایس بی کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کمرے میں ڈی ایس بی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے جرموں کی طرح کھڑا نہیں کیا گیا بلکہ ڈی ایس بی کے اشارے پر میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈی ایس بی نے کچھ کرکٹ گارڈ صاف کیا اور کہا ”میں نے تمہاری ساتھی نیلی کا طویل انٹرویو کیا ہے۔ وہ بہر حال مغویہ ممتاز نہیں ہے۔ اس کی عمر اور قد کاٹھ مغویہ جیسا ہے مگر وہ قاضی سلطان کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔ اس سے پوچھنا پتہ چلے گا کہ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی بھی صورت ہماری مطلوبہ لڑکی ممتاز نہیں۔“

اتنا کہہ کر ڈی ایس بی خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی بات سن کر اطمینان کی سانس لی اور خاموش رہا۔ ڈی ایس بی چند لمحوں کے بعد گہری نظرت دیکھتا رہا پھر بولا۔

”تمہارا ساتھی میرپور بھی ہمارے شک پر پورا نہیں اترا۔ ہمیں شبہ تھا کہ وہ منگل سنگھ ڈاکو ہو گا لیکن وہ ہر آزمائش سے گزر گیا۔ ہم نے اس کے چہرے کی جانچ پڑتال بھی کی ہے۔ اس نے کسی قسم کا سواگت نہیں بھرا رکھا۔ وہ جیسا نظر آ رہا ہے، اس کی حقیقت بھی دہی سے لیجئے وہ منگل سنگھ نہیں بلکہ تمہارے چچا ایوب خان کا ملازم ہے۔“

ڈی ایس بی نے اتنی تیزی سے بات کر رہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے لیے یہ اطمینان بخش بات تھی کہ میرے دو ساتھی ”باس“ ہو گئے تھے۔ میرپور کو میں نے ٹرانزل روم سے نکلنے کے بعد دیکھا نہیں تھا۔ تاہم ساحل کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا تھا کہ تھانے کی فضا اب ہمارے لیے خاصی سازگار ہو چکی تھی۔ یہ ایک اچھے کی بات تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ

ڈی ایس پی کوئی چال نہ چل رہا ہو۔ پولیس والوں سے اسے نرم اور شائستہ رویے کی توقع کی جاتی۔ میں اسی ادنیٰ بن میں تھا کہ ڈی ایس پی کی آواز میری سماعت سے نکل کرانی۔

”مسٹر مقصود! اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوں گے۔“

”میں تیار ہوں جناب۔“ میں نے پر اعتماد انداز میں کہا۔

”آپ پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں!“

اس کے بعد ڈی ایس پی نے جو سوالات کیے، میں نے ان کا جواب سوچی سمجھی اور طے شدہ اسکیم کی روشنی میں دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیش تر سوالات کے ذریعہ وہ میرے بخش اور ساحل کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے ہر سوال کا تسلی بخش اور منطقی جواب دے کر ڈی ایس پی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

وہ خاصا مطمئن نظر آیا بھی تاہم اس نے کہا ”اب تمہارے چہرے کا احوال جانا جائے گا۔ ذرا پتا تو چلے، تم نے اپنے حلقے میں کتنی اور کس قسم کی تبدیلیاں کر رکھی ہیں!“

”وہ کس طرح جناب؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”آپ میرے چہرے کا احوال کس طرح دریافت کریں گے؟“

”اس کام کے لیے ہمارے پاس ماہرین موجود ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”تھوڑی دیر پہلے انہوں نے تمہارے ساتھی میر بخش کے چہرے پر بھی خاصا ”غورو خوش“ کیا ہے۔“

پھر ڈی ایس پی نے ایک اپ جانچنے اور پرکھنے کے دو ماہرین کو اس کمرے میں بلوایا۔ ڈی ایس پی کی حکم نامہ دایت پر انہوں نے میرے چہرے کو ”ٹھوٹک بجا“ کر اور کھسک کر دیکھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ماہرانہ تحقیق کے بعد انہوں نے ڈی ایس پی کو بتایا کہ وہ میرا اصل چہرہ تھا۔ اس پر کسی قسم کا میک اپ یا ماک میک اپ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی میں نے اپنا خلیہ تبدیل کرنے کے لیے کسی نوعیت کی کامیمنگ سرجری کروائی تھی ہے۔

اس تسلی بخش رپورٹ کے بعد وہ ڈی ایس پی کے اشارے پر ٹرائل روم سے رخصت ہو گئے اور ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”مسٹر مقصود! یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم درحقیقت وہی ہو جو نظر آ رہے ہو لیکن اب تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہو گا کہ تم گناہگار نہیں ہو۔“

”یہ ثبوت میں آپ کو کس طرح دے سکتا ہوں

جناب؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں ڈی ایس پی سے پوچھا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی!“

اس نے کہا ”یا اکل اسی طرح جیسے تمہارے ساتھی میر بخش نے ثابت کیا ہے کہ وہ منگل سنگھ نہیں۔“

ڈی ایس پی کے ذوق مندی انداز نے میرے جسم میں ریختی ہوئی چیونٹیاں پھونڈ دیں۔ میں نے ابھین زدہ مگر خطرناک لہجے میں پوچھا ”میر بخش نے کس طرح یہ ثابت کیا ہے کہ وہ منگل سنگھ نہیں؟“

”پانسٹر قبول کر۔“ ڈی ایس پی نے سنجیدگی سے کہا اور ایک مخصوص اشارہ بھی کیا۔

میں اچھل پڑا ”کیسا کیا چاہ رہے ہیں آپ؟“

”میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔“ ڈی ایس پی نے بدستور سنجیدگی سے کہا ”تم کوئی انگوٹھا چوستے پئے نہیں ہو جو میرا مطلب نہ سمجھ رہے ہو۔“

”نکرمیں۔ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟“ میرے لہجے میں احتجاج تھا۔

”جیسے میر بخش نے کیا ہے۔“ ڈی ایس پی اپنی بات بڑا رہا۔ ”تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تم گناہگار نہ ہو، کوئی ہتھ نہیں بلکہ متقصود نامی ایک مسلمان ہو۔“

میں متذبذب نظر سے ڈی ایس پی کو دیکھنے لگا۔

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”اس آزمائش سے تو تمہیں ہر صورت گزرتا ہو گا۔“

مجھے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان کی پہچان کے لیے وہ کڑی آزمائش بڑی مستند تھی۔ وقت کی مصلحت اور حالات کے تقاضے نے مجھے ڈی ایس پی کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ آنے والے چند سیکنڈ میں اٹھ کر اس امتحان میں سرخ رو ہو چکا تھا۔

اب ایک مرتبہ پھر ہمارے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں فوج ہو گیا اور میں نے ڈی ایس پی سے کہا۔

”جب ہر طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم دو لوگ نہیں جن کی گرفتاری کے لیے آپ نے ناکا لگایا ہوا تھا تو پھر نہیں جانے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے۔ اب آجی رات ہونے کو آ رہی ہے۔ ہمارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے؟“

ڈی ایس پی نے کہا ”اگر تم لوگ ہمارے مطلوبہ مجرم نہیں ہو تو پھر کیا ہو۔ تمہارے ہاتھ بھی صاف تو نہیں ہیں۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔“

”میا مطلب، ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟“ میں چیخ کر ”جرم نہیں، جرائم کو۔“ ڈی ایس پی مکاری سے

”سمجھ میں، اب وہ ہم سے کچھ ”پیدا“ کرنے کے چکر لگائے ہیں۔“ میں نے لہجے میں اشتعال کیا ”جناب! کون کون سے جرائم سرزد ہوئے ہیں؟“

”ہر سبکدوش کے گناہنے لگا“ تمہاری گاڑی کی ڈرائیونگ کے نیچے سے ایک خطرناک ہتھیار اور گولیوں کا ٹیکڑن ہوا ہے۔ تمہارا ایک ساتھی بری طرح زخمی ہے اور تم اس بات کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود منگل سنگھ گاڑی میں عموماً سے یہاں پہنچے ہو۔ گاڑی جو کسی ڈرائیور اکبر سومو کی ملکیت ہے اور اس کی نچھانے کے لیے اس کی گاڑی پر سرخ کاغذ چسپاں کیا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم لوگ عمر نہ میں کوئی سنگین واردات کر کے آ رہے ہو۔“ وہ ایک ناخوش بو کر کا تھانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا ”یہ تم کوئی ہیں یا کچھ اور بھی بیان کرو؟“

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا اور معتدل لہجے میں کہا ”ڈی ایس پی صاحب! میں ہسپتال گولیوں والے پولیسر بخش کے زخمی باز اور اس ”سیاہ سرخ“ گاڑی کے استعمال آپ کو تفصیل سے بتا چکا ہوں اور ساتھ ہی میں اپنی مجبوریوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ آپ کو میری بات کا اندازہ نہیں آتا؟“

وہ قہقہے طور پر یہ طے کیے بیٹھا تھا کہ ہمیں آسانی سے سمجھوئے گا۔ اس سے اس کی نیت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بددیانت پولیس افسر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں زیادہ سے زیادہ نشان کر کے کسی ”قائدے“ کی تلاش میں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا ”تم نے اپنی زبان اور بے بسی کی جو کہانی سنائی ہے اس پر میں آنکھ بند کر کے یقین کر لوں۔ مجرم تو بہت چلاک اور عیار ہوتا ہے۔ ایک سے ایک متاثر کن کہانی سن کر پولیس کی نیند اٹھ جاتا ہے۔ اگر ہم اسی طرح مجرموں کی باتوں سے متاثر ہو کر ہوں گے تو؟“

”نہ سننا بات ختم کر کے میری جانب دیکھا۔ میں نے نہ سننا چاہا۔“ اگر میری بات پر یقین نہیں کریں گے تو دست بردار رہو۔“ آپ کا؟“

”تم تمہاری کہانی کی تصدیق کروں گا پہلے تو۔“ وہ عیار

نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔

وہ طنز سے انداز میں زیر لب مسکرایا اور بولا ”میں سب سے پہلے عمر کوٹ میں دوڑا اور سومو سے رابطہ کروں گا جس کے نام پر گاڑی رجسٹرڈ ہے۔ ہو سکتا ہے، تم لوگ ڈرائیور کو اس کے کسی آدمی یا آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر آئے ہو۔ کچھ بھی ممکن ہے سائیں۔“

مجھے یقین ہو گیا، وہ ہمیں آسانی سے چھوڑنے کے دوزخ میں نہیں تھا۔ میں نے بات کو بدھانے کے بجائے سینٹا چاہا کیونکہ بات اگر بڑھ جاتی تو ہمارے لیے مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس بے ہودہ صورت حال سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ضروری تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”اگر میں یہ چاہوں کہ آپ کسی مزید تفتیش و تحقیق میں نہ پڑیں اور خاموشی سے ہمیں جانے دیں تو اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہو گا؟“

وہ مفتی خیر انداز میں مسکرایا اور بولا ”کافی سمجھ دار نکلتے ہو!“

”حالات کی سنگینی انسان کو سمجھ دار بنادیتی ہے ڈی ایس پی صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”آپ مطلب کی بات کریں۔“

وہ فوراً ہنسی پر اُٹھ گیا اور سادہ سے لہجے میں بولا ”تم اپنی ”رہائی“ کے لیے کیا قربانی دے سکتے ہو؟“

وہ چونک کر کھل گیا تھا اس لیے میں نے بھی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا ”ڈی ایس پی صاحب! زاری جامد تلاشی سے لگ بھگ گیارہ ہزار روپے آپ برآمد کر چکے ہیں۔ اس رقم کے علاوہ ہمارے پاس وہی گاڑی ہے جو اوپر سے سرخ اور اندر سے سیاہ ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ ریڈ اینڈ بلیک گاڑی تو ڈرائیور اکبر سومو کی ہے۔“ ڈی ایس پی نے تینسی نظر سے مجھے دیکھا ”اس کی تو تم بات ہی نہ کرو۔“

میں نے کہا ”جناب! گاڑی، گھوڑی اور عورت اسی کی ہوتی ہے جس کے قبضے میں ہو۔ اگر مذکورہ گاڑی ڈرائیور اکبر سومو کی ملکیت ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل کرپشن اور جعل سازی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ کسی بھی گاڑی کا انجن نمبر اور تینتیس نمبر آسانی تبدیل کیا جاسکتا ہے اور ملکیت تبدیل کرنا تو اس سے بھی کہیں زیادہ سہل ہے۔“ ایک

لے کر رک کر میں نے طویل سانس لی اور کہا ”آپ تو ماشاء اللہ کافی بار سوخ اور با اختیار پولیس افسر ہیں۔ آپ نے لے کون سا کام مشکل ہے!“

”تم مجھے کہتے پولیس والا سمجھ رہے ہو؟“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

مجھے بھی ناؤ آگیا۔ میں نے کہا ”آپ ہمیں چھوڑنے کے لیے جس قسم کے معاملات طے کر رہے ہیں اور ہم سے کوئی قربانی دینے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ اس سے میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے“ اسی کی روشنی میں میں نے ایک بات کہہ دی۔ خدا انخواستہ میں نے آپ کو بد عنوان افسر کہنے کی جسارت نہیں کی۔“ ایسا انداز اختیار کرنا اس وقت میری مجبوری بن گئی تھی۔

میں نے دانستہ محتاط الفاظ استعمال کیے تھے اور کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ بھی دوستانہ رہے۔ میں نے سب کچھ کہہ بھی دیا تھا اور کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا یہی تھا کہ پولیس والوں سے کوئی جھڑا مول نہ لیا جائے۔ جس طرح ہم ان کے ڈنگل میں آئے ہوئے تھے اس موقع پر وہ پہلے ڈراتے ہیں پھر ”جان بخشی“ کے عوض لے چوڑے مطالبے سامنے لے آتے ہیں۔ ڈی ایس پی بھی کسی اونچی ”ڈیمانڈ“ کے پکر میں تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ وہ ہمیں کسی مصیبت میں پھنسانے کے بجائے ”جھیلنے“ کے موڑ میں تھا۔ اگر ہم اس کی بات مان لیتے تو وہ ہمیں خوش خوشی جانے دیتا۔ اس نے کہا ”مجھے گاڑی وغیرہ کے پکڑ میں نہ ڈالو۔ نقد کی بات کرو۔“

”وہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“ میں نے کہا ”ہمارے پاس ان گیارہ ہزار گے سوا اور کوئی رقم نہیں۔“

”تمہارا کراچی میں سونے کا کاروبار ہے۔“ ڈی ایس پی طنزیہ لہجے میں بولا ”یہاں میرے پورے خاص میں بھی تمہارا چچا ابوب خان صرائے کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ تمہارے ایک فون پر رقم کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس نے مجھے بند گلی میں گھیر لیا تھا۔ مجھ سے ایک فاش غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ خود کو زیادہ سے زیادہ متوسط طبقے کا ظاہر کرتا۔ میں نے اپنے فرضی چچا اور خود کو سونے کے کاروبار سے متعلق ظاہر کر کے بڑی سنگین غلطی کی تھی۔ اسی کڑوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈی ایس پی چیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں واقعی انھیں میں پر گیا۔

اس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھ لیا۔ مجھے یوں

محسوس ہوا جیسے اس نے میری سوچ کی پریشانی بھانپ لی۔ پولیس والے جب کسی بے قصور کو گھیرتے ہیں تو اسے زیادہ خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے چہرے کے تاثرات نے ڈی ایس پی کو خاصا مسرور کیا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں اس پوزیشن میں آ رہا ہوں جہاں وہ مجھ سے اپنی مرضی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ بد عنوانی اور رشوت ستانی میں پاکستانی پولیس بھی اگلی پلے سے کچھ کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ڈی ایس پی نے میرے چہرے پر بدستور نظر جمائے ہوا تھا۔ اس نے جیسے لہجے میں کہا ”تم کوئی چھوٹی موٹی اسمانی نہیں، مسٹر مقصود۔ سارے لوگ بھی اصلی میں ملٹی اور سولے کھوٹ ملانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم نے ہمارے تمہارے پچانے خوب مال کما رکھا ہو گا اس لیے تم خود کو نڈیم مسکین ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

میں اس کی نیت تو بھانپ چکا تھا، ٹٹولنے کی خاطر میں پوچھ لیا ”ہماری آزادی کی آپ کی نظریں کیا قیت ہوگی؟“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا ”میں انفرادی نہیں۔“

میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا تاہم انجان بنے ہوئے پوچھا ”میں کچھ سمجھ نہیں پایا ڈی ایس پی صاحب! آپ ہماری رہائی کے بدلے کس قسم کی تین چینی کا مطالبہ کر رہے ہیں؟“

”تم بھی بہت بے وقوف ہو۔“ وہ جھنجھلاہٹ آواز میں بولا ”تین چینی کا مطلب نہیں سمجھتے!“

”میں واقعی نہیں سمجھا جناب۔“ میں نے اپنے چہرے مصنوعی حیرت سجالی۔

وہ بولا ”چینی، پولیس کی ایک پرائیویٹ اصطلاح ہے اس کا مطلب ہوتا ہے ایک لاکھ روپے۔“

”اوہ!“ میں نے پریشانی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ”تین لاکھ روپے تو بہت بڑی رقم ہے جناب! ہم آپ کا مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمارے پاس صرف گیارہ ہزار۔“

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا ”تم صرف ایک فون کا گے اپنے وارثوں کو۔ میرے پورے خاص یا پھر کراچی۔ وہ خود بدوبست کر کے دوڑے چلے آئیں گے۔“

ڈی ایس پی اب کھل کر سامنے آیا تھا۔ میرا تجربہ مشاہدہ تو یہ تھا کہ پولیس افسر عموماً براہ راست رشوت کا معاملہ طے نہیں کرتے بلکہ نیچے کے کسی پولیس اہلکار کے

ہیں اور وہ شخص ”مصیبت زدہ“ افراد کو یہ راہ بتاتا ہے مگر یہ ڈی ایس پی تو مجھ سے کھلم کھلا اور ”بقلم رشوت“ کا مطالبہ کر رہا تھا۔

میں نے کچھ سیل و جت کا مظاہرہ کیا تو وہ غصے میں آیا۔ ”میں نے فیصلہ سنا دیا“ باقی کی تفتیش بیگلے ہوگی۔“

”باقی کی تفتیش!“ میں نے انھیں زدہ لہجے میں کہا ”تمام بچے تو ہو چکی جناب۔ اب اور کون سی تفتیش کرنا رہ گئی“

وہ مکاری سے مسکرایا اور کہا ”ابھی نہایت ہی اہم بات ہیں۔ جو یہاں تمہانے میں طے نہیں ہو سکتے۔“

میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ اس نے لفظ ”اہم“ پر زور دیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ڈی ایس پی یا اسے بڑے ریک کا کوئی بھی افسر مجرموں یا ملزموں کو شاکی غرض سے کہیں بھی لے جاسکتا تھا اور اس سلسلے اسے وزیر صاحب کی اجازت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے جانے والوں میں اگر کوئی خوب صورت لڑکی یا لڑکا شامل ہو تو پھر زیادہ تر کسی بیگلے وغیرہ پر ہی تفتیش کی گئی۔ الغرض یہ سب کچھ مجاز افسر کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے مزاج، سرشت، فطرت اور نیت کا اس میں عمل دخل ہے۔

ڈی ایس پی نے بیگلے کا ذکر کیا تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھ ساحل جیسی ایک جوان اور خوب مت لڑکی تھی۔ اس کے حسن و جمال اور دلکشی میں کوئی شک نہیں تھا۔ میں نے سوچا، تیس رشوت خور ڈی ایس پی کی ہمارے ساحل پر تو نہیں جی ہوئی تھی؟ ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔

میں شعوری اور لاشعوری طور پر محتاط ہو گیا اور ڈی ایس پی سے پوچھا ”جناب! ایسے کون سے معاملات باقی ہیں تفتیش کے لیے کسی بیگلے پر جانا ضروری ہے؟“

”میں مجرم ہو، چھتیس سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں۔“

میں نے کہا ”جناب! اصول تو یہ ہے کہ ملزم یا مجرم جس شخص کے پاس رشوت خور رہتا ہو، انہیں اسی متعلقہ شخص سے رشوت ختم کرنے کے لیے لے جایا جاتا ہے جیسا کہ ہمارے دستور کے مطابق ہے۔ ہمیں اس سے آگے کسی بیگلے پر رشوت ختم نہیں ہونا چاہیے۔“

اس نے غور کر لیا جانے والی نظریں مجھے دیکھا اور کہا ”میں مجھے“ پولیس، پولیس“ پڑھاؤں گے۔ اتحق انسان“

میں نے اپنی تمام عمر اسی جھگڑے میں گزار دی ہے۔ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کر کے تفتیش کے لیے کس متعلقہ بندہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کون کون سے مقامات غیر متعلقہ ہیں۔“

وہ میرے سوالات سے خاصا بدہم ہو رہا تھا اور میری کوئی تاویل یا دلیل سننے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایس آئی کو اپنے پاس بلایا اور تھکانے لہجے میں کہا۔

”مجرموں کو بیگلے پر پچانے کا بندوبست کرو۔ کبھی سیدھی انگی سے ٹھکانا نظر نہیں آتا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس موقع پر کسی قسم کا احتجاج یا مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ وہ فوری خیال یہ تھا کہ تھکانے کی بہ نسبت کسی پرائیویٹ بیگلے پر مجھے ہاتھ پاؤں کو ”کھولنے“ کا زیادہ اچھا موقع مل جاتا۔ راستے میں بھی کوئی کارروائی ڈالی جاسکتی تھی۔ جب وہ پولیس افسر اپنی پیداکے پکر میں ہمیں پریشان کرنے پر تیار ہوا تھا تو پھر مجھے یہ حق حاصل ہو جاتا تھا کہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ”کھلو خلاصی“ کے لیے کچھ بھی کر کر دوں۔

ڈی ایس پی کی ہدایت پر ہمیں دوبارہ اسی دبا کل میں بٹھایا گیا جس میں ہم ناکا کے مقام سے تھکانے پہنچے تھے۔ ہماری گاڑی کو وہیں تھکانے میں کھڑا رہنے دیا گیا۔ ہم تینوں کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور مسل پولیس والوں نے ہمیں باقاعدہ نشاندے پر بھی رکھا ہوا تھا۔

سب سے آگے ڈی ایس پی کی چیپ تھی۔ اس کے پیچھے وہ موبائل جس میں ہم تینوں دو مسل جوانوں کی نگرانی میں موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک پولیس والا ہی تھا۔ اس مرتبہ تھکانے دار ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ اس کا مسل باڈی گارڈ بھی چیپ میں موجود تھا۔

موبائل کی پیچڑ سیٹ پر سب انسپکٹر موجود تھا۔ میں نے سوچا، اگر راستے میں کوئی شہری موقع ہاتھ آتا تو کوئی ترتیب آزمائے کی کوشش کون گا۔ اس خیال پر عمل درآمد کے لیے ضروری تھا کہ وہ ”موقع“ مجھے کسی ایسی جگہ میسر آئے جہاں ویرانی ہوئی کہ رات کی تاریکی کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔

پورے راستے میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کیونکہ مشکل سے اندر میں منٹ بعد ہم اس بیگلے پر پہنچ گئے جہاں ڈی ایس پی تفتیش مزید کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک عام سا بظاہر تھجو تباہی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ گیٹ پر مسل گارڈ موجود تھے جن کا تعلق ظاہر ہے پولیس ہی

کے ٹھکے سے ہو گا۔ وہ بنگلا دو منزلہ تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں کوئی فیملی وغیرہ رہائش پذیر نہیں تھی۔ گیٹ پر متعین مسلح گارڈز کی تعداد دو تھی۔ بنگلے کے اندر بھی ملازم صورت دو افراد موجود تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس تھے مگر یہ بات طے تھی کہ وہ بھی ٹھکے پولیس کے کانسٹیبل وغیرہ ہی ہوں گے۔

ہمیں بنگلے کی زیریں منزل پر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ کمرہ اپنی بیشک کے اعتبار سے ڈرائنگ روم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کمرے کی دیوار پر لگے وال کھاک میں وقت دیکھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس وقت دو بجتے والے تھے۔ ڈی ایس بی نے ہمارے ساتھ آنے والے اے ایس آئی سے کچھ کھسپھسپ کر کے اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

یہ اے ایس آئی ان دو افراد میں سے ایک تھا جو موبائل میں ہماری نگرانی پر مامور کیے گئے تھے۔ اس اے ایس آئی کا نام عبدالرزاق تھا۔ موبائل کا ڈرائیور دوسرا ”نگران“ اور سب انسپٹر موبائل لے کر واپس تھانے چلے گئے۔

ڈی ایس بی میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”تم آؤ میرے ساتھ۔ ہم دوسرے کمرے میں مذاکرات کریں گے۔“ میں نے کہا ”میں مذاکرات کرنے میں کیا قباحت ہے؟“

”یہاں ٹیلی فون نہیں۔“ ڈی ایس بی نے کہا۔ ”تو پھر؟“ میں نے سوایہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر کہہ کہ تم یہاں سے اپنے گھر والوں یا چچا سے رابطہ نہیں کر سکو گے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”میں تمہیں جس کمرے میں لے کر جا رہا ہوں وہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔“

میں ڈی ایس بی کی نیت کو بہت وضاحت کے ساتھ جان گیا تھا۔ وہ ہمیں شرافت سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر کے وہ ہمارے لواحقین سے ایک بھاری رقم ایٹینا چاہتا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ میں نے جو بیان دیا تھا وہ جی بے درودھ تھا۔ میرے پورے خاص یا کراچی میں میرا کوئی رشتہ دار تو کیا، جان بچان کا کوئی آدمی بھی نہیں تھا۔

اس مرحلے پر مجھے ڈی ایس بی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے میں ایک فائدہ نظر آیا۔ میں مذاکرات کے چکر میں کسی طرح ڈی ایس بی کو پھنسا لیتا تو مجھے سوچنے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ وقت مل سکتا تھا۔ اگر مجھے وہاں اپنی بچت اور

چھٹکارے کے لیے مارا ماری بھی کرنا پڑتی تو میں اس سے نہ کرنا۔ ڈی ایس بی کے ساتھ جانے سے مجھے اس بنگلے اندرون کو بہتر طور پر سمجھنا کا موقع بھی مل رہا تھا۔

میں نے ڈی ایس بی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا ”جناب! اب تو ہم آپ سے بہت کرم پر ہیں۔ آپ جہاں لے جائیں گے، چلے جائیں گے۔“ میں نے دانستہ عجز و انکار کا رویہ اختیار کیا تھا۔ ایس آئی عبدالرزاق وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ساحل کے پاس رک گیا جبکہ ڈی ایس بی کا بازو گاڑنا ہمارے ساتھ ہو گیا۔ وہ ایک صحت مند اور چوکس پولیس والا تھا جس کی عمر لگ بھگ تیس سال ہوگی۔ اس نے ایک ہی ٹوپی کھانکھوٹ بڑے ہارنر انداز میں تھام رکھی تھی۔

ڈی ایس بی مجھے بنگلے کی بالائی منزل پر لے آیا۔ بنگلے کے اندر سفر کرتے ہوئے میں نے ایک ایک شے کو اپنی نظریں رکھا تھا۔ تاکہ بوقت ضرورت کسی قسم کی کارروائی میں کی دقت پیش نہ آئے۔ اس وقت میرے ظاہری اور باطنی حواس پوری طرح متحرک ہو چکے تھے۔

میں ڈی ایس بی کی مصیبت میں ایک کمرے میں داخل ہوا تو اس کا مسلح گارڈ بے پردہ روڑے پر ہی رک گیا۔ ڈی ایس بی نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ بیٹنے کے لیے صوفے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک سنگ کم بیڈ روم تھا۔ ٹیلی فون اسٹینڈ پر فون سیٹ بھی نظر آیا تھا۔ ایک دیوار پر انٹر کام سیٹ لگا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا انٹر کام سیم دو تین منزلوں پر رابطے کے لیے نصب کیا گیا تھا۔ اگر واقعی زیریں منزل پر فون کی لائن موجود نہیں تو اس انٹر کام سے اچھا خاصا کام چلایا جاسکتا تھا۔

ڈی ایس بی نے مجھے ایک صوفے پر بیٹنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کے اندر ایک اینٹی کی نظر ڈالنے کے بعد سوال کیا۔

”یہ عجیب سی بات نہیں کہ زیریں منزل پر فون کی سہولت موجود نہیں اور یہاں فون سیٹ رکھا ہوا ہے؟“ ”تم بولتے بہت ہو۔“ اس نے تیز آری سے کہا ”میرے پاس تمہارے اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔“ پھر اس نے معنی خیز انداز میں بتایا ”جس چیز کی جہاں ضرورت ہو، اسے وہیں پر ہونا چاہیے۔ یہ کمرہ عموماً میرے استعمال میں رہتا ہے اس لیے ٹیلی فون کی سہولت بھی یہیں نہیں آئی۔“

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، وہ جھوٹ کا سارا لہر

مجھے وقف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زیریں منزل پر بھی اس فون کی کوئی لائن موجود ہوگی مگر وہ مجھ سے ٹینڈ کی بات کرنے کے لیے یہ ڈراما چاہ رہا تھا۔ میں فون کے موضوع کو پس پشت ڈال کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جلد ہی وہ اصل موضوع پر آگیا ”مسٹر مقصود! پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“

”میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں جناب۔“ میں نے کہا۔

”سائیں، یہ بات تو تم ذہن سے نکال دو۔“ وہ حتی لہجے میں بولا ”میرا ہزارہ روپے میں تو تین تم تینوں کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ تم یہاں سے فون کر کے اپنے لواحقین سے تین پتی رقم منگوانے کا بندوبست کرو گے۔ فی بندہ ایک پتی۔ کیا سمجھے؟“

میں اسے باتوں میں الجھا کر زیادہ سے زیادہ سہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی غیر مسلح نہیں ہو گا مگر اس کی وردی کے اوپر کسی قسم کے اسلحے کی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا لباس کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے متعذر لہجے میں کہا ”ڈی ایس بی صاحب! اگر آپ نے یہی بات کہنا تھی تو یہاں بنگلے پر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تو تھانے میں بھی یہ مطالبہ کر چکے تھے۔“ ”در اصل میں تھانے دار کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا۔“ وہ ایک آنکھ دبا کر بولا ”اگرچہ میں نے تھانے دار کو ناکے والے مقام کی نگرانی کے لیے بھیج دیا تھا لیکن اس کے تھانے کا عملہ اسے صورت حال سے آگاہ کر سکتا ہے۔ اس لیے احتیاط بہت ضروری ہے۔ یہ بنگلا میرے تعزیر میں رہتا ہے۔ کسی کو کالوں کا خبر نہیں ہوگی کہ ہمارے درمیان کیا ”ڈیل“ ہوئی ہے۔“

وہ مسلسل درودھ کوئی شے کام لے رہا تھا۔ اس موقع پر میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں، تم اس تھانے کے عملے سے پردہ پوشی کے لیے ہمیں اس بنگلے پر لے آئے ہو مگر اسے ایس آئی عبدالرزاق کی یہاں موجودگی کا کیا جواز ہے تمہارے پاس؟ عبدالرزاق بھی تو اسی تھانے کے عملے میں شامل ہے۔

اگر میں واقعی اس سے یہ سوال کرتا تو وہ میری تسلی کے لیے کوئی نہ کوئی جواب بھی دے دیتا چنانچہ میں نے دوسرے زاویے سے اسے کر دیا۔

”ڈی ایس بی صاحب! آپ بھی عجیب بات کر رہے

ہیں۔ تھانے دار کی نگرانی میں تو ہمیں گرفتار کیا گیا ہے اور وہ تھانے تک بھی ہمارے ساتھ آیا تھا“ ازاں بعد آپ کے بیان کے مطابق آپ نے اسے واپس ناکے پر بھیج دیا ہے۔ تھانے دار اس واقعے سے لاعلم کیسے رہ سکتا ہے؟“

”وہ اس واقعے سے واقعی لاعلم نہیں رہ سکتا۔“ وہ بولا ”مگر میں اس سے صرف یہاں کی ”ڈیل“ چھپانا چاہتا ہوں ورنہ وہ بھی مجھے دار بن جائے گا۔“

وہ مرتضیٰ افسریت کاٹا ہوا تھا۔ مجھے بے وقوف بنانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے گنوا نہیں چاہتا تھا حالانکہ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایسے ”معاملات“ میں تمام جھوٹے ڈی ایس بی کیوں اس کے گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔

”غرض کریں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ”ہم آپ کی ”خوابش“ پوری کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ ہمیں چھوڑ دیں گے نا؟“

”بالکل چھوڑ دوں گا۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”اس صورت میں آپ تھانے دار کو کیا جواب دیں گے؟“

”میں اس کا افسر ہوں۔“ وہ غراہٹ سے مشابہ لہجے میں بولا ”وہ مجھے جواب دینے کا بند ہے“ میں نہیں۔ میں ڈی ایس بی ہوں۔ ڈی بی پر نشنڈٹ پولیس۔ کیا سمجھے؟“

اس کی برہمی ظاہر کر رہی تھی مجھے میں نے اس کی ذم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ میں نے محذرت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہمیں چھوڑنے کے لیے آپ کو اپنے سامنے کوئی نہ کوئی جواز تو رکھنا ہو گا!“

”اس کے سوا سہ تو ہو سکتے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”دن سسٹی ٹائن زندہ باد۔“

”یہ دن سسٹی ٹائن کیا شے ہے جناب!“ میں نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا ”یہ ایک قانونی دفعہ ہے۔“ دن سسٹی ٹائن“ یعنی دفعہ ایک سو انتر (۱۶۹) بہت کام کی چیز ہے۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میں اس دفعہ کے تحت رپورٹ بنا کر اپنے سینئر کو بھیج دوں گا کہ میں نے منگل ٹکٹ ”ڈی ایئر“ اور ممتاز کے شے میں ناکے سے جن تین افراد کو گرفتار کیا تھا، کڑی تفتیش کے نتیجے میں یہ اصل مجرم ثابت نہیں ہو سکے۔ میں

نے تصدیق کر لی ہے کہ یہ منگل سنگھ گنڈا سنگھ اور مغویہ ممتاز نہیں ہیں بلکہ یہ علی الترتیب میر بخش، مقصود احمد اور لیلیٰ ہیں۔ ان تینوں کا تعلق معاشرے کے معزز طبقے سے ہے لہذا میں انہیں باعزت جاننے کی اجازت دے رہا ہوں۔

اپنی بات ختم کر کے وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ کو شیطانی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے متاثر ہوتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا ”واقعی جناب! وہ سنہ تین تو بڑی حیرت انگیز دفعہ ہے!“

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا اور بالکل کاروباری لہجے میں بولا ”تم اپنے بچے کو فون کرو گے یا پھر کراچی میں رابطہ کرنا چاہو گے؟“

وہ گھوم پھر کر اسی طرف گلیا تھا جس رخ سے میں بچتا چاہتا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا ”میں اس سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے دانستہ اپنا رویہ پلٹ کر اس طرح کار کھاکہ وہ مجھ سے خوش امید بنانے پر مجبور ہو جائے وہ مجھے مائل بہ آمادگی دیکھتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے“ میں تمہیں مشورے کا موقع دیتا ہوں۔“

”تمہیںک یو سر!“ میں نے اسے مزید خوش کرنے کی خاطر کہا۔

وہ بولا ”انہیں اوپر بلاؤں یا تم نیچے جا کر ان سے ملنا چاہتے ہو؟“

میں اپنے ساتھیوں کو گراؤنڈ سے اوپر لا کر اپنے لیے صورت حال کو قدرے مشکل اور پیچیدہ بنانے کے حق میں نہیں تھا پناچہ میں نے دو لوگ انداز میں کہا۔

”میں وہیں جا کر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ ڈی ایس پی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اپنے کھانکھوف ہزار باڑی گاڑ کے ساتھ مجھے زیریں منزل پر پہنچ دیا۔ باڑی گاڑ بہت مختار اور تجربہ کار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک مناسب اور محفوظ فاصلے سے مجھے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے تھا۔ ویسے بھی میں گاڑ کے ساتھ کسی قسم کی شکایت آرائی کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ ڈی ایس پی تھا۔ اگر وہ کسی طرح میرے شکنجے میں آجائے تو میں جنگلے کی فضا کو اپنے حق میں ہموار کر سکتا تھا۔ میں جس قسم کی صورت حال سے گزر رہا تھا اس میں ذرا سی تسلی بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے بے گت خیر ثابت ہو سکتی تھی۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے زیریں منزل کے ڈرائنگ روم

نما کرے میں آگے۔ وہاں اے ایس آئی عبدالرزاق میر بخش اور ساحل کو اپنی ”نظر“ میں رکھے ہوئے تھا۔ ڈی ایس پی کے گاڑ نے مجھے ڈرائنگ روم میں پھنکار کر عبدالرزاق سے مختصر بات کی جس کے نتیجے میں وہ گاڑ کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے پاس چلا گیا۔

گاڑ نے سخاوت سے مجھ سے کہا ”تمہیں جو بھی مشورہ کرنا ہے جلد از جلد کرو۔“

میں اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں متشکر نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میر بخش نے بھی آواز میں احتیاط کیا ”کیا ہوا سائیں؟“

ساحل بھی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”خیریت تو ہے وجدان!“

ساحل نے مصلحت کے قحط کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرگوشیاں انداز اختیار کیا تھا۔ میں نے انہیں مزید آہنگی سے بولنے کی تاکید کرنے کے بعد کہا۔

”ابھی تک تو تب خیریت ہی ہے اور اس خیریت کو ہم سب نے مل کر مزید بخیریت بنانا ہے۔ میں ڈی ایس پی سے تھوڑی مصلحت سے کر آپ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بہانے یہاں آیا ہوں۔“

”تھم سائیں۔“ میر بخش دروازے میں کھڑے مسلح افراد کی طرف کن انگوٹھیں دے دیتے ہوئے بولا۔

اس نے آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہ سن سکے۔ اگر واقعی دیواروں کے کان ہوتے ہیں تو مجھے امید تھی کہ وہ بھی ہماری گفتگو کو سن نہیں پاری ہوں گی۔

میں نے بار بار باری دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”ڈی ایس پی کسی بھی طرح جان چوڑنے پر تیار نہیں۔ اس نے ہماری نجات کے لیے واٹگف الفاظ میں پورے تین لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔“

”اتنی رقم ہمارے پاس کہاں سے آئے گی؟“ ساحل کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

میں نے کہا ”ڈی ایس پی نے اس رقم کی ”تمہ“ کا طریقہ بھی بتایا ہے۔“

”وہ کیا سائیں؟“ میر بخش اظہاری لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

”وہ کہہ رہا ہے کہ میں میری پوری خاص میں اپنے بچا ایوب خان کو فون کروں۔“ میں نے کہا ”یا پھر کراچی اپنے گھر والوں کو فون کر کے اس رقم کا بندوبست کرنے کی تاکید کروں۔“

جب تک کسی بھی وسیلے سے تین لاکھ کی رقم اس جنگلے پر نہیں پہنچے گی، ہم ہیں یہ اتنی زور اپنی کلائیوں پر سجائے گن پوائنٹ پر سانس لیتے رہیں گے۔“ اپنی بات ختم کر کے میں نے جھکری زدہ دونوں کلائیوں کو اشارہ کرنے والے انداز میں ہلکا سا جھٹک دیا۔

ساحل نے مایوسی سے کہا ”لگتا ہے یہ کہاں بھی ٹیل ہوئی!“

”ہاں سائیں۔“ میر بخش تائیدی انداز میں بولا ”میری پوری خاص اور کراچی والی کہانی تو سراسر فرضی تھی۔ آپ ان دو بدلوں میں سے کہیں بھی فون کر کے ایک پیرا تک نہیں منگوا سکتے۔“

”اب کیا ہو گا وجدان؟“ ساحل نے گھیر لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا ”میں تم دونوں کی طرح ابھی اتنا یوس نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے کسی بھی قسم کی صورت حال میں مایوس ہونا نہیں سیکھا۔“

”تو کیا تم یہاں اپنی ”چی“ کی قوت آزمائو گے؟“ ساحل نے پوچھا۔

میر بخش نے ”چی“ کے ذکر پر ابھرنے زدہ نظروں سے پہلے مجھے اور پھر ساحل کو دیکھا۔ اس کی ابھرنے بجائیں۔ ہم نے اس کے ساتھ کبھی ”چی“ کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور از خود وہ اس پر اسرار قوت کے بارے میں بھلا کیا واقفیت رکھ سکتا تھا۔ میں نے ساحل کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جب تک کوئی بھی صورت حال میرے کنٹرول سے باہر نہیں ہو جاتی، میں کسی بھی پراسرار یا ماداری قوت کا استعمال نہیں کروں گا۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

وہ مطمئن انداز میں بولی ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ موجودہ صورت حال تمہارے ہاتھ میں ہے؟“

”اگر ہاتھ میں نہیں تو ہاتھ سے زیادہ دور بھی نہیں۔“

میں نے دو معنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”اگرچہ میری کلائیوں میں جھٹکوی لگی ہوئی ہے لیکن ابھی میری ”دراز“ دچی“ منلوں نہیں ہوئی۔ بس میں کسی مناسب موقع کی تاک میں ہوں۔“

ساحل نے پوچھا ”اس موقع کے انتظار میں تم ڈی ایس پی کے تین لاکھ روپے کے مطالبے کو کب تک شلتا رہو گے؟“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔“ میں نے کہا ”اسی لیے میں مشورے کا بہانہ کر کے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔“

ہوں۔“

”وہ آئیڈیا کیا ہے؟“ ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا ”میں ڈی ایس پی سے جا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی کو بھیج کر رقم منگوا لیتا ہوں۔“

”ساتھی کو بھیج کر؟“ ساحل نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”کون سے ساتھی کو بھیج کر تم اتنی بڑی رقم منگوانے کی بات کر رہے ہو۔ اور کہاں سے؟“

میں نے ذریعہ مسکراتے ہوئے کہا ”میں میر بخش کو میری پوری خاص بھیجنے کی بات کروں گا اور ساتھ ہی ڈی ایس پی سے یہ فرمائش بھی کروں گا کہ وہ اس کی جھٹکوی کھول دے۔“

”آپ بھی بہت کمال کی باتیں کر رہے ہو سائیں۔“ میر بخش نے انجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا ”میں میری پوری خاص جا کر کس سے رقم لاؤں گا۔ اتنی بڑی رقم مجھے کون دے گا اور وہ بھی اس وقت رات کے تین بجے۔ ناممکن سائیں“

میں نے کہا ”میری دشمنی میں ”ناممکن“ کا لفظ نہیں ہے میر بخش!“

وہ میرے لہجے میں بھری ہوئی سنجیدگی سے چونک اٹھا۔ تاہم متذبذب لہجے میں پوچھنے لگا ”سائیں! آپ خود ہی بتاؤ“

میں نے اتنی بڑی رقم کہاں سے لے کر آؤں؟“

میں نے اس کی ابھرنے کو سلسلے میں بدلنے کے لیے وضاحت ضروری سمجھی اور کہا ”دیکھو میر بخش! میں بتا چکا ہوں کہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے اور ”آئیڈیا“ کی خاطر بہت سی بظاہر ناممکن باتوں کو بھی ممکن تصور کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کسی بھی صورت نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہیں رقم کے سلسلے میں چنداں پریشان نہیں ہونا۔ اور نہ ہی تمہیں واپس آنے کی ضرورت ہے۔“

وہ مزید الجھ گیا، لگتے زدہ آواز میں بولا ”جیسے۔“

آپ مجھے کیوں بھیج رہے ہو سائیں۔“

”تمہیں یہاں سے نکلنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔“ میں نے اس کی ابھرنے کو دور کرتے ہوئے کہا ”اس طرح تم از کم ہمارا ایک ساتھی تو پولیس والوں کی حراست سے نکل جائے گا۔ تم باہر آزاد دنیا میں رہ کر ہمارا انتظار کرنا۔ ہم بھی بہت جلد تم سے آئیں گے۔“

وہ قطعیت سے بولا ”سائیں! میں آپ کو ان سنگین حالات میں چوڑ کر ہرگز نہیں جانوں گا۔ میری جان آپ پر قربان۔ میں آپ کو رہائی دلانے کے لیے اپنی جان داؤ



پر تو لگا سکتا ہوں مگر پیٹھ دکھا کر اپنی جان نہیں بچا سکتا۔  
میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”بے وقوفی کی باتیں  
مت کرو۔ تمہارے اس عمل سے کہیں بھی بزدلی ظاہر نہیں  
ہوگی۔ اگر تم کسی طرح آزاد ہو کر میرے پور خاص پہنچ گئے تو  
ہمارے لیے زیادہ آسانی سے کچھ کر سکو گے۔“ ایک لمحے کا  
توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ”اگر میں تمہیں کسی بھی  
ہائے میں سے جانے کو کہہ رہا ہوں تو اس میں کوئی بھلائی  
ہی پوشیدہ ہے۔“

وہ تذبذب میں نظر آنے لگا۔ ساحل نے میری تائید  
کرتے ہوئے کہا ”میر بخش! وجدان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہیں  
فوراً اس کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔“  
میں نے کہا ”تم میرے پور خاص میں اپنے قیام کی کوئی جگہ  
مجھے بتا دو۔ ہم یہاں سے نکلنے ہی سیدھے وہاں آجائیں  
گے۔“ اسی وقت دروازے میں کھڑے ڈی ایس بی کے مسلح  
گاردز نے وارننگ کے سے انداز میں یہ آواز بلند کہا ”ہمت  
ہو چکے راز نواز۔ اب بس بھی کرو۔“

میں نے حکم آتیز سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف  
دیکھا۔ وہ متاثر لہجے میں بولا ”میں نے آپ کے پوچھنے پر  
میرے پور خاص کے ایک علاقے رتن آباد کا نام بتایا تھا۔ وہاں  
میرا ایک جانے والا رہتا ہے۔ اس کا نام اللہ یار ہے۔ سبزی  
منڈی میں اس کی دکان ہے۔ آپ کسی سے بھی اس کے  
بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ اللہ یار خاصا مشہور بندہ ہے۔ میں  
اس کے پاس رگ کر آپ کا انتظار کروں گا لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔  
وہ بولا ”ہم پولیس والوں کو بتا چکے ہیں کہ رتن آباد میں  
آپ کا چچا (فرضی) ایوب خان رہتا ہے۔ اس طرح میرے  
اور آپ کے لیے کوئی پریشانی پیدا نہ ہو جائے۔ یہ لوگ تو  
سیدھا میرے پور خاص کا رخ کریں گے اور خاص طور پر رتن آباد  
میں ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”بعد میں جو پریشانی پیدا ہوگی“ اس کے بارے میں بعد  
ہی میں سوچا جائے گا۔“ میں نے اٹل لہجے میں کہا ”میری الحال تم  
وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔“  
”جو حکم سائیں!“ وہ مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ  
جوڑتے ہوئے ہوا۔

کے بارے میں مجھے یقین تھا ورنہ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا  
تھا۔ میں اندر آگیا تو ڈی ایس بی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا  
اشارہ کیا۔

وہ پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے ایک خاص فاصلہ رکھے  
ہوئے تھا۔ میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا تو اس نے  
سوال کیا۔  
”ہو گیا مشورہ؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا ”پھر کیا  
لے کیا ہے تم نے؟“  
میں نے کہا ”میں آپ کی مطلوبہ رقم دینے کو تیار ہوں  
مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔“

وہ میرے اشارے سے تاج اٹھا، برہمی سے بولا ”تم اس  
وقت ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھے ہو اور میں  
ایک اعلیٰ پولیس افسر ہوں۔ تم میرے سامنے کوئی شرط رکھنے  
کی بات کر رہے ہو۔ جانتے ہو؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟“  
اسے میری بات بہت زور سے لگی تھی۔ میں اس موقع  
پر اسے خود اذہان ناراض کر کے کام لگانا نہیں چاہتا تھا اس لیے  
فوراً خوشامدانہ رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”سرا! آپ میری بات کو کسی اور انداز میں لے گئے  
ہیں۔ میری کیا مجال کہ میں آپ سے اپنی کوئی شرط منوا  
سکوں۔“

”پھر تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ وہ بدستور سخت لہجے میں  
بولا۔ ”جناب! میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ رقم کا  
بندوبست کرنے کے لیے آپ مجھے ایک سہولت دے دیں تو  
آپ کی سہرا ہی ہوگی!“

”کس قسم کی سہولت؟“ اس کے استفسار میں دلچسپی  
شامل تھی۔

میں نے نہایت ہی عاجزی سے کہا ”جناب! اگر آپ  
میرے ساتھی میر بخش کی ہتھکڑی کھولا دیں تو میں اس  
میرے پور خاص پہنچ کر چچا سے تین لاکھ روپے کی رقم منگوا سکتا  
ہوں۔“

میری تجویز سن کر وہ ہٹا گیا اور غصیلے لہجے میں بولا ”تم  
مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر تم کسی قسم کے پکڑ میں ہو تو یہ  
خام خیالی ہے تمہاری۔ رقم لانے کے لیے نہ تو میر بخش کی  
ہتھکڑی کھولنا ضروری ہے اور نہ ہی اس کا میرے پور خاص جانا۔  
تم ابھی یہاں سے ایک فون کھڑا کرنا چاہو۔ وہ علی الصبح  
رقم لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔“

”سرا! آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

میں نے مسکین صورت بنا کر ڈی ایس بی کو شیشے میں اتارنے  
کی سعی کی ”میں اپنے چچا ایوب خان کو فون نہیں کر سکتا۔“  
میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈی ایس بی  
ہے بھلا تھا۔ وہ ناراضی زدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔  
”تم اپنے چچا کو فون کیوں نہیں کر سکتے؟“

”اس لیے کہ وہ رات کے اس آخری پہر اپنے گھر پر  
دگاہ۔“ میں نے با اعتماد لہجے میں کہا ”اور چچا کے گھر فون کی  
سہولت موجود نہیں۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا  
پھر جلدی سے بولا ”چلو ٹھیک ہے، تم پھر کراچی میں اپنے  
اندھن سے۔۔۔ وہاں تو تمہارے گھر میں ضرور فون  
ہوگا! میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پلاننگ کے مطابق  
تفصیلاً آگے بڑھا دیا۔

”جناب! میں اس وقت اپنے گھر فون کر کے اس قسم کی  
خطرناک اطلاع نہیں دے سکتا۔“  
”وہ کیوں؟“ وہ تھلا کر بولا ”اس اطلاع سے وہاں کون  
کی قیامت آجائے گی؟“

میں نے سنجیدگی سے کہا ”قیامت ہی تو آجائے گی  
جناب۔ پھر میں نے اپنی آواز کو جذبات سے لبریز کرتے  
ہوئے ڈی ایس بی کو بتایا ”سرا! میری والدہ دل کی مرلیضہ ہیں۔  
ان کا بالی پاس بھی ہو چکا ہے۔ وہ یہ اندوبناک خبر سننے ہی  
برداشت کی آخری حد سے گزر جائیں گی۔ آپ تو ماشاء اللہ  
خامے سیانے ہیں۔ برداشت کی آخری حد سے گزرنے کا  
مطلب جانتے ہوں گے؟“

اس نے شک زدہ نظر سے مجھے گھورا اور ٹیلی فون سیٹ  
کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ”تم مجھے اپنے کھر کا نمبر  
بتاؤ۔ میں خود تمہارے باپ سے بات کرنا ہوں۔ میں ایسے  
طریقے سیکھتا ہوں کہ بات کروں گا کہ تمہاری ماں پر کسی قسم کے  
صرصے کا اثر نہیں ہوگا۔“

”کوئی فائدہ نہیں جناب۔“ میں اپنے طریقہ واردات پر  
ڈابھا ”نئی سال پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں  
صرف میری والدہ اور چھوٹا بھائی ہے۔ فون ہر صورت میں  
والدہ ہی انیڈ کریں گی۔ اگر بالفرض محال، چھوٹے بھائی نے  
فون اٹھا لیا تو وہ اپنے بیچنے میں والدہ صاحبہ کو اور بھی ڈرا  
دے گا۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”تو اس کا۔۔۔“ ”جناب! یہ ہوا کہ تم کسی بھی طرح میری بات  
نہیں مانو گے!“ وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا  
”میں طرح باتیں بناتے رہو گے۔“

میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا ”آپ میری مجبوریوں کو  
سمجھنے کی کوشش کریں جناب! میر بخش کی ہتھکڑی کھول کر  
اسے میرے پور خاص جانے دیں۔ انشاء اللہ وہ کل رقم لے کر  
آجائے گا۔“

”میں سائیں! یہ تو نہیں ہو سکتا۔“ وہ نفی میں گردن  
جھٹک کر ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم تینوں  
میں سے کوئی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔ اس بجھے میں  
رہتے ہوئے تمہیں تین لاکھ روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔“

میں نے عاجزانہ انداز میں کہا ”سرا! میں اپنی مجبوری  
آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”ہوں!“ ڈی ایس بی نے ایک گہری سانس چھوڑتے  
ہوئے کہا ”تم واقعی مجھے مجبور اور بے بس نظر آ رہے ہو مگر  
فکر نہ کرو، میں تمہاری مجبوری رفع کرنے کا کوئی بندوبست  
کر سکتا ہوں۔ تم تینوں کو کہیں آنا جانا بھی نہیں پڑے گا اور  
بغیر کہیں فون کے رقم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔  
میں اس کے بدلے ہوئے دوستانہ بلکہ ہمدردانہ رویے کو کوئی  
مفہوم یا معنی پہنانے سے قاصر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے  
وہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے لہجے سے مجھے  
کسی گہری سازش کی بو آ رہی تھی۔

میں نے اچھے ہوئے انداز میں پوچھا ”جناب! میں آپ  
کی بات سمجھ نہیں سکا!“

”میں سمجھتا ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں ہماکتے  
ہوئے بولا ”اس کمرے کو دیکھ رہے ہو! میں اکثر ویشتر یہاں  
راتیں گزارا ہوں۔ تم اسے میرا بیڈ روم بھی کہہ سکتے ہو۔“

اس نے تھوڑا وقفہ کر کے میرے چہرے کے تاثرات  
بجھانے کی کوشش کی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اگر تم  
چاہو تو میں اس کمرے کے اس حصے کو تمہارے لیے چمک میں  
بدل سکتا ہوں۔ پھر اس نے ذہل بند کی جانب اٹھنے سے  
اشارہ کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تم ابھی اور  
اسی وقت اس ”چمک“ میں تین لاکھ روپے مالیت کا ایک  
”چمک“ جمع کروادو۔ صبح تک تمہارا چمک کیش ہو جائے گا پھر  
تم تینوں ہمیشہ خوشی یہاں سے روانہ ہو جانا۔“

اس کی باتوں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں نے اس کی  
کھنکھائی اور ذلت کو آخری سرے تک تانے کی خاطر چہرے  
پر تانے لگے تاثرات سناہے ہوئے بنا۔

”جناب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس تو نہ کوئی  
چمک ہے اور نہ ہی کوئی چمک بک۔ میں آپ کی پیشکش پر  
بہت حیران بلکہ پریشان ہوں۔“

”تم اب اتنے ننھے بچے بھی نہیں ہو۔“ وہ اپنے چہرے پر خباثت کی تہ چلاتے ہوئے بولا ”تم تو ایک بلینگ چیک اپنے ساتھ لے کر پھر رہے ہو!“

پھر اس نے اپنی ناک پر ایک انگلی رکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا اور بے ہودگی سے مسکرائے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

میرے بدن کا سارا خون دماغ کو چڑھ گیا۔ ساحل کے بارے میں ڈی ایس بی کے مکروہ عزائم نے میرے تن بدن میں شرارے بھردے۔ میں نے ہر مصلحت کو بلائے طاق رکھ کر ایک جیتے کے مانند جست بھری اور ڈی ایس بی کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے صوفے کی دوسری جانب پہنچ گیا۔

وہ اس اچانک حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اور میری وحشت اب اسے کسی تیاری کا موقع دینے والی نہیں تھی۔ مجھ پر ایک جنون سا سوار ہو چکا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ ساحل کی ذات سے متعلق ڈی ایس بی کی بدگمانی نے مجھے اچانک بے قابو کر دیا تھا۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

صوفے کی دوسری طرف زمین پر لوٹ بوٹ ہونے کے دوران میں، میں ڈی ایس بی کی پشت پر پہنچ گیا اور اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو سامنے لاتے ہوئے میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی کوئی مزاحمتی کارروائی کرتا، میں نے اپنے دونوں بازو پیچھے پیچھے ہوئے اس کی چربی کی گردن کو شکنے میں کس لیا۔

ڈی ایس بی سامنے میں آگیا۔ وہ اگرچہ عمر سے مجھ سے دو گنا تھا۔ تاہم طاقت، توانائی، تکنیک اور چستی میں مجھ سے گنا نہیں کھاتا تھا۔ ہتھکڑی کی زنجیر اس کے زرخیز پر فٹ زینہ گئی تھی۔ میں نے تموزا سا زور لگایا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پیچھے ہوئے حلق سے ”خرخراہٹ“ برآمد ہونے لگی۔

میں نے موت سے زیادہ سفاک لہجے میں اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی ”ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟“ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پر اپنے بازوؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کمرے کا فرش قالین پوش تھا اس لیے ہمارے ”کراؤ“ کی آواز کمرے سے باہر نہیں جاسکی تھی ورنہ دروازے سے باہر کھڑا اس کا باڈی گارڈ ضرور مداخلت کر چکا ہوتا۔

ڈی ایس بی نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا کہ میری

مطلوبہ چابی اس کی پتلون کی جیب میں تھی۔ ساتھ ساتھ اس نے ہاتھ سے مذکورہ جیب کو تھپتھپانے کی ناکام کوشش کی۔

میں نے اپنے ہتھکڑی لگ ہاتھوں سے اس کی جیب سے چابی نکالنے کی باہر اندہ کوشش کی تو ڈی ایس بی کا چہرہ داراں کی طرح ہلکا ہلکا جھٹکا۔ اس نے اپنے مقدمہ کے حصول کی خاطر اس کی گردن کو پیٹ کی جانب جھکا چاہا تاکہ میرے ہاتھ اس کی جیب تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس کی گردن ایک ”ناگانی حد“ سے زیادہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔

میں نے خرابست آہستہ میں اسے حکم دیا ”اپنی زبان سے چابی نکال کر پھینک دو۔“ ساتھ ہی میں نے ہتھکڑی کی زنجیر کو اس کے ٹیڈے پر دبا دیا۔

میں مسلسل اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھا کہ حلق سے کوئی ”داویلا“ خارج کر کے اپنے باڈی گارڈ کو پھینک دے۔ لیکن اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس نے زندگی بھر حکم چلایا تھا، میری زبان سے اپنے بائیں جلد پہنچ گیا، دروازہ کھلنے کے بعد جو بہترین کمین گاہ لے حکم بنتے ہوئے اس کا چہرہ مسے سے سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے دہائی

وقت اس کی گردن پیٹنے کی دھار پر بھی اس کی ذرا سی غم عدولی کسی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”تو کتنا چاہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا دیا کہ وہ مجھے خطرناک نتائج کی سنگین دھمکیاں دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تاہم میں نے اس کی گردن پر آہنی زنجیر کا دباؤ بڑھانے سے سر دھبے میں کہا۔

”میرے چہرے پر برہنہ وحشت نے اس کی آنکھوں میں وحشت بھری اور اس کا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف رینگ گیا۔ میں نے اس دوران میں احتیاط کے واسطے کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ڈی ایس بی کی کوئی معمولی سا حرکت بھی باڈی پلٹ سکتی تھی۔

ڈی ایس بی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھکڑی نکول دی۔ جس چابی سے میری ہتھکڑی کوئی گئی تھی وہ ایک تختے میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے وہ سمجھا بھی اپنے قبضے میں کر کے جب میں ڈال لیا پھر اس کی گردن کو اپنے بازو کے حلقے میں کسے ہوئے میں اس کے لباس کو ٹٹول کر کسی خیمہ وغیرہ کا سراغ لگانے لگا۔

جلد ہی میرا ہاتھ ایک ریوالتور کے اجمار کو کھنچا گیا کامیاب ہوا۔ یہی لمحہ تھا جب ڈی ایس بی نے ایک اپنی

اس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔

اس نے ٹیلی فون اسٹینڈ کو ایک زوردار لٹ مار دی۔ اسٹینڈ فون سمیت میز پر رکھے کالج کے جگ سے پڑا۔ وہ بج پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی پوری گلاس بھی موجود تھا۔ ٹیلی فون اسٹینڈ کی خطرناک ٹکرائی کا پانی سے بھرا ہوا جگ دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک زوردار چھٹکا ہوا اور جگ کی کڑیاں کمرے میں ٹکرائیں۔ یہ آواز ایسی گئی گزری نہیں تھی کہ ڈی ایس بی اس کی گردن ایک ”ناگانی حد“ سے زیادہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔

میں نے خرابست آہستہ میں اسے حکم دیا ”اپنی زبان سے چابی نکال کر پھینک دو۔“ ساتھ ہی میں نے ہتھکڑی کی زنجیر کو اس کے ٹیڈے پر دبا دیا۔

میں مسلسل اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھا کہ حلق سے کوئی ”داویلا“ خارج کر کے اپنے باڈی گارڈ کو پھینک دے۔ لیکن اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس نے زندگی بھر حکم چلایا تھا، میری زبان سے اپنے بائیں جلد پہنچ گیا، دروازہ کھلنے کے بعد جو بہترین کمین گاہ لے حکم بنتے ہوئے اس کا چہرہ مسے سے سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے دہائی

وقت اس کی گردن پیٹنے کی دھار پر بھی اس کی ذرا سی غم عدولی کسی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”تو کتنا چاہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا دیا کہ وہ مجھے خطرناک نتائج کی سنگین دھمکیاں دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تاہم میں نے اس کی گردن پر آہنی زنجیر کا دباؤ بڑھانے سے سر دھبے میں کہا۔

”میرے چہرے پر برہنہ وحشت نے اس کی آنکھوں میں وحشت بھری اور اس کا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف رینگ گیا۔ میں نے اس دوران میں احتیاط کے واسطے کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ڈی ایس بی کی کوئی معمولی سا حرکت بھی باڈی پلٹ سکتی تھی۔

ڈی ایس بی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھکڑی نکول دی۔ جس چابی سے میری ہتھکڑی کوئی گئی تھی وہ ایک تختے میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے وہ سمجھا بھی اپنے قبضے میں کر کے جب میں ڈال لیا پھر اس کی گردن کو اپنے بازو کے حلقے میں کسے ہوئے میں اس کے لباس کو ٹٹول کر کسی خیمہ وغیرہ کا سراغ لگانے لگا۔

کی عکاسی کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ باڈی گارڈ اگر اس وقت کسی مہم جوئی کے چلن میں نہ جاتا، تو اپنے ساتھ ساتھ ڈی ایس بی کو بھی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر جاتا۔

کمرے کی باڈی میرے حق میں پلٹ چکی تھی لیکن کمرے سے باہر حالات تبدیل ہو گئے۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ کچھ لوگ زمیں منہل سے ہانپتی منہل کی طرف آ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ ساحل اور میرٹش نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ڈی ایس بی۔ نادار تھے۔ وہ بہت ہی نازک اور سنگین لمحات تھے۔ میں نے ڈی ایس بی کی گردن کو ایک مخصوص جھٹکا دیا، اس کے ساتھ ہی ایک زوردار فریٹ جیس ٹک اپنے سامنے بند زاپ باڈی گارڈ کی تشریف پر رسید کی۔ میرے یہ دونوں قتل بیہ وقت اور مہیا کی تھے۔

ڈی ایس بی کی گردن میرے بازو کی گرفت میں جھول گئی۔ وہ دو تین لمحوں کے لیے اٹنا غلیل ہو چکا تھا۔ باڈی گارڈ اپنی باڈی کے نہایت ہی با آبرو صے پر میری طوفانی لٹ کھا کر لڑکھایا اور ڈنگا گئے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑکی کی چوٹی پر کھٹ سے ٹکرایا۔

میں ڈی ایس بی کے چہرے کی زبردستی کو دھارے میں ہونے کی گارڈ کی جانب بڑھا۔ وہ کھڑکی سے ٹکرا کر زمین پر گرے کے بعد سنبھل چکا تھا۔ میں اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسی لمحے کھلی ہوئی کھڑکی سے میری نگاہ باہر چلی گئی۔

اس کھڑکی سے بیٹھ کر مین گیٹ دکھائی دے رہا تھا اور میں نے وہاں جو منظر دیکھا اس نے مجھے بے حس و حرکت ہونے پر مجبور کر دیا۔

دو جیمیں آگے پیچھے وہاں آکر کھیں اور ان میں سے کوئی نصف درجن افراد برآمد ہو کر بیٹھ کے گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ گیٹ پر اگرچہ روشنی بہت زیادہ نہیں تھی تاہم میں ان افراد میں ایک شخص کو بخوبی پہچان گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اس شخص نے سر پر ایک تازہ پٹی بندھی تھی۔ وہ ایک سوا یک فیصد آتا تھا! اسی لمحے مجھے اپنی غشی کا احساس ہوا مگر اب وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ میری لمبائی غفلت یا عدم توجہی نے فائدہ اٹھا کر باڈی گارڈ نے اپنی کٹھنوف پر قبضہ جمایا اور اس کی ہلاکت خیز ٹال کو میری گردن سے پیوست کرتے ہوئے وہ آنکھیں لہجے میں غرایا ”بند زاپ!“

**فیصل** کی گھڑی بڑی کڑی ہوتی ہے اور یہ کڑی گھڑی میرے سر پر آن پہنچی تھی۔ اس کی ”ٹنگ ٹنگ“ میرے دماغ پر دستک دے رہی تھی۔ وجد ان اچھے کو۔ کچھ گزر گزرا۔ اگر وقت گزر گیا تو تمہیں اپنے ساتھیوں سمیت ایک اذیت ناک طوفان سے گزرنا ہوگا۔

میں نے ہمیشہ وقت کی پکار پر کان دھرے ہیں اس کے تقاضوں کو سمجھا ہے اور ان کے مطابق ہی قدم اٹھایا ہے۔ مجھے بخوبی احساس تھا میں ان لحاظ میں بہت ہی سنگین صورت حالات سے دو چار تھا۔ وہ نہایت ہی نازک لحاظ تھے جن میں بھونک بھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

ڈی ایس پی کے گاؤڑی کا مشکوف کی خوفناک نال میری گردن کے عقبی حصے سے پیوست تھی اور اس کے حکم پر میں نے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا رکھے تھے۔ میرے دائیں ہاتھ میں ڈی ایس پی سے چھینا ہوا ریو اور موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے گاؤڑی کی جان پر بن آئی تھی اور اس نے میرے تھکمانہ بیٹلے کے نتیجے میں اپنی کا مشکوف کھڑکی کے پاس پھینک دی تھی اور اب اس کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ مجھے بھی کچھ اسی قسم کا حکم دے رہا تھا۔

”ریو اور پھینک کر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ لو!“ میں نے تھوڑی سی جھپکا ہٹ کے بعد اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

وہ کلا مشکوف کی قاتل نال سے میری گردن پر ٹھوکا دیتے ہوئے غرایا ”گھوم جاؤ۔“

میں نہایت فرماں برداری سے گھوم گیا۔ اب میرا چہرہ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف تھا۔ اس دروازے کو تھوڑی دیر پہلے گاؤڑ ”دھڑام“ سے کھول کر کمرے میں آیا تھا۔ میں اس وقت ڈی ایس پی کو اپنے بازو کی لپیٹ میں دوپچے دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا اور گاؤڑ ہمیں کمرے میں نہ پا کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

گاؤڑ کو ایک مرتبہ پھر حیرت کا جھکا لگا۔ کمرے کے قالین پوش فرش پر قریب اندام ڈی ایس پی دنیا دانیسا سے بے خبر ہوا تھا۔ گاؤڑ نے میری گردن پر نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پھر ٹھوکا دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں آگے بڑھوں۔

میں نے دو قدم آگے بڑھائے اور اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا۔ اس وقت میں کھلے ہوئے دروازے سے صرف ایک قدم کی دوری پر تھا۔ میری بائیں جانب چند انچ کے فاصلے پر

کمرے کی دیوار تھی جس پر سوچ بورڈ لگا تھا۔ اس وقت بورڈ پر صرف دو سوچ آن پوزیشن میں تھے۔ ان دونوں میں ایک سلیٹنگ فین کا اور دوسرا ٹیوب لائٹ کا سوچ تھا۔ فین کا سوچ خصوصاً ریگولر کے برابر میں لگایا جاتا ہے۔ مجھے اس سوچ سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ ٹیوب لائٹ کا سوچ تھا جو فین والے سوچ سے دو فٹ کی دوری پر تھا۔ میں نازک ترین لحاظ کے جس مرحلے پر پہنچ چکا تھا وہاں سیکنڈ کا کروڑواں حصہ بھی ضائع کرنا انتہائی ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے بجلی سے بھی زیادہ سریع انداز میں اپنے فیصلے پر عمل کر ڈالا۔

میں نے سانس روکی، میرا بایاں ہاتھ ٹیوب لائٹ کے سوچ پر پڑا اور میں نے ہتھک لگنے والے انداز میں زمین پر بیٹھ کر بیک رول کیا۔ یہ تینوں عمل اتنے مربوط اور مکالماتی تھے کہ گاؤڑ کے حواس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو گیا۔

سوچ بورڈ پر پڑنے والے میرے ہاتھ نے ٹیوب لائٹ کو آف کر دیا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس دوران میں بیک رول کرتے ہوئے میں گاؤڑ کی ایسی کم تیزی کر چکا تھا۔ میں نے فرش پر اپنی لوٹ لگاتے ہوئے دونوں پاؤں کو بیک ٹھکنے کے اشارے میں گاؤڑ کی کلائیوں پر مارا، نتیجے میں کلا مشکوف کا ڈیگریڈ کیا گیا۔ ایک خوفناک برست نے کمرے کی چھت کو اڑھڑ کر رکھ دیا۔ اندھیرے میں گاؤڑ پر ایک کرتے ہوئے میں نے ٹانگہ کا خاص خیال رکھا تھا۔

اگر اس موقع پر میں فرنٹ رول کرنا تو نتیجہ اس کے بالعکس برآمد ہوتا۔ فطری رد عمل کے تحت گاؤڑ کلا مشکوف سے فائرنگ کرنا اور میں عین گولیوں کی ریخ اور نشانے پر فرش پر موجود ہوتا پھر میرا بھی وہی حشر ہوتا جو اس وقت کمرے کی چھت کا ہوا تھا۔

کمرے کی تاریکی میں گاؤڑ اپنی نئی نوبلی کلا مشکوف سمیت پیچھے کی جانب الٹ گیا تھا۔ میں اپنی برقت کارروائی کے بعد سائڈ رول کرتے ہوئے گاؤڑ سے محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ محفوظ ان معضوں میں کہ مجھے بیک آف میسر بھی تھی۔ یہی وقت تھا جب نیچے سے آنے والے کمرے کے سامنے کچھ گئے۔

کمرے سے باہر برآمدے میں وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں گاؤڑ اور ڈی ایس پی پر قابو پا چکا تھا تو میں نے ان تینوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ ذریعہ منظر سے

بائی منظر کی جانب آ رہے تھے۔ ان میں ایک تھوڑی ایس پی کی ذاتی ڈرائیور تھا اور باقی دو افراد سادہ پوش گھریلو ملازم تھے۔

وہ کوئی نہایت ہی اہم اطلاع لے کر نیچے سے اوپر آئے تھے۔ مگر فائرنگ اور کمرے کی تاریکی نے ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ ٹھنک کر حیران اور پریشان نظروں سے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چوڑے ٹانگوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے اندر کی صورت حال کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہیں اندر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ کمرے سے باہر روشنی کا مناسب انتظام نہیں تھا تاہم میں انہیں واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ان کی آمد کا مقصد کھل گیا۔ ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے کمرے کے اندھیرے میں کھورتے ہوئے نشتر ناک لہجے میں کہا ”سر! آپ کہاں ہیں؟ نیچے بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ گیٹ کے باہر رکتے والی جیپوں سے متعلق کوئی اطلاع فراہم کر رہا ہے۔ میں نے بھی تھوڑی دیر قبل کمرے کی کھڑکی سے ان جیپوں کو گیٹ کے سامنے رکتے دیکھا تھا اور ان میں سے برآمد ہونے والے نصف درجن افراد میں تاراسب سے زیادہ نمایاں تھا۔

ڈی ایس پی کو میں نے مخصوص داؤ کے استعمال کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے انٹا غفلت کر دیا تھا۔ ڈرائیور کی پکار اور احتیاط کا کوئی جواب دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تاہم اس موقع پر ڈی ایس پی کے گاؤڑ کو کوئی رد عمل ضرور ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ اس کی جانب مکمل خاموشی تھی۔

میں نے ٹیوب لائٹ کو آف کرنے کے بعد بڑے نیچے تلے انداز میں پوری ایکویسی کے ساتھ بیک رول کرتے ہوئے اس کی کلائیوں پر ڈبل ٹک کی۔ پھر بھر ضرب لگائی تھی۔ نتیجے میں وہ کلا مشکوف سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا تھا۔ اسی دوران میں اس کی کلا مشکوف نے موت بھی اٹھائی تھی۔ میں گولیوں کی تر تار بہت میں گاؤڑ کے گرنے کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ اب اس کی طرف سے کوئی تر عمل نہ پا کر ابھین میں گرفتار ہو رہا تھا۔

ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے کمرے کی تاریکی میں سے کوئی جواب نہ پا کر اضطرابی لہجے میں کہا ”سر! آپ خاموش کیوں ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کمرے میں آپ نے

اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟ آپ خیریت سے تو ہیں! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں فائرنگ کی آواز سنی تھی۔“

ڈرائیور کے متعدد سوالات کا اسے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ڈی ایس پی اس وقت جہاں تھا وہاں سے کوئی جواب ارسال نہیں کر سکتا تھا۔ میں دانستہ خاموش تھا البتہ گاؤڑ کی خاموشی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر یہی سمجھا کہ اس کی مسلسل خاموشی کسی چال کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ مجھے شکار کرنا چاہتا ہو اور میری جانب سے کسی حرکت کا انتظار کر رہا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے اور آنے والے کسی بھی سنگین لمحے کے لیے تیار تھے۔

کمرے سے باہر موجود ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے دُوریدہ نظر سے اپنے دونوں ساتھیوں کو دیکھا پھر کمرے کی جانب منہ کر کے فریادی انداز میں بتانے لگا ”سر! نیچے والی منزل پر بازی پلٹ چکی ہے۔ اے ایس آئی عبدالرزاق اس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ گرفتار شدہ ہندے نے اس کی کلا مشکوف چھین لی ہے اور اسے بری طرح پیٹ رہا ہے۔ ہتھکڑی کی وجہ سے وہ کلا مشکوف سے فائرنگ تو نہیں کر سکتا مگر وہ کھن کولاٹھی کی طرح استعمال کر رہا ہے۔“

ڈرائیور کی فراہم کردہ اطلاعات نے میرے دل و دماغ کو خوشی سے بھر دیا۔ میرے دل سے بے ساختہ نکلا۔ میرٹش! زندہ باد۔

جب میں ڈی ایس پی کے گاؤڑ سے اندھیرے میں نہرو آزما میں مصروف تھا اسی دوران میں میرٹش نے چلی منزل پر کام دکھا دیا تھا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی کہ کلا مشکوف اب ٹھکانا اے ایس آئی کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی لیکن میں گیٹ سے باہر کی صورت حال کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے باہر جو منظر دیکھا تھا وہ میرٹش سمیت ہم تینوں کے لیے ہر صورت ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا اور یقیناً میرٹش ابھی تک گیٹ سے باہر کی تازہ ترین پوزیشن سے آگاہ نہیں تھا۔

جب ڈرائیور کے تشویش ناک انکشاف پر بھی گاؤڑ کی جانب سے کسی رد عمل کا مظاہرہ سامنے نہیں آیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی مظاہرے و ظاہرے کے قائل نہیں رہا ہوگا۔ میں نے صورت حال کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور ڈی ایس پی جیسا لوجہ اختیار کرتے ہوئے تھکمانہ انداز میں ”اپنے“ ڈرائیور سے کہا۔

”یہاں سب خیریت ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر چھت پر چلے جاؤ اور گیٹ سے باہر نظر رکھو۔ میں نے کمرے میں دانستہ اندھا کر رکھا ہے۔“

وہ میرے داؤں میں آیا اور دونوں سادہ پوش ملازمین کو ساتھ لے کر چھت کی جانب چلا گیا۔ وہ تینوں کمرے سے باہر ایسی جگہ رکے تھے جہاں سے کمرے کے اندر کا لین پر پڑے بے ہوش ڈی ایس پی کے جسم کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اوروہ اپنے ”صاحب“ کو یوں کسپرسی کی حالت میں زمین بوس دیکھ لیتے تو کسی بھی قیمت پر میرے حکم کی تعمیل نہ کرتے۔

میں ڈی ایس پی کے گاڑی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی سمت طاری مہل خاموشی نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ وہ بھی اپنے ”سر“ سے ملتی جلتی کیفیت کا شکار تھا۔ تاہم میں نے عملی تصدیق ضروری سمجھی اور اندھیرے میں احتیاط سے بیٹھنے ہوئے اس طرف پہنچ گیا جہاں گاڑی میری ڈبل بیک لگ کھانے کے بعد گرہا تھا۔ جلد ہی میرے ہاتھوں نے اس کے بدن کا چھو لیا۔ یہ مجھے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ گاڑی کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ ہوسکتا ہے، پیچھے اٹلتے ہوئے اس کا سر کسی شے سے ٹکرا گیا ہو، نتیجے میں وہ فرش پر ڈھیر ہو کر بے ہوش ہو گیا ہو۔ گولیوں کی گونج کی وجہ سے میں اس کے ساتھ ہونے والی ”کارروائی“ سے بے خبر ہوا تھا۔

لائٹ آف ہونا اور فائرنگ کی آواز یقیناً بیٹکے سے باہر موجود تارا اور اس کے ساتھیوں سے پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ زیریں منزل پر ساحل اور میر بخش نے بھی بے آوازیں سنی ہوں گی۔ مجھے فوری طور پر میر بخش اور ساحل کی مدد کے لیے پہنچنا چاہیے تھا۔ میری جیب میں چابیوں کا وہ چمکا موجود تھا جس سے ان دونوں کی ہتھکڑی کھولی جاسکتی تھی۔ یہ سوچتے ہی میں کمرے سے نکلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے نہ صرف اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا تھی بلکہ گیٹ سے باہر موجود افاد سے بھی درود ہاتھ کرنا تھے۔

میں جیسے ہی کمرے کے دروازے پر پہنچا، انٹر کام کا مخصوص بزرخ اٹھا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ڈی ایس پی نے مجھے بتایا تھا، یہ انٹر کام بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا کام دیتا تھا۔ اس کا یہی مطلب ہوسکتا تھا، زیریں منزل سے کوئی ڈی ایس پی کی ”خیریت“ دریافت کر رہا تھا۔ میری جانبہ معلومات کے مطابق زیریں منزل پر اس وقت صرف تین افراد موجود تھے۔ ساحل، میر بخش اور نگران اے ایس آئی عبدالرزاق جو اب نگران نہیں رہا تھا۔ کلاشکوف چھن خانے کے بعد وہ میر بخش کے رحم و کرم پر تھا۔ قوی

امکان اسی بات کا تھا کہ ساحل انٹر کام کو استعمال میں لاری تھی۔

اس دوران میں ایک مرتبہ پھر انٹر کام کا بزرخا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر آگے بڑھ کر انٹر کام کا ریسپورڈر اٹھالیا اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے ڈی ایس پی کے انداز میں پوچھا۔

”کیا ہے بھئی؟“

جواب میں جو آواز میری ساعت سے ٹکرانی وہ ساحل کی تھی اور نہ ہی میر بخش کی۔ وہ یقینی طور پر گیٹ پر متعین گاڑوں میں سے کسی کی آواز تھی۔ وہ فہودیا نہ انداز میں بتا رہا تھا ”سر! ڈیرا اکبر سومرو آپ سے ملنے آیا ہے۔“

”ڈیرا اکبر سومرو؟“ میں نے ڈی ایس پی کے لیے میں گاڑی کے الفاظ دہرائے۔

”جی سر!“ اس نے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا ”ابھی تھوڑی دیر پہلے اور فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی اور آپ کے کمرے کی لائٹ بھی بجھ گئی ہے۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟“

”میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

وہ بولا ”ڈیرا اکبر سومرو بھی اس فائرنگ سے متاثر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ فوری طور پر بیٹکے کے اندر آنا۔ چاہتے ہیں۔ کیا میں انہیں ان کے ساتھیوں سمیت بیٹکے میں آنے دوں؟“

میں نے کھڑکی سے تارا کی جھٹک دیکھی تھی۔ گاڑی تارا تھا، ڈیرا اکبر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے بھی اکبر سومرو کو نہیں دیکھا تھا اس لیے صورت آشنائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ڈیرا اکبر سومرو اپنے بیٹکے پر، عمر کوٹ کے ایک دور افتادہ مقام پر تھا۔ یہاں شاہی پلی کے مضافات میں اس کی موجودگی حیرت انگیز تھی اور وہ بھی رات کے آخری پر! بہر حال ایک بات کی تصدیق ہو گئی کہ اس انٹر کام کا براہ راست تعلق بیٹکے کے مین لیٹ پر متعین سکیورٹی گاڑوں سے تھا۔

میں ڈیرا اکبر سومرو کو بیٹکے میں داخلے کی اجازت دے کر اپنے ساتھیوں کی خیریت کو کسی خطرے سے دو چار نہیں کر سکتا تھا اس لیے گاڑی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”تم انہیں بیٹکے میں داخل نہ ہونے دینا جب تک میرا حکم نہ ہو۔“

”سر! وہ اصرار بلکہ ضد کر رہے ہیں۔“ گاڑی نے بتایا ”وہ

نیت نہ اندر آتا چاہتے ہیں۔“

میں نے ڈی ایس پی کے مخصوص لب ولہجے کی نقانہ دیکھی ہونے کا راز سے پوچھا ”کیا تم ذاتی طور پر ڈیرا اکبر سومرو کو جانتے ہو؟“

اس نے انٹر کام پر نفی میں جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے وہ ڈیرا اکبر سومرو کے علاوہ کوئی بھی ہوسکتا ہے!“ میں نے ایک خدشے کا اظہار کیا۔

گاڑی نے بتایا ”جی سر! یہاں ہونا ممکن ہے۔“

”یہ ہمارے خلاف کسی قسم کی چال بھی ہو سکتی ہے؟“

”بالکل ہو سکتی ہے۔“ گاڑی نے تصدیقی انداز میں کہا۔

اسی وقت گاڑی کے نزدیک ہی کوئی گرجدار آواز میں بولا نہ بایا! تم اپنے ڈی ایس پی سے ہماری بات کرواؤ۔ کیا ماٹوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے؟“

پھر تارا کی آواز میری ساعت سے ٹکرانی۔ وہ اپنے بڑاں دوست اکبر سومرو سے کہہ رہا تھا ”ڈیرا سائیں! اوپر لی منزل پر کوئی گڑبڑ ہے۔ لگتا ہے کوچدان نے یہاں بھی کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہے۔ ہمیں ڈی ایس پی کی اجازت کا انتظار کیے بغیر بیٹکے میں گھس جانا چاہیے ورنہ وہ شیطان ایک مرتبہ پھر مارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

تارا نے ”شیطان“ کا لفظ یقیناً میرے لیے استعمال کیا تھا۔ ان کی آوازوں کی صفائی سے لگتا تھا، وہ انٹر کام کے ریسپورڈر بہت نزدیک کھڑے تھے۔ ان کے تیز اور عوام کو بھانپتے ہوئے گاڑی نے مجھ سے پوچھا۔

”سر! یہ لوگ ذہنی بیٹکے میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟“

میں نے حتمی لیے میں کہا ”میں خود نیچے گیٹ پر آ رہا ہوں۔ ان سے کہو، میرا انتظار کریں۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے میزبان بہ نفس نفیس وہاں پہنچ رہا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی میں ریسپورڈر کی ٹیل کر کے کمرے سے باہر نکلا۔ کمرہ چھوڑنے سے پہلے میں نے ڈی ایس پی والا بڑا اور تلاش کر کے اپنی جگہوں کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ کی نازک موقع پر میرے ساتھیوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتا تھا۔ باہر نکلنے ہوئے میں نے دروازے کو اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ وہ برائی طرز کا دروازہ تھا جس کے باہر ایک آہنی لٹکی بھی لگی تھی۔ میں نے اس کنڈی کو چڑھا دیا۔ اب ’دواہ توڑے بغیر اندر سے کوئی باہر نہیں آسکتا تھا اور اندر خود افراد موجود تھے وہ اس حالت اور کیفیت میں نہیں تھے کہ فی الفور دروازہ توڑنے کی جسارت کر سکتے۔ میرے ۱۷۲

اندازے کے مطابق ڈی ایس پی دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا اور اس کے گاڑی کی بھی کم و بیش پوزیشن تھی۔ جب ”باڈی“ بے ہوش تھی تو ”باڈی گاڑی“ کے ہوش مندر بہنے کی کیا ضرورت تھی!

میں نے کمرے سے باہر اگر چھت کی جانب جانے والے زینے پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں سناٹے کا راج تھا۔ میرے حکم پر ڈی ایس پی کا ڈرائیور اور دونوں گھلو سادہ پوش ملازم چھت پر چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ باہر کی صورت حال پر نظر رکھیں۔ جب تک میں انہیں واپسی کا حکم نہ دیتا، وہ چھت سے نیچے آنے والے نہیں تھے۔ میں نے بڑی مہارت اور خوب صورتی سے ڈی ایس پی کا لب و لہجہ اختیار کر کے صورت حال کی سنگینی کو نیکی کر لیا تھا۔

میں محتاط مگر تیز قدموں سے زینے اترنے لگا۔ وہاں کی ہر شے پر میری گہری نظر تھی۔ دس سینڈ میں، میں اس کمرے کے سامنے پہنچ چکا تھا جہاں کچھ دیر پہلے میں نے ساحل اور میر بخش کو چھوڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی میر بخش کا چہرہ خوشی سے مہل اٹھا۔ یہ خوشی مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھنے کی تھی۔ بالائی منزل پر ہونے والی فائرنگ نے یقیناً انہیں میری طرف سے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ اس نے ہوش جذبات میں کچھ بولنا چاہا تو میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ ساحل میرے ہتھکڑی سے آزاد ہاتھوں کو جرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن اسے ایس آئی عبدالرزاق مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔

میر بخش میری متلاشی نظر کا مفہوم سمجھ گیا اور اس نے ہاتھ روم کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں دی کی کلاشکوف کو ہوا میں لیرایا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گن کا مالک ہاتھ روم میں بند ہے۔ میر بخش کے چہرے کا گہرا اطمینان اس بات کی اطلاع دے رہا تھا کہ ہاتھ روم میں بند اے ایس آئی کا ”شٹائی بندوبست“ اس نے کر دیا تھا جیسا کہ میں ڈی ایس پی اور اس کے باڈی گاڑی کے ساتھ بالائی منزل پر کر آیا تھا۔

وہ کمرہ بیٹکے کے مین گیٹ سے کافی فاصلے پر واقع تھا چنانچہ وہاں ہلکی آواز میں گفتگو کی جاسکتی تھی۔ میر بخش کی حالت سے لگتا تھا کہ ابھی ابھی وہ اے ایس آئی سے ”نٹ“ کر فارغ ہوا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں اپنی جیب سے چابیوں کا بیجھا ہر آدک اور جلدی جلدی ان دونوں کے ہاتھوں کو، ہتھکڑی کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

ساحل بے تابی سے اپنی کلائیوں کو سسلاتے ہوئے بولی، "وہ جان! تم نے یہ بات تو ہو؟ فائزنگ کی آواز سن کر تو میری جان ہی نکل گئی تھی۔"

اس کی آواز دھیمی اور لہجہ پر تشویش تھا۔ میربخش نے کلا شکوف کو باہر انداز میں دونوں ہاتھوں میں سونتے ہوئے کہا۔

"مزہ تو اب آئے گا وہ جان سائیں!"

اس کے لہجے سے بے نیازی جھلکتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے زخمی بازو اور اس میں ہونے والی تکلیف کو یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ان دونوں کو بچنے کی چھت اور مین گیٹ سے باہر کی صورت حالات سے آگاہ کیا۔ میری پوری بات سننے کے بعد میربخش حیرت سے بولا۔

"وڈیرا اکبر سومرو اور یہاں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا سائیں؟"

"یقین مجھے بھی نہیں آ رہا۔" میں نے کہا "لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دو بیڑوں میں سے چھ افراد کو نکل کر بچنے کے گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا تھا اور ان چھ افراد میں تارا کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ باقی باقی مجھے گیٹ پر متعین سیکورٹی گارڈ سے معلوم ہوئی ہیں۔"

ساحل نے کہا "تارا کو تو ہم بے ہوشی کی حالت میں ہوملے کر کمرہ میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ کب اور کیسے ہوش میں آیا اور اسے کیونکر پتا چلا کہ ہم یہاں شادی پٹی کے ایک بچکے میں موجود ہیں؟"

میں ساحل کے سوالات کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔ میں نے کہا "اس بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو موجودہ صورت حال سے نمٹنا ہے۔"

"سائیں! وڈیرا اکبر سومرو تو دوسرے ایک اپنے بچکے پر تھا۔" میربخش نے ابھی زندہ انداز میں کہا "اس کی یہاں شادی پٹی میں موجودگی مجھے میں نہیں آ رہی۔"

میں نے کہا "جو بات ابھی سمجھ سے بالاتر ہے، بعد میں زیریں ترین ہو جائے گی۔ ان الجھنوں میں وقت ضائع کرنا ہوش مندی کے اصولوں کے منافی ہے۔"

"سائیں! آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر میں جی اٹھا ہوں۔" میربخش نے کلا شکوف ہوا میں لہراتے ہوئے کہا "اب سو وڈیرا اکبر سومرو بھی میرے سامنے آجائیں تو پروا نہیں۔ میں آپ کی حفاظت کے لیے لاشوں کے انبار لگا سکتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بڑے سنگین لہجے میں اضافہ کیا "سائیں! اکبر سومرو کی طرف بھی میرا ہمت

حساب نکلتا ہے۔ آج یہ حساب بے باق ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "میربخش! جب تک جان پر نہ بنے، آج گن کا استعمال نہیں کرو گے۔ ہمیں دوسروں کی جان سے کھیلے بغیر اپنی جان بچا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے۔ میری یہ بات ذہن میں رکھو گے۔"

"سائیں!" وہ سناتے ہوئے لہجے میں بولا "وڈیرا اکبر سومرو انسان نہیں بلکہ ایک شیطان ہے۔" اس کا انداز بہت خوفناک تھا "وہ خود کو "بھوتار" کہلاتا ہے۔ اس کی اپنی پراسٹیوٹ جیل ہے۔ وہ لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے، بڑا دل بے گناہوں کا خون اس کے ہاتھوں پر ملا ہوا ہے۔ جو ان پڑے افراد سے اس کے گھرے رابطے ہیں۔ وہ ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اپنی رعایا اور ہارپوں پر ظلم و ستم کے باز توڑتا ہے۔ وہ کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں۔ میں تو کتا ہوں۔"

"یہ تقریروں کا وقت نہیں ہے میربخش!" میں نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "حالات کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا اور فرماں برداری سے بولا، "جو حکم سائیں!"

"وہ جان! یہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں؟"

ساحل نے ہیزاری سے کہا۔

میں نے کہا "مصیبت تو مصیبت ہی ہوتی ہے۔ کس اور حس کا کیا سوال ہے!"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ہاتھ روم کے دروازے کی جانب اٹھلی اٹھاتے ہوئے میربخش سے پوچھا "قانون بمبار کا کیا حال ہے؟"

میرا اشارہ واضح طور پر اسے ایس آئی عبدالرزاق کی طرف تھا۔ میربخش میرے سوال کی یہ تک پہنچتے ہوئے بولا "اس کی پیشانی پر میں نے کلا شکوف کا پٹ باندھا تھا۔ وہ مرد چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر آگرا۔ میں نے تھک کر اسے ہاتھ روم میں پھینچا دیا۔ اب وہ دو تین گھنٹے تک وہاں آرام فرمائے گا۔"

میں نے پوچھا "اس کا سر تو نہیں پھنسا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا "میں پیشانی پر ایک گنگ سائز آلو نمودار دو گیا ہے۔ اپنی بات ختم کر کے میربخش نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا "اوپر والوں کا بھی تم ویش کیسی حال ہے۔ ڈی ایس بی اور اس کلائی کا

ایک کمرے میں "مجاہد استراحت" ہیں۔"

اسی وقت بچکے کے باہر ایک کلا شکوف گرجن اٹھی۔ برست کی تیز تر خراہٹ فضا میں گونجی۔ آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ فائزنگ کا رخ نیچے سے اوپر کی طرف تھا۔ تھوڑی سی دیر میں بلکہ اسی وقت میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ فائزنگ کے جواب میں بچکے کی چھت پر سے انسانی بیڑوں کی صدا انہیں بلند ہوئی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ فائزنگ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب سے کی گئی ہوگی۔ بچکے کی چھت پر ڈی ایس بی کا ڈرا نیور اور دو سادہ پوش گھریلو ملازم اپنے "صاحب" کے حکم پر بچکے کے گرد فوج کی گرائی پر "مامور" تھے۔ ممکن ہے "مارا یا اکبر سومرو نے ان کی جھلک دیکھی ہو اور عین ممکن ہے "وہ سمجھے ہوں کہ وہ تینوں افراد ہم ہیں۔ یعنی میں ساحل اور میربخش۔ اسی لیے انہوں نے ہم پر فائزنگ کی تھی۔

گولیوں کی ترزا ہٹ اور جوایا انسانی بیڑوں کی آواز نے ساحل کو سرا سدا کر دیا۔ وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے زہر لب مسکراتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"ساحل! تھوڑی دیر پہلے تم نے پوچھا تھا۔ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ بس تو جان لو، ہم "اس" مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ یہ مصیبت انسانوں کی نازل کردہ ہے جو دوسرے انسانوں کی جان لیتی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

آخری جملہ میں نے بیک وقت دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

میربخش کلا شکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "میں پوری طرح تیار ہوں۔"

میں نے اپنی پتلون کی جب سے ڈی ایس بی والا ریو لور نکال کر ساحل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ کیا تمہیں اسے چلانا آتا ہے؟"

اس نے میرے ہاتھ سے ریو لور لیتے ہوئے اثبات میں کھلایا۔

میں نے کہا "جب تک تمہاری جان یا عزت پر نہ بنے، تم اسے استعمال نہیں کرو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ مجھے اس کے چہرے پر جذبات کے آثار دکھائی دیے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانپتے ہوئے احتیاط کیا۔

"کیا بات ہے ساحل، تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔ کیا

ریو لور کے استعمال میں کوئی دقت محسوس کر رہی ہو۔ تم نے بتایا ہے نا، تم اسے چلانا جانتی ہو!"

"میں وقت پڑنے پر اسے استعمال کر لوں گی۔" اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا "لیکن۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا "لیکن کیا ہے ساحل؟"

"وہ جان! تم تو مجھے اپنی جان کی حفاظت کی ہدایات اس طرح دے رہے ہو جیسے مجھ سے دور جانے والے ہو۔" وہ شکایتی انداز میں گویا ہوئی "کیا تم ان نازک لمحات میں میرے ساتھ نہیں ہو گے؟"

میں نے بے ساختہ کہا "میں تو ہر بل تمہارے ساتھ ہوں۔"

"پھر!" اس کی بولتی ہوئی آنکھوں میں بڑا معنی خیز سوال تھا۔

میں نے جلدی سے کہا "یہ تو میں تمہیں حفظ ماتقدم کے طور پر دے رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد جانے ہمیں کس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑ جائے۔ ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہنا چاہیے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "مجھے تو ہم یہاں سے نکلے بھی نہیں۔ کون جانتا ہے یہاں کتنی خون ریزی ہونا ابھی باقی ہے!"

ساحل نے ایک جھنجھری لی۔ اسی وقت بچکے کے باہر دوبارہ فائزنگ کی آواز بلند ہوئی، یہ اسٹریٹ فائزنگ تھی۔ یا تو گارڈز نے آنے والوں کو روکنے کے لیے ہتھیار استعمال کیے تھے یا پھر "تارا اپنڈ کپٹی" نے گارڈز کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے فوراً بعد جوابی فائزنگ بھی سنائی دی۔ اس دو طرفہ فائزنگ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ بچکے کے گیٹ پر دونوں پارٹیوں میں ٹھن گئی تھی۔ وہ دونوں پارٹیوں والے فی الحال ہمارے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی باہمی منہ بھڑھار سے سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ اس سب سے بڑے موقع سے فائدہ اٹھانا ہم پر واجب ہو گیا تھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساحل اور میربخش کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اس بیٹھک نما کمرے کے باہر نکل آیا۔ وہاں سے بچکے کا مین گیٹ پچاس قدم کی دوری پر تھا۔ گیٹ کے قریب ہی کار پورج بنا ہوا تھا۔ پورج میں ڈی ایس بی کی ذاتی گاڑی موجود تھی۔ وہاں سے فرار کے لیے یہ ہمارے کام آسکتی تھی۔

پورج میں عمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے فوری

طور پر ڈی ایس بی کی گاڑی کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر ہم اس گاڑی کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ جاتے تو باہر سے آنے والے ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ ہم یہ آسانی ان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس کی ایک واضح وجہ یہ بھی تھی کہ پورچ میں تاریکی تھی اور گیٹ کے نزدیک بھی روشنی موجود تھی۔

میں دبے قدموں چلتے ہوئے مذکورہ گاڑی کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ ساحل اور میر بخش نے بھی باؤسنگی میری تقلید کی۔ ہم محفوظ پناہ گاہ میں بیٹھے ہی تھے کہ ہنگلے کے باہر ایک مرتبہ پھر گولیوں کی ترزاہٹ گونج اٹھی۔ اس بار گولیوں کی گونج میں انسانی چیخوں کی آواز بھی شامل تھی۔ ان کرب ناک چیخوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کم از کم چار پانچ افراد اپنی جان ہار گئے تھے یا کم از کم شدید مصروب ہوئے ہوں گے۔

پھر ہنگلے کے مین گیٹ پر باقاعدہ بھونچال آیا۔ میں نے ڈی ایس بی کی گاڑی کی آڑ میں سے دیکھا، ہنگلے کا گیٹ زور دار آواز سے کھلا اور تاریکی سرکشی کی تین افراد ہنگلے میں داخل ہوئے۔ تارا کے علاوہ باقی دو افراد میں سے ایک اپنے لباس اور طے سے وڈیرا دکھائی دیتا تھا۔ میر بخش نے میرے خیال کی تصدیق کی کہ وہ وڈیرا اکبر سوموہی تھا۔ وڈیرے کے ساتھ جو شخص تھا۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں کلا شکوف تھام رکھی تھی۔ وہ یقیناً وڈیرے کا باڈی گارڈ قسم کا کوئی جان نثار تھا۔ تارا کے ہاتھ میں بھی پشیل دکھائی دے رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ وہ پشیل نہیں ہو سکتا تھا جو میں نے ہوش کے کمرے میں اس سے چھین لیا تھا۔ مذکورہ پشیل اعشاریہ تین اٹھ کبلی برکھا جو میر بخش ہوش سے نکلے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ازاں بعد ہماری گاڑی (بلیک اینڈ ریڈ) کی تلاشی کے دوران میں وہ پشیل پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ تارا کی چال میں غمازت کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔

وڈیرا اکبر سوموہی پر نظر پڑنے ہی میر بخش کچھ بے چین ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ کچھ کرگزرے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے کو مختصر پاتے ہوئے بڑے بھرپور انداز میں "نفی" میں گردن ہلا دی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔ اسے میرے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

تارا کے کیم پر ابھی تک وہی لباس تھا جس میں ہم اسے ہوش کے کمرے میں بے ہوش چھوڑ آئے تھے۔ وہ ایک ہٹا کٹا اور چاق و بردہ شخص تھا۔ مارشل آرٹس سے بھی اسے گہری نگاہی حاصل تھی یا ہم میں نے عمر کوٹ کے ہوش میں اس کی خوب کٹ بنائی تھی۔ میرے گھٹنے کی ضرب نے

اس کی ٹھوڑی کی ایسی مزاج پر سی کی تھی کہ اس کی زبان دانتوں تلے اکڑ کر ٹکٹی تھی۔ وہ کسی سوار خور جانور کی طرح خون سے لتھڑا ہوا دہانہ کھول بند کرنے لگا تھا۔ ازاں بعد میرے پاؤں کا بلینڈ اس کی ناک پر اس زور سے لگا تھا کہ وہاں سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا تھا پھر سب سے آخر میں اس کے سر کا قبضی حصہ چوٹی میز سے تصادم کے بعد شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اسی چوٹ نے تارا کو ہوش و حواس سے بھی بے گانہ کر دیا تھا۔ ہم اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر آئے تھے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی ہم تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ بہر حال، وہ اس قسم کی حیرت میں پڑنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم انتہائی سنگین حالات سے دوچار تھے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی فکر کرنا بھی پھر کچھ اور سوچنا تھا۔

تارا اینڈ کمپنی کھلے ہوئے گیٹ سے اندر آئے تو ان کے پیچھے مجھے کسی گاڑی کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا گیٹ پر متعین وہ دونوں مسلح سیکورٹی گارڈز اب کسی قسم کے تعاقب یا مزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ بھی یقین ممکن تھا وہ اب کسی اور جگہ میں پہنچ چکے ہوں!

ہم دم سادھے ڈی ایس بی کی گاڑی کے پیچھے دبکے رہے۔ اس وقت ہم ایسی پوزیشن میں تھے کہ اچانک فائرنگ کر کے ان تینوں کو گنا کے گھاٹ اتار سکتے تھے پھر ہمارے لیے وہاں سے فرار ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ میر بخش کچھ اسی قسم کے عوام کا اظہار جسمانی حرکات و سکنات سے لگے لگے کر بھی رہا تھا مگر میں خراج خواہ کے خون خرابے کے حق میں نہیں تھا۔ بے مقصد انسانی جان سے کھینا کسی طور مجھے کو ارا نہ تھا۔

وہ تینوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔ سب سے آگے تارا تھا اس کے پیچھے وڈیرا اکبر سوموہی اور سب سے آخر میں وڈیرے کا ساتھی محافظ۔ وہ شخص چونکہ نظر سے اپنے عقب میں بھی دیکھنا چلا جا رہا تھا۔

میرے ذہن میں انٹرکام پر سیکورٹی گارڈز سے ہونے والی گفتگو تازہ ہو گئی۔ جب میں اسے یہ شہیت ڈی ایس بی احکام دے رہا تھا تو میں منظر میں تارا کے جملے بھی مجھے ثنائی دے تھے۔ اس نے اپنے میزبان وڈیرے سے کہا تھا "سائیں! میں ڈی ایس بی کی اجازت کے بغیر ہنگلے میں گھس جانا چاہیے ورنہ وہ شیطان (یعنی میں) ایک مرتبہ پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔" تارا کے الفاظ سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ باجماعت

صرف میری ہی تلاش میں اس ہنگلے تک پہنچے تھے اسی لیے اب وہ ہنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہو گئے تھے۔ میری سماعت میں میر بخش نے سرگوشی کی "سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ جب تک تینوں مردود ہنگلے کی تلاشی لیتے، ہم بہت دور نکل جائیں گے۔"

ساحل ہم دونوں کے درمیان مٹھی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے میر بخش کو جوایا کہا "تجربہ تو تمہاری اچھی ہے لیکن میں یہاں سے پیدل جانے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"سائیں! ہم پیدل کیوں جائیں گے۔" میر بخش نے دھیمی آواز میں کہا "آخر یہ کس مرض کی دوا ہے! بات ختم کرتے ہی اس نے ڈی ایس بی کی گاڑی کو تھیکا۔

جب ہم پورچ میں اس گاڑی کے پیچھے پناہ لے رہے تھے تو میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کا خیال آیا تھا لیکن بعد میں مجھے یہ خیال ٹھنکنا۔ اعتبار سے کچھ زیادہ مناسب اور قابل عمل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے خیالات میر بخش کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

"اس گاڑی کے استعمال میں دو قباحتیں ہیں۔"

"وہ کیا سائیں؟" اس نے پوچھا۔

"نمبر ایک۔" میں نے بتایا "اس کی چابی ڈی ایس بی کے ڈرائیور کے پاس ہے جسے میں نے ہنگلے پر نگاہ رکھنے کے لیے جھپٹ کر بھیج دیا تھا اور۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اپنا جملہ مکمل کر دیا "اور تھوڑی دیر پہلے ہنگلے کی چھت کا جانب سے ہم نے جو چیخیں سنی ہیں ان کے پیش نظر ڈرائیور کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

میر بخش اپنا سینہ ٹھٹکتے ہوئے بولا "سائیں! چابی وغیرہ کی تو آپ فکر نہ کریں۔ میں نے ایک طویل عرصہ ڈرائیورنگ کی ہے اور بغیر چابی کے میر قسم کی گاڑی اسنادت کرنے کا تجربہ جانتا ہوں۔ اس گاڑی کو یہاں سے نکالنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں اپنے فنی میں یقیناً ماہر ہو گے۔ میں تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کر رہا مگر میں اس گاڑی کو لے جانے کے حق میں نہیں ہوں اور یہی دوسری قباحت ہے۔"

میر بخش نے پوچھا "آپ اس گاڑی کے استعمال سے کیوں بچنا چاہتے ہیں؟"

"بہ ایک پولیس افسر کی گاڑی ہے۔" میں نے وضاحت

کرتے ہوئے کہا "اس میں سفر کرنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جلد یا بدیر ڈی ایس بی اور اس کے درؤ کو پیش آنے والے واقعے سے پردہ اٹھ جائے گا۔ اس کے بعد بڑی شدت سے ہمیں تلا ش جائے گا اور اس گاڑی کی وجہ سے ہم یہ آسانی گھیرے جاسکتے ہیں۔ یہ بات قطعاً سچ نہیں رہ سکتی کہ ہم تینوں ڈی ایس بی کی گاڑی میں موقع سے فرار ہوئے ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میر بخش نے تشویش ناک لہجے میں کہا "ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے یہاں بیٹھے تو نہیں رہ سکتے!" ساحل نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے، ہم یہاں سے اس گاڑی میں نکل جائیں اور کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑا کر اپنے لیے کوئی اور بندوبست کریں۔"

"ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "مگر میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! آپ کے ذہن میں جو بھی منصوبہ ہے اس پر فوراً عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں زیادہ دیر تک رکتا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"وجدان! تم کیا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

ساحل نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے بتایا "میں نے بالائی منزل کی کھڑکی سے ہنگلے کے باہر دو جیپوں کو آگے پیچھے رکھنا تھا جس میں سے چھ افراد برآمد ہوئے تھے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحت کی "میرا اشارہ وڈیرا اکبر سوموہی اور تارا کی جانب ہے۔ میں ان کی جیپوں میں سے کسی ایک کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

ساحل نے کہا "وجدان! ابھی چند لمحے پہلے ہم نے صرف تین افراد کو ہنگلے کے اندرونی حصے کی جانب جاتے دیکھا ہے۔ تم بتا رہے ہو دو جیپوں میں سے چھ افراد برآمد ہوئے تھے۔ بالی تین تو باہر ہی ہوں گے نا۔ میں تو۔"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ شاید اسے یاد آگیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ہنگلے کے باہر گیٹ پر سیکورٹی گارڈز اور وڈیرا اینڈ کمپنی کے مابین فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا۔

میں نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا "ہنگلے کے گیٹ پر اس وقت جو بھی صورت حال ہے اس کے بارے میں باہر نکل کر ہی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے وہاں کی صورت حال نہایت سنگین ہوگی۔"

"سائیں! اگر باہر والی کسی جیپ میں یہاں سے روانہ



ہونا ہے تو ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے۔“ میر بخش نے کہا  
 ”یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔“  
 ”مجھے یہاں رکنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔“ میں نے کہا  
 ”تم ساحل کے پاس رکو۔ میں باہر کی پوزیشن دیکھ کر آتا  
 ہوں۔“

میر بخش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا  
 ”سائیں وجدان! آپ ساحل کے پاس ہی رہو۔ میں باہر جاتا  
 ہوں۔ آپ کا یہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔“

میر بخش اس وقت ایک جاں نثار کا کردار ادا کر رہا تھا۔  
 اس کے دلوں کو دیکھ کر میں نے اسے روکنا مناسب نہیں  
 سمجھا اور پہنچے آواز میں اسے تاکید کر دی ”چھوٹک چھوٹک کر  
 قدم رکھنا اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اندھیرے میں گیٹ کی  
 جانب رینگ گیا۔ کلاشکوف اس کے پاس بھی اس لیے میں  
 اس کی طرف سے زیادہ فکر مند نہیں تھا۔

”وجدان!“ ساحل نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا  
 اور میرے پہلو سے جڑتے ہوئے بولی ”میں بہت وحشت  
 محسوس کر رہی ہوں۔ یہ تمہارے ملک میں ہمارے ساتھ کیا  
 ہو رہا ہے؟“

میں نے کہا ”اس میں میرے ملک کا کیا تصور ہے؟ ہم  
 جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں ان میں ہمارے ساتھ  
 یہی ہونا ہے چاہے ملک کوئی سماجی ہو۔“

”مگر یہ تو تمہارا اپنا ملک ہے، تمہاری اپنی دھرتی ہے!“  
 وہ مجھ سے مزید چپک گئی ”میں تو سمجھ رہی تھی یہاں تمہارے  
 ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے گا۔“

میں نے کہا ”یہ تمہاری سمجھ کا پھیپہر ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ پاکستان کوئی فرشتوں کا دیس نہیں  
 ہے۔“ میں نے کہا ”دنیا کے ہر ملک میں ایسے برے لوگ  
 موجود ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ کیا  
 تمہارے ملک نیپال میں تمہارے ساتھ سب اچھا پیش آتا رہا  
 ہے؟ گھنٹنڈو کی بدھ شل گھنڈ عبادت گاہ میں پیش آنے والے  
 واقعات کو تو تم نہیں بھولی ہوگی۔ تمہارے گھر، تمہاری  
 رہائش گاہ پر تمہارے ماں باپ کو کس بے دردی سے قتل کیا  
 گیا تھا۔ ان کی لاشوں کو بھی نے تو کشتی میں ڈال کر گھنڈو  
 شہر کے پویس ہینڈ کو ارنر پھینچا تھا۔ اس بارے میں تم کیا  
 کہو گی؟“

”سورس وجدان!“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی

”میں پریشانی میں ایک غلط بات کہہ بیٹھی ہوں۔ تم ٹھیک کر  
 رہے ہو، دنیا کا کوئی بھی ملک یوں نہیں ہو سکتا۔“  
 میں نے کہا ”ساحل! ہم اس وقت اعصاب خرد  
 حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں تمہاری پریشانی کو سمجھ سکتا  
 ہوں اس لیے تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

وہ بے ساختہ میرے ہاتھ کو تشکرانہ انداز میں دباتے  
 ہوئے بولی ”تھینک یو وجدان!“

”پہلے سو ری وجدان اور اب تھینک یو وجدان۔“ میں  
 نے شکایتی لہجے میں کہا۔

وہ میری بات کی تک پہنچتے ہوئے بولی ”کیا کروں، بھول  
 جاتی ہوں۔ آہستہ آہستہ پریکٹس ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے تم  
 نے کہا تھا کہ دوستی کے درمیان سو ری، پلیئر اور تھینک یو کو  
 جگہ نہیں دینا چاہیے۔“

”تم بھولی ہو مگر بھولی نہیں ہو۔“ میں نے معنی خیز انداز  
 میں کہا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ اس نے استفسار کیا۔

اب اس کے لہجے میں مایوسی اور بےزاری کی جگہ فطری  
 شوخی نے لے لی تھی۔ یہ ایک مثبت اور خوش آئند بات  
 تھی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ کہہ نہ سکا کیونکہ اسی وقت  
 میر بخش واپس آیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے بیجان خیر  
 لہجے میں کہا۔

”سائیں! باہر تو بوری پانچ لاشیں پڑی ہیں۔“  
 ”یعنی دو کیو رٹی گاڑو کی اور تین وڈیرے کے ساتھ  
 آنے والوں کی لاشیں؟“ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق  
 کے لیے سوالیہ نظریں میر بخش کو دیکھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”جی سائیں“ پھر اس  
 نے اضطرابی انداز میں اضافہ کیا ”اور دونوں جیسپ بھی  
 وہاں موجود ہیں۔ ایک کے انگشتیں میں چابی بھی لگی ہوئی  
 ہے۔“

”وری گڈ۔“ میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا پھر پوچھا  
 ”چابی کون سی جیب میں موجود ہے۔ آگے والی میں یا پیچھے  
 والی میں؟“

”پیچھے والی میں۔“ اس نے بتایا۔  
 ”یہ اور بھی اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا ”وہ جیب  
 نکالنے میں ہمیں آسانی رہے گی۔“

میر بخش نے مزید بتایا ”سائیں! وہ نئی ٹور پجارو ہے۔“  
 ”ہیل رائٹ!“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”ہم اسی  
 پجارو میں یہاں سے روانہ ہوں۔ لیکن ہم ایک ایک کر کے

میں سے میر بخش کی طرف دیکھتے  
 تھے۔ پہلے تم پجارو میں پہنچو۔“  
 اس نے تذبذب کے انداز میں مجھے دیکھا اور کہا  
 ”میں پہلے آپ دونوں چلے جاؤ۔ میرے پاس کلاشکوف  
 میں آپ کو گور دیتے ہوئے بعد میں آؤں گا۔“

اس کی تجویز معقول اور بر عمل بھی اس لیے میں نے  
 غور و خوض میں وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساحل کو  
 سے پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے ساتھ کھینچتی چلی  
 گئی۔ ہم روکن کی حالت میں چلتے ہوئے یا آہستگی جنگل سے باہر  
 نکلے۔

باہر رات کی تاریکی میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہر  
 ریل لائیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم لاشوں کے درمیان سے با  
 ہٹا کر گزرتے ہوئے پجارو کے پاس پہنچے۔ میں نے بڑی  
 فٹ سے پجارو کا عقبی دروازہ کھول کر ساحل کو اندر بیٹھے  
 اشارہ کیا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دروازہ بند  
 کیا اور دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ ڈور کے پاس  
 پہنچا تو اسی لمحے بغیر میں دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ  
 پر بیٹھا۔ میں نے دروازوں کو کھولنے اور بند کرتے ہوئے  
 بات کا خیال رکھا تھا کہ ایک ذرا سی آواز بھی پیدا نہ  
 سنائے۔ ہمارے حق میں سب سے مفید یہ بات تھی کہ  
 ہمارے دروازے لاک نہیں تھے۔ آنے والوں نے  
 دروازے لاک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تو  
 نڈالنت میں مجھے چیم زون میں وہاں سے اپنے ساتھ لے  
 سنا والے تھے۔ انہوں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا  
 کہ وہ جنگل پر اس قسم کے حالات پیش آسکتے ہیں۔ ٹارا اینڈ  
 جی ٹی نے ”فاحصل“ کرنے کے لیے اس قدر ”بے قرار“ تھے  
 کہ انہیں سمجھ میں نہ آ سکی کہ لاشیں وہیں چھوڑ کر وہ دندناتے ہوئے  
 غائب ہو گئے تھے۔

جب تک میں کار پورچ میں موجود تھا میں نے جنگل کے  
 آواز اور آواز کی آوازیں سنی تھیں۔ آنے والے ہماری  
 مائیں دوائے ہو رہے تھے۔ زیریں منزل پر جب انہیں  
 پہنچے تو انہیں ناکامیابی ہوئی تو وہ بالائی منزل کی جانب چلے  
 گئے۔ میں ساحل کے ساتھ جب جنگل سے نکل رہا تھا تو  
 کوسان کے قدموں کی آوازیں پہنچنے سے اوپر جاتے ہوئے  
 ٹارو پر سنی تھیں۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بڑی بے چینی سے  
 انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے پیچھے سیٹ

کا دروازہ نیم وا کر رکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ ٹارا اینڈ  
 کینی کے اوپر پہنچتے سے پہلے پجارو میں پہنچ جائے۔ وہ لوگ  
 اوپر پہنچ جاتے تو پھر ہم یہ آسانی ان کی نظروں میں آسکتے تھے۔  
 میں نے ان لوگوں کو کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا، وہ ہمیں  
 دیکھ سکتے تھے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میر بخش چاروں  
 جانب چوکنا نظر سے دیکھتے ہوئے پجارو کے نزدیک آیا۔  
 کلاشکوف کو اس نے بالکل ”ریڈی“ انداز میں تھام رکھا  
 تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ پلک بھپکتے میں ایک خوفناک برسات  
 فائر کر سکتا تھا۔

میر بخش نے پجارو میں داخل ہونے کے لیے دروازے  
 کے پینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ جنگل کے اندر فائرنگ ہونے  
 لگی۔ گولیوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ کسی کلاشکوف سے فائر  
 کی گئی ہیں۔ میر بخش نے تشویش ناک نظر سے جنگل کی طرف  
 دیکھا اور ایک کرپچارو میں سوار ہو گیا۔ اسی وقت جنگل کے  
 اندر کلاشکوف کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ ہونے لگی۔  
 اس دو طرفہ فائرنگ سے گستاخا تھا ”ٹارا اینڈ کینی کے خلاف  
 مزاحمت پیش کی جا رہی ہے۔“

میں نے فائرنگ کی آواز سے فائدہ اٹھا اور نئی نوبلی  
 پجارو کو اشارت کر دیا۔ گاڑی بالکل نیو برانڈ تھی اس لیے  
 اس کا انجن بڑی سبک خرابی سے بیدار ہو گیا۔ میں نے جیب  
 کو بیک کرنے کے لیے ریورس گیر میں ڈالا اور ساحل کی  
 طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ریوالور کہاں ہے جو میں نے تمہیں دیا تھا؟“  
 ”میرے ہاتھ میں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔  
 میں نے کہا ”ڈراؤ نا، اُدھر۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو وجدان؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”میں جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تمہاری نظر  
 کے سامنے ہی کر دوں گا۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور  
 لیتے ہوئے کہا ”تم توجہ سے دیکھتی جاؤ۔“

وہ ریوالور میری جانب منتقل کرنے کے بعد الجھن زدہ  
 نظریں مجھے دیکھنے لگی۔ اس وقت میں نے میر بخش کے چہرے  
 پر بھی تذبذب کے آثار دیکھے۔ میں نے ڈی ایس پی وانا  
 ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی نال کار رخ اپنے سامنے  
 کھڑکی دوسری جیب کی طرف کر دیا پھر نہایت صبر سے  
 ساتھ اعشاریہ تین دو گلی بڑی دو گولیاں جیب کے پچھلے  
 ٹائروں میں بھوست کر دیں۔

ہوا خارج ہونے کی مخصوص آواز کے ساتھ دونوں

جانب کے مائز فلٹ ہو گئے۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اب وہ لوگ فوری طور پر اس جیب کی مدد سے ہمارا تعاقب نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک وہ مائز تبدیل کر کے ایسے کسی ارادے پر عمل کرنے کی پوزیشن میں آتے، ہم وہاں سے میلوں دور نکل چکے ہوتے۔

اب وہاں ایک سیکڑ بھی رکنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے ریو اور واپس ساحل کو دے دیا اور پجارد کو ریورس گینر میں چلائے ہوئے باقاعدہ راستے پر لے آیا۔ اسی وقت میں نے بنگلے کی پھٹ پر کسی انسانی ہیولے کو چکراتے دیکھا۔

تاریکی کے باعث اسے پہچاننا مشکل تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آواز نے مجھے بتادیا کہ وہ شیطان کا برادر خورد تارا تھا۔ وہ چیخ کر اپنے ساتھی کو پکار رہا تھا۔ ”کلا شکوف لے کر فوراً ادھر آؤ۔ وہ فرار ہو رہے ہیں۔“

اگلے ہی لمحے پھٹ پر کلا شکوف برادر انسانی ہویا نمودار ہوا پھر تارا کی ہدایت پر اس نے کلا شکوف سے ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔

تارا آواز اور احکام سنتے ہی میربخش بھی اپنی کلا شکوف کا رخ، پجارد کی کھلی ہوئی کمری میں سے بنگلے کی پھٹ کی جانب کرچکا تھا۔ جو اب اس نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ اس دوران میں، میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ پجارد کو محفوظ فاصلے پر پہنچانے کے بعد گینر تبدیل کیا اور ایک بنگلے سے اسے آگے بڑھاتے ہوئے ایسی کرئیر پر پاؤں تارباؤ بڑھا دیا۔

بنگلے کی پھٹ سے برساتی جانے والی گولیوں میں سے ایک بھی ہمیں یا پجارد کی باڈی میں نہیں لگی تھی۔ البتہ ہمیں عارضی آؤ فرام کرنے والی دوسری جیب اس فائرنگ کی زد میں آئی تھی۔ اس کی باڈی میں متعدد سوراخ بن گئے۔ میں اس کے مائزوں کو برست کر کے پیلے ہی بیکار کرچکا تھا۔ اب وہ بیکار رہ گئی تھی۔

جب ہم کافی دور نکل آئے تو میربخش نے کہا ”سامیں!“ آپ نے دوسری گاڑی کو بیکار کر کے ہمت اچھا کیا ہے اب تارا وغیرہ ہمارا پیچھا نہیں کر سکیں گے۔“

”شکر ہے ان جنسی لوگوں سے پیچھا تو چھوٹا۔“ ساحل نے سکھ کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے میربخش سے کہا ”میں نے جو کچھ کیا ہے وہ آزاد ضروری تھا۔ ہم اسی

صورت میں خود کو زیادہ محفوظ رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارا توبہ نہ کر لے سکیں۔“

میربخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں سامیں! لیکن بنگلے کے پوسٹ میں ڈیڑھ لی کی گاڑی بھی موجود ہے۔ وہ ہم تک پہنچنے کے لیے اس گاڑی کو استعمال کر سکتے ہیں۔“

”ہاں، کر سکتے ہیں۔“ میں نے پجارد کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا ”وہ اس گاڑی کے علاوہ ایک اور بھی نہایت نام شے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“

”کیا شے سامیں؟“ میربخش نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

ساحل بھی پوری توجہ سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے تجسس سے لہر لہے میں کہا ”وجدان بات کو تو توڑ کر سستی خیز انداز میں کہیں تارے ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ، تم کس چیز کے استعمال کا ذکر کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”تم لوگوں کو بالائی منزل پر جانے کا افاق نہیں ہوا“ اس لیے تم نہیں جانتے کہ وہاں کی سب سے اہم چیز کیا ہے حالانکہ اس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں لیکن اس وقت تمہارے ذہن اس طرف نہیں جاسکتے۔“

”پلیز وجدان! اور سپنس پیدا نہ کرو۔ تم مجھے جاسوسی پر اکسارہے ہو!“ ساحل نے شوخی سے کہا ”اس سرگزشت گوا بھن سے پاکیزہ ہی رہنے دو۔“ میربخش سنجیدگی سے بولا ”سامیں! آپ کسی اہم چیز کے بارے میں بتا رہے تھے!“

میں نے ایسی کرئیر پر پاؤں کا دباؤ مزید بڑھاتے ہوئے کہا ”بالائی منزل پر ڈی ایس پی والے کمرے میں ملی فون موجود ہے۔ تارا یا وڈرا اکبر سومو ملی فون کو استعمال کر کے ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔“

میربخش نے وڈرا اسکرین کے پار کمرے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر ٹھکر کی جھانپ ابھر آئی۔ میں نے اس سے پوچھا ”کیا بات ہے میربخش؟ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

”سامیں! اس وقت ہماری گاڑی کا رخ شادی پلی کے اکثری کی جانب ہے۔“ میربخش نے تشویش ناک لہجے میں بتایا ”یہ وہی سڑک ہے جس پر سڑک کے ہم شادی پلی پہنچتے تھے۔“ ”تو پھر؟“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”سامیں! ہمیں اکثری پہنچ کر اپنا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔“

میربخش نے کہا ”میربخش نے کہا“ فون والی بات کے پیش نظر ہمارا عمر کوٹ کی طرف جانا بھی طور مناسب نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا ”تمہاری تشویش بجائے لیکن ہم اس سڑک ہائی سمت میں بھی تو سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔“ ادھر نانی اور میر پور خاص کی درمیانی سرحد ہے جہاں پولیس نے خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے ٹانگا لگایا ہے۔ ڈی ایس پی نے مجھے بتایا تھا کہ تھانا انچارج شادی

ہاں نے بنگلے کی جانب روانہ ہونے سے پہلے تاکے کی بھیج دیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے توان لوگوں کے چنگل تلخے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر دوبارہ اس موٹی ٹوند نے ہمارے وار کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ اگلی جھپٹی ساری کسر اے گا۔ جب اسے پتا چلے گا کہ ہم نے اس کے اعلیٰ رستم ڈی ایس پی کے ساتھ کیا ”سلوک“ کیا ہے تو وہ اپنا شرکے گا۔“

”وجدان! تم خواہ مخواہ بہت دور تک سوچ رہے ہو۔“ میں نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا“ تم کیا کہنا چاہ رہی

ہو! ”وجدان! تم نے بتایا تھا“ ڈی ایس پی اور اس گاڑی کو اٹھانے کے بعد تم نے اس کمرے کو بند کر کے لڑکی لگا دی تھی۔ وڈرا اکبر سومو یا تارا کو کیسے پتا لگا کہ اس کمرے میں کوئی ملی فون سیٹ بھی رکھا ہوا ہے؟“

”کمرے کے اندھیرے کو ٹیوب لائٹ کا شین آن کر کے رہا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“

میربخش نے میرے کلام کے دوسرے جملے پر غور کیے بغیر ”سامیں!“ اگر وہ لوگ ڈی ایس پی والے کمرے میں آکر توڑ کر نہیں ہو جائے گی؟ وہاں تو ڈی ایس پی اور گاڑی بے ہوش پڑے ہیں۔“

”میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے بتایا ”انداز میں کہا“ میرا اندازہ ہے کہ وہ نہ صرف کمرے کے باہر آکر ہمارے پیچھے آئے ہوں بلکہ وہاں انہیں ”میں کچھ سمجھا نہیں سکتا“ میربخش نے انداز میں

مکملے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”جب ہم پجارد میں

جھنک رہے تھے تو تم نے بنگلے کے اندر فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں؟“ ان دونوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”اور یہ بات تم لوگوں نے بھی محسوس کی ہوگی کہ وہ دو طرف فائرنگ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے تارا اینڈ کمپنی کے جواب میں کوئی فائرنگ کر رہا تھا یا پھر تارا اینڈ کمپنی نے کسی کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ کی تھی۔“ میں نے ذرا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ”بنگلے میں تارا وغیرہ کی مزاحمت کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔“

میرے اس ڈرامائی ہیلے کے اختتام پر ساحل نے فوراً پوچھا ”کون شخص ہے وہ؟“

”ڈی ایس پی کا ڈی گاڑ۔“ میں نے بتایا۔ ”ممہ۔“ گھر میں تو بتایا تھا وہ وہاں بے ہوش پڑا تھا؟“ ساحل نے کہا۔

میربخش بولا ”ہاں سامیں! بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی؟“

”میں نے امکانات کی بات کی ہے۔“ میں نے کہا ”اس وقت باہر سے آنے والوں کی مزاحمت کرنے کے لیے بنگلے میں صرف ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ہتھیار موجود ہے یعنی ڈی ایس پی کا ڈی گاڑ۔ اس کی نئی ٹوبلی کلا شکوف وہیں کمرے میں پڑی تھی۔ ہو سکتا ہے جب باہر سے آنے والے اس کمرے میں پہنچے ہوں تو گاڑ کو ہوش اچکا ہو اور اس نے اپنی گن سے ان پر فائرنگ کر دی ہو۔“ میں نے ایک لمحے کو رگ کر مزید کہا ”ڈی ایس پی کا ریو اور اس وقت ساحل کے ہاتھ میں ہے۔ اے ایس جی عبدالرزاق سے جھپٹی ہوئی کلا شکوف تمہارے پاس موجود ہے۔“ میں نے میربخش کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”بنگلے کے دونوں مسلح سیکورٹی گاڑوں کی لائشیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ میں نے جن تین افراد کو یہ حیثیت ڈی ایس پی بنگلے کی پھٹ پر گھرائی کا فرض سونپا تھا وہ تین غیر مسلح تھے اور پھر ان کی چیٹوں کی آوازیں ہم نے سنی تھیں جب بنگلے کے باہر سے ان پر کلا شکوف کا برست مارا گیا تھا۔ ان میں سے اگر کوئی زندہ بچ بھی گیا ہو گا تو وہ مسلح مزاحمت کے قاتل کہاں ہوگا۔“

میربخش نے پوری بات سننے کے بعد کہا ”سامیں! اگر ڈی ایس پی کے گاڑے والے واقعی تارا وغیرہ پر فائرنگ کی ہے تو انہیں بھی قاتل تھانہ نقصان پہنچا ہوگا۔“

”یقیناً پہنچا ہوگا۔“ میں نے کہا ”اور یقیناً نہیں پہنچا ہوگا۔“

آتش فشاں 218 حصہ 7

”یہ کیا بات ہوئی؟“ ساحل نے کہا۔

میں نے وہ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا ”اس دو طرفہ فائرنگ کے بعد تارا اور وڈیرے کا محافظ تو زندہ پائے گئے ہیں۔ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو تارا کے حکم پر اس محافظ نے ہم پر گولیاں برسائیں تھیں جو زیادہ تر وہ سری، پیپ کی باڈی میں لگی تھیں اور ہم یہ حفاظت نکل آئے تھے۔“

”اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی نقصان ہوا ہے تو وہ وڈیرے کا ہوا ہے!“ میربخش نے مسرور لہجے میں کہا۔

میں نے کہا ”فی الحال کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ تینوں محفوظ رہے ہوں اور ڈی ایس پی کا باڈی کارڈ زندگی بھر گیا ہو!“

ساحل ایک بھر بھری لے کر رہ گئی۔ میربخش معنی خیز انداز میں سر ہلاتے لگا۔

ساحل نے کہا ”لگتا ہے پولیس والوں کا برا وقت چل رہا ہے۔ پے در پے انہیں نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔“

”ان کے کڑوت ہی ایسے ہیں۔“ میں نے ذہر خند لہجے میں کہا۔ اس وقت میرے ذہن میں ڈی ایس پی کی ہوس ناک گفتگو تازہ ہوئی تھی۔ وہ ”دن کبھی نائن“ کی آڑ میں ہمیں

چھوڑنے پر تیار ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اس نے ایک کڑی شرط بھی لگا دی تھی۔ ساحل کے بارے میں اس کے مذموم عرائم

جان کر میرا دماغ گھوم گیا تھا اور اس کے بعد ہی یہ باراماری کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میں نے ساحل یا میربخش کو ابھی تک

اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا ”ان کڑوتوں پر ان کے ساتھ اس سے بھی

زیادہ برا ہونا چاہیے۔ اس میں وقت کا کوئی قصور نہیں۔ وقت نہیں، انسان اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔“

میربخش نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا ”سائیں! ہم اڑی کے بہت نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ آگے کیا ارادہ ہے آپ کا؟“

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا پھر میں نے پجوار کو ہوا کا کھوڑا بنایا ہوا تھا ایسے لہجے میں کہ بہت

جلد اڑی بیٹھنے والے تھے۔ میں نے میربخش کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”عمر کوٹ جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔“

”چرخس طرف جائیں گے۔“

میں نے پچھا ”اڑی سے اور کس طرف کی سڑکیں نکلتی ہیں؟“

وہ بتانے لگا ”اڑی سے بائیں جانب یعنی شمال میں ایک سڑک نکلتی ہے جو چھوڑو سے ہوتے ہوئے قلعہ ماگھڑی میں داخل ہو جاتی ہے۔“

”مجھے نہیں جانا سا گھڑوا گھڑوا۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

وہ بولا ”اور آپ عمر کوٹ بھی نہیں جانا چاہتے اس لیے ہم اڑی سے گزرنے کے بعد اس سڑک کو چھوڑ دیں گے۔ یہ سڑک سیدھی عمر کوٹ کی طرف جاتی ہے۔“

”میں بنیادی طور پر کراچی جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے بدستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا ”اس مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے راہنمائی کرو۔“

میربخش نے حتمی لہجے میں کہا ”پھر تو آپ گاڑی کو اڑی سے دائیں جانب موڑ لیں۔ کراچی جانے کے لیے عمر کوٹ سے میرپور خاص میں سے گزرنا ضروری ہے۔ ایک رات

وہی شادی پٹی والا تھا جس پر ناکا لگا ہوا ہے۔ اب ہم دوسرے اور تیسرے راستے کو آزما لیں گے۔“

میں نے پوچھا ”اڑی سے دائیں طرف گاڑی موڑنے کے بعد کیا صورت حال ہوگی۔ میرا مطلب ہے، کاروائی کیا ہے گا۔“

”وہ جان سائیں!“ میربخش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”چند گز آگے یہ سڑک آپ کو چھوڑا ہوگی۔ اس کی بات ختم ہونے تک وہ چند گز گزر گئے۔ ہم اڑی سے گزر کر اس چوراہے پر آگئے جہاں دو سڑکیں ایک دوسرے کو

کراس کرتی تھیں۔ میربخش نے کہا ”سائیں! گاڑی کو سیدھے ہاتھ موڑ لیں۔“ میں نے اس کے کہنے کے مطابق

پجوار کو کڑی سے جنوب کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ کر لیا۔ میربخش نے بتانا شروع کیا ”وہ جان سائیں! اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم صاف بھروسے گزریں گے۔ پھر

رجیم ٹکری سے ہوتے ہوئے ”سامارو“ پہنچ جائیں گے۔ سامارو، میرپور خاص کے بہت نزدیک ہے۔ وہاں سے سید

سڑک جنیس آباد (میرپور خاص) کی طرف جاتی ہے۔ اس کا تفصیلی بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا ”اور پھر

راستہ کون سا ہے؟“

”ہم سامارو میں رکنے یا وہاں سے میرپور خاص میں داخل ہونے کے بجائے سیدھے آگے بڑھ جائیں۔“

”تو کوٹ“ کے مقام پر میرپور خاص پہنچ سکتے ہیں۔“

میں نے استفسار کیا ”کیا یہ وہی ”جی سر“ ہے جس کے

ساتھ ”شیت“ شخص قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو منگل

بائی ڈاکو نے اغوا کر رکھا ہے اور پچاس لاکھ روپے کے ڈان کا مطالبہ کر رہا ہے؟“

”جی سائیں“ یہ وہی ”جی سر“ ہے۔“ میربخش نے

تفصیل کر دی۔

ساحل نے کہا ”یہ منگل کنگھ تو بہت ہی منحوس آدمی ہے اس کی وجہ سے ہمیں کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اگر ہم خیریت سفر جاری رکھتے تو پتا نہیں، اس وقت

ماں ہوتے۔ جہاں بھی ہوتے، خیریت سے ہوتے۔“

میربخش ہوٹل سے نکلنے کے بعد مجھے بتا چکا تھا کہ ہم بدستور ”شالیہارا ایکسپریس“ کے ذریعے کراچی جائیں

میربخش نے حتمی لہجے میں کہا ”پھر تو آپ گاڑی کو اڑی سے دائیں جانب موڑ لیں۔ کراچی جانے کے لیے عمر کوٹ سے میرپور خاص میں سے گزرنا ضروری ہے۔ ایک رات

وہی شادی پٹی والا تھا جس پر ناکا لگا ہوا ہے۔ اب ہم دوسرے اور تیسرے راستے کو آزما لیں گے۔“

میں نے پوچھا ”اڑی سے دائیں طرف گاڑی موڑنے کے بعد کیا صورت حال ہوگی۔ میرا مطلب ہے، کاروائی کیا ہے گا۔“

”وہ جان سائیں!“ میربخش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”چند گز آگے یہ سڑک آپ کو چھوڑا ہوگی۔ اس کی بات ختم ہونے تک وہ چند گز گزر گئے۔ ہم اڑی سے گزر کر اس چوراہے پر آگئے جہاں دو سڑکیں ایک دوسرے کو

کراس کرتی تھیں۔ میربخش نے کہا ”سائیں! گاڑی کو سیدھے ہاتھ موڑ لیں۔“ میں نے اس کے کہنے کے مطابق

پجوار کو کڑی سے جنوب کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ کر لیا۔ میربخش نے بتانا شروع کیا ”وہ جان سائیں! اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم صاف بھروسے گزریں گے۔ پھر

رجیم ٹکری سے ہوتے ہوئے ”سامارو“ پہنچ جائیں گے۔ سامارو، میرپور خاص کے بہت نزدیک ہے۔ وہاں سے سید

سڑک جنیس آباد (میرپور خاص) کی طرف جاتی ہے۔ اس کا تفصیلی بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا ”اور پھر

راستہ کون سا ہے؟“

”ہم سامارو میں رکنے یا وہاں سے میرپور خاص میں داخل ہونے کے بجائے سیدھے آگے بڑھ جائیں۔“

”تو کوٹ“ کے مقام پر میرپور خاص پہنچ سکتے ہیں۔“

میں نے استفسار کیا ”کیا یہ وہی ”جی سر“ ہے جس کے

ساتھ ”شیت“ شخص قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو منگل

بائی ڈاکو نے اغوا کر رکھا ہے اور پچاس لاکھ روپے کے ڈان کا مطالبہ کر رہا ہے؟“

”جی سائیں“ یہ وہی ”جی سر“ ہے۔“ میربخش نے

وڈیرا اکبر سومو تو دود پر تک اپنی جاگیر پر تھا۔ میں اسے کے بچکے پھوڑ کر آپ کی طرف آیا تھا پر وہ تارا کی معیت میں ڈی ایس پی کے بچکے پر رات کے آخری پیرکس طرح پہنچ گیا! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

میں نے کہا ”جس طرح تم نے بہت سی امکانی باتوں کا ذکر کیا ہے، بالکل اسی طرح یہ بھی ممکن ہے، تارا، وڈیرا اکبر سومو کے ساتھ ہی عمر کوٹ شرنک پہنچا ہو لیکن اس نے

وہاں وڈیرے کی موجودگی کو راز میں رکھا ہو اور جب تارا ہمیں گھیر گھار کر وڈیرے تک پہنچانے میں ناکامیاب رہا تو

وڈیرا اس کی خیر خیریت دریافت کرنے ہوٹل پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے بعد ان دونوں کا ایک ساتھ ڈی ایس پی کے بچکے پر

وارد ہونا کوئی اچھے کی بات نہیں رہتی۔“ میں ایک لمحہ سانس لینے کو رکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”دوے

حقیقت کیا ہے، اس کے بارے میں تو وڈیرا اکبر سومو اور تارا ہی بتا سکتے ہیں اور ان تک جانے کا ہمارا کوئی ارادہ

نہیں۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے چونکا نظر سے عقب کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ اب تک ہمیں اپنے

تغائب میں کسی قسم کی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ میربخش نے کلا شکوف کا اسٹریپ کنڈھے پر چڑھا رکھا تھا اور

اس کی نال کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر ”فوکس“ تھی۔ اس نے اس سڑکے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی احتیاط کا دامن

ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس نے ”جی سائیں“ کہہ کر میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا ”تم اب گن کو کندھے سے اتار کر اپنی گود میں رکھ لو یا پھر گاڑی کے کسی حصے میں ڈال دو۔ تغائب میں اگر

کسی کو آتا ہوتا تو ہمیں متغائب کی اب تک ”خف“ نظر آجاتی۔ خراخواہ اپنے اعصاب کو دباؤ کا شکار نہ بناؤ۔“

اس نے اپنے بائیں بازو کے کندھے سے کلا شکوف کا پٹا اتار کر اسے گود میں رکھ لیا پھر بولا ”یہ تو ٹھیک ہے، ہمارا

تغائب نہیں کیا جا رہا لیکن کسی وقت اپنا تن اس ہتھیار کی ضرورت پیش آسکتی ہے اس لیے میں کلا شکوف کو اپنی

دسترس ہی میں رکھوں گا۔“

میں نے کہا ”میربخش! ہم ابھی تک ایک نہایت ہی اہم کام کو نبھاتے ہوئے ہیں!“

”کیا آپ گاڑی روک کر یہ کام کرتا چاہتے ہیں؟“  
 ”اس کام کے لیے گاڑی روکنا ضروری نہیں۔“ میں  
 نے کہا ”میں گاڑی ڈرائیو کر رہا ہوں۔ تم گاڑی کا یہ حصہ  
 اچھی طرح چیک کر لو اور تم۔“ میں نے عقب نما آئینے میں  
 ساحل کو دیکھتے ہوئے کہا ”تم گاڑی کے پچھلے حصے کی تلاشی  
 لو۔ اچھی طرح ایک ایک کوئے کھانچے کو دیکھو۔ کوئی چیز  
 تمہاری نظر سے بچتا نہیں چاہیے۔“

وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مصروف ہو گئے۔ دس ہند رہ منٹ کی تلاشی کے بعد کافی خوش آئند خبریں مجھ تک پہنچیں۔ میر بخش نے پجاو کے اس حصے سے ایک بھاری رقم کا سراغ لگایا تھا۔ وہ رقم ایک خفیہ خانے میں چھپائی گئی تھی۔ میر بخش نے رقم دالی گندی میری نظر کے سامنے لرائی اور بتایا "سامیں! یہ پورے پچاس ہزار روپے ہیں۔"

وہ پانچ سو روپے والی نوٹوں کی ایک مکمل گڈی تھی جس پر بینک کی نقد تبدیلی مہر بھی لگی تھی۔ گڈی ہر لگی بین اور چٹ سے ظاہر ہوا تھا، اس میں سے ایک نوٹ بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ گویا وہ میرنکس کی اطلاع کے مطابق واقعی پچاس ہزار روپے تھے۔ ان حالات میں ہمیں رقم کی سخت ضرورت تھی۔ یہ رقم نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔

میر بخش نے جو بیٹے انداز میں کہا "سائیں! میں نے سن رکھا ہے، اس دنیا میں ہمارا جو نقصان ہوتا ہے، وہ آخرت میں ستر گنا ہمیں واپس ل جاتا ہے۔ پولیس والوں نے ہم سے لگ بھگ گیارہ ہزار روپے چھینے تھے۔ پانچ لاکھ تو ہمیں اسی جہان میں مل گئے، باقی بیٹھ گناہ کبھی کبھی ملے ہیں!"

”میر بخش!“ میں نے گمبیر لہجے میں کہا ”میں تمہارے اس سوو زیاں کے فارمولے پر یقین نہیں رکھتا۔ اللہ کے ہاں نوازے اور چھیننے کا دستور اور کلیہ بہت عجیب و غریب ہے۔ اسے انیٹیٹ کرنا ہمارا کس کے بس کی بات نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ رقم ہمیں ان گیارہ ہزار کے بدلے میں ملی ہوگی۔ ہماری رقم کا زیاں ایک ساٹھ تھا، اس رقم کا حصول ایک اتفاق ہے۔ بہر حال یہ رقم بڑے موقع پر ہمارے ہاتھ لگی ہے اس لیے اسے حسین اتفاق بھی کہا جاسکتا ہے۔“

میر بخش نے میرے خیالات پر کسی قسم کا اعتراض یا تنقید نہیں کی۔ پجارو کے عقبی حصے کی تلاش میں ساحل کو

ٹین کے دو کین ملے تھے۔ وہ دونوں کین اپنی ٹیول سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے ڈھکنوں کو بہت محفوظ انداز میں بند کیا تھا۔ وہ پانچ پانچ لیٹر والے کین تھے گویا ہمارے پاس اس وقت دس لیٹر فیول اضافی حیثیت میں موجود تھا۔ یہ بھی صحیحی ملائے میں بہت بڑی نعمت تھی۔

پچاروں میں کہیں بھی کوئی ہتھیار یا اس کا ایمونیشن نہیں پایا گیا تھا۔ اس صورت حال میں ہمارے لیے سب سے اہم وہ رقم تھی جس کی مدد سے ہم دیگر اشیاء کی ضرورت خرید سکتے تھے۔ پولیس والوں نے تلاشی کے نام پر ہمیں بالکل بے غالی کر دیا تھا۔ گیارہ ہزار روپے، آٹا کا پستل مع گلولے، اسپرینس نمالیک اینڈ ریڈ گاڑی، ہمارا سفری بیگ وغیرہ سب سچے ہم سے چھین لیا گیا تھا۔ میں نے عمر کوٹ سے میرو رخاص کی جانب سفر کے دوران میں یاں شاہی کی چپ والی چلیاں کھڑی کے باہر پھینک دی تھیں۔ اگر جامعہ تلاشی کے مراصل میں وہ چلیاں میرے پاس سے برآمد ہو جائیں تو ہمارے لیے مصائب میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک تارا و ذرا اکبر سوم اور ڈی ایس پی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیں پیش آمد حالات بھی زیر بحث آئے میں نے محسوس کیا کہ شرمشاہ میں تو ساحل بھی اس بات چیت میں شامل رہی لیکن پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ جب میں نے اسے کافی دیر تک بچہ ہوتے ہوئے نہ سنا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”ساحل! ایبات ہے، تم چپ کیوں ہو؟“

اس نے فطری رد عمل کے طور پر مجھے دیکھا۔ وہ درحقیقت میری پشت کو دیکھ رہی تھی لیکن میں بیک دیو سر میں اس کا چہرہ نہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس کی صورت تکلیف کے آثار نظر آئے پجوار کے اندر اگرچہ بہت دیرم روشنی تھی تاہم میں نے ساحل کے چہرے کی کیفیت کو مکمل کتاب کی طرح بڑھایا۔

وہ جواب دیتے ہوئے بولی ”کچھ نہیں ہے وجد ان“  
 ”کچھ تو ہے۔“ میں نے پجارد کی رفتار قدرے کم کر دی  
 ”یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟“  
 وہ ہنسیکا ہٹ آئینز لہجے میں بولی ”بس ذرا میرے پاؤں مثلاً  
 تکلف ہو رہی ہے۔“

”کیا ہوا ہے، میرے چہرے کو؟“ وہ بے ساختہ اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”میں محسوس کر رہا ہوں“ تم اس وقت شدید کُف میں ہو۔“

”خنخے میں پھر سے درد جاگ اٹھا ہے۔“ اس نے بتایا۔  
 ہر حال فکر کی کوئی بات نہیں، میں برداشت کر رہی ہوں۔“  
 انہما سے پاکستان آتے ہوئے سرحدی صحرا میں ساحل

اس وقت تک دھو تھی) کے پاؤں میں شادیہ مोज اگئی  
 جب ہم بھارتی سرحدی گاؤں "سوئی کاس" سے جب پاکستان  
 کے سرحدی گاؤں میں پہنچے تو پینڈت کشوری لال کے میاں  
 پنہا پنہا پنڈت نے وید (عظیم) کو بلا کر "دھو" کے پاؤں کا  
 منہ نہ کروایا تو بتایا اس کے دائیں نچے میں مोज اگئی تھی۔  
 یہ نہ باتش کے لیے اسے ایک مزمزم دے دیا تھا۔ اڑاں بعد  
 میں نے اپنی "جی" کی قوت سے اس کے نچے کا درد رفع کر دیا  
 غلام ساحل خود بھی اس عمل کو کافی حد تک سمجھ گئی تھی تاہم  
 چونکہ اس کی "جی" کی قوت بیدار نہیں تھی اس لیے خاطر  
 ڈانٹا مج پر آمد کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

یہ پوری رات ہم نے افرا آفری اور بھاگ دوڑ میں گزار دی تھی۔ اس بے آرامی نے ساحل کے فٹھے کے درود کو غنچور جگا جگا دیا تھا۔ ویسے بھی وہ مسلسل ہیل والی سینڈل پہنے اُسے تھی۔ ٹھکن اور رت جگا اچھے اچھوں کو پچھاڑتا ہے، ساحل تو ایک نرم و ملازک حینہ تھی۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تم تکلیف کو  
براہت کرنے کے بجائے دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں  
کرتی ہو؟“

”کیا کروں میں؟“

”سب سے پہلے تو ہیل وار سینڈل کو پاؤں سے جدا کرو۔“ میں نے مشورہ دیا ”پھر وہی عمل دہراؤ جو تم ٹیکپارکر سقائے کی حوالات میں پہلے بھی کر چکی ہو۔“

وہ پہلی ”تم کہہ رہے ہو تو میں ایسا ہی کروں گی۔“ پھر اس سائنٹسٹ کو پاؤں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا ”میرے عمل مادہ تاثیر تو نہیں ہو سکتی جو تمہارے عمل میں ہے۔ تم تو بڑا عظیم الشان قوت کے مالک ہو۔“

”ہاں گو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں نے پہلے بھی آپ دونوں کی زبان سے یہ لفظ دو سنا کرتے سنا ہے۔“ میر بخش نے کہا ”جی کی قوت کیا چیز ہے؟“

مکملت کے سوال کا جواب دینا بہت ضروری تھا۔ وہ

میرا ساتھی اور جاں نثار دوست بن چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی آسان الفاظ میں اسے اس قوت کے بارے میں بتا دیا۔ میری وضاحت سنتے ہوئے اس کے چہرے پر ہیجان خیز تاثرات ڈھیلیا سا لگا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے جذبات سے بیز لہجے میں کہا۔

”سائیں! آپ تو بہت کمال کے آدمی ہو۔ آپ کے پاس تو بہت حیرت انگیز اور زبردست قوت ہے۔ اس گھر بل بوتے پر تو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ہاں“ ہے تو لیکن میں اسے انتہائی جائز اور مثبت کاموں میں استعمال کرتا ہوں۔ شعبہ بازی مجھے پسند ہے اور نہ ہی میں نے اس کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔“

”آپ بہت عظیم ہیں سائیں!“ وہ فرط جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”عظیم صرف اللہ کی ذات ہے۔ بالی سب انسان برابر ہیں۔ بس بعض اوقات کسی شخص کی محنت اسے دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے لیکن اس برتری کے سبب اسے دوسروں سے خود کو بڑا یا اعلیٰ دافع نہیں سمجھ لینا چاہیے“ اللہ انسان کو دو طریقوں سے آزماتا ہے۔ کسی ایسی چیز سے نوازد کہ جس کا انسان اہل نہیں ہوتا یا پھر کسی ایسی شے سے محروم رکھ کر جس کا وہ استحقاق رکھتا ہو۔ یہ صلاحیتیں، کمیتیاں، ہنر اور تجربے کا ریاں سب آئی جاتی ہیں۔ ہم سب معمولی اور غیر معمولی اداکار ہیں۔ ہمارا بدایت کا رتو وہ ہے جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔“

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لڑزاں لمبے  
میں گویا ہوا "سامیں! آپ تو صرف عامل ہی نہیں ملکہ عالم  
بھی ہیں۔"

”میں کچھ بھی نہیں ہوں۔“ میں نے قطعیت سے کہا  
 ”بس ایک سیدھا سادہ معمولی سا انسان ہوں۔ میں شت سوچ  
 اور مثبت عمل کا قائل ہوں اور منفی سوچ رکھنے والے لوگوں  
 سے نبرد آزما ہوں۔ میں ایک طرح سے حق و باطل کی جنگ  
 میں مصروف ہوں اور مجھے یقین ہے، بالآخر حق ہی کی  
 ہوگی۔“

وہ سحرزدہ نظر سے مجھے نکلے چلا جا رہا تھا۔ یہ میرے لیے اس کی والہانہ عقیدت تھی جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

میں نے کہا ”میر بخش! میری ایک بات ذہن نشین کرلو۔ یہ دنیا مفید لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے ہمیں ہر لمحے خود کو مفید بنانے کی کوشش میں مصروف رہنا چاہیے۔ ہماری

ذات سے کسی دوسری ذات کو فائدہ ضرور پہنچنا چاہیے۔ یہی ایک صحت مند معاشرے کا اصول ہے۔ بے فیض اور غیر منفید شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں۔“

ساحل نے مجھ سے سوال کیا ”وجدان! تمہارے نزدیک ایک مفید انسان میں کیا کیا اوصاف ہونا چاہئیں؟“

میر بخش کی طرح وہ بھی پوری توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے کھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

”میرے نزدیک مفید انسان وہ ہے جس میں تین بنیادی اوصاف ہیں۔ کم از کم ایک وصف ضرور موجود ہو۔ وہ تین اوصاف یہ ہیں۔ نمبر ایک، مثبت علم، نمبر دو، صحت مند فکر۔ نمبر تین توانائی سے بھرپور دانش۔“

”اور اگر کسی شخص میں یہ تین خاصیتیں موجود ہوں تو؟“ ساحل نے پوچھا۔

”تو وہ شخص میرے نزدیک الیگزینڈر فیڈمین (شرف یافتہ انسان) کہلانے کا حق رکھتا ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”آپ ایسے شخص کو زندہ بھی کہہ سکتے ہیں۔“

میر بخش نے شوق سے لبریز لہجے میں پوچھا ”سائیں! کیا میں بھی اپنی ”چی“ کی قوت بیدار کر سکتا ہوں؟“

اسی وقت مجھے پچارو سے باہر آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں نے میر بخش کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا ”یہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں؟“

اس نے بغور پچارو کی وڈا اسکرین کے پار دیکھا اور مجھے بتایا ”ہم اس وقت ”صالح بھمبرو“ سے گزر رہے ہیں۔ اس سے آگے ”محمد رحیم کھری“ آئے گا اور پھر اس کے فوراً بعد ”سامارو“ کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔“

میں نے تسلی تیز انداز میں سر ملاتے ہوئے میر بخش سے پوچھا ”ہاں“ تم کیا کہہ رہے تھے؟“

”میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا سائیں کہ کیا میں بھی ”چی“ کی قوت کو بیدار کر سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں!“ میں نے کہا۔

”اس کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے؟“ اس نے پوچھا ”میرا مطلب ہے، اس قوت کی بیداری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟“

”صرف ایک چیز کی۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیا سائیں؟“

میں نے بتایا ”عزم!“

”میں کچھ سمجھ نہیں سکا!“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”عزم کا تہاں مطلب ہے ”ارادہ“ جس شخص نے کوئی کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، سمجھ لو اس نے وہ کام سرانجام دے لیا۔“

”پھر بھی“ جی جی عظیم قوت کی بیداری کے لیے کچھ پابز تو بتائیں! پڑتے ہوں گے!“ میر بخش کے اس اصرار نے انداز میں بے پناہ کچلی شامل تھی۔

میں نے واضح الفاظ میں کہا ”کوئی پابز نہیں بتا سکتا۔ بس ایک سیدھی سادی آسان سی مشق ہے۔ اسے باقاعدگی سے کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ کی نیت صاف ہے ”ارادہ پختہ“ اور مقصد نیک ہے تو پھر کامیابی آپ کا مقدر ہے۔ آپ کا ہر بھی عمل لگن سے بھرپور ہوگا، وہ مثبت نتائج ضرور لائے گا۔“

وہ ہچکچاہٹ آہستہ انداز میں پوچھنے لگا ”سائیں! کیا آپ مجھے ”چی“ کی بیداری کے لیے مخصوص وہ سادہ سی مشق بتا سکتے ہیں؟“

”بالکل پتا سکتا ہوں۔“ میں نے فراخ دلی سے کہا۔

اس موقع پر ساحل نے شکایتی لہجے میں کہا ”وجدان! تم نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ وہ مخصوص انکسرسائز مجھے بھی کراؤ گے لیکن ابھی تک تم نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔“

”میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مشق کرانے کے لیے مکمل ذہنی سکون اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔“ میں نے کہا ”ایسا کہا تھا یا نہیں؟“

”ہاں“ تم نے یہی کہا تھا۔“ اس نے تصدیق کی۔

میں نے پوچھا ”کیا اس کے بعد سے ہمیں ذہنی سکون اور فرصت میسر آئی ہے؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے کہا ”پھر تمہاری شاییت بے جا ہے۔“

وہ بولی ”جب ہمیں فرصت ملے گی اس وقت ہم اس مشق کا عملی مظاہرہ کر لیں گے۔ فی الحال تم ہمیں اس کی تیئوری تو بتا سکتے ہو نا!“

”ہاں“ فی الحال یہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا پھر انہیں ”چی“ کی حقیقت بتانے لگا۔

میں نے انہیں بتایا کہ ”چی“ ایک پوشیدہ اور خفیہ قوت ہے جو ہر انسان کے پیٹ کے پیچھے میں سے ناف سے تھوڑا نیچے موجود ہے۔ آپ اس مقام کو ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کا زیریں حصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چینی فلڈائی میں اسے ”چی“ کا نام دیا گیا ہے۔ ہندو اٹھارویں صدی میں اسے ”کنڈلینی شکتی“ کہلاتی ہے۔ اسلامی روحانیت میں اسے

”نہف“ کہتے ہیں۔ تینوں تہذیبوں کے عالموں نے اس کی بارے کے لیے مختلف طریقے، مشقیں، ریاضتیں و مراسم باہر و غیرہ وضع کیے ہیں۔ راستے الگ الگ ہیں مگر کم و بیش ایک ہی سہ۔ جو بھی انسان اس کے حصول کے پابز کرے، راستے پر بالکل درست قدم رکھتا ہے، وہ بالآخر فی حلال کو پاتا ہے۔“

میں ان کی طرف دیکھے بغیر بولے چلا جا رہا تھا۔ میری رائے توجہ ڈراؤنک پر مرکوز تھی۔ میں نے ”چی“ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا ”جب مخصوص مشق کے ذریعے اس پختہ قوت کو بیدار کیا جاتا ہے تو یہ ریڑھ کی ہڈی کے راستے جسمی دماغ کی جانب سفر کرتی ہے۔ اس موقع پر بہت سمجھ بوجھ اور احتیاط کے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مشق نہ والے کوئی سنگین غلطی کر بیٹھے یعنی اس کے ارتکاز اور

ہم میں کوئی زخم پڑ جائے یا اس کی نیت میں کوئی کھوٹ جائے یا وہ کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھے تو پھر یہ تکی بھی نہ نیت کی سرکشی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ یہ ایک راجزات شیر کو چگانے کے مترادف ہے لیکن اس مرحلے پر اگر مشق کرنے والے کو کسی ماہر استاد کی رہنمائی حاصل تو پھر خطرے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ ویسے بھی یہ قوت

چاک بیدار ہو کر دماغ کی جانب سفر نہیں کرتی۔ جب آپ سے جگانے کے لیے اپنی مشق کے ذریعے اس کو بولے دے سمجھو۔“ تم جس تو یہ کسمسا کر میں بدلتی رہتی ہے۔

ان مزال میں مشق کرنے والے شخص پر مخصوص قسم کی نیات بھی طاری ہوتی رہتی ہیں جن کی بنا پر نگران استاد سے مفید مشوروں سے نوازتا رہتا ہے۔ ان مشوروں اور

توجہ پر عمل کرتے ہوئے اس سرکش قوت کو ذبح کر ڈال کر انسانی طرف لایا جاتا ہے۔

”دماغ میں پیچ کر یہ قوت فوٹان کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو دماغ کے ایک مخصوص حصے کو ریش کر دیتی ہے۔ یہ وہی حصہ ہے جہاں خیالات نمود پاتے ہیں۔ یہ خیالات کی نشوونما کو

نقبت دیتی ہے گویا یہ خیالات کی قوت کو بڑھاتی ہے“ انہیں بتاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے آئو جزیئر کے طور پر کام کرتی ہے۔ انسان خیال کی قوت سے بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔“

ساحل نے پوچھا ”فوٹان کیا چیز ہوتی ہے؟“

”یہ انٹرنیٹ کا سب سے چھوٹا اور ناقابلِ تعمیر ذرہ ہے۔“ میں نے بتایا ”دوشنی کا سارا کھیل اسی حصے سے

نکلتا ہے۔“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”اس کا تہاں؟“

”کیا ہم فوٹان کو دیکھ سکتے ہیں؟“

”نہی ایک فوٹان کو دیکھنا انسانی آنکھ کے بس کی بات نہیں۔“ میں نے کہا ”فوٹان کا مجموعہ روشنی ہے جسے ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ذرہ الیکٹرون، پروٹان اور نیوٹرون سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔“

میر بخش نے پوچھا ”سائیں! خیال کی قوت سے کارنامہ کیسے انجام دیا جاسکتا ہے؟“

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ”خیال کی قوت بڑی غضب کی چیز ہے۔ اگر انسان پوری لگن سے کسی ایک خیال پر توجہ مرکوز کر دے تو وہ خیال مجسم شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہماری سوچ جتنی مضبوط ہوتی ہے، ہم اتنے ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ خیال کی قوت واقعات کو جنم دیتی ہے۔ ہم گہری توجہ سے جس بات کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں، وہ ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ ایک راگی ملہار گاکر برسات کا

ساں پیدا کر سکتا ہے۔ وہ جب دیکھ راگ چھیڑتا ہے تو گگ

جل اٹھتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ لوگ اسے گانے والے کا فن کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ اس کا ارتکاز توجہ ہے۔ وہ اپنے فن میں ذوق کر خیال کی قوت سے ایک واقعے کو جنم دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خیالات کا کنٹرول ناقابلِ یقین اور حیرت آفریں مناظر تخلیق کر سکتا ہے۔“

راگ راگینوں اور گروہوں کے بارے میں مجھے بے پور میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ رانی روپ متی کا گنگی کے فن میں خاصی دسترس رکھتی تھی۔ اس سے میں گھنٹوں موسیقی پر گفتگو کرتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی تھیں۔

ساحل اور میر بخش پوری دل جمعی سے میری جانب متوجہ تھے اور ”چی“ سے متعلق باتیں سن رہے تھے۔ انچانک میں نے ساحل سے پوچھا ”تمہارے بچے کا درد اب کیا ہے؟“

”اے! ہاں۔“ وہ چونکتے ہوئے بولی ”میں نے تو کافی دیر سے یہ درد محسوس نہیں کیا۔“ پھر وہ زبانی سے مجھے کئے گئے۔

”یہ ہوتی ہے خیال کی قوت!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ”تم کافی دیر سے مجھے سن رہی ہو۔ تمہاری توجہ میری باتوں پر لگی ہے گویا اس وقت تم ارتکاز توجہ کی کیفیت سے گزر رہی ہو۔ میری باتوں کے سوا تمہارا دھیان کسی اور سمت میں نہیں ہے اس لیے تم باقی تمام نیفات سے بے خبر ہو۔ تمہارے غم میں درد تو ہو رہا ہو گا لیکن عدم توجہ کی وجہ سے تم اسے محسوس نہیں کر رہی ہو۔ جس طرح

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

آتش فشانی

میں نے کہا ”میرے سامنے اس طرح ہاتھ نہ جوڑو۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہم دوست ہیں۔ مجھ سے بجا جھگ بات کیا کرو۔“

”سائیں! مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ تاہم اس مرتبہ اس نے ہاتھ نہیں جوڑے تھے ”سائیں! میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ آپ نے مجھے سام نہایا، آپ بہت مہربانی ہے۔ اب میری یہ زندگی آپ کی امانت ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ پر قربان ہو جائے۔“

بات ختم کرتے ہوئے وہ خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اسے مزید روکنا تو کتنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ میرے ساتھ رہتے رہتے خود ہی سب کچھ سیکھ جاتا۔ اس کی ساری عمر وڈیرا اکبر سومرو کی چاکری میں گزری تھی۔ اس کم کے بھوتار وڈیرے صرف حکم چلاتے ہیں اور میر بخش جیسے ادنیٰ چاکر ”جو حکم سائیں“ کہنے کے لیے پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی چاکر اپنے وڈیرے کے سامنے دم مارنے کی جسارت نہیں کر سکتا، دوستی کرنا اور دوستانہ انداز میں بات کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ مجھے امید تھی کہ میر بخش تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے روتوں کو بخوبی سمجھنے لگے گا۔ اگلے سال سے ہمارے ساتھ گھٹنے ملنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس میل تال کے لیے کچھ وقت کی ضرورت تھی۔ وہ دونوں اچانک خاموش ہو گئے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے درد کو محسوس کر رہے تھے۔ میں نے دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”کیسی خوش خبری؟“ ساحل نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میر بخش بھی سوالیہ نظر سے مجھے تنکے لگا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں کی تربیت و تعلیم ابھی سے شروع کروں۔“

”وہ تو تم کافی دیر سے کر رہے ہو۔“ ساحل نے کہا۔

”تمہارا علمی اور فنی لیچر ہم پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔“

”میں عملی تربیت کی بات کر رہا ہوں۔“

”اس کے لیے تو سکون اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہوگی۔“

ساحل نے کہا۔

میر بخش بولا ”سائیں! کیا گاڑی میں وہ مشق کرنا مناسب ہوگا۔ آپ تو کہہ رہے تھے۔“

میں نے میر بخش کی بات کانٹے ہوئے کہا ”باقاعدہ عملی

ارتکاز توجہ سے کوئی واقعہ تخلیق کیا جاسکتا ہے، بالکل اسی طرح عدم توجہ اور بے نیازی سے کسی حقیقت کی نفی بھی کی جاسکتی ہے اور یہ سارے کا سارا اکیلے خیال کی قوت کا ہے۔“ ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ”اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوگئی کہ تمہارے اندر ارتکاز توجہ یعنی کنسنٹریشن کی صلاحیت موجود ہے۔“

میر بخش نے کہا ”سائیں! میں بھی کافی دیر سے اپنے بازو کا درد بھولا ہوا ہوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ پچھلے چند روز میں منٹ سے گھما کر بازو میں کوئی ٹیس کیوں نہیں آئی۔“

”اب تو تمہاری حیرت دور ہوگئی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”تم بھی اپنے اندر توجہ کی قوت رکھتے ہو۔“

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا ”اس کا مطلب ہے، میں اپنی ”جی“ کی قوت کو بیدار کر سکتا ہوں۔“

”یہ ناممکن نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”اگر تمہارا عزم پختہ اور کوشش مثبت ہوئی تو تم یہ قوت ضرور حاصل کر لو گے۔“

ساحل نے کہا ”بس بھی بہت ہوگی۔ وجدان! اب جہاں بھی ہمیں کچھ دیر ٹھہرنے کا موقع ملے گا، تم ہمیں ”جی“ کی مشق کرنا علمنا سکھاؤ گے۔“

”تھیک ہے، میں نے کب انکار کیا ہے۔“

”میں تم سے مارشل آرٹس بھی سیکھوں گی۔“ وہ چل کر بولی۔

”وہ بھی ضرور سکھاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

میر بخش نے کہا ”ان فنون کے لیے آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں سائیں۔“

”لے لیا۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا ”اور کچھ؟“

”بہت بہت شکریہ سائیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ساحل سے کہا ”تم ذرا میر بخش کو ”شکریہ“ والا فلسفہ سمجھا دو۔“

وہ میری بات کا مقصد سمجھ گئی اور آئندہ پانچ منٹ میں وہ میر بخش کو بتاتی رہی کہ میرے نظریے کے مطابق تھینک یو، سوری اور پلیز جیسے تکلفات کو دوستوں کے درمیان جگہ نہیں پانا چاہیے۔

میر بخش گہرے، عقیدت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”سائیں! آپ کا دوست بننے کے قابل کہاں ہوں۔ آپ نے مجھے، آپ کے ساتھ رکھ لیا ہے، یہی بڑی بات ہے۔ آپ تو میرے آقا ہیں۔“ پھر اس نے دونوں ہاتھ مخصوص انداز میں جوڑ دیے۔



مشق تو گاڑی میں نہیں کی جاسکتی البتہ اس کی ابتدائی تیاری کے لیے ہلکا ہلکا کچھ کیا جاسکتا ہے۔  
”وہ کیا؟“ ساحل کی آواز میں دلچسپی شامل تھی۔

میں نے کہا ”تم دونوں میں ارتکاز توجہ کی صلاحیت موجود ہے اور اس صلاحیت کو آزمائے کا موقع بھی ہے۔ ساحل، تم اپنے تئیں میں درمخوس کر رہی ہو اور میری توجہ تم اپنے زخمی بازو میں نہیں محسوس کر رہے ہو۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ”میں نے یہ بات تم دونوں کی اچانک خاموشی سے سمجھ لی ہے۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو اور تم دونوں کی خاموشی کی کوئی اور وجہ ہو! کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

وہ بیک زبان بولے ”آپ نے ہمارے بارے میں بالکل درست محسوس کیا ہے۔“

”چتر تم دونوں اپنی توجہ اپنے اوپر جسم کے زخمی حصے پر مرکوز کر دو۔“ میں نے کہا ”اور اس خیال کو ذہن میں جمانے کی کوشش کرو کہ تمہارے زخم تکلیف دہ نہیں رہے۔ تم لوگ ایسا سوچتے ہوئے جسم کے متاثرہ حصوں کو دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سے سسلانے بھی جاؤ۔ اس طریقے سے تمہیں یقینی طور پر بہت آرام و سکون ملے گا۔“ اگلے ہی لمحے وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔

جب ہم ”محمد رحیم کلری“ کے نزدیک پہنچے تو رات کی تاریکی چھٹنے لگی۔ آہستہ آہستہ اب پیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ تاریکی کا جتنا حصہ ختم ہوتا وہ جگہ احوالے لیتا۔ وہ ایک بیک وقت عمل تھا۔ غیر محسوس طور پر تاریکی اجالے میں بدل رہی تھی جس طرح انسانی جسم میں خون کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایک طرف تازہ خون بنتا رہتا ہے، دوسری جانب ناقابل استعمال ڈیلٹا بلیڈ سیز ایک قدرتی عمل کے تحت دوران خون میں سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ قدرت کا ہر نظام حیرت آفرین ہے اور ”انوسلم“ کے تحت کام کرنا ہے۔ جس طرح تاریکی اجالے کی خوراک بن جاتی ہے بالکل اسی طرح اندھیرا روشنی کو نکل جاتا ہے۔ شام و سحر کا یہ چکر صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور صدیوں تک چلتا رہے گا۔ گویا یہ سلسلہ ازل سے ابد تک چھلایا ہوا ہے۔

ریگستان میں ایک ہی دن میں موسم کی کئی صورتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ دن کے ابتدائی اور آخری حصے یعنی شام و سحر کے وقت موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ نہ سردی اور نہ گرمی۔ دوپہر میں آسمان اگ بھرا لگتا ہے گویا جسم

کا سا سماں ہوتا ہے۔ جھلکی ہوئی رات اسے اندر ٹھنڈک رکھتی ہے۔ اگر سردی بہت زیادہ نہ تھی جو تو پھر بھی موسم سردی ہوتا ہے۔

میں وینڈ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہ جمائے ڈرائیو میں کر رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کا منظر ایک مخصوص حد تک روشن تھا۔ اب تو ویسے بھی اجالا ہلکا تھا۔ غور سے دیکھنے پر گرد و نواح کا منظر نگاہ کے سامنے واضح ہو جاتا تھا۔ اس وقت فضا بہت دلکش اور موسم خاصا سا ہوا رہا تھا۔

محمد رحیم کلری سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پکارو کو روکنا پڑا۔ دراصل اس مقام پر ریلوے کراسنگ تھی۔ ریل کی پٹری سڑک کے اوپر سے گزرتی تھی اور اس وقت ریلوے کراسنگ والا پھانک بند تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا وہاں سے کوئی ٹرین گزرنے والی تھی۔

وہ ریلوے کوئی مین لائن نہیں تھی اس لیے زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہاں سے گزرنے والی کوئی پیچتر لوکل ٹرین ہوگی یا پھر وہ مال گاڑی بھی ہو سکتی تھی۔

ریلوے پھانک پر، پھانک والا ریلوے ملازم ہاتھ میں گنٹل لیپ لیے کھڑا تھا۔ مذکورہ لیپ سے پھونکنے والی بزر روشنی اس بات کی نشان دہی کرتی تھی کہ آنے والی گاڑی وہاں سے گزرنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ دن کے وقت یہی کام سبز جھنڈی دکھا کر کیا جاتا ہے۔

پھانک کے نزدیک ہی ٹھیل کی چھت والا ایک کمرانا ہوا تھا جو یقیناً پھانک والے شخص کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ میں نے نگاہ دوڑا کر دور تک دیکھا۔ ہمارے سامنے اور پیچھے کسی بھی قسم کی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ علی الصبح کا وقت تھا اور اس غیر مصروف سڑک پر ہمارے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

میں وہاں رکے ہوئے چند لمحات ہی گزرے تھے کہ پھانک والا ہماری جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس نے چیک دار چادر کی بکلی مار رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گنٹل لیپ جمول رہا تھا۔ یہ لیپ بھی عجیب چیز ایجاد کی ہے ریلوے والوں نے جو کبھی سبز اور کبھی سرخ روشنی خارج کرتا ہے اور حقیقت ایک ڈانٹا ہے جس کی ایک ”نیوٹرا“ میں سرخ شیشہ اور دوسری دیوار میں سبز شیشہ جڑا ہوا ہے۔ دونوں دیواریں آئینے کے سامنے والی ہوتی ہیں اور لیپ کے ڈبے کے اندر غلام روشنی والا ایک چراغ چل رہا ہوتا ہے مگر رنگ دار شیشوں کے سبب اس میں سے یوں نکلنے والی روشنی اپنی

سبز اور سرخ دکھائی دے سکتی ہے۔  
لیپ بردار پھانک والے کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا۔ وہ پھانک کو بند کر کے گاڑی کو اپنے اپنے لیے پٹری کے بالکل نزدیک کھڑا تھا، گاڑی کے ایک اے وہیں موجود رہتا چاہیے تھا۔ میں نے پھانک سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا کیا تھا۔ پھانک والے نے طرف قدم اٹھاتے دیکھ کر میں نے سرگوشیاں انداز میں

کھانکونف کو گود میں سے اٹھا کر کسی جگہ چھپا دو۔ اس دن ٹائٹس کرنا کوئی نئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس ہاتھ میں سے میری توجہ کو اشارہ بھی کر دیا۔

اس وقت اگرچہ اجالا پھوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ تاہم نی کے اندر کی جانے والی حرکت کو پھانک والا دیکھ نہیں تھا۔ میری توجہ نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کھونف کو گود میں سے اٹھا کر دامن کے نیچے دونوں فٹ میں پھنسا کر کھڑا کر دیا۔ میری توجہ نے گھرے نیلے رنگ غلام رقیص زیب تن کر رکھا تھا جو اس گلیے اجالے میں فاصلے سے سیاہ نظر آتا تھا۔ اس نے کھانکونف کو اس زمیں اپنی دسترس میں استادہ کیا تھا کہ بوقت ضرورت اس آسانی سے نکال کر استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔

وہ پکارو سے باہر لیپ بردار شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ”موجود ہمارے جانب کیوں آ رہا ہے۔ اسے تو بند پھانک میں موجود رہنا چاہیے۔ گاڑی کسی بھی لمحے آ سکتی ہے۔“

”یہ بات مجھے ہی حیران کر رہی ہے۔“ میں نے کہا ”میں نے اگلے ہی لمحے اس حرکت سے الجھ گیا ہوں۔“

میرے درمیان سرگوشیوں میں بات چیت ہو رہی تھی۔ میں نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ”وہ دران! اسے پاس ایک بھاری رقم بھی موجود ہے۔ اسے بھی کہیں بڑھانا چاہیے۔ پچاس ہزار روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”میرے نظریے میری توجہ کی طرف دیکھا۔“

”میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا، بولا ”سائیں! میں نے اسے گود میں ڈال دیا۔“ اگر کہیں اور ”نہ تو تم کہیں۔“

”میں نے دیکھ لیا ہے۔“ میں نے کہا اور گاڑی کے

پھانک والا ریلوے ملازم اب ہماری پکارو سے صرف دس گز کے فاصلے پر تھا اور اس کا رخ سیدھا ہماری ہی جانب تھا۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک قد آور صحت مند انسان تھا۔ چادر کی بکلی نے اس کے چہرے کا زیادہ تر حصہ چھپا رکھا تھا جس کی وجہ سے میں اس کا طبع نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گنٹل لیپ اس نے بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دایاں ہاتھ چادر کے اندر تھا۔ میں مختلط نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اپنے تئیں قدموں سے چلتے ہوئے ڈرائیوگ سیٹ والی کھڑکی کے پاس آیا اور ایک طائرانہ سی نگاہ پکارو کے اندر ڈالنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا ”سائیں! ماچس ہوگی آپ کے پاس؟“

چادر کی بکلی کی وجہ سے اس کی اصل آواز اپنی اصل حالت میں مجھ تک نہیں پہنچی۔ یہ سلام نہ دعا۔ اس نے آتے ہی ماچس کی فرمائش کر دی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس ریلوے ملازم کی نیت میں مجھے فوراً نظر آ رہا تھا۔

میں نے گھور کر اس کے چہرے کو دیکھا اور سخت لہجے میں کہا ”میاں کوئی سگریٹ نہیں پیتا اس لیے تمہیں ماچس نہیں مل سکتی۔“

میری بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ بلی تھیلے سے باہر آئی۔ بکلی پوش شخص نے لیپ کو ایک طرف پھینکتے ہوئے دایاں ہاتھ چادر سے برآمد کیا اور اس میں موجود ریواریو کی نال کو میری کپٹی سے لگاتے ہوئے بولا۔

”گاڑی سے باہر آ جاؤ۔“

اس کے لہجے میں حکم پایا جاتا تھا اور وہ بالکل مارنے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پہلو میں بیٹھے میری توجہ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ ریواریو بردار بکلی پوش نے غراتے ہوئے کہا ”کسی قسم کی چالاکیاں کے بارے میں نہیں سوچنا ورنہ تم میرے ایک بھی زندہ نہیں رہنے گے۔“

میرے اسے باتوں میں لگانے کی خاطر کہا ”تم تو گاڑی کو گنٹل دینے کے لیے لیپ تھامے پھانک پر کھڑے تھے، تمہیں ہماری یاد کیسے آئی؟“

”کیا اس مت کرو اور گاڑی سے باہر نکل آؤ۔“ اس نے قطعی انداز میں کہا۔

میں نے چھینچھاڑ جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس دوران میں اگر ٹرین وغیرہ آئی تو تمہاری نوکری بھی جاسکتی ہے۔“

میں نے پوچھا ”آخر تمہاری ہم سے دشمنی کیا ہے؟“  
جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسے ہماری بانوں کی  
نہیں بلکہ اس بچارو کی ضرورت تھی، میں بت ایزی ہو گیا  
تھا۔ شاید اسی لیے مجھے اس شخص سے چھڑ خانائی منہ آنے

اس نے روانی میں ”اپنے سامھی“ کے الفاظ استعمال کر کے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ کل دو افراد تھے جنہیں ہماری گاڑی کا اشد ضرورت تھی۔  
”ٹھیک ہے۔“ میں نے پکار کر پینجرز سیٹ کی جانب

[illegible]

”ہاں ضرورت پڑی تو اسے ٹھکانے بھی لگا دیں گے۔“  
 میں نے اس وحشت زدہ شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے  
 کہا ”پہلے اس کا انٹرویو تو کروں۔ کیا پتا، یہ اس امتحان میں  
 ہاں ہی ہو جائے اور ہمیں اس کے خون میں ہاتھ نہ رنگنا  
 پڑے۔“

وہ شخص کی کیا پاتی ہوئی آواز میں بولا "مگن کی نال میرے منہ سے نکال دیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"وہ تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔" میر بخش نے خون خوار انداز میں اسے ٹھوکتے ہوئے کہا "اور اسی حالت میں تمہاری زبان چلے گی۔ ہم سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔"

اس شخص کی وحشت میں اضافہ ہو گیا۔ میر بخش کے اٹل لمبے میس بڑی تاثیر تھی۔ تاہم میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔ بلی بلی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی اور ہماری پجاردین سڑک پر لٹری تھی۔ پھاٹک چونکہ بند تھا اس لیے ہمارے پیچھے یا پھاٹک کی دوسری جانب گاڑیوں کی "اندرفت" سے وہاں رش لگ سکتا تھا اس طرح ہماری "کارروائی" پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی تک دور دور تک کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم یہ صورت حال مستقل نہیں رہ سکتی تھی۔

میں نے میر بخش سے کہا "تم اس شخص کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے سڑک سے پیچھے آنا لو۔ میں گاڑی کو مناسب جگہ پر لگا تا ہوں تاکہ کسی قسم کی "بدمزگی" کا امکان باقی نہ رہے۔"

"نیک ہے سائیں" آپ گاڑی میں جا میں۔" میر بخش پر اعتماد لیجئے میں بولا "میں اس چت کبرے کو سنبھالتا ہوں۔" میں نے پجاردی کی جانب جانے سے پہلے ریلوے کراسنگ پر موجود پھاٹک کھول دیا۔ اب وہاں کسی آنے جانے والی گاڑی کے رکنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اس طرح میں تسلی کے ساتھ اس دھبے دار شخص سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا۔

پھاٹک کو کھولنے سے خطرے کا ایک امکان پیدا تو ہو گیا تھا مگر مجھے امید تھی کہ وہ خطرہ لاحق ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اگر کوئی گاڑی یا ٹرین کو اس دوران میں ریلوے لائن سے گزرتا ہو بھی وہ زبردستی جائے گی۔ اسی طرح اگر سڑک پر سے گزرنے والی کسی کار "بس یا ٹرک" نے ٹرین وغیرہ کی جھٹک دیکھ لی تو وہ پھاٹک کھلا ہونے کے باوجود بھی کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوگا۔ ویسے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس شخص کو بہت جلد "منٹا" دوں گا۔

میں پجاردی میں آیا اور اسے با آہستگی ڈرائیو کرتے ہوئے سڑک سے اتار کر کپے میں کھڑا کر دیا۔ میں گاڑی سے نیچے اترنے لگا تو ساحل نے سوال کیا۔

"جیہاں اس شخص کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"خوڑی ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اور میں یہاں گاڑی میں اکیلا رہوں گی؟"

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"بات ڈر کی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی "میرے پاس دو روپے والے ہیں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

میں نے سوالیہ نظریے سے اسے دیکھا "پھر کیا بات ہے تم اس قدر ابھی ہوئی کیوں ہو؟"

"میں تو بس صرف یہ کہہ رہی ہوں اس پوچھنا پڑی ضرورت کیا ہے؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا!" میرے لمبے میں ابھن تھی۔

وہ بولی "ہم نے اس شخص سے ہتھیار چھین لیا ہے اب وہ ہمارے سامنے کسی تحریک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار رکھے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

"ابھی میں اتنا بے حس نہیں ہوا ہوں۔" میں اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "اس میں بے حس والی کون سی بات ہے؟"

"شاید تم نے اس شخص کی باتیں غور سے نہیں سنی۔" میں نے کہا "وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کا ایک اور ساتھی بھی یہیں آس پاس کیس موجود ہے۔ انہیں ہماری گاڑی کی ضرورت ہے تاکہ فرار ہو سکیں اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ کسی سنگین جرم میں ملوث ہیں۔"

"وہیں ان کے جرم سے کیا لینا دینا۔" ساحل نے بیزار سے کہا "وہ جائیں جہنم میں۔"

"وہ جہنم میں ڈال جائیں گے تو اپنے ساتھ اور بھی کئی جانوں کو مصیبت میں ڈال جائیں گے۔" میں نے پاٹ لیجئے میں کہا "میں نے اس کبرے کی عقیقہ دیوار کے ساتھ ایک فورورمل ڈرائیو ٹیوٹا جیب کھڑی دیکھی ہے اور پھاٹک والا اصل شخص کہیں نظر نہیں آ رہا۔ سنگل لیپ کی اس جہاز میں شخص کے پاس موجودگی تو یقینی بتاتی ہے کہ پھاٹک والا شخص اس وقت کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ ممکن ہے اس شخص کے ساتھی نے پھاٹک والے کو اس کے کمرے میں یہ فعال بنا رکھا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے!"

"ہاں واقعی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بیزار سے بولی "یہ بھی ممکن ہے" تارا اور اس کے خیر خواہ ہماری تلاش میں یہاں پہنچ جائیں۔ اس امکان کو نظر انداز تو نہیں جا سکتا؟"

میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" پھر پوچھا "تو

کیا ہم پھاٹک والے کو اس حال میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں؟"

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "میں بہت جلد اس شخص سے ملاقات کر کے واپس آتا ہوں پھر ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔"

"ایسا یا نہیں ہو سکتا کہ اس شخص کو تم اسی گاڑی میں لے آؤ۔" ساحل نے تجویز دی "ہماری گاڑی سڑک سے ہٹ کر کھڑی ہے۔ گاڑی کے اندر گن پوائنٹ پر اس سے ہر بات پوچھی جا سکتی ہے اور اگر کسی ہنگامی حالت میں ہمیں آگے بڑھنا پڑ گیا تو ہمارے لیے بہت آسانی رہے گی۔"

ساحل کی تجویز میرے دل کو لگی۔ اس نے بڑی ذہانت کی بات کی تھی اور یہ ذہانت بر محل تھی۔ میں نے زبردست سکراتے ہوئے کہا "تم ایک عقل مند لڑکی ہو!"

"صرف عقل مند؟" وہ شرارت سے مجھے ٹھوکتے لگی۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلا کر کہا "تم عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ عقل مند بھی ہو۔"

وہ چونک کر بولی "یہ عقل بند کیا ہو تا ہے؟"

"دوسروں کی عقل، بند کرنے والے کو "عقل" بند کہتے ہیں۔"

"میں نے تو کسی کی عقل" بند نہیں کی۔" وہ ابھن زدہ لیجئے بولی "کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

میں نے پوری ذہانت داری سے کہا "میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا ساحل! تم اتنی حسین، اتنی متین اور اتنی ذہین ہو کہ کسی بھی عقل مند کے ہوش اڑا سکتی ہو" اس کی عقل کو بند کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس حسن کا حادو ہے اور تم اس جادو کا استعمال بھی جانتی ہو۔"

میں روانی میں بتا سیں "کیا کیا بول گیا تھا۔ ساحل نے گرمی نظریے مجھے دیکھا اور شرارت آمیز انداز میں بولی "میں تو اس وقت مانوں گی جب یہ جادو تم پر اثر دکھائے گا؟"

"میں اس بندے کو لے کر آ رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں پجاردی سے نکل آیا۔

اپنے عقب میں مجھے ساحل کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ہنسی میں بڑی فکری تھی اس کی آواز میں بڑا ترن تھا۔ وہ بولتی تھی تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جلتی ہوئی آگ ہو۔ مدد سے اسے حسن، نزاکت اور ذہانت سے خوب نواز رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جہت کبرے چرے والا دروازہ قامت

شخص ہماری پجاردی میں موجود تھا۔ اس مرتبہ ساحل پنجرہ سب سے آگے تھی اور میر بخش اس شخص کے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں چلا گیا تھا۔ میر بخش نے اس دھبے دار شخص کو پجاردی کے فرش پر سینوں کے درمیان لٹالیا اور کلا شکوف کے بجائے روپے والی نال اس کی کیپٹی پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظریے سے میری جانب دیکھا۔

میں نے گردن موڑ کر اس شخص سے پوچھا "کون ہو تم؟"

جواب دینے کے بجائے وہ سراسیمہ نظریے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مختلف قسم کے تاثرات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ مجھے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ بہت خوف زدہ ہے اور مجھ سے رحم کی اپیل کر رہا ہے۔ کبھی ایسا لگتا، وہ عیاری سے بیچ لنگھنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ کسی موقع کی تاک میں ہے تاکہ بازی ہلٹ سکے۔

میر بخش نے اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم سائیں کے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو ورنہ پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"بھگوان کے لیے مجھے زندہ چھوڑ دو۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولا "میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔"

اس شخص کے پہلے جیلے نے ہم تینوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی جاں بخشی کے لیے "بھگوان" کا واسطہ دیا تھا۔ یہ اس کا ایک بے اختیار عمل تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندو تھا۔

میرا ذہن اس وقت برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میر بخش نے اس کی گردن پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا "ہم یہاں سے بہت دور تو تمہیں پہنچا دیں گے کیونکہ تم سیدھی طرح زبان کھولتے نظر نہیں آ رہے۔"

میں نے اپنے چند شات کی تصدیق کے لیے سرسراہٹ ہوئی آواز میں اس شخص سے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

میرے لمبے میں اتنی سنگینی اور سفاکی تھی کہ وہ خاموش نہ رہ سکا۔

"میں بوٹا سنگھ ہوں۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا "تم بوٹا سنگھ نہیں بلکہ سنگل سنگھ ہو۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلا تے ہوئے کہا۔

میر بخش نے میری بات پر رد اچھلایا "تم ایک خطرناک ڈاکو ہو۔ تم نے اپنے ساتھی کی مدد سے ایک لڑکے کو اغوا کر رکھا ہے۔"

اندھیرے میں چلا یا ہوا میرا تیر تو نشانے پر بیٹھا ہی تھا،

میر بخش کے انکشافات نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ لگتے زدہ لہجے میں منہنایا۔

”آہ۔ آپ کو کھارے بارے میں۔ کیسے پتا چلا؟“  
سائل نے نفرت سے اسے گھورتے ہوئے اس کا رخسار دیکھا۔ ”تم لوگوں نے جس لڑکی کو اغوا کیا ہے اس کا نام ممتاز ہے۔ وہ ”بٹی سر“ کے ایک صاحب حیثیت شخص قاضی سلطان کی بیٹی ہے۔ تم نے ممتاز کی رہائی کے بدلے قاضی سلطان سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

وہ ہمارے ان بے درپے حیلوں سے ہلکا گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود وحشت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کئے اور کچھ کئے بھی یا نہ کئے۔ بالآخر اس نے خوف زدہ نظرسے ہم تینوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ لوگوں کا تعلق پولیس سے ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلادیا ”ہم پولیس والوں سے گہرے مراسم رکھتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم ڈی ایئر بی کے انویسٹمنٹ بینک پر موجود تھے۔ یہ وہی ڈی ایئر بی ہے جس کی نگرانی میں تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے ”شادی بلی“ کی سرحد پر ناک لگایا گیا ہے۔“

اس کی بلیک اینڈ وہانت صورت پر سرسوں پھول گئی۔ میں نے اس کے چہرے کو بلیک اینڈ وہانت اس لیے کہا ہے کہ رنگ تو اس کا گندمی تھا تاہم جھلمبرے کی سفید ریشم کی وجہ سے وہ سیاہ نظر آتا تھا۔ یہ بھی ایک بہت عجیب و غریب اور گہنا مرض ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ سب سے خطرناک اور کمرہ الذکر وہ قسم ہے جو بالآخر کوڑھ (Leprosy) میں بدل جاتی ہے۔ انسانی جلد پر نمودار ہونے والے یہ سفید دھبے دبے پاؤں اپنا کام دیکھتے ہیں اور مریض بے خبری میں ادا جاتا ہے۔ ان دھبوں کا پھیلاؤ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے لیکن چونکہ ان میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس لیے مریض زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ یہی سوچتا ہے، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ یہی ہوگا ناکہ میرا پورا وجود سفید ہو جائے گا۔ وہ جو جائے! وہ جو کہ اس مرض کا علاج نہیں کر داتا اور ڈاکٹر تبدیل کرتا رہتا ہے۔ بالآخر ایک روز اسے بڑے بھیا تک انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

گزشتہ زمانوں میں کوڑھ کے مریضوں کو شہر سے باہر ویران ٹھنڈوں اور غاروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ صحت مند لوگ کسی قسم کے وبائی حملے سے محفوظ رہیں۔ اس مرض

میں مبتلا شخص کی ہڈیاں اندر ہی اندر گھل جاتی ہیں اور دیکھ ہی دیکھتے وہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ خطرناک ڈاکو منگل سنگھ اس وقت ہمارے رحم و کرم پر تھا اور ممتاز نامی وہ اغوا شدہ لڑکی منگل سنگھ کے سامنے گنڈا سنگھ کی کسٹڈی میں تھی۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر منگل سنگھ سے پوچھا۔

”ممتاز کہاں ہے؟“

اس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا تو میر بخش نے اپنے پاؤں کو اس کی گردن پر اس طرح مسلایا جسے کوئی سرگٹ نوش ختم شدہ سرگٹ کے ٹوٹے کو ملتا ہے۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ تاہم منگل سنگھ کی کراہ پجارو سے باہر نہ جاسکی۔

میں نے میر بخش کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ ماری اور گمبیر لہجے میں کہا ”اگر اب منگل سنگھ نے میرے کسی بھی سوال کا جواب دینے میں پس و پیش سے کام لیا تو تم بد رفتار کرو۔“

اپنی جان سب کو باری ہوتی ہے۔ منگل سنگھ خوف کی شدت سے تھر تھراتے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پھینسی پھینسی آواز میں کہا ”مہاراج! مجھے چھما کر دیں۔ میں بھگوان کی سونگھ کھا کر کتا ہوں“ آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“

”ہمیں سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا ”بس تم سے جتنا پوچھا جائے“ اس کا جواب دو۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اور یہ تم یا پھر بھگوان کو بیچ میں نہ لاؤ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا شخص مستند جھوٹا ہوتا ہے۔“

”پھر آپ کو میری بات کا یقین کیسے آئے گا؟“

میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا ”میں نے بتایا ہے نا“ قسم یا سونگھ کسی شخص کے سچا ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ عام طور پر وہی افراد زیادہ قسمیں اٹھاتے ہیں جنہوں نے کسی جھوٹ کو چھپانا ہوتا ہے۔ جھوٹے اور مکار افراد اپنے مفاد کی خاطر کھوکھلی قسموں کا سہارا لے کر خدا، بھگوان، ایٹور اور لاؤ آف لارڈز کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔“

الحمد للہ میں ایک مسلمان ہوں اور ایک خدا پرست ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ خدا جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے منگل سنگھ سے بات کرتے ہوئے میں نے آخری جملہ محض خانہ پری کے لیے ادا کیا تھا۔ اس دنیا میں بسنے والے

انسانوں کے مجموعی اور انفرادی تاثر، نظریات اور خیالات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا!

منگل سنگھ میری ڈانٹ پھٹکار اور میر بخش کی دھونس سے راہ راست پر آگیا۔ میں نے اسے آمادہ تعاون دیکھا تو اپنا سوال دہرایا ”ممتاز کہاں ہے؟“

”وہ گنڈا سنگھ کے پاس ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اور وہ ہاں سنگھ کہاں ہے؟“

”ادھر ریلوے کوارٹر میں۔“ اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے بتایا۔

میں نے پوچھا ”اس کوارٹر میں اور کون کون موجود ہے؟“

”گنڈا سنگھ اور ممتاز کے علاوہ چھانک والا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

وہ بڑی شرافت سے میرے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ جب کسی کی جان پر بن آئے تو بڑے سے بڑا ”غیر شریف“ انسان بھی شرافت کے مظاہرے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا ”چھانک والے ریلوے ملازم کو تم لوگوں نے یہ غماں بنا رکھا ہے!“

”ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔ میر بخش نے اس کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ قدرے کم کر دیا تھا چنانچہ وہ یہ آسانی بول رہا تھا۔ اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا ”چھانک ہماری جیب میں کوئی پیچیدہ قسم کی خرابی پیدا ہوگئی جو باوجود وحشت کے بھی ہم سے دور نہ ہو سکی۔ ہمیں پولیس والوں کی دسترس سے نکلنے کے لیے فوری طور پر کسی گاڑی کی ضرورت تھی۔ ہم نے چھانک والے کو زیر کیا پھر چھانک بند کر کے کسی شکار کا انتظار کرنے لگے۔ اس کارروائی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے ہاتھ میں سنگل لیپ بھی اٹھایا تھا۔“

”اور پھر ہمیں شکار نظر آگیا؟“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور پوچھا ”تم کتنی دیر سے سنگل لیپ تھامے چھانک کے پاس کھڑے تھے؟“

”میں آپ کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھنے کے بعد ہی وہاں کھڑا ہوا تھا۔“ اس نے بتایا ”ویسے ہمیں یہاں پہنچنے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“

میں نے پوچھا ”اس کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ جو فوری میل ڈرائیو ٹوٹا جا چپ کھڑی ہے، تم لوگ اسی میں یہاں تک پہنچے ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”کوارٹر میں موجود تمہارے سامنے گنڈا سنگھ کے پاس کس قسم کا اسلحہ موجود ہے؟“

”تھوڑی سی پینکپاٹ کے بعد اس نے بتایا ”گنڈا سنگھ نے پاس صرف ایک رائفل ہے۔“

”تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟“ میر بخش نے اس کی گردن کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”بھگوان کی سو۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی پھر سنپھل کر بولا ”میں سچ کہتا ہوں، ہمارے پاس اسلحے کے نام پر بس یہی دو ہتھیار تھے۔ میرا ریوالور تو آپ جھین ہی چکے ہیں۔ رائفل وہاں کوارٹر میں گنڈا سنگھ کے پاس ہے۔“

میں نے ریلوے کوارٹر کی جانب نگاہ دوڑائی اور ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”تم کافی دیر سے ہمارے رحم و کرم پر ہو گنڈا سنگھ کو تمہاری جانب سے تشفیس ہو تو گی؟“

”ہاں جی، وہ پریشان ہو رہا ہوگا۔“ منگل سنگھ نے تائید کی۔

میں نے کہا ”وہ تمہاری خبر لینے کیوں نہیں نکلا؟“

”ہمارے درمیان یہ طے ہے کہ جب تک میں کوارٹر کے سامنے جا کر مخصوص انداز میں سٹی نہیں بھاؤں گا، وہ کوارٹر سے باہر نہیں نکلے گا۔“ منگل سنگھ نے بتایا ”چاہے مجھے کتنی بھی دیر ہو جائے۔ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔ میں اپنے گروہ کا سردار ہوں۔ سب کو میری بات ماننا پڑتی ہے۔“

”تم ایک ایسے گروہ کے سرغنہ ہو جو صرف ایک فرد پر مشتمل ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یعنی بائیس سالہ گنڈا سنگھ۔ تمہارے گروہ کے تین افراد تو پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے، جب کسری میں پولیس نے تمہارے ڈیرے پر چھاپا مارا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

وہ حیرت سے بھرپور نظرسے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”آپ کو تو ایک ایک بات معلوم ہے۔“

”ہمیں ایک ایک نہیں بلکہ آدھی آدھی اور چوتھائی چوتھائی بات بھی معلوم ہے۔“ میں نے رعب دار لہجے میں کہا ”کس قسم کی غلط فہمی میں رہتے ہوئے غلط بیانی سے کام لینے کی کوشش نہ کرنا منگل سنگھ۔“

اس نے پوچھا ”آپ ہیں کون لوگ۔ آپ پولیس والے تو نہیں لگتے!“

میں نے کہا ”ہم پولیس والے نہیں لگتے بلکہ ہم پولیس والوں کے بہت کچھ لگتے ہیں۔“

”میں سمجھ نہیں سکا۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔  
 ”میں سمجھتا ہوں منگل سنگھ۔“ میں نے اس کے غبارے کی ساری ہوا خارج کرتے ہوئے کہا ”تم نے قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو اغوا کر کے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ سلطان نے تمہارے مطالبے اور دھمکی میں آئے بغیر پولیس والوں سے رابطہ کیا۔ ایس بی عمر کوٹ سے اس کی گہری شناسائی بلکہ رشتہ داری ہے اسی لیے ایس بی کے حکم پر ایک ڈی ایس بی نے ناکا لگا کر تمہاری گرفتاری کا اہتمام کیا تھا۔ بس تم یوں سمجھو کہ ہم ایس بی عمر کوٹ کے خاص بندے ہیں۔“

لے گئے تھے۔ پولیس والوں نے وہاں ریڈ کیا تو تم ایک خون ریز مقابلے کے بعد کمزری سے عمر کوٹ کی طرف نکل گئے پھر پولیس کی ہائی کمان کو خفیہ اطلاع ملی کہ گزشتہ رات اب چونکہ ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا اس لیے پچھلی شب کو گزشتہ رات کہا جاسکتا تھا تم مغویہ اور اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک جیب میں عمر کوٹ سے میرور خاص کی طرف جانے والے ہو۔ ہمیں مسلحی سرحد کو شادی پٹی کے مقام سے عبور کرنا تھا اسی لیے تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے وہاں ناکا لگایا گیا مگر تم تو یہاں نظر آ رہے ہو۔ یہ کیا ماجرا ہے؟“

منگل سنگھ ایک خطرناک جرم اور سفاک ڈاکو تھا لیکن اس وقت اس کی گردن تیز دھار تلوار پر دھری تھی اس لیے اپنی جان کی سلامتی کے لیے وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سے تعاون کر رہا تھا پھر ہمارے ”تعاون“ اور ”کارکردگی“ نے بھی اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اس وقت وہ ایک درندہ صفت مجرم نہیں بلکہ رحم کا اہل کندہ نظر آ رہا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے انسان کو ہیرو سے زبرد ہوتے ہوئے در نہیں لگتی۔

منگل سنگھ نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا ”ہمارا پروگرام تو یہی تھا کہ عمر کوٹ سے سیدھے میرپور خاص کی طرف نکل جائیں گے لیکن جن دشمن بھی۔ کے بونے ہیں۔ اگر پولیس والوں کو ان کے کسی مخبر نے ہمارے منصوبے کی اطلاع پہنچادی تھی تو میرے ہی ایک ”پولیس“ والے خیر خواہ نے شادی پٹی والے ناکے کے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے ہم عمر کوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانے والے راستے پر نہیں گئے بلکہ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم عمر کوٹ سے پہلے ”سامارو“ جاتیں گے پھر محمد رحیم کھلی سے گزرنے کے بعد ایک نیم مارے راستے پر سفر کرتے ہوئے ضلع میرپور خاص میں داخل ہو جائیں گے لیکن اس ریلوے کرائٹ پر ہماری جیب میں کوئی خرابی ہوگئی اور ہم نے مجبوراً پھانک والے کو زیر کر کے آپ کی گاڑی حاصل کرنے کے بارے میں سوچا اور۔۔۔“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مرتبش بول اٹھا ”اور اس سوچ پر عمل کر۔ کہ ہمیں منہ کی کھانا پڑی۔ ہے“

منگل سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”سائیں! میں اس وقت آپ کے قبضے میں ہوں۔ آپ چاہیں تو میری جان بھی لے سکتے ہیں لیکن میں جتنی کروں گا کہ اگر مصالحت کی کوئی راہ نکل آئے تو۔۔۔“

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تعاون طلب نظر سے بچھ دینا۔

میں نے پوچھا ”تم کس قسم کی مصالحت چاہتے ہو؟“  
 ”آپ پولیس والے نہ سہی مگر پولیس والوں کے قریبی“  
 ”وہ کاروباری انداز میں بولا“ یہ سارا لٹھ راگ ممتاز کی تلاش اور رہائی کے لیے پھیلایا گیا ہے۔ آپ لڑکی کو اپنے ماتھے لے جاؤ اور ہم دونوں کو میاں سے جانے کی اجازت دے دو۔“

میں نے کہا ”اس ڈیل میں تو تمہارا بہت نقصان ہو جائے گا۔“

اس نے سوالیہ نظریں مجھے دیکھا ”آپ کس نقصان کی بات کر رہے ہو؟“

”تم نے مغویہ ممتاز کی رہائی کے لیے اس کے باپ قاضی سلطان سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اگر ہم ممتاز کو یونہی سوکھے کھلے گئے تو یہ تمہارا نقصان ہی ہو نا؟“

وہ بے بسی سے بولا ”سائیں! جان بچی سولا کھوں پائے۔ زندگی رہی تو میں اور کمالوں گا۔ آپ بتائیں یہ سودا منظور ہے؟“

”تم خاصی پچکانا بتائیں کر رہے ہو۔“ میں نے مٹھکے خیر انداز میں کہا۔

وہ متعجب انداز میں بولا ”میں نے بچوں والی ایسی کون کی بات کہہ دی؟“

”اوسے کھا مڑا!“ میں نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا ”اس وقت تم جس طرح ہمارے پچنگل میں پھنسے ہوئے ہو اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ابھی تک زندہ سلامت ہو۔ ہم تم دونوں کی ٹانگیں تو زکرمناز سمیت اس گاڑی میں ڈال کر پولیس ہینڈ کوائر لے جاسکتے ہیں۔ تم بارگیشہ کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہو۔ کیا سمجھے؟“

وہ حالات کی نزاکت کو بڑی رصاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا اس لیے زیادہ چونچڑانہیں کی اور دوستانہ انداز میں بولا ”میرے پاس ایک اور پیش کش بھی ہے!“

اب میں نے اسے کھنے کا ارادہ کر لیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اس کی باتیں مجھے متاثر کر رہی ہوں۔ اس طرح میں اس کی رہی سہی خطرناکی سے بھی آگاہ ہو سکتا تھا۔ ممتاز اور پھانک والے کی محفوظ سلامتی کے لیے منگل سنگھ کو براؤن سے ٹھوک بجا کر دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے اس کی باتیں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”منگل سنگھ! تم کیا پیش کش کرنا چاہتے ہو؟“  
 وہ بولا ”میں اپنی اور اپنے ساتھی کی جان بخشی کے لیے مغویہ کے علاوہ آپ کو ایک بھاری رقم بھی دینے کو تیار ہوں۔“

”مثلاً کتنی بھاری رقم؟“  
 ”پورے ایک لاکھ روپے نقد۔“ اس نے چارہ پھینکنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات سجالیے جیسے اس کی آفر میں مجھے بہت کشش دکھائی دی ہو۔ یہ وہی ڈاکو تھا جو ایک لڑکی کی زندہ واپسی کے لیے اس کے لواحقین سے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اب اس کی اپنی جان بچنے میں آگئی تھی تو وہ ان پچاس لاکھ روپوں کے مطالبے سے دوست بردار ہو رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ مزید ایک لاکھ روپے دینے کو بھی تیار تھا گویا اس طرح وہ بیٹھے بٹھائے اپنا اکیاون لاکھ روپے کا نقصان کر رہا تھا۔ اور یہ خسارہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے برداشت کرنے کو تیار ہوا تو۔

حضرت انسان بھی عجیب شے ہے۔ یہ مطلب براری کے لے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ جانور کو شعور نہیں دیا گیا۔ وہ صرف اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے جائز و ناجائز تک دو کرتا ہے مگر انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود بھی بعض اوقات بہت پستی میں چلا جاتا ہے اور کچھ ایسا کر گزرتا ہے کہ انسانیت کو اس کے کروت پر نادام ہونا پڑتا ہے۔

میں نے منگل سنگھ کو بدستور خوش نمئی یا غلط نمئی میں مبتلا رکھتے ہوئے کہا ”مجھے تمہاری یہ پیش کش منظور ہے مگر میں پہلے اپنی تسلی کروں گا۔“

”کس بات کی تسلی؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔  
 میں نے کہا ”صرف در باتوں کی تسلی۔ نمبر ایک مغویہ صحیح سلامت ہے یا تم لوگوں نے اس کے ساتھ۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظریں اس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا ”سائیں! فکر نہ کرو۔ لڑکی بالکل صحیح سلامت ہے۔ آپ اس سے بات چیت کر کے یقین کر سکتے ہیں۔ بس اتنے دنوں کی افزائش میں اس کا لباس خاصا میلا ہو گیا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے فخریہ انداز میں اضافہ کیا ”ہم جس لڑکی کو تادان کی خاطر اغوا کرتے ہیں اس کی عزت کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ اگر تاوان وصول ہونے کی صورت نظر آئے اور ہماری جان

جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ہم مغوی یا مغویہ کو قتل کر دیتے ہیں مگر اس کی عزت سے کھیلنا گوارا نہیں کرتے یہ ہمارا اصل اصول ہے۔ عیاشی کے لیے ہم دوسرے راستے اختیار کر لیتے ہیں مگر اپنے اصولوں کو نہیں توڑتے۔“

اس ڈاکو نے جو اصول بیان کیا تھا، میں نے اس کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث میں پڑے بغیر اس سے استفسار کیا ”کسریٰ میں پولیس مقابلے کے دوران میں تم پر ایسا وقت آیا تھا جب تمہاری جان خطرے میں پڑ گئی تھی مگر تم نے مغویہ کو قتل کرنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”ہاں، ایک بہت ہی خاص وجہ ہے۔“ جیت کبرے ڈاکو منگل سنگھ نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”جو لوگ اپنے تعلقات کے زعم میں ہمارا مطالبہ پورا کرنے کے بجائے پولیس کی مدد حاصل کرتے ہیں، وہ بہت جلد پولیس والوں کی جانب سے مایوس ہو کر ہمارے سامنے گھٹے ٹیک دیتے ہیں کیونکہ پولیس والے ان سے رفا تو اٹھتے رہتے ہیں مگر کارروائی بالکل کھوکھلی کرتے ہیں۔ ان کے وعدوں سے دل برداشتہ ہو کر مغوی یا مغویہ کے لواحقین ہمارا ہر مطالبہ پورا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور اس موقع پر ہم ان سے دو گنا رقم حاصل کرتے ہیں۔“

”اور اگر لواحقین کے پاس اتنی رقم نہ ہو تو؟“

”اس بات کا خیال ہم اغوا کی واردات کرنے سے پہلے خاص طور پر رکھتے ہیں۔“ منگل سنگھ نے بتایا ”ہم صرف مال دار اور صاحب حیثیت لوگوں پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں۔ میں جانتا ہوں ممتاز کا باپ بہ آسانی ایک کروڑ روپے ادا کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”پھر تو میں یہ کون گا کہ تمہارا ایک کروڑ ایک لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا!“

میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے پوچھا ”آپ دوسری نسلی کس بات کی کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے اسے بتایا ”میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم جو ایک لاکھ روپے مجھے دو گے وہ کہیں نقلی تو نہیں؟“

”ہم کبھی اصلی اور نقلی کے چکر میں نہیں پڑتے سائیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”ہمارے پاس جو بھی رقم ہے وہ دوسروں ہی سے لوٹی ہوئی ہے۔ اب جو بھی ہو اصلی یا نقلی!“

میں نے پوچھا ”کیا وہ ایک لاکھ روپے کی رقم اس وقت تمہارے لباس میں موجود ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”نہیں، رقم ہماری جیب میں رکھی ہے۔“

”اس کی کردل پر سے پاؤں اٹھا لو میرے بھائی!“ میں نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔

میرے بھائی نے فوراً میرے بھائی کی تقبیل کی ”تاہم اس ڈاکو کو ریوالور کے نشانے پر رکھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ منگل سنگھ نے جب مجھے آمادہ دیکھا تو دوستانہ انداز میں بولا۔

”آپ مجھے اس کو وارنٹ تک جانے کی اجازت دے دیں۔ میں مغویہ اور رقم کو آپ کے پاس لے آتا ہوں۔“

میں نے طنز لہجے میں چونٹ کر ”کیا میں شکل سے انتہائی احمق نظر آتا ہوں تمہیں؟“

”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ دھبے دار منگل سنگھ نے کہا۔

”تم نے واقعی ایسی ہی بات کی ہے منگل سنگھ!“ میں نے کھیل لہجے میں کہا ”کیا میں اتنا ہی بے وقوف ہوں کہ تمہیں یہ آسانی اس کو وارنٹ تک جانے کی اجازت دے دوں تاکہ تم وہاں موجود رہا نقل کے بل بوتے پر مجھے کم زور بنا سکو۔ تم ممتاز اور پھانک والے کی جان بھی لے سکتے ہو یا انہیں گن پوائنٹ پر رکھ کر وہاں سے فرار بھی ہو سکتے ہو!“

”میں نے جو کہا ہے اس پر عمل بھی کروں گا۔“ وہ براعتاً دہلیز میں بولا ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ ایک ڈاکو کا وعدہ۔ ہم لوگ اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے گردن تک کٹا سکتے ہیں۔“

”لیکن میں ہرگز کوئی تجربہ نہیں کر سکتا!“ میں نے وہ ٹوک انداز میں کہا۔

وہ بولا ”پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ آپ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر اس کو وارنٹ تک لے جائیں۔ میں محض مخصوص انداز میں سیٹی بجا کر اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کو کوآرڈر سے باہر بلاؤں گا پھر آپ کی مرضی جو بھی کرتے پھرں۔“

”ہاں، یہ معقول تجویز ہے۔“ میں نے کہا۔

میرے بھائی نے پوچھا ”سائیں! آپ نے کیا سوچا ہے؟“

میں نے کہا ”سائل میں پچھارو میں موجود رہے گی۔ تم منگل سنگھ کو کلا شیفوف کے نشانے پر رکھ کر کوآرڈر تک لے جاؤ گے۔ یہ وہاں پہنچ کر مخصوص انداز میں سیٹی بجائے گا پھر اس سیٹی کی آواز سن کر گنڈا سنگھ جیسے ہی کوآرڈر سے آمادہ ہو گا اسے بھی فائرنگ ریج میں لا سکتے ہو۔“

منگل سنگھ نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تم اسے بے دریغ گولیوں سے بھون ڈالتا۔“

یہ بات میں نے منگل سنگھ کو خوف زدہ کرنے کے لیے کسی نئی دہندہ کو کسی قسم کی مہم جوئی کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ میرے بھائی اس عرصے میں میرے مزاج اور طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں خواہ مخواہ کی خون ریزی کا قائل نہیں۔ منگل سنگھ کو گولیوں سے بھوننے والی بات کو اس نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

اس نے پوچھا ”منگل سنگھ کا سدباب تو آپ نے بتا دیا سائیں! لیکن اگر دروازے سے برآمد ہونے والے گنڈا سنگھ نے کسی قسم کی کوئی پھرتی دکھائی تو اس کو کس طرح کنٹرول کرنا ہوگا؟ اس کے پاس بھری ہوئی ایک رائفل بھی ہے!“

میں نے منگل سنگھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”ویسے تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ گنڈا سنگھ کوئی چالاکی دکھائے کیونکہ منگل سنگھ کی سیٹی سن کر وہ یہی سمجھے گا کہ سب خیریت ہے۔ یہ فرض محال، اگر اس نے اسامہ بنے کی کوشش کی تو میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں تم سے پہلے ہی کوآرڈر کے دروازے پر پہنچ جاؤں گا۔“

ہم اس پلاننگ کے عین مطابق پچھارو سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈی ایس بی والا ریوالور ساحل کے پاس ہی رہنے دیا تاکہ کسی بنگالی صورت حال میں وہ اسے استعمال کر سکے۔ منگل سنگھ سے چھینا ہوا ریوالور میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ اس کے استعمال کی نوبت آئے گی۔ ابھی تک ایک بات سراسر ہمارے حق میں جاری تھی کہ اس سڑک پر اب تک کسی بھی جانب سے کوئی گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سڑک خاصی غیر مصروف تھی۔ اب صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ کسی ٹرین کی آمد و جلد کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

ریلوے ملازم کا وہ کوآرڈر پھانک کے نزدیک ہی ریلوے کی پڑی سے خفیہ میں بنا ہوا تھا۔ کمرے کے سامنے ایک ہنوا سائیاں نما احاطہ بھی نظر آ رہا تھا۔ کچیرل کی چھت والا وہ اظہار کرا اس وقت ہم سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے دوسری جانب گھوم کر جانے کی ضرورت تھی۔ ہماری پچھارو جس طرف کھڑی تھی وہاں سے کمرے کی عقبی دیوار نظر آتی تھی اسی لیے میں نے یہ آسانی منگل سنگھ کو نوٹا فور وکیل ڈرائیو جیب کو دیکھ لیا تھا۔ کمرے کی عقبی دیوار میں کوئی کھڑکی یا روشن دان موجود نہیں

تھا اس لیے امید کی جاسکتی تھی کہ گنڈا سنگھ نے اپنے ”مرئی“ کے ساتھ ہونے والی کارروائی نہیں دیکھی ہوگی۔

میں جلد از جلد اس نئے کونشنا چاہتا تھا۔ اس بات کا خارج از امکان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ آرا اینڈ کمپنی یا کوئی پولیس والا بیدار مغز افسر ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آنکلا۔ اس صورت میں ہماری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

مجھے اس لیے بھی کوآرڈر والے معاملے سے جلدی فارغ ہونا تھا کہ ساحل کو میں پچھارو میں بالکل تنہا چھوڑ آیا تھا۔ اس کے پاس لاکھ ریوالور سہی مگر بھی تو وہ ایک لڑکی ہی۔ ابھی لڑائی بھڑائی کے ہٹھکھٹا محاملات سے اس کا ڈائریکٹ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے مارشل آرٹس اور جوتا سنگ وغیرہ سیکھنے کی فراہم کی تھی اور میں غلط نیت سے اسے یہ فنون سکھانا بھی چاہتا تھا۔ وہ ایک قد آور اور چست و چوند لڑکی تھی۔ بہت جلد ان فنون میں مہارت حاصل کر سکتی تھی۔ خاص طور پر مارشل آرٹس میں وہ بہت کامیاب رہتی۔ دراز قافیہ میں اس کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی۔

ہم طے شدہ پروگرام کے تحت اپنی اپنی پوزیشن پر جا کر کھڑے ہوئے۔ میں نے منگل سنگھ کو سیٹی بجانے کا اشارہ کیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی پہلی دو دو انگلیوں کو منہ میں ڈالا اور زبان پر ان انگلیوں کا مخصوص دباؤ ڈالتے ہوئے سیٹی بجا دی۔

وہ بہت ہی آزمائشی لمحہ تھے۔ منگل سنگھ کا ساتھی گنڈا سنگھ کمرے سے نکلنے کے بعد کس رد عمل کا مظاہرہ کرنا؟ اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منگل سنگھ نے ہمیں اس سیٹی کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کی ہوں اور اس کی آواز کے کچھ اور ہی معنی ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہو سکتا تھا اور جو کچھ بھی وہاں پیش آتا میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے منگل سنگھ کی زبان پر اعتبار کیا تھا، اس کی نیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نیت کو جاننے کا ابھی تک کوئی طریقہ ”کوئی فارمولا ایجاد نہیں ہوا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو دنیا میں کوئی کسی سے دھوکا نہ کھاتا۔ بے شک، اللہ ہی نینوں کے حال جاننے والا ہے!“

منگل سنگھ کی مخصوص سیٹی کے جواب میں پھانک والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے ایک نوجوان کی صورت دکھائی دی۔ وہ یقیناً گنڈا سنگھ تھا۔ گنڈا سنگھ نے اپنے دائیں ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی۔ میں پوری



طرح کسی بھی جنگی کارروائی کے لیے جو کس ہو گیا۔  
گنڈا سنگھ نے اپنے سرور منزل سنگھ کو کلا شکوف کے نشانہ پر بے بس دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔  
مجھے محسوس ہوا وہ کوئی سنگین قدم اٹھانے کا ارادہ کر رہا تھا۔  
اس کے راتقل والے ہاتھ میں، میں نے واضح جیش محسوس کی تاہم میری جیش اس دوران میں نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گنڈا سنگھ کو بھی کلا شکوف کی ہلاکت خیز فائرنگ کی ریج میں لا چکا تھا۔ میں نے سینڈ کے ہزاروں حصے میں فیصلہ کر لیا کہ اگر گنڈا سنگھ کا راتقل والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا تو میں اس کا سوا ستیاناس مار کر رکھ دوں گا۔ میں ایسی آڑ میں کھڑا تھا کہ گنڈا سنگھ میری وہاں موجودی سے بے خبر تھا۔  
تاہم شانی خیریت گزری۔ گنڈا سنگھ نے اپنے گرو کو گن پوائنٹ پر فہم دیکھ کر کسی قسم کی حماقت کا ثبوت نہیں دیا۔  
اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گنڈا سنگھ پر نظریہ ہی منزل سنگھ نے اس کے لیے احکام جاری کر دیا تھا۔  
”گنڈا سنگھ! راتقل پھینک کر ہار جاؤ۔“  
گنڈا سنگھ کی عمر لگ بھگ بائیس سال تھی۔ وہ حماقت میں میرے ارباب قریب تھا شاید اس لیے مجھ پر گنڈا سنگھ ہونے کا شبہ کیا گیا تھا۔ منزل سنگھ عموماً وہ قد کاٹھ میں میری جیش کے برابر تھا اور ساحل کو ممتاز سمجھا گیا تھا۔ یہ دونوں ڈاکو اور مغویہ ممتاز ہمیں ناکے پر پیش آئے، اے حالات سے قطعی لاعمل تھے۔  
گنڈا سنگھ نے اپنے پیر استاد کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہاتھ والی راتقل کو ایک طرف پھینک کر کمرے سے باہر آگیا۔ میری جیش نے کلا شکوف کے اشارے سے گنڈا سنگھ کو منزل سنگھ کے قریب آنے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں سنگھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔  
اس دوران میں، میں بھی دیواری آڑ سے نکل کر سامنے پہنچ گیا۔ منزل سنگھ نے میری جانب دیکھے ہوئے کہا ”سائیں!“  
آپ کو آڑ کے اندر جا کر دیکھ لو۔ لڑکی وہاں موجود ہے اور صحیح سلامت بھی ہے۔ رقم تیار، آپ لوگوں کو ابھی دیتا ہوں۔“  
گنڈا سنگھ اس صورت حال سے حیرت میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بازی کس طرح چلتی گئی تھی۔  
میں نے میری جیش، مخاطبہ کرتے ہوئے کہا۔  
”تم کو آڑ کے اندر جا کر صورت حال کا جائزہ لو اور فوراً آکر مجھے رپورٹ پیش کرو۔“  
”جو حکم سائیں۔“ وہ فرماں برداری سے بولا ”ان کا کیا

کرنا ہے؟“ اس نے ”سنگھ اینڈ کمپنی“ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔  
میں نے کہا ”انہیں میں دیکھتا ہوں۔“  
میں نے منزل سنگھ والا ریوالور جیب سے نکل کر ہاتھ میں لے لیا۔ میں ان دونوں کو بغیر کسی ہتھیار، آواز کے چکیوں میں مسل کر رکھ سکتا تھا لیکن خواہ مخواہ کی نمائندگی سنگھ آرائی کے حق میں، میں کسی بھی نہیں رہا۔ ریوالور کو بھی میں نے ڈاکوؤں پر رعب طاری کرنے کے لیے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔  
منزل سنگھ کلا شکوف بہ دست کو آڑ کے اندر داخل ہونے لگا تو میں نے کہا ”تم نے صرف مغویہ ممتاز ہی کی خیریت معلوم نہیں کرنا بلکہ پھانک والے ریلوے کے ملازم کی بھی خبر گیری کرنا ہے“ ان دونوں کی سلامتی کے بعد ہی ہم ان شخصوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔“  
میری جیش اثبات میں گردن ہلا کر کو آڑ کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بات کا میں نے اندازہ لگایا کہ کو آڑ کے اندر مغویہ اور یہ غلامی آزادوالات میں موجود نہیں تھے ورنہ گنڈا سنگھ کے کو آڑ سے باہر آتے ہی کو آڑ کے اندر دہشت میں کسی قسم کی ہلچل کے آثار نظر آ جاتے۔ اندر مکمل سناٹا اور سکون طاری تھا۔  
یاداً منٹ بعد میری جیش کمرے سے باہر نکلا اور میرے پاس آکر بولا ”سائیں! اندر وہ دونوں خیریت سے ہیں تاہم ان مردوروں نے انہیں اچھی طرح ہاندھ کر ڈالا ہوا ہے۔“  
میری جیش میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”کیا تم نے جکڑے ہوئے مغویہ اور یہ غلامی کوتا دیا ہے کہ ان کی مصیبت ختم ہو گئی ہے اور وہ اب رہا کیے جانے والے ہیں؟“  
”میں نے انہیں اچھی خاصی تسلی دے دی ہے۔“  
میری جیش نے بتایا۔  
میں منزل سنگھ کی جانب متوجہ ہو گیا ”تم نے اپنی جیش کش کی پہلی قسط تودا کر دی یعنی ایک کروڑ روپے کا نقصان اٹھایا۔ اب دوسری قسط کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جاؤ۔ ایک لاکھ روپے کا بوجھ کب تک ساتھ ساتھ اٹھائے پھوگے!“  
وہ خاموشی کے ساتھ ٹیوٹا جیب کی جانب بڑھ گیا۔ گنڈا سنگھ دو قدم کے فاصلے سے اس کی تقلید کر رہا تھا۔ میری جیش نے مسلسل ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے معمولی سی کوئی غلط حرکت بھی انہیں ناقابلِ غلطی

نقصان سے دوچار کر جاتی۔  
فردوسیل ڈرائیو ٹیوٹا جیب کے نزدیک پہنچ کر منزل سنگھ نے اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میری جیش نے گرن دار آواز میں کہا ”خبردار!“  
منزل سنگھ کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ میکا کی انداز میں رک گیا۔ میری جیش نے خوفناک لمحے میں دریافت کیا ”کیا کسی چالاک کا ارادہ ہے۔ یاد رکھو، میں کسی بھی ہوشیاری کے آثار دیکھنے ہی سے دریغ دونوں کو گولیوں میں پروں دوں گا۔ تمہارے جسموں میں اتنے سوراخ نمودار ہو جائیں گے کہ آپ بے پروا دیکھنا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔“  
میں نے منزل سنگھ سے پوچھا ”تم اپنی جیب سے کیا نکالنے والے تھے؟“  
”چالی۔“ اس نے شکست خوردہ انداز میں جواب دیا۔  
”چالی!“ میں نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا ”کیسی چالی۔“  
اس نے بتایا ”ہماری گاڑی میں ایک خفیہ خانہ ہے۔ ایک لاکھ کی رقم وہ رقم میں نے اسی خانے میں محفوظ کر رکھی ہے۔ وہ خانہ لاک ہے اور چابی سے کھلتا ہے۔“  
منزل سنگھ کی اس وضاحت پر اس کا نوجوان ساتھی گنڈا سنگھ حیرت آمیز نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ خفیہ خانے کے راز سے گنڈا سنگھ واقف نہیں تھا۔ اس خانے کا ذکر اس کے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں تھا۔  
میں نے منزل سنگھ کی بات پر آگے بند کر کے بھروسہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت کسی لئے اپنے شخص کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے بارے ہوئے جواری سے بھی تشبیہ دی جاسکتی تھی اور زخمی سانپ کتنا بھی مناسب تھا۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ”ہم تو ڈوبے ہیں صہم۔“ کے صداقت کسی بھی قسم کی کوئی حرکت فرما سکتے ہیں۔  
یہ عین ممکن تھا کہ وہ اس خفیہ خانے میں سے ایک لاکھ کی رقم کے بجائے کوئی ہتھیار برآمد کر لیتا اور اچانک ہم پر فائرنگ شروع کر دیتا۔ ایسی صورت میں ہماری جانوں کو بے حد خطرہ لاحق ہو جاتا۔ دیکھئے یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ چالی کا ہاندھ کر کے اپنی جیب میں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے اس کا بدن ٹھٹھل کر اس کے پاس کس آنکھ سے اس کی عدم موجودگی کا یقین کر لیا تھا۔ یہی کارروائی میں نے تھوڑی دیر پہلے گنڈا سنگھ کے ساتھ بھی کر ڈالی تھی۔  
میں نے منزل سنگھ سے کہا ”تم چالی میرے ساتھی کو دے دو اور اس خفیہ خانے کی نشان دہی بھی کر دو۔ رقم یہ خود

ہی نکال لے گا۔“

کسی قسم کا پس و پیش کے بغیر منزل سنگھ نے مذکورہ چالی اپنی جیب سے نکال کر میری جیش کے حوالے کر دی پھر اسے بتانے لگا کہ وہ خفیہ خانہ گاڑی کے کس حصے میں واقع ہے۔ میں نے منزل سنگھ اینڈ گنڈا سنگھ کو کور کر لیا اور میری جیش کی تلاشی میں مصروف ہو گیا۔  
اس تلاشی کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ میری جیش نہ صرف یہ آسانی خفیہ خانے تک پہنچ گیا بلکہ اس نے منزل سنگھ کی بتائی ہوئی رقم بھی دریافت کر لی۔  
منزل سنگھ نے کہا ”گن کر دیکھ لو سائیں۔ پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔“  
وہ استعمال شدہ نوٹ تھے۔ ان میں ایک ہزار پانچ سو اور سو سو والے تینوں قسم کے نوٹ شامل تھے۔ میں نے انڈیا میں پانچ ہزار روپے کا نوٹ بھی دیکھا تھا مگر پاکستان میں ابھی تک مجھے ایک ہزار روپے سے بڑا نوٹ نظر نہیں آیا تھا۔ ازاں بعد میری جیش نے مجھے بتایا کہ پاکستانی کرنسی کا سب سے بڑا نوٹ ایک ہزار والا ہی ہے۔  
منزل سنگھ نے ہمیں جو رقم فراہم کی تھی یاوں سمجھ لیں کہ اپنی جان بخشی کے لیے جو نذرانہ پیش کیا تھا وہ کوئی قرض کی وصولی تو بھی نہیں جو میں ایک ایک نوٹ گن کر شمار کرتا۔ مال مفت دل بے رحم کے مطابق اس رقم کو گئے بغیر میں نے منزل سنگھ سے کہا۔  
”تم کہہ رہے ہو، ایک لاکھ ہیں تو پھر ایک لاکھ ہی ہوں گے۔“  
”تم مسلمان لوگ ہم ہندوؤں پر بھروسہ نہیں کرتے نا۔“  
وہ نیم طنزیہ انداز میں بولا ”ہمیں چالاک بنیا کہتے ہو اس لیے رقم گن کر اپنی تسلی کر لیتے تو زیادہ اچھا تھا۔“  
میں نے کہا ”ہر قوم میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی فرد واحد کے ذاتی کواریا اعمال پر اس قوم کے لیے کوئی فارمولہ تیار نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا ہے۔ بنانا مجھے درجنوں بدکار، گریٹ اور جرائم پیشہ ہندو پنڈت نظر آئے ہیں۔ چند مخلص، پاکو اور اور مثالی ہندوؤں سے میری دوستی بھی رہی ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے میری دوستی اور تعلق کی خاطر اپنا لاکھوں کا نقصان کیا۔ اسے ہی ہندو بھائیوں کی دشمنیاں مول لیں اور وہاں کی بددینی قسم کی مسلم شتم طاقتوں کا ٹھکر مقابلہ کیا۔ میرے نظریات اور خیالات بلکہ تجربات عام قسم کے لوگوں سے خاصے مختلف ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے یا بُرے اور اچھے برے انسان دنیا کے ہر خُلق میں پائے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انسان اچھے یا بُرے ہوتے ہیں اس لیے کسی قوم یا مذہب کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ کوئی بھی مذہب برائی کی تعلیم نہیں دیتا۔ دنیا میں پائے جانے والے تمام مذاہب کی تعلیمات چوری، ڈاکا، قتل و غارت گری، جھوٹ، منکاری، دل آزاری اور خُرچہ کارروائیوں سے روکتی ہے۔ امن و سکون، صلہ رحمی، تعاون، مدد، مظلوم کی وادری، ظالم کی سرکوبی اور تمام تعمیری کاموں کی تلقین کرتی ہے۔ مذہب کسی بھی صورت انسان کو برا نہیں بناتا۔ اس کے اپنے اعمال و کردار ہی اس کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔“

منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک مسلمان اس قسم کے آزاد خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ بات آزاد خیالی کی نہیں مونی۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی انسان کے دل و دماغ میں کتنی گنجائش ہے۔ تنگ نظر لوگ کسی بھی قوم کی بدنامی کا سبب ہوتے ہیں جب کہ وسیع النظر افراد اپنی قوم اور مذہب کا سر بلند کرتے ہیں۔۔۔۔ جن قوموں نے دنیا میں فلاح و ترقی پائی ہے ان قوموں میں وسیع دل و دماغ رکھنے والے افراد کی کمی نہیں رہی۔ فتنہ و فساد پھیلانا بہت آسان کام ہے کیوں کہ ہر خُرچہ کار عمل ہی ہو کرتا ہے۔ امن و آشتی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا بہت طلب کام ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہی ہے اور حقیقت آنکھیں بند کر لینے سے بدل نہیں جاتی۔

اس وقت دنیا میں جتنے مسلمان موجود ہیں، وہ اگر ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ایک دائرے میں کھڑے ہو جائیں تو ان کے حصار میں دنیا کی باقی تمام اقوام نظر آئیں گی۔ کسی بھی محیط، دائرے، حصار یا حدود میں موجود اشیا اس محیط، دائرے، حصار یا حدود سے زیادہ طاقتور نہیں ہوسکتیں مگر وہ ہاتھ کہاں سے آئیں جو مضبوط کڑیوں کا گروا اور ان کے ایک۔ ایک۔ سیسہ پلائی ہوئی زنجیر کو تختیوں دے سکیں۔ کسی بھی زنجیر کی انام نکڑیاں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ہم تو پاکستانی ہیں، افغانی ہیں، ایرانی ہیں، عراقی ہیں، شامی ہیں، مصری ہیں، عرب ہیں، ہم ہیں، کالے ہیں، گھورے ہیں، مفلوک الحال ہیں، مال دار ہیں، ہم سب کچھ ہیں مگر ایک نہیں ہیں۔ ایک نہیں ہیں تو نیک نہیں ہیں۔

کاش! اے کاش! ہم کچھ بھی نہ ہوتے، صرف مسلمان ہی ہوتے!

منگل سنگھ کی حیرت رفع نہ ہو سکی تو اس نے پوچھا ”سائیں! آپ اپنے مٹنے سے مولوی تو دکھائی نہیں دیتے مگر باتیں بڑی عالمانہ کر رہے ہیں۔“

اب میں اسے کہتا تھا کہ اپنی وضع قطع سے نظر آنے والے آقا اور ایک حقیقی عالم دین میں کیا فرق ہوتا ہے اس معاملے میں لب کشائی کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میں نے منگل سنگھ کو کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب جانا۔

وہ بولا ”سائیں! میں نے تو اباد چن (دعہ) پورا کر دیا۔ مغویہ ممتاز، پر غلانی پھانک والا اور ایک لاکھ کی رقم میں آپ کے حوالے کر چکا ہوں۔ اب آپ کی باری ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ مسلمان اپنے وطن کے پالن کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے؟“

اس نے مجھے ایک بند گلی میں گھیر لیا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ اس وقت میں فیصلے کے پھندے میں ”ہاں اور نہ“ کے درمیان سوائید نشان کی صورت جھول رہا تھا۔ میں نے اس کشمکش میں جو فیصلہ کیا وہ میرے ضمیر کی آواز تھی۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط! اس چہر میں اچھے بغیر میں نے حتیٰ لچے میں کہا۔

”منگل سنگھ! تم نے بالکل درست سنا ہے۔ ایک چار مسلمان اپنے وعدے کو نبھانے کے لیے گردن کٹوا سکتا ہے۔“

”پھر ہمارے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟“

میں نے کہا ”تم دونوں میاں سے جاسکتے ہو لیکن جانے سے پہلے تمہیں ایک چھوٹا سا کام کرنا ہو گا۔“

”یہ کیا سا میں؟“ منگل سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے ٹوٹوٹا جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تم لوگ گاڑی کو دھکیل کر جس طرح میاں لائے ہو اسی طرح دھکیل کر واپس سڑک پر پہنچاؤ گے۔ میں تمہیں اس کا مناسب معاوضہ بھی دے دوں گا۔“

میں نے یہ بات ایک خاص مقصد کے تحت کہی تھی۔ میں کسی بھی صورت میں پھانک والے غریب انسان کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ گاڑی اس کے کاروبار کی پشت سے لگی کھڑی رہتی تو اس کی پوزیشن کمزور ہو سکتی تھی۔ گاڑی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص منصوبہ ترتیب پا چکا تھا۔

منگل سنگھ نے میری بات سن کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“

”تم فائدے اور نقصان کے پکر میں نہ پڑو۔“ میں نے ڈرے سخت لہجے میں کہا ”جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“

منگل سنگھ نے معلوم کرنا چاہا ”آپ ہمیں اس کام کا کیا معاوضہ دیں گے؟“

”یہ کام مکمل ہونے کے بعد پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا۔

وہ دونوں ٹوٹوٹا جیب کو دھکا لگاتے لگے۔ ڈرائیوگ بیٹ میں نے سنبھال لی۔ کچھ دیر کی مشقت کے بعد وہ گاڑی کو سڑک پر میرے مطلوبہ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دراصل سڑک سے نیچے کچا تھا اور جیب کو میں نے ایسی پوزیشن میں کھڑا کیا تھا کہ دیکھنے میں یوں محسوس ہو، انتہائی مجبوری کی حالت میں اسے سڑک سے نیچے اتار گیا ہو گا۔

میں جیب سے نیچے اترا اور منگل سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم نے اپنی ڈیوٹی انجام دے لی۔ اب تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملنا چاہیے۔“

وہ پتا نہیں، میری اس معاوضے والی بات کا کیا مطلب نکال بیٹھا؟ اس کی مونی مونی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ اس دوران میں کلا فکٹوف برادر میرے نیچے بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ جرائم پیشہ افراد عموماً ایسے موقع پر اپنا اس قسم کا کوئی وعدہ ”ایٹھا“ کرنے کے لیے سامنے والے کی جان لے لیتے ہیں اور اس پر احسان بھی جانتے ہیں کہ انہوں نے اس شخص کو ایک کٹھن زندگی سے نجات دلا دی۔

میرے بخش کو سامنے دیکھ کر منگل سنگھ بھی یہی سمجھا تھا کہ شاید اب دونوں کو گولیوں سے بھونک دیا جائے گا۔ ان دونوں کی ساری زندگی جرائم کی دلدل میں گزری تھی۔ وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی تھے مگر میں جرائم پیشہ تھا اور نہ ہی میرا سماجی میرے بخش اس قبیل سے تعلق رکھتا تھا۔

میں نے منگل سنگھ سے لے ہوئے ایک لاکھ روپے کے نوٹ واپس اسے دیتے ہوئے کہا ”یہ تم لوگوں کا معاوضہ ہے۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے نوٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ رقم اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ”رکھ لو۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔ واقعی یہ روپے تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔“ اس نے لرزے ہاتھوں سے وہ نوٹ پکڑے پھر حیرت

سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں حیرت بے یقینی اور تشکر کے جذبات موج زن تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوئے۔

جب انسان کی سمجھ میں نہ آئے کہ اسے اپنی زبان سے کون سے الفاظ ادا کرنا چاہئیں تو پھر زبان پر تالا بڑ جاتا ہے، سمجھ سوچ ایک جگہ دُک جاتی ہے اور ہونٹ تھر تھرا کر رہ جاتے ہیں۔ منگل سنگھ کے ہونٹوں میں بھی کپکپاہٹ نما جنبش ہو رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ رقم تمہیں نئی زندگی شروع کرنے کے لیے دے رہا ہوں اور تمہاری جان اس لیے بخش رہا ہوں کہ تم نئی زندگی شروع کر سکو۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مزید کہا۔

”منگل سنگھ! جس خطرناک مرض میں تم مبتلا ہو اس کا انجام بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ اس کے علاج میں توبہ کا بڑا عمل دخل ہے۔ برے کاموں سے توبہ! مجھے امید ہے، تم یہ چوری چکاری، ڈاکا زنی اور قتل و غارت گری کو چھوڑ کر ایک سیدھے سادے انسان کی طرح زندگی گزارو گے۔ یاد رکھو! وقت ہر انسان کو اچھا بننے کا کم از کم ایک موقع ضرور فراہم کرتا ہے۔ تم سوچو، وقت میرے ہوش سے تمہیں یہ موقع فراہم کر رہا ہے۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھانا یا اسے ضائع کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

وہ فرط جذبات سے میرے قدموں میں جھک گیا پھر گلو گبر آوازیں بولا ”تمہارا ج آپ تو بھگوان کا ونا رہا ہو۔ مجھے اپنے چرنوں (قدموں) میں جگہ دے دو۔ میں ہر پاپ (گناہ) سے بچی توبہ کروں گا۔“

”مجھے گناہ گار نہ کرو۔“ میں نے شانوں سے تھام کر اسے کھڑا کر دیا ”میں ایک انسان ہوں، مجھے انسان ہی رہنے دو اور جہاں تک چرنوں میں جگہ دینے کا تعلق ہے تو فی الوقت ممکن نہیں۔ تمہارے لیے میرا یقین مشورہ ہے کہ جلد از جلد یہاں سے دور چلے جاؤ اور شریفانہ زندگی اختیار کرنے کی کوشش کرو۔“

وہ اب دیدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے کبرے ہوئے ہوئے ہوئے کپکپا رہے تھے۔ وہ اس وقت جذبات کی شدت سے گزر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگایا۔

اس وقت ہم دونوں انسان تھے جو انسانیت کے ناتے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے صدق دل سے دعا کی۔

”اے میرے پروردگار! اس ڈاکو کو نیک دل انسان

کسم۔ میں پنچھی اکلوتی چارپائی کے سرپانے کی جانب دیوار کے ساتھ تھوڑی سی جگہ خالی بھی ہوئی تھی۔ یہ دیوار

اب میں وہاں زیادہ دیر رکنے نہیں چاہتا تھا۔ ممتاز نے  
الحال میں اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھا تھا۔ میں تو  
سے اس کے والدین تک پہنچا دیتا یا چراس کر، محفوظ و امن کا  
وہی معقول بندوبست کرتے۔ ممتاز کو چونکہ میں اپنے ساتھ  
لے جا رہا تھا اس لیے پھانک والے سے میں نے ضرورت  
تھگو کر لینا مناسب بنانا۔

میں نے چند لمحات تک اس کے چہرے پر نظربجا کر اس کے چہرے کے اثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا وہ پوری قوت سے میری باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ حکام جاری رکھتے ہوئے کہا ”پیچھے آنے والی گاڑی والوں کی کوشش کرتی کہ کسی طرح آگے والی گاڑی کو روک لیں مگر

**kitabiat@hotmail.com**  
**kitabiat1970@yahoo.com**

آگے والے کسی قیت پر رکنے کو تیار نہیں تھے چنانچہ مجبوراً پچھلی گاڑی والوں نے اگلی گاڑی کی باڑی اور ٹائروں پر گولیاں برساتنا شروع کر دیں۔ نتیجے کے طور پر آگے والی گاڑی لڑکھائی اس کے ٹائر پھٹ گئے اور ڈرائیور کو گاڑی سڑک سے نیچے اتارنا پڑی۔

”مگر وہ گاڑی تو میرے کوارٹر کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی ہے؟“ پھانک والے انور علی نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باہر کے حالات سے بے خبر نہ تھا۔

میں نے کہا ”وہ گاڑی اب تمہارے کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ نہیں بلکہ ادھر سڑک کے کنارے کچے میں آڑی نیڑی کھڑی ہے۔“ اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”یہ کب اور کیسے ہوا؟“

”یہ جب اور جیسے بھی ہوا تم اس کے لیے اپنا دماغ نہ تھکاؤ۔“ میں نے کہا ”بہر حال یہ حقیقت ہے کہ وہ گاڑی اب سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر تھیر آئینہ لیے میں بولا ”وہ دونوں آدمی کہاں ہیں جنہوں نے میرے ہاتھ پاؤں پابند کر رکھے۔“ اس نے اپنے منہ سے کوئی آواز نکالی تو وہ مجھے ٹھٹھکیا کر کہے ”ان میں سے ایک راکفل نامے ہمارے سروں پر سوار رہا اور دوسرا سگنل لیمپ لے کر باہر چلا گیا تھا؟“

”وہ دونوں آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ میں نے انور علی کو حقیقت حال سے بے خبر رکھتے ہوئے کہا۔ ساحل اور میر بخش سمجھ گئے کہ میں کسی مصلحت کے تحت سچ میں جھوٹ کی آمیزش کر رہا ہوں۔ انور علی نے جب سگنل لیمپ کا ذکر کیا تو مجھے کچھ یاد آگیا تھا۔ میں نے پھانک والے سے پوچھا۔

”گاڑی کافی دیر سے نہیں گزری۔ کیا اس ریلوے لائن پر بہت کم آمد و رفت رہتی ہے؟“

اس نے بتایا ”رات میں آخری گاڑی گیارہ بجے گزرتی ہے۔ اس کے بعد اب نوبت آئے گی۔ ویسے اس لائن پر زیادہ رش نہیں ہوتا۔“ پھر اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔

میں نے پوچھا ”کیا بات ہے انور علی؟“

اس نے سوال کیا ”سائیں! آپ نے بتایا ہے کہ پچھلی گاڑی نے ڈاکوؤں والی گاڑی پر گولیاں برسائی تھیں جس کے

نتیجے میں اس کے ٹائر پھٹ گئے اور سڑک سے اتر گئی۔ مگر میں نے تو فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔“

”ہم یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں فائرنگ کی آواز بھی سنائیں گے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال۔“ میں واپس اپنی کمائی کی طرف آگیا ”جب ڈاکوؤں والی گاڑی رک گئی تو انہوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر فراری میں عافیت جانی اور مغویہ کو چھوڑ کر دو گیارہ ہو گئے تعاقب میں آنے والی گاڑی میں موجود افراد نے مغویہ کو اپنی گاڑی میں سوار کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمہاری نظر سے او بھل ہو گئے۔“

”میں سمجھ گیا سائیں، بالکل سمجھ گیا۔“ انور علی نے پر اعتماد لہجے میں کہا ”میں پولیس والوں کو یہ بیان دوں گا۔“ مادھوی ڈکٹ کی کاپی ممتاز نے سوال کیا ”کیا وہ دونوں ڈاکو واقعی فرار ہوئے ہیں؟ ان کے ارادے فرار ہونے والے تو نہیں لگتے تھے۔ وہ دونوں بہت خطرناک لوگ تھے؟“ ممتاز سندھی لب و لہجے میں بہت صاف اردو بول رہی تھی۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ تعلیم یافتہ تھی۔ میں نے اس خوب صورت لڑکی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”ہاں ممتاز، وہ دونوں درحقیقت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ میں نے ممتاز سے دانستہ جھوٹ بولا۔ وہ بھی انور علی کی طرح کوارٹر سے باہر پیش آنے والے حالات سے بے خبر تھی اور میں اسے بے خبری رہنا چاہتا تھا۔ فی الحال ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”جب انہوں نے دیکھا کہ وہ بری طرح ہمارے چنگل میں پھنس چکے ہیں تو انہوں نے فراری میں عافیت جانی۔“

ممتاز نے استفسار کیا ”آپ ڈاکوؤں کی گاڑی پر فائرنگ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“

”تاکہ یہ بے چارہ انور علی کسی بڑے وبال میں نہ آجائے۔“ میں نے کہا ”اس کمائی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“

”آپ کون لوگ ہو اور مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ ممتاز نے نہایت ہی اہم سوال پوچھا۔

میں نے کہا ”ہم خدا کی فوج دار ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔“ میں نے ذرا توقف کر کے اضافہ کیا ”ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کریں گے۔ تم از خود بھی اپنے گھر جاسکتی ہو۔ ویسے تمہارے بے ہمتی ہو گا کہ ہماری حفاظت میں تم اپنے والدین کے پاس

پہنچو۔ تم نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھا لے ہیں۔“

وہ احسان مندی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تذکرانہ جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ ہم نے اسے ڈاکوؤں کے چنگل سے نجات دلانا واقعی اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آزاد ہو گئی ہوں۔“

وہ بار بار اپنی کھانسیوں کو سلا رہی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے مضبوط رسی کی بندشیں موجود تھیں۔

میں نے کہا ”تم واقعی آزاد ہو گئی ہو اور اس بات کا یقین تمہیں اس وقت آئے گا جب اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔“

”مجھے تو یہ سب کچھ کسی بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا ہے۔“

”بھیاںک خوابوں کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ممنونیت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”آپ بتا رہے ہو، وہ دونوں شیطان کہیں بھاگ گئے ہیں مگر مجھے اب بھی ان سے خوف آ رہا ہے کہ کہیں واپس نہ آجائیں۔“

”تم نے گزشتہ چند روز بس مصیبت میں گزارے ہیں یہ انہی حالات کا اثر ہے۔“ میں نے کہا ”ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ دونوں ڈاکو اب کبھی پلٹ کر تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں چند روز سے اس مصیبت میں گرفتار تھی۔ ہماری تو یہ پہلی ملاقات ہے۔ آپ میرے گزرتے ہوئے حالات سے کس طرح واقف ہیں؟“

”رانی میں ایک غلطی کر بیٹھا تھا۔ بہر حال، اب اس غلطی سے بھٹانا تھا۔ میں نے بات بتاتے ہوئے کہا ”واقعی میں ان تین پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتا، تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو اور ڈاکوؤں نے تمہیں کیوں اغوا کیا تھا۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”آپ وہ نہیں ہیں تو نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

اس کے اس جملے میں بڑی فورس تھی۔ ممتاز بولتی ہوئی آنکھوں والی ایک ذہن لڑکی تھی۔ ویسے بھی وہ اب صاحب حیثیت شخص کی اکلوتی اولاد تھی۔ حسین و جمیل تھی، تعلیم یافتہ تھی۔ یہ تمام عوامل مل کر انسان کو پر اعتماد بنا دیتے ہیں اور ”اعتماد“ ذہن لوگوں کا خاصہ ہے۔ میں نے ممتاز کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے جواب میں کہا۔

”میں لیا نظر آنے کی کوشش کر رہا ہوں!“

”جو آپ نہیں ہیں۔“ وہ ٹٹولتی ہوئی نگاہ مجھ پر مرکوز کر کے بولی۔

”میں کیا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ بہت گہرے انسان ہیں۔“

”کسی کی گہرائی بتانے کے لیے بھی کسی نہ کسی ہنری ضرورت ہوتی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

”اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تم ایک بہت ہنر مند لڑکی ہو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

میں مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرے آخری جملے پر جھینپ کر اس نے نگاہ جھکا لی۔ میں پھانک

والے انور علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”چاچو! نوبت میں کتنا وقت باقی ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا ”تم نے بتایا ہے کہ نوبت کون کی گاڑی وہاں سے گزرتی ہے۔“

ہماری جامہ تلاشی کے نام پر ہمیں ہر شے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ہمارے جسموں پر لباس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گھڑی کی عدم موجودگی کے سبب وقت کا درست اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ ابھی تو نہیں بجے ہوں گے۔

انور علی نے اپنی میلی کپلی گھڑی کے ڈائل کو دیکھتے ہوئے کہا ”اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ گاڑی کی آمد میں پورا ایک گھنٹا باقی ہے۔“

بات ختم کر کے وہ سرا سید نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا ”کیا بات ہے چاچو، تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

”سائیں! آپ تو اب یہاں سے چلے جاؤ گے۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا ”اگر وہ دونوں ڈاکو پھر اس طرف آئے تو میں؟“

میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا ”وہ اب کبھی اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔ تم بے فکر ہو کر اپنے معاملات کو جاری رکھو۔“

وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ ویسے یہ حقیقت بھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نیکل سنگھ اور اس کا ساتھی گندا سنگھ انور علی پریشان کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں نے منگل سنگھ کی آنکھوں میں جو اثر دیکھا تھا، اس کے آئندہ عزائم کی عکاسی کرتا تھا۔ مجھے اُمید نہیں بلکہ پورا یقین تھا کہ اب وہ

میں نے ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی سے گردن باہر نکالی اور میربخش کی طرف دیکھتے ہوئے حلق کی پوری قوت سے چلایا ”بھاگو میربخش... جلدی، ہری اپ!“

www.kitabiat.com

نہایت باہمی لگس جس ہلاکت خیز رفتار سے ہمارے نزدیک  
 'شامی' اسے نظر انداز کرنا خود کو موت کے حوالے  
 کے مترادف تھا۔ اس گاڑی میں جو کوئی بھی تھا، ہمارا

ہم بجا رو کے نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے ساحل اور مہار کو گاڑی کے عقبی حصے میں سوار کرایا اور خود ڈرائیونگ

میر نے فورا ساحل کی مدد کرتے ہوئے کہا ”ہم کہا

میری پکار پر میر بخش خیالات کے بھور سے نکل آیا۔ اس دوران میں ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے لیے پیچڑ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ وہ کسی گولی کی رفتار سے بچا رو تک پہنچا اور بجلی کی سی سرعت سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے ایک جھٹکے سے بچا رو کو آگے بڑھا دیا۔ چند لمحات میں بچا رو ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ بچا رو چونکہ ساکن حالت سے حرکت میں آئی تھی اس لیے اونچی رفتار پکڑنے میں اسے جو لمبے لگے اسی وقت میں ٹیوٹا ہائی کس ہمارے بہت قریب پہنچ گئی۔ وہ اب بھی ہمارے عقب میں تھی تاہم ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ یقینی طور پر متعاقب گاڑی کی رفتار ہم سے کچھ زیادہ رہی ہوگی۔ میں بیک وقت دو مقامات پر متوجہ تھا۔ بھرپور توجہ کے ساتھ ڈرائیونگ بھی کر رہا تھا اور ریڈیو پر مر میں اپنے پیچھے آنے والی گاڑی کو بھی نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ ابتدا میں وہ صرف ایک گاڑی تھی، ٹیوٹا ہائی کس۔ جس کے عقبی کھلے ہوئے حصے میں کوئی شخص گن تھاے کھڑا تھا۔ فاصلے میں تیزی سے واقع ہونے والی کمی کے باعث گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد کے ہولے دکھائی دینے لگے۔ رفتہ رفتہ ان ہیولوں کے طے واضح ہوئے تو مجھے چوٹنا پڑا۔ وہ چہرے میرے لیے ابھی نہیں تھے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں استادہ گن بردار شخص کو بھی میں بخوبی پہچان گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے پورے وجود میں سنسنی ہونے لگی۔ بے اختیار ایکس کرینر میرے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا "ایک خون ریز مہر کے کا وقت آن پہنچا ہے۔" ٹیوٹا ہائی کس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شیطان کا برلور خورد تارا موجود تھا۔ اس کے برابر میں پیچڑ سیٹ پر وڈیرا اکبر سومو نظر آ رہا تھا جبکہ عقبی حصے میں گن بردار وہ شخص وڈیرے کا گارڈ تھا۔ وڈیرے کے ساتھ آنے والے چار حواریوں میں سے صرف ایک شخص زندہ بچا تھا، باقی تین ڈی ایس بی کے سیکورٹی گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ تارا وڈیرے کا مہمان تھا اس لیے میں اسے اس کے حواریوں میں شمار نہیں کر رہا۔ اس کے زخمی سر پر پٹی بدستور موجود تھی۔

میری طرح میر بخش نے بھی حالات کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کر لیا۔ یقیناً خون اس کی رگوں میں اچھل کر رہ گیا ہوگا۔ اکبر سومو ایک طویل عرصے تک اس کا ان داتا رہا تھا تاہم حالات کی بے رحمی نے میر بخش کو وڈیرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس وقت انتہائی مستعد نظر آ رہا تھا۔

کلا شکوف کو اس نے بڑے چوکس اور ماہرانہ انداز میں ریڈی کر لیا۔

میری پوری کوشش تھی کہ دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلے میں اضافہ جاری رہے۔ ابھی تک ہم شاید فائرنگ ریٹ میں نہیں آئے تھے یا ممکن ہے متعاقب دشمنوں کی کوئی مصلحت ہو۔ بہر حال اس طرف سے فائرنگ نہیں کی گئی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فائرنگ نہیں کریں گے۔ میں نے میر بخش کے تیور دیکھ لیے تھے اس لیے گاڑی کی رفتار کو مزید بڑھاتے ہوئے تنہی انداز میں کہا "ہمارے پاس فاضل ایویشن نہیں ہے۔ تم ٹیوٹا فورڈ میں فائرنگ کر کے اس گن کے بیگزین کو خاصی حد تک خالی کر دے۔" لہذا ایک بھی گولی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

"سمجھ گیا سائیں! وہ کلا شکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "ہر گولی رنگ لائے گی۔"

بچا رو کے عقبی حصے میں موجود ساحل اور ممتاز اس اچانک افتاد پر سرا سمہ نظر آنے لگیں۔ دونوں ہلکے دم عمر تھیں۔ حسین اور جوان بھی تھیں تاہم دونوں کے حسن اور جوانی میں علاقائی فرق تھا۔ ساحل نے پروڈانے والے انداز میں کہا۔

"یہ شیطان ریاں بھی پہنچ گئے!"

اس کی بڑا بہت میں خوف سے زیادہ جھنجھلاہٹ مثال تھی۔ ممتاز نے ساحل سے پوچھا۔

"کیا تم ان لوگوں کو جانتی ہو؟"

ساحل نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ممتاز نے گروں موڑ کر ٹیوٹا ہائی کس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر میری آنکھیں کوئی دھوکا نہیں کھا رہیں تو اس گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ وڈیرا اکبر سومو بیٹھا ہے۔"

ممتاز کے چہلے نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا "تم وڈیرے کو کیسے جانتی ہو؟"

"اکبر سومو عمر کوٹ کے ایک دور افتادہ علاقے میں رہتا ہے۔" ممتاز نے بتایا "وہ خاصا معروف اور طاقتور وڈیرا ہے۔ بابا کی طویل عرصے سے اس سے دشمنی چل رہی ہے۔ میں اپنے دشمن کو نہیں پہچانوں گی تو پھر کسے پہچانوں گی؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا "لیکن اس گاڑی کا ڈرائیور مجھے اس علاقے کا نہیں لگتا۔ پتا نہیں ہے۔"

شخص کون ہے اور وڈیرے کے ساتھ کیوں نظر آ رہا ہے؟

ساحل نے جلدی سے کہا "وہ تارا ہے۔ وہ شخص آج بارے کا مہمان بنا ہوا ہے۔"

ممتاز نے اکبر سومو سے شناسائی ظاہر کر کے میرے ہاتھ پل پکڑی پھر یہ خیال اور بھی سنسنی خیز تھا کہ اکبر سومو نے تارا کے باپ قاضی سلطان کا دیرینہ دشمن بھی تھا۔ اکبر سومو اپنے دشمن کی بیٹی کو ہمارے ساتھ دیکھ کر ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فائرنگ نہیں کریں گے۔

میرے خیالات کو ممتاز کی آواز نے تو بالا کر دیا۔ وہ میری تھی "وہ جان! تم وڈیرے کی گاڑی کو اپنے عقب کی پڑی تیزی سے وہاں سے فرار ہونے ہو۔ اس سے نا ظاہر ہونا ہے کہ وہ تم لوگوں کا بھی دشمن ہے۔ کیا میں دیکھ رہی ہوں؟"

"اکبر سومو سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔" میں نے کہا "ہر گولی اس کے مہمان تارا نامی اس شخص سے ہے جو ہائی کس کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھپتھپا رہا ہے۔" "تم لوگوں کے درمیان کس قسم کا جھگڑا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں ممتاز کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیونکہ اسی متعاقب گاڑی سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ دونوں لڑکیوں ہاتھیں نکل گئیں اور فطری رد عمل کے طور پر وہ نیچے جھک گئیں۔

میں نے بچا رو کو فائرنگ سے بچانے کے لیے تھوڑی تھپتھپائی دکھائی۔ نتیجے میں وہ ڈرا سا لڑکی۔ لڑکیاں ایک بہرپور چال تھیں۔ میں نے اسٹیرنگ وھیل پر گرفت قائم کرتے ہوئے لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دونوں سیٹوں کے درمیان گاڑی کے فرش پر لیٹ جاؤ۔ ایک کر بیٹھ جاؤ۔ گاڑی کو خطرناک جھٹکے بھی لگ سکتے ہیں۔"

ان دونوں نے خاموشی سے میرے احکام کی تعمیل کی۔ میر بخش نے کہا "سائیں! "ساہو" یہاں سے زیادہ دور نہیں جو بھی کرتا ہے اس سے پہلے ہی کرنا ہے۔"

"تم ٹیوٹا ہائی کس کو تعاقب سے روکو۔" میں نے کہا "گاڑی کی رفتار بڑھا کر ان سے دور نکلنے کی کوشش کرنا۔"

"متعاقب خطرناک حد تک رفتار کو بڑھا رہے ہیں۔" میر بخش نے کہا "ہم زیادہ دیر تک ان کی فائرنگ ریٹ سے باہر نہ دے سکتے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں انہیں جلد از جلد

تعاقب سے روکنا ہے۔" "سائیں! "میر بخش سنجیدگی سے بولا "انہیں روکنے کے لیے فائرنگ بہت ضروری ہے۔"

"پروا نہیں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم ہر صورت میں ہونا چاہیے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لڑکیوں کے بہوت باتوں سے ہمیں سامنے دنیا کی کوئی دلیل انہیں قائل نہیں کر سکتی۔ وہ صرف جوتے کی زبان سمجھتے ہیں۔"

میر بخش مسرور لمحے میں بولا "یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں۔ وڈیرا اکبر سومو واقعی ایک بہت بہت بڑا بہت اسی لیے وہ خود کو بھوتار کھاتا ہے۔ اس کو اتنی باتیں اور جوتے پڑنے چاہئیں کہ وہ باتوں کے قائل نہ رہے۔"

میرا اشارہ درحقیقت تارا کی جانب تھا مگر میر بخش اسے اپنے دل کی بات سمجھتے ہوئے وڈیرے کی طرف لے گیا۔ میں نے کہا "کس کے قائل نہ رہے؟ باتیں کرنے کے یا باتیں سننے کے؟"

"دونوں کے" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ میں نے کہا "میں نے خون خرابے سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کر لی مگر یہ حرامی خون تارا اپنی تمام تر خرابیوں کے ساتھ ہمارے تعاقب میں لگا ہوا ہے اس لیے اب خون خرابا تو ہوگا اور بہت ٹھیک تھا کہ ہوگا۔"

میرا اشارہ پھر میر بخش نے اپنے جسم کو مخصوص زاویے پر موڑا اور کلا شکوف کو اپنی سائیڈ والی کھڑکی سے تھوڑا باہر نکال لیا مگر ٹریڈر کے فی نوٹ نہ آئی۔ اسی وقت بچا رو کا عقبی شیشہ ایک چھٹکے بلکہ دھماکے سے چٹنا چور ہو گیا۔ جدید محفوظ شیشے بڑے مفرد انداز میں ٹوٹے ہیں۔ میر بخش کی "حرکت" کو یقینی طور پر متعاقب گاڑی کے گن بردار شخص نے نوٹ کر لیا تھا۔ اس کی کلا شکوف سے نکلنے والی پشیم کو لیاں ضائع ہو گئیں۔ تاہم ایک آدھ بچا رو کی باڈی کے عقبی حصے پر ضرور لگی تھی جس کی وجہ سے وہ شیشہ اب اپنا وجود بھونچکا تھا۔

اس فائرنگ پر دونوں لڑکیاں پھرچیں انہیں۔ تاہم انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور ریٹوں کے درمیان دیکھی بیٹھی رہیں۔ ان کا چپٹا ایک بے ساختہ عمل تھا اور اپنی جگہ پر رہتے رہتے ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے حالات کی سنگینی کو خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کی صورت حالات کا مقابلہ اور سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھیں۔



میر بخش نے اس موقع پر ذرا بھی سستی نہیں دکھائی۔ کھڑکی سے باہر نکلی ہوئی کلاشکوف سے اس نے متعاقب نوپوتا ہائی کس پر فائزنگ کر دی۔ اس نے نیتا نشانہ تو وزیرے کو بنایا تھا لیکن وہ ایک متحرک ٹارگٹ تھا۔ آرا گاڑی کو دائیں بائیں لراتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے وہ فائزنگ سے محفوظ رہے تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ان کی گاڑی کی رفتار قدرے کم ہو گئی جس کی وجہ سے ہمارا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے لراتے ہوئے اس مختصر سی سڑک پر رواں دواں تھیں۔ ریلوے کراسنگ پر پہنچنے سے قبل ریلوے ٹریک، سڑک کی دائیں جانب ساتھ ساتھ متوازی چل رہا تھا۔ کراسنگ کے بعد یہی سڑک کی بائیں جانب آگئی تھی۔ تاہم اب وہ متوازی نہیں رہی تھی بلکہ بتدریج سڑک اور ریلوے ٹریک میں فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میر بخش کی زبان مجھے معلوم ہوا کہ ”سامارو“ کے بعد وہ پھر متوازی ہو جائیں گی اور ”کزی“ کے مقام پر انہیں آپس میں مل جانا تھا۔

پجوارو کا عقبی شیش ٹوٹنے کے باعث وہاں ایک وسیع خلا نمودار ہو چکا تھا جس کی وجہ سے ہم زیادہ غیر محفوظ ہو گئے۔ میر بخش نے اس خلا کے پار نوپوتا ہائی کس کو نشانہ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”سائیں! یہ تعاقب اگر اسی طرح جاری رہا تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔“ اس کے لیے سے تشویش عیاں تھی۔ میں نے کہا ”میں بھی اس ”کارپیزنگ“ کے حق میں نہیں ہوں۔ پجوارو کے پیچھے حصے میں پیٹرول سے بھرے دو چھوٹے ٹین موجود ہیں۔ دس لیٹر پیٹرول کا یہ تھا سا ذخیرہ ہمارے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتا ہے۔ اس ہائی اوئیل ٹین کیسولین کو کوئی گولی چھو کر بھی گر گئی تو یہ گاڑی آگ کا گولا بن جائے گی پھر ہم میں سے کسی کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہو سائیں۔“ میر بخش نے ایک جھڑکھری لیتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!“

”میں نے ایسی کون سی بات سمجھی کی بات کر دی ہے میر بخش؟“

”میں آپ کی بات نہیں کر رہا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ میں نے ڈرائیوگ پر باہر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا ”پھر تم کس کی بات کر رہے ہو۔ کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟“

”سائیں! میں پجوارو میں موجود پیٹرول والے چھوٹے کینز کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پجوارو ایک ڈیزل گاڑی ہے۔ اس کے عقب میں ڈیزل والا کین اپنے مخصوص اسٹینڈ میں موجود ہے۔ دوسری جانب فاضل اسٹینڈ بھی اپنی جگہ پر سست ہے۔ یہ دونوں چھوٹے کین پجوارو کا فیول نہیں ہو سکتے پھر انہیں گاڑی میں کیوں رکھا گیا؟“

میر بخش کی الجھن بجا تھی۔ پجوارو واقعی ڈیزل سے چلتی تھی۔ میرا دھیان پہلے اس طرف نہیں گیا تھا اور گاڑی میں موجود وہ دونوں کین دیکھ کر مجھے اطمینان سامحوس ہوا تھا کہ چلو ہمارے پاس فاضل ایندھن تو ہے۔ بہر حال یہ فیول پجوارو میں استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے میر بخش سے کہا ”تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ پیٹرول والے چھوٹے کین پجوارو میں کیوں رکھے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ فی الوقت ہمیں جلد از جلد ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔“

”اوکے سائیں!“ میر بخش گہری سنجیدگی سے بولا ”آپ پجوارو کی رفتار کو تھوڑا کم کر کے ان کی گاڑی کو فائزنگ ریخ میں لاؤ۔ میں نوپوتا ہائی کس کے ٹائروں کو نشانہ بناتا ہوں۔“ میں نے کہا ”نوپوتا ہائی کس کو فائزنگ ریخ میں لانے کا مطلب یہ ہو گا کہ پجوارو بھی فائزنگ ریخ میں آجائے گی۔ تمہارے ہاتھ میں کلاشکوف ہے تو دوسری طرف بھی کلاشکوف بردار موجود ہے۔ جب دونوں گاڑیوں سے فائزنگ کی جائے گی تو نقصان بھی یقیناً دو طرفہ ہوگا۔“

”یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا سائیں۔“ میں نے کہا ”پجوارو کی پشت پر ڈیزل والا کین بھی بندھا ہوا ہے۔ ابھی تک وہ فائزنگ سے محفوظ رہا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ آئندہ بھی محفوظ رہے گا۔“

”گولی لٹنے سے ڈیزل آگ نہیں پکڑے گا۔“ میر بخش نے گہمیر لیے میں کہا ”اگر پجوارو والا کین پھٹ گیا تو نوپوتائے لیے مصیبت بن جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں، کین کو فائزنگ کی زد میں ضرور آنا چاہیے۔“

میں میر بخش کی بات کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ پجوارو کی پشت پر بندھے ہوئے ڈیزل کین میں اگر فائزنگ سے سوراخ ہو جائے تو سارا ڈیزل سڑک پر بہہ جاتا جس کے سبب نوپوتا ہائی کس کے ڈرائیو تارا کو عمارت میں ملکہ حقیقتاً دن میں تارے نظر آجاتے۔ وہ جس رفتار سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، پکینی سڑک کے باعث اس کا اقلتیا کم از کم

میں نے پجوارو کے عقبی حصے میں ”روپوش“ دونوں ٹین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تم کسی بھی صورت وہاں سے باہر نکلنے یا سر اٹھانے کی کوشش نہیں کرو کی ورنہ پچھلے ہڈی سے آنے والی گولیوں کی بوجھار تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گی۔“

”ہم تمہارے حکم کا انتظار کریں گے۔“ ساحل نے منہ پوٹے میں کہا ”تم لوگ جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کر گزرو۔“ ساحل کی آواز میں بلا کا عزم موجود تھا۔ اس بات نے مجھے بہت سکون بخشا۔ میں اس سے ایسی ہی بہادری اور جرات کی توقع کر رہا تھا۔ وہ میری توقع پر پوری اتر رہی تھی۔ ممتاز نے کہا ”وہ جان! آنا اگر تمہارا دشمن ہے تو ڈیرا اکبر ہمارا دشمن ہے گویا وہ دونوں اجتماعی طور پر ہمارے دشمن ہیں۔ اس معرکہ میں میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم نے ڈاکوؤں کے چنگل میں اتنے دن گزار کر بہت بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔“ میں نے کہا ”فی الحال تم آرام کرو۔ ویسے بھی وزیرے کو ابھی یہ بات معلوم نہیں کہ تم ہماری ہم سفر بنی ہوئی ہو۔“

پھر میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا ”میں ایک دو تین گئے ہوئے اچانک پجوارو کی رفتار کم کروں گا۔ اسی مرحلے پر نوپوتا ہائی کس کے سامنے والے ٹائروں پر فائزنگ کرنا۔“ اس نے اثبات میں گردن کو جھکا دیا۔ وہ اس وقت بے انتہا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

جب میں نے پہلے پہل نوپوتا ہائی کس کو اسے تعاقب کی ہڈی دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ ڈرائیوگ ٹین کی بجٹ پر کوئی گمن نصب ہے لیکن ازاں بعد نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ وہ گمن ایک کلاشکوف تھی جو نصب نہیں تھی بلکہ ڈرائیو کے محافظ نے اسے ہاتھوں میں تھام کر ٹین کی پشت پر لگا رکھا تھا۔ میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ ”نوپوتا ہائی کس“ عام طور پر میاں ”پولیس موپائل“ کی صورت میں استعمال ہوتی ہے یا پھر بار برداری کے لیے۔ عموماً پاڑے اسلحہ کے ذریعہ ڈھونڈنے کے لیے اس گاڑی کو استعمال کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بار برداری کے لیے اسے پہنچنے سے پہلے چھوڑ دیا جاتا ہے جبکہ ”موپائل“ کی موت میں اس حصے پر پڈ لگا کر اندر دو طرفہ نشتریں پھینکنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی پیشانی پر سرخ اور نیلی چوٹے لگائے جاتے ہیں۔ ہمارا اتنا قبائلی نہیں تھا۔ اس کا تعلق کسی بھی طور پر نہیں سے نہیں تھا۔

میں نے تین تک متقی گننے کے بعد اچانک پجوارو کی اسپید کم کر دی۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے گاڑی کو سڑک پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا انداز میں نکال لیا تھا۔ میر بخش نے اس موقع پر نہایت ہی پھرتی سے متعاقب گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے فائزنگ کی۔ دوسری جانب سے جوابی فائزنگ کی گئی۔ یہ فائزنگ ہمارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ گاڑی خوفناک انداز میں لہرائی۔

یعنی طور پر پجوارو کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ اچھلتی کودتی سرکش گاڑی کو میں نے بڑی مہارت سے کنٹرول کیا۔ ٹائر پھینکنے سے ایک زوردار دھماکا ہوا تھا جس نے گاڑی میں موجود دونوں ٹیڑیوں کو ایک مرتبہ پھر پھینکنے پر مجبور کر دیا۔ گاڑی کو مزید آگے بڑھانا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے بدقت تمام اسے کچے میں ایک طرف روک لیا۔

اسی وقت میر بخش کی خوشی سے معمور آواز میری سماعت سے لگرائی ”سائیں! ابھی ہوا جس کا امکان تھا۔“

”اس میں ایسی خوشی والی کون سی بات ہے؟“ میں نے گردن گھما کر عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میر بخش کے جواب دینے سے پہلے ہی میں اس کی خوشی کی وجہ جان گیا۔ اسی وقت نوپوتا ہائی کس کے بریک چرچرائے میں نے دیکھا، وہ سڑک پر دور تک پھسلتی چلی جا رہی تھی اور اس خطرناک پھسلن کا سبب وہ آئل تھا جو سڑک پر جا بجا پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے دشمنوں کی فائزنگ سے پجوارو کے پیچھے فٹ ڈیزل والا کین پھٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی حالات بالکل اس کے مطابق پیش آئے تھے۔

میں حیرت اور استعجاب سے پھسلتی ہوئی نوپوتا ہائی کس کو دیکھنے لگا۔ وہ سڑک پر رکتے ہوئے ہم سے تھوڑی آگے نکل گئی مگر اس کی اسپید اتنی زیادہ تھی کہ سنبھلنے کے بجائے وہ الٹ گئی۔ اب وہ بھی پجوارو کی طرح کچے میں اتر آئی تھی لیکن پجوارو کے بالکل الٹی پڑی تھی۔

وہ بڑے نازک ٹکڑے تھے۔ اس وقت سوچ بچار نہیں بلکہ عمل کی ضرورت تھی۔ دشمنوں کے سنبھلنے سے پہلے ہمیں ان کے سر پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے ساحل اور ممتاز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ہم باہر جا رہے ہیں۔ تم دونوں گاڑی میں رہو گی اور اس طرح رہو گی کہ باہر سے نظر نہیں آؤ گی۔ سمجھ گئیں؟“ ممتاز خاموش رہی۔ تاہم ساحل نے کہا ”وہ جان! میں جہنم کے ساتھ آتی ہوں۔“

”نہیں، تم وہیں زیادہ محفوظ ہو۔“

”میرے پاس بھی ریو اور ہے۔“ وہ اصرار کرنے لگی

”ضرورت پڑنے پر میں اسے استعمال کر سکتی ہوں۔“

میں نے کہا ”یہ ضرورت یہاں پجوار کے اندر بھی

سامنے آ سکتی ہے۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن میں نے

حتیٰ انداز میں اسے خاموش کر دیا ”میں جو کہہ رہا ہوں، بس

اس پر عمل کرو۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گی تو ہماری مشکلات میں

اضافہ ہو جائے گا۔“

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔ میں میربخش کے ساتھ

پجوار سے باہر نکل آیا۔ کلا شکوفہ بدستور اس کے ہاتھ میں

تھی مگر میں جانتا تھا اس ہتھیار میں بہت کم گولیاں باقی ہوں

گی۔ جو ریو اور ساحل کے قبضے میں تھا وہ مرئی ڈی ایس کی کا

تھا۔ یہ اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ایک شان دار امپورنڈ

ریو اور تھا جس کی دو گولیاں میں بیٹھنے سے نکلنے ہوئے، جب کو

بیکار کرنے میں استعمال کر چکا تھا۔ باقی چار گولیاں اس وقت

بھی ریو اور کے قبضہ میں موجود تھیں۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے الٹی ہوئی ٹیوٹا ہائی کس کے

قریب پہنچ گئے۔ وہاں کی صورتِ حالات خاصی ڈرگروں تھی۔

گن بردار محافظ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا،

وہ اپنی گن سمیت اس وقت گاڑی کے نیچے دب ہو گا۔ میں نے

جھک کر ڈرائیونگ کبین کا جائزہ لیا۔ وڈیرا اکبر سومو اور

تارا اپنی نشستوں پر موجود تھے۔ تاہم وہ گاڑی میں بری طرح

بھنس گئے تھے۔ وہ کسی مدد کے بغیر وہاں سے باہر نہیں آ سکتے

تھے۔ وہ زندہ تھے مگر بہت مصیبت میں دکھائی دیتے تھے۔

میربخش نے کہا ”سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں فوراً

آگے بڑھ جانا چاہیے۔“

”ہم آگے بڑھیں گے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

”لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔“

”کون سا ضروری کام سائیں؟“

”ٹیوٹا ہائی کس کو سیدھا کرنا ہے۔“

”ممممم مگر یہ تو ہمارے دشمنوں کی گاڑی ہے!“ وہ حیرت

سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا ”میں جانتا ہوں۔ یہ دشمنوں

کی گاڑی ہے اسی لیے اسے سیدھا کرنا چاہتا ہوں۔ میں دوستی

اور دشمنی میں ایک سلیقے کا قائل ہوں۔“

”آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں سائیں؟“

”آجائیں گی، گاڑی سیدھی ہونے کے بعد۔“ میں نے

فومعنی انداز میں کہا ”جب تک ٹیوٹا ہائی کس الٹی رہے گی،

تمہاری کھوپڑی بھی اوندھی ہی رہے گی۔“

میربخش کی آنکھوں میں الجھن بکھوڑے سے رہی تھی۔

وہ لکت زدہ لہجے میں بولا ”سائیں! لگے۔ کیا۔ آپ

واقعی۔؟“

”ہاں میں واقعی۔“ میں نے سر کو ایٹاقی جنبش دی ”اور

اس کام میں ہمیں ایک لمحہ بھی خالص نہیں کرنا چاہیے۔“

وہ فکرمند ہو گیا ”مگر سائیں! ہم دو افراد اپنی بھاری

گاڑی کو کس طرح سیدھا کریں گے!“

میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا ”دو نہیں، صرف

ایک فرد۔“

وہ مزید حیران ہو گیا اور وحشت زدہ نظر سے مجھے نکلے

لگا۔

میں نے گہیر لہجے میں کہا ”میربخش! تم جا کر پجوار کا

پچھلا پتہ تبدیل کرو۔ گاڑی کے عقب میں فاضل الٹینی

موجود ہے۔ میں ٹیوٹا ہائی کس کو دیکھتا ہوں۔“

میربخش کی حالت اس وقت دیوانوں ایسی ہو رہی تھی۔

وہ میرے حکم کی تعمیل میں وہاں سے جانا بھی چاہتا تھا اور میری

کارروائی دیکھنے کے لیے وہاں رکتا بھی چاہتا تھا۔ اس کا ذہن

یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ میں تن تنہا اس گاڑی کو سیدھا

کروں گا۔

میں نے میربخش کی طرف دیکھے بغیر تحکمانہ انداز میں کہا

”ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم جلدی سے پجوار کو سٹر

کے قائل بنا دو اور اس سے پہلے سڑک پر موجود آئل کو ریت

سے ڈھک دو تاکہ کوئی اور گاڑی اس طرح پھسل کر تباہی کے

دبانے پر نہ پہنچ جائے۔“

یہ ایک اتفاق تھا اور خاصا سودمند اتفاق تھا کہ ابھی

تک ہمارے سوا وہاں سے کوئی اور گاڑی نہیں گزری تھی۔

ایک تو وہ صبح کا وقت تھا، دوسرے۔ وہ سڑک بھی کچھ زیادہ

مصروف نہیں لگتی تھی۔ اس وقت ہم ریلوے کراسنگ اور

سامرو کے درمیان تھے۔

میربخش کو احکام دینے کے بعد میں ”حتیٰ“ ہائی کس کی

جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنی بھاری گاڑی کھسکی کہ میں اپنی

جسمانی قوت صرف کر کے اسے سیدھا نہیں کر سکتا تھا چنانچہ

اس نازک موقع پر میں نے ”چی“ کی قوت کو آزمائے کا فیصلہ

کیا۔

میربخش کی طرح ممکن ہے، اور بھی بہت سے افراد یہ

سوچ رہے ہوں کہ میں دشمنوں کی مصیبت کو رفع کرنے میں

میں نے رہا تھا۔ مجھے بچ نکلنے کا ایک اچھا موقع میسر

ہو گیا۔ اس موقع سے مجھ پر فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ کسی

سوچ بڑھایا یا بندی نہیں لگائی جا سکتی۔ تارا میرا اور اکبر

میربخش کا دشمن تھا۔ وڈیرے کا گاڑی چونکہ اپنے مالک

میربخش کا بند تھا اس لیے وہ بھی ہمارے دشمنوں ہی میں شمار

ہوتا۔ اگر میں انہیں موجودہ مصیبت سے نجات دلانا چاہتا

تو یہ بھی ان پر میرا ایک کاری دار ہی تھا۔ مصیبت زدہ

نہیں برا احسان کرنا اسے بھری محفل میں سو جوتے مارنے سے

بہت زیادہ موثر ہوتا ہے۔

دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔

میں نے ٹیوٹا ہائی کس کے پہلو میں آگیا۔ میں نے دونوں بازو

میں سے ہٹا کر اپنے ہاتھ گاڑی کی باڈی پر نکال دیے اور

پہلے کسی کے مرکز پر مرکوز کر دیا۔ کئی سال پہلے کسی

آتش دان نے ہماری سے بھاری چیز کو اٹھانے کے لیے

بے فاصلہ بنایا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر اسے دنیا سے

ہٹا کر ہونے کی کوئی جگہ دے دی جائے اور ایسی ایک

مضبوط سلاح سپاہی کے جانے جو اس کڑا ریش کا بوجھ سہار سکتی

ہو تو دنیا کو اس سلاح پر اٹھا سکتا ہے! ایک مضبوط فلکرم کی

دست۔

اس سائنس دان کے پیش کردہ ”قوت“ وزن اور

ثقل کے فارمولے کو آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا۔

ٹیوٹا ہائی کس کو ”چی“ کی قوت کی مدد سے سیدھا کرنا

ہوتا تھا۔ ”چی“ کے استعمال کے لیے کسی سلاح یا فلکرم کی

قوت پیش نہیں آتی بلکہ اس کے لیے بنیادی طور پر صرف

فیکٹری اہم ہیں۔ آپ کا رٹاکا توجہ اور مرکز توجہ!

میں نے ٹیوٹا ہائی کس کے مرکز پر اپنی توجہ مرکوز کرتے

ساتھ دونوں ہاتھوں کے پیش سے سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

اسے ذہن کا روشن حصہ کسی چیز کے مانند توانائی فراہم

کے سنگ۔ یہ میری پختہ سوچ کی توانائی تھی جو میرے بازوؤں

پر ہوتے ہوئے ہاتھوں کے راستے گاڑی میں منتقل ہو رہی

تھی۔ ”چی“ کی قوت عملی طور پر اسی طرح کام کرتی ہے۔ اس

توجہ میرے دونوں بازوؤں کی کار لکھنے کے انداز میں مصروف

تھی۔ چنانچہ تاحات بعد گاڑی زمین سے اٹھنے لگی۔ میری جانب

ساتھ دونوں پیسے رفتہ رفتہ فضا میں بلند ہونے لگے۔ میں نے

توجہ کا عمل جاری رکھا اور گاڑی کو پہلو کے بل تقریباً

تین حالت میں کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سائنس

کا کرتے ہوئے پہلے سے پیش کے ساتھ گاڑی کو دو سرے

نہر کھیل دیا۔

ٹیوٹا ہائی کس نے ایک دو لمبے پھٹکے پھٹکے کھائے اور

اپنے ”قدموں“ پر کھڑی ہو گئی۔ گاڑی کے ڈرائیونگ کبین

میں موجود تارا اور اکبر سومو ”آپ سائڈ ڈاؤن“ کی حالت

سے واپس ”آپ سائڈ“ کی حالت میں آ گئے۔

میں ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وڈیرے کے

محافظ کی جانب بڑھا۔ گاڑی اٹھنے کے باعث وہ بری طرح نیچے

دب گیا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر بغیر جائزہ لیا۔ گن

ابھی تک اس کے ہاتھوں میں موجود تھی تاہم وہ چاروں

خانے حت بے حس و حرکت پڑا تھا۔ سائنس کی آمدورفت

جاننے کے لیے میں اس پر جھک گیا اور ایک جھپٹے میں مجھے

معلوم ہو گیا، اس کی سائنس پوری ہو چکی تھیں۔

اسی وقت میں اپنے عقب میں کسی کو موجود پا کر سیدھا

کھڑا ہو گیا۔ میں نے بڑی سرعت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ میربخش

تھا۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی اس نے کہا۔

”گتا ہے، یہ مانو ٹیگا کام سے۔“

”تمہارا انداز درست ہے۔“ میں نے تصدیق کر دی

”یہ اپنی آخری سانس گاڑی کے نیچے دبے دبے چکا۔“

یوں جھنجھو، دنیا کے غم و فکر سے آزاد ہو گیا۔“

”سائیں! آپ نے اس گاڑی کو؟“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے میربخش کو مزید بولنے

سے روک دیا۔ وہ یقیناً یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ٹیوٹا کو

کس طرح سیدھا کر لیا تھا۔ اس قسم کی حیرانی آمیز اور خوب

خیر باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا

”میں نے نہیں پجوار کا ناز تبدیل کرنے کو کہا تھا اور تم ابھی

تک یہیں نظر آ رہے ہو؟“

وہ پجوار کی جانب بڑھنے لگا تو میں نے گاڑی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ گن تم اپنے قبضے میں کرلو۔“

میربخش گاڑی کے ہاتھ سے گن نکالنے کے لیے آگے

بڑھا پھر چونک کر میرے عقب میں دیکھنے لگا اس سے پہلے کہ

میں اس کی چوکی ہوئی نگاہ کا مطلب سمجھ پاؤں، اس نے ایک

زوردار مدھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔

میں ریتیلی زمین سے ٹکرایا ہی تھا کہ فضا فائز کی آواز

سے گونج اٹھی۔ میربخش نے اس نازک موقع پر نہایت عقل

مندی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے دھکا دیتے ہوئے وہ خود بھی زمین پر

لیٹ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اس گولی کی زد میں آنے سے

محفوظ رہے۔

وہ گولی یقینی طور پر ہمارے دشمنوں کی جانب سے چلائی

گئی تھی۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے کئی آنکھوں سے ٹیوٹا کی

نے خود کو پوشیدہ کر رکھا ہے۔ پتا نہیں، تم کون سی دوسری لڑکی کا ذکر کر رہے ہو!

وڈیرا اکبر سومرو بے یقینی سے بچاؤ کی جانب دیکھنے لگا۔ جب اسے وہاں کچھ دکھائی نہ دیا تو انجمن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم ہمیں پکڑ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے بچاؤ کے پچھلے حصے میں دو لڑکیوں کو دیکھا ہے۔ تم مجھے جھٹلا نہیں سکتے۔ میرے سر میں کوئی چوٹ بھی نہیں لگی اور میری نظر بھی سلامت ہے۔“

میربخش وڈیرے کی جانب سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا اس نے اکبر سومرو کی جانب دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں کہا ”سائیں! تمہاری نظر تو بیشہ سے خراب رہی ہے۔ ایسا کون ہے جس کی بس بٹی یا بسو تمہاری اس نظر سے محفوظ رہی ہو؟“

اپنے سابق ادنیٰ سے جا کر کا یہ انداز گفتگو وڈیرے کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ میربخش کو نفرت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ”کتے! تم ذرا بچکے پر تو پہنچو۔ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔“

بات ختم کرتے ہی وڈیرے نے کلاشکوف کا رخ میربخش کی طرف کر دیا۔ تارا مجھے پشیل کے نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اعصاب شکن لمحات تھے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں مسلح افراد میرے حملے کی رنج سے باہر تھے۔ اگر میں انہیں اتوں میں لگا دیتا تو ”کارروائی“ کے لیے کوئی مناسب موقع نکل سکتا تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ تارا مجھے جان سے مارنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا البتہ وڈیرے سے کچھ بعید نہیں تھا۔ میربخش نے اس سے غداری کر کے اس کے غیظ و غضب کو بری طرح لٹکا دیا تھا۔

وڈیرے کے حافظہ کی لاش ہم سے ٹھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔ میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اکبر سومرو! تمہارا یہ جان نثار حرام موت برا ہے جس طرح ڈی ایس بی کے بچکے پر تمہارے کین ساٹھی سیکورٹی گارڈز کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ تم یہ پے درپے نقصانات کب تک اٹھاتے رہو گے؟“

”یہ تمام نقصانات میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائے ہیں۔“ وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا ”تم نے ڈی ایس بی کے بچکے پر میری ایک جپ کو بھی بیکار کر دیا تھا لیکن فکر نہ کرو“ میں نے تمہارا بہت خوب صورت بندوبست کر دیا ہے۔“

لفظ ”بندوبست“ پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔ میں نے

اسے آمادہ گفتگو دیکھا تو آہستہ آہستہ گھستا شروع کر دیا۔ میں درحقیقت کسی سنہری موقع کی تاک میں تھا جب میں وہاں کی بازی کو پلیٹ سکتا۔

میں نے وڈیرے کی جانب دیکھتے ہوئے مصیبت سے پوچھا ”تم نے میرے لیے کون سا خوب صورت بندوبست کیا ہے؟“

وہ فخریہ انداز میں بولا ”میں نے بچکے والی کمائی کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ تم جب بچکے سے نکل رہے تھے تو ڈی ایس بی کے گاڑی گارڈ کو ہوش آگیا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے کلاشکوف تان کر انکوائری شروع کرتا، ہم نے اسے گیٹ پر متعین گاڑز کے پاس دوسرے جہان میں پہنچا دیا۔“

”اور اس سے پہلے تم لوگوں نے دو سادہ پوش گریلو ملازموں کو ڈی ایس بی کے ڈرائیور سمیت فٹا کے لمحات اتار دیا تھا۔“ میں نے چہیتے ہوئے لہجے میں کہا ”گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈز بھی تمہاری فائرنگ کا نشانہ بنے تھے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تم غلط نہیں کہہ رہے۔“ اس نے تائید کی ”مگر تمہاری اس درست بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”میری تو مزے کی بات ہے بچے۔“ وہ معنی خیز انداز میں زیر لب مسکرایا ”میں نے تمہیں بتایا ہے نا میں نے تمہارے وہاں سے نکلنے ہی بچکے والی کمائی کو الٹا کر رکھ دیا ہے۔“

میں نے اسے باتوں میں لگانے کی خاطر پوچھا ”میں مجھ نہیں سکا ہوں، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”اور اس لیے بھی بتاؤں گا کہ اب بہت جلد تم پولیس کی تحویل میں جانے والے ہو پھر تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی بالی زندگی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے گی۔ کیا سمجھے؟“

”وہ کس خوشی میں بھئی؟“

”خوشی میں نہیں بلکہ جرم میں۔ جرم بھی نہیں بلکہ جرائم میں!“ وہ ایک مرتبہ پھر معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ”میں نے اور میرے ساتھیوں نے ایسے کون سے جرائم کیے ہیں جو ہمیں جیل کی ہوا کھانا پڑے گی؟“

وڈیرا اکبر سومرو ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا ”تم نہایت ہی مشکوک اور خطرناک بندے ہو۔ تم اپنی ساتھی دھوکے ہمراہ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے بڑی ملک ہجارت سے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ تم پر بھارتی ایجنٹ ہونا

آتش فشانی حصہ 7

رہ دیکھا۔ اس کا ڈرائیونگ سائڈ والا دروازہ کھلا تھا اور ہاتھ آ کر کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے جہاز کی جھلک نے صورتِ حالات کو مجھ پر واضح کر دیا۔ اب نہایت ہی سمجھ گیا کہ میربخش نے مجھے دھکا نہیں دیا تھا۔ اس نے یقیناً تارا کو پستول بدست گاڑی سے نکلنے دیا تھا۔

وہ بہت ہی خطرناک لمحات تھے۔ میربخش اپنی کلاشکوف کو پکار میں جھوڑا تھا اور وڈیرے کے گاڑی والی گن اب ہم سے کافی دور پر تھی۔ میربخش نے گاڑی والی گن کی جانب پشیمانی رفت ”کی تو اسی لمحے تارا کے پستول نے ایک اور گولی

مال دی۔“

یہ ایک تنہیسی فائر تھا۔ وہ محض میربخش کو کلاشکوف کی بائیں بازو سے روکنا چاہتا تھا۔ اس کو شش میں وہ کامیاب رہا۔ اس دوران میں وہ تیزی سے چلتے ہوئے ہمارے سروں پر پہنچا پھر اس کی زہریلی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔

”تم خود کو بہت جالاک سمجھتے ہو نا۔ لو دیکھ لو، تمہاری پالائی کسی کام نہیں آئی۔ میں نے بالآخر تمہیں چھاپ ہی لیا۔ تم کیا سمجھتے تھے، مجھے غیادے کر غائب ہو جاؤ گے؟“

میں نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا ”میں تو اس وقت صرف کچھ رہا ہوں کہ تمہاری اصل میں کوئی فرق ہے ورنہ توڑی دیر پہلے میں نے تمہیں جس عذاب سے نجات دلائی ہے اس کے پیش نظر تمہیں اور تمہارے میزبان کو راہ راست پر آجانا چاہیے تھا مگر تم خود کو نطفہ ناقص قرار دیتے ہوئے کہنے پر تے ہوئے ہو۔“

”زیادہ ”بک بک“ نہ کرو اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

اس نے پشیل کو ہوا میں لہراتے ہوئے حکیمانہ انداز میں کہا ”اور تم بھی وجدان کے گچھے!“ اس نے میربخش کی جانب اشارہ کیا۔

ہم دونوں نے اس کی فرمائش پر عمل کیا اور اس کے سامنے ”ہنڈ زاپ“ ہو گئے۔

وہ پشیل تھا۔ ہم سے محفوظ فاصلے پر تھا۔ کسی قسم کی ہتھیاری کارروائی اس پر کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ میربخش نے پہلے انداز میں کہا۔

”سائیں! میں نے کہا تھا نا دشمن کسی رحم کے قابل نہیں ہوتا۔ آپ نے ان دونوں کی جان بچا کر اچھا نہیں کیا۔“

دونوں کے ذکر پر مجھے وڈیرے کا خیال آیا۔ میں نے اپنی جانب دیکھا۔ یہ وہی لمحہ تھا جب وڈیرے گاڑی سے باہر نکلے تھا۔ اس نے یقیناً میربخش کی بات سن لی تھی۔ وہ تیزی

آتش فشانی حصہ 7

نے ہماری جانب بڑھتے ہوئے خون خوار لہجے میں بولا۔

”نمک حرام! تمہیں دوستی اور دشمنی کا مطلب تو میں سمجھاؤں گا۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے گاڑی والی کلاشکوف پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے لیے صورتِ احوال مزید سنگین ہو گئی۔ وڈیرے کے چہرے پر تو نہایت ہی خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

وڈیرا اکبر سومرو کی عمر بچپن کے قریب تھی۔ وہ سندھ کے روایتی وڈیروں کے لباس میں تھا۔ وہ دونوں خاصے خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ دونوں کی چال ڈھال اور لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ اس حادثے میں وہ بیکس محفوظ رہے تھے۔ تارا کے سر پر پٹی بدست موجود تھی۔ یہ عمر کوٹ کے ہوٹل میں ہمارے درمیان ہونے والے معرکے کی یادگار تھی۔

وڈیرا اکبر سومرو نے بچاؤ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا ”لڑکیاں نظر نہیں آ رہیں۔ وہ کہاں ہیں؟“

”لڑکیاں!“ وڈیرے کے انکشاف نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ تاہم میں نے صورتِ حالات کو سنبھالتے ہوئے کہا ”تم کون سی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو؟“

”وہی لڑکیاں جو تھوڑی دیر پہلے بچاؤ میں موجود تھیں!“ تارا نے طنزیہ انداز میں کہا ”ہم نے ریلوے کراسنگ سے گزرتے ہی انہیں بچاؤ میں دیکھ لیا تھا۔ ان میں ایک تو تمہاری ساتھی دھوکے (ساحل) تھی۔ دوسری میرے لیے ابھی ہے۔ تم نے اسے کہاں سے اڑایا ہے اور وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟“

ممتاز نے مجھے بتایا تھا وہ اکبر سومرو کو اچھی طرح جانتی تھی لیکن وڈیرے نے اس کے حوالے سے خصوصاً کوئی بات نہیں کی۔ بس دو لڑکیوں کا ذکر کر رہا تھا وہ۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا۔ یا تو وہ ممتاز کو صورت سے پہچانتا نہیں تھا یا پھر اس نے بچاؤ میں ممتاز کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ممتاز وڈیرے اکبر سومرو کے دشمن کی بیٹی تھی۔ اگر وڈیرے کو اس کی ممانعت موجودگی کی خبر ہو جاتی تو ہماری مشکلات میں یقیناً اضافہ ہو جاتا۔

میں نے تارا کے طنز کا جواب تمسخرانہ انداز میں دیا ”تارا! لگتا ہے، سر کی چوٹ نے تمہارے دماغ پر گہرا اثر کیا ہے، خاص طور پر تمہاری بصری حس بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ تمہیں ایک کے دو دو نظر آنے لگے ہیں۔ ہمارے ساتھ صرف ساحل تھی۔ تم لوگوں کی فائرنگ سے اس کا پاؤں زخمی ہوا ہے۔ وہ بچاؤ کے عقبی حصے میں لیٹی ہے۔ نظر نہیں وہ اس لیے نہیں آ رہی کہ مزید فائرنگ سے بچنے کے لیے اس

آتش فشانی حصہ 7

لے گیا تھا ورنہ ہم قابل گرفت نہیں تھے۔  
 ”یہ تمام باتیں اب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔“ ڈویرے  
 نے تیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ”مٹی کمانی تمہاری سوچ  
 اور خیال سے بالکل مختلف ہے۔“  
 اس کے پر اسرار انداز نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر  
 مجبور کر دیا۔ میں نے پیشانی پر پریشانی کے تاثرات سجاے  
 ہوئے سوال کیا ”اور وہ مٹی کمانی کیا ہے؟“

”مٹی کمانی یہ ہے وجدان!“ تارا نے براہ راست مجھے  
 مخاطب کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”ڈی ایس بی  
 کے بنگلے پر تم نے بہت اودھم مچایا ہے۔ تم نے سب سے پہلے  
 محترم ڈی ایس بی کو بے ہوش کر کے اس کا ریا اور جیمنی پھر  
 کسی طرح اس کے باڈی گارڈ پر قابو پالیا۔ تم جیسے بدنام زمانہ  
 مجرم سے کچھ بھی بعید نہیں۔ تم نے گارڈ کو بے بس کرنے کے  
 بعد قتل کر دیا۔ اس دوران میں تمہارے ساتھی زیریں منزل  
 پر اے ایس آئی عبدالرزاق سے کلا شکوف چھین کر اسے  
 ہاتھ روم میں بند کر رکھے تھے۔ تم بالائی منزل پر موجود ڈی ایس  
 پی کے ڈرائیور اور دو گھریلو ملازموں کو زندہ چھوڑنے کا فخر  
 مول نہیں لے سکتے تھے اس لیے فوراً ان کا کام بھی تمام  
 کر دیا۔ بنگلے سے فرار ہوتے وقت جب گیٹ پر موجود  
 سیکورٹی گارڈ نے تمہیں روکنے کی کوشش کی تو تم نے انہیں  
 گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس فائرنگ کی زد میں ہمارے تین  
 افراد بھی آگئے۔ وہ ڈویرے اسامی کے بہترین ساتھی تھے تم  
 نے ان کی لاشیں گرا دیں اور ہماری چیپ میں وہاں سے فرار  
 ہو گئے۔“

بات ختم کرنے کے بعد تارا نے بڑے فخر سے مجھے  
 دیکھا۔ میرا دماغ چکر اکر رہ گیا۔ ڈویرے نے میری کیفیت سے  
 محظوظ ہوتے ہوئے کہا ”تم ہماری ایک چیپ لے کر فرار  
 ہو گئے اور دوسری چیپ کے پچھلے ٹائروں کو بیکار کر دیا۔ اس  
 کے علاوہ تم نے چیپ کی باڈی پر متعدد گولیاں بھی برسائیں  
 تاکہ ہم تمہارا تعاقب نہ کر سکیں۔“

”مگر یہ تو سب جھوٹ ہے۔“ میں نے احتجاجی انداز میں  
 کہا ”ہم نے کسی ایک فرد کو بھی قتل نہیں کیا۔ بنگلے پر جو  
 ہلاکتیں ہوئیں ان میں سراسر تم لوگوں کا ہاتھ ہے۔“  
 تارا نے طنزیہ لہجے میں کہا ”یہ تو تم کہہ رہے ہو۔“  
 تمہاری بات کا یقین کون کرے گا؟“

”میں جو بھی کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے، صداقت ہے۔“  
 ”تمہارے اس سچ اور صداقت کا کوئی ثبوت نہیں۔“  
 ڈویرے مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا ”بنگلے پر صرف دو

ٹھکانا بہت آسان ہے۔ اس کے بعد تم نے میرے ایک  
 آدمی نواز علی کو صحرائیں قتل کر ڈالا، دوسرے آدمی میر بخش کو  
 ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔“ اس نے نفرت آمیز نظر سے  
 میر بخش کو دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس کمتر  
 کینے کا تو میں جو حشر کروں گا وہ دنیا دیکھے گی۔ نہ صرف دیکھے گی  
 بلکہ کانوں کا ہاتھ بھی لگائے گی۔ کسی کو آئندہ غداری کا حوصلہ  
 نہیں ہو سکے گا۔“

ڈویرے کے چہرے کے عضلات سے اندازہ ہوتا تھا وہ  
 اس وقت شدید غصے میں تھا۔ یہ میرے لیے خاصا سو مند  
 ثابت ہو سکتا تھا۔ میں غصے کی حالت میں اس سے کوئی ایسی  
 غلطی کروانے میں کامیاب ہو سکتا تھا جس سے مجھے ہاتھ پاؤں  
 چلانے کا موقع مل جاتا۔

میں نے براہ راست ڈویرے کی آنکھوں میں دیکھتے  
 ہوئے کہا ”تم میرے بلکہ ہمارے جرائم گنوائے کی کوشش  
 میں مصروف تھے کیا تم نے وہ ارادہ ترک کر دیا ہے؟“  
 وہ میرے طرزِ مخاطب پر تھلا کر رہ گیا۔ تاہم وہ بات کو  
 آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تمہارے جرائم کی کمانی بہت طویل  
 ہے۔ بہر حال۔“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بتانے لگا  
 ”میرے آدمی میر بخش کے ساتھ مل کر تم نے عمر کوٹ میں  
 بد معاشی اور غنڈا گردی کی کئی وارداتیں کیں جن میں کئی  
 افراد زخمی ہوئے۔ اس کے بعد تم میری ہی چوری شدہ بلکہ  
 چھپتی ہوئی گاڑی میں عمر کوٹ سے میر پور خاص کی طرف فرار  
 ہو رہے تھے تو ناکے پر تم لوگ دھڑلے گئے۔ تم پر ڈاکوؤں  
 وغیرہ کا شک کیا گیا۔ اگرچہ تم لوگ ڈاکو نہیں تھے، نہ ہی مفویہ  
 ممتاز سے تمہارا کوئی تعلق تھا مگر تم لوگوں نے اپنی شناخت  
 چھپانے کے لیے نام اور مقامات کے بارے میں متعذر جھوٹ  
 بولے۔ اتنی بھاری تعداد میں جھوٹ وہی لوگ بولتے ہیں جو  
 کسی نہ کسی جرم یا جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔“

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکاوٹ میں نے پوچھا  
 ”پھر۔ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم؟“

”جو بھی ثابت کرنا ہے وہ تو پولیس ہی کرے گی۔“  
 ڈویرے نے تعارت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ”ہم تو  
 صرف تم لوگوں کو ان کے حوالے کریں گے اور تم لوگوں  
 میں یہ غلط اور بد بخت شخص میر بخش شامل نہیں۔“ اس نے  
 باقاعدہ انگلی سے میر بخش کی طرف اشارہ بھی کر دیا ”اس حزام  
 کے ختم کو تو میں اپنے ساتھ بنگلے پر لے جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”میں ڈی ایس پی کے سامنے اپنی بے گناہی  
 ثابت کر دیا ہوں۔ وہ تو رشوت کے چکر میں ہمیں اپنے بنگلے پر

پولیس والے زندہ پئے ہیں یعنی ڈی ایس پی اور اے ایس آئی عبدالرزاق۔ ڈی ایس پی کو ہم ہی ہوش میں لے کر آئے تھے اور اے ایس آئی کو بھی ہم نے ہی زیریں منزل کے ہاتھ روم سے برآمد کیا ہے۔ ہم نے انہیں جو کمائی سائی انہوں نے اس پر یقین کر لیا۔ ڈی ایس پی بڑی سرگرمی سے تمہاری تلاش میں ہے۔ پولیس پر ہتھیار اٹھانا اور انہیں قتل کرنا انتہائی سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ اب تم اپنی پوزیشن کا خودی اندازہ لگاؤ۔“

حالات نے ہمارے خلاف سازش کا ایک ایسا ناپیدہ جال بن دیا تھا جس میں ہم بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔ اگر ہمیں دوبارہ ڈی ایس پی کے حوالے کر دیا جاتا تو پھر ہماری جان چھوٹی شکل ہو جاتی۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے، کوئی ہماری سچائی کا یقین نہ کرے۔ ہمارے لیے بہترین تھا کہ ان جیشوں کے چنگل سے نکل کر آگے بڑھ جاتے مگر کیسے؟ میرا ذہن بڑی تیزی سے اس سوال کا جواب تلاشے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے دُعا اکبر سومو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”کہا آپ لوگ واقعی ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ بات سولہ آنے درست ہے۔“ اس نے قطعیت سے کہا۔

”پھر اس کے مشن کا کیا ہو گا؟“ میں نے تار کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے سوال کیا ”یہ تو مجھے اپنے چوہدری کے قدموں میں ڈالنا چاہتا تھا؟“

تار نے کہا ”میرا مشن ضرور کامیاب ہو گا۔ ڈی ایس پی کے ہنگامے میں نے فون پر چوہدری صاحب سے بات کر لی ہے۔ ہم ایک خاص مقصد کے تحت جنہیں پولیس کے حوالے کریں گے۔ تم پر اتنے سنگین مقدمات ڈال دیے جائیں گے کہ جیل سے باہر کبھی نہیں آسکو گے۔ ویسے بھی چوہدری صاحب نے تمہارا چار یا مریہ تو ڈالنا نہیں۔ وہ صرف تم سے سونے کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ تمہارے باپ نے چوہدری صاحب سے ہماری ایلٹ کا سونا چھین کر کہیں چھپا دیا تھا اور تم اس خفیہ مقام سے واقف ہو۔ چوہدری صاحب کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ ڈی ایس پی نے بھی ان کی بات ہو گئی ہے۔ تم ڈی ایس پی کے چنگل میں پھنسو گے تو ہر راز تمہاری زبان سے اگلو الیا جائے گا۔ ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ تم جاؤ جنم میں۔ پولیس تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں!“

تار کے انکشافات بڑے تشویش ناک تھے۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب اگر ہم پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو ہمارا یادگار حشر کسکتی تھی۔ ڈی ایس پی کے ہنگامے ہونے والی قتل و غارتگری کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ حالات ہماری مخالفت میں جارہے تھے۔ میں نے انہیں زدہ نظریے پکار کر جواب دیکھا تو دُعا نے پوچھا۔ ”دو لڑکیاں تو کچا، وہاں ایک بھی نظر نہیں آ رہی۔ تمہاری زخمی ساتھی کیس تکلیف کی شدت سے جان تو نہیں ہار گئی؟“

ممتاز اور ساحل میری ہدایت پر بڑی جتنی سے عمل پیرا تھیں۔ ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے بھی اٹھ کر ہمارے حالات جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی یہ فریاد برداری ہمارے لیے کافی سودمند ثابت ہو رہی تھی۔ فریاد برداری عموماً نفع بخش ہی ثابت ہوتی ہے!

تار نے دُعا کے تشویش کے جواب میں کہا ”ساتھیں! پچھو کون سی دور ہے۔ وہاں جا کر دیکھ لو وہ لڑکیاں کہاں اور کس حالت میں چھپی بیٹھی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو تارا۔“ دُعا نے تائید کی ”اس طرح یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ دوسری لڑکی کون ہے۔“

تار نے کہا ”میں ان دونوں کو نشانے پر رکھتا ہوں۔“ اس کا اشارہ واضح طور پر ہماری جانب تھا ”آپ پچھو کے اندر کے حالات کی خبر لے لو پھر ہم ان سب کو لے کر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

دُعا نے پچھو کی جانب قدم اٹھا دیے۔

میرا ذہن برق رفتاری سے کام کرنے لگا۔ ہم نازک ترین حالات سے گزر رہے تھے۔ تار اور دُعا اچھے سے اپنے فاصلے پر تھے کہ میں ان پر حملہ آور ہو کر انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میری ایسی کوئی بھی حرکت انہیں فائرنگ پر مجبور کر دیتی جس میں یقیناً نقصان ہمارا ہی ہوتا۔

دُعا نے پچھو کی سمت دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ میربخش اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔ وہ کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند اپنے سابق آقا کے سامنے کھڑا اسے ٹھوکر رہا تھا۔ دُعا اپنے غلام کی اس حرکت پر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے دُعا سے مشابہ آواز میں کہا۔

”حرام زادے! بہت جا میرے راستے سے۔“  
”تمہارا حکم سننے والے کان اب میرے پاس نہیں رہے ساتھی۔“ میربخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جرات مندی سے کہا ”تمہیں پچھو تک جانے کے

لے میری لاش پر سے گزرتا ہو گا۔“  
دُعا رانت پیٹتے ہوئے بولا ”تمہاری لاش گرانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں ابھی فائرنگ کر کے تمہارا جسم چلی کر سکتا ہوں۔“

”تو پچھو دیر کس بات کی ہے۔“ میربخش عجیب سے لہجے میں بولا ”چلاؤ گولی۔“

مجھے میربخش کی حماقت پر غصہ تو آ رہا تھا تاہم میں اسے اس حرکت سے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جو عزم دیکھا تھا اور اس کی آواز میں جو اعتماد شامل تھا وہ کسی طوفان بلا خیر سے کم نہیں تھا۔ وہ یقینی طور پر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

دُعا نے تھلائے ہوئے انداز میں میربخش کے سوال کا جواب دیا ”ڈبل انسان! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی کھپیا باتیں کر کے تم مجھے طیش دلانے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تمہیں ایک شہت مارنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ میں تو تمہیں اپنے ساتھ جاگیر پر لے جاؤں گا اور تمہارے بدن کا عضو عضو چمید کر اس میں مریچیں بھوں گا۔ غداروں کو میں اتنی آسان موت دینے کا عادی نہیں ہوں۔“

”میں غدار نہیں بلکہ ہیرو ہوں۔“ میربخش نے سینہ ٹوکتے ہوئے کہا۔

”تیرے تو ہیرو کی میں۔ اول۔“

دُعا کلا شکوف سے میربخش پر حملہ آور ہوا مگر اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ”ٹھک“ کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور وہ ”اول“ کرتے ہوئے زمین بوس ہوئے لگا۔

کلا شکوف اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری تھی۔ تار نے پوچھا کہ اپنے میزبان کو دیکھا کیا ایک لمحے کے لیے وہ میری جانب سے غافل ہو گیا تھا۔ اس کی اس غفلت سے فائدہ نہ اٹھانا سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ میرے لیے وہ حماقتی مملکت کافی تھی۔ میں نے فضا میں پرواز کی اور برہم تار کے اوپر پہنچ گیا۔

تار نے مجھے اپنے انتہائی قریب دیکھا تو ہاتھ میں پکڑا ہوا ہینسل میری جانب سیدھا کرتا چلا ہمارا وقت اس کے ہاتھ سے نکل کر میری دسترس میں آچکا تھا۔ میں نے اس کے ہینسل والے ہاتھ پر ایک زوردار چھینا مارا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے ریت پر دوڑ تک دھڑکتا چلا گیا۔

اس دوران میں میربخش نے دُعا کے والی کلا شکوف پر قبضہ جما کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔ دُعا اپنی باتیں کتنی

تھامے زمین پر ہڑا کر رہا تھا۔ اسی وقت ساحل بجاو سے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ڈی ایس پی والا ریو لور نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ساحل ہی نے فائر کر کے دُعا کے کونٹے ٹھیکے پر مجبور کیا تھا۔ ساحل کے ہاتھ میں ریو لور دیکھ کر ساری صورت حالات واضح ہو گئی۔ ساحل کی یہ کارروائی بروقت تھی۔ اس نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دُعا پر گولی چلائی تھی۔ اس ہمدرد لڑکی پر میں فخر محسوس کرنے لگا۔

اگرچہ ساحل کی چلائی ہوئی گولی نے بازی پلٹ دی تھی۔ تاہم تار اب بھی مجھ سے زور آزمائی میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کے ہینسل والے ہاتھ کی کھائی دیوچ رکھی تھی اور وہ اپنا بازو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ اس وقت میرے نیچے دب ہوا تھا۔ میں نے کھائی کو جھٹکا دیتے ہوئے اس کی ہینسل میں ایک زوردار کھٹکنا سید کر دیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔ اس کی جگہ اگر کوئی عام سا غنڈا ہوتا تو میرے کھٹنے کی طوفانی ضرب اسے بڑبڑنے پر مجبور کر دیتی۔ تار میں کسی سانپ کی سی قوت بھری تھی اور وہ بے پناہ قوت برداشت کا بھی مالک نظر آتا تھا۔ عمر کوٹ کے ہونٹ میں ”میں نے اسے جو زخم دیے تھے انہیں چاٹنے کے لیے کئی دن درکار تھے مگر وہ آندھی طوفان کی طرح اس صحرا میں میرے پیچھے پکڑا تا پھر رہا تھا۔

تار نے میرے کھٹنے کی ٹھوک کھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جواباً مجھ پر حملہ بھی کیا۔ اس نے کھٹنے فولد کرتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں میرے پیٹ پر جمائے اور پوری قوت سے مجھے اپنے اوپر سے دور اچھال دیا۔

میں کسی بد نصیب مظلوم کی طرح زمین پر لوٹ پوٹ نہیں ہوا بلکہ میں نے فضا میں رہتے ہوئے اپنے وجود پر توازن حاصل کر لیا اور ہوا میں رول کرتے ہوئے سیدھا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

تار مجھ سے صرف تین قدم کی دوری پر زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ کوشش ناکامیاب بنادی۔ میں لیفٹ رائڈ ہاؤس کرتے ہوئے دو قدم اندر آیا پھر بجلی کی سرعت سے رائٹ وھیل لگ اس کی کھوپڑی پر رسید کر دی۔

وہ ابھی پوری طرح سنبھل کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ میری وھیل لگ نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اس کے ہاتھ کا ہینسل ہاتھ سے نکل کر دور جا کر اور وہ اپنے قدموں پر ڈگمگاتے ہوئے دونوں ہاتھ ہوا میں چلانے لگا۔

تارا کے سر کا عقبی حصہ کیلے ہی بری طرح زخمی تھا۔ میری دھانسی لگنے کے اس کے زخم کی ٹھیک ٹھاک مزاحیہ سی کڑواہٹ تھی۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی سفید پٹی عقبی جانب سے سرخ ہونے لگی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کے سر کے زخمی حصے سے خون جاری ہو گیا تھا۔

تارا کے ہاتھ سے نکلے ہوئے پائل کو ساحل نے اٹھالیا۔ میرنکس نے کلا شکوف ساحل کے حوالے کی اور وڈیرے پر پل پڑا۔ وہ لالتوں اور گھونٹوں سے اپنے سابق آقا کی "خدمت" میں مصروف ہو گیا۔ میں میرنکس کو اس کے حال پر چھوڑ کر تارا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میرنکس کے سینے میں وڈیرے کے لیے عم وغصے کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، اچھا تھا وہ غبار نکال کر دل ہلکا کر لیتا۔

تارا بڑا ہمت والا ثابت ہو رہا تھا۔ بری طرح پٹنے کے بعد بھی وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے تپلے میں وہ پہلے جیسی تیزی و پھرتی نہیں تھی۔ اس کی کسمپرسی دیکھ کر مجھے ترس بھی آیا۔ لڑکھاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مجھے فرنٹ لگ مارنا چاہی۔

میں ایک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا لگ والا پاؤں ہوا میں جھولا اور "دھب" سے ریشمی زمین پر آنکا۔ وہ اس وقت واضح طور پر ہانپ رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "تارا! تم تو مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے والے تھے اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

وہ میرے اس ترش انداز پر تھلا کر رہ گیا اور غصے سے بولا "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم خوش قسمت ہو۔ بار بار ہمارے گھیرے سے نکل جاتے ہو لیکن یاد رکھو، قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ دیکھنے والے کانوں کا ہاتھ لگائیں گے۔"

"اور تم یہ ساری کارروائی اسی حالت میں کرو گے جس میں نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا؟ تم تو اس وقت اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو!"

وہ جھنکار کر آگے بڑھتے ہوئے بولا "میں ابھی نہیں جانتا ہوں کہ کس قابل ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے گھٹنے پر اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارنا چاہی۔ تارا جو گرز پڑنے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے پاؤں کے حرکت میں آنے سے قبل اس کا ارادہ مٹا دیا اور اپنا اشارہ توڑتے ہوئے اسی پاؤں سے فرنٹ لگ ایک جھک کے ساتھ اس کے منہ پر جڑی۔ اشارہ توڑنے کا

سراسر فائدہ مجھے پہنچا اور تارا کا ٹھوکرے کے لیے آگے بڑھا ہوا پاؤں نہ صرف یہ کہ میرے گھٹنے تک نہ پہنچ سکا بلکہ میری لگنے کے اس کی ٹھوڑی کا سوا ستیاں بھی کھینچ کر لیا۔ سوا ستیاں ان معنوں میں کہ عمر کوٹ والے ہونے کے کمرے میں گھٹنے کی بھرپور ضرب سے اس کی ٹھوڑی کا ستیاں تو پلے ہی مار گیا تھا جس کے نتیجے میں دانتوں تلے دب کر اس کی ٹانگہ زبیل لوہان ہو گئی تھی۔

ٹھوڑی پر لگنے والی میرے پاؤں کی ضرب نے تارا کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کوئی مٹی کا دھو نہیں تھا۔ تاہم وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا۔ میں بہ آسانی اس پر حاوی ہو چکا تھا۔ سر کی عام سی چوٹ بھی انسان کو گھٹنے نیچے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ تارا ہی کی بہت تھی کہ وہ چاہے لڑکھاتے ڈمگاتے قدموں ہی سے سہی بہر حال میرے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی حالت خاصی قابل رحم تھی۔ میں نے اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

"تارا! تم تو مجھے بتانے والے تھے، کس قابل ہو! پھر کیا ہوا؟"

وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورتے لگا۔ میں نے اسے مزید تانے کے لیے کہا "بھئی، جی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے کسی قابل بھی نظر نہیں آ رہے۔ بہتر یہی ہے کہ چوڑیاں پن کر "شو" وغیرہ کرنا شروع کر دو۔"

اس کے ہونٹ کچھ اس انداز میں بے جیسے مجھے گالی دے رہا ہو۔ میں نے جلدی پر تیل کا پورا گیلن انڈیلنے ہوئے کہا "شرم و حیا نے تو تمہاری زبان کو گنگ کر دیا ہے۔ ہونٹ ہل رہے ہیں مگر مجال ہے جو آواز نکلے۔ تم تو اچھے خالص "مشرقی مرد" ثابت ہو رہے ہو!"

وہ غصے کی شدت سے چپکاپی اٹھا پھر غلط گالی میری جانب اچھالتے ہوئے اس نے وحشت ناک انداز میں کہا "آؤ۔ مجھ پر حملہ کر دو۔" اس نے ہاتھوں سے باقاعدہ مجھے بلانے کا اشارہ بھی کیا "تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے دو چار چوٹیں پہنچانے کے بعد تسخیر کر لیجے۔ تارا اب بھی تمہاری پڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔ مرنے کے بجائے تم تو آگے بڑھو۔" میں نے مسکھکہ خیر انداز میں کہا "جی جانور کی تو قربانی بھی قبول نہیں ہوتی۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔" وہ طیش کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے مجھے جانور کہا ہے؟ میں نے سنجیدگی سے کہا "میں نے تو ایک مثال دی ہے۔ اس وقت بری طرح زخمی ہو۔ تم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔"

"مہمان بازی مت کرو۔" اس نے مجھے ٹھکرا "سیدھی سچ اعتراف کر لو کہ تم میرے نزدیک آتے ہوئے ڈر رہے ہو۔ تم جانتے ہو میں تمہیں چنگیوں میں مسل دوں گا۔" وہ انتہائی بے وقوفانہ بات کر رہا تھا۔ اس وقت میں ہر بالے سے اس پر پل پڑتی برتری ثابت کر چکا تھا لیکن اس کی اکڑ گئی تو اس بات پر بھی گویا رسی ہل چکی تھی، بل بالی تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے غصے سے کہا۔

"تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے تارا۔ تم منفی ذہنیت کے مالک ہو جبکہ میں مثبت طرز فکر کا حامل ہوں۔"

وہ آکٹا ہٹ آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "تمہاری ہائی کلس الٹ گئی تھی۔ تم دونوں کسی چوہے کی طرح گاڑی کے ڈرائیونگ کیمین میں پھنس گئے تھے۔ تم دونوں کا گن بردار محافظ تمہاری گاڑی کے نیچے رہا تھا۔ میں اگر ہاتھ تو تم سب پر لعنت بھیج کر یہاں سے چلا جاتا۔ تم میرے ساتھ تھے اس کی پروا نہیں ہوتا چاہیے تھی مگر میں نے ہائی کلس کو سیدھا کر کے تم لوگوں کو جان بچانے کا موقع دیا۔" وہ اپنی اور دشمنی کا بھی کوئی قاعدہ، کوئی دستور ہوتا ہے لیکن میں نے جملہ ادھر اچھوڑنے کے بعد اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "لیکن تم تو دوستی کیا دشمنی کے بھی قابل نہیں ہو۔ تم نے احسان فراموشی کی وہ مثال قائم کی ہے انڈین یاد رکھی جائے گی۔"

"مجھے تمہارے اس لہجے سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ ہنسندہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے بولا "سیدان جنگ میں ہمارے جاز اور ہر تدبیر واجب ہوتی ہے۔ تم میرے دشمن ہو۔ ہمارے دشمن۔ میں تمہیں اور تمہاری دشمنی کو بھول نہیں سکتا۔ تم میرے اکلوتے بھائی دارا کے قابل ہو، یہ بات میں رافت تک یاد رکھوں گا جب تک تمہیں نیست و نابود نہ کر دیتا۔" اس نے بڑے زور سے دانت چکچکائے اور

کہنے ہوئے لہجے میں بولا "تم نے گاڑی کو سیدھا کر کے دی جان بچائی، یہ تمہاری بے وقوفی تھی۔ اپنی حماقت کو نہان کا نام نہ دو جو جان!"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم بالکل ٹھیک تھے۔ واقعی مجھے تمہارے ساتھ بھلائی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش رہا۔

تھی۔ تم کسی سانپ سے کم نہیں۔ تمہارا کام ڈنسا ہے۔ تم لاٹھی والے ہاتھ اور دودھ پلانے والے ہاتھ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہو۔ تم ہر احسان، ہر بھلائی کو فراموش کر کے اپنی فطرت کے عین مطابق ڈنک مارو گے۔"

میری بات ختم ہوئی تھی کہ وہ اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ ایک مارشل آرٹسٹ تھا تاہم جوش جذبات میں اس وقت وہ بالکل دیسی انداز میں مجھ پر جھننا تھا۔ اس نے دونوں بازو آگے پھیلا کر میری گردن کو گرفت میں لینا چاہا۔ میں بیٹھک لگانے والے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں پیٹ کے بل میرے سر پر گرا، اسی لمحے میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تارا فضا میں بلند ہوا، میں نے دونوں ہاتھوں کے پٹس سے اسے دور پھینک دیا۔ زمین ریشمی تھی اس لیے وہ کسی خطرناک چوٹ سے محفوظ رہا۔ بصورت دیگر اس کی ریزہ کی ہڈی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

جس وقت تارا بدلت تمام زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے میرنکس کی جانب دیکھا۔ وہ پوری طرح وڈیرے پر قابو پائے ہوئے تھا۔ میرنکس نے اپنے سابق آقا کے ساتھ اتنی بے دردی سے لات مکا کیا تھا کہ وہ چاروں خانے جت ریت پر پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"ہاتھ ہلکا رکھو میرنکس، میں اپنے سامنے کو جان ہی سے نہ مار دیتا۔" میں نے تارا کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"سامنے وجدان! اس جیسے کینے اور ذہیت انسان اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔" میرنکس نے ایک جان دار ٹھنڈا اکبر سمو کی پشت پر سید کرتے ہوئے کہا "ابھی تک تو یہ زندہ ہے۔ اگر آپ حکم کرو تو میں اس کی جان بھی نکال سکتا ہوں۔"

"نہیں!" میں نے قطعیت سے کہا "یہ تمہارے قابو میں ہے۔ یہی بہت ہے۔ ابھی تو ہم نے اس سے بہت سی کمائیاں سناں ہیں۔ اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔"

"پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟" میرنکس نے پوچھا۔ "تم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مکمل قابو میں کر لو تاکہ یہ کسی قسم کی "حرکت" کے قابل نہ رہے۔" میں نے کہا "میں اس لعین سے نہ کہ تمہاری طرف آتا ہوں۔"

لعین سے میری مراد تارا تھی کیونکہ وہ اب میرے سامنے اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ اس وقت جس اشارے میں کھڑا تھا اس



میں مجھے کافی کمزوریاں نظر آئیں۔ میں نے اس کے پاؤں پر نظر جماتے ہوئے برق رفتاری سے اس کے ہاتھوں پر ایک راؤنڈ ہاؤس کلک ماری۔

ردعمل کے طور پر اس نے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ اس نے اپنے چہرے کو گور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کا سینہ کھل گیا۔ میں نے اس گپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور سائڈ کلک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

ٹھوکر کھانے کے بعد وہ لڑکھڑایا تاہم زمین بوس ہونے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔ اس کے بعد تو اس کا غصہ آسمان سے پاتیں کرنے لگا۔ بے در پے نا کامیابی نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ وہ کسی خونخواری کی طرح مجھ پر پل پڑا۔

اس نے رائٹ شیخ میرے منہ پر رسید کرنا چاہا۔ میں نے گردن کو ایک جانب جھٹکتے ہوئے چہرے کو اس کے وار سے بچایا۔ اس نے لیفٹ گھٹنا میرے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔ تاہم مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ میں نہایت پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تار نے بڑے دھواں دھار انداز میں مجھے "فنی شاٹ" لگانے کی کوشش کی۔ یہ مارشل آرٹس کی ایک ایسی ضرب ہے جو تیر مقابل کے کھنکے کے جوڑ پر لگائی جاتی ہے تاکہ اس کا توازن بگاڑا جاسکے۔

میں نے بیک اسٹیپ لیتے ہوئے اپنے کھنکے کو تار کے وار سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دائیں راؤنڈ ہاؤس کلک اس کے چہرے پر رسید کر دی۔ اس نے گردن کو پیچھے جھکاتے ہوئے چہرے کو میری کلک سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی بے اختیار اس کا دایاں ہاتھ بچاؤ کے سے انداز میں سامنے نکل آیا۔

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور راؤنڈ ہاؤس کلک کو ریورس کرتے ہوئے اس کی کہنی پر لاک لگاتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ ایک "کڑا کے" کی آواز پیدا ہوئی اور تار کی فلک شکاف چنچ فضا میں بلند ہوئی۔ یہ تعریف اس کی برداشت سے باہر تھی۔

تفنی طور پر تار کا بازو کہنی کے جوڑ سے ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ایک سائڈ کلک رسید کرتے ہوئے اسے دور پھینک دیا۔

وہ کچھ دیر تک اونڈھا زمین پر پڑا رہا پھر اپنے مجروح بازو کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دایاں بازو اس طرح جھول رہا تھا

جیسے کندھے سے اس کا رابطہ نہ رہا ہو۔ وہ کسی مولیٰ کی طرح تار کے بائیں ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔ تار کا شمار ایسے افراد میں ہوتا تھا جو کسی رحم کے قائل نہیں ہوتے۔ میں نے اس کے "شایان شان" سلوک کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے ٹھوکروں میں اڑانے لگا۔ اس کی کمزور مدافعت نے میرا "کام" آسان بنادیا۔

دس منٹ بعد وہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی ساری تن فن غائب ہو گئی۔ وہ اس وقت کسی کچھوے کی طرح بے بس پڑا تھا۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اب اس کی جانب سے کسی نقصان وہ کارروائی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

دوسری جانب میربخش اپنے سابق وڈیرے سائیں کو چھٹی کا دودھ یا دلاؤ چکا تھا۔ وہ دونوں شیطان ہمارے رحم و کرم پر تھے۔ میں زیادہ دیر وہاں رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے میربخش سے کہا "تم جلدی سے پیارو کا ٹائر تبدیل کرو۔ میں ان سو ماروں پر نظر رکھتا ہوں۔"

"ان کا کیا کرنا ہے سائیں؟" میربخش نے سوال کیا۔ "یہ ہمارے ساتھ جا میں گے۔" میں نے کہا "ان کی کھالوں سے بہت مضبوط اور ڈھیت قسم کے جوتے تیار ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں خاصی مولیٰ کھال کے ذرائع ہوتے ہیں۔"

میربخش مزید کوئی سوال کیے پیارو کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے ساحل کی جانب ہاتھ دھاتے ہوئے کہا "یہ ریوالور مجھے دو اور ممتاز سے کمو آرام سے سیٹ پر بیٹھ جائے۔ حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔"

میں جب تار سے نیو آزمائی میں مصروف تھا اس دوران میں میربخش نے ہائی گس میں سے ایک رسی تلاش کر کے وڈیرے کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے تھے۔ ساحل نے اپنے ہاتھ کا ریوالور مجھے دیتے ہوئے کہا "وہ جان! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے کہا "میں ان دو بازوؤں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ انہیں پیارو میں ڈال کر ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

میری سوال تھوڑی دیر پہلے میربخش نے بھی مجھ سے کیا تھا اور میں نے اسے خاصا تسلی بخش جواب دے دیا تھا اس لیے ساحل نے مزید جرح نہیں کی اور ممتاز کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے جب ساحل سے ممتاز کو سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تو وڈیرے اکبر سومو نے چونک کر پیارو کی طرف دیکھا تھا۔ اسے دو لڑکیوں کے بارے میں خاصی تشویش تھی

خاص طور پر دوسری لڑکی یعنی ممتاز کے بارے میں۔ وہ اور تار ریلوے کراسنگ سے ہمارے تعاقب میں تھے انہوں نے ممتاز اور ساحل کو پیارو میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے میربخش سے پوچھا "تمہارے پاس اور سی تو ہوگی؟"

وہ پیارو کے عقب سے فاضل اسٹینن تار کا ٹائر تبدیل کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اس نے جواب دیا "سائیں! مزید رسی تو نہیں ہے۔ جوتی میں نے اس سے اس مردود کے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ دیے ہیں۔"

"دوسرا مردود بھی اسی قسم کی "تواضع" کا حق دار ہے۔" میں نے کہا "میں کسی کے ساتھ "نا انصافی" نہیں کر سکتا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میربخش اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "تم جو کر رہے ہو" اسے جلد از جلد منٹالو۔ میں ہی ان کی "خاطرواری" کی کوئی راہ نکالنا ہوں۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت وڈیرے کے پاؤں کی رسی کھول دی۔ مجھے ماننا پڑا کہ میربخش نے بڑی مضبوط بندشیں لگائی تھیں۔ میربخش کے اس کارنامے میں سالما مال کا جمع شدہ غصہ بھی شامل رہا ہو گا جو وہ وڈیرے کے لیے اپنے دل و دماغ میں رکھتا تھا۔

میں نے وڈیرے کے پاؤں سے فارغ ہونے والی رسی سے تار کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ ان ہاتھوں میں وہ مجروح ہاتھ بھی شامل تھا جو کسی عضو متصل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میربخش نے وڈیرے کے ہاتھ بھی پشت پر جکڑے تھے۔ میں ان دونوں کو ایک خاص مقصد کے تحت اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ان کے پاؤں آزاد اور ہاتھ جکڑنا ہونا ضروری تھے ورنہ ہم ان گناہ کی پونوں کو کہاں کہاں اٹھائے پھرتے انہیں تو آزادانہ پاؤں پر ہی چلنا تھا۔

میں نے ریوالور کے اشارے پر تار اور اکبر سومو کو الٹ کر کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ انہوں نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے کہا "شرافت سے پیارو کی طرف پلو۔"

وہ تقابوت آمیز قدم اٹھاتے ہوئے پیارو کی جانب بڑھنے لگے۔ اس دوران میں ساحل نے ممتاز کو سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ وڈیرے کی اس پر نظر بڑی قواس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس نے گت زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ۔ یہ تو۔ ممتاز ہے۔ قاضی سلطان کی بیٹی!" "کیا تم اسے جانتے ہو؟" میں نے اسے گھور کر سادگی سے پوچھا۔

"ہاں" میں اسے اور اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وڈیرے نے جواب دیا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "چلو اچھی بات ہے۔ تمہاری جان پہچان نکل آئی۔ سزا چھڑ کر رہے گا۔" "مہمہ مگر یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟" وڈیرے کی حیرت رنح ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی "اسے تو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔"

"یہ اس طرح میرے ہاتھ لگی ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ایک زوردار بھڑوڈیرے کے گال پر رسید کر دیا۔ "کچھ آیا سمجھ شریف میں یا تفصیل بھی بیان کروں؟"

وڈیرا اکبر سومو میرا بھڑوڈیرے کا تھلا اٹھا تاہم وہ تھلا ہٹ نکلنے کا موقع نہیں تھا۔ اس لیے بے بسی سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ وہ کسی عام آدمی کا بھڑ نہیں تھا جو صرف آواز پیدا کر کے رہ جاتا۔ وہ میرا بھڑ تھا۔ وجدان علی کا بھڑ! جس نے شاولن ٹیپل جیسے عظیم الشان ادارے سے مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی جہاں اس کے ہاتھ پاؤں کو فولادی بنادیا گیا تھا۔

وڈیرے کے گال پر جہاں میں نے طمانچہ رسید کیا تھا وہاں میری انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے تھے بلکہ چھپ گئے تھے شاید میں نے کچھ زیادہ ہی قوت صرف کر دی تھی اسے وہ بھڑنارتے ہوئے۔

تار نے تو ممتاز کو جانتا تھا اور نہ ہی اس کے اغوا کی کہانی سے وہ واقف تھا اس لیے اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی خاموشی اور لاطعلقی تو اس کی ناواقفیت ہی کو ظاہر کر رہی تھی۔

میں نے وڈیرا اکبر سومو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا "تمہارے پاس موبائل فون تو ہو گا؟"

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے اس کے دوسرے گال کو سرخ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا "جھوٹ مت بولو حبیب انسان۔ میں دروغ گوئی کی بہت عبرت ناک سزا دیتا ہوں۔ جب تمہارے عام سے ملازم مجھے اغوا کرتے ہوئے اپنے پاس موبائل فون رکھ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں رکھ سکتے؟"

میرا اشارہ اس موبائل فون کی طرف تھا جو میں نے تھپا کر رکھے صحرا میں سفر کے دوران میں وڈیرے کی ایسبرینس

نما گاڑی سے برآمد کیا تھا۔ ازاں بعد اس لنگ ساز موبائل فون کو تاجہ کر دیا گیا تھا۔ میر بخش نے میری اس کارروائی پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

وڈیرا "نہ پائے رفتن" نہ جائے ماندن" والی کیفیت کا شکار تھا اس لیے اسے زبان کھولتے ہی بی۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ جنگل سے نکلے وقت موبائل فون اپنے ساتھ لایا تھا۔ تاہم اس کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ وہ فون اس وقت نئیوٹا ہائی کلس میں موجود تھا۔

میں نے ان دونوں بد بختوں کو ساحل کی گمرانی میں چھوڑا اور خود ہائی کلس کی جانب بڑھ گیا۔ جاتے ہوئے میں پولو اور بھی ساحل کے حوالے کر گیا تھا۔ وہ پجارو کے اندر بھی جبکہ وہ دونوں زیر حراست افراد پجارو کے باہر کھڑے تھے۔ میر بخش اپنے کام کے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی مہم جوئی کی کوشش کرتا تو میر بخش اسے "سنبھال" لیتا۔

میں نے صرف پانچ منٹ کے اندر ہائی کلس کے ڈرائیونگ کین کن چھان مارا۔ وڈیرے کا نااہل موبائل فون بہ آسانی دستیاب ہو گیا۔ اس تلاشی کے دوران میں کوئی اور قابل ذکر چیز برآمد نہ ہو سکی۔ مجھے سب سے زیادہ کھوج اسلئے وغیرہ کا تھم کر ہائی کلس میں کسی قسم کا کوئی آتشیں ہتھیار موجود نہیں تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان کے پاس اسلئے کے نام پر صرف دی کاشفوف اور پستل تھا جن پر ہم قبضہ جتا چکے تھے۔

میں نے وڈیرے کے موبائل فون کو پجارو میں منتقل کیا۔ اس کی بیٹری واقعی ڈاؤن ہو چکی تھی یا اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ بہر حال، وہ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وہی الوقت کسی بیکار شے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

اس وقت تک نہ تو نئے سے موبائل فون مارکیٹ میں آئے تھے اور نہ ہی ان کے نمائندے ہی مختصرے چارجر۔ لنگ ساز موبائل فون کے ساتھ ساتھ اسی قبیل کی ایک بیٹری کو اٹھائے اٹھائے پھرنا پڑتا تھا۔

میر بخش نے ٹائمر کی تبدیلی کا کام تسلی بخش طریقے سے کر دیا تو میں نے اس سے کہا "اب ڈرائیونگ تم کرو گے اور دونوں لڑکیاں تمہارے ساتھ آگے پہنچ کر سیٹ پر بیٹھیں گی۔"

"دونوں لڑکیاں ایک سیٹ پر؟" میر بخش نے متعجب انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ہاں" دونوں ایک ساتھ۔ سیٹ خاصی کشادہ ہے یہ چھوٹی موٹی وہاں آسانی سے سما جائیں گی۔" چھوٹی موٹی ہے میری مراد خدا نخواستہ یہ نہیں تھیں کہ وہ دونوں تھیں بچیاں تھیں۔ لڑکی یا عورت کو چھوٹی موٹی اس کی نزاکت اور سٹکلے سینے کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ یہ بہت جلد کہیں بھی سما جاتی ہیں۔ خاص طور پر سر کا حل ان کے چھینے کی پسندیدہ جگہ ہے!

میر بخش نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے سوالیہ نظریے اکبر سومو اور تارا کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا "یہ میرے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں رہیں گے۔ انہوں نے ہم سے منسوب کردہ قتل و غارت گری کی فرضی جھوٹی کمائی تو سنا دی۔ اب کچھ نئی نئی اور دلچسپ کمائیاں میں بھی انہیں سنانا چاہتا ہوں۔ خوب کڑے کی جوئل بیٹھیں گے دوا لے نین!" دونوں لڑکیاں پجارو کے عقبی حصے سے نکل کر پہنچ کر سیٹ پر آئیں۔ وہ سیٹ ان کے بیٹھنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ میں دراصل دونوں خبیثوں کے ساتھ پچھلے حصے میں اکیلا رہنا چاہتا تھا تاکہ اگر کسی شدید قسم کی کارروائی کی ضرورت پیش آجائے تو وہ لڑکیوں کی نظر سے پوشیدہ رہے۔ میر بخش نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میرے اشارے پر اکبر سومو اور تارا پجارو کے عقبی حصے میں سوار ہوئے۔ انہوں نے مجھے ہی سیٹوں پر بیٹھنے کی کوشش کی، میں نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

"لاٹ صاحب کے بچو! اپنی اوقات کو نہ بھولو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم کسی دعوت میں شریک ہونے نہیں جا رہے۔ تم اس وقت قیدی ہو اس لیے آرام سے پھیل کر سیٹوں پر بیٹھنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ تمہارا ٹھکانا وہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے پجارو کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔

وہ سکرٹ کر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگے تو مجھے شرارت سوچی۔ وہ اچھوٹا خیال یکدم ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں نے ان دونوں کی ہڈیوں کو کھینچا اور انہیں اس طرح ایک دوسرے کے پلو میں بیٹھنے کو کہا کہ ان کے رخ ایک ہی سمت میں ہو گئے۔ وہ اپنے دائیں اور بائیں پلو سے جڑے بیٹھے تھے۔ گویا وڈیرے کا پایاں زخمی بازو، تارا کے دائیں مجروح بازو سے دو جسم کی دوری پر تھا اور ان کے صحیح سلامت بازو ایک دوسرے سے لگ گئے تھے۔

میں نے ان دونوں کے ناکارہ ہڈیوں کو نظر انداز کر دیا اور کار آمد بازوؤں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر اس طرح

باندھ دیا جیسے کسی بانس کی لہائی بڑھانے کے لیے کوئی دوسرا بانس اس کے اوپر رکھ کر مضبوط رسی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ وہ بڑے مضبوط خیز انداز میں، جڑواں حالت میں بیٹھے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

میں نے ان کی نظروں کی پروا کی بغیر میر بخش کو حکم دیا "گاڑی کو سڑک پر لے آؤ اور جس حد تک ممکن ہو، تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے منزل پر پہنچا دو۔"

میر بخش نے کوئی سوال کرنے کے لیے لب کھولنا چاہے تو میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "گائیڈ تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے، جو بھی پوچھنا ہے، اسی سے پوچھو۔ ممتاز "مس گائیڈ" ہے مگر تمہیں مس گائیڈ نہیں کرے گی۔ یہ بھی اپنے والدین سے ملنے کے لیے ایک ایک سانس بے چینی سے لے رہی ہے۔ یہ پہلی فرصت میں اپنے گھر پہنچنا چاہتی ہے۔"

میں نے میر بخش کو بڑے واضح انداز میں بتا دیا تھا کہ ہمیں سیدھا "نئی سر" جانا تھا۔ جہاں ممتاز کے والدین بڑی بے قراری سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ میر بخش نے ایک جھٹکے سے پجارو اشارت کی پھر اسے سڑک پر لانے کے بعد بتدریج اس کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

ہم کچھ دور بعد "سامارو" کو اپنے پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ یہ سڑک سیدھی کسری کی طرف جاری تھی۔ جہاں سے ہمیں آگے "نئی سر" کی سمت سفر لے کرنا تھا۔ جس سڑک پر اس وقت ہم جو سفر تھے وہ کسری سے مشرق کی جانب مرکز سیدھی دھرم سال (تھپار کر) کو جاتی تھی۔

میرے ذہن میں ایک سوال کافی دیر سے چکر رہا تھا۔ مجھے یہ جانا تھا کہ وڈیرا اکبر سومو ہمارے تعاقب میں عمر کوٹ سے سیدھا ڈی ایس پی کے جنگلے واقع شادی پٹی کس طرح پہنچ گیا تھا۔ میر بخش جب گزشتہ روز جنگلے سے روانہ ہوا تھا تو وڈیرا وہاں موجود تھا۔ اپنے ذہن کی غلط دور کرنے کے لیے میں نے وڈیرے سے پوچھا۔

"اکبر سومو! تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ ہم عمر کوٹ سے فرار ہونے کے بعد شادی پٹی کی طرف گئے ہیں اور رات کے آخری پر ہم تمہیں ڈی ایس پی کے جنگلے پر ملیں گے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے نہیں ہوگی میرے لیے ہے۔" میں نے کہا "میر بخش تمہیں کل دوپہر کو جنگلے پر پھونڈ کر ہماری طرف آیا تھا۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا "کل رات ساڑھے نو بجے مجھے میرے ایک آدمی نے اطلاع دی تھی کہ تم تینوں شادی پٹی والے ناکے سے گرفتار کر لیے گئے ہو۔ میں اپنی جاگیر سے فوراً عمر کوٹ پہنچا۔ اس وقت تک تارا کو ہوش آچکا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور تھانہ شادی پٹی گیا۔ جب ہم مذکورہ تھانے پہنچے تو صبح کے لگ بھگ تین بج چکے تھے۔ راستے میں تارا نے مجھے عمر کوٹ کے ہوش میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر کا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں جاگیر سے روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ دو جھپٹیں اور چار محافظ بھی لے آیا تھا۔ اب وہ چاروں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں اور تارا زندہ ہیں۔"

یہاں تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "رکو نہیں" بولتے چلے جاؤ۔ اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو تم دونوں بھی اپنے چار ساتھیوں کے پاس پہنچا دیے جاؤ گے۔"

میرے لہجے میں جھپی ہوئی سنگینی کو اس نے صاف محسوس کر لیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گر گیا۔ تاہم اپنی آواز میں تھوڑی ہمت بھرتے ہوئے اس نے مجھے تنبیہ کی "وہ جان! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ یاد رکھو، میں تمہیں عبرت ناک انجام سے دو چار کر دوں گا۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

"میں تمہاری طاقت اور ہمت کا بڑی وضاحت کے ساتھ مشاہدہ کر چکا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تم انتہائی بزدل، گھٹیا اور کینے انسان ہو۔ تمہاری بہادری کا اندازہ مجھے اس وقت ہو گیا تھا جب تم اپنے سابق نوکر اور میرے موجودہ دوست سے لات ٹھڈے کھا رہے تھے۔"

اس نے سگتی ہوئی نظریں سے مجھے دیکھا اور دوبارہ تنبیہ کی "میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا وہ جان، تم یہ سب اچھا نہیں کر رہے۔ اگر اپنے لیے مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں فوراً آزاد کر کے جانے دو۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ اچھا نہیں کر رہا تو کیا تم لوگوں نے ہمارے ساتھ اچھا کیا ہے؟" میں نے پچھتے ہوئے لہجے میں کہا "ڈرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، تم نے ڈی ایس پی سے ساز باز کر کے ہمیں نو دس افراد کے قتل میں ملوث کرنے کی جو سازش کی ہے، اس میں تمہاری شرافت کی کیا شرح نکلتی ہے؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے

مزید کہا ”تم مجھے عبرت ناک انجام کی دھمکی دینے سے پہلے اپنی حالت پر غور کرو۔ اس وقت تو تم اپنے چہرے پر بیٹھنے والی کبھی کو بھی اڑانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس سے زیادہ افسوس ناک اور قابل رحم صورت حالات اور کیا ہوگی!“

وہ کینہ تو زنگاہ سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے ایک بیان سے یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ وہ گزشتہ روز تارا کے ساتھ اپنے جنگل سے روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ کسی مخبر کی اطلاع پر اسے رات میں گھر سے نکلتا ہوا تھا۔

میں نے اس کی جرح کبھی نہ کی۔ اپنے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ تکلیف کی شدت سے ہلکا اٹھا۔ ڈبیرے کی بائیں کبھی پر گولی لگی تھی اور یقینی طور پر ہڈی کا شہر خراب کر گئی تھی۔ ساحل نے بروقت فائر کر کے ڈبیرے کو حاکم سے محکوم بنادیا تھا۔ اس نے دانتوں پر دانت جمائے اور تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

”تم بہت بہادر رہتے ہو مگر تمہارا یہ سلوک بہادری کے منافی ہے۔“

”میں صرف بہادر بنایا ہی نہیں بلکہ میں نے اپنی بہادری ثابت بھی کی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم جیسے ضمیر فروش ظالم اور احسان ناشاں افراد تو اس سے بھی زیادہ بدترین سلوک کے مستحق ہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ بہت رعایت برت رہا ہوں۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے دیکھے ہوئے بازو پر ایک اور ہلکا سا وار کیا اور تھمکان لہجے میں کہا ”تم نے ابھی تک ڈی ایس پی کے جنگل پر پہنچنے کی کمانی مکمل نہیں کی۔ اگر اب تمہاری زبان کو بریک لگے تو میں تمہاری کبھی نہ ٹھوکروں میں اڑا دوں گا۔ شاباش، شروع ہو جاؤ۔“

وہ ٹاپنہ بدہ نظر سے مجھے تنکے لگا کر جب میں نے اس کی کبھی کو نشانہ بنانے کے لیے اپنے پاؤں کو حرکت دی تو وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔

”ہم تقریباً تین بجے صبح شادی پلی کے متعلقہ تھانے پہنچے۔ اس تھانے کے انچارج سے میری اچھی دعا سلام ہے۔ تھانا انچارج اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ شادی پلی والے ناکے کی عمرانی کرنے گیا ہے۔ میں نے اے ایس آئی جشیہ احمد سے تم لوگوں کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ ڈی ایس پی تمہیں اپنے جنگل پر لے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم سیدھے اس جنگل پر پہنچے تھے۔ آگے کے حالات و واقعات تمہارے علم میں ہیں۔“

میں نے ڈبیرے کی دو جیبوں کو کم و بیش صحت سناڑے

تین بجے ڈی ایس پی کے جنگل کے گیت پر رکتے دیکھا تھا۔ اس حساب سے ڈبیرے کا بیان درست نظر آتا تھا مگر کچھ معاملات ابھی حل طلب تھے۔

میں نے اس سے پوچھا ”تم نے بتایا ہے تمہارے کسی آدمی نے تمہیں ہماری گرفتاری کی اطلاع دی تھی۔ ہمیں شادی پلی والے ناکے سے پکڑا گیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، تمہارے مخبر کا تعلق اسی علاقے سے ہے؟“

ڈبیرے نے خاموشی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میں نے تیز لہجے میں سوال کیا ”کون ہے وہ شخص؟“

”اے ایس آئی جشیہ احمد۔“ اس نے بتایا۔ میرے سینے سے ایک کمری سانس خارج ہو گئی۔ اے ایس آئی جشیہ سے ہم نے بلکہ میں نے ناکے کے مقام پر خاصی باتیں کی تھیں۔ وہ ایک باتونی شخص تھا۔ اس کی زبانی مجھے اس ناکے کی حقیقت کے بارے میں پتا چلا تھا۔ منگل

تجھ گھڑا سنگھ اور ممتاز والی کمانی بھی جشیہ ہی نے مجھے سنائی تھی۔ ازاں بعد اس ”ٹوڈ ٹاک“ پر اسے ڈی ایس پی سے ڈانٹ بھی سننا پڑی تھی اور اب ڈبیرا بتا رہا تھا کہ اے ایس آئی اس کا خاص آدمی تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ بھی سوچا، ممکن ہے وہ مجھے پکڑ دینے کی کوشش کر رہا ہو۔

اسی امکان کے پیش نظر میں نے اس سے پوچھا ”کبر سومو! اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو خود سوچ لو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمہاری مخبر والی کمانی کو ہضم نہیں کر پاتا ہوں۔“ میں نے آخری جملہ دانستہ اسے گھنے کے لیے کہا تھا۔

وہ بولا ”جو حقیقت تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ تم اس پر یقین کرتے ہو یا نہیں۔“

”اے ایس آئی تمہارا آدمی کس طرح ہو سکتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے بتایا ”جشیہ ایک طویل عرصے سے میرے لیے مخبری کا کام کر رہا ہے۔ اے ایس آئی کے عہدے پر اس کی ترقی بھی میری کوششوں ہی سے ہوئی ہے۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کہا ”تم تو ابھی کل کے بچے ہو وچدان! تمہیں کیا معلوم کہ حکمرانی کے لیے کس طرح ہر جھگے میں اپنے بندے پہنچائے جاتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو اکبر سومو۔“ میں نے طنز انداز میں کہا ”کل کے بچے کو واقعی یہ بات معلوم نہیں لیکن یہ بچہ برسوں کے بوڑھے کو زیر دام لانے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ بچہ

کلی کا بچہ بخوبی جانتا ہے کہ تم جیسے بڑے ظالموں کو عبرت پاک سزا کس طرح دی جاتی ہے۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے گھائل بازو سے ایک چھوٹی سی ”تھکلی“ کی۔ اس کے چہرے پر کرب کے اثرات نمودار ہوئے اور بے ساختہ اس کے لبوں سے میرے لیے ایک بے ہودہ گالی پھسل گئی۔

میں نے اس کی کسبہ کی پروا کیے بغیر اس کے فرعون صفت چہرے پر ایک زنانے وار چھڑ جڑوا۔ نیچے کے طور پر اس کی باجھوں سے لمبو رتنے لگا۔ وہ اس طوفانی طمانچے سے قزاق رہ گیا۔ میں نے کھا جانے والی نظری سے اسے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔

”تم نے پچاس پچپن سال کن جانوروں میں رہ کر گزارے ہیں۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ دو لڑکیوں کی موجودگی میں تم کس قسم کی بے ہودہ گوئی کر رہے ہو۔ کیا تم اپنے زنان خانے میں بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتے ہو؟“ وہ کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش نظری سے مجھے تنکے لگا۔

میں نے کہا ”اکبر سومو! میں تمہاری نظریں کل کا بچہ ہوں مگر اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں عقل کا بچا بھی ثابت

ہوں گا۔ جو بھی جھوٹ بولو ڈرا سوچ سمجھ کر بولنا۔“ میر بخش گا ہے یہ گاہے عقب نما آئینے میں اپنے سابق ڈبیرے سامنے کی درگت بنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں کہا تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ مسرت کی انتہا سے گزر رہا تھا۔

میں نے دوبارہ ڈبیرا اکبر سومو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”اے ایس آئی جشیہ کو صرف یہ معلوم تھا کہ ہمیں گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارے اصلی ناموں سے واقف نہیں تھا پھر تم نے یہ کیسے جان لیا کہ گرفتار ہونے والے ہم ہی ہوں گے؟“

”یہ تم نے اچھا سوال کیا ہے۔“ اس نے کہا ”اے ایس آئی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ گرفتار شدگان میں وچدان اور وچوشاں ہیں کیونکہ تم لوگوں نے پہلے اپنے نام مراد اور کلثوم بتائے تھے۔ بعد میں تھانے جاکر تم مقصود احمد اور لیلی بن گئے۔ البتہ میر بخش کا نام ہر جگہ میر بخش ہی رہا۔ مجھے اے ایس آئی کی جس بات نے تمہاری طرف متوجہ کیا وہ ”ریڈ اینڈ بلیک“ گاڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تم لوگوں نے مجھ سے دور پار کی رشتہ داری بھی ظاہر کی تھی اور پولیس کو بتایا تھا کہ

## جاسوسی، انجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہونے والی مقبول ترین کمانی

### علی یار خان کی سرگزشت

کتابی صورت

(گیارہ حصوں میں)

تیار ہے



قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

## کتابیات پبلی کیشنز

5802551 5802552 5805313

74200 74200

kitabiat1970@yahoo.com

آتش فشاں حصہ 7

آتش فشاں حصہ 7

تم عرکوٹ کا تاریخی قلعہ دیکھنے میرے پاس آئے تھے چونکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اس لیے میرا شک تمہاری طرف گیا اور بالآخر یہ شک جج بھی ثابت ہوا۔

وڈیرے کی اس وضاحت میں خاصی جان تھی۔ میرے ذہن نے اس کی بات کو تسلیم کر لیا۔ یقینی طور پر وہ اسی طرح تعاقب کر کے ڈی ایس بی کے جنگ پر پہنچے ہوں گے۔ اے ایس آئی جی نے میری وجہ سے اپنے افسران بالا سے خاصی جھاڑ کھائی تھی اس لیے بھی اس نے خصوصی ایف بی سی دکھائی ہوگی۔

”تمہارا کیا حال ہے چوہدری کے پالتو بندر؟“ میں نے تارا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک یک ٹک مجھے گھورتا رہا پھر دارنگہ دینے والے انداز میں بولا ”تم ہمارے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہو وجدان۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

”میں تو تمہارے خاندان کا قرض لوٹا ہوا ہوں۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ میں نے کہا ”تمہارے ملعون بھائی دارا نے جو کچھ میرے اور میرے والدین کے ساتھ کیا تھا میں کئی سال سے اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اب میں جو کچھ تمہارے ساتھ کروں گا وہ قرض کی ادائیگی ہوگی اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے؟“

وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے چھین چھاڑ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”کیس تمہیں میری یہ بات تو بری نہیں لگ گئی کہ میں نے تمہیں چوہدری کا بندر کہہ دیا ہے؟“

وہ اب بھی خاموش رہا۔ اس کی خاموشی میں میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

میں نے کہا ”جو کسی کے اشاروں پر ناچتا ہے اسے بندر ہی کہا جاتا ہے۔ کیا تم اپنے چوہدری کے اشاروں پر نہیں ناچتے؟ میں نے تو تمہارے ساتھ بہت رعایت کی ہے میں تمہیں چوہدری کا پالتو کہتا تھا تو یہ ٹائٹل تمہارے لیے زیادہ مناسب ہوتا۔ اسی کے خیرے پر پل بڑھ کر تو تم اس ذیل ڈول کو پیٹے ہو۔ تمہارا یہ ہٹا کٹاپن چوہدری کے گلوں کا رجن منت ہے۔“

میں مسلسل ایسے جملے ادا کر رہا تھا جو اس کے زخموں پر نمک پاکی کا کام کر رہے تھے۔ تاہم وہ کسی قسم کی اشتعال انگیز حرکت سے گریزاں نظر آتا تھا۔ ابھی تک مجھے تارا کا جو تجربہ

”تمہیں یہ بات میرے دشمن کی بیٹی نے بتائی ہوگی؟“

”سوال نہیں کرو“ صرف میری بات کا جواب دو۔“ میں نے انٹ کر کہا۔

وہ راہ راست پر آتے ہوئے بولا ”ہاں“ ہم ایک طویل رصے سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔“

میں نے کہا ”اپنے دشمن کے سامنے جاتے ہوئے ڈر ہے؟“

”ڈرتی ہے میری جوتی۔“ وہ جوش میں آگیا۔

میں نے ٹھیکے انداز میں کہا ”پھر تمہاری حالت مردوں کے درجہ کیوں ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے تمہارا پیشاب خطا ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ بچاؤ تمہاری ہی ہے لیکن میں یہاں کی قسم کی گندگی برداشت نہیں کروں گا“ یہ بات ذہن میں رکھنا چھویرا سا نہیں!

وہ بے بسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے لرزے لگا پھر اپنے خون آلود دہانے کو وا کرتے ہوئے گویا ہوا ”میں کسی ہتھیار داسی سے نہیں ڈرتا۔ اس کا تو میں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اس کی اتنی ہمت نہیں کہ میرے سامنے آکر وار کر سکے۔ میں تو تمہیں قتل کرتے رک گیا۔ ممکن ہے وہ ممتاز کے باپ قاضی سلطان کو کوئی گالی دینے کا ارادہ رکھتا ہو اور میرے ماہی ”سلوک“ نے اس کی زبان پر نالا ڈال دیا ہو۔ میرے نامت خیر طمانچے نے اس کی گھٹی موچھوں تلے ہونٹوں کو کھینچ کر دیا تھا۔ وہ اس تلخ تجربے کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا ”جب تم اتنے ہی ہمدرد ہو“ قاضی سلطان کو خاطر میں نہیں لاتے تو پھر تمہاری جان کیوں نگلی جارہی جا اس کا سامنا کرتے ہوئے؟“

”میں اپنی اس حالت پریشان ہوں۔“ اس نے اپنے ہاتھ پر ایک پتھری سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”جب قاضی سلطان مجھے اس حال میں دیکھے گا تو میں شرمندگی سے گردن لٹاؤں گا۔“

اس کا کہنا بجا تھا۔ اپنے دشمن کے سامنے کمزور اور لڑھکھک حالت میں جانے سے واقعی ناک کٹ جاتی ہے۔ نعل غیرت مند تو اس قسم کی شرم ناک صورت حالات پر اذیت کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے اکبر سوم کو مخاطب کرتے ہوئے کھیلے انداز میں کہا ”تو اس کے لیے اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے اگر یہ ندامت اور شرمندگی تمہیں گردن نہیں اٹھانے

دے گی تو تم کی بیمار بکمرے کی طرح گردن ڈالے رہنا۔ آخر ہم بھی تو تمہارے دشمن ہیں۔ تم ہمارے سامنے تو گردن اٹھائے بیٹھے ہو؟“

”تمہاری بات دوسری ہے۔“

”دوسری کیوں ہے بھئی؟ دشمن تو آخر دشمن ہی ہوتا ہے۔“

وہ موضوع گفتگو کو تبدیل کرتے ہوئے بولا ”قاضی سلطان کی بیٹی تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟ تم ڈی ایس بی کے جنگ سے تو میربخش اور دھنوا (سائل) کے ساتھ نکلے تھے؟“

”یہ ہمیں راستے میں ملی ہے۔“ میں نے بتایا۔

اس دوران میں میربخش سائل یا ممتاز نے ہماری بات چیت میں مداخلت نہیں کی۔ میربخش اور سائل تو میرے مزاج کو بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ ممتاز عقل مند کا تقاضا نبھاتے ہوئے خاموش تھی۔

وڈیرے نے پوچھا ”اس لڑکی کو تو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا پھر تمہیں راستے میں کیسے مل گئی؟ میں نے تو سنا ہے ڈاکوؤں نے اس کی واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے ناموں کا مطالبہ کیا تھا؟“

”تم خواخواہ بے خبری کا ڈراما نہ رچاؤ اکبر سومو۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچے ہوئے کہا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”میں کون سی بے خبری کا ڈراما رچا رہا ہوں؟“ اس نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا ”تم یہ کیا؟ تم نے سنا ہے؟“ اور ”تمہیں پتا چلا ہے“ جیسے جملے بول کر خفاقی کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ جو بھی بات ہے اسے زبان پر کیوں نہیں لاتے!“

میں نے اسے گھیرنے کے لیے ایسا مضبوط جال پھینکا تھا کہ وہ گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا ”پتا نہیں“ تم کسی قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے ڈی ایس بی کی زبان معلوم ہوا ہے“ قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو مشکل تنگھٹکے نامی کسی ڈاکو نے اغوا کر لیا تھا۔ ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے یہی تو شادی پٹی اور میرپور خاص کی ضلعی سرحد پر ناکا لگایا گیا تھا جہاں سے تم گرفتار ہوئے تھے۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو نا!“ میں نے ٹوٹتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔

”یہی حقیقت ہے بھئی۔“

”تم اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔“ میں نے اپنے ”مشن“

پر کام جاری رکھا "لیکن تمہاری یہ اداکاری حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کر سکتی اکبر سومو!"  
وہ آنکھٹ آمیز انداز میں بولا "پھر تم ہی بتاؤ حقیقت کیا ہے؟"

میری ہمم اور ہراسرا گفتگو نے ان دونوں کو اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ وہ پہلو تو بدل نہیں سکتے تھے، بس کسمائے پر اکتفا کرنے لگے۔ پجارد بھی بڑی عجیب گاڑی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹوشی والوں نے اس میں بہت سی تجربات تبدیلیاں کی ہیں۔ خاص طور پر سیٹنگ اور انٹرنس کے حوالے سے۔ ابتدائی زمانے میں اس کے عقبی حصے کی دو طرفہ سینوں کے درمیان اچھی خاصی گنجائش ہوتی تھی۔ ازاں بعد اس حصے میں آگے پیچھے نشستوں کی تعداد بڑھانے کے نتیجے میں یہ گنجائش کم سے کم تر ہوتی گئی۔ ہم جس پجارد میں جو سفر تھے وہ دو طرفہ نشستوں والی تھی جس کے درمیانی حصے میں اتنی گنجائش بہر حال موجود تھی کہ میں نے ان دو سرکاری ساندوں کو وہاں ٹھونس رکھا تھا۔ ایک تو گنجائش کی کمی، دوسرے ان کے بازوؤں کی بندش نے انہیں "پر زے" نکالنے سے روک رکھا تھا۔ وہ بے بسی کی عملی تصویر تھے۔

میں نے اپنی پلاننگ کے مطابق ڈیرے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تم ایک بھونٹا ڈیرا ہو۔ اپنی رعایا پر ظلم کر کے تمہیں از حد خوش ہوتی ہے۔ کوئی ایسا جرم نہیں جس میں تم ملوث نہ ہو۔ تم چوری و دہشتی کروا رہے ہو، خطرناک مجرموں کو پناہ دیتے ہو۔ نائی گرامی ڈاکو تمہاری پشت پناہی کے طفیل اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب ہیں۔"

میں سانس لینے کے لیے رکا تو اس کے چہرے کا جائزہ بھی بغور لیا۔ وہ میری باتیں سن کر سسک اٹھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ غصے سے تھم رہا تھا۔ تاہم مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کے جذبات کے سوڈے میں نمک چھڑکتے ہوئے کہا "قاضی سلطان سے تمہاری دیرینہ دشمن چلی آ رہی ہے۔ تم نے قاضی سلطان کو "چرکا" لگانے کے لیے اپنے ناٹو ڈاکو منگل سنگھ سے دشمن کی بیٹی ممتاز کو اغوا کرایا اور اس کی واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے تانواں کا مطالبہ کر دیا۔"

"یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔" وہ پھٹ پڑا "میں کسی منگل سنگھ نامی ڈاکو کو نہیں جانتا، نہ ہی میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو اغوا کرایا ہے۔"

میں نے اس کا احتجاجی جملہ مکمل ہوتے ہی زخمی کنی پر پاؤں کی ایک درمیان ٹھوک رسید کر دی۔ وہ فزیک کے ہونے بکڑے کے مانند ڈکرا اٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلی لٹراتے ہوئے تنبیہیں انداز میں کہا۔

"اگر مزید تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو زبان کو بند رکھو۔ صرف وہ سنو جو میں بیان کر رہا ہوں اور سمجھ لو کہ یہی حقیقت ہے۔"

"ہم تمہاری جھوٹی باتوں کو کس طرح حقیقت سمجھ لیں؟" تارا نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے معترض لہجے میں کہا۔

"اس طرح سمجھ لو بذات۔" میں نے جملہ پورا کرتے ہی اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔

وہ تکلف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ اس کی ناک کو میں عمر کوٹ والے ہول میں بھی خاصی اذیت سے دوچار کر چکا تھا۔ وہ جڑے سمجھتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"وہ جان! ایک مرتبہ میں اس مصیبت سے نکل آؤں پھر تمہیں بتاؤں گا کہ تکلیف اور اذیت کیا ہوتی ہے۔ تم نے ہمارے اسٹائل کا ابھی مزہ نہیں چکھا۔"

"اوئے کسی رستم خان کی اولاد۔" میں نے اسے گھورا "کل سہ پیر سے تو میں تمہارے مختلف اسٹائلز دیکھتا آ رہا ہوں۔ تم ہر اسٹائل میں پینے کی دھمکی دیتے ہو پھر خود پٹنا شروع ہو جاتے ہو۔ تم نے تو مارشل آرٹس کی ناک کٹوا دی ہے۔"

"میں نے تمہارا توقف کرتے ہوئے اس کو ناک کی "میں تمہارے میزبان چھوڑا، سامنے سے بڑی اہم باتیں کر رہا ہوں۔ اگر اب تم نے ہماری گفتگو میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو مارشل آرٹس کی ساری بے توقیری کا بدلہ لے لوں گا۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟" میں نے اس کی مضبوط ناک پر ایک چٹکی بھری اور مضحکہ خیز انداز میں کہا "تم نے اپنی سچ حرکتوں سے ان فنون کی ناک کٹوائی ہے، میں عملی طور پر تمہاری یہ پکڑا ناک کاٹ کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ جانتے ہو، مومن سے ہاتھ پر؟" وہ غصے کو اپنے معدے میں اتارتے ہوئے کینہ تو نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "اسی ہاتھ پر جس کی کنی کی ہڈی سے کڑا کے کی صدا بلند ہو تھی!"

پھر میں دوبارہ ڈیرا اکبر سومو کی جانب متوجہ ہو گیا "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ تم نے منگل سنگھ کی مدد سے ممتاز کو اغوا کر دیا۔" مغویہ کے ماموں کی کارروائی پر پولیس نے ڈاکوؤں کے ڈیرے پر چھاپا مارا تو منگل سنگھ اپنے ساتھی گندا

سنگھ کے ہمراہ مغویہ سمیت تمہارے پاس عمر کوٹ پہنچ گیا۔" سا احتجاج کیا "میرا اغوا اور منگل سنگھ وغیرہ سے کوئی تعلق اس موقع پر ڈیرے نے کچھ کتنا چاہا تو میرا ہاتھ میکانیکی نہیں۔ ڈی ایس پی مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس علاقے انداز میں اس گئے زخمی بازو کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ نے دار سے بھی میری واقفیت ہے۔ کوئی تمہاری بات ہونٹ کھٹنے سے پہلے ہی بند ہو گئے۔ میں نے زہر لب کاقین نہیں کرے گا۔"

مکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "یقین اس کی بات کا کیا جائے گا جس کی کمائی میں جان "پولیس کی سرگرمیاں جب عمر کوٹ تک پہنچیں تو تم ہوگی۔" میں نے اپنے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجاتے نے اپنی بچت کے لیے مغویہ کو عمر کوٹ سے میز پر خاص منتقل ہوئے کہا "اور میری کمائی بہر حال تمہاری کمائی سے زیادہ کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن عین موقع پر تمہیں اطلاع ملی کہ طاقت ور ہے کیونکہ میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو ڈاکوؤں شادی بیٹی سے آگے پولیس نے ناک لگایا ہے۔ اس لیے تم نے کے چنگل سے چھڑایا ہے!"

اپنے ڈاکوؤں کو نوپوتا فورڈ کیل ڈرائیو پیپ میں عمر کوٹ سے میرے آخری جملے پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل سا مارو کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ سامرو سے آگے بچا راستہ استعمال کر کے میز پر خاص میں داخل ہو جائیں۔ "منگل سنگھ کی قید سے چھڑایا ہے؟" "کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟" میں نے مصنوعی ہونے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "کمائیاں اسی طرح جنم لیتی ہیں۔ تم نے بھی تو ہم سے منسوب کر کے قتل و غارت گری کی ایک جھوٹی کمائی تیار کی تھی جس کے نتیجے میں تم ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے تاکہ ہماری باقی کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے۔ کیا وہ کم خطرناک کمائی تھی۔ تو تمہارا ادھار لوٹا رہا ہوں۔ اور کمائی تو ابھی جاری ہے، غور سے سننے جاؤ۔"

وہ سننے پر مجبور تھا اس لیے ہم تن گوش رہا۔ میں نے کہا "پھر تمہیں خبر ملی کہ ہم ناکے پر پکڑے گئے ہیں۔ تم نے ڈارے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے شادی جلی کا رخ کیا۔ اس طرح تم ایک تیرے کٹی شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف تم پولیس کو اپنے معاملات میں الجھا کر منگل سنگھ وغیرہ کو بحفاظت نکل بھاگنے کا موقع دینا چاہتے تھے اور دوسری جانب ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ڈی ایس پی تمہاری بات پر یقین کر کے ہمارے لیے بے شمار مشکلات کھڑی کر دیتا تھا۔ تمہاری چال کامیاب نہ ہو سکی۔ ڈی ایس پی کی رہائش پر ہمارا پلہ بھاری رہا اور ہم وہاں سے یہ حفاظت نکل آئے۔ تاہم ازاں بعد تم نے ایک نئی چال کے تحت ڈی ایس پی کے کان بھر کر ہمیں خطرناک قاتل بنانے کی کوشش کی۔ اور تمہاری یہ کوشش بھی پوری ہوئی نظر نہیں آ رہی۔"

اس وقت تم جن حالات کا شکار ہو اور جس حالت میں قاضی سلطان کی حوٹی پینچنے والے ہو، اس کے پیش نظر تمہاری کمائی قلاب اور میری کمائی ہٹ ہو جائے گی۔"

"تمہاری کمائی ہٹ کیسے ہو سکتی ہے؟" اس نے کمزور لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا "کمائی ہٹ کرنا اس کی بات کا کیا جائے گا جس کی کمائی میں جان "پولیس کی سرگرمیاں جب عمر کوٹ تک پہنچیں تو تم ہوگی۔" میں نے اپنے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجاتے نے اپنی بچت کے لیے مغویہ کو عمر کوٹ سے میز پر خاص منتقل ہوئے کہا "اور میری کمائی بہر حال تمہاری کمائی سے زیادہ کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن عین موقع پر تمہیں اطلاع ملی کہ طاقت ور ہے کیونکہ میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو ڈاکوؤں شادی بیٹی سے آگے پولیس نے ناک لگایا ہے۔ اس لیے تم نے کے چنگل سے چھڑایا ہے!"

اپنے ڈاکوؤں کو نوپوتا فورڈ کیل ڈرائیو پیپ میں عمر کوٹ سے میرے آخری جملے پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل سا مارو کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ سامرو سے آگے بچا راستہ استعمال کر کے میز پر خاص میں داخل ہو جائیں۔ "منگل سنگھ کی قید سے چھڑایا ہے؟" "کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟" میں نے مصنوعی ہونے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "کمائیاں اسی طرح جنم لیتی ہیں۔ تم نے بھی تو ہم سے منسوب کر کے قتل و غارت گری کی ایک جھوٹی کمائی تیار کی تھی جس کے نتیجے میں تم ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے تاکہ ہماری باقی کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے۔ کیا وہ کم خطرناک کمائی تھی۔ تو تمہارا ادھار لوٹا رہا ہوں۔ اور کمائی تو ابھی جاری ہے، غور سے سننے جاؤ۔"

وہ سننے پر مجبور تھا اس لیے ہم تن گوش رہا۔ میں نے کہا "پھر تمہیں خبر ملی کہ ہم ناکے پر پکڑے گئے ہیں۔ تم نے ڈارے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے شادی جلی کا رخ کیا۔ اس طرح تم ایک تیرے کٹی شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف تم پولیس کو اپنے معاملات میں الجھا کر منگل سنگھ وغیرہ کو بحفاظت نکل بھاگنے کا موقع دینا چاہتے تھے اور دوسری جانب ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ڈی ایس پی تمہاری بات پر یقین کر کے ہمارے لیے بے شمار مشکلات کھڑی کر دیتا تھا۔ تمہاری چال کامیاب نہ ہو سکی۔ ڈی ایس پی کی رہائش پر ہمارا پلہ بھاری رہا اور ہم وہاں سے یہ حفاظت نکل آئے۔ تاہم ازاں بعد تم نے ایک نئی چال کے تحت ڈی ایس پی کے کان بھر کر ہمیں خطرناک قاتل بنانے کی کوشش کی۔ اور تمہاری یہ کوشش بھی پوری ہوئی نظر نہیں آ رہی۔"

اس وقت تم جن حالات کا شکار ہو اور جس حالت میں قاضی سلطان کی حوٹی پینچنے والے ہو، اس کے پیش نظر تمہاری کمائی قلاب اور میری کمائی ہٹ ہو جائے گی۔"

## نمائندہ ماہرین طب کی آراء کی روشنی میں مزید کردہ کتاب



قیمت 45 روپے ❖ ڈاک خرچ 23 روپے

مٹاپا..... دل سے دشمنی  
مٹاپا..... زندگی کا خاتمہ

کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں  
آپ کے ساتھ نہ ہوں۔  
تو پھر جلدی کیجئے.....

### حصہ اول: مزید کردہ کتاب

”مٹاپا اور اس کا سدباب“ کا مطالعہ ضرور  
کیجئے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس  
پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول  
جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پوسٹل آرڈر  
ڈرافٹ یا کارڈز چیک ارسال کریں



63-C II فزیکس ڈیپارٹمنٹ D.H.A. میں روڈ کی ڈرافٹ

میں نے خواب کا لہجہ میں کہا ”جو شخص الٹی ہوئی گاڑی  
کو سیدھا کر سکتا ہے اس کے لیے سیدھی گاڑی کو الٹا نہ کرنا  
مافوق الفطرت کام ہے!“

”ہاں تو تمہاری جسمانی طاقت کام آئی تھی۔“ تارا نے  
کہا ”میں نے سنا ہے“ شاؤنٹن نیپل میں تم نے وزنی اشیاء  
فانے کی بہت ریکش کی ہے مگر اتنے فاصلے سے تم اس  
بدیہالی کس کو کیسے الٹا سکتے ہو؟“

میں نے ایک ٹرائل کی سی کیفیت میں کہا ”تمہاری  
مطلوبات انتہائی ناقص اور تمہاری سوچ بے حد لاغر ہے۔  
نہیں ایک طویل عرصے تک کسی نفسیاتی اسپتال میں اپنا  
علاج کروانا چاہیے۔ میں نے تمہاری ہائی کلس کو جسمانی  
فائت سے سیدھا نہیں کیا تھا۔“

”پھر تم نے کون سی صلاحیت آزمائی تھی؟“ وہ ہونٹوں  
کی طرح منہ کھول کر میرا منہ کھینکے گا۔

میں نے کہا ”یہ باریک بات تمہاری موتی عقل میں نہیں  
آئے گی۔ تم خواخواہ اپنے دماغ کو تھکانے کی کوشش نہ کرو۔  
پلے ہی تمہارے سر پرست سی چوٹیں اچھکی ہیں اور تم نہیں  
باتنے آئندہ ان چوٹوں کا اسکور کیا ہوگا۔“

اس نے مجھے گھورنے پر اکٹفا کیا۔ کچھ بولتا تو سراسر  
گھائے میں رہتا۔

میں نے دانت تارا کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر  
میں چاہتا تو ”جی“ کی قوت اور اس کی کرشمہ کاریوں پر اسے  
ایک طویل لیچر دے سکتا تھا مگر میں خواخواہ اس قوت کو اپنے  
دشمنوں کی موجودگی میں زیر بحث نہیں لانا چاہتا تھا۔ مخالفین  
سے اپنے گن چھپا کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے!

یہ حقیقت ہے کہ میں نے الٹی ہوئی ٹویٹا ہائی کلس کو  
”جی“ کی قوت کے طفیل سیدھا کیا تھا ورنہ جسمانی قوت کے  
بے تن تھادہ کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے  
کہ اس سیدھی گاڑی کو چھوٹے بغیر دور بیٹھے بیٹھے بھی اٹایا  
جاسکتا تھا۔ اور وہ بھی ”جی“ ہی کی مدد سے۔ ”جی“ بڑی  
نیرت انگیز اور پر اسرار قوت ہے۔ اس کے منتی کے لیے

فاصلے کی کوئی قید نہیں۔ وہ دنیا کے ایک حصے میں بیٹھ کر  
”دوسرے حصے میں واقعات وقوع پذیر کر سکتا ہے۔ میں ”جی“  
کے منتی کی بات کر رہا تھا۔ اس درجے پر پہنچنے کے لیے کڑی  
رباضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے کسی بھی فن کی انتہا تک  
پہنچنا آسان کام نہیں۔ میں بہر حال اس فن کا منتی نہیں تھا۔  
میں اپنے ہی ماحول میں ”چھو کر اور چیزوں کو چھوئے بغیر  
واقعات تخلیق کر سکتا تھا۔ ویسے شاؤنٹن نیپل میں ماسٹر بینگ

تمہارے ڈاکوؤں سے چھڑایا ہے؟“

”تم قاضی سلطان کے آدمی کیسے ہو سکتے ہو؟“

”کیوں“ اس میں کیا خرابی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ جڑ بڑ ہوتے ہوئے بولا ”تم تو اپنی ساتھی دھو  
(ماصل) کے ہمراہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں  
داخل ہوئے ہو۔ تمہارا نام وجدان ہے میں ڈی ایف میں لی کو  
تمہاری اصلیت پتا چکا ہوں۔ تم پر انڈین ایجنٹ ہونے کا شبہ  
کیا جا رہا ہے۔ تمہارے نام وجدان سے بھی یہ واضح نہیں  
ہو تا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان!“

”تم تو میری حقیقت بلکہ اصلیت سے واقف ہو تا؟“ میں  
نے اس کی آنکھوں میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا ”تمہارے  
اس مہمان تارا اور اس دوست چوہدری نواز علی نے  
تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں“ تم قاضی سلطان کے آدمی  
نہیں ہو سکتے۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا ”تم  
خواخواہ اپنی شخصیت کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کر رہے ہو!“

میں نے کہا ”میں بندہ صرف خدا کا ہوں“ آدمی کسی کا  
بھی ہو سکتا ہوں اور کان کھول کر سن لو۔ میری تندرست اور  
توانا کمائی کے مطابق میں قاضی سلطان کا آدمی ہوں۔ میرٹش  
میرا ساتھی ہے ہم دونوں نے ممتاز کو ”ڈاکوؤں سے  
زبردست مقابلہ کر کے حاصل کیا ہے۔ ہم ”سامارو“ کے  
قریب پہنچے ہی والے تھے کہ تم ٹویٹا ہائی کلس میں ہماری راہ  
روکنے آئے۔ ہمارے درمیان ایک زبردست معرکہ ہوا  
جس کی یادگار کے طور پر تم دونوں کا ایک ایک بازو شدید زخمی  
ہو گیا۔ تمہاری رف ڈرائیونگ کی وجہ سے تمہارا گارڈ گاڑی  
الٹنے کے باعث ہلاک ہو گیا۔ بہر حال میں نے تم دونوں کو  
اپنی گاڑی میں ڈال کر قاضی سلطان کے پاس پہنچا دیا۔ دی  
ایڈ! گو! یہ کمائی کیسی ہے؟“

”مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ  
ہنسی سے بولا۔

میں نے اس کے مجروح بازو کو یک تک دیکھتے ہوئے کہا  
”مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے اور یاد رکھو جب میرا دماغ  
خراب ہوتا ہے تو میں فوراً گھاسل اعضا کی تلاش میں نکل  
جاتا ہوں۔“ میری نظریہ دستور ڈیرے کے بائیں بازو پر لگی  
تھی۔

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا ”تمہاری کمائی میں  
ٹویٹا ہائی کلس الٹ گئی تھی مگر وہ تو وہاں ریت میں سیدھی  
کھڑی ہے۔ اس کا کیا کر دو؟“

”اگر تمہارا دماغ پھر گھبرا گیا تو یہ تمہارے لیے بڑی سود مند  
بات ہوگی۔ تمہیں بیٹھے بیٹھے ایک اعلیٰ ڈگری مل جائے  
گی۔ نہ ٹویٹور سٹی جانے کا جھجھٹ اور نہ ہی موتی موتی کتابیں  
پڑھنے کی مصیبت۔“

وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تو کوفت زدہ انداز  
میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے بے لگاسا مقدمہ لگاتے ہوئے کہا۔

”چھوٹرا سائیں! شاید تم میری بات کو سمجھ نہیں پائے  
ہو۔ میں ”بی۔ ڈی“ والی ڈگری کی بات کر رہا ہوں۔ کچھ  
لوگ مذاق میں اسے ”پھرا ہوا دماغ“ بھی کہتے ہیں۔“

وہ دانت کچکا کر رہ گیا۔ اس صورت حالات سے سب  
سے زیادہ انجوائے میرٹش اور ممتاز کر رہے تھے۔ ممتاز نے  
خود کو بہت ہی سمجھ دار اور معاملہ فہم لڑکی ثابت کروا تھا۔ میں  
اس سے منسوب کر کے بھوٹی بچی کمائی سنا رہا تھا لیکن اس نے  
کسی مرطے پر مجھے ٹوٹنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دوبارہ اکبر  
سوموی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہاں تو میں تارا تھا کہ منگل سنگھ اپنے ساتھی گنڈا سنگھ  
کے ہمراہ ممتاز کو اغوا کر کے ”سامارو“ سے آگے جا رہا تھا کہ  
ریلوے کراسنگ پر قاضی سلطان کے آدمیوں سے اس کی منہ  
بھیز ہو گئی۔ زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور ڈاکوؤں کو جان  
بچانے کے لیے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ وہ ٹویٹا فرو صیل  
ڈرائیونگ کو ریلوے کراسنگ پر چھوڑ کر ٹویٹا گیارہ ہو گئے۔ قاضی  
سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو اپنی گاڑی میں سوار کرایا اور  
”نبی سر“ کی جانب روانہ ہو گئے۔ تمہارے ہاتھ ڈاکوؤں کی  
جیب اسی ریلوے کراسنگ پر کھڑی مل جائے گی۔ اس کے  
ٹائروں اور باڈی پر گولیاں کے متعدد سوراخ بھی اس کمائی کی  
سچائی کا ثبوت دیں گے۔“ میں نے خاموش ہو کر اکبر سوموی کی  
جانب دیکھا۔

”ابھی تو تم نے کہا تھا“ قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو تم  
نے ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے۔“ وہ سر کو نفی میں  
جھکتے ہوئے بولا۔ اس کی حالت دیوانوں ایسی ہو رہی تھی  
”اور اب تم بتا رہے ہو“ قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز  
کو ڈاکوؤں کی حراست سے آزاد کروایا ہے کیا یہ کوئی نئی  
کمائی ہے؟“

”یہ وہی کمائی ہے لیکن اپنی سوڈیا ہے۔“ میں نے مزہ  
لیتے ہوئے کہا ”کمائی کی یہی خاصیت ہوتی ہے کہ اس میں  
سے ہر لمحے ایک نئی کمائی جنم لیتی رہتی ہے۔“ ایک لمحے کا  
توقف کر کے میں نے کہا ”اوتے گھامز چھوٹے! تم مجھے ہی  
قاضی سلطان کا آدمی کیوں نہیں سمجھ لیتے جس نے ممتاز کو



پائی اور ان کے شاگرد ماسٹر لیشی یان نے مجھے ”جی“ کی ایڈوانس مشقوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔ جب بھی مجھے وافر مقدار میں فرصت میسر آتی، میں ان مشقوں کو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ کوئی نئی تخیل میں کی جانے والی مشق نہیں ہے۔ انسانی دماغ پر پائے جانے والے مخصوص گلیٹنڈز پر باقاعدگی سے ارتکاز توجہ کی پریکٹس کرنا ہوتی ہے۔ پینل گلیٹنڈ (PINEAL GLAND) دماغ کے سامنے والے حصے میں پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین اسے باطنی آنکھ یا تیسری آنکھ بھی کہتے ہیں۔ اس غدود کی مدد سے دماغی صلاحیت اور سوچ کی قوت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا تھا۔ گویا یہ انسانی دماغ کا (SEND) ہے۔ ایک اور اہم غدود پیچوٹری گلیٹنڈ (PITUITARY GLAND) ہے جو دماغ کے عقبی زیریں حصے پر پایا جاتا ہے۔ اس گلیٹنڈ کی مدد سے باہر کی معلومات کو اپنے دماغ تک لایا جاسکتا ہے۔ اسے آپ انسانی دماغ کا (PICK) کہہ سکتے ہیں۔ ”PICK“ اور ”SEND“ کے دو بٹنوں کو اگر استعمال کرنا آجائے تو انسان بڑا صاحب کمال ہو جاتا ہے۔ اور یہ دسترس حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا، اگر کبھی زندگی نے مہلت دی تو میں ان غدود کی مشقوں کو ضرور کروں گا۔ یہ غدود یا گلیٹنڈ زعام حالت میں انسانی جسم کے مختلف افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔

مارا کی بے بسی نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم وڈیرا سوال کرنے سے باز نہ آیا۔ اس نے پوچھا ”وچدان! ایک طرف تم کہتے ہو، قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو ڈاکوؤں کی قید سے رہائی دلائی ہے، دوسری جانب تم قاضی سلطان کے آدمیوں کی جگہ خود کو اور میر بخش کو رکھتے ہو۔ تمہاری اس من گھڑت اور جھوٹی کمائی پر کون یقین کرے گا؟“

”تم سمیت سب یقین کریں گے۔“ میں نے حتیٰ لچے میں کہا۔

”مم۔ میں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”جب پولیس والوں کے جوتے پڑیں گے تو یہ بھی ممکن ہو جائے گا پچھو پڑا سائیں!“

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”میں ڈی ایس بی صاحب کو تمہاری اصلیت بتا چکا ہوں۔“

”تم اپنے حجازی ڈی ایس بی کو میری اصلیت بتاؤ یا فرضی جراثم لگاؤ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کہا

”جب ”ایس بی“ میری کمائی کو مان لے گا تو سب کی چھٹی

ہو جائے گی۔ ایس بی، مغویہ ممتاز کا ماموں ہے اور تمہارے دشمن قاضی سلطان کا سالا ہے۔ تم نے سن رکھا ہوگا۔ ساری خدائی ایک طرف، جو رو کا بھائی ایک طرف۔ قاضی سلطان کی جو رو کا بھائی بت طاقتور ہے اسی کے احکامات پر ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ہو رہی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے مرتضیٰ ڈی ایس بی کا بھی ”صاحب“ ہے۔ وہ وہ لپٹ کر رکھ دے گا تم سب کو۔ تم ڈاکوؤں کے پشت پناہ ہو، میں اس کیس میں ”نجات دہندہ“ کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ بولو، ہم میں سے کس کی بات کو توجہ سے سنا جائے گا؟ تمہاری یا میری؟ اور کس کی بات کو رو کیا جائے گا؟ تمہاری یا میری؟“

”تم نے ایک شیطان کا دماغ پایا ہے۔“ وہ بے ساختہ میری تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا ”تمہارے ذہن نے بہت ہی خطرناک کمائی بنی ہے۔“

میں نے کہا ”ابھی کمائی فائل نہیں ہوئی۔ میں نے تو تمہیں ”دن لائن“ سنایا ہے۔ ضرورت پڑنے پر حالات کے تقاضے کے مطابق اس میں ترمیم و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور گویا گلیٹنڈ بولڈ کرنے کی کوشش کی ”وچدان! ایک بات کو تم بالکل بھولے بیٹھے ہو۔ تمہاری اس فرضی کمائی میں دھو (مصل) کا کسین ذکر نہیں ملتا۔ اس کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟“

”کچھ تجسس بھی تو رہے دو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”قاضی سلطان کی حویلی پر پہنچ کر تمہیں پائی یا تیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔“

اس موقع پر میر بخش خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے براہ راست وڈیرے پر حملہ کیا ”سائیں! اپنے وچدان صاحب اس کمائی کے لکھاری ہیں۔ وہ کسی بھی کروڑ کو ان یا آؤٹ کر سکتے ہیں۔ تم کیوں فکر میں پڑتے ہو؟“

اپنے سابق ادنیٰ غلام کی اس جرات پر وڈیرا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ بچارو کے اندر عملی طور پر میر بخش کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے زبان کا استعمال کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

”تم اپنی چوچ بند رکھو نمک حرام! تم نے ایک بہت پرانی سندھی کمائی کو بچ کر رکھا ہے۔“

”روایتی کمائیاں اور کمائیاں جی ہی ہوتی ہیں۔“ میر بخش گویا اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا ”بہت سے سچے واقعات اور حقائق کو نیچو ڈکریزے بزرگ کوئی کمادت قصہ کمائی یا روایت بناتے تھے۔“

میں نے دلچسپی لینے ہوئے وڈیرا اکبر سومو سے پوچھا ”تم سندھی روایتی کمائی کی بات کر رہے ہو؟“

”کھلاڑی اور درخت والی کمائی۔“ اس نے برا سامنے ہاتھ ہوتے ہوئے کہا ”تم بھی سونگے؟“

میں نے کہا ”سناؤ، کیا حرج ہے۔ آخر میں نے بھی تو نہیں ایک سندھی خیر کمائی سنائی ہے نا!“

”تم نے جو کچھ بیان کیا وہ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

”تمہارا بیان شروع ہو تو اندازہ لگاؤں، تم کیا فرمانے والے ہو؟“ میں نے کہا۔

اس نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد مجھے ایک سندھی پرانی روایتی کمائی سنا دی۔ وہ درخت اور کھلاڑی سے منسوب ایک کمائی تھی جس کے مطابق، ایک روز کسی نے درخت سے آکر کہا ”لوہار! دکان میں تمہارا دشمن تیار کیا جا رہا ہے۔ درخت نے پوچھا کون سا دشمن، کیا نام ہے اس کا؟ درخت کو بتایا گیا وہ دشمن لوہے کی ایک کھلاڑی ہے۔ درخت نے پوچھا کھلاڑی کو لوہے سے بنایا جا رہا ہے۔ وہ میرا کیا گاڑ لے گی۔ مجھے کھلاڑی کی پورا اتیں۔ کہنے والے شخص نے کہا اس کھلاڑی سے تمہیں کاٹا جائے گا۔ درخت بولا ”یہ لگن نہیں۔ تم مجھے خواہ مخواہ ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ میں کی کھلاڑی ولہاڑی سے خوف زدہ ہونے والا نہیں۔ چند روز بعد اسی شخص نے درخت کو اطلاع دی، کھلاڑی تیار ہو چکی ہے۔ بس اب تمہاری خیر نہیں۔ درخت نے کھلاڑی کی شکل و شبہات کے بارے میں استفسار کیا۔ اسے یہ معلومات بہم پہنچادی گئیں۔ درخت نے کہا، کھلاڑی کو خالص لوہے سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں لوہے سے زیادہ طاقتور ہوں۔ دو روز بعد وہ شخص پھر درخت کے پاس آیا اور اسے سندھی خیر اطلاع دی، کھلاڑی کو بچانے کے لیے اس میں دست فٹ کر دیا گیا ہے۔ درخت نے ”بچھا۔“ دست کیا ہوتا ہے؟ اسے بتایا گیا، دست کسی درخت سے کاٹی گئی ایک موٹی شاخ ہوتی ہے۔ دست کو ہاتھ میں تھام کر کھلاڑی سے وار کیا جاتا ہے۔ اب تم کتنے کے لیے تیار ہو جاؤ! درخت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور ٹکست خوردہ تراز میں بولا ”تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔ ایپ واقعی مجھے خوش میں چلا ہوا جانا چاہیے کیونکہ میرا اپنا دشمن سے جا کر لیا ہے۔ اگر درخت کی شاخ کھلاڑی کا دست نہ بنتی تو وہ دبے گا۔ کھلاڑی میرے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔“

بات ختم کرنے کے بعد وڈیرے نے نہایت ہی سنجیدگی

سے کہا ”وچدان! اگر میرے کیمپ کا آدمی میر بخش تمہارے کیمپ میں نہ چلا جاتا تو اس وقت صورت حال بہت مختلف ہوتی۔ تم اور تمہاری ساتھی میرے قدموں پر پیشانیاں رگڑ کر التجا میں کر رہے ہوتے۔“ پھر اس نے ایک ٹکست خوردہ آہ بھری اور بولا ”وقت وقت کی بات ہے۔ اس وقت تمہارا پلہ بھاری ہے۔ کل یہ موقع مجھے بھی مل سکتا ہے۔ میں اس وقت اس مخمبہ میر بخش کو بھوکے کتوں سے نچواؤں گا اور اس کی کٹی چھٹی لاش کو اپنے بنگلے کے سامنے باس پر لٹکواؤں گا تاکہ آئندہ کوئی شخص غدار کی جرات نہ کر سکے۔“

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ”تمہاری یہ ناپاک خواہش، حسرت با تمام بن جائے گی۔“

میر بخش نے کہا ”وڈیرا سائیں! ہم کنری کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ یہاں سے اپنی منزل ”نئی سر“ زیادہ دور نہیں۔ تم حوصلہ جمع رکھو۔ وہاں تمہارے ساتھ درخت اور کھلاڑی والی کمائی دہرائی جائے گی۔ تمہارے سر پر اتنے ڈنڈے برسائے جائیں گے کہ کھلاڑی کو بھول جاؤ گے۔“

ساحل نے میر بخش سے کہا ”اب تم اس بے چارے کو اتنا بھی نہ ڈراؤ کہ یہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی آخری سفر پر روانہ ہو جائے۔ آخر وہ تمہارا ”باس“ رہا ہے۔ کچھ تو لحاظ کرو۔“

ساحل کی دیکھا دیکھی ممتاز نے بھی لب کھول لیے۔ وہ ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے بولی ”میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اکبر سومو جیسے بھوتار وڈیروں سے جتنا بھی برا سلوک کیا جائے، دم کہہ یہ ایک مرتبہ میرے بابا کے پاس پہنچ جائے پھر وہ اسے مزہ چکھائیں گے۔ کیوں وچدان! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“

آخری جملہ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ادا کیا تھا اور اس کے لہجے میں خاصی بے تکلفی اور بے باکی پائی جاتی تھی۔ وہ خاصی دیر سے خاموش تھی۔ اچانک اس کے بولنے کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب اس کی حویلی بہت نزدیک آگئی تھی۔ تیسری ہم بہت جلد اس کے گھر پہنچنے والے تھے۔

میں نے ممتاز کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”بالکل بالکل۔ تمہارے بابا قاضی سلطان تو وڈیرے کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں گے اور جب انہیں میری زبانی یہ پتا چلے گا کہ تمہارے اغوا کے پیچھے اسی مردود کا ہاتھ ہے تو ان کی ”خوشی“ ہزار چند ہو جائے گی۔ وہ ایک طویل عرصے تک اس کی ”خاطر داری“ میں لگے رہیں گے۔ پھر میں نے وڈیرے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”سائیں! تمہارے تومرے آگئے۔“

گھلا کھاؤ اور جان بناؤ!"

دوڑے نے میرے منہ پر کوئی تہمت یا تنقید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے اپنا اور اپنے سہمان دوست تارا کا انجام صاف نظر آنے لگا تھا۔ دونوں نے چپ سا دھننے ہی میں عافیت جانی۔ ممکن ہے ان کا خیال ہو کہ خاموش رہ کر وہ اپنے بچاؤ کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتے ہیں۔

ہم کسری سے ہوتے ہوئے بھی سر کی جانب بڑھنے لگے تو ممتاز نے کہا "وعدہ! تھوڑی دیر پہلے دوڑے نے تمہارے بارے میں کہا تھا کہ تم نے شیطان کا دباغ پایا ہے لیکن میں یہ کسوں کی کہ تم بے حد ذہین اور معاملہ فہم ہو۔ تم نے مشکل سنگھ وغیرہ سے جس طرح مجھے آزاد کرایا ہے، وہ قابل تعریف ہے پھر دوڑے اور اس کے ساتھی تارا کو تم اب تک جس انداز میں کنٹرول کیے ہوئے ہو وہ بہت مہادری کا کام ہے۔ میں نے وہ منظر نہیں دیکھا جب تم نے ایک بھاری بھر کم الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کیا تھا لیکن میں یہ ضرور کسوں کی کہ اس کارنامے پر تمہیں ایک غیر معمولی انسان کا ٹائٹل ملنا چاہیے۔"

"تم میری تعریفوں میں اپنی توانائی صرف نہ کرو۔" میں نے کہا "میں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی ٹائٹل و اسٹیل کی ضرورت نہیں۔ جب مجھ پر کوئی وقت پڑا تو تم بھی میری مدد کرنا۔ یہ دنیا "گیو اینڈ ٹیک" کے اصول پر کام کرتی ہے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر تم واقعی ایسا سمجھتی ہو تو یہ تمہارا بڑا آپن ہے۔"

وہ میرے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی۔ سنجیدگی سے بولی "اللہ نہ کرے کہ تم پر کبھی برا وقت آئے۔ اگر خدا نخواستہ کبھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پیش آگئی تو میں جی جان سے تمہارے کام کا آؤں گی۔ تم اس مشن کے ہیرو ہو۔"

ممتاز صاحب ثروت شخص قاضی سلطان کی اکلوتی اولاد تھی، تعلیم یافتہ بھی تھی اس لیے اس میں بے پناہ اعتماد موجود تھا پھر میں نے جان پر کھیل کر اسے جس طرح مشکل سنگھ اینڈ کمپنی کے چنگل سے نکالا تھا، میرے اس عمل نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ مجھے ہیرو کا درجہ دینے لگی تھی۔ میں اس کے جذبات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ممتاز کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر سائل اچانک خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"سائل! تم کافی دیر سے چپ ہو۔ خیریت تو ہے کہیں

تمہارے منہ کا درد پھر تو نہیں جاگ اٹھا؟"

میں نے سائل کو مخاطب کیا تو دیر چوک کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ دھن کے نام سے سائل کو جانتا تھا۔ میں نے اس کے چونکنے کی پروا کیے بغیر اپنا دھیان سائل کی طرف ہی رکھا۔ اس نے کہا۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔ میں تو اس درد کو بھول ہی گئی تھی۔ واقعی۔"

اس نے حیرت بھرے انداز میں ہلہ ادا ہوا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "اگر تم خیریت سے ہو تو پھر خاموش کیوں ہو؟"

"کیا جو لوگ ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں وہ مسلسل بولتے رہتے ہیں؟" اس نے اننا مجھ سے سوال کر دیا۔

اس کے انداز میں ناراضی نہیں بلکہ شرارت چھپی تھی۔ سائل ایک شرع و چیلن لڑی تھی۔ بدھ نسل کنڈ کی عبادت گاہ میں، عارضی قیام کے دوران میں ہمارے درمیان بڑی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں۔ والدین کی موت نے اسے کچھ عرصے کے لیے دل شکستہ اور طول کر دیا تھا۔ تاہم اب اس کی فطری شوخی اور چیلن پن دھیرے دھیرے واپس آ گیا تھا۔ آج کل وہ بالکل اپنے فطری مزاج کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ صحت مند لوگ ہر وقت بولتے رہیں مگر یہ ضروری ہے کہ تم بخیریت ہونے کی صورت میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتیں۔"

"میں تو اس لیے چپ تھی کہ ممتاز تم سے بات کر رہی تھی۔"

"ہوں!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ وہ بولی "ایک وقت میں آدی ایک طرف ہی توجہ دے سکتا ہے نا! اب دیکھو میں بول رہی ہوں تو ممتاز خاموش بیٹھی ہے۔"

اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو یکھ فلاج کرنے کے لیے بڑی بر محل مثال دی تھی جس سے اس کی ذہانت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سائل بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی لیکن میں نے لاشعوری طور پر یہ محسوس کیا تھا کہ ممتاز کا بے تکلفی سے مجھ سے بات کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ممکن ہے، ایسی کوئی بات سرے سے ہی نہ ہو۔

ممتاز نے سائل کی حمایت کرتے ہوئے کہا "سائل کی دلیل معقول اور جان دار ہے۔ یہی آپ دوستگو کا تقاضا بھی ہے۔"

ممتاز نے یہ بات کہہ کر تصدیقی انداز میں گردن موڑ کر

میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں ممتاز! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

چند لمحات تک بچارو میں خاموشی رہی پھر میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟ تم نے وہاں سامارو کے نزدیک اپنے سابق آقا سے بھی خاصی "دل لگی" کی ہے۔ کہیں زخم کی تکلیف بڑھ تو نہیں گئی؟"

"ٹھیک ہے سائل۔" وہ جلدی سے بولا "تھوڑا درد ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے پوچھا "تمہیں ڈرائیونگ میں کوئی وقت تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے کہا۔

"کوئی مسئلہ ہو تو ہٹاؤ۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آجاتا ہوں۔" ان رسم خان کے بھوں سے تو جو پوچھا تھا وہ میں نے پوچھ لیا۔ "اس نے کہا "سائل! اب تو ہم "نئی سر" کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ آپ اطمینان رکھو۔ میں خیریت سے گاڑی کو ممتاز کی حوصلہ شکنی تک پہنچا دوں گا۔"

میر بخش کے تسلی بخش جواب نے مجھے مطمئن کر دیا پھر ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر گفتگو ہونے لگی۔ اس بات چیت میں ممتاز نے بھی بھر پور حصہ لیا۔

کچھ دیر بعد ہماری بچارو بی سر میں داخل ہو گئی۔

قاضی سلطان کی حوصلہ شکنی کے گیت پر مسلح محافظوں نے ہمارا "استقبال" کیا۔ وہ تعداد میں دو تھے ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک انجینی مجروح بچارو کو حوصلہ شکنی کے گیت کے سامنے رکھتے دیکھ کر ان کے چہرے تن گئے اور وہ بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی کی جانب بڑھے۔ شاید وہ ہمیں اپنا کوئی دشمن سمجھتے تھے۔

لیکن بچارو کے نزدیک پہنچنے ہی مسلح محافظوں کے چور بدل گئے۔ انہوں نے پیجزر سیٹ پر اپنی چھوٹی ناگن ممتاز کی جھلک دیکھ لی تھی۔ ان کے چہروں کے تناؤ نے حیرت آمیز خوشی کی شکل اختیار کر لی۔ وہ جیمز ڈون میں باادب "بالما حظ" ہو شمار ہو گئے۔ ممتاز اپنی جانب والی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر احکام صادر کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم حوصلہ شکنی کے اندر تھے۔

بچارو سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہماری آمد کی خبر حوصلہ شکنی کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی تھی۔ قاضی سلطان نے نفس نہیں وہاں پہنچ گیا۔ مغویہ بیٹی کو اپنی نگاہ کے سامنے دیکھ کر وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند بچارو کی طرف بڑھا۔ اس دوران

میں ممتاز اپنی جانب والا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آگئی تھی۔ فرط جذبات سے قاضی سلطان نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔

وہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ ایک ان ہونی، ہونی میں بدل گئی تھی۔ قاضی سلطان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ اس کی گمشدہ بیٹی خود بخود اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ بے خودی کے ریلے سے وہ باہر آیا تو ہماری جانب اس نے توجہ کی۔

اس دوران میں "میں" میر بخش اور سائل بچارو سے باہر نکل آئے تھے۔ البتہ وہ دونوں ابن مردود بچارو کے پچھلے حصے میں موجود تھے۔ ہم تینوں قاضی سلطان کے لیے بالکل نا آشنا تھے۔ تاہم دیرا اکبر سومرو پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ اس نے حیرت زدہ سوالیہ نظریے ممتاز کی طرف دیکھا۔ ممتاز نے کہا "بابا جانی! میں آپ کو کسب کچھ تفصیل سے بتاتی ہوں۔ پہلے ان محسنوں کو آرام سے حوصلہ شکنی میں پہنچایا جائے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے ہماری جانب اشارہ کیا۔ میں نے اور میر بخش نے آگے بڑھ کر خوش دلی سے قاضی سلطان سے مصافحہ کیا۔ سائل نے صرف سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ اس سلام سے میری مراد باقاعدہ "السلام علیکم" نہیں بلکہ آپ اسے آسانی کے لیے "آداب" یا "ہیلو ہائے" کہہ سکتے ہیں۔

قاضی سلطان نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ ہمیں عزت و احترام کے ساتھ سہمان خانے میں پہنچایا جائے۔ اس نے ایک بازو میں ممتاز کو لپیٹ رکھا تھا۔ ملازم کو ہمارے بارے میں حکم دینے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر دیرا اکبر سومرو اور تارا کی جانب ابھی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اس ابھن میں سیکڑوں سوال تھے۔

میں نے اس کی ابھن کو ایک مخصوص راہ پر ڈالتے ہوئے کہا "قاضی صاحب! ان دونوں کی حیثیت اس وقت مجرموں کی سی ہے۔ انہیں گاڑی سے نکلوا کر بحفاظت کسی محفوظ مقام پر بند کر دیا۔ ان سے بعد میں پوچھ گچھ ہوگی۔" قاضی سلطان نے اکبر سومرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو تو میں فوراً پہچان گیا۔ دشمن کو میں بھلا کیسے نہیں پہچانوں گا مگر۔" اس نے مارا کی جانب انگلی اٹھائی "مگر یہ شخص کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ اکبر سومرو کا دوست تارا ہے، کئی روز سے اس کے گھر مہمان خنہ ہوا ہے۔ دشمن کا دوست، دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس رشتے سے تارا بھی آپ کا دشمن ہے۔ ان دونوں دشمنوں کو آپ فوراً اپنی تحویل میں لے لیں۔"

”یہ دونوں یہاں کس لیے آئے ہیں؟“  
”یہ آئے نہیں، لے آئے گئے ہیں۔“ میں نے قاضی سلطان بتایا۔

اس نے پوچھا ”کس سلسلے میں؟“

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ممتاز نے اپنے باپ کا بازو کھینچے ہوئے کہا ”بابا جانی! آپ اندر چلیں۔ میں نے کمانا“ میں آپ کو پوری کمانی سنا ہی ہوں۔“  
قاضی سلطان نے متذنب نظر سے بیٹی کو دیکھا پھر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جاتے جاتے وہ اپنے ملازمین کو اکبر سومو اور مارا کے بارے میں خصوصی احکام دے گیا۔ ہماری پچانوہ جب حویلی کے اندر پہنچ کر ایک مخصوص مقام پر رکی تھی تو سب گارڈز کے علاوہ تین چار بٹے کے ملازم بھی وہاں جمع ہو گئے تھے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لیے وہ پچانوہ کی جانب بڑھے۔

جب اکبر سومو اور مارا کو پچانوہ سے باہر لایا جا رہا تھا تو وہ دونوں بڑے خوفناک انداز میں مجھے گھور رہے تھے۔ اگر اس وقت ان کا مجھ پر بس چلتا تو وہ مجھے کیا چبڑا دیتے۔ میں نے انہیں جس مضحکہ خیز انداز میں باندھا تھا وہ قاضی سلطان کے ملازمین کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے انہیں کھینچ کھانچ کر گاڑی سے باہر نکال لاتے۔ ان کے سلامت بازو ایک دوسرے کے اوپر دو ہاتھوں کے مانند بندھے تھے جو بازو آزاد تھے وہ اعضائے معطل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ دونوں اس وقت بے بسی کی انتہا سے گزر رہے تھے۔

جن دو صحت مند ملازمین نے مارا اور اکبر سومو کو پچانوہ سے باہر نکالا، ان میں سے ایک سے میں نے کہا ”سائیں!“ یہ دونوں بہت خطرناک مانو ہیں۔ ان کو بہت ہی حفاظت والی جگہ پر رکھنا۔ کہیں یہ فرار ہوئے میں کامیاب نہ ہو جائیں!“

”جو حکم سائیں!“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

دوسرے ملازم نے کہا ”سائیں!“ میں اس خطرناک بھوتار وڈیرے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کرو۔ قاضی سائیں کے دشمن کو ہم ٹھن پوائنٹ پر رکھیں گے۔ ویسے آپ ان دونوں کو جس حالت میں یہاں لائے ہو اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے یہ فرار ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ تو اپنے ٹوٹے پھوٹے بازوؤں کو حرکت دینے کے قابل بھی نہیں ہیں۔“

”پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔“ میں نے مدبرانہ انداز

میں کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ”مارا اینڈ کمپنی“ کو کسی بندی خانے میں لے جانے لگے۔

ہم تینوں قاضی سلطان کے ملازم کی رہائشی میں مروانے میں واقع ایک سبے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ اس کمرے کی وسعت اور آرائش و زیبائش سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ قاضی سلطان صاحب ثروت ہی نہیں بلکہ صاحب ذوق بھی تھا۔ اس ڈرائنگ روم کو سجانے کے لیے لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہوں گے اور مزے کی بات یہ بھی کہ وہ تمام کجاوٹ بڑے باہرانہ اور فنکارانہ انداز سے کی گئی تھی۔ رقم کو خواہ مخواہ ضائع نہیں کیا گیا تھا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان صوفوں کو دیواروں سے خاصا ہٹا کر لگایا گیا تھا۔ ہر دیوار میں بڑے سائز کی ایک کھڑی موجود تھی جس پر قیمتی رنگینی پر دے لگے نظر آرہے تھے۔ کمرے کا فرش دبیز، بیش قیمت گلدار قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ صوفوں کے آگے گلاس ٹاپ میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر لگی تصاویر سے اعلیٰ ذوقی جھلکتی تھیں۔ الغرض وہ ایک عالی شان نشست گاہ تھی جہاں بیک وقت پچاس افراد بیٹھ سکتے تھے۔

ملازم ہمیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہم پھیل کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ دیوار گیر کلاک بھی بہت آرٹسٹک اسٹائل کا تھا۔ ہم لگ بھگ پچھلے چوبیس گھنٹے سے ایمر جنی کی صورت حال سے دوچار تھے۔ اس دوران میں کہیں ڈھنگ سے ہمیں کچھ کھانا

پچان بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں نے اور ساحل نے کل دوپہر کا کھانا عمر کوٹ کے ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میری بخش ہمارے پاس آگیا تھا۔ جب سے اب تک ہمیں نہ تو آرام کا موقع ملا تھا اور نہ ہی باقاعدہ کھانا کھانے کا۔ شادی بلی کے تھانے میں اور ڈی ایس بی کے بیچلے پر صرف چائے بکٹ وغیرہ سے ہماری رسی تواضع کی گئی تھی۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ ڈی ایس بی اپنی حیرانہ نظر ہم پر لگائے بیٹھا تھا۔ میری دولت اور ساحل کے حسن و جوانی پر اس وقت ہم تینوں تھکن کے ساتھ ساتھ بھوک بھی محسوس کر رہے تھے۔ خند بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمیں پچھاڑنے کے لیے پھول رہی تھی۔ گزشتہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی ہماری آنکھ نہیں گلی تھی۔ ہم پچھلے چوبیس گھنٹے میں پیش آنے والے سستی خیز حالات کے بارے میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے کہ وہی ملازم ڈرائنگ روم میں

داخل ہوا جو ہمیں یہاں پہنچا کر گیا تھا۔ اس نے مخصوص سندھی لہجہ دلجو اختیار کرتے ہوئے خف و زار اردو میں کہا ”سائیں!“ آپ لوگ نما دو کرو کتا زہ دم ہو جاؤ۔“

میر بخش نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا ”ہمارے پاس تو پینے کے لیے اور کوئی لباس بھی نہیں ہے۔ کیا نہانے کے بعد ہم یہی میلے کپڑے دو بارہ پہنیں گے؟“

کل رات سے لے کر اب تک میر بخش اور میں خاصی ارا مارا میں مصروف رہے تھے اور ہمارے لباس اس قابل نہیں رہے تھے کہ نما دو کرو کر انہیں دوبارہ جسم پر سلیا جاتا۔

میر بخش نے سندھی میں اس ملازم سے ڈاک خانہ لایا۔ دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد میر بخش نے مجھے بتایا ”وچدان سائیں!“ ڈرائنگ روم سے تھوڑے ہی فاصلے پر مہمان خانے والا حصہ ہے جہاں مہمانوں کے قیام کے لیے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ملازم ہمیں ایک کمرے میں لے جانا چاہتا ہے۔ وہاں ہمارے لیے صاف ستھرے لباسوں کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔“

میں نے حیرت سے اس ملازم کو دیکھا اور پوچھا ”قاضی سلطان کہاں ہے؟“

”وہ حویلی کے اندر ہیں سائیں!“ اس نے بتایا۔

”اور ممتاز؟“

”چھوٹی ماگن ان کے ساتھ ہی ہیں۔“

”وچدان سائیں!“ میر بخش نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”ملازم نے بتایا ہے کہ ہم نما دو کرو فارغ ہو جائیں تو ہمارے لیے کھانا لگایا جائے گا۔ اس کے بعد ہی قاضی صاحب سے ہماری ملاقات ہوگی۔“

میں نے کندھے اچکائے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساحل اور میر بخش نے میری تقلید کی اور ہم تینوں ملازم کی پیروی میں ڈرائنگ روم سے نکل کر ان کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میر بخش نے جن کا ذکر کیا تھا۔ حویلی کا مہمان خانہ ایک ڈرائنگ روم اور چند بندہ رومز پر مشتمل تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم سے اٹھا کر کسی بندہ روم کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً میر بخش اور ساحل کا بھی یہی حال ہو گا۔ ہم تینوں حالات کی ایک ہی سستی میں سوار تھے۔ میں نے سوچا، مذکورہ کمرے میں پہنچ کر ملازم سے پانی کے بارے میں کہوں گا۔

مجھے اس ملازم سے ایک بھی لفظ نہیں کہنا پڑا۔ ہم

کمرے میں داخل ہوئے تو ایک دیوار کے ساتھ موجود ڈرائنگ ٹیبل نما میز پر مجھے بانی کا ایک بلوری جگ رکھا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی تین گلاس بھی موجود تھے۔ گلاسوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے لیے ہی وہاں رکھے گئے تھے۔ وہ جگ اور گلاس کی قیمتی امپورٹیز ڈائریٹ کا حصہ تھے۔ ان کی حفاظت اور نزاکت میں کوئی کام نہیں تھا۔

کمرے میں تھوڑے سے فاصلے پر دو بیڈ لگے تھے۔ گویا وہ ایک بندہ روم تھا جہاں دو مہمان بیک وقت قیام کر سکتے تھے۔ دیوار کے ساتھ رکھی ڈرائنگ میز کے قریب ایک صوفہ پڑا تھا۔ اس پر تین افراد یہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ملازم ہمیں بیڈ روم میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ ساحل نے ایک دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دیوار میں ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”مہیں کس بات کا یقین نہیں آ رہا؟“

”اس دور دراز علاقے میں اچھا ہاتھ روم کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔“ اس نے کہا۔

”مہیں یقین کر لینا چاہیے۔“ میں نے کہا ”یہ دروازہ واقعی ہاتھ روم کا ہے۔“ یہ بات میں نے دروازہ کھولنے کے بعد کسی تھی ”مہم کیوں بھول رہی ہو،“ گھر گاؤں میں رہنے والے کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ ایک طاقت ور شخصیت قاضی سلطان کی حویلی ہے۔“

میر بخش نے کہا ”سائیں!“ اسار پیسے کا کھیل ہے۔ جب

شارجہ جیسے ریگ زار میں سرسبز شاداب اسٹینڈیم بنایا جا سکتا ہے تو ہمارے ملحقہ ہاتھ روم کیوں نہیں بن سکتا۔ پورے سندھ میں جو لوگ دولت مند ہیں انہیں ہر قسم کی آسائشیں حاصل ہیں۔ آپ بی وی ڈراموں میں دیکھ لیں۔ جب وہ ڈیروں کی حویلیوں اور بنگلوں کے اندرونی مناظر دکھائے جاتے ہیں تو وہاں کس چیز کی نظر آتی ہے؟ اصل چیز ہے قوت خرید۔ جس کی جیب میں نوٹ ہیں، وہ بازار میں فروخت ہونے والی ہر شے کو خرید سکتا ہے۔ سندھ کے تمام ڈیروں اور صاحب حیثیت افراد نے اپنی رہائشوں کو ہر سہولت سے سجا رکھا ہے۔ ملحقہ ہاتھ روم تو عام بات ہے۔“

جس دوران میں میر بخش یہ معلوماتی یکجہ روے رہا تھا، میں نے ہاتھ روم کے اندر نگاہ ڈال کر وہاں کا سرسری جائزہ لے لیا۔ وہ ایک مکمل داش روم تھا۔ ایک جانب دیوار پر نصب کھونٹیوں پر تین جوڑے کپڑے لٹکے تھے جن میں دو مردانہ اور ایک زنانہ سوٹ تھا۔ ساحل کے لیے سندھ کا روایتی

لباس مٹایا گیا جو یقینی طور پر ممتاز کا ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کے لیے شلوار سوٹ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک بات میں نے ان کمزروں کو دیکھتے ہی محسوس کر لی اور وہ یہ کہ وہ تینوں جوڑے بالکل کورے تھے! ابھی تک انہیں کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

کمزروں کے علاوہ بھی ضرورت کی ہر شے داش روم میں موجود تھی۔ ہمارے لیے خصوصی طور پر بنے نوٹھ برش بھی وہاں رکھ دیے گئے تھے۔ یقیناً یہ سارا انتظام ممتاز کے کہنے پر کیا گیا ہوگا۔ میں نے سندھ کی روایتی مہمان نوازی کے بہت سے قصے سنے تھے، عملی مظاہرہ اب دیکھنے میں آ رہا تھا۔ میں نے میری جانب بڑھتے ہوئے کہا ”ساحل! پہلے تم فریش ہو جاؤ۔ ہم بعد میں نمائیں گے۔“

”میں پہلے ایک گلاس پانی پیوں گی۔“ وہ میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے بولی۔

میں نے جگ میں سے ایک گلاس بھر کر ساحل کی جانب بڑھا دیا۔ پانی پینے کے بعد وہ داش روم میں گھس گئی۔ میں اور میربخش اپنے خشک حلق ترک کرنے کے لیے پانی سے انصاف کرنے لگے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہم تینوں نما وھو کرتیار ہو گئے۔ ساحل کے بدن پر سندھی لباس بہت چمک رہا تھا۔ وہ لباس لمبائی کی پیمائش میں معمولی سا چھوٹا تھا۔ ممتاز کا قد پانچ فٹ دو انچ کے قریب تھا جبکہ ساحل کی ہائیت پانچ فٹ دس انچ تھی۔ تاہم اس لباس نے ساحل کے حسن کو دوہرایا کر دیا۔ میربخش تو شلوار قمیض پہننے کا عادی تھا مگر میرے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ساری زندگی پینٹ سوٹ، پینٹ شرٹ یا جینز وغیرہ استعمال کی تھی۔ مارشل آرٹس کی ٹریننگ کے دوران میں ہمیں جو یونی فارم پہننے کو دیا جاتا تھا وہ بھی خالص لوز ہوتا تھا مگر شلوار قمیض کی بات دوسری تھی۔

”مجھے تو شدید نیند آرہی ہے۔“ ساحل نے ایک طویل جمائی لیتے ہوئے کہا۔

میربخش بولا ”میں بھی بہت تھک گیا ہوں سائیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھاسل بازو کو آہستہ سے دبایا۔

جب میربخش نہانے کے لیے داش روم کا رخ کر رہا تھا تو میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے بازو کے زخم کو گھسیٹا ہونے سے بچائے۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا ”تمہارا زخم تو پانی سے بچا ہوا ہے نا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں نے کوشش تو پوری کی ہے سائیں لیکن قمیض اتارتے ہوئے مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ قمیض کا کپڑا زخم کے ساتھ چپک گیا تھا۔“

”زخم سے خون تو نہیں نکلا؟“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں سائیں! میں نے بہت احتیاط سے قمیض کا کپڑا الگ کیا ہے۔“

میں نے کہا ”بہر حال، تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگرچہ تمہارا زخم سنگین نہیں لیکن پھر بھی انفیکشن کا خطرہ موجود ہے۔ اس امکان کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ میں قاضی سلطان کے آدمی سے بات کرنا ہوں۔“

”وجدان!“ ساحل بو جھل آواز میں بولی ”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے کوئی فشر آور شے کھالی ہو۔ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی ہیں۔“

”تم ٹھیک کتنی ہو ساحل۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”کم و بیش میرا بھی یہی حال ہے۔ شدید تھکن اور بے آرامی کے بعد اگر گنگنے پانی سے ہاتھ لیا جائے تو جسم کے تمام مسل ریلیکس ہو جاتے ہیں جن میں دماغ کے مسل بھی شامل ہیں۔ ہماری کیفیات میں تو نیند اور بھوک بھی شامل ہے۔ کھانا کھالینے کے بعد تو نیند سے ہمارا برا حال ہو جائے گا۔“

”وجدان سائیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میربخش نے کہا ”جیسے ہی ہمارے خالی معدوں میں خوراک اترے گی، ہم پہلی فرصت میں سونے کی کوشش کریں گے۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے میربخش سے پوچھا ”تم نے وہ بچاس ہزار روپے والی نوٹوں کی گڈی بچاؤ کے ڈیش بورڈ سے نکالی تھی یا؟“

میں نے سوایہ انداز میں جملہ اوھو را چھوڑ دیا۔ میربخش نے کہا ”سائیں! بچاؤ میں سے میں نے کوئی بھی شے باہر نہیں نکالی۔ نہ اسلحہ اور نہ ہی رقم کی گڈی۔ سب کچھ وہیں ہے۔“

میں نے استفسار آمیز نظر سے ساحل کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی ”یہ والور وغیرہ بھی وہیں بچاؤ ہی میں ہیں۔ میں خالی ہاتھ باہر آئی تھی۔“

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”چلو“ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت ہم دوستوں میں ہیں۔ ہمیں یا ہماری کسی چیز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔“ میں نے بات ختم ہی کی تھی کہ وہی ملازم ایک مرتبہ پھر

”جھک! اس مرتبہ وہ ایک ہلکی دستک کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی اطلاع دی۔“

”سائیں! آپ لوگوں کے لیے کھانا لگادیا گیا ہے۔“

میں نے بے اختیار پوچھا ”کھانا کہاں لگایا گیا ہے؟“

”کھانے کے کمرے میں۔“ ملازم نے بتایا۔

ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ قاضی سلطان کا مہمان خانہ ایک مکمل گھر تھا۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور بیڈ رومز کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا کہ فوری طور پر اگر کسی چیز کو گرم کرنا ہو تو حویلی کے اندرونی حصے میں نہ جانا پڑے۔ وہ کچن ملٹی پزیر تھا۔

ملازم کی معیت میں ڈائننگ روم کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا ”میرا یہ ساتھی میربخش زخمی ہے۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہے۔ تم ہمیں کھانے کے کمرے میں بچا کر فوراً اپنے قاضی سائیں سے کہو کہ میرے ساتھی کی باقاعدہ مرہم پٹی کے لیے کسی ڈاکٹریا حکیم وغیرہ کو ہمارے پاس بھیجے۔“

”جو حکم سائیں!“ ملازم نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے موزانہ انداز میں کہا۔

دونوں ہاتھ جوڑکرات کرنے کا انداز اس خطے کی روایت ہے چنانچہ میں ہر کسی کو ٹوٹنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ برعکاس کی اپنی مخصوص رسوم و روایات ہوتی ہیں جو باہر سے آنے والوں کو عجیب سی لگتی ہیں مگر مقامی لوگ اس کے غلامی ہوتے ہیں اس لیے اعتراض برائے اعتراض سے لٹیڈ کی نہیں پیدا کرتا چاہیے۔ البتہ میربخش اب چونکہ میرے ساتھیوں میں شامل تھا اس لیے میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس عادت کو بھولنے کی کوشش کرے گا۔

قاضی سلطان کے مہمان خانے کا ڈائننگ روم جدیدیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک جمائی ساز ڈائننگ ٹیبل لگی تھی جس کے چاروں طرف ڈائننگ چیئرز بھی نظر آ رہی تھیں۔ اس نیم بیضی ٹیبل پر بیک وقت تیس فرا و بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ میرے کے اوپر ہمارے لیے کھانا بنایا گیا تھا۔

ملازم ہمیں ڈائننگ روم میں پہنچانے کے بعد بولا ”سائیں! آپ لوگ آرام سے کھانا کھاؤ۔ میں دروازے کے پاس باہر موجود ہوں۔ اگر کسی شے کی مزید ضرورت ہو تو آپ مجھے حکم کر دیتا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ میربخش نے سندھی میں

ملازم سے کہا ”ہم تمہیں بتا دیں گے۔“

ہم تینوں ڈرائنگ ٹیبل کے قریب پہنچ گئے۔ ساحل نے اور میں نے کرسی کھینچی تو میربخش فوراً ہماری مدد کو لپکا۔ اس کا انداز خاموش تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ کیا کر رہے ہو میربخش؟“

”سائیں! آپ دونوں آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔“

”کیا مطلب!“ میں نے چونک کر کہا ”صرف ہم دونوں ہی کیوں۔ کیا تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

ساحل بھی حیرت بھری نظر سے میربخش کو دیکھنے لگی۔ وہ ساوہ سے لہجے میں بولا ”سائیں! میں بھی کھاؤں گا مگر آپ لوگوں کے بعد۔“

”بعد میں کیوں بھی؟“

”سائیں! اچھا نہیں لگتا۔“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

میں نے انھیں زدہ لہجے میں پوچھا ”کیا اچھا نہیں لگتا؟“

”سائیں! آپ مالک ہوتے۔“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس وقت مجھے میربخش کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پناہ عقیدت جھلکتی نظر آئی۔ میں اس کے مسئلے کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے اپنا آقا سمجھ رہا تھا اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے کو شاید وہ کوئی گستاخی تصور کرتا تھا اسی لیے بچکا ہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا ”میربخش! بھرتیہ ہے کہ تم ابھی سے اپنا راستہ الگ کرلو۔“

”سائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!“ اس کا چہرہ فکر مند کی اکٹھار بن گیا ”مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوئی سائیں؟“

میں نے سنجیدگی سے کہا ”میربخش! تم ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہو رہے ہو۔“

”سائیں! اللہ سائیں کے واسطے، مجھے میری خطا بتا دیں۔“ وہ گڑگڑاتے والے لہجے میں بولا ”مجھے یاد نہیں آ رہا کہ مجھ سے کون سی کوتاہی ہوئی ہے!“

میں چند لمحات تک خاموش نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر گھبر لہجے میں کہا ”میربخش! میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا اور اب بھی تم یہ واضح کر رہا ہو۔ اگر تم نے میرے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں اپنی چاکرانہ ذہنیت کو بدلتا ہوگا۔ میں کوئی آقا ہوں اور نہ ہی تم میرے غلام۔ ہم صرف ساتھی ہیں، دوست ہیں۔ تمہاری اس قسم کی ملازمانہ حرکتیں مجھے پسند نہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا

چاہیے۔ نوکر باہر کھڑا ہے۔ اب تم وڈرا اکبر سوم کو ملازمت میں نہیں ہو بلکہ میرے ساتھیوں میں شامل ہو چکے ہو۔ اس بات کو بیشیاد رکھنا۔

”سائیں! میں جو کچھ بھی کرتا ہوں، آپ کی عقیدت میں کرتا ہوں۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔

میں نے کہا ”عقیدت کو دل میں دبا کر رکھنا چاہیے۔ اس کا اظہار کسی آزمائشی مرحلے پر کرنا چاہیے۔ دوستوں میں جتنی زیادہ بے تکلفی ہو، محبت اتنی ہی بڑھتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ تکلف علامت ہے بے گانگی کی نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ۔“

وہ محذرت خواہانہ انداز میں بولا ”معافی سائیں! آئندہ آپ کو اس سلسلے میں، میں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”وجدان!“ ساحل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”بس بہت ہو گئی۔ اب کھانے پر ٹوٹ پڑو۔ میرے پیٹ میں تو چوہے ریس لگا رہے ہیں۔“

اس موقع پر مجھے اپنی ایک آنجنابی ساتھی یاد آگئی۔ ڈاکٹر جاگی دیوی سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور بھوک کی کیفیت میں وہ اسی قسم کی بے تابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھی جیسا ساحل نے کیا تھا۔

جاگی کے خیال نے مجھے افسردہ کر دیا۔ اس لڑکی نے میری خاطر بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں، اپنا بہت کچھ قربان کیا تھا اور بالآخر ایک معرکے میں اپنی جان بھی قربان کر دی تھی۔ میری زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں جاگی دیوی خاصے نمایاں مقام پر رہی تھی۔

ساحل کا اشتہا انگیز جملہ مکمل ہوتے ہی ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ڈانٹنگ نیبل پرانوں اور اقسام کے کھانے بچے ہوئے تھے۔ وہ کسی غریب شخص کا دسترخوان نہیں تھا کہ اچانک آجائے والے مسلمانوں کی وجہ سے گھر میں افراطی تقری جج جاتی اور ہر تکلف کھانا دسترخوان تک پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قاضی سلطان اس علاقے کا ایک دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ اس کے گھر کے مہمان خانے کو دیکھ کر میں نے اس کی حیثیت کا اندازہ لگایا تھا۔ لہذا ڈانٹنگ نیبل پر نصف درجن ڈشوں کی موجودگی کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔

وہ مقامی کھانے تھے۔ ان میں سے بیشتر ڈشوں سے میں ناواقف تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ کھانے میں سندھی برائی، شامی کباب، بھیجکے کا سائیں، چکن قورمہ، چٹائی، خوابی، کاشیٹھا اور کسڑو وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ

ایک بڑی ڈش میں مٹرلاڈ بھی موجود تھا۔

میں یہ بات جانتا تھا کہ انڈیا پاک کے لوگ بہت چٹورے ہوتے ہیں۔ وہ کھانے کی اشیاء میں بہت تیز مزاج مسالے استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں تو میں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا تھا اور ایک آدھ مرتبہ تجربہ بھی۔ میں نابل کھانا کھانے کا عادی ہوں۔ نہ ہی روکا بھیکا اور نہ ہی بالکل دھواں دھار ہندوستان میں زیادہ تر فاسٹ فوڈ یا کین کنی پر گزارہ ہوتا تھا یا پھر میں ”انتہائی محفوظ“ گھریلو کھانے کا انتخاب کرتا تھا۔

میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے میر بخش سے استفسار کیا ”ان میں سب سے زیادہ محفوظ ڈش کون سی ہے؟“

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور بولا ”سائیں! یہ سب ہی محفوظ کھانے ہیں۔ قاضی سلطان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر کھا لیں۔“

یہ بات یقینی تھی کہ وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ ساحل بات کی تک پہنچ گئی۔ اس نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے میرے سوال کی وضاحت کر دی۔

”اچھا اچھا! آپ یہ پوچھ رہے تھے۔“ وہ تادم سا ہو کر بولا ”وجدان سائیں! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ مٹرلاڈ اور میٹھے پر ہی گزارہ کریں۔ ہلکے پھلکے اسپائسی کا موڈ ہو تو شامی کباب کچھ لیں۔“

ساحل کے لیے میری بہ نسبت کھانے کا مسئلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ خیال چونکہ ہندوستان سے بہت قریب ہے اس لیے وہاں بھی ایک حد تک مزاج مسالے کا استعمال ہوتا ہے۔ میں نے اس روز مٹرلاڈ اور خوابی کے میٹھے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ فروٹ کسڑو بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ملازم نے مودبانہ انداز میں دریافت کیا ”سائیں! آپ لوگ چائے پیس پیو گے یا کمرے میں؟“

ساحل نے دو ٹوک انداز میں فیصلہ سنایا ”میں تو چائے یا کافی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ اس وقت تو میری شدید خواہش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آکھ لگاؤں۔ میرے بچے ایک ایک من کے ہو چکے ہیں۔“

”سائیں! میں بھی تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ میر بخش نے دلی زبان میں کہا۔

میر بخش کے آرام کی بات سن کر مجھے اس کا زخمی کندہ یاد آگیا۔ میں نے ملازم سے پوچھا ”میں نے تم سے ایک

فوری کام بولا تھا؟“

”وہ ڈاکٹر والا کام سائیں۔“ وہ تصدیقی انداز میں مجھے کچھ لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا ”میں نے قاضی سائیں تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔“

”یعنی سائیں نے کیا کہا ہے؟“

”انہوں نے کہا ہے ڈاکٹر کا فوراً بندوبست ہو جائے گا۔ ملازم نے بتایا کہ آپ کھانے سے فارغ ہو جائیں تو ڈاکٹر کو آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ میں ابھی جا کر ان کو بتاتا ہوں کہ آپ لوگوں نے کھانا کھالیا ہے۔“

”تھک ہے۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”ہم بیڈ روم میں چلتے ہیں۔ تم قاضی سائیں سے کہو کہ ڈاکٹر کو بھیج دیں۔“

”سائیں! آپ لوگ چائے کمرے میں پیو گے نا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے کہا ”چائے صرف میں ہی پیوں گا۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا کیونکہ اس نے واضح طور پر انکار نہیں کیا تھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے چائے پینے سے صاف انکار کر دیا۔

اس ملازم کا نام فقیر علی معلوم ہوا۔ مہمان خانے والے نے میں اس کے علاوہ بھی کئی ملازم کام کرتے تھے۔ فقیر علی نے میر بخش کو پوچھا کہ لگاؤں میں نے اس سے کہا۔

”فقیر علی! قاضی سائیں سے کہنا میں فوراً ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ ”جی سائیں“ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں اب زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ممتاز اپنے والدین کے پاس پہنچ گئی تھی۔ قاضی سلطان اپنے درینہ نشین اکبر سومو سے جو بھی سلوک کرتا، مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں تو جلدی فرصت میں سندھ کے ریگ زار سے تان چھڑا کر کراچی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ آئندہ کے لیے پائونٹ برسکوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کراچی پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر ہے۔ میں وہاں آرام و سکون سے کچھ عرصہ قیام کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر نے ہمارے کمرے میں آکر میر بخش کے زخمی بازو کا معائنہ کیا۔ تار کے پینسل سے نکلنے والی اعشاریہ تین آٹھ کیلی برکی گولی نے میر بخش کو سنگین

نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ گولی میر بخش کے دائیں کندھے کو چھیتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر ساحل کا اسکارف اس کے گھائل بازو پر باندھ دیا تھا جو شادی لمبی کے پولیس والوں نے اتار دیا۔ اس وقت تک خون کا رساؤ بند ہو چکا تھا ورنہ بہت مصیبت ہو جاتی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد میر بخش کے زخمی بازو پر بڑے ماہرانہ انداز میں پیٹی باندھ دی۔ اس سے پہلے اس نے زخم کو صاف کر کے ایک اینٹی سپسک، ہیلر آئنٹ منٹ بھی لگا دی تھی۔ مرہم چسپی سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے میر بخش کو ایک اینکیشن دیا اور ایک خوراک دوا کی دیتے ہوئے بولا۔

”سائیں! اس پڑیا کو ابھی پانی سے نگل لو۔ زخم تشویشک نہیں۔ بس ایک ہی خوراک کافی ہوگی۔ ویسے میں نے احتیاطاً اینکیشن بھی لگا دیا ہے۔ دو دن کے بعد پٹی تبدیل کروالینا۔“

میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ ملازم فقیر علی نے ڈاکٹر کا ایمرضی میڈیکل باکس اٹھالیا پھر جب وہ وہاں سے جانے لگے تو میرے پوچھنے سے پہلے ہی فقیر علی نے کہا۔

”سائیں! میں نے آپ کا دوسرا پیغام بھی قاضی سائیں تک پہنچا دیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو بلائیں گے۔“

ان کے جانے کے بعد میں ڈرینگ روم ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تاکہ میر بخش کو پانی سے وہ دوا کھلا سکوں۔ میں ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے پانی لینے آیا تھا۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی پڑیا میں صرف دو گولیاں تھیں۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ ان میں ایک چن کلر اور دوسری کوئی پلینٹ ٹیبلٹ تھی۔ میں نے وہ دوا میر بخش کو کھلا دی۔

وہی ملازم ایک مرتبہ پھر ہمارے کمرے میں آیا۔ اس مرتبہ اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس ٹرے میں چائے کا گھڑاں اور تین پیالیوں کے علاوہ کچھ بکٹ اور اسپنکس بھی نظر آ رہے تھے۔ چائے کا ارادہ صرف میں نے ظاہر کیا تھا مگر ہم تینوں کے لیے بھیجی گئی تھی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پھر کیا پروگرام ہے۔ ایک پیالی ہو جائے؟“

”نہیں وجدان۔“ وہ نفی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی ”میں ایک آدھ گھنٹا سونا چاہتی ہوں۔ اس دوران میں تم قاضی سلطان سے ملاقات کرلو پھر آئندہ کا پروگرام بنائیں گے۔ میں اس ریگستان سے بہت دشت محسوس کر رہی

ہوں۔  
”ٹھیک ہے، تم آرام اور بے فکری سے سو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

میربخش بھی چائے سے انکار کر چکا تھا۔ مرہم بنی کرانے اور دو کھانے کے بعد وہ آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہو گیا تھا۔ میں اور میربخش اس وقت صوفے پر بیٹھے تھے میں نے اس کا صحت مند کندھا ہتھپتاتے ہوئے کہا۔

”تم دوسرے بیڈ پر آرام سے لیٹ جاؤ۔“ اس نے آنکھیں کھولی کر میری جانب دیکھا اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا ”سائیں! اور آپ۔“

”میں چائے پینے کے بعد قاضی سلطان سے ملنے جاؤں گا۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ”اس دوران میں تم دونوں تمورا آرام کرلو۔ پتا نہیں آئے والے صبح و شام ہمارے لیے کیا لے کر آتے ہیں!“

میربخش نے متذبذب نظروں سے بیڈ پر لیٹی ساحل کی جانب دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے۔ وہ ایک بیڈ روم میں ساحل کے ساتھ تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں دل ہی دل میں میربخش کی ساوگی آمیز معصومیت اور شرافت پر مسکرا اٹھا۔

میں نے کہا ”میربخش! میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں۔ خیر میں کوئی اور بندوبست کروا تا ہوں۔“  
”بہت مہربانی سائیں۔“ وہ ممنونیت آمیز انداز میں بولا۔

مشرق بہت عجیب و غریب دنیا ہے اور خاص طور پر ”انڈوپاک۔“ یہاں کی عورتیں اور مرد اپنی ایک مخصوص سوچ رکھتے ہیں۔ وہ ہشت ہوں یا ہشتی، ان کا انداز جدا گانہ ہے۔ یہاں کی روایات، رسوم و رواج اور طرز فکر دنیا کے کسی اور خطے سے نہیں ملتا۔

میں یہی سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ ملازم جب چائے کے برتن اٹھانے کے لیے آیا تو میں نے اس سے کہہ کر میربخش کے لیے مہمان خانے کا دوسرا بیڈ روم کھلوا دیا۔ ویسے بھی اس بیڈ روم میں صرف دو بیڈ تھے یعنی وہ کمر دو افراد کے قیام کے لیے تھا۔ میربخش نظمیت ہو کر ملازم کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے سوچا جب تک قاضی سلطان کا لاوا آتا، میں بھی ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ میں صوفے سے اٹھا اور بیڈ کی جانب قدم بوجھانے تو واش روم کے سامنے سے گزرتا ہوا۔

واش روم کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ غیر ارادی طور

پر میری نگاہ واش روم کے اندر چلی گئی۔ سامنے وہ دیوار تھی جس پر کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں نصب تھیں اور ان کھونٹیوں کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہم نے نہانے کے بعد لباس تبدیل کیے تھے اور ہمارے میلے لباس انہی کھونٹیوں پر لٹکے تھے مگر اب مجھے وہاں ایک بھی کپڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فقیر علی وہاں ان موجود ہوا۔ اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا ”سائیں! آپ کو قاضی سائیں نے بلایا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا اور فقیر علی سے پوچھا ”وہ باتھ روم میں ہمارے لیے کپڑے لٹکے تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہے کیا کسی نے وہ کپڑے وہاں سے ہٹا دیے ہیں؟“

”جی سائیں! آپ کے کپڑے دھونے کے لیے وہاں سے اتارے گئے ہیں۔“ فقیر علی نے جواب دیا ”ایک گھنٹے کے اندر آپ لوگوں کے کپڑے صاف ستھرے استری شدہ مل جائیں گے۔“

”صرف ایک گھنٹے میں؟“ میں نے حیرت سے دہرایا ”کیا اس حویلی میں کوئی نوٹیک سسٹم لانداری بھی موجود ہے؟“

وہ پتا نہیں کس حد تک میری بات کو سمجھ سکا! اس نے بتایا ”سائیں! قاضی سائیں کی حویلی میں ایک بہت بڑی واشنگ مشین ہے۔ وہ صرف کپڑے دھوتی ہی نہیں بلکہ انہیں سکھاتی بھی ہے اور اگر چاہیں تو اس میں استری کا بندوبست بھی موجود ہے۔“

میں سمجھ گیا، قاضی سلطان کی حویلی میں تھری سسٹم واشنگ مشین موجود تھی۔ میں فقیر علی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت تک ساحل نیند کی دادی میں اتر چکی تھی۔

کمرے سے باہر آکر میں نے فقیر علی سے پوچھا ”اب کس طرف جانا ہے؟“

”حویلی کے اندر سائیں۔“ اس نے بتایا۔  
”میں نے تو سن رکھا ہے، مہمانوں کو مہمان خانے تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔“ میں نے کہا ”یہ یہاں کی بہت پرانی روایت ہے۔“

وہ بولا ”آپ نے بالکل ٹھیک سن رکھا ہے سائیں مگر جو قاضی سائیں کے خاص مہمان ہوتے ہیں ان کا درجہ رشتے داروں کے برابر ہوتا ہے۔ وہ حویلی کے اندرونی حصوں میں بھی آجاسکتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے ہم قاضی سائیں کے خاص مہمان

ہیں؟“  
”بالکل سائیں! یہ بات تو حویلی کے سارے ملازموں کو معلوم ہو چکی ہے۔“ وہ بڑے احترام بھرے لہجے میں بولا ”آپ نے چھوٹی لاکھن کو پکارا قاضی سائیں پر بہت بڑا احترام لیا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ ممتاز نے اپنے باپ کو ہمارے بارے میں کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بتایا تھا جسکی ہماری یہ خاطرین ضرور سمجھ رہی تھیں۔ اس نے گزرتے ہوئے اس کمرے کے سامنے آکر کہا، قاضی سلطان سے میری ملاقات ہو رہی تھی۔

اس حویلی کو جس حد تک اندر سے دیکھ سکا اس کے لیے ایک لفظ ”شان دار“ ہی کافی ہے ملازم مجھے قاضی سلطان کے پاس پہنچا کر واپس چلا گیا۔ قاضی سلطان نے ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مصافحہ کیا اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ دوسرے صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کمرہ اپنی ساخت اور ترتیب کے لحاظ سے شگ روم تھا۔

قاضی سلطان کی عمر کچھ بھگ پچاس سال تھی۔ وہ ایک راز قامت اور پورا قار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی رنگت مانولی تھی جس میں گندم کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس نے کلف دار بے داغ سفید شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس پر نندی بلو ویسٹ کوٹ کی موجودی اس کی شخصیت کو مزید نکھار رہی تھی۔ گھٹی موٹی مونچھیں اور پوتھی ہوئی ذہانت سے معمور آنکھیں اس کی شخصیت کا خاتمہ تھیں۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی گونج وار رعب و دبدبہ پایا جاتا تھا۔ قاضی سلطان بلاشبہ ماسٹر کلاس پرستانی کا مالک تھا۔

ہمارے درمیان چند رسمی باتیں ہوئیں پھر وہ اصل موضوع کی طرف آگیا۔ کھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا ”برخوردار! اتنا کہہ کر اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ کر پوچھا ”کیا تمہیں میرا برخوردار کتنا برا تو نہیں لگا۔ اگر میرا مدازہ درست ہے تو تم میں بائیس سال سے زیادہ کے نہیں۔ اگرچہ تمہاری صحت اور جوانی تمہیں بچپن کا ظاہر کرتی ہے مگر میری تجربہ کار آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے زرب لب مسکراتے ہوئے کہا ”سائیں! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں آپ سے عمر میں آدھا بھی نہیں ہوں۔ آپ مجھے برخوردار کہہ سکتے ہیں۔“

”تم صرف برخوردار ہی نہیں بلکہ فرماں بردار بھی ہو۔“

اس نے تو صیغی انداز میں کہا۔

میں نے زرب لب مسکراتے پر اکتفا کیا۔  
وہ بولا ”وہ جان! ممتاز نے مجھے اپنے اور تمہارے احسان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے انخواہی کہانی میں سن چکا ہوں اور جس طرح تم نے اسے ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے وہ بھی میں جان چکا ہوں۔ ممتاز نے تمہارا کارنامہ تو بتا دیا لیکن وہ تمہارے اور تمہاری ساتھی ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی۔ میربخش کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہو گئی۔ وہ پہلے اکبر سومرو کا چاکر تھا، اب تمہارا وفادار ہے۔“

میں پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا، جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا ”اور اب آپ ہماری حقیقت جانا چاہتے ہیں ہماری اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں؟“  
”تم میری بات کو کوئی غلط رنگ نہ دنا۔“ وہ متحمل لہجے میں بولا ”میں صرف اس لیے تم دونوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ آئندہ کی کہانی مکمل کرنے کے لیے مجھے اس معلومات کی ضرورت ہے۔ تم دونوں میرے لیے عظیم محسنوں کی حیثیت رکھتے ہو۔ کہیں مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے تم لوگوں کی پوزیشن خراب ہو۔ آخر مجھے

## سرگوشی چھڑیے

## جیسا شروع کئے

23

25

23

25

تمہارا سرگوشی اور دیگر بری عادات سے چھٹکارا حاصل کیجئے

**اس کتاب کو پڑھنے کی خواہش ہی**

**سرگوشی چھڑانے کی پہلی کڑی ہے**

کتاب کی قیمت مع ڈاک 75 روپے

ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں

www.kitablat1970@yahoo.com



اکبر سومو سے بھی تو نمٹتا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں خود بھی اس سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا کیوں کہ ہم خود کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتے۔ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں حالات کو نیکل کریں۔“

”اسی لئے تو میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بولنے سے پہلے اپنے دماغ میں خیالات کو مجتمع کر رہا ہوں۔ قاضی سلطان پوری دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگا پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے چونکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”وجدان! تم خواجہ خواہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میں نے تمہیں بتائے بغیر تمہاری بیجارو کی تلاشی کروائی ہے اور۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا ”وہ بیجارو آپ کے دیرینہ دشمن کی ملکیت ہے۔ میں نے تو اسے

ایک نجات دہندہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔“

”اوہ!“ اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور بولا ”بہر حال، اس گاڑی کی تلاشی کے دوران ہمیں چھوٹے چھوٹے چیزیں ملیں ہیں جن میں پچاس ہزار روپے کی کلیننگ کلاشنکوفیں، ایک ریو اور اور ایک پیتول شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک بجھا ہوا موبائل فون بھی ملا ہے۔“

میں نے قاضی سلطان کی بات کے جواب میں کہا ”پچاس ہزار روپے کی رقم ہماری ہے۔ باقی اسلحہ وغیرہ اکبر سومو اور تارا کا ہے۔“ میرے گراں حوالے بات لی گئی۔

اسے ”ڈکھا“ دینے پر وہ امانت میرے پاس محفوظ ہے جب تم یہاں سے جانے لگو تو میں پچاس ہزار روپے کی گڈی تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

حقیقت یہ ہے کہ وہ رقم وڈیرا اکبر سومو کی تھی۔ کلاشنکوف میں ایک وڈیرے کے محافظ کی تھی اور دوسری اے ایس آئی عبدالرزاق سے میرے شخص نے چھینی تھی جب کہ ریو اور وڈی ایس پی کا تھا اور پیتل تارا کا۔ میں نے ننھا ننا جھوٹ دانست بولا تھا۔ اگر بعد میں بات کھل جاتی تو میں کوئی اور جواز پیش کر دیتا۔ اس وقت میں برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

مش فشان



# آتش فشان

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اسے آتش فشان بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا تھا اور انہیں "انصاف" کے ترازو میں تولنے کا خواباں تھا۔ یہی خواہش اسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن نیمپل میں فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پائوں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہو گئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا رُوپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور انہیں حرف غلط کی طرح مناتا چلا گیا۔

ظلم جبر کی فضا میں افسانے والے ایک مہر اور اہم چمکیں کچا افسانے کی لہر خیز داستان

معلومات فراہم کی تھیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ اکبر سوموند صرف ڈاکوؤں اور دیگر مجرموں کو پناہ دیتا ہے بلکہ باقاعدہ ان کی پشت پناہی بھی کرتا ہے۔ اس جیسے بھوتار وڈیرے سے کچھ بھی بعید نہیں۔ خیر، منگل سنگھ نے چند روز بعد عمر کوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانا چاہا پولیس کو بروقت پتا چل گیا اور انہوں نے شادی پٹی کے سرحدی مقام پر ناکا لگایا۔ ممتاز نے کہا کہ ڈاکوؤں کو اس ناکے کی خبر ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنا روٹ تبدیل کر کے عمر کوٹ سے "سامارو" کی جانب رخ پھیر لیا۔ وہ سامارو سے آگے ایک کیے راستے سے میرپور خاص میں داخل ہونا چاہتے تھے کہ ریلوے کراسنگ کے قریب ان کی جیب خراب ہو گئی اور یہیں سے تمہارا کردار شروع ہوتا ہے۔"

وہ ایک لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تم نے نہایت جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ممتاز کو ڈاکوؤں کے قبضے سے نکالا پھر تم اسے اپنی گاڑی یعنی وڈیرے کی بیچارہ میں اس طرف لا رہے تھے تو وڈیرا تمہارا تعاقب میں لگ گیا۔ سامارو کے نزدیک تم لوگوں میں ایک خوفناک معرکہ ہوا اور تم ان دونوں کو باندھ کر یہاں آئے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تارانا ہی اس بد معاش سے تمہاری کوئی نئی دشمنی چل رہی ہے۔ وڈیرا چون کہ اس کا

قاضی سلطان مختار نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ میں اپنے بارے میں اسے تفصیلاً بتاؤں۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سائیں! جب تک مجھے یہ پتا نہیں چلے کہ آپ کی بیٹی نے آپ کو ہمارے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے اس وقت تک میں کیا کہہ سکتا ہوں!"

وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے ہٹکا رہا پھر چھبیر آواز میں بولا "ممتاز نے مجھے بتایا کہ ڈاکو منگل سنگھ اسے اغوا کر کے کنڑی میں اپنے وڈیرے پر لے گیا تھا۔ یہ بات تو تمہارے علم میں بھی آچلی ہے کہ اس خطرناک ڈاکو نے ممتاز کی واپسی کے لیے مجھ سے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا تھا۔ بہر حال، کنڑی میں پولیس آپریشن کے بعد منگل سنگھ اپنے ایک ساتھی گنڈا سنگھ کے ساتھ ممتاز کو کنڑی سے عمر کوٹ لے گیا۔ ممتاز نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اس نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے اغوا کی واردات وڈیرا اکبر سومو کے ایمپر کی تھی۔ اکبر مجھ سے دشمنی نکالنے کے لیے ڈاکوؤں کو استعمال کر رہا تھا۔"

میں نے چونک کر قاضی سلطان کو دیکھا۔ یہ میرے لیے واقعی حیرت کی بات تھی کہ ممتاز نے اپنے باپ کو اس قسم کی

دوست ہے اس لیے وہ تمہارا بھی دشمن بن گیا ہے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا ”مگر یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ تم دونوں کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور آتا ہے تمہاری کیا دشمنی ہے؟“

میں نے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہا ”قاضی سائیں! آپ ایک جہاں دیدہ اور سرود گرم چشیدہ آدمی ہیں۔ میرے ساتھ آپ کا رویہ مشفقانہ ہے آپ ایک پر خلوص دوست کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ویسے بھی ”دوستی دشمنی“ کے بین الاقوامی اصولوں کے تحت ہم دوست ہیں کیوں کہ وزیر اکبر سومو ہم دونوں کا مشترک دشمن ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سب کچھ سچ بتا دوں تاکہ دوستی کے اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جاسکے۔ میں سندھ کی سرزمین سے اگر کچھ تلخ احساسات لے کر جا رہا ہوں تو اس کے ساتھ ساتھ میرے پاس یہاں کی شیریں یادوں کا سراپہ بھی ہونا چاہیے۔“

وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”ممتاز نے بلاوجہ تمہاری تعریف نہیں کی۔ تم اچھے دیکھتے ہی نہیں بلکہ بہت اچھا بولتے بھی ہو۔“

قاضی سلطان کے اس جملے میں غور طلب صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ ممتاز نے اپنے باپ کے سامنے میری تعریف کی تھی مگر کیوں؟ اس وقت میرا ذہن یہ سمجھی سلجھانے سے قاصر تھا۔ ممتاز حد سے بڑھ کر ہماری حمایت پر تلی ہوئی نظر آتی تھی۔ میرے حق میں اس کی وکالت بڑی معنی خیز تھی۔ میں یہی سب سوچ رہا تھا کہ قاضی سلطان کی آواز میری سماعت سے گمراہی۔

”وجدان! میں ایک بار سوخ آدمی ہوں۔ صرف اس علاقے میں نہیں بلکہ خیبر سے کراچی تک میرا اثر سوخ ہے۔ میں پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھی تمہاری ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ میری دوستی تمام تکیوں کو صاف کر دے گی۔“

قاضی سلطان کے لیے سے سچائی یقین تھی۔ میں نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تاہم اس سلسلے میں میں نے کچھ ایسی باتوں کو چھپا لیا تھا جو سرا سر میری ذاتی تھیں اور ان کے کبھی ٹھٹھانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اپنی صلاحیتیں وغیرہ۔

میری کمائی ختم ہوئی تو قاضی سلطان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا پھر جذبات سے معمور لمحے میں بولا ”آج سے تم میرے ایک سچے دوست کی طرح ہو۔“

اس کے جذبات کی سچائی اور خلوص کی گہرائی کو محسوس کر کے مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے دیکھتے ہوئے دل سے سوچا ”میں نے اتنے سچے پر خلوص اور ایثار پیش شخص سے کیوں بددع گوئی؟ مجھے وہ باتیں بھی بتا دیتا چاہیے تھیں جو میں نے دانستہ چھپائی تھیں۔ اگر قاضی سلطان کو یہ پتا چل جاتا کہ میں بے پناہ جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہوں تو کون سی قیامت آجائی۔ یا اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں سونے کا خزانہ نشتاں پاکستان آیا ہوں تو کیا وہ مجھ سے ہوتا چھین لیتا؟ ہرگز نہیں! وہ ایک صاحب ثروت شخص تھا۔ میں کچھ دیر تک اسی طرح جذباتی انداز میں سوچتا رہا پھر معتدل ہو گیا۔ میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ مناسب موقع دیکھ کر رفتہ رفتہ اسے سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن الحال تو مجھے اس تمام کٹ راک سے نکل کر کراچی پہنچنا تھا۔ یہ بات میں نے قاضی سلطان کو بڑے واضح الفاظ میں سمجھا دی تھی۔ اسے میرے کراچی جانے پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

اس نے کہا ”میں تمہیں اس کمائی سے بڑی خوبصورتی سے کٹ کر دوں گا۔ تم کل صبح جاؤ تو کراچی جا سکتے ہو۔ ویسے میں تو یہی چاہوں گا کہ تم چند روز کے لیے میرے پاس رک جاؤ تاکہ ہم ایک دوسرے کو اور اچھی طرح سمجھ لیں۔“

”زندگی رہی تو ہماری بہت جلد ملاقات ہوگی۔“ میں نے کہا ”نی الحال فوری طور پر میرا کراچی جانا ضروری ہے۔ کچھ اہم کام نمٹانے ہیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ خوش دلی سے بولا ”میں تمہیں اپنے دوست کا پتا دے دوں گا۔ وہ کراچی کا ایک معروف پبلشر ہے۔ وہاں سے شام کا اخبار نکالنا ہے۔ تم جانتے ہی ہو! اخبار کے مالک کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ کراچی میں تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔ میرا وہ دوست تمہارا ہر مسئلہ چکی بجاتے میں حل کر دے گا۔“

میں نے شکرانہ انداز میں کہا ”آپ نے تو میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔“

”دوست اور کس لیے ہوتے ہیں۔“ وہ فراخ دلی سے بولا ”جی دوستی خوشیوں کو ضرب دیتی ہے اور پریشانیوں کو تقسیم کرتی ہے۔ تم قاضی سلطان کی دوستی کو یاد کرو گے۔“

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا ”آپ نے تو بڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اس صحرائی کمائی سے آپ مجھے بڑی خوبصورتی سے کٹ کر دیں گے۔ وہ کس طرح قاضی صاحب؟“

وہ سنجیدگی سے بولا ”میری بات دھیان سے سنو وجدان!“ میں بہت تن گوش ہو گیا۔ اس نے کہا ”میں اپنے سالے کی مدد سے ممتاز کو تلاش کروا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے آدمی ممتاز کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایس لی صاحب اپنے کھجے کے توسط سے ڈاکوؤں کے قبضے سے ممتاز کو چھڑانے میں مصروف تھے! انہوں نے شادی پٹی کی سرحد پر ان کی گرفتاری کے لیے ناکا بھی لگا رکھا تھا مگر ڈاکوؤں کو بروقت خبر ہو گئی اور انہوں نے اس طرف رخ نہیں کیا۔ ڈاکوؤں کی بد قسمتی شروع ہو گئی تھی۔ وہ شادی پٹی کی طرف جاتے تو ڈی ایس بی انہیں پکڑ لیتا۔ انہوں نے روٹ تبدیل کر کے سامرا کے راستے میرپور خاص میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو میرے آدمیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ریلوے کراسنگ پر میرے آدمیوں نے ڈاکوؤں کی جیب پر فائرنگ کی۔ ڈاکوؤں کو یہ مشکل اپنی جان چا کر بھاگنا پڑا۔ وہ اپنی ”زخمی“ پیپ کو بھی وہیں مرک کے کنارے چھوڑ گئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

قتلہ ادھورا چھوڑ کر قاضی سلطان نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا ”یہ تو وہ کمائی ہے جو میں نے چھانک والے بوزے ملازم انور علی کو بچانے کے لیے گھڑی تھی۔ سرا سرفرضی کمائی!“

”میں تمہاری تیار کی ہوئی کمائی ہی استعمال کروں گا کیوں کہ تم پلاٹ بہت جان دار مٹتے ہو۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”میں فرق صرف اتنا ہو گا کہ تم کمائی میں سے ”کٹ“ ہو جاؤ گے۔ تمہاری جگہ میرے آدمی آجائیں گے جو قرب و جوار میں تن دی سے ممتاز کو تلاش کر رہے تھے۔ تم نے چھانک والے کو بھی سمجھایا تھا کہ ایک دوسری پارٹی نے فائرنگ کر کے لڑکی کو ڈاکوؤں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ سمجھ لو وہ دوسری پارٹی میرے آدمی ہی تھے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ قاضی سلطان بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”اس کے بعد کے واقعات بالکل ویسے ہی رہیں گے جیسے پیش آئے ہیں۔ پہلے کہیں تمہارا ذکر آیا ہے اور نہ بعد میں آئے گا۔ تمہاری تو ہو گئی چھٹی۔ میں نہیں جانتا وجدان اور ساحل کون ہیں!“

میں نے کہا ”مگر کچھ باتیں اب بھی ابھی ہوئی ہیں۔“ اس نے پوچھا ”مثلاً کون سی باتیں؟“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”مثلاً یہ کہ ممتاز کی واپسی آپ کے سالے ایس لی صاحب سے پوشیدہ ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی کاموں ہے اور اس کی بازیابی کے لیے چارہ جوئی میں لگا ہوا ہے۔ کیا آپ اس کے سامنے بھی میرا ذکر کول کر دیں گے۔ ایس لی کے عہدے پر فائز شخص بہت ذہین اور قابل ہوتا ہے بلکہ اسے کانیاں گننا چاہیے۔ وہ آپ کے اس جھوٹ کو پکڑ لے گا یا نہ بھی پکڑ سکا تو بعد میں یہ بات کھلنے کے امکانات بہر حال موجود ہیں۔ اس طرح آپ کی رشتہ داری میں کوئی رخنہ نہ پڑ سکتا ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا ”لیکن میں واضح کر دوں کہ میں اپنے سالے سے جھوٹ نہیں بول سکتا بلکہ تم سمجھ لو کہ میں نے تمہیں یہاں بلانے سے پہلے ایس لی صاحب سے فون پر تفصیلی بات کر لی ہے۔“

یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا ”آپ نے ایس لی صاحب کو سب کچھ سچ بتا دیا۔ میرا مطلب ہے میری کارکردگی کے بارے میں؟“

”میں نے کہا؟ میں اپنے سالے سے جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔“

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ آج رات کے کھانے پر ہمارے پاس ہوں گے۔“ قاضی سلطان نے بتایا ”انہوں نے تمہارے کارنامے کو سراہا ہے اور کہا ہے کہ وہ تمہیں ہماری ہمارے شخص سے ملے بغیر تمہیں کہیں جانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں تمہیں ان کی آمد تک اپنے پاس روک رکھوں۔“

”کہیں کوئی گزیر تو نہیں ہو جائے گی؟“ میں نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

وہ بولا ”کیسی گزیر؟“

میں نے کہا ”ایس لی صاحب ایک اعلیٰ افسر ہیں۔ وہ مجھے آسانی سے جانے نہیں دیں گے۔ اگر وہ بیانات اور گواہیوں کے چکر میں پڑ گئے تو مجھے کئی روز یہاں رکن پڑے گا۔ میرے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ میں خواہ مخواہ کے بکھیروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”میں نے انہیں تمہاری بہادری کی کمائی سنائی ہے۔“ قاضی سلطان نے کہا ”وہ رات کو جب یہاں آئیں گے تو انہیں ”کٹ والی کمائی“ بھی سنا دوں گا۔ وہ میری بات مانتے ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

میں کسی قسم کی قانونی کارروائی کے پیش نظر یہاں نہیں روکا جائے گا۔

مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے کہا ”مگر آپ اپنے سالے صاحب کو یہ نکتہ سمجھائیں تو پھر ٹھیک ہے“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے سوال کیا ”قاضی صاحب! کیا آپ ایس پی صاحب کو میری حقیقت بھی بتا دیں گے؟“

”اگر تم ایسا نہیں چاہتے تو بالکل نہیں بتاؤں گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”ہماری دوستی کا تقاضا تو یہی ہے کہ تمہارے جذبات کا میں احترام کروں۔ دوستی دراصل دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے کا ہی نام ہے۔“

”میرے، تمہارے، میں چاہتا ہوں“ اس موقع پر ایس پی صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے پھر بعد میں بھی ان سے تفصیلی بات کی جاسکتی ہے۔

”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری خوشی۔“ وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”یہ بات ابھی اپنی بیٹی سے بھی آپ نہ ہی کہیں تو اچھا ہے۔“

”ہاں“ میں سمجھ رہا ہوں۔ ممتاز اپنے ماموں کی بہت لاڈلی ہے۔ ”وہ بولا“ میں اس سلسلے میں احتیاط کروں گا۔“

میں نے قاضی سلطان سے پوچھا ”آپ ان دونوں ”سورماؤں“ کا کیا کریں گے؟“ میرا اشارہ اکبر سومرو اور تارا کی طرف تھا۔

وہ بولا ”ان میں سے ایک تمہارا دشمن ہے اور ایک میرا دشمن۔ ہم جو کچھ دوستی کے رشتے میں بندھ چکے ہیں اس لیے وہ ہمارے مشترکہ دشمن ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں مشترکہ طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔“

”مجھے تو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے حتمی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ”آپ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کریں، مجھے منظور ہے۔“

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا ”ممتاز نے مجھے بتایا ہے کہ منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ نے اکبر سومرو کے اشارے پر اسے اغوا کیا تھا اس حوالے سے وڈیرا اکبر سومرو ڈاکوؤں کا پشت پناہ یا سرغنہ ہوا۔ میں نے ایس پی صاحب کو بتایا ہے کہ جب تم نے ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑالیا تو ان کے باوا آدم اکبر سومرو نے تمہارا تعاقب کیا۔ اس سے وڈیرے کا جرم اور بھی واضح ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اکبر سومرو اور اس کے ساتھی تارا کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ باقی کے جرائم وہ خود اٹھوا لیں گے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ممتاز نے اتنے حتمی انداز میں قاضی سلطان کو کیوں بتایا کہ منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ وڈیرا اکبر سومرو کے کارندے تھے۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وڈیرے کے رویے سے میں ضرور بھانپ لیتا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ممتاز نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ وڈیرے اکبر سومرو کو چھٹانے اور ہماری پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے کمر لہا رہا تھا۔ میں نے اکبر سومرو کو ڈرانے کے لیے ایک جھوٹا کہانی اسے سنائی تھی جس کے مطابق ممتاز کے اغوا میں اس کا ہاتھ تھا۔ میں نے اکبر سومرو کو خوف زدہ کرنے اور اس کی جھوٹی کہانی کے جواب میں وہ قصہ گھڑا تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ کیا ممتاز میری باتوں کو بالکل سچ سمجھ رہی تھی اور اس نے اپنے باپ کو بھی وہی کہانی سنا دی تھی۔ ایک اور بات قابل غور تھی۔ ممتاز نے قاضی سلطان کو جو کہانی سنائی اس میں ٹیوٹا ہائی گس کے اٹنے اور اسے دوبارہ سیدھا کرنے کا ذکر نہیں تھا۔ وہ میرے اس کارنامے کو اپنے باپ سے چھپا

رہی تھی؟ میں جیسے جیسے سوچ رہا تھا، الجھتا جا رہا تھا۔ دھوری ڈکٹ سے مشابہ وہ لڑکی بڑی گہری ثابت ہو رہی تھی!

”کس سوچ میں پڑ گئے وجدان!“ قاضی سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا میرا پروگرام تمہیں پسند نہیں آیا؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کا پروگرام فل اینڈ فائل ہے۔ اس میں مجھے کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی لیکن۔“

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ قاضی سلطان نے پوچھا ”لیکن کیا وجدان؟“

میں نے کہا ”میں نے وڈیرا اکبر سومرو کی زبان کھولنے کے لیے اسے ممتاز کے حوالے سے ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ میں نے منگل سنگھ کو اس کا چیلنا گردانتے ہوئے اس پر الزام لگایا تھا کہ ممتاز کو اس کے اشارے پر اغوا کیا گیا تھا۔ کیا آپ کی بیٹی میری انہی باتوں کی بنا پر اکبر سومرو کو قصور وار ٹھہرا رہی ہے یا کوئی اور بات ہے؟“

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا ”ہمیں اس ابھرنے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ ممتاز کے اغوا میں اکبر سومرو کا ہاتھ ہے یا نہیں۔ اس وقت وہ ہمارے قبضے میں ہے اور حالات سراسر اس کی مخالفت میں جا رہے ہیں۔ ممتاز نے مجھے بچا دیں تمہاری اکبر سومرو سے ہونے والی گفتگو کے بارے

میں تصدیق دیتا ہوں۔ وہ تمہیں آٹھ دس افراد کے قتل میں ملوث کرنا چاہتا تھا، جو اب تم نے ممتاز کے اغوا کا سارا ملہ اس پر ڈال دیا۔ اب جو بھی ہو، ہماری اس فائل کہانی کے مطابق اصل مجرم وڈیرا اکبر سومرو ہی ہے البتہ اس کے کارندے منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔“

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ممتاز کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں نے دونوں ڈاکوؤں کو از خود جانے دیا تھا، وہ فرار نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات صرف میری ساتھی ساحل اور میر بخش کو معلوم تھی اور وہ دونوں بھروسے کے آدمی تھے۔

میں نے کہا ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اکبر سومرو نے ممتاز کو اغوا کروایا تھا یا نہیں۔ اس نے ممتاز جیسی درجنوں لڑکیوں کو اغوا کروایا ہو گا، لا تعداد لڑکیوں اور عورتوں کی عزتوں کو برباد کیا ہے اس نے۔ وہ ایک بھوتار وڈیرا ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ کسی نہ کسی مظلوم کی آواز ڈھکائے گی، کسی نہ کسی بے گناہ مقتول کا خون تو رنگ لائے گا۔ وہ چھری تلے آہی گیا ہے تو اسے پوری طرح ”فٹ“ کر دیتا چاہیے۔“

”تم فکر نہ کرو وجدان۔“ قاضی سلطان نے گہری سنجیدگی سے بولا ”میں اس کا بڑا مناسب ”بندوبست“ کرنے والا ہوں۔“

میں نے کہا ”قاضی صاحب! ایک بات ذہن میں رہے۔ ہم جس گاڑی میں یہاں پہنچے ہیں وہ بچاؤ وڈیرے کی ہے جب کہ ہماری فائل کہانی کے مطابق آپ کے آدمی اپنی گاڑی میں دونوں مجرموں کو ڈال کر آپ کے پاس لائے ہیں۔ وڈیرے کے ساتھ ساتھ اس کی ”وزم خوردہ“ بچاؤ کا بھی کوئی معقول بندوبست ہونا چاہیے۔“

”ہو جائے گا۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا ”ڈاکوؤں کی ٹیوٹا فور ووجیل ڈرائیو ریلوے کراسنگ پر کھڑی ہے۔ وڈیرا اکبر سومرو نے جس ٹیوٹا ہائی گس میں میرے آدمیوں کا تعاقب کیا وہ سامارو کے نزدیک صحرا میں موجود ہے۔ میرے وفادار آدمی اپنی جیب میں ممتاز اور ان دونوں مجرموں کو بٹھا کر حویلی تک لائے ہیں۔ بچاؤ بالکل آؤٹ۔ ٹھیک ہے، گاڑی اب کسی کو حویلی کے اندر یا باہر نظر نہیں آئے گی۔ تم اس سلسلے میں مطمئن ہو جاؤ۔“

میں واقعی مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد قاضی سلطان سے رخصت کے کرسمان خانے کی طرف آ گیا۔ اس وقت شام ہو چلی تھی۔ میں نے

## ڈاکٹر جی ایم نازکی شہرہ آفاق کتاب

## ازدواجی نفسیات

قیمت  
40 روپے

ڈاکٹر جی  
23 روپے

❖ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل

❖ مگنی اور آئیڈیل

❖ ازدواجی ہم آہنگی

❖ ازدواجی زندگی کا جنسی پہلو

کتاب کی قیمت بذریعہ پیسنگی ڈرافٹ

منی آرڈر یا کرسڈ چیک ارسال وائے کریں



تھوڑی دیر بعد میری بخش میرے پاس آگیا۔ وہ اپنے کندھے کے زخم میں خاصی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ میرے نزدیک صوفے پر بیٹھے ہوئے بولا "سائیں! قاضی صاحب کا ڈاکٹر تو کمال کا بندہ ہے۔ درد بالکل غائب ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا بازو زخمی ہوا ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہ ایسا جین کرا بیچکشن کا کمال ہے۔ ممکن ہے،" اٹھ دس گھنٹے بعد ہمیں ہلکا سا درد پھر سے ہونے لگا

”پھر بھی سائیں، متنازکی واپسی کے لیے ڈاکوؤں نے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔“ میر بخش نے کہا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوانے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔ میرے بخش  
ور ساحل تو ایک نیند لے چکے تھے مگر میں نے ایک لمحے کے

**10. \_\_\_\_\_**

آتش فشان ۸ حصہ ۸



”سائیں! آپ کو قاضی سائیں نے حویلی میں بلایا ہے۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”خیریت ہی ہوگی سائیں۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ مالک نے کہا، آپ کو بلا لاؤں میں آپ کے پاس آگیا۔“

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم کمرے میں چلو۔ میں قاضی سلطان کی بات سن کر آتا ہوں۔“

تھوڑے نال کے بعد وہ کمرے میں چلی گئی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ بھی میرے ساتھ حویلی کے اندر جانا چاہتی تھی مگر بدست یہ ممکن نہیں تھا اس لیے میں اکیلا ہی فقیر علی کی راہ نمائی میں قاضی سلطان کے پاس پہنچ گیا۔

قاضی سلطان نے مجھے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے سالے ایس بی کا فون آیا تھا۔ اس نے پہلے تو ذریعہ پہنچ سکنے کی محذرت کی پھر بتایا کہ کسی حکمہ جاتی مصوفیت کے باعث وہ آج پوری رات مصروف رہے گا اس لیے اب اس سے کل صبح ہی ملاقات ہو سکے گی۔ قاضی سلطان نے مزید بتایا۔

”وجدان! ایس بی صاحب نے تاکید کی ہے کہ ان کے آنے سے پہلے آپ لوگوں کو جانے نہ دیا جائے اس لیے ممکن ہے، تم لوگوں کو رخصت ہوتے ہوئے دوپہر ہو جائے۔“

میری ہنسی حس نے بتایا کہ کہیں کوئی کڑبو ہو گئی ہے۔ میں نے قاضی سلطان سے اس حوالے سے سوال کیا تو اس نے اپنی قطعی لا علی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا ”ایس بی صاحب نے اپنی محکمہ جاتی مصوفیت کے بارے میں تو کچھ بتایا ہو گا!“

”نہیں! انہوں نے کسی قسم کی تفصیل نہیں بتائی۔“ وہ بولا ”بس یہی کہا ہے کہ آج کی رات ان کا عمر کوٹ میں موجود رہنا ضروری ہے۔ اوپر سے احکام آئے ہیں۔“ پھر وہ مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ”تم کیوں پریشان ہو رہے ہو وجدان۔ کل صبح اور دوپہر میں کیا فرق ہے۔ تم دوسرے کو بھی یہاں سے نکلے تو بے آسانی شام سے پہلے کراچی پہنچ جاؤ گے اور ویسے بھی تم نے کون سا پبلک رٹھنپورٹ میں ستر کرنا ہے۔ میں یہاں سے تمہیں اپنی لینڈ کروزر میں روانہ کروں گا۔ ایک ماہر ڈرائیور اور دو مسلح گارڈز تمہارے ساتھ ہوں گے۔“ پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا ”قاضی سلطان صرف دوستی کرنا ہی نہیں بلکہ دوستی نبھانا بھی جانتا ہے۔“

”میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی شخصیت سے

دوستی ہو گئی۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”مجھے امید ہے کہ آپ میرے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔“

”پھر تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے مثال انداز میں کہا ”میں ڈی ایس بی کے بارے میں سوچ کر اچھ رہا ہوں۔ ہم نے شادی پٹی میں اس کے ساتھ جو ”شان دار سلوک“ کیا ہے۔ وہ اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارے خلاف کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا ہے۔“

میں نے اپنے اندیشے کا کھل کر اظہار کر دیا۔ قاضی سلطان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”وہ رشوت خورد عنوان ڈی ایس بی میرے سالے کے حکم کا غلام ہے۔ میں ایس بی سے کہہ کر اس کی ہر ممکن چال کو اسی پر لوٹا دوں گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا ”پھر میں بھی تو یہاں بیٹھا ہوں۔ کوئی معاملہ مجھ سے باہر تھوڑی ہے۔ تم کمرے میں جا کر آرام سے نیند پوری کرو اور اگر کسی مخصوص شے کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دو۔ یہاں تمہیں کوئی بھی کمی محسوس نہیں ہوگی۔“

اس نے ”مخصوص شے“ کے الفاظ ادا کرتے ہوئے خاصا زور استعمال کیا تھا۔ میں سمجھ گیا، اس کا اشارہ ”ڈرنکس“ کی جانب تھا۔ یہ آفراس نے مجھے اس لیے کی تھی کہ وہ میرا بے تکلف دوست بن چکا تھا مگر میں نے بڑی خوبصورتی سے اس کی پیش کش مسترد کر دیا۔

”قاضی صاحب! اس سلسلے میں تو میں محذرت چاہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”اس محذرت کی کوئی خاص وجہ؟“ اس نے خجیدگی سے پوچھا۔

”میں نے کبھی اس شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

”شاباش! وہ جو شیلے لہجے میں بولا۔“

میں نے کہا ”قاضی صاحب! شاباش کا لفظ ذومعنی ہو کر رہ گیا ہے۔ میں اسے اپنی تعریف سمجھوں یا آپ کی حیرت۔ یا پھر۔“

میں نے جملہ ادھر اچھوڑ کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

”وجدان! میں نے سچے دل سے تمہاری تعریف کی ہے۔ اگر تم نے ابھی تک اس خانہ خراب کو ہاتھ نہیں لگایا تو تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہو گا کہ آئندہ بھی کبھی اسے ہاتھ

نہ لگانا۔ اس سے دور رہنے کی کوشش کرنا کیوں کہ یہ کجگت بہت وقار دار ہے، بے انتہا محبت کرنے والی ہے۔ ایک مرتبہ کسی کا ہاتھ تھام لے تو زندگی بھر ساتھ بھائی ہے۔ اس سے چاہے جتنی بھی بے وقافی کر لو، یہ جان نہیں چھوڑتی، اس کو ایک بار اختیار کرنے کے بعد چھوڑنا ممکن نہیں۔“

”یا پون کہہ لیں کہ یہ کجگت چھوڑتی نہیں؟“ میں نے جیکھی نظر سے قاضی سلطان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شدت سے اثبات میں گردن ہلانے لگا ”ٹھیک کہہ رہے ہو، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

کچھ دیر بعد میں حویلی کے اندرونی حصے سے واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

ساحل بستر لیٹ چکی تھی تاہم وہ جاگ رہی تھی اور اس کے تیر بتاتے تھے کہ وہ باتوں کے موڈ میں ہے مگر اس وقت میری آنکھیں نیند کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں اور میں فوری طور پر سونے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے کمرے میں آکر زیر پاؤں کا بالب روشن کیا اور ٹیوب لائٹ کا بجن آف کر دیا پھر بستر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا ”لگتا ہے ابھی کا سوا مدت بعد ہی انھوں گا۔ تسکین اور نیند سے جوڑو ڈھک رہا ہے۔“

”تم نے صبح میں مم جوئی بھی تو بہت کی ہے۔“ ساحل نے تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے بستر پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت رات کے گیارہ بجتے والے تھے۔ میرے لائٹ آف کرنے سے ساحل یہ تو سمجھ گئی کہ میں سونے کے موڈ میں ہوں مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

”وجدان! تم نے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”ہم اس وقت ایک انجینی جگہ پر انجینی لوگوں کے درمیان ہیں۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولی ”ہمیں احتیاط سے کام لیتا چاہیے اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم دروازے کو اندر سے لوٹ ضرور کر لیں۔“

میں نے یہ دستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے کہا ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ قاضی سلطان سے میں نے دوستی کاغذ لی ہے۔ اس وقت ہم انجینی لوگوں میں نہیں بلکہ ایک دوست کی حویلی کے مہمان خانے میں ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔“ وہ سنجیدگی سے بولی ”بے

ٹھیک قاضی سلطان تمہارا دوست بن چکا ہے مگر ابھی دوستی کسی ایک بھی آزمائشی مرحلے سے نہیں گزری۔ ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے ہیں۔“

میں نے ساحل سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی بات محل ہونے سے پہلے ہی کہا ”ٹھیک ہے۔ تم آخر دروازے کو اندر سے کھدی لگا دو۔“

وہ خاموشی سے اٹھی اور دروازے کو بولٹ کر کے واپس بستر پر آگئی۔ میں نے کہا ”اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا ہو گا۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں تھوڑی نیند لے لوں؟“

”ضرور۔ ضرور۔“ وہ روا روئی میں بولی گئی مگر عادت کے مطابق اس نے بات بھی جاری رکھی ”وجدان! ہم کس حد تک قاضی سلطان پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟“

”ان حدود کا تعین صبح اٹھ کر کریں گے۔“ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولی ”وجدان! اس وقت ہمیں کہیں ٹھہرنے کا موقع ملا ہوا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مجھے ”جی“ کی بیداری کے لیے مخصوص مشق کے بارے میں کچھ بتا دو۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی، سوچ رہی ہوں، کچھ پریکٹس ہی کر لوں گی۔“

”تمہیں نیند اس لیے نہیں آ رہی کہ تم نے نین چار گھنٹے سو لیا ہے۔“ میں نے چمک کر کہا ”لیکن میں اس وقت نیند کی شدید طلب محسوس کر رہا ہوں۔“

”جھاٹھک ہے۔“ وہ دھنسنے والے انداز میں بولی ”تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آئی جائے گی۔“

اس کے دھنسنے کی ادا مجھے بھائی۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور کہا ”منہ کیوں پھلا رہی ہو؟“

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا!“

”تم جو بھی کرتی ہو اس سے بے خبری ہی ظاہر کرتی ہو!“

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا ”مگر تمہارا چہرہ چٹکی کھا جا تا ہے۔“

وہ اپنے چہرے کو ٹوٹتے ہوئے بولی ”پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“

”میری باتوں کو سمجھنے کے لیے چہرے کو انگلیوں سے مت ٹٹولو۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”انگلیاں بھی تمہاری ہی ہیں۔ وہ تمہیں کیا بتائیں گی۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ”آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھو۔ تمہارے چہرے کے تاثرات دل کی کمانی کھول دیں گے!“

”کس کے دل کی؟“ وہ بختے ہوئے بولی۔  
 ”تمہارے دل کی“ اور کس کے دل کی؟“ میں نے  
 ٹھہرے ہوئے لیے میں کہا۔  
 بے اختیار اس کی نظر جھک گئی۔ یہ اس کا عین فطری  
 رد عمل تھا۔

میں نے اپنے بستر سے نیچے آتے ہوئے کہا ”چی کی  
 باقاعدہ مشق کرنے کے لیے کھلی فضا کی ضرورت ہوتی ہے یا  
 پھر کوئی ایسا کمرہ ہو جس کی کھڑکی شمال کی سمت کھلتی ہو کیوں کہ  
 - مشق کے دوران میں ایک مخصوص طریقے سے برتننگ  
 کرنا ہوتی ہے جس کے لیے تازہ اور شفاف ہوا زیادہ مفید  
 رہتی ہے۔ اس مشق میں دماغ کے سیکڑ کو زیادہ سے زیادہ  
 آکسیجن ملنا چاہیے۔“

”یہ برتننگ کیا چیز ہے؟“ ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا ”برتننگ (BREATHING) دراصل  
 سانس لینے کا عمل ہے۔ اس میں سانس کھینچنا (INHALE)  
 اور سانس چھوڑنا (EXHALE) دونوں شامل ہیں۔ چی کی  
 مشق کے دوران میں یوگا کی مخصوص تکنیک سے سانس لی  
 جاتی ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور  
 کہا ”اور میرے خیال میں یہ کمرہ اس مشق کے لیے مناسب  
 ہے اور نہ ہی یہ وقت موزوں۔“

”کرا تو سمجھ میں آ رہا ہے۔“ ساحل نے کہا ”مگر وقت  
 موزوں کیوں نہیں؟“ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

اس دوران میں وہ بھی بستر چھوڑ کر نیچے آگئی تھی۔ میں  
 نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”برتننگ کے  
 لیے سب سے زیادہ مناسب، موثر اور موزوں وقت علی  
 الصبح کا ہے۔ یعنی صبح کاؤب اور صبح صادق کے درمیان کا  
 وقفہ۔ اس دوران میں فضا میں موجود آکسیجن سب سے زیادہ  
 معطر اور صاف شفاف ہوتی ہے۔ لہذا فائدہ بھی کئی گنا زیادہ  
 حاصل ہوتا ہے۔ ماسٹر یوگ پانی نے شاؤن نیپل میں مجھے  
 بتایا تھا کہ فضا میں آکسیجن کا مائیکرویل مختلف اوقات میں اپنی  
 طاقت بدلتا رہتا ہے۔ سورج کی موجودگی میں یہ بالکل نارمل  
 ہوتا ہے۔ غروب آفتاب سے صبح کاؤب تک یہ انتہائی کمزور  
 حالت میں رہتا ہے جب کہ صبح کاؤب سے صبح صادق کے  
 درمیانی وقفے میں یعنی طلوع آفتاب سے چند لمحے پہلے تک یہ  
 اپنی طاقت کے عروج پر ہوتا ہے۔ میں نے یکسری نہیں پڑھی  
 اور نہ ہی میں کوئی سائنس دان ہوں۔ میں اپنے استاد ماسٹر  
 یوگ پانی کے الفاظ تم تک پہنچا رہا ہوں۔ ویسے یہ میرا ذاتی  
 تجربہ ہے کہ صبح کاؤب اور صبح صادق کے درمیانی وقفے میں

یوگا کی مشقیں کرنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے۔ گلتا ہے کوئی  
 نہایت ہی لطیف قوت قلب و روح کو سرشار کر رہی ہو۔“ میں  
 سانس لینے کو رکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس وقت  
 تمہیں اس لیے بھی ”چی کی“ مشق نہیں کرنا چاہیے کہ کھانا  
 کھائے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری۔ کھانے کے کم از کم  
 پانچ گھنٹے بعد سانس کی مشق کرنا چاہیے۔“

ساحل خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ میں خاموش  
 ہوا تو اس نے پوچھا ”وجدان یہ شمال رخ کھڑے ہو کر مشق  
 کرنے کی کیا مصلحت ہے؟“  
 ”یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔“ میں نے کہا ”اس وقت تم  
 صرف مشق کے لیے کھڑے ہونے کا انداز سیکھ لو۔“

پھر میں نے اسے ”ہارس پوزیشن“ میں کھڑے ہونا  
 سکھایا۔ یہ ایک گھڑ سواری پوزیشن ہوتی ہے۔ جس طرح گھڑ  
 سواری کھڑے پر بیٹھا ہے بالکل اسی انداز میں پاؤں پھیلا کر  
 زمین پر کھڑے ہونا ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں پر ایک  
 مخصوص پوزیشن میں رکھا جاتا ہے۔ گھٹنوں میں ہلکا سا ٹم اور  
 کمر بالکل سیدھی، سینہ باہر کو نکلا ہوا۔

کھڑے ہونے کا یہ انداز اچھی طرح سمجھانے کے بعد  
 میں نے ساحل سے کہا ”اب میں سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی  
 جب تھک جاؤ تو سونے کی کوشش کرنا۔“

وہ میرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پریکٹس کرنے  
 لگی۔

میں نے بستر لیٹتے ہوئے کہا ”اور ہاں، ڈرنے کی کوئی  
 ضرورت نہیں۔ اس کمرے میں ہمارے لیے کئی بھیٹے  
 نقصان دہ نہیں ہے۔ خاموشی سے اپنے بستر سو جانا۔ شب بہ  
 خیر!“

پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ساحل نے کچھ نہیں  
 کہا۔ یقیناً وہ مجھے گھور کر رہ گئی ہوگی۔ میری ہدایت کا مطلب  
 وہ بہ خوبی سمجھ گئی تھی، اور عمر کوٹ کے ہوٹل میں گزارا  
 ہوئی وہ رات اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئی ہوگی جب  
 اس نے رات اور دردی آڑ میں میرا قرب حاصل کیا تھا۔

میں سونے سے پہلے ممتاز کے بارے میں سوچنے لگا۔  
 اس لڑکی نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا نام اس کی  
 شخصیت سے لگا کھاتا تھا۔ وہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں  
 خوبصورت لڑکیوں میں ممتاز نظر آنے والی ہستی تھی۔ اس کی  
 آنکھیں بولتی تھیں اور سامنے والے کو اس کے حسن کی  
 تعریف میں بولنے پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ بلاشبہ ایک ذہین اور  
 معاملہ فہم لڑکی تھی۔

ممتاز کی معاملہ فہمی اپنی جگہ لیکن اس نے اپنے بابا کو جو  
 بیان دیا تھا، اس میں سے چند باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں  
 مثلاً اس نے قاضی سلطان کو بتایا کہ ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو  
 سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اسے اکبر سوم کو اشارے پر  
 اغوا کر کے اپنے ڈیرے پر لے گئے تھے۔ میں نے پچارو میں  
 وڈیو کے کوڈز دے دھمکانے کے لیے جو بھیجی کمانی تخلیق کی  
 تھی، وہ ممتاز کے بیان سے مدد دے ہو جاتی تھی مگر میں اچھی  
 طرح جانتا ہوں کہ وڈیو اس اغوا میں ملوث نہیں تھا۔ اگر  
 ایسی کوئی بات ہوتی تو ممتاز اس کو پہلے نظر دیکھتے ہی ہمیں بتا  
 دیتی کہ مشکل تنگہ وغیرہ نے اسی کے ایما پر اغوا کی واردات کی  
 تھی جب کہ اس وقت ممتاز نے نہایت ہی تحمل سے مجھے یہ  
 بتایا تھا کہ وہ وڈیو کو اس حوالے سے جانتی ہے کہ وہ اس  
 کے بابا قاضی سلطان کا درہند دشمن ہے۔ پھر سب سے بڑی  
 بات یہ کہ وہ اکبر سوم کو دیکھ کر ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی  
 تھی۔

اس کے علاوہ بھی ممتاز کی ہمت سی ”وائس“ قابل غور  
 اور جواب طلب تھیں۔ میں نے سوچا ”مجھ ممتاز سے ضرور  
 ملاقات کروں گا تاکہ مجھے میرے سوالوں کے تسلی بخش  
 جواب مل سکیں۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے بدن کو  
 ڈھچکا چھوڑا، دو چار گہری سانس لے کر دماغ کو خیالات سے  
 خالی کیا اور یہ آہستہ پنڈ کی وادی میں اتر گیا۔  
 رات کے آخری پیرا چاکل میری آنکھ کھل گئی۔ کرا  
 ایک مخصوص مکمل میں بسا ہوا تھا۔ مجھے اپنے اوپر کسی بوجھ کا  
 احساس ہوا۔ میں بیڈ پر چٹ لیٹا تھا۔ دباؤ کے احساس نے  
 میرے ہاتھوں کو بے اختیار میرے سینے پر پھانسا دیا۔ اس کے  
 ساتھ ہی میں نے گردن اٹھا کر اس طرف دیکھا اور میرے  
 سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ ساحل میرے اوپر  
 لدی ہوئی تھی۔

میں نے اسے اپنے اوپر سے اتارنے کے لیے ہاتھوں کو  
 حرکت دی تو وہ کسمپانی اور جذبات سے پوچھل آواز میں  
 اس نے صرف اتنا کہا ”اوں ہوں۔“

اس کا انداز منع کرنے والا تھا۔ میں نے قدرے سخت  
 لہجے میں کہا ”یہ کیا کر رہی ہو ساحل!“ اس کے ساتھ ہی میں  
 نے اسے ہٹانے کے لیے زور لگایا۔

وہ اسی بخور آواز میں بولی ”میں ساحل نہیں ہوں۔“  
 ”پھر کون ہو؟“ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل  
 گیا۔

”اب پہچاننے سے بھی انکار کرو گے؟“ اس کے لہجے

میں گہری شکایت تھی۔  
 میں ایک دم سانسے میں آ گیا۔ میں نے اس آواز کو  
 پہچان لیا۔ وہ کلونی حسن کی مالک ہالیہ کی پراسرار ہنستی  
 نیلگہ کی آواز تھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ اس  
 کمرے میں جو بھیجی گئی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، وہ نیلگہ کے  
 دم قدم سے تھی۔ نیند سے اچانک بیدار ہونے کے سبب میں  
 اس کی آواز اور مخصوص مکمل کو پہچان نہیں سکا تھا۔  
 میں نے پوچھا ”تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی  
 کوشش بھی جاری رکھی مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ  
 ہستی ہالیہ کا وزن لے کر میرے اوپر سوار ہوئی ہو۔ میرے  
 سوال کے جواب میں نیلگہ نے کہا۔

”وجدان! میں نے اپنی اصل شکل و صورت میں تم سے  
 آخری ملاقات میں تمہیں بتایا تھا کہ جب بھی کوئی عورت  
 تمہاری تمنائی میں آئے گی تو میں تمہیں اس کے اندر طوں  
 گی۔ تمہارا قرب حاصل کرنے کے لیے میں یہی راستہ اپنا  
 سکتی ہوں کیوں کہ تم نے اپنا جاپ مکمل نہیں کیا اور۔۔۔ نہ  
 ہی بھی کرو گے۔“

میں نے قدرے سختی سے کہا ”ساحل تو دوسرے بستر پر  
 تھی۔ تم نے میرے قریب آنے کے لیے اس کا بدن کیوں  
 استعمال کیا؟“

”تمہیں نہیں معلوم کیوں کہ تم اس وقت گہری نیند میں  
 تھے۔ وہ پوچھل آواز میں بولی ”تم یہی سمجھتے ہو، ساحل اپنے  
 بستر پر سو رہی تھی لیکن۔۔۔“

جملہ ادھر اور چھوڑ کر وہ اپنے ہاتھوں سے میرے چہرے کو  
 ٹٹولنے لگی میرے پورے وجود میں سرسراہٹ ہونے لگی۔  
 میں عجیب صورت حال سے دوچار تھا۔ جسمانی طور پر وہ  
 سرفیض ساحل تھی مگر اس کے اندر نیلگہ بول رہی تھی۔  
 اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ساحل، نیلگہ کی آڑ میں  
 کوئی ڈراما کر رہی ہو۔ میں نیلگہ کی آواز اس کے لب و لہجہ  
 اور اس کے وجود کی مخصوص مکمل کو ہمت اچھی طرح پہچانتا  
 تھا۔

نیلگہ کے ادھر سے جملے کے جواب میں، میں نے  
 پوچھا ”لیکن کے آگے بھی تو کچھ بولو۔“

وہ اپنی انگلیوں کو باقاعدہ حرکت میں رکھتے ہوئے بولی  
 ”ساحل تھوڑی دیر پہلے اپنے بستر سے اٹھ کر تمہارے پہلو  
 میں آگئی تھی۔ شاید وہ تمہاری پیلیوں کے راستے دل میں  
 گھسنا چاہتی تھی۔“

مجھے ساحل کی اس حرکت پر غصہ تو نہیں آیا تاہم اس کے توسط سے نیلگری میرے ساتھ جو کچھ کر رہی تھی وہ میرے حواس خنک کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے فوری طور پر اس کا کوئی ستباب نہ کیا تو نیلگری مجھ پر حاوی آ جائے گی اور میں۔۔۔ اس کے سامنے جت نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے حصول کو آسان بنانا مجھے پسند نہیں رہا۔

میں نے نیلگری سے منہنے کے لیے پی کی قوت کو آزمانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ خود مجھ سے الگ ہو گئی پھر ہوا میں تیرتے ہوئے وہ جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ میں کیا کرنے والا ہوں!

”دجدان!“ اس نے شیرینی سے معمور آواز میں کہا ”تم میری اس حرکت کا برا نہ مانا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”دل کے ہاتھوں!“ میں نے تعجب کا اظہار کیا ”نیلگری! تم تو ہالہ کی ترائیوں میں بیٹے والی ایک عظیم پر اسرار قوت ہو۔ یہ دل کے معاملات۔۔۔؟“

میں نے راستہ اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لیے میں بولی ”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ایک مہمان ہفتی ہونے کے ساتھ ساتھ میں طبعاً مزاجاً اور فطرتاً ایک عورت ہوں۔ میرے شرر میں ہر وہ ایک موجود ہے جو کسی عورت میں ہو سکتا ہے۔ جب میرے سینے میں دل ہے تو دل میں جذبات بھی ہوں گے۔ جذبات ہیں تو معاملات بھی ہوں گے۔ میں انہی معاملات کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“ اس وقت وہ ایک مکمل عورت نظر آ رہی تھی۔

میں نے نرمی سے پوچھا ”مجھ سے تم کیا چاہتی ہو؟“ ”میں تم سے کچھ نہیں چاہتی بلکہ تمہیں چاہتی ہوں؟“ ”تمہاری یہ چاہت میری سمجھ سے باہر ہے نیلگری!“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”چاہت سمجھ میں آنے والی شے نہیں۔“ میں خاموشی سے اسے سامنے بیٹھی ساحل کو دیکھنے لگا جس کے اندر اس وقت نیلگری سائی ہوئی تھی۔ وہ اچانک بہت افسردہ اور طول نظر آنے لگی پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔

”دجدان! میری خواہش تھی کہ تم اپنا جاپ مکمل کر کے میرے جسم و جان کے مالک بن جاؤ۔ میں ساری زندگی ایک دایہ بن کر تمہارے چرنوں میں گزارنے کی خواہش مند

تھی مگر یہ نہیں ہو سکا اور نہ ہی ہو سکا ہے۔ پتا نہیں تم نے اتنا بھانگے کیوں ہو؟“ ”تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو نیلگری۔“ میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا ”تم سے اس قسم کی قربت سے گریز کی ایک خاص وجہ ہے۔“

وہ شاکہ انداز میں بولی ”اور وہ وجہ یہ ت۔۔۔ تم نے مجھے عورت تسلیم نہیں کیا اور اس انداز میں نہیں سوچا۔“ ”تم میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔“ میں نے اشارے میں سر ہلایا ”میں نے بیشہ تمہیں ایک مہمان ہفتی سمجھا ہے۔“ ”میں نے سوچ رکھنے والی ایک پر اسرار قوت۔ میری نظر میں تمہارا مقام بہت بلند ہے۔“

”عورت کا مقام صرف مرد کے دل میں ہوتا ہے!“ ”میں نے قدرے چڑ کر سوال کیا ”تم خود کو ایک عورت ثابت کرنے کے لیے اتنی۔۔۔ ضد کیوں ہو؟“

”اس لیے کہ میں بنیادی طور پر ایک عورت ہی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی ”میرے سوا کوئی اور عورت تمہاری قربت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جو بھی عورت حدود پھیلائے گی کو شش کرے گی پھر کر جان دے دے گی۔“

میں نے چونک کر ساحل کے اندر موجود نیلگری کو دیکھا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے لگا شاید میری سماعت نے دھوکا کھایا ہے۔ میں نے اضطرابی لہجے میں اس سے پوچھا ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو نیلگری۔ ماضی میں بہت سی لڑکیاں میری قربت میں رہی ہیں۔ میری قربت ان کے لیے ہلاکت خیز ثابت نہیں ہوئی؟“

”میں نے حدود پھیلائے کی بات کی ہے۔“ وہ اپنے لبوں پر ٹکوتی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ ”ایسا موقع تمہاری زندگی میں آج تک نہیں آیا۔ گولڈن ٹرائی ایٹنگل کے سفر کے دوران میں سونا نامی ایک لڑکی نے یہ خطرناک حدود عبور کرنے کی کوشش کی تھی مگر تم نے اپنی مضبوط قوت ارادی سے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ وہ ایک محفوظ حد تک محدود رہی تھی تاہم تمہیں آج تک اس محدودی کا بھی ملال ہے۔“ میں چٹم تصور سے وہ منظر دیکھنے لگا جب گولڈن ٹرائی ایٹنگل کی طرف جاتے ہوئے ایک ہاڑی سلسلے کے چٹائی غار میں سونا نے مجھے حاصل کرنے کے لیے اپنے جذبات کے سرش گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا تھا مگر میں نے اپنے بائیں استقامت میں جیش نہیں ہونے دی تھی۔ میں اس منظر کو سوچ کر بھر بھرا جاتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر نیلگری نے کہا ”دجدان! تم ابھی تک کورے ہو۔ تمہاری زندگی کی کتاب کا ہر پتا صاف شفاف ہے۔ جو بھی عورت اس پر اپنا نام لکھنے کی کوشش کرے گی۔ اسے جان سے جانا ہو گا۔ وہ گویا اپنے پروانہ موت پر دستخط کرے گی۔“

”کیا اس دشمنی کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہو گا؟“ میں نے دیکھتے لہجے میں دریافت کیا ”تم ہر اس عورت کو جان سے مار ڈالو گی جو میری قربت کی حدود کو پھیلائے گی کوشش کرے گی؟“ ”میں نہیں بلکہ تم اس کی جان لے لو گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مہم! میں! میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا نیلگری! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ”تم پوری دنیا کی خبر رکھتے ہو اور خود سے بے خبر ہو!“

”میں سمجھ نہیں پا رہا، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ گھبر آواز میں ٹھہر ٹھہر کر مجھے بتانے لگی ”شادولن ٹیمپل میں جب تم مارشل آرٹس کی تربیت لے رہے تھے تو ماسٹر تنگ پائی نے تمہیں اپنی نگرانی میں چند مخصوص مشقیں بھی کروائی تھیں۔ یاد کرو، مختلف پیاریوں سے محفوظ رکھنے

کے لیے تمہیں مخصوص جڑی بوٹیوں کا رس بھی پلایا گیا تھا۔ انہی بوٹیوں میں ایک ایسی جڑی بھی شامل تھی جس نے تمہیں ہر قسم کے زہر سے محفوظ کر دیا ہے۔“ وہ سانس لینے کو رکھی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”تم اس واقعے کو تو نہیں بھولے ہو گے جب گنگولی چوہدری نامی ایک ڈاکو تمہاری ساتھی لڑکی بلا کو اغوا کر کے سارکا کے جنگلات میں لے گیا تھا۔ تم نے جرات اور بہادری کو کام میں لا کر گنگولی کے قبضے سے ہلا کر چھڑا لیا۔ واپسی میں جنگل ہی میں ایک بلیک کوبرا نے تمہیں ڈس لیا تھا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا مگر وہ کوبرا مرنے لگا تھا۔“

نیلگری کی مدھر آواز مجھے تحیلات کی دنیا میں لے گئی۔ ایک ایک منظر کسی فلم کی طرح میری نگاہ کے سامنے روشن ہونے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”دجدان! سارکا ہی میں تمہاری ساتھی عورت رانی روپ متی کو خون کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ تمہارا اور روپ متی کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔ تم اس موقع پر روپ متی کو اپنا خون دینا چاہتے تھے مگر تم اس خیال سے باز رہے کیوں کہ تمہارا خون روپ متی کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا۔ راجو نامی ایک غریب شخص نے روپ متی کو اپنا خون دیا

## جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت



قیمت فی حصہ 60 روپے  
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

کتابی صورت  
(گیارہ حصوں میں)  
تیار ہے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت 600 روپے ڈاک خرچ معاف



نیگلی ہے درپے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔  
واقعی اس طرف کبھی میرا دھیان نہیں گیا تھا کہ میں ایک  
خطرناک آدمی بن چکا ہوں۔ ایسا سوچتے ہوئے میں اپنے وجود  
میں سنسنیات محسوس کرنے لگا۔

نیلکی میرے چہرے کے تاثرات سے محفوظ ہوتے ہوئے بولی "تکلو قبیلے میں شیڈاگ نامی ایک بد معاش سے تمہاری ٹھن گئی تھی۔ شیڈاگ نے تمہاری برتری ماننے کے لیے تمہیں ایک آزمائش سے گزارا تھا۔ کیا تم دو شاخہ زبان والے نلے کو برے کا تجربہ بھی بھول گئے۔ یہ تو ابھی تمہوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"

”مجھے یاد ہے، سب کچھ یاد ہے“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا، ”مگر کبھی میں نے اس بارے میں غور نہیں کیا تھا۔“

وہ ایک ادائے دل ربانی سے بولی "اس" لے تو میں  
تمہیں غور و فکر کا موقع دے رہی ہوں۔ تم سوچو جب تمہارا  
خون کسی دوسرے انسان کے جسم میں پہنچ کر اس کی جان لے  
سکتا ہے اور خطرناک سانپ تمہیں ڈٹے ہی ہلاک ہو جاتا ہے  
تو پھر تمہاری قربت کی نازک حدود کو پھلانگنے والی عزت کا  
کھا حش ہو گا؟

ٹینگلی کا یہ سوال سن کر میرے روٹنے لگے ہو گئے۔  
میں اس کی بات کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس نے  
ایک حقیقت بیان کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک  
کسی انسان کی جان لینے کا ذمہ دار نہیں اٹھا تھا۔ ٹینگلی  
کے اعترافات نے میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی  
تھی۔

”ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا  
”نیگلہ! ایک بات تو بتاؤ۔ ہماری پہلی ملاقات کھٹمنو کے  
رہتا پارک میں ہوئی تھی اور میں تمہارے کمرشل کے مجسمے کو  
اٹھا کر اپنی ایک دوست نرس ماما متی کے گھر لے گیا تھا۔ اس  
سے پہلے ہم کہیں نہیں ملے تھے مگر تم کو میری زندگی میں پیش  
آنے والے اس سے پہلے کے واقعات کو بھی جانتی ہو۔ میں  
نے تو کبھی تم سے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ تمہاری  
معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟“

”مجھے ایک مہمان بخشنی بھی مانتے ہو اور میرے ذرا ان پر بات بھی کرتے ہو۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی ”میں تو تمہیں وہاں تک جان گئی ہوں جب تم صرف دو ماہ کی عمر کے تھے اور اپنی ماں مختلفہ کا دودھ پیتے ہوئے پاکستان سے سنگاپور پہنچے

تھے۔“ وھوئس میں آکر ڈاکوئس اور ممتاز والی حقیقت اسے بتادی  
میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اور کہا ”ننگلری! تم تو بڑے ہے ڈی ایس پی اگرچہ مغویہ کے ماموں سے جو نیز ہے مگر وہ  
خطرناک باتیں کر رہی ہو!“  
”جس کو اپنے من میں رسالیں اس کے بارے میں پوری اپروچ کر کے کمانی الٹ دی ہے اس نے ڈی آئی جی کو بتایا  
جاگکاری تو رکھنا ہی پڑتی ہے نا!“ ساحل کے اندر موجوں ہے کہ تم لوگ ڈاکوئس کے ساتھی ہو۔ تم پر بھاری ایجنٹ  
ننگلری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے اس سے پوچھا ”ساحل کو کب آزاد کر دلی؟“  
 ”یہ نام تم نے خوب رکھا ہے، مجھے پسند آیا۔“ وہ تیر  
 رز آواز میں بولی ”اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو،  
 ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔“  
 میں نے پوچھا ”تم رک کیوں کہیں۔ ابھی تمہاری بائ  
 تو مکمل نہیں ہوئی۔“  
 ”کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے  
 بولی۔ اس کے لیے میں قسط بتائی۔

وہ کوئی نہایت ہی اہم بات کہتے تھے کہ نئی-نئی میں سچے لافعلی اور ہمارے بارے میں اپنی لامعنی طاہر کر کے حالات گیا، اب وہ اس سلسلے میں لب کشائی نہیں کرے گی۔ میں سنبھال لیں گے۔ تارا اور اکبر سو حوقا قاضی کی قید میں ہیں۔ نے کہا ”تم نے بتایا نہیں، ساحل کو کب آزاد کر رہی ہو؟“ تمہارے غیب کی صورت میں سارا ملبان او دونوں پر آن وہ اقطرابی نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر میرے سوال کا گھرے گا اور تمہاری کہانی کے ہٹ ہونے کے امکانات سو کا جواب دینے کے بجائے اس نے کہا ”صدا، صدا، صدا“۔ ہندو سر اس کرا میں گئے۔

تھکری کی باتوں میں بہت وزن تھا۔ میں خود بھی کئی رات سے ایس بی اور ڈی ایس بی کے حوالے سے بہت بے چین اور الجھا ہوا تھا۔ میں نے تھکری سے پوچھا ”تم نے بتایا ہے کہ کراچی میں بھی کچھ ہونے والا ہے؟“

”جنتیں ابھی اور اسی وقت اس حویلی سے نکلتا ہے۔“ وہ بولی ”اس ہونے والے کو مہی روک سکتے ہو اور اس کام کے لیے ہمیں دوپہر کا یہ بجے سے پہلے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا ہو گا۔“

میں ابھی دوا انداز میں اسے دیکھنے لگا ”وہاں ریلوے ٹنگری اکیا یہاں کوئی زلزلہ آنے والا ہے؟“

”زلزلہ نہیں بلکہ قیامت آنے والی ہے“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”یہاں بھی اور ادھر کراچی میں بھی۔“

میں نے کہا ”پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو۔ محل کربات کرو۔“

”تم نے شادی کی تھی میں ڈی ایس بی کے بچے پر جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ مرثیٰ تو نہ لاؤ ڈی ایس بی اس واقعے کو آسانی سے بھولنے والا نہیں۔ وہ تمہاری تلاش میں کسی بیکاری کی طرح سرگرداں تھا اور بالآخر اس نے تمہارا سراغ پایا ہے۔“ نیگلری نے بتایا ”رہلوے کراکس پر کھڑی ڈاکوؤں کی جیب اور سامان کے نزدیک پائی جانے والی ہائی کس نے اس کا کام آسان کر دیا ہے پھر پھر چمک والے انور علی نے بھی اس کی

سے اسے دیکھا اور کہا "ہاں" میں بوٹا سنگھ کو جانتا ہوں۔"

وہ بولی "ملک نواز ش علی کے آدمیوں نے بوٹا سنگھ کو ٹریس کر لیا ہے اور یہ خبر ملک نواز ش تک پہنچ چکی ہے، تم لاہور میں بوٹا سنگھ کے پاس قیام کرنے والے ہو۔ چودری نواز ش ڈائری کے راز سے بھی واقف ہو چکا ہے" بوٹا سنگھ کی روپوشی نے اسے ریڈ الارٹ کر دیا ہے۔ بوٹا سنگھ اپنی جان اور تمہاری ڈائری کو بچانے کے لیے لاہور سے کراچی آ رہا ہے۔ وہ جس ٹرین میں سوار ہے وہ گل بھگ گیا رہ جائے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے گی۔ ملک نواز ش کو تم کوئی عام سا چودری نہ سمجھو۔ وہ بہت ہی طاقت ور اور پار سونگ ہے۔ کراچی میں بھی اس کا اپنا ایک نیٹ ورک موجود ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو خبردار کر دیا ہے کہ بوٹا سنگھ اسٹیشن سے نکل کر گاڑوں کے علاقے تک نہ پہنچے جائے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "بوٹا سنگھ کراچی میں رہائش پذیر" اپنے ایک دوست کے پاس آ رہا ہے اس کا دوست "گاڑوں وٹ" کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ حالات کی گتینی کس رخ کو جا رہی ہے؟"

میں ہاتھ ملتے ہوئے کمرے میں بیٹھنے لگا۔ نیٹ ورک کی انکشاف انگیز باتوں نے مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو تھوٹیں ناک صورت حال سے دوچار پایا رہا تھا۔

ٹیکری نے کہا ”وہدان! ملک نوازش نے اپنے کارندوں کو صرف دو ہدایات جاری کی ہیں۔ نمبر ایک ”سوئے کے رازدوئی ڈائری کو پوٹا تنگھ سے حاصل کر کے فوراً اس کے پاس ”رکھنا وائی“ پتھیا جائے“ چاہے اس ڈائری کے حصول کے لیے پوٹا تنگھ کی جان ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ نمبر دو، وہ لوگ جنہیں لاہور نہیں آئے ویں، کم از کم اس وقت تک جب تک وہ اپنے گمشدہ سوئے کو بازیاب نہ کر لے اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ ملک نوازش تم سے سخت خوف زدہ ہے۔“

میں نے بنگلہ سے یہ سوال نہیں کیا کہ اس نے ساری معلومات کس طرح حاصل کی ہیں کیوں کہ میں جانتا ہوں وہ ایسا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میں پہلے بھی اس کی پراسرار نکتوں کے کئی مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ البتہ میں نے اس سے یہ ضرور کہا۔

”ینگلری! تم تو بہت عظیم عقلمی ہو۔ جس کام کے لیے تم مجھ سے کہہ رہی ہو، وہ تمہارے ایک اشارے پر ہو سکتا ہے پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتی ہو؟“

اس کے جواب نے مجھے لا جواب کر دیا۔ وہ گنبد آواز میں بولی "میں مانتی ہوں" میں ایک ہلکتی ہوں مگر میں سب کچھ نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھی کوئی موجود ہے جس کو میں جواب دہ ہوں۔ میں ہر ہلکتی نہیں ہوں۔ میرے اختیارات کی ایک حد ہے۔ اس جہان کا کاروبار ایک مربوط نظام کے تحت جاری ہے۔ آکاش پر جو فیصلے ہوتے ہیں وہ اہل ہیں۔ انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ مقدس چری کتابوں کے پتوں پر درج ہوئی کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے اپنا کام کر دیا۔ اب تم اپنے کام کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وجدان۔ دانش روم میں تمہارا لباس موجود ہے" اسے پہن لو۔"

لباس کے ذکر پر میں نے ساحل کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہ نارنجی بناری ساڑی میں لبوس تھی۔ پتا نہیں کیوں میں اب تک اس کے لباس پر وحیان نہیں دے سکا تھا؟ میں کوئی سوال کیے بغیر دانش روم میں گھس گیا۔ میں نے پانچ منٹ کے اندر لباس تبدیل کیا پھر باہر آکر ساحل کے اندر موجود نیلگری سے استفسار کیا "ہم یہاں سے جائیں گے کیسے؟"

اس نے بتایا "حویلی کے گیٹ پر بیدار رانجن والی ایک جپ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

میں چونکے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ ساحل بھی میرے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ میں نے میرے بخش والے کمرے سے جانا چاہا تو نیلگری نے کہا "تمہارا ساڑھی اس وقت جپ میں موجود ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہمارے اس راز میں شریک ہو اس لیے میں نے میرے بخش کو نیند ہی کی حالت میں جپ میں پٹخا دیا ہے۔ وہ وہاں آرام سے ایک سیٹ پر پڑا سو رہا ہے۔ ساحل کو بھی کچھ بتا نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ بھی سارے راستے سوتی رہے گی۔ کراچی کی شہری حدود میں داخل ہونے کے بعد یہ دونوں بیدار ہو جائیں گے پھر تم جس طرح چاہو ان کی تسلی بخشی کرتے رہنا۔ میں تم سے صرف یہی کہوں گی کہ ہمارا یہ راز ہم دونوں کے بیچ میں رہنا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

آخری جملہ نیلگری نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ میں اس کی بات کی نہ تک پہنچ کر سننا اٹھا۔ میرے رگ دوپے میں اضطراب چمکیاں لینے لگا۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کی معیت میں قدم اٹھانے لگا۔

ہم دونوں یہ سہولت حویلی سے باہر آگئے کسی بھی پہرے دار یا سیخ محافظ نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا تھا نیلگری نے کوئی قلم پڑھ کر اس حویلی پر چھوٹ کر دیا تھا۔ وہاں کا ماحول اور فضا اس کے نرائس میں تھے۔ وہ اس وقت ایک ساحل لگ رہی تھی۔

مجھے کھنڈوں کی وہ رات یاد آئی جب میں نے رتیا پارک میں یہاں۔ اس کے مختصرے جواب نے میری تشنگی نہیں کی بلکہ میں نے والی نیلگری کے کرکٹلی جیسے کے دو کھنڈوں کو مایا کر کے گھر پہنچایا تھا۔ اس رات میں وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نیلگری نے مصنوعی بارش برسا کر مجھے رکے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اپنی ہلکتی سے میری گاڑی کو بھی فلیٹ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں وہاں رکوں اور اس کے ٹوٹے ہوئے جیسے کی "مرہم پی" کر دوں۔ وہ جو چاہتی تھی مگر بھی گزرتی تھی۔ بس ایک ہی ایسا تھا جس پر اس کا حکم کھلا بس نیکر چلتا تھا۔ وہ مجھے ایک خاص محالے میں زیر نہیں کر پاتی تھی۔

حویلی کے باہر تھوڑے فاصلے پر سیاہ شیشوں والی ایک کڑیٹھ لینڈ کروزر موجود تھی۔ جب کا انجن اشارت تھا۔ نیلگری نے مجھ سے پیچھے بیٹھ کر بیٹھے کو کہا۔ میں یہی سمجھا کہ ڈرائیونگ وہ "دوسرے کی مگر تھوڑی دور پیلے وہ مجھے بتا چکی تھی کہ ساحل گاڑی میں بیٹھنے کی گہری نیند میں چلی جائے گی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا جپ کے اسٹیرنگ پر ڈرائیور موجود ہے۔

نیلگری لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں سوار ہونے لگی تو میں بھی پیچھے بیٹھ والا دروازہ کھول کر جپ کے اندر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص پر میری نگاہ پڑی۔ میں چکر کر رہ گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں غجب بھری نے پھنی سے اسے سننے لگا۔

اسی وقت نیلگری کی مدد سرگوشی نے میری ساعت دھیرے سے بوسہ ثبت کیا "وجدان! میں جاری ہوں۔"

میں نے بے ساختہ پلٹ کر نیلگری کی طرف دیکھا۔ پچھلی نشست پر ساحل بڑی پرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا تھا وہ کوئی بہت حسین خواب دیکھ رہی ہے گویا وہ اس وقت نیلگری کی تحویل میں نہیں تھی۔ نیلگری اس کے اندر سے نکل کر باجلی تھی۔ اب وہ صرف اور صرف ساحل تھی۔

میری نگاہ لینڈ کروزر کی آخری نشست کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں میرے بخش موجود تھا۔ نیلگری نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرے بخش گہری نیند میں تھا۔ اس کے مدھم خراٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ابھر رہی تھی۔ میں گردن موڑ کر ڈرائیور کی

رک کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں پر پائی جانے والی خیمہ کی اور گنبد آباد ستور موجود تھی۔ میں نے کہا "نکل صبح تو اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کے ہمراہ تم ہم سے رخصت ہوئے تھے۔ اس وقت تم اکیلے نظر آرہے ہو۔ تمہارا وہ نوجوان ساتھی کہاں ہے؟"

میرے ذہن میں اس قدر تجسس جاگا ہوا تھا کہ میں نے جت کبرے مشکل سنگھ سے کئی سوالات کر ڈالے۔ وہ چہرے کے تاثرات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی لائے بغیر بولا "سائیں! آپ بہت مہمان ہستی ہو اس لیے میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

وہ خاموش ہو کر لینڈ کروزر کی وینڈ اسکرین کے پار گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ گاڑی کے باہر چار سو اندھیرے کا راج تھا۔ جپ کی ہیڈلائٹس ایک مخصوص فاصلے تک سڑک اور اس کے گرد و پیش کو روشن رکھے ہوئے تھیں۔ اس تاریکی میں جس قدر کم رفتار اور محتاط ڈرائیونگ کی ضرورت تھی، مشکل سنگھ اس کا خیال نہیں رکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لینڈ کروزر کی رفتار حد سے زیادہ تھی۔

مشکل سنگھ نے ٹرائس کی سی کیفیت میں بولنا شروع کیا "سائیں! یہ سوال آپ نے بہت اچھا کیا کہ میرا ساتھی گنڈا سنگھ کہاں گیا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتا تو شاید آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہوتی۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ ہم نے وہاں سے سیدھا عمر کوٹ پہنچنا تھا لیکن کچھ دور جا کر گنڈا سنگھ نے ایک عجیب بات کی۔

"مشکل سنگھ! ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس وقت ہم ایسے راستے سے گزر رہے تھے جو میں روڈ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس پورے علاقے میں ہماری تلاش کا کام جاری تھا اس لیے ہم حکم کھلا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے گنڈا سنگھ سے پوچھا "مگر ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"ہم یہاں سے سیدھے کسری جائیں گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کسری کیوں۔" میں نے پوچھا "وہاں اب ہمارے لیے کیا رکھا ہے؟"

"کچھ رکھا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں مشکل سنگھ۔"

"مجھے بھی تو بتا چلے! میں نے کہا۔"

وہ بولا "میں ایک ضروری کام سے وہاں جانا چاہتا

وہ خاموش ہو کر لینڈ کروزر کی وینڈ اسکرین کے پار گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ گاڑی کے باہر چار سو اندھیرے کا راج تھا۔ جپ کی ہیڈلائٹس ایک مخصوص فاصلے تک سڑک اور اس کے گرد و پیش کو روشن رکھے ہوئے تھیں۔ اس تاریکی میں جس قدر کم رفتار اور محتاط ڈرائیونگ کی ضرورت تھی، مشکل سنگھ اس کا خیال نہیں رکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لینڈ کروزر کی رفتار حد سے زیادہ تھی۔

مشکل سنگھ نے ٹرائس کی سی کیفیت میں بولنا شروع کیا "سائیں! یہ سوال آپ نے بہت اچھا کیا کہ میرا ساتھی گنڈا سنگھ کہاں گیا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتا تو شاید آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہوتی۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ ہم نے وہاں سے سیدھا عمر کوٹ پہنچنا تھا لیکن کچھ دور جا کر گنڈا سنگھ نے ایک عجیب بات کی۔

"مشکل سنگھ! ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس وقت ہم ایسے راستے سے گزر رہے تھے جو میں روڈ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس پورے علاقے میں ہماری تلاش کا کام جاری تھا اس لیے ہم حکم کھلا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے گنڈا سنگھ سے پوچھا "مگر ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"ہم یہاں سے سیدھے کسری جائیں گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کسری کیوں۔" میں نے پوچھا "وہاں اب ہمارے لیے کیا رکھا ہے؟"

"کچھ رکھا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں مشکل سنگھ۔"

"مجھے بھی تو بتا چلے! میں نے کہا۔"

وہ بولا "میں ایک ضروری کام سے وہاں جانا چاہتا

وہ خاموش ہو کر لینڈ کروزر کی وینڈ اسکرین کے پار گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ گاڑی کے باہر چار سو اندھیرے کا راج تھا۔ جپ کی ہیڈلائٹس ایک مخصوص فاصلے تک سڑک اور اس کے گرد و پیش کو روشن رکھے ہوئے تھیں۔ اس تاریکی میں جس قدر کم رفتار اور محتاط ڈرائیونگ کی ضرورت تھی، مشکل سنگھ اس کا خیال نہیں رکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لینڈ کروزر کی رفتار حد سے زیادہ تھی۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

مفہور

7420000

kitab@1970@yahoo.com

ہوں۔

”مجھے بتاؤ کیا کام ہے۔“

”وہیں جا کر تلوں کا۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

گنڈا سنگھ کا انداز مجھے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا۔ گنڈا سنگھ بھی دوسرے ڈاکوؤں کی طرح میرا حکم مانتا تھا۔ سائیں! آپ سے ملاقات کے بعد میں نے اپنا پیشہ ترک کر کے شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس مرحلے پر گنڈا سنگھ میرے سامنے ضدی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ کسریٰ میں ہمارے ڈیرے پر پولیس نے ریڈ کر کے وہاں کی ایسی کئی کمی کوی تھی۔ میں بھول کر بھی ادھر کا رخ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا اس لیے میں نے دو ٹوک انداز میں گنڈا سنگھ سے کہا۔

”میں تو کسی قیمت پر بھی کسریٰ نہیں جاؤں گا۔“

”تو پھر ہمیں سے ہماری راہیں الگ ہو جائیں گی۔“ گنڈا

سنگھ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”گنڈا سنگھ!“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”میں تمہارا سردار ہوں۔ تم مجھ سے کس انداز میں بات کر رہے ہو؟“

وہ بدستور روکے پچکے لہجے میں بولا ”منگل سنگھ! تم سردار تھے۔ اب نہیں ہو۔“

”کیا مطلب!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا

”اب میں سردار نہیں ہوں۔ کیوں؟“

”اس لیے کہ تم نے ایک منگل کی باتوں میں آکر اپنا ہمت سا نقصان کر لیا ہے۔“ وہ برہمی سے بولا ”تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ گنڈا سنگھ آپ کی طرف اشارہ کر رہا تھا سائیں۔ میں نے آپ کی باتوں سے متاثر ہو کر جرم اور گناہ کی راہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور نقصان سے اس کی مراد مفوی ممتاز تھی۔ گنڈا سنگھ کا خیال یہ تھا کہ میں نے ممتاز کو آپ کے حوالے کر کے گویا پچاس لاکھ روپے گنوا دیے تھے۔ اس رقم کا مطالبہ ہم نے تاوان کی صورت میں مفوی کے باپ قاضی سلطان سے کیا تھا۔

میں نے گنڈا سنگھ سے کہا ”تمہاری باتوں سے بغاوت کی بو آ رہی ہے لگتا ہے تمہارا دماغ ابھی تک وہیں ہے لوٹ مار اور ڈاکا زنی میں!“

”ظاہر ہے“ ایک ڈاکو لوٹ مار اور ڈاکا زنی ہی کرے گا۔“

”میں نے یہ قبیح پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تم نے چھوڑا ہوگا“ میں نے تو نہیں چھوڑا۔“

ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے افسوس بھری نظر سے اسے دیکھا اور کہا ”پھر سمجھا اور اس رقم میں سے آٹھ روپے اس کو دے دیے پھر واقعی ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ تم کسریٰ جاؤ یا کسریٰ نہ جاؤ۔“

مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تو عمر کوٹ جا رہا ہوں۔“

”ایسے کیسے چلے جاؤ گے تم عمر کوٹ منگل سنگھ؟“

طنز سے انداز میں بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

وہ بولا ”تمہارے پاس ایک ہماری رقم موجود ہے۔ اگر مجھے عمر کوٹ ہی میں گزارنا تھی۔ میں نے خود کو دوسروں کی رقم پر ہم دونوں کا برابر حق ہے۔ پہلے رقم کا بیڑا ہوگا پھر ہر نظر سے زیادہ پوشیدہ رکھنے کے لیے ایک چارپائی ہوئی کا انتخاب کیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں جلد ہی سو گیا مگر

میں نے اسے یاد دلایا ”وہ جان سائیں یہ یہ رقم ہمیں تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت اس لیے دی تھی کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ برائی کی راہ چھوڑ کر اچھا ہٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے چارپائی چھوڑی اور ٹہلنے

کر سیدھا رات اختیار کر لیں۔“

”یہ رقم ہمیں اس مسئلہ وجدان نے نہیں دی منگل سنگھ“

گنڈا سنگھ نے بکڑے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ رقم تو ہماری ہی کافی دور نکل آیا۔ میں اس سڑک پر اکیلا ہی تھا، میرے

تھی۔ ٹیوٹا فورڈ ڈیوڈی کے ایک خفیہ خانے میں تم نے مجھ چاروں طرف اندھا رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رکھی تھی۔ مجھے بھی اسی وقت معلوم ہوا تھا۔“ وہ تھوڑی دیر میں ٹھہر گیا۔ میں کیوں ٹھہر رہا ہوں البتہ میری گھبراہٹ

تک ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے ٹکرا رہا پھر بولا ”اس میں وجدان تو قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں اپنی کیفیت پر غور کر رہا تھا کہ مجھے

کا کیا کمال ہے“ ہماری رقم ہمارے پاس آئی۔ تم نے اگر اپنے سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے پیسے کو چھوڑ دوں گے تو چھوڑ چوٹک گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ

دو۔ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ مجھے اپنے ڈاکو ہونے پر ہی زیادہ گاڑی میرے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

بہ۔ تم آؤ میری رقم میرے حوالے کرو اور جا کر کسی مسجد میں گھر رہے ہیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نہایت ہی

بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔“

گنڈا سنگھ کل تک آنکھ ملا کر مجھ سے بات نہیں کرنا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی کو دور کر دیا۔ میں نے نہیں سنا دیکھا تھا۔

اور آج مجھے یہ آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی کو دور کر دیا۔ میں نے نہیں سنا دیکھا تھا۔

دور کرنے کی خاطر کہا ”تم ایک بات بھول رہے ہو گنڈا سنگھ۔ سب سے نمایاں چیز اس کی گردن میں پڑی ہوئی مالا تھی۔ میں

اور وہ یہ کہ اس رقم پر صرف اور صرف میرا حق ہے، تمہارا نے ایسی مالا بھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔“

اس میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ میری ذاتی رقم منگل سنگھ یہاں تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کی کہانی نے

مجھے بے چین کر دیا۔ کسی خوب صورت جوان لڑکی اور نادر

ہم ایک گروہ کی صورت میں لوٹ مار کرتے رہے الوجود مالا کے ذکر پر آپوں آپ میرا دھیان نیلگہ کی طرف

ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”اس لیے لوٹ کے مالا چلا گیا۔ میں نے منگل سنگھ سے پوچھا ”اس مالا کے بارے میں

سے حاصل کر کے چلا ہوں۔“

گنڈا سنگھ کے تیور، خیالات اور عوام نہایت ہی

خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس سے لکھنا مناسب نہ

سمجھا اور اس رقم میں سے آٹھ روپے اس کو دے دیے پھر

واقعی ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ تم کسریٰ جاؤ یا کسریٰ نہ جاؤ۔“

مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تو عمر کوٹ جا رہا ہوں۔“

”ایسے کیسے چلے جاؤ گے تم عمر کوٹ منگل سنگھ؟“

طنز سے انداز میں بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

وہ بولا ”تمہارے پاس ایک ہماری رقم موجود ہے۔ اگر مجھے عمر کوٹ ہی میں گزارنا تھی۔ میں نے خود کو دوسروں کی

رقم پر ہم دونوں کا برابر حق ہے۔ پہلے رقم کا بیڑا ہوگا پھر ہر نظر سے زیادہ پوشیدہ رکھنے کے لیے ایک چارپائی ہوئی کا

انتخاب کیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں جلد ہی سو گیا مگر

میں نے اسے یاد دلایا ”وہ جان سائیں یہ یہ رقم ہمیں تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت

اس لیے دی تھی کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ برائی کی راہ چھوڑ کر اچھا ہٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے چارپائی چھوڑی اور ٹہلنے

کر سیدھا رات اختیار کر لیں۔“

”یہ رقم ہمیں اس مسئلہ وجدان نے نہیں دی منگل سنگھ“

گنڈا سنگھ نے بکڑے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ رقم تو ہماری ہی کافی دور نکل آیا۔ میں اس سڑک پر اکیلا ہی تھا، میرے

تھی۔ ٹیوٹا فورڈ ڈیوڈی کے ایک خفیہ خانے میں تم نے مجھ چاروں طرف اندھا رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

رکھی تھی۔ مجھے بھی اسی وقت معلوم ہوا تھا۔“ وہ تھوڑی دیر میں ٹھہر گیا۔ میں کیوں ٹھہر رہا ہوں البتہ میری گھبراہٹ

تک ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے ٹکرا رہا پھر بولا ”اس میں وجدان تو قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں اپنی کیفیت پر غور کر رہا تھا کہ مجھے

کا کیا کمال ہے“ ہماری رقم ہمارے پاس آئی۔ تم نے اگر اپنے سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے پیسے کو چھوڑ دوں گے تو چھوڑ چوٹک گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ

دو۔ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ مجھے اپنے ڈاکو ہونے پر ہی زیادہ گاڑی میرے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

بہ۔ تم آؤ میری رقم میرے حوالے کرو اور جا کر کسی مسجد میں گھر رہے ہیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نہایت ہی

بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔“

گنڈا سنگھ کل تک آنکھ ملا کر مجھ سے بات نہیں کرنا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی کو دور کر دیا۔ میں نے نہیں سنا دیکھا تھا۔

اور آج مجھے یہ آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی کو دور کر دیا۔ میں نے نہیں سنا دیکھا تھا۔

دور کرنے کی خاطر کہا ”تم ایک بات بھول رہے ہو گنڈا سنگھ۔ سب سے نمایاں چیز اس کی گردن میں پڑی ہوئی مالا تھی۔ میں

ناخن جتنا بڑا تھا۔“

یہ وہی مالا تھی جو کبھی نیلگہ نے مجھے تختہ دی تھی

لیکن پاک بھارت سرحد عبور کرتے ہوئے وہ مالا ریگستان میں

کیسے کم ہو گئی تھی پھر ایک ملاقات پر نیلگہ نے مجھے بتایا کہ

مالا دوبارہ اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔

منگل سنگھ بدستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے مجھے

بتانے لگا کہ سیاہ لینڈ کروزر والی اس حسین لڑکی نے اس سے

کہا کہ کچھ بندوں کو ”نبی سر“ سے لینا ہے، تم گاڑی میں بیٹھ

جاؤ۔ منگل سنگھ کسی معمول کی طرح کوئی سوال کے بغیر لینڈ

کروزر میں بیٹھ گیا۔ رات کے آخری پہرہ ”نبی سر“ پہنچ

گئے منگل سنگھ کے بقول ”اس حسینہ نے گاڑی ایک حویلی

سے کچھ فاصلے پر روک دی اور اس سے کہا کہ وہ ڈرائیونگ

سیٹ پر آجائے وہ حویلی میں سے بندوں کو لینے جا رہی ہے۔

منگل سنگھ نے ان بندوں کو کراچی پٹھانا ہے۔ جب اشارت

تھی، منگل سنگھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ”بندوں“ کا انتظار

کرنے لگا۔ اس حسین ساحہ نے گاڑی سے نکلے ہوئے منگل

سنگھ کو ہدایت دی کہ جن بندوں کو کراچی پٹھانا ہے وہ اس کے

لے آجی نہیں ہیں اور یہ کہ وہ خود ان کے ساتھ نہیں جائے

گی۔ منگل سنگھ کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو کراچی پٹھانہ

واپس عمر کوٹ آجائے پھر وہ اسے ان خدمات کے صلے کے

طور پر کوئی انعام دے گی۔ منگل سنگھ اس کے سحر میں اس

طرح جکڑا ہوا تھا کہ کوئی سوال کیے بغیر اس کے احکام کی

تعمیل کرنا چلا گیا۔

منگل سنگھ کی کہانی نے واضح کر دیا کہ نیلگہ نے اسے

ٹپ کیا تھا۔ وہ ہمیں قاضی سلطان کی حویلی سے نکال کر

کراچی پٹھانا چاہتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے یہ سارا

کھٹ راگ پھیلایا تھا۔ میں نے منگل سنگھ سے سوال کیا ”تم



جانتے ہو؟

”کون جادوگرنی!“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔  
”میں اسی ہستی کا ذکر کر رہا ہوں سامیں جس کے حکم پر  
میں آپ کو کراچی پہنچانے جا رہا ہوں۔“ منگل سنگھ نے کہا ”وہ  
کسی جادوگرنی سے کم نہیں۔ میں اب تک خود کو اس کے اثر  
میں محسوس کر رہا ہوں۔“

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا ”میں نے تمہاری  
زبان سے پہلی مرتبہ اس کا ذکر سنا ہے۔“

وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ کافی دیر تک  
خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا ”سامیں! آپ بت گئے  
آوی ہو۔ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ مجھے تو یہ کوئی بہت  
بڑا چکر لگتا ہے۔“

”مثلاً کیا پکڑ؟“ میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ”آپ نے مغوی ممتاز کو  
ہمارے قلعے سے چھڑایا اور نئی سر میں آپ کی موجودگی سے  
ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اس لڑکی کو یہاں پہنچایا ہے۔ آپ  
کے اس کارنامے پر قاضی سلطان کو آپ کا شکر گزار ہونا  
چاہیے لیکن جس طرح آپ اس کی حویلی سے رخصت ہوئے  
ہیں اس سے لگتا ہے کہ یہاں کے حالات آپ کے لیے  
سازگار نہیں رہے پھر اس جادوگرنی کا کردار اور عمل بھی  
بہت مادیانہ سا ہے۔ میں اس کے زیر اثر عمر کوٹ سے یہاں  
پہنچا اور اب آپ کو کراچی پہنچانے جا رہا ہوں۔ وہ جادوگرنی  
ہمارے ساتھ نہیں آئی بلکہ وہیں حویلی میں رہ گئی ہے۔ یہ  
سب سوچتے ہوئے میرا دماغ پھوٹنے کی طرح دگنے لگتا  
ہے۔“

”اس لیے تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اس بارے میں  
سوچنا چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”آپ کے دونوں ساتھیوں کا رویہ بھی مجھ سے  
بالا تر ہے۔“

”انہوں نے کیا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”پہلے آپ کا ساتھی مرد گاڑی میں داخل ہوا اور  
آتے ہی پچھلی سیٹ پر سو گیا پھر آپ اس لڑکی کے ساتھ آئے  
ہو۔ لڑکی بھی گاڑی میں آتے ہی گری نیند سو چکی ہے۔ صرف  
آپ جاگ رہے ہو۔ یہ تمام باتیں کچھ عجیب سی نہیں ہیں۔  
اس پر اسرار ہستی نے آپ کو لوگوں کو کراچی پہنچانے کے لیے  
میرا انتخاب ہی کیوں کیا؟ وہ خود بھی تو یہ کام کر سکتی تھی۔ یہ  
ساری باتیں ابجھانے والی ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں  
آ رہا سامیں!“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تم اس معاملے میں سوچ سنا  
کر اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔“ میں نے کہا ”تمہاری بہتری کی  
میں ہے کہ ہمیں کراچی پہنچانے کے بعد خود سیدھے عمر کوٹ  
پہنچ جاؤ تاکہ وہ برا سرا جادوگرنی ہمیں کسی نہ کسی  
نوازے۔ اس نے اگر وعدہ کیا ہے تو ہمیں ضرور انعام دے  
گی۔“

وہ شش و پنج کی کیفیت میں جٹلا نظر آنے لگا۔ میں نے  
اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سیٹ پر پشت سے ٹیک لگا دی اور  
آنکھیں بند کر کے صورت حالات پر غور کرنے لگا۔  
ہم جن حالات سے گزر رہے تھے وہ خالص  
توشیٹ ناک تھے پھر ڈی ایس بی اور ایس بی کی باہمی دہلا  
چپقلش نے انہیں مزید گھبرایا۔ نیلگری نے بروقت مجھے  
حالات کی سنگینی سے آگاہ کر دیا ورنہ صبح ہوتے ہی ہم دھرلے  
جاتے۔ ڈی ایس بی کے ساتھ میں نے جو شاندار سلوک کیا  
تھا وہ اس کے لیے ناقابل فراموش کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ  
مجھے بڑی سے بڑی مصیبت میں گرفتار کر سکتا تھا۔

نیلگری نے ایک طرف مجھے حالات کی نزاکت سے باخبر  
کیا۔ دوسری جانب وہ منگل سنگھ کو گھیر گھار کے ہمارے پاس  
آئی تاکہ ہم یہ آسانی کراچی پہنچ سکیں۔ منگل سنگھ پر نیلگری  
کے طلسماتی اثرات بہت واضح تھے وہ پوری طرح اس کی  
مطیع و فرمان بردار نظر آتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہمیں کراچی  
پہنچانے کے بعد سدا عمر کوٹ جاتا۔ اس بات میں بھی کسی  
شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ نیلگری اسے کسی انعام  
سے نوازی۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی۔ برا سرا رشتہ کیوں  
مالک۔ جب جو چاہتی تھی کر گزرتی تھی۔ پتا نہیں یہ لینڈ  
کوڈر اس نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ گاڑی اڑکھڑپا  
اور سیاہ پیشوں والی تھی۔ یہ انتظام ہماری سہولت اور  
جفاکشی کی خاطر کیا گیا تھا۔ مجھے نیلگری کے کمالات کے  
تجربے اور مشاہدے ہو چکے تھے کہ میں نے اب اس کی باتوں  
پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس کے مسلمانوں اور سکھوں میں مشترک ہے۔ اگر سنگھ ہمارا شروع  
سنی خیز انکشافات بھی یاد آئے لگے اس نے بہت سے مسلمانوں اور سکھوں میں مشترک ہے۔ اگر سنگھ ہمارا شروع  
زہریلے پن کی طرف توجہ دلا کر مجھے ریڈ الرٹ کر دیا تھا۔ پاکستان کے دیماتوں والوں کو بوجائے  
زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں اس طرف میرا دھیان ہی نہیں اُٹھانے میں آتا ہے۔  
تھا اور شاید کبھی بھی نہ جاتا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے ڈسٹر  
زہریلے سے زہریلا جان دار بھی پلک جھپکتے میں موت کے  
میں چلا جاتا تھا۔ میں کسی ضرورت مند کو اپنا خون نہیں  
سکتا تھا۔ ان حقائق کو جھٹلانا حقیقت کی طرف سے آنکھیں

بند کر لینے کے مترادف تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ  
پہلی فرصت میں کسی ماہر ڈاکٹر سے اس سلسلے میں مشورہ کروں  
گا اور اپنے اس زہریلے پن کو ختم کر کے نارمل انسان کی سی  
زندگی گزاروں گا۔  
پھر میرا دھیان نیلگری کی دیکھیری کی طرف چلا گیا۔ اس  
نے نہ صرف ہمیں قاضی سلطان کی حویلی سے نکال کر پولیس  
والوں سے محفوظ کر دیا تھا بلکہ بوٹا سنگھ اور ڈائری کے بارے  
میں معلومات بہم پہنچا کر میرا کام آسان بنادیا تھا۔ وہ چوہدری  
نواز ش علی کی نظر میں آچکا تھا۔ ڈائری کے حصول کی خاطر  
چوہدری کے بندے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم نامہ  
وصول کر چکے تھے۔ وہ بے چارہ ہائی رنک پر تھا۔  
نیلگری نے میرے اور ساحل کے بارے میں کچھ کہتے  
ہوئے اپنا جملہ نامہ مکمل چھوڑ دیا تھا۔ اس کے انداز نے مجھے  
گہری توشیٹ میں جٹلا کر دیا۔ میں اس کے جملے کو واضح معنی  
پہنانے سے بچتا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں اس انداز میں  
سوچتا نہیں جانتا تھا۔ نیلگری نے ساحل کے نام پر بہرہ  
کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ نام تم نے خوب رکھا ہے، مجھے پسند  
آیا۔ اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور  
ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن؟  
لیکن کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اگر  
اپوری دیانت داری سے اس ادھورے جملے کو مکمل کیا جاتا تو  
اس میں یہ الفاظ درج کیے جاتے۔ لیکن تمہارا ساتھ پائیدار  
میں۔ تم جلد یا بدیر جد ہونے والے ہو۔  
اس طرف دھیان جاتے ہی میں ذہن کو جھٹک دیتا۔  
شاید میں یہ حرکت کسی لاشعوری جذبے کے تحت کر رہا تھا۔  
میں ساحل کو خود سے علیحدہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا  
اسی لیے اس بارے میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا۔ انسانی  
نفسیات کی گتیاں بھی عجیب ہیں۔ جتنی کھولو اتنی ہی بندھتی  
چلی جاتی ہیں۔ میں اس وقت نفسیات سے زیادہ حالات کے  
بارے میں سوچتا چاہتا تھا اس لیے میرا دھیان بوٹا سنگھ کی  
طرف چلا گیا۔  
بوٹا سنگھ کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ یہ نام  
اس کے مسلمانوں اور سکھوں میں مشترک ہے۔ اگر سنگھ ہمارا شروع  
سنی خیز انکشافات بھی یاد آئے لگے اس نے بہت سے مسلمانوں اور سکھوں میں مشترک ہے۔ اگر سنگھ ہمارا شروع  
زہریلے پن کی طرف توجہ دلا کر مجھے ریڈ الرٹ کر دیا تھا۔ پاکستان کے دیماتوں والوں کو بوجائے  
زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں اس طرف میرا دھیان ہی نہیں اُٹھانے میں آتا ہے۔  
تھا اور شاید کبھی بھی نہ جاتا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے ڈسٹر  
زہریلے سے زہریلا جان دار بھی پلک جھپکتے میں موت کے  
میں چلا جاتا تھا۔ میں کسی ضرورت مند کو اپنا خون نہیں  
سکتا تھا۔ ان حقائق کو جھٹلانا حقیقت کی طرف سے آنکھیں

لے بھی وہاں کی آبادی میں وہ بے آسانی کھل مل گیا تھا۔ اگر وہ  
سکھوں کے روایتی طے میں ہوتا تو اس کے لیے مشکلات  
کھڑی ہو جاتیں۔

جب تک خوش قسمتی اس کا ساتھ دیتی رہی وہ محفوظ رہا  
اور اب اس کی بد قسمتی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ چوہدری  
نواز ش علی کے خوں خوار کتے اس کی بو سنکتے پھر رہے تھے۔  
لاہور میں رہنا اس کے لیے ممکن نہ رہا تو اس نے کراچی کا  
رخ کیا مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ”استقبال“ کا بڑا  
”شان دار“ بندوبست کیا جا چکا تھا۔

مجھے یہ ضرورت بوٹا سنگھ کو بچانا تھا۔ میں اس کا احسان  
مند تھا۔ اس نے میرے باپ کی قیمتی ڈائری کو اپنے پاس  
محفوظ رکھا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان پر کھیل کر  
لاہور سے کراچی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے بوٹا سنگھ کو بھی  
نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے طے سے واقف تھا۔ بس اتنا  
جانتا تھا کہ وہ ایک مونا سنگھ ہے یعنی کلین شیو اور مخصوص  
جوڑے سے بے نیاز۔ سگا پور میں آں جہانی خشونت سنگھ کی  
بیٹی ارلا کوڑ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے باپ کی  
بادداشتوں والی ڈائری لاہور میں رہائش پذیر بوٹا سنگھ کو امانت  
نبھا دی گئی ہے۔ میرے ذہن میں بوٹا سنگھ کی لاہور والی  
رہائش گاہ کا ایڈریس محفوظ تھا لیکن موجودہ صورت حالات  
میں وہ پتا بے مصرف ہو کر رہ گیا تھا۔

نیلگری خلوص نیت سے میری مدد کر رہی تھی۔ میں نے  
اسے گوتم بھوش کے چنگل میں چھٹنے سے بچایا تھا شاید وہ  
اس احسان کا بدلہ چکا رہی تھی۔ دوسری جانب وہ مجھ سے  
محبت کی دعوے دار بھی تھی۔ میں نے نیلگری کا جو روپ  
اغیا نیال اور رشی کیش میں دیکھا تھا اب وہ اس سے  
قدرے مختلف انداز میں پیش آ رہی تھی۔ مجھے اس کے  
رویے کی تبدیلی پر اعتراض تھا اور نہ ہی اس کے محبت کے  
دعوے کو جس شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میرے اندر سے  
ایک آواز اٹھتی تھی کہ مجھے نیلگری کی مدد کے بغیر اپنے مل  
ہوتے پر آگے بڑھنا چاہیے۔ میں اس کی محبت کی نافذی  
نہیں کر رہا تھا لیکن جی بات یہ ہے کہ اس کی محبت کے تصور  
ہی سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو  
کہ میں نے اس حوالے سے اس کے بارے میں کبھی نہیں  
سوچا تھا۔ میں نے بیشہ اسے برا سرا رشتہ کیوں کی مالک ایک  
ممان ہستی ہی سمجھا تھا۔

میں اپنی کیفیات کو کوئی نام نہ دے سکا۔ نیلگری سے  
گریز کی لاشعوری ترغیب کو میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر



”اس پر اسرار ہستی کا حکم ہے“ وہ دھیرے سے بولا

موجود ہوٹلوں میں سب سے زیادہ صاف ستھرا اور پرکشش ”کس اتالی کالی ہے“ میر بخش نے کہا ”اس سے پتا ہوٹل تھا۔“

صواری دیر پہلے لے چکے تھے۔ ہم سیدھے ہوٹل کے ڈائننگ  
ہال میں جا پہنچے۔ ہال میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ بس  
ایک دو کمائے میزوں پر ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ہم نے ہال کے

کونے میں بھیجی ایک میز کا انتخاب کیا۔ ڈانگ پال صاف ستھرا اور جاذب نظر تھا۔ جب تک ہمارے لیے ناشتا سرو کیا جاتا، ہم باری باری داش روم سے ہو آئے تھے۔ ناشتا شروع کرنے سے پہلے ہم پوری طرح فریش ہو گئے۔

میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ساحل اور میر بخش کو حقیقت حال سے آگاہ کر دوں۔ وہ دونوں میرے قریبی اور جاں نثار ساتھی تھے۔ انہیں بہانوں سے بہلانا مناسب نہیں تھا اور گزشتہ رات حالت بے خبری میں ان کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا، اس کے بعد تو وہ بہانوں سے بھیلنے والے تھے بھی نہیں۔

ساحل میرے اعتماد پر پوری اتاری تھی اور میں اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرتا تھا۔ میر بخش بھی گزشتہ روز سے کئی بار آزمائشی مرحلوں سے گزر چکا تھا لہذا اسے بھی اپنے بارے میں کھل کر بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ساحل نیلکری کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ تاہم وہ میرے اور نیلکری کے درمیان تعلق سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی اسے فی الحال اس تعلق سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ البتہ وہ سونے کے راز کے بارے میں بھی جانتی تھی۔

میں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ان دونوں کو تازہ ترین صورت حال کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ ساحل خاموشی اور سنجیدگی سے سنی رہی لیکن میر بخش کے چہرے پر حیرتوں کا سیلاب لگ گیا تھا۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”سائیں! آپ آخر چہ کیا ہو؟“

”میں جو کچھ سمجھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا ”نہیں سائیں، نہیں۔ اللہ سائیں کی قسم! آپ جو سامنے ہو اسے ہزار گنا چھپے ہوئے ہے۔ پہلے آپ کا بارشمل آرٹس اور ”جی“ کی قوت ہی تم حیران کرنے والی نہیں تھی۔ اب نیلکری جیسی پراسرار شخصیت سے آپ کا رابطہ تو بالکل کھو بیٹھا والا ہے۔“

”مگر تم پاگل نہ ہو جانا میر بخش۔“ ساحل نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ”یہ ایک معیاری ہوٹل ہے۔ اگر یہاں تمہارا دفاعی توازن بگڑ گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ مجبوراً تمہیں کسی دفاعی اسپتال میں داخل کرنا پڑے گا۔ کیا تم وجدان کو چھوڑ کر کسی اسپتال میں رہنا پسند کرو گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی ”میں اتنے عظیم انسان کا ساتھ چھوڑنے کے بارے میں

تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اپنی آخری سانس تک وجدان سائیں کے قدموں میں۔“ وہ ذرا سا اٹکا پھرتا جاری رہا ہونے لگا۔ ”میرا مطلب ہے“ اب ہمارا زندگی بھر کا ساٹھ ہے۔“

اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ساحل نے کہا ”آئندہ کا کچھ عمل وہاں کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے زندگی بھر کے ساتھ کو بھانسنے کے لیے ضروری ہے۔“

”اے اپنے دماغ کو قابو میں رکھو۔“ کچھ دیر تک ہمارے درمیان حالات حاضرہ کے بارے میں گفتگو ہوئی رہی پھر میر بخش نے پوچھا ”سائیں! آپ تو ہوجا سکتے تھے کہ کو بھانسنے نہیں ہو جب کہ آپ کے دشمنوں کو اسے جیل سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ خاموشی سے اسے اڑے تو پھر کیا ہوگا؟“

”ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔“ میں نے ہر سوچ انداز میں کہا۔ ”میں جلد از جلد ریلوے اسٹیشن کے اندر ہمارے پاس کم از کم ایک آدھ ریوالور تو ضرور ہوتا

داخل ہو جانا چاہیے تاکہ پلٹ فارم پر موجود لوگوں کی گھرا جائے۔“

”مکان ہے، ہمیں وہاں کچھ مشکوک چہرے نظر آجائیں۔“

”اگرچہ میں اپنے پاس کسی قسم کا اسلحہ رکھنے کے حق میں ہوں گے، ہم ایک شخص کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔“

”میر بخش نے میرے استفسار کے جواب میں کہا ”سائیں! ہمارے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے۔ اگر آپ کی نوازش کے بندے کوئی عام اشتباہی نہیں تھے، انہیں ایک کر سکتا ہوں۔“

”نمائتہ ہی اہم شخص ہونا شک کی ”سرکوبی“ کے لیے بھیجا گیا تھا۔“

”نمائتہ ان کی حرکات و سکنات عام لوگوں سے مختلف ہونا لازمی تھا۔ اگر ہم وہاں موجود افراد کو باریک بینی سے واپس کرتے تو یہ ایک عجیب گمان پیدا ہو سکتا ہے۔“

”میں نے یہ سب سنی ہے۔“

”میر بخش نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”سائیں! میرا خیال ہے، دو ہزار کے اندر اندر ایک اچھا

کرتے ہیں۔“

”سائیں! میرا خیال ہے، دو ہزار کے اندر اندر ایک اچھا

”سائیں! میرا خیال ہے، دو ہزار کے اندر اندر ایک اچھا

درخت کے نیچے کھڑے ہیں۔ تمہیں جاؤ اور یوں آؤ۔“ پھر میں نے بائیں ہاتھ سے جھکی بھائی۔

میر بخش کے جانے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس طرف میں ایک خاص مقصد سے جا رہا تھا۔ میں حفظ المذم کے طور پر ایک ٹیکسی کو ایجنج کرنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کس وقت کیسے حالات پیش آجائے۔ اگر ہمیں ان لوگوں کے تعاقب کی ضرورت پیش آئی تو پہلے سے ہمارے پاس سواری کا بندوبست ہونا چاہیے تھا۔

میں ایک یلوکب کے پاس پہنچا، ٹیکسی کا ڈرائیور اندر موجود تھا۔ وہ ایک نئی اور بڑے سائز کی ٹیکسی تھی۔ تعاقب کے نقطہ نظر سے یہ نہایت ہی موزوں سواری ثابت ہو سکتی تھی۔ ڈرائیور بھی جوان اور صحت مند تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”کیا تمہاری ٹیکسی خالی ہے؟“

”میں تیز گام کے لیے یہاں آیا تھا مگر وہ تو ایک گھنٹا لیت ہے۔“ اس نے بتایا ”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

”فی الحال تو ہمیں کہیں نہیں جانا۔“ میں نے کہا ”ہم کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہمارا ایک مہمان تیز گام سے آنے والا ہے۔“

”مگر میں تو ایک گھنٹا یہاں ضائع نہیں کر سکتا۔ اس وقت میں سو روپے کا وعدہ تو ہو ہی جائے گا۔“ ڈرائیور نے کہا ”میں تو اسٹینڈ سے ٹیکسی نکال رہا ہوں۔“

اس کی ٹیکسی اسٹینڈ میں ایسی جگہ لگی ہوئی تھی جہاں سے اسٹیشن کی غارت کا ”خروج“ بہت نزدیک تھا۔ ہمارے لیے وہ ٹیکسی آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

”اگر میں شام تک کے لیے تمہاری ٹیکسی حاصل کرنا چاہوں تو تم کتنا کرایہ لو گے؟“

اس نے آٹھ سو روپے بتائے۔ ٹھوڑی بار گفتگ کے بعد وہ پانچ سو میں راضی ہو گیا تاہم ہمارے درمیان گیارہ سے پانچ بچے تک کا وقت طے ہوا۔ میں نے دو سو روپے اسے ایڈوانس دیے اور کہا ”تم اسی جگہ ہمارا انتظار کرو، ہم کسی وقت بھی تمہاری ٹیکسی میں آئیں گے۔ باقی کے تین سو روپے ہمیں شام پانچ بجے ملیں گے ٹھیک ہے!“

اس کے لیے اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ میں ساحل کے ساتھ واپس درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں میر بخش بھی آگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے مقصد میں

وہ پڑی سے اترنے والا تھا“ میں نے جلدی سے کہا  
”میربخش! اب ہمیں اپنے کام میں مصروف ہو جانا

میر بخش میرے نزدیک آگیا۔ ساحل ہماری کارکردگی

اس وقت ہم برج کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں نے میرے بخش کی بات کے جواب میں کہا ”میں مانتا ہوں“ وہ اس جہم

غیر میں تمہیں چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے مگر اس صورت میں ہوتا نکھ کی جان خطرے میں آجائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اس دشمن کو کوئی جانی نقصان پہنچے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ڈاڑھی اس بیگ میں ہو۔

”ہاں، یہ ضروری نہیں ہے“ میرنٹن نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میں نے کہا ”چوہدری کے بندے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوتا نکھ کو“ ”اپنے ساتھ“ لے جا رہے ہیں اس کا مطلب ہے ”وہ یہاں کوئی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتے۔ ہمیں بھی انٹیشن کی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد ہی کوئی ایکشن لینا چاہیے۔“

میرنٹن میری دلیل سے قائل ہو گیا۔ تو وہی ہی دیر میں ہم اس گیٹ کے پاس پہنچ گئے جہاں سے مسافر باہر نکل رہے تھے۔ گیٹ پر دو گھنٹہ چکر مسافروں کے گٹ چپک کر کے انہیں جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ہجوم اس قدر تھا کہ لگاؤ کا افراد چپکنگ کے بغیر بھی نکل رہے تھے۔ ہمارے پاس ہیٹ فارم گٹ موجود تھے اس لیے ہمیں اس گیٹ سے گزرنے کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہم جیسے ہی ہوتا نکھ اور چوہدری نواز ش کے بندوں کے پیچھے ہیٹ فارم سے باہر آئے، میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ کلف دار سوٹ میں لباس فریہ اندام شخص نے اپنی قمیص کی سائڈ پائٹ میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ کو جب کے اندر ہی رکھتے ہوئے اس نے ہوتا نکھ کے پہلو سے لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنا چہرہ ہوتا نکھ کے کان کے قریب لے گیا۔

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا کہ وہاں کیا کارروائی ہو رہی تھی۔ یعنی طور پر اس فریہ شخص نے ہوتا نکھ کے کان میں سرگوشی کی ہوگی کہ وہ اس وقت ان کے گمن پوائنٹ پر ہے لہذا شرافت سے ان کے ساتھ چلتا رہے۔ ہوتا نکھ کے چہرے کے تاثرات میرے اندازے کی گواہی دے رہے تھے۔ میرنٹن بھی صورت حالات کو بھانپ گیا۔ تشویش ناک لمبے میں بولا ”سائیں! بندہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔“

”بندہ ہاتھ سے نہیں نکلے گا میرنٹن۔“ میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا ”میں یہ بندہ تمہارے ہاتھ میں دے رہا ہوں۔“

”کیا مطلب سائیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

ہمارے درمیان بہت دیر لگے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے میرنٹن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”تم ساحل اور ہوتا نکھ کو لے کر فوراً ٹیکسی میں بیٹھو۔ میں

ان سے منٹ کر آ رہا ہوں۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے فریہ اندام شخص کی چال دیا۔ وہ اپنے موٹے ساتھی پر کرا۔

شریف پر ایک زوردار لات رسید کی۔ اس وقت ہمارے سینے پر ایک طرح سے اچھائی ہوا کیونکہ وہ ایک مرتبہ پھر کی عمارت سے باہر نکلنے والے فرنیٹنوں پر قدم رکھ چکے تھے۔ اپنے پستول کے نشانے پر لا چکا تھا۔ وہ دونوں ایک تھے۔ میری دھواں دھار گک نے موٹے شخص کو کسی گونسو سرے سے ختم کر دیا اور تک لڑکتے گئے۔ فرنیٹن کی آمد کے مانند لڑھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا ہتھیار بردار ہاتھ حمار کے سب وہاں رشت تو ہو ہی رہا تھا۔ ہمارے اس ”پینچل پائٹ“ سے باہر آ گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا کیونکہ اس کے وجہ سے خاصی آفراتفری مچ گئی۔ میں اس معاملے کو اس کے ہاتھ میں ایک پستول موجود تھا۔ اسی لمحے میرنٹن سفلو نہیں دینا چاہتا کیونکہ ریلوے پولیس والے اگر ہماری ہوتا نکھ کا ہاتھ تھا اور ٹیکسی کی جانب دوڑ لگا دی۔

اس دوران میں موٹے آدمی کے ساتھی دروازے قاصر تھیں اور میں پولیس سے ”دور دور“ ہی رہنا چاہتا تھا۔

شخص نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا، گویا میرے لیے وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ میرے پہلو میں گرا کر مٹ گئے۔ پلٹ تیار تھی۔ میں نے اس کے نئے کلوپ اگر رکھی پھر میرنٹن کی چپتی ہوئی آواز میری سماعت اپنے بازوؤں پر روکا اور اس کے چہرے پر ایک باقوت شے ”فرانی“ ”سائیں!“ ٹیکسی میں آجاؤ۔ جلدی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے میری جانب کا دروازہ کھول دیا۔

وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بلبلانہ اظہار میرنٹن کی عقل مندی پر میں اشکراں اٹھا۔ اس نے اس کارروائی کے دوران میں ”میں موٹے پستول بردار ٹیکسی کو اسٹینڈ سے نکلوا کر مروج کی مناسبت سے بڑی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہا۔ مزید کہ وہ فرنیٹنوں کو دشمنی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے چوہدری نواز ش کے اختتام پر پہنچ کر سنبھلا اور اس نے پستول والا ہاتھ میری سرینوں کی طرف دیکھا۔ موٹے آدمی کے ہاتھ میں مجھے پستول سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن میں پلک جھپکتے میں اس کے ٹھکانے میں دیا۔ میں اپک کر ٹیکسی کے اندر آ بیٹھا۔

میرنٹن نے حکمانہ انداز میں ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت سر پہنچ گیا۔

میں نے برق رفتاری سے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں کی ”فورا نکھو یہاں سے۔“

رکھ لیا۔ قریب ہی کھڑے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا ”ٹیکسی ایک جھگڑے سے آگے بڑھی۔ وہ دونوں اس کی زد میں آتے آتے پہنچ گئے۔ ٹیکسی کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ ”بھائی، کیا ہو گیا؟“

میں نے موٹے شخص کی دھناتی کرتے ہوئے کہا ”دونوں میری طرف دوڑے تھے۔ درحقیقت وہ میری نہیں“

جب کترا ہے۔ چور لٹیرا ہے۔ میں اس کی حرمت کر لے ٹیکسی کی سمت لپکے تھے جس کے اندر ان کا شکار بیٹھا تھا۔ وہ ہوتا نکھ کو کسی بھی قیمت پر کھانا نہیں چاہتے تھے۔

”شاباش! اور مارو۔“ مجھے حوصلہ آمیز انداز میں تلمی میں سے مڑ کر ٹیکسی کے عقب میں دیکھا۔ وہ دونوں رنگ کے اس لمحے کی جانب دوڑتے ہوئے جا رہے تھے

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا مقابلہ کرنے کے بجائے ہمارے پرائیوٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا ایک ہی مطلب فرار کی فکر میں تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ ڈر کر بھاگ رہا تھا۔ اصل میں ہوتا نکھ ان کے لیے بہت اہم تھا جو اب اس کے گمن پوائنٹ پر نہیں رہا تھا بلکہ وہ دونوں میرے کچھ کے گمن پوائنٹ پر آچکے تھے۔

مجھے اپنے عقب میں خطرناک سرگرمی محسوس ہوئی۔ دونوں بدعاشی کر رہے تھے۔ ہمارے مہمان کو لوٹنا چاہتے میں سرعت سے پلٹ گیا۔ چوہدری کا دو سرانک خوار ہونا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ اسے اسیے اٹھائی گریوں گردن کو دوپٹے کے لیے اپنے بازوؤں کو میری جانب بڑھا دیا۔

ٹیکسی ڈرائیور میری وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔

تھوڑا جھگڑے ہوئے میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر کہا

”چکر کچھ نہیں بھئی۔“ میں نے جلدی سے کہا ”وہ مجھے اپنے عقب میں خطرناک سرگرمی محسوس ہوئی۔ میں نے انہیں ٹھوڑا سبق سکھایا۔ ایسے اٹھائی گریوں گردن کو دوپٹے کے لیے اپنے بازوؤں کو میری جانب بڑھا دیا۔“

ٹیکسی ڈرائیور میری وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔

تھوڑا جھگڑے ہوئے میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر کہا

”سری؟“

”اڑ پورٹ!“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

”اڑ پورٹ؟“ ہوتا نکھ نے حیرت سے دہرایا اور میرنٹن کی طرف دیکھنے لگا ”ہم تو گاؤن ویٹ جا رہے تھے!۔۔۔ اب لوگ وہ جان کا نام استعمال کر کے میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں کرنا چاہتے؟“

ہوتا نکھ کے ان کلمات سے میں سمجھ گیا کہ میرنٹن اسے ہمارے بارے میں مختصراً بتا چکا تھا اسی لیے وہ پر سکون اور خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ہوتا جی! ہم گاؤن ویٹ ہی جائیں گے پہلے ذرا اڑ پورٹ پر ایک ضروری کام ہے۔“

میرنٹن نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا ”ہم نے اگر تمہیں دھوکا دینا ہوتا تو چوہدری نواز ش کے بندوں سے چھڑاتے ہی نہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ لوگ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ تم اپنے کسی دوست کے پاس گاؤن ویٹ جا رہے ہو اس لیے بھی ہم براہ راست ادھر کا رخ نہیں کر سکتے۔“

میں ٹھوڑے ٹھوڑے وقفے سے مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا۔ جلدی ایک سفید میٹھی میری نظر میں آگئی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ایک محدود فاصلے پر پہنچی تو میں نے پھر سیٹ پر بیٹھے ہوئے موٹے تازے شخص کو پہچان لیا۔ وہ چوہدری نواز ش کے ان ہی بندوں میں سے ایک تھا، ریلوے انٹیشن پر جن سے میری مٹھ بھیل ہوئی تھی۔ گویا وہ ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے۔ شہر کی بچھلی نشست پر دروازے قامت چلوں تھیں والا شخص بھی موجود تھا۔ ڈرائیونگ ایک دھلا پتلا پست قامت آدمی کر رہا تھا۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

میرنٹن اور ساحل بھی اس تعاقب سے آگاہ ہو گئے۔ ساحل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”وہ جان! وہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں!“

آنے دوڑا نہیں۔“ میں نے کمری سنجیدگی سے کہا۔

میرنٹن بولا ”ہم نے ان کا شکار جیتنا ہے، وہ آسانی سے ہمارا چھٹا نہیں چھوڑیں گے۔“

ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں۔ اس پر آہستہ آہستہ ہمارے چہرے ہر گھل رہے تھے۔ ہماری مجبوری تھی کہ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے، اس میں ہماری حیثیت ٹیکسی ڈرائیور سے پوشیدہ نہیں

ہے سکتی تھی۔

اس نے بدستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے سسے ہوئے لیے  
میں کہا "جناب! آپ تو کسی پھڑے کے چکر میں لگتے ہیں۔ وہ  
لوگ آپ کا تعاقب کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ لوگوں  
کے درمیان کیا دشمنی ہے۔ اور نہ ہی میں جانتا چاہتا ہوں۔  
خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ میں کسی مصیبت میں نہیں پڑنا  
چاہتا۔"

"اتنے بڑے کئے ہو کر بھی بڑی دکھا رہے ہو!" میرے پیش  
نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا "بات مبادری یا بڑی دکھانے کی  
نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے مسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"میں پرانے پھڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ بے  
چارگی سے بولا "آپ اپنے دو سو روپے بھی واپس لے لیں۔  
مجھے نہیں چاہیے یہ رقم آپ کوئی اور عیسیٰ کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کرنا چاہی،  
اسی وقت میرے پیش نے اسے روپو الور کی جھلک دکھائی۔ وہ چوٹی  
پہنی نگاہ سے روپو الور کو دیکھنے لگا۔

پہرے سب پر برا جہان میرے پیش نے روپو الور پر ہاتھ  
پھیرتے ہوئے غصے لہجے میں کہا "یہ بالکل اصلی ہے اور میرا  
ہوا بھی ہے۔ کو تو جیسے چیک کرادوں؟"

"نہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور ہلکایا۔

میرے پیش نے بات دار آواز میں کہا "اپنی توجہ کو  
ڈرائیونگ پر مرکوز رکھو۔ باتیں تم اس طرف دیکھے بغیر بھی  
کر سکتے ہو۔"

وہ ٹیکسی کی اسپڈ بڑھاتے ہوئے وینڈ اسکرین کے پار  
دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں چون و چرا کی کوئی  
گفتگو نہیں تھی۔ شرافت اور قربان برواری کا مظاہرہ ہی  
اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا "دیکھو مسٹر! ہماری تم سے  
کوئی دشمنی نہیں۔ اگر تم خاموشی سے ہمارے حکم کی تعمیل  
کرتے رہے تو ہم بہت جلد تمہیں آزاد چھوڑ دیں گے۔  
تمہاری آزادی خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"دوسے کس طرح؟" وہ بے چینی سے بولا۔

میں نے کہا "تم اپنی ڈرائیونگ کی مہارت کا مظاہرہ  
کرو۔ جتنی جلدی تم تعاقب کرنے والوں کو جل دینے میں  
کامیاب ہو جاؤ، ہم اتنی ہی جلدی تمہیں آزاد کر دیں گے۔  
جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تعاقب کرنے والی سفید شیرڈ

سے ہمارا پیچھا چھوٹ گیا ہے، ہم تمہاری ٹیکسی کو چھوڑ دیں  
گے۔ اپنے گے ہم کسی اور سواری کا بندوبست کر لیں گے۔"

وہ مزید اسپڈ بڑھاتے ہوئے بولا "اسی مقصد میں کامیاب سری کے  
کے لیے مجھے بے سمت سفر کرنا ہوگا۔ موقع ملے گا میں ایک دو سب سے  
راستے بدلنا ہوں گے۔"

"تو بدلو راستے؟" اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟  
میرے قہار زیادہ رکھے کے چکر میں ٹیکسی ڈرائیور نے پہلی لین  
بیش نے اگڑے ہوئے انداز میں کہا۔

"مگر آپ لوگ تو ان پورٹ جانا چاہتے ہو!"  
"اس بات کو بھول جاؤ۔" میں نے سختی سے کہا "موتوں کے مانند آگے بڑھیں۔ ساحل نے کہا "یہ جنم کی  
الحال ہمیں نہیں جانا۔"

بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس سمجھ داری میں غار میں نے کہا "جنم کی بلا میں تو اپنے ہاتھ دھونے کے لیے  
حصہ اس روپو الور کا تھا جو میرے پیش نے اپنے ہاتھ میں تمام راہی ایک ہی استعمال کرتی ہوں گی اس لیے ہمیں زیادہ احتیاط  
تھا۔ پتا نہیں یہ ہتھیار کیسی عجیب و غریب شے ہے۔ اس کی ضرورت ہے۔ ان سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی راستہ  
استعمال توجہ دہشت بٹھاتا ہے وہ بٹھاتا ہی ہے مگر اس کی طاقت ہے۔"

خوفی جھلک بھی بہت سے بگڑے کام بنادیتی ہے انسان بڑے  
سے طاقت کی زبان سمجھتا اور اس کے سامنے جھٹکتا آیا ہے

اگر میرے پیش ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے روپو الور کی "منہ کش" سنجیدگی سے کہا "کھانا پیچھے دیں۔" آگ جہاں کا خیر تھا۔  
کرنا تو یقین ممکن تھا، وہ اپنی ٹیکسی کو سڑک کے ایک جانب خطرناک لوگ ہیں تو میں کبھی بھی آپ کو اپنی ٹیکسی میں نہیں  
روک کر نہیں نیچے اتار دیتا۔

ان پورٹ جانے والی بات میں نے بے ساختہ ہی کہہ ڈالا تھا۔ آپ تو مرنے والے کی باتیں کر رہے ہیں۔  
تھی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جو ہر انٹر نیشنل شی میں ہوتا ہے

میری معلومات کے مطابق کراچی پاکستان کا سب سے بڑا اور آٹھواں اس بیک کی آٹھ ہی سے وہ روپو الور کے ذریعے ٹیکسی  
جدید شہر تھا۔ میں نے یہاں زندگی میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا۔ ڈرائیور کو کنٹرول کر رہا تھا۔ ڈرائیور کے تہرے پر اس نے  
تھا۔ یہاں کے علاقے "مڑوئیں" مختلف مقامات سے میں نے

ناواقف تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ مجھے یہ ساری معلومات حاصل  
ہوتی گئیں تاہم واقعات کے تسلسل اور دلچسپی کو قائم رکھ کر کیا ارادہ ہے تمہارا؟

کے لیے میں ہر شے کا قاعدہ ذکر کروں گا۔  
اس وقت ہم شاہراہ فیصل سے گزر رہے تھے۔ میٹروپولیٹن

ہوٹل سے شروع ہونے والی یہ کشادہ سڑک سیدھی ان پورٹ کے لیے اختیار ہو چکے ہو تو پھر شرافت سے وہی کروچو تم سے کہا جا  
کو جاتی ہے۔ ہوتا سگھ پچھلے فٹسٹ پر میرے اور ساحل رہا ہے ہم صرف ان لوگوں کے لیے خطرناک ہیں جنہوں  
درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ سر منڈواتے ہی آئے۔

بڑے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں تعاقب میں آنے والی نہیں آنے والے سانج و دشمن عناصر ہیں۔ ہمارے ہمتان کو قتل  
شیرڈ پر بڑی ہمارا نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ہمارے درمیان کے اس سے بیک چھیننا چاہتے ہیں۔ ان سے دو دو ہاتھ کرنا  
فاصلہ بند رہنمائی ہو رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "اسپڈ بڑھاؤ۔" ہائیک آٹھ دیانی اور کہا "کیل بوتا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں  
"میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں جناب۔" وہ بے چاہیہ

سے بولا "یہ تو شکر کریں، ہمیں مکمل ٹکے ہوئے مل رہے؟  
ورنہ اتنی رفتار قائم رکھنا بھی دشوار ہو جاتا۔"

میں نے ہوتا سگھ کے بجائے "بوتا جی" کہہ کر اسے  
مطلب کیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دلاڑی آدمی تھا۔ ذرا ایسا اشارہ۔

میں نے ہوتا سگھ کے بجائے "بوتا جی" کہہ کر اسے  
مطلب کیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دلاڑی آدمی تھا۔ ذرا ایسا اشارہ۔

میں نے ہوتا سگھ کے بجائے "بوتا جی" کہہ کر اسے  
مطلب کیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دلاڑی آدمی تھا۔ ذرا ایسا اشارہ۔

میں نے ہوتا سگھ کے بجائے "بوتا جی" کہہ کر اسے  
مطلب کیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دلاڑی آدمی تھا۔ ذرا ایسا اشارہ۔

کچھ گیا کہ اس نے خود کو سگھ ظاہر نہیں کرنا۔ معنی خیز انداز  
میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ جان بھائی! آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔"  
ساحل نے کہا "وہ جان! اگر اسی طرح کارپیننگ ہوتی  
رہی تو نتیجہ برآمد ہونے میں بہت وقت لگ جائے گا اور  
ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔"

ساحل کی بات ختم ہوئی تو میں نے تعاقب شیرڈ اور  
ٹیکسی کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگانے کے لیے اپنے پیچھے  
نگاہ دوڑائی اور اسی وقت میں ایک ہائی روف کو دیکھ کر چونک  
اٹھا۔ نیلے رنگ کی وہ ہائی روف بہت تیزی سے سفید شیرڈ کے  
پیچھے لگی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کسی وقت کا سامنا نہیں  
کرنا چاہا کہ نیلی ہائی روف "سفید شیرڈ کا تعاقب کر رہی تھی۔"

اس وقت ہم کرا سارا اور ڈرگ روڈ کے درمیان سڑک  
رہے تھے۔ یہ کنٹونمنٹ کا علاقہ ہے اس لیے دائیں بائیں  
خاصا وسیع علاقہ تعمیرات سے خالی ہے۔ اس کھڑے میں بڑی  
فری ڈرائیونگ کی جاسکتی ہے۔

پتا نہیں نیلی ہائی روف کب سے سفید شیرڈ کا پیچھا  
پکڑے ہوئے تھی۔ میری نظر بلکہ ہماری نظریں تو وہ ابھی  
ابھی آئی تھی۔ میرے پیش سمیت ساحل اور ہوتا سگھ بھی نیلی ہائی  
روف کے عزائم کو بھانپ گئے تھے۔

ساحل نے تشریفات ناک لہجے میں کہا "یہ شیرڈ والوں کے  
ساتھی بھی ہو سکتے ہیں!"

"نہیں۔" میں نے دونوں کا انداز میں کہا۔  
"وہ جان! یہ بات تم اتنے وثوق سے کس طرح کہہ  
رہے ہو؟"

"اگر نیلی ہائی روف والے چوہری نوازش کے بندوں  
کے ساتھی ہوتے تو انہیں ہماری ٹیکسی کے پیچھے آنا چاہیے  
تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ جان سائیں! مجھے تو یہ لوگ چوہری نوازش کے  
خالفین میں سے لگتے ہیں۔" میرے پیش نے اظہار خیال کرتے  
ہوئے کہا۔

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "تم بالکل ٹھیک  
پر سوچ رہے ہو۔"

ہمارے درمیان فاصلہ اب اتنا کم ہو گیا تھا کہ نیلی ہائی  
روف میں موجود لوگوں کو بے آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ جس  
فحص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ خاصا مشتاق  
اور تجربہ کار نظر آتا تھا۔ دو افراد ہائی روف کے پچھلے حصے میں  
تھے۔ ان کا نگاہیں بھی سفید شیرڈ پر جمی تھیں۔



نے میرے بہت سے دوستوں کی جانیں لی ہیں۔ لاشوں کے کچھ نذرانے اس کی خدمت چودریہ میں بھی پہنچنے چاہیے۔

”آپ نے دل خوش کر دیا سائیں!“ میر بخش نے مسرور لبے میں کہا ”اب مجھے کوئی پروا نہیں، میں تو آپ کی وجہ سے ہاتھ روکے بیٹھا تھا۔“

پھر میں نے ایک مقام پر ڈرائیور کو ٹپکی روکنے کو کہا۔ راشد منہاس روز پر اب ہم خاصا آگے آگئے تھے۔ ڈرائیور نے اللہ کا نام لے کر ٹیکسی روک دی۔

اس سے پہلے کہ میں اور میر بخش ٹیکسی سے باہر آتے سفید شیزو ہمیں اور ٹیک کے کچھ اندر میں فٹ آگے آگے رک گئی۔ چودری کے گماشتوں نے گاڑی اس ذریعے پر روک بھی کر لی کہ ہم چاہتے تو آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اسی وقت نیلی ہائی روف نے ہم دونوں کو اور ٹیک کیا اور شیزو سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ سفید شیزو ٹیکسی اور ہائی روف کے درمیان بچھ کر رہ گئی۔

میں نے ٹیکسی کے دروازے کو کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو ایک منظر نے مجھے چکھنے پر مجبور کر دیا۔ میر بخش بھی وحشت زدہ انداز میں ہائی روف کی طرف دیکھنے لگا۔ ساحل بوٹا سنگھ اور ٹیکسی ڈرائیور میری ہدایت پر ٹیکسی رکتے ہی محفوظ پوزیشن میں جا چکے تھے اس لیے وہ اس سنسنی خیز منظر کو نہ دیکھ سکے۔

ہائی روف پر بیٹوں کی تیز چڑچڑاہٹ کے ساتھ رکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کا سلائیڈنگ ڈور کھلا اور پچھلے حصے میں سوار دونوں افراد اچھل کر باہر آگئے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔

ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کے کے کا رخ سفید شیزو کی جانب تھا۔ وہ چپے کی مانند جست بھر کر شیزو کے قریب آگئے پھر ان کی کے کے (کلا شیفون) شیزو پر گولیوں کی برسات کرنے لگیں۔ شیزو میں موجود تینوں افراد گتے کی کیفیت کا شکار تھے۔ گتوں سے نکلنے والے برستوں نے شیزو کا ستیاناس مار دیا۔ ونڈ اسکرین، سائیڈ اسکرین اور گاڑی کی باڈی ”لوہان“ ہو گئی۔ جب گاڑی کا یہ حشر ہوا تھا تو اس کے اندر والوں کا کیا حال ہو گا؟ اس کا اندازہ نہ خوبی لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے چودری کے کے پالتو کتوں کو تڑپ تڑپ کر غصے سے ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب کچھ بہ مشکل پانچ سیکنڈ میں پیش آیا تھا۔ شیزو میں موجود تینوں افراد نابود ہو گئے۔ کلا شیفون بردار افراد نے شیزو کے اندر جھانک کر اپنا اطمینان کیا اور

ہماری ٹیکسی کی جانب قدم اٹھانے لگے۔

وہ بہت نازک لمحات تھے۔ ہائی روف والوں کی لڑائی کارروائی نے ہمیں ٹیکسی سے بچنے اترنے کا موقع نہیں تھا۔ خوفناک برسٹ کی آوازوں نے ہمارے ساتھیوں سانس روک کر چپے رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں اور میر نے آنے والوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

وہ دونوں ہماری ٹیکسی کے قریب آگئے۔ کسی لمحے بھی ہو سکتا تھا تاہم کچھ بھی نہ ہوا۔ مگر بردار افراد نے بڑے کے نزدیک پہنچ کر کلا شیفون کا رخ زمین کی طرف کر دیا۔ بکے چروں پر بھی مجھے دوستانہ تاثرات نظر آئے۔ میر سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

ایک مگر بردار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”انسانیت کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔ ہماری گاڑی میں آجاؤ۔ جہاں جانا ہو، ہم چھوڑ دیں گے۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ٹھوس لبے میں جواب دیا ”ہم تمہارے دشمنوں کے دشمن ہیں اس رشتے سے تم ہمیں اپنا دوست سمجھو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس آجائے گی۔ یہ پانچ ڈرائیور ریلوے اسٹیشن سے یہاں تک تم لوگوں کے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پولیس والوں سے کیا بچائے گا۔ اگر ہم بھروسہ کرتے ہو تو ہماری گاڑی میں آجاؤ۔ تم ان۔“

میں نے سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں ان کے ساتھ جا کافیلہ کر لیا۔ اس دوران میں ہمارے دیگر دونوں ساتھی سیدھے ہو چکے تھے۔ میرے اشارے پر وہ ٹیکسی سے باہر آگئے۔ میں اور میر بخش بھی نیچے اتر آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے کہا۔

”اب تم جہاں جانا چاہو، جا سکتے ہو۔ ہم تمہیں آؤ کیا۔“

پھر ہم سب نیلی ہائی روف میں آ بیٹھے۔ ہمارے اندر پہنچنے ہی ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے بائیں کرنے لگی۔

کلا شیفون بردار دونوں افراد ہمارے ساتھ گاڑی پہنچے حصے میں تھے۔ ان پر اعتماد کر کے میں کسی الجھن پریشانی میں نہیں تھا۔ بس میرے دل نے کہا تھا ”ان لوگوں کو بھروسہ کرنا چاہیے اسی لیے میں نے ان کے ساتھ جانے فیصلہ کیا تھا۔ ساحل اور بوٹا سنگھ سراسر نظروں سے باہر اپنے عقب میں دیکھ رہے تھے جب کہ میر بخش خاصا بچی

صورت حال واضح ہو گئی تو بوٹا سنگھ نے کہا ”وجدان بھائی! تو کوئی نیا ہی کھیل شروع ہو گیا ہے۔ بیک میں آپ کی امانت رکھی ہے۔ اسے محفوظ رہنا چاہیے۔“

”بیک میر بخش کی تحویل میں محفوظ ہے اس لیے اس کے اندر رکھی امانت بھی محفوظ ہی سمجھو۔“ میں نے کہا ”اب تم اپنی ذمہ داری سے آزاد ہو چکے ہو۔ میں نے اپنی فائزگی وصول پائی۔ اس کی حفاظت کرنا اب میری ذمہ داری ہے۔“

”شکر ہے“ میں اپنے مقدمہ میں کامیاب ہو گیا۔ ”بوٹا سنگھ نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

میں ایک بیٹی سے کروڑپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ آسم ایک سڑک بائیں جانب مڑی تھی۔ اس طرف کا علاقہ خاصا غیر آباد تھا۔ میں اس جلی چوہے کے کھیل کو اب زیادہ طویل نہیں دینا چاہتا تھا۔ جو بھی ہوتا تھا وہ ہو جاتا۔ چودری نواز ش کے نمک خوار کسی بھی قیمت پر بوٹا سنگھ اور فائزگی والے بیک کو چھوڑنے والے نہیں تھے اور ہمارا ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک اس تعاقب سے جان نہیں چھڑایا تھا۔ اتنی سہلت ہمارے پاس نہیں تھی کہ ڈرائیور کو ہٹا کر میں خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتا۔ اس لمحاتی وقفے سے وہ لوگ ہمارے سر پہنچ جاتے۔ جب ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہی تھے تو پھر بھری بڑی سڑک کے بجائے بائیں جانب نکلنے والی وہ روڈ زیادہ مناسب تھی۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا ”وہ آگے بائیں جانب جو سڑک مڑی ہے، تم اپنی ٹیکسی کو اس سڑک پر ڈال دو اور جس میں رہنے کا کھوں تو ٹیکسی روک لینا۔“

”جناب! وہ تو خاصی ویران سڑک ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا ”مگر کوئی مارا ماری شروع ہو گئی تو چھڑانے والا بھی کوئی نہیں لے گا۔“

”میری تو میں چاہتا ہوں۔“ میں نے سفاکی سے کہا۔

”کیسی کیا مطلب؟“ وہ گڑبڑا کر پوچھا۔

”تم مطلب و مطلب کو چھوڑ دو سائیں۔“ میر بخش نے کہا ”وجدان سائیں تم سے جو کہہ رہے ہیں، آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرو۔“

ساحل نے کہا ”کہیں واقعی آنکھ بند نہ کر لیتا، ہمیں نہ سہی مگر تمہارے گھر والوں کو ابھی تمہاری بہت ضرورت ہو گی۔ آنکھیں بند کر کے ڈرائیونگ کو تو سیدھے۔“

اس نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔“ وہ سسے ہوئے

انداز میں بولا ”پتا نہیں، آج کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“

میں نے کہا ”اس مصیبت کا نام ہے۔ قسمت کا کھٹا اور حالات کی مار۔ اگر تم چاہتے ہو، تمہاری شادی ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنا ہو گا۔ اور زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے تم بے چون و چرا ہماری بات مانتے جاؤ۔“

”مانوں گا سراسر آپ لوگوں کی میں ہر بات مانوں گا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں آنکھ بند کر کے آپ کے حکم کی تعمیل کا مطلب بھی سمجھتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

آخر کے ایک دو جملے اس نے ساحل کے جواب میں کہے تھے۔

اب تینوں گاڑیاں شاہراہ فیصل پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے اپنی یلو کیب بائیں جانب موڑی تو اسی وقت میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ سفید شیزو تو ریلوے اسٹیشن سے ہمارے تعاقب میں تھی۔ اس نے ہمارے پیچھے ہی مڑنا تھا مگر نیلی ہائی روف نے بھی شیزو کے مڑنے ہی شاہراہ فیصل کو چھوڑ دیا۔

لگ بھگ آدھے گھوینٹ تک یلو کیب واپٹ شیزو اور ریلوے ہائی روف راشد منہاس روڈ پر آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر میں شلوار قمیص والے موٹے کے پاس ایک ہاسٹل دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کیا اور قسم کا اسلحہ تھا، میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے میر بخش سے کہا ”کوئی مناسب جگہ دیکھ کر ٹیکسی رکاوڑاں گا۔ تم موٹے سور کو رکھنا۔ باقیوں کو میں سنبھال لوں گا۔ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے سائیں۔“ وہ چونکا انداز میں بولا پھر پوچھا ”کیا ہم ٹیکسی کے اندر رہی رہیں گے؟“

”تم اور میں ٹیکسی سے فوراً باہر آجائیں گے۔“ میں نے کہا ”ساحل، بوٹا اور ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی رکتے ہی، جب کہ سیمپوں کی آڑ میں چھپ جائیں گے تاکہ باہر سے کسی بھی قسم کی ہونے والی فوری فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے کروڑپیش کا جائزہ لیا اور کہا ”ہم دونوں ٹیکسی سے باہر آتے ہی ٹیکسی کی آڑ میں گئے۔ تم شلوار قمیص والے موٹے شخص کو اپنی نگاہ میں رکھنا۔ ایک آدھ بندہ پھلکا پھلکا پیڑ جاتے تو پروا نہیں۔ ڈرائیور نواز ش کو کبھی تو پتا چلے کہ اس کے دشمن کا کیا نیا چیز ہے۔ اس کے ہر کاروں

نظر آ رہا تھا۔

”ہمارے ”میزبانوں“ نے نہایت ہی مہارت کے ساتھ اپنی ککے کے سیٹوں کے نیچے چھاپڑیں بھران میں سے ایک نے پوچھا ”تم لوگ کہاں جاؤ گے؟“

سوال کرنے والے کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس نے چٹون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا دوسرا ساٹھی جینز اور نی شرٹ میں تھا۔ وہ بیچس سے زیادہ کانٹا نہیں لگتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے شخص کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھا تھا۔

میں نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے سوال کرنے والے سے سوال کر ڈالا ”پہلے ہمیں تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ جب ہماری تسلی ہو جائے گی تو پھر ہم سے سوال کرنا۔“

”تم کس قسم کی تسلی چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے کہا ”پہلے تو یہ بتاؤ تم کون لوگ ہو اور شیرو والوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ”تم ہمیں خدا کی فوج وار کہہ سکتے ہو اور ہم ہر اس شخص کے دشمن ہیں جو اس شرکے امن وامان کو دہم برہم کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”گویا تم اس شرکے ٹھیکے دار ہو!“ میں نے کہا۔ ”تم ایسا کہہ سکتے ہو۔“ وہ زہر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا زہریلا پن شامل تھا۔ وہ مجھے بہت گراٹھن محسوس ہوا۔

میں نے پوچھا ”تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ سفید شیرو والے ان ٹیٹوں افراد کو تم لوگوں نے کیوں قتل کیا؟“

”وہ انسانیت کے دشمن تھے۔“ اس نے اپنی کچی ہوئی بات کو دہرایا پھر مزید بتانے لگا۔ ”تم ہیں چار دہن سے انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ دراصل ہمیں اس موٹے شخص کی تلاش تھی۔ اس نے چند روز پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قتل اور ڈکیتی کی ایک واردات کی ہے۔ اس کے وہ ساتھی تو ہمارے ہاتھ نہیں آ سکے۔ چلو یہ دوسرے ساتھی ہی سہی۔ متاثرہ خاندان سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ پولیس والے تو اس موٹے تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خود ہی انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ بے کس اور بیچ سے عاری افراد کی کون ستا ہے بھائی۔“

میں نے کہا ”تمہارا نشانہ تو وہ فریہ شخص تھا۔ باقی دو افراد کا کیا قصور؟“

”گیٹوں کے ساتھ گھن بھی پتا ہے۔“ وہ سفاسکی سے بولا ”اس کے یہ دونوں ساتھی بھی شریف شہری نہیں ہو سکتے۔ ہم

ریلوے اسٹیشن سے تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے بلکہ شیرو کا پیچھا کرتے ہوئے اسٹیشن تک پہنچے تھے۔ ان کے کرنے کا ہمیں موقع نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے اسٹیشن عمارت کے باہر تمہارا اور ان کا مقابلہ دیکھا ہے۔ ہم بہت بھادری اور جرات مندی سے ان کی پٹائی کی۔ تمہاری کار کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ اسی وقت میں نے لیا تھا کہ تمہاری طرف دو سی کا ہاتھ ضرور بڑھاؤں گا۔“

بات ختم ہوتے ہی اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے دو ستارہ میں کہا ”دوستی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تم ہمارے دشمنوں کے دشمن ثابت ہوئے ہو اس لیے ہمارے دوست ہی ہوئے۔“

پھر اس نے باری باری ہوتا سنگھ اور میر بخش سے ہاتھ ملایا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اب تک صرف وہی شخص بولتا آیا تھا۔ اس کا نوجوان ساتھی ڈرائیور بالکل خاموش تھے اس سے میں نے یہ اندازہ لگا ہمارے ساتھ بات چیت کرنے والا ان کا کوئی سینئر تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے نام بھی بتائے۔

میں نے اس سینئر کو مخاطب ہوتے ہوئے دیکھا ”ہم دوست بن ہی گئے ہیں تو پھر یہ بھی بتاؤ تم یہ سڑکوں پر قسم کا انصاف کرتے پھر رہے ہو۔ کوئی بھی مٹھا سواں تم سماجی ٹھیکے داری کی اجازت نہیں دیتا۔ تم تو بھدہ یہ لحد قانون ہاتھ میں لے رہے ہو۔ یہ کہاں کی دوافش مندی ہے؟“

”یہی تو دوافش مندی ہے میرے بھائی۔“ وہ معنی انداز میں بولا ”ہمارے ملک کا مزاج تو جیسا ہے اس سب واقف ہیں لیکن اس شرک کا مزاج کچھ عجیب سا ہے۔ آئے دن وارداتیں اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں انصاف حاصل کرنا ناممکنات میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ اسی نا انصافی اور معاشرتی وباؤ کے باعث ہماری تنظیم ہوتی ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنے کے لیے کسی سماج یا قانون کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود مختار اور آزاد ہوتے ہیں۔ جب کوئی معاشرتی ناموس ہماری نظر میں آ جاتا ہے ہم اس کے جرم کی تصدیق کر لیتے ہیں تو پھر اس جرائم شخص کو موت کے گھاٹ اتارنا ہمارا اولین فرض بن جاتا ہے۔ ہم اس شرک کو قسم کے جرم سے پاک کرنے کا عزم کر میدان میں اترتے ہیں۔“

”تمہارے عزائم تو قابل ستائش ہیں۔“ میں نے کہا ”اے انداز میں کہا“ لیکن ان کاموں کے لیے

پولیس اور عدالتیں ہر شرمیں موجود ہوتی ہیں۔ یقیناً کراچی میں بھی یہ ادارے ہوں گے!“

”مگر یہ ادارے دیانت داری سے کام کر رہے ہوتے تو پھر ”سی ایف کے“ کے قیام کی ضرورت نہیں نہ آتی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لمحے میں بولا۔

”سی ایف کے!“ میں نے حیرت سے دہرایا ”یہ کیا چیز ہے بھائی؟“

اس نے بتایا ”سی ایف کے ہماری تنظیم کا نام ہے یعنی کرائم فری کراچی۔“

ہمارے درمیان بات چیت کے دوران میں ہائی روف نیا چورنگی سے بائیں جانب گھوم گئی۔ اب اس کی رفتار میں قدرے کمی آئی کیوں کہ یہاں ٹریفک زیادہ اور بے ہنگم تھا۔

”ہم نے سفید شیرو والوں سے اپنی دشمنی کے بارے میں تمہیں بتا دیا۔“ اسی شخص نے پوچھا۔ ”دوست! تم بھی تو کچھ بتاؤ وہ لوگ ریلوے اسٹیشن سے تمہارے تعاقب میں کیوں لگ گئے تھے اور تمہارے درمیان اسٹیشن کی میزبانی پر قائم ناگہانی کس ذیل میں ہوئی تھی؟“

میں جس شخص نے باتیں کر رہا تھا اس نے اپنا نام امتیاز علی بتایا تھا۔ اس کے نوجوان ساتھی کا نام اشتیاق احمد اور ڈرائیور کا نام بارخان تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ انہوں نے ہمیں اپنے اصلی نام بتائے ہوں گے۔ وہ جس قسم کے کاموں میں ملوث تھے ان میں راز داری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ امتیاز مجھے اپنی تنظیم ”سی ایف کے“ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اصولی طور پر تو انہیں اپنا کام کر کے جانے اور واپس سے فوراً فرار ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے بالکس وہ نہ صرف ہمیں بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے بلکہ اپنی تنظیم کے عزائم اور مقاصد سے بھی آگاہ کیا جا رہا تھا۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی پتہ لگتا تھا۔

بہر حال اب تو ہم ان کی گاڑی میں بیٹھ ہی چکے تھے۔ جائے وقوعہ سے فوری فرار ہماری بھی ضرورت تھی۔ اتنا مجھے احساس تھا کہ وہ لوگ ہمارے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر انہوں نے ہم سے کسی نوعیت کی دشمنی کرنا ہوتی تو وہ موقع عین مناسب تھا جب انہوں نے کک کے کے برست مار کر سفید شیرو سمیت تین افراد کو چھلی کر دیا تھا۔

امتیاز کا سوال ایسا تھا کہ اس کا کوئی تسلی بخش جواب دیا جانا ضروری تھا ورنہ وہ لوگ ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو سکتے تھے۔ اتنی دیر میں میں ایک موٹر بیکس تیار کر چکا تھا جس میں بیچ زیادہ اور جھوٹ کر تھا۔

میں نے کہا ”امتیاز بھائی! ہم تو بالکل سیدھے سادے لوگ ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔ ٹرین سے اترتے ہی وہ محسوس ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے ہمارے پاس ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ان کی نظر ہمارے بیک پر تھی۔ انہوں نے بیک چھیننا چاہا تو ہمارے درمیان ٹھوڑی سی مار مارا ہو گئی۔ اس کے بعد کے حالات آپ لوگوں کی نظر میں ہیں۔“

ایک لمحے کو میں سانس لینے کی خاطر رکا پھر کہا۔ ”بہر حال ہم ان تینوں کو نہیں جانتے۔ ہم نے انہیں زندگی میں پہلے بھی نہیں دیکھا۔“

”تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں۔“ امتیاز نے ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہا ”ہم نے اس دوران میں ان کے بارے میں ٹھوڑی چھان بین کی ہے۔ ان تینوں کا تعلق ایک جرائم پیشہ گروہ سے ہے جس کا سرغنہ میاں زاہد حسین نامی ایک شخص ہے۔ ان کا ٹھکانہ بی۔ای۔سی۔ ایچکے ایس کے علاقے گرین بیٹ کے ایک بنگلے میں ہے۔ ہم براہ راست ان کے ٹھکانے پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس میں ہماری چند تعقیبی مجبوریوں ہیں۔ تم اسے ہماری مصلحت کہہ لو۔

بہر حال، ہم حکم کھانا اسٹیشن میں آکر دوسروں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ چن چن کر جرائم پیشہ افراد کا خاتمہ کرنا ہماری پالیسی ہے۔ تم یقین کر دو جدان! چار روز قبل اس موٹے نے جس گھر میں ڈکیتی کی ہے وہاں ایک ماہ بعد لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ لڑکی کے والد نے مزاحمت کی تو انہوں نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔“

میں نے امتیاز سے یہ نہیں کہا ”وہ اگر برے لوگ ہیں تو تم بھی کوئی اچھے کام نہیں کر رہے ہو۔ کیوں کہ ”سی ایف کے“ جو کچھ کر رہی تھی اس پر بحث کا دروازہ کھل جاتا تو بات بہت دور تک جاسکتی تھی اور میں ابھی اس موڈ میں نہیں تھا۔ مجھے سوچ میں مبتلا دیکھ کر امتیاز نے پوچھا ”جدان! تم کراچی میں کس کے پاس آئے ہو؟“

”میاں کلشن کے علاقے میں میرے ایک عزیز رہتے ہیں۔“ میں نے سوچے سمجھے پروگرام کے تحت جواب دیا ”ہم ان سے ملنے آئے ہیں۔“

جس طرح نیلی ہائی روف والوں میں سے صرف امتیاز علی بات کر رہا تھا ویسے ہی ہماری جانب سے بھی صرف میں ہی بول رہا تھا اور یہ دونوں کے لیے اچھا تھا۔

امتیاز نے کہا ”کلشن تو کراچی کا سب سے زیادہ پوش

علاقہ ہے۔ تم نے اپنے جس عزیز کا ذکر کیا ہے، وہ کیا کرتا ہے اور اس کا نام کیا ہے؟

”میرے عزیز کا نام منہاس باقر ہے۔“ میں نے بتایا ”وہ بہشتنگ کے شعبے سے منسلک ہے۔“

میں نے دانستہ گول مول جواب دیا تھا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ منہاس باقر ایک اخبار کا مالک ہے تو وہ ہماری طرف سے چوکنہ ہو جاتا۔ بہشتنگ کا شعبہ بہت وسیع ہے لہذا امتیاز علی میرے جواب سے کسی تشویش میں مبتلا نہیں ہوا۔

اس نے بوٹا نکلے والے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”وہ لوگ اسی بیگ کو تم سے چھیننا چاہتے تھے؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولا ”لگتا ہے“ اس بیگ میں تم لوگوں نے کلو کے حساب سے سونا بھر رکھا ہے جو وہ لوگ اس کے حصول کے لیے ریلوے اسٹیشن سے تمہارا تعاقب کرتے ہوئے اتنی دور نکل آئے تھے!“

امتیاز نے یہ بات مذاق کے انداز میں کسی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ اس بیگ کے اندر واقعی کلو کے حساب سے سونے کا راز نہاں تھا۔ میں نے اسی کے رنگ میں کہا۔

”امتیاز! وہ لوگ جتنی دور آئے تھے، آئے ہی تھے لیکن تم نے انہیں جتنی دور پہنچا دیا ہے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ان کی واپسی کے امکانات اب صفر کے برابر ہیں۔“

”انہیں ایک نہ ایک دن حرام موت مرنا ہی تھا۔“ وہ سفاکی سے بولا ”اور وہ دن آج کا نکل آیا۔ اس میں نہ تو ہمارا کوئی کمال ہے اور نہ ہی ان کی کوئی بے وقوفی۔“

میں نے اس کے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ دوبارہ بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”کیا تم یہ بیگ کھول کر مجھے دکھا سکتے ہو۔“

اس کے سوال سے واضح تھا کہ دوست کہنے کے باوجود وہ ہم پر شک کر رہا تھا۔ میں نے کہا ”اس میں صرف نئی استعمال کی چیزیں ہیں۔ ان لوگوں کو پتا نہیں کیا غلط فہمی ہو گئی تھی جو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے بڑگئے تھے۔“

”معاف کرنا دوست!“ امتیاز ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میری دوستی کو شک کی نظر سے نہ دیکھنا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے تجسس سے مجبور ہوں۔ اس بیگ کو کھول کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا ”اگر تمہیں واقعی دوست کی زبان پر اعتبار نہیں تو، خود ہی اس کا معائنہ کر لو۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے بیگ امتیاز کی جانب بڑھادیا۔

مجھے یقین تھا کہ اسے بیگ میں سے کوئی بھی اعتراض“ شے نہیں ملے گی۔ ڈائری کے مندرجہ غور سے نہ پڑھا جاتا تو کچھ پلے نہیں پڑ سکتا تھا۔

میرے تئیں وہ جھل سا ہو گیا اور اسی خیال تھا کہ اس نے بیگ کی سرسری تلاشی لے کر اسے حوالے کر دیا اور بیڑانے والے انداز میں بولا ”پاکر لوگ احق کہیں کے گدھے کے بچے!“

میں نے طنزیہ انداز میں کہا ”دوست! میری با تصدیق ہو گئی یا کوئی اور ثبوت بھی فراہم کرنا ہو گا؟“ ”میں نے کہا تھا،“ میری بات کا برانہ منانا۔“ ”اے کہا“ لیکن لگتا ہے، تم میری اس حرکت پر ناراض ہو۔“

”خیر، چھوڑو اس بات کو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ”جب تمہیں دوست کہہ دیا ہے تو پھر برا کیا منانا۔“ ایک کو رک کر میں نے استفسار کیا ”ہمیں کہاں ڈراپ کر رہے امتیاز؟“

”تم کو تو کلشن ہی چھوڑ آئیں!“ وہ فراخ دلی سے ”نہیں، اتنی زحمت کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے کہا ”تم ہمیں جائے وقوعہ سے یہ حفاظت نکال لا۔ یہی تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ اپنے ٹھکانے پر ہم خود ہی جائیں گے۔ تم ہمیں کسی ایسی جگہ اتار دو جہاں سے یہ ٹیکسی مل جائے۔“

وہ گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا ”ہم اس وقت منڈی سے گزر رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں، ہم آپ کو لوگوں بھادر آباد کے چوراہے پر ڈراپ کر دیتے ہیں۔ اس کے آپ جہاں جانا چاہیں، چلے جائیں۔ ٹھیک ہے؟“ ”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

دراصل میں جلد از جلد ان سے جان چھڑانا چاہتا وہ اگرچہ بالکل دوستانہ ماحول میں گفتگو کر رہا تھا تاہم میں اس کی کمی ہوئی باتوں پر زیادہ اعتبار نہیں کیا۔ موقع واقع سے فوری روپوشی نامگزین نہ ہوتی تو میں ان کے ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر واقعی ان کا تعلق کسی انتظام سے تھا تو اب تک امتیاز نے اپنے بارے میں مجھے کچھ بتایا تھا، وہ اسے ہرگز ہرگز نہیں بتانا چاہیے تھا۔ یہ بھی کھیل، کھیل رہے تھے فی الحال میں اس کی یہ میں نہیں پایا تھا۔

نبلی ہائی روف ایک بارونق چوراہے کے قریب گئی۔ امتیاز نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ”وہ جان اگر

سے دوستی کی ہے تو اس کی لاج بھی رکھنا۔

”تم مجھ سے ایسا انجیل کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”رازدی حفاظت۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”مجھے نہیں لگتا کہ دوبارہ ہماری ملاقات ہو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں تمہاری تنظیم کے بارے میں لوگوں کو بتا دوں۔ کون ہے جو میری بات کا یقین کرے گا؟“  
”سی ایف کے“ کے بارے میں کسی ہوئی میری باتوں کو سہرا نہیں سمجھا جائے گا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو وجدان! کسی کو تمہاری بات کا یقین نہیں آئے گا۔“ وہ اثبات میں سر ملتا ہے ہوئے بولا ”مگر ہماری دوستی میں فرق ضرور آجائے گا۔ تم پر بھروسہ کر کے تمہیں جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ تم مجھے ایک شریف انسان لگے ہو۔ مجھے امید ہے تم بھی شرافت کا مظاہرہ کرو گے۔ میں تمہاری دوستی کو کھوتا نہیں چاہتا۔ خدا حافظ!“

آخری الفاظ اس نے جذباتی انداز میں ادا کیے اور ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔ ہم تینوں نے اس سے مصافحہ کیا اور گاڑی سے باہر آ گئے۔

میں نے امتیاز کی جانب دیکھتے ہوئے اوائلی انداز میں ہاتھ بلایا اور مسکراتے ہوئے کہا ”وش ہو گڈ لک!“

سلائیڈنگ ڈور اپنی مخصوص آواز کے ساتھ بند ہوا اور نیلی ہائی روف ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

”یہ کس قسم کے مجرم ہیں سائیں؟“ میری بخش نے جاتی ہوئی ہائی روف کی جانب دیکھتے ہوئے غیب خیز انداز میں کہا۔  
میں نے کہا ”مجرموں کی ہزاروں اقسام ہیں مگر اتنے شریف انقض مجرم میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ وہ تو انصاف اور امن و امان قائم کرنے کے بھی دعوے دار ہیں۔“

”ان پر ریسرچ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔“ ساحل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ”نی الحال تو چیٹ پوچھا کوئی بندہ دست کرنا چاہیے۔ مجھے تو بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔“

اس وقت لگ بھگ دوپہر کے دو بجے ہوں گے۔ بچ کا وقت تھا اور ساحل تو ویسے بھی بھوک کی چوکی تھی۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی تو تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک باریبیو ریسٹورنٹ نظر آیا۔ میں نے اس سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا ”چلو“ وہیں چل کر بیٹھے ہیں۔ کھانا بھی کھائیں گے اور گپ شپ بھی ہوئی رہے گی۔

ہم چاروں چلتے ہوئے مذکورہ ریسٹورنٹ میں آ گئے۔

خاصا صاف ستھرا اور معیاری ریسٹورنٹ تھا۔ ایک جائز ڈاننگ ہال بنا ہوا تھا اس کے علاوہ فیملی کین کا انتظام بھی تھا۔ ہم ایک کین میں آکر بیٹھ گئے۔ ایک مناسب سی میز کی دونوں جانب صوفہ نما بڑے سائز کی سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سیٹ پر دو افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ میں اور ساحل ایک سیٹ پر راجان ہو گئے۔ دوسری سیٹ پر میری بخش اور ایک شخص نے سنبھال لی۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد ہم بائبل میں لگ گئے موضوع گفتگو ”سی ایف کے“ ہی تھی۔

ساحل نے کہا ”مجھے تو ایک فی صد یقین نہیں کہ ان تعلق ایسی ویسی تنظیم سے ہے۔“  
”ہاں سائیں!“ میری بخش تمیزی انداز میں بولا ”اس قسم کے خدناک لوگ تو نہ کسی کو کھت دیتے ہیں اور نہ ہی اپنے جرم کے عینی شاہدوں کو یوں آسانی سے جانے دیتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔“

ہونا سکتا بولا ”ان کے رویے پر مجھے خود حیرت ہے۔ انہوں نے چوہدری نواز علی کے تینوں بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ ان کے دشمن ہیں مگر ہم سے دوستی کرنے کے لیے انہوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔“

میں نے اس الجھن کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا اور ہونا سکتے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”ہونا سکتے! تم نے میرے لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ میں تمہارے اس ایثار کا کوئی بدلہ بھی چاہوں تو تمہیں دے سکتا۔ البتہ جو کچھ میں تمہارے لیے کر سکتا ہوں مجھے بتاؤ میں ضرور کروں گا۔“

”وجدان! اچھی بات تو یہ ہے کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ وہ معتدل انداز میں بولا ”میرے آجہاں دوست خشونت شکنے نے یہ ڈائری مجھے بھجوائی اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی۔ میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔“

”اس فرض کی ادائیگی میں تمہیں اپنا گھر چھوڑ کر لاہور سے کراچی آنا پڑا۔“ میں نے کہا ”اور اس طرح آنا پڑا کہ تمہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔“

”پورا نہیں ہے وجدان!“ وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ”لاہور میں کرایے کا گھر تھا۔ چھوٹ گیا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ میری بھی جمانی ناف ختم ہو گئی۔ اب میں بھی اس طرف کاربغ نہیں کر سکوں گا۔ چوہدری نواز علی کے بندے میرے بارے سوچتے پھر رہے ہیں۔“

ساحل نے کہا ”اور تمہاری پو کا کچھ حصہ چوہدری نے یہاں کراچی بھی بھیج دیا۔ تین سو گھنٹے والے ریلوے اسٹیشن پر تمہارے استقبال کے لیے موجود تھے۔“  
”خدا کا شکر ہے وہ تینوں شیطان جنم واصل ہوئے۔“ میری بخش نے کہا ”مجھے ان کے انجام سے خاصا اطمینان ہوا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی تعداد کچھ تو کم ہوئی۔“  
میں نے کہا ”ہاں! کچھ کم تو ہوئی مگر ختم نہیں ہوئی۔ نیلگی کی اطلاع کے مطابق چوہدری کا ایک نیٹ ورک کراچی میں سرگرم ہے پھر امتیاز علی نے بھی بتایا ہے کہ وہ تینوں مجرم جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کا سرغنہ میاں زاہد حسین نامی ایک شخص ہے۔ جس کا ٹھکانا گرین ہیل کے علاقے میں ہے۔ شاید اسی نیٹ ورک کا ذکر نیلگی نے کیا تھا۔“

میری بخش نے کہا ”سائیں! ہم چوہدری کے خاص بندے میاں زاہد حسین کی سرکوبی کے لیے ای سی ایچ ایس میں اس کے ٹھکانے کا سراغ لگانے ہیں۔“  
”یہ وقت ضرورت بہ کام ضرور کریں گے۔“ میں نے کہا۔

اسی وقت ہمارا آرڈر ملیں کر دیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بیگ میں سے وہ ڈائری نکال لی جس کی خاطر یہ سارا کھٹ راگ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ڈائری کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہ غور دیکھا پھر چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ میں اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس ڈائری میں کثیر الماریت سونے کا راز رقم تھا بلکہ میرے جوش اور جذبات کا تعلق ماضی کی یادوں سے تھا۔ وہ ڈائری میرے والد عابد علی سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے باپ نے مجھے کتنی محبت سے پالا تھا، کتنی توجہ دی تھی انہوں نے مجھے اس عرصے کا ایک ایک لمحہ میری نگاہ میں محوم رہا تھا۔ میں ایک سفید نیپکن میں پلٹا ہوا تھا جب وہ مجھے پاکستان سے لے کر سنگاپور پہنچے تھے۔ وہ ماہ کی عمر ہی کیا ہوئی ہے۔ چوہدری نواز علی کے جرنے میرے والدین کو پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ ان لمحات میں میری ماں پر کیا گزری ہوگی ”انہوں نے کیسے کیسے مددے اٹھائے ہوں گے“ ان کے تصور ہی سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ چوہدری ہی کے بیچے ہوئے انٹرنیشنل غنڈے دارانے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے والدین کو ہولناک موت سے دوچار کیا تھا۔ میں اس خوف چکاں واقعے کا عینی شاہد تھا۔ وہ میری یا شہور زندگی کا پہلا اپ سیٹ تھا اور ابھی تک میں اس سانحے سے

نکل نہیں سکا تھا۔ مجھے سیٹ اپ ہونے میں نہ جانے اور کتنا وقت لگتا تھا!

یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اگر میں ماضی کے اس ریلے میں بسہ جاتا تو پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا لہذا میں نے سرخ جلد والی اس ڈائری کو اپنی گود میں رکھا اور ہونا سکتے کی جانب متوجہ ہو گیا۔  
”ہونا سکتے!“ میں نے تمغیر آواز میں اسے مخاطب کیا ”آج تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ڈائری والی امانت میرے پاس پہنچ گئی ہے۔ اب تمہارا آئندہ کیا پروگرام ہے؟“

”میں اپنے دوست کے پاس جاؤں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”وہی دوست جو گارڈن ویٹ کے علاقے میں رہتا ہے؟“

”جی ہاں! میں اس کے پاس آنے کے لیے بلا ہور سے نکلا تھا۔“ اس نے بتایا ”میں جب بھی کراچی آتا ہوں تو اسی کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ وہ بہت قابل بھروسہ آدمی ہے۔“  
میں نے پوچھا ”کیا تم نے اپنے دوست کو اپنے کراچی آنے کی اطلاع دی تھی؟“

”میں نے جس افراقی میں لاہور چھوڑا اس میں اطلاع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“ وہ بولا ”میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں۔ ششاد علی کے گھر کا راستہ مجھے معلوم ہے۔ میں بہ آسانی اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔“  
میں نے پوچھا ”تمہارا یہ دوست ششاد کر آیا ہے؟“  
”ایک ریموٹ ادارے میں اکاؤنٹنٹ ہے۔“  
”اس کے پیوی پیٹے بھی ہوں گے؟“

اس نے اثبات میں سر ملایا ”جی، ششاد کے دو بچے ہیں۔ وہ گارڈن ویٹ کے علاقے ”المیلا“ کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اس کی رہائش عین کمرے والے ایک فلیٹ میں ہے۔“

میں نے پُرسوج انداز میں کہا ”پھر میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے دوست ششاد کے پیوی پیٹوں پر رحم کھاؤ اور فی الحال ادھر کاربغ نہ کرو۔ چوہدری نواز علی کے بندوں کو یہ بات بتائی گئی تھی کہ تم اپنے کسی دوست کے پاس گارڈن ویٹ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ جب وہ یہاں تک معلومات رکھ سکتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ جانتا ہرگز مشکل نہیں ہو گا کہ تمہارا دوست گارڈن ویٹ میں کہاں اور کس فلیٹ میں رہتا ہے۔ اگر تم وہاں گئے تو ششاد کسی بہت بڑی مصیبت میں

جٹا ہو جائے گا۔"

یہ بات مجھے نیلگری نے بتائی تھی کہ چوہدری نواز شریف نے اپنے بندوں کو احکام صادر کر رکھے ہیں کہ بوتا سنگھ اسٹیشن سے نکل کر گاڑن ویسٹ نہ پہنچنے پائے۔ فوری طور پر اس سے وہ قیمتی ڈائری بچھین لی جائے چاہے اس ڈائری کے حصول کے لیے بوتا سنگھ کی جان ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ نیلگری کی معلومات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چوہدری کے بندے بوتا سنگھ سے ڈائری حاصل کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کی جان لینے میں کامیاب ہوتے تھے بلکہ ایک ناگمانی نے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ اور بھی زیادہ حساس اور اہم ہو گیا تھا۔ چوہدری نواز شریف کا جو نیٹ ورک کراچی میں کام کر رہا تھا وہ صرف انہی تینوں افراد پر مشتمل نہیں تھا جو یہ سمجھا جاتا کہ کمانڈر ختم، پیسا، منجم، "سی ایف کے" کے اہل کار، امتیاز علی نے مجھے بتایا تھا کہ شیروالوں کا سرخند میاں زاہد حسین تھا۔ گویا وہ چوہدری کے نیٹ ورک کا بندہ خاص تھا۔ میاں زاہد بی ڈائری کے معاملے کو آپریشن کر رہا ہو گا۔ وہ اپنے بندوں کی ہلاکت پر خاموش نہیں بیٹھ جاتا بلکہ ہمیں گھبرنے، ہم سے ڈائری پھینچنے اور اپنے بندوں کا انتقام کی خاطر وہ ہماری تلاش میں کراچی کا چاچا چچا بھانجنا سکتا تھا۔ گویا ہمارے لیے بہت ساری ہنگامہ خیزیاں تیار تھیں۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بوتا سنگھ نے سوال کیا "آپ نے میاں کے جو حالات بتائے ہیں وہ بہت تشویش ناک اور گہمیر ہیں۔ مجھے واقعی شمشاد کے پاس نہیں جانا چاہیے۔"

پھر وہ پریشان نظریے مجھے سننے لگا۔

میں نے پوچھا "تمہارے پاس شمشاد کا کوئی کاٹھنٹ نمبر تو ہو گا؟"

"ہاں یہ۔ بس اس کے گھر اور دفتر کے فون نمبرز

؟۔" "فی الحال تم شمشاد کے پاس نہیں جاؤ۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "وہاں جانا تمہارے لیے اور شمشاد کی فیملی کے لیے ملک ثابت ہو سکتا ہے البتہ تم فون پر اسے اپنے آمد کی اطلاع ضرور دے دو اور اسے واضح الفاظ میں یہ بھی بتا دو کہ تم کسی ناگزیر وجہ کی بنا پر اس سے نہیں مل سکتے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا "کیا تمہارا دوست شمشاد ڈائری کے راز میں تمہارا شریک ہے؟"

"نہیں، قطعی نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا "یہ راز پاکستان میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ خوشنکٹہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں اس کے راز کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے وہ میرا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "ٹھیک ہے، پھر تم شمشاد کو اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔ تمہاری کسی بچہ کے بارے میں سن کر وہ بے چارہ خواہ خواہ پریشان ہو جائے گا بلکہ تم اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہ دو۔ جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے، تمہیں کوئی سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

"اور حالات کے سازگار ہونے تک میں کہاں جاؤں؟" بوتا سنگھ نے پوچھا "واپس لاہور تو نہیں سکتا اور کراچی میں شمشاد کے سوا میرا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔"

میں نے کہا "فی الحال تم کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔ ہم آپس میں رابطہ رکھیں گے جیسے ہی کوئی مناسب اور موزوں صورت حال سامنے آئی، ہم کوئی اہم فیصلہ کر لیں گے۔ پھر میں نے دوستانہ انداز میں اس سے پوچھا "اس وقت تمہاری مالی پوزیشن کیا ہے؟"

"میرے پاس کچھ رقم ہے۔" وہ میرے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا "پانچ ہزار روپے میں کافی دن تک میں بہت اچھا گزارہ کر سکتا ہوں۔ اور صدر میں درمیانے درجے کا ایک ہوٹل ہے جہاں میں پہلے بھی دو مرتبہ ٹھہر چکا ہوں۔ آپ کے مشورے کے مطابق فی الحال وہیں قیام کر لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا "اس عارضی قیام کے دوران میں تم اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر لو۔ آئندہ زندگی کی پلاننگ کے سلسلے میں تمہیں جہاں بھی میری مدد کی ضرورت پیش آئی میں تمہارے کام آکر بہت خوشی محسوس کروں گا۔"

پھر میں نے اس سے اس ہوٹل کا نام پوچھا جہاں قیام کا ارادہ رکھتا تھا۔ نہ کہ وہ ہوٹل صدر کے قلع میں واقع تھا۔ میر بخش اپنے سابق آقا و ذرا اکبر سومرو کے ساتھ کئی مرتبہ صدر آچکا تھا اور اس ہوٹل سے واقف بھی تھا۔

مانگتے لگا۔ میں نے اپنی جیب میں سے پانچ ہزار کے نوٹ نکال کر بوتا سنگھ کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ رقم بھی اپنے پاس رکھ لو۔ پیسا خرچ ہوتے ہوئے کچھ بچا نہیں چلتا۔ یہ روپے تمہارے کام آئیں گے۔ میں بہت جلد تم سے رابطہ کروں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے رقم رکھ لی۔ میں نے کہا "احتیاطاً تم مجھے شمشاد کے فون نمبرز اور گھر کا ایڈریس نوٹ کرادو۔ کسی انتہائی ضرورت کے وقت کام آئے گا۔"

اس نے اپنے سفری بیگ میں سے کاغذ قلم نکال کر میری مطلوبہ معلومات تحریر کی شکل میں مجھے فراہم کر دیں۔ شمشاد علی جس پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھا، اس کا دفتر آئی آئی چندر میکر روڈ پر واقع تھا۔ تھوڑی دیر بعد بوتا سنگھ ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! اپنے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے اپنے بارے میں تو کبھی بھی نہیں سوچا۔" میں نے دروداری میں جواب دیا۔ "میں قیام کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "ابھی سہ پہر ہے یہ سہ پہر بیٹھ نہیں رہے گی۔ شام آئے گی اور پھر رات ہو جائے گی۔ ہم پونہی مارے مارے تو نہیں پھر سکتے ہمیں اپنے لیے کوئی ٹھکانا کرنا ہو گا۔ جس قسم کے حالات سے ہم گزر رہے ہیں، ان کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہمارے پاس ایک محفوظ اور مضبوط قیام گاہ ہونا چاہیے۔"

"محفوظ اور مضبوط قیام گاہ!" میں نے ساحل کے کہے ہوئے الفاظ زیر لب دہرائے۔ میر بخش چونک اٹھا "اس نے کہا 'سائیں! سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ٹھکانا تو ہمیں قاضی سلطان کا دوست ہی فراہم کر سکتا ہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں منہاس باقر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ کراچی کی ایک معروف اور طاقت ور شخصیت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میر بخش۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"وجدان! تم کہاں جا رہے ہو؟" ساحل نے پوچھا۔ "منہاس باقر سے رابطہ کرنے۔" میں نے جواب دیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا "اس ریسٹورنٹ کے برابر میں" میں نے ایک "پلی سی او" دیکھا تھا۔ تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں قاضی سلطان کے دوست کو فون کر کے آتا ہوں۔"

پھر میں فیملی کیمین سے نکل کر ریسٹورنٹ سے باہر گیا۔ اپنی جیب میں سے میں نے وہ پرچہ نکالا جس پر منہاس باقر کے خط کا ایڈریس "اس کے گھر اور دفتر کے فون نمبرز قاضی نے مجھے لکھ کر دیے تھے۔ اسی کاغذ کے ایک کونے میں قاضی سلطان کا فون نمبر بھی درج تھا۔ اس نمبر پر نگاہ پڑے ہی میرا دھیان "نئی سر" کی طرف چلا گیا۔

ہم رات کے آخری پر قاضی کی حویلی سے بڑے پراسرار انداز میں روانہ ہوئے تھے۔ نیلگری کی زبانی وہاں

پیش آنے والے حالات کے بارے میں مجھے پہنچتی جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ بہت سنسنی خیز تھیں۔ مولیٰ تو نہ والا مرتضیٰ ڈی ایس پی قاضی کی حویلی پر ریڈ کر کے مجھے "رنگے ہاتھوں" پکڑنے والا تھا۔ ہوس پرست بد نیت ڈی ایس پی کا منصوبہ کس طرح خاک میں مل گیا ہو گا؟ یہ جاننے کے لیے میں بے چین ہو گیا۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا ڈی ایس پی مجھے حویلی میں نہ پا کر اپنے بال نوچ رہا ہو گا۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے چوٹ دے آیا تھا۔ وہ اپنے زخم چاٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

نیلگری اگر بروقت مجھے حالات کی گھنٹی کے بارے میں آگاہ نہ کرتی تو میں بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ نیلگری کے تعاون اور راہنمائی سے میں نے ڈائری بھی حاصل کر لی تھی اور خود سمیت اپنے ساتھیوں کی جان بچانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

نیلگری نے بیٹھ مجھے فائدہ پہنچایا تھا لیکن اس کی مدد حاصل کرتے ہوئے میں ایک بے نام سے اضطراب میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا "میں کوئی نفاذ ہوں اور نیلگری کسی تجربہ کار جہاں دیدہ عورت کی طرح مجھے گائیڈ کر رہی ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی ہے اور قدم قدم پر میری مدد کر رہی ہے۔ مجھے لگتا جیسے میں اس کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہوں۔"

ایسی احساس مجھے بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔ میں ابتدائی عمری سے اپنی مرضی کا مالک تھا۔ من مانیاں کرتا آیا تھا۔ لاکھن ہی میں دارا جیسے مجھے ہوئے شخص سے میرا پالا پڑا تھا اور میں اس سے نمٹتا رہا تھا۔ میں نے اکثر دوستوں کی مدد کی تھی، ان کے کام آتا تھا۔ شاید خود مختار اور آزاد زندگی گزارنے کے سبب میرا مزاج ایسا بن گیا تھا کہ نیلگری کی مدد اور گائیڈنس سے میں الجھ جاتا تھا اور مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا "نیلگری سے مدد نہیں لوں گا لیکن پھر وہ پھم سے میرے حالات میں اس طرح کوئی تھکی کہ میں اس کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا۔ پتا نہیں، وہ مجھ سے کیا کیا منوانا چاہتی تھی۔ آخر تو بہت سنسنی خیز اور تشویش ناک تھے۔ بعض اوقات میں اس کے عزائم کے بارے میں سوچ کر ایک لمحے میں پڑ جاتا۔ گزشتہ رات والی ملاقات میں تو وہ کھل گئی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کے سوا اور کوئی عورت میری خلوت کی ساکھی نہیں بن سکتی۔ میرے ذہن پر یہ پلے پلے کے بارے میں اس نے جو

انکشاف کیا تھا اسے رد کرنا حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔

میں نیگلری کے عکسین خیالات کو ذہن میں بسائے "نی سی او" میں داخل ہو گیا۔ ساحل اور میر بخش سے میں یہ کہہ کر آیا تھا کہ مناس باقر فون کروں گا لیکن یہاں پہنچ کر میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے آیر بیٹر سے قاضی سلطان کی حویلی کا نمبر ملانے کو کہا۔ لا شعوری تجسس نے مجھے وہاں کے حالات جاننے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد آیر بیٹر نے چھوٹے سے بوتھ میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "آپ کا نمبر مل گیا ہے بات کر لیں۔"

میں نے بوتھ کا دروازہ بند کر کے ریسپور اٹھالیا۔ "ہیلو" کے جواب میں قاضی سلطان کی آواز میری سماعت سے نکرائی۔ وہ فوراً مجھے پہچان گیا اور پہچان خیر لہجے میں بولا۔

"سائیں! تم کہاں ہو؟"

"میں گراچی میں ہوں۔" میں نے بتایا "اور بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ اپنی سائیں؟"

وہ پر جوش انداز میں بولا "سائیں! یہاں تو خوب ہنگامہ خیزی رہی۔ شادی پٹی والے ڈی ایس پی نے نبی سر کے تھانا ان چارج کی مدد سے میری حویلی پر دھاوا بول دیا تھا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا "مگر تم راتوں رات اپنے ساتھیوں کو لے کر کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"قاضی صاحب! آپ کو بتانے بغیر میرے اچانک چلے آنے سے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

وہ جلدی سے بولا "نہیں۔ نہیں بلکہ تم لوگوں کی غیر موجودگی میں حالات کو نیکل کرنا میرے لیے آسان ہو گیا تھا۔"

"اسی لیے تو میں وہاں سے نکل آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ خدا کے بندے اگر تمہیں جانا ہی تھا تو مجھے بتا کر بھی جاسکتے تھے، وہ بیٹھی ناراضی سے بولا "میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوا تھا ہوں۔"

میں نے کہا "قاضی صاحب! آپ کو بتانے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ مجھے ایک بے چینی پی گئی تھی۔ میری چٹنی جس مجھے بار بار وارن کر رہی تھی کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے وہاں سے نکل آنا چاہیے ورنہ کینہ پرور ڈی ایس پی کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے خدشات کے بارے میں آپ کو بھی بتایا تھا۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے اس سلسلے میں بات تھی۔" وہ تائید کرتے ہوئے بولا "مگر میں سمجھ رہا تھا کہ ایس پی اس معاملے کو سنبھال لے گا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ بد ذات ڈی ایس پی اپنے خیر خواہی آنی کی تیج جانے گا۔ ڈی ایس پی کے کیٹے پین نے حالات کو دبا۔ میرا سالا بھی اسی وجہ سے رات کے کھانے پر نہ سکا۔ وہاں عمر کوٹ میں اونچے پینے پر میٹنگر جال تھیں۔"

"میرحال! یہ باتیں قاضی صاحب! ڈی ایس پی کے کے کیا نتائج رہے۔" اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ تم نے نہت گیا۔ تم لوگوں کی غیر موجودگی نے ہمارے بالکل صاف اور سیدھا کار کیا تھا۔ پولیس کے سامنے میں وہی کہانی پیش کی جو ہمارے درمیان طے ہوئی تھی۔ تم تمہارے ساتھی "گٹ" ہو گئے۔ میں نے سارا ملہا وڈرا سو موہر ڈال دیا۔ اسی کے ایمپر منگل سنگھ نامی ایک ڈاکو میری بیٹی ممتاز کو اغوا کیا تھا۔ مقامی تھانے دار میرے اور سو موہر کے درمیان سال ہا سال سے لینے والی دشمنی واقع ہے پھر اس کے تھانے میں ممتاز کے اغوا کی رپورٹ بھی درج تھی۔ میں نے یہی موقف اختیار کیا کہ میرا آدمیوں نے وڈرا اکبر اور اس کے ساتھی تارا پر قابو پانے کے لیے قہقہے سے نکلا ہے۔ منگل سنگھ ڈاکو اور اس کے ساتھی گندا سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔" وہ لمبے سانس لینے کے لیے رکھا پر بات جاری رکھتے ہوئے "اگر تم لوگ حویلی میں موجود ہوتے تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس صورت میں ڈی ایس پی مراد پر آئی اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا تو کیا اس کا مانی ہٹ اور میری کمائی فلاب ہو جاتی۔"

میں نے پوچھا "وڈرا اکبر سو موہر تارا کا کیا بیٹا؟"

"بننا کیا تھا میں نے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔ قاضی سلطان نے بتایا "اس موقع پر ممتاز کی گواہی بہت آئی۔ اس نے تمہاری حمایت میں میری بیان کردہ کمائی تصدیق کر دی۔ مغوی نے جب وڈرا اکبر کو اس اغوا کا اعتراف دے دار ٹھہرا دیا تو میرا پی کیا رہ جاتا ہے۔ واقعات اور شام بھی وڈرے کے خلاف جا رہے ہیں پھر ایس پی کی درہم حمایت بھی مجھے حاصل ہے۔ جو بھی ہو گا، میرے حق میں ہی ہو گا۔ وڈرے کا جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ پولیس ہی کی نی۔"

میرا آپ نے ان دونوں کو آزاد کر دیا۔" میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

وہ چونک کر "تم کیا کہنا چاہتے ہو وجود ان!"

میں نے کہا "اکبر سو موہر جیسے مجھ تو وڈرے پولیس کی تیج میں آزاد ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس وقت تو حالات حویلی میں اس کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اس لیے وہ قابو آیا۔ پوری طرح اس کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اس لیے وہ قابو آیا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی ذریعہ استعمال کر کے خود کو اور اپنے مسان دوست تارا کو بچالے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے ڈی ایس پی کی حمایت بھی حاصل ہے۔"

قاضی سلطان نے کہا "عام حالات میں، کسی عام آدمی کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے، لیکن میں نے تو عام آدمی ہوں اور نہ ہی موجودہ حالات کو عام کام جا سکتا ہے۔ میں آسانی سے وڈرے کو چھوٹے نہیں دوں گا۔"

"اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔" میں نے قاضی سلطان سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ پورے وثوق سے بولا "وجود ان! تم دیکھ لینا۔ انشا اللہ ایسا ہی ہو گا۔"

میں ٹیلی فون پر بات تو قاضی سلطان سے کر رہا تھا لیکن میری چشم تصور میں وہ صوری وڈٹ کے سرپا والی وہ دلکش و دلنشین لڑکی گھوم رہی تھی جس کا نام ممتاز تھا۔ وہ قدم قدم پر میری حمایت پر کمر بستہ تھی۔ اس کی صورت تو سٹارٹر ٹرک ٹھی "اس کا عمل بھی مجھے بہت متاثر کر رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ سامنے آنے کے بعد حویلی کے کسی نہایت خفیہ حصے میں جا چھپی تھی اور وہاں بیٹھ کر میرا لیس لڑی تھی۔ عجیب احسان شناس لڑکی تھی وہ!"

ریسیور میں ابھرنے والی قاضی سلطان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "وجود ان! ایک بات سچ بچتاؤ۔"

"ہاں پوچھیں، آپ سے دوستی کی ہے تو بات بھی بتانا پڑے گی۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

اس نے شہید لہجے میں کہا "کیا تم کوئی جادو واوہ بھی جانتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں!"

وہ بولا "چلو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ہمیں ڈی ایس پی سے کسی انتقامی کارروائی کی توقع تھی۔ حالات و واقعات سے تم اس قسم کا اندازہ قائم کر سکتے ہو مگر یہ کیسے ممکن ہوا کہ تم میری حویلی سے چپ چاپ نکل گئے اور میرے ملازمین کو خبر تک نہ ہوئی۔ پھرے دار میرے برسوں

کے آزمائے ہوئے ہیں۔ میں ان کی فرض شناسی پر منحصر مستعدی کا بھی قائل ہوں۔ اگر تم لوگ ان کی لامعی میں حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک چٹکا رہی ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم کوئی ایسا علم یا عمل جانتے ہو جس کی مدد سے نامکمل کام ممکن ہو جاتا ہے۔"

میں نیگلری کی ذات کو قاضی سلطان کے سامنے اوپن نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ جہاں دیدہ مردود گرم چشمہ شخص کسی ہلاوتے میں نہیں آ سکتا تھا لہذا میں نے اپنا بھرم رکھنے کی خاطر کہا۔

"قاضی صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں چند ایسے شعبے جانتا ہوں جن کی مدد سے بعض کام بہ آسانی ہو جاتے ہیں۔ آپ اسے ہاتھ کی صفائی یا نظربندی کی تکنیک سمجھ لیں مگر میں نہ تو کسی قسم کا جادو جانتا ہوں اور نہ ہی کوئی عامل کامل ناکلیا ہوا ہوں۔"

دوسری جانب لکھائی خاموشی وہی پھر قاضی سلطان نے ابھرنے زدہ لہجے میں کہا "چلو، تمہاری بات کا یقین کر لینا ہوں لیکن اس دانے کو کس خانے میں فٹ کر دو گے؟" پھر خود ہی اس نے اپنے سوال کی وضاحت کر دی۔ "میرا اشارہ اس رقم کی جانب ہے جو کل ہمیں اکبر سو موہر کی بچاؤ سے ملی تھی۔ یہ حفاظت رکھنے کے باوجود بھی وہ پچاس ہزار روپے غائب ہو گئے۔"

میں اس کے سوال سے گڑبڑا گیا۔ یہ سب نیگلری کا چلایا ہوا پکر تھا۔ اس نے منگل سنگھ والی رقم مجھ تک پہنچادی اور قاضی سلطان کے پاس موجود رقم کو حاصل کر کے منگل سنگھ کو دے دیا ہو گا۔ اس نے یہ توڑ منگل سنگھ وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر اسے اس کی رقم مل جائے گی۔ یقیناً نیگلری ہی نے اپنی قوت سے قاضی سلطان کے پاس محفوظ رقم کو غائب کیا تھا۔ میری یہ مجبوری تھی کہ میں قاضی سلطان کو نیگلری کے راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ پھر بحث کے کئی دروازے کھل جاتے اور میری ذات اہم سے اہم تر ہو تی چلی جاتی۔ میں فی الحال کسی نئی قسم جوئی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے قاضی سلطان کو گول مول جواب دیا۔

"قاضی صاحب! آپ بھی عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے پاس سے پچاس ہزار روپے کی رقم غائب ہو گئی ہے تو اس میں میرا کوئی کمال کس طرح ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے، آپ اور کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ انسان سے بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے۔"

وہ میری وضاحت سے مطمئن تو نہ ہوا مگر بندہ وہ خاصا



کچھ دار تھا۔ اس نے صغیرے اشاکل سے بھانپ لیا کہ میں اس سلسلے میں کھلتا نہیں جاتا اس لیے وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

”خیر چھوڑو۔ میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ لی الا لال اپنے بارے میں بتاؤ؟“  
”میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے کہا ”کچھ عرصہ میں کراچی میں قیام کا ارادہ رکھتا ہوں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ آپ سے بات کرنے کے بعد میں آپ کے دوست منہاس باقر سے رابطہ کروں گا تاکہ اپنی رہائش کا کوئی معقول بندوبست کر سکوں۔“

قاضی سلطان نے کہا ”منہاس باقر سے تو آج تمہارا رابطہ نہیں ہو سکے گا۔“

”کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟“ میں نے پوچھا۔  
وہ بولا ”تمہارے اچانک غائب ہونے کے بعد میں نے کراچی فون کیا تھا، منہاس باقر کو تمہارے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔ میں اگرچہ دو ٹوک سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم کراچی ہی جاؤ گے تاہم میں اپنی نئی فونی دوستی کے تقاضے نہ ماننا چاہتا تھا مگر منہاس سے میری بات نہیں ہو سکی۔ اس کے گھر سے پتا چلا کہ وہ ایک دن کے لیے اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ آل پاکستان پیپرز پبلیشرز کی کوئی ضروری میٹنگ ہو رہی ہے وہاں۔ وہ کل دوسرے کے بعد واپس کراچی آئے گا۔“  
”اوہ! میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ جلدی سے بولا ”وہ جان! تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے بارے میں کنفرم نہیں تھا ورنہ منہاس کے گھروالوں کو تمہارے بارے میں ہدایات دے دیتا۔ تم اگر کو تو میں ابھی فون پران سے بات کر لیتا ہوں۔ ہمارے درمیان فیملی رزمز ہیں۔ تمہیں منہاس کی غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں۔ کل منہاس باقر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے آپ اس کے گھروالوں کو ہماری آمد کی اطلاع دیتا چاہیں تو کوئی حرج نہیں۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ سہمٹ کر انداز میں بولا ”میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے بے تکلفی سے کہا ”وہ جان! تم جتنے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ چھپے ہوئے ہو۔ انشا اللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔“

میں نے مذاق کے انداز میں کہا ”گویا آپ مجھے چھپا

رستم کہہ رہے ہیں!“  
”بالکل! میں یہی کہہ رہا ہوں۔“ وہ قطعیت سے ”اور سنو، جب تک ہمارے درمیان تکلفات کی دیوار قائم رہے گی، تم میرے سامنے کھل نہیں سکو گے لہذا اس پر غور کرو۔“  
”میرے دل میں نہیں ٹھہرتا چاہتے جہاں بونا ٹنگہ گیا ہے؟“  
”ابھی اور اسی وقت گراو۔ جب میں تمہیں ”تم“ سے نہیں کہتا تو تم مجھے ”آپ“ کہہ کر کیوں بات کرتے ہو؟“  
”بات اس ہوٹل یا اس ہوٹل کی نہیں۔“ میں نے کہا ”میں نے کہا ”میں تو عمر کے تفاوت کی وجہ سے آپ کا احترام“ میں کسی پر سکون اور صاف ستھری جگہ پر قیام کرنا چاہتا

کہتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کی۔  
”دور نہ اس میں تکلف والی تو کوئی بات نہیں۔“  
”بس! میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“ وہ دونوں مسافرانہ انداز میں کہا ”وہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل ہے۔ میں آپ کو ایک انتہائی معیاری اور صاف ستھرے میں بولا۔  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اوکے۔ میں ہوٹل میں سے پہلے میں ایک ضروری گیا۔“

”صرف سمجھ ہی نہیں گئے، آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“  
”اوکے۔ اوکے۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کٹن الا توای میسر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوئے؟ وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔  
ہم اس وقت ہمارے آباد کے سب سے زیادہ پالا علاقے میں تھے۔ ریٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں جیس تو خریدی جا سکتی ہیں۔“  
”ساتھ ساتھ اسٹور سے ہونے والی بی بی؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے گفتگو کے بارے میں بتاتا تھا۔  
”میرے دل میں نہیں گئے، آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“  
”اوکے۔ اوکے۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کٹن الا توای میسر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوئے؟ وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔  
ہم اس وقت ہمارے آباد کے سب سے زیادہ پالا علاقے میں تھے۔ ریٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں جیس تو خریدی جا سکتی ہیں۔“  
”ساتھ ساتھ اسٹور سے ہونے والی بی بی؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے گفتگو کے بارے میں بتاتا تھا۔

میرے دل میں نہیں گئے، آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“  
”اوکے۔ اوکے۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کٹن الا توای میسر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوئے؟ وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔  
ہم اس وقت ہمارے آباد کے سب سے زیادہ پالا علاقے میں تھے۔ ریٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں جیس تو خریدی جا سکتی ہیں۔“  
”ساتھ ساتھ اسٹور سے ہونے والی بی بی؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے گفتگو کے بارے میں بتاتا تھا۔

میرے دل میں نہیں گئے، آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“  
”اوکے۔ اوکے۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کٹن الا توای میسر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوئے؟ وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔  
ہم اس وقت ہمارے آباد کے سب سے زیادہ پالا علاقے میں تھے۔ ریٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں جیس تو خریدی جا سکتی ہیں۔“  
”ساتھ ساتھ اسٹور سے ہونے والی بی بی؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے گفتگو کے بارے میں بتاتا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بیک کو ہتھیلیا یا۔  
”جس۔“ میں نے اشیات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”بیک ٹاپ تمہاری لی گئی ہے تو یہ دونوں جوڑے تمہارے لیے ہی ہوں گے۔“

وہ سنجیدگی سے بولا ”سائیں! میں نے زندگی میں کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی۔ یہ تو سہ۔“  
وہ دانستہ جملہ، اچھوڑ کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی انجھن یہ جا چکی۔ میں نے اس کے استعمال کے لیے دو پتلونیں اور شرٹس خریدی تھیں۔  
میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”میرے دل میں اگر زندگی میں کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تو کیا ہوا؟ اب پہن لو۔ کوئی بھی نیا کام انسان پہلی مرتبہ کرنا ہے، پھر کرنا چلا جاتا ہے۔“

”ہم۔“ میں نے اس لباس کا عادی نہیں ہوں!“

”کبھی تم اس لباس کے بھی عادی نہیں تھے۔“ میں نے اس کے بدن پر موجود گہرے نیلے شلوار قمیص کی جانب اشارہ کیا۔ پیدائش کے وقت انسان بے لباس ہوتا ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد اسے نیکین جیسا لباس میسر آتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کے رنگ ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ایک اختیاری عمل ہے اور اس میں تبدیلی ناممکن نہیں ہے۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”میرے دل میں اگر زندگی کا آغاز کیا ہے اس لیے تمہیں اپنے اشاکل میں تبدیلی لانا چاہیے اور اس کے لیے گیٹ اپ کی تبدیلی سرفہرست ہے۔“

”تھیک ہے،“ وہ پینٹ شرٹ جیسے لباس کے عادی نہیں ہو لیکن جب پہنے لگو گے تو رفتہ رفتہ یہی تمہارا پناہ دہن جائے گا۔ دراصل، پتلون قمیص میں بندہ زیادہ اسماٹ اور چست دکھائی دیتا ہے باتوں سے قائل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھے صدر رینج گئے۔

میرے دل میں نہیں گئے، آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“  
”اوکے۔ اوکے۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کٹن الا توای میسر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوئے؟ وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔  
ہم اس وقت ہمارے آباد کے سب سے زیادہ پالا علاقے میں تھے۔ ریٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں جیس تو خریدی جا سکتی ہیں۔“  
”ساتھ ساتھ اسٹور سے ہونے والی بی بی؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے گفتگو کے بارے میں بتاتا تھا۔

میرے دل میں نہیں گئے، آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“  
”اوکے۔ اوکے۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کٹن الا توای میسر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوئے؟ وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔  
ہم اس وقت ہمارے آباد کے سب سے زیادہ پالا علاقے میں تھے۔ ریٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں جیس تو خریدی جا سکتی ہیں۔“  
”ساتھ ساتھ اسٹور سے ہونے والی بی بی؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے گفتگو کے بارے میں بتاتا تھا۔

بخش کے لیے سنگل بیڈ حاصل کر لیا، تاہم ہمارے کمرے دو مختلف فلورز پر تھے۔ میرے بخش تیسرے فلور کے کمرہ نمبر دو تھے اور ہم دونوں دوسرے فلور کے کمرہ نمبر ایک میں۔ ہوٹل کے رجسٹریں میں نے اپنا نام جاوید، ساحل کا نام بیلا اور میر بخش کا نام فرید درجن کر دیا تھا۔

جب ہوٹل پہنچے تو سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شام ہونے والی تھی۔ ہم نے اپنے کمروں میں پہنچ کر لباس تبدیل کیے اور فریش اپ ہو کر ایک ہی کمرے میں بیٹھ گئے۔ میرے بخش نے زندگی میں پہلی مرتبہ چٹون شرت پہنی تھی اس لیے عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور بندہ میں منٹ اسے نشست و برخاست کے ادب و آداب سکھاتا رہا۔ شام کی چائے بھی ہم نے دو مروس کے ذریعے کمرے ہی میں منگو کر لی، پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس وقت ہمارے درمیان صرف دو ہی موضوع زیر بحث تھے۔ نمبر ایک چوہدری نواز علی اور اس کے کرگے۔ نمبر دو خدائی فوج داری کی دعوے دار تنظیم ”سی ایف کے“

میرے ذہن میں بار بار نیٹکری کے کسے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی چوہدری نواز علی نے اپنے کراچی کے نیٹ ورک کو سخت ہدایات دی ہیں کہ بوٹا سنگھ سے ہر صورت وہ ڈائری حاصل کی جائے چاہے ڈائری کے حصول کے لیے اس کی جان بھی لینا پڑے۔ وہ کسی بھی طور اسٹیشن سے نکل کر گارڈن ویسٹ تک نہیں پہنچ پائے۔ علاوہ ازیں وجدان کو یعنی مجھے کسی بھی قیمت پر لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔ نیٹکری نے آخر کار چوہدری کی ہدایت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا وجدان! اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے چوہدری تم سے بے حد خوف زدہ ہے۔ میں نیٹکری کی فراہم کردہ اطلاعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے خاموش پا کر ساحل نے پوچھا ”وجدان! تم کن خیالوں میں گم ہو؟“

میں نے اپنے ذہن میں موجودہ خیالات سے انہیں آگاہ کیا اور کہا ”چوہدری نواز علی تو واقعی بہت پہنچ والا ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی جاری کردہ ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے وہ جانتا ہے، بوٹا سنگھ کراچی میں گارڈن ویسٹ کے علاقے میں قیام کرنے والا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں انٹریز سے سیدھا راجپوت پتھنوں گا اس لیے مجھے کراچی سے لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔“

”ہاں سائیں! چوہدری بڑا خبر بندہ لگتا ہے۔“ میرے بخش

نے کہا ”کیوں کہ کل رات تک تو ہم نئی سر میں قاضی سلاطین کی حویلی میں تھے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے چوہدری نواز کے پاس جادو کی کوئی پھڑی ہے جس سے وہ تازہ ترین معلومات حاصل کر لیتا ہے۔“

میں نے کہا ”چوہدری تو کوئی جادو جانتا ہے یا نہیں؟ نیٹکری بہت بڑی سادہ ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں بہت دور تک جان سکتی ہے۔ وہ بے پناہ شہتوں کی مالک ہے۔ میں اس کے لاتعداد کلمات کا بھٹی شاہد ہوں۔ چوہدری اور اس کے بندوں کے بارے میں فراہم کردہ اطلاعات نیٹکری کی شکستیں بھی یقیناً کام کر رہی ہوں گی۔ وہ ایسا کرنی والی ہستی ہے۔“

”ویسے بھی جب تمہارا دشمن نواز علی اتنا ہی سنڈکیٹ چلا رہا ہے جس کی پہنچ لاہور سے کراچی اور ہنگامہ پور ہنگامہ اور انڈیا وینپال تک ہے تو پھر اسے انتہائی ہوتا ہی چاہیے۔“ ساحل نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تم غیر قانونی طور پر میرے ساتھ انڈیا پاکستان میں داخل ہونے والے ہو۔ مارا ہمارے“ استقبال کے لیے ہی لاہور سے عمرکوٹ پہنچا تھا اور ہمارے ہاتھ پاؤں تو ذکر ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔“

”شاید اسے وجدان سائیں کی طاقت کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔“ میرے بخش نے کہا ”ورنہ وہ اپنے احکام پر تبدیلی نہ لاتا۔ مارا کو اس نے اس لیے عمرکوٹ بھیجا تھا کہ آپ لوگوں کو بے بس کر کے اپنے ساتھ ”رکھائے“۔“

جائے اب وہ کراچی میں موجود اپنے نیٹ ورک کو ہدایت دے رہا ہے کہ وجدان سائیں کو لاہور آنے سے روکا جائے۔“

میں نے کہا ”چوہدری دراصل یہ چاہتا ہے کہ جب تک وہ گمشدہ سونے تک نہ پہنچ جائے، مجھے اس وقت تک لاہور نہ آنے دیا جائے۔ سونے کا حصول اس کے لیے بہت اہم رکھتا ہے۔ آج سے لگ بھگ بیس سال پہلے اس سونے مالیت کم و بیش پانچ کروڑ روپے تھی۔ آج کے نرخ کے مطابق تو یہ قیمت پچیس کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔ یعنی پانچ گنا۔“

”چوتھائی ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے سائیں! میرے بخش دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”اور اس ہمارے مالیت کے سونے کا راز جس ڈائری میں رقم ہے وہ میرے قے

میں ہے اسی لیے تو ڈائری کے حصول کی خاطر چوہدری کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام اس سے روٹھ گیا ہے۔“

”میں تو بوٹا سنگھ کے ضبط اور حوصلے کی داد دیتی ہوں۔“ ساحل نے کہا ”وہ اتنے عرصے سے اس قیمتی راز کی حفاظت کرتا رہا اور اس دوران میں اس کے ذہن میں خیانت کا خیال نہیں آیا وہ چاہتا تو خود بھی اس سونے کے حصول کی کوشش کر سکتا تھا۔“

”اس میں بوٹا سنگھ کے مضبوط یا ایمان داری کا کوئی دخل نہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”پہلی بات تو یہ کہ مذکورہ ڈائری کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے پاس پہنچی تھی۔ اپنی موت سے چند روز قبل خوشونت سنگھ نے ڈائری بوٹا سنگھ کو لاہور بھجوا دی تھی۔ اس ریفرنس کے ساتھ کہ میں بھی لاہور آکر اس سے یہ ڈائری حاصل کروں گا۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے وابستہ رہی ہو۔“

اس کی بیٹی ارلا سے ہوئی۔ اسی کی زبان سے مجھے ڈائری کے بارے میں بتا چلا تھا۔ ورنہ میری یادداشت کے مطابق تو وہ ڈائری چاچا پر آب سنگھ نے سنگاپور چھوڑنے سے پہلے اپنے دوست پر آب سنگھ کے ذکر پر میری آواز بوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنے دل میں چاچا پر آب کے لیے درد کی ایک لہری اٹھتی محسوس کی۔ پر آب سنگھ میرے باپ عابد علی کا سچا دوست تھا۔ والدین کے بسمانہ قتل کے بعد اسی شخص نے مجھے سنبھالا تھا۔ اس وقت میں بارہ سال کا تھا اور باپتہ کار بھی۔ دارا اینڈ کمپنی وحشی درندوں کے مانند میرے تعاقب میں تھے وہ سنگاپور کے چپے چپے پر میری بوسختی پھر رہے تھے۔ چاچا پر آب سنگھ نے مجھے سنگاپور سے ملائیشیا اور پھر ملائیشیا سے ہنگامہ (تھائی لینڈ) پہنچایا تھا۔ وہ مجھے مارشل آرٹس کی دنیا میں ایک دیو مہاراج وانگ وانگ دنگ یائے کے جتنا زخم تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی بلیک بیلٹ تھا اور چاہتا تھا کہ میں بھی اپنے دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ان فنون میں مہارت حاصل کروں۔ میرے تعاقب میں آنے والے دشمنوں نے چاچا پر آب سنگھ کو مہاراج کے جتنا زخم ”واٹ ٹریسٹ“ کے احاطے میں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تاہم چاچا کی خواہش کے مطابق میں نے مارشل آرٹس میں نہ صرف مہارت حاصل کی بلکہ ان فنون کی دنیا کی سب سے بڑی تربیت گاہ ”شاکلون نیپل“ میں یادگار ریکارڈ بھی قائم کیے۔ اب نہ

چاچا پر آب سنگھ زندہ تھا اور نہ مہاراج وانگ وانگ دنگ یائے اور نہ ہی میرا استاد مارشلینگ پائی۔ صرف ان لوگوں کی یادیں باقی ہیں۔ یادیں بہت تریاکی ہیں، میں بھی اپنے ان محسنوں کے خیال سے خاصا رنجیدہ اور طویل ہو گیا۔

ساحل نے پوچھا ”وجدان! تم نے اپنی بات مکمل نہیں کی؟“

میں نے افسردگی کی کیفیت سے باہر آتے ہوئے کہا ”میں آپ لوگوں کو بتا رہا تھا، سنگاپور میں، آخری ملاقات کے دوران میں ارلا کو نے بوٹا سنگھ کا لاہور کا ایڈریس مجھے دیتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ خوشونت سنگھ نے بوٹا سنگھ کو سونے والے راز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اس لیے بوٹا اس ڈائری کی اصل اہمیت سے آگاہ نہیں۔ وہ اسے میری خانہ داری یادداشتوں کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن ہے، بوٹا نے ڈائری کو کھول کر کبھی پڑھا بھی ہو مگر راز کی باتیں راز دارانہ انداز میں رقم کی گئی ہیں۔ کوئی بھی غیر متعلق شخص اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی مدد سے اس متروک کنوئیں تک پہنچ سکتا ہے جس کے اندر میرے والد صاحب نے سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے کیونوں کے دو بڑے تیلے چھپکے تھے البتہ۔“

”میں نے پُرسوج انداز میں کہا ”چوہدری نواز علی ایسا آدمی ہے جو مذکورہ متروک کنوئیں کا کھوج لگا سکتا ہے۔ یہ شرط ہے کہ ڈائری اس کے ہتھے چڑھ جائے۔“

”اور یہ ڈائری اس وقت تمہارے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔“ ساحل نے کہا ”تم کسی بھی حال میں ڈائری کو چوہدری تک نہیں پہنچنے دو گے۔“

”یقیناً ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

میرے بخش بولا ”سائیں! سی ایف کے آوی اتھارڈ نے بتایا تھا کہ سفید شیر ڈالے موٹے کا سرغہ کوئی میاں زاہد نامی شخص ہے۔ اگر وہی شخص چوہدری نواز علی کے نیٹ ورک کو آپرٹ کر رہا ہے تو پھر وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ چوہدری کے احکام بہت سخت ہیں۔ ان لوگوں نے ہریت پر یہ ڈائری حاصل کرنا ہے اور آپ کو لاہور جانے سے روکنا ہے۔ ممکن ہے میاں زاہد حسین ہمیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔“

”اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ ہمیں ٹریس کر چکا ہو۔“ ساحل نے تکبیر آواز میں کہا ”اور اس وقت وہ ہماری کڑی نگاہی کر رہا ہے۔“

میں نے کہا "یہ سب کچھ ممکنات میں سے ہیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہم سے زیادہ بولنا سکھ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔" میر بخش نے کہا "چوہدری کے بندوں کا اصل ٹارگٹ تو وہی تھا۔"

میں نے میر بخش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جرائم پیشہ افراد سے کچھ بھی امید نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ ہمیں نہیں کرنے کی قسم لگے ہوئے ہیں تو پھر بولنا سکھ جیسے ہی ان کی نظر میں آئے گا وہ اس کے ساتھ خاصا "یادگار" سلوک کریں گے۔"

"وہ جان! کیا ہم چوہدری کے بندوں کے خوف سے ہوٹل کے اس کمرے ہی میں دیکھے بیٹھے رہیں گے؟" ساحل نے آکٹا ہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"یہ بات کس نے کہہ دی؟" الٹا میں نے اس سے سوال کر دیا۔

"ہم اس وقت جس نوعیت کی گفتگو کر رہے ہیں اس سے تو ایسا ہی تاثر ملتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

میں نے کہا "ہرگز میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ ہم کان لپیٹ کر ہوٹل کے اس کمرے تک محدود ہو جائیں۔ میری ساری زندگی خطرناک مجرموں سے بچنے آزمائی میں گزری ہے۔ میں نے بھی پس پائی اختیار کی ہے اور نہ ہی فیضیو کھلا ہے۔ میں نے ہمیشہ آگے بڑھ کر دشمن پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہاں زاہد حسین جیسے دو ٹکے کے مجرم میرے سامنے کیا بیچتے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "ہم ابھی ہوٹل سے نہیں گے رات کا کھانا ہم باہر کسی ریسٹورنٹ میں کھا لیں گے اور تھوڑی سی رو تفریح کے بعد واپس آجائیں گے۔"

ساحل نے کہا "اور واپسی میں کچھ بھی دیکھتے ہوئے آئیں گے، ٹھیک ہے؟"

ساحل کی زندگی کا زیادہ حصہ کھنڈو کے ایک دور وراز علاقے میں گزرا تھا اور وہ بھی ایک عبادت گاہ میں۔ اس نے بہت محدود زندگی گزار دی تھی۔ میں نے بھی اس بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں چند روز قیام کیا تھا۔ اس علاقے میں دیا پر جانے کے سوا کوئی تفریح نہیں تھی۔ ساحل جب ہمارے ساتھ نیپال سے انڈیا پہنچی تو ایک جہان حیرت اس کے سامنے تھا۔ اسی دوران میں چار مرتبہ اسے سنبھال جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ ہال میں بیٹھ کر کچھ دیکھنے کا تجربہ اسے بھایا اور جب بھی ہم کسی تفریح کا ذکر کرتے تو وہ چل کر کیسی کہتی "کچھ بھی دیکھیں۔"

گے۔

اور ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بچپنا بھلاہٹ تھی۔ دکھائی جا رہی تھی۔ انٹرویو کے بعد کچھ شروع ہوئی جیسا کہ اس وقت نظر آ رہا تھا۔ وہ بولی ہوئی۔

ایک معصوم صورت لڑکی تھی۔ شرارت اور چٹپٹا ہوا کچھ یوں کہ قلم شروع ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے انگ انگ میں بھری تھی۔ میں نے نہایت ہی کچھ دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور کہا "ٹھیک سا اس کے پوچھا کیا ہوا ساحل؟"

کچھ بھی دیکھیں گے۔ "میرے سر پر اس کا پاؤں لگا ہے۔" وہ جھپٹی رو میں تھوڑی دیر بعد ہم تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکل بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

ہوٹل کے زینے اترنے کے دوران میں میر بخش نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ "سامیں! اگر آپ اجازت دیں تو ذرا بولنا سکھ کو بھی درجہ چائے اپنے دونوں پاؤں کو ساحل والی سیٹ کی پشت گاہ پر لگائے قلم دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس بے ہودہ انداز نے مجھے

ہیں۔" "ضرور، ضرور۔" میں نے کہا اور اس کی مینڈ کھولا کر رکھ دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ "میں اسیاں سے اپنے پاؤں ہٹاؤ۔"

جس ہوٹل میں بولنا سکھ کو قیام کرنا تھا۔ وہ ہمارے۔ "مجھے کھور کر دیا گیا نام اس نے پاؤں ہٹا لیے۔ معاملہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دو تین گھنٹوں کے مریض دفع ہو گیا۔ ہم دوبارہ قلم دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس ہوٹل تک پہنچ گئے۔ استقبالیہ سے بولنا کے بارے تھوڑی ہی دیر بعد عملی جانب سے عامیانہ قسم کے جملوں کی استفسار کیا تو پتا چلا۔ "میر بولنا نامی ایک مہمان آج ہوئی۔ توازیں میری سماعت تک پہنچنے لگیں۔ ہم (ROW\_B) کی کر ٹھہرا تو ہے مگر وہ اس وقت کمرے میں موجود نہیں سیٹ ٹھہرا ایک نو اور تین پر بیٹھے تھے۔ ساحل کی سیٹ کا نمبر کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ بولنا ہوٹل کے ایک مختار اور وہ قمار کے کنارے پر تھی۔ میں دو نمبر سیٹ پر تھا ایک سو دو میں ٹھہرا ہے۔ فی الحال بولنا سکھ سے ملاقات اور میر بخش میرے برابر سیٹ نمبر تین پر بیٹھا تھا۔ میں نے ہو سکتی تھی تاہم یہ اہم بات معلوم ہو گئی کہ وہ یہاں ابھی جس شخص کو تنبیہ کی تھی وہ (ROW\_A) کی سیٹ نمبر ایک پر تھا۔ اب وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد سے پوچھے

میں نے ایک بک اسٹال سے کراچی کا میپ اورا کھٹا انداز میں پائیں کر رہا تھا۔ نشانہ ساحل کی ذات تھی۔ گائیڈ بک خریدی۔ یہ دونوں چیزیں انگریزی میں تھیں اس قسم کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسے میں کراچی کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ میرا مذاق تماش بین میری نظر سے کبھی گزرے تھے۔

بات اگر ان کی جملہ بازی تک محدود رہتی تو ممکن ہے؛ (MANDARIN) زبان سیکھی تھی۔ "مینڈرین" لکھے بیٹھ بیٹھ داشت کر جانا لگیں اس وقت تو میں مبر کا دامن اپنے حضرات و خواتین کی زبان ہے۔ آپ اسے تعلیم یافتہ سے چوڑے پر مجبور ہو گیا جب ساحل اچانک اپنی سیٹ افراد کی زبان سمجھ لیں۔ گھر میں والد اور والدہ اردو اسے انہی اور پیچھے مڑتے ہوئے نہایت ہی سخت الفاظ میں بھی سکھاتے رہتے کہ یہ ہماری روایت اور کلچر کا حصہ ہے۔

ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے دوران میں شخص نے مجھ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بد تیز بھاشا (ہندی زبان) بھی لکھتا، پڑھتا اور بولنا لگتی تھی۔ شخص کی جانب قہر اکو نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا "لگتا ہے، تم اور ہندی بول چال میں زیادہ فرق نہیں۔" تاہم میں کسی حیرت کی زبان نہیں سمجھتے تھیں کوئی اور سی سنی پڑھانا معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ انگلش زبان پڑے گا۔"

ساحل نے کہا "وہ جان! اس کہنے نے میری گردن پر اتھ لگا ہے۔"

ہم صدر کے علاقے میں کافی دیر تک گھومتے رہے۔ ہماری باتیں سن کر دوسرے تماش بین بھی ہماری جانب متوجہ ہو گئے اور مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔

میں نے اس شخص سے استفسار کیا "تمہیں کون سی چیز نکلے نہیں دے رہی ہے؟"

"زیادہ بکواس نہیں کرو۔" وہ الٹا مجھے آنکھیں دکھانے لگا "خاموشی سے بیٹھ کر قلم دیکھو اور ہمیں بھی دیکھتے دو۔"

اس کے روئے نے مجھے سلا کر رکھ دیا۔ میں نے کہا "میں انتظامیہ سے تمہاری شکایت کرنا ہوں۔ پتا نہیں کیسے کیسے جانوروں کو یہ سنبھالنے اندر رکھتے دیتے ہیں۔"

"جانور کس کو بولا؟" بد تیز شخص کے سامنے نے مجھ پر ٹکا تاتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل میرے عقب میں تھا۔

میں نے کہا "تم لوگوں کو۔" اور کس کو؟

"اس کا مطلب ہے، تمہیں مزہ چھاننا ہی پڑے گا۔" ان کے تیرے سامنے نے کہا اور بات ختم کرتے ہی میرے چہرے پر گھونسا مارنے کی کوشش کی۔

کوشش ان معنوں میں کہ جب اس کا گھونسا میرے چہرے کے مقام پر پہنچا تو چہروں سے ہٹ چکا تھا اور اس نے نشانہ تو باندھ کر اور کیا تھا۔ میں نے شوذر رٹن کا استعمال کرتے ہوئے اپنا چہرہ ایک جانب جھک دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی جوالی حملہ ضروری ہو گیا۔

میں نے حملہ آور کے شانے کو گرفت میں لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے گریبان میں ڈال کر "بیک تھرو (THROW BACK)" کے انداز میں دوڑ پھینک دیا۔ وہ گیلی کی بالکل اختتامی ROW میں جا کر گرا۔ اس کے بعد تو وہاں ایک ہل چل گئی۔ بانی دو افراد ہم پر پل پڑے۔

میرے جیسے میں وہ آیا جس نے دو مرتبہ ساحل نے بد تیزی کی تھی۔ وہ بالکل دسی انداز میں مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ دوسرے حملہ آور کو میر بخش نے سنبھال لیا اور اس کی ٹھیک ٹھاک درگت ہٹانے لگا۔

میں اپنے ہمدردانہ کے حملوں کے جواب میں اسٹریٹ فائٹ کے کر آ رہا تھا۔ بہت ہی محدود جگہ پر اگر بالکل رف فائٹ کرنا ہو تو یہ گریہ مت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں میں نے اپنے مقابل شخص کے منہ ناک سے خون چھڑا دیا۔ اس کا چہرہ بڑا وحشت ناک منظر پیش کرنے لگا۔ میر بخش نے اپنے جیسے میں آئے ہوئے شکار کو کھینچ کر اپنے قدموں میں جپت کر ڈالا تھا اور اس کے چہرے دیکھتے ہوئے سارے ہاتھ

تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ سنبھالنے کے انتظامیہ کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنبھالنے لائسنس آن کر دی گئیں۔ قلم کو روک دیا گیا۔ پوری گیلی کے تماش بین ہمیں اپنا مرکز نگاہ

بنائے ہوئے تھے۔ انتظامیہ کے چار بٹے کئے گراں ذیل افراد ہمارے پاس آئے اور اس بد اسخی کا سبب دریافت کرنے لگے۔

میں نے اور ساحل نے انتظامیہ کو ان لوگوں کی ”حرکتوں“ کے بارے میں بتایا۔ دو افراد نے ہم سے مار کھانے والوں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ ان کا تیسرا ساتھی کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کے بعد لگتا تھا وہ خاموشی سے کہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا یا پھر وہاں سے ٹھک لیا تھا۔

ہم تینوں بھی انتظامیہ کے افراد کے ساتھ سینما فیکر کے کمرے میں پہنچے۔ فیکر کو جب صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ ہم سے معذرت کرنے لگا۔

”سرا! ہم بہت شرمندہ ہوں۔“ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”لیکن یقین چاہیں! اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کسی کے ہاتھ پر نہیں لکھا ہوا کہ وہ اندر جا کر شرافت کا مظاہرہ کرے گا یا بد گیزی پر اتر آئے گا۔ میں ایک مرتبہ پھر اس واقعے پر آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ آپ کو بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔“

میں نے برہمی سے کہا ”یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی پیشانی پر اس کے شریف یا بد معاشر ہونے کا ٹھپا نہیں لگا ہوا مگر آپ یہ تو کر سکتے ہیں کہ ہاں میں موجود لوگوں کو لچر قسم کے فقرے بازی اور بے گٹے کی حرکتوں سے باز رکھ سکیں۔ یقین کریں، فلم کی آواز کم اور تماشاخیوں کے جھبرے زیادہ سننے کو ملتے ہیں۔“

”آپ کا اعتراض اور شکایت جائز ہے سرا“ سینما فیکر نے کہا ”مگر کیا کریں؟ اس قسم کے رویے اور سرگرمیاں یہاں کے لوگوں کا مزاج بن چکا ہے۔ شاید آپ پہلی مرتبہ سینما میں پکڑ دیکھتے آئے ہیں۔“

”یہی بات نہیں ہے۔“ میں نے فہرے ہوئے لہجے میں کہا ”میں نے دنیا کے بہترین پیکر ہاؤس میں فلمیں دیکھی ہیں البتہ پاکستان میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا جو بڑا دلچسپ ثابت ہوا۔“

فیکر نے کہا ”آپ فکر نہ کریں۔ میں ان بد معاشر کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ آپ اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھیں تاکہ فلم چلائی جا سکے۔ دوسرے تماشاخی بھی خاصا شور مچا رہے ہیں اور میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔“

اس واقعے نے طبیعت کو تندر کر دیا تھا۔ میں نے

بیزاری سے کہا ”آپ فلم شروع کر دیں تاکہ دوسرے تماشاخیوں کا حرج نہ ہو۔ وہ میاں تفریح کے لیے آئے ہیں ان کا مزہ نکلے گا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تو اب واپس جا رہے ہیں۔“

سینما فیکر کوئی بہت ہی شریف النفس انسان تھا۔ ہمارے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی اس نے ہمارے ٹکٹ کی شدہ رقم واپس کر دی۔ ہم تینوں سینما ہاؤس کی عمارت نکل کر باہر آئے اور پیدل ہی ایک جانب چلتے گئے۔ میر بخش نے کہا ”سائیں! لگتا ہے آج کا دن ایسے واقعات کے لیے ہے۔“

”لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ساحل نے اس کی تائید کی ”میں نے اپنی رشتہ واپج پر نگاہ ڈالی، رات کے گھر میں پہنچے تھے۔ میں نے اسنو دالے سے ہانڈی رو جتنے والے تھے۔ اگر ہم سینما گئے اندر بیٹھے ہوتے اور ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آتا تو اب تک ہم آرمی سے ناپسندیدہ ٹکٹ منٹ خرید لیا۔ ازبں علاوہ چین کلر بیٹلس کا فلم دیکھ چکے ہوتے۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا۔“

”اور گھومنا پھرنا ہے یا واپس چلیں؟“ ان دونوں نے واپس ہو کر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہاں سے ہمارا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میر بخش نے پوچھا ”اے میر بخش! اپنے ہوٹل میں جانے سے پہلے ہم ایک مرتبہ بوٹا سنگھ کو ”سائیں! کسی ٹیکسی کو روکا جائے۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے حتمی لہجے میں ”ہم چلتے ہوئے چلیں گے البتہ۔“ میں نے ساحل کی جانب والے ہوٹل پہنچ گئے وہاں کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ دیکھا اور پوچھا ”تمہیں پیدل چلنے میں کوئی دشواری تو نہ محسوس ہوئے؟“ میں نے اس کے کمرے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو استقبالیہ ٹھکر کے کہا۔

”بالکل نہیں، میں اپنے پاؤں کو بالکل ٹھیک محسوس کرتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظریں سے میر بخش کی طرف دیکھا۔ جاتا۔ میں نے اپنا نام و جدان بتایا تو ٹھکر کے انٹرکام پر بولا ”لاکھ لاکھ شکر ہے سائیں! میرا بازو بھی بھلا چنگا ہے میں اسے لگاتے رہا پھر قدرے اپوی سے بولا۔“

میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کر رہا۔ ”جناب! دوسری جانب کوئی اینڈ نہیں کر رہا۔ لگتا ہے،“

”ڈاکٹر نے دو دن بعد پٹی بدلنے کو کہا تھا۔“ میں نے اصرار کیا ”اس بات کا امکان تو تھا کیوں کہ اس وقت رات کے ڈرنک چیچ کر دوں گا۔“

”آپ سائیں؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا ”کیا تو سے گزرا تھا اس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہو گا؟“ اس پر ڈاکٹر بھی جانتے ہوئے۔

میرے بجائے ساحل نے جواب دیا ”میر بخش! امرت پور سے گزرا تھا اس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہو گا؟“ اس پر ڈاکٹر بھی جانتے ہوئے۔

میرے لیے باقاعدہ ڈاکٹر کی جاننا ضروری نہیں، بلکہ انسان پر جانے کماؤنڈر ہونا بھی شرط نہیں، بس میڈیکل اور فرسٹ اینڈ آگاہی کافی ہے۔ ویسے اپنے وجدان صاحب کو جانے کیا اسے آرام کرنے دیں۔ صبح ملاقات کر لیں گے۔“

ساحل اور میر بخش نے اثبات میں گردن ہلائی۔ استقبالیہ ٹھکر بولا ”آپ لوگ ایک منٹ سامنے صوفے پر بیٹھیں۔ میں اوپر جا کر کچھ لیتا ہوں۔“

ہم نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور انتظار گزارا کارز میں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایک منٹ بعد ٹھکر کے آکر بتایا۔

”میرا خیال ہے، مہمان واقعی سوچا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اسے آرام سے سونے دیا جائے۔“

”تمہیں مہمان کی اس خواہش کا علم کیسے ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ بولا ”کرا انبراہیم سودو کے دروازے کے ہینڈل میں ”ٹوڈنٹسز پلیر“ کا مخصوص ٹیک لگ رہا ہے۔“

استقبالیہ ٹھکر کی وضاحت پر ہم بوٹا سنگھ والے ہوٹل سے نکل کر اپنے ہوٹل میں آ گئے۔

ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں اس وقت خاصی گھما گھمی تھی۔ پتا چلا کہ وہ رونق کسی شادی کی تقریب کے سلسلے میں تھی۔ ہم اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میر بخش کو ایک فلور مزید اوپر جانا تھا۔ وہ تیسرے فلور کے کرا نمبر دوں میں تھا اور ہم دوسرے فلور کے کرا نمبر ایک میں تھے۔ ہم نے اپنے فلور پر میر بخش کو شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

اندر آتے ہی مجھے کچھ عجیب محسوس ہوا؟ اس کا میں فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا۔ میری چھٹی حس بار بار خبردار کر رہی تھی کہ کمرے میں کوئی گزبڑ ہے۔ ساحل کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخ کے لیے واٹس روم میں کھس گئی تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے کو اندر سے ڈبل لاک لگایا اور اس گزبڑ کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا جس کا احساس میری چھٹی حس دلا رہی تھی۔

جلدی میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری موجودگی میں اس کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ ہمارا ایک ”بیز“ الماری اور ٹیبل کو پارک بنی سے دیکھنے کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کسی خاص چیز کو وہاں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے کمرے میں سب سے زیادہ خاص چیز وہ ڈائری تھی جس کے حصول کے لیے خونی واقعات پیش آ رہے تھے۔

مجھے اپنے پورے بدن میں چونچیاں سی رہتی محسوس ہوئیں۔ میں نے سب سے پہلے اس مقام کا جائزہ لی جہاں میں نے ڈائری کو چھپایا تھا۔ حفظ المانڈم کے طور پر میں نے اس ڈائری کو بیگ سے نکال کر ایک پردے کے پیچھے لٹکی کے فریم میں بھسا دیا تھا۔ وہ سلائیڈنگ ونڈو تھی اور جب تک

اسے کھولنا نہ جاتا، ڈائری وہاں محفوظ رہتی۔ میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ سلائیڈنگ ونڈو کھلنے پر ڈائری کمرے کے اندر ہی گرے۔ یہ ایک ایسی عام سی جگہ تھی جس طرف کسی کا خیال نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے مصلحتاً اس راز میں ساحل اور میرے بخش کو شامل نہیں کیا تھا۔

میری احتیاط پسندی کام آئی۔ ڈائری اپنی جگہ پر محفوظ تھی۔ میں نے ڈائری کو فریم سے نکالا، اسے چوہا اور سلائیڈنگ ونڈو والا پردہ برابر کر کے رکھی پر آبیٹھا۔ ساحل نے واش روم سے باہر آکر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "کیا اس ڈائری کو ہر وقت سینے سے لگائے رہو گے؟"

اس وقت وہ ڈائری میری گود میں رکھی تھی اور میں کرسی میں غم و راز سا ہو کر بیٹھا تھا۔ میں نے ساحل کے سوال کے جواب میں ڈائری کو پھینکے ہوئے کہا۔

"یہ چیز ایسی ہے ساحل!"

"یہ ایسی چیز ہے یا دیکھی چیز؟ تو مجھے نہیں معلوم" وہ معنی خیز نظر سے دیکھتے ہوئے بولی "مگر یہ جیسی جیسی اور کیسی بھی ہے۔ بہت گلی!"

"یہ ڈائری کی لک (LUCK) کہاں سے نکل آئی؟" میں نے شونی سے پوچھا۔

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لمحے میں بولی "میں نے پارس پتھر کے بارے میں سن رکھا ہے۔ معلوم نہیں، ایسا کوئی پتھر حقیقت میں وجود رکھتا بھی ہے یا نہیں لیکن اس پتھر کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ جس چیز سے چھو جائے، اسے سونا بنا دیتا ہے۔"

"میں نے بھی سنا تو ہے۔" میں نے کہا "اس کی چھونے کی خاصیت کی بنا پر ہی اسے ٹچ اسٹون (STONE TOUCH) کہا جاتا ہے مگر میں نے خالی سنا ہی سنا ہے۔ اس پتھر کو بھی دیکھا نہیں۔ اگر یہ واقعی وجود رکھتا ہے تو اس کا شمار طلسماتی اور نایاب اشیاء میں ہونا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان!" وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی۔

میں نے پوچھا "ساحل! یہ تو تیرا ڈائری کے لکے ہونے کا تذکرہ کرتے کرتے تم پارس پتھر تک پہنچ گئیں۔ ان دونوں میں کیا تعلق ہے؟ آخر تم کتنا کیا جانتی ہو؟"

اس نے کہا "میں جو کچھ لکنا چاہتی ہوں وہ تم بھی سمجھ سکتے ہو!"

"میں نہیں سمجھتا" اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے نہکتی رہی اس کی نگاہ میں کھوپڑی بینا یا جاتا تھا۔ پتا نہیں، وہ میرے ہاتھ کیسا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ایک کمرہ گھورتی غزالی آنکھوں نے مجھے مضطرب کر دیا تو وہ بولی۔

"وجدان! معلوم نہیں، تم واقعی بے خبر ہو یا جلاز ہوئے بھی لالعلی کا اظہار کرتے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے کن آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تم کل کر کو کیا کتنا جانتی ہو۔ ہر تک بتاؤ گی نہیں، مجھے کیسے معلوم ہو گا!"

وہ ایک لمبائی ڈھیرے ہوئے بولی "وجدان! پارپر جس چیز کو چھو جائے وہ سونا بن جاتی ہے" اسی طرح تم نے شے کو چھو لو وہ گلی (LUCKY) ہو جاتی ہے۔ تمہارے لیے سوار یہ ڈائری مجھے بہت خوش قسمت نظر آ رہی ہے اور اس کی خوش بختی پر رشک کر رہی ہوں۔"

میرے سینے سے ایک طویل پوچھل سانس خارج ہوئی اس خوبصورت لڑکی نے بڑی خوبصورتی سے اظہار عبت تھا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ ساحل با میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس دلچسپی کو پسندیدہ عقیدت تک محدود نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ دلچسپی اس نے آگے کی چیز تھی۔ اسے محبت کے مقام پر فائز کیا جاسکتا تھا۔

اور آج اس نے بڑے موثر الفاظ میں اپنے دلی جذبات اظہار بھی کر دیا۔ اس سے زیادہ کھل کر اور وہ کیا کہہ سکتی تھی!

ساحل کسی تیز رفتار میزائل کے مانند میری جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کا ٹارگٹ میرا دل تھا اور اس کو شش سے لگتا تھا، وہ خود کو کچی نشانی باز ثابت کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔ ساحل میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ جوان و حسین تھی، معاملہ فہم تھی، ذہین تھی۔ وہ قدم قدم پر مجھ ساتھ دیتی آتی تھی اور میری خاطر یا رہا اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیا تھا۔ میں اس کے ایثار اور جذبہ قربانی کو ماننا اور بعض معاملات میں اس کا احسان مند بھی تھا لیکن میں کبھی اس کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا تھا جو اس کے سوچنے کا انداز تھا۔

شاید میرے دل کا وہ خانہ ابھی دانی نہیں ہوا تھا جس نے محبت کا بیوا جڑ پکڑا تھا اور عشقیہ جذبات نمودار ہوئے تھے۔ مجھ ہی ہو سکتا ہے، وہ خانہ تو وا ہو "اس میں محبت کا پودا لگے پروان چڑھ رہا ہو، جذبات بھی موجود ہوں مگر اظہار کی ذرا سے عاری ہوں۔ کونگا جذبہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا ہے۔"

خود کو گھٹا بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ انتہائی طاقت ور جسم اور بیدار ذہن رکھنے والا کوئی شخص دلی معاملات میں اس قدر کمزور ہو سکتا ہے، اتنا بزدل ہو سکتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی اور نہ ہی سمجھائی جانے کے قابل!

میں لباس تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ ساحل میرے خیال پر سوار ہو کر اندر آئی۔ وہ میرے دماغ میں تھی اور میں دماغ کو کمرے میں رکھ کر واش روم میں نہیں آ سکتا تھا۔ کپڑے بدلنے کے دوران میں مجھ سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ میں بار بار خود سے الجھتا رہا۔ چندر منٹ بعد جب میں واش روم سے نکلا تو بخیر سنبھال چکا تھا۔

اس ڈائری کا ساز پانچ بائی نو آج تھا۔ اس پر پوریلیدر کو چڑھا تھا جس کا رنگ سرخ تھا۔ ڈائری کے صفحات لگ بھگ دو سو ہوں گے۔ جب سے یہ ڈائری میرے ہاتھ چڑھی تھی، میں وقتاً فوقتاً اس میں جھانک رہا تھا تاہم تفصیل سے پڑھنے کا اب موقع ملا تھا۔

اس وقت رات کا ایک بجنا تھا یعنی کہ نئی تاریخ شروع ہو گئی تھی۔ ساحل ڈبل بیڈ پر پچھل کر سو رہی تھی۔ اس کی آنکھ تو زور دیر پہلے ہی گلی تھی اور پتا نہیں، گلی بھی تھی یا نہیں۔ ممکن ہے وہ سونے کی اداکاری کر رہی ہو۔ وہ بار بار ایسا کر چکی تھی۔

میں اپنی چیز پر غم و راز سرخ جلد والی ڈائری کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ اپنی دونوں ٹانگوں کو کراس کر کے میں نے باؤل بیڈ کے ایک کنارے پر ٹکا رکھے تھے۔ وہاں سے ساحل کا بدن صرف دو انچ کی دوری پر تھا۔ مجھے وہ رات کرسی پر غم و راز سو کر گزرائی تھی یا پھر فرش کے تالین پر بستر لگانا تھا۔ بیڈ پر سونے کا روم میں کسی قیمت پر نہیں لے سکتا تھا۔

نیلگری نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اصلی صورت میں میرے سامنے نہ آنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور غلطی میں میرے ساتھ کسی عورت کو بوداشت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میری یہ مجبوری تھی کہ جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے تھے ان میں ساحل کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ورنہ اسے دوسرے کمرے میں رکھ کر میں نیلگری کے کمرے سے مکمل آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ وہ جلوت میں میرے پاس نہیں آ سکتی تھی اور غلطی میں آنے کے لیے وہ کسی دوسری عورت کی محتاج تھی۔ اس سے بچنا اگر میرے لیے دشواری لا رہا تھا تو نیلگری بھی مجھے حاصل کرنے کے لیے بڑی مشکلات کا شکار تھی۔ گویا دونوں جانب رسائی کی ہی کیفیت تھی۔ نیلگری نے قاضی سلطان کی حویلی میں ہونے والی نشست

ملاقات میں کھل کر اظہار محبت کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا محبوب مانتی تھی اور میرا قرب حاصل کرنے کے لیے جتن میں لگی ہوئی تھی۔ آج ساحل نے بھی بڑے واضح الفاظ میں اپنے دلی جذبات مجھ تک پہنچا دیے تھے۔ میں عجیب و غریب کشش میں مبتلا تھا۔ وہ دونوں میری طلب گار تھیں لیکن دونوں کی طلب کا انداز مختلف تھا۔ ایک براسرار شکستوں کی مالک پڑی با اختیار تھی مگر میرے معاملے میں وہ بے اختیار ہو جاتی تھی، مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ دوسری کی محتاج تھی۔ دوسری ایک معصوم صورت اور چنچل مزاج تھی۔ اس کے پاس کوئی اختیار تھا اور نہ ہی کوئی براسرار طاقت، وہ سادہ اور بے کار تھی۔ مجھ تک رسائی کے لیے وہ اپنے جذبے کو کام میں لا رہی تھی گویا وہ اس معاملے میں کسی دوسری کی محتاج نہیں تھی۔ اس حوالے سے ساحل کو نیلگری پر سبقت حاصل کیلئے بڑے دراز ساحل کو بھرپور نظر سے دیکھا۔

سوئے میں اس کے چہرے کی معصومیت اور حسن کی سادگی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ تصنع اور بناؤ گھٹا رہا وہ کشش نہیں ہوتی جو جاذبیت سادگی میں پائی جاتی ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ خالص ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ سل اور سادہ نظر آتی ہے۔ اس کی اڑ پڑیری کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ساحل کے سر پائے نگاہ نہائی اور ڈائری کو پڑھنے لگا۔

رات دبے قدموں گزر رہی تھی اور میں مطالعے میں مگن تھا۔ اس ڈائری کے غائب حصے میں وہ واقعات درج تھے جو آپ میری اس داستان کی ابتدا میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ میرے پیدا ہونے سے لے کر بارہ سال کی عمر تک پہنچنے کی تفصیلی کہانی تھی۔ سب سے آخر میں سونے کا ذکر تھا اور وہ بھی اٹھاروں کنایوں میں تھا۔ میرے والد صاحب کو ان کے مزاحم اکبر نے اطلاع دی تھی کہ چوہدری نواز ش علی اپنے چچہ خاص دارا کی مدد سے بھاری مالیت کا سونا سرحد پار اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ والد صاحب نے اسمگلنگ کی اس کوشش کو ناکامیاب بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

وہ سونا نمک کی صورت میں ٹینوس کے جھٹے بڑے سازز کے تھیلوں میں بھرا ہوا تھا۔ چار تھیلے اسمگلروں نے کار کی ڈکی میں چھپا رکھے تھے جب کہ باقی دو تھیلے کار کی پچھلی سیٹ پر رکھے تھے۔ والد صاحب کی فائزنگ سے وہ لوگ اپنی گاڑی کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ والد صاحب کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ کار کی ڈکی میں بھی چار تھیلے چھپائے گئے تھے۔ وہ دارا اینڈ کمپنی کے فرار پر کار کی پچھلی سیٹ پر موجود تھیلے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی وقت دارا واپس آگیا۔

لہذا والد صاحب کو وہاں سے لٹکانا پڑا۔ انہوں نے سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے وہ دونوں تھیلے ایک قریبی متروک کنوئیں میں پھینک دیے تھے۔ اس وقت ان دو تھیلوں میں بھرے ہوئے سونے کی قیمت کم و بیش پانچ کروڑ تھی جو بیس برس گزر جانے کے بعد اب پچیس کروڑ تک جا پہنچی تھی۔

بالکل آخری صفحات میں والد صاحب نے رہت والے اس متروک کنوئیں کی نشاندہی کی تھی۔ سرحد سے ملی ہوئی زمین میں ایک مقام پر سرخ قلم سے دائرہ بنایا گیا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پچیس سال قبل وہ متروک کنواں پایا جاتا تھا۔ آج کل وہاں کی کیا صورت حال تھی یہ وہاں پہنچ کر ہی معلوم کیا جاسکتا تھا۔ سمجھنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں تھیں۔

میں اس ڈائری کے مندرجات کا اچھی طرح مطالعہ کر چکا تھا۔ میں نے ڈائری بند کر دی۔ پھر دیوار گیر کلاک کی جانب میری نگاہ اٹھ گئی۔ کلاک تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے ایک بڑھائی لی اور سونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ساحل ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سوچلی تھی۔ اب مجھے بھی اس سے محدود فاصلے پر سوجانا چاہیے تھا۔

میں نے کمرے میں کوئی ”محفوظ“ مقام تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسی وقت ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ رات کے سنانے میں کھنٹی کی آواز ایک عجیب قسم کا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس آواز سے ساحل کی نیند غارت ہو اس لیے دوسری کھنٹی بجنے سے پہلے ہی میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب ہوٹل کا آپریٹر تھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے اس کے ”ہیلو“ کے جواب میں کہا۔ وہ منت آمیز لہجے میں بولا ”سوری سر! آئی ایم ویری سوری۔ میں آپ کو اتنی رات گئے ڈسٹرب کر رہا ہوں۔“

”آگے بھی کچھ کہو گے یا۔“ میں نے سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ”سوری“ کی گردان کرنے لگا اور اس کے بعد بولا ”سر! آپ کے لیے ایک ایمرجنسی کال ہے۔ آپ کے والد صاحب بات کریں گے!“

”ماٹ ٹان سینس؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا ”سر! آپ گھر سے ناراض ہو کر آئے ہیں نا“ اسی سلسلے میں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے

ہیں۔“

آپریٹر کی بے سروپا باتیں سمجھ سے بالا تر وقت وہ مجھے کوئی فائزاتقل شخص لگا۔ والد صاحب انتقال کو کم و بیش آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آپریٹر سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا ”ٹھیک بات کراؤ۔“

اگلے ہی لمحے اس نے مجھے لائن دے دی۔

”ہیلو!“ میں نے گہری سنجیدگی سے ماؤتھ پیس

دوسری جانب سے ایک اجنبی آواز نے میری

دستک دی ”جاگ رہے ہو پر خوردار!“

اس کی آواز میں بھاری پن اور ایک مخصوص

گونج تھی۔

میں نے سپاٹ لیجے میں پوچھا ”کون ہو تم؟“

”کیا آپریٹر نے تمہیں میرے بارے میں

بتایا؟“ اس نے تعجب سے استفسار کیا۔

”کیا تم بھی وہی بکواس کرنا چاہتے ہو جو آپ

ہے؟“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”برخوردار! میں تمہارے

میاں زاہد حسین بول رہا ہوں۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس لیے نہیں کہ وہ چھ

ایک طاقت ور اور تجربہ کار مرہ تھا بلکہ اس لیے کہ

مجھے نہیں کر لیا تھا۔ نہایت ہی تشویش ناک صورت

ہو گئی۔ میرا ذہن بہ یک وقت کئی محاذوں میں مصروف

”کیا میرا نام سننے ہی تمہاری جان نکل گئی۔“

سنسناتے لہجے میں پوچھا ”خاموش کیوں ہو؟“

میں نے اپنے پاؤں کے پنجے سے ساحل کی پنڈلی

کرتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا ”تم بھونکتے جاؤ“ میں

ہوں۔“

”کیا اپنے باپ سے بھی تم اس لہجے میں باغ

تھے۔“ وہ دھاڑے مشابہ آواز میں مستغفر ہوا۔

میں نے جواباً ٹھوس لہجے میں کہا ”میں منہ دیکھ

مارنے کا عادی ہوں۔ جو مجھ سے جس لہجے میں بات کر

میں اسی لہجے میں جواب دیتا ہوں۔ تم ایک ایسے ہی جا

ہو جس پر بھونکنے کے الفاظ چلتے ہیں۔“

ساحل نے میری ”گوشش“ کے جواب میں

آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ

کھل خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میاں زاہد کی جاننے

ہو گیا۔ وہ نہایت ہی ذہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا، تم ویسے تو



ہو رہے ہو۔

”مطلب کی بات کرو! میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس دوران میں ساحل اشاروں میں مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ فون پر کس سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے مالتھ پیر پر اپنی ہتھیلی جما کر اسے دھیمی آواز میں بتایا کہ دوسری جانب میاں زاہد حسین ہے۔ وہ ہراساں دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اسے تسلی آمیز اشارہ کیا اور اپنی توجہ انٹری پر مرکوز کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا ”میرا مقصد اور مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو بخود دار۔ مجھے وہ ڈائری چاہیے جو بوتانگہ نے تمہارے حوالے کی ہے۔“

”تم یہ بات اسنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟“

وہ گھبر آواز میں بولا ”میں بات کو گھنٹا پھر کر کرنے کا عادی نہیں ہوں اس لیے تم بھی سیدھی اور چلی بات کرو۔“

میں نے کہا ”مجھے بھی پسلیاں بجھوانے کا کوئی شوق نہیں۔ تم جس ڈائری کا ذکر کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں۔“

”پھر وہ ڈائری کہاں ہے؟“

”بوتانگہ ہی کے پاس ہوگی۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ کاٹ دار لہجے میں بولا ”وہ ڈائری بوتانگہ کے پاس تو نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا تم بوتانگہ سے مل چکے ہو؟“ میں نے ہلکاتے ہوئے کہا۔

وہ سفائی سے بولا ”ایک گھنٹا پہلے بوتانگہ میرے پاس تھا۔ اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ مہار آباد کے ریسٹورنٹ میں اس نے وہ ڈائری تمہارے حوالے کر دی تھی۔“

ایک گھنٹا پہلے بوتانگہ کے ”میاں زاہد حسین کے پاس ہونے کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے اس کے ہوٹل سے کہیں لے جایا گیا تھا۔ اسی وقت میری نگاہوں کے سامنے وہ ٹیک کھوم گیا جس پر ”نورسٹریٹ پلیز“ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ بوتانگہ والے ہوٹل کے استقبالیہ کلرک نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ اس کے کمرے کے پنڈل میں یہ مخصوص ٹیک لٹک رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ میاں زاہد حسین کی کارستانی تھی۔ انہوں نے بوتانگہ کو ٹیکس کرنے کے بعد انہوں کو لیا تھا۔ اس خیال سے میرے پورے وجود میں سنسنی سی جھیل گئی۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ بوتانگہ تھکن کے باعث گرمی نیند سو رہا ہوگا۔

میں نے اکڑے ہوئے لہجے میں میاں زاہد سے پوچھا ”اس وقت بوتانگہ کہاں ہے؟“

”اس وقت وہ بہت اچھی جگہ پر ہے۔ وہ گیمز میں بولا ”ہر گم رنگ سے آزاد۔“

میں سمجھ گیا کہ انہوں نے بوتانگہ کو قتل کر دیا تھا کی شدت سے میری آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ”تم ورنہ ہو۔“ میں نے خاصی اونچی آواز میں کہا۔

”اور تم بھی کچھ کہ نہیں ہو۔“ میاں زاہد ہنسنے آج وہ دہر کو راشد منہاس روڈ پر میرے تین اوپر بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ابھی تو ایک ہوا ہے ”باتی دو کا باتی ہے۔ وہ دو تم تینوں میں سے کوئی ہیں۔“

وہ انتہائی بے غلی بات کر رہا تھا۔ شیزوفرنیوں کی طرح ”سی ایف کے“ والوں کا ہاتھ تھا۔ میں نے پھر سے لہجے میں کہا ”تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ تمہارے آدمیوں کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ انہیں ان دشمنوں نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا جو ایک نیلی ہائی روف ان کا تعاقب کر رہے تھے۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا ”تو یہ سمجھتے ہیں، تم ہی ان کے قاتل ہو۔ کل صبح کے اخبارات بھی ہماری بات کی تصدیق کریں گے۔“

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آیا۔ میں سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”خبردارت والوں کو یہ خبر کس نے پہنچائی ہے؟“

وہ بولا ”میرے آدمیوں میں سے جو ڈرائیونگ کر رہا ہے اس نے اسپتال میں، مرنے سے پہلے پولیس کو ایک خط بیان بھی دیا ہے اور اس بیان کے مطابق وجدان ناہی کا خطرناک انڈین ایجنٹ نے ان کی شیزوفرنی کی وجہ ان ناہی پر شخص ”را“ کا تہیت یافتہ ایجنٹ ہے اور روز قبل وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے انڈیا سے اپنے میں داخل ہوا ہے اور اب کراچی میں دہشت گردی دارواتی کر رہا ہے۔ اس کا مشن امن و امان کی صورت حال کو ختم کر کے خوف و ہراس کی فضا کو قائم کرنا ہے۔ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکاوٹ جاری رکھے۔ بولا ”باتی کی تفصیل تم صبح کے اخبارات میں پڑھ لیا۔“

میاں زاہد حسین پاؤں تلے سے زمین سمجھنے لپڑے باتیں کر رہا تھا۔ جواہر میں جو کچھ کہہ رہا تھا اس نے سابقہ گرمی تشویش میں جلا کر دیا۔ وہ صرف ایک طرف کی بات سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی فکر مندی اور بے عمل بھی تھی۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے

بانک کے زیریں حصے پر فرضی مونچھوں کو موڑ دیا، پھر اسی ہاتھ کے اشارے سے چلی منزل کی جانب اس کی توجہ دلائی اور آخر میں بلانے والے انداز میں ہاتھ کی انگلیوں کو حرکت دی۔ میں نے اشاروں میں اسے سرخس کو اپنے کمرے میں لانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اس دوران میں میں میاں زاہد سے فون پر بات بھی کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ہم تو یہی سمجھ رہے تھے تم سندھ کے صحرا میں رہتے چائے پھر رہے ہو گے۔ میں نے صرف بوتانگہ کے استیصال کے لیے آدی بھیجے تھے مگر تمہیں یہاں پا کر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی، تم نے آنا کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تم سے دو ہاتھ کرتے ہوئے بہت مزہ آئے گا۔“

میں نے پوچھا ”تم نے یہ نہیں بتایا کہ میری یہاں آمد کے بارے میں تمہیں کیسے معلوم ہوا کیوں کہ تمہارے تینوں آدمی تو جہنم واصل ہو گئے؟“

”میں میری دہشت نے تمہارے حواس گم کر دیے ہیں۔“ وہ مسکھ اڑانے والے انداز میں بولا ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں چاکا ہوں کہ شیزوفرنی کے ڈرائیور نے مرنے سے قبل پولیس کو بیان دیا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اس کے علاوہ میرا ایک آدمی بائیک پر شیزوفرنیوں کی عمرانی کر رہا تھا اور اس بات سے شیزوفرنی والے دہشتوں افراد بھی آگاہ نہیں تھے۔ میرے اسی آدمی نے خفیہ طور پر بوتانگہ کی قیام گاہ اور تمہارے بارے میں مجھے اطلاعات فراہم کی ہیں۔“

”تم خود ہی اپنی باتوں میں پھنس رہے ہو۔“ میں نے طنز لہجے میں کہا ”مگر تمہارا کوئی بندہ بائیک پر شیزوفرنیوں کی عمرانی کر رہا تھا تو پھر اس شخص نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ تمہارے تین آدمیوں کو میں نے نہیں بلکہ نیلی ہائی روف والوں نے قتل کیا ہے۔“

”دوسری جانب سے فتنہ لگانے کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میاں زاہد نے کہا ”میں نہیں بلکہ تم پھنس رہے ہو اور پھنسنے ہوئے انسان کا بچ بھی جھوٹ سمجھا جاتا ہے اور پھنسنے والے کا جھوٹ بھی کچھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پولیس اسی بات کا یقین کرے گی جو میں کون گائیوں کہ تم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم تو ”را“ کے ایجنٹ ہو۔ پڑوسی ملک سے دہشت گردی کی خطرناک تربیت لے کر یہاں پہنچے ہو۔ کیا تم میرے دوڑوں کو جھٹلا سکو گے؟ تمہارے پاس اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔“

”تم ایک نمبر کے شیطان ہو۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

”چلو تم نے مجھے ایک طاقت تو مانا، شیطان ہی سہی۔“ میں نے پوچھا ”ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت مجھے فون کس مقصد سے کیا ہے؟ اگر تمہاری ”بک“ ”بک“ ختم ہو گئی ہو تو یہ بھی بتا دو۔“

اس نے بڑے کمزور انداز میں قہقہہ لگایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ”پہلے مجھے شک تھا اب یقین ہو گیا ہے۔ میری دہشت نے تمہارے اعصاب کو شل اور تمہاری یادداشت کو بالکل ہی بے کار کر دیا ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے وہ ڈائری چاہیے جو مہار آباد کے ریسٹورنٹ میں بوتانگہ نے تمہیں دی تھی۔“

میں دانستہ زاہد حسین کو باتوں میں لگا کر کچھ وقت حاصل کر رہا تھا۔ مجھے میرے پیش کا انتظار تھا۔ میں نے کہا ”تم اس ڈائری کی فراہم کر رہے ہو تا جس کی خاطر تم نے ہمارے کمرے کی تلاشی بھی کرائی ہے؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے فون کے ریسپور کو کنڈھے اور کان کے بیچ کر نہایت ہی مہارت کے ساتھ بے آہنگی ڈائری کا وہ ورق پھاڑ لیا جس کے دونوں صفحات پر آگے پیچھے سونے والے حروف کو میں کی تفصیلات اور مقام کی نشان دہی کی گئی تھی۔ یہ ورق پھنسنے سے ڈائری کے ابتدائی صفحات میں سے بھی ایک ورق آزاد ہو کر باہر نکل آیا۔ جو لوگ ڈائری یا نوٹ بک سے ورق پھاڑنے کا تجربہ رکھتے ہیں وہ میری بات کو آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ میں نے مذکورہ دونوں اور اوراق کو بیکر کے انہی محفوظ جب میں رکھ لیا۔ گویا میں نے پچیس کروڑ کے سونے کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا!

میاں زاہد حسین نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”تم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو، اس کے اسٹاف میں میرا ایک آدمی بھی کام کرتا ہے۔ اپنے کمرے کی تلاشی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کتنی پیچھے والا ہوں!“ اس کے لہجے میں غور شامل تھا۔

”تم نے بھی میرے کمرے کی تلاشی سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ تمہاری مطلوبہ ڈائری میرے پاس نہیں۔“ میں نے جواہر چوٹ کی ”ورنہ وہ ڈائری ضرور تمہارے ہتھے چھ گئی ہوئی اور میں رات کے آخری پر تمہاری منحوس آواز سننے سے محفوظ رہتا۔“

وہ زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا ”تم نے یقیناً وہ ڈائری کہیں چھپا دی تھی یا پھر ہوٹل سے نکلے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے ہو۔“

میں نے کہا ”جب تم اتنی پہنچ رکھتے ہو کہ میری غیر موجودگی میں میرے کی غاشائی کروا سکتے ہو تو پھر کسی پردہ الہی کی طرف فون کی اوٹ سے کیوں نہیں میں“ کر رہے ہو بڑے طوطے۔ یہاں چلے آؤ آئے سانسے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“  
 وہ بولا ”میں اتنا ہی تنگ دل نہیں ہوں۔“  
 ”اس میں تنگ دلی والی کون سی بات ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے بتایا ”آج رات اس ہوٹل کے ریسیورٹ میں ایک شادی خانہ آبادی کی تقریب ہوئی ہے۔ دلہا اور دلہن اسی ہوٹل میں سہاگ رات منائیں گے۔ اور وہ بھی بالکل تمہارے سامنے والے کمرے میں۔ ہوٹل میں کسی قسم کی جگمگہ آرائی سے ان کی زندگی کی اس منتوں اور مراوں بھری رات کا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔ دیئے تو اس بد بخت دلہا میاں نے شادی جیسا احمقانہ کام کر کے ساری زندگی روٹا ہی ہے۔ کم از کم یہ رات تو اسے سکون سے گزار لینے دو۔ شادی کے بعد صبح کے صبح میں صرف ایک رات کی خوشی ہی تو آتی ہے۔ اس بے چارے کو اپنی مختصر خوشی کا ایک ایک لمحہ کشید کرتے دو۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
 وہ سنجیدہ لہجے میں بولا ”مجھے تمہارے ساتھیوں سے کوئی غرض نہیں۔ صرف تم سے اور ڈائری سے مطلب ہے۔ اگر تم میری بات باتے ہو تو وہ ڈائری میرے حوالے کر دو تو میں تم سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ ڈائری حاصل کرنے کے بعد میں تمہیں آزاد چھوڑ دوں گا۔ تم اگر چاہو تو تمہیں ”انڈین ایجنٹ“ کے چکرے بھی نکال دوں گا۔“ وہ اتنی مکاری سے جھوٹ بول رہا تھا۔ میں اس وقت چوہدری نواز علی کے لیے حلق کی ہڈی بنا رہا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی حاصل کرنے کے بعد مجھے آزاد چھوڑنے کی بات اس طرح کر رہا تھا جس طرح رپڑ میں سے چاکلیٹ نکالنے کے بعد رپڑ کو چھینک دیا جاتا ہے۔ میں اس کی چال میں آنے کی بے وقوفی نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال اس کی مکاری کی آخری یہ تک پہنچنے کے لیے میں نے کہا ”ٹھیک ہے“ اگر تم مجھ سے لا تعلق ہونے کا وعدہ کرتے ہو تو میں یہ ڈائری تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ بولو“ میں یہ ڈائری تم تک کیسے پہنچاؤں؟“  
 دوسری جانب ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی پھر میاں زاہد حسین کی مسرور آواز ریموور میں ابھری۔ وہ

نعمایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”تم وہ ڈائری لے کر اپنے ہوٹل سے باہر آ جاؤ۔“  
 روڈ پر پہنچ کر تم ہی کو رٹ کی جانب مڑ جاؤ۔ انکیش باؤس کر کرنے کے بعد ”ایف آئی اے“ کا پولیس اسٹیشن پر آ جاؤ۔ تم تمہارا اور آگے بڑھو گے تو اس روڈ کے اختتام پر ایئر بس کے ساتھ تمہیں گمرے فکری سوز کی ایف آئی اے کھڑی دکھائی دے گی۔ گاڑی کے اندر تمہیں دو پولیس والے بیٹھے نظر آئیں گے۔ دراصل وہ دونوں میرے نام ہیں جنہوں نے پولیس والوں کا ہمیں بھر رکھا ہے۔ تم ڈائری میرے آدمیوں کے حوالے کر دو اور جہاں جاؤ چلے جاؤ۔ ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔“

میں اس کی پلاننگ اور ”نظامات“ سے آگاہ ہو کر اسے مزید چکر دینے کے لیے میں نے کہا ”تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دو گے؟“

میں نے ڈائری کی خواہش کے لیے نیم رضامندی اور لے گا ہر کی تھی کہ وہ میری بات سے یہ تاثر لے کہ میں اس کے کام میں آ گیا ہوں۔

وہ تمہیں آواز میں بولا ”میں تمہیں صرف دس منٹ دے سکتا ہوں۔ پانچ منٹ سوچ بچار کے لیے اور پانچ منٹ ہوٹل سے نکل کر سوز کی ایف آئی اے تک پہنچنے کے لیے اور میرے فون بند کرتے ہی تم ان دس منٹ کے لیے کاؤٹ ڈاکٹر شروع کر دینا۔ یاد رکھو، کسی بھی چال کی صورت میں شاہراہ عراق تمہارے لمبے سے بھجک جائے گی۔“

”ٹھیک ہے“ میں آ رہا ہوں۔“ میں نے غصے سے بولے میں کیا۔

فون بے جان ہو گیا۔ میں نے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیکھا کہ گلاب کی طرف دیکھا۔ کلاک میں ساڑھے تین بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا پورے آٹھ گھنٹے تک ہمارے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے ریموور کو کھینچ کر دیا۔

اسی وقت کمرے سے باہر راہداری میں دوڑتے دوڑتے آواز ابھری، پھر کسی نے کمرے کے دروازے کو کھینچا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے کی جانب قدم اٹھاؤں کمرے کے باہر ایک بلند آہنگ نسوانی چیخ ابھری۔

میں اس چیخ والی کی آواز کو ہزاروں آوازوں میں گم شاخت کر سکتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں۔ میری ساحل تھی! میں نے کسی زخمی پیچھے کے مانند غراتے ہوئے ایک طویل جست بھری اور طوفانی انداز میں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکلا۔

ایک دھشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا!

دو دردی پوش افراد نے ساحل کو دو بوجھ رکھا تھا اور اسے سمجھ کر ایک طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دروازے کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تھی پھر دروازے پر دو حواں دھار انداز میں دنگ ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی ساحل کی بلند آہنگ چیخ میری سماعت تک پہنچی تھی۔ اب سب کچھ میرے سامنے تھا۔

سینکڑ کے ہزاروں حصے میں ”میں صورت حال کی بہ سنگ پہنچ گیا۔ وہ دونوں دردی پوش افراد ساحل کے تعاقب میں میرے کمرے کے دروازے تک دوڑتے چلے آئے تھے۔ ساحل نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے دروازے پر دستک دی تو اسی دوران میں انہوں نے ساحل کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اب وہ اس سے ہچکچاتی میں مصروف تھے۔

ساحل کو جب میں نے میرے پیش کو بلانے کے لیے ہوٹل کی ادوری خیل کی جانب بھیجا تھا تو دروازے کو اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ ان نازک ترین لمحات میں اسے دستک دے بغیر اندر گھس آتا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ یہ سوچنے کا وہ وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ وہ خوری رد عمل ظاہر کرنے کے لمحات تھے اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

دردی پوش افراد کا تعلق ہوٹل اسٹاف سے تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ دوم سومس سے متعلق تھے۔ میں نے آؤدیکھا ناؤ، بجلی کے کوندے کے مانند لپک کر ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ وہ دونوں ٹھنک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

انہیں شاید امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی کوئی مداخلت کاران کے سر پہنچ جائے گا۔ انہوں نے ایک ساعت کے لیے معنی خیر نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ ساحل کو چھوڑ کر گھٹ پھل پڑے۔ میرے لیے تو یہ ”اللہ دے اور بندہ لے“ والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی خوش دلی سے انہیں ٹھوکوں پر رکھ لیا۔ وہ بری طرح بیٹھے گئے۔

ان میں سے ایک لڑائی بھڑائی کا مارا نظر آتا تھا جب کہ دوسرے کے حلقوں میں انٹاری پن کی جھلک تھی۔ وہ شاید موہل پورٹ کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ میں نے دو چار ٹھوکوں میں اس انٹاری کا انٹاری پن ناک کے راستے باہر نکال دیا۔ وہ راہداری کے فرش پر لپٹ چکا تو میں نے چیخ کر ساحل سے کہا ”تکرے سے بیک آٹھلاؤ۔“

وہ لپک کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اس دوران

میں دو سرا حملہ آور کام دکھا گیا۔ اس کا ایک زور دار پیچ میرے کانڈے پر لگا۔ اس نے نشانہ تو میرے منہ کو بنایا تھا مگر میں نے جھکا کر دے کر اس کا نشانہ خطا کر دیا۔ اس نے چیخ میں خاصی طاقت تھی۔ مجھے اپنے شانے میں درد کی ایک بجلی کی لہر اٹھی محسوس ہوئی۔ ایسی دردناک لہروں کو میں بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بیک اسٹیپ لیا اور بجلی کی سی سرعت سے ایک فرٹ: ہش کلک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

میرا یہ مقابلہ دیکھی انداز کا فاسٹر تھا لہذا اس نے اپنا دفاع بھی اسی انداز میں کرنے کی کوشش کی جو صدنی صدا کا میاب رہی۔ وہ میری زبردست کلک کھا کر ہوا میں اچھلا اور پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا۔

میرا خیال تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہو گا اور وہ راہداری کے فرش سے اٹھ نہیں سکے گا لیکن اس کی سخت جانی نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔ وہ فرش پر گرتے ہی کسی اسپرنگ کے مانند ہوا میں بلند ہوا پھر زیادہ طراری سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں ان سنگین لمحات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ مار پیٹ اور اٹھا پھینچ رہنے والی نہیں تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس ہوٹل میں ہمارا مزید قیام انتہائی مشکل اور خطرناک ثابت ہوتا۔ ہمیں جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا اسی لیے میں نے ساحل کو کمرے سے اپنا بیگ لانے کو کہا تھا۔

قد مقابل کے جسم میں کسی گینڈے ایسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں کے حصار میں مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ٹانگہ اور ٹیکنیک میں کوئی خافی نہیں تھی لیکن میں اس کے عمل سے قبل ہی اس کے عزائم کو بھانپ گیا۔ اس کی کمر کی حرکت نے مجھے بتا دیا کہ وہ کون سا قدم اٹھانے جا رہا تھا چنانچہ اسے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس نے جیسے ہی اپنے بازوؤں کا حلقہ میری کمرے گرد کستا چاہا میں ہینک لگانے والے انداز میں تیزی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں بازو میرے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کو کراس کر گئے۔ میں نے اس کی پشت پر اس کے دونوں ہاتھوں کی چپت کی ”چٹا“ بڑے واضح انداز میں کی۔ یہی لمحہ تھا کہ میں اسی رفتار سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جس تیزی سے میں بیٹھا تھا پھر اس سے قبل کہ حملہ آور کی سمجھ میں کچھ آتا، میرا فلولادی پیچ اس کی ناک کا ”مزانج“

دریافت کر چکا تھا۔

اس نے ایک دردناک آواز خارج کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی ناک کو تھام لیا۔ اس عمل کے ساتھ ہی میرے لیے اس کی ناپاک زبان سے چند ناقابل اشاعت گالیاں بھی برآمد ہوئیں۔ میں گالی کا جواب بھی ہاتھ پاؤں سے دینے کا عادی ہوں۔ میں نے ایک لمبا سٹیپ لے کر سائیڈ پش لک اس کے پیٹ کے بالائی حصے پر رسید کر دی۔ میری اس لک میں غصے کی اچھی خاصی مقدار شامل تھی پھر پاؤں بھی عین اس کے ”ڈایا فرام“ پر پڑا تھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند چھلی جانب اچھلا اور پست کے بل سامنے والے کمرے کے دروازے سے نکل گیا۔

یہ ہوئی کا وہی کمرہ تھا جس میں ایک نوبیا ہوتا جو واشب زفاف مناتا تھا۔ معلوم نہیں ”دروازے کے قہقہے کم زور تھے یا میں نے یہی طیش میں کچھ زیادہ زور دار لک لگا دی تھی۔ عکراؤ کے نتیجے میں ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور وہ شخص سنگل پس فلتش ڈور کے ساتھ کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ دروازے کے پٹ نے فریم سے جدا ہونے میں کسی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وہ رات کا آخری حصہ تھا۔ دہلا دہلن کو شب مراو کے آخری پیر جس حالت میں ہونا چاہیے تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ ان کی بولھائی ہوئی تیز چٹخیں میری سماعت سے نکلنا نہیں۔ کمرے کے اندر زیرو پاور بلب کی تینگوں روشنی بچھلی ہوئی تھی۔ نوبیا ہوتا جوڑے نے چیخے چلاتے ہوئے خود کو سینٹا پھر ان کی نظرس اس افتاد کی جانب اٹھ گئیں جس کے سبب وہ دھماکا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ وہ خوف زدہ انداز میں ”ٹوٹے ہوئے دروازے کے پٹ کے اوپر ایک شخص کو بے حس و حرکت پڑا دیکھنے لگے۔

”ڈایا فرام“ انسانی جسم کا نمایاں نازک حصہ ہوتا ہے۔ اس پر نکلنے والی ضرب سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ فرنگل باڈی پر پائے جانے والے پریشر پوائنٹس میں سے ایک ڈایا فرام بھی ہے۔ پریشر پوائنٹس مارشل آرٹس میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان پر ایک جہاں لیا تصور کیا جاتا ہے۔

میں اس سادگت شخص کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ساحل بیگ اٹھائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں نے اس کا بازو تھاما اور وہ داری میں دوڑ لگا دی۔ میں جلد از جلد ہوئی کی عمارت سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہاں

جس قسم کے حالات پیش آچکے تھے اس کے بعد مزید قیام بڑی موت نما مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

زینے کے نزدیک پہنچ کر میں نے بالائی منزل کا رخ کیا۔ چاہا تو ساحل کی گھبراہٹ ہوئی آواز آئی ”وہ اوپر نہیں ہے۔“ وہ سمجھ گئی کہ میں میر بخش کی طرف جا رہا ہوں۔ میر کا کمرہ ہوئی کے تیسرے فلور پر تھا جب کہ ہم دونوں دروازے فلور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے ابھنن زندہ نظرت ساہو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اوپر نہیں تو پھر کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم“ وہ کہاں ہے۔“ وہ جلدی سے پوچھا۔

”اس کا کمرہ تو بالکل خالی پڑا ہے۔ میں نے خود کمرے کے باہر جا کر دیکھا ہے۔ میں میر بخش کے کمرے سے نکل کر چم بتائے آ رہی تھی کہ وہ دونوں مصیبتیں نکلے پڑ گئیں۔“ پھر نے راہ داری میں اس سمت اشارہ کیا جہاں سے ہم آئے تھے ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے ایک باؤنڈ ملازم بے ہوش پڑا تھا۔

میر بخش کا اچانک غائب ہونا تشریش میں جتنا کہ وہاں بات بھی مکر یہ ایسے لمحات نہیں تھے کہ میں اس کی عار میں اوپر نیچے بھاگتا پھرتا۔ ہم دونوں اگر یہ خیریت ہوئی۔ نکلے میں کامیاب ہو جاتے تو میر بخش کے لیے بھی کچھ کرنا تھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے ساحل کی کلائی کو ہور سے جھٹکا دیا اور تیزی سے نیچے جانے والے زینے پر تو رکھتے ہوئے کہا ”ہری آپ“ جلدی۔ ہمیں پہلی فرصت ہوئی کی عمارت سے نکلنا ہے۔“

بیگ ابھی تک ساحل کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس سے وہ بیگ لے لیا۔ اس طرح اسے میرے ساتھ قدم قدم ملا کر چلنے میں آسانی ہو گئی۔ ہم تقریباً دوڑنے والے انداز میں زینے اتر رہے تھے ساحل نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

”وہ جان! میر بخش کہاں جا سکتا ہے؟“

”ابھی یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔“ میں۔

سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولی ”میں ڈر رہی ہوئی کہیں اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو!“

والا بندہ نہیں۔“ مطمئن ہوتے ہوئے بولی ”ہاں یہ تو تم ٹھیک وہ قدرے کہہ رہے ہو۔“

ہم فرسٹ فلور سے نکل کر ہوئی کے ریسٹورنٹ میں پہنچے جی تھے کہ نیچے دو تین افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ استقبالیہ کاؤنٹر سے ڈائنگ ہال کی جانب آ رہے تھے۔ دوسرے فلور پر میں نے چند لمبے قبل جو باراباری کی تھی وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔ یقیناً ہوئی کے محلے کے کچھ لوگ صورت حال جاننے کے لیے اوپر کا رخ کر رہے تھے۔

میں ہر قسم کے حالات سے نشنبے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس وقت میں کیا تھیں افراد بھی میرے سامنے آ جاتے تو میں انہیں پھڑکا کر رکھ دیتا لیکن میں اس ہوئی میں خواہ خواہ کی جنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے لمبہ بیڑے سے کی جتنی جتنی الامکان کو بخش کی اور ایک کر ریسٹورنٹ کے داخل دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ ساحل بھی میرے ساتھ ہی کھینچی چلی آئی۔ اس کی کلائی میرے ہاتھ میں تھی نہ بھی ہوئی تو وہ ایسا کرتی۔

اس وقت ریسٹورنٹ کے ڈائنگ ہال کی بٹیاں گل تھیں۔ بس ایک آدھ بلب ہی روشن تھا۔ ہم دونوں ایک نیم تاریک گوشے میں خود کو چھپائے میں کامیاب رہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ افراد ہال میں داخل ہوئے۔ میں نے جن کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ میں نے سانس روک کر ہال کے زینے پر نگاہ جمادی۔

وہ تعداد میں تین تھے اور ان کا تعلق ہوئی کی سیکورٹی فورس سے تھا۔ میں نے ان کی مخصوص یونی فارم سے انہیں پہچان لیا۔ وہ تینوں پوری طرح مسلح تھے۔ انہوں نے وہاں رہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تیزی سے اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ذہنی طور پر اوپر کے حالات کا جائزہ لینے لگے تھے۔ میں نے زینے سے نظر ہٹا کر ساحل کو دیکھا۔

”ٹھیکس لاؤ بدھا!“ ساحل کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی ”شکر ہے“ یہ مصیبت تو ٹلی۔“

میں نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت قدرے سخت کرتے ہوئے کہا ”یہ مصیبت عارضی طور پر ٹلی ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ اس مصیبت کا پہلا حصہ تھا۔ جب تک ہم اس ہوئی سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر نہیں پہنچ جاتے یہ مصیبت

ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی! ہمارے ساتھ ساتھ چلے گی۔“

”جس طرح ہم ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی اور میرے ہاتھ کی گرفت میں جلدی اپنی کلائی کی طرف دیکھا پھر بولی ”وہ جان! کہیں تم مجھے بھی کوئی مصیبت تو نہیں سمجھتے؟“

”کیا کسی مصیبت کو اتنے اہتمام سے پکڑ کر رکھتے ہیں؟“

میں نے اس کی کلائی پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ جھنجھکی۔ میں اس وقت براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ نظر چراتے ہوئے سرسرائی آواز میں بولی۔

”وہ جان! میں زبردستی اور اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ انڈیا سے پاکستان چلی آئی ہوں۔ رالی روپ متی اور دیگر افراد نے مجھے ہندوستان میں قیام کا مشورہ دیا تھا۔ تم نے بھی مجھے اپنے ساتھ پاکستان لانے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ صرف اور صرف میری ضد تھی کہ میں تمہارے ساتھ ساتھ چلوں گی“ چاہے تم کہیں بھی جاؤ۔ اس حوالے سے میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہیں تم مجھے کوئی مصیبت نہ سمجھتے ہو!“

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بھرپور اور حسین مصیبت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا ”اچھا موقع ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ہوئی سے باہر نکل جانا چاہیے۔ اوپر جانے والے سیکورٹی گارڈز کو جب ہمارے ”فکارتانے“ کا علم ہو گا تو وہ شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سوگھتے ہوئے لگیں گے۔“

ہم دہے قدموں ریسٹورنٹ کے ڈائنگ ہال سے نیچے اتر آئے۔ میں نے زینے کے اختتام پر پہنچ کر استقبالیہ کی جانب محتاط نظر دوڑائی۔ وہاں استقبالیہ کلرک کے سوا اور کوئی مجھے نظر نہ آیا۔ جب ہم ہوئی میں آئے تھے تو میں نے ہوئی کی انٹریس پر بھی ایک مسلح سیکورٹی گارڈ کو دیکھا تھا جو اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ ممکن ہے ”وہ بالائی منزل کی طرف جانے والے گارڈز میں شامل ہو۔ بہر حال“ اس گارڈ کی عدم موجودی ہمارے حق میں مفید ثابت ہونے والی تھی۔

میں نے ساحل کو اشارہ کیا اور ہوئی کی لابی میں قدم رکھ دیا۔ استقبالیہ کلرک نے چونک کر ہمیں دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ استقبالیہ چھوڑ کر ہماری طرف بڑھتا، ہم تقریباً دوڑتے ہوئے لابی کا

ایریا عبور کر چکے تھے۔ میں نے عقب میں ریپشسٹ کی لٹکاری ہوئی آواز سنی لیکن ہم نے اپنے قدم نہیں روکے اور ہوٹل کی عمارت سے باہر آگئے۔

سامنے ہی مجھے ایک ٹیویٹا ہائی ایس کھڑی نظر آئی۔ وہ کریم کلر گاڑی اشارت تھی اور ایک باوردی شخص اس کی چھت پر سے سڑی بیگ اتار رہا تھا۔ قریب ہی ہوٹل کے دو مہمان بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔ ان کی شکل و شبانہ نے مجھے پک چھپتے میں بتا دیا کہ ان کا تعلق فارایسٹ کے کسی ملک سے تھا۔ ٹیویٹا ہائی ایس پر اس ہوٹل کا نام اور مخصوص مونو گرام بھی بنا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ گاڑی مہمانوں کو انرپورٹ سے ہوٹل لانے اور ہوٹل سے انرپورٹ تک چھوڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ان دو مہمانوں کا ہوٹل کی گاڑی میں یہاں پہنچنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے پہلے سے بنگلے لے رکھی تھی، ہوٹل کا ملازم (HIACE) میں انہیں انرپورٹ سے یہاں لایا تھا۔

میں گاڑی پر نظر پڑتے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ان ہنگامی حالات میں، میں اسے استعمال کروں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ باوردی شخص استقبالیہ کلرک کی چیچک مار کا مطلب سمجھ پاتا اسے ہم پر توجہ دینے کا موقع ملتا، میں نے اچانک اس پر حملہ کر کے اسے ہٹکھلا ہٹ میں پھینکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ساحل کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

”ہائی ایس“ میں سے اترنے والے مہمانوں نے یہ صورت حال دیکھی تو دوڑ کر ہوٹل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھے۔ عورت کے حلق سے تو باقاعدہ ایک ڈری سہی اور طویل چیچ بھی برآمد ہوئی تھی۔ میں نے وردی پوش شخص پر صرف تین سیکنڈ ضائع کیے اور اس کی گردن پر پالی جانے والی ایک مخصوص نس کی ”مزاج برسی“ کرتے ہوئے اسے اغوا کر لیا۔ وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔

اس کارروائی کے بعد میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ استقبالیہ کلرک نے خاصی مشکل مندی کا ثبوت دیا اور دروازہ کھڑا چلا دیا۔ اس نے میرے انتہائی نزدیک آنے کی چنداں کو شش نہیں کی۔ شاید اس نے میرے تیر دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس وقت مرے مارنے کے قتل موڈ میں ہوں۔ اپنی جانب سب کو یاد دی ہوتی ہے اور کلرک۔۔۔ چاہے وہ کسی بھی شعبے کا ہو! اسے اپنی زندگی کچھ زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے کیوں کہ اس کی ایک مفلس زندگی پر دسیوں دوسری

زندگیوں کا بوجھ بھی لدا ہوتا ہے!

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پیدار انجن والی ٹیویٹا ایس کو اس کے موجودہ رخ پر ڈال دیا۔ ٹیویٹا ہی دیرینہ اندازہ ہو گیا کہ میں شاہراہ عراق پر نکل آیا ہوں۔ یہ سوک تھی جس کو میرے لبو سے سرخ کرنے کی دھمکیاں حسین نے مجھے دی تھیں۔ اس نے مجھے صرف دس دس وقت دیا تھا۔ پانچ منٹ سوچ بچار کے لیے اور پانچ ہوٹل سے نکل کر اس کے بندوں تک پہنچنے کے لیے۔ وقت۔۔۔ میں سے ایک سیکنڈ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ پڑ ساڑھے تین بجے فون کو بند کر دیا تھا اور اب سینکڑوں منٹ ہو رہے تھے۔ گزشتہ دس منٹ بہت ہنگامہ خیز اور تیز گزرے تھے۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تو جب میاں زاہد نے مجھے دس منٹ کی صلت دے دی تو مدت گزرنے سے پہلے ہی اس کے آدمیوں نے سادہ گھیرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ یہ ممکن نہیں تھا کہ زاہد اس معاملے سے لاعلم ہو۔

میں ذہن میں ایسے ہی سیلوں سوال لیے ڈرائیونگ کر ایک عمارت پر مجھے پاکستان کا جھنڈا لہراتا نظر آیا۔ عمارت کی پیشانی پر مجھے ”لیکشن ہاؤس“ کے الفاظ لکھے دکھائی دیے تو میرے رگ و پے میں ایک منفی سی دھڑ میں غیر ارادی طور پر اسی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میاں کے آدمی میرے انتظار میں، سوزوکی ایف ایکس میں پانچ کی دریاں پنے بیٹھے تھے۔ مجھے پیدل چل کر ان تک تھا۔ میں نے میاں زاہد کو کبھی راگ سنایا تھا۔

میں نے ہر نوعیت کی صورت حال سے دو دو ہاتھ کا فیصلہ کر لیا۔ ٹیویٹا ہائی ایس ایکشن ہاؤس کے بعد ”آئی اے“ کے تھانے کے پاس سے گزری۔ سامنے کورٹ کی عمارت تھی۔ میں نے شاہراہ عراق کے انڈیپنڈنس کے ساتھ ایک گرے کلر سوزوکی ایف ایکس کھڑے دیکھا۔ گاڑی کے اندر مجھے دو پولیس والے بھی آئے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جب کہ دوسرے سبجریز سیٹ سنبھال رکھی تھی۔

سوزوکی ایف ایکس کچھ اس انداز میں کھڑی تھی گاڑی کا عقبی حصہ شاہراہ عراق پر تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں چوہدری نواز علی اور اس کے کارندوں کے غم و غصے اور نفرت کی شدید ترین لہریں اٹھ رہی تھیں۔ نے ٹیویٹا ہائی ایس سے ایک نئی مٹی اچھوٹی سی ٹکر ایف ایکس کی ”ڈم“ پر رسید کی۔ اس کارروائی میں

اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ دونوں گاڑیوں کو کوئی ناقابل طاقی نقصان نہ پہنچے پائے میں اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب رہا۔

کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب رہا۔ گاڑیوں کے معمولی ٹکراؤ نے ساحل کو چنچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھپٹا لے ہوئے انداز میں بولی ”کیا کر رہے ہو وہ ان؟“

”وہ ان؟“ ”میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔“ میں نے لہجے میں برہمی نہیں دیکھی۔ ”تم نے پولیس کی گاڑی کو ہٹ کیا ہے؟ ہم پہلے ہی کم سمیت میں پھنس جائیں گے۔“

میں نے اپنی گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔ وہ سوزوکی ایف ایکس بھی ٹکر کھانے سے پہلے اسی رخ پر کھڑی تھی۔ ہائی ایس کی ”جھکی“ نے اسے لولا لٹکرا پوزن لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ گویا وہ ہماری مخالف سمت میں رخ کیے کھڑی تھی۔

میں نے ساحل کی بات کے جواب میں کہا ”میں نے آپکے کھول کر ہی پولیس والوں کو ”سیلیوٹ“ مارا ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے تعاقب میں لگ جائیں۔“ میری بات ختم ہونے تک ایف ایکس نے باقاعدہ پوزن لے لیا تھا۔ اب اس کا رخ ہماری جانب تھا۔ ان کے عزائم سے لگتا تھا کہ وہ میری خواہش ضرور پوری کریں گے۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لوگ مجھے وجدان کی حیثیت سے پہچان گئے تھے ورنہ وہ کبھی بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ہمارے تعاقب میں نہ آتے۔ میاں زاہد نے انہیں ایک خاص مقصد کے لیے وہاں متعین کیا تھا۔

ساحل میری باتوں سے خاصی الجھ مچئی تھی۔ اس نے کہا ”وجدان! تم بھی عجیب بات کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ سمیت کی ان گھڑیوں میں تم پولیس کو اپنے پیچھے کیوں لگنا چاہتے ہو؟“

”وہ پولیس والے نہیں ہیں۔“ میں نے ساحل کی پیشانی دھڑکنے کے لیے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ”پولیس کی وردیاں انہوں نے بھرم بازی کے لیے پہن رکھی ہیں۔“

وہ حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ پھر اس نے تعاقب میں آنے والی ایف ایکس کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا ”وجدان! وہ باقاعدہ پولیس یونی فارم میں ہیں۔ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو وہ پولیس والے نہیں؟“

میں نے کہا ”پولیس کی وردی پسینے سے کوئی پولیس والا نہیں ہو جاتا۔ میں نے بتایا ہے نا یہ بھرم بازی ہے۔“ ”پھر وہ لوگ کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

میرے پر اعتماد انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر میں ان لوگوں کو پولیس والا نہیں سمجھ رہا ہوں تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ میں کوئی بھی بات خواہ خواہ اور بے مقصد نہیں کہتا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بتایا ”وہ دونوں افراد میاں زاہد حسین کے آڈ کار ہیں جنہوں نے پولیس اہل کاروں کا ہمیں بھرم کھا ہے۔“

”تم نے انہیں کیسے شناخت کیا؟“ ساحل کے سوالوں میں تنگ نہیں بلکہ تجسس تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں جب ساحل کو میری بحث کی جانب روانہ کیا تھا تو اس کے بعد ہی میاں زاہد حسین سے سوزوکی ایف ایکس اور پولیس والوں کے بہوپ میں اس کے بندوں کے حوالے سے بات ہوئی تھی۔ ساحل اس گفتگو سے آگاہ نہیں تھی اور یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اسے تفصیل سانے بیٹھ جاتا اس لیے میں نے مختصر الفاظ میں کہا۔ ”تمہارے سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا“ پہلے ذرا ان حرام زادوں سے نمٹ لوں۔“

ساحل نے خاموشی اختیار کر لی اور گردن موڑ کر عقبی جانب دیکھنے لگی۔ ایف ایکس والے اب باقاعدہ ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے اور دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا پھر یہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

میں نے سڑک کے اختتام پر پہنچ کر ہائی ایس کو دائیں جانب موڑ لیا۔ ایف ایکس نے ہائی ایس کی تقلید کی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا، نکلی پولیس والا کانٹینبل کے بہوپ میں تھا جب کہ پیچریز سیٹ پر ارجمان میاں زاہد کے آدمی نے اسے ایس آئی کا سواگت بھر رکھا تھا۔ میں کسی دیران مقام کی تلاش میں تھا جہاں سوزوکی ایف ایکس والوں سے شاندار ”ملاقات“ کی جاسکتی۔ میاں زاہد حسین کو یہ بتانا بہت ضروری تھا کہ اس کا پالا کس شخص سے پڑا تھا۔ محبت، جنگ اور دشمنی میں سب جائز سمجھا جاتا ہے۔ میرے اور چوہدری نواز علی کے درمیان دشمنی خاصی ”پہچور“ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے شکار کرنے کے لیے اپنے ایک سے ایک مرے آگے بڑھائے تھے جنہیں میں بیٹھا آیا تھا۔ زندگی اور موت کی اس خطرین میں دونوں جانب اب بہت کم ٹہرے بچے تھے گویا کھیل فائل راؤنڈ میں چل رہا تھا۔

ایف ایکس والوں نے میری مشکل آسان کر دی یا یوں کہہ لیں کہ انہوں نے میری خواہش پوری کر دی۔ سرور شہید روڈ جیسے ہی آئرس کو سل والے چوراہے پر ختم ہوا، ایف ایکس نے ہائی ایس کو اوور ٹیک کر لیا۔ اب دونوں گاڑیاں ایف ایکس کی ریل روڈ پر آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ بگڑا طرز تعمیر کی عکاس عمارت ”شاہین ٹیکس“ سے تھوڑا پہلے ایف ایکس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں، میں نے ان کا بھروسہ ساتھ دیا کیوں کہ میرے مطلب کا مقام تھا۔ رات کے لگ بھگ چار بجے اس مقام پر گہرے سانے کا راج تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھی ناکافی تھی لہذا میرے کام کے لیے راہ ہموار تھی۔

بریکس کی تیز چڑچاہٹ کے ساتھ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک ساتھ رہیں۔ ایف ایکس کی پیچڑ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک پستول واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے نے بھی نقلی اے ایس آئی کی تقلید کی پھر وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ہماری گاڑی کے نزدیک آ گئے۔ میں اور ساحل ابھی تک ہائی ایس کے اندر ہی بیٹھے ہوئے تھے میں نے سرگوشیاں انداز میں ساحل کو سمجھا دیا تھا کہ اسے عملی طور پر کچھ نہیں کرنا، صرف میرے اشاروں پر بچنا ہے اور پہلا اشارہ یہ ہے کہ جب تک میں اس سے نہ ہوں، وہ ہائی ایس کی پیچڑ سیٹ کو نہیں چھوڑے گی۔

ساحل نے سمجھ داری سے اثبات میں سر ہلادیا۔ پستول بردار نقلی اے ایس آئی میری سائیڈ میں آ گیا جب کہ کالینیل کے بھوپ والا ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں نے گاڑی رکتے ہی ساحل کی جانب والا دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا۔ دروازے کا شیشہ پیلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ البتہ میری سائیڈ والے دروازے کا شیشہ گرا ہوا تھا۔ اے ایس آئی نظر آنے والا پستہ قامت موٹا شخص مجھ پر پستول تانے ہوئے غرایا ”ڈائری کہاں ہے؟“

”کون سی ڈائری؟“ میں نے جواباً سوال کر دیا۔ وہ خوشخوار لہجے میں بولا ”ہمارے پاس فضول بحث کے لیے وقت نہیں ہے تم ابھی طرح جانتے ہو، میں کس ڈائری کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ڈائری میرے حوالے کر دو ورنس۔“ اس نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ میاں زاہد کی جانب سے اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ ہماری جان لے لے ورنہ وہ اس موقع پر ڈائینا گ میں وقت ضائع نہ کرتا اور پہلی فرصت میں ہمیں شوٹ کر دیتا۔“

میں نے اس سے پوچھا ”اگر میں تمہیں وہ ڈائری تو تم کیا کر لو گے؟“

”میں تمہاری ماں۔“ وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس نے میرے ہاتھ جواب میں میری ماں کو کوئی غلط کام دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اپنی ماں کے خلاف اس کی ناپاک زبان سے کوئی ایسی بات کہیں سن سکتا تھا۔ وہ ماں جس کا دودھ لہو بن کر رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اور جس کو میں نے اپنی بصارت کے ذریعے خاک و خون میں لوٹے دیکھا تھا۔ میں پہلے ہی کسی بگڑی کارروائی کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے میں نے ہائی ایس کا دروازہ کھولا اور اچھوڑا گاڑی سے باہر آ گیا۔ نقلی اے ایس آئی کے لیے یہ ایک متوقع حرکت تھی۔ ہائی ایس کا وزنی دروازہ ایک دم اس کے منہ پر پڑا۔ وہ ایک دردناک چیخ مارتے ہوئے گرا۔ ہائی ایس کا دروازہ اس کے منہ پر ایسے پڑا تھا کہ کسی بد نصیب پر کوئی افتاد ٹوٹ پڑتی ہے۔ الفاظ اس کے منہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے اور وہ زمین پر ایک جانب پڑا کر تھا، ایسا تھا نہیں۔ اس کے سونے بازوؤں میں بجلی بھری تھی اور وہ زمین بائیں جھٹکے دیتے ہوئے مجھے زمین پر لگا۔

اس دوران میں اس کا ساتھی مدد کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ موٹے نقلی اے ایس کو زمین سے اٹھانے کے بجائے اس پاس کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ایک لمحے میں میرا ذہن اس کی تلاش کی میں نے اپنے ساتھی کے پستول کو ڈھونڈ رہا تھا جو دروازے تصادم کے باعث موٹے کے ہاتھ سے نکل کر کہیں اڑھا گر گیا تھا۔

میاں زاہد حسین نے ان دو گرگوں سے ”اقتیلا“ کی نقلی کار کو قوت تھا اور نہ ہی موقع اس لیے میں ان کے پیچ گیا۔ اس دوران میں فریہ شخص کمر ہاتھ رکھ کر زمین اٹھ چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے انتہائی قریب پایا تو تانتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

وہ اگرچہ اچھا خاصا موٹا تازہ تھا تاہم پھرتا ہی نہیں تھا۔ اس کا ٹھونسا میرے سینے پر لگا۔ میں اس سے سانس روک چکا تھا۔ ماسٹرنگ پائی نے یوگا کی تربیت دوران مجھے بتایا تھا کہ انسان اگر بروقت سانس روک اس کے جسم پر لگنے والی ضرب کم سے کم تکلیف دہ ہوتی ہے۔

جیسے ہی موٹے کے گھونے نے میرے سینے کو چھو، میں نے دائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کی گھونے والی کلائی

کی پھر اسے کلاک دائرہ موڑا دے کر اپنی بائیں کمری اس کی کمری پر رسید کر دی۔ میری ایلو کایہ وار خاصا کاری ثابت ہوا کہ میں نے اس کا بازو مڑنے کے باعث خاصا تن چکا تھا۔ اس کیوں کہ اس کا بازو مڑنے کے لیے ”کڑا کے“ کی آواز پیدا کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہی موٹے نقلی اے ایس آئی کے حلق سے بلبلاتا خارج ہوئی۔ اس کا دایاں بازو کمری کے مقام سے لگا ہوا چکا تھا۔

میں نے اسی پر پس نہیں کی بلکہ موٹے کے جھٹکے ہوئے چہرے پر ایک زوردار ٹھٹھا بھی رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کلائی اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دی۔ وہ لڑکھاتے ہوئے دو قدم دور جا کر۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ موٹے کا ساتھی تھا جس نے مجھے اپنے بازوؤں کے خٹکے میں کسے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی گرفت میں کسی بد نصیب پر کوئی افتاد ٹوٹ پڑتی ہے۔ الفاظ اس کے منہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے اور وہ زمین پر ایک جانب پڑا کر تھا، ایسا تھا نہیں۔ اس کے سونے بازوؤں میں بجلی بھری تھی اور وہ زمین بائیں جھٹکے دیتے ہوئے مجھے زمین پر لگا۔

جب طاقت اور تکنیک آئے سانسے ہوں تو جیت ہمیشہ تکنیک ہی کی ہوتی ہے۔ طاقت کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ جسٹانی طاقت ہمیشہ دفاعی طاقت (تکنیک + ذہانت) کی غلام رہی ہے۔ اگر طاقت ہی سب کچھ ہوتی تو دنیا کے ہر ملک پر تسلط کے باعث موٹے کے ہاتھ سے نکل کر کہیں اڑھا گر گیا تھا۔

میں نے دائیں بائیں جھٹکے کے بعد مجھے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ شاید وہ مجھے دھڑما سے زمین پر پٹختے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے ہوا میں بلند کرنے کے لیے اسے تھوڑا پیچھے جھٹکا پڑا۔ اسی وقت میرا داؤ چل گیا۔ میرے دونوں بازو کمریوں کے اوپر سے اس کی ہانوں میں قید تھے تاہم میرے ہاتھ آزاد تھے۔ وہ جیسے ہی نیچے جھکا، میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر کلائی کی سرعت سے فرنٹ رول کیا۔

میری دونوں اسے بہت مہنگی پڑی۔ وہ میرے اوپر سے لڑکتے ہوئے دور جا کر اچھوڑے میں نے اسے اٹھنے کی مصلحت نہ دی۔ وہ جیسے ہی سنبھلا، میں نے اس کے تھوڑے پر فرنٹ جگ لگ رسید کر دی۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا تاہم دونوں ہاتھوں سے اپنا جوجھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے اس کی ہمت کا اندازہ بھی ہوا۔ وہ دونوں مارشل آئرس سے نابلد تھے

اس لیے مجھے اسٹریٹ فائٹر کے اصولوں پر کاربند رہ کر ان سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔

وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے اس کے پیٹ میں ٹھٹھا مارا۔ وہ رد عمل کے طور پر جھکا تو میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک دھواں دھار کبک پیچ رسید کر دیا۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے کمرے کے مانند ڈکڑا لگا پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مغالطہ پر آ کر آیا۔

میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے موٹے نقلی اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میرا ہی عمل بروقت تھا۔ وہ حیثیت اپنے مجبور بازو کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لمبی جست بھر کر اسے سوزو کی ایف ایکس کے قریب جالیا پھر اس کے منہ پر ایک چائنا رسید کرتے ہوئے پھرے ہوئے لمبے کیسے کہا۔

”کیا تمہارے میاں زاہد نے تم جیسے ذہنی جمع کر رکھے ہیں؟“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا ”تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو وجدان!“

”اور وہ تمہارا والد ثانی میاں زاہد سب ٹھیک کر رہا ہے؟“ میں نے غراتے ہوئے دریافت کیا۔ وہ تحیف سی آواز میں بولا ”تم سخت نقصان اٹھاؤ گے“

”اچھا۔“ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھکا دیا ”اگر میں نقصان اٹھاؤں گا تو پھر تم میاں سے یہ خیریت کیوں جاؤ۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس موٹے سوزو کو ٹھوکوں پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی تیز رفتار مشین کے مانند مصروف کار ہو گئے۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بری طرح پٹ رہا تھا۔ میرے طوفانی مکوں نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ اس کا چہرہ ہیکام منظر پیش کرنے لگا۔

میں پیٹتے اور وہ پٹتے ہوئے اس شخص کے قریب پہنچ گئے، تھوڑی دیر پہلے میں نے جس کی اچھی خاصی درگت ہائی تھی پھر یہ دلچسپ کرکٹ چوک اٹھا کہ اس دہلے پہلے شخص کے ہاتھ میں ایک پستول موجود تھا۔

یہ وہی پستول تھا جو نقلی اے ایس آئی کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں اڑھا اور پھر ہو گیا تھا۔ موٹے کا ساتھی نے اسے پہلے بھی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مرتبہ ناکامیاب رہنے کے بعد اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

وہ پستول کا رخ میری جانب کرتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولا ”اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہیں شوٹ

کردوں گا۔“

اس کی دھمکی میں دم تھا اور نہ ہی آواز میں کوئی نرم تھا۔ وہ بارے ہوئے جواری کی آواز میں بول رہا تھا۔ پستول والے ہاتھ میں ’میں لرزش دلیج چکا تھا اس لیے میں نے اس ہتھیار کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔  
”تم مجھے شوٹ کر دو گے۔ اس کی پکارت ہاتھ کے ساتھ؟“

اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی تو لرزے میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بھری ہوئی آواز میں بولا ”تم میاں کی کو نہیں جانتے۔ وہ تمہاری کھال بچا لیں گے۔“  
میں نے کہا ”تمہارے میاں جی نے اپنے اعزہ کے لیے دو زخموں کو پولیس والوں کے بھیس میں میرے پاس بھیجا ہے۔ اس سے میں چوہدری نواز شعلی کے تلوے چاٹنے والے میاں زاہد حسین کو بہت دور تک جان گیا ہوں۔ وہ میری کھال کیا بچوائے گا۔ تم دونوں کسی ٹائی کے پاس جا کر اپنی موٹیں بچاؤ۔“ راستے میں کوئی بھانجرا مل جائے تو درجن دو درجن چوڑیاں بھی چڑھا لو۔ تاکہ میرے دیے ہوئے ”ٹائٹل“ پر پورے اثر سکے۔“

وہ میری باتیں سن کر تھلا اٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پستول کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اس وقت موٹا نقلی اے ایس آئی ہم دونوں کے درمیان تھا۔ پستول بردار کے عزائم بھانپتے ہوئے میں نے موٹے کی چربیلی تو نہ پر ایک مچا کی جگہ کے ساتھ فرنٹ لگ کر جڑی۔ یہ ٹھوکر کسی ڈائی مشین کے وزنی ہتھوڑے سے کم نہیں تھی، میری اس غیر متوقع حرکت سے پستول والے نے بے اختیار گولی چلا دی۔

فضا میں فائز کی آواز بلند ہوئی اور موٹا نقلی اے ایس آئی مردہ جھپکی کے ہاتھ پیٹ سے زمین پر گر ا۔ کوئی اس کی کھوپڑی کے ارباب ہو گئی تھی۔  
میں نے پستول بردار کو دوسرا فائز کرنے کا موقع نہ دیا کیوں کہ اگلی گولی کا نشانہ میں ہی ہوتا۔ میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی ایک طویل اسٹیپ لے کر سائیکلک بدمقابل کے سینے پر رسید کر دی۔ ہمارے درمیان اس وقت لگ بھگ پانچ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر کسی مارشل آرٹسٹ کو سائیکلک پر عبور حاصل ہو تو وہ طویل اسٹیپ لے کر آٹھ سے دس فٹ تک بھرپور لگ کا استعمال کر سکتا ہے۔

میری لگ کھا کر وہ نقلی لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے گیا پھر فٹ پاتھ سے اس کا پاؤں رچا اور وہ فٹ پاتھ پر

چاروں شانے جت ہو گیا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچا پھر کسی ریسر کی فضا میں اچھل کر میں پشت کے بل اس کے پیٹ پر گر کر کے حلق سے ”اوں“ کی تحف سی آواز خارج ہوئی۔  
ہاتھ پاؤں جھپٹنے لگے۔

یہ غیبت تھا کہ وہ ابھی زندہ تھا اور نہ اس قسم کے اوپر کی سانس اور اور پیچے کی نیچے وہ جاتی ہے۔ زندگی کے حقیقی رنگ کی بات کر رہا ہوں۔ نی وی پڑ جانے والی ریننگ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نما کی مار پیٹ کی جاتی ہے۔ ریننگ کے مقابلے ہاتھ اندھیری کی شبیہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے اپنے نیچے دیے ہوئے شخص کا پستول والو اپنے قابو میں کیا اور اس کی کھائی کو زبردست جھٹکا دیا۔  
ہاتھ کی گرفت سے نکل کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔

میں اس کے سینے سے اتر آیا اور اس کے چہرے کا پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس کا خاصا ٹائٹ کر چکا تھا۔ میرے پاؤں کی حالیہ آتش فزوں نے اس کا چہرہ مس کر دیا۔ جب وہ کسی بھی مزاحمت کے قابل نہ رہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میاں حسین کے لیے ”زندہ بہ دست مردہ“ کا یہ پہلا ختمہ جانب سے خاصی اچھل چا دیا۔ میاں زاہد کا وائٹ کچھ تھلا تا اور ناک سے دھواں خارج کر تا چہرے میرے تصور گھوم گیا۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہو اور میں نے فٹ پاتھ پر پڑے پستول کو اٹھا کر ٹوپیا تانی الٹی جانب دوڑ لگا دی۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے گاڑی کو جھٹکے سے آگے بڑھایا ”شہابین پبلکس“ سے میں نے گاڑی بائیں جانب ڈائریکٹ الدین روڈ پر موڑ لیا۔ مجھے جلد از جائے وقوعہ سے دور نکل جانا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے فائز کی آواز فضا میں بلند ہوئی تھی وہ کسی کو بھی اس جانب متوجہ نہ کر سکتی تھی اور ہم تو پہلے ہی اپنے پیچھے جسم کی بلاؤں کو لگے ہوئے تھے۔

پولو گراؤنڈ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ساحل۔ پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔ اس کی آواز میں گری ٹوشن جاتی تھی۔

”وہ جان! جس ڈائری کے لیے یہ سارا کھٹ ران پھیلا یا گیا ہے وہ تو۔“  
”ہوٹل ہی کے کمرے میں رہ گئی۔“ میں نے اس

بات کاٹے ہوئے کہا ”یہی کہنا چاہتی ہوں!“  
اس نے حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی ”تم یہ بات اتنے اطمینان سے کہہ رہے ہو؟“

”ہاں“ میں واقعی بہت مطمئن ہوں۔“ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا ”تم بھی خواہ مخواہ کسی فکر اندیشی میں نہ پڑو۔ میں نے خود ہی وہ ڈائری ہوٹل میں چھوڑ دی ہے ورنہ تم جب بیک لے کر کمرے سے نکلے تھیں تو میں تم سے پہلا سوال ڈائری کے بارے میں کرتا۔“

اس کی حیرت دہچھوٹ گئی بلکہ اس حیرت نے ابھن اور تذبذب کی شکل اپنائی تھی وہ لرزے ہوئے لیجے میں بولی۔  
”کھم۔۔۔ وہ ڈائری تو بہت اہم ہے وہ جان۔ تم نے اسے ہوٹل کے کمرے میں کیوں چھوڑا؟“

”میاں زاہد کو پکڑ دینے کے لیے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ اچھل پڑی۔  
”مطلب یہ کہ۔“ میں نے ہائی ایس کو سگنل سے بائیں جانب موڑا اور اسے ”شیرن“ اور ”پی سی“ کے درمیان سے گزار کر فٹا بڑھاتے ہوئے ساحل سے کہا ”میں چاہتا ہوں“ میاں زاہد اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ میں افرا تفری میں سرخ جلد والی وہ ڈائری ہوٹل ہی میں بھول کر فرار ہوا ہوں۔“

وہ بولی ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی وہ جان۔“  
”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے تائید کی ”یہ بات خاصی پیچیدہ ہے۔“

”میاں زاہد حسین کو اس قسم کی خوش فہمی میں ڈالنے کے لیے تم نے وہ قیمتی ڈائری ہوٹل میں چھوڑ دی۔“ وہ تذبذب انداز میں بولی ”یہ وہی اہم ڈائری ہے جس کے حصول کے لیے خونی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ تم نے محض میاں زاہد حسین کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے ایسا بڑا رسک لیا؟“ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ”اور خوش فہمی بھی کسی! اگر تم ڈائری کی ڈیلی کیٹ یعنی کوئی اور بوکس ڈائری وہاں چھوڑ آتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تم تو اصلی ڈائری۔“

میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور قطع کلائی کرتے ہوئے کہا ”میں نے ہوٹل کے کمرے میں جو ڈائری چھوڑی ہے اسے تم بوکس اور نقلی ہی سمجھو۔ وہ میاں زاہد حسین کے کسی کام نہیں آئے گی مگر وہ اس کو سمجھنے کی کوشش

ضرور کرے گا۔ اور اس کا پرائیویٹ باپ ملک نواز شعلی تو اس ڈائری کو دیکھ کر ایسا کھوے گا کہ زندگی بھر گھومتا ہی رہے گا۔“

وہ زہر لب مسکراتے ہوئے بولی ”تمہارا اطمینان بتا رہا ہے کہ تم کوئی گہری چال چل چکے ہو!“

”اب تم بالکل صحیح جگہ پر پہنچ گئی ہو۔“ میں نے ہوٹل میزوپول کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کہا ”میری چال اتنی گہری ہے کہ اس کی میں نہ تو میاں زاہد حسین کیچے کے گا اور نہ ہی ملک نواز شعلی۔ بڑھا چوہدری زندگی بھر سر پر ہتھارہ جائے گا مگر وہ اس سونے تک نہیں کیچے کے گا جس کی چکا چوند دیکھنے کے لیے برسوں سے اس کی آنکھیں ترسی ہوئی ہیں۔“

وہ سنجیدگی سے بولی ”اپنی اس چال کے بارے میں مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

اس کے سوال کے جواب میں میں نے مختصر الفاظ میں اسے سرخ جلد والی ڈائری کے اس ورق کے بارے میں بتایا جو میں نے نہایت صفائی سے پار کر کے اپنی جیب میں منتقل کر لیا تھا۔ اس ورق کے آگے پیچھے دونوں صفحات پر سونے والے متحرک کنٹریں کی نشان دہی کی گئی تھی اور بالکل درست مقام پر پہنچنے کے لیے خطوط کی مدد سے ایک نقشہ سا کھینچ دیا گیا تھا۔ وہ دو صفحات اس ڈائری کی روح تھے۔ روح کے بغیر ہم بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہ ڈائری بھی اب کسی کام کی رہی تھی اور نہ کاج کی۔ کسی لاش کی طرح وہ بھی ایک بو جھگی۔ چوہدری نواز شعلی اس ڈائری کو چاہے ایک صدی تک اپنے سر پر اٹھائے پھر تا، وہ مردہ کبھی بولنے والا نہیں تھا۔

پوری بات سننے کے بعد ساحل سے کہا ”وہ جان! تم نے تو بہت کامیاب چال چلی ہے۔ ایسی ذہانت میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔“

آخری جملہ اس نے بڑی لگاؤ سے ادا کیا تھا۔ میں نے کہا ”انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو ایک سے ایک منظر اسے دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ قدرت نے سارے خوب صورت اور حسین مناظر انسان کی آنکھ ہی کے لیے تخلیق کیے ہیں۔ تمہارا مشاہدہ بہت قوی ہے یعنی تم غامت و نظر کی مالک ہو۔“

وہ اپنی تعریف سن کر چکی پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”قدرت نے تو ہر طرف حسن اور دل کشی ہی تخلیق کی ہے لیکن ہماری آنکھوں کو اکثر وہ بیش تر زنجیدہ اور تم زندہ کرنے والے مناظر ہی دیکھنا پڑتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا



ہے؟

”یہ حضرت انسان کی کارفرمائی ہے۔ میں نے جواب دیا  
”وہ اپنے اعمال سے ایسے دل دوز اور جگر پاش مناظر تخلیق  
کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔“

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی ”اس کا مطلب یہ ہے کہ  
انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہے!“

”اس میں کیا شک ہے؟“ میں نے جلدی سے کہا۔  
ساحل گاڑی سے باہر سڑک کو دیکھتے ہوئے چونک کر بولی  
”وہ جان! یہ راستہ تو دیکھا ہوا سالگ رہا ہے!“

میں نے غور کیا تو ساحل کی بات واضح ہو گئی۔ ٹیوٹا ہائی  
الیں اس وقت شاہراہ فیصل سے گزر رہی تھی۔ ہم نے گزشتہ  
روز ریلوے اسٹیشن سے نکلنے کے بعد زیادہ تر سفر اسی سڑک پر  
کیا تھا۔ نیکی ڈرائیور کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ شاہراہ  
فیصل سدھی انڈپورٹ کو جاتی ہے۔ اس وقت ہم عائنہ  
بادوانی اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ساحل نے پوچھا ”اب کیا ارادہ ہے وجدان؟“  
”کس سلسلے میں؟“ میں نے دو قسمی انداز اختیار کرتے  
ہوئے کہا۔

وہ بولی ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت ہمارے سامنے کوئی  
منزل نہیں تھی۔ ہوٹل کو ہم نے نہایت ہی ہنگامی صورت  
حال میں چھوڑا تھا۔ اس شہر ناشناس میں سرچھپانے کا اور  
کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ قاضی سلطان کا مضافی دوست  
منہاس باقر دوپہر تک اسلام آباد سے آنے والا تھا۔ اس سے  
پہلے اوھر کا رخ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”کیا سوچنے لگے؟“ مجھے خاموش دیکھ کر ساحل نے  
استفسار کیا۔

میں نے جواب دیا ”ساحل! اس اجنبی شہر میں میرا ایسا  
کوئی جانکار نہیں ہے کہ ہمیں رات کے آخری پھر اس کا  
دروازہ کھٹکھٹاؤں اور نہ ہی ہم کسی دوسرے ہوٹل میں قیام کا  
سوچ سکتے ہیں۔“

”پھر کیا ساری رات اسی گاڑی میں سفر کرتے رہیں  
گے؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”یہ  
بھاری رات گزارنے کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم  
اسی گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتے رہیں۔ اس وقت  
تک جب تک گاڑی کا ایندھن ساتھ دے یا پھر جب صبح کا  
اجالا پھیل جائے۔“

وہ معتدل لہجے میں بولی ”چلو“ ایک طریقہ تو یہ  
اس کے علاوہ اور کون سا طریقہ ہے تمہارے ذہن  
رات بتانے کا؟“

”دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم شاہراہ فیصل  
مانیں۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں!“

میں نے سمجھایا ”یہ سڑک انڈپورٹ کی طرف  
ہے۔ ہمیں اس کی پیروی کرنا چاہیے۔ کراچی ایک  
الا قوامی شہر ہے۔ اس کا انٹرنیشنل انڈپورٹ چومیں  
مصروف رہتا ہوگا۔ انڈپورٹ ہی وہ واحد مقام ہے جہاں  
زیادہ سے زیادہ وقت سکون کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔  
بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ہر رنگ و نسل کے  
موجود ہوں گے۔ کوئی ہماری جانب توجہ نہیں دے گا  
یہ آسانی اس ماحول اور ان لوگوں میں دل مل جائے گی  
”ڈن!“ اس نے اسٹیئرنگ پر جے میرے بائیں  
اپنا دایاں ہاتھ مارتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا  
انڈپورٹ جا میں گے۔“

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا ”لیکن اس میں  
قبات ہے۔“

”کیسی قبات؟“

”اس قبات کا نام ہے لباس۔“ میں نے کہا  
ہمارے لباس۔“

”کیا ہوا ہمارے لباس کو؟“ وہ الجھن زدہ لہجے میں  
اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اور میرے لباس  
جائزہ لیا۔ اس کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج  
ہم دونوں نے سلیڈنگ ڈریس پہن رکھے تھے۔

میں نے کہا ”ہم اگر اس لباس میں انڈپورٹ کی  
میں قدم رکھیں گے تو فوراً سب کی نظریں آجائیں گے  
خواہ مذاق کا نشانہ بنیں گے ہی“ اس کے ساتھ ساتھ  
والی نظریں ہمیں شک کے انداز میں دیکھیں گی۔ اس  
ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ دوسروں کو اپنے  
لیں۔“

”پھر کیا کریں؟ کہاں جائیں؟“ اس کی الجھن  
گئی۔

”جائیں گے تو ہم انڈپورٹ ہی۔“ میں نے اٹل  
کہا ”لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنا لباس تبدیل کرنا ہوگا۔  
وہ متذبذب نظریے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”ہم  
لباس کہاں تبدیل کریں گے؟“

”اسی گاڑی میں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مجھے تنکے لگی۔  
میں نے کہا ”ٹویو ہائی ایس خاصی بڑی گاڑی ہے۔ درجن بھر افراد اس میں بہ آسانی سفر کر سکتے ہیں۔ تم گاڑی کے پچھلے حصے میں چلی جاؤ اور اطمینان سے لباس تبدیل کر لو۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں غور مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے وجدان۔“ وہ جلدی سے بولی ”میں تم پر اندھا اعتماد کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے تم میری جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ تم نے قدم بہ قدم میری عزت کی حفاظت کی ہے۔ میں ایسے محافظ پر بے اعتمادی کس طرح ظاہر کر سکتی ہوں۔“

”پھر تمہاری ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے؟“  
”کچھ نہیں!“ وہ جان چڑانے والے انداز میں بولی پھر پوچھا ”تم گاڑی کو کسی جگہ روکو گے یا یہ کارروائی چلتی ہوئی گاڑی میں ہی کرتا ہو گی؟“

میں نے کہا ”چلتی ہوئی گاڑی میں تو یہ مناسب نہیں ہو گا۔ میں کسی تاریک مقام پر گاڑی روکتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس تبدیل کر پھر میں کر لوں گا۔“

میں نے ایک ”مستقل“ سی جگہ دیکھ کر ہائی ایس کو شاہراہ فیصل سے اتار کر سروس روڈ پر ڈال دیا پھر ایک نیم تاریک مقام پر گاڑی کھڑی کر دی۔ ساحل کو بیک کے ساتھ میں نے گاڑی کے پچھلے حصے میں بھیج دیا اور خود گاڑی سے باہر آ کر پیچھے بیٹھ گیا اور سامنے والے ٹائر کا معائنہ کرنے کی ادکاری کرنے لگا۔

میرا یہ عمل دہرے مقصد کا حامل تھا۔ ایک تو میں مین روڈ سے گزرنے والوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ گاڑی میں کچھ خرابی ہو گئی ہے اور میں اسے چیک کرنے یا ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دوسرے میں ساحل کی ہچکچاہٹ اور گریز کو رفع کرنے کا خواہش مند تھا۔ گاڑی کی باڈی کے پیچھے میرا جسم چسپ کر رہ گیا۔ مجھے امید تھی کہ اب ساحل کسی فطری دھڑکنے کے بغیر لباس تبدیل کر سکے گی۔

پانچ منٹ کے اندر اندر ساحل نے لباس بدل لیا۔ اس نے بلو جینز پر مگرے کلر کی لوئی ڈائری شرت پہن لی تھی۔ پاؤں میں جو گزرتھے اس کے بعد میں نے بھی سلیڈنگ سوٹ سے نجات حاصل کر کے جینز اور ہمداری دوائی شرت زیب تن کر لی۔ پاؤں میں ساحل کی طرح میں نے بھی جو گزرتھیں پہنے

تھے اتارے ہوئے کپڑوں کو ہم نے بیگ میں بھرا اور ہائی ایس ایک مرتبہ پھر ایئر پورٹ کی جانب رواں دواں لگئی۔ اس دفعہ رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے پاس جو رقم بچی تھی اسے میں نے تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنی مختلف جیبوں میں محفوظ کر دیا۔ کچھ رقم میں نے ساحل کے پاس رکھا دی۔ دوران سفر رقم کو پیش بانٹ کر مختلف جگہوں پر محفوظ کرنا چاہیے۔ جیب کتنے یا کسی اور قسم کے نیاں کے سبب کسی بڑی چیز سامانہ کرنا پڑے۔ ڈائری سے نکالا وہ ہوا وہ پیش کش میں نے اپنے لباس کے ایک خاص الخاص مقام پر چھپا کر تلاشی لینے والا کوئی بھی شخص اسے یہ آسانی برآمد نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ دقت تلاش کرنے والے کو میں کب بھی بڑی سے بڑی مشکل میں ڈال دیتا!

\*\*\*

ٹھیک چار بج کر تیس منٹ پر ہم بالائی منزل پر ڈائری پورٹ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی کی چسکیاں رہے تھے۔ ہم ٹھوڑی دیر قبل اعصاب شکن بحثات گزرے تھے ان کے پیش نظر بڑی شدت سے کافی کی طہور رہی تھی۔ ہونٹ کی گاڑی نوٹو ہائی ایس کو میں نے پارک لائٹ میں کھڑا کر دیا تھا اور سفری بیگ ہم اپنے ساتھ آئے تھے۔ میان زاہد حسین کے گماشتے اس ٹھکانے آئی کافی چائیں اسی بیگ کے اندر کپڑوں کے درمیان رکھا ہمارے ساتھ بورڈنگ یا ایئر لائن والا کوئی معاملہ تو تھا نہ لہذا ہمارے بیگ میں غیر لائسنس یافتہ آفتیش اسٹے موجودی ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں ہمارے درمیان موجودہ حالت پر گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ ساحل کی سوئی ایک ہی مقام پر گر رہی تھی۔ اس نے دھیمے لمبے میں اپنی تنویش کا کام کیا۔

”وجدان! میری سمجھ میں نہیں آ رہا“ میر بخش کا غائب ہو گیا!“  
اس کی تنویش یہ جاتی تھی۔ میں میر بخش کی طرف غافل نہیں تھا تاہم گزشتہ ڈھ گھنٹے میں ہم جن حالات گزرے تھے اس میں سب کچھ فراموش کر کے میر بخش تلاش کے لیے نکل کھڑے ہونا ممکن تھا اور نہ ہی مناسب میں نے ساحل سے کہا ”تم مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ میں نے تمہیں میر بخش کو بلانے اور پری فلوری طرف تو وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟“

”وہ کافی کا مھوٹ بھرتے ہوئے بولی ”میں تمہاری اشاراتی ہدایت پر سیدھی ہونٹ کے کمرائبر تین سو دو کے دروازے پر پہنچی تھی۔ اس وقت میری گھڑی میں سوا تین بجے تھے رات کے اس پر میر بخش کو نیند میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پہلے ہولے ہولے اس کے دروازے پر دستک دی۔ جب اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو میں نے دستک کی قوت بڑھا دی مگر اس دفعہ بھی نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔“

”وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”پار بارنا کالیانی کے بعد بتائیں“ میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے دروازے کے ہینڈل کو کھٹکا کر دیکھا اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہنٹ سی کلک کے ساتھ دروازہ کھٹکا چلا گیا۔ گویا ”میر بخش نے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا۔“

”حیرت ہے!“ میں نے کافی کے ساتھ مھکوائے گئے سینڈویچ کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا ”میر بخش اتنا بے احتیاط تو نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ایک ایک پیلور نظر رکھنے والا بندہ ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولی ”مجھے خود غیر مقتل دروازہ دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ لاؤڈ ہوا اس کی خیر کرے۔ میں تو میر بخش کے لیے بہت پریشان ہو رہی ہوں۔ وہ ہمارا ایک جاں نثار دوست ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”میر بخش کی دوستی اور وفاداری کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ خدا اسے سلامت رکھے!“ اس وقت میر بخش کے لیے میرے دل سے دعا نکلی تھی۔ میں نے دوبارہ ساحل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”جب تم کمرے میں داخل ہوئیں تو تم نے کیا دیکھا؟ میرا مطلب ہے وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟“

اس نے بتایا ”کمرے کے اندر ٹائٹ بلب کی روشنی بجلی ہوئی تھی۔ ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی مگر میر بخش کا کس نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ میں نے واش روم میں جھانک کر دیکھا اور کمرے کا کونا کونا چھان مارا لیکن میر بخش اس کمرے میں ہوا تو اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔“

”وہ کہاں جا سکتا ہے!“ میں نے پُر خیال انداز میں زیر سوال لئی بولی ”میں تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔“  
”نارواہ امکان اسی بات کا ہے کہ اس نے کسی قسم کی موزیک کو سونگ لیا ہو گا۔“ میں نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔

”اور موقع کی گنجینی کو دیکھتے ہوئے وہ کسیں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔“

ساحل سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ”میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔“

”تم اپنے دل کی گھبراہٹ پر قابو رکھو۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ”انہ کے فضل سے وہ بہ خیریت ہو گا۔ تم مجھے بتاؤ۔ جب تمہیں کمرے میں میر بخش نہیں ملا تو پھر تم نے کیا کیا تھا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولی ”میں تمہیں میر بخش کے غیاب کے بارے میں بتانے آ رہی تھی کہ ان دو مردوں نے مجھے گھبرا لیا۔“

”وہ تمہیں کہاں ملے تھے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔  
”میں نے میر بخش والے کمرے سے نکل کر پیچھے ہی دروازہ بند کیا، وہ دونوں مجھے زینے پر نظر آئے تھے۔“ ساحل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”وہ جو تھے فلور سے تیسرے فلور کی طرف آ رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے دوڑ لگا دی۔ میں بھاگتی ہوئی دوسرے فلور پر پہنچی لیکن اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں دریافت کیا ”ساحل! تمہارے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا پھر تم نے واپسی پر بے دھڑک کمرے میں داخل ہونے کے بجائے دروازے کو ہیوں ہیٹ ڈالا تھا؟“

”وہ سب کچھ بھوکھا ہٹ میں ہوا تھا۔“ وہ محتال لمبے میں بولی ”اس وقت میں اوپر سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اور اس حالت میں کہ دو افراد مجھے قابو کرنے کے لیے میرے پیچھے آندھی اور طوفان کی طرح لپکے نکلے آ رہے تھے۔ تم اس دستک کو میرا لاشعوری اور اضطرابی عمل کہہ لو۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ہاں“ اس قسم کے سنگین حالات میں انسان اس نوعیت کی غلطیاں کرتا ہے۔ ان افعال کا غلطیاں کتنا بھی جائز نہیں کیوں کہ اس میں انسان کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ یہ ایک لاشعوری“ بے ساختہ اور فوری عمل ہوتا ہے۔“

ساحل نے کہا ”وجدان! اس وقت ہم بڑی حد تک ایک محفوظ مقام پر بیٹھے ہیں۔ راستے بھر کسی دشمن نے ہمارا تعاقب نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے ہمارے مخالفین ہمارے فرار ہونے کی سمت سے آگاہ نہیں لہذا ہمیں سب سے پہلے میر بخش کو تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“  
میں نے ساحل کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ”اور

اس تلاش کا آغاز میں اسی ہوٹل سے کروں گا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان۔“ وہ بوکھلا گئی ”کیا دوبارہ اس ہوٹل میں جانے کا ارادہ ہے؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا ”میر بخش کو ڈھونڈنے کے لیے اس ہوٹل کا رخ کرنا دانش مندی ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔“

”تجربہ کیا کرنے والے ہو؟“

”میں فی الحال یہ کرنا چاہتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر میں نے ریسٹورنٹ کے شفاف اور چم بھاتے فرش پر رکھے سفری بیگ کو اٹھالیا۔ گود میں رکھ کر میں نے بیگ کی سائیز پاکٹ میں ہاتھ گھمایا تو اپنے مطلب کی شے مجھے مل گئی۔ وہ دراصل ہوٹل کا تعارفی بروشر تھا۔ میں نے بیگ کو دوبارہ فرش پر رکھا اور نہ کوہ بروشر ساحل کے سامنے ٹیبل پر ڈال دیا۔

وہ سالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”یہ کیا ہے؟“

”ہوٹل کا تعارف نامہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ہے۔“ وہ ابھن زدہ انداز میں بولی ”لیکن اس بروشر کا میر بخش کی تلاش سے کیا تعلق؟“

میں نے کہا ”میں ابھی ایک ایسی بن کر اس ہوٹل میں فون کروں گا۔ فون نمبر اس بروشر پر موجود ہیں۔ میں خود کو فرید (میر بخش) کا شناسا ظاہر کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کروں گا۔ دیکھتے ہیں، ہوٹل والے اپنے کمرے نمبر تین سو دو میں ٹھہرے ہوئے سمان فرید کے بارے میں کیا رپورٹ دیتے ہیں!“

”ہاں“ یہ ترکیب اچھی ہے۔“ ساحل نے سرائے والے انداز میں کہا ”اس طرح ہمیں میر بخش کے غیاب کے سلسلے میں ہوٹل والوں کا نقطہ نظر معلوم ہو جائے گا۔“

ساحل کی مضبوط تائید کے بعد میں کرسی سے اٹھا اور بروشر کے ساتھ ٹیلی فون تک چلا آیا۔ میں نے مذکورہ ہوٹل کے نمبر ڈائل کیے اور دوسری جانب سے ریسپورڈ اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

اس وقت تک پاکستان میں ”سی ایل آئی“ کی سولت متعارف نہیں ہوئی تھی اس لیے ہوٹل والے مجھے یا اس مقام کو ٹریس نہیں کر سکتے تھے۔ ”سی ایل آئی“ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا تحفہ ہے اس ٹیکنالوجی سے پہلے حکمہ ٹیلی فون جرمن ٹیکنالوجی ”اینا لوگ“ سے استفادہ حاصل کر رہا تھا۔ (ANALOGUE) سسٹم کے تحت اور ریزرنگ ٹیپوٹی کے

لے بہت دشواری کا سامنا ہوتا تھا اور بعض اوقات گا کروانے کے بعد ٹھنوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے مقابلے میں اب وہ سسٹم انتہائی فروسودہ دکھائی دیتا ہے۔ چوتھی تیل پر میری کال ریسپو کر لی گئی۔ میری ہل سے ”ہیلو“ کا مخصوص لفظ ٹکرایا پھر آپریشنر نے اس ہل نام دہرایا۔

میں نے مطمئن ہونے کے بعد بھاری آواز میں کہا سلیمان شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل میں میرا دوست فرید ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا اس سے بات کروادیں۔

”اے دوست کا کمرہ نمبر بتائیں۔“ دوسری جانب سہمی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا ”فرید کمرہ نمبر تین سو دو میں ٹھہرا ہوا ہے۔ دوسری جانب چند لمبے خاموشی رہی پھر نمبر بتائی دے سے کہا گیا ”اس نام کا کوئی آدمی ہمارے ہوٹل میں قیام نہیں اور۔ کمرہ نمبر تین سو دو تو بالکل خالی ہے۔“

مجھے یہ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ آپریٹر ایک بار سی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے گمان کیوں غلط جگہ تو نمبر نہیں لگ گیا۔ اس غلطی کا اظہار ہونے کے برابر تھا کیوں کہ مجھے آغاز ہی میں آپریشنر نے کا نام بتا دیا تھا تاہم میں نے پھر بھی اپنی تسلی کی خاطر ہوٹل کا نام واضح الفاظ میں دہرایا اور پوچھا ”کیا یہ وہی انداز میں کہا ہے؟“

”ہوٹل کا نام آپ بالکل صحیح بتا رہے ہیں۔“ وہ جانب سے تصدیقی انداز میں کہا گیا ”لیکن آپ کا یہ کہنا انداز میں ساحل کی طرف دیکھا۔ غلط ہے کہ ہمارے ہوٹل میں کمرہ نمبر تین سو دو میں کوئی دوست فرید قیام پذیر ہے۔“

میری ابھن بے انتہا بڑھ گئی۔ میں نے اضطراب کی حالت میں کہا ”دیکھیں، میں اپنے دوست سے بہت ضروری بات محفوظ حکمت عملی کام آگئی اور قیمتی ڈائری میاں زاہد کے چاہتا ہوں۔ اس کے دو عزیز آپ کے ہوٹل کے کمرہ نمبروں کے ہاتھ لگنے سے محفوظ رہی۔ فون پر میاں زاہد نے ایک میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مرد اور اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا تھا عورت۔ میرا مطلب ہے، لڑکی ہے۔ اس لڑکی کا نام بلا کہ ہوٹل کے اسٹاف میں اس کا ایک بندہ موجود ہے۔ میں مرد کا نام جاوید ہے۔ آپ ان میں سے کسی کو فون دیں۔“

”شاید آپ کوئی باگل انسان ہیں۔“ دوسری جانب کہا گیا ”یا پھر آپ کسی شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارے کمرہ نمبر سو ایک گزشتہ ایک ہفتے سے خالی پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کس جاوید اور بیلا کی بات کر رہے ہیں؟“

میں نے ایک اور پیئر تریڈلا ”میں، آج شام کو میری

لے بہت دشواری کا سامنا ہوتا تھا اور بعض اوقات گا کروانے کے بعد ٹھنوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے مقابلے میں اب وہ سسٹم انتہائی فروسودہ دکھائی دیتا ہے۔ چوتھی تیل پر میری کال ریسپو کر لی گئی۔ میری ہل سے ”ہیلو“ کا مخصوص لفظ ٹکرایا پھر آپریشنر نے اس ہل نام دہرایا۔

میں نے مطمئن ہونے کے بعد بھاری آواز میں کہا سلیمان شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل میں میرا دوست فرید ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا اس سے بات کروادیں۔

”اے دوست کا کمرہ نمبر بتائیں۔“ دوسری جانب سہمی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا ”فرید کمرہ نمبر تین سو دو میں ٹھہرا ہوا ہے۔ دوسری جانب چند لمبے خاموشی رہی پھر نمبر بتائی دے سے کہا گیا ”اس نام کا کوئی آدمی ہمارے ہوٹل میں قیام نہیں اور۔ کمرہ نمبر تین سو دو تو بالکل خالی ہے۔“

مجھے یہ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ آپریٹر ایک بار سی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے گمان کیوں غلط جگہ تو نمبر نہیں لگ گیا۔ اس غلطی کا اظہار ہونے کے برابر تھا کیوں کہ مجھے آغاز ہی میں آپریشنر نے کا نام بتا دیا تھا تاہم میں نے پھر بھی اپنی تسلی کی خاطر ہوٹل کا نام واضح الفاظ میں دہرایا اور پوچھا ”کیا یہ وہی انداز میں کہا ہے؟“

”ہوٹل کا نام آپ بالکل صحیح بتا رہے ہیں۔“ وہ جانب سے تصدیقی انداز میں کہا گیا ”لیکن آپ کا یہ کہنا انداز میں ساحل کی طرف دیکھا۔ غلط ہے کہ ہمارے ہوٹل میں کمرہ نمبر تین سو دو میں کوئی دوست فرید قیام پذیر ہے۔“

میری ابھن بے انتہا بڑھ گئی۔ میں نے اضطراب کی حالت میں کہا ”دیکھیں، میں اپنے دوست سے بہت ضروری بات محفوظ حکمت عملی کام آگئی اور قیمتی ڈائری میاں زاہد کے چاہتا ہوں۔ اس کے دو عزیز آپ کے ہوٹل کے کمرہ نمبروں کے ہاتھ لگنے سے محفوظ رہی۔ فون پر میاں زاہد نے ایک میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مرد اور اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا تھا عورت۔ میرا مطلب ہے، لڑکی ہے۔ اس لڑکی کا نام بلا کہ ہوٹل کے اسٹاف میں اس کا ایک بندہ موجود ہے۔ میں مرد کا نام جاوید ہے۔ آپ ان میں سے کسی کو فون دیں۔“

”شاید آپ کوئی باگل انسان ہیں۔“ دوسری جانب کہا گیا ”یا پھر آپ کسی شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارے کمرہ نمبر سو ایک گزشتہ ایک ہفتے سے خالی پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کس جاوید اور بیلا کی بات کر رہے ہیں؟“

میں نے ایک اور پیئر تریڈلا ”میں، آج شام کو میری

لے بہت دشواری کا سامنا ہوتا تھا اور بعض اوقات گا کروانے کے بعد ٹھنوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے مقابلے میں اب وہ سسٹم انتہائی فروسودہ دکھائی دیتا ہے۔ چوتھی تیل پر میری کال ریسپو کر لی گئی۔ میری ہل سے ”ہیلو“ کا مخصوص لفظ ٹکرایا پھر آپریشنر نے اس ہل نام دہرایا۔

میں نے مطمئن ہونے کے بعد بھاری آواز میں کہا سلیمان شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل میں میرا دوست فرید ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا اس سے بات کروادیں۔

”اے دوست کا کمرہ نمبر بتائیں۔“ دوسری جانب سہمی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

وہاں ہماری آمد اور قیام سے منکر ہو رہے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ انہیں ایسا کرنے کے لیے ادنیٰ سطح کے احکام موصول ہوئے ہیں۔“

”میں بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”میاں زاہد میری توقع سے بڑھ کر بارہ سو گز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی خطرناکی سے بچنے کے لیے ہمیں بھونک بھونک کر قدم اٹھانا ہوگا۔“

ساحل نے کہا ”اس خطرناک شخص کے پیچھے ہوئے دو افراد کے ساتھ تم نے جو عالی شان ”سلوک“ کیا ہے وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔“

ساحل کا اشارہ نقلی کا ٹیبل اور بہوئے اے ایس آئی کی جانب تھا۔ موٹے ”اے ایس آئی“ کی لاش ایم آر کیانی روڈ پر بے گور و کفن پڑی تھی۔ اس کے سامنے کی چلائی ہوئی گولی نے موٹے کی ٹھوپڑی میں سوراخ کر دیا تھا جب کہ ہم کا ٹیبل کی وردی والے دبلے پٹے شخص کو زخمی حالت میں وہاں پھوڑا آئے تھے۔

میں نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا ”ساحل! ہم جس شخص کو زندہ پھوڑا آئے ہیں وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔“

”وہ تو فون سے چور چور تھا۔“ وہ سادہ سے انداز میں بولی ”تم نے اس کے چہرے پر اتنے ٹھنڈے برساتے تھے کہ ممکن ہے آئینہ دیکھ کر وہ خود کو پچھاننے سے انکار کر دے۔ وہ بے چارہ ہمارے لیے کیا مصیبت کھڑی کرے گا؟ میرا خیال ہے، وہ تو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں۔“

”تمہارا خیال صدی صدی درست ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تائید کی ”میں نے اس کے جسم کے جوڑ جوڑ کی ایسی خبر گیری کی ہے کہ اسے ”فنف“ ہونے میں ہفتہ دس دن تو ضرور لگیں گے لیکن یاد رکھو، دشمن کو کبھی بھی حقیر اور کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں نے اس نقلی کا ٹیبل کے حوالے سے مصیبت کھڑی کرنے کی جو بات کی ہے اس سے میرا مطلب کچھ اور تھا۔“

”اپنے اس مطلب کی وضاحت بھی کر دو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا ”اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں نے ہمیں ٹیپوٹا ٹیپوٹا ایس میں دیکھا تھا اور یہ بھی کوئی دھکی پھکی بات نہیں کہ ہائی ایس کا قتل اسی ہوٹل سے ہے جہاں سے ہم فرار ہو کر انٹروپرت پہنچے ہیں۔ زندہ بچ رہنے والا وہ نقلی کا ٹیبل اپنے لوگوں کو بتا سکتا ہے کہ

ہم کون سی سواری استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ ہائی ایس کے طفیل انرپورٹ تک راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ساحل نے کہا ”وہ جان! تم خواہ اندیشوں میں گھر رہے ہو۔ یہ بات تو ہول والے بھی جانتے ہیں کہ ہم نے فرار ہونے کے لیے ان کی مخصوص ہائی ایس استعمال کی ہے۔ وہ لوگ یعنی ہمارے دشمن زیادہ سے زیادہ اس وسیلے سے انرپورٹ پہنچ جائیں گے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

ساحل نے اپنی بات کا اختتام ایک اچھوتے سوال پر کیا تھا۔ اس کے سوال نے مجھے ایک نئی راہ بھادی۔ میں نے مسرور لہجے میں کہا ”ساحل! تم قدم قدم پر اپنی ذہانت کو ثابت کرتی رہتی ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنا کہ ہمارے دشمن اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ ہم انرپورٹ تک آئے ہیں۔“

”میں نے تو ایک سامنے کی اور منطقی بات کی ہے۔“ وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی ”اس میں میری ذہانت کہاں جھلکتی ہے!“

میں نے کہا ”تمہاری اس سامنے کی اور سادہ بات سے میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا ہے۔ تم اس لیے بھی ذہین ہو کہ اس وقت تمہاری بات نے ایک محرک کارواں ادا کیا ہے۔“

”میری ذہانت کو ایک طرف رکھو اور مجھے اپنے اچھوتے آئیڈیے کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ چاکلے بے حد سنجیدگی سے بولی۔

میں نے نیچے سروں میں کھکار کر گلا صاف کیا اور اسے بتانے لگا ”جب انرپورٹ کے پار رنگ لٹ میں ہوش کی ٹوہٹا ہائی ایس کڑی پائی جائے گی تو ہمارے دشمن بھی سمجھیں گے کہ ہم کراچی سے باہر کسی دوسرے شہر یا پاکستان سے باہر کسی دوسرے ملک کی جانب پرواز کر گئے ہیں۔ میرا آئیڈیا یہ ہے کہ اب ہم خود کو مکمل طور پر روپوش کر لیں اور درپردہ اپنے دشمنوں پر کاری ضربیں لگاتے رہیں۔ ان کا دھیان کبھی ہماری طرف نہیں جائے گا۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہم کراچی یا پھر پاکستان چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس طرح ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ ہم بالکل نئی شخصیات کی آڑ میں میاں زاہد حسین کے بیٹے پر ہونگ دلتے رہیں گے۔“

میری بات ختم ہونے پر ساحل نے کہا ”وہ جان! تمہارا آئیڈیا نہایت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔ اس قسم کی مہم جوں میں بے پناہ مزہ آئے گا لیکن اس بات کو بھی ذہن میں

رکھو کہ میاں زاہد ایک کائیاں اور چال باز شخص ہے۔ اس شہر میں اثر و نفوذ تو م دیکھ ہی چکے ہو۔ وہ آسائے بات تسلیم نہیں کرے گا کہ ہم کراچی چھوڑ کر کسی اور نکل گئے ہیں۔“

”اگر وہ آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا تو پھر کراچی؟“ میں نے رواداری میں پوچھا۔

وہ بولی ”میاں زاہد ہمارے خروج کی تسلی کے لیے سی ایل ”ضرور چپک کر دے گا۔ قریبی پروازوں پر وہ جان اور ساحل یا پھر جاوید اور بیلا کے نام نہیں ملے ہمارے جانب سے وہ مشکوک ہو جائے گا۔ کراچی سے جانے والی پروازوں کے مسافروں کی ای سی ایل کنٹرول لسٹ) ہمارے منصوبے کا راز عیاں کر دینا ہمارے روپوشی کا بھاندا پھوٹ جائے گا۔“

”تم ایک اہم نکتے کو فراموش کر رہی ہو۔ ہم ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”میاں زاہد ایک پیشہ شخص ہے۔ ایک سینڈ کیٹ کا مقامی باس ہے۔ وہ ایک مربوط نیٹ ورک آپریٹ کر رہا ہے۔ وہ مجرموں کی ذہانت سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ چوہدری نواز کی جانب سے اسے اپنے دو دشمنوں (ساحل + جاوید) سرکوبی کے احکام ملے ہیں۔ ہم نے ہول میں اپنی چھپانے کے لیے (بیلا + جاوید) کے نام استعمال کیے۔ پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ہم مزید فرض ناموں لے کر شرے نکل سکتے ہیں۔“ ایک لمحے کو رک کر ساحل کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات کا

اثر اور کہا ”سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے کرا میاں زاہد کے بندوں کو وہ ڈانری مل گئی ہوگی جس کے لیے اس نے ہمارا چھپا پکڑا ہوا تھا۔ وہ ڈانری ہمارے بعد میاں زاہد کے لیے ہماری اہمیت خوب خود کم ہو جائے گی۔ وہ اس وقت ہماری جانب توجہ دینے کے بجائے بلکہ میں اس ڈانری کو اپنے ولی نعمت ملک نواز علی کی تک کی تک دوں میں لگا ہو گا۔“

ساحل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”وضاحت اور منطق سمجھ میں آ رہی ہے لیکن کوئی ہٹھانے سے قبل ہمیں ایک نمائندگی ضروری کام گا۔“

”کون سا کام؟“ اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ وہ بولی ”ہمیں جلد از جلد اپنے لیے کسی متحد

منصوب ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔ کسی بھی بڑے کام کے لیے ایک فرم قانون میں ضروری ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسا پلٹ فارم ہونا چاہیے جہاں کھڑے ہو کر ہم پر فارم کر سکیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا وہ جان؟“

”جی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا ”تم سمجھتی ہی اس طرح ہو کہ کوئی نہ بھی سمجھتا چاہے تو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

وہ بے چین ہو کر بولی ”اس میں مسکراتے والی کون سی بات ہے۔ میں نے تو ایک انتہائی سنجیدہ معاملے کی طرف تمہاری توجہ دلائی ہے!“

میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے جواب دیا ”ساحل! میں تمہاری سنجیدہ بات پر نہیں بلکہ تمہارے اسٹائل پر بے ساختہ مسکرا رہا ہوں۔“

”کیوں کیا ہوا میرے اسٹائل کو؟“ وہ ابھن زدہ لہجے میں بولی۔

”ہرگز رتے دن کے ساتھ تمہارے اسٹائل بدلتے جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا ”آج کل تم جتنی سمجھو اور دیکھو بوجھ کی باتیں کر رہی ہو اسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی دھن ہو جو بدھ بیل کنڈ کی عبادت گاہ میں بچوں کی طرح انگلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ شوخی اور شرارت تمہارے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دنیا کے کسی غم اور فکر سے تمہیں کوئی علاقہ نہیں تھا پھر میں نے تمہارا منصوبہ بھرا سوگ وار روپ بھی دیکھا ہے۔ جب تم ٹھنڈوں سے ہندوستان آئیں تو تمہاری سادگی اور بے خبری بھی دیکھنے کی چیز تھی۔ اور اب تم جتنی بڑی بڑی اور بروہاری کی باتیں کرنے لگی ہو تمہارا یہ انداز یا روپ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔“

وہ ایک ادا سے بولی ”پہلی بات تو یہ کہ میں اب دھنوں میں رہی ہوں نا لڑکی سے منسوب ہر اسٹائل ختم ہو گیا۔ تم نے میرا نام ساحل رکھ دیا۔ میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھ میں تمہیں جو تبدیلی نظر آ رہی ہے وہ اس نام کا اثر ہے۔ گھمٹا ایسا نہیں کہوں گی!“

اس نے بات روک کر سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے چوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا ”تم ایسا کیوں نہیں کہو۔“

”کیوں کہ میں ایسا نہیں سمجھتی۔“ اس کی سنجیدگی اور مہم کی ہوئی۔

”پھر کیا سمجھتی ہو؟“ میں نے کیرا۔

”یہ سب تمہاری قربت کا اثر ہے وہ جان!“ وہ بے باکی سے بولی۔

میں اس سے کسی ایسے ہی نیچے جواب کی توقع کر رہا تھا لہذا مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور نہ ہی میں سناٹے میں رہ گیا۔ میرے اور ساحل کے درمیان پائی جانے والی رفاقت کا عرصہ بہت مختصر تھا تاہم اس گلیل مدت میں میں اسے اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ بڑی عجیب و غریب لڑکی تھی۔ میری زندگی میں درختوں لڑکیاں آتی تھیں اور آگ بلی کی تھیں۔ ان میں سے اکثر مجھ سے محبت کرتی تھیں اور بعض تو اپنی محبت میں جان کا نذرانہ دے کر امر ہو گئی تھیں۔ تھائی وانگ جاگتی دیوی اوس۔ کون کون سے نام گواؤں!

کہتے ہیں ”دنیا میں جتنے انسان ہیں اتنے ہی محبت کرنے کے انداز بھی ہیں۔ ہر انسان اپنے اسٹائل سے محبت کرتا ہے۔ جن لوگوں کا اسٹائل قدرے پیچیدہ ہوتا ہے ان کی محبت عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسے مشکل پسند محبت کرنے والے اپنے محبوب کو بھی مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ بہر حال، محبت ہر حال میں محبت، دوتی ہے اور جب یہ ہوتی ہے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے یہ سوچ سمجھ کر ذہن سے کیا جانے والا فیصلہ نہیں جس میں کوئی مجرب فارمولا استعمال کر کے ضرب، تقسیم سے اپنے حسب فضا جواب حاصل کیا جاسکے۔ یہ تو دل کی آواز ہے، الوہی جذبہ ہے۔ جس پر کسی کو اختیار نہیں۔ شاید اسی لیے اکثر محبت کرنے والے بے اختیار نظر آتے ہیں!“

ساحل اپنے دل میں میرے لیے جو جذبات رکھتی تھی میں ان سے بہ خوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ بڑے ضبط اور ربط والی لڑکی تھی۔ میں نے اسے عجیب و غریب کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا۔ وہ عام محبت کرنے والوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے اپنے جذبات اور افعال پر کمال کا عبور حاصل تھا۔ اس کے جذبات میں دیوانگی بھی غم غم سے فرازا لگی جھلکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک حیرت انگیز لڑکی تھی!

”کس سوچ میں ڈوب گئے وہ جان؟“ مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔

”اوں۔“ میں چونک گیا پھر بات بتاتے ہوئے کہا ”میں تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں وہی مسئلہ ٹھکانے والی تجویز۔“

اس نے کہا ”ہم اس مقصد کے لیے قاضی سلطان کے صحابی دوست مناس باقر سے مدد لے سکتے ہیں۔ وہ ایک

ملقات در پبلشر ہے۔ یہ کام اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

”پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔“ میں نے کہا ”لیکن اب ارادہ بدل دیا ہے۔“

”ارادہ بدلنے کی وجہ کیا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

میں نے ساحل کو میاں زاہد کی ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو اس نے ہمارے ”انڈین ایجنٹ“ ہونے کے بارے میں کسی نہیں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ راشد منہاس روڈ پر ہونے والی قتل و غارت گری کی واردات کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ اخبارات یہی خبریں شائع کریں گے کہ ”را“ کے تربیت یافتہ ایجنٹوں نے کراچی کا سکون و رہبرم برہم کرنے کے لیے دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ ان ایجنٹوں کے ذکر میں وجدان اور ساحل کا نام بھی آئے گا۔ اس طرح پورا شہر ان ناموں کی جانب متوجہ ہو جائے گا۔ میاں زاہد نے اپنے جاں بہ لب آدمی سے اپنی مرضی کا بیان دلوا کر بہت گری چال چلی تھی۔ ہمارے پاس ایسی کوئی شناخت نہیں تھی جس سے خود کو بے گناہ ثابت کر سکتے۔ اہل شہر ہمیں انڈین ایجنسی ”را“ کا ایجنٹ سمجھنے پر مجبور تھے یا یوں کہہ لیں کہ انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میاں زاہد حسین کے جن تین بندوں نے سفید شیر ڈیڑھ ہمارا تعاقب کیا تھا ان میں سے دو تو موقع پر ہی ”سی ایف کے“ والوں کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے تھے جب کہ تیسرا آدمی جو ڈرامیٹک کر رہا تھا اسے سفید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا اور اس نے اپنے پاس کی زبان بولتے ہوئے پولیس کو بیان دیا تھا کہ ان کی گاڑی پر ”را“ کے تربیت یافتہ ایجنٹ وجدان نے گولیاں برسائی تھیں۔ جھوٹا بیان دینے والا شخص تو جہنم واصل ہوا ہی تھا لیکن جاتے جاتے ہمارے لیے مشکلات کا پہاڑ بکھرا کر گیا تھا۔

راشد منہاس روڈ والا خوشی واقعہ اتنا اہم تھا کہ آج کے تمام اخبارات اس کی خبریں لگاتے۔ ان حالات میں یہ سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ منہاس باقر کا اخبار وہ خبر نہیں چھاپے گا۔ وہ تو ویسے بھی شام کا اخبار تھا۔ ایوانگر اپنی جٹ پٹی، مسالے دار اور مبالغہ آمیز خبروں کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ہماری خبر کو منہاس باقر کا اخبار بتا نہیں، کس بلندی پر اچھاٹا اور ہمیں کس پستی میں گرا۔ اب سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ہم سے پہلے ہی ہماری ”شہرت“ منہاس باقر تک پہنچ جانا تھی لہذا اس طرف رخ پھرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے ساحل کو میاں زاہد حسین سے ہونے والی فونک گفتگو کے پس منظر میں صورت حال کی نزاکت احساس دلایا تو وہ پریشان ہو گئی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔“ وہ سر اسیسہ لہجے میں ”اب تو ہمیں کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔ ابھی تک میرے کے بارے میں بھی کوئی۔“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ میں چونک کر اس کی جانب متوجہ تھا اس لیے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تازہ ترین تاثرات مجھے سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ وہ میرے عقب میں دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے سے تذبذب اظہار ہوتا تھا۔

میں نے فطری رد عمل کے طور پر اس کی نگاہ کے نواز میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو ساحل کے تذبذب کا سہا میں آگیا۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر موجود شخص کو دیکھ میں چونک اٹھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے پہچاننے میں غلطی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔

وہ امتیاز تھا۔ امتیاز علی۔ ”سی ایف اے“ نامی ایک اہم رکن ”گرام فری کراچی“ نامی اس ناقابل تنظیم کو ابھی تک میرے ذہن نے قبول نہیں کیا تھا۔ میں اس نوعیت کے کسی ادارے کے بارے میں پہلے کسی نہ تھا۔

امتیاز کا رخ ہماری میز کی جانب تھا اور اس کے چہرے دوستانہ تاثرات کو بڑی وضاحت سے دیکھا جاسکتا تھا۔

”جگر! کہاں اس نے ہمیں سلام کیا اور مسکرا کر بولا۔“

”جگر! کہاں اس نے ہمیں سلام کیا اور مسکرا کر بولا۔“

آج اس کے طرز خطاب میں کل کی یہ نسبت زیادہ تکلفی پائی جاتی تھی۔ میں نے گول مول جواب دینے پر کہا ”ہم کہاں جاسیں گے دوست۔ بس ذرا کافی پیئے اور آگئے تھے۔“

”کافی پیئے!“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے نیم طرز دوستانہ لہجے میں بولا ”وہ بھی کلفشن سے اتنی دو۔“

ایزپورٹ پر؟“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ ”تم تو اپنے کسی رشتے دار سے ملنے لاہور سے کراچی آئے نا جو کلفشن میں رہتا ہے؟“

میں نے جواب دینے کے بجائے کہا ”یار! کیا کھڑے ہی انٹرویو کرتے رہو گے آرام سے بیٹھ کر۔“

پھر میں نے میز کے گرد پڑی ایک خالی کرسی کی

اشارہ کر دیا۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کرسی کی پیچ کر بیٹھ گیا۔

امتیاز نے نظر پڑنے سے قبل میرے اور ساحل کے درمیان اپنے لیے کسی مضبوط اور محفوظ ٹھکانے کے بارے میں تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ امتیاز کی صورت دیکھتے ہی میرے دماغ میں ایک جگہ ساجک اٹھا۔ بڑی سرعت سے میرے ذہن نے سوچا ”میں ذرا سی کوشش کر کے ”سی ایف کے“ کے درمیان جگہ بنا سکتا ہوں۔ مجھے اس تنظیم کے اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی سروکار۔ میں عارضی طور پر اپنے لیے ”سر چھپانے“ کا کافی ٹھکانا کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے ”سی ایف کے“ میرے لیے بہت ہی مفید اور مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے امتیاز سے ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔

”یار! کانی تو ایک بہانہ ہے۔“ میں نے گھبر انداز میں کہا ”در اصل ہمارے ساتھ ایک ٹریڈی ہو گئی ہے جو ہم تمہیں یہاں نظر آ رہے ہیں۔“

”کیسی ٹریڈی؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”ہم اپنے جس عزیز سے ملنے آئے تھے۔ وہ اتفاق سے گھر نہیں ملا۔ اس لیے ہمیں ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا اور ادھر ہوٹل میں میاں زاہد نے ہمارا عینا حرام کر دیا۔“

وہ ٹھک نہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر تمہارا وہ عزیز گھر میں نہیں ملا تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی نوبت کیوں آئی۔ تم اس کے گھر میں ٹھہر سکتے تھے۔“

”چند ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر ایسا ممکن نہیں تھا۔“ میں نے مبہم سا جواب دیا ”فرصت میں تمہیں تفصیلاً بتاؤں گا۔“

وہ کہنے سے گریز کرتے ہوئے بولا ”یہ میاں زاہد تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے؟“

”شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولا ”اس کا دماغ خراب ہوا ہے یا نہیں لیکن تم میرا دماغ ضرور خراب کر دو گے!“

اس کا انداز دو قسمی تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا ”کیوں میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“

”دیکھو دوست!“ وہ ایک لحظے بے حد سنجیدہ ہو گیا ”سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تو پہلے تمہاری کمائی پر یقین کیا تھا اور نہ ہی اب اعتبار کر رہا ہوں۔ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو یا جو کچھ اپنے بارے میں بتاتے ہو۔ تم بڑے گھرے آدمی ہو

اور میاں زاہد کے لیے تمہاری بہت اہمیت ہے جیسی اس کے بندوں نے ریلوے اسٹیشن سے تمہارا پیچھا کیا اور اب بھی ہوٹل میں وہ تم سے ”دل گلی“ کر چکا ہے جو تم یہاں بیٹھے کافی جیتے نظر آ رہے ہو۔ یقیناً تمہارے درمیان کوئی دیرینہ دشمنی چھل پھول رہی ہے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

آخری جملہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا ”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ میری اصل دشمنی لاہور کے ایک نواحی سرحدی گاؤں موضع ”رکھان دالی“ کے چوہدری ملک نواز علی سے ہے۔ میاں زاہد حسین چوہدری نواز علی کا آلہ کار ہے اور مجھے لاہور جانے سے روکنے کے لیے اسے سخت ترین احکام موصول ہوئے ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے دانستہ سونے کی رازداری ڈائری کا ذکر گول کر دیا تھا۔ امتیاز کھونچنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولا ”اس کا مطلب ہے تم لاہور سے نہیں آئے ہو ورنہ تمہیں لاہور جانے سے روکنے کا جواز نہیں بنتا!“

اس نے بڑی جاندار دلیل دی تھی۔ میں نے کہا ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں لاہور سے نہیں بلکہ انڈیا سے آیا ہوں۔ اور اس سے پہلے سنگاپور سے ہندوستان پہنچا تھا۔“

وہ گھبر انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے قدرے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”چوہدری نواز علی کی اصل دشمنی میرے والد عابد علی سے تھی۔ میرا باپ مجھے بچپن ہی میں سنگاپور لے گیا تھا۔ چوہدری کے آدمیوں نے میرے والدین کو سیری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا اور میں ان قاتلوں کا تعاقب کرتے ہوئے پہلے انڈیا پہنچا اور پھر سراپا انتقام بن کر یہاں آیا ہوں۔ چوہدری نواز علی مجھ سے خاصا دہشت زدہ ہے اور مجھے خود تک پہنچنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم چوہدری نواز علی کے لیے کوئی توپ کشم کی چیز ہو!“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ”میں نے کمانا ذرا فرصت مل جائے تو پھر تمہیں اپنی کمائی سناؤں گا۔“

”میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور دوست بتانا بھی مجھے آتا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”بتاؤ میں فوری طور پر تمہارے لیے کیا کروں؟“

اس کی پیش کش میں مجھے خلوص کی جھلک نظر آئی۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی ہو گا۔ اور وہ امتیاز علی سے بہتر ہی الحال اور بونی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے صاف کوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”مجھے اپنے قیام کے لیے کوئی محفوظ جگہ درکار ہے۔ سروس اتنا ہی ہو جائے تو بہت ہو گا۔“

وہ فراخ دلی سے بولا ”سمجھو تمہارے قیام کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آج تم میرے ساتھ“ میرے فلیٹ پر رہو گے اور کچھ؟“

میں نے ذول سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں نے کہا ”دوست! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”دوست بھی کہتے ہو اور احسان مندی بھی ظاہر کرتے ہو۔“ وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ”امتیاز بیٹھ بے لاگ اور بے لوث دوستی کرتا ہے۔“

”تم جس مشکل وقت میں میرے کام آ رہے ہو میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔“ میں نے اسے زیادہ سے زیادہ اعتماد میں لیتے ہوئے کہا ”ورنہ آج کل کون کسی کا ساتھ دیتا ہے اور وہ بھی کسی انجینی کا۔“

وہ سنجیدی سے بولا ”تم ایک اچھے انسان ہو اس لیے میرے تعاون کا بوجھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہے ہو مگر فکر نہ کرو میں تمہیں یہ بوجھ اتارنے کا بہت جلد موقع دوں گا۔ یعنی آج ہی رات کو!“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“ اس کی مبہم بات کے جواب میں میں نے کہا۔

وہ بات کرنے سے پہلے بولے دل آویز انداز میں مسکرایا اور بولا ”دوست! آج رات تم مجھے اپنی کمائی سناؤ گے۔ بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں۔“

”اوہ!“ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

وہ مذاق کے انداز میں بولا ”تم کیا سمجھتے تھے کہ میں تم سے کوئی ”فائرنگ“ وغیرہ کا کام لینا چاہتا ہوں؟“

”نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”بیاتو میں نے کچھ نہیں سوچا۔“

اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آگیا ہو پھر اس نے پوچھا ”دوست تمہارے دو ساتھی نظر نہیں آ رہے وہ کہاں ہیں؟“

میں جانتا تھا وہ کسی بھی لمحے ہوتا سنگھ اور میر بخش کے

بارے میں سوال کر سکتا تھا۔ لہذا میں نے بڑے رسالہ کا جواب دیا۔

”میر بخش تو تھکنی ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور پوچھا۔“

نزدیکی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میاں زاہد کے آدمیوں سے اغوا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔“

میں دانستہ ہوتا سنگھ کے بجائے صرف ”ہوتا“ کا استعمال کر رہا تھا۔ ہم نے اس جہانی کی شناخت کو بچا کر لیے یہ راہ نکالی تھی۔

”بہت افسوس ہوا تمہارے ساتھی کی موت کا۔“

امتیاز علی نے رنجیدہ لہجے میں کہا پھر پوچھا ”دوسرے ساتھی بخش کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔“

میں نے اسے میر بخش کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں مختصر بتایا۔

وہ میری بات سننے کے بعد اضطرابی لہجے میں ستر ”آپ تینوں کراچی کے کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟“

میں نے ہوٹل کا نام بتایا اور کہا ”یہ ہوٹل صحران علاقے میں واقع ہے۔“

”پھر تینوں یہی کہیں گے کہ تمہارے ساتھی میر بخش زندہ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔“ وہ تمناک انداز میں بولا ”گر وہ اب تک زندہ بھی ہے تو اس سخت اذیت میں ہو گا۔ تم بتا ہی چکے ہو کہ تمہارے ساتھی کو میاں زاہد کے آدمیوں نے ہلاک کر دیا ہے۔“

میں نے جلدی سے پوچھا ”تم میرے ساتھی کی ہر مصیبت کے بارے میں اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟“

ساحل بھی امتیاز کی بات سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ میر بخش کے بارے میں پہلے ہی لاتعداد اندیشوں اور ان خدشات میں گھری ہوئی تھی۔

امتیاز نے گھبرائے لہجے میں کہا ”وہ جدان! تم یہ کیسے خوش قسمت بھی ہو اور بد قسمت بھی مگر تمہاری خوش بد قسمتی پر حاوی ہے۔“

”دوست! پہیلیاں نہ بھجواؤ۔“ میں نے بے قرارہ میں کہا ”جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔“

اس نے کہا ”تم بد قسمت ان معنوں میں ہو کہ ہوٹل میں تم نے قیام کیا، میاں زاہد حسین اس کے داموں میں سے ایک ہے۔ تم اسے ہوٹل کا مالک بھی کہتے ہو۔“

ایک لمحے میں مجھ پر بہت ساری حقیقتیں عیاں ہو

میں سمجھ گیا کہ اس ہوٹل میں میاں زاہد کا اتنا اثر و رسوخ کیوں ہے اور ہوٹل کا عملہ اس کے اشاروں پر کیوں ناکر رہا تھا۔

امتیاز علی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”وہ جدان! خوش قسمت تم اس حوالے سے ہو کہ اس کے چنگل سے زندہ سلامت نکل آئے مہیا تمہاری خوش قسمتی زیادہ طاقت ور نکل آئے۔ تمہارا دوست میر بخش۔“

وہ جلد ادھر اچھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ ساحل نے کہا ”وہ جدان! میں تو تجس کی مرتبہ کہہ چکی ہوں، میر بخش کسی بڑی مشکل میں پھنس چکا ہے۔ لاڈلہ حاسا پر رحم کرے۔“

میر بخش کی سلامتی کے لیے ساحل کی زبان سے بے ساختہ دعائیں نکلت نکلت تھیں۔ امتیاز نے چونک کر ساحل کی جانب دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مجسم سوال کو فوراً پڑھ لیا اور وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میری ساتھی ساحل کا تعلق ”بدھ مت“ سے ہے۔“

”ہندوستان میں تم لوگوں کا ”ساتھ“ ہوا ہو گا! اس کے لیے میں پراسرار سوال تھا۔“

میں نے جواب دیا ”نہیں، یہ کھنڈوسے میری ساتھی بنی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، تم انڈیا سے پہلے نیپال میں تھے؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا ”تمہارے وہ دونوں ساتھی ہوتا اور میر بخش بھی وہیں سے آئے تھے؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا ”ہوتا تو واقعی لاہور سے آیا تھا۔ چوہدری کے بندوں نے اس کی زندگی عذاب کر دی تھی اور وہ اپنی جان بچانے ہوئے کراچی پہنچا تھا البتہ میر بخش عمر کوٹ سے ہمارے ہمراہ ہے۔“

”عمر کوٹ!“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”یہ تو اندرون سندھ کا ایک ضلع ہے۔ تم اس ریگستان میں کیا کرتے پھر رہے تھے؟“

میں نے مختصر اسے غیر قانونی طور پر اپنے بارڈر پار کرنے کا قصہ سنایا۔

”اوہ!“ وہ متاسفانہ انداز میں بولا ”پھر تو تم دونوں کے پاس پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات بھی نہیں ہوں گے؟“

”ہاں کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔“ میں نے بددلی سے کہا پھر اسے میاں زاہد کی چال بازی کے بارے میں بتا دیا کہ وہ کس طرح ہمیں ”را“ کا ایجنٹ ظاہر کر کے اپنے آدمیوں کی ہلاکت کو ہمارے کھاتے میں ڈالنے کا بندوبست کر چکا ہے۔

”علا نکہ اس کے تینوں بندوں کو ہم نے ختم کیا تھا۔“

امتیاز نے کہا۔

میں نے کہا ”تم ج کے اخبارات اس واقعے کی تفصیل شائع کریں گے اور ہمارا باہر نکلتا دشوار ہو جائے گا۔ بیٹھے بٹھائے ہمیں انڈین خفیہ ایجنسی ”را“ کا ایجنٹ بنا دیا گیا ہے۔“

”حالات سراسر تمہاری مخالفت پر کمزور ہیں۔“ امتیاز نے پرتشیش انداز میں کہا ”لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہارے پاسپورٹ اور دیگر ضروری شناختی دستاویزات میں تیار کروا دوں گا۔ تم لوگوں کو بس اپنے ایک اپ اور گیت اب پر ذرا خصوصی دھیان دینا ہو گا۔ تم بھی یاد کرو گے، کس قسم کے دوست سے واسطہ پڑا تھا!“

”واقعی، تم بہت مختلف قسم کے دوست ہو۔“ ساحل نے فکرا انداز میں کہا۔

وہ اپنی رست واپس پر نظر ڈالتے ہوئے بولا ”پانچ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ اب میں دو ڈھائی گھنٹوں کے لیے بہت مصروف ہو جاؤں گا۔ تم لوگ بیس ریستورنٹ میں میرا انتظار کرو گے یا میں تمہیں اپنے فلیٹ کا ایڈریس سمجھا دوں!“

ساحل نے کہا ”میرا خیال ہے، ہم ریستورنٹ میں ہی تمہارا انتظار کر لیتے ہیں۔“

میں نے امتیاز سے پوچھا ”تمہاری مصروفیت کی نوعیت کیا ہے؟“

وہ بولا ”در اصل میں اپنے پاس کے ایک غیر ملکی دوست کو لینے اپروٹ آیا ہوں۔ جہاز کو پونے پانچ بجے میاں پینا تھا مگر وہ آدھا گھنٹا لیٹ ہے۔ اب سو اچانک بجے وہ لینڈ کرے گا۔ میں نیچے جاؤں گا کیوں کہ ”انٹرنیشنل ارا نیول“ کے لیے چلی منزل ہی استعمال ہوتی ہے۔ بالائی منزل ”انٹرنیشنل ڈیپارچ“ کے لیے مخصوص ہے۔ میرے پاس کافی وقت تھا اس لیے ریستورنٹ میں آ بیٹھا اور یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ تم لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کا وہ غیر ملکی دوست کس کنٹری سے آ رہا ہے؟“

”انگلنڈ سے۔“ اس نے بتایا ”میں مہمان کو پاس کے بیگلے پر چھوڑ کر تمہیں لینے آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ جانے سے پہلے کسی الجھن میں نظر آیا پھر کسی فیصلے پر پہنچنے ہی بولا ”یار! تم بھی میاں میرے انتظار میں کیا سوچتے



اتماز کا رویہ کبھی کبھی مجھے کھٹکنے لگتا تھا۔ وہ خود کو جس قسم کی تنظیم کا رکن بیان کر رہا تھا وہاں تو راز کو انتہائی راز

ارایوں لاؤں میں پہنچنا ہو گا۔

آتش فشاں

اس وقت تک ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا۔ ہم دونوں

# مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

## روشنی کے مینار

قیمت 150/- روپے ڈاکٹریج 25/- روپے

## عظمت کے مینار

قیمت 150/- روپے ڈاکٹریج 25/- روپے

## ایمان کا سفر

قیمت 150/- روپے ڈاکٹریج 25/- روپے

## کچرا گھر

قیمت 100/- روپے ڈاکٹریج 25/- روپے

## آدھا چہرہ

قیمت 250/- روپے ڈاکٹریج 25/- روپے

## کالی کسانیاں

قیمت 30/- روپے ڈاکٹریج 23/- روپے

## ہٹ ٹوٹ کی چوہیاں

قیمت 60/- روپے ڈاکٹریج 23/- روپے

500/- روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاکٹر کیج معاف  
بے عیادت پیشگی سی آر ڈاکٹر سال کرنے پر بھی جعلی نہیں  
کتابیات پبلیکیشنز  
فون: 3325541  
74206 (کراچی)  
Email: kishaninf@vsnl.net

یہ دو قرن قیاس تھی۔ میں قدرے مطمئن ہو گیا۔  
اسی وقت آغاز نے دواڑے کی جانب اشارہ کرتے  
ہوئے کہا "ہمارے سامان آگئے۔"

میں نے اس کے اشارے کی تقلید میں اس مقام کو  
میں نے اس کے اشارے ایک کر کے باہر آ رہے تھے ہم  
دیکھا جہاں سے مسافر ایک ایک کر کے باہر آ رہے تھے ہم  
رنگ کا سارا اچھے دس بارہ تھوڑے دور کھڑے تھے۔

انگریز مہمان نکل آ کر مرد کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھے  
پوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے بھی اسے کبھی دیکھ چکا ہوں۔  
جلدی مجھے یاد آ گیا کہ میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں۔ میں  
نیل آ کر مرد کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور میرے ان محسوسات کا  
بب یہ تھا کہ وہ ہلا دوڑ کے فلم اشارہ مائیکل ڈوگل سے گری  
مشابہت رکھتا تھا۔ میں نے سنا کہ پور اور تھا نی لینڈ میں مائیکل  
ڈوگل کی چند فلمیں دیکھی تھیں۔ نیل آ کر میری عمر لگ بھگ  
چھ سال رہی ہوگی جب کہ مائیکل ڈوگل اس وقت اس سے  
خاص کم عمر تھا۔ بس ان میں عمری کا فرق تھا ورنہ صحت اور  
فل و شہادت میں ان میں کای تفاوت ہو گا۔

نیل آ کر میرے ساتھ اس کی سیکرٹری بھی قدم سے قدم  
لا کر چل رہی تھی۔ اس نے فل اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا  
تھا۔ کپالے پائل شاؤن پر لہرا رہے تھے۔ اس کی ہائٹ کسی بھی  
یورپین انڈسٹری سے کم نہیں رہی ہوگی۔ پاؤں میں موجود ہینسل  
میل سینڈل "کھٹ کھٹ" کی مخصوص آواز پیدا کر رہی تھی۔  
اس نے بڑی مہارت سے اس کے کلر لیکنگ کا استعمال کر  
رکھا تھا۔ اس کی چال زانی، ڈھال متوالی اور انداز میں بے  
تناہی لگتی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک حسین و جمیل عورت تھی۔

انگریز سے خاص طور پر عورتیں عموماً خوبصورت ہی ہوتی  
ہیں۔ کسی بد صورت یا کم صورت عورت کو ڈھونڈنے کے لیے  
خاص محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاہم ہمارے پاکستانی بھائی  
جو یورپ کی فرنگٹوں سے شادی کرتے ہیں "وہ اس تلاش  
اور جستجو میں بڑے ماہر اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں!"

اقباز نے دھڑے سے سرگوشی کی "بھگ! تم فوراً ہائی  
رواف میں پہنچو۔ میں مہمانوں کو لے کر رہا ہوں۔"  
پھر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے نیل آ کر اور اس کی سیکرٹری  
کی جانب بڑھ گیا جو اب خامسے قریب آ چکے تھے میں  
خاموشی سے وہاں سے کھٹک لیا۔

\*\*\*

گزشتہ رات ساحل نے تھوڑی بہت نیند لی تھی مگر  
میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ پہلے میں ڈائری  
کے مطالعے میں غرق رہا۔ دوسرے فرصت ملی تو میاں زاہد

پوچھا۔ اس نے مجھے دوست یا یار کے بجائے اسے  
"بھگ! کتنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اس انداز میں  
سادگی اور اپنائیت تھی۔

میں نے کہا "پورے اخبار میں کہیں اس ہوٹل کا  
ہے اور نہ ہی وہاں ہونے والی مارا ماری کا تذکرہ جہاں ہم  
ٹھہرے تھے۔"

اقباز نے کہا "اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظریے اس کی جانب دیکھنے پر اکتفا کر  
وہ بولا "پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میاں زاہد  
اس ہوٹل کا ایک پارٹنر ہے اس لیے ممکن ہے اس  
اپنے ہوٹل کو اس معاملے میں لوٹ کرنے کو مناسب نہ  
ہو۔ وہ میاں پر تہنار اور ضمن اول ہے۔ وہ اپنے اسٹائل میں  
سے نمٹنا چاہتا ہو گا۔"

میں نے جہت سے اقباز کو دیکھا اور کہا "کیا بات  
رہے دوست! ہوٹل والا واقعہ اور اس کے بعد ایم آر  
روڈ پر جو کچھ پیش آیا وہ جیسے بچپانے والے معاملات  
ہیں۔ تمہاری وضاحت سے تو لگتا ہے "میاں کے اخبار  
میاں زاہد کے اشاروں پر خبریں شائع کرتے ہیں۔ کیا پانچ  
میں پریس آزاد نہیں؟"

وہ زیر لب مسکرایا اور گھمبیر آواز میں بولا "میل  
پریس اور میڈیا کتنا آزاد ہے یہ تو تمہیں رفتہ رفتہ  
چل جائے گا لیکن میں نے اخبارات میں "ہوٹل والے واقعہ"  
کی خبر کی غیر موجودگی کے سلسلے میں جو بھی وضاحت کی ہے  
کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ واقعی یہ سب کچھ میاں  
کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ میں نے تو ایک امکان کا اظہار  
ہے۔ بہر حال "میاں کا میڈیا اور اخبارات مختلف قسم کے  
کافکار تو رہتے ہیں۔"

اس نے گول مول جواب دے کر بات بھٹکائے  
کوشش کی تھی۔ میں نے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا  
پوچھا "اقباز! ایک وجہ تو تم نے بتادی۔ اب دوسری  
بیان کرو۔ تم نے کہا تھا "ہوٹل والے واقعے کے غیاب  
وجوہ ہو سکتی ہیں!"

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا "دوسرا"

وجہ میرے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ وہ واقعہ  
ساڑھے تین چار بجے پیش آیا ہے پریس تک یہ خبر پہنچنے  
مزید دیر ہو گئی ہوگی۔ اس لیے صبح کے اخبارات میں  
ہونے سے رہ گیا ہو گا۔ ممکن ہے "شام کے اخبارات  
حوالے سے خبریں لگائیں۔"

اپنے اپنے اخبارات کو دیکھنے لگے۔ میری نظر اخبار میں کل  
والی واردات کو تلاش کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میری  
کوشش پلاؤر ہو گئی۔ اس دوران میں اقباز بھی مذکورہ خبر  
ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ ہم نے باری باری دونوں  
اخبارات کی خبروں کا جائزہ لیا۔ کم و بیش ایک جیسی کوریج  
تھی تاہم زبان اور پیش کش کا انداز مختلف تھا۔ گولیوں سے  
چھلنی سفید شیر ذکی تصویر دونوں اخبارات میں ایک ہی جیسی  
تھی۔

میاں زاہد حسین کا کہنا اخبارات کی ذہنت بن گیا تھا۔  
اس خبر کا لب لباب یہ تھا۔ بدنام زمانہ انڈین خفیہ ایجنسی  
"را" کے دو تربیت یافتہ ایجنٹ کراچی کا امن و امان و رہم  
برہم کرنے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل  
ہو چکے ہیں۔ خفیہ اور باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ان  
خطرناک لوگوں میں ایک وجہ ان نامی مروجے اور دوسری اس  
کی ساتھی ساحل ہے۔ وہ دونوں مارشل آرٹس کے ماہر اور  
ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے پر قدرت رکھتے ہیں "وہ کل صبح  
اندرون سندھ سے کراچی پہنچے اور پہلی واردات انہوں نے  
راشد منہاس روڈ پر کی جہاں تین بے گناہ شہریوں کو گولیوں  
سے چھلنی کر کے وہ فرار ہو گئے۔ پولیس بڑی سرگرمی سے  
انہیں تلاش کر رہی ہے۔ آخر میں ہمارے حلیوں کی کچھ  
تفصیل بیان کی گئی تھی اور شہریوں سے بڑھو راجیل بھی کی گئی  
تھی کہ وہ اگر اس ملے کسی مروجہ عورت کو کہیں دیکھیں تو  
فوراً ایمر جنسی نمبر پر پولیس کو اطلاع دیں۔ اہل شہر کا حوصلہ  
بڑھانے کے لیے یہ تسلی بھی دی گئی تھی کہ وہ "را" کے  
ایجنٹوں سے ہرگز نہ ڈریں اور انہیں قانون کے حوالے  
کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ اور پولیس سے بھرپور تعاون  
کریں۔

اقباز نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "بھگ! تم دونوں  
کے لیے صورت حال خاصی تشویش ناک ہو گئی ہے۔ اب  
تمہیں یوں حکم کھلا ہا ہر نہیں پھرنا چاہیے۔ میں آج ہی  
تمہارے گھٹ آپ اور میک آپ کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔  
تم دونوں کے حلیوں کی تفصیل چھپنے کے بعد یہ بہت ضروری  
ہو گیا ہے۔"

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور الجھن زدہ لہجے  
میں کہا "یہ تو ہو جائے گا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ  
رہی۔" "ایسا کہتے ہوئے میں اخبار کے اندرونی صفحات میں  
بھی جھانک رہا تھا۔  
"تم کسی بات پر الجھ رہے ہو بھگ! اقباز نے چونک کر

کے ٹیلی فون نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد بے درے ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ میں سوئے یا آرام کرنے کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، دشمنوں سے ہلکی چٹکی ”انکھیلیوں“ میں رات کا باقی حصہ بھی بیت گیا۔ ان حالات میں سکون اور آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایئر پورٹ سے نکل کر منزل تک پہنچنے کے دوران میں آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت تھی لہذا میں نیند سے باز رہا۔ حالانکہ اس وقت دل تو یوں چاہ رہا تھا، پر کر لیا سوجاؤں اور دو چار دن کے بعد ہی انھوں مگر یہ ممکن تھا اور نہ ہی مناسب۔ اس لیے میں نے اس خیال کو ذہن سے اور خواہش کو دل سے باہر نکل بیٹھا۔

ہائی روف میں موجود اشتیاق احمد خاصا الارٹ بیٹھا تھا وہ اپنی عقلمانی نگاہ سے باہر کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ایک ”کے“ کے تیار حالت میں اس کے دامیں ہاتھ پر پڑی تھی جسے وہ آن واحد میں استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ ڈائریور باہر خان بڑی مشاطی سے ہائی روف کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ غیر ملکی مہمان ہم سے بائچ چھوٹ آگے ایک چھتائی نیوی بلو ہونڈا اکارڈ میں منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ سب خیریت گزری اور ہمارا ہی سفر فیض سوسائٹی کے ایک بنگلے پر ختم ہوا۔ اس عالی شان رہائشی علاقے میں آکر دونوں گاڑیوں میں درمیانی فاصلہ قدرے بڑھ گیا تھا اور جب امتیاز نے ہونڈا اکارڈ کو ایک ذی شان بنگلے کے سامنے روکا تو باہر خان ہائی روف کو اسی اسٹریٹ پر تھوڑا آگے لے گیا اور پھر گاڑی کو ایک جانب روک دیا۔ اس کی خطا نظر بنگلے کے گیٹ پر پکی ہوئی تھی۔

میں نے لب کشائی کی اور اشتیاق سے پوچھا ”بھائی! کیا ہم بنگلے کے اندر نہیں جائیں گے؟“ اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کوئی جواب نہ دینا چاہتا ہو تاہم اس نے سنجیدگی سے کہا ”تمہارے ہر سوال کا جواب امتیاز ہی دے گا۔“

”تو تو تار دو۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا ”ہونڈا اکارڈ جس بنگلے میں داخل ہوئی ہے، کیا تم لوگوں کا پاس یہیں رہتا ہے؟“

اس وقت تک نیوی بلو اکارڈ کو وہ بنگلے کے اندر غائب ہو چکی تھی۔ اشتیاق نے خطا لیجے میں کہا ”یہ بھی تم امتیاز ہی سے پوچھنا۔“

اس کے بعد مزید کسی سوال کی گنجائش باقی نہ تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اشتیاق دانستہ ہم سے فری ہونے کو شش نہیں کر رہا۔ پانچ منٹ کے بعد اسی بنگلے پر مجھے امتیاز کی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک سیل گارڈ بھی تھا۔ امتیاز نے ہماری جانب دیکھ کر ہاتھ اشارہ کیا۔ باہر خان نے بڑی سرعت سے گاڑی کو روک دیا اور بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ ہائی روف بنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑی رہی، میں نے اشتیاق کو ہائی روف سے گراہ وہ خاصا پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے کچھ دیر نہ لگی کہ وہ تحفظ کے خیال سے اور کسی متوقع خطر سے بچ جانے کے لیے بنگلے سے باہر رہا تھا۔ ہائی روف بنگلے اندر داخل ہو کر رک گئی تو امتیاز نے ہمیں گاڑی سے آنے کا اشارہ کیا۔

سب سے پہلے اشتیاق اور اس کے بعد میں اور ہائی روف سے باہر آگئے۔ سیل گارڈ امتیاز کی ہدایت پر ایک ایسے کمرے میں لے آیا جسے سرونٹ کو راز رکھنا کی بات تھی۔ ہم وہاں لگ بھگ آدھا گھنٹا رہے۔ دورانہ میں چائے پانی سے ہماری تواضع کی گئی پھر امتیاز اپنے ساتھ لے کر بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ کی ڈرائیوری میں سفر کر رہے تھے۔

دو چار اسٹریٹ سے گھومنے کے بعد وہ مین روڈ پر مجھے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”بھگ! تمہیں اشتیاق مگر میری بھی مجبوری ہے۔ مہمانوں کے لیے ان انتظامات کرنا تھا اب میں تم لوگوں کو اپنے فلیٹ پر واپس اسی مصروفیت میں لگ جاؤں گا۔ رات میں نشست کریں گے پھر اطمینان کے ساتھ تم بات بات میں نے اشتیاق سے پوچھا ہوا سوال امتیاز نے ”یار! جس بنگلے میں تم نے غیر ملکی مہمانوں کو پھانسل دیا، تمہارا پاس بھی وہیں رہتا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی ”وہ بنگلہ مہمانوں کے قیام کے لیے استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی بی بی مہمانوں کے قیام کے لیے خاطر داری دیکھ جاؤ۔ حفاظت کے لیے وہاں نصف درجن ملازم ہیں۔ ایک گارڈ کی جھلک تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔“

انتہائی عمل تھا، اس میں میری کسی کوشش کو دخل نہ تھا۔ اس وقت ہم کورنگی روڈ سے گزر رہے تھے اور ہمارا رخ گورا قبرستان کی جانب تھا۔ اس روڈ کو پینٹل ہائی وے بھی کہا جاتا ہے۔ امتیاز نے نہایت سنجیدہ اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”بھگ! اب میں تمہیں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں اسے دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔“

”میں ہم تن گوش ہو گیا۔ اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”میں طارق روڈ کے سنٹرل کمرشل ایریا میں رہتا ہوں۔ میرا فلیٹ ایک عمارت کے سینکڑے فلور پر ہے۔ ہمیں وہاں قیام کے دوران میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔“

ایک لمحے کو وہ خاموش ہو گاڑی کو گورا قبرستان سے واپس جانب موڑا اور کہا ”بلڈنگ کے لوگ میرے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ میں اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ وہاں رہتا ہوں۔ وہ روزانہ ہمیں آتے جاتے بھی دیکھتے ہیں۔ تم دونوں میرے رشتے دادوں کی حیثیت سے وہاں قیام کرو گے۔“

”اور تمہاری بیوی اور چھوٹا بھائی؟“ ساحل نے پوچھا۔

”وہ بھی وہیں رہیں گے۔“ امتیاز نے کہا ”دراصل اس فلیٹ میں ہماری تنظیم ہی کی ایک رکن رونی ٹائی لڑکی اور اشتیاق احمد میری بیوی اور چھوٹے بھائی کی حیثیت میں رہتے ہیں۔ سب لوگ ہمیں ایک فمیلی سمجھتے ہیں۔“

”جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے! میں نے کہا۔ وہ بولا ”کسی حد تک کہہ سکتے ہو۔ ایک طرح سے ہم لوگوں کو جو اثر دے رہے ہیں اس میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ ہم تینوں ایک ہی تنظیم سے منسلک ہیں، ہمارے اغراض و مقاصد بھی یکساں ہیں۔ اس نائنے سے ہم تینوں ”فمیلی ممبرز“ ہی تو ہوتے البتہ“ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”ہم آپس میں جو رشتے داری ظاہر کر رہے ہیں اس میں حقیقت کا کوئی دخل نہیں اور یہ ہماری مجبوری ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو فوراً لوگوں کی نظروں میں ٹھکنے لگیں گے۔ تم خالص سمجھ دار آدمی ہو، میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے!“

”چلو! مان لیا تم جو کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے اور جو کہہ رہے ہو وہ تمہارے معاملات کا تقاضا ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن یہ تو تار دو، ہم سے تمہاری کیا ”رشتے داری“ ہو گی۔ اس بات کا تعین کرنا بھی بہت ضروری ہے۔“

”میں یہ تعین کر چکا ہوں۔“ وہ گاڑی کو بائیں جانب

سندھی مسلم سوسائٹی کی طرف موڑتے ہوئے بولا ”بھگ! تم رونی کے بھائی ہو اور تمہاری ساتھی ساحل رونی کی بھابی ہے۔ تم دونوں لاہور سے کراچی آئے ہو۔ کچھ عرصہ ہمارے پاس ٹھہرو گے، خوب سیر پائے کر گے اور واپس چلے جاؤ گے۔ تم کراچی دیکھنے ہی آئے ہو۔ میں رونی کو بھی تازہ ترین ”رشتے داروں“ کے بارے میں سمجھا دوں گا، تم لوگ بھی خیال رکھنا۔ اگر انٹوس پڑوس والے کسی شخص سے تم لوگوں کی براہ راست بات ہو جائے اور وہ تمہارے بارے میں کچھ پوچھ پیچھے تو تم اسی ”یہ شک“ کی روشنی میں جواب دو گے جو میں نے طے کی ہے۔“

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا ”دوست! تم نے ہمارے سارے رشتے رونی ہی سے جوڑ ڈالے ہیں۔ خود کو بڑی صفائی سے بچایا ہے۔“

وہ گاڑی کو مین طارق روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا ”عورت سے جڑے ہوئے رشتے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔“ پھر اس نے ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

ساحل نے اس کی بات کی تائید کر دی ”امتیاز! میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔“

وہ دوبارہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”بھگ! رونی سے تمہاری رشتے داری جوڑنے کی ایک اور بھی خاص الخاص وجہ ہے۔“

”کیسی کیا وجہ ہو سکتی ہے امتیاز؟“ میرے لیے میں حیرت تھی۔

وہ سنجیدہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”دراصل رونی کا تعلق بھی لاہور ہی سے ہے۔ حالات اور گردش وقت اسے لاہور سے کراچی لے آئی پھر ایک اتفاق نے اسے ہماری تنظیم میں شامل کر دیا۔ تم بھی چوں کہ بنیادی طور پر لاہور ہی سے تعلق رکھتے ہو اس لیے میں نے تمہیں رونی کا بھائی بنا دیا ہے۔ اب ان رشتوں کا مول ادا کرنا تم دونوں کی ذمہ داری ہے۔“

ساحل نے کہا ”وہ جان! تم اس رشتے داری کو دوسرے رخ سے بھی تو دیکھو۔“

”دوسرا رخ تم ہی دکھا دو۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

وہ بولی ”ہم دونوں بالواسطہ اور بالواسطہ رونی اور امتیاز کے رشتے دار ہیں۔ بھئی جب تم رونی کے بھائی ہو تو پھر امتیاز کے سالے ہوئے۔ اور سالے کی بیوی یعنی میں امتیاز کی بھی بھابی ہی ہوں گی نا!“

آلا کار ہو۔ اس نوعیت کی خطیں اپنے رازوں کی حفاظت کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور ان کا طریقہ کار نہایت ہی سیکرٹ ہوتا ہے مگر ہمارے ساتھ تمہارے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم انتہائی بے احتیاطی اور غیر ذمے داری کا ثبوت دے رہے ہو۔“

میں ایک لمحے کو سانس لینے کو رکا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”تم لوگوں نے کل دوسرا شہد منہاس روڈ پر میاں زائد کے تین بندوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ہم اس واردات کے معنی شاید تھے تم نے ہمیں قہم کرنے کے بجائے اپنے ساتھ ہالی روف میں بٹھالیا اور نہایت شرافت کے ساتھ ہمارا آباد کے چوراہے پر اتار کر آگے بڑھ گئے۔ یہ دوسرا قابل یقین ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوران سفر میں تم نے اپنی تنظیم کے حوالے سے ہمیں خاصی معلومات بھی فراہم کیں۔“

وہ زبردست مسکراتے ہوئے اپنے سر کو ہلکی ہلکی اِشاقی جنبش دیتا رہا تاہم اس کے لب خاموش رہے شاید وہ میری بات مہمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے بات کو آگے بڑھایا ”اور آج علی الصبح سے تم ہمارے ساتھ جس طرح پیش آ رہے ہو وہ مزید حیرت میں

”خالصاً وہ سوال تم سے ہی متعلق ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جاتے ہوئے کہا۔

وہ خنجر کی سی بولا ”پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا ”اختیار اہماری ملاقات کو ابھی چوبیس گھنٹے میں نہیں گزرے۔ گزشتہ روز دوسرے کے وقت ہم پہلی مرتبہ بھی اس قلیل مدت میں ایک دوسرے کو جان لینا اور لے لے تھے اس قلیل مدت میں ایک دوسرے کو جان لینا اور دوسرے پر بلائیں فیتھ کرنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

میں نے ذرا توقف کر کے سوالیہ نظریں اسے دیکھا۔ وہ بولا ”ارواحیات کرو جو جگہ اپنے فیتھ کی بات کر رہے ہو یا میرے فیتھ کی؟“

”خاص طور پر تمہارے فیتھ کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”میرا فیتھ تو تمہارے فیتھ سے مشروط ہے۔“

وہ ایک لمحے کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”میرے فیتھ کے بارے میں کیا جانتا چاہتے ہو؟“

میں نے مختصر اور جامع الفاظ میں اسے بتایا ”دوست! تم انتہائی قدامت کی حامل ایک خفیہ تنظیم ”سی ایف کے“ کے

میں بھی رات گئے بھی اور علی الصبح بھی۔“ وہ تھوڑا سا کرنے کے بعد بولا ”تم لوگ بالکل بے فکری سے یہاں روٹی کے آنے سے پہلے اگر کوئی ٹاک کرے تو تم اس حسب ضرورت نمٹ لینا۔ ساری باتیں تو ہم نے کر لی ہیں۔ دوسرے کے بعد تو روٹی سب منیضال ہی لے گی۔“ وہ جانے لگا تو میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا ”یہاں فون تو ہو گا؟“

”ہاں! ہاں۔ فون موجود ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”ادھر دوسرے بیڈ روم میں رکھا ہے۔ کوئی نہ لے آؤں۔“ پھر اس نے ذرا توقف کر کے مجھ سے سوال کیا ”تم کسی کو فون کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں! چند دوستوں سے رابطہ کروں گا۔“ میں جواب دیا ”کیا تمہارے فون سے سنگا پور کال ہو سکتی ہے؟“ ”براہ راست تو یہ ممکن نہیں۔“ اس نے جواب ”سنگا پور بات کرنے کے لیے ہمیں کال بک کروانا ہوگی۔ کوئی بات نہیں، تم یہ فون استعمال کر سکتے ہو۔“

پھر اس نے یہی فون سیٹ ہمارے کمرے میں لا کر دیا اور انٹر نیٹ کال بک کروانے کے لیے ایس پیج کا کواڈ تپانے کے بعد بولا ”اب میں چلوں گا۔ تم لوگ آرام کرو اگر کو تو دروازے کو باہر سے لاک کر جاؤ۔ روٹی کے اپنی چالی موجود ہے۔ وہ جب آئے گی تو لاک کھول لے گی۔ میں نے کہا ”نہیں، تم دروازے کو باہر سے منسلک کرو۔ میں اندر سے بولٹ کر لیتا ہوں۔ روٹی کے آنے کے دروازہ کھول دوں گا۔ اگر تم باہر لاک لگائے تو پھر ہم ہنگامی صورت حال میں اندر سے دروازہ نہیں کھول سکتے۔ یہ رسک لینا ٹھیک نہیں۔ کسی وقت بھی کوئی حادثہ آ سکتا ہے، کوئی ٹریل شوٹنگ ہو سکتی ہے۔ گھر کے اچانک آگ بھڑک سکتی ہے۔ اس قسم کے حالات ہمارے لیے جانے فرار رہنا چاہیے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجہ ان۔“ وہ نامیہ انداز میں بولا ”احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں چاہیے۔“

پھر وہ جانے کے لیے دروازے کی جانب قدم بڑھا۔ تو میں نے کہا ”اختیار! تمہارے ساتھ تفصیلی میٹنگ تو رات ہو گی لیکن ایک سوال نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا ہے۔ اگر سرمدست اس کا جواب مل جائے تو مجھے اطمینان

جائے گا۔“

”کیا سوال کا تعلق مجھ سے ہے؟“

اس نے الفاظ ”سالے کی بیوی“ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیے تھے۔ میں اس کی شرارت کو سمجھ گیا اور ذمہ معنی لے کر میں ”کما“ تمہارے خوب مزے آ رہے ہیں ساحل!“

اختیار نے ایک گلی میں گاڑی روکنے ہوئے کہا ”ایک چھوٹا سا کام تم لوگوں کو خود بھی کرنا ہے۔“

ہم دونوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”جس سرکاری سے تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ تم دونوں فی الفور اپنے طے اور شخصیت و حیثیت میں تبدیلی پیدا کرو۔۔۔۔۔ میں آج رات تک اس کا انتظام کروں گا۔ بس تم لوگ اپنی نئی شخصیت کے لیے نئے ناموں کا انتخاب کرو۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے، یہ کام شام سے پہلے ہو جائے گا۔“

ہم گاڑی سے باہر آ گئے اختیار نے گاڑی کو لاک کیا اور ہم اس کی تقلید میں ایک چار منزلہ عمارت کے زینے چڑھنے لگے اختیار نے تو تباہی چکا تھا کہ اس کا فلیٹ اس عمارت کے سیکنڈ فلور پر تھا۔ اس عمارت کے ہر فلور پر صرف دو دو فلیٹ تھے، آٹھ سائے بے ہوئے اختیار نے سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ کے سامنے رک کر جب نولتے ہوئے کہا۔

”اس وقت فلیٹ میں کوئی بھی نہیں، روٹی دوسرے کے بعد آئے گی۔ لوگوں کی معلومات کے مطابق وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے یہاں کے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ تم لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے روٹی کو فون کر کے تم دونوں کے بارے میں مختصر بتا دیا ہے۔ وہ جب دوپہرے واپس آئے گی تو تمہیں تھانی کا احساس نہیں ہونے دے گی۔“

اس کے بعد اختیار نے جب سے فلیٹ کی چابی برآمد کی اور اگلے ہی لمحے ہم تینوں اس فلیٹ کے اندر تھے۔ دو بیڈ روم، ایک ڈارنگ روم اور کشادہ لاؤنج پر مشتمل وہ ایک صاف ستھرا اور فرشتہ فلیٹ تھا۔ وہاں موجود ہر شے معیاری اور سلیقے کی تھی۔

اختیار نے ایک بیڈ روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تم دونوں فی الحال اس کمرے پر قبضہ کرو، فاسٹل سینٹک رات میں کریں گے۔“

”تم کب تک واپس آؤ گے؟“ میں نے اختیار سے سوال کیا۔

”اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جگر!“ وہ چھت کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں شام میں بھی آ سکتا ہوں رات

# طالبوت

③ حصوں میں (مکمل)

قیمت فی حصہ 50 روپے

ایک خرچ فی حصہ 20 روپے

کتابیات ملک

7420000

Kitabiat1970@yahoo.com

ڈالنے والی بات ہے۔ تم نے ہمیں اپنے پاس اور اس کے انگریز مہمانوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا پھر وہ بخلا بھی دکھایا۔ جہاں نیل آرمز اور اس کی سیکریٹری قیام کریں گے اور اب ہمیں اپنے فلیٹ پر لے آئے ہو۔ کیا کسی اجنبی پر اتنی جلدی اور اس قدر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اور انجینی بھی ایسے لوگ جن کے پیچھے دشمن لٹھ لے کر دوڑ رہے ہوں اور انہیں خطرناک انڈین ایجنٹ اور دہشت گرد گردانا جا رہا ہو۔ میری اس ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لیے تمہارے پاس کیا جواب ہے امتیاز؟

وہ چند لمحے مجھے گہری نظر سے دیکھ رہا پھر گہیر آوازیں اس نے استفسار کیا "تم نے کبھی پہلی نظری محبت کے بارے میں سنا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "وہی نا۔ جس کے بارے میں کچھ اس قسم کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا!"

"بالکل بالکل۔" اس نے بڑ زور تاکید کی پھر بولا "جس طرح پہلی نظری محبت ہوتی ہے، اسی طرح پہلی نظری دوستی بھی ہوتی ہے جگر!"

میں نے اور ساحل نے حیرت آمیز نظروں سے اسے دیکھا، وہ مجھ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا "وجدان! میں نے کل ریلوے اسٹیشن پر تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا، میرے دل نے تمہیں پسند کیا، اور دماغ نے دوستی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ سراسر ایک بے اختیاری عمل ہے۔"

"لیکن۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بولنے سے منع کر دیا اور کہا "میں جانتا ہوں اب تم پھر 'سی ایف کے' کے حوالے سے کوئی سوال کرنے والے ہو۔ وجدان! میں تمہیں اپنی تنظیم کے مقاصد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ ہم ظالم کا ہاتھ توڑتے ہیں اور مظلوم کو انصاف مہیا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر میں تمہاری مدد کر رہا ہوں تو درحقیقت میں اپنے تنظیمی فرائض نبھا رہا ہوں۔ تم سے میری دوستی ایک الگ چیز ہے اور 'سی ایف کے' کے معاملات بالکل الگ ہیں۔ میں 'سی ایف کے' کے پلیٹ فارم سے تمہاری مدد تو کرتا رہوں گا مگر کبھی تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تم ہماری تنظیم کے لیے کام بھی کرو۔ میری دوستی صرف اور صرف تم سے ہے جو ہر قسم کے مفاد سے بالا تر اور جداگانہ ہے، تمہیں کروا دینا کہو!"

اس کے لفظوں سے سچائی اور سچے سے خلوص پکٹا تھا۔

میں نے اس وقت امتیاز کی آنکھوں میں سے لوث لوث جذبات اٹھتے دیکھے اور بے اختیار آگے بڑھ کر اسے لگا لیا۔

چند لمحات تک ہم دونوں بغل گیری کی حالت خاموش کھڑے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے پھر امتیاز میرے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے جکڑتے ہوئے جذبات سے مفلوب آواز میں کہا۔

"وجدان! میں نے تم سے دوستی کا دعویٰ کیا ہے۔ قدم پر اسے بھانے کی کوشش بھی کروں گا۔ تم کو کچھ اپنے قول و فعل میں اتنا راست ہوں۔"

میں نے کہا "میں نے بھی دوست مان کر تمہیں گے۔ تم وجدان کی دوستی کو کبھی خاموش نہیں کر سکو گے۔ وہ میرا عقیدہ ہے میں بولا "انشاء اللہ ہماری یہ دوستی ثابت ہوگی۔"

"امتیاز! میری ساری زندگی دشمنوں سے نبرد آزما رہی ہے۔" میں نے کہا "میں نے بھی ہمیشہ کمزور کی ہے اور طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے جتنے چوائے ہیں۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا کہ ہر ریکارڈ پر کتنے بڑے بڑے خونی معرکے درج ہیں۔ میں اپنے روز و شب حق کی سرپرستی اور باطل کی سرکوبی کیے ہیں۔ تم اسے "رائٹ اینڈ رائٹ" کی جنگ بھی کہو۔"

"ہماری تنظیم بھی کچھ اسی قسم کی جنگ لڑ رہی ہے امتیاز نے کہا۔

"ہاں اب مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔"

"فرد رفتہ تمہارا یہ اندازہ یقین میں بدل جائے وجدان!" اس نے کہا۔

میں نے پُر سوچ انداز میں کہا "امتیاز! بالکل جب تم مجھے اپنی تنظیم سے متعارف کرایا تھا تو مجھے یہ سب سنا عجیب سا لگا تھا اور میں نے 'سی ایف کے' کے حوالے بعض تنقیدی اور طوطیہ جملے بھی کہہ ڈالے تھے۔ دراصل اس قسم کی تنظیم کا سڑک میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا اس بھی مجھے ہضم نہیں ہو سکا تھا حالانکہ میں بھی کرشن کی سے وہی کچھ کرتا آ رہا ہوں جو تمہاری تنظیم کے ساتھ ہیں۔"

"یہ غیر سرکاری انصاف ہے وجدان!" امتیاز نے ہماری نیت صاف ہے "اور کہتے ہیں نیت صاف ہو تو آسان ہو جاتی ہے۔ ہم ایک نیک کام کر رہے ہیں اسی

قدرت بھی ہماری مدد کرتی ہے۔"

نہ نے کہا "امتیاز! تمہاری 'سی ایف کے' کا مشن میں نے سمجھ لیا تھا ہے۔ اگر میں نے تم لوگوں کے میرے عزائم سے کچھ بھی محسوس کی اور تمہارے کام نے مجھے طرفت کار میں بھی محسوس کی اور تمہارے کام نے مجھے متاثر کیا تو میں بھی حتی الامکان تم لوگوں سے تعاون کروں گا۔"

"وہ دن میرے لیے عید کا دن ہو گا وجدان!" امتیاز نے بھونکی ہوئی آواز میں کہا "ہم کندھے سے کندھا ملا کر ظلم اور باضالی کے خلاف سپرہ پلائی دیوار ثابت ہوں گے لیکن"

اس نے دانستہ جملہ ادھر اور اچھوڑ دیا۔ میں نے سوال کیا "تم چاہک خاموش کیوں ہو گئے امتیاز؟"

"جگر! وہ مخصوص انداز میں بولا "مجھے خوشی اس وقت ہو گی جب تم ہمارے کام سے متاثر ہو کر 'سی ایف کے' میں شمولیت اختیار کر لو گے میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اسہ ملے گی میں تم سے زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔"

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلاتے پر اکتفا کیا۔

تھوڑی دیر بعد امتیاز فلیٹ سے رخصت ہو گیا تو ساحل نے میرے قریب آتے ہوئے کہا "وجدان! کیا تم نے اپنے ساتھ شد کا چھٹا چکا رکھا ہے؟"

اس نے متعجب سوال کیا تھا "میں نے اتنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا کیا چاہتی ہو؟"

"جی! میں نے کوئی اتنی پیچیدہ بات تو کی نہیں جو تمہیں سمجھے میں شوری محسوس ہو رہی ہو۔" اس کے انداز میں شرارت غور کر آئی "میں نے یہ سنا تھا اور دیکھا بھی ہے کہ صنوبر خائف ایک دوسرے پر مرتے ہیں آپس میں دوستی محبت اور شادی کرتے ہیں لیکن امتیاز کا تم سے والمانہ لگاؤ دیکھ کر نقل ونگ ہے حضرت کو تم سے پہلی نظری دوستی ہو گئی ہے۔"

بات ختم کر کے اس نے معنی خیز انداز میں میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر دل کی کی مسکان تھی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ساحل! بہت بری بات ہے کسی کے جذبات کا یوں مذاق نہیں اڑاتے دوستی دراصل محبت ہی کی ایک صورت ہے۔"

"کیا امتیاز کو تم سے محبت ہو گئی ہے؟"

"یہ تو وقت ثابت کرے گا۔" میں نے کہا "فی الحال نظر تو ایسا ہی آ رہا ہے۔"

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے ہم صنف سے محبت پر اسے سخت اعتراض یا حیرت ہو۔ میں نے اس کی نگاہ کا مفہوم جاننے کے بعد ٹھہری ہوئی آوازیں کہا۔

"ساحل! اجی اور خالص محبت صنف اور جنس کی محتاج نہیں ہوتی وہ صرف محبت ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو ہماری ایک بیٹے سے بھی محبت کر سکتے ہیں۔"

لا جواب ہو کر اس نے موضوع بدل دیا اور اضطرابی انداز میں بولی "تم سنگاپور میں کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟"

"میں میرے چند دوست وہاں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"یعنی ہم صنف دوست یا۔۔۔؟"

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "تمہارے سامنے ہی بات کروں گا۔ تم دیکھ لینا، میرے وہ دوست ہم صنف ہیں یا صنف مخالف۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے کہا "فون بعد میں کریں گے، پہلے ذرا فلیٹ کا تنقیدی جائزہ لے لیں۔"

ہم بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے جاتے ہوئے امتیاز بیڈروم میں نصب انٹرنیٹ کنکشن کو آن کر گیا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر داخلی دوازے کو اندر سے لوٹ کر دیا۔ اس کے بعد ہم فلیٹ کے دیگر حصوں کا معائنہ کرنے لگے۔ دوسرا بیڈروم بھی انٹرنیٹ کنکشن اور ایئر کنڈیشنر کی سہولت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ لاؤنج میں بھی ایک کاسین واش روم موجود تھا۔ ڈرائنگ روم کی آرائش میں سادگی اور پُر کاری نظر آتی تھی۔ وہاں یہ ایک وقت دس بارہ افراد بیٹھ کر باہم کلام ہو سکتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں واپس بیڈروم میں آ گئے۔

میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹیلی فون سیٹ کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ ساحل بھی آکر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کا گداز میں اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ٹیلی فون ایکس چینج میں اور ریز کال کی بنگ کے لیے آپریٹر کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے آپریٹر سے سنگاپور کا ایک نمبر مانگ لیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور مطلوبہ فون نمبر میری بات کو ادی گئی۔

میں نے دراصل سنگاپور کے سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملوایا تھا۔ دوسری جانب سے پوچھا گیا "کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں نے کہا "انسپکٹر چیانگ شو سے۔"

”آپ کی تعریف؟“ نہایت ہی شستہ انگریزی میں سوال کیا گیا۔  
 ”میں انسپکٹر کا ایک دوست بات کر رہا ہوں۔“ میں نے شاکستہ انداز میں کہا ”میرا نام وجدان علی ہے۔“  
 دوسری جانب سے مجھے انتظار کرنے کو کہا گیا پھر مدہ سیکنڈ کے بعد وہی آواز میری ساعت سے ٹکرائی ”انسپکٹر چینگ شو اس وقت ہیڈ کوارٹر میں موجود نہیں۔ کل رات اس کے ایک عزیز کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اسی عزیز کے گھر ہو گا۔“

”کیا مجھے وہاں کا فون نمبر مل سکتا ہے؟“ میں نے درخواست آمیز لہجے میں کہا ”دراصل میں اس سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

فون پر بات کرنے والے نے معذرت کرتے ہوئے کہا ”سوری مسٹر! وہاں کا فون نمبر مجھے معلوم نہیں۔ تم اپنا کا ٹیکٹ نمبر چھوڑ دو۔ انسپکٹر جاب بھی ہیڈ کوارٹر پر چکر لگائے گا۔ تمہارا پیغام اس تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ ضروری سمجھے گا تو تم سے رابطہ کر لے گا۔“

میں اپنا نام تو بتا ہی چکا تھا، ٹیلی فون سیٹ کی پیشانی سے پوسٹ فون نمبر بھی نوٹ کر دیا پھر وہ ٹیلی فونک رابطہ ختم ہو گیا۔

میں نے ریسیور رکھا تو ساحل نے انسپکٹر چینگ شو کے حوالے سے متعدد سوال کر ڈالے۔ میں نے اپنی ابتدائی زندگی سے متعلق جتنہ جتنا چاہا تھا۔ سنگا پور میں گزارے ہوئے وقت میں چینگ شو نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ میرے والد صاحب عابد علی کا گہرا دوست تھا۔ والد کے انتقال کے بعد چاچا پر تاب سنگھ اور چینگ شو نے حقیقی معنوں میں میرے سرپرست کا کردار ادا کیا تھا۔ پر تاب سنگھ اب آگ جہانی ہو چکا تھا۔

میں ساحل کو چینگ شو کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا تو وہ اور میرے نزدیک آگئی۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے جڑی بیٹھی تھی۔ مزید قربت کا مطلب تھا کہ وہ میرے اندر اترنے کی تیک و دو میں مصروف ہو گئی تھی۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ نیلگری کے کسے ہوئے الفاظ میری ساعت میں گونجتے لگے۔ اس نے بڑے واضح انداز میں مجھے باور کرایا تھا جب بھی کوئی عورت تمہاری میں میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے گی تو اس عورت کے جلو میں نیلگری میری خلوت میں اتر آئے گی۔ اس نے ایسا صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ ایک درمختہ بات ثابت بھی کر

دکھایا تھا۔ اس کے بعد میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ اس وقت جانے کیا ہوا کہ میرے ذہن میں ایک نیا خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا اور میں نے چشم زدن پر فیصلہ کر لیا کہ اس خیال کو عملی جامہ پہناؤں گا۔ اس وقت میری نگاہ ساحل کے چہرے پر جمی تھی۔ میرے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو وہ جان نہیں سکتی تھی تاہم مجھ کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نے اسے چونکنے پر مجبور کیا۔

چہرے کو دل کی کتاب کہا جاتا ہے۔ ساحل میرے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے ابھمن زدہ لہجے میں متحضر ہوئی ”وجدان! تم کیا سوچ رہے ہو؟“  
 ”میں ایک ٹیسٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“  
 ”اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”اس کے لیے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

اس کے بدن میں ایک خفیف سی جھرجھری نمودار ہوئی۔ اس نے حیرت میرے لہجے میں پوچھا ”یہ آپ کچھ کس ٹیسٹ کی سوچ رہے؟“  
 ”میں ایک تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کی حیرت استحباب میں بدل گئی ”کس قسم کا تجربہ؟“  
 ”اس قسم کا تجربہ!“

میں نے یہ جملہ ادا کرتے ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں گرا لیا پھر میرا چہرہ اس کے چہرے جھک گیا۔  
 وہ پچھنی ہوئی آنکھوں سے یک ٹک مجھے تنکے لگی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں اس نوعیت کی حرکت بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے جذبات اور احساسات جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں بہت دور تک جا کر دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”ہیلو نیلگری! کیسی ہوا؟“  
 ”نیل۔۔۔ گری۔۔۔“ ساحل نے جو حیرت اور تعجبور ہو گیا کہ کیا نیلگری نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ بیٹنی کے سمندر میں غوطہ زن تھی ”اچانک سطح آب پر ابھرنا“  
 ”سرسراہی آواز میں دہرایا۔“

میں نے کہا ”ہاں، نیلگری میں تمہی سے رابطہ ہوں۔“  
 ”وجدان! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ ساحل پوری طرح اپنے حواس میں آتے ہوئے بولی ”میں ساحل ہوں۔“  
 ”میرے اندر نیلگری کیوں پکار رہے ہو؟“

نیلگری کو وہاں غیر موجود یا کمرے سینے سے اطمینان پاس خانہ ہوئی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ”جی نہیں۔ بس ایسے ہی۔“ وہ آسانی سے مطمئن ہونے والی تھی ”جی نہیں۔ بیٹھے بیٹھے نیلگری کا خیال کیسے آگیا؟“  
 ”میں نے اس کے سوال کا خاموش جواب دیا۔ اس میں نے الفاظ کو سارا بنانا حماقت کے مترادف ہوتا۔ اس صرطے میں الفاظ کی انگاری کے مانند دھک رہے تھے۔ میں نے انکساری لب کسی انگارے کے اپنے وجود کو دکھایا۔  
 ”ان کا بونوں کی آزاری سے اپنے وجود کو دکھایا۔“  
 ساحل نے اس تمخیل گرفت سے آزاد ہونے کی ادکاری کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ان کی فحشی حماقت کی انتہی ساعتوں میں پہلی مرتبہ رج کر ساحل کو یاد کیا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے جدا ہوتے ہوئے بولی ”وجدان! تم پچھلی رات کے جاگے ہوئے ہو۔ تھوڑی عیند لے لو۔ نیند کے شمار سے تمہاری آنکھیں سر اٹھیں پھر پوچھ لو۔“  
 ”میں اس وقت شدت سے نیند کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ کسی فرماں بردار ننھے بچے کی طرح میں نے ساحل کی نصیحت پر عمل کیا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

ساحل نے ایک ٹانگ کو فولڈ کر کے گھٹنے کے خنید حصے کو میرے لیے تکیہ بنادیا پھر وہ کسی ایکسپٹ مساجر کی طرح اپنی غولٹی انگلیوں سے میرے بالوں کو سسلانے لگی ”اس کی روشنی انہیں بال کا گداز سر کے راستے میرے بدن میں اترنے لگا۔“  
 ”میں نے آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔“

نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے میں نیلگری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج کے تجربے نے میرے لیے سوچ کے کنارے کو کھول دیا تھا۔ نیلگری کا سنسنی خیز دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ ساحل میری تنہائی میں آنے کے باوجود بھی اول آواز آخر ساحل ہی رہی تھی جس کے نتیجے میں ”میں یہ سوچنے پر آمادہ ہو گیا کہ کیا نیلگری نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ بیٹنی کے سمندر میں غوطہ زن تھی“  
 ”سرسراہی آواز میں دہرایا۔“

میں نے کہا ”ہاں، نیلگری میں تمہی سے رابطہ ہوں۔“  
 ”وجدان! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ ساحل پوری طرح اپنے حواس میں آتے ہوئے بولی ”میں ساحل ہوں۔“  
 ”میرے اندر نیلگری کیوں پکار رہے ہو؟“

تھا۔ وہ پراسرار ہستی مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی اور اس نے مجھے اپنا محبوب تسلیم کر لیا تھا۔ وہ مجھے اپنی جائیداد بنا کر رکھنے کے چکر میں تھی اور مجھے کسی کی ذاتی پراپرٹی بن کر رہنا قطعاً قبول نہیں تھا۔

حالیہ تجربے نے نیلگری کے منصوبے کا راز فاش کر دیا تو مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آنے لگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے بعض نازک مواقع پر میری بھرپور مدد کی تھی لیکن اس کے ہاتھوں بے وقوف بننے سے مجھے شدید ہنک کا احساس ہوا اور نیلگری کا وہ تعاون اور مدد مجھے خود غرضی کی ایک شکل نظر آئی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ زیر بار کر کے مجھ پر تصرف حاصل کرنے کے لیے اپنی راہ ہموار کر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اسی وقت یہ اہل فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں آنکھیں بند کر کے نیلگری پر بھروسہ نہیں کروں گا اور اگر اس نے کسی چالاکی یا چال بازی کا مظاہرہ کرنا چاہا تو میں بھی جواباً اسی لیول کی عیاری اور شیطانی دکھاؤں گا۔ وہ اگر نادیدہ اور پراسرار تنہائیوں کی مالک ہے تو میں بھی کوئی ایسا گیزرا نہیں تھا کہ اس کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ جاتا۔ میں چند روز تک سنجیدگی سے ”جی“ کی ایڈوانس مشقیں کر لیتا تو اس لاطنی قوت میں بے پناہ استعداد پیدا کر سکتا تھا۔

نیلگری کے خیالوں سے الجھتے ہوئے میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

\*\*\*

جب میری آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ کمرے کے باہر سے مجھے باتوں کی آواز آئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ساحل کسی دوسری عورت سے بات چیت کر رہی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں روٹی کا نام چمکا۔ اقباز نے بتایا تھا کہ وہ دو بج تک واپس آئے گی۔ میں گیارہ ساڑھے گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹا تھا اس کا مطلب تھا ”میں نے اچھی خاصی نیند لے لی تھی۔ روٹی کی واپسی کا مجھے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔“

میں نے ایک بھرپور اچھٹائی لے کر بستر چھوڑ دیا۔ بیگلے پر مسلح گارڈ نے ہماری جو خاطر تواضع کی تھی اس کے ”اثرات“ معدوم ہو چکے تھے اور میں ہلکی ہلکی بھوک محسوس کر رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر لانچ میں ”میں نے ساحل کو ایک نہایت ہی حسین و جمیل عورت کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے پایا۔ میں نے اس عورت کو سلام کیا تو اس نے میرے لیے بھی ایک کرسی سیدھی کر دی اور نہایت ہی مذہب انداز میں مجھے بیٹھنے کو



کہا۔

روٹی اسم بامنی تھی۔ کہوڑ کی آنکھ جیسی سرخی رکھنے والا یا قوت (روٹی) اگر اپنی شان... اور جاہ و جلال میں بے مثال ہے تو کلابی رنگت کے حامل یا قوت کے حسن اور دلکشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ روٹی کی جلد شفاف اور رنگت بے داغ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وسعت قدرت نے میدے میں گلاب کی پتیوں کو گوندھ کر اسے تخلیق کیا ہو۔ وہ بلاشبہ ایک پُرکشش اور جاذبِ نظر شخصیت تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال رہی ہوگی۔

مجھے اپنی جاذب دیکھتے پاکر اس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا ”وجدان بھائی! آپ ذرا ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں آپ لوگوں کے لیے ناشتا لگاتی ہوں۔ رات کا کھانا ہم امتیاز کے آنے کے بعد کھائیں گے۔“

اس نے اتنی اپنائیت اور محبت سے مجھے بھائی کہا تھا کہ میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ میں حقیقی خوشی کی پھوار میں خود کو سرشار محسوس کرنے لگا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ یہاں مجھے روٹی کے بھائی کی حیثیت سے قیام کرنا ہے۔ امتیاز نے مجھے اپنے لیے نام منتخب کرنے کو بھی کہا تھا اور میں نے یہ کام انجام دے لیا تھا۔

میں نے روٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”امتیاز نے تمہیں ہمارے بارے میں مختصر بتا دیا ہوگا، کچھ باتیں ساحل کی زبانی تمہیں بتا چلی ہوں گی۔ ایک اہم بات میں بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اب میں وجدان نہیں اور یہ ساحل نہیں۔ آخری الفاظ میں نے ساحل کی جانب اشارہ کھتے ہوئے ادا کیے تھے۔

”اس کا مطلب ہے تم نے عارضی نام سوچ لیے ہیں؟“ ساحل نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ”عارضی اور نقلی یہ ہمارے لیے ہوں گے ورنہ دنیا والوں کے لیے تو یہی نام ایک دم اصلی کی حیثیت رکھیں گے۔“

روٹی نے پوچھا ”وجدان بھائی! آپ نے اپنے لیے کیا نام تجویز کیے ہیں؟“

”میں وجیہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”اور ساحل“

”الماس!“

”وندرفُل۔“ روٹی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”بہت موزوں اور خوبصورت نام ہیں اور تم دونوں پر بچنے بھی ہیں۔“

پھر ہمارے درمیان کافی دیر تک خوش گپیاں ہوئی

رہیں۔ اس دوران میں ہم نے ہلکا ہلکا ناشتا بھی کرا کر آپس میں یوں مکمل مل گئے تھے کہ دیکھنے والا کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم زندگی میں پہلی مرتبہ ملے۔ واقعی رشتے داروں کی طرح ہی دکھائی دیتے تھے۔ خوش مزاجی نے بہت جلد محکافات اور اجنبیت کے پڑاؤ اٹھا دیا تھا۔

لگ بھگ سات بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میزبان روٹی نے فون اٹھایا دیکھا پھر لاؤنج میں آکر مجھے ”وجدان! تمہارے لیے کال ہے۔“

میں اٹھ کر اس بیڈ روم میں آیا جو ہمارے لیے نوٹ کیا گیا تھا۔ ریسیور کو میں نے کان سے لگایا اور دیکھا کہ ”ہیلو۔“

”ہیلو وجدان۔“ دوسری طرف سے کہا گیا ”میں چیاگ شو بول رہا ہوں۔ تم نے اپنے اس انکل کو نہیں؟“

میں چیاگ شو کی آواز کو بہ خوبی شناخت کر چکا ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر اس نے ”کیا“ مجھے تمہاری کال کے بارے میں بتا چلا تھا۔ خاص بات تھی؟ یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم اپنے آپ پاکستان کے شہر کراچی میں ہو۔“

میں نے کہا ”انکل چیاگ شو! بس آپ سے بات کو جی بہت چاہ رہا تھا اس لیے فون کر ڈالا۔“ پھر مجھے خاص بات یاد آئی اور میں نے پوچھا ”میرا فون ریم والے نے بتایا تھا کہ کل تمہارے کسی عزیز کی ذمہ داری تھی اور تم اس عزیز کے گھر گئے ہوئے تھے!“

”ہاں، ہمیں بالکل ٹھیک بتایا گیا تھا۔“ وہ غم میں بولا ”وہ میرا عزیز تمہارا بھی بہت کچھ لگتا تھا وجدان۔“

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں ”انکل! آپ کسی کی بات کر رہے ہیں؟“

”میں ہونا گھٹا کا تذکرہ کر رہا ہوں۔“ اس نے بتایا ”مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ہونا گھٹا کو تو کل رات زائد کے آدمیوں نے اغوا کر کے قتل کر ڈالا تھا اور چیاگ شو سنگا پور میں اپنے کسی عزیز کی حیثیت سے انتقال کی بات کر رہا تھا بلکہ وہ تو ہونا گھٹا کو میرا بھی بتا رہا تھا۔ انسپکٹر کے انکشاف نے مجھے الجھا کر رکھا۔“

”تو حذب سبجے میں کہا۔“

”انکل! میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔“

”وجدان! کیا تم ہونا گھٹا کو بھول گئے ہو؟“

”میں ہونا گھٹا کی قربانی کو بھول کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا لیکن اس کا قتل تو کل یہاں کراچی میں ہوا ہے۔ اور آپ وہاں سنگا پور میں اس کے گھر تعزیت گئے لیے گئے تھے۔ یہ بات مجھے ابھی یاد ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی کہا ”وجدان! میں نہیں جانتا، تم کس ہونا گھٹا کے قتل کی بات کر رہے ہو۔“

”میں ہونا گھٹا کی قربانی کو بھول کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا لیکن اس کا قتل تو کل یہاں کراچی میں ہوا ہے۔ اور آپ وہاں سنگا پور میں اس کے گھر تعزیت گئے لیے گئے تھے۔ یہ بات مجھے ابھی یاد ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی کہا ”وجدان! میں نہیں جانتا، تم کس ہونا گھٹا کے قتل کی بات کر رہے ہو۔“

”انکل چیاگ شو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”البتہ میں جس ہونا گھٹا کی موت کا ذکر کر رہا ہوں وہ تمہارے کاروبار کا نگران اعلیٰ تھا۔“ ”عابد علی ایڈسن“ کا فیبر اور عزت ہونا گھٹا جو کل رات ہارٹ انفیکٹ کے باعث چل ”بل۔“

”اوہ!“ میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی ”تو آپ اس ہونا گھٹا کی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں، اب آپ تمہاری سمجھ میں؟“ چیاگ شو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

اور واقعی سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا ”ہونا گھٹا“ انسپکٹر چیاگ شو کا ایک دیرینہ چاکر تھا اور جب میں چاچا پر تاب گھٹا کے ساتھ ہنگام چلا گیا اور ازاں بعد میں... ایک طویل عرصہ گولڈن ٹرائی اسٹیکل اور شاؤنڈ ٹیبل میں گزارے کے بعد... واپس سنگا پور پہنچا تو چیاگ شو کی زبانی مجھے بتا چلا کہ ہونا گھٹا نامی اس شخص نے اپنی محنت سے میرے والد صاحب کے کاروبار کو بہت ترقی دی ہے۔ انسپکٹر ہی نے ہونا گھٹا کو ”عابد علی ایڈسن“ کا فیبر مقرر کیا تھا۔ ان دنوں سنگا پور کے علاقے چانٹا ٹاؤن کی ساکو اسٹریٹ پر میرے والد صاحب کا ایک جنرل اسٹور ہوا کرتا تھا۔ اب یہ اسٹور ”عابد علی ایڈسن“ کے نام سے تین بڑی دکانوں پر پھیل چکا تھا۔ اس شعبہ جاتی اسٹور پر درجنوں ملازم بھرتی تھے جو سب ہونا گھٹا کی گمرانی میں میرے والد کے لگائے ہوئے پڑی آب داری میں مصروف تھے۔ انسپکٹر چیاگ شو نے فورٹ کیننگ ڈوڈا لے ہمارے گھر کی دیکھ بھال کا بھی مناسب بندوبست کر دیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ چاچا خوشونت گھٹا نے جس مومنہ کو ڈائری کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی تھی ”اس کا نام بھی ہونا گھٹا ہی تھا“ ”عابد علی ایڈسن“ کا فیبر ہونا گھٹا اس وقت میرے دماغ سے نکل گیا تھا جب میں نے انسپکٹر چیاگ شو سے ملنے کا آغاز کیا تھا۔

بھراں میں نے اپنے فیبر کی موت پر گھرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ انسپکٹر سے اس سلسلے میں تعزیت اس لیے بھی

ضروری تھی کہ ہونا گھٹا اس کا دوست اور دیرینہ شناسا تھا۔ وہ میرا شکر ہے ادا کرنے کے بعد بولا ”وجدان! تم نگر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہارے برلن کی گمرانی کا کوئی مقبول انتظام کروں گا۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں انکل۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا ”میں نے اپنے گھر اور ”عابد علی ایڈسن“ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی سلسلے میں میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“

ریسیور میں مجھے انسپکٹر چیاگ شو کی حیرت بھری آواز سنائی دی ”وجدان! تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا کاروبار تو پھر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سنہری موقع پر تم برلن کو فروخت کرنے کی بات کر رہے ہو۔ یہ تو عقل مندی نہ ہوئی!“

میں نے کہا ”انکل! کچھ بھی ہو، میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا۔ آپ جلد از جلد میرے گھر اور برلن کے لیے کسی مناسب خریدار کو تلاش کریں اور اس فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو امریکی ڈالرز میں تبدیل کروا کر مجھے بھجوا دیں۔ میں نے گزشتہ ملاقات پر آپ کو ایک ”پاور آف اٹارنی“ قسم کی دستاویز بھی تیار کروا کے دی تھی۔ آپ کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”تم مالک ہو۔ میں تمہاری بات ماننے سے انکار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو بتا دو، مستقبل میں تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ انسپکٹر نے گہری اپنائیت سے پوچھا۔

”بچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میرے ذہن میں اس کیرئیر کم کے استعمال کا کوئی باقاعدہ منصوبہ موجود نہیں تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر انسپکٹر کو ٹانے کے لیے کہہ دیا۔“

”انکل! میں نے مستقبل طور پر کراچی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب جو بھی کاروبار کروں گا، یہیں پر کروں گا۔“ ”ٹھیک ہے“ جیسی تمہاری مرضی۔“ چیاگ شو نے دوستانہ انداز میں کہا ”لیکن اس موقع پر تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ اگر تم اس مشورے پر عمل کرو گے تو اس سے بہت سوں کو فائدہ ہوگا اور تم اپنے استادوں کا کچھ احسان بھی کم کر سکو گے۔ علم فُن اور ترقی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔“

میں نے گہری شجیدگی سے کہا ”انکل! آپ کس قسم کا مشورہ دینا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا ”تمہارا جو جی چاہے، وہ کاروبار کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی زیر نگرانی ”مارشل آرٹس“ کا ایک ادارہ

ضروری تھی کہ ہونا گھٹا اس کا دوست اور دیرینہ شناسا تھا۔ وہ میرا شکر ہے ادا کرنے کے بعد بولا ”وجدان! تم نگر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہارے برلن کی گمرانی کا کوئی مقبول انتظام کروں گا۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں انکل۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا ”میں نے اپنے گھر اور ”عابد علی ایڈسن“ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی سلسلے میں میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“

ریسیور میں مجھے انسپکٹر چیاگ شو کی حیرت بھری آواز سنائی دی ”وجدان! تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا کاروبار تو پھر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سنہری موقع پر تم برلن کو فروخت کرنے کی بات کر رہے ہو۔ یہ تو عقل مندی نہ ہوئی!“

میں نے کہا ”انکل! کچھ بھی ہو، میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا۔ آپ جلد از جلد میرے گھر اور برلن کے لیے کسی مناسب خریدار کو تلاش کریں اور اس فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو امریکی ڈالرز میں تبدیل کروا کر مجھے بھجوا دیں۔ میں نے گزشتہ ملاقات پر آپ کو ایک ”پاور آف اٹارنی“ قسم کی دستاویز بھی تیار کروا کے دی تھی۔ آپ کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”تم مالک ہو۔ میں تمہاری بات ماننے سے انکار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو بتا دو، مستقبل میں تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ انسپکٹر نے گہری اپنائیت سے پوچھا۔

”بچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میرے ذہن میں اس کیرئیر کم کے استعمال کا کوئی باقاعدہ منصوبہ موجود نہیں تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر انسپکٹر کو ٹانے کے لیے کہہ دیا۔“

”انکل! میں نے مستقبل طور پر کراچی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب جو بھی کاروبار کروں گا، یہیں پر کروں گا۔“ ”ٹھیک ہے“ جیسی تمہاری مرضی۔“ چیاگ شو نے دوستانہ انداز میں کہا ”لیکن اس موقع پر تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ اگر تم اس مشورے پر عمل کرو گے تو اس سے بہت سوں کو فائدہ ہوگا اور تم اپنے استادوں کا کچھ احسان بھی کم کر سکو گے۔ علم فُن اور ترقی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔“

میں نے گہری شجیدگی سے کہا ”انکل! آپ کس قسم کا مشورہ دینا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا ”تمہارا جو جی چاہے، وہ کاروبار کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی زیر نگرانی ”مارشل آرٹس“ کا ایک ادارہ

ضروری تھی کہ ہونا گھٹا اس کا دوست اور دیرینہ شناسا تھا۔ وہ میرا شکر ہے ادا کرنے کے بعد بولا ”وجدان! تم نگر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہارے برلن کی گمرانی کا کوئی مقبول انتظام کروں گا۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں انکل۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا ”میں نے اپنے گھر اور ”عابد علی ایڈسن“ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی سلسلے میں میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“

ریسیور میں مجھے انسپکٹر چیاگ شو کی حیرت بھری آواز سنائی دی ”وجدان! تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا کاروبار تو پھر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سنہری موقع پر تم برلن کو فروخت کرنے کی بات کر رہے ہو۔ یہ تو عقل مندی نہ ہوئی!“

میں نے کہا ”انکل! کچھ بھی ہو، میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا۔ آپ جلد از جلد میرے گھر اور برلن کے لیے کسی مناسب خریدار کو تلاش کریں اور اس فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو امریکی ڈالرز میں تبدیل کروا کر مجھے بھجوا دیں۔ میں نے گزشتہ ملاقات پر آپ کو ایک ”پاور آف اٹارنی“ قسم کی دستاویز بھی تیار کروا کے دی تھی۔ آپ کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”تم مالک ہو۔ میں تمہاری بات ماننے سے انکار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو بتا دو، مستقبل میں تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ انسپکٹر نے گہری اپنائیت سے پوچھا۔

”بچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میرے ذہن میں اس کیرئیر کم کے استعمال کا کوئی باقاعدہ منصوبہ موجود نہیں تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر انسپکٹر کو ٹانے کے لیے کہہ دیا۔“

”انکل! میں نے مستقبل طور پر کراچی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب جو بھی کاروبار کروں گا، یہیں پر کروں گا۔“ ”ٹھیک ہے“ جیسی تمہاری مرضی۔“ چیاگ شو نے دوستانہ انداز میں کہا ”لیکن اس موقع پر تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ اگر تم اس مشورے پر عمل کرو گے تو اس سے بہت سوں کو فائدہ ہوگا اور تم اپنے استادوں کا کچھ احسان بھی کم کر سکو گے۔ علم فُن اور ترقی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔“

میں نے گہری شجیدگی سے کہا ”انکل! آپ کس قسم کا مشورہ دینا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا ”تمہارا جو جی چاہے، وہ کاروبار کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی زیر نگرانی ”مارشل آرٹس“ کا ایک ادارہ

ضرور قائم کرنا تاکہ ان فنون کی منتقلی کا کام جاری رہے۔  
 ”ایسا ایک مستند اور شاندار ”کلب“ میرے منصوبے میں شامل ہے انکل۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا  
 ”انشاء اللہ میں فنون حرب و ضرب کو پھیلانے کے لیے مؤثر اقدامات کروں گا۔“

انسپیکٹر جیٹنگ شو نے اختتامی گفتگو کرتے ہوئے کہا  
 ”ٹھیک ہے وجہ ان! اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ میں کل ہی ”ساکو اسٹریٹ“ والے شعبہ جاتی اسٹور اور (FORT KENNING ROAD) پر پارک کے سامنے واقع تمہارے گھر کو فروخت کرنے کے لیے چارہ جوئی کرتا ہوں۔“

میں نے مناسب اور بھرپور انداز میں انسپیکٹر جیٹنگ شو کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ پاکستان کا وقت سنگاپور کے وقت سے تین گھنٹے پیچھے ہے۔ میرے بیڈروم کا دواؤں گیر کلاک اس وقت ساڑھے سات کا وقت بتا رہا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھ کر ساحل اور روبی سے باتیں کرنے لگا۔

\*\*\*

امتیاز رات دس بجے لدا پھندا واپس آیا۔  
 اس کے ساتھ اشتیاق کو نہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اشتیاق اس کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے وہاں رہتا ہے۔ میں نے امتیاز سے پوچھا۔  
 ”اشتیاق کہاں ہے؟“  
 ”وہ آج دہلا چلا گیا ہے۔“  
 ”دہلا؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا ”مگر تم نے تو کہا تھا کہ۔۔۔!“

وہ میری بات کو قطع کرتے ہوئے بولا ”میں نے جو پہلے تم سے کہا تھا اسے بھول جاؤ۔ نئی پالیسی یہ ہے کہ اشتیاق کافی عرصے سے روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک جانے کی زحمت کر رہا تھا۔ یہاں کے اکثر لوگوں کو بھی میں نے اسی قسم کی باتیں بتا رکھی ہیں۔ آج اشتیاق دہلا ہوا نہ ہو گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“ وہ ایک لمحے کو رک کر میری جانب دیکھنے لگا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”اور کل سے روبی کے اسکول میں بھی ”سروریکیشن“ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اب دو ڈھائی ماہ تک یہ اسکول نہیں جائے گی۔ اس فلیٹ میں صرف دو جوڑے رہیں گے ایک میں اور روبی اور دوسرا۔“  
 ”وجہ اور الماس!“ ساحل نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

”اوہ!“ وہ چونک اٹھا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے  
 ”آپ دونوں کے نام مجھے پسند آئے۔“  
 میں نے کہا ”جب ایک جوڑے میں روبی حضور دوسرے میں کم از کم ڈائمنڈ (الماس) تو ہونا چاہیے۔“  
 ”ضرورت ضرور۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے  
 ”اور تمہارے اس ڈائمنڈ کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ میرا  
 آرمر اس قیمتی پتھر کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔  
 برطانوی ڈائمنڈ ایکسپورٹ کمپنی کے مالک ہیں جس نے  
 دنیا کے بیش تر ممالک میں موجود ہیں۔“

میں نے کہا ”اس بیوپار سے اندازہ لگا جا سکتا  
 نیل آرمر کی مالی حیثیت کیا ہو گی کیوں کہ ڈائمنڈ  
 پتھروں میں اس وقت وہی ولیو اور مقام ہے جو پتھروں  
 گلاب کا پھولوں میں آسم کا اور جنگل میں شیر ہرکا کا ہے۔“  
 ”تم مثالیں اچھی دیتے ہو وجہ ان!“ روبی نے خوش  
 سے کہا ”تمہارے بیان سے مجھے یہ جان بڑھ جاتی ہے۔“  
 امتیاز بولا ”مسٹر نیل آرمر ڈائمنڈ انڈسٹری تک ہی  
 نہیں ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے بینک کے مالک بھی ہیں۔  
 کے علاوہ بھی ان کے سیکڑوں بزنس ہوں گے۔ مجھے  
 بارے میں زیادہ تفصیل معلوم نہیں۔“

ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ امتیاز  
 باتیں کرتے کرتے اچانک نیل آرمر کا تذکرہ کرنے لگا۔  
 میرے ذہن میں اس کا جو سبب تھا اس کی تصدیق  
 میں نے پوچھا۔  
 ”امتیاز! لگتا ہے آج نیل آرمر سے تمہاری ملاقات  
 ہوئی ہے؟“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں  
 ہلاتے ہوئے بولا ”پہلے ان کی پاکستان آمد پر بھی  
 آدھ بات ہو جاتی تھی مگر آج وہ بہت دوستانہ مؤثر  
 باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ایسا انکشاف بھی  
 میں دیکھ رو گیا۔“  
 ”کیسا انکشاف؟“ ساحل نے جھجھکے ہاتھوں  
 کر سوالیہ داغ دیا۔  
 ”جھجھک تو مجھے بھی تھا تاہم میں نے محض مستفردانہ  
 ہی میں امتیاز کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔“

امتیاز نے بتایا ”یہ بات تو مجھے معلوم تھی کہ وہ کسی  
 بینک کے مالک ہیں مگر میں یہ نہیں جانتا تھا وہ بینک  
 نوعیت کا ہے۔ میرا تو یہی خیال تھا جس طرح کے  
 بینک ہوتے ہیں وہ بھی ویسا ہی ہوگا۔“

”دوست! نیل آرمر کا بینک کس قسم کا ہے؟“ میں نے  
 پوچھا۔  
 ”اس بینک میں اکاؤنٹ کھولانے کے لیے رقم کی  
 وہ پولا۔۔۔ بلکہ وہاں سونے سے اکاؤنٹ کھولا جاتا  
 ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہاں سونے سے اکاؤنٹ بینک  
 ہے اور اس نوعیت کے بینک کو گولڈ اکاؤنٹ بینک کہا جاتا  
 ہے۔“

”جے“ نے گولڈ اکاؤنٹ بینک کا ذکر سنا تھا اس لیے  
 میں نے اچھے کی بات نہیں تھی۔ اس نوعیت کے  
 میرے لیے اچھے کی بات نہیں تھی۔ اس نوعیت کے  
 بینک میں کم از کم پانچ گرام سونے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا  
 ہے۔  
 ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک مسٹر نیل آرمر اور اس  
 کی بیوی سیکرٹری مس شیا کے بارے میں گفتگو ہوتی  
 رہی پھر میں نے ایک ساتھ مل کر ڈنک کیا۔ کھانے پینے کی پیش تر  
 جس امتیاز اپنے ساتھ باہر سے لایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد روبی اور ساحل تو ایک  
 کمرے میں بیٹھ گئیں۔ میں اور امتیاز دوسرے کمرے میں  
 مگ شپ کرنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ جو بڑے بڑے شاپنگ  
 بیگز لے کر لایا تھا پہلے تو اس کی تفصیل بتانے لگا۔ وہ ہمارے  
 لیے کئی جوڑے کپڑے اور میک اپ کا مکمل سامان اور  
 لوازمات لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

”وہ جان! تمہارا شیڈ کافی دنوں سے بڑھا ہوا ہے۔ آج  
 تم شیڈ تو بڑھاؤ گے مگر مونچھیں چھوڑ دو گے۔ تمہارا شیڈ  
 کھانا ہے چھ روز میں تمہاری عالی شان مونچھیں تیار ہو  
 جائیں گی۔ اس کے علاوہ تم سر کے بال تھوڑے سے بڑھا کر  
 سائڈ ہانگ ٹھکانا شروع کر دو گے۔ لباس کے سلسلے میں تم بیش  
 بہ خیال رکھو گے کہ تمہیں اپنی شہرت کو پتھروں کے اندر  
 نہیں کرنا“ اوہن اینڈ فری چھوڑ دینا ہے۔ اس طرح تمہارے  
 طے اور اثاثوں میں نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔ ساحل بھی  
 بدلی پٹاؤں کے ترک کر کے شلوار قمیض اور دیگر ”ایزی  
 ہینڈل ڈریس“ استعمال کرے گی۔ بالوں کو باندھنے کے بجائے  
 غلا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر تم لوگ اتنا بھی کرو تو تمہارے  
 میک اپ میں اتنا فرق آ جائے گا کہ دشمنوں سے اپنی  
 شناخت چھپانے کے لیے تم لوگوں کو کسی قسم کے ایجنسز میک  
 اپ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

میں امتیاز کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ وہ بہت مفید اور  
 معقول باتیں کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان چند لمحے  
 قیام اور کمر کی باتیں ہوئی رہیں پھر وہ اصل موضوع کی طرف  
 آگیا اور مجھ سے میری کمائی سننے کی فرمائش کرنے لگا۔

میں اپنے ذہن میں ایک مکمل کمائی کا خاکہ تیار کر چکا تھا  
 جس میں مرکزی کردار میں خود تھا۔ ازیں علاوہ میں نے بہت  
 کم کرداروں کو اس کمائی میں شامل کیا تھا یہ کمائی چودری  
 نواز ش علی اور میرے والد عابد علی کے مابین پیدا ہونے والی  
 دشمنی سے شروع ہوتی تھی۔ میرے والد مجھے اور میری والدہ  
 کو لے کر پاکستان سے سنگاپور جا پہنچے۔ اس کے بعد چودری  
 کے پیچھے ہوئے غیثیہ الا غیثیہ دارا کا طویل تذکرہ تھا اور  
 ہمارے معرکوں کی تفصیل تھی۔ دوستوں اور دشمنوں کے  
 چھوٹے موٹے کردار بھی آتے جاتے رہے۔ میں دشمنوں کو  
 ختم کرتے ہوئے اپنے والدین کے لو کا حساب لینے کے لیے  
 پاکستان آیا تھا اور یہاں چودری نواز ش علی میرا اصل  
 ٹارگٹ تھا۔ میں نے پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخل  
 ہونے سے لے کر اب تک کے حالات واقعات کو من و عن  
 امتیاز کے گوش گزار کر دیا تھا۔ سرسرت میں نے متروک  
 کونسیں میں دفن لگ بھگ چوتھی ارب مالیت کے سونے کا  
 راز امتیاز کو نہیں بتایا تھا۔ یہی وہ واحد چیز تھی جو میں نے اس  
 سے چھپائی تھی۔ میں فی الحال احتیاط کے پیش نظر ایسا کر رہا  
 تھا۔ اس میں میری کوئی بددینی یا چال شامل نہیں تھی۔ میں  
 کوئی مناسب موقع دیکھ کر امتیاز کو اس راز میں ضرور شریک  
 کر لیتا۔

نصف شب کے بعد روبی ہمارے کمرے میں چلی آئی۔  
 ساحل اس کے ساتھ تھی۔ روبی نے ہم دونوں کو باری باری  
 دیکھتے ہوئے کہا ”کیا آج سونے کا ارادہ نہیں۔ اس کو تو کافی  
 دیر سے جمایاں آ رہی ہیں۔“

امتیاز اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ  
 کرتے ہوئے بولا ”مگر تمہیں اس کی ضرورت نہ ہو تو میں  
 اسے اپنے کمرے میں لے جاؤں۔ دراصل مجھے ایک اہم  
 کال کا انتظار ہے جو رات میں کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔“  
 ”تم فون کو بہ خوشی لے جاؤ۔“ میں نے کہا ”فی الحال میں  
 اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔“

وہ کمرے سے جانے لگا تو میری جانب دیکھتے ہوئے بولا  
 ”وہ جان! ممکن ہے رات کے کسی پہر میں مجھے تمہارے بیڈ  
 روم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش آ جائے۔ تم ذہنی  
 طور پر اس بات کے لیے تیار رہنا!“

”کیوں بھئی!“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔  
 ”خیر یہ تو ہے۔ تمہیں اس قسم کی ضرورت کیوں پیش آئے  
 گی؟“  
 وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”میں نے ابھی جس اہم فون

کال کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق ایک پانزے سے ہے۔ اگر میرے حسبِ مشافہ اطلاع دی گئی تو پھر میں نہیں ضرور ڈسٹرب کروں گا۔

”اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے، اس سربراہ کا تعلق وجدان سے ہے!“ ساحل نے ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا، ”کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں؟“

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے کہا، ”ایسا کون سا سربراہ ہے میرے دوست؟“

”جگرا!“ وہ مجھے مخصوص انداز میں مخاطب کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا، ”اگر وقت سے پہلے بتا دیا تو پھر وہ ”سربراہ“ کیسے رہے گا؟“ پھر اس نے رولی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہم دونوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا، ”گڈ نائٹ مائی ڈیر فرینڈز!“

ہم نے بھی جواباً انہیں ”شب بہ خیر“ کہا اور بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا، تاہم میں نے دروازے کو بولت کرنا ضروری نہ سمجھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری اجازت کے بغیر وہ اس بیڈ روم میں جھانکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

تمنا کی میسر آتے ہی ساحل الفاظ کی کڑا ال سے حالات کے گزے عرصہ اکھاڑنے لگی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”وجدان! تم نے دوپہر میں مجھے نیلگی کیوں کہا تھا؟“

ہماری دوستی اور تعلق جس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا وہاں ساحل سے نیلگی کے حوالے سے کھل کر بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ خاص طور پر جب سے نیلگی کی چال مجھ پر کھلی تھی، میں اپنے دل میں اس کے لیے خفگی کے جذبات رکھتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں ساحل کو نیلگی کے دعوے اور طریقہ واردات کے بارے میں بتا دیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر ابھین زدہ لہجے میں بولی ”وجدان! یہ تم کہہ رہے ہو اس لیے میں یقین کرتی ہوں ورنہ عقل ان باتوں کو ماننے سے انکاری ہے۔“

میں نے کہا، ”عقل ایک محدود شے کا نام ہے اور قدرت نے ایسی ایسی قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔ اور ان قوتوں کے حامل افراد ایسے عجوبہ روزگار ہیں کہ عقل ان کے کمالات کا احاطہ نہیں کر سکتی اسی لیے انہیں ماورائے عقل اور ”مابعد“ وغیرہ کے خانے میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی، ”کیا یہ سچ ہے کہ نیلگی میرے جسم کے ساتھ تمہاری تمنا کی آچکی ہے؟“

”ہاں! یہ صد فی صد سچ ہے۔“ میں نے راستہ مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ تمہاری غلط میں کس حد تک داخل ہوئی؟“ اس نے نیچے اور مٹی خیز انداز میں پوچھا۔

”جس حد تک میں نے اسے اجازت دی۔“

”مجھے خیر تجربہ اختیار کرتے ہوئے کہا، ”وہ کبھی مجھ پر نہیں ہو سکی۔“

وہ تذبذب نظر آنے لگی۔ اس وقت اس کے چہرے پر اس قسم کے تاثرات تھے جیسے کسی عورت کا شوہر عورتوں سے مراسم قائم کر لے تو اس بیوی کے چہرہ نمودار ہوتے ہیں۔ ساحل کی یہ کیفیات صرف اس پر تھیں کہ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی، ظاہر ہے اس صورت میں کسی دوسری عورت کا سایہ بھی میرا اثر ہو کرنا چاہتا تو اسے تکلیف پہنچانا لازمی بات تھی۔

”وجدان!“ ساحل میری آنکھوں میں دوپٹے سے

”ایک بات پوچھوں، سچ بتاؤ گے؟“

میں نے کہا، ”ہاں، پوچھو۔ بتانے والی بات ہوئی تو جواب دوں گا۔“

”گویا تم نے جواب دینے سے پہلے ہی ایک کڑی عائد کر دی!“ وہ خفا کی لہجے میں بولی۔

”میں نے تو ایک اصولی بات کی ہے ساحل۔“

پہلو تہی کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی، ”اور اپنے خود ساختہ اصول کی روشنی میں فیصلہ بھی تمہیں کو گے کہ آیا میرا سوال جواب کے قابل یا نہیں؟“

”اچھا بابا! پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو!“ میں نے ہبا اختیار کر لی۔

اس نے چند لمحات تک مٹولتی ہوئی نظر سے مجھ پرے کا جائزہ لیا اور مدبرانہ انداز میں بولی ”وجدان! یہ معلومات اور مشاہدے کے مطابق ہر قسم کے لوگ تمہارے محبت میں گرفتار ہیں۔ ان میں لڑکیوں اور عورتوں کی زیادہ ہے اور اب یہ پُر اسرار ہستی نیلگی بھی اسی تھا۔“

آنکھڑی ہوئی ہے۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کیا تم بھی کسی سے محبت ہے؟“

یہ سوال وہ پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکی تھی مگر ہر بار یہ انداز مختلف ہوتا تھا۔ میں نے ڈپٹی می کا سارا لیتے جواب دیا۔

”ساحل! میں اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں

محبت کرتا ہوں اور ان کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“

”میں جان دینے اور لینے کی بات کر رہی ہوں اور نہ ہی جسم کی محبت میرا موضوع ہے۔“ وہ گہری تنہید کی سے بولی

”تم ہر دفعہ بڑی خوبصورتی سے میرے سوال کے حصار سے نکل جاتے ہو مگر آج میں تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔“

نہیں بتانا ہو گا کہ تم نے اپنی زندگی میں کس سے محبت کی ہے اور اس محبت سے میری جو مراد ہے وہ تم بہ خوبی سمجھ رہے ہو!“

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا، ”میری ایسی قسمت کہاں کہ مجھے کسی سے اس قسم کی محبت ہو جائے جس قیمت کا تم تنہا کر رہی ہو۔ یہ تو نصیب والوں کا حصہ ذمیت کا تم کو وقف کر کے میں نے اس سے پوچھا ہے۔“

”ابھی تمہاری دیر پہلے تم نے اپنے کسی حصار کا ذکر کیا تھا۔ کیا تم مجھ پر کوئی بندش وغیرہ کر رہی ہو؟“

”شروع کر دی تم نے گزرو۔“ وہ ایک انداز دل ربا کی سے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی، ”لیکن میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہوں!“

”میں نے کب چھوڑنے کو کہا ہے!“

”اور اُدھر کی باتوں میں میرا دھیان نہ بٹاؤ وجدان!“

میں نے کہا، ”تمہارا دھیان اگر بٹ سکتا ہے تو بہت پہلے تم اپنے سوال کو نبھول چکی ہو تھیں۔ تم مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہو ساحل!“

”میں اس وقت اپنی تعریف نہیں بلکہ اپنے سوال کا جواب سننا چاہتی ہوں۔“

”جواب تو میں تمہیں دے چکا۔“

”اس کا مطلب ہے تم شرافت سے نہیں مانو گے!“ وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بچوں کی طرح میرا سینہ کونٹے ہوئے بولی۔

میں نے کہا، ”اگر میں شرافت سے نہیں مانا تو کیا تم کوئی بد معاشی وغیرہ بھی دکھا سکتی ہو؟“

”بالکل دکھا سکتی ہوں!“

اتنا کہنے ہی اس نے دھکا دے کر مجھے بستر پر گرا دیا پھر میرے قریب بیٹھے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں بولی ”شریف انسان کی بد معاشی بڑی قیامت خیز ہوتی ہے وجدان! میں وہ پسلاؤں چھوٹی موٹی دھنوں میں رہی جو ہر وقت بچوں ایسی حرکتوں میں مشغول رہتی تھیں۔ تمہارے ساتھ نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ تمہیں ابھی میری طاقت کا اندازہ

نہیں!“

آخری جملہ اس نے دو معنی انداز میں ادا کیا تھا۔ ساحل کی بے باکی، ہماوردی اور جارحیت آمیز انداز کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور اس کی وجہ سے بھی میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ آج دوپہر والے واقعے کے بعد سے اس کا حوصلہ کھل گیا تھا۔ اس کے انداز میں بے پناہ اعتماد اٹھایا تھا اور اس کے عزائم تشویش ناک دکھائی دیتے تھے۔

ساحل کے اندر جو یہ تبدیلی آئی تھی اس کے لیے اسے تصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ موقع تو اسے میں نے ہی فراہم کیا تھا۔ شاید وہ میرے اشارے کی منتظر تھی اور میں۔۔۔ فی الحال کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

ساحل خاموش نظر سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے خیالات کے بحور سے باہر نکلتے ہوئے کہا، ”میں تمہیں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ میں ایک زہریلا انسان ہوں۔ تمہیں اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو مجھ سے فاصلے پر رہا کرو۔“

”تمہارا یہ زہریلا پن دوپہر میں کہاں چلا گیا تھا وجدان؟“ وہ شرارت آمیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی۔

میں ہلکا سا ادا اور لا جواب ہو کر اس کا منہ تکتے لگا۔

وہ گہری تنہید کی سے بولی ”وجدان! اگر واقعی تمہارے ساتھ کسی قسم کے زہریلے پن کا مسئلہ ہے تو تم بہ فکر ہو۔“

میں خود تمہارا علاج کواؤں کی۔“

میں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”تم میرا علاج کواؤں کی انکر کس سے؟“

”ایک لیڈی ڈاکٹر سے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

”یہ تم کہا کہہ رہی ہو ساحل؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں!“ اس نے کہا، ”میں دن میں اپنے کسی نونالی مسئلے پر رولی سے بات کر رہی تھی تو اس نے مجھے بتایا کہ ایک نہایت ہی ماہر لیڈی ڈاکٹر اس کی دوست ہے اور وہ خاص طور پر پیچیدہ اور مشکل امراض کا علاج کرنے کے لیے معروف ہے۔ میں کل تمہیں اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی۔“

ساحل تو بہت تیزی سے پیش قدمی پر آمادہ نظر آتی تھی۔ وہ میرے ایک ایک معاملے کو گہری فکر مندی سے دیکھنے لگی تھی جو میرے لیے شدید فکر مندی کی بات تھی۔ اگر میں اس سیل آب کے سامنے کوئی مضبوط بند نہ باندھتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ ہمالے جانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔

میں نے ایک تکیہ اٹھایا اور بستر سے نیچے اتر آیا۔ وہ

حیرانی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”کماں جا رہے ہو وجدان؟“

”مجھے نیند آ رہی ہے۔“ میں نے ایک معنوی گمانی لیتے ہوئے کہا۔ ”میں اب سونا چاہتا ہوں۔“

وہ چمک کر بولی ”سوئے کے لیے تو یہ بیڈ ایجاد کیا گیا ہے اور تم ادھر قالین پر ڈیرا لگانا چاہتے ہو؟“

”بیڈ پر تم سو جاؤ۔“ میں نے کہا ”میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“

”نیگلی کی دھمکی سے ڈرتے ہو؟“ اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”میں نیگلی کی دھمکی سے زیادہ تمہاری بے باکی سے ڈرنے لگا ہوں ساحل!“

اس نے کھکھلا کر ایک قہقہہ لگایا اور چیخنے والے انداز میں بولی ”مجھے یقین نہیں آ رہا“ تم وہی وجدان ہو جو دس بارہ افراد کو چکیوں میں مسل ڈالتا ہے، جرائم پیشہ افراد اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں اور چوہدری نواز شعلی جیسا طاقت ور شخص اسے خود سے دور رکھنے کے لیے اپنے درجنوں گرگوں کو میدانِ عمل میں اتار چکا ہے۔“

ساحل کے انداز و وضاحت میں خطر نہیں بلکہ شرارت تھی۔ وہ گویا مجھ سے دل لگی کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ ”دل لگی“ دل کی لگی میں بدل جاتی، میں نے نہایت ہی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے باور کروانا ضروری سمجھا۔

”ساحل!“ میں نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شیر کے منہ کو ایک مرتبہ خون لگ جائے تو پھر اس کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔ کیا تم خود کو میرے لیے خون کی ندی میں بدلنا چاہتی ہو؟“

میرے اس سنسنی خیز سوال میں ہلا کی طاقت تھی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ بہ یک وقت آ کر گزر گئے پھر وہ سیدینگ ڈریس پینے کے لیے داش روم میں گھس گئی۔

میں نے بیڈ روم کے دروازے کے نزدیک قالین پر کبچہ رکھا اور دروازہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے ساحل روشن ہو گئی اور اپنی آنکھیں روشنی کی حرارت کو میرے موجود میں اتارنے لگی۔

ساحل کی بے باکی اگر اسی رفتار سے سفر کرتی رہی تو مستقل قریب میں میرے لیے بہت پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ رنگ سنت کی قیامت سرایا بیٹی سونیا سے دس ہاتھ

آگے دوڑنے کے موڑ میں دکھائی دیتی تھی۔

\*\*\*

رات کے آخری پردہ دروازے پر ہونے والی دھمکی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیوار گیر کھاک پر نظر ڈالا۔ اس وقت صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے آنکھ کر پڑا۔ دروازہ کھول دیا۔

سامنے امتیاز کمرابت جلدی میں نظر آتا تھا۔ ”خیریت تو ہے دوست۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”صبح صبح!“

وہ بڑی سرعت سے قطع کلائی کرتے ہوئے بولا ”تمہیں بتایا تھا نا، مجھے ایک اہم کال کا انتظار ہے۔“ منٹ پہلے وہ کال مجھے موصول ہوئی ہے۔ ”تم نے تو یہ بھی کہا تھا، مجھے کوئی انوکھا سراپا والے ہو؟“

”میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔“ وہ بیجان فہم میں بولا۔ ”یہ کال اسی سلسلے کی کڑی ہے۔“

میں نے پوچھا ”اور وہ سربراہ کماں ہے؟“ ”سربراہ تنگ پہنچنے کے لیے ہمیں اس فلیٹ سے کچھ فاصلہ طے کرنا ہو گا۔“ وہ دہے دہے جوش کے مارا ”میں تو بالکل تیار ہوں۔ تم بھی فوراً ریڈی ہو جاؤ۔“ ”جانا کماں ہے؟“ میں نے ابھین زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”گرین ہیلٹ کے ایک بنگلے میں!“

گرین ہیلٹ کے نام پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میرا اضطرابی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس علاقے میں زائد حسین کے گروہ کے کچھ افراد بھی ایک بنگلے رہتے ہیں!“

”ایگزیکٹو!“ اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی۔ ”اسی بنگلے میں داخل ہونا ہے جگہ!“

میں نے چونکا نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا ”کوئی خاص بات ہے؟“

”تمہارے لیے سربراہ ہے۔ اس سے زیادہ عام اور کیا ہو گی!“

”کچھ وضاحت اس سربراہ کی بھی تو کرو دوست!“ ”جگہ! میں نے میر بخش کا سراغ لگایا ہے۔“ میں بے ساختہ اچھل کر رہ گیا!

میں نے حیرت آمیز خوشی سے اس کی طرف دیکھا ”کیا واقعی؟“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک نظریہ خبر سوچی ہوئی ساحل پر ڈالی اور دوبارہ امتیاز کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”یار رہے اتنی بڑی خبر ہے کہ تیاری میں ایک خود بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ بس میں لباس تبدیل کروں۔“

”ٹھیک ہے، میں لاؤنج میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ امتیاز نے کہا ”ساحل کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے روٹی کو ہر بات سمجھا دی ہے۔ ہماری واپسی سے پہلے اگر ساحل پیدا ہو گئی تو روٹی اسے پریشانی سے بچالے گی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے پر اکتفا کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ اندر از کندہ بشر چل رہا تھا۔ میں سیدھا واش روم میں گھس گیا۔

میر بخش کو ہم سے جدا ہوئے لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میاں زائد حسین والے ہوٹل میں قیام کے دوران میں وہ گزشتہ رات آخری پیر غائب ہو گیا تھا۔ ساحل کا شک درست ثابت ہوا۔ اسے میاں زائد کے ایما پر ہی غائب کیا گیا تھا۔ لیکن کہ امتیاز اس کی موجودگی ایک ایسے بنگلے پر بتا رہا تھا جو میزبان پر میاں زائد حسین کے آدمیوں کے استعمال میں تھا۔

میر بخش کے بارے میں ملنے والی اس اطلاع نے میرے رگ و پے میں سرت آمیز سنسنی دوڑا دی۔ وہ میرا سچا دوست اور وفادار ثابت ہوا تھا اور اب اسے میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک وہ زندہ اور سلامت ہو۔

میر بخش کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے دو منٹ میں کپڑے بدلے اور تیسرے منٹ پر میں امتیاز کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور پوچھا ”کوئی تھیادو غیروہ تمہارے پاس؟“

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ”کہو تو لے آؤں۔“ بیک کے اندر ایک پمفلٹ رکھا ہے جو میں نے گزشتہ رات ”مضامین کمپلکس“ کے نزدیک ایک معرکے میں میاں زائد کے ہندوں سے چھینا تھا۔

امتیاز نے اپنے لباس سے ایک اسمبل باؤی پمفلٹ نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”اسے اپنے پاس رکھ لو۔ پوری طرح محفوظ ہے ضرورت پڑنے پر بہت کام آئے گا۔“

میں نے پمفلٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور کہا ”دب تم؟“

”میرے پاس ہے اسلحہ۔“ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چلو آؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

اگلے ہی لمحے ہم دونوں فلیٹ سے باہر تھے۔ ہم نے نہایت ہی محتاط انداز میں زینے طے کیے اور بلڈنگ کے داخلی گیٹ پر پہنچ گئے۔ اس گیٹ کی ایک ایک چابی بلڈنگ کے تمام کینوں کے پاس رہتی تھی تاکہ وقت بے وقت اسے اپنی سہولت اور ضرورت کے تحت کھولا جا سکے۔ عموماً رات بارہ بجے یہ گیٹ بند کر دیا جاتا تھا۔ امتیاز نے گیٹ کھولا اور باہر آ کر دوبارہ لاک کر دیا۔

بلڈنگ سے باہر آ کر امتیاز پیدل ہی ایک جانب پلٹ پڑا۔ میں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا ”کیا گرین ہیلٹ کا علاقہ یہاں سے قریب ہی ہے؟“

اس نے بتایا ”طارق روڈ اور گرین ہیلٹ ایک ہی علاقہ یعنی ”لی ای سی ایچ ایس“ میں واقع ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم وہاں تک پیدل جائیں گے۔ دونوں مقامات کے درمیان پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو ہے۔“

”اور ہم تو؟“ میں نے واستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ وہ میرے جھپٹے کی تک پہنچ گیا، جلدی سے بولا ”ہم احتیاطاً تھوڑا پیدل چلیں گے وجدان۔ تم فکر نہ کرو، ادھر کینے ڈی خان کے نزدیک ہمارے لیے ایک گاڑی تیار کر لی ہے۔“

دو گھنٹاں گھومنے کے بعد ہم کینے ڈی خان کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز ایک یلوکب کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ”آؤ وجدان۔ ہم اس گاڑی میں جا سکیں گے۔“

یلوکب ہمارے اندر بیٹھے ہی اشارت ہو چکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈرائیور صورت شخص موجود تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی اس نے یلوکب آگے بڑھا دی۔

میں نے امتیاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کیا ہم اس ٹیکسی میں گرین ہیلٹ تک جائیں گے؟“

”یہ دیکھنے میں ایک ٹیکسی ہے۔“ امتیاز نے بتایا ”مگر بیش پر انیٹ استعمال میں رہتی ہے جاوید کو اپنا ہی بندہ سمجھو۔“ اس نے ڈرائیور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے ہم جس قسم کے مشن پر جا رہے ہیں اس میں ٹیکسی کا استعمال زیادہ موزوں رہتا ہے۔“

یلوکب میں طارق روڈ کو چھوڑ کر شاہراہ قائدین پر

”جی۔ میں نے امتیاز سے پوچھا ”یار! تم نے یہ نہیں بتایا، میر بخش کا سرخار تم نے کیسے لگایا ہے؟“

ڈرائیور جاوید کو امتیاز اپنا ہی بندہ کہہ چکا تھا۔ اس لیے اس کی موجودگی میں میر بخش کا تذکرہ کیا جاسکتا تھا۔ امتیاز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا ”زیادہ تفصیل سامنے کا تو ابھی وقت نہیں۔ مختصر آتا جان لو کہ میں نے آج صبح ہی میر بخش کی تلاش شروع کر دی تھی۔ میاں زاہد حسین اور اس کے گھر میرا خصوصی ٹارگٹ تھے۔ بالآخر میری یہ تلاش کامیاب رہی۔ میرے ایک ساتھی نے تھوڑی دیر پہلے اطلاع دی ہے کہ میر بخش اس وقت گرین بیٹ والے بنگلے میں موجود ہے۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے میری جانب دیکھا اور پوچھا ”کوہودان! یہ سربراہ تمہیں کیا لگا؟“

”فٹانسک!“ میں نے رُجوش انداز میں جواب دیا۔

یوکیک نے شاہراہ گھیل کو عبور کرنے کے بعد ایک سروس روڈ پر چڑھ کر چار چاند گلیوں میں سے گزر کر وہ ریلوے لائن کے قریب پہنچ گئی۔ خلاف معمول ہماری گاڑی نے ریلوے لائن کو اوپر سے کراس کرنے کے بجائے اس کے نیچے ”ایک پلیا میں سے راہ لی اور دوسری جانب پہنچ گئی۔ ہم لوگ ”سی مارکیٹ“ میں سے گزرے پھر چند لمحے ایک نالے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے اب ہم گرین بیٹ کے علاقے میں تھے۔ امتیاز نے ایک گلی کے کونے پر۔۔۔ یوکیک روکائی اور جاوید کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ہم قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ امتیاز نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”اس بنگلے کا مین گیٹ دوسری گلی میں ہے۔ ہم اس وقت بنگلے کی عین گلی میں ہیں۔ تم یہ بات تو سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہمیں بنگلے میں کہاں سے داخل ہونا ہے؟“

”اچھی طرح سمجھ گیا ہوں یار۔“

اس نے کہا ”میری آخری اطلاع تک میر بخش زندہ تھا۔ ہمیں اسے یہاں سے زندہ ہی لے کر جانا ہے کوہودان، چاہے اس کے لیے ہمیں میاں زاہد کے آدمیوں کی زندگیوں سے کیوں نہ کھیلنا پڑے۔“

”زندگی اور موت کی بسات میاں زاہد نے بچائی ہے۔“

میں نے گنہگار آواز میں کہا ”اور اس بسات پر مجھے کھیلنے کی کھلی دعوت بھی دی ہے۔ کھیلوں گا تو میں ضرور۔ اور کھل کر کھیلوں گا۔“

”تمہارے عراغ میں خاصی عجیب محسوس کر رہا ہوں

میں۔“ امتیاز نے چونک کر کہا۔

”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں یار! میں پُرسوج انداز میں کہا۔

”امتیاز۔۔۔ ایک بنگلے کے پچھواڑے رک گیا اور جانب دیکھتے ہوئے بولا ”ہمیں اس بنگلے کے اندر داخل ہے۔ میر بخش یہیں پر ہے۔“

میں نے گلی میں دونوں جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ طرف خاموشی کا راج تھا، یہ چوں کہ ایک عین گلی تھی۔ لے اسٹریٹ لائٹس کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں تھا۔ یہ ایک طرح سے ہمارے لیے خاصا سودمند تھا۔ کی گہری تاریکی میں ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر اپنے خوش اسلوبی سے نمٹ سکتے تھے۔

امتیاز نے رست واپس پر نظر ڈالی۔ وینٹ اینڈ وائڈ اندھیرے میں بھی اسے وقت بتا دیا۔ وہ دھستے لہجے میں ”ساڑھے تین بجے ہیں۔ بنگلے کے اندر موجود سامنے سے ہے، وہ لوگ سو گئے ہیں۔“

”سو گئے ہیں؟“ میں نے حیرت سے دہرایا ”راہ امتیاز نے کہا ”جگہ پر رات کا آخری پیر شریف کے لیے ہے۔ اس بنگلے کے کینوں کے لیے تو ابھی سنا وقت ہوا ہے۔“ پھر اس نے ایک آگھ دہائی اور بولا ”اطلاعات کے مطابق آج رات میاں راگ رنگ کی بھی تھی۔ چند ماہر ناپنے والیاں بلائی گئی تھیں۔ رات تک وہ تاج تاج کر خود کو توڑتیں، تھک کر چور ہو جاتیں۔ اپنے تماش بینوں کو تھکانے میں مصروف ہو جاتیں۔ وقت تک تمام مہمان اور میزبان ایک دوسرے میں ہوں گے، ہر کوئی دوسرے میں خود کو ڈھونڈ رہا ہو گا۔ کارروائی کے لیے یہ بالکل مناسب موقع ہے۔“

”اور ہمیں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔“

نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنے بازوؤں کی بجلی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

امتیاز معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بنگے بازوؤں کی وال کا جائزہ لینے لگا۔ مذکورہ دوبارہ مشکل با آہنی تھی۔ ہم آسانی آپک کر بنگلے کے اندر پہنچے۔ وہ بنگلا گلی کے آخری سرے پر واقع تھا اور خاصا ہی معلوم ہوتا تھا۔ آباد بنگلوں سے وہ کافی ہٹ کر تھا۔ شاید ایڈوائس کی یہ دولت میاں زاہد کے بندوں نے اسے آج گاہ بنایا ہوا تھا۔ اس گلی کے بیش تر بنگلے خالی تھے

چار بڑے قریبی نظریات۔

چار بڑے خیال ہے جگہ۔ امتیاز نے سرگوشیانہ انداز میں ”اس کے دوسرے ادھر ہو جائیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ناگہ سے مخصوص اشارہ بھی کیا۔

اس نے کہا ”یہ تو کرنا ہی ہو گا یار لیکن ایک بات مجھے الجھا رہی ہے۔“

”کی کون سی بات ہے بھی؟“

”تم نے نیکی کو گلی کے اس سرے پر کھڑا کر دیا ہے۔“

میں نے یوکیک کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا ”جب کہ میں نے یوکیک کی اس سرے پر واقع ہے اس میں کیا مصلحت ہے جگہ کی؟“

”مصلحت یہ ہے کہ میں میاں زاہد کے آدمیوں کو کسی قسم کے شک میں مبتلا ہونے کا موقع نہیں دیتا چاہتا۔“ امتیاز نے بتایا ”اگر گاڑی کو اس طرف کھڑا کر دیا جاتا تو وہ ان لوگوں کی نظر میں آسکتی تھی وہ فوراً یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اس عین گلی میں کون آیا ہے۔ اور وہ کس بنگلے میں گیا ہے جب کہ گلی کا وہ سرا روشن اور آباد ہے۔ ادھر ایک دو گاڑیاں بھی کھڑی ہیں اندر بیٹانی یا تھوٹیش کی کوئی بات نہیں۔“

”رائٹ ہو آرا!“ میں نے اس کا کندھا چھتے ہوئے کہا۔

آندھرو منٹ کے اندر ہم بنگلے کے اندر تھے۔ بنگلے کے اس عین حصے میں ایک چھوٹا سالان بنا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں جڑی گھاس دکھائی دے رہی تھی گویا وہاں گھاس اگانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پھولوں کے چند پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ بنگلے کے دونوں پہلوؤں میں اصل عمارت اور باؤنڈری کے درمیان پانچ فٹ کے راستے چھوڑے گئے تھے یہ اہتمام ہوا کی گزر گاہ کے لیے کیا گیا تھا۔ عین لائن کوئی دس فٹ چڑھا تھا۔

میں نے کہا ”امتیاز! اس خاموشی اور سنائے سے تو لگتا ہے یہاں کوئی بھی نہیں۔“

”یہ خاموشی نہیں، مدہوشی ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا ”مدہوش اڑاتی ہے جگر اور یہاں بھی شباب اور مدہ کا عام استعمال ہوا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

بات اتنی واضح تھی کہ نہ سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے کے بعد پوچھا ”کیا پورگرام ہے یار؟“

”ڈبل پروگرام۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”ڈبل پروگرام کیا مطلب؟“

”ہم ان دونوں پہلوؤں والے راستوں سے الگ الگ

چلتے ہوئے عمارت کے سامنے والے حصے میں پہنچیں گے۔“

امتیاز نے پانچ فٹ گزر گاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس دوران میں ہم بنگلے کے اندرونی حصے کی کیفیت جاننے کی کوشش بھی کریں گے۔“

”اچھا آئیڈیا ہے۔“ میں نے سراپنے والے انداز میں کہا ”میں اس پہلو کی طرف جا رہا ہوں۔“ یہ بنگلے کا دایاں پہلو تھا تاہم عین سمت سے بایاں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا ”ہم میں سے جو بھی کوئی خاص بات نوٹ کرے، دوسرے کو بتائے گا۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔“

”آل رائٹ جگہ!“ امتیاز نے دو نوک لہجے میں کہا اور اپنے لباس میں سے لمبی نال والا ایک ریو لور پر آد کر لیا۔

ایسا خوف ناک ریو لور میں نے شان کو زری المعروف بہ جیمس ہائڈ ڈبل اسوین کی فلموں میں ہیرو کے پاس دیکھا تھا۔ اس فلم تک کا یہ جاسوسی کردار عالم گیر شہرت کا حامل ہے۔ شان کو زری کے بعد اور بھی بہت سے ہیروز اس کردار میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔

امتیاز کو دکھانے کے لیے میں نے بھی چائنا میڈ اسٹیل باڈی ہٹل ہاتھ میں لے لیا اور اس کی نال کو ایک بوسہ دینے کے بعد میں اپنے تختہ راستے کی جانب دبے قدموں بڑھ گیا۔

امتیاز نے دوسرے پہلو کی جانب قدم اٹھا دیے۔

تاریکی میں چند قدم اٹھانے کے بعد میں نے ہٹل دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا تاہم یہ وقت ضرورت میں اسے فوراً استعمال میں لاسکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی احتیاط سے گروڈچس کا جائزہ لیا اور ایک ایک کھڑکی کو چیک کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں اور اندرونی پروے بھی کھینچے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کے اندر لائٹ کے آثار محسوس ہوئے تو میں نے کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ دوسری جانب دیکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ میری وہ کوشش ناکامیاب رہی۔

کچھ دیر بعد میں بنگلے کے دائیں پہلو کا سفر پورا کر کے سامنے والے حصے میں پہنچ گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر بائیں جانب دیکھا۔ امتیاز مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ میری نگاہ کے سامنے بنگلے کا مین گیٹ تھا۔ میں نے دائیں بائیں چوکنا نظر سے دیکھا۔ وہاں کسی ذی روح کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں دبے قدموں گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

گیٹ متقل نہیں تھا، صرف اندر سے کندی لگائی گئی تھی۔ میں نے یہ آہستہ گیٹ کی اندرونی کندی کھول دی تاکہ یہ وقت واپسی ہمیں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں

واپس مڑا اور اس طرف قدم بڑھا دیے جدھر سے امتیاز کو آتا تھا۔ اس کو نے میں ایک پورچ بنا ہوا تھا۔ پورچ کے اندر سلیٹی رنگ کی ایک ٹیوٹا کرولا کھڑی تھی۔

میں جھٹکے کے بائیں پہلو کی سمت بڑھا تو امتیاز مجھے ایک جگہ کھڑا نظر آیا۔ وہ ایک کھڑکی پر آٹھ ٹکائے ہوئے تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔ جس کھڑکی پر امتیاز نے دونوں ہاتھ رکھ کر چوہا جھار کھا تھا اس کے پیچھے مجھے روکنی دکھائی دی۔

میں نے امتیاز کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔

میں نے سرگوشیاں انداز میں کہا ”دوسری طرف تو کچھ نہیں ملا۔ کیا یہاں کچھ ہے؟“

اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور آواز دیا کرولا ”اندر کھری ان دن۔“ پروگرام چل رہا ہے۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ میں نے ابھٹن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”خود ہی دیکھ لو۔“ امتیاز نے ہنس انداز میں کہا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا، کھڑکی کے اس کو نے سے اندرونی پردہ ڈرا سا سر کا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کے اس حصے پر آٹھ لگائی تو کمرے کے اندر نظر آنے والے منظر نے مجھے ساکت کر دیا۔ میری کنپٹیوں میں سنسنات ہوئے گی اور دل کی دھڑکن ایک بارگی بے انتہا بڑھ گئی۔

اندر چار مرد وزن فطری لباس میں ایک دوسرے سے سقم گھٹا تھے۔ ان میں ایک عورت اور تین مرد تھے۔ عورت خود کو ان کے جنگل سے نکالنے کی وجہی کو شش کرتی، وہ مل کر اسے ناکامیاب بنا دیتے۔ بالآخر عورت نے سیٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم لوگ انسان ہو یا جانور؟“

وہ بے بس عورت یقیناً چلا کر بولی ہوگی تاہم کھڑکی کے بند ہونے کے باعث اس کی مدغم آواز مجھ تک پہنچی تھی پھر اس عورت کے سوال کے جواب میں ایک مرد نے کہا۔

”ہم انسان ہی ہیں لیکن ہماری جبلت نے اس وقت ہمیں حیوان بنا دیا ہے۔“

”میں نے ایسے جمو کے موٹائی پوری زندگی میں نہیں دیکھے۔“

”تو اب دیکھ لو۔“ ایک مرد بے ہودگی سے بولا۔ میں اس سے زیادہ بداداشت نہ کر سکا۔ نہ سننا اور نہ ہی

دیکھنا۔ اس وقت میرے جسم کا سارا خون دماغ کو چڑھ رہا تھا۔ میں نے نظری نظر میں امتیاز کو اشارہ کیا اور اس کو کھڑکی پر ابر میں نظر آنے والے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

وہ کمر عام عمارت سے تھوڑا الگ تھلگ تھا میرا سروٹھ کو اوڑھ رہے تھے۔ اس کمرے کے اندر جو کچھ جا رہا تھا میں اس کی تک پہنچ گیا۔ وہ عورت یقیناً اپنے کمر سے وہاں پہنچی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں وہاں سے واسطہ پڑے گا۔ بہرحال اس وقت وہ غمگین تھی۔ شاید وہ انہی تپنے والوں میں سے کوئی ایک تھی۔

امتیاز کے مطابق، آج رات اس جنگل کو روکنے کے لیے تھیں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ جنگل میں کوئی چوکیدار یا ملازم وغیرہ کیوں دکھائی نہیں دیتا تھا!

میری دستک کے جواب میں اندر خاموشی چھا گئی۔ ایک مرد کی آواز ابھری ”اس وقت باہر کون ہو سکتا ہے؟“

میں اب دروازے کی چول سے کان لگائے کھڑا دوسرے مرد نے کہا ”بے ہوگی کوئی بی بی دلی۔“

”بی بی دستک نہیں دے سکتی!“ پہلے مرد نے تشویش سے انداز میں کہا۔

”کیوں نہیں دے سکتی۔“ دوسرا بحث پر اتر آیا ”متم کوئی احمق جانور نہ سمجھو۔“

تیسرے نے کہا ”تم دونوں بی بی بحث میں پڑ کر اپنا بازو کھٹا کر رہے ہو۔“

مجھ ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں بچ رہی تھی۔ میں نے چلی جانے کی اور ابھی تو ہم نے پہلے نے تیسرے کی بات کالی اور بولا ”میتا چلی گئی!“

دوبارہ بھی آسکتی ہے مگر ہماری جان چلی گئی تو واپس نہیں آسکتی۔ اس دستک کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“

”اے بزدل کہیں کے۔“ دوسرے نے کہا ”مرد“

انتاڑتے ہو۔ پتا نہیں صاحب نے تمہیں اپنے پاس لگا کیوں رکھا ہے اور وہ بھی چوکیدار اور گارڈ کی ملازمت ہے۔“

”اس وقت تو جبار وردی میں ہوتا ہے نہ۔“ اور ان ہاتھ میں کلا شکیف بھی ہوتی ہے۔“ تیسرے نے طنز سے

میں کہا۔ ”اور اس وقت بے چارہ نہ بونی فارم میں ہے اور اس کے پاس کوئی ہتھیار ہے۔“

میتا نامی اس پیشہ ور نے کمری چوٹ لگائی ”اس کنڈیشن میں تو یہ جلی بھاری مظارہ کر سکتا ہے!“

”تم لوگوں کو مذاق سوچ رہا ہے۔“ جبار نامی چوکیدار نے

لہجے میں کہا ”میں نے واضح طور پر دستک کی آواز سنی ہے۔ ہمیں پہلے باہر جھانک کر دیکھ لینا چاہیے۔ پورے اطمینان کے بعد ہی۔“

جبار نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ اس کو بزدلی کا طعنہ دینے والے نے کہا ”اس سے پہلے کہ تم ہم میں سے کسی کو دروازہ کھولنے کے لیے کہو، میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔“

یہ کلام تمہارے بس کا تو ہے نہیں! اس شخص نے جبار کی مشکل آسان کرنے کی بات کی تھی۔

اس شخص نے جبار کو ہاتھ پر جھانکنا چاہتا تھا۔ یہ الفاظ تھی یعنی وہ خود دروازہ کھول کر باہر جھانکنا چاہتا تھا۔ یہ الفاظ دیکھ کر اس نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ اب مجھے نہ تو

دروازہ کھولنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی دروازہ کھولنے کے لیے مزید دستک کی۔

میں تن کو روپی طرح تیار دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی اندرونی کندی گرائی گئی پھر ہینڈل کھونٹنے کی آواز آئی۔ جیسے ہی دروازے کے پٹ سے فریم کو چھوڑا، میں نے ایک ڈبل پینٹا چیلش دروازے پر رسید کر دیا۔

دروازے کا پٹ عقب میں موجود شخص کے منہ پر پڑا۔ ضرب اتنی زور دار تھی کہ وہ تکلیف کی شدت سے ہلکا اٹھا۔ اسی اثنا میں ہم دونوں بھرا مار کر کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔

امتیاز نے دروازے کو اندر سے لوٹ کر دیا۔ چوکیدار نے اس نے بڑی سرعت سے بیڈ شیٹ کو کھینچا اور ستر پوٹھی میں مصروف ہو گئی۔

منہ پر دروازے کا پٹ کھانے والے کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا۔ دوسرے دونوں افراد ڈرے سے ایک جانب کمرے تھے۔ اس وقت وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ انہیں اٹھ کر کھڑکی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

زخمی ہونٹوں والے نے سرسرائی آواز میں پوچھا ”کون ہو تم لوگ۔“ اور جنگل میں کیسے داخل ہوئے ہو؟“

”اگر یہ تمہارا پہلا اور آخری سوال ہے تو اس کا جواب میں ضرور دوں گا۔“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے دیکھا ”تو بھوتخوہر ہے؟“

وہ حذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ بھی سمجھا تھا کہ اس سوال کے بعد اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ امتیاز نے اس کی حیرت آمیز برائی کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا منظر نظر

اس پر واضح کر دیا ”ہم خدائی فوج دار ہیں۔ اور ایسے لوگ کبھی بھی کسی بھی طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ اب تم تینوں

میں سے ایک کو رہا کر دو۔“

اس شخص نے جبار کی بات کی تھی۔ وہ بھی سمجھا تھا کہ اس سوال کے بعد اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ امتیاز نے اس کی حیرت آمیز برائی کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا منظر نظر

اس پر واضح کر دیا ”ہم خدائی فوج دار ہیں۔ اور ایسے لوگ کبھی بھی کسی بھی طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ اب تم تینوں

میں سے ایک کو رہا کر دو۔“

اس شخص نے جبار کی بات کی تھی۔ وہ بھی سمجھا تھا کہ اس سوال کے بعد اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ امتیاز نے اس کی حیرت آمیز برائی کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا منظر نظر

اس پر واضح کر دیا ”ہم خدائی فوج دار ہیں۔ اور ایسے لوگ کبھی بھی کسی بھی طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ اب تم تینوں

میں سے ایک کو رہا کر دو۔“

مجھے بچوں کی طرح کم از کم ایک ایک چٹنی پسینہ لو تاکہ تمہارا حساب کتاب ہو سکے۔“

”ہم نے ایسا کیا کیا ہے؟“ جبار منمنایا۔

امتیاز نے اس کے گال پر اٹنے ہاتھ کا پتھر رسید کیا اور خون خوار لہجے میں بولا ”تم نے سنا نہیں پاس نے کیا کیا تھا! پہلا اور آخری سوال؟ اور تم نے ایسا دیا، جیسا تیسرا سب کیا ہے۔“

امتیاز نے مجھے پاس ظاہر کر دیا تھا۔ وہ تینوں ریوالتور کی زد پر اپنے لباسوں کو تلاش کرنے لگے۔ بیڈ شیٹ میں نیم لپٹی ہوئی میتا نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے تو سوال کرنے کی اجازت ہے نا؟“

”پوچھو، کیا پوچھنا ہے تمہیں۔“ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

”کیسے تم لوگوں کا تعلق پولیس سے تو نہیں؟“

امتیاز نے اس کی بات کا جواب دیا ”تم جیسی عورتوں کا دھندا تو پولیس کے تعاون سے چلتا ہے۔ تمہیں پولیس والوں کی کیوں فکر ہو گئی۔ وہ تو اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ آج کی آمدنی میں سے ان کا حصہ تم نے یہاں

آنے سے پہلے پیشگی انہیں پہنچا دیا ہو گا۔“

میتا جیزب ہو کر رہ گئی۔ وہ دھاتی ہوئی جوانی کی طوائف تھی۔ عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہوگی تاہم اس نے خود کو فٹ رکھنے کے لیے خاصی محنت کی تھی اور پینتالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

اسی دیر میں امتیاز نے تینوں مردوں کا مختصر انٹرویو لیا۔ ان میں ایک تو وہی بزدل چوکیدار جبار تھا، دوسرا خود کو بھادر ظاہر کرنے والا ڈرائیور تھا۔ اس کا نام ضیف معلوم ہوا۔

تیسرا شخص گھریلو ملازم عثمان تھا۔ جنگل کے اندر ان چاروں کے علاوہ دو مرد اور دو عورتیں مزید تھیں۔ دونوں عورتیں میتا کے ساتھ آئی تھیں اور جنگل کے اندر صاحب اور اس کے دوست کی تقریر کا سامان بنی ہوئی تھیں۔ میتا ان کی مدیم تھی جو زیادہ کمانے کے لالچ میں ان تینوں نریدوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اندر موجود عورتوں کے نام سوینی اور رخ معلوم ہوئے۔

میتا بڑی کمری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھماک عورت میرے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی

بالآخر اس نے پوچھا۔

”مان لیا تم خدائی فوج دار ہو لیکن یہ بھی تو بتا چلے کہ یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟“

میتا بڑی کمری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھماک عورت میرے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی

بالآخر اس نے پوچھا۔

”مان لیا تم خدائی فوج دار ہو لیکن یہ بھی تو بتا چلے کہ یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟“

میتا بڑی کمری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھماک عورت میرے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی

بالآخر اس نے پوچھا۔

”مان لیا تم خدائی فوج دار ہو لیکن یہ بھی تو بتا چلے کہ یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟“



”تھک“ کی ایک آواز سدا ہوئی اور جبار اپنا سینہ بٹھا  
ہوئے پیچھے کی جانب الٹ گیا۔ امتیاز کے سامنے لگے  
ریو الورنے اس کے دل میں چھید ڈال دیا تھا۔  
”جنگ ہونے کا دعویٰ دار جب دروغ گوئی کرتا ہے تو اس

ہماری اس گفتگو سے ڈرامیور حریف نے فائدہ  
اور اس نے لیکر امتیاز کے ریوالور والے ہاتھ پر قبضہ  
دیا۔ اس اچانک حملے سے ٹریگر پر امتیاز کی انٹلی دبا

شاگرد نامی اس شخص کی آواز اب بہت قریب سے آ رہی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ اس کمرے کے نزدیک پہنچ گیا تھا جہاں اس وقت ہم موجود تھے۔

حقه 8

”عثمان۔ جابر۔“ وہ جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں اپنے ملازمین کو پکار رہا تھا ”وہ بڑھی حرافہ جتنا کس کو نے میں جا چھپی ہے۔ اس سے کہو، جلدی بنگلے کے اندر پہنچے۔ رخ کو کچھ ہو گیا ہے۔“

”ہائے میں مر گئی۔ میری بچی؟“ مینا بے ساختہ سینہ تھام کر برستے نکل آئی۔

اس کے بدن پر لباس نامی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ رخ کے بارے میں سنتے ہی وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔ امتیاز نے اس کا لباس اس کی جانب پھینکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ”فورا اسے پہن لو۔ شاکر کے سامنے، یہاں کی صورت حال تمہارے چہرے سے نہیں جھلکتا چاہیے۔ اس کی بات غور سے سنو اور بنگلے کے اندر چلی جاؤ۔ اگر تم نے میری ہدایت نہ کی، خلاف ایک سانس بھی لی تو سمجھ لینا، اسی وقت ایک بے آواز گولی تمہارے بدن میں اتر جائے گی۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی ہو، میں کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتا!“

وہ جلدی جلدی اثبات میں سر ملانے لگی پھر اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

لباس پہننے کے بعد اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا ”شاکر صاحب ان تینوں کے بارے میں کوئی سوال کریں تو کیا جواب دوں؟“ اس نے ان تینوں کی لاشوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

”تم کہہ سکتی ہو کہ یہ اپنا کھیل مکمل کرنے کے بعد سکون کی نیند سو رہے ہیں۔“ امتیاز نے بے پروائی سے کہا ”کمرے کے اندر وہ آئے گا نہیں، تم دروازے پر ہی اس سے بات کر لینا اور اس کے ساتھ چلی جانا۔ ویسے تم شاکر سے کچھ غلط بھی نہیں کہو گی۔ یہ تینوں واقعی سکون کی ابدی نیند سو رہے ہیں۔“

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی پھر شاکر کی چنگھاڑ سے مشابہ آواز اندر پہنچی ”عثمان!۔ اگر تم لوگ بڑھا پے سے جنگ میں مصروف ہو تو تھوڑی دیر کے لیے سیز فائر کر دو۔ یہ نامراد کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ اس وقت تم سے زیادہ رخ کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ اندر کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔ شاید اسے کوئی دورہ وغیرہ پڑ گیا ہے۔“ شاکر کی آواز نشتے سے بوجھل تھی۔

میدم مینا نے یہ سنتا تھا کہ لپک کر دروازے پر آئی اور بجلی کی سی سرعت سے بولٹ گرانے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اچک کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔ باہر

کھڑا شاکر نامی وہ شخص کو شش کے باوجود بھی اندر آ گیا ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

اس موقع پر مینا نے واقعی سمجھ داری کا ثبوت دیا جذبات سے لبریز آواز میں بولی ”کیا ہوا ہے رخ کو؟“

”خود ہی آ کر دیکھ لو۔“ شاکر سٹپٹائے ہوئے لہجے پھر کمرے کے اندر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے مینا کو سوال کیا ”وہ تینوں کہاں ہیں؟“

”تھک کر سو رہے ہیں۔“ مینا نے دروازے پر نکلے ہوئے کہا۔

”سارے گدھے کے بچے۔“ شاکر نے زبردستی ملازمین کو ایک کلاسیکل ناقابل اشاعت گالی دی اور بے لیے مڑ گیا۔

مینا نے پلٹ کر اطمینان بھری نظر سے کمرے کا دیکھا اور شاکر کے پیچھے چل دی۔

میں نے امتیاز سے کہا ”یار! ہمیں ان کے پیچھے کا کے اندر دینی حصے میں پہنچ جانا چاہیے۔“

”میرا بالکل یہی ارادہ ہے۔“ وہ اثبات میں مل ہوئے بولا ”میتا پر ہم زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یہ عورت کسی بھی وقت ہمارا بھانڈا چھوڑ سکتی ہے۔“

میں ہمیں اس کمرے سے نکلتا ہے۔

بات ختم کرتے ہی اس نے کمرے میں موجود لاشوں پر ایک اچھٹی سی نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔

اس کی تھلید میں قدم اٹھا دیے۔ شاکر اور مینا تھوڑے فاصلے پر آگے جا رہے تھے۔ امتیاز نے میرے سر کو شش کی۔

”شاکر اس وقت پوری طرح ہوش و حواس نہیں آتا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں بنگلے کے حصے میں پہنچنے میں کافی آسانی رہے گی۔“

میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا ”تمہیں صد فی صد یقین ہے کہ میرے بخش اس وقت آزاد موجود ہے؟“

”صد فی صد نہیں بلکہ ایک سو ایک فی صد ہو۔“ وہ چٹائی لہجے میں بولا ”مجھے ملنے والی اطلاعات ہی نہیں سکتیں۔“

ہم ان دونوں کے تعاقب میں انتہائی احتیاط سے بنگلے کی اندرونی عمارت میں پہنچ گئے۔ جب مینا، شاکر

ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گئی تو میں نے کہا۔ ”یار امتیاز! مینا نے بتایا تھا کہ شاکر یہاں کا کرنا

ہے۔ اگر ہم اس پر قابو پالیں تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

”جگرا تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔“ امتیاز خوشی سے بھل اٹھا۔

اس وقت ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس بنگلے میں مسینہ طور پر صرف دو افراد ایسے رہ گئے تھے جن سے ہمیں تشنا تھا۔ ایک نیم بدوش شاکر اور دوسرا اس کا دوست جو مینا کی لڑکی سوینی کے ساتھ مصروف تھا۔ ہمارے لیے یہ ایک انتہائی آسان ٹارگٹ تھا لہذا ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

میری نگاہ نے ایک وحشت انگیز منظر دیکھا۔ چاند چرو رخ ایک کنگ ساڑ بید رہے ہوش پڑی تھی۔ سینے تک اس کا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس چادر کے نیچے وہ یقیناً بے لباس ہوئی۔ مینا بے تابی سے جھنجھوڑ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وحشی شاکر نے جانے اس کے ساتھ ایسا کیا کر دیا تھا کہ وہ کولر سی لڑکی ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔

بید کے نزدیک ہی زبانی پر ایک کلرٹی وی آن تھا جس پر ایک یورپی چینل چل رہا تھا ”دوکس“ نامی اس چینل پر غریبوں والی فلم: انا سانی جاری تھی۔ وہ کوئی تربیتی فلم تھی جس میں ٹاپ ماڈل کال گرلز کو پیشہ ورانہ تعلیم دی جا رہی تھی۔ یورپ اور امریکا میں ایسی فلم بندی اور فلم بنی عام سی بات ہے!

اگر ہم نے کمرے کے اندر کی صورت حال کو اس تفصیل سے جان لیا تھا تو ممکن نہیں تھا کہ اندر والے ہمیں نہ دیکھ پائے ہوں۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی شاکر اور مینا نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا تھا۔ مینا ایک نظر ہم پر ڈالنے کے بعد رخ کی جانب متوجہ ہو گئی تاہم شاکر جیٹھی جیٹھی سرخ آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے غصے سے بولا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

”تمہاری ماں کے یار۔“ امتیاز نے زہر خند لہجے میں کہا اور ربوہ اور کارن شاکر کی جانب موڑتے ہوئے بولا ”میر بخش کہاں ہے؟“

”میر بخش!“ شاکر نے زپ لب دہرایا اور اگلے جیسے ہوش آ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا زیادہ نشے میں نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ میں

نے شاکر کی آنکھوں میں اپنے لیے شناسائی کی چمک دیکھی۔ چونک اٹھا۔

اسی لمحے وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولا ”آواز میں بولا“ وجدان۔ اولاد شیطان۔ تم یہاں کی گئے!“

”میں عن قریب تمہارے پرائیویٹ باب میں حسین اور سنی پرائیویٹ دادا چوہدری نواز علی کی طرف تک بھی پہنچنے والا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ”مستر شاکر! باقی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ فی الحال صرف اتنا بتاؤ میرا ساھی میر بخش کہاں ہے؟“

میں نے اس کے نام سے مخاطب کیا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اس کا نقش تقریباً ہوا ہو چکا تھا۔ ٹوٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو تمہیں میرا نام بھی معلوم ہو چکا ہے۔“

میرے بجائے امتیاز نے اسے لٹاؤ ”صرف ہاں نہیں“ ہم تمہارا پورا خیمہ نسب بھی جانتے ہیں۔ تم خبیث بن فلاں مباحیثیت کی اولاد ہو۔“

ہمیں باتوں میں لگا کر شاکر نے ایک چالاکي دکھائی۔ کوشش کی۔ اس کا ہاتھ بڑی سرعت سے تلے کے نیچے اور ایک پستول لے کر باہر آ گیا۔ اس نے سیکنڈ کے حصے میں مجھے نشانہ بنا کر گولی داغ دی۔

فائر کی آواز بند کمرے میں ایک دھماکے کی طرح لیکن میں کسی بھی قسم کے ضرر سے محفوظ رہا۔ میں آڑ کے نشانے پر موجود رہتا تو گولی میرا کچھ بگاڑ سکتی۔ مینا اس کا پستول والا ہاتھ سیدھا ہوتے ہی فضا میں پروانہ ڈبل فرٹ سمرسالت لگاتے ہوئے عین شاکر کے منہ گیا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں پستول کا رخ میری جانب چاہا لیکن اسی وقت میرے پاؤں کی ایک ذرہ دار ٹھوکر ٹھوڑی پر لگی۔

وہ بلبلائے ہوئے پیچھے بستر پر الٹ گیا۔ وہ پٹ پٹ بے ہوش رخ پر گر اٹھا۔ مینا کی ”لڑکی“ نے حیرت انگیز آنکھیں کھول دیں۔

میرے حملے نے شاکر کے ہاتھ سے پستول جھڑوا اتفاق سے وہ پستول سیدھا مینا کے سامنے جا گرا۔ مینا پستول پر قبضہ کیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ہم سب کو نشانے پر رکھتے ہوئے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

”تم سب جنم میں جاؤ اور وہیں جا کر اپنی ڈنگالتے رہو۔ مجھے اور میری لڑکیوں کو ابھی یہاں سے

دلی ہمارے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرے۔“

”میر بخش! تم نے گلی“ ٹھو میری پیچی۔ ہمت کرو۔ میں سوئی کو بھی ملائی ہوں۔“

میں سوئی کا فیصلہ میرے دل کو لگا، میں نے سراپنے والے مینا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بچت اسی میں ہے کہ فوراً انداز میں چکر ہو جاؤ۔ اپنی حفاظت کے لیے شاکر کا پستول سے پشتر ہو چکر ہو جاؤ۔ یہ بات تو ہمیں یاد دلانے کی ضرورت بھی ساتھ لے جاؤ اور یہ بات تو ہمیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے بارے میں تم نے زبان بند رکھا ہے۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گی مینا۔“ شاکر نے مینا کی جانب دیکھتے ہوئے حکمانہ لہجے میں کہا ”لاؤ“ یہ پستول مجھے دے دو۔ یہ دونوں ہمارے دشمن ہیں۔ میں ان پر قابو پاؤں گا۔ تم رخ کو سنبھالو۔“

اسی وقت کمرے کے دوسرے دروازے پر تیز دستک ہوئی پھر کسی نے تیش بھری آواز میں دریافت کیا ”شاکر بھائی! تم خیریت سے تو ہو نا۔ میں نے ابھی ابھی فائر کی آواز سنی ہے؟“

میں یک جہتکے میں سمجھ گیا۔ اس دروازے کی دوسری جانب وہ گر اٹھا جہاں شاکر کا دوست سوینی کے ساتھ موجود تھا۔ شاکر نے مجھ پر گولی چلائی تھی تو امتیاز انتہائی باہراندہ سرعت سے فرش پر رول کرتے ہوئے ایک جانب لڑھک گیا تھا۔ وہ اسی وقت اسی دروازے کے نزدیک پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔

شاکر نے بند دروازے کے پیچھے سے بولنے والے سے چلا کر کہا ”یار قبا! اوھر دو بد معاش گھس آئے ہیں۔ تم اپنی گن لے کر فوراً یہاں پہنچو۔“

میں نے امتیاز کو اشارہ کیا کہ مذکورہ دروازے کی کنڈی گرا۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ شاکر نے چیخ کر اپنے دوست کو مطلع کیا ”قبا! اس دروازے سے نہ آنا۔ دروازے کے پیچھے ایک بد معاش دیوار لے کر کھڑا۔“

اس کی سنسنی خیز اطلاع پوری ہونے سے پہلے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور کلا شکوف بردار قبا نامی وہ شخص کمرے کے اندر آ گیا۔ یا تو اس نے شاکر کی وارننگ سنی ہی نہیں لیا یا پھر اس کی بات کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صورت حال اچانک و اہمیت رخ اختیار کر رہی تھی۔

قبا نامی اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی شاکر ایک مرتبہ پھر

چلایا ”یہ وجدان ہے“ تمہارے بھائی اسحاق کا قاتل۔ اسے فوراً شوٹ کر دو۔“ وہ انگلی سے میری جانب اشارہ کر رہا تھا۔ قبا نے نفرت آمیز انداز میں مجھے دیکھا اور کلا شکوف کا ایک برست فائر کر دیا۔

اس موقع پر امتیاز نے برق رفتاری سے رد عمل کا مظاہرہ کیا اور ٹریگر پر قبا کی انگلی دبنے سے پہلے ہی وہ اس کی کلا شکوف کو ایک ٹھوکرا کر چھت کی جانب موڑ چکا تھا۔ گولیوں کی ترزا ہٹ سے کمرہ گونج اٹھا۔ تمام گولیاں چھت میں گئی تھیں اور وہاں جاہ جاپلا سٹراڈھڑ کر رہ گیا۔ اس فائرنگ کے ساتھ ہی دوسرے کمرے سے سوینی کی انتہائی کمرہ بھی چیخ بلند ہوئی۔

امتیاز کلا شکوف کو ٹھوکرا کرنے کے بعد لوٹ لگا کر ایک چوٹی الماری کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ قبا نامی کلا شکوف بردار دوبارہ میری جانب متوجہ ہوا تو اس کے چہرے میں ایک شناسا جھٹک دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وباٹ شیرڈ میں جن تین افراد نے ریلوے اسٹیشن سے ہمارا تعاقب کیا تھا ان میں کلف دار شلوار قمیص والا ایک فریہ شخص بھی تھا۔ قبا اس موٹے سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے شاکر نے قبا کو مطلع کیا تھا کہ میں اس کے بھائی اسحاق کا قاتل ہوں۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ قبا اس موٹے کا بھائی تھا۔ سفید شیرڈ والے تین افراد ”سی ایف کے“ والوں۔ فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے لیکن یہ ہلاکتیں وقت کی ستم خیزی نے میرے کھاتے میں ڈال دی تھیں۔

قبا (بعد میں اس کا نام یعقوب معلوم ہوا) مجھ پر فائرنگ کرتے ہوئے ٹھوڑا سا چٹکیا کیوں کے میرے عقب میں بیٹا اور رخ موجود تھیں اور پٹاؤں میں شاکر بھی بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسی لمحے سوینی بھی خوف زدہ انداز میں بھاگتے ہوئے اپنی ”ماں“ مینا کے پاس پہنچ گئی۔

یعقوب کی لٹائی چٹکیا ہٹ سے امتیاز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے الماری کے عقب سے ٹاک کر یعقوب کے ہاتھوں کا نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو بے آواز فائر کر دیے۔

یعقوب عرف قبا جیتنے ہوئے پیچھے ہٹا اور کلا شکوف اس کی گرفت سے نکل کر دوڑ جا گری۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے نہ ہٹاؤں اور کلا شکوف پر قبضہ کر لیا۔ قبا اور شاکر وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

”اب کیا ارادہ ہے شاکر! میر بخش کے بارے میں بتاتے

ہو یا تم دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دوں؟  
"میر بخش اس بیگے میں نہیں۔" شاکر نے کس انگلیوں  
سے یعقوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر کہاں ہے؟" میں نے استفسار کیا۔  
"مجھے نہیں معلوم۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

اقباز نے کہا "وجدان! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔  
فائرنگ کی آواز کسی حد تک باہر بھی گئی ہوگی۔ اگرچہ یہ رات  
کا آخری پہر ہے۔ لوگ گہری نیند میں ہوں گے لیکن کوئی شب  
بیدار اس جانب متوجہ ہو سکتا ہے۔ تم ان سیہ کو کور کرو۔ میں  
خانہ تلاشی لے کر آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کلا شکوف کو ریڈی آن  
کرتے ہوئے کہا پھر اقباز نے پوچھا "ان کا کیا کرنا ہے؟" میرا  
اشارہ میڈم مینا اور اس کی لڑکیوں کی جانب تھا۔

وہ مینا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "تم اپنی لڑکیوں کو لے  
کر واش روم میں.... جاؤ اور ان کے لباس پر توجہ دو۔  
تمہارے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے۔" پھر اس نے  
میری جانب مڑتے ہوئے کہا "انہیں فی الحال جانے کی  
اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

بات ختم کرتے ہی وہ مینا کے پاس پہنچا اور اس کے ہاتھ  
سے شاکر والا ہینٹول جھپٹ لیا۔ اقباز کے ریوالور کی جھٹ  
گولیاں فائر ہو چکی تھیں۔ اب اس کے تمام پیسیرز خالی ہو  
گئے تھے۔ اسی لیے اقباز نے وہ ہینٹول اپنے قبضے میں کھینچا  
البتہ میرے پاس فلی لوڈڈ اسمبل باڈی ہینٹول خاموشی سے  
آرام فرما رہا تھا۔

اقباز کی ہدایت پر مینا، سوینی اور رخ کے ساتھ لمحہ  
واش روم میں ٹھس گئی اور میں ان دو سوراخوں کی جانب  
متوجہ ہو گیا جو اس وقت نہ سونے تھے اور نہ ماؤں بلکہ صرف  
"میاؤں میاؤں" ہو کر رہ گئے تھے۔ کلا شکوف کے نشانے پر  
وہ بے دست دبا ہو کر رہ گئے تھے۔

شاکر نے مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتے ہوئے  
کہا "وجدان! تم ابھی نئے نئے جرم کی دنیا میں آئے ہو اسی  
لئے میاں جی کی طاقت کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تمہاری بھلائی  
اسی میں ہے کہ اس کارروائی سے باز آجاؤ۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم مجھے یہ مشورہ اس لیے  
دے رہے ہو کہ شاید تمہارا میاں بھی میرے بارے میں  
تفصیلاً نہیں جانتا۔ میں تو شیر خوار کی عمر ہی سے تمہاری  
خصوص دینا میں قدم رکھ چکا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچنے  
کے بعد تو میں نے دارا جیسے بدنام زمانہ شیطان ابن شیطان

سے بچنے آزمائی شروع کر دی تھی۔"

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "کیا ہمارے درمیان  
نہیں ہو سکتی؟"

میں یہ فوٹی اس کی چال سمجھ رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت  
کسی بھی اصول پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ مجھے کسی  
موقع حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جواباً میں نے اسے گھسٹا

دیا۔  
"کیوں نہیں ہمارے بیچ یقیناً دوستی ہو سکتی ہے۔  
نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ قدرے مطمئن نظر آیا اور میری جانب ہاتھ پیر  
ہوئے بولا "چلو، پہل میں کرنا ہوں۔ آج سے ہم  
ہیں۔ کلا شکوف پیچنگ کر میرے ہاتھ میں اپنا فائر  
دو۔"

میں نے اس کی مکاری کی تہ میں اترتے ہوئے  
لفظی جوتا مارا "مسٹر شاکر! تم نے دوستی کے لیے ہاتھ  
دیا ہے لیکن یہ بھول گئے کہ تمہیں میری دوستی کے  
اپنے میاں جی کی دشمنی مول لینا ہوگی۔ کیا تم یہ سوا لیا  
سکتے ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گر کر گرا  
آہر لہجے میں بولا "میں میاں جی کو سمجھانے کی کوشش  
گا۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ دراصل اس نے میاں زادہ جی  
سمجھانے کی بات اس طرح کی تھی جیسے کوئی بوی اپنے  
سمجھانے کا ذکر کرتی ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا  
یہ بات پوری سنجیدگی سے کر رہے ہو تو پھر میری کون  
تم الو گئے پیچھے ہٹو کیوں کہ تم مجھے بے وقوف مانے  
کوشش کر رہے ہو۔ تم میاں زادہ کی کھٹکلی ہو وہ تمہارا  
ہاتھوں کا ٹھکانا نہیں جو تم اسے ڈکیشن دے گے!"

اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار نمودار  
جیسے اس نے دل ہی دل میں مجھے کوئی طوفانی کالی دی تھی  
وہ منہ سے کچھ نہیں بولا "صرف دانت کچپا کر رہ گیا۔"

اسی وقت قویا نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ اپنے  
کو پکڑ کر دھرا ہوا پھر فرش پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا  
کے چہرے پر تکلف کے شدید تاثرات تھے یوں محو  
تھا "چاکا اس کے پیٹ میں کوئی خطرناک قسم کا دارو  
شاکر جھک کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور ڈکیشن  
لہجے میں پوچھنے لگا "کیا ہوا قویا۔ یہ اچانک تم زخمی ہو

مجھے ہو؟"  
میں بھی صورت حال جاننے کے لیے دو قدم آگے بڑھ  
تیا۔ قویا کی کیفیت نے مجھے بھی الجھا دیا تھا۔ جلد ہی اس کی  
مکاری کا پلٹا کھل گیا۔

میں قویا کی جانب متوجہ تھا کہ امتیاز جلدی سے کمرے  
میں داخل ہوا اور مایوسی بھرے لہجے میں بولا "وجدان! میں  
نے تمام کمرے اور دوسری جگہوں پر چیک کر لیا ہے میر بخش  
کا سرخ فیل نہیں رہا۔ کہیں ان کینوں نے اسے جان سے  
لے لیا؟"

اقباز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور قمر اکوڈ نظروں سے  
شاگرد کھینچے لگا۔

شاکر نے کہا "میں تو تم لوگوں کو پیسلے ہی بتا چکا ہوں کہ  
تمہارا مطلوبہ بندہ یہاں نہیں ہے۔ اب تم نے خود دیکھ کر  
تلی کر لیا نا!"  
"نہی تلی کی تو میں ایسی کیم نہیں کر دوں گا۔" اقباز نے  
سٹائی سے کہا پھر میرے ہاتھ سے کلا شکوف لے کر وہ  
جارحانہ انداز میں شاکر کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے قویا کے "درو قویا" کی قلعی کھل گئی۔  
مجھے ہنسا ہونے لگا کہ وہ کسی اسپرنگ کے مانند فرش پر اچھلا  
اور بے قابو گاڑی کی طرح سیدھا میری طرف بڑھا۔

اس کی اس برق حرکت نے غایت کر دیا کہ وہ شدید  
تکلیف کا بہانہ کر دین پر اسی مقصد کے لیے گرا تھا کہ کسی  
طرح مجھ تک پہنچ سکے۔

قویا نے کسی سرکاری سائیکل کی طرح میرے پیٹ میں ٹکر  
مارنے کی کوشش کی۔ اس کا نشانہ سچا تھا لیکن میں اس وقت  
فل ایکشن میں تھا۔ قویا کا سر "مارگٹ" تک پہنچنے سے پہلے  
ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

میرا یہ عمل میکا جی تھا، قویا اپنی ہی جھونک میں میرے  
قویہ سے گزرا پھر اس کا سر نیوی ٹرائی سے جا ٹکرایا۔ ٹرائی  
پر کھار ہوا اہیات پروگرام دکھانے والا ٹکرائی ڈی اس ٹکراؤ  
کے باعث لغزش اچھلا پھر ایک دو فلاپا بایاں کھانے کے بعد  
زخمی ہوا ہو گیا۔ اس طوفانی بوسے کے نتیجے میں ایک  
جھٹکے سے اس کا اسکرین چٹنا چور ہو گیا۔ ٹرائی پر رکھی ہوئی  
دیکر ایشیا بھی زلزلہ مچا کر بکھر گئیں۔

ابھی وقت واش روم کا دووا نہ کھلا اور "ماں بیٹیاں"  
چلائی ہوئی دہاں سے برآمد ہوئیں۔ وہ اس وقت مناسب  
لباس میں تھیں۔

مینا نے کمرے میں پھیلی ہوئی افرا تقری کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"  
"تمہاری لڑکیوں کی برائیاں آئی ہیں۔" میں نے بھرپور  
ہوئے انداز میں کہا "اس لیے پانے چھوٹ رہے ہیں۔"

جب ہم اس کمرے میں پہنچے تھے تو ہم پر نظر پڑتے ہی  
شاکر نے ٹی وی کو ری موٹ کنٹرول سے آف کر دیا تھا مگر اس کی  
پاور سپلائی جاری تھی۔ قویا سے ٹکراؤ کے بعد شاید اس کے  
اندرو کوئی شارٹ سرکٹ جیسا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ  
سے اس میں سے ایک دو مرتبہ کچھ آوازیں سی برآمد ہوئی  
تھیں۔ میرا اشارہ انہی آوازوں کی جانب تھا۔

"ہم تو جا رہے ہیں بھائی۔" مینا دونوں لڑکیوں کو سمیٹنے  
ہوئے ایک جانب بڑھی۔ اس وقت تک رخ باقاعدہ ہوش  
میں آچکی تھی۔

میں نے ڈانٹ کر کہا "کیس آئے جانے کی ضرورت  
نہیں۔ تم تینوں واپس ہاتھ دو م میں چلو۔"

انہوں نے مایوسی سے میری جانب دیکھا اور میرے حکم  
کی تعمیل کر دی۔ میں نے ان کے ہاتھ دو م میں داخل ہوتے  
ہی باہر سے کنڈی لگا دی۔ اب وہ اس وقت تک باہر نہیں آ  
سکتی تھیں جب تک وہ کنڈی کھولی نہ جاتی۔

میں نے پہلے رخ کو چاند چوکھا تھا۔ اس وقت تک میں  
نے پوری طرح اسے دیکھا نہیں تھا۔ اب مجھے محسوس ہو رہا  
تھا کہ میں نے اس کی ادھوری تعریف کی تھی۔ رخ درحقیقت  
چاند چوکھا ستارہ آنکھیں تھی۔

میں اس سے زیادہ رخ کے بارے میں سوچنے لگا کیوں  
کہ زخمی چہرے والا قویا میرے سر پہنچ گیا تھا۔ ٹی وی ٹرائی  
سے تصادم نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا، تاہم اس کی  
دانست میں، میں اس کے بھائی اسحاق کا قاتل تھا۔ اس لیے  
وہ مرے مارنے پر تڑپا گیا۔

وہ دونوں ہاتھ آگے نکال کر کچھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ مجھے  
اپنے بازوؤں کی گرفت میں دبوچنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے  
بازوؤں کو بڑی مہارت کے ساتھ اپنی ہڈیوں میں دبوچ لیا پھر  
دونوں ہاتھوں سے اس کی کپٹیوں پر کراس چوہ (CHOP  
CROSS) رسید کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے  
ایک دھکا دیتے ہوئے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ دونوں  
ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کی جانب گیا۔  
میں نے شارٹ اسٹیپ کے ساتھ ایک سائیز فلاٹنگ ٹک  
اس کے سر پر جڑی۔ وہ لڑھکتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مجروح  
ٹرائی کے پاس پہنچ گیا۔

اقباز پے در پے کلا شکوف کے بٹ شاکر کے منہ سر پر



خاصی دلچسپی ہے۔ اس کی تربیت کے لیے مل پارک بہت مناسب رہے گا۔

”بھگرا آج میں نے تمہارے آرٹ کا عملی مظاہرہ دیکھا ہے۔“ امتیاز نے سانس نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم نے واقعی شاولین ٹیبل سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اگر موقع ملا تو میں بھی تم سے کنگ فو کی چند ٹیکنیکس ضرور سیکھوں گا۔ پاکستان میں خالص چینی کنگ فو (KUNG-FU) کے ماہرین کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔“

”فکر نہ کرو! اب سمجھو یہ کی کافی حد تک دور ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنا لگا۔

میں نے بتایا میں مستقبل قریب میں یہاں کراچی میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

”ویل ڈن۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”تمہارے عزائم نے مجھے بڑی تقویت دی ہے۔ بھگرا۔ میں اس سلسلے میں پیش آنے والے فاضل معاملات کے بارے میں باس سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً اس پروجیکٹ کے لیے ہمیں مالی تعاون دیں گے۔“

”میں نے فائنل کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔“ میں نے سبکدوش والے معاملات سے اسے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

”مجھے کراچی میں سٹیل ہونے کے سلسلے میں کسی مالی پریشانی سے نہیں گزرنا پڑے گا یا۔“

امتیاز نے کہا ”میری دعا ہے“ اللہ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔“

میں نے پوچھا ”امتیاز! تم نے بتایا تھا کہ تم بھی کافی عرصہ مارشل آرٹس سیکھتے رہو ہو؟“

”ہاں! میں نے بانڈو (BANDO) اسٹائل میں براؤن بیلٹ تک سیکھا ہے۔ اس کے بعد میرا پارٹنر ملک سے باہر چلا گیا اور میں نے بھی ٹریننگ سینٹر جانا چھوڑ دیا۔“

میں نے کہا ”یار! تو حویزی سخت اور کر لیتے۔ بانڈو میں براؤن بیلٹ غالباً چھٹا گریڈ ہے۔ اس کے بعد بلیک بیلٹ کا درجہ آتا ہے۔ تم بھی بلیک بیلٹ ہو جاتے۔“

”غالباً نہیں بلکہ یقیناً براؤن بیلٹ کا چھٹا گریڈ ہے۔ وہاںٹ۔ سیلو اور نیو گرسن، بلو اور پھر براؤنٹ۔ بس میں بلیک بیلٹ سے ایک درجہ پیچھے رہ گیا۔“ ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے بے پروائی سے کہا ”خیر بھگرا کپڑے کی ان رنگ دار بنیوں میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز ہے ٹیکنیک میں

مہارت حاصل ہونا۔ جو کسر رہ گئی ہے۔ وہ میں تم سے سیکھ لوں گا۔“

”ضرور۔ ضرور۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔

پھر ہمارے درمیان ”مشن لیٹ ٹائٹ“ پر مختصر ٹیبل ٹوڈی دیر بعد ساحل اور رونی بھی واپس آئے۔

سب نے نماں دھو کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے اکثر اہم مذاہن تیار لے آئی تھیں۔

ناشتے کے بعد امتیاز نے کہا ”میں اور رونی آج کامیاب مصروف رہیں گے۔ ضروری نوعیت کے چند کام منسلک ہیں۔ تم لوگ فلیٹ پر آرام کرو۔ ویسے جاہو تو کھوٹے کھانے کے لیے نزدیکی علاقوں میں جاسکتے ہو۔ فلیٹ کی ایک چابی تمہارے پاس ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

رونی نے خاتون خانہ کے فرائض نبھاتے ہوئے ”فرنج میں کھانے پینے کی ہر چیز موجود ہے۔ تم لوگ نہ لچ کر سکتے ہو۔ ویسے یہاں آس پاس ہر قسم کے ہوٹل، ریسٹورنٹ دن بھر اور رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔ ہمارے ”فوڈ“ باہلی کیو اور ہر نوع کے لوکل کھانے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔“

میں نے امتیاز سے پوچھا ”ویسے تم لوگ کب تک آ جاؤ گے؟“

”شام تک۔ اور رات بھی ہو سکتی ہے۔ اس جواب دیا ”پاس کو اپنی تازہ ترین کارکردگی کی رپورٹ ہے اور تمہارے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”میں میری بخش کے لیے پریشان رہوں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”میرے بخش بڑی اطمینان بخش جگہ ہے۔“

تمہیں اس کے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں اس کے بارے میں معلوم کرنا رہوں گا۔ رات میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ آنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

لگ بھگ دس بجے وہ دونوں فلیٹ سے رخصت ہوئے۔

تعماتی میرا آئے ہی ساحل نے مجھے اپنے سوالوں کی بات لیا۔ میں اسے جانے بغیر منہ اندھیرے امتیاز کے ساتھ تھا۔ اس کی تشویش یہ تھی۔ اگرچہ رونی نے نہایت موزوں الفاظ میں اسے بریف کر دیا تھا تاہم وہ میرے سننے کی منتہی تھی۔

میں آدھے گھنٹے تک اس کے مختلف سوالات جواب دیتا رہا۔ میں نے شاکر کے بیٹلے پر پیش آنے والی حالات کی گنجینی کو مکمل حد تک کم کر کے اس کے سامنے

کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے اب اتنی سیانی ہو گئی تھی کہ میرے بیان کی گہرائی تک رسائی حاصل کر سکے۔

اس پوچھ آج کے اختتام پر اس نے اطمینان بھری سانس خانی کی اور کہا ”ہارڈ پڑھا کلا کلا شکر ہے۔ میرا بھتیجہ زلف سلامت ہم تک پہنچ گیا۔“

اس وقت ہم لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گرمی بڑھنے لگی تو میں نے کہا ”چلو ساحل اندر کمرے میں جا کر بیٹھے۔“

”جی۔“ مجھے گرمی نظروں سے دیکھنے کے بعد شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا ”کیا نیلگی کو ٹیٹ کرنے کا ارادہ ہے؟“

”تم کالی تیز نہیں ہوتی جا رہی ہو؟“

”کس حوالے سے؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے کہا ”ہر ہر حوالے سے۔“

”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے میرا کچھ زیادہ ہی تیز ہونا ظاہر ہو۔“ وہ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی ”تم نے خود ہی بتایا ہے نا“ نیلگی نے دعویٰ کیا تھا کہ جب بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں جاؤ گے وہ تمہاری غلطی میں چل آئے گی۔“

”اس کا دعویٰ کل درود پورالے واقعے کے بعد غلط ثابت ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ممکن ہے“ نیلگی اس وقت کسی ضروری کام میں مصروف ہو اور وہ کام چھوڑ کر یہاں نہ آسکتی ہو!“ ساحل اگرچہ سنجیدہ لہجے میں بات کر رہی تھی تاہم مجھے معلوم تھا وہ مجھ سے چھپ چھپا کرے موڈ میں تھی۔

میں نے ایک گرمی سانس لیتے ہوئے کہا ”نیلگی کا دعویٰ کس حد تک غلط ثابت ہوا ہے یہ تو آنے والے دنوں میں ہی بتا پڑے گا۔ میں فی الحال آرام کرنے کے لیے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔“

”وہ جان اور آرام؟“ وہ زرب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا ”ہاں! میں اپنے سر میں ہلکا سا درود محسوس کر رہا ہوں۔“

”مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ جلدی سے بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی ”شاید کالی سے کچھ آرام ملے۔ تم کمرے میں چلو میں کالی کا بل کراؤں گی۔“

پھر وہ جن میں گھس گئی اور میں نے کمرے کا رخ کیا۔

دس منٹ بعد ہم ایک ریزنڈنٹ کمرے میں بیٹھے کافی کی بنکیاں لے رہے تھے۔ کافی ختم ہوئی تو ساحل نے کہا ”آؤ

وہ جان! میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”درو میں آرام ملے گا۔“

”درو تو تمہارے سر میں بھی ہو رہا ہے!“

”ہاں! وہ تو ہو رہا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ”پھر میں تمہارے نازک ہاتھوں کو تکلیف کیوں دوں؟“

”تم ایک دم اتنے بیگانے سے کیوں ہو جاتے ہو وہ جان؟“

”کیوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی ”تمہارا ہی تو قول ہے“ فرینڈ شپ میں پلیز“ سوری!“

”میکسیڈوزی اور فینک یو کہ جگہ نہیں دینا چاہیے۔ ابھی تم نے میرے نازک ہاتھوں کو تکلیف دینے کی جو بات کی ہے وہ کیا فرینڈ شپ کو زیب دیتی ہے۔ اس سے بیگانگی اور تکلف کا اظہار ہوتا ہے۔“

وہ مجھے گھبرنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے معاملے کو سنبھالتے ہوئے کہا ”میں نے تو وہ بات محض اس لیے کی تھی کہ تم خود بھی اپنے سر میں درود محسوس کر رہی ہو۔“

”تو کیا ہوا!“ وہ کھکھلا کر ہنس دی ”جواب میں تم میرا سر دباؤ۔ حساب برابر ہو جائے گا۔“

”ہاں! یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر کھکھلائی۔ اس کی نفرتی ہنسی نے فلیٹ کے درود یوار میں ناگہانی بھردی۔ کمرے کی فضا مسطر ہو گئی۔ وہ بولی تو جیسے سر کی گھنٹیاں سی بجائیں۔

”وہ جان! تم بہت چالاک ہو!“

میں نے یہ سہیل پوچھا کہ میں کیسے چالاک ہوں، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ”تم سے زیادہ چالاک نہیں ہوں۔“

”تم جب کسی بحث مباحثے میں نہیں پڑنا چاہتے تو فوراً سامنے والے کی بات مان لیتے ہو۔“ وہ لگاؤٹ بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”چاہے بعد میں وہ کام کو یا نہ کر دے مگر وقتی طور پر بحث و تکرار کا درود باز نہ ہو جاتا ہے۔“

”اس میں ایسی برائی کی کون سی بات ہے!“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”گواہی تم اپنے طریقہ وادات کو تسلیم کر رہے ہو؟“

”حقیقت کو تسلیم کرنے میں حرج کیا ہے!“

”کوئی حرج نہیں۔“ وہ موضوع گفتگو تبدیل کرتے ہوئے بولی ”فوری حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سر میں درود ہو رہا



ہمارے درمیان، میرے زہریلے پن اور ہومیو پیتھک

”میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے کہا۔  
 ”جست کچھ۔“ اس نے میرے کان کے نزدیک

میں ہم تن گوش ہو کر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر عزیز کو دیکھتی تھی۔ ایک طرح کا میسج ہی ہو گا۔

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا ”یہ تم نے بہت اچھا کیا  
رااا سے میرے بخیر اگلا ہمارا بندھے گا۔“

”اب اگر تمہاری اجازت ہو تو میں وہ خبر بھی سناؤں۔“  
اختیار نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے کہا ”ہاں، ضرور سناؤ۔“

”کل تم باس سے ملنے جا رہے ہو۔“

”کیا؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ مجھ جوش انداز میں بولا ”میں نے تمہارے اور تمہارے کارناموں کے بارے میں تفصیلاً باس کو بتا دیا ہے۔ انہوں نے خود تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ جگر! تم بہت لکھی ہو ورنہ باس آسانی سے کسی کو لفٹ نہیں کراتے۔ وہ پہلی فرصت میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا ”یار! ابھی تک تو میں تمہارے باس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوا، نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ اور تم نے ملاقات کا بندوبست بھی کر ڈالا؟“

آخری جملہ میں نے دانستہ کہا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا اس ملاقات میں اختیار سے زیادہ اس کے باس کا ہاتھ ہو گا۔ ویسے میں نے کل انٹرویو پر اختیار کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس کے باس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب سے ”سی ایف کے“ کے اغراض و مقاصد کے بارے میں سنا تھا، اس تنظیم کے کرنا دھرتا اور روح رواں سے ملنے کا اشتیاق میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ ”کراٹم فری کراچی“ نامی یہ تنظیم میرے مشن کے بہت قریب تھی۔

اختیار میری بات کے جواب میں بولا ”جگر! ہمارے باس کا نام شعیب غوری ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں بھی اس کی اصلی رہائش گاہ سے آگاہ نہیں۔ ویسے کراچی کے پانچوں اضلاع میں اس کے ٹھکانے ہیں۔ وہ انہی ٹھکانوں پر اپنے ملنے والوں سے ملاقات کرتا ہے اور وہ بھی نہایت احتیاط کے ساتھ۔ کوئی نہیں جانتا، وہ کس وقت کہاں ہو گا۔ اگر تنظیم کے افراد اس کی خبر رکھنے لگیں تو پھر وہ ”باس“ کس چیز کا ہوا۔ جگر! میں نے کہا تھا نا، میرا۔ باس بہت ادب منی ہے۔“

”ہاں، مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔“ میں نے پھر پوچھا ”کل تم مجھے اپنے باس سے ملوانے کس ٹھکانے پر لے کر جاؤ گے؟“

”باس نے ڈسٹرکٹ ساؤتھ والے بنگلے پر بلایا ہے۔“

اختیار نے بتایا ”تم نے وہ بنگلا کل دیکھا تھا۔“  
”یعنی وہ بنگلا جہاں تمہارے باس کا انگریز دوست نیل آرمرا اپنی طرح دار سیکریٹری شیبہ کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔“

میں نے چونک کر کہا ”تم ڈیفنس سوسائٹی والے بنگلے کا رہے ہو نا؟“

وہ اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولا ”بالکل وہی بنگلا، مسٹر نیل آرمرا اور اس کی سیکریٹری آج سہ پہر یہاں نہ روانہ ہو گئے ہیں۔“

”واپس انگلینڈ؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ”میں کل صبح ٹھیک دس بجے ساؤتھ والے بنگلے پہنچا۔ ہم نے۔۔۔ یعنی باس نے کوڈ روڈ میں ہر گھنٹہ ایک نام رکھ دیا ہے جو ڈسٹرکٹ سے منسوب ہے۔ یوں کچھ کہ کل صبح ہم باس سے ملنے ”ساؤتھ“ جا رہے ہیں۔“

”اس وقت ہم کس ڈسٹرکٹ میں بیٹھے ہیں؟“

”یہ ڈسٹرکٹ ایسٹ ہے۔“ اختیار نے بتایا۔  
”میں نے پوچھا“ باقی تین ڈسٹرکٹ کون کون سے ہیں؟“

وہ بولا ”ڈسٹرکٹ ویسٹ“ ڈسٹرکٹ سنٹرل اور ڈسٹرکٹ

لیبر۔“  
”اس کا مطلب ہے ”سی ایف کے“ کا نیدر پورے شہر میں پھیلا ہوا ہے!“ میں نے پُر خیال انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔

”جگر! اس شہر کو ”کراٹم فری کراچی“ بنانے کے لیے فعال نیٹ ورک کو تاشد ضروری ہے۔“

ہم کچھ دیر تک ”سی ایف کے“ اور اس کے طریقہ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں کل اس تنظیم کے سے ملنے جا رہا تھا اس لیے بھی زیادہ سے زیادہ معلوم حاصل کرنا میرے لیے مفید تھا۔ اختیار نے اس سلسلے میں مکمل سے کام نہیں لیا۔

اس رات ڈنر ہم نے گھر سے باہر کیا۔ نزدیک ہی ایک صاف ستھرا فاسٹ فوڈ ریستوران تھا۔ اختیار ہمیں وہاں گیا۔ آج فلیٹ آتے ہوئے وہ ایک برائی سی مزدا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ براؤن ٹھکری کی مزدا گاڑی استعمال میں رہتی ہے۔ برائی نظر آنے والی وہ گاڑی غلام ہی طاقت ور انجن کی حامل تھی۔ پچھلے دو دن سے وہ کینک کے پاس گئی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی اختیار اور نیل کی نجی استعمال میں رہتی تھی۔ روٹی بھی ڈسٹریبیوٹ کرتی تھی۔ کھانے کے بعد ہم نے ہمدرد آباد کا مشہور ”اس“ قالودہ کھایا پھر میر بخش سے ملنے گلشن اقبال کی جانب روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر فیروز کا وہ پرائیویٹ اسپتال گلشن کے بارون

میں تھا۔ اس دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر ڈاکٹر کی اپنی رہائش تھی۔ ڈاکٹر اس وقت اسپتال میں موجود نہیں تھا تاہم ہمیں صبح تک رسائی کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اختیار نے جو ریفرنس استعمال کیا تھا اس کے بعد ہم فوراً میر بخش کے پاس ”اس“ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

ڈاکٹر فیروز نے اپنے عملے کو ہماری بابت بتا رکھا تھا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے بے اختیار بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اس کوشش سے روکتے ہوئے سنبھالا ”میں میر بخش۔ ابھی تمہیں بہت زیادہ حرکت نہیں کرنا۔“

فرط بیضا نے اس کے آنسو نکل گئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا ”سائیں! انہوں نے میرے ساتھ بہت۔۔۔“ اس کی آواز بندھ گئی۔

میں نے کندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی ”میر بخش! جلد رکھو۔ ہم نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔ میاں زاہد حسین اس وقت اپنے بال فوج رہا ہو گا۔ جنہیں اغوا کرنے والے اور زندہ کو بک کرنے والے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گئے ہیں۔“

اس کے جسم کے بیش تر حصوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ایک بازو میں فریجک بھی ہو گیا تھا۔ زیادہ تر چونٹیں اندرونی تھیں جو بیوی چوٹیوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں تاہم یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اور فوراً ہی اسے زینٹ منٹ بھی دے دیا گیا ورنہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میر بخش مجھے اور ساحل کو اپنے پاس دیکھ کر کھل اٹھا۔ قند اختیار کو بھی اس نے پہچان لیا تاہم روٹی کی جانب وہ بار بار سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے اسے روٹی کے بارے میں مختصر بتا دیا۔

ہم نے ہمدرد آباد سے میر بخش کے لیے تین چار تازہ موٹی مکھن خرید لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پھولوں کا کھل ہسٹہ بھی ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کے بیڈ کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز رکھی تھیں۔ ہم میر بخش سے تسلی بخشی کی باتیں کر رہے تھے کہ معلوم ہوا ”ڈاکٹر فیروز اسپتال میں آچکا ہے۔ میں نے اختیار سے کہا ”میں ڈاکٹر فیروز سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں وجدان! ڈاکٹر سے ایک تفصیلی ملاقات بہت ضروری ہے۔“ وہ بولا ”ہم جاتے ہوئے اس کو کچھ کر لیتے

ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہم میر بخش کے پاس سے اٹھنے لگے تو اسی وقت ڈاکٹر فیروز وہاں پہنچ گیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم میر بخش سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر وہ میر بخش کے چیک اپ میں مصروف ہو گیا۔

ڈاکٹر فیروز کی عمر کچھ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا ایک دھلا پٹلا شخص تھا۔ چہرے پر نظر کا چشمہ اس کی شخصیت پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ وہ بہت تیز بولتا تھا۔ اس کی باتیں سمجھنے کے لیے پوری طرح انٹینٹیو رہنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر میر بخش کے معائنے سے فارغ ہوا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ ہماری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”میر بخش کی حالت تسلی بخش ہے۔ ہم مزید دو دن اسے اسپتال میں رکھیں گے۔ تیسرے روز آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔“

”ڈاکٹر! میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ہاتھ کا فرمیجکرس پوزیشن میں ہے؟“

”صاحب، فریجکس تو فرمیجکس ہوتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”یہ دو چار دن میں ٹھیک ہونے والا معاملہ نہیں۔ میر بخش کا دایاں بازو کہنی کے نزدیک سے ٹوٹا ہے۔ اگرچہ یہ نوٹ پھوٹ بہت زیادہ خطرناک نہیں تاہم ایک آدھ مہینہ تو یہ اس بازو سے کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ میں نے بہت اطمینان بخش پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دو روز بعد آپ اسے گھر لے جائیں اور مکمل آرام کرائیں۔ ایک ہفتے بعد چیک اپ کے لیے دوبارہ اسپتال لانا ہو گا۔“

تھوڑی دیر بعد ہم چاروں میر بخش سے رخصت ہو کر اسپتال سے نکل آئے۔ آتے ہوئے میں نے میر بخش سے وعدہ کر لیا تھا کہ گا۔ یہ بے گاہے میں اسے دیکھنے آتا رہوں گا۔

ہم واپس فلیٹ پہنچنے تو رات کے کم و بیش بارہ بج رہے تھے۔ اختیار نے باوجود ہائی کے طور پر مجھ سے کہا ”وجدان، جلدی۔۔۔ سونے کی کوشش کرنا تاکہ صبح جلدی اٹھ سکے۔ کل ہمیں باس سے ملنے بھی جانا ہے۔“

”تم میرے اٹھنے اور سونے کی فکر نہ کرو۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ”میں علی الصبح بیدار ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی کل سے مجھے باقاعدگی کے ساتھ نل پارک جانا ہے۔ ساحل کی رینگ شروع ہونے والی ہے۔“

”جگر! تم اس نیک کام میں روٹی کو بھی شریک کر لو تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔“ وہ قریب ہی کھڑی روٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”شاید یوگا کی مشقیں ہی اس کی قوتیلت کو

دور کر سکیں۔“

”توطیت!“ میں نے حیرت سے خوش مزاج روی کی طرف دیکھا ”میں نے تو اسے توطیت میں نہیں دیکھا۔ کیا تم کوئی دلچسپ مذاق کر رہے ہو؟“

”جگر! یہ مذاق کا کون سا وقت ہے!“ وہ دیوار گیر کھلاک کی طرف نگاہ اٹھا کر بولا۔ ”روی کی توطیت بہت گہرائی میں چھپی ہوئی ہے، اوپر سے نظر نہیں آتی۔ ابھی تم نے اس کی کہانی سنی ہے اور نہ ہی گھل مل کر گفت و شنید کی ہے۔ آہستہ آہستہ تم پر اس کی نظر نہ آنے والی اداسی کا راز کھلے گا۔“

اس دوران میں روی بالکل خاموش اور سنجیدہ کھڑی رہی۔ امتیاز کی بات پوری ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا ”وجدان بھائی! یہ سچ ہے کہ میں یوگا کی مشقیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ لوگ مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں تو مجھے خوشی ہو گی۔“

”تمہاری خوشی مجھے عزیز ہے روی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اگرچہ میں تم سے عمر میں پانچ تھوڑے سال چھوٹا ہوں لیکن تمہارے منہ سے اپنے لیے ”بھائی“ کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ میری اپنی کوئی بہن نہیں۔“

”بہن بھائی کے رشتے میں عمر کی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا وجدان۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی ”تمہیں بھائی کہتے ہوئے مجھے بھی ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوتا ہے اور میں بھی یہ ضرور کہوں گی کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا بھی کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔“

”اکلوتی تھی، کیا مطلب؟“ ساحل نے چونک کر روی کی طرف دیکھا۔

وہ ایک دم اداس ہو گئی ”بتاؤں گی۔ بتا دوں گی۔“ امتیاز نے مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا، اس وقت اس موضوع کو موقوف کر دیا جائے۔ میں نے ایک طویل مصنوعی جہاں لیتے ہوئے کہا۔ ”بھئی، مجھے تو شدید نیند آ رہی ہے۔ باقی باتیں کل کر لیں گے۔“

ساحل میری بات کو فوراً سمجھ گئی۔ روی سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا ”ٹھیک ہے ڈیر، ہم تمہارے اکلوتے پن پر بعد میں بات کریں گے، فی الحال تم آرام کرو اور ہم بھی۔“

پھر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ یہ سچ ہے کہ روی کی زبان سے اپنے لیے ”بھائی“ سننا

مجھے بڑا مسرور کن لگا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے جب ہندوستان کے شمالی قصبے ”رشی کیش“ میں تھا تو سیتا نامی ایک چودہ سالہ لڑکی نے مجھے ”بھیا“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کی شیرینی کو بھی میں آج تک نہیں بھول سکا تھا۔ بڑا دلچسپ کی بنی سیتا کو میں نے وحشی ہندوؤں کی بربریت سے بچا کر پتا نہیں، روی مجھے بھائی بنا کر کون کون سے امتحانات ڈالنے والی تھی!

ہم کمرے میں آکر سونے کے لیے لیٹنے لگے تو ساحل نے کہا ”وجدان! تمہیں تو بیٹھے بیٹھے ایک بنی بھائی پڑا۔ خوبصورت بہن بھی مل گئی۔“

میں نے اس کی بات کے آخری حصے پر توجہ دینے پر کہا ”ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ روی واقعی ایک خوبصورت ہے۔“

”بے چاری بڑی دکھی معلوم ہوتی ہے۔“ وہ ہمدرد سے بولی۔

میں نے کہا ”تم سے وہ کافی کھوز ہو چکی ہے۔ اس کے کیریدنے کی کوشش کرنا۔“

”ہاں، میں اس کا مسئلہ جاننے کی پوری کوشش کر گی۔“ ساحل نے سنجیدگی سے کہا پھر مجھ سے پوچھا ”پارک میں جانے کے لیے کتنے بجے نکلنا ہے؟“

”صبح صادق کا وقت ٹھیک رہے گا۔“ میں نے کہا۔ آج صبح مل پارک جا چکی ہو۔ یہاں سے کتنے منٹ کی ہے؟“

”مشکل سے پندرہ منٹ۔“ اس نے بتایا۔ ”ٹھیک ہے، پھر ہم پیدل ہی جائیں گے۔“ میں نے ”لیکن وقت کے بارے میں روی کو بتانا ہو گا۔“

وہ بولی ”میں ابھی بتا کر آ جاتی ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک ٹیکہ اٹھا کر سونے کے لیے کمرے کے ایک کونے میں قالین پر لیٹا۔ ساحل واپس آئی تو مجھ پر نگاہ پڑتے ہی مسکرا اٹھی۔ وہ ”کو اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے شوشی سے کہا۔“ ”نیل گر، نیل گری سے اس قدر خوف زدہ ہے۔“ ”یہ نیل گر کیا ہوتا ہے؟“ میں نے واپس پوچھا۔

اس نے یہ دستور شوشی سے بتایا ”نیل گری کا نام تھا۔ تم بعض اوقات اوٹ پانگ باتیں کرنے لگتی ہو۔“ ”صرف باتیں۔۔۔ یا حرکتیں بھی؟“ میں نے اس وقت آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ساحل کی

مجھے اپنے قریب ہی محسوس ہوئی تو میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا "کیا مطلب؟"

وہ اس وقت مجھ سے صرف دو قدم کی دوری پر تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں بھی ایک ٹکڑے دبا ہوا دیکھا تو صورت حال میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے سوالیہ نظریے اس کی طرف دیکھا تو اس نے میرے انداز سے کی تصدیق کر دی۔

"میں بھی قاتلین پر ہی سوؤں گی۔"

"کیا حماقت ہے ساحل؟"

"اگر قاتلین پر سو کر رات گزارنا حماقت ہے تو اس حماقت کا آغاز تمہاری طرف سے ہوا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "میں تو تمہاری پیروی کر رہی ہوں" یہ سوتے ہوئے کہ جو کام تم کر رہے ہو اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ یعنی وہ کام اگر تمہارے لیے مفید ہے تو میرے لیے بھی سودمند ہوگا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھ کر ایک لمبھی آہ بھری اور سمجھانے والے انداز میں کہا "ساحل! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ نیچے سوئے میں کون سی مصلحت یا مجبوری پوشیدہ ہے۔ تم جا کر وہاں بیڈ پر لیٹو۔ آرام دہ بستر چھوڑ کر یہاں کیوں بے آرام ہونا چاہتی ہو؟"

"مجھے تمہارے قریب میں آرام ملتا ہے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کمری سنجیدی سے بولی "یا تو تم بھی بستر بیٹھو گے یا پھر میں تمہارے نزدیک قاتلین پر رات بسر کروں گی۔"

میں نے کہا "تم خواہ خواہ کی ضد کر رہی ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولی "وہ جان! نیلگی کا دعویٰ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود بھی تم بہت محتاط ہو گئیں؟"

"میری یہ احتیاط نیلگی کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ کی بنا پر ہے۔" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ بھلا کہاں جان چھوڑنے والی تھی! شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی "تم نیلگی کی پروا نہ کرو۔ اگر اس نے ہماری خلوت میں داخل ہونے کی کوشش کی تو بری طرح پھتائے گی۔ اس کی اس حرکت کے ساتھ ہی "تھومبا" دیو بھی یہاں پہنچ جائے گا کیوں کہ تھومبا نے بھی نیلگی سے ملنے جلنے دعوے کر رکھے ہیں۔ تھومبا کی موجودگی میں نیلگی کی دال نہیں گلی گی اور اسے مجبوراً یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

میں ساحل کی چالاکی کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ مگر قدرے سخت لیے میں کہا "میں اس وقت نہایت ہی غصے میں ہوں ساحل! نیلگی ایک حقیقت ہے، تم بھی اس کے دیکھ چکی ہو۔ تھومبا جیسا بچکانہ اور متعارف کو کرنا کچھ سناٹیل ٹھیکنا چاہتی ہو؟"

وہ ایک لمحہ مجھے نونٹاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی مگر پھر ہی شرر مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی "وہ جان! تم ناویا نہ مانو، نیلگی کی طرح تھومبا بھی ایک حقیقت ہے۔"

میں بے بسی سے نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی پھر بوجھل آواز میں بولی "وہ جان! پتا نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے مجھے رات ہماری زندگی میں پھر بھی نہیں آئے گی۔"

میں نے اپنے چہنچہک نظریے سے دیکھا۔ وہ اس کے خاصی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سر ہلکے لیے میں کہا "جہیں اگر ایسا محسوس ہو رہا ہے تو اس پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے انسان کی زندگی میں جو دن اور جو رات گزر جاتے ہیں پلٹ کر واپس نہیں آتے۔ ظاہر ہے یہ رات بھی ایسی ہی واپس نہیں آئے گی۔"

"تم شاید میرے محسوسات کو سمجھ نہیں سکتے۔" ابھن زدہ انداز میں بولی۔

اس کی ابھن سے میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے کہا "تم کھل کر کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ چند لمحے متذبذب رہنے کے بعد تامل کرتے ہوئی بولی "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے جیسے آج رات بعد بہت کچھ بدل جائے گا۔"

اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ذہنی دباؤ نے اسے اپنی گرفت میں رکھا ہو۔ میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا ساحل، کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ ڈپریشن دکھائی دے رہی ہو۔ جا کر آرام سے سو جاؤ۔ تم کے بعد تمہاں ہلکی جھلکی ہو جاؤ گی۔"

"ہلکی جھلکی؟" وہ کثیر آواز میں بولی "جب بہت جانا ہے تو انسان خود بہ خود ہلکا ہلکا ہو جاتا ہے۔" اب میں ساحل کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھا۔ اس کا رویہ اس کے عمومی مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

اپنی اور اُسی سے بھاگنے والی لڑکی تھی مگر اس وقت اپناک اس کی ساری شوخی اور چپختا غائب ہو چکی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بستر کی جانب لاتے ہوئے کہا "پلو میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔ تم اس وقت ایک غمگین نیت سے گزر رہی ہو۔"

وہ ایک زانسی کی سی حالت میں بستر تک پہنچی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی "تم مجھے سلانے کے بعد دور تو نہیں چلے جاؤ گے نا؟"

"میں کہاں جا سکتا ہوں؟ زیادہ سے زیادہ وہاں نیچے چلیں۔ پس۔"

"نہیں! اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور نصیحت سے بولی "تم بھی ادھر بستر ہی سو جاؤ۔"

"جا رہا ہوں تم سوئے کی کوشش تو کرو۔" میں نے اسے پچوں کی طرح پکارتے ہوئے کہا۔ اس وعدے کے بغیر وہ سوئے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

وہ میری نصیحتیں دہاتی سے قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے سوچا جب وہ کمری خند میں چھج جائے گی تو میں اٹھ کر نیچے قاتلین پر چلا جاؤں گا۔

میں اس کے نزدیک بیٹھ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا اور اس کی ٹھیکری زلفوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے لہجے میں بولی۔

"وہ جان! کیا تم مجھے دیند بھی سلا سکتے ہو؟"

"وہ کون سی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے سادگی سے کہا "اپنی نیند!"

"یہ جہیں کیا ہو گیا ہے ساحل۔" میں نے ہلکے سے اسے جھوڑا لایا "تمی مایوسی کی باتیں تمہیں زب نہیں دیتیں۔ آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اس کی کھلی ہوئی زبانی آنکھوں میں کرب کے سائے لہراتے دیکھے۔ وہ مجبور آواز میں بولی "وہ جان! تمہاری قسم، میرے پہلو میں بہت شور ہے، تو تم بھی محسوس کر کے دیکھو۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنے دل کے مقام پر رکھ دیا۔ میں سنانے میں رہ گیا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی جھلکی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اس نینت نے میرا جینا محال کر رکھا ہے۔ تم اس کی دھڑکن روک کر مجھے اس تکلیف سے نجات دلا دو۔" وہ غرائی ہوئی آواز میں بولی "پھر اس پر درد کو کشید کر کے اپنے پہلو میں سلاؤ۔ مجھے اس دردناک زندگی کی ضرورت نہیں۔"

"تم اس وقت ذہنی دباؤ اور خیالی انتشار کا شکار ہو۔" میں نے دوبارہ اس کے بالوں میں مساج کرتے ہوئے کہا "ایک بھروسہ اور ہر سکون خند تمہیں شانت کر دے گی۔ پلیز، سوئے کی کوشش کرو۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" وہ خواب ٹانگ لیے میں بولی۔

"واقعی مجھے سو جانا چاہیے کیوں کہ یہ رات میری زندگی میں دوبارہ پھر کبھی نہیں آئے گی۔ اور تم نے بھی تو اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ رات کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔"

پھر اس نے زیر لب وعائیہ انداز میں کہا "لاڈلہ بدھا جہیں بھی اس درد سے آشنا کر دے۔" اور وہ ایک گہری سانس لینے کے بعد خاموش ہو گئی۔

پتا نہیں کیوں اس وقت آپوں آپ میرا دھیان نیلگی کے ایک ادھورے تھیلے کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی میں پورے وجود سے کانپ کر رہ گیا۔

نیلگی نے نئی سریش، قاضی سلطان کی رہائش گاہ پر ایک برا سرار ملاقات کے دوران میں ساحل کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔"

"لیکن" کے بعد نیلگی کی پرا سرار خاموشی کا ایک ہی مطلب تھا کہ میرا اور ساحل کا ساتھ پائیدار نہیں اور غریب ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے اور اب ساحل کی باتیں مایوسی کی جس انتہا کو چھو رہی تھیں، نیلگی کے ادھورے تھیلے کی روشنی میں وہ کچھ اور بھی زیادہ غمگین اور خطرناک محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اچانک لاتعداد اندیشوں میں گھر گیا۔ غیر ارادی طور پر میرے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا۔

"کیا ساحل مجھ سے بچھڑنے والی ہے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا!" بے اختیار میرے دل سے نکلا۔

میں نے اضطرابی لگاؤ سے معصوم صورت ساحل کو دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کمری خند سو رہی تھی۔ اس کی سانسوں سے اندازہ ہوتا تھا، وہ ہر قسم کے ذہنی انتشار سے نجات حاصل کر چکی تھی۔

میں کافی دیر تک بغیر سوچے اور محسوس کیے اس کے چہرے کو ٹکتا رہا۔ ان لحات میں میری سوچ اور محسوسات جیسے ٹمچہ ہو کر گھرے تھے شاید میں محبت کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ میں ساحل کے مشاہدے میں غرق ہو گیا تھا۔

جب میں کمرے کے ماحول میں واپس آیا اور میں نے بیڈ سے نیچے اترنے کی کوشش کی تو پتلا چلا، میری شرٹ کا

ایک کونا ساحل کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنی شرت آزاد کروانا چاہی تو بتا چلا نہ اتنا آسان نہیں۔ اور میں نے اگر زبردستی سے کام لیا تو وہ جاگ جائے گی۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط اور بے یقینی کی عکاس تھی۔

مجھے اگر کسی معصوم بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی ماں کہیں جانے والی ہے تو وہ بڑی مضبوطی سے اس کا دامن اپنے سینے ہاتھ کی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ ماں لاکھ سمجھانے کی کوشش کرے کہ وہ کہیں نہیں جا رہی مگر بچے کی بے یقینی اسے ہمت نہیں دیتی اور وہ ماں کے دامن پر اپنی گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور وہیں اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یہ وہ پہلو تھا جس میں بہت شور سنائی دیتا تھا۔ ایک درد لداوے اس مقام کو اپنا آسان بنا لیا تھا۔ ساحل نے مجھ سے التجا کی تھی کہ اس کک کو تشدد کر کے میں اپنے یہاں پناہ دے دوں۔ وہ لا رڈ بھاسے دعا گو تھی کہ وہ مجھے بھی اس دورے آشنا کر دے۔

کچھ ہونے والا تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا کیا ہونے والا ہے۔ جب یہ اندازہ نہ ہو گیا ہو جائے گا تو پھر انسان الجھ کر رہ جاتا ہے۔ میرے خیالات میں پراگندگی اتر آئی۔ میں نے دوردیدہ نگاہ سے ساحل کی جانب دیکھا۔ وہ آسودگی کی خند سو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا وہ اپنا سارا انتشار مجھ میں منتقل کر کے بری الذمہ ہو گئی ہو!

وہ میری زندگی کی پہلی بے کل رات تھی۔ میں نے وہ رات سونے کی کوشش میں جانتے ہوئے گزار دی۔

\*\*\*

میں اس وقت بل پارک کے سب سے اونچے مقام پر کھڑا تھا۔ یہاں ایک اچھا خاصا گول چوترہ بنا تھا جس کے ارد گرد مضبوط پائپ کی ریٹنگ لگائی گئی تھی تاکہ کسی قسم کے حادثے میں جانی نقصان کا سامنا نہ ہو۔ اس چوترے سے واقعی پورا کراچی شہر دکھائی دیتا تھا۔ فضا شاندار اور مظہر جان دار تھا۔ اس وقت سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ہم جب فلیٹ سے روانہ ہوئے تو ہلکا ہلکا اندھیرا موجود تھا۔ خوش گلوں بوندوں کے چھمکانے کی آوازوں نے معطر فضا میں نغمگی سی گھول دی تھی۔

صبح خیزی کے شرعین مرد۔ زن کثیر تعداد میں نظر آرہے تھے۔ میں نے محوم پھر کراچی بلند ترین چوترے کو منتخب کیا تھا مگر اس میں ایک خرابی بہر حال موجود تھی کہ وہاں ”جی“ کے

لے مخصوص مشق نہیں کی جاسکتی تھی۔ چوترے کا فرش تھا جب کہ مذکورہ مشق کے لیے فرش کا آرام دہ اور ضروری پاک ہونا ضروری تھا۔

میں نے ”جی“ کی مشق کے لیے نزدیک ہی واقعہ کے ایک تختے کو منتخب کر لیا۔ اس طرف مختلف ورزشیں کرنے کے لیے آہنی پائپ کے جھولے بھی لگے تھے۔ رونی خاصی پرجوش دکھائی دیتی تھی جب کہ اس نے ساحل کو انتہائی سنجیدہ پایا۔

میں نے ساحل سے کہا ”پہلے تم صرف پانچ منٹ ”جی“ کی ورزش کرو گی۔ اس کے بعد مارشل آرٹس، ٹینس کا آغاز ہو گا۔“

اس کے بعد میں رونی کی جانب متوجہ ہو گیا ”ساحل“ مصروف کرنے کے بعد میں تمہیں یوگا کی مشق کے واسطے بتاؤں گا۔“

رونی تھوڑے فاصلے پر ایک جانب خاموش کن ہو گئی۔ ساحل نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا ایک دم سنجیدہ دکھائی دیتی تھی۔

”تم نے ہارس پوزیشن میں کھڑے ہونے کی اچھی پریکٹس کر لی تھی۔“ میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے ”اب تم شمال کی سمت رخ کر کے سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔“ انھیں بند کر کے اٹھ دس گہری سانس اور ہوا مار مایہ لو۔“

اس نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ میں نے کہا ”اب مشق کے لیے بالکل تیار ہو چکی ہو۔ ہارس پوزیشن میں کھڑے ہو کر تم اپنی آنکھیں بند کر لو گی۔ زبان کو نالو کے ساتھ باہر ہے“ میرا مطلب ہے ”زبان کی نوک (ٹپ) کو“ اپنی پورے

اوردھیان ناف کے مقام پر مرکوز کرنا ہے۔ اس کے بعد کے راستے ایک جھکے سے سانس کو اندر کھینچنا ہے اور فوراً ہی منہ کے راستے جھکے سے سانس کو خارج کرنا ہے واضح رہے کہ اس عمل کے دوران میں زبان کی ٹپ اپنی مستقل نالو سے چپلی رہے گی اور ہونٹ ہم وار رہیں۔ سانس کی آمد و شد کے دوران میں پیٹ پھول چکنا رہے یعنی سانس اندر کھینچنے پر پیٹ پھولے گا اور خارج کرنے پر چپک جائے گا۔ اس عمل میں ذہن صرف ایک کام کرے اور وہ یہ کہ تمہاری توجہ مستقل مقام ناف پر جمی رہے گی۔ الجال اتنا ہی کافی ہے۔“ ایک لمحے کا توقف دے کر ”استفسار کیا“ ”اگر کوئی اسٹیپ تمہاری سمجھ میں نہ آ پوچھ سکتی ہو؟“

”میں ہر بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“ وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”میں نے سراسر اپنے والے انداز میں کہا“ ”آر“ ”دیکھو! میں نے اس اثبات میں گردن ہلا دی۔“

”میں نے اسے مشق کرنے کا اشارہ کیا۔“ چپے ہی وہ ہارس میں آئے مشق کرنے اور اس نے آنکھیں بند کیں، میں پوزیشن میں کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے ایک فٹ کے فاصلے پر زمین پر بے قدموں اس کے دوران میں بعض اوقات ہتھدی منہ پہنچا۔ اس مشق کے دوران میں بعض اوقات ہتھدی منہ کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ ”سانس“ اور ”توجہ“ کے درمیان جب تک ایک روٹھم یا ریو نہیں بن جاتا“ دماغ حکایت پر کمر بستہ رہتا ہے جس کے نتیجے میں ایک جکڑ سا آتا ہے اور ہتھدی دھڑا دھڑا منہ کے بل گرتا ہے۔ میں ساحل کو خبردار دینے کے لیے اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ وہاں میری موجودگی سے واقف نہیں تھی۔

پورے پانچ منٹ تک ساحل نے بڑے سکون اور اطمینان سے مشق کی اور اسے ایک مرتبہ بھی چکر نہیں آیا۔ اس کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے اس کی مشق ختم کر کے آرام کرنے کو کہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے ایک جانب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

میں رونی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”ایک بات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لو رونی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ صحت گوشت ہو گئی۔ میں نے بولنا شروع کیا ”یوگا میں توجہ نگاہ اور انوالومنت کی بڑی اہمیت ہے۔ بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بنیادی طور پر یوگا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ”جنتھ“ ”یوگ“ ”میں کی جانے والی مشقوں کا تعلق انسان کے جسم سے ہوتا ہے اسے باڈی یوگا (BODY YOGA) یا فزیکل یوگا بھی کہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر ”راج یوگ“ آتا ہے جس میں ذہنی اور دماغی مشقیں کی جاتی ہیں۔ اسے (YOGA BRAIN) کہا جاتا ہے تیسرے اور آخری نمبر ”منتر یوگ“ ہے جسے یہ خالصتاً روحانی مشقوں اور مختلف جاپ پر مشتمل ہے اور (SPIRITUAL YOGA) کہلاتا ہے۔“

”میں فی الحال جسمانی مشقیں کرنا چاہتی ہوں۔“ رونی نے میری بات ختم ہوتے ہی کہا ”جیسا کہ دی ویڈیو پر دکھایا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”تمہیں ابتدا میں یہی کرنا بھی چاہیے۔“ ”جنتھ یوگ“ کی مشقوں کے اثرات سب سے زیادہ جسم پر ہوتے ہیں اور یہ دوسرے ”یوگ“ سے نسبتاً آسان بھی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا یوگا میں سانس کا ایک الگ اور اہم قسم ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ ”یوگ“ چاہے کوئی بھی ہو اس کی مشق سانس کے ساتھ بھی کی جاسکتی ہے اور بغیر سانس کے بھی۔ سانس کے ساتھ مشق خاصی لطیف اور فرحت بخش ہو جاتی ہے، ظاہر ہے اس عمل میں اس کی افادیت بھی بڑھ جاتی ہے۔“

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے اسے یوگا کی ابتدائی معلومات سے روشناس کرواتے ہوئے مزید بتایا ”ضروری نہیں ہے کہ دنیا کے تمام یوگا ایکسپٹ جھ سے متفق ہوں لیکن اب میں تمہیں جو نکتہ بتانے جا رہا ہوں وہ میرے تجربے کا پتھر ہے اور میرے استاد کی تعلیم بھی۔ شاذ و نادر میں آس جہانی ماسٹر ہنگ بائی اور ہنگا میں آس جہانی ماسٹر دانگ ہنگ بائی نے مجھے یہ گر سکھایا تھا۔ یہ نکتہ تم بھی ذہن نشین کر لو۔ یوگا میں چاہے کوئی بھی مشق کی جائے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جب جسم کا کوئی حصہ زمین کی مخالف سمت میں حرکت کرے گا تو سانس کو اندر کھینچنا یعنی (INHALE) کرنا ہے۔ جب جسم کا کوئی حصہ زمین کی جانب حرکت کرے گا تو سانس کو باہر خارج کرنا یعنی (EXHALE) کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یوگا میں آسن یعنی پوچھ کر بھی بڑی اہمیت ہے۔ آسن یا پوچھ جسمانی نشست کو کہتے ہیں۔“

ایک لمحے کو رنگ کر میں نے ساحل کی طرف اشارہ کیا اور رونی کو بتایا ”ساحل کے بیٹھے کا جو انداز ہے اسے ”پدم آسن“ یا کنول آسن یعنی (LOTUS POSTURE) کہا جاتا ہے۔ عام زبان میں اسے ”آلتی پالتی مارنا“ بھی کہتے ہیں۔ پھر میں نے رونی کو یوگا کی ایک آسان سی ابتدائی مشق کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ مشق بالکل سیدھے کھڑے ہو کر یہ آسانی کی جاسکتی تھی اور خاصی مفید بھی تھی۔

اس کے بعد میں ساحل کو مارشل آرٹس کی تربیت کے لیے ابتدائی ایکسرسائز سے متعلق بتانے لگا۔ یہ بلکی پھلکی جسمانی ورزشیں جسم کو گرم کر کے اس میں چپک پیدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بازوؤں اور ٹانگوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دینا آسان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم واپس فلیٹ پر آگئے۔ اس دوران میں امتیازیدار ہو چکا تھا۔

ناتھنے کے دوران میں بھی میں نے ساحل کو گم صم پایا۔

بولی۔  
میں نے کہا ”سائل! تیرے بات اچھی طرح جانتی ہو“ آج  
میں امتیاز کے پاس اور ”سی ایف کے“ کے کمراد ہر تاشیب  
غوری سے ملنے جا رہا ہوں اور تم پوچھ رہی ہو ”جانا کہاں  
ہے“  
”اوہ!“ اس نے اپنے چہرے کے عضلات کو اس طرح  
حرکت دی جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو پھر بولی ”سوری وجدان!  
میں واقعی بھول گئی تھی۔“  
”یہ سوری کیا ہوتا ہے؟“ میں نے اسے تیز نظر سے  
گھورا۔  
”سو۔۔۔ وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔  
میں سمجھ گیا“ وہ ”سوری“ کے استعمال پر سوری کئے

میری اس تعریف سے وہ خوش ہوئی ماماں نے  
میں وہ شوخی اور جوش شامل نہیں تھا جو اس کی فطرت  
تھا۔  
یہ ایک حقیقت ہے کہ ہارس پوزیشن میں کلب  
سانس کی وہ مشق لگا رہا بیچ تنک کرنا خاصا مشکل  
ہے۔ اس مشق کے بعد ذہن کا تھک جانا ایک لازمی  
ہے۔ میں نے سوچا، معاملے میں شوق میں بہت کر کے  
تو تھیک ٹھاک کر لی۔ اب واقعی اسے تھکن کا احساس  
ہوگا۔ کچھ دیر آرام کر لے گی تو اس کی ساری  
ہو جائے گی۔ میں اسے قلیت پر رولی کے پاس چھوڑ  
کے ساتھ روانہ ہو گیا۔  
میری اس سوچ کو دل نے قبول نہیں کیا۔

عجیب گویا کی عمر بچپن، چھپن کے قریب تھی۔ نہ چھپے  
 فٹ سے لگا ہوا، جسم انتہائی متناسب اور سرخ و سفید  
 و رنگت وہ سر سے تقریباً نکلتا ہی تھا۔ بالوں کی ایک جھار سی  
 گھڑی پر موجود تھی۔ اس نے نفیس اور قیمتی فریم والا نظارہ  
 چسپاں لگا رکھا تھا۔ جسم پر انتہائی عمدہ تراش کا ایک بیش قیمت  
 سوٹ تھا۔ غریب کے بائیں گال پر بھورے رنگ کا ایک مسما  
 موجود تھا جس کا سامنے دو کیڑے کسی ٹکے کے برابر تھا۔ وہ  
 بھاری اور گونج دار آواز میں بڑی روانی اور فراوانی سے

میں نے نوٹوگراف سے نگاہ اٹھا کر شعیب غوری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں بولا ”مشرووحدان! گھرے سانوے رنگ کا یہ شخص میاں زاہد حسین ہے، جسے عام طور پر ”میاں جی“ کہا جاتا ہے۔ اس تقریب میں وہ ہے کس اور نانا درپوہ عورتوں کو سلائی شیشیں تقسیم کر رہا ہے۔ اس قسم کے شوخیل ڈرامے وہ اکثر کرتا رہتا ہے اور۔۔۔“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”وہ جو قصور میں پولیس افسر نظر آ رہا ہے نا“ یہ میاں کا ایک دوست ایس پی ہے جو اکثر تقریبات کو



بادری اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ میاں زاہد کو تصویریں کھینچوانے اور عوام میں مقبول ہونے کا بہت شوق ہے۔ شاید مستقبل بعید میں وہ خود کو چیف منسٹر یا گورنر کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ سیاست میں بھی بڑی سرگرمی دکھا رہا ہے۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اثبات میں سرھلایا اور وہ فوٹو گراف شعیب غوری کی جانب بڑھا دیا۔  
”اپنے پاس رکھ لو“ وہ دھمکے ہوئے لہجے میں بولا۔  
میں نے کہا ”میں نے میاں جی کو اپنے ذہن میں رکھ لیا ہے۔“

”گھٹ۔۔۔ دیری گڈ۔ تم میرے اندازے کی تصدیق کر رہے ہو مشرود جان!“  
”تمہارا یہ اندازہ میرے بارے میں ہے یا میاں زاہد حسین کے بارے میں؟“

وہ بولا ”تمہارے بارے میں مشرود جان علی!“  
”لیکن تم نے تو میرے بارے میں ایک بات نہیں کی۔“  
میں نے کہا ”پھر میرے بارے میں لگائے گئے کسی اندازے کی تصدیق یا تردید کیسے ہو سکتی ہے؟“

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے تھکا رہا پھر گہرے لہجے میں بولا ”جب وقت آئے گا تو تمہارے اور تمہارے معاملات کے بارے میں گفتگو رہے گی جس کے نتیجے میں مجھے یقین ہے ہم بہت گہرے دوست بن جائیں گے۔“

میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شعیب غوری کی بات اس وقت میرے لیے نہیں پڑی تھی تاہم ازاں بعد اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہمارے درمیان واقعی بہت گہری دوستی قائم ہو گئی تھی۔

میں امتیاز کے پاس شعیب غوری سے ملاقات کے بعد باہر نکلا تو امتیاز نے مجھے گھیر لیا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا کہ ہمارے بیچ کیا باتیں ہوئیں۔ جب میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ لٹی میں سرھلاتے ہوئے بولا ”کیا واقعی؟“

”ہاں یار!“ میں نے کہا ”میں خود بھی حیران ہوں۔“  
”بات تو حیرانی ہی کی ہے“ وہ کسی گہری سوچ میں نظر آنے لگا ”پاس تو نوڈی پوائنٹ اور نہایت مختصر بات کرنے کا عادی ہے۔۔۔ مجھوہ ایک انتہائی غیر متعلق موضوع کیوں لے بیٹھا۔“

اس کے انداز سے لگتا تھا ”وہ خاصا مایوس ہوا تھا۔ میں نے کہا ”یار! تمہارا پاس تو مجھے عجیب سا لگا ہے۔ پورے

آدھے گھنٹے تک وہ مجھے یہ بتاتا رہا کہ ذہنی کے کر لائٹ ایریا کہاں واقع ہے اور کس ملک کی نورت ہے؟ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تھمارے پاس بھرپور کمال گزرتا رہی اپنی ڈی کر رکھا ہے اس کی فوری معلومات اور بیان کردہ عجائبات حیرت آفرین اور حجابز ہیں۔“

”جگر! تم کوئی گزیر تو نہیں کر رہے ہو؟“ وہ ٹھنک سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔  
میں نے کہا ”گزیر۔۔۔ اور وہ بھی تم سے سوال نہیں ہوتا۔“

”لیکن اپنا پاس ایسا تو نہیں!“ اس کی بے چینی تھی۔  
”تم اس سلسلے میں پاس سے استفسار کر سکتے ہو۔“  
”یہ نامکن ہے“ وہ جلدی سے بولا۔  
”پھر مجھ پر اعتبار کرو۔“  
”وہ تو کرتا ہوں۔“  
”پھر؟“

”جگر! پاس کا تمہارے ساتھ رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔  
وہ اچھے ہوئے لہجے میں بولا۔  
میں نے کہا ”امتیاز! وہ تمہارا پاس ہے اور۔۔۔“  
آلوین رائٹ!“

”اوکے۔۔۔ دیش اوکے میں سمجھ گیا“ وہ ہاتھ بولا۔  
اس کے اشارے پر بے اختیار مجھے ہنسی آئی۔  
پھر ایک مینٹا گزر گیا۔ اس عرصے کے دوران

ساحل کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بالکل اسی تھی۔ سب سے اسی طرح مل جل رہی تھی جیسے وہ پہلے تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا اس کے اندر کوئی بہت بڑی تبدیلی آ رہی ہو وہ پہلے مجھ کے باوجود بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس کا کوئی سسٹم آف ہو گیا تھا۔

میرا یہ احساس تھائی میں اور زیادہ شدت کر جاتا۔ خلوت میں جتنی ہی مجھے یوں لگتا ساحل پہ ہو گئی ہے۔ پہلے اس کا انگ انگ میرے قرب کا مظاہر تھا۔ وہ میرے تنک کے لیے چلتی تھی اور اس کی بار خود پسندی کی حدود کو چھوئے لگتی تھی۔ اس کی انگریزوں نے میرے اندر حوصلہ جگایا تھا اور میں نے چند عملی مثالیں قائم کر ڈالی تھیں مگر اب وہی ساحل

ساحل پر پتھر خرچ سا گر جا چھپی تھی۔ وہ جتنی نظر آ رہی ہے اس سے میری کتنی ممکن نہیں تھی۔ میری پریشانی قدی تھی اس کے گرد کے حوالے کر کے صاف نکل جاتی۔ وہ خوبصورت گزیر تھی بلکہ ایک سلجھاؤ تھا مگر میری آنکھوں میں ڈال دیتی۔ میں بعض اوقات ذہن مجھے الجھاؤ میں ڈال دیتی۔ وہ باوقی ہوئی پر لکونی مسکراہٹ عجیب سا کھڑا ہوا جاتا۔ وہ باوقی ہوئی پر لکونی مسکراہٹ عجیب سا کھڑا ہوا جاتا۔ وہ باوقی ہوئی پر لکونی مسکراہٹ

جائے میری آنکھوں میں بہت دور تک اور بہت دیر تک تکتی رہتی۔ اس وقت میں خود کو ٹرانس کی سی کیفیت میں محسوس کرتا۔ وہ ایک عالم ہوئی اور میں معمول ”وہ ایک ساحرہ ہوئی اور بہت محورا“  
ساحل میری توقعات سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔ وہ میری زندگی میں آنے والی ہر لڑکی سے مختلف تھی۔ اس کے اندر بڑی گہرائی اور گہرائی تھی۔ وہ تو اپنے وجود میں موج زن ایک تجربے کران کا تعارف تھی۔ جس طرح ساحل پر بیٹھ کر لوں تھے والے شخص کو سمندر کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اسی طرح ساحل سے ملنے والا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے والا اس کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اسی طرح ساحل کے بعد خاموش ہو جاتی ہے ”اسی اندازہ بن جاتی ہے۔ شعلہ دکھا کر شعلوں کی نذر ہو جاتی ہے ساحل میرے من میں ایک تریب جگا کر شائست ہو گئی تھی وہ میرے احساس کا حصہ بن گئی تھی۔ میری سانسوں کی سرسبز میں وہ خوشبو کی طرح بس گئی تھی۔ کس کی انتہا سے کشید کیا ہوا کیف وہ آدھری نہیں دے سکتا جو اس آنچوے سرور میں پناں تھی۔

ساحل نے اس ایک ماہ کے اندر عملی میدان میں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ ”جی“ کی مشق کے خاطر۔ خواہ مخواہ برآمد ہوئے وہ لائٹ ویٹ اشیاء مثلاً کانڈ، کولڈ ڈرک کا اسٹرا اور پانی کی سطح کو حرکت دینے میں ماہر ہو گئی۔ اب اس کا توجہ کے ساتھ پریکٹس کی ضرورت تھی۔ اس کی باطنی توانائی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا، اس کی کارکردگی اور فعالیت بھی بڑھتی چلی جاتی۔

مارشل آرٹس میں ساحل نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ابھی خاص فائٹ کر سکتی تھی۔ اس سرفہر فن سیکھنے کے لیے رات دن محنت کی تھی۔ وہ بنیادی تین لکس یعنی فرنٹ لک، سائڈ لک اور بیک لک بالکل صحیح انداز میں استعمال کرنے پر قادر ہو گئی۔ ازیں علاوہ بلا لک اور پینٹلک میں بھی بہت مہارت ہو گئی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ساحل میں سیکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی جس

میں اس کی سنجیدگی نے مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے بالکل رولی نے مجھے سخت مایوس کیا۔ امتیاز نے ایک روز مجھ سے کہا ”کیا بات ہے جگر! تم اپنی اس بہن رولی پر توجہ نہیں دے رہے ہو؟“

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”یار! مایوس کے منہ پر مرم لگانے سے بات نہیں بنتی۔ مجھے یہ سرجری

# مقناطیسیت

اس کتاب کے مطالعے سے آپ کی شخصیت کی مقناطیسی قوت کو اجاگر کریں اور کامیابی زندگی میں گوارے دیں

قیمت

40 روپے

★

آؤ خرچ

23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ

www.kitabiat.com

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

کیس لگتا ہے۔

وہ تائیدی انداز میں سرہلانے لگا۔

میں نے مزید کہا ”روٹی کے علاج کے لیے مجھے پہلے اس کی کمائی سننا ہوگی۔ وہ کمائی جس کا تم نے ابتدا میں تذکرہ کیا تھا۔ اس کی نفیات میں کوئی گمرہ پڑی ہوئی ہے۔ جب تک وہ گمرہ نہیں کھلے گی کوئی مشق اور آئسکریٹس اسے قائمہ نہیں پہنچائے گی۔“

”تم کس گمرہ کی بات کر رہے ہو جگر! وہ ٹرسوچ انداز میں بولا ”مجھے تو لگتا ہے“ اس کی پوری نفیات ہی کھل چکی ہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”ویسے تو میں بھی نہیں اس کی کمائی تفصیلاً سنا سکتا ہوں لیکن اس کی تحلیل نفسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان سے بتائے۔“

میں نے اثبات میں سرہلایا ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کوئی مناسب سامع دیکھ کر اس کا تفصیلی انٹرویو کروں گا۔ ویسے تم نے بھی اس سلسلے میں کوشش نہیں کی۔“

”ایک آدھ بار کی تھی لیکن جی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی“ امتیاز نے اپنی شکست کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”ٹھیک ہے“ اب میں ٹرائی کروں گا۔“

”یہ بہت نیکی کا کام ہو گا جگر!“

”ہاں یہ تو ہے۔“

میر بخش کی آمد سے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میر بخش اب پوری طرح فٹ ہو چکا تھا۔ ہم نے اس کا فرضی نام سلیمان شاہ رکھ لیا تھا۔ ہم فلیٹ کے اندر صرف وجدان، ساحل اور میر بخش ہوتے تھے ورنہ باہر ہر جگہ ہم وجیہ، الماس اور سلیمان شاہ بن جاتے تھے۔ میر بخش نے اسی فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ڈیرا بجا رکھا تھا۔

فلیٹ پر قیام کے دوران میں نے اس ایک ماہ میں بہت سے مفید کام بھی کیے مثلاً میں نے پورے کراچی کو دیکھ ڈالا، تمام اہم راستے ذہن نشین کر لیے۔ اب میں کہیں بھی

ترن تنہا آ جا سکتا تھا۔ بیسٹریوں اور وگینوں کے روٹ اور نمبر بھی مجھے معلوم ہو گئے جو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیے۔ جس طرح ہم نے اپنے گیت اب اور حلیوں میں مناسب تبدیلی کر لی تھی بالکل یہ سلوک میر بخش کے ساتھ بھی کیا گیا۔ اس نے باقاعدہ ڈانسی چھوڑ دی تھی، پہلے اس کے

چہرے پر صرف ہماری بھرم مچھیں ہوا کرتی تھی۔ پوری طرح اس شر کے رنگ میں رنگ گئے تھے اور ڈھل گئے گویا ہم بھی ”جگر اچوی“ ہو گئے تھے۔

اس عرصے میں اپنی رضا سے، میں نے امتیاز مشن میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ درحقیقت یہ ”جگر“ کے پرائیکٹ تھے۔ میری ہمراہی نے امتیاز مشن خوشی سے سر فراز کیا۔ وہ اب مجھے اپنا دایاں بازو دے کر تھوکتے تھے۔ وہ اس کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔

پہلا مشن ”جگر“ ٹیلی فون کے ایک انفری کٹر کے قتل کرنے والوں کے خلاف تھا۔ ڈی ای کی ایک لاکھوں کی نوبتہ ایک پارٹی کے خلاف قانونی چارہ جو اسے نامعلوم افراد کی طرف سے خطرناک دھمکیاں لگیں۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ فریق مخالف نے اس سالہ بیٹی کو اغوا کر لیا۔ پولیس نہ تو اس معصوم مغوی کی لاسکی اور نہ ہی اغوا کنندگان کا کوئی سراغ ملا۔ نوبتہ معاملے سے اپنی لا علمی ظاہر کرتی رہی۔ چند روز بعد اس کی کئی پھٹی لاش ایک گندے نالے سے مل گئی۔ برصغیر عظم کے اتنے بڑے واقعات کے بعد بھی پولیس مجرموں رسائی حاصل نہ کر سکی اور کیس دفتر داخل ہو گیا۔ ”جگر“ نے اپنی کوشش سے مجرموں کا سراغ نکالا اور سرکاری انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے چارہ جو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دوسرا واقعہ بہت اندوہناک اور گردنیں جھکا دینا تھا۔ یہ ڈیپٹی اور ایجو ریڈی کی ایک واردات تھی جس میں ڈاکوؤں نے گھر سے تمام نقدی اور زیورات سمیت سامان سمیٹنے کے بعد اس گھر کی فوجیا ہتا ہو کے ساتھ فعل بھی کیا تھا اور وہ بھی۔ اس بد نصیب کے شوہر آنکھوں کے سامنے گن پوائنٹ پر پہلے اس شخص کو دست دیا کر کے اچھی طرح رسیوں میں جکڑا گیا پھر بیوی کے ساتھ ہیمانہ سلوک کیا گیا۔ دوسرے روز ایک ٹرین کے نیچے آ کر کٹ مرا۔ خود کشی کے سوا اس پاس کوئی راستہ نہیں رہا تھا کیونکہ وہ بد قسمتی سے بلکہ جی تھا اور انتہائی وجیہ اور جوان بھی۔ بے بسی نے اس

سنے میں جتنے خیر دوست کیے تھے اس کے بعد وہ جی بے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس معمول کے مطابق ڈاکو تلاش میں ناکامیاب رہی۔ میں نے ”سی ایف کے“ سے تلے ان دو مجرموں کو تلاش کر کے قتل کر دیتے تھے۔

ثانی واقعہ تھا۔ ہمارا تیسرا بڑے گھرانے کا بگڑا ہوا ایک نوجوان تھا۔ وہ اپنی امارت کی جھلک دکھا کر نچلے طبقے کی لڑکیوں کو بہانہ بنائیں شادی کے خواب دکھا کر اپنی مرضی کے سفر پر دوڑنے لگا جاتا اور پھر۔ اسی دوری پر آنسو بہانا چھوڑ کر کسی اور میدان کی طرف نکل جاتا۔ اس کے گریڈ بڑے درجنوں ”کارنامے“ تھے۔ برادر ہونے والیوں میں سے ایک دن پولیس اسٹیشن جاکر فریاد بھی کی تھی مگر پولیس والے اس شیطان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ وہ جن مہاشیطانوں کی اولاد تھا، وہ بڑی پیچھے والے تھے۔ ان کے اشارہ اہد پر پولیس افسروں کی تقریریں اور تبادلوں ہوتے تھے۔ ”سی ایف کے“ نے اس شیطان کو ایک ناریک گوشے میں جکڑ کر ایک صاف ستھری سڑک کو اس کے غلیظ خون سے داغ دار کر دیا۔

ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں بلا واسطہ یا بالواسطہ ”سی ایف کے“ سے منسلک ہو چکا تھا۔

\*\*\*

میں اس وقت ”ایٹ“ میں شعیب غوری کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمارے سوا اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ یہ بنگلہ ہل پارک کے نزدیک ہی واقع تھا۔ امتیاز کے ذریعے غوری کے پیغام پر میں وہاں پہنچا تھا۔

آج وہ قدرے مختلف موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کڑش ملاقات کی طرح کیس یا کسی اور غیر متعلقہ بات کو موضوع گفتگو نہیں بنایا بلکہ حال چال دریافت کرنے کے بعد اس نے میرے ”تعاون“ کی تعریف کی اور پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”سر وجدان! بھجلی ملاقات میں، میں نے تم سے ادھک کی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر تمہیں حیران ہونا چاہیے تھا مگر تم نے اپنی کسی ابھمن یا حیرانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔“

وہ یہاں تک پہنچ کر خاموش ہوا اور غصی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ نظر کے چشے کے پیچھے اس کی ذہین آنکھیں مارکت تھیں۔ میں خاموش رہا تو اس نے کہا۔

”دراصل اس وقت تک میں تمہارے بارے میں اوجھری معلومات رکھتا تھا لیکن اب یہ مکمل معلومات تقریباً مکمل ہو چکی ہیں اس لیے پرنس کی بات ہو سکتی ہے۔“

”کیسا پرنس؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا ”سی ایف کے کو چلانے کے لیے مجھے مختلف قسم کے پرنس کرنا پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے، کوئی بھی تنظیم سہائے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس کو فعال رکھنے کے لیے فنانس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں یہ تو کر نہیں سکتا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے لوٹ مار شروع کروں۔ میں نے دولت کمانے کے چند ذرائع وضع کر لیے ہیں اور انہیں میں اپنا پرنس کہتا ہوں۔“

میں نے ابھمن زدہ انداز میں کہا ”مجھ سے تم کس قسم کا پرنس کرنا چاہتے ہو؟“

”میں اسی طرف آرہا ہوں“ وہ اپنی مخصوص گوجیلی آواز میں بولا ”میں نے ابھی تک یہ فیصلہ تو نہیں کیا کہ تم سے کون سا پرنس کروں گا لیکن میرا خیال ہے“ اس ملاقات کے اختتام تک یہ معاملہ طے ہو جائے گا۔“

”تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کھل کر اور واضح الفاظ میں کہو“ میں نے پھلو بہتے ہوئے کہا ”تمہارا یہ بہم انداز مجھے الجھا رہا ہے۔“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا ”سر وجدان! مجھے پتا چلا ہے“ تمہارے اور چوہدری نواز علی آف رکھاں والی کے درمیان کوئی دیرینہ دشمنی پھل رہی

**مشہور ماہرین نفسیات کی آپریشن کتاب**

# احساس کمتری

(اسباب، تدارک، علاج)

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

● احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

● کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔

قیمت  
25 روپے

ڈاک خرچہ  
23 روپے

حدوث کتابت کراچی

74000 (0300) 740000

Kishan 1970@yahoo.com

(پیشہ 20) (پیشہ 5) (پیشہ 20) (پیشہ 20) (پیشہ 20)



نوازش سے دودھ ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔ حساب ماضی کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے۔ علاوہ ازیں میں اس دھڑکی، اس گھر اور اس مقام کو ایک مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں، جہاں میں نے جنم لیا تھا۔“

بولتے بولتے میری آواز بھرائی۔ غوری نے کہا ”مسٹر وجدان! جہاں تک جنم بمبوی کو دیکھنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے تمہیں ایک مرتبہ موضع رکھاں والی یہ نقشہ نہیں جانا ہوگا البتہ چوہدری والا مسئلہ میں کراچی میں بیٹھے بٹھائے حل کر سکتا ہوں۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”وہ کس طرح مسٹر غوری؟“

”ہم جب دوست بن ہی چکے ہیں تو تمہارے تمام دشمن میرے بھی دشمن ہیں“ وہ نہایت ہی سنجیدگی سے بولا ”میں اپنے بندوں کی مدد سے چوہدری کو ٹھکانے لگوا سکتا ہوں۔ میرے لیے یہ اتنا زیادہ مشکل نہیں۔“

میں نے نفی میں گردن ہلا دی ”نہیں مسٹر غوری! اگر تم چوہدری کو کسی بھی طرح ختم کروا دو گے تو مجھے مرنا نہیں آئے گا۔ میرے سینے میں جو لاؤ روٹن ہے اس پر ایک چھینٹا پانی کا نہیں پڑے گا۔ جب تک میں اپنے ہاتھوں سے چوہدری نوازش کو تڑپا تڑپا کر نہیں ماروں گا میرا انتقام پورا نہیں ہوگا۔ تم سینے میں روشن انتقام کی آگ کی تپش سے خوب واقف ہو گے۔ اس قاتل آگ کے لپکتے شعلے زہریلے ناگوں کے مانند اپنی زبانیں لہراتے رہتے ہیں۔ یہ آتش نشانی جب تک بجھے گا نہیں، مجھے قرار نہیں آئے گا۔“

”تمہاری یہ خواہش میں یہاں کراچی میں بھی پوری کر سکتا ہوں۔“ غوری نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں مسٹر غوری!“ میں نے ابھرنے والے نظروں سے دیکھا۔

وہ بولا ”میں کسی نہ کسی طرح چوہدری نوازش کو کراچی پہنچا کر تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔“

”کیا یہ تمہارے لیے ممکن ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی حرج نہیں میرے دوست“ میں نے پہلی مرتبہ شعیب غوری کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہرا اور کام کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ جیسی تو وہ اتنی اہم تنظیم کو بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا۔ میں نے اسی کے انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مسٹر شعیب! اگر تم یہ کام کرو تو تمہاری تنظیم ”سی ایف کے“ کو

بھاری امدادوں گا۔“

”اس ریشم کی ضرورت نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اگر میں تمہارے دشمن کو یہاں پہنچا کر تمہارے قدموں میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ ایک اور طرف سے دوسرے دوست کے لیے ایک اور سیاق و سباق ہوگا۔“

میں اس کے انداز دوستی کو سراہے بنا نہ رہا۔ ”غوری! تم ایک قابل فخر دوست ہو۔ مجھے بھی کبھی تمہارا دیکھنا۔ وجدان کی دوستی تمہیں پسند آئے گی۔“

”مجھے وجدان اور اس کی دوستی پسند آچکے ہیں۔ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا“ اور میں دوستی کو آزمانے کا قائل نہیں۔ دوستی ہر قسم کے راز کیل سے ہونا چاہیے۔“

”میں خود بھی اسی قسم کے خیالات کا مالک ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا ”پھر تو خوب نیچے کی مائی نیچر۔“

”شیور مائی زیر غوری۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا بول بے تکلفی سے مجھے ”غوری“ کہنا شروع لگتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”حالانکہ ہماری غور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے اس طرح پکارنے مجھے کوئی یاد آجاتا ہے۔“

بات ختم کر کے وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔ مجھے ہر محسوس ہوا جیسے وہ ماضی میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ میں نے بے تکلفی کی فضا کو قائم رکھتے ہوئے جیسے جیسے میں استفسار کیا۔

”مسٹر غوری! کوئی یاد آجاتا ہے یا۔۔۔ یاد آجاتی ہے؟“ وہ چونک اٹھا پھر اس نے بڑی خوبصورتی سے میرا سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ معاملہ رفع دفع کروا دیا۔

”وجدان! ”یاد“ کا لفظ چوں کہ مونث استعمال ہوتا ہے اس لیے ”یاد آجاتی ہے“ کہہ دینا مجھے کچھ غلط نہیں۔ تم چاہو سمجھ سکتے ہو!“

مجھے جو سمجھنا تھا وہ میں سمجھ گیا۔

اس نے واپس کرٹ ٹاپک کی طرف آتے ہوئے کہا ”مسٹر وجدان! اس وقت تمہارے سامنے تین اہم کام ہیں۔ نمبر ایک، متروک کنوئیں سے سونے کے بھرے ہوئے بڑے شعلے پر آد کرنا۔ نمبر دو، چوہدری نوازش علی سے عداوت انتقام نمبر تین، تمہاری جنم بمبوی کی یا تڑا۔ نمبر چار ہے، ہمیں یہ کام ایک خاص ترتیب اور تاثر سے کرنا چاہیے۔“

”تمہارا خیال بالکل درست ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”پانچ اور تھانگ ہر کامیاب منصوبے کی شرائط اولین ہیں۔ تمہارے ذہن میں اس بارے میں کیا رائے ہو؟“

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ”پہلے میں اس متروک کنوئیں کی تلاش اور کھدائی کا محفوظ بندوبست کروں گا۔

کھدائی سے ایک روز قبل میں چوہدری نوازش علی کو تمہارے پاس پہنچانے کا انتظام کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ دونوں کام ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہو جائیں۔ جس روز چوہدری تمہارے ہتھے چڑھے، اسی روز کنوئیں کی تہ سے سونے والے خیمے نکال لیے جائیں۔ پھر کھدائی کا کام میں

میل کروالوں گا۔“ وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکھا پھر اپنی چیز کو کھینچ کے مراحل سے گزرتے ہوئے بولا ”ان واقعات کے چند روز بعد تم اپنی جنم بمبوی کی یا تڑا کو جاسکتے

ہو۔“

”ویل ڈن۔“ میں نے ستائشی نظروں سے غوری کو دیکھا۔ ”مجھے تمہارا پروگرام پسند آیا۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

”شیک یو مسٹر وجدان!“ وہ سر کو خفیف سی جھنجھوڑتے ہوئے بولا ”میرے پاس تمہارے لیے ایک اور بھی تجویز ہے۔“

”میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا ”اگر تم سونے کا حصہ نہ لینا چاہو تو میں اس سونے کی بات کے برابر تمہیں رقم بھی دے سکتا ہوں۔ جس بھی کرنا میں تم چاہوں۔ یو۔ ایس۔ اسٹریٹنگ۔ یا جو بھی تمہاری خواہش ہو۔ میں وہ تمام سونا اپنے انگریز دوست مسٹر نیل

آرمز کے حوالے کر دوں گا۔ تم تو جانتے ہی ہو، وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک چلاتے ہیں۔ ہم اس سونے کے عوض کرنسی حاصل کر سکتے ہیں۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا ”بڑے تو غریب سنگاپور سے بھی ایک بہت بڑی رقم

یو۔ ایس کی شکل میں تمہارے پاس پہنچنے والی ہے۔ مجھے لگتا ہے تم اقل رات، فلینز کٹر، فلینز ہونے والے ہو!“

آخری جملہ اس نے مذاق کے رنگ میں کہا تھا۔

میں نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”مسٹر غوری! ہماری بارگزر شپ کا دوبارہ اس سونے کے حصول پر ہے۔ اگر بالفرض، تم وہ سونا برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تو تمہاری اس محنت کو کون ادا کرے گا۔“

”سوال اچھا ہے۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”لیکن میں تم سے ضرور پوچھوں گا کہ یہ سوال تمہارے ذہن میں کس بنا پر آیا ہے؟“

میں نے کہا ”اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں

کرنا چاہیے کہ ہونے کی کھدائی کے سلسلے میں اچانک حکومتی سرپر کوئی رکاوٹ سامنے آسکتی ہے۔ بہر حال وہ سونا سنگلنگ کے مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر حکومتی اداروں کو اس کی کھدائی کی کٹنگ مل گئی تو تمہارا کام کھدائی میں پڑ جائے گا۔“

”حکومت اور حکومتی اداروں کی تم پر دھمک۔“ وہ جڑا اعتقاد لیے میں بولا ”میرے ذہن میں ایک اچھوتا اور خفاف منصوبہ ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔“

”کیونکہ میں کس مقصد کے لیے وہ کھدائی کروا رہا ہوں۔ بلکہ میں تو حکومت کی سرپرستی میں وہ کام کروں گا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”وہ کس طرح دوست؟“

”میں نے کہا نا، یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ وہ ہاتھ کو قتل کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا ”میں جانتا ہوں، اس ملک میں قانون کی مدد سے غیر قانونی کام کس طرح کیے جا سکتے ہیں۔ تم اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔“

”ہاں، اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور پوچھ ہو تو وہ بھی آتا رہا۔“

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا ”ایک خدا شہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے یہ وہ سونا وہاں سے نکالا جا چکا ہو!“

میں نے یہ بات دانستہ صرف غوری کو چپک کرنے کے لیے کی تھی ورنہ میں جانتا تھا، اگر صحیح نشاندہی کے بغیر اس مدفن سونے کی بازیابی ممکن ہوتی تو چوہدری اب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھنا رہتا۔

شعیب غوری نے کہا ”مسٹر وجدان! اگر وہ سونا متروک کنوئیں سے نکالا جا چکا ہو تو یہ بات چوہدری نوازش سے چھپی نہ رہتی۔ یا تو وہ خود سونے کو وہاں سے نکالوا یا نکالنے والوں کی جان کو آجاتا۔ اس صورت حال میں وہ حالات پیش نہ آتے جو پاکستان۔ خصوصاً کراچی میں داخل ہوتے ہی

تمہیں درپیش ہیں۔ چوہدری کے تنگ خوابوں نے ڈائری کے حصول کے لیے ہوتا آنکھ کو ہلاک کروا، تمہارے ساتھی میر بخش کو بھی اسی سلسلے میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مجھے ایک

سوا ایک فیصد یقین ہے کہ وہ ہماری مایت کا سونا ابھی تک اسی متروک کنوئیں کے اندر، کیونوں کے ”سیلنگ بینک“ میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو

اچانک خاموش ہوا پھر مضطرب انداز میں دونوں ہاتھ لٹے ہوئے بولا ”مجھے ایک اچھوتا آنکھ سوجھ رہا ہے مسٹر

وجدان!“

”کیسا آئیڈیا؟“

”میاں جی سے دل گھٹی کا آئیڈیا۔“

”میں سمجھ نہیں سکا مسٹر غوری!“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”ہم میاں زاہد حسین سے کچھ انگلیلیاں کر سکتے ہیں۔“

میں اب بھی اس کی بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا اور پوچھا ”کیسی انگلیلیاں؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”مسٹر وجدان! تم ”کام“

کے دو صفحات نکال کر وہ ڈائری ہوٹل کے کمرے ہی میں چھوڑ

آئے تھے۔ میاں زاہد نے وہ ڈائری فوری طور پر اپنے پاس

چوہدری نواز ش کو بھجوا دی ہوگی۔ یہ بات صرف ہم جانتے

ہیں کہ وہ ڈائری ایک بے کار اور بے مصرف کتاب بن کر رہ

گئی ہے۔ ورنہ میاں زاہد اور چوہدری نواز ش تو خوشی سے

بغلیں بجا رہے... ہوں گے ہمیں انہیں اسی خوش فہمی میں

جتنا رکھتے ہوئے ان کی خوشی کا سوا ستیاناس مارتا ہے۔“ وہ

ایک لمحے کو خاموش ہو کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ

لینے لگا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”اب تم اس ڈائری

کے حصول کے لیے میاں زاہد کا تعاقب کرو گے۔ یہ تعاقب

میاں زاہد اور اس کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان

پہنچانے کے لیے ہو گا۔ آؤ اس ڈائری کی استعمال کی جائے

گی۔ اس سے ہمیں دہرا فائدہ پہنچے گا۔ تمہارا ڈائری کے پیچھے

بھاگنا ان کی خوش فہمی کو اور زیادہ مضبوط کر دے گا کہ سونے

کا راز اسی ڈائری کے اندر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس

بھاگ دوڑ میں چند جرائم پیشہ بڑے لوگ بھی اس شر سے کم

ہو جائیں گے۔ خس کم، جہاں پاک... والی مثال تو تم نے سن

رکھی ہوگی مسٹر وجدان!“

میں نے اس کے آئیڈیے کو سراہا پھر ہمارے درمیان

باہمی امور پر کچھ باتیں ہوئیں اور جب میں شعیب غوری کے

ٹھکانے ”ایٹ“ سے رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھے ایک

مرتبہ پھر حیران کر دیا۔ وہ میری جانب ایک خاکی لفافہ بڑھاتے

ہوئے بولا۔

”مسٹر وجدان! یہ تحفہ میری طرف سے رکھ لو۔“

”کیا ہے اس لفافے کے اندر؟“

”کھول کر دیکھ لو۔“

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خاکی لفافہ وہیں

کھول لیا۔ اندر سے دو کی رنگ برآمد ہوئے۔ دونوں رنگز میں

چند چایاں بھول دی تھیں۔ میں نے سوالیہ نگاہ سے اس کی

طرف دیکھا۔

وہ تبسم ریز لہجے میں بولا ”ان میں ایک پٹھے میں گاڑی

کی چایاں ہیں، نئی ٹوبلی نیلے رنگ کی شیرٹ۔ دوسرا کی رنڈ

فلٹ کی چابیوں والا ہے۔ یہ فلٹ ساحل سمندر پر

ایک کثیر الشمارہ اپارٹمنٹس بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر

ہے۔ نیلی شیرٹ ڈاسی بلڈنگ کی پارکنگ میں موجود ہے۔ گاڑی

نمبر اور فلٹ کا ایڈریس ایک پرچے پر لکھا ہوا ہے اور وہ

بھی اسی بھورے لفافے کے اندر ہے۔ شاید تم دکھانا چاہ

گئے!“

میں نے بے اختیار اس خاکی لفافے کے اندر جھانکا

مذکورہ پرچہ برآمد کر لیا۔ وہ پرچہ غوری کے بیان کی تصدیق

تھا۔ گاڑی کا نمبر اور فلٹ کا ایڈریس اس پر درج تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا

پوچھا ”یہ سب کیا ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں مسٹر وجدان! یہ ایک حقیر سا تحفہ

میری جانب سے۔“

کسی کے پر خلوص تحفے کو ٹھکرانا نہیں چاہیے جب

مخلص سے نئی نئی دوستی بھی ہوئی ہو۔ میں نے وہ خاکی لفافہ

جیب میں رکھتے ہوئے کہا ”مسٹر غوری! تمہارے یہ تحفے

خاصے وزنی ہیں!“

انداز مذاق کا تھا، وہ بھی اسی رنگ میں بولا ”اگر وہ

زیادہ محسوس کرنے لگو تو ساتھ ساتھ آتا رہے بھی جائے۔

دوستوں سے تحفے لے کر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔“

میں نے کہا ”اب تم ہم دوست بن گئے ہیں اس لیے

”مسٹر“ کا حلقف اچھا نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کو کہہ

اور شعیب بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”اوکے۔“ وہ ذریعہ مسکرایا پھر بولا ”وجدان! تم

ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس فلٹ پر شفٹ ہو جاؤ۔

نے بجلی ٹیگس اور ٹیلی فون کے بل ایڈوائس بے کر گئے

ایک سال تک تو یہ بل مانس میں آئیں جسے فلٹ کی

فرنش ہے۔ کچن میں فرنیچر سمیت ضرورت کی ہر شے

ہے۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے

اس بلڈنگ میں ہر فلور پر صرف دو فلٹ آئے سائے

ہوئے ہیں۔ وہاں سب اپنے کام سے کام رکھنے والے

پذیر ہیں۔ کوئی کسی کی ٹوہ میں نہیں ہے اور نہ ہی کسی

معاظے میں ٹانگ اڑانے کی کسی کے پاس فرصت

نمایت ہی سکون اور آرام سے وہاں وقت گزار سکتے

ہیں نے شعیب غوری کے اس تحفے کو خوش

قبول کیا اور ”ایٹ“ سے باہر نکل آیا۔

روٹی اور امتیاز خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے۔ ان کی خوشی میں حزن کی آمیزش تھی ”سی ایف کے“ کے بانی شعیب غوری سے ہونے والی میری ملاقات اور اس کے نتائج نے انہیں جہاں بے پناہ خوشی دی تھی وہیں وہ اس احساس سے خالصہ ریجید تھے کہ اب ہم ان سے رخصت ہونے والے تھے۔ ہماری رہائش طارق روڈ سے سمندر کے کنارے جانے والی تھی۔ میں نے امتیاز کا کندھا جھٹکتے ہوئے کہا ”یار! دل چھوٹا کیوں کرتے ہو۔ ہم ایک ہی شہر میں ہیں اور ملنے ملانے پر کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی۔“ ”جگرا! اگر تبدیلی رہائش کا فیصلہ پاس کا نہ ہوتا تو میں تمہیں کسی قیمت پر جانے نہ دیتا۔“ امتیاز نے خلوص دل سے کہا۔

”میں تمہارے دلی جذبات کو سمجھتا ہوں یار!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ کسی فوری خیال کے تحت بولا ”آج رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے یہ ایک طرح سے فیئر ویل ڈنر ہوگا۔“ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا پھر خود ہی امتیاز نے وغیرہ کا انتخاب بھی کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہم سب امتیاز کی گاڑی میں ایک اوپن ایئر ریٹورنٹ میں بوسے ڈنر کرنے جارہے تھے۔ امتیاز نے بتایا کہ وہ پہلے بھی وہاں کی مرتبہ آچکا تھا۔ وہاں کا مینو خاصا صحت مند اور کھانے صحت بخش تھے۔ روٹی نے بھی وہاں کے کھانوں کی بہت تعریف کی۔ اس اوپن ایئر ریٹورنٹ کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ ہم

ایک گوشے کی میز پر بیٹھ گئے۔ بوسے ڈنر کے اصولوں اور ٹیکٹک سے میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایسے مقامات پر وقت بہت اچھا گزرنا ہے۔ تھوڑا تھوڑا کھاتے رہو اور انجوائے کرتے رہو۔

ہم کھانے کے دوران میں خوش گہلوں میں مصروف تھے کہ اچانک مجھے اپنے پاؤں کے نزدیک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ کوئی جاندار وہاں موجود تھا۔ اس کے مخصوص لمس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کوئی بلی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے معیاری ریٹورنٹ میں وہ بلی کہاں سے آگئی تھی۔

میں نے اپنے پاؤں کو تھوڑی حرکت دی تو وہ ”میاؤں“ کی آواز نکالنے کے بعد دو سرے میزوں کی جانب دوڑ گئی۔ سب نے اس بلی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت سفید بلی تھی جو عام بلیوں کی بہ نسبت انتہائی صاف اور خوش نما تھی۔ امتیاز نے برا سامنا نہ بناتے ہوئے کہا ”یہ کم بخت کہاں

سے آگئی۔ میں اس ریٹورنٹ کی منجمنٹ سے ملا کر ”گاہ“ ”اب چھوڑ دو بھی“ روٹی نے بے پروائی سے کہا۔ اوپن ایئر ریٹورنٹ ہے۔ اس میں کسی بلی کا گھر نہیں ہے۔ پھر اس نے ہمیں کون سا نقصان پہنچا ہے۔“

ساحل نے بہ ظاہر سنجیدہ رہتے ہوئے ایک خوبصورت مذاق کیا ”یہ بلی وجدان سے اپنی برادری کا بدلہ لینے کیلئے چھوڑے گی نہیں اسے۔“ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر خاموش رہا۔ امتیاز نے پوچھا ”جیسی“ بلیوں کی برادری کا کیا قصہ ہے؟“ ”پچھلے دنوں وجدان ایک تجربہ کرنے کے لیے غریب بلیوں کو اپنا بھوٹا کھانا دیا ہے“ ساحل نے امتیاز کو بتایا۔ اپنے کنبے کی سردار بھی ہے۔ اس نے اپنی تحقیق سے معلوم کر لیا ہے کہ وجدان کتنا خطرناک تجربہ کر رہا تھا۔ میں بلیوں کی جان کو صد فیصد خطرہ تھا۔“

اب روٹی اور امتیاز بھی بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ غریب ہدایت پر میں نے چند ایسے تجربات کیے تھے۔ وہاں ہے ”ان تجربات اور لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ قسطنطنیہ ہوا تھا۔ کسی بھی بلی کو میرے جھوٹے سے کوئی نقصان اور ٹیسٹ کی رپورٹس میں بھی ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس سے پتا چلتا ہو کہ ایک ذہنی انسان ہوں۔“

ہو میڈائنز غریب نے رپورٹس دیکھنے کے بعد میڈیا پر ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے وہ سمجھ رہی ہو ”میں خواہ تو اداں الجھانے کے لیے اپنے ذہنی پن کی کمائی لے کر اس پاس پہنچا تھا ورنہ میرے بلڈ اور اسپونم کی رپورٹ تو کیتر تھیں۔“

میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔ دو مرتبہ انتہائی خطرناک ذہنی سانپ مجھے ڈسنے کے بعد تڑپ تڑپ کر مر گئے تھے۔ میں نے دوبارہ ان کا حوالہ دیا تو ڈاکٹر غریب نے کہا تھا ”آپ ہو سکتا ہے“ آپ کسی جاندار کو اپنے دانٹوں سے کان دیکھیں۔ ویسے میرے خیال میں آپ کے ساتھ ذہنی پن کوئی مسئلہ نہیں۔“

میں نہ تو ڈاکٹر کے ساتھ کوئی مباحثہ کرنا چاہتا تھا۔ ہی اسے تجربات کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا۔ نے مجھے اپنے لیے مخصوص رکھنے کی خاطر میری توجہ ذہنی پن کی طرف دلائی ہو لیکن میں ان دونوں سانپوں کی موت کو نہیں بھول سکتا تھا۔ میرے استاد

ہر رنگ بلی نے پتا نہیں مجھے کون کون سی جڑی بوٹیوں کے پتے پٹے تھے کہ میں ہر قسم کے زہر سے محفوظ ہو گیا تھا لیکن میرے وجود کے اندر پایا جانے والا زہر کسی ٹیسٹ کی پکڑ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک وقت کا کھانا انسان زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں کھا لیتا ہے لیکن بونے میں جانے والے لوگ بعض اوقات تین چار گھنٹے سے زیادہ لگا دیتے ہیں کیونکہ اس ماحول میں کھانا کم اور باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہم نے بھی اس روز جی بھر کر وقف موضوعات پر باتیں کیں۔ امتیاز اور روٹی ہمارے بیوان تھے۔ ہم وہاں سیرانی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

جب ہم ریٹورنٹ سے باہر نکلے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم سروس پروڈر کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آئے۔ امتیاز کو گاڑی نکالنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہمارے عقب میں کسی نے اپنی گاڑی بڑے بے ہوش انداز میں کھڑی کر رکھی تھی۔ امتیاز نے اس گاڑی کے مالک کو کئی صلواتیں بھی سناوائیں تاہم یہ سب اس کے دل کا غبار تھا اور ڈاکٹر گاڑی کے مالک کی ساعت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اس فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے جو شعیب غوری نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ امتیاز نے کہا ”جگرا بڑے پوش علاقے میں جارہے ہو اور وہ بھی سمندر کے کنارے۔ میں نے وہ فلیٹ دیکھ رکھا ہے۔ بہت انجوائے کو گے گنگ سائز سلائیڈنگ ڈور میں سے ٹھانیں مارا

سمندر بڑا بحر کار دکھائی دیتا ہے۔“ ”جلیں“ ہم بھی ویک اینڈ پر چمک مٹانے ان کے پاس چلے جایا کریں گے۔“ اس وقت میں ڈرامائیگ کر رہا تھا۔ میری راہنمائی کے لیے سبجریٹ سیٹ پر امتیاز موجود تھا۔ روٹی اور ساحل گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھی تھیں اور دو مہمی آواز میں مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ میرٹش بھی امتیاز کے ساتھ ہی پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں امتیاز کی فرمائش پر گاڑی چلا رہا تھا حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ ڈرامائیگ لائنس وغیرہ کو کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس نے بے پروائی سے کہا تھا ”سب بھگت لیں گے جگرا“ ویسے بھی جس جس علاقے میں جارہے ہیں وہاں ان بھونٹی مولی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ وہ اس روز خاصا ڈاکٹر دکھائی دے رہا تھا۔

راستے میں ایک دو مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا ”کوئی ہمارا

تعاقب کر رہا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے بے اختیار اپنے عقبی منظر کا جائزہ بھی لیا۔ اپنے پیچھے خامے فاصلے پر مجھے ایک گرے جیب کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ گنگ بھگ نصف شب کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام رہ گیا تھا۔

کافٹن کا مین عبور کرنے کے بعد میں نے اپنے عقب میں اسی گرے جیب کی جھلک دیکھی تو چونکا ہو گیا۔ میں نے امتیاز سے کہا ”یار! میں محسوس کر رہا ہوں ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

امتیاز نے بھی گاڑی کے عقبی منظر کا جائزہ لیا اور چونکا اٹھا ”جگرا! ہمارا اشارہ اس گرے جیب کی طرف تو نہیں؟“ ”تم بالکل نشانے پر بیٹھے ہو“ میں نے کہا ”میں نے پہلے

## مشہر مصنفین کی شہرکتیں

### روشنی کے مینار

اسلام کے نامور مبلغین  
اولیائے کرام کے پیچھے  
اور بڑا شرافت  
ضیاء اللہ بھائی کے نگارے

قیمت 150/- روپے ڈاکٹنگ 25/- روپے

### عظمت کے مینار

ضیاء اللہ بھائی  
کے مضامین  
حکام و سرمد مجموعہ

قیمت 150/- روپے ڈاکٹنگ 25/- روپے

### ایمان کا سفر

محمد الدین لوہار کی  
اصلاحی کتابوں کا مجموعہ  
وہ فن پارے  
جن کی آپ کو تلاش ہے۔

قیمت 150/- روپے ڈاکٹنگ 25/- روپے

### مچرا گھر

محمد الدین لوہار کی  
کتابوں کا دوسرا مجموعہ  
جسے آپ آنکھوں سے نہیں  
دل سے نہیں سمجھ سکتے۔

قیمت 100/- روپے ڈاکٹنگ 25/- روپے

500/- روپے کی کتابیں ایک ساتھ مل کر بڑا سستا صفحہ  
یہ عبارت چینی می آڈر ارسال کرنے پر یہی اصل ہوگی

03022621-03022622-03022623  
Email: kashmiri@vsnl.net



بھی ایک دو مرتبہ اسے دیکھا ہے تاہم فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں نے اس کا خاص نوٹس نہیں لیا۔  
 ”اب تو وہ بتدریج فاصلہ کم کر رہی ہے“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا پھر اس کی چوٹی ہوئی آواز میری سماعت سے گرائی ”اے بھگیا یہ تو ہی گاڑی ہے؟“  
 عقلمی نشست پر موجود روٹی اور ساحل بھی ہماری جانب متوجہ ہو گئیں۔

میں نے امتیاز سے پوچھا ”تم کون سی گاڑی کا ذکر کر رہے ہو؟“  
 ”وہ جو ریسٹورنٹ کے سامنے ہماری گاڑی کے پیچھے پارک تھی“ امتیاز نے مختاط لہجے میں کہا ”اسی گرسے جیب کے باعث تو مجھے گاڑی نکالنے میں خاصی دشواری ہوئی تھی۔“

اب میں نے توجہ سے اس جیب کو دیکھا تو مجھے یاد آگیا۔ امتیاز واقعی درست کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی قوت مشاہدہ کی داد دینا پڑی۔ میں نے عقلمی نشست پر موجود اپنی ساتھیوں کو تنبیہ کی کہ وہ ہرگز ہرگز پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔ پھر میں امتیاز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ کہہ رہا تھا ”بھگیا میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں“ ریسٹورنٹ پہنچنے سے پہلے ہی ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ کوئی بت پہلے ہمارے پیچھے لگ گیا تھا۔  
 ”میرا بھی یہی خیال ہے“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

سپر مارکیٹ کے چوراہے سے میں نے ”امتیاز کی ہدایت پر گاڑی دلائیں جانب موڑ لی اور اس کے ساتھ ہی اس کی رفتار بھی بڑھائی۔ امتیاز عقلمی نگاہ سے متعاقب گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب گرسے جیب بھی ہماری تقلید میں مڑی تو امتیاز نے گھبر آواز میں کہا ”ہمارے پاس اسلحہ کی کیا پوزیشن ہے؟“

میر بخش نے بتایا ”ہمارے پاس جو بھی ہتھیار ہیں وہ ہمارے بیگ میں بند ہیں اور دونوں بیگز گاڑی کی ڈکی میں ہیں۔“

”پھر تو بے کار ہے“ امتیاز نے اضطرابی لہجے میں کہا ”اتنا وقت نہیں کہ ہم گاڑی روک کر ڈکی سے وہ ہتھیار نکالیں۔ اب تو ہمیں صرف اسی پٹسل سے گزارہ چلانا ہو گا جو میری جیب میں ہے۔“

اس کے ساتھ ہی امتیاز نے اپنی جیب سے اسٹیل پاؤڈر چائنا میڈ پٹسل برآمد کر لیا۔ یہ وہی پٹسل تھا جو گرین پٹسل

والے جنگل پر کارروائی کے لیے امتیاز نے مجھے دیا تھا۔ ازار بعد میں نے یہ پٹسل اسے واپس دے دیا تھا۔

بوٹ بینک سے گزرتے ہوئے دونوں گاڑیوں کا دروازہ فاصلہ اس حد تک کم ہو چکا تھا کہ تعاقب کے سلسلے میں کڑی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ گرسے جیب یا ہتھیار والی بچارو بھی جس کے اندر موجود افراد کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

امتیاز نے کہا ”یہ تمہوڑا آگے جا کر ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بوٹ بینک کا پُر وقت علاقہ گزر گیا تو پھر دور دور تک یہ سڑک تاریک اور دیران ہی ملے گی۔“  
 ”یہ کون ہو سکتے ہیں؟“ میر بخش نے سوال کیا۔  
 میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”یقیناً ہمارے دشمن!“

پھر جیسے ہی ہماری گاڑی بوٹ بینک سے خراب چورنگی جانب بڑھی، پچارو نے ہماری گاڑی کو اور ٹیک کیا اور ٹیک کی تیز چرچر ہٹ کے ساتھ جیب ہم سے کچھ فاصلے پر روک گئی، مجبوراً مجھے بھی گاڑی روکنا پڑی۔ اگر میں ٹیک لگانے میں ایک لمبے کی غفلت بھی کرتا تو خطرناک قسم کا حادثہ ہو سکتا تھا۔ پھر پچارو اس زاویے سے رکی تھی کہ سڑک تقریباً بالکل ہو کر رکھ گئی تھی۔

جیب رکھنے ہی دھڑا دھڑا اس کے عقبی دروازے کھلے اور دو افراد ایک کرچا رو سے باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ”کے“ دبی ہوئی تھیں جن کی ہلاکت خیز نال کا رخ ہماری جانب تھا۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی خود دفاعی کارروائی کر سکتے۔ وہ دونوں گمن بردار جنگلی کی سی سرعت ہماری گاڑی کے نزدیک پہنچے پھر اپنے ہاتھوں میں موجود

کلاشنکوف کو بڑے جارحانہ انداز میں ہم پر تان لیا۔ اس نے ساتھ ہی ان میں سے ایک نے غرا کر استفسار کیا۔  
 ”تم میں سے وچدان کون ہے؟“

میں سنانے میں رہ گیا۔ سوال کرنے والا مجھ سے مزید ایک فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبی کلاشنکوف بیل کا رخ میرے سینے کی جانب تھا اور گمن بردار مارنے مرنے پر پوری طرح آمادہ نظر آتا تھا۔

ان نازک لمحات میں کلاشنکوف کے آگنی بیل کے اندر میں نے موت کو بڑے مسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا!

گمن بردار کے سوال سے عیاں تھا، وہ میرا صورت دیکھ کر نہیں دھڑکا۔ وہ میرے بارے میں استفسار نہ کرتا۔ ویسے میں نے گزشتہ ایک ماہ میں اپنے جیلے میں اتنی تبدیلی کر لی تھی کہ وہ پہلا لاوا وچدان نہیں دیکھتا تھا۔

میرا پورا بدن تن کر ریٹھ الارٹ ہو گیا اور حواس اپنی تعل غایت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گرسے پچارو ریسٹورنٹ سے ہمارے تعاقب میں یہاں تک پہنچی تھی۔ اس تاریک مقام پر ہمیں گھیرنے سے یہی ظاہر ہوتا تھا ”ان کے ارادے ہرگز ٹیک نہیں ہو سکتے تھے پھر جیب سے آگے ہونے والے دونوں گمن بردار خامسے جارحانہ موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔ ان نازک لمحات میں بہت جتنے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔“

سہلا قدم میر بخش نے اٹھایا اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولنے کے بعد وہ اچھل کر گاڑی سے باہر نکل آیا پھر اس نے گمن بردار کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سینے پر زوردار ہاتھ مارا اور بڑے غریب لہجے میں بولا۔

”میں ہوں وچدان۔ بولو کیا کام ہے مجھ سے؟“  
 میر بخش کو اس سوال کا بڑا وحشیانہ جواب موصول ہوا۔ گمن بردار نے جنگلی کی سی سرعت سے کلاشنکوف کا بٹ میر بخش کے منہ پر رسید کرتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔  
 ”لا! اہیل بے وقوف سمجھتے ہو۔ تم کسی بھی طور وچدان نہیں ہو سکتے۔“

یہ بڑی ابھمی ہوئی صورت حال تھی۔ وہ لوگ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے اور میر بخش کو وچدان ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پتا نہیں، یہ ہمارے کس قسم کے دشمن تھے۔ میں اور امتیاز گاڑی کے اندر کسی ایکشن کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

میں اس وقت اپنے نزدیک گمن بردار کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے اس مرحلے میں ”جی“ کی قوت کو آنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن میرے اس فیصلے پر عمل سے پہلے ہی وہ واقعہ پیش آیا جس نے میں نے عجیب کہا ہے۔ میرا ارٹاکاز بلک جھپٹنے میں منتشر ہو کر رہ گیا۔

اچانک تاریکی میں سے کوئی سفید شے اڑتی ہوئی آئی اور کلاشنکوف بردار کے ہاتھوں پر کسی دہلیز سے تھوڑے کے مانند گمن گمن بین ہو کلاشنکوف میں کچھ بڑبڑایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی طرف گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کی خوں خوارابی کی غراہٹ ابھری اور وہ سفید شے بھاگتی ہوئی رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر

نہ لگی کہ وہ کوئی جلی تھی مگر اس کی جسامت عام بلیوں کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی!

یہ جلی کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ان لمحات سے بھرپور استفادہ کیا اور ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گیا۔ امتیاز نے میری تقلید کرنے میں ایک لمبے کی تاخیر نہ کی۔ وہ گاڑی سے نکلے ہی اس جانب دوڑا جہد میر بخش موجود تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے کلاشن بردار کی سمت بڑھا۔ وہ زمین پر گرے گرتے بچتا تھا۔

جلی کی جست اور جھپٹنے والا واقعہ سکھنے کے دسویں حصے میں پیش آیا تھا۔ لہذا میر بخش کو گمن کی ٹھوک لگانے والا مسلح شخص ”اپنے پیڑواتے ہوئے“ سا بھی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ہم دونوں نے ان دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس دوران میں بارش میر بخش بھی سنبھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔

میں نے سنبھلنے کی کوشش میں مصروف گمن بردار کے جڑے پر ایک دھواں دھار گھونسا رسید کیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے لمبا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلاشن پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک موڑا دیتے ہوئے اس کے پیٹ میں کھنسا مارا۔

وہ پہلے ہی اچھی خاصی تکلیف میں جلتا تھا۔ ناف کے مقام پر کھنسا کھانے کے بعد وہ زخمی ہوتے ہوئے جانور کے مانند ڈکرائے لگا۔ میں نے اس کی دردناک غفلت سے فائدہ اٹھا کر ایک جھٹکے سے کلاشنکوف کو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ گمن بواخت پر آتے ہی وہ وحشت زدہ نظریں مجھے کھنکھناتا لگا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑنے ہی مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔

میرے سوال کے جواب میں اس شخص نے ایک ناقابل فہم حرکت کی۔ اس نے چونکنے والے انداز میں میرے عقب میں دیکھا اور تیز رفتاری سے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ رد عمل کے طور پر میں اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے مزید اس کے پیچھے جانا مناسب نہ سمجھا اور امتیاز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میر بخش اور امتیاز اپنے مذمقابل کو رگیدتے اور کھدیتے ہوئے کافی دور چلے گئے تھے۔ اس طرف اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ وہ مجھے واضح طور پر نظر تو نہیں آ رہے تھے

تاہم ان کی حرکات و سکنات سے میں نے یہ آسانی ان کی سمت کا تعین کر لیا۔

دونوں گاڑیوں کے درمیان دس گز سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سیاہ شیٹوں والی پجھاو میں مزید کوئی شخص برآمد ہوا تھا اور نہ گاڑی نے کسی قسم کی حرکت کی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ گرے پجھاو آڑی حالت میں خاموش اور ساکن کھڑی تھی، جیسے وہاں ہونے والے ہنگامے سے وہ قطعی طور پر لاپتہ ہو۔

میں نے براؤن مڑا کے نزدیک آکر کلا شکوف ساحل کی طرف پڑھاتے ہوئے کہا "اسے رکھ لو۔ یہ وقت ضرورت اس کے استعمال میں جھبکے کی زحمت نہ کرنا۔"

ساحل نے بڑے باہر انداز میں کلا شکوف کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے اسے اسے ادب و آداب سے خاصی آگاہی حاصل کر چکی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر گہری بخیدگی طاری تھی۔ اس نے لب کشائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

روٹی نے پوچھا "وہ جان بھائی! یہ کیا جکر چل پڑا ہے؟"

"مجھے آگرتا ہوں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور احتیاطی غیو کی طرف بڑھ گیا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے جب ان کے نزدیک پہنچا تو امتیاز کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں مجھے کوئی چیز چپکنی نظر آئی۔ میں نے ایک لمبے میں پہچان لیا۔ وہ اسٹیل پاڈی چائنا میڈ ہٹل تھا۔ وہ گویا کسی پر فائز کارا درہ رکھتا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔

پھر اسی لمبے امتیاز نے اندھیرے میں فائر جھونک دیا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ خاموشی اور سناٹے کے باعث گولی چلنے کی آواز کچھ زیادہ ہی گونج پیدا کر گئی۔ میں نے عقب میں پہنچ کر امتیاز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیا ہوا یا ر! انہی نے کس پر فائر کیا ہے؟"

"جھاگ گیا سالا۔" وہ اندھیرے میں گھورتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا "جھگوڑا کس کا۔"

میں سمجھ گیا، وہ کس کا ذکر کر رہا تھا۔ "میر بخش کہاں ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"آں۔ میر بخش! وہ چونک کر بولا پھر اندھیرے میں ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا "وہ وہاں گرا تھا۔"

"گرا تھا۔ کیا مطلب؟" میں نے امتیاز کے اشارے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے تشریح تاک انداز میں استفسار کیا۔ "میر بخش کس طرح گر گیا؟"

وہ میرے قدم سے قدم ملاتے ہوئے بولا "وہ ٹھوکر کھڑا گرا تھا۔ میں اس کے پاس رکتے یا اسے دیکھنے کی بورڈنگ نہیں تھا۔ میں اس کم بخت" فرار ہونے والے کے پیچھے ہوا تھا مگر وہ بھی ہاتھ نہ آیا۔ ایک گولی بھی خواہ مخواہ ضائع کر دی میں نے۔"

امتیاز کے لہجے میں ایک افسوس شامل تھا۔ اس دوران میں ہم دونوں میر بخش کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اپنا دایاں بازو تمام کر دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس کی کہنی میں ایک ماہ پہلے فریجیمر ہو گیا تھا۔ میں نے بظلمت میں ہاتھ ڈال کر میر بخش کو کھڑا کیا اور اسے چلاتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

گرے پجھاو پر نگاہ پڑتے ہی امتیاز چونک پڑا "جگر! یہ ماجرا ہے۔ یہ ابھی تک میاں" بے حس و حرکت "کیوں کھڑی ہے؟"

"مجھے بھی اس کے قیام پر حیرت ہو رہی ہے یا نہ۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

امتیاز نے پوچھا "وہ تمہارے والا کہاں گیا؟"

میں نے اس کے سوال کو سمجھتے ہوئے جواب دیا "ابھی جھاگ گیا۔ تمہارے والے کی طرح۔"

"عجب جھگوڑے دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے جگر۔"

"گرے جیب کو جھگوڑا نہ کہنا دوست۔" میں نے کہا۔

"دیکھ لو یہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔"

"اور یہ بہت تشریف کی بات ہے!" امتیاز نے غصیل سے کہا۔

میں نے پوچھا "تمہارے والے جھگوڑے کی کلا شکوف کہاں ہے؟"

"جھگوڑا کھاگ گیا۔" وہ حقارت سے بولا "مگر حاکم! گن سے ہمیں ڈرانے آیا تھا۔ میں نے اس آہنی اوزار کو جھاڑیوں میں پھینک دیا۔"

ہم دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے مختلط قدموں کے ساتھ اپنی براؤن مڑا کے قریب پہنچ گئے میر بخش کی کراہوں میں شیدت آگئی۔ اس کی کہنی میں شاید دوبارہ تکلیف جاگ اٹھی تھی۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔ مگر شیدت ایک ماہ کی کوشش سے یہ مشکل اس کا فریجیمر ٹھیک ہو گیا تھا۔

امتیاز نے سیاہ شیٹوں والی گرے پجھاو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کیا معاہدہ جگر؟"

"معاصل کرنے سے ہی سمجھ میں آئے گا۔" میں نے کہا "ہمیں زیادہ دیر میاں نہیں رکنا چاہیے۔ فائر کی تباہی"

بہت دور تک گئی ہے۔ یہ ایسا بھی ویران علاقہ نہیں کہ کوئی ہادری جانب متوجہ نہ ہو۔ پولیس کی کوئی غشی گاڑی ادھر رانج کر سکتی ہے۔"

وہ آہستہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے جگر لیکن کیا ہم اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے کا ریسک لے سکتے ہیں۔ وہ جیب مڑا سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے؟"

"یہ ریسک تو ہم کافی دیر پہلے ہی لے چکے ہیں۔" میں نے براؤن مڑا کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا "بلکہ روٹی اور ساحل مستقل ریسک پر ہیں مگر معلوم ہوتا ہے" گرے جیب نے مکمل چپ ساحل ہے۔ اس جانب سے کسی قسم کی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔"

"واقعی جگر! یہ تو بڑے انوکھے دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔" امتیاز نے گاڑی کے نزدیک پہنچ کر کہا "میں تو سخت یزان ہوں! ان کی دشمنی کے اسٹاکل پر!"

میں نے ساحل سے پوچھا "کوئی ٹریوٹو نہیں ہوئی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

روٹی نے کہا "ہمیں فوری طور پر میاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہم یہی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں نے فل کر میر بخش کو سارادیا اور یہ آہستہ اسے گاڑی کی بیئرینٹ پر بیٹھا دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ امتیاز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آگے بڑھنے کے لیے ہمیں اس گرے جیب کی پشت پر ایک ٹکر دینا پڑے گا۔ یہ ایسے بے ہودہ انداز میں کھڑی ہے کہ راستہ ہٹا کر ہو کر رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ گناہ عظیم ہو گا یا۔ سوئے ہوئے کی نیند میں غل و غلا کہاں کی شرافت ہے۔ تم کسی اور راستے سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"راستوں کی کمی نہیں ہے۔" وہ گاڑی کو اشارت کر کے باورس کرتے ہوئے بولا "منزل تک پہنچنے کے دس راستے ہیں میاں سے لیکن وہ محسوس پجھاو۔"

روٹی نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا "امتیاز! اب ہمارے بھی اس جیب کے ذکر کو۔ وجدان جو کہہ رہا ہے وہی کہہ جب اس بے چاری نے ہمیں کچھ نہیں کہا تو تم بھی اسے معافی ہی کر دو تو اچھا ہے۔"

"وی کر رہا ہوں۔" وہ مڑا کو بائیں سمت ایک اسٹریٹ میں داخل کرتے ہوئے بولا "تم واقعی ٹھیک کہتی ہو۔ اس بے

چاری جیب نے ہمیں کچھ کہا ہے اور نہ ہی اس سے برآمد ہونے والے کھوکھلے گن بردار جھگوڑوں نے۔"

لفظ "کھوکھلے" کے استعمال پر مجھے کچھ یاد آیا۔ تھوڑی دیر پہلے امتیاز نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے برقیاتی خالی کلا شکوف جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ میں نے ساحل کی جانب توجہ دھرتے ہوئے کہا۔

"ڈرائیو گن مجھے دکھانا۔"

اس نے کلا شکوف میری طرف بڑھا دی۔

میں نے گن سے میگزین جدا کر دیا اور اسی وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ کلا شکوف کا میگزین بالکل خالی تھا۔ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔

امتیاز نے کہا "کیا ہوا جگر! کیوں ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو؟"

"بھئی! یہ تو بڑے ہی شریف انفس دشمن واقع ہوئے ہیں۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "خالی ہتھیاروں سے ہم پر چڑھ دوڑے تھے۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ فضا ایک مخصوص قسم کے سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ سائرن یقیناً پولیس کی کسی موبائل پر نصب تھا۔ وہ مخصوص آواز۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ اس جانب بڑھ رہی تھی جدھر اندھیرے شیٹوں والی گولی بہری گرے پجھاو کھڑی تھی۔

"ہم بوقت وہاں سے نکل آئے جگر!" امتیاز نے ٹرسکون لہجے میں کہا "ورنہ پولیس والے خواہ مخواہ ہمیں پریشان کرتے۔"

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "اس اسٹریٹ کے راستے ہم کس طرف نکلیں گے؟"

"ہم ایک دو مزید اسٹریٹ گھومنے کے بعد پہلی پیڈ پر پہنچ جائیں گے۔ یہ مین کٹھن کا ساحل ہے۔" امتیاز نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "پہلی پیڈ سے ایک سڑک خراب چورنگی کی طرف جاتی ہے ہم وہ راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے یہ دستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امتیاز سے پوچھا "یہ بورڈ کس چیز کے ہیں۔ کیا اس طرف کوئی آسٹریلیٹین ہوٹل یا ریسٹورنٹ کھلا ہے؟"

اس اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے مخصوص بورڈ دکھائی دیے تھے جس پر "آسٹریلیٹین کانسٹیبل" کے جلی حروف درج تھے۔

امتیاز نے بتایا "جگر! یہ ہوٹل یا ریسٹورنٹ نہیں بلکہ

اسے ایک کلینک یا اسپتال سمجھ لو۔ یہاں بے اولاد جوڑوں کا جدید ترین علاج کیا جاتا ہے۔ جس میں "نیسٹ ٹیوب" بے بی شامل ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اب سمجھا۔" میں نے جلدی سے کہا "یہ طریقہ علاج آج کل پوری دنیا میں بہت تیزی سے رائج ہو رہا ہے۔"

ہماری گاڑی نیلی بیڈ پر پہنچ کر دائیں جانب مڑ گئی۔ بائیں جانب تاحہ نگہ سمندر پھیلا ہوا تھا جو رات کی تاریکی میں بہت پھر ہوا تھا اور وحشت ناک دکھائی دیتا تھا۔ اگلے دس منٹ میں ہم خراک چور گئی سے گزر کر اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں داخل ہو گئے جہاں وہ فلیٹ واقع تھا جو شعیب غوری کی طرف سے میرے لیے ایک تحفہ تھا۔

\*\*\*

میرا ذہن مختلف سوالات کی آجگاہ بنا ہوا تھا!

سوالات لاتعداد تھے اور سب کی نوعیت بھی جدا تھی۔ مثلاً گرے پجارو نے ہماری گاڑی کا تعاقب کیوں کیا؟ انہوں نے ہمیں خراک چور گئی سے تھوڑا پہلے گیرانگراخی کا شکوہ فرمایا تھا۔ ہمیں دھمکانے کی کوشش کیوں کی؟ ایک گن بردار نے میرا نام لے کر استفسار کیا لیکن میری بخش کو وجہ نامانے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ اس کی بڑھی ہوئی سندھی اشاکل کی داڑھی کے باعث گن مین نے اس کے چہرے پر ہت رسید کرتے ہوئے اسے ملاکہ کر ڈانٹا تھا گویا وہ نہ تو میری بخش کو پہچانتے تھے اور نہ ہی میری شکل سے واقف تھے پھر وہ مجھے کیوں پوچھ رہے تھے؟ یہ بات تو طے ہے وہ ہمارے دوست ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا ایک سب کچھ چھوڑ چھاؤں کا ہنگامہ کھڑے ہونے والا۔ جس بھی کچھ کم اعتقاد اور حیرت انگیز نہیں تھا اور میرے جیب کی مسلسل "خاموشی" بھی کسی لمحے کی طرح تھی۔ سڑک پر اس کا "بے حس و حرکت" قیام یہی ظاہر کرتا تھا کہ پجارو میں صرف دو ہی افراد تھے جو کلا شکوہ فرمائے ہماری جانب بڑھے تھے۔

یہ بات میرا ذہن کسی بھی طور ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب وہ گرے پجارو ٹائٹوں کی چڑھاہٹ کے ساتھ رکھی تھی تو اس کے دونوں طرف کے عقبی دروازے کھلے تھے جہاں سے کلا شکوہ بردار برآمد ہوئے تھے۔ اس کا واضح مطلب تو یہی تھا کہ پجارو میں کم از کم... ایک شخص اور موجود تھا جو اس جیب کو ڈرائیو کر کے وہاں تک پہنچا تھا۔ عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے افرا گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتے تھے۔ اگر پجارو کی ڈرائیو تک سیٹ پر کوئی

ڈرائیو موجود تھا تو پھر اس باراماری اور افرا غوری کی کارروائی کے دوران میں اس شخص نے کسی قسم کے رویہ کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟ خاص طور پر اس وقت جب ہر سچ سلامت اور محفوظ انداز میں وہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ وہی وقت تھا جب فضا پولیس والوں کے سامنے سے گزرتی تھی۔ یہ ایسا اطمینان بخش اور سکون آور موقع نہیں تھا کہ چپ چاپ دم سادھے وہ ڈرائیو پجارو میں بیٹھا رہتا اور عمل غیر فطری تھا۔ اور میرے ذہن کو الجھا رہا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے پہلو میں کچھ فاصلے پر ساحل سمندر کے تھلے لے رہی تھی۔ اس وقت رات کے گھبراہٹ میں بیٹھے تھے گراہمی سوجوں کے باعث مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں لنگ سائز ڈیل بیڈ سے نچے اتر آیا اور سلائیڈنگ ڈور کے قریب کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔

سمندر اس وقت خاصی موج میں تھا۔ رات کی تاریکی میں سمندر کی سطح پر دور، بہت دور، بحری جہازوں کی جہاں جھلکاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ جہاز میلوں کے فاصلے پر اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ میں سمندر کی سطح کو لگا کر تک موجیں اچھالتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس وقت رات کے سناٹے نے ان موجوں کی آواز میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اگرچہ سلائیڈنگ ڈور بند تھا تاہم پھر بھی پانی کی اچھال کی مہیب آواز ہمارے بیڈ روم میں پہنچ رہی تھی۔ سلائیڈنگ ڈور کھلا ہونے کی صورت میں سونا شاید ممکن نہ رہتا۔ سمندر کی مخصوص آواز اور تیز ہوا کی سرسراہٹ نیند میں خلل کا باعث بن سکتی تھی۔

میں بیڈ روم سے نکل کر لاونچ میں آیا۔ یہ فلیٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر واقع تھا اور اس کا نمبر آٹھ سو ایک تھا۔ وہاں ہر فلور پر صرف دو فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اس فلیٹ کا رقبہ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ جس پر دو بیڈ روم، ایک ڈرائیونگ روم اور ایک کشادہ لاونچ بنایا گیا تھا۔ اس لاونچ میں بیٹھنے کے لیے صوفہ سیٹ اور سینئر ٹیبل بھی موجود تھی۔ وہ لاونچ گویا ڈرائیونگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بیڈ روم میں ایک چھوٹا اور دو دروازے کشادہ تھے جہاں اس وقت ساحل سوری تھی۔ لیکن "اس بیڈ روم اور ڈرائیونگ روم کے درمیان واقع تھا۔ دونوں بیڈ روم میں سمندر کے سناٹے سلائیڈنگ ڈور لگے ہوئے تھے جن سے آگے ایک خوبصورت گمری گہنی ہوئی تھی۔

لاونچ میں قدم رکھتے ہی میری نگاہ ٹیلی فون اینڈنگ

بائیں اٹھ گئی۔ میں اینڈنگ کے نزدیک بچھے صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچانک میرے ذہن میں امتیاز کو فون کرنے کا خیال آیا تھا۔ اس خیال کی تحریک میری یادداشت میں محفوظ ایک منظر نے دی تھی۔ جب میں نے کلا شکوہ بردار شخص سے گن چیمین کر کے ٹارگٹ بنایا تھا تو اس کے چہرے پر ابھرنے والی وحشت نے مجھے چونکا رہا تھا۔ ایک ٹائپ کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں اس شخص کو پہلے بھی نہیں دیکھ چکا ہوں۔ کب؟ کہاں؟۔۔۔ یہ سب کچھ سوچنے اور جاننے کا وہاں وقت تھا اور نہ ہی موقع لیکن اس وقت وہ چہرہ دوبارہ میری یادداشت سے نکل کر سامنے آ گیا تھا اور مجھے شک ہو رہا تھا میں نے اس شخص کو "سناؤتھ" میں دیکھا ہے۔ ایسے اسی ٹک کی تصدیق یا تردید کے لیے میں امتیاز کو فون کرنا چاہتا تھا۔

امتیاز اور روٹی ہمیں یہ حفاظت فلیٹ پر پہنچا کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور یہ رات اپنے پاس گزارنے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن امتیاز نہیں مانا۔ اس نے اپنی بعض خطی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بھرا! مجھے ہر حال میں اپنے فلیٹ پر پہنچنا ہے۔ رات کے آخری پر ممکن ہے" پاس مجھ سے رابطہ کرے۔ تم تو سمجھتے ہو۔ پاس آؤ!"

میں اس کی مجبوری سمجھ گیا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر تم ضرور جاؤ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اور جاتے جاتے میرا بھی ایک ضروری کام کرتے جاؤ۔"

"تم کو بھرا! تمہارے لیے دل و جان حاضر ہے۔" وہ بیٹھے ہاتھ مار کر بولا تھا۔

میں نے بھی مزاح کے انداز میں کہا "فی الحال تمہارے دل و جان کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں چیزیں کسی جان میں کی شخصیت کے لیے۔۔۔ پتہ چڑھ۔"

وہ قدرے عجیب گویا اور کن انکھوں سے روٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے میری بخش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارا سامھی اس وقت سخت تکلیف میں ہے۔ اس کی کسی والے فریج میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یہاں فوری طور پر اسے طبی امداد بھی نہیں پہنچائی جاسکتی۔ تم ایسا کچھ کرنا کہ میری بخش کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ڈاکٹر فیروز کے اسپتال میں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کی سہولت موجود ہے۔ تم اپنے فلیٹ جانے سے پہلے اسے اسپتال دکھا دینا۔ یہ کل

آرام سے ہمارے پاس آجائے گا۔"

"تمہارا مشورہ اور تجویز بالکل درست ہے۔" امتیاز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

پھر وہ تینوں اس فلیٹ سے رخصت ہو گئے تھے۔ میں یہ سب سوچتے ہوئے طارق روڈ والے فلیٹ کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ امتیاز وغیرہ لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے فلیٹ سے گئے تھے۔ میرے خیال میں انہیں اب تک اسپتال سے ہو کر واپس فلیٹ پہنچنا چاہیے تھا۔

ڈائلنگ عمل ہونے کے بعد کھٹنی بجنے لگی پھر وہ کھٹنی بجتی چلی گئی۔ دوسری جانب سے کوئی کال ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید میں نے نمبر ڈائل کرنے میں کوئی گڑبڑ کر دی ہو۔ اس فون میں "ری ڈائل" اور "سی ایل آئی" وغیرہ کی سہولیات موجود نہیں تھیں لہذا میں نے سنبھل سنبھل کر وہ نمبر دوبارہ ڈائل کیے مگر نتیجہ پہلے والا برآمد ہوا۔ آخر کار پاس ہو کر میں نے ریسپونڈ کر ڈیا۔

امتیاز وغیرہ کی طرف سے ایک بے نام ابھرنے میرے ذہن کو گھیر لیا جس میں گمری تھویش پائی جاتی تھی۔ اسے اس وقت گھر پر ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ رات کے آخری پر پاس سے اس کی ضروری بات ہونے والی تھی اور اس وقت رات کا آخری پھر ہی چل رہا تھا۔

میرے دل میں ایک مرتبہ پھر ڈائل کرنے کی خواہش نے سر اٹھایا۔ میں نے گود میں رکھے ہوئے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا یہ تھا کہ اس کی کھٹنی بجنے لگی۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید دوسری جانب امتیاز ہو، ریسپونڈ کر ڈیا۔

"ہیلو! میں نے ناؤ تھ پیس میں کہا۔"

ایک مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وہ جان!"

یہ میں ہوں "شعیب غوری۔"

"ہاں! میں نے پہچان لیا۔" میں نے کہا "خیریت! اس وقت فون کی نوبت کیسے آئی؟"

"خیریت! میں ہے وہ جان!" شعیب غوری گھبراہٹ سے آواز میں بولا "تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔ بہت ہی بری!"

میرا دل اچھل کر حلق میں آیا "کسی بری خبر شعیب؟"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "امتیاز کو ایک حادثہ پیش آیا ہے۔"

"حادثہ؟ کس قسم کا حادثہ؟" میں ہو کھلائے ہوئے لہجے میں بولا "وہ تینوں یہاں سے تو تھیک تھاک گئے تھے۔"

میں نے غم و غصے کی کئی جلی کیفیت کے درمیان کہا  
 ”عجب! تمہاری تفتیش سے حملہ آوروں کے بارے میں  
 بھی کچھ پتا چلا؟“  
 ”میں اسے ان دشمنوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا  
 ہوں۔“ وہ بھڑکائی ہوئی آواز میں بولا ”فی الحال صرف اتنا ہی  
 پتا چلا ہے، ان پر فائرنگ ایک تیز رفتار جیپ سے کی گئی تھی  
 جس کا رنگ گرے ہٹا جا رہا ہے۔“

”کمال ہے وجدان! اس قسم کے وطن میں نے کبھی دیکھے ہیں اور نہ ان کے بارے میں کہیں سنا ہے جو مخالف مکتوں کے ساتھ یوں کارروائی کریں اور پھر موقع پا کر فرار بھی ہو جائیں۔ خاص طور پر: تم نے جیپ کے حوالے سے جو کچھ بتایا ہے، وہ ناقابل یقین لگتا ہے۔“ ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ویسے میرے لیے سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امتیاز نے اتنے بڑے واقعات کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ وہ تو معمولی سے معاملہ بات بھی مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔“

مکھن نے دھکی لہجے میں اس سے اپنے ساتھیوں کی  
 موجودگی کو قریبی کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا  
 کہ ان خیل کی لاشوں کو ایک سرکاری اسپتال میں چنچاڑا  
 یا پٹنہ ضروری کارروائی کے بعد پولیس و لاٹھیں و رٹا کے  
 ساتھ لے گئے۔

”میں نے کہا، ”میں اس سلسلے میں بہت محفوظ بندوبست کروں گا۔“ وہ براہ اعتماد لہجے میں بولا ”ہم دونوں کی شرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو گا کہ ہمارا تعلق براہ راست ان تینوں سے ہے۔ تم اس بارے میں ذہن کو نہ الجھاؤ۔ میں ہوں نا!“

شعیب غوری نے اتنی اپنائیت سے ”میں ہوں ناں!“ کہا کہ میرا ذہن قدرے مطمئن ہو گیا۔ اسی وقت میرے ذہن میں اس گن برادر کا حلیہ بھی روشن ہو گیا جس کے ہاتھوں سے میں نے کلا ٹکٹوف چھینی تھی۔

میں نے شعیب غوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا  
”دوست! میرے ذہن کے جس حصے پر گرے پجارو کا نمبر  
چیک کر رہ گیا تھا وہیں ایک چوہ بھی چسپاں ہے اور وہ  
دھن سے میری سوچ کو منتشر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“  
”کیسا چروہ جانا؟“ وہ تنگی سے بولا۔

میں نے بتایا ”بوٹ بین والے واقعے میں“ میں نے  
جس کا شکوفہ بردار سے اس کی گن جینی تھی اس شخص کا  
چروہ۔“

وہ زود فہم انسان فوراً میری بات کی تہ تک پہنچ گیا اور  
پوچھنے لگا ”کیا تم نے اس شخص کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے؟“  
”میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟“  
”میرا خیال ہے ساؤتھ میں۔“ میں نے بتایا۔

”کیسا کہہ رہے ہو وہ جانا؟“ وہ تجب انداز میں بولا۔  
میں نے کہا ”مجھے خود حیرت ہے اسی لیے تو سوچ سوچ کر  
الٹ رہا ہوں۔“

”وجدان! میرے ٹھکانوں کا کوئی آدمی اس قسم کی  
کارروائی میں شامل نہیں ہو سکتا۔ وہ پروٹوکول انداز میں بولا  
”ممکن ہے“ ہمیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو!“

میں نے الجھن آمیز تائیدی انداز میں کہا ”خدا کرے“  
یہ میری غلط فہمی ہی ہو۔ بہر حال میں نے جو کچھ محسوس کیا وہ  
من و عن تم تک پہنچا رہا ہوں کیوں کہ میں ہمیں اپنا سچا  
دوست سمجھتا ہوں۔“

”مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے وجدان!“ وہ تنگی سے  
بولا ”اور اس بات کی خوشی ہے تم نے اپنے دلی جذبات اور  
محسوسات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔“ وہ چتر  
لمحات کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”لیکن تم  
یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری بات کو نظر انداز کر کے خاموش ہو  
کر بیٹھ جاؤں گا۔ تم مجھے اس گن بردار کا علیہ بتاؤ۔ صرف  
”ساؤتھ“ ہی نہیں بلکہ میں اپنے تمام ٹھکانوں کے آدمیوں کو  
خاموشی سے چیک کروں گا۔ اگر تمہارا مطلوب بندہ ہاتھ گیا تو  
اس سے بھی ”ڈانیا لگ“ کر لیں گے۔ تم میرا مطلب سمجھ  
رہے ہو نا؟“

شعیب نے لفظ ”ڈانیا لگ“ پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔  
میں نے کہا ”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شعیب۔“  
وہ بولا ”ڈانیا کا کوئی ایسا ادارہ یا عہدہ نہیں جس میں کالی  
بھیڑیں موجود نہ ہوں۔ ممکن ہے میرے کیمپ میں بھی کوئی  
چھپو پرورش پا رہا ہو۔“

میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے  
”شعیب! ویسے تمہارے خیال میں ہمارے کس دشمن  
کارروائی کی ہوگی؟“

”مجھے تو نہ فیصد تو یہی امید ہے کہ میاں زاہر  
نے شیر کے جڑے میں ہاتھ دینے کی کوشش کی ہے۔  
سناتے ہوئے لیجئے میں بولا ”پچھلے دنوں ہم نے اس  
سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ وہاں شیر والے نے اس  
عبرت ناک موت، ہوش میں ہونے والی مارا ماری  
کے باہر گرے سوز کی ایف ایکس والے دو فوجی  
والوں کا ہولناک انجام پھر گرنیٹ والے بنگلے پر مارے  
کے ساتھ جو ”شادزار“ سلوک کیا گیا ہے اس میں  
دونوں کا بھرپور ہاتھ رہا ہے۔ چنانچہ یہ بین ممکن ہے کہ  
شب خون مارنے کی ناک میں رہا ہو اور۔ آج رات یہ  
موقع اس لیے گیا۔“

میں نے کہا ”میرا ذہن بھی گھوم پھر کر میاں زاہر  
طرف جا رہا ہے۔“  
”تم مجھے اس شخص کا تفصیلی علیہ بتاؤ۔“ شعیب  
دوبارہ پوچھا۔

میں نے کہا ”تد لگ بمگ پانچ فٹ دس انچ، جمنا  
بہ فزبی، چروہ کرخت، رنگ سانولا اور ہلکی موچیں۔“  
”یہ ایک عام ساحلیہ ہے۔“ وہ سرسری انداز میں  
”بہر حال میں اسے اپنے کیمپ میں تلاش کرنے کی ہر  
کوشش کروں گا۔“ پھر اس نے مجھ سے استفسار کیا  
کے بارے میں میری تجاویز کو ذہن میں رکھو گے نا؟“  
”ہاں!“ میں نے اثبات میں جواب دیا ”جب  
تمہارا ڈائریور ہمیں لینے نہیں آئے گا، ہم اس فلیٹ  
قدم بھی نہیں نکالیں گے۔“

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”وجدان! یہ نہ  
اور خوشی کا مرقع ہے۔ کبھی خوشی بھی نہیں۔ تم تو  
اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ تم نے بھی بڑی جگہ  
گزارا ہے۔ آگ کے دریا کو پار کرتے ہوئے میل  
پہنچے ہو۔“ وہ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد بولا  
اپنے ساتھیوں کی اندوہناک موت کا یقیناً بہت دکھ ہے  
اس صدمے کو اپنی اپنی برداشت کے مطابق  
اس کے ساتھ ہی زندگی کے چکر میں کسی قسم کا  
نہیں ہونے دیں گے۔ کل جب میرا ڈائریور  
آئے تو ڈائری کے وہ اہم ترین صفحات اپنے پاس  
بھولنا!“

شعیب کی باتوں سے سفاکی بچتی تھی لیکن وہ مجھے باتیں  
نہایت ہی نہیں لگیں کیوں کہ وہ زندگی کی حقیقت بیان کر رہا  
فہم بھی اسی سوچ کا حامل تھا کہ سکھ دکھ کے سامنے میں  
زندگی کے بے کسلسل حرکت میں رہنا چاہیے۔

”تم فکر نہ کرو شعیب۔“ میں نے محسوس لیجئے میں کہا  
”مجھے اچھا وعدہ یاد ہے۔ میں نے تم سے یہ کہا تھا نا، کل وہ  
لمحات میں تمہارے حوالے کر دوں گا تو اس کا ہرگز ہرگز یہی  
مطلب تھا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔“

آگے بچنے کے دو صفحات پر مشتمل ڈائری کا وہ نہایت  
فیضی ورق ہر وقت میری بیٹھ کی ایک خفیہ جیب میں موجود  
رہتا تھا۔ میں نے دانستہ شعیب سے دوسرے دن کا وعدہ کیا  
تھا کہ اگر میں چاہتا تو اسے ملاقات کے دوران میں وہ ورق اس  
کے حوالے کر سکتا تھا۔

”اوکے!“ شعیب لیل فوک گفتگو کو ختم کرتے ہوئے  
بولا ”اب تم سو جاؤ۔ کل کا دن بہت غٹ ہے ہمارے  
لیے۔“

”فٹ بھی۔ اور رف بھی۔“ میں نے دانت پیٹتے  
ہوئے کہا۔

پھر ہمارے درمیان وہ رابطہ ختم ہو گیا۔



حالت نیند میں ساحل کی مصوویت میں بے پناہ اضافہ  
ہوا تھا۔ میں داپس بیڈ روم میں آیا تو وہ بدستور سوری  
گئی۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ بجے سو گئی تھی اور اس وقت چار  
بجے والے تھے شعیب سے فون پر ہونے والی گفتگو  
نمکدہ گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

میں جن جذباتی اور صدقائی نیفیات سے گزر رہا تھا ان  
میں کسی قسم کے رومانس کی گنجائش نہیں تھی لیکن ساحل  
کے نزدیک پہنچنے ہی میرا دل بے طرح چل اٹھا۔ وہ بڑی بے  
فکری اور سکون کی نیند سوری تھی۔ میرے جی میں آئی کہ  
بیت فکرا سے پیار کروں۔ چائیں، پچھلے کچھ دنوں سے مجھے  
فہم ہوا تھا۔ ساحل کے پاس پہنچنے ہی میں بے اختیار ہو جانا  
فہم ساحل کے اندر کوئی ایسی شے ضرور موجود تھی جو مجھے  
نور دیتی تھی یا یوں کہہ لیں ”وہ دھیرے دھیرے میری  
نورانی بنی جا رہی تھی۔“

میں پشانی چوسنے کے لیے اس کے چہرے پر جھکا ہی تھا  
کہ باہر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یوں محسوس  
ہوا کہ وہ پہلے سے جاگ رہی تھی بس آنکھیں بند کیے سوئی تھی  
میں گایا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا، میری گرم سانسوں کے لمس

نے اسے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ ان لمحات میں میرے  
تخس میں جتنی حد سرایت کر گئی تھی۔  
ساحل کی آنکھیں کھولنے پر میں گزرا کر پیچھے ہٹا تو وہ  
اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ”پانی! مجھے شدید پیاس  
محسوس ہو رہی ہے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر بیڈ سے نیچے اتر آیا پھر  
فریج میں سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر ساحل کے ہاتھ  
میں تھمادیا۔ اس دوران میں وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

اس نے ایک ہی سانس میں ٹھنڈا پانی اپنے حلق میں  
اندھا پھر میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولی ”کیا بات ہے  
وجدان! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“

وہ گہری لڑکی میری فکر مندی کو بھابھ گئی تھی۔ میں نے  
نہایت سنجیدگی سے کہا ”کچھ نہیں ساحل! میں اس وقت بہت  
زیادہ پریشان ہوں۔ بلکہ مجھے زندہ اور دکھی ہوں۔“

”کیا ہوا۔ کیا ہو گیا وجدان؟“ وہ بے پناہ اضطراب کے  
ساتھ بولی۔

”تمہارے لیے ایک بہت ہی بڑی خبر ہے میرے  
پاس۔“ میں نے شکست لیجئے میں کہا ”تمہارے لیے اس طرح  
گمہ رہا ہوں کہ میں وہ خبر پہلے ہی سن چکا ہوں۔“

وہ بے چینی سے بولی ”کچھ بتاؤ بھی تو سہی۔“ پھر وہ اپنے  
سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ”لا رڈ ہا خیر کرے۔“

اگلے دس منٹ میں میں نے ساحل کو اپنے ساتھیوں کو  
پیش آنے والے اندوہناک واقعے کے بارے میں بتایا۔ میر  
بخش اور روٹی سے اس کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ امتیاز بھی  
ہمارا مخلص دوست تھا۔ ہم ورد اور جاں نثار دوستوں کی  
موت پر جتنا دکھی انسان کو ہوتا چاہیے، ساحل اس حقیقی  
کیفیت سے گزر رہی تھی۔ میں نے اسے شعیب غوری سے  
ہونے والی گفتگو اور گرے پجارو کے بارے میں بتایا۔  
شعیب کی طرح ساحل کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ حملہ میاں  
زاہر حسین کی کارستانی ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا ”زیادہ امکانات تو اسی بات کے ہیں لیکن  
میرا ذہن گرے جب کے غیر منطقی اور ان منجمل ”رویلے“ پر  
اٹکا ہوا ہے۔ بوٹ بین کے نزدیک جو کچھ ہوا، وہ میرے  
حلق سے نہیں اتر رہا۔ اگر گرے پجارو والے میاں زاہر کے  
بیچے ہوئے تھے تو ان کا بھگوان بن سمجھ سے باہر ہے۔“

”وجدان! بوٹ بین والی سڑک پر آج رات جو کچھ  
پیش آیا اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی توجہ نہ  
الاح نظر نہیں آتی۔“ ساحل نے تمکیر کیجئے میں کہا ”تم ایک

گرے جب پر ہی کیوں الجھ رہے ہو؟“  
ساحل نے یہ سوال ایسے انداز میں کیا تھا کہ میں چونک اٹھا پھر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ”تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟“

وہ مزید سنجیدہ ہو گئی ”کیا تم اس سفید بلی کو بھول گئے؟“  
ساحل کے اس سوال نے میرے رگ و پے میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیا اور نگاہ کے سامنے اس جھپٹا مار سفید بلی کا سراپا ابھر آیا جس نے کلا شکوف ہرادر کے حواس کی ایسی کم تپتی کردی تھی۔ وہ آن واحد میں تاریکی سے نمودار ہوئی تھی اور اپنا ”کام“ کر کے پلک بھینکتے میں تاریکی ہی کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کا یہ کام ہمارے لیے نہایت مفید ثابت ہوا تھا۔

ساحل کے یاد دلانے پر مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں اب تک اس غیر معمولی جسامت کی بلی کو کیوں بھولا ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ حالات کا اثر ہو۔ بوٹ بینس والی اس سڑک پر ہم ہنگامی صورت حال سے گزر رہے تھے اور فلیٹ پر پہنچنے کے بعد بھی میری کنٹریکشن کی کہنی ہی زیر بحث رہی تھی۔ اور اس کے بعد تو شعیب غوری کی کال نے میرے ذہن کو وہ زبردور یاد کیا تھا کہ میں کسی اور شے کے بارے میں سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اسی ذہنی پراگندگی میں وہ فریہ متواون بلی میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا ”ہاں واقعی“ میں تو اس بلی کو بھول ہی گیا تھا۔ پتا نہیں وہ بلی تھی بھی یا نہ!“

میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اس بلی کے تصور میں کھو گیا۔ وہ مہمان دوست بلی کسی صحت مند کتے کی جسامت رکھتی تھی۔ اس کی جھپٹ میں پھینک کر ایک اور غراہٹ میں شیر کا وہید تھا۔ میں اس عجیب و غریب بلی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ساحل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بلی کے ذکر کو موقوف کر کے اصل موضوع کی طرف آگئی تھی۔

”وجدان! ہمارے ساتھیوں کی المانک موت کسی جاں حسل صدمے سے کم نہیں۔ آئندہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟“

میں جذباتی ہو گیا ”ساحل! میں ان تینوں کے قاتلوں سے بہت بھانک انتقام لوں گا۔ ایک بار وہ میرے ہتھے چڑھ جائیں پھر تم دیکھنا“ میں ان کا کیا حشر کرتا ہوں۔“  
”وہ ہتھے کیسے چڑھیں گے؟“

”شعیب گرسے پیارو کی مدد سے ان کا سراغ لگانا۔“  
کوشش کر رہا ہے۔“ میں نے کہا ”اسے جب کاغذ ملے گا۔“  
چکا ہے۔ بہت جلد وہ اصل مجرموں تک پہنچ جائے گا۔“

ساحل نے پوچھا ”وجدان! کیا ہم ان قاتلوں کے سراغ کے لیے شعیب غوری پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں؟“  
”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا ”شعیب ایک مخلص دوست ثابت ہو رہا ہے۔ اس شہر میں اس کا ایک فعال نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ ہماری بہ نسبت زیادہ ذرا لعل کا مالک اور واقف ہے اس کی مدد لینے کی حرج نہیں۔“ میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے کایا کرنا ”ویسے میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہیں رہوں گا۔ اپنے طور پر بھی مجبور کر کوشش کروں گا۔“

ساحل چند لمحات تک خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی ”شعیب دوبارہ رابطہ تک کرنے کا؟“

”میرا خیال ہے“ دس بجے کے بعد۔“ میں نے کہا ”میں تو اس نے مجھے سونے کا مشورہ دیا ہے اور یقیناً وہ خود بھی گیا ہو گا۔“

”تو پھر تم سونے کی کوشش کرو۔“ وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولی ”تھوڑی نیند لے لو تاکہ فریش ہو جاؤ۔“

”کافی۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”وہاں کتنے میں تمہاری نیند پوری ہو گئی؟“  
”ہاں ہو گئی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی ”تم تو ایک لمبے لمبے بھی نہیں سوئے ہو؟“

میں نے بو جھل آواز میں کہا ”مجھے نیند نہیں آ رہی۔“  
”تم بہت ذہنی دباؤ میں ہو۔“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

”یہ موقع ہی ایسا ہے ساحل۔“ میں نے لمبل لہجے میں کہا ”میں کوشش کے باوجود بھی سو نہیں پاؤں گا۔“ ایک لمبے کورک کر میں نے اضافہ کیا ”اگر تمہیں اب قرینہ نہیں فوراً تیار ہو جاؤ، ہم باہر جا رہے ہیں۔“

”یا بہ۔“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”کیا کرنے؟“  
ارادہ ہے وجدان۔ کس کوئی الٹا سیدھا حادقہ اٹھانے کا قصد تو نہیں کر لیا!“

میں نے گہری نظر سے ساحل کو دیکھا۔ کچھ عرصے اس کے مزاج اور رویے میں جو تبدیلی آئی تھی اس کا ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کا انداز استانیوں والا ہو گیا تھا۔ اس کی ایسی ادائیں میرے دل کو بھاتی تھیں۔

اس لیے بھی کہ پچھلے چند ماہ سے کوئی مجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔ بہرحال اس کی روک ٹوک سے مجھے خاصی فہمت ملتی تھی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ”یہ تو قدم ڈالنے کے بعد پتہ چلے گا وہ الٹا پڑا یا سیدھا۔“ میں نے اس کی بات کو لکڑی عمل نہیں۔ جو بھی سوچتا ہے باہر جا کر ہی سہی گا۔ فلیٹ کے اندر مجھے بہت محنت کا احساس ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہم تھوڑی دیر باہر ٹھل آتے ہیں۔“ وہ نیم رضامند ہوتے ہوئے بولی ”ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چل ڈی ہمارے ذہنوں کو سکون دے گی۔“

”ساحل کی ٹھنڈی ریت!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذہنی انداز میں کہا ”ٹھیک کہہ رہی ہو“ ساحل کی ٹھنڈی ذہنی سکون کے لیے بہترین شے ہے۔ بلکہ پراخیال ہے“ دلی سکون کے لیے یہ اس سے بھی زیادہ مفید ہوتی ہے۔“

اس نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جیسے بیان کرنے کے لیے دھندلے ہوئے پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور واش روم میں گس گئی۔

میں ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بیڈ روم میں آ گیا۔ یہ کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا اور اس میں بھی آبیج ہاتھ کی بوت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں مشکل بیڈ بچا تھا۔ میری ٹخنوں نے اپنے لیے اس کمرے کا انتخاب کیا تھا مگر اسے ایک رات بھی یہاں گزارنا نصیب نہیں ہوئی تھی اور وہ دو ہاتھوں کے بیچ میں بار گیا تھا۔ میری کنٹریکشن کی یاد سے میرا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ غم میری کنٹریکشن کے لیے تھا اور غصہ اس کے قاتلوں پر۔

میں نے ایک جھٹکے سے واش روم کا دروازہ کھولا اور آنکھوں کو نیند سے بچانے کے لیے واش بینس پر جا کھڑا ہوا۔ جب میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو ساحل کا ریٹ پر ٹھکانا (بوم آسن) جمانے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اپنی پشت کو اس نے ناک اور پیشانی پر اس انداز میں ٹکا رکھا تھا کہ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی ”وہ سانس کی ٹھنڈی مصروف تھی جس میں باری باری دونوں تھنوں کا استعمال کرتے ہوئے“ ”ان ہیل“ اور ”ایگر ہیل“ کیا جاتا تھا۔ یہاں تو بڑے لمبے سے ایک عمدہ ابتدا تھی۔ اس عمل سے ان کے ذہن اور جاں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔“

ان کے لوگ یوگا کا باؤی بلڈنگ ویٹ لفٹنگ اور مارشل

آرٹس کی طرح ورزشوں اور ریا متوں کا مکمل سمجھتے ہیں۔ اس سوچ کے حامل افراد غلطی پر ہیں۔ اول تو یوگا کوئی ٹھیل نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ایک آرٹ ہے۔ ”آرٹ آف لائف۔“ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کا فن ہے۔ ہم سب لوگ زندہ ہیں اور کسی نہ کسی طور زندگی گزارتے بھی ہیں لیکن یوگا بہتر انداز میں زندگی گزارنا سکھاتا ہے اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں مگر جو بھی کام بہتر انداز میں کیا جائے اس کی افادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یوگا میں کسی قسم کا جبر، سختی اور زبردستی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں آسانیاں اور فراوانیاں پیدا کرتا ہے۔

ساحل جس لگن اور ثابت قدمی سے یوگا مارشل آرٹس اور ”جی“ وغیرہ کو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس سے لگتا تھا ”وہ بہت جلد بہت اہل ہو جائے گی۔“ ”تھہ یوگ“ کے کم و بیش تمام آسن (POSTURES) وہ بڑی سہولت سے لگا لے لگاتی تھی۔ اسی طرح مارشل آرٹس میں وہ بھی پھٹکی فائٹ تک پہنچ گئی تھی اور ”جی“ کی مخصوص مشق نے اسے اس قابل کر دیا تھا کہ وہ بہ آسانی پچاس گرام تک کی اشیا کو متحرک کر سکتی تھی۔

ہم فلیٹ سے نکلنے لگے تو میں نے فلیٹ کی چابیوں کے ساتھ ہی گاڑی کی چابیاں بھی اٹھالیں۔ ساحل نے میرے اس عمل پر سوالیہ نظریں مجھے دیکھا اور کہا ”میں تو سمجھ رہی تھی، ہم صرف نکلنے جا رہے ہیں۔“

”ہم نکلیں گے بھی۔“ میں نے فلیٹ کو لاک کرتے ہوئے کہا ”لیکن مناسب اور موزوں جگہ دیکھ کر ورنہ رات کے اس پرمہاری چمقل قدمی پولیس والوں کو سخت ”ٹانگوار“ گزرے گی اور خواہ خواہ ہمیں ان کے ناقابل جواب سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”گاڑی پاس ہوگی تو ہم کس بھی جاسکتے ہیں۔“

ساحل نے مزید نہیں پوچھا ”کیس“ سے میری کیا مراد ہے اور ہم لفٹ کے ذریعے پہنچے آگے۔ رات کو اوپر جاتے وقت میں نے اس نئی ٹوبلی شیر ڈاؤن کر لیا تھا جو شعیب نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ امتیاز نے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے چوکیدار سے بھی میری تعارفی ملاقات کروادی تھی اور ہمیں شعیب غوری کا مسمان بتایا تھا۔ شعیب کے لیے چوکیدار کے سامنے امتیاز نے صرف ”صاحب“ کا لفظ ادا کیا تھا۔ چوکیدار کی کھلتی ہوئی پاجموں اور پھینکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ”صاحب“ کا بہت احترام کرتا تھا۔ جب ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بلڈنگ سے نکلے تو





غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ کیا کبھی ہو تم؟

وہ شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اسپتال کی طرف نہیں جانے دوں گی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ میرے بازو پر بڑھا دیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ میں ڈرا بیوگ کی وجہ سے اس کی طرف مسلسل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم میں نے چند لمحات میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے جس ”خیال“ کی تصویر دیکھی وہ میری زندگی میں اب ناپید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت میرے خیال میں اپنی ماں شگفتہ کا چہرہ چمک اٹھا۔ ماں سے زیادہ خیال رکھنے والی کوئی اور بستی اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ پتا نہیں کیوں ساحل کی اس تیزی سے بڑھتی ہوئی وابستگی سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

میں نے قہر فرائے ہوئے لہجے میں کہا ”ساحل! میں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا اسپتال۔“

”کیوں۔ تم اسپتال کیوں جانا چاہتے ہو؟“ وہ بھی ضد پر اتر آئی۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”ان تینوں کو دیکھئے۔ ان کے چھٹنی بدن اور لوسو بدن دیکھنے کے لیے میں وہاں جانا پتا۔“ یہی سب کیا ہو گا؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے تحریک ملے گی۔“ میں اس وقت اچھا خاصا جونی ہو رہا تھا ”بے بسی“ بے کسی اور بے رسی کی تصویر وہ تین لاشیں میرے انتقام کو تمیز کر رہی تھیں۔

وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی ”ان تینوں کی ناممکنی موت نے تمہیں خاصا متاثر کیا ہے ورنہ تم ایسے تو نہ تھے وجدان۔“

میں نے پلٹ کر پوچھا ”کیا تم متاثر نہیں ہوئی ہو؟“

”ہوئی ہوں۔ بہت زیادہ ہوئی ہوں۔“ وہ شکست لہجے میں بولی ”لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنی اس شکست و ریزیت کا تماشا بنایا جائے۔ ہمیں ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ تمہاری ان جذباتی حرکتوں سے دشمن کوئی مزید نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔“

میں حیرت سے اس چھوٹی موٹی لڑکی کو سنتا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا، معصوم اور سادہ سی دھواں وجود کے اندر سے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک سمجھ دار اور بردبار ساحل نے لے لی تھی۔ نام کی تبدیلی انسان پر اس قدر اثر انداز ہو سکتی ہے، یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس وقت میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی ساحل کو دیکھ کر تو یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں

ایک سادہ دیمائی زندگی گزار رہی تھی۔

اپنی اس مختصر سی نامحانہ تقریر کے اختتام پر اس نے کہا ”کچھ ڈی موڑ لو وجدان! میں تمہیں ہرگز اسپتال کی طرف نہیں جانے دوں گی!“

ساحل کا لہجہ اتنا دو ٹوک اور مستحکم تھا مجھے اس میں تحکم کا احساس ہوا۔ اس تحکم میں اپنائیت اور خلوص کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میری وحشت اور سرکش پر جیسے کسی نے منہ بوجہ ہتھی مار ڈالا تھا۔ اپنے اندر دوں۔ کہیں بہت دور مجھے بے بسی کا شدید احساس ہوا۔

میں نے سرایت کرتی ہوئی ایک نگاہ اس پر ڈالی اور کی الوہی جذبے کے تحت اس کی بات مان لی۔

\*\*\*

میں نے اپنے انگوٹھے کے پلکے دباؤ کی مدد سے خبری دھار کو چپک کیا اور تسلی بخش انداز میں گردن ہلا دی۔ یہ وہی ظالم خنجر تھا جس کے لمحاتی کرشمے نے میاں زاہد حسین کے ایک خاص آدمی شاکر علی کی رگ پکا ”مزاج“ کو بھانپا تھا۔ میں نے خبری کارکردگی کی تعریف کی تو امتیاز نے یہ خنجر مجھے بطور تحفہ دے دیا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا ایک روز کی خبر امتیاز کے قاتلوں پر آسانی بجلی بن کر گرے گا اور انہیں اتنے کلکوں میں تقسیم کر دے گا کہ دنیا کا کوئی کمپیوٹر اس تعداد کو شمار نہیں کر سکے گا۔

امتیاز اور میر بخش کا تصور میرا سینہ سلگا دیتا تھا اور بولی، حسن بولی کی یاد مجھے ملول و غم زدہ کر دیتی۔ یہ میری برداشت تھی کہ میں اپنے پیاروں کے صدقات میں اپنے آنسو روکے بیٹھا تھا ورنہ میری جگہ اور کوئی ہو گا تو شاید دھاڑیں مار مار کر رو دیتا۔ دراصل، میں نے بیچین ہی سے روٹکنے کھڑے کر دینے والی زندگی گزارا تھی جس میں نہ قدم پر مجھے جذباتی دکھ سینے پڑے تھے۔ اس وجہ سے بھی میں خاصا حوصلہ مند ہو گیا تھا۔

ساحل اس وقت کچن میں ناشتا بنا رہی تھی۔ میں اس کی محبت بھری ضد سے مجبور ہو کر واپس آ گیا تھا اور اسی کی فرمائش پر میں نے دو تین گھنٹے کی تیند بھی لے لی تھی۔ ان صدقاتی لمحات میں وہ کسی تیشق اور مردانہ ترس کا رول ادا رہی تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی کھنٹی بج گئی۔ وال کلاک دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے دیکھے لہجے میں کہا ”ہیلو۔“

”وجدان مبارک ہو۔“ ایریش میں شعیب غوری کی آواز ابھری۔

میں سمجھ نہیں سکا، وہ کس سلسلے میں مجھے مبارک باد بک رہا تھا۔ میں نے کہا ”اس مبارک باد کی کچھ وضاحت کر کے؟“

وہ غصے ہوئے لہجے میں بولا ”میں نے ایک خاص حالت میں تھائی کے لیے فون کیا ہے۔“

”کون سا خاص معاملہ؟“

وہ بولا ”میں نے لگ بھگ سات گھنٹے پہلے تمہیں ایک ٹیلی فون کیا تھا۔“

”اُن دنوں میں گری خبیثہ کی پائی جاتی تھی“ اسی سلسلے میں ایک ٹیلی فون بھی اس وقت میرے پاس ہے۔“

”تم نے ان تینوں کے قاتلوں کا سراغ لگا لیا ہے۔“

”نہیں، میں نے انہیں نہیں پایا۔“

”دوبارہ؟“ شعیب نے سراہنے والے انداز میں کہا ”تمہاری سوچ بالکل نشانے پر پچی ہے۔“

میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا ”ہمارے ماٹریں کا قاتل کون ہے؟“

”میاں زاہد حسین!“ شعیب غوری نے سرسراتی آواز میں بتایا۔

”میاں زاہد حسین۔“ میں نے ایک ایک لفظ کو چپا کر

”میں نے تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا۔“

”میں نے تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا۔“

”میں نے تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا۔“

”میں نے تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا۔“

”میں نے تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا۔“

”کچھ گئے ہو گے؟“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا ”یہ تو ہمارے لیے اجنبی تو نہیں!“

”بالکل نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا ”ایک ہفتہ ماہ پہلے میں نے کرن بیلٹ والے بنگلے پر اس شخص کی اچھی طرح درگت بنائی تھی۔“

شعیب نے کہا ”میرا خیال ہے، تو یا کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔“

”جیسے پتا چلا ہے، تو یا تمہیں اپنے بھائی اسحاق کا قاتل سمجھتا ہے۔“

”حالا نک۔“ میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا ”جانتا ہوں“ سب جانتا ہوں۔ اسحاق اور اس کے دو شیر ذہن ساتھیوں کی موت ”سی ایف کے“

کے کھاتے پر درج ہے۔ وہ کھاتا۔ جو میرے پاس ہے ورنہ اس شرکی عوام کو تو یہی باور کرایا گیا تھا کہ اس خوں ریز واقعے میں ”را“ کے دو خطرناک ایجنٹوں (وجدان + دھون) کا ہاتھ ہے۔“

”موجودہ واقعے سے تو یہی لگتا ہے، میاں زاہد اور تو یا بھی یہی سمجھتے ہیں۔“ میں نے گھمبر لہجے میں کہا ”کرن بیلٹ

والے بنگلے پر شاکر علی نے تو یا سے میرا ”تعارف“ اسی حوالے سے کرایا تھا جب کہ تم اچھی طرح جانتے ہو، ہمیں اس واردات میں ملوث کرنے والا میاں زاہد ہی ہے۔“

”میاں زاہد بہت ہی کائیاں اور چال باز شخص ہے۔“

شعیب نے کہا ”کیا حقیقت ہے اور کیا فسانہ ہے بات وہ بہ خوبی جانتا ہے۔ وہ تو یا پر جذباتی دباؤ ڈال کر اسے تمہارے سامنے

لے آیا ہے۔ تو یا کو اس نے باور کرا دیا ہو گا کہ تم ہی اس کے بھائی کے قاتل ہو۔ یہ کام میاں زاہد کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ آخر کو وہ ان سب کا پاس ہے۔“

میں گری سوچ میں ڈوب گیا۔ کرن بیلٹ والے بنگلے پر

میں اور امتیاز میر بخش کو رہا کر دینے گئے تھے۔ یہ دو کردار

اب اس دنیا میں نہیں تھے یعنی امتیاز اور میر بخش مکر وہ دو

کردار ابھی زندہ تھے یعنی شاکر علی اور تو یا۔ وہ نہ صرف زندہ

تھے بلکہ اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے پوری طرح سرگرم

عمل بھی تھے۔ میں ان ناسوروں کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو وجدان۔“ شعیب کی آواز میری

سماعت سے ٹکرائی ”کیا کوئی پرابلم ہے؟“

”پرابلم یہ ہے کہ میں جلد از جلد تو یا اور میاں زاہد حسین تک پہنچنا چاہتا ہوں۔“ میں نے قہر فرائی ہوئی آواز میں کہا ”مجھے اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان کے خون کی

گزر رہا ہوگا!

”کیوں کوئی خاص خبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”گورا قبرستان والے اس اندوہ ناک واقعے نے پولیس والوں نے بڑی آسانی سے جان چھڑائی ہے۔ تقریباً سبھی اخبارات میں اس قاتلانہ کارروائی کی خبر چھپی ہیں جسے دہشت گردوں کی معمول کی سرگرمی بتایا ہے۔“

”گویا جو معاملہ سمجھ میں نہ آئے یا جس کو چھاپا تبصرہ ہو اسے نامعلوم دہشت گردوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔“ میں نے طنز سے انداز میں کہا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے میرے دوست۔“ وہ خیال انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا ”اپنے ساتھیوں کے خون کا حامل چکانے کے سلسلے میں ہم ایک دن مزید کیوں انتظار کریں؟ تدفین کا کام تو مغرب سے پہلے ہو جائے گا۔ اس کے بعد پوری رات پڑی ہے ہمیں اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔“

”کل رات کا انتظار ایک مصلحت کی بنا پر ہے۔“

نے کہا۔

میں نے استفسار کیا ”کیسی مصلحت؟“

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ”کل رات ہم زاہد حسین اپنے بچکے پر ایک شاندار جشن منا رہے ہیں۔ بہت خاص الخاص لوگ شرکت کریں گے۔ اس کے علاوہ ہے اس شراب و شباب کی تقریب میں کچھ غیر ملکی مسافر موجود ہیں جن میں دو افراد سنگا پور سے آ رہے ہیں۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں منا رہا ہے۔“

میں نے اس کی فراہم کردہ معلومات پر چونک کر سوال کیا ”تمہیں یہ تفصیل کیوں کر معلوم ہوئی؟“

”وہ بڑی گڈ فوٹیشن!“ وہ سر اٹھانے والے انداز میں بتانے لگا ”وجدان! کسی بھی تنظیم کو کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے تمام مخالفین کی خبر رکھی جائے۔ میری تنظیم ”سی ایف کے“ اصطلاحی اور نظریاتی طور پر حامل ہے چنانچہ تمام منفی افکار کی حامل تنظیموں میں مجھے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ مخالف کیسیوں میں سے ہے۔ بندے گاہے بہ گاہے مجھے خاص خاص باتوں سے باخبر رہتے ہیں۔ یہ تمام معلومات مجھے اس شخص سے ملتی ہیں جو میاں زاہد حسین کے نیٹ ورک میں اس کا وفادار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔“

میں مطمئن ہو گیا۔

ضرورت ہے۔“

شعیب نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں تمہیں ان کے زخموں تک پہنچا دوں گا۔ بس ایک دن اور صبر کر لو وجدان!“

”ایک دن بعد کیوں۔“ میرے لمبے میں احتجاج شامل ہو گیا ”ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟“

وہ دوستانہ لمبے میں بولا ”میں تمہاری جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ تم یہ مت سمجھو کہ مجھے امتیاز، رولی اور میر بخش کی موت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ میں ان کے غم میں دکھی ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر شافی انتقام لینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے یہ انتقامی کارروائی تمہارے ہاتھوں انجام کو پہنچے گی۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”آج کا دن ہم اپنے ساتھیوں کے سوگ میں گزرا رہے ہیں۔ ان کی لاشیں وصول کرنے اور تجزیہ و تحقیق کا مکمل بندوبست کر دیا ہے۔ امتیاز علی کا ”چھوٹا بھائی“ اشتیاق احمد ایک آدھ گھنٹے میں ”دینی“ سے آنے والا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

”چھوٹا بھائی“ اور ”دینی“ کے الفاظ پر اس نے قدرے زور ڈالا تھا کہ میں یہ خوبی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان تدفین کا پروگرام ہے۔ تم چار بجے تک ”ساؤتھ“ آ جاؤ۔ ہم ایک ساتھ قبرستان چلیں گے۔ اوہ ”ساؤتھ“ کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ میں نے تمہارے شک کی تصدیق یا تردید کے لیے اپنے تمام اسٹاف کو چیک کر لیا ہے۔ تمہارے بتائے ہوئے محلے کا کوئی شخص ان میں شامل نہیں۔ اب میں یہی کہوں گا، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ویسے اگر تم کو گے تو میں اپنے پورے اسٹاف کی شناخت پریذکر کروں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا ”مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔“ پھر پوچھا ”کیا تم نے صرف ”ساؤتھ“ کو چیک کیا ہے؟“

”میں کوئی بھی کام کیا نہیں کرتا وجدان!“ وہ ٹھوس انداز میں بولا ”میں نے پانچوں مقامات کی چھان بین کی ہے۔“

میں مطمئن ہو گیا۔

شعیب نے کہا ”تم تو ابھی تک فلیٹ سے باہر نہیں نکلے ہو گے اور ظاہر ہے، کوئی اخبار بھی تمہاری نظر سے نہیں

”اس کا مطلب ہے، سی ایف کے میں بھی دوسری تحقیقوں کے جاسوس خفیہ طور پر کام کر رہے ہوں گے؟“ میں نے ایک خدشہ کا اظہار کیا ”یہ تو ایک منطقی سی بات ہے!“

”ہاں، یہ ممکن ہے۔“ اس نے کہا ”میں اس سلسلے میں کو تباہی نہیں کرتا اور اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ میرے اسٹاف کے ہر ممبر کو کوئی دوسرا ممبر نگران مقرر ہے۔ اس طرح مجھے نیچے سے اور تک ہر سطح پر ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے اور جیسے ہی کوئی شخص میری نظر میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ میں اس کے کچے کچے کے ساتھ اسے بہت سی پرسکون مقام پر منتقل کر دیتا ہوں۔“

”گویا اس کا انتقال ہو جاتا ہے!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم کافی سمجھ دار ہو، میں کیا سمجھاؤں!“

میں نے پوچھا ”شعب! میں چوہدری نواز علی اور اس کے بد طینت باپ چوہدری رمضان کے کروتوں سے تو بڑی حد تک واقف ہوں۔ دیگر جرائم کے ساتھ ساتھ وہ اسمگلنگ کے دھندے میں بھی ملوث تھے۔ ملک رمضان تو فنا ہو گیا۔ چوہدری نواز علی کا خاص بندہ میاں زاہد حسین یہاں کراچی میں سرگرم عمل ہے۔ وہ ایک فعال نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا ہے۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں، ان کی مصروفیات کی نوعیت کیا ہیں؟“

”میں تمہارا سوال بڑی وضاحت سے سمجھ گیا ہوں۔“

شعب نے میری بات پوری ہونے پر کہا ”میاں زاہد درحقیقت منشیات خصوصاً ہیروئن کی اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔ اس کا بگ باس موضع ”رکھان والی“ میں بیٹھ کر صرف ڈوریاں ہلاتا ہے۔ ملک نواز علی کے اشاروں پر یہ منشیات امریکا، یورپ اور جنوبی ایشیا کے ممالک کو بھیج دی جاتی ہے۔ میں اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک نواز علی کوئی عام روایتی سازمینداریاں چوہدری نہیں بلکہ جرائم کی دنیا کا ایک بہت بڑا مروج ہے۔“

”یہ بات مجھ سے زیادہ اور کن جانتا ہو گا۔“ میں نے گلے ہوئے انداز میں کہا ”میں نے اس کے بچھائے ہوئے انگوروں کی ایک دیکھی راہ گزر پر بہت طویل سفر کیا ہے۔ بلکہ اب تک کر رہا ہوں۔“

شعب نے تو صیغی انداز میں کہا ”ملک نواز علی اور اس کی طاقت کو جان لینے کے بعد میں یہی کہوں گا کہ تم اور تمہارا عزم ماؤنٹ ایلبرسٹ سے ایک سوت بھی نیچے نہیں۔“

”اس تعریف کا شکریہ دوست۔“ میں نے کہا ”اب تو

مجھے تم جیسے مخلص دوست کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے۔ چوہدری نواز علی کے وائٹ کتے کرنے میں بہت مزہ آگاہ۔“

”میرا تعاون تو زندگی بھر تمہیں حاصل رہے گا۔“

خوش دلی سے بولا۔

میں نے ڈاکو منٹش کے سلسلے میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ”گاڑی کے ڈیش بورڈ سے برآمد ہونے والا تھیل بھی مجھے پسند آیا۔“

وہ مذاق کے رنگ میں بولا ”دیکھن یا راہ دوس! ہزار روپے کی رقم قرضہ ہے۔ جب سنگاپور سے تمہاری رقم جائے تو لوٹانا نہ بھولنا!“

”میں دوستوں اور دشمنوں کا قرض یکساں طور پر یاد رکھتا ہوں۔“ میں نے بھی اسی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ دشمنوں کا حساب سودور سوریج ہے اور حساب دوستوں دردل۔“

”شکر ہے، تمہارے لیے میں کچھ گفتگو تو آؤں۔“

چمک کر بولا ”میں نے تمہاری سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے قرضے والی بات کی تھی۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”ویسے اگر تمہیں مزید رقم کی ضرورت ہو تو بتانا۔ یہ بات میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“

”بتا دو گا۔“ میں نے بھی سنجیدگی سے کہا ”فی الحال ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، پھر چار بجے ساؤتھ میں ملاقات ہوگی۔“ گفتگو کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ”مجھے خود آنا ہو گا یا تمہاری طرف سے کوئی لینے آئے گا؟“

”کیا تم از خود ساؤتھ پہنچ سکتے ہو؟“

”ڈیفینیٹ لی۔“ میں نے پروتھ لے لی ”میں نے کراچی کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں۔ وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولا ”پھر ٹھیک ہے، تم مجھے بجے ساؤتھ پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔“

دو بجے دوپہر کی فون پر ٹیل آرمر سے میری چند ضروریات پر تفصیلی بات ہوئی۔ مدون سونا بھی زیر بحث آئے گا۔ ”تو کیا تم ٹیل آرمر کو بھی سونے کی باڈی میں ڈھپ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”فی الحال میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔“

انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”اس وقت میرے پاس

وہ پولی ”میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو کیا فلیٹ پر تنہا رہو گی؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا اس میں کوئی پریشانی ہے؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے کہا ”مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن تمہیں ہو سکتی ہے۔ کیا تمہیں اکیلے فلیٹ پر رہتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔“

”ڈر کیسا وجدان!“ وہ مستحکم لہجے میں پولی ”ڈر تو انسان کے اندر ہو تا ہے اور میں نے وہ ڈر نکال دیا ہے۔ ویسے بھی تین چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ تم چار بجے جاؤ گے اور سات آٹھ بجے تک لوٹ ہی آؤ گے۔ میں غوراً آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے ساتھیوں کی المناک موت نے مجھے بے ہوش کر دیا ہے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔ میں ان تین چار گھنٹوں کے دوران میں تمہیں گاہے بگاہے فون کرتا رہوں گا۔“

پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ اچانک مجھے انسپٹر چانگ شو کا خیال آ گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے بتایا تھا کہ مکان اور اسٹور کے لیے اس نے الگ الگ دو پارٹیاں تیار کر لیں ہیں اور بہت جلد یہ سودا فاضل ہو جائے گا۔

میں نے ساحل سے کہا ”سنگاپور میں انسپٹر چانگ شو سے بات کرتے ہیں۔“

وہ میری سنگاپور والی پراپرٹی کی فروخت کے معاملات سے آگاہ تھی۔ اس نے کہا ”ہاں وجدان، تمہارے انسپٹر دوست نے اب تک وہ کام کر ہی دیا ہو گا۔ اس کے پاس میاں کافون خبر نہیں ہے۔ تم ہی اسے فون کرو تو اچھا ہے۔“

میں نے نیلی فون ایکس چینج کی خدمات حاصل کرتے ہوئے سنگاپور پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر لے لیا۔ اتفاق سے چانگ شو اس وقت ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔ مجھے یارپیں میں اس کی مخصوص آواز سنائی دی تو میں نے کہا۔

”انکل! یہ میں ہوں وجدان۔“

”پہچان لیا مائی سن۔“ وہ خوش دلی سے بولا ”تم ہو کہاں۔ میں نے کل رات تمہیں فون کیا تھا لیکن کسی نے انیڈ نہیں کیا۔“

میں نے اسے بتایا ”ہاں انکل! بس کل کی رات خاصی افزائش میں گزری ہے۔ میں گھر نہیں تھا اور آپ میرا فون نمبر نوٹ کر لیں۔ میں نے اپنی رپازیشن تبدیل کر لی ہے۔“

وہ توشیح ناک لہجے میں بولا "اُفراق تفری زیادہ خطرناک تو نہیں تھی۔ کیا تم خیریت سے ہو؟"

"ہاں! سب ٹھیک ہے اکل۔" میں نے گول مول جواب دیا "آپ کوئی فکر نہ کریں۔"

وہ فوراً اصل موضوع کی طرف آگیا "وجدان! میں نے تمہاری دکان اور مکان کی فروخت کا معاملہ نمٹا دیا ہے۔ کل دونوں پر یاریاں پے منٹ کر دی ہیں۔ تین دکانوں پر مشتمل شعبہ جاتی اسٹور اپنے تمام سامان کے ساتھ اٹھارہ لاکھ ڈالر میں گیا ہے۔ میرے خیال میں "عابد علی اینڈ سن" کی بہت اچھی قیمت مل گئی ہے۔ دراصل چائنا ٹاؤن اور خصوصاً ساکو اسٹریٹ پر پراپرٹی کی بہت ویلو ہے اور تمہارا شعبہ جاتی اسٹور تو بہت چلتا تھا۔ اس کی ساتھ بہت مشہور ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ اٹھارہ لاکھ کا ریٹ امریکی ڈالر میں ہے یا سنگا پورین؟"

"مالی سن! چینگا شونے بڑی محبت سے کہا "میں یہ ڈیل امریکی ڈالر میں کر رہا ہوں۔ میں نے "عابد علی اینڈ سن" کو اٹھارہ لاکھ یو۔ ایس میں فروخت کیا ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس کی پھر پوچھا "میرا مکان کتنے میں فروخت ہوا؟"

"وجدان! تم خوش قسمت ہو۔" انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تمہارا مکان بھی ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں پراپرٹی کی قیمت پچھلے کچھ عرصے سے بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ فورٹ کیٹنگ روڈ (FORT KENNING) والا وہ مکان زیادہ بڑا نہیں لیکن یہ آسانی سے سات لاکھ یو۔ ایس میں بک گیا۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بولا "اس طرح تمہاری پراپرٹی پچیس لاکھ امریکی ڈالر میں، میں نے فروخت کر دی ہے جو کہ بہت بڑی رقم ہے۔"

"ہاں اکل! رقم تو واقعی بہت بڑی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا "آپ یہ رقم کب تک مجھے بھیج دیں گے؟ ویسٹرن یونین بینک والے تو آپ کے پولیس ہیڈ کوارٹر سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

"ہاں! وہ تو ہمارے نزدیک ہیں۔" چینگا شونے بولا "لیکن میں تمہیں یہ رقم بینک کے ذریعے تمہیں بھیجوں گا۔" میں نے حیرت سے کہا "کیوں اکل! میں نے تو سنا ہے" ویسٹرن یونین بینک والوں کی سروس اور ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔"

"تم نے بالکل درست سنا ہے۔" وہ سمجھانے والے

انداز میں بولا "میں دو اہم وجوہات کی بنا پر مئی ٹرانسفر لے بینک کی خدمات سے بچنا چاہتا ہوں۔"

"دو وجوہات کون سی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

انسپکٹر چینگا شونے بتایا "نمبر ایک۔ اس طریقہ میں اچھی خاصی رقم بینک کیشن کے طور پر ہمیں واپس یونین والوں کو ادا کرنا ہوگی۔ نمبر دو۔" وہ جملہ ادھر ادھر کر چند لمحے خاموش رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "وجدان! تم میری اولاد کی طرح ہو اس لیے مجھے امید ہے کہ میری بات کا برا نہیں منادو گے۔ دراصل پاکستان کے حالات کے بارے میں، میں نے جو کچھ سن رکھا ہے وہ انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ مجھے امید ہے وہاں یہ خبر بھی میرا سکے گی کہ تمہارے پاس ایک بہت بڑی رقم آئی ہے۔ چوڑی ڈیکٹی یا اس قسم کی کسی عظیم واردات کے امکانات خائے قوی ہیں لہذا میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔"

میں نے کشادہ دلی سے کہا "اکل! میں نے آپ کی بات کا ہرگز برا نہیں مانا کیوں کہ آپ میرے ملک کو نہیں بلکہ یہاں پائے جانے والے برے لوگوں کو برا کہہ رہے ہیں۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس ملک بدنامی یا نیک نامی ملتی ہے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے استفسار کیا "مئی ٹرانسفر کے لیے آپ نے کیا ہے؟"

"میں ہنڈی کے ذریعے یہ رقم تمہیں بھیج دوں گا۔" اس نے بتایا۔

"یہ ہنڈی کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مئی ٹرانسفر کا بین الاقوامی غیر قانونی اور محفوظ ترین طریقہ۔" چینگا شونے بڑے پراعتماد انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اکل! میں نے یہ سارے معاملات آپ چھوڑ دیے ہیں۔" میں نے کہا "آپ جو مناسب اور سونل سمجھتے ہیں وہ کریں لیکن۔" میں نے جملہ ادھر ادھر اچھوڑا تو اس نے پوچھا۔

"لیکن کیا وجدان؟"

میں نے کہا "میں نے ایک ماہ پہلے جب اس فروخت کے بارے میں آپ سے بات کی تھی تو کہا تھا مجھے رقم امریکی ڈالر میں چاہیے لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں ملتی ڈالر کی گردش میں ہیں اس لیے آپ کچھ ایسا بندوبست کریں کہ مجھے وہ رقم پاکستانی کرنسی میں مل جائے۔"

"ہو جائے گا مالی سن! وہ بڑی شقت سے بولا "میں

بذرا کاروبار کرنے والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہیں ہنڈی کرنسی میں ادا کیجی کریں۔ ان کے لیے یہ عام سی بات ہے۔ میں تمہارا فون نمبر اور ایڈریس انمیں بتا دوں گا۔ وہ خود سے رابطہ کر لیں گے۔ رقم جیسے ہی تمہارے ہاتھ آئے ایک فون مجھے کھڑا کرنا۔ بس معاملہ کلیئر۔"

میں نے اپنے ذہن میں پچیس کو پینسٹھ سے ضرب دی اور پانچ سو کو بدستور ساتھ رکھتے ہوئے حساب جوڑ لیا۔ یہ رقم سولہ سو پچیس لاکھ روپے بنتی تھی۔ ان دنوں اوپن کرنسی مارکیٹ میں ڈالر پینسٹھ روپے کا چل رہا تھا۔ پاکستانی کرنسی میں یہ واقعی بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے انسپکٹر چینگا شونے کہا "اکل! آپ میرے مردم والد عابد علی کے چند اچھے دوستوں میں سے ایک ہیں۔ جب تک والد صاحب زندہ رہے، آپ نے ہر ہر قدم پر اپنی دینی کو نبھایا ہے۔ بعد میں میرے ساتھ بھی آپ کا رویہ بہت شگفتہ اور تعاون دوستانہ رہا۔ آج میں آپ سے ایک فرمائش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ یہ فرمائش ضرور پوری کریں گے۔"

"بولو مالی سن! چینگا شونے اپنے مخصوص انداز میں کہا "تمہاری کیا فرمائش ہے؟"

"آپ کو ہر صورت میں میری ایک بات ماننا ہوگی۔" میں نے اصرار کی بجائے میں کہا۔

"میں نے کہا، بولو۔ میں تمہاری فرمائش پوری کر دوں گا۔"

میں نے کہا "آپ اس رقم میں سے ایک لاکھ یو۔ ایس ملی طرف سے یہ طور تحفہ قبول کریں گے تمام اخراجات نکال کر باقی جو رقم بچے وہ مجھے ارب سال کریں گے دیش فنانس!۔"

"دھمپہ! کیا کہہ رہے ہو مالی سن؟" انسپکٹر کی آواز ٹھار لڑا اتر آئی۔

مجھ پر اور میری فیملی پر چینگا شونے ان گنت احسانات عہدہ ایک فرض شناس اور سختی پولیس آفیسر تھا۔ یہ ایک اوامری ڈالر اس کے بہت سے خوابوں کو تعبیر دے سکتے تھے لہذا وہ اس کا حق بھی رکھتا تھا۔

ایک لاکھ امریکی ڈالر کو معمولی رقم نہیں تھی۔ میں نے چینگا شونے حیرت نما چپکلی ہٹ کے پیش نظر کہا "اکل! ان پے سے میری یہ فرمائش پوری نہ کی تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

وہ افسردہ لہجے میں جلدی سے بولا "اوکے۔ اوکے۔"

مالی لوونگ سن!۔"

چند معاملاتی باتوں کے بعد ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

\*\*\*

ساڑھتھ میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شعب خوری کے کمرے میں جب میں پہنچا تو وہ نیل آرم سے فون پر اپنی گفتگو سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھ کو مصافحہ کرتے ہوئے کہا "وجدان! میں تمہاری انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا "میں تو ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں!"

"تم لیٹ نہیں ہو۔" اس نے کہا "لیکن میں ہی کچھ جلدی میں ہوں۔ آج کی ہنگامہ خیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"آپ کون سی نئی بات ہو گئی شعبہ؟"

وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے بولا "مجھے ایک ایمر جنسی میں فوری طور پر ملک سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ ٹھیک پانچ بجے مجھے ایئر پورٹ پہنچنا ہو گا۔ ہمارے پاس باہمی گفتگو کے لیے بس یہی ٹھکانا، دوا ٹھکانا ہے۔"

میں نے کہا "شعب! میں تمہاری ایمر جنسی کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا بتا دو، تم کس ملک کی طرف جا رہے ہو؟"

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا "مارشس!"

"اوہ! میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "میں نے ساتھیوں کی تدفین میں تو تم کسی طور بھی شرکت نہیں کر سکو گے مجھے تو لگ رہا ہے کہ کل رات والے مشن میں بھی تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا، کل رات کسی بھی وقت واپس آنے کی۔" وہ سر کو آٹھائی جنبش دیتے ہوئے بولا "مجھے بس جانا، آنا ہی کرنا ہے۔ مارشس (MAURITIUS) میں یہ مشکل ایک گھنٹے کا کام ہے۔ جو بھی فرسٹ کلاس فلائٹ دستیاب ہوگی، میں واپس آ جاؤں گا۔ ویسے بھی کل رات والا ہمارا مشن، رات کے آخری حصے میں ہی آغاز ہو گا۔"

تھوڑے وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا "ویسے میں نے خاص آوی ہے اور میری غیر موجودگی میں ساڑھتھ کے سارے معاملات کو وہی آپریت کرتا ہے۔ خدا نخواستہ میں نہ پہنچ سکا تو کیر شاہ تمہیں میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ میں

یہاں سے روانہ ہونے سے قبل اس سے تمہاری ملاقات بھی کروا دوں گا۔"

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے شعیب، تمہاری مجبوری کو میں محسوس کرتا ہوں۔"

"مجھے خود سخت افسوس ہے کہ اپنے ساتھیوں کی تدفین میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا "کراچی سے مارشیل ہفتے میں چار فلیٹس ہیں۔ اگر میں نے اس فلائٹ کو مٹ کر دیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ تم سمجھ دار ہو۔ میری تنگی پیچیدگیوں کو محسوس کر سکتے ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا "یہ لگ بھگ آٹھ گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ میں کو شش کروں گا، ادھر سے بھی دوسرے تک مجھے کسی فلائٹ میں سیٹ مل جائے۔"

میں نے شعیب سے پوچھا "مسٹر نیل آرمے سے تفصیلی بات ہو گئی؟"

"ہاں ہو گئی۔" وہ بولا "مسٹر نیل آرمے سونے کی بازیافت میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ ویسے تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔ نیل آرمہ اگلے ہفتے کراچی آ رہا ہے۔ وہ تم سے بھی چند امور پر بات چیت کرنا چاہتا ہے۔"

"ضرور۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

شعیب نے اپنی بیکری دروازے ایک تہ شدہ کانڈ نکالا اور بڑی احتیاط سے اس کی تمہیں کھولنے کے بعد میز پر پھیلا دیا۔ میں نے اس بڑے سائز کے کانڈ کو بہ غور دیکھا تو پتا چلا وہ ایک نقش تھا۔ انڈوپاک کا تفصیلی سرحدی نقشہ۔ ایک مقام پر سیاہ مار کر سے بڑا سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس دائرے کے اندر نگاہ ڈالی تو مجھے بارڈر کے ادھر اور ادھر لاہور اور امرتسر نظر آیا۔ شعیب نے پاکستانی حدود میں سرحدی مقام کے قریب انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ جان! یہ تمہارا آبائی گاؤں موضع 'رکھال والی' ہے۔"

میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس جگہ کو دیکھا جہاں میرا گاؤں آباد تھا۔ اسی گاؤں کے ایک متروک کنوئیں میں چوتھائی ارب کی مالیت کا سونا دفن تھا۔

شعیب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ سرحد کے اس بار ایک جگہ پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے بتا رہا تھا "اور یہ ہے ضلع امرتسر کا چھوٹا سا گاؤں 'رام پور'۔"

اپنے باپ کی ڈائری میں لکھی ہوئی تفصیل میرے ذہن

میں روشن ہو گئی۔ رام پور کا چوہدری کرم داس، چوہدری محمد رمضان کا گھرا دوست تھا کیوں کہ وہ ایک تاجر کے چٹے بنے تھے۔ دونوں کا خفیہ پیش ایک تھانہ تھا۔ ان کے دھندے میں گردن گردن تک دھنسنے ہوئے تھے۔

میں نے پر خیال انداز میں کہا "چوہدری نواز شیل باپ ملک رمضان تو کھوڑی سے گر کر مر گیا۔ پتا نہیں رام پور کا چوہدری کرم داس بھی زندہ ہے یا ختم ہو گیا؟"

"پتا ہے۔ کیوں کہ میں نے پتا چلا لیا ہے۔" شعیب نے گھیسر لہجے میں کہا "کرم داس اب اس دنیا میں نہیں۔ اس کا بیٹا رام داس! آج کل 'رام پور' کا چوہدری ہے۔"

"تمہارا کام کرنے کا انداز بہت تیز رفتار ہے شعیب! میں نے تعجب نظر سے اسے دیکھا۔

"مجبوری ہے۔" وہ خفیف انداز میں مسکرایا "یہ زمانہ ہی تیزی کا ہے۔ جو لوگ زمانے یا وقت کا ساتھ نہیں دیتے بری طرح روند دیے جاتے ہیں۔ وقت اور زمانہ انہیں چپے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔"

"میں تمہارے خیالات سے مد فیصد متفق ہوں۔" میں نے کہا "میرے تجربے نے بھی مجھے یہی بتایا ہے۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا "وجدان! ڈائری کے وہ صفحات کہاں ہیں؟"

میں نے اپنی پیٹ کی خفیہ جیب سے دو صفحات پر مشتمل وہ ورق نکال کر شعیب کی طرف بڑھا دیا۔ ڈائری کے صفحات میں مختلف لکیروں کی مدد سے متروک کنوئیں کی بڑے دائرہ انداز میں نقشہ بنا کر نشان دہی کی گئی تھی اور دائرے کی شکل میں کنوئیں کے مقام کو سرحد کے قریب دکھایا گیا تھا۔

شعیب غوری ڈائری کے صفحات کو اپنی میز پر پچا ہوئے نقشے سے ملا کر غور فکر کرتا رہا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولا "ہن گئی بات!"

"کون سی بات بن گئی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "دیکھو وجدان! اس مرتبہ اس نے اپنے نقشے کے ایک مقام پر انگلی رکھی ہوئی تھی "یہ رکھال والی" زمین ہے جہاں وہ متروک کنواں واقع تھا۔ تھا اس لیے کہ رہا ہوں کہ پتا نہیں اب بھی ہو گیا نہیں! خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا! وہ کندھے اچکاتے ہوئے دوبارہ اپنے نقشے کی جانب متوجہ ہو گیا اور ادھر ادھر انگلی کو حرکت دیتے ہوئے بولا "ہمارا مطلب یہ متروک کنواں سرحد کے بہت قریب واقع ہے اور سرحد کی دوسری جانب چوہدری رام داس زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک لمحے کو رک کر اس

میں نے انداز میں کہا "تم یہ نہ سمجھنا کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہاں باقاعدہ کوئی بارڈر موجود ہے۔ ہرگز نہیں! صرف عمرانی پر مامور افراد ہی جانتے ہیں کہ کہاں پاکستان کی زمین ہوئی اور کہاں سے بھارت کی زمین شروع ہو گئی۔" وہ نے ساری اراضی آپس میں ملی ہوئی ہے اور تاحہ نگاہ ملتا ہے۔ یہ سمجھت دکھائی دیتے ہیں۔"

میں کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ایک اور مقام پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہ چوہدری نظام الدین کی زمینیں ہیں جو پاکستانی حدود میں ملک نواز شیل علی کی زمینوں سے ملی ہوئی ہیں لیکن متروک کنوئیں سے ان کا ہمسایہ زیادہ ہے۔"

پالا خرمی نے پوچھ ہی لیا "میں اس ساری تفصیل کا مفہوم نہیں سمجھ سکا!"

"مفہوم صرف اتنا ہے کہ ہم حکم کھلا اور علی الاعلان اس متروک کنوئیں کی کھدائی نہیں کر سکتے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اس کام کے لیے ہمیں آس پاس کی کوئی زمین استعمال کرنا ہوگی۔ ظاہر ہے وہ زمین ملک نواز شیل کی تو نہیں ہو سکتی۔"

میں نے ڈونٹتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "دکسی سرگرم دیو کا راہو ہے؟"

"تمہارا انداز بالکل درست ہے۔" وہ تعجب سے لہجے میں بولا "اور یہ آئیڈیا بھی مسٹر نیل آرمے کا ہے۔ کل جب تم 'سٹیت' میں مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد روانہ ہوئے تو تمہارے جاتے ہی نیل آرمہ کا فون آ گیا تھا۔ وہ میرا اتنا بے تحاشہ گھبراہٹ اور غصہ دوست ہے کہ میں اپنے اوپن برنس کے انگریز معاملات اس سے ضرور ڈر سکس کرتا ہوں پھر ہم چل کر سونے کے سلسلے میں اس کے 'گولڈ کاؤنڈ بینک' کو گئی استعمال کریں گے تو اس وجہ سے بھی میں نے اسے اس سے بوجھت سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ کنوئیں کھود کر یہ مقصد حاصل کرنا انتہائی نازک ہوگا۔ ملک نواز شیل علی کوئی بہت بڑا پینڈا اکھڑا کر سکتا ہے۔ مجھے بھی نیل آرمے کی بات پسند آئی اور میں نے کھدائی وغیرہ کا پروگرام ختم کر دیا۔ یقیناً تمہیں بھی نیل آرمے کی سرگرم دلی تجویز زیادہ جان دار لگے گی۔"

"ہاں! یہ زیادہ محفوظ اور جان دار ہے۔" میں نے پوچھا "انڈاز میں کہا۔"

وہ بولا "میں نے صبح چھبیس فون پر بتایا تھا کہ دفینے تک رکال کے لیے ہمارے پاس صرف دو راستے ہیں۔ ایک

نیشیل اور دوسرا انٹرنیشنل۔ ان دونوں راستوں پر دو مختلف آدمیوں سے ہمارا واسطہ پڑے گا۔ وہ دو آدمی ہیں چوہدری نظام الدین اور چوہدری رام داس!"

وہ خاموش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے مدبرانہ لہجے میں کہا "ان دو آدمیوں سے ہمارا واسطہ اس لیے پڑے گا کہ ہمیں متروک کنوئیں تک سرگرم لگانے کے لیے ان میں سے کسی ایک کی زمین استعمال کرنا ہوگی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں! تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "میں اوٹریل آرمرس بات پر متفق ہیں کہ ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے رام داس کی زمین کو استعمال میں لانا چاہیے کیوں کہ وہاں سے متروک کنوئیں کا فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں۔ بہت ہوا، بہت ہوا تو ادھا فرلانگ ہو گا جب کہ چوہدری نظام الدین سے یہ فاصلہ پندرہ بیس گنا ہوگا۔"

میں نے نقشے کی باریکیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چوہدری نظام الدین کی زمین کو استعمال کرنے کی صورت میں ہمیں کم از کم ایک میل کی سرگرم نکالنا ہوگی جو کہ خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تم دونوں کا اتفاق بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا!"

"تمہیں کون سی بات الجھا رہی ہے؟" شعیب نے پوچھا۔

میں نے کہا "میری معلومات کے مطابق ملک نواز شیل علی کا باپ ملک رمضان اور رام داس کے باپ کرم داس میں بڑا گھبراہٹ یا راند تھا لہذا ملک نواز شیل اور رام داس بھی آپس میں دوست ہوں گے۔ چوہدری رام داس ایک دوست کے خلاف ہمیں اپنی زمین کیوں استعمال کرنے دے گا؟ پھر اگر ہم وہ سونا رام پور کی زمینوں کی مدد سے نکالیں گے تو وہ پاکستان کس طرح لایا جائے گا کیوں کہ موضع رام پور تو امرتسر میں ہے اور امرتسر بھارت میں؟"

"تمہارے دونوں سوالات کے جواب ہیں میرے پاس۔" وہ مجھے انداز میں مسکرایا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ آج کل ملک نواز شیل اور رام داس میں شدید قسم کی دشمنی چل رہی ہے اور بعض اسگنگ کے تنازعات کے سبب وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور جہاں تک سوال ہے ہماری مالیت کے سونے کو بھارت سے پاکستان لانے کا تو یہ ہمارا درد سر نہیں ہے۔ نیل آرمہ 'برآمدت' کو وہیں 'رام پور' گاؤں ہی میں اپنی



تحويل میں لے لے گا۔

”ہوں!“ میں نے مگرمی خجیدی سے کہا ”اس کا مطلب ہے“ نیل آرمر پوری طرح اس پروجیکٹ میں ان ہو چکا ہے۔“

شعب غوری نے اثبات میں گردن ہلا دی۔  
میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا ”نیل آرمر ایک مصروف بزنس میں ہے۔ وہ اگر ہمارے پروجیکٹ میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا ہے تو یقیناً اس کے بدلے وہ کوئی مالی فائدہ بھی چاہے گا۔“

”ہاں“ یہ تو ہے۔“ شعب نے کہا ”سوئے کا وہ بیواری فائدے کا خواہاں تو ہے لیکن میں اسے کم سے کم پر راضی کر لوں گا۔ تم فکر نہ کرو، ہم دونوں کی بزنس پارٹنرشپ زیادہ متاثر نہیں ہوگی۔ میں نیل آرمر کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ وہ میری بات مان لے گا۔“

”وہ تمہاری بات اس لیے مان لے گا کہ تمہارا دوست ہے۔“ میں نے کہا ”مگر رام واس کو اتنی آسانی سے نہیں ٹرغایا جائے گا۔ وہ بھی اس دھنپے میں سے کچھ نہ کچھ ضرور طلب کرے گا!“

”ہاں“ یہ اس کا حق ہو گا۔“ شعب نے کہا ”ایسے معاملات میں دل اور ہاتھ کو ذرا کھلا رکھنا پڑتا ہے وچدان۔ یہ ایک طرح سے جو اخٹ و پنجر ہو گا جس کے مرکزی کردار ہم دونوں ہیں۔“

میں نے پوچھا ”سرحد پار کے معاملات تم لوگ خود ہی دیکھو گے نا؟“

”ہاں وچدان!“ شعب نے یقینی لہجے میں کہا ”دھر اور ادھر کے تمام مسائل کو حل کرنا میرا کام ہے۔ انٹرنیشنل معاملات میں نیل آرمر نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔ تم نے یہ پروجیکٹ مجھے سونپ دیا ہے۔ اب تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا۔ یہ ساری باتیں تو میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ایک دوست ہونے کے ناطے تم ہر معاملے سے باخبر رہو۔“

شعب کی تسلی نے میرے کندھوں کا بوجھ اتار پھینکا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک آدھ روز میں ہنڈی کے ذریعے میری رقم سنگاپور سے کراچی آ رہی ہے۔ میں نے اسے اماؤنٹ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس نے اتنی بڑی رقم کی خبر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اتنا زیادہ مال دار بن جانے کے بعد اپنے اس دوست

کو بھول نہ جانا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دوست۔“ میں نے غور سے لہجے میں کہا ”مگر ہنڈی والا معاملہ مجھے الجھا رہا ہے۔ ملاؤ میرے خیر خواہ چینگا شو نے ہنڈی کے کاروبار کی غامض تعریف کی ہے!“..... شعب غوری نے کہا۔

”تم مطمئن رہو۔ یہ انتہائی ایمان دارانہ کاروبار ہے۔ میں کراچی کے ہنڈی والوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان میں چند میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ تمہاری رقم کی ایک پائی بھی زادھر ادھر نہیں ہوگی۔“

شعب کے اطمینان دلانے پر میں بالکل بے فکر ہو گیا۔

\*\*\*

میں جب واپس فلیٹ پر پہنچا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ساحل کی دی کے سامنے بیٹھی کوئی تقریبی چیمیل دیکھ رہی تھی۔ مجھے سب سے پہلے ساحل کو اپنے ساتھیوں کی تدفین کی نصیحتات سے آگاہ کرنا پڑا۔ قبرستان میں سب خیریت گزری تھی اور کسی بھی قسم کا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شعب غوری مجھ سے ملاقات کے بعد ماریشس روانہ ہو گیا تھا۔ ہم اس کا نائب کیر شاہ قبرستان میں قدم قدم پر میرے ساتھ ہا تھا۔ قبرستان سے نکلنے کے وقت کیر شاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ کل دن میں کسی وقت مجھ سے رابطہ کرے گا کہ رات والے ”آپریشن“ کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ شعب غوری کے پروگرام کے مطابق، میں نے کیر شاہ کی شکست میں دھمک کر سر کرنا تھا۔

میری پوری بات سننے کے بعد ساحل نے کہا ”وچدان! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ چلو کہیں باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔“

آج جانی جاگتی دیوی کی طرح ساحل بھی بھوک کی بہت کمزور تھی اور خاص طور پر جب سے اس نے مارشل آرٹس اور یوگا کی پریکٹس شروع کی تھی، اس کی بھوک دو چندان ہو گئی تھی۔ اسے گاہے بہ گاہے ہوتا رہتا تھا یہ کھانا اور نہ کھانا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر اس نے کھانے پینے کے

معاملات کو بے قاعدہ اور کھلا چھوڑ دیا تو تیزی سے قریب ہوتی چلی جائے گی۔ کیونکہ مودوں کی یہ نسبت عورتوں میں سب سے زیادہ درخاں پایا جاتا ہے۔

چند روز بعد ہم دونوں نیلی شیش میں بیٹھ کر کسی ایچ سے ریسٹورنٹ کی تلاش میں کلفٹن کی سڑکوں کو تپ رہے تھے۔ ساحل نے کہا ”کل رات آتے ہوئے“

میں کھانے پینے کے کئی مقامات ایک ہی جگہ دیکھے تھے۔“ وہ پوٹ جینس کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے کہا ”اس طرف پھر کبھی چلیں گے۔ فی الحال تو مجھے بھی ٹھیک ٹھاک بھوک لگ رہی ہے۔ آج اسی کو چیک کرتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی سے باہر ایک مقبول مورت ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس وقت ہم زمرہ کے علاقے سے گزر کر سپر مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ساحل نے میری تائید کی تو ہم اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

وہ ریسٹورنٹ مقبول صورت ہی نہیں بلکہ مقبول سیرت بھی واقع ہوا۔ ہم دونوں نے پیٹ بھر کر خوش ذائقہ اور معیاری کھانا کھایا۔ جب میں نے ویٹر سے بل لانے کو کہا تو مائل ہوئے۔

”تم بل کے معاملات سے نمٹو۔ میں ذرا واش روم ہو آؤں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔  
پانچ بیس منٹ بعد وہ واپس آگئی۔ ساحل اکیلی واش روم کی طرف ہی تھی لیکن واپس میں وہ اکیلی نہیں بھی بلکہ اس کے ساتھ دو اور بھی تھیں اور ان دو میں سے ایک کو بچانے میں، میں نے ایک لمبے کی تاخیر نہیں کی۔ وہ بلاشبہ بہت تیزی سے مدھوری ڈشٹ کی مماس و حسین و جمیل لڑکی بہت کم وقت کے لیے میرے ساتھ رہی تھی۔ میں بی سکرے قاضی سلطان کی اس اگلیاتی اور لاڈلی بیٹی کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ ممتاز سے میری نگاہ ملی تو اس کے ہونٹ خود بہ خود کمرانے لگے۔ اس کی ساتھی دوسری لڑکی کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”وچدان! تم اس قدر بدل گئے ہو!“ ممتاز نے میرے نزدیک آنے پر حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ اس نے اتنی بے غلطی کا اظہار کیا تھا کہ رسمی علیک سلیک کو بھی فراموش کر چکی تھی۔

میں نے اپنی سیٹ سے گھڑے ہو کر اس کا حال احوال دریافت کیا۔ پھر تینوں اسی میز کے گرد بچھی کر بیٹھیں۔ آج کل میں نے اپنے پیٹے میں چول کے بہت زیادہ پٹے لگا رکھے تھے اس لیے ممتاز نے میرے بدل جانے پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”یہ شبانہ ہے۔“ ممتاز اپنی ساتھی لڑکی کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے بولی ”انگل باقر کی بیٹی۔ تم منہاس باقر سے تو واقف ہو نا!“

میں نے شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ میں منہاس باقر سے واقف ہوں۔ وہ شبانہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”وچدان کا ذکر تو میں تم سے اتنی مرتبہ کر چکی ہوں کہ اس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔“

ممتاز کا انداز بہت متنی خیز اور بولڈ تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ممتاز کی بے باکی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور خاص طور پر اس نے بی سمریں پولیس والوں کے سامنے جتنے کھلے ڈالے انداز میں میری حمایت کی تھی اس سے یہی ظاہر ہوا تھا، وہ مجھ میں شہیدہ قسم کی دلچسپی لے رہی ہے۔ میرے تعارف پر شبانہ مجھے ایسی نگاہ سے دیکھنے لگی جیسے دال میں کچھ کالا ہو۔

ممتاز کی ساتھی شبانہ کی عمر پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ گدازدین کی مالک ایک الزماؤن لڑکی تھی۔ عمیق چرے والی اس سانوی لڑکی کے نقش میں ایک ٹیکھا پن موجود تھا جو بے پناہ کشش پیدا کر رہا تھا۔

میں نے ممتاز سے پوچھا ”تم یہاں کراچی میں؟“  
”دون پہلے آئی ہوں۔“ اس نے شوخی سے بتایا ”پاپا چھوڑ گئے ہیں۔ کم از کم ایک ماہ رہوں گی یہاں۔“ پھر وہ شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”دو ہفتے بعد اس کی شادی ہے۔ بس اسی سلسلے میں شاہنگ و فیروہ چل رہی ہے۔ اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے سوال داغ دیا ”اور تم تو ایسے بے مروت نکل کر پلٹ کر خبری نہیں لی۔“

اس کے انداز میں شہر میں شکوہ تھا۔ ساحل جو اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھی تھی، اچانک بول اٹھی۔ اس نے ممتاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”وچدان نے جب تمہیں ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اپنا تعارف کرواتے ہوئے خدائی فوج دار کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس سے بے مروتی کا گدہ نہ کرو۔ یہ مشکل وقت میں ہی سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ اب!“

ساحل کے آخری جملے نے مجھے پوچھنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ بات تو جان گیا تھا کہ ساحل کسی بھی لڑکی یا عورت کو مجھ سے بے باک یا بے تکلف ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ ممتاز کی موجودگی میں وہ جیسے آف ہو جاتی تھی لیکن اس وقت ممتاز کے حوالے سے اس نے جس طرح اپنی بات کو ختم کیا تھا اس کے پیش نظر میں ممتاز سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

”اس وقت کون سی افتاد آن پڑی ہے؟“  
ممتاز کے بجائے ساحل نے میرے سوال کا جواب دیا۔  
اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میز پر بیٹھنے سے پہلے ممتاز کی موجودہ  
صورت حال سے آگاہ ہو چکی تھی۔  
”وجدان! دو غنڈے ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں  
تک پہنچے ہیں۔“

میں فوراً الٹ ہو گیا ”کیا وہ دونوں اس وقت  
ریسٹورنٹ میں موجود ہیں؟“ میں نے بد دستور شبانہ کی طرف  
دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”وہ اندر  
داخل نہیں ہوئے بلکہ ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے ہوں  
گے جیسا پہلے کرتے رہے ہیں۔“  
”یہ کس قسم کے غنڈے ہیں بھئی۔“ میں نے شبانہ سے  
استفسار کیا ”اور کب سے تم لوگوں کے پیچھے لگے ہوئے  
ہیں؟“

اس نے بتایا ”ہم تین چار گھنٹے سے لگے ہوئے ہیں۔  
مختلف اسٹورز سے شاپنگ کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ میں  
ٹھیک ٹھیک تو نہیں بتا سکتی کہ وہ کب سے ہمارے تعاقب میں  
ہیں لیکن محض شبانہ ایک گھنٹے سے ہم نے انہیں مسلسل تعاقب  
میں دیکھا ہے۔ ہم جس بھی دکان یا اسٹور کے اندر جاتے  
ہیں وہ ہمارے پیچھے اندر داخل نہیں ہوتے بلکہ باہر ہی ہمارا  
انتظار کرتے رہتے ہیں اور جیسے ہی ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر  
آگے بڑھتے ہیں وہ ہمارے تعاقب میں لگ جاتے ہیں۔“  
”کیا ان کے پاس بھی گاڑی ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”وہ دونوں موٹر سائیکل پر ہیں۔“ شبانہ نے کہا ”ان کے  
پاس ہٹل اور ٹو فائیو ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا انہوں نے ابھی تک آپ سے کوئی  
بات کی ہے یا کسی قسم کی اور کوئی حرکت؟“  
شبانہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔  
ممتاز نے کہا ”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ  
ہمارے ٹھکانے کا سراغ لگانا چاہتے ہوں۔ یہ وہ معلوم کرنا  
چاہتے ہیں کہ ہم کہاں رہتے ہیں۔“  
”یہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے کہا ”خیر دیکھ لیتے  
ہیں ان سراغ رسالوں کو بھی۔“  
شبانہ نے بروائی سے بولی ”مجھے تو اس ایڈو پٹر میں بہت  
مزہ آ رہا ہے لیکن ممتاز خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ اسی  
کے اصرار پر میں اس ریسٹورنٹ کے اندر آئی ہوں۔ یہاں  
سے ہم ڈیڑی کو فون کر کے ان دونوں غنڈوں کے بارے میں

اطلاع دینا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ہماری سائل  
نظر پڑ گئی اور ہم فون کرنے کے بجائے ہمسایہ پاس  
آگئے۔ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کندھے پر ہاتھ  
ہوئے کہا ”دو ایسے اگر انہیں ہمارے بنگلے کا پتہ چل جائے  
وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اس شہر کے ہزاروں لوگ میرے  
ڈیڑی اور ہمارے گھر سے واقف ہیں۔“

میں نے محسوس کیا ”شبانہ خاصی پر اعتماد اور بے پروا  
لڑکی تھی اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ وہ اخبار کے  
مالک اور ایڈیٹر کی بیٹی تھی۔ پریس والوں سے تو ایسے ایسے  
بارسوخ لوگ بھی ڈرتے ہیں۔ اور جن لوگوں سے دوسرے  
ڈرتے ہوں ان میں خود اعتمادی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔  
ممتاز نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں ان موٹر سائیکل  
سوار غنڈوں سے خوف زدہ نہیں ہوں بلکہ احتیاط میں کیا کرتی  
ہے۔ انجوائے کرنے کے لیے زندگی میں اور بہت کچھ دیا  
ہے۔“

میں نے کہا ”اب تم دونوں اس سلسلے میں بالکل بے فکر  
ہو جاؤ۔ میں ان دونوں سے خود ہی منٹ لیتا ہوں۔“  
”تم نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے وجدان! ساحل  
نے پوچھا۔

میں نے بتایا ”ممتاز اور شبانہ معمول کے انداز میں اس  
ریسٹورنٹ سے ٹیکس کی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کھرکی  
جانب روانہ ہو جائیں گی۔“ اتنا کہہ کر میں نے شبانہ کی طرف  
سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا ”آپ لوگوں کو مزہ لگتا  
شاپنگ تو نہیں کرتا؟“ اس نے نفی میں سر ہلائی۔ میں نے بات  
کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”حسب معمول وہ دونوں ان کے  
تعاقب میں لگ جائیں گے اور اگر وہ واقعی ان کا ٹھکانا جانے  
چاہتے ہیں تو انہیں بنگلے کے دروازے تک چھوڑ آئیں  
گے۔“ میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا وقفہ لیا پھر کہا  
”ہوئے! دن ٹو فائیو کے پیچھے ہم اپنی گاڑی لگا دیں گے  
مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے ہم ان کا تعاقب کریں گے۔ جب  
آپ دونوں گھر پہنچ جائیں گی تو میں ان کی ”خیر خیریت“ جان  
شالی طریقے سے پوچھ لوں گا۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔“ شبانہ نے سراہنے والے انداز  
میں کہا ”لیکن وجدان! اس کے لیے ہمیں ہم سے ایک دھڑ  
کرنا ہو گا!“

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ساحل نے  
چوٹے ہوئے لمبے میں پوچھا ”کس قسم کا وعدہ؟“  
وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی ”جب تم ان غنڈوں

پہن کا دودھ یاد دل کر قابغ ہو جاؤ تو سیدھے ہمارے گھر آؤ  
گے۔“ وہ مجھے سے مخاطب تھی۔  
میں نے کہا ”تمہارا بنگلا یہاں سے کتنی دور ہے؟“  
ممتاز بولی ”بیانا نے تمہیں باقرا نکل کے گھر کا ایڈریس  
اور فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔ شاید تم بھول گئے ہو۔“  
”میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔“ میں نے شوخ نظر سے  
ممتاز کی طرف دیکھا۔

ساحل کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے  
جیسے میری وہ شوخ حرکت پسند نہ آئی۔ تاہم وہ بدستور  
ناہوش رہی۔  
شبانہ نے بتایا ”ہمارا بنگلا یہاں نزدیک ہی ہے۔ عبداللہ  
شاہ غازی کے گھر سے جو راستہ ”سی ویو“ کی طرف جاتا ہے  
پہلے اسی راستے پر واقع ہے۔“  
”تم آج کل کہاں ٹھہرتے ہوئے ہو؟“ ممتاز نے مجھ  
سے پوچھا۔

میں نے اسے اپنی اپارٹ منٹس بلازمک کا نام، فلیٹ کا  
نمبر اور فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔ میری اس  
جہات کو ساحل کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ وہ کسی روایتی  
پڑی کی طرح میرے معاملات پر نظر رکھتے ہوئے تھی!  
شبانہ نے پرجوش انداز میں کہا ”تو ایڈیٹر پھر شروع کیا  
ہائے۔“

میں نے اسے ادا کرنا تھا اس لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ممتاز  
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”آپ دونوں نکلو۔ ہم ایک منٹ  
بہرہا رہتے ہیں۔ جب تک آپ ہماری جھلک نہ دیکھ لو  
گاڑی کو آگے نہ بڑھانا۔“

”ٹھیک ہے“ میں سمجھ گئی۔ ”شبانہ نے خراعتا انداز میں  
کہا۔

جب وہ دونوں ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کو پار کر  
گئیں تو ساحل نے گہری سنجیدگی سے کہا ”وجدان! لگتا ہے  
ان کی قسم کی ہنگامہ آرائی کا فیصلہ کر چکے ہوں!“  
”غنڈوں سے بچنے کے لیے نامحانہ بیکھڑوں سے کام  
لے چکا ساحل۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا  
”ہنگامہ پور لوگوں کو قابو کرنے کے لیے ہنگامہ آرائی ہی کی  
ضرورت ہوتی ہے۔“ ایک لمحے کو روک کر میں نے اضافہ کیا  
”میں تو خوش ہوتا چاہیے ساحل۔ قدرت نے تمہیں بہت  
اچھا موقع دیا ہے۔“

”کیا موقع؟“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔  
میں نے کہا ”اپنی محنت کو آزمانے کا موقع۔ تم نے بھی تو

بارشل آرٹس میں خاصی مہارت حاصل کر لی ہے۔ اس فن  
کو کب کام میں لاؤ گی؟“  
وہ اپنی ٹھیکوں کو اختطاری انداز میں کھولنے بند کرنے  
لگی۔ اس کے ساتھ ہی ساحل کے چہرے پر دبا دبا جوش بھی  
نظر آنے لگا۔ مجھے اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر خوشی  
محسوس ہوئی۔

میں نے حتیٰ لمبے میں کہا ”چلو ساحل! وہ دونوں باہر اپنی  
گاڑی میں بیٹھی ہماری جھلک دیکھنے کی خطرہ ہوں گی۔“  
ہم دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے اور بڑے نارمل  
انداز میں چلتے ہوئے اپنی ٹیڑھیں آہستہ میں نے دیکھا  
اس وقت شبانہ کی کمر ٹکڑ ٹکڑا کر حرکت میں آئی اور ایک  
جانب بڑھ گئی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رکھتے ہوئے ہونڈا  
دن ٹو فائیو بھی ان کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ شبانہ  
اپنے بنگلے کی لویشن مجھے بتا چکی تھی اس لیے میں نے ٹیڑھ اور  
دن ٹو فائیو کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا کہ وہ دونوں غنڈے  
اپنے تعاقب کو محسوس نہ کر سکیں۔ اس تعاقب کے دوران  
میں اگر یہ فاصلہ بڑھ بھی جاتا تو میں انہیں بہ آسانی ٹریس کر  
سکتا تھا۔ کیوں کہ یہ تمام راستے اچھی طرح میرے دیکھے  
بھالے ہوئے تھے۔

موٹر سائیکل پر سوار وہ دونوں افراد اپنے طے اور  
صورت ہی سے پہچنے ہوئے بد معاش دکھائی دیتے تھے۔ انہوں  
نے بلو جینز پر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک کی شرٹ گرے  
اور دوسرے کی بلیک تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے ٹو پونا کولا  
کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

ساحل نے مجھ سے پوچھا ”وجدان! ان دونوں کے  
بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ظاہر ہے وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔“  
”یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔“ وہ الجھ کر بولی ”دراصل میں  
یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں، شبانہ کے بنگلے پر پہنچ کر ان کا رویہ کیا  
ہو گا؟“

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لمبے میں کہا ”وہ دو قسم کا  
رویہ ظاہر کر سکتے ہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے  
اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی ”نمبر ایک، وہ اپنی موٹر  
سائیکل کو روکے بغیر آگے نکل جائیں گے اور کسی دوسرے  
راستے سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ ایسا اس صورت  
میں ہو گا، اگر وہ صرف مناس باقرا بنگلا دیکھنا چاہتے ہوں  
گے یا شبانہ اور ممتاز کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے ہوں۔“  
”اور دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟“

”دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ وہ بنگلے سے تھوڑا آگے جا کر واپس لوٹ آئیں۔“ میں نے گھبر انداز میں کہا ”اس صورت میں وہ کسی کارروائی کا پروگرام بھی رکھتے ہوں گے۔ واپس آکر وہ اس بنگلے اور بنگلے کے کینوں کے خلاف کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ ساحل نے بوجھل لہجے میں کہا ”اس کا مطلب ہے کوئی بڑا پھنڈا بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔“

”بالکل ہو سکتا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”انہوں نے خواہ مخواہ صرف منہاس باقر کا گھر دیکھنے کے لیے اتنا کھٹ راگ نہیں پھیلایا ہو گا۔ باقر اس شر کا معروف صحافی، پبلشر اور ایڈیٹر ہے اسے لاکھوں افراد جانتے ہوں گے اور شائد کے بہ قول ہزاروں لوگوں نے ان کا بنگلا بھی دیکھ رکھا ہو گا۔“

ساحل اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولی ”ہمیں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

”وہ تو ہم ہیں۔“ میں نے کہا ”بلکہ میں تو ایور ریڈی قسم کا بندہ ہوں۔ ہر وقت کسی بھی سنگین اور رنگین مسئلے کے لیے بالکل تیار رہتا ہوں۔“

”صرف مسئلے کے لیے یا معاملے کے لیے بھی؟“ وہ پوچھتے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”معاملے“ سے اس کی مراد کو میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کا واضح اشارہ ممتاز کی طرف تھا۔

میں نے مصنوعی سنجیدگی چرسے پر طاری کرتے ہوئے کہا ”بھئی! معاملہ ہو یا مسئلہ! احتیاط اور تیاری میں کیا بااحت ہے محتاط اور تیار آدمی کم سے کم نقصان اٹھاتا ہے بلکہ میرا خیال ہے نقصان اٹھاتا ہی نہیں۔“

وہ نکلی آمیز لہجے میں بولی ”ہاں وجدان! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مسئلے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں، تم معاملے کے سلسلے میں کبھی نقصان نہیں اٹھاتے ہو، بیشہ فائدہ ہی میں رہتے ہو۔“

”میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا ساحل۔“ میں نے بے دست و دونوں ٹوفاؤ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ”ایک معاملے میں تو میں ابھی تک کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ میں جتنا اس معاملے کی طرف دھڑکتا ہوں، وہ اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتا ہے ہم یہ ظاہر ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں لیکن ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ حائل ہے پتا نہیں، میں اپنے معاملے کو کب اور کیسے سودمند بنا سکوں گا۔“

”فلسفہ اچھا بول لیتے ہو۔“ وہ مگرمی سنجیدگی سے بولی ”پوچھنے لگی“ تمہارے اور تمہارے معاملے کے درمیان یہ فاصلہ کس نے حائل کیا ہے؟“

”وقت نے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”وقت تو اسی کا غلام ہے جو اس کی قدر کرتا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں وقت کی تاندی کی کڑا ہوں؟“

”میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی!“

”پھر تمہارا مطلب کیا تھا؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے محسوس کیا اس کے وجود میں بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ اندر ہی اندر رہائے آپ سے الجھ رہی تھی۔ ہم اس وقت جس قسم کی مصم پر پیش قدمی کر رہے تھے اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ ہم اپنی طور پر بالکل پرسکون رہیں تاکہ ہمارے اعصاب اور ہاتھ پاؤں حالات کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں۔

میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ کو سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ ساحل کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بہت بدلتے ہوئے اور خوشگوار لہجے میں کہا ”ساحل! تم نے دیکھا، موسم کتنا حسین ہو رہا ہے لگتا ہے توڑی دیر میں بارش شروع ہو جائے گی۔“

وہ شانت لہجے میں بولی ”ٹھیک کہتے ہو، موسم کے بعد حسین موسم آتا ہے اور پھر بارش بھی ہوتی ہے جس میں دھل کر ہر شے ٹھہر جاتی ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں ساحل کی بات کے جواب میں کہہ سکتا، کرم کلر ٹوٹا کر لایا اس اسٹریٹ میں داخل ہو گئی جہاں منہاس باقر کا بنگلا واقع تھا۔ میں پوری طرح اس طرف متوجہ ہو گیا۔

شائد کی گاڑی اپنے عالی شان بنگلے کے گیٹ پر رکی تو موٹر سائیکل سوار نہایت ہی دھیمی رفتار سے آگے بڑھ گئے انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ معمول کے مطابق وہاں سے گزر رہے ہوں۔ میں اس اسٹریٹ کی ابتدا ہی میں اپنی گاڑی کو روک چکا تھا۔

ساحل نے کہا ”وہ جان! وہ تو آگے نکل گئے!“

”میرا خیال ہے وہ پلٹ کر ضرور آئیں گے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے پرتشوش انداز میں کہا ”گرنے آئے تمہارا تعاقب کا مقصد اور حودا رہ جائے گا۔“

میں نے شائد کی ٹوٹا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ”اس گاڑی کو اندر جانے دو۔ مجھے امید ہے وہ بنگلے کا نمبر وغیرہ زب کرنے کے لیے ضرور ایک پکڑا دھڑکا لگائیں گے اور۔“

میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا ”اگر وہ سیدھے نکل گئے تو ہم ان کے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ اسٹریٹ خاصی طویل ہے میں انہیں نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔“

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ون ٹوفاؤ واپس پلٹ کر تڑپ میری پیش گوئی کے مطابق وہ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند ساعت کے لیے رکے گیٹ کے پہلو میں آدراپاں نیم پلٹ کر بے غور دیکھا اور موٹر سائیکل گھما کر بالکل بائبل انداز میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی ٹیلی فون کو ان کے پیچھے ڈال دیا تاہم اتنا فاصلہ رکھا کہ اسیں تعاقب کا احساس نہ ہو۔

”تمہارے اندازے اتنے درست کیوں ثابت ہوئے؟“

”ساحل! یہ سرسری سے لہجے میں استفسار کیا۔“

میں نے کہا ”کیوں کہ وہ مطلق پوچھتے ہیں۔“

وہ بولی ”اس اندازے میں کیا منطق پوشیدہ تھی؟“

میں سمجھ گیا، وہ مجھے چیمپرنے کے لیے اس قسم کے سوالات کر رہی تھی ورنہ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ موٹر سائیکل سوار اگر ان دونوں کے تعاقب میں تھے تو یقیناً وہ اس وقت تک واپسی کا قصد نہ کرتے جب تک کہ وہ ان کے بچے نکالنے سے انکساری حاصل نہ کر لیتے یا پھر کسی قسم کی کارروائی نہ ڈال دیتے۔ یہ اتنی سنجیدہ اور پوشیدہ بات نہ تھی جو ساحل کی سمجھ میں نہ آسکتے۔ میں جانتا تھا وہ کتنی نا سمجھ تھی!

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”ساحل! میری زندگی کا زیادہ حصہ جرائم پیشہ افراد سے دست و پنہان کر کے گزرا ہے۔ میں ان کی نفسیات پر اٹھتا ہوں ہوتا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔“

اپنی دوران میں موٹر سائیکل ایک دو گلیاں گھوم کر پھر اپنی آخری جگہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سمندر کا یہ منظر ”کسی دیو“ کہلاتا ہے ساحل نے مگرمی سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں یہ دونوں کس کے تعاقب میں ہیں؟“

”میں نے کہا“ زیادہ امکان تو اسی بات کا ہے کہ وہ شائد کا تعاقب کر رہے ہیں ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ممتاز تو چند ملازمتی میاں بچی ہے۔ کراچی میں اس کی کسی سے کیا

دشمنی ہو سکتی ہے۔“ ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد میں نے مزید کہا ”اس سلسلے میں اپنے ذہن کو زیادہ نہ تھکاؤ۔ بلکہ تیلے میں سے باہر آنے ہی والی ہے۔“

”کیس یہ وہی جلی تو نہیں جو بوٹ مین والے واقعے میں انگریز مار کر غائب ہو گئی تھی!“

ساحل نے مزاح کے رنگ میں کہا اور دھیرے دھیرے مسکرا دی۔

اس کی مسکراہٹ سے گاڑی جھکا اٹھی۔ بڑی فورس تھی اس مسکراہٹ میں۔ ایک تازگی اور فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ شاید اس لہجے بھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ غیر معمولی سنجیدہ رہے تھے۔ میں اس کی اس خود اختیاری سنجیدگی سے سخت پریشان تھا۔ خود اختیاری اس لیے کہ رہا ہوں کہ یہ ظاہر اس کا سبب نظر نہیں آتا تھا ورنہ وہ تو ایک چنچل اور شوخ لڑکی تھی۔ ساحل ایک ایسی ساتھی تھی جس کی ہمراہی میں دیرانے میں بھی ہمارا تر آتی تھی۔ اس کی اداسی آمیز سنجیدگی نے میری ہماروں کو خزاں کے سپرد کر رکھا تھا۔

یہ سارے خیالات و احساسات سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ میں نے اس کے جواب میں اسی کا رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے“ یہ وہ جلی نہیں ہوگی۔ وہ سفید تھی یہ کالی ہوگی۔“

ہم موٹر سائیکل والوں کا تعاقب کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے ”کنارہ“ اور ”ڈیلیج“ جب پیچھے رہ گئے تو ساحل نے پرتشوش لہجے میں دریافت کیا ”ان کو کہاں گھیرنے کا ارادہ ہے؟“

”گھیرنے کے لیے مناسب مقام کا آغاز تو ہو چکا ہے۔“ میں نے گاڑی سے باہر اندر سے میں گھورتے ہوئے کہا۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے وہ آگے جا کر کہیں کورنگی کے اریب قریب نکلتی تھی۔ یہ علاقہ تقریباً سنسان ہی تھا اور رات کی تاریکی نے اس کے سنسان پن میں رنج کر اضافہ کیا تھا۔ میں نے اچانک گاڑی کی رفتار بڑھادی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا ”ہم انہیں نہیں گھیریں گے بلکہ یہ دونوں ہمیں گھیریں گے۔“

”کیا مطلب؟“ ساحل کے سوال میں حیرت آمیز الجھن تھی۔

”دیکھتی جاؤ، آگے کیا کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا ”اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو فائنڈا فائی کے لیے تیار کر لو۔ دماغ کو اس لیے کہ ہاتھ پاؤں اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔“

کیوں کہ اب مقابلہ کرتے ہوئے کسی مزے کی توقع کی جائے تھی۔

وہ ابتدا میں کراٹے کی تکنیک آزماتا رہا۔ میں نے اس کے ہر ہاتھ کا جواب دیا۔ اس کی پیش نہ چلتی دیکھ کر اس کا ساتھی بھی میدان میں اتر آیا۔ اسی وقت شیراز کا دواڑہ اٹھا اور ساحل بھی باہر آکر اس ”تماشے“ میں شامل ہو گئی۔ ہمارے درمیان باقاعدہ گروپ فائٹ شروع ہو گئی۔ ساحل نے دراز قامت کو سنبھال لیا اور میں اس کے ساتھی پر ”توجہ“ دینے لگا۔

وہ بھی مارشل آرٹس تھا اور اچھل کھل کر کھڑے ہو کر رہا تھا۔ میں نے دو چار خوفناک ٹکس میں اس کی تکی تمام شدہ کر دی۔ زخمی ہونے کے بعد وہ اچانک کسی بندر کے مانند اچھلنے لگا پھر بندر ہی کی طرح اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا وہ ”مٹکی اسٹائل“ کے مظاہرے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کنگ فو (KUNG-FU) میں مختلف خانوں کے لڑنے کے انداز کو باقاعدہ شکل دے کر طویل انکس سائز پر مشتمل ”قارم“ بنائے گئے ہیں۔ کراٹے میں جو اہمیت ”کاتا“ کی ہے۔ وہی اہمیت کنگ فو میں ”قارم“ کی بھی ہے۔

مٹکی اسٹائل (بندر کا انداز) میں سب سے زیادہ استعمال بچوں اور کندھوں کا کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ مقابلہ کیے اسٹانس سے بھانپ لیا کہ وہ بچوں کا کیا تھا، یہی ناچنگلے اس کے کندھوں کے زاویے میں بھی نظر آئی۔ گویا اس نے باقاعدہ کسی چینی کنگ فو ماسٹر سے وہ اسٹائل نہیں سیکھا تھا بلکہ فلمیں دیکھ دیکھ کر کچھ ریکٹس کر لی ہوگی۔ وہ ایسا موقع اور وقت نہیں تھا کہ میں فائٹ کو طویل دے کر انجوائے کرنا۔

میں نے ”فنی شاٹ“ اور ”سوسپ“ مار مار کر یہ مقابلہ کا مٹکی اسٹائل اس کی ناک کے راستے نکال باہر کیا۔ وہ لڑکھارے سنبھلنے کی کوشش ہی میں تھا کہ میری پریشرنگ نے اس کا ایک کندھا بیکار کر دیا۔

ساحل ڈٹ کر اپنے یہ مقابلہ کا مقابلہ کر رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص ساحل پر بھاری پڑ رہا تھا۔ ایک لپک کر اس جانب بڑھا اور ایک بھرپور سائیڈلنگ دواڑہ قامت شخص کی پشت پر رسید کر دی۔

وہ تھوڑا لڑکھارے اور ڈنگاٹے قدموں سے پیچھے چلا گیا۔ میں نے فضا میں پرواز کی اور میرے پاؤں کا بلڈ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ یہ ایک بھرپور فلائنگ کک تھی۔ وہ تکلیف شدت سے کراہتے ہوئے زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی میں تیز رفتاری سے موٹر سائیکل کو اوور ٹیک کر کے بت آگے نکل گیا جب ہمارے درمیان حائل فاصلہ ایک فلائنگ سے بڑھ گیا تو میں نے نیلی شیراز کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ ساحل کو میں نے پینچر سیٹ پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود گاڑی سے باہر آکر اس کے انجن کے چھڑچھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔

ٹھوڑی ہی دیر میں میری توقع کے عین مطابق ون ٹو فائیو ہمارے پاس آکر رک گئی۔ میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ڈرائیو کرنے والے نے خاصے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا ہو گیا ہے بھائی؟“

”انجن میں کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔“ میں نے کہا ”مگاڑی اچانک بند ہو گئی ہے۔ اشارت ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اگر جنیس انجن کے معاملات سے کچھ واقفیت ہے تو مدد کر دو۔“

وہ دونوں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے نیچے اتر آئے ان میں ایک دراز قامت تھا اور دوسرا متناسب القہ۔ وہ جب شیراز کے نزدیک آئے تو انجن کو فراموش کر کے گاڑی کے اندر دیکھنے لگا۔ ان کی نظریں حیرانہ چمک چمک کر میں نے تاڑ لیا۔ وہ نہایت ہی عامیانہ انداز میں ساحل کو گھور رہے تھے۔ میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے ان سے کہا۔

”بھائی! انجن اس طرف ہے۔“ ساتھ ہی میں نے انجن کی جانب اشارہ بھی کر دیا ”پہلے ذرا اسے دیکھ لو۔“

”مگاڑی کے انجن کو تو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔“ دراز قامت بولا ”پہلے ذرا تمہارے انجن کا معائنہ کر لیں۔“ اس کی بھوکی نگاہ ساحل پر جمی ہوئی تھی۔

اب مزید کسی ڈائلاگ کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کو پتھپتھاتے ہوئے کہا ”حرام زادے! ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔“ میرا انجن تو اس طرف ہے۔“

وہ غصے سے میری جانب پلٹا تو میں نے ایک دھواں دھار بیخ اس کی خبیث صورت پر رسید کر دیا۔ وہ چلا تے ہوئے دو قدم پیچھے گیا اور حیرت آمیز نفرت سے مجھے تنکے لگا۔ شاید میری طرف سے اسے اس قسم کے رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

وہ خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا اور پیتھے بدل بدل کر مجھ پر وار کرنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مارشل آرٹس تھا۔ اس احساس نے مجھے خوشی دی

اسی وقت مجھے عقب میں ساحل کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ ”بندر کاچی“ ساحل کو اپنے خاص فن سے ہر اسان کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک کندھا بیکار ہو جانے کے سبب اس کی اچھل کود کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔

میں نے لپک کر ساحل کی مدد کی اور منگی اشاکل کا مظاہرہ کرنے والے غنڈے پر اسٹیک اشاکل کے دو چار اسٹیک لٹا کر اسے لبا لٹا دیا۔ شاؤ لن نیپیل میں تربیت کے دوران میں ’میں نے دو شو ٹنگ فو (WU-SHU-KUNGFU) کے مروج پانچ قدیم اشاکل بھی سیکھے تھے۔ جن میں ڈرگین، ٹائیگر، لیپارڈ، گرین اور اسٹیک اشاکل شامل ہیں۔ اٹھوا، شیر، پیتا، کونج اور سانپ کے لڑائی کے انداز میں ”جی“ بنیادی کروار ادا کرتی ہے۔

مونژ سائیکل کے اشارت ہونے کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ بندر کے بچے میری ”مصروفیت“ کے دوران میں مجھ سے بری طرح پٹنے والا وہ دراز قامت سنبھل کر مونژ سائیکل پر سوار ہو چکا تھا اور اپنے ساتھی کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ ہونڈا دن ٹو فائیو کے انجن کی خویوں سے واقف افراد جانتے ہیں کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ بڑی بڑی وارداتوں میں فرار کے لیے ”یہ گاڑی“ بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

میں بھگوڑے مونژ سائیکل سوار کے تعاقب کو ڈھن سے جھٹک کر بندر کے بچے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں نے اچھی پنڈلی پر چڑی کیس میں موجود خنجر کو نکالا اور ٹکست خوردہ شخص کے پاس پیش کیا پھر دباؤ سے مشابہہ لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے آٹھ انچ پھل والے ہلاکت خیز خنجر کو بھی لہرایا۔

وہ گھٹیا کرولا ”خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“ ”تمہارا ساتھی نرم دیا کر بھاگ گیا۔“ میں نے خنجر کی نوک کو اس کے گال پر چھبوتے ہوئے کہا ”تم بھی سر پر پاؤں رکھ کر نکل جانا۔ میں تمہیں روکن کا حق توڑا ہی۔ بس جاتے جاتے میرے چند سوالات کے جواب دیتے جاؤ۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ گھٹکت زدہ لہجے میں بولا ”اس قاتل خنجر کو ہٹا لو پلینز تم جو پوچھو گے میں بتاؤں گا۔“

”یہ خنجر تو فی الحال نہیں ہٹ سکتا۔ پہلے تم جی بول کر خود

کو قابل اعتماد ثابت کرو۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ وئی جانے فرار نہ پا کر منمنایا ”پوچھو گیا پوچھتا چاہے ہو؟“

”میں سوال کر چکا ہوں۔“ میں نے خنجر کے دستے پر پکڑ اور دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا ”تم کون ہو اور کس کے لیے کام کرتے ہو؟“

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا ”ہم فری لانسریں۔ جو بھی ہم سے کام لینا چاہے، ہم معقول معاوضے پر اس کا کام کر دیتے ہیں۔“

”فری لانسرا!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ”گیا کراپے کے غنڈے ہو؟“ میں نے غصیلی نظر سے اسے دیکھا۔ ”تم معاوضے پر جو کچھ بھی کرتے ہو، اس میں کون کون سے کام شامل ہیں؟“

”ہر قسم کے کام۔“ اس نے بتایا ”جیب تراشی سے لے کر قتل تک ہر نوعیت کا کام!“

”ماشا اللہ!“ میں نے زہر خند انداز میں کہا ”تمہارا پینڈ نہایت معزز اور قابل فخر ہے۔“

وہ بولا ”کیا کریں۔ پیٹ کا دو نرخ تو کسی نہ کسی طور ہرما ہی پڑتا ہے نا!“

”پیٹ کا دو نرخ بھرنے کے لیے خود کو جتنی کیوں بنا رہے ہو؟“ میں نے خنجر کی نوک سے اس کے گال پر خون کی ایک لکیر کھینچے ہوئے کہا ”اپنی آن سیاہ کاریوں میں مارشل آرٹس کو کیوں بے حرمت کر رہے ہو؟“

وہ تکلیف کی شدت سے ہلکا اٹھا۔ میں نے جیسے اس کے گال میں سرچیں سی بھر دی تھیں۔ وہ ٹکست زدہ لہجے میں متعجب ہوا ”تنت نہ کون ہو؟“

”اگر میں تمہارے سوال کے جواب میں کون تمہارا باپ۔ تو تمہیں قطعاً یقین نہیں آئے گا۔“ میں نے بات کے اختتام پر اس کے دوسرے گال کو بھی رگھیر کر دیا اور سخت لہجے میں بولا ”اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے کوئی سوال نہ کرو۔ اور اچھے بچوں کی طرح شرافت سے میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔“

میرے وحشیانہ انداز و اطوار دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہو گیا اور میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ”نہ پائے رفتن نہ جانے مانن“ جیسی صورت حال میں بڑے سے بڑا پچھنے خاں بھی تعاون پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

زیر دام آئے ہوئے انسان نما اس بندر کے بچے نے بتایا کہ اس کا نام وقار ہے اور جو آدمی فرار ہوا تھا اس کا

عارف تھا۔ وہ دونوں کورنگی کے علاقے میں رہتے تھے اور ”دراز“ پر مختلف قسم کے جرائم کرتے رہتے تھے۔ یہی ان کا روزگار تھا اور وہ اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے۔ اپنے فائدے نقصان پر غمگین نگاہ رکھتے ہوئے وہ یہ وعدہ کر رہے تھے۔

میں نے پوچھا ”تم دونوں کرم کلر ٹیوٹا کرولا کا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟“

ٹیوٹا کرولا کے ذکر پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ میں کس حوالے سے اس کی جان پر غائب بنا ہوا ہوں۔ اس کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ خنجر آواز میں بولا۔

”ہم اس لڑکی کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے تھے۔“ ”کون سی لڑکی؟“ میں نے پوچھا ”ٹیوٹا کرولا میں تو ڈرکیاں تھیں؟“

”دع وہ جو انڈین ہیروئن مدھوری ڈکشت جیسی ہے۔“

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ ممتاز کا ذکر کر رہا تھا۔ ہمارا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا وہ دونوں منہاس یا قریبی بیٹی شبانہ کا تعاقب کر رہے ہیں گے۔

میں نے وقار سے پوچھا ”تم انڈین ہیروئن کی کاپی کا ٹھکانا کیوں معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میرا مطلب ہے، یہ کام تم کسی کے ایما پر کر رہے تھے؟“

مجھے گہری تشویش ہونے لگی تھی کہ کراچی میں ممتاز کا ایسا کون سا دشمن پیدا ہو گیا تھا جو اس کی قیام گاہ کا پتا چلانے کے لیے کراپے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کر رہا تھا۔ ”اصل آدمی سے نہ تو ہم ملے ہیں اور نہ ہی اسے جانتے ہیں۔“

”کس سے یہ ڈیل کس نے کی تھی؟“ ”اس شخص کا نام شاید ہے۔“ اس نے بتایا ”یہ کام اس کے ”صاحب“ کا تھا۔ شاید کا صاحب کوئی بہت بڑا بائس وال ہے۔ شاید اس سیاست دان کے بنگلے پر کام کرنا ہے۔“

”اور اس سیاست دان کا بھلا کہاں ہے؟“ ”وہ حامل نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے غرا کر کہا ”اگر شے پکڑ دینے کی کوشش کی تو اس دنیا سے رو پکڑ کر دوں گا۔“ ”میری آنکھیں گھمبای دے رہی ہیں، تم سیاست دان کے بنگلے کا ایڈریس جانتے ہو بلکہ وہاں جا بھی چکے ہو۔ مجھ سے

جھوٹ بول کر تم اپنی مصیبتوں میں اضافہ کرو گے۔“ وہ فوراً پڑی پر ”گیا“ ”تم جی کہتے ہو، میں ایک مرتبہ عارف کے ساتھ اس بنگلے پر جا چکا ہوں۔ ہم اس ”کام“ کا پائلس چرنے وہاں گئے تھے۔ شاید نے وہاں کے کسی با اختیار شخص سے ملوا کر ہمیں مذکورہ رقم دلوائی تھی۔“ ”تم نے یہ کیس کتنے میں دن کیا تھا؟“

”دس ہزار میں۔“ اس نے بتایا ”پانچ ہزار ہم ایڈریس لے چکے ہیں پانچ ہزار باقی ہیں جو کام کی تکمیل پر ملنا تھے لیکن اب تو لگتا ہے۔“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ماپوسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”ابھی کچھ نہیں بڑا۔ پانچ ہزار کی رقم بھی تمہیں مل جائے گی۔ تم اس سیاست دان کو مدھوری ڈکشت جیسی لڑکی کے بنگلے کا پتا بتاؤ۔ اللہ اللہ خیر ملتا۔“ ”یہ تو میں اس وقت کروں گا جب تم مجھے یہاں سے جانے دو گے۔“

”اگر تم میرے سوالوں کے جواب میں شرافت کا مظاہرہ کرو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کھوں گا۔“ میں نے کہا ”تمہارا ساتھی عارف تو فرار ہو ہی چکا ہے۔ کیا میں تمہارا اچار ڈالوں گا۔“

اس قسم کی حوصلہ افزا باتیں میں اسے پکڑ دینے کے لیے کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا ”اگر تم مجھے یہ غفلت جانے دو تو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ بتا دوں گا جو تم پوچھنا چاہو گے۔“

”یہ اگر مگر شرافت لگانے کی امتحانہ کوشش نہ کرو۔“ میں نے خنجر کی دھار کو اس کی گردن پر ٹکاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ”میری بات کو غور سے سنو اور مجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اگر تم مجھے سب کچھ بچ بتاؤ گے تو اس کے بعد میں تمہیں جانے کی اجازت دوں گا۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا ”اس بنگلے کی لوکیشن اور ایڈریس بتاؤ جہاں وہ سیاست دان رہتا ہے جس کے ایما پر تم لڑکی کی قیام گاہ کا سراغ لگانے نکلے تھے؟“

”وہ بھلا ڈیٹس میں واقع ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے لوکیشن اور ایڈریس بھی پوچھا ہے؟“

لوکیشن کی وضاحت کرنے کے بعد اس نے کہا ”بنگلے کا نمبر بی۔ اڈمیں ہے۔ بنگلے کے بالکل سامنے ایک انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکول ہے۔ بنگلے کے گیٹ کا رنگ سیاہ ہے۔“

اس کی بیان کردہ لوکیشن بہت آسان تھی۔ خاص طور پر اسکول والی نشانی بہت اہم تھی۔ میں نے استفسار کیا۔  
 ”بچکے کے بارہ کوئی نیم پلیٹ بھی لگی ہوگی؟“  
 ”ہاں۔“ اس نے اثبات میں پلکیں جھپکائیں ”نیم پلیٹ پر“ محمود لاثانی“ کا نام لکھا ہوا ہے۔“  
 میں نے محمود لاثانی اور B-38 کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا اور وقار کو گھورتے ہوئے کہا ”اگر تمہاری فراہم کردہ معلومات میں سے کوئی بات بعد میں غلط ثابت ہوئی تو۔“  
 وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹھکایا ”میں اپنے خدا کو حاکم و ناظر جان کر کتا ہوں کہ اب تک میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اسی خدا کا واسطہ دے کر کتا ہوں“ میری جان بکس دو۔“

اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر کچھ جھوٹ بولنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے زرخے سے خنجر نکالیا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”جم جا رہے ہیں۔“ میں نے گاڑی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”تم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ گھر جا کر اپنے ساتھی عارف کو بھی یہ بات سمجھاؤ اور تم دونوں معمول کے مطابق اس سیاست دان تک اس کی مطلوبہ معلومات پہنچا کر اپنے بھائی پانچ ہزار بھی کھرے کرلو۔“

وہ حیران اور دیران نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے بچ بولا ہو گا۔ میں نے گاڑی اشارت کی اور واپسی کے راستے پر ڈال دی۔

جب ہم ”ویسج“ اور ”کنارہ“ کے درمیان تھے تو ساحل نے کہا ”وہ جان! میں نے آج کی فائنٹ میں محسوس کیا ہے کہ ابھی میرا فن کیا ہے۔“

”جو رفتہ رفتہ پک رہا ہے۔“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا ”میں اپنی محنت کے نتائج سے مطمئن ہوں۔ تم نے بہت ڈٹ کر ایک باقاعدہ مارشل آرٹس کا مقابلہ کیا ہے۔“

”میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے سادگی سے پوچھا ”کیا تم اپنا دل کسیں رکھو نا چاہتی ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ”خاموشی سے دغا اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔ اس کی خاموشی میں ایک مضطرب طوفان

چھپا ہوا تھا۔ کبھی وہ پورے سائز سامان سے لیس ہو کر مجھے ”ہراساں“ کرنے پر غور کرت رہتی تھی۔ اب میں اس کی جانب راغب ہوا تو وہ کئی کانٹے لگی تھی۔ بلوت میں اس کی کچھ ٹھیک ٹھاک اور نارل رہتا تھا لیکن علوت میرا کتنی اس کے ناز و انداز ہی بدل جاتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک کنوینس سے دو ہاتھ کے قاصد پر کھڑا ہوں مگر مجھے اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں۔ میں اپنی پیاس بجانے کے لیے دو ہاتھ کا قاصد طے نہیں کر پاتا تھا۔ پیاس کو تو ریم زار کی چٹکتی ہوئی ریت بھی پانی ہی نظر آتی ہے“ میرے سامنے تو ایک جیتا جاگتا محبت کا سا گر ٹھانیں مارنا رہتا ہے جس کے ساحل پر ساحل کا رویہ کسی کوٹ گاڑا گاڑا مارا کر رہا تھا۔

وہ ساحل ہی تھی جس نے میرے دل میں محبت کی ڈپ چٹائی تھی۔ میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔ میں ابتدا میں ساحل کو بھی انہی لڑکیوں میں سمجھ رہا تھا لیکن یہ آتی ضرور رہتی نہیں۔ ساحل میرے اندر ہی کہیں کھو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ ساحل میری زخیم کو کس ڈگری تک پہنچانے کا ارادہ رکھتی تھی؟

ساحل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کے تصور سے حقیقت کی طرف لوٹ آیا۔ وہ پوچھ رہی تھی ”وعدہ پورا نہیں کرو گے؟“

فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا ”کون سا وعدہ؟“ میں نے کہا۔

وہ اپنے لہجے کی شرارت آمیز سنجیدگی کو برقرار رکھے ہوئے بولی ”وہی وعدہ جو تم نے ریسٹورنٹ میں ”ان“ سے کیا تھا!“

میں نے ابھرنے والے نظر سے اسے دیکھا اور اسی وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے واپسی پر منہاس باقر کے گھر آنے کی ہامی بھری تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے گاڑی سے باہر کے منظر کا جائزہ لیا۔ اس وقت ہم عبداللہ شاہ قانڈی کے مزار سے گزر کر پہلی پینڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ساحل نے بروقت مجھے یاد دلایا تھا۔

میں نے گاڑی کو واپسی کے راستے پر موڑنے کے دوران میں کہا ”انسان کو ہر ممکن حد تک وعدہ پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم منہاس باقر کے بچکے پر جا رہے ہیں۔“

وہ ذریعہ خفیف سا مسکرائی مگر زبان سے ایک لفظ

بچکے پر متنازع اور شانہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں مرنے والی افواہ کی طرح ٹھٹھکیا گیا۔ منہاس باقر، متنازع کے باب قاضی سلطان کا گہرا دوست تھا۔ جب میں نئی سرے کراچی کی طرف آ رہا تھا تو قاضی سلطان نے مجھے منہاس باقر کا پتہ اور فون نمبر دیا تھا کہ مجھے کراچی میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن یہ ایک اتفاقی ہی تھا کہ یہاں پہنچنے ہی میں درپے مسائل میں الجھتا چلا گیا اور منہاس باقر سے کوئی پیغام نہ آیا۔ جب کچھ فرصت میری آئی تو میں اس وقت تک ”سی ایف کے“ سے وابستہ ہو چکا تھا اور رہائش و غیرہ کا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

بچکے کی جانب آتے ہوئے میں نے ساحل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے کسی بھی طور سی ایف کے کا ذکر نہ کرے۔ یہ راز صرف ہم دونوں تک محدود رہنا چاہیے۔ سب کو یہی بتایا جائے کہ یہاں مجھے ایک دیرینہ دوست مل گیا تھا اور ہم اسی کے ایک غلیٹ میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ شانہ اور متنازع نے موٹر سائیکل والوں کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے انہیں ”چور اچکے“ کا خطاب دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ دراصل میں متنازع کو کسی قسم کے خوف دہراس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خواہ لڑا ہو یا بھاگتا ہو رہتا ہے۔ البتہ جب مجھے منہاس باقر سے خالی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ یہاں میں نے معلوم کیا یا داندہ کہ کس، تھوڑی کی دھڑکی ماری تھی اور اس سیاست دان کا ذکر گول کر دیا تھا۔ ”تو تمہاری تقریر ایٹ“ میں رہتا تھا۔ پہلے میں اپنے طور پر محمود لاثانی اس شخص کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ منہاس سے میں نے یہی کیا تھا کہ وہ دونوں فٹو اچھی خاصی مار کھانے کے بعد اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور میں ان کا تفصیلی ”ریپورٹ“ نہیں کر سکا۔

منہاس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اپنے دوست کی بیٹی متنازع کی حفاظت کا معقول بندوبست کرے گا۔ اگر اسے گھر سے باہر جانا ہو تو وہ مسلح گارڈ کے ساتھ نکلے گی۔ اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ قاضی سلطان کا کوئی دشمن متنازع کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

میں نے منہاس باقر کو بہت گہرا آدمی پایا۔ وہ اپنے جسم سے اندرونی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ تو ایک پوائنٹ اور پراختیاءات کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور

ہوتا تو موٹر سائیکل والوں کا تعاقب سن کر پریشان ہو جاتا۔ منہاس تشویش میں مبتلا ہوا تھا مگر ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے دو عمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

منہاس باقر ایسا آدمی نہیں تھا کہ بیٹھ کر اس کے ساتھ طویل گپ شپ کی جاتی۔ جب کام کی دو چار باتوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں نے اپنے ذہن میں کھیلانے ہوئے ایک سوال کو اس کے سامنے رکھ دیا۔

”باقر صاحب! آپ تو ماشاء اللہ ایک سینئر صحافی اور ایڈیٹر پبلشر بھی ہیں۔ شہر کے حالات کے بارے میں آپ سے زیادہ باخبر اور کون ہو گا۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں یہ ”منا معلوم و دہشت گرد“ کون لوگ ہوتے ہیں؟“

”بہت ہی نازک سوال کر دیا ہے تم نے!“ وہ ہونٹ ہنچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”اس نازک سوال نے میرے ذہن پر بہت بوجھ ڈال رکھا ہے۔“

وہ اپنی پیشانی کو کھانے کے بعد بولا ”یہ لوگ دراصل کراچی کے قاتل ہوتے ہیں۔ جو ملک دشمن تنظیموں کے آلہ کار کا کردار ادا کرتے ہوئے شہر میں خوف دہراس پھیلاتے ہیں جس سے ہمارا ملک عالمی برادری میں بدنام ہوتا ہے۔“

”ان مذموم سرگرمیوں کا کوئی مقصد تو ہونا ہو گا؟“

”مختلف قسم کی تنظیمیں مختلف نوعیت کے مقاصد رکھتی ہیں۔“ منہاس باقر نے بتایا ”یہ کوئی چھوٹی موٹی تنظیم نہیں ہوتی بلکہ بین الاقوامی اور سرخ کی حال ہوتی ہیں جس کی پشت پناہی سپر طاقتیں کرتی ہیں۔ جب کسی بڑی طاقت کو کسی گنہگار ملک سے کوئی بات منوانا ہوتی ہے۔ تو زبانی کلامی کوشش کے بعد وہ یہ راستہ اختیار کرتی ہے جس ملک کا کرتا دھرتا ان کے عزائم پر صاد نہیں کرتا۔ وہ اس کے ملک میں ایسے واقعات کو جنم دیتے ہیں جس سے حکومت کی تابانی ثابت ہوتی ہے اس کھینچاٹائی میں یا تو وہ ملک بڑی طاقت کے سامنے کھٹے ٹیک دیتا ہے یا پھر اس کی ثابت قدمی اس کے لیے دیال جان بن جاتی ہے۔ پھر وہ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ حکومت عوام کی نظر میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتی ہے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”آج کل اس شہر میں ایک بہت بڑی یہودی قوت سرگرم عمل ہے۔ فائرنگ اور قتل و غارتگری کی یہ دار و امین وہی لوگ کر رہے ہیں۔ اس طرح عوام کے مختلف



طبقوں میں بھی منافرت پھیل رہی ہے۔ نامعلوم افراد کی فائرنگ سے متاثر ہونے والے لوگ اپنے مخالفین کو اس کا ذمے دار قرار دیتے ہیں ایک لمبے کی تاخیر نہیں کرتے یہ شہر اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا پورا ملک پوری دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار کمپنیاں یہاں سرمایہ کاری کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لائیں۔ عجیب و امبیات اور افسوس ناک صورت حال ہے۔

میں نے پوچھا "اس کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہونا چاہیے نا۔ ایسی خرابی غیر ملکی قوتوں کو بے نقاب کرنے کے لیے حکومت کو سخت اقدامات کرنا چاہئیں تاکہ عوام میں اس کی توقیریں اضافہ ہو۔"

منہاس باقر نے کہا "گرچہ حکومت ایسی کوششیں کرتی رہتی ہے لیکن یہ اتنا بھی آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ دراصل پراہم یہ ہے کہ غیر ملکی خود میاں اگر ہمارے سر پر ڈنڈا نہیں مارتے بلکہ ان کے آڈ کار ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ اسی ملک اسی شہر میں رہنے والے مگر غیروں کے ہاتھوں میں کیے ہوئے وہ جس ملک کی فضا میں سانس لیتے ہیں جس زمین کا اگلا ہوا اناج کھاتے ہیں اور جو ملک ان کی شناخت کا باعث ہے وہ اسی کے سینے کو گودنے میں مصروف ہیں۔ اغیار کے اشادوں پر وہ اپنے بہن بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ مسٹر وجدان! ایسے دشمن کو تلاش کرنا آسان نہیں ہونا جو آپ کے خیر خواہوں کی فہرست میں شامل ہو اور خود کو آپ سے زیادہ آپ کے دشمن کا دشمن ظاہر کرتا ہو۔ بہر حال۔" وہ گھبرائے انداز میں بولا "مید ہے" عن قریب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

منہاس باقر کی لائق اور بے پروائی میں ایک گہرا کرب پوشیدہ تھا جو اس کے چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ایسے افراد اندر سے بت دکھی ہوتے ہیں جو کمال ضبط سے دل کے حال کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ممتاز اور شبانہ کا تواصر یہ تھا کہ ہم دونوں بھی رات وہیں "اسی جگہ پر بسر کریں لیکن میں واپس فلیٹ پر آتا چاہتا تھا لہذا انہوں نے میری مرضی کو دیکھتے ہوئے زیادہ ضد نہیں کی اور ہم رات ایک بجے منہاس باقر کے جگہ سے نکل آئے۔ ہماری اپارٹ منٹ بلڈنگ میں انتظامی سہولیات بہت عمدہ تھیں۔ سیکورٹی کا نظام بہت فعال تھا۔ مین گیٹ پر انٹرکام سسٹم موجود تھا۔ کوئی بھی ملاقاتی اپنی مرضی سے منہ اٹھائے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ چوکیدار نما مسلح گاڑ پیلے

متعلقہ فلیٹ سے رابطہ کر کے اس ملاقاتی کے بارے میں تصدیق کرتا پھر اسے داخلے کی اجازت ملتی تھی۔ گویا خاص اقدامات کے حوالے سے وہ آئیڈیل رہائش گاہ تھی۔ فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد جب ہم اپنے بیڈروم میں پہنچے تو وہاں ہمارے لیے حیرت کا سامان موجود تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر گلے ساز بیڈ کی طرف نکلے گئے۔

بیڈ کے عین وسط میں ایک خوبصورت سفید لیٹریں لگی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر نگلی کے آثار تھے۔ وہ بچہ اس انداز میں مجھے گھور رہی تھی جیسے دیر سے گھرانے پر کئی یوٹی اپنے شوہر کو دیکھتی ہے۔

"یہ کہاں سے آگئی وجدان!" ساحل نے اچنبھک نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "کوئی کڑی کھلی رہ گئی ہوگی۔" پھر میں نے کمرے میں چاروں طرف نظرو ڈالی۔ ساحل بولی "اب اس بیدخت کو بھاؤ بھی۔ دیکھو تو کتنی ڈھٹائی ہے تمہیں دیکھ کر جاری ہے۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے بستر سے نیچے اتارنے کا اشارہ کیا۔

"میاؤں۔" بیڈروم میں ایک مخصوص آواز ابھری۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بلی دھیرے سے مسکرائی ہو۔ بے اختیار میں بھی زیر لب مسکرائے لگا۔ اسی وقت اس سفید بلی نے چملا گنگائی اور بستر کے نیچے گھس گئی۔

نہی جہاں کودنے کے بعد وہ ٹھہر سکتی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ کیا وہ بلی آٹھویں فلور سے براہ راست سڑک پر کودی تھی؟

ظاہر یہ ناممکن سی بات نظر آتی تھی۔ میں نے ایک اجنبی قلم میں بلی کے ایسے کلمات دیکھے تھے جو بلند ترین لاروں سے۔ یہ سولت کو کور بہ حفاظت زمین پر پہنچ جاتی تھی مگر وہ قلمی بلی تھی اور ہم جیتی جاگتی زندگی میں سانس لے رہے تھے۔

میں اس حیرت انگیز بلی کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر واپس بیڈروم میں آگیا۔ اس دوران میں ساحل بیڈ کے نزدیک ہی کابینہ پر ایک شیٹ بچھا چکی تھی۔ جب سے اس نے پوگا کی باقاعدہ پیکس شروع کی تھی "سوئے سے قلم وہ ایک دو آسن ضرور لگاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "اس دیکھ لیں بلی کو نکال دیا نا؟"

"ہاں" اب تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ وہ قاتلین پر کچھی ہوئی چادر پر چت لیٹ گئی۔ میں خاموشی سے داش روم میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد جب میں داش روم سے نکلا تو وہ پوگا کا ایک نہایت ہی سفید انداز ابل ان (PLOUGHPOSTURE) لگاے ہوئے تھی۔

میں ساحل کے پوچھ کر طرف سے نظر اکر ستر پر آگیا! شعیب غوری کے دست راست اور ساتھ کے عبوری گران کیر شاہ نے دوپہر کے وقت مجھ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ قاتلین اس کا فون آنے سے پہلے ہی ممتاز کی کال آگئی۔ وہ ٹام میں ہم سے ملنے آنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ عبوری دیر بعد میں اسے فون کروں گا۔ اگر ہمیں شام میں کس جانان ہوا تو مل بیٹھے کا پروگرام رکھ لیں گے۔ دراصل جب تک کیر شاہ سے میری بات نہ ہو جاتی، میں شام یا رات کی کوئی مصروفیت کفرم نہیں کر سکتا تھا۔

آتش فشاں (175) حصہ 6

شعیب غوری آج رات واپس نہیں آئے گا لہذا ہمیں خود ہی اپنے پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ شعیب واپسی پر ہم سے کوئی بڑی خوش خبری سننا چاہتا تھا۔

میں نے کیر شاہ سے پوچھا "تم کسی محمود لاٹانی کو جانتے ہو؟"

"کون محمود لاٹانی؟"

"کوئی سیاست داں ہے۔" وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس کی آسانی کے لیے کہا "یہ محمود لاٹانی وائٹس کے بھلا نمبر "لی ٹھنی ایٹ" میں رہتا ہے۔" پھر میں نے اسے مذکورہ جگہ کی لوکیشن سمجھائی اور کہا "اس جگہ کے سامنے ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول بھی ہے۔"

وہ پھر کھٹک اٹھا "تمہیں اس جگہ کے بارے میں کس نے بتایا ہے؟" "میں کیا ہوا؟" لانا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا "تم محمود لاٹانی سے اپنی ناواقفیت ظاہر کر چکے ہو!" وہ سسکی خیر لےجے میں بولا "وجدان! تم نے جس جگہ کا ذکر کیا ہے، وہی تو ہمارا ٹارگٹ ہے۔ میاں زاہد ہمیں وہیں ملے گا۔"

میں اچھل پڑا "کیا واقعی؟" بے اختیار میزے منہ سے نکلا۔

"ہاں وجدان۔" کیر شاہ تصدیقی لہجے میں بولا "اس جگہ کے سامنے جو پرائیویٹ اسکول ہے وہ ہمارا مورچہ ہوگا۔ میں نے اسکول کے چوکیدار کی مٹھی گرم کر کے اسے اس بات کے لیے آمادہ کر لیا ہے کہ وہ رات بھر کے لیے ہمیں اسکول کی عمارت کو استعمال کرنے دے گا۔ وہ لالچی شخص اس بات پر فوراً تیار ہو گیا ہے۔ ویسے بھی آج کل اسکول کی چھتیاں ہیں اس لیے چوکیدار کو زیادہ پروا نہیں ہوگی۔" "اگر وہ میاں زاہد حسین کا بھلا ہے تو اس کے گیٹ پر محمود لاٹانی کے نام کی نیم پلیٹ کیوں نصب ہے؟" میں نے ابھمن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

کیر شاہ نے بتایا "اب مجھے یاد آیا۔ محمود لاٹانی نامی ایک سیاست داں میاں زاہد کا رشتے دار ہے۔ ممکن ہے میاں زاہد نے کسی مصلحت کی بنا پر اس کی نیم پلیٹ لگا رکھی ہو۔"

"یہ نیم پلیٹ تمہاری نظر سے نہیں گزری تھی؟"

"جی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔" وہ کہنا انداز میں بولا "ہم اس جگہ کو لوکیشن کے اعتبار سے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں نے پوچھا ”تمہارا پاس شعیب غوری تو آ نہیں رہا۔ تم نے رات والے مشن کے بارے میں کیا لائحہ عمل بنایا ہے؟“

وہ بولا ”لائحہ عمل میں نے پاس کے مشورے سے ہی ترتیب دیا ہے۔ تم شام میں ساؤتھ آ جاؤ۔ پھر میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔ ہم رات کے پہلے پہری اس اسکول میں ڈیرا بجا کر بیٹھ جائیں گے۔ میں نے نیلی اسکول وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہم اسکول میں رہتے ہوئے پہلے خاموشی سے ”نلی“ تھنی ایٹ“ والوں کی گھما گھماؤ کا نظارہ کرتے رہیں گے پھر مناسب وقت پر اپنی کارروائی کریں گے۔ تم آ جاؤ تو تفصیلات بات کرتے ہیں۔“

مزید دو چار منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے ریسور کریفل کر دیا۔

ساحل کو میں بتا چکا تھا کہ آج رات دشمنوں پر بہت بھاری ہے۔ احتیازاً روٹی اور میرٹش کے قاتلوں کو اس رات روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں ان کو اس طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ ہمارے ساتھیوں کی دھم بے پناہ سکون محسوس کریں گی اور یہ ساری کارروائی چوں کہ میاں زاہد کے زیر سایہ ہوئی ہے اس لیے میاں جی کی تو میں ایسی کم تسمی کر کے رکھ دوں گا۔

ساحل نے پوچھا ”ابھی تم نے فون پر شعیب کے خاص آدمی کبیر شاہ سے گفتگو کرتے ہوئے محمود لاٹالی اور ”نلی“ تھنی ایٹ“ کا ذکر کیا تھا۔ کیا کچھ معلوم ہوا، ممتاز کا تعاقب کروانے والا یہ سیاست دان محمود لاٹالی کون ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟“

میں نے جواب میں جب ساحل کو یہ بتایا کہ مذکورہ جنگلے میں میاں زاہد حسین کی رہائش ہے جہاں آج رات وہ اپنی کامیابی پر جشن منا رہا ہے تو میری طرح اسے بھی شدید حیرت ہوئی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، ہم سب کے دشمن ایک ہی جھٹ کے نیچے جمع ہیں۔“ پھر اس نے پوچھا ”کیا تم نے کبیر شاہ سے محمود لاٹالی کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟“

”میں نے دانستہ اسے اس حوالے سے زیادہ نہیں کر دیا۔“ میں نے کہا ”جواب میں وہ مجھے بھی کرید سکتا تھا اور میں فی الحال ممتاز کے معاملات اور سی ایف کے کواٹک الگ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”مگر یہ معاملات تو اب یک جا ہو چکے ہیں۔“ وہ خود کلائی کے انداز میں بولی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

”وجدان! یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ میاں زاہد حسین یا اس کا کوئی آدمی ممتاز میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے ان لوگوں کی ممتاز سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”یہ بات غور طلب اور فکر انگیز ہے۔“ میں نے ”خیر“ آج کی رات تمام سوالات کے جواب مہیا کر دے گا۔ سب معلوم ہو جائے گا“ اس جنگلے کے اندر رکن کیا کچھ لپکا رہا ہے!“

پھر ہمارے پورے میان کافی دیر تک حالات حاضرہ پر ٹھکرتی رہی۔ جب میں نے ساحل سے کہا کہ اس مشن میں اسے اپنے ساتھ رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تو خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا اور نہ ہی نہایت ہی سنجیدگی سے بولی۔

”اگر ممتاز میاں آجاتی ہے تو میں رات بھر کے لیے اسے روک لوں گی۔ یہ صورت دیکر تم مجھے مناس باقر کے جنگلے پر چھوڑ دیتا۔“

اس نے کتنی سادگی سے اس مسئلے کا حل پیش کر دیا تھا۔ میں نے حیرت و دلچسپی اور لگاؤ کے طے پلے تاثرات سے اسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ”میرا تو خیال تھا تم ساتھ جانے کی ضد کرو گی!“

اس وقت میں ساحل کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا وہ بڑی مہارت سے نظر چراتے ہوئے بولی ”میں تمہارے ساتھ جانے کی ضد کروں گی تو میری وجہ سے خواہ مخواہ تمہاری جان مصیبت میں پڑ جائے گی۔ میری حفاظت کے خیال سے تم فیض رہو گے میں اپنی ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ اس لیے میں فلیٹ پر ہی رہوں تو زیادہ اچھا ہے۔“

وہ اپنی ذات سے مجھے تکلیف نہ پہنچانے کی بات کر رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا اس کی ذات اب میری ذات میں شامل ہو چکی ہے۔ میں نے کہا ”میں کوشش کروں گا ممتاز رات بھر کے لیے تمہاری پاس رک جائے مگر مجھے امید نہیں ہے“ اس کا انکل مناس باقر اس بات کے لیے تیار ہو خصوصاً تعاقب والے واقعے کے بعد سے وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے ہوں گے۔“

ساحل نے دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولی ”میرا خیال ہے، ممتاز تمہاری بات نہیں مانے گی چاہے اس کے لیے اسے اپنے میزبان انکل کی ناراضی کیوں نہ مول لینا پڑے!“ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا ”وہ اس وقت کس فز

نہیں پر پول رہی تھی۔ ممتاز کی مجھ میں بوجھتی ہوئی دلچسپی میں کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے کل کر اگرچہ اس کی فہمت نہیں کی تھی تاہم اس قسم کے جذبے چھپائے چھپتے چاروں نے زبان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ انسان کا رویہ اور طرز عمل ہر بات کی وضاحت کے لیے کافی ہوتا ہے۔

میں نے اس موضوع کو پھیلانا مناسب نہ سمجھا اور مناس باقر کے جنگلے کے گبر ڈاکٹر کرنے کے لیے فون کی ہاتھ بٹھوڑا پھر اس سے پہلے کہ میں ریسور اٹھاتا فون کٹ گئی تھی۔

میں نے اپنے ”ہیلو“ کے جواب میں ایک مانوس آواز ”وجدان! آئی ایم ریلی سوری۔“ تمہیں کبیر شاہ سے ملے ہو چکا ہو گا“ میں اس مشن میں تمہارے پاس موجود نہیں ہوں۔“

”ہاں کبیر شاہ نے مجھے بتا دیا ہے۔“ شعیب غوری کی عزت کے جواب میں ”میں نے کہا“ تم ٹھیک ٹھاک تو ہو؟“ جس کام سے مارشس گئے تھے وہ ہوا یا نہیں؟ واپسی میں تاخیر ادب کیا ہے؟“

”ایک سانس میں تین سوال!“ شعیب غوری نے ایک لمبی سانس لینے کے بعد کہا ”میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ جس کام سے یہاں آیا تھا وہ ہو گیا۔ واپسی میں تاخیر کا سبب

”آج کا موسم ہے۔ اس اچانک موسمی تبدیلی کی وجہ سے اکثر فائس کینسل کر دی گئی ہیں۔ جو جا بھی رہی ہیں اور وہ اپنے خیرہ وقت سے گنتوں لیٹ ہیں۔ آج کے دن میں کسی فائٹ میں سیٹ نہیں مل سکتی۔ میں انشا اللہ کل رات میں تمہارے پاس ہوں گا کراچی میں۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش

ہوا ہر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”لیکن تم نے آج کی ذات کو ضائع نہیں کرنا۔ میں نے کبیر شاہ کو خصوصی ہدایات دی ہیں۔ ویسے مخالف کیمپ میں موجود میرا بندہ تم ان کی مدد اور راہ نمائی کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہو گا۔ میں نے کبیر شاہ کو فرخ سے کنکٹ کر دیا ہے۔ اپنی

انتہائی بہت بڑی خوشخبری سننا چاہتا ہوں وجدان!“ ”مگر تم نے کبیر شاہ سے اس رات کا ایک ایک لمحہ کیش نہ کیا؟“ میں نے کبیر شاہ کو اس میں کہا۔ مجھے محسوس ہوا ”میرے سانس میں شفا کی آواز آتی تھی۔“ ”تم کل یہاں پہنچ کر خوشخبری سن کر خوشحال بنو گے!“

”تمہارے اس عزم پر اور با اعتماد لمبے نے کیلجے میں نہایت آمادہ ہے۔“ وہ مراہنے والے انداز میں بولا ”یہ تو تم اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہو“ میں تمہیں

سمجھانا اچھا نہیں لگتا لیکن اس لیے مقابلہ رہنے کی ہدایت ضرور کروں گا کہ یہ پاکستان ہے۔ یہاں کی پولیس بے گناہوں سے زیادہ مجرموں کا ساتھ دیتی ہے اس لیے جھوک جھوک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے تم میری بات کو سمجھ گئے ہو گے؟“

”بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”اگر تم نے میاں زاہد کو عبرت ناک انجام دے دو چار کروں تو سمجھ لو تم نے چوہدری نواز علی کی کمر توڑ دی۔ وہ میاں زاہد کی کارکردگی سے بہت خوش ہے۔ اس نے کراچی کے میٹ ورک کو بڑی مشاقی سے کنٹرول کر رکھا ہے۔“

میں نے کہا ”میں عملاً بھی نواز علی کی کمر توڑ کر رکھ دوں گا۔“

”انشا اللہ! ایک دن ایسا ضرور ہو گا۔“ شعیب نے معتدل انداز میں کہا ”میاں زاہد کا خاتمہ چوہدری نواز علی کی ڈم پر پاؤں رکھنے کے مترادف ہے۔ وہ اپنے ایک بہترین اور مفید آدمی کی موت پر چکرا کر رہ جائے گا اور پہلی فرصت میں کراچی کا رخ کرے گا گویا شکار چوہدری شکاری کے پاس آ جائے گا۔“ ایک لمبے کے لیے اس نے توقف کیا پھر نہایت ہی سنجیدہ انداز میں بولا۔

”وجدان! شکار کرنے کے دو بڑے طریقے ہیں۔ نہر ایک شکاری کیل کانٹے سے لیس ہو کر شکار کے تعاقب میں لگ جائے۔ جب شکار دھڑوڑ کر ٹھک جائے رک کر ہانپنے لگے اور گر کر کانپنے لگے تو اسے اپنی مرضی کے مطابق شکار کر لے۔“

نہر دو شکاری ایک مقام پر مناسب بندوبست کے ساتھ شکار کے انتظار میں سکون سے بیٹھ جائے اس کا بندوبست شکار کو مذکورہ مقام تک لے آئے تو وہ شکار کر لے۔ آج رات کا مشن ایسا ہی طریقہ ہے۔ زاہد حسین کا ”بندوبست“ چوہدری نواز علی کو کراچی پر پہنچا دے گا جہاں شکاری پہلے سے گھات لگائے بیٹھا ہو گا۔ میں شکار کا یہ طریقہ اپناتا ہوں۔“

اس کی پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا ”میرے نزدیک یہ تن آسانی اور سہل پسندی ہے۔ مجھے تو شکار کو دوڑا دوڑا کر گرائے میں مزہ آتا ہے۔ میں چوہدری کی آخری سانس تک اس کے تعاقب میں رہوں گا۔ اسے تڑپا تڑپا کر سکا سکا کر مارنے میں مجھے بہت مزہ آئے گا۔ اتنے بڑے شیطان کو یوں آسانی سے گھیر کر شکار کرنا اس کے شایان شان نہیں شعیب!“

”یہ یوش و جدان۔“ شعیب غوری نے کشادہ دلی سے کہا ”میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دوش یو گند لک۔“

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

میں نے اگلے ہی لمحے منہاس باقر کے بنگلے کا نمبر لایا اور تھوڑی دیر بعد ممتاز لائن پر آگئی۔ میں نے کہا ”ٹھیک ہے ممتاز، تم شام سے تھوڑا پہلے آ جاؤ اور کوکوش کو کہہ دو کہ آج کی رات ہمارے پاس رک جاؤ۔“

”تو تم کیا سمجھ رہے ہو؟ میں دو چار گھنٹوں کی گپ شپ کے لیے آ رہی ہوں!“ وہ اٹھلا کر بولی۔ اس کے لیے سے مسرت پھولی پڑ رہی تھی۔ ”میں نے اکل باقر سے اجازت لے لی ہے۔ آج کی رات میں تمہارے فلیٹ پر ہی گزار دوں گی۔ وہ میری حفاظت کی طرف سے خاصے فکر مند ہیں لیکن میری ضد کے سامنے انہوں نے زیادہ مخالفت نہیں کی۔ وہ تمہارے اس کارنامے سے بہ خوبی آگاہ ہیں جب تم نے مجھے خطرناک ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑا کر بابا کے پاس پہنچایا تھا۔“

ممتاز کی بے باکی اور خود اعتمادی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میرے بارے میں اس کا رویہ فکر انگیز تھا۔ بدھوری وکٹ سے مشابہہ وہ لڑکی اپنے انداز سے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کئی سر میں ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا رویہ بھی بڑی معنی تھا۔ وہ مجھے ہر خوردار کی طرح نہٹ کرنا تھا اور ہر لمحے ششخص و مہمان نظر آتا تھا۔

چاہت ایک ایسا جذبہ ہے جو پہلی نگاہ ہی میں نظر میں آ جاتا ہے۔ ممتاز کے جذبات کو مجھ سے زیادہ ساحل نے محسوس کیا تھا جیسے کسی گھر کا پہرے دار اس گھر کے کیتوں سے پہلے کسی بیوی خطرے کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ ساحل کسی چوکیدار سے کم نہیں تھی!

ممتاز میری معیت میں رات گزارنے آ رہی تھی۔ وہ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی میری یہ رات دشمنوں کی میت کے ساتھ گزرنے والی تھی!

\*\*\*

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں اس وقت کیر شاہ کے ساتھ انگلش میڈیم اسکول کی بالائی منزل پر تھا۔ یہاں سے ہم ٹیلی اسکوپ کی مدد سے میاں زاہد کے بنگلے کی ممکنہ حد تک تفصیلات دیکھ سکتے تھے۔ میں اپنی ٹیلی شیڈ ساؤتھ میں بیٹھ چھوڑ آیا تھا اور یہاں تک ہم دونوں طاقتور انجنوں والی دو موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر

پہنچے تھے جو اس وقت زیریں منزل پر اسکول کے احاطے پر گھڑی تھیں۔ کیر شاہ نے لالچی چوکیدار کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ ایک رات کے لیے وہاں سے غیر حاضر رہنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس دو کھانا شگوفہ ایک ایک پتھول اور میری پینڈی پر موجود وہ خیر بھی شامل تھا جو امتیاز کے قاتلوں کے خون کا پیا تھا۔

ہم نے ٹیلی اسکوپ کو ایک ایسی گھڑی میں سیٹ کیا تھا کہ باہر سے یا سامنے والے بنگلے سے ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم ہم سب کو بڑی وضاحت سے دیکھ رہے تھے۔ اس اسکول میں ٹیلی فون بھی تھا جو زیریں منزل پر آس میں رکھا تھا۔ کیر شاہ نے اس کا تار دھکا کر اسے بالائی منزل پر پہنچا دیا تھا تاکہ کسی قسم کی ہنگامی صورت حال میں اندرونی ملک کے لیے ساؤتھ سے رابطہ کیا جاسکے۔ میں نے اسکول میں آنے کے بعد اپنے فلیٹ پر فون کر کے ممتاز اور ساحل کی خیر خیریت دریافت کرنی تھی اور ساحل کو اس ٹیلی فون کا نمبر بھی لکھوا دیا تھا تاکہ کسی ایمر جنسی میں وہ مجھے اطلاع دے سکے۔

اب تک سامنے والے بنگلے میں میں نے جن لوگوں کی آمد و شد دیکھی تھی ان میں میرے کام کے صرف تین ہی افراد تھے۔ اول یہ تہ قامت میاں زاہد حسین جس کی بھول چھوٹی آنکھوں سے مکاری اور سفاکی چلتی تھی۔ دوم یعقوب عرف قویا جس کی ملکیت گھرے پجارد والوں نے میرے ساتھیوں پر فائزنگ کر کے انہیں مجھ سے چھین لیا تھا اور سوم شاکر علی جو وہیل چیئر پر تھا۔ گرین بیٹھ والے بنگلے پر ڈبہ ماہ پہلے مرحوم امتیاز علی نے ایک پلاکٹ ماب خیرت اس کے قدموں میں ”زنجیریں“ ڈال دی تھیں۔

ان تینوں شیطانوں کے لیے میرے دل و دماغ میں وہ درجہ نفرت اور غصہ بھرا ہوا تھا اور آج ان تینوں کو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہونا تھا۔

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ کیر شاہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”جدان! میں نے دوپہر میں فون تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ اب میں اسی سوال کو دہرا رہا ہوں کیوں کہ تم نے جواب نہیں دیا تھا۔“

میں ٹیلی اسکوپ کی مدد سے سامنے والے بنگلے کا بابا دیکھ لیتے ہوئے کیر شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جدان! تمہیں اس بنگلے کا اندازہ نہیں کس نے بتا دیا؟“ میری معلومات کے مطابق بابا نے تمہیں اس بابے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”تمہاری معلومات درست ہیں کیر شاہ۔“ میں نے بنگلے کی جانب متوجہ رہتے ہوئے کہا ”در اصل بات یہ ہے کہ کل رات دو غنڈے میری ایک ساتھی کا تعاقب کر رہے تھے۔ میں نے انہیں گھر کر جب مرمت کی تو ان میں سے ایک نے پانچا کر وہ محمود لائی کے ایما پر تعاقب کر رہے تھے جو بیٹھن سرائی کے بنگلے نمبر ”بی۔ ٹھری ایٹ“ میں رہتا ہے۔ اسی والے سے میں نے تم سے محمود لائی کا پوچھا تھا۔“

”میں وہ کوئی اور ساتھی تھی۔“ میں نے بتایا۔ کیر شاہ نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہمارے درمیان چند لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں میں بدستور بنگلے کے احاطے، پھلوں اور گیٹ کے سامنے والے تمام مناظر کو باریک بینی سے واپس کر رہا تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص ٹیلی اسکوپ سے استفادہ کر سکتا تھا لہذا کیر شاہ کلا شگوفہ کے میز پر سڑکی پینٹنگ میں مصروف تھا۔

میری اس دور بینی (ٹیلی اسکوپ) ناک جھانک میں اہانک ایک گاڑی نے تھمک ڈال دیا۔ وہ لمبی چوڑی چمچاتی گاڑی بڑے اشکال سے سیاہ گیٹ کے سامنے آ کر رکی تھی۔ ہراس سے پہلے کہ چوکیدار اس کے لیے بنگلے کا گیٹ کھولا گاڑی کی پیچڑ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی بیٹھ گئیں۔ میں اس دروازہ قامت شخص کو پہلی نظر میں پہچان گیا۔ وہ تارا تھا!

”یہ شیطان یہاں کیسے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

کیر شاہ نے چونکتے ہوئے لمحے میں پوچھا ”کس شیطان نہات کر رہے ہو؟“

میں کیر شاہ کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیوں کہ باہر کے منظر میں سنسنی خیزی اتنی بڑھ چکی تھی کہ میں جیسے گنگ نہ کر رہا تھا۔ گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں سے دو سونڈ ڈیڑ افراد برآمد ہوئے اور ان کے چہروں پر نگاہ دینے ہی میں ان میں پیچھے بائیں کی بھولی بیسیوں میں پہنچ گیا۔ میری دھڑکنے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ میں نے ان دونوں میں سے ایک ٹھیک پہچان لیا تھا لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ وہ ہزاروں میل دور یہاں کراچی میں کیسے پہنچے تھے۔ اسی وقت مجھے اپنے کندھے پر دباؤ محسوس ہوا۔ اس

کے ساتھ ہی کیر شاہ کی آواز میری سماعت میں داخل ہوئی ”گتا ہے،“ میاں زاہد کے غیر ملکی مہمان آگئے ہیں!“

میرے ہاتھ میں تو ٹیلی اسکوپ تھی۔ میں گاڑی کی ذکی سے برآمد ہونے والے سوٹ کیسوں کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا جن پر لگے سنگا پورا اڑلائن کے ٹیک پتا رہے تھے کہ وہ دونوں سنگا پور سے پاکستان آئے تھے ”نگر وہ۔“ وہ تو سنگا پور کی سیل میں تھے!“

یہ جملہ بڑوانے والے انداز میں میرے ہونٹوں سے جدا ہوا تھا اور اس بڑواہٹ میں تشویش ناک حیرت شامل تھی۔

”تم نے پہلے کسی شیطان کا ذکر کیا اور اب سنگا پور کی کسی جیل کا تذکرہ کر رہے ہو۔“ مجھے اپنی پست پر کیر شاہ کی آواز سنائی دی ”جدان! یہ کیا قصہ ہے؟“

تارا کو کراچی میں دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی تھی لیکن اس سے ”ممتاز کے تعاقب“ والا معاملہ صاف ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تارا ہی نے ممتاز کا سراغ لگانے کے لیے وہ حرکت کی ہوگی کیوں کہ ممتاز کی مضبوط گواہی پر تارا اور دوسرا اکبر سومو کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ تارا عمر کوٹ پولیس

(ایک اقبال کے سرے)

**انجمن موسیقی**

یہ کتاب موسیقی کی نگاہ سے، موسیقی کا قصہ ہے،  
یہ موسیقی کی تہذیب بھی ہے، تعارف بھی۔ اس کی سادگی اسے  
موسیقی پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔  
(دہانہ پروردگی) (سلاطین صحت) (طبیقات کا) (مستطاب)

قیمت 1800 روپے + ڈاک خرچ 250 روپے

اس ڈیسک کی مدد سے ان کیسوں کی طرف  
”میں ہر روز پڑھتا ہوں“

**موسیقی کی نگاہ سے**

موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک  
مختصر و مفید اعلیٰ طرز کی ایک کتاب پیسے کی  
شائع نہیں ہوئی۔

کتاب کی قیمت پینسے

فون: 5802552-5895313 گیس: 5802551  
Email: kitabiat1970@yahoo.com

کی تحویل میں تھا اور وہ دونوں سنگاپور کی جیل میں۔ میں نے سنگاپور میں انسپکٹر جیٹنگ شو کی مدد سے دارا کے سنڈیکیٹ کو یہ دہلا کر دیا تھا۔ دارا تو اس آپریشن میں ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن اس کے سنڈیکیٹ کے تین عہدے داروں کو جیٹنگ شو نے چھاپ لیا۔ ایک پوریشن عہدے دار پولیس مقابلے میں مارا گیا جب کہ انڈین بھولا ناتھ اور پاکستانی جمال کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ بھولا ناتھ کے قبضے سے دس گلوہروں پر آمہ ہوئی تھی۔ جمال، اس سنڈیکیٹ کے روح رواں دارا کا فرسٹ کزن تھا۔ یہ دونوں سزا پر جیل چلے گئے تھے۔ یہ تمام خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزر گئے۔

اس انجھی ہوئی صورت حال کو میں خود کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کبیر شاہ کو اس بارے میں کیا بتاتا۔ اس سے پہلے کہ کبیر شاہ دوبارہ اس سلسلے میں استفسار کرتا، فون کی فکشنیج اٹھی۔ کبیر نے لپک کر ریسور اٹھا لیا۔

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے کہا ”وجدان! اتھارے لے کال ہے۔“

میں نے یہاں کا فون نمبر صرف ساحل اور ممتاز کو دیا تھا۔ یہ انہی کی کال ہو سکتی تھی۔ اچھے ہوئے ذہن اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں نیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔ نیلی اسکوپ میں نے کبیر شاہ کو تھما دی۔

”ہیلو۔“ میں نے ریسور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔  
دوسری طرف سے ساحل بولی ”وجدان! لائٹ چلی گئی ہے۔“

”اس میں ایسی پریشانی کی کون سی بات ہے۔“ میں نے اس کے لہجے میں موجود گھبراہٹ کے پیش نظر فکر ”بلڈنگ میں اسٹینڈیٹ جریئر موجود ہے۔ وہ اسے آن کریں گے۔“ وہ تشویش ناک انداز میں بولی ”پورے فلیٹ میں اندھیرے کا راج ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے سلائڈنگ ڈور کے پاس جا کر تھمیں فون کیا ہے۔“

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم ممتاز کی مدد سے دونوں کمروں کے سلائڈنگ ڈور کھول دو۔ اس کے علاوہ کچن میں جا کر چوہا بھی آن کر دو۔ کچھ نہ کچھ اجالا ہو ہی جائے گا۔“

”ٹھیک ہے،“ میں کچن میں جا رہی ہوں۔ ”وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولی ”تم ممتاز سے بات کر لو۔ یہ خاصی سستی ہوئی ہے۔ اس پورے علاقے کی لائٹ ایک ساتھ چلی گئی ہے شاید کوئی ٹیکنیکل فالت پیدا ہو گیا ہے۔“

ساحل کا جملہ ختم ہوا تو ممتاز کی آواز میرے کان میں پہنچی ”وجدان! یا تم کی بہت ہی اہم کام میں مصروف رہ جلدی سے یہاں نہیں آ سکتے؟“

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ریسور میں ساحل کی جی ابھری۔ میں نے تڑپ کر ممتاز سے پوچھا ”کیا ہوا؟“  
”دو۔ دو۔“ اس کی آواز میں بے پناہ خوف شامل ہو گیا۔

میں نے کہا ”وہ سے آگے بھی تو کچھ بولو۔ ساحل کیوں جیجی تھی؟“

ممتاز نے بے مشکل اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے بولا ”وجدان! فلیٹ میں ایک۔ سفید چیتا۔ کس کیا ہے۔“  
”کچن میں۔ ساحل بھی کچن۔“

اس کے بعد ممتاز کی آواز معدوم ہو گئی۔ میں پہلی ذہنی طور پر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ ایک نئی افتاد آن پڑی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں نے جیج کر ریسور میں کہا۔

”تم یہ کیا بکواس کر رہی ہو ممتاز۔ کوئی سفید چیتا فلیٹ میں کیسے آ سکتا ہے؟“

دوسری جانب خاموشی رہی۔ مکمل خاموشی۔  
میری دشتہ جنون کی شکل اختیار کر گئی ”تم بولی کیوں نہیں ہو۔ میری بات کا جواب دو۔ بیلو ممتاز! تم میری بات نہ کر رہی ہو؟“

”ہیلو۔ ہیلو۔ ہیلو۔“ میری اس ”ہیلو ہیلو“ کی تکرار کے جواب میں جو تراز ایرپس میں ابھری اسے سن کر میں بیسے میں نہا گیا۔ کچن کا سارا خون دماغ کو چڑھ کر کپٹینوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ یہی ساعت کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ میرے کان نے یہی مخصوص گونج وار لفظ سنا تھا۔ ”مباداؤں۔“

میرے تصور میں وہ غیر معمولی جسامت کی سفید پٹو مٹی جس کی برقی جست نے کلا مشکوف ہوا روکے بس کر دیا تھا۔

میں آخری کو شش کے طور پر حلق کی پوری قوت سے چلایا ”متناہ۔ ساحل۔ تم تک میری آواز پہنچ رہی ہو؟“  
تم لوگ خاموش کیوں ہو؟“  
میرے اس سوال کا جواب کون دیتا۔ نیلی فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔

میں اس وقت ایک دورا رہے پر کھڑا تھا!  
وہ دورا ہوا جو ہینکنگ گارڈن ایسے عجوبے کی مانند ہوا تھا۔ اس کے نیچے الگ کا دریا بہہ رہا تھا جس میں اب کپڑا اترتا پڑتا ہے۔ اس دورا پہ کی ایک طرف بہے جانی دشمن تھے جنہیں سنگین اتفاق نے یک جا کر دیا۔ دوسری جانب ساحل اور ممتاز تھیں۔ میں انہیں کوئی ٹیڈ نہ دیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری ان چاہنے والیوں کا ایک ایک افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ انہیں فوری طور پر اس غیبت سے نکالنا ضروری تھا کیوں کہ ان کی پتا حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھی۔ اور دشمنوں پر قربان کرنا مل ہونے کا مرنی موقع بھی بار بار ہاتھ نہیں آتا، میں ہاتھ آئے اس موقع کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا انہیں صفحہ ہستی سے مٹانا اتنی ہی اہم تھا جتنا کہ ساحل لینا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میں ادھر اور ادھر کے بیچ لگا رہا پھر ایک بڑے عزم نتیجے پر پہنچ گیا۔ میرے قدم مضبوطی سے زمین پر آگئے تھے۔ میں نے اپنے فلیٹ کی طرف جانے کا بیلا کیا تھا۔ جان لینے سے جان بچانا زیادہ اہم ہوتا ہے۔

اسی لمحے میرے عقب میں کبیر شاہ کی آواز ابھری۔ وہ لٹے فون پر چیخے ہوئے سن چکا تھا۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا ”کیا ہوا وجدان، تم اس قدر چلا کیوں رہے ہو۔ فریٹ تو ہے نا، کس کا فون تھا؟“

”ساحل کا فون تھا۔“ میں اس وقت تک ذہنی طور پر مکمل چکا تھا ”وہاں فلیٹ میں لائٹ چلی گئی ہے۔ وہ دوسری فون کھرا کر اٹھ بیٹھی اور پریشانی میں مجھے فون کر ڈالا۔“

وہ شک آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تمہاری بولکھانی ہوئی تنگدو میں کسی سفید چیتے کا ذکر بھی آیا فون پر کیا سلسلہ ہے وجدان؟“

کبیر شاہ کا شک اور تشویش بھی تھی لیکن میں بھی ایسے سوالوں کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے تحمل انداز میں کہا ”ٹھانی بتایا تو ہے، ساحل سو رہی تھی۔ اس نے خواب میں رک سفید چیتے کو فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس جراثیم میں اس کی آنکھ کھلی تو لائٹ جا چکی تھی۔ اس نے کھانا اٹھائی کوئی درندہ فلیٹ میں کھس آیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”یہ لڑکیاں بہت ہی جذباتی اور ڈرپوک ہوتی ہیں۔“ وہ فون سے مطمئن ہوتے ہوئے بولا پھر پوچھا ”کیا اب ساحل ازل ہو چکی ہے؟“

مکان سے اندرونی کیفیات کو چرے سے ظاہر نہیں ہونے

دیا اور فنی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا ”نہیں شاہجی! وہ سخت خوف زدہ ہے مجھے جانا ہوگا۔“

”کہاں جانا ہوگا؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”فلیٹ پر۔“ میں نے قطعیت سے کہا ”میں بس آنا جانا ہی کروں گا۔ تم فکر نہ کرو، میں جلدی لوٹ آؤں گا۔“

وہ بولا ”تم نے تو بتایا تھا، کوئی اور لڑکی بھی وہاں فلیٹ پر موجود ہے؟“

”ہاں، ہے تو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”مگر وہ بھی ساحل کی طرح ایک لڑکی ہے اور تم تو جانتے ہو۔ لڑکیاں کتنی ڈرپوک ہوتی ہیں!“

میں نے کبیر شاہ کے الفاظ اسی پر لوٹا دیے تو وہ قطعی انداز میں سر ہلانے کے بعد گویا ہوا ”تو کیا تم ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آ رہے ہو؟“

”یہ رسک تو میں کسی قیمت پر نہیں لے سکتا شاہجی۔“ کبیر شاہ کو عام طور پر ”شاہجی“ کہا جاتا تھا اس لیے میں نے بھی یہی انداز مخاطب اختیار کیا ”یہ اسکول اور وہ سامنے والا بنگلہ کسی بھی وقت میدان جنگ کا نقشہ پیش کر سکتے ہیں۔“

”پھر؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”میں انہیں کہیں اور چھوڑ کر آؤں گا۔ یہ بھی ممکن ہے، ساحل کی ساسھی کے گھر ہی پہنچاؤں۔“

میں نہیں جانتا تھا وہاں فلیٹ پر پہنچ کر مجھے کس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑے گا۔ میں تو کبیر شاہ کے اطمینان کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو سکوں۔ میں فی الحال کبیر شاہ کو کھل کر کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کہا ”تم چاہو تو انہیں ساؤتھ بھی چھوڑ کر آ سکتے ہو!“

”دیکھتا ہوں۔“ میں نے بہم انداز میں کہا ”جو بھی مناسب ہوگا، کروں گا۔“

آنکھ دو منٹ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے میری موٹر سائیکل فلیٹ کی سمت اڑی جا رہی تھی۔ اس وقت میرا ذہن صرف ایک ہی شے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ شے بھی سفید پٹو۔ اس لمبی کی انٹری اوپن ایئر سٹورٹ سے ہوئی تھی۔ وہ میرے قدموں کا مزاج پوچھ کر کھٹک گئی تھی پھر قدرے بڑی جسامت کے ساتھ بوٹ بینس والے واقعے میں اس نے ہماری مدد کی۔ ازاں بعد گزشتہ رات وہ ہمارے بیڈ روم میں بھی پائی گئی تھی مگر جب میں نے اسے کھدیرا تو وہ کچن کی کھڑکی کے راستے نیچے کود گئی تھی۔ مجھے

اس کی "کود" پر شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔ آٹھواں فلور اچھی خاصی بلند پر تھا۔ بلی کا وہاں سے چلا گیا لگنا خاصا خطرناک تھا جب کہ وہ کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آتی تھی۔ کھڑکی سے نیچے سڑک تک اس کے "قیام" کے لیے کوئی "مقام" بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور اب۔۔۔ فلیٹ میں کبھی سفید چیتے کی آمد۔۔۔ اور وہ بھی کچن کی کھڑکی کے راستے؟ یہ ایک عجیب و غریب مقام تھا۔ چیتا۔۔۔ اور وہ بھی سفید! سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ شہر کے انتہائی پوش اور محفوظ حصے میں جنگلی درندے کا کیا کام! پھر میں نے آج تک سفید چیتے کے بارے میں کہیں سنا تھا اور نہ دیکھا تھا۔ انہی سوچوں میں اچھٹے ہوئے میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز سوال نے سر اُبھار دیا۔

"کہیں یہ سارے روپ ایک ہی بلی کے تو نہیں! وہ موقع اور وقت کی مناسبت سے اپنی جسامت میں کمی بیشی کر لیتی ہو؟"

اس خیال کے ساتھ ہی میرے روٹکنے کھڑے ہو گئے۔ یہ ظاہر ایسا ہوتا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی بلی اپنی جسامت میں تبدیلی پر کیسے قادر ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ حقیقت تھی پھر وہ بہت ہی پراسرار بلی تھی۔ پتا نہیں، وہ بلی تھی بھی یا نہیں!

ڈرائیونگ کے دوران میں وہ عجوبہ روزگار بلی میرے تصور میں سائی رہی۔ کبھی تو نوازیدہ بلوٹکے کی شکل اختیار کر لیتی اور کبھی اس کی جسامت اس قدر بڑھ جاتی کہ غرائی، دہانہ چیتا دکھائی دیتی۔ میں انیس پر اگندہ خیالات کے ساتھ اپارٹمنٹس بلڈنگ تک پہنچ گیا۔

وہ بلڈنگ اور گرد و نواح کا سارا علاقہ روشن تھا۔ یعنی لائٹ آگئی تھی۔ میں نے سیکورٹی گارڈ کے سلام کا جواب دیا اور اس سے کسی قسم کا انتشار کیے بغیر لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچ گیا۔ ڈور بیل کے جواب میں ممتاز نے دروازہ کھولا۔

اس کا چہرہ خوف اور تشویش کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے پھونسنے پر پوچھا "کیا ہوا تھا؟"

"اندروں تو آجائے سب بجاتی ہوں۔" وہ اضطرابی انداز میں بولی۔

میں نے فلیٹ کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور ممتاز کے ساتھ چلتے ہوئے استفسار کیا "ساحل کہاں ہے۔۔۔ اور وہ جیتا ہے؟"

میری بات ختم ہونے تک ہم بیڈروم میں پہنچ گئے۔

ساحل بیڈروم دروازہ تھی اور اس کی سنجیدگی پہلے سے ہزاروں بڑھ چکی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی۔ ساحل کی اس سنجیدگی میں خوف کے بجائے متانت تھی جس نے اس کی کمرانی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے جب ان سے سفید چیتے کے حوالے سے پوچھنا شروع کیا تو انہوں نے باری باری مجھے اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ساحل نے بیچ میں کہیں کہیں گریں لگائی تھیں ورنہ زیادہ تر باتیں ممتاز کی زبانی مجھ تک پہنچیں۔

ان کے مطابق وہ دونوں ٹی وی کے سامنے بیٹھی کوئی دلچسپ ٹیم شو دیکھ رہی تھیں کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ اس پورے علاقے کی لائٹ غائب ہو گئی تھی اس لیے فلیٹ کے اندر گھب اندھیرے نے ڈیرا جما لیا۔ اسٹینڈ بائی جزیئر کی سہولت کے باعث چون کہ اطمینان تھا اس لیے ہم نے فلیٹ کے اندر کسی ایمرجنسی لائٹ کا بندوبست بھی نہیں کیا تھا۔

فلیٹ کے باہر لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ جزیئر میں کوئی فالت ہو گیا ہے چنانچہ ساحل نے فوراً مجھے فون کر دیا اور جب وہ میرے شور سے پر چلنا جلائے کچن کی طرف لی تو اسی وقت کچن کی کھڑکی میں سے ایک سفید چیتا جست بھر کر اندر گھس آیا تھا جسے دیکھ کر ساحل کی جھجک گئی اور شدید خوف کے باعث ممتاز کو سانپ سو بگھ گیا۔ وہ میرے لمبی نوک

سوالات کے جوابات نہ دے سکی۔

ان کی فراہم کردہ معلومات سے میری تشفی نہ ہوئی۔ میں نے ممتاز سے پوچھا "تم فون چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟" میری آمد کے بعد اس کا خوف نہ ہونے کے برابر رہا تھا۔ وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے جیسے ہی اس چیتے کو ساحل کی طرف دیکھتے دیکھا تو میرے اعصاب مفلوج ہو رہ گئے۔ میں تمہارے سوالات کے جواب میں بھی کچھ نہ بول سکی۔ مجھ پر پستے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "اس سفید چیتے نے تم میں سے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

دونوں نے باری باری نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "وہ چیتا اب کہاں ہے؟"

اس سوال سے پہلے میں نے فلیٹ کے کونے کونے میں اچھی طرح جھانک لیا تھا۔ وہ دھمکے ہوئے لہجے میں بولی "شاید تمہیں ہماری بات کا یقین نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے چیتے کو دیکھ کر بے ساختہ جھجکا تو اس نے فوراً بعد لائٹ آگئی اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ فلیٹ

میں ہوتی ہی سب کچھ معمول پر تھا۔ میں نے محتاط قدموں سے بیڈروم میں آکر دیکھا۔ ممتاز کا یقین پر خوف زدگی کے عالم میں بیڈروم میں تھی۔ مجھے صحیح سالم دیکھ کر اس کی جان میں جان بیکار ہو کر کے ہر کمرے میں جا کر دیکھ لیا مگر وہ خوں

ڈار جاتو رہیں کہیں نظر نہیں آیا۔

ساحل مجھ سے جھوٹ بول سکتی تھی اور نہ ہی فیکٹس میں کٹش کی آمیزش کر سکتی تھی اس نے جو کچھ دیکھا اور کہیں کیا وہی بیان کر رہی تھی۔ سفید چیتے کی آمد اور شدہ راقی حیرت ناک اور ناقابل یقین تھی۔ میں نے ممتاز کی بات متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم دونوں ٹی وی دیکھ رہی تھیں تو فلیٹ کا داخلی دروازہ بند تھا؟"

یہ سوال میں نے اس امکان کے پیش نظر کیا تھا کہ اگر دروازہ کھلا تھا تو چیتا وہاں سے "زخمت" ہو سکتا تھا اگرچہ مجھے اس امکان کی قطعی کوئی امید نہیں تھی۔

ممتاز نے جواب دیا "مجھے اچھی طرح یاد ہے تمہارے ہاتھ ہی ہم نے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا تھا۔ یہ بات ہم اتنے وقت سے اس لیے بھی کہہ رہے ہوں کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے چیتا دروازے سے باہر نہیں گیا۔" میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔

ساحل کبھی انداز میں بولی "ممکن ہے وہ کچن کی کھڑکی ٹائمن سے واپس چلا گیا ہو!"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "جیسے ہلکی گزشتہ رات اس کھڑکی سے باہر کود گئی تھی۔"

ساحل نے جو کچھ کر مجھے دیکھا اور پشیمانی سہلاتے ہوئے بولی "وہ جان! مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس سفید چیتے کی نمائی ہی کی طرح تھی۔"

میں ساحل کی بات کو یہ سوچ کر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ ٹی وی اور چیتے کی صورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور میں نے ٹی وی فون پر اپنے کان سے ایک مخصوص قسم کی گونج "سپاؤن" سنی تھی۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ اس واقعے میں بہت سارے پراسرار

ہوال بھی شامل تھے میں نے ہندوستان سے خیال اور خیال سے ہمالیہ کی گود تک سفر کے دوران میں سفلی اور علوی طوائفوں کے اتنے کمالات دیکھے تھے کہ میری نگاہ میں بہت سے اسراروں سے پردے اٹھ گئے تھے۔ یوگی گوتم بھوش اور

اس کا چیلنا پنڈت دھیراج داسے تخلیق کرنے کے ماہر تھے۔ وہ اپنی پراسرار شکلیتوں سے مجھرا عقول واقعات کو جنم دیتے تھے۔ گوہر کی عبادت گاہ میں کیا کیا عظیم میری نظر سے گزرا تھا۔ ٹکٹو فیلے کی سروانی کاشی! اندھا راہ منا ٹوبان اور ہمالیہ کی سرخسختی ٹیلنگی میری چشم تصور میں گھوم گئے۔

ٹیلنگی کی لمبائی خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں اپنے اس اندرونی اضطراب کو فوری طور پر کوئی نام نہ نہ سکا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میرا یہ عمل میکا کی تھا۔ ساحل نے جو کچھ کر پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو وجدان؟"

"میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

"کیا تم فلیٹ سے باہر جانا چاہتے ہو؟" ممتاز نے سوال کیا۔

"ہاں میں ڈرائیونگ گارڈ کے پاس جا رہا ہوں۔"

ساحل نے کہا "سیکیورٹی گارڈ سے تو یہاں بیٹھے بیٹھے بھی بات ہو سکتی ہے۔ فلیٹ میں انٹرکام سسٹم موجود ہے۔"

"ہاں" قسم کی موجودگی میرے علم میں ہے۔ میں نے سرسری انداز میں کہا "میں گھوم پھر کر کچھ اور بھی دیکھنا چاہتا ہوں، محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارے غیاب میں اگر دوبارہ لائٹ چلی گئی تو؟"

ممتاز نے سرا سمد لہجے میں پوچھا۔

"اب لائٹ نہیں جائے گی۔" میرے لہجے میں ہلکی سی سختی اور یقین تھا۔

ممتاز نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

میں نے ایک نظر ساحل کی طرف دیکھا اور فلیٹ سے باہر گیا۔

میں مختلف فلورز پر لفٹ سے باہر نکلتا رہا، سوار ہوتا رہا پھر ایک چکر کار پارکنگ کا لگایا اور کوشش کی وہاں سے گزروں جہاں دوچار افراد کھڑے ہوں۔ یہ ساری مشقت میں اس لیے کر رہا تھا کہ اگر واقعی اس بلڈنگ میں کوئی سفید چیتا گھس آیا تھا تو کیا کسی اور نے بھی اسے دیکھا تھا! چیتے کی آمد پر جو افراد تعزیری اور کھلبلی بننا چاہے تھے مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ "چیتے کی کمائی" میرے فلیٹ کے اندر سے شروع ہو کر اندر ہی ختم ہو گئی تھی۔ بلڈنگ کی "میر" کے بعد میں سیکورٹی گارڈ کی طرف چلا گیا اور اس سے جزیئر کے فالت سے متعلق پوچھا۔

"صاحب! مشین تو پھر مشین ہے نا۔" وہ فلسفیانہ انداز

میں بولا "اور الیکٹریکل مشین تو کچھ زیادہ ہی ناقابل اعتبار ہوتی ہے حالانکہ میں روزانہ اسے چیک کرتا ہوں۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا!" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے معذرت خواہانہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا "بھراجل" میں نے دو تین منٹ میں اس کا نقص ٹھیک کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ جزیرو کو آن کیا جاتا "لائٹ آگئی۔ یہ مشکل دس منٹ تک بلڈنگ میں اندھیرا رہا ہو گا۔"

میں اپنی فٹیش مکمل کر کے واپس فلیٹ میں آیا۔ ممتاز نے پوچھا "کچھ پتا چلا اس درندے کے بارے میں؟"

"اس بلڈنگ میں تم دونوں کے سوا کسی تیسرے شخص نے کوئی درندہ نہیں دیکھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کیوں کہ چیتا نامی کوئی جنگلی حیات نہ تو بلڈنگ میں داخل ہوتی ہے اور نہ ہی یہاں سے رخصت ہوتی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں ممتاز۔" مگر میں نے خود میرا مطلب ہے تم دونوں نے اپنی آنکھوں سے ایک جیسے جاتے سفید جیسے کو دیکھا ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو سائل سے۔"

"مجھے تمہاری بات کا صد فی صد یقین ہے ممتاز۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم دونوں نے جو کچھ بتایا ہے وہ غلط نہیں لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔"

"وجدان! یہ کیسے ممکن ہے؟" ممتاز کی الجھن بڑھ گئی۔ اس کے بالکل سائل کا چہرہ مسکون تھا تاہم وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ممتاز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"انسانی آنکھ بعض اوقات دھوکا کھا جاتی ہے۔ وہ ہم کو حقیقت سمجھ لیتی ہے تم لوگوں کے ساتھ بھی دھوکا ہوا ہے۔ تم جس شے کو سفید چیتا سمجھ رہی ہو وہ چیتا نہیں کچھ اور تھا۔"

"کچھ اور تھا۔ کچھ اور کیا؟" ممتاز کی الجھن اضطراب میں بدل گئی۔

سائل نے سمجھانے والے انداز میں کہا "ممتاز! تم اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالو اور فی الحال اس "جیسے" کی سوچ کو جھٹک دو۔ یہ پراسرار چکر تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

سائل کی بات سے مجھے زیادہ لگنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس معاملے کی بہ میں اتر چکی تھی۔ میں نے ممتاز سے کہا "کل میں نے ریسٹورنٹ میں تم سے ایک وعدہ کیا تھا واپس میں تمہارے انکل کے بنگلے پر آنے کا۔ آج تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"وعدے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ سادگی سے بولی "جو کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے کل رات والا وعدہ تم نے شانہ سے کیا تھا۔"

"بہ ظاہر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "لیکن درحقیقت وہ وعدہ میں نے تمہاری وجہ سے کیا تھا۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی "یہ تو اور بھی! اچھی بات ہے۔ اگر تم نے میری خاطر شانہ سے وعدہ کیا تھا تو پھر میں آنکھیں بند کر کے تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔ پولو کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں نے ممتاز کو خوف و وحشت کی کیفیت سے نکالنے کے لیے وہ وعدے کا پکر چلایا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا میمبے کو شش خاصی حد تک کامیاب رہی تھی۔ وہ اب نازل انداز میں بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا "ممتاز! اس فلیٹ میں جو کچھ ہوا اسے ذہن سے جھٹک دو۔ جیتے والی حیرت انگیز کہانی صرف اور صرف تم تک محدود رہے گی۔ تم اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کرنا گی، خصوصاً اپنے اخباری انکل (منہاس باقر) کے سامنے میں تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے منہاس باقر کا تذکرہ خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ وہ ایک شام کے اخبار کے ایڈیٹر و پبلشر تھے شام کے اخبارات، چپٹی اور مسالے دار خبروں کے حوالے سے بہت مشہور ہیں۔ معمولی سی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور بعض اوقات بے بنیاد خبریں شائع کرنا ان کے معمول میں شامل ہوتا ہے۔ اگر منہاس باقر تک سفید جیسے کی کہانی سنی تو وہ فوری طور پر میرے کندھوں کو استعمال میں لے آئے اس مرج مسالے والی خبر سے خواہ مخواہ ہماری تشویر ہوئی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس بارش میں بلڈنگ میں ممتاز اور سائل کے سوا کسی اور شخص نے اس طوفانی جیسے کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے حوالے سے یہ سائل اور سائل کے بیان کے ساتھ ایسی کوئی ناقابل یقین خبر اخبارات کی رشتہ بنی تو اس بلڈنگ میں ہماری خاصی متاثر ہوئی۔ لوگ تسخیرانہ نظروں سے ہمیں دیکھ

کر دیتے ہو اور دو نمبر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ممتاز نے میری تاکید کے جواب میں کہا "ٹھیک ہے۔" کہانی صرف میرے ذہن کے اندر محفوظ رہے گی۔ وعدہ کرنا مجھ میں مجھے اس سفید جیسے کی حقیقت سے آگاہ کر دے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے جواز انداز میں کہا "مجھے یقین ہے تمہارے پاس اس کی ہر پرور و توجہ موجود ہے!"

اس کے لیے میں شامل اعتماد کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے سامنے اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کی ہائی بھرلی کہا "اب تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

دوایر گیر کلاک کی سوئیاں نصف شب گزرنے کا اعلان رہی تھیں۔ سائل نے مجھ سے پوچھا "کیا تم واپس جانے لڑا رہے ہو؟"

"ہاں" میں جس کام سے گیا تھا وہ ابھی مکمل نہیں ہے۔ میں نے دیکھے چھے الفاظ میں کہا کہ سائل میری بات نہ جانے۔

وہ اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولی "تم تو ممتاز کو بھی فوراً اپنے کو کہہ رہے ہو۔ کیا یہ بھی تمہارے ساتھ جانے لڑا رہے ہو؟"

"تم دونوں میرے ساتھ چلو گی۔" میں نے کہا "میں منہاس باقر کے بنگلے پر چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف نکلتا ہوں گا۔"

ممتاز نے کہا "اگر تم یہیں ہمارے پاس رک جاتے تو بہت اچھا۔ کیا تمہارا اپنے ان دوستوں کے پاس جانا بہت اچھا ہے؟"

"بہت ضروری۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "پھر تو نکلتی ہے۔"

ممتاز لباس تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں گئی تو میں سائل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے پُرسوج انداز میں "وجدان! مجھے تو لگتا ہے تمہارے ساتھ پھر کوئی پراسرار شے ہوئے ہوئے والا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے یہ پکر شروع ہو چکا ہے۔" میں نے دو ٹوک جواب دیتے ہوئے کہا "تمہارے ساتھ پھر کوئی پراسرار شے ہوئے ہوئے والا ہے۔"

"ممتاز! دو ٹوک جواب دیتے ہوئے اس نے کہا "مجھے یقین ہے" وہ پوچھا "تمہارے سوا کسی اور کو دکھائی نہیں دیا ہو گا۔ اس

لسلے میں میرا ذہن بار بار اسی کم بخت کی طرف جا رہا ہے۔ وجدان! وہ کوئی عام سی کمی نہیں تھی۔"

"تم بھی بالکل میرے ہی انداز میں سوچ رہی ہو۔" میں نے تائیدی لیے میں کہا "مگر یہ سب پھر اسی کمی کا چلایا ہوا ہے تو پھر ماننا ہو گا وہ کوئی طوفانی جانور ہے۔ وہ یہ وقت ضرورت اپنی حجامت میں کمی پیش کرنے پر قادر ہے لیکن اس کا رویہ مجھے الجھا رہا ہے۔"

"مثلاً تمہارے ذہن میں کس قسم کی الجھن ہے؟"

میں نے کہا "بوت بین والے واقعے میں اس نے ایک دوست کا کردار ادا کیا تھا اور اب اس نے تم دونوں کو خوف زدہ کر کے ثابت کیا ہے کہ اس کا انداز معاندانہ ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحتی لیے میں کہا "ہمارے سارے اندازے اور قیاسات کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ سارے کردار ایک ہی حیرت انگیزی نے ادا کیے ہوں۔"

وہ جھرمجی لیتے ہوئے بولی "وجدان! اس منے کو جلد از جلد حل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اپنے اندر بہت اضطراب اور بے کفیی محسوس کر رہی ہوں۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "بہت جلد سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ پہلے میں وہ کام نمٹاؤں جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ آج کی رات بہت اہم ہے سائل! بہت اہم! تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو" میاں زاہد حسین کے بنگلے پر کیسے کیسے "پیس" اکٹھا ہو چکے ہیں۔"

"لاڈ بڑھا تمہاری حفاظت کرے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

اسی وقت ممتاز واش روم سے نکل آئی۔ اگلے پانچ منٹ میں ہم تینوں اپارٹ منٹ بلڈنگ سے باہر تھے۔ میری نیلی شیزو ساڑھ میں کھڑی تھی۔ یہاں میں موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ چائنا ٹاؤن کے کارنر سے میں نے ان دونوں کو ایک پلیٹ کب میں بٹھایا اور خود موٹر سائیکل پر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جب ہم بنگلے پر پہنچے تو منہاس باقر وہاں موجود تھا۔ میں نے راستے میں اس اچانک "آد" کا جواز سوچ لیا تھا۔ باقر کے استفسار پر میں نے بتایا "انکل! ادھر تو لائٹ چلی گئی اور جزیئر خراب پڑا ہے۔ یہ دونوں بہت بورت محسوس کر رہی تھیں۔ بجلی کی واپسی کا انتظار کرنے کے بجائے میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" وہ معتدل انداز میں بولا



اس نے پہل کر دی۔

ساحل نے دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو تھام کر تھوڑا نیچے جھکا یا پھر یکبارگی اپنے احسری ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔ اس کی یہ حرکت میکانیکی اور غیر متوقع تھی۔ وہ عمل کے طور پر میں نے اسے اپنی ہانپوں کے حصار میں باندھ لیا۔ میرے سینے میں اس کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ اس سرکش سمندر کی بے تاب لہریں ساحل سے ہم کنار ہونے لگیں، اس کے سینے پر سرخ کر اپنے دل کا انداز سناتے لگیں۔

ساحل اور موجوں کا طن بڑا لمحاتی اور عارضی ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہہ کر واپس سمندر میں جا ملتی ہیں۔ مجھے بھی ساحل سے جدا ہونا پڑا۔ میں نے اس کے بوسے کی گھنٹی شہرٹی کو اپنے تن بدن میں اتارا، اسے ایک بھروسہ والا فی نظر سے دیکھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اس بنگلے سے اس طرح نکلا تھا جیسے جسم سے جان نکلتی ہے۔

\*\*\*

انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکول میں آمد و شد کے لیے ہم عمارت کا عقبی گیٹ استعمال کر رہے تھے۔ اسکول کے سامنے وہ بنگلا تھا جہاں اچانک میرے کئی دشمن جمع ہو گئے تھے لہذا ان سے شافی نماز کے لیے احتیاط کی ضرورت تھی۔ جب میں کیر شاہ کے پاس پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے چھوٹی سی پوچھا۔

”شاہ جی! کیا خبریں ہیں؟“

”میں تو ابھی تک سب خیریت ہے، سوائے ایک تبدیلیوں کے“ اس نے کہا ”تم سناؤ، ادھر کی کیا رہی؟ تم جلدی افرا تفری میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے؟“

میں نے کہا ”وہی جو میرا اندازہ تھا۔ ساحل نے خواب میں ایک چیتے کو فلیٹ میں گھس کر اودھم مچانے کی کوشش کی تھی۔ بہر حال میں ان دونوں کو اپنے ایک کمرے کے کمرے میں چھوڑ آیا ہوں“ پھر میں نے اس سے پوچھا ”تم نے یہاں ہونے والی ایک دو تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے؟“

”جدا ان! تم نے کسی شیطان کی آمد کا ذکر کیا تھا؟“ کیر شاہ نے بتایا ”وہ شیطان اس بنگلے سے رخصت ہو چکا ہے۔ میں چونک اٹھا۔ کیر شاہ تارا کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک ننھی گاڑی میں تارا اور دو غیر ملکی مسلمان بھولتا تھا۔ وہاں ان بنگلے پر پہنچے تھے۔ میں خود ان کی آمد پر سخت حیرت زدہ رہا تھا۔ تارا عمر کوٹ پولیس کی تحویل میں تھا اور سبکدوش ہوا۔

”لائٹ سخت ناقابل اعتبار چیز ہو کر رہ گئی ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ لکڑی ایوارڈ منس بلڈنگ والوں کے اسٹینڈ بائی چیز بھی ایسے مواقع پر اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔ خیر تمہارا فیصلہ مجھے پسند آیا۔ تم لوگ یہاں آرام سے رہو گے۔“

منہاس باقر مختصر اور ٹوپی پوائنٹ بات کرنے کا عادی تھا اس لیے اس سے زیادہ دیر گفتگو ممکن نہیں تھی ویسے بھی میں اپنے پیچھے جو صورتِ حالات چھوڑ آیا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ منہاس باقر کے بنگلے سے نکلنے سے قبل مجھے چند لمحات کے لیے ساحل سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔

وہ موجودہ حالات کی گھنٹی سے پوری طرح آگاہ تھی۔ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی ”اپنا خیال رکھنا وجدان!“

اس کی انتہائی گہری سنجیدگی میں مجھے ہوئے جذبات کو میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ جذبات میرے لیے تھے اور اتنے بھرپور تھے کہ اس کا گریز اور بے اعتنائی بالکل معنوی ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور فو معنی انداز میں کہا۔

”گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اب تم میرا خیال نہیں رکھو گی؟“

اس کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے وہ اندر سے تڑپ کر رہ گئی ہو پھر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی ”مم میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ظاہر ہے، تم وہاں اکیلے جا رہے ہو۔ تمہیں خود ہی اپنا خیال رکھنا ہو گا۔“

”میں تمہیں اس آگ میں نہیں جھونک سکتا ساحل!“ میں نے چٹائی لہجے میں کہا ”وہاں کچھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں تم پر آج آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں محفوظ ہو، یہ خیال مجھے بہت تقویت دے گا اور پوری حاضر دماغی سے میں اپنے دشمنوں سے نمٹ سکوں گا۔“

”لارڈ ہا تمہاری حفاظت کرے گا“ وہ یہ کہتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھ آئی۔

ہمارے درمیان فاصلہ صفر کے برابر ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی تپش اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ بہت ہی جذباتی اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہم دونوں ہی سنجیدہ تھے اور ہماری سنجیدگی میں طلب کی تڑپ موجود تھی۔ میں کسی پیش رفت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ

وہ دونوں افراد جیل میں تھے۔ اچانک ان تین افراد کو ایک ساتھ یہاں کراچی میں دیکھنا انتہائی پرستش اور حیران کن تھا اور اب کبیر شاہ مجھے بتا رہا تھا کہ تارا وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ تارا کو دیکھ کر میرے منہ سے "شیطان" کا لفظ ادا ہوا تھا اسی لیے کبیر شاہ بھی اسے شیطان ہی کہہ رہا تھا۔

کبیر شاہ کے انکشاف نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا "کہاں چلا گیا وہ شیطان؟" "یہ جانتا توئی الحال میرے لیے ممکن نہیں وجدان؟" "کیا وہ اکیلا ہی گیا ہے یا غیر ملکی مہمان بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے ہیں؟" میں نے تیرے لہجے میں استفسار کیا اور ٹیلی اسکوپ سے سیاہ گیت والے بنگلے کا جائزہ لینے لگا۔

کبیر شاہ نے بتایا "وہ اکیلا گیا ہے اور نہ ہی غیر ملکی مہمان اس کے ہمراہ گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ابھن زدہ انداز میں پوچھا۔

کبیر شاہ بولا "وہ شیطان، نام کیا ہے اس شخص کا؟" "تارا" میں نے بتایا۔

"ہاں تارا کے ساتھ ایک نوجوان بھی یہاں سے گیا ہے" وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ "اور وہ دونوں لگ بھگ آدھا گھنٹا پہلے ایک سیاہ لینڈ کروزر میں یہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گاڑی میں ڈرائیور بھی تھا۔"

میں نے مذکورہ نوجوان کا طہر دریافت کیا۔ کبیر شاہ کے جواب پر میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا مگر اس وضع قطع کا کوئی شخص مجھے یاد نہ آسکا۔ میں نے پوچھا "اور ان سنگاپورین مہمانوں کی کیا خبر ہے جو تارا کے ساتھ گاڑی میں یہاں بیٹھے تھے؟"

"وہ جب سے بنگلے میں گئے ہیں، ان کی جھلک دکھائی نہیں دی۔"

میں اس نوجوان کے بارے میں سوچنے لگا جو تارا کے ساتھ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر گیا تھا۔ اسی سوچ کے دوران میں مجھے شیعہ غوری کے اس آدمی کا خیال آگیا جو مخالف کیمپ میں ہمارے لیے کام کر رہا تھا۔ فرخ خان نامی وہ شخص سامنے والے بنگلے میں موجود تھا۔

میں نے کبیر شاہ سے پوچھا "فرخ کی جانب سے کیا اطلاعات ہیں؟"

"تمہارے جانے کے بعد اس کا فون آیا تھا" کبیر شاہ نے بتایا "اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے میں میاں زاہد حسین، شاکر علی، قویا، دو سنگاپورین مہمان کے علاوہ دو گھریلو ملازم اور دو سیکورٹی گارڈز موجود ہیں۔"

ازیں علاوہ تین ایسی عورتیں بھی بنگلے میں ملائی تھیں جو فرم کی معروف کال گرلز ہیں۔ یہ رات وہ بنگلے پر ہی گزارا کریں گی۔ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ وہ تینوں رات بھر کس کس مصروفیات میں مشغول رہیں گی۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ میں ٹیلی اسکوپ کو ہاتھ میں تھامے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، فرخ کا فون تارا اینڈ کمپنی کی روانگی کے بعد آیا تھا کیونکہ اس بیان میں ان لوگوں کا کوئی ذکر نہیں!"

"ہاں، ان کے روانہ ہونے کے فوراً بعد۔" اس نے تصدیق کی۔

"دو بار وہ کب کال کرے گا؟"

"اب وہ کال نہیں کرے گا، کبیر شاہ نے بتایا "پہلے ہی اس نے بت بڑا رسک لے کر وہ معلومات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے، جیسے ہی بنگلے کی صورت حال ہماری "کارروائی" کے لیے "سازگار" ہوئی، وہ ہمیں اس طرح فون کرے گا کہ اس پہلی گفتنی بیچتے ہی رابطہ منقطع کر دے گا۔ یہ اس کی طرف سے ایک سگنل ہوگا۔ اس کے بعد ہمیں فوراً حرکت میں آنا ہوگا۔"

رات دو بجے تک ہمارے درمیان بات چیت ہوئی رہی۔ کبیر شاہ نے شیعہ غوری کے لیے بت سے کاروائی سرانجام دیے تھے۔ وہ مجھ سے بھی مختلف سوالات کر رہا تھا جن کے میں مناسب اور محتاط جواب دیتا رہا۔ اسی دوران میں فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ ہم دونوں نے چونک کر ٹیلی فون سیٹ کی جانب دیکھا۔

ایک گفتنی کے بعد فون خاموش ہو گیا۔ ہمارے عمل میں آنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ آئندہ پانچ منٹ میں ہم اسکول کی عمارت سے نکل کر سیاہ گیت والے بنگلے کے عقب میں آجائے گئے۔ اس طرف رات کے سنانے کا راج تھا۔ ہمارے درمیان میں طے ہوا تھا کہ عقبی دیوار عمارت کے کمرے کے اندر داخل ہوں گے اور سب سے پہلے سیکورٹی گارڈز کے پایا جائے گا۔ اس کے بعد گھریلو ملازموں کی باری آئی۔ ہم اپنی موٹر سائیکل کو عقبی دیوار کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا کیا اور یکے بعد دیگرے بنگلے کے اندر کودے۔ تیرے اسلئے اور دشمنوں کو ہم نے بڑی خوبصورتی سے تیر کر لیا تھا۔ امتیاز، رولی اور میر بخش کی موت کی ذمہ داری گمرے پچا کو مالک یعقوب عرف قویا وہاں موجود تھی۔

میں نے قویا اور میاں زاہد حسین کو اپنے حصے میں لے لیا جبکہ ناکر علی، جمال اور بھولا ہاتھ سے کبیر شاہ کو غنٹا تھا۔ اسلئے میں سے ایک کلاشکوف اور پستول ہم نے موٹر سائیکل پر ہی چھوڑ دیے تھے جو ایک کینوس کے تھیلے میں محفوظ تھے۔ یہ ہمارا ریزرو ایمونیشن تھا جو ابھی کسی ہنگامی صورت حال میں ہمارے کام آتا۔ ٹیلی اسکوپ کو کبھی میں نے تھیلے میں ڈال دیا۔ باقی اسلئے میں سے ایک کلاشکوف کبیر شاہ نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیا جبکہ ایک ہاسٹل میں نے اپنے لباس میں محفوظ کر لیا تھا۔ ازیں علاوہ، امتیاز اینڈ کمپنی کے قاتلوں کے خون کا پھانسا خنجر میری پنڈلی پر بندھا تھا جو کسی بھی وقت تڑپ کر اپنے چڑی کیس سے باہر آسکتا تھا۔

ہم نے بنگلے کی باؤنڈری کے اندر آتے ہی سب سے پہلے ٹیلی فون کے تار تلاش کر کے انہیں "معذور" بنادیا۔ اب اس بنگلے کے اندر سے کہیں فون کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی باہر سے کوئی کال وہاں آسکتی تھی۔ اس نیک کام سے فارغ ہو کر ہم سیکورٹی گارڈز کی جانب متوجہ ہو گئے۔

دونوں سیکورٹی گارڈز بنگلے کے سامنے والے حصے میں گیت کے نزدیک ہی بیٹے ہوئے گاڑی روم میں تھے۔ میں نے ایک گیلے کے قریب ہی پڑے ہوئے پتھر کو اٹھایا اور بنگلے کے گیت کا نشانہ لے کر اسے اپنے ہاتھ سے "روانہ" کر دیا۔

چھریزادہ بڑا نہیں تھا تاہم اس نے گیت کی فولادی چادر سے ٹکرائی اتنی آواز ضرور پیدا کر دی کہ دونوں سیکورٹی گارڈز چونک گئے۔ وہ محتاط نظروں سے گیت کو دیکھنے لگے پھر ان میں سے ایک نے اس جانب اندھیرے میں دیکھا جس طرف ہم موجود تھے۔ اسی وقت میں نے اپنے منہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔

اس آواز پر دوسرا گارڈ بھی ہماری جانب متوجہ ہو گیا پھر انہوں نے مجھے لہجے میں آہیں میں کوئی بات کی۔ گیت پر چونکے ہوئے بھری تھی اس لیے ہم اندھیرے کی آڑ سے انہیں ہلکا سا آواز دیکھ رہے تھے۔

غصہ کی باہمی مشاورت کے بعد ایک گارڈ بے باؤں انداز میں جواب بڑھنے لگا۔ گویا اس نے ہمارا مقصد پورا کرنے کے لیے جس قدر تدبیر شروع کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گھاسے ساز کی کلاشکوف بہت واضح دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے کبیر شاہ کے کان کے پاس سرگوشی کی "یہ میرا شکار ہے۔"

مرد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں ہمدرد گارڈ محتاط قدموں اور چوکنا نگاہ سے آگے

بڑھ رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں 'دو دیواروں کے ایک کونے کی آؤ میسر تھی۔ جیسے ہی وہ گارڈ مجھ سے دو فٹ کی دوری پر پہنچا، میں نے اچھل کر اس پر حملہ کر دیا۔

میرا یہ عمل اتنا برق رفتاری تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جب دیر میں وہ کچھ سوچنے لگنے کے قابل ہوا، میں اسے اپنے گھٹنے میں پوری طرح فٹ کر چکا تھا۔

میرا بیباں بازو کسی ڈھیر پرے ٹاگ کے مانند اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ سے میں نے اس کا کلاشکوف برادر بازو جکڑ لیا تھا۔ میں نے اس فوری حملے کے بعد گارڈ کو کھینچ کر دیوار کی آؤ میں کر لیا۔

گارڈ کے بدن میں کسی سانپ کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ خود کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے زور مارنے لگا لیکن میں نے اس خیال سے اسے نہیں دوہوا تھا کہ وہ کچھ مچھلی کی طرح پھسل کر میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس سانپ سے انٹھیلیوں کا وقت نہیں تھا لہذا میں نے اپنے بائیں بازو کو ایک مخصوص جھکاؤ سے اسے شانت کر دیا۔ اب وہ کم از کم دھمکنے کے لیے اٹھنا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے سیکورٹی گارڈ کو اسی اندھیرے کونے میں لہبا لٹایا اور اس کی کلاشکوف کو گھٹے میں چھپا دیا۔ اس دوران میں گارڈ کا سامنی اسے آوازیں دیتا ہوا ہماری جانب آنے لگا۔

"غفل! کہاں ہو تم" اور کوئی گزیر تو نہیں؟"

کبیر شاہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے لہجے میں غرایا "میری باری ہے۔"

میں خاموشی سے ایک جانب تن کر کھڑا ہو گیا۔

غفل کا سامنی گارڈ جیسے ہی اس کونے پر نمودار ہوا کبیر شاہ نے اپنی کلاشکوف کا بٹ پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ گارڈ کے حلق سے "اوں" کی ایک ہلکی آواز برآمد ہوئی اور وہ تورا کر نشن بوس ہو گیا۔ یعنی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اب اس گارڈ کو کبھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا نصیب ہو گا یا نہیں۔ اس عمل نے مجھے کبیر شاہ کے مزاج کی جارحیت اور سفاکی سے آشنا کر دیا۔

دونوں گارڈز سے سننے کے بعد ہم نے گھریلو ملازموں کا رخ کیا اور صرف پانچ منٹ کے اندر ہم نے فرخ خان سمیت دیگر دو افراد کو زیر کر کے ایک ہاتھ روم میں بند کر دیا۔ اس معرکے میں پروگرام کے مطابق فرخ نے ٹھوڑی مزاحمت بھی پیش کی تاکہ اس پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ان تینوں افراد کو ہاتھ روم میں بند کرنے سے پہلے ہم نے یہ اطمینان ضرور کر لیا

تھا کہ وہ کسی قسم کی گزرو نہ کر سکیں۔

فرخ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق شاکر علی اور قوبا بیگلے کی زیریں منزل پر تھے جب کہ غیر ملکی مہمان جمال اور بھولا ناتھ کو بالائی منزل پر ٹھہرایا گیا تھا۔ میاں زاہد حسین بھی بالائی منزل کے ایک وی آئی بی کمرے میں رات گزار رہا تھا۔ فرخ کے مطابق، بیگلے پر پینچنے والی عینوں کال مگر بالائی منزل پر ٹھہرنے والوں کے لیے تھیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بالائی منزل پر موجود چھ افراد اس وقت جاگ رہے ہوں گے اور باہمی تعاون کے ذریعے ایک دوسرے کو جگا رہے ہوں گے۔

ہمیں صرف آٹھ افراد سے نمٹنا تھا۔ دو زیریں منزل پر اور چھ بالائی منزل پر۔ دونوں منزلوں پر مزاحمت کا امکان فکری پر سنٹ تھا۔ یعنی بالائی منزل والی عینوں کال مگر ہمارے ہمارے کوئی دشمن نہیں تھی اس لیے وہ ہماری راہ میں آنے کی کوشش نہ کریں۔ اسی طرح زیریں منزل پر شاکر علی و بھول چیر کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا لہذا وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں نے اس آپریشن میں اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی بے گناہ خواہ غواہ زندگی نہ ہار جائے اسی لیے ملازمین اور گارڈز کو ہم نے کچھ عرصے کے لیے ”آؤٹ آف اسکرین“ کر دیا تھا۔

میں نے کیر شاہ سے کہا ”شاہ جی! ہمارے ہاتھ باندھے ہوئے بندے تو اوپر نیچے ہو گئے ہیں۔“

”ہم بھی اوپر نیچے ہو جاتے ہیں“ وہ کلاٹھکوف کو چتھتاتے ہوئے بولا۔

”ہاں“ یہی مناسب رہے گا“ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا ”اب ہمیں جو بھی کارروائی کرنا ہے“ ایک ساتھ کرنا ہے تم بالائی منزل کا رخ کرو۔ میں نیچے والوں کو دیکھتا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا!“

وہ سواوہ نظر سے مجھے نکتے لگا۔ میں نے کہا ”میاں زاہد حسین ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ جمال اور بھولا ناتھ بھی جرائم پیشہ افراد ہیں اور ہمارے دشمنوں کے دوست کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ان عینوں کے ساتھ سخت ترین سلوک کیا جاسکتا ہے مگر وہ پیشہ ور عورتیں ہماری دشمن ہیں اور نہ ہم ان کے دشمن۔ ان کے خون میں ہاتھ رنکنے سے گریز کرنا۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بالائی منزل کی جانب بڑھ گیا۔

میں نہایت محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس کمرے کے

دروازے پر آیا جس کے پارے میں فرخ خان کی اطلاعات تھیں کہ وہاں شاکر علی اور قوبا کو ٹھہرایا گیا ہے۔ قوبا کا خیال آتے ہی میرا سارا خون دماغ کی طرف دوڑنے لگا۔ اسی شیطان صفت شخص کی ملکیت گمرے پجھاو سے میرے ساتھیوں پر گولیوں کی بارش پر سائی گئی تھی۔ امتیاز علی دہلی، میر بخش، ایک ایک خون آلود چہرے میرے تصور میں نمودار ہونے لگا۔ میں نے ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھما اور اس دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے پوچھا گیا۔

میں نے آواز بدل کر کہا ”جی“ میں ہاشم ہوں۔“

جن دو ملازمین کو ہم نے فرخ کے ساتھ بے بس کر کے ہاتھ روم میں مقید کیا تھا ان میں ایک ہاشم علی اور دوسرا مجید اللہ تھا۔ فرخ خان کی فراہم کردہ معلومات قدم قدم پر ہمارے کام آ رہی تھیں۔ دروازے کا بولٹ مگر نے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے قوبا میرے سامنے تھا۔

وہ میرے سامنے تھا تو اس کا یہی مطلب تھا ”میں بھی اس کے سامنے ہوں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک بیک وحشت میں مبتلا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسا ہی حرکت کرنا“ میں نے اس کے سینے پر ایک زوردار پریشر فٹ لگ کر رسید کر دی۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند عقب میں اچھلا اور سیدھا بیڈ پر پہنچ کر چاڑھ خائے ”دراڑ“ ہو گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا ”اس کا بولٹ چڑھا لیا اور خون خوار نظر سے قوبا کو گھورتے ہوئے آفتیش لمحے میں دریافت کیا ”وہ گمرے پجھاو تمہاری ہی ملکیت ہے؟“

”گمرے پجھاو؟“ وہ انکب انکب کر بولا۔

”ہاں وہی مخوس جب“ جس کا نمبر تھری ”دن“ کا تین دن ہے“ میں کسی درندے کے مانند غرایا ”جی“ جب سے فائرنگ کر کے گورا قبرستان کے نزدیک میرے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔“

”تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے“ وہ بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولا ”میرے پاس نہ تو کوئی پجھاو ہے اور نہ ہی میں یا میری کوئی گاڑی تمہارے ساتھیوں کی موت کی ذمہ دار ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے ہاتھ روم کے دروازے کی جانب دیکھا۔ ہاتھ روم کے اندر سے پائی گمر نے کی آواز آ رہی تھی اور دوسرے بیڈ کے نزدیک یہی ایک وہیل چیر بھی نظر آ رہی تھی ”اس کا ایک ہی مطلب تھا“ قوبا کا سامنے شاکر

لی اس وقت ہاتھ روم کے اندر تھا۔

میں نے قوبا کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے دبا کر کہا ”ملا فہمی کے بیچے! آج میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تمہیں والے عبرت پکڑیں گے۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بستر سے اٹھ کر پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ میں اسے لیتے ہوئے دباہ بستر پر آ گیا اور اس طرح کہ اب وہ میرے نیچے رہتا تھا اور اس کی گردن میرے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔

”بتاؤ“ میرے ساتھیوں نے تمہارا کیا بکاڑا تھا“ میں نے اس کی گردن پر دباؤ بوجھاتے ہوئے کہا ”کیوں تم نے انہیں موت کے گھاٹ اتارا؟“

وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا ”میں پھر یہی کہوں گا“ تم کی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہو۔ تمہارے ساتھیوں کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ تم نے جس گمرے پجھاو کا نمبر بتایا ہے، وہ میری ملکیت نہیں۔“

”اس کا مطلب ہے“ تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے“ میں نے اٹھ کیوں کے شکبے میں اس کی ٹومند گردن لڑکتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور میری لمحائی غفلت سے قوبا نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے میرے نیچے رہتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو لٹکایا اور میرے پیٹ پر پاؤں ٹکاکر اپنے اوپر سے مجھے دراڑ چھال دیا۔

میں قاتلین پوش فرش پر جت گرا کر اگلے ہی لمحے میں بلک پڑا۔ اس پرنگ لٹکا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسی وقت دباہ دستک ہوئی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ دستک کمرے کے دروازے پر نہیں بلکہ ہاتھ روم کے دروازے پر پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ روم کے اندر سے شاکر کی آواز سنائی دی۔

”قوبا! کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ تم کس کے ساتھ“

”یہ شیطان پتا نہیں، کیسے ہمارے کمرے میں ٹھس آیا“

”کون شیطان؟“ شاکر نے فکر مند ہی سے پوچھا۔

”وہی جس کا نام وجدان ہے اور۔ جو میرے بھائی کا قاتل بھی ہے۔“

شاکر نے پوچھا ”کیا کمرے ہو تم؟“

اس سے پہلے کہ قوبا اسے بتا کہ وہ کیا کر رہا تھا، میں

نے آگے بڑھ کر بڑی سرعت سے ہاتھ روم کے دروازے کو باہر سے بولٹ کر دیا۔ شاکر علی اپنی ”معدوری“ کے باعث اب کمرے کے اندر نہیں آسکتا تھا۔ ہاتھ روم کے اندر اس کی پیچیدگیاں کوکھیں سننے والا نہیں تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، قوبا پوری طرح تن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی قوبا تھا جو مجھے اپنے بھائی کا قاتل سمجھتا تھا حالانکہ قتل کی اس سنگین واردات میں ”سی ایف کے“ والوں کا ہاتھ تھا یعنی امتیاز علی اور اشتیاق احمد۔ کلا شعیب غوری کی تحقیق کے مطابق امتیاز اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں کا تعلق گمرے پجھاو سے تھا جو قوبا کی ملکیت تھی مگر وہ کسی ایسی حقیقت سے انکاری تھا۔

یہ خیالات سینکڑے کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ اس وقت میں پوری طرح قوبا کی جانب متوجہ تھا۔ ”اس روز تو تم بچ کر نکل گئے تھے“ وہ کینڈ توڑ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا ”لیکن آج میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔ تمہاری بد قسمتی گھیر کر تمہیں یہاں لے آئی ہے۔ آج میں اپنے بھائی کے خون کا حساب بھی چکا دوں گا۔“

”اس سے بھرنے کے بجائے ہاشم اور مجید کو آواز دو“ ہاتھ روم کے اندر سے شاکر علی کی آواز آئی ”یہ بد بخت تمہارے اکیلے کے بس کا نہیں۔ خواہ خواہ کوئی نقصان نہ اٹھائیں۔“

شاکر علی کا مشورہ بروقت اور درست تھا مگر ہاشم علی اور مجید اللہ کسی کی پکار سننے اور احکام کی تعمیل کے قابل نہیں تھے اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت تھا کہ قوبا سے فضول قسم کی ڈائلاگنگ کرنا لہذا میں نے قوبا پر ایک زوردار حملہ کیا۔ میری راؤنڈ ہاؤس لگ اس کے جڑے پر پڑی۔ وہ چہرہ تمام کر ایک قدم پیچھے ہٹا تو میں نے ایک کرینٹ لگ اس کے دوسرے جڑے پر رسید کر دی۔

وہ تھوڑا سا لڑکھایا مگر زمین بوس نہیں ہوا۔ اس کی لڑکھاپٹ کا فائدہ اٹھا کر میں نے سائڈ لگ اس کی پٹلی پر جمادی۔ اس لگ میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور سیدھا دیوار سے جا کر گر پڑا۔ اس کی بد قسمتی کہ دیوار سے ٹکراؤ کے دوران میں اس کی کھوپڑی نے پٹلی کی جس کا خمیازہ اسے فوری طور پر بھگتنا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تمام کر نیچے بیٹھ گیا۔

مگر یہ بیٹھ والے بیگلے پر میں نے اس کی اجمعی خاصی دھنکی کی تھی۔ اس وقت مجھے مرحوم امتیاز کا ساتھ حاصل تھا اور آج میں اس کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے

دو چار کرنے کے لیے باہل ہوا جا رہا تھا۔

میں نے قوبا کے نزدیک آکر اسے سر کے بالوں سے جکڑ لیا پھر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کرتے ہوئے پوچھا "ہٹاؤ" تمہاری گرے پچاڑ میں سے کن لوگوں نے میرے ساتھیوں پر فائرنگ کی تھی۔ مجھے ان کے نام اور ٹھکانے کا پتا چاہیے؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس کا ایک ٹھٹھا بڑی سرعت سے حرکت میں آیا۔ وہ میرے جسم کے نازک حصے کو نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر میں نے پکی گولیاں نہیں کھلی تھیں۔ وہ اپنی اس حرکت میں کیسے کامیاب ہو جاتا۔

اس کے گھٹنے کو میں نے اپنے گھٹنے سے ہلاک کیا اور اس کے ساتھ ہی میرا طوفانی بیچ اس کی ناک پر پڑا۔ ایک خوفناک بیچ تھا۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ میں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ اسے ہاتھ پاؤں کی مسلسل ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ پٹپٹا اور دوڑا جا ہاتھ پاؤں چلائے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں کچھ زیادہ ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ اس کی ایک پیش نہ چلی اور میں نے اسے جت کر دیا۔ وہ فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ میں دو چار ہاتھ میرے جسم پر بھی جمائے تھے مگر وہ ایک ناقابل ذکر سارٹ تھی۔

ہاتھ روم کے اندر سے شاکر علی مسلسل بیچ رہا تھا۔ وہ ہاشم علی اور عجیب اللہ کو آواز دے رہا تھا، کبھی وہ سیکورٹی گارڈز کو پکارنے لگتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے فرخ خان سے بھی وہاں جلدی پہنچنے کو کہا مگر اس کی بیچ پکار اور احکام کو سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ بالآخر اس ناکافی کے بعد اس نے ہاتھ روم کا دروازہ پٹپٹا شروع کر دیا۔

اس سے قبل کہ قوبا اٹھ کر کھڑا ہوتا، میں اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ساری تن فرس کن ہے کسی نہ کسی راستے خارج ہو چکی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان دبوچا اور اس کی خون آلود آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے جو پوچھا ہے، جلدی سے ہٹاؤ۔ ورنہ آج تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ تمہارے بھائی کو تو میں نے قتل نہیں کیا لیکن میں یہ اعزاز تمہیں ضرور دوں گا۔"

وہ کمزور سی آواز میں کراہا "مجھے جو معلوم تھا وہ بتا چکا ہوں۔ تم باہل غلط سوچ رہے ہو۔ تمہارے ساتھیوں پر

ہونے والی فائرنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"تم لوگوں کا فائرنگ سے تعلق ہونہ ہو لیکن میرے کون کا تمہارے چہرے سے ایک گمراہ تعلق ضرور ہے" میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور دو چار تازی توڑ چاس کے ٹھوکروں پر رسید کر دیے۔

فوجی تکلیف کی شدت سے چلا اٹھا۔ اس کا چوہیلے ہی میری گھس اور بیچڑ سے بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ ان طوفانی ٹھوکروں نے سونے پر سناگے کا کام کیا اور اس کی ناک پر سے خون جاری ہو گیا۔ اس کا خون آلود چہرہ ابیت ناک منہ پیش کر رہا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ کہیں بے ہوش نہ ہو جائے وہ گرین ہیلٹ والے پنگلے پر بے ہوشی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ وہاں تو وہ شاکر علی کے ساتھ ہونے والے "شٹان وار" سلوک کو دیکھ کر بے ہوش ہوا تھا اور وہ بے ہوشی ہی عارضی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بے ہوشی اس کے لیے دائمی ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے اس کے گالوں پر تھپڑ رسید کر کے اسے مجبور ڈالا اور دانت کچکچاتے ہوئے کہا "تمہارا آخری وقت آن پہنچا ہے قوبا! بچ کا اقرار کرو ورنہ۔"

میں نے جملہ ادھر چھوڑا اور چنڈی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کیس میں سے باہر نکال لیا پھر اسے قوبائی ٹکا ہوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "اس جاؤ گر کو پچھانے ہوتا۔ اس نے اپنے چنکرار سے تمہارے دوست شاکر علی کو وہیل چیر کا تختہ دیا ہے۔ آج ہی جاؤ گر تمہیں کفن کا نذرانہ پیش کرے گا۔"

میرے لہجے میں اتنی یقینی تھی کہ وہ قہر قہر کانٹے لگا مجھے اپنے بیچے اس کا دھوچر پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی تو خون کے چھینٹے اڑے جو میری شرٹ کو داغ دار کر گئے اسی دوران میں میری ساعت سے قوبا کی لڑتی ہوئی "خون آلود" آواز نکلا۔

"تمہیں خدا کا واسطہ ہے، میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔

تمہارے ساتھیوں کے قتل میں ہمارا کوئی ہاتھ نہ۔" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی خون خوار لہجے میں کہا "تمہیں تو شاکر علی نے بھی بت کھائی تھی کہ میرے پیش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن اس جاؤ گر کو پتا کمال دکھانا ہی پڑا تھا۔ شاکر پر اس نے پاؤں کی جانب سے عمل شروع کیا تھا۔ تمہاری باری سر کی طرف سے آئے گی اور

نہم کر کی نوک سب سے پہلے تمہاری آنکھوں کا مزاج بچے گی۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی نوک کو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان چھوایا۔ وہ تکلیف کی شدت سے الجھا اٹھا۔ اسی وقت بالائی منزل سے اٹھانچ کی آوازیں آنے لگیں گویا وہاں بھی کارروائی کا آغاز ہو گیا تھا۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے تم زبان کھولتے ہو یا اپنا کام شروع کرو؟"

بالائی منزل پر ابھرنے والی آواز وہ بھی سن چکا تھا، اس نے قہر قہراتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟" "سوال نہیں، صرف جواب!" میں نے خنجر کے دتے پر بازو بڑھاتے ہوئے غرا کر کہا۔

اس نے جڑے سے خنجر کو خنجر سے پھینچنے والی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی بات پر ڈٹ رہا۔ مجھے ایک لمحے کو شک گزرا۔ موت کو سامنے دیکھ کر زبان بے مانت بیچ بولنے لگتی ہے۔ پوچھنا کہ مطابق موت قوبا سے زیادہ دور نہیں تھی بلکہ اس کے سینے پر سوار تھی۔ اگر ابھی تک وہ میرے ساتھیوں کے قتل سے انکاری تھا تو اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں تھا کہ وہ واقعی اس معاملے سے

اتعلق ہو! اس نے تو ابھی تک یہ بھی تسلیم نہیں کیا تھا کہ کسے پچاؤ اس کی ملکیت ہے۔ ممکن ہے شعیب غوری کی غارتگری میں کوئی قسم نہ ہو گیا ہو! قوبا حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی جان چاٹتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کر رہا تھا تو پھر تو اسے اپنی جان بیاہی نہیں تھی یا پھر وہ یا اس کے ساتھی میرے ساتھیوں کی موت کے دتے وار نہیں تھے۔ جان تو البتہ سب بیاہی ہوئی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے انسان لاکھوں کی جان لے لیتا ہے۔

میں قوبا کے ساتھ مزید "سلوک" کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بالائی منزل سے نسوانی چیخوں کی آوازیں آئے۔ شاید اس کے ساتھ ہی کلاشن گرج اٹھی۔ اس صورت حال میں میں قوبا کے ساتھ مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے کسی عملی اقدام سے پہلے ہی اس نے ہاتھ پٹپٹا کر مڑے۔ میں نے پوری شدت سے اسے سمجھوڑ ڈالا۔ اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ وہ گری بے ہوشی میں پٹپٹا تھا یا پھر؟

اس سے آگے سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ بلکہ بالائی منزل پر پھر فائرنگ ہونے لگی تھی۔ میں نے

قوبا کو اس کے حال پر چھوڑا اور بالائی منزل کی جانب دوڑ پڑا۔ جب میں ہاتھ روم کے دروازے کے نزدیک سے گزرا تو شاکر علی کی ٹھٹکت خورہ جھنجھلاہٹ آئیز آواز میری ساعت سے نکلا۔

"یہ فائرنگ کیسی ہو رہی ہے؟ کوئی دروازہ تو کھولے۔ میں بھی تو دیکھوں، ہاں ہر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟" "اس قیامت کو دیکھنے کے لیے تمہیں قیامت کا انتظار کرنا پڑے گا" میں نے چیخ کر کہا "اور اس فائرنگ کو تم کوئی عام سی فائرنگ مت سمجھو۔ یہ "نامعلوم" دہشت گردوں کی فائرنگ ہے جو پتا نہیں کہاں سے آتے ہیں اور اپنا کام کر کے پتا نہیں کہاں چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا اور نہ ہی جان سکتا ہے کیونکہ جاننے والے سب جانتے ہیں۔"

میں نے کمرے سے نکلے ہوئے دروازے کو باہر سے پوٹ کر دیا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے زینوں کی جانب بڑھ گیا۔ میں ابھی نصف زینے ہی طے کیا تھا کہ اوپر سے ایک انسانی جسم لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ میں اپنے پنجوں پر فضا میں اچھلا۔ وہ گولا نما جسم میرے نیچے سے گزر گیا۔ اسی وقت کیر شاہ کی آواز میری ساعت سے نکلا۔

"وجدان! اسے روکو۔ یہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے کیر شاہ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ہوا میں پرواز کی اور اس شخص کے سنہیلے سے پہلے ہی اس کے سر پر بیچ گیا۔

وہ بھولا ناٹھ تھا۔ میرا نام کیر شاہ کی زبان سے وہ سن چکا تھا۔ اب مجھے اپنے سامنے کھڑا کیر شاہ کو دکھایا گیا۔ میں نے اس کی پوٹھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پیٹ میں ایک فرنٹ پش کک ماری۔ وہ چیٹ پکڑ کر تکلیف کی شدت سے ڈبڑا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنہیل کر کچھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے تھلے میں غاصی تیزی تھی۔

اس کی راؤنڈ باؤس کک کو میں نے اوپن آرم ہلاک کیا۔ اسی دوران میں اس نے دوسری راؤنڈ باؤس کک آزمائی۔ میں اسے ہلاک کرنے کے بجائے ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھا اور تیزی سے بیک سوپ کر دی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا لیکن حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاصا چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اس کی شاٹ (KNEE SHOT) کا داؤج

دیا۔ اس نے تیزی سے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچی۔ اسی وقت میں نے برق رفتاری سے ایک سوپ (SWEEP) اس کی پینڈی پر رسید کر دی۔ نتیجے کے طور پر وہ ایک مرتبہ پھر پشت کے بل پڑا آسمان کو تک رہا تھا۔

میں ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے تھوڑے کو اپنے پاؤں سے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ بھولا ناٹھ نے کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے پاؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر بڑی سرعت سے ایک موڑا دیا۔ میری جگہ اگر کوئی عام سمارشل آرٹسٹ ہوتا تو نہ کے بل ٹنگی فرش پر گرنا لیکن میرے ذہن نے بروقت فیصلہ کیا تھا۔

میں نے اپنی پاؤں کو ہوا میں ٹوٹسٹ (TWIST) کیا اور آزاد پاؤں سے بھولا ناٹھ کے چہرے کا کپڑا کرتے ہوئے فرنٹ رول کر کے دور پہنچ گیا۔ میں نے اپنے عقب میں بد مقابل کی گراہ سنی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے میرے لیے ایک ناقابل اشاعت گالی بھی پھل گئی۔ یہ اس کی بھولتاہٹ کی انتہا تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، بھولا ناٹھ اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے بیک فلیک (FLICK BACK) لگائی اور اس سے دو فٹ کے فاصلے پر پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا، میں ہوا میں اچھلا اور دھیل فلائنگ کلک اس کی کینٹی پر ثبت کر دی۔ یہ ایک جھٹکے دار حواس قسم کی کلک تھی۔

وہ ڈانگاتے ہوئے قدموں سے پیچھے کی طرف گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا کوئی موقع نہ دیا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ دس فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ میں نے فرنٹ سرسٹ لگایا اور اس کے درپرو پہنچ گیا۔

وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر سٹپٹ گیا۔ اسی سٹپٹ میں اس نے غیر ارادی طور پر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ ہوا۔ وہ بے طرح زور لگا رہا تھا اور جھٹکے دے دے کر میری کمر کا کڑا ٹکانے کی تگ دو میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھٹنوں کی کیلے بند دنگے ضربوں سے میرے پیٹ کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے گھٹنوں سے بلا ٹنگ کرتے ہوئے اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نتیجے میں میرے بازوؤں پر اس کی گرفت بھی ڈھیلی ہو گئی۔ اسی لمحے میں نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو اوپر کھینچ لیے۔ وہ حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت میں تڑکا لگایا۔ میرے آزاد

ہاتھوں نے چوپ (CHOP) کی شکل اختیار کی اور بجلی کی رفتار سے ہاتھوں کے بلینڈ بھولا ناٹھ کی کن ٹیوں پر پڑے یہ ایک ملک اور خطرناک وار تھا۔

مجھے یقین ہے، اس انٹیک نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کر دیا ہوگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر جھومتے لگا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر ساڈ ٹنگ اس کی پہلی پر رسید کی اور اسے کئی فٹ پیچھے اچھال دیا۔

اسی وقت زخموں کے اوپری حصے سے کیر شاہ نے مجھے پکارا ”وہ جان! اگر اس مردود سے نمٹ چکے ہو تو اوپر آجاؤ۔ یہاں حالات بگڑ گئے ہیں۔“

حالات تو پوری طرح ہمارے قابو میں تھے پھر کیے بگڑ گئے۔ یہ سوچتے ہوئے میں زخموں کی جانب بڑھا تو بھولا ناٹھ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں آہنی راڈ کو میں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی شدید نقصان پہنچانے میں ناکام رہا۔

اگر انسان کے ہاتھ مضبوط اور بازو طاقت سے مبرور ہوں تو پھر کسی ہتھیار یا اوزار کے بغیر بھی دو ہمت کچھ کر کے دکھا سکتا ہے لیکن جب بازو دوست کم زور پڑنے لگیں تو اسے بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ بھولا ناٹھ کی میں اتنی دھمک بنا چکا تھا کہ وہ آہنی راڈ اس کے ہاتھ میں انتہائی مضبوط فنگ رہی تھی پھر جب اس نے راڈ سے مجھ پر حملہ کیا تو اس ٹھٹک خیزی میں کئی چند اضافہ ہو گیا۔

میں نے اس کے راڈ والے بازو کو ہوا میں بکڑ بلا کر کیا پھر ایک اسٹیپ اندر آتے ہوئے خطرناک سولر پانچ (SOLAR PUNCH) اس کے سینے کے وسط میں پڑ کر دیا۔ وہ ”اؤنہ“ کی آواز نکالتے ہوئے کسی کتے کے منہ پر سے کے مانند زمین بوس ہو گیا۔ اب اس زمین سے اس کے اٹھنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

میں بالائی منزل پر پہنچا تو ایک کمرے میں وحشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ جمال اور دو عورتیں خون خن میں پت کمرے کے فرش پر پڑے تھے۔ جمال کے ہاتھ میں ایک رپو اور دیا ہوا تھا۔ وہ تینوں زندگی سے بہت دور۔ موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔

میں نے سولہ نظروں سے کیر شاہ کی طرف دیکھا۔ جب میں زیریں منزل پر قویا سے دست و پا کر رہا تھا تو میں بالائی منزل پر دو مرتبہ فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ ایک بار فائرنگ کے ساتھ نسوانی چیخیں بھی شامل تھیں۔ ”میں کیا کرتا، یہ سب کچھ مجبوری میں کرنا پڑا۔“

نسوانی چیخ نے ہماری سماعتوں کو کھرج ڈالا۔ پھر اگلے ہی لمحے چیخنے والی کی صورت بھی نظر آئی اور وہ صورت خاصی خوب صورت تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھی، اس وقت اپنے لباس کو پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ فائرنگ اور پھر دیوارے کے اچانک کھٹکنے سے وہ بری طرح بدحواس ہو گئی تھی اور اسی بدحواسی میں اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی تھی جبکہ ہاتھ سے لباس چھوٹ گیا تھا۔ اس کے بدن پر اندر گارمنٹس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ کھلفانی لباس اس کے کندھن وجود کی پردہ پوشی کے لیے انتہائی ناکافی تھا اس لیے وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے جسم ڈھانچنے کا ناکام کوشش کر رہی تھی۔

ہمیں اپنے سامنے موت کے فرشتوں کے روپ میں کھڑا دیکھ کر اس کی گھٹکی بندھ گئی۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولی ”قت۔ تم۔ لگ۔۔۔ کون لوگ ہو؟“

”ہمارے بارے میں تمہیں ”لی ایچ ڈی“ کرنے کی ضرورت نہیں“ میں نے غرا کر کہا ”اگر زندگی چاہتی ہو تو فوراً بتاؤ، میاں جی کدھر ہے؟“

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میاں زاہد حسین وہاں موجود نہیں تھا۔ اس عورت کے حلق سے میرے سوال کے جواب میں ایک سرا سیمہ آواز برآمد ہوئی۔ ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اس طرف گیا ہے۔“

ساتھ ہی اس نے مغربی دیوار میں موجود ایک بند دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

میں نے کیر شاہ سے کہا ”تم اس عورت پر توجہ رکھتے ہوئے اسے لباس پہننے کی مہلت دو۔ میں اتنی دیر میں اس دروازے کا حال احوال معلوم کرنا ہوں“ پھر میں نے خوف زدہ کال گرل سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”رخشی!“ اس نے بتایا۔

”تمہارے ساتھ آنے والی دوسری دو ”گرلز“ تو اپنی سانسیں چوری کر چکیں۔ اگر تم مزید جینے کی خواہش مند ہو تو کسی قسم کی غلط بیانی کرنا اور نہ ہی کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرنا۔“

”قت۔ تو کیا نازش اور مرلا۔؟“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر وحشت زدہ نظریں مجھے سنبھلنے لگی۔

میں اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تڑکرہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ہلاک ہونے والی پیشہ ور عورت کے نام مجھے معلوم ہو گئے تھے۔ ان میں نازش جمال کے لیے

نکاشن کو سلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں برسٹ نہ مارتا تو ہل مجھے گولی کا نشانہ بناتا۔ ان دونوں کی کم ہمتی کہ یہ ذوق زدہ ہو کر جمال کے پیچھے جا چکی تھیں اس لیے جان سے نہیں“ بات ختم کر کے اس نے جمال کے نزدیک مردہ حالت میں بیڑی ہوئی دونوں عورتوں کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے اس سے مزید سوال جواب کرنے کے بجائے بلان زاہد حسین کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ بولا ”میں نے حالات بگڑنے والی بات میاں زاہد حسین حوالے ہی سے کی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر دیا ہے اور کمرے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا۔“

میں بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہمارا سب سے ”وی“ لائی ”شکار تو میاں زاہد ہی تھا۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو ہمارے پاس ہاتھ ملنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔

میں کیر شاہ کی معیت میں اس دروازے کے سامنے پہنچا جس کے پیچھے میاں زاہد بند ہو کر رہ گیا تھا۔ دو عورتوں کی ایک میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا لیکن میری معلومات کے مطابق اس بنگلے میں تین پیشہ ور عورتوں کی انٹری ہوئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ تیسری میاں زاہد کے ہاتھ ہوگی۔

”ہمیں ہر صورت میں اس دروازے کو کھولنا ہے“ میں نے حتمی انداز میں کہا۔

کیر شاہ حتمی لہجے میں بولا ”اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دروازے کے لاک پر فائرنگ کی جائے۔“

”تو کد۔ فوراً کرو شاہ جی!“ میں ٹھکانہ لہجے میں بولا ”اگر مجھے دو مرتبہ فائرنگ کر چکے ہو۔ اس بات کی پروا مت نہ کرو۔ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی اس طرف متوجہ ہو جائے گا اگر کسی کو یہ نیک کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہوگا تو اب نہ وہ کچھ ہوگا“ میں نے ایک لمحے کے توقف سے غصے سے بولے ”انداز میں کہا“ آج کسی بھی قیمت پر میاں زاہد حسین کو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جانا چاہیے، دیکھ لے ہمیں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہانا پڑیں۔“

میری بات ختم ہوتے ہی کیر شاہ نے ایک درنگ میں مارا اور دروازے کی لاک والی سائڈ کو ٹاپ ٹو باٹم پر لڑکھڑکھا۔ اسی لمحے میں نے بر۔۔۔ ٹھٹک پاور کا استعمال سے ہونے والی ہینڈ پش دروازے کے کھٹنے پر مارا۔ ”دھڑ۔۔۔“ سے کل گیا۔

بمبار مار کر کمرے میں داخل ہوئے تو ایک خوف زدہ

اور سرلا انڈین بھولا ناتھ کے لیے بلوائی مٹی تھی۔ ایک ہندو غیر ملکی مسمان کے لیے میاں زاہد نے ہندو عورت کا ہی بندوبست کیا تھا۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا، وہ اندر سے لاک کیا گیا تھا۔ اس کا پینڈل بھی اسی درجہ سے گھونٹنے سے انکاری تھا۔ میں نے مزید فائرنگ کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے میاں بھی برہمتنگ ٹینک کو آزمایا۔ میں نے دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھوں کو سر سے بلند کیا اور ایک طویل سانس اندر کی جانب کھینچی، پھر سانس چھوڑتے ہوئے بازوؤں کو کھائیوں کے مقام پر کراس (CROSS) کرتے ہوئے پشٹ پر لے گیا۔ اس کے بعد واپس پہلوؤں کی جانب ہاتھوں کو لاتے ہوئے میں نے اپنے پیچھے وں کو پوری طرح سانس سے بھر لیا۔ اب میں ایک کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ سانس کو ایک تھرسٹ (THRUST) کے ساتھ باہر خارج کرتے ہوئے میں نے دونوں ہتھیلیوں کو ایک زوردار جھٹکے سے دروازے پر لاک کے نزدیک استعمال کیا۔ ہتھیلیوں کے اس پش میں اتنی قوت تھی کہ دروازہ ایک مخصوص آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس قسم کے برہمتنگ پش (PUSH BREATHING) کی مدد سے بعض اوقات ایک دیوار کو بھی بہ آسانی گرایا جاسکتا ہے۔ اس ٹینک میں مارشل آرٹس اور بوگایا ایک ساتھ کارفرما نظر آتے ہیں۔

میں کھلے ہوئے دروازے سے گزر گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں لائٹ آن تھی۔ اس کمرے میں مجھے ایک چکروارزنہ نظر آیا۔ جگہ کی تنگی کے باعث اس ساخت کے زینے بنائے جاتے ہیں جو ایک گول پکر کی صورت میں سیدھے نیچے سے اوپر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان دائروار اسٹیپس (STEPS) کے سارے کے لیے درمیان میں ایک مضبوط ستون کھڑا کر دیا جاتا ہے جو زمین اور چھت کے دو مقامات پر مضبوطی سے نصب ہوتا ہے۔

میاں زاہد حسین کمرے میں موجود نہیں تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا وہ نیچے جا چکا تھا۔ میں خیر ارادی طور پر زینہ اترنے لگا۔ اس زینے کے گرد اگر ایک کنگی خول بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس "مخافت" کے سبب باہر سے یہ زینہ نظر نہیں آتا ہوگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں ایک کیپسول میں قدم بہ قدم اوپر سے نیچے اتر رہا ہوں۔ اس کو رُو (COVERED) چکروار زینے کا اختتام بھی ایک دروازے پر ہی ہوا۔ اس کے پینڈل نے مجھے بتا دیا کہ

دروازے کو باہر سے لاک کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس دروازے کی دوسری جانب بھی کوئی چھوٹا سا کمرہ ہوگا۔ اسی لئے ایک تشویش ناک خیال نے میری سوچ پر دستک دی۔ کیا میاں زاہد حسین جنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے؟

اس خیال نے میرے حلق میں کڑواہٹ بھری۔ میں تیر رفتار سے زینہ چڑھتے ہوئے اوپر جانے لگا۔ زینے دروازے کو تو زکریا کھول کر باہر نکلنا ہے کار تھا کیونکہ اگر میاں زاہد واقعی وہاں سے فرار ہو گیا تھا تو پھر وہ جنگل کی زیریں منزل پر کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

میں جب واپس میاں زاہد کے کمرے میں پہنچا تو رشتہ نامی وہ پیشہ ور عورت مکمل لباس میں آچکی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور دعوت انگیز بدن کی مالک تھی جس کا سر ہلکے دیکھنے والے میں مستفی و ڈاؤن تھا۔ اس کی عمر تیس کے ارب قریب ہوگی۔ میں نے چھوٹے ہی رشتے سے سوال کیا۔ "وہ خبیث تہمتی دیر پہلے اس کمرے میں گیا تھا؟"

میرا اشارہ اس دروازے کی جانب تھا جس میں نے برہمتنگ ٹینک کے ذریعے کھولا تھا۔ رشتی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"جب پہلی مرتبہ فائرنگ ہوئی تو میاں جی مجھے یہیں ٹھہرنے کا کہہ کر اس دروازے میں غائب ہو گیا تھا۔"

گویا یہ چندہ میں منٹ پہلے کی بات تھی۔ یہ وقت اس کے فرار کے لیے کافی تھا لیکن اس دوران میں میں نے جنگل کے اندر یا باہر کسی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا "میاں زاہد علی دہاں سے کوئی گاڑی نہیں لے کر گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں بھولا ناتھ کو "پکنا جھپٹا" سکھا رہا تھا "اس وقت میں نے جنگل کے گیت کو بند دیکھا تھا۔ میاں زاہد کی اچانک روپوشی نے معاملات کو سردست الجھا دیا تھا۔

میں نے کڑے لہجے میں رشتی سے سوال کیا "تم فائرنگ کی آواز اور اپنی ساتھی کال گر لڑکی چچیں سن کر کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلی تھیں؟"

"میں ڈر گئی تھی۔ سخت خوف زدہ ہو گئی تھی میں۔" ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی "مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ باہر کی صورت حال کا جائزہ لے سکوں۔"

"کیا تم جانتی ہو اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟"

نے زینوں والے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے میری حسب توقع جواب دیا "نہیں، میرا خیال

کوئی دانش روم ہوگا۔ میں اس جنگل پر پہلی مرتبہ آئی ہوں۔"

"اور تمہاری وہ دونوں ساتھی کمر لڑکیاں؟"

"وہ بھی میاں پہلے کبھی نہیں آئیں۔"

میں نے پوچھا "ان کے نام تم نے نازش اور سرلا بتائے۔ سرلا نام سے تو ظاہر ہوتا ہے" وہ کوئی ہندو عورت نہ تھی۔

"سرلا واقعی ہندو تھی" رشتی نے افسوس ناک انداز میں کہا۔ اسے اپنی پیشہ ور ساتھی کی موت سے دھچکا پہنچا تھا۔

میاں جی نے اپنے ہندو مسمان بھولا ناتھ کے لیے سرلا کو "گایا" پھر اپنا کچھ جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو "پوچھنے لگی۔ دوسرے کمرے میں بھولا ناتھ اور جمال نامی دو غیر ملکی مان ٹھہرے ہوئے تھے وہ کہاں ہیں؟"

میں نے ذہنی انداز میں کہا "وہ بے چارے مفقود الخیر دیکھ لیں۔"

کبیر شاہ نے رشتی سے پوچھا "کیا واقعی وہ غیر ملکی مسمان بک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے؟ میں ان چاروں کو بک ہی کمرے میں ناقابل بیان حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس حوالے سے میرا دماغ ابھی تک چکرا رہا ہے۔"

رشتی نے بڑے کھلے ذلے انداز میں بتایا "ہاں یا راہوہ دونوں کمرے دوست ہیں۔ مجھے معلوم ہے وہ اچھا براہر ہم ایک ساتھ مل کر کرتے ہیں۔"

رشتی کے لیے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھجک موجود نہیں تھی۔ اس نے جمال اور بھولا ناتھ کے لیے حال کا صفحہ استعمال کیا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مفقود الخیر کی ٹیم سے آشنائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔

کبیر شاہ نے رشتی سے سوال کیا "تم لوگوں کا تعلق کس گروہ سے ہے؟"

"میڈم روزی!" اس نے دوغٹلی جواب دیا۔ "وہ درختوں والی میڈم روزی؟"

"بالکل وہی۔"

میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے رشتی سے پوچھا "تمہاری میڈم کے پاس ہندو لڑکیاں اور عورتیں بھی

نہیں ہیں جناب!" وہ ایک ادا سے بولی "ہر رنگ اور

رنگ کے کپڑے مل جاتیں گے میڈم روزی کے اڈے پر۔ آپ

کو اگر کے دیکھیں۔"

کبیر شاہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "وہ جان!

یہ پیشہ بہت ترقی کر چکا ہے لگتا ہے اس سلسلے میں تمہاری معلومات محدود ہیں۔"

"میری معلومات تو محدود نہیں ہیں" میں نے کہا "لیکن پاکستان میں اس قسم کے کاروبار کے بارے میں اور اتنی وسعت کے ساتھ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"بھولے بادشاہ!" کبیر شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس قسم کے کاروبار ملک نہیں، بلکہ لوگ کرتے ہیں جو کہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پاکستان بھی اسی دنیا کا ایک ملک ہے۔"

کبیر شاہ کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ رات کے سناٹے میں کسی گاڑی کے انجن کے اشارت ہونے کی سبب آواز ابھری۔ ہم دونوں نے بے یک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اسی لئے جنگل کے زیریں حصے میں گاڑی کے ٹائروں کی مخصوص "جرچراہٹ" سنائی دی۔

ہم دونوں لپک کر کمرے سے باہر آئے کسی سوال جواب کا وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ یہ بات طے تھی کہ کوئی اس جنگل سے بڑی جلدی میں روانہ ہو رہا تھا اور وہ "کوئی" میاں زاہد حسین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں موجود باقی تمام افراد کو ہم نے مناسب طور پر "فٹ" کر دیا تھا۔

بالائی منزل کی بالکونی سے جھک کر جب نیچے دیکھا گیا تو ایک افسوس ناک منظر سے سامنا ہوا۔ جنگل کا گیت پوری طرح کھلا ہوا تھا اور اس گیت میں سے ایک قیمتی گاڑی باہر نکل کر مرکز پر چڑھ چکی تھی۔ ہماری بے خبری میں اس نے بڑی خاموشی سے گیت کھول لیا تھا۔

کبیر شاہ نے ایک جھٹکے سے کھاشکوف سیدھی کی مگر اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ کرتا، وہ قیمتی گاڑی ایک موڑ کاٹ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"وہ جان! وہ کیڑہاگ گیا" کبیر شاہ نے بیجانی لہجے میں کہا "ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "مخالف زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ جب تک ہم جنگل کے عقب میں پہنچ کر اپنی موٹر سائیکل کو سنبھالیں گے" میاں زاہد کہیں سے کہیں نکل چکا ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے خاموشی سے جانے دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ان زینوں کی جانب دوڑ لگادی جو ہمیں زیریں منزل پر پہنچا سکتے تھے۔ ہم پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے نیچے آئے پھر جنگل کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ گیت میں سے نکل کر جنگل کے عقب میں پہنچنے کے لیے

میں نے کہا "مخالف زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ جب تک ہم جنگل کے عقب میں پہنچ کر اپنی موٹر سائیکل کو سنبھالیں گے" میاں زاہد کہیں سے کہیں نکل چکا ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے خاموشی سے جانے دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ان زینوں کی جانب دوڑ لگادی جو ہمیں زیریں منزل پر پہنچا سکتے تھے۔ ہم پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے نیچے آئے پھر جنگل کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ گیت میں سے نکل کر جنگل کے عقب میں پہنچنے کے لیے

میں نے کہا "مخالف زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ جب تک ہم جنگل کے عقب میں پہنچ کر اپنی موٹر سائیکل کو سنبھالیں گے" میاں زاہد کہیں سے کہیں نکل چکا ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے خاموشی سے جانے دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ان زینوں کی جانب دوڑ لگادی جو ہمیں زیریں منزل پر پہنچا سکتے تھے۔ ہم پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے نیچے آئے پھر جنگل کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ گیت میں سے نکل کر جنگل کے عقب میں پہنچنے کے لیے



ہمیں کم از کم دس ہنگے گھوم کر آنا پڑا جبکہ ہم جو راستہ اختیار کر کے ہنگے میں "داخل" ہوئے تھے اسی راہ سے فوری واپسی ممکن تھی۔

ہم جیسے ہی ہنگے کی عمارت کے پہلو سے گزر کر عقبی حصے میں پہنچے ایک غراتی ہوئی آواز نے ہمیں رکنے کا حکم دیا۔ "تم دونوں اس وقت میری گن کے نشانے پر ہو۔ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں فائرنگ کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔"

ہنگے میں داخل ہو کر ہم نے دو سیکورٹی گارڈز کو "ناقابل استعمال" بنایا تھا۔ کیر شاہ نے تو اپنے حصے کے گارڈ کی کھوپڑی پٹخادی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے کی امید نہیں تھی، البتہ وہ میرے حصے والا گارڈ ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اسے دو تین گھنٹے کے لیے اٹھا خلیل کروا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ اپنی سخت جانی کے سبب قتل از وقت ہوش میں آیا ہو گا۔

میں نے کیر شاہ کے کان میں سرگوشی کی "تم دوسری طرف سے گھوم کر اس کے عقب میں پہنچو میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ بات میں نے اس بنیاد پر کہی تھی کہ وہ شخص ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ ہم دونوں اس کے گن پوائنٹ پر ہیں۔ میں اس کی دھمکی کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ اگر واقعی ہم اس کی نگاہ میں تھے تو وہ کیر شاہ کی حرکت کو نوٹ کر لیتا۔

کیر شاہ نے جیسے ہی اپنی جگہ سے جنبش کی دکھائی نہ دینے والے شخص نے وارننگ دی "خبردار! جو کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ میں تمہاری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا ہوں۔"

آواز ایک اندھیری اوٹ سے ابھر رہی تھی۔ یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ وہ ہمیں بے خوبی دیکھ رہا تھا۔ ہم بھی اندھیرے میں تھے مگر ہم دونوں کے ذوائے میں فرق تھا۔ میں نے جھجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"تم ہمیں آگے بڑھنے سے بھی روک رہے ہو اور پیچھے جانے پر بھی نہیں اعتراض ہے آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال تم لوگ اپنے ہتھیار میری جانب پھینک دو۔"

میں نے ذرا غور کیا تو اس آواز کو پہچان گیا۔ یہ طفل نائی گارڈ کی آواز تھی۔ اس سیکورٹی گارڈ پر میں نے طبع آزمائی کی تھی۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ وہ اپنی جلدی کس

طرح ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے مضبوط لمبے میں کہا۔ "طفیل! ہنگے کے اندر بازی پلٹ چکی ہے اس وقت ہمارا ہولڈ ہے۔ تمہارا باس میاں زاہد دم دیا کر میاں سے فراز ہو چکا ہے۔ ہمتی کی ہے کہ تم گن پھینک کر خود کو ہماری تحویل میں دے دو ورنہ ہم تمہارا بڑا عبرت ناک مشرک کریں گے۔"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیرت سے مضطرب ہوا۔

میں نے سخت لمبے میں کہا "ہم تمہارے نام کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں تمہاری فنی اور پرائیویٹ زندگی کے بارے میں۔"

"تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"بالکل درست۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "اس لیے نہیں بنا سکتے کہ تم تو آل ریڈی بے وقوف ہو۔" وہ غصے سے بولا "میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتا۔ ہر ہوگا کہ تم میرے تین گھنٹے سے پہلے ہتھیار پھینک دو۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا "میں فنی شروع کرنے والا ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ "دن تو قہری" کا آغاز کرتا میں نے کیر شاہ کو ایک فوری عمل کا مخصوص اشارہ دیا اور سیکورٹی گارڈ کی طرف مت کر کے تیز آواز میں کہا۔

"مسٹر طفیل! تمہیں ایسا مذاق پسند نہیں اور میں دنیا مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا تعین نہیں آیا اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہمارے "ہولڈ" پر ایمان لانا چاہتے ہو تو نگاہ اٹھا کر ذرا چھت کی طرف دیکھو۔ ہمارا ایک مسلح ساتھی اس وقت تم پر گن تانے وہاں کھڑا ہے۔"

میرا جملہ آخری الفاظ تک پہنچا ہی تھا کہ کیر شاہ نے آگے بڑھ کر آواز کی سمت ایک برسٹ فائر کروا۔ اس کے ساتھ ہی سیکورٹی گارڈ کی آخری جھپٹیں فضا میں بلند ہو کر ہوا میں منتشر ہو گئیں۔

انسانی نفسیات کے عین مطابق میرے انکشاف پ سیکورٹی گارڈ نے ہنگے کی چھت کی طرف دکھا تھا۔ اس دوران میں وہ یقیناً ہماری جانب سے قافل ہو گیا تھا اور اس کی اس لمبائی غفلت سے کیر شاہ نے ماہرانہ انداز میں ہتھیار فائدہ اٹھایا تھا۔

اس پے در پے بازی کا فائدہ ہم کے بعد وہاں رکتا ہمارے لیے انتہائی پرخطر ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہے، ہم نے اس عمارت کا ٹائما نوک رابطہ منقطع کر دیا تھا لیکن اس پاس کے کسی ہنگے سے

شب بیدار شخص قریبی تھانے فون کر کے اس غیر معمولی رنگ کی اطلاع دے سکتا تھا۔

کیر شاہ نے مجھے بازو سے تھامتے ہوئے کہا "وہ جان! ہاں زاہد حسین کے پیچھے جانا اب بکس کے ڈھیر میں سے سوئی لاش کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ہماری پکڑ اور پہنچ سے ت زیادہ دور جا چکا ہو گا۔ ہمیں فوراً میاں سے فرار ہو جانا ہے۔"

"ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن واپسی سے قبل ایک نوڑی کا ہائی ہے۔"

"کون سا نوڑی کام؟" وہ متوجہ لمبے میں بولا۔

میں نے ہنگے کے سامنے والے حصے کی جانب قدم فالتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم گن (جو ہے) کے ڈھیر میں سے ایک فنی سی سوئی تلاش میں کر سکتے لیکن اس بھوسے میں ایک فنی سی چنگاری تو لگ سکتے ہیں۔"

"تم کتنا کیا چاہتے ہو؟" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے لہ "کیچتے جاؤ۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں بھولا ناٹھ ٹھنڈا اٹھا رہا تھا اسے سے رنجشی آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ہمیں دیکھ کر لگ لگ کر میری "فرمائش" پر کیر شاہ نے اسے گن پوائنٹ رکھ لیا پھر وہ دونوں میری تھلید میں اس کمرے میں پہنچے وہاں میں یعقوب عرف قبا کو لہبا لگایا تھا۔

قبا ہنوز دنیا و دنیا سے بے خبر تھ کہ دائمی یا نسری بجا تھا۔ میں نے اس ساتھ روم کا دروازہ کھولا جہاں شاکر علی کو لگایا تھا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی دہشت زدہ ہو گیا۔ پھر نہ آنے کے لیے مجھے نہ راتا۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بولا۔

"تم نے قادر مطلق کا واسطہ دیا ہے تو میں تمہیں جان نہ نہیں لڑاؤں گا۔" میں نے سخت لمبے میں کہا "لیکن ہمارے بدلے تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینا ہوں۔ سچے امید ہے اس جان بخشی کے بدلے تم شرافت کا ثبوت کر سکتے ہو سچ بولو گے۔"

"میں ایک ایک بات سچ بتاؤں گا۔" وہ گھٹکیا "تم پوچھو" پہنچنا چاہتے ہو؟"

"میں نے پوچھا" تمہارے باس میاں زاہد حسین کا اصل نام کمال ہے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں اس کے اصل ٹھکانے سے میں واقف نہیں۔ میں کیا بلکہ کوئی بھی واقف نہیں۔ وہ بہت محتاط اور کالین شخص ہے، مختلف ٹھکانوں پر پایا جاتا ہے۔ کوئی تعین سے نہیں کہہ سکتا، وہ کس وقت کہاں ہو گا۔"

"تم مجھے پکڑنے کو مشق تو نہیں کر رہے؟"

"میں پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں۔"

میں نے اس کے لمبے سے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ دوسرا کوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ وہ گرین ہیلٹ والے ہنگے پر ہماری سفائی اور مشائی کا ٹریڈر دیکھ چکا تھا جس کے نتیجے میں اسے قدموں کا نہیں رہا تھا۔ مجھے امید تھی وہ اپنی باقی ماندہ ہمتی کو کسی رسک کی بجائے چڑھانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کے جواب پر یقین کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، میں تمہارے بیان کو بعد میں چیک کروں گا اور بیان غلط ثابت ہونے پر تمہیں پاتال سے بھی دھونڈ نکالوں گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اثبات میں سرھلنے لگا۔ میں نے پوچھا "رات کو یہاں دو اور افراد بھی موجود تھے جن میں ایک کا نام آتا ہے۔ وہ نصف شب کے بعد ایک سیاہ لینڈر کو درمیں ہنگے سے کہیں چلے گئے تھے۔ آتا کے ساتھ وہ دروازہ پر قائم نوجوان کون تھا؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گر گر گیا۔ میں سمجھ گیا، کوئی خاص بات ہے اسی لیے وہ جواب دینے میں تامل کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے خوں خوار لمبے میں کہا۔

"تمہارے جواب سے میں تمہاری سچائی کو بھی پرکھ لوں گا کیونکہ میں مذکورہ نوجوان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" یہ جھوٹ میں نے اس سے سچ اٹھانے کی خاطر بولا تھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولا "وہ فیصل صاحب ہیں۔ چوہدری نواز علی صاحب کے صاحب زاوے، کچھ دنوں سے وہ یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

شاکر علی کے جواب نے میرے وجود میں سنسنی دوڑادی۔ وہ ایک بہت ہی اہم انکشاف کر رہا تھا۔ ملک نواز علی کا سپوٹ چھوٹا چوہدری کراچی میں موجود تھا۔ گویا چوہدری نواز علی اور چوہدری عابد علی کی جوان اولاد آپس میں کھرانے والی تھی۔ فیصل میری جانب پیش قدمی نہ بھی کرتا تو میں اسے ضرور دھونڈ نکالنے کی کوشش کرتا۔

اپنے اندرونی جذبات کو چہرے کے تاثرات سے ظاہر آتش فشاں حصہ ۱۱

نہ کرتے ہوئے میں نے شاکر علی سے سراپے والے انداز میں کہا۔ ”تم نے بچ بول کر میرا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ میں فیصل کی کراچی میں آمد سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ اب تم یہ بھی بتا دو“ فیصل اور تارا سیاہ لینڈ کروئرز میں کہاں گئے ہیں؟“

”وہ دونوں گلشن والے جنگل پر گئے ہیں“ اس نے بتایا

”ان کی شب بیری کہاں بندوبست کیا گیا ہے؟“

میں نے پوچھا ”گلشن میں وہ بنگلا کس جگہ واقع ہے؟“ اس نے جنگل کے گہرے تارے کے بعد لویشن کی جو وضاحت کی اس کے مطابق وہ بنگلا حسن اسکاؤٹ اور نیا چورنگی کے درمیان واقع تھا۔ میں نے یہ معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ وہ علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا۔

شاکر علی نے ساجت آیمیز انداز میں کہا ”میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر آپ کو یہ معلومات فراہم تو کر دی ہیں لیکن میری ایک درخواست ہے۔“

میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا، وہ بولا ”اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔ آپ میری مجبوری کو سمجھ رہے ہیں نا۔“

”تم اس حوالے سے بے فکر ہو جاؤ“ میں نے قسلی آیمیز انداز میں کہا۔

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ کہیں دور ایک مخصوص سائزن کی آواز سنائی دی ”اس قسم کا سائزن یا تو پولیس موبائل سے خارج ہوتا تھا یا پھر کسی ایسپینس سے“ میں نے کبیر شاہ سے کہا۔

”شاہجی! رشتی کو شاکر کے پاس بھیج دو۔ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکھ سکتے۔“

کبیر شاہ نے کن کی ٹال سے ٹوکاؤے کر رشتی کو ہاتھ روم میں ”مٹل“ کر دیا۔ شاکر نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

”آپ اس کو میرے پاس کیوں بھیج رہے ہیں؟“

”تاکہ رات کے پانی مجھے کو تم یادگار ناکو“ میں نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

وہ پوچھا ”کیا“ میں نے اس کا کیا کر دیا؟“

”تم اس کے پیچھے کا تقاضا پورا کرو گے؟“ میں نے کہا

”یعنی اپنے پاس کے پیسے پورے کر دو گے؟“

رشتی کو اس مقصد کے لیے متید کیا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے وہاں کوئی نہ نہ کر سکے۔

خصوص قسم کے سائزن کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ آواز کا رخ اور زاویہ بتا رہا تھا کہ وہ گاڑی ہماری ہی سمت میں دواں دواں ہے۔ ہم نے ایک دوڑ لگا کر جنگل کی عقبی دیوار پھاندی اور اپنی موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گئے۔ اس مقام پر اندھیرے اور سانپوں نے ڈیرا ہمارا تھا۔ ”سامان“ سمیت موٹر سائیکل محفوظ تھیں۔

ہم نے آن واحد میں اپنی ”گٹیاں“ اشارت کیں اور سائزن کی مختلف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ایک منٹ بعد وہ مخصوص آواز ہماری ساعت کے دائرہ کار سے باہر ہو گئی گویا ہم محفوظ جگہ پر پہنچ گئے تھے۔

میری شرٹ قبا کے خون سے بری طرح آلود ہو گئی تھی۔ ہم زیادہ دیر تک سڑکیں ٹانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے چنانچہ جب ہمیں اطمینان ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو ہم نے موٹر سائیکل کا رخ ”ساؤتھ“ کی جانب موڑ دیا۔ جب ہم ساؤتھ پہنچے تو ہماری اذان ہو رہی تھی۔

\*\*\*

سیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اس پارک میں لگ بھگ دو درجن افراد عمرخیزی میں مصروف تھے جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مذکورہ پارک ”ساؤتھ“ سے اونگڑا گیا تھا اور ایک جدید ترین خوبصورت مسجد سے ملحق تھا جس کی پارک ہی کے ایک کونے میں بنی ہوئی تھیں۔ ڈیفنس سوانی کے اہل ثروت حضرات نے عبادت کے لیے مسجد بھی شاد اور دلکش بنوائی تھی تاکہ یا دالی میں مصروفیت کے دوران میں بھی ان کا احساس تقاخر کی منزلوں کو چھوڑنا ہے۔ ایک طرح سے شہر طرز فکر تھا کیونکہ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے سلسلے میں لوگ ب سے زیادہ تجویس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض تو ایسے خالص ہوتے ہوئے بھی مفلس و نادار بن جاتے ہیں۔

میں اس وقت نیوی بلوٹریک سوٹ (SUIT) میں تھا اور پارک کے ایک کونے میں سائزن کی (TRACK) میں تیار کر رہا تھا۔ ساؤتھ پہنچ کر سب سے پہلے میں نے ہاتھ لے کر لباس تبدیل کیا تھا۔ کبیر شاہ نے جب سونے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے یہ اہل خاندان نہیں آ رہی لہذا میں انیسر سائز کے لیے نزدیکی پارک جاؤں گا۔ پارک اسی وقت میری نگاہ میں سما گیا تھا۔ جب احتیاجات ساتھ میں پہلی مرتبہ ساؤتھ آیا تھا۔ احتیاجات نے منزل

نہر کو اڑپورٹ سے ساؤتھ پہنچایا تھا۔ جب میں نے نہر سائز کا ارادہ ظاہر کیا تو کبیر شاہ نے مجھے یہ خبر انداز ٹریک پر فراہم کر دیا تھا۔

یہ پوری رات جس کی اب صبح ہو رہی تھی، میں نے اپنی افواہی اور نمیشن میں گزار دی تھی اس لیے یوگا کی ایک مخصوص مشق کے ذریعے میں اپنے حواس اور اعصاب کو یکساں بنانا چاہتا تھا۔ میں پارک کے کونے میں شمال رخ کی آسن (LOTUS POSTURE) جھاکر بیٹھ گیا۔

بعض بند کر کے میں نے چند ہموار اور گرمی گری سائیں بنائیں۔ اس کے بعد میں نے دائیں ہاتھ کے انگلیوں اور تخت شاد کے ملا کر ایک چنگی بنائی اور اپنی ناک کو اس کے اندر جکڑ لیا۔ یہ جکڑت نرم خوشی۔ پھر میں نے یوگا کی اس مخصوص مشق کا آغاز کر دیا جو پرانا یا نام (PRANAYAM) کہلاتی ہے۔ میں نے اپنے تجربے اور مارت کے پیش نظر اس مشق میں کچھ ترسیم و اضافہ کر لیا تھا لیکن یہ زیادہ مفید اور سودمند ہو گئی تھی۔

میں نے انگشت شاد سے بائیں نتھے کو دبائے رکھا اور دائیں نتھے پر سے انگوٹھے کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دھیرے دھیرے سانس کو اندر کھینچنا یعنی (INHALE) کرنا شروع کیا۔ میرا تصور اس نکتے پر جما ہوا تھا اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی تو یا دالی اس سانس کے ساتھ ہی میرے نتھے کے واسطے سمجھیں میں ابھر رہا ہے۔ براؤن فیلٹریشن (FILTRATION) کی غرض سے جو خون سمجھیں میں میں پپ کر رہا ہے یہ نور اس خون میں شامل ہوتا ہے پورے بدن میں گردش کر رہا ہے۔ (INHALE) یا مکمل تک میں اس تصور پر قائم رہا پھر میں نے انگوٹھے سے دائیں نتھے کو دبا کر بائیں نتھے کو آزاد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سانس خارج کرنے کا عمل یعنی (EXHALE) ہوتا ہوا گیا۔ میں دھیرے دھیرے سانس چھوڑتے ہوئے ہے پھر دوبارہ اس سانس کے ساتھ میری تمام ذہنی، جسمانی، روحانی خرابیاں بھی میری ذات سے خارج ہو رہی ہیں۔ تصور کے ساتھ ہی خارج ہوتی ہوئی سانس مجھے آلودہ اور ہلکی محسوس ہونے لگی جبکہ (INHALE) کرتے وقت سانس انتہائی لطیف اور نور سے معمور تھی۔

میں نے تقنوں کی تبدیلی کے ساتھ یہ عمل چھ مرتبہ دہرایا۔ گویا میں نے اس مشق کے چھ چکر پورے کر لیے تھے۔ غرض کہ جسم اور روح بالکل تروتازہ ہو گئے۔ مجھے اپنے سانسات میں ایک ٹھنڈک اور جذبات میں خوش بو اتارنی

محسوس ہوئی۔ میری ذات معطر ہو گئی۔ اگر بھر پور تصور کے ساتھ ”ایامام“ کی یہ ساوہ سی مشق کی جائے تو یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مشق کے اختتام پر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلیں تو میری نگاہ ایک مسکراتے ہوئے حسین چہرے سے ٹکرائی۔ وہ ایک سنگی بیٹھ پر بیٹھی تھی اور بڑے دل آویز انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے یوں پر ملکوتی مسکراہٹ تھی تھی۔ جو اپنی زہرب لب مسکرایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس پارک کے گرد گرد گھاس کے مستطیل قطعے کے چاروں جانب جو لگ اور اونگڑ کرنے والوں کے لیے ایک پختہ ٹریک بنایا تھا۔ میں گھاس سے اٹھ کر جب اس ٹریک پر آیا تو اسی حسین چہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر کیوں مسکرا رہی تھی؟ میری یادداشت نے پلک جھپکتے میں مجھے بتا دیا کہ یہ چہرہ نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس کی دلکش مسکراہٹ کیا معنی رکھتی تھی؟

میں انہی سوچوں میں غلطان چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اپنے عقب میں مجھے ایک محترم نسوانی آواز سنائی دی ”ایسٹید زی مشہ!“

میں نے پلٹ کر دیکھا تو اسی حسین چہرے سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ وہ مجھ سے پانچ فٹ کی دوری پر تھی اور بڑی گرمی نظر سے میرے خال و خلو کو کھوج رہی تھی۔ میں نے اس سے خطاب ہوتے ہوئے کہا۔

”سوری۔ آپ نے مجھے آواز دی ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی ”میرا نام صدف ہے۔ میں اس سامنے والے جنگل میں رہتی ہوں“ پھر اس نے پارک کے باہر ایک جنگل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ جنگل جس کا گیت خرابی شکل کا ہے۔ اس پر نیلا رنگ ہوا ہے اور پینڈل پینڈل کے ہیں۔“

میں نے غیر ارادی طور پر نگاہ اٹھا کر مذکورہ جنگل کے گیٹ کو دیکھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ مجھے اپنے بارے میں اس تفصیل سے کیوں آگاہ کر رہی تھی جبکہ میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے میرے چہرے کی انجمن پڑھ لی۔

”آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ سے خواہ مخواہ کیوں فری ہو رہی ہوں؟“ وہ تبسم ریزہ انداز میں بولی ”دراصل آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو رہی ہے۔ آپ تو انڈیا میں تھے۔“

حیران تو میں پہلے ہی تھا۔ اب اس حیرت میں کئی چند اضافہ ہو گیا۔ وہ میری ذات سے انڈیا کو منسوب کر رہی تھی۔ میں فوراً ریڈ الارٹ ہو گیا۔ اپنے اندرونی جذبات کو چرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور قدرے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟“

”اگر میری آنکھیں اور یادداشت دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو آپ کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔“ وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی ”انڈیا کی پنک ٹی یعنی جے پور میں۔“

جے پور کے ذکر پر میں چونک اٹھا۔ پنک ٹی کے نام سے معروف ہندوستان کا یہ شہر ایک طویل عرصے تک میری آماجگاہ رہا تھا۔ اسی شہر میں صدف ثانی یہ لڑکی مجھے دیکھنے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات اور چہرے کے تاثرات کو حتی المقدور چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو کبھی انڈیا گیا ہی نہیں، پھر جے پور اور پنک ٹی میں میرے پائے جانے کا کیا سوال؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس سے پوچھا ”آپ نے وہاں کس جگہ مجھے دیکھا تھا۔ کیا ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اگر ہوئی تھی تو مجھے کیوں یاد نہیں؟“

میں نے دانستہ اس قسم کا انداز اپنایا تھا کہ وہ میرے چور خیالات کو نہ سمجھ سکے۔ اس نے مجھے بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے وضاحت کی۔

”ہماری وہاں ملاقات ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے آپ کو براہ راست دیکھا ہے۔“ اس نے بدستور گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”جے پور میں میرے ماموں سرفراز خان رہتے ہیں۔ وہاں ان کا لیدر کا بزنس ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں ان کے پاس جے پور گئی ہوئی تھی۔ میں نے جے پور کے اخبارات میں آپ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ آپ نے اس شہر کے پنڈتوں کی خینیس حرام کر رکھی تھیں۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نامی ایک مقامی طاقت ور شخص آپ کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ آپ کے معرکوں کی خبریں جے پور کے اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ آپ نے کسی ہندو ناری رانی روپ متی کو بھی اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ ایک منسلکے کے ہندو ناری سے تعلقات پر وہاں کے پنڈت اور پوجاری سخت مشتعل تھے۔ آپ کا نام وجدان ہی ہے نا؟“

صدف نے جو کچھ بیان کیا، وہ مٹی پر حقیقت تھا مگر میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ایک اجنبی لڑکی سے پہلی

ہی ملاقات میں، میں کھل نہیں سکتا تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ میں آگ اور خون کے دریا سے گزر رہا تھا۔ گزشتہ رات والا واقعہ اس کی مثال کے لیے کافی ہے۔ میں نے کامیاب اداکاری کا مظاہرہ جاری رکھتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑے ٹھہراؤ سے کہا ”میں بھڑکی مکوں گلا کہ آپ اس وقت کسی سخت قسم کی غلط فہمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میرا نام وجدان نہیں بلکہ ودیہ ہے اور میں کبھی انڈیا نہیں گیا۔ ممکن ہے، آپ کے بیان کردہ وجدان کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہو جس کی وجہ سے آپ مجھے وجدان سمجھ رہی ہیں۔“

اس نے توجہ سے میری بات سنی اور بے چینی سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”اگر آپ کی مانگ کو ختم کر کے چہرے سے مونچھوں کو ہٹا دیا جائے تو آپ ودیہ وجدان بن جائیں گے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ خیر۔“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اپنے چہرے میں مونچھیں اور ہیئر اسٹائل کی تبدیلی میں نے امتیاز علی کے مشورے پر کی تھی۔ صدف کا مشاہدہ بہت قوی تھا۔ یہ تو میری ضد لائن کاری تھی کہ میں اس سے اتفاق نہیں کر رہا تھا ورنہ وہ تو صدف کی صدیچھے پہچان گئی تھی۔

صدف کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ گداز بدن کے ساتھ یہ قامت قیامت میں بدل گئی تھی۔ اس پر چہرے کی دکاشی اور مخصوص ملکوتی مسکراہٹ نے اس کی شخصیت کو انفرادیت دے کر ایک حسین کھارے نواز دیا تھا۔ مجھے اپنے سراپا سے نگاہی تعارف میں مصروف پا کر اس نے پوچھا۔

”وجیہ صاحب! میں نے آپ کو وجدان سمجھ کر خواہ زحمت دی۔ آئی ایم ریلی ویری سوری۔“

”تو مینشن پلیز۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پوچھا ”کیا آپ یہیں قریب ہی رہتے ہیں؟“

”نہیں۔ میں کراچی میں نیا ہوں۔ ایک دوست کے ہاں مہمان ٹھہرا ہوا ہوں۔“ پھر میں نے اسے فلیٹ کا ایڈریس دیا۔

”میرا دوست اسی فلیٹ میں رہتا ہے۔ دو چار دن بعد میں واپس اپنے شہر لاہور چلا جاؤں گا۔“

”اوہ! تو آپ کا تعلق لاہور سے ہے۔“ وہ چوکی اور مسکراتے ہوئے بتایا ”میری مہاجر لاہور کی رہنے والی ہے۔ پایا مقامی ہیں۔ میری تنصیل لاہور میں شادمان کالونی میں ہے۔ آپ وہاں کس جگہ رہتے ہیں؟“

”جمہور!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

جب میں دو ماہ کا تھا تو میرے والد صاحب چوہدری نواز ش کے پتو غنہ دار اسے مجھے بچاتے ہوئے لاہور کے کئی علاقوں میں روپوش ہوئے تھے موضع ”رکھال والی“ سے گلشن راوی اور پھر جمہور میں ان کا قیام رہا تھا۔ انہیں بعد وہ کراچی آگئے پھر ایک دوست کے توسط سے سنگاپور چلے گئے تھے۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسز وجہ۔“ صدف کی آواز نے مجھے خیال سے چونکا دیا۔ ”میں ڈاؤن میں بیٹھ چڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا فاضل ایئر ہے۔ ایک سال بعد انشا اللہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ آپ کیا اسٹڈی کر رہے ہیں؟“ میں نے سرسری انداز میں بتایا ”میں کرکبوشن سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ والد صاحب کا سونے کا بزنس ہے۔ انہی کا ہاتھ بناتا ہوں۔ انارکلی میں ہماری جیولری کی بہت بڑی دکان ہے۔“

یہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے دل میں سخت افسوس ہوا رہا تھا لیکن مجھے حالات اور مصلحت کا تقاضا سمجھنا بھی ضروری تھا خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ بچہ پور میں میری ماضی کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھی۔ میں نے سوچا بعد میں کبھی اگر ملاقات کا موقع ملا تو میں اس غلط بیانی کے لیے معذرت کر لوں گا۔

اسی لمحے صدف نے مجھے پکارا ”اوکے مسز وجہ! زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ میرے پاپا نماز ادا کر کے مسجد سے نکل آتے ہیں۔ اب میں ان کے ساتھ واک کروں گی۔ میں یہاں روزانہ مارننگ واک کرنے آتی ہوں۔“

آخری جملہ صدف نے کچھ اس انداز میں ادا کیا تھا جیسے مجھے کوئی خاص قسم کی اطلاع دے رہی ہو۔ میں اس کو سی آف کر کے پارک سے نکل آیا۔

واپس ساؤتھ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ ظاہریہ دنیا بہت بڑی نظر آتی ہے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہزاروں میل پھیلی ہوئی۔ لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو یہ بہت چھوٹی سی دنیا ہے۔ یہاں ہم بار بار ایک دوسرے سے سامنا کرتے ہیں۔ کبھی بچپان کر آگے بڑھتے ہیں اور پھر جوش انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی۔۔۔ بچپان کر کبھی نہیں بچپان پاتے، چند رسی جھلوں کا تابلو کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں کیفیات کے بیان کے لیے میری اور صدف کی ملاقات کی مثال کافی ہے۔ وہ مجھے بچپان کر آگے بڑھی تھی

لیکن میں کتنا اکر نکل آیا تھا۔

ساؤتھ میں واپسی پر اشتیاق احمد سے ملاقات ہوئی۔ اشتیاق میری کراچی میں آمد اور ”سی ایف کے“ میں شمولیت سے قبل امتیاز کے ساتھ اس کے چھوٹے بھائی کی مشیروں سے ملاقات دوڑ والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ”کبیر بھائی تو سوچے ہیں۔ انہوں نے میری ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ رہوں اور آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھوں۔“

میں نے کہا ”اشتیاق اپنی اہمال میں بھرپور ناشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد آرام کا راوہ ہے۔ تمہاری یہ ذہنی صلاحیتیں آسان ثابت ہوگی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے لیے ناشتے کی بندوبست کرنے چلا گیا۔

آئندہ آٹھ گھنٹے میں، میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ گزشتہ پوری رات میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہیں لگائی تھی۔ پیٹ میں خوراک کتنی تو مجھ پر کسل مندی سوار ہو گئی تھی۔ رات والے خونچاک آریٹش نے مجھے جھلجھلائی جان خالی کھینکس۔ اس وقت دیوار گیر ہلک سا آٹھ بجایا اور اعصابی طور پر تھکا دیا تھا۔ یوگا کی مشق نے جہاں مجھے کھل سکون بخشتا تھا وہیں میری بھوک کو بھی بھرنا کا خاصا کام تھا۔ اس نتیجے میں، میں تین افراد کا ناشتہ عمدہ میں ادا کر چکا تھا۔ اسی اوور اینٹنگ نے مجھے ایک شمار کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اپنے لیے مخصوص کمرے میں جا گیا۔

جب میں بستر دراز ہوا تو صدف چپکے سے میری صف میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے پارک میں اس سے ملاقات ہوئی تھی، میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فرض کیا، اگر میں اس کی بات کی تصدیق کر دیتا تو خود کو وجدان تسلیم کر لیتا تو اس کا رد عمل کیا ہوتا؟ اور اب جب کہ میں نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے خود کو بیہوش کرنے کی کوشش کی تھی تو اس سے وہ کیا تاثر لے گا؟

یہ دونوں سوالات ایسے تھے کہ میں اپنے ذہن میں اس کا کوئی حتمی جواب تلاش نہیں کر سکا۔ صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خیال آپوں آپ ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں گزشتہ رات اس کے پاس سے بڑے جذباتی انداز میں رخصت ہوا تھا۔ اپنی پیشانی پر اس کے ہونے کی خوشبو میں ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ ساحل ایک مہلکا ہوا پھنسا تھا۔ اس کا قرب میرے تن بدن کو اپنی مٹک سے چسپاں تھا۔ جب سے اس نے گریز کی ”پالیسی“ اپنائی تھی، میری

طلب میں کتنی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس حرارت میں بولتے سے قبل، میں بنتوں سے اس کے کس بو کا تھا۔ اگر مجھے بنگالی حالات کے پیش نظر، آپس میں جانا ہوتا تو میں اس کے یا قوتی لیوں کو اپنی پیشانی پر لٹا دیتا۔

دراست زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ساحل کے شگرفی کی انگاری سے کم نہیں تھے وہ انگارے جو جلاتا ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں اور آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھوں۔ اس کا کوئی کرنا ہے اور احساسات کو مکنا ہے۔ اس کا میں نے کہا ”اشتیاق اپنی اہمال میں بھرپور ناشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد آرام کا راوہ ہے۔ تمہاری یہ ذہنی صلاحیتیں آسان ثابت ہوگی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے لیے ناشتے کی بندوبست کرنے چلا گیا۔

آئندہ آٹھ گھنٹے میں، میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ گزشتہ پوری رات میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہیں لگائی تھی۔ پیٹ میں خوراک کتنی تو مجھ پر کسل مندی سوار ہو گئی تھی۔ رات والے خونچاک آریٹش نے مجھے جھلجھلائی جان خالی کھینکس۔ اس وقت دیوار گیر ہلک سا آٹھ بجایا اور اعصابی طور پر تھکا دیا تھا۔ یوگا کی مشق نے جہاں مجھے کھل سکون بخشتا تھا وہیں میری بھوک کو بھی بھرنا کا خاصا کام تھا۔ اس نتیجے میں، میں تین افراد کا ناشتہ عمدہ میں ادا کر چکا تھا۔ اسی اوور اینٹنگ نے مجھے ایک شمار کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اپنے لیے مخصوص کمرے میں جا گیا۔

جب میں بستر دراز ہوا تو صدف چپکے سے میری صف میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے پارک میں اس سے ملاقات ہوئی تھی، میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فرض کیا، اگر میں اس کی بات کی تصدیق کر دیتا تو خود کو وجدان تسلیم کر لیتا تو اس کا رد عمل کیا ہوتا؟ اور اب جب کہ میں نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے خود کو بیہوش کرنے کی کوشش کی تھی تو اس سے وہ کیا تاثر لے گا؟

شاہ پر نظر پڑ گئی۔ وہ برآمدے میں ایک کرسی پر نیم دراز تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔ ”اچھا ہوا، تم خود ہی اٹھ گئے ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ تیس جگنا پڑے گا۔“

”کیوں کوئی خاص بات؟“ میں یہ کہتے ہوئے اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مکرراتے ہوئے بولا ”سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ کھانے کا وقت ہے اور مجھے ٹھیک ٹھاک بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کھانے کے دوران میں دوسری خاص باتیں بھی ہو جائیں گی۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”ویسے تمہارے لیے سب سے خاص اطلاع یہ ہے کہ آج شام چھ بجے غوری صاحب یہاں پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے فون کیا تھا۔ تم اس وقت سو رہے تھے میں نے تمہیں جگنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے میں نے غوری صاحب کو گزشتہ رات والی کارروائی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ ہماری کارکردگی پر بہت خوش ہیں البتہ میاں زاہد کے نکل جانے کا انہیں خاصا افسوس ہے۔“

”ہاں شاہجی! افسوس تو مجھے بھی بہت ہے۔“ میں نے گنبد لہجے میں کہا اور میرے تصور میں وہ تمام مناظر گھوم گئے جو ڈینکس کے بگلا نمبر ”بی۔ تھری ایٹ“ میں دیکھنے کو ملے تھے۔

کبیر شاہ نے کہا ”تم فکر نہ کرو وجدان! وہ زیادہ دیر تک ہم سے دور نہیں رہ سکے گا ہمیں زاہد حسین کے گلشن والے ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے۔ آج رات ہم وہاں ریڈ (RAID) کریں گے۔ باس بھی جب تک یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ ان کا مشورہ اس سلسلے میں ہمارے لیے منیہ ثابت ہو گا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”شعبہ ہماری بہتر طور پر راہ نمائی کر سکتا ہے۔ میں میاں زاہد حسین کی تلاش میں ایک نہیں، ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ آڈن اور ٹھکانوں پر یلغار کر سکتا ہوں۔ وہ ہاتھ پاؤں بھی چھپ بیٹھا تو میں اسے دم سے پکڑ کر کھینچ نکالوں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”میں تمہارے جذبات کو محسوس کر سکتا ہوں۔“

”شاہجی! میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا ”بی۔ تھری ایٹ“ میں ہم اپنے آوی فرخ خان کو بھی باندھ کر چھوڑ آئے ہیں۔ اس کا پتا نہیں لگایا ہو گا؟“

کسی نہ کسی طرح خود کو ان بندشوں سے آزاد کر لیا ہو گا۔ میرا خیال ہے 'شاکر علی' کی چیخ پکار پر وہ ان دونوں کو ہاتھ دوم سے باہر لے ہوں گے۔ "کبیر شاہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر معنی خیز انداز میں بولا "تپا نہیں، شاکر علی نے اپنے پاس کی چنگی ادا کی کا حق وصول کر لیا ہو گا یا نہیں!"

میں سمجھ گیا، اس کا اشارہ حشر خیز دن کی مالک کال گرل رشتی کی جانب تھا۔ میں نے رشتی کو معذور شاکر کے ساتھ ہاتھ دوم میں بند کر دیا تھا۔ رشتی اور اس کی دونوں ساتھیوں نازش اور مرزا کو ایڈیٹس پے منٹ پر وہاں لایا گیا تھا۔

کبیر شاہ کے ساتھ میں نے واجبی سانچ لیا۔ اس کی وجہ صبح والا انگڑا ناشتا تھی۔ اس وقت مجھے کوئی خاص محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا پھر میں کبیر شاہ سے آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

آرام تو میں اچھا خاصا کر چکا تھا۔ اس وقت میں دراصل ساحل کو فون کرنا چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر مجھے مکمل براؤنی میسر آ جاتی۔ ساڑھ میں شام سے پہلے میرے لیے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ شیب غوری شام چھ بجے آ رہا تھا جس کا مطلب تھا وہ پاکستانی وقت کے مطابق صبح دس بجے کے قریب جہاز میں سوار ہوا ہو گا۔ راجی اور مارٹینس (Mauritius) کے درمیان کم و بیش آٹھ گھنٹے کی فاصلت تھی۔

میں نے منہاس باقر کے بیٹے کا فون نمبر پوچھ لیا۔ تیسری گھنٹی پر دو سری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ وہ واحد تھا۔ میں نے رمی علیک سلیک کے بعد اس سے 'ساحل' سے بات کرانے کو کہا۔

وہ بولا "مسٹر ویدان! وہ تینوں نکلی ہوئی ہیں، شاپنگ وغیرہ کے پکرمیں۔"

"ان کی واپسی کا امکان کب تک ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا "اگر آپ کہتے ہیں تو میں سے پوچھ کر بتا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہو گا وہ کب سے نکلی ہوئی ہیں؟"

"نہیں" میں نے بھی نہیں معلوم۔ "اس نے معذرت آمیز انداز میں جواب دیا "میں ابھی ٹھوڑی دیر پہلے کالج سے آیا ہوں۔ وہ میری آمد سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے" میں بعد میں فون کرلوں گا۔ "میں نے کہا۔

"کوئی خاص بات تھی مسٹر ویدان؟"

"نہیں" میں ایسے ہی ساحل کی خیریت معلوم کرنے لیے فون کیا تھا۔

"خیریت کے سلسلے میں تو اب بالکل بے فکر ہیں۔ یہ منہاس باقر کا بگلا ہے۔" وہ فخر سے کہنے میں بولا۔

"ہاں" وہ تو ہے۔ "میں نے کہا اور اقتصادی کلمات ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

واجدہ نے بڑے فخر سے انداز میں مجھے بتایا تھا کہ وہ منہاس باقر کا بگلا تھا۔ یہ ایک بیٹے کا اپنے باپ پر مضبوط احاطہ تھا۔

مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ آج کل کی اولاد کے دوسرے بہت بدل گئے ہیں۔ وہ اپنے والدین پر فخر کرنے کے بجائے اعتراضات کرتے ہیں اور پھر لمحے ان کی غلطیاں اور کوتاہیاں گوانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان دنوں منہاس باقر کے گھر میں شبانہ کی شادی کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ وہ بیٹے ہونے اس کی شادی تھی۔ منہاس اس کی شادی میں شرکت کے لیے ہی "نمی سر" سے کراچی پہنچی تھی۔ جب ہماری اس سے ایک ریسٹورنٹ میں اتفاق ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت بھی شبانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔

ایسا سوچتے ہوئے میرا دھیان ان دونوں لفظوں کی طرف چلا گیا جو خود کو فری لانسر کہلاتے تھے اور کرایے پر مختلف جرم کرتے تھے۔ بی۔ تھری ایٹ کے کسی محمود لاٹانی

سیاست دان نے انہیں ممتاز کا کھوج لگائے پر مامور کیا تھا۔ ازاں بعد مجھے پتا چلا بی۔ تھری ایٹ میں میاں زاد حسین رہتا تھا۔ گزشتہ رات ہم نے مذکورہ ہنگلے پر حملہ کر کے اپنے دشمنوں کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا تاہم میاں زاد ہمیں جل دینے میں کامیاب رہا تھا۔

فری لانسر فٹنڈے وقار نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں محمود لاٹانی کے ایما پر مدھوری ڈکٹ (ممتاز) کا تعاقب کر رہے تھے تو میں اس معاملے کو سمجھ نہیں سکتا تھا پھر گزشتہ رات میں نے بی۔ تھری ایٹ میں تارا کی جھلک دیکھی تو ساری بات پوری وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں اتر گئی۔ تارا ممتاز کی جانب سے بہت اوصار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کا کھنچ نکالوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ممتاز کی مضبوط کی تحویل دی ہو اور اس کا جوڑی دار و دیر الکر سومو پولیس کی تحویل میں گئے تھے۔ تارا کو کراچی میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کیوں کہ ان کا جرم ایسا نہیں تھا کہ اتنی جلدی چھوٹ جاتے۔ بہر حال میاں کی پولیس اور قانون کے چمکا رہی تھیں قدم پر دیکھ رہا تھا!

نار کا خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ گزشتہ رات تھری ایٹ سے گلشن اقبال چلا گیا تھا اس لیے میرے بچے کیا اور سب سے اہم بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ منہاس باقر کی نوازش علی کا بیٹا فیصل بھی تھا۔

اس کی حالت میں پولیس کے حوالے کیا گیا تھا لیکن نو ذہنی حالت میں پولیس کے حوالے کیا گیا تھا لیکن میں نے اسے بالکل ٹھیک ٹھاک اور چاق و چوبند دیکھا۔

اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ پوری طرح فٹ ہو کر ان میں اترا آیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔

میں بستر نیم دراز پر باتیں سوچ رہا تھا لیکن دل ساحل کی طرف کھٹک رہا تھا۔ جب بے کلمی بڑھی تو میں کمرے سے نکل آیا۔ میں نے ساڑھ کے قائم مقام کر تادھر تا کبیر شاہ کا کہہ کر ٹھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔

"کیا تم اکیلے ہی جانا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیا میرے ساتھ جانے میں کوئی قحاح ہے؟"

"نہیں" ایسی تو کوئی بات نہیں۔ "وہ گڑبڑا کر بولا "میں تو نازی حفاظت کے خیال سے پوچھ رہا تھا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "شکریہ دوست۔ میں زیادہ نہیں جاؤں گا۔ اور میں اکیلے ہی جانا چاہتا ہوں۔"

وہ انہماک میں سر ملاتے ہوئے بولا "واپسی کب تک ہو گی؟"

"مندی آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں یہ تو یاد ہی ہو گا کہ پاس چھ بجے کی فاصلت سے جی پہنچ رہے ہیں۔ سات ساڑھے سات بجے وہ ہنگلے پر آئے گا۔ میں انہیں لینے اڑ پورٹ جاؤں گا۔" کبیر شاہ نے ہائی کے طور پر کہا "جب تک تم واپس آئیے کچھ ہو گے؟"

آخری جملہ اس نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا "شیتور۔ ساڑھے سات بجتے میں ابھی کم از کم چار گھنٹے باقی ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی تمہیں ساڑھ میں موجود لگاؤں۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مطمئن ہو گیا۔ میں اپنی ٹیلی شیڈ میں ساڑھ سے لائن ہو گیا۔ یہ گاڑی شیب غوری نے مجھے دوستی کی خوشی بہار طور تحفہ دی تھی جس کا نمبر انتہائی آسان اور مرتب تھا۔

"میں دن نو، تھری، فور۔ اس نمبر کا مجموعہ دس بنتا تھا جس کا نمبر وہ ایک ہوتا ہے۔ یہ عدد میرے نام کے عدد سے ہو یہ نمبر کرتا تھا۔ ویدان کا مجموعہ انیس بنتا ہے اور اس کی مفرد نو ذہنی "ایک" ہی ہے۔ نمبر کی پیچیدگی ایک اچھا شگون تھا۔

میں نے منہاس باقر سے کہا "ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے، ہمیں ان کی تلاش شروع کر دینا چاہیے۔"

"میں نے تلاش شروع کر دی مسٹر ویدان!" منہاس باقر نے کبیر شاہ سے کہا پھر بتایا "میں نے ڈیفنس اور گلشن کے بڑے بڑے ڈائرنٹل اسٹورز پر فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے خاص طور پر ان اسٹور سے میں نے رابطہ کیا ہے جہاں شبانہ اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔"

"پھر ادھر کی کارپورٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "دو اسٹورز نے اس بات کی تصدیق کی

میں نے مسجد والے پارک سے شیر ڈکوزن کیا اور نیچل ہائی وے (میں کورنگی روڈ) پر آ گیا۔ اس وقت میں ڈیفنس فیز ون اور نو کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ کشمیر کالونی کے سٹکل سے میں نے گاڑی کو میں اتحاد پر ڈال دیا۔ یہ خیابان سیدھی سی ویو کو جاتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں منہاس باقر کے ہنگلے پر پہنچ گیا۔

منہاس اس وقت گھر پر ہی تھا۔ اس نے مجھے زرا تنگ روم میں بٹھایا۔ اس کی زبانیں مجھے معلوم ہو کر وہ تینوں (ساحل + ممتاز + شبانہ) ابھی تک شاپنگ سے واپس نہیں آئی تھیں۔

میں نے منہاس سے پوچھا "وہ کتنے بجے کی گئی ہوئی ہیں؟"

"تیسری وائف بتا رہی ہیں، وہ لگ بھگ گیارہ بجے گھر سے نکلی تھیں۔"

"گیارہ بجے!" میں چونک اٹھا پھر رست واپس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اس وقت چار بجنے والے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، وہ کم و بیش پانچ گھنٹے سے باہر ہیں۔" پھر میں نے منہاس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں کہا "اٹ اٹ از ٹوچ منہاس صاحب!"

"ہاں" اب تو مجھے بھی تشویش ہو رہی ہے۔ "وہ فکر آمیز انداز میں بولا "خاص طور پر اس صورت میں کہ شبانہ نے اس دوران میں کوئی فون بھی نہیں کیا۔ اگر اسے گھر سے زیادہ دیر باہر رہنا پڑتا ہوتا ہے تو کتنے دو کتنے میں وہ ایک آدھ بار رنگ ضرور کر گیتی ہے۔"

میں ساحل کے لیے سخت فکر مند ہو گیا۔ اس وقت گھر میں منہاس اور اس کی مفلوج بیگم کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔واجدہ ٹھوڑی دیر پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا تھا۔

میں نے منہاس باقر سے کہا "ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے، ہمیں ان کی تلاش شروع کر دینا چاہیے۔"

"میں نے تلاش شروع کر دی مسٹر ویدان!" منہاس باقر نے کبیر شاہ سے کہا پھر بتایا "میں نے ڈیفنس اور گلشن کے بڑے بڑے ڈائرنٹل اسٹورز پر فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے خاص طور پر ان اسٹور سے میں نے رابطہ کیا ہے جہاں شبانہ اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔"

"پھر ادھر کی کارپورٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "دو اسٹورز نے اس بات کی تصدیق کی

میں نے منہاس باقر سے کہا "ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے، ہمیں ان کی تلاش شروع کر دینا چاہیے۔"

"میں نے تلاش شروع کر دی مسٹر ویدان!" منہاس باقر نے کبیر شاہ سے کہا پھر بتایا "میں نے ڈیفنس اور گلشن کے بڑے بڑے ڈائرنٹل اسٹورز پر فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے خاص طور پر ان اسٹور سے میں نے رابطہ کیا ہے جہاں شبانہ اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔"

"پھر ادھر کی کارپورٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "دو اسٹورز نے اس بات کی تصدیق کی

میں نے منہاس باقر سے کہا "ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے، ہمیں ان کی تلاش شروع کر دینا چاہیے۔"

"میں نے تلاش شروع کر دی مسٹر ویدان!" منہاس باقر نے کبیر شاہ سے کہا پھر بتایا "میں نے ڈیفنس اور گلشن کے بڑے بڑے ڈائرنٹل اسٹورز پر فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے خاص طور پر ان اسٹور سے میں نے رابطہ کیا ہے جہاں شبانہ اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔"

"پھر ادھر کی کارپورٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "دو اسٹورز نے اس بات کی تصدیق کی

ہے کہ بارہ اور ایک بیج کے درمیان انہوں نے کچھ خریداری کی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔  
 ”بارہ اور ایک بیج کے درمیان!“ میں نے پر خیال انداز میں دہرایا۔ ”اس بات کو بھی اب تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا شانہ پہلے بھی بغیر اطلاع اتنی دیر کے لیے گھر سے غائب رہی ہے؟“

منہاس باقر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا اور آج کل تو میں نے اسے خاص طور پر منع کر رکھا ہے۔ چند روز بعد اسے ماہوں بیٹھنا ہے۔ اس کا گھر سے زیادہ باہر نکلتا دیکھے بھی اچھا نہیں۔“

میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے ٹھٹھکنے لگا۔

منہاس نے کہا ”میں مزید پانچ بیج تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد عملی طور پر انہیں تلاش کیا جائے گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا ”میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس شہر کی پولیس اور انتظامیہ مجھ سے بھرپور تعاون کرے گی۔ انشاء اللہ ان بچوں کو کچھ نہیں ہو گا۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے“ میں نے ذول سے کہا۔

اسی وقت بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز ابھری پھر یہ ہارن بجتا ہی چلا گیا۔ منہاس باقر نے اپنے بنگلے کی حفاظت کے لیے ایک چاقو دو بند اور صحت مندی کی گارڈ رکھا ہوا تھا۔ میری آمد پر نذر محمد نامی اسی گاڑی نے گیٹ کھولا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ اسی وقت منہاس باقر نے کہا ”گتا ہے“ وہ واپس آگئیں۔“

ہم نے اختیار ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔ اسی لمحے کریم کلر ٹیوٹا نکولا بنگلے میں داخل ہوئی۔ یہ گاڑی شانہ کے استعمال میں رہتی تھی اور اس وقت بھی وہ اس کے استعمال میں تھی۔ یعنی وہ گاڑی میں اکیلی ہی تھی!

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ منہاس باقر پریشانی سے آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں گاڑی پورچ میں آکر رک چکی تھی اور شانہ بڑے تشویش ناک انداز میں اس سے برآمد ہو رہی تھی۔ منہاس باقر نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔

”کیا وہاں شانہ؟ وہ دونوں کہاں ہیں؟“  
 ”ڈیڑی! اندر چلیں“ شانہ نے روہانی آواز میں کہا ”غضب ہو گیا ڈیڑی!“

ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے اندر پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے کے بعد شانہ نے مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”مشرود جان! تم نے پہلے ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہی وقت آن پڑا ہے۔ اس بار تم نے ایک نہیں، دو لڑکیوں کو واپس لانا ہے جن میں ایک تمہاری ساتھی ساحل بھی ہے۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ”مضطرب کیجئے میں بولا“ ”سکون سے بتاؤ“ آخر ہوا کیا ہے؟ تم ان دونوں کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟“

”میں نے انہیں کہیں نہیں چھوڑا بلکہ وہ مجھ سے چھین لی گئی ہیں۔“ وہ گھبراہٹ سے آواز میں بولی پھر اس کے آنسو نکل آئے۔

منہاس باقر نے ایک اونچی کوالٹی کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا نام لیا اور کہا ”بہن! ایک بیج تو وہاں شاہنگ کر دی تھیں۔ اس کے بعد کہاں چلی گئی تھیں؟“

وہ غمناک آواز میں بتانے لگی ”کلشن کی مارکیٹ سے ہم طارق روڈ کی طرف نکل گئے تھے۔ کچھ دیر وہاں شاہنگ کرتے رہے پھر ایک چائیز ریسٹورنٹ میں بیچ کرنے کے بعد ہم ہمارا آباد چلے گئے۔ وہاں بھی چند قابل ذکر بین الاقوامی معیار کے اسٹور کھلے ہیں۔ بس وہیں یہ حادثہ پیش آیا۔“

میرے استفسار پر شانہ نے بتایا کہ وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھی تھیں کہ دو ڈھانچے پوش افراد نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک نال والی کلاشکوف تھیں جن کا رخ گاڑی کی عقبی نشست کی طرف تھا جہاں ساحل اور ممتاز بیٹھی تھیں۔ ایک گن بردار نے انہیں فوراً گاڑی سے نیچے اتارنے کو کہا۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی تو ایک نے مجھے غلیظ گالی دیتے ہوئے پھینک کر کہا۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم انہیں زندہ سلامت چھوڑ کر جا رہے ہیں ورنہ ہمارے دشمنوں کو بچا دینے والوں کو بھی ہم حقیر جونیئوں کی طرح مسل دیا کرتے ہیں۔“

مارا کے نام نے میرے ذہن میں نسبین چادی میں نے اضطراب کی انتہا کو چھوئے ہوئے کہا ”کیا۔ انہوں نے واقعی مارا کا نام لیا تھا؟“

”مجھے اپنی سماعت پر پورا بھروسہ ہے“ وہ یقین سے بولی پھر کہا ”وجدان! کیا یہ وہی مارا تو نہیں جسے ممتاز کے والد نے پولیس کے حوالے کیا تھا؟“  
 ”بالکل وہی ہے“ میں نے دانت کچکاتے ہوئے کہا۔

رات جن دو موٹر سائیکل سواروں نے تمہارا تعاقب کیا وہ تاراجی کے ہر کارے تھے۔ وہ فیث خصلت ممتاز! ناخوش میں ہی سہی آیا ہے اور اس رات وہ ممتاز کی قیام گاہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔“  
 ”تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟“  
 ”میرے اپنے ذرائع ہیں“ معلومات حاصل کرنے کے“

منہاس نے پوچھا ”مشرود جان! جب تمہیں اتنی اہم نئی معلومات تھیں تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں اپنے دست قاضی سلطان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“ اس کے انداز میں اچانک رہی اتر آئی۔

میں نے اس کی ناراضی کا برا منائے بغیر کہا ”انکل! پہلی بات تو یہ کہ یہ معلومات مجھے آج ہی صبح حاصل ہوئی ہیں“ میں نے دانستہ اس سے یہ چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا ”اور دوسری بات یہ کہ آپ ممتاز کے سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں۔ ممتاز کے ساتھ ساتھ میری عزیز ترین بہن بھی اغوا ہوئی ہے۔ میں ان دونوں کی تلاش کے لیے اپنی ہستی واد پر لگا دوں گا۔ مارا مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔“

پھر میں شانہ کی جانب متوجہ ہو گیا ”تم مارا کے پیچھے ہوئے ڈھانچا پوش اغوا کنندگان کے بارے میں بتا رہی تھیں؟“

اس نے بتایا ”مجھے خاموش رہنے کی دھمکی دینے کے بعد انہوں نے ممتاز اور ساحل کو گن پوائنٹ پر گاڑی سے نیچے اتار دیا پھر بڑی تیزی سے وہ انہیں ”میری گاڑی کے آگے کھڑی سیاہ لینڈ کروزر میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لینڈ کروزر کے تمام شیشے سیاہ تھے۔ میں دیکھ نہیں سکی، جب میں ادا کوں موجود تھا۔ وڈا اسکرین اس زاویے سے مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔“

سیاہ لینڈ کروزر نے مارا پر میرا ٹھک اور پختہ کر دیا۔ وہ گزشتہ رات ایک سیاہ لینڈ کروزر ہی میں فیصل کے ساتھ تھی۔ قرنی اینٹ سے روانہ ہوا تھا۔ ان کی منزل شاکر علی کی زبانی مجھے کشن اقبال کا ایک بنگلا معلوم ہوئی تھی۔

منہاس باقر نے اپنی بیٹی سے پوچھا ”ہمارا آبادیہ میں واقع کس جد پیش آیا ہے؟“

”میں ہمارا آبادیہ میں“ وہ شکستہ لہجے میں بولی پھر لوکیشن کی وضاحت کرنے لگی۔ وقوعہ کا وقت اس نے لگ بھگ سو اتین بجے بتایا تھا۔

میں نے کہا ”انکل! میں ہمارا آبادیہ کئی مرتبہ جا چکا ہوں۔“

.. علاقہ تو خاصا بارونق ہے پھر دن میں تین سو اتین بجے تو اس کی رونق بھیر کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہے۔ دن دہائے اغوا کی واردات کا مطلب تو یہی ہے کہ۔۔۔“

”میں! تم نے زنا دیکھی ہوئی لیکن پاکستان کا پہلا مرتبہ دیکھ رہے ہو“ منہاس باقر نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں! دن دہائے اور رات پچھڑے میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں کا قانون اور جرائم کی نوعیت بہت اونگھی اور زنا ہی ہے۔“

پھر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا اور نہایت ہی جھل کے ساتھ بڑے بڑے پولیس آفیسرز سے رابطے کرنے لگا۔ اس کے انداز کا یہ ٹھہراؤ شاید اس لیے بھی تھا کہ اس کی اپنی بیٹی یہ خبیثت واپس گھر پہنچ گئی تھی یا ممکن ہے وہ ہر قسم کے گراس میں اسی صبورداشت کا مظاہرہ کرتا ہو لیکن میں اس جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ ساحل کے اغوا کا سنتے ہی میرے تن بدن میں چنگاریاں ہی بھڑکی تھیں۔ مجھے اپنا وجود بھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلی فونک رابطوں کے اثرات اور نتائج کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

”میں جا رہا ہوں انکل!“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے فیصلہ کر لیا۔ ”انشاء اللہ بہت جلد میں آپ کو ایک بہت بڑی خوش خبری سناؤں گا۔“

”تم کہاں رہے ہو؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔  
 ”یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا“ میں نے گول مول جواب دیا اور اس کی بات سے بغیر ہنگلے سے باہر نکل آیا۔

یہ سوال و جواب کا وقت نہیں تھا کہ میں وہاں بیٹھ کر منہاس باقر سے طویل مناظرہ کرتا۔ عمل کے اس وقت کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی میرے نزدیک گناہ کبیرہ سے کم نہیں تھا۔

\*\*\*

وہ بنگلا نیا چورنگی اور حسن اسکاڑ کے درمیان پوش علاقے میں واقع تھا۔ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے شیر ڈکود ڈکواتے ہوئے یہاں پہنچا۔ اگر میرے پاس کوئی ہوائی سواری ہوتی تو میں بلا دروغ اس کا استعمال کرتا۔ ساحل کے اغوا نے مجھے دشت میں بٹھا کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو جنونی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی کو میں نے بنگلے کے سامنے سڑک کے کنارے روکا اور گیٹ کے پہلو میں نصب اطلاعی کھنسی پر انگلی رکھ کر بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک باوردی گاڑی نے گیٹ کے پیٹ میں بے ہوئے ایک بچہ گیٹ کو کھول کر باہر بھاگنا اور سوا لہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا ”کیا بات ہے؟“



وہ یقیناً سیکورٹی گارڈ تھا۔ میں نے بھڑے ہوئے لہجے میں کہا ”بات بہت خطرناک ہے۔“  
”کس سے ملنے آئے ہو؟“ اس کے تیور بھی بدل گئے۔  
میں نے کہا ”سینف اللہ سیال ہے۔“  
میں نے ہنسی بجانے سے گل نیم پلیٹ کو بہ غور پڑھ لیا تھا۔ وہاں کسی ریٹائرڈ پولیس آفیسر سینف اللہ سیال کا نام لکھا تھا۔

سیکورٹی گارڈ نے جواب دیا ”سیال صاحب اپنی فیملی کے ساتھ یورپ کے تقریبی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ تم کون ہو؟ اور ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“  
میں نے سیکورٹی گارڈ کے سوالات کے جواب میں زبان کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ایک زوردار فرنٹ لک اس کے چہرے پر رسید کر دی۔

اس کا اوپری دھڑکیٹ سے باہر تھا اور دونوں ہاتھ بچہ گیٹ کے پیٹ پر ٹکے تھے۔ میرے اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے نتیجے میں وہ حلق سے ایک چیخ برآمد کرتے ہوئے بنگلے کے اندر دوڑے۔ میں پختہ فرش پر گرا۔ اسی اثنا میں نے بنگلے کے اندر داخل ہو کر چھوٹا ٹائٹ اندر سے بند کر دیا۔

پختہ فرش سے شرفِ ملاقات کے دوران میں گن اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ میری پھرتی پر پوری طرح حیران بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ میں نے خون خوار لہجے میں کہا ”میں تمہارا باپ ہوں اور سیال ایڈمنسٹریٹو سے ایک برائے حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔ اب بتاؤ۔ تم نے ان کے بارے میں کتنے فیصد جھوٹ بولا ہے؟“

”مم۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ اپنی گن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”وہ لوگ واقعی ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔“

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی حرکات کو نظر میں رکھتے ہوئے سوال کیا ”اس وقت بنگلے میں اور کون کون ہے؟“

”میرے علاوہ دو ملازم اور ہیں۔“ اس نے بتایا۔  
بات ختم کرتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے گن کی جانب بڑھنے والے اس کے ہاتھ کو بری طرح پکڑ لیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں اس کو اجاگر کر رہا ہوں۔

”اٹھ کر شرافت سے کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسے ”ہنڈ ز اپ“ کرنا کے اس کی تلاش کی۔ اس گن کے سوا اس کے پاس اور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔  
اسی وقت بنگلے کے اندر دوئی حصے سے کسی نے پوچھا ”کیا ہوا خاور! اتم جیتے کیوں تھے؟“

اس سے قبل کہ خاور نامی وہ سیکورٹی گارڈ اس سوال کا کوئی جواب دیتا، میں نے عقب سے اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن کے گرد حائل کر دیا اور ہاتھ سے گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو دب کر گارڈ کو اپنا قیدی کر لیا۔

میں اس کام سے قانع ہی ہوا تھا کہ وہ شخص بنگلے کے اندر سے نکل کر میرے سامنے آگیا جس نے تھوڑی دیر پہلے خاور کو پکار کر اس کا حال دریافت کیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑنے ہی وہ چونکا۔ اسی لمحے اس نے فرش پر پڑے بے سدھ سیکورٹی گارڈ کو بھی دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور وحشت ابھرائی۔ پھر اچانک اس نے ایک عجیب حرکت کی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہو گا یا پھر میری طرف بڑھے گا لیکن اس اللہ کے بندے نے ”نجیب“ ”نجیب“ پکارتے ہوئے بنگلے کے اندر دوئی حصے کی طرف دوڑ لگا دی۔ جو اب میں بھی اس کے تعاقب میں لپک رہا۔

اس کی پکار سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ نجیب نامی اپنے ساتھی کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔ گارڈ نے بنگلے میں دو ملازمین کی موجودگی ظاہر کی تھی۔ میری اطلاعات کے مطابق تارا اور چوہدری نواز علی کا بیٹا فیصل کرشن رات اس بنگلے پر پہنچے تھے۔ بنگلے کے باہر نصب نیم پلیٹ مجھے الجھاری تھی اور اس الجھن کو نجیب اور اس کا ساتھی ہی سلجھا سکتے تھے۔

میں نے اس ”مفرور“ کو ایک کمرے کے دروازے کے سامنے جالیا۔ اس کا ہاتھ دھک کے لیے دروازے کی جانب اٹھ رہا تھا کہ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ دروازے سے پانچ فٹ دور جا گرا۔ وہ شام سے پہلے کاؤٹ تھا مگر مجھ پر ایک وحشت سوار تھی اور میں ہر مصیبت ہر احتیاط کو بلائے طاق رکھ کر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

میرا دھکا کھانے والا اپنی کوشش میں تو کامیاب نہ ہوا البتہ وہ زمین پر گرنے سے میل تیز جیتی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی نجیب کو پکار چکا تھا۔ اس کی پکار نے رگ دکھایا اور کمرے کے اندر سے ایک بوجھل آواز برآمد ہوئی۔

”مشتاق! اتم حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہے ہو؟“

اس دوران میں مشتاق نامی وہ شخص زمین سے اٹھ چکا تھا۔ میں نے اسے بالوں سے دبوچا اور کھیت کر دروازے کی طرف لاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی ”پنپے“ ساتھی سے کہا ”اس کا باپ اس سے ملنے آیا ہے لہذا دروازہ کھولنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ وہ کس پوزیشن میں ہے۔“

مشتاق کے لحاظ روپے نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ وہ زانی بھرائی سے دور رہنے والا ایک عام گھریلو ملازم ہے ورنہ وہ اتنی آسانی سے میرے قابو میں نہ آتا۔ اس نے میرے احکام کی تعمیل کی تو ایک جھٹکے سے وہ دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے ایک طویل قامت خونمد باڈی بلڈر کڑا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا اور اس کے باڈی بلڈر ہونے کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ اس نے صرف جینز پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ بالکل کھلا تھا اور چہرے پر پھول مار کا محنت مند مومیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اس کا ایکس رے کر لیا۔

ہماری نگاہیں ملیں، میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت ابھرتے دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا، میں نے مشتاق کو ایک دھکے سے اس کی جانب پھینک دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لینے ہوئے کمرے کے فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اسی لمحے داش روم کے اندر سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نجیب اپنی جزوی برہنگی کے توسط سے وہاں کیا گل بجا رہا تھا۔ سینٹیل میز پر رکھی ہوئی بولٹ اور اس کے گرد رکھے جام بھی اس کا فرمایا کی تصدیق کر رہے تھے۔ جتنی دیر میں میں دروازے کو اندر سے بولٹ کرنا ”نجیب“ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

اس نے حقارت سے مجھے دیکھا اور آتشیں لہجے میں بولا ”تم کون ہو اور بنگلے کے اندر کس طرح داخل ہوئے؟“

”تمہارے پہلے سوال کا جواب دروازہ کھلنے سے قبل مشتاق نے دے دیا تھا“ میں نے اس پر نظر رکھتے ہوئے کہا ”دوسرے سوال کا جواب تمہارا سیکورٹی گارڈ دے گا۔“

اس نے سیکورٹی گارڈ کے ذکر پر مشتاق کو دیکھا جو سہا ہوا ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ میں نے خاور کو کہا تھا یہاں ہے۔ سننے ہی نجیب نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں چونکے پہلے سے محتاط تھا اس لیے میں نے اس کا وار خالی کر دیا۔

وہ اپنی پہلی ہی ناکامی پر جھنجھلایا اور انسان

(STANCE) بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس ”حرکت“ سے مجھے خوشی ہوئی۔ میں بھی جوائی ٹی اسٹانس میں آگیا۔ (T-STANCE) میں فرنٹ فٹ، بیک فٹ کی لوکیشن پر نوے درجے کا زاویہ بنا کر انسان کو ”فنی“ کی شکل دیتا ہے۔ تنگ جگہ پر فائٹ کے لیے ٹی اسٹانس بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

نجیب نے حملے میں پہل کی۔ فرنٹ اسٹیپ کے ساتھ اس کا چیخ میرے چہرے کی جانب آیا۔ میں نے نیک جرک (NECK JERK) سے اپنے چہرے کا دفاع کیا۔ اسی لمحے اس نے دو سرا چیخ آرمیا جو میرے شانے پر لگا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے مضبوط کندھے کو ایک دائرے کی شکل میں حرکت دینے لگا۔ نجیب کے چیخ میں ہلاکی قوت تھی۔ اس نے اس قوت کے حصول کے لیے کافی محنت کی ہوگی۔

وہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سمجھاتے ہوئے بولا ”نجیب کے دشمن اپنے قدموں پر چل کر اس تک رسائی تو حاصل کر لیتے ہیں مگر جاتے وہ دوسروں کے کندھوں پر ہیں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی پڑیوں کا ٹھہرہ بنا دوں گا۔“

میں نے ایک اسٹیپ پیچھے ہٹا۔ اس نے دوسری راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ اسی لمحے میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک ویلنگ (WHEEL KICK) اس کے جڑے پر رسید کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامتے ہوئے کراہا اور لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا ”میں کسی نجیب وجیب کا دشمن نہیں بلکہ تارا کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ میری اس تلاش کے راستے میں جو بھی آئے گا، میرے دشمنوں میں شمار ہوگا۔ بتاؤ“ وہ شیطان کا چپلا کہاں چھپا ہے؟“

تارا کے ذکر پر اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور جلدی سے بولا ”یہاں کوئی تارا نہیں رہتا“ کم کسی غلط فہمی کی بنا پر یہاں آگئے ہو۔“

”مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔“ میں نے شعلہ بار لہجے میں کہا ”وہ تلفظ تصدیق اپنی بے بے کے بار فیصل کے ساتھ رات کو یہاں آیا تھا، کالی لینڈ کرؤز میں۔ میرے پاس بکی افکار میٹش ہے۔ تم مجھے بھلانے کی کوشش نہ کرو۔“

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے مجھ پر جھلاٹک لگا دی۔ میں بیک فلک لگاتے ہوئے چھ فٹ دور چلا گیا۔ نجیب سیدھا جا کر مشتاق سے ٹکرایا اور جھنجھلاہٹ میں اس کے سر کو پکڑ کر دیوار سے ٹکرایا۔ مشتاق ایک خوفناک

آواز نکالے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ میں دھوکے سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ یوم حشر سے پہلے اٹھ بھی سکے گا۔ نجیب کے ایک ہی بیٹے نے مجھے اس کی سائنس ایسی طاقت سے روشناس کرایا تھا۔

واش روم کے اندر سے نظریہ آنے والی نے نجیب سے پوچھا، "ڈارلنگ! تم کمرے میں کس سے لہجہ رہے ہو؟ یہ کون شخص تمہیں دھمکیاں دے رہا ہے؟" "ہے ایک بد بخت! نجیب نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ مجھ پر چلائنگ لگادی۔

اس مرتبہ اس کے ہاتھ سیدھے میری گردن پر آئے۔ وہ اس شہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا گلا دبائے لگا۔

مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گرفت سے میرا گلا تو دبائی رہا تھا، اس کے ساتھ ہی وہ مجھے اٹھاکر فرش سے بلند بھی کر جا رہا تھا۔ اسے اپنے قدم اور طاقت کا ایذا پہنچ حاصل تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جمائے اور ٹانگوں کو رول کرتے ہوئے ایک جڑی ڈھل فرنٹ فلائنگ گلب اس کے پیٹ میں رسید کردی۔

میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت چھوٹ گئی اور وہ کسی طوفان کے مانند ہاتھ روم کے دروازے سے جا نکلیا۔ یہ گھراؤ اتنا شدید تھا کہ ہاتھ روم کا دروازہ قبضوں سے نکل گیا۔ چوٹی پت اندر موجود دھجوزن سے جا کرایا جس کے نتیجے میں ایک سرخسلی مگرو حشت زدہ چیخنے کو ملی۔

میری نگاہ نے اس کرب ناک آواز کا تعاقب کیا اور ہاتھ روم کے اندر اس کے ماخذ و مخرج تک جا پہنچی۔ ایک اوسط شکل کی لڑکی بدن پر تو لیا پہنے ہاتھ روم کے فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس مضطرب کوشش میں وہ تو لیا اس کے بدن پر سے پار پار پھسل رہا تھا۔ وہ بائیں تینیس سال کی بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی۔ صورت کی کمی کو اس کے بدن نے پورا کر دیا تھا۔ اس پر زیادہ دیر تک نظر جمائے رکھنا آسان کام نہیں تھا۔

لڑکی سے پہلے نجیب سنہل گیا اور ایک دھکے سے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے وہ ہاتھ روم سے باہر گیا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ بار کھانے کے بعد اس نے احتیاط کا دائرہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں اس کے فائنٹنگ اسٹائل سے سمجھ گیا تھا کہ وہ سیم

کبھی نیشن (SAME COMBINATION) کا مادن تھا۔ یعنی کبے بعد دیکرے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کے انڈیکس دھراتا تھا۔ لیفٹ رائٹ ہاؤس کے بعد رائٹ رائٹ ہاؤس اور رائٹ ہنچ کے بعد لیفٹ ہنچ۔ اس مرتبہ اس نے مجھے بیک لگ ماری۔ میں نے ذہن میں کیکولیت کی لیفٹ بیک کے بعد وہ رائٹ بیک مارے گا چنانچہ اس کے عمل سے پہلے ہی میں نے اس کی پشت پر فرنٹ تھرسٹ (THRUST) (FRONT) لگ کر جڑی۔ اس لگ میں بے پناہ جوش (PUSH) شامل تھا۔ وہ کسی میل ٹرین کے انجن کی طرح روانہ ہوا اور کمرے کی دوسری دیوار سے جا کرایا۔

اس کی جگہ اگر کوئی عام خٹے کا فائبر ہوتا تو ٹکڑا کر پیرہ جاتا لیکن وہ کسی گیند سے کم نہیں تھا۔ دیوار سے ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ کمرے کے اسٹرائیکر کے مانند واپس پھٹا اور جھگی پھیلنے کی طرح پھٹکارتا ہوا میری جانب آیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ وہ میرے نزدیک آکر ایک لمبے کورہا پھر اس نے ایک لوڑ لگ ماری۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ اس نے اچانک رائٹ ہاؤس (ROUNDHOUSE) اٹھادی۔ میں ایک قدم آگے آیا۔ نتیجے میں اس کی لگ میرے کندھے پر بولڈ ہو کر رہ گئی۔ میں نے اس کی ران پر دونوں ہاتھوں کا پیش آزمایا۔ وہ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس مرتبہ اسے اٹھنے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس دوران میں ہاتھ روم والی لڑکی مناسب لباس پہن کر باہر آئی تاہم وہ اس افراطی سے بری طرح خوف زدہ تھی۔ میں نے غرائے ہوئے اسے حکم دیا "ایک طرف آرام سے خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ۔ تم سے میں بعد میں بات کروں گا" پہلے اس سورما سے نمٹ لوں۔

اس نے :۔ فرمایا واری سے میرے حکم کی عقل کی۔

میں نجیب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے میز پر سے چیش کا ایک گول دان اٹھایا اور حملہ آور ہونے والے انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ میں پلک جھپکتے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے کو جھپک گیا۔ اس کا جھکا ہوا بدن میرے سر کے اوپر تھا۔

میں نے اس کی جینز کے کیلٹ میں ہاتھ ڈالا، وہ سر ہاتھ میں نے اس کی بغل میں دیا اور کسی اول درجے کے ویٹ لفٹر کی طرح ایک جھٹکے سے اٹھا کر اسے سر سے بلند کر دیا۔ وہ فضا میں ہاتھ پاؤں چلائے لگا اور مجھے مغلطات میں تولنے لگا۔ میں نے اسے چٹھے کی پنکھڑیوں کی طرح گول ٹھٹھا شروع

ملایا۔ مجھے گالیاں دیتے ہوئے اس نے ایک زنانہ حرکت کی۔ بے سرو جھکا کر اس نے بغل میں موجود میرے ہاتھ کی کھائی رانٹ جمادیے۔ تکلیف کی شدت ایک لہر بن کر میرے بدن میں تھری۔ میں نے اس کم ظرف کو سینٹیل ٹیبل پر پٹخ لایا۔

چھانکے کی ایک تیز آواز کے ساتھ گلاس ٹاپ ٹیبل پانچور ہو گئی۔ اس پر رکھے جام دینا بھی کڑیوں میں بدل لے۔ نجیب ٹیبل کے فریم میں کسی گھماں گھل تصویر کے مانند نہ ہو گیا۔ شیشے کے تیز اور ٹکلیے گلوبے اس کے برہنہ وجود ن اور تھنوں کی تعداد میں پیوست ہو گئے۔ جسم کا زیریں حصہ می محفوظ نہیں رہا تھا۔ سب سے زیادہ قیامت اس کے بازو پر گزری تھی۔ متعدد مقامات سے خون رسنا شروع دیا۔

میں نے چند لمبے نجیب کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن میرا یہ انتظار بے سود ثابت ہوا، وہ زندہ تھا مگر بہت اور حوصلہ اربمٹھا تھا۔ کسی فائبر اور جنگ جو کے پاس سب سے قیمتی سرمایہ اس کی بہت اور حوصلہ ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ بھی ہار بیٹے تو پھر جسمانی طاقت، اسلحہ اور فائنٹنگ ٹیکنیک سب بے کار ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے اکھڑی اکھڑی سانس لیے ہوئے نجیب کو میز کے دھانچے فریم سے کھینچ کر باہر نکالا اور فرش کے قالین پر چاروں فائے پت ڈال کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ پھر میرا ہاتھ اپنی پٹلی کی جانب رینگ گیا جہاں چرمی کیس میں آٹھ انچ طویل چمچ والا ایک قاتل خنجر بیٹھ موجود رہتا تھا۔ یہ امتیاز کی نشانی تھی۔ اس کی ایک یاد تھی۔

میں نے خنجر کو برہنہ کر کے نجیب کی آنکھوں کے سامنے لڑایا اور غرا کر کہا "تمہاری زندگی اور موت کے درمیان مائل فاصلے کو اس خنجر کی دھار کے نیچے جگہ ملی ہے۔ اب نہیں فیصلہ کرنا ہو گا۔ چمچ بول کر زندہ رہنا ہے یا جھوٹ بول کر زندگی کو الواح کرنا ہے؟"

میرے لمبے میں دنیا جہان کی سفاکی سمٹ آئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے رنگ میں ایک واضح تبدیلی آتے دیکھی۔ اس تبدیلی میں خوف اور سر اسٹیگی کی آمیزش تھی۔ اس کے بدن میں ہلکی سی جھینش ہوتی تاہم وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے خنجر کی نوک کو اس کے زرخرے پر چھوئے ہوئے کہا "تارا اور فیصل کہاں ہیں؟"

اب تک کی کارروائی سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ دونوں اس بیٹھے میں موجود نہیں تھے۔ خرخرامٹ سے مشابہ اس کی آواز میری سماعت سے نکل آئی۔

"میں کسی فیصل اور تارا کو نہیں جانتا۔"

"وہ تمہاری ماں کے قصہ ہیں" میں دہاڑا دیا "تم اپنے دو دعوہ والد صاحبان کو جاننے سے انکاری ہو؟" اس کے ساتھ ہی میں نے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھا دیا۔

وہ تھلا کر گیا "نت۔ تم۔ اچھا نہیں کر رہے ہو۔" "انہوں نے بھی کچھ اچھا نہیں کیا" میں نے پھٹکار کر کہا "میری دو ساتھیوں کو آج تین بجے اغوا کیا ہے انہوں نے۔" "دو ساتھیوں کو؟" اس کی الجھی ہوئی آواز کے ساتھ ہی چہرے پر حیرت بھی نمودار ہوئی "مگر وہ تو ایک لڑکی۔"

اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ متوشل نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کا یہ احساس اور احتیاط بعد از وقت والی بات تھی۔ میں اس کی غلطی پکڑ چکا تھا۔ کوئی چور جب رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اس سے اقبال جرم کروانا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ تو رنگی زبان میری گرفت میں آ گیا تھا۔

میں نے خنجر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "خاموش کیوں ہو گئے؟ یہی کہنا چاہ رہے تھے تا، وہ تو ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے وہی۔ مدھوری ڈکٹ کی صورت والی؟"

میرے سوالات میں بہت فورس تھی اور آخری جملہ میں نے اپنے اندازے کی بنا پر ادا کیا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ وہ تامل کرتے ہوئے مستغرق ہوا۔ "تم کون ہو؟"

"پہلے میرے سوالات کے جواب دو" میں نے دھشت بھرے لہجے میں کہا۔

اسے لہجہ میں گویا کہ آج غلو خاص ممکن نہیں۔ میں اپنے سوالات کے جواب لے کر رہوں گا۔ اگر وہ جواب نہیں دے گا تو اس کے بدلے اسے جان رہنا ہوگی۔

"تم۔ میری گردن سے خنجر ہٹاؤ تو میں کچھ بولوں بھی" وہ جھنجھلا کر بولا۔

میں نے سختی سے کہا "خنجر کی نوک تمہارے حلق میں پیوست نہیں۔ تم اسی حالت میں بولو گے ورنہ اس خنجر کی دھار وہ فاصلہ مٹا دے گی جو تمہاری زندگی اور موت کے درمیان واقع ہے اور سینڈ واچ (SAND WATCH) کے جیبر کی طرح رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ بیشک کے لیے ختم ہو جانے کے لیے۔"

میری سفاکی، ثابت قدری اور وحشت کو دیکھ کر وہ تعاون پر آمادہ ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں حسبِ مشا جواب نہ پا کر اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا، میں نے تجھ پر دباؤ قدرے کم کرتے ہوئے پوچھا۔

”تارا اور فیصل کہاں ہیں؟“

”وہ یہاں سے آج دوپہر کو چلے گئے تھے“ اس نے رک رک کر بتایا ”ابھی تک واپس نہیں آئے۔“

”کب واپس آئیں گے؟“ میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

”وہ اب یہاں نہیں آئیں گے۔“

”کہاں جائیں گے؟“

”وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”کشمیر روڈ والے بنگلے پر جائیں گے۔“

”یہ بنگلا کشمیر روڈ پر کس جگہ واقع ہے؟“ میں نے پوچھا ”مجھے اسپورٹس کلب کے ریفرنس سے لوکیشن سمجھاؤ۔“

”وہ بنگلے کا نمبر بتانے کے بعد اس کی لوکیشن کی وضاحت کرنے لگا۔“

میں نے یہ ضروری معلومات اپنے ذہن میں نقش کیں اور عجیب سے پوچھا ”تم کچھ بتا رہے تھے وہ دونوں ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے؟“

”ہاں، ان کا پروگرام تو یہی تھا“ وہ اثبات میں سر کو تکانم جنبش دیتے ہوئے بولا ”وہ اندرونِ سندھ سے آئی ہوئی ممتاز نامی ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے جس کی شکل کسی اندین اداکارہ سے خاصی حد تک ملتی جلتی ہے۔“

میرا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ تارا ساحل کی یہاں موجودی سے اگر واقف تھا بھی تو وہ اس کے ٹھکانے سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ ممتاز کے تعاقب میں یہاں تک پہنچا تھا اور اسی کو اغوا کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا مگر بد قسمتی سے ساحل بھی اس پلین میں آگئی۔

میں نے اپنے دل میں ایک نہیں سی اٹھتی محسوس کی اور عجیب سے پوچھا ”کشمیر روڈ والا یہ بنگلا جس کا تم نے ایڈریس مجھے سمجھایا ہے، کس کی ملکیت ہے؟“

”میاں زاہد حسین“ اس نے جواب دیا ”دراصل پہلے پروگرام کچھ اور تھا۔ میاں جی کے فون نے ساری گزیر گمادی۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا ”ابتدائی پروگرام کے مطابق تارا نے اغوا کر کے ممتاز کو ڈیفنس کے ایک بنگلے کی طرف لے کر لایا تھا لیکن آج صبح چار بجے میاں جی کا فون آگیا کہ مذکورہ بنگلے کے حالات دیگر گوں ہیں لہذا لڑکی کو کشمیر روڈ والے بنگلے پر پہنچایا جائے۔ میاں جی خود بھی اسی بنگلے پر جا رہے تھے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے، تارا اینڈ جینی کشمیر والے روڈ والے بنگلے پر ہی گئے ہوں گے؟“

”وہ میاں جی کے حکم سے انکار کیسے کر سکتے ہیں۔“

”اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں بھی انہی کا وفادار ہوں۔“

”اس وقت تم خوب وفاداری نبھارہے ہو!“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”وہ جمل سا ہو کر بولا ”مجبوری کی بات دوسری ہے۔ جان بچانے کے لیے حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ مجبوری کی بات دوسری ہوئی ہے۔ میں بھی اس وقت بہت مجبور ہوں اس لیے تم سے دوسری بات پوچھ رہا ہوں۔“

”وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا ”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”بہت سمجھ دار ہو“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”جب تارا نے میری دوستیوں کو کشمیر روڈ والے بنگلے میں پہنچا دیا ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں نے ایک جنون کی سی کیفیت میں کہا ”سب سے بھرتی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وحشت پُر سکون جگہ اگلا جہاں ہے جہاں کسی قسم کا کوئی تکبیر نہیں ہو گا۔ نہ پاس میاں جی کا حکم ماننا ہو گا اور نہ ہی وجدان سے لات جو اٹکھانا پڑے گا۔“

”وج۔ وجدان۔ کیا تم وجدان ہو؟“ وہ لکت زدہ آواز میں بولا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اختیازی نشانی نے میرے سفر کا رد اور ادا کیا۔ وہ برق کی طرح چکا اور عجیب کی شدہ رنگ سے خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ میں نے بیک رول کرتے ہوئے اپنے لباس کو اس کے ٹکڑے خون سے آلودہ ہونے سے بچایا۔

میں نے زندگی میں انسانی جان لینے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کی تھی مگر ساحل کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے خون رنگ چادر سی تن گئی تھی۔ میں اپنی

ماصل تک پہنچنے کے لیے ہزاروں ”لاکھوں انسانی جانوں سے قتل سکھاتا تھا۔ اب تک میں اپنی زندگی بیٹا آیا تھا، ساحل کا وجود اس طرح میرے معمول میں داخل ہوا تھا کہ وہ میری ذات کا حصہ بن گئی۔ کوئی اپنی ذات سے جدا نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اپنی ذات کے ایک حصے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی تلاش تھی جو ساحل کی شکل میں اچانک مجھ سے چھڑ گئی۔“

\*\*\*

سرمئی شام دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے میں بدل گئی تھی۔

یہ رات کا آغاز تھا۔ روشنیوں کا شرابی پوری آن پان کے ساتھ جگمگا رہا تھا لیکن میرے اندر ایک مستقل اندھیرے نے جگہ بنانا شروع کر دی۔ ان روشنیوں کی آہ و

ناب میرے من کی بے کلی کو کم کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے پڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

میں ڈرائیونگ کے دوران میں مسلسل ساحل اور ممتاز کے بارے میں سوچنے لگا۔

شبانہ کے بیان کے مطابق ان دونوں کو آج سہ پہر تین بجے بمادر آباد چورنگی سے اغوا کیا گیا تھا اور اب کم و بیش آٹھ بجے والے تھے۔ پانچ گھنٹے ان مصیبت زدہ لڑکیوں نے کس طرح گزارے ہوں گے، یہ خیال مجھے بہت پریشان کر رہا تھا۔

فائل طور پر ساحل کے حوالے سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ ساحل اب پہلے والی ساحل نہیں رہی تھی۔ اس نے میرے

قرب میں بہت کچھ سیکھا تھا مگر مجھے وہ رہ کر نیلگی کی پیش گوئی یاد آ رہی تھی اور میری اصل پریشانی کا سبب بھی یہی تھا۔ نیلگی نے بڑی سفاک اور دل چرپیش گوئی کی تھی۔ نبی

کر کی ایک بنگلا نما حویلی میں اس کی زبان سے ادا ہوئے والا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔ اس نے ساحل کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا ”وجدان! ساحل کی مناسبت سے تم اپنا

ہم سا کر لو۔“ ساحل اور ساگر کا جنم جنم کا ساتھ ہے مگر ”اس“ ”مگر“ کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پچھتے پچھتے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر سمجھ دار کے لیے اس ادھورے جملے میں بہت کچھ پنپاں تھا۔

جھپٹے دنوں نیلگی کا میرے ساتھ جو رویہ رہا تھا، اس کے پیش نظر مجھے ہر وقت دھڑکا کا رہتا تھا۔ مجھے یہی شک تھا کہ ساحل کو کچھ سے جدا کرنے میں نیلگی کوئی بہت بڑا رول

پلے کرے گی۔ وہ میرے لیے اپنی جاہت کا کھل کر اظہار کر رہی تھی اور میرے نزدیک کسی اور عورت کو دیکھنا اسے

جھپٹے دنوں نیلگی کا میرے ساتھ جو رویہ رہا تھا، اس کے پیش نظر مجھے ہر وقت دھڑکا کا رہتا تھا۔ مجھے یہی شک تھا کہ ساحل کو کچھ سے جدا کرنے میں نیلگی کوئی بہت بڑا رول

پلے کرے گی۔ وہ میرے لیے اپنی جاہت کا کھل کر اظہار کر رہی تھی اور میرے نزدیک کسی اور عورت کو دیکھنا اسے

گوارا نہیں تھا لیکن پھر وہ اچانک غائب ہو گئی۔ لگ بھگ گزشتہ دو ماہ سے اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں اسے خود اس سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جب چاہتی تھی، چم سے میری تنہائی میں چلی آتی تھی۔ اسے لائے بلانے پر مجھے اختیار نہیں تھا۔

نیلگی کے تصور نے میری نگاہ میں اس کے منفرد حسن کو اجاگر کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے ساحل کی یاد نے اس تصور کو آف کر دیا۔ میری سوچ پلٹ کر ساحل پر مرکوز ہو گئی۔ جب

دل پر بوجھ ہو تو کوئی شے اچھی نہیں لگتی۔ میرے اندر کاموسم جگمگایا تھا۔ ساحل موسمِ بہار کے مانند میرے اندر اتر چکی تھی۔ وہ میری نس نس میں لبو بن کر دوڑتی تھی۔ میری اس

بہار کو خزاں کی نظر لگ گئی۔ نیلگی کی پیش گوئی بالآخر پوری ہو کر رہی، ساحل مجھ سے چھڑ گئی۔ تارا نے ایک شیطانی چال چل کر مجھے ساحل سے جدا کر دیا تھا۔

میری نیلی شیز کسی بے لگام گھوڑی کے مانند عروس ابلاؤ کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میری منزل کشمیر روڈ کا ایک بنگلا تھی۔ وہ بنگلا جہاں تارا، ممتاز اور ساحل کو لے گیا تھا۔

مجھے اپنی ساتھیوں کو اس صیبت کے چنگل سے نکالنا تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر نیلگی کی پیش گوئی کو پورا نہیں ہونے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ساحل تک پہنچنا تھا، اسے واپس لانا تھا۔ ہر

قیمت پر، ہر طوفان سے گزر کر چاہے اس مقصد کے لیے مجھے اپنی جان بھی قربان کرنا پڑتی یا دشمنوں کی جائیں نکالنا پڑیں!

میں نے کشمیر روڈ پر پہنچ کر مذکورہ بنگلے کو تلاش کیا۔ اس تلاش میں مجھے تھوڑا بھٹکانا پڑا۔ راستہ آسان اور سادہ تھا لیکن میں اس وقت ذہنی طور پر بہت زیادہ منتشر تھا اس لیے

ان دو چار گلیوں نے مجھے گھما کر رکھ دیا۔ میں نے اپنے ٹارگٹ بنگلے کے سامنے سے گاڑی گزارتے ہوئے سوچا، مجھے سب سے پہلے اپنے ذہن کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ دھیان

ٹھکانے پر ہو گا تو میں اپنے دشمنوں سے نہٹ سکوں گا۔ مجھے خود پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ میں اتنا جذباتی پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلے میرا اس نوعیت کا کوئی عزیز مجھ سے چھڑا بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنی شیز بغلی گلی میں تھوڑے فاصلے پر کھڑی کر دی۔ یہ بنگلے کا پہلو تھا۔ دوسری جانب ایک الزا ساؤنڈ

کلیک تھا۔ میں نے گاڑی اسی کلیک کے سامنے کھڑی کی تھی۔ وہ کوئی عام سا دکان نما کلیک نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع و

عریض بنگلے پر پھیلا ہوا خاصا معروف الزا ساؤنڈ کلیک تھا۔ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بات

میں نے اپنی شیز بغلی گلی میں تھوڑے فاصلے پر کھڑی کر دی۔ یہ بنگلے کا پہلو تھا۔ دوسری جانب ایک الزا ساؤنڈ

کلیک تھا۔ میں نے گاڑی اسی کلیک کے سامنے کھڑی کی تھی۔ وہ کوئی عام سا دکان نما کلیک نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع و

عریض بنگلے پر پھیلا ہوا خاصا معروف الزا ساؤنڈ کلیک تھا۔ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بات

میں نے اپنی شیز بغلی گلی میں تھوڑے فاصلے پر کھڑی کر دی۔ یہ بنگلے کا پہلو تھا۔ دوسری جانب ایک الزا ساؤنڈ

کلیک تھا۔ میں نے گاڑی اسی کلیک کے سامنے کھڑی کی تھی۔ وہ کوئی عام سا دکان نما کلیک نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع و

خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ اندر کی تمام جہاں بھی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا اس وقت اندر کوئی بھی موجود نہ ہو۔ یہ حیران کن بات تھی۔ نجیب نے زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا تھا کہ تارائے انگوٹھی اور ادوات کے بعد اسی جھنگ پر آتا تھا اور یہ کہ میان زاہد بھی یہیں موجود تھا۔ میں تو یہاں خاصی گھما گھمی کی توقع کر رہا تھا لیکن ایسی کوئی بات کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لمحے کو میرے ذہن میں خیال آیا، کہیں نجیب نے مجھے مس گائیڈ تو نہیں کر دیا۔ موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر انسان عموماً جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتا ہے لیکن نجیب تو ایک شیطان تھا۔ ممکن ہے اس نے مجھے غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس جھنگ کا تذکرہ کیا ہو۔ اس کا خیال ہو کہ اس طرح میں اس کی جان بخشی کر دوں گا۔ بہر حال میں نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔

میں یہاں تک آیا تھا تو جھنگ کو ٹپکے کیے بغیر واپس چلے جانا ممکن نہیں تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے جھنگ کے پہلو سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ الزام ساز بند کھینک کے سامنے میری گاڑی کے سوا اور کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہاں اچھا خاصا سناٹا تھا۔ جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ کھینک مارنگ کی شفٹ میں چل ہو گا۔

میں نے گلی میں دوڑنا جب دور تک نگاہ دوڑائی اور جھنگ کی سائڈ وال پھلانگ کر اندر پہنچ گیا۔ میرے پاؤں میں جو گرتھے اس لیے ہلکی سی ”دھپ“ کی آواز کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ میں دبے قدموں جھنگ کے اندر دھکی دھکی کر جانے لگا۔

میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جھنگ کا ہر دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کی لائٹ بھی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے وارن کرنے لگی کہ اس جھنگ میں کوئی گزبوسہ ہے۔ اور گزبوسہ کہاں ہے، یہ معلوم کرنے کا تجسس مجھے بے اختیار آگے بڑھا رہا تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک جھنگ کی زیریں منزل کے تمام کمرے دیکھ لیے مگر کسی ذی نفس کے آثار نہیں ملے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا، نجیب نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا!

میں محتاط قدموں سے بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک کمرے میں مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں یکے بعد دیگرے ایک ایک باہر سے میں نے جھنگ کو تاب نوٹا مگر دیکھا تھا اور اس کے کسی بھی ظاہرہ میں مجھے روشنی نظر نہیں آئی تھی۔ بنگلا محل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اب یہ روشنی اور وہ بھی ایک

ایسے کمرے میں جس کی کھڑکیوں کا رخ جھنگ کے فزنی کی جانب تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ لائٹ ابھی نکل جاتی تھی۔ وہاں یقیناً کوئی موجود تھا۔

میں جو ٹھٹک کر رک گیا تھا، دوبارہ محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ میں ہر قسم کی صورت حالات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ میں نے روشنی کمرے کے دروازے کے پینڈل پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو میری حیرت دوچند ہو گئی۔ وہ دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔

میں نے دروازے کے پٹ کی آڑ لیتے ہوئے پینڈل دھکا کر آہستہ آہستہ دروازہ کھولنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نصف دروازہ ہی کھول پایا تھا اور جھانک کر اندر دیکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری سماعت سے ایک گھبر آواز نکلتی۔

”درو نہیں وجدان! میں تمہارے استقبال کے لیے یہاں موجود ہوں۔“

سیکنڈ کے سوویں حصے میں میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ تارا کی آواز تھی۔ میرے بدن میں سستی دور ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا ”اندر آ جاؤ۔ آج سارے حساب بے باقی ہو جائیں گے۔“

میں ایک دھکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ خاصا کشادہ ہال نما کمرہ تھا جس کے فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ پہلو پہلو صوف سین گے تھے اور آخری سرے پر تارا بے نفس اچلیس ایک صوف پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک جھنگے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہلکی کلپٹیک کرتے ہوئے بولا۔

”ویل کم مشرود جان من آف شیطان!“

میں نے دانت کھینچ کر اسے خوں خوار نظریے گھور اور سلگتے ہوئے لمبے میں سوال کیا ”ساحل اور ممتاز کہاں ہیں؟“

”میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا“ وہ اپنے مخصوص بے رحمانہ انداز میں بولا ”لیکن اس سے پہلے میں کچھ باتوں کی وضاحت کر دوں۔ تمہارا ذہن ابھرا ہو گا کہ یہاں تمہارا استقبال کس انداز میں ہو رہا ہے؟ مجھے تمہاری آمد کی خبر کیسے ہوئی؟“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر میرے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تم نے گلشن والے جھنگ پر جو ”کارنامہ“ انجام دیا ہے مجھے اس کی خبر ہو چکی ہے اور یہ خبر کچھ دیر پہلے مجھے مشتاق نے دی ہے، ملی فون کے ذریعے۔“

”مشتاق!“ میں چونک اٹھا ”وہ تو بے ہوش ہو گیا تھا؟“

”سننے جاؤ“ سچ میں مت بولو۔“ وہ سخت لمبے میں گویا ہوا مشتاق نامی اس گھبر ملازم کو تمہارے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل ہوش گمایا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب نجیب نہیں میرے اور اس جھنگ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مشتاق ہوش میں آنے کے باوجود بھی بے ہوشی کی اداکاری کرتا رہا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی۔ اس نے تمہارے ہاتھوں نجیب پر گراں ڈال اور فائزر کا مشورہ کیا تھا۔ وہ چون چراں کر کے خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ تم نے نجیب کو قتل کرنے سے پہلے اپنا نام اس کے سامنے لیا تھا۔ مشتاق نے مجھے فون پر بتایا کہ وجدان نامی کسی شخص نے فادر اور نجیب کو قتل کر دیا ہے۔ مشتاق تمہارے نام اور موت سے آشنا نہیں البتہ نجیب نے تمہاری شہرت سن رکھی تھی مگر دیکھا پہل مرتبہ تھا۔ یعنی آخری مرتبہ۔“

وہ آہستہ آہستہ دھکیلمے میں بات کر رہا تھا مگر میں اس کی آواز میں شامل غم وغصے کی انہمی طرح محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی خاور کی موت میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں نے تو اسے دو گھنٹوں کے لیے اغوا قفل کیا تھا۔

میں نے تارا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”مگر یہ ماری تفصیل تم مجھے کیوں سنارہے ہو۔ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”تمہارے سوال کا جواب اس تفصیل کے بعد ملے گا۔ میں چاہتا ہوں، مرنے سے پہلے تمہارے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہے۔ آج ہمارے درمیان آخری معرکہ ہو گا۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی اس جھنگ سے زندہ سلامت باکے گا۔ تم نے مجھ پر بہت قرض چڑھا دیا ہے، میں یہ قرض دودھ سود تمہیں لوٹاؤں والا ہوں۔“

”میں بھی اپنے دل میں تمہارے لیے کچھ اسی قسم کے بذلت رکھتا ہوں“ میں نے مٹھیاں بٹختے ہوئے کہا ”تمہاری لماس اگر ختم ہو چکی ہو تو میرے سوال کا جواب دے دو!“

اس نے کھانچنے والی نظریے مجھے دیکھا اور پھر بے ہوشی میں بولا ”جیسے ہی مجھے تمہارے بارے میں اطلاع ملے گی میں سب کو یہاں سے ہٹا دوں گا۔ اس جھنگ میں اس وقت انہوؤں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔“

”ساحل اور ممتاز کو تم نے کہاں شفٹ کیا ہے؟“

”فی الحال میں ان کے بارے میں نہیں جانتا، وہ اس وقت کہاں ہوں گی“ وہ مکاری سے زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ”وہ جہاں بھی ہیں، زندہ ہیں۔“

میں نے دباؤ نہ کر کہا ”تم جھوٹ بول رہے ہو، تمہیں سب

”معلوم ہے۔“

”تمہارے سر کی قسم“ میں غلط نہیں کہہ رہا، وہ بدستور زہر ملی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا ”تمہاری آمد سے آج کھانا پہلے میاں جی ان دونوں کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ٹھکانے پر لے گئے ہیں۔ جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آئے تو پورے جھنگ کی تلاشی لے لو۔ ویسے میں ایک بات جانتا ہوں، ساحل اور ممتاز کو بڑی مناسب جگہوں پر پہنچایا جانے والا ہے۔“

میں نے تڑپ کر پوچھا ”کیا کتنا چاہتے ہو تم؟“

”دیری سہل!“ وہ شیطانی انداز میں مسکرایا ”ان کو ان کے طلب گاروں کے پاس پہنچایا جائے گا۔ تم جانتے ہو ان کی طلب، کس کس کو ہے؟“

اس نے سوالیہ نظریے مجھے دیکھا، میں نے دانت پیٹتے ہوئے کہا ”تمہارے مذموم عزائم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بہتر ہو گا کہ اپنی ناپاک زبان سے خودی بتا دو۔“

تارائے کہا ”ابھی تھوڑی دیر بعد ممتاز کو عمر کوٹ روانہ کر دیا جائے گا۔ اس کا طلب گار میرا یار و ذرا اکبر سوحو ہے۔ ممتاز اور اس کے ماما ایس پی نے اکبر کو بہت نقصان پہنچایا ہے، وہ اپنا سارا نقصان اس نوجوان حسین سے پورا کرے گا۔ کس طرح؟ یہ صرف اکبر سوحو ہی جانتا ہے۔ اور کسی کو جاننے کا حق بھی نہیں۔“

وہ بہت ہی خطرناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا تاہم یہ معلومات میرے لیے بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا ”ساحل کو تم لوگوں نے کہاں چھپایا ہے اور اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا کیا ہے؟“

”اوہ۔۔!“ وہ عجیب سے انداز میں ہنسا ”تم اس بدلی لڑکی کے لیے بڑے بے چین ہو رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے وہ تمہاری محبوبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب کہیں جاکر تو اوٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ مجھے تمہاری اس بے فزاری سے بہت لطف محسوس ہو رہا ہے۔“

اس کی ہنسی مجھے زہر لگی۔ میں نے برہمی سے کہا ”تم یونہی یک بیک کرتے رہو گے یا ساحل کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ گے؟“

اس نے بتایا ”تم نے ہمارے چوہدری صاحب کی محبوبہ ڈائری کا ایک قیمتی ورق چرائیا ہے۔ ہم تمہاری محبوبہ ساحل کو چوہدری نواز شکی کو حویلی میں پہنچا دیں گے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ میں تھلا اٹھا ”تم کس ڈائری کی بات کر رہے ہو؟“

”وہی تمہارے باپ کی رقم کردہ ڈائری جس میں کثیر المالیات سونے کا راز تحریر کیا گیا تھا“ وہ بے پناہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ”تم جس ڈائری کا ذکر کر رہے ہو؟ چند ماہ پہلے میاں زاہد حسین نے میرے ہوٹل کے کمرے سے چوری کروائی تھی۔ وہ اب تک تمہارے چوہدری تک پہنچ چکی ہوگی۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے“ وہ اثبات میں سرھلاتے ہوئے بولا ”ڈائری تو چوہدری صاحب تک پہنچ ہی گئی ہے مگر اس ڈائری کے دو صفحات یعنی ایک ورق اس کے اندر سے تم نے بڑی صفائی سے پار کر لیا ہے۔ اس ایک ورق کے بغیر بات نہیں بن سکتی۔ وہ ڈائری ادموری اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے جس طرح تم ساحل کے بغیر ادمورے اور اجازین کر رہ گئے ہو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”جہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے اور تمہارے چوہدری کو بھی“ میں نے اسے پکڑ دیتے ہوئے کہا ”میں نے اس ڈائری میں سے ایک صفحہ بھی الگ نہیں کیا۔“

وہ میرے پکڑ میں نہ آیا۔ میرا جملہ ختم ہوتے ہی اس نے کہا ”تم مجھے کوئی سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ ڈائری کے بارے میں میرا اور چوہدری صاحب کا موقف اٹل ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ قیمتی صفحات میرے حوالے کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہاری محبوبہ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ بہ صورت دیگر، ہمارے درمیان آج خون ریز معرکہ ہوگا۔ اگر بد قسمتی سے تم مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بھی ساحل کو پانے کے لیے وہی شرط ہوگی۔ یہ چوہدری صاحب کا ناقابل تبدیل فیصلہ ہے۔ جب تک تم انہیں ڈائری کے وہ صفحات نہیں دو گے، ساحل چوہدری نواز ش کی جوبلی میں رہے گی اور زندہ رہے گی۔“ وہ ایک لمحے کا توقف کر کے بڑے معنی خیز انداز میں بولا ”مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ چوہدری صاحب کی مرضی ہے کہ وہ کب تک نہیں چھوٹ دیتے ہیں۔“

وہ چاہیں کب تک اسی قسم کی بکواس جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں جو جانا چاہتا تھا، وہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ آخری سوال کے طور پر میں نے پوچھا ”کیا ساحل ابھی تک کراچی ہی میں ہے یا اسے لاہور کے لیے روانہ کر دیا گیا ہے؟“

”تم سوال ہی کرتے رہو گے یا وہ صفحات میرے حوالے بھی کر دے گا؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں سمجھ گیا ”اب وہ مجھے مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ میں نے کہا“ میں تمہیں ان صفحات کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے، تمہی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا ہی کرنا پڑے گا۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ یہ حملہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے بیک جپ کی اور دو فٹ پیچھے چلا گیا۔ وہ منہ کے بل زمین کی طرف تیا کر نیچے کرنے کے بجائے اس نے ہاتھوں کے بچوں کا استعمال کرتے ہوئے فرش پر ایک قلابازی لگائی اور میرے پلوں میں پہنچ گیا۔ ہمارے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر ہیچ مارا۔ اس نے گردن جھکا کر میرا وار خالی دیا۔ میں نے ایک اسٹیپ اندر آگراس کی جھکی ہوئی گردن پر رائٹ ایلبرو سید کر دی۔ اس کا سر ایک جھٹکے سے مزید جھک گیا۔ اس کے حلق سے ایک مٹی مٹی گھبراہ برآمد ہوئی اور اسی لمحے اس نے ایک ہیچ حرکت کی۔

وہ اچانک زمین پر بیٹھا اور جھکی کی سر سرعت سے اس نے میرے ٹانگوں کو ٹخنوں سے جکڑ کر مجھے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا وار چل گیا اور میں پشت کے بل پیچھے جاگرا۔ تارا اپنی گردن کو سلاتا ہوئے میری جانب بڑھا۔ میری ایلبرو (ELBOW) نے اسے اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ کسی ریچھ کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے اس کے گردے ہوئے جسم کو اپنے پاؤں پر دھکا اور ایک جرک کے ساتھ اپنے سر کے عقب میں اچھال دیا۔ وہ ایک صوفے کے پتے پر جا کر گرا۔ میں نے فٹ اسپرک لگایا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

تارا اپنی کمر کو سلاتا ہوئے میری جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ وہ اس وقت ایک زخمی کوبرے کے مشابہ نظر آ رہا تھا۔ اتفاق سے اس نے ایلبرو پر جو بلیک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، اس پر بھی ایک کوبرے کی سفید رنگ میں تصویر بنی ہوئی تھی۔

میں ہر قسم کے حملے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ چار فٹ کی دوری پر پہنچ کر اس نے ہوا میں جب کی اور رائٹ سائڈ فلائنگ ملگ مارنے کی کوشش کی۔ کوئی شخص ان معنوں میں کہ اس کی لگ میرے وجود کو بچ نہ کر سکی، بہت کماتو دور کی بات ہے۔ میں نے تیزی سے اپر سائڈ فلائنگ کیا۔ تارا کے

جسم نے ہوا میں ٹوٹ کر دو تین فٹ دور اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کے زمین پر آتے ہی ایک سلائنگ ملگ مار دی۔ وہ ہلاک نہ کر سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرنٹ فلائنگ ملگ مار دی۔ میرا پاؤں تارا کی ناک پر پڑا۔ وہ ایک ہیچ کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ یہ وہی ناک تھی جس کی میں نے عموماً کوٹ کے ہوٹل میں اچھی خاصی ”خاطر داری“ کی تھی۔

جب تارا نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو ایک رشت ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا تھا جو اس کے ہونٹوں اور غصوں کی ورٹکین کرنا جا رہا تھا۔ تارا بار بار ہاتھ کی پشت سے اپنے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس منظر نے میرے اندر ایک سنسنی سی دھڑادی۔ میں نے ایک عجیب سا سرور محسوس کیا۔ تارا کو کس پھری کی حالت میں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ساحل کے غم نے مجھے جنونی بنادیا تھا اور یہ غم دینے والا تارا ہی تھا۔

میں نے اس کے سینے کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ کر اسے لات کھوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنے چہرے کو کور کرتے ہوئے پیچھے ہٹا رہا اور مار کھانا رہا۔ بالآخر اس کی پشت دیوار سے جا لگی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا لیکن یہ وہ دروازہ نہیں تھا جس سے گزر کر میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

ایک لمحے کو میں نے محسوس کیا جیسے وہ فرار کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس نے اچانک دروازے کو دیکھا تھا لیکن یہ اس کی چالاکی تھی۔ اس نے میری توجہ ہٹانے کے لیے وہ حرکت کی تھی۔ میری لمبائی غفلت کا نتیجہ فوری ہی برآمد ہو گیا۔

تارا نے کسی ارباب جیسے کی طرح میرے پیٹ میں ایک زوردار ٹکڑ مار دی اور اپنے سر کے زور سے پانچ فٹ مجھے عقب میں دھکیلتا چلا گیا۔ اس کی ٹکڑ میں کسی سائڈ کی قوت تھی۔ مجھے اپنے پیٹ میں مروڑ سا اٹھتا محسوس ہوا۔ میں نے فوراً سانس روکی اور اس کے سر پر رائٹ ایلبرو سے ہٹ کیا۔

تارا ایک ورنٹاک آواز کے ساتھ منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پشت پر سوار ہو کر گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں کسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے سر کو آزاد کرانے کے لیے زور لگانے لگا تاہم یہ زور بے سمت اور خواہ مخواہ نہیں تھا۔ تارا ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا۔ یہ بات اسے معلوم تھی کہ اپنی اس کوشش میں اگر اس نے ذرا سی بھی

نان ٹیکنیکل حرکت کی تو اس کی گردن کا کڑا کانکل جائے گا۔

ہمارے درمیان باقاعدہ ریسنگ کی طرح زور آزمائی ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں اس کا داؤ چل گیا اور اس نے بیک پش (BACK PUSH) کا استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ اس جسارت کے نتیجے میں اس کی گردن کو ایک جھٹکا لگا تھا تاہم یہ زیادہ خطرناک اور ضرر رساں نہیں تھا۔

ہم ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس مرتبہ حملے میں پہل میں نے کی۔ میں نے ٹی شات کا جھانسا دے کر ایک فرنٹ ٹو سائڈ ملگ اس کی ٹھوڑی پر سید کر دی۔ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔

اس نے ڈبل ہیچ سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں نے گردن کو بیک جرک دی۔ اس کے ساتھ ہی میری کمر کی کمان کی طرح پیچھے کو جھک گئی۔ تارا نے دونوں بازو کھول کر مجھے دھونچا چا بکٹیں اس کے بازوؤں کے حلقے میں آنے سے پہلے ہی فضا میں سائڈ ٹوٹسٹ کرتے ہوئے دور جا چکا تھا۔ البتہ اس فضا کی پرواز کے دوران میں میرے جو گزر پش پاؤں تارا کے چہرے کو ایک شاندار ”سلائی“ پیش کر چکے تھے۔

وہ کسی پٹنے ہوئے کتے کی طرح حلق سے ”چپاؤں چپاؤں“ کی آواز نکالتے ہوئے دور کھٹک چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا، میں تیزی سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ آج میرے اندر کوئی اور ہی وجدان سما گیا تھا۔ اس نے اٹھتے ہی مجھے غلط گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ ایک مارشل آرٹسٹ کو یہ زب نہیں دیتا کہ وہ مغالطات راز آئے۔ یہ ایک کمزوری اور بد اخلاقی بھی جاتی ہے۔ تارا کو میں نے شروع ہی سے گرم مزاج اور غصیلایا تھا۔ یہ اس کے کمزور اعصاب کی دلیل تھی۔ اس کے بالکل دوزخ مکانی دار میں خاصا حمل اور تدریایا جاتا تھا۔ دونوں بھائیوں میں مزاج کا بہت بڑا فرق تھا ورنہ اعمال دونوں کے متوازی تھے۔

وہ جھنجھلاہٹ اور ناکامی کے لے جٹے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کی جھنجھلاہٹ سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کی رائٹ ہانڈ ہاؤس کو میں نے بڑی صفائی سے ہلاک کیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر آگریں نے اس کے سینے پر ہیچ مارا۔

اس نے میرے کتے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائی

کے مقام پر بکڑ لیا اور نیچے کی جانب ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اگر میں کسی قسم کی مزاحمت کرتا تو میری کلائی چبھ سکتی تھی۔ اس کے جھٹکے کے ساتھ ہی میں بھی زمین کی طرف جھک گیا۔ میری اس حرکت پر تارا اگر میری کلائی کو چھو ڈیتا تو اس کا فائدہ تھا مگر اس نے کلائی کو دوپچے رکھا اور نتیجے میں وہ خود بھی میرے اوپر کھینچتا چلا آیا۔ میں نے اچانک اٹھ کر اسے اپنے اوپر سے دور پھینک دیا۔ میرے اوپر گرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے کلائی چھوٹ گئی تھی۔

اس نے پلٹ کر مجھ پر ایک لگ چلائی مگر اس لگ میں فورس برائے نام تھی۔ میں نے اس ڈھیلی ڈھالی لگ پر کھڑے ہاتھ کا چوپ رسید کر دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی اور ایک لوٹر سائڈ لگ اس کی مضبوط ٹانگ پر رسید کر دی۔ بڑی جتنی کی آواز ابھری اور تارا زمین پر لوٹ پوٹ ہوئے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ بے کار ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لنگڑاتے ہوئے اٹھا۔ اس حالت میں مجھے اس پر رحم آنا چاہیے تھا مگر آج تو میں رحم و کرم سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جو انسانیت کے نام پر بد نما رہتا تھا۔ اس نے میری عزیز ترین ہستی کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں اس سے ہمدردی کس طرح کر سکتا تھا!

وہ اپنی دائیں ٹانگ کو ہوا میں اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ پاؤں زمین پر لگاتے ہوئے اسے شدید تکلیف سے گزرتا پڑتا اور میں اسے ہر قسم کی تکلیف سے گزارنا چاہتا تھا۔

میں نے بڑی سفاکی سے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اس کی گھاس ٹانگ کو ایک مرتبہ پھر نشانہ بنایا۔ جواب میں اس کی چیخیں ابھریں اور میرے دل کو وافر مقدار میں سکون بخش گئیں۔

تارا خاصا سخت جان تھا۔ لوٹ پوٹ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے نزدیک آیا تو اس نے مجھے نیچے مار دیا۔ یہ ایک رائٹ اسٹریٹ تھا۔ میں نے بلا ٹانگ کے بعد اس کی کلائی کو گریپ (GRIP) میں لے کر ٹوئسٹ (TWIST) کیا۔ وہ جھکا تو میں نے اس کی کبھی پر اپنی بائیں کبھی کا وار کیا۔ تارا کے منہ سے زنج ہوتے ہوئے جانور جیسی آواز پیدا ہوئی اور وہ زمین پر گر کر رہنے لگا۔

مجھے یاد آیا "اندرون سندھ کے ریگزار میں ایک معرکے کے دوران میں" میں نے تارا کی اس کبھی کا جنازہ نکالا تھا۔ چوٹ پر چوٹ کیا قیامت ڈھاتی ہے" اس کا احساس انہی

لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تارا اب مزید مجھ پر حملہ آور ہو گا۔ اس کا دایاں پہلو بالکل ہی بے کار ہو کر رہ گیا تھا لیکن میں نے دیکھا، وہ ڈھیٹ ابن خبیث ایک مرتبہ پھر ڈنگاٹے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس پر نظر جمائے صرف چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس مرتبہ تارا نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے وہ دیوار پر نصب سوچ بورڈ کی جانب بھاگا اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے ایک ٹپن دیا دیا۔ اس کی اس شاطرانہ حرکت سے میں یہ تو سمجھ گیا کہ اس نے کوئی نئی چال چلی تھی لیکن فوری طور پر میں اس کی چال کو سمجھ نہ سکا۔ پھر اس سے ٹپل کل میں غور فکر کرتا، مجھے اپنے عقب میں دھڑ سے ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جہاں سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے چار گن بردار بھڑا مار کر کمرے کے اندر آئے اور آتے ہی انہوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ ان کا ٹارگٹ صرف اور صرف میں تھا۔ میں اس اچانک اقدام پر بوکھلا کر رہ گیا تاہم میرے دماغ نے ہدف میری راہنمائی کی۔ میں اپنی جانب چار گنوں کی نالوں کو اٹھنے دیکھ کر ہوا میں اچھلا۔ شاؤن نیپل میں ٹینک کے دوران میں مجھے ہائی ور نیپل جپ کی خصوصی مشق کو اپنی گئی تھی اور میں بے آسانی دس بارہ فٹ تک ہوا میں اچھل سکتا تھا۔

میری جپ کے نتیجے میں کمراتار کی آخری چیخوں سے گونج اٹھا۔ میری جانب آنے والی درجنوں گولیوں میں سے کسی نے یا سکی نے اس کے وجود کو چھید ڈالا۔ حملہ آور افراد نے اپنی گنوں کا رخ چھت کی جانب کیا اور برست فائرنگ لیکن میں وہاں ہوتا تو فائرنگ کی زد میں آتا۔ میرا حساس ذہن مجھے "آٹو" سیٹ کر چکا تھا۔ ور نیپل جپ کرتے ہی میں نے بلندی پر پہنچ کر اپنی باڈی کو سرسالت (SAULT) (SOMER) کے انداز میں رول کیا اور ڈبل اسٹیپ کرتے ہوئے سوچ بورڈ کے پاس پہنچ گیا۔

چار گنوں سے خارج ہونے والی ملک گولیوں نے کمرے کی چھت کو اوجیر ڈالا۔ اسی وقت مجھے اپنے بائیں کندھے میں الگ سی اترتی محسوس ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ گن بردار میری جانب فائرنگ کرتے، میں ہاتھ مار کر کمرے کی لائٹ آف کر چکا تھا۔ میں تاریکی کی چھائی ہی جس مقام پر کمراتار تھا، وہاں سے

نورا آگے رینگ گیا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا ورنہ وہ زہرے میں بھی اگر میری سمت فائرنگ کرتے تو مجھے شدید زخاں پہنچ سکتا تھا۔ حیرت انگیز طور پر مزید فائرنگ نہیں ہوئی اور وہ چاروں کی بعد دھڑکے کمرے سے نکل گئے۔ یقینی طور پر وہ اپنی "ٹپن" کو ری لوڈ (RELOAD) کرنے گئے تھے۔ برست فائرنگ نے گنوں کے میگزین خالی کر دیے تھے۔ میں ان کی واپس تک وہاں رکے کی طاقت نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی گولی ری باؤنڈ ہو کر میرے کندھے میں آدھسی تھی جس سے میں شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

میں نے زخمی کندھے کو ایک ہاتھ سے تھاما اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے کے نزدیک آگیا۔ مجھے اپنے ہاتھ پر خون کا رساؤ محسوس ہوا۔ کندھا ٹھیک ٹھاک زخمی ہو چکا تھا۔ چند لمحات تک جب باہر خاموشی رہی تو میں احتیاط سے باہر نکل آیا۔ وہاں کسی ذی نفس کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ایک کمرے کو سوچا اور گولی کی رفتار سے بالائی منزل کی بالکونی کے پاس پہنچ گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ چاروں میری طرف آرہے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹپنیں ری لوڈ کر لی ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں اس وقت اپنی ریسک پر تھا اور اس قسم کی صورت حالات میں بالائی اور فوری فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے سانس روکی، بالکونی کی ریٹنگ پر چڑھا اور ڈائیونگ بورڈ سے جپ لگانے کی طرح خود کو فضا کے حوالے کر دیا۔

میرے پاؤں میں جو گرز تھے اتنی بلندی سے نیچے آتا کوئی آسان کام نہیں لیکن جو لوگ "فری فال" کی تیئوری اور ٹیکنیک سے آگاہ ہیں، انہیں یہ نامکن نظر نہیں آتا۔ مشاق لوگوں کے لیے یہ ایک تکمیل ہے۔

زمین پر میرے پاؤں اور ہاتھ ایک ساتھ عمل میں آئے اور میں فرٹ رول کرتے ہوئے دور تک لڑھکا چلا گیا۔ میرے زخمی کندھے کی تکلیف اس حرکت سے کئی گنا بڑھ گئی مگر میں بازو کو تھام کر "ہائے ہائے" نہیں کر سکتا تھا۔ میرے عقب میں چار خدناک مٹوں کی سفاک نالیں اٹھی ہوئی تھیں جیسے چار توپیں وہاں کھولنے کو بے قرار ہوں۔

دولت ختم ہوتے ہی میں اٹھ کر اپنی گاڑی کی جانب لاؤ گیا۔ اسی وقت نیچے کی بالائی منزل سے گولیوں کی ایک پھار میری جانب آئی مگر خوش قسمتی سے ایک بھی گولی

میرے وجود کو چھو نہ سکی۔ وہ بڑے قیامت خیز لمحات تھے میرے پاس سوچنے، رکنے یا پلٹ کر پیچھے اپنے دشمنوں کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میں نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھائی ہی تھی کہ عقبی نشست سے کوئی سفید شے پرواز کرتے ہوئے آئی اور "دھپ" سے میری گود میں گری۔ ہڑبڑاہٹ میں اسٹینٹرنگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اسی لمحے میری سماعت سے ایک مانوس آواز نکرائی۔ "میاؤں..."

## سگریٹ نوشی چھوڑیے جیسا شروع کیجئے



تسبا کو نوشی اور دیگر بری عادات  
سے چھٹکارا حاصل کیجئے۔

مکتبہ انتشاریات

کتابیات 1970@yahoo.com

263-C 111 بکس پشاور 1 گاہکین کو 111 (7) اور 111 سب کے سامنے 75500



خالد بن ولید روڈ پر زیادہ رش و گنڈو وغیرہ کا تھا۔ حنا ب  
 موٹر سائیکل کسی ڈم کے مانند میری شیرڈ کے ساتھ بندھی چلی آ  
 رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی کچھلی سین پر بیٹھے ہوئے شخص نے  
 چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس طرح اس کے دونوں ہاتھ اور بالائی

موزسائیکل ڈرائیونگ سائیڈ سے شیرڈ کے برابر آئی سی اور اس وقت موزسائیکل کی کچھلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص بائبل میرے متوازی بیٹھ رہا تھا۔ اب چادر کے اندر سے اس کے آنچہ باہر نکل آئے تھے اور نظر آنے والے ان ہاتھوں میں ایک مختصر الوجود کلکشن دکھائی دے رہی تھی جس کا پیرل ایک سوانا

میرے عقب میں آنے والی گاڑیاں پولیس موبائل کے بے گناہ کا پورا پورا موقع دے لیں۔ جھوٹی ہی دیر میں وہ نوبل میرے غریب ہونے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خوف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ کرنی الفاظ پولیس موبائل سے بچنا حاصل کرنا ہے۔ میں شہر کو مختلف سڑکوں پر موڑنے سے شہر بہت روڑ پر لے آیا۔ اتفاق اور خوش قسمتی سے اس وقت اس روڑ پر زیادہ رش نہیں تھا۔ میں ایسکی ریٹر پر دیا

میں نے پولیس سوبال کو ڈانگ دینے کے لیے اپنی شہر  
ایک مرتبہ بھر سڑکی روڈ پر ڈال دیا۔ شاہراہ افضل  
مصرف، سیدی اور کشادہ روڈ پر میں زیادہ دیر تک پولیس  
والوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا لہذا ہاسٹی علاقے کو  
گلیوں میں کھمپا پھر کر اس سوبال سے نجات حاصل کی جا سکتی

تھی۔ اسی حکمت عملی پر قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اپنی گاڑی کو ”لال قلعہ“ کے پہلو سے بائیں جانب اندر لے لیا۔ اب میں میرا محمد شاہ روڈ پر سبز کر رہا تھا۔ پولیس موہاں جس طرح میرے تعاقب میں چلی آ رہی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا، وہ مجھے کوئی ڈاکو یا قاتل قسم کی چیز سمجھ رہے ہیں، علامہ اقبال روڈ والا سیکشن تو ذکر ہم نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا مگر موٹر سائیکل سے جو میری جانب برست فائز کیا گیا تھا۔ اس نے ہمیں مزید مشکوک کر دیا۔ پتا نہیں، ان دونوں موٹر سائیکل سوار افراد کا کیا ہوا ہوگا۔ میں اس لمحے کے بارے میں سوچ کر لرز اٹھا جب جدید ترین کلشن کا ہیرل میری جانب اٹھا ہوا تھا اور اب جب میں مجھ پر فائزنگ ہونے والی تھی۔ اگر میں بریک لگانے میں سیکنڈ کے دس دیں صے کے لیے براہی تخریر کر دیتا تو آج اپنی داستان بیان کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ اتنے نزدیک سے کلشن کوف کا برست میرے پیچھے کو گاڑی کے اندر چاروں طرف اڑا دیتا۔ حملہ آور کلاشکوف بردار کی ٹانگہ میں کوئی فرق تھا اور نہ ہی اس کا نشانہ کیا تھا۔ اگر میں ڈرا سی بھی کوئی تار دیتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اچانک شیر ڈرک جانے سے موٹر سائیکل کی فٹ آف گئی اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ اسی ”خطا“ کے نتیجے میں ان کی موٹر سائیکل لہرا کر ایک شوروم کے گیٹ سے جا گری تھی۔

میں نے بے ساختہ پیئرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی سفید بلی کو ممنونیت آمیز نظر سے دیکھا۔ اس نے میرے قدموں میں سرسراہٹ پیدا کر کے غیر ارادی طور پر مجھ سے بریک لگوا دیے تھے۔ گویا میری جان بچانے کا سہرا اسی کے سر بندھتا تھا۔

میرا محمد شاہ روڈ کے دو تین کٹ گزرنے کے بعد میں نے بیک ویو میں دور تک دیکھا اور میرا دل اچھل کر قلعہ میں آ گیا، لال قلعہ والے کارنر سے پولیس موہاں مڑ کر میری جانب سیدھی ہو چکی تھی۔ رہائشی علاقے کی سڑک پر آ کر میری اسپڈ کم ہوئی تھی جس کا فائدہ پولیس والوں نے اٹھایا البتہ ان کی ایک ”مہربانی“ میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ اب موہاں کا سائرن خاموش تھا۔ پتا نہیں، اس میں ان کی کیا مصلحت تھی!

موہاں کو ایک مرتبہ پھر اپنے تعاقب میں دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ رہائشی علاقے میں موہاں سے جان چھڑانے کے لیے چور سپاہی والا کھیل ضروری ہو گیا۔ میں نے ایک ذیلی اسٹریٹ میں شیر ڈرک کو موڑتے ہوئے اچانک اسپڈ

بڑھا دی۔ اس اسٹریٹ کے اختتام تک پہنچے ہوئے میں موہاں سے اچھے خاصے فاصلے پر آ گیا۔ وہ مجھے ہی مذکورہ اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ میں ایک اور اسٹریٹ پر سبز چڑھا۔ میں اس وقت نہایت مہارت کے ساتھ ”کے ڈی اے اکیم نمبرون“ کی کشادہ اسٹریٹس پر پولیس والوں کے ساتھ آنکھ چوٹی کھیل رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں انہیں گراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ گزشتہ دو تین ٹرنک کے وقت مجھے اپنے عقب میں پولیس موہاں دکھائی نہیں دی تھی۔ پہلے میرا ارادہ تھا، گھما پھرا کر اپنی گاڑی کو کارساز والی سڑک پر لے جاؤں گا لیکن پھر ایک صاف ستھری گلی میں داخل ہونے ہی میں نے اپنا ارادہ فوراً ترک کر دیا۔

اس فوری اور جتنی تبدیلی کا سبب وہ گیٹ تھا جس کے اندر میں نے ایک چمچانی بلیک ہوٹل سوک کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبصورت عورت موجود تھی جو بے آہستگی گاڑی کو بچنے کے اندر لے گئی۔

مجھے یقین تھا، اس عورت نے میری شیر ڈرک نہیں دیکھا ہو گا۔ بہ فرض خیال اگر دیکھا بھی تھا تو اس نے میری جانب دھیان نہیں دیا ہوگا۔ اس اسٹریٹ میں آواز سے اختتام تک خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں نے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنی شیر ڈرک کو اس مکے ہوئے گیٹ سے بچنے کے اندر داخل کر دیا۔

بلیک ہوٹل سوک ایک مخصوص راستے پر سبز کرتے ہوئے اپنے پورچ میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے گیٹ کے اندر پندرہ میں فٹ کا فاصلے طے کر کے شیر ڈرک بائیں جانب موڑ کر روک دیا۔ بچنے کے سامنے والے صے میں ایک خوبصورت سرسبز لان بنا ہوا تھا۔ میں نے لان کا حصہ گزرنے کے بعد ہی گاڑی کو بائیں جانب پیئرز فرس پر روک دیا۔

غالب امکان یہی تھا کہ میری اس ”جسارت“ پر وہ ہوٹل سوک والی بہت دبا دیا جائے گی۔ میں اس کی اجازت حاصل کیے بغیر بڑی بے جگری سے اس کے بچنے میں محس آ یا تھا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ عورت بڑے اطمینان سے اپنی گاڑی سے نکل کر اچھڑے، یعنی میری گاڑی پر ایک اچھی ہونٹی نگاہ ڈال کر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اس کا یہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر اور غیر فطری تھا۔ چ سوچتا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ اس نے میری شیر ڈرک دیکھا نہیں ہوگا اور وہ میری وہاں موجودگی سے بے خبر ہوئی۔ میں نے اپنے ذہنی کندھے کو مضبوطی سے تھاما اور بیک ویو میں بچنے کے گیٹ کا جائزہ لینے لگا۔ جس جگہ میں نے شیر ڈرک کو رکھا

ہاں سے وہ گیٹ بالکل عقب میں بڑتا تھا۔ اس عورت نے بڑے سلیقے اور تکل کے ساتھ گیٹ کو بند کر کے اندر سے بولٹ کیا اور بڑے تھکے دموں سے میری جانب بڑھنے لگی۔

عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں، میں نے اس کا بازو لیا۔ وہاں اگرچہ زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن میں اس کے رہا ہو کر بڑی وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا قد کسی بھی طور باج فٹ آٹھ انچ سے کم نہیں تھا وہ متناسب جسم کی مالک ایک بخش عورت تھی جس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے ارب قریب لگایا۔ اس کا چہرہ ایک اب سے عاری تھا، رنگت مانولی تھی جس کی وجہ سے اس کی کشش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک حاذیب نظر اور خوبصورت عورت تھی جس کے سن کی کتنی میں کسی کلام کی گنجائش نہیں تھی۔

”کیا ساری رات اسی گاڑی میں گزار دو گے؟“

اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے سراپا میں اس قدر غور ہو گیا تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا، وہ کب میرے زیب پہنچ گئی تھی۔ میں نے تیزی سے پچاس جھپکائیں اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گیا۔

”اوہ! تم تو زخمی ہو“ اس نے میرے خون آلود کندھے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولی ”اندرا آ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ مڑ کر بچنے کے اندر دنی صے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا یہ رویہ میری حیرت میں مزید اضافہ کر گیا۔ میں جس قسم کی صورت حال میں اس کے بچنے میں وارد ہوا تھا، اس کے پیش نظر اسے کسی اور نوعیت کے رد عمل کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ میں اس سمجھ میں نہ آنے والی میرا بہانہ کی راہنمائی میں بچنے کے اندر پہنچ گیا۔ مختلف اہلکاروں سے گھبرا کر وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی جو اپنی بچنے سے بیڈروم نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک جھازی سائز بلیک طرف اشارہ کرتے ہوئے سر ہلی آواز میں کہا۔

”تم یہاں آرام کرو۔ میں تمہارے زخمی کندھے کا کوئی ٹیڈوسٹ کرتی ہوں۔“

”تم کون ہو؟“ بے ساختہ میری زبان سے پھل گیا۔

وہ زرب مسکرائی ”یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا اگر نہیں پوچھا تو اس کا بھی مطلب ہے، میں تمہاری دشمن نہیں بلکہ دوست ہوں۔ ویسے میرا نام کتنی ہے۔“

”کتنی!“ میں نے دھیمی آواز میں دہرایا ”اگر تم میری

دوست ہوتو پھر میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں گا کہ اس وقت پولیس میرے پیچھے کی ہوئی ہے۔ تم مجھے پناہ دینے کے جرم میں کسی مصیبت میں بھی مبتلا ہو سکتی ہو۔“

وہ ہر اہتمام دلچسپی میں بولی ”پناہ میں نے نہیں دی بلکہ تم از خود میرے بچنے میں آئے ہو، بہر حال اس ڈزٹ میٹز اس نے بے پردائی سے کندھے اچکا ہے اور کہا ”اس بچنے میں تم بالکل محفوظ ہو۔ پولیس کا باب بھی یہاں ناک نہیں کر سکتا۔ شاید تم نے بچنے کے باہر نصب نیم پلیٹ کو نہیں دیکھا؟“

اس کے اہتمام سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی توپ قسم کی شے ہے۔ میں نے واقعی نیم پلیٹ کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ میں نے کتنی کے سوال کے جواب میں ٹی ٹی میں گردن ہلاتی اور پوچھا ”نیم پلیٹ پر کیا لکھا ہوا ہے؟“

”تا دوں گی۔“ وہ بے اعتنائی سے بولی ”پہلے تمہارے کندھے کے علاج محتالے کے سلسلے میں کچھ کوشش کر لوں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔“ میں نے کتنی سے زیادہ جرح نہ کی اور اس کے مشورے کے مطابق بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ بیڈ سائز پر ایک خوبصورت جدید قسم کا کٹلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا میں تمہارا فون استعمال کر سکتا ہوں؟“

”میں تمہاری دوست ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی ”تم اس بچنے کی ہر چیز کو بے دریغ استعمال کر سکتے ہو۔“

اس کی مسکراہٹ بڑی دل آویز اور دلنشین تھی۔ اس نے چھاتی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو اس کی ساتونی رنگت کی دلکش کمی کو کمپوز کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹمک کی کان نے لباس پہن کر کٹلی کی شکل اختیار کر لی ہو۔ جنوں کی کٹلی تو سیاہ رات کے ماند کا کتنی بھی لیکن میرے سامنے جو کٹلی کھڑی تھی وہ اپنی رنگت اور رنگت سے کسی بھی ذی ہوش کو جنوں بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

میں اس وقت کٹلی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ لپک تھی۔ یوں لگتا تھا وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ آنکھوں کے مقام پر دو دھاتی ورنٹا طیس ڈٹ کر دیے گئے ہوں۔ وہ کسی ساحرہ کی آنکھیں تھیں جو اپنے سامنے موجود ہر شے کو مسخر کرنے پر قدرت رکھتی تھیں۔ میں نے اسکی آنکھوں والی عورت پہلے ہی نہیں دیکھی تھی۔

میں شاید اس کی آنکھوں میں دیکھتا چلا جاتا کہ وہ چاکل مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں بیڈروم میں اکیلا رہ گیا۔ اس اکیلے پن نے مجھے احساس دلایا کہ تموزی دیر پہلے میں

آتش فشان 230 حصه 8

اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے پیش نظر مجھے خود ہی اپنے دشمنوں سے شکستہ ہے۔ میں آپ کو یہ بتا ہی چکا ہوں، انہو اکندگان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

میں نے منہاس باقر کو نہایت ہی محفوظ اور چیدہ چیدہ باتیں بتائی تھیں۔ یہ حالات کا تقاضا اور میری مجبوری بھی تھی۔ میں نہ تو کل کر اس کے سامنے آ سکتا تھا اور نہ ہی مکمل پردہ پوشی ممکن تھی۔ وہ بہت سمجھ دار اور بردبار شخص تھا۔ جہاں دیدہ اور سرد گرم چیدہ۔ اس سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔

میری بات سننے کے بعد اس نے کہا ”میری دعا ہے، اللہ جہیں جلد از جلد کامیاب کرے۔ تم اس مشن سے سرخ رو ہو جاؤ تو پھر میں بھی تمہیں ایک نہایت ہی ہم ذمہ داری سونپنا چاہتا ہوں۔“

”کیسی ذمہ داری؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ بولا ”ابھی میں خود اس سلسلے میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، ایک بہت ہی منظم گروہ کراچی میں کام کر رہا ہے۔ مقامی افراد کے اس گروہ کے پیچھے درحقیقت یہودی لابی اپنا کام کر رہی ہے۔ میں اسی گروہ سے متعلق تحقیقاتی کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے، تم وہ کام کر گزرو گے جو دوسروں کے لیے ناممکن ہے۔“

میں نے پوچھا ”آپ جس گروہ پر کام کر رہے ہیں اس کی سرگرمیاں کس نوعیت کی ہیں؟“

”بہت ہی پراسرار نوعیت کی۔“ وہ غہرے ہوئے لہجے میں بولا ”ان کے کام اور کردار کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ یہودیوں کے اشاروں پر کتنے چیلوں کی طرح نچ رہے ہیں۔ اس گروہ کے تمام اراکین ہم میں سے ہیں، ہمارے ہی بھائی بند ہیں اس لیے عام لوگ ان کے در پردہ عزائم تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ان کے ظاہر ہفت اور تعمیری کاموں پر نظر رکھتے ہیں مگر میں کسی بہت بڑے طوفان کے آئندہ رکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں، میں نے کچھ شواہد بھی جمع کیے ہیں لیکن ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگر تم میرے ساتھ مل کر کام کر دو تو ہم بہت جلد کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہودی لابی بہت ہی مکاری اور عیاری دکھا رہی ہے۔“

”آپ نے جو شواہد جمع کیے ہیں اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھ کا شہر میں دہشت گردی اور بد نظمی کی جو وارداتیں

آئے دن سننے اور دیکھنے میں آرہی ہیں، اس کے پیچھے اسی گروہ کا ہاتھ ہے۔ وہ یہودیوں کے کسی نہایت ہی خاص مقصد کے لیے، ملک اور حکومت کو بدنام کرنے کے لیے اس قسم کی سنگین وارداتیں کرتے پھر رہے ہیں۔ انشا اللہ بہت جلد میں اس گروہ کو بے نقاب کر کے ان کا کچا چٹھا کھول دوں گا۔ یہودیوں کے ناپاک عزائم کبھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے، اس موضوع پر فرصت سے بات کریں گے۔“ میں نے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد میں نے ساؤتھ کا ممبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر میں نے انہیں میں کبیر شاہ کی آواز سنی۔ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا ”تم کہاں رہ گئے بھئی؟“

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے اب تک کی کارروائی کی مختصر کہانی سنائی جہاں اسے میرے کارناموں پر خوشی ہوئی، وہ ہیں سائل کے انخواب والے واقعے نے اسے شدید رنج بھی پہنچایا۔ اس نے مناسب الفاظ میں مجھے دلاسا دیا اور دشمنوں کے دانت کھنکھنے کے بلکہ دانت توڑنے کے عزائم کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے اظہار خیال کے اختتام پر پوچھا ”شعب صاحب آگئے ہیں نا؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا ”میری ان سے بات کراؤ۔“

”شعب صاحب اس وقت ساؤتھ میں نہیں ہیں۔“

”پھر کہاں ہیں؟“

”انہیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں سینٹرل جانا پڑ گیا۔“ کبیر شاہ نے بتایا ”ایک گھنٹا پہلے وہ یہاں سے گئے ہیں۔“

میں نے پوچھا ”سینٹرل میں ان سے رابطہ ہو سکتا ہے؟“

”آں..... ہاں.....“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا ”ہو تو سکتا ہے لیکن..... میں پہلے ان سے پوچھ لوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ.....“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، فی الحال رہنے دو شاہ جی۔ تم دیکھیں گے۔“ میں نے گویا اس کی مشکل آسان کر دی۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ کبیر شاہ نے پوچھا۔

”سمجھ لو، ایک دوست کے پاس ہوں۔“ میں نے کہا ”اور محفوظ ہوں۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ جربز ہوتے ہوئے بولا ”رات میں اگر باس کا فون آ گیا تو میں انہیں تمہارے بارے میں تھیلہ بتا دوں گا۔ تم صبح سیدھے ساؤتھ چلے آؤ۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر ریسور کو کر پیل کر دیا۔

میرے مرحوم دوست امتیاز کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ کراچی کے پانچ اضلاع میں شیعہ غوری نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے جو انی اضلاع کے نام سے منسوب تھے۔ ”سادھ“ اور ”ایسٹ“ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایسٹ والا ٹھکانا گل پارک کے نزدیک تھا اور ”سادھ“ ڈیفنس میں پارک والی مسجد کے قریب۔ ”سینٹرل“ تارتھ ناظم آباد میں تھا۔ ”ویسٹ“ اور ”لیٹر“ کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ یعنی ان ٹھکانوں کے بارے میں!

کبیر شاہ عرف شاہ جی سادھ کا قائم مقام تھا اور اس کی تنظی مجبوریوں کو میں بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اس سے زیادہ جرح، کرپہ یا اصرار نہیں کیا۔ میں یکے بعد دیگرے اسی ٹیلی فون کنٹیکٹ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ لیٹی بیڈروم میں داخل ہوئی۔ وہ ابھی تک اسی پیاز کی رنگ کے لباس میں تھی۔

اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھ کر میں سمجھ گیا، وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میرے نزدیک آکر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ فرسٹ ایڈ باکس کو اس نے سائیڈ میں رکھ دیا۔ میں بیڈ پر شیم دراز تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں ایک دالہ اندازہ ڈالی۔ اس نگاہ میں کوئی جلی بھری تھی۔ مجھے اپنے تن بدن میں ایک سنسنی سی اتڑتی محسوس ہوئی۔ وہ میری کیفیت کو تاڑتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور بیسم ربہ انداز میں منفسر ہوئی۔

”اگر تم ٹیلی فون سے فارغ ہو چکے ہو تو میں اپنا کام شروع کروں؟“

میں نے کہا ”ٹیلی فونک معاملات سے تو میں منٹ چکا ہوں مگر تم کوں کام شروع کرنے والی ہو؟“

جواب دینے کے بجائے اس نے فرسٹ ایڈ باکس کو خپچا یا اور مخصوص انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کلیوں کے چننے کا تاثر پایا جاتا تھا۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے پوچھا ”کیا تم ڈاکٹر ہو؟“

”ڈاکٹر تو نہیں ہوں مگر تمہاری مشکل کو یہ آسانی حل کر سکتی ہوں۔“ اس نے فرسٹ ایڈ باکس کو کھولتے ہوئے کہا ”ویسے کسی زمانے میں، میں نے فرنگ کا کورس بھی کیا تھا۔“ میں نے اپنا گھاس بازو اس کے سامنے رکھ دیا اور

آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا ”میرا ذہن تمہارے بارے میں سیکڑوں سوالات تیار کر چکا ہے۔ تمہاری ان مہربانیوں کو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ تمہاری ہر ہر ادا، ہر ہر رویہ سیکڑوں ہزاروں سوالات کو جنم دیتا ہے۔“

”فی الحال تم اپنے ذہن کو نہ ٹھکاؤ۔ تمہارے ہر سوال کا منطقی جواب تمہیں مل جائے گا۔“ وہ میرے ذہنی کندھے کا معائنہ کرتے ہوئے بولی ”تم اطمینان سے ایک مہربان، قدر دان دوست کی مہربانیوں سے استفادہ کرو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“

اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر کے معائنے کے بعد اس نے بتایا ”شکر کرو، کوئی تمہارے کندھے کا گوشت مجازتے ہوئے گزرنے لگا۔ اگر وہ کندھے کے اندر گھس کر بیٹھ جاتی تو پھر آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس صورت میں ہڈی کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ بہر حال“ اس نے ایک لمبے کا وقف کیا پھر بولی ”تم اپنی شرٹ اتار دو، تاکہ میں یہ آسانی تمہاری سرسختی کر سکوں۔“

میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی میرے کندھے کے اندر دھنسی ہوئی ہے۔ دراصل مجھے دو گھنٹے میں، میں جن جان لیوا اور سنسنی خیز حالات سے گزر رہا تھا ان میں، میں جی طرح پر اپنے گھاس کندھے کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ مجھے اتنا موقع اور فرصت میسر نہیں آئی تھی کہ میں کندھے کا معائنہ کر سکوں۔ شیم روڈ والے بنگلے پر جب میں نے اپنے بائیں کندھے میں آگ سی اتڑتی محسوس کی تھی تو یہی سمجھا کہ چھت سے دی باؤنڈ ہو کر کوئی گولی میرے کندھے میں گھس گئی ہے۔ لیٹی کی اطلاع

میرے لیے خاصی حوصلہ افزائی تھی۔ گولی میرے کندھے سے ”بغل گیر“ ہو کر رخصت ہو گئی تو اس میں میرا ہی فائدہ تھا اور نہ اگر وہ وہاں ”سکونت“ اختیار کر لیتی تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ پہلے ہی کچھ کم مقبضیتیں کھڑی تھیں جو ایک کا حربہ اضافہ ہو جاتا!

میں نے لیٹی کی ہدایت پر اپنی خون آلود شرٹ اتار دی۔ وہ بڑے اٹھناک سے میرے کندھے کی ”خاطر داری“ میں مصروف ہو گئی۔ اس کی کارروائی کے دوران میں، میں اپنے کندھے میں خاصا درد محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات تو میں ناقابل برداشت حد تک چھوئے لگتی مگر میں اپنے دانتوں پر دانت جمائے وہ تکلیف سہتا رہا۔ آدھے گھنٹے کی ڈاکٹری کے بعد لیٹی نے اپنے کام سے فارغ ہو کر فرسٹ ایڈ باکس بند کر دیا پھر کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”تمہاری خون آلود شرٹ تو میں نے اترا دی لیکن میں

بہرہی ہوں، تمہاری چٹلون کی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ ہے۔“ پھر اس نے بیڈروم کے اٹیچڈ واش روم کی جانب لڑکھایا اور بولی ”وہاں ایک نیو براڈ سلپنگ سوٹ لٹکا ہے۔ فریٹی ہو کر وہ لباس پہن لو۔ میں تمہارے لیے بین کمر دووا لے آئی ہوں۔“

پھر اس سے پہلے کہ میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑا ہوتا، وہ ٹ ایڈ باکس اٹھا کر بیڈروم سے نکل گئی۔ میں اس مہربان بی دوست کے بارے میں سوچتے ہوئے واش روم میں ٹس گیا۔ وہ ایک معما ثابت ہو رہی تھی۔ سوچنے سے مزید فوجانی تھی۔

واش روم میں ایک نیا ٹیکو سلپنگ سوٹ موجود تھا۔ وہ رات مردانہ تھا جس سے ظاہر ہوا، اس بنگلے میں لیٹی کے علاوہ دلی مرد بھی رہتا تھا لیکن میں جب سے اس بنگلے میں آیا تھا لی کے سوا کسی کو دیکھا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔ اس سلپنگ سوٹ یا رگے بارے میں لیٹی ہی کوئی وضاحت کر سکتی تھی۔

دس منٹ کے بعد میں تروتازہ ہو کر واش روم سے نکل آیا۔ لیٹی بیڈروم میں موجود تھی اور بیڈ شیٹ کو درست کر رہی تھی۔ ایک ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے بستر کی اڈر کو بدل دیا تھا۔ میرے ذہنی کندھے نے پہلے والی چادر کو چا جاوا جسے دار کر دیا تھا۔

کمرے میں میری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے لیٹی نے کہا ”دراصل وہ شیٹ خاصی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے نئی بیٹ بچا دی ہے۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ میری بات سے بغیر ایک مرتبہ لڑکھائی سے نکل گئی۔ میں بستر کی اچلی چٹلیں چادر پر نیم دراز اور خود کو پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں بڑے لگا۔ میرے لیے یہ حالت موت اور زندگی کے مکمل میں زور سے تھے اور خالد بن ولید روڈ پر تو موت مجھ سے چند انچ نادر ہی پر آن کر پڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ حسن سفید ملی میرے زونوں میں نہ کسائی تو میں بے اختیار بریک لگانے پر مجبور نہ ہوتا۔ میرا وہ عمل غیر ارادی اور اچانک تھا جس نے مجھے اہت کے منہ میں جانے سے بچالیا تھا۔ اور اس عمل کا محرک جب وہ سفید ملی تھی۔ گویا اس مرحلے پر سفید ملی نے مجھے اہت کے جڑوں سے کھینچ کر نکالا تھا۔ میں ایک جھلکے سے اٹھ اڑیہ گیا۔

میرا ذہن تیزی سے اس دست گیر ملی کے بارے میں ٹپنے لگا۔ میں کاںی دیر سے اس ملی کو بھولا بیٹھا تھا۔ کیوں؟ یہ

خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس ملی کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ جب میں لال قلعہ کے پہلو میں میرا محمد شاہ روڈ پر مڑا تھا تو وہ ملی میری شیر ڈ کی پانچر سوٹ پر بے نیازی سے بیٹھی اپنا سر کھج رہی تھی۔ اس کے بعد پولیس والوں سے آٹھ بجو کی کے دوران میں میرا دھیان اس طرف سے ہٹ گیا تھا اور اب..... وہ اچانک ہی میری سوچ کا مرکز بن گئی تھی۔

میں اس ملی کے بارے میں پریشان ہو گیا۔ میں نے سوچا، لیٹی سے اس سفید ملی کے بارے میں پوچھوں گا۔ شیر ڈ سے نکل کر میں لیٹی کے ساتھ ہی اس بیڈروم تک پہنچا تھا۔ اس ملی سے متعلق وہی مجھے کوئی تسلی بخش بات بتا سکتی تھی۔ میں بے چینی سے لیٹی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

میرا یہ انتظار جلد ہی ختم ہو گیا۔ لیٹی ایک بدلے ہوئے روپ کے ساتھ بیڈروم میں داخل ہوئی۔ اس نے گلابی رنگ کی ٹائی پین رکھی تھی جس کا کپڑا بہت نئیس اور مین تھا۔ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں دلی صورت حال تھی۔ اس حریری لباس میں وہ کسی قیامت سے دم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ملوکی مسکراہٹ ہوٹوں پر سجائے بڑی سبک خرازی سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ میں اس نے ایک قیمتی طشتری اٹھا رکھی تھی جس پر ایک بلوری گلاس دکھائی دے رہا تھا۔ اس گلاس میں مشروب ٹاپ کوئی نظر آ رہی تھی جس کا رنگ کندنی تھا۔

میرے پاس آ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی طشتری آگے بڑھائی پھر بڑے دل آویز انداز میں بولی ”یہ لیٹو۔ اس سے تمہارے ذہن کی تکلیف جاتی رہے گی اور انفیکشن کا بھی کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔“

”مگر تم تو کوئی بین گمر ہیڈ سین لینے لگی تھیں۔!“ میں نے اس کے سر پر اسے نگاہ جراتے ہوئے کہا۔ اس پر نظر لگائے رکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

وہ دل پریں لہجے میں بولی ”اس مشروب کو تم بین گمر ہی سمجھو۔ یہ تمہاری تمام تکلیف دور کرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے دل و دماغ اور ذہن کو تروتازہ بھی دے گا۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ بلوری گلاس اٹھایا اور اس میں موجود کندنی مشروب کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ مشروب انتہائی شیریں، خوش ذائقہ اور خوشبودار تھا۔ مجھے اپنے جسم و جان میں ایک سکون بخش خشک کی اتڑتی محسوس ہوئی۔ اس خشک میں ایک ناقابل فہم آج بھی شامل تھی۔ شاید میں اس کیفیت کو صحیح طور پر بیان نہیں کر پا رہا۔ وہ مشروب اتنا اثر تھا کہ میری قوت بیان کو بھی متاثر کر رہا تھا۔

میں اس کی کیف آوری کو بہ خوبی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے مزید دو گھنٹہ لینے کے بعد پوچھا ”کیا یہ مشروب بازار میں عام فروخت ہوتا ہے؟“ میری آواز میں سردی کی آمیزش تھی۔

جواب دینے سے پہلے وہ مخصوص انداز میں مسکرائی پھر فی میں گردن کو جھٹک دیتے ہوئے بولی ”یہ مشروب تمہیں پوری مارکیٹ میں نہیں ملے گا کیوں کہ اسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ دنیا کا کوئی مشروب اس سے زیادہ فرحت بخش نہیں ہو سکتا۔“

”وہ تو میں محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی اور گلاس میں بچے ہوئے مشروب کو ایک ہی بڑے گھونٹ سے اپنے اندر اتار لیا۔ اس کے بعد میں نے خالی گلاس کو واپس فطرتی میں رکھتے ہوئے پوچھا ”اس ہوم میڈ مشروب کا تم نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟“

وہ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”اس کا نام جام امید رکھا ہے لیکن یہ نام صرف مجھ تک محدود ہے یا پھر میں تمہیں بتا رہی ہوں۔“

”اچھا ہے..... بہت اچھا ہے۔“ میں نے گلابی ناخن کے اندر جھلملاتی ہوئی لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بے مثال..... لا جواب ہے..... اکمال ہے۔“

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”تم اس مشروب کے نام کی تعریف کر رہے ہو یا میری؟“

اس کا یہ پُر معنی سوال پر عمل تھا۔ میں اس وقت بے ساختہ اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے نیچے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ”دونوں کی۔“

وہ میرے پیٹ کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھی تھی، کرسی کو پیڈ کے مزید قریب کرنے کے بعد اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ایک نرم سی گرماہٹ اپنے سر میں اتار لی محسوس ہوئی۔ اس گرماہٹ میں لذت حیات شامل تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز میں غبار شامل تھا۔

”نرسنگ۔“ اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”نرسنگ!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”آپریشن کے بعد آپریٹڈ باڈی کو یکوری روم میں رکھا جاتا ہے۔ جب متعلقہ شخص ہوش میں آ جاتا ہے تو اسے روم یا وارڈ میں شفٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد نرسنگ شروع ہو جاتی ہے۔“ اس نے

تھوڑا وقفہ کر کے میری آنکھوں میں جھانکنا پھر سلسلہ کلام کو اپنی مخصوص مسکراہٹ کی آمیزش سے جاری رکھتے ہوئے بولی ”تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے کندھے کی ہلکی ہلکی سرجری کی ہے۔ چوں کہ اس عمل کے دوران میں تمہیں بے ہوش نہیں کیا گیا۔ اس لیے یکوری روم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تم براہ راست اپنے پیڈ پر منتقل کیے جا چکے ہو لہذا نرسنگ کا آغاز ہوا جاتا ہے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ کرسی سے اٹھی اور پیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر ہولے ہوئے میرا سر دبانے لگی۔ اس کی سانوٹی ہلکی سی حرارت بخش گداز میرے تن میں اترنے لگی۔ میں بھول گیا کہ اس سے سفید ملی کے ہارے میں اختصار کرنا تھا۔ اس وقت میں پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ وہ ”نرسنگ“ کے دوران میں مجھے اپنے ہارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے بیان میں اتنی شخصیت تھی کہ ایک لمحے کے لیے مجھے میرا وجود بے جا سمجھ کر کہیں ادھر ادھر سمجھنے کے لیے نہ جا سکا۔ وہ دلی تھیں آواز میں کسیر تھی۔ میں ہمہ تن گوش بن رہا تھا۔

”میں ایک ممتاز سیاست دان کی بیوہ ہوں۔ ایک سال پہلے میرے شوہر سعید خان کا انتقال ہو گیا تھا۔ سعید خان میرے لیے اتنا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا کہ مجھے معاش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بنگلہ، گاڑی اور بینک بیلنس، سب کچھ ہے میرے پاس۔ میں نے غف جیپوں پر بہت بھاری اور محفوظ انویسٹمنٹ کر رکھی ہے جس سے مجھے کچھ بھگ تین لاکھ روپے ماہانہ پرافٹ مل جاتا ہے۔ بیوہ میرے پورے مہینے کے اخراجات کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔“

میں نے پرافٹ کی رقم پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا ”تمہارا شوہر تو جاتے جاتے تمہیں ہر معاشی اور مالی غم سے آزاد کر گیا لیکن تم جو کچھ کر رہی ہو کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ اس وقت تمہارا مرحوم شوہر کی روح کو کس قدر اذیت پہنچ رہی ہو گی!“

میں نے الفاظ ”جو کچھ“ پر زور دیا تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی ”تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ سب کچھ پہلی اور آخری مرتبہ ہے۔“

”پہلی مرتبہ تو مجھ میں آنے والی بات ہے۔“ میں نے کہا ”آخری مرتبہ کیوں کر؟“ وہ قدرے بھجھکائے ہوئے لہجے میں بولی ”اب ضروری نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔ کچھ اہم باتیں اور ان کی بھی رہنے دو۔“

بات ختم کرتے ہی وہ مجھ سے مفرانچ کے فاصلے پر اٹھی۔ نا بے خبر بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کوشش میں بڑی کامیابی ہوئی۔ میں آنکھیں نیم وا کر رہ گیا۔ اس پر امید نامی مشروب کے اثرات اب کل کر سامنے آ گئے تھے۔ اسی لمحے میں دردناک اجڑا کے ساتھ ساتھ کچھ مسکن اشیاء شامل کی گئی تھیں۔ مجھے غبار کی کیفیت محسوس ہوئی لیکن درد ان میں لکی اپنا رنگ دکھا چکی تھی۔

سیاہ رات، دن کے اجالے کو نگھل جاتی ہے۔ لیلیٰ کے ہارے بن میں سر سے ایسی جاہزیت تھی۔ میں سرے کی اس این میں بھٹک کر رہ گیا۔ وہ کسی سیاہ ریشمی تھان کی طرح مجھ لگی اور مجھے کوئی چلی گئی۔ احتیاط اور تکلف کے سارے بند ہوئے تو میں بے خودی اور خوفزدہ اموشی کی منزل پر کھڑا تھا۔

☆☆☆

علی الصباح میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک طویل رات لیٹے ہوئے بدن کو کھینچا اور گہری سانس لیتے ہوئے ری اس ہو گیا۔ میرا جسم پھول کی طرح پھٹکا محسوس ہو رہا تھا زشت ساری کلفت، الفت میں بدل گئی تھی لیکن اب وہ بہت جاتی رہی تھی۔ میں ٹرانس اور بے خودی کی حالت سے رہا تھا۔ جب میرے حواس بہ جا ہوئے تو میں نے خود کو بقوت کی اذیت ناک دنیا میں پایا۔ مجھے درجہ اول حالات رہ کر ستانے لگے۔ ساحل کی یاد ایک کسک بن کر میرے دل پر جا گزری ہو چکی تھی۔ اس کی جدائی نے میرے جگر میں جو ماؤڈ الا تھا۔ وہ زمانے کی کسی بھی شے سے بھر نہیں سکتا تھا۔ مایوسی اس کی اور اس غلا کو صرف اور صرف ساحل کی ذات مان کر سکتی تھی۔

گزشتہ رات کے ”واقعات“ کے بارے میں سوچتے ہی مجھے خود پر حیرت ہونے لگی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مایوسی منازل سے گزر گیا! پھر میری یہ حیرت انفس میں سے تھی۔ وہ سب کچھ غیر ارادی طور پر محسوس ہو گیا تھا۔ چنانچہ لیلیٰ نے مجھے کیسا طبعی مشروب پلایا تھا کہ میں بے چوں لگا اس کے اشاروں پر عمل کر گیا تھا، اس کے کناپوں کو بھٹاتا ہوا اس کی آواؤں کو محسوس کرتا گیا۔

پھر مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ تھوڑی دیر قبل تو حیرت دل میں بدلی تھی۔ اب یہی انفس، بیچانی کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ اپنے عمل پر اندامت محسوس ہونے لگی۔ اس شرمندگی فطرت پکڑی تو میں لیلیٰ کے بارے میں سوچنے لگا جس کے پرہیز وادارہ تھا۔ اگرچہ میں بھی میرا کاحصہ دار تھا، اگر ایک کی ذمہ داری تھی۔

لیلیٰ کے ہارے میں سوچتے ہوئے میں نے کن آنکھوں سے اپنے پہلو میں دیکھا۔ وہ آسودگی کی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا بے ترتیب بدن کسی زیرِ مرمت گاڑی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کی بیڈ شیٹ پر پنک ناخن میں وہ اشنی منی مائن (ANTI MONY MINE) کسی کھلتے ہوئے گلاب کا منظر تخلیق کر رہی تھی۔

میں اس کی آسودگی میں غل ہوئے بغیر بہ آہستگی کنارِ شوق سے لی آیا۔ داشِ روم میں ایک حیرت میری نظر تھی۔ اپنے خون آلود لباس پر نظر پڑنے ہی میں چونک اٹھا اور چوکنے کی وجہ سے تھکی کر اب وہ لباس بے داغ، صاف اور استری شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے ابھی طرح یاد تھا، میں نے گزشتہ رات سلیپنگ سوٹ پہننے ہوئے اپنی چٹون اور شرٹ کھنٹی پر لٹکائی تھی اور ان کی حالت خراب ہو رہی تھی مگر یہی چٹون اور شرٹ اب دیگر برقی قمیص اور لگتا تھا، جیسے ابھی کسی ٹیویس لاٹری سے دل گرا آئی ہوں۔

فریش ہو کر لباس پہننے کے دوران میں، میں مسلسل لیلیٰ کے ہارے میں سوچتا رہا۔ ہمارے دونوں کے سوا اس ہنگامے میں اور کوئی نہیں تھا۔ اگر میں نے اپنے آلودہ لباس کو صاف نہیں کیا تھا تو پھر یہ کارنامہ لیلیٰ ہی کا ہو سکتا تھا۔ آج کل جدید قسم کی واشنگ مشینز آگئی ہیں۔ جن میں دھوئے، سکھائے اور استری کرنے کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تھا، میری نیند کے دوران میں لیلیٰ نے میرے لباس کو بھی ”فریش“ کیا۔ ”اب“ کر دیا تھا۔ وہ بڑی حیرت انگیز اور پراسرار ہستی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے عمل سے میری یادداشت میں نقش ہوئی چلی جا رہی تھی۔

میں تازہ دم ہو کر داشِ روم سے نکلا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ لیلیٰ بستر پر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ ہلکی سبز بیڈ شیٹ پر ایک تنہا سامیہ کا پھول نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنے وجود میں سنسنہٹ سی اتار لی ہوئی محسوس ہوئی کیوں کہ اس لمحے مویجے کے پھول میں حرکت پیدا ہوئی تھی پھر وہ ”پھول“ میری جانب دیکھ کر مسکرایا، اس نے اپنے حلق سے مخصوص آواز خارج کی اور اچھل کر بیڈ سے نیچے اتر آیا۔

”میاؤں“ کی تیز آواز نے میرے جسم و جان کو ہمنواز کر رکھا۔ مویجے کا پھول نظر آنے والی وہ سفید ملی پلک جھپکتے میں بیڈ روم سے نکل گئی۔

اب میں اس آفت کی برکالہ، شیر کی خالہ کا صورت آشنا ہو چکا تھا۔ ویسے تو تمام بلیوں کی شکلیں آپس میں ملتی جلتی ہوتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے، میں اس سفید ملی کو ہزاروں لاکھوں



بلیوں میں بھی الگ شناخت کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھ پر جو احسانات کیے تھے انہیں فراموش کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ گزشتہ رات کہاں غائب ہوئی تھی؟

میں رات کیلی سے اس بلی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر بلی اور کچھ جام امید کی اثر پذیریری نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ابھی بلی کو دیکھ کر یہ تو سلی ہوئی کہ وہ بنگلے ہی میں موجود ہے۔ مگر بلی کہاں چلی گئی! تھوڑی دیر پہلے تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

بلی کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے، وہ کسی دوسرے واٹس روم میں ہو۔ میں نے ڈیرینک کے سامنے پہنچ کر اپنے بال سنوارے پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنے جو گزر چھپنے اور بلی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جب اس انتظار نے طول پکڑا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔ اب تک بلی کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں بیٹھنے لگا۔ باہر اب اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد بھی جب مجھے بلی کی صورت دکھائی نہ دی تو میں بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ اس تلاش کے دوران میں، میں مسلسل بلی ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے آئندہ پندرہ منٹ میں اس بنگلے کا ایک ایک کمرہ، ایک ایک واٹس روم اور ایک ایک کوننا جھانک لیا لیکن بلی کہیں نظر آئی اور نہ ہی اس کا کوئی آثار دکھائی دیا۔ لگتا تھا، وہ جیسے یہاں آئی ہی نہ ہو، یہاں رہی ہی نہ ہو۔ یہاں اس کی موجودگی کا کوئی نشان ڈھونڈنے میں، میں ناکامیاب رہا۔

میں واپس اسی بیڈ روم میں آیا جہاں شب بستی کا مجھے موقع ملا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر اس اسرار اور طلسم کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، میرا تجسس اور ابھرنے بڑھتی جا رہی تھی۔ بلی کا سابق سلوک اور موجودہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ایک بھارت کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئی، ایک یادگار لمحائی رفاقت کا تختہ دے کر کسی پہیلی کے مانند غریب مل شدہ ہو گئی تھی۔ میں سردست اسے حل کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اسم باکسی ثابت ہو رہی تھی۔ بلی..... یاہ رات کی پہلی کرن کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔

بہی سب سوچتے اور اچھے ہوئے بے اختیار میرا ہاتھ اپنے زخمی کندھے پر چلا گیا اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کھانسی کندھے پر پڑی موجود تھی، تو میں تازہ دم ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا مگر اب بلی پر ہاتھ پڑتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میرا وہ کندھا دوسرے کندھے کی طرح انتہائی صحت مند ہو۔ درد اور تکلیف سے بے نیاز!

میں نے بے چینی کی کیفیت میں گھائل کندھے کو ٹولا اور بار بار دبا کر دیکھا لیکن حقیقت بدل نہ سکی۔ مجھے وہاں شہر برابر تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ ناممکن تھا..... انتہائی ناممکن! اجرا وہ کندھا گولی لگنے سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ مانا، بلی بہت اچھی نرس رہی ہوگی، اس نے نہایت مہارت سے میرا زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی بھی مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا، ایک ہی ڈیرینک سے زخم بھر جائے۔ نہ صرف زخم بھر جائے بلکہ اس میں تکلیف کا احساس تک نہ رہے!

میرا ذہن تیز رفتاری سے ان واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے فوراً ڈیرینک کے سامنے جا کر اپنی شرٹ اتار دی پھر کندھے پر بندھی پٹی کو کھولنے لگا۔ اس دوران میں، میں "جام امید" نامی اس حیرت انگیز اور درد بخش مشروب کے بارے میں بھی سوچتا جا رہا تھا۔ بلی نے کندن رنگت والے اس مشروب کی بہت تعریف کی تھی۔ لیکن ہے، اس مشروب کے گہرے اثرات نے میرے کندھے کی تکلیف کو آؤن چھو کر دیا ہو..... لیکن یہ کیا؟ کندھا پٹی کی بندش سے آزاد ہوا تو میں چونک اٹھا۔

ڈیرینک کا آئینہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ آئینہ کہیں کا بھی ہو، وہ جھوٹ سے آتشا ہوتا ہے۔ ہمیشہ شج بولا ہے۔ میں جس آئینے کے سامنے کھڑا تھا اس کی راست گوئی نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میں چند منٹ کے فاصلے پر آئینے میں اپنے بائیں کندھے کو دیکھ رہا تھا۔ جی کل پٹی بھی اٹھائی اور میرے اس کندھے پر زخم تو کیا، ایک خراش تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا کوئی نرس یا کوئی ڈاکٹر اتنا صاحب کمال ہو سکتا ہے کہ ایک ہی پٹی سے زخم کا نام و نشان مٹا ڈالے؟ نہیں، ایسا صاحب کمال اور ہنرمند ڈاکٹر ممکن نہیں اور نہ ہی ایسا ہوتا ناممکن ہے کہ کوئی مرہم یا دوا اتنی زود اثر ہو کہ زخم کو چند گھنٹوں میں بھر کر اس کے آثار تک ناپید کر دے..... تو پھر یہ سب کیا تھا؟ میں بلی آنکھوں سے جس حقیقت کو دیکھ رہا تھا اس سے انکار کی مجال نہیں تھی۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوندھی۔ اس بجلی کی چمک نے میرے خیالات میں ایک انتہائی خطرناک اور روٹنے کھڑے کر دینے والے سوال کو اجاگر کر دیا۔ میں نے سوچا، کہیں یہ سب نیلگری کی کیا دھرتیوں نہیں؟

اس سوال نے میرے پورے وجود میں ایک سنہری سی دوڑا دی۔ نیلگری بہت ہی پر اسرار اور گہما گہما کی ایک تھی۔ وہ بہت کچھ کرنے پر قادر تھی۔ گزشتہ رات جو مجھ کو وہاں تو اس کے لیے بائیں ہاتھ کا چمکا رہا تھا۔ اس سے بڑے بڑے

بڑے وہ میری نگاہ کے سامنے دکھائی گئی تھی۔ میں اس کی خداداد قوت کو تسلیم کرتا تھا۔

پھر مجھے نیلگری کی دلچسپ دھمکی بھی یاد آئی۔ پاکستان کی حدود میں داخل ہونے کے بعد جب پاک رینجرز نے ہمیں تائی پولیس کے حوالے کیا تھا تو تھانے کے حوالات میں اس کی پر اسرار ہستی نیلگری نے مجھ سے الوداعی "ملاقات" کی۔ الوداعی اس حوالے سے کہ اس نے کہا تھا، آئندہ وہ اپنی اصل شکل میں بھی میرے سامنے نہیں آئے گی بلکہ جب ہی کوئی عورت میری خلوت میں پہنچے گی تو وہ اس عورت کے اندر رہتے ہوئے میرا قرب حاصل کرتی رہے گی۔ یہ ایک بات ہی خطرناک دھمکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نیلگری ایسا کرنے پر قدرت رکھتی ہے اور ازاں بعد اس نے ایک دو مراحل پر ایسا ثابت بھی کیا تھا۔ ساحل (دھن) کی صورت میں میرے بہت قریب رہ کر وقت گزار چکی تھی۔ وہ اپنے جن "نام" کا کھل کر اظہار کر چکی تھی، میں اب تک ان سے بچتا چلا آیا تھا۔ وہ میرے حصول میں ناکامیاب رہی تھی مگر.....

گزشتہ رات کے واقعات ایک مرتبہ پھر میرے ذہن کی فلم کے مانند چلنے لگے۔ میں یہ سوچتے رہا جو ہو گیا، نیلگری اپنی شاطرانہ چال سے مجھے ٹریپ کرنے میں ناکامیاب ہو گئی۔ وہ کافی عرصے سے غیر حاضر تھی۔ میں سمجھا، وہ مجھ سے مایوس ہو کر ہمالیہ کی گود میں جا بیٹھی ہے۔ یہ سمجھتا میری ذہنی ثابت ہوئی۔ وہ مایوس یا بد دل نہیں ہوئی بلکہ گمات لگا کر مجھے شکار کرنے کے انتظار میں تھی..... اور بالآخر اس نے مجھے شکار کر لیا تھا۔ یہ سوچتا اور معلوم کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ناکہ بلی میرے نزدیک آئی تھی یا میں بلی کے قریب پہنچا تھا؟

حقیقت یہ تھی کہ نیلگری نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ وہ جتنی حسین و جمیل تھی اس سے کہیں زیادہ خوبصورتی نے مجھے شکست دی تھی۔ اس دل فریب و دل کش شکست کو انہندہ کی بھر فراموشی نہیں کر سکتا تھا۔

بلی کو میں تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے میں تلاش کر چکا تھا۔ میں نہیں بلی تھی۔ گویا نیلگری اس بنگلے سے رخصت ہو چکی تھی۔ وہاں مزید رک کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں آتا تھا۔ میں بیڈ روم سے نکل آیا۔

بنگلے کی عمارت سے باہر آتے ہوئے سلاخی نظر سے سفید لکڑی دیکھتا رہا مگر وہ مجھے نہیں نظر نہ آئی۔ پتا نہیں، وہ کس طرف اور نظرت کی بلی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کا موڈ پایا جاتا تھا۔ نیلگری کی "کارروائی" کے دوران میں وہ محض غائب رہی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا

کہ نیلگری ہی نے اسے اپنی کسی ہفتی کے زیر اثر "دھل" درمقولات" سے باز رکھا ہو گا۔ نیلگری ہزار ہا نادیہ تو توں کی مالک تھی اور جانور، خصوصاً بلی نادیہ تو توں اور ہوائی مخلوق کو بہت جلد دیکھ لیتی ہے۔

میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں گزشتہ رات میں نے اپنی شیر ڈکھڑی کی تھی۔ یہاں مجھے استغاب کے ایک اور جھگ سے گزرتا ہوا۔ بلی شیر ڈوہاں سے غائب تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ کارپورج میں بلیک ہوٹل اسوک بھی موجود نہیں تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں کھڑا شیر ڈور کیل کے بارے میں سوچ رہی رہا تھا کہ بنگلے کے گیٹ کے اوپر وہی سفید بلی نمودار ہوئی اور گیٹ کے ستون پر سے ہوتے ہوئے وہ باہر کود گئی۔ اس چھلانگ سے قبل اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے ایک خاص ادا سے "میاؤں" بھی کیا تھا۔

مجھے یوں لگا، وہ اس "میاؤں" کے ذیلے مجھے کوئی پیغام دے گی ہو۔ رات اس گیٹ کو بلی نے بند کر کے بولن چڑھا دیا تھا۔ میں تیزی سے چلتے ہوئے گیٹ کے پاس آیا۔ گیٹ کی اندرونی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے دھکیل کر گیٹ کو کھولا جا تا تو معلوم ہوا، وہاں سے بند ہے۔ اس کوشش کے دوران میں میری نگاہ بلیک کر گیٹ کے درز سے باہر چلی گئی اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ گیٹ کے سامنے، باہر سڑک پر میری بلی شیر ڈکھڑی تھی۔

سفید بلی کا اشارہ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ بند گیٹ کے باہر پہنچنے کا طریقہ بتا رہی تھی، گویا مجھے بھی دیوار بھاند کر یا ایک گز گیٹ کے اس پار جانا تھا۔ میں نے اس محسن بلی کی خفیہ ہدایت پر عمل کیا اور اپنی شیر ڈکھڑی نکال چکی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے گیٹ کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہاں گیٹ کی کنڈی میں مجھے ایک بڑا سلاخا جھوٹا نظر آیا۔ میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں نے ایک جھگ سے شیر ڈ آگے بڑھا دی۔

حیران ہونے کے لیے اکتا چکا تھا کہ میں نے حیرت کا اظہار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گزشتہ رات اس بنگلے کا گیٹ کھلا دیکھ کر میرا وہاں داخل ہونا، بلی کی معیت میں بے چون و چرا اس کے بیڈ روم میں پہنچنا، پھر وہاں پیش آنے والے واقعات..... میرے لباس کا صاف ستھرا ہونا، میرے کندھے کا زخم سرے سے غائب ہو جانا، سفید بلی کی حرکات و سکنات کا ساکت و جامد ہو جانا، بلی کا غیاب اور اب میری گاڑی کا بنگلے سے باہر پہنچ جانا، گیٹ کا باہر سے لاگ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام ایسے

واقعات تھے جن کی کوئی عقلی توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔  
ماورائی اور روحانی ذیل میں یہ تمام ڈانڈے نیلگری سے جانتے  
تھے..... آہ نیلگری!

واپسی کے سفر کے دوران میں، میں نے شکایتی نظر سے  
سفید بلی کو دیکھا۔ وہ حسب معمول پنجرہ زینٹ پر براجمان مجھے  
ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہ میں موجود  
شکایت کو اس نے محسوس کر لیا اور گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔

میں نے اس سے پوچھا: ”وہاں ماہ پہلے اوپن ائر  
ریسٹورنٹ میں تم ہی میری میز کے نیچے سرسرا رہی تھیں نا؟“  
”میاؤں“ اس نے بیک لفٹلی جواب پر اکتفا کیا۔

”اور اسی رات بوٹ ٹینک کے مقام پر ہمارے دشمن ممکن  
بردار پر بھی تھپی نے جست لگائی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں  
نا؟“

اس نے اپنے جواب کو دہرایا ”میاؤں۔“

میں نے سوال کیا ”مگن بردار پر چھلانگ لگاتے وقت  
تمہاری جسامت میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ تم کسی صحت  
مندکتے کے جذبے کو پہنچ گئی تھیں؟“

ایک مرتبہ پھر مجھے ”میاؤں“ سننے کو ملی۔

میں نے فلیٹ کے بیڈروم میں بیڈ کے اوپر اس کی  
موجودگی کا حوالہ دے کر سوال کیا اور اس نے ایک بار پھر  
”میاؤں“ کی آواز نکالی۔

میں نے ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد اس سے  
پوچھا ”تم اس بات سے انکار تو نہیں کر دیتی تاکہ جب ساحل  
اور ممتاز سی اینڈ والے فلیٹ میں تمہاں تو تم نے ایک سفید  
چیتے کا روپ دھار کر انہیں ڈرانے کی کوشش کی تھی؟“

یہ سوال بہت اہم تھا لیکن حسب سابق اس سفید بلی نے  
اس کا جواب بھی اپنی مخصوص ”میاؤں“ میں دیا تو میں بھلا کر رہ  
گیا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کی کون سی ”میاؤں“ کا  
مطلب ”ہاں“ ہے اور کس ”میاؤں“ کا مطلب ”نہ“۔ مجھے تو  
وہ تمام میاؤں ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ کچھ بھی ہو، یہ بلی  
کوئی عام بلی نہیں تھی۔ اس نے اب تک دوستانہ رویے کا  
مظاہرہ کیا تھا، سوائے چیتے والے واقعے کے۔

ایک فوری خیال کے تحت میں چونک اٹھا۔ یہ خیال  
نیلگری کے بارے میں تھا۔ گزشتہ رات اس کی پراسرار  
حکمتوں کے سبب سفید بلی بس ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بھی تو ممکن  
تھا کہ سفید چیتے والے واقعے میں بھی نیلگری ہی کا ہاتھ ہو؟ اگر  
ایسا تھا تو پھر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ نیلگری نے  
ساحل اور ممتاز کے اغوا کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ نیلگری مجھے

اپنی پراپرٹی بنا کر رکھنا چاہتی تھی اور میرے نزدیک آنے  
والی بھر عورت سے ایک مخصوص قسم کی دشمنی رکھتی تھی۔  
ساحل تو اس حوالے سے سرفہرست تھی!

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اپنے دل و  
دماغ پر بہت بوجھ محسوس ہوا۔ تاراک کی باتوں سے یہ تو اندازہ  
ہو گیا تھا کہ ساحل کی زندگی کوئی الغور کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو  
میں اس ”فی الغور“ کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی ک  
پہنچنا اور اسے بحفاظت واپس لانا چاہتا تھا۔ سفید بلی کے  
بارے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کا اسرار میری  
سمجھ میں نہیں آ جاتا، میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ خاص طور  
پر اس کی جسامت میں کسی تیشی والی سمسٹری کو جاننا بہت ضروری  
تھا۔ وہ میرے قریب رہتی تو میں زیادہ بہتر طور پر اس کا مشاہدہ  
کر سکتا تھا۔

میں نے ڈیفنس سوسائٹی کی حدود میں داخل ہونے کے  
بعد سفید بلی کی جانب دیکھا اور سوال کیا ”کیا تم ہمیشہ میرے  
پاس رہ سکتی ہو؟“

نا قابل فہم اور نارٹا یا جواب موصول ہوا ”میاؤں۔“  
میں نے ایک نیا تجربہ کیا ”ٹھیک ہے۔ میں مجھ کا تم  
مستقل طور پر میرے ساتھ رہنے کے لیے آدائی کا ظاہر کر دیتی  
ہو چنانچہ اب ضروری ہو گیا ہے، میں تمہارے لیے کسی موزوں  
سے نام کا انتخاب بھی کر لوں۔ میں تمہاری طرح ”میاؤں  
میاؤں“ کرنے سے قور ہا!“

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے  
”میاؤں“ نہیں کیا بلکہ خطرہ نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز  
ایسا ہی تھا جیسے وہ میرے منہ سے اپنا تجویز نام سننے کا انتظار کر  
رہی ہو۔ میں نے کھانک کر گھاسا صاف کیا اور کہا۔

”آج سے تمہارا نام ڈارلنگ ہے۔“  
وہ پراسرٹ انداز میں دہانہ کھول کر بولی ”میاؤں!“  
میں نے کہا ”ڈارلنگ! صرف ”میاؤں“ ہے۔ کچھ نہیں  
چلے گا۔ اگر تمہیں یہ نام پسند آیا ہے اور تم میری بات سمجھتی ہو  
تمہیں اس کا ثبوت دینا ہوگا۔“

وہ بخیرہ ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔  
مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ وہ کسی سمجھ دار  
اور بردبار شخص کی طرح بہت کمشوش ہو گئی تھی جس سے کبھی ظاہر  
ہوتا تھا، وہ میری باتوں کو پوری طرح سمجھ رہی ہے۔  
میں نے کہا ”ڈارلنگ! ثبوت کے طور پر تمہیں ابھی  
اسی وقت میری گود میں آنا ہوگا!“  
میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک منٹ سے

اٹھ کر میری آغوش میں پہنچ گئی پھر بڑے رومانیک انداز  
اس کے حلق سے آواز نکلی ”میاؤں!“  
میں سنبھل گیا۔ اس عجیب و غریب روزگار کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆  
”ساؤتھ“ میں کبیر شاہ سمیت سبھی نے مجھ سے افسوس کا  
ایک پھر کبیر شاہ اپنے ساتھ مجھے اپنے کمرے میں لے  
لیے وہی پینڈروم تھا جہاں کل کا بیسٹرن دن میں نے آرام  
لے ہوئے تھے۔ کبیر شاہ نے پہلے میرے لیے ناشتے  
بلا دیے۔ میں نے رسوائی چھٹکا ناشتا کیا۔ دل بہت  
ل ہو رہا تھا۔ کچھ کھانے پینے کو کئی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں  
اس کے بارے میں سوچتے ہوئے زہر مار کر رہا تھا۔  
ناشتے کے دوران میں کبیر شاہ نے کہا ”وہ جان! تمہاری  
سے گزشتہ رات مجھے پاس کی ڈانٹ سننا پڑی۔ اچھا ہوتا،  
پینڈروم میں تمہارا ان سے رابطہ کروا دیتا۔“  
”ایسا کیا ہو گیا شاہ جی؟“ میں نے چونک کر اسے  
پوچھا۔

وہ بولا ”آدھی رات کے وقت پاس کا فون آیا تھا۔ میں  
بائیں تھیں تمہارے اور تمہیں پیش آنے والے حالیہ واقعات  
مبارے میں بتا دیے۔ وہ اس پر خامے برہم ہوئے کہ میں  
ان سے تمہاری بات کیوں نہیں کر دیتی۔ خاص طور پر  
ان کے سامنے نے انہیں بہت دکھ پہنچایا ہے۔ وہ دس  
بلیک یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اچھا ہوا، تم ان سے پہلے ہی  
لگے۔ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا ”تم نے  
بتایا تھا کہ کسی اپنے دوست کے پاس ہو کر گوداں کا پتا اور  
نام نہیں بتایا تھا ورنہ میں رات ہی تم سے رابطہ کر لیتا۔“  
اس کے لیے میں معذرت شامل تھی۔

میں نے فراخ دلی سے کہا ”چلو، کوئی بات نہیں۔ میں  
ناشبہ سے تفصیلی ملاقات کر لوں گا۔“ پھر میں نے دیوار  
نالاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس وقت نوجیتے والے  
ناشبہ کے آنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ جب تک میں  
ضروری فون کر لوں۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مجھے آرام کرنے کا کہہ کر بیڈروم  
چل گیا۔  
گزشتہ رات جب میں نے کبیر شاہ کو فون کر کے اپنے  
ات سے آگاہ کیا تھا تو اس بات کا خیال رکھا تھا کہ  
بات یا تفصیل میں نہ جاؤں۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ چوہدری  
ساحل ایڈ جکٹنی نے میری دوست ساحل کو اغوا کر لیا ہے  
اس ساحل کی تلاش میں پہلے گشتن اقبال والے بچکے اور پھر

کشمیر روڈ والے بچکے پر زبردست مارا ماری کر کے اپنے  
دوست کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ میں نے اسے تار کی موت  
کے بارے میں بھی بتا دیا تھا تاہم وہ اس حقیقت سے واقف  
نہیں تھا کہ ساحل کے ساتھ ممتاز نا ہی ایک لڑکی بھی اغوا ہوئی  
تھی اور یہ کہ کشمیر روڈ والے بچکے پر میرے بائیں بازو میں کوئی  
گولی بھی لگی تھی۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا اور میں نے اس پر خدا کا  
شکر ادا کیا ورنہ اگر کبیر شاہ میرا زندگی بھر کا دیکھنے کی فرمائش کر  
بیٹھتا تو میرے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں جن طلسمانی اور  
ماورائی حالات سے گزرا تھا ان کی وضاحت یا توجیہ بہت  
مشکل تھی۔ میرے بیان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا..... اور  
یہ کچھ غلط بھی نہ ہوتا!

گزشتہ رات لگ بھگ ساڑھے نو بجے میں نے ”نمی سر“  
میں قاضی سلطان سے بات کی تھی۔ اس بات کو قریباً بارہ گھنٹے  
ہونے کو آئے تھے۔ اتنے وقت میں کراچی سے عمرکوٹ جا کر  
واپس بھی آیا جا سکتا تھا، اس کا مطلب یہی تھا، ممتاز کو وہاں  
پہنچایا جا چکا ہوگا۔ اس سلسلے میں قاضی سلطان نے بیٹی کے  
حصول کے لیے کیا ”بندوبست“ کیا تھا یہ اسی سے معلوم کیا جا  
سکتا تھا۔

میں نے نمی سر میں قاضی سلطان سے حویلی میں رابطہ کیا۔  
تھوڑی دیر بعد میں قاضی سے ہمکلام تھا۔ اس نے رکی علیک  
سلیک کے بعد بڑے پرجوش انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور  
بتایا کہ اس نے اپنے آئیں بی سالے اور پولیس کی بھاری  
جمعیت کے تعاون سے ممتاز کو اغوا کنندگان کے قبضے سے آزاد  
کر لیا ہے۔ کراچی سے عمرکوٹ کی طرف جانے والے راستے  
کی ناکابندی کر کے پولیس نے بہت خطرناک آپریشن کیا تھا  
جس کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ممتاز واپس اپنے  
والدین کے پاس پہنچ چکی تھی۔

قاضی سلطان مجھے اس کا روروائی کی تفصیل سنانا چاہتا تھا  
جو بھینا بہت ہی سنسنی خیز ہوتی لیکن فی الحال میرے لیے اتنا  
ہی کافی تھا کہ ممتاز بخیر دعا و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ میں نے  
قاضی سے کہا۔

”انشاء اللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی پھر میں آپ  
سے یہ تفصیل سنوں گا۔ فی الحال آپ ممتاز کا خیال رکھیں۔ وہ  
بڑے اذیت ناک لمحات سے گزر کر آپ کے پاس پہنچی ہے۔“  
”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ قاضی نے تائید کی ”وہ  
بہت سبھی ہوئی ہے۔ تمہارا ایک مرتبہ پھر ذہن سے شکر یہ ادا  
کرتا ہوں۔ یہ دوسری مرتبہ ہے، جب تم نے ممتاز کو بچایا

ہے۔“ پھر اسے کچھ یاد آگیا، پوچھنے لگا ”ساحل کا کچھ سراغ“  
 وغیرہ ملا؟“

میں نے کہا ”ساحل میرے جانے پہچانے دشمنوں کے پاس ہے۔ تارائے اپنی موت سے قبل اسے زاہد حسین نامی ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ میاں زاہد حسین، چوہدری نواز شعلی کا خاص آدمی ہے جو کراچی میں اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرتا ہے۔ میں بہت جلد میاں زاہد کے سر پر عتاب بن کر نازل ہونے والا ہوں..... بہت جلد!“

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں سنگین اور سفاکی درآئی۔ قاضی سلطان نے کہا۔ ”میں نے گزشتہ رات ہی منہاس باقر کو یہ خوش خبری سنا دی تھی۔ تمہارا کوئی رابطہ نمبر میرے پاس نہیں تھا اس لیے تمہیں فون نہ کر سکا بعد میں منہاس باقر سے تمہارے فلیٹ کا جو فون نمبر مجھے مل گیا، میں نے اس پر فون کیا لیکن وہاں سے کسی رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ بہر حال، میں ایک مرتبہ پھر تمہارے اس تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“  
 ”آپ مجھے بار بار شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے کہا  
 ”ملاقات ہونے پر تفصیل گفتگو کریں گے۔“

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ ممتاز کی بازیابی سے مجھے دلی سکون حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساحل کا تصور بھی ابھرا یا۔ ممتاز کی واپسی نے ساحل کی یاد دلادی تھی۔ وہ دونوں کل سہ پہر بہادر آباد چورنگی سے انخوا ہوئی تھیں۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے ایک کو برآمد کر لیا گیا مگر دوسری ابھی تک مفقود ابھری تھی۔ اس خیال نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ میں دہی دل سے ساحل اور اس کی سلامت واپسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

تارائے اپنی موت سے قبل مجھ سے جو مکالمہ بازی کی تھی اس میں تو چوہدری نواز شعلی کی طرف سے یہی مطالبہ دہرایا گیا تھا، اگر میں ڈائری کے وہ دو قیمتی صفحات ان کے حوالے کر دوں تو وہ میری ساحل کو میرے سپرد کر دیں گے۔ تارائے باقاعدہ مجھ سے وہ صفحات مانگے تھے۔ اس کا تقاضا ظاہر کرتا تھا، وہ لوگ مجھ سے ہر صورت میں وہ صفحات نکلوانا چاہتے ہیں۔ تارا اب باقی نہیں رہا تھا چنانچہ لائحہ عمل یہ کام اب میاں زاہد حسین کو کرنا تھا اور اس لیے بھینا وہ مجھ سے رابطہ کرتا۔ رابطے کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ چوہدری نواز شعلی مجھیں کر دے روئے بابت کے سونے کو بہ طور حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس حصول کے لیے وہ قیمتی صفحات اذہد ضروری تھے..... گویا میاں زاہد حسین نے ہر صورت مجھ سے رابطہ کرنا تھا اور اس سے پہلے اسے میرا سراغ لگانا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ساحل کے بارے میں اگر کوئی شخص مجھے درست معلومات فراہم کر سکتا تھا تو وہ میاں زاہد حسین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میاں زاہد کراچی کے نیٹ ورک کو آپرٹ کر رہا تھا۔ تارائے انخوا کے بعد دونوں لڑکیوں کو میاں زاہد کی تحویل میں دیا تھا۔ اسی نے ممتاز کو ڈیڑا اکبر سوردی کو حلی میں پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ ساحل کے بارے میں بھی اسی کو قدم اٹھانا تھا۔ تارا مجھے یہ بتا چکا تھا کہ ساحل کو بالا خر چوہدری نواز شعلی کی حلی میں واقع موضع رکھاں والی میں پہنچا دیا جائے گا لیکن اس کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ مجھ سے ڈائری کے صفحات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کے دوران میں وہ لوگ ساحل کو کراچی کی حدود سے باہر نہیں لے جائیں گے۔ مجھے جو بھی تک و دو کرنا تھی، فوراً سے پتہ کرنا تھی..... اور اس سلسلے میں، میں نے پہلی فرصت میں ایک ہنگامی فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا، میاں زاہد حسین کا بے دردیغ تعاقب کرنے کے بجائے میں اسے اپنے قریب آنے کا موقع دوں گا۔ کس طرح؟ اس بارے میں، میں مسلسل سوچا چار کرنے لگا۔

نہجک دس بجے مجھے اطلاع ملی کہ شعیب غوری ساؤتھ میں داخل ہو چکا ہے۔ آئندہ چندرہ منٹ بعد میں شعیب کے ساتھ ایک ساؤتھ پر دف کرے میں بند ہو گیا۔ ہمارے درمیان واجبی سی ”پیلو ہائے“ ہوئی۔ اس نے ساحل والے واقعے پر گہرے رنج کا اظہار کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد ساحل کو ڈھونڈ نکالے گا بلکہ اس نے بتایا کہ رات ہی اس نے اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی کر ڈالی ہے جس کے نتیجے میں وہ میاں زاہد کے ایک ایسے ٹھکانے کا پتہ چلائے ہیں جس کا مایاب ہو گیا ہے جس کے بارے میں اس کی قیاس و حدس کم لوگ جانتے تھے۔ اس سے پہلے میں نے ممتاز اور ساحل کے انخوا سے لے کر تارائی کی موت تک کے تمام واقعات تفصیل سے اسے سنا دیے تھے۔ کے ڈی اے اسکیم بہرون کے نیچے اور لیٹی کا قصہ میں نے دانستہ گول کر دیا۔ معلومت کا تقاضا یہی تھا ورنہ مجھے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا پڑتی اور قصہ بہت دور تک جا پڑتا۔

شعیب نے کہا ”وہ جان! میرے غیاب میں تم جن المناک حالات سے گزر رہے ہو ان کا مجھے پوری طرح احساس ہے اور انشاء اللہ میں اس سلسلے میں تمہاری بھرپور مدد بھی کروں گا۔ تمہارے بیان سے میں نے اندازہ لگایا ہے، تمہارے دشمن چند روز تک ساحل کو کراچی ہی میں رکھیں گے۔ میاں زاہد حسین ڈائری کے دو قیمتی صفحات حاصل کرنے کے لیے

نہیں ضرور بچ کرے گا۔ وہ صفحات جو تم میرے حوالے کر چکے ہو۔“

میں توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا، چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا ”میں سب سے پہلے میاں زاہد کے اس خفیہ ٹھکانے کو چیک کر داتا ہوں جس کا میں نے فون ڈی پیلو دیکھا ہے۔ مجھے امید ہے، وہاں ساحل کا اراغ ہمیں مل جائے گا۔ بس اس کے لیے بڑی احتیاط اور ہرج بھج کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔“

”یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔“ میں نے کہا ”لیکن اصل تک پہنچنے کے لیے میں بہت سے جگہں ہوں۔“  
 ”میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔“ وہ ٹھہرے لیٹے لہجے میں بولا ”دنیا داری اور دلداری ایک ساتھ جاری رہنا چاہیے۔ ساحل کی تلاش اور میاں زاہد کی کھپتائی کے ساتھ ساتھ ہمیں سونے والے معاملے کو بھی دیکھتے رہنا ہے۔“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔  
 ”سونے والے معاملے کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے چوکی اُکاس سے پوچھا۔

ساحل کے تذکرے میں سونے والے معاملے کی ”آمد“ نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، شعیب غوری کوئی انسان نہ ہو، مشین ہو۔ احساسات اور جذبات سے عاری۔ وہ انتہائی نازک حالات میں بھی اپنے کاروباری منصوبوں سے غافل نہیں رہتا تھا۔ شاید اس کی کاشمیری کی وجہ یہی تھی۔ جذبات سے مغلوب لوگ دنیاوی اور دنیوی ترقی میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ شعیب ایک فعال نظم کاروبار رواں تھا۔ دل کے بجائے دماغ سے سوچتا اور جذبات کو ایک طرف رکھ کر فیصلے کرنا اس کی جھجوری تھی..... اور بھجوری ایک عادت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا ”سونے والے معاملے کو یہ ہوا ہے کہ مسٹر نیشنل آرمز اپنے طے شدہ پروگرام سے نکل کر یہاں آ رہا ہے۔ رات فون پر میری اس سے بات ہوئی۔ وہ کل کراچی پہنچ جائے گا۔ وہ جلد از جلد اس مہ فون انوائسٹنگ رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”بھجور؟“ میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔  
 ”بھجور یہ کس سلسلے میں وہ تم سے ایک بھر پور میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔“ شعیب نے بتایا ”تم ڈیٹی طور پر تیار رہنا۔“  
 ساحل کی جدائی نے میرے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بے دلی سے کہا ”شعیب! نیشنل آرمز سے ہر قسم کے معاملات تم خود ہی طے کرو۔ میں نے یہ پروویجٹ جب

## جامہوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات صدیوں سے زندہ ایک بے پناہ شہنشاہ کی آپ بیتی، ہر گرجا کی دوست تھی، سمندر جس کے نیچے آغوش ماسور تھا، آگ اس کے بدن کو بنو دیتی تھی۔  
 وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے کے ریکارڈ توڑ دیے



پانچ حصوں میں مکمل

قیمت فی حصہ 60/- روپے ڈاک خرچ فی حصہ 23/- روپے

مکمل سیٹ منگانی پر کتابی قیمت 300/- روپے ڈاک خرچ معاف  
 300/- روپے کا منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیں۔  
 یہ رعایت صرف منی آرڈر سال کرنے پر ہی مل سکے گی۔



تمہارے سپرد کر دیا ہے تو پھر تم مجھے بار بار اس میں نہ گھسیٹو۔ میں اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔

”میں تمہارے احساسات کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔“ وہ خیر خواہانہ انداز میں بولا ”ساحل سے بچنے کے واسطے نے تمہیں بری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے لیکن اولاً آخر تم سونے والے اس معاملے سے الگ نہیں ہو۔ تم سے کوئی مشورہ صلاح کے بغیر آگے کیسے بڑھا جا سکتا ہے!“

میں نے چند لمحوں سوچا اور فیصلہ کر لیجے میں کہا ”شعیب! ہمارے درمیان، سونے والے معاملے پر جب پہلی مرتبہ بات ہوئی تھی تو ہم نے ایک پارٹنرشپ بزنس کا فیصلہ کیا تھا۔ تم نے مجھے فنی فنون اور خود کو نوڑی ٹانگ کا حصہ دار قرار دیا تھا جب کہ سونے کی بازیابی تمہارے ہی ذمے تھی چاہے تم اس کے حصول کے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرو۔“

”میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔“ اس نے زہر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے واضح الفاظ میں اسے بتایا ”اس وقت میں اور اب میں تھوڑی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ اس مہم میں تمہارے علاوہ مسٹر نیل آرمز، رام داس وغیرہ بھی شامل ہو چکے ہیں۔ اس شمولیت کا مطلب ہے، انہیں بھی حصہ دینا ہوگا۔“ میں چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس دوران میں شعیب بڑی توجہ سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ”ان حالات کے پیش نظر ہمیں اپنے معاہدے کو ”ری نئے“ کر لینا چاہیے۔“

اس نے پرمشئی اعزاز میں سر کو اٹھاتی جنبش دی اور پوچھا ”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

میں نے کہا ”اگر واقعتاً سونے کی وہی مقدار برآمد ہوتی ہے جس کا ہم اندازہ لگائے بیٹھے ہیں تو اس وقت مذکورہ سونے کی مارکیٹ ویلیو لگ بھگ چوتھائی ارب روپے ہے یعنی کچیس کروڑ روپے۔ فنی فنون کی پارٹنرشپ کے حساب سے میرے حصے میں کم و بیش تیرہ کروڑ روپے آئیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔“

”تمہارا دف اندازہ تقریباً درست ہے۔“ اس نے تائید کی۔

میں نے کہا ”میں چاہتا ہوں، سونے کی بازیابی کے تمام بکسیرے تم خود ہی اپنے طور طریقے سے منبذ۔ مجھے اس کٹ راگ سے الگ ہی رکھو۔ میں اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرے حصے کے حوالے سے ایک لم ترم طے کر لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تمہارے خیال سے اتفاق کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔“ وہ صبر سے ہوئے لہجے میں بولا ”تم بتاؤ مجھے، تمہیں کتنی رقم درکار ہے؟“

میں نے کہا ”دس کروڑ روپے۔“ اس نے چند لمحوں سوچا پھر فیصلہ کر لیجے میں بولا ”مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ!“

”کبھی شرط؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”اگر اس متروک کنٹینر سے اتنا ہی سونا برآمد ہوا جتنا ہم سوچ رہے ہیں!“

”بالکل، یہ بنیادی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بس تو پھر تم اس معاملے کو ڈن سمجھو۔“ وہ بولا ”میں نیل آرمز اور دیگر متعلقہ افراد سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ سونے کی بازیابی کے سلسلے میں ہماری آخری میٹنگ ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے مطمئن انداز میں کہا ”سونے کی برآمدہ اس کی ترسیل اور فروخت وغیرہ سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اس مشن کے اختتام پر مجھے دس کروڑ روپے مل جانا چاہئیں۔“

”مل جائیں گے۔“ وہ پریقین لہجے میں بولا ”مگر مسز نیل آرمز یہاں آتے ہیں تو میں آئندہ کے لیے لاؤنچنگ تیار کر لوں گا۔ وہ گولڈ کاؤنٹ بینک کے مالک ہیں۔ سونے کی فروخت کے سلسلے میں ہمیں آنا جانا نہیں ہوگا۔ برآمد شدہ سونے کے بیکٹ ڈائریکٹ نیل آرمز کے بینک میں طے جائیں گے۔ ایک ڈراؤنٹ کے بعد اس نے کہا ”تم بچے فکر ہو جاؤ وجدان۔ میں اس سلسلے میں اب تمہیں بچ نہیں کروں گا۔“

مزید چند ضروری باتوں کے بعد ہماری میٹنگ ختم ہو گئی۔ شعیب غوری ”سادھ“ سے رخصت ہونے لگا تو کہنے لگا ”تم نے میاں زاہد حسین کے جس خفیہ ٹھکانے کا ذکر کیا ہے، میں وہاں دھاوا بولنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم نے کچھ سوچ رکھا ہے یا.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انداز سوالیہ تھا چنانچہ اس نے کہا ”میں نے تو سوچ تو بہت کچھ رکھا ہے۔ اس کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ کم از کم ایک دن کا وقت دے دو مجھے۔ میں پہلے یہ معلوم کر لوں کہ ساحل کہاں رکھا گیا ہے۔ اسی خفیہ ٹھکانے پر یا نہیں اور.....“

”ٹھیک ہے، تم اپنے طور طریقوں سے معلوم کرو۔ میں اپنی نئی حکمت عملی آزماتا ہوں۔“ میں نے کہا ”میں اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات کو سمجھو۔“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”اس سلسلے میں تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، کیر شاہ سے کہہ دیتا۔ وہ ہر وقت تمہاری مدد کے لیے یہاں سادھ میں موجود ہے گا۔ میں اسے خصوصی ہدایات بھی دے گا۔“

میں نے کہا ”تمہارے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ میں ساحل کی تلاش کے سلسلے میں اکیلا ہی لگتا چاہتا ہوں۔ ہاں، البتہ اگر کسی مرحلے پر مجھے کیر شاہ کی ضرورت لگے تو میں فوراً اس سے رابطہ کروں گا۔“

”تمہاری باتوں سے گلے ہے، تم سادھ میں بھی مستقل رہیں۔“

”ہاں، میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔“

”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”نی الحال تو ساحل سمندر والے فلیٹ پر جاؤں گا۔“ میں نے کہا ”لیکن کسی نہ کسی طور سادھ سے بھی بچ میں رہوں گا۔“

”تم تو اوقات تنہائی میں گزارنا چاہتا ہو۔“

شعیب نے کہا ”تم اس کے لیے آزاد ہو مگر کوئی انتہائی نرم اٹھانے سے پہلے کیر شاہ کو کم از کم مطلع ضرور کر دیتا۔“

”میں نے اس کی ضرورت کسی وقت بھی محسوس نہیں کی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

دوپہر کا کھانا میں نے سادھ ہی میں کھایا اور نیلی شیرڈ

میں اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں ایک دوڑیلی ریلوں کے محوم کرینشل ہائی وے (مین کوریج روڈ) پر آیا تو سنگٹل بند تھا۔ میں نے شیرڈ کو روک لیا۔ اسی وقت میری نگاہ ایک شاسا چرپے پر پڑی۔

وہ صدف بھی جو دعائت منی میں نیٹھل ہائی وے کو چھوڑ کر اندر کی جانب آ رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملی تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ میں نے بادل ناخو استہ خوش دلی سے اس کی مسکراہٹ اور ہنسنے ہوئے ہاتھ کا جواب دیا۔ اپنی دیر میں سنگٹل کھل گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

صدف ایک روز پہلے پارک میں مجھ سے ملی تھی۔ وہ میڈیکل کے فائل ایئر میں تھی اور مستقبل قریب میں ڈاکٹر بننے والی تھی۔ گزشتہ روز ہمارے درمیان مختصر مکالمات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ پر جس ٹھک کا اظہار کیا، وہ بیہوش تھا لیکن میں نے بڑی شدت سے اس کی تردید کر دی۔ میں نہیں چاہتا تھا، کسی انتہائی لڑکی پر میرا ماضی اس طرح کھل جائے کہ میرے لیے مسائل کھڑے ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ یہ ”مسائل“ مثبت اور فنی، کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے تھے۔

میں اپنے فلیٹ کی جانب سفر جاری رکھے ہوئے صدف کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اپنی سوچ کو ختم کرنا پڑا کیوں کہ میرے ”پڑوس“ میں براجمان اس سفید حسین نے اپنی مخصوص آواز میں ”سادھ“ کیا تھا۔ اس کے اشارے سے ظاہر ہوتا تھا، اسے میرا کسی اور کے بارے میں

**سب بک ڈسٹری بیوٹرز کے مشورے کتابی شکل میں دستیاب ہیں**

**علامہ اویس** | **تقلا** | **علامہ اویس**

دوستی مکمل قیمت: 50 روپے فی حصہ | دوستی مکمل قیمت: 40 روپے فی حصہ | قیمت: 30/-

ڈاکٹر فرخ: 23/- روپے | ڈاکٹر فرخ: 23/- روپے | ڈاکٹر فرخ: 23/- روپے

**کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس میں سے**

”بجے تھے۔ انپکٹر نے بتایا کہ وہ کل صبح ایک کثیر رقم مجھے ہنڈی کر دے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔  
”انکل! آپ نے مجھ سے کیا ہوا وعدہ تو پورا کر دیا ہے نا!“

”نومائی سن! میں اس شیطان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔“  
چچا بگ شونے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اس وقت دارا  
تھیں کیوں یاد آ گیا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہارے  
ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔“

میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا ”دارا کے خاں سے دراصل میں جمال اور بھولا ناتھ کا ذکر چاہتا ہوں۔ یہ دونوں افراد دارا کے سینڈ کیٹ سے وابستہ تھے اور آپ نے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجا تھا۔ بھولا ناتھ سے آپ

نے دس کلو کرام ہیر وین جی برآمد کی کمی جو وہ سنہ ۱۹۷۲ء  
یورپ کی طرف اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

”ہاں، یہ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔“ چانگ شو  
نے کہا پھر بتایا ”جمال اور بھولا ناتھ کو چند روز قبل رہائی ملی

ہے۔ وہ اپنی سزا کاٹ کر آزاد ہو چکے ہیں۔  
 میں نے کہا "انکل! اب وہ واقعی ہمیشہ کے لیے آزاد ہو  
 چکے ہیں۔ انہیں ہم نے زندگی کی قید سے رہائی دلوا دی ہے۔"  
 "مائی سن! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ حیرت سے بولا۔  
 "مائی سن! یہ تم کو کتنے خوش کرے گا۔" "لی۔ ٹری

ایٹ“ پر غیث آنے والے واقعات تفصیل سے سناؤں گے۔ دارا کا فرسٹ کزن جمال، کبیر شاہ کی فارنگ سے ہلاک ہوا تھا جب کہ بھولا ناتھ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ اسے

میں نے بتایا ”میرے دشمنوں سے گلہ جوڑ کرنے۔“ پھر  
انہوں نے انیسٹر کو دارا کے برادر خورد تارا کے ”کارناموں“ اور  
بہت ناک موت کی تفصیل سنائی۔

اس نے زہریلے لہجے میں کہا ”حس لم، جہاں پاک!“  
چینگ شو کے اس مختصر سے تبصرے کے بعد ہمارے  
ہریانہ کیلے فوئک رابطہ ختم ہو گیا۔  
میں نے ریسور کو کرڈیل کیا اور ڈرائنگ کی جانب متوجہ

ہو گیا۔ اس دوران میں وہ بڑی کہری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز خالصتاً یوہانیہ تھا۔ نہایت ہی تیز و طرار تھی۔ جس طرح اپنے شوہروں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتی ہیں، بالکل ویسے ہی وہ مجھے بھی واضح کر رہی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ڈارلنگ! میرے پاس آؤ۔“  
وہ سبک قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاؤں کے نزدیک  
مہلتی۔

میں نے اسے بلانے کے لیے صرف ہونٹوں اور زبان کو زکرت دی تھی، باقاعدہ کوئی اشارہ وغیرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے رازدار میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی تھی، وہ دوسری بات کو چھٹی ہے۔ میں نے اس کی جانب بازو دراز کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ، میری آغوش میں بیٹھ جاؤ۔“ وہ ”میاؤں“ کی آواز نکالتے ہوئے اُچک کر میری گود میں آ گئی۔ میں نہایت ہی شفقت سے اس کے ریشم ایسے لہلہا پر اتھ پھیرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو

میرے نکاح کے لیے میری بہن نے میری ساری حالتیں بیان کر دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میری بہن نے میری ساری حالتیں بیان کر دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میری بہن نے میری ساری حالتیں بیان کر دی تھیں۔

کے لیے اسے پیار بھری ایک چپت رسید کر دی۔ وہ بس سے

میں نے اس کو دھریا۔ وہ بدستور آسودہ اور  
 بے کسی و حرکت پڑی رہی۔ اس کا جسم صرف زندگی کا احساس  
 رہا تھا۔ سانس کی آمد و شد سے ہٹا چلتا تھا، وہ زندہ ہے۔  
 مگر یہ وہ گہری نیند میں چلی گئی تھی!

دیا۔ اس کے نزدیک ہی اسٹینڈر پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا، میں جیسے ہی ڈارلنگ کو پیچھے رکھوں گا، وہ بیدار ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ آسودگی کی سنڈروم میں تھی۔ میں ٹیلی فون کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گیا اور دلچسپی سے پراسرار ڈارلنگ کو کھینچنے لگا۔ چند لمحات کے بعد آپاں آپ میرا خیال ڈارلنگ سے پرواز کرتے ہوئے لٹا کی جانب چلا گیا مجھے پھر اس کی ”کارروائی“ یاد آنے لگی۔ گویا میں نیلگری کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیلگری نے مجھے ایسی چوٹ دی تھی جو کسی بھی طرح ایک شکست سے کم نہیں تھی۔ میرے ذہن نے نیلگری کے بارے میں جو اندازے قائم کیے تھے، وہ ان پر پوری اترتی تھی۔ وہ اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے مجھے انھنوں کے جال میں

باندھ دی گئی۔ پچھو دیر تک میں اسی ادویہ میں بیٹھ رہا پھر کھلی کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کھلی سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیے۔ نیلگہری نے اسے واسطہ بنایا تھا۔ اس کا مطلب تھا، کھلی اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔

میں نے لیلیٰ کے بیڈروم سے گزشتہ رات تین فون کیے

پیش قدمی کے لئے ہمیں کتنی کوشاں رہنا چاہیے۔

انسان جو کئی کئی سال کا اور بھی  
 پرانے ہو جائے گا، وہ اس طرح کے کوششوں

انسان کی زندگی میں کتنی کوشاں رہنا چاہیے۔

پیش قدمی کے لئے ہمیں کتنی کوشاں رہنا چاہیے۔

[illegible]

۱۰ لکھنؤ سے پہلے پہنچ کر  
 ۳۵ روپے سے زائد اگر خرچ ہوئی

۲۳ روپے سے پہلے پہنچ کر  
 ۴۰ روپے سے پہلے پہنچ کر

۱۰ لکھنؤ سے پہلے پہنچ کر  
 ۳۵ روپے سے زائد اگر خرچ ہوئی

۲۳ روپے سے پہلے پہنچ کر  
 ۴۰ روپے سے پہلے پہنچ کر




تعلیمی و تربیتی ادارہ اور مسائل تحریریں  
 تعلیمات اسلامی  
 تعلیمات اسلامی

فون: 5802551 5802552-5895313  
 E-mail: khalafat197@yahoo.com

چارٹ نمبر 23

[illegible]

تھے۔ پہلا قاضی سلطان کو، دوسرا منہاس باقر کو اور تیسرا کبیر شاہ کو۔ ان تینوں فونز کا دورانیہ دس منٹ سے زیادہ تھا اور اس دوران میں میری نگاہ ٹیلی فون سیٹ پر جمی رہی تھی۔ سیٹ کی پیشانی پر مسجور چھوٹی سی ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک میں فون نمبر درج تھا۔ یہ نمبر میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک اس فون نمبر کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟

بے اختیار میرا ہاتھ ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے ٹیلی فون کے بٹنکے کا فون نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی گھنٹی پر دوسری جانب کال ریسپونڈ کر لی گئی۔ ایک مانوس نسوانی آواز میری سماعت سے گزری "ہیلو!"

میں ہلکے جھپٹے میں سمجھ گیا، دوسری طرف ٹیلی فون پر میری بات کرنے لگی۔ "کیا تم کو بات کر رہی ہو؟"

اس نے تصدیق کی اور پوچھا "تم کون ہو؟"

"اتنی جلدی بھول گئیں!" بے اختیار میرا لہجہ طعنے پر ہو گیا۔

"میں واقعی تمہیں نہیں جانتی۔"

"میں وجدان بات کر رہا ہوں۔ کچھ یاد آیا؟"

اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "میں کسی وجدان کو نہیں جانتی۔ سوری..... رائگ نمبر....."

پھر اس سے پہلے کہ وہ ریسپونڈ کر کو پڑل کر دیتی۔ میں نے جلدی سے کہا "پلیز فون بند نہ کرنا، میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جب میں تمہیں جانتی ہی نہیں تو پھر باتوں کا کیا سوال ہے؟"

"سوال ہے۔" میں نے قطعیت سے کہا "اور یہ سوال اس لیے ہے کہ میں کل رات تم سے ایک بھر پور ملاقات کر چکا ہوں۔"

"وہاں ٹان سنس!" وہ برہمی سے بولی "گلتا ہے، تم کوئی پاگل ہو۔ کل رات تو میں اپنے بٹنکے پر اٹھ گئی تھی۔"

اس کی باتیں میرے شک بیکے یقین کی تائید کر رہی تھیں۔ میں نے کہا "اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں یاد دلانے کے لیے چند حوالے دیتا ہوں۔"

"جو بھی کہنا ہے، جلدی کہہ ڈالو۔" وہ بیزاری سے بولی "فضول باتیں سننے کا میرے پاس وقت نہیں۔"

میں نے کہا "ابھی جن باتوں کو فضول کہہ رہی ہو بعد میں انہیں تسلیم کرتے ہی بنے گی۔"

"اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔" وہ اکٹا ہٹ آمیز انداز

میں بولی "تم جو بھی انکشاف کرنا چاہتے ہو، اس میں تاخیر نہ کرو۔"

میں نے استفسار کیا "کیا کل رات تم لگ بھگ ساڑھے نو بجے اپنے بٹنکے پر پہنچی تھیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "تمہارے پاس بلیک ہوڈر اسوک ہے؟"

"ہاں ہے۔۔۔۔۔ پھر؟"

"جب تم نے پورچ میں اپنی گاڑی کھڑی کی تو لان کے قریب ہی ایک نیلا شیر ڈمبی آکر رکھی تھی؟"

"بالکل غلط۔" وہ غصے سے لہجے میں بولی۔

"نیلا شیر ڈمبی، میں زخمی حالت میں تھا۔ تم مجھے اپنے ساتھ بٹنکے کے اندر لے گئی تھیں۔" میں نے کہا "اور بیٹروم میں جا کر تم نے میری مرہم پٹی بھی کی تھی؟"

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے، تم کوئی دماغی مریض ہو۔" ٹیلی نے چڑ کر کہا۔

میں نے پوچھا "کسی زمانے میں تم نے نرسنگ کورس کیا تھا؟"

"یہ بات درست ہے۔"

"تمہارے شوہر سعید خان کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعید ایک ممتاز سیاست داں تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "اس نے اپنے پیچھے اور تمہارے آگے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ تم نے جو رقم انویسٹ کر رکھی ہے اس سے تمہیں ماہانہ تین لاکھ کے قریب پرافٹ مل جاتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ صبر سے ہوئے لہجے میں بولی "تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔ یہ باتیں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ تمہیں بھی یہیں سے معلوم ہو گئی ہوں گی لیکن تمہاری اس جانکاری سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے، کل رات ہماری ملاقات ہو چکی ہے اور میں نے تمہاری مرہم پٹی کی تھی؟"

میں نے مصحفی گزشتہ رات کے "اہم واقعات" کو گول کر دیا اور ٹیلی نے پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ کل رات تم اپنے بٹنکے پر اٹھ گئی تھیں؟"

"میں تمہارے اس قسم کے سوالات کے جواب دینے کی پابندی نہیں ہوں۔" وہ جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی "اس سے پہلے کہ میں فون بند کر دوں، تمہارا منہ بند کرنے کے لیے تمہیں بتا دینا چاہیے ہوں، گزشتہ رات ہی نہیں بلکہ میں ہر رات اپنے بٹنکے پر اٹھ گئی ہی رہتی ہوں اور میں نے کل رات کی وجدان

ملاقات کی ہے اور نہ ہی میں اس نام کے کسی شخص سے گفتگو ہوں۔ تم کوئی پاگل ہو یا تم نے جانتی آنکھوں سے کوئی دیکھ لیا ہے۔ بس یاد رکھو؟"

"بس ایک بات اور۔" میں نے جلدی سے کہا "کیا آج ان ہر تم اپنے بٹنکے پر ہی رہی ہو؟"

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی "تم نے اپنے اس سوال کو آخری بات کہا ہے تو سنو، میں آج کا دن آرامی سے باہر گزار کر آئی ہوں۔ علی الصباح ایک ضروری کام سے مجھے حیدر آباد جانا پڑ گیا۔ میں لگ بھگ پچھ بجے سے نکل گئی تھی اور اچھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی میری واپسی ہوئی ہے۔" اس نے ایک لمبے کا توقف کیا پھر بات ختم کرنے والے انداز میں بولی "اگر اب تم نے دوبارہ فون کر کے مجھے پتھان کرنے کی کوشش کی تو میں سمجھ لوں گی، تم کوئی نفسیاتی رولیں ہو چنانچہ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا میرا فرض بن جائے گا۔۔۔۔۔ اور تم جانتے ہو، میں ایک ممتاز سیاست داں کی بیوی ہوں۔ تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو گے اس ملک میں سیاست داں اور اس کے اہل خانہ کس طاقت اور قدرت کے مالک ہوتے ہیں؟"

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔ دوسری جانب سے ٹیلی نے ریسپونڈ رکھ دیا تھا۔ وہ خاصی مچا ہوا اور غرور ارت معلوم ہوتی تھی ورنہ وہ اتنی دیر مجھ سے گفتگو نہ کرتی۔

میں ہلکے جھپٹے میں سمجھ گیا، اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ میں نے پہلی نیلگہری کی افسوں گری کے کئی واقعات اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیے تھے۔ وہ بڑی کرنی والی تھی۔ گزشتہ رات کم و بیش ساڑھے نو بجے میں ٹیلی کے بٹنکے پر پہنچا تھا۔ اسی وقت وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیلگہری نے اپنی گتھی سے، رات کے انداز سے نو بجے سے سب سے پہلے ایک کی زندگی کے واقعات ٹیلی کی زندگی کے واقعات میں ڈھیل رہی تھی۔ گویا اس نے ٹیلی کی زندگی کی بد رات چرائی تھی۔ وہ بے چاری بیوی سمجھ رہی تھی کہ، اس نے رات سو کر گزار دی ہوگی!

ٹیلی سے ہونے والی اس گفتگو نے نیلگہری کی "کارکردگی" پر پھر تصدیق ثبت کر دی۔ اس حسین ساحرہ نے غنڈی شروپ "جام امید" کا سہارا لے کر ٹیلی کی بے بسی پر مبنی بے کسی سے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ میں ایک آنکھ آہ بھر کر رہ گیا۔

ٹھنڈی ہوا کے جمو کے کھلے ہوئے سلائیڈنگ ڈور سے

کمرے کے اندر پہنچ رہے تھے۔ میں قالین پر یوگا کی مختلف مشقیں کر رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ سپیدہ سحر ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ بہت خوشگوار اور سہانا سماں تھا۔ چاروں جانب پھیلی خاموشی اور سنائے نے مشق کا لطف دو بالا کر دیا۔

یوگا کی مشقوں کو ایک ترتیب سے کیا جاتا ہے۔ ایک سے زیادہ شعبوں کو آزماتا ہو تو ان میں بھی ترتیب کا خیال رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے جھ یوگ (باؤنی یوگا) پر راج یوگ (برہمن یوگا) اور آخر میں منتر یوگ (روحانی یوگ) کی مشقیں کی جائیں تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ویسے تو کوئی بھی مشق، کسی بھی طور کر لی جائے اس کا فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔

میں نے اپنے دماغ اور روح کو "وارم اپ" کرنے کے لیے جھ یوگ کے چند آسن لگائے جن میں اونٹ آسن (Camel Posture) میں آسن (Fish Plough Posture) اور پل آسن (Posture) شامل تھے۔ اس کے بعد میں کنول آسن میں بیٹھ کر سانس کی ایک مخصوص مشق کرنے لگا۔ کنول آسن یعنی لوٹس پوزیٹر (Lotus Posture) کو یوگا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس آسن یا انداز کو پدم آسن، سکھ آسن اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنا بھی کہتے ہیں۔ منتر یوگ کی اکثر مشقیں اسی آسن میں کی جاتی ہیں۔

میں شمالی رخ بیٹھ کر سانس کی مشق کرنے لگا۔ سانس سمجھنے، روکنے اور چھوڑنے کی مشقوں کو مجموعی طور پر پرائانام (Pranayam) کہا جاتا ہے۔ عموماً سانس کو روکنے کے تین طریقے راج ہیں۔ دو جسم کے اندر اور ایک بدن سے باہر۔ جسم کے اندر یا تو سانس ہیمپڑوں میں روکی جاتی ہے یا پھر پیٹ میں جب کہ بدن سے باہر سانس روکنے کے لیے اپنے پیٹ اور ہیمپڑوں کو خالی کرنا پڑتا ہے یعنی اتنا گھبرا (Exhale) کرنا ہوتا ہے کہ جسم کے اندر خصوصاً پیٹ اور ہیمپڑوں میں سانس باقی نہ رہے۔ سانس روکنے کا یہ طریقہ خاصا مشکل اور صبر آزما ہے اگر اس میں مہارت حاصل ہو جائے تو انسان اپنے دل کی دھڑکن کو روک کر خود کو مدہ ظاہر کر سکتا ہے۔ جو شہبازہ باد یوگی گھٹنوں سانس روکنے کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اسی طریقے کو اپناتے ہیں۔ نہ صرف سانس بلکہ ایک مخصوص شکل سے معدے کو ہر قسم کی کمی اور خوراک سے خالی کر لیا جاتا ہے۔

شادمن پیکل میں قیام اور تربیت کے دوران میں میرے





پاس دیکھا ہے۔ کیا حال ہی میں یہ تہارے تھے چڑھی ہے؟“ اس فلیٹ میں پیش آنے والے سفید جیتے کے دانتے سے کبیر شاہ واقف تھا۔ ازاں بعد جسے میں نے سال کے خواب سے تعبیر کر کے بات بتائی تھی۔ بلو کو واقعی اس نے میرے پاس نہیں دیکھا تھا۔ جب میں ڈارلنگ کے ساتھ کئی کے بنگلے سے ساؤتھ آتا تھا تو اس شیطان کی خالہ نے بڑی مہارت سے خود کو روپوش کر لیا تھا۔ کبیر شاہ کے سوال کے جواب میں، میں نے مختصر کیا۔

”ہاں، شاہجی ڈارلنگ سے ٹی ٹی دوستی ہوئی ہے۔“

”آخر یہ کون؟“

”ڈارلنگ کے معنی نہیں جانتے ہو؟“

”محبوبہ! اس نے کہا۔“

”بالکل درست۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا

”ڈارلنگ نامی یہ سفید بلی میری محبوبہ ہے۔“

”سیاؤں! میرا جملہ ختم ہوتے ہی لاؤنج میں ایک مخصوص آواز ابھری۔“

کبیر شاہ نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ”اوہو! تو موصوفہ

تہارے آس پاس ہی ہے؟“

”ڈارلنگ اس وقت میری گود میں بیٹھی ہے۔“ میں نے

کہا۔

”محبوبہ کو ہر وقت، چاہنے والے کی آغوش ہی میں رہنا

چاہیے۔“ وہ چپک کر بولا پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

کبیر شاہ نے بے جملہ روادری میں ادا کیا تھا مگر اس کا یہ

سرسری انداز مجھے جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھا۔ یک بہ یک میرا

خیال ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے

ساحل کو چاہنے لگا تھا، کچھ یہ کہ مجھے اپنی جانب مائل

کرنے کی کوشش میں رہتی تھی اور میں دانستہ سے نظر انداز کرتا

چلا آیا تھا۔ مجھے بہت بعد میں یہ احساس ہوا کہ میں اسے چپکے

چپکے چاہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری چاہت اس پر مبنی،

ساحل کے رویے میں اچانک ایک ناخوشگوار تبدیلی واقع ہو

گئی۔ وہ بڑی خوبصورتی سے گریز کی راہ پر چلنے لگی۔ ہم دونوں

ریل کی پٹریوں کی طرح پہلو پہ پہلو جو سفر تھے اور ہمارے

درمیان حائل چند فٹ کا فاصلہ برقرار تھا۔ یہ فاصلہ ایک بے رحم

زنجیر کے مانند تھا۔ ایک ایسی نادیدہ زنجیر جو بڑے کردفر سے

تتی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی لپک تھی اور نہ ہی کوئی چپک۔ یہ

سفاک اور سخت کیر زنجیر بڑی ستم گر تھی۔ ہمیں ملنے دیتی تھی اور

نہی پھڑنے دیتی تھی۔ اس نے ہمیں پاس پاس رکھ کر دور دور

کر دیا تھا۔

زندگی کا یہ سفر چلتے چلتے جاری تھا کہ اچانک یہ ظالم زنجیر ٹوٹ گئی، گویا پٹریوں کا تان ٹوٹ گیا۔ پہلے ہم ایک فاصلے پر رچے ہوئے بھی ایک ہی سمت میں سفر کر رہے تھے لیکن وقت کے ظالم تازیانے نے ہمیں جدا کر دیا۔ اپنے ہمارے بچے والے اجسام کی طرح ہمارے رخ بدل گئے تھے۔ سال تو پھر بھی ایک ”طے شدہ“ سمت میں آگے بڑھ رہی تھی مگر میں بے سمت ہو کر رہ گیا تھا۔

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے میں بھائی کیفیت سے گزرنے لگا۔ اس وقت میری دونوں مٹھیاں بچی ہوئی تھیں، دافٹوں پر دانت تھے ہوئے تھے اور بدن ہوئے ہوئے لرز رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، اگر میں کچھ دیر پریاسی حالت میں بیٹھا رہا تو اپنے ہوش و حواس کم کر بیٹھوں گا۔ پتا نہیں..... معلوم نہیں..... میں نہیں جانتا، وہ کس طرح میرے اندر ساکن تھی کہ میں اس کے لیے بے اختیار ہو جاتا تھا۔ میری سوچ اور جذبے کنٹرول میں نہیں رہتے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ”سیلف کنٹرول“ پر مجبور رکھتا ہوں لیکن ساحل کے معاملے میں، میں بے بسی کا شکار ہو جاتا تھا۔ یہ بے بسی، بے چارگی اور بے اعتباری مجھے مار ڈالے گی، اگر میں نے جلد از جلد ساحل تک پہنچنے کی کوشش نہ کی تو!

یہ آخری جملہ ایک سوال بن کر میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ ایک خوفناک وارننگ تھی، ایک کھلا پیغام تھا اور میں ہمیشہ سے چپچپ قبول کرتا آیا ہوں۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے لاؤنج میں بیٹھے

لگا۔ ساحل کے بارے میں جذباتی انداز سے سوچتے ہوئے

میں نے اپنے اندر کئی اور وجود کو بیدار ہوتے ہوئے محسوس

کیا۔ وہ وجدان انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا جو بہت ہی

سرکش اور ضدی تھا۔ وہ ہر احتیاط کو بالائے طاقت کرکھ کر سونپتا تھا

اور مقصد کے حصول کے لیے ہر معاملے میں بے خطر کودتا تھا۔

میں نے اس وجدان کے مگر آرا کا رنارے بھی دیکھے

تھے اور بعد میں خودی حیران بھی ہوا تھا کہ کیا واقعی یہ سب کچھ

میں نے کیا ہے؟

اس وقت میرے ذہن میں سرکش اور انتقامی خیالات کا

میل لگا ہوا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کیا، کوئی ضروری

نہیں کہ میں قدم قدم پر شعیب ثوری اور ”سی ایف کے“ کی

انگلی پکڑ چلوں۔ دوستوں سے مشورہ اور مدد لینا ابھی بات

ہے لیکن میں ساحل کی تلاش کو صرف اور صرف خود تک محدود

رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا، اس سلسلے میں ہر اقدام میں

نہ تھا کروں گا۔ ان نتیجہ خیز اور دولہ انگیز خیالات کی روشنی میں، میں نے اپنے ذہن میں ایک فوری اور اصل ارادہ باندھ یا۔ یہ کہ..... کراچی چھوڑنے سے قبل میں میاں زاہد حسین کو بہت ناک انجام سے دوچار کروں گا۔ اس کے انحلت بہ زبان حشر کو دیکھ کر کراچی سرکٹ میں کھلبلی مچ جائے گی اور انکا ہمہ ہوگا جس کی گونج کراچی سے ”رکھنا والی“ تک مانی دے گی۔ یہ ایک طرح کا ٹیلی گرام ہوگا جو میں رکھناں نامی میں اپنی آمد کی اطلاع کے طور پر چوہدری نواز علی کو روانہ کروں گا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور میاں زاہد کو تلاش کرنا بہت مشکل! مگر ان لمحات میں میرے دماغ کی ڈکٹری بدل گئی تھی۔ نئی ڈکٹری میں ”مشکل“ اور ”ناممکن“ کے الفاظ بیچ نہیں تھے۔ میں نے اس ڈکٹری کے اوراق اٹھتے ہوئے حتمی کامیابی یعنی ”فتح“، کو سرکل کیا اور ڈکٹری بند کر دی۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک

ات کی مہلت تھی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے

میں مضبوط اور مربوط پلاننگ کرنے لگا۔ سب سے پہلا مرحلہ

پلان زاہد کی تلاش کا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً اس مسئلے کا حل

پیدا کر دیا، گویا میرا ذہن پوری طرح فعال ہو چکا تھا۔ اپنی

پلاننگ کے مطابق مجھے کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے جن کے

لیے دو ڈھائی گھنٹے کافی تھے۔ حسب وعدہ کبیر شاہ نے ٹکٹ اور

ضروری کاغذات مجھے موجود دیے تو میں انتظامات میں جُت

لگا۔

میں نے شیر ڈنگلی اور ڈارلنگ کی ہر اہی میں مارکیٹ کا

پتہ پکڑ لیا۔ ضروری خریداری کے بعد میں نے ایک میٹر

اندر سے کٹنگ کر والی۔ میری ہدایت پر اس نے مجھے سولہ پیر بنا

دیا۔ اس کے ہاتھوں کی جنبش، انگلیوں کی حرکات و سکنات اور

چہرے میں ابھرنے والے اپنے عکس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا

کہ یہ سولہ پیر ڈریسر ”سولہ پیر“ میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں اپنے فلیٹ پر موجود تھا۔ میں نے

بلے اپنا سفری بیگ تیار کیا۔ تمام ضروری سامان اور کاغذات

تیار رکھے۔ آن لائن بینکنگ سے استفادہ کرنے کی

چاہا۔ ابھی میرے پاس موجود تھی۔ اس کے علاوہ کیش کی

مہارت میں بھی ابھی خاصی رقم میرے پاس تھی۔ اس کے بعد

میں نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ آئینے کے سامنے جا کر میں نے اپنا

اندازہ لیا تو حیران رہ گیا۔ چلیے کے اعتبار سے اب میں چند

گھنٹے پہلے والا وجدان نہیں رہا تھا، ویسے مزاج اور ارادوں کے حوالے سے بھی میں بہت بدل چکا تھا۔ یہ سب آثار سمجھو۔ کسی بہت بڑے طوفان کے۔

میں نے بلیو جینز پر سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بھاری بھر کم آری شوز تھے۔ گزشتہ چند ماہ میں میری مونچھیں اچھی خاصی بڑی ہو گئی تھیں۔ سولہ پیر کی وجہ سے بھی

(تحقی الدین نواب کی دس سالہ کامیابیوں کا مجموعہ)

## ایمان کا سفر

نیالیڈیشن شائع ہو چکا ہے

مطبوعہ: کبیر شاہ

قیمت: 150/- روپے • ڈاک خرچ: 25/- روپے

کتابیات بلی کی پبلیکیشن

پہلی کتب 23

کراچی 74200

Kitabiatibali@yahoo.com

مقبول ترین مفت

میں کی کتابیں اور گورنر میں لایا ہے جس جلی ہیں

⑧ بہترین کامیابیوں کا مجموعہ

## کچرا گھر

کانیالیڈیشن شائع ہو گیا ہے

کتابیات بلی کی پبلیکیشن

قیمت 100 روپے

ڈاک خرچ 25 روپے

میں کی کتابیں

میں کی کتابیں اور گورنر میں لایا ہے جس جلی ہیں

کتابیات بلی کی پبلیکیشن

فون: 5802552-5895313

ایس: 5802551

Email: Kitabiatibali@yahoo.com

نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ میں دراصل بھولا ناتھ

جبل کو دیکھنے لگا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ وہ اپنے

ایزولا ایک وہ سادہ سے بچہ میں بولا چم پوچھا تم

اسے میرے بارے میں کسی قسم کا شبہ ہو جاتا تو وہ پردے میں

رہ کر کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ میں قبل از وقت اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاؤں گا اور نو بجے سے پہلے میں وہاں کا تعقید کا جائزہ لے لوں گا۔ کلینک میں داخل ہونے اور پینچمنٹ سے میاں زاہد کے بارے میں استفسار کرنے کے بارے میں حالات موجودہ کے مطابق ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ بہت ہی نازک سیچویشن تھی اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

صدر سے اس ڈیٹل کلینک تک بہ سہولت پچیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ میں نے تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے یہ فاصلہ پندرہ منٹ میں طے کر لیا۔ جب میں مطلوبہ کلینک پہنچا تو میری رست واپس آٹھ بیس کا وقت بتا رہی تھی گویا میاں زاہد کی آمد میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ اگر وہ دس منٹ پہلے بھی آ جاتا تو پھر بھی آدھا گھنٹا بڑھتا۔

میں نے کلینک کے سامنے گاڑی روکی نہیں بلکہ دھیمی رفتار سے آگے بڑھا لے گیا۔ اس دوران میں، میں گرد و نواح کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ کلینک کے سامنے، سڑک کی دوسری جانب ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ وہ اسٹور مجھے آئیڈیل جگہ تھی۔ اس کے اندر رہتے ہوئے میں بہ آسانی کلینک میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اس وقت کلینک کے آگے تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں جو ظاہر ہے وہاں آنے والے فریضوں ہی کی ہو سکتی تھیں۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے شیر ڈکودا پس موڈ لیا اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے سے گزر کر دوبارہ کلینک والی سمت میں آ گیا۔ میں نے سوچا، ابھی کافی وقت ہے لہذا ایک نظر اندر جھانک کر دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کالے آؤٹ کیا ہے..... اور وہاں موجود افراد میں کہیں میاں زاہد حسین تو شامل نہیں؟ کلینک کی گمرانی سے ملے جانا بہت ضروری تھا۔ میں نے شیر ڈکودا کلینک کے آگے کھڑی گاڑیوں کے ساتھ پارک کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہنگامی صورت حال میں مجھے وہاں سے فوراً نکلنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

چند سیکنڈ میں، میں کلینک کے اندر سے راؤنڈ لگ کر باہر آ چکا تھا۔ کلینک کے ڈیننگ روم میں میاں زاہد موجود تھا اور وہی مجھے کوئی مشتبہ چہرہ نظر آیا۔ ڈارلنگ شیر ڈکودے کے اندر بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی پشت کو پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”ڈارلنگ! تم اس مشن میں میرے ساتھ رہو گی یا گاڑی

میں بیٹھ کر انتظار کرو گی؟“ اس نے بڑے سُر لے انداز میں آواز نکالی ”میاؤں!“ میں اس آواز کو ”ہاں یا نہ“ میں سے کسی بھی خانے میں فٹ نہ کر سکا۔ اس سے درست جواب کے لیے تھوڑی سی دھبی جتنا سک کر پڑی تھی۔ میں نے بدستور اس کے نرم و ملائم اور گلداز بدن کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”ڈارلنگ! تمہاری ”میاؤں“ خاصی معنی خیز ہوتی ہے۔ میری بات دھیان سے سنو۔“ وہ ہر تن گوش ہو گئی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں گاڑی کو یہاں چھوڑ کر سامنے والے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں جا رہا ہوں۔ اگر تم گاڑی کے اندر ہی میرا انتظار کرنا چاہتی ہو تو آرام سے سیٹ پر بیٹھی رہنا۔ اور اگر میرے ساتھ جانا چاہتی ہو تو گاڑی سے باہر آ جاؤ۔“ بات ختم کرتے ہی میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ڈارلنگ نے اپنی مخصوص آواز میں ”میاؤں“ کیا اور چھلانگ لگا کر میرے قدموں کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اپنا فیصلہ بتا دیا تھا۔ میں سڑک پار کر کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے نزدیک آ گیا۔ ڈارلنگ کو اس طرف پہنچانے کے لیے مجھے کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ وہ ایسے مواقع پر مجھے کسی قسم کی زحمت نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک جانب چلی گئی۔

میں اس کی اداؤں کو اب خاصا سمجھنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر میرے قریب رہتی تھی جیسے کوئی سراغ رساں گمرانی پر مامور ہو۔ وہ ”حاضر غائب“ کی فلاسفی سے بھی بخوبی واقف تھی۔ جب مناسب سمجھتی، میرے نزدیک آ جاتی اور جب نامناسب خیال کرتی، میری نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ ایسی سمجھ دار بی بی میں نے پہلے کسی نہیں دیکھی تھی۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور خاصا کشادہ تھا لہذا وہاں اچھا وقت گزارا جاسکتا تھا۔ میں نے وہاں رکھی اشیائے بے بہا کا اس طرح جائزہ لینا شروع کیا کہ شیشے کے پار کلینک کا منظر مجھے واضح نظر آتا رہے۔ مجھے وہاں ”مصروف“ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کلینک کی گمرانی کر رہا ہوں۔

پونے نو بجے میری مراد بر آئی۔ میں نے چونک کر اس سیاہ لینڈ کر وڈر کو دیکھا جو میری شیر ڈکودے کے برابر آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نئے ماڈل کی ایک بیوی گاڑی تھی جس کے شیشے میں سیاہی تھی۔ میں تن کر پوری توجہ سے جیب کو دیکھنے لگا۔ لینڈ کر وڈر کے دروازے کھلے اور تین افراد آگے پیچھے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک باس ٹائپ شخص تھا کہ وہاں زاہد حسین ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ میاں زاہد پتہ قامت اور سیاہ

نہ اس کی آنکھیں چھوٹی، مکاری سے بھری ہوئی اور جسم ہائل بڑی ہی تھامگر میں نے جس باس ٹائپ شخص کا ذکر کیا ہے، وہ دراز قامت، گندمی رنگت اور سونی آنکھوں کا مالک تھا۔ اس کا جسم بھی بالکل فٹ تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا پرس سوٹ پہن رکھا تھا جس پر گولڈن کڑھائی واضح نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ باقی دو افراد تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشکوف تھی جب کہ دوسرا نہتا دکھائی دیتا تھا۔ کلاشکوف بردار شخص لینڈ کر وڈر کے نزدیک ہی رک گیا جبکہ پرس سوٹ والا دوسرے شخص کے ساتھ کلینک کے اندر داخل ہو گیا۔ میری پہلی حس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ میرے ہی استقبال کے لیے ہاں پہنچے تھے۔

میں اپنی جگہ موجود رہا اور گہری نظر سے لینڈ کر وڈر کو دیکھتا رہا۔ کلاشکوف بردار کی حیثیت گاڑی کی سی تھی اور وہ اس وقت بپ کے ڈرائیو سے ہٹیں کر رہا تھا۔ مزید پندرہ منٹ بھی گزر گئے مگر زاہد حسین کی صورت مجھے نظر نہ آئی۔ نوپانچ پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے گا۔ اس نے مجھے چمکا دیے اور میری حقیقت جاننے کے لیے آدی بھیج دیے تھے۔

میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے نکل آیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک کے سامنے پہنچ گیا۔ چوبیس بجے اس کی گھمیل میں، میں اپنی طرح ان ہو گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار کیا اور پراعتاد قدم اٹھاتے ہوئے ڈیٹل کلینک میں داخل ہو گیا۔

تھوڑی دیر پہلے میں جھانک کر جا چکا تھا۔ اس وقت پینچمنٹ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ میں سیدھا حاتھ نامی اس لمبی لمبی لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ذرا ناچوکی، اس کے چہرے پر شامانی کے تاثرات ابھرے۔ مجھے شک گزرا کہ اسے میرے صلیب کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔

میں نے حنا سے کہا ”میں مومن ہوں اور میاں زاہد حسین نے ملے آ یا ہوں۔“ میں نے دانستہ اپنی آواز بہت دھیمی رکھی مجھے بتایا گیا ہے، وہ ٹھیک ٹو بجے یہاں موجود ہوں گے۔ کیا کیا ان سے ملاقات کر سکتا ہوں؟“

”وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ حنا نے جواب دیا پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ”میاں جی وہاں تشریف لے گئے ہیں۔“

میں نے اس کے اشارے کا بھاری تعاقب کیا اور میری غریب پرس سوٹ والے دراز قامت شخص پر جا کر رک گئی۔ مجھے ملنا جانب متوجہ پا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سامنے نے بھی

اس کی تقلید کی۔ میں اس دوران میں ان کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ میں نے باری باری ان سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میرا نام مومن ہے۔ میں سنگاپور سے آیا ہوں۔“ پرس سوٹ والے نے ہاتھیں پھیلاتے ہوئے کہا ”جب تم کلینک میں داخل ہوئے تو میں سمجھ گیا تھا تم ہی مومن ہو۔ محل نے مجھے تمہارا حلیہ بڑی تفصیل سے بتا دیا تھا۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا ”میں میاں زاہد حسین ہوں۔“

دوسرا جھمٹ بول رہا تھا۔ وہ ایک فیصد بھی میاں زاہد حسین نہیں تھا، گویا میاں زاہد نے مجھے آٹو بتانے کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیا تھا۔ ایک دوسرے کو بتانے کے اس کھیل میں بازی اسی کے ہاتھ آئی جو زیادہ کامیاب اداکاری کا مظاہرہ کرتا۔ میاں زاہد کی معلومات کے مطابق میں اس کا صورت آشنائیں تھا لہذا یہ کھیل بہت مزے دار ثابت ہوتا۔

میں نے پرس سوٹ والے سے کہا ”مجھے یہاں پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ خیر کوئی بات نہیں، میں نے اپنا وقت ہی کم کیا ہے۔ میرا خیال ہے، ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیے۔“

”اصل موضوع یہاں ڈسکس نہیں ہو سکتا مشر مومن۔“ اس نے کہا ”میرا خیال ہے، کسی پرسکون جگہ پر چل کر بیٹھتے ہیں۔“

میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ”لیکن ساڑھے نو بجے کا تو تمہارا ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے!“ ”وہ معاملہ میں نے نمٹا دیا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”میں نے ڈاکٹر سے بات کر کے تمہارا نمبر آگے لگوایا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے سے نو بجے تک دکان نہیں آ یا نہیں تھا اس لیے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں اس کلینک میں ٹنگ بھگ سوا آٹھ بجے پہنچ گیا تھا۔

وہ کھلم کھلا جھوٹ بولی رہا تھا۔ سیاہ لینڈ کر وڈر انہیں لے کر پونے نو بجے کلینک پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس جھوٹ کو اس کے گھر تک پہنچانے کی خاطر کہا۔

”یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ اب سکون سے بات ہو سکے گی۔ جانا کہاں ہے؟“

وہ بولا ”میرا خیال ہے، بیٹلے پر چلتے ہیں۔ تم میرے مہمان ہو۔ آج رات کا کھانا میری طرف سے ہو گا۔ وہیں چل کر بات بھی کر لیں گے۔“

میں نے تھوڑی سی کھچکا ہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔



بیک کا اسٹریپ جانے کس طرح گن کی نال سے الجھ گیا تھا کہ گن بردار کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی پشت میری

میرے لیے میں موت کی سی یقینی سٹ اپ کی۔ اس نے بے اختیار چوکی ہوئی نگاہ سے پردہ پوش کفر کی جانب دیکھا۔ وہ کفر کی میری پشت پر تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ اس لیے بھی کہ تھوڑی دیر پہلے میں کفر کی کے پردے میں مشکوک قسم کی حرکت نوٹ کر چکا تھا۔

کفر کی خاموشی اور اس پر بڑا ہوا پردہ ساکن تھا۔ جتنی دیر میں میری نظر کفر کی سے پلٹ کر وہاں تھی میاں زادہ

یہ ایک بے ارادہ عمل تھا۔ اسلام نے مجھے ہلاک کرنے کی  
لکشمی کی اور نشانہ کوئی دوسرا بن گیا۔ اسلام کن تھامے وحشت

میرے علم کی ٹیبل میں اس نے پس و پیش سے کام لیتا چاہا تو میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی کھوپڑی پر کھاشکوف کا



دریافت کیا۔

”تمہارے ساتھ اور کون تھا اور وہ کہاں ہے؟“

میرے ساتھ میں تھی کلاشکوف کی ساری گولیاں فائر ہو چکی تھیں۔ اسلم نے ایک طویل برست مار گرن کو خالی کر دیا تھا مگر زمین پر بڑا ہوا وہ ڈرائیور اس ”راز“ سے واقف نہیں تھا لہذا اس کی خوفزدگی اور سرسراہٹ جینوں تھی۔ اس نے دہشت آمیز انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا، وہ گرن کی نال کو منہ سے نکالنے کے لیے التجا کر رہا تھا تاکہ میرے سوا نالوں کا جواب دے سکے۔

میں نے خوفناک انداز میں کہا ”جواب دینے کے لیے تمہاری زبان کا آزاد ہونا ضروری نہیں ہے تم اشاروں میں بھی بتا سکتے ہو۔“ پھر میں نے اس کے حلق میں تھکی ہوئی کلاشکوف کی نال پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا اور پوچھا۔

”کیا وہ میاں زاد حسین ہے؟“

اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔

میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ میں نے کہا ”وہ کس طرف گیا ہے؟“

اس نے ہاتھ سے ایک کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس کے اس جنبشی جواب کے بعد مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ اس شخص سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی مگر میں اسے آزاد بھی چھوڑنے کا ریسک نہیں لینا چاہتا تھا لہذا میں نے اسے دنیا سے غفلت میں پہچانے کا فیصلہ کیا۔ نال کو اس کے منہ سے باہر نکال کر میں نے اپنے ہاتھوں کی مشاق انگلیوں کو اس کی گردن پر ”آزمایا“ اور اسے دو تین گھنٹے کے لیے اٹھاٹھیل کر دیا۔ یہ کام میں نے چند سیکنڈ میں انجام دے لیا تھا۔ خالی گرن کو بھی میں نے وہیں پھینک دیا۔

پھر میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسی دروازے کی جانب ریگ گیا جہر ڈرائیور نے اشارہ کیا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے پینڈل کو گھما کر چند جھلکے دے مگر دروازہ کھل نہ سکا۔ مجھے ”بی۔ ٹری ایٹ“ کے وہ لمحات یاد آئے جب میں نے میاں زاد کے کمرے کے دروازے کو کھولنے کے لیے ”پٹی“ کی قوت کو آزمایا تھا۔ میں ان لمحات کو بھی نہیں بھول سکتا تھا جب وہ شیطان صفت انسان مجھے چکما دے کر بچنے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

آج میں اسے ایسا کوئی موقع دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بچنے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ اب قصہ پارینہ اور صدائے ماضی فریب میں بدل چکی تھی۔ میں نے کمرے کا

بٹ رسید کر دیا۔ وہ ڈمگیا اور تیرا کر زمین یوس ہو گیا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ غصیلے انداز میں اپنے بیوی فوجی بوٹ سے اس کے چہرے پر دو تین بھر پور ٹھوکریں بھی لگا دیں۔ کھوپڑی پر پڑنے والی ضرب نے اسے دنیا دیا مینہا سے بے خبر کر دیا۔ کلاشکوف بدستور اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی لیکن اس ”غافل“ شخص کے ہاتھوں میں وہ گرن اب ایک لامحی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اس کا میگزین خالی کر دیا تھا۔ میں نے اسے گن پھینکنے کا حکم شخص اس احتیاط کی بنا پر دیا تھا کہ وہ کوئی چالاک نہ دیکھا کر گرن کو ری لوڈ نہ کر لے۔

اسی وقت کھڑکی کے پردے میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کی دوسری طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ وہاں کھڑکی کے پیچھے جو کوئی بھی موجود تھا، فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ میاں زاد بھی ہو سکتا تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، فرار ہونے والے کم از کم دو افراد تھے۔ میں لپک کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ جب میں اٹلی میاں زاد سے گفتگو کر رہا تھا تو اس وقت میں نے کھڑکی کے پردے میں پراسرار حرکت کو نوٹس کیا تھا۔ پردے کی حالیہ سرسراہٹ نے یہ بات ثابت کر دی کہ اس پردے کی اوٹ سے کوئی مسلسل اندر جھانک رہا تھا۔

میں تیزی سے دوڑتے ہوئے اس جانب پہنچا جہر وہ کھڑکی کھلتی تھی۔ وہ ایک برآمدہ تھا جگہ تھی۔ جس کے سامنے سرسبز لان اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ میری عقابانی نگاہ برآمدے کے آخری سرے تک جا پہنچی اور میں نے وہاں کسی کو کھڑتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس شخص کی صرف پشت نظر آتی تھی اور میں نے اس کے لباس سے پہچان لیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو لینڈ کروزر کو چلا کر ڈیٹیل کلینک سے یہاں تک لایا تھا۔

میں چپے کی رفتار سے اس کے عقب میں لپکا۔ چند سیکنڈ میں، میں اس کے سر پہنچ گیا۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی جست بھر کر اس کی یہ کوشش ناکامیاب بنا دی۔ میرا ابھی ہاتھ اس کی گردن پر پڑا اور میں نے کارڈیوج کر اسے ایک جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔

وہ زور دار آواز کے ساتھ راہ داری کے پختہ فرش سے ٹکرایا پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا، میں نے کلاشکوف کی خوفناک نال اس کے منہ میں کھسک دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں نے خوشخوار لہجے میں

دروازہ کھولنے کے بجائے اس سے بھی زیادہ ضروری کام پہلے کرنا مناسب سمجھا اور ڈرائیور کے بے حس و حرکت جسم کے اوپر سے پھلانگ کر مین گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔

گیٹ اندر سے بند تھا مگر اس میں تالیاں نہیں لگتا تھا۔ گیٹ کا تالا کڑی کے ہک سے لٹک رہا تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے وہ تالا بند کر دیا۔ اب چابی کے بغیر اس تالے کو کھولا نہیں جاسکتا تھا..... اور تالا کھلنے سے پہلے وہ گیٹ واپس ہوسکتا تھا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈ میں ہوئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں گیراج کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں دو گاڑیاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ ان میں ایک تو وہی سیاہ لینڈ کرورز جس میں سوار ہو کر میں اس بیٹنگ تک پہنچا تھا اور دوسری ایک وہاٹ ہونڈا اکاڑو تھی۔ مجھے یاد آیا کہ بنگلا نمبر ”بی۔ قمری ایٹ“ سے فرار ہونے کے لیے میاں زاہد نے ایک سفید ہونڈا اکاڑو کا سہارا لیا تھا، گویا اس بیٹنگ میں اس مردودی موجودگی مسلم ہوئی تھی۔

میں نے چند سیکنڈ میں دونوں گاڑیوں کے انجنوں سے معمولی جھنجھڑا کر کے انہیں ایسا بنادیا کہ وہ مکمل چپک اپ کے بغیر اسٹارٹ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو گئیں۔ کوئی بھی شخص اگر انفری کے عالم میں انہیں استعمال کر کے بیٹنگ سے ”رخصت“ نہیں ہوسکتا تھا۔ گویا میں نے میاں زاہد کے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ میں مطمئن ہو کر بیٹنگ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ میری متلاشی نظر کسی مقول گوشتے کو ڈھونڈ رہی تھی۔

اس مرحلے پر میں نے کسی کمرے میں داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے بیٹنگ کا مین گیٹ، گیراج اور ان دونوں مقامات کا درمیانی راستہ واضح طور پر نظر آتا تھا۔ جلد یا بدیر میاں زاہد کو اس بیٹنگ سے لٹکانا تھا اور وہ میری نگاہ میں آئے بغیر کہیں بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بیٹنگ کے کمرے میں اندھا دھند چکرانے سے بہتر تھا کہ اسے گھات لگا کر شکار کیا جائے۔

اس وقت رات کے لگ بھگ گیارہ بجے تھے۔ ڈینس کا یہ فیئر ابھی زیادہ تر غیر آباد رہا تھا اس لیے وہاں سانے کا راج تھا۔ مجھے اس گوشے میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے کسی کے دے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے اپنی حیات کو ساعت میں بدلا اور اس آہٹ پر توجہ مرکوز کر دی۔ لمحہ بہ لمحہ قدموں کی دھیمی چاب نزدیک آتی چلی گئی۔ میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت میں نے ایک انسانی جسم کو بیٹنگ کی عمارت سے نکل کر گیراج کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ شخص

اندھیرے کی آڑ لے کر قحط قدموں سے، دائیں بائیں، کیچے ہوئے آئے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہینڈل بھی موجود تھا۔

اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میرے دل نے کوئی دی، وہ میاں زاہد حسین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اندھیرے کے باعث میں اس کے چہرے کی، بیاہی اور آنکھوں کی مکاری کو بڑھتی دیکھ سکا تاہم اس کے بھاری جسم اور پست فاسٹی نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ وہ اس وقت ایک سوٹ میں ملبوس تھا۔

میں نے شکاری چیتے کے مانند اپنے اور میاں زاہد کے درمیانی فاصلے کو نگاہ میں ناہور اس حساب کو ضرب تقسیم کر کے اپنے قدموں کے سپرد کر دیا۔ ”آئندہ دو سیکنڈ کے اندر میں کی پلٹ ٹرین کی طرح سفر کرتے ہوئے میاں زاہد کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔“

اس موقع پر اس کی مکاری مکمل کر سامنے آ گئی۔ اس نے اپنے عقب میں میری موجودگی محسوس کر لیا۔ نہ صرف محسوس کر لیا بلکہ اس کا فوری رد عمل بھی سامنے آ گیا۔ اس نے اچانک پلٹ کر مجھ پر فائر کر دیا تھا۔

اگر میں میکا کی انداز میں بروقت نیچے نہ بیڑ جاتا تو گولی میری کھوپڑی کے پار ہو جاتی۔ میں نے نیچے بیٹھے ہی وہاں رکے رہنا خطرناک جانا اور فرنٹ رول کر کے اس کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

میری یہ بھرتی آمیز احتیاط بہت سودمند ثابت ہوئی کیوں کہ میاں زاہد نے دوسرا فائر اسی جانب کیا تھا جہاں پر بیٹر کر میں نے پہلی گولی کو خالی دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے تیسرے فائر کا اسے موقع نہ دیا اور اس کے ہینڈل والے ہاتھ پر ایک راؤنڈ ہاؤس (Round House) لگ ماری۔

ہینڈل اس کے ہاتھ ہی میں رہا لیکن وہ تکلیف کی شدت سے کراچے ہوئے دو قدم پیچھے چلا گیا پھر اس سے مل کر وہ بارہ ہینڈل کا رخ میری طرف کرتا، میں نے ایک بھر پور سائیڈ کلک اس کی کمر پر رسید کر دی۔

اس کلک کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا جس سے ظاہر ہو گیا کہ میاں زاہد بے پناہ قوت برداشت کا مالک تھا۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر کھا کر وہ ٹھوڑا سا لڑکھایا اور اس کے منہ سے میرے لیے ایک گالی نکل گئی۔ اس نا قابلِ اشاعت گالی کے اختتام پر اس نے کہا۔

”وعدان! ابنی شیطان! آج تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے۔ تمہاری جانب بہت سا حساب لگتا ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھ پر گولی چلا نا چاہی مگر میں اس کی اس جرات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اس کا ہینڈل والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں نے ہوا میں چپ کی اور فرنٹ سرسالت لگاتے ہوئے اس کے اوپر سے گزرا گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں موجود ہینڈل نے گولی اگلی لیکن جہاں کا نشانہ لیا گیا تھا، میں اب وہاں موجود نہیں تھا۔

میں نے جیسے ہی زمین پر پہنچے ٹکائے، وہ میری طرف گھوما لیکن میں اس دوران میں پنجوں سے فرش کو پٹش (Push) کر کے دوبارہ ہوا میں اچھل چکا تھا جیسے ہی میاں زاہد کا چہرہ میری سمت ہوا، میں نے ایک دھانسو قسم کی (Wheel Flying Kick) اس کے قہقہوں پر رسید کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو کھاتے ہوئے کراہا اور لائے قدموں پیچھے چلا گیا۔ بیک گیز میں دو قدم کا فاصلہ طے کر کے رکا پھر وہ اندھا دھند مجھ پر فائرنگ کرنے لگا۔

اس کی اس ”اندھا دھند“ سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بے بیک وقت ٹریل بیک فلیک (Back Flick) کرتے ہوئے گیراج میں پہنچ گیا۔ اپنے ہینڈل کی تین گولیاں وہ پہلے ہی فائر کر چکا تھا۔ اس مسلسل فائرنگ نے ہینڈل کا کلک خالی کر دیا۔ میں نے فائرنگ کے اختتام پر ”ٹھٹ ٹھٹ“ کی آواز سنی تھی۔

میاں زاہد نے جھنجھلا کر خالی ہینڈل کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیا کلک لوڈ کرتا، میں گیراج کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ میری یہ ”آمد“ بڑی دھواں دھار تھی۔ میں نے دو قدم کی مختصر دوڑ لگانے کے بعد ایک سائیڈ فلائنگ کلک اس کے سینے پر رسید کر دی پھر جیسے ہی میرے قدم زمین پر لگے، میں نے لیفٹ راؤنڈ ہاؤس گھمادی۔

میاں زاہد نے میری کلک کو بلاک کرنے کے لیے ہینڈل والا ہاتھ بے ساختہ آگے کر دیا۔ میری کلک نے وہ خالی ہینڈل اس کے ہاتھ سے چھڑا کر کہیں اندر اندھیرے میں پھینچا دیا۔ میں نے ایک اسٹیپ انڈر آ کر اس کے چہرے پر فرنٹ ہیج مارا۔ اس نے جھکا کر دے کر اپنے چہرے کو بچالیا۔ میں نے ڈبل ہینڈ پیش اس کے سینے پر رسید کر دیا۔ عقب میں جھکا کر اپنے کے سب اس کا سینہ ایک بہترین ہارنگ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

وہ اس دھکے کو سہ نہ سکا اور پشت کے بل زمین پر جا رہا۔ میں نے اس کے قریب آ کر نہایت ہی کٹیلے لچھے میں کہا۔

”میاں جی! میری جانب تمہارا جو حساب لگتا ہے، وہ

میں گاہے بہ گاہے اتارتا رہا ہوں مگر تم بری طرح میرے مقروض ہو چکے ہو۔ آج میں تم سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہوں گا۔ تاہم، میری ساحل کو تم نے کہاں چھڑا رکھا ہے؟“

”ساحل تک پہنچنے کے لیے ہمیں ہماری بات ماننا ہو گی۔“ وہ لباس جھانڈتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ڈائری کے دو صفحات ہمارے خوالے کر دو۔ تمہاری محبوبہ ہمیں دے دی جائے گی۔“

”دو صفحات کیا، پوری ڈائری تم پہلے ہی حاصل کر کے اپنے والد محترم ملک نواز علی کو پہنچا چکے ہو۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

والد محترم کے الفاظ نے اس کا چہرہ متحیر کر دیا تاہم وہ مغلظات کا سہارا لینے کے بجائے نہایت ہی ترش الفاظ میں بولا ”ان دو صفحات کے بغیر وہ ڈائری ایسے ہی ہے جیسے گولی کے بغیر گن یا زہر کے بغیر سانپ۔ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئے تو تمہاری محبوبہ کا وہ حشر کیا جائے گا جسے دیکھ کر تم خود کشی پر مجبور ہو جاؤ گے۔“

”میں تمہاری ناپاک زبان کو گولی سے کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔“ میں نے جیسے ہی لہجے میں کہا ”خود کشی کرے گا تمہارا باپ نواز علی۔ اگر میری ساحل کا ایک ہال بھی بانٹا ہوا تو میں تم سب کو زندہ گاڑ دوں گا۔“

وہ صبر سے ہونے انداز میں بولا ”تم شدید قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ ہمیں ہماری طاقت کا اندازہ نہیں۔“

”تو ساحل کے بارے میں تم زبان نہیں کھولو گے؟“ میں پوری سفاکی سے بولا۔

وہ غرٹ آمیز انداز میں گویا ہوا ”تمہارا تو باپ بھی میری زبان نہیں کھولا سکتا۔ تم میاں زاہد کو کیا سمجھتے ہو؟“

میں نے عمارت آ میز لچھے میں کہا ”میں تمہیں بھگواؤ، بزدل، ذلیل، کمینہ اور دنیا کا کھٹیا ترین انسان سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں تم ہی کمینہ عابت ہو رہے۔“

میری پوری بات ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر جھٹ پڑا۔ اس نے ایک زوردار مکاری ٹھوڑی پر مارنے کی کوشش کی۔ آج میں اپنے دشمن کی کسی کوشش کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کے ہیج کورائٹ آؤٹ (Right Out) بلاک کیا۔ اس نے پھرتی سے لیفٹ ہیج بھجے پر آ زلیا۔

میں نے نیک جھک (Neck Jerk) سے اپنے چہرے کو بچالیا۔ اس کے دونوں بازو اس حملوں کے نتیجے میں ایک دوسرے کے اوپر کر اس ہو چکے تھے۔ میں نے اچانک مڑ کر اس کے چہرے پر ایک ہیج رسید کر دیا۔

اس کی ناک سے خون نہ رسنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے ناک کو صاف کرتے ہوئے غصیلے انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی تاہم وہ جسمانی طور پر انتہائی فٹ تھا۔ اب تک میں نے میاں زاہد سے جتنی فائنٹ کی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدہ مارشل آرٹسٹ تو نہیں تھا تاہم لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اسے خاصی مہارت حاصل تھی..... اور کیوں نہ ہوتی؟ آخر کو وہ ایک سینئر کیٹ کا پروگرام کنٹرولر تھا۔ اسے جرائم کے دنیا کا ایک بہترین ڈائریکٹر مانا جاتا تھا۔ اسی کی ڈائریکشن پر پرنس سوٹ والے نے اس کا کردار نبھانے کی کوشش کی تھی اور بہ ذم خود مجھے گھیر کر اس جینگے تک لے آیا تھا۔ وہ لوگ میری اصلیت جاننا چاہتے تھے اور اس جاننے کے چکر میں ایک بہت بڑی مصیبت کو گلے لگا بیٹھے تھے۔

میاں زاہد نے بڑے جارحانہ انداز میں میرے پیٹ پر لات مارنا چاہی، میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کی انگلی ہونے لگی۔ پوری قوت سے پریشر رک رک کر دیا۔ میرا دایاں پاؤں کسی ڈائی مشین کے پیمر کی طرح اس کے گھٹنے پر پڑا۔ وہ ردعمل کے طور پر نیچے جھکتا چلا گیا میں نے اسی وقت لیفٹ فرنٹ جبرک لگ کر اس کے منہ پر بارودی زمین پر بیٹھے بیٹھے وہ پیچھے کی جانب الٹا اور کافی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میں تیز قدموں سے چل کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سنہلے ہی میں نے اس پر تابو توڑ لات کے برساتا شروع کر دیے۔ وہ پٹا رہا اور قدم قدم پیچھے سرسکا رہا۔ ہم فائنٹ کرتے ہوئے ایک برآمدہ نما راباداری میں آ گئے۔ یہاں تھوڑے فاصلے پر ڈرائیور ہے بوش پڑا تھا۔ میں نے اسلم نامی گمن بردار سے جتنی ہوئی خالی کلاشکوف ڈرائیور کے نزدیک ہی پھینک دی تھی۔ زاہد حسین نے چالاکی دکھاتے ہوئے وہ گمن اٹھائی اور اس کی نال کار رخ... میری جانب اٹھاتے ہوئے غریبا۔

”کھیل ختم، پیسا ہمیں۔ لاؤ، یہ بیک مجھے دے دو۔“ اس کا اشارہ اس بیک کی طرف تھا جو میں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا تھا۔ میاں زاہد کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ خالی گمن کے بل پر مجھے دھکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبے یوں غائب کیا جسے اس کے ہاتھ میں کلاشکوف دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے چنگھاڑتے ہوئے ایک طوفانی سائیڈ کلک اس کے پیٹ میں جڑ دی۔

وہ مجھ سے اس قسم کے ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا لہذا

میری اس کلک نے اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ ٹوپ میں سے ہٹکے ہوئے کسی گولے کے مانند ہوا میں اچھلا اور بیک میئر میں چنچی پرواز کرتے ہوئے پشت کے رخ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس دیوار کے قریب ہی دھاتی فریجیر رکھا ہوا تھا۔ وہ دیوار کو زوردار سلامی دینے کے بعد آہنی کریسوں پر گر کر رہی سہی کسر اس سے ٹکرائے نکال دی۔ میں اس کی کیمپری پر آتش کراٹھا۔

میاں زاہد کا وجود ان کریسوں میں جھنسن کر رہ گیا تھا اور وہ خود کو آزاد کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں کو بڑے اعتماد انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر ذرا ترس یا رحم نہ آیا اور میں نے اپنے وزنی فوجی بوٹ سے ایک کرسی کے پائے کو خوف ناک ٹھوکر مار دی۔

دونوں کریسوں کا فاصلہ مزید کم ہو گیا جس کے نتیجے میں میاں زاہد کا آفت زدہ وجود پھینچ کر رہ گیا۔ میری سماعت تک، اس کے حلق سے خارج ہونے والی ایک کرب ناک چیخ نے رسائی حاصل کی تو مجھے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ میں نے ترنگ میں آ کر ایک کرسی کی پشت کو بڑی حقارت سے ٹھٹھا مارا۔ اس ٹھٹھے کے نتیجے میں دونوں کریسیاں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے الٹ گئیں۔ کریسوں کے ”الٹاؤ“ سے میاں زاہد کی جو حالت ہوئی ہوگی، بیان سے زیادہ اس کے تصور میں مزہ ہے۔

چند لمحات بعد وہ ہانپتا ہنکتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب آ کر چیخ مارنے کا ڈانچا دیا۔ وہ دھڑام سے فرش پر جا کر اس کے اس گل نے مجھے بتا دیا کہ ہمت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

میں نے چند لمحوں کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن جب باوجود کوشش کے بھی وہ اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو میں اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ کھٹکھٹ خودہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی بے بسی سٹ آئی تھی۔ وہ اس وقت انڈر لڈنگ کا پاس نہیں بلکہ ایک حقیر کچھا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے اشارہ پر در پر انسانی جان کو اس جہاں سے اس جہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ساری سفاکی اور درندگی پتا نہیں، بس کس راستے اس کے جسم سے خارج ہو چکی تھی۔

کسی بے بس اور لاچار انسان کو دیکھ کر خوش ہونا اچھی بات نہیں لیکن میں اس وقت بہت سرور تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میاں زاہد حسین کوئی انسان نہیں بلکہ شیطان مفت

انسان نما جانور تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی رو رعایت کا حق دار نہیں تھا۔ اگر میں اس پر رحم کھا کر اسے آزاد کر دیتا تو اس کی بے بسی اور لاچارگی ایک جھپٹکے میں غائب ہو جاتی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ انسان دکن اور شیطان دوست ثابت ہوتا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں استفسار کیا ”سائل کہاں ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کو کڑوٹ لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی ڈھنکی نما خاموشی نے میرے جنون میں اضافہ کر دیا۔ میں نے اس کے منہ سے چھڑے کوکوں کی برسات سے لہو لہان کر دیا پھر اسے گریبان سے جھنجھوڑتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

”میری سائل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

وہ بدستور خاموش رہا جیسے اس نے زبان نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ اس کے عمل نے میری جھنجھلاہٹ میں اضافہ کر دیا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”میں یہ سوال تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں میاں زاہد۔ اگر مجھے جواب نہ ملتا تو میرے کیے کا بھی کوئی جواب نہیں ہوگا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

اس کے ہونٹوں کو ہلکی سی جھنسن ہوئی مگر آواز پیدا نہ ہو سکی۔

میں نے دونوں لہجے میں پوچھا ”سائل اس وقت کہاں ہے؟“

”آج صبح..... میں نے اسے..... لاہور بھیج دیا.....“

”وہ بھلا ہٹ آمیز لہجہ میں بولا۔

میں نے استفسار کیا ”لاہور..... یا رکھاں والی؟“

”رکھاں والی۔“

”اگر میری سائل ”رکھاں والی“ روانہ ہو چکی ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے کہا ”تمہیں تو اس وقت لکھاں والی میں ہونا چاہیے۔“

اس کی آنکھوں میں دشت ابھر آئی۔ میں نے پوچھا ”وہ کس ذریعے سے لاہور بھیجی گئی ہے اور کب تک رکھاں والی پہنچ جائے گی؟“

”بائی روڈ..... پرائیویٹ جیب میں.....“ اس نے رک رک کر خف آواز میں بتایا ”وہ کل صبح لاہور پہنچے گی اور دوپہر میں رکھاں والی۔“

میں نے اپنا ہاتھ بے ساختہ اپنی پنڈلی کی جانب پڑھا دیا۔ اس پنڈلی پر اتنا زلزلہ کی یادگار، میرا سامی، میرا مستقل سکونت رکھتا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس قاتل خنجر کو چری

کیس سے جدا کیا۔ مہلک خنجر کا پیا سا پھل میاں زاہد کی نگاہ میں چمکا تو اس کے رہے ہے حواس پر بجلی سی گزری۔ اس کی آنکھوں میں جاگزیں دشت میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر موت کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ مردہ آواز میں کھکھکیا۔

”مم..... مجھے..... معاف کر دو..... وجدان.....!“

معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کو کون واپس لا سکا ہے؟..... کوئی نہیں، کبھی نہیں! میں نے اپنے خنجر کے نقشہ لکھ کو میاں زاہد کی شہرگ کے کھٹ پر دھک کر میرا بی کا موقع فراہم کر دیا۔

اسی وقت میں نے جینگے کے باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، وہ ایک نہیں بلکہ دو گاڑیاں تھیں جو بڑی تیزی سے جینگے کی جانب آرہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں منہجھل کر کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاتا، دونوں گاڑیاں جینگے کے گیٹ کے سامنے آ کر رک گئیں۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر اس برآمدہ نما راباداری میں دوڑ گیا۔ اپنے عقب میں، میں نے گاڑیوں کے بھاری دروازے کھلتے اور بہت سے لوگوں کے، ان گاڑیوں سے اترنے کی آوازیں سنیں۔ وہ جو کوئی بھی تھے، میاں زاہد کے دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ دوست ہوتے تو ان کی گاڑیاں جینگے کے اندر آتیں اور انہیں احترام و کشادہ دلی سے دیکھ کر مانا جاتا۔ ان کا انداز تو ایسا تھا جیسے پولیس نے ریڈ کیا ہو!

انکھے ہی لمحے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ میری سماعت سے میگافون کی آواز نکل گئی۔ وہاں سے جینگے کے کلین کوکلی دھمکی دی جا رہی تھی۔

”ملک رؤف! ہم نے تمہارے جینگے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس وقت تم مکمل طور پر پولیس کے زنجیر میں ہو لہذا اس قسم کی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے ساتھیوں سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہیں صرف پانچ منٹ کی مہلت دی جاتی ہے۔ فراہم کی کسی بھی صورت کا نتیجہ موت ہے..... بھیا تک موت!“

میرا ذہن میاں زاہد حسین اور ملک رؤف کے درمیان سوا لہ نشان پرانک کر رہ گیا۔

میں دوڑتے ہوئے برآمد نما راہداری کے آخری سرے پر پہنچا تو میری سماعت سے میگانوں کی آواز نکلائی۔ پولیس والے اپنی دھمکی کو ہمارا ہے تھے۔ اس ہنگامے کے مالک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جا رہا تھا۔

”ملک روٹ! ہم نے سبھی کو جہالت دی تھی اس کا ایک منٹ گزر چکا ہے۔ اب تمہارے پاس صرف چار منٹ بچے ہیں۔ یہ آخری وارننگ ہے۔ اس کے اختتام پر سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے ہاتھ میں تین منٹ کا وقت ہوگا۔ اس وقت میں ہماری ہدایت کے مطابق اگر تمہاری جانب سے مثبت ردعمل دیکھنے میں نہ آیا تو ہم ہنگامے کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو، فرار کی ہر کوشش خودکشی کے مترادف ہوگی۔ تمہارے ہنگامے کو پولیس کے سطح چٹانوں نے پوری طرح گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اگر کسی شخص نے ہنگامے سے باہر قدم رکھا تو اسے بے دریغ گولیوں سے بھونک دیا جائے گا!“

میگانوں اس اعلان کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کی مدت تین منٹ مقرر کر دی گئی تھی۔ ٹھیک تین منٹ بعد پولیس اندھا دھند ہنگامے میں آئی۔ میں نے اندر سے گیٹ کو تالا لگا دیا تھا مگر ایسے مواقع پر پولیس ناک کرنے یا گیٹ کھلوانے کے کھلف میں نہیں پڑتی۔ ریڈ کا مطلب ہے..... ریڈ! وہ آسانی دیا ہوا پیمانہ گنگے کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ وہ بہت نازک لمحات تھے اور..... اس دوران میں مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ ہنگامے سے باہر نکلتا انتہائی خطرناک ثابت ہوتا۔ پولیس والے یہی سمجھتے کہ میں ملک روٹ کا کوئی سامی ہوں۔ وہ کوئی سوال کے بغیر مجھے شوٹ کر دیتے۔ فی الحال مناسب یہی تھا کہ میں خود کو ہنگامے ہی میں کھیں روپوش کر لوں اور جیسے ہی موقع ملے، یہاں سے نکل جاؤں۔

ایک بات ملے تھی۔ ہنگامے کے اندر پولیس کی حراست کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پرنس سوٹ میں لباس نعلی میاں زاہد، کن برادر اسلم اور بالکل اصلی میاں زاہد حسین اپنی طبیعت پروری کر کے کسی اور جہان میں سکونت اختیار کر چکے تھے جبکہ قطعی میاں زاہد کا خاموش سامی اور ذرا عجیب و دوں شہید زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ میرے ذہنی لوٹ کی ضروریوں نے خاموش سامی کا چہرہ مسخ کر دیا تھا اور ذرا عجیب و دوں تین کھٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ اس صورت حال میں پولیس باہر کا کھیرا توڑ دیتی اور مجھے وہاں سے نکلنے میں آسانی ہو جاتی۔

میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس دروازے کے

پاس پہنچا جس کے پیچھے کچھ دیر پہلے میاں زاہد روپوش ہوا تھا۔ ذرا عجیب نے اشارے سے مجھے بتایا تھا کہ میاں زاہد نے وہاں پناہ لی تھی۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے دروازے کو بند کرنے کی غلطی نہیں کی اور اپنے جینے کے لیے کوئی موزوں مقام تلاش کرنے لگا۔ وہ کمرہ ایک شاندار بیڈ روم تھا۔ تمام لائٹس آن تھیں۔ پانچ کینڈل میں، میں نے ایک دبیز پردے کا انتخاب کر لیا۔ پردے کے اختتام پر کمرے کے کونے میں ایک طویل و عریض چوبلی الماری رکھی تھی۔ میں نے الماری کے قریب سے پردہ ہٹایا اور بڑی مہارت سے اس کے عقب میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے سامنے پردہ اس طرح برابر کر لیا تھا کہ الماری اور پردے کے درمیان بننے والی ایک سلونی جھری سے میں بیڈ روم کے بیشتر حصے کو بے آسانی دیکھ سکتا تھا۔

اس وقت میرا ذہن ملک روٹ اور میاں زاہد حسین کے درمیان جتنا تنگ کے کرب دکھا رہا تھا۔ پولیس کی دھمکی کے مطابق وہ ہنگامے کی ملک روٹ نامی شخص کی ملکیت تھا جسے چھاپنے کے لیے وہ جماعت وہاں پہنچے تھے۔ میرا دھماکا جا کر اسی پرنس سوٹ والے دروازے کا قاتل شخص پرک جاتا تھا جس نے مجھے گھبرانے کے لیے نعلی میاں زاہد کا رول کیا تھا۔ اپنے رعب داب اور حرکات و سکنات سے وہ ہنگامے کا مالک نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں وہی ملک روٹ ہو سکتا تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی تھی کہ پولیس والے میاں زاہد حسین کی وہاں موجودگی سے آگاہ نہیں تھے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ صبح آٹھ بجے میری فلائٹ تھی۔ مجھے ساڑھے چھ بجے انز پورٹ پہنچنا تھا اور اس وقت میری رسٹ وایج میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ جب میں آج شام میاں زاہد کی تلاش میں نکلا تھا تو مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی، اس تلاش کے دوران میں، میں کن کن گھنٹا تھیں سے گزروں گا۔ اسی لیے میں مکمل تیاری سے نکلا تھا۔ میرے بیگ میں ہر وہ شے موجود تھی جس کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اگر مجھے براہ راست انز پورٹ بھی جانا پڑا تو وہاں نہیں تھی۔

پولیس کی دی ہوئی مہلت گزرتی۔ ہنگامے کے اندر بدستور خاموشی اور سناٹے نے پنچے گاڑ رکھے تھے۔ میں ہنگامے کے کینوں پر گزرنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ہنگامے کے احاطے میں ”نقل و حمل“ محسوس ہوئی پھر راہداری میں ہماری ہمراہی پولیس کی چاب ستائی دی۔ اس کا

واج مطلب یہی تھا کہ پولیس نے اپنی دھمکی کے مطابق ”آرٹیشن اربلی ٹائٹ“ شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ بیرونی کیم کو بند پا کر اندر کود آئے تھے۔ ان کا یہ عمل بہت ہی ناپا خلا اور بریکٹ تھا۔ اس بیڈ روم کا دروازہ کھلا رکھنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ باہر کی حرکات و سکنات کی صوتی اثرات بے آسانی مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ میں نے کم از کم چار افراد کو باہر پکارتے ہوئے سنا۔ چند لمحات کے بعد ان میں سے دو افراد ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئے۔ دو اس راہداری کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ راہداری کی اس سمت پہلے انہیں بے ہوش ڈرائیور کا وجود ملتا اور اس کے بعد ہاں زاہد حسین کی خون آلود لاش۔ میں نے بڑی بے دردی اور پوری سفاکی سے اس تنگ انسانیت کو زخ کر ڈالا تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق پولیس نے متذکرہ بالا رولوں افراد کو ”دستاب“ کر لیا۔ اسی وقت ڈرائنگ روم کی طرف جانے والے بھی واپس لوٹ آئے۔ ڈرائنگ روم میں لائٹس اور ایک فرد بے ہوش پڑا تھا۔ وہاں سے لوٹنے والے پولیس مین بڑی سستنی خیز خبریں لائے ہوں گے۔ میں نے ان چاروں کو تھوڑا آواز میں باتیں کرتے ہوئے سنا وہ ہنگامے میں موجود صورت حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان میں سے جو بڑھڑھاتا تھا اس نے حکیمانہ لہجے میں کہا۔

”پورے ہنگامے کی تلاش کرو۔ ممکن ہے، ملک روٹ کا کوئی آدمی یہیں چھپا بیٹھا ہو!“

ان احکام سے ظاہر ہو گیا کہ وہ ملک روٹ کا سراغ لگا چکے ہیں۔ زندہ، بے ہوش اور مردہ بائے جانے والوں میں سے کوئی ایک ملک روٹ تھا اور وہ جہاں میاں زاہد نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، پرنس سوٹ والا وہی ملک روٹ تھا۔ اگر اس نے نعلی میاں زاہد کا درکار ادا کیا تھا تو اس کا مطلب تھا، امیماں زاہد حسین کا بہت ہی خاص آدمی تھا۔ اب وہ میاں جی اور اس کا خاص آدمی دونوں بہت عام ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر تک باہر خاموشی رہی پھر دو افراد اس بیڈ روم میں داخل ہوئے جہاں میں ایک دبیز پردے کے پیچھے دیکھا کھڑا تھا۔ انہوں نے پہلے تلاشی نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ باخبر ڈرائنگ کے نزدیک رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے یہ بیڈ روم کی وہ دیوار تھی جو میری نظر کے عین سامنے تھی۔ میں بڑی وضاحت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کی تو عوامی صحت مندرجہ اور عہدے کے لحاظ سے وہ اسپیکر تھا۔ دوسرا اے ایس آئی تھا جو خاصا چاق و چوبند اور اسارٹ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے

کلاشکوف تمام رکھی تھی۔ اسپیکر کے ہاتھ میں ریو اور نظر آ رہا تھا۔

بیڈ روم میں اسپیکر کی گھمبیر آواز ابھری ”سرفراز!“ اس کا مخاطب اے ایس آئی تھا ”صورت حال کو بڑی خوبصورتی سے نیکل کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

سرفراز نامی اے ایس آئی نے پُر زور انداز میں گروں ہلائی اور کہا ”یہاں جو کچھ ہو گیا ہے وہ ملک روٹ کے کسی دشمن کا کارنامہ ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ کام دکھا کر چلا گیا لیکن سر۔“ اس نے بڑے شیطانی انداز میں اپنے آفسر کو دیکھا اور بولا ”یہ کارنامہ اب ہمارے کھاتے میں لکھا جائے گا۔“

”تم بہت ترقی کر دو گے سرفراز!“ اسپیکر نے دھمکی آواز میں کہا ”موقع شناس ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کو موقع پرست بھی ہونا چاہیے۔ دنیا داری کا بھی اصول ہے۔ اس اصول کو نظر انداز کر کے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا!“

اے ایس آئی نے ایک آنکھ دہائی اور مستحق خیر لہجے میں بولا ”اب کہانی کچھ اس طرح بنے گی کہ ہم نے غشیات کے اسٹور ملک روٹ کے اڈے پر چھاپا باراب ملک روٹ اور اس کے ساتھیوں نے گرفتاری دینے کے بجائے ڈٹ کر پولیس کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں ملک روٹ اور اس کے دو ساتھی ہلاک ہو گئے۔ دوسرا شہید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ سرفراز! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“ بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے اپنے آفسر کو دیکھا۔

”تم بالکل ٹھیک سمت میں جا رہے ہو۔“ اسپیکر نے تائیدی انداز میں کہا ”لیکن اس کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے بہت سے پہلوؤں کو جاندار بنانا ضروری ہے۔ ہمیں اس ہنگامے کے مختلف مقامات پر ”ضروری“ فائرنگ کرنا ہوگی تاکہ پولیس مقابلے کا صحیح نقشہ کش کر سائے آئے۔ اس فائرنگ سے باہر موجود درجن مہر کا شہیلو کی تسلی بھی ہو جائے گی۔ ہمارے ساتھ ہنگامے کے اندر جو دو کا شہیلو آئے ہیں، انہیں ”سمجھانے“ کی ضرورت ہے پھر اس ہنگامے سے کچھ غشیات وغیرہ بھی برآمد کرنا ہے..... اور سب سے اہم بات۔“ اسپیکر چند لمحوں کے بعد پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”باہر راہداری میں جو گردن کنی لاش پڑی ہے، شاید تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا سرفراز!“

”سر، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اے ایس آئی بولا ”میں واقعی افراتفری میں اس پر زیادہ دھیان نہیں دے

”سکا۔“

انسپکٹر نے سنسنی خیز انداز میں انکشاف کیا ”وہ اس شہر کی ایک مشہور سیاسی اور سماجی شخصیت میاں زاہد حسین کی لاش ہے۔ میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی پہچان لیا تھا۔ میاں جی کو بھی اس کہانی میں بڑی خوبصورتی اور کاریگری سے فٹ کرنا ہوگا۔“

”سرا! آپ بہت متنبہ ہوئے۔“ کہانی کا ”ہیں۔“ اسے ایس آئی نے مسکا لگایا۔ ”آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جسے آپ چنگیوں میں انجام دے لیں گے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے چنگی بجانے کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔

”کچھ کرتے ہیں؟“ چوبیلی تو ندوالا انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

پھر وہ دونوں تیزی سے بیڑوم سے نکل گئے۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور تازہ ترین رت حال پر غور کرنے لگا۔ یہاں تو ایک نیا اور سنسنی خیز کھیل شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے ملک کی پولیس کے ”کارناموں“ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ جس پر یقین کرنے کی جی نہیں چاہتا تھا لیکن جب اس قسم کے واقعات سامنے آتے تو شرم سے میری گردن جھک جاتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پولیس کا پورا ڈیپارٹمنٹ ہی کر پٹ ہے۔ جیسا اس جگہ میں بھی ایماندار، فرض شناس اور قانون پرور لوگ موجود ہیں مگر بحیثیت مجموعی عوام میں اس جگہ کے حوالے سے تاثر کچھ اچھا نہیں پایا جاتا۔ اچھے پولیس والوں کی محدود تعداد میں اچھائیاں، برے پولیس والوں کی لامحدود برائیوں میں کہیں غلط ملط ہو کر غلط سلط ہو جاتی ہیں جو کہ آفس ناک بات ہے!

انسپکٹر کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ وہ میاں زاہد حسین کو ایک سماجی اور سیاسی شخصیت کے طور پر جانتا تھا مگر اس مردود کی اصل حیثیت سے ناواقف تھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ پولیس والے تو ان چیزوں سے بھی واقف ہوتے ہیں جو سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوتیں! انسپکٹر ایک فعال سنڈیکیٹ کے روبرو رہا ہے نا آتا تھا، یہ بات ناقابل یقین اور میرے سمجھ سے آئے والی تھی؟

اسی وقت بیڑوم سے باہر بنگلے کے احاطے میں کلاکٹو فر کے موت بردار تھپے کو گنجنے لگے۔ میں سمجھ گیا، اب وہاں کون سا ڈراما کھیل جانے والا تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ میرے حق

میں جاتا تھا۔ مجھے کسی کا رتا سے کارڈ ٹ نہیں لیتا تھا۔ اگر یہ سب کچھ انسپکٹر اور اے ایس آئی کے کھاتے میں درج ہونے والا تھا تو میری بلا سے! میرے لیے خوش آئند بات تو یہ تھی کہ اب فوری طور پر اس بنگلے کا محاصرہ ختم ہونے والا تھا لہذا میرے وہاں سے نکلنے میں بہت کم دقت رہ گیا تھا۔

کلاکٹو فر کے حریف دو تین برست سٹائی دیے پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد بنگلے کے اندر درجن بھر افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ محاصرہ توڑ دیا گیا تھا۔ میں نے پردے کے پیچھے رہے ہوئے چند لمبے انتظار کیا۔ میری جانب خاموشی کا راج تھا۔ پولیس والوں کی آوازیں ڈرائنگ روم کی طرف آرہی تھیں۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اب وہاں کون کون سا ڈراما رچایا جانے والا تھا۔ میں پہلی فرصت میں اس بنگلے سے نکلنا چاہتا تھا لہذا بے قدموں چپکے سے پردے سے باہر آ گیا۔

انگلے پھرہ منٹ میں نہایت احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں قہقی دیوار چھانڈ کر بنگلے سے نکل چکا تھا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں اور بنگلے سے باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لہذا مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ڈارلنگ پارک تک میں نے پیدل سفر کیا پھر ڈیڑھ گھنٹہ کے نزدیک سے مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی کے ڈرائیو میں ڈیٹل کلینک پہنچا جہاں میری ٹیلی شیڈ کھڑی تھی۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بجے تھے۔ مذکورہ کلینک کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی میں سوار ہونے کے لیے دروازے کے لاک میں چابی لگائی تو اپنے قدموں کے انتہائی قریب کسی نرم دھماکے سے کی موجودگی نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بے ساختہ میں نے اپنے پاؤں کو جھٹکا۔

اسی وقت ایک مالوس آواز میری سماعت سے گھرائی ”میاؤں!“

انگلے لیے ڈارلنگ میرے سامنے موجود تھی۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ وہ جانے کب سے وہاں میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وفا شعار اور فرماں بردار اطاعت گزار بیویاں اسی طرح اپنے شوہروں کی راہ دیکھتی ہیں۔ اس وقت مجھے ڈارلنگ پر بہت پیار آیا۔ میں ایک شخص سے کامیاب ہونا تھا۔ شاید اسی خوشی کا اثر تھا کہ میں نے فرط جذبات میں جبکہ ڈارلنگ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”میاؤں میاؤں“ کرتے ہوئے بڑے معشوقانہ انداز میں میرے ہانڈوں میں اپنا منہ رگڑنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، کسی کا رتا سے پڑا ڈارلنگ مبادک بادبیش کر رہی ہے!

☆☆☆

میں نے قلیت میں قدم رکھا تو فون کی کھنٹی بج رہی تھی۔ دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد میں نے سنری پر کھینکا اور آگے بڑھ کر ریسورٹ اٹھایا۔ ”ہیلو“ کے جواب میں مجھے دوسری جانب شعیب غوری کی آواز سنائی دی۔ اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”وہ جان! تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں آدھے گھنٹے سے تمہیں ڈرائی کر رہا ہوں۔“

”کیوں، خیر تو ہے؟“

”سب خیریت ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا ”وہ جان! نہارے لیے میرے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔۔۔۔۔ بلکہ یہ خوش خبری ہمارے لیے مشترکہ اہمیت کی حامل ہے۔“ اس کے لہجے میں خاصی سنسنی پائی جاتی تھی۔

میں نے کہا ”میرے پاس بھی تمہارے لیے ایک اعلیٰ کوائف کی نیوز موجود ہے۔ یہ دیری پچی اینڈ گنڈ نیوز بھی ہم لوگوں کے لیے بہت اہم اثرات ہے۔“

”وہ اضطرابی انداز میں بولا“ ”تاناؤ، کیا خوش خبری ہے؟“ ”پہلے تم بتاؤ گے۔“ میں نے کہا ”خوش خبری کا ذکر ختم نے پڑا تھا۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ اوکے۔“ وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا پھر اس نے بتایا ”وہ جان! مسٹر نیل آرمز نے متروک کنوین کا فیصلہ برآمد کر لیا ہے!“

”کیا واقعی؟“ میں بے ساختہ حیرت بھرے لہجے میں لگا۔

”بالکل، ایسا ہو چکا ہے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”تفصیل کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بتانے لگا“ ”جیسا کہ تم جانتے ہو، دو روز قبل مسٹر نیل آرمز مجھ سے ایک نہایت ہی اہم میٹنگ کر کے رام پور (اتر سر) روانہ ہو گیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ منسٹر رام پور کے چوہدری رام داس سے تمام معاملات طے کر آیا تھا۔ راج شام میں نیل آرمز نے مجھے اطلاع دی ہے، وہ لوگ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔ پاک بھارت سرحد پر رام پور کی زمین سے متروک کنوین کا فاصلہ چند گز سے زیادہ ہے۔ یہ تھا پھر مسٹر نیل آرمز اپنے ساتھ بہترین ٹیم لے کر گیا تھا کہ ان کی بھارت کا منہ یوں ثبوت کثیر المالیات سونے کی بازیابی ہے۔“

”یہ تو واقعی بہت بڑی خبر ہے۔“ میں نے کہا پھر پوچھا ”کیا اتنا ہی سونا برآمد ہوا ہے جتنی ہم توقع کر رہے تھے؟“

”مسٹر نیل آرمز کے مطابق بازیاب ہونے والے سونے کی قیمت ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔“ شعیب غوری نے بتایا ”اور یہ بات تو تم ابھی طرح جانتے ہو، گولڈ کے معاملے میں نیل آرمز کی رائے کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک معروف گولڈ اکاؤنٹ بینک کا مالک ہے!“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ میں نے کہا ”میں تو سمجھ رہا تھا، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بتائیں، اس دینے کی کیا حالت ہو گی۔“ میں سال کوئی کم مدت نہیں ہوتی۔“

شعیب نے کہا ”خدا کا شکر ہے، وہ سونا اپنی اصلی حالت میں ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ ویسے کیوں کے ان دو تھیلوں کی نیل آرمز نے بہت تعریف کی ہے جن میں سونے کے بکٹ بھرے گئے تھے۔ وہ دہری نہیں بلکہ تھری تھہ والے تھیلے ہیں جس کی وجہ سے استاد زمانہ نے خزانے کا کچھ بھون بگاڑا۔ وہ جس طرح متروک کنوین میں پھینکا گیا تھا بالکل اسی محفوظ حالت میں ہم نے حاصل کر لیا ہے۔“ وہ ایک لمبے کسانس لینے کی خاطر کچھ بات پھر جاری رکھتے ہوئے بولا ”تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤ وہ جان! متروک کنوین کے مقام پر اس وقت سرسبز کھیت لہلہا رہے ہیں۔ وہ تمہارے دشمن دیرینہ چوہدری نواز علی کی زمین ہے جس میں فصل سر اٹھا رہی ہے۔“

چوہدری نواز علی کے ذکر پر میں نے چونک کر پوچھا ”شعیب! اس دینے تک رسائی کے لیے نیل آرمز نے اپنی نیم سے جو زر زمین کھدائی کروائی ہے وہ نواز علی کی نظر سے تو اوجھل ہے؟“

”ایک دم اوجھل۔“ وہ قطعیت سے بولا ”وہ ہماری اس کامیابی سے یکسر بے خبر ہے۔“

میں نے خیال اندر فرز لہجے میں کہا ”تمہاری بات دل کو گنتی ہے۔ اگر ملک نواز علی کی تمہارے مشن کی ہینک بھی مل جاتی تو وہ ہر قسم کی بڑی سے بڑی رکاوٹ کھڑی کر سکتا تھا۔ سونے کی تلاش نے اسے ختم دیوانہ بنا کر رکھا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ازاں بعد جب بھی اسے معلوم ہوگا کہ اس کی بے خبری میں وہ سونا اس کی زمین کے نیچے سے پر اسرار انداز میں کھینک اور محض ہو چکا ہے تو ممکن ہے، اس پر دل کا دورہ پڑ جائے۔“

”میں کسی بھی صورت اس ”ادارات“ کی خبر اس تک نہیں پہنچنے دوں گا۔“ شعیب نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”ابھی تو تم نے ملک نواز علی سے دو دو ہاتھ کرنا ہیں۔ میں چاہوں گا، وہ دل کے دورے سے نہیں بلکہ تمہارے ہاتھوں اپنے انجام کو

چو بدری کو از پیش علی کے تذکرے نے میرے ذہن میں ساحل کا سراپا روشن کر دیا۔ جنم مکانی میاں زاہد حسین کے آخری بیان کے مطابق آج صبح ساحل کو بائی روڈ لاہور روانہ کر دیا گیا تھا۔ وہ کل صبح لاہور پہنچ جاتی۔ اس کے بعد دوپہر تک وہ موعظ رکھاں والی میں ہوتی۔ پھر قریباً ساتھ ساتھ لاہور پہنچنے والے تھے۔ میری فلائٹ آٹھ بجے کی تھی جو زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے لاہور پہنچ جاتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس برانڈیٹ جہ میں یہاں سے روانہ کی گئی تھی اور اس کی نگرانی کے لیے میاں زاہد حسین نے کتنے بندوں کو ساتھ بھیجا تھا۔ جب میں میاں زاہد حسین سے آخری ملاقات کر رہا تھا، مجھے جوش جذبات میں یہ اہم بات جانے کا خیال نہیں رہا تھا۔ ویسے ایک بات تو طے تھی، دیگر افراد کے ساتھ لاہور پہنچنے کا بیٹا فیصل ضرور اس جہ میں موجود ہوگا۔ بچے لوں کراچی میں اس کے بڑے واضح آثار طے ملتے پھر اچانک وہ جنروں میں نہ رہا۔ میں امید کر رہا تھا، گلشن اقبال والے بچے میں اس سے ملاقات ہو جائے گی مگر وہ ہاں پہنچنے سے پہلے ہی تارکے ساتھ کھل گیا۔ نتیجے میں، میں نے پہلے تنجب اور پھر میں تارکو ان کے جائز ”انعام“ سے ہمکنار کر دیا۔

”اگر تم مطمئن ہو تو پھر مجھے بھی کوئی ٹکڑی نہیں۔“ میں نے بے پردائی سے کہا۔  
وہ بولا ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مجھ پر اس قدر اعتبار کرتے ہو۔ یقین کر دو جدان!“ اس کے لہجے میں گہری شجیرہ کی در آئی ”اگر کسی مرے پر خد اخوانہ کی قسم کی کوئی گزرب ہوگئی تو میں تم سے کیا وعدہ اپنی جیب سے پورا کر دوں گا۔ تم سے جو ملے ہو گیا ہے، وہ بہر صورت کیٹش کی صورت میں تمہیں ضرور ملے گا۔“  
”مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے شعیب۔“ میں نے پوری سچائی کے ساتھ کہا ”انٹ اللہ کوئی گزرب نہیں ہوگی۔ بااثر ضرور کوئی

میں نے ایک طویل سانس خارج کی پھر شعیب خوری کے سوال کے جواب میں آج شام سے لے کر تھوڑی دیر پہلے تک پیش آنے والے واقعات کی تفصیل اسے سنا دی۔ میری بات کے اختتام پر دو چلا اٹھا۔

”مریو..... یو آر گرےٹ۔ ودان! تمہارے اس کارنامے نے میرے کنبے میں خشک اتار دی ہے..... دہری ناگس..... خس کم، جہاں باگ!“

پھر میں نے شعیب کو پولیس والوں کے اس ”کارنامے“ سے بھی آگاہ کیا جس میں تو نہ مارا کا انسپکٹر، اپنے اے ایس آئی کو اعتماد میں لے کر، ان واقعات کو پولیس مقابلہ کارنگ دے کر اپنے کریڈٹ پر درج کروانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد شعیب نے کہا۔

یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا۔ آج شعیب بڑے غلط اعداء میں بات کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہتا چاہا تھا، میں بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا جسے سمجھنے کے لیے بہت زیادہ عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا: ”شعیب! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

دو چہرے کئے ہوئے لہجے میں بولا "وہ رات! اس وقت رات کا ایک منٹ نہ رہا ہے۔ کل صبح چھبیس بہت جلدی اٹھنا ہو گا اس لیے اب کچھ نیند بھی لے لو۔ پچھلے چند کھٹوں میں تم نے بہت دیر باری کی ہے۔ تم آرام کی ضرورت محسوس کر رہے ہو گے!"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا "میں فریض ہونے

”ہاں، کبیر شاہ نے اس سلسلے میں بہت مستعدی دکھائی ہے۔“

”اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو؟“ وہ دوستانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

”تم اسنے بھجھو اور ہو کہ ایک چھوٹی سی بات کی طرف توجہ دلاتا میں اچھا نہیں لگتا لیکن بھر بھی یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی اس لیے ضرور کہوں گا۔“ اس نے اتنا کہہ کر ذرا ٹوٹ کر کیا پھر بولا ”ایئر پورٹ پر تمہاری اور تمہارے سامان کی چیکنگ ہوگی۔ تم اس بھجھار کو اسنے ساتھ نہ لے جاؤ تو اچھا ہے۔ عام استعمال کی چھری چاقو کی بات دوسری ہے مگر یہ غلام تو ابھی شعل ہی سے انتہائی خطرناک اور سفاک نظر آتا ہے۔ تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟“

میں نے کہا ”میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ اس منہجر کے سلسلے میں تمہاری ہدایت کو یاد رکھوں گا۔“

”وش کو گنہ گار ایجنڈہ اللہ حافظ!“ شعیب نے الوداعی انداز میں کہا۔

میں نے "خدا حافظ" کہہ کر ریسورٹ کو دکھایا۔  
 اسی لمفون کی کھنٹی پرے مطراق سے دو بارونہ اٹھی۔  
 اس کا مطلب یہی تھا، کوئی پہلے سے میرے خبر کوڑائی کر رہا تھا  
 اور جیسے ہی میں نے ریسورٹ دکھا، اس کی بین آئی۔  
 تیسری کھنٹی پر میں نے ریسورٹ اٹھا کر باؤتھ نہیں میں  
 "ہیلو" کہا۔

”یارو جہان! اتم خیریت سے تو ہوتا؟“ منہاس باقر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مگر آپ کی آواز سے ٹھہراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ خدا خواستہ کوئی اور گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟“

دو قدرے سنبھل کر بولا ”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں شام سے لے کر اب تک میں کچھیں مرتبہ تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ تم سے رابطے کے لیے میرے پاس ابھی ایک فون بصر ہے۔ پہلے تو تیل جا رہی تھی، کسی نے فون ایڈز نہیں کیا اور اب کافی دیر سے تمہارا فون انچل مل رہا تھا۔ کیا تم گھر میں نہیں تھے؟“

میں نے مملکت کے قحطی کو نبھاتے ہوئے ہلکا سا  
 جھوٹ بولا "منہاس صاحب! میں آج شام بچہ دیکھنے نکل گیا  
 تھا۔ ابھی توڑی در پہلے واپس آیا ہوں۔ قحطی میں قدم رکھنے  
 ہی ایک دوست کا فون آ گیا جس سے فارغ ہوا تو آپ کا  
 فون لگ گیا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا  
 "آپ کس قسم کی گڑبگ کا ذکر کر رہے ہیں؟ آپ کی بیٹی شاید تو  
 خیریت سے ہے؟ اب تو اس کی شادی میں صرف ایک ہفتہ  
 باقی رہ گیا ہے!"

”جہانہ اور مگر کے دیگر افراد حیرت میں ہیں۔ وہ جلدی سے بولا پھر اصل موضوع کی جانب مڑتے ہوئے اس نے کہا ”وہ دھان! میں نے چند روز قبل تم سے ایک جرائم پیشہ گروہ کا تذکرہ کیا تھا جو یہودی لابی کے زیر اثر اس شہر میں سرگرم عمل ہے۔ وہ لوگ دہشت گردی اور بد امنی کے واقعات میں اس طرح ملوث ہیں کہ کسی کو ان پر شک نہیں ہو سکتا۔ حقای افراد پر مقتول کی گروہ بظاہر بہت سے ساجی اور غلامی کام کرتا ہے۔ عوام ان کے چروں کے پیچھے پھیندہ یہودی عزائم کو نہیں بڑھ پا رہے ہیں اس لیے وہ کامیابی سے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔“

”ہاں، آپ نے ایسے کسی کردہ کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ آپ ان لوگوں کے خلاف کسی خفیہ حکمتی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں جس میں کسی سر ملے پر آپ کو بھری مدد کی بھی ضرورت ہوگی۔“

”دو مرحلہ آگیا ہے دھند ان“ وہ پر جوش انداز میں بولا

”میں اس وقت بڑی شدت سے تمہاری ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“

”اس وقت؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔  
 ”میں جانتا ہوں، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔“  
 اب یہ نہیں میں منہاس باقر کی آواز ابھری۔ ”یہ کسی شریف آدمی  
 کے آرام اور نیند کا وقت ہے لیکن میں تمہیں ضرور زحمت دوں  
 گا۔۔۔۔۔ اس زحمت کے لیے پیشگی معذرت قبول کرلو۔“  
 میں نے جلدی سے کہا ”منہاس صاحب! اس قسم کی  
 باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے بزرگوار اے



ہیں۔ حکم کریں، میں آپ کے کون سے کام آسکتا ہوں۔  
دیئے آپ کی اضطراری حالت کو دیکھ کر لگتا ہے، آپ نے اس  
یہودیت نواز جرم پیشہ گروہ کے بارے میں کوئی نہایت ہی اہم  
راہنما پایا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

”یو آر ایسویو ٹیلی کرکٹ!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا  
”میں نے اس غیبت گردہ کے دو افراد کو گزیر لیا ہے۔ اس  
سلسلے میں میرے اخبار کے کرائم رپورٹر نے بہت تعاون کیا  
ہے۔ شہر داخلے صرف کرائم رپورٹر ہی نہیں بلکہ میرے اعتماد کا  
آدی ہے۔ تم اسے میرے ان تعلق داروں میں شمار کر سکتے ہو  
جو بیک وقت دوست بھی ہوتے ہیں اور ملازم بھی۔ ان کی  
ملازمت، معاونت سے کہیں آگے کی چیز ہوتی ہے۔“

میں ریسپورٹ کان سے لگائے خاموشی سے منہاس باقر کی  
بات سن رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا  
”وہ جان! اگرچہ شہر داخلے لڑائی جھڑائی کے کاموں کا ماہر ہے۔  
کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے وہ کافی چابک دست اور کچھ  
یوجہ کا مالک بھی ہے مگر اس معاملے پر میں چاہتا ہوں کہ تم اس  
کے ساتھ رہو۔۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تمہارے اثر و کام کرے۔ میں  
تمہاری معاملہ فہمی اور دوری اندیشی کا قائل ہو چکا ہوں۔ تم  
نے جس بہادری، سمجھ داری اور جرأت مندی سے میرے  
دوست سلطان کی اگلوٹی بنی ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نہ  
صرف چھڑایا تھا بلکہ اس کے اغوا کے ذمے داروں کو عبرت  
ناک انجام سے دو چار کیا تھا، یہ تصدیق میں نے ممتاز اور قاضی  
سلطان کی زبانی سنا تھا مگر تم نے جس حکمت عملی سے کام لے کر  
دوسری مرتبہ ممتاز کو بچایا ہے وہ سب تو میرے سامنے کے  
واقعات ہیں۔ مجھے تم جیسے کسی جوان ہی کی ضرورت تھی۔ مجھے  
یقین ہے، اب میرا مشن باغیجیل کو ضرور پہنچے گا۔“

منہاس باقر بہت ہی جوش و جذبے کے ساتھ لہجہ میں بول  
رہا تھا۔ اسے سن کر مجھے حیرت ہوئے گی۔ میں نے اب تک  
اسے انتہائی کم گو اور غیر جذباتی پایا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا  
جس کے ساتھ کسی بھی موضوع پر طویل گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ  
دو اور دو چار کی طرح نو دی پوائنٹ بات کر کے معاملہ نشاندہ  
تھا۔ ایسے شخص کا روانی کے ساتھ نان اسٹاپ بولنا خلاف  
معمول تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی تھی کہ  
موجودہ معاملے سے اس کی گہری جذباتی دلچسپی تھی۔ میں نے  
منہاس کو ایک سچا اور محبت و وطن پاکستانی پایا تھا جو ملک دشمن  
عنصر سے شدید نفرت کرتا تھا۔

جذباتی وابستگی سخت سے سخت انسان کو بھی اس کے خول  
سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شاید، منہاس باقر کے

ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ تھا۔

میں نے اس کی پوری بات توجہ سے سننے کے بعد کہا  
”منہاس صاحب! اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیا تعاون  
چاہتے ہیں؟“

وہ بولا ”میں نے جن دو افراد کا ذکر کیا ہے وہ گلستان  
جوہر کے ایک فلیٹ میں مقیم ہیں۔ یہ اپارٹمنٹس بلڈنگ گلستان  
جوہر کے آخری سرے پر واقع ہے جس کے زیادہ تر فلیٹس  
ابھی غیر آباد ہیں۔ میں چاہتا ہوں، تم شہر داخلے کے ساتھ وہاں  
پہنچو اور ان لوگوں سے اس گروہ کے بارے میں مزید  
”انگوائے“ کی کوشش کرو۔ زبان کھلوانے کے سلسلے میں تم  
پولیس والوں سے چار ہاتھ آگے ہو۔ میں جلد از جلد اپنے شہر  
سے یہودی لابی کے قدم اکھاڑنا چاہتا ہوں۔“ ایک لمحے کے  
توقف سے اس نے بتایا ”ان دو افراد کے نام جہانگیر اور نواد  
معلوم ہوئے ہیں۔“

میں نے پوچھا ”کیا یہ آپ یقین آج ہی رات ہونا  
ضروری ہے؟“

”بے ضرورتی!“ وہ دونوں لہجے میں بولا۔  
”ہوں!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ جلدی سے بولا ”ان جرائم پیشہ لوگوں کے حراج اور  
پردگام کا کچھ پھر دسنا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ پہلے اپنے ٹھکانے  
بدلتے رہتے ہیں۔ آج جہانگیر اور نواد گلستان جوہر کے اس  
فلیٹ میں ہیں، لیکن ہر لمحے کل کسی ایمر جنسی میں وہ کہیں اور شفٹ  
ہو جائیں۔ میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اگر یہ سراغ  
ہاتھ سے نکل گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں منہاس  
صاحب!“ میں نے تذبذب انداز میں کہا تو وہ میرے لہجے  
میں چھپی الجھن کو فوراً محسوس کرتے ہوئے بولے۔  
”تم کس سوچ میں ڈوب گئے وجدان؟“

”آں!۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔“  
”کوئی پرابلم ہے اس وقت آئے میں؟“  
”ہاں میں کوئی دشواری نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا  
پھر پوچھا ”مجھے کہاں پہنچنا ہوگا اور کتنے بجے تک پہنچنا ہوگا میں  
چاہتا ہوں، ایک دو گھنٹے میں سب منٹ جائے۔“

وہ جہاں دیدہ آدی تھے۔ میرے لہجے میں شامل گریز نما  
تذبذب نے اسے بتا دیا کہ میں اس وقت کسی نہایت ہی  
پیچیدہ معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔ وہ نہایت ہی شگفتہ انداز  
اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے کل کر بات کرو وجدان! میں نے محسوس کیا

ہے، تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو!“

میں نے خود کو یقین آمدہ صورت حالات کی وضاحت  
کرتے ہوئے کہا ”منہاس صاحب! تازہ ترین معلومات  
کے مطابق میری سماجی ساحل کو آج صبح کراچی سے لاہور  
روانہ کر دیا گیا ہے جہاں سے وہ میرے دیرینہ دشمن ملک  
نواز علی کی حویلی میں پہنچا دی جائے گی۔ میں کل صبح آٹھ  
بجے کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہوں۔ یہ پروگرام فل اینڈ  
فائل ہے۔“

”اوہ!“ منہاس باقر گہری سانس لے کر رہ گیا۔  
”آپ باؤس نہ ہوں منہاس صاحب۔“ میں نے جلدی  
سے کہا ”آپ کا مشن ادھر اور انہیں رہے گا۔ مجھے امید ہے، ہم  
”گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے۔“

اب اس کے انداز میں مجھے تذبذب محسوس ہوا۔ میرے  
حالات جاننے کے بعد وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں  
نے اس کی الجھن کو تسکین میں بدلتے ہوئے کہا۔

”آپ گلزنہ کریں منہاس صاحب! میں نے آج دن  
میں تین چار گھنٹے کی نیند لے لی تھی۔ اس وقت میں بالکل  
زبیش اور چاق و چوبند ہوں۔ آپ بتائیں، میں کہاں  
پہنچوں؟“

مختصر سے تامل کے بعد اس نے کہا ”تم میرے اخبار  
کے دفتر ہی آ جاؤ۔ میں اس وقت دفتر میں موجود ہوں۔ تمہیں  
اس گروہ کے حوالے سے کچھ بریف بھی کرنا ہے۔“  
”ٹھیک ہے، میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے  
فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔  
میرے فلیٹ سے منہاس باقر کے دفتر کا فاصلہ صرف تین  
منٹ کا تھا۔ نصب شب کے بعد روڈ خالی تھیں اور میں بہ  
آسانی تین منٹ میں وہاں پہنچ جاتا۔ ایک گھنٹے کا وقت میں  
نے اس لیے لیا تھا کہ میں موٹر افریش ہونا چاہتا تھا۔ گزشتہ چار  
گھنٹے میں نے افراتفری اور مارا مارپیٹ میں گزارے تھے۔ میں  
ایک بھر پور شادری کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں  
بیک سے کپڑے نکال کر دوشاں روم میں گھس گیا۔

دورانِ غسل میں مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ اسی وقت  
مجھے یاد آیا کہ میں نے آج دوپہر کے بعد سے ابھی تک  
باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام میں، صدر کے علاقے میں،  
میں نے لائٹ ریفر-شمنت ضرور لیا تھا مگر اسے کھانے میں شمار  
نہیں کیا جا سکتا پھر کل روڈ کے پچھلے چرچن حالات سے  
نبرد آزما رہا، انہوں نے میری بھوک کو چکا دیا تھا۔ میں نے

سوچا، منہاس باقر کی طرف جاتے ہوئے، راستے میں بوٹ  
ٹین سے کچھ کھا لوں گا۔ اس علاقے میں رات گئے  
ریسٹورنٹ کھلے رہتے تھے۔ وہ علاقہ ایک طرح سے نوڈ  
مارکیٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں نہادھو کر تیار ہوا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا پھر اس  
سے پہلے کہ میں فلیٹ سے باہر نکلتا، کھنکھائی اٹھی۔ مجھے حیرت  
ہوئی کہ اس وقت دروازے پر کون ہو سکتا ہے۔ اس علاقے  
میں تو ویسے بھی پرانی دیسی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اور پھر  
آدھی رات کے بعد تیل کا بجنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈور تیل ایک طرح کا سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں  
شرقا دروازے کھولتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی دروازہ کھولنے  
فی والا تھا لہذا یہ جواب اور بھی آسان ہو گیا۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے آٹھ سو دو والی پڑوسن  
کھڑی تھی۔ میں اسے اس وقت وہاں دیکھ کر چوکا۔ اس نے  
ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں دو تین برتن ڈھکے  
ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی پڑوسن اٹھلا کر دیکھا۔ وہ  
جلدی سے بولی ”آج کل آپ کی سبز دکھائی نہیں دے  
رہی!“

اس کا اشارہ ساحل کی جانب تھا۔ ہم اس فلیٹ میں دنیا  
والوں کی نظروں میں، میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے  
تھے۔ اس رشتے کی آڑ میں سماجی زندگی بڑی سہل اور پرسکون  
ہو جاتی ہے۔ درنہ جس کی بھی نگاہ اٹھتی ہے، شک سے لبریز  
ہوتی ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کی طرف دیکھتے  
ہوئے کہا ”دو چند روز سے اپنے میکے، لاہور گئی ہوئی ہے۔  
میں کل صبح اسے لینے جا رہا ہوں۔“

”دراصل آج میں نے اپنے گھر میں میلا کر دیا تھا۔“  
اٹھانے مجھے بھرپور نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا ”اچھا ہوا، میں  
اسی وقت لے کر آگئی۔“ اس نے ٹرے میری جانب  
بڑھاتے ہوئے کہا ”ورنہ صبح تو آپ پھر غائب ہو جاتے۔ یہ  
آپ کے حصے کا کھانا ہے۔“

میں جس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے ہر فلور  
پر صرف دو فلیٹ آئے سامنے بنے ہوئے تھے۔ میں آٹھ سو  
ایک میں تھا اور اٹھلا آٹھ سو دو میں۔ اس کے شوہر کا نام طفیل تھا  
جو کسی بینک میں معزز عہدے پر فائز تھا۔ فیصل اور اسد نامی دو  
بچوں کے ساتھ وہ ایک خوش باش اور مطمئن فیملی کا نقشہ پیش  
کرتے تھے۔ اٹھانے سے ایک دو مرتبہ لفٹ میں آتے جاتے

میری "ہیلو ہائے" ہوئی تھی اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی تعریف میں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ وہ ایک مہر پرور عورت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور پوچھا "کیا طفیل صاحب اس وقت گھر میں نہیں ہیں؟"

یہ سوال میں نے اس غرض سے پوچھا تھا کہ اتنی رات کو اسے خود کھانا دینے آیا نہ تھا۔

وہ بولی "طفیل سرگودھا گئے ہوئے ہیں اور دونوں بچے سو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کی فلیٹ میں لائٹ دیکھی تو اس لیے خود ہی چل آئی۔ آج کا کھانا کل دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔"

"آپ کو برتن اچھی واپس کر دوں یا....."

"برتن بعد میں آ جائیں گے۔" وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

میں نے زہر لب مسکراتے ہوئے اس کا شکر یہ ادا کیا اور کھانے کی ٹرے لے کر اندر آ گیا۔

اس وقت مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ یہ کھانا بروقت پہنچا تھا۔ میں نے ٹرے میں موجود مختلف برتنوں کے ڈھکن اٹھا کر دیکھے۔ ایک ڈش میں گر باگرم چکن بریانی تھی جس سے دھبی دھبی مہاں بھی اٹھ رہی تھی۔ لگتا تھا، اچھی اچھی دیک کے اندر سے نکالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دو مہاں تھان، تان تھے اور دیگر لوازمات کے ساتھ سوٹ ڈش بھی تھی جس کے عناصر ترکیبی میں خربانی کو اولیت اور مرکزیت حاصل تھی۔ یہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتا۔ میں جس مشن پر روانہ ہو رہا تھا اس کا تقاضا تھا کہ ہلکا پھلکا کھاؤں چنانچہ سوٹ منٹ میں، میں نے آٹھ ٹکڑے کمر دیکھا اور فلیٹ سے باہر آ گیا۔

جب میں منہاس باقر کے دفتر پہنچا تو رات کے ٹھیک دو بج رہے تھے۔

منہاس نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔ رکی علیک سلک کے بعد میں نے اس سے پوچھا "آپ تو علی الصباح دفتر آیا کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے؟"

"مجھے ایک ایمر جنسی میں آدمی رات کو دفتر آنا پڑا ہے۔" اس نے اضطرابی لہجے میں بتایا "یہاں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی تم سے فون پر رابطہ ہو پایا تھا، خبر۔" وہ جلدی سے موضوع بدلنے ہوئے بولا "تم سناؤ، کیا حال چال ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا پھر پوچھا "آپ کس ایمر جنسی کا ذکر کر رہے ہیں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "ابھی دو گھنٹے پہلے پولیس نے ڈینٹس میں ایک کامیاب آپریشن کیا ہے۔ مجھے باخبر ذرائع سے جیسے ہی اس آپریشن کی اطلاع ملی، میں دفتر چلا آیا۔ میرے اخبار کی ایک باجریزم جانے دوہہ پرکھی جلی ہے۔ صبح تک سسٹی خیر خبروں کی توقع ہے۔"

پولیس آپریشن کے ذکر پر میرا ہاتھ خشکا۔ آج رات ساڑھے دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک میں ملک رؤف کے بنگلے پر بہت "معروف" رہا تھا۔ ازاں بعد وہاں پولیس کی "معروفیت" شروع ہو گئی تھی۔ منہاس باقر نے پولیس آپریشن کا تذکرہ کیا تو لا محالہ میرا ذہن اس طرف چلا گیا۔

"پولیس نے کس قسم کا آپریشن کیا ہے منہاس صاحب؟" میں نے استفسار کیا۔

تھوڑے تامل کے بعد اس نے بتایا "ڈینٹس کے ایک بہ نسبت کم آبادیہ میں ملک رؤف نامی نشیات کا ایک اسٹور ہوتا تھا۔ پولیس نے اس کے بنگلے پر کامیاب چھاپا مارا ہے۔ وہاں پولیس کو شدید لومیت کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مارا ماری میں ملک رؤف کے علاوہ دو مزید افراد کی ہلاکت واقع ہوئی ہے۔ دو ملازم شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ہلاک ہونے والے تین افراد میں ملک رؤف، اس کا سب باڈی گارڈ اسلم اور ایک معروف سماجی و سیاسی شخصیت میاں زاہد حسین بھی شامل ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ میاں زاہد ایک اسٹور کے بنگلے میں کیا کر رہا تھا؟ پولیس نے ہماری جمیٹ کے ساتھ کارروائی کر کے نہ صرف اسٹور کو چل ڈالا بلکہ اس بنگلے سے نشیات کی ہماری مقدار برآمد کر لی ہے۔" وہ ایک لمحے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ آپریشن انسپکٹر قادر بخش کی نگرانی میں ہوا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک اخبار کا پیشرو اینڈ ایڈیٹر بالکل اسی انداز میں سوچ رہا تھا جیسا پولیس چاہتی تھی۔ گویا سوئی تو نود والا انسپکٹر قادر بخش اپنی "انکیم" میں کام لیا رہا تھا۔ اس پورے آپریشن کا سب سے اہم کردار میں تھا۔ اس واقعے کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا، مگر میں منہاس باقر کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا..... کچھ بھی نہیں!

"دے دے ایک بات ملے ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میاں زاہد حسین کسی چکر میں وہاں پھنس گیا ہو گا اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ پولیس مقابلے میں نہیں مارا گیا بلکہ

پولیس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ اس کی گردن کی لاش ایک برآمدے میں پڑی لی ہے جب کہ پولیس نے اس آپریشن میں گن فائرنگ سے کام لیا ہے۔ بہر حال، صبح تک صورت حال واضح ہو جائے گی۔"

میاں زاہد حسین اس شہر کے معزز افراد میں شمار ہوتا تھا۔ عوام کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ ایک فعال سٹڈیٹ کا پاس تھا بلکہ خواص کی اکثریت بھی اس راز سے بے خبر تھی جن میں منہاس باقر بھی شامل تھا۔ میں نے آج تک میاں زاہد کے حوالے سے اپنے معاملات کے بارے میں منہاس باقر کو کبھی کچھ نہیں بتایا تھا..... اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر منہاس باقر نے کہا "کس سوچ میں ڈوب گئے ہو دھدان؟"

"کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔" میں نے چونکنے کی اداکاری کی "بس ذرا سائل کی طرف دھیان چلا گیا تھا۔"

وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا پھر مجھے جہانگیر اور فواد کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے اب تک یہودی تنظیم کے آلہ کار کردہ کے بارے میں جو تحقیق کی تھی اس سے مجھے آگاہ کیا، چند ہدایات دیں اور پھر لہجے میں کہا۔

"یہ راز ہمارے درمیان رہنا چاہیے دھدان۔"

"یعنی میرے اور آپ کے درمیان؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "اور وہ آپ کا کرائم پرور شہزادہ اعلیٰ؟"

"وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔" منہاس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"گویا یہ راز ہم تینوں کے بیچ ہوتا؟"

"ہاں، بالکل۔" وہ سرگوشیانی جنبش دیتے ہوئے بولا "اور اگر کسی مرحلے پر ہمیں پولیس کی مدد کی ضرورت پیش آئی تو اس کا بندوبست بھی موجود ہے۔ ایک دو با اختیار پولیس آفیسر میرے گہرے دوستوں میں ہیں۔ میں انہیں اعتماد میں لے کر بڑے سے بڑا کام نکلوا سکتا ہوں۔" وہ چند لحظات کا توقف کرنے کے بعد گویا ہوا "دے دے تمہاری موجودگی میں مجھے یقین ہے، کسی اور سے کسی قسم کی مدد نہیں لینا پڑے گی۔ تم اکیلے ہی تمام معاملات سے نمٹ لو گے۔"

"یہ تو آپ کی محبت ہے جو مجھ پر اتنا اعتبار کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "تم کسی حد تک ٹھیک کہتے ہو۔ اس اعتماد میں ایک

حد تک میری محبت اور شفقت بھی شامل ہے مگر غالب عنصر تمہاری کارکردگی ہے۔ اب تک کے تمہارے تمام کارنامے میرے سامنے ہیں۔"

میں نے موضوع کا زادے بدلنے ہوئے کہا "وہ آپ کا کرائم پرور شہزادہ نظر نہیں آ رہا؟"

"وہ اس وقت دفتر ہی میں ہے۔" منہاس باقر نے بتایا "میں ابھی اسے اپنے کمرے میں بلا کر تم سے حصار کر داتا ہوں۔" پھر ذرا توقف کے بعد اس نے کہا "میں نے اپنے اخبار کے لیے ایک فیل ٹائم الگ کرائم پرور بھی رکھا ہوا ہے جو اس وقت اخباری ٹیم کے ساتھ ڈینٹس گیا ہوا ہے۔ شہزاد اعلیٰ کو میں خاص الخاص معاملات میں استعمال کرتا ہوں۔ اخبار کے حوالے سے اس پر کوئی لود نہیں ہے۔"

پھر وہ مختصر الفاظ میں شہزاد کے بارے میں بتانے لگا جس کے مطابق دس سال پہلے وہ جہلم سے کراچی آیا تھا۔ اس نے انٹرنس تک تعلیم کر رکھی تھی۔ ہنر کے نام پر اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ ابتدا میں اسی ہنر کو ذریعہ معاش بنایا۔ منہاس نے دیکھا کہ بندہ بڑھا لکھا اور چابک دست ہے تو اس نے شہزاد کو رپورٹنگ سائیڈ میں آزمایا اس شے میں وہ خاصا نمایاں رہا اور آدھے چل کر اخبار کے لیے کرائم پرور کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتا رہا۔ آج کل وہ مکمل طور پر منہاس باقر کے اشاروں پر چلتا تھا۔ منہاس باقر اسے پھندے والے معاملات میں استعمال کرتا تھا کیوں کہ شہزاد دنگا فساد میں مہارت رکھتا تھا۔

آئندہ چند لحظات میں، میں شہزاد اعلیٰ سے ہالٹاؤ حصار ہو چکا تھا۔ وہ ایک دروازہ قاصت اور دبلا چٹا شخص تھا۔ اس کا فٹ کچھ فٹ کے قریب اور عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ اس سے مصافحہ کرنے میں مجھے بہت مزہ آیا۔ اس کی پھیلی خاصی کشادہ، انگلیاں آہنی سلاخوں کی مانند اور گرفت مضبوط تھی۔ اس نے جس گرم جوش سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا، اس سے میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ وہ یاروں کا یار اور لڑنے مرنے کو تیار رہنے والا بندہ ہے۔ ایسے افراد اپنے مقصد اور دوستوں کے لیے جان کی بازی لگانے میں کسی سوچ بچار سے کام نہیں لیتے۔

یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ شہزاد اعلیٰ سے مل کر میں نے دلی مسرت محسوس کی تھی۔ ٹھیک ڈھائی بجے ہم منہاس باقر کے دفتر کی ہائی روٹ میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

گلستانِ جوہر کا یہ حصہ اس وقت رات کی تاریکی میں ڈوبا

ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ہمیں اپنے مطلوبہ فلیٹ تک آنے کے لیے خاصا لمبا سفر کرنا پڑا۔ دن کے وقت یہ فاصلہ پونے گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہو سکتا تھا مگر رات کے آخری پہر سڑکیں سناں پڑی تھیں پھر شہزاد نے ابھی خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی کیا چنانچہ ہم صرف بیس منٹ میں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلاشبہ، شہزاد ایک مشاق ڈرائیور ثابت ہوا تھا۔

شہزاد نے جس ایبار ٹینس بلڈنگ کے بجھواڑے گرین ہائی روف کھڑی کی وہ گلستان جوہر کے بالکل آخری سرے پر واقع تھی۔ اس بلڈنگ کے بہت کم فلیٹس ابھی آباد ہوئے تھے۔ یہ بلڈنگ چار بلاکس اے، بی، سی اور ڈی پر مشتمل تھی۔ ہر بلاک کے چار فلور تھے۔ یعنی کل پانچ منزلیں۔ فلیٹس سسٹم میں پہلی منزل کو ”گروائڈ“ کا نام دے کر کھیتی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی پانچ منزلہ عمارت، فور فلور بلڈنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

میرے مطلوبہ دونوں افراد بلاک ڈی کے فلیٹ نمبر تین سو آٹھ میں تھے۔ وہ ایک کارنر فلیٹ تھا۔ جو تیسرے فلور پر واقع تھا۔ اس بلڈنگ کے فور فلور پر آٹھ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا بڑا رہائشی پرڈیجکٹ ہوگا! ویسے گلستان جوہر کے اکثر پرڈیجکٹس یو پیٹل اور ہیٹ ٹاک ہیں۔ اس رہائشی منصوبے کی عمارتوں کو منڈی کہا جا سکتا ہے۔ ہم گاڑی سے باہر آئے اور حفاظت قدموں سے چلتے ہوئے بلڈنگ کی باؤنڈری وال تک پہنچ گئے۔ میرے پاس اپنا ٹھکس اور آرموڈ ہینجر تھا جب کہ دوران سفر میں شہزاد اگلی مجھے بتا چکا تھا، وہ اپنے ساتھ ایک بسٹل لایا تھا۔ ہم نے چونکہ ارکی نظر بچا کر باؤنڈری وال کر اس کی اور عمارت کے اندر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہمیں اپنے ٹارگٹ فلیٹ تک رسائی حاصل کرنے میں صرف تین منٹ لگے تھے۔

کارنر فلیٹ ہونے کے باعث داخلے کے لیے دو دروازے مل گئے تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں اور دوسرا لابی میں نکلتا تھا۔ میں تو شواہت کر زینے کے پاس کھڑا ہو گیا اور شہزاد اگلی کو میں نے اشارہ کیا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ میں نے اطلاق کھنی بجانے سے اسے خاص طور پر منع کر دیا تھا۔

اس نے ہولے سے دستک دی۔ اندر نجی آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ دستک کے بعد ٹی وی کی آواز معدوم ہو گئی۔ اس کا بھی مطلب تھا، دستک کو اندر والوں نے سن لیا تھا۔ ویسے ٹی وی کی آواز ہمیں بتا چکی تھی کہ وہ دونوں یا ان میں

سے کوئی ایک ضرور جاگ رہا تھا۔ ہم دروازہ کھٹکے کا انتظار کر رہے تھے کہ مجھے اپنے دائیں جانب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس طرف کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو چھٹی طور پر فلیٹ کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی تھی۔

میں نے بے اختیار اس کھڑکی کی سمت دیکھا اور یہ اندازہ لگانے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا کہ کھڑکی کے پیچھے موجود پردے میں حرکت ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس پردے کے پیچھے سے کسی نے چھپ کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں زینے کی محبت پر روشن نیوب لائٹ کی روشنی بڑی دافر مقدار میں پکھی رہی تھی، گویا مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ ویسے آج شام سے میں نے اپنے چلے میں بڑی تسلی بخش تبدیلی کر لی تھی۔

میں نے بروقت اپنی جگہ سے حرکت کی اور ڈرائنگ روم کے دروازے کو باہر سے کھڑی چڑھا دی۔ میرا یہ عمل بے آواز تھا۔ اس دوران میں میرے اشارے پر شہزاد اگلی دوبارہ دستک دے چکا تھا۔ یہ دستک پہلے کی بہ نسبت تیز اور زیادہ شدت لیے ہوئے تھی۔

تھوڑی دیر بعد، اندر سے کسی نے ہماری بھرم آواز میں پوچھا ”کون ہے؟“

”ہم اس بلڈنگ میں بنے آئے ہیں۔“ میں نے اپنی آواز میں پریشانی بھرتے ہوئے کہا ”سینڈ فلور پر۔“ فلیٹ نمبر دو سو چار میں۔

شہزاد اگلی کی معلومات کے مطابق دو سو چار میں چند روز پہلے ایک بمبلی آ کر آباد ہوئی تھی۔ منہاس باغ کے دفتر سے یہاں تک پہنچنے کے دوران میں، میں نے شہزاد سے ابھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں اور اب ان کو استعمال کر رہا تھا۔

اندر سے اسی ہماری آواز والے نے سوال کیا ”اس بلڈنگ میں بنے آئے ہو تو ہم کیا کریں؟“

”میرے بھائی!“ میں نے اپنے لہجے میں معنوی لچاوت شامل کرتے ہوئے کہا ”بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ پورے دنوں سے ہے۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا ہوگا۔ میرے پاس کنوینینس کا بندوبست نہیں اور رات کے آخری پہر کسی بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ آپ لوگوں کے پاس ایک سوئٹ گاڑی موجود ہے۔ اگر آپ معیت کے وقت میں میری تھوڑی مدد کر دیں تو اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میری بیوی کی حالت ایسی ہے کہ اگر اسے بروقت ہسپتال

دہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ”میں نے پہلے نہیں دیکھا نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے، پیچھ کوئی نئی نیلی آئی ہے۔“

میں اس سے پوچھ سکتا تھا، پہلے مجھے نہیں دیکھا تو اس وقت کیسے دیکھ لیا۔ اگر اس وقت نہیں دیکھا تو پھر تم یہ بات اتنے وقتوں کے کس طرح کہہ رہے ہو؟ میں جانتا تھا، اس شخص نے کھڑکی کے پردے میں درز پیدا کر کے مجھے زینے کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا اور یہ علیہ اس کے تئیں یقیناً ایسی تھی۔ میں اس سے سوال وجواب کر کے وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میری پہلی ترجیح دروازہ کھلوانا تھی۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ وہ شہزاد کی وہاں موجودگی کو محسوس نہیں کر سکا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا، دستک بھی میں نے ہی دی ہوگی۔

میں نے شہزاد اگلی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے، دروازے کے پیچھے موجود ٹھنڈے سے کہا ”بھائی! اتم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے مجھے پہلے اس بلڈنگ میں نہیں دیکھا ہوگا۔ میں آج رات ہی آیا ہوں۔ میرا کام کچھ اس نوعیت کا ہے کہ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا ہوں۔ شفق تک میرے چھوٹے بھائی نے کروائی تھی اور اسی کی زبانی مجھے بتا چلا کہ آپ کے پاس سوئٹ (SWIFT) گاڑی ہے۔“

میں نے دروازہ کھلوانے کے لیے بڑے مضبوط دلائل دیے تھے لیکن اندر موجود شخص بھی بہت چمکا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے کہا ”تم تھوڑا انتظار کرو۔ میں اپنے ساتھی سے مشورہ کرتا ہوں۔“

میرے اندازے کے مطابق اس فلیٹ میں جہاگیر اور فودانی دو افراد مقیم تھے جن کا تعلق ایک ایسی تنظیم سے تھا جو بیرونی لابی کے اشاروں پر کچھ بلی کے مانند چلتی تھی۔

میں صرف ایک منٹ انتظار کرنا پڑا۔ دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آواز سنائی دی، پھر میں نے دروازے کا ہینڈل کھوئے اندر اندر کی کھڑکی گرائے جانے کی آواز سنی۔ وہ بہت نازک لمحات تھے۔ گزشتہ ایک منٹ میں، اشاروں کی زبان میں، میں نے شہزاد کو آئندہ کی حرکات و سکنات کے بارے میں سمجھا دیا تھا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا کر مجھے مطمئن کر دیا تھا، گویا اس کے دماغ نے میرے سنکڑے پوری طرح ریسیور کیا تھا۔

میں فوری حملے کے لیے اسٹانس (STANCE) بنائے، سانس روکے کھڑا تھا۔ جیسے ہی اندر موجود شخص نے دروازے کے سنگل پینٹ کو چوکھٹ سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی، میں نے پوری قوت سے ڈبل ہینڈ چل کر دروازے کے

پینٹ پر رسید کر دیا۔ نتیجے میں دروازہ پوری طرح کھل گیا اور اس کے پیچھے موجود شخص دیوار اور پینٹ کے درمیان دب کر رہ گیا۔ نے اختیار اس کے طعن سے ایک کراہ بڑا دے ہوئی۔

میں نے فلیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میرے اس عمل سے پہلے ہی شہزاد بھی بڑا مار کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ میں نے چشم زدن میں دروازے کو اندر سے پلٹ کر دیا۔ اس دوران میں شہزاد نے اس شخص کو اپنے بسٹل کے نشانے پر رکھ لیا۔

”سنگ..... کون ہو..... تم کو؟“ اس شخص نے وحشت زدہ نظر سے شہزاد کے ہاتھ میں موجود بسٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے شہزاد سے کہا ”تم دوسرے کو دیکھو۔ اسے میں بتاتا ہوں، ہم لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس ارادے سے یہاں پہنچے ہیں۔“

شہزاد پستول بدست ایک کمرے میں گھس گیا۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ڈرا سہا ہوا وہ شخص اچانک شیر ہو گیا۔ وہ پگلا نہیں جانتا تھا، میں نہایت سیسے سے کتنا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہوں۔

اس نے بڑی سرعت سے میرے پیٹ میں مگر مارنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش جلدی طور پر کامیاب ہوئی۔ اس کا مینڈھلے کی طرح جھکا ہوا سر میرے پیٹ کی جلد سے ٹکرایا مگر میرے اندر دلی اعصاب پر کاری ضرب نہیں لگا سکا۔ میں نے اس عمل پر فوراً ریڈل ظاہر کرتے ہوئے اپنے پیٹ کو کمرے سے لگا لیا تھا۔ سانس کی مشقوں نے مجھے اس ٹن میں خاصی مہارت بخشی تھی۔

میں نے خود کو بجانے کے ساتھ ہی اس شخص پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کی پٹت میرے سامنے ایک میز کی صورت موجود تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اپنی دونوں کہنیاں اس کی کمر پر رسید کر دی۔ وہ ایک خوفناک آواز خارج کرتے ہوئے دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گر گیا، میں اچھل کر اس کے اوپر سے آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے فلیٹ کے کسی حصے سے یہ آواز میری سماعت سے گزرائی۔

”فواد! یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم نے تو بتایا تھا، کسی کی بیوی.....!“

بولنے والے کی زبان کو بریک لگ گئے۔ میں سمجھ گیا، اس کی آنکھوں نے اپنے سامنے ایک پستول بردار شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس دوران میں فودانی وہ شخص اٹھ کر دوبارہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو چکا تھا۔

ہماری معلومات کے مطابق اس فلیٹ میں فواد اور جہانگیر بای دو افراد ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھ سے بیٹے والے فواد نامی شخص کو مخاطب کرنے والا جہانگیر بھی ہو سکتا تھا۔ فواد نے جہانگیر کے ادھر سے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ پر حملہ کر دیا۔

اس نے بڑی تیز رفتاری سے رائٹ ہینچ میرے چہرے پر آزمائے کی کوشش کی۔ میں نے دائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کا مکا دیوچ کر بڑی سرعت سے ایک مروڑ دیا۔ رڈمفل میں اس کی کمر ٹوسٹ (TWIST) ہوئی اور چہرہ آگے کی جانب جھک گیا۔ میں نے اس کے خنجر کمر پر بائیں کھٹنے سے ٹھوکر لگائی۔ وہ منہ کے بل دیوار سے جا گر گیا۔ اس تصادم میں اس کے حلقے کے ایک کربناک آواز خارج کی۔

فواد کی طویل، دردناک چیخ کے دوران میں، میں نے شہزاد علی کو سنا۔ وہ غالباً جہانگیر کو ہتھول کے بل پر دھکا رہا تھا۔ اسی لمحے ایک نسوانی چیخ بھی اس دھمکی میں شامل ہو گئی۔ گویا ان دونوں کے علاوہ کوئی سر ملی چیخ خارج کرنے والی بھی موجود تھی۔ اس صورت حال کو سمجھنے میں مجھے ذہن کو زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

نسوانی چیخ کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لیے فواد کی جانب سے غافل کر دیا تھا۔ اس نے سنبھل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا حملہ بڑا دیسی قسم کا تھا۔ میں یہ اندازہ تو کر چکا تھا، فواد باقاعدہ مارشل آرٹس سے تابلد تھا۔ وہ مقامی انداز کا فائٹرز تھا۔ فواد نے مجھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش جلدی طور پر پوری ہوئی۔ میں اس کا پش (PUSH) لے کر تھوڑا سا لڑکھایا لیکن اسی لڑکھاہٹ کے دوران میں میری وکیل کلک (WHEEL KICK) چل گئی جو فواد کی پٹنی پر لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے قبل ایک زبردست سائیڈ کلک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

اس کے حلقے سے ”غوں“ کی آواز برآمد ہوئی اور وہ ہوا میں بیک فٹائی کرتے ہوئے عقبی دیوار سے جا گر گیا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کا جسم ”دھب“ سے فرش پر آگرا۔ اسی لمحے میں نے اندر کمرے میں دھینگا مشتکی کی سی آوازیں سنیں۔ ظاہر ہوتا تھا، جہانگیر، شہزاد سے بھڑ گیا تھا۔ میں نے فواد کے ساتھ لاؤنج میں معرکہ آرائی کی تھی جب کہ شہزاد فلیٹ کے ایک کمرے میں گھسا ہوا تھا۔

میں نے فواد کو جزیائی نگاہ سے دیکھا۔ وہ فوری طور پر اٹھنے کے قابل نظر نہیں آتا تھا۔ دیوار سے ٹکراؤ میں، شاید اس

کی کھوپڑی پر کوئی شدید نوعیت کی چوٹ آگئی تھی۔ وہ لاؤنج کے فرش سے بڑا دھیرے دھیرے گرا رہا تھا۔ میں اس پر ایک اپنی سی نظر ڈال کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اندرونیج کر ایک دلچسپ اور حیرت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ شہزاد اور جہانگیر آپس میں گھسا گھمٹے تھے۔ ایک ماہ جبین، بیڈیٹس کو ہنگامی انداز میں پیچھے بیڈ پر بیٹھی پکپکاتی تھی۔ اس کی چٹکی کسی خشک کدو کی سرہون منت نہیں تھی بلکہ اس کی آنکھوں میں بھی وحشت اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اچانک چیخیں آمده حالات سے بری طرح خوف زدہ ہو چکی ہے۔ وہ قہر قہر کانپتے ہوئے بڑی سبھی ہوئی نظروں سے دو انسانوں کو جاگوروں کے مانند کشم کشا ہوتے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ڈوری بھی جینے کی نشست سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل اس فلیٹ میں ”کیا کچھ“ ہو رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے شہزاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہزاد نے جہانگیر کو پیچھے کر رکھا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر زور آزمائی کر رہا تھا۔ شہزاد کچھ اس طرح جہانگیر پر چھایا ہوا تھا کہ جہانگیر کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہانگیر کے بدن پر اس وقت صرف ایک باجامد تھا اور اس نے شہزاد سے ہتھول والے ہاتھ کو بڑی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ شہزاد کی زور آزمائی کا سبب فوراً میری سمجھ میں آ گیا پھر اس سے قبل کہ میں شہزاد کی کوئی مدد کرتا، ایک فوری واقعہ پیش آ گیا۔

شہزاد کے پیچھے دبے ہوئے، شخص نے اپنے جسم کو ایک مخصوص انداز میں زوردار جھٹکا دیا۔ شہزاد اس کے اوپر سے اچھل کر دور جاگرا، ہٹل جہانگیر کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس نے بیک ہٹ (BACK PUSH) لگایا اور سر کو جھکاتے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ پڑی تو میں الجھل پڑا۔ میں نے بیک جھپٹنے میں اسے پہچان لیا۔ میری سانس گویا ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی۔ میں نے اپنے تن بدن میں ایک خوشگوار سستی کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ حالات کی اس کڑوٹ نے مجھے میرے شکار تک پہنچا دیا تھا۔

میری نگاہ اس وقت کوئی دہم کی سکتی تھی اور نہ ہی کوئی دھکا کھا سکتی تھی۔ وہ جہانگیر نامی اس شخص کے لہو کی پیاسی تھی۔ سانولا رنگ، ہلکی موچیں، کرخت چہرہ، جسم مائل پر فریبی اور قد باج فٹ دس انچ..... اس بد بخت نے میرے سینے پیادوں کو کچھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا تھا۔ وہ میرے پیش، انداز علی اور دونوں کا قاتل تھا..... کمرے سے پچھلے برآمد ہونے والا ”بردار.....“ وہ گمرے پچھلے جس کا نمبر ”تھری، ون، فائی، ون“ تھا۔ اس کے شیشے سیاہ تھے اور اسی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں

سے سیاہ بخت جہانگیر نے گولیاں برس کر گورا قبرستان کے نزدیک میرے تین اہم ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا! یہ تمام خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ میرے من میں روشن خوفناک آگ کے انتقامی شعلوں میں اچانک بلا کی بھڑک پیدا ہو گئی۔ جہانگیر نے، میرے چہرے پر تیزی سے پھٹکتی ہوئی سفاکی اور درندگی کو بڑھ لیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے پہچاننے میں غولی غلطی نہیں کر رہا۔

جہانگیر نے شہزاد سے جھینا ہوا ہٹل مجھ پر تانتے ہوئے گنیر آواز میں کہا ”وہ جاننا ہوں، ایک دن تم سے سامنا ضرور ہوگا لیکن یہ معلوم نہیں تھا، ان حالات میں ہماری ملاقات ہوگی۔ مرنے سے پہلے کی دعائیں دہرا لو۔ اب تمہاری زندگی کے چند لمحات باقی بچے ہیں۔“

”تمہارے لیے بھی میرا یہی پیغام ہے۔“ میں نے ہٹل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ”تمہاری تلاش میں، میں نے ایک ایک لمحہ بڑی اذیت سے گزرا ہے۔“

”چلو خوش ہو جاؤ۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا ”اب تمہاری اذیت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔“

میں نے اپنی توجہ کو اس کے کندھوں پر مرکوز کر رکھا تھا۔ انسانی جسم کی حرکات و سکنات کو نوٹس کرنے کے دو اہم ٹریٹل کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بالائی جسم کی حرکات کو کندھوں سے پکڑا جاسکتا ہے اور زبردستی جسم کی حرکات کمر سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کمر اور کندھے انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے معاملے میں ”چٹل خور“ ثابت ہوتے ہیں۔

اس وقت سب سے اہم شے اعشاریہ تین آٹھ کیلبر کا وہ ہٹل تھا جو جہانگیر نے بڑے خطرناک انداز میں مجھ پر تان رکھا تھا۔ ہمارے درمیان میں جھل چارٹ کا قاصدرا ہوگا اس محدود فاصلے کو میری ایک سائیڈ کلک چشمِ ذہن میں پات سکتی تھی۔ میں اسی لمحے کی تلاش میں تھا جب مذکورہ کلک کا استعمال انتہائی محفوظ ہوتا!

میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا ”میرے ساتھیوں نے تمہارا کیا کیا بڑا کیا تھا۔ تم نے انہیں جان سے کیوں مارا؟“

”یہ سوال تم انہی سے پوچھنا۔“ وہ ہتھول والے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے بولا ”میں نہیں ان کے پاس پہنچانے والا ہوں۔“

”ہم سے تمہاری دشمنی کیا ہے؟ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔“ میں نے کہا ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے وہ جان

کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو!“

وہ متذبذب انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسی لمحے جہانگیر کی نگاہ میرے عقب میں اٹھی۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے (YELL) کرتے ہوئے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اگلے ہی لمحے میری رائٹ سائیڈ کلک اس کے پیٹ پر کسی دزدنی گولے کی مانند لگی۔ اس ضرب میں میرا بے پناہ غصہ بھی شامل تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ ریورس میگزین میں سفر کرتے ہوئے عقبی دیوار سے جا گر گیا۔ ہٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ کے اوپر جاگرا۔ بیڈیٹس میں سکڑی سسکی حسینہ نے وحشت زدہ نظروں سے ہٹل کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ ہٹل کی جانب بڑھ گیا۔

یہ ایک فطری عمل تھا۔ اس نے اپنی حفاظت کی خاطر ہٹل کو قاتلوں میں کرنے کی کوشش کی تھی اس کوشش کے نتیجے میں بیڈیٹس نے اس کی ستر پوشی سے انکار کر دیا۔ اس کا بے لباس بدن اچانک ہی بیڈیٹس کی اوٹ سے باہر آ گیا۔

اس حسینہ کے ساتھ..... نہ خدا ہی ملانہ وصال منم، جیسی صورت حال ہو کر رہ گئی تھی۔ ہٹل اس کے ہاتھ کی چیخ سے جیسے اچنے کے قاصدے پر رہ گیا۔ وہ ”ادھر“ اور ”ادھر“ کے درمیان سناکت ہو کر رہ گئی۔ اس کی غمات آمیز بے بسی کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن نہیں!

اس دوران میں شہزاد ایک کمر ہٹل تک پہنچ گیا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر جہانگیر کا جائزہ لینا چاہا تو عقب سے ایک ٹھوکر میری کمر پہنچ گئی۔ میں نے ہٹل کو اپنے عقب میں دیکھا، وہ فواد تھا جو سنبھل کر مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ جہانگیر نے چونک کر جھینا اسی کو دیکھا تھا اور مجھے اس پر وار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہ تمام حالات مشکل سے تین سیکنڈ میں رونما ہوئے تھے۔ انہی لمحات میں فواد نے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اپنے عقب میں موجود فواد پر بڑی سرعت سے ایک بھریور کرینٹ کلک (CRESCENT BACK) آزمائی۔ کرینٹ کلک ہلالی شکل میں ایک قوس بناتی ہوئی جاتی ہے۔ اس قوس کے راستے میں آنے والی ہر شے کو ایک عقیم نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فواد کے ٹھوڑے پر میرا دایاں پاؤں کسی تھوڑے سے مانند لگا اور وہ الٹ کر بیڈ پر جاگرا۔

بیڈ پر موجود ہٹا کا حسینہ کی حیرت ”پچکا چور“ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔

اپنی برہنگی کا احساس ہوتے ہی اس نے جلدی سے خود کو بیڈ شیٹ میں لپیٹ لیا۔

میں نے شہزاد کو فواد کی طرف بڑھتے دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے دیکھے بغیر اپنا اٹھ چلا دیا۔ میرا ہاتھ جھانگیر کے منہ پر پڑا۔ اس کے حلق سے خوفناک غراہٹ خارج ہوئی۔

میں اس کی جانب مڑا تو وہ اسٹائنس ہٹا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے انداز سے مارشل آرٹ جھلک رہا تھا۔ میرے سینے سے ایک مطمئن سانس خارج ہوئی۔ میں نے اسے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔

”اس رات تو تم نے خالی کلاشن کے زور پر مجھے زیر کرنے کا ڈراما رچا تھا۔ اگر تمہیں مارشل آرٹس میں مہارت حاصل ہے تو موقع سے فرار کیوں ہو گئے تھے؟“ ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے چوٹ کی ”تمہارا دوسرا بھگوتو ساسکی کہاں ہے؟“

وہ ہنسنے لگا اور اس نے میرے سوالات کا عملی جواب پیش کیا۔ اس کی تیز رفتار راؤنڈ ہاؤس کک (ROUNDHOUSE KICK) میرے کندھے پر لگی۔ اس کک نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا کیوں کہ میں بلا کک کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ میرے کندھے کو ہلکا سا جھکا لگا۔ میں نے جواباً اپنی ایک کک (SPIN KICK) اس کے منہ پر ماری۔

میرا وار خالی گیا۔ جھانگیر نے بروقت اپنے سر کو ایک جھک (JERK) دے کر چہرے کو بچا لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیک اسٹیپنگ کرتے ہوئے مجھ سے چند فٹ کی دوری پر چلا گیا۔ میں نے لپک کر اس کمرے کا دروازہ لاک کر دیا پھر میری نظر شہزاد کی جانب اٹھ گئی۔ وہ اپنے ہتھمقابل سے بڑا شاندار اسلوب کر رہا تھا۔ پہل کو اس نے اپنے لباس میں چھپا لیا تھا اور فواد کی سرمت کے لیے وہ صرف ہاتھ پاؤں کو زحمت دے رہا تھا۔ اس کی ضربیں بڑی نیچی تھیں۔

جھانگیر پلٹ کر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس نے لیفٹ فرنٹ کک کا جھانسا دے کر رائٹ فرنٹ کک میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کے جھانسنے پر ایک قدم پیچھے ہٹ چکا تھا۔ اس عمل کی تکمیل پر میں نے بڑی تیز رفتاری سے رائٹ بیک سوپ (RIGHT BACK SWEEP) ماری۔ میری ہڈی کی طوفانی ضرب اس کی ”جھانسا کک“ والی ٹانگ پر لگی۔ اسی لمحے جھانگیر کی ہائی فرنٹ کک بھی ناکامیاب ہو کر نیچے آئی تھی۔ وہ بری طرح

الٹھا اور منہ کے بل کمرے کے پختہ فرش پر آ رہا۔

جھانگیر کے حلق سے ایک ہر تکلیف آواز خارج ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہینڈ پش (HAND PUSH) لگا کر قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی خوشحالی سے مجھ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب اور غراہٹ آمیز تھیں۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے حملہ آور ہونے سے قبل ہی شروع ہو گیا۔

میں نے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک سائیڈ فلائنگ کک ماری۔ میرے پاؤں کا بلڈا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ یہ پاؤں چونک کر ایک فوجی بوٹ میں قیام پزیر تھا اس لیے یہ ضرب قیامت خیز ثابت ہوئی۔ وہ چہرے کو پلڑ کر زمین کی طرف جھٹکے لگا۔ میں نے اسی لمحے ایک لوئر بیک کک اس کے منہ پر جڑی۔ بیک کک کو (REAR KICK) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کک اپنے ٹارگٹ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے، خاص طور پر (LOWER) بیک کک!

جھانگیر کے جھٹکنے ہوئے سر کو ایک جھکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں اچھل کر اس کے قریب آیا اور رائٹ پریشر کک اس کے سینے پر رسید کرنا چاہی۔ وہ تیزی سے ردول ہو کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ اسی لمحے اس کے اوپر دھڑاں سے فواد کا جسم گرا۔ شہزاد نے فواد کو سر سے بلند کر کے دور اچھال دیا تھا۔

اس صحنے میں شہزاد بھرپور میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی فائٹ کا انداز بڑا منفرد تھا۔ اس نے مارشل آرٹس سے چندہ ٹیکنیکس لے لی تھیں۔ جو ڈو اور سیلف ڈیفنس کو لگا کر اس نے چند کمینشن تیار کر لیے تھے جو اسٹریٹ فائٹ اور روم فائٹ میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

جھانگیر اس افتاد سے جھجلا کر رہ گیا۔ میں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ وہ فواد کو اپنے اوپر سے نیچا کر کر کھڑا ہو گیا۔ جھجلاہٹ میں اس نے ایک لاٹ بھی فواد کو رسید کر دی جیسے وہ دانستہ اس پر اچھلا ہو۔ اس کے بعد وہ بڑے دھواں دھار انداز میں میری جانب بڑھا۔

اس نے سر کو کھماریے والے انداز میں جھکا کر اچانک دوڑ لگائی تھی۔ میں اس ارٹا بھینسنے کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس کا سر جیسے ہی میرے نزدیک پہنچا، میں نے دائیں کھٹنے کی ایک بھرپور ضرب اس کی کھوپڑی پر آزمائی۔ ”ٹھک“ کی آواز پیدا ہوئی اور وہ ایک مرتبہ پھر منہ کے بل زمین پر گرا۔

اس بار جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو ایک دھشت

ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ کھٹنے کی ضرب کے باعث شاید اس کی زبان دانتوں تلے دب کر ٹک گئی تھی۔ اس کا دہانہ لہو لہان ہو رہا تھا۔ اس نے جھجکارتے ہوئے، منہ میں جمع ہونے والے خون کو ایک جانب ٹھوک دیا۔ اس ٹھوک میں اس کا ایک دانت بھی موجود تھا۔

جھانگیر نے دھشت زدہ نظر سے اپنے تازہ بہ تازہ اکھڑے ہوئے دانت کو دیکھا، پھر اس مقام پر ہاتھ لگایا جہاں تھوڑی دیر پہلے دانت جما ہوا تھا، اس کے بعد وہ کسی خوشی درندے کی مانند میری جانب بڑھا۔

اس نے میرے نزدیک آ کر چہرے پر رائٹ شیخ مارنے کی کوشش کی۔ میں نے سائیڈ اسٹیپ لے کر اس کے بازو کو بلاک کیا۔ وہ اپنی ناکا مپانی پر جھجھکیا اور پاؤں کو کھٹا کر لیفٹ شیخ مارنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی ایک اضطرابی اور جھجھلاہٹ آمیز حرکت تھی جس کا نتیجہ اس کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ پاؤں کو کھٹانے کے بعد اس کی پشت میری طرف ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو کلائیوں کے مقابلے سے گرفت میں لے لیا اور اس کی ”تقریف“ پر ایک نیچی فرنٹ کک جڑی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے بازوؤں کو آزاد کر دیا۔ فرنٹ کک کے پیش نے اس کے اندر میل ٹرین کا انجن فٹ کیا اور وہ تیز رفتاری سے سامنے والی دیوار سے جا کھرا گیا۔ میں ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس شخص کی طرف سے میرا دل غم وغصے سے بھرا ہوا تھا۔ میں میری جیسے جیسے جاں نثار، امتیاز علی جیسے جاں بہادر اور روٹی جیسے جاں کھار ساتھیوں کی الناک موت کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔ ان تینوں کی بربادی کا سبب یہی شخص جھانگیر تھا۔ میں تو اس کو بچانے ہی وہ مقصد بھی فراموش کر بیٹھا تھا جس کی خاطر ہم یہاں گلستانِ جوہر کے دور دراز علاقے میں پہنچے تھے۔ اس شخص کی شکل دیکھتے ہی، میرے دماغ میں اپنے پیاروں کے چہرے روشن ہو گئے تھے۔ ان کی اجاگر صورتیں صرف ایک ہی لفظ کی تکرار کر رہی تھیں..... انتقام..... انتقام..... انتقام!

میں اپنے عزیز ساتھیوں کی اس پکار کو نظر انداز کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی موت کا انتقام تو مجھ پر ایک قرض کی صورت لدا ہوا تھا۔ ایک ایسا بوجھ، جس کو اتارے بغیر سانس لینا بھی محال ہو۔ یہ میں ہی جانتا تھا، اب تک میں نے کس دشواری سے اپنے شخص کو بحال کر رکھا تھا۔

جھانگیر کسی بہت ہی ڈھٹ مٹی سے بنا تھا۔ اس کی قوت

برداشت قابلِ ذکر تھی۔ وہ جس حد تک مجھ سے ہٹ چکا تھا، اس کے بعد تو اسے لبا لبت جانا چاہیے تھا لیکن وہ ایک مرتبہ پھر غم ٹھوک کر میرے سامنے استادہ تھا۔

میں نے شعلہ بار نظر سے اسے دیکھا تو وہ سلگ اٹھا پھر بڑے دھشاندہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ٹی شٹ (KNEE SHOT) کا ڈاج دیا اور پلک جھپکتے میں ایک فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔ اس کی کک میرے شانے پر لگی۔ میں ردعمل کے طور پر، بیک فٹ پر آ کر اپنی گردن کو پیچھے کی طرف جھکا چکا تھا، پھر اس کی کک میں کوئی خاص فورس بھی نہیں تھی۔ میں بس ایک ہلکا سا جھک محسوس کر رہ گیا۔

جھانگیر نے اپنی اس نیم کا میاب کوشش کو اوور اسٹیسٹ کیا اور بڑے فخریہ انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس نے تیز رفتاری سے لیفٹ راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ میں ایک اسٹیپ پیچھے چلا گیا۔ اس نے زیادہ پرجوش انداز میں رائٹ راؤنڈ ہاؤس ماری۔ میں نے اس کے جوش سے فائدہ اٹھا یا اور سرعت سے نیچے بیٹھتے ہوئے ایک بیک سوپ ماری۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا۔

رائٹ راؤنڈ ہاؤس کک نے اس کا توازن بگاڑ دیا تھا کیوں کہ وہ نشانے کو ٹھیک نہیں کر پانی تھی۔ میں اسی لمحے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ جب کوئی کک اپنے نشانے پر نہ لگے تو حملہ آور کا توازن برقرار رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ جھانگیر پر ایک دھشت سوار تھی اس لیے بھی وہ سنبھل نہ سکا۔ سوپ ویسے بھی ہتھمقابل کو زمین یوں کرنے ہی کے لیے لگائی جاتی ہے۔ خاص طور پر بیک سوپ (BACK SWEEP) کسی جھاڑو کے مانند، اپنی راہ میں آنے والے ہر شے کا صفایا کرتی چلی جاتی ہے۔

اس مرتبہ جھانگیر نے اٹھنے میں تھوڑی تاخیر سے کام لیا۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے ایک اسٹیپ لے کر اسٹیپ کک (SNAP KICK) چلائی۔ وہ لڑکھاپا اور ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرنٹ پریشر کک اس کے شانے پر جڑ دی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر زمین پر آ گرا۔ اس نے بائیں شانے کو تھام رکھا تھا اور اس کا چہرہ اذیت کی آماجگاہ کا منظر پیش کر رہا تھا..... وہ چہرہ جو پہلے ہی لہو لہان ہو رہا تھا۔ اس تیز تر صورت میں، اذیت کے تاثرات نے ایسا بھگاریا لگا کہ جھانگیر کا چہرہ ہیمائیک شکل اختیار کر گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو جھوم رہا تھا۔ اس کا مضروب بازو، شاخ پر لٹکی ہوئی کسی ٹھنڈی کے مانند جھول رہا تھا۔ میری پریشر کک (PRESSURE KICK) نے اس کے

شانے کا کبڑا کر دیا تھا۔ بادی انظر میں یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے پائیں شانے کا جوڑا اپنی جگہ سے ہلک گیا ہو۔  
جہاگیر نے کینہ تو نظر سے مجھے دیکھا پھر دامن ہاتھ سے اپنے پائیں ناکارہ بازو کو سہلاتے ہوئے بولا ”دیکھ لینا..... تمہارا شہرت برا ہوگا!“  
”فی الحال تو میں تمہارا شہر برا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے دہاڑ کر کہا ”بتاؤ، تم نے میرے ساتھیوں کو؟“

وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پھٹ پڑا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا گھڑا اٹھنے لگا یہ ایک طرح سے اس کی ہلکت کا اعلان تھا۔ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو مغلظات میں تولنے لگا۔ بہادر انسان ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور بزدل شخص کمزور پڑنے پر گالیوں کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اب تک میرے سامنے بڑی جواں مردی سے ڈٹا ہوا تھا لیکن اس آخری مرحلے پر اس کی بزدلی اچانک ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔

میں نے ایک لانگ اسٹیپ (LONG STEP) سائیڈ کلک اس کے سینے پر باری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں اچک کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا پھر اس کے ہاتھوں کو مٹی میں جکڑ کر میں نے اس کے چہرے پر ٹوک کر برسات کر دی۔ وہ مزاحمت کی پوزیشن میں تھا اور نہ ہی اس میں اتنی سکت باقی بچی تھی۔ چند ہی لمحات میں اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔  
میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار چھڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”تمہاری باتوں سے یہ تھذوق ہو چکی کہ تم میرے ساتھیوں کے قاتل ہو۔ اب شرافت سے یہ بھی بتا دو کہ تم یہودی لابی کے لیے کس قسم کے خدمات انجام دے رہے ہو؟“

اس کی آنکھوں میں دشت ہی بھر گئی، لکنت زدہ لہجے میں بولا ”مم..... میں..... کسی یہودی لابی..... کو نہیں..... جانتا!“  
”میں جانتا ہوں۔“ میں نے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں کستے ہوئے کہا ”یہودی لابی اور اس کے مقاصد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگ کسی ایسی مقامی تنظیم سے وابستہ ہو جو یہودی لابی کے مفاد کی خاطر ان کے اشاروں پر رونا جیتی ہے۔ میرے سامنے تمہاری دروغ گوئی نہیں چل سکے گی۔ تم دونوں کو کافی دنوں سے واچ کیا گیا ہے۔ تم اگر چہ اس مقامی تنظیم کے آلہ کار ہو لیکن میں تمہارے ذریعے یہودی لابی تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر تمہارے اندر زندگی کی خواہش نہیں مٹی تو زبان کھول دو۔“  
”مم..... میں نے بتایا ہے نا، میں ایسی کسی لابی سے

واقف نہیں ہوں۔“ اس نے نگاہ جراتے ہوئے کہا ”تم خواہ مخواہ مجھ پر شک..... کر رہے ہو۔“  
میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی ایک زوردار تھپور رسید کر دیا پھر غرا کر کہا ”مجھے تشدد کے لیے مجبور نہ کرو۔ میں تم وقت میں زیادہ کام نہ کرنا کے موڈ میں ہوں۔ اگر تم نے میرا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کی تو مجھے مجبوراً دوسرا اختیار کرنا پڑے گا۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی، میں نے پنڈلی پر موجود خنجر کو ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا، پھر اس کے برہنہ پھل کو اپنے نچے دبے ہوئے جہاگیر کی آنکھوں کے سامنے چاہا۔ امتیاز دہلی کی یادگار، اس خنجر کا پھل پورے آٹھ انچ طویل تھا۔ پھل کے اختتام پر پانچ انچ کا دستہ تھا۔ تیرہ انچ طویل یہ تشد لب، خونخوار ہتھیار ہر وقت میری پنڈلی سے چمٹا رہتا تھا اور میرے اشارہ برد پر چیر چھاڑ کے لیے پیش قدمی کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے برداشت نہیں تھی!

اسی دوران میں شہزاد اعلیٰ بھی ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے اپنی ”ہنرمندی“ سے فواد کو چاروں خانے چت لٹا دیا تھا۔ وہ بے جا رہ اس وقت گہری غفلت میں تھا، اس کا بے حرکت جسم کمرے کے فرش پر، بندے کے کنارے ہی پڑا تھا۔ بندے پر موجود حسینہ بڑی دشت ناکی سے ہماری ”کارروائی“ دیکھتی رہی تھی۔ وہ خاصی ذہین اور موقع شناس معلوم ہوئی تھی۔ اس دوران میں اس نے چیخنے چلانے یا دہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی البتہ بیڈیٹ کے اندر سے اس کا خوفزدہ چہرہ مسلسل اس ٹھیل کو دیکھ رہا تھا جو پھلے پندرہ منٹ سے وہاں جاری تھا۔

میں نے اپنے خنجر کو بڑے خوفناک انداز میں حرکت دی اور جہاگیر سے استفسار کیا ”زبان کھولتے ہو یا میں اس کی دھار کا مظاہرہ پیش کروں؟“  
”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ مجھے پکڑ دینے کی کوشش کرنے لگا حالانکہ اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر پکار رہی تھیں، میں نے بالکل ٹھیک بندے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ آنکھیں بڑی چٹل خور ہوتی ہیں، ہر بات بتا دیتی ہیں!

”کس قسم کی غلط فہمی؟“ میں غرایا۔  
”ہم کسی..... یہودی لابی کے لیے کام نہیں کرتے۔“ وہ ایک ایک کر بولا۔  
”تم جس تنظیم کے آلہ کار ہو وہ یہودیوں کی ٹاؤٹ ہے۔“ میں نے پھر سے ہوئے لہجے میں کہا ”بتاؤ ہم کس تنظیم سے وابستہ ہو..... اور تمہارے پاس کیا نام ہے؟“

وہ حذب بظ نظر سے مجھے نکتے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تامل کی گہری پرجھانیاں تھیں۔ وہ مجھے ”ہاں“ اور ”نہ“ کے بیچ میں لٹکا ہوا دکھائی دیا۔  
شہزاد اعلیٰ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”وجدان! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے تمہیں جی کرنا ہوگی۔“  
”یہ لاتوں کا بھوت نہیں شہزاد!“ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا ”اس کے ساتھ تو لات مکا ہوت ہو چکا پھر بھی خاموش ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے پہلے اس کی قصد کھولنا ہوگی! یہ بھی تو دیکھ میری قصاص دہلی!“

بات ختم ہوتے ہی میں نے اپنے خنجر کی دھار کو اس کے بدن کے ایک نہایت ہی نازک جگہ پر آزمایا۔ یہ ایک معمولی سا چکا تھا لیکن میرے نیچے دبا ہوا پھل تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ تیز دھار خنجر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔  
میں نے اس کی چلاہٹ کی پروا کیے بغیر ایک انچ کے فاصلے پر دوسرا چکا لگایا۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ہاتھ پاؤں بچھٹنے لگا۔ میں نے خنجر کی نوک کو اس کی شہرگ پر چبھوتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”میں تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں جہاگیر!“  
میرے انداز میں سفاکی کی کوئی کمی نہیں تھی ”تمہارا تعلق کس تنظیم سے ہے؟ اور تمہارے پاس کیا نام ہے؟ اگر میری بات کے اختتام پر تم نے ان سوالات کا جواب نہ دیا تو ہر پانچ سیکنڈ میں تمہیں ایک اذیت ناک جھکے کا تختہ پیش کروں گا..... اور بالآخر تمہاری شہرگ تک پہنچ جاؤں گا۔ تم جاننے ہو، شہرگ پر لگنے والا کٹ (CUT) کتنا جانیں کسل ہوتا ہے!“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھوکا انداز میں کہا۔

”اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ زبان کھول دو..... یا حرام موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!“  
اس کی ایک بلند آہنگ چیخ کمرے کی فضا میں گھٹیل ہو کر رہ گئی۔ اس مرتبہ میرے خنجر نے کچھ زیادہ ہی (DEEP CUT) لگا دیا تھا۔ وہ بے آپ جھلکی کی طرح تڑپنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوشش ان منٹوں میں کہ وہ میرے نیچے بری طرح دبا ہوا تھا اور ”دبا ہوا“ شخص کسی بھی کام کی کوشش ہی کر سکتا ہے۔ وہ کام اپنی مرضی سے تکمیل تک پہنچانا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جہاگیر کی بے اختیار بی نے اسے تڑپنے، جھڑکنے پر مجبور کر رکھا تھا، وہ بے آپ جھلکی کی مانند اچھل کود چا کر اپنی جلد تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کی آہ دیکا کی پروا کیے بغیر چکا بازی جاری رکھی تو اسے کھٹے کھٹے پڑے اور جب کوئی انسان کھٹے کھٹا ہے تو پھر اسے ہتھیار پھینکنا پڑتے ہیں۔ وہ نہبتا ہو جاتا ہے۔ جہاگیر نے اپنے نہبتا پن کا اعلان کرتے ہوئے زبان کھول دی۔  
”میں بتاتا ہوں..... سب کچھ بتا ہوں۔“ وہ سراپیمہ لہجے میں بولا ”خدا را، اس موذی خنجر کو میری گردن سے ہٹاؤ۔“

میں نے گھبراہٹ سے آواز میں کہا ”یہ خنجر تمہاری گردن سے ہٹ رہا ہے..... اور صرف..... اس لیے ہٹ رہا ہے کہ تم میرے سوالات کے سلی بخش جواب دے سکو۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟“  
”میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی دشت زدہ آنکھوں کو بند کر کے کھول دیا۔ یہ اس کا انتہائی جواب تھا۔ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”اگر تمہارے جوابات سے میری فہمی نہ ہوئی تو میں سمجھ لینا، تم نے زندگی بچانے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیا۔“

پھر میں اس کے سینے سے نیچے اتر آیا۔ اس کی اتنی درگت بن چکی تھی کہ وہ فرار ہونے یا حملہ آور ہونے کا خیال دل میں بھی نہیں لاسکتا تھا۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں نے شہزاد کو اشارہ کیا۔

”شہزاد! تم اس مردود کو اپنے پھل کے نشانے پر رکھ لو۔ اگرچہ مجھے امید تو ہیں کہ یہ کوئی شیطانی کرے گا لیکن پھر بھی اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس نے میرے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے تڑپ کر دی تو میں صرف تمہارا نام پکاروں گا۔ تم ”شہزاد“ کا لفظ سنتے ہی بے دریغ اسے شوٹ کر دینا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

یہ بات میں نے محض جہاگیر کو دشت زدہ کرنے کے لیے کہی تھی تاکہ وہ کوئی فحشی خیال دل میں نہ لائے اور اگر اس کا ذہن کسی سرکشی کا شکار نہ ہو جائے تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا رسک نہ لے، اس سٹیل کو خیال انداز کر دو۔  
اس کے بعد میں نے دوسری کرسی سنبھالی اور بیڈیٹ میں طوف حسینہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ خوفناک پھل والا خنجر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ حسینہ کی دشت زدہ نگاہ اس خنجر کی دھار پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بغیر نام کے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“  
وہ چونکی جیسے کتے سے باہر آئی ہو پھر اس کے ہونٹ کپکپائے ”نا..... بندہ!“



”یہ کیا نام ہوا؟“ میں نے اسے گہری نظر سے گھورا  
 ”تا..... بندہ..... اگر تم تا..... بندہ ہو تو پھر از..... بندہ کون  
 ہے؟“ وہ انجمن زدہ نظر سے مجھے تنکے لگی، اس انجمن میں  
 سراپا کی مثال تھی۔ ”یہ تو ایسی ہی بات ہوگی..... از کر اچھا تا  
 حیدر آباد۔“

میری بات ختم ہونے پر اس نے قدرے سنبھل کر کہا  
 ”میرا نام تائندہ ہے۔ تمہیں سمجھنے میں غلطی لگی..... نہیں،  
 نہیں۔“ اس نے بڑی سرعت میں گردن کوٹنی میں جھکا اور  
 لجاجت آمیز لہجہ میں بولی ”مم..... میرا مطلب ہے، اپنا نام  
 بتانے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔“ وہ بری طرح ڈری ہوئی  
 تھی اور پیاس کا مین فطری عمل تھا۔

اس کی خوفزدگی بڑی قابل رحم اور معصومہ خیز تھی۔ میں نے  
 بے پروائی سے کہا ”تم تائندہ ہو یا شرمندہ، اس بات سے  
 مجھے کوئی غرض نہیں اور نہ ہی اس بات سے کوئی سروکار ہے کہ تم  
 ان دو شیطانوں کے بیچ رات کے آخری پہر کیا کر رہی تھیں۔  
 اگر مزید شرمندگی سے بچنا چاہتی ہو تو لباس پہن کر اپنے حواس  
 میں آنے کی کوشش کرو۔“ پھر میں نے کمرے میں چاروں  
 جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا ”تمہارا لباس کہاں ہے؟“  
 اس نے جواب دینے کے بجائے واش روم کے بند  
 دروازے کو دیکھا۔ اس کا یہ خاموش جواب میری سمجھ میں  
 آ گیا۔ میں نے تمکنا سنا انداز میں کہا۔

”تائندہ بصورت شرمندہ! تم فوراً اس بیڈ شیٹ میں لپٹی  
 لپٹی واش روم میں پہنچو اور تسلی سے اپنا لباس پہن لو..... اور  
 اس وقت تک واش روم سے باہر نہ آنا جب تک میں تمہیں اس  
 بات کی اجازت نہ دوں۔“

میرا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ چادر بردار، اپنے بدن کو سمیٹتے  
 ہوئے واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں دوبارہ جہانگیر کی  
 طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بہت سہا بیٹھا تھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں، تمہارے حواس بجا ہو چکے ہیں۔“  
 پھر میں نے شہزاد کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا ”اگر تم ریڈی ہو  
 تو میں اس بد بخت کا ”انٹرویو“ شروع کروں؟“

”میں ایور ریڈی ہوں و جدان!“ وہ بھل کر ایک مخصوص  
 جنبش دیتے ہوئے بولا ”جیسے ہی تمہاری زبان پر میرا نام آیا،  
 میں نیکر دو بادوں گا۔“

”نیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔  
 جہانگیر کی آنکھوں میں موجود وحشت کی گناہ بڑھ گئی۔ اس  
 وحشت میں دہشت بدرجہ اتم موجود تھی۔ میں نے اس کی انہی  
 آنکھوں میں گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

”اب تو تمہارا ذہن بیہودی لابی کی کارفرمائی سے انکاری  
 نہیں؟“

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ اس کا مطلب  
 تھا، اس نے اقرار کر لیا۔

”زبان سے یوں۔“ میں دھاڑا ”تیار بکرے کی طرح  
 گردن کو مت جھکنا۔“

وہ بولا ”اس شہر میں بیہودی لابی اپنا کام دکھا رہی ہے۔“  
 میں نے کہا ”بیہودی لابی کسی مقامی تنظیم کے پلیٹ فارم  
 سے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے اور تم اس تنظیم کے آلہ کار  
 ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ کمزور آواز میں بولا۔  
 ”تم کس تنظیم سے وابستہ ہو۔“ میں نے پوچھا ”اور  
 تمہارے پاس کیا نام ہے؟“

”کیا دونوں سوالوں کے جواب دینا ضروری ہیں؟“  
 اس نے انجان مجھ سے سوال کیا۔

”اس میں قاحت کیا ہے؟“ میں نے غصیلی نظر سے اسے  
 دیکھا۔

”میرا خیال ہے، ایک سوال کا جواب دوسرے سوال کو  
 کھول دے گا۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے ٹھیکسی نظر سے اسے  
 دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”میں جس تنظیم سے منسلک  
 ہوں، وہ تمہارے لیے اچھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے تیز آواز میں کہا۔  
 ”سی ایف کے“ وہ گھست خوردہ آواز میں بولا۔

میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا ”یہ کیا بکواس ہے؟“ بے  
 ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا  
 ”میں ”سی ایف کے“ کے لیے کام کرتا ہوں جس کا بگ باس  
 شیعہ غوری ہے۔ ہم سب اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔  
 یہ اشارے ہمیں اپنے باس کی طرف سے ملتے ہیں۔ برٹن میں  
 بگ باس کا ایک نائب باس موجود ہے۔“

جہانگیر کے انکشاف نے میرے دماغ میں ہلچل مچادی۔  
 میں اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شیعہ غوری اور  
 اس کی تنظیم ”سی ایف کے“ سے میں بخوبی واقف تھا بلکہ ”غیر  
 سرکاری“ طور پر اس سے منسلک بھی تھا۔ میں نے سوچا، شاید  
 جہانگیر مجھے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ جھوٹ بول  
 کر اپنی جان بچانا چاہتا ہو۔ میں نے خوشحال لہجہ میں کہا۔

”میں شیعہ غوری اور اس کی تنظیم کو اچھی طرح جانتا  
 ہوں۔ تم غلط بیانی کر کے اپنی جان نہیں بچھڑا سکتے۔“

”میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔“ وہ تھق سے بولا۔  
 میں نے کہا ”سی ایف کے ایک اصلاحی اور مثبت طرز فکر  
 کی تنظیم ہے۔ تم یقیناً کوئی گڑبڑ کر رہے ہو۔“

”میں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی اور نہ ہی اس پوزیشن میں  
 ہوں کہ جھوٹ بول سکوں۔“ اس نے کن آنکھوں سے بھل  
 بردار شہزاد کو دیکھا ”زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی  
 زندہ رہنا چاہتا ہوں اور تم نے وعدہ کیا ہے، اگر میں بچ بولوں  
 گا تو تم مجھے جان سے نہیں مارو گے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔“ میں نے کہا ”لیکن  
 تمہارے جواب سے میری تسلی نہیں ہو رہی۔“

”وہ اس لیے کہ تم شیعہ غوری کو ایک فرشتہ صفت انسان  
 سمجھتے ہو۔“ وہ قدرے بہادری سے بولا ”تم اس تنظیم سے کبھی  
 طور پر منسلک ہو اس لیے پوری طرح باخبر نہیں۔ شیعہ غوری  
 تمہیں جس طرح بے وقوف بناتا ہے، تم بن رہے ہو۔“

اس کی باتوں سے مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے کہا ”کیا تم  
 یہ تمام حقائق شیعہ غوری کے سامنے بھی بیان کر سکتے ہو؟“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کوٹنی میں حرکت  
 دیتے ہوئے بولا ”تم تو سیدھے سادے شریف آدمی ہو۔  
 مجھے امید ہے، تم میری جان بخشی کر دو گے لیکن شیعہ غوری کو  
 اگر اس سلسلے میں ذرا سی ہلک بھی پر دہنی تو وہ میرا جو شکر کرے  
 گا اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”پھر تمہاری باتوں کی تصدیق کس طرح ہو سکے گی؟“  
 ”مجھیں میری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا۔“

”تم نے جو کہہ کہا ہے، ذہن اسے تسلیم نہیں کرتا۔“  
 ”وہ اس لیے کہ تمہارا ذہن اس وقت ”سی ایف کے“  
 کے کبب میں بیٹھا ہوا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”جب  
 کبھی تمہاری آنکھ کھلے گی تو تمہیں میری باتوں کا یقین آ جائے  
 گا لیکن اس وقت تک پتا نہیں، میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔“

مجھے لگتا ہے، میری زندگی کے دن گئے جا چکے ہیں۔ وہ  
 اچانک بے حد سراسیمہ نظر آنے لگا ”بگ باس شیعہ غوری  
 کوٹنی معمولی آدمی نہیں۔ اس کی اتنی ہی آنکھیں ہیں جتنے اس  
 کی تنظیم کے درکر ہیں۔ وہ اپنے ہر بندے پر ایک نگاہ رکھتا  
 ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اس وقت بھی مجھے دیکھ رہا  
 ہے۔..... وہ میری غدار کی جیٹنی شاید ہے اور میری اس غلطی کو  
 وہ بھی معاف نہیں کرے گا۔ مجھ سے خراب ہوگا، بہت جلد مرنا ہوگا۔  
 اگر تم نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو بگ باس نہیں چھوڑے گا۔“ وہ

پٹری سے اترنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موت کے  
 سائے ناچتے ہوئے دیکھے۔ وہ خوفزدگی کے عالم میں بولا  
 ”وہ جان! تم اسی وقت مجھے جان سے کرار دو۔ اپنی زبان  
 سے ”شہزاد“ کا لفظ خارج کر دو تا کہ تمہارا سہمی مجھے شوٹ کر  
 دے۔ یہ فوری اور کم از کم اذیت ناک موت ہوگی ورنہ بگ باس  
 مجھے جس طرح فنا کے گھاٹ اتارے گا اس کے بارے میں  
 سوچتے ہوئے ابھی سے میری روح فنا ہو رہی ہے۔ پلیز  
 و جدان! میری مشکل آسان کر دو۔ اپنے ہاتھوں سے میری  
 جان لو۔“

وہ باقاعدہ گڑگڑانے لگا۔ میرے لیے یہ ایک غیر متوقع  
 صورت حال تھی۔ میں نے بہت سے لوگوں کو زندگی کی ہلک  
 مانگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جہانگیر عجیب بھکاری تھا۔ یہ مجھ  
 سے موت کی ہلک مانگ رہا تھا۔ منت مانت کر رہا تھا کہ میں  
 اسے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد کر دوں۔ میں غیر یقینی  
 نظر سے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گھٹکیا ”وہ جان! میں تمہارے تین ساتھیوں کا قاتل  
 ہوں۔ اگر چہ میں نے اپنے ہاتھوں سے انہیں نہیں مارا لیکن  
 گرے بچارو سے، میرے جسم ہی سے فائرنگ کی گئی تھی۔  
 میرے آلہ کاروں نے کلاشنکوف کے برٹش سے تمہارے  
 ساتھیوں کو بھون ڈالا تھا۔ کم از کم تم اپنے ساتھیوں کا انتقام  
 لینے کے لیے ہی مجھے قتل کر دو۔“

اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک  
 اچھوتا خیال آیا۔ میں نے فرش پر بے سہ سہ بڑے نواد کو دیکھا  
 اور جہانگیر سے پوچھا ”اس فلیٹ میں اور کتنے کمرے ہیں؟“

اس نے حیرت سے میرا یہ غیر متوقع سوال سنا اور بولا  
 ”اس کے علاوہ ایک بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم ہے۔“

میں نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم نہیں رک  
 کر اور نواد اور تائندہ پر نظر رکھو۔ میں جہانگیر کو دوسرے کمرے  
 میں لے جا رہا ہوں۔“ بانی پوچھتا چہ وہاں ہوگی۔“

شہزاد نے کوئی سوال کیے بغیر شانے اچکا دیے۔ گویا اس  
 نے مجھ سے اتفاق کیا۔

میں نے خبر کے اشارے سے جہانگیر کو آگے لگایا اور ہم  
 ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہ میری اس حرکت پر سخت پریشان  
 اور الجھا ہوا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی ہو کہ  
 میں اسے خاموشی سے ٹھکانے لگانے کے لیے وہاں لایا ہوں۔  
 میں نے ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ بند کیا اور ہم  
 آٹے سائے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائنگ روم کا بیرونی  
 دروازہ میں فلیٹ میں داخل ہونے سے قبل ہی باہر سے بوٹ

اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن و عن ہمارے پاس  
تک پہنچا سکتا ہے اور اس فوراً اس معاملے کو جبک پاس کے  
پاس لے جائے گا۔“

”تمہارے پاس کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
اس نے بتایا ”سلیم واسطی۔“ یہ ”ملیر“ کا کرتا دھرتا  
ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بات تم جانتے ہی ہو کہ ”سی ایف کے“ نے  
کراچی کے ہر ضلع میں ایک ٹھکانا بنا رکھا ہے جو اسی ضلع کے نام  
سے موسوم ہے۔ میں پہلے ”ساؤتھ“ میں تھا جہاں کا پاس کبیر  
شاہ ہے۔ مگر قبرستان والے واقفے کے بعد مجھے ”ساؤتھ“  
سے ”ملیر“ شفٹ کر دیا گیا تھا۔“

اس کی بات نے فوراً مجھے کلک کیا۔ خرکار چورنگی سے تھوڑا  
پہلے پوٹ بین کے علاقے میں جب گرے پکارو والوں نے  
پہنیں گھیرا تھا تو ایک مکن برادر کو دیکھ کر میں چونکا تھا اور مجھے  
جھک کر رہا تھا کہ میں اس صورت کو پہلے ”ساؤتھ“ میں دیکھ چکا  
ہوں۔ وہ صورت اسی جہانگیر کی تھی۔ ازاں بعد جب میں نے  
شعب خوری کی اس جانب توجہ دلائی تو وہ بڑی چالاکی سے  
مجھے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جہانگیر کی بات کے اختتام پر میں نے کہا ”تمہارے  
بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فواد اس سلسلے میں اپنی زبان بند  
رکھے تو معاملات تمہارے ہاتھ میں رہ سکتے ہیں۔“  
”مگر وہ اپنی زبان بند کیوں رکھے گا؟“  
”وہ نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ تم اس کی زبان بند کر سکتے ہو۔۔۔۔۔ ہمیشہ  
کے لیے!“

میں نے کہا ”انسان کی بھاد اور فدا کا یہی دستور ہے، خاص  
طور پر جرائم کی دنیا میں تو یہ مسلم فارمولا ہے۔ انسان اپنی بھاد  
کے لیے دوسرے کی فدا کا سامان کرتا رہتا ہے۔“  
”لیکن تم میری بھاد کیوں چاہتے ہو؟“ اس کی حیرت دور  
ہونے کا ہم نہیں لے رہی تھی ”میرے اشارے پر تمہارے  
تین بہترین ساتھیوں کو قاتل رشتہ میں۔۔۔۔۔“

میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا ”وہ اشارہ تمہارے  
دل کی آواز نہیں تھا۔ تمہیں اپنے سابق پاس کبیر شاہ کی طرف  
سے حکم ملا تھا۔ اور کبیر شاہ اپنے پاس اور تمہارے بگ ہار  
کے حکم کا پابند ہوگا۔ اس حساب سے میرے ساتھیوں کا اصل  
قاتل تمہارا بگ پاس ہے۔ میں ان کے قتل کا انتقام شعب  
خوری سے لوں گا۔ تم بے گناہ ہو، اس لیے تمہیں زندہ رہ  
نا ہے۔“

کر چکا تھا۔ اب میں نے اپنے اچھوتے خیال پر عمل شروع کر  
دیا۔

وہ گہری جیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے قدرے نرم  
لہجے میں کہا ”لوگوں کو زندگی کی خاطر ٹھکاتے، روٹے کر لاتے  
تو دیکھا گیا ہے لیکن تم واحد آدمی ہو جو موت کے لیے التجا کر  
رہے ہو۔ اس حوالے سے تم اپنی نوعیت کے منفرد آدمی ہو۔“  
”تم نے شعب خوری کا ثبوت چہرہ دیکھا ہے اس لیے یہ  
بات نہیں سمجھ سکو گے۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا  
”میں جانتا ہوں، وہ مجھے کتنے بھیا تک انجام سے دوچار  
کرے گا۔ یہ زندگی میرے لیے موت سے بھی زیادہ بدتر ہو  
جائے گی۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے جڑوں کو بھیجا۔ وہ تکلیف کی  
شدت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے باوقار  
کے چروں نے اس کی گردن کو مستعد مقامات سے خون آلود  
اور خوریز بنا دیا تھا۔ میں نے انسانی ہمدردی کے ناتے وہاں  
موجود ایک کپڑا اٹھا کر اس کی گردن پر پلٹ دیا تاکہ خون کا  
انجن رگ جائے۔

اس نے نقشہ آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ”تھینک یو  
وہ جان!“

میں نے اپنے منصوبے کے تحت اس کا خوف کم کرنے کی  
خاطر کہا ”شعب خوری تو تمہارے خلاف اس وقت کوئی قدم  
اٹھانے کا جب اسے یہاں کے حالات کی خبر ہوگی۔ تم اس  
سلسلے میں پیش بندی کر سکتے ہو!“

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ اطمینان کی جھلک دکھائی دی  
مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر مسرہ نظر آنے لگا، بولا ”میں پھر یہی  
کہوں گا، تم شعب خوری کی گہرائی کو نہیں ناپ سکتے۔ وہ اپنے  
درکرز کے ایک ایک معاملے سے آگاہ رہتا ہے۔ یہ واقعہ جلد یا  
بدیر اس کے علم میں آجائے گا اور وہ میری کھال تھچھا کر جسم  
میں سمندری منک بھروادے گا۔“

”مگر کیسے۔ اس تک یہ خبر کیسے پہنچے گی؟“  
وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا ”میرے فرائض میں ایک  
بات بھی شامل ہے کہ میں فواد کی غیر نصابی سرگرمیوں پر گہری  
نظر رکھوں۔ اسی طرح مجھے یقین ہے، میرے بارے میں بھی  
فواد کو کچھ اسی قسم کے احکام ملے ہوں گے۔“ وہ ذرا توقف  
کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا ”فواد تم دونوں کی یہاں آمد

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نوٹیں حصے میں ملاحظہ

فرمائیں جو کہ ستمبر 2004 میں شائع ہوگا

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

# آتش فشاں



حصہ 10

# آتش فشاں

راوی: وجدان علی

: حسام بٹ

یہ کتاب نام وجدان رکھا گیا۔ مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چہرہ دستیوں نے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا تھا اور انہیں "انصاف" کے ترازو میں دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤن شہل میں فتون حرب و ضرب ہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دوست کے انسان میں ہلکا کر اسے آتش و آہن کا ایک بے سار ہاتھوں نے اس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ ہلاؤں کسی برقی مشین سے خال شاہ کار بنادیا۔ اس کا ذہن طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لہک اور بجلی کی آغوشہ فعال ہو گئی۔ وہ ایک ایسے طوفان کی لہک تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا چمک تھی۔ تلواریں کی جھنکار اور چیتے لکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور انہیں حرف غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

ظلم و جبر کی فضا میں انسانی لینے والے ایک سراپا انتقام پھیلنے کیلئے شخص کی لرزہ خیز داستان

اس سے کیسے نمٹا ہوں۔"

بھر میں نے اپنی سائیکل کا شیشہ گرایا اور گاڑی کے اندر سے رچے ہوئے پولیس والے سے استفسار کیا "کیا بات ہے بھئی؟"

میرے انداز اور لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا اس کے اشارے پر میں فوراً گاڑی سے باہر نکل آؤں گا۔ جب میرے روئے نے اس کی توقع کا جنازہ اٹھا دیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس حیرت میں ایک احتیاط بھی پائی جاتی تھی۔

اس نے کہا "آپ کو صاحب بلار ہے ہیں۔" اس کے انداز میں حکم کا بے ادب اخلاقی نہیں تھی اور یہ میرے اسٹائل کا شمر تھا ورنہ پولیس والوں سے کوئی یہ نہیں پوچھتا..... کیا بات ہے بھئی!

میں نے تمہیر آواز میں پوچھا "تمہارا صاحب مجھے کیوں اور کہاں بلارہا ہے؟"

میرے اس انداز کے استفسار پر وہ مزید الجھ گیا۔ اس نے لگ بھگ سو گز دور ایک جانب اشارہ کیا اور بولا "صاحب وہاں چیکنگ کے لیے سب کو اپنے پاس بلارہے ہیں۔"

میں نے سوال کیا "کیا یہ لوگ تمہارے صاحب کے

خوف اور ڈر بڑے عجیب احساسات ہیں۔ خطرہ جتنا دور ہوئے اسی قدر زیادہ ستاتے ہیں۔ پچاسی کے تختے پر کھڑا ہوا ہزارے موت کا مجرم شاید اسی لیے بڑا دروڑے خوف دکھائی دیتا ہے خطرے اور اس کے درمیان فاصلہ مفر کے برابر ہوتا جاتا ہے جب انسان یہ سوچ لے کہ جو ہوتا ہے ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ہوتا۔ ہر شے غیر اہم ہو کر رہ جاتی ہے!

میں واقعی طور پر ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس "تیاری" نے میرے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ پولیس والوں سے خواہ مخواہ گہری بات۔ کسی چالاکی ہی سے ان سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔ ہم سے آگے پانچ چو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پولیس والا نے سترے تھوڑے سے چلتے ہوئے گڑلا کے قریب آ گیا۔ میں نے ایک ہنگام میں ہر موجود تھا۔ اس نے میری سائیکل کا شیشہ

نے کے بعد مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

موسم کی مہربانی کے پیش ہم نے گاڑی کے تمام شیشے مار کے تھے اور صبحی الصباح کی وحشت نے انہیں گنگا کر دیا تھا۔ میں نے گردن کھما کر کئی نشست پر بیٹھی ہوئی صدف اور

میں کی طرف دیکھا اور سرگشیا انداز میں کہا۔

"پریشان یا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں دیکھو میں

پاس پہنچ گئے ہیں؟“

میرا اشارہ اپنے سامنے کھڑی گاڑیوں کی طرف تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہنے لگا: ”آپ بھی جلدی آجائیں ورنہ مجھے ڈانٹ سنا پڑے گی۔“

میں نے اس کی ”بھموری“ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: ”اس کا مطلب ہے تمہارا صاحب گاڑیوں کی نہیں بندوں کی چیکنگ کر رہا ہے!“ میرے سوال میں اس نے انکار کیا۔

وہ میرے تصور اور اپنے صاحب کے لیے طرزِ خطاب دیکھتے ہوئے ”آپ“ سے ”سر“ پر اتر آیا۔ بڑے جلت بھرے میں لہجے میں بولا: ”سر! وہاں کا غذات اور بندوں کی چیکنگ ہوگی۔ بعد میں گاڑیوں کو بھی چیک کیا جائے گا۔ پلیز آپ گاڑی سے باہر آ جائیں۔“

”میں گاڑی سے باہر تو نہیں آ سکتا!“ میں نے قدرے جارحانہ انداز اختیار کیا۔

وہ حذبِ نظر سے مجھے دیکھنے لگا: ”سر! صاحب کا بھی حکم ہے۔“

”اپنے صاحب سے کہو وہ یہاں آ کر ہماری چیکنگ کرے!“ میں نے برہمی سے کہا۔

”آپ دیکھ رہے ہیں سر! وہ اصرار معروض ہیں۔“ ”وہ مصروف ہیں تو میں کیا کروں!“ میں نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا: ”اگر انہیں چیکنگ کی بہت زیادہ جلدی ہے تو یہاں آ جائیں ورنہ میں نے تو قطار میں گاڑی کھڑی کر رکھی ہے۔ جب خبر آئے گا تو چیکنگ بھی ہو جائے گی۔“

پولیس والے کے لیے وہ سب کچھ نیا، انوکھا اور ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے سنا تھا اور پچھلے کچھ عرصے سے دیکھ بھی رہا تھا کہ پاکستان اور اٹلی میں کمزور اور طاقتور کے لیے الگ الگ قانون تھا۔ قانون کے رکھوالے تو ایک ہی تھے لیکن وہ ان دونوں معاشرتی طبقوں کے ساتھ بالکل مختلف اور جداگانہ سلوک کرتے تھے، گویا طاقتور لوگ قانون کے ساتھ کسی کھلونے کی طرح کھیلتے تھے اور قانون نے کمزور بے بس اور لاچار کو کھلونا بنایا ہوا تھا۔ قانون سے یہاں میری مراد خاص طور پر پولیس اور عام طور پر عدالتی نظام ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ڈیپارٹمنٹس کئی طور پر کرپٹ تھے تاہم ان کی کارکردگی جو ہونا چاہئے وہ بہر حال نہیں تھی۔

میرے انداز نے پولیس والے کو باور کرایا کہ میں توپ قسم کی چیز ہوں جو اس کے صاحب کو خاطر میں نہیں لارہا۔ میں گزشتہ تین منٹس سے اس سے مغز ماری کر رہا تھا اور شاید یہ بات اس کے صاحب نے نوٹ کر لی تھی۔ وہاں سے ایک

پولیس والے نے اسے پکارا۔

”رجب علی! کیا بات ہے۔ تم وہاں اتنی دیر کیا کر رہے ہو؟“ اس نے ہچکچاہٹ آمیز نظر سے مجھ دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی جانب منہ اٹھا کر بلند آواز میں بولا: ”سرگاڑی سے باہر نکلیں آ رہے۔“

اس کا لہجہ ”سر“ کہنا اس بات کا غماز تھا کہ وہ مجھ سے اور میری شخصیت سے پوری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ میں اس کے صاحب سے بڑا کوئی آفیسر ہوں۔ یہ میری چال کے ساتھ ساتھ اس کے کمزور دماغ ہونے کی بھی دلیل تھی۔

پولیس والے نے ایسی بات کی تھی کہ اس کے صاحب کا چونکا لازم ہو گیا۔ وہ جگہ مجھے نظر آرہی تھی جہاں پر ان سب کا صاحب چیکنگ کے نام پر قانونی کارروائی میں مصروف تھا۔ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ ان کے صاحب نے لوگوں کو اپنے سامنے سے ہٹایا اور پولیس والے سے ان کا دفاع طلب ہوا۔

”کیا کیا تم نے رجب علی؟“ اس کے سوال میں حیرت سے زیادہ بے اعتنائی تھی۔

رجب علی نے کہا: ”صاحب جی! سر کہتے ہیں آپ کو چیکنگ کی اگر اتنی ہی زیادہ جلدی ہے تو یہاں آ کر چپے کر لیں سرگاڑی سے باہر نہیں آئیں گے۔“

اس کے صاحب نے وہیں سے جیسے جیسے ٹوٹ پوتا کر دیا۔ ایک نظر دیکھا پھر اس کی نگاہ گاڑی کی تھی نشست کی طرف اٹھ گئی اس کے بعد اس نے پولیس والے کو اپنے ہاتھ سے ایک مخصوص اشارہ کیا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ انہیں جانے دو۔

اس جنبشی کارروائی کے بعد اس کا صاحب اپنے ماحول میں مصروف ہو گیا۔ پولیس والے نے مجھے نگاہی سیلوٹ کیا اور جڑی لیا جلت سے بولا: ”سر! آپ جا سکتے ہیں۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

میں نے بڑی رعوت سے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ ایک جھٹکے سے کر دلا کو آگے بڑھا دیا۔ میری اس نمائندگی میں کامل اداکاری کا ہاتھ تھا۔ جب ہم ناکے سے کانٹا اٹھ لے آئے تو زرگل نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”وہ ان! کیا کیا تم کوئی جادو جانتے ہو؟“ ”نہیں تو“ میں نے گہری تنجیدگی سے جواب دیا۔

”مجھے تو یہ ”جی“ کا کمال لگتا ہے۔“ صدف بولنا ”جو کچھ

جادو سے کہہ نہیں۔“

”جی“ کیا ہوتی ہے؟“ صدف کے اظہارِ خیال نے زرگل کو چونکے پر مجبور کر دیا۔

اس سے پہلے کہ جی کے حوالے سے گفتگو کا کوئی نیا درکھل جاتا، میں نے جلدی سے کہا: ”اس میں کسی جادو کو دخل ہے نہ ہی جی کی کارفرمائی۔ یہ ایک کھیل تھا۔۔۔۔۔ اعتماد کا! اور میں یہ کھیل بڑی کامیابی سے کھیل کر جیت چکا ہوں۔“

”اعتماد کا کھیل!“ زرگل نے انھیں زدہ انداز میں کہا۔ تاہم صدف نے اس موقع پر مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

میں نے زرگل کی تفسی کے لیے کہا: ”بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی پولیس بائزر اور پر اعتماد لوگوں پر ہاتھ ڈالنے ہوئے ڈرتی ہے۔ میرے انداز نے اس پولیس آفیسر کو یقین دلا دیا کہ ہم کوئی عام لوگ نہیں ہیں بلکہ بہت ہی طاقتور اور بائزر ہیں۔ ہو سکتا ہے سیاست میں بھی ہمارا مکمل دخل ہو اور ہر برسرِ اقتدار سلیبی پارٹی کی حمایت ہمیں حاصل ہو ورنہ پولیس والوں کے سامنے اپنی انزکون دکھا سکتا ہے۔ میں نے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہانڈی پلٹ دی۔“

زرگل نے کہا: ”اگر وہ پولیس آفیسر تمہارے اعتماد کی دعوت میں نہ آتا تو صورتِ حالات کی گتینی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔“

”ہاں! ایسا ممکن تھا۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا: ”اگر ایسے حالات پیدا ہو جاتے تو پھر میں ہر نوعیت کا ہنگامی قدم اٹھاتا۔ یہ بات بہر حال طے ہے۔“ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ کر کر دیکھتے ہوئے ذرا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا: ”میں کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو کر دلا کی ڈک کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔“

”میرا خیال ہے اس کی لوہٹ نہ آئی۔“ صدف نے غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا: ”پولیس والوں کے آفیسر نے گہری نظر سے ہمارے گاڑی کو دیکھنے کے بعد ہمیں چھوڑنے کا اشارہ کیا تھا۔“

زرگل نے صدف سے پوچھا: ”اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

”اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔“ صدف ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری تنجیدگی سے بولی: ”انہیں جس گاڑی اور جن افراد کی تلاش ہے وہ وہیں اور نہ ہی ٹوٹ پوتا کر دلا۔ سو گڑ کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں پہچان نہ پاتا۔ اگر آفیسر کو کسی خاص شخص یا چند افراد کی تلاش تھی تو یہ بات طے ہے ہم

ان کے مطلوبہ بندے نہیں تھے ورنہ اگر ملک کی ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو وہ ہمیں اتنی آسانی سے نہ چھوڑتے۔“

زرگل! اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی: ”ہاں! ہو سکتا ہے۔ پولیس والے تو اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ میں بڑے سچ تجربات سے گزر چکی ہوں۔ یہ صرف ڈنڈے کے سامنے جھکتے ہیں ورنہ شریف اور کمزور لوگوں پر تو انہیں ڈنڈا چلانا ہی آتا ہے۔“

”اگر آوے کا آواہی مجزا ہوا تو پھر کوئی بھی نظام چل نہیں سکتا۔“ صدف فلسفیانہ انداز میں بولی: ”ڈیپارٹمنٹ پولیس کا ہوا بعد اثنوں کا ہر جگہ چند ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ میرے ماموں کی ایک مثال روشن اور زندہ ہے۔“

وہ اپنے ڈی ایس ای ماموں اور گریڈ زب خان کی بات کر رہی تھی۔ میں نے بھی اس شخص کو کھرا اور دیانت دار پولیس آفیسر پایا تھا۔ بہر حال اس قسم کے فرض شناس پولیس والے اگلیوں پر گئے جا سکتے ہیں۔ زرگل نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا، صدف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”ایسے ایمان دار لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو ڈانٹنے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لیکن اس کی کارکردگی آٹے کے ستارے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ سب کہتے ہیں ہم نے روٹی کھائی۔۔۔۔۔ آٹے کی روٹی!“

زرگل نے بڑی گہری بات کی تھی لیکن صدف بھی خاصی تیار نہیں نظر آتی تھی۔ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے اس نے کہا: ”ساری خرابی سسٹم کی ہے۔ انصاف کے تقاضے صرف پولیس تک ہی محدود نہیں بلکہ ان تقاضوں کی تکمیل عدالتی نظام کی مرہونِ منت ہے۔ اگر کوئی سچا اور کھرا پولیس والا انصاف اور فرائض کے تقاضے پورے کرنے پر کمر بستہ ہو جائے لیکن عدالت اس سے تعاون نہ کرے تو پولیس والے کی ساری محنت اندھے کوئیں میں جاگرتی ہے اور اس کی دل شکنی الگ ہوتی ہے۔“ وہ ایک لمبے کوسانس لینے کی خاطر رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی: ”اس سلسلے میں ماموں نے ایک نہایت ہی دل چسپ قصہ سنایا تھا جو سچا ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا مضحکہ خیز اور افسوس ناک بھی ہے۔“

”ہمیں بھی سنا وہ قصہ!“ میں نے حالات کی کلفت کو دور کرنے کی خاطر کہا۔

وہ بولی: ”چھوڑو۔ خواہ مخواہ تم دونوں ہنسو گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں یقین ہی نہ آئے۔“

”یقین آنے یا نہ آنے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا: ”البتہ اہم بات یہ ہے کہ

ہم دونوں نہیں گئے چاہے خواہ مخواہ ہی تھی۔“  
وہ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولی ”چلو تم ضد کر رہے ہو تو سنا دیجی ہوں۔“  
پھر صدف نے بتایا کہ اورنگ زیب خان کی زبانی اسے معلوم ہوا ان کے گھمے کے ایک فرض شناس اہلکار نے ایک کار لفٹر کو پکڑ لیا۔ اس کار لفٹر کا تعلق ایک با اختیار اور صاحب حیثیت خاندان سے تھا اور وہ اپنے من چلے دوستوں کے ساتھ مل کر اس قسم کی وارداتیں کرتا تھا۔ مقصد کاروں کا حصول نہیں بلکہ صرف ”سٹسی خیزی“ ہوتا۔ وہ جیسی ہونی گاڑی کو ازاں بعد کہیں بھی چھوڑ دیتے لیکن اس کی حالت خراب کرنے کے بعد۔ وہ اپنے ہم جونی کے جذبات کی تسکین کے لیے مسروقہ گاڑی کو کسی گھمبے یا ایسی کسی جگہ کرکرا کر اس کا علیہ بگاڑ دیتے۔ بڑے گھروں کے بچوں کے کھیل بھی نزلے ہوتے ہیں۔

بہر حال جب وہ مجھ کو امیر زادہ ایمان دار پولیس والے کی گرفت میں آگیا تو پہلے اس نے دھوکا دھکی سے کام چلانے کی کوشش کی۔ اپنے باپ کے وسیع تر تعلقات اور اعتبارات سے اسے متاثر کرنے لگا لیکن پولیس والا اس کی کسی نقلی یا دھکی سے مرعوب نہ ہوا اور اسے اپنے ساتھ تھانے لانے پر مصر رہا۔ ان حالات کے پیش نظر اس کار لفٹر نے پولیس والے کو رشوت کی پیش کش کر دی۔ اس کی نظر میں یہ ایک ایسا حربہ تھا جو پولیس پر فوراً کارگر ثابت ہوتا ہے لیکن اس روز اس کا تجربہ غلط ہو گیا۔ پولیس والے نے اس کی ایک دہشت اور ضروری کارروائی کے بعد اسے عدالت میں پیش کر دیا۔ جس نے بھی سنا اسے خوب برا بھلا کہا یہ الفاظ دیگر اس کے ساتھیوں نے ابھی خاصی لخت ملامت کر ڈالی کہ اس نے اپنی فضول فرض شناسی میں ایک بھڑکی رقم گنوا دی تھی۔ اس کار لفٹر امیر زادے نے پولیس والے کو بیس ہزار روپے کی رشوت آفر کی تھی جو اس وقت اس کے پرس میں موجود تھے۔ اس واقعے کا سب سے تکلیف دہ پہلو اس وقت سامنے آیا جب چند روز بعد اس امیر زادے نے پولیس والے کو فون کیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا ہے۔ اس نے حیرت سے دریافت کیا وہ کیسے آئے؟ اسے جواب ملا تو احمق تھے۔ اپنی ایمانداری کے چکر میں تم نے میری پیش کش ٹھکرادی لیکن وہ مجسٹریٹ بہت مشکل مندرجات ہوا جس کی عدالت میں میرا کیس لگا تھا۔ پولیس والے نے پوچھا۔ تم نے کتنی رشوت دے کر جان چھڑائی؟ اسے بہت ہی دل شکن جواب سننے کو ملا۔ کار لفٹر نے ایک شمرانہ قہقہہ لگایا

اور کہا ”صرف بریائی کی چار دیکھیں۔ مجسٹریٹ کے گھر پر کوئی تقریب تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی فرمائش کی جو میں نے آنکھ بند کر کے پوری کر دی۔“  
صدف نے اس شرمناک واقعے کو اختتام تک پہنچایا تو گاڑی میں گہری خاموشی نے قبضہ جمایا۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی کہتا بھی تو کیا کہتا؟ صدف نے ایک حقیقت بیان کی تھی اور حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کوئی بھی معقول آدمی حقائق کو چھلانے کے لیے خواہ مخواہ زبان درازی کرتا ہے اور نہ ہی کٹ جتی!

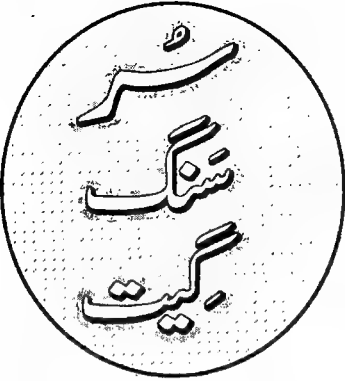
☆ ☆ ☆  
حنایت اللہ باجوہ ہماری بیٹے کا مالک ایک دراز قاصت شخص تھا۔ دراز قاصتی نے اس کے ذیل فوڈل میں ایک جتانی منظر بھر دیا تھا اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہم اس کے اڈے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے اڈے کے باہر بہت سے ٹرک کھڑے تھے۔ دیکھ گڑھ فارورڈنگ کمپنی عریض عام میں ٹرکوں کا اڈا کھلاتی تھی۔  
ری ایک سلیک کے بعد وہ ایک تک مجھے بتاتا چلا گیا۔ مجھے اس کی اس ادھر ہجرت بھی ہوئی اور قدرے عجیب سا بھی محسوس ہوا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جسے اس نے کوئی توجہ نہ دیا ہو۔ جب مزید چند محلات تک اس کی محویت نہ ٹوٹی تو میں نے کھٹک کر اسے مخاطب کیا۔  
”باجوہ صاحب! کیا بات ہے۔ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟“

اس وقت ہم اس کی کہنی کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہ چٹکا اور برب مکرراتے ہوئے بولا۔ ”جناب! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آخر آپ میں ایسی کن کن سی خاص بات ہے؟“  
”پھر کچھ نظر آیا؟“ میں نے استفسار کیا۔  
اس نے ہاں یا نہ میں جواب دینے کے بجائے معنی نثر انداز میں بھلا دیا اور کہا ”فریڈ یا شا کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اگر اس نے آپ لوگوں کی سفارش کی ہے تو ضرور آپ بھی غیر معمولی ہی ہوں گے۔ فریڈ یا شا کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اتنی صبح کھر سے نہ نکلتا بلکہ یوں سمجھو کہ جب اس نے فون کیا اس کے بعد میں ایک لمبے کے لیے نہیں سویا اور..... پچھلے ایک گھنٹے سے میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس کا انداز

ایسا تھا جسے ہمیں بہت دیر ہو گئی ہو۔  
میں نے کہا ”میں تمہاری آمد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل ہمیں راستے کا اندازہ نہیں تھا۔“ ہم جب باجوہ کے اڈے پر پہنچے تو سات بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ ”بہر حال ہمارے کام کا کیا ہوا؟“  
میں نے بات کے اختتام پر اس سے استفسار کیا۔  
”میں نے پاشا کی ہدایت کے مطابق انتظام کر لیا ہے۔“ اس نے بتایا ”کیا آپ اس بندے کو ساتھ لائے ہیں جسے کراچی پہنچانا ہے؟“  
میں نے کہا ”وہ بدبخت ہماری گاڑی کی ڈکی میں ہے۔“  
نو پوتا کر دلا باہر ٹرکوں کے پاس کھڑی تھی۔ حنایت اللہ نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی گاڑی کو اڈے کے اندر لے آؤں۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی اندر پہنچا دی۔

حنایت باجوہ نے کہا ”کیا آپ اس بندے کو چھوڑ کر واپس چلے جاؤ گے یا اس کی روانگی تک یہیں ٹھہر دے گے؟“  
میں نے پوچھا ”اسے کتنے بجے یہاں سے بھیجا جائے گا؟“  
”جس ٹرک میں میں اسے بھیجوں گا وہ دوپہر گیارہ بجے تک اڈے سے نکلے گا۔“ اس نے بتایا۔  
”ہم اتنی دیر تو یہاں نہیں رک سکتے۔“ میں نے کہا ”ہمیں ایک ضروری کام کے لیے فوراً نکالنا ہوگا۔“  
وہ جی لکھے میں بولا ”ٹھیک ہے تو پھر آپ اسے میرے حوالے کر کے جاسکتے ہیں۔“  
میں نے اپنی معلومات کے لیے پوچھا ”تمہارا یہ ٹرک کراچی کب پہنچے گا؟“  
”کل شام بیھے یا سات بجے۔“ اس نے بتایا ”آخر بھی بج سکتے ہیں کیوں کہ مال سے لدے ہوئے ٹرک کی رفتار عام گاڑیوں سے کم ہوتی ہے۔“  
پھر اس نے میرے استفسار پر مزید بتایا کہ وہ جادل کی لڑیوں سے بھرے ہوئے ٹرک میں فیصل کو لا رہے ہیں۔ کراچی پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اسے فیصل کے فن حرب و ضرب اور خطرناکی کے بارے میں بتایا تو اس نے سید ٹھونکتے ہوئے کہا۔  
”یار! تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے بڑا محفوظ اور مضبوط بندوبست کیا ہے۔ آؤں گے ہمیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“  
وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں نے اس کی تقلید کی۔ صدف اور

## سدا بہار فلمی گیتوں کا نوٹیشن



موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تحفہ!  
اس کتاب میں دیئے گئے گیتوں کا نوٹیشن ایسا ہے جس پر عمل کر کے گلوکاروں کی گائیکی کے مخصوص انداز بھی اپنائے جاسکتے ہیں۔ ”نرنبوٹی“ میں نئی علامات اختراع کر کے گلوکاروں کے ہر انداز کو اجاگر کر کے پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔

صفحات 208  
ڈاک خرچ 25 روپے  
قیمت 200/-

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ  
بذریعہ منی آرڈر بھیجی روانہ کریں

کتابیات سہیل کتب خانہ

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون 021-5804300  
kitabiat1970@yahoo.com  
مل انٹر نیٹ جات تک اس کتاب کو سہارا دے  
021-7766751 فون



زرگل دفتری حصے میں بیٹھے رہے اور ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اڈے کے اس حصے میں آگئے جہاں لوٹنگ وغیرہ کی جاتی تھی۔ ادھر ایک طرف گودام نما چند کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ باجوہ نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کرنے کے بعد مجھے اندر لے لیا۔

کمرے کے اندر فرش سے چھت تک چاول کی بوریاں رچی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کا تین چوتھائی حصہ انہی بوریوں نے گھیر رکھا تھا۔ عنایت باجوہ نے کہا: ”ان بوریوں کے ساتھ ہی تمہاری ”امانت“ لاہور سے کراچی پہنچ جائے گی۔ آٹھ بجے تک مزدور آجائیں گے پھر میں ایک ٹرک اندر منگوا کر بوریاں لدوانا شروع کر دوں گا اور یہ کام میں اپنی نگرانی میں کرواؤں گا۔“

”کیا تم چاولوں کی یہ بوریاں دکھانے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو؟“ میں نے انہیں زدہ لہجے میں پوچھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا پھر ایک بوری پر پڑی چادر کو کھینچنے کے بعد بولا: ”یہ دیکھو!“ میں نے دیکھا اور چونک اٹھا۔ وہاں مجھے ایک مضبوط انہی صندوق رکھا نظر آیا جس میں ہوا کی آمد و شد کے لیے چاہے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ میں نے سوالیہ نظر سے باجوہ کو دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پاشا نے مجھے ”مال“ کی خطرناکی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسی احتیاط کے پیش نظر میں نے یہ مناسب بندوبست کیا ہے آپ کے مال کو میں اس صندوق میں بند کر دوں گا بلکہ وہ کسی فوری خیال کے تحت چونکا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا: ”اگر آپ میری تمویذی مدد کر دو تو ہم یہ ٹیک کام ابھی کر لیتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے بندہ بے ہوش ہے!“

”تمہیں بالکل درست بتایا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

لیکن وہ زیادہ عرصے تک بے ہوش نہیں رہے گا۔“

وہ بے پروائی سے بولا: ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ابھی کچھ دکھاتا ہوں۔ تم میرے ساتھ تو آؤ۔“

”ساتھ آؤ“ سے اس کی مراد تھی ہاتھ بٹاؤ۔ میں نے عنایت اللہ باجوہ کا ہاتھ بنایا اور فیصل کا بے ہوش جسم کروا کر ڈکی سے اس انہی صندوق کے اندر کھینچ گیا۔ باجوہ نے جس پھرتی کا مظاہر کیا اسے دیکھ کر مجھے ماننا پڑا کہ اس عمر میں بھی وہ خاصا طاقتور اور مستعد تھا۔ وہ اناج سے بھری ہوئی کسی بوری کے سائز کا صندوق تھا۔ عنایت باجوہ نے اس ہوادار صندوق کا ڈھکنا بند کیا پھر اس کی کنڈی میں تالا لگا دیا اور بولا۔

”لو جی۔ اب تو تمہاری تسلی ہوگئی ہوگی۔ یہ تالا کراچی

جا کر ہی کھلے گا اور۔۔۔۔۔“ اس نے ذرا کر صندوق کی جانب اشارہ کیا اور کہنے لگا: ”اس طویل سفر کے دوران میں اگر اس بندے کو ہوش آگئی تو یہ بڑا کوشش کے باوجود بھی صندوق سے باہر نہیں آسکے گا۔ تم اس کے ہاتھ پاؤں بہت نفی بخش انداز میں باندھ رکھے ہیں۔“

میں نے ذہن میں چکرانے والے ایک سوال کے پیش نظر پوچھا: ”ٹرک میں چاولوں کی بوریوں کے درمیان اس کا دم تو نہیں گھٹ جائے گا۔ میرا مطلب ہے تم نے ہوا کی آمد و رفت کے بارے میں سوچ لیا ہے؟“ وہ پر اعتماد انداز میں بولا: ”میں نے بتایا ہے نا، اپنی نگرانی میں لوٹنگ کرواؤں گا۔“ ساری سیٹنگ میرے ذہن میں ہے، تمہاری امانت کا ایک بال بھی ہلکا نہیں ہوگا۔“ وہ ایک لمحے کو رک کر بڑے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر بولا: ”دوپے میں احتیاطاً ڈرائیور کے ساتھ دوپٹے کئے اور چاق دو بند کلینرز کو بھیجوں گا۔“

چوہدری نواز شعلی کے لیے میرے ذہن میں بہت زیادہ غم و غصہ اور نفرت بھری ہوئی تھی۔ فیصل اسی چوہدری کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس وقت میری چمڑی کے نیچے آیا ہوا تھا۔ ایک فوری اور شریر خیال نے میری سوچ میں جگہ بنائی اور میں باجوہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عنایت اللہ!“ میں نے پوری خفیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ”کیا یہ صندوق تمویذی دہرے کے لیے مکمل سکتا ہے؟“

”اس نے ابھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا: ”ہاں مکمل سکتا ہے مگر کیوں؟“

”میں اس کے اندر چند ضروری چیزیں رکھنا چاہتا ہوں۔“

”مثلاً کس قسم کی چیزیں رکھنا چاہتے ہو؟“ اس کی انجمن دو چند ہوگئی۔

میں نے سفاکی سے کہا: ”امرد کے چند کپڑے دو چار کیلے، کلومبر گا جریں اور ایک پانی کا پیالہ۔ ان پھلوں اور ہزیوں کا موسم تو ہے نا؟“

”موسم ہے اور میں یہ کام کر دوں گا لیکن پانی کا پیالہ!“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سفر کے دوران میں پانی پینے کے اندر نہیں ٹھہر سکے گا اور چاولوں کے پھینکنے کا اندیشہ الگ ہے!“

میں نے تمہیر آواز میں کہا: ”تو خالی پیالہ ہی رکھ دو۔ لوازمات پورے ہونا چاہئیں۔ ذرا دیکھنے والوں کو پتا تو چلے

بندر کس شاندار انداز میں ”انکس پورٹ“ کیا جا رہا ہے۔ دیے تو اس کے ہاتھ پاؤں اس انداز میں بکڑے ہوئے ہیں کہ پھل اور ہزری تک پہنچنے۔۔۔۔۔ بلکہ اپنا منہ پہنچانے کے لیے اسے دانٹوں پینا آجائے گا۔“

آئندہ چندہ منٹ کے اندر اس نے میری نفی سی ”فرمائش“ پوری کر دی اور صندوق کو تالا بند کرنے کے بعد چابی میرے حوالے کر دی تو میں نے پوچھا۔

”باجوہ! تمہاری منصوبہ بندی اور مہارت کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے تم اس لوہیت کے کام کرتے رہتے ہو؟“

وہ منہ کھول کر ہنسا تو اس کی تو بد بھی رقص کرنے لگی پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا: ”ایسی کوئی بات نہیں یار۔ یہ تو باشا کا حکم تھا اس لیے میں تیار ہو گیا اور نہ ایسے کاموں کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ اس منصوبہ بندی کے پیچھے باشا کے مشورے بھی چھپے ہوئے ہیں۔“ پھر وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستغرق ہوا: ”کہیں تم مجھے کوئی اسلحہ یا مردہ فرد تو نہیں سمجھ رہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا: ”بس ایسے ہی ایک خیال میرے ذہن میں آ گیا تھا۔“

وہ مطمئن ہو گیا پھر اس نے پوچھا: ”کراچی میں اس بندے کو کہاں پہنچانا ہے؟“

”فی الحال تو اسے اپنے اڈے تک بہ خیریت پہنچاؤ۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ”اس بات کا فیصلہ بعد میں کریں گے کہ ہم اسے تمہارے اڈے سے انھواٹے ہیں یا تمہیں کسی خاص مقام پر پہنچانا ہے میرا مطلب ہے اس بندے کو!“

وہ انہات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے اس کے لاہور اور کراچی کے اڈوں کے فون نمبرز اپنے پاس نوٹ کر لیے۔

باجوہ کے لیے میں نے منہاس باقر کے نمبرز لکھوا دیے پھر کہا۔

”تمہارا چاولوں والا ٹرک تو کل شام کو کراچی پہنچے گا لیکن میں آج دوپہر کے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے کراچی والے اڈے کا پتا اور فون نمبرز نوٹ کر لیے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں رابطہ کر کے معاملہ طے کر لوں گا۔“

ہمارے درمیان حریف چندہ منٹ تک ضروری امور پر بات چیت ہوئی رہی پھر میں نے اسے احتیاط سے کام کرنے کی ہدایت کی خاص طور پر لوٹنگ کے وقت اس انہی صندوق کی ”بار بار داری“ کا راز عام نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جس طرح دیواروں کے کان ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ہوا کا منہ

بھی ہوتا ہے۔ اگر اس ہوا کو کسی معاملے کی ہوا لگ جائے تو یہ جگہ جگہ سرگوشیاں کرنی بھرتی ہے۔

عنایت اللہ باجوہ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کام انتہائی تسلی بخش اور میرے حسب فضا ہوگا۔ میں مطمئن ہو کر دیکھ گمزدار وارڈنگ کے دفتر سے نکل آیا۔ آج یہ کبھی ایک ایسے انہی صندوق کو فارورڈ کرنے جا رہی تھی۔ جو گمزداری دنیا میں انقلابی حیثیت کا حامل تھا۔

☆☆☆ میری رست و اچ آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔

وہ دونوں عقبی نشست پر خاموش بیٹھی تھیں۔ میں بدستور ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد صدف نے پوچھا: ”وہ جان! تم نے فیصل کو لاہور سے کراچی پہنچانے کے انتظامات کا ابھی طرح جائزہ لے لیا ہے نا! کسی گڑبڑ کے امکانات تو نہیں ہیں؟“

ہمارا رخ بادای بارغ سے اتر پورٹ کی جانب تھا۔ ریلوے اسٹیشن کو پہنچے چھوڑ کر ہم گڑھی شاہو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں صدف اور زرگل کی مشترکہ ہدایات پر کروا کر ڈرائیور کر رہا تھا۔ آگے چل کر ہم نہر کعبور کرتے پھر کچھ دیر تک شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) کا سہارا لیتا پڑتا اور ہم اتر پورٹ کے نزدیک تر پہنچ جاتے۔ ہمارے درمیان طے پٹی ہوا تھا کہ ناشتا اتر پورٹ پر ہی کیا جائے گا۔ کہیں اور کسی ہوٹل میں بیٹھنے کا وقت نہیں تھا۔ ٹھیک ٹوبجے مجھے اور صدف کو ”ان“ ہونا تھا اور میری کوشش یہ تھی کہ میں تیز رفتاری سے ڈرائیور کرتے ہوئے ساڑھے آٹھ بجے تک اتر پورٹ پہنچ جاؤں تاکہ آدھے گھنٹے میں ہم تسلی سے ناشتا کر سکیں۔

گڑھی شاہو سے گزرتے ہوئے میں نے صدف کے سوال کا جواب دیا: ”عنایت باجوہ بہت کام کا بندہ ثابت ہوا ہے۔ اس نے بڑا تسلی بخش بندوبست کیا ہے۔ مجھے امید ہے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔“

پھر میں نے انہیں انہی صندوق والے اس ”بندوبست“ کی تفصیل بتائی تو زرگل حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی: ”اتنی جلدی اس گوشت کے پہاڑ نے یہ انتظام کیسے کر لیا۔ اس قسم کا سوراخ دار صندوق تیار کرنے میں وقت تو لگتا ہے!“

گوشت کے پہاڑ سے اس کی مراد عنایت اللہ باجوہ تھی۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے سبب واقعی ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ چونکہ وہ گوشت و پوست سے بنا ہوا تھا اس لیے زرگل کا دیا ہوا تسلی اس پر فٹ بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "زرگل! تمہاری حیرت بجا ہے لیکن آپ دونوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ وہ بندہ رات چار بجے سے جاگ رہا ہے جب فرید پاشا نے اسے فون کرنے کے یہ فرض سونپا تھا۔ ویسے میں نے وہ صندوق اچھی طرح دیکھا ہے۔ ہنگامی ضرورت کے تحت اس میں صرف چند دسواخ نکالے گئے ہیں ورنہ وہ صندوق پہلے سے باجوہ کے گودام میں موجود تھا اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔"

زرگل میری اس وضاحت پر خاموش ہوگئی۔ میں ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کوری جٹی دروازے کا مت پشتون دوستیہ انتہائی نازک حالات میں مجھ سے ٹکرائی تھی اور اس واقعے کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ مجھے اس سے فیصلی بات چیت کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ مجھے اپنی سستی خیر کالی سنا چاہتی تھی بلکہ میں اس کے حالات جاننے کا متنی تھا۔ اس کا دشمن چاچا حکمت یار ہاتھ دھو کر اور گن اٹھا کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مردانہ لباس پہن کر زخمی حالات میں زندگی کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ میں نے نہ صرف اس کے زخمی کندھے پر ہریم پٹی کی بھی بلکہ اسے ایک محفوظ پناہ بھی فراہم کی تھی جو شہاد اور اس کے ساتھی درندوں کے ہاتھوں گذشتہ رات انتہائی غیر محفوظ اور تباہ حال ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں زرگل ایک مرتبہ پھر میرے ساتھ نظر آ رہی تھی۔

میں نے زرگل کو وقتی پناہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ حکمت یار کا خطرہ ہی الخالی نہیں چکا تھا۔ لہذا میں اپنے وعدے اور فرض سے آزاد ہو چکا تھا لیکن زرگل کی متنی چیز باتیں اور اچھے ہوئے انداز مجھے تشویش میں مبتلا کر رہے تھے۔ خاص طور پر جب سے اسے معلوم ہوا تھا میں اور صدف کراچی جا رہے ہیں اس وقت سے وہ خاصی مجھ کی تھی اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یا تو اسے ہمارا کراچی جانا پسند نہیں آیا تھا یا پھر وہ بھی ہمارے ساتھ کراچی جانا چاہتی تھی۔ سائل والا معاملہ اب اس سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا اس لیے وہ مجھے کراچی جانے سے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

میں زرگل کے بارے میں جس قدر سوچ رہا تھا میری انجمن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر مجھے اس کے تشویشناک اور جواب طلب بیٹے یاد آئے۔ اس نے میرے مختلف سوالوں کے جواب میں بڑے سمجھیر انداز میں کہا تھا۔ مجھے امید ہے تم لوگوں کے کراچی رخصت ہونے سے پہلے میں کوئی بھی فیصلہ نہ کر رہی ہوں گی یا پھر..... لگتا ہے تمہارے رخصت ہونے

سے پہلے میں بجلی چٹکی ہو جاؤں گی اور..... مجھے یقین ہے میں تمہارے رخصت ہونے سے پہلے اپنی داستان مکمل کر لوں گی!

اور اب..... اس کی مکمل داستان سننا تو درکنار اس کا خلاصہ سننے کا وقت بھی نہیں بچا تھا۔ مجھے اس بات کا فہم ہو رہا تھا کہ حالات کی تیزی سے بدلتی ہوئی کروٹ نے مجھے اتنی ہلکت نہ دی کہ میں زرگل کا دکھن سکنا۔ بہر حال اس کی تشویش بھری باتوں نے مجھے اکسایا اور میں اس کے دل کا حال جاننے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"زرگل!" میں نے بھی منظر دکھانے والے آئینے میں اسے مخاطب کیا "تمہارے پاؤں کا درد اب کیسا ہے؟" وہ ششے سے ہاتھ دیکھتے ہوئے بولی "سوجھ کھل گئی ہے تو درد بھی جا رہا ہے۔"

اس کے لہجے میں بے پناہ تنیدگی بھری ہوئی تھی اور آواز میں واضح طور پر میں نے غزابت بھی محسوس کی۔ میں نے اس سے پوچھا "اور شہزادہ کیا حال ہے؟" "وہ بھی ٹھیک ہے۔" "وہ بدستور باہر دیکھتے ہوئے بولی "بھروسہ ٹھیک ہے۔"

اس کے انداز میں ایک عجیب سی بے رخی پائی جاتی تھی جو اپنے ہی کی نہیں بلکہ نگلی سے نکل کھاتی تھی۔ میں نے اس روئے کا سب جاننے کی خاطر سوال کیا۔ "کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟"

اس کی نظر چشم زدن میں باہر سے اندر چلی پھر عقب نما آئینے میں ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس نے پوچھا "میں تم سے کیوں ناراض ہوں کی وجہ ان آخر نے مجھے پناہ دے کر جو سکی کی ہے میں اس کے لیے تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے احسان نہیں تنگی کی بات کی ہے۔" "چلو تم اسے سنی ہی سمجھو۔" میں نے کہا "لیکن اتنا تو بتا دو کہ تمہارا انداز کیوں بدلا ہوا ہے؟"

وہ تالنے والے لہجے میں بولی "وہ جان! میرے انداز کو کچھ نہیں ہوا۔ شاید یہ حالات کا اثر ہے۔ گزشتہ رات فرید پاشا کی کوٹھی پر جو مجھ پیش آیا میرے ذہن میں اس کی خوب نکال بادی ابھی تک بسی ہوئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے جب دیکھا کہ وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں تو تائیدی ضروری تھی "میں بھی ان مناظر کو بھول نہیں پایا ہوں۔ علم و برہمیت کی اس مثال کو

بھلانا آسان نہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافی کیا "اور یہ سب کچھ اصلی کرداروں کے ساتھ ایک ایسے فیصلے کی کوٹھی میں پیش آیا جو ظلم اندیشی کا ایک معروف اور کامیاب پروڈیوسر ہے۔"

اس دوران میں صدف بالکل خاموش بیٹھی رہی میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب میں زرگل کے ساتھ گفتگو کر رہا ہوتا تو صدف ج میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

علامہ اقبال روڈ پر گاڑی آئی تو منہ ہمارے پیچھے رہ گئی۔ میں نے زرگل سے کہا "قسمت کی تم نظر لینی بھی بعض اوقات رکب دکھاتی ہے۔ میں تمہارے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن باوجود کوشش کے بھی میں اس کام کے لیے موقع نہ نکال سکا۔"

"وہ ذمہ داری مجھ میں بولی "وہ جان! تم اس سے کہیں زیادہ ضروری کام میں جو مصروف ہو۔"

میں اندازہ نہ کر سکا کہ وہ طر کر رہی تھی یا حقیقت بیان کر رہی تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا "پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے زرگل؟"

اس نے نظر سے آئینے میں مجھے دیکھا اور بولی "کیا اور؟"

ہمارا ساہمہ سسل سے آدھے پونے کھینے کا باقی رہ گیا ہے۔ میرے ذہن "تک" کے لیے ہم ان پورٹ کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ تم نے کہاں جانے کے بارے میں سوچا ہے؟"

وہ عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا اس کی آنکھوں میں کتنی اتر آئی ہو وہ ایک کھاتی نظارہ تھا کیوں کہ میں ڈرائیونگ پر بھی توجہ نہ رہا تھا۔ دوبارہ جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ کھینے کا تاثر غائب ہو چکا تھا۔ وہ ایک عام سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"کیا تم دونوں کو اپنی کراچی جا رہے ہو؟" "اگر تمہیں یقین نہ ہو تو میں کلٹ دکھا دیتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولی "مجھے تمہاری زبان پر پھر دوسرے دراصل یہ سوال میں نے اس کو مقصد سے کہا تھا۔"

میں نے پوچھا "کس مقصد سے؟"

اس کا بدلا ہوا انداز اور توجہ مجھے انجمن میں ڈال رہے تھے۔ اس نے جواب دیا "میں بھی تم لوگوں کے ساتھ کراچی جانا چاہتی ہوں اس لیے تمہاری ضرورت تھی۔"

بالآخر اس کے دل کی بات زبان پر آئی تھی۔ میں کافی دیر سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش کو پورا کرنا میرے بس میں نہیں تھا اس لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا "کیا وہاں جدان! تم چپ کیوں ہو گئے کیوں نہیں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟" "نہیں تمہاری بات تو غلط نہیں۔" میں گڑبڑا کیا "لیکن میں..... بھلا تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"گو یا دوسرے رشتوں میں تم یہ کہنا چاہتے ہو مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتے؟"

"اس میں میرا کوئی اختیار نہیں زرگل۔" میں نے کہا "جس فلاح سے ہم جا رہے ہیں اس میں تمہارا جانا ممکن نہیں۔"

"اس ناممکن کی کیا وجہ ہے؟" اس نے پوچھا۔ "جہاز اور لوڈ ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

میں نے کسی بہانے یا غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ جس فلاح سے ہم جا رہے تھے وہ اپنی اور لوڈ تھی۔ جنگل انجمنی والے نے مجھے صوبہ مال سے پوری آگاہ کر دیا تھا۔ نئے ٹکٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بہت سے چانس ٹکٹ بھی ڈراپ ہو جاتے زرگل کو ہم اپنے ساتھ لے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ الا یہ کہ صدف اس سفر سے باز آجاتی تو زرگل اس کے ٹکٹ پر سفر کر سکتی تھی۔ ڈومینک فلائش میں نام کی تبدیلی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اور ہماری سہیل بھی مکرم نہیں لیکن صدف کیوں کر ڈراپ ہوئی! یہ ناممکن سے بھی زیادہ ناممکن بات تھی۔

میرے جواب نے زرگل کو کمری سوچ میں پھنسا دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس سوچ میں ادھیڑ بن کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اس نے کل کہ میں اس سے کوئی بات کرتا اس نے مجھے مخاطب کر لیا۔

"وہ جان! گاڑی روکو!"

یہ جملہ اتنا اچانک اور غلاف توقع تھا کہ میں اور صدف بیک وقت حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا "تم گاڑی کیوں روک رہی ہو زرگل؟"

"میری منزل آگئی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"منزل!" میں سٹ پٹا گیا "کیا یہ کوئی پتلا ہے یا تقریبی مذاق؟"

وہ بات لہجے میں بولی "میں نے اپنی منزل کی بات کی ہے اپنا آئی میں اسٹ۔"

جملہ کا آخری حصہ اس نے انگریزی میں ادا کیا تھا اور اس میں ایک حکم پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے گرجہ جٹ ہونے کے بارے میں مجھے پہلے بتا چکی تھی۔ پیٹھے بٹھائے زرگل نے جو توروں پر لے تھے وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے غصہ سے ہونے لگے میں اس سے پوچھا۔

”تمہاری منزل اچانک کہاں سے آگئی؟“

”زندگی میں سب کچھ ترتیب وار یا منصوبہ بندی سے نہیں آتا جدان!“ وہ خواب ناک لہجے میں بولی، ”بلکہ زیادہ تر واقعات اچانک ہی رونما ہو جاتے ہیں۔“ پلیر، گاڑی روک دو مجھے جانا ہو گا میری منزل مجھے لگا رہی ہے۔“

اس کی سر پر پائتیں سن کر میں جھنجھلا گیا اور میں نے ٹوپیٹا کر دلا سڑک کے کنارے روک دی۔ زرگل نے ہمیں ”اللہ حافظ“ کہا اور اپنی سائیکہ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گئی پھر پلٹ کر پیچھے دیکھے بغیر وہ ایک سمت میں تیز قدم اٹھانے لگی۔

اس کا رخ فورٹریس اسٹیزیم کی جانب تھا۔

”عجیب لڑکی ہے!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ صدف نے کہا، ”لڑکیاں تو عجیب ہی ہوتی ہیں وجدان!“

”کیا تم بھی کوئی ایسا ہی سین دکھانے والی ہو؟“

وہ گہری سنجیدگی سے بولی، ”اگر تم میرے ساتھ وہی سلوک کرو گے جو زرگل کے ساتھ کیا ہے تو میں بھی اس بارے میں سوچ سکتی ہوں۔“

”کمال ہے بھئی۔“ میں نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا، ”میں نے زرگل کے ساتھ کون سا بر سلوک کیا ہے؟“

”وہ کراچی جانا چاہتی تھی۔“ صدف نے کہا، ”چلو ہماری فلائٹ سے نہ سبکی بعد والی کسی فلائٹ سے آ جانی لیکن تم نے تو اسے دودھ کی مٹی کی طرح نکال باہر کیا!“

”میں نے نکال باہر نہیں کیا۔“ میری جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہو گیا، ”گاڑی اس نے روک لی تھی۔ نا دور شاہی حکم سے۔“

پتا نہیں اسے کون سی منزل لب سڑک نظر آگئی تھی اور دیکھا تم نے“ میں نے ایک لمحے کو توقف کیا اور اسی سے ہوئے انداز میں کہا، ”وہ لو اب زادی گاڑی سے اتر کر فورٹریس اسٹیزیم کی طرف گئی ہے۔ معلوم نہیں وہ وہاں اپنے کون سے نئے کا مظاہرہ کرنے گئی ہے!“

زرگل کے انتہائی نامعقول رویے نے مجھے کوفت میں جلا کر دیا تھا اور میں اس وقت خاصا غصیلیا ہور ہا تھا۔ صدف نے کہا، ”وہ جدان! تمہارے کمرے جواب کے بعد وہ بھی کر سکتی

تھی۔ اللہ کے بندے، کسی کی امید کو اس بری طرح سے ذبح نہیں کرنا چاہئے۔“

”امید!“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا، ”تم کس امید کی بات کر رہی ہو؟“

وہ غہری بولی آواز میں بولی، ”وہ امید جو زرگل نے تم سے لگائی تھی۔ وہ کسی سیر و تفریح کے لیے تو کراچی نہیں جا رہی تھی۔ وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے وجدان! تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے بڑے اچھے جذبہ بات دیکھے ہیں۔“

”اور ان جذبات کو اب تم زبان دے رہی ہو!“

”میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔“

”تو مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟“

”تم اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔“ صدف اتنی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی کہ میں چانچ نہ سا دوہا دینی سمجھ رہی تھی یا یہ بھی مذاق کا کوئی انداز تھا۔ ”چلو اس فلائٹ سے نہ سبکی کسی اچھی فلائٹ سے وہ کراچی آ جاتی۔ تم اسے کچھ رقم فراہم کر سکتے تھے کراچی میں اپنے ٹھکانے کا پتا بتا سکتے تھے تاکہ اسے تم تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور کم از کم اسے منہاس باقر کے تمام فون نمبرز تو لوٹ کر وہی دیتے تاکہ وہ تم سے یہ آسانی رابطہ کر سکتی لیکن۔۔۔۔۔“ وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر عقب نما آئینے میں مجھے دیکھنے لگی اور کہا، ”تم نے تو اس بری طرح اس بے چاری کی دل شکنی کی ہے کہ وہ کسی ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے اپنے گھماں دل کی کرچیاں شمار کر رہی ہوگی اور اگر وہ آنے والی رات تک زندہ رہی تو پھر آج سے اختر شماری کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

”بس بس صدف!“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا، ”میرے پاس ان چونچلوں کی فرصت ہے اور نہ ہی میں ایسا شوق رکھتا ہوں“ پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا، ”مجھے یہ کرنا چاہئے تھا مجھے وہ کرنا چاہئے تھا۔۔۔۔۔ اوہہ!“

صدف نے ہمت نہ ہاری اور کہا، ”وجدان! یہ فرصت اور شوق کی بات نہیں بلکہ عجیب لڑکیاں تو یہی چاہتی ہیں اور زرگل کو تم عجیب لڑکی نامزد کر چکے ہو۔“

صدف کے پیچہ امرا کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کے چنگی لی، ”کیا میں نے واقعی زرگل کے ساتھ بدسلوکی کی ہے؟“

”اور نہیں تو کیا!“ اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔

”تمہیں اس پشتون دوشیزہ سے بڑی ہمدردی ہے!“

”پشتون دوشیزہ کا کیا سوال!“ اس نے کہا، ”دنیا کی ہر

عورت کو دوسری عورت سے ہمدردی ہوتی ہے۔“

”یہ میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔“ میں نے متلانا انداز میں کہا، ”پھر تو واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس صورت حال میں مجھے زرگل کا دل توڑنے کے بجائے یہ کرنا چاہئے تھا۔“

وہ چونک کر نظر سے مجھے دیکھنے لگی، ”یہ کیا وجدان؟“

میرے ادا کیے ہوئے لفظ ”یہ“ نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کہا، ”میں اس کے آسمان اور سیدہ حاصل یہ تھا کہ میں تمہارے گٹ پر زرگل کو کراچی لے جاتا۔“

”کیسے ممکن ہے؟“ بے اختیار اس کی زبان سے پھسل گیا۔

میں نے کہا، ”دنیا کی ہر عورت دوسری عورت کی ہمدرد ہوتی ہے۔ پھر ممکن اور ناممکن کیا ہوتا ہے۔ کیا تم زرگل کے زخمی دل پر رحم لگانے کے لیے اسے اپنا ٹکٹ نہیں دے سکتی ہو؟۔۔۔۔۔ اور تم تو ایک ڈاکٹر بھی ہو۔ تمہیں ایسی سیاحتی زیادہ زیب دیتی ہے!“

”گاڑی روکو وجدان!“ وہ جھمکانا انداز میں بولی۔

میں نے پوچھا، ”کیا تمہیں بھی سرراہ کوئی منزل نظر آگئی ہے؟“

”ایسی ہی بات ہے۔“ وہ جلدی سے بولی، ”گاڑی کو روک دو۔“

میں نے حیرت اور الجھن کے طے طے احساسات کے ساتھ ایک مرتبہ ٹوپیٹا کر دلا سڑک کے کنارے روک دیا۔ صدف نے اپنی جانب کا دروازہ کھولا۔ گاڑی سے باہر جانے کے بعد اس نے بڑے اطمینان سے دروازہ بند کیا۔ میں سانس روک کے اس کی ایک ایک جنبش کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ بڑی نفاس سے چلتے ہوئے ایک ادا کے ساتھ گاڑی کی دوسری جانب پہنچی اور پھر ایک جھٹکے سے پیچہ زیت والا دروازہ کھول کر میرے پہلو میں آ بیٹھی۔

”اب میں اپنی منزل کے بہت قریب آگئی ہوں۔“

اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور ڈیڑا سکرین کے پار دیکھنے لگی۔

میں حجب نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کسی سنگی بت کے مانند گاڑی سے باہر سڑک کو نکلتی رہی تھی۔ بالآخر میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”اب سمجھا دنیا کی ایک عورت دوسری عورت سے کس طرح اظہار ہمدردی کرتی ہے!“

”میں اس وقت قلنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ

سادگی سے بولی۔

میں نے ریست واپ پر نگاہ ڈالی اور گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے سمجیر آواز میں کہا، ”صدف! تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو اعلان فرمایا ہے اس کی اہمیت کا احساس ہے تمہیں؟“

”پوری طرح احساس ہے۔“ وہ حتی لہجے میں بولی، ”میں نے یہ اعلان بہت پہلے فرمادیا تھا۔ خیال کو احساس میں اور احساس کو الفاظ میں اب ڈھالا ہے۔“

تھوڑی دیر پہلے میں زرگل کے رویے پر خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔ صدف کے اس نئے پتھر نے مجھے حد درجہ سنجیدہ کر دیا۔ میں نے سوچا آج اس سے دو ٹوک بات ہوئی جائے۔ میں نے حتی الامکان اس موضوع سے بچنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا خیال ہے اب وقت آ گیا تھا۔ میں بعد میں کوئی بات اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتا تھا۔

”صدف! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا، ”تم ایک بچی اور جاں نثار دوست ہو تم نے بارہا بت کیا ہے کہ میری خاطر تم بڑے بڑے نقصان بھی برداشت کر سکتی ہو۔ یقیناً چلو تمہیں زندگی کے کسی مرحلے پر اگر میری جان کی ضرورت پیش آگئی تو میں ایک لمحے کی دیر نہیں کروں گا لیکن۔۔۔۔۔“

میں جملہ ادھر اچھوڑ کر اپنے سامنے پھیلی ہوئی وسیع و عریض سڑک کو دیکھنے لگا۔ اس نے میری جانب دیکھے بغیر پوچھا، ”تو؟“

اس ”تو“ میں ان گنت سوال پوشیدہ تھے۔ میں نے حناط الفاظ کا استعمال کیا اور کہا، ”تمہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ میری منزل کون ہے!“

وہ ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر مجھے دیکھنے لگی، ”جانتی ہوں“

تمہاری منزل کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔“

”پھر بھی؟“ میں نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

”ہاں پھر بھی!“ اس کے لہجے میں کسی چٹان ایسی سختی تھی ”وجدان! اگر اس وقت تمہاری منزل تم سے دور ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”میں نے تمہیں کب قصور وار ٹھہرایا ہے صدف؟“

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی، ”کیا میں نے کسی کوئی ایسی کوشش کی کہ تم اپنی منزل تک نہ پہنچ سکو۔ بتاؤ میں نے تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالی؟“

”تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔“ میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر کہا ”میں نے تم سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”پھر اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم مجھے قدم قدم پر یہ احساس دلاتے پھر وہ تم کسی کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ اس حوالے سے میں تم سے زیادہ کئی ہوں ودھان۔“ اچانک اس کی آواز میں تقاضا کا احساس شامل ہو گیا۔

میں نے چونک کر ایک نظر اسے دیکھا اور دوبارہ ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

صدف نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا ”تم کافی دلوں سے اپنی منزل کی تلاش میں ہو اور اس تلاش میں میں بھی تمہارا بھرپور ساتھ دے رہی ہوں۔ ہماری کوششوں میں کسی کی یا کوئی بات کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تمہیں ابھی تک کوئی واضح کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ دوسری طرف میں ہوں۔“

اس نے بڑے متنی خیز انداز میں جملہ نامکلم جھوڑا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی ”میں نے اپنی منزل کو تاکا اور اس کے تعاقب میں لگ گئی۔ نتیجہ خاصا مفید اور حوصلہ افزا بنا۔“

وہ جس قسم کی باتیں کر رہی تھی اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں تھی بلکہ مجھے خاموش رہنا پڑا۔ صدف نے بیٹنے والی گفتار استعمال کی تھی اس کے بعد کسی اہم یا غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مجھے والے کے لیے تو صرف ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ تو میں نا سمجھ تھا اور نہ ہی صدف نے محض ایک اشارے پر اکتفا کیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فریہ پاشا اور منہاس باقر کے الفاظ حقیقت کا روپ دھار کر مٹی میدان میں اتر آئے ہوں۔ خاص طور پر پاشا کی پیش گوئی محض شکل اختیار کر چکی تھی۔ ایک ہیرو اور دو ہیروئن والی فلم کا آخر کیا!

میں اس وقت ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک عجیب سی صورت حالات سے گزر رہا تھا۔ بات نہیں کہ میں صدف کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی بہت پیاری اور نازنین۔ صدف میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ درخوب صورت اور خوب سیرت تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مستقبل کی ڈاکٹر تھی۔ ایک معزز اور صاحب ثروت خاندان سے اس کا تعلق تھا لیکن میرے گریز کے صرف دو اسباب تھے اور ان اسباب میں سے صدف نے از خود ایک کو

ختم کر ڈالا تھا۔ میں ساحل پر کسی کو فیت دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کی برابری مجھے گوارا تھی۔ میرے دل کا خاندان متعلق صرف اور صرف ساحل کے لیے مختص تھا۔

انسان زندگی میں کسی ایک ہی سے صرف ایک مرتبہ ہی عشق کرتا ہے۔ محبت ایک سے زیادہ افراد سے بھی کی جاسکتی ہے۔ صدف نے تو مجھے ہر قسم کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ تو اپنی چاہت کے بدلے مجھ سے چاہت کی طلب گار بھی نہیں تھی۔ ایسے کمرے جذبات اور سچے احساسات کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی محبت میں کچھ بانٹتے نہیں ان کے جذبے سے ٹکرانے والا پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ایسے ایثار پرست اور قربان فطرت لوگ قابل ستائش ہوتے ہیں!

صدف کو خود سے دور رکھنے کا دوسرا سبب بالکل سامنے کی بات تھی۔ زندگی کے عملی تجربے نے مجھے بتایا تھا آج تک جو بھی لڑکی میرے قریب آئی اس کا سکھ چین چھن گیا۔ میری خاطر اور مجھ سے دوستی کی یادداشت میں اسے زیت کی ہر تکلیف سے گزرتا پڑا۔ اس سلسلے میں ایک طویل فہرست ہے۔ تھائی ڈانک جاگنی دیوی، سونیا، رانی روپ متی، کوشلیا، ساحل، ممتاز اور..... ان میں بعض تو میری دوستی کے جرم میں جان سے گزر گئیں۔ ساحل ایک ایسی لڑکی تھی جیسے میں بھی ٹوٹ کر جا رہے تھا۔ مجھے اس سے سچا عشق تھا۔ اس کا حصول میری زندگی کا نصب العین تھا۔ ساحل کی جدائی نے میرے اندر اتنا دھواں بھر دیا تھا کہ ساحل پسینا دھو کر بھی گئی تھی۔

صدف میڈیکل کے فائل ایئر میں تھی۔ چار ماہ بعد وہ ڈاکٹر بن جاتی لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا اگر وہ مجھ سے الگ ہو کر بڑھائی پر توجہ دیتی جس کے امکانات ہر گزرتے دن کے ساتھ محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے تھے۔ اگر میں اس کی خواہش کی خاطر اپنا بے کسی متھد سے اسے ساتھ لگائے رکھتا تو یہ میری خود غرضی ہی نہیں بلکہ بہت بڑی حماقت بھی ہوتی۔ اسے ہر حال میں اپنی تعلیم کو مکمل کرنا چاہیے تھا۔

صدف خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے احساسات سے آگاہ نہیں تو تم غلطی پر ہو۔ چلو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ میں تمہاری منزل ہوں تو کیا تم ہر وقت اپنی منزل پر ہی ٹھہری رہنا چاہتی ہو؟“

”ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے!“ وہ دھڑا سکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”میں نے تمہاری بات کی ہے صدف!“

”اتفاق سے میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔“

میں اس مشکل لڑکی کے جواب میں پھنس کر رہ گیا۔ منطقی طور پر اور خلفاند انداز میں اسے کوئی بات سمجھانا ممکن نہیں تھا۔ وہ صرف جذبات کی چال میں آسکتی تھی۔ میں نے اس کی بہتری اور بھلائی کی خاطر آخری کوشش کی اور کہا۔

”صدف! کیا تم واقعی مجھے اتنا چاہتی ہو؟“

میرا لہجہ اتنا ٹھیکھا تھا کہ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”مجھیں کوئی جوت چاہئے؟“

”تم کیا جوت دے سکتی ہو؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ بولی ”جو بھی تم مانگو۔ میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔“

”جان دینے سے بات نہیں بنے گی۔“ میری سنجیدگی برقرار رہی۔

”پھر تمہیں کس قسم کا جوت درکار ہے؟“

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”صدف! اس بات کو بھلا بایا مٹھ کر اپنا نہیں جاسکتا کہ محبت فرماں برداری کا دوسرا نام ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے حکم کی تعمیل کو اپنی مصراع سمجھتا ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کا سوال نہیں کرتا کیوں کہ وہ جوت محبت ہے۔“

”میں تمہارا پیچھے نہیں رہی ہوں۔“ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا ”تم آخر کہا کیا چاہتے ہو کیا میں نے تم سے کسی نوعیت کی تاثر یا کسی کی ہے؟“

”تاثر اس کی تو بہت تو اس وقت آتی جب میں تمہیں کوئی حکم دیتا۔“ میں نے متنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”تو یہ نوعیت کب آئے گی کہ جب میں اپنی چاہت کو ثابت کر سکوں گی؟“

”تم جاو تو کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔“

”میں جا ہوں گی ابھی آ جائے!“

صدف کا انداز دو ٹوک تھا۔ جذبات کی شدت کے سبب اس کی آواز میں لرزش کی آمیزش تھی۔ میری دانست میں لوہا گرم ہو چکا تھا۔ اور چوٹ لگانے کے لیے یہ مناسب وقت تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

”ودھان! اس سوچ میں پڑ گئے۔ حکم دو تاکہ میں اپنی فرماں برداری کا ثبوت پیش کر سکوں۔“

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”صدف! میں جانتا ہوں تم سب سے پہلے اپنی تعلیم کو مکمل کرو۔“

وہ ٹھک زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”یہ کہیں تمہاری کوئی

چال تو نہیں؟“

”ہرگز نہیں!“ میں نے قطعیت سے کہا۔

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”ودھان! چودہری نوازش علی نے تمہاری منزل ساحل کو تم سے دور کر رکھا ہے اور تم اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کسی طرح کشت و خون کے بازار گرم کیے ہوئے ہو اس کا اندازہ تمہیں یہ بخونی ہو رہا ہوگا۔ میاں زادہ سینکس خٹا کے متحدہ آدی کبیر شاہ فیصل اور چودہری دلدار عسرت ناک انجام سے دو چار ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو توقف ہوئی پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولی ”ودھان! میں اس وقت اپنی منزل پر کھڑی ہوں۔ ایک بات ذہن میں ابھی طرح بٹھا لو اگر کسی نے فریب یا چال بازی سے مجھے منزل سے یا منزل کو مجھ سے دور کرنے کی کوشش کی تو میں قہر میں کر اس پر ٹوٹ پڑوں گی۔ اور تم جانتے ہو میں جو کچھ رہی ہوں ایسا کر کے بھی دکھا سکتی ہوں!“ اس کے الفاظ سے سنگینی چھٹی تھی۔

”میں جانتا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میرے دل میں کوئی چوڑ اور نہ ہی نیت میں کوئی تورا اس لیے میں نے بڑے پراعتماد انداز میں کہا ”تم ٹھہر کر صدف۔ میری طرف سے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی جائے گی اور اگر کسی دوسرے نے یہ جرات کی تو ہم دونوں مل کر اس کا تپا تپا کر دیں گے۔“

گازی اتر پورٹ کی عمارت کے سامنے کھینچ گئی۔ میں نے اپنی رست واضح پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ میرے پاس صرف پچیس منٹ کا وقت باقی تھا اور اس دوران میں ہلکا بھلکا ناشتا کیا جاسکتا تھا۔ ہم اتر پورٹ کے ریسٹورانٹ میں جا بیٹھے۔

ناشتے کا آرڈر دینے کے بعد میں سنجیدہ نظر سے صدف کو دیکھنے لگا۔ میں اس مشکل لڑکی سے ٹھٹھکوا ایک نازک مرحلہ طے کر چکا تھا۔ اب بس اختتامِ مکالمے باقی تھے جن کے لیے میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ناشتا آگیا۔ صدف نے مجھ سے پوچھا۔

”ودھان! تم ایسے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو؟“

”تو کیا اس موقع پر مجھے قہقہے لگانا چاہئیں؟“ میں نے خالی خالی نگاہ سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میں نے ہلکی سی شرارت دیکھ لی تھی۔

”قہقہے نہ منی لگاؤ تو تمہیں خوشی کا اظہار ضرور کرنا چاہئے۔“ وہ اپنی شرارت کو بڑی سنجیدگی سے پیش کرتے ہوئے بولی ”اور یہ بتادوں کہ خوش کیوں ہونا چاہئے۔“

”بھئی! میں تمہاری جان جو چھوڑ رہی ہوں۔ چاہے چہر

ماہ کے لیے ہی سہی۔ کراچی پہنچے ہی میں تم سے الگ ہو جاؤں گی اور اس وقت تک تم سے ملنے کی کوشش نہیں کروں گی جب تک میرے فاضل ایکڑ آخر تم نہیں ہو جاتے لیکن! وہ لیکن پر رک کر چند لمحے خاموش رہی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگی "لیکن تم گاہے بے گاہے فون پر مجھ سے رابطے میں رہو گے۔ میرے گھر کا فون میرے گھر کے پاس ہے تم مجھے منہاس باقر صاحب کے تمام نمبرز نوٹ کر دو۔ مجھے امید ہے تم کراچی میں منہاس باقر کے پاس ہی روکے یا جہاں کہیں بھی سفر دو گے اس خبر ہوگی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" "میرا خیال ہے" تم بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔ میں نے تائیدی انداز میں کہا "میں ابھی تمہیں اپنے رابطے کے تمام نمکذہ نمبرز نوٹ کر دیتا ہوں لیکن ایک بات واضح کر دوں کہ میں نے ملاقات پر پابندی نہیں لگائی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے مشن میں شمولیت کے بجائے ایک سو ہو کراچی بڑھائی پر توجہ دو۔ میل ملاقات اگر ہو جائی ہے تو کوئی حرج نہیں البتہ۔" میں نے ذرا رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔

"کراچی پہنچ کر نہیں بلکہ ہم یہیں سے الگ ہو جائیں گے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

میں نے کہا "اگر تم حقیقت پسندی سے کام لو تو اس طرح چپ چپے تمہارا کراچی چلے جانا کسی طور مناسب نہیں۔ تم یہاں اپنے ماموں کے پاس رہنے آئی ہو جن کے حساب سے اس وقت تم کسی گاؤں کی سیر کوئی ہو گی۔ نادیہ کی بات الگ ہے وہ تمہارے رازوں کی اٹین سے لیکن گھر کے دوسرے افراد تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ تمہیں یہاں کے معاملات صاف کرنے کے بعد کراچی جانا چاہئے۔" "تو پھر میں کیا کروں؟" اس کے الفاظ سے ابھین جھلکتی تھی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "صدف! تم اتر پورٹ سے سیدھی اپنے ماموں اور نگ زب خان کے گھر شادمان کالونی جاؤ گی۔ انہیں بتاؤ گی کہ تم گاؤں سے واپس آ گئی ہو۔ پھر جب اور جیسے تمہارا دل چاہے تم کراچی چلی آنا۔ کل برسوں کا جیسا تم مناسب سمجھو۔"

"تمہاری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "اور تم تو یوں تو کر دلا اپنے ساتھ لے جاؤ گی۔

کرنے کے لیے اس کو بھی میں انٹری دی تھی۔ اس کا یہ عمل ظاہر کرتا تھا اس کے مطابق ساحل کو اس کو بھی میں ہونا چاہئے تھا جب کہ ایسا نہیں تھا تو رہا تھا میں کامیاب ہو جاتا۔ یا تو نئی دھواں سے تنگین غلطی ہوئی تھی یا پھر اس کا دائرہ کار محدود تھا۔ یہ شخص میرے لیے ایک مسلسل انجمن کا سبب بن کر رہ گیا تھا۔

پورڈنگ کے بعد میں جہاز میں کچھ کر جب اپنی سیٹ پر بیٹھا تو ایک بار میرا دھیان صدف کی طرف چلا گیا۔ میرے برابر میں ایک موٹا تازہ ہٹا کٹا شخص برعکس کر بیٹھا تھا۔ اگر صدف کا سفر جاری رہتا تو اس موٹے کی جگہ وہ نظر آتی۔ شاید وہ کوئی چانس ٹکٹ والا تھا صدف کے ڈراپ نے مجھے وہ موقع فراہم کر دیا تھا۔

لاہور سے کراچی کے درمیان لگ بھگ اسی منٹ کی فاصلت ہے۔ میں نے اس وقت کا بیش تر حصہ آنکھیں بند کر ساحل، فیصل اور صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔ فیصل ایک لیا سہرہ تھا جس کی چچی تلی چال مجھے ساحل تک پہنچا سکتی تھی اور یہ شخص بلاشبہ صدف کی کوشش سے میرے ہاتھ آیا تھا۔ یہ لڑکی اپنی جان کو جو حکم میں ڈال کر مجھے اتنا زبردبار کر رہی تھی کہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ڈر لگنے لگا۔

صدف ایسی ضدی، مستقل مزاج اور شدت پسند لڑکیاں بڑی ثابت قدم اور پرمز ہوتی ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ کچھ بھی!

☆☆☆

شادمان کالونی اتوار کی رات ایک مقامی فائبر اشارہ ہوٹل میں بہ خیر و خوبی انجام پائی۔ میں اس شادی میں پوری طرح شریک تھا۔ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ممتاز سے بھی گپ شپ ہوئی تاہم میں نے اس سے کسی بھی موضوع پر تفصیلی بات نہ کی۔ منہاس باقر نے کراچی پہنچنے سے پہلے ہی میری رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔ میں ہوٹل سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا اس فلیٹ پر پہنچ گیا۔ منہاس باقر کا مستند خاص شہزادہ اعلیٰ مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ یہ وہی چاق و چوبند شخص تھا جس کی معیت میں میں نے گلستان جوہر میں ایک کامیاب آپریشن کیا تھا۔

پچاسی جب ہم مذکورہ فلیٹ پر پہنچے تو رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گزشتہ رات مجھے سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اگرچہ آج شام کے وقت میں نے ایک چھٹی لگائی تھی تاہم وہ بات بھلا نہ ہوگی جو کہ میری نیند کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ شہزادہ اعلیٰ مجھے سے دوبارہ مل کر بہت خوش تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے بہت کی باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن میری آنکھوں میں

بحری نیند نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

"اچھا وجدان! میں اب چلتا ہوں تم آرام کر دو کل تفصیلی بات کریں گے۔"

میں خود بھی سونا چاہتا تھا مگر فطری تجسس کے پیش نظر پوچھ بیٹھا "شہزاد! تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تم کوئی اہم بات مجھ سے کرنے والے ہو!"

"ہاں! بات تو اہم ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا "ابھی تک میں نے اس بارے میں منہاس صاحب کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ دراصل وہ شادی کے پگاموں میں اس قدر مصروف ہیں کہ کچھ بات تو یہ ہے کہ مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ورنہ میں انہیں اس سلسلے میں بے خبر نہ رکھتا۔ تم سے بھی تو میری دیر پہلے ہی ملاقات ہوئی ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ شہزاد کے ساتھ میں نے گزشتہ دنوں گلستان جوہر میں ایک "لاسٹ ٹائم آپریشن" کیا تھا۔ لیکن شہزاد نے جس اہم بات کا تذکرہ کیا اس کا تعلق اسی واقعے سے ہو۔ میں نے دلچسپی لینے ہوئے پوچھا "تم کون سی اہم بات ابھی تک منہاس صاحب سے نہیں کر سکتے؟"

"وجدان! میں نے ہفتے کی شام نواد کو دیکھا تھا۔" شہزاد نے نہایت ہی سنجیدگی سے بتایا۔

"نواد!" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "وہی شخص نا جسے ہم گلستان جوہر کے فلیٹ میں بے ہوش چھوڑ آئے تھے؟"

"ہاں ہاں وہی" اس نے اثبات میں گردن ہلایا "منہاس صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے آنے کے بعد کسی وقت نواد کو ہوش آ گیا تھا اور وہ جہانگیر کو مل دے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔"

میرے ذہن میں اس رات کا آخری پہر تازہ ہو گیا جب منہاس باقر کی نشان دہی پر میں نے اور شہزاد نے گلستان جوہر کے اس فلیٹ پر دھوا بولا تھا۔ ہمارے ہاتھوں نواد اور جہانگیر نا ہی ان دو افراد کی اچھی طرح درگت بنی تھی۔ ازاں بعد میں جہانگیر کو اپنے حق میں ہتھوڑ کر کے چھوڑ آیا تھا۔ اس نے میری وفاداری اور دوستی میں سی ایف کے کے بہت سے اہم رازوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔ میں نے بعد میں منہاس سے درخواست کی تھی کہ وہ جہانگیر کو اپنے پاس نہ دے کیوں کہ نواد کی روپوشی کے بعد اس کی جان کو ہزار ہا خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ وہ دونوں سی ایف کے کے لیے کام کرتے تھے اور "لیٹر" کے پاس سلیم واسطی سے انہیں ہدایات ملتی تھیں۔

میں نے ٹیلی فون پر منہاس باقر کو جھانگیر کے تازہ ترین حالات کے بارے میں بتایا تو فواد کا تذکرہ بھی ہوا تھا یہ الگ بات ہے کہ جھانگیر اس تک پہنچ ہی نہیں سکا۔ میرا اور منہاس کا مشترک خیال یہی تھا کہ سی ایف کے نے جھانگیر کو ٹھکانے لگوا دیا ہوگا۔ جھانگیر نے مجھے تنظیم کے بارے میں جتنا کچھ بتا دیا تھا اس کے بعد وہ سی ایف کے کے لیے کسی خالی کارٹس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اسے پہلی فرصت میں ختم کر دیتے کیوں کہ اس وقت شعیب غوری میرا سچا بھروسہ دار و گہرا دوست بنا ہوا تھا۔ جھانگیر نے شعیب غوری اور اس کی سازشی تنظیم سی ایف کے کو بری طرح بے نقاب کر کے اپنے تابوت میں آخری میل ٹھوک دی تھی لیکن اب تو حالات خاصے بدل گئے تھے۔ شعیب غوری محل کر میرے دشمن کی حیثیت سے سامنے آ چکا تھا۔ بہر حال فواد کا مہل پر آنا واقعی بہت اہم تھا۔ میں اس کی دم سے نادیدہ طور پر ہاتھ پھیلے تسلیم واسطی اور پھر ان کے بگ پاس شعیب غوری تک رسائی حاصل کر سکتا تھا جو اس وقت میرا خصوصی ڈارگٹ تھا کیونکہ میری وگب جان اس کے خنجر کی دھار تلے ڈوبی ہوئی تھی۔

شہزاد علی ایک تک مجھے سوچتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے لگاتی دہنی کرجب بازی کے بعد اس سے سوال کیا ”تم نے فواد کو کہاں دیکھا ہے؟“

”گارڈن ایسٹ کے علاقے میں۔“ اس نے جواب دیا ”وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی سیڑھیوں میں مجھے دکھائی دیا تھا۔ اتفاق سے میں بھی اسی بلڈنگ سے نکل رہا تھا۔ اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی اس لیے لفٹ کے بجائے آمد رفت کے لیے زینے کا راستہ استعمال ہو رہا تھا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا تھا؟“

”میرا خیال ہے نہیں۔“ وہ پورے وثوق سے بولا ”میں ایسے رخ پر تھا کہ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑ سکی ورنہ وہ مجھے دیکھتے ہی ٹھنک جاتا۔ گلستان جو ہر دالے علاقے کے بعد وہ میرا صورت آشنا ہو چکا ہے۔“

میں نے پوچھا ”تم نے جس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا ذکر کیا ہے فواد اس میں رہائش پذیر ہے یا وہ کسی سے ملنے کے لیے وہاں گیا تھا؟“

”ابھی تک یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔“ شہزاد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”دراصل شادی کی مصروفیات نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔ مجھے امید ہے ایک آدھ دن میں میں تفصیل جان لوں گا۔ اس بلڈنگ میں میرا ایک دوست رہتا

ہے جس سے ملنے اس روز میں وہاں گیا تھا اور فواد کی مجھے ایک جھلک نظر آ گئی۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”تم یہ کام پہلی فرصت میں کرو۔ فواد ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اگر ہمارے قبضے میں آجائے تو ہم سی ایف کے کے اندر گھسنے کے لیے بے پناہ راستہ بنا سکتے ہیں۔“

شہزاد نے مجھے بتایا کہ وہ صبح ہی اس مشن پر لگ جائے گا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ گارڈن ایسٹ میں برمنگھم روڈ پر واقع تھی۔ یہ گراچی کا ایک پوش علاقہ ہے اور زیادہ تر یہاں ایک خاص کیڑی کی لوگ آباد ہیں۔ شہزاد رخصت ہو گیا تو میں اس فلیٹ کا سرسری جائزہ لینے لگا۔ جہاں مجھے شہر ایا گیا تھا۔

یہ فلیٹ میں طارق روڈ پر واقع تھا جو دو بڑے ایک ڈرائنگ اور ایک لابی پر مشتمل تھا۔ اس بلڈنگ کے گراؤڈ فلور پر متعدد شاہیں تھیں جن میں ہوزری، گارمنٹس، لمبوسا، پرنٹری اور جیولری وغیرہ فروخت ہوتی تھی۔ طارق روڈ شاہجی کے لحاظ سے گراچی کا خاصا بارونق علاقہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے بھی مجھے یہاں قیام کا موقع ملا تھا لیکن وہ فلیٹ میں روڈ سے ڈراہٹ کر تھا۔ اس فلیٹ کے تصور کے ساتھ ہی

انتہائی روٹی اور میر بخش بھی میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ان دنوں میں سی ایف کے کے پلیٹ فارم پر کام کر رہا تھا اور کچھ عرصہ امتیاز کے اس فلیٹ پر رہا تھا۔ اب وہ رات دن خواب و خیال ہو کر رہ گئے تھے۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور سونے کے لیے بستر پر آ گیا۔ میں نے محوم پھر گراچی طرح فلیٹ کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں رہائش کی ہر سہولت موجود تھی۔ منہاس باقر نے مجھے بتایا تھا کہ اس بلڈنگ کے کچن ایک دوسرے سے کوئی سرد کار رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ یہ میرے جیسے بندے کے لیے ایک مفید اور موڈوں رہائش گاہ تھی کیوں کہ عام طور پر اکیلے رہنے والوں کو نظر میں رکھا جاتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کو بھی گھونٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میرا خیال تھا ”بستر پر گرتے ہی میں گہری نیند میں پہنچ جاؤں گا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور میرا دھیان آپوں آپ رکھاں والی کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ رات کے آخری پہر میں نے وہاں کے جامع عمر ران چوہدری لواز علی کو پہلا ڈوز دیا تھا۔ اس بات کو نگہ جھک بائیں گھسنے لڑ چکے تھے۔ چوہدری کو جو خطرناک ”مرض“ لاحق تھا اس کا تقاضا تھا کہ اسے دوسرا ڈوز دیے دیا جائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑا اور ٹیلی فون کے پاس آ کر بیٹھ گیا پھر میری انگلی رکھاں والی

میں چوہدری لواز علی کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پہلی ہی گھنٹی پر فون اینڈز کر لیا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس طرف کوئی میرے فون ہی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ پھر اچانک میں مجھے ایک بھاری بھر کم ”ہیلو“ سنائی تھی اس آواز میں اتنی توشلیں آتی تھیں اور اتنی دیوانہ گی تھی کہ میں ہلک جھپکنے میں سمجھ گیا۔ میرا دلچسپ دیرینہ اس وقت انکاروں پر لوٹ رہا تھا۔ فون چوہدری نے خود پیرا کر لیا تھا۔

”اوہو!“ میں نے استہزاء انداز میں کہا ”سارا گاؤں گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہے اور چوہدری ابھی تک جاگ رہا ہے۔“ جتنی ایسے رکھوالے چوہدری کو اللہ ہر گاؤں کو کھٹھ کو دے!“

”تو یہ تم ہو“ وہ ہنسا، ”وہدان! تم تصور بھی نہیں کر سکتے میں تمہارے کتنے ٹکڑے کر دوں گا اور۔۔۔۔۔۔“

”یہ مت بھولو چوہدری کہ تمہارا لوجوان لخت جگر اس وقت میرے رحم و کرم پر ہے۔“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا ”تمہاری یہ بدزبانی اس کے لیے انتہائی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ قدرے معتدل لہجے میں بولا ”فیصل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”میں نے گزشتہ رات تمہیں بتایا تھا کہ میں گراچی میں ہوں۔“ میں نے اس کے زخموں پر ٹھک پاشی کرتے ہوئے کہا ”اس کا بھی مطلب ہے تمہارا سہیوت بھی گراچی میں ہے لیکن چاہئیں تم شہر گئے ہو یا جینے کی فرقت نے تمہارا دامنی لواز ان بگاڑ دیا ہے کہ تمہیں میری بات کا یقین ہی نہیں آ رہا۔“

میرے لہجے سے چوہدری کے لیے انتہائی نفرت اور خفا تھی۔ وہ خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا ”میرا داغی لواز ان اپنی جگہ پر ہے۔ تم جیسے کل کے لوڈے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور میں تمہیں بتاؤں گا چوہدری لواز کس آفت کا نام ہے۔“

مجھے کی شدت سے اس کی آواز کا پ رہی تھی۔ میں نے کہا ”چوہدری! میں تمہارا کچھ نہیں بلکہ سب کچھ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔ تم تازہ ہو یا نہ ہو جاؤ گے۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم خود کو بھی پہچان نہیں پاؤ گے۔“ میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اور مجھے مت بتاؤ کہ تم کون سی آفت ہو۔ میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگوں کے خیر میں گندگی بھری ہوئی ہے جو سل درنسل فیصل تک پہنچی ہے لیکن فکر نہ کرو میں اس غلاط کو مزید پھیلنے کا موقع نہیں دوں گا۔ اگر تم نے

میری بات نہ مانی تو تمہاری نسل یہیں اسٹاپ ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟“

وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا ”تم بہت برا کر رہے ہو وہدان!“

”میں انچھوں کے ساتھ اچھا اور بدوں کے ساتھ ہمیشہ برا کرتا ہوں چوہدری!“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا ”تم اچھے ہیں بچے جن کے رسال کو میرے حوالے کر دوں میں تمہاری نسل کے جھنڈا بردار کو چھوڑ دوں گا۔“

”میں۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں وہ لڑکی اب میرے پاس نہیں۔“ وہ بڑی سرعت سے بولا۔ ”تم شعیب غوری سے رابطہ کرو۔“

”میں اس ٹھک انسانیت کو تو دیکھ لوں گا چوہدری لیکن ساحل تم ہی میرے حوالے کر دو گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”دس کروڑ روپے کوئی مقبول رقم نہیں ہوتی۔ میں تمہیں اتنا بڑا املاؤٹ آسانی سے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔ اس وقت تمہاری آنتیں میرے ہاتھ میں ہیں۔ یاد رکھو یہ ات کہ تمہارے گلے کو بھی آ سکتی ہیں۔ میں فیصل کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ اس رقم میں اتنے پیسے بھی نہیں ہوں گے۔ کیا تمہیں پتا ہے دس کروڑ میں کتنے پیسے ہوتے ہیں؟“

”تم مجھے پہلے ہی بہت نقصان پہنچا چکے ہو“ وہ غصا ہوا ”ڈینس سوسائٹی والی کو بھی جو کچھ ہوا میں اسے بھولنے کو تیار ہوں۔ تم جلد از جلد فیصل کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہیں محاف کر دوں گا۔“ وہ چالاک بڑھا مجھے شکار کرنے کے لیے چارہ بھینک رہا تھا۔

میں نے ایک محکمہ خیر تقبہ لگایا ”چوہدری! اس وقت تم محاف کرنے کی نہیں بلکہ بھگ جانے کی پوزیشن میں ہو۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے تم نے ڈینس سوسائٹی والی کو بھی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کو بھی کے شہر سے تمہیں میری طاقت اور آئندہ عزائم کے بارے میں بتا چل گیا ہوگا۔“

”کبیر شاہ کو میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔“ وہ بھڑے ہوئے لہجے میں بولا ”باقی اس کو بھی میں کچھ بھی نہیں بچا۔ ملازم ہماری نظر میں کیڑے کوڑوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتے۔“

اس پچھتی ہوئی صورت حالات میں بھی اس کا کبیر ٹھانصاں مار رہا تھا۔ میں نے نونے دالے انداز میں کہا ”اس کا مطلب ہے چھوٹا چوہدری دلدار بھی۔۔۔۔۔۔“

میں نے مٹتی خیر انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔



چوہدری نواز شعلی کے جواب نے چوہدری دلدار کی موت کی تصدیق کر دی۔ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا ”وہ جان! دیکھ لو تم میں کتنے بڑے نقصان کو برداشت کر رہا ہوں۔ تم اس تباہ کاری اور ہلاکت بخیزی کے بدلے میرے فیصل کو.....“

”کبواس بند کرو“ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی ”تمہیں تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہی ہوگا۔ جب اتنی موثر رقم وصول کی ہے تو اپنے اندر نقصان پہنچے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔ ویسے ایک بات ہے تم شعیب غوری سے جڑنے والی دوستی کو خوب جھگارہے ہو۔ کیا یہ بھی اس بھڑکی رقم ہی کا کوئی کرشمہ ہے؟“

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”تم نے کبیر شاہ کو کسی پرائیویٹ اسپتال میں داخل کر دیا ہے“ میں نے اس کی حالت سے کھینچے ہوئے کہا ”گنتا ہے یہ سب کچھ شعیب غوری کی خوشنودی کے لیے کیا کیا ہے ورنہ اس لوے لنگڑے کبیر شاہ کو تو تم خاموشی سے ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ اس کی موت میرے کھاتے میں رقم ہو جاتی اور تم بھی پرائیویٹ اسپتال کے خرچے سے بچ جاتے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تم سر اسر کبواس کر رہے ہو“ وہ تیز آواز میں چیخ کر بولا ”مجھے کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں اور..... یہ کیا تم نے دس کروڑ روپے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اتنی معمولی رقم تو میرے سوزوں میں رکھی رہتی ہے۔“

”جس رقم کو تم اس وقت معمولی گردان رہے ہو“ میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور کہا ”گزشتہ رات تم اس رقم کے حصول پر غصے میں تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ دس کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ ساحل والی ذیل میں تمہیں بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔ کاش! تمہیں پتا ہوتا کہ یہ معمولی یا غیر معمولی رقم کہاں سے آئی ہے۔“

”میں آم کھاتا ہوں پھر نہیں گنتا“ وہ بے پردائی سے بولا ”شعیب غوری نے وہ رقم کہیں سے بھی حاصل کی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

میں نے دل کا غبار نکالتے ہوئے کہا ”تمہارے لیے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تم بے غیرت درجہ اول ہو۔“

”کیا بک رہے ہو؟“ میرے لہجے نے اسے تھملا کر رکھ دیا۔

میں نے کہا ”چوہدری! شعیب غوری تمہارا جوتا تمہارے سر میں مار کر چلا گیا اور تمہیں خبر بھی نہ ہوئی! بے غیرتی اور بے

حیاتی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی؟“

میں اس موقع پر چوہدری اور شعیب میں پھوٹ ڈال سکنا تھا۔ اپنے دو دشمنوں کو آپس میں لڑانا میں کاروبار ہوتا۔ میری ہم بات نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا پوچھنے لگا۔

”وہ جان! تم بہت گستاخ ہو بلکہ اپنے باپ سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہی ہو لیکن میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا“ تم شعیب غوری کے حوالے سے کیا کہہ رہے ہو۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟“

میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا ”میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا اور اس طرح دوں گا جیسے شوز کی دکان میں جوتا پہنانے والا دیتا ہے لیکن اس سے پہلے میں وضاحت کروں کہ تم بہت بڑے شیطاں ہو یعنی اپنے باپ چوہدری محمد رمضان سے بھی آٹھ دس گز آگے کے شیطاں! میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے اپنی سانس درست کی پھر بات کی تعمیل کرتے ہوئے کہا ”جوئے کی دکان میں جوتا پہنانے کے لیے چمچ لہا ایک چھوٹا سا آلہ استعمال کیا جاتا ہے تاکہ پاؤں کو بہ سہولت جوتے کے اندر بٹھایا جاسکے تمہارا داغ اور اس میں پانی جانے والی کچھ بہت چھوٹی ہے اس لیے میری بات تمہاری عقل میں نہیں اتر رہی..... تو لو سنو!“

میں نے چند لمحات کے توقف کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”شعیب غوری نے تمہیں جوتے کروڑ روپے ادا کیے ہیں وہ ان پچیس کروڑ یعنی چوتھائی ارب روپے کا ایک حصہ ہیں جو سونے کی فروخت سے شعیب نے حاصل کیے ہیں۔ درحقیقت یہ میرا حصہ تھا جو اس نے تمہارے حوالے کر کے ساحل کو ہتھیا لیا تم سے۔“

میں تصور کی نگاہ سے چوہدری کی کیفیت کو بھاپینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری سماعت سے اس کی لڑتی ہوئی آواز گھرائی۔

”تم کس سونے کی بات کر رہے ہو؟“

”جس کے لیے تم پاؤں لے ہوئے چارے تھے۔“

”تت..... تم..... ڈائری دا لے راز.....“ وہ حیرت اور صدمے کی شدت سے اپنی بات کو پورا نہ کر سکا۔

میں نے چمکا کر کار کا کام جاری رکھا اور کہا ”اب آئی نا تمہاری بڑی مت میں میری بات۔ میں بالکل اسی سونے کا ذکر کر رہا ہوں جس کے بارے میں والد صاحب نے اپنی ڈائری میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ انہوں نے سونے کے بنگلے سے میرے ہونے دو تھیلے کہاں چھپائے تھے۔ تم اس ڈائری کے حصول کے لیے سرتاپا زور لگاتے رہے

اور اس کوشش میں تم نے متعدد قتل بھی کر دئے بالآخر شیطاں شیطاں کر کے وہ ڈائری تمہارے پاس پہنچادی لیکن اس میں سے سونے کے راز والے اہم منٹے چھان لیے گئے تھے۔ تم نے اپنے سر سمیت نہ جانے کیا کیا بیعت ڈالا ہو گا چوہدری!“

میں نے ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد چوہدری کو حیرت زدہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ”ان دنوں شعیب غوری کے ساتھ میری گاڑی چمن رہی تھی اور میں اس کی مدد سے سونے تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لہذا میں نے وہ منٹے شعیب کے حوالے کر دیے۔ ہمارے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ وہ سونا چاہے کتنے کا بھی فروخت ہو میں دس کروڑ روپے لوں گا۔ آج سے بیس سال پہلے وہ سونا پانچ کروڑ روپے بابت کا تھا جواب کم از کم پچیس کروڑ کا ہو چکا ہے۔ شعیب نے میرے حصے کی رقم تمہیں دی ہے چوہدری۔ اب آئی سمجھ میں کہ اس نے تمہارا جوتا کس طرح تمہارے سر پر برمایا ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو“ وہ بھڑکی ہوئی آواز میں بولا ”تم ہماری دوستی کو اپنی کسی چال سے خراب کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری سازش کا مایاب نہیں ہونے دوں گا وہ جان!“

”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو تو میں ثبوت فراہم کرنے کو تیار ہوں۔“

”تم اس سلسلے میں کیا ثبوت دے سکتے ہو؟“

”میرے والد صاحب نے سونے سے میرے ہونے کیوں کے وہ دو تھیلے ایک متروک کنوئیں میں چھپے تھے“ میں نے غصے سے لہجے میں بتانا شروع کیا ”مذکورہ کنوئیں ”پاک بھارت“ سرحد کے نزدیک تمہاری زمینوں میں واقع ہے۔ شعیب غوری نے اپنے ایک انگریز دوست مسٹر نیل آرمر کے توسط سے اس کنوئیں سے یہ سونا حاصل کیا ہے۔ اس کنوئیں کے اوپر اب کھیت لہلاتے ہیں۔ میں تمہیں کنوئیں کی درست لائکسن بتاتا ہوں۔ تم میرے بیان کی تصدیق کے لیے اس مقام کو چیک کر سکتے ہو۔“

”تم بہت مکار ہو وہ جان!“ وہ چمکارا ”میں آج شام کو اپنے بھتیجوں میں تھا۔ اگر میری زمینوں میں کھدائی کی گئی ہوگی تو یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک لمحے میں اس دائرے کی مجھے خبر ہو جاتی۔ تم مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔“

میں نے اس کی بے اعتباری کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے متروک کنوئیں کا مکمل وقوع بتایا اور کہا ”شاید تم نے میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے بتایا

ہے نا اب اس مقام پر سرسبز کھیت لہلاتی ہیں۔ وہ متروک کنوئیں تو بہت نیچے کہیں غائب ہو چکا ہے۔ سونا کیوں کے مضبوط ٹھیلوں کے اندر محفوظ کیا گیا تھا اس لیے وہ میلا تک نہیں ہوا۔“

”اوتے جھوٹوں کے سردار!“ چوہدری نے سخت لہجے میں کہا ”اگر وہ کنوئیں زمین کے نیچے کہیں غائب ہو چکا ہے اور اس کے اوپر کھیت لہلاتی ہیں تو پھر شعیب باغیل آرمر نے وہ سونا کس طرح حاصل کیا۔ بغیر کھدائی کے یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو وہ لوگ کوئی جادو فرما جاتے ہیں؟“

میں نے اس کے کھال حصوں پر کیوں پھوڑتے ہوئے کہا ”چوہدری! جو بات عقل میں نہ آئے اسے جادو کا نام دے دیا جاتا ہے۔ میری وضاحت تمہاری کھوپڑی میں اس لیے نہیں آ رہی کہ شاید وہاں داغ نام کی کوئی شے وجود ہی نہیں رکھتی“ میں چند لمحے کے لیے رکا پھر انتہائی تحقیر آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”اوتے لکڑی کے بندر! اس متروک کنوئیں میں کھدائی تو کی گئی ہے لیکن چھپ چھپا کر۔ اس کے لیے سرحد پار تمہارے دمن کی زمین استعمال کی گئی ہے۔ رام پور (امرتسر) کے رام داس کو تو تم بھی طرح جانتے ہو نا؟ اس کا باپ چوہدری کرم داس تمہارے باپ چوہدری رمضان کا گہرا دوست تھا اور اسی دوستی کے نتیجے میں وہ کثیر المالیات سونا ادھر سے ادھر اسمگل کیا جا رہا تھا لیکن تمہاری بد قسمتی کہ..... خیر پھوڑو۔ اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔“

دوسری طرف چندھوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ یہ خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ میری بات چوہدری کی بدھی میں بیٹھ گئی تھی۔ رام پور سرحد پار امرتسر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر رام داس ناکی ایک چوہدری کی محل داری تھی۔

”تمہیں سانپ کیوں سوکھ گیا چوہدری!“ میں نے کھیلے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بیچانی انداز میں بولا ”کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ وہ شہد سونا سرنگ لگا کر اس متروک کنوئیں سے نکالا گیا ہے؟“

”میں بالکل یقینی کہنا چاہتا ہوں“ میں نے تندی انداز میں کہا ”اب حریف تصدیق کے لیے تم میری بتائی ہوئی جگہ کی کھدائی کر دے دیکھ لو۔ تمہارے پاس بندوں یعنی کیڑے کوڑوں کی کمی تو نہیں ہوگی۔“

وہ میرے طنز پر وار کو سمجھتے ہوئے بولا ”تم یہ نہ سمجھو میں تمہاری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ میں اپنی زمین میں کھدائی تو بعد میں کر اؤں گا“ اس سے پہلے میں شعیب

خوری سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

”میں اس کوشش کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ شعیب غوری اس معاملے میں خاصا فعال نظر آتا ہے۔“ میں نے چوٹ کی ”اور یہ تم نے عقل مندی کی بات کی کہ آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔ خدا کے بندے اور شیطان کے چیلے! اگر تمہاری آنکھ بند ہو گئی تو پھر اپنے لو جو ان فرزندِ غار جند کو کیسے دیکھ سکو گے۔ میں نے سن اور دیکھ رکھا ہے جس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے اسے منوں مٹی کے پیچے دبا دیا جاتا ہے۔ کروڑوں کی مالیت کے سونے کی طرح!“

”نے..... فیصل کہاں ہے؟“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ”ابھی تک تم نے اس سے میری بات نہیں کر دائی“ وہ ادھر ادھر کے انتہائی اہم معاملات کو فراموش کر کے اپنے پیچے کا قصہ لے بیٹھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ فیصل چوہدری کی کمزوری تھا جو صدف کی مہربانی سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ چوہدری کے پلائے کا سب سے زیادہ بھاری بات اس وقت میری جانب تھا لہذا میرا ہاتھ اٹھ کر رہا تھا۔ میں اس جھگے ہوئے پلائے کی بدولت بے آسانی چوہدری کو جھکانے اور گھٹنے نیچے پر مجبور کر سکتا تھا۔

میں نے نہایت ہی مطمئن لہجے میں کہا ”چوہدری! اگر اپنے پیچے کی صورت دیکھنا چاہیے ہو تو ساحل کو میرے حوالے کر دو۔ دس کروڑ بھیجی معمولی رقم تو تمہارے موزوں میں اڑی رہتی ہے۔ تم یہ رقم..... حقیر رقم شعیب غوری کے منہ پر دے بارو اور.....“

”تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو دھاند!“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

میں نے ددلوک انداز میں کہا ”کل رات کو فیصل سے تمہاری بات کروادوں گا۔“

”کل رات!“ وہ چل گیا ”میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔“

”میں اس انتظار کی کوئی مدت سے پہلے کے لیے تمہیں ایک آسان ترکیب بتاتا ہوں“ میں نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”تم ابھی سے ایک نوکر کے نیچے بیٹھ جاؤ اور پوری توجہ اس نقشے پر مرکوز کرو کہ تم ایک دیسی مرنے ہو جو اٹھارویں کی کوشش کر رہی ہے۔ اٹھاروا چوہدری کا فریضہ ہے اس لیے باوجود زور لگانے کے بھی تمہاری کامیابی کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ اس..... عقلی مصروفیت“ میں تمہارا

دل لگ جائے گا اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔

”کیسا آئیڈیاز ہے؟“

اپنی بات کے اختتام پر میں نے استفسار کیا تو وہ ہنسنے لگا ”وہ جان! اٹھارے مرنے کا کھیل تو میں تمہارے ساتھ کھیلوں گا اور ایسا کھیلوں گا کہ تمہاری آنے والی سلسلہ ہاتھ لگا کر دیکھے گی۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں ساحل کو مجھے لانا دو“ میں نے برجستہ کہا ”میری سلسلہ اسی سے چلے گی..... لیکن تم میری بات کو سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ کہیں تم مجھے اپنی فرزندگی میں لینے کے خواب تو نہیں دیکھ رہے؟“

”اوہ بھلائی.....“ غصے کی انتہا کو پہنچ کر وہ انگلیں پر اتر آیا ”میں جہیں بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دوں گا۔“

”بشرطیکہ میں تمہارے قابو آ گیا۔“

”اپنی ناپاک زبان بند کر دو۔“

”اوکے!“ میں نے معتدل انداز میں کہا ”دش بویڈ لک چوہدری!“

پھر اس کا جواب سننے میں نے ریسور کو کر پیل کر دیا۔ شعیب کے حوالے سے چوہدری کو بھڑکانا سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر چوہدری واقعی میری توقع کے مطابق سوچنے لگتا تو ان میں پھوٹ پر دستیابی ممکن نہیں تھی لیکن اس سلسلے میں زیادہ پر امید نہیں تھا۔ وہ دونوں شیطان کے چیلے تھے اور بدی کے علم بردار۔ مجھے کچلنے اور نقصان پہنچانے کے لیے وہ ہر محاذ پر کندھے سے گندھا مارا کھڑے ہو سکتے تھے۔ میں ان کا مشترکہ دشمن تھا۔ وہ دونوں اتنی آسانی سے میری باتوں میں آنے والے نہیں تھے لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

کوشش بڑا اطمینان بخش اور امید افزا لفظ ہے جو مجھے ہوئے دلوں کو بھی حوصلہ بخش دیتا ہے۔ کھیر کے آخری انچ میں جب مریض کی زندگی کے دن نہیں بلکہ گھنٹے بھی گنے جا چکے ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر بھیجی اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اسے صد فیصد یقین ہوتا ہے کہ وہ مریض بچے گا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر یہ بھی دیکھ رہا ہوتا ہے کہ علاج بڑھانے کے لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں لیکن وہ اپنی کوشش کو جاری رکھتا ہے کیونکہ کبھی اس کا فرض ہے۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن کوشش کرنا انسان پر لازم۔ خدا کی اس امانت کو بچانے کے لیے آخری سی کوشش کرنا چاہئے۔

میں نے چوہدری کو اڑھائی گھنٹوں سے جھکا اور ہنسنے

لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحات کے بعد مجھے محسوس ہوا ”تھوڑی دیر پہلے چوہدری سے ہونے والی ٹیلی فون گفتگو نے میرے اعصاب میں اچھا خاصا تانہ پیدا کر دیا تھا۔“

میں نے بستر چھوڑ دیا اور قالین پر آ گیا۔ وہ بیڈروم ہوا دار تھا۔ میں نے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے یوگا کا سہارا لیا۔ اس وقت سانس کی کوئی مشق کرنا تو مناسب نہیں تھا لہذا میں نے پرانا نام کوچ نہیں کیا اور تھوڑے یوگ کو آزمانے لگا۔ کول آسن اور مین آسن کے بعد میں نے ہیڈ اسٹینڈ لگایا اور دس منٹ بعد میں دوبارہ بستر پر دروازہ ہنچا تھا۔ اس وقت میرے اعصاب اور اعصاب خاصے فرمانبردار ہو گئے تھے۔ میں نے دو چار گہری سانسیں لیں اور اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دینے لگا۔

”میں نہایت ہی پرسکون“ گہری اور میٹھی نیند سوڑ گئی لیکن اس دوران میں تم جاگتے رہو گے اور ٹھیک جہ جے جے جے تم مجھے ہشاش بشاش بیدار کر دو گے لیکن میری نیند کے وقفے میں اگر اس قلیت کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کا کار پیدا ہوئے تو وقت مقررہ سے پہلے ہی تم مجھے اٹھا دو گے۔“

اس ہدایت کے اختتام پر میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔ انسانی دماغ سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ اگر یہ آپ کی ہدایات پر کان دھرنے لگے تو آپ حرمت انگیز کارنامے انجام دیتے لگتے ہیں اور مجھے یقین ہے بلکہ میرا تجربہ ہے کہ تھوڑی سی پریکٹس کے بعد یہ آپ سے اور آپ کی ہدایت سے مالوس ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد یہ آپ کی ہدایت پر عمل بھی کرنے لگتا ہے۔ خاص طور پر اس نوعیت کی ہدایت کہ میں سودا ہوں اور میرا دماغ جاگتا رہے گا پورے عجیب و غریب اور حیرت آفرین مناظر سے روشناس کرائی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیں۔ لاشعور کی کرشمکاری آپ پر آشکار ہو جائے گی۔

☆☆☆

میرے دماغ نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ میری ہدایت پر عمل نہ کرے۔ میں نے سونے سے قبل اسے تاکہ لیں گی کہ وہ جہ جے جے جے مجھے بیدار کر دے لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا ”کچھ گڑبڑ ہے۔ یکبارگی میری نگاہ یوگا کرکھار کی جانب اٹھ گئی۔“

کلاک میں سوئیاں چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ اس کا بھی مطلب تھا کہ قلیت میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا تھا یا پھر پیش آنے والا تھا۔ میں نے اس خیال کے ساتھ ہی ایک جھکے سے بستر چھوڑ دیا اور بیڈروم میں چاروں طرف نظر

دوڑائی لیکن وہاں مجھے کسی بھی غیر معمولی واقعے کا آثار نظر نہ آئے۔ اس کا بھی مطلب تھا ”قلیت“ کے کسی دوسرے حصے میں کوئی گڑبڑ بھی۔

میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ دلوں بیڈروم ساتھ ساتھ جے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے مختصر سالانہ تھا۔ پھر ڈرائنگ روم آتا تھا۔ میں نے سونے سے قبل دوسرے بیڈروم کا دروازہ بند کر دیا تھا جو ہنوز بند تھا۔ میں نے احتیاطاً اس دروازے کو کھول کر اندر جھانکا اس سے پہلے میں نے اندر کی لائٹ آن کر دی تھی لیکن مجھے وہاں کچھ بھی غلاف معمول دکھائی نہ دیا۔ لاؤنج پر بھی میں ایک طائرانہ نظر ڈال چکا تھا۔ یا کیا ایہ کیا جا رہا ہے؟

اب آ جا کر ایک ڈرائنگ روم ہی بچا تھا۔ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی لاؤنج کے کنارے پر قلیت کا مین دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بھی میں نے شہر اولیٰ کے جانے کے بعد اندر سے لاک کر دیا تھا اور وہ ابھی تک بدستور لاک ہی تھا۔ میں محتاط قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا اور پھر جیسے ہی میں نے دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں قدم رکھا مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نگاہ نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔

ڈرائنگ روم کے بڑے صوفے پر نقلی دھندل بھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر لگا ہوا ہے یہ وہ زہر لب مسکرانے لگا۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے قصہ بھی آیا اور جھجکا ہٹ بھی محسوس ہوئی۔ اس بات پر حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ہند قلیت کے اندر کیسے گھس آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بہرہ پیا جن کمالات کا مظاہرہ کر چکا تھا یہ اس کا عشرِ شیر بھی نہیں تھا۔

جلد ہی میری جھجکا ہٹ اطمینان میں بدل گئی۔ میرے جی میں آئی کہ اچھا ہے یہ ہاتھ آ گیا۔ اب اس سے بھی حساب کتاب ہو ہی جائے۔ دیکھتا ہوں کیا یہ بیٹپتا ہے!

زہر لب اس کی مسکراہٹ قدرے وسیع ہوئی اور آنکھوں میں بھی ایک بڑا بڑا چمک نے جگہ بنالی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرا دماغ بڑھ رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے اس خیال کا ثبوت پیش کر دیا۔

”میں خرید و فروخت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا“ میری ساعت میں خود میری آواز نے سرگوشی کی ”اس لیے تم اس ابھمن میں نہ پڑو کہ میں کیا بیٹپتا ہوں؟“

اس کے انداز نے مجھے اکٹاہٹ میں جھٹکا کر دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا ”کون ہو تم؟“

وہ بدستور جی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر جاتے ہوئے بولا

”میرا نام وجدان ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”تم جھوٹے ہو، فریبی ہو، بہرہ دہ ہو“ میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا ”تم وجدان کس طرح ہو سکتے ہو جبکہ اصلی وجدان تو میں ہوں۔“

وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا ”نہ تم نقلی ہو اور نہ ہی میں کوئی بہرہ دہ یا ہوں۔ ہم دونوں ہی اصلی وجدان ہیں۔“

”تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم بیک وقت اصلی ہوں“ میرے لہجے میں دہشتی اثر آئی ”ہم میں سے کوئی ایک اصلی ہے اور مجھے یقین ہے میں ہی اصلی ہوں۔“

وہ ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”چلو میں تمہاری بات تسلیم کر لیتا ہوں۔ تم ہی اصلی وجدان ہو لیکن یہ راز میرے اور تمہارے درمیان دن ہے دوسرے اس سے آگاہ ہیں اور نہ ہی کوشش کے باوجود بھی اس سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھیں گے تو اصلی وجدان میں ہوں گا اور جب تم پر نظر جائے گی تو مجھیں اصلی وجدان سمجھیں گے۔ میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنی پہچان میں بھی تبدیلی کرتا رہوں گا۔ دیکھ لو آج میرا لباس وہ نہیں جو تم پہلے دیکھتے آئے ہو۔“

میں نے اس کے لباس پر ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ اب غور کیا تو وہ واقعی مجھے دوسرے لباس میں نظر آیا۔ آج وہ سفید سوٹ میں نہیں تھا نہ ہی اس نے سفید بوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ سیاہ چلون اور اسکاٹی بلیو شرٹ میں تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر آنے والا سیاہ چشمہ بھی غائب تھا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ فورڈ بلیو ڈی سرخ لینڈ کرور میں بھی نہ ہو!

”تم بالکل درست سوچ رہے ہو“ وہ میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے بولا۔

”آج میں بائیک پر ہوں۔ میری“ جی بی۔ ہنڈریڈ“ نیچے کھڑی ہے۔ تم چاہو تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھ سکتے ہو۔“

میں بے اختیار کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جب میں نے نیچے جھانکا تو اس کے انکشاف کی تصدیق ہو گئی۔ مین طارق روڈ پر اس کی نیلی بائیک جی بی ہنڈریڈ کھڑی تھی جس کے ہینڈل پر ایک ہیڈلٹ بھی لگا نظر آ رہا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ روڈ غیر آباد تھی۔ اس کی بائیک سے تھوڑے فاصلے پر دو تین گاڑیاں اور بھی کھڑی تھیں جو بھینا اسی پارکٹ منٹ بلڈنگ کے کینوں کی ہوں گی جس کے سینکڑوں گھر میں مقیم تھیں۔

میں واپس اس بہرہ دہ کی طرف چلا اور ایک صوفہ سنبھالتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا ”کیا تم سوچ رہا تھا جانتے ہو؟“

”میں قیافہ شناس اور فیس ریڈر ہوں“ اس نے جواب دیا ”چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا ہوں اور حتی الامکان درست اندازے لگاتا ہوں۔ کسی کے خیالات یا سوچ پڑھنے پر میں قدرت نہیں رکھتا۔“

میں نے تو صیغی انداز میں کہا ”اگر تم محض قیافہ شناس ہو تو واقعی حیرت انگیز ہو۔“

”گویا تم اپنی تعریف کر رہے ہو“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ”نہیں، مجھی! میں تمہاری طرح فیس ریڈر یا پراسرار صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوں۔ تم نے پچھلے چند دنوں میں مجھے جس طرح چکرایا ہے اس سے میں واقعی الجھا ہوا ہوں۔“

”کیا میں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے؟“

”ہرگز نہیں“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”پھر تم مجھ سے اتنے شاک اور برگشتہ کیوں ہو؟“

”میں تم سے شاک نہیں بلکہ تمہاری حرکتوں کے فٹیل میں ایک عجیب سی کوفت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں اپنے فطری تجسس سے مجبور ہوں۔ جب تک تمہاری اصلیت نہیں جان لوں گا مجھے تم پر غور نہیں آئے گا۔“

”اپنی اصلیت کے بارے میں میں تمہیں بتا چکا ہوں“ وہ شہرے ہوئے لہجے میں بولا ”میں وجدان ہوں۔ تم میرے اندر کوئی خالی تلاش کرو۔“

میں نے اسے ٹوٹے والی نظر سے دیکھا اور گھمبیر آواز میں کہا ”تمہارے اندر کی خالی پلانے کے لیے مجھیں اندر تک کھولنا ہوگا۔ مگر نہ کرو میں بہت جلد تمہاری حقیقت تک پہنچ جاؤں گا۔ تم زیادہ دلوں تک مجھے فریب نہیں دے سکو گے۔“

اس کا چہرہ ابھی سا گیا اور آنکھوں میں دکھانے لگا۔ وہ تنگی آ میرے لہجے میں بولا ”وجدان! تمہارا رویہ ٹھیک نہیں۔ میں نے ابھی تک تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی بلکہ تمہیں فائدہ ہی پہنچایا ہوگا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں نے تمہیں ڈارلنگ بتا دی اس لیے تمہارے لیے راہ ہموار کی۔ تم میرے غلوں کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے، انا مجھ پر شک

کر رہے ہو؟“

”تم نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”میں نے جو کچھ کیا تمہاری بھلائی کے لیے کیا۔“

”اگر تم میرے اتنے ہی خیر خواہ ہو تو پھر میری فرما کر مجھے اپنی اصلیت کے بارے میں سچ بتا دو“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غلوں لہجے میں کہا ”کیا تم کوئی اور پانسمان پٹے ہے؟ دیکھو میری معلومات کے مطابق تم اور پانسمان ہم زاد یا جیکر لیف کی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تمہاری معلومات بالکل درست ہیں۔ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”پھر تم کیا ہو؟“ میں نے چکر پوچھا۔

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”میں تمہارا برادر ہوں۔“

”برادر؟“ میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

وہ سرمائی ہوئی آواز میں بولا ”تم نے خود مجھے بیدار کیا ہے اپنی یوگا اور جی کی مشقوں سے۔ تم مجھے جی کی ایک مادی شکل سمجھ لو۔“

میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس پر تو کوئی کچھ نہ تھا۔ پچھلے چند روز سے میں اپنے ساتھ جب و غریب کیفیات کو محسوس کر رہا تھا اور اسے جی کی ایڈوانس مشقوں کا اثر سمجھتا تھا اور اب۔۔۔۔۔ یہ پتہ بھی میرے احساسات کی تصدیق کر رہا تھا۔

میں نے اسے چند واقعات کے بارے میں مختصر بتایا اور پوچھا ”کیا اس میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ وہ جیسی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”میں بعض اوقات تمہارے بہت قریب آ جاتا ہوں لیکن تم مجھے دیکھ نہیں پاتے اور مجھی میں تم سے کچھ فاصلے پر چلا جاتا ہوں جیسا کہ اس وقت میں یہاں موجود ہوں اور تمہیں نظر آ رہا ہوں کیونکہ اس وقت میں مکمل مادی شکل میں ہوں۔ جب میں مادی شکل میں نہیں ہوتا مجھیں دکھائی نہیں دیتا“ تم صرف مجھے محسوس کر سکتے ہو۔“

”تم کب تک مجھ سے چپے رہو گے؟“ میں نے ہزاروں کا اظہار کیا۔

وہ شاک کی نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”تم بہت سنگ دل ہو وجدان میرے لیے ایسے سخت الفاظ استعمال کر رہے ہو جیسے

میں خواہ مخواہ تمہارے پیچھے پڑ گیا ہوں حالانکہ میں تمہاری جی کی مشقوں کے نتیجے میں نمودار ہوا ہوں۔ میں تو ایک ایسی ڈھال ہوں جس سے تم بہت سے فائدے اٹھا سکتے ہو۔“

”مجھے ایسی ڈھال کی ضرورت نہیں جس کے اندر دار روکنے کی مکمل قدرت نہ ہو“ میں نے ایک خاص حوالے سے اس پر زور کیا ”ایسی تکنیکی ہمدردی سے میں ایسے ہی اچھا ہوں۔“

وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا ”تم چوہدری دلدار کی کوشی پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مجھے تنقید کا نشانہ بنارہے ہو؟“

”کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے؟“ میں نے تڑپ سے کہا ”اگر تمہیں معلوم تھا کہ ساحل اس کوشی پر موجود نہیں تو پھر ڈرا سے کیا ضرورت تھی اور اگر تم اس حقیقت سے واقف نہیں تھے تو پھر تمہاری اس معذرت دہشی کا مجھے کیا فائدہ؟“

”میں واقعی یہ نہیں جانتا تھا کہ ساحل کو اس کوشی سے کراچی میں روانہ کیا جا چکا ہے“ وہ غلامت آمیز انداز میں بولا ”انہی میں پکا نہیں ہوا ہوں۔ تم ہا قاعدہ کسی استاد کی گمرانی میں جی کی مشقیں نہیں کر رہے ہو اس لیے میں بعض معاملات میں الجھتا ہوں اور تمہیں بھی مجھ پر تعریف حاصل نہیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے اسے کھورا ”تعریف سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

وہ سادگی سے بولا ”میں تم اپنی مرضی سے مجھے اپنے پاس نہیں بلا سکتے اور نہ ہی اپنے حسب نیت مجھ سے کام لے سکتے ہو۔ میں ایک ایسا جھیل ہوں جو کسی بھی وقت تمہارے جی کی دہی پر ٹیون ہو جاتا ہوں اور اپنی بساط کے مطابق تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے مشتاق لہجے میں استدعا کیا۔ ”تم پر مکمل تعریف حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”کسی ماہر استاد کی زیر نگرانی اگر تم جی کی ایڈوانس مشقیں کر دو یہ اختیار تمہیں حاصل ہو سکتا ہے“ وہ شور و دہنے والے انداز میں بولا ”ورنہ تم اور میں اس معاملے میں یوگنی احوال سے بچ سکتے رہیں گے۔“

”کیا تم اپنی مرضی سے تادی اور مادی حالت میں آ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں“ وہ قطعیت سے بولا ”مجھے اس کا اختیار نہیں ہے البتہ اگر تم میرے شور سے پر عمل کر لو تو یہ قدرت حاصل کر سکتے ہو۔“

میں نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا "میرے پاس سوئے اور کھانے کا وقت نہیں کسی کامل استاد کو کھانے سے تلاش کروں اور پھر اس کی نگرانی میں کب جی کی ایڈوانس مشقیں کروں" کاش میرے استاد محترم ماسٹر بینک پائی آج زندہ ہوتے تو وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ میں نے جی کے بارے میں جو کچھ سیکھا ماسٹر بینک پائی ہی سے سیکھا تھا۔

"آج کے انسان کے پاس ہر کام کے لیے وقت ہے لیکن عبادت ریاضت اور محنت کے لیے اسے فرصت میسر نہیں" میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ قول خود میرا پرتو ہی سے بولا "وہ اگر یہ تیوں یا ان میں سے کوئی ایک یا دو کام کرتا بھی ہے تو ریاضت یا عبادت کے ساتھ۔ دنیا والوں کو کھانے کے لیے معاشرے کی نظر میں حرام اور محض زلفظ آنے کے لیے جبکہ عبادت ریاضت اور محنت کو بھی باطل قرار دیا اور خانہ پرزی کے لیے نہیں کرتا چاہے ان کاموں کی روح سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں اختیار کرنا پڑتا ہے پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ۔ پھر کہیں جا کر فیض حاصل ہوتا ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا "میرے ساتھ تھی ہونے سے پہلے کیا تم کسی یونیورسٹی میں پھر رہتے؟"

"کیا میں نے بھی تم پر اعتراض کیا کہ تم مارشل آرٹس اور یوگا پر لیے لیے بھاش کیوں اور کیسے دے لیے ہو؟" وہ میرے سوال کی د میں بیٹھتے ہوئے بولا "ماسٹر وجدان! میں تمہارا پرتو ہوں۔ تمہاری شکل و صورت، خوب اور عادات و اطوار کی مکمل جھلک مجھ میں موجود ہے۔"

"یار مسٹر پرتو!" میں نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا "تم میرا ایک کام کر دو تو میں زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

وہ اتنجن زندہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا کیوں اس وقت وہ فیس ریڈنگ نہیں کر رہا تھا اور نہ وہ میرے مزاج تک پہنچ جاتا۔ میں نے اسے گونگو کی کیفیت میں دیکھا تو وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"تم میرا اچھا چھوڑ دو اور جہاں سینگ سائیں ادھر کا رخ کرلو۔ مجھے تمہاری مدد یا ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

اس نے برا سامنا بنایا اور گہری سنجیدگی سے بولا "تم نے مجھے اپنی بے سمت مشقوں سے ادھر اور اُٹھائیں کیا ہے۔ میں درمیان میں لنگ کر رہ گیا ہوں۔ نہ با اختیار ہوں اور نہ ہی بے اختیار۔ ادھر کا زمانہ ادھر کا۔ اگر میں کچھ غرض نہ ہی طرح مطلق

رہا تو بہت برا ہو جائے گا جس کا سب سے زیادہ نقصان صرف اور صرف تمہیں ہی پہنچے گا وجدان!"

"مثلاً ایسا کیا ہو جائے گا؟" میں نے متاسفانہ انداز میں پوچھا۔ وہ کبھی لہجے میں بولا "اس کا نکتہ میں نیکی اور بڑی دلوں قسم کی قوتیں کار فرما ہیں۔ سب سے زیادہ غیر محفوظ وہ ہوتا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی" میری طرح حلق ہوتا ہے۔ اگر تم نے پوری سنجیدگی سے باقاعدہ جی کی ایڈوانس مشقیں کر کے مجھے حاصل نہ کیا تو اس بات کے امکانات ہیں بڑی کی کوئی قوت مجھے اپنے چکل میں جکڑ لے۔ پھر میں اس قوت اور حامل ہذا کی مرضی اور اختیار کے مطابق استعمال ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تمہارے دمن مجھے تمہاری مخالفت میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے تم نیکی اور سچائی کی نشانی ہو جبکہ تمہارے دمن بڑی اور عظمت کی علامت ہیں۔"

"تم تو بہت خطرناک باتیں کر رہے ہو؟" میں واقعی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میں حقیقت بیان کر رہا ہوں جو سنگین اور سختی ہوتی ہے۔"

اچانک دل کی بات میری زبان پر آگئی "کیا تم مجھے ساحل کے بارے میں بالکل درست معلومات فراہم کر سکتے ہو؟"

"تمہاری محبوب کے بارے میں میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ تم۔ اس لیے آئی ایم سوری!" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے غلکی آئینہ نظر سے اسے دیکھا اور بیزاراری سے کہا "تم بالکل بے کار آدمی ہو۔ میں اگر جی کی ایڈوانس مشقیں باقاعدگی کے ساتھ کر کے تمہیں اپنے قابو میں نہ لا سکا تو پھر ان مشقوں کو ترک کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے نجات حاصل کر لوں گا۔ میں اس تنہا ذہب اور غیر متنی فضا میں رہ کر نیکی سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔"

اس نے اپنے ہونٹوں کو کچھ اس انداز میں حرکت دی جیسے میری کسی جگہ بات یا حرکت پر طرہ پر مسکرایا ہو۔ میں گہری نظر سے اسے مسلسل دیکھ جا رہا تھا۔ اس کے لبوں کو جنبش ہوتی اور اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا "ذرا اپنے عقب میں توجہ دیکھو!" میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بہرہ دے کی اس بلی حرکت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں ایک جھٹکے سے اس کی جانب مڑا تا کہ اسے کمری کمری

ساکوں لیکن میری یہ خواہش حسرت میں بدل کر رہ گئی۔ وہ صوفیہ میرا منہ چار ہاتھ جہاں ایک لمحہ پہلے میرا پرتو وہ نقلی وجدان بیٹھا مجھ سے مکالمہ کر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار پورے ڈرائنگ روم کو اپنی نظر سے جھان مارا۔ وہ صوفیہ ہی نہیں بلکہ دھرم بھی اس کے وجود سے خالی ہو چکا تھا۔

اسی وقت نیچے مین روڈ پر کسی موٹر سائیکل کے اشارت ہونے کی آواز ابھری۔ میں لپک کر ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکی میں پہنچا اور میری نگاہ نے اس کی رخصت کا منظر پکڑ لیا۔ وہ آفت زادہ اپنی نیکی جی ہینڈ ریڈ پر سوار ہو کر بڑی تیزی سے میرے دوڑنے سے ٹکنا چلا گیا۔

میں اپنے ہاتھوں میں سر کو تھام کر ایک صوفی پر ڈسے گیا۔

میں نے کوئی سیدھی سادی اور پُر امن زندگی نہیں گزاری تھی۔ آٹھ کھولتے اور ہوش سنبھالتے ہی ہنگاموں سے میرا واسطہ پڑ گیا تھا۔ جن کارندوں نے ابتدا سے میری داستان حیات پڑھی ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ سستی خیزی اور ہنگامہ آرائی ہمیشہ میرے ہمراہ رہی ہے۔ کیا کیا فائز اور اپنے فن کا ماہر میرے تہ متاعل آیا۔ بھانت بھانت کے فنڈوں کو میں نے برتا اور پرکھا۔ زندگی کے اس منکھن اور سنگین سفر میں بعض پراسرار شخصیات سے بھی میرا حلق پر باجوبے پناہ شکنوں کے مالک تھے۔ جب پرنٹ ماسٹر بینک پائی کی کوئی ہوش بند و دھرج اور نیلگہری! لیکن اس نقلی وجدان نے مجھے گھما کر رکھ دیا تھا اور یہ کم بخت اپنی عقلیت کا ذمہ دار بھی مجھے ہی ٹھہرا رہا تھا۔ اپنے بقول وہ میرا پرتو بن بیٹھا تھا۔

بہرہ دے وجدان کے بارے میں سوچتے ہوئے ازخود میرا دھیان نیلگہری کی طرف چلا گیا۔ میرے بیان کردہ حجت آئینہ صلاحتوں کے مالک افراد میں نیلگہری ہی باقی رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نقلی وجدان کے پیچھے کہیں نیلگہری کا ہاتھ نہ ہو۔ جب ڈرائنگ روم سے میری زندگی میں داخل ہوئی تھی تو اس وقت بھی ڈرائنگ کی پراسرار حرکات کو دیکھتے ہوئے میں نے نیلگہری کے بارے میں سوچا تھا لیکن ازاں بعد نیلگہری نے اس کی تردید کر دی تھی۔

نقلی وجدان کے حوالے سے نیلگہری کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے جلد ہی اپنا خیال رو کرنا پڑا۔ نیلگہری نے ہمیشہ مجھے ساحل سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی جبکہ نقلی وجدان اس کے بالکل عمل کر رہا تھا۔ اس کے افعال میں نیلگہری کا

دھل نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی بدستوں کی شاہ زادوی نیلگہری نے آخری ملاقات میں مجھ سے دھمکی نما وعدہ کیا تھا کہ وہ اب ازخود میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی۔ مجھے اہالیہ کی کوڈ میں اس کے ممکن تک جانا ہوگا۔

نقلی وجدان کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اتنا ہٹ سی ہونے لگی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں نے یہی سوچا کہ آئندہ جی سے متعلق کوئی مشق نہیں کروں گا۔ اسی طرح خود ہی اس سے جان چھوٹ جائے گی لیکن اسی وقت پرتو کے کہے ہوئے سنگین الفاظ خطرے کی گھنٹی بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر واقعی وہ کسی بڑی کی قوت کے مجھے چڑھ گیا تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ بڑی کی قوت کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے دشمنوں کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتا اور میرے سامنے مصائب کا ایک وسیع و عریض درکھل جاتا پھر میں ساحل اور اس کی تلاش پر توجہ مرکوز رکھنے کے قابل نہ رہتا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور ایک جھٹکے سے صوفی چھوڑ دیا۔ یہ آرام کرنے یا سوچوں میں گم رہنے کا وقت نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیوار پر نصب کلاک میج کے سوا پانچ بج رہا تھا۔ میں اس مہم ارادے سے اٹھا کہ آج ہی سے جی کی ایڈوانس مشقوں کو باقاعدگی سے کروں گا تا کہ جلد از جلد پرتو میرے تصرف میں آ جاتا۔ میں اس سے کوئی کام لیتا کہ نہیں یہ تو بعد میں سوچنے کی بات تھی۔ فوری طور پر کم از کم اتنا تو ہو جاتا کہ وہ دشمنوں کے گھمب میں پہنچنے سے بچ جاتا۔

میں نے داس روم میں دس منٹ صرف کر کے خود کو فریض اپ کیا اور سانس کی مشق کے لیے تیار ہو گیا۔ فضا میں ابھی تک تاریکی کا دبیرا تھا۔ ان دنوں لگ بھگ سو سات بجے صبح سورج طلوع ہوتا تھا۔ یہ وقت سانس کی مشق کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ اس بیڈ روم کی ایک کھڑکی شال کے رخ نیلگہری میں چمکی تھی۔ میں نے وہ کھڑکی داک اور بیڈ روم کے قلابین پوش فرش پر آلتی پالتی مار کر یعنی کنول۔ میں بیٹھ گیا جو چم آسن یا سکھ آسن بھی کہلاتا ہے۔

پرانایام کے فریم کو استعمال کرتے ہوئے میں اس کی ابتدائی مشقیں کر چکا تھا جن میں اشروک برہمچک بھی شامل تھی۔ اب مجھے کچھ اور آگے بڑھنا تھا۔ ماسٹر بینک پائی کی تعلیمات میرے ذہن میں نقش تھیں۔ سانس کی غنی مشق میں مجھے اپنے ایک مخصوص عدد کو بھی کام میں لانا تھا۔ دماغ کے اگلے حصے میں پیشانی کے مین وسط میں پایا جانے والا یہ

مخصوص غدد و پٹیل گینڈ کھلاتا ہے جسے بعض لوگ تیسری آنکھ کا نام دیتے ہیں۔ یہ غدد خیالات کی ترسیل کے لیے۔ جن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو دھرم میں اپنے ماتھے پر عین اسی مقام پر بندیا لگاتی ہیں جس کے عقب میں یہ غدد پایا جاتا ہے۔ اس مخصوص مقام پر لیا گیا یوسا کیس آد اور نشاٹ انگیز احساس کو ختم دیتا ہے۔

پرانایام کے فریم میں کی گئی مشقوں میں سانس کھینچنا اور سانس چھوڑنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے پدم آسن میں رہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور دو چار گہری سانسوں کے بعد مخصوص مشق شروع کر دی۔

”جی“ کا خفیہ قیام ناف کے عقب میں ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کے قریب ہے۔ میں نے اس مقام کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور سانس کھینچ کر اپنے پیٹ کو ہوا سے بھر لیا اس کے بعد میں نے مقام جی پر ایک بھر پور اسٹروک لگا کر سانس کو خارج کر دیا۔ متعدد بار یہ عمل دہرانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جی کے مقام سے حرارت خارج ہو رہی ہو۔ یہ کچھ اس قسم کا احساس تھا جیسے کسی بجلی کے اندر رکھا ہوا لوہا گرم ہو رہا ہو۔ جب اس ”لوہے“ کی پیش مجھے پورے پیٹ میں محسوس ہونے لگی تو میں نے سانس کا متبادل نظام قائم کر دیا۔ اب میں ہوا کو پیٹ میں بھرنے کے بجائے پیچڑوں میں روک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ تصور کر رہا تھا کہ پیٹ کے ذریعے مجھے میں دکھائی ہوئی آگ کی آنچ دھیرے دھیرے سڑ کر کے میری تیسری آنکھ یعنی پٹیل گینڈ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ جیسے ہی وہ مخصوص پیش اس گینڈ کو چھوئی، میں آہستہ آہستہ سانس خارج کرتے ہوئے برہنہ کھنک کا ایک سائیکل مکمل کر لیتا۔

اس عمل کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ میں نے اپنی پیشانی کو تپتا ہوا محسوس کیا۔ گویا جی اپنے پوشیدہ مسکن سے نکل کر دھیرے دھیرے پٹیل گینڈ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اور اسے متحرک کر رہی تھی۔ پانچ چکر لگانے کے بعد میں نے مشق ختم کر دی۔ ابتدا کی طور پر زیادہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ ماسٹر جنگ پالی کے مطابق تیز دوڑنے سے فائدے کے بجائے انا نقصان ہو سکتا تھا۔

میں ابتدائی مشقوں سے اپنی خوابیدہ جی کو بیدار کر چکا تھا۔ اب اسے آہستہ آہستہ دماغ کی طرف لاکر پٹیل گینڈ کو متحرک کرنا تھا تاکہ اپنی مرضی کے احکام کی ترسیل کو موثر اور جلدی بنایا جاسکے۔ میں نے مشق ختم کی تو بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی

تھی۔ آنکھوں میں نیند کا غبار بھی بھر چکا تھا۔ میں نے ایک بھر پور نیند لینے کا فیصلہ کیا اور بستر پر گر کر آنکھیں موند لیں۔ اس قسم کی دماغی اور روحانی مشقوں کے بعد آرام بہت ضروری ہوتا ہے۔

جلد ہی نیند کی مندر لیں اور گداز ہاتھوں نے مجھے اپنی ریشمی گرفت میں جکڑ لیا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹی بندوبست تھی۔ چھوٹے ٹوک سے مشابہہ دین ہار برداری کے لیے استعمال ہوتی تھی جس کے سینے پر سرخ رنگ کے بڑے الفاظ میں ”PRESS“ لکھا ہوا تھا۔

میں نے اس مقام کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور سانس کھینچ کر اپنے پیٹ کو ہوا سے بھر لیا اس کے بعد میں نے مقام جی پر ایک بھر پور اسٹروک لگا کر سانس کو خارج کر دیا۔ متعدد بار یہ عمل دہرانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جی کے مقام سے حرارت خارج ہو رہی ہو۔ یہ کچھ اس قسم کا احساس تھا جیسے کسی بجلی کے اندر رکھا ہوا لوہا گرم ہو رہا ہو۔ جب اس ”لوہے“ کی پیش مجھے پورے پیٹ میں محسوس ہونے لگی تو میں نے سانس کا متبادل نظام قائم کر دیا۔ اب میں ہوا کو پیٹ میں بھرنے کے بجائے پیچڑوں میں روک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ تصور کر رہا تھا کہ پیٹ کے ذریعے مجھے میں دکھائی ہوئی آگ کی آنچ دھیرے دھیرے سڑ کر کے میری تیسری آنکھ یعنی پٹیل گینڈ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ جیسے ہی وہ مخصوص پیش اس گینڈ کو چھوئی، میں آہستہ آہستہ سانس خارج کرتے ہوئے برہنہ کھنک کا ایک سائیکل مکمل کر لیتا۔

اس عمل کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ میں نے اپنی پیشانی کو تپتا ہوا محسوس کیا۔ گویا جی اپنے پوشیدہ مسکن سے نکل کر دھیرے دھیرے پٹیل گینڈ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اور اسے متحرک کر رہی تھی۔ پانچ چکر لگانے کے بعد میں نے مشق ختم کر دی۔ ابتدا کی طور پر زیادہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ ماسٹر جنگ پالی کے مطابق تیز دوڑنے سے فائدے کے بجائے انا نقصان ہو سکتا تھا۔

میں ابتدائی مشقوں سے اپنی خوابیدہ جی کو بیدار کر چکا تھا۔ اب اسے آہستہ آہستہ دماغ کی طرف لاکر پٹیل گینڈ کو متحرک کرنا تھا تاکہ اپنی مرضی کے احکام کی ترسیل کو موثر اور جلدی بنایا جاسکے۔ میں نے مشق ختم کی تو بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی

گئی ہے۔ میں تو کافی دنوں سے ہاتھ پر ہاتھ رکے بیٹھا تھا۔ یقین جانو میں نے تمہاری وجہ سے اپنا پروگرام منسوخ کر دیا ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ ”کون سا پروگرام؟“ میں نے استفسار کیا۔

”تمہارا صاحب کی بیٹی کی شادی کے فوراً بعد یعنی آج میں جہلم جانے والا تھا“ اس نے بتایا۔ ”کئی برسوں سے میں نے ادھر کارن نہیں کیا لیکن تمہاری اچانک آمد اور فیصل کے حوالے سے ہونے والی کارروائی نے مجھے یہیں روک لیا۔ مجھے امید ہے یہ مشن بہت ہی سنسنی خیز ثابت ہوگا اور ہاتھ پاؤں کھولنے کا بھرپور موقع ملے گا۔“

”حالات تو کچھ ایسی قسم کی صورت دکھا رہے ہیں“ میں نے ذوقی انداز میں کہا۔

یہ بات مجھے معلوم تھی کہ شہزادگی کا تعلق خلع جہلم سے تھا۔ وہ دس سال پہلے کراچی آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس کے دیگر عزیز رشتے داروں پر آپاٹی ملائے میں تھے۔

”وہاں! میں نے سنا ہے فیصل مارشل آرٹس کا بھی ماہر ہے؟“ شہزاد نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا ”تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ اس نے اس میدان میں لگ بھگ دس سال لگائے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق وہ بلیک بیلٹ سیکنڈ ڈان ہے۔“

”کسی زمانے میں مجھے بھی جوڈو کرنا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔“ شہزاد نے بتایا۔ ”میں نے ایک کلب میں داخلہ بھی لیا اور ان دنوں میں خاصی حد تک مہارت بھی حاصل کر لی لیکن بلیک بیلٹ تک نہ پہنچ سکا۔ کراچی آنے کے بعد مصروفیت نے کسی طرف دھیان دینے کی فرصت دی البتہ کبھی کبھار ہاتھ پاؤں چلانے کا موزع ضرور مل جاتا ہے۔ وہ چند لمحات کے لیے توقف ہو کر پوچھنے لگا ”بلیک بیلٹ تو ماسٹرز کو دی جاتی ہے؟“

”ہاں یہ ماسٹر بیلٹ کہلاتی ہے“ میں نے کہا ”اس کے بعد ڈان شروع ہو جاتا ہے۔“

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے خیال افروز لہجے میں بولا۔ اس کا انداز خود کشاکی کا تھا ”وہاں تیلو“ اور ”گرین بیلو“ براؤن کوئلز براؤن اور بلیک۔ لیکن میں تو گرین بیلٹ سے آگے نہ جا سکا۔“

”یہ بھی بہت ہے“ میں نے کہا ”شہزاد! مارشل آرٹس عمل کا نام ہے۔ جو شخص جتنی زیادہ پریکٹس کرتا ہے وہ اتنا ہی پرفیکٹ ہو جاتا ہے۔ بیلٹ وغیرہ سے کچھ زیادہ فرق نہیں

پڑتا۔“ پھر چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے استفسار کیا ”تم نے فواد کے معاملے میں کیا پیش رفت کی ہے؟“

وہ خیالات کی دنیا سے باہر آگیا ”میں نے اپنے جس دوست کا ذکر کیا تھا اس کا نام سرہ ہے۔ میں آج دن میں اس سے جا کر ملا تھا اور مجھے معلوم ہوا ہے فواد اس بلڈنگ کے قلیٹ نمبر چار سو دو میں غلام جیلانی نامی ایک شخص کے پاس آتا ہے۔۔۔۔۔ اور آج کل وہ روزانہ ہی وہاں جا رہا ہے۔“

یہ ایک اہم اطلاع تھی۔ میں نے شہزاد سے پوچھا ”تمہارا دوست سرہ کس قلیٹ میں رہتا ہے۔“

”تین سو دو میں۔“ اس نے بتایا۔

”یعنی سرہ والا قلیٹ، غلام جیلانی کے قلیٹ کے عین نیچے ہے؟“

”بالکل یہی بات ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر چند لمحات کے بعد کہا ”اگر فواد روزانہ ہی وہاں جا رہا ہے تو پھر اسے شکار کیا جا سکتا ہے۔ گھات کے لیے سرہ کا قلیٹ خاصا موزوں ثابت ہوگا۔“

شہزاد نے ایک مرتبہ پھر میری تائیدی کی۔

میں نے کہا ”تم غلام جیلانی نامی اس شخص کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر فواد وہاں آ رہا ہے تو عین ممکن ہے، غلام جیلانی بھی سی ایف کے سے وابستہ ہوا۔“

سی ایف کے (کرائم فری کراچی) نامی وہ ڈھکوسلا تنظیم شہزاد سے خفیہ نہیں رہی تھی۔ گلستان جوہر والے مشن میں وہ شعیب غوری اور اس کی تنظیم کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ مزید منہاس باقر نے بتا دیا تھا کیونکہ وہ شہزاد پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔

ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ حمایت باجوہ ایک دہلے پٹے دروازہ قلمبند کے ساتھ ایجنسی کے باہری کھنکھڑا گیا۔

مجھ پر نظر پڑی تو وہ سید حامیرے پاس آگیا۔ اس دوران میں ہم گاڑی سے باہر آ گئے تھے۔

دکی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا ”باجوہ جی! آپ یہاں کراچی میں؟“

”میں تمہاری حیرت ابھی دور کر رہا ہوں، بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب فریڈ پاشا کا کیا دھرا ہے۔“ وہ اپنی نوکڑ کو تھرتھراتے ہوئے بولا پھر میری جانب ہاتھ بڑھا دے ہوئے کہنے لگا ”اس دین کی چابیاں دو۔ جب تک تمہاری امانت اس دین میں منتقل ہو، ہم تمہاری کپ شپ کر لیتے ہیں۔“

میں نے شہزاد کو اشارہ کیا تو اس نے چابیوں والا کچھا باجوہ کو دے دیا۔ باجوہ نے وہ چابیاں اپنے قریب کھڑے لیے بڑے شخص کی جانب بڑھا دیں۔ وہ وہاں سے جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

”کیا میری امانت کو کہیں اور رکھا گیا ہے؟“

”ہاں۔“ باجوہ نے اثبات میں گردن ہلائی ”احتیاط کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو، سوراخ دار صندوق کا معاملہ کتنا حساس ہے۔ کسی کو اس کی ہینک بھی پرگنی تو ہم سب کے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ آدی امانت کو تمہاری دین میں رکھ کر لے آئے گا۔ یہ تم نے اچھا کیا۔“ اس نے جانی ہوئی دین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ایسے کاموں کے لیے بند گاڑی ہی مناسب رہتی ہے پھر تمہاری دین پر تو ”پریس“ کا لٹکے گا رڈ کے مانند موجود ہے۔ مجھے امید ہے، اپنی امانت کے ساتھ بحفاظت منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ اور مزید یہ ایک دیر باؤس میں تمہاری امانت کو رکھ دیا تھا میں نے ایسے معاملات میں اس قسم کی احتیاط تو کرنا ہی پڑتی ہے۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن آپ کس چکر میں یہاں موجود ہیں؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے سوالیہ نظر سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ میں نے سر کی مخصوص جنبش سے باجوہ کو یاد کرایا کہ شہزاد ہجروے کا آدی ہے۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”یہ سب فریڈ پاشا کی مہربانی سے ہوا ہے۔ آؤ، میں تمہیں کچھ اور بھی دکھاؤں!“

بات ختم کرتے ہی اس نے ابجی کے دفتر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ مجبوراً ہمیں بھی اس کی تقلید کرنا پڑی پھر جیسے ہی میں نے دفتر میں قدم رکھا، میں اچھل کر رہ گیا۔ ایک کرسی پر زرگل بیٹھی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑے ہی وہ مکمل ٹھہری۔

”زرگل..... تم یہاں.....؟“ میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

زرگل کے بجائے حمایت اللہ باجوہ نے کہا ”ماتا ہوں، سب متا ہوں یا۔ ذرا آرام سے بیٹھو جاؤ۔“

میں نے اور شہزاد نے کرسیاں سنبھال لیں۔ اس دوران میں وہ گوری چٹی پشتون دو شیرہ ہا ہلک خاموش چلی رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے منہ میں زبان نہ ہو۔ باجوہ نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”تعمیلی باتیں تو تم اس لڑکی سے پوچھنا۔ میں تو پاشا ہے!

کی فرمائش پر اسے لاہور سے کراچی لایا ہوں اور اس کے لیے مجھے اپنی گاڑی میں ایک لمبا چوڑا سفر کرنا پڑا ہے۔ یقین جانو، میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا ”چلو، ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ اس طرح میں کراچی میں بہت سے لوگوں سے کاروباری ملاقاتیں بھی کر لوں گا۔ یہاں آنے کا بہانہ بن گیا ورنہ نکلنے کا موقع کہاں ملتا ہے.....“

”آپ فریڈ پاشا کی کسی مہربانی کا ذکر کر رہے تھے؟“ میں نے باجوہ کو پتھر کی سے اترتے ہوئے دیکھا تو یاد دہانی کے انداز میں کہا۔

”میں اسی طرف آرہا ہوں۔“ وہ باتونی شخص جلدی سے بولا ”تمہارے جانے کے کچھ ہی دیر بعد زرگل میرے دفتر میں آئی اور مجھ سے کہنے لگی، میں بھی کراچی جاؤں گی۔ میں نے پوچھا، اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس نے کہا، مجھے اناج دایے ٹرک کے ساتھ جانے دو۔ یہ ایک عجیب اور ناممکن سی بات تھی۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے کہا کہ میں فریڈ پاشا سے اس کی بات کر ادوں۔ یہ پہلے تمہارے ساتھ میرے دفتر سے ہو کر چلی تھی اور بھائی..... آپ نے جس طرح مجھے آدمی رات سے گھما کر رکھا ہوا تھا اس سے آپ لوگوں کی اہمیت کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے..... سید پور میں فریڈ پاشا سے اس کی بات کرادی۔ اس نے پاشا سے پتا نہیں، کیا فکٹ پٹ کی کہ اس نے مجھے کہا، میں بھی ٹرک کے ساتھ کراچی جاؤں گا اور اس لڑکی کو اپنے ہمراہ لے کر جانا ہوگا۔ بس یہ ہے سارا قصہ!“ باجوہ نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بولا ”اب تم اپنی صندوق بند امانت کے ساتھ ساتھ اس زبان بند امانت کو بھی وصول کرلو۔“

میں نے زرگل کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا ”تم نے فون پر فریڈ پاشا سے کیا فکٹ پٹ کی تھی؟“

”ماتا دوں گی، ذرا فرصت تو میسر آنے دو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی ”ابھی تو تمہیں بہت سے قصے سننا ہیں۔ میں اپنی داستان سنائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی!“

میں اس گلاب رنگت پشتون دو شیرہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابھی یہ کل صبح کی تو بات تھی جب میں لاہور میں تھا۔ زرگل نے ہمارے ساتھ کراچی آنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور جب ہم نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے انتہائی غیر متوقع رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی تھی، مجھے جانا ہوگا۔ میری منزل مجھے پکار رہی ہے!



میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی کراچی میں زرگل سے دوبارہ ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے اس کے تہ سے بھانپ لیا کہ سردست وہ میرے کسی استفسار کا جواب نہیں دے گی لہذا میں نے سوال کرنے سے اجتناب برتا اور موجودہ صورت حالات پر غور کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ میری امانت کے ساتھ بندوین انجینی کے دفتر کے باہر پہنچ گئی ہے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ہم سب دفتر سے نکل آئے۔ عنایت اللہ باجوہ نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے مجھے امانت چپک کر دوائی اور کہا۔

شہزاد نے ایک گہری سانس خارج کی اور مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگا۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم بنگلے پر پہنچ گئے۔ وہ بنگلا ڈینس سوسائٹی کے ایک ایسے فیر میں تھا جو ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ مکمل اور ہائش کے قابل بنگلوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی اور جو بنگلے داغی تار تھے ان میں بھی ضروری نہیں تھا، ہائش اختیار کر لی گئی ہو۔ منہاس باقر والا بنگلا اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں تھا۔ نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی منہاس نے بتایا کہ اس بنگلے کی تعمیر کا کام کیوں روک دیا گیا تھا۔

”اس صندوق کی سیٹنگ سے پہلے میں نے احتیاطاً اس کے اندر کھانے پینے کی چند اشیاء بھی رکھ دی تھیں تاکہ اگر یہ بندہ ہوش میں آجائے تو ان اشیاء پر منہ مار سکے۔ میرے خیال میں اس نے کچھ ”منہ ماری“ کی کوشش تو کی ہے۔“

میں نے بغور اس صندوق کے اندر موجود فیصل کا جائزہ لیا اور باجوہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے کے باوجود بھی اس نے منہ کے ذریعے اپنے معدے میں کچھ تارنے کی کوشش کی تھی۔ باجوہ نے مذکورہ اشیاء کی ”پینچ“ میں رکھی تھیں۔ اس وقت فیصل نیم بے ہوش تھا۔ اس تالا بند صندوق کی چابی میرے پاس محفوظ تھی۔

شہزاد نے بنگلے کے گیٹ کے نزدیک دین روکی اور ایک مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔ اس کے بعد گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ لگ بھگ چندر سینڈ بعد ایک من بردار شخص گیٹ پر نمودار ہوا اور اس نے ہمارے لیے گیٹ وا کر دیا۔ ہم دین سمیت بنگلے کے اندر پہنچ گئے۔ گیٹ دوبارہ بند ہو گیا۔

منہاس باقر نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اس بنگلے کا انتخاب کیا ہوگا۔ شہزاد نے مجھے بتایا کہ وہ پہلے بھی وہاں آتا رہا تھا۔ میں نے شہزاد اور کن بردار شخص کی مدد سے فیصل والے سوراخ دار صندوق کو بنگلے کے ایک دور افتادہ کمرے میں پہنچایا۔ اس کمرے کے ایک حصے میں فرش سے چھت تک پرانے اخبارات کے بڈل رکھے ہوئے تھے۔ منہاس باقر شاید اسے گودام کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا، بنگلے کے مزید دو کمرے اخبارات کے بڈلوں سے بھرے ہوئے تھے۔

میں نے عنایت اللہ باجوہ کا بے حد شکر ادا کیا اور اس سے ایک بھر پور مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ واپسی کے سفر میں زرگل بھی ہمارے ساتھ تھی۔ دین کا ڈرائیونگ سیمین خاصا کشادہ تھا۔ زرگل کھڑکی یعنی شیشے والی سائیڈ میں میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بدستور خاموش اور سنجیدہ تھی۔

میں نے محسوس کیا شہزاد کن انجینیوں سے کئی بار ابھین زدہ انداز میں زرگل کو دیکھ چکا تھا پھر اس کی نشوونما زبان پر آگئی۔ مجھ سے کہنے لگا۔

ہم نے صندوق کھول کر فیصل کو باہر نکالا۔ اس کی حالت دیکھنی تھی۔ اب وہ پوری طرح ہوش میں آچکا تھا لیکن اس کی کسبیری مٹائی تھی۔ وہ جتنے طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد وہاں پہنچا تھا اس نے فیصل کی مت مادی تھی اور..... صندوق کھینچنے سے پہلے بھی اس کے ساتھ خاصا شان دار سلوک ہو چکا تھا۔

”وہ جان! میں ان محترمہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میری بات کو محسوس نہ کرنا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کیا انہیں اس بنگلے پر لے جانا مناسب ہوگا؟“

بنگلے سے اس کی مراد وہ زیر تعمیر عمارت تھی جہاں ہم نے فیصل کو رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے کہا ”ان محترمہ کے بارے میں جان لو کہ یہ بڑی دشمن دار اور جنگ جو خانوں ہیں لہذا اس مشن میں ان کی موجودگی سے کوئی حرج نہیں ہوگا۔ ویسے بھی یہ فیصل والے معاملے سے اچھی طرح واقف ہے۔ تم اسے اپنا ہاتھ انداز ساسی بھی سمجھ سکتے ہو۔“

جتنی دیر میں، میں فیصل کی بندشیں کھولنے شہزاد نے بنگلے کے اندر سے ضروری سامان مہیا کر دیا جس کا پہلے سے بندوبست کیا گیا تھا۔ اس دوران میں کن بردار کھولا مسلسل فیصل کو اپنے نشتے پر رکھ رہا تھا کہ وہ کسی مہم جوئی کے خیال سے باز رہے۔

میں نے شہزاد کے فراہم کردہ سامان میں سے ایک جھٹلی نکالی اور فیصل کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر اسے یہ آہنی زنجیر پہنا دیا۔ وہ اگرچہ ہوش میں تھا لیکن کن پوائنٹ پر

اس نے کسی جراث مندی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس نے ہاتھ پاؤں جھک کر گزور سا احتجاج ضرور کیا۔ بہر حال، وہ صندوق والی زندگی کی نسبت اب خاصے اچھے حال میں تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کر کے اس کے پاؤں میں بیڑی پہنا دی پھر ایک مضبوط آہنی زنجیر کو جھٹلی اور بیڑی کے ساتھ باہم منسلک کرنے کے بعد اس زنجیر کا دوسرا سرچھت میں لگے ہوئے کنڈے میں پھنسا دیا۔ اس زنجیر کی لمبائی اتنی تھی کہ فیصل اس کمرے میں دو چار قدم چل سکتا تھا۔

کن بردار شخص نہایت ہی چوکنا نظر سے مجھے یہ کارروائی کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب میں اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے سانس لیچے میں کہا۔

”سچی! آپ نے تو اس جوان کو ایساٹ کر دیا ہے کہ اس کی عمرانی کی ضرورت بھی نہیں رہی۔“

”لیکن اس کے باوجود بھی تم اس کی طرف سے کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔“ میں نے تنبیہی انداز میں کہا ”تم نہیں جانتے، یہ کتنا خطرناک ہے۔ اسے بے دست دیا دیکھ کر کسی خوش فہمی میں نہ پڑ جانا۔“

”اوکے سر!“ وہ فرماں برداری سے بولا ”آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنے کام کے ساتھ پورا انصاف کرتا ہوں۔“

شہزاد نے کہا ”وہ جان! سہیل اپنے فن کا ماہر ہے۔ مجھے امید ہے، امن و امان کی کوئی صورت حال پیش نہیں آئے گی، ویسے میں بھی پیش رفت اسی بنگلے پر گزاروں گا۔ یہ سوری ما کوئی فلاح حرکت نہیں کر سکے گا۔“ اس کا اشارہ واضح طور پر فیصل کی جانب تھا۔

”تم ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ لے آؤ۔“ میں نے شہزاد سے کہا ”تاکہ ہم اپنا اہم کام شروع کر سکیں۔ میرے خیال میں اب یہ بولنے کے قابل ہو گیا ہے۔“

اس بنگلے میں فون تو موجود تھا لیکن میں دانستہ چوہدری نواز شعلی کو فیصل کی آواز براہ راست سنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ ”ریکارڈر“ جھٹکیاں ہی کافی ہوتیں اور اگر وہ زیادہ ہی ضد کرتا تو پھر بعد کی بندشیں دیکھی جانی۔ اس بنگلے کے آس پاس دو دروازے کوئی اور بنگلا نظر نہیں آتا تھا لیکن منہاس باقر نے اپنے تعلقات اور اختیارات استعمال کر کے اس ادھر سے بنگلے میں بھی فون کی سہولت حاصل کر لی تھی۔ تعلقات اور اختیارات ایک طرح سے حل مشکلات ہوتے ہیں جو ہر ناممکن کو ممکن بناتے ہیں!

عنایت اللہ باجوہ نے مجھے بتایا تھا، کراچی پہنچنے کے بعد اس نے فیصل کو چند محکومت پانی بھی پلایا تھا۔ میں نے دوبارہ

اسے تھوڑا کھلایا پلایا تاکہ وہ بات کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس میں ذرا توانائی آئی تو وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اس کے پوری طرح بحال ہونے کا انتظار کیا پھر ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر ریکارڈنگ کا بین دکھایا۔

فیصل بے بسی اور لا چارگی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ تاہم اس کی رگوں میں چوہدری نواز شعلی کا خون دوڑ رہا تھا لہذا اس کی پھٹکار میں کوئی کمی نہ آئی۔ آواز دھیمی مگر مستحکم دہی تھا، فرعونیت کا غماز! اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والا۔ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں اندازہ نہیں وہ جان، تمہاری اس حرکت کا کتنا بھیا بک نتیجہ سامنے آئے گا۔“

میں نے کہا ”میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے، حرکت میں برکت ہے اس لیے معروف رہنے کی کوشش کرتا ہوں اور جہاں تک کسی بھیا بک نتیجے کی برآمد کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے، وہ صرف اور صرف تمہارے لیے ہی بھیا بک ہوگا۔“

وہ چند لمحے کینہ تو نظر سے مجھ دیکھتا رہا پھر غصے سے بولا ”میں نے تمہاری بہادری اور شجاعت کے بہت قصے سنے ہیں لیکن تمہارے رویے کو دیکھ کر لگتا ہے، وہ سب جھوٹے فسانے تھے۔ تم درحقیقت بہت ہی بزدل ہو، بالکل اپنے باپ کی طرح!“

وہ والد صاحب کا ذکر جیسے کر مجھے تاؤ دلانا چاہتا تھا لیکن میں اس کی چال میں نہ آیا اور کہا ”تم نے میرے کس رویے سے اندازہ لگایا کہ میں بزدل ہوں؟“

”کیا تم ایسے بہادری سمجھتے ہو کہ مجھے آہنی زنجیروں میں جکڑ کر خود کو فاح تصور کر رہے ہو؟“ وہ طنز یہ لہجے میں بولا ”اگر تم نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو پھر میرے ہاتھ پاؤں کھول کر دیکھو، میں تمہیں بتاؤں گا کہ اصل بہادری کیا ہوتی ہے۔ تمہیں جبر مجاز کرنے رکھ دیا تو میرا نام فیصل نہیں۔“

اس نے مجھے غصہ دلانے کے لیے والد صاحب کے بعد میری والدہ کا تذکرہ کیا تھا لیکن میں اس کی چال سمجھ رہا تھا اس لیے کہا ”میں تمہیں اپنی بہادری آزمانے کا پورا موقع دوں گا فیصل لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں۔ دراصل میرے نزدیک عینی جانور کی نہ تو قربانی جائز ہے اور نہ ہی لاچار دشمن پر ہاتھ اٹھانا۔“

”میں لا چار اور بے بس نہیں ہوں۔“ وہ پوری ڈھٹائی سے بولا ”مجھے آزاد کر کے دیکھ لو۔ میں دہشت میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلادوں گا۔“

میں نے تحمل لہجے میں کہا ”اگر تم بے بس اور مجبور نہیں

ہو تو پھر خود ہی آزاد ہو جاؤ۔“

اس نے مجھے ایک غلط گالی دی۔ اس کی اس حرکت پر شہزاد نے اسے دھتک کر رکھ دیا۔ میں نے فوراً شہزاد کا ہاتھ روک لیا اور فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکی سے کہا۔

”میں نے تمہاری یہ تعلیم اور گیدڑ بھیکیاں سننے کے لیے ریکارڈنگ شروع نہیں کی۔ اگر تم اس کیسٹ کے ذریعے اپنے باپ کے لیے کوئی پیغام ریکارڈ کروانا چاہتے ہو تو مختصر الفاظ میں یک دو درنہ میں نیپ بند کر رہا ہوں۔“

وہ ایک مطلق العنان چوہدری کا اکلوتا بیٹا تھا۔ آج تک کسی نے اس لہجے میں اس سے بات نہیں کی ہوگی۔ میرے انداز پر وہ تملاکر رہ گیا اور بے درخی مقلدات پر اتر آیا۔ میں نے پندرہ بیس سیکنڈ تک اس کی بے ہودہ گولی گور ریکارڈ کیا اور ریکارڈنگ ختم کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے اس مہلت کو اپنے خاندانی پس منظر کو اجاگر کرنے میں ضائع کر دیا۔ تمہاری یہ بکواس جو بھی سنے گا، یہی کہے گا کہ تم بہت ہی گھٹیا اور کہینے ہو۔“ میں نے چند لمحات کے لیے وقف کیا پھر سنجیدگی سے کہا ”میں اس پندرہ بیس سیکنڈ کی ریکارڈنگ کو پھوڑ کر باقی کیسٹ صاف کر دوں گا اور تمہارے باپ کو یہی حصہ سناؤں گا۔ ہو سکتا ہے، ذالالت کے میدان میں وہ تمہیں اظہارِ ایشیتہ کر رہا ہو۔ اس کیسٹ کو سننے کے بعد اسے پتا چلے گا کہ تم اس سے چار ہاتھ آگے ہو اور..... میں چوہدری کو یہ باور دلانے میں خاصی آسانی محسوس کروں گا کہ اگر اس نے میرا مطالبہ پورا نہ کیا تو اس کے بیٹے کو کس دردناک عذاب سے گزرنا ہوگا۔ ابھی تو تم نے صرف بھونکنا شروع کیا ہے۔ میں تمہیں اس قدر عاجز کر دوں گا کہ تم کاٹنے پر اتر آؤ گے اور کاٹو گے بھی خود کو، نوچو گے بھی خود کو۔“

اس کے منہ سے ایک مرتبہ پھر گالیوں کا کڑوا ملنے لگا۔ میں اسے گارڈ سکیل کے ریم وکر پر چھوڑ کر شہزاد کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔ ایک دوسرے کمرے میں آنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”شہزاد! میں نے فیصل کو آہنی زنجیر کا پابند بنا کر بے بس کر دیا ہے۔ وہ اس کمرے میں دو چار قدم سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا اور وہ بھی ایک محدود حصے میں۔ اس بات کی امید تو نہیں کہ وہ خود کو آزاد کرالے گا یا کسی قسم کی گڑبڑ پھیلانے کا لیکن میں صرف ایک گن برادر پر بھروسہ نہیں کر سکتا جبکہ میں سکیل کی صلاحیت سے پوری طرح واقف بھی نہیں۔ میں یہ چاہوں گا، تم ہمہ وقت یہاں موجود رہو کم از کم اس وقت تک جب

تک میں چوہدری نوازش علی سے مذاکرات نہیں کر لیتا۔“

”تمک ہے؟ میں کڑوں گا“ شہزاد نے کہا ”ہم فیصل کے سلسلے میں کسی قسم کا کوئی رسک نہیں لیں گے۔“

میں نے کہا ”آج کی رات میں طارق روڈ والے فلیٹ پر گزروں گا اور تمہیں ریلیف دینے کے لیے کل یہاں آ جاؤں گا۔ تم کل کا پورا دن آزادانہ گزارنا اور اس دوران میں زیادہ وقت اس کام کو دینا جو فواد سے متعلق ہے۔“

شہزاد کو میری یہ تجویز پسند آئی۔ پوچھنے لگا ”فیصل کے بارے میں کوئی خاص ہدایت؟“

میں نے تاکیدی انداز میں کہا ”اسے کبھی بے بس اور کمزور نہ سمجھنا۔ بلیک ہیٹ سیکنڈ ڈان کی بھی وقت کوئی چٹکار دکھا سکتا ہے۔ تمہیں ہر وقت چوکنا اور چوک رہنا ہوگا۔ یہ الٹی سیدھی بکواس کر کے تمہیں پیش دلا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں عمل اور برداشت سے کام لینا اور اس کے قریب جانے کی کوشش نہ کرنا یہی ہدایت گارڈ سکیل کے لیے بھی ہے۔ فیصل سے ہر چال کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

میں چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا۔ شہزاد پوری توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا ”بس آج کی رات اہم ہے۔ کل رات سے پہلے پہلے میں بازی کو پلٹ دوں گا۔ چوہدری نوازش علی کو میرے سامنے ٹھکنے پھینکا ہوں گے۔ اگر اس نازک موقع پر اس نے کسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو وہ اپنے بیٹے کو ہمیشہ ہمیش کے لیے کھودے گا۔“

پھر میں نے شہزاد کو فیصل کے کھانے پینے کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائیں اور گہری سنجیدگی سے کہا ”فیصل ہمارے لیے اور چوہدری نوازش کے لیے بہت قیمتی ہے اس لیے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اگر چوہدری کی عقل میں میری بات آ جاتی ہے تو ہمیں فیصل کو کچھ دسالم واپس کرنا ہوگا۔ اس کی تندرست واپسی سے ساحل کا حصول منسلک ہے۔ میں اپنی ساحل کو کوئی گزند پہنچنے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“

شہزاد سمجھی بھرے انداز میں سرگوشیاں حرکت دیتے لگا۔ وہ منہاس باقر کا معتبر خاص تھا اور اس کے بہت قریب بھی اس لیے ساحل والا معاملہ اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ مزید چند منٹ وہاں گزارنے کے بعد میں زرخش کے ساتھ اس جنگل سے نکل آیا۔

شہزاد نے بہت اصرار کیا کہ وہ مجھے فلیٹ پر چھوڑ آتا ہے لیکن میں نے اس کی بات نہ مانی اور کہا ”ہم دونوں میں سے کسی ایک کا ہر وقت یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ میں ٹھوڑا پیدل چل لوں گا تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ یہ علاقہ میرا

دیکھا ہوا ہے۔ ٹھوڑے فاصلے سے مجھے ٹیکسٹل مل جائے گی۔“

میں ڈیفنس سوسائٹی کے اس غیر آباد فیز میں صرف ایک مرتبہ پہلے آیا تھا لیکن اس علاقے کا نقشہ بڑی حد تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں زرگل کے ساتھ چلتے ہوئے ایک کشادہ سڑک پر نکل آیا۔ اس دوران میں ایک دو خالی ٹیکسیاں ہمارے قریب سے گزریں لیکن میں نے کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تو زرگل خاموش نہ رہا۔

”کہاں تک پیدل چلاؤ گے وجدان؟“ اس نے دھمکے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے بڑی گہری نظر سے اسے دیکھا اور کہا ”کیوں؟“

کیا پیدل چلتے ہیں تمہیں کوئی دقت محسوس ہو رہی ہے؟“

”ایسی بات نہیں“ وہ جلدی سے بولی۔

میں نے پوچھا ”کیا تم پہلے بھی کراچی آئی ہو؟“

اس نے ٹی میں جواب دیا ”یہ پہلا موقع ہے اور خاصا ہنگامہ پر درموقع ہے۔“

”تو پھر یہاں کے علاقوں اور راستوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کرو“ میں نے اندر سے میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا ”میں بھی یہ پہل قدمی اسی مقصد سے کر رہا ہوں۔“

وہ چند لمبے میرے ہم قدم خاموشی سے چلتی رہی پھر اس نے پوچھا ”کیا طارق روڈ تک ہم پیدل چل قادی کرتے ہوئے جا سکیں گے؟“

ٹاور سے ڈیفنس سوسائٹی کے اس جنگلے تک آنے کے دوران میں ہمارے درمیان ابتدائی گفتگو ہو چکی تھی اور میں نے زرگل کو بتایا تھا ”میں طارق روڈ پر ایک فلیٹ میں رکا ہوا ہوں۔“

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”طارق روڈ یہاں سے خاصا دور ہے۔ وہاں تک پیدل جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ اب جو بھی ٹیکسی نظر آئے گی ہم اس میں بیٹھ جائیں گے۔“

آئندہ دس منٹ میں کوئی ٹیکسی ہماری نگاہ میں نہ آ سکی اور چھل قادی کا شوق جی بھر کر پورا ہو گیا۔ پھر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

جب ہم طارق روڈ پہنچے رات کے سوانہ بجے تھے۔ فلیٹ پر جانے سے پہلے میں نے ڈرنر کا ضروری سمجھا اور زرگل کو لے کر ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ اس وقت طارق روڈ پوری طرح جاگ رہا تھا اور ہر طرف رنگ و روشنی کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ طارق روڈ بنیادی طور پر شاہینک

ایریا ہے۔ یہ مارکیٹ خاصی دیر سے کھلتی ہے اسی لیے رات گئے تک کھلی رہتی ہے۔ جن علاقوں میں شاہینک کے لیے آنے والوں کا رش ہو وہاں ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کے دیگر اسپاٹس کی بہتات ہوتی ہے۔ کراچی والوں کا یہ مزاج ہے کہ وہ شاہینک کو ایک تفریح سمجھ کر کرتے ہیں اور خود روش ہر تفریح کا لازمی جز ہے۔

ہم جس ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے آئے تھے وہاں سیلف سروس کا سسٹم تھا چنانچہ میں نے زرگل سے اس کی پسند و ریاقت کی اور اسے ایک میز پر چھوڑ کر خود کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

کاؤنٹر پر لوگوں کے جم غفیر کو دیکھ کر گنتا تھا ”آج پورا کراچی یہیں ڈنر کرے گا۔ میں اپنا آرڈر نوٹ کروانے کے لیے ادائی کاؤنٹر کی جانب آیا تو لوگوں کے ہجوم میں ایک شاسا چہرے کو دیکھ کر چونک اٹھا۔

وہ فواد تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک مذہبیں بھی تھی اور وہ ابھی ریسٹورنٹ میں داخل ہی ہوئے تھے۔ ایک لمبے لمبے مجھے اندازہ ہو گیا ”فواد کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اتنے اطمینان میں نہ رہتا۔ گلستان جو ہر والے فلیٹ میں جس طرح میں نے اس کی درگت بنائی تھی وہ اس کے لیے ناقابل فراموش تھی۔ شہزاد کی تحقیق کے مطابق آج کل وہ گارڈن ایسٹ کے ایک فلیٹ کے چکر لگا رہا تھا اور ریسٹورنٹ میں آنے کا صرف ایک ہی مقصد تھا ”وہی جس مقصد سے ہم وہاں پہنچے تھے۔“

فواد اپنی ساتھی سے سرگوشیاں کرنے لگا تو میں انہیں نگاہ میں رکھتے ہوئے زرگل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر چونکی لیکن اس کے کسی سوال سے پہلے ہی میں نے کہا۔

”ہم اس ریسٹورنٹ کے اندر بیٹھ کر نہیں کھا سکیں گے۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے ٹکنے لگی۔ میں نے اپنے برس میں سے کچھ رقم نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید کہا ”میں ریسٹورنٹ سے باہر فٹ پاتھ پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم مطلوبہ کھانا پیک کر داکے باہر آ جاؤ۔ پروگرام میں اس تبدیلی کی وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ ہری اپ سمجھو..... ایک ایمر چکی ہے۔“

میرے اسٹائل نے اسے باور کرایا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی یا ہونے جا رہی تھی۔ وہ رقم پکڑ کر فوراً کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ میں مختصر نظر سے فواد کو دیکھتے ہوئے ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ یہ غیبت تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکا تھا ورنہ صورت حال خاصی تبدیل ہو جاتی۔

آتش فشاں (35) حصہ 10

ریسٹورنٹ سے باہر آنے کے بعد میں نے داخلی دروازے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کسی ٹیکسی کی تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میرے نزدیک ہی ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ اس نے تین مسافروں کو ڈراپ کیا۔ میں فوراً آگے بڑھ کر ڈرائیور سے مذاکرات کرنے لگا۔

”مجھے چند گھنٹوں کے لیے تمہاری ٹیکسی چاہیے“ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

”کہاں جائیں گے؟“ ڈرائیور غریب سی والے نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا ”اس کا فیصلہ میں نے ابھی نہیں کیا۔ کہیں بھی چلے جائیں گے۔“

میں ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرتے ہوئے چونکنا نظر سے ریسٹورنٹ کے دروازے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے جواب نے ٹیکسی والے کو الجھا دیا۔ اس نے کہا ”کہیں بھی چلے جائیں گے کیا مطلب؟“

میں نے ایک فوری بہانہ تراشا ”وہ دراصل بات یہ ہے کہ اس وقت میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ہوں۔ وہ ریسٹورنٹ سے کھانا لینے گئی ہے۔ ہم تمہاری ٹیکسی میں بیٹھ کر کچھ کھائیں بیٹیں گے اس کے بعد سڑکوں کی سیر کریں گے اور بس!“

ٹیکسی ڈرائیور نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور کہا ”ٹھیک ہے میٹر سے جو بنے، دے دینا“ وہ مجھے کوئی من چلا سمجھا ہوگا جو ریل فریڈ کے ساتھ ڈیٹ پر ہو۔

میں نے کہا ”میٹر کے حساب سے تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ ممکن ہے راستے میں ہم کبھی رک بھی جائیں۔ اس صورت میں تمہیں ٹیکسی روکنا ہوگی اور تمہارا میٹر بھی رک جائے گا کیونکہ اس کا چلنا اور رکتا ہوئے کامرہ ہون منت ہے۔“

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے پھر ہم فی گھنٹہ ملے کر لیتے ہیں لیکن ایک بات بتا دوں آپ مجھے کسی سنسان یا اندھیری جگہ پر ٹیکسی روکے کو نہیں کہو گے۔“

میں اس کی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ وہ ہمیں کوئی ایسا جڑا تصور کر رہا تھا جو ڈیٹ پر ہوں اور راز و نیاز کے لیے انہیں کوئی مناسب جگہ میسر نہ ہو، وہ اس مقصد کے لیے ٹیکسی کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

”تم جو کچھ سمجھ رہے ہو ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں ٹیکسی کو بارونی اور روشن مقام پر رکھاؤں

گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ جی ہاں تھا۔ پاؤں بجا کر کام کرنا پڑتا ہے، ٹیکسی ڈرائیور اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولا ”آج کل بڑی سخت چکنگ ہو رہی ہے۔ آپ لوگ تو کچھ دے دلا کر جان چھڑا لو گے“ میں غریب بے چارہ مارا جاؤں گا۔ وہ میری دن بھر کی کمائی پر ہاتھ صاف کر جائیں گے“ ایک لمبے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”آپ بخیر واللہ مالک ہے۔“

ڈرائیور کے اس مختصر سے تجربے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک باتونی شخص تھا۔ بہر حال ہمارے درمیان دوسرے پے فی گھنٹہ پر معاملہ ظہر گیا۔ اسی وقت میں نے زرگل کو ریسٹورنٹ سے نکلنے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ پیک کھانا اٹھائے تیزی سے میری طرف بڑھنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھے ڈنر فرما رہے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو کس ماری تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ وہ رات کا کھانا کھا چکا تھا۔ میں نے کھانے کے دوران میں یہ محسوس کیا کہ وہ عجیب مٹھو کھانے والے آئینے میں حیران نظر سے چپکے چپکے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیران ہونا بھی چاہیے تھا۔ ہم ایک معزز اور آرام دہ ریسٹورنٹ کے ماحول کو چھوڑ کر اس کی ٹیکسی میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

اس دوران میں میں ایک لمبے کے لیے بھی فواد کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک ریسٹورنٹ سے باہر نہیں آئے تھے جس کا مطلب تھا وہ کھانے کے لیے اندر ہی بیٹھ گئے تھے۔ ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فواد اپنی سائیکل کے ہمراہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا ”اس جوڑے کو دیکھ رہے ہو؟“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے مزید کہا ”تمہیں ان کا تعاقب کرنا ہے لیکن تھوڑا فاصلہ رکھ کر انہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے۔“

ابھی تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ فواد وہاں سے اکیلا ہی رخصت ہوگا یا وہ حسینہ بھی اس کے ساتھ جائے گی اور اس بارے میں میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا وہ کیسے واپس جائیں گے۔ اپنی گاڑی میں کسی ٹیکسی میں یا پھر پبلک ٹرانسپورٹ کا سہارا لیں گے۔ تعاقب والی بات نے ٹیکسی ڈرائیور کو چونکا دیا۔ اس نے ہماؤ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

”جناب! یہ تو آپ ایک نئی بات بتا رہے ہیں۔ اس حساب سے تو دو سو روپے کی گھنٹہ کمائی ہیں“ وہ صرف ٹیکسی

ڈرائیور ہی نہیں بلکہ خاصا کاروباری بھی تھا۔

میں اس کی نیت کو سمجھ رہا تھا اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں دس پچاس کے لیے بات کو خراب نہ کروں۔ سو ڈیڑھ سو اگر زیادہ دیتا پڑتے تو مجھے کوئی فرق نہ پڑتا البتہ وہ جی جان سے خوش ہو کر میرے احکام کی تعمیل کرتا۔

میں نے کہا ”تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ناراض نہیں جانے دوں گا“ پھر میں نے اس کے دلی اور دفنی اطمینان کی خاطر اضافہ کیا ”بات دراصل یہ ہے کہ وہ لڑکی میرے ایک عزیز کی بیٹی ہے جو اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ اس نے میری ذہنی لنگی ہے کہ میں معلوم کروں، فرزانہ کس کے ساتھ اور کہاں جاتی ہے“ پھر میں نے زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے جتنی خیر انداز میں کہا ”آج اس ڈرائیور کا ڈراپ سین بھی ہو جائے گا۔“

زرگل نے اس موقع پر متعلیٰ مندی کا ثبوت دیا اور مجھ سے یہ نہیں پوچھا ”کون سا ڈرائیور کیا ڈراپ سین! میں نے ابھی تک اسے پروگرام کی تبدیلی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ فرزانہ کے حوالے سے میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے جو گفتگو کی تھی اس پر وہ چونکی ضرور تھی تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ معمولات اور حالات کے تقاضوں کو بھاننا جانتی تھی۔ وہ سمجھتی ہوئی میں کسی خاص مشن پر ہوں۔

تھوڑی ہی دیر بعد یہ تعاقب شروع ہو گیا۔ فواد سفید شہرڈ میں ہماری ٹیکسی کے آگے جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کو محدود اور متناظر فاصلے پر رکھا ہوا تھا تاکہ شہرڈ نگاہ سے اوچل ہو سکے اور نہ ہی انہیں تعاقب کا احساس ہو۔

فواد میرے لیے امید کی کرن کے مانند تھا۔ میں اس کرن کی روشنی میں شیب خوری کے قریب پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ شیب نے دوشی کی آڑ اور دشمنی کے بھار میں مجھ پر جو خدشہ چڑھایا تھا اسے سو دور سو دور اپنی لوٹنا ضروری تھا اور میں اس ادا کی کا آغاز کر چکا تھا۔ کبیر شاہ شیب کا دست راست سمجھا جاتا تھا میں نے اسے اپنا جی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا اور اب فواد کی باری تھی۔ اگر وہ مجھے شیب تک پہنچانے کا وسیلہ ثابت نہ ہو سکا تو اس کا خشر کبیر شاہ سے زیادہ بھیاں تک ہوتا۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ شیب خوری اور اس کی نام نہاد اصلاحی تنظیم سی ایف کے، یہودی لالی کے اشاروں پر ناچتی ہے میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ ان لوگوں کو تباہ و برباد کر دوں گا۔ ایسے ملک دشمن اور یہود لواز لوگوں کو نیت و ناپود ہو جانا چاہیے۔ شیب خوری ایک نازک معاملے میں بھی میرا کھلا دشمن تھا۔ اس نے مجھے کمزور بنانے

اور جھکانے کے لیے ساحل کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ اسے یقین تھا، میں ساحل کو ڈھونڈتا ہوا اس کے پاس ضرور آؤں گا اور وہ مجھے شکار کر لے گا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی فیصلہ کرتا کہ شکاری کون ہے اور شکار کس کا ہوا!

ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی مہارت سے تعاقب جاری رکھا اور ہم بریڈروڈ (گاڈون ایسٹ) کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ کے پاس پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی سفید شہرڈ سے خاصے فاصلے پر ایک گاڑی کے عقب میں روک لی تھی۔ میں نے دیکھا فواد شہرڈ کو اس بلڈنگ کے اندر لے گیا۔ یہ ایک توشیش ناک صورت حال تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا وہ وہاں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہے بہ صورت دیگر وہ گاڑی کا باہر ہی چھوڑ کر اندر جاتا۔ خیر، جب ہم اس کے تعاقب میں تھے تو انتظار بھی کر سکتے تھے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے تنقیدی نگاہ سے اس عمارت کا جائزہ لیا۔ وہ ایک چھ منزلہ گھڑی اپارٹمنٹس بلڈنگ تھی۔ شہر اعلیٰ مجھے بتا چکا تھا، فواد یہاں کسی غلام جیلانی نامی شخص سے ملے آتا تھا جو فلیٹ نمبر چار سو دو میں رہتا تھا۔ فواد کے ساتھ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کو دیکھ کر میں مجھے میں پرچیا۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ اس لڑکی کا فواد سے کا تعلق تھا تو حالات زیادہ واضح ہو جاتے۔ بہر حال میرے لیے فواد اس لڑکی سے زیادہ اہم تھا۔ آدھے گھنٹے تک میں ٹیکسی میں بیٹھے انتظار کرتے رہے پھر ہمارا انتظار رنگ لے آیا اور فواد کی سفید شہرڈ بلڈنگ سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ گاڑی کے اندر فواد اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو تعاقب کا اشارہ دیا تو اس نے ٹیکسی کو شہرڈ کے پیچھے لگا دیا۔

میں گہری سوچ میں تھا۔ لڑکی کو وہاں چھوڑنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس لڑکی کا تعلق چار سو دو نمبر فلیٹ میں رہنے والے غلام جیلانی سے تھا اور فواد اسے ڈراپ کر کے واپس جا رہا تھا۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ فواد کی وہاں آمد و شد کا کیا سبب تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی آواز پر میں خیالات سے چونک اٹھا۔ وہ پوچھ رہا تھا ”آپ کے عزیز کی لڑکی فرزانہ تو اپنے کمر پہنچ گئی لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ آدی اسے چھوڑنے کے لیے اندر کیوں گیا۔ اور نہ صرف اندر گیا بلکہ اس نے وہاں اچھا خاصا وقت بھی گزارا ہے جبکہ آپ نے بتایا تھا فرزانہ چوری چھپے۔“

”تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ فرزانہ اپنے کمر پہنچ گئی

ہے؟“ میں نے درشتی سے کہا۔ اس کا دل درمقولات مجھے ناگوار گزرتا تھا اس لیے زور دے کر کہتا تھا کہ وہ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھے۔ میں نے برہمی سے کہا ”اس بلڈنگ میں فرزانہ کی ایک دوست رہتی ہے۔ وہ اسی دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلتی تھی۔ ہمیں شک ہے وہ دوست بھی اس سازش میں شریک ہے۔“

فیکسی ڈرائیور کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ اس کے بعد اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور سفید شیرٹ کا تاقب کرتے ہوئے ہم مکین اقبال کی حدود میں داخل ہو گئے۔ حسن اسکوائر سے تھوڑا آگے آنے کے بعد فواد نے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا اور سر دس روڈ پر آنے کے بعد وہ مسجد بیت المنکر کے قریب سے ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

فیکسی ڈرائیور نے بھی بیت المنکر والی گلی میں داخل ہو کر تاقب کے سلسلے کو نئے نہیں دیا۔ پھر جب سفید شیرٹ اس گلی کے تقریباً آخری سرے پر واقع ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں داخل ہوئی تو میں نے زرگل کے کان میں سرگوشی کی۔

”سفید شیرٹ والی مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے“ اس کے بعد میں نے قدرے بلند آواز میں کہا ”دردانہ! میں یہاں فیکسی میں بیٹھا ہوں۔ تم دیکھ کر آؤ وہ شخص کس فلیٹ میں جاتا ہے۔“ زرگل نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور کوئی سوال کیے بغیر فیکسی سے باہر نکل گئی۔ چند لمحات کے بعد وہ بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔ میرے خیال میں فواد کو گاڑی پارک کرنے میں جتنا وقت لگتا اس مہلت میں زرگل اس کے انتہائی قریب پہنچ جاتی۔

میں نے فیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں زرگل کو دردانہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ایسا میں نے محض احتیاط کے پیش نظر کیا تھا تاکہ بعد میں کوئی بے چیدائی پیدا نہ ہو۔ مجھے زیادہ دیر تک زرگل کا انتظار نہیں کرنا پڑا اس منٹ بعد وہ بارہ میرے پہلو میں فیکسی کے اندر موجودگی میں نے استفسار بے نگاہ سے اسے دیکھا تو اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

فیکسی ڈرائیور ہاتھ ہونے کے ساتھ ہی سمجھ دار بھی تھا۔ میرے روپے سے اس نے اندازہ لگالیا کہ اس کی بے جا مداخلت مجھے پسند نہیں آئی اس لیے اس نے فواد کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی اور پوچھنے لگا ”یہاں رکنا ہے یا واپس چلیں؟“

میں نے فیکسی والے کو جواب دینے سے پہلے زرگل کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا تو وہ ٹھہرے ہوئے کچھ میں بولی

”میرا خیال ہے وہ اب گھر سے نہیں نکلے گا۔ وہ ایک بند فلیٹ کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا ہے جس کا مطلب ہے وہ اسی فلیٹ میں رات گزارے گا۔“

زرگل کا تجزیہ کسی تجربے کا محتاج نہیں تھا تاہم میں نے فیکسی ڈرائیور سے کہا ”ہم یہاں دس منٹ تک رکیں گے پھر واپس چلیں گے۔“

پھر آچہ دس منٹ تک کوئی غیر معمولی بات سامنے نہ آئی تو میرے حکم پر ڈرائیور نے فیکسی کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔

حسن اسکوائر سے طارق روڈ زیادہ فاصلے پر نہیں۔ ہم دس منٹ میں طارق روڈ پر تھے۔ ڈرائیور نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی سے فیکسی اسی ریسٹورنٹ کے سامنے لے جا کر روک دی جہاں سے اس نے ہمیں اٹھایا تھا۔ میں نے دست و پا بے نگاہ ڈالی۔ رات کے دس بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے فیکسی ڈرائیور سے پوچھا ”ہاں بھی تمہارا کیا حساب تھا؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی مبلے ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا ”میں نے آپ کے لیے ڈیڑھ گھنٹا فیکسی چلائی ہے۔ اس کے تین سو روپے بنتے ہیں۔ آپ نے ادھر سے بھی دینے کا وعدہ کیا تھا اب آپ کی جمر میں!“

اس نے گیند میری کورٹ میں پھینک دی تو میں اس کی چالاک پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے سن رکھا تھا اور کسی حد تک مجھے اس کا تجربہ بھی تھا کہ بیشتر فیکسی ڈرائیور بے ایمان ہوتے ہیں۔ ہم تو پچیس پر اس کی فیکسی میں بیٹھے تھے اور دس پچاس پر ہمارا سفر ختم ہو گیا تھا۔ اس حساب سے اس کی فیکسی میں گزرا ہوا اکل وقت ایک گھنٹا پچیس منٹ جتنا تھا۔ اگر وہ ڈیڑھ گھنٹا بنا رہا تھا تو اس میں بے ایمانی والی کوئی بات نہیں تھی اور پھر اس نے معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنی خوشی سے اسے پانچ سو روپے دیے اور ہم فیکسی سے باہر آ گئے۔ جو لوگ بے ایمان نہ ہوں ان کا خیال رکھنا چاہئے۔

فلیٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے زرگل کو فواد کے بارے میں مختصراً بتایا تاکہ اس کا ذہن صاف ہو جائے۔ وہ سائل اور شیب غوری کے حوالے سے جو چوہدری نواز شعل سے ہونے والی میری گفتگوں بھی سمجھ سکتا تھا اور میں نے صدف اور زرگل کی موجودگی ہی میں جو چوہدری کو فون کیا تھا اس لیے اسے فواد اور سی ایف کے کی بات سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ آخر میں میں نے اس سے

پوچھا۔ ”تم نے فواد کو جس فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا ہے اس کا نمبر وغیرہ مجھیں یاد ہے؟“ میں نے فیکسی والے کی موجودگی میں تم سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا“ تمہاری احتیاط پسندی مجھے اچھی لگی۔ وہ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی پھر بتایا ”وہ بندہ فلیٹ نمبر ”تیرہ۔ ڈی“ میں داخل ہوا تھا۔ میں بغیر کسی راہنمائی کے اس فلیٹ کے دروازے تک پہنچ سکتی ہوں۔“

”اور تم نے بتایا ہے وہ لاک فلیٹ کو کھولنے کے بعد اندر داخل ہوا تھا؟“ میں نے اپنا اطمینان کرنا ضروری جانا۔

زرگل نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا ”میں زبے کی آڑ میں چھپ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ فواد انی اس شخص نے فلیٹ نمبر تیرہ۔ ڈی کے دروازے پر پہنچ کر پہلے چوکنٹا نظر سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جب سے چابی نکال کر اس نے فلیٹ کا لاک کھولا تھا“ وہ ایک لمبے کوحتقت ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی ”میں نے اس کے اندر داخل ہونے کے بعد فلیٹ کے دروازے پر جا کر اس کا نمبر دیکھا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے وہ اس فلیٹ میں اکیلا ہی ٹھہرا ہوا ہے۔“ میں نے چرسوچ انداز میں کہا ”اور یہ بھی کہ وہ رات وچیں گزارے گا۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے“ وہ میری تائید کرتے ہوئے بولی پھر پوچھا ”کیا آج ہی اس کی گھونٹا ہے؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی باتوں سے بڑی سرگرم اور دلولہ انگیز لگتی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں کے تجربے نے زرگل کو میرے ساتھیوں میں شمار کر دیا تھا۔ اگر ہمارے ساتھ سیٹوں والا مسئلہ پیش نہ آ جاتا تو میں اس کی کراچی آنے والی فرمائش پر ضرور غور کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات کے تقاضے نے ازاں بعد صدف کا سفر بھی ملتوی کر دیا۔

میں نے زرگل کے سوال کے جواب میں کہا ”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو یہ کام بھی کرنا ہی ہوگا۔ فی الحال میں سب سے پہلے چوہدری نواز شعلی سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔“ منہاس باختر نے مجھے جس فلیٹ میں ٹھہرایا تھا وہ مذکورہ ریسٹورنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا لہذا چند منٹ ہی میں ہم اس فلیٹ تک پہنچ گئے۔

فلیٹ کے اندر اگر میں نے داخلی دروازے کو لاک کیا پھر فریش ہونے کے لیے واش روم میں کھس گیا۔ اسی کام کی غرض سے زرگل نے دوسرے واش روم کی راہ لی۔ جب ہم تازہ دم ہو کر وہاں سے نکلے تو میں نے زرگل سے کہا۔

”میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں تمہیں نیند خوب ستا رہی ہے“ جیسی سے اترنے کے بعد وہ کئی بار جھپٹاں لے چکی تھی اور ابھی چند ساعت پہلے بھی اس نے اسی عمل کو دہرایا تھا ”اس لیے بہتر ہوگا“ تم دوسرے بندہ روم میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔“ تم سے میں تفصیلی بات نہ کر سکا۔

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جس میں شکایت اور تنگی بہ یک وقت شامل ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ منہ کو ڈھانپنے کے لیے اٹھ گیا۔ اسے ایک زبردست جھانی نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے وہ جان امیرا خیال ہے“ میں سوہی جاتی ہوں“ وہ غصہ لکھے میں بولی ”لیکن اگر رات کے کسی وقت تمہارا ہم جونی کا کوئی پروگرام بن جائے تو مجھے ساتھ لے جانا نہ بھولنا۔“

”جھا“ میں اس بارے میں سوچوں گا“ میں نے کہا ”تم پہلے سو تو جاؤ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔“

وہ مجھ پر ایک بھرپور اور معنی خیز نظر ڈالنے کے بعد بولی ”کیا تم ہمیشہ اتنے ہی مصروف رہتے ہو؟“

”ہاں، اتفاق سے میں نے ایسی ہی قسمت پائی ہے۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے تجرنا سے خوش قسمت ہو۔“

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اس نے بڑی گہری بات کی تھی۔ وہ مجھے جتنے بے نیاب دیکھ کر پوچھنے لگی

”وہ جان آخر تجھے نئے ذہن میں ہو۔“

میں نے پوچھا ”یہ آپ کت کتے کتے۔“

خفگی کا خیال کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کا مظاہرہ کیا تھا ”میں نے کل صبح! سو میں جس روپے کا مظاہرہ کیا تھا اس پر تمہیں ناراض ہونے کا حق ہے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی ”اپنا تک میں نے گاڑی رکوائی اور تم لوگوں کو چھوڑ کر ایک طرف چل دی۔“

میں نے کہا ”اچھا کیا تم نے یاد دلایا۔ مجھے تو تم سے واقعی ناراض ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیا حرکت کی تھی تم نے اور۔۔۔۔۔ اور اس سے بڑی حرکت یہ کہلا ہو رہے کر اچھی پہنچ گئی ہو؟“

”حرکت میں برکت ہے۔“ وہ لطفیانہ انداز میں بولی ”تھوڑی دیر پہلے یہی سبق تم لیصل کو بھی پڑھا رہے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

وہ جو والو سے رہی تھی اس میں کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ میں نے کہا ”اب خود ہی وضاحت بھی کر دو کہ تمہاری ان حرکات میں کون کون سی برکات پوشیدہ ہیں؟“

آتش فشاں (40) حصہ 10

چاہتے ہو؟

”زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد۔“ میں نے اندازہ سے اسے وقت بتادیا۔

”ٹھیک ہے، اور کچھ؟“

”اور مجھے اپنے استعمال کے لیے ایک مستعد گاڑی بھی چاہیے۔“ میں نے کہا ”کل آپ مجھے کوئی اچھی سی گاڑی بھی خریدادیں۔ ادا جی میں کروں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”میرے پاس ایک بالکل نئی ہنڈائی بالکل فارغ پڑی ہے۔“ ”ایک ایکٹیم“ سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس گاڑی کو حاصل کیا تھا لیکن اسے ٹیکسی نہیں بنایا۔ میں وہ گاڑی تیار سے لیے بھیج دیتا ہوں۔ دور سے وہ ٹیکسی ہی نظر آتی ہے مگر اس پر ٹیکسی والا مخصوص نیون ساکن نہیں ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے حقیقی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”ایک ٹیکسی چلاتے ہوئے میں بہت لطف محسوس کروں گا اور نت نئے تجربات بھی ہوں گے۔ دیے اس گاڑی کی کنڈیشن کیسی ہے؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس!“ اس نے بتایا۔

”تو پھر ٹران!“ میں نے کہا۔

اختتامی رسمیات کو نبھانے کے بعد میں نے رابطہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد میں نے رکھان والی کے فرعون مفت چوہدری نواز شعلی کے فون کی کھنٹی کھڑکا دی۔ یہ آپس سے میرا تیسرا ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ وہ لائن پر آیا تو میں نے تمییز آواز میں کہا۔

”کہو چوہدری! کیا مزاج ہے؟ تمہاری تنہا اور کلف گلی گردن میں کوئی نرمی آئی یا ابھی تک اسی طرح اکڑے ہوئے ہو؟“

”کیا تمہارے پاس بکواس کے سوا کہنے کو کچھ نہیں ہے؟“ وہ ہنکرا۔

میں نے اس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا ”بہت کچھ ہے میرے پاس۔ تمہارے سننے اور میرے کہنے کے لیے لیکن میں اپنی بعد میں کہوں گا۔ پہلے تو وہ دن لو جس کی خاطر میں نے آدھی رات کو تمہارا سکون برکباد کیا ہے۔ میں نے سنا ہے، تم خاصے آرام طلب ہو گئے ہو۔“

وہ میرے فون کی کٹ کو بے شکل برداشت کرتے ہوئے بولا ”تم مجھے ایسی کون سی خاص چیز سنانا چاہتے ہو؟“

”ارے بھئی، تمہارے لمبے کی آواز ہے۔“ میں نے

سرسری انداز میں کہا ”کیا اپنے لختہ جگر کی پیاری پیاری باتیں نہیں سنو گے؟“

پھر اس سے قبل کہ وہ مجھے کسی ناقابل اشاعت خطاب سے نوازتا، میں نے فون کے ریسپونڈر ٹیپ ریکارڈر کے آپٹیکر کے سامنے رکھ کر پلے کا جن دبا دیا۔ کیسٹ کا ریکارڈر کیا ہوا آخری حصہ بذریعہ فون، کراچی سے لاہور کے ایک دور دراز گاؤں رکھان والی میں نشر ہونے لگا۔

میں نے کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈر کو پہلے ہی سیٹ کر کے رکھ دیا تھا، اس کے بعد ہی چوہدری نواز شعلی کا نمبر ملایا تھا۔ چدرہ میں سینکڑی ریکارڈنگ پلک جھپکتے میں پلے ہوئی۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر کو اسٹاپ کیا اور ریسپونڈر کو کان سے لگاتے ہوئے چوہدری سے دریافت کیا۔

”اب تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ تمہارا سپوت میرے قبضے میں ہے اور زندہ بھی ہے۔“

”تم نے اس کی ریکارڈنگ کی ہوئی آواز مجھے سنائی ہے۔“ وہ غصے سے بولا ”میں براہ راست فیصل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے پوری سفاکی سے کہا ”نی الحال یہ ممکن نہیں۔ تم اسی ریکارڈر آواز سے گزراؤ چلاؤ اور اس بات کو ذہن میں قفل کرو کہ جب تک تم میرا مطالبہ پورا نہیں کرو گے تمہارا بیٹا میرے ہاتھوں مشکل سے مشکل ترین حالات سے دوچار ہوتا رہے گا۔ تم نے اس کی آواز کا کرب تو محسوس کیا ہوگا!“

”وہدان! اولاد شیطان!“ وہ اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا اور گرجدار آواز میں بولا ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ساحل اب شیعہ غوری کے پاس پہنچ چکی ہے اور۔۔۔۔۔۔“

”اور میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہارا بیٹا اس وقت تو میرے پاس ہے لیکن یہ سدا میرے پاس نہیں رہے گا۔“ میں نے اس کا جملہ اچکا اور محسوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”میرے ہاتھ سے نکل کر یہ ”معبیت زدہ“ جہاں بھی جائے گا وہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس جہاں میں پہنچنے والوں کے نام اور پتے سنگی تختیوں پر کندہ کیے جاتے ہیں اور وہ بھی ایسے افراد کے جن کے لواحقین انہیں باقاعدہ اپنے ہاتھوں سے سپرد زمین کرتے ہیں ورنہ۔۔۔۔۔۔ میں نے جملہ ادھورا جھوڑا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”ورنہ بے شمار ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی پوریوں میں بند لاشیں اخبارات کی سرخیاں بنی ہیں یا پھر کندے نالوں اور گٹر ز میں سے برآمد ہونے والے ان کے حقن زدہ

دھوم کا شرے میں سمنسی اور سراپا کی پھیلائے ہیں میں۔۔۔۔۔۔ وہ میری بات کی تکمیل سے پہلے ہی پھٹ پڑا۔۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔۔ میں نے کراچی نیٹ ورک کو پوری طرح۔۔۔۔۔۔ سرگرم کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی آواز میں لرزش اور بھراہٹ کی آمیزش تھی۔ ”تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد تمہیں کھوج لوں گا۔“

”میں نے تمہاری دھمکیاں سننے کے لیے فون نہیں کیا چوہدری!“ میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا ”میں تمہیں اور تمہارے نیٹ ورک کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے کراچی اور لاہور نیٹ ورک کو میں تار تار کر چکا ہوں۔ کیا تم چوہدری دلدار اور میرا زہد حسین کی لرزہ خیز اصوات کو بھول گئے ہو؟“ وہ جواب میں کیکڑائی ہوئی آواز میں مجھے مغلظات میں تولے لگا۔ یہ اعصاب شکنی کا جین ثبوت تھا۔ کزدر اور بے بس انسان اگر ساتھ ہی کم ظرف بھی ہو تو وہ کالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔ چوہدری نکور تو نہیں تھا تاہم میرے کھینے نے اسے بے بس ضرور بنادیا تھا اور اس کی کم ظرفی میں دو آرائیں ہو سکتی تھیں۔

میں نے دو ٹوک انداز میں اسے مخاطب کیا اور کہا ”میں تمہیں کل شام سات بجے تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اس وقت تک تمہارا بیٹا میرے پاس محفوظ رہے گا لیکن اگر کل کا سورج غروب ہو گیا تو پھر فیصل کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔“

میں نے تھوڑا وقت کیا اور لہجے کی عینگی کو برقرار رکھتے ہوئے مزید کہا ”میں کل دن میں کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔ اس وقت تک تم یہ فیصلہ کرو کہ ساحل کو کس جگہ اور کب میرے حوالے کر رہے ہو۔ یہ ایک ہاتھ لو، ایک ہاتھ دو والی ڈیل ہوگی اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرو کہ اس معاملے میں کسی ٹک کی تمنا نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں دی ہوئی مہلت میں، میں کوئی توسیع کر سکتا ہوں۔ کل سات بجے شام۔۔۔۔۔۔ سورج غروب ہونے سے چند لمحات پہلے۔۔۔۔۔۔ اور بس!“

پھر میں نے چوہدری کی کسی بھی نویت کی بکواس سے بغیر فون بند کر دیا۔ میرا دل اس وقت حقیقی اطمینان اور سچے سکون کی کیفیت سے آشنا ہو رہا تھا۔ میں نے چوہدری نواز شعلی جیسے درندہ صفت اور عالم دہا جہاں شخص کو بڑی مضبوط نیل ڈال دی تھی۔ اس کی ساری سرکشی اور درندگی جسم کے مختلف حصوں سے دھواں بن کر خارج ہو رہی ہوگی۔ کاش! وہ اس وقت میری نگاہ کے سامنے ہوتا تو میں اس کی حالت سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکتا!

میں نے آج تک چوہدری نواز شعلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی، صرف اس کا نام ہی سنا تھا یا پھر ”کام“ دیکھا تھا جو بہت ہی شرمناک اور ناقابل ملامت تھا۔ میں نے چوہدری اور اس کی ذات سے متعلق ہر قصے کو ذہن سے جھٹکا تو بے اختیار دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھ گئی۔ کلاک آدھی رات یعنی بارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا، اسی لمحے کلاک کا گھٹنا اپنا فریضہ پورا کرنے لگا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے شہزاد کو فون کرنے کے لیے ریسپونڈر کی جانب ہاتھ بڑھایا لیکن میرا ہاتھ ریسپونڈر تک نہ پہنچ سکا۔ برابر والے بیڈ روم سے ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی اور میں گڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بیڈ روم میں زورگل سو رہی تھی۔ میرا دل ایک بارگی اچھل کر ملتی میں آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی نگین صورت حال پیش آگئی تھی۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے بیڈ روم سے نکل آیا پھر اس سے پہلے کہ میں زورگل والے بیڈ روم میں قدم رکھتا، فلیٹ کے داخلی دروازے پر تیز دستک ہونے لگی۔

بے اختیار میری نگاہ اس دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ دستک کا انداز بتاتا تھا، اگر میں نے دروازہ کھولے میں نے ایک لمحے کی تاخیر بھی کی تو دستک دینے والا اسے تو زکر اندر محسوس آئے گا۔

ان نازک لمحات میں میرا ذہن دروازے اور بیڈ روم کے درمیان سوالیہ نشان پر ٹھک کر رہ گیا۔ فیصلے کی سولی شاہد ایسے ہی وقت کو کہا جاتا ہے!

**اردو زبان کی نئی ترین داستان**



**داریوتا**

46 حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں

تمام حصے ایک ساتھ منگوانے پر سستی قیمت - 2300/- روپے

یہ حمایت بذریعہ جنگی ڈرائنگ سنی آرڈر یا  
چیک ارسال کرنے پر دی جائے گی

**کتابیات پبلی کیشنز**  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802551-5895313  
فیکس: 5802551  
C-63، 11، انیس بینش ڈی ایچ اے سین روڈ، لاہور  
(انٹر کالونی میں، اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500



وہ کڑے وقت کے آزمائشی لمحات تھے!

سوائے نشان کا کاشا میرے حلق میں پیوست ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا، زمین نے میرے پاؤں میں آگنی زنجیر ڈال دی ہو۔ مصیبت کی گھڑی اجازت لے کر آئی ہے اور نہ ہی کسی ایک سمت سے وار کرتی ہے۔ زرگل کی وحشت ناک چٹخ اور دروازے پر ہونے والی خوف ناک دستک دو طرفہ یلغار تھی۔ میرے دماغ نے زرگل کے حق میں فیصلہ دیا اور میں بیرونی حالات کو نظر انداز کر کے بیڑم کی جانب لپکا۔

کی صورت حال کا جائزہ لوں ورنہ میں ممکن تھا، دستک دینے والا دروازے کو چھوٹکے سے اکھاڑ پھینکا۔ یہ بات طے تھی کہ زرگل نے حکمت یار سے متعلق کوئی بھیاںک خواب دیکھا ہو ورنہ اس فلیٹ کے اندر ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں اسے تشفی بخش چٹکی دینے کے بعد داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت ایک باہر پھر دستک کے عمل کو دہرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی بے آواز بلند لگاکار ابھی گیا۔ آواز مراد تھی۔

”ڈاکٹر! شرافت سے دروازہ کھول دو۔ مجھے دروازہ توڑنے پر مجبور نہ کرو!“

پتا نہیں، یہ کون سا دواہیات معاملہ تھا۔ کوئی کسی ڈاکٹر کو دھمکی دے رہا تھا۔ ایک بات تو واضح ہوگئی کہ آنے والا ہم سے متعلق نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دروازے کے وسط میں نصب، آئی گلاس پر آنکھ جمائی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔

اس گلاس نے مجھے ایک غصیلے شخص کو دکھایا۔ وہ دروازے کے عین سامنے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں اندازہ لگالیا وہ شخص ہمارا دشمن نہیں تھا۔ اگر وہ ہمارے مخالف دھڑ سے ہوتا تو دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہوتا تاکہ آئی گلاس کی مدد سے اسے دیکھنا نہ جاسکے۔ علاوہ ازیں اس صورت میں وہ بلند آواز میں بولنے کی حماقت بھی نہ کرتا۔ رات کے اس پھر حملہ آور ہونے والے دشمن اس انداز میں انٹری نہیں دیتے۔ وہ کوئی دوسرا ہی معاملہ تھا۔ اور اس معاملے کی تہ میں اترنے کے لیے دروازہ کھولنا ضروری تھا۔

یہ بات تو طے تھی، اگر میں دروازہ نہیں کھولوں گا تو وہ ایک مرتبہ پھر اسے پیٹ ڈالے گا لہذا میں نے اس کی ٹخن لپٹنے کا فیصلہ کیا اور لاک بٹھا کر بے آہستگی دروازہ کھول دیا۔ اس عمل کے دوران میں، میں نے بے احتیاطی طوطی کی کہ باہر موجود شخص آقا فانا مجھے پر لٹ پڑے تو میں اپنا مناسب بچاؤ کر سکوں۔ دروازہ کھولتے ہوئے میں نے اس کے سنگل پٹ کو اوٹ بتالیا۔

مجھے یہی فلیٹ کے دروازے کا سنگل پٹ دا ہوا، ایک پست قامت شخص آندھی اور طوفان کی رفتار سے دغنا تا ہوا۔ اندر گھس آیا۔ میں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا، ایک جھٹکے سے باہر آیا اور دھڑ سے میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس شخص نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ شاید وہ اس فلیٹ میں کسی

اور کی توقع کر رہا تھا۔ کم از کم میری نہیں!“

”کون ہو تم؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا ”ڈاکٹر کہاں ہے؟“

پھر وہ بیڑم کی جانب چونکنا نظر سے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا ”تم کس ڈاکٹر کا پوچھ رہے ہو؟“

”ڈاکٹر فیصلہ شریف!“ وہ برہمی سے بولا پھر تھلاشی نگاہ سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا ”جواپے نام کے بالکل فیصلہ بد معاش ہے۔ ایک نمبر کی حرافہ!“

میں نے کہا ”یہاں ڈاکٹر فیصلہ کیا، کوئی بھی ڈاکٹر نہیں رہتی۔ تم غلط جگہ پر آگئے ہو۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ وہ دہاڑا ”میں بالکل ٹھیک جگہ پہنچا ہوں۔ ڈاکٹر فیصلہ اسی فلیٹ میں رہتی ہے۔ تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔ بتاؤ، کہاں تھی وہ؟“ اس کی آنکھوں میں اس نامعلوم ڈاکٹر کے لیے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔

”میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، جنہیں کوئی زبردست حم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کی حالت کے پیش نظر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”یہاں میں رہتا ہوں اور مجھے آئے ہوئے یہ مشکل دودن ہوئے ہیں۔ جذبات اور غصے نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ تم غیر متعلقہ فلیٹ پر آگئے ہو۔“

”تم مجھے پکڑ دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟“ وہ شکی لہجے میں بولا۔

اسی وقت زرگل بیڑم سے برآمد ہوئی۔ اس شخص کا ہاتھ بے اختیار جب کی جانب بڑھا اور اٹکلے ہی لمحے ایک ریو اور اس کے ہاتھ میں نظر آیا۔ اس نے ہلکے جھپٹے میں زرگل کو اپنے ریو اور کے نشانے پر رکھ لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا ریو اور بردار ہاتھ جھک گیا۔ وہ زرگل کو شاید ڈاکٹر فیصلہ سمجھا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، وہ کسی زبردست غلط فہمی کا شکار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”مشتاق حیدر!“ اس نے جواب دیا پھر اس کی نگاہ اندرونی کمرہ میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی ڈاکٹر فیصلہ کی توقع کر رہا تھا۔

”مستحق!“ میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”اگر جنہیں میری بات کا اعتبار نہیں تو تم اس فلیٹ میں جہاں چاہو، اپنی مطلوبہ ڈاکٹر فیصلہ کو تلاش کر سکتے ہو۔ یہ پیش کشی میں تمہاری پریشانی کو دیکھتے ہوئے کر رہا ہوں ورنہ میں اگر چاہوں تو اسی وقت ایک فون کر کے جنہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں۔ اور میرے لیے یہ بھی ممکن ہے، میں خود ہی دھکے دے کر جنہیں یہاں سے نکال باہر کروں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ریو اور کو جیب میں رکھ لو۔“

میرے آخری جملے میں تنگم پایا جاتا تھا۔ میری بات اس کی عقل میں آگئی۔ اس نے ایک بھر پور نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد ریو اور کو جیب ٹھکانے لگا دیا جہاں سے اسے برآمد کیا تھا۔ آئندہ تین منٹ کے اندر وہ فلیٹ کی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ بالآخر ناکامیاب ہونے کے بعد اس نے مایوسی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ فلیٹ تو یہی ہے۔ میں پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں آچکا ہوں اور ڈاکٹر فیصلہ شریف سے ملاقات بھی کر چکا ہوں لیکن..... آج وہ غائب ہے۔“

میں نے خیال افروز انداز میں کہا ”ہوسکتا ہے، وہ ہم سے پہلے یہاں رہتی ہو۔ بہر حال، تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تم ریو اور سوتے خوں خوار انداز میں ڈاکٹر فیصلہ کو لگیں ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔ آخر اس نے تمہارا کیا پکاڑا ہے؟“

”کیا پکاڑا ہے؟“ وہ منہ بگاڑ کر بولا ”یہ پوچھو، کیا نہیں بگاڑا۔ وہ ایک قاتل ہے۔ میرے بچے کو اس نے قتل کیا ہے۔ وہ بچہ جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔“

مشتاق حیدر نامی اس شخص کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد ہی جانی تو اس نے مجھے ایک عجیب و غریب واقعہ سنایا۔ اس کی بیوی دس سال کے بعد امید سے ہوئی تھی لیکن اس فلیٹ پر رہنے والی کسی ڈاکٹر فیصلہ شریف نے اس کا اہارشن کر دیا تھا۔ اس کے مطابق، یہ ایک گہری سازش تھی جس میں اس کی سالی نورین اور اس کی خالہ فاخرہ شامل تھیں۔ باوجود وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ مشتاق کی بیوی کلثوم کسی بچے کو جنم دے۔ ڈاکٹر فیصلہ، نورین کی دوست تھی اور اس قسم کے کیس کرنے کے لیے خاصی بدنام بھی تھی۔ مشتاق ان دنوں شہر میں نہیں تھا اور اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر نورین اپنی چھوٹی بہن کلثوم (مشتاق کی بیوی) کو ڈاکٹر فیصلہ کے پاس لے گئی اور ڈی این پی کے ذریعے اس کا اہارشن کر دیا۔ وہ تفصیل بتانے کے بعد پیش کے عالم میں گویا

”ودھان!..... وہ میرا گدا ہار رہا تھا۔“

”وہ کون؟“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

اسی لمحے ایک مرتبہ پھر دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ وہ سبے ہوئے لہجے میں بولی ”ودھان وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دیکھو، وہ دروازے پر دستک دے رہا ہے!“

اس کی باتیں بے ربط اور خوف میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جب میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس کا ذکر کر رہی ہے تو میں نے اسے شانوں سے بھجوز ڈالا ”زرگل! کیا ہے دوتی کی باتیں کر رہی ہو۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ کون تمہارا گدا ہار رہا تھا۔ کہیں تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا۔“

ایک مرتبہ پھر دروازہ پینا جانے لگا۔ زرگل نے سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور بولی ”ودھان میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ حکمت یا میری جان لینا چاہتا ہے۔ تم دروازہ نہ کھولنا۔ اگر وہ اندر آ گیا تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کسی درندے سے کم نہیں۔“

بات کے اختتام پر اس نے مجھے اپنی پانہوں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ اس کی اضطرابی حرکت میں خوف پنہاں تھا۔ میں نے اس حرکت کو جزدی طور پر کامیاب ہونے دیا پھر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میں جا کر دیکھتا ہوں، دروازے پر کون ہے!“

اس کی پانہوں کی ڈھیلی ہوتی ہوئی گرفت میں ایک مرتبہ پھر چٹخ آگئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اسے خود سے الگ کروں لیکن حالات تھا حاضر رہے تھے کہ میں فوری طور پر باہر

”اگر میں کراچی میں موجود ہوتا تو کلثوم کو کبھی بھی اس قاتل ڈاکٹر کے پاس نہ جانے دیتا۔“ مشتاق نے زہر خند لہجے میں کہا ”بچے کے حوالے سے علاج معالجے کے سلسلے میں لورین کی فرمائش پر دو تین مرتبہ ڈاکٹر فضیلہ سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور میں نے اسے خاصا مشکوک پایا۔ بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں تحقیق کی تو اس کی شہرت مجھ پر کھل گئی۔ بہر حال، میں نے سختی سے کلثوم کو منع کر دیا تھا کہ کبھی فضیلہ کے کلینک کا رخ نہ کرے لیکن میری غیر موجودگی میں یہ غضب ہو گیا!“

یہ ایک انتہائی غیر متعلقہ قصہ نکل آیا تھا لیکن مشتاق کی بے بسی اور تکلیف کو دیکھ کر میں اس کی کہانی میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ذاتی بڑا غم ہوا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا ”جب تم نے اپنی بیوی کو تنہیہ کر دی تھی تو پھر وہ ڈاکٹر فضیلہ کے پاس کیسے چلی گئی جبکہ دس سال کے بعد اس کی گودہری ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی؟“

”وہ خود نہیں گئی تھی بلکہ اسے بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا تھا۔“ مشتاق نے بتایا ”کلثوم زینہ اتر رہی تھی کہ اس کا باؤں پھل گیا اور وہ بری طرح گر گئی۔ ان دنوں وہ اپنے ٹیکے میں تھی چنانچہ لورین فوراً اسے ٹیکے میں ڈال کر ڈاکٹر فضیلہ کے پاس لے گئی اور علاج کے نام پر میرے بچے کو قتل کر دیا۔“

”تم نے لورین سے باز پرس نہیں کی۔“ میں نے سوال کیا۔

”میں نے اسے کھری کھری سنائی ہیں۔“ وہ غرت سے بولا ”اس کا کہنا ہے، سب کچھ ڈاکٹر کے مشورے پر کیا گیا۔ ڈاکٹر فضیلہ نے چیک اپ کے بعد ان پر واضح کر دیا تھا کہ چیک اپ کی بری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ اگر فوری طور پر اپارشن نہ کیا تو زچہ کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رک کر پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں ابھی لورین کے پاس سے ہی آ رہا ہوں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ ڈاکٹر فضیلہ کی ”خبر گیری“ کروں گا مگر وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ میں جانا چاہتا تھا، لورین کے بیان میں کس حد تک سچائی ہے۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ”یہ اپارشن والا واقعہ کب کا ہے؟“

”بیس پچیس دن ہو گئے ہیں۔“ اس نے بتایا ”لیکن مجھے آج شام ہی پتا چلا ہے، میں آج دوپہر کو کراچی پہنچا

ہوں۔“ پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میرے کام کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے کہ بعض اوقات ایک ماہ تک بھی شہر سے باہر ہونا پڑتا ہے۔“

”یہ لوگ تمہیں فون یا کسی اور ذریعے سے بھی تو اطلاع دے سکتے تھے!“ میں نے کہا۔

”میری سرال والوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔“

میں نے متاسفانہ انداز میں کہا ”پھر تو واقعی یہ ایک جرم ہوا۔ تمہاری سرال والوں کا رویہ نارمل نہیں ہے۔“

”ان سے تو میں اچھی طرح نمٹ لوں گا۔“ وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا ”پہلے ذرا ڈاکٹر فضیلہ کا حشر خراب کر لوں۔ اگر وہ زندہ رہی تو پتا نہیں، کتنی جانوں کو وہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم کر دے گی۔ اس قاتل ڈاکٹر کو میں معصوم زندہ گیوں سے کھینچنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

اس کا طیش اور لہجے میں چھپی ہوئی تکلیف بتاتی تھی، اگر ڈاکٹر فضیلہ اس کے جیسے چڑھتی تو وہ اسے کچا چبانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرے گا۔ وہ اس وقت جنونی ہو رہا تھا۔

میں نے اسے اطمینان سے بٹھایا اور کہا ”مسٹر مشتاق! تمہاری بیوی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ بہت افسوسناک ہے۔ غمخو، میں ڈاکٹر فضیلہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں مسرت ہلکے سے لیے گئی۔ میں نے پوچھا ”کیا ڈاکٹر فضیلہ اسی فلیٹ میں کلینک چلاتی تھی؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا ”میں کلثوم کے علاج کے سلسلے میں یہیں پر ڈاکٹر سے ملتا تھا۔“

میں نے کہا ”یہ فلیٹ میرے ایک دوست کا ہے۔ میں اسے فون کر کے ڈاکٹر فضیلہ کے بارے میں پوچھتا ہوں۔“

”تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔“ وہ ہنسنے لگا ”میں نے اسے فون کیا تو زچہ کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رک کر پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں ابھی لورین کے پاس سے ہی آ رہا ہوں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ ڈاکٹر فضیلہ کی ”خبر گیری“ کروں گا مگر وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ میں جانا چاہتا تھا، لورین کے بیان میں کس حد تک سچائی ہے۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ”یہ اپارشن والا واقعہ کب کا ہے؟“

”بیس پچیس دن ہو گئے ہیں۔“ اس نے بتایا ”لیکن مجھے آج شام ہی پتا چلا ہے، میں آج دوپہر کو کراچی پہنچا

ہوں۔“ پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میرے کام کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے کہ بعض اوقات ایک ماہ تک بھی شہر سے باہر ہونا پڑتا ہے۔“

”یہ لوگ تمہیں فون یا کسی اور ذریعے سے بھی تو اطلاع دے سکتے تھے!“ میں نے کہا۔

”میری سرال والوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔“

میری سماعت سے ٹکرائی۔

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے مختصراً اسے حالات سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

”ہاں وجدان! میں نے بھی اس ڈاکٹر کے حوالے سے کافی قابل اعتراض قصے سنے تھے اسی لیے میں نے اس سے فلیٹ

نہی کر دیا تھا۔ یہ دو قصے پہلے کی بات ہے۔ میں نے چند روز قبل کلینک کی سیٹنگ ختم کر کے اس فلیٹ کو دوبارہ رہائشی انداز دیا ہے۔“

میں نے کہا ”منہاس صاحب! اگر ڈاکٹر فضیلہ ایسی ہی بدنام زمانہ تھی تو پھر مشتاق حیدر کی طرح اور لوگ بھی اسے پوچھتے ہوئے یہاں دستک دے سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اور بھی بہت سے لوگوں کو ڈاکٹر سے شکایت ہو۔“

”میرا خیال ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ اپنی بھاری اور سنجیدہ آواز میں بولا ”میں نے ڈاکٹر سے فلیٹ خالی کروانے کے بعد دروازے پر ایک لکڑی چپاں کر دیا تھا۔ اب یہ قصہ پرانا ہو چکا۔ جن کو ڈاکٹر کے پیچھے آتا تھا، وہ پلوں ہو کر چاچے ہوں گے۔ میں نے اس لکڑی میں وضاحت کر دی تھی کہ اس ڈاکٹر کے ساتھ فلیٹ کے مالک کا کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ نہیں

لہذا اس کو تلاش کرنے والے یہاں دستک دینے کی کوشش نہ کریں۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”شاید مشتاق نامی یہ شخص کئی دنوں بعد وہاں آیا ہے اسی لیے پریشان ہو رہا ہے۔“

”کوئی ایسا دیا پریشان جناب!“ میں نے اپنے سامنے موجود شخص کے چہرے پر نگاہ ڈالنے ہوئے کہا ”یہ تو اس وقت

اتنا جنونی ہو رہا ہے کہ اگر ڈاکٹر فضیلہ اسے مل جائے تو یہ اس کا لہو پی جائے گا۔ یہ ڈاکٹر کو اپنے بچے کا قاتل سمجھتا ہے۔“

منہاس باخبر نے کہا ”وجدان! ڈاکٹر فضیلہ کے گھر کا ایڈریس تو مجھے معلوم ہے لیکن میں اس پر اپنی ایجنٹ سے رابطہ کر کے معلوم کر سکتا ہوں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں، فضیلہ

بہادر آباد میں رہتی ہے لیکن تم مشتاق کو ایڈریس کے سلسلے میں پلوں کر کے وہاں سے رخصت کر دو۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”وجدان! تعلیم اور محنت کی بھی معاشرے کے سب سے اہم شعبے ہیں۔ اگر ان شعبوں کی نمائندگی کرنے والے غلط راہوں پر نکل

جائیں تو وہ معاشرہ اخلاقی اور معاشرتی طور پر تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔“ انہوں نے ڈاکٹر فضیلہ جیسی ڈاکٹر کے خلاف قانونی اور عدالتی طور پر چارہ جوئی بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر کے جرم کی کوئی کوئی ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے اور۔۔۔ تم اندازہ لگا سکتے

ہو، یہ کام آسان نہیں۔“

”اسی لیے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”مشتاق جیسے متاثرہ افراد کو جب انصاف کے لیے قانونی

قانون اور دیکھیں کتنی تو وہ گمن گناہ کر اپنا غبار کھانے چل پڑتے ہیں۔“

منہاس نے کہا ”میں بھی اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں، تم اسے پہلا پھسلا کر وہاں سے رخصت کر دو۔ اگر یہ ڈاکٹر فضیلہ

تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ اس کے خون میں ہاتھ رنگ لے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر

بولا ”یہ سیدھا سیدھا معاملہ کے کیس میں جیل چلا جائے گا۔ اس کی بیوی کو زندہ رہنے کے لیے نہیں، کیا کیا جن کرنا پڑیں گے۔ کسی اپنے کسی پرانے کے آگے ہاتھ پھیلاتا پڑیں گے۔

زندگی بڑی دردناک ہے وجدان!“

میں کئی طور پر منہاس باخبر سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا لیکن مشتاق کی موجودگی میں بات کو بڑھانا بھی ٹھیک نہیں تھا لہذا

میں نے ٹھیک تو کھنگٹو کو ان الفاظ پر ختم کر دیا۔

”منہاس صاحب! میں اپنے ذاتی معاملات کے سلسلے میں تمہاری دیر بعد آپ کو فون کرتا ہوں۔ اللہ حافظ۔“

ریسیور کر ڈیل کرنے کے بعد میں مشتاق حیدر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہماری گفتگو کو اس نے پوری توجہ سے سنا تھا اور

میں نے اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے بڑی تفصیل میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور سلی ٹیلی کے علاوہ اظہار

انہوں کے ساتھ اسے فلیٹ سے رخصت کر دیا۔

جانے سے پہلے اس نے تمنا بن لہجے میں کہا ”جناب! آپ خاصے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں نے آدمی رات کو یہاں آ کر آپ کو بہت پریشان کیا ہے۔ میں اس کے لیے

بہت شرمندہ ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔“

”میں نے تمہیں معاف کر دیا۔“ میں نے فراخ دلی سے کہا پھر پوچھا ”تم کہاں رہتے ہو؟“

اس نے جواب دیا ”محمود آباد میں۔“

”تم مجھے اپنا مکمل پتہ لوٹ کر دو۔“ میں نے کہا ”اگر کبھی مجھے ڈاکٹر فضیلہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہوا تو میں

تمہیں اطلاع دوں گا۔“

اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی جس نے اس کے چہرے پر بھی خوشی بکھیر دی۔ بڑی سرعت سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے مجھے اپنے گھر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر

لوٹ کر دیا پھر ہنسنے لہجے میں بولا۔

”میں ایک مرتبہ پھر اپنے روپے اور عمل کے لیے

معذرت خواہ ہوں۔“

میں نے اس کا شانہ چھتھایا ”اے جذبات کو کنٹرول میں رکھو مشاق! پیش اور غصے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ سمجھ داری سے کام لو اور اپنے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرو۔ اپنی بیوی کا بہت خیال رکھو۔ اس وقت اسے تمہاری بہت ضرورت ہے۔“

اس کی آنکھوں میں کی اتر آئی۔ اس نئی میں ممنونیت کا سمندر موج زن تھا۔ میں نے مزید کہا ”کیا تمہاری بیوی کو یہ بات معلوم ہے، تم ریو اور اٹھائے ڈاکٹر فیصلہ کو تلاش کرتے پھر رہے ہو؟“

”نہیں، میں نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔“  
”اور بتانا بھی نہیں۔“ میں نے تاکید اٹھائی۔  
اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

مشاق حیدر کے جانے کے بعد میں نے منہاس باقر کو دوبارہ فون کیا ”ہاں منہاس صاحب!“ میں نے رابطہ ہونے پر کہا ”مشاق کی موجودگی میں حساس موضوعات پر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے چوہدری نواز شہ کو ایک اوپن وارننگ دے دی ہے۔“

”میں سمجھ گیا تھا۔“ وہ مشاق کی موجودگی کے حوالے سے ہلکا پھلکا پوچھا ”چوہدری نواز شہ سے کیا ڈائیلاگ ہوئے؟“

میں نے اسے، چوہدری سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ”اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کتنا با اختیار اور سمجھ دار چوہدری ہے۔ اپنی طاقت اور اختیار کے زعم میں وہ میری وارننگ کو کوئی اہمیت دیتا ہے یا نہیں۔ اس سے اس کی سمجھ داری اور سوجھ بوجھ کا بھی پتا چل جائے گا۔ بیٹے کا رشتہ بہت اہم ہوتا ہے منہاس صاحب!“

”رشتہ بیٹے کا ہو یا بیٹی کا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ منہاس نے کھیر آواز میں کہا ”اولاد کا غم اور خوشی دنیا کے غم اور خوشی سے مختلف اور نرالی ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، وہ فیصل کے سلسلے میں گھٹنے ٹیک دے گا۔ تمہاری وارننگ بے لگ اور خاصی سنگین ہے!“

”سمجھ داری اور حالات کی نزاکت تو اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔“ میں نے کہا ”آنے والا وقت ہی بتائے گا، چوہدری اس بازی کو کس انداز میں کھیلتا ہے۔ اگر اسے اپنے چہیتے کی زندگی عزیز ہے تو پھر سال کو میرے حوالے کرنا ہوگا۔ شعیب غوری کسی بھی صورت چوہدری نواز شہ سے زیادہ طاقت ور اور بارسوخ شخص نہیں۔ میں نے چوہدری کو پاکستان

اور پاکستان سے باہر کی محاذوں پر رکھا اور برتا ہے۔ اگر چوہدری، شعیب سے سال کی واپسی کی فرمائش کرے گا تو مجھے یقین ہے، شعیب اس سے انکار نہیں کرے گا۔“  
منہاس باقر کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”بظاہر تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔“  
”اور دور پردہ کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم صرف امکان کی بات کر سکتے ہیں۔“ منہاس نے کہا ”بالفرض، چوہدری تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے یا یوں کہو، مجبور ہو جاتا ہے لیکن کل شام سے پہلے کا وقت وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں گزارے گا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرنے کا کہ کسی طرح فیصل کا سراغ مل جائے تاکہ تم سے ڈیل کی کویت ہی نہ آئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

میں نے کہا ”بڑی وضاحت سے سمجھ رہا ہوں جناب۔ جس طرح چوہدری اپنے بیٹے تک پہنچنے کے لیے اپنے کراچی نیٹ ورک اور شعیب غوری کی سی ایف کے استعمال میں لا رہا ہوگا، دوسری طرف بالکل اسی طرح ہم بھی سال کو کھوجنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں۔ کامیابی جس کا مقدار ہوگی وہ پہلے اپنے مطلوبہ بندے تک پہنچ جائے گا۔ سی ایف کے بہت ہی منظم اور فعال تنظیم ہے۔ شعیب نے لاہور میں میری قیام گاہ کا سراغ لگایا تھا اور فریڈ پاشا کی کوشی میں فون پر ہماری بات بھی ہوئی تھی۔ شعیب بہت ظالم اور سفاک شخص ہے۔ ساتھ ساتھ والے فٹن میں شامل ہمارا ایک بندہ امجد اس کے گھمے چڑھ گیا تھا۔ اس نے امجد کی زبان کھلوانے کے بعد اسے ٹھکانے لگوادیا۔ اس طرح شعیب پر یہ حقیقت مکمل گئی کہ کراچی میں آپ اور لاہور میں فریڈ پاشا میری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ آپ نے اس فلیٹ کے بارے میں تو مجھے مطمئن کر دیا کہ شعیب کا اس طرف دھیان نہیں جاسکتا۔ بہر حال، شہزاد کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ خاص طور پر اس فلیٹ کی طرف آتے جاتے ہوئے بے حد چوکنا رہنا ہوگا۔ اور آپ تو خاصے معروف آدمی ہیں۔ شعیب غوری برا اور است یا جھپ کر آپ پر وار کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”ہمیں اپنی حفاظت کی طرف سے ہر وقت بہت الٹ رہنے کی ضرورت ہے۔“ منہاس باقر نے کہا ”فیصل تک رسائی سے پہلے وہ کسی پر بھی کوئی اوچھا وار کر سکتے ہیں۔ کھلی جنگ میں سب کچھ ممکن ہے۔“

”یہ بات میرے ذہن میں ہے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”میں اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں رہتا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے استفسار کیا ”میرے کام کا

کیا ہوا جناب؟“

وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا ”تمہارا کام ہو گیا ہے۔ میں نے دو تجربہ کار اور مستند مسیح افراد کو ہنگامی میں اس جنگی کی طرف روانہ کر دیا ہے جہاں فیصل کو رکھا گیا ہے۔ وہ دونوں میرے مجرورے کے آدمی ہیں۔ وہ جیسے ہی وہاں پہنچیں گے، شہزاد کو ایک لے کر تمہاری جانب روانہ ہو جائے گا۔ ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”فائل پروگرام تو شہزاد کے آنے کے بعد ہی بنے گا۔“ میں نے کہا ”لیکن ایک بات طے ہے کہ صبح ہونے سے پہلے فواد کا چھاپنا ضروری ہے۔ ممکن ہے، اس کی زبان کھل جانے کے بعد شعیب کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس موقع کو ضائع کرنا محض مہدی نہیں ہوگی۔“

”فواد سی ایف کے میں کوئی اونچی حیثیت نہیں رکھتا۔“ منہاس باقر نے مربیانہ لہجے میں کہا ”اس قسم کے کارکن اپنے پاس یا بگ ہاس کے معمولات یا ذاتی زندگی کے بارے میں مفر کے برابر معلومات رکھتے ہیں۔ میں سال کے سراغ کے سلسلے میں فواد کی طرف سے زیادہ پراسید نہیں ہوں۔“

میں نے غصے لہجے میں کہا ”فواد اور جہانگیر ایک ہی رہے اور حیثیت کے مالک ہیں۔ جہانگیر سے میں نے نہایت ہی اہم راز اٹھوائے تھے۔ میرا خیال ہے فواد کا سیدھی خالی نہیں ملے گا۔ بعض اوقات اس قسم کے معمولی کارندے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔“

”میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کروں گا وچدان!“ اس نے غصے سے انداز میں کہا۔ ”میں جو محسوس کر رہا ہوں وہ میں نے بیان کر دیا۔“

میں نے کہا ”میں فواد کو نچوڑنے کے بعد کسی اور طرف کا رخ کروں گا۔ ہو سکتا ہے، وہ جہانگیر سے متعلق ہی کوئی سنگینی خیر انکشاف کر دے۔ ابھی تک ہم جہانگیر کی زندگی یا موت کے بارے میں جرحیقین نہیں ہیں۔“

پھر چوتھ منٹ تک ہمارے درمیان چوہدری نواز شہ، شعیب غوری، سال اور فیصل کے بارے میں انتہائی اہم باتیں ہوئی رہیں۔ سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ فیصل کی حفاظت اور ”راز“ کو اہمیت دی جائے۔ فیصل میری بساؤ کا ایک ایسا مہرہ تھا جو میرے پاس رہتا تو چوہدری کی شکست یقینی تھی لیکن اگر وہ بدستور سے میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر میں ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ منزل پر پہنچنے کے لئے والی بات ہوئی۔ سال ایک مرتبہ مجھ سے اتنے فاصلے پر چلی جاتی کہ میں۔۔۔۔۔

اس سے آگے میں کچھ سوچ نہ سکا۔ یہ سوچ کی ایک ایسی بندگی تھی جس میں قدم رکھنا مجھے گوارا نہ تھا۔ میرے خیال کا پرندہ اپنی پرواز بھول کر زمین یوں ہو جاتا۔ سال سے دوری، زندگی سے دوری تھی اور۔۔۔۔۔ زندگی سے دور دورہ کر کوئی کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے!

فون بند کرنے سے پہلے میں نے منہاس باقر سے کہا ”میری ایک چھوٹی سی فرمائش ہے۔ کیا آپ اپنے پراپرٹی ایجنٹ سے معلوم کر کے ڈاکٹر فیصلہ شریف کی رہائش گاہ کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔“

”یہ عین ممکن ہے اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”لیکن تم اس کے گھر کا پتا جان کر کیا کرو گے؟“ اس کے سوال میں گہری تشویش تھی۔

میں نے کہا ”منہاس صاحب! جیسا کہ مشاق نے بیان کیا ہے اور آپ بھی اس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر فیصلہ غیر نظامی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ اگر اس کی ان مجرمانہ حرکتوں کی تصدیق باضابطہ طور پر ہو جاتی تو اس کو تھوڑی بہت سزا ملنا چاہیے نا۔ انسانی زندگی سے کھینا کوئی تحسن کھیل تو نہیں!“

”اوہ!“ اس کی فکر آواز میری سماعت سے مکرانی ”کہیں تم ڈاکٹر کو کوئی جہت ناک سزا تو نہیں دینا چاہتے؟“

”جہت ناک نہیں، سبق آموز!“ میں نے فقط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا ”وہ بھی کوئی فوری طور پر نہیں۔ ابھی تو میں اپنے انتہائی ضروری مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ ذرا فرصت مل جائے پھر اس مجرم ڈاکٹر کو دیو کیوں گا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کھیر آواز میں اضافہ کیا ”منہاس صاحب! مشاق کی بیوی دس سال بعد امید سے ہوئی تھی اور یہ ان کا پہلا بچہ تھا۔ ذرا سوچیں، اس امید کے پیدا ہوجانے کے بعد انہوں نے کتنے حسین بیٹے بنے ہوں گے، اپنے آنے والے بیٹے کے بارے میں کیا کیا گماناں گے کی ہوگی۔ اولاد کی محرومی کا دکھ کوئی لاولدی محسوس کر سکتا ہے۔ میں نے مشاق کی آنکھوں میں دھوئیں کا بخار دیکھا ہے۔ ایسا کڑوا اور کھٹا دھواں جو ہزاروں روشن دیپوں کے کیمار کی بجائے سے اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر فیصلہ کی نام نہاد دیکھائی نے ایک زہر آلود پھونک مار کر ان کی روشن زندگی کو تاریکی کے عیش خار میں پھینک دیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوگی!“

”ہاں، واقعی یہ کوئی بات نہ ہوگی۔“ وہ تائیدی مگر شک لہجے میں بولا ”بلکہ اسے سراسر زیادتی کہنا چاہیے اور وچدان!“ اچانک اس کا انداز نا صحا نہ ہو گیا۔ ”میں اس ملک

کے طول و عرض میں ایسی ہی جہت کی زیادتیوں کی ہزاروں لاکھوں مثالیں ملیں گی، ہر کس کا مدعا اور دعوے۔

منہاس باقر کی آواز سے دکھ۔ گہرا صدمہ جھٹکتا تھا۔ وہ اسی صورت حال پر کبیدہ خاطر اور بے حد طول تھا لیکن وہ جذباتی آدمی نہیں تھا اس لیے رنج کے اظہار میں جوش کہیں نظر نہیں آتا تھا، گہری سنجیدگی اور بردباری نے اس کے جذبات کو مضبوط لگا دم دے رکھی تھی۔

میں نے کہا ”منہاس صاحب! ہزاروں لاکھوں نہ سہی لیکن میں کسی ایک فریادی اور کچلے ہوئے انسان کی دادری تو کر سکتا ہوں۔ اگر میرے پاس چنگی بھر مرہم ہے تو میں اس سے کسی گھال غصے کا ایک ڈھم تو حنا پ سکتا ہوں۔ کہتے ہیں، ایک انسان کو بھانا پوری انسانیت کو بھانے کے مترادف ہے۔ تو کیا ایک مظلوم کی مدد کرنا ایک ظالم کا ہاتھ توڑنا، دھکی انسانیت کی تداوری نہ ہوگی؟ ایک ظالم کی سرکوبی نہ ہوگی؟“

”بے شک ہوگی!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”میں کل ہی تمہیں اس ڈاکٹر کا پتا معلوم کر کے بتا دوں گا لیکن میری ایک بات ذہن نشین کر لو تاہم کہ اسے میری نصیحت بھی سمجھ سکتے ہو۔“ وہ ایک لمبے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح تصدیق کر لینا کہ ڈاکٹر واقعی تصور دار ہے کیونکہ عموماً ڈاکٹر ایسے کس مریض یا مریض کے لواحقین کے ایما پر کرتی ہیں۔“ ”آپ اس سلسلے میں اطمینان رکھیں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”میں مطمئن ہونے کے بعد ہی کوئی کارروائی کروں گا اور یہی کوئی ضروری نہیں کہ میں اسی وقت نکل کھڑا ہوں۔ سائل کا معاملہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں اسے پہلے پشت ڈال کر کسی اور سرگرمی میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ دیے آپ ایک بات تو بتائیں؟“

”ہاں پوچھو!“ منہاس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ میں نے پوچھا ”آپ ایک اخبار کے ایڈیٹر و پبلشر ہیں۔ آپ اس آرگن کے توسط سے ان معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کیوں نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے، اگر ایسے جرائم پیشہ سب ز افراد کی نقاب کشائی کی جائے تو اس کے بہت سے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔“

”اس نوعیت کے مضامین اور فیچر ز میرے اخبارات میں بلکہ کم و بیش ہر اخبار میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں سنگینی برقرار تھی ”میں اس فریضے سے غافل نہیں ہوں۔“

”آپ نے اس فرض کی ادائیگی کے اثرات بھی دیکھے ہوں گے!“

”کچھ زیادہ..... حوصلہ افزائی نہیں۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”بہنی اخبارات میں ایسے مضامین پڑھ کر لوگوں کا شعور تو بڑھتا ہوگا۔“ میں نے کہا ”عوام ان سے سبق سیکھتے ہوں گے۔ آپ کی یہ کوشش اصلاح معاشرہ کے لیے خاصی تسننی خیز ثابت ہوئی ہوگی اور آپ بڑے حوصلہ شکن انداز میں کہہ رہے ہیں کہ.....“

وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بولا ”وہ جان! بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قوم کا مجموعی مزاج بڑا انوس ناک بن کر رہ گیا ہے۔ اس قوم میں ہم سب شامل ہیں اور میں اکثریت کی بات کر رہا ہوں..... ہم صرف ڈیڑے کی زبان سمجھتے ہیں یا پھر معصیت کی گھڑی کو یاد کرتے ہیں ورنہ اپنی اصلاح اور بہتری کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ کون سی ترکیب اور تدبیر ایسی ہے جو ہمارے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو مگر عمل کرنے سے ہماری جان چاتی ہے ورنہ ہمارے درمیان تو ایک ایسا نسخہ کیا موجود ہے جو مل جل کر غلط فہمیاں دیتا ہے۔ یہ مقدس کتاب ہر گھر میں پائی جاتی ہے لیکن ایسے گھر کتنے ہوں گے جہاں یہ باقاعدگی سے پڑھتی بھی ہوگی اور..... ان لوگوں کو شاکر کا نفعی آسان کام ہے جو اس کی فراہم کردہ تعلیمات کو سمجھتے ہوں گے اور پھر اس کے مطابق اپنی زندگی کو بھی ڈھالتے ہوں گے!“

منہاس باقر ایک سچ سچائی بیان کر رہا تھا جس سے انکار ممکن نہیں۔ کوئی منافی ہی اس انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ یہ آسانی کتاب ایک کامل راہ نجات ہے، اگر اسے سوچ سمجھ کر پڑھا جائے اور پھر غلطیوں سے اس عمل بھی کیا جائے۔ پوری دنیا میں اس وقت مسلمانوں پر بڑا کڑا وقت ہے اور انہیں نئے طریقوں سے ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے کیوں کہ انہوں نے یہ حیثیت مجموعی فرقان حمید کی پکار پر توجہ نہ دینا چھوڑ دی ہے چند بالغ عاقل اور وسیع نظر افراد کے علاوہ اور یہ چند افراد..... درجنوں ہوں یا سینکڑوں اپنا خون جلاتے اور اچھے وقت کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

خوش امید ہے بڑا اور کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ ایک نامید بے آسرا شخص اس سہارے کی بدولت اپنی مایوسی پر قابو پاسکتا ہے۔ خوش امید انسان میں جینے کی امنگ اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے!

منہاس باقر سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تو میں زرگل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس دوران میں خاموش بیٹھی بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ہم دونوں میرے بیٹے

رہم میں تھے۔ زرگل کا خوف بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا اور وہ قدرے نارمل نظر آتی تھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

دور سائیت سے بولی ”اب تو میں بھی یہی محسوس کر رہی ہوں کہ وہ کوئی خواب تھا..... بہت ہی ڈراؤنا خواب!“ اس نے ایک جھرجھری لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی: ”وہ جان! حکمت یار بڑی بے دردی سے میرا گھاد بارہا تھا۔ میں تمہیں متوجہ کرنے کے لیے آواز دینا چاہتی تھی، تمہیں جھج کر پکارنا چاہتی تھی لیکن اس کم بخت نے اتنی جتنی سے میری گردن کو دبوچ کر رکھا تھا کہ بے بسی نے میری قوت کو یابی گویا سلب کر ڈالی تھی۔“

”اب ایسا تو کہہ زرگل!“ میں نے اس کا رہا سہا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا ”میں تمہاری وحشت ناک جھج سن کر ہی تو ادھر لپکا تھا اور تم کہہ رہی ہو.....“

اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں اس سے ہلکی جھلکی چھیڑ چھاؤ کرنے کے موڈ میں ہوں بات کاٹنے ہوئے بولی ”شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا اس لیے مذاق کی سوجھ رہی ہے!“

زرگل ایک تعلیم یافتہ پشتون دوشیزہ تھی اور اس کے انداز گفتگو سے جھٹکتا تھا وہ بڑی لکھی ہے۔ وہ سچ غلط اور لب و لہجے کے ساتھ اردو بولی تھی جو ایک حیرت انگیز بات بھی تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”زرگل! میں تم سے کسی قسم کا مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ واقعی میں تمہاری جھج سن کر بوکھلا گیا تھا۔ گتا ہے اپنے چاچا کو تم نے کچھ زیادہ ہی ذہن پر سوار کر لیا ہے۔“

”حکمت یار کوئی انسان نہیں بلکہ ایک آسیب ہے۔“ وہ تمہیر آواز میں بولی ”اس نے پچھلے دنوں جس شیطانی انداز میں میری زندگی کا تعاقب کیا ہے..... اور یہ تعاقب ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے حکمت یار جب تک میری جان نہیں لے لے گا“ اسے سکون نہیں آئے گا۔“ ”پت کے اختتام پر اس نے ایک مرتبہ جھرجھری لی۔

”یادہ پہلے بھی تمہارے خواب میں آتا رہا ہے؟“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

وہ نیں میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”تمہیں وہ جان! ایسا آج پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ میں اپنے خیالوں میں جہد وقت اس سے خوف زدہ تو رہتی ہوں لیکن ایسا واقعہ پہلے بھی پیش نہیں آیا..... اور میرا خیال ہے یہ کوئی اچھی علامت نہیں!“

”تمہارے خیال کی تائید کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں محسوس کر رہا ہوں حکمت یار کی وحشت تمہارے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہی ہے وہ تمہارے شعور سے آگے بڑھ کر لا شعور پر بھی حاوی ہونے لگا ہے۔ تمہارا دن کا سکون تو برباد تھا۔“ اگر یہی صورت حال زیادہ عرصے تک برقرار رہی تو راتوں کی نیند بھی غارت ہو جائے گی۔ تم جی بڑبڑا کر اور کبھی چلا کر اٹھو گی اور حکمت یار کے خوف سے قہر کا پچنے لگو گی۔ میں کل تمہاری کہانی ضرور سنوں گا اور ہر ممکن تمہاری مدد کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔

دیے ایک بات کا تم اطمینان رکھو۔“ میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور غصے آمیز لہجے میں کہا ”تمہارا چاچا حکمت یار یہ نہیں جانتا کہ تم لاہور سے کراچی منتقل ہو چکی ہو لہذا انی الحال تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں۔“ ”میں باقی ہوں وہ جان!“ وہ شکر گزاری کے احساسات کے ساتھ بولی ”تم نے اب تک میری بھرپور مدد کی ہے اور آئندہ بھی اس سلسلے میں تم مجھے یاس نہیں کرو گے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں کوئی سوال کیے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چند لمحات کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا ”میری کہانی تو تم بعد میں سننے رہو گے۔ ابھی فوری طور پر تم مجھے کوئی ایسا نوٹناؤ جس سے میں اپنے دماغ اور سوچ کو قابو میں رکھ سکوں۔ تم نے میرے پاؤں کی سوچ نکالتے وقت کوئی حادہ دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اعصاب کو بڑے سکون رکھنے کے لیے بھی تم مجھے گھر کی کوئی بات ضرور بتاؤ گے!“

وہ سرخ و سفید پشتون دوشیزہ اس وقت بہت ہی سادہ اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس کی سادگی اور معصومیت میں شرمیلر ملاوٹ نہیں تھی۔ اس قسم کے خالص اور سچے تاثرات اسی وقت نمودار ہوتے ہیں جب انسان اپنے کسی قابل اعتماد و خیر خواہ کے سامنے ہودہ سامنے والے سے ہمدردی، غلطی اور تعاون کی امید رکھتا ہو اور اسے یقین ہو سامنے والا اس کی بات اور معاملات کو اپنی ذات تک محدود رکھے گا۔

اس بات میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ زرگل مجھے پر غلطی اور قابل بھروسہ سمجھتی تھی۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ قاضیہ کالونی والی لکھی سے میرے ساتھ نہ جاتی، گلبرگ قمری والی لکھی میں قیام سے انکار کر دیتی اور یوں ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور سے کراچی نہ پہنچ جاتی! زرگل کا یہ بھروسہ اعتماد اور مدد کی توقع اپنی جگہ لیکن اس کے کھلتے اور نکلنے ہوئے پرچم زے کی وارننگ سے کم نہیں

میں زرگل کے بارے میں نہیں جانتا تھا بلکہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا سوائے اس کے چاچا چمکت یار..... اور ان کی دشمنی کے۔ اس کی داستان حیات سننے کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ بالآخر مجلے کیا جاسکتا تھا۔ میں اس کی کٹی اور کسی مدد کر سکتا ہوں اس سلسلے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

”میں ایسا نہیں سمجھوں گی۔“ وہ خیف سا سکا کر بولی۔  
 ”یہ بھی گرد تو بہت ہی عمر رسیدہ اور کمر فریدہ شخص کو کہا جاتا ہے  
 جب کہ تم تو ماشاء اللہ ابھی بھر پور جوان ہو!“

”زرغل! اگر دیا چلے کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے ایسے گرد بھی دیکھے ہیں جن کے چلے عمر میں ان سے دو گنا اور تین گنا تھے۔“

”وعدہ ان! تم نے بہت کچھ دیکھ رکھا ہے۔ پچھلے چند دنوں کے تجربے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔“

”اللہ نے یہ دو آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی دی

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ یہ دستور نکتے ہوئے  
 بولی ”یہ الگ بات ہے کہ ان مناظر میں بعض خوش گوار اور  
 بعض بہت ہی تلخ اور تکلف دہ ہوتے ہیں۔“

میں نے اثبات میں جواب دیا ”یہ تو ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ یہ شر اور خیر کے مختلف عناصر سے ترتیب پاتی ہے۔ ترش اور شیریں کا ملاپ ہی کسی شے کا وجود قائم رکھتا ہے جیسے برقی رو کی ترسیل کو برقرار رکھنے کے لیے مثبت اور منفی پولز کی

زور گل نے پُرسوج انداز میں کہا ”انسان کی آنکھیں اگر متعدد خوب نکالے نظر اوروں کے بعد صرف ایک دل خوش کن منظر دیکھ لیں تو ماضی..... گزرے ہوئے وقت کی ساری کلفت اور کمزورت دور ہو جاتی ہے۔“

کئی سال بھی لگ جاتے ہیں۔“  
 ”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”اس کے لیے زندگی کو خیر باد کہنا پڑے گا!“  
 ”پھر کیا فائدہ۔“ وہ ہاتھ ملہا کر بولی ”جب زندگی ندری  
 تو پھر غم اور خوشی کی کیا اہمیت؟“

”تم یقین جانو۔“ وہ محسوس لہجے میں بولی ”میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہیں دنیا میں کوئی غم و گھر نہیں۔ وہ ہر دلت خوش اور خوش حال دکھائی دیتے ہیں۔“

نے دوسروں سے چھٹی ہوئی ہیں ورنہ انسان کتنا بھی با اختیار یا اقتدار اور صاحب ثروت کیوں نہ ہوئے ممکن نہیں کہ اسے کوئی غم نہ ہو۔ اصول تو یہ ہے کہ انسان زندگی کے مختلف شعبوں میں

جس قدر پھیلا ہوا ہے اُس کی پریشانی، فکر اور مسائل اسی قدر وسیع ہوتے ہیں۔ ”میں نے تجوڑ اتوف کیا پھر اس وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے کہا ”ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اعلیٰ پریشانیوں اور غموں کاؤٹنڈر انہیں اپنے دورِ حال میں

اس نے انہات میں سر ہلا دیا اور ایک گہری طویل سانس لے ہوئے بولی "وعداں! تم مجھ کوئی گمراہتا نہ والے تھے!"

جاری رکھا جائے تو نہ صرف شکستہ اعصاب کی مرہم پٹی ہو جاتی ہے بلکہ یہ قابو میں بھی آ جاتے ہیں۔“

”میں اس مفید مشق کو اپنی زندگی کا حصہ بنالوں گی۔“ وہ

”پلو دھان! منہاس صاحب نے عیو کیب اور دو مسلح سکیورٹی گارڈ یہاں بھیج دیے ہیں۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”میں

میں کہا ”پروگرام موقع ہے۔ صبح سے پہلے پہلے نواد پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ اس مجھ سے نہیں بیٹھا جاسکتا کہ فرمت طے کی تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ میرا سابق تجربہ یہی ہے کہ مجھے کبھی فرمت

میں نے کہا ”شہزاد! اس وقت لمبوسات کی کوئی دکان کھلی ہوگی؟“

دہر لیا ”رات کا ایک بج رہا ہے۔ مجھے نہیں امید ایسی کوئی دکان ملے ہو۔ مگر ٹینس اور بولٹک والے زیادہ سے زیادہ مگیا رہ جے تک اپنا کاروبار سمیٹ لیجے ہیں۔ ویسے مسئلہ کیا ہے؟“ بات کے اختتام پر اس نے پوچھا۔

زرنگ نے ابھی تک نائلہ کا دایہ گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ میں اسے لباس تبدیل کرنے کے لیے کہتا اور از خود اس نے نائلہ کے وارڈروب میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شہزاد نے پوچھا ”لباس نیا ہونے کی شرط ہے یا دھلا ہوا استعمال شدہ بھی طے گا!“

بھی احمد کے ساتھ تھا لیکن خوش قسمتی سے شعیب کے ہاتھ نہیں چڑھ سکا تھا۔  
شہزادے رابطہ ختم ہوا تو زرگل نے تشویش بھرے لہجے

”ہاں، کہا تو تھا!“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں بھی ڈوب ہوا تھا۔ حالات کی بساط پر میرا ذہن مہروں کی پلیننگ کر رہا تھا۔ کیا تم واقعی اس مشن میں عمل حصہ لینا

سے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کو گلشن والے قلیٹ سے باہر لانے میں زرگل بہت معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہم نے فواد کے ساتھ جو بھی کارروائی کرنا تھی وہ اس

اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر کہیں کرنا تھی۔ وہ ایک رہائشی عمارت تھی۔ اگر ہر فرد کے فلیٹ پر کوئی غیر انسانی مضمون کھول بیٹھے تو ایک مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی!

داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی "دلوں ہی باتیں ہیں وجدان۔ مجھے یہاں تنہا رہنے ہوئے واقعی ڈر محسوس ہوگا۔ اس فلیٹ پر بٹکنے اور خوف زدہ ہونے سے تو یہ اچھا ہوگا میں تمہارا ہاتھ بناؤں۔"

اس کے لہجے سے انہایت اور غلوں میں پھٹتا تھا۔ "ہاتھ بناؤں" کے الفاظ اس نے اتنی سادگی اور سچائی سے ادا کیے تھے کہ میں اس کی پیش کش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اسے ساتھ لے جانے کے بارے میں سوچ ہی چکا تھا، فراخ دلی سے کہا۔

"ٹھیک ہے زمرگ! تم بھی ہمارے ساتھ ہی جاؤ گی۔" "بس تو بھر جلدی سے مجھے وہ مختصر مشق بتا دو۔" وہ کسی نئے بچے کی طرح بھل کر بولی "تا کہ جب ہم اس مشن سے کاماب لوں تو میں اپنے بکھرے ہوئے اعصاب کو سمیٹ کر چین کی نیند سو سکوں۔"

میں چند لمحات تک خاموش رہ کر اپنے خیالات کو ایک نقطے پر جمع کر رہا تھا زمرگ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"تکیدہ اعصاب کسی تپتی ہوئی ڈوری کے مانند ہوتے ہیں۔ ڈوری کو چاہے جتنا بھی صحیح کرتا ن لیا جائے اس میں حرید کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ اس کی فطرت میں لچک ہوتی ہے جو اسے ٹوٹنے سے بچائے رکھتی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کی فطری لچک کا اختتام ہو جاتا ہے اور ڈوری کے بل ٹھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ ٹھکنے سے پہلے ٹوٹنے ہیں پھر ٹھکرتے ہیں۔ ان بلوں کے نازک ریشے شکست و ریخت کا شکار ہو کر اپنی سالمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ڈوری کا وجود انہی ریشوں کی محنت پر منحصر ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی صورت شکل کو برقرار رکھیں رکھ سکتے تو ڈوری کا جو دھب تک قائم رہ سکتا ہے۔"

"انسان کے اعصاب کی طاقت اور ضعف کا دار و مدار بھی لچک پر ہے جس شخص کے اعصاب میں جتنی زیادہ لچک موجود ہوئی ہے وہ اتنی ہی زیادہ برداشت کا مالک ہوتا ہے۔"

"تپتے ہوئے اور ٹھکنے والے اعصاب اپنی لچک کو کھو دیتے ہیں جس کے نتیجے میں انسان ڈھس جاتا ہے اس لیے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اعصاب میں لچک پیدا کرے تاکہ اس کی ذہنی اور جسمانی محنت بہ حال رہ سکے۔" فقرات اور پریشانیوں اس لچک کے دشمن ہیں۔ آپ کی محنت کے یہ دلوں دشمن اگر ختم نہیں ہو سکتے تو نہ ہوں۔ انہیں اپنا کام کرنے دیجئے اور آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ اعصابی لچک کو بڑھانے کا کام اپنی برداشت میں اور صبر کو آزمائے کا کام!"

وہ ہمدردی کوٹھ یک تک مجھے دیکھ کر جاری تھی۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ تحقیقی اعصاب میں لچک پیدا کر کے تمہیں ذہنی سکون فراہم کرے گی، کسی بھی آرام دہ جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ لیٹ جاؤ یا کھڑی ہو جاؤ۔ آرام دہ جگہ سے میری مراد ایک ایسی جگہ ہے جہاں تازہ ہوا کا گزر ہو اور کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ ہو تاکہ تم پوری توجہ سے یہ مشق کر سکو۔ بیٹھ کر لیٹ کر یا کھڑی ہو کر مجھے جیسے جیسے تمہیں ہولت ہو جائی انہیں بند کر لو۔ اس کے بعد تین چار گہری اور ہموار سانس لو تاکہ پیچھے تازہ ہوا سے معطر اور ذہن منور ہو سکے۔ اس مختصر تیاری کے بعد اپنے ذہن میں کسی کلف دار کپڑے کا تصور کرو۔ کھڑکھڑاتا سرسرا تا اور کڑک کپڑا۔ یہ ناراض اور غصیلیا کپڑا تمہارے اعصاب ہیں۔ تم نے اس میں لچک اور نرمی پیدا کرنا ہے۔ اور تم بھینا ایسا کر کے دکھاؤ گی۔"

"ایک گہری سانس کھینچو۔ دھیرے دھیرے ناک کے راستے تازہ ہوا کو اپنے پیچھے زون میں بھر دے۔ جب سانس کی آمد مکمل ہو جائے تو پھر منہ کے راستے سنی بھانے والے انداز میں ہونٹوں کو سکیز کر اس سانس کو آہستہ آہستہ خارج کرو۔ تصور یہ قائم کرو کہ تم اس اکڑے ہوئے کپڑے پر پھونک مار رہی ہو۔ تمہاری پھونک میں بڑی تازگی اور فرحت ہے بڑی نرمی اور لوج ہے۔ اس پھونک کی ٹھنڈک اور طاقت کپڑے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس کی اکڑنوں ٹھنڈک رہی ہے جس کی جگہ نرمی اور گداز پیدا ہو رہا ہے۔ وہ کلف دار کپڑا رفتہ رفتہ نرم میں بدل رہا ہے۔ اس کے اندر اتنی لچک اور لوج پیدا ہو چکا ہے کہ یہ زمانے بھر کی تھکنوں، خستوں اور کڑکھلی کو اپنے دامن میں سوسل سکتا ہے۔ ان منفی عناصر کی ہستیاں کو نیست و نابود کر کے راحت اور آرام کی فضا تخلیق کر رہا ہے!"

"یاد رکھو! نرمی سے زیادہ کوئی شے سخت نہیں ہو سکتی۔ خطرناک سے خطرناک تلوار کا دار و روکے کے لیے ڈھال بنائی جاسکتی ہے اپنے جسم کو فائر جگ سے محفوظ رکھنے کے لیے بلیٹ پروف ہیلمٹ اور جیکٹ تیار کی جاسکتی ہے لیکن نرمی کا دار و روکے کے لیے آج تک کوئی ڈھال کوئی روک ایجاد نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ جسم پر نہیں دل بردار کرتی ہے ذہن کو سخر کرتی ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو تسخیر کرنا ہی اصل حکمرانی ہے۔ اپنی طاقت کے بل پر مخلوق خدا کو ہراساں کر کے انہیں اپنے اشاروں پر نچھاننا اور اپنے احکام کی بجا آوری پر مجبور کرنا ایک ناک ہے اپنی برتری جتانے کا ایک کھوکھلا مظاہرہ۔ ایسے چھٹ بھیس کی دنیا میں کی نہیں!"

میری تقریر ختم ہوئی تو زمرگ کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے

چونک کر مجھے دیکھا اور ٹرانس کی کیفیت میں بولی "بھریا ہوا!" "اور پھر دردناکے پر دستک ہونے لگی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اگلے ہی لمحے واقعی دستک ہونے لگی۔ زمرگ نے دیکھ کر پچھلا کر مجھے ناچنے کی کوشش کی۔ میں خاموشی سے اٹھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ شہزاد علی سامنے کھڑا مکر رہا تھا!

☆☆☆☆☆  
کرم اپار غنٹس سے چند گز پہلے ہی شہزاد نے سیلو ہڈائی روک لی۔ اس مقام پر نیم تاریکی تھی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ ہم جس قسم کی کارروائی کرنے وہاں پہنچے تھے اس کے لیے مناسب وقت جی تھا۔ کرم اپار غنٹس ایک بہت بڑا ہانسی منصوبہ ہے جس میں سیکڑوں فلیٹس ہیں جن میں نیچے والوں میں سے اکثر سوز رہے تھے۔

شہزاد بہت موقع شناس اور پابند پیر بندہ تھا۔ میں نے زمرگ کے لیے ایک لباس کی فرمائش کی تو وہ تین لباس اٹھا لایا۔ وہ میری طرف آنے سے پہلے منہاس باقر کے بیٹھے پر گیا تھا اور زمرگ کے لیے شانہ کا ایک نیا لباس وہاں سے حاصل کر لیا۔ مذکورہ لباس شانہ نے چند روز پہلے ہی خرید لیا تھا اور ابھی اس کے استعمال میں نہیں آیا تھا۔ شانہ اور زمرگ کی فونک میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے زمرگ کے بدن پر وہ لباس بڑا فٹ بیٹھا تھا۔

دوسرے دو لباسوں کو دیکھ کر میں چونک اٹھا تھا اور میں نے حیرت بھرے لہجے میں شہزاد سے پوچھا تھا "یہ دو لباس تم کیوں اور کہاں سے لائے ہو؟"

وہ دو پولیس یونی فارم تھیں۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ایک لاٹری والے سے میری اچھی یاد اللہ ہے۔ ایک پولیس والوں کی یونی فارم اس کے پاس دھلنے کے لیے آئی ہیں۔ میں نے اس وقت اسے تھوڑی تکلیف دی اور وہ میرا مسئلہ حل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ہم اپنا کام نکالنے کے بعد یہ دو لباس لاٹری والے کو لوٹا دیں گے۔ وہ انہیں دوبارہ دھو کر بیٹ کر دے گا۔" وہ ایک لمحے کو حریف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا "وہ جان! فوٹو کرم اپار غنٹس سے باہر لانے کے لیے ہمیں پولیس والوں کا سوا ٹک بھرتا ہو گا ورنہ اس رہائی علاقے میں کارروائی خاصی مشکل ہو جائے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!"

میں نے ہر معنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن یہ

محض دردیاں ہیں۔ مخصوص قسم کے پیلٹس اور بیجز کے بغیر کہیں وہاں کا چوکیدار کسی شک میں جھان نہ ہو جائے!" "میرا خیال ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ جینی لہجے میں بولا "اس شہر میں پولیس کی وردی دہشت اور خوف کی علامت بن گئی ہے چوکیدار فردی معاملات پر توجہ نہیں دے گا۔ پھر ہمارے پاس اختیار بھی ہوں گے تو وہ دم نہیں مار سکے گا۔ اس پر ہم خالص پولیس والوں کا سا انداز اختیار کریں گے تو انہی نیموں کے بغیر بھی نکل آئے گا۔" زرار کر اس نے کہا "تم اس مشن میں سینئر اور میں جونیئر پولیس والا ہوں۔ میں کلاشکوف اٹھاؤں گا اور تم یہ پائل اپنے پاس رکھو گے۔ باقی کا کام ہم اپنی بھرپور اداکاری سے چلائیں گے۔ کیا۔ آئیڈیا ہے؟"

"آئیڈیا اچھا اور قابل عمل ہے!" میں نے ہر سوچ انداز میں غندہ بے دے دیا۔ شہزاد دو پولیس یونیفارم کے ساتھ اسلحے کے نام پر ایک کلاشکوف اور ایک بی بی پائل بھی لایا تھا۔ آئندہ چند منٹ میں ہم نے لباس تبدیل کیے اور کارروائی کے لیے لاٹری میں طے کر لیا تھا۔ اب ہم دو پولیس والوں کے ہمیں میں سیلو ہڈائی میں ملے میدان میں کودنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں نے احتیاطاً فلیٹ سے روانہ ہوتے وقت اپنا سول ڈریس گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا کمال تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا یہ بھی دیگر ضروری لوازمات کا حصہ ہے اور کسی بھی وقت اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ زمرگ چاقو و چونہ غنٹس شیش پر براجمان تھی۔ اس کے چہرے سے دہادہا جوش ظاہر ہو رہا تھا میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور کہا۔

"زمرگ! اہم انداز جارہے ہیں۔ تم گاڑی میں بیٹھ کر ہمارا انتظار کرو!" "ٹھیک ہے" مجھے امید ہے تم لوگ اندر زیادہ دیر نہیں لگاؤ گے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ شہزاد نے زمرگ سے پوچھا "تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا؟"

زمرگ نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ ہم دونوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ میں نے زمرگ سے کہا "تم آگے پنجرہ ڈیٹ پر آ جاؤ۔ تاکہ واپسی کے سڑک کو آسان بنایا جاسکے۔" اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں مطمئن ہونے کے بعد شہزاد کے ساتھ کرم اپار غنٹس کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ میں نے پہلے ہی سوچا تھا کہ زمرگ اسے باہر لانے کے لیے زمرگ کا سہارا لوں گا۔ ایک مرتبہ وہ اٹھالے سے نکل آتا تو پھر ہم اس کے ساتھ ہر سڑک کے لیے تیار تھے مگر شہزاد کے آئیڈیا میں



زیادہ جان حتی لہذا اسے آزمائے کا فیصلہ کیا گیا۔ پولیس والوں کے روپ میں ہم قلیٹ کے اندر اور باہر فواد کے ساتھ جرم کا سلوک کر سکتے تھے، کسی بھی شخص کو ہمارے رویے پر حیرت یا اعتراض نہ ہوتا۔ پولیس کے بارے میں معاشرے کی عمومی سوچ اس وقت میرے لیے خاصی آسانیاں فراہم کرنے کا وسیلہ بن گئی تھی۔ عوام آئے دن پولیس والوں کے ایسے "کارنامے" دیکھتے رہتے ہیں!

چوکیدار ہمیں دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا۔ وہ چالیس سال کا ایک محنت مند شخص تھا۔ جس کے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ لباس کے اندر کچھ چھپا رکھا ہوتا لوگ بات ہے۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے ٹھکانہ انداز میں سوال داغ دیا "تیرہ ڈی میں کون رہتا ہے؟"

میرے اکڑے ہوئے لہجے نے اسے باور کرایا کہ کوئی سنگین گزربڑے۔ اس نے کہا "سر! اس قلیٹ میں ایک جوڑا رہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی چند دن پہلے ہی آئے ہیں۔ جہانگیر کی بیوی بے چاری گولی ہے۔"

چوکیدار کی فراہم کردہ اطلاعات چونکا دیے والی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس قلیٹ میں صرف فواد کو ہونا چاہیے تھا۔ شہزاد نے سوائے نظروں سے مجھے دیکھا، میں خود بھی اچھٹا گیا تھا۔ ہماری لمبائی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر چوکیدار نے پوچھا۔

"سر! خبر یہ تو ہے نا....."

میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "خیریت بالکل نہیں ہے۔" پھر میں نے اسے چکر دیا "تم نے جس شخص کا نام جہانگیر بتایا ہے اس کا حلیہ یہ ہے نا؟" اس کے بعد میں نے فواد کا تفصیلی حلیہ اور قد کاٹھ اس کے سامنے بیان کیا۔

وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بالکل..... بالکل..... میں اسی جہانگیر کی بات کر رہا ہوں۔" مجھے بس اتنا ہی موقع درکار تھا میں چوکیدار کے ذہن پر سوار ہو گیا "تم جسے جہانگیر سمجھ رہے ہو اس کا نام فواد ہے اور وہ ایک خطرناک دہشت گرد ہے۔ ہم کافی دنوں سے اس کے تعاقب میں تھے۔ آج رات ہی اس کا سراغ ملا ہے وہ دس اور گیارہ بجے کے درمیان یہاں آیا ہے۔"

"سر! جہانگیر کے ساتھ تو اس کی کوئی بیوی....."

"سب کچھ اس بے ایک ڈراما ہے۔" میں نے چوکیدار کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔ "ابھی دیکھنا تم 'ہم کس طرح اس خطرناک مجرم کو بے دست دبا کر کے اپنے ساتھ لے جاتے

ہر۔" قانون کی نگاہ سے بچنے کے لیے یہ لوگ آج کل اسی طرح رہائش علاقوں میں پناہ لے رہے ہیں اور خود کو فیملی والا ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ کوئی عورت بھی اس کی ساتھی ہوگی..... اور عین ممکن ہے وہ کوئی بھی نہ ہو۔"

چوکیدار تنگ اور سنسنی آمیز تاثرات کے ساتھ دیکھنے لگا۔ شہزاد نے کہا "سر! جلدی کریں۔ اگر فواد کو پولیس کی بھونک بھی پڑ گئی تو وہ فرار ہو جائے گا۔ کئی ماہ کی کوشش کے بعد تو اس کی گرفتاری کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔"

میں نے چوکیدار کا کندھا چھتے ہوئے کہا "تم شعل سے خاصے فرض شناس اور مستعد نظر آتے ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"داؤد!" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"تم ادھر گیت پر ہی رہنا داؤد۔" میں نے ٹھکانہ انداز میں کہا "ہم اوپر چارہ ہیں۔ اگر فواد کی طرح ہمیں جمل دینے میں کامیاب ہو جائے اور فرار ہونے کی کوشش کرے تو تم اسے کوئی موقع نہ دینا..... بلکہ تم یہ چھوٹا گیت بھی بند کر دو۔" میں نے مین گیت کے اندر رافع چھوٹے گیت کی جانب اشارہ کیا۔ "اسے روکنے کے لیے تم تہمتی کر سکتے ہو!"

یہ ساری مکالمہ بازی میں ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر کر رہا تھا اور مجھے اپنی اس کوشش میں حد درجہ کامیابی حاصل ہوئی۔ چوکیدار اس طرح میرے احکام کی تعمیل کرنے لگا جیسے اس نے میری باتوں کو سن و سن درست مان لیا ہو۔ دہشت گرد کا حال خاصا موثر ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے شہزاد کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے تیرہ ڈی کی طرف بڑھنے لگے۔ چوکیدار نے مجھے مذکورہ قلیٹ کی لوکیشن بتادی تھی۔ ذیابے زرنگ کی فراہم کردہ اطلاعات بھی میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ تیرہ ڈی سینکڑوں گز پر واقع ایک لی۔ کیٹگری قلیٹ تھا۔ چوکیدار کے مطابق جہانگیر (فواد) ایک کرائے دار کی حیثیت سے وہاں رہ رہا تھا۔

شہزاد نے کہا "پہلا مرحلہ آسانیاں ملے ہو گیا۔ لگتا ہے فواد نام بدل کر یہاں رہ رہا ہے لیکن کوئی بیوی کا قصہ مجھ میں نہیں آ رہا!"

ہم تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا "گوئی بیوی والا قصہ لوگوں کو دکھانے کے لیے ہے۔ خود کو محزز اور شریف شہری ظاہر کرنے کے لیے اس نے تنظیم ہی کی کی عورت کو اپنے ساتھ رکھ لیا ہوگا اور مجھے یقین ہے، وہ عورت قوت کی بانی ہے سالالان ہوگی!"

شہزاد نے ترکت میں آتے ہوئے کہا "وہ جان! تم اس مروجہ کی زبان کھلوانا، میں فواد کی زبان بند کرنے کا کام کروں گا۔ کم بہت نام بھی بدلاتا ہے ہی ایک باغی ساتھی کا نام اسے پسند آیا۔"

شہزاد کا اشارہ اس جہانگیر کی طرف تھا جو سی ایف کے سہ انفراف کے بعد مجھ سے آٹھ گھنٹن پھر اچانک منظر سے غائب ہو گیا۔ اغلب امکان ای کا تھا، شیب خوری نے اسے چھانے لگوادیا ہوگا۔ سی ایف کے ایسی تنظیموں میں راز اور راز داری کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور جہانگیر نے فواد کی موجودگی میں گلستان جو ہر دالے قلیٹ پر جو انکشاف کیے تھے، اس کے بعد تنظیم کے لیے جہانگیر کی حیثیت کسی خالی کارتوس کی سی تھی اور..... خالی کارتوس کو بلیٹ میں پرو کر بیٹے پر سجایا جاتا ہے، نہ ہی اس فائل کی زینت بنایا جاتا ہے۔ اس کھوٹلی شے کو تھیرا اور بے وقعت جان کر پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے!

ہم مطلوبہ دروازے پر پہنچ کر دو تھوڑی گھنٹہ میں چند روز پہلے کا ایک منظر کھم کیا۔ ایک رات میں اور شہزاد اسی طرح جہانگیر اور فواد کی سرکوبی کے لیے گلستان جو ہر کے قلیٹ نمبر ڈی۔ تین سو آٹھ پر پہنچے اور چند خوش گوار ناخوش گوار یادیں رقم کرتے گئے۔

میرے اشارے پر شہزاد نے قلیٹ کے دروازے پر ہلکی دھک دی۔ ڈور تیل کو ہم نے دانت نظر انداز کر دیا تھا۔ پہلی دھک بے اثر ثابت ہوئی۔ دوسری مرتبہ شہزاد نے قدرے زیادہ قوت صرف کی تو اندر سے کچھ اس قسم کی آوازیں ابھریں جیسے دو لکھ دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں اور اب جب میں دروازہ کھلنے ہی والا ہو۔

اسی کیفیت میں دس سینکڑوں گز دور دروازہ نہ کھلا تو ایک مرتبہ بھر دھک کامل دہرایا گیا۔ اس دروازے میں آئی گلاس نصب نہیں تھا۔ میری چھٹی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی، دروازے کے پیچھے کوئی موجود ہے اور دروازہ کھولنے میں ہیں وہ چپس سے کام لے رہا ہے۔ وہاں یقیناً فواد ہو گیا اس کی "بیوی مارکا" ساتھی یا پھر وہ دونوں بھی ہو سکتے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں شہزاد کو ایک مرتبہ بھر دھک کا اشارہ کرتا، دروازے کی اندرونی کنڈی گرنے کی آواز آئی۔ میں نے اپنے لہجے میں حسب ضرورت تبدیلی کرتے ہوئے کہا "جہانگیر! دروازہ کھولو۔ میں داؤد ہوں۔ یہاں کا چوکیدار!" چھٹا کھات کی خاموشی کے بعد دروازہ ختم دا ہوا اور نیند میں ڈوبی نسوانی آواز میں "غوغا" ابھری۔ وہ میری اس وقت آمد کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ گویا فواد نے

کوئی چال چلی تھی!

شہزاد نے ہلک جھپٹے میں، میرا اشارہ پا کر دروازے کو ایک زوردار دھکا دیا۔ دروازے کا پٹ، گوئی کے منہ پر لگا اور وہ اگلے قدموں کی فٹ پیچھے جا گری۔ ہم بھر مار کر قلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عورت کی دردناک گوئی کراہیں ابھرنے لگیں۔ اس کے ساتھ بری ہوئی تھی۔

اسی لمحے کھلے ہوئے دروازے کے پٹ کے پیچھے سے، ایک سایہ نمودار ہوا اور اس نے بڑی بھرتی سے شہزاد کی کمر پر لات رسید کی۔ وہ فواد کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو دروازے کی اوٹ میں چھپ کر صورت حال کو بھاپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس کی صورت میری نظر میں آئی تو میرے خیال کی تقدیر بنی ہوئی۔ وہ فواد ہی تھا۔

میں نے ایک جھپٹے سے قلیٹ کا دروازہ بند کیا اور فواد کی جانب لپکا جو زمین پر گرے ہوئے شہزاد کو دوپٹے کی کوشش کر رہا تھا۔ سینکڑوں ہزاروں حصے میں، میں نے اندازہ لگا لیا کہ فواد شہزاد سے زیادہ اس کی کلاشن کوف میں دلچسپی لے رہا تھا تاکہ باسالیٹ سکے۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنے وزنی بوٹ سے فواد کے تھوڑے پر ایک کاری ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا اور کلاشنوف پر سے اس کی گرفت ختم ہوئی۔ میں نے کار میں اٹھ ڈال کر اسے جھکا دیا اور اٹھا کر دوسری طرف پھینک دیا۔ وہ زمین بوس گوئی پر جا گرا۔ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"بیٹو! سرفواد! تم جہانگیر کب سے بن گئے؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اس کے چہرے پر خوف و ہراس کو منڈلاتے دیکھا، دہشت بھری آواز میں بولا "وہ جان..... یہ تم ہو!"

وہ شاید اب تک ہمیں پولیس والے ہی سمجھ رہا تھا۔ شہزاد کے نام سے وہ واقف نہیں تھا اس لیے مجھے مخاطب کر رہا تھا۔ ہم جس دھواں دھار انداز میں قلیٹ کے اندر داخل ہوئے تھے، اس سے فوری طور پر فواد کو ہماری صورتوں پر دھیان دینے کا موقع نہیں دیا تھا۔

میں نے فواد کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے حقیر آمیز لہجے میں کہا "تم کیا سمجھ رہے تھے، یوں ملن ملین ہو کر میرے ہاتھ سے بچ جاؤ گے۔ میں تمہیں، تمہارے پاس اور بگ پاس کو قبر کے کنارے تک ہراساں کروں گا۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے میرے چہرے کو دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا ”میں تم سے جو کچھ بھی چاہتا ہوں، وہ یہاں ممکن نہیں، خاص طور پر تمہاری کوئی بیوی کی موجودگی میں تو یہ انتہائی دہمات ہوگا۔ یہ بے چاری کیا سمجھے گی، ہم زبان والے اتنے ہی بے ہودہ ہوتے ہیں اور پھر..... میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے۔“

اس دوران میں شہزاد نے کوئی کے دوپٹے کو کوری کی شکل دے کر اس کے دونوں بازو، کلائیوں کے مقام سے پشت پر باندھ دیے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”وہدان! یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔“

میں نے فواد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ہاں بھی! شرافت سے ہمارے ساتھ چلو گے یا پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں تو زردوں؟“

”تم لوگ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ اس نے ہراساں لہجے میں دریافت کیا۔

فواد اتنا بزدل یا گھبرایا نہیں تھا لیکن من گھڑت لہجے سے اس کے پس کر کے رکھ دیا تھا۔ شہزاد نے کوئی کو جھڑپ کے بعد فواد کو کلاشن کوف کے نشانے پر رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب شامیں مار رہا تھا۔ شاید یہ اس تک کا نتیجہ تھا جو چھوڑ دیے پہلے فواد نے اس کی کمر پر رسید کی تھی۔ اس کے سوال پر شہزاد نے پھٹکار کر کہا۔

”تم ہم دونوں کو اپنی لیبارٹری میں لے کر جاؤ گے جہاں تمہارا امیڈیکل نیٹ ہوگا۔ تم نے پہلے بھی کئی لوئی لٹری اور انڈم بہری لڑکیوں کو شادی کے نام پر بہت دھوکے دیے ہیں۔ دیکھنا ہوگا، تم اس کو کئی کا شوہر بننے کے قابل بھی ہو یا نہیں؟“ بات ختم کرتے ہی اس نے زبردست عورت کی جانب اشارہ کیا۔

کوئی نے جھکی ہوئی نظر سے شہزاد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ شاید شہزاد کی بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک میانہ قد اور دلیلی پتلی سانوئی عورت تھی۔ اس کے کوئی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں حتی طور پر فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

مجھے شہزاد کی اس بات سے صد فیصد اتفاق تھا کہ ہمیں اس فلیٹ یا اس عمارت میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے فواد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم پولیس والے ہیں۔ یہ بات ذہن میں بٹھالو۔“

میرے لہجے میں جھنجھکی تھی ”تم دونوں کو اپنے ساتھ تھا۔ لے کر جائیں گے۔ باہر ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ ضرور! تفتیش کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا لہذا.....“

میں نے جملہ احوال چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں بڑا دور تک جھانکا اور سفاکی سے کہا ”تم لوگ شرافت کا مظاہر کرنا۔ اس بلڈنگ والوں کو میں تمہارے بارے میں متاثر ہوں کہ تم ایک خطرناک دہشت گرد ہو چنانچہ اگر تم نے کسی تم جوئی کی کوشش کی تو ”پولیس مقابلے“ میں مارے جاؤ گے۔ میں تمہیں شوٹ کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

میرے انداز میں بھری ہوئی سفاکی اور وحشت نے فواد کو ہادر کر دیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر جلتا خیر عمل ہو کر ڈالوں گا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں سر کو ہلکے جنبش دی۔ میں نے حفظاً بقدم کے طور پر مزید کہا۔

”اگر میری ہدایات پر من و عن عمل کرو گے تو تمہاری زندگی سلامت رہے گی۔ میں ضروری پوچھتا چھ کے بعد چھوڑ دوں گا۔“

اس نے بے اعتباری سے مجھے دیکھا۔ اس کا یہ رد عمل عین فطری تھا۔ اصولی طور پر اسے میری بات کا یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شیب خوری اور میرے درمیان دشمنی کی جو سادہ چمچی ہوئی تھی، اس پر حریف کے کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ مہرے کے لیے بھی چھوٹ نہیں تھی۔ فواد کے پاس کوئی جائے فرار نہیں تھی اس لیے وہ ہماری بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔

ہم سب آگے پیچھے چلتے ہوئے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں نے کوئی کے بندے سے ہوتے ہاتھوں کو دوپٹے کی گرہ سے تمام رکھا تھا۔ فواد شہزاد کی کن کے شہو کے پر چل رہا تھا۔ گیس کے نزدیک چوکیدار کے علاوہ بھی تین چار افراد کڑے نظر آئے۔ وہ وہیں کے رہنے والے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کی سرگوشیوں سے اندازہ ہوا کہ ہماری اس ”کارروائی“ کی خبر چوکیدار تک محدود نہیں رہی تھی اور..... ایک خطرناک صورت حال تھی! کسی وقت کوئی بھی اپ سیٹ ہو سکتا تھا۔ وہاں موجود افراد میں سے کسی کا دھیان ہمارے کندھوں یا کمر ذخیرہ کی طرف چلا جاتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ اس کے بعد ہمارے ”نعلی“ ہونے کا راز کھل جاتا۔

میں نے چوکیدار کے پاس کچھ کمرسب کی طرف دیکھتے ہوئے بے آواز بلند کہا ”تم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔ ہم نے اس دہشت گرد کو گرفتار کر لیا ہے۔ اب تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔“

قسمت مہربان تھی کہ کسی نے ہم سے کوئی میز حایا نیگھا سوال نہیں کیا۔ چونکہ یہ بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر ہمارے لیے گھٹ کھول دیا۔ ہم گھٹ عبور کر کے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ فواد نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دوران میں اپنی گردن جھکا رکھی لیکن نیم تاریکی میں آتے ہی اس کی شرافت کا پول کھل گیا۔

وہ کسی عمدہ صوبہ کی تلاش میں تھا اور ایسا موقع نیم تاریکی نے اسے فراہم کر دیا۔ ہم یلو ہنڈائی سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ فواد نے گن کی پردا کیے بغیر اچانک ایک جانب دوڑ لگادی۔ اس صورت حال نے ہمیں بولھلا کر رکھ دیا۔

میں نے کوئی کہ ایک جانب دھکا دیا اور ترش لہجے میں شہزاد سے کہا ”تم گاڑی لے کر مین روڈ کی طرف آؤ۔ میں اس سوراخ کے بچے کو دیکھتا ہوں۔“

بات ختم کرنے سے پہلے میں فواد کے پیچھے لپک چکا تھا۔ فواد نے اپنی اسٹریٹ پر دوڑ لگائی مگر جو آگے جا کر مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ وہ چاہے کتنا بھی تیز رفتار ہوتا لیکن میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پیچھے کی پھر کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، مسجد بیت المکرم کے نزدیک اسے جالیا۔ اس دوران میں شہزاد نے فاصلہ مندی کا ثبوت دیتے ہوئے گن کو زحمت سے بچانے رکھا۔ دو رات کے آخری حصے میں ہونے والی فائرنگ کی تیز رفتاریت وہاں کے خوابیدہ لوگوں کی نیند خراب کر دیتی۔ ہم کسی قسم کی بد مزگی سے گزر رہے بغیر وہ مشن پورا کرنا چاہتے تھے۔

فواد نے ”نہ پائے رفتن نہ جائے مانن“ والی صورت حال دیکھی تو حاطے کے لیے تین کہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت شہزاد بھی گاڑی لے کر وہاں پہنچ گیا۔ فواد کی کوئی ساسی کو شہزاد نے ہنڈائی کی فنتی نشست پر ڈال دیا تھا۔ زرنگ پینجر سیٹ پر موجود تھی۔ شہزاد نے پویشن کی مناسبت سے بڑی عمدہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے گاڑی اس طرح رد کی کہ فواد گاڑی اور میرے درمیان پھنس کر رہ گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں ایسا تار ڈر دیکھا جسے وہ ایک مرتب پھر بھاگنے کی تیاری کر رہا ہو۔ میں نے اسے کوئی موقع نہ دیا اور تیل اس کے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناتا، میں حرکت میں آچکا تھا۔ میری برقی رفتار فرنت پش تک اس کے پیچھے پڑی۔ یہ ایک طوفانی شوکر تھی۔ وہ ہوا میں پرواز کرتے ہوئے جیسی سمت گیا اور گاڑی کے پونت سے ٹکرایا۔

گھراڑا خاصا شدہ تھا۔ اس کی سر پر خضر تک چوٹ آئی اور وہ بہ آواز بلند چیخنے پر مجبور ہو گیا۔ میں آن و احد میں اس

کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ کراچے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے اس کے جڑے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب گھوم گیا۔ میں نے اس کی گردن پر بازو پھیلا دیا۔ اسے نیچے جھکاتے ہوئے، اپنی ایزی کی ایک ٹھوکر اس کے چہرے پر ثبت کر دی۔

فواد چلاتے ہوئے مغفلات بچنے لگا۔ میرے پاس مکمل کوئی فرصت نہیں تھی لہذا میں نے اس کی مزاحمت کو نیت نہ کر کے اس کے لیے تین چار بے تے دار کیے اور وہ سڑک پر گر کر ہانپنے لگا۔ اس کی حالت خاصی دیگر گونجی۔ آئندہ ایک منٹ کے اندر میں نے شہزاد کی مدد سے فواد کو ہنڈائی کی فنتی نشست پر پہنچا دیا جہاں اس کی نام نہاد بیوی پہلے سے موجود تھی۔ مزید ”پینک“ کے لیے میں بھی گھس کر اسی نشست پر بیٹھ گیا۔ میرے اشارے پر شہزاد نے گاڑی ایک جھلکے سے آگے بڑھا دی۔

گوئی کے ساتھ اس کی پشت پر بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس بات کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے کہ وہ اپنی جانب کالا کھٹا کر گاڑی سے باہر کودنے کی کوشش کرے۔ اس کی طرف سے چیخنے چلانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ فواد کو میں نے پوری طرح فٹ کر رکھا تھا۔ اس کے ذہن پر مزید دہشت بھانے کے لیے میں نے پہل کی بے رحم تال کو اس کی پسلیوں میں چھپوایا ہوا تھا۔

شہزاد بڑی مشاطی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب ہم نے حسن اسکوائر کا سٹیل عبور کیا تو اس نے مجھ سے پوچھا ”وہ جان! جانا کہاں ہے؟“

اس کے لہجے میں حد درجہ احتیاط اور سنجیدگی تھی۔ میں نے تمبیر آواز میں کہا ”جہاں سے تم آئے ہو، وہاں تو ہرگز نہیں جانا۔“

میں فیصل والے حاطے کو ہر قسم کے مسائل سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ شہزاد نے بدستور سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا ”کیا وہاں چلیں جہاں سے تم آئے ہو؟“

”یہ بھی کسی طور مناسب نہیں۔“ میں نے جتنی انداز اختیار کر کے ہوئے کہا۔

”تو پھر؟“ شہزاد کے استفسار میں استعجاب اتر آیا۔ میں نے کہا ”کیا تمہارے پاس کوئی اور ٹھکانا نہیں۔“

تسل بخش ٹھکانا! شعیب خوری پر یہ راز مکمل چکا تھا کہ منہاس باقر پر پش پناہ بنا ہوا ہے لہذا اس کی بھی جگہ پر فواد اور اس کی کوئی ساسی کو لے جانا مناسب نہیں تھا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ منہاس

باقر سے تعلق رکھتی ہو۔ اس طرح شعیب خوری یا چوہدری فوارش کا منیت درک مجھ تک..... اور فیصل تک پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ کم از کم کل رات تک تو میں اس نوعیت کا کوئی رسک لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

شہزاد نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ”میرے پاس دو محفوظ ٹھکانے ہیں جن میں جھلکے جھلکے مارچ کا مناسب سامان بھی موجود ہے۔“ ذرا سا توقف دے کر اس نے اضافہ کیا ”ایک سیل سر جانی ٹاؤن میں ہے اور دوسرا بھائی کالونی میں۔ یہ دونوں اڈے آباد علاقے سے کافی ہٹ کر ہیں۔ وہاں کی جانے والی ”کارروائی“ کسی کی نظر یا سماعت تک نہیں پہنچتی۔ فواد تو جوان ناقل ہے ہی، مجھے یقین ہے مارچ سیل میں پہنچ کر اس کی کوئی بیوی قوت کو یا کی سے کالا مال ہو جائے گی!“

شہزاد کے لہجے سے عیاں سمجھنے نے فواد کو ایک جبر جبری لہجے پر مجبور کر دیا۔ وہ میری جانب گردن مٹھانے کے بعد بولا ”آ..... آپ لوگ..... بہت بچھا ڈمگے۔“

”اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ ہم میں سے کون بچتا ہے گا۔“ میں نے پہل کی تال پر دباؤ بڑھاتے ہوئے فحش لہجے میں کہا ”نی الحال تو تم اس بات کو ذہن میں بٹھالو کہ اگر تم نے اب بولنے کی کوشش کی تو میں تمہاری پسلیوں میں ہوا دان بٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ زندگی سے ذرہ بھر مجھے دیکھی ہے تو زبان پر تالا ڈال لو۔ جب تک تم سے کوئی سوال نہ کیا جائے تمہیں خاموش رہنا ہے۔“

وہ بے بسی سے گردن جھٹک کر رہ گیا۔ میں نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”سر جانی ٹاؤن تو بہت دور ہے۔ میرے خیال میں بھائی کالونی والا ٹھکانا ہمارے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ مناسب رہے گا۔“

شہزاد نے سر کو انتہائی پیش داری اور گاڑی کو بھائی کالونی کی جانب دوڑانا شروع کر دیا۔ اس وقت تک بھائی کالونی ابھی اتنا آباد نہیں تھا، پھر یہ باقی شہر سے بھی خاصا کٹا ہوا تھا اس لیے رات کے آخری پہر وہاں اندھیرے اور سناٹے کی مکمل مکمل داری تھی۔ قیوم آباد اور کراسنگ کے درمیان سفر کرتے ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم تاریکی کے کسی عین غار سے گزر رہے ہوں۔ میں نے احتیاطاً اپنے ڈھکانوں کو ہینڈ ڈاؤن کے احکام دے تاکہ وہ شہزاد کے اس خفیہ ٹھکانے کا کل ڈور ڈھنکھن نہ کر سکیں۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد میں نے انہیں سر اٹھانے کی اجازت دی تھی۔

شہزاد کا ٹھکانا بھائی کالونی کے آباد حصے سے کافی آگے

تھا۔ ہم گاڑی سیت ایک احاطے میں داخل ہو گئے۔ وہ گگ بھگ ایک سوئیں گز کا پلاٹ تھا جس میں چار دیواری کے اندر بڑے سائز کا صوف ایک ہی کمرانا ہوا تھا۔ گاڑی کو احاطے میں چھوڑنے کے بعد ہم اس کمرے میں آ گئے۔ داخلے سے پہلے شہزاد نے کمرے کی واحد لائٹ آن کر دی۔

اس کمرے میں سامان کے نام پر ایک سنگل بیڈ، ایک چھوٹی میز اور چار آہنی کرسیوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں توقع کر رہا تھا، دیواروں پر مارچ کے آلات نظر آئیں گے لیکن وہاں ایسی کوئی شے موجود نہ تھی۔ ممکن ہے، شہزاد نے ان لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے مارچ والی بات کی ہو..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے، مذکورہ آلات کہیں چھپا کر رکھے گئے ہوں۔ بیڈ کے نیچے ایک پرانا سا جستی صندوق رکھا تھا۔ ایذا رسانی میں استعمال ہونے والے مخصوص آلات اس صندوق میں بھی ہو سکتے تھے۔

ہم نے فواد کی کوئی کو ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور خود آہنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پہل جب میں رکھ لیا تھا، تاہم شہزاد نے ان دونوں کو کلاشکوف کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ میرے استفسار پر جب شرافت کی زبان فواد کی سمجھ میں نہیں آئی تو شہزاد نے اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ وہ پہلے ہی ہی طرح زخمی تھا، شہزاد نے اسے دھتک کر رکھ دیا۔

دو منٹ بعد فواد کمرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس طرح کہ..... اس کے دونوں ہاتھ زمین پر پھیلے ہوئے تھے، پتھیلیوں کا رخ اوپر کی جانب تھا۔ ان پتھیلیوں کے مین وسط میں آہنی کرسی کے پائے پیوست تھے اور..... مذکورہ کرسی پر شہزاد بہ نفس نفیس موجود تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”وہ جان! ابھی میں نے پورا زور نہیں ڈالا اور اس ناپاک جانور کی حالت خیر ہو رہی ہے۔ تم نے جو پوچھا ہے، پوچھو۔ اگر اس نے کسی غلامیاتی سے کام لیا یا تمہیں پس گانیز کرنے کی کوشش کی تو میں آرام سے پھیل کر بیٹھ جاؤں گا..... کرسی کے پائے اس مردودی پتھیلیوں میں گزریں گے تو اس کی ترکی تمام شدہ ہو جائے گی۔“

فواد صورت حال کی سمجھتی اور ہمارے بے رحم ارادے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے سائے لہرانے لگے۔ اسے یقین ہو گیا، اس کی جان چھوٹنے والی نہیں لہذا اس نے تعاون پر آمادگی ہی میں عافیت جانی اور اچھے بچے کی طرح میرے سوالات کے ٹھیک



کردوں گا۔

بات کے اختتام پر اس کے لہجے میں سفاکی در آئی۔ یہ سمجھنے میں مجھے قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ ”معتول بندوبست“ سے اس کی کیا مراد تھی۔ فواد جیسے سنگ دل اور قاتل لوگوں سے کچھ سمجھ نہیں ہوتا۔ یہ اپنی مطلب برادری کے لیے سنگین سے سنگین تر قدم اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔

میں آئندہ دس منٹ تک فواد سے شعیب غوری کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ اپنے بگ باس کے بارے میں مجھ سے کم ہی جانتا تھا۔ میں نے ساحل کے حوالے سے بھی کئی سوال کیے لیکن یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ میری سامگی کولا ہور سے کراچی پہنچایا گیا تھا اور وہ شعیب کے قبضے میں تھی۔ فواد کو صرف اتنا پتا تھا کہ میں کراچی آچکا ہوں۔ تنظیم کے دیگر کارکنان کی طرح فواد کو بھی میری طرف سے ہوشیار بننے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پتھر بھی گرم تھی کہ مجھے پکڑنے کے لیے شعیب غوری نے کوئی بہت ہی خفیہ منصوبہ بنایا تھا جو چندہ چندہ افراد کی ہی محدود تھا۔ میں نے ہر طرح کا دباؤ ڈال کر فواد کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن کوئی حوصلہ افزائی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں نے ایک نفسیاتی چال چلی اور فواد سے کہا ”اگر تم مجھے پکڑ کر شعیب غوری کے حوالے کر دو تو اس کا رتا سے پر وہ تمہیں کسی بھی ضلع کا پاس بنا دے گا۔ اس کوشش کے بارے میں تم کیوں نہیں سوچتے؟“

وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر شکایتی لہجے میں بولا ”کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ میں تو اس وقت خود تمہارے رحم و کرم پر ہوں، تمہیں پکڑ کر بگ باس کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں!“

”اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کروں گا۔“ میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا ”اگر تم عندیہ دو تو میں تمہارے ساتھ چلے کو تیار ہوں۔“

دو بے یقینی سے مجھے سننے لگا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ سی ایف کے اس وقت تمہارے بھوکے پیاسی ہور ہی ہے اور تم خود میرے ساتھ چلے کو تیار ہو۔ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری فرمائش تو خود کشی کے مترادف ہے۔“

”تم کوئی خواب دیکھ رہے ہو اور نہ ہی میرا دماغ اپنی

جگہ سے سرکا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”اگر تم مجھے سیدھا شعیب غوری کے پاس لے چلو تو میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ یہ کوئی مذاق ہے اور نہ ہی خود کشی کی کوشش۔“

”یہ کیسے ممکن ہے!“ وہ بد لے ہوئے انداز میں بولا ”میں نے آج تک بگ باس کو دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے بچے ٹھکانے سے واقف ہوں۔ تم اس تنظیم کے فعال رکن رہ چکے ہو، اس کا طریقہ کار تم سے ڈھکا چھپا نہیں۔ میں تو براہ راست ”ایسٹ“ کے پاس سراج الدین سے بھی رابطہ نہیں کر سکتا، بگ باس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اگر کسی طرح تم میرے قابو آ جاتے تو میں پہلی فرصت میں تمہیں غلام جیلانی کے حوالے کرتا۔ غلام جیلانی ایسٹ کے کرتا دھرتا سراج الدین تک یہ خوش خبری پہنچاتا۔ اس طرح سراج الدین کے ذریعے تمہاری امیری کی اطلاع بگ باس تک پہنچ جاتی۔“

میں نے بے سوچ انداز میں کہا ”تو پھر بے کار ہے۔ تم کسی کام کے بندے نہیں ہو!“

شہزاد نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ جان! اگر یہ شخص ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا تو پھر سی ایف کے کے لیے بھی کیوں مفید رہے۔ اس کی بقا کی کیا توجیہ بانی رہ جاتی ہے۔“ شہزاد کے الفاظ کی سنگینی بہت واضح تھی۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شہزاد۔“ میں نے شہزادی بات کی تائید کی تو فواد کے چہرے پر موت کا خوف بکھوڑے لیے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”غلام جیلانی کا فون نمبر کیا ہے؟“

ٹھوڑے تامل کے بعد اس نے مذکورہ فون نمبر مجھے بتا دیا۔

میں نے استفسار کیا ”رات کے پہلے حصے میں تمہارے ساتھ جو حسین و جمیل لڑکی تھی، ابھی تک تم نے اس کا تعارف نہیں کرایا؟“

”اس لڑکی کا نام شازلین ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم نے شازلین کو غلام جیلانی کے قلیب پر چھوڑا ہے۔“ میں نے کہا ”کیا وہ غلام جیلانی کی کچھ لگتی لگتی ہے۔“

”تم جو بھی سمجھو۔“ وہ ہم انداز میں بولا ”ماشاء اللہ کافی سمجھ دار ہوا!“

میں نے کہا ”تمہارا اشارہ تو یہ بتاتا ہے کہ شازلین، غلام

جیلانی کی داشتہ ہے۔“

”میں نے کہا نا، تم سمجھ دار ہو۔“ وہ سخت خیر انداز میں بولا۔

”غلام جیلانی کی داشتہ تمہارے ساتھ کیا کرتی پھر رہی تھی؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ”شازلین بھی تنظیم سے وابستہ ہے۔ ہم ایسٹ سے آرہے تھے۔ راستے میں وہ فاسٹ فوڈ ریستورنٹ پڑا۔ شازلین کی فرمائش پر مجھے وہاں رکتا پڑا۔ شازلین کی عمر اور تجربہ تو زیادہ نہیں لیکن غلام جیلانی کی چپقلی ہونے کے سبب اس سے خاصا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس کی حکم نما خواہش سے انکار ممکن نہیں۔“ ٹھوڑا تامل کرتے ہوئے اس نے مزید بتایا ”یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ شازلین کو اصل میں غلام جیلانی پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ اس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتی ہے اور ایسٹ میں اس کی رپورٹ بھی کرتی ہے۔“

”کیا یہ بات غلام جیلانی کے علم میں نہیں؟“ ”ہو سکتا ہے، اسے حقیقت کا پتا ہو اور وہ اس سلسلے میں محتاط رہتا ہو۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ میں نے کہا ”شازلین تم دونوں سے زیادہ اہم ثابت ہو سکتی ہے۔ میں اسی کو اپوچ کر دوں گا۔“

میں نے شازلین کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس رہی ہوگی۔ بلاشبہ وہ حسن کا مرقع تھی۔ اس کے نقوش بڑے جاذب اور جیسے تھے۔ ایسی عورتیں ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی اہلیت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ فواد نے شازلین کے بارے میں جو سیٹائی بتائی تھی، مجھے اس میں حقیقت دکھائی دینے لگی۔ سی ایف کے جیسی دہشت گرد تنظیموں میں کسی بھی کارکن پر اندھا اعتماد نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص کی نگرانی کا فریضہ کسی دوسرے کے سپرد ہوتا ہے، جیسے فواد اپنے سامگی جاکٹ پر چھین تھا۔ اسی طرح یقیناً غلام جیلانی بھی کسی سینئر پر نگاہ رکھتے ہوئے ہوگا اور شازلین پر بھی کسی جونیئر کی نظر رکھی ہوگی۔

فواد سے مزید کوئی مفید بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی لہذا میں نے اسے نمونہ عبرت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کمرے کے ایک کونے میں سرگوشیوں میں شہزاد کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس نے میری تائید کی اور پوچھا ”اس کو گولی کا کیا کرتا ہے؟“

”یہ بے چاری غیر متعلق اور بے قصور ہے۔“ میں نے کہا

”واپسی میں اسے کسی بے نسبت روشن جگہ پر ڈرا کر دیں گے۔ اس سے ہماری کوئی دوسری بے نہ ہی دشمنی۔ ایک تجربے کے بعد شاید اسے کچھ عقل آ جائے۔ مجھے نہیں پتا، یہ کسی حد تک بول اور سن سکتی ہے البتہ میں اسے رخصت کرنے سے پہلے یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ اس نے آج کی رات جود نہیں کیا، سنا اور بھگتا، اسے اپنی یادداشت سے صاف کر دے ورنہ اس کی زندگی عذاب بن کر رہ جائے گی۔“

اگلے چند منٹ میں ہم نے گولی کے ہاتھوں کو دوپٹے کی بندوشوں سے آزاد کیا، میں نے لہائی کے رخ دوپٹے کو چھڑ کر جوگلوں میں تقسیم کیا۔ ایک ٹکڑے سے فواد اور دوسرے سے علیہ کی آنکھوں پر دوپٹہ پٹی باندھ کر کئی تا دہہ شہزاد سے اس ٹکڑے کا اتنا پتا یاد رکھ گئیں۔ آتے دقت بھی میں نے گولی سے باہر انہیں دیکھنے نہیں دیا تھا۔ کچھ ہی بعد ہر فرد مکمل مکان سے نکل کر سمندر کی جانب جا رہے تھے۔ مکان چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔

سمندر کا وہ حصہ بہت ہی دیران، بدبودار اور عجیب و غریب تھا۔ شہزاد نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ میں نے زرنگی سے پوچھا ”تم علیہ کو سنبھال لو گی؟“

اس نے بڑا اعتماد انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”اس کی طرف سے تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اس جین روین جھرو کو سنبھال سکتی ہوں۔“

ہم دونوں آنکھیں بند سے فواد کو اپنے ساتھ لے کر سمندر کے کنارے کنارے چلے گئے۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آتا تھا۔ ہم نے اس سے کیا سلوک کرنے کا فیصلہ کر لیا، اسے مطلق خبر نہیں تھی تاہم وہ سونیئر یعنی انداز میں صرف اپنی موت کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ اس لیے اس نے سوچنے میں مدد حق بہ جانب بھی تھا۔ سی ایف کے اس سوچ کی حال تھی!

جب ہم کافی آگے نکل آئے تو میں نے سمندر میں قدم بڑھا دیے۔ شہزاد خاموشی سے میری تقلید کرنے لگا۔ فواد ہم دونوں کے پیچ میں تھا۔ شہزاد کو میں اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے اس نے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ٹھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے فواد کی آنکھوں پر بے بندش سے آزاد کر دیا۔ چاروں جانب چوکانا نظریں سے دیکھنے کے بعد اس نے خوف میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ جان! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، اگر میں تمہارے ساتھ تعاون کروں تو تم میری جان بخش دو گے۔ کیا تم نے اپنے وعدے سے پھر جاؤ گے؟“

آتش فشاں (65) حصہ 10

”میں زبان کا دمٹی ہوں۔“ میں نے سرسراہٹ آواز میں کہا ”مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے۔“

”پھر یہ سب کیا ہے۔۔۔؟“ اس نے میرے ہاتھ میں دیے پتل کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا ”یہ پتول ہے۔۔۔ اور بس!“

”تمہارے تہوار اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اس میں تمہاری نظر کا قصور ہے۔“ میں نے خطرے لہجے میں کہا ”کل تم کسی اچھے آئی اسپیشلسٹ سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کروانا۔“

وہ بے چینی سے بولا ”کل تک میں زندہ رہوں گا تب“

”میں پورے ڈوٹق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اگر کل تک زندہ نہ رہے تو اس موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوگا۔“ میں نے جتنی لہجے میں کہا۔

وہ تھمراتی ہوئی آواز میں بولا ”پھر تم۔۔۔ مجھے اس طرف۔۔۔ کیوں لائے ہو؟“

”تمہاری سلی پش جال پش کے لیے!“

”قت۔۔۔ تم مجھے بہلا رہے۔۔۔ ہو۔۔۔ گڑ بڑا کر بولا۔

”اب تم اتنے نئے بچے بھی نہیں ہو۔“ میں نے مسی خیز انداز میں کہا۔

فواد نے چلے چلے اپنے نظروں سے مجھے دیکھا جیسے وہ اپنے کسی اچھوتے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

اس سے پہلے کہ میں اس کے ارادے کو بھانتا، اس نے نکلی کی سی سرعت سے شہزاد کو دھکا دیا اور اندھیرے میں ایک سمت دوڑ لگا دی۔

جب انسان کو موت یقینی نظر آئے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ فواد کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ میں اسے زندہ چھوڑوں گا لیکن اس کی جان لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فواد نے ایک منٹ کی دھمکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس کا کھلا دشمن تھا۔ اور جرائم کی دنیا میں اپنے دشمن پر بھروسہ کرنا خود کشی کرنے کے مترادف ہوتا ہے!

شہزاد کا کمانے کے بعد پشت کے بل زمین پر گرنا تھا۔

میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے فواد کا نشانہ لیا اور ایک محفوظ فائر کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چپاک سے منہ کے گلے گرا۔ میں نے ہلکے جھجکے میں جان لیا، چپاک کی وہ آواز پانی کے سبب پیدا ہوئی تھی۔ فواد نے اپنی جان بچانے کی

کوشش میں کھلے سمندر کی طرف دوڑ لگا لی تھی۔

میں نے گولی چلانے کے بعد اس کی جانب پیش قدمی جاری رکھی اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ کھٹا مٹا کر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں اندازہ لگالیا کہ میری چلائی ہوئی گولی اس کی تشریف کے ایک پورشن میں بیوست ہوئی تھی۔ میں نے توازن کی فلاحی پر عمل کرتے ہوئے انصاف کا تقاضا پورا کر دیا۔ پتل ایک مرتبہ پھر گر جا اور تشریف کے دوسرے پورشن میں بھی دوڑ تک ایک آگلی سرنگ کی جتنی چلی گئی۔

رات کی تاریکی میں ایک درندہ کا چچ نمودار ہوئی لیکن ٹھانص رات سے سمندر نے اس فریادی چیخ کو اپنے مہیب وحشت ناک شور میں گم کر دیا۔ اس چیخ کے ساتھ ہی فواد ایک لمحے کے لیے فضا میں اچھلا پھر دھڑا سے گلیا ریت پر زمین پر تشریف فرما ہو گیا۔

میں فواد کے سر پر پہنچا تو شہزاد بھی کلاشن کوف تھاے میرے عقب میں حاضر ہو گیا۔ اس نے برق رفتاری سے گن کا رخ زمین پر پڑے ہوئے فواد کی جانب موڑا۔ اس کے انداز میں بے حد خطرناکی پائی جاتی تھی۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو شہزاد کا ششوف کا پورا ایکڑ نو فواد کے سینے میں انویسٹ کر دیتا۔

میں نے ہاتھ مار کر گن کے مہلک بیرل کو نیچے جھکا دیا پھر شہزاد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”تم اپنی جڑیت کا بدلہ لینے کے لیے مجھے عہد شکن نہ بناؤ۔ طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے معذرت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”سوری دھدان! امیں جوش میں آ گیا تھا۔“

”یہ جانے ہوئے بھی کہ جوش میں ہوش رخصت ہو جانا ہے؟“

”پتا نہیں، مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ وہ فنی میں سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

میں نے رسانیت سے کہا ”اس کا پتا بعد میں کر لیں گے۔ پہلے ضروری کام کر لیں۔ تم فواد کے ہاتھ کو بکڑو!“

شہزاد، فواد کی جانب لپک گیا۔ عہد شکنی کے حوالے سے میں نے شہزاد سے جوابات کی تھی، اس میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ یہ واضح تھا کہ میں فواد کو جان سے نہیں مارتا جانتا۔ فواد کو اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا ورنہ میں شہزاد کو فائرنگ سے ہرگز نہ روکتا۔ فواد کے لیے بے چینی اور انجمن کا باعث میرا

سمجھ میں نہ آئے والا رویہ تھا۔

شہزاد نے کے بعد دھمکے فواد کے ہاتھوں کو زمین پر پھیلا یا، اس طرح کہ اس کی ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف ہو گیا۔ ہتھیلیاں تھوڑی دیر پہلے آہنی کرسی کے پایوں تلے دبی رہی تھیں۔ عملی طور پر نہ کسی ممکن روڈ کی شدت نے انہیں بہت دور تک چھوڑ ڈالا تھا۔ میں نے تھیوری کو ریٹیکل سے گزرا اور اپنا پتل کی دو گولیاں چند سینکڑے دھپے سے ان ہتھیلیوں کے پار تھریں۔ فواد تکلیف اور بے بسی کی شدت سے ہلکا اٹھا۔ اس کی حالت دیکھ کر بلکہ صرحت اظہار تھی۔ وہ اپنی زندگی کے مایوس کن لحاظ سے گزر رہا تھا۔

میرے پتل میں دو گولیاں باقی بچی تھیں۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر دو گولز فائر کیے اور فواد کے کلوے سوراخ دار ہو گئے۔ اس کا دروانی کے بعد میں نے خالی پتل شہزاد کی طرف پڑھایا اور فواد کو مخاطب کرتے ہوئے نکمیر آواز میں کہا۔

”میں نے تم سے جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا۔ دیکھ لو، میں زبان کا کتنا دمٹی ہوں۔ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، تم کسی نہ کسی طرح سی ایف کے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اپنے بڑوں کو بتا سکو گے کہ تمہارا یہ شہر کس نے کیا ہے۔ میں تمہاری زبان کو اسی لیے سلامت چھوڑے جا رہا ہوں کہ تم میرے بارے میں گل افشاںیاں کر سکو کہ۔۔۔ سی ایف کے اور شعیب خوری پر میری دھاک پٹینی چلی جائے۔“

میں نے چند لمحے رک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ تکلیف کی شدت اور زخموں کی حدت سے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس نے میری دھمکی کو توجہ سے سنا ہوگا۔ مصیبت کے وقت انسان سب سے پہلے اپنی تکلیف پر توجہ دیتا ہے۔ تقریریں اور بھاشن کیوں نہیں سنتا۔

میں نے اس پر آخری نظر ڈالتے ہوئے کہا ”میں اگر اس مرتبہ تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں تو یہ تمہیں سمجھنا کہ آئندہ بھی میں اس روایت کو نبھاتاؤں گا۔ اب اگر تم بھی میرے راستے میں آئے تو میں ایک لفظ کہے سے اسے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہیں جہنم واصل کر دوں گا۔ گڈ بائے!“

دہاں مزید رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہذا ہم نے واپسی کی راہ اختیار کی اور جیلو ہڈائی کے پاس پہنچ گئے۔ گاڑی کے اندر صورت حال نارمل تھی۔ علیہ نامی اس کو گئی عورت نے زرنگ کے لیے کوئی براہیم پیدا نہیں کی تھی، اس کی آنکھوں پر ابھی تک وہ بچی موجود تھی۔ میں نے زرنگ کو اشارہ کیا کہ وہ

گوگنی کی آنکھوں کو دعوت نگارہ دے دے۔ اس غیر متعلق مظلوم عورت سے ہمیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔

شہزاد نے گاڑی اشارت کر کے واپسی کا سنز شروع کیا تو زرنگ نے مجھ سے استفسار کیا ”دھدان! کیا تم لوگوں نے فواد کا کام تمام کر دیا۔ میں نے چھ گولیاں فائر ہونے کی آواز سنی تھی؟“

”تمہارے شمار میں کسی ٹیک کی گنجائش نہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”میں نے لکائی فرق سے پتل کا کلپ خالی کر دیا ہے لیکن جہاں تک ”کام تمام“ کا تعلق ہے تو میں یہی کہوں گا کہ تمہارا اندازہ درست نہیں۔ میں مارنے سے ڈرانے کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔“

”دھدان!“ شہزاد نے ڈرائیوگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا ”تم نے فواد کو ڈرانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے تو وہ کھلی آنکھوں بھی تمہارے ہی سینے دیکھے گا۔ بے حد خوف ناک اور ڈرانے سینے!“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کسی دشمن کو ایک ہی بار میں جان سے مارنے میں وہ لطف نہیں آتا جو اسے ایسی حالت میں پہنچا کر حاصل ہوتا ہے جہاں وہ ہلے پلے مارتا رہے اور اچھے برے الفاظ میں آپ کو یاد کرتا رہے۔ کچھ بہ کچھ مرنا جینا دشمن کے لیے سب سے عمدہ سزا ہوتی ہے۔“

گوگنی علیہ نے ایک ٹھمر جھری لی اور وحشت بھری نظر سے سائیز اسکرین کے بار گہری تاریکی میں گھورنے لگی۔ شاید وہ اپنے مقدور کا اس تاریکی سے موازنہ کر رہی تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد روئے سخن علیہ کی جانب کیا اور کہا۔

”تم اگر سن سکتی ہو تو میری بات کو توجہ سے سنو۔ زندگی میں سیکھنے کے لیے ایک تلخ تجربہ کافی ہوتا ہے۔ بار بار ایسے تجربات سے بے وقوفی ہی گزرا کر جتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو، کہاں جاؤ گی۔۔۔ اور نہ ہی میں یہ سب کچھ جانتا جانتا ہوں۔ بس میری ایک نصیحت لیے باندھ لو۔۔۔ اور یہ کہ اپنی حیثیت اور پتلے میں کسی ساجھی کو تلاش کر دو۔“

”ہر۔۔۔ سب کچھ سننے سونا نہیں ہوتی۔ فواد کے تجربے سے تم نے اگر کچھ نہیں سیکھا تو پھر قدم قدم پر تمہیں شوکر ہی بیٹھیں گی۔“

وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم، وہ میری باتوں کو کس حد تک سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے کہا ”میں تمہیں کسی روشن مقام پر گاڑی سے



اتار دوں گا۔ مجھے امید ہے تم میری نصیحت پر عمل کر کے اپنی باقی ماندہ زندگی کو سونارے بنانے کی کوشش کرو گی۔“  
تھوڑی ہی دیر بعد ایک ایسی جگہ نظر آگئی جہاں عطیہ کو ڈراپ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے شہزاد کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ اس نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ وہ خیابان اتحاد اور ڈیفنس موڑ کے درمیان کا علاقہ تھا۔ رات کے آخری لمحات میں وہاں کسی بندے بھر کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اپنی جیب میں سے والٹ نکالا اور اس میں سے گن کر جہاز دار اے پانچ ٹوٹ الگ کر لیے پھر رخصت کرنے سے پہلے میں نے دو رقم عطیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔  
”یہ دو کلو نی زندگی شروع کرنے کے لیے تمہیں اس رقم سے بہت سہارا ملے گا۔ یہ سکران ان الوقت ہے اور آج کل کا ہر بندرودازہ اسی جہز سے کھلتا ہے۔ یہ تمہارے بہت کام آئیں گے۔“

اس نے دو رقم لینے کے سلسلے میں تامل کیا تو میں نے واضح الفاظ میں کہا ”یہ تو قرض ہے اور نہ ہی میں تم پر ترس کھا کر خیرات دے رہا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو، زندگی کے ایک لمحہ میں مرے پر بھی کسی نے میری مدد کی تھی۔ میں اس احسان کو آگے بڑھا رہا ہوں۔ اگر اللہ نے تمہیں توفیق اور استطاعت دی تو تم بھی کسی ضرورت مند کے کام آ جانا۔“  
اس کی آنکھیں ڈبڈب آئیں اور کپکپاتی آنکھوں نے رقم کو چھو لیا۔ پھر اگلے ہی لمحے پانچ جہاز کے ٹوٹ کوئی عطیہ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکے تھے۔ وہ ہم تینوں کو منیت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ شہزاد نے ایک جھٹکے سے ہڈائی کو آگے بڑھا دی۔

زرنگ نے پراسنجاب لہجے میں کہا ”کیسا مذاق ہے۔ ہم نے عطیہ کو جس جگہ ڈراپ کیا ہے وہیں سڑک کے کنارے گونگے بہرے بچوں کا ایک اسکول بھی ہے۔ میں نے ایک عمارت پر اس قسم کے اسکول کا بورڈ لگا دیکھا ہے۔“

میں نے سرسری انداز میں کہا ”زندگی میں بہت کچھ اتفاقاً ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہو گا۔“  
شہزاد نے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی وہاں گونگے بچے ہیں جن کا ایک اسکول واقع تھا پھر مجھ سے پوچھنے لگا ”میں تم دونوں کو کلیٹ پر چھوڑ دوں یا تم مجھے بنگلے پر ڈراپ کر کے واپس جاؤ گے؟“

جواب دینے سے قبل میں نے اپنی رست واضح پر گاہ ڈالی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”تم ڈیفنس موڑ سے گاڑی کو لیف

ٹرن دو۔ ہم پہلے بنگلے پر جائیں گے۔ مجھے فیصل کی یاد تازہ رہی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لو گا تو مجھے قرار آ جائے گا۔ پھر میں پشکون نیند سو سکوں گا۔ تم وہیں بنگلے پر رہ جانا، ہم کلیٹ پر چلے جائیں گے۔ کل دن میں کسی وقت میں تمہیں ریلیف دینے آ جاؤں گا۔“

شہزاد نے کوئی اختلاف کیے بغیر گاڑی کو موڑ لیا اور تعویذی ہی دیر بعد ہم مذکورہ بائبل قبرستان پہنچے۔ پہنچنے کے بعد ایک اندرونی صورت حال منظر پیش ہوئی۔ سہیل کے علاوہ دیگر دو سیکورٹی گارڈز بھی نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ پوری طرح چوکس بھی تھے۔ نئے آنے والے گارڈز میں سے ایک کا نام عباس اور دوسرے کا زمر خان تھا۔ وہ دونوں پوری طرح سنبھلے تھے۔ میں شہزاد کے ساتھ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں فیصل کو ”شہزاد“ کہا جاتا تھا۔

اس کمرے کے ایک حصے میں فرش سے چھت تک پرانے اخبارات کے بڈل بھرے ہوئے تھے۔ فیصل کو میں نے بڑے نشی بھرے انداز میں ”بائند“ کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی جھکڑی کی جگہ میں تھے۔ پاؤں میں بیڑی موجود تھی۔ اس بیڑی اور جھکڑی کو باہم منسلک کرنے والی زنجیر کا دوسرا سمت میں نصب کنڈے میں پھنسا دیا گیا تھا۔ اس آہنی زنجیر میں صرف اتنی ”ممتاحش“ تھی کہ فیصل اس کمرے میں دو چار گام تک حرکت کر سکتا تھا پھر اخبارات کے بڈلز سے ٹک لگا کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ بیٹھے کا کوئی چانس نہیں تھا۔

اس وقت فرعون صفت چوہدری کا سپوٹ پشٹ کے ٹل بڈلز کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا، وہ واقعی سو رہا تھا یا سوتا ہو نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں نیند مشکل ہی سے آتی ہے۔

شہزاد نے مجھ سے استفسار کیا ”وہ دان! اگر مفلک کا موڑ ہو تو میں اسے جگہ دیتا ہوں۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن کو جنبش دی۔ ”یہ بے چارہ نیند کا ماتا ہے۔ اسے سوئے دو۔“ میرے لہجے میں غلو کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ”تاہم، اس بد بخت کو پھر بھی آٹھ گھنٹے کا موٹ لے لیں۔“

شہزاد نے کہا ”میں نے اسے تھوڑا بہت کھانے پلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کسی حد تک تعاون کیا ہے۔“

”یہ تم نے..... اور اس نے بہت اچھا کیا ہے۔“ میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ پھر سیکورٹی گارڈ سہیل کی جانب

متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا ”شہزاد کے جانے کے بعد اس بندے نے کوئی گڑبگڑ کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟“

وہ میرے نزدیک آنکھائیت ہی فرما رہا تھی۔ بولا ”کوئی گڑبگڑ تو نہیں کی جناب لیکن مجھے لالچ دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔“

میں نے چونک کر سہیل کو دیکھا اور پوچھا ”کس قسم کا لالچ؟“

اس نے بتایا ”اس نے اپنی رہائی کے بدلے مجھے ایک کروڑ روپے دینے کی پیش کش کی ہے۔ کہہ رہا تھا۔ اس کا باپ بہت بڑا اور طاقت ور چوہدری ہے۔ اگر ایک کروڑ کم ہوں تو وہ رقم بڑھا بھی سکتا ہے۔“

”کہہ دو یہ بالکل ٹھیک رہا ہے سہیل۔“ میں نے زبردستی طریقہ بیان کرنا شروع کیا۔ ”اس کا باپ واقعی بہت مال دار ہے۔ ایک کروڑ کی رقم ان لوگوں کے لیے بالکل ایسے ہی ہے جیسے تمہارے لیے سو روپے کا ایک نوٹ۔“

سہیل حیرت سے آنکھیں پھیل کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اندازہ مذاق اس سے پوچھا ”سہیل! تقدیر نے تمہیں زندگی سونارے کا ایک سنہرا مومخ دیا تھا۔ کیا تم نے اس کی پیش کش پر ذرا بھی غور نہیں کیا؟“

وہ ایک دم بے حد عجیبہ نظر آنے لگا پھر جذبات سے معمور لہجہ میں بولا ”جناب! یہ موقع تقدیر نے نہیں بلکہ شیطان نے فراہم کیا تھا۔ میں اپنے بڑے سے بڑے فائدے کے لیے بھی شیطان کا آلہ کار نہیں بن سکتا۔ رزقِ حلال کی روٹی موسمی، رزقِ حرام کے عیش و آرام سے زیادہ سکون بخش اور باعثِ عزت ہے۔“

میں..... غریبہ نظر سے سہیل کو دیکھنے لگا پھر وہی لہجہ میں کہا ”تمہارے خیالات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ مجھے امید ہے تم جس راہ پر چل رہے ہو وہ تمہیں تمہاری منزل تک لے جائے گی۔ میں نے تو تمہیں محض آزمانے کے لیے وہ بات کی تھی۔“

”اللہ کا شکر ہے جناب!“ وہ تین سے بولا ”میں بہت پر سکون اور خوش گوشت زندگی گزار رہا ہوں۔ منہاس صاحب دوسرے مالکان سے بہت مختلف ہیں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سہیل سے پوچھا۔ ”اس بندے نے ایک کروڑ کے عوض تم سے رہائی کی جو بات کی تم اس بارے میں کوئی تفصیل بھی بتاتی تھی؟“

میں نے بات ختم کرتے ہی فیصل کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کسی قسم کا تعجب و تبدل نظر نہ آیا۔ اس کا یہی مطلب تھا، کھڑے کھڑے اس کی آنکھ کھل گئی تھی یا پھر وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کا باہر تھا، ہماری باتیں سن رہا تھا اور ظاہر یہی کر رہا تھا کہ وہ اپنے ماحول سے لاطعل کھری نیند میں ہے!

سہیل نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا ”اس نے کہا تھا، یہ اپنے خراج کار کو بالکل قدرتی رنگ دے گا۔ میں اسے آہنی بندشوں سے آزاد کر دوں۔ یہ مجھے دشمنی کر کے ایسا تاثر دے گا جیسے اس نے مجھ سے گن جھین کر خود کو آزاد کر دیا ہو۔ پھر یہ مجھے بے ہوش کر کے یہاں سے لٹکے گا۔ باقی دو گارڈز کو یہ موت کے گھاٹ اتارے گا اور یہاں سے رو پھر ہو جائے گا۔“

”کیا اس نے یہ پیش کش ان دو گارڈز کے سامنے کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

سہیل نے جواب دیا ”نہیں، عباس اور زمر داس وقت بنگلے کے چروانی سے میں پھرا دے رہے تھے۔ میں اس کے پاس یہاں کمرے میں تھا۔“

”تم نے اس کی پیش کش کا کیا جواب دیا؟“

”میں نے اسے کھری کھری سنائیں اور یہ فیسے مجھے مگور کر رکھا۔“

میں نے متنی خیز انداز میں سہرا لیا اور شہزاد کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ سہیل کو ہم نے فیصل والے کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ ہم گاڑی کے قریب آگئے تو میں نے شہزاد سے کہا۔

”میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئینہ بایا ہے۔ اس آئینہ یا کی بنیاد اس کتبے پر ہے کہ فیصل اس وقت سو رہا ہے اور اس نے ہماری باتیں نہیں سنیں۔“

شہزاد ادا بھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نی الحال تم عباس اور زمر کو بنگلے کے چروانی سے تک ہی محدود کر دو اور انہیں سختی سے ہدایت کر دو کہ وہ بہت ہی توجہ سے پھرا دیں۔ خاص طور پر انہیں فیصل والے کمرے کی طرف پھٹکنے بھی نہ دینا۔“

شہزاد پوری توجہ اور دلچسپی سے مجھے سن رہا تھا۔ میں نے مزید کہا ”فیصل کی نگرانی کے لیے تم سہیل کو کمرے میں چھوڑ دو اور تم اپنی شکل بھی فیصل کو نہ دکھاؤ۔ وہ یہی سمجھے کہ تم واپس نہیں

آئے ہوگیں کمرے سے باہر رہ کر تم پوری طرح چوکنا اور قطا رہو گے۔“

شاید میری بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے شہزادے کے چہرے پر دبا دبا جوش انگڑائی لے کر بیدار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”فیصل کو یہ احساس ہے کہ میرے بہت قریب وہ اس لیے وہاں نہیں کسی قسم کی کوئی آفرینش کر سکتا۔ وہ منہاس باقر سے بھی ناواقف نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سہیل کو ایک عام گارڈ سمجھتے ہوئے ٹارگٹ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ آئندہ بھی یہ کوشش کر سکتا ہے۔ تم اس کوشش کے لیے اسے موقع فراہم کر دو گے۔“

”میں تمہاری بات کی نہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ شہزاد نے تسلی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا ”اب اس آئینہ یا تیک یا بالکل واضح ہو چکی ہے۔ تم سہیل کو سمجھا دو کہ وہ فیصل والے کمرے میں رہے ہوئے خود کو کسی نگاہ میں مبتلا ظاہر کرے۔ فیصل اس کو دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ وہ اس کی ایک کروڑ والی پیش کش میں الجھا ہوا ہے لہذا وہ دوبارہ ٹرائی کرے گا۔ اس موقع پر ہمارے منصوبے کے عین مطابق سہیل تھوڑے پس و پیش کے بعد اس کی بات ماننے کو تیار ہو جائے گا لیکن رقم کی وصولی کے لیے وہ یقینی ظاہر کرے گا۔ وہ فیصل سے یقین دہانی چاہے گا کہ ایک کروڑ روپے اسے کب اور کیسے ملیں گے۔ فیصل اس سوال کا کوئی نہ کوئی جواب تو دے گا۔ سہیل اسے امید دلانے کے لیے کہل دے گا۔ یہ سب سے پہلے سے لکھنے کی کوشش کرے گا لیکن اس سے پہلے وہ اس کے بتائے ہوئے، رقم کی وصولی کے ذرائع کی تصدیق ضرور کرے گا۔ عین ممکن ہے، فیصل اپنے کراچی میں ورک کے کرتا دھرتا کا نام اور پتا بتا دے۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اپنی آزادی اور بٹاکے لیے وہ نیٹ ورک کے ہیڈ کو سامنے لانے میں کوئی حرج نہیں سمجھے گا کیونکہ وہ ”ہیڈ“ اس کے باپ چوہدری نواز شیخ کا ایک آلہ کار ہوگا۔“

”آئینہ باوقافی اچھوتا اور مغرور ہے۔“ شہزاد کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ”اس وقت تو چوہدری کے کراچی نیٹ ورک کا درجہ رواں بھی بڑی تیزی آ زماش سے گزر رہا ہوگا۔ فیصل کی تلاش کے سلسلے میں چوہدری نواز شیخ نے اس کی زندگی خراب کر رکھی ہوگی۔“

”فیصل کی تلاش اور میری سرکوبی کے لیے!“ میں نے تھوڑا اضافہ کر دیا۔

شہزاد نے کہا ”ٹھیک ہے، تم پوری طرح مطمئن ہو کر جاؤ۔ میں سہیل کو ایسا فیڈ کروں گا کہ فیصل اس کی اداکاری کی حقیقی جذبات کی عکاسی سمجھے گا جیسے ہی مجھے کوئی خاص بات معلوم ہوگی، میں تمہیں مطلع کر دوں۔“ اس نے بے ساختہ جملہ ادھورا چھوڑا پھر انجمن زدہ لہجے میں پوچھنے لگا ”اگر تم سو رہے ہو تو۔“

اس مرتبہ میں نے اس کا جملہ نہیں ہونے دیا اور قہقہے کلاہی کرتے ہوئے کہا ”میرے سونے اور جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی اہم بات اور نازک معاملے کے لیے تم مجھے کسی بھی وقت کال کر سکتے ہو۔“

”اب اس کے!“ وہ اپنی گردن کو مخصوص انداز میں جھٹکتے ہوئے بولا۔

اختصاصی رسمیات کے بتا دے کے بعد میں نے ہنڈائی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، زرگل بیئر سیرٹ پر آئی اور ہم طارق روڈ والے قلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

طارق روڈ پر آنے کے بعد میں نے سیلو ہنڈائی کو ایک چار منٹ لپٹا کر ایک آرکائیڈ کے نیچے سڑک کے کنارے پارک کیا اور زرگل کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ابھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اس اشارے کی قیاس کر دی۔ میں گاڑی کو لاک کرنے کے بعد زرگل کے ساتھ سڑک پار کرنے لگا۔

میں نے جس شاہک آرکائیڈ کے سامنے سیلو ہنڈائی کو چھوڑا تھا۔ وہ میرے قلیٹ سے لگ بھگ پانچ سو گز کے فاصلے پر تھا اور میرے بیڈروم کی کھڑکی سے نظر بھی آتا تھا۔ میں بیڈروم کے اندر رہے ہوئے گاڑی پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ دیے میں نے اسی وقت فیصل کر لیا تھا کہ کل کسی وقت آمد شد کے اس دیے کو چھوڑ کر کوئی دوسری گاڑی اپنے استعمال میں لے آؤں گا۔ جب تک ساحل اور فیصل والا معاملہ منٹ نہ جاتا، بے حد احتیاط کی ضرورت تھی!

زرگل جب کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہی تو میں نے وضاحتی انداز میں کہا ”نواد جاوے کہ کبھی حالت میں ہو، یہ گاڑی اس کی یادداشت میں محفوظ ہو چکی ہے۔ مجھے یقین ہے، اس نے ہنڈائی کا نمبر حفظ کر لیا ہوگا لہذا اس کو استعمال میں رکھنا خطرناک ہے اس لیے میں نے اسے اپنی اقامت گاہ سے کافی فاصلے پر کھڑا کیا ہے تاکہ اگر کوئی اس گاڑی کی بوسگت ہو ادھر آئے تو میرا سراغ نہ لگا سکے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”ویسے میں کل چمکا فرصت میں اس گاڑی سے نجات حاصل کر لوں گا۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ اس نے صرف ایک جملہ بولے،

اٹھنا کیا۔ اس ایک جملے میں زرگل نے ”سمجھ گئی“ کی ادائیگی کچھ اس ڈھب سے کی جیسے وہ بہت سمجھ دار ہو۔ میں اس پر ایک اچھٹی سی نظر ڈال کر رہ گیا۔

جب ہم قلیٹ کے اندر داخل ہوئے تو صبح کے پونے پانچ بج رہے تھے۔ مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ میں نے زرگل سے کہا ”تم اپنے کمرے میں جا کر اعصاب کو ٹھیک بنانے والی مشق کرو۔ میں تو سو رہا ہوں۔ تمہیں جب نیند آئے، سو جانا۔“

اس نے شاکی انداز میں مجھے دیکھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے میں اس سے بے پروا رہی ہوں۔ میں نے اس کے اطمینان اور تسلی کی خاطر مزید کہا۔

”کسی فکر اور اندیشے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس قلیٹ میں تم محفوظ اور مطمئن ہو۔ صبح یا کوڑھن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنا۔“

وہ کوئی سوال و جواب کے بغیر سر جھکا کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایات دیں اور آنکھیں بند کر کے خود کو نیند کے حوالے کر دیا لیکن چند لمحات کے بعد ہی اس حوالگی میں رخ پڑ گیا۔ زرگل کی نگاہ نے مجھے کمری نیند میں پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ میرے بیڈروم میں، پٹے کے نزدیک کھڑی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے زرگل؟“ وہ انجمن زدہ انداز میں بولی ”مجھے ڈر لگ رہا ہے!“

بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی ”کیسا ڈر؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم اتنی بزدل یا کمزور دل کی تو نہیں ہو!“

”مجھے خود جرات ہو رہی ہے۔“ وہ غمازت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا ”کس تم نے وہ مشق کر لی؟“ ”بہت کوشش کی لیکن دل نہیں لگا۔“ وہ بتانے لگی ”پھر میں سونے کے لیے لیٹ گئی مگر نیند بھی نہیں آ رہی۔ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔“

وہ اس وقت انتہائی سنجیدہ تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”تم اپنی کیفیت کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“

میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ دھیرے سے بیڈ کے کنارے پر گت کی بھر کہا ”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس قلیٹ میں ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو!“

میں نے چونک کر اسے دیکھا ”کیسے ممکن ہے؟“ ”میں نے اپنے محسوسات سے سمجھیں آگاہ کر دیا۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں، ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی اور موجود نہیں۔“

میں نے کہا ”یہ تمہارے محسوسات نہیں بلکہ وہم ہے۔ گنتا ہے، حکمت یار کا خوف آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ خیر، تم میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے بیڈ سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ہم بیڈروم سے نکل کر اس کے بیڈروم میں آ گئے۔ میری حتمی نظر ایک ایک شے کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے زرگل سے کہا ”تم بھی اچھی طرح دیکھ لو تاکہ تمہارا وہم لہجہ رفع ہو سکے۔“

ہم نے زرگل والے بیڈروم کا تفصیلی معائنہ کیا، پھر ڈرائیونگ روم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کے بعد کچن اور واش روم میں جھانکا گیا۔ سب سے آخر میں، میں نے داخلی دروازے کے لاک اور کنڈیاں چیک کیں پھر زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب تو تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا ”میں اپنے وہم کو سمجھ رہی ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید میں نے چا چا حکمت یا کو زیادہ ہی ذہن پر سوار کر لیا ہے جو مجھے لاشعوری طور پر ایک انجانے سے خوف میں مبتلا کر رہا ہے۔“

ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوبارہ بیڈروم میں آ گئے۔ میں نے زرگل سے کہا ”ایسا کرو، تم میرے بیڈ پر سو جاؤ۔ اگر ہم لوگوں نے پھر پور نیند نہ تو کھ کھادوں بڑا مشکل مندی میں گزرے گا جبکہ یہ دن میری زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔“

وہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”اور تم؟“ میں اس کے دو لفظی تپیلے کی نہ تک پہنچ گیا اور کہا ”ظاہر ہے، مجھے بھی اسی بیڈروم میں سونا ہوگا ورنہ تم بار بار ڈرتی رہو گی اور۔۔۔۔۔“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”میں ادھر کارپٹ پر سو جاؤں گا۔ تم پورے اطمینان کے ساتھ اس بستر پر سو سکتی ہو۔“

اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے لائٹ کو جلا چھوڑ دیا اور سڑک کی جانب مٹھنے والی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ شاہجہان آریڈ کے سامنے میری ہنڈائی جوں کی توں کھڑی تھی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے چار پانچ گہری اور جاذب سانس لیں پھر زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”گڈ نائٹ! میں تو اب سوؤں گا۔“ پھر میں قالین کی جانب بڑھ گیا۔

”مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“ وہ میرے سے بولی۔

”کیا اچھا نہیں لگ رہا؟“

”میں بستر پر آرام سے سوؤں اور میرا محسن ادھر زمین پر پڑا ہے۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بولی ”تم بستر پر آ جاؤ، میں نیچے سو جاتی ہوں۔“

”ایک ہی بات ہے، اس سے فرق کیا پڑے گا؟“

”بہت فرق پڑے گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”اگر تم نیچے لیٹے تو میں ایک لمحے کے لیے سوئیں سکوں گی۔ غمناک احساس مجھے شدت سے ستاتا رہے گا۔“

میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے، میں پہلے تمہیں گہری نیند میں پہنچاؤں۔ اس کے بعد ہی خود سونے کے بارے میں سوچوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں قالین سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ خاصی بدک ہوئی نظر آنے لگی۔ چٹانیں، اس نے میرے اقدام کا کیا مطلب لگا لٹھا۔ میں نے اسے اپنے وجود میں سمٹنے ہوئے دیکھا تو وضاحت ضروری ہو گئی۔

میں نے بید کے نزدیک پہنچ کر حکمانہ انداز میں کہا ”بستر پر چٹ لیٹ جاؤ، آنکھیں بند کر لو اور اپنی توجہ میری آواز پر مرکوز کر دو۔“

اس کی جان میں جان آئی، ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے قضا لکھ میں دریافت کیا ”کیا تم مجھ پر کوئی عمل وغیرہ کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں!“ میں نے انہماک میں سر ہلایا ”اسے تو بھی عمل کہتے ہیں۔ میں مخصوص لب دلچے میں تمہیں ترغیبات دوں گا۔ تم پورے انہماک سے میرے الفاظ کو اپنے ذہن میں اتار دو گی۔ اگر تمہاری توجہ میری آواز پر مرکوز رہی تو بہت جلدی تم نیند کی گداز باہوں میں سمٹ جاؤ گی۔ کیا تم اس عمل کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو؟“

”ایک منٹ!“ اس نے سرسری انداز میں کہا پھر

چاروں خانے جت ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں پانچ ٹیکہ تک اس خاموش طوفانی بیکر حسن و جمال جکتا رہا۔ پچھتوں دوشیرہ میں جوانی کوٹ کوٹ کر گہری تھی۔ اس کے چہرے کی رعنائی کو انجمائے خوف کی آغوش نے خاصا سہا دیا تھا جس سے اس کی جاذبیت میں پر معصومیت در آئی تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسی ڈری سکھائی دکھائی دیتی تھی جسے کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش ہو!

میں نے ترغیبات کا سلسلہ شروع کیا ہی تھا کہ آنکھوں کے پیچھے اس نے سوال کیا ”وہ دن! تم اتنے گہری کیوں ہو؟“

”یہ بات تم پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکی ہو۔“ پہلے مرتلے پر اس کی مداخلت مجھے پسند نہ آئی۔ اس لیے میرے لہجے میں ابھی خاصی سختی تھی۔

وہ بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے بولی ”پہلے کی بات اور تھی۔ اس بار میں ایک خاص وجہ سے کہہ رہی ہوں۔“

”اب وہ خاص وجہ بھی خود ہی بتاؤ۔“ میں نے رکا سے کہا۔

”میں محسوس کر رہی ہوں، تمہاری گہرائی! پراسراریت بھی شامل ہے۔“

”پھر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے کہا ”کیا تم میری بات سے اتفاق کرتے ہو؟“

”اتفاق اور اختلاف بعد میں ہوتا رہے گا۔“ میں نے کر کہا ”نی الحال اگر تم واقعی سوتا جا چکی ہو تو خاموش رہ کر باتیں توجہ سے سنو اور انہیں اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرو۔“

”جب تک تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے، میرے اندر ایک بے چینی سے پھیلی رہے گی۔“ وہ آنکھیں دا کر ہوئے بولی ”اور اس اضطرابی کیفیت میں، میں تمہارے ترغیبات پر دھیان نہیں دے سکوں گی۔“

میں نے بے بسی سے ایک طویل سانس خارج کیا اور ”ٹھیک ہے، تم ایک سوال جلدی سے پوچھ لو۔۔۔۔۔ صرف ایک سوال!“

اس نے پوچھا ”تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی دروازے کے باہر شہزاد کی موجود ہے۔ کیا تم غیب داں ہو؟“

میں اس کا اشارہ ہلک جھپکتے میں سمجھ گیا۔ آج رات درمیانی حصے میں جب شہزاد ہمارے فلیٹ پر پہنچا تھا، اس میں ایک مشق کے سلسلے میں زرگل کو ضروری ہدایات دی تھیں۔ وہ واقعی خوبیت سے مجھے سن رہی تھی کہ ایک مرتلے پر

خاموش ہوا تو اس نے بے ساختہ پوچھا تھا، پھر کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں، میں نے بے اختیار کہہ دیا تھا اور پھر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میری بات ختم ہوتے ہی شہزاد نے دروازہ ناک کیا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا لیکن زرگل کا محسوس ذہن ہال کی کمال اتارنے پر مائل ہوا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”غیب کا علم صرف خدا کی ذات تک محدود ہے۔ کوئی انسان اس کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اس زعم میں مبتلا ہے تو سمجھو، اس کی بربادی قریب آ چکی ہے۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر کھیر لکھے میں اضافہ کیا ”دستک کے حوالے سے جو کچھ ہوا ہے تم ایک اتفاق کہہ سکتی ہو۔ اس میں میرے کسی علم یا کھنی کو دخل نہیں۔“

”جی کوئی نہیں؟“ اس نے تجھے لکھے میں دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے، نہیں۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، تم یقین نہیں ہوا؟“

وہ ایک نہایت ہی اہم نکتے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ اگرچہ میں نے اس وقت محسوس بات برائے بات دستک کا ذکر کیا تھا لیکن یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ خیال چکی کی کارفرمائی کے سبب میرے ذہن میں آیا ہو۔ بعض اوقات ہر انسان تھوڑا بہت مستقبل بین ہو جاتا ہے۔ جی کی قوت ظاہر ہے، اس کی صلاحیت میں اضافہ کر سکتی ہے۔ لاہور میں تو زرگل سے جی کے بارے میں زیادہ بات نہیں ہوئی تھی لیکن کراچی پہنچنے ہی اس نے اس سلسلے میں مجھے کافی کر پڑا لٹا تھا اسی لیے وہ ایک اتفاقی بات چکی کے کریڈٹ پر ڈال رہی تھی۔ میں اگر جی کی اثر پذیر روی پر اس سے گفتگو شروع کر دیتا تو پھر سونا نصیب نہ ہوتا کیونکہ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور طوفانی باب ہے، لہذا میں نے اپنے لہجے میں رکھائی کا عنصر شامل رکھتے ہوئے کہا۔

”زرگل! اگر تم واقعی سونے کا ارادہ رکھتی ہو تو پھر غیر متعلقہ باتوں کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دو۔“ میں نے ذرا رک کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا ”لیکن اگر تم ابھی سونا نہیں چاہتی ہو تو پھر شرب بخیر!“

بات ختم کر کے میں لپٹنے لگا تو وہ جلدی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے، میں اب کوئی سوال نہیں کروں گی۔ تم اپنا عمل شروع کرو۔“

میں نے ترغیبات کا آغاز کیا اور زرگل کو گہری نیند میں پہنچانے کے لیے پناہنوم کی مخصوص ٹیکنیک سے کام لینے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ دریم لینڈ کے ایک پرسکون اور کیف آور گوشے میں پناہ گزیں ہو چکی تھی!

☆☆☆

رات کو دیر سے..... بلکہ صبح سے پہلے سوئے تھے اس لیے دوسرے پہر کے قریب بیدار ہوئے۔ چھ مٹھنے کی نیند نے بڑی حد تک تھکاوٹ کو دور کر دیا۔ فریٹش اپ ہونے کے بعد ہم فلیٹ سے نکل آئے۔ ناشتے کا وقت بہت پیچھے رہ گیا لیکن کچے کے انتظار میں بھوکا نہیں رہا جا سکتا تھا۔ مین طارق روڈ پر آنے کے بعد میں نے زرگل سے کہا۔

”پہلے ہم بھرپور ناشتا کریں گے۔ اس وقت تک مارکیٹ پوری طرح کھل جائے گی پھر میں تمہیں ضروری شاہجہان کراؤں گا۔“

”آج کے دن کا تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ اس نے میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا ”میرا پروگرام زیادہ تر میں نہیں بناتا ہوں۔ حالات میرے لیے اسکرپٹ تحریر کرتے ہیں۔ میں تو اپنی مرضی کی لائنیں بول کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ بہر حال.....“

میں نے جملہ ادھر اچھوڑ کر تھوڑا وقفہ کیا اور مزید کہا ”ناشتے کے بعد میں شہزاد سے رابطہ کروں گا۔ وہاں کی صورت حالات جاننے کے بعد ہی کوئی منصوبہ ترتیب دیں گے۔“

ہم ایک ایرانی ریسٹورنٹ کی بالائی منزل پر آ بیٹھے۔ ریسٹورنٹ کا یہ حصہ ”فیلی ہال“ کے نام سے معروف تھا جہاں بدستور فیکٹر اور فیکٹی کی تک دو دو میں مصروف جوڑے زیادہ وقت گزارتے تھے جن میں سے پانچ فیصد ہی فیکٹی بنانے میں کامیاب ہوتے۔ باقی ایک دوسرے سے گلے شکوے کرنے کے بعد راہ بدل کر کسی اور سمت قسمت آزمائی میں لگ جاتے! ناشتے کے بعد میں نے زرگل کو بھرپور شاہجہان کراؤالی۔ مختلف قسم کے پلیوساٹ، سینڈلز، پرس، دست داج، ایک چھوٹا سا سوٹ کس اور میک اپ کی مکمل رینج۔ میک اپ کے سامان میں بعض آئینے ایسے بھی تھے جو زرگل کی سمجھ میں نہیں آئے۔ میں نے انہیں الگ الگ پیک کر دیا تھا۔ وہ ”نہ نہ“ کرتی رہی لیکن میں نے ”ہاں ہاں“ کرتے ہوئے اسے لا دیا تھا۔

جب وہ سوالات پر سوالات کرنے لگی تو میں نے کہا۔

”میں نے کچھ زیادہ نہیں کیا۔ موقع مل کی مناسبت سے یہ اشد ضروری تھا۔“

”موقع مل!“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”آج رات تم ایک دعوت دیدہ میں جانے والی ہو۔ کیا روٹی سوگی کھر کے کپڑے پہن کر دعوت میں شرکت کرو گی؟“

”کون سی دعوت دیدہ؟“ اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

# گرینڈ کریکٹرز



دنیا نے کرکٹ کے پراسرار ذکی داستان حیات خود ان کی زبانی  
کرکٹ کی اس جگہ گیتی دنیا کے چونکا دینے والے انکشافات  
اور لاتعداد کہانیاں، چار عظیم کھلاڑیوں کی زندگی کے پوشیدہ  
اور سر بستہ راز جو کبھی منظر عام پر نہیں آئے۔ اردو زبان کی  
اپنی نوعیت کی واحد کتاب جس میں ان کھلاڑیوں کی زندگی کا  
ہر پہلو اور ہر دور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

منگوانے کیلئے آج ہی فون کریں  
کتابیات پبلی کیشنز کراچی  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون 021-5804300  
kitabiat1970@yahoo.com  
(63-C فون 111 ایکسپریس ڈی آفیس میں منگوانے کے لئے (آخر کار ملی بک سٹاپ کے سامنے)

آئی تھی چونکہ میرے ساتھ آئی تھی اور ایک دوست کی حیثیت سے آئی تھی اس لیے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ میں نے اسے منہاس کی جھلی کے حوالے کیا اور خود منہاس کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہو گیا۔

اب تک کے تمام واقعات سے میں نے منہاس باقر کو پوری طرح آگاہ کر رکھا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لیے میں نے ”میں چوہدری نواز شریف سے فاضل منگلو آپ کی موجودگی میں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تو شام ہوئے ہی دیے اور حیدر آباد سے معاملات میں مصروف ہو جائیں گے لہذا آئندہ کے لیے جو کچھ لائحہ عمل تیار کرنا ہو اس کے بارے میں ابھی فیصلہ ہو جائے۔“

آپ کو بالکل غری کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحات تک گھبراہٹ میں مجھے دیکھتا رہا پھر اپنی مخصوص آواز میں بولا ”کیا یہاں سے فون کرنا مناسب ہوگا؟“

”میرے خیال میں عین مناسب ہوگا۔“ میں نے پرامن لہجے میں کہا۔ ”چوہدری نواز شریف اور شعیب خوری کو یہ بات ابھی طرح معلوم ہے کہ کراچی میں آپ میری پشت نہائی کر رہے ہیں۔ اگر میں آپ کے کسی بھی پلیٹ فارم سے سو کروں گا تو یہ بالکل فطری عمل ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا، وہ مل فون ایس پیج کے تعاون سے یہاں کا نمبر ٹریس کر لیں گے اور انہیں معلوم ہو جائے گا، میں نے آپ کے بنگلے سے رابطہ کیا ہے۔ یہ ایسی کوئی خاص یا خطرے والی بات نہیں ہوگی۔ آپ کا قاضی صحافت سے ہے اور آپ بڑے با اثر شخص ہیں۔ شعیب خوری یا چوہدری کا نیت درگ برادر است آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے آپ کے مضبوط ٹھکانوں سے باہر ہی نہیں گھیرنا چاہیے۔“

خیر۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر کہا ”اب تو میں نے خود کو کسی حد تک روپوش رکھنے کا بھی عارشی بندوبست کر لیا ہے۔“

پھر میں نے منہاس باقر کو میک اپ کے سامان اور دیگر ضروری اشیاء کے بارے میں بتایا جن کے استعمال سے طے میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا کی جا سکتی تھی۔

”یہ اچھا آئیڈیا ہے۔“ وہ سر ہانپنے والے انداز میں بولا ”اس سلسلے میں، میں تمہاری مزید مدد کر سکتا ہوں۔“ وہ کہہ کر سوچ میں بول رہا تھا ”ایک بہت ہی ماہر میک اپ مین سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ فی دی کے اکثر اشارز کا میک اپ وہی کرتا ہے۔ شانہ کو دھن بنانے کے لیے میں نے کسی بیوٹی پارلر میں نہیں بھیجا بلکہ وہ میک اپ ماسٹر یہاں کھڑ رہ گیا تھا۔ تم بھولے ہو اسے بلوایتا ہوں۔ وہ انکار نہیں کرے گا چونکہ اس کا کھانا شوبز سے ہے اس لیے طے میں تبدیلی کا اسے زیادہ تجربہ ہوگا۔“

منہاس باقر نے اس آئیڈیے کو مبرا اور اگلے ہی لمحے میں شمول سے بات کر رہا تھا۔ پہلے میں نے وہاں کی رپورٹ لی اور

میں نے اسے منہاس باقر کی بیٹی شانہ کی شادی کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ برسوں رات کو شانہ کی شادی ہوئی تھی۔ وہ میاہ کرکراچی سے حیدر آباد کی تھی اور آج یعنی منگل کو حیدر آباد میں ویسے کی تقریب تھی۔ بات پوری کرنے کے بعد میں نے کہا ”منہاس صاحب کی جھلی کے ساتھ آج رات تم حیدر آباد جاؤ گی۔ اب آئی کچھ میں بات۔“

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میں اکیلی جاؤں گی۔“ وہ کھوتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”کیا تم وہاں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا ”میں نہیں جاسکوں گا۔ یہاں کا مشن دوسرے دیر سے زیادہ اہم ہے۔ میں نے منہاس صاحب سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں اس لیے ہم سیدھے ان کے بنگلے پر جا رہے ہیں۔ میں جنہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا تم شام تک ایک مرتبہ پھر جائزہ لو۔ کوئی شے کم ہو تو متاؤ تاکہ اس کی کوئی کمی پورا کر لیا جائے؟“

”میرا خیال ہے، ہم نے ضرورت سے زیادہ خریداری کر لی ہے۔“ وہ سامان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”ایک نہایت ہی اہم شے باقی ہے اور مجھے حیرت ہے تم اسے ابھی تک بھولے بیٹھی ہو۔“

”ایسی کیا چیز ہے؟“ زرنگ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”جیولری۔“

”اوہ! وہ چوکی؟“ شاید اس طرف میرا دھیان اس لیے بھی نہیں گیا کہ مجھے زیورات وغیرہ پہننے کا شوق نہیں۔

”بات شوق کی نہیں، موقع کی ہوتی ہے۔“ میں نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”زیادہ نہ سبکی، بندے، پیٹنٹ اور ایک آدھ رنگ تو چلے گی۔“

میرے خواہش نما اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ہچک کر دیے۔ میں نے زرنگ کی جیولری کے ساتھ ہی شانہ کے شوہر کے لیے بھی ایک قیمتی طلائی گفٹ بیک کر دیا۔ پھر زرنگ سے کہا ”میری طرف سے تم یہ تحفہ دو لھا کو دے دینا۔“

منہاس باقر کے ساتھ میرے مراسم جس نوعیت میں بدل چکے تھے اس کے پیش نظر سلوک کے موخ پر بہت کچھ سوچنے پھنسنے کی ضرورت تھی۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دے رکھا تھا اور میں کھلے دل ہاتھ کا میک اپ بھی تھا۔ شانہ کو میں نے ایک جڑاؤ طلائی سیٹ شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ منہاس کے ساتھ ساتھ شانہ کو بھی وہ سیٹ بہت پسند آ رہا تھا۔

منہاس باقر اخبار کی کاپی بریس بیچنے کے بعد گھر آ جاتا تھا لہذا اہم سیدھے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ زرنگ پہلی مرتبہ وہاں



”تم یہ تفصیل مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”اس لیے کہ فیصل اور ساحل کے تادلے کے لیے میں نے اس مقام کا انتخاب کیا ہے۔“

”اوہ!“ اس نے ایک نکلان زدہ سانس خارج کی ”ٹھیک ہے، میں اپنے آدمیوں کو اس پارک کے بارے میں بتا دوں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔“ وہ پشکارا پھر ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا ”اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی سچی منصوبہ بندی ترتیب پاری ہو تو اسے فوراً جھک دو۔ اگر مجھے تمہاری طرف سے ذرا بھی شک ہو گیا تو پھر ساحل کو تم زندہ نہیں دیکھ سکے گا۔“

میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”تم سب کو اپنی طرح سازشی فاول پلینز نہ سمجھو۔ میں زبان کا دھنی ہوں جو کہ رہا ہوں وہ کر کے بھی دکھاؤں گا۔ اس لیے ایسی فصول و حکیموں میں اپنی توانائی ضائع نہ کرو۔ تاؤ، ساحل کو کتنے بچے پارک میں پہنچاؤ گے؟“

”میرے خیال میں نو بچے کا وقت ٹھیک رہے گا؟“ وہ ہلکا سا بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ”سات بج کر ایک سیکنڈ بھی نہیں!“

میرے انداز میں ایسی قطعیت تھی کہ موضع رکھاں والی میں وہ بری طرح تھلا کر رہ گیا ہوگا۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا ”تم میں ذرا سی بھی کاروباری سوچ ہو جو اور مصلحت نہیں۔ سات اور نو۔۔۔ میں آخر فرق ہی کیا ہے؟“

”یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ مجھ میں کاروباری سوچ ہو جو نہیں۔“ میں نے زہرے لہجے میں کہا ”اور وہ اس لیے کہ میں تم سے کوئی بڑا س ڈیل نہیں کر رہا جس میں مجھے اپنے فائدے نقصان کی خاطر تمہاری مرضی اور خواہش کا خیال رکھنا ہو۔ ساحل کی واپسی میرا مطالبہ ہے اور یہ مطالبہ تمہیں ہر صورت میں پورا کرنا ہے، بشرطیکہ تمہیں اپنے بیٹے کی زندگی عزیز ہو!“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ”سات اور نو میں تمہارے نزدیک کوئی فرق نہیں ہوگا مگر میں ایک ایک سیکنڈ کو شمار کرتا ہوں۔ میں نے تم پر دماغ کر دیا تھا کہ میری دی ہوئی مہلت میں تو سب کی توقع نہ رکھنا۔ اگر آج کا سورج غروب ہو گیا تو تمہارے لیے موت جبر کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ میں ابھی تک اپنے فیصلے پر ثابت قدم ہوں لہذا تمہارے پاس چھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا ”سات بجے شام ڈھان!“

میں نے اس کی شکست خوردگی اور بے بسی پر محظوظ ہوتے ہوئے کہا ”ٹھیک سات بجے شام تمہارا سپوٹ میٹ ورسام مذکورہ کچھوے سے ٹیک لگائے گا اور تمہارے لیکن کی خفیہ آنکھیں اس پر نظریں گاڑے ہوں گی تاکہ تمہاری جانب سے کسی سبائیائی کی صورت میں فیصل کو بچھڑی کر دیا جائے۔“

”ایہ۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ جھجھکی لیتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”تو سمجھو پھر تمہارا بیٹا بھی محفوظ رہے گا۔ کوئی اس کی جانب میلی نگاہ سے بھی نہیں دیکھے گا۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جس طرح ٹھیک سات بجے فیصل مذکورہ مقام پر موجود ہوگا، بالکل اسی طرح تم ساحل کو بھی وہاں پہنچاؤ گے۔ میرا مطلب ہے، اپنے ٹھک خواروں کو ایسے احکام صادر کرو گے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں گے اور اگلے ہی لمحے وہ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں پھیل قدی کرتے نظر آئیں گے۔ تمہارے آدمی فیصل کو اور میرے آدمی ساحل کو اپنے کور میں لے لیں گے۔ نہ کوئی بدلتی اور نہ کوئی ہنگامہ آرائی نہایت ہی پُر امن انداز میں بندوں کا تبادلہ ہو جائے گا۔ پارک میں موجود افراد کو ذرا بھی احساس نہیں ہوگا کہ وہاں ان کی نظروں کے سامنے کتنا بڑا معاملہ پیش ہو گیا۔ جو بدلتی!“ میں نے چٹائی لہجے میں اسے مخاطب کیا اور کہا ”میری طرف سے یہ فیئر ڈیل ہوئی لیکن اگر تمہاری جانب سے کسی چالاکی یا ہوشیاری کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا تو پھر بھیا یک ترین نتائج کے لیے تیار رہنا!“

وہ میرے لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے بولا ”میں فیصل کے معاملے میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔ تم اس سلسلے میں بے فکر رہو۔“

”یہ تمہاری دانش مندی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”تم بھی کسی محفل غریب سے کام نہیں لینا!“

”میں الفاظ سے نہیں جھگڑتا۔ میں اپنا زبان کا دھنی ہونا ثابت کروں گا۔“ میں نے غصوں لہجے میں کہا ”آج شام سات بجے تمہیں یقین آ جائے گا کہ جہان کتنا بڑا فیئر ڈیل ہے۔“

”دیکھو گا!“ وہ تمسخر آواز میں بولا۔

پارک میں مجھے بھی کسی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ شام کے وقت وہاں بڑی چھل پھل اور رونق دیکھنے میں آتی ہے۔ مجھے امید ہے، کسی قسم کی بدترکی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پارک امید کی طرف سے سسٹیکورنی گاؤڑ ٹھوڑے ٹھوڑے فاصلے پر پڑے جو کسی انداز میں چلتے رہتے ہیں جو ہر قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے مجاز ہوتے ہیں لہذا وہاں کے ماحول کو دیکھتے ہوئے جو بدلتی کے بندے بہت محتاط رہیں گے البتہ پارک سے باہر کسی قسم کی بھی ناگفتہ بہ صورت حالات سے سادہ پڑ سکتا ہے۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”ساحل کو یہ حفاظت پارک سے نکال کر لانا اور پھر کسی محفوظ مقام پر پہنچانا ایک اہم مرحلہ ہوگا اور۔۔۔ ابھی تک یہ بھی طے نہیں ہوا کہ ہائیڈرو کے بعد ساحل کو کہاں رکھا جائے گا؟“

میں نے دراز کر مٹھاس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا ”پہلے میرے ذہن میں آپ کے بچنے کا خیال تھا۔ ساحل سب سے زیادہ محفوظ ہیں رہ سکتے ہیں لیکن آپ لوگ تو حیدر آباد جا رہے ہو۔ ایسی صورت میں یہ بگلا اور بھی زیادہ محفوظ اور مفید ہو جاتا ہے۔“ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بولا ”ہماری حیدر آباد جانے والی بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ تمام حلقے یہ جانتے ہیں کہ ہر سو میری بیٹی کی شادی ہوئی ہے اور آج حیدر آباد میں دلچسپ ہے تم نے شادی کے موقع پر ہوں میں دیکھ ہی لیا ہوگا، زندگی کے رہنے سے بڑے بڑے لوگ وہاں موجود تھے۔ مجھ جیسے معروف لوگوں کی سماجی سرگرمیاں پوشیدہ نہیں رہیں لہذا ہمارے ذہن بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔“

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا ”اگر تم ساحل کو لے کر یہاں آ جاؤ گے تو کسی کا اس طرف دھیان نہیں جائے گا۔ ہم بچنے کو لاک کر کے جائیں گے اور سیکورٹی گاؤڑ وغیرہ کو بھی وہاں سے ہٹا دیا جائے گا تاکہ یہی محسوس ہو، بچنے کے اندر کوئی بھی موجود نہیں۔ ویسے ہی تم اندرونی لائش کو آف ہی رکھنا تاکہ کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔ بچنے کی عقلی گل میں ایک چھوٹا دروازہ کھلتا ہے، وہ اندر سے کھلا چھوڑ دیا جائے گا۔ تم اسی دروازے کو استعمال میں لا کر یہ آسانی بچنے کے اندر آ جانا۔ میں اپنے ڈی ایس بی دوست خورشید شاہ سے کہہ کر چند سادہ لباس پوشیدہ والوں کو بچنے کی نگرانی پر مامور کروا دیتا ہوں تاکہ تمہارے دشمنوں میں سے اگر کوئی اصرار کا رخ کرے تو اس سے نمٹنا ہلکے دیرے تو رات گئے ہم واپس آ ہی جائیں گے۔“

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا ”میرا خیال ہے، پولیس

والوں کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حلیہ تو دیسے بھی بدلا ہوا ہوگا۔ و جہان کی حیثیت سے کسی کا دھیان میری طرف نہیں جائے گا اور جہاں تک ساحل کا سوال ہے تو اس کو میں کسی نہ کسی طرح کو کر ہی لوں گا۔ آپ اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔“

”ہوں!“ اس نے ایک ہنکاری بھری اور چہرے لمحے سوچنے کے بعد بولا ”ٹھیک ہے، تم اپنے طور پر جیسے مناسب سمجھو، بیان بناؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم شہزاد اور میرے سیکورٹی گاؤڑ کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہو۔“

میں نے کہا ”شہزاد کی تو اس مشن میں میرے ساتھ رہے گا۔ اس سے میرا ذہن مل گیا ہے۔ سبکمل یہاں پہنچنے والا ہے۔ اسے بچنے کے اندر ہی رہنے دیں۔ جب ہم فیصل کو لے کر پارک کی جانب روانہ ہوں گے تو وہاں موجود دونوں گاؤڑ کو یہاں بھیج دیں گے۔ بچنے کی حفاظت کے لیے یہاں پہلے سے دو گاؤڑ موجود ہیں۔ یہ چاروں افراد دور دورہ کر بچنے کی نگرانی کرتے رہیں بس اتنا ہی کافی ہے۔ بچنے کے نزدیک کسی قسم کی بھیج رگانا ٹھیک نہیں۔ میں گیت پر چھوٹا تالا ذہن کو کم راہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔“

”میں تمہارے منصوبے میں تھوڑی تبدیلی کر رہا ہوں۔“ مٹھاس باقر نے بزرگانہ انداز میں کہا ”بچنے والے گاؤڑ ستر علی اور آفتاب احمد کو تو میں تمہاری خواہش کے مطابق نگرانی پر مامور کر دوں گا لیکن عباس اور زمر خان کو یہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں سات بجے سے پہلے ہی پارک کی طرف روانہ کر دینا۔ وہ شہرہ مقام سے ٹھوڑے فاصلے پر موجود ہیں گے۔ جب تم ساحل کو لے کر پارک سے نکلو گے تو وہ دونوں تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے تاکہ کسی نوعیت کی بدترکی میں تمہاری طاقت بڑھا سکیں۔ پھر جب تم یہ حفاظت اس بچنے تک پہنچ جاؤ گے تو وہ واپس چلے جائیں گے۔۔۔۔۔ وہیں جہاں سے آئے تھے!“

”آپ کی بات دل کو گنتی ہے۔“ میں نے کہا ”میں اس سلسلے میں زمر و خان اور عباس کو اچھی طرح بریف کر دوں گا۔“

”کسی مزید گاؤڑ یا اسلحے کی ضرورت محسوس کرو تو شہزاد سے کہہ دینا۔“ مٹھاس نے دوستانہ انداز میں کہا ”وہ فوراً بندوبست کر دے گا۔ میں نے تمہارے سلسلے میں اسے خصوصی ہدایات دے رکھی ہیں۔“

”میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے کہا ”شہزاد بہت جی دار اور مخلص آدمی ہے۔ مجھے امید ہے، ہمیں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ دیسے آپ لوگ



حیدر آباد کے لیے کہتے ہیں بیک وقت دو اندھوں گے۔

منہاس باقر نے جواب دیا "اگر چکر راجی میں موسم سرما اپنی بہار دکھانے میں اکثر نا کامیاب رہتا ہے لیکن حیدر آباد کا حال اس سے بہت مختلف ہے۔ وہاں آج کل شام اور خصوصاً رات میں ابھی خاصی سردی ہو جاتی ہے۔ لڑکے والوں نے بھی قدرے جلد فارغ کر کے ناکودہ کیا ہے۔ دو گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ میرے خیال میں ہم شام ساڑھے چھ بجے نکلیں گے یا زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں۔"

"یہ بالکل مناسب پروگرام ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں بھی فوراً پارک سے نہیں نکلوں گا۔ کم از کم.... آدھا گھنٹہ پارک رک کر دشمنوں کی کسی بھی ممکنہ چال کو سمجھنے اور اس سے بچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر سب خیریت رہی تو ہم ساڑھے سات بجے تک وہاں سے روانہ ہوں۔ اس وقت رات کا آغاز ہو چکا ہوگا۔"

ہمارے درمیان منصوبہ سازی جاری تھی کہ سہیل بنگلے پر پہنچ گیا۔ اسے شہزاد نے کچھ نہیں بتایا تھا لہذا میں نے مختصر الفاظ میں اسے آئندہ فراموش سے آگاہ کیا۔ میک اپ کے ذریعے عارضی شخصی تبدیلی اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بہت دلچسپی اور سستی خیزی سے مجھے نکتے لگا پھر مضطرب لہجے میں بولا "سر! آپ تو کمال کے آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ اس بندے کے بڑوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔" بندے سے اس کی مراد فیصل تھی۔

میں نے کہا "شہزاد نے مجھے تمہارے اور فیصل کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں مختصر بتایا ہے۔ اب تم اپنی زبان سے تفصیل سناؤ تاکہ فیصل کو ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔"

سہیل نے کم دیش دی باتیں بتائیں جو اس سے قبل میں شہزاد کی زبانی سن چکا تھا۔ اس کے مطابق اس نے ہماری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے فیصل کو یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ اس کی پیشکش پر غور کر رہا ہے لہذا فیصل تھوڑا اور مکمل کیا۔ سہیل نے خدشہ ظاہر کیا کہ فیصل اپنا کام نکلوانے کے بعد رقم سے انکاری ہو جائے گا۔ فیصل نے اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر سہیل اسے ایک فون کرنے کا موقع دے تو وہ اسے کسی خاص آدمی سے بات کرے گا۔ سہیل اس آدمی سے جا کر ملے، اسے مذکورہ رقم دے دی جائے گی۔ جب رقم سہیل کے قبضے میں چلی جائے تو وہ بنگلے پر آ کر فیصل کو فرار ہونے کا موقع فراہم کرے۔ سہیل نے اپنی کھانا داری تو میں نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ نہایت ہی سیکرٹ اور پرائیویٹ گفتگو سے

اسے دور رکھنا ضروری تھا۔ میک اپ والی بات اس سے مجھے نہیں چاہی تھی کیونکہ بعد میں بھی میرا اس سے واسطہ پڑے گا۔ پھر میک اپ ماسٹر ہم دونوں کو ساتھ بٹھا کر ہی اپنے فرائض انجام دے گا۔

فیصل نے نہایت ہی ہوشیاری کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسے ایک بات یہ بھی ثابت ہو گئی کہ گزشتہ رات اس نے ہماری کوششوں کی مدد سے وہ درندہ پیش قدمی کی غلطی نہ کرتا۔ جب میں اور اس کے نزدیک کھڑے باتیں کر رہے تھے تو وہ واقعی نیند میں اور اسے مطلق خبر نہیں تھی، ہم نے اور سہیل نے اس کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا تھا۔

فیصل نے سہیل کو جو نیا رنگ سنایا تھا اس سے اس کی ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ سہیل کو بے وقوف بنا کر جو بے دان ہونے دھکیلتا تھا۔ دھکیلتا اس شخص کو فون کرنا جو میاں زادہ حسین جہنم رو آگئی کہ بعد کراچی نیٹ ورک کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اگر اس کے منصوبے کے مطابق سہیل ایک کروڑ روپے کی رقم وصول کرنے اس کے بتائے ہوئے جے پریکٹس جاتا تو یہ کیا ہوتا۔ پروانہ موت پر دستخط کرنے کے مترادف ہوتا۔ وہ لوگ سہیل کا قیور کر کے جبراً اس کی زبان کھلوایں گے۔ فیصل کو کہاں رکھا ہے۔ اس کے بعد چوہدری کے تنگ خواروں کے لیے ہاڑی پڑھتی۔

آسان ہو جاتی۔ ٹارگٹ نگاہ میں آ جانے کے بعد ایک بہتر سہل ہو جاتا ہے۔ وہ فیصل والے بنگلے پر ہلا بول دیتے اور اگر زبان سے وہ فون نمبر ادا ہوگا، میرے ذہن کی یادداشتی خانے خون کے دریا سے گزر کر اسے جھڑانے کی کوشش کرتے۔ فیصل میں نوٹ ہو جائے گا۔ میں اس کی نظر بچا کر آپ کا نمبر ڈائل کو فرار ہونے کے لیے ہاتھ تکھلانا کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کروں گا۔"

میں نے تشویش ناک نظر سے منہاس باقر کو دیکھا۔ وہ میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اس نے گھبراہٹ سے کہا "سر! آپ نے کیا سوچا؟"

"دو جہان! چوہدری کا بیٹا اپنے باپ سے چار ہاتھ آگے ہی نہ آتا ہے۔ اس نے بڑی خطرناک چال چلنے کی کوشش کی ہے۔" "لیکن میں اس کی چال اسی پر لوٹا دوں گا شہزاد آپ کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، فونی طور پر فیصل کو کسی جگہ میں صاحب! میں نے پورا اعتماد ادا کیا ہے۔" "اگر چوہدری اور اس کے منہاس باقر کے درمیان میں کے نیٹ ورک کو دانتوں پیسنہ نہ آ گیا تو میرا نام بھی دجہان اس لیے وہ نہایت ہی مختصر اور مختلط الفاظ استعمال کرے گا۔ میں نہیں!"

منہاس نے کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بڑی رقم کا معاملہ ہے۔ اس کا مطلب ہے تم کھینچا چاہتے ہو؟"

"بالکل!" میں نے قطعیت سے کہا "یہ ایک شاندار موقع ہے۔"

میں نے جواب دیا "فون کا کارڈ میں ضرور کھیلوں گا لیکن میں نے اسے اس وقت میرا ذہن برقی رفتار سے کام کر رہا تھا۔" میں فیصل کو بے اعتباری ظاہر کرتے ہوئے اس سے فون نمبر اگلاؤں گا اور کہوں گا، ڈائلنگ میں خود کروں گا، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اسے فون کو کوئی خاص اطلاع نہ دے دے۔ میرا خیال ہے کہ فیصل کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے لیے یہی بڑی بات ہو گی کہ میں اسے فون پر بات کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کر رہا بلکہ اس کے بجائے ہونے ناکامیہ حال میں بھی قدم رکھ چکا ہوں۔ وہ زیادہ سوچ بچار نہیں کرے گا۔"

رکھ چکا ہوں۔ وہ زیادہ سوچ بچار نہیں کرے گا۔" "تمہاری بات میں وزن ہے۔" منہاس باقر نے دلچسپی سے کہا "میں نے یہ سب کچھ پوچھا تھا، فیصل تمہاری بات مانتے ہوئے تمہیں اپنے کسی طاقتور اور با اختیار بندے کا فون نمبر بتا دیتا ہے۔ کیا تم وہاں اس کی بات کر دو گے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے دونوں انداز میں کہا "اگر اس کا رابطہ کر دانا ہوتا تو پھر خود ڈائلنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تو پھر؟" اس مرتبہ منہاس کے لہجے میں قدرے الجھن

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "جیسے ہی فیصل کی سہل ہو جاتا ہے۔ وہ فیصل والے بنگلے پر ہلا بول دیتے اور اگر زبان سے وہ فون نمبر ادا ہوگا، میرے ذہن کی یادداشتی خانے خون کے دریا سے گزر کر اسے جھڑانے کی کوشش کرتے۔ فیصل میں نوٹ ہو جائے گا۔ میں اس کی نظر بچا کر آپ کا نمبر ڈائل کو فرار ہونے کے لیے ہاتھ تکھلانا کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کروں گا۔"

میں نے تشویش ناک نظر سے منہاس باقر کو دیکھا۔ وہ میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اس نے گھبراہٹ سے کہا "سر! آپ نے کیا سوچا؟"

لینے والے نئے پاس کا پتہ ٹھکانا معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر وہ کوئی اور شخص بھی ہوا تو نہایت ہی اہم ہوگا۔ ممکن ہے، وہ پاس سے زیادہ اہم ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟"

منہاس باقر چند لمحات تک تو صوفی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ذریعہ لب مسکراتے ہوئے کہا "کیا تمہیں کچھ عرصہ الفریڈ بچپاک کے ساتھ رہنے کا موقع بھی ملا ہے؟"

"آپ یہ غیر متعلقہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ غیر متعلقہ سوال نہیں۔" اس نے کہا "تم بہت اچھی کہانی بنی لیتے ہو!"

"گویا آپ تصدیق کر رہے ہیں، میرا منصوبہ بے بداع اور قابل عمل ہے؟"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنے حصے کا رول بہ خوبی نبھائوں گا۔"

"باقی تمام معاملات میں دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔

پھر میری فرمائش پر منہاس نے سہیل کو بلایا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم نے فیصل کو کیا جواب دیا تھا؟"

اس نے بتایا "میں نے شہزاد صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد فیصل سے کہا تھا، میں نہیں جانتے اس کے مطلوبہ نمبر پر بات کر دوں گا۔ اس نے پوچھا، تین بجے کیوں، فوراً کیوں نہیں؟ میں نے شہزاد کے مشورے کے مطابق جواب دیا کہ تین بجے شہزاد تھوڑی دیر کے لیے بنگلے سے چلا جائے گا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اس پر فیصل نے پوچھا "اگر شہزاد نامی وہ طرم خان یہاں موجود ہے تو مجھ سے اس نے مجھے شکل کیوں نہیں دکھائی؟ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ شہزاد دیگر ضروری کاموں میں الجھا ہوا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "سر! آپ تو جانتے ہیں، شہزاد صاحب آپ کی ہدایت پر ہی فیصل کے سامنے نہیں گئے۔"

"فیصل نے تم سے میرے بارے میں استفسار کیا ہوگا؟"

میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "ہاں، وہ تین چار بار آپ کا پوچھ چکا ہے اور میں نے اسے ہر دفعہ یہی بتایا کہ آپ اسے روٹا سے معاملات طے کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور شام کو ہی بنگلے پر آئیں گے۔"

اس سے فیصل نے خاصی طمانیت محسوس کی اور کہہ کر یہ کچھ سے دیگر سیکورٹی گارڈز اور وہاں کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں پوچھنے لگا لیکن میں نے یہی غلطی کیا کہ جب تک ایک کروڑ روپے کی رقم میری جیب میں نہیں آ جاتی، میں اسے چھوٹی

سے چھوٹی بات بھی نہیں بتاؤں گا۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے تقریبی نظر سے اسے دیکھا۔ ”تم کا ایک کچھ دار ہو۔ میں منہاس صاحب سے تمہاری تنخواہ میں اضافے کے لیے سفارش کروں گا۔“

اس کا چہرہ خوش سے تنہا تھا۔ اس تنہا میں اپنی تعریف اور آمدنی میں اضافے کی خوشی یکساں طور پر شامل تھی۔ منہاس صاحب نے سکیل کو دوبارہ دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور ہم ضروری امور پر بات کرنے لگے۔ دس منٹ بعد میک آپ کا ماہر وہاں پہنچ گیا۔

اس فنکار کا نام نیم جوہر تھا۔ اس سے مصافحہ کرنے کے بعد مجھے عجب سا احساس ہوا پھر جب ایک سلیک ہوئی تو اس عجیب احساس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ نیم جوہر کی آواز، انداز اور اعضا میں ایک خاص قسم کی نرمی اور نزاکت پائی جاتی تھی جسے عرف عام میں نسوانیت کا نام دیا جاتا ہے۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ لہذا منہاس باقر کی خواہش پر ہم سب نے پیٹ پوچا گی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے بھرپور ناشتا کیا تھا اس لیے دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے ہاتھ چلاتا رہا۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تو منہاس باقر نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

”تم چاہو تو اپنی ساتھی سے مل لو۔ میک آپ کے بعد تو تم بڑی حد تک بدل جاؤ گے۔“

”اچھا یاد دلایا آپ نے۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”حلیے کی تبدیلی کا راز میں فی الحال زرگل سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔“ پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ”کیا ممتاز وہاں چلی گئی؟“

”وہ تو شادی کے دوسرے روز یعنی کل صبح ہی اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔“ اس نے بتایا ”ہاں، البتہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ویسے ہی ضرور آئے گی لیکن اتفاق دیکھو کہ تم وہاں نہیں جاسکو گے ورنہ میرے دوست اور ممتاز کے باپ قاضی سے تمہاری ملاقات ہو جاتی۔ وہ یہ وجوہ شادی میں نہیں آسکا اور تم دیسے کی تقریب میں شرکت نہیں کر سکو گے۔ تمہیں بہت یادگار رہتا ہے۔“

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور کہا ”زندگی نے وفا کی تو بہت جلد میں قاضی صاحب سے ایک بھر ملاقات کروں گا۔“

زرگل کے ساتھ چندہ منٹ گپ شپ کرنے کے بعد میں نیم جوہر کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ منہاس نے میک آپ ماسٹر کو سب کچھ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ انسان کے طبع

میں بالوں کے اسٹائل کی بہت اہمیت ہوتی ہے، نیم جوہر پویشی کے ساتھ میجر ڈریسر بھی تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے اپنے فن کا کمال دکھا کر انہیں میں کے فرق سے مجھے سبیل بنا دیا۔ رہی سبکی سرگاڑی کی وردی نے پوری کر دی۔ اگر میں سبیل کے لب و لہجے اور نشست و برخاست کی فطرتی حرکتیں فیصل کا باپ مجھے بھی پہچان نہیں سکتا تھا اور مجھے اپنی کارکردگی پر پورا بھر دیا تھا۔ جیسے نیم جوہر کو اپنے فن پر بھر دیا تھا۔

ایک ساتھ گزارے ہوئے اس ایک گھنٹے کے اندر ہمارے درمیان اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ نیم نے مجھے میک آپ کے حوالے سے بہت سی مفید باتیں بھی دیں۔ میں نے یہ سن سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا کہ مکمل مہارت کے لیے تو برسوں درکار ہیں تاہم وہ ایک دو سبک میں مجھے اتنا حلقہ کر دے گا کہ میں اپنی مرضی کے مطابق حلیہ تبدیل کرنے پر قادر ہو جاؤں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں پہلی فرصت میں اسے سبک کی زحمت دوں گا۔ نیم جوہر بہت ہی شفیق اور فیصل انسان تھا۔

حلیو ہنڈل کی کو میں نے منہاس باقر کے بنگلے پر ہی چھوڑ دیا۔ منہاس نے مجھے لائٹ گرین کمر کی ایک بوڑھا سوک فرام کر دی۔ تھوڑی دیر بعد میں اس سبک رفتار گاڑی میں بیٹھ کر بنگلے سے رخصت ہو گیا۔ یہ میرے نئے رول کا پہلا سیشن تھا!

☆☆☆

شہزادہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں پونے تین بجے وہاں پہنچا اور دس منٹ کے اندر نہایت ہی جامع اور مختصر الفاظ میں میں نے شہزادہ کو آبدی کی پلاننگ سے آگاہ کر دیا۔ شہزادہ شہید پارک والے منصوبے کو اس نے سراہا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ میں سبیل بن کر اس مشن میں حصہ لوں گا۔ میں نے بات کے اختتام پر اس سے کہا ”حیاس اور زمرہ خان کو بھی میرے بارے میں کچھ بتا نہیں چلنا چاہئے۔ میں ان سے بھی سبیل کی حیثیت سے طوں گا۔ ویسے وہ ڈیوٹی کیسی دے رہے ہیں؟“

”ایک دم اطمینان بخش۔“ اس نے جواب دیا پھر پوچھا ”انہیں کب تک یہاں سے روانہ کرنا ہے؟“

”اس بارے میں بعد میں فیصلہ ہوگا۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”پہلے میں فیصل سے ”ملاقات“ کروں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے مزید کہا ”سبیل کے جانے کے بعد تم فیصل کی طرف تو نہیں گئے؟“

”ایک مرتبہ اس پر اپنی سی نگاہ ڈالی تھی۔“ اس نے بتایا ”لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں دراصل اس پر یہ ظاہر کرنے

کی کوشش کر رہا ہوں کہ کسی اہم نوعیت کے کام میں مصروف ہوں۔“

میں نے کہا ”یہ تم بہت اچھا کر رہے ہو۔ اب تم مجھ سے بیٹہ ہو سکو کہ میں سبیل ہوں۔ میں ابھی فیصل کے پاس جا کر اسے یہ خوش خبری سناؤں گا کہ تم کسی کام سے بنگلے سے باہر چلے گئے ہو۔ ایک بات کا خیال رکھنا شہزادہ! فیصل کو اس کی ”ڈیوٹی“ کے بارے میں جھگ بھی نہیں پڑنا چاہئے۔ شہزادہ شہید پارک کی طرف لے جاتے ہوئے ہم اس پر یہی ظاہر کریں گے کہ کیا ہے گھمانے پھرانے کے لیے آزاد فضا میں لائے ہیں۔ فیصلی پر گرام ہم تھوڑی دیر بعد طے کریں گے۔ ذرا میں دیکھ لوں فیصل ایک کروڑ روپے کے طے میں کیا بھر دکھاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ پرخیاں انداز میں بولا ”شہزادہ شہید پارک کے حوالے سے اس وقت مجھے بات خان یاد آ رہا ہے۔ کافی دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بات خان سے میری اچھی یاد اللہ ہے۔ وہ پارک میں سیکورٹی گاڑی کی حیثیت سے ملازم ہے۔“

”یہ تم دور کی کوڑی لائے ہو۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ”ان ریکارڈ تم کسی ضروری کام سے تھوڑی دیر کے لیے اس بنگلے سے باہر تو جا رہے ہو۔ میرا خیال ہے تم آف دی ریکارڈ چلے جاؤ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ آیا بات خان آج کل بھی پارک کے اندر ڈیوٹی انجام دے رہا ہے یا نہیں اس مشن میں اسے استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے!“

”تمہیں فیصل کو سنبھالنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟“

”قلعہ نہیں۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے“ پھر میں بات خان کا کھوج لگاتا ہوں۔“ اس نے کہا ”اور پچو وغیرہ سے بھی منٹ آتا ہوں۔“ میں نے سوال کیا ”کیا تمہیں سونے کا تھوڑا بہت موقع ملا تھا؟“

”ہاں میں نے تین گھنٹے نیند لے لی ہے۔ اور یہ کافی ہے۔“

”اگر بات خان دستیاب ہو جاتا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”تو کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ تعاون کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

وہ پرخیاں انداز میں بولا ”میرا خیال ہے وہ میری بات سے انکار نہیں کرے گا اور دینے بھی ہم اس سے کوئی غیر قانونی

یا بھرمنا کام تو نہیں لیں گے نا!“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے طبیعت سے کہا۔

شہزادہ تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ کر بنگلے سے رخصت ہو گیا۔ مذکورہ شہزادہ شہید پارک اس بنگلے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ مجھے امید تھی شہزادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔ میں نے سبیل کے لب و لہجے کو ذہن میں تازہ کیا اور فیصل والے کمرے میں پہنچ گیا۔ میری اداکاری کا امتحان شروع ہو گیا۔

”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی فیصل نے بچی آواز میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے قریب آ کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”میں شہزادہ سے ہدایات لے رہا تھا۔ اس نے کافی وقت لے لیا۔“

”کیا وہ چلا گیا؟“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال کر دیا۔

میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کوئی جھوٹ نہیں بولا بلکہ حقیقت بیان کر دی ”ہاں وہ ابھی بنگلے سے نکلا ہے۔“ میں بڑی کامیابی سے سبیل کا رول ادا کر رہا تھا۔

”اور باقی دونوں گاڑی؟“ فیصل نے اپنے اندرونی جوش کو دہاتے ہوئے دریافت کیا۔

”وہ حسب معمول اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

”اچھا موع ہے۔“ اس نے چار اچھٹکے والے انداز میں کہا ”اگر تم مجھے ان آہنی بندشوں سے آزاد کر دو تو میں تمہیں زخمی کر کے بنگلے سے نکل جاؤں گا۔ اگر ان گاڑیوں نے میرے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو میں ان کی لاشیں گرانے میں ایک لمحہ نہیں سوچوں گا۔“

”تم ایسے ہی خالی خولی کیسے چلے جاؤ گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خٹک لہجے میں کہا ”میرے ایک کروڑ کا کیا ہے؟“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس دیکھنے میں عیاری اور چال بازی کوٹ کوٹ کھر بھری ہوئی تھی۔ وہ مجھ بے وقوف بنا کر چمکا دینے کے موڈ میں تھا لیکن میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میں اس کے پھر میں آنے والا نہیں۔ میں ایک لاپرواہی مگر محتاط آلہ کار کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ فیصل نے فوراً بیترابا دل اور بولا۔ اس کے انداز میں برہمی پائی جاتی تھی۔

”میں نے تو تمہیں رقم حاصل کرنے کا آسان راستہ بتایا تھا لیکن ابھی تک تم نے فون پر میری بات ہی نہیں کرائی۔ تم

نے حالانکہ وعدہ کیا تھا، تین بجے مجھے ایسا موقع دو گے؟“

”میرا وعدہ وعدہ شہزاد کے جانے سے مشروط تھا۔“ میں نے وضاحت کی ”وہ ابھی ابھی نکلا ہے تو میں تمہاری طرف آیا ہوں۔ تم نہیں جانتے، شہزاد اور وجدان کتنے سفاک ہیں۔ ان کی موجودگی میں سانس بھی سنبھل نہیں کر لیتا ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر تمہارے کام آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا ”جہیں اپنے اس فیصلے پر کبھی پشیمانی نہیں ہوگی۔ میں جہیں اتنی دولت دلاؤں گا کہ تمہاری آنے والی سات لسلوں کو کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ اس نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر مضطربانہ لہجے میں اضافہ کیا ”یہ نہایت ہی موزوں وقت ہے۔ وجدان صبح سے ادھر نہیں پہنچا اور شہزاد ابھی اس وقت بیگلے میں موجود نہیں۔ تم مجھے آزاد کر دو تاکہ میں فون پر تمہارے لیے رقم کا بندوبست کر سکوں۔“

کراٹھا۔

میں نے اداکاری جاری رکھنے ہوئے فیصل کی طرف دیکھا اور ہاتھ نہیں میں کہا ”چوہدری نواز علی کا صاحب زادہ فیصل رقم کے سلسلے میں بے ڈی ملک سے بات کرے گا۔“

پڑتا ہے۔ فون پر اظہارِ ادبی جملے بولنے کے بعد وہ خاصی مطمئنیت محسوس کر رہا تھا جیسے اسے یقین ہو چلا ہو، اب تب میں جے ڈی ملک کے بندے اس کی رہائی کے لیے اس جینگے پر بلا بولنے والے ہوں۔ میں نے اسے خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔



فیصل ہٹا لگا ہم میں سے ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ ہمیں اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ہم اس طرح دل و جان سے اس کی مدد میں جت جا رہے تھے۔ اس کے ذہن نے وہی فیصل دیا ہو گا کہ ہمارے داغ چل گئے ہیں۔ بہر حال، وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی فہم میں تھا اس لیے وہ خاموش تماشا بنی بنا اپنی بندشیں ختم کر داتا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہاتھ پاؤں سے آزاد ہو گیا۔ آہنی زنجیر، بھٹکڑی اور بیڑی اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئیں۔

میں دبے قدموں سے چلتے ہوئے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا اور شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں اس کو دروازے میں سے تمہیں ایک پیسا نہیں دوں گا۔" اگر تم مجھے رقم نہیں دو گے تو میں اس میں سے وصول کروں گا!" اس کا اشارہ فیصل کی طرف تھا "تم نے اکیلے اسے آزاد نہیں کیا۔ میں نے بھی خاصی کسرت کی ہے۔" میں نے بے اعتنائی سے کہا "میں نے وصول کرنے سے کب منع کیا ہے۔ تمہیں تو دیے بھی کسرت کی بہت عادت ہے۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔ تمہارا شکار بھاگ کر نہیں نہیں جائے گا۔ تم اس کے اندر سے جتنی رقم نکال سکتے ہو، نکال لو۔ اس وقت تم فیصل کو ایک انسان نہیں، بلکہ آٹومیٹڈ میٹر مشین سمجھ لو۔ جو مختلف شبن دبانے پر کمرے کے لوٹ فرام کرتی ہے۔" "کمرے کے لوٹوں کے بدلے میں کراہا مکا!" شہزاد نے وحشیانہ انداز میں کہا اور فیصل کے منہ پر ایک طاقت ور رچ جوڑ دیا۔

فیصل لاکھ مارشل آرٹس سیکھ لیکن وہ شہزاد کی طرف سے ایسے رویے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا ذہن تو ہماری بے سرد پاؤں اور فائر آفٹل ہاتھوں میں الجھا ہوا تھا۔ شہزاد کا مکا کھانے کے بعد وہ دھڑام سے پشت کے بل زمین پر بوس ہو گیا۔ شہزاد کسی باکسر کے مانند اسٹائلس بنا کر قدموں پر اچھلتے لگا۔ فیصل زیادہ دیر تک بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔ صورت حال کی سنگینی کو سمجھتے ہی وہ سمجھ گیا، ہم نے اس کے ساتھ بھرپور ڈراما کھلایا تھا۔ وہ دانت پر دانت جما کر زمین کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بدن میں لاکھ لوہیت کی کڑوہیاں سہی مگر بنیادی طور پر وہ ایک مارشل آرٹس تھا اس لیے تم شوک کر دہمٹا بلے پر اتر آیا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا!

شہزاد اپنے قدموں پر اچھلتے ہوئے ہوا میں کے برسانے لگا۔ وہ ایک طرح سے فیصل کو اشتعال دلانا تھا تاکہ

وہ اس پر حملہ آور ہو۔ فیصل نے ایک سے پہلے پتھر ابد لا پھر اس کی تک ہوا میں بلند ہوئی۔ اس تک میں وہ دم نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ میں پلک جھپکے میں سمجھ گیا، رگ پٹوں کی آٹھنیں اور کڑوری نے فیصل کو غیر مستعمل بنادیا تھا۔ اس حالت میں اسے زد و کوب کرنا فیصل کی نہیں، اس کے فن کی بے عزتی ہوتی۔

"رگ جاؤ شہزاد! کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے با آواز بلند کہا۔

شہزاد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، ہمیں چونک جانا پڑا۔ بنگلے کے بیرونی حصے میں درجن بھر افراد کے گونے کی آوازیں ابھری تھیں۔ ہماری نگاہیں ابھی چار دیواری میں کدوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ہماری سماعتوں پر دستک دینے لگیں۔ اس سے قبل کہ ہم کوئی جنبش کرتے، بنگلہ بے درخی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ لگتا تھا، درجنوں گولوں کے دہانے بیک وقت کھول دیئے گئے ہوں!

فیصل بھی اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے بے ساختہ دروازے کی جانب دوڑ لگادی لیکن میں اسے چھوڑنے والا کہاں تھا۔ وہ میرا ایک زوردار دھکا کھا کر منہ کے بل کمرے کے پختہ فرش پر گرا۔

میں نے ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور فیصل کو گھٹینے ہوئے شہزاد سے کہا "اخبارات کے بڈل بٹا کر چھپنے کی جگہ بناؤ۔ جلدی۔۔۔۔۔ ہری اپ!"

ان نجات میں بنگلے سے فرار ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ چاہے کون کون لوگ تھے اور کس مقصد سے وہاں چڑھ دوڑے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ سرے کفر، ہاتھ کر تقسیم اجل کرنے نکلے ہوں۔ بہر حال، وہ دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ دوست اور خیر خواہ دستک دے کر آتے ہیں، گولیوں کی برسات کرتے ہوئے نہیں۔ حملہ آوروں کی نہیں مسلسل موت اگل رہی تھیں۔

جس کمرے میں ہم موجود تھے وہ بنگلے کے دور افتادہ حصے میں واقع تھا۔ لہذا موت کے ہر کاروں کو وہاں تک پہنچنے میں چند سیکنڈ لگے۔ ہم ابھی پوری طرح سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ دروازے پر ایک زوردار دھوکا پڑی۔

اس کمرے کا دروازہ بے چون و چرا کھٹکا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے، دے دم اور سفاک موت بھرا مار مار کے ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی!



میں نے زندگی میں بارہا موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہی ایسے ہی سنگین اور ہلاکت خیز لمحات تھے۔ شہزاد کی چوٹی کام آگئی ورنہ درجنوں گولیاں ہمارے اجسام کو چھلتی بنا چکی ہوتیں۔ ان لوگوں کے کمرے میں داغ ملے سے قبل ہم اخبارات کے بڈلز کے پیچھے پناہ گزین ہو چکے تھے۔ اس حادثاتی پناہ گاہ میں پہنچنے ہی شہزاد نے فیصل کو اپنے بازو کی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا اور میں ایک درز سے کھلے ہوئے دروازے کے فریم میں جا دھشت ناک منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ تین افراد تھے۔ دو آگے اور ایک قدرے پیچھے آگے والوں کے ہاتھوں میں کے نظر آ رہی تھیں جب کہ ان کا تیسرا ساتھی پتول بردار تھا۔ میں افراتفری کی کیفیت میں صرف دروازہ ہی بند کر پایا تھا اگر اسے لاک بھی کر دیتا تو وہ لوگ اتنی آسانی سے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان تینوں نے چونکا نظر سے کمرے کا جائزہ لیا پھر ایک کلاشن کوف بردار نے کہا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں!" اس کے لہجے سے حیرت عیاں تھی۔

"انہیں نہیں ہونا چاہئے تھا۔" پتول بردار شخص نے آگے بڑھ کر کہا "یہ دیکھ کر ہے ہومے دونوں۔" اس نے کمرے کے فرش پر پڑی آہنی زنجیر جھک کر اور بیڑی کی جانب اشارہ کیا "فیصل کو اسی کمرے میں قید رکھا گیا تھا لیکن ان چڑوں کی موجودگی ظاہر کر رہی ہے" اسے آزاد کر کے کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔

"اگر وہ لوگ اسی بنگلے میں کہیں چھپ کر بیٹھے ہیں تو ہماری نگاہ سے بچ نہیں سکیں گے۔" دوسرے کلاشنکوف والے نے کہا "ہمارے ساتھی بنگلے کا کونا چھان مار رہے ہیں۔ ہم تینوں دم سادے حملہ آوروں کی باہمی گفتگو سن رہے تھے۔ میں نے اور شہزاد نے تو از خود سانس روک رکھی تھی جب کہ فیصل کے ساتھ نیک لاک کی مجبوری تھی۔ شہزاد نے اس کی گردن کو اپنے بازو میں اس طرح بوجھ رکھا تھا کہ وہ زبان کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ مزید افراد اس کمرے میں پہنچ گئے۔ چھپا ہوا وہی لوگ تھے جو اس بنگلے کے مختلف حصوں میں ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کلاشنکوف پر میری گرفت اور مضبوط ہوئی اور میں دو بڈلز کے درمیان والی درز سے آنکھ مٹائے تازہ ترین سنگین صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس شکل و صورت میں وہ چھری کی ٹیلی اسکوپ کا کام کر رہی تھی۔ پتول بردار شخص نے سوالیہ نگاہ سے آنے والوں کو

دیکھا۔ وہ اپنی اداؤں سے ان کا سرغند دکھائی دیتا تھا۔ "ان کا کوئی سراغ با تھ لگا؟" اس نے عجب دارا داز میں پوچھا۔ اسے کسی میں جواب موصول ہوا "ہم نے پورے بنگلے کی اچھی طرح تلاشی لے لی ہے پاس! یہاں، ہمارے سوا اور کوئی انسان موجود نہیں۔"

"دو کمرے تو اخبارات کے بڈلز سے بھرے ہوئے ہیں۔" تلاش کنندگان میں سے ایک نے کہا "جیسے ہی کمرہ آدھا بھرا ہے۔"

"تم لوگ ایک مرتبہ پھر بنگلے کی تلاشی لو۔" پاس ٹائپ شخص نے گرج کر کہا "مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ ابھی بنگلے سے نکلے نہیں ہیں۔ باہر کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اگر وہ لوگ یہاں سے رخصت ہو چکے ہوتے تو گاڑیاں نظر نہ آتیں۔ ہمیں ہر حال میں فیصل کو حاصل کرنا ہے چاہے اس کے لیے درجنوں افراد کو خون میں نہلانا پڑے۔ او کے۔۔۔۔۔ کوئیٹ۔۔۔۔۔"

وہ پاس نما شخص گاڑیوں کے حوالے سے بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس نے دوسرے فیصل کا نام لیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا وہ کوئی بہت ہی اہم آدمی تھا۔ اسے فیصل کی یہاں موجودگی کی خبر کسی اسی لیے وہ اتنا پر اعتماد تھا۔ اس کا حکم سننے ہی وہ لوگ تیزی سے کمرے سے خارج ہو گئے صرف ایک کلاشنکوف بردار اس کے پاس رہ گیا۔ وہ دونوں کمرے کے فرش پر پڑی آہنی بندشوں کا جائزہ لینے لگے۔ ان کے انداز میں بڑی تشویش بکھائی جاتی تھی۔

میرے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ انہیں ہمارے خفیہ بھانے کا پتا کیسے چلا۔ یہ کام تو کسی بھی طرح ہو چکا تھا اسی لیے وہ دہمداہتے ہوئے اس بنگلے میں گھسے تھے اور شکرے کے مانند ہمیں شکار کرنے کے لیے وہ مختلف کمروں میں چکرارہے تھے۔

آہنی زنجیر جھکڑی اور بیڑی کو باریک بینی سے دیکھنے کے بعد پاس نے اپنے ساتھی سے کہا "ناورائ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں! انوا کنندگان نے منوی فیصل کو اپنی مرضی سے آزاد کیا ہے۔ اور۔۔۔۔۔ وہ لوگ اس بنگلے سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔" اس کے لہجے میں بڑا وثوق پایا جاتا تھا "تم یہ بڈل بٹاؤ!" اس نے سنسنیاتی ہوئی نظر سے اخباری بڈلز کو دیکھا۔

پاس نما شخص کے آخری جملے نے میرے بدن کے سارے خون کو داغ میں پہنچا دیا۔ وہ ناورائی اپنے ماتحت کو نہایت ہی خطرناک حکم دے رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا وہ

اخبارات کو نہیں بلکہ براہ راست ہمیں دیکھ رہا ہو۔ دروازہ قائم اس شخص کی آنکھوں میں بے پناہ سفاکی پائی جاتی تھی۔ اگر اخبار کے وہ بٹلز وہاں سے بنائے جاتے تو ہماری روپوشی کا راز عیاں ہو جاتا۔ اس نازک موقع پر میں جیتی ہوئی بازی کو مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کن نظر سے شہزاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے کسی یا غبار کی طرح گردن کو اٹھائی جنبش دی۔ وہ میرے عزائم کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔

ناورائی کلاشکوف بردار اپنے پاس کا حکم پا کر بٹزل کی جانب پیش قدمی کر چکا تھا۔ ان بٹزل کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے دونوں ہاتھوں کا استعمال ضروری تھا لہذا اس نے کلاش کو پکے کی مدد سے کندھے پر لٹکالیا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

میرے اعصاب تن گئے۔ اگر وہ ہمارے سامنے سے ایک بٹزل بھی اٹھا لیتا تو ہم ان دونوں کے مارگٹ بن جاتے۔ میرے ذہن نے فیصلہ دیا، یہ کسی صورت نہیں ہوگا! نادر نے جیسے ہی بٹزل اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے وہ بٹزل توپ سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند اس کے سینے پر لگا۔ میرے طوفانی ہنڈ پش نے بٹزل کو راکٹ بنادیا تھا۔ نادر بٹزل سمیت چار فٹ پیچھے فرخ پر جاگرا۔ یہ ایک جتنا دار تھا جس نے نادر کو چاروں خانے جت کر دیا۔

میں نے تیل کرتے ہوئے برقی رفتار سے ہائی جپ لگائی اور کلاشکوف سونے بٹزل کے عقب سے نکل کر پینٹ فرخ پر پہنچ گیا۔ دروازہ قائم ہاس کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورت حالات تھی۔ اسے ہماری روپوشی کا یقین تو تھا لیکن یہ امید نہیں تھی کہ کوئی چلاوے کے مانند نکل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔ فطری رد عمل کے طور پر اس نے مجھ پر گولی چلا دی۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے لیفٹ ڈائیو کیا اور ہوا میں تیرتے ہوئے ایک کونے میں پہنچ گیا۔ میرے جسم پر ایک سکیورٹی گاڑ کی یونیفارم تھی اور میں مکمل طور پر سہیل کے میک اپ میں تھا لہذا وجدان کی حیثیت سے مجھے پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ ہتھول بردار ہاس نے مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اپنی کن کو ایک مرتبہ پھر زحمت دی لیکن اب میں اس کی ایک دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہمارے درمیان یہ مشکل تین فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا جیسے ہی اس کا ہتھول والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا میں نے ایک لیفٹ کرینٹ لک اس کے تھوڑے پر جڑی۔

میری تیز رفتار لک "شائیں" کی آواز پیدا کرتے ہوئے چہرے پر مہلک بوسہ جیت کرنے سے پہلے اس کے

کندھے سے نکل کرئی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دبے پستول نے گولی اگلی لیکن ٹھوکر کھانے کے بعد اس کا زاویہ بدل گیا اور۔ میرا ایک بال بھی بائیں ہاتھ کے بغیر مشرقی دیوار میں جاگیا۔ پھر مشر نے پاس نما شخص کو سنبھالنے کا موقع نہ دیا۔

وہ کرینٹ لک کھا کر کھڑا تے قدموں سے چوڑے پیچھے چلا گیا تھا۔ میں نے ایک طویل اسٹیپ سے اس کی پسلیوں میں سائڈ لک دکادی۔ وہ ایک دھماکے کی آواز بچھ کرتے ہوئے اخبارات کے بٹزل سے نکل گیا۔ اگرچہ اسے کچھ مہلک چوٹ نہیں لگی تھی تاہم وہ پیش کے عالم میں گالیاں پٹے لگا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک دو بٹزل اس کے اوپر آن کرے تھے۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں غیر معمولی سرگرمی محسوس ہوئی، میں ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔ اس دوران میں نادر اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور بڑے خطرناک انداز میں کلاشکوف کے برست میں مجھے نہلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا ارادہ عملی مراحل سے نہ گزر سکا اور وہ کراس کی کرب ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

شہزاد اخبارات کے بٹزل کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کی کلاشکوف سے نکلنے والی گولیوں نے نادر کی زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کسی گردن کے جانور کی طرح فرخ پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے قتل سے بڑی وحشت ناک کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اندازہ لگالیا، شہزاد کی فائرنگ نے اسے زخموں سے چور کر دیا تھا۔ اس کے زخم شدید نوعیت کے تھے..... بہت ہی شدید!

شہزاد کی موداری نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا تھا، وہ فیصل کو "سنبھالے" گا۔ مجھے اپنی جانب الجھن زدہ نظر سے دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ جہاں بے خبری میں ہے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے اپنی گردن کو سنبھلایا۔ یہ ایک مخصوص اشارہ تھا۔

میں فوراً سے پیش تر سمجھ گیا، اس نے فیصل کے ساتھ کیا کیا ہوگا۔ یہ میرا پسندیدہ حربہ تھا جو میں اپنے دشمنوں کو دیا دانیما سے بے خبر کرنے کے لیے آزما تا تھا۔ میری آنکھوں میں تائیدی تاثرات کی جھلک دیکھ کر شہزاد اچھل کر باہر آ گیا۔ اس اثنا میں ہاس سنبھل چکا تھا اور متحسّس نگاہ سے نادر کے چھلنی وجود کو نک رہا تھا جس کی تڑپ اور پھڑک میں۔

بزدل کی آہ تھی۔ شاید وہ شہزاد ہونے جا رہا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا۔

"میرے معاشوں کے اس باپ لم ڈھینگ کو سنبھالو۔ میں دوسروں کی خبر لے کر آتا ہوں۔" تم ڈھینگ میں نے اسے دروازہ قائم کے حوالے سے کہا تھا۔

بات ختم کرتے ہی میں کلاشکوف کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے انداز کے مطابق پانچ چھ حملہ آور ابھی باقی تھے جو اپنے پاس کے حکم پر ہمیں کھوجنے میں مصروف تھے۔ ان پر قابو پانا بہت ضروری تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے میں کسی قسم کی آنکھ پھولی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان چیخوں سے سننے کے بعد مجھے ساحل کی طرف جانا تھا۔ ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان کو بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور میں تو اس وقت سچ سمندر میں کھڑا تھا!

میں جیسے ہی کمرے سے نکل کر راہ داری میں آیا دو حملہ آوروں سے ٹکرا بیٹھ ہو گیا۔ وہ اچانک ہی سامنے آ گئے تھے اور ان کے انداز سے گواہی ملتی تھی کہ ہمارے کمرے میں ہونے والی فائرنگ نے انہیں اس طرف متوجہ کیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑنے ہی وہ چونک اٹھے۔ مجھے سیکورٹی گاڑ دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی نگوں کارخ میری جانب پھیر لیا۔ ایک کے ہاتھ میں کے کے اور دوسرے کے ہاتھ میں مکمل تھا۔ وہ مجھے مارنا نہیں بلکہ ڈی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میرے قدموں میں فائرنگ کرنے کے لیے اپنے نگوں کے ٹریمرز دبا دیے۔ میں ان کی ابدانی جنبشوں سے ان کا ارادہ بھانپ چکا تھا لہذا ایک جھٹکے میں میں نے اپنے جسم کو ہوا میں اٹھایا اور فرنٹ سر سائٹ کرتے ہوئے ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا۔

فائرنگ کی آواز گونجی مگر میں محفوظ رہا۔ ان کا نشانہ خطا گیا۔ فطری رد عمل کے طور پر انہوں نے بیک وقت اوپر کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نگوں کا زاویہ بھی عمودی ہو گیا لیکن اس کے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے یا مجھے پر فائرنگ کرتے ان پر قیامت منتری ٹوٹ پڑی۔ سر سائٹ کی ٹیکل پر میں ہوا مٹا رہے ہوئے ان کے وسط میں پہنچ چکا تھا پھر زمین پر آنے سے پہلے ہی میں نے ڈبل سائڈ فلائنگ لک چلا دی۔

میرے پوٹوں کی وزنی ٹھوکروں نے ان کی کھوپڑیوں پر دھک دی اور وہ دو مخالف سمتوں میں لڑھک گئے۔ ان کے ہاتھوں سے سچوٹ کر دور جا گریں پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے، مجھے ایک اور مشکل سے دو چار ہونا پڑا۔ مزید بین افراد دھانچے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریو لو اور

دوسرے کے ہاتھ میں کلاش تھی۔ تیسرا نہ تھا۔

انہوں نے حیرت بھری نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا پھر مجھ پر بے دریغ فائرنگ کرنے لگے۔ میں ان نازک لمحات میں انہیں آسانیاں فراہم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ان کے ٹریمرز دبنے سے پہلے ہی میں نے خود کو باؤنگ ہال بنالیا۔ فرنٹ سر سائٹ، بیک سر سائٹ، سائڈ سر سائٹ اور بیک فلک کی آمیزش سے میں راہ داری میں اچھلتا پھرتا تھا۔ ان کی نگوں گولیاں اگل رہی تھیں لیکن ان کا نشانہ دیواریں اور چھت بن رہے تھے۔ چند سینڈ میں ان کے ہتھیار خالی ہو گئے۔ اس بے سمت فائرنگ کے نتیجے میں ان کے دوسرا بھی لقمہ اجل بن گئے۔ یہ دو افراد ہی تھے جو ان سے پہلے راہ داری میں داخل ہوئے تھے۔ مکمل شکست کی صورت حالات کو دیکھ کر وہ تینوں اگلے قدموں فرار ہونے لگے۔

میں نے کلاشکوف کو سیدھا کیا اور ان کے دوڑتے ہوئے قدموں میں ایک شارٹ برست مارا۔ تیز چیخوں کی آواز کے ساتھ ان میں سے دوم کے قتل پختہ فرخ پر گرے۔ تیسرا راہ داری سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی نہ تھا تھا جو تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ میں شامل نہیں تھا۔ میں لپک کر آگے آیا اور فرخ پر بڑے زخموں کا سرسری جائزہ لیا۔ ان کے پاؤں اور ہڈیاں بری طرح گھائل تھے۔ وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کی خالی نگوں بھی خطرناک نہیں رہی تھیں۔ لہذا میں ان کے اوپر سے پھلانگ کر اس جانب زور گیا جدرہ ان کا نہ تھا۔ سامنے فرار ہوا تھا۔

وہ راہ داری میں مختلف کمروں کو آپس میں ملاتی تھی جن میں دو کمرے اخبارات کے بٹزل والے تھے۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ ان دونوں کمروں میں کہیں دستبند نہ ہوا۔ اس مفروضے کو جنگ کے اندر گھیرنا ضروری تھا۔ اگر وہ یہاں سے نکل جاتا تو صورت حال ہمارے لیے زیادہ سنگین ہو جاتی۔ میرے اندازے کے مطابق حملہ آوروں میں وہ آخری آدمی تھا جو اس وقت ہمارے قابو میں نہیں تھا۔ باہر پہنچ کر وہ مزید لک لاسکتا تھا جس کے نتیجے میں ہماری دشواریوں میں لامحدود اضافہ ہو جاتا۔

میں نے مفروضہ حملہ آور کو چاروں طرف دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں اضطرابی قدموں سے چلتے ہوئے جنگ کے مین گیٹ کی طرف آ گیا۔ وہ گیٹ نیم وا تھا۔ میں سمجھ گیا، جب میں اور شہزاد اس دور افتادہ کمرے میں فیصل کے ساتھ "انکھیلیوں" میں مصروف تھے حملہ آوروں



میں سے کسی نے دیوار پھلانگ کر اس گیت کو کھولا تھا پھر باقی مسخ افراد بھی اندر آ گئے تھے۔

اچانک بنگلے کے عقب میں مجھے کسی موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک اٹھا اور برق رفتاری سے خود بہ خود میرے قدم گیت کی جانب اٹھ گئے۔ میں گیت کھول کر باہر نکل آیا اور بنگلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹر سائیکل سواری میری فائرنگ ریش سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کا تعاقب کیے بغیر میں اسے پکڑ نہیں سکتا تھا اور ظاہر ہے میں اس پوزیشن میں نہیں تھا۔ دیے میں نے موٹر سائیکل پر فرار ہونے والے کو پکڑنا لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی تلاش میں میں بنگلے سے نکل کر گیت کی طرف آیا تھا۔ شکار ہاتھ سے نکل جانے کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔

میں تشویش ناک انداز میں بنگلے کے عقب کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مجھے دو گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان میں ایک ہیوی انجن والی موٹر سائیکل ”جی ٹی او“ تھی جب کہ دوسری ایک بڑی جیب تھی۔ ریش روور نامی اس جیب میں خاصے آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ نامعلوم حملہ آور انہی گاڑیوں میں سوار ہو کر ہمارے بنگلے کی طرف آئے تھے۔ نامعلوم کو معلوم بنانے کے لیے میں دوبارہ بنگلے کے اندر آ گیا۔ آتے ہوئے میں گیت کی کنڈی لگاتا نہیں بھولا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد میں اسی راہ داری میں پہنچ گیا جہاں میں دو زخمیوں کو چھوڑ کر گیا تھا مگر اب مجھے وہاں ایک ہی نظر آیا۔ میری نگاہ راہ داری کے دوسرے سرے تک رینگ گئی۔ وہاں مجھے کچھ گڑبڑ نظر آئی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دوسرا زخمی خود کو فرش پر پھینٹے ہوئے ادھر جا نکلتا تھا اور اس کی یہ کوشش خالی از مقصد نہیں تھی۔ وہاں دو افراد مردہ حالت میں پڑے تھے جو انہی لوگوں کی بے دریغ فائرنگ کا نشانہ بنے تھے۔ مذکورہ زخمی مرنے والے ایک شخص کی گمن تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا میں دوڑ کر اس کے سر پر جا پہنچا۔ اسے اس مکاری کی سزا ملنا چاہئے تھی۔

رینگتے ہوئے گھما لٹ شخص نے کلاشکوف پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ میں نے اس کی کلائی پر بوٹ کی زوردار ضرب رسید کی۔ وہ تکلیف کی شدت سے جا بولا اٹھا۔ گن کا خیال دل سے نکال کر وہ فرش پر تڑپنے لگا۔ میرے بوٹ کی ضرب نے اس کی کلائی کا پچھر نکال دیا تھا۔

میں نے زہر خند لہجے میں کہا ”گلتا ہے زندگی تمہیں اس نہیں آئی۔ تمہیں بھی تمہارے مرحوم ساتھیوں کے پاس ہی پہنچنا پڑے گا۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے چہرے

کو نشانہ بنایا اور ایک دھواں دھار ٹھوکر رسید کر دی۔ یہ ضرب پہلے والی ضرب سے زیادہ خوفناک تھی۔

راہ داری اس کی وحشت ناک چیخوں سے گونج اٹھی۔ اسی لمحے شہزادہ کمرے سے نکل آیا۔ کلاشکوف ہنوز اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا ”اندروں کی کیا صورت حال ہے؟“

”تسلی بخش ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا ”میں نے اس کے لم ڈھینگ باس کو بھی لبا لبا دیا ہے لیکن لگتا ہے.....“ اس نے راہ داری کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب نگاہ دوڑائی اور بولا ”تمہارے میں سے زیادہ کام آیا ہے۔“ میں نے گھیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”یہ کام اس کارکردگی کو ماننے کا وقت نہیں۔ ان نامعلوم نامرادوں کا ایک ساتھی بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں فوراً نکلتا ہوگا۔“ ایک لمحے توقف دے کر میں نے پوچھا ”فیصل کا کیا حال ہے؟“

”وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔“ اس نے بتایا۔

میں نے گہری تشویش سے کہا ”اس کی بے ہوشی کو طویل نہیں کھینچنا چاہئے۔ اس کی ڈیوڑھی میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔“

”گلتا ہے“ میں نے کچھ زیادہ ہی دباؤ ڈال دیا۔

”شہزادے کہا۔“

”یہ غلطی سنگین صورت بھی اختیار کر سکتی ہے!“ میں نے ہونٹ سکپڑے۔

”اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا!“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے عقب میں کھڑا گاڑیوں کے بارے میں بتایا پھر کہا ”تم فوراً باہر جا کر اس جیب کی حمل تلاشی لو۔ مجھے امید ہے ریش روور میں سے کچھ کچھ ایسا ضرور ہاتھ آجائے گا جس سے حملہ آوروں کی شناخت میں مدد مل سکے۔ یہ فیصل کو آزاد کرانے یہاں آئے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے یا تو یہ چوہدری نواز شعلی کے آدی ہیں یا پھر شعیب غوری کے۔ کسی تیسری سمت ذہن دوڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ سرکوبانہی جنٹل دیتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے سب سے پہلے فیصل کا جائزہ لیا۔ وہ اخبارات کے بٹل کے عقب میں بے سدھ پڑا تھا۔ شہزادے صورت

حال کا تقاضا نبھایا تھا لیکن فیصل کی بے ہوشی اگر طویل

ہو جاتی تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ فیصل کے علاوہ

اس کمرے میں دو افراد اور موجود تھے جن میں سے نادر زندگی

بارگیا تھا جب کہ ان سب کا باس وہ دروازہ قامت شخص عالم غفلت میں پڑا تھا۔ راہ داری کی صورت حالات مکمل طور پر تیار سے حق میں تھی۔ وہاں دو افراد کی لاشیں اور دو زندہ شدید زخمی پڑے تھے۔ اس لحاظ سے صبح کے میں دشمن کے تین افراد کام لے گئے۔ اور ایک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شہزاد واپس آ گیا۔ اس نے آکر مجھے بتایا کہ رنچ روہ میں سے کام کی کوئی شے نہیں مل سکی۔ گاڑی کے کاغذات وہ اٹھا لیا تھا۔ رنچ روہ کسی یوسف ہمدانی کے نام سے جڑو تھی۔ چنانچہ تاظم آباد کا تھا۔ میں نے ان کاغذات پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد شہزاد سے کہا۔

”تم ان دونوں زخمیوں کو پابند بنانے کے لیے اپنی زنجیر تھکڑی اور پیر کی استعمال میں لاؤ۔ اس کے بعد فیصل اور ”باس“ پر گہری نظر رکھو۔ میں منہاس صاحب کو فون کرنے جا رہا ہوں۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مزید کہا ”باس سمیت ان شیطان زادوں کی جاہ بگلاشی بھی لے لینا۔“ اس نے ایک مرتبہ پچھر سر کو تباہی جہش دی اور میری خواہش کی تکمیل کے لیے چل پڑا۔

پچھر میں بھی فون والے کمرے میں آ گیا۔ منہاس باقر نے مجھے بتایا تھا ”وہ حیدر آباد جانے کے لیے ساڑھے چھ سے بلے نہیں نکلیں گے۔ اس وقت شام کے پانچ چالیس ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہی تھا“ وہ ابھی گھر پر ہی ہوگا۔ کوئی بھی بڑا ہی قدم اٹھانے سے پہلے اسے مطلع کرنا ضروری تھا۔

فون منہاس باقر ہی نے ریسیو کیا۔ میرے ”ہیلو“ میں پانی جانے والی گیسر تانے اسے پوچھنے پر مجبور کر دیا ”خیریت تو ہے وجدان؟“

”مجھیں خیریت نہیں ہے!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ ایک دم بے حد مستعد ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی مناسب الفاظ میں اسے پیش آمدہ صورت حال سے آگاہ کیا اور تھوڑا بھرے لہجے میں کہا ”میں فوری طور پر اس بنگلے کو خیر باد کہنا دوگا!“

”یہ تو ہے!“ وہ دونوں لہجے میں بولا ”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

میں نے کہا ”آپ بتائیں۔ میں طارق روڈ والے قلیٹ پر نہیں جا سکتا۔ وہ ٹار شہید پارک سے خاصے فاصلے پر ہے اور فیصل کی ڈیلیوری کا قضا ہے کہ ہم یہیں آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”میرا بھلا مذکورہ پارک

سے زیادہ دور نہیں لیکن ان حالات میں ادھر کا رخ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہمیں کسی غیر معروف یا نئی جگہ پر پناہ لینا ہوگی۔“

”میں فیصل کے ساتھ حملہ آوروں کے ممکنہ پاس کو بھی اس بنگلے سے نکل لے جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا ہوش میں آنے کے بعد وہ شخص مفید معلومات اہل کرتا ہے۔

”تمہارا آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اگر میری مان تو اس ”باس“ پر اُٹتی ہے۔“ منہاس نے فیصل کو لہجے میں کہا ”میں جانتے ہیں وہ لوگ یا تو چوہدری نواز شے سے خوش رست ہیں یا پھر یہ وہ نواز تنظیم سی ایف کے کے پیچھے ہوئے ہیں اس لیے باس پر دقت خالص کرنے کی ضرورت نہیں تو لوگ تھیل کو لے کر فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔“

”لیکن جائیں کہاں؟“ میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

”تم شہزاد کو فون پر بلاؤ۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”کوئی مل نکالتا ہوں میں اس مسئلے کا بھی کچھ تو کرنا پڑے گا نا!“

میں نے کہا ”حملہ آوروں کا مسئلہ حل طلب ہے۔ آپ کے اس بنگلے میں تین لاشیں اور دو شدید زخمی پڑے ہیں۔ اگر ہم ان لوگوں کو یونہی چھوڑ کر چلے گئے تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔“

”ان کا بھی کچھ کرتے ہیں۔“ وہ متنی خیز لہجے میں بولا۔

”شہزاد سے میری بات کرادو۔“

میں نے منہاس کو بولڈ کر کے کہنا اور شہزاد کو بلانے چلا گیا۔ اس دوران میں وہ دونوں زخمیوں کو اپنی ہڈیوں کے ذریعے بے دست دیا کر چکا تھا۔ وہ پہلے ہی بری طرح زخمی تھے۔ ان سے مزید کسی شیطانی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ شہزاد کو فون کی طرف بھیجے کے بعد میں اپنے اصل شمار کی طرف بڑھ گیا۔ چوہدری نواز شے علی کے فرزند یا جند کی طرف!

فیصل ہنوز بے ہوش تھا۔ میں نے اسے مختلف زاویوں سے ٹٹول کر اس بات کا اندازہ لگایا کہ وہ آئندہ ایک گھنٹے میں کسی بھی وقت عالم ہوش و حواس میں داخل ہو جائے گا۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ سات بجے تک اسے نارمل ہو جانا چاہئے تھا۔

فیصل کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے مینہ باس کا جائزہ لیا۔ اس کی بے ہوشی اور زخم ہوئے ”سلی ٹین“ تھے۔ شہزاد نے اپنا سارا غم و غصہ اسی دروازہ قامت پر خارج کیا

تھا۔ آئندہ پانچ گھنٹوں تک اس کی ”بیداری“ کا امکان نہیں تھا۔

میں ہر طرف سے اطمینان پانے کے بعد ٹیلی فون والے کمرے میں آ گیا۔ اس دوران میں شہزاد منہاس سے ضروری بات حاصل کر چکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے ریسیور ہری طرف بڑھا دیا۔ مطلب یہی تھا ”اب میں بات کروں۔“

میں نے ریسیور کان سے لگایا۔

”منہاس کی بھاری بھر کم آواز میری ”ہاں وجدان!“ منہاس کی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے فوری نوعیت کے مسائل کا حل نکال لیا ہے۔ شہزاد تم سے تفصیل بات کرے گا۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اور جب تم اپنی ساحل کو حاصل کر لو تو مطمئن ہونے کے بعد میرے بنگلے پر ہی آنا جیسا کہ پہلے ہم طے کر چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب رات گئے ہم لوگ حیدر آباد سے واپس لوٹیں گے تو تم اپنی ساحل کے ساتھ ہمارا استقبال کر دے گے۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے!“ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

”وش یو ٹو لگ!“ اس نے غلوں دل سے کہا۔

ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے شہزاد کو دیکھا ”ہاں بھی! منہاس صاحب نے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بولا ”میں فوری طور پر اس بنگلے سے نکلتا ہے۔ ہم فیصل کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ باقی سب کو یہیں چھوڑ دینگے۔“

”لیکن جائیں گے کہاں؟“

”تفصیل میں تمہیں یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا۔“

شہزاد کو جو بھی اسکیم بتائی ہوگی، وہ میرے فائدے کے لیے ہی ہوگی۔ اب تک منہاس نے ایک مخلص اور پُر خلوص بزرگ کا رول ادا کیا تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر اسی دین میں آ بیٹھا جس میں فیصل کو اس بنگلے تک پہنچایا گیا تھا۔ وہ دین ایک چھوٹے ٹرک سے مشابہ تھی جو بار برداری کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ نیلے رنگ کی اس دین کے سامنے والے حصے پر سرخ رنگ سے بڑا ہوا ”پریس“ لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اس دین کے عقبی بندھے پر فیصل والے صندوق کو تار سے یہاں تک پہنچایا تھا۔ میں سکیورٹی گاڑڈ سکیل کی یونیفارم اور چلیے میں تھا۔ شہزاد کی بہ نسبت میرا ڈرائیونگ کرنا زیادہ محفوظ ہوتا۔ شاید اسی خیال کے پیش نظر شہزاد نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا مشورہ دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شہزاد فیصل کو لے کر بنگلے کے بیرونی حصے میں آ گیا۔ فیصل کو اس نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ میں اس کی مدد کے لیے دین سے باہر آ گیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا شہزاد نے فیصل کی کلائیوں کو دوبارہ الٹی تھکڑی میں جکڑ دیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر مٹھی چوہدری زادے کو دین کے بندھے میں منتقل کیا اور دروازے کو بند کر کے لاک کر دیا۔ چند لمحات کے بعد ہماری دین بنگلے سے نکل کر مصروف سڑک پر آ گئی۔

شہزاد نے بھلا چھوڑتے وقت مین گیٹ کو پوری طرح کھول دیا تھا۔ میں نے اپنی رست داغ پر نگاہ ڈالی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے شہزاد سے پوچھا۔

”کس طرف جانا ہے؟“

”سیدھا منہاس صاحب کے دفتر!“

”تفصیل کیا ہے؟“ میں نے سنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

وہ بتانے لگا ”ٹار پارک کے نزدیک ہی ایک نئی اپارٹمنٹس بلڈنگ تیار ہوئی ہے۔ اس بلڈنگ میں ”ڈی ایچ اے“ کے ملازمین کو مفت رہائش دی جا رہی ہے۔ ہمارے اخبار میں ایک صاحب نوٹو گرافر ہیں۔ ان کی اہلیہ کی کالج میں پچھڑ ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک فلیٹ انہیں بھی الاٹ ہوا ہے۔ ان لوگوں نے ابھی وہاں شفٹ نہیں کیا۔ ویسے بھی بلڈنگ میں ابھی تک آدھ فلیٹ ہی آباد ہوئے ہیں۔ مذکورہ نوٹو گرافر کا نام طارق دیم ہے۔ جوان دنوں اپنی ٹیلی کے ساتھ شہلی علاقہ جات کی سیر کو گیا ہوا ہے۔ منہاس صاحب

نے مجھے بتایا ہے ان کے فلیٹ کی چابیاں ادھر دفتر میں رکھی ہیں۔ ہم وہاں اسی قفسہ سے جا رہے ہیں۔ یہ اپارٹمنٹس بلڈنگ ایک طرح سے ابھی غیر آبادی ہے لہذا ہماری طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔ ویسے بھی ہمیں یہ مشکل ایک سمجھنے کے لیے کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش ہے۔ اس فلیٹ سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

میں نے پوچھا "اور اس بجٹ کا کیا ہوگا جسے ہم جوں کا توں چھوڑ آئے ہیں؟"

"منہاس صاحب بہت دور اندیش اور سمجھدار آدمی ہیں۔" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا "انہوں نے بجٹ کا مسئلہ بڑے منطقی انداز میں حل کر دیا ہے۔"

"وہ منطقی حل مجھے بھی تو بتاؤ۔" میری آواز میں تشویش تھی۔

اس نے بتایا "انہوں نے کہا ہے وہ ہمارے بجٹ کے نکلنے کے ٹھیک چندرہ منٹ بعد متعلقہ خانے میں فون کر کے اطلاع دیں گے کہ ان کے نامکمل بند بجٹ میں چند شریپنڈ دہشت گرد ہس آئے ہیں اور پتا نہیں وہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں لہذا پولیس کو چاہئے کہ وہ موقع پر پہنچ کر تفتیش کرے اور جرائم پیشہ افراد کو حراست میں لے کر ان کے ساتھ قرار واتی انصاف کرے۔"

شہزاد سانس لینے کے لیے چند ساعت کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "پولیس والوں کے لیے منہاس صاحب کوئی انجینی نہیں ہیں اس لیے فوری کارروائی کی توقع کی جاتی ہے۔ منہاس صاحب نے اپنے جزل بیجر مختیار کامل کو خصوصی ہدایت دی ہیں کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ پولیس والوں سے نہیں۔ پولیس والوں کو بھی مختیار صاحب کے بارے میں بتایا جائے گا۔ میں نے بجٹ سے باہر آتے وقت دونوں زنجیوں کو بندشوں سے آزاد کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا پاس مطلق ہے ہوش پڑا ہے۔ مردے تو کچھ بول نہیں سکتے البتہ پولیس زنجیوں کی زبان کھلوانے کے لیے اپنا پورا زور مارے گی اور تم جانتے ہو وہ یہ تو نہیں کہیں گے کہ انہوں نے کسی فیصل کی تلاش میں اس بجٹ پر چڑھائی کی تھی۔ منہاس صاحب نے پولیس کو بتاتا ہے کہ وہ بنگلہ بند تھا۔ اس صورت حال میں حملہ آوروں کو کوئی جواب نہیں بن پائے گا۔ وہاں کا نقشہ دیکھ کر پولیس پر واضح ہو جائے گا کہ دو مخالف پارٹیوں میں کوئی زبردست معرکہ ہوا ہے۔ پھر بجٹ کے عقب میں حملہ آوروں کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ریخ دور اور "جی ٹی او" دن نوفا نیوان لوگوں کے لیے بہت مشکلات پیدا کر دیں گی۔

اوپر سے منہاس صاحب اپنے تعلقات کا بھی استعمال کریں گے۔ مختیار صاحب بڑے تیز آدمی ہیں۔ نامعلوم حملہ آوروں کو مصیبت پڑ جائے گی۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے پولیس کی آمد سے پہلے ان میں سے کوئی بجٹ سے نکلنے کی کوشش کرے۔" میں نے بندوین کو کلنی سڑک پر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ایسی صورت میں وہ لوگ اور زیادہ مشکل میں پھنس جائیں گے۔" شہزاد نے خیال آرائی کی "اس نوعیت کی کوشش ان دو زنجیوں میں سے کوئی کر سکتا ہے۔ وہ بالفرض بجٹ سے باہر ابھی جاتے ہیں تو موٹر سائیکل یا بیج ڈرائیو کرنا ان کے بس کا کھیل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایسی کسی سٹی کے دوران ہی میں پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا "اور اگر وہ مفرور کسی قسم کی بیرونی مدد لے کر واپس لوٹتا ہے تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہوگی۔ پولیس کو ان لوگوں کے خلاف ایک مضبوط کیس بنانے میں آسانی ہو جائے گی۔ پولیس ان بد معاشرے کے مقابلے میں منہاس صاحب کی بات کو زیادہ معتبر جانے گی کیوں کہ واردات ان کے بند بجٹ میں ہوئی ہے۔ وہ لوگ کسی فیصل یا وجدان کا تذکرہ اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔ ایسی صورت میں نہ صرف پولیس بلکہ ان کے بڑے بھی ان کے دھن ہو جائیں گے۔ لہذا ہم ہر حوالے سے سیف سائیڈ پر ہیں۔"

شہزاد کی باتوں میں بہت وزن تھا اور منہاس صاحب نے بھی ایک بھر پور حکمت عملی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن میرا دل جانے کیوں مطمئن نہیں تھا۔ میں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے تیزی سے سوچنے لگا۔ ساحل اور فیصل والا معاملہ اتنا نازک ہو چکا تھا کہ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میرے اور چوہدری نواز کے حساس گوشوں کے تبادلے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا اس قلیل مدت کے لیے میں کسی اور پناہ گاہ میں جا بیٹھوں!

مجھے سوچ میں ڈوبا اور خاموش دیکھ کر شہزاد نے پوچھا "وجدان! تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "شہزاد! میں منہاس صاحب کے منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

وہ ویسے بھی ہمیں طے شدہ وقت سے تھوڑا پہلے ہی پارک کے اندر ہونا چاہئے لہذا طارق دسم کے فلیٹ کو ہم بھول جاؤ لیکن ہم منہاس صاحب کے دفتر ضرور جائیں گے۔"

"جب اس فلیٹ کو استعمال نہیں کرنا تو پھر وہاں جانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟" اس کی انجمن میں اضافہ ہو گیا۔ "دفتر تو ہم فلیٹ کی چابی لینے ہی جا رہے تھے!" میں نے پوسچ انداز میں کہا "اب ہم وہاں گاڑی بدلنے جائیں گے۔"

"گاڑی بدلنے! میں سمجھا نہیں؟"

میں نے کہا "یہ مت بھولو کہ حملہ آوروں میں سے ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ اس بات کا چشم دید گواہ ہے کہ ہمارے بجٹ پر ایک لائٹ گرین ہونڈا سوک اور ایک یہ پکلی وین کھڑی تھی۔ اس نے واپس اپنے کمپ میں پہنچ کر ان گاڑیوں کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا لہذا وہین میں سفر ہمارے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے!"

"اوہ! اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔" شہزاد نے توجہ میں بھرے لہجے میں کہا "ہمیں پہلی فرصت میں اس نئی وین سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔"

"اور اس سے پہلے فیصل کوشش میں لانا ضروری ہے۔" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "اسے حواس میں آ جانا چاہئے تاکہ تبادلے کے وقت وہ داخل نظر آئے۔ ہم منہاس صاحب کے دفتر سے گاڑی تبدیل کریں گے اور واپس مذکورہ پارک کی طرف چل پڑیں گے۔ کیا فوری طور پر ہمیں وہاں سے کوئی گاڑی مل جائے گی؟"

"بھئیال جائے گی۔" وہ پُر دھڑکی لہجے میں بولا "اور کوئی نہ بھی دست یاب ہوئی تو دفتر کی ہائی روف ضرور موجود ہوگی۔ ہم اس گاڑی میں پہلے ہی ایک مشن سر کر چکے ہیں۔"

"تم گرین ہائی روف کی بات کر رہے ہو!"

بھر میں سے سڑک کے کنارے ایک محفوظ مقام پر وین روک دی۔ شہزاد نے میری ہدایت پر عمل کیا اور میڈیکل اسٹور سے حمرل وافر کی دو بوتلیں خرید لیا۔ میں نے وین کو اس زاویے سے روکھا تھا کہ شہزاد کے عقبی حصے میں سوار ہونے کی طرف کسی کی نگاہ نہ جاتی۔ جب شہزاد نے وین کے اندر پہنچنے کے بعد عقبی دروازہ بند کر دیا تو میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ آئندہ چندرہ میں منٹ میں ہم نے گاڑیوں کی تبدیلی والا مرحلہ طے کر لیا۔

☆☆☆

ٹار شہید پارک ایک پُر فضا تفریحی مقام ہے۔ شام کے وقت وہاں خوش حال اور صحت افزا چروں کی بہتات دیکھنے میں آتی ہے۔ دو فنی افراد حسین اور دل کش صورتوں کے نظارے سے تسکین پاتے ہیں۔ متلاشی طبع لوگوں کے لیے وہاں بہت کچھ ہے۔ اسی پارک کے ایک کونے میں بچوں کی تفریح طبع کے لیے ایک صاف سقرا "سند باد" بھی موجود ہے جہاں کاسکیورٹی نظام تسلی بخش ہے۔ پارک میں داخلے کے وقت بھی گاڑی باقاعدہ تلاشی لیتے ہیں۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ گرین ہائی روف تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ شہزاد ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ فیصل ہم دونوں کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ اس کی کھانیاں تھک کر کی گرتی تھیں۔ آزاد نہیں کی تھیں۔ یہ ٹیک کام اس وقت سرانجام دیا جاتا جب گاڑی سے نکال کر اسے پارک میں لے جایا جاتا۔ تھک کر کی جالی میری جب میں محفوظ تھی۔ جب سے میں نے اسے بتایا تھا "ہم اسے چوہدری نواز کے بندوں کے سپرد کرنے جا رہے ہیں وہ خاصا شائن ہو گیا تھا۔ ویسے بھی ہم نے اس کے ساتھ کوئی مس بی نہیں کیا تھا اس لیے وہ ہماری بات پر یقین کرنے کے لیے مجھ پر تھا۔ البتہ ساحل کے حوالے سے میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اس خیال سے مطمئن تھا کہ ہم اس کی جان چھوڑنے والے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم اس کی طرف سے بے اعتدال نہیں تھے۔ وہ کسی وقت بھی گل کھلا سکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا پردیکھت تھا جسے میں کسی بھیڑ بھاڑ کے بغیر نہایت ہی خاموشی سے پایہ تکمیل کو پہنچانے نکلا تھا۔ زیادہ پھیلاؤ سے یہ معاملہ بگڑ جاتا!

منہاس باقر کے دفتر سے روانہ ہونے سے قبل میں نے شہزاد کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ اسے پارک سے باہر گاڑی میں موجود رہنا تھا۔ جب کہ میں فیصل کو اپنے ساتھ پارک کے اندر لے جاتا۔ اس پارک میں داخلے کے

لیے کئی گیت ہیں۔ ہم نے ایک ایسے گیت کا انتخاب کیا، جدھر نہ ہونے کے برابر رش ہوتا۔ زیادہ ہجوم "سندباد" نے اے جھ میں ہوتا ہے۔ ویسے کسی بھی گیت سے داخل ہوں، جوبی کچھوے کا گنگ سا ستر تقریباً چارک کے وسط میں واقع ہے اس لیے فاصلہ کم و بیش ایک ہفتا ہے۔ میں ایک سیکورٹی گاڑ کی وردی میں تھا اس لیے سہیل کے چلیے میں میری شناخت کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

شہزاد پارک کے باہر میرا انتظار کرتا۔ اگر مغوی افراد کا تبادلہ بہ سہولت ہو جاتا تو میں آدھا گھنٹا پارک میں گزارنے کے بعد شہزاد کے پاس آ جاتا پھر ہم ساحل کے ساتھ منہاس صاحب کے بنگلے کی جانب روانہ ہو جاتے۔ کئی آپ سیٹ کی صورت میں شہزاد کو فوراً پارک کے اندر پہنچاتا تھا۔ لیکن مجھے امید تھی کہ پارک کے اندر کسی ہنگامی صورت حال کا امکان پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں کا سیکورٹی نظام قابلِ تحسین تھا۔

اسلئے کسم پورہ ہمارے پاس دو گھنٹیں تھیں جو گرہن ہائی روف ہی میں چھوڑنا تھیں یہ واپسی کے سفر میں کئی ایمر جیسی کی صورت میں ہمارے کام آئیں۔ پارک کے اندر اسلحہ لے جانے کی ممانعت تھی۔ ہم نے سہ پہر میں دو سادہ لباس سیکورٹی گاڑوں کو پارک روانہ کر دیا تھا جن میں سے عباس کے پاس ریوایور اور زمر خان کے پاس بی بی پتول تھیں لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد شہزاد کے پاس بیات خان کا فون آ گیا کہ وہ اسلحہ اندر نہیں لے جانے دیں گے۔ یہ دونوں ہتھیار لائسنس یافتہ تھے جو سیکورٹی گاڑ بیات خان نے اپنے پاس جمع کر لیے تھے تاہم پارک کے اندر اس نے ہر نوعیت کے حفاظتی تعاون کا یقین دلایا تھا اور ہماری ضرورت کے مطابق اس نے پارک کے متعلقہ حساس حصے کو اپنی نگاہ کا مرکز بنالیا تھا۔ گویا پارک کے اندر ہمیں افرادی قوت پر ہی بھروسہ کرنا تھا۔ جینا ہمیں صورت حال دوسری پارٹی کے لیے بھی ہوئی!

چھ بیٹن لیس پر میں نے پارک سے تھوڑے فاصلے پر گاڑی رکوائی۔ شہزاد نے گاڑی روکنے کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میرا یہ اقدام اس کے لیے خلاف توقع تھا۔ میں نے متنی خیز لہجے میں کہا "وہ سامنے پبلک کال آفس ہے" میں وہاں سے وجدان کو فون کروں گا۔ چوہدری نواز شریف کو اطلاع تو دے دیں کہ ہم اس کے تحت جگر کو لے کر آ گئے ہیں۔ وجدان نے مجھے ہدایت کی تھی کہ مطلوبہ مقام پر پہنچنے سے پہلے میں اسے فون کروں۔ میری کال کے بعد وجدان موضع رکھاں والی میں چوہدری نواز شریف سے رابطہ کرے گا۔ میں چونکہ سہیل کے روپ میں تھا اس لیے فیصل کے

سامنے وجدان کی حیثیت سے بات نہیں کر سکتا تھا تاہم شہزاد اپنی زودہنگی سے کل پر میری بات کی تدبیر۔ پہنچ گیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ذرا جلدی آ جانا سہیل ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"ابھی پانچ منٹ میں آیا۔" میں یہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا۔ فیصل نے نفرت آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی اس نگاہ کے دو اسباب تھے۔ نمبر ایک شہزاد نے گاڑی کے اندر رہے ہوئے فیصل کو کن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی کہ اسے الٹی تھک کڑی لگی ہوئی تھی۔ نمبر دو وہ میرے حوالے سے بہت خار کھائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ایک کیبل کھینک کر اس سے ان کے ایک اہم آدمی کا نام پتا اور پٹی فون نمبر اگوا لیا تھا۔ اپنی رہائی کے جھانے میں آ کر اس نے مجھے کسی سے ڈی ملک کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا۔ اگر اس کا بس چلنا تو وہ مجھے کیا کھا جاتا۔ ہم نے جھپٹے کچھ عرصے سے اسے بے بس بنا رکھا تھا۔ اس کی رہائی میں اب چند منٹ باقی رہ گئے تھے یہ تکلیف دہ اسیری اسے بھجلا ہٹ میں ڈال رہی تھی۔

میں نے بی بی او میں آنے کے بعد رکھاں والی کے چوہدری نواز شریف کو فون کر لیا۔ چوہدری کے لیے میرے دل میں بہت غصہ تھا۔ تھوڑی دیر پہلے منہاس باقر کے ہائل بنگلے پر جو واقعات پیش آئے تھے، میں اس کا ذمہ دار بالواسطہ یا بلاواسطہ چوہدری ہی کو سمجھتا تھا اس لیے اس کی کوشش ضروری تھی۔

چوہدری جب آن لائن ہوا تو میں نے نان اسٹاپ اے کھری کھری سنائیں پھر اس نے تازہ ترین "کرفوت" کا ذکر کیا اور کہا "چوہدری! تمہیں احساس نہیں تم سے کتنی سنگین غلطی سرزد ہوئی ہے!"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی۔" اس نے معافی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "غلط فہمی کے بچے!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہاری مٹا فٹ نہ بکواس سننے کے لیے فون نہیں کیا۔ وہ بھکارا لیکن اس بھکار میں وہ جیزی اور تندہی ناچدہ تھی جو ہمیشہ سے اس کا خاصہ رمی تھی۔ چوہدری ہونی سانس کے درمیان اس نے کہا "میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں مجھے اس واقعے کا علم نہیں۔"

"تھرمر اپنے اس جانناڑ سے سے پوچھو" میرا اشارہ شعیب غوری کی طرف تھا "اگر اس واقعے کے پیچھے تمہارا ہاتھ نہیں تو پھر وہ لوگ سی ایف کے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ ان کے سرخ نے دو تین بار فیصل کا ذکر کیا تھا۔ فیصل کا مطلب گارتھ دونوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا "میں ابھی شعیب کو فون کرتا ہوں۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے!" میں نے برقی سے کہا۔ اس نے پوچھا "میں فیصل کے بارے میں جانا چاہتا ہوں؟"

"فیصل گزشتہ آدھے گھنٹے سے پارک کے اندر موجود ہے۔" میں نے اسے چکر دیا۔ لیکن ٹھیک سات بجے اسے طے شدہ مقام پر لایا جانا گے۔ تمہیں شعیب غوری یا ہے۔ ڈی ملک سے اطلاع مل جائے گی۔"

"جی ڈی ملک!" اس نے اس انداز میں دہرایا جیسے کبلی کے نیچے تار کو پھولیا ہو "تم اس شخص کو کیسے جانتے ہو؟"

چوہدری کے اضطراب سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا کہ مذکورہ شخص اس کے لیے بہت اہم تھا۔ میں توقع بھی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے اندر میرے اور تنویش میں رکھنے کی خاطر کہا۔

"چوہدری! میں حرام زادوں کی ایک طویل فہرست ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ تم میری معلومات کو چیلنج کرنے کے بھر میں بند ہو۔"

میری بھینٹا ہٹ کو دیکھتے ہوئے بی بی او والی میری طرف متوجہ ہو گیا اور شاہنگی سے بولا "سرا کیا مسئلہ ہے؟"

"لائسنس کٹ گئی ہے۔" میں نے ہزاروں سے کہا "بات پوری نہیں ہو سکی۔"

"کوئی بات نہیں سرا! آپ دوبارہ ٹرائی کر لیں۔"

وہ میری سیکنڈ ٹرائی سے واقف نہیں تھا شاید اسی لیے یہ مشورہ دے رہا تھا۔ میں نے اکتا ہٹ آئینہ انداز میں رستہ واضح پر نگاہ ڈالی۔ سات بجے میں صرف آٹھ منٹ باقی تھے۔ اب مزید کسی ٹرائی کے لیے گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ ٹھیک سات بجے مجھے پارک کے اندر مقررہ مقام پر ہونا چاہیے تھا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے بڑے سے کال کی ادائیگی کی اور بی بی او والے کے مفید مشورے کے جواب میں صرف اتنا کہا "اسرا! آگے!"

بی بی او سے نکل کر گاڑی کی طرف آتے ہوئے میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ چوہدری کے حالیہ رویے نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ جو بھی گز رہوئی تھی، اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ وہ میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن کیوں؟

یہ سوال کسی ناگ کی طرح بھن بھیلے میری سوچ کے مختلف زاویوں کو ڈس رہا تھا اور بار بار ایک ہی جواب ابھر کر سامنے آ رہا تھا اور وہ یہ کہ چوہدری کی نیت میں کوئی طور پیدا ہو گیا تھا۔ کیا توڑ؟ یہ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ از خود یہ سیور کر لیں کر دیا گیا تھا۔ میرے ذہن نے مجھ سے پوچھا "اگر چوہدری غلاف معمول جا رہا ہے تو کیا مجھے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنا چاہیے؟ اس خطرناک سوال کا جواب بھی تھا۔ نہیں!"

میں اسی ادبیز بین میں گاڑی کے نزدیک آ گیا اور پھر گاڑی کے اندر بیٹھنے سے قبل میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے فیصل کے برابر والی سیٹ سنبھال کر دروازہ بند کیا تو شہزاد نے مستعزبانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا پروگرام ہے سہیل! آگے بڑھیں یا۔۔۔؟"

وہ میرے چہرے سے سویرا الجھن تک پہنچ گیا تھا اسی لیے اس نے سوالیہ انداز میں اپنا ہلہ اور چھوڑ دیا تھا۔

شہزاد نے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا "مثلاً کیسی تہذیب؟"

میں نے معنی خیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "تازہ ترین ہدایات کے مطابق، فیصل کو پارک کے اندر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تہوارے پاس گاڑی میں رہے گا اور مجھے امید ہے، شرافت سے رہے گا۔" میں نے لہجہ بھر کر کرفیصل کی طرف دیکھا پھر شہزاد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی "میں اکیلا پارک کے اندر جاؤں گا پھر جب چاہدہری نوازش کے بندے ملے شدہ مقام پر پہنچ جائیں گے تو میں ان سے معاملات طے کروں گا۔ اس کے بعد میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آؤں گا اور فیصل کو چھڑی سے آزاد کرنے کے بعد ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وجدان نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ میں اپنی تسلی کئے بغیر ان لوگوں کو فیصل کے پاس نہ لے کر آؤں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ وجدان بہت ہی میزبان آدمی ہے۔ وہ جب تک اپنے مطالبے کی مکمل شکل کو آنکھوں سے نہیں دیکھ لے گا، اس کی تسلی نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے، وہ چوہدری پر پوری طرح بھروسہ نہیں کر رہا!"

"وجدان نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ چوہدری ہاتھ پاؤں جوڑ کر اس کا مطالبہ مانے کو تیار ہے۔" میں نے کہا "فیصل کو وہ زندگی کے ہر مسئلے پر فوقیت دے رہا ہے لہذا کسی بدعمر کی کا اندیشہ نہیں۔ ادھر چوہدری کے بندوں نے ساحل کو وجدان کے حوالے کیا، ادھر ہم فیصل کو ان کی تحویل میں دے دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا!"

شہزاد نے کہا "سہیل! تم بے فکر ہو کر جاؤ، میں فیصل کو سنبھال لوں گا۔ دیے یہ خاصا سمجھ دار بندہ ہے۔ خوش اسلوبی سے منشی ہوئے اس معاملے کے اختتام پر یہ کوئی گند نہیں کرے گا اور اگر..... اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں اسے بچھڑانے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔" بات کے اختتام پر شہزاد کا لہجہ خاصا سنگین ہو گیا۔

میں نے ضمیر سے ہوئے لیجے میں کہا "ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئے گی۔" پھر میں نے خاص طور پر فیصل کو سنانے کی غرض سے کہا "پارک کے اندر اور باہر چاروں طرف ہمارے مسلح آدمی پھیلے ہوئے ہیں جو کسی بھی ہنگامی صورت حال میں بے دریغ فائرنگ شروع کر سکتے ہیں، بس ہمارے ایک اشارے کی ضرورت ہے۔ فیصل خاصا عقل مند نظر آتا

ہے۔ موت کے منہ میں جانے والی کوئی حماقت نہیں کرے گا۔"

ہم مذکورہ پارک پہنچ گئے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی رستہ واضح پر نگاہ ڈالی۔ سات بجتے میں صرف بائیس منٹ باقی تھے۔ شہزاد نے ایک گیٹ کے قریب گاڑی روک دی۔ اس گیٹ کے بارے میں ہم پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ اس طرف زیادہ رش نہیں تھا۔ شہزاد نے سڑک پر گاڑی اس انداز میں گھڑی کی کہ کسی اچانک صورت حال کے پیش نظر ہمیں وہاں سے نکلنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں نے فیصل کو راہ مستقیم پر رکھنے کی خاطر دوا اسکرین کے پار دور تک نگاہ دوڑائی اور پھر سر کو ایسے انداز میں جھکی جس سے دیکھا جاسکے وہاں کے خفیہ بندوستان کا جائزہ لے رہا ہوں۔ پوری طرح مطمئن ہونے کی اداکاری کرنے کے بعد میں نے شہزاد سے کہا۔

"تم گاڑی میں میرا انتظار کرو۔ میں اندر کی صورت حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ہم دونوں کے درمیان زبان سے کم اور آنکھوں سے زیادہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہمارا یہ انداز فیصل سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میں گاڑی سے نکلے گا تو اس نے بے یقینی سے کہا۔

"تم لوگ پھر کوئی چکر چلانے کے موذی تو نہیں ہو؟" کافی دیر کے بعد اس نے لب کشائی کی تھی۔

"کیسا پھر؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ برہمی سے بولا "سہیل! تم پہلے بھی بے وقوف بنا کر مجھ سے ایک آدمی بے ڈی ملک کا ٹھکانا اور فون نمبر معلوم کر چکے ہو۔ اب بھی تم کوئی چال تو نہیں چل رہے؟"

"میں تم سے غلط بیانی نہیں کروں گا فیصل!" میں نے متحمل لیجے میں کہا "میں تو ہر وقت کوئی نہ کوئی چال چلا رہتا ہوں، یہ الگ بات ہے، وہ چالاکی کسی کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتی۔ ہاں، البتہ اگر سامنے والے ایسا نہ کوٹنے کی کوشش کر رہا ہو تو میں اسے گولے ڈھیر پر پختے میں ایک لمبے کی تاثیر نہیں کرتا۔ تم نے مجھے ایک کرڈر روپے کا لاٹھی دے کر موت کے منہ میں دھکیلنے کی سازش کی تھی۔ میں جیسے ہی تمہارے بے ڈی ملک کے پاس پہنچتا، وہ مجھے بے بس بنا دیتا پھر وہ لوگ مجھے ایسی اذیتوں سے گزارتے کہ میں تمہارا پاپا ٹھکانا اگلنے پر مجبور ہو جاتا لیکن میں نے تمہاری سازش کا مایاب نہیں ہونے دی اور تمہاری چال چلی ہی رہی رہی۔" مجھے اسے اختتام پر میں نے دھمکی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "وجدان کے ساتھ کام

کرنے والوں کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہ سمجھنا! اگر میری یہ نصیحت نہیں یاد رہی تو زندگی بھر پیش کرو گے۔"

پچھلے پچیس آنے والے ہنگامی حالات کے بارے میں فیصل کو نہیں جانتا تھا۔ اس دوران میں وہ گہری بے ہوشی میں رہا تھا۔ وہ ابھی سمجھ رہا تھا، ہم نے ڈیلیوری کے لیے اسے بچکے سے نکالا ہے۔ اس نصیحت کے جواب میں وہ مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں نے شہزاد کو جواب کرتے ہوئے کہا۔

"مگر فیصل کسی قسم کی کوئی ٹکڑ بڑ پھیلانے کا ارادہ ظاہر کرے تو تم بے دریغ اسے بھون کر رکھ دیتا۔ جب کوئی خود ہی زندہ نہ رہتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

میرے الفاظ میں سفاکی اور سنگینی بھری ہوئی تھی۔ شہزاد بڑی وضاحت سے میری بات کو سمجھ گیا اور بولا "سہیل! تم مطمئن ہو کر جاؤ، مجھے امید ہے، بدعمری کی قوت نہیں آئے گی۔"

میں گرین ہائی روڈ سے نکل کر پارک کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ جب میں ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد پارک کے اندر داخل ہوا تو چھن کر اٹھاون منٹ ہو رہے تھے۔ بندوں کے تادلے میں صرف دو منٹ باقی تھے۔ میں تیز قدموں سے مطلوبہ مقام کی طرف بڑھنے لگا۔

اس وقت میرے ذہن و دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ دل ساحل کی جھلک دیکھنے کو چل رہا تھا اور ذہن میں ایک ایسا بھلا چمکی جی جس کا ہر مہرہ لمحہ بہ لمحہ اپنی صورت بدل رہا تھا۔ چوہدری سے فون پر ہونے والی گفتگو نے میرے اندر کھلی جارہی تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا تھا کہ چوہدری کی نیت میں کوئی فوری پیدائش ہو گیا ہے۔ فون میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی بلکہ چوہدری نے ان خود ریسور رکھا ہے، پھر جب میں نے دوبارہ رنگ کرنے کی کوشش کی تو اس نے اس سے پہلے ہی ریسور ہٹا کر رکھ دیا۔

ایک متضاد سوچوں کے ساتھ میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر مجھے وہ مقام دکھائی دینے لگا جہاں پر ایک ٹکٹ ساز چلی پگھلے کی گردن استراہ ہے۔ وہاں مجھے چندے کیلئے ہونے نظر آئے۔ ایک بچہ پگھلے کے سر کو تھام کر اس کی گردن پر چڑھ بیٹھا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے کسی کو اپنے پاس بلارہا تھا۔ اسی وقت نزدیک ہی گلاس پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک لکھرا بدار شخص بچے کے قریب آیا اور اس کی تصویر بنائی۔ بچہ پگھلے کو دیکھ کر ہنس مٹا رہا تھا۔

میں نے دھڑکنے ہوئے دل کے ساتھ رستہ واضح کر دیکھا۔ میری گھڑی کی سوئیوں نے سات بجتے کا منظر دکھا دیا۔

میں نے بے قراری سے پگھلے کی سمت نگاہ دوڑائی لیکن وہاں ساحل کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہی بچے آپس میں اٹھیلیاں کر رہے تھے۔

میں گہری تشویش کے گھیرے میں آ گیا۔ اس وقت ساحل اور فیصل کو اس مقام پر ہونا چاہیے تھا۔ فیصل کو تو میں گاڑی میں چھوڑ آیا تھا لیکن ساحل کہاں کی؟

میں نے بے چینی سے گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔ اگلے ہی لمحے عباس اور زمرہ خان میری نظر میں آ گئے۔ وہ مطلوبہ مقام سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے آپس میں محدود فاصلہ رکھا ہوا تھا تا کہ کسی کو شک نہ کر رہے۔ میں شہزاد کے دوست بیات خان کو نہیں جانتا تھا۔ ممکن ہے، وہ بھی کہیں آس پاس ہی ہوا!

زمرہ خان اور عباس مجھے دیکھ نہیں پاتے تھے۔ میں فوراً سے نزدیک بنے ہوئے ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ وہ اگر مجھے دیکھ بھی لیتے تو میں ان کے لیے سہیل تھا..... ان کا ایک ساتھی سیکوریٹری گاڑی شہزاد نے ان دونوں کو بچکے سے روانہ کرتے وقت سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر وہ پارک کے اندر کوئی غیر معمولی سرگرمی نوٹ کریں تو ہمیں فوراً اطلاع دیں۔ پتا نہیں، انہوں نے بچکے پر کوئی فون کیا تھا یا نہیں۔ وہاں جو حالات پیش آئے، انہوں نے ہمیں کسی اور طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

میں اس ستون کی آڑ میں کھڑا چوہدری کا انتظار کرتے رہا۔ جب مزید دو منٹ تک مجھے ساحل کی صورت نظر نہ آئی تو میں نے میدان عمل میں کودنے کا فیصلہ کیا اور ستون کی آڑ سے نکل کر اپنے آدمیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ چوہدری نوازش علی کی گینگی اور درندگی مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس سے کسی وقت کسی بھی چال کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کی طرف سے میرا ذہن متنی خیالات سے اٹا ہوا تھا۔ اس ذخیرے میں ایک اسکاکی خیال قدرے بہتر کنڈیشن میں تھا۔ میں اسے اپنی خوش گمانی بھی کہہ سکتا تھا..... اور وہ یہ کہ ممکن ہے، چوہدری بھی میری طرح احتیاط سے کام لے رہا ہو۔ وہ فیصل کو صورت حال دیکھنے بغیر ساحل کے سامنے نہ لانا چاہتا ہو! چوہدری نوازش سے میری مراد اس کے احکام سے تھی۔ وہ شیطان مفت جاگیر دار خود تو اس وقت موضع رکھاں والی میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا تھا، اس کی ہدایت کے مطابق ہوتا تھا۔ چوہدری کا نیت درک اس کی مرضی کے خلاف کیسے جاسکتا تھا۔

عباس نے نظری تو میں نے اشارے سے اسے اپنے

پاس بلا لیا۔ تازہ ترین صورت حال کے بارے میں جانتا بہت ضروری تھا۔ اس نے میرے نزدیک آکر پوچھا ”سہیل! شہزادہ نظر نہیں آ رہا..... اور اب تو سات سے اوپر کا وقت ہو گیا ہے؟“

میں نے کہا ”شہزادہ یہیں قریب میں ایک خفیہ مقام پر موجود ہے۔ تم اپنی رپورٹ پیش کرو۔“

اس نے قدرے ہلکی آواز پر میرے سامنے سے گزرتے ہوئے رپورٹ والی بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ وہ رتبے کے اعتبار سے مجھے (یعنی سہیل کو) اپنے برابر سمجھتا تھا، جسی چھوٹے ہی اس نے شہزادہ کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ میں نے اس کی انجمن کو دور کرنے کی غرض سے کہا۔

”مجھے شہزادہ ہی نے یہ بات معلوم کرنے کے لیے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔“

وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا ”یہاں پر سب خیریت ہے۔“

”کیا تم نے یا زمرہ نے اس دوران میں جینگے پرفون کیا تھا؟“

اس نے نفی میں گردن ہلا دی ”اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔“

”بات خان کہاں ہے؟“

اس نے ایک وردی پوش سیکورٹی گارڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے اس لحاظ سے متفکریں کہاں سے کوسید چوکانا اور حفاظت رہنے کی تاکید کی اور صحت مند سیکورٹی گارڈ بات خان کی جانب بڑھ گیا۔ اس دوران میں، میں مسلسل چولی بچھوے اور اس کے گرد و نواح کو بھی نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ میں نے بات خان کے پاس پہنچنے کے بعد شہزادہ کے دوست کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا اور پارک کی صورت حال کے بارے میں استفسار کیا۔

اس نے جواب دینے سے قبل سوال کر ڈالا ”وہ شہزادہ کدھر ہے؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے عقب میں دور تک ٹکا دوڑائی۔

میں نے کہا ”وہ پارک کے باہر گاڑی میں موجود ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اندر بھی آ جائے گا۔“ اس کے بعد

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ چند لمحوں کے بعد میری نظر سے دیکھا رہا پھر مجھے لہجے میں بتانے لگا ”کوئی بڑی بات تو دیکھنے میں نہیں آئی۔ سب کچھ

معمول کے مطابق ہے لیکن میری عقابانی نظر نے دو افراد کو پایا ہے۔ وہ دو تھے وہ تھے وہ تھے اس بچھوے کے پاس آئے ہیں اور خاموشی سے دوسری طرف نگل جاتے ہیں۔ ان کی اس حرکت کو کسی اور نے نوٹ نہیں کیا ہوگا۔ وہ دونوں افراد بظاہر بھی شوکر رہے ہیں کہ دوسرے افراد کی طرح وہ بھی وہاں تفریح کی غرض سے آئے ہیں لیکن میں نے ان کی حرکات و سکنات میں خاصی تشویش اور مشکینی پائی ہے۔“

بات خان ایک نہایت ہی اہم انکشاف کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، ہمارے دونوں سادہ پوش گارڈز بھی ان افراد کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہے ہوں گے کیونکہ وہی مذکورہ مقام ہی کی نگرانی کر رہے تھے۔ بات خان کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا کیونکہ وہ پارک کے سیکورٹی گارڈ کی یونی فارم میں تھا۔ اس حوالے سے مجھ پر بھی کوئی توجہ نہ دینا، میں بھی اس وقت سیکورٹی گارڈ کی وردی میں تھا۔

میں نے بات خان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو وہ تائیدی انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر میں نے نگرانی کرنے والے پراسرار دو افراد کے بارے میں پوچھا تو اس نے خاموشی سے دو جانب کیے بعد دیکھے اشارہ کر دیا۔ میں نے تجاہلی مارا فائدہ سے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ایک دبا پتلا تھا اور اس نے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ دوسرا قدرے فربہ تھا۔ وہ سیاہ چٹون اور گرے شرٹ میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی ان کی ”ادازوں“ سے اندازہ لگا لیا کہ وہ ہمارے دشمن کے آدمی تھے۔ گویا دوسری جانب سے بھی ملٹی جلیتی چال چلی جا رہی تھی!

میں نے بات خان سے کہا ”اگر میں زمرہ خان یا عباس سے کھس پھس کروں گا تو یقینی طور پر ان مشکوک افراد کی نگاہوں میں آ جاؤں گا لہذا انھیں موقع پاکر ایک کام کرنا ہے۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”کیا کام؟“

”کام بہت آسان ہے۔“ میں نے مشکوک افراد اور مقام بچھو کر کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا ”اور اس کام کے بعد سمجھو، تمہاری چٹنی۔ تم نے ہماری چٹنی مدد کی اس کا شکریہ اب ہمیں تمہارے تعاون کی حریہ ضرورت نہیں۔ بعد میں شہزادہ ہمیں فون پر تفصیل سے آگاہ کر دے گا۔“

وہ ہکا بکا مجھے سمجھنے لگا پھر بولا ”بولو، کیا کام کرنا ہے؟“ میں نے کہا ”تم ان دونوں مشکوک افراد کی نظر بچا کر عباس یا زمرہ خان سے کہو کہ اب ان کی نگرانی کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ وہ حساس مقام سے فاصلے

پلے جائیں اور فرنٹ میں آئے بغیر اپنے دشمن پر نگاہ رکھیں۔ ان پر اشارہ اس چٹون قیص اور شلوار سوٹ والے کی طرف ہے۔“

”سمجھ گیا سہیل صاحب!“ اس نے فرمانبرداری سے کہا پھر مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے پوچھا ”تم مجھے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

بات خان نے ہلکیا تے ہوئے کہا ”میں نے شہزادہ سے کسی قسم کی تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ اس نے صرف اتنا بتایا تھا، اس کے چند آدمیوں کو تحفظ کی ضرورت ہوگی۔ میں ایک سیکورٹی گارڈ ہوں اور پارک میں آنے والے ہر شخص کو تحفظ فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے مگر شہزادہ نے جس انداز میں تعاون کی درخواست کی تھی، اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی بہت ہی خاص واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن ابھی تک تو سب کچھ پراسرار اور سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔ آپ ہم کو اس کے بارے میں کچھ بتاؤ؟“

میں نے نالائقی کے لیے اسے ایک ایسی سیدھی مختصر سی کہانی سنائی جس میں اس کا قائد تھا اور نہ میرا کوئی نقصان وہ مطمئن ہو کر ایک طرف بڑھ گیا۔ میں ایک چولی بچھوے میں اس مقام کا جائزہ لینے لگا جہاں چوہدری کے بندوں نے سائل کو اور میں نے فیصل کو پہنچایا تھا۔ وہاں کلنڈر سے بچوں کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے چوہدری نواز ایش کو کڑی تاکید کی تھی کہ ٹھیک سات بجے سائل کو پارک میں پہنچ جانا چاہیے اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا مگر کلنڈر کا وعدہ خلافی پر اتر آیا تھا۔ ایک طرح سے وعدہ خلافی میں بھی کر رہا تھا۔ ہوسکتا ہے میری طرح دوسری بار بھی یہی حد خطا ہو.....!

آنکھ دوڑھٹ کے اندر عباس اور زمرہ خان میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ بات خان نے انہیں میری ہدایات پہنچا دی تھیں۔ ایک منٹ بعد دشمن کے نگران بھی غائب ہو گئے۔ ایک لمحوں کے بعد میں پوچھوں ہوا جیسے اس بچھوے پرے پارک میں میرے سوا اور کوئی بھی نہ ہو۔ میں نے خود کو اندر سے تھپایا۔ مجھے سمجھنے میں ایک لمحوں کی دیر نہ لگی کہ وہ احساسات سائل کے وہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے تھے۔ میں بے چین ہو کر یک لخت پیچھے سے اٹھ گیا۔

مجھے اپنے پورے وجود میں ایک انجانا سا اضطراب پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ میری چٹنی جس تیار ہی تھی، کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی

ہے۔ سائل کا وہاں نہ پہنچایا جانا خالی از علت نہیں تھا۔ ان حالات میں میں پارک میں زیادہ دیر کر کر انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پارک کے باہر فائرنگ کی آواز گونجی۔

میں نے بے ساختہ پلٹ کر اس سمت میں دیکھا۔ یہ وہی حصہ تھا جہاں گرین ہائی روف میں شہزادہ فیصل کے ساتھ موجود تھا۔ میرا دل الجھل کر قلع میں آ گیا۔ وہاں کوئی سنگین واقعہ پیش آ گیا تھا۔ میں نے ایک لمحوں کی تاخیر کے بغیر پارک کے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔

فائرنگ کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے تیزی سے آگے بڑھنے کی صدا بھی بلند ہوئی۔ میں ممکنہ تیزی سے بھاگتے ہوئے پارک سے باہر نکل آیا۔ اسی لمحے میری نگاہ گرین ہائی روف پر پڑی۔ شہزادہ بیک گیر میں اسے گیٹ کی طرف لا رہا تھا۔ میں نے کوئی کی رفتار سے دوڑ کر گیٹ اور ہائی روف کا درمیانی فاصلہ طے کیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر پہنچ گیا۔

شہزادہ نے ایک تشویش ناک نظر مجھ پر ڈالی اور ایک جھٹکے سے گرین ہائی روف کو آگے بڑھا دیا۔ اس وقت وہ کسی عقاب کے مانند فعال دکھائی دیتا تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ فیصل وہاں موجود تھا۔

شہزادہ نے اضطرابی لہجے میں مجھ سے کہا ”ممن اٹھالو۔ وہ لوگ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ میں ڈرائیونگ سے فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں تم فائرنگ سے انہیں روکو۔ اگر وہ لوگ ہمارے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو یو پی گزب ہو جائے گی۔“

میں نے کلاشکوف کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے عقب میں نگاہ دوڑائی۔ ایک نیلی پھارو بڑی تیزی سے ہمارے تعاقب میں تھی۔ اس کی تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار بتا رہی تھی کہ یہ پہلی فرصت میں نہیں چھوٹنا چاہتی ہے۔

میں نے پھارو کے اگلے پہیوں کو نشانہ بنا کر چنگی فائرنگ کی۔ اس عمل کے لیے مجھے ہائی روف کی کھڑکی سے اوپر کی دھڑا ہر لگانا پڑا۔ یہ فائرنگ بے نتیجہ رہی مگر حیرت انگیز طور پر پھارو میں سے ہم پر گولیاں نہیں برسائی گئیں۔

میں نے شہزادہ سے کہا ”وہ لوگ بہادر اور استہیں نشانہ نہیں بنائیں گے کیوں کہ فیصل ہم دونوں کے بیچ موجود ہے۔ وہ اس کی زندگی کا رسک نہیں لے سکتے۔ تم ڈرائیونگ اور اسپیلڈ پر توجہ دو۔ پھارو والے ہائی روف کے عقبی ٹائرز کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے تاکہ ہم رکنے پر مجبور ہو جائیں۔“



”میرا بھی یہی خیال ہے۔ پہلے بھی انہوں نے ہوائی نازنگ ہی کی ہے یا پھر گاڑی کے نازوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔“ شہزاد نے رفتار بڑھاتے ہوئے میری تائید کی ”میں فیصل کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ تم گاڑی کے عقبی حصے میں چلے جاؤ تاکہ انہیں روکنے میں آسانی ہو۔“

میں نے سیٹ کے اوپر سے سلائیڈ کیا اور یہ مشکل ہائی روف کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چوہدری نے میرے ساتھ کھلا دھوکا کیا تھا۔ ساحل کو میرے حوالے کرنے کے بجائے اس نے فیصل کو چھیننے کی پلاننگ کی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہفتا پارک کے باہر اپنے بندوں کا جال پھیلا دیا ہوگا اور انہی میں سے کسی کی نظر گرین ہائی روف میں بیٹھے فیصل پر پڑ گئی ہوگی۔

شہزاد کا ذہن بھی میرے انداز میں سوچ رہا تھا، گنبد آواز میں اس نے بتایا ”ہمارے دشمن خفیہ طریقے سے پارک کے بیرونی حصوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے غیر معمولی نوعیت کی سرگرمی دیکھی تو ہوشیار ہو گیا۔ پھر اس سے قبل کہ میں تم تک کوئی اطلاع پہنچاؤں گا وہ لوگ مجھے گھیسونے لگے۔ مجھے روکنے کے لیے انہوں نے باقاعدہ فائرنگ شروع کر دی۔“

”اسی فائرنگ نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے لگتا ہے وہ ایک پجاردہ پر اکتفا نہیں کریں گے؟“ شہزاد کے لہجے میں تشویش تھی۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے عقبی منظر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”اس ننگی پجاردہ کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر مجھے دو اور گاڑیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ان کے تینور بھی بڑے خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔“

فیصل نے فیصلے لے لیے ”تم لوگ اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔ میرے آدھے جتن تک تمہارا تعاقب کریں گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً گاڑی روک دو۔“

”ہمارا جتنم کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ میں نے سفاکی سے کہا ”اور اگر تم نے زبان بند نہ کی تو ہمیں اس جانب پارسل کرنا پڑے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

وہ کیڑے نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ شہزاد نے کہا ”چلو یہ اچھا ہوا۔۔۔۔۔ تم نے اپنی زبان سے اقرار کر لیا، حناقب گاڑیوں میں تمہارے بندے ہیں۔ اب یہ بھی بتاؤ وہ جے ڈی ملک کے پیچھے ہوئے ہیں یا پھر ان کا تعلق شیعہ غوری کی

تحفظ سی ایف کے سے ہے؟ تو لوگ ایک ہی قیل کی بنے ہو!“

اس سے پہلے کہ فیصل کوئی جواب دیتا، گرین ہائی روف بڑے خطرناک انداز میں لہرائی عقب سے ایک مرتبہ ہماری گاڑی کو فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہائی روف نازروں تو برست ہونے سے محفوظ رہے تاہم چند گولیوں میں لگیں اور ایک اچھی سی گولی نے بیک اسکرین کی خاص مزاح پر ہی کر ڈالی۔ شیشے کے درجنوں محفوظ کر میرے اوپر بھی آن کر گئے۔ میں نے گردن کو جھکا کر ہوئے کلاشوف سیدی کی اور پجاردہ کے اگلے نازوں کو اپنے مرتبہ پھر نشانہ بنایا۔

میری یہ کوشش کسی حد تک کامیاب ہوئی۔ پجاردہ سامنے والا ایک نازنا کارہ ہو گیا۔ وہ سڑک پر برقی طور لہرائی اور ڈرائیور نے اسے سائڈ پر روکنے کی کوشش کی۔ ایک ”ٹانگ“ تروانے کے بعد پجاردہ والے ہمارا تعاقب چاہتے نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں عقب میں نظر جمائے ریڈار پر تھا۔ پجاردہ کے پیچھے آنے والی دو گاڑیوں میں سے ایک دھڑلے سے رک گئی اور دوسری نے تعاقب کا فریضہ سنبھال لیا۔ سوزا جیب پجاردہ کی مدد کے لیے ٹھہری تھی جب کہ ٹیوٹا ہائی کس ہماری گرد پانے کے لیے اندھا دھند دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

ہم اس وقت ڈی ایچ اے کے قلب میں ”آگے بڑھنا“ کھیل رہے تھے۔ اس علاقے کی سڑکیں کم مصروف اور بڑے صاف ہیں لہذا اس خوبی دوڑ کے نتیجے میں کوئی بدامنی پیدا ہو رہی تھی۔ ٹیوٹا ہائی کس کی طوفانی رفتار کے سامنے روف زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکتی تھی اس لیے شہزاد اسے مسلسل ایک سڑک پر رکھنے کے بجائے بار بار ”پھری“ بدل رہا تھا۔ جن حالات سے گزر رہے تھے ان میں کسی فیصلے تک پہنچنا مشکل تھا۔ فوری طور پر یہ نہیں سوچا جاسکتا تھا کہ ہمیں کس سڑک پر پہنچنا ہے۔ ہماری جی الامکان کوشش یہی تھی کہ کسی طرح حناقبین کو ڈانچ دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور یہ کچھ زیادہ بار آور ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ہائی کس بتدریج فاصلہ کم کرتے ہوئے ہمارے قریب سے قریب تر پہنچ رہی تھی۔ مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد شہزاد ہائی روف کو گزری کی طرف لے آیا۔ اب ہم خیابان حافظ پر دوڑ رہے تھے۔ سعودی انسپری خیابان شمشیر اور پیچھے چھوڑ کر ہم خیابان بحرہ سے آگے بڑھتے گئے۔ خیابان ہلال کو عبور کرنے کے بعد ہمارا رخ سمندر کی طرف ہو گیا۔ علاقہ کم آباد اور خاصا کھلا تھا۔ اس وقت ہلکا اندھا میرا

ہونے لگا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا ”تم اچھا موقع ہے یہ علاقہ اور ملگیا اندھرا ہمارا ساتھ دے گا۔ تم کسی طرح ان شیطانوں سے چھپنا چھڑانے کی کوشش کرو۔ اگر ہم نہ۔۔۔۔۔“

میری بات اور میری وہ گئی اسی وقت ہائی کس سے ہم یعنی ہائی روف کے عقبی نازوں پر ایک برسٹ فائرنگ کیا جو اب میں نے ایک لمحہ ضائع کے بغیر فائرنگ کر دی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی رکنے پر مجبور نہ ہوا۔

میں دوبارہ فائرنگ کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ہائی کس کے عقب میں مجھے ایک پولیس موہاگل دکھائی دی۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے ہمیں چڑ کر رہی تھی۔ پتا نہیں پولیس والے کب ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ میری نگاہ میں وہ ابھی آئے تھے۔

یہ ایک خطرناک اور سنسنی خیز صورت حال تھی۔ شہزاد بھی پولیس موہاگل کو دیکھ چکا تھا، تشویش ناک لہجے میں بولا ”ہم تو بڑے پشیم گئے۔ یہ الو کے پٹھے کہاں سے نازل ہو گئے؟“

”ہم جس قسم کے کارنامے انجام دے رہے ہیں، وہ انہیں دعوت دینے کے مترادف ہے۔“ میں نے عقبی صورت حال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ”الو کی میں سر ڈال دیا ہے تو مولے بھی آئیں گے!“

”وہ جان! ہمیں سب سے پہلے پولیس والوں سے چھپنا چھڑانا ہوگا!“ شہزاد کی آواز میں ہولکا ہٹ تھی۔ میں سر پیٹ کر رہ گیا، بے دھیانی میں وہ بہت غصہ ڈھا گیا تھا۔

فیصل نے چونک کر مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں متحیر ہوا ”ت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ سبیل ہو یا وہ جان؟“

شہزاد سے ہولکا ہٹ میں جو غلطی سرزد ہوئی تھی اس کی ٹانگیں ٹھنک نہیں تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں فیصل کو ایک طویل انٹرویو دینے بیٹھ جاؤں۔ میں نے اسے جھاڑ پلاٹے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”تم سبیل اور وہ جان کے چکر میں نہ پڑو۔ میں ہر صورت میں تمہارا پاپ ہوں!“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

میں نے اس کے گال پر الٹا نچر رسید کیا اور خون خوار لہجے میں کہا ”میں نے تمہیں نصیحت کی تھی اپنی نایاب زبان کو بند رکھنا لیکن لگتا ہے کسی اور سے سننے سے پہلے تمہیں ہمیشہ

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو وہ جان!“ اس کے الفاظ میں دھمکی کا شائبہ تھا۔

میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا ”تم اور تمہارا باپ کسی بھی اچھے سلوک کے مستحق نہیں ہو۔“ ہر مصلحت کو پالانے طاق رکھ کر میں اس سے یہ حیثیت و دھان بات کر رہا تھا ”میں نے تو یہی کہا تھا، تمہیں چوہدری نواز ش کے حوالے کر دوں لیکن تم لوگوں کی کھٹی میں جھد کھنی اور دغا بازی شامل ہے۔ دیکھ لو تمہارے باپ نے میری بات نہ مان کر تمہیں کس عذاب میں دھکیل دیا ہے۔ اب تم پوری طرح میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں تمہیں بار بار جات میں تقسیم کر کے کھٹے کباب والے کے ہاتھ فروخت کروں گا۔“

اس نے مجھے گالی دینا چاہی لیکن الفاظ ہونٹوں سے جدا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے ٹھوکرے پر کلاشن کوف کا بٹ مارا۔ وہ تکلیف کی شدت سے ہلکا اٹھا۔ اب مجھے اس کے حلیے اور صحت کی ذرا بھی پروا نہیں رہی تھی۔ جب میری ساحل مجھے نہیں لگی تھی تو پھر میں اس حرامی لپے کو کیوں سینٹ سینٹ کر رکھتا؟ میں فیصل کا وہ حشر کرنے والا تھا جسے دیکھ کر چوہدری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

راکفل کا بٹ کھانے کے بعد فیصل کا چہرہ ہولناک ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پشت پر اٹھ کر گرفت میں تھے اس لیے اس کا پس صرف زبان تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی بولتی بند کرنے کے لیے اس کی ناک کو نشانہ بنایا اور ایک زوردار پینچ مار کر پر جڑ دیا۔ فیصل کے لیے میرے دل میں بہت غصہ بھرا تھا۔ وہ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکا اور مجری طرح چلانے لگا۔

میں نے نمک پاشی کرتے ہوئے کہا ”تم کیسے مارشل آرٹسٹ ہو۔ یہ ذرا سی تکلیف نہیں سہہ سکتے۔ میں نے تو سنا ہے تم نے بلیک بیلٹ حاصل کر رکھی ہے اور کئی غیر ملکی ٹورنامنٹس بھی جیت چکے ہو۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں تم نے بلیک بیلٹ اپنی محنت سے نہیں بلکہ۔۔۔۔۔ میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ خالی جگہ مڑ کر کے اس نامک جملے کو اپنی ضرورت کے مطابق ٹھکنے سے ٹھکنے تر بنایا جاسکتا تھا۔

وہ پھرے ہوئے لہجے میں غرایا ”تم مجھے آزاد کر کے دیکھو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا“ میں نے بلیک بیلٹ کہاں سے اور کیسے حاصل کی تھی!“

”میں تمہاری یہ حسرت ضرور پوری کروں گا“ پہلے تمہارے ان متعدد والد صاحبان سے نفٹ لو۔“ میں نے گن کی ٹال سے عقب میں اشارہ کیا۔

اگر میری بات ختم ہوئی اور پولیس موبائل پر گولیوں کی برسات کر دی گئی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ موبائل کے پیچھے مجھے وہی سوزی کی جیپ نظر آئی جو زخمی بھاروی "عیادت" کے لیے رک گئی تھی۔ اس جیپ اور ہائی کس سے بے دریغ پولیس موبائل پر فائرنگ کی جارہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا دشمن پولیس والوں کو ہمارا سامنا بھی سمجھ رہے تھے اور ہم سے پہلے انہیں نیست و نابود کرنے پر تڑپ گئے تھے۔ یہ ایک کھلی قانون شکنی تھی! پولیس والے بھی چوڑیاں پھین کر موبائل دوڑانے نہیں نکلے تھے۔ وہ اپنی دانت میں خطرناک مجرموں کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہوں نے دو کے بجائے ایک محاذ پر لڑنے کا فیصلہ کیا اور موبائل کی رفتار گھٹا کر سوزی کی جیپ پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس طرح وہ لوگ ہائی کس سے ہونے والی فائرنگ سے محفوظ ہو گئے۔ ہائی کس والوں نے عقبی "معاملات" کو یک سر نظر انداز کر کے ہمارا تعاقب جاری رکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ ہم سے خاصے فاصلے پر رہ گئے۔

یہ صورت حال ہمارے لیے خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اب ہمیں صرف ایک ہائی کس سے نمٹنا تھا۔ پولیس والوں سے بچھا چھوٹنے کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر قسم کی جواب دہی سے بچ گئے تھے۔ ہماری گاڑی میں ایک جتھہ کڑی لگا زخمی موجود تھا۔ جسے ہم اپنی مرضی سے کہیں لے جا رہے تھے۔ اگر ہم پولیس والوں کے مجھے چڑھ جاتے تو کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے۔ پولیس والوں نے جیپ والوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ہی وائرلیس پر ہائی روف اور ہائی کس کے بارے میں اپنے ممبر کو بتا دیا ہوگا لہذا اس بات کے قوی امکانات تھے ہمیں چاروں جانب سے گھیرا جائے گا۔

میں نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم ایک گاڑی کی رفتار کم کر دو مگر اس طرح کہ ہائی کس والوں کو فائرنگ کرنے کا موقع نہ ملے۔ میں اس کھاتی فرصت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ اگر کچھ دیر مزید یہ چیزنگ جاری رہی تو ہم متعدد پولیس موبائلز کے زخموں میں آجائیں گے۔ پیچھے آنے والی پولیس موبائل نے بھینا ہمارے بارے میں اپنے لوگوں کو فوری مطلع کر دیا ہوگا!"

میری ہدایت کے اختتام پر شہزاد نے ہائی روف کو سرسک پر بری طرح لہرایا اور لینتھ ٹرن کے لیے اسٹرنگ گھما دیا۔ موڑ کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑی ورنہ ہائی روف کو خطرناک حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔

ہائی کس والوں نے بھی ہماری تقلید میں گاڑی موڑ لی۔

اس دوران میں مجھے ہائی کس کے پہلو میں فائرنگ کا موقع مل گیا۔ کا شکیف کی مہلک گولیوں نے ہائی کس کی باڑی کو چھید ڈالا لیکن سونے اتفاق کہ اس کے فائرنگ باز رہے۔ البتہ ہمارے درمیان فاصلہ خاصا بڑھ گیا۔ سطح سمندر پر ہائی کس سے بھی ہم فائرنگ کی گئی۔ ہم فائرنگ باز سے باہر تھے چنانچہ ہمیں اور ہماری گاڑی کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔

"یہ تو جہنم کی بلاؤں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہیں!" شہزاد عقب نما آئیے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔ فیصل زہر خند لہجے میں بولا "میں نے تو پہلے ہی تھا میرے آدمی جہنم تک تمہارا تعاقب کریں گے۔ اب وقت ہے۔ اگر میری بات سمجھ میں آ رہی ہے تو گاڑی روک دو۔ میں اپنے آدمیوں سے تمہاری سفارش کروں گا۔" فیصل کے آخری جملے سے اعتماد جھلکتا تھا۔ لگتا تھا کہ ہم نے صورت حال سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو سنبھال کر رکھا اور اس وقت اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے فیصلی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"اپنے وعدے سے پھر تو نہیں جاؤ گے؟"

"کون سا وعدہ؟"

"سفارش والا وعدہ!"

وہ ٹک آئیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کیا تم نے بے وقوف سمجھے ہو؟"

شہزاد کے بچے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھتے ہوئے سڑک میں بدل رہا تھا۔ جب وہ خیابان پر آیا تو میں نے کہا "اس سڑک کو نہیں چھوڑنا۔ میں تمہیں ہدایات بعد میں دوں گا۔"

خیابان اتحاد خاصی وسیع اور کم مصروف سڑک ہے۔ پر مجھے بار بار سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ سی دیو سے شہر تک اس پر بے دریغ گاڑی دوڑائی جاسکتی ہے۔ میں اپنے عقب میں ہائی کس کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ لمبا پانی خانہ کرتے ہوئے ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بھی ہائی روف کو اڑانے کی کوشش میں تھا۔

تھاقب گاڑی پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے میں فیصل مخاطب ہوا اور اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "اور تمہارا باپ کتنے بے وقوف ہوئے بات تم لوگوں کو زیادہ طرح معلوم ہوگی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تم لوگ اور دل کے حمار اور وعدہ خلاف ہو۔ تمہارے باپ سے جو ذیل والی تھی۔ اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر تمہارا اور سنا

کا نابلد دیانت داری سے ہو جاتا تو اس کا رچرنگ کی نوبت ہی آتی۔ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا اور عواقب و جواب کا جائزہ لینے کے بعد کہا "لیکن تمہارا باپ خود کو زیادہ سیانا اور طاقت ور ثابت کرنا چاہتا ہے۔ وہ مقررہ وقت پر رسائل کو پارک میں پہنچانے بغیر تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم اس وقت میرا نوالہ بنے ہوئے اور تمہارے باپ نے یہ نوالہ چھیننے کے لیے جڑوں میں ہاتھ ڈال دیا ہے اس لیے میں نے کلاشن کی بال سے اس کے سر کے عقبی حصے پر دستک دی اور بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا "تم تم لوگوں کی حکمتیاتی پر پھر دسانا نہیں کر سکتا۔"

"تمہاری مرضی ہے ورنہ میں تو اپنے وعدے پر قائم ہوں" وہ جھلپاٹ آمیز لہجے میں بولا۔ میں نے اس اعصابی کھل کو جاری رکھتے ہوئے کہا "یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو اگر ہم چڑی روک دیں تو تم اپنے لوگوں سے ہماری سفارش کر دو گے۔ وہ ہمیں ٹیڑھی نظر سے بھی نہیں دیکھیں گے اور یہ خوش ہانے کی اجازت دے دیں گے؟" اسے گھسنے میں کوئی حرج نہ تھا۔

"اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو گاڑی روک کر دیکھ لو،" فیصل نے کہا۔

"کیا خیال ہے شہزاد!" میں نے اپنے عقب میں ہائی کس پر نگاہ جاتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا "اس کے باپ کو آزاد کیا اسے بھی آزاد کر دیکھ لیتے ہیں؟"

"وہاں ایسے تم کیا کہہ رہے ہو؟" شہزاد کے لہجے میں افسوس تھا۔ میں نے کہا "اچھا! تو تم یہ کہنا چاہتے ہو اس کی باتوں میں ناؤں؟"

"ظاہر ہے، فیصل کی بات ماننا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے!"

"لوگنی فیصل! میرا سامنی نہیں مان رہا۔" میں نے اپوی سے کہا۔

"وہ دانت چکھاتے ہوئے بولا" میں سب سمجھ رہا ہوں تم لوگ مجھے اعصابی طور پر کھردور کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا!"

"تم جتنی جسمانی اور اعصابی طور پر بری طرح متاثر ہو، میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "لہذا ایسی کوشش مجھ میں وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر شہزاد مان جاتا تو تم میری بات کا ثبوت بھی دیکھ لیتے۔"

"وہ زبان سے کچھ نہیں بولا، بس خون خوار نظر سے مجھے گھور کر رہا۔"

کر رہا گیا۔

ابھری۔

میں نے بے اختیار پلٹ کر دوڑا اسکرین کے پار دیکھا اور پریشان ہو کر رہ گیا۔ سامنے سڑک پر ایک گھبراہٹ میں پڑا ہوئی تھی۔ بائیں جانب والی سائیز اسٹریٹ سے ایک وائرلیسنگ کل کر دوڑ پر آگیا تھا اور ٹش لیش ناک بات یہ تھی کہ وہ ٹیکسٹر روڈ پر رک گیا تھا۔ اس طرح کہ ہم وہاں سے گزر نہیں سکتے تھے۔ ٹیکسٹر کا عقبی حصہ سائیز اسٹریٹ کو اس طرح گھیرے ہوئے تھا کہ گاڑی کو اس اسٹریٹ پر موڑا نہیں جاسکتا تھا۔ ہمیں ہر صورت میں روکنا تھا یا پھر ہائی روف کو ٹیکسٹر سے ٹکرانا تھا۔ اسی لمحے میری جھٹی جس نے پارک کیا، وہ وائرلیسنگ کی سوچے منصوبے کے تحت سڑک پر لا کر ہماری راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا بڑے وسیع پیمانے پر ہمیں چھاپنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ہمارے لیے آگے گناواں پیچھے کھاتی والی صورت حال پیدا ہو گئی۔

یہ تمام خیالات سینکڑوں کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن سے گزر رہے اور اس سے پہلے کہ ہائی روف اور وائرلیسنگ کے درمیان حائل فاصلہ صفر کے برابر رہ جاتا تھا میں نے تھکمانہ انداز میں کہا۔

"شہزاد! گاڑی کو روک لو۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی سرعت سے اپنی جیپ سے بھڑکی کی چابی نکالی۔ اس وقت میرا ذہن برقی رفتار سے کام کر رہا تھا۔ میں نے عقب میں آنے والی دشمن ہائی کس کو یک سر نظر انداز کر دیا۔ اس طرف سے ہمارے رکنے کی صورت میں فائرنگ کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ ہمیں روکنے کے لیے ہی اپنی گنوں کو زحمت دے رہے تھے نکل و غارت گری ان کا مقصد اول نہیں تھا۔ اس طرح فیصل کی جان کی حفاظت نہ رہتی۔ ایسی حفاظت وہ کسی صورت نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے ہائی روف رکنے سے قبل چند سینکڑے کے وقفے میں فیصل کی جتھہ کڑی پر یک جھپٹے میں کارروائی کی اور ایک ہاتھ کی آہنی کڑی سے آزاد کر دیا۔ اگلے ہی لمحے فارغ ہونے والی کڑی کو میں نے سیٹ کے عقب میں نصب ایک باپ سے خشک کر کے لاک کر دیا۔ اب فیصل ایک طرح سے اس باپ سے بندھا ہوا تھا اور اپنی مرضی سے گاڑی کو چھوڑ کر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ کام میں نے حفظ بالقدم کے طور کیا تھا تاکہ پیش آمدہ انفرانٹری میں وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔

آتش فشانی (107) حصہ 10

ٹائروں کی تیز چہرہ ہٹ کے ساتھ ہائی روف رک گئی۔ عقب میں آنے والی ہائی کس نے ہماری ہلید کی اور چند گز کے فاصلے پر ٹھہر گئی۔ نغصا میں چند لمحات کے لیے سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا وقت چند ثانیوں کے لیے ٹھہم گیا ہو۔ وہ بڑی ہی مہلک اور نازک ساعت تھی۔ شہزاد نے اسٹیرنگ چھوڑ کر دوسری کے کے سنبھال لی اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سفاکی سے کہا ”تم اس حرام زادے کو کس پوائنٹ پر رکھو۔ جب تک یہ ہمارے قبضے میں ہے وہ لوگ ہمیں فائرنگ کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ میں ان سے ہٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”تم اکیلے ہی کیوں کوشش کرو گے؟“ شہزاد نے جی داری سے کہا ”یہ نامرد گاڑی کے اندر قفس ہو چکا۔ میں بھی کیوں نہ تمہارا ساتھ دوں؟“

”اس کا موقع آیا تو ضرور اپنی خواہش پوری کرنا۔“ میں نے کہا ”فی الحال فیصل پرتوچہ مرکوز رکھو۔“

فضا برطانی ہوئے والا سکوت کھاتی ثابت ہوا۔ ہماری اس گفتگو کے دوران ہی میں ہائی کس کے عقبی حصے میں سے چار گن بردار اچھل کر نیچے اتر آئے پھر وہ ہائی روف کو نشانے پر رکھتے ہوئے چند قدم آگے آنے کے بعد ریک ہٹے۔ اسی وقت ہائی کس کے اگلے حصے میں سے ایک ٹیم ٹیم شخص برآمد ہوا۔ دراز قامت اور گورے چہرے اس شخص کے ہاتھ میں پھل نظر آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر آنے کے بعد اپنے سرخ ساتیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا، پھر ہماری جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

ہائی کس میں سے نمودار ہونے والوں کے اسٹائل سے لگتا تھا وہ اپنی دانست میں ہمیں زیر کر چکے تھے۔ میں نے انہیں اسی خوشی نگاہی میں جھٹکا رکھا اور شہزاد کے نزدیک چہرہ لے جاتے ہوئے کہا۔

”میں اسلحہ موٹے کو باتوں میں لگا ہوں۔“ میرا انداز سرگوشیاں تھا ”اس دوران میں تم گاڑی کو یک گیر میں ڈال کر تیزی سے پیچھے لانے کی کوشش کرو۔“ یہ آئینڈ یا فوراً ہی مجھے سوچا تھا۔

”یہ بہت خطرناک ہوگا وجدان!“ وہ دوبارہ اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”خطرناک اور مفید سوچنے کا وقت نہیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں تم وہی کرو۔ جیسے ہی میں موٹے سے بات چیت شروع کروں تم گاڑی کو اس انداز میں پیچھے لانا چاہیے ان سب کو روند ڈالنے کے بعد ڈائریکٹ ہائی کس کو ہٹ کرنا

چاہئے ہو!“ وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے گن کا رخ موٹے کی طرف کرتے ہوئے کہا ”پھر تم اپنی روف کو طوفانی انداز میں موڑتے ہوئے واپسی کے راستے ڈال دو گے!“

”اوکے پاس!“ شہزاد نے چٹائی لیجھ میں کہا۔

یہ ایک خطرناک چال تھی جو انتہائی مہلک ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بات کا میں نے خود اندازہ لگا چکا تھا، فیصل کی وجہ سے وہ ہمیں اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ نہیں بنانا چاہتے تھے ورنہ وہ اب تک ہمیں گولیوں کا ہاڑ پر رکھ چکے ہوتے۔ وہ فیصل کی سلاحتی کے لیے ہمیں گریز دے رہے تھے۔

ابھی وہ موٹا پھول بردار ہائی روف سے چند قدم دور تھا کہ فیصل نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ کھڑکی میں سے باہر نکال کر موٹے کو خبردار کرنے لگا ”گاڑی کے نزدیک آنا یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ ان کی گاڑی کو روکنے کی کوشش کرو!“

میں نے حالات مجھڑتے دیکھے تو شہزاد کو آٹھ گولیاں پر ایکشن کا اشارہ دے دیا۔ وہ گاڑی کو پورس گیر میں ڈال دیا تیار بیٹھا تھا۔ فیصل کی چیخ پکار پر موٹا چھٹکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا رکی ہوئی ہائی روف کو وہ کس طرح روکنے کی کوشش کریں۔

پھر جب تک وہ فیصل کی بات کے مفہوم تک پہنچتا تھا، ان پر چڑھائی کر چکا تھا۔

ہائی روف ٹوپ میں سے نکلے ہوئے گولے کی طرح پیچھے کو بڑھی۔ اس کا پہلا نشانہ وہ موٹا ہی بنا۔ میں نے چار گن بردار افراد کے قدموں میں فائرنگ کی۔ وہ اس غیر محسوس صورت حال پر گڑبڑا گئے اور جواباً بے دریغ ہم پر گولیاں برسائے گئے۔ ہائی روف حرکت میں بھی لہذا ان کی گولیاں فائر ہونے والی گولیاں گاڑی کی ہاڈی میں لگیں۔

شہزاد نے کسی بات کی پروا کیے بغیر حیران و پریشان ہوا افراد کو روند ڈالا اور ہائی کس کو ایک زوردار ٹکر مارنے کے بعد اسٹیرنگ کو واپسی کے لیے کھمادیا۔ میں اس دوران میں خود اسٹیرنگ سے میدان جنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے وہ ہماری راہ کوئی کرنے والے واٹر ٹینگر میں سے بھی بردار نکال کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

پھر فائرنگ کرنے لگے۔ وہ ہر ممکنہ طور پر ہمیں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔

ہائی کس طوفانی ٹکر کھانے کے بعد اپنے قدموں پر

ساحرے سرگرمی تو شہزاد کے لیے آسانی پیدا ہو گئی۔ اسی وقت میں نے ہائی کس کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے فائرنگ کر دی۔ گاڑی کو قفلت ہونے میں دیر نہیں لگی، اب وہ ہمارے تعاقب کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں دیکھتے ہوئے ڈشوں پر گولیاں برسائیں۔ متعجب انہیں ہلاک کرنا نہیں تھا۔ میں انہیں شدید زخمی کر کے تعاقب سے روکنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے گن کی نالی پیچھے رکھتے ہوئے ان کے جسموں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجے میں کرب ہاں انسانی جنوں سے فضا کو گونجی تھی۔ ہماری ہائی روف نے پہلے ہی ڈشوں کو بڑی بے دردی سے روند ڈالا تھا۔ اس فائرنگ نے قامت برپا کر دی۔ موٹے اور اس کے چاروں گن بردار ساتھیوں پر برآمد وقت آن پڑا۔ واٹر ٹینگر سے نمودار ہونے والوں نے انہیں کور ہاڈ اور ہماری گاڑی کو نشانہ بنانے لگے۔ میں انہیں روکنے کی کوشش میں تھا تاہم برقی مقابل میں سے چند درجے سنبھلے ہوئے تھے وہ ہم پر فائرنگ کر رہے تھے پھر اس سے پہلے کہ شہزاد گاڑی کو واپسی کی راہ پر ڈالتا ایک خوفناک دھماکے سے فضا زلزلہ کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فیصل کی تیز چیخ بھی سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر عقب میں دیکھا تو ایک دھشت ناک منظر سے سامنا ہوا۔

ہائی کس آگ کا گولائی نظر آئی۔ شاید اس اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں کوئی من چلی گولی اس کے فوکل ٹینک سے جا گئی یا ٹینک سے گاڑی کا کوئی اور حساس حصہ فائرنگ کی زد میں آ گیا ہو۔ ایسی ہی ایک شہریر گولی نے فیصل کے کندھے پر بھی بوسہ دیا تھا۔ وہ اپنا بازو جھٹکتے ہوئے ہولے ہولے کراہنے لگا۔ افسوس کہ اس وقت وہ اپنے آزاد زخمی بازو کو کھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا، تھانے والا ہاتھ اپنی جگہ میں آٹش واہن کے اس خونیں منظر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے

ہم کانی دور نکل آئے۔ اس لمبائی کا درواں کے دوران میں ہمیں گاڑیاں ہمارے پیچھے خاصے فاصلے پر رک گئی تھیں اور ہمیں ”خوش دھن“ میں تھیں لیکن ان لوگوں میں سے کسی نے کوئی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پرانی آگ میں کودنا

فخر اس وقت راگ سائینڈ ڈائریکٹ کر رہا تھا۔ میں نے گھیر لیجھ میں کہا ”گاڑی کو کسی سائینڈ اسٹریٹ میں موڑو اور راستہ بدل کر پیچھے کی کوشش کرو۔“

”میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بولا ”کون سا

راستہ؟“

”میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بولا ”کون سا

راستہ؟“

”میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بولا ”کون سا

”جہاں ہمیں مشن کی تکمیل کے بعد جانا تھا!“

اس کے بعد شہزاد نے کوئی سوال نہ کیا۔

فیصل کی دہلی دہلی کراہیں گاڑی میں ابھر رہی تھیں۔

میں نے اس کے زخمی کندھے کا جائزہ لیا۔ شہریر گولی ٹرائی سیپ مسل میں گھسی بیٹھی تھی۔ ٹرائی سیپ کندھے کا بہت ہی اہم حصہ ہوتا ہے۔ اس کے عقب میں جوڑ کی ہڈی واقع ہوتی ہے۔ مجھے حدشہ تھا، گولی نے اس کے بازو کی ہڈی کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ شروع میں اس نے زخمی بازو کو ایک دوسرے جھکا تھا لیکن اب وہ کسی ترقی کے مانند لٹکا ہوا تھا۔ بے جان اور معطل سا!

میں نے ٹمک پاشی کرتے ہوئے کہا ”اوسٹر بلیک ہیلٹ! تم تو بہت ہی بودے ثابت ہو رہے ہو۔ ایک ذرا سی چوٹ پر عورتوں کی طرح ٹسوے بھانے بیٹھ گئے!“

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے زیر ہلے لیجھ میں کہا ”تم اپنے انہی آدمیوں سے ہماری سفارش کرنے والے تھے نا۔ دیکھو لو انہوں نے تمہیں گولی مار دی۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے پیارے!“

میں اسے تنگ کرنے کے لیے چھیڑ چھاڑ سے کام لے رہا تھا۔ وہ میرے انداز کو سمجھ گیا اس لیے کسی قسم کی بحث و تکرار کے بجائے وہ نفرت آمیز اور انتقام انگیز نگاہ سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ اس کی بے بسی اور بے کسی پر مجھے ایسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ رکھاں والی کے منطق الخان چوہدری نوازش کا فرزند اور چند اپنی زندگی کے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ اور آگے چل کر ان حالات کی نزاکت میں مزید اضافہ ہونے والا تھا۔ چوہدری نے اپنی چالاکی نہماقت سے بیٹے کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔

شہزاد گاڑی کو ڈیفنس فیوژن کی مختلف سرکوں پر گھمانے کے بعد اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ کسی دوست یا دشمن نے ہمارا تعاقب نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں اس وقت منہاس باقر کے ساتھ ایک کمرے میں بند نہایت ہی اہم امور پر بات کر رہا تھا۔ وہ پانچ منٹ پہلے حیدر آباد سے لوٹا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ کھری بنجیدگی سے میری بات سننے کے بعد بولا۔

”چوہدری نے اپنی چالاکی دکھانے کے لیے جو رسک لیا

ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے اسے اپنے بیٹے فیصل سے وہ محبت نہیں جس کا وہ دعوے دار ہے!"

میں نے کہا "منہاس صاحب! شاید آپ کا واسطہ نوازش علی جیسے چوہدریوں یا ڈیڑھوں سے نہیں پڑا۔ یہ لوگ انتہائی سخی القلب اور شفاک ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اتنی خطرناک بازی کھیلتے ہیں کہ اپنے پیادوں کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔"

"جیسا کہ چوہدری نوازش نے فیصل کے معاملے میں ثبوت دیا۔"

"میں اس چوہدری کے بچے کی زندگی خراب کر دوں گا۔" میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا "یہ آخری دھوکا ہے جو میں نے اس سے کھایا ہے۔ میرا تو عمل اسے بہت مہنگا پڑے گا۔"

منہاس نے کہا "میں اسے تمہاری جڑوں کا مایابی ہی کہوں گا کہ تم نے فیصل کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ جب تک وہ تمہارے قبضے میں ہے تمہیں چوہدری پر برتری حاصل رہے گی۔"

انے بنگلے پر پہنچنے ہی فیصل کو دوبارہ اپنی جھکڑی پہنا دی تھی۔ اس موقع پر شہزاد نے اس کی اچھی خاصی مرمت بھی کر ڈالی۔ ازاں بعد ہم نے اسے ایک ہاتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ میں نے منہاس کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔ فیصل کو مستقل طور پر اس بنگلے میں رکھنا مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا لہذا میں نے منہاس سے کہا۔

"جناب! یہ بنگلہ آپ کی رہائش گاہ ہے۔ آپ یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس بنگلے کو ہم اپنی کارروائیوں میں کسی حوالے سے استعمال کریں۔ میرے خیال میں فیصل کو کہیں اور منتقل کر دینا چاہئے۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "تمہارے دونوں دشمن چوہدری اور غوری یہ بات چاہتے ہیں کہ میں تمہیں مکمل سمورٹ دے رہا ہوں۔ تم ان لوگوں کو فیصل کی جھک دکھا کر قابو ہو گئے ہو۔ اس بات سے بحث نہیں کہ پارک سے میں اتحاد تک تعاقب کرنے والوں کا حلقہ چوہدری نوازش سے تھا یا شعیب غوری سے یا پھر دونوں کے مشترکہ آدمیوں سے! ہر صورت میں وہ لوگ آج میں دوست اور ہمارے دشمن ہیں۔ وہ لوگ اپنی ناکام بابی اور جھجکا ہٹ کھانے کے لیے ادھر کا رخ کر سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں فوری طور پر سیوری گارڈ کو الٹ کر دیتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی فیصل کے کسی مناسب بندوبست کے بارے میں

بھی سوچتا ہوں۔"

میں نے سگتے ہوئے لہجے میں کہا "منہاس صاحب! ایک بات تو طے ہے میری ساحل سیکس کراچی میں موجود ہے۔ میں اپنی کوششوں سے اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

وقت میری نگاہ میں دو ٹارگٹ ہیں۔ میں باری باری ان ہٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا "کون سا تارگٹ؟"

"جے ڈی ملک..... اور..... غلام جیلانی!"

ان دونوں افراد کے بارے میں منہاس بھی میرے ساتھ ہی جانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر ٹھکر کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے دونوں تارگٹ نہایت ہی اہم ہیں۔ ایک کا حلقہ شعیب غوری سے دوسرے کا چوہدری نوازش علی سے ہے۔ تم پہلے کے ہٹ چاہتے ہو؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے اسے چوہدری ہونے والی آخری مختصر گفتگو کے بارے میں بتایا۔

کہا "چوہدری نے جے ڈی ملک کے ذکر پر جملہ حیرت اظہار کیا ہے، اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ملک کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ واضح توقع یہی ہے کہ جے ڈی ملک جہنم مکانی میاں زاہد حسین کی جگہ کام کر رہا ہے۔" میں نے سانس لینے کے لیے ذرا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں پہلے جے ڈی ملک کی گردن تاننا چاہتا ہوں۔ دشمنی کے حوالے سے اس کا پہلا "حق" بنتا ہے۔ اگرچہ نوازش علی نے شعیب غوری سے ساحل کو واپس لے لیا۔ اس بات کے قوی امکانات ہیں وہ جے ڈی ملک کی گردن تانے میں مددگار ہو گا۔"

میں ہو۔ غلام جیلانی میرا سیکرٹ آپشن ہے!"

چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد منہاس نے مجھ سے استفسار کیا "اس معرکہ آرائی سے واپس لوٹنے کے بعد چوہدری سے رابطہ کیا ہے؟"

"ابھی نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"پہلی فرصت میں اسے فون کرو اور اس کی مکمل عہدہ اسے بے خطر ساڈاؤ ممکن ہے کوئی نئی بات سامنے آجائے۔"

منہاس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا "دریں میں فیصل کی منتقلی کے بارے میں کچھ سوچنا۔ پھر وہ اس کمرے میں دھکے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

بولا "تم اسے استعمال میں لاؤ۔ میں دوسرے فون سے کام چلاؤں گا۔"

پھر وہ کمرے میں چلا گیا۔ دوسرا فون ڈکڑکڑاتے ہوئے منہاس کے مشورے کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ ڈاننگ مکمل ہوئی تو پہلی ہی فون آئینڈ کر لیا گیا۔ اس حالت کے نتیجے میں لائن کٹ گئی۔ لگتا تھا دوسری طرف کوئی فون کے ریسپور پر ہاتھ رکھے بیٹھا کھنٹی بجتے جا رہا تھا۔

مجھے فضا تو بہت آیا لیکن دوبارہ ڈاننگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہذا میں نے اس کوشش کو دہرایا۔ اس مرتبہ دوسری کھنٹی پر ریسپور اٹھایا گیا۔ پھر میری وساحت پر ایک بولکالی ہوئی آواز نے دستک دی۔ میں نے اس پریشان حال آواز کو ایک جیسے میں پہچان لیا۔ وہ موٹی کمال والے چوہدری نوازش علی کی آواز تھی جس کی حالت اس وقت خاصی پتلی ہو رہی تھی۔

اس کی بھری ہوئی "ہیلو" کے جواب میں میں نے زہر لے لہجے میں کہا "چوہدری! خود کو سنبھالو۔ ابھی تو کھیل کی ابتدا ہوئی ہے۔ اگر تم اپنی جلدی ہانپنے لگے تو مقابلہ جاری کیسے کرے گا؟ تم پہلے راؤنڈ میں ڈھے جاؤ گے جب کہ میں آخری راؤنڈ تک جانا چاہتا ہوں۔"

"تم اپنی ناپاک زبان کو بند کرو۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے دہانہ "تاؤ میرا فیصل کہاں ہے؟"

"روڈناک عذاب میں!" میں نے پوری سفاکی سے کہا۔

"میں پوچھتا ہوں تم نے اسے کہاں چھپایا ہے؟" وہ عالم وحشت میں گر جا۔

میں نے مکمل لہجے میں کہا "تم یہ سوال کرنے کا حق کھو چکے ہو۔ یہ ممکن لوگ گردن جھکا کر مذمت کا اظہار کرتے ہیں یوں پٹا کر استفسار نہیں کرتے۔ لگتا ہے تمہارا دماغ جل گیا ہے۔"

"میں تمہاری فضول بکواس نہیں سن سکتا۔" وہ مجرد لہجے میں بولا "مجھے فیصل کے بارے میں فوراً بتاؤ۔"

"تم اپنے بیٹے کو کھوپکے ہو چوہدری!..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔" میں نے چٹائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "اب تم کی اس کی صورت نہیں دیکھ سکو گے۔ وہ زندہ ہے گا لیکن ہلکا ہونے کی دعا میں مانگے گا۔ عہد شکنی کی بڑی سزا ہوئی ہے۔ چوہدری نوازش علی! تم نے اپنی ہوشیاری میں بیٹے کو

نا قابل بیان شکل میں ڈال دیا ہے۔"

"عہد شکنی تو تم نے بھی کی ہے!" وہ زہر خند لہجے میں بولا "ہمارے درمیان ہونے والے عہد کے مطابق ٹھیک سات بجے شام فیصل کو پارک کے اندر طے شدہ مقام پر ہونا چاہئے تھا!"

میں نے کہا "وہ پارک کے اندر نہ کی مگر پارک کے باہر ضرور موجود تھا اور یہ بات ثابت بھی ہو چکی ہے۔ تمہارے بندوں نے اسے مجھ سے چھیننے کی بھرپور کوشش کی لیکن میں نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی..... اور یہ بھی سن لو میں نے یہ باتھا کیوں برتی تھی!"

"ساندو! وہ ہنسنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں نے پارک میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں فون کیا تھا۔ ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ تم نے فون بند کر دیا۔ میں نے دوبارہ تمہارا نمبر ملا یا مگر تم نے ریسپور ہٹا کر فون کھینچ کر دیا۔ تمہاری بد نیتی مجھ پر مکمل تو میں بدک گیا۔" ایک لمبے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "جب تم نے فون کے ساتھ وہ گندی حرکت کی اس وقت ہمارے درمیان ساحل پر بات ہو رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تم ساحل کو میرے حوالے نہیں کرنا چاہتے بلکہ تمہارے ذہن میں کوئی اور خطرناک پلاننگ ہے لہذا میں نے فیصل کر لیا کہ جب تک ساحل کو اپنی آنکھوں سے پارک میں دیکھ نہیں لوں گا، فیصل کو اندر لانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ دیکھو چوہدری! میرا اندازہ کتنا درست نکلا؟ تم نے ساحل کو پارک میں پہنچانے کے سلسلے میں کوئی مثبت احکام نہیں دیے بلکہ فیصل کو مجھ سے چھیننے کے لیے تم نے پارک کے باہر اپنے خطرناک پالتو کتوں کا جال بچھا دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

دوسری جانب جمیس خاموشی طاری ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور شخص سے کھسک پھر کر رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، اس نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"اگر تم مجھ پر بے اجماعی ظاہر کر رہے ہو تو میں کیسے یقین کر لوں کہ تم فیصل کو میرے بندوں کے حوالے کرنے کے لیے نیک نیت تھے۔ تمہارا جھوٹ تو اسی بات سے بڑا جارہا ہے کہ تم نے پارک کے اندر جا کر ساحل کو چپک کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری معلومات کے مطابق تم نے اس پارک کے اندر قدم بھی نہیں رکھا۔"

میں آج دوپہر کے بعد سے سہیل کے چلیے میں سرگرم عمل

ہو میں فیصل سے تمہاری بات کرادوں گا؟ کیا میں سزا  
 ایک مرتبہ بھی ساحل کے پارے میں بات کی؟ جو لوگ  
 کے بچھڑے ہوتے ہیں میں ان کے ساتھ بڑا ہی سخت  
 سلوک کرتا ہوں۔ جھوٹی آن بان اور شان والے نرغے  
 میں تمہاری اصلیت لکڑش کر کے دم لوں گا۔ اے مرزا  
 تمہیں اندازہ نہیں وجدان کی طوفان کا نام ہے؟“  
 میرے الفاظ میں ایک عین دم محکم پڑ پڑا تھا۔  
 اس نے پوچھا، ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

میں نے نہایت ہی گھبرے ہوئے لہجے میں کہا "بچہ  
عرصے سے میں تمہارے پیچھے بھاگتا آیا ہوں۔ اب رہا  
عمل شروع ہو گیا ہے۔ میں تم سے ساحل کے پار سے  
سوال کروں گا اور نہ ہی مطالبہ اسے اپنی حکمت علیٰ اوزار  
سے حاصل کروں گا۔ تم جیسے پشت دکھانے والے ہیں  
چوہدری سے کیا کلام کرنا ممکن....." میں نے دانستہ جملہ  
چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اس کے کانوں کے کیڑے سے  
ہوئے کہا "آج کے بعد تم میری حفاظت میں رہو گے۔  
پھر دسے کیوں کر فیصل تک پہنچنے کے لیے تمہیں میری ضرورت  
ہوگی اور میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اس کا  
فیصل تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ تم اس کی ایک  
دیکھنے کے لیے رو رو کر چینیٹا کھودو گے اور میری وجہ سے  
بے نقصانات اٹھاتے رہو گے۔ میں تمہیں تمہاری چوہدری  
اور تمہارے نہایت دیک کر تار تار کروں گا۔ یہ وجدان کا وعدہ  
"۱"

”اب اس بجواس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔“ میں نے  
کی بات کاٹ کر کہا ”جو ایک بار دھوکا کرے وہ بار بار دھوکا  
دے۔ تم میری نظر میں دغا کے ٹھکانے اور ذلیل ترین انسان

میں نے کھانا سائل کو حاصل کرنا میری ذمہ داری ہے  
 اسے کہیں بھی چھپا لوں میں اسے پاتال سے بھی سچا لائوں گا  
 ایک مرتبہ پھر مجھے محسوس ہوا وہ اپنے پاس موجود کچھ  
 سے مسکوت کر رہا ہو۔ میرے ذہن میں خدشہ پیدا ہوا کہ  
 وہ مجھے ٹریس کر دے گا۔ کی بہم میں نہ لگا ہو۔ میں نے سنبھلا

وقت کراچی کے ایک معروف پبلشر کے گھر سے بات

ہوں اور فون رکھنے کے بعد یہاں سے نکل جاؤں گا۔  
میں نے پہلے ہی ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دیا ہے۔ آمین

10-112

شخص تھا اور اپنی مذاق کی بات بہت کم ہی اس کی زبان سے  
سننے میں آتی تھی لہذا میرا حیران ہونا فطری بات تھی۔ میں نے

اس تبصرے پر ملاحظہ ہوتے ہوئے منہاس باقر سے پوچھا۔

”بہت ہی جاندار انتظام کر کے آ رہا ہوں۔“ وہ

اپنی مخصوص سنجیدگی سے بولا ”ہم چوہدری لمبڈے کو ایسی جگہ

شفٹ کریں گے جدھر بھولے بھٹکے سے بھی دشمنوں کا دھیان نہیں آسکتا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”ایسی جگہ کو؟“

ہو سکتی ہے جناب؟“

”وہی بنگلہ جہاں یصل کو آج شام تک رکھا گیا تھا!“

”تم کیوں الجھڑے ہو؟“

منہاس باقر مختصر سا جملہ بول کر چند لمحات کے لیے

خاموش ہو گیا۔ اس نے بالکل درست کہا تھا، نیٹکے والی بات پر

میں کوئی الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ بات ہی ایسی تھی۔ کچھ پوچھے کے بجائے میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا تو وہ وضاحت

کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے ابھی بختیار کامل سے بات کی ہے۔ اس نے مجھے یہ بتایا کہ اگر آپ کو یہ سچا لگا تو یہ سچا ہے۔“

کارروائی مکمل کر لی ہے۔ تمہارے بیان کے مطابق وہاں تین

لاشیں دوزخی اور ایک شخص بے ہوش پڑا تھا لیکن پولیس نے

وہاں سے پانچ لاکھیں برآمد کی ہیں۔ بے ہوش حصہ وہاں نہیں

رو رو دکھائی نہیں دی۔ صرف وہاں ”جی ٹواؤ“ ون ٹوفا سوکھڑی

ملی ہے اور.....“

میں نے منہاس کی بات کاٹتے ہوئے بیجالی کچھ میں  
کہا ”آپ کا مطلب ہے کہ یہ شخص جو خداوند کے قریب ہے“

وقت ہوش آگیا تھا اور وہ باس نما دراز قامت اس نے دوشدید

زخمی ساتھیوں کو شوٹ کرنے کے بعد ریچ روور میں وہاں سے

فرار ہو گیا ہے؟“

قیاس ہے۔“

میں نے کہا ”جناب! یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اگر وہ دراز

قامت بے ہوش گھر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو ہماری

لاشوں سے کیا مطلب اخذ کریں۔“

”ہماری پوزیشن اس صورت میں بھی بہت صاف ہے

10-113

وجدان! وہ اعتماد لےجھ میں بولا "میں نے بختیار کا مل سے رپورٹ لینے کے بعد متعلقہ تھانے بھی فون کیا ہے۔ اس معاملے کی تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر سے میری بات ہو چکی ہے۔ اس کا کہنا ہے دو مخالف مجرمانہ گروہ اس جنگل میں گھمائے ہیں۔ ہم کسی بھی طور اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھے جارہے۔ بے ہوش شخص کے غائب ہونے سے اس لیے بھی فرق نہیں پڑتا کہ ہاں کی دیواریں اور چھت ہمارے غیر متعلق کی گواہی دے رہی ہیں۔ ان مقامات پر فائرنگ نے اپنے ان صحت اور بین ثبوت چھوڑے ہیں اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"اوہ!" میں نے ایک مطمئن سانس خارج کی "یہ بہت اچھا ہوا!" پھر میں نے پوچھا "کیا پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد بنگلہ ہمارے تصرف میں دے دیا ہے؟" "ان کا تو لبیا چڑا ہر دم کرتا۔" منہاس باقر نے بتایا۔ "لیکن میں نے اپنے تعلقات اور صحافتی حوالہ استعمال کیا۔ وہ لوگ کل فاسٹ ڈنٹ کریں گے۔ میرا خیال ہے دو پہر کے بعد ہمیں اس جنگل کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی اجازت مل جائے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کل شام تک ہی فیصل کو وہاں شفٹ کیا جاسکتا ہے!" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "لیکن اس مرتبہ وہاں زیادہ ریش نہیں لگایا جائے گا۔ فیصل کے لیے کوئی ایک گھرانہ کافی ہوگا۔ تم جلد از جلد اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرو۔ بہر حال اسے زیادہ عرصے کے لیے اس طرح قید و بند میں نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ تمہارا شکار ہے۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ تم ہی کر سکو گے!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "میں دو چار روز میں اس کی قسمت کا فیصلہ کروں گا۔ ڈرامے میں بے ڈی ملک اور غلام جیلانی کی "خیر و عافیت" جان لوں۔" "جتنی جلدی ممکن ہو سکے، فیصل والے معاملے کو ختم کرو۔"

منہاس نے کہا "تمہارے سر کرنے کے لیے ابھی بہت سے پہاڑ باقی ہیں۔" فیصل کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لیے تازہ ترین صورت حال سے آگاہی ضروری ہے۔ "میں نے کہا "چوہدری نواز شین سے مجھ سے جتنا بڑا دھوکا کیا ہے اس کا ایک خطرناک پس منظر ضرور ہے۔ میں اس پس منظر کو جاننا چاہتا ہوں۔ اگر ساحل کو میرے حوالے کیے بغیر فیصل کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی گئی ہے تو اس کا بھی مطلب ہے انہوں نے

بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ بہت کچھ طے کر رکھا ہے۔" "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "چوہدری نواز ہو یا شعیب غوری ان لوگوں کی نیت درک بہت مشکل ہے۔ اس نیت درک کے کرنا ہر لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "منہاس صاحب آپ کے دفتری استعمال والی گرین ہائی روف شام صابر معرکے میں بڑی سرگرم رہی ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چیزنگ میں تھوڑے وقفے کے لیے ایک پولیس سوبائل شامل رہی ہے۔ ممکن ہے ہماری ہائی روف کا نمبر وغیرہ پورے کے ریکارڈ پر آچکا ہو۔ لہذا کچھ عرصے کے لیے اس گاڑی منظر عام پر نہیں آتا چاہئے۔ مجھے خدشہ ہے کہ پولیس وار جنگلے پر ہونے والی چاند باری کو اس کار چیزنگ سے متعلق کر دیں۔" میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہوا تو گرین ہائی روف ہمارے بے مشکلات گھڑی کر سکتی ہے!"

"تمہاری بات میں وزن ہے لیکن یہ بھی تو سوچو! واقعی ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا گیا ہے تو اس نمبر ذریعے بھی ہمارا سراغ لگایا جاسکتا ہے بہر حال۔" وہ چہرے سوچنے کے بعد بولا "میں چند روز کے لیے گرین ہائی روف منظر سے ہٹا دوں گا۔ ویسے بھی اس میں خاصی ٹوٹ پھڑ ہو چکی ہے۔ اسے بھر پور آرام اور باہر آنے مرمت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی....." وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "میں سہیل کو کچھ عرصے کے لیے چھٹی دے دوں گا کہ تم اس کے روپ میں آزادانہ محوم پھر سکو۔ انہ جھپٹے دنوں مجھ سے چھٹی کے لیے کہا بھی تھا۔"

پھر منہاس باقر نے بتایا کہ سہیل کا تعلق فیصل آباد تھا۔ اس کے والدین وہاں رہتے تھے البتہ بیٹی کے بہت لوگ کراچی میں بھی سہیل تھے۔ اس جنگی ملاقات کے بعد پر میں نے کہا۔

"اس وقت فیصل آپ کے جنگلے کے ایک ہاتھ بندے ہے۔ کیا کل دو پہر یا شام تک وہ یہیں رہے گا؟" "مجبوری ہے!" اس نے کندھے اچکانے "سہیل کی کفایت کے بعد ہی اسے وہاں منتقل کیا جاسکتا ہے۔" "فیصل والا معاملہ ابھی تک میری نظر پر علم میں نہیں آیا۔ اگر گھر کے افراد میں سے کسی کو معلوم ہو کہ گھر میں ایک شخص کو تھوڑی لگا کر ہاتھ روم میں بند کیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ میں سوچ رہا ہوں....."

وہ جملہ مکمل چھوڑ کر الجھن زدہ نظر سے مجھے تنگے لگا۔ میں اس کی پریشانی کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا۔ فیصل کو اپنے اندر قید رکھنے والا معاملہ واقعی بہت نازک تھا۔ منہاس نے میری دوستی میں کہہ دیا تھا کہ کل شام تک فیصل کو یہیں رکھیں گے لیکن جنگلی طور پر یہ درست نہیں تھا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرنے کی خاطر منہاس سے پوچھ لیا کہ "منہاس صاحب! ایسا کرتے ہیں فیصل کو کورنگی شفٹ کر دیتے ہیں۔ کل شام کو اسے جنگلے پر منتقل کر دیا جائے گا۔"

"کورنگی کیوں اور کس جگہ؟" اس نے سوال کیا "میں نے بھٹائی کالونی کے آخری حصے میں واقع شہزاد کے خفیہ ٹھکانے کا ذکر کیا اور کہا "ہم گزشتہ رات پوچھ کچھ کے لیے فواد کو وہیں لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ شہزاد کے پاس سرجانی ٹاؤن میں بھی ایک ایسی ہی محفوظ جگہ ہے، بس ایک رات..... بلکہ آدھی رات اور آدھے دن کی بات ہے۔" فواد والا واقعہ اس کے علم میں تھا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "شہزاد خاصا چلا پڑھ قلم کا بندہ ہے۔ میں نے اسی لیے اسے تمہارے ساتھ لگایا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا "سرجانی ٹاؤن تو شہر کو دوسرا کنارہ ہے۔ اس وقت ہم ڈسٹرکٹ سادھ کے اختتام پر بیٹھے ہیں البتہ بھٹائی کالونی یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ ادھر کارنگ کرا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں شہزاد سے بات کرتا ہوں۔"

پھر اگلے ہی لمحے اس نے شہزاد کو بھی وہیں بلا لیا۔ اور اس مسئلے پر جدلہ خیال ہوا جس کے نتیجے میں سبکی طے پایا کہ فیصل کو درست بھٹائی کالونی والے ٹھکانے پر منتقل کر دیتے ہیں اور اس کی نگرانی کے لیے شہزاد خود وہاں موجود رہے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت آج کل کی طرح بھٹائی کالونی میں اس قدر دست و پائی تھی..... اور شہزاد کا وہ خفیہ ٹھکانا آبادی سے خاصے فاصلے پر سمندر کے نزدیک تھا۔

فیصل والا معاملہ طے پا گیا تو منہاس باقر نے مجھ سے پوچھا "تم تو یہ رات یہیں گزارو گے نا؟"

اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ شہزاد فیصل کو تھوڑا کھلانے پلانے کی غرض سے وہاں سے مٹ گیا تھا۔ فیصل کا بایاں کندھا شدید دھجی تھا۔ میرے اغماز سے کے مطابق کوئی گوشت کے اندر گدی۔ گولی کو برآمد کرنے کے بعد مناسب ٹریٹ منٹ ضروری تھا ورنہ خطرناک نتائج کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے شہزاد کو

خصوصی ہدایات دے دی تھیں۔ فیصل کی "بیمارداری" کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی تھی وہ میں نے اسے بتا دیں۔ وہ لاکھ دکن سبکی اور کروڑ دکن کا بیٹا لیکن جب تک وہ میری کسٹڈی میں تھا انسان ہونے کے ناطے اس کی انتہائی ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض بنتا تھا۔

سوال کرنے کے بعد منہاس جواب طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "میری تو یہ خواہش ہے میں طارق روڈ والے فلیٹ پر چلا جاؤں۔"

"میں تمہاری خواہش کے راستے میں دیوار نہیں بنوں گا۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔

"میں تو یہ بات اس لیے پوچھ رہا تھا کہ وہ بہت بے چین ہو رہی ہے۔ دو تین مرتبہ وہ تمہارے بارے میں مجھ سے استفسار کر چکی ہے۔"

"وہ کون؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"میں زرگل کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ!" میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ زرگل آج شام منہاس باقر کی بیٹی کے ساتھ ویدیک تقریب میں شرکت کے لیے حیدر آباد تھی اور جب سے یہ لوگ واپس آئے تھے میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ زرگل کی بے قراری بے جا اور برہنہ تھی۔ وہ میری ہم کے بارے میں جاننے کے لیے مجھے مضطرب ہوئی۔

منہاس نے مزید کہا "اگر آپ لوگ یہاں رکتا چاہتے ہوں تو میں آپ دونوں کے لیے شب بھری کا لگ بندوبست کر داتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے ہمارا فلیٹ پر جانا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔" میں نے جتنی سمجھ میں کہا۔

"لیکن جب تک میں فیصل کو بھٹائی کالونی والے ٹھکانے پر چھوڑ نہیں آتا زرگل ہمیں رہے گی۔ واپسی میں میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

منہاس باقر نے میری بات سے اتفاق کیا پھر ضروری امور نذرانے کے لیے ہم اپنی اپنی جگہ پر مصروف ہو گئے۔

گرین ہائی روف کوئی الحال باہر نکالنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لائٹ گرین ہوٹل اسوک ہم ناممل جنگلے پر چھوڑ آئے تھے البتہ معلوم کرنے پر مجھے جھپٹا کہ یہ ہوٹل نہیں جنگلے پر موجود تھی۔ فیصل کی منتقلی کے لیے کسی خاص گاڑی کو استعمال کرنا زیادہ مناسب اور محفوظ تھا۔

ٹھیک دو بجے رات..... ہم منہاس باقر کے جنگلے سے روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شہزاد موجود تھا۔ میں فیصل



کے ساتھ جی ٹی ٹسٹ پر بیٹھا تھا۔ فیصل کو کنٹرول کرنے کے لیے نیندا کا انجکشن دے دیا گیا تھا۔ اس سے قبل اسے تھوڑا کھلا پلا تھا۔ یہ ہم نے بھی چند تھوڑے ذرے کے نام پر اپنے معدوں میں اتار لیے تھے۔ فیصل کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ وہ آنکھیں موندے خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی گردن کو ٹسٹ کی پشت گاہ سے ٹکانے کے بعد اس کے کندھے پر اپنا بازو چڑھا دیا تاکہ دور سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو کہ ہم یہ تکلفی سے بیٹھے ہیں۔ کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے شہزاد نے ایک لوڈز کلاشکوف اور ایک پستول بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ ازیں علاوہ ہلکی سرجری اور مرہم پٹی کا ضروری سامان بھی ہم ساتھ لے آئے۔ فیصل کے کندھے میں سے گولی نکالنا بے حد ضروری تھا۔

ہیلو ہنڈائی نے بھی کیا قسمت پائی تھی۔ وہ جب سے میرے تصرف میں آئی اس کے ”نصیب“ مکمل گئے۔ پہلے ہم نے اسے استعمال کرتے ہوئے کرم اپارٹمنٹس میں فواد والا معاملہ نہایا۔ بعد ازاں اسی گاڑی میں فواد کو بھائی کالونی والے ٹھکانے پر لے جایا گیا اور اب..... فیصل بھی اس پہلی سواری کی مسافرت کا لطف اٹھا رہا تھا۔

اس سفر کے دوران میں میرا ذہن برق رفتاری سے ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ آج کی رات ہم دونوں ایک ہی جھٹ سے فٹے گزراں گے۔ گزشتہ چند روز ہم نے جس کرب ناک بھر میں گزارے تھے وہ کئی صدیوں پر بھاری تھے۔ جدائی میں بیٹے ہوئے ایک ایک لمحے کو میں شمار کرنا چاہتا تھا؛ وصل کی گھڑیوں میں یک ٹک میں ساحل کا دیدار کرنا چاہتا تھا کہیں سب کچھ ملایا میٹ ہو گیا..... چوہدری کی دعا بازی نے میری امید اور آس پر پانی پھیر دیا۔ یہ ایک ایسی گھٹکت تھی جس کا داغ میں چوہدری کے خون سے دھونا چاہتا تھا؛ چاہے وہ خون فیصل کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔ چوہدری نواز اس علی نے یہ گھٹکت بیٹے کو داد پر لگا کر میرے حصے میں ڈالی تھی؛ گویا فیصل کی جھٹ چڑھا کر اس نے مجھے توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں ایسے باپ بھی ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کو فیصل کی طرح داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ ایک مکمل حقیقت تھی اور آنکھوں دیکھے اس لیے کو کھٹلا نا ممکن نہیں تھا۔

ہم کسی بدحظی کے بغیر شہزاد کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ گزشتہ رات بھی دو بجے کے بعد

ہی ہم یہاں آئے تھے۔ فواد نے اس ٹھکانے پر نہایت عرصہ راز رکھے تھے۔ ایٹ کے پاس سراج الدین اور غلام کا تعلق میرے لیے بہت معلومات افزا تھا؛ پھر شاز نے ایک دلچسپ اور سنسنی خیز کردار عیاں ہونے والی تھی۔ ایک سو میں گزرتے پر مشتمل شہزاد کے اس ٹھکانے صرف ایک ہی کمرانا ہوا تھا جس میں ایک مشکل بیزا کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ بیڈ کے نیچے ایک پرانا سا جوتہ صندوق بھی موجود تھا۔ اس صندوق کو دیکھ کر میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ اس کے اندر تارچہ کا سامان ہوگا۔ گزشتہ روز اس صندوق کو کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی مگر آج سب سے پہلے شہزاد نے اسی صندوق کو کھولا۔

صندوق کسی پنڈورا بکس سے کم نہیں تھا۔ شہزاد نے اس کے اندر سے ایک طویل لٹری زنجیر برآمد کی اور فیصل پر فخر آگئی پابندیاں عائد کرنے کے لیے مختلف کارڈز اور تلوں پر مصروف ہو گیا۔ اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچتے ہی ہم نے فیصل کو پر لٹا دیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ چند لمحات کے بعد فیصل کا ہاتھ بندشوں سے آزاد کرنے کے بعد اس بیڈ تک محدود کر دیا۔ پھر میں اس کے زخمی کندھے کا یہ غور جائزہ لینے لگا۔

فرسٹ ایڈ اور سائنس سرجری کا سامان ہم بٹنگے سے لے کر ساتھ لائے تھے۔ اس بات کی تصدیق ہونے کے بعد گورگور فیصل کے جسم میں موجود ہے؛ شہزاد کی تشویش میں بے ہوش اضافہ ہو گیا۔

”وہ جان! گولی نکالنے سے پہلے اسے نیندا کا ایک انجکشن نہ دے دیں؛ وہ فیصل کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا“ سرجری کے دوران اسے بے پناہ تکلیف ہوئی اس کی ہڈی ٹوٹ جانا لازمی ہے۔ پھر یہ جس طرح ڈکرائے گا وہ ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے!“

میں نے فرسٹ ایڈ کٹ کھول کر اس کے اندر نگاہ دوڑائی پھر مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”مزید کسی انجکشن کی ضرورت نہیں۔ اسے بہت زیادہ گہری نیند میں پہنچا کر اسے خطرناک ہوگا۔ اس کی تکلیف کا بندوبست میں لوکل دوا کرلوں گا۔“

”لوکل؟“ شہزاد نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ”گلتا ہے میڈیکل کے بارے میں تمہارا معلومات زیادہ نہیں ہے!“ پھر میں نے اسے زائلو کیا۔ ان کی وائل دکھاتے ہوئے کہا ”اس شیشی میں گوشت کو کس کرنے کی دوا ہے۔ میں فیصل کے کندھے کے متاثرہ حصے کو اس انجکشن کی مدد سے مرن کر دوں گا یعنی لوکل کر دوں گا“ پھر سرجری

کے دوران اسے تکلیف کا احساس نہیں ہوگا۔“ ”اوہ!“ اس نے ایک حسانانہ سانس خارج کی ”تم تو ایک مشن ڈاکٹر کی طرح مجھے اس عمل کے بارے میں بتا رہے ہو۔ کیا تم میڈیکل کے اسٹوڈنٹ بھی رہ چکے ہو؟“ ”ہاں قاعدہ نہیں بلکہ بے قاعدہ!“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔ میں اس گفتگو کے دوران میں اپنا کام بھی جاری رکھے ہوں تھا۔ شہزاد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”میں نے باقاعدہ کسی میڈیکل انٹینیوٹ سے یہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن میرے حلقہ احباب میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور رہا ہے۔ ان لوگوں کی صحبت نے مجھے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا ہے۔“

اس نے اچانک پوچھا ”ان دنوں تم کس ڈاکٹر سے وابستہ ہو؟“

”ڈاکٹر صدف!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ ”وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا“ صدف..... میں نے تو اس نام کی کوئی لڑکی تمہارے آس پاس نہیں دیکھی!“

میں نے اسے صدف کے بارے میں کچھ تفصیل بتائی پھر فیصل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ فیصل صدف ہی کی بہرائی سے میرے بچے چڑھا ہے۔“

اس کے بعد میں نے شہزاد کو صدف کے عسکری فن کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری بات سنتا رہا پھر جو شیشی لکچ میں بولا ”میرے اندر صدف سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔“

”انسان کے اندر اگر کسی شے کا شوق پیدا ہوا جائے تو پھر وہ جلد یا بدیر اپنے مقصد کو حاصل بھی کر لیتا ہے۔“ میں نے اپنے ہاتھوں کو مصروف رکھتے ہوئے کہا ”انشاء اللہ بہت جلد تم صدف سے ملاقات کرو گے۔“

یہ بات میں نے بے دھیانی میں ایسے ہی کہہ دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا مستقبل میں میں صدف سے کب اور کہاں ملوں گا۔ صدف کے تذکرے نے میرے ذہن میں اس کے خیال کو اجاگر کر دیا۔ وہ ایسی لڑکی تھی جو کسی جموٹکی کی طرح آئے اور گزر جائے۔ وہ بڑی جاگزیں اور تاثر انگیز شخصیت کی مالک تھی۔ ذہن میں اس کا تصور روشن ہوا تو پھر اس کی باتیں اور گھٹائیں یاد آئیں لگیں۔ اگر وہ اس موقع پر یہاں موجود ہوتی تو مجھے کسی ماہر سرجن کی طرح کام کرنے کی دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی، پھر میرے لیے جواب دہی مشکل

ہو جاتی کہ میں نے فن یہ کہاں سے حاصل کیا ہے! وہ شہزاد کی طرح آسانی سے مطمئن نہ ہوتی۔ اس کی تسلی کے لیے مجھے خاصی کرب بازی کا مظاہرہ کرنا پڑتا۔ جتنا تک کی کرب بازیوں نے اس کے دماغ کو التماسیدھا کر دیا تھا۔ اسے قائل کرتے ہوئے ذہن کی چوکیں مل جاتیں!

میں صدف کی حساس کوشش کے بعد میں نے فیصل کے زخمی کندھے کی سرجری کر ڈالی۔ اندر دھکی گولی کو میں نے بڑی احتیاط سے باہر نکال لیا۔ ابتدائی معائنے سے مجھے اندازہ ہو گیا جوڑ کی ہڈی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ زخم کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد میں نے اسے کچل گائے اور ڈریسنگ کر دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے فیصل کو ایک پین بک انجکشن بھی دے دیا۔ تاکہ ہوش میں آنے کے بعد وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہ کرے۔

”اب میں چلوں گا شہزاد!“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔“ اس نے پراعتاد لکچ میں کہا ”کل دوپہر سے پہلے اس طرف چکر لگالینا۔ یہاں فون کی سہولت میر نہیں اور میں فیصل کو کتنا چھوڑ کر باہر سے کال کرنے کا رسک نہیں لے سکتا۔“

میں نے کہا ”میں ہیلو ہنڈائی اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ کل صبح تم سے ملاقات ہوگی۔ اس ٹھکانے کے بارے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا لہذا مجھے ہی تمہارے پاس آنا ہوگا۔ یہ رات تم جیسے تیسے اس ”مریض“ کے ساتھ یہاں گزرارلو۔“

وہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ میں نے لوڈ کلاش کوف اس کے حوالے کر دی اور کہا ”مجھ سے زیادہ تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“

اس نے زرب مسکراتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر میں اس ٹھکانے سے رخصت ہو گیا۔ شہزاد پچھلے کچھ دنوں سے میرے تجربے میں تھا اور میں نے اسے قائل بھر دیا پایا تھا لہذا فیصل کے سلسلے میں اس پراعتاد رقابت آمیز نہیں تھا۔

لگ بھگ تین بجے میں منہاس باقر کے بٹنگے پر پہنچ گیا۔ اس کے سوا گھر کے بانی افراد سو چکے تھے۔ میں نے اسے فیصل کے تازہ ترین حالات کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کیا تو وہ مجھے ایک الگ تھک کرے میں لے آیا اور بولا ”تمہاری ساتھی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کئی مرتبہ پوچھ چکی ہے۔ کہو تو اسے یہاں بلا لوں گے نہیں دیکھ کر اس کی تسلی ہو جائے گی!“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”دشمنوں کے ذکر یاد آیا کہ تم آج شام چوہدری نواز شعلی سے ایک بہت بڑا ذیل کرنے والے تھے۔ اس کا کیا بیجا؟“

میں نے کہا ”اس کے بارے میں“ میں تمہیں تفصیل۔

ذکر لے بیٹھی۔ مجھے تمہارا خیال کرنا چاہیے۔“  
آخری جملہ اس نے بڑی محبت اور خلوص سے ادا کیا۔

یہ بیان لیا تھا تو میں اس کے حسن و حسن نظر خواہ نہ ہو رہا تھا۔

وہ بستر پر بیٹھے ہوئے بولی ”تم نے کیا سنا تھا؟“  
 ”بھی کہ تم لوگ قرض کی وصولی اور ادائیگی میں بہت  
 اصول پابند ہوتے ہو!“

کر ڈالا۔

میں نے رواروی میں کہہ دیا "نہیں ایسا کچھ غلط بھی نہیں ہے۔"

"وہ جان! وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی "میرے اس فعل میں روایتی اصول اور ضابطے کا کوئی دخل نہیں۔ یہ نہ کوئی بدلہ ہے اور نہ ہی کوئی قرض۔ میں تمہاری حالت اور کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم ایک بھر پور اور سکون آور نیند لو۔ کوکٹ آئل کا مساج کہیں گہری نیند میں اتار دے گا۔ بس اتنی بات ہے!"

"یہ جتنی سی بھی بات ہے بڑی اچھی بات ہے!" میں نے جیسے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں "تم کوکٹ آئل کو میرے سر میں اتار دے میں نیند کی وادی میں اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی..... میں نہایت ہی پرسکون تھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی۔ ایک گھنٹے کی یہ نیند میری ذہنی اور بدنی تھکاوٹ کو زائل کر دے گی!!!!

میری یہ ہدایت ختم ہوئی تو مجھے اپنے سر میں نفسی سی اترتی محسوس ہوئی۔ زرگل کی مخروطی موسیقی انگلیوں کا ترم بڑے دھیمے اور رومانی انداز میں آئل کے ساتھ چھیڑ خانی میں مصروف تھا۔ اس کی انگلیوں کی چلبلی جنبشوں میں ایک جادو سا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ میرے سر میں مساج نہ کر رہی ہو بلکہ کوئی مہر چھوکتی رہی ہو۔

اس جادو گرئی کی یہ مہر کاری جاری رہی اور پتا نہیں میں کب نیند کی گداز آغوش میں چھپا چکا۔ میں ڈوٹھ سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری ہدایت کے اثرات تھے یا زرگل کی کیف اور کوشش کے ثمرات! احسن کی فسوں گرئی عقل کی چارہ گری پر ہمیشہ حاوی رہی ہے۔

☆☆☆

ٹھیک پانچ بجے میری آنکھ کھل گئی۔  
کمرے کی لائٹ آن تھی۔ ہلک جھپٹے میں مجھے کسی خوش گوار تہی کا احساس ہوا۔ ایک گھنٹا پہلے میں جیسے پر سر رکھ کر سویا تھا لیکن اب میرا سر زرگل کے زانو پر ٹکا ہوا تھا۔ میری قوت لاسہ نے گداز کی اس تفریق کو محسوس کیا تو میرے رگ و پے میں بجلی سی کوند گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زرگل نے میری نیند کے دوران میں جیسے کو اپنی تھائی

سے بدل لیا تھا۔ وہ میرے پہلو میں اس طرح نیم دراز تھی کہ اس کی ایک ٹانگ دراز اور دوسری فولنگی۔ اس نے ٹیک کر کر کے بیڈ کے سر ہانے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس نیم دراز کی حالت میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔

میں جب یک لخت اٹھ کر بیٹھا تو میں نے واضح طور پر محسوس کیا زرگل کو میری بیداری کا پتا چل گیا تھا لیکن وہ آنکھیں موندے یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے گہری نیند میں ہو۔ میں چند لمحات تک یک ٹنگ اس "خواہیدہ" مریض حسن کو دیکھا رہا اور بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ میری اس مسکراہٹ میں حیرت اور استحباب نہیں بلکہ ایک ناقابل بیان سی معنی آفرینی تھی زرگل کے اس انداز میں بڑی یقینی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا وہ زرگا کھلی یا کھل کا زرا!

میں نے ایک بھر پور نگاہ اس کے مجسم سر پایا پر ڈالی اور بہتر چھوڑ دیا۔ دس منٹ بعد میں اپنی ابتدائی ضروریات سے نمٹ کر فارغ ہو گیا۔ پھر میں نے سرک کی جانب کھلے والی کھڑکی وا کر دی ان دنوں موسم خاصا گلابی ہو رہا تھا۔ خشک ہوائ نے میرے چہرے پر یوسہ دیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے چند گہری اور متوازن سانس لیں پھر قاتلین پوش فرش پر آسن جما کر یوگا کی نہایت ہی اہم مشقیں کرنے لگا۔

نقلی وجدان کے نصیحت آمیز الفاظ میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر میں "جی" کی مشقوں کی طرف سے غافل ہو جاتا تو وہ نقلی وجدان یعنی میرا پر تو کسی بڑی کی قوت کے قبضے میں چلا جاتا..... اور یہ مجھے کسی طور منظور نہیں تھا۔ "جی" کی ان ایڈوائس مشقوں کو بڑے اٹھنا کہ ہے اس دوران میں میں اپنے گرد و پیش سے یک سرے گانہ ہو جاتا تھا۔

میں نے مخصوص مشقوں سے فارغ ہونے کے بعد آگے کھولی تو زرگل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بڑی خوبیت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہ چار ہوئیں تو وہ دھیرے سے مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔

"تم کب اٹھی ہو؟"

"تم اتنی جلدی کیوں بیدار ہو گئے؟"

"مجھے تو ایک گھنٹے بعد اٹھنا تھا..... اس لیے لیٹ گیا تھا۔"

تم جواب دے بغیر ایک دوسرے سے سوال پوچھ جا رہے تھے۔ بالآخر اسے ہار ماننا پڑی۔ بولی "پتا نہیں میں اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں لائٹ جل رہی تھی میں نے دیکھا تم بستر پر موجو نہیں تھے پھر تم مجھے ادھر قاتلین

نظر آئے جب سے اب تک تمہیں ہی دیکھے جا رہی ہوں۔ نظر آئے تیسری سید و غریب اور انٹی سید مشقیں کئے معلوم نہیں کسی سر پہ کسی ناخن اور اور کسی پچم پچما! جادو ہے۔ کسی سر پہ کسی ناخن اور اور کسی پچم پچما! جادو ہے۔ اس کی حیرت اور الجھن پر میں مسکرا اٹھا۔ مشقوں کے

حوالے سے اس کا بیان درست تھا مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ چاک اس کی آنکھ کھلی ہو۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یا تو وہ ابھی تک سوئی ہی نہیں تھی یا پھر میرے اٹھنے سے اس کی آنکھ کھلی تھی لیکن اس نے مجھ پر خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت کی فطری چالاکی کا مظاہرہ کر رہی تھی جسے بولے پٹانے ڈھاب رکھا تھا۔

میں نے اس کی خوش بھی برقرار رکھتے ہوئے کہا "مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ تم میرے سر میں کوکٹ آئل کا مساج کر رہی تھیں اور میری آنکھ کھل گئی۔ شاید تم بھی میرے قریب ہی سو گئی تھیں، میری آنکھ کھلی تو تم بے خبر سو رہی تھیں۔ میں دھیرے سے اٹھا اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔"

"میں تو بھی بیدار تھی تم حج دیر تک سو گئے لیکن ابھی تو صبح ہونے میں بھی دیر ہے۔" وہ ایک انگڑائی لے کر بدن کو تڑپتے ہوئے بولی "تم نے بتایا ہے تمہیں تو ایک گھنٹے بعد ہی اٹھا تھا اور میں دیکھ رہی ہوں تم تو تیار بھی ہو چکے ہو۔ کیا کوئی خاص پروگرام ہے؟"

"ہاں خاص ہی پروگرام ہے۔" میں نے جھللاتی ناخن سے نگاہ چراتے ہوئے کہا "میں ایک دو گھنٹے کے لیے فلیٹ سے باہر جاؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ میں فلیٹ کی ایک چابی ساتھ لے جاؤں گا۔ واپسی پر میں خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ جاؤں گا۔ اس دوران میں تم اپنی نیند پوری کر لو۔ تمہارے حالیہ تیروں سے مجھے یقین ہو گیا ہے اب تم نے ڈرنا چھوڑ دیا ہے تم خاصی بے باک ہو گئی ہو!"

آخری جملہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ ڈر سا سمجھتی اور نگاہ چراتے ہوئے بولی "واقعی میں محسوس کر رہی ہوں کہ ڈر اور خوف بڑی حد تک زائل ہو چکا ہے۔ میں اپنے اندر ایک کافیڈس محسوس کر رہی ہوں۔"

"اگر تم اسی طرح غر بننے کی کوشش کرتی رہیں تو مجھے یقین ہے تمہارا کافیڈس اور بڑھ گا۔ غرائی اٹ اپ!" وہ اچانک موضوع بدلتے ہوئے بولی "تم ایک دو گھنٹے کے لیے کھانا پروگرام سے جا رہے ہو؟" میں نے سردست اور قہر از وقت اسے تفصیل بتانا ضروری نہ سمجھا ورنہ یا تو وہ میرے ساتھ جانے کی ضد کرتی یا

پھر متعدد سوالات نکال کر بیٹھ جاتی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "مجھے کسی شخص سے ملنے جانا ہے۔ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اسے آف کرنے ڈیٹس سوسائٹی تک جاؤں گا۔"

اس نے خشک زدہ نظر سے مجھے دیکھا لیکن کوئی اعتراض نہ کیا، بس اتنا ہی کہا "ڈرنا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ میں اب اتنی بھی ڈر اور بے خوف نہیں ہوں!"

"تم فکر نہ کر ڈر ہی سہی کمر بھی پوری ہو جائے گی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "میں داہن آؤں گا پھر ناشتا کریں گے۔"

وہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس دوران میں دو تین مرتبہ اس نے خاصی کشادہ جھپٹیں بھی لیں۔ میں نے فلیٹ سے رخصت ہونے سے پہلے اسے ہدایت کی کہ وہ آرام سکون سے سو جائے۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔

اس نے مجھے "خدا حافظ" کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیش ایک گھنٹا باقی تھا۔ میں نے دعائیت شیر ڈو کچ نہیں کیا اور پیدل ہی لبرٹی کی جانب بڑھ گیا۔ لبرٹی غسل کے قریب رات بھر دو تین ٹیکسیاں کھڑی رہتی تھیں۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ڈیٹس، کلشن اور انہی جیسے دوسرے پوش علاقوں میں لوگ دیر تک گاتے ہیں اسی لیے صبح جلدی اٹھنے کا رواج نہیں۔ ان علاقوں میں عموماً دس بجے سے پہلے صبح نہیں ہوتی اسی لیے میں نے علی الصباح کارروائی کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایسا وقت تھا جب میرے شکار کی نیند اپنی گہرائی کی انتہا پر ہوتی۔ میں بے ڈی ملک کو حج دھکار کرنا چاہتا تھا۔ لبرٹی سے میں نے ٹیکسی کی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے میں بے ڈی ملک کے پاس سے سوچنے لگا۔

اس شخص کی اہمیت مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ چوہدری نواز اس کا نام سن کر جس طرح چونکا تھا، وہ نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں تھا، پھر فیصل نے اپنی مصیبت سے چھوٹکارا پانے کے لیے بے ڈی ملک تک ہی رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کی کوشش سے فائدہ اٹھا کر میں نے بے ڈی ملک کا پتا اور فون نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

اپنے پروگرام کے مطابق میں پہلے بے ڈی ملک کو چھانپا جاتا تھا۔ ساحل کے پارے میں اس سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ شخص چوہدری کے کراچی نیٹ ورک کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس وقت میں اپنے اصل جیلے میں تھا۔ سبیل والا ملک اپ دو بار کے فریش اپ نے ختم کر دیا تھا۔ میں نے سوچا پہلی فرصت میں ہم جو ہرے لے کر اس فن میں اتنی مہارت حاصل کروں گا کہ جیلے کی تہذیب کے لیے میں کسی کا محتاج نہ رہوں!

سیکیورٹی کو میں نے ڈینس مارکیٹ کے سامنے چھوڑ دیا۔ پھر دو طرفہ سڑک عبور کر کے مارکیٹ کے کونے پر آ گیا۔ یہاں سے ایک سیدھا راستہ مارکیٹ کی عقبی سمت جاتا تھا جہرہ ڈینس فیروئے کے عالی شان بنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ مجھے اسی طرف جانا تھا۔ بے ڈی ملک کا بنگلا اسی علاقے میں واقع تھا۔ اس بنگلے کا نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

فلپس سے نکلے ہوئے احتیاطا میں نے ایک بھرا ہوا پستول اپنے ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ کسی انتہائی ناگزیر صورت حال میں اس کا استعمال کیا جاسکے۔ ویسے اسلحے کے استعمال سے حتی الامکان بچنے کی کوشش ہی کرتا ہوں۔

پوسٹ آفس کے قریب سے گزر کر میں بنگلوں والے حصے میں داخل ہو گیا۔ پھر ٹھیک پانچ منٹ بعد میں بے ڈی ملک کے بنگلے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے محوم پھر کر اس بنگلے کا جائزہ لیا۔ اس کی سامنے والی اور عقبی گلی میں سامنے کا بابر تھا۔ بنگلے کے گیٹ سے ملحق ایک چھوٹا سا گاڑو دم بنا ہوا تھا۔ جس کا دروازہ مجھے بند نظر آیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا اندر گاڑو موجود ہوگا یا نہیں! ایک امکان یہ بھی تھا کہ چوکیدار یا سیکورٹی گاڑو نماز پڑھنے گیا ہو۔ اس وقت نماز فجر ادا کی جا رہی تھی۔

بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے میں نے عقبی گلی کا انتخاب کیا۔ یہ ایک گندی گلی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ بنگلا چوسو گز پر بنا ہوا تھا۔ بنگلے کے گیٹ پر بے ڈی ملک کی نیم پلیٹ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا تھا کہ میں بالکل درست جگہ پہنچ گیا ہوں۔

یہ سوچنا ایک حماقت ہوتی کہ بے ڈی ملک اس بنگلے میں تنہا رہتا ہوگا۔ اس جیسے جرم پر پشیم لوگ اپنے ارد گرد محفوظ اور مضبوط حفاظتی حصار رکھتے ہیں۔ مجھے اس حصار سے بچ کر یا اسے توڑ کر اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچنا تھا۔

میں نے محتاط نظر سے بنگلے کی عقبی دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار لگ بھگ آٹھ فٹ بلندی اور دیوار کی اس بلندی کے اوپر

خاردار تار کا جنگلا نصب تھا تاکہ وہاں سے دیوار بھلائی نہ اندر داخل نہ ہو سکے۔ اسی عقبی دیوار میں مجھے ایک چھوٹا آہنی دروازہ بھی نظر آیا جو اندر سے بند تھا۔ زیادہ امیدیں نہ وہ لاک ہوگا۔

اپنی حفاظت کے خیال سے جو لوگ بنگلے کی دیوار کے اوپر خاردار تار کی باڑ لگواتے ہیں وہ رات کے وقت اس باڑ میں کرنٹ بھی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ ہم جوئی کے کھڑے افراد کو لگ پتا جائے۔ میں نے پہلے اس تار کو چیک کر کے معلوم ہوا اس میں کسی قسم کا کرنٹ نہیں دوڑ رہا تھا۔

دیوار کے اوپر تین تین فٹ کے فاصلے پر اینگول عمودی شکل میں نصب تھے جن میں موجود سوراخوں کے خاردار تار کو پرو کر وہ باڑ تیار کی گئی تھی۔ مذکورہ اینگول کڑی بلندی کم و بیش دو فٹ رہی ہوگی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد اس آہنی جنگلے میں جلی موجود نہیں میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

میرے پاؤں میں سبک خرام اور آرام دہ جوگز نے میں ایک اسٹیپ لے کر اپنے قدموں پر اچھلا اور ایک باڑ دیوار کے ساتھ لگا کر اپنے جسم کو بڑی سرعت سے اوپر اٹھا کر اگلے ہی لمحوں میں نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں ایک کراہک اینگول آئرن کو تمام چکا تھا۔

اس ابتدائی کامیابی کے بعد میں نے جھوٹے اپنے جسم کو ایک اور جھٹکا دیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ دیوار کے اوپر کھینچ گیا۔ میں نے اینگول آئرن کو پھڑپھڑاتے ہوئے بات کا خیال رکھا تھا کہ خاردار تار میرے کپڑوں میں الجھتا میرے جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ ویسے میں نے اس دن بلیو جینز پر چست سیاہ لی شرٹ پہنی تھی لہذا اس نوبت کے الجھاؤ کا امکان نہیں تھا۔

اب میرے سامنے دو فٹ اونچی کانٹے دار باڑا رکاوٹ تھی جسے بڑی ٹیکنیک سے عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے شانوں میں ہائی جیب اور فری فال کی پریکٹس کی تھی اور ان فنون میں مہارت بھی حاصل کر لی تھی۔ اب اس ٹیکنیک کی آزمائش کا وقت تھا۔

میں نے ایک اینگول آئرن کو دو مختلف جگہوں سے خاردار دیوار کے اوپر پاؤں پھیلا لیے۔ پاؤں کا یہ پھیلاؤ لگ بھگ فٹ تھا جیسا کہ پوزیشن یا سانس کے وقت ہوتا ہے۔ بے ڈی ملک کے کانٹے دار تار پانچ انچ کے فاصلے سے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اینگول آئرن کو تھامے تھامے ایک گہری سانس لی اور ہاتھ پاؤں کی مخصوص جنبشوں کی مدد سے ایک

گائی۔ ایک جھپٹے میں میں سب سے اوپر والے تار پر کھڑا تھا۔ کانٹے پاؤں میں مضبوط جوگز تھے لہذا مجھے کانٹے دار تار نے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ اس تے ہوئے تار پر میرا قیام مشکل سے ایک سینٹر رہا ہوگا! اگلے ہی لمحے میں نے فضا میں حرکت سرسالت لگا دیا۔

نئی ہوئی اس آہنی سپورٹ نے میرے لیے جھپٹک پڑ کا کام کیا جسے ہی میرے قدموں نے تار کو چھوا! مجھے ایک زبردست ہلچل ملا جو سرسالت لگانے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ میری پاؤں نے ہوا میں رول کیا اور سرسالت کی ٹیکل پر میرے قدموں نے ایک ہلکی ”دھپ“ کے ساتھ لان کی نرمی پر دھک دی۔ لان میں موجود گھاس خاصی دبیز بھی لہذا اس ”دھپ“ کی آواز بھی وہیں دم توڑ گئی۔ میں کسی بد معرکی کے بغیر بنگلے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے قدموں پر رہتے ہوئے چاروں جانب جھٹکا لگا دوڑائی۔ اندر میرا اب آہستہ آہستہ اگلے میں بدلنے لگا تھا۔ میری ”آمد“ نے بنگلے کے ٹیکنوں میں سے کسی کو اس طرف حوجہ نہ کیا۔ میں دے قدموں لان سے نکل آیا۔

اس وقت میں بنگلے کے عقبی حصے میں تھا۔ تجزیہ حصار کے بعد اندر تھا۔ میں نے اندر داخلے سے پہلے حفاظتی انتظام کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ بنگلے کی پہلو والی دونوں دیواروں کے ساتھ پانچ بجے فٹ چوڑی کڑو گاہیں تھیں جو سیدی بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچی تھیں۔ میں ایک دیوار کے ساتھ قیام رومی سے قدم اٹھانے لگا۔

وہ بنگلا ایک منزل تھا اور میں نے اس کی حیثیت پر کسی قسم کی حفاظتی تدبیر نہیں دیکھی۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ میں انہی خیالات کے ساتھ سامنے والے حصے کی طرف آ نکلا۔ ادھر برآمدے میں مجھے ایک محافظ نظر آ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا اور مجھ پر تھا۔ اس کی کن کرسی کے ساتھ ہی گئی کھڑی تھی۔ میں اس شخص کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ گاڑو دم میں سے ایک شخص نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ طبی طور پر گیٹ والا چوکیدار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلاشکوف بھی نظر آ رہی تھی۔

میں گن بردار کو دیکھتے ہی اچھل کر دیوار کے ساتھ ٹک گیا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ہوگی۔ اگلے ہی لمحے میری ساعت میں اس کی آواز گونجی۔ وہ کرسی پر سوتے ہوئے کاٹھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”نذیر علی! اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے۔“

گاڑو کی اس پکار نے ثابت کر دیا کہ اس نے مجھے نہیں

دیکھا تھا ورنہ وہ سب سے پہلے میری جانب بڑھتا۔ میں اسی دیوار سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد گاڑو نے نذیر علی اس محافظ کو بنگلا دیا اور دوبارہ اپنے گاڑو دم کی طرف چلا گیا۔

میں نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گاڑو دم کی طرف نگاہ دوڑائی۔ مسل چوکیدار اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور اس کا رخ گیٹ کی جانب تھا۔ داخلی گیٹ ہنوز بند تھا۔ میری نظر برآمدے کی طرف لوٹ آئی۔ وہاں رکھی کرسی خالی دکھائی دی البتہ گن ابھی تک وہیں موجود تھی۔ اس کا مطلب یہی تھی کہ نذیر علی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

ابھی تک میں نے ان دو افراد کے سوا کسی اور انسان کے آگاہ نہیں دیکھے تھے۔ گتھا، بنگلا ستانے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا بے ڈی ملک سے کن حالات میں سامتا ہوگا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا یہاں کتنے آدمیوں سے مجھے منہنا ہوگا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا جلد از جلد ہی کرنا تھا۔

میں دے قدموں برآمدے کی طرف رینگ گیا۔ اس گمن کو وہاں سے ہٹانا ضروری تھا۔ میں ان دونوں سے پھینچر چھاؤ کے بغیر بنگلے کے اندر دئی حصے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں جیسے ہی کرسی کے پاس پہنچا کسی شے سے میرا پاؤں الجھ گیا۔ نیم تاریکی کے باعث میں دیکھ نہ پایا کہ وہ کیا چیز تھی۔ بہر حال اس کی آواز نے مجھ پر حقیقت محول دی۔ چھانے کی تیز آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا اور کراچی کا کوئی برتن چپٹا چور ہو گیا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ کوئی بانی والا جگ وغیرہ رہا ہوگا! میں جلی کی سی سرعت سے اچھل کر ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

یہ ایسا واقعہ نہیں تھا کہ چوکیدار اپنے کیمین میں خاموش بیٹھا رہتا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز میری ساعت تک پہنچی ”کیا ہوا نذیر تم نے کیا توڑ ڈالا؟“

میں سانس روکے ستون کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ اگر نذیر چوکیدار کے سوال کا جواب دیتا تو بات آئی گئی ہو جاتی۔ جب چوکیدار کو جواب نہیں ملا تو وہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے دوبارہ اس طرف آ گیا۔

یہ بڑے اہم لحاظ تھے۔ مسل چوکیدار نے میرا کام کافی آسان کر دیا۔ اگر وہ اس طرف پیش قدمی نہ کرتا تو مجھے اس تک پہنچنے کی زحمت کرنا پڑتی۔ میں ستون کے پیچھے اس زاویے سے چھپا کھڑا تھا کہ چوکیدار مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرے انتہائی قریب آ گیا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ پھر اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

”نذیر تو یہاں موجود نہیں پھر یہ جگہ کسے ٹوٹ گیا؟“  
 ”ایسے ٹوٹ گیا!“ میں نے گھبر کر کوئی کی۔

وہ ایک بارگی اچھل کر اپنے پلٹا جیسے زہریلے بھونے  
 اچانک اسے ڈنک مار دیا ہو۔ نیم تاریکی میں ہماری آنکھیں  
 ایک لمحے کے لیے جا رہیں پھر اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی  
 زبانی یا عملی کارروائی کرتا، میں نے جھٹکے سے ایک فرنٹ پش  
 کب اس کے سینے پر رسید کر دی۔

وہ ”اوں“ کی آواز نکالتے ہوئے برآمدے کے پختہ  
 فرش پر گرنا۔ اتفاق سے یہ وہی جگہ تھی جہاں کالج کی کرچیاں  
 پڑتی تھیں۔ چوکیدار تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ مجھے فوراً  
 اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کوئی آواز پیدا کرنے بغیر مجھے اس سے  
 نمٹنا چاہیے تھا۔ بہر حال اب تو یہ غلطی ہو چکی تھی۔

میں بڑی تیزی سے ستون کی آڑ سے نکل آیا۔ چوکیدار  
 نے زمین پر پڑے پڑے اپنی کلاشن کار پر میری سمت پھیرنا  
 چاہا مگر میں نے اسے اس ”حرکت“ کا موقع نہیں دیا۔ میرے  
 جو کمر پش پاؤں کی ایک طوفانی ٹھوکر اس کے گن والے ہاتھ پر  
 پڑی۔ گن اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گری۔ دیکھتے ہی  
 ایک ہاتھ سے وہ کلاشن کو پوری طرح سنبھال نہیں پایا تھا اس  
 کا خود خفگی میں کیا گیا ایک فطری عمل تھا۔

میری توقع کے برخلاف زمین پر گرے ہوئے غیر مسلح  
 چوکیدار نے ایک لمبی لوٹ لگائی اور دوبارہ گن تک رسائی  
 حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں اس سے پہلے کہ تک پہنچا اور  
 اس کے چہرے پر ایک بچی کنگ ماری۔ وہ اس تکلیف کو  
 برداشت نہ کر سکا اور بے طرح ہلکا اٹھا۔

اسی لمحے ایک گھبراہٹی ہوئی آواز سنائی دی ”فریاد خان!  
 کیا ہو رہا ہے؟“

اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھری۔ اس سے  
 پہلے کہ فریاد نامی چوکیدار کو پکارنے والا موقع واردات پر پہنچ  
 جاتا، میں نے فریاد کی فریاد کا راستہ روکنے کے لیے ایک ہاتھ  
 مضبوطی سے اس کے منہ پر جمادیا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے  
 گھسیٹنے ہوئے ایک تارک کوٹھے میں لے گیا۔ وہ اپنے منہ پر  
 سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب بس نہ چلا تو اس  
 نے ایک خالصتاً زائد حرکت کی۔ اس نے اپنے ناخنوں سے  
 میرا چہرہ نوچنا چاہا تھا میں نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اس  
 کی یہ کوشش ناکامیاب بنادی۔

اسی لمحے طلبے اجالے میں مجھے نذیر کی صورت دکھائی  
 دی۔ وہ سیدھا میری طرف ہی آرہا تھا اور غالباً اس نے مجھے  
 فریاد کے ساتھ ختم تھا دیکھ بھی لیا تھا۔ میں نے فریاد کی گردن

میں ہاتھ ڈال کر ایک نپاٹکا مخصوص جھٹکا دیا۔ وہ میری بازو  
 میں بھول گیا۔ کم از کم دو گھنٹے تک وہ ”واپس!“ کہتا  
 نہیں تھا۔

اس کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد میں اٹھ کر  
 ہوا سی تھا کہ نذیر میرے رد پر دیکھ گیا۔ ہم اتنے فاصلے پر  
 کہ ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کچھ  
 لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم اور اس جھٹکے میں کیسے داخل ہو گئے؟“  
 ”میں تمہاری موت ہوں۔“ میں نے سرسراہٹ آواز  
 کہا۔ اور موت کو کہیں بھی آنے جانے کے لیے اجازت  
 قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ تم نے.....“

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھ پر  
 کر دیا۔ یہ ایک دیسی قسم کا جارحانہ ایک تھا۔ میں نے ایک  
 جانب ہٹ کر اس کا دار خالی دیا۔ وہ اپنی ہی جھوک میں  
 جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو چونک اٹھا۔ نذیر فریاد خان  
 کا شکوف کے بہت قریب جا کر گرنا تھا۔ اس نے ایک لمحہ  
 جانب دیکھا اور گن کی طرف ہاتھ بڑھا کر سرخ ہو گیا۔ پھر  
 سے نکل کر وہ مجھ پر فائرنگ کرتا میں نے فرش پر سائیڈ رول  
 اور کسی کی طرف نکل گیا۔

اسی لمحے فائرنگ کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ نذیر نے  
 مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے بردت سا  
 رول نے اس کا نشانہ خطا کر دیا نتیجے میں اسے ایک ناقابل  
 حطانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی گن سے خارج ہونے والا  
 گولیوں نے اٹھائیں فریاد خان کے بدن کو چھید ڈالا۔ نذیر  
 علی سائے میں آ گیا۔

اس کا سنا ٹوٹنے سے پہلے میں اس کے سر پر پھینک گیا۔  
 جب وہ ہوش میں آیا تو گن کے استعمال کا وقت بہت چکا تھا۔  
 میں نے اس کے سینے پر ایک زبردست ڈنک پش کنگ ماری  
 کر دی۔ وہ پش کے بل برآمدے کے پختہ فرش پر گرنا  
 کلاشکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن دوسرے ہی لمحے  
 اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نہ صرف کھڑا بلکہ اس نے جواباً مجھ پر فائر  
 کر دیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ پھر تیزا ثابت ہو رہا تھا۔

اس نے ایک بچی راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ یہ نی شات سے  
 مشابہ ایک ”بیلوڈی بیٹ“ کنگ تھی۔ اس کی اس جہاز  
 سے اندازہ ہوا، وہ مارشل آرٹس سے بھی واقف تھا۔ میں نے  
 بڑی چابک دستی سے اس کے کک والے پاؤں کو پکڑا۔  
 مردوڑے کے اسے دور اچھال دیا۔ وہ برآمدے سے باہر گر  
 اگر اور کوئی موقع ہوتا تو میں اس کے گن کو تپانے کی کوشش کرتا۔

اس نے فائرنگ کر کے میرے لیے تھوٹیں کی فضا تخلیق کر دی  
 تھی کسی بھی لمحے جھٹکے کے اندر موجود افراد اس طرف متوجہ  
 ہو سکتے تھے!

نذیر جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا میں نے اسے ایک سائیڈ  
 کنگ ماری دی۔ وہ سنبٹنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دور لڑھک  
 گیا۔ میں پلک کر اس کے قریب پہنچا اور اسے اٹھنے کا موقع  
 دینے بغیر پے در پے اس کے چہرے پر چار پانچ ٹھوکریں رسید  
 کر دیں۔

وہ دونوں ہاتھوں سے خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا  
 اور اس کوشش کے دوران ہی میں اس نے میرا پاؤں پکڑ لیا۔  
 اس کے ساتھ ہی وہ پختہ فرش پر پڑنے پڑنے روٹنگ کرنے  
 لگا۔ یہ دو لڑھک روٹنگ تھی۔ میں اٹھ کر گر پڑا۔ اسی لمحے دروازہ  
 کھلنے کی آواز آئی پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔  
 میں پلک جھپٹنے میں سمجھ گیا، جھٹکے کے اندر موجود افراد ہماری  
 طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

میں نے ایک لمبی لوٹ لگائی اور کلاشکوف تک رسائی  
 حاصل کر لی۔ وہاں ایک کنگ ساز سنگی گلا رکھا تھا، میں نے  
 سٹ کر اس گولے کے عقب میں پناہ لے لی۔ اسی وقت دو افراد  
 میری نگاہ میں آ گئے۔ وہ جھٹکے کے اندرونی حصے سے نکل کر  
 برآمدے میں ظاہر ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے جب  
 کہ میں ایک خاص زاویے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں  
 بھی سٹ تھے اس دوران میں نذیر اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ان  
 میں سے ایک نے نذیر سے پوچھا۔

”یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟“  
 ”کوئی دشمن اندر کھس آیا ہے۔“ نذیر نے بتایا ”اس نے  
 چوکیدار فریاد کو قتل کر دیا ہے اور مجھے بھی مارنے کی کوشش.....“  
 وہ رام غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔  
 ”کیا ایک رہے ہو؟“ دوسرے شخص نے دہاڑے سے  
 مشابہ آواز میں کہا۔

”آپ خود دیکھ لیں۔“ نذیر نے کہا ”ادھر فریاد کی لاش  
 پڑی ہے اور وہ دشمن بھی یہیں کہیں جھسا ہوا ہے۔“  
 وہ لوگ نذیر کی بات کو یک سرے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے  
 کیوں کہ فریاد کا بے جان جسم ان کی نگاہ میں آچکا تھا۔ ان  
 دونوں نے متقی خیر نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک  
 نے نذیر سے استفسار کیا۔ اس کے استفسار میں گہری تھوٹیں  
 پائی جاتی تھیں۔

”وہ شیطان کہاں چھپا ہے؟“  
 ”ادھر!“ نذیر نے گولے کی جانب اشارہ کیا ہوگا

کیوں کہ اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بڑی  
 آہستگی سے اپنا زانو یہ تبدیل کر لیا تھا۔

میں دم سادھے ان کا انتظار کرنے لگا۔ جلدی مجھے اپنے  
 قریب ان کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں الٹ  
 ہو گیا۔ پھر جیسے ہی وہ سنگی گولے کے پہلو میں پہنچے، میں اچانک  
 اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھٹکا گئے۔ میں نے اس بھٹکا ہٹ کا  
 قائدہ اٹھا یا اور انہیں گیس سیدی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ میں  
 نے کلاشکوف کو تھامے ہوئے گولے کے عقب سے بائیں جب  
 لگائی پھر اڑتے ہوئے ان کی طرف آیا۔ وہ دونوں میرا دھکا  
 کھا کر زمین بوس ہو گئے۔ میں نے پیٹا اسپرنگ لگایا اور اچھل  
 کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

ان دونوں نے بھی فرش پر قیام کی ضرورت محسوس نہیں کی  
 اور فوراً اٹھ کر میرے مد مقابل جم گئے تھیں ہر ایک تک ان کے  
 ہاتھوں سے یاری بھار رہے تھے۔ میں نے انہیں ڈان دینے  
 کے لیے ایک ہینٹھک لگائی۔ انہوں نے بڑی سرعت سے اپنی  
 گنوں سے مجھ پر فائرنگ کی لیکن میں ان کے ٹارگٹ پر موجود  
 ہوتا تو وہ مجھے گولیوں کا نشانہ بناتے۔

میں نے ہینٹھک کی تکمیل کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر بائیں  
 جب لگائی اور ان کے اوپر سے گزرتے ہوئے عقب میں پہنچ  
 گیا پھر ان کے پلٹنے سے قبل ہی میں نے ان کی پشتوں پر ڈنک  
 فرنٹ فلائنگ گس جڑ دیں۔

وہ دونوں ایک جھٹکے سے منہ کے بل پختہ فرش پر گرے۔  
 میں اپک کر ان کے قریب پہنچا اور انہیں ٹھوکروں پر رکھ لیا۔  
 زمین بوس ہوتے وقت انہیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئی  
 تھیں۔ میں نے دوبارہ انہیں مسلح ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ  
 دونوں تابوتوں پر بٹھے کر رہے تھے اور میں جواباً انہیں بری  
 طرح پیٹ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہانپنے لگے۔ میں نے  
 ہاتھ پاؤں کے ساتھ کلاشکوف کا ہٹ بھی استعمال کیا تھا۔ تاہم  
 فائرنگ سے میں نے احتیاب ہی برتا۔ جب تک انتہائی  
 ناگزیر نہ ہو جاتا مجھے ہاتھ پاؤں ہی سے کام چلانا تھا۔

یہ کس نذیر نے پوری کر دی۔ اس دوران میں اسے اپنی  
 کلاشن تک پہنچنے کا موقع مل گیا تھا جو کرسی کے ساتھ کی کھڑی تھی  
 اور اب وہ مجھ پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اگر وہ ہوش مندی سے  
 نشانہ لیتا تو شاید مجھے شکار کرنے میں کامیاب ہو جاتا مگر وہ  
 بھٹکا ہٹ آمیز انداز میں بے دریغ فائرنگ کر رہا تھا پھر  
 ہمارے درمیان فاصلہ اور اینگل بھی حائل تھا۔ میں نے اس کی  
 فائرنگ سے محفوظ رہتے ہوئے ایک طویل برست مارا۔  
 جواب میں نذیر کی چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ میری فائرنگ کی زد

میں آگیا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اسی لمحے عقب سے کسی نے مجھے جکڑ لیا۔ وہ ان دونوں میں سے ایک تھا۔ میں نے اپنے قدموں پر رچے ہوئے پاؤں کو نوٹ کر دیکھا اور ایک جھٹکے سے گھوم گیا۔ اگر دو بونے والا مجھے آزاد کر دیتا تو اس کے ساتھی کی بجٹ ہو جانی لیکن اس کے بالکل متضاد برآمد ہوئے۔ میرا جھٹکا کھا کر وہ بھی محکوم گیا اور اس کی ٹانگیں دوسرے شخص کے منہ پر لگیں۔ یہ کسی ہائیڈروکس مشین کے ہینڈل کی شوکر تھی۔ متاثرہ شخص ہلکاتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے الٹی چپ لگائی اور پشت کے بل زمین پر گرا۔

یہ ریسرلر کا ایک مخصوص داؤ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اوپر لدے ہوئے شخص سے اسی طور نجات حاصل کرتے ہیں۔ زمین سے ٹکرائے کے نتیجے میں اس شخص کے حلق سے ”فون“ جیسی ایک بہم آواز خارج ہوتی۔ اسی لمحے میں نے اپنی دونوں کہلیاں اس کے پیٹ میں رسد کیں اور بیک رول کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قدموں کے نزدیک ہی دوسرا شخص چاروں خانے جٹ پڑا تھا۔ اس کے وجود میں مجھے موہوم سی پہنچ محسوس ہوئی۔

میں نے اس کے سینے پر اپنی ہی کی ضرب لگائی۔ اس کے وجود نے ایک زبردست جھٹکا کھایا پھر سکت ہو گیا۔ میں نے جھٹکے اس کا جائزہ لیا۔ وہ زندہ تھا تاہم اس کے کھال ہونے کا فوری امکان نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کو چپک گیا۔ وہ بھی میرے ”دوبے“ سے ناراض ہو کر عارضی خاموشی اختیار کر چکا تھا۔ ان کی طرف سے ”مطمئن“ ہونے کے بعد میں کھلے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دروازہ جس میں سے تھوڑی دیر پہلے یہ دونوں برآمد ہوئے تھے۔

میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے دروازے کے پاس پہنچا پھر میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اندر قدم رکھ دیا۔ اندرونی حصے میں ہنوز خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا تھا کہ وہاں کوئی موجود بھی ہے یا نہیں! اگر کوئی وہاں موجود تھا تو پھر وہ گہری نیند میں ہوگا! میں نے بے ڈی ملک کی تلاش میں ابتدائی دو کمرے اور لاؤنج دیکھ ڈالا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس سے میری تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ اگر بے ڈی ملک میرے حقے نہ چڑھتا تو پھر یہ ساری محنت بے کار چلی جاتی۔ میں وہاں سے نا کامیاب نہیں لوٹا جاتا تھا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے اس سنگھ استوری بنگلے کا کوٹا کوٹا جھانک ڈالا لیکن بے ڈی ملک یا کوئی اور شخص مجھے

نظر نہ آیا۔ میری تشویش انہما کو ختم ہو گئی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے اپنے مطلوبہ مقام پر ہی چڑھائی کی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں باہر موجود افراد سے بے ڈی ملک کے بارے میں استفسار کروں۔ ان چاروں میں سے دو افراد انا اللہ ہو چکے تھے۔ باقی دوک میں گہری نیند ”سلا“ کر اندرونی حصے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے باہر جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر بنگلے کی تلاشی لی لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر برآمدے میں نکل آیا۔ نذر علی اور فریاد خان سوال و جواب کی دنیا سے بہت دور جا چکے تھے۔ میں نے دوسرے دونوں افراد کا تنقیدی معائنہ کیا۔ ان میں سے ایک کی ”حالت“ مجھے بہتر لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اسے ہوش میں لا کر بے ڈی ملک کے بارے میں استفسار کر سکتا تھا لیکن یہ ”کوشش“ کھلے عام کرنا مناسب نہیں تھا کیوں کہ اب باقاعدہ اجالا پھیل چکا تھا۔

میں نے اچھی حالت والے شخص کی بظلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹنا شروع کیا اور تھوڑی سی کسرت کے بعد میں اسے کچن تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ کچن پر وہ سیر میں نے دوسرے کے ساتھ بھی دہرایا۔ وہ کام کا نہ کسی لیکن میں اسے اپنی نگاہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ نذر علی اور فریاد خان کی طرف سے ہر خطرہ ٹل چکا تھا۔

میں نے اپنے مطلوبہ بندے پر تھوڑی محنت کی۔ پانی کے چھینٹنے جب کارگر نہ ہوئے تو میں نے چٹا گرم کر کے اس کے تلوؤں کی ”سنگائی“ شروع کر دی۔ میری یہ ”خدمت“ اسے ”راس“ نہ آئی اور اس نے پاؤں جھٹکتے ہوئے آنکھوں کو مل دیں۔ مزید دس منٹ کی کوشش کے بعد وہ بولے کے قابل ہو گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“  
تھوڑے تامل کے بعد اس نے جواب دیا ”سکندر!“  
”بے ڈی ملک کہاں ہے؟“  
اس کا چہرہ خستہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا، وہ جواب دیتے ہوئے کچکا پڑا تھا ”مجھے نہیں پتا ملک صاحب کہاں گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ تم کون ہو؟“

”میں تمہارا بھائی باپ ہوں“ میں نے خون خوار لہجے میں کہا ”اور لگتا ہے تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے۔ مجھے تمہارے حقیقی باپ سے پوچھنا پڑے گا۔ کیا تمہارا باپ زندہ ہے؟“

سوال ختم کرتے ہی میں نے چولے پر سے گرم چٹا اٹھایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے دائیں سے بائیں لہرائے لگا۔ وہ خوف زدگی کے عالم میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرے باپ کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔“  
”تم اب تک زندہ کیوں ہو بے غیرت؟“ میں نے گرم چٹا اس کے نگوے کی طرف لے جاتے ہوئے سفاکی سے کہا ”میں تم سے آخری مرتبہ بے ڈی ملک کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ آخری مرتبہ اس لیے کہ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں یہ چٹا تمہاری ناپاک زبان پر رکھ دوں گا، پھر تم زندگی بھر بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔ کیا ارادہ ہے؟“

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم میری بات کا یقین کر دو۔۔۔۔۔۔“  
جملہ احوار رہ گیا ”سکندر کے حلق سے ایک ٹھٹک کھاف چڑ برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی انسانی گوشت کے چلنے کی مخصوص پوچھ کی فضا میں نفوذ کر گئی۔ میں نے گرم چٹے کو سکندر کے نگوے سے ہم کنار کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دمکی آئینہ لہجے میں کہا۔

”تم اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہاری باتوں کے پکر میں آ جاؤں گا۔ میں پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں۔“ پھر میں نے اسے قدموں سے نکالنے کے لیے مصلحتاً ایک جھوٹ بولا ”میری معلومات کے مطابق رات بارہ بجے تک بے ڈی ملک اسی بنگلے پر موجود تھا۔ اب وہ یہاں سے غائب ہے۔ وہ کہاں گیا ہے، یہ تمہیں پتا ہونا چاہیے۔۔۔۔۔۔ اور کتنے بجے گیا ہے یہ بھی! کیوں کہ تم لوگ اس کی غیر موجودگی میں اس بنگلے کی رکھوالی کر رہے ہو؟“

پھر میں نے اسے دکھاتے ہوئے چٹا ایک مرتبہ پھر چولے پر چڑھا دیا۔ خوف کی شدت سے وہ تھر تھرا کانپنے لگا پھر لرزیدہ آواز میں بولا ”مجھ پر مزید ظلم نہ کرنا میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔“

گرم چٹے کی دہشت فرضی نہیں تھی بلکہ وہ اس کی کارکردگی کا عملی مزہ چکھ چکا تھا اس لیے اس کا پانی ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں دریافت کیا ”تو تمہارا بے ڈی ملک کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟“

وہ بیٹھے بیٹھے ایک اچھٹک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھ سے پُر غلوں تعداد حالات کا جو اور مصلحت کا تقاضا تھا۔ اپنے جسم کے نازک حصوں کو بے قافی ہوش دھواں جانے

ہوئے دیکھنا اور محسوس کرنا کوئی لمبی کھیل نہیں۔ اسے جواب دیتے ہی بنی۔

”ملک صاحب۔۔۔۔۔۔ رات کے آخری پہر اپنے چار کاٹھروں کے ساتھ کسی دوست کے پاس گئے ہیں۔“ اس نے ایک ایک کرتا بتایا ”وہ وہاں رکیں گے اور ان کے کاٹھروں کی خاص مشن پر روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ لوگ سیدھے اسی بنگلے پر آئیں گے۔“

سکندر کے انکشاف نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا ”وہ لوگ کتنے بجے واپس آئیں گے؟“

”صبح وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ اس نے کزور سے لہجے میں کہا ”ملک صاحب نے کہا تھا، سات بجے کے بعد کسی بھی وقت ان کی واپسی ہو سکتی ہے۔“

میں نے رست واپچ پر نگاہ ڈالی۔ وہاں سات دس کا وقت ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، وہ وہ لوگ اب تب میں آنے ہی والے تھے۔ میرے ظاہری اور باطنی حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ میں نے تجتے ہوئے چٹے کو سکندر کی آنکھوں کے نزدیک پہنچایا اور سفاکی سے پوچھا۔

”تمہارا ملک اپنے چار کاٹھروں کے ساتھ کہاں اور کس نوعیت کے مشن پر گیا ہے؟“

مجھے کی پیش نے اسے چہرہ پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے گال پر ایک زناٹے دار پھینک کر بڑبڑایا اور غصیلے لہجے میں کہا ”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟“

وہ میری جانب رخ پھیرتے ہوئے لکت زدہ لہجے میں

**مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں**

**بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات**

**روشنی کے مینار**

تقریباً 225/-

مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر 1





بولا "ایک شیطان نے ملک صاحب کے آدمیوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ مجھے یہ چلا ہے، اس بد بخت نے ملک صاحب نے ایک خاص بندے سے فیصلہ کر لیا ہے۔ ملک صاحب کے کاغذ و فیصلہ کو چھڑانے گئے ہیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے رگ و پے میں بجلی کی کوند مچی ہو۔ سکندر کا اکتشاف سنسنی اور قہر سے لبریز تھا۔ وہ بے خبری میں میرے سامنے میرا ہی قصہ پھینک رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بھجان خیر لہجے میں دریافت کیا۔ میرا استفسار بے ساختہ تھا۔

"فیصلہ کو کس نے اغوا کیا ہے؟"

"اس شخص کا نام وجدان سننے میں آیا ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔

"کیا تم نے وجدان کو دیکھ رکھا ہے؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "میں نے اس مردود کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے، وہ کسی چھلاوے سے کم نہیں۔ ہل میں ادھر اور ہل میں ادھر نظر آتا ہے لیکن مجھے امید ہے، ملک صاحب کے کاغذ و اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ بہت ہی مشاق اور تربیت یافتہ ہیں۔"

اگر سکندر کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میں ہی وجدان ہوں جسے وہ چھلاوے کا نام دے رہا ہے تو پتا نہیں، اس کی کیا حالت ہوتی۔ میں اس وقت حیرتوں کے حصار تخلیق کرنے کے موذ میں نہیں تھا اس لیے سکندر سے پوچھا۔

"میں نے یہی معلوم ہوگا، وجدان نے نہیں تو کہاں چھپا رکھا ہے۔ میرا مطلب ہے، ملک صاحب کے کاغذ و کہاں سے اسے حاصل کریں گے؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے دیکھا ہوا چٹا ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے کے قریب پہنچا تو کھانی تامل کے بعد اس نے جواب دیا۔

"مجھے وجدان کے ٹھکانے کا تو علم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں..... کسی اخبار کا مالک اس کی پشت چاہی کر رہا ہے۔ ملک صاحب کے کاغذ و اسی اخبار والے کے ہنگلے پر آپریشن کریں گے۔ ملک صاحب کا خیال ہے، وجدان نے فیصلہ کو اسی ہنگلے میں....."

"فون کس طرف ہے؟" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چھین کر کہا۔

میری یہ چیخ غیر ارادی تھی۔ سکندر کے جواب نے

میرے دماغ کو آگ کا گولا بنا دیا۔ وہ سہم کر رحم طلب نظر سے مجھے نکلے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اچانک بھجان میں کیوں مبتلا ہو گیا ہوں مگر میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ ان نازک ترین لمحات میں مجھے کیا کرنا ہے۔

"میں نے فون کا پوچھا ہے!" میں گرم چٹا اس کے ہونٹوں کے نزدیک لاتے ہوئے دہاڑا۔

"بتاتا ہوں..... تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ جان کنی جیسی کیفیت میں بولا "فون ادھر دوسرے کمرے..... میں ہے۔"

میں سکندر کو دھکیلے ہوئے آن واحد میں فون والے کمرے میں پہنچا پھر اسے اپنی گرفت میں جکڑ کر میں نے منہاس باقر کے ہنگلے کا نمبر ڈال کیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون دماغ میں سرایت کر گیا ہو۔ میری کن ٹیوں پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔

ڈانٹک کی تھیل پر دوسری جانب کھٹی بجی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، وہ کھٹی ایک سال بعد کی تھی۔ میں اس وقت انتظار کی انتہائی اذیت سے گزر رہا تھا۔ میرے انتظار نے ایک سال مزید طے کیا اور دوسری کھٹی بجی پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دوسری طرف کسی نے فون اٹھائے نہیں کیا۔ میری دھشت عروج کو پہنچ گئی۔ اس طرف خاموشی کا ایک ہی مطلب تھا.....

ادروہ یہ کہ اس ہنگلے کے کینوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرادیا گیا تھا۔ میں نے اپنے سینے میں درد کا ایک طوفان سا اٹھاتے محسوس کیا۔ تم وادوہی سنو زور آندھی میری ٹس ٹس میں چیختی تھی۔

وہ بہت ہی آزمائشی لمحات تھے۔ سچ ڈی ملک نے میرے گرد و پیش زہری آتش کا حصار سا کھینچ دیا تھا۔ مجھے اپنی جان بھری پر رکھ کر اس حصار کو کھینچ رہا تھا اور اپنے دشمنوں کو فک کے گھاٹ اٹھاتا تھا۔ میں نے دانت کچکچا کر ریسپور کو کرپل پر پٹخ دیا۔

اسی لمحے ہنگلے کے باہر کسی بیوی انجن والی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ میں نے چونکنا نظروں سے اپنی گرفت میں پھنسے ہوئے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کے خصوص اب دا ہوئے اور اس نے بڑے ہی ادھیات انداز میں سرگوشی کی۔

"گلتا ہے، ملک صاحب کے کاغذ و واپس آ گئے!" اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا، گیٹ پر موجود گاڑی کا ہارن صبح کی خاموشی اور چمکون فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگا!



گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے کانوں میں لالال کی کراہ اُبھر چلی۔ کراہی سنائی دی گی میں متوجس انداز میں چلی۔ کیا دیکھتی ہوں لالال اپنے خون آلود ہاتھ کو تھامے ہوئے کراہ رہی تھی۔ پتول اس کے ہاتھ سے گولی نکلتے ہی کہیں دور جا رہا تھا اور..... میں ابھی سمجھنے ہی نہیں پائی تھی کہ اچانک تاریکی کی اوٹ سے چند ہولوں نے فکارتی کتوں کی طرح نہیں گھیر لیا۔ دھندلی روشنی کے باوجود میں ان لوگوں کو پہچان گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے چہروں کے نقوش ہنوز میرے اور لالال کے ذہن سے خوشیں ہوئے تھے۔

یہ کل پانچ افراد تھے۔ پھوٹا خان اور اس کے چار حواری۔ چونکہ سردست میری ان سے کوئی "نسل" نہ تھی اس لیے وہ پانچوں بڑی زبردست نظروں سے لالال کو گھور رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں دبی ہوئی کتوں کا رخ اس کی طرف کر رکھا تھا۔ لالال کے پتول والے ہاتھ پر انہی میں سے ہی کسی ایک نے گولی چلائی تھی۔

"لالال!..... خبردار..... کوئی غلط حرکت کی تو..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔"

پھوٹا خان نے غرائی ہوئی آواز میں لالال سے کہا۔ لالال کے چہرے سے اذیت کے آثار یک لخت صحت کر پھر بار اثرات میں بدل گئے اور وہ مغلوب ہونے کے باوجود پھوٹا خان کوڑی نظروں سے گھورتی ہوئی ناک کی طرح پھنکادی۔

"پھوٹا خان! تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ تمہارا بیٹا میرے قبضے میں ہے۔"

پھوٹا خان اس کی بات پر ہنسنے سے اکڑ گیا اور آگے بڑھ کر ایک زناٹے وار پھنسا اس کے گال پر سید کر دیا۔

"میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ اگر میرے بچے کا تم لوگوں نے ہال بھی بیکار کیا تو....." یہ کہہ کر اس نے فوراً لالال کے ہال اپنی گئی میں جکڑ لیے اور اسے جھکادیتے ہوئے دوبارہ قہر آلود لہجے میں بولا "بتاتا ہوں نے میرے بچے کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ بول ورنہ ادھر ہی تیرا ہاتھ کر ڈالوں گا۔"

مگر لالال جواب بدستور اسے شعل فضاں نظروں سے گھورتی رہی۔ اس کی زبردست خاموشی پر پھوٹا خان ایک بار پھر فیسے سے کھول اٹھا اور پتول کی سیاہ تال اس کی کتلی سے لگا دی "بتاتی ہے یا..... ابھی تیرا بیٹا پار کر ڈالوں؟" اس کی زہر آلود اور متعصقانہ دھمکی پر لالال کے سانولے چہرے پر بڑے خوفناک اثرات ابھرے اور وہ بلا خوف بولی۔

"پھوٹا خان! اگر تو نے میرا قصہ پاک کر ڈالا تو تیرا بیٹا کبھی زندہ نہیں رہے گا کیونکہ میری زندگی ہی تیرے بچے کی زندگی کی

ضامن ہے" اس کے بے پرواہ لہجے پینے لگا۔ پھر جیسے زنج ہو کر بولا۔

"چل پھر..... ہمیں وہاں کے چل جدھر تو نے میرے بچے کو رہنا مل جاتا ہے۔"

"ہرگز نہیں" لالال بلا خوف قطعیت سے انکار کرتے ہوئے بولی۔ "اس طرح تم کبھی بھی اپنے مقدمہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پھوٹا خان! تمہیں اپنے پہلے والے معاہدے پر قائم رہنا پڑے گا اور مجھے کوئی اسیت یہاں سے جانا دیا جائے..... میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہاری اس غلطی کو معاف کر دوں گی" لالال کی بات سن کر پھوٹا خان ایک بار پھر چراغ پا ہو گیا اور اس نے بے دردی سے لالال کی کھپڑوں کو گھونٹوں اور لالال سے تو اسٹین کرنی شروع کر دی۔ لالال بہر حال ایک عورت تھی تو منہ پھوٹا خان کے قیامت خیز اور بے رحم مکوں اور لالال نے لالال کو چپکنے چلانے پر مجبور کر ڈالا۔

وہ بولا "بتاتا ماتی ہے ہماری بات..... یا باری باری ہم پانچوں..... تیرا منہ کالا کریں۔"

پھوٹا خان نے زرارہ کتے ہوئے ہانپتی آواز میں غرا کر کہا۔

میں نے دیکھا لالال بری طرح مضروب ہو چکی تھی۔

پھوٹا خان کے کھپڑوں اور مکوں نے اس کے چہرے کی حالت لگا کر رکھ دی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے نیل ابھر آئے تھے۔ ہونٹوں اور ناک سے خون کی پتلی کبیر جاری ہو گئی تھی اور وہ زمین پر پڑی بری طرح کراہنے کے انداز میں ہانپ رہی تھی۔ میں ایک طرف خاموش کھڑی لالال کی یہ درگت دیکھ رہی تھی۔ ابھی پھوٹا خان نے اپنے دو حواریوں کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً آگے بڑھے اور لالال کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ لالال کا زخم آلود چہرہ خراشوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ مگر مجھے اس پر بالکل ترس نہیں آ رہا تھا۔ پھوٹا خان اپنے ایک ہاتھ کے بچے سے اس کے گال دیوبج کر زہرناک لہجے میں غرایا "کیا کہتی ہے اب..... بول.....؟" لالال زخمی تاگن کی طرح اسے خوشی نکاتھوں سے گھورتی لگی۔

پھوٹا خان نے اس کا چہرہ جھک کر اپنے چاروں حواریوں سے کہا۔

"اڑو..... یہ ایسے نہیں مانے گی، تم لوگ ذرا اس کو اپنے انداز میں سمجھاؤ۔" اس کے حواری جارحانہ انداز میں لالال کی طرف بڑھے۔ تبھی لالال گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

"غصہ..... میں..... میں..... چلنے کو تیار ہوں" اس کی بات پر پھوٹا خان نے اپنے حواریوں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا پھر لالال کو گھورتے ہوئے بولا۔

”اگر تو نے ہمارے ساتھ ذرا بھی دھوکا کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں اپنا بچو تو ڈھونڈ ہی لوں گا مگر تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیری روح بھی مجھ سے پناہ مانگے گی۔ چل آگے بڑھ۔“ یہ کہہ کر پھوٹا خان نے اسے آگے کی طرف دھکیلا۔ لالاں خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔ پھوٹا خان نے مجھے اپنے چاروں حواریوں کے گھبرے میں دے دیا تھا۔ اب ہم سب لالاں کے عقب میں چلے گئے۔

رات کا اسرار پھر سنا میرے اعصاب چنچار ہوا تھا۔ مجھے ایک بار پھر پریشان کن گھبراہٹ نے آن لیا تھا۔ پھوٹا خان اور اس کے حواریوں کے سر پر اس وقت خون سوار تھا۔ اگرچہ ان پانچوں خونخوار بھیڑیوں کی توجہ لالاں پر مرکوز تھی مگر وہ میری طرف سے بھی غافل نہ تھے۔ میں یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر میں نے ذرا بھی کوئی ایسی دیکھی حرکت کی تو یہ لوگ مجھ سے ڈرے برابر بھی رعایت نہیں کریں گے۔ اس لیے میں موجودہ حالات کی سنگین کارکردگیاں دیکھتے ہوئے سر دست کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جو انہیں مشتعل کر دے تاکہ میرا دل کھربا تھا کہ لالاں اور پھوٹا خان کے درمیان ہونے والی متوقع خون ریز جنگ ہو سکتا ہے میرے لیے فرار کا باعث بن جائے چنانچہ میں بدستور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔

دل و دماغ بری طرح ہول رہے تھے۔ میرے ذہن رسا میں ایک بات یہ بھی آئی تھی کہ پھوٹا خان نے شاید جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لالاں پر غلط وقت پر ہاتھ ڈالا تھا جو خود اس کے بیٹے مراد علی کی جان کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ میرے محتاط خیال کے مطابق پھوٹا خان کو اپنے چاروں حواریوں سمیت پہلے خاموشی کے ساتھ لالاں کا تعاقب کرنا چاہیے تھا اور لالاں کے اصل ٹھکانے تک پہنچنے ہی اس پر ہاتھ ڈالتے تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس طرح قبل از وقت لالاں کو قابو کرنے سے وہ انہیں ہسٹا بھی سکتی تھی جس کا مجھے سو فیصد یقین تھا کیونکہ اس جان لیوا حقیقت کا یقین لالاں اور اس کے منگیز، کوئل کو بھی بخوبی اور اک ہوگا کہ اگر ایک بار پھوٹا خان کو اس کا بیٹا مل گیا تو وہ ان دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہر حال اندیشہ شک اور وسوسہ انگیز لمحات میں ہمارا پیدل سفر جاری تھا۔

پھوٹا خان کے پوچھنے پر لالاں نے اسے یہی بتایا تھا کہ اس کا بچہ مراد علی اس کے منگیز کوئل کے قبضے میں ہے اور وہ مقام یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جہاں کوئل نے مراد علی کو برغمال بنا رکھا تھا وہ ایک جنگلی علاقہ تھا جس کے آغاز ہی میں مٹی کے اونچے نیچے نیلے بنے ہوئے تھے۔ حالانکہ پھوٹا خان کے پاس جیب بھی تھی مگر اس نے شاید کچھ سوچ کر ہی جیب کے

بجائے پیدل سفر کو ترجیح دی تھی۔ ہم سب خاموشی سے۔۔۔ آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل کے قریب پہنچتے ہی پھوٹا خان نے گھبر لے کر میں لالاں سے پوچھا۔

”لالاں۔۔۔ میں ایک بار پھر تم کو آگاہ کر۔۔۔ رہا ہوں۔ ہم سے کسی بھی قسم کی چالائی کرنے کی کوشش کی تو بلا تاجر نہیں گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا“ اتنا کہہ کر وہ ذرا ہٹا پھر لالاں کی بدستور بھیڑوں بھری خاموشی پر دوبارہ بولا ”اب تو ہمیں بتانے کی کہ ہم کس راستے سے اس جنگل میں داخل ہوں کہ ہمارا مطلبہ علاقہ وہاں سے نزدیک پڑے“ اس بار اس کی بات پر لالاں کے قدم رک گئے۔ وہ چند تاپے کچھ سوچنے کے انداز میں کھڑی رہی پھر اس نے دائیں طرف یعنی جنگل کے متوازی چلنا شروع کر دیا۔ جنگل کے قریب پہنچنے پر میں نے محسوس کیا تھا کہ پھوٹا خان سمیت اس کے چاروں مع حواری مستعد ہو گئے تھے۔

پھر اچانک ایک مقام پر لالاں نے جنگل کی طرف اپنا رخ موڑا تو کیا ایک پھوٹا خان کے دو حواری اس کے دائیں بائیں ہو کر چوکنا انداز میں چلے گئے۔ میرے دل کی دھڑکنیں خرد ز ہونے لگیں۔ کسی لمحے کچھ ہو جانے کا تصور میرے روٹنے کھڑے کر رہا تھا۔ اب ہم لالاں سمیت جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔

پورا جنگل سائیں سائیں کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھوٹا خان نے اپنے دو حواریوں کو چند ہدایات دے کر انہیں دو مخالف سمتوں میں سامنے ٹیلوں کی طرف روانہ کر دیا۔ ایسے میں میں نے کن انھیں سے لالاں کے خاموش چہرے کی طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر درود دور تک کسی فنگر یا پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ شکست خوردگی کی ایک ذرا سی بھی رقت وہاں موجود نہ تھی۔ اس کی یہ اسرار بھری غیر متوقع ”بے نیازی“ اس کے کسی اچانک گل کھلنے کا پتہ دے رہی تھی۔

بہر طور اپنے ان دونوں حواریوں کو روانہ کرنے کے ذرا ہی دیر بعد پھوٹا خان نے ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اب اس کے پانی دونوں حواریوں نے حسب معمول دائیں بائیں سے مجھے گھیر رکھا تھا جبکہ خود پھوٹا خان لالاں کی پشت سے اپنا پستول لگائے ہمارے پیچھے چل رہا تھا۔ اب سامنے جاسیچھوٹے بڑے مٹی کے تودہ نما قدرتی ٹیلوں ٹپوں کے خاکے واضح ہونے لگے تھے۔ ان کے قریب پہنچتے ہی لالاں نے ٹیلوں کے متوازی ایک طرف ہو کر چلنا شروع کر دیا۔ بالخصوص یہ میرے لیے بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ اب کسی بھی لمحے اعصاب شکن حالات کا خفیہ جیسے ہمیں جہاز نے والا تھا۔ آئندہ کے کسی بھی

متوقع اور خوں ریز حالات میں خود میری جان کو بھی خطرہ درپیش ہو سکتا تھا۔ دم بہ خود اور تاریک ماحول میں اس قدر ہولناک سناٹا طاری تھا کہ۔۔۔ پتا کھڑا اور دل دھڑکا والا معاملہ تھا۔

پھر ایک مقام پر جہاں دو نسبتاً بلند نیلے شانہ بٹانہ دکھائی دے رہے تھے، لالاں ان کے درمیان اور بل کھاتے دراڑ نما راستے کے آغاز میں رک گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونچا سا ناک پکارنے کے انداز میں زور سے اپنے سامنے کوئل کو آواز دی۔ ایسا اس نے پھوٹا خان کی درشت مگر سرکشوانہ ہدایت پر کیا تھا۔ لالاں کے ”کوئل“ پکارنے کی آواز خاصی دور تک گونجی چلی گئی۔ میرا متوجہ دل لکٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ آواز کی بازگشت چند تاپے بلکھڑے لینے کے بعد معدوم ہو گئی۔ لالاں نے دوسری بار پھر کوئل کو پکارا۔ رات کے سنانے میں لالاں کی آواز تنہا کی طرح چوست ہوتی چلی گئی مگر پھر بھی جوابا خاموشی چھائی رہی۔

پھوٹا خان کے چہرے پر پیش اور پریشانی کے تاثرات مزید گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک ٹیلوں کی طرف ذرا دور گولیوں کی جھلک تیز تڑا ہٹ سنا دی۔ ہم سب بری طرح چپک پڑے۔ میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ گولیوں کی تڑا ہٹ کی آواز یک دم ہی معدوم ہو گئی تھی جس سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ اچانک فائرنگ ابھی یک طرفہ ہی تھی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے دوبارہ گولیوں کی تڑا ہٹ ابھری۔ مجھے تو البتہ اندازہ نہ ہو سکا تھا لیکن شاید پھوٹا خان اور اس کی حواریوں کو دوسری بار ہونے والی فائرنگ سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ جوابی فائرنگ تھی۔ جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ پھوٹا خان کے ان دونوں حواریوں اور کوئل کے بیچ ٹھن گئی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ پھوٹا خان اب بری طرح پریشان اور شکر نظر آنے لگا تھا۔ ان حالات میں اس کا ایک دم پریشان اور بے چین ہو جانا پر معنی تھا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر ہوئے ”دو طرفہ“ انداز کی فائرنگ سے پتا چلتا تھا کہ کوئل کو ”معالے“ کی خطرناک کاٹھپک کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ یقیناً پیش میں آ کر مراد علی کو جانی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ ایسا پہلی بار ہو کر اب بذات خود مجھے بھی پھوٹا خان کے اس معصوم بچے کی جان کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ معصوم بے چارہ بہر حال بے گناہ تھا اور میں بھی یہ ہرزگ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کے کڑو توں کی سمیٹ چڑھ جائے۔ پھوٹا خان کی حالت چلی ہونے لگی۔ وہ شدید مضطرب نظر آنے لگا۔ لالاں کے چہرے پر البتہ اب بھیڑوں بھری گہری شجیدہ خاموشی کھنڈ آئی تھی۔

”گلتا ہے۔۔۔ سائیں بخش اور سو ڈھلے نہ کام لگا ڈو یا

ہے۔“ معا پھوٹا خان کی فنگر آواز ابھری ”حالانکہ میں نے ان دونوں کو سمجھا بھی تھا کہ اگر کوئل انہیں نظر آ بھی جائے تو اس پر ہاتھ ڈالے بغیر ایک ادھر ہی اس کی ٹوہ لگائے اور دوسرا فوراً ادھر آ کر مجھے خبر کرے مگر اب۔۔۔“ وہ دانت چیس کر اپنی مٹھیاں بھیجنے لگا۔

سائیں بخش اور سو ڈھلے یقیناً اس کے ان دونوں حواریوں کے نام تھے جنہیں ذرا دیر پہلے ہی پھوٹا خان نے کوئل کی ٹوہ لینے کے لیے ٹیلوں کی طرف روانہ کیا تھا۔

”سائیں میرا خیال ہے۔۔۔ آپ اور کل ادھر ہی روکیں گے۔ آگے جا کر دیکھنا ہوں“ پھوٹا خان کو سخت متشکر پارکاس کے ایک کارندے نے پرجوش ہو کر کہا تو پھوٹا خان نے اس کی بات جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے لالاں سے درشت لہجے میں پوچھا۔

”تیرا وہاں۔۔۔ یہاں سے کتنے فاصلے پر موجود ہے؟“ ”مجھے لگتا ہے اسے گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہے“ جواباً لالاں نے گولو سے لہجے میں کہا حالانکہ اس نے پھوٹا خان کا سوال گول کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ بلا تعویق پھوٹا خان کو تجویز دیتے ہوئے بولی ”پھوٹا خان! تنہا رہے ان دونوں ساتھیوں نے جوش میں آ کر جلد بازی سے کام لگا ڈو یا ہے۔ اس طرح تمہارے بچے کی زندگی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کوئل کو اب تک یہ نہیں معلوم کہ میں اس وقت تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو خود جا کر اپنے ساتھی سے بات کروں؟“

پھوٹا خان اس کی بات پر بہ مشکل اپنے غیظ کو دباتے ہوئے پھونکا کر بولا ”نہیں۔۔۔ جنہیں ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ چلو آگے بڑھو۔“ یہ کہہ کر اس نے لالاں کو آگے دھکیلا اور وہ خود اس کے عقب میں پستول تانے چلے لگا۔ چنانچہ مجھے بھی ساتھ کھڑے اس کے دونوں حواریوں نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب چہروں پر سنسنی خیز خاموشی طاری کیے آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹیلوں کے درمیان بنی یہ گزرگاہ بل کھائی آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً سنانے میں ایک بار پھر گولیوں کی خوفناک تڑا ہٹ ابھری۔ اس بار یہ آواز خاصی قریب سے سنا دی گئی تھی۔ گلتا تھا ہم جاتے وقت کے خاکے قریب پہنچ چکے تھے۔ مگر اس بار پھوٹا خان کے قدم نہیں رکے تھے۔ وہ بدستور لالاں کے عقب میں اسے گاہے بگاہے آگے دھکیلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میرا دل متواتر بری طرح دھڑکنے جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہمیں سامنے نسبتاً ایک کم بلند نیلے کی ڈھلان پر ایک ساہو دکھائی دیا۔ جسے دیکھ کر ہم سب ٹھک کر رک گئے۔ اس نے بھی شاید ہمیں دیکھ لیا تھا اور اب وہ تیزی کے ساتھ مذکورہ نیلے کی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ خاصا زخمی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ڈھلان سے تقریباً لڑکھڑاتا ہوا

سیدھا راہ گزر میں عین پھوٹا خان اور لالال کے قدموں میں آگرا۔ اس کا وجود خاصا زخمی دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شاید گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پھوٹا خان اور اس کا ایک حواری فوراً اس کی طرف لپکے۔

”اڑے سوڈھل! بابا کیا ہوا تجھے؟ سائیں بخش کدھر ہے؟“ پھوٹا خان نے اس کے ذرا قریب پہنچ کر کھڑے کھڑے اس سے پوچھا۔ سوڈھل نامی زخمی شخص بری طرح ڈھلکا تھا۔ وہ کچھ بھی سی سائیں لے رہا تھا۔ میں اور دوسرا حواری بھی ذرا آگے بڑھ آئے تھے۔ پھوٹا خان اپنے زخمی حواری کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اسے گویا جھنجھوڑ کر دوبارہ بولا۔

”اڑے۔ کچھ بول تو سہی..... ہوا کیا ہے؟“

”س..... سائیں..... بخش..... م..... مر چکا ہے ک..... کوڑل نے..... م..... مجھے بھی زخمی کر ڈالا“ زخمی سوڈھل نے بے مشکل ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا اور پھر اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا کہ ہم سب ہی چند ثانیے کے لیے لالال سے غافل ہو گئے تھے اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جس کی وہ کافی دیر سے منتظر بھی تھی۔ ہم چوں کہ اس وقت راہ گزر کے ایک سوڈھل سے جھڑپ کر رہے تھے۔ لہذا لالال نے کسی چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کی اور راہ گزر کے موڑ کے عقب میں تیزی سے غائب ہو گئی۔ پھوٹا خان کا وہ حواری جو میرے ساتھ چپکا رہا تھا۔ اس کی البتہ لالال پر نظر پڑ چکی تھی اور اس نے بھی اپنی سی بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لالال پر اپنی کن سیدھی کرتی جا رہی تھی۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی ٹیلے کے عقب میں غائب ہو چکی تھی اس لیے اسے لالال پر فائر کرنے کا موقع تو نہ مل سکا تھا البتہ..... اس نے جوش میں آ کر تیزی سے حرکت کی اور لالال کے عقب میں دوڑ گیا۔ پھوٹا خان اور اس کا چل نامی حواری..... سوڈھل کے قریب سے فوراً محض برانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر لالال کی جرأت زندان نے میری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو بھی جیسے پارہ بننے کی ترغیب دی اور میرے جی میں بھی اس موقع سے فی الفور فائدہ اٹھانے کی تمنا جاگ اٹھی لیکن پھوٹا خان نے غراہٹ آمیز آواز میں چل کو مجھ پر نظر رکھنے کی ہدایت دے کر خود تیزی سے آگے بڑھ کر موڑ کی دوسری طرف غائب ہو گیا۔ چیل نے فوراً مجھ پر اپنی رائفل تان لی تھی مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ اپنے سوڈھل اور سائیں بخش نامی دونوں ساتھیوں کی عہد شکنی موت نے اسے خاصا متشکر اور پریشان سا کر دیا تھا۔ اس پر مستزاد ان کا شکار لالال بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلی تھی۔ یہی سبب تھا کہ چیل کے چہرے پر اس بار دہشتی یا کڑھکی

کے بجائے رنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ میرا دل بھی اب خون کے بجائے مفر کی راہ کا خطرہ تھا۔ دفعتاً مجھے جیسے اپنی سامعین کے بالکل قریب گولیوں کی تڑتار ہٹ سنا دی۔ بے اختیار میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ مجھ پر رائل تانے کھڑا چل تورا کر گرا۔ ایک لمحے کو تو میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا تھا کہ یہ سب کیا اور کیسے ہوا تھا؟ مگر میں ایسے اچانک اور غیر متوقع حالات کی عادی ہو چکی تھی اور بوکھلانے یا ڈرنے کے بجائے میں لڑاؤ کی اپنے حلق حواسوں پر قابو پانے کی بھی صلاحیت رکھنے لگی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے سامنے کن تانے پہاڑ کی طرح کھڑے چل کو سرحد بننے زمین پر ڈھیر ہوتے دیکھا تو فوراً میری نگاہیں فائرنگ کی سمت میں اٹھ گئیں۔ یہ میرے بائیں جانب ٹیلے کی وہ اونچی سمت تھی جہاں سے سوڈھل..... زخموں سے چور ہو کر لڑکھڑاتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اب عین اس سمت پر مجھے ایک انسانی ہیولا ہاتھ میں گن پکڑے دکھائی دیا۔ میرے وجود میں الٹا کی اضطراری جنبش ابھری۔ اور جوش کی ایک جارحانہ لہر بجلی کی طرح میری رگوں میں سرایت کرتی چلی گئی۔ تب میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے بالکل قریب ساکت پڑے چل کی لاش پر پھینچی اور اس کے مردہ وجود کے قریب پکڑا رائل آپک کی اور پشت کے بل لیٹے لیٹے ذرا کروٹ بدل کر ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے اس پراسرار ہیولے پر ایک برسٹ فائر کر دیا۔ ٹیلے پر گردوغبار کا طوفان اٹھا اور پھر اسے نشانے کی ”تسلی“ کے بغیر مخالف سمت کی طرف دوڑ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ ٹیلے کی سمت سے برسٹ چلنے کی ٹھن گرج سنا دی۔ مگر اس وقت تک میں بل کھاتی راہ گزر کے موڑ کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرے جی میں جانے کیسی ”مہم جوئی“ سانی کہ میں ایک ٹیلے کی آڑ سے چپک کر بیٹھی رہی۔ اس وقت میرے رگ دپے میں عجیب سے جوش کی لہر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پراسرار ہیولا کوڑل کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ جو پھوٹا خان کے دو حواریوں کو جنم رسید کرنے کے بعد زخمی سوڈھل کا پیچھا کرتا ہوا اس طرف نکل آیا تھا اور اپنی جنگجوانہ اور مکارانہ چال دیتی سے وہ پھوٹا خان کے تیسرے حواری چل کو بھی اب ختم کر چکا تھا اور بڑی آسانی کے ساتھ مجھ تک بھی آپہنچا تھا لیکن میری بروقت ہوش مندی نے اب اس کے لیے میرا حصول مشکل بنا ڈالا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ کوڑل جیسے مکار دشمن سے میں خود بھی بری طرح خائف تھی۔ اگرچہ میں نے اس خوف کو اپنے اعصاب پر سوار کرنے کے بجائے اس کا ڈٹ کر سامنا کرنے کی غان کی تھی اور میں نے اس بار اپنے دل میں یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں اب اپنے پھوٹا خان اور لالال وغیرہ جیسے دشمنوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی کیونکہ یہ

میرے دشمنوں کا وہ گردہ تھا جو بار بار میرے اہم مقاصد کے آڑے آکر میرا جینا دو بھر کیے ہوئے تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ سب سے بڑی اور اہم بات یہ بھی تھی کہ ان کے زہن میں آکر بار بار میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوا تھا چھوٹا خان اور لالاں وغیرہ کے دونوں مخالف ٹولوں کا مقصد مشترک تھا اور وہ تھا میرا حصول تاکہ وہ لوگ اس بیش قیمت "راکاس مورتی" کے مدفن تک پہنچ سکیں اور یہی وجہ تھی کہ میرے حصول کی خاطر ان دونوں ٹولوں کے درمیان خطرناک رسائی جاری تھی۔

نیلے کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ جانے کا میرا ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ کوئل یقیناً میرا تعاقب کرتا ہوا ضرور ادر آئے کی کوشش کرے گا۔ میری ان حالات میں اس جرأت کا مظاہرہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ چھوٹا خان اور لالاں سمیت کوئل..... بہر صورت میری موت کے متنبی نہ تھے۔ جب تک کہ وہ میرے ذریعے "راکاس مورتی" تک نہیں رسائی حاصل کر لیتے اس کے بعد یقیناً میری زندگی ان کے لیے کاٹنے کی طرح ٹھنکتی۔ اور تب یہ لوگ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک لمبی کبھی دیر کی نہیں لگائیں گے۔ لہذا یہی سبب تھا کہ میں اب ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جا رہی تھی کہ میں چھوٹا خان سمیت لالاں اور کوئل کو جہنم داخل کر کے ہی دم لوں۔

میں دم سادھے نیلے کی آڑ میں جھک کر اکڑوں بیٹھی تھی۔ میرے چہرہ اطراف سانٹے پھیلے ہوئے تھے۔ ہر سکوت فضا میں مجھے اپنی سانسوں کی بازگشت بھی چھیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی چہ جائیکہ جسے نہ کر میرے دشمن میری یہاں موجودی سے واقف نہ ہو جائیں۔

معاذ مجھے اپنے عقب میں آہٹ سی سنائی دی۔ میں جنگلی بلی کی طرح راتقل تانے پلٹی۔ کسی نے مٹی کا ڈھیلا اچھالا تھا۔ یہی وہ جان لیوا تھا جب بلی کی سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں دشمن کی اس چالاکی کا عقدہ کھلا اور جب تک میں دوبارہ ہلکتی مجھے دیر ہو چکی تھی۔ ایک ہیو لے نے میرے رخ پھیرنے پر عقب سے مجھ پر چھلا گنگ لادی تھی۔

☆☆☆

میرے حلق سے اضطرابی چیخ کی نکل گئی۔ بد بخت کوئل نے مجھے گردن سے دبوچنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے پشت کے بل گرے ہی..... اپنے ہاتھ کی مٹھی مضبوطی سے جکڑتے ہوئے ایک گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ راتقل چونکہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی لیکن میرا ماکہ کوئل کے لیے غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔ ایک ٹائے کے لیے وہ بھجلا سا گیا۔

میں نے فوراً پھلکی کی طرح تڑپ کر قریب دھری اپنی رانگیاں ہاتھ جمایا تو کوئل اپنے مضروب چہرے کی تکلیف کو محسوس میرے راتقل والے ہاتھ کو پکڑنے کی سعی کرنے لگا۔ میں نے پشت کے بل لیے اپنے اپنی دائیں بائیں اس کے سینے پر چھاننا اور اسے پرے دھکیل دیا۔ مگر اس کوشش میں وہ میرے ہاتھوں راتقل پھینچنے میں کامیاب ہو چکا تھا چنانچہ اگلے ہی لمحے وہ میرے سے اٹھا اور میری راتقل ایک جانب پھینک کر اپنی راتقل پھینک کر اپنی اور زہر خند لہجے میں بولا۔

"خبردار..... کوئیاں! اب کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ اس نے شعلہ آگنی نظروں سے مجھے کھور اور میں بے اختیار لپک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل متوحش انداز پر تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"چھوٹا خان کے اور کتنے ساتھی باقی ہیں" اس نے ڈر سے پوچھا۔

"ایک..... دوسرا وہ خود ہے اور لالاں کے تعاقب میں دونوں گئے ہیں" میں نے مصفا صاف گوئی سے جواب دیا تو اس نے دوبارہ پوچھا "کس طرف گئے ہیں وہ دونوں مردود؟"

"اس طرف....." میں نے اس بار دروغ گوئی سے کہہ لیتے ہوئے بالکل مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ وہ چند ٹائے دانت پیٹتے ہوئے کچھ سوچتا رہا پھر اس کے بعد مجھے مذکورہ سمت میں آگے بڑھنے کو کہا۔ میرے تے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ تاہم میں نے ایک دم بھی آگے بڑھانے بغیر چالاکی سے کہا۔

"چھوٹا خان کے سر پر اس وقت خون سوار ہے۔ تھوڑا سا لے بہتر یہی ہوگا کہ تم میری نگر چھوڑ کر اپنی لالاں کو ان دونوں کے خونی پیچے سے بچاؤ۔ میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں! تنہا رہا تو مجھ..... سے کوئی ٹھنکی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرو۔" میں یہ کہتے ہوئے ٹوٹتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے پر اپنی بات کی اثر پذیری بھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے فوراً یہ بات محسوس کر لی کہ وہ میری بات پر چند لمحے کے لیے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ پھر معرات کے پڑھنے سانے میں ہمیں دھواں دھار فارنگ کی گھن گرج سنائی دی۔ ہم دونوں ہی بری طرح ٹھٹکے تھے۔ کوئل البتہ زیادہ پریشان دکھلا دینے لگا تھا۔ فارنگ کی آواز اس سمت سے ابھری تھی مگر تمھوڑی دیر پہلے چھوٹا خان اور اس کا چوتھا ساتھی لالاں کا تعاقب کرتے ہوئے نکلے تھے۔ یہ مخالف سمت تھی جو میرے جھوٹا پول کھولنے کے لیے کافی تھی۔ شاید یہ بات کوئل نے بھی فوراً محسوس کر لی تھی وہ اب میری طرف سنسنائی ہوئی نظروں سے

گھومنے لگا مگر میں نے اپنے چہرے سے ذرا بھی گھبراہٹ ظاہر ہونے نہیں دی تھی۔

"تو کہہ رہی تھی کہ وہ دونوں مردود..... اس سمت گئے ہیں..... جبکہ فارنگ کی آواز تو عقب سے آ رہی ہے؟"

"میں نے بالکل درست کہا تھا" میں نے دھمکانی سے اپنی بات قائم کرتے ہوئے جواب کیا۔

"لالاں موقع پاتے ہی اس طرف دوڑی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر بعد میں اپنا رخ تبدیل کر لیا ہو۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تم اس طرف موجود ہو گے۔" میری توجہ نے اس کی آنکھیں غیظ کو زرا کم کیا تو وہ بولا۔

"کوئیاں! تنہا میری بات بالکل درست ہے۔ ہماری واقعی تم سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے لیکن کوئیاں تو اگر راکاس مورتی تک ہماری راہنمائی کر دے تو یہ میرا وعدہ ہے پھر ہم تیرا پیچھا چھوڑ کر واپس اپنی رہتی راہستان کی طرف لوٹ جائیں گے۔"

"اس ردیل چھوٹا خان کو بھی یہی غلط فہمی پڑے ہوئے ہے جتنا ہے میں راکاس مورتی کے راز سے واقف ہوں" اس کی بات کے اہتمام پر میں نے بھی مکارانہ حکمت عملی سے اپنے لہجے میں بے بسی سوتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"جبکہ حقیقت یہی ہے کہ..... مجھے خالقو چاچا نے اس مورتی کے بارے میں صرف اس قدر ہی بتایا تھا کہ وہ کندھ کوٹ کشمور کے صحرائی علاقے میں کہیں دفن ہے۔"

"تو ایک چالاکی بلی بننے کی کوشش مت کر کوئیاں!" معا کوئل نے دانت پیٹتے ہوئے جیسے میری مکارانہ حکمت عملی پر پانی پھیر دیا۔ "انتا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ راکاس مورتی کشمور کے صحرائی علاقے میں کہیں دفن ہے اور ہمارے پاس اتنے وسائل ہیں اور نہ ہی اتنا وقت کہ کشمور کے صحراؤں کو کھنگالتے پھر مجھے پورا یقین ہے کہ خالقو دھاڑیل نے جس مقام پر وہ مورتی دفن کی ہے اس سے تجھے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا اور تو راکاس مورتی کے دفن سے بخوبی آگاہ ہو چکی ہے۔ ورنہ وہ ردیل اور دغا باز چھوٹا خان ہرگز تجھے پر غمال نہ بناتا۔"

اس کی گفتگو نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت دوبارہ فارنگ کی گھن گرج ابھری۔ کوئل ایک بیک ٹھٹکا اور پھر اپنی راتقل کی مہیب نال لہراتے ہوئے مجھ سے تنہا نہ کر سکی ہے بولا "چلو آگے بڑھو۔ اب کوئی بات نہیں ہوگی" اس کے خنخور لہجے کی قطعیت کو محسوس کر کے میں سر جھکا کر اس جانب چل پڑی مگر چھوٹا خان اپنے ایک اکلوتے حواری کے ساتھ لالاں کے تعاقب میں دوڑا تھا۔

کوئل میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں جان بوجھ کر آہستہ دوی

سے آگے بڑھ رہی تھی۔ معا کوئل نے میری پشت میں اپنی راتقل کی نال چھوتے ہوئے دھکیل کر کہا "جلدی چلو..... ورنہ گولیوں سے بھون دوں گا۔"

ناچار میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ فارنگ کا انداز ایک طرف محسوس ہو رہا تھا۔ جس کا بدستور اور واضح مطلب یہی تھا کہ لالاں ابھی جی تھی چھوٹا خان جیسے عفریت سے اپنی جان بچانے کی تک وہ میں مصروف تھی۔ کوئل کا پس نہیں چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح لالاں کی مدد کو لپکے۔ مگر وہ مجھے بھی چھوٹا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی وجہ تھی کہ وہ شدید تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت کی قسم کے حالات کا شکار تھا۔ چھوٹا خان کے تین حواریوں کو بڑی سفاکی..... سے قتل کر چکا تھا۔ اور نہ جانے اس نے اب تک چھوٹا خان کے بیٹے مراد کی کو کہاں چھپا رکھا تھا۔ فارنگ کی آواز بھر گئی۔

"کوئیاں! میں کہتا ہوں..... دوڑ دو تیز دوڑو۔ جلدی کرو" مجھے عقب سے کوئل نے جونیوں کے سے انداز میں ٹھوکا مارتے ہوئے کہا اور پھر میں نے ٹیلوں کے درمیان مل کھائی راہ مگر پر بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ فارنگ کی آواز اب بالکل فریب سے آئی ہوئی سنائی دینے لگی تھی۔ یہ میرے لیے

بڑے سنگین لحاظ تھے جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اس وقت چھوٹا خان کے سر پر اپنے بیٹے کے سوا اور کوئی ذہن سوار نہ تھی۔ وہ منتقل ہو کر مجھے بھی ہلاک کر سکتا تھا پھر دو خنخور اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دشمنوں کے بیچ میں بھی پس سکتی تھی۔ مگر میں نے باوجود اس کے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے اور میرا دل متوحش ہونے کے باوجود "فرار" کی راہ کا متلاشی تھا۔ میں اب کوئل کی ہدایت کے مطابق دوڑے جا رہی تھی۔

دائیں بائیں ٹیلوں کا سلسلہ اب مزید مختان ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر چاک ایک مقام پر میں دم ہو کر گڑ بڑی اور بری طرح پھپھنے لگی۔ دھواں دھار گولیاں چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوئل نے میرے بال تھکی میں جکڑ لیے اور زرا بولا۔

"میرے ساتھ کمر مت کر چل اٹھ" مجھے غصہ تو آیا مگر میں اسے دبانے پر مجبور تھی۔ ناچار اٹھ کر کھڑی ہوئی اور ہڈ حال سی آگے بڑھنے لگی۔ مگر میرا چلنے کا انداز سست ہی تھا۔ کوئل اس وقت پائے رفتن نہ جانے ماندن کی سی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ مجھے چھوٹا نا بھی نہیں جانتا تھا اور میرے ہوتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر اپنی لالاں کو دشمنوں کے اندھا دھند حملوں سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ وہ تنہا ہوتا تو شاید اب تک قہر و غضب بن کر دشمنوں پر ٹوٹ چکا ہوتا۔ لیکن مجھے پر غمال رکھنے کی..... ذمے داری اس

کے جارحانہ عزائم میں آڑے آ رہی تھی۔ میری سست رو چال پر بالآخر وہ تمل گیا اور ایک زوردار لٹ اس مردود نے میری کمر پر رسید کر دی۔ مجھے ایک زوردار جھکا لگا۔ اور میں جتنی ہوتی تھی کے بل زمین پر جا گری۔ اب تو میں بالکل ہی ڈھے کر رہ گئی تھی۔ تب پھر مجھے کوزل کی آواز سنائی دی۔

”حرام زادی! تو جانے کی کدھر آخر ہم سے بچ کر۔ میں پہلے دشمنوں سے نمٹ لوں۔ پھر تجھے ہی دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ آندھی طوفان کی طرح میرے قریب سے گزرا۔ میرا دل بے پایاں مسرت سے جھوم اٹھا۔ میرے ذہن رسائے پر گل یہ تکیب سوچ رہی تھی، جو کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ میں نے تھکاوٹ اور بڑھ چلائی کی اداکاری چھوڑ کر زمین پر بڑے بڑے سر اٹھا کر سامنے تاریک راہ گزریں راصل بدست کوزل کو گم ہوتے دیکھا تو پھر ہی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر آؤ دیکھنا تاؤ عقب میں دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

میرے دوشن مجھے بھول کر آپس میں ہی تیراؤ ماز ہو چکے تھے اور میرے فرار کا یہ بہترین موقع تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی چال میں اپنی آسانی کے ساتھ کامیاب ہو چکی تھی۔ شاید اس کی وجہ میری ہی تھی کہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ کم از کم پھونکا خان یا کوزل..... مجھے نکل کر کے اپنے ”بیش قیمت“ مقصد کو ”ختم“ کرنا بہر حال نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی میرا ان سے کوئی خونی یا سنگین جھگڑا تو نہیں تھا۔ وہ اپنے حصول مقصد کی خاطر مجھے اس وقت تک زندہ رکھنے پر مجبور تھے جب تک کہ وہ دونوں میرے ذریعے اس منحوس ”راکاس مورٹی“ کو نہ حاصل کر لیتے۔

بہر طور میں اب دونوں پر مٹی ڈال کے بے تحاشا دوڑی چلی جاری تھی۔ ٹیلیوں کے درمیان مجھے دائیں بائیں مزید چوڑی گز رنگا جیس نظر آئی تھیں۔ اور جب میں نے ایک موڑ کا تو اچانک میں ایک نیم اندھیرے مقام پر ٹھک کر رک گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب میرے دائیں بائیں بلکہ چہار اطراف گز رنگا ہوں کی بھول بھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں پریشان سی ہو گئی۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کون سی راہ گزریں داخل ہونے کی کوشش کروں؟ پھر اللہ کا نام لے کر اپنی دائیں جانب والی راہ گزریں داخل ہو گئی۔

بالآخر میں دوڑتے دوڑتے ایسے مقام پر پہنچ کر رک گئی جہر ٹیلیوں کا سلسلہ یک لخت معدوم ہو چکا تھا۔ ذرا ستانے اور اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے کے بعد میں نے جنگل کے بالکل مخالف سمت میں بڑھنا شروع کر دیا۔ جلد

ہی مجھے راستے کی درست سمت کا اندازہ ہو گیا۔ یہ وہی مقامز جدھر پھونکا خان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہم نے لا لاللاں نشان دہی پر ٹیلیوں کے اندر اپنا سفر شروع کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب صرف چند فرلانگ کے فاصلے پھونکا خان کی جیب کو موجود ہونا چاہیے تھا یہاں قد آدم خوردہ خادار جھاڑیوں کا سلسلہ بہت مختصر تھا..... اس کے بعد پھونکا جھدری جھاڑیوں والا ویرانہ تھا اور وہیں پھونکا خان کی جیب کھڑی تھی لہذا منزل کے قریب پہنچنے کی دھن میں میں بغیر سہ خادار جھاڑیاں چلائی ہوئی جب آخری سرے پر پہنچ کر یکدم جھاڑیوں سے نکلی تو سامنے نگاہ پڑتے ہی میرے قدم جیسے کہ دم زمین میں گڑے گئے۔ سامنے دم روشنی میں مجھے پھونکا خان کی جیب تو کھڑی نظر آئی تھی مگر میرے چونک کر کہنے کی وجہ پھونکا تھی۔ میں نے جیب کے قریب کچھ لوگوں کو کھڑے دیکھا تھا۔ ان کا فاصلہ مجھ سے زیادہ نہ تھا۔ ان کی نظروں سے چھپنے کی غرض سے میں دوبارہ لائے پاؤں جب واپس جھاڑیوں کی طرف ہٹاؤ اچانک مجھے کسی کے زور سے ہنکارنے کی آواز سنائی دی ”خبردار..... رک جاؤ..... ورنہ.....“

میں یہ آواز سن کر بری طرح دل گئی یہ مردود کوزل کی آواز تھی۔ میرے تو فرشتے کوچ کر گئے مگر میں رک نہیں اور پوانہاد عقب میں دوڑ لگا دی۔ اس لمحے میرے عقب میں دتین گولیاں چلنے کی آواز ابھری مگر میں رک نہیں اور ہراساں ہرنی کے مانند دوڑتی چلی گئی۔ معاً مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی میرے تعاقب میں دشتانہ انداز میں دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اپنے تعاقب کے اجاں نے مجھے لرزاسا دیا۔ اور پوانہاد دوڑتے دوڑتے میری ٹانگیاں بھی لرزے لگیں۔ ٹھیک اسی وقت میرا پاؤں جھاڑیوں میں دبا اور میں ایک اضطراری سی کراہ آمیز چیخ ماری ہوئی منہ کے کئی خادار جھاڑیوں میں جا گری۔ میرے چہرے پہ خراشیں ابھر آئیں۔ گھبراہٹ اور عالم سراہی سے میرا خون رگوں میں

جمنے لگا تھا اور شاید یہی سبب تھا کہ میں گرتے کے ساتھ ہی چہرے دم بخودی بے حس و حرکت اپنی جگہ پڑی رہی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے تحمل حواس پر قابو پانے کا کوشش کرتے ہوئے دوبارہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو اچانک کسی نے عقب سے غراتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور میں ایک بار پھر خامود..... جھاڑیوں میں گری اور گرتے ہی معاً مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر سوار میرا مقابلہ وجود نسوانی تھا۔ صنف نازک بذات خود ایک کمزوری ہے جس سے مجھے قدرے حوصلہ ہوا مگر مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہیں لگی یہ نیلانی وجود اس چٹال لاللاں کے سوار کی کانٹیں ہو سکتا تھا۔ لاللاں

جیسی مردانہ ”صنف نازک“ کا خیال ذہن میں ابھرتے، میرے اندر ایک صرف ایک ثانے کے لیے مغلوب ہونے کا محسوس سا خیال ابھرا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر..... سرکش اور باغی کڑے حالات میں بھڑ جانے والی کونجیاں اگڑائی لے کر یکدم بیدار ہو گئی چنانچہ میں نے گرتے ہی : ن شری کی طرح زمین پر لوٹ لگائی اور خود کو لاللاں کی مضبوط گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میں اسے پہچان گئی تھی۔ وہ لاللاں ہی تھی۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی تو وہ بھی زخمی مان کی طرح پھکارے مشابہ آواز نکال کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ خوں خوار نگاہوں سے گھورتے گئی۔ تاروں کی ٹٹھاتی روشنی میں اس کا چہرہ جوش غیظ سے سرخ نظر آ رہا تھا تاہم مجھے وہ..... مسیحیل اور زخمی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”کونجاں!..... تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ نہ بوشی سے میرے ساتھ چلو“ معادہ اپنی پھری ہوئی سانسوں کا قابو پاتے ہوئے دانت بھینچ کر بولی تو میرے دماغ میں بھی غیش آمیز جوش کا وہاں سا بھر نے لگا اور میں نے جواباً شعلا فٹاں لکے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لاللاں! جس مقصد کے لیے تو اپنی جان کی پر داکے بغیر..... تن کی بی بازی لگاتے ہوئے ہے یوں سمجھ اس سے کہیں زیادہ دوسری رگوں میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے بھولاوا بن کر مجھے شعلہ فٹاں بناتے ہوئے ہے مگر تیرے مقابلے میں میرے ذہن زیادہ طاقت ور سفاک اور دوڑی تعداد میں ہیں اس لیے میں تجھے خردا کرتی ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جا.....“ میرے جواب نے لاللاں کے خراش زدہ چہرے کی سرخ سی کو مزید گہرا کر دیا پھر وہ انگلی سے لمحے میں دانت بھینچتی ہوئی جارحانہ انداز میں میری طرف یہ بڑھاتے ہوئے لگی۔

”..... تو ایسے نہیں مانے گی تیرا! اس کے منہ سے گالی سن کر مجھے میرا جانا ہوا داغ بھگ بھگ کرنے لگا۔

”ڈیل..... تو کتنا کی بچی! میں تیرا خون پی جاؤں گی“ شعلہ خوں لکے میں اسے جواب دیتے ہوئے بیک وقت میں بھی اس کی طرف لگی۔ پھر ہم دونوں زخمی شیریں اور ختم نامگن کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گردن پر بھانے کی کوشش کی تو میں نے اپنی انگلیوں سے تیرے نیلے ہاتھوں سے اس کا چہرہ توج ڈالا۔ اس کے طلق سے زخمی کا منہ ہوئی اس کے ساتھ ہی اس نے پتول نکال لیا اور غرا کر بولی۔

”کونجاں!..... کاش..... میں تجھے ہلاک کر سکتی.....

لاللاں مجھ پر پتول تانے آتش خوں رنگ لہجے میں ایک ایک لفظ چکا کر بولی۔

”میں واقعی تجھے ایک کمزور لڑکی سمجھتی تھی۔ اچھا ہوا جو تونے اپنے پر پڑوں سے مجھے آگاہ کر دیا۔ چل اب شرافت سے ورنہ میں تیری دندوں ٹانگوں پر گولیاں چلا کر تجھے معذور بنا دوں گی۔“ اس کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی کیونکہ میں نے اب اپنے ہتے ہوئے اعصاب یک دم ذلیل چھوڑ دیے تھے۔ میرے سپر ڈالنے پر اس کے خون آلود زخمی ہونٹوں پر زہر خندی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے پتول کے اشارے سے مجھے ایک طرف چلنے کو کہا۔ میں اس کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔ چنانچہ خاموشی سے آگے بڑھی وہ اپنے اور میرے درمیان ایک مختا فاصلہ رکھ کر عقب میں چلنے لگی۔

لاللاں مجھے پتول کے بل پر جیب کے قریب لے آئی تو میں بری طرح چوکی۔ میں نے دیکھا لاللاں کا منگیتر مردود کوزل پھونکا خان پر راصل تانے کھڑا تھا اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک نوٹس نالہ ڈرے سبے بچے کو بھی گدی سے دبوچ رکھا تھا۔ بچے کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ معصوم بچہ پھونکا خان کا بیٹا مراد علی تھا۔ پھونکا خان کے چہرے پر قیامت کردٹ لے رہی تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر کوزل نے ایک خنوار سی نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر جب اس نے اپنی لاللاں کے زخمی اور خون آلود چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں لمحہ بھر کو حیرت سے پھیل گئیں۔

”لاللاں! یہ..... یہ تجھ کو کیا ہوا؟“

”یہ اس نے کیا ہے۔ بہوت خطرناک چھو کر ہے یہ..... کوزل! اس سے ہوشیار رہنا۔“

لاللاں نے ہاتھوں سے خون تھوکتے ہوئے کوزل سے کہا۔ اس کی بات سن کر کوزل اپنی چندی چندی مگر سفاک آنکھوں سے میری طرف گھورتے لگا۔ پھر لاللاں سے جوش غیظ سے بولا۔

”لاللاں! تو ادھر آ! میں اس حرام زادی سے ابھی تیرا حساب بے باق کیے دیتا ہوں۔“

”نہیں کوزل! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل چلو“ لاللاں نے کہا۔

”کونجاں! ہمارے ہاتھ لگ چکے ہیں میرا خیال ہے اب اس مردود پھونکا خان کا اھر ہی قصد پاک کر دو کیونکہ اب ہماری مقدس مورٹی (دکاس مورٹی) کے راز سے واقف ہو چکا ہے“ لاللاں کے لہجے میں یکا یک سفاکی اترا آئی تھی جسے محسوس کر کے

خود میں بھی ایک لمحے کو دل ہی گئی تھی۔ بلکہ پھوٹا خان بھی لالال کے خونی عزائم بھانپ کر ایک لمحے کو اپنا پیش بھلا کر پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

”ان دونوں کو گولیوں سے بھون دے کوئل!“ اچانک میرے عقب سے لالال کی سفاک گونج ابھری۔

پھوٹا خان لاکھ میرا دکن کی لیکن اس وقت اس کے معصوم بنے کو دیکھ کر میرا کچھ بچنے لگا تھا۔ اس کی معصوم فریاد نے میرے اندر آگ سی بھڑکا دی۔ پھر اس لمحے جیسے میرا رواں دواں بیدار ہو گیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے کچھ بھیجی تھیں دیتا تھا اور میں شینا باجی کی طرح بے خطر گویا آتش نمرودیوں کو دہڑتی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں لالال کی آواز سے محسوس کیا تھا کہ وہ جوش غیظ میں میرے کافی قریب بلکہ بالکل ساتھ آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ پسٹول والا اس کا ہاتھ بھی ڈرا نیچے جھک آیا تھا، اچانک میرے سنسنے ہوئے وجود میں پاراسا دوڑ گیا۔ میں نے جھپٹ کر لالال کے ہاتھ سے پسٹول چھین لیا۔ لالال ایک لمحے کو تھکا تھکی کھڑی رہ گئی۔ ہوش اسے تب آیا جب میں اس کا چھینا ہوا پسٹول اس کی کپٹی سے لگاتے ہوئے کوئل سے بہ آواز بلند بولی۔

”کوئل! خبردار..... اپنی رائفل چھینک دے ورنہ لالال کا بھیجہ اڑا دوں گی۔“

میری فراغت سے مشابہ آواز نے ایک لمحے کو کوئل کو کماکت سا کر دیا۔ تاہم اس کے مکروہ چہرے پر برا فروختی کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ پھوٹا خان کے زرد پڑتے چہرے پر جیسے زندگی کی رقیق دوڑ گئی۔ ننھا مراد علی اپنی معصوم چھٹی چھٹی آنکھوں سے میری جانب نکلنے لگا۔

”رائفل مت چھیننا کوئل!“ اچانک لالال کا جیسے سکتوٹا اور اس نے خنخرائی آواز میں اپنے سامنے کو متنبہ کیا، ”زندہ تو ہمیں یہ بھی نہیں چھوڑیں گے کوئل! رائفل چھیننے کی بے وقوفی مت کرنا“ لالال نے دوبارہ جی جان سے کوئل کو تائین کی۔ یہ بہت سنسنی خیز لمحات تھے۔ کوئل نے میری دھمکی کو نظر انداز کر ڈالا اور بدستور وہ پھوٹا خان اور اس کے معصوم بچے پر اپنی رائفل تانے لگا رہا۔ ادھر جانے کیا سوچ کر کوئل نے پھوٹا خان سے مخاطب ہو کر غراتے ہوئے کہا۔

”خبردار پھوٹا خان! اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت مت کرنا اور نہ ہی کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا۔ تم دونوں باپ بیٹے اب بھی میرے نشانے پر ہو۔“

اس عجیب صورت حال پر میں تھلا کر رہ گئی۔ اگرچہ میری بروقت اور فوری جارحانہ کارروائی سے دونوں باپ بیٹوں کے

سروں پر ناجیتی موت عارضی طور پر ٹپ چکی تھی لیکن مکار لالال نے شین میری جیتی ہوئی بازی کو مکمل فتح میں بدلنے سے روک رکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے مکار لالال نے چلتے بازی سے بڑا مخاطب کر کے کہا، ”کوئیاں! بے وقوفی مت کر۔ پھوٹا خان! بھی دشمن ہے۔ وہ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔“

”کواس بند کر اپنی..... کیتا!“ میں نے غرا کر جھڑکا۔ ”تم ایک بے گناہ اور معصوم بچے کی جان لینا چاہو۔ یہ مجھے گوارا نہیں! اپنے سامنے سے کہو کہ وہ رائفل چھینک دے! میں تم دونوں کی بہتری ہے۔“

”ہماری بہترین کس میں ہے یہ ہم خوب جانتے؛ کوئیاں!“ لالال نے استہزا لیتے ہیہ میں کہا۔

”اب اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم دونوں کو سلامت یہاں سے نکل جانے دیا جائے ورنہ حالات جان حد تک سنگین ہو جائیں گے اور پھر ہم میں سے کوئی گزار نہیں بچے گا۔“

میں نے اس کی تجویز پر غور کیا۔ میرا پسٹول والا ہنوز اس کی کپٹی پر تھا دوسری طرف کوئل نے اپنی رائفل مہیب نال پھوٹا خان اور معصوم مراد علی پر بدستور تانے رکھی۔ ”ٹھیک ہے پھر.....“ چند لمحوں کے بعد میں نے کہا، ”تم پہلے اپنے سامنے آ کر..... وہ..... دوڑ چلا جائے۔ پھر میں تمہیں بھی زندہ سلامت یہاں سے رخصت کر دوں گی۔“

”ہرگز نہیں! ہم دونوں کو ایک ساتھ یہاں سے جانے جائے“ لالال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مطالبہ کیا۔

”میرے پاس صرف ایک پسٹول ہے جبکہ تمہارے پاس گولیوں سے بھری ہوئی رائفل ہے۔ وہ دور سے آسانی ہمیں نشانہ بنا سکتا ہے۔ تمہیں پہلے ہماری بات ماننی چاہیے۔ یہ بہت ذرا بھی چوک ہو جائی تو گویا آہٹیم بم پھٹ پڑتا۔ اپنی پیشانی عرق آلودی محسوس ہونے لگی تھی۔

ان کڑے اور سنسنی خیز لمحات میں صرف میں اور لالال جو کلام تھے۔ کوئل نے موجودہ حالات کی ساری ذمہ داری کوئل کی صوابدید پر چھوڑ رکھی تھی۔ وہ جو فیصلہ کرے۔

”کیا کہتی ہو پھر..... لالال.....!“ میں نے ان لمحات کو جلد پانے کی غرض سے لالال کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”ٹھیک ہے..... میں اور کوئل یہاں سے اٹھ جائیں گے۔“

”جہیں..... صرف..... کوئل! اٹھ بیروں واپس چلنے کا تم ادھر ہی میرے نشانے پر موجود رہو گی۔“ میں نے ٹوک کر کہا، ”اب اس کا بھی حل باقی رہ جاتا ہے، میرا تم سے وعدہ ہے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں تمہیں بھی زندہ سلامت یہاں سے رخصت کر دوں گی۔“

میری بات سن کر لالال چند لمحوں کے بعد سوچتی رہی پھر ایک گہری ہکاری بھر کر اس نے اپنے سامنے کوئل کی طرف دیکھا۔ رقیقت موجودہ صورت حال کی خطرناکی پر یہ دونوں زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے لہذا لالال نے کوئل کو یہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ کوئل نے ایک لمحہ پھوٹا خان اور اس کے بیٹے مراد علی کو..... سنسنی ہوئی نظروں سے گھورا پھر اس کے بعد وہ بدستور ان دونوں باپ بیٹیوں پر اپنی رائفل تانے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھ قدموں پیچھے کی طرف سرکے لگا۔ میری تیز اور جفا گانگی بیک وقت کوئل اور لالال پر بھی ہوئی تھیں۔ پھوٹا خان کی حالت زیادہ تپلی ہو رہی تھی۔ کوئل ان پر رائفل تانے کا لی دور چلا گیا تھا اور پھر وہ جھڑپوں میں اوجھل ہو گیا۔ میرا دل اس سے انجانے اندیشوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کوئل کے اوجھل ہوتے ہی میں نے پھوٹا خان کو جیب میں سوار ہونے کا کہا۔ اس کی تشویش زدہ نظریں ہنوز سامنے تاریکی میں جمی ہوئی تھیں جہاں کوئل غائب ہوا تھا۔

میری ہدایت پر پھوٹا خان نے اپنے بیٹے کو ڈرتے ڈرتے گود میں اٹھایا اور جیب میں سوار کیا اور پھر جلدی سے خود بھی سوار ہو کر اسے اشارت کیا۔ میرا خیال تھا کہ پھوٹا خان اپنی بددلیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً آگے روانہ ہو جائے گا لیکن اس نے یہ آواز بلند بھیجی جیب میں سوار ہونے کا کہا۔ میں نے پسٹول لالال کی کپٹی پر لگاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ جیب تک چلنے کو کہا۔ وہ چند لمحوں کے بعد پھوٹے خاموش کھڑی رہی اس کے بعد اس نے بھی جیب کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں اسے کوئل کی لمحات والے اندھے رخ پر اپنی ڈھال بتائے جیب تک آئی اور پھر جیب میں سوار ہو گئی۔ میرے سوار ہوتے ہی پھوٹا خان نے ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔ میں نے اس ناشائش مراد علی کے ہاتھوں کے جھڑپوں کو دیکھ دیا۔ جیب جھٹکے لگائی ہوئی طوفانی رفتار سے آگے دوڑنے لگی۔

میرے دل دماغ کو اب پھوٹا خان کی طرف سے کھد بد لگ لگی کیونکہ میں اس کے ساتھ تھی اور اس کی دعا باز فطرت سے بخوبی واقف تھی اس لیے میں نے ایک سوچ پر اس سے کہا، ”پھوٹا خان! تم مجھے ادھر ہی اتار دو۔“

میری بات پر پھوٹا خان سامنے نظریں مرکوز رکھتے ہوئے ساٹ لہجے میں بولا۔

”کوئیاں! خاموشی سے بیٹھی رہو۔ میں تمہیں اس اندھیرے ویرانے میں تنہا نہیں اتار سکتا۔“

اس کے جذبات سے عاری سر لہجے پر جانے کیوں میرے پورے وجود میں متوحش سی لہر دوڑ گئی۔ تاہم میں نے کچھ نہ کہا خود کو غیر فطرتی حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

خاصی دیر بعد جیب اندھیرے ویرانوں میں ستر کرتی ہوئی بالآخر پھوٹا خان کی اوطاق کے سامنے جارک۔ میرا دل اب انجانے خطرے سے دھک دھک کرنے لگا۔ اوطاق کے باہر پھوٹا خان کے چار پانچ مسلح آدمی موجود تھے۔ وہ سب بیک وقت ہماری طرف بڑھے۔ پھوٹا خان اپنے بیٹے سمیت پیچھاڑا اور پھر مجھے بھی پیچھاڑنے لگا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ جیب سے اتر آئی۔

پھوٹا خان نے جیب سے اترتے ہی مختصر اپنے ساتھیوں کو حالات سے آگاہ کیا نیز انہیں یہ بھی بتایا کہ اس کا بیٹا مراد علی میری وجہ سے لالال اور کوئل کے خونی چنگل سے نجات پاسکا ہے تو اس کے حواری عجیب گولگی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

پھر ہم سب اوطاق کے اندر آ گئے۔ پھوٹا خان نے اپنے تخت جگر کو خود سے لپٹا کر خوب چوہا اس کے بعد اس نے اپنے دو حواریوں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”جادو سے پہلے گھر پہنچاؤ اس کی ماں بہت پریشان ہو گئی اور میری خیریت کی بھی اطلاع دے دینا۔ میں بھی ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

وہ دونوں حواری سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے مراد علی کو دواں سے لے گئے۔ پھوٹا خان کا گھر اوطاق سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔

ان کے جانے کے بعد پھوٹا خان میرے چہرے کی طرف چند لمحے عجیب سی نظروں کے ساتھ نکلنے لگا۔ خود میری اپنی متوحش سی نگاہیں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ پھوٹا خان کے چہرے پر رقت آمیز آثار نمودار ہوئے اور پھر اگلے ہی لمحے جیسے میرے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ پھوٹا خان جو اپنے علاقے کا ایک بااثر زمیندار تھا اور جس کی خصلت میں کوئل کوٹ کر بددلیائی اور دعا بازی بھری ہوئی تھی وہ اچانک آگے بڑھا اور اس نے ایک دم جھک کر میرے پاؤں پھولے اور چند بات سے مرعش لہجے میں بولا۔

”کوئیاں! تم..... مجھے معاف کر دینا..... تم..... تم نے آتش فشاں (39) حصہ 10



میرے بچے کی زندگی بجا کر مجھے خرید لیا ہے۔ میں تو..... میں تو اتنا گر چکا ہوں کہ مجھ کو..... اپنی دھن بھی نہیں کہہ سکتا..... پر کونجاں! میں آج سے تیرا میری بن گیا ہوں۔ تیرا غلام ہوں میں..... تو نے عورت ذات ہو کر مجھ پر اتنا برا احسان کر کے ثابت کر ڈالا کہ عورت واقعی عظیم اور بڑے دل اور حوصلے کی مالک ہوتی ہے۔“

میں پھوٹا خان کی اس کایا کلب پر چند لمحوں کے لیے تو ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہاں موجود اس کے خواری حیرت بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں نے آہستہ سے اپنا ایک ہاتھ پھوٹا خان کے کاندھے پر رکھ دیا اور دھیرے سے بولی۔

”پھوٹا خان! تم بڑے انسان نہیں ہو مجھے خوشی ہے کہ میری ایک چھوٹی سی کوشش سے تمہارے اندر کا ایک اچھا انسان بیدار ہو گیا۔ مگر میں تمہیں صرف ایک صورت میں ہی معاف کر سکتی ہوں کہ اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اب اپنے اندر کے اس انسان کو کبھی مرے نہیں دو گے“ میری بات پر پھوٹا خان سیدھا کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نمناک سی تھیں۔ وہ چند ٹاپے احسان مند نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے بعد اس نے اپنے کاندھے سے اجڑا کر مجھے چھوڑ دیا اور روایتی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھتے ہوئے جذبات سے متحش لہجے میں بولا ”مجھے پہلے میری ایک درخواست ماننا ہوگی۔“

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔

”میرا صرف ایک ہی بیٹا ہے..... مراد علی پتا نہیں تو مجھے اس قابل سمجھتی بھی ہے کہ نہیں..... مگر میری یہ دلی خواہش ہے تجھے اپنی دھی بنالوں..... اور..... اور تیرے سارے دکھ خود لے لوں۔“

اس کی بات پر بے اختیار میری آنکھوں میں رے کے ہوئے آنسوؤں کے بند اٹلی پڑے۔ میں خود دکھوں کی ماری تھی ”ادی.....“ اور ”دھی.....“ جیسے جذبات انگیز الفاظ مجھ پر ایسا ایسا عجیب سی رقت طاری کر دیتے تھے۔ مجھے روتا دیکھ کر پھوٹا خان نے بے اختیار ”میڈی دی“ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چٹایا اور شفقت بھرے انداز میں میرے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے بولا۔

”بس میڈی دی! اب اپنے یہ آنسو پونچھ لے۔ تو مجھے پہلے ہی بہت دکھی محسوس ہوتی ہے۔ تو وعدہ کر کہ مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی! میں تیری آنکھوں میں ایک تڑپ اور درد سامعوس کر رہا ہوں۔ تو مجھے..... لمبی اور ٹھن رہا ہوں کی تنہا مسافر لگتی ہے۔“

مجھ سے وعدہ کر دیے! مجھے اپنے دکھوں کا حال سنائے گی! مجھے ایک باپ کی طرح ہی سمجھے گی؟“

پھوٹا خان کی اس انقلابی تبدیلی نے جیسے مجھے بڑے طور پر چھو جوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے آنسو تھے کہ سنبھلے ہوئے تھے بلکہ اب تو میں سسکیاں بھی بھرنے لگی تھی۔ اس دوران اس کی پُر شفقت آواز دوبارہ ابھری۔

”دھی! تیرے آنسو بتا رہے ہیں کہ تو نے مجھے والا..... مان دے دیا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے میرے ساتھ..... تجھے میں اپنے گھر لے چلوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے دھیرے سے الگ کیا تو میں نے اچانک قدر پریشان کن لہجے میں آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”چاچا سائیں! میں اس وقت ایک بہت بڑی پریشانی بے چینی کا شکار ہوں۔ تو اگر میری ایک مدد کر سکتا ہے تو..... نے دانستہ اپنا جملہ احمورا چھوڑ دیا۔

”ہاں..... ہاں دھی! تو حکم کر..... جو راز ظاہر کرنا ابھی کر دے۔ میں ہوں ناں بول کیا پریشانی ہے تمہاری پھوٹا خان نے جوش سے کہا۔

”چاچا.....! میری ایک بہنوں سے بھی بڑھ کر کنبلی شینا..... وہ اس وقت شہر (لاٹکانہ) کے اسپتال میں زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھے کسی طرح اس کے پاس جانا ہے۔ وہ کس حال میں ہوگی۔ بس چاچا میں کی طرف اس کے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔“

”تو فکر مت کر دھی!“ پھوٹا خان میری آنکھوں آنسو پونچھتے ہوئے شفیق لہجے میں بولا ”میں ابھی اور ادنیٰ خود تجھ کو شہر لے کر چلتا ہوں۔ پہلے تو کچھ کھانی لے۔ پتا ہے کب سے کچھ کھایا یا ابھی نہیں ہے۔“

”نہیں چاچا! اپنی سبیلی کی حیرت معلوم کیے بغیر ایک لمحہ بھی میرے وطن سے پیچھے نہیں اترے گا۔ میں تو شہر لے چل۔ میرا دل بڑا اذیتیں سا ہو رہا ہے۔ حالات پر آتے ہی شینا کی طرف سے میری تشویش ناک اور پریشان کن بے چینی فزوں ہونے لگی تھی اور پھر شاید پھوٹا خان نے پریشانی کی نزاکت کا احساس کر لیا مگر پھر چند لمحوں کے بعد امر اور میرے لہجے میں بولا ”کونجاں دھی! تمہارے میں خود اس وقت تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ پھر کیا تو مجھے وقت دے سکتی ہے۔ میں جا رہا ہوں تیرے ساتھ شہر جانے پہلے میں ایک اور معاملہ طے کر لوں۔ تاکہ مجھے پیچھے نہ قری رہے“ اس کی بات سے پہلے تو میں بھی سمجھتی تھی کہ گھر جا کر اپنی بیوی وغیرہ کو اپنے شہر جانے کی اطلاع دے

ہے مگر جب اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ کہیں چلنے کو کہا تو میں چلنے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر میرے استفسار پر وہ بولا ”دھی! تیرا میرے ساتھ چلنا ضروری ہے۔ پہلے میں تجھے اپنے گھر لے چلوں گا۔ پھر اس کے بعد ہم اس وقت شیخ شیر کے ہاں چلیں گے۔ چل آ..... میرے ساتھ میں تجھے راستے میں وہ بات بتاتا ہوں“ یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب کھڑے آدمیوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”زمان! ابی میں تیل کتنا ہے؟“

”سائیں! ابی میں تو تیل ٹھوڑا ہی ہوگا پر..... دو ڈبے ہاتھ موجود ہیں۔ میں بھی تیل کر رہا ہوں۔“

”اور سنو..... میں ابھی شہر جاؤں گا..... پیچھے گھر کا خیال رکھنا اور ان دونوں سائینوں کے جوڑے (لالاں اور کوڑل) سے تیار رہنا۔ اگر ادھر کارخ کریں تو بے دریغ دونوں کا سر چل جائیگا۔ پھوٹا خان نے انہیں ہدایت دی تو میں نے کچھ سوچ کر پھوٹا خان سے کہا۔

”چاچا سائیں! میرا خیال ہے تم ادھر ہی رکڑیں خود شہر چلی جاتی ہوں۔“

میری بات پر پھوٹا خان ملاحت آمیزی سے بولا۔ ”جیے! میں بھلا تجھے کیا کہیے جانے دوں گا۔ تو فکر نہ کر۔ پہلے میں ان دونوں ذریعوں لالاں اور کوڑل سے غافل تھا۔ پھر اب مجھے یقین ہے وہ ادھر کارخ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے..... میرے ساتھ۔“

ہم دونوں اوطاق سے باہر آ گئے۔ ہمارے ساتھ دو مسلح آدمی بھی تھے۔ ذرا ہی فاصلے پر پھوٹا خان کا بڑا سا پتہ اینٹوں کا ٹولہ نما مکان تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک اذیت مزملازم نے کھولا تو پھوٹا خان مجھے لیے اندر داخل ہو گیا۔ کشادہ سخن میں ”کی! تم اندر ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے۔ سامنے تختیں پالوں والی ایک بڑی سی ریل چھٹی چار پائی پر ایک فریہ ندامت مگر خاموشی قبول صورت گوری چٹی عورت مجھے مراد علی کے ساتھ کھینچتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا جیسی عورت پھوٹا خان کی بیوی ہے اور شوہر کو دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر مجھے یہ وہ قدر سے چونکی۔

”نہیراں! یہ کونجاں ہے..... میں اس کے ساتھ شہر جا رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے۔ پھر آکر تفصیل بتاؤں گا۔“

پھوٹا خان نے بے جگت اسے بتایا اور پھر چند لمحوں وقف سے بے خبر بولا۔

”نہیراں! ہمارے مراد علی کو شیخ شیر نے نہیں بلکہ کسی اور نے اغوا کیا تھا۔ مجھے ذرا غلط بھی ہو گئی تھی۔ میں ابھی اس کے گھر

جا کر اس سے معافی مانگتا ہوں۔ اور تو بھی اس کی طرف سے اپنا دل میلانا نہ کرنا“ میں نے دیکھا شوہر کی بات پر یک دم اس کی بیوی ہنساں کا چہرہ کھل اٹھا اور بولی۔

”دیکھا“ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ میرا والا..... ایسی گری ہوئی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔ پر دیکھ..... اب تو بھی اس بے چارے کی زبیںیں واہیں کر دے۔ وہ بے چارہ بہن کی وجہ سے اب تک خاموش ہے۔ مگر میں جانتی ہوں میرا ادا شیخ کتنا جانی دار شخص ہے۔“

”ہاؤ..... ہاؤ! میں اس لیے تو اس کے پاس جا رہا ہوں۔ تو فکر نہ کر..... اور ہاں سن ذرا محتاط رہنا۔ ابھی کچھ روز تک..... مراد علی کو باہر مت نکلنے دینا۔ اچھا چلتا ہوں میں“ پھوٹا خان نے جلدی سے کہا پھر مراد علی کا گل چوم کر مجھے لیے باہر آ گیا۔ اوطاق میں آ کر ہم جب میں سوار ہوئے۔ پھوٹا خان نے بظنی ہوسٹر لگایا اور اپنے ایک آدی کو ساتھ لیا۔ وہ دونوں جب کی اگلی دونوں سیٹوں پر براجمان ہو گئے جبکہ میں عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ پھر جب اشارت ہو کر آگے بڑھی۔ پھوٹا خان خود جب چلا رہا تھا۔ میں اس بات پر خوش تھی کہ میری ایک ذرا سی ”جرات امیز“ نیکی سے نہ صرف پھوٹا خان راہ راست پر آچکا تھا بلکہ اب وہ اپنے سارے شیخ شیر سے بھی معافی طلبی کرنے پر تیار تھا اور اس کی زبیںیں بھی واہیں کھلنا چاہتا تھا۔

جب تاریک اور ٹیڑھے میڑھے سے کچے راستے پر درمیان کی رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ پھر زراد پر بعد جب شیخ شیر کے پتہ اینٹوں والے مکان کے سامنے رکی۔ پھوٹا خان اور میں نیچے اتر آئے۔ شیخ شیر کے مکان کے دروازے کی پیشانی پر بلب روشن تھا۔ باقی ہمارے چہار اطراف تاریک ساٹا طاری تھا۔ اس کا آدی جیب سے اتر کر چونکا کھڑا تھا۔ پھوٹا خان مجھے لیے دروازے تک آیا اور اس کی کنڈی کھڑکادی۔ دوسری بار دروازہ کھڑکانے پر اندر سے بھاری بھر کم آواز ابھری۔

”کون ہے؟“ یہ بلا شیخ شیر ہی کی آواز تھی۔ میں جانتی تھی وہ مجھے دیکھ کر پہلے حیران اور پھر یک دم خوش ہو جائے گا۔ کیوں کہ آخر کو مجھے اس نے اپنی بہن بنا کر کھا تھا۔

”درکھول بھائی شیر! میں یہاں ہوں..... تیرا بہنوئی..... پھوٹا خان!“ جواباً پھوٹا خان نے بلند آواز میں کہا تو یک دم اندر سے پہلے کنڈی کھلنے کی آواز ابھری پھر اس کے ساتھ ہی دروازے کے دونوں پٹ بھی وا ہو گئے۔ سامنے شیخ شیر کھڑا تھا۔ اس کی حیرت بھری نظریں پہلے اپنے بہنوئی پھوٹا خان پر پڑیں پھر اس کے بعد اس نے میری طرف دیکھا تو یکدم جیسے اسے ایک اور

جھکا لگا۔

”ادی کو خانا! یہ تم ہو..... ہم..... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا..... آؤ اندر آؤ۔“

بلخ شیر کے چہرے سے حیرت آمیز خوشی کے آثار چھوٹے پڑ رہے تھے۔ میں اور پھوٹا خان جب اندر داخل ہوئے تو بلخ شیر فخر آمیز خوشی سے اپنی پیوی کو آواز دیتے ہوئے بولا۔

”اڑی اودو..... بھاگ بھری ادھر..... دیکھ تو کسی کون آیا ہے“ یہ کہہ کر وہ ہم دونوں کو اندر کمرے میں لے آیا۔ اندر کمرے میں اس کی پیوی بھاگ بھری جاگ رہی تھی۔ البتہ ایک چار پائی پر اس کے دونوں بچے..... محمد علی اور سو بڑیں ٹوٹو خواب تھے۔ جبکہ ایک دوسری چار پائی پر ان کا سب سے چھوٹا ننھا بیٹا علی شیر سو یا ہوا تھا۔ بھاگ بھری تو میری پہلی بن چکی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑنے ہی حیرت آمیز خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر اس نے جلدی سے چادر درست کی اور پہلے پھوٹا خان کو ادب سے سلام کیا پھر آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”بھائو شیر! میرے پاس وقت کم ہے۔ تجھ سے تھوڑی باتیں کرنی ہیں۔“ پھوٹا خان نے بہ غلت بلخ شیر سے کہا، ”پھر اس کے گلے لگ کر بولا“ یار! کیا تو اتنا بزدل رکھتا ہے کہ..... اپنے بہنوئی کو معاف کر سکے۔“

اس کی بات سن کر بلخ شیر کا چہرہ یک لمحے اپنے تئیں کے جوش سے تھمبلیا پھر اس نے دوبارہ پھوٹا خان کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے عرض کیجے میں اس سے کہا۔

”اڑے بھا پھوٹا خان۔ یہ تو کسی بات کرتا ہے۔ کیا تو نے یہاں آ کر اپنا دل بڑا نہیں کیا۔ بھلا میں پھر تنگ دل کیسے ہو سکتا ہوں یار! پھر تو میری لاڈلی ادی شیراں کے سر کا سائیں ہے۔ تیرے لیے تو میرے دل میں محبت کے ساتھ احترام بھی ہے۔ پر یار! سب سے پہلے مجھے یہ تو بتا میرے بھانجا..... مراد کا کیا بنا؟“

”جتنا ہوں۔ وہ خیریت سے گھر آ گیا ہے اور یہ سب..... دی کو خانا کی وجہ سے ہوا ہے۔“

پھوٹا خان نے کہا اور پھر اس نے مختصر ادھر سے دھیرے سے رات بیتے ہوئے سارے سنسنی خیز حالات سے آگاہ کر دیا۔

ادرا بلخ شیر کو مجھے پھوٹا خان کے ساتھ دیکھ کر جو تھوڑی دیر پہلے حیرت ہوئی تھی وہ اب ساری کھانسنے کے بعد یکدم ایک دیدنی سی سرست میں بدل گئی۔ پھر بلخ شیر نے بھی پھوٹا خان کو بتایا کہ اس نے بھی اپنے بھائی بہن بتایا ہوا ہے۔

”ہا..... ہاؤ..... بھائو شیر! مجھے اس بات کا پہلے سے علم

ہے“ پھوٹا خان دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”اچھا! یہ بتاتو نے مجھے معاف کر دیا ہے۔“

”اڑے بابا! کہیں باتیں کرتا ہے تو بھلا پھوٹا خان! چل کر یہاں آ گیا..... میرے لیے اس سے بڑی فخر اور بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ بس..... میں نے اپنی زمینیں مل دے دیں۔“

بلخ شیر کی جوش آمیز خوشی دیدنی تھی۔ وہ دل کا اتار چڑھا کر اپنی وہ زمینیں بھی اپنے بہنوئی کو بخش دینے پر راضی ہو گیا مگر پھوٹا خان فوراً زور زور سے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کے کاغذ سے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”اڑے بابا! جب دل اپنے ہو گئے تو پھر ان زمینیں حیثیت..... بھلا میں اپنا بڑا بوجھ اپنے خیمہ پر برداشت نہیں کروں۔“

”اڑی بھاگ بھری! تو کیا کھڑی ہمارا منہ کئے جاؤ؟ یہ خوشی کا موقع ہے جا جا کر اپنے بھرا پھوٹا خان کے لیے سوچی کا حلہ تیار کر۔“

بلخ شیر نے بھاگ بھری سے کہا۔ خوشی اور ایک عجیب فخر آمیز جوش سے اس کی آواز کیلپاری تھی مگر پھوٹا خان اسے کرتے ہوئے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”اڑے بار! بلخ شیر! حلوے کی تنجوی کیوں کرتا۔ ہماری صلہ ہونے کی خوشی میں باقاعدہ جشن منائیں گے کہ گوشت دیکھے گا۔ پر بازو پوچھتے تو ہمیں دی کو خانا کا احسا ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف میرا پیٹ (دہانہ) بھلا

دشمنوں کے خونی چنگل سے بال بال بچا ہے بلکہ اس کی ہلا اور دلیری کے باعث آج ہم دونوں پھر ایک ہو گئے ہیں۔ خانا کی بات پر بلخ شیر خیر معنوں میں تب میری طرف منہ نہ تھا اور لمحہ بھر اپنی جگہ پر کھڑا میرے چہرے کی طرف نرم منمن بھری نظروں سے نکتا رہا پھر میرے قریب آ کر ان بڑی محبت کے ساتھ اپنے دونوں بازو پھیل کر مجھے اپنے سے لگاتے ہوئے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔

”بھلا پھوٹا خان! میرا اب سائیں جاتا ہے۔ کہ خدا محبت اپنی لاڈلی بہن شیراں سے کرتا ہوں اتنی ہی ادی سے بھی کرنے لگا ہوں بلکہ بھلا پھوٹا خان! اگر تو میرے بات سن رہا ہے تو یقین کر میں ادی کو خانا کو زیادہ محترم آدمی دل کی گہرائیوں سے اسے چاہنے لگا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری بلکہ ہمارے خاندان کی محسن بھی ہے۔ دوسرے بے چاری بہت دیکھی بھی ہے۔ بھلا پھوٹا خان تو نے شاید دیکھ بھری وہ داستان نہیں سنی جو اس نے ایک دن مجھے

اگر تو بھی سن لے تو تیرا دل بھی میری طرح اس کے غم میں چور چور ہو جائے۔“

میں نے غصے سے اس کی آواز آخر میں بھرا سی مٹی جی۔ یہی دیکھتا تھا جب پھوٹا خان بھی ذرا میرے قریب آیا اور اپنا دایاں ہاتھ روایتی انداز میں میرے سر پر رکھتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولا۔

”ہاؤ بھائو شیر! جب میں نے کو خانا کو اپنی روح کی گہرائیوں سے اپنی دمی (بہن) کہا تھا تو یقین جان..... اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر میرے دل میں ایک باپ کی سی تڑپ پیدا ہوئی کی اور میں نے اس کی دکھ بھری داستان سے بغیر ہی اس کے اندر چپے ہوئے غم و اندوہ کا مجھے بے اختیار احساس ہونے لگا تھا۔“

ان دونوں کے جذبات نے میری آنکھیں بھگو دیں۔ ”اڑی دے! تو کیوں روتی ہے۔ اب تو تیرا ایک بھائی بھی ہے اور باپ بھی۔ اب تو اپنے سارے غم دکھ..... زمینیں اور پریشانیوں میں دے دے اور بس۔“ پھوٹا خان جوش جذبات سے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... ہاں مم..... مگر میں ابھی شہر جانا چاہتی ہوں“ میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا تو پھوٹا خان کو جیسے اچانک یاد آیا اور وہ قریب کھڑے بلخ شیر سے بولا۔

”ہاؤ یار! ایک بات سن تمہیں تو پتا ہی ہوگا اس کی ایک سہلی شینا..... اسے اس کیسے انیسویں یا دوا دلا دینے کی طرح دمی کر ڈالا ہے۔ وہ شہر کے اسپتال میں داخل ہے اور میں دمی کو خانا کو لے کر ابھی شہر جا رہا ہوں۔ تو یار ذرا..... میرے گھر کا خیال رکھنا۔“

اس کی بات پر بلخ شیر تروت بولا ”بھائو! تیرا ابھی یہاں رہنا مناسب رہے گا۔ ادی کو خانا کو میں خود شہر لے جاتا ہوں۔“

”نہیں..... بلخ شیر! یہاں کا تو مجھے کرنے دے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر..... میں بھی تیرے ساتھ چلا ہوں۔“

”نہیں یار! تو ادھر رہے گا تو مجھے گھر کی طرف سے زیادہ فکر نہیں رہے گی۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔“

خاصی دیر بعد کہے اور تا ہموار راستوں سے نجات ملی اور چپ پختہ اور چوڑی شاہراہ پر آ کر اب طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی۔ اس کا رخ اب شہر کی جانب تھا۔ ہمارا سفر جاری تھا کہ اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے قدرے جھکتے ہوئے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان پھوٹا خان سے کہا۔

”چا چا سائیں! وہ..... ہم..... میرا مطلب ہے“ ہمیں پہلے اس مقام کو دیکھ لینا چاہیے تھا جدھر..... چھوٹے سائیں.....“

”ہاؤ..... ہاؤ..... میری ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے پھوٹا خان نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سائیں! جب ذرا آہستہ کر لو اور..... جو سامنے موڑ آ رہا ہے اسے موڑنے کے بعد جب کنارے پر روک دینا۔ ہمیں دائیں طرف کے کپے میں اترنا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد جب رک گئی۔ نیچے اتر کر ہم نے گہری نظروں سے پھر چار اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد قریب کا علاقہ کھکا ڈالا مگر چھوٹے سائیں کہیں نظر نہیں آئے۔ ”میرا خیال ہے ڈاکٹر خان محمد..... نے سڑک پر آ کر شہر جانے والی کسی گاڑی سے لفٹ مانگ لی ہوگی“ پھوٹا خان نے مچڑخاں لہجے میں کہا اور پھر اس کے بعد ہم ماپوں ہو کر چھوٹے سائیں کی تلاش ترک کر کے دوبارہ جب میں آ بیٹھے۔ ہمارا شہر کی طرف ایک باہر سفر شروع ہو چکا تھا۔

اب ہماری جب شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ صبح کا ڈب ڈب وجہ سے لاڈکانہ کی سڑکیں دیران تھیں۔ بالآخر دس پندرہ منٹ کی تیز رفتار ڈرائیو تک کے بعد جب سول اسپتال کی عمارت کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ پھر جب کے رکتے ہی ہم سب جلدی سے نیچے اتر آئے۔ میں بے تاملانہ اور متوجہ انداز میں بے اختیار دوڑتی ہوئی شیعہ حادثات کی عمارت کے اندر داخل ہوئی۔ اندر دل دھڑکا دینے والی دیرانی اور سگواری خاموشی طاری تھی۔ دو تین سو بج کر شش پر گلیا پوچھا پچھرا رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح ایمر جیسی آپریشن تھیمز کی طرف دوڑی اور پاگوں کی طرح اس کے دونوں پت دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ مجھے اپنے عقب سے پوچھا پچھرا دالے کسی سوپر کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ مجھے اس طرح دیوانہ وار آپریشن تھیمز میں داخل ہونے سے روک رہا تھا شاید مگر مجھے کسی کی پر دانی نہیں تھی۔ آپریشن تھیمز کے اندر داخل ہوتے ہی میں ٹھک کر رک گئی اور جیسی چٹنی آنکھوں سے سامنے آپریشن ٹیبل کو دیکھنے لگی۔ اندر کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میرے عقب میں پھوٹا خان بھی اندر آ گیا تھا۔ میرا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ میں فوراً واپس چلی تو

ایک کالی کوٹنی سی جھنگل منہ بسورتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ناک بھوس چڑھا کر بولی۔  
”چلو..... چلو نکلو باہر کیوں ہماری نوکری کے پیچھے ہاتھ دھو کر بڑھتے ہو۔“

”سنو سنو..... یہاں ادھر اس کمرے میں ایک ذخی مر لیض کو لایا گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ کہاں ہے؟“ میں نے پلٹ کر جیسے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

”بی بی! تم کوئی کن مر لیض کی بات کر رہی ہو یہاں تو کھٹے کھٹے بعد اداہ مومے مر لیضوں کو لایا جاتا ہے۔“

جھنگل نے پات دار آواز میں کہا۔ میری آنکھیں بھیجی ہوئی تھیں اور حق میں وقت اترا آئی تھی۔ میں نے رندے ہوئے لہجے میں اسے شینا کے اور یہاں اس کے داخلے کے بارے میں بتایا تو وہ جیسے چند تھپتھپے کچھ سوچ کر بولی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ وہ لڑکی..... ہائے اس کی حالت تو بڑی نازک تھی..... چیچ..... چیچ..... بے چاری۔“

اس کے افسوس کرنے پر میں لڑکئی اور اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”نک..... کیا ہوا..... اے..... مم..... مجھے بتاؤ؟“ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرا دل ٹٹھی میں لے کر پیچھ رہا ہو۔ میں اس وقت صدمے سے شاگ کی ایک ایسی انتہائی کیفیت سے دو جا رہی۔

”بی بی! یہاں اس کا علاج ممکن نہ ہو سکا تھا۔۔۔۔۔ وہ کو ما میں چلی گئی تھی اسے پہلی کا پٹر کے ذریعے فوراً کراچی کے بڑے اسپتال لے جایا گیا ہے۔“

میں اس کی بات سن کر دھک سے رہ گئی۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ سانسیں رکنے لگیں اور مجھے پورا آپریشن تھیمز گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اگر مجھے پھوٹا خان یکدم تمام نہ لیتا تو یقیناً میں فرس پڑش کھا کر گر جاتی۔

”حوصلہ کر دیجیے! حوصلہ کر..... اللہ سائیں پر بھروسہ کر۔“ میری ذہنی ہوئی ساتروں میں اترنے والے پھوٹا خان کے یہ آخری الفاظ تھے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو..... پھوٹا خان میرے قریب ہی جھکا ہوا تھا۔ میں تڑپ کر شینا..... شینا پکارنی اٹھ بیٹھی۔ پھوٹا خان نے میرے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگا دیا۔ ہم ایک تک ”شعبہ حادثات“ میں ہی موجود تھے اور مجھے بے ہوش ہونے کی وجہ سے ایک بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر پھوٹا خان نفسی آمیز لہجے میں بولا۔

”دھیے! تو اتنی بہادر ہو کر یوں حوصلہ چھوڑ دی ہو گی اس کی امید نہ تھی۔ دیکھ کو بھان! اللہ سائیں پر بھروسہ کر۔“

”چا چا سائیں! میں کیسے حوصلہ کروں۔“ میں نے لہجے میں کہا۔ ”تم..... تم نہیں جانے کہ شینا میرے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ..... وہ میری ماں سے بڑھ کر کچی..... وہ..... میرے لیے بہنوں سے بھی بڑھ کر ایک بہن..... وہ..... وہ میری روح ہے۔ میرا حوصلہ..... میری ہمت..... کچھ ہے وہ۔ اگر..... اگر اسے کچھ ہو گیا تو..... تو شاید زندہ.....“

”نہ..... نہ دھیے! اندہ کی باتیں نہ کر۔ چل اٹھ! چل چلنا ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔“ پھوٹا خان نے عین انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”چا چا! تو..... تو واپس اپنے کمر لوٹ جا۔ مم..... اسکی کراچی چلی جاؤں گی۔“

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو پھوٹا خان یکدم سے خائف سا نظر آنے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ آمیزی سے شکایت بولا۔ ”دھیے! تو نے اپنے چا چا سائیں کا اتنا مان رکھا؟ تو کیا سمجھتی ہے کہ میں نے اگر تیرے سر پر ہاتھ رکھ کر تجھے ”دھی“ (بہن) کہا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں اڑی چری تو بھی تو اس دھرتی کی رہنے والی ہے کیا یہ تجھے نہیں پتا کہ اگر ہم ایک باہر کی عورت ذات کے سر پر ہاتھ کر اسے ماں..... بہن یا بیٹی بنالیں تو وہ ہمارے لیے کتنے سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ واہ..... کو بھان! دھیے! تو نے چا چا سائیں کا دل دکھا دیا۔“

وہ اتنا کہہ کر سر جھکائے خاموش ہو گیا۔ اسے دیکھا میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا اور پھوٹ پھوٹ رو دی۔ ”چا چا سائیں! مم..... مجھے معاف کر دینا۔ مم..... نے آپ کا دل دکھایا۔“

پھوٹا خان نے فوراً مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور میرا پر اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے بولا۔

”پاگل! میں تو اپنے تجھے جوش دلانے کے لیے نکلا تھا۔ چل اٹھ! اپنے آنسو پونچھ لے اور کچھ آگے کی سوچ۔“ پھوٹا خان اب میرے بیڈ کے پاس کی بیٹھا کسی ٹوکھا میں مستغرق تھا۔ خود میں بھی خاموشی سے آئندہ کے حالات بارے میں لائحہ عمل طے کر رہی تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ اگر چھوٹے سائیں کا لفت وغیرہ لے کر یہاں پہنچ چکے تھے تو پھر کہاں ہوا!

پھر ہاؤس اچانک میرے پر سوچ ذہن میں ابھرا۔ میں نے پھر کچھ کراچی جانے سے پہلے کیا۔ کچھ ہاؤس جا کر چھوٹے سائیں سے ایک ملاقات کر لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے انہیں بھی پناہ لینا سے متعلق اسے کراچی کے بڑے اسپتال منتقل کرنے کی ملاج ہو اور کوئی بغیر نہیں کہ وہ بھی کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے گہری سوچ میں مستغرق پھوٹا خان کو پک ٹھاپ کر کے کہا ”چا چا سائیں! ہمیں سب سے پہلے فوراً ہاؤس سائیں سے مل لینا چاہیے اس شہر میں ان کا کچھ ہاؤس کی ایک بگلا ہے۔“

میری بات پر پھوٹا خان نے خیالات سے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولے ”ٹھیک ہے..... اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ابھی وقت چلتے ہیں۔“

”مجھے کچھ سائیں تک کا راستہ معلوم تھا۔ اس لیے ذرا ہی بعد ہماری چپ کچھ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے رکنی۔ ہم نیچے اتر آئے۔ گیٹ پر ایک بندوق بردار چوکیدار موجود تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ چھوٹے سائیں اندر موجود تھے۔ پھر وہ ہماری اطلاع دینے کے لیے اندر چلا گیا۔ پھوٹا خان اس سے مجھے کچھ زیادہ ہی مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی یہی وجہ تھی کہ اس نے صرف چھوٹے سائیں کی تبدیلی کی دیکھی تھی بلکہ اسے ذہنی بھی کرنے کا کرب ہو تھا۔ تاہم میں بار بار اسل دے رہی تھی کہ وہ چھوٹے سائیں کی طرف سے بالکل بھی کسی ”بدحوالی“ کی توقع نہ رکھے کیونکہ میں بخوبی جانتی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے وہ پھوٹا خان کی طرف سے اپنا سارا غم بھول جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد پھر یارنوار ہوا اور اس نے فوراً ہمیں اندر آنے کو کہا۔ وہ اب نہ صرف ہاؤس کا پھوٹا خان تھا۔ زبان البتہ باہر موجود تھا۔ میں نے مجھے چھوٹے سائیں نظر آئے ان کے ایک ہاتھ میں پتی بندھی ہوئی ایک بھر حامیری نگاہ ایک جانب کھڑی لینڈ کروزر پر پڑی تھی دیکھ کر میں پریشان سی ہو گئی کیونکہ یہ لینڈ کروزر سردار حیمسو خان کی تھی۔

”نک..... کو بھان! ات..... تم.....؟“ چھوٹے سائیں نے سہ قراوی سے کہا اور پھر میرے ساتھ شرمسار سے کھڑے پھوٹا خان کو دیکھ کر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہاں تین چار سائیں بھی کھڑے تھے۔

”تم..... تم.....؟“ یہاں آنے کی جرات کیسے کی۔ میں..... میں..... مارے طیش کے چھوٹے سائیں کی آواز کانپنے لگی۔ ان کے بلند اور غصیلے لہجے پر لینڈ کروزر کے قریب کھڑے ایک جگمگ پوش مسلح محافظ بدوقف نسبتاً لمبا اور اس نے

کے قریب آگئے۔ ”چھوٹے سائیں! انہیں کچھ مت کہنا۔ یہ..... آ..... آپ سے معافی مانگنا چاہتے ہیں“ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر چھوٹے سائیں سے کہا تو ان کا بال کچھ سرد ہوا۔ پھر اس کے بعد میں نے کمرے سے ہوتے سنسنی خیز حالات کے بارے میں مختصر آئیں آگاہ کیا تو پھوٹا خان نے نہایت احترام کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ کر چھوٹے سائیں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ پر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ سے بہت نادم ہوں اور کو بھان! دھی سے بھی..... میں کو بھان! دھی کو یہاں آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ اب آپ میرے ساتھ جو سلوک کریں! میں حاضر ہوں۔“

اس کی بات سن کر چھوٹے سائیں کے چہرے پر غصے کی ذرا بھی رقی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر فراخ دلانہ مسکراہٹ لیے پھوٹا خان کے قریب آئے۔ بے اختیار دوستانہ انداز میں اس سے مصافحہ اور بعد میں معاف کرنے کے بعد ہمیں اندر ایک بڑے آرام دہ کمرے میں لے آئے۔ میں نے دیکھا وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ایک ادھر عزم ملازمہ کو مٹھتے کا بندوبست کرنے کا کہا پھر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ سردار حیمسو خان یہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ ماحول میں بدحوالی کا پیدا ہو جانا یقینی امر ہوتا۔ پھر میں نے پریشان کن بے قراری سے کہا۔

”چھوٹے سائیں! شینا کے بارے میں آپ کو پتا چل گیا ہوگا؟“ ”ہاں کو بھان! میں نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اسپتال کا ہی رخ کیا تھا“ چھوٹے سائیں سوگوار سی متانت کے ساتھ بولے ”اور ہمارے سامنے کے صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر مزید بتانے لگے۔“

”شینا کی حالت بدستور نازک ہے اور اسے فوراً ایم ای سیفرو والوں کے ایک پہلی کا پٹر میں کراچی کے ایک بڑے اسپتال ریفیر کر دیا گیا ہے۔ مجھے تمہاری طرف سے فکر مند سی تھی۔ ورنہ میں بھی کراچی چلا گیا ہوتا۔“

”مجھ..... چھوٹے سائیں! ہم نے بھی اس وقت کراچی روانہ ہونے کا پروگرام بنایا ہے۔“ میں نے فوراً کہا اور پوچھا ”پتا نہیں شینا کے ساتھ کون کیا ہے؟“

”زیب! اتنا بیچو تا م کی ایک خاتون اس کے ساتھ ہیں اور اس نیک خاتون نے ہی آغا فاضل کو کراچی منتقل کرنے کے انتظامات کیے تھے۔ یہ ساری معلومات میں نے ان کے دفتر فون کر کے حاصل کی تھیں۔“

میں خاموش غمگین انداز میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ درحقیقت میں اپنی آنکھوں سے بے اختیار اٹھ پڑنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے شینا کی نازک حالت کاظم دینی اور حسانی طور پر پڑھا حال کیے ہوئے تھا۔ مجھے کسی طور بھی قرار نہیں مل رہا تھا۔ مجھے ہر لمحہ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی قیمتی چیز کھونے والی ہو۔ میرا پس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر کراچی موت وزینت کی کشش میں جلا شینا کے پاس جا پہنچوں۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کا کب کراچی روانہ ہونے کا پروگرام ہے؟“

”لحہ بھر کی سوگوار خاموشی میں پھونٹا خان نے چھوٹے سائیں کو مخاطب کر کے پوچھا تو میں جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر چھوٹے سائیں کی طرف نکلنے لگی۔ جواباً انہوں نے کہا۔

”میرا تو ابھی اسی وقت کراچی نکلنے کا ہو رہا ہے ارادہ ملکہ میرا خیال ہے کہ ہمیں اسی وقت یہاں سے نکل لینا چاہیے مگر تم لوگوں نے کس طرح نکلنے کا پروگرام بنایا تھا؟“

”ارادہ تو ہمارا ابھی ابھی نکلنے کا ہے اپنی جیب میں“ پھونٹا خان نے جواباً کہا۔ میں چھوٹے سائیں کا چہرہ دیکھنے لگی وہ بولے ”میرا خیال ہے“ ہمیں سکھر سے کوئی فلائٹ پکڑنا پڑے گی میں نے ابھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی آئی اے کے دفتر فون کر کے موہن جو دروازہ رپورٹ سے معلوم کیا تھا۔ ہفتے میں دو دن کراچی کی فلائٹ ہوتی ہے۔ آج کا دن فلائٹ کا تو تھا مگر سیٹ کنفرم نہ ہوئی۔ اب سکھر سے ہی یونٹک طیارہ مل سکتا ہے مگر ایک منٹ..... میں نے غبر ملایا تھا، کھینچ جا رہا تھا۔ ابھی ہٹا کرتا ہوں۔“

چھوٹے سائیں نے کچھ سوچ کر کہا پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر کھینچ کے اور رابطہ ملتے ہی بولے۔

”آج کراچی کے لیے کتنی فلائٹس ہیں..... جی..... اچھا..... اور پرائیویٹ ائیر لائن کے فوکر میں..... اوہ اس میں بھی سیٹ نہیں ہے۔ دیری سیڈ!“ میری نگاہیں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ہواؤں جھانے کی گئی تاہم وہ ابھی تک گفتگو میں مصروف تھے۔ پھر میں نے دیکھا اچانک ان کے چہرے پر امید کی روش نمودار ہوئی۔

”اچھا..... جبکہ آباد سے آج کی فلائٹ مل جائے گی۔ ہاں ہاں..... مجھے یاد تو رہا ہے کہ کبیر اور جعفرات کے روز فلائٹ جاتی ہیں مگر..... وہی سیٹ کا مسئلہ ہوگا“ اچھا..... اچھا..... ٹھیک! آپ مجھے جبکہ آباد ہی آئی اے آفس کا فون نمبر دے

دیں۔ میں سیٹ کنفرم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ٹھیک! اتنا کہہ کر چھوٹے سائیں نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے ایک نمبر بچ کرنے لگے۔ میں اور پھونٹا خان خاموشی سے ان کے نکلے جا رہے تھے۔

”جیو ٹی آئی اے جیب آباد؟“ رابطہ ہوتے ہی پھر سائیں نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”جی مسٹر! کیا کراچی کے لیے آج کے دن کی فلائٹ تین سیٹیں مل جائیں گی؟ اچھا..... ایک سیٹ ہے جس میں ایک پھر وہ کنفرم کر لیں۔ ابھی فلائٹ کے نکلنے میں تین منٹ اوکے! میں ابھی دو گھنٹوں کے اندر اندر پہنچتا ہوں۔“

چھوٹے سائیں نے گفتگو مکمل کرنے کے بعد موبائل پر کیا اور اسے دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے گنگو سے بولے ”جیب آباد سے کیا رہے جانے والی فلائٹ ملے ایک سیٹ ہے۔“

”سائیں..... ڈاکٹر صاحب! ہم سے آپ کا جلد کر پہنچنا زیادہ بہتر ہوگا۔“

پھونٹا خان نے جلدی سے چھوٹے سائیں کی طرف دیکھا اور میں نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے چھوٹے سائیں سے کہا۔

”چاچا پھونٹا خان ٹھیک کہہ رہے ہیں چھوٹے سائیں! آپ جہاز میں جائیں ہم بھی کسی نہ کسی طرح جی جی جا گئے۔“ مگر کوئی جواب! تم..... تمہارے دشمنوں کی بھی تو کی نہیں مجھے تمہاری فکر ہے گی“ بالآخر چھوٹے سائیں کی مجھ سے تشریف تو کوکڑیاں پر آئی تھی جس نے کہیں جھکی مسکراہٹ سمجھ بولی۔

”چھوٹے سائیں! آپ میری فکر نہ کریں۔ میرے چاروں طرف اگر دشمن گھمڑے ہوئے ہیں تو آپ خیر خواہوں کی بھی کی نہیں اور سب سے بڑا سہارا تو میرا سائیں ہے۔ ویسے چاچا پھونٹا خان میرے ساتھ ہوں۔ چھوٹے سائیں! آپ دیر نہ کریں۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت آپ کا کافی الفور وہاں پہنچنا ضروری ہے۔“

میری بات پر چھوٹے سائیں نے بغور میرا چہرہ دیکھا خاموشی سے سر ہلادیا۔ اس اثنا میں ملازمہ نے ہمارے سامنے ناشتے کے برتن لگا دیے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نے تھوڑا کھا لیا۔ پھر اس کے بعد پھونٹا خان نے چھوٹے سائیں کو کھانا ان کی کار میں تک دادو جانے والی شاہراہ کے کنارے روک دیا میں موجود رہے۔ جواباً چھوٹے سائیں نے بتایا کہ وہ اپنے

زیدوں کو کار واپس لانے کے لیے روانہ کر چکے تھے۔

”فہ کدہ“ چھوٹے سائیں نے اس وقت اپنی لینڈ کرورر سے جیب آباد نکلنے کا پروگرام بنایا اور وہاں بذریعہ فلائٹ کراچی پہنچنے کے لیے مختصر تیاری کرنے لگے اور پھونٹا خان ان سے نصیحت ہوئے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ لاڑکانہ سے جیب آباد کا راستہ ہاں روڈ دو گھنٹے کا تھا۔ جبکہ جیب آباد سے کراچی جانے والی فلائٹ کا وقت گیارہ بجے تھا۔

ہم نے جیب ایک باہر موٹر مکینک کو دکھائی جس نے اس کا موبائل آئل بدلا اور پمپ کی پمپنگ کر کے اسے تیار کر دیا۔ پھونٹا خان نے اسے اجرت خاص سے نوازا۔ اس کے بعد ہم برساتی لاڈلہ بن کر شریف کراچی کی طرف روانہ ہو گئے۔ کراچی پہنچنے کے لیے یہ رات دوسرے کراچی جانے والے راستے یعنی سکھر مورو سکھر لاڈلہ شاہد میرہ کے مقابلے میں مختصر شارٹ کٹ تھا۔

اب ہم کراچی کی طرف جو سفر تھے۔ پھونٹا خان کے کہنے کے مطابق ہمیں کراچی پہنچنے میں نو یا دس گھنٹے لگ سکتے تھے۔ جس وقت ہم لاڑکانہ سے چلے تو اس وقت ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور ہمارا شام چھ گھنٹے تک پہنچتا پھونٹا خان کراچی پہنچتا ہو جاتا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں مستغرق تھی کہ مہا پھونٹا خان نے زمان کو کٹا ہٹ کر کے کہا۔

”زمان..... یار! اپنے گوشت کی طرف ذرا گاڑی موڑ لینا۔ میں چاہتا ہوں گھر پر اطلاع دیتا جاؤں اور پھر شیر سے بھی مل کر اسے اپنے کراچی جانے کے ارادے سے مطلع کر دوں۔“ تمہارا کیا خیال ہے دیکھ کو بھائی؟“

پھونٹا خان نے اچانک ذرا گردن موڑ کر مجھ سے رائے طلب کی تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مختصر جواب دیا ”جیسے آپ کی مرضی چاہا۔“

ٹھوڑی دیر بعد زمان نے پھونٹا خان کی ہدایت کے مطابق جیب کو طلبہ کیے راستے پر اتار دیا۔

جیب اب جھک کر کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ لگ بھگ نصف گھنٹے بعد جب جب پھونٹا خان کی اوطاق کے قریب سے گزرنے لگی تو پھونٹا خان نے اچانک زمان کو گاڑی روک کر کہا۔

میں نے اوطاق کے باہر کے موضوعوں پر کچھ لوگوں کو براہیمان دکھا۔ ان میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح حیران ہو گئی۔ دور سے اسے دیکھ کر میرے حلق میں یک دم کڑواہٹ سی گئی۔ وہ گہرا تھا سائیں ملخوڑا کا کاٹھ پینا گہرا گہرا جس نے اپنی سازش کے ذریعے نہ صرف اپنے ہی باپ سائیں

ملخوڑا کو سرداری سے معزول کر کے گنگو بدر کر دیا تھا بلکہ اس کی جگہ اب خود کشتی کا سردار بن چکا تھا۔

پھونٹا خان کے چند آدمیوں نے بھی جیب روکنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر ہم سب جیب سے نیچے اتر گئے۔ میں نے جیب سے اترتے ہوئے کئی انہیوں سے پھونٹا خان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں مجھے حسب توقع انہیوں کے آثار محسوس ہوئے تھے۔

ہمارے جیب سے اترتے ہی وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ گہرا ہم کے دو ساتھی ساتھی بھی اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ گہرا ہم بڑی نیکی نیکی نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے پھونٹا خان کے آدمیوں نے میرے متعلق ”حقیقت“ سے آگاہ کر ڈالا ہو۔ بعد میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔

”پھونٹا خان! میں کیا سن رہا ہوں! کیا تو نے اس چھوکر کی کے ساتھ یاری کا گٹھلی ہے؟“

اس مردود کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ پھونٹا خان ہمتے سے اکر گیا اور ایک زنانے دار پھر گہرا ہم کے چہرے پر جڑ دیا۔ پھونٹا خان کے ہماری بھر کم ہاتھ کے پھڑکنے گہرا ہم کو چند قدم پیچھے کی طرف لٹکھڑانے پر مجبور کر دیا۔

”اگر..... خود بارہ تو نے پھر کبھی اس قسم کے الفاظ منہ سے نکالے تو میں تیری گردی سے زبان کھینچ لوں گا۔“

پھونٹا خان نے انکارہ آنکھوں سے اس کے ہتھتے ہوئے چہرے کو گھورتے ہوئے تہہ راہ لہجے میں غرا کر کہا تو گہرا ہم اپنا گال سہلایا تاہم جتنی آنکھوں سے پھونٹا خان کو گھورنے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی مستعد ہو کر گویا گہرا ہم کے اشارے کے منتظر تھے۔

پھونٹا خان کے موجودہ آدی بھی یکدم چسک ہو گئے تھے۔ صورت حال کی سنسنی خیزی سے لگتا تھا جیسے ابھی وہاں خوں ریز جنگ چھڑ جائے گی مگر یقین تھا کہ گہرا ہم پھونٹا خان کے علاقے اور اس کی اوطاق میں کسی قسم کی جارحانہ ”بے وفائی“ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

”پھونٹا خان! تیری اس حرکت کو میں کیا سمجھوں؟ کیا تیری نیت بدل گئی ہے..... اور تو اکیلے ہی اس جتنی مورٹی (راکٹس مورٹی) کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے؟“ بدینت گہرا ہم نے سکتی نظروں سے پھونٹا خان کو گھورتے ہوئے کینٹو ز لہجے میں کہا۔

”گہرا ہم! اپنی بوکاس بند کر..... اور کان کھول کر میری بات سن لے“ دفعتاً پھونٹا خان نے گہرا ہم کو شعلہ فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے کرک دار لہجے میں کہا ”کو بھائی! آج سے میری دیکھو جیسی ہے سمجھا تو..... اگر تو مجھ سے دینی چاہتا ہے تو

آج کے بعد سے تجھے راکاس موتی والا سلسلہ فراموش کرنا ہوگا۔“

میں نے دیکھا پھوٹا خان کی بات پر گہرام کی درشت آنکھوں میں ایک لمبے کو بلا کی خطرناک چمک سی ابھری تھی۔ پھر وہ استہزائیہ لہجے میں پھوٹا خان سے بولا۔  
”ٹھیک ہے..... سمجھ گیا۔ تم دونوں نے اگر اندر ہی اندر ساز باز کر لی ہے تو سو بسم اللہ..... رہی دوستی کی بات تو وہ میرے تھپڑنے ہی ختم کر دی ہے۔ سو نے کی چمک نے تیری آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے اور تو یقیناً آج سے مجھے اپنا دشمن ہی سمجھے گا کہ تو یہی سمجھتا ہے۔“ گہرام نے زہر آلود لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور مجھ پر ایک آخری گھونٹی ہونی نظر ڈال کر اس نے اپنے ساتھ گھڑے دونوں ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کی اندر گودھنی ہوئی آنکھوں سے جھلکتی مکاری کو بھانپتے ہوئے میرا دل ایک لمبے کو زور سے دھڑکا تھا۔

”سائیں! حکم کرو اس بد زبان کا ابھی حشر کر کے رکھ دیتے ہیں۔“ اچانک پھوٹا خان کے تینوں مسلح آدمیوں نے آگے بڑھتے ہوئے گہرام اور اس کے دونوں حواریوں کے سینوں پر اپنی بندوقوں کی نائیں لگاتے ہوئے پھوٹا خان سے کہا۔

”نہیں! اسے اپنا گل کھلانے دو یہ بھول گیا ہے کہ آج یہ اپنے قلعے کا سردار میرے ہی ”آشیر داؤ“ سے بنا ہے۔ اب اسے اپنی ”سرداری“ سے بھی ہاتھ دھو تا پڑیں گے۔ ہٹ جاؤ اور اسے جانے دو۔“

پھوٹا خان نے مسکراتے ہوئے زہر خند لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہا اور پھر یہ تینوں گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو چار حانظروں سے گھورتے ہوئے ایک طرف کو ہٹ گئے۔ راہ پاتے ہی وہ تینوں غصے سے دانت پیستے ہوئے دیباں سے چلے گئے۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہوری تھی۔ مجھے گہرام کے تیز ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ پھوٹا خان کی نیت پر شک کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تو میں ہی جانتی تھی کہ اب پھوٹا خان کے اندر مثبت نوعیت کی انقلابی تبدیلی نمودار کی تھی۔ اسے اب اس پیش قیمت راکاس موتی سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جب اس کا تخت جگر مراد علی لاں اور کوڑل کے خونی شے میں تھا تو پھوٹا خان کو بے خبری اس حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا کہ اصل دولت ”سونا چاندی“ نہیں بلکہ ”اولاد“ ہوتی ہے۔

گہرام اپنے دل میں پھوٹا خان کے خلاف عناد اور بغض لیے وہاں سے رخصت ہوا تھا اور میں جانتی تھی کہ آنے والے

حالات میں گہرام میرا ہی نہیں بلکہ پھوٹا خان کے لیے بڑا بدترین اور کینہ پرورد دشمن ثابت ہوگا۔

اگرچہ پھوٹا خان کے راہ راست پر آتے ہی میں۔ اسے گہرام کی اپنے شریف باپ سائیں ملٹوزاد کے خاندانی دیتوں کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا وہ یہ کہ سائیں ملٹوزاد کے ساتھ بہت بڑی نا انصافی ہوئی ہے۔ سرداری کا اصل چاچا سائیں ملٹوزاد ہی تھا اور یہ بات بھی پھوٹا خان پہلے ہی جانتا تھا کہ سائیں ملٹوزاد اس کے سالے کی شہر کا فرمایا گھر اودست بھی تھا۔ پھوٹا خان نے مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنی اس غلطی کی تلافی بھی ایک روز ضرور کر کے رہے گا۔ سائیں ملٹوزاد کو اس کا حق ایک روز ضرور دلا کر رہے گا۔

بہر طور اس قضیہ کے بعد پھوٹا خان نے سب سے اپنے گھر اطلاع کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی نے..... تلخ شیر کے ہاں تھے۔ ہم سیدھے تلخ شیر کے پچنے اور اسے خیل آدھ حالات اور اپنے آئندہ کرنامے ہونے کے پروگرام سے بھی آگاہ کیا۔ تلخ شیر نے اگرچہ ایک پھر پھوٹا خان کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے خود میرے کراچی جانے پر اصرار کیا مگر پھوٹا خان نہیں مانا۔ ہمیں کراچی پہنچنا تھا اس لیے ہم زیادہ دوہراں رکنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے بہر طور پھوٹا خان کے آگے کسی کی بھی نہ چلی اور پھر وہ اس کی بیوی بھاگ بھری اور رہن شیر اس یعنی پھوٹا خان کے لیے ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

یہاں ہمیں لگ بھگ ایک گھنٹا ہو گیا تھا یا شاید اس سے زیادہ۔ بہر طور میں پھوٹا خان اور زمان ایک بار پھر جیپ سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

پختہ سرنگ ابھی دور تھی۔ وہاں سے پھوٹا خان کے گھانا کا کچا راستہ آدھ رفت کی وجہ سے خاصا ہموار ہو چکا تھا۔ جب کوئی تھک چکے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں شینا کی زندگی اور کی تخت پائی کی دعائیں کرنے لگی۔ اس سے مجھے شینا کے اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔

جیپ چل کھاتے راستے پر سبک رفتاری سے رواں رہی تھی۔ راستے کے دائیں بائیں محض چھاڑیاں تھیں۔ پختہ سرنگ اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔

اچانک کسی سمت سے بندوق چلنے کی آواز ابھرنا دوسرے ہی لمحے جیپ کی وڈ اسکرین ایک چمکانے چمکانے ہوئی۔ میں اور پھوٹا خان تو کار توں کے دھماکے پر یکدم نیچے جھک گئے تھے لیکن شاید اسٹیرنگ پر موجود چارے زمان کو بچنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ وڈ اسکرین

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔ شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلنے ہی

جب ہی طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے

کی کوشش کرتا وہ جھاڑیوں میں جھکے لکھائی ہوئی لڑکی شاید

کسی درخت سے جا لگتی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے

ساختہ میرے حلق سے اظہاری چیخ برآمد ہوئی۔ میں چونکہ

سیڑوں کے درمیان دھک مٹی تھی اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ

آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درو بھری کراہی تھی۔ دوسرے

ہی لمحے میری ٹھکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش

میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گوگیاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“

پھر میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا ہتھول

ہاتھ میں بکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے

ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت کیے بعد دیگرے

تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز

ہو گئی۔ دفعتاً جوانی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین

چار کارٹوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیڑوں کے

درمیان دھک مٹی۔ میرا دل لپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ

لڑنے ہی اس کے حلق سے بڑی کر یہ چیخ خارج ہوئی تھی۔

شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا

جھکے آگے بڑھنے لگے۔ یہ مذکورہ سمت تھی جدھر پھوٹا خان نے  
چشمِ قدی کی تھی۔ میں نے تاک کر پستول والا ہاتھ ذرا بلند  
کر کے ان دونوں دشمن حملہ آوروں میں ایک کا نشانہ لے کر ٹریگر  
دبا دیا۔ میری پستول نے محدود گرج کے ساتھ شعلہ اگلا اور ایک  
دشمن کو بہرہ انگیز چیخ کے ساتھ تورا کر گرا جبکہ دوسرا اٹھکے ہوئے  
شکاری درندے کی طرح بدکار اور ایک درخت کی آڑ میں جا دیا۔  
میں نے پہلا فائر کرتے ہی اسے بجھنے کے پورے پورے گولی  
چلا دی مگر نشانہ خطا گیا۔ دوسرے دشمن نے درخت کی آڑ لینے  
ہی اپنی ہندو سیدی کر کے مجھ پر ایک کارتوس فائر کر ڈالا۔ میں  
فوراً جھاڑ دار زمین سے چپک گئی۔ میں سانس روکے چند ثانیے  
دم سادھے دیکھ رہی پھر جنگی ٹی کی طرح میں نے ڈاسرا ابھار کر  
سامنے دیکھا۔ دشمن درخت کی آڑ میں دیکھا ہوا تھا۔ اس کا فاصلہ  
مجھ سے بہ مشکل تیس چالیس گام کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اپنی  
جگہ سینے کے بل لیٹے لیٹے ایک لمبے لمبے خنجر کے بغیر اس کا نشانہ  
لے کر دو فائر جھونک مارے۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ  
بڑی دل دوزخی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے زمین  
بوس ہوتا چلا گیا۔ میرا دل بے مندی کے احساس سے دھڑکنے  
لگا۔ پھر اس لمحے مجھے اپنے دائیں جانب جدھر پھوٹا خان غائب  
ہوا تھا، تیرہ تیز اور بلند آوازیں سنائی دیں۔ ایک دوبار گولی  
چلنے کی بھی آواز ابھری تھی۔ میں اس انجانے اندیشے کے زیراثر  
فوراً مذکورہ سمت کی طرف پکی۔ میں جھاڑیوں میں چٹا پڑی سے  
آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ آوازیں اب قریب آگے لگی تھیں اور تب  
اچانک میں نے قد آدم جھاڑیوں کے چھدرے چھدرے  
ردزونوں سے سامنے جھانکا تو میری روح فنا ہوگئی۔ کیا ہمتی  
ہوں کہ مجھ سے چند ہی گز کے فاصلے پر پھوٹا خان کو دو افراد اس  
کے پشت کی سمت دونوں ہاتھ جکڑے کھڑے تھے اور مردود  
گہرام نے اپنی دو تال ہندوئی اس کی گردن سے لگا رکھی تھی اور وہ  
بڑے درشت لہجے میں پھوٹا خان سے میرے بارے میں پوچھ  
چوچ کر ہاتھ۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو  
پاتے ہوئے اپنے پستول میں گولیاں بھریں اور آہستہ سے اسے  
کلپ کرنے کے بعد بے غور سامنے نگاہیں جمادیں۔ میں نے  
دیکھا، پھوٹا خان کی پیشانی پر ہلکا سا خم کا نشان ابھرا ہوا تھا۔  
”اڑے! موریا خان! تم دونوں اس پر نظر رکھو۔ میں  
کنجیاں کو جا کر تلاش کرتا ہوں۔“

معاہدہ گہرام نے اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا  
تو ان میں سے ایک نے قدرے ششک لہجے میں گہرام سے کہا۔  
”سامیں! احتیاط کرنا۔۔۔ وہ بڑی خطرناک چمکوری ہے۔  
اس نے ہمارے دوستوں کو بھی ہلاک کر ڈالا ہے۔ میرا خیال  
ہے، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں“ اپنے ساتھی کی بات  
گہرام غصے سے بولا۔  
”وہ مجھ سے زیادہ خطرناک نہیں ہو سکتی۔ تم ادھر ہی رہو اور  
اس غدار کو پٹے نہ دینا“ یہ کہہ کر گہرام اپنی ہندوئی سنبھالے لپک  
طرف کو لپکا۔ ان کی گفتگو سے مجھے ایک بات کا تو اندازہ ہوا تو  
کہ ان کی آہنی ہی نفی تھی جتنی نظر آ رہی تھی۔ لہذا مجھے ہی گہرام  
ایک طرف کو لپکا، میں نے بھی فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور جنگی  
ٹی کی طرح گہرام کی طرف پکی۔ وہ ہندوئی تانے خنجر  
بھڑکے کی طرح دبے پاؤں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ میں پہلے  
ہاتھ میں لیے اس کا اور اپنا درمیانی فاصلہ پانچنے کی غرض سے  
راستہ کا قتی ہوئی دبے پاؤں اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کے  
بعد جب خاصے خاصے پردہ ایک جگہ رکاوٹیں بھی اپنی جگہ بک  
گئی۔ اس کے قدرے ٹھنک کر گئے کے انداز سے میں بھی ٹھٹھا  
اسے اپنے تعاقب کا احساس ہو چکا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ گنا  
گیا تھا مگر ابھی اس کی پشت میری طرف ہی تھی۔ تب پھر  
نے ”ابھی نہیں تو ابھی نہیں“ کے صدقائی پھرتی کے ساتھ  
جھاڑیوں سے نکل آدھے آگے بڑھ کر فوراً اپنے پستول کی تال اس کی  
گدی سے لگا دی۔  
”خبردار گہرام! اپنی جگہ سے ہلے بغیر ہندوئی چپک دے  
ورنہ تیرا بھیچو اڑا دوں گی۔“ میں شیریں کی طرح غرائی اور گہرام  
جیسے پھر کات بن گیا۔  
”میں آخری بار کہہ رہی ہوں“ ہندوئی چپک دے  
ورنہ۔۔۔“ اس بار میں پستول کی تال اس کی گدی میں زور سے  
چھو کر غرائی۔ گہرام نے جیسے میرے زخمی لہجے کی خوشخواری  
بھانپتے ہوئے فوراً اپنی ہندوئی چپک دی تب میں نے اسے  
عقب میں گھوم جانے کو کہا۔ اور اس کے عقب میں مڑتے جا  
میں محتاط انداز میں اس سے چند فٹ دور کھڑی ہوگئی۔ پھر میں  
نے اسے غصیل نگاہوں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا۔  
وہ چند ثانیے میری طرف شعلہ فشان نظروں سے گھورتا رہا پھر اس  
نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ میں اس کے آگے بڑھنے کا  
فوراً اس کے عقب میں بدستور اس پر اپنا پستول تانے چلنے لگی۔  
بہت جلد ہم اس مقام تک پہنچ گئے جدھر گہرام کے دوست  
پھوٹا خان کو بازو دوسے سے جکڑے موجود تھے۔ ہندوئی ان کی  
پشت پر بھول رہی تھیں۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کے دونوں  
ساتھیوں کی آنکھوں میں پہلے غریبی کے سے تاثرات حیرت  
ابھری پھر فوراً اس کی جگہ خوشخواری نے لے لی۔  
”گہرام! اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اپنی ہندوئی چپک کر  
دونوں ہاتھ اٹھا کر ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔“ میں نے؟

آواز بلند ہو کر گہرام سے کہا تو اس نے بجائے اپنے ساتھیوں  
کو مخاطب کرنے کے قہر بار لہجے میں مجھ سے غرا کر کہا۔  
”کنجیاں! تو اپنی موت کو دعوت دے رہی ہے۔ پھوٹا  
خان ایک دفاعی شخص ہے۔ وہ تیرے ذریعے وہ قیمتی مورتی  
حاصل کرنے کے بعد تجھے بھی دھوکا دے سکتا ہے لیکن اگر تو  
۔۔۔ میرے ساتھ نباہ کر لے تو۔۔۔؟“  
”اپنی بکواس بند کر زبیل انسان۔۔۔“ میں اس کی بات  
کاٹ کر زور سے دہاڑی ”میں نے جو کہا ہے وہ کر۔۔۔ میری  
پاس وقت کم ہے“ میری غصیلی دھاڑ پر یکدم گہرام کے دونوں  
ساتھیوں نے اپنے کان دھوئے سے ہندوئی اتار کر اسے ہاتھوں  
میں پکڑ لیا اور ان کا رخ میری طرف کر دیا۔ مگر میں بھی ایک  
کانٹاں تھی۔ میں جانتی تھی وہ اس طرح خاموشی سے سپر ڈالنے  
والے نہیں تھے چنانچہ جیسے ہی ان دونوں نے مجھ پر ہندوئی  
تائیں میں لپک کر گہرام کی پشت پر آ کر پستول اس کے سر سے  
لگا دیا اور آرتھریہ ہی انداز میں اپنا گم دہرایا۔ میں نے دیکھا  
پھوٹا خان کے چہرے پر تشویش آمیز پریشانی کے تاثرات تھے۔  
”اڑے بابا! چپک دو اپنی ہندوئی۔۔۔“ بالآخر گہرام نے  
ہونٹ چاک کر اپنے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ اس کے دونوں  
ساتھی چند ثانیے تو ابھن آ میرتہذب میں جھلارے مگر پھر اپنے  
سر وار کا حکم پاتے ہی انہوں نے اپنی ہندوئی ایک طرف چپک  
دی۔ پھوٹا خان فوراً حرکت میں آیا اور اس نے زمین پر پڑی  
ہوئی دونوں ہندوئی پر قبضہ جمایا اور یہی میں چاہتی تھی۔  
”بول کتے! اب تیرا کیا شکر کیا جائے؟“ پھوٹا خان نے  
ایک ہندوئی اپنے کان دھے پر اور دوسری اپنے دونوں ہاتھوں میں  
پکڑتے ہوئے گہرام پر تان کر غصے سے بولا تو گہرام کے  
بدھت باریک ہونٹوں پر بڑی زہریلی سکرابٹ دوڑ گئی۔ وہ  
اسے گھور کر بولا۔  
”پھوٹا خان! تو اب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میرا ذرا  
بھی بال بکا ہوا تو میری ہمتی کے سارے جنگجو لوگ مل کر تیری  
خون کی اینٹ سے اینٹ بنادیں گے“ میں اس کی بے خوبی پر  
ایک لمحے کو ششدری رہ گئی۔ مگر پھوٹا خان جیسے مجھ سے اکڑ گیا  
پھر دوسرے ہی لمحے وہ چراغ پا ہو کر آگے بڑھا اور گہرام کو  
گر بیان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اس کے سینے پر ہندوئی کی  
تال لگا کر خوش لہجے میں بولا۔  
”تیری یہ خوش فہمی ابھی میں دور کیے دیتا ہوں حرام  
زادے!“  
یہ کہہ کر پھوٹا خان نے ہندوئی کا گھوڑا چڑھا لیا اور الٹی پراپنی  
انگل رکھ دی تو میں اسی وقت چلا کر اس سے بولی ”نہیں چاچا!

زندگی سونوارنے اور نکھار والی  
کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی

مشہور ماہرینِ نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

احساسِ کمتری

اسباب — تدارک — علاج

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ۔۔۔

- احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے؟
- کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں؟
- کیا آپ واقعی احساس کمتری کے شکار ہیں یا صرف یہ آپ کا خیال ہے؟
- ہو سکتا ہے کہ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ہی آپ کا یہ احساس ختم ہو جائے؟

مشہور نفسیاتی نقیب اسلام حسین کے قلم سے

قیمت 30 روپے — ٹاک خرچ 23 روپے

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

پتہ: 944 کراچی 74200

فون: 9922532، 9922533

میل: 263-C، خیبر پختونخوا، اسلام آباد

755004 (7) (2) (2) (2) (2) (2) (2) (2) (2) (2)

میل کے ذریعے:



نہیں اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ مت خراب کرنا  
 چھوڑ دے۔ میرے منع کرنے پر پھوٹا خان کا طش ڈرامہ ہوا اور  
 پھر وہ اپنے حلق سے غراہٹ آمیز آواز نکالتا ہوا ایک طرف کو  
 ہٹ گیا۔ گہرام کپڑے بھارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد پھوٹا  
 خان نے گہرام کو دونوں ساتھیوں سمیت آگے بڑھنے کو کہا۔ اب  
 میں اور پھوٹا خان ان تینوں پر اپنی تحسین تانے عقب میں چلنے  
 لگے۔ ہم سب سے پہلے جیب کے پاس پہنچے۔ پھوٹا خان نے  
 اسے اشارت کرنے کی کوشش کی مگر بے سود رہا سیلف لگانے  
 پر اس کا انجن گھر گھرانے کے بعد خاموش ہو جاتا۔ ناچار  
 پھوٹا خان اسٹرنگ وکیل پر جھنکار مکا مارتے ہوئے نیچے اتر  
 آیا۔ مجھے اب کراچی جانے کا پروگرام موخر ہوتا محسوس ہوا۔  
 پھوٹا خان کو اپنے سامنے زمان کی موت کا بڑا دکھ تھا مگر اسے یہ بھی  
 معلوم تھا کہ میں نے اس کے بد نصیب ساتھی کی موت کا بدلہ  
 گہرام کے دو ساتھیوں کو ہلاک کر کے لیا تھا اور نہ پھوٹا خان  
 نے گہرام سمیت ان تینوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔

بہر طور ہم دونوں گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنی  
 گمنوں کے نشانے پر دھکیلتے ہوئے بالآخر خاموشی دیر بعد پھوٹا خان  
 کی اوطاق پہنچے۔ وہاں حسب توقع اس کے ساتھی موجود تھے۔  
 ہمیں دیکھ کر ان کے بشرود پر حیرت آمیز پریشانی سی دوڑ گئی۔  
 مگر پھر دوسرے ہی لمحے جیسے انہیں ساری صورت حال کا ادراک  
 ہو گیا۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ فائرنگ کی آواز ان کے کانوں  
 تک بھی پہنچی تھی اور وہ اب ہماری طرف نکلنے کا ارادہ ہی کر رہے  
 تھے۔

پھوٹا خان نے تینوں کو اپنے مسلح ساتھیوں کے حوالے کیا  
 پھر انہیں انتہائی افسوس ناک لہجے میں زمان کے قتل ہونے کی  
 اطلاع دی اور ساتھ ہی انہیں جنگل سے جیب اور زمان کی لاش  
 اٹھوانے کے لیے روانہ کیا۔ مگر اس سے پہلے انہوں نے ان  
 تینوں کی ایک مضبوطی سے منگیلیں کس دی تھیں پھر پھوٹا خان  
 نے اپنا ایک آدمی اسی وقت پلٹ کر میرے مطلع کرنے  
 کے لیے روانہ کیا اور پھر ہم دونوں اندر آ کر تھکے تھکے انداز میں  
 چار پانی پر بیٹھ گئے۔ پانی گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو  
 اوطاق کے اندر دوٹی کوٹھری میں قید کر دیا گیا تھا۔ پھوٹا خان نے  
 شاید پلٹ کر میرے آنے تک ان تینوں کے بارے میں فیصلہ  
 موخر رکھا تھا۔ ہم نے پانی وغیرہ پیا اور چرسوچ انداز میں خاموش  
 ہو کر پلٹ کر میرے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

ذرا دیر بعد ہمیں باہر کی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی  
 پھر میں نے پلٹ کر دیکھا کہ وہاں سے انداز میں اندر داخل  
 ہوتے دیکھا۔

”اڑے بھا پھوٹا خان! خیریت تو ہے..... یہ سب کیسے  
 بابا! کہاں ہیں وہ تینوں خنزیر۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“  
 وہ شیر کی طرح دہاڑتا ہوا ہمارے قریب آ کر بولا۔  
 پھوٹا خان نے ذرا دیر بعد اسے ساری صورت حال سے  
 آگاہ کر دیا۔ پلٹ کر شیر موڑے پر بیٹھا غصے سے پیچ کتاب کھانے  
 لگا۔ پھر کوٹھری کے بندروانز کے کوٹھڑے سے ہوتے پھوٹا خان سے  
 بولا۔

”بھا پھوٹا خان! اب ان تینوں کو بالکل مت چھوڑنا بلکہ ان  
 تینوں کو تو میرے حوالے کر دے۔“  
 ”نہیں پلٹ کر شیر! اب ہمیں گرم دماغی کے بجائے ٹھنڈے  
 دماغ سے سوچنا پڑے گا۔ کیونکہ اب یہ مردود گہرام عام آدمی  
 نہیں رہا اپنے فیملی کے سوا دار ہے یہ.....“  
 پھوٹا خان نے پہلی بار معاملہ فیملی سے پلٹ کر سمجھانے  
 یوئے کہا۔ میں نے دیکھا اس کی پیشانی پر سلیش انگریز کی  
 تھیں۔ اس نے شاید صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگایا تھا  
 مگر پلٹ کر کہاں پھلکا بیٹھے والا تھا۔ ایک دم چپ کر بولا۔  
 ”بھا پھوٹا خان! پہلے یہ بتا رہے ہیں کہ اپنے فیملی کے سوا دار۔ ہم  
 نے بھی کوئی چوڑیا نہیں پہنیں رہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے  
 ہم پر قاتلانہ حملہ کیا ہے انہیں حساب دینا پڑے گا۔“  
 ”اڑے بابا! اس لیے تو پہلے میں نے تجھ کو یہاں بلایا  
 ہے؟“ پھوٹا خان نے اس کی طرف دیکھ کر کسی قدر پریشانی سے  
 کہا۔

”پریشانی شیر! ہمیں ٹھنڈے دماغ سے اس مسئلے کو حل کرنا  
 ہوگا۔ میں اس رڈیل گہرام کی زہریلی فطرت سے واقف ہوں۔  
 یہ سانپ کی طرح مٹی کھا کر زمین کو مٹی کر ڈالتا ہے۔ اس کا کچھ  
 اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا۔“ اس کی پرموخر گفتگو پر پلٹ کر شیر بھی  
 چنداٹیوں کے لیے چرسوچ خاموشی میں ڈوب گیا پھر ایک گہری  
 سانس لے کر بولا۔

”بھا پھوٹا خان! آخر ان کی ہستی کے چند معتبر لوگوں کی  
 چہانت تو ہوگی ناں..... ہم خود گہرام کو اس کے دونوں ساتھیوں  
 سمیت ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔“  
 ”ہاں۔ ایک ایسی طریقہ یہ دیا جاتا ہے۔“ پھوٹا خان نے چرخیاں  
 انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

”بلکہ ایسا کرتے ہیں میں اپنے چند آدمیوں کو پہلے ان کی  
 ہستی کی طرف روانہ کرتا ہوں..... اور ہستی کے چند معتبر لوگوں کو  
 یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔“ اس کی بات پر پلٹ کر شیر نے  
 بلا تامل اثبات میں اہانسرا ملا دیا۔  
 بالآخر یہ طے پایا گیا تو پلٹ کر شیر نے آخر میں میری طرف

دیکھتے ہوئے پھوٹا خان سے پوچھا۔  
 ”..... اور..... تم لوگوں کا کراچی جانے کا پھر کیا ارادہ  
 ہے؟“ اس کی بات پر میں نے جواباً پہلی بار شامل گفتگو ہوتے  
 ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے پہلے یہ فیصلہ کر لیتے ہیں یا پھر میں خود  
 اکیلا کراچی روانہ ہو جاتی ہوں۔“  
 میری بات پر پھوٹا خان دیر سے بے اپنا دست شفقت  
 میرے سر پر رکھتے ہوئے ملاحت سے بولا۔

”کوئی ناں دے! اتہارا رہا حال اکیلے کراچی جیسے انجمنی اور  
 بھرے پرے شہر میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ زندگی اور موت اللہ  
 سامنے کے اختیار میں ہے۔ ہمارے جلد پہنچنے نہ پہنچنے سے کوئی  
 فرق نہیں پڑے گا۔ بس یہ گہرام والا معاملہ نہ بنانے کے بعد ہم فوراً  
 نکل پڑیں گے۔ میں ابھی اپنے آدمی ہستی کی طرف روانہ کرنا  
 ہوں۔“

اس کے سمجھانے پر میں خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد  
 پھوٹا خان نے اپنے کوٹھ سے بھی چند خرید آدمی بلوالیے۔ انہیں  
 ہدایت دے کر گہرام کی ہستی کی طرف روانہ کر دیا اور مجھے  
 پھوٹا خان نے اپنے گھر پہنچ دیا تاکہ میں کچھ دیر آرام کروں لیکن  
 آرام اب میرے نصیب میں کہاں تھا؟ اس بد بخت گہرام والے  
 معاملے نے میرا کراچی جانے کا پروگرام بدل ڈالا تھا اور میں بھی  
 کہ جلد از جلد کراچی شینا کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے  
 بے چین ہوئی جا رہی تھی۔ پلٹ کر شیر کی بیوی بھاگ بھری کی طرح  
 پھوٹا خان کی بیوی بشریاں بھی بڑی ملتازار اور ہمدرد خاتون ثابت  
 ہوئی تھی بلکہ بشریاں تو اب مجھے اپنی ایک حسد کے روپ میں  
 دیکھنے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میری بہادری کی وجہ سے اس  
 کا لکھنا چٹا مرنی والا لال اور کوٹھ کے خونی بچوں سے آزاد ہوا  
 تھا اور نہ صرف یہ بلکہ میری ہی وجہ سے اس کے شوہر پھوٹا خان  
 اور بھائی پلٹ کر شیر کے درمیان مفاہمت بھی ہو گئی تھی۔

بہر حال اب میں بے چینی سے اس وقت کی منتظر تھی کہ  
 گہرام والا معاملہ بہ خیر خوبی طے پا جائے تو میں اور پھوٹا خان  
 ایک بار پھر کراچی کا قصد کریں۔ اس سلسلے میں پھوٹا خان نے  
 اگرچہ مصالحتاہ دوش اپنائی تھی اور سب سے پہلے خیر سگالی کے طور  
 پر اپنے آدمی گہرام کی ہستی کی طرف روانہ کر چکا تھا مگر پھر بھی  
 جانے کیوں اس کی کھیر معاملے کی طرف سے میرا دل اپنا چھانے  
 ٹھکڑا شہادت اور دوسو سو کا شکار تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ  
 معاملہ اتنی جلدی اور آرام سے منٹ جائے گا؟ بہر طور میرے  
 پاس اب انتظار کی ٹھن گھڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ موسم کی رست بدل چکی تھی۔  
 اپریل شروع ہو چکا تھا اور پسینہ بھائی کریموں کی آمد آ رہی تھی۔

بشریاں نے دوپہر کا کھانا تیار کر لیا تھا اور اس کے منع کرنے کے  
 باوجود میں نے بھی رسوئی میں اس کے ساتھ ہاتھ بٹایا تھا۔ تھوڑی  
 دیر بعد پھوٹا خان اور پلٹ کر شیر بھی آ گئے اور ہم سب نے اکٹھے بیٹھ  
 کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اگرچہ مجھے ذرا بھی بھوک نہ تھی مگر کھانے  
 سے قبل از وقت ہاتھ پیچ لیا خلاف تہذیب بھی تھا۔ کھانا کھانے  
 کے بعد یہ قول پھوٹا خان کہ ”اس کے آدمیوں کی گہرام کی ہستی  
 واپسی اگلے چند گھنٹوں میں متوقع تھی۔“

ہم سب ایک نشست پر اور آرام وہ کرے میں آ کر بیٹھ  
 گئے تھے اور اس دوران میں پلٹ کر شیر نے میرے ہاتھ سے متعلق  
 وہ ساری درد انگیز اور عبرت اثر داستان دھیرے دھیرے  
 پھوٹا خان کو سننا ڈالی جسے سن کر پھوٹا خان ایک لمحے کو تو انگشت  
 بدنماں رہ گیا تھا۔ چونکہ پلٹ کر شیر کی طرح وہ خود بھی اخبار بینی کا  
 شوق رکھتا تھا اور گا بے بگا ہے وہ مقامی سندھی روزناموں میں  
 میری اور صفت انہیں ڈیرے عارب خان کی رسائی سے  
 متعلق خبریں اور ایڈیٹروں کے ادارے پر ہتھارتا تھا۔ بالخصوص  
 زیب النساء پلجیو کی میرے سلسلے میں دی گئی پریس کانفرنس کی  
 مفصل کٹھا بھی اس کی نظروں سے گزری تھی۔ پھوٹا خان نے  
 میری بہادری بہت اور جرأت مندی کی دل سے تعریف کی تھی۔  
 پھوٹا خان اور پلٹ کر شیر دونوں ہی مجھ سے از حد متاثر نظر آ رہے  
 تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں اور چہروں سے میرے لیے ہمدردی  
 کے جذبات سے کہیں زیادہ ایک عجیب سی عقیدت تھی اور ستائی  
 تاثرات مترج ہو رہے تھے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں سندھ  
 دھرتی کی ایک ایسی مظلوم بچی کے لقب سے بھی نوازا دیا تھا جو  
 اپنے اندر بیروں مرشدوں جیسے خواہش رکھتی تھی۔ جس کے  
 سامنے بڑے بڑے بڑے طوفان سرگرم ہو جاتے تھے اور نہ زور  
 آنڈھیاں میرے بلند حوصلوں کے بادبانوں سے ٹکرا کر ہوا کے  
 نرم خوبصورتوں میں بدل جایا کرتی تھیں۔

پھوٹا خان نے تو بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی  
 عقیدت اور احترام کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی  
 آنکھوں سے لگاتے ہوئے انہیں چوم لیا تھا پھر فرط جذبات سے  
 قرعش لہجے میں مجھ سے بولا۔

”دھے! اگر تو ہمیں کسی قابل سمجھتی ہے کہ اپنی اس جنگ  
 میں ہمیں بھی اپنے ساتھ شامل کر لے رہا ہیں کی قسم! ہماری  
 زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا اور اگر تیری اس جنگ میں ہمیں  
 موت بھی آگئی تو یقین کر دو کہ یہی نصیبوں والی موت ہوگی۔“

”ہاں اوری کوئی ناں! بھا پھوٹا خان کی طرح میں بھی اپنے  
 دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اگر تو اپنے ادا پلٹ  
 شیر کو اس قابل سمجھتی ہے کہ وہ ایک غیرت مند بھائی کی طرح

تیری ڈھال بن جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری بخشش کا سامان پیدا ہو گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک مظلوم بہن کی چادر کی حفاظت کرتے ہوئے اگر مجھے موت بھی آگئی تو وہ بھی شہادت سے بھی بڑھ کر میرے لیے درجہ رکھے گی۔" بلخ شیر نے بھی پھوٹا خان کی طرح میرے ساتھ شامل ہونے کا دم بھرا تو بے اختیار میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے جو آج پہلی بار میری آنکھوں سے اُمڈ پڑے تھے۔ مجھے روتا دیکھ کر پھوٹا خان اور بلخ شیر یک دم اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر میرے قریب آ کر پہلے پھوٹا خان نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اس کے بعد بلخ شیر نے بھی اپنا ہاتھ رکھا۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ہمیں اب اپنے آدمیوں کا بے چینی سے انتظار تھا۔ لگ بھگ کوئی گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز پر پھوٹا خان اور بلخ شیر چونک کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور باہر دروازے کی طرف لپکے۔ شاید ان کے آدمی گہرام کی بستی سے لوٹ آئے تھے۔

وہ دونوں واپس آئے تو خامے فکر مند اور اچھے ہوئے نظر آرہے تھے بلکہ بلخ شیر کے چہرے پر تو جوش آمیز تہمتا ہٹ کے تاثرات بھی تھے "کیا ہوا؟ چاچا! اتہارے آدمی کیا پیغام لائے ہیں؟"

بالآخر ان کے خاموش بشروں کو نکتے ہوئے میں نے بے قرار ہو کر پھوٹا خان سے پوچھا۔

"ان لوگوں نے میرے آدمیوں کے ہاتھ پواخت پیغام بھیجا ہے۔"

پھوٹا خان نے ایک گہری ہنکار خارج کرتے ہوئے کہا "انہوں نے کہا ہے کہ بلاتاخیر ہمارے سردار گہرام کو عزت و احترام کے ساتھ ان کی بستی میں لایا جائے اور ہم سے نہ صرف ہمارے سردار کو برغالی بنانے کی معافی مانگی جائے بلکہ ہمارے جن دوست قیدیوں کو ہلاک کیا گیا ہے ان کا خون بہا بھی دیا جائے" پھوٹا خان کی اس صراحت پر میں پریشان ہی ہوئی مگر دوسرے لمحے بلخ شیر پر جوش لہجے میں بڑا کر بولا۔

"ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا بھلا پھوٹا خان! میں تو کہتا ہوں گہرام کو ان لوگوں کے حوالے ہی نہ کیا جائے اور چونکہ گہرام نے پہلے تو ہم حملہ کرنے کا جرم کیا ہے اب یہ لوگ اس جرم کا ہمیں "بھونکا" (قصاص) دیں گے بلکہ ہمارے ساتھی زمان کی موت کا بھی خوں بہا دینا پڑے گا۔ ان کی دھناتی تو دیکھو! انہا ہمارے گلے پڑے ہیں۔ ان مردود جو گیوں کو تو ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم ان کا سردار زندہ سلامت ان کے حوالے کر رہے ہیں۔"

"نہیں بلخ شیر! بلاوجہ اس طرح بات مگڑ جائے گی پھوٹا خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ابھن آمیز لہجے میں "ایسا کرتے ہیں گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں" چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا بھی حل ہے..... دیکھتے ہیں یہ جو کچھ کیا گا لیتے ہیں۔"

"یہ لوگ اپنی اوقات بھول رہے ہیں۔ جنگ تو جنگ کی بلخ شیر نے بدستور تلخ میں دانت پیس کر کہا۔

"تو ادھر ٹھہر" میں اس مردود گہرام کو دھکا دے کر آتا ہوں پھوٹا خان نے کہا اور باہر نکل گیا۔

پھوٹا خان جا چکا تھا۔ بلخ شیر اپنی جگہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ اپنے بہنوئی پھوٹا خان کے برعکس بلخ شیر ایک جی دار غرور اور آگے مزاج انسان تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ پھوٹا خان کو بی بدول انسان تھا۔ بہادری اور سردہڑ کی بازی لگا کر ان کے خیر میں بھی شامل تھا مگر وہ ذرا غصہ سے دل و دماغ سے ہلے معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تھکے تھکے سے انداز میں واپس لوٹ آیا۔ بتایا کہ اس نے وہ بالآخر گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو آزاد کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے (پھوٹا خان) آدمیوں گہرام وغیرہ کو سندھو دیا (دریائے سندھ) کے پار تک چھوڑنے بھی گئے تھے۔

"یہ مردود گہرام! ڈھی سا ب کی مثل یہاں سے گیا ہے! بستی چینی ہی ہے کی نہ ضرور کوئی گل ٹھلائے گا۔"

پھوٹا خان نے جرتوش لہجے میں جیسے خود کلامی کرنا ہوئے کہا تو بلخ شیر نے جوش سے کہا "دیکھ لیں گے! پھوٹا خان! ان کیوں فکر کرتا ہے۔"

"اڑے یار! فکر کی بات تو نہیں ہے میں کون سا لا جو گیوں سے ڈر رہا ہوں۔ مگر بلاوجہ میرا اور دھی کو نبھانے کا کہنا جانا مسئلہ ہو جائے گا۔"

"نہیں بھلا! تو اس کی فکر نہ کر! میں پیچھے سنہال لوں گا تو نے اورادی کو نبھانے اگر کراچی ٹکنا ہے تو پہلے نکل جا۔"

بلخ شیر نے فوراً کہا۔ مگر پھوٹا خان کا اس طرح کراچی جانے پر شبہ دل نہیں مان رہا تھا۔ جو دیر ابھی یہی خیال تھا کہ ابھی ان حالات میں ہمارا سر درست گوشہ سے ٹکنا مناسب نہ ہوگا لہذا میں نے پھوٹا خان کی تائید کرتے ہوئے بلخ شیر سے کہا۔

"اداخ شیر! چاچا سائیں ٹھیک کہہ رہے ہیں پہلے مردود گہرام والا معاملہ ذرا غصہ اڑ جائے تو پھر کراچی جانے کچھ سوچیں گے۔"

میں نے دیکھا میری بات پر پھوٹا خان نے چھپو

نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”دعے! میں تیرے دل کی پریشانی سے انہی طرح واقف ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک تو خود کو دھوکا دینے کے پاس نہیں پائے گی تیرے دل کو فرات نہیں آئے گا۔“

میں نے اس کی بات پر صاف دل سے کہا ”چاچا! ایشیا کی پریشانی اپنی جگہ لیکن یہ بھی تو سوچنے والی بات ہے کہ اگر ان حالات میں ہم کراچی نقل بھی گئے تو کیا ہمیں پیچھے کی فکر اور پریشانی نہ ہوگی لہذا اب بہتر یہی ہے کہ گہرام والا معاملہ منٹ جائے تو بعد میں ہی کراچی جانے کا سوچتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر“ میری بات پر پھوٹا خان نے کہا۔ ”میں آج ہی اپنا ایک آدمی تھری کی منیت سے جوگیوں کی ہستی کی طرف روانہ کرتا ہوں۔ مجھے ان کے عزائم سے باخبر کرنا ہے۔ دے دیے میرا ذاتی خیال۔ یہی ہے کہ ہستی کی جو بیخاست ہے وہ دراصل گہرام ہی کی ہم خیال اور شریک ہے ورنہ ہستی کی اکثریت امن پسند ہے وہ ہڑائی یا مار کٹائی کی خوگر بہر حال نہیں ہے۔“

☆☆☆

یہ اس روز شام کا ذکر تھا۔ شیخ اپنے گھر روانہ ہو چکا تھا۔ جبکہ پھوٹا خان موجودہ حالات سے باخبر رہنے کے لیے اپنی اوطاق کی طرف چل دیا تھا۔ اس وقت گھر پر میں بشیراں اور مراڈلی تھے۔ گہرام والے معاملے کی پریشانی اگرچہ اپنی جگہ تھی مگر مجھے شینا کی طرف سے ایک ہل بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے محبوب شوہر محمد پریل کا خیال بھی۔ بد قسمتی سے میں بے دردی اور یکے بعد دیگرے ایسے گونا گوں حالات سے دوچار رہی تھی کہ مجھے پھر دوبارہ پریل کو تلاش کرنے کا موقع نہ مل سکا البتہ دوران گفتگو ایک موقع پراخان شیخ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ پریل کی تلاش جاری ہے۔ اس نے مانی مختار اور پریل کو ڈھونڈنے کے لیے اپنے دو آدمیوں کو بدستور لگا رکھا تھا۔ لیکن ابھی تک انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر شیخ نے دے دیے انھوں میں مجھ سے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ مانی مختار پریل کو لے کر کہیں دور نکل چکی ہے۔ اس اطلاع پر میں بری طرح ہپنا دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سردست میرے پاس صبر و دعا کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ سو وہ میں کر رہی تھی۔

میں اپنی بے چینی اور اداسی دور کرنے کے لیے پھوٹا خان کی بیوی بشیراں سے باتوں میں مصروف تھی۔ پھر اس کے بعد ہم ذرا آرام کرنے کی غرض سے اندر کمرے میں لیٹ گئے۔ جاکو تو شام ہو چکی تھی۔ بشیراں کے کہنے پر میں نے

نہا دھو کئے کپڑے پہن لیے۔ یہ کپڑے بشیراں کی ہی تھے اگرچہ مجھے ذرا کھلے تھے۔ مگر صاف اور اچھے تھے۔ اس ناخبر بشیراں نے مجھے گڑی جانے پلائی۔ اس دوران میں پھوٹا خان اور شیخ آپس میں باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ پھوٹا خان کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا جبکہ شیخ خاصا شہر دکانی دے رہا تھا۔ وہ دونوں اندر کمرے میں جا بیٹھے۔ ان کمرے میں جاتے ہی میں بھی وہاں آ گئی اور پھوٹا خان کی بات دیکھ کر پوچھا۔

”چاچا! آخر تو ہے کیا ہوا؟“ اس اثنا میں بشیراں پریشان اور شکری کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ پر جانے کے برتن تھے۔ پھوٹا خان میری بات کا جواب دے رہا تھا۔

”شیخ! تو اب ایسا کر“ وہی کونجیاں اور میرے بچوں سب سے پہلے اپنے گھر لے جا۔ میں خود ہی ان لوگوں سے نہ لوں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھائی! میں بھی ابھی جا کر اپنے آدمی پر کرتا ہوں۔ آج ان لوگوں کو مزہ چسکا کر رہیں گے“ شیخ نے جواب پر جوش لے کر کہا تو میں مزید پریشان سی ہوئی اور بالآخر متوجس لہجے میں دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو پھوٹا خان نے بتایا۔

”کونجیاں دے! گہرام نے ان کی بات نہیں دہرائی وہی حرج کاڑھا۔ میرے تجربے آکر بتایا ہے کہ گہرام ہمارے گھر پر شب خون مارنے کے لیے پرتول رہا ہے“ اس کی بات پر میں گئی۔ فکر مست ہو گئی تھی۔ بعد میں پھوٹا خان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ گہرام کی ہستی سے کچھ لوگ اس کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کونجیاں کو ہمارے حوالے کرو یا پھر ایک بڑا جنگ کے لیے تیار ہو۔

اس بات نے مجھے مزید پریشانی میں مبتلا کر دیا اور ایک بار پھر میں اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگی۔ کونجیاں میں نہیں جانتی تھی کہ میری وجہ سے اب یہاں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو۔

مجھے تنہا میں مبتلا یا شیخ جیسے میری پریشانی بھانپتے ہوئے کھلی دیتے ہوئے بولا ”تو کیوں فکر کرتی ہے اسی کونجیاں ہم نے کوئی جوڑیاں تو نہیں پہن رکھی ہیں۔ تو دیکھنا! ہم ان لوگوں کو ایسا منہ توڑ جواب دیں گے کہ ساری عمر یاد رکھیں گے اور پھر کبھی ادھر آکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ان میں ہمت نہ ہوگی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ادا! مگر..... اس ہولناک جنگ میں ان گھوڑے کے گناہ اور مضمون لوگوں کی جانوں کو بھی تو خطرہ ہوگا“

میں نے کسی قدر تشویش آ میر لہجے میں کہا تو پھوٹا خان بولا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو دے! میرے گھوڑے لوگ بہت ہی دار اور ڈر ہیں۔ میری ایک آواز پر سب اکٹھے ہو جائیں گے لیکن میں نے پھر بھی انہیں غلط رہنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ ہمارے آدمی سندھو دریا پر سو بے سہارا کھینچے گئے ہیں۔ اول تو گہرام کے آدمی وہ دریا بھی پار کرنے کی جرأت نہیں کر پائیں گے۔ اگر ان کا کوئی بھولا بھٹکا آدمی دریا پار کرے گا ابھی گھیا تو اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔“

پھوٹا خان کی بات پر میری پریشانی کم نہ ہوئی تھی۔ رات بھاری سلی کی طرح دے پاؤں سرک رہی تھی۔ کمرے سے باہر دویران محن میں چنچا ہوا سنا کوڑا لے سانپ کی طرح پھنکاریں مارتا محسوس ہو رہا تھا محن کی لائٹ گل تھی مگر باہر چاند کی روشنی چار اطراف اتاری ہوئی تھی۔

باہر دور نہیں آوارہ کتوں اور گیدڑوں کی السائی ہوئی چیخنے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

اگر یہ شخص اطلاع ہوئی گہرام کی ہستی والے..... آج رات گھوڑے پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بھینٹا میں اس بات کا امکان بھی غالب رہتا کہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ آج کی رات ہی حملہ آوروں کو یہ شخص اطلاع ہی نہیں بھی بلکہ یہ ایک خفیہ اور صدقہ خیر بھی جو پھوٹا خان کا ایک خبر گہرام کی ہستی سے اڑا لیا تھا۔ اور ان کے جارحانہ عزائم سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آج رات ہی گھوڑے پر ہلنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ہم تنہا خواہمیں سرور پر پریشانی تک دوپٹے کے طور پر چادریں لپیٹے دعا و عبادت میں مشغول تھیں۔ اس دوران میں مجھے چپاں محسوس ہوئی پھر میں زبردستی دھڑکے سے پانی پینے کا کہہ کر گئی اور باہر محن میں آ گئی۔ ایک طرف گھڑوئی رہی تھی جس پر دو بڑے بڑے تازہ پانی سے بھرے سٹکر رکھے تھے۔

میں نے گلاس سنبھالا اور سورتی ڈبھی سے گھڑے میں سے پانی نکال کر گلاس میں بھرا اور ابھی میں نے چند گھونٹ ہی پیے تھے کہ اچانک دور کہیں گولیوں کی بھیاک ترزا ہٹ سنا دی۔ میرا دل پہلے ہی ”دھڑکا“ ہوا تھا۔ پانی کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹنے چھوٹنے بھاگتا تھا۔ گولیوں کی بھیاک آواز شاید اندر کمرے میں موجود بشیراں اور بھگام بھری نے بھی سنی لی تھی۔ وہ دونوں ہی متوجس انداز میں باہر برآمدے میں آکر مجھے مخاطب کر کے گولیں۔

”کونجیاں! اندر آ جاؤ“ گلتا سے حملہ ہو گیا ہے“ میں نے گلاس داہیں رکھا اور ان کے قریب آ گئی۔ پھر ہم اندر کمرے میں آ گئے۔

”اللہ سائیں تو خیر نہ کرنا۔ ہمارے سر کے سائیں کی جانوں

کی حفاظت کرنا“ بھگام بھری نے دعائیانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے زبردستی کہا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش نے آٹا رکھنا آئے تھے۔ ہم تنہا پھر دعاؤں میں مشغول ہو گئے مگر میری سامتیں باہر کہیں دور ہونے والی فائرنگ پر گئی ہوئی تھیں۔ فائرنگ اب متواتر ہو رہی تھی جس کے دھواں دھار آہنگ سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ اب باقاعدہ تباہ و تاراج کا آغاز ہو چکا تھا۔ یعنی بالفاظ دیگر جنگ شروع ہو چکی تھی۔

بشیراں اور بھگام بھری کے چہروں پر اب پریشانی کے ساتھ ہراس بھی پھیل چکا تھا۔ وہ اب زیادہ خصوصیت و تشویش کے ساتھ دعاؤں میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ میرے اندر دھڑکنا جاری تھی۔ اچانک جانے کیا ہوا کہ میری چمچی جس پھڑکی جس نے میرے اندر ایک عجیب سے ”کھٹکے“ کو بھرا دیا۔ بے شک اس وقت ہمارا واحد سہارا خدا سے خیر کی دعا میں لگنا ہی تھا لیکن جانے کیا بات تھی کہ میرے دل کو پریشانی کے ساتھ ایک بے نام بے چینی نے آ لیا اور میں بشیراں اور بھگام بھری کو دعاؤں میں مشغول چھوڑ کر کسی خیال کے تحت باہر نیم تارک محن میں آ گئی۔ محن کی دیواریں دم بہ خود ہیولوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ میں جیرونی دروازے کی طرف دے پاؤں آدمی اور پھر اس کی جھری سے آکھ لگادی۔ باہر مجھے شیخ کے دو مسلح آدمی مستعدی سے کھڑے نظر آئے۔ میں چند تھاپے انہیں دیکھتی رہی پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہوئی اس سے مجھے اپنے حلق میں کاٹنے جیسے محسوس ہوئے اور میں اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے محن کے کونے میں رہی گھڑوئی کی طرف بڑھی، پانی نکال کر میں نے چند گھونٹ ہی بھرے تھے کہ اچانک مجھے باہر عجیب سی کھڑ پڑکا احساس ہوا۔ میرا دل بیکار کی زور سے دھڑکا اور میں پانی کا گلاس رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر میں نے ایک بار پھر دروازے کی متواتر جھری سے اپنی آنکھ چپکا دی۔ باہر سناٹا اور دیرانی کا راج تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کبھی ٹھوڑی دیر پہلے جو دو مسلح محافظ کھڑے تھے وہ اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے اندر ناچانے اندر شاک و دوسوں کی بیخاست ہو گئی۔ یہ بے دل کے کسی عینیت گوشے میں ابھرنے والی بے نام ”کھٹک“ اب بیکھت کوڑیا لے سانپ کی شکل اختیار کر گئی۔ تب مجھے ہلکی سی آہٹ کا احساس ہوا اور میں نے فوراً سیدھی ہو کر آواز کی سمت دیکھا تو بے اختیار میرے حلق سے خوف بھری چیخ خارج ہو گئی۔ میرے دائیں طرف کی دیوار پر چھوڑ گھڑوئی رہی تھی وہاں ایک سایہ ابھرتا ہوا نظر آیا۔ دیوار کی منڈ پر اس زراسرار ہونے کو دیکھ کر ایک لمحے کو خوف کی وجہ میری کھلی بندھ گئی اور میں اپنی جگہ کن ہو کر رہ گئی تھی۔ ہوش مجھے

تب آیا جب وہ پراسرار ہولا دیوار ٹاپ کر صحن میں کودا اور شکرے کی طرح میری طرف بڑھا۔ میرے حلق سے اس بار زوردار چیخ خارج ہوئی مگر اس وقت تک اس ہولے نے آگے بڑھ کر میری گردن دبوچ لی تھی اور وہ مجھے اپنے ساتھ کھینٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میری چیخوں کی آواز پر اندر کمرے میں موجود بھیرا اور اب بھاگ بھری بھی ہر اسان انداز میں دوڑتی ہوئی باہر نکلیں تو ایک مشکوک شخص کو مجھے دبوچے ہوئے پا کر وہ بھی ہراساں انداز میں چیخنے لگیں۔ مگر اس حملہ آور نے ان کی پروا کیے بغیر مجھے بدستور ایک ہاتھ سے دبوچ کر دوسرے ہاتھ سے میری گردن دروازے کی..... کھنڈی کھول دی۔ کھنڈی کھنڈی کی دھڑکی کا چاک پانچ سلسلہ حملہ آور دروازے کو دھکیل کر شیطانی بگلوں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ بھیرا اور بھاگ بھری وحشیانہ چیخوں کے ساتھ واپس کمرے کی طرف دوڑیں تو ان میں سے دو حملہ آور انہیں جھپٹنے کو کمرے کی طرف دوڑے۔ میرے گرد جو حملہ آور کھڑے تھے ان میں ایک کو پچھان کر میں خوف سے زرد پڑ گئی۔ وہ مردود گہرام تھا جو میری طرف بڑی خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر وہ دونوں حملہ آور زنی کا پتھی ہوئی بھیرا اور بھاگ بھری کو بھی اپنی بندوق کے نشانے پر باہر صحن میں لے آئے۔

”بھرا! اگر کسی نے بھی اب کوئی آواز نکالنے کی کوشش کی تو“ گہرام قہر پار لہجے میں غرا کر بولا۔ ابھی ذرا دیر پہلے میرے اندر جو اندیشوں بھری بے نام ٹھک ابھری تھی وہ اب ایک کر یہ حقیقت کی صورت میں میرے سامنے تھی۔ گہرام نے بڑی مکاریانہ چال چلی تھی۔ اس نے پھونکا خان اور شیخ شریسمیت اس کے سارے آدمیوں کو یہاں سے در لڑائی میں مصروف کر دیا تھا اور خود بڑی جالا کی سے اپنے چند حواریوں کے ساتھ ادھر نکل آیا تھا اور باہر متعین دونوں محاطلوں پر قابو پالیا تھا۔

”ہم اس چھوڑی کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں“ معا گہرام نے خزاں رسیدہ سے کی طرح کا پتھی ہوئی بھیرا اور بھاگ بھری سے کہا ”اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو تم دونوں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔“

گہرام نے اتنا کہہ کر اپنے دونوں حواریوں کو اشارہ کیا جنہوں نے بھیرا اور بھاگ بھری کو دبوچ رکھا تھا۔ اشارہ پاتے ہی وہ دونوں انہیں دھکیلتے ہوئے اندر کمرے میں لے گئے اور باہر سے دروازے کی کھنڈی چڑھا دی۔

میں مردود گہرام اور اس کے سب حواریوں کے عزائم جان چکی تھی۔ میں جس طرح اس ناگہانی افتاد کا شکار ہو چکی تھی اس نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو یکفلت مفلوج کر کے رکھ دیا

تھا اور میں ابھی تک خوف اور سراسیمگی کا شکار تھی۔ اس کے بعد کی کارروائی کو بڑی منظم طریقے سے نمٹایا گیا اور مجھے دبوچ کر یہ لوگ بیرونی دروازے سے باہر تاریکی میں لے آئے پھر دروازے کو باہر سے کھنڈی چڑھانے کے بعد یہ لوگ اندر کمرے میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

دور در پائے سندھ کی طرف دھواں دھار فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور میں بڑی بے بسی کے ساتھ یہ سوچ رہی تھی کہ پھونکا خان اور شیخ شریسمیت کے خواب دخیال میں بھی شاید یہ بات نہ ہوگی کہ دشمن نے کس مکاری کے ساتھ انہیں وہاں ابھار کر شیخ شریسمیت کے کمرے میں قتل کیا تھا۔

وہ سب راستہ بدل کر تاریکی میں ڈھمکتوں اور جھنگروں کی آڑ میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ مجھے گہرام نے بازو سے سختی سے دبوچ رکھا تھا۔ میری سانسیں بری طرح چڑھ اتر رہی تھیں اور دل سانس سانس کرتی کنبیوں میں پر دھڑک رہا تھا۔ ان کا رخ ہٹا دیا کی سمت تھا جسے پار کرنے کے بعد یہ لوگ اپنی بستی کی حدود میں داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے قابو میں کیے اپنے علاقے کی طرف لے جا رہے تھے۔ میرا دماغ ابھی تیزی کے ساتھ موجودہ خطرناک صورت حال سے مفکر راہ تلاش کرنے میں مشغول تھا جو سر دست مجھے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ میں اس وقت پانچ چھ نیم گیم اور سب دشمنوں کے زرخے میں تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ ان رزویلوں نے بھیرا اور بھاگ بھری کی اندر کمرے میں سوتے ہوئے مصحوم بچوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جلدی میرے کانوں میں دیا کے بپنے کا لکا سا شور سنائی دیا۔ ہم اب دریا کے ریلوے کراڑے پر پہنچ چکے تھے۔ سامنے دریا سے سندھ کا چوڑا پت نظر آ رہا تھا۔ اس کی جھلجھلائی سلسلہ مدام چاندنی میں دک رہی تھی۔ وہ اب دریا کے ستوازی آگے بڑھنے لگے۔ پھر ایک پل نظر آئی، ہم اس پر سے گزرنے لگے۔ ایک لمحے کو میرے پی پی میں یہ جرأت آمیز خیال ابھرا کہ میں خود کو دریا میں گر دوں مگر پھر دریا کے چوڑے اور مجربیت پاٹ کو دیکھ کر مجھ میں ہمت نہ ہوئی۔ دینے بھی مجھے تیرنا تب آ رہا تھا۔ بہر طور اب ہم دوسری سمت کے کراڑے پر آگئے۔ سامنے تاریک اور گہرا جنگل تھا۔

ہم قنیب میں اترنے لگے اچانک میری متوجش نگاہوں نے سامنے درختوں کے قریب دو تیل گاڑیوں کو کھڑے پایا۔ پھر یہ لوگ تین افراد پر مشتمل دونوں یوں میں بٹ کر جلدی سے تیل گاڑیوں پر سوار ہوئے۔ گہرام اور اس کا ایک ساتھی مجھے دبوچے ہوئے تیل گاڑی میں سوار ہو گئے اور اس کے تیرے ساتھی نے توانا بیلوں کی دسی تمام لی اور انہیں ہولے سے ہٹا کر۔ اب

دونوں تیل گاڑیاں آگے پیچھے تیزی کے ساتھ دوڑنے لگیں۔ ہماری تیل گاڑی آگے تھی۔ اب ہم جنگل کے ایک اور پرمہول ہلن میں داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

تاریک جنگل کے پرمہول سنانے میں سبک رفتار سے دوڑتی ہوئی تیل گاڑیوں کے چوبی پٹیوں کی مدد سے کچھ کچھ آواز بھی کر رہے معلوم ہو رہی تھی۔

معا تاریک فضا میں یکدم گولیوں کی بمباریک ترزاہٹ ابھری اور ساتھ ہی ہمارے عقب میں آئی ہوئی تیل گاڑیوں پر سوار گہرام کے حواریوں کی مگر خراش چھٹی ابھریں میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹھا۔ کیا یہی گہرام کے حلق سے سانپ کی سی ہلکی ہلکی ہنکارے سے مشابہت ابھری اور اس نے فوراً اپنے ساتھی کو تیل گاڑی روک دینے کا حکم دیا۔ وہ تینوں بری طرح ٹھٹھکے تھے۔ گولیوں کی کیاہاری ابھرنے والی ترزاہٹ کے بعد اب چار سو سنانا ہو گیا تھا۔ جو وحشت زدہ دلوں پر موت کی دنگ دیتا محسوس ہو رہا تھا۔

”اتر چل دی کرو“ معا گہرام سانپ کی طرح ہنکارا۔ اس کے تینوں ساتھی بندوق میں ہاتھ میں لیے نیچے اتر آئے۔ اس ناگہان بدلتی ہوئی صورت حال نے میرے اندر امید کی جوت سی جلدی بھی لیکن یہ گہرام اور اس کے دونوں حواریوں کے لیے کشائش کا پیغام تھی۔ وہ تینوں مجھے دبوچے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ عقب میں دھندلے خاکے کی طرح نظر آتی تھیں گاڑی کو پتھی پتھی اور وحشیانہ نظروں سے گھورنے لگے۔

گولیوں کی آواز سے بیلوں میں بے چینی سی پیدا ہونے لگی اور عقب میں موجود تیل گاڑی جب دوڑتی ہوئی ہمارے قریب سے گزرنے لگی تو گہرام کے دونوں ساتھیوں نے یکدم آگے بڑھ کر بدک کر بھاگتے ہوئے دونوں بیلوں کا راستہ روک لیا اور پھر ایک نے فوراً آگے بڑھ کر ان کی دسی دبوچ لی۔ گہرام مجھے بازو سے پکڑے جب درخت کی آڑ سے نکل کر تیل گاڑی کے قریب آیا تو ہماری نظروں کے سامنے تیل گاڑی کے چوبی تختے پر گہرام کے تینوں ساتھیوں کی خون منس لٹ پت لائیں پڑی گئیں۔

پھر اس لمحے جیسے گہرام کی پچھٹی حس نے کسی خطرے کو محسوس کیا اور ہولے سے چلا کر اپنے دونوں ساتھیوں سے بولا۔ ”یہاں سے پرے بہت جاؤ جلدی“ یہ کہہ کر مجھے بازو سے محسوس کر دو بارہ درخت کی آڑ میں آگیا مگر اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنی جگہ بدلنے میں ذرا دیر ہو چکی تھی کیونکہ اسی لمحے ایک بار پھر گولیوں کی بمباریک ترزاہٹ ابھری اور اس کے

دونوں ساتھی تیرا کر گھرے مگر اس کے ایک ساتھی میں شاید ابھی دم بانی تھا۔ اس نے گرتے ہی آواز کی سمت کیے بعد دیکرے دو کارٹوس فائر کر دیے پھر ٹھٹھک اسی وقت مذکورہ ”اندھیری“ سمت سے دوبارہ گولیوں کی ترزاہٹ ابھری اور گہرام کے آخری ساتھی کا سرخون سے تر ہر ہو گیا۔ وہ آواز نکالنے بغیر ہی اگلے جہان کو سدھار چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو یوں آن کی آن میں جہنم داخل ہوتا دیکھ کر گہرام کی حالت بالگوں کی سی ہو گئی۔ اس نے اپنی دونوں بندوق ایک ہاتھ میں پکڑ کر انداز سے سے ہاتھ معلوم حملہ آوروں کی طرف دو فائر جھونک مارے۔ مگر پراسرار حملہ آوروں کو گہرام کے مقابلے میں بڑی موثر گھات ملی ہوئی تھی اور گہرام اس وجہ سے مات کھایا تھا۔ ان پراسرار حملہ آوروں کے بارے میں میرا اندازہ یہی تھا کہ یہ لوگ ہونہ ہو پھونکا خان یا شیخ شریسمیت کے آدمی ہی ہو سکتے تھے۔ انہیں شاید بین وقت پر دشمنوں کی اس خفیہ کارروائی کا علم ہو گیا تھا۔ تاہم ساتھ ہی اب میرے دماغ میں جھلکی کی سرعت کے ساتھ ایک سمجھا کا ہوا۔ گہرام اب اکیلا رہ گیا تھا اور اس کی بندوق بھی سر دست خالی تھی۔ اسے اب اپنی بندوق دوبارہ لوڈ کرنے میں ایک ”لحاتی“ وقفہ درکار تھا لیکن میں اب اس لحاتی وقفے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے خود کو کوئی طور پر تیار کر چکی تھی کیونکہ گہرام اس وقت ٹھٹھک خود رہا تھا اور وہ کسی بھی وقت مجھے بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی گہرام نے اپنی کمرے کے گرد لپٹی ہوئی گولیوں کی پٹی سے کارٹوس نکالنے کی کوشش کی، میں نے اس کی ایک ہاتھ کی گرفت سے آزادی ملنے ہی اسے زور کا دھکا دیا۔ اس کے لیے شاید میری یہ جارحانہ اور اچانک حرکت خلاف توقع تھی یہی سبب تھا کہ وہ غیر متوقع دھکا کا کھار درخت کی آڑ سے نکل کر چند قدم تک لڑکھاتا چلا گیا مگر اس نے خود کو گرنے نہیں دیا تھا۔ مگر میں اس سے پہلے ہی جنگل کی طرف دوڑی۔ اچانک دوبارہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ہاتھ معلوم حملہ آوروں نے شاید گہرام پر گولیاں برسائی تھیں۔ مگر میں اس کی پروا کیے بغیر اندھا دھند تاریک جنگل میں دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میری سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ ایک دو جگہ پر میں جھماڑیوں سے الجھ کر گری بھی گئی اور میرے چہرے پر بخاردار جھماڑیوں کی خراشیں بھی ابھری تھیں مگر چونکہ میری اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے میں ان خراشوں کی پروا کیے بغیر دوبارہ اٹھ کر دوڑنے لگی اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے عقب میں دوڑا چلا آ رہا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ شاید بد بخت گہرام میرا پیچھا کر رہا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے کسی نے عقب سے مجھ پر گولیاں برسائیں۔ یہ رانفل کی آواز تھی۔ جو پراسرار حملہ آوروں کے پاس تھی جبکہ

گہرام کے پاس بندوبست تھی۔ گولیوں کی بمیا تک تڑتا ہوا تھا۔ گہرام نے ہی میری رزگاریں اور میں ایک بار پھر منہ کے بل پھر اندر جھانپوں پر آن گری۔ اس بار میرے حلق سے چیخ خارج ہوئی۔ یہ چیخ میرا اضطرابی عمل تھا بلکہ کرتے ہوئے میرا سر سامنے درخت کے ایک موٹے تنے سے ٹکرایا تھا۔ مجھ پر عقب سے ہونے والی گولیوں کی بو چھار بھینا مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کی گئی تھی جس سے مجھے۔۔۔ اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ گہرام اور اس کے ساتھیوں پر پہلے پونے والے کم از کم میرے دوست نہیں تھے۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟ میں نے متوجہ ذہن کے ساتھ سوچا۔ تاہم میں نے اپنے سر کی جوت کو سہلاتے ہوئے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی تو اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی بے تحاشا دوڑتا ہوا میرے سر پہنچ چکا ہو اور پھر اگلے ہی لمحے جب میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تو رافٹل کی سردنال میری گردن سے آن گئی۔ میں اپنی جگہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

”خبردار کو بچا! اپنی جگہ سے ہٹنا بھی مت۔۔۔ ورنہ۔۔۔“

ایک غرائی ہوئی نسوانی آواز میری کھلی ہوئی ساعتوں میں گونجی اور میں اس شناسا آواز کو پہچان کر دھک سے رہ گئی۔ یہ آواز لاالان کی تھی۔ وہی آفت کی پرکالہ لاالان۔ جو موت کا سایہ بنی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ تو مجھے اس کا شناسا ہولا دکھائی دیا۔ وہ کسی ڈھکی ٹھکی کی طرح پھنکار رہی مارتی ہوئی باپ رہی تھی۔

اس نے انتہائی قہر آلود لہجے میں مجھے ایک طرف قدم بڑھانے کا حکم دیا۔ فائرنگ کا سلسلہ وقفہ وقفہ سے جاری تھا۔ لاالان مجھے بے اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ وہ بڑی محتاط اور جنگلی لمبی کی طرح میرے عقب میں رافٹل تانے چل رہی تھی۔ ادھر فائرنگ کا سلسلہ اچانک موقوف ہو گیا تھا۔ لاالان نے ایک مقام پر پہنچ کر اپنے حلقے سے عجیب مگر مخصوص آواز نکالی دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی داہنی جانب سے ایک اور انسانی ہولا ابھرا ہوا نظر آیا۔ لاالان اسے دیکھ کر فرخ سے چور لہجے میں بولی۔

”کوؤل! میں نے کوکباں کو پکڑ لیا ہے“ اس کی زبان سے کوؤل کا نام سن کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گئی۔ تو یہ ساری کارستانی اس سانپوں کے جوڑے لاالان اور کوؤل کی تھی میں نے سوچا۔

”لاالان! لگتا ہے“ گہرام میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے“ اچانک جواب کوؤل نے لاالان کو مخاطب کر کے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”ایک تیل گاڑی موجود ہے“ میرا خیال ہے ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے یہ سارا علاقہ اس مردود گہرام کا ہے۔ وہ اپنے آدی لانے میں نہیں دیریں کرے گا۔“ اس کے یہ کہنے کی دیر بھی کہ

کوؤل نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور بڑی بے دردی کے کھینچا ہوا آگے بڑھا۔ لاالان بڑی محتاط نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہوئی ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔ پھر سامنے ایک تیل گاڑی کھڑی نظر آئی۔ جس میں گہرام کے تین ساتھیوں کی خون منٹ پت لاشیں پڑی ہوئی تھیں جبکہ دوسری تیل گاڑی جس میں گہرام اور میں سوار تھے اس کے دونوں تیل شاید بدحواس ہو کر بھاگ چکے تھے۔ کوؤل نے جلدی جلدی تین لاشیں تیل گاڑی سے اتار کر نیچے پھینکیں پھر اس کی رسی سنبھال کر اس میں سوار ہو گیا جبکہ لاالان مجھے دوپے تیل گاڑی میں سوار ہوئی اور یہی نہیں اس کمپنی نے ایک رسی کی مدد سے میرے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے کوؤل نے مخصوص آواز میں بیلوں کو ٹھٹکا کر اور آگے دھکیں کے کچے راستے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ دونوں تیل تندرست اور تواتا تھے۔ کوؤل کا اشارہ پاتے ہی دوڑنے لگے۔ جلد ہی ہم سندھو دریا کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں آکر کوؤل کو جانے کیا سوچی کہ اس نے اچانک تیل گاڑی روک دی۔

”کوؤل! گاڑی کیوں روک دی؟“ لاالان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”لاالان! ہمیں دریا پار کر کے آگے نکلتا ہوگا“ کوؤل نے کچھ سوچنے کے بعد انداز میں جوابا کہا۔

”اور یہ تیل گاڑی چھوڑ کر پیدل آگے بڑھنا ہوگا ورنہ گہرام اور اس کے ساتھی تیل گاڑی کے پہیوں کے نشانات کے ذریعے ہم تک پہنچ سکتے ہیں“ اس کی پرجوش تامل پر لاالان نے فطیحی انداز میں اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد ہم تینوں تیل گاڑی سے نیچے اتر آئے پھر گہرام نے بیلوں کا رخ واپس جنگل کی طرف موڑ کر ایک تیل کی چنگ کوڑے سے نواچا اور انہیں آگے شکار دیا۔ دونوں تیل ڈکراتے ہوئے اندھا دھند اندر جنگل کی طرف دوڑ گئے۔ ہم تینوں اب دریا کے سندھ کے ریتیلے کراڑے پر دم بہ خود ہولوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

یہاں دم دم آواز نرم اور خشک جاندنی بجلی ہوئی تھی۔ کوؤل نے دریا کی طرف قدم بڑھا دیے تو مجھے بھی عقب سے لاالان نے رافٹل کا ٹھوکا مارا اور تاجار کوؤل کی تھلید میں، میں نے بھی قدم بڑھا دیے۔

تموڑی در بعد ہم دریا کے سندھ کے مچہیت چوڑے پاٹ پر بنی پل پار پر گزر رہے تھے۔

دریا پار کرنے کے بعد ہم اب تیز تیز قدموں سے اس کے متوازی دراز شیب میں بنی اوپنی تیج خاردار جھاڑیوں میں سے گزرنے لگے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے

تھے۔ ہمارے چہرہ پر مچہیت سناٹا طاری تھا۔ لاالان اور کوؤل خامے سخت جان ثابت ہوئے تھے۔ وہ کافی دیر تک بغیر رکے چلے رہے۔ اس دوران میں میرے قدم ذرا بھی ست پڑتے تو میرے عقب میں چلتی ہوئی لاالان میری پشت پر زور سے اپنی رافٹل چھو کر مجھے آگے کو دھکیلتی تھی۔ میرے ساتھ آسان سے گرا کجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ لاالان اور کوؤل کے نرنے میں آنے کا مطلب وہ پرجوش جو کندھ کوٹ اور کشور کے صحرائی علاقوں تک محیط تھی۔ میں نے اب تک خاموش حکمت ملی اپنا رگی پالا پھر ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ میں بھلا ان سے کیا کہہ سکتی تھی؟ اور یہ بات خود نہ دونوں بھی بے خوبی جانتے ہی ہوں تھے میرا ان کے ہاتھوں پر خیال بننے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ مگر میرے لیے اب یہ خیال ہی وہاں روح بنا ہوا تھا کہ کیا یہ دونوں بدبخت! اسی طرح پیدل ہی کندھ کوٹ تک کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ بھلا یہ مڑھاب! دشوار گزر منزلوں کی مسافت میں کس طرح لے کر سکتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ پریشان کن جراتی بھی ہو رہی تھی کہ کندھ کوٹ و کشور تک کے دشوار گزر اسرنے راستوں کا بھلا کوؤل اور لاالان کو کیسے علم تھا؟ جبکہ ان دونوں کا تعلق تو اس دھرتی سے ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ دونوں دبیل دھرتی راہتھیاں صحرائی علاقوں کے ساپ تھے لیکن شاید مقصد کے حصول کی لکھن جب انسان کے دماغ میں سامنے لگتی ہے تو وہ انجان سے ایمان منزلوں کا راست بھی کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ ضرور کوؤل اور لاالان نے بھی جب کندھ کوٹ اور کشور کے علاقوں کے سفر کی غمانی ہوئی تو انہوں نے کسی طرح محتای لوگوں سے پوچھ بچھ بھی کی ہوگی۔

بالآخر ایک موقع پر میں تمھکن سے چور ہو کر گری گئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

”مم۔۔۔ مجھ سے اب مزید نہیں چلا جا رہا۔ میں تو تمھوڑا سا سانس لینا چاہتی ہوں“ لاالان کوؤل رک کر درشت نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

”کیا خیال ہے کوؤل! ذرا دیر بیٹھ کر ٹھکان نہ اتار لی جائے“ اچانک لاالان نے کوؤل سے پوچھا۔

”نہیں لاالان! ابھی ہم اپنے دونوں بدترین دشمنوں کے علاقوں میں موجود ہیں۔ ہمیں صبح کا اجالا بھیننے سے پہلے پہلے یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہیے۔ کیا تم بھی تھک گئی ہو؟“ کوؤل نے یہ کہتے ہوئے لاالان کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تو لاالان بولی۔

”نہیں کوؤل! میں جب تک اس مقدس مورتی کو نہ پاؤں مجھے جھکن کہاں لے گا لیکن یہ کم بخت کو نکال!“ وہ اتنا کہہ کر رکی

تو کوؤل نے اپنے جڑے سے بھینچ کر مجھے اپنے پاؤں کی ٹھوک مارتے ہوئے تھیک تھیک آگے بڑھنے میں بولا۔

”چل ڈی اٹھ چھوڑ کر! بہت مکر کر لیا تو نے! ہم خوب جانتے ہیں تجھے۔ تو بڑی سخت چھوڑ کر ہے۔“

”مم۔۔۔ مگر تم مجھے کدھر لے جا رہے ہو؟ اور میری تم لوگوں سے آخر کیا دشمنی ہے؟“ بالآخر میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھ لیا تو کوؤل اپنی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولا۔

”زیادہ سانی لمی بننے کی کوشش مت کر۔۔۔ تو ابھی طرح جانتی ہے کہ ہم تجھے کدھر لے جا رہے ہیں۔“

”تم لوگوں کو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ تم مجھے ہوس اس مورتی کے دفن سے واقف ہوں۔“ میں نے بالآخر ذرا رست اور جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”میری بات کا یقین کر دو میں۔۔۔ میں اس مورتی کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتی۔“

”زیادہ چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے چھوڑ کر!“ اس بار لاالان نے غراتے ہوئے درشت لہجے میں مجھ سے کہا۔

”ہم یہ بات ابھی طرح جانتے ہیں کہ جب خالقو دھائیل کو اپنے غدار ساتھی جانو ماچھی کی بغاوت کے بعد اپنی موت سامنے نظر آنے لگی تھی تو اس نے مجھے مورتی کے دفن تک پہنچنے کے ”اشارات“ سمجھا دیے تھے۔ بلکہ یہی نہیں تجھے اس بڑھے ڈاکو نے چندا کی نشانیاں بھی سمجھا دی تھیں جن سے اس دفن تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے“ میں ایک لمحے کے لیے لاالان کی بات سن کر ششدر رہ گئی۔

یہ کم بخت تو واقعی کسی مخوس سائے کی طرح میرے ساتھ ہی چپکی رہی تھی اور اسے ان خفیہ باتوں کا بھی علم تھا جو صرف میرے اور خالقو چاچا کے درمیان ہوتی تھیں۔ میں بہر حال اس کی توجہ پیش کرنے سے قاصر رہی تھی تاہم مجھے شہ ضرور ہوا تھا کہ لاالان نے محض اپنے قیاسات کی بدولت اس بات کا اندازہ لگا تھا کہ خالقو چاچا کو کچھ سے غیر معمولی شفقت محبت اور قابل مہمروسا ہونے کی وجہ سے اس نے مجھے را کا س موتی کے دفن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ پھر یہ بات صدی صدی سے بھی نہیں لاالان کی ذہانت پر ایک لمحے کو اش کر پھی تاہم میں نے موقع مل اور حالات کے مطابق دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بات اپنی جگہ درست تھی مگر یہ بھی تو سوچ کر کہنے اور سننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس بات کو تو اب کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں خواب تک مصیبتوں اور کڑے حالات کا اب تک شکار چلی آ رہی ہوں۔ اس مورتی تک پہنچنے کی وہ

تمام نشانیاں اور اشارات میرے دل و دماغ سے اب تک بخوبی چلے ہیں اور ویسے بھی مجھے بھی اس صورتی سے ذرا بھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔

”ہوں.....“ کوئل نے میری تمام باتیں بغور سننے کے بعد معنی خیز بھکاری بھری اور سنسنائی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”کوئیاں! تو اتنی بھولی نہیں جتنی نظر آتی ہے، تیرے دل و دماغ پر اس بڑے ڈاکو کی ایک ایک بات نقش ہو چکی ہے جیسے پتھر پر لکیر.....“

”چلو تمہاری بات میں اگر ذرا دیر کو مانے بھی لیتی ہوں تو ٹھیک ہے پھر..... صورتی سے متعلق مجھے خالقو چاہا ہے جو نشانیاں اور اشارے سمجھا ہے ہیں وہ ہم دونوں کو بھی بتائے دیتی ہوں۔ پھر مجھے اتنی ذرا غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم دونوں بہ آسانی اکیلے بھی اس صورتی کی مدفن تک پہنچ سکتے ہو“ میں نے ایک بار پھر ان دونوں کو پکڑ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو لاالان زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولی۔

”تو کیا سمجھتی ہے ہم تیری باتوں میں آکر اور تجھے آزاد کر کے اپنی ہم پروردانہ ہو جائیں۔ تو ہم سے جموٹ بھی بول سکتی ہو کیونکہ تو بھی مجھی یہ نہیں چاہے گی کہ وہ جتنی اور مقدس صورتی ہمارے ہاتھ لگے اس لیے کہ اس بڑے ڈاکو نے اپنی زندگی میں ہی جو وصیت صرف اور صرف تجھ سے کی ہے تو اسے ضرور پورا کرے گی“ مجھی تو..... چل اب اٹھ ہمارا وقت برباد نہ کرنے مکار لاالان کی فطانت نے مجھے لاجواب کر کے رکھ دیا تھا، اس کی قیاسات لگانے کی قوت بڑی تیز اور بالکل درست سمت کام کرتی تھی۔ ناچار میں نے بندہ سے ہوئے ہاتھوں کے باوجود کھڑے ہونے کی کوشش کی تو لاالان نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کر دیا اور آگے کی طرف دیکھا۔ ہم تینوں ایک بار پھر تاریکی میں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے ارد گرد پھلتی ہوئی چھدری چھدری جھاڑیوں کا سلسلہ اب موقوف ہو چکا تھا اور اب دور دور تک بھر اور تار یک میدان کے سوا کچھ نہ تھا جبکہ لاالان اور کوئل کی کوشش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد یہ میدان عبور کر لیں۔ میرا دماغ یہ سوچ سوچ کر دکنے لگا تھا کہ یہ دونوں مردود کندھ کوٹ اور کشمور تک کا طویل اور ڈھور کار سفر آخر تک ایسے ہی پیدل طے کرتے رہیں گے؟ میرے ذہن میں یہ بھی خیال نکلی کی طرح کوندا ہمارا بلکہ میرا منزل سے سر دست دور رہنا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ اس طویل مسافت میں مجھے کسی وقت بھی ان کے چنگل سے نکل بھاگنے کا موقع مل سکتا تھا تاہم یہ ایک اہل حقیقت تھی کہ میں کسی صورت

بھی ان دونوں سانپوں کے جوڑے کو وہ صورتی حاصل نہیں کرنے دینا چاہتی تھی، یہ قول خالقو چاہا ہے کہ وہ صورتی ہمارے دل میں ہماری دھرتی کی امانت تھی جو ایک بیش قیمت اور شگفتہ ورش کی حامل تھی۔ یوں تو میں نے پہلے ہی سے اپنے دل میں یہ عزم مصمم کر رکھا تھا کہ اگر بد قسمتی سے ہم کندھ کوٹ اور کشمور کے علاقے میں پہنچ بھی جاتے تو تب بھی لاالان اور کوئل کو اس صورتی کے مدفن کا سراغ نہیں دوں گی۔

میں اب محسن کے مارے بے حال ہو رہی تھی۔ پشت پر ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے محسن کا احساس سوا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم مسلسل اور بغیر رکے آگے بڑھتے رہے۔ میں نے راستے میں چلتے چلتے لاالان سے یہ گزارش کی تھی کہ وہ کم از کم میرے ہاتھ جکڑ بندوں سے آزاد کر دے تاکہ مجھے چلنے میں بھی آسانی ہو۔ محسن کا احساس بھی کم سے کم ہو۔

”کوئل! کیا خیال ہے..... اس کی یہ بات ہمیں مان لینی چاہیے۔ اس میں ہمارا بھی فائدہ ہے۔ اس طرح یہ چلنے کے دوران میں کوئی بھانہ بھی نہیں بنا سکتی، اس کی بات پر کوئل نے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلایا تو لاالان نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب سے کھول دیے اور پھر سامنے کے رخ پر انہیں دوبارہ مضبوطی سے باندھ دیا۔ میرے لیے ان مردودوں کی اتنی ”کرم نوازی“ بھی سر دست بہت تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دونوں اپنی پیٹ پوجا کے لیے کیا کرتے ہیں۔

پھر جلد ہی لاالان نے کوئل سے کہا ”کوئل! کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہونا چاہیے۔“

”میرا خیال پانی کی پیاس تو ہم دوہا سے بچا سکتے ہیں اور کھانے کے لیے تو سچ سے پہلے بندوبست ہونا مشکل ہی نظر آ رہا ہے“ کوئل نے جواب دیا۔

”چلو پانی کی تو پیاس بجھائی لیتی چاہیے پھر کھانے کے لیے بھی کچھ سوچ لیں گے۔“

لاالان نے کہا اور پھر ہم تینوں اٹھ کر دریا کے کنارے آگئے۔ سب سے پہلے لاالان اور کوئل نے پانی پیاس کے بعد لاالان نے میرے دونوں ہاتھ کھول دیے تو میں نے بھی خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ سندھو دریا کا پانی بہت شیشا اور خند تھا۔ پانی پلے لینے کے بعد لاالان نے دوبارہ میرے ہاتھ مضبوطی سے باندھ دیے۔ ہم تینوں دریا کے کنارے سندھ کے تاریک ریتیاں ”کراڑے“ پر موجود تھے۔ رات غالباً اپنے پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ آسمان شفاف اور روشن تھا۔ مدھم مدھم چاندنی نے چہار سو جگہ طرح کا طلسم بکھیرا ہوا تھا۔ کوئل نے دریا کے اونچے ریتیلے کراڑے پر کھڑے ہو کر گرد و پیش کا چنداے گہرا جائزہ لینے

کے بعد لاالان سے کہا۔

”لاالان! مجھے ذرا دور سامنے بزیوں کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ذرا آگے بڑھنا چاہیے تاکہ بیزی کے خیموں سے کچھ بھی ترکاری ہی تو ذکر کر پیت کی پوجا کر سکیں۔“

اس کی تجویز پر لاالان نے اپنا سر اثبات میں ہلادیا۔ ہم اب کراڑے سے نشیب میں اترنے لگے۔

مجھے تو بھوک نہیں تھی بلکہ پانی بھی میں نے قلع اور ہونٹوں کی خشکی و درکری کی وجہ سے پیا تھا۔

پانی پینے کے بعد ہم دوبارہ اپنے پہلے والے مقام پر آگئے اور درختوں کے گھنے چھند تلے تاریکی میں بیٹھ گئے۔

”لاالان! تو یہاں ذرا ہوشیار سے بیٹھ۔ میں ذرا کھیتوں سے کچھ ترکاری تو ڈلاؤں“ کوئل نے کہا اور پھر ایک طرف اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ایسے موقع پر میں بڑی حسرت سے سوچنے لگی کہ کاش..... میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے تو میں لاالان سے سننے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتی۔

ہمارے گرد و پیش سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئل کو دور بیزی کے کھیتوں کی طرف گئے کافی دیر ہو چکی تھی اچانک ہمیں دور کہیں بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے دیکھا لاالان بے چین اور خشکی نظر آنے لگی۔ میری طرح شاید اس نے بھی یہ اندازہ لگایا تھا کہ کوئل کا بیزی کے کھیتوں میں ”پہرے دار“ کتوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ پھر اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ لاالان کی پریشانی بھی سوا ہونے لگی ”گلتا ہے“ کوئل کو کتوں نے گھیر لیا ہے، میں نے کسی خیال کے تحت ہم لہجے میں لاالان سے کہا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلکی سی دھمکی پھر خاصی دیر بعد کوئل ہانپتا آتا دکھائی دیا۔

لاالان یکدم چونکنا ہی ہوئی۔ پھر کوئل کے قریب آنے پر لاالان نے قدرے متشکر لہجے میں اس سے پوچھا ”کیا ہوا کوئل! کیا کچھ بچک بچک گئے تھے؟“

”ہاں! کم بخت جانے کدھر جھے بیٹھے تھے بڑی مشکلوں سے جان بچا کر آیا ہوں۔ کچھ ابھی نہ سکا تو ذکر۔“ کوئل نے تھکے تھکے سے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر دینے بڑھ حال سا ہو کر کر گیا۔

”کی کتے نے کاتا تو نہیں جھپیں؟“ لاالان نے متشکر ہو کر پوچھا۔

”نہیں“ ایک تو میرے اوپر چڑھ آیا تھا، میں نے گولی چلائی تو اس کا کچھ نہیں گیا۔ باقی بھی بھاگ گئے۔ میں بھی بھاگ لیا، کوئل نے جواب دیتا تو لاالان بولی۔

”میرا خیال ہے ہمیں پھر نکل لینا چاہیے۔ کہیں گھٹے لوگ نہ جاگ پڑیں اور بھاگے بھاگے ادھر نہ آجائیں“ کوئل نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلادیا۔

”چلی رہی اٹھ۔ اب تو تیرے ہاتھ بھی آگے کو باندھ دیے ہیں تیرے تیز چل ذرا“ لاالان نے کھڑے ہوتے ہوئے میری کمر پر اپنی رانفل کی نال چھو کر درشت لہجے میں کہا۔ ناچار میں بہ مشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم تینوں ایک بار پھر خود رد جھاڑ جھکاڑ سے بھرے پڑے کچے اور تاریک راستے پر چلنے لگے۔

مذکورہ مقام سے کافی دور جانے کے بعد میں نے لاالان سے رنغ حاجت کی درخواست کی۔ شکر تھا کہ انہوں نے میری یہ درخواست رد نہ کی۔

”تم بے شک یہاں میرے سر پر کھڑی رہو لیکن میرے ہاتھ ذرا دیر کو کھول دو۔“

لاالان شاید جلدی جلدی یہ سب نشاننا چاہتی تھی اس لیے اس نے کسی بجٹ میں پڑے بغیر میرے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھول دیے۔ اور میرے سر پر رانفل کی نال تان کر چوکنٹا سی کھڑی ہوئی۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے کن انکھوں سے لاالان کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی پھر جیسے ہی اس نے اپنی رانفل ایک طرف جھاڑیوں میں رکھ کر میرے دونوں ہاتھ رسی سے باندھنے لگی تو میں نے کھکی کی سی پھرتی کے ساتھ پوری قوت سے ایک مکاس کی ناک پر جڑ دیا۔ لاالان کے لیے میرا یہ جملہ طلسمی غیر متوقع اور اچا کھا تھا، اس کے قلع سے ہلکی سی کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی اور اس کا دماغ جھنجھٹا سا گیا اور پھر جب تک وہ جھنجھٹی میں نے ایک طرف تاریکی میں دوڑ لگادی۔

☆☆☆

گھناٹوں اندھیری قہر آدم جھاڑیاں ایسے نازک وقت میں میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو رہی تھیں۔ میں بے تحاشا ان سے الجھتی ہوئی دوڑے چلی جا رہی تھی۔ پھر دفعتاً مجھے عجب میں گولی چلنے کی گونج سنائی دی۔ مگر میں نہر کی البتہ اس لمحے مجھے ذرا دور سے آوارہ یا پہرے دار کھیتی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے مجھے مزید پریشان کر دیا۔ لاالان اور کوئل سے زیادہ مجھے کتوں کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ کیونکہ اگر کتوں کا یہ خونخوار اور بدست غول میرے پیچھے پڑ جاتا تو مجھے ان سے اپنی جان بچنا ہی مشکل ہو جاتی اور میرے لاالان اور کوئل کے خوشی ہاتھوں دھریا جانے کا بھی قوی خدشہ تھا۔ اچانک میرے ذہن



میں ایک خیال بکلی کی طرح کونڈا اور میں نے ایک قریبی درخت کی طرف اپنا رخ موڑا اور پھر جنگلی بلی کی سی پھرتی کے ساتھ درختوں پر چڑھ گئی وہ پالپر کا بلنڈر خاصا جھنڈ دار اور گھٹا درخت تھا۔ میں نے خود کو اس کی گھنی شاخوں میں چھپا لیا اور دم سادھے دیک کر بیٹھ گئی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کنوں کے بھونکنے کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ اچانک میں نے ایک طرف جھانپو یوں سے دو پہیوں کو ابھرتے دیکھا۔ یہ دونوں لالائ اور کوڑل تھے جو شکاری کنوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں عین میرے نیچے کھڑے گردو پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان دونوں رزلیوں کو اپنے قریب پا کر میں نے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ کہیں میری سانسوں کی بارگشت بھی انہیں نہ چونکا دے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں انہیں میری اوپر درخت پر موجودی کا نہ احساس ہو جائے۔ وہ دونوں چنداڑے درخت کے عین نیچے کھڑے رہے پھر دونوں الگ ستوں کی طرف بڑھ گئے۔ میں ابھی درخت سے نیچے نہیں اترنا چاہتی تھی بلکہ میرا ارادہ تو اب دن کی ہی روشنی میں ہی نیچے اترنے کا تھا۔ چنانچہ اب میں دم سادھے صبح کی منتظر تھی۔

چار سو اسرار ابھرنے کا ایک منٹا نے مجھے غیر مری پر اسرار نظروں سے گھورتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ماحول میں آسیب زدہ سا مسکوت طاری تھا۔ کافی وقت گزرنے کے بعد خدا خدا کر کے چڑیوں کی چھبھاہٹ سی گونجنے لگی۔ میں نے آسان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ جہاں اب لنگجا سا سپیدہ دھرمودار ہو چلا تھا۔ اور ہوتے ہوتے بالآخر خنک کاذب کے بعد دن کا اجبارا اندھیا رو کو نگلنے لگا۔ چڑیوں کے چھبھانے کی پرلہن آوازوں میں اب کوڑوں کی کائیں کا میں کی کر یہہ آوازیں دم گھونکنے لگی تھیں۔ اب دن کا اجالا ابھی طرح پھیل چکا تھا اور دور کہیں مشرق کی سمت گل گول افق سے اٹھنے والی سورج کی سنہری کرنیں، جنگل جھاڑیوں اور درختوں کے چھدرے چھدرے روزنوں سے نمودار ہونے لگیں۔ میں ابھی کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ لالائ اور کوڑل اب شاید میری تلاش میں بھٹک کر کافی آگے نکل چکے تھے۔ دن کی روشنی کا بھی عجیب سحر ہوتا ہے۔ خود بہ خود دل ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ ذرا دیر بعد سنہری دھوپ کی رو بہلی کرنیں جب کندنی ہونے لگیں تو میں نے نیچے اترنے کا ارادہ کیا اور اندھ کا نام لے کر زربلہ کلہ پڑھا اور احتیاط کے ساتھ درخت سے نیچے اتر آئی۔ کئی گھنٹوں تک درخت پر ٹھکڑے سے بیٹھے رہنے کی وجہ سے میرا پورا وجود اکر سا گیا تھا۔ درخت

میں اب درخت پر چڑھ کر جھینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے میں نے بھی مناسب جانا تھا کہ یہاں سے پہلے خاصی دور نکل جاؤں، جب میں خاصی دور تک دوڑتے دوڑتے پلٹنے کی تو میں نے ایک جگہ رک کر ذرا دیر اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور پھر کاہے بگاہے عقب میں دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے بعد میں نے دائیں جانب رخ کیا اور کھیتوں کی طرف نکل آئی۔ کھیتوں میں مجھے چند پھیانی عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ انہوں نے ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں کسی دور پرے کے ایک مختصر سے کچے اور چھپرنا گھروں پر مشتمل گھٹھ کی طرف نکل آئی تھی۔ یوں تو اب میں دہرے خطرات سے دو جا رہی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ لالائ اور کوڑل بھی اسی علاقے میں میری تلاش جاری رکھے ہوئے ہوں۔ دوسرے یہ کہ گہرام بھی اپنے چند رخ ساتھیوں کے ساتھ میری تلاش میں سرگرداں تھا مگر میں نے بھی دل میں مہم ارادہ کر رکھا تھا کہ میں کسی بھی جگہ ایک بلبل بھی رکے بغیر منزل کی طرف بڑھتی رہوں گی اور بھوتا خان یا خیر کے گھٹھ پہنچ کر ہی دم لوں گی۔ ویسے بھوتا خان کے گھٹھ کی نسبت خیر کے گھٹھ نسبتاً پہلے پڑتا تھا اس لیے میرا ارادہ سب سے پہلے خیر کے گھٹھ پہنچنے ہی کا تھا کیونکہ مجھے سب سے پہلے اس مردود گہرام اور اس کے ذلیل حواریوں نے وہیں سے اٹھنا تھا۔

میں کھیتوں کے درمیان راستوں کی منڈ پر پر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کھیتوں کے بائیں جانب گارے مٹی سے لپے ہوئے چھپرنا بھونپڑے سے گھروں کی

بے ترتیب قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک ایک پاٹ داری نواہی آواز میری ساتھیوں میں گونجی۔

”ڈی جھوکی..... ذرا ٹھہرو“ میں نے ٹھٹک کر آواز کی سمت دیکھا۔ میرے بائیں جانب لوٹن کے کھیت میں چند آدمیوں کے قاصطے پر ایک موٹی سی بکلی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ اس کے قریب چارے کا کٹائی کیا ہوا ایک بڑا سا گھڑا بڑا ہوا تھا۔ ایک پانی سے بھرا ہڈکا تھا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس عورت نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا، کچھ سوچ کر میں اس کی طرف بڑھی اور بے غور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے ماسی؟“

”ڈی جھوکی اذرا میری مدد کر دے یہ چار میرے سر پر رکھو اے اور یہ پانی کا گھڑا تو اٹھا لے دو قدم پر میری بھونپڑی ہے وہاں تک ذرا چھوڑ دے۔“

اس نے عجیب سے خراٹ بھرے لہجے میں کہا مگر یہ لہجہ عام سے بڑے بوزوں والا تھا جو اپنے سے کم عمر لوگوں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اس لیے میں نے برا نہ منا مگر مجھے ذرا تال سا ہوا تھا میں نے ایک نظر اس کا جائزہ لیا۔ وہ سانولی رنگت مگر خاصی قبول صورت عورت تھی۔ عمر یہی کوئی بیٹالیس چالیس کے لگ بھگ تھی۔

”اڑی سوچتی کیا ہے جھوکی؟ فکر نہ کر میں تجھے کھن اور جوار کی روٹی سے ناشتا بھی کرواؤں گی اور بکرے کے دودھ کی گار مگر چاہے بھی پلاؤں گی۔“

اس نے مجھے تذبذب میں مبتلا کر کے کراہی آواز میں کہا تو اس کے دیہاتی لب و لہجے پر میں نے ساختہ مسکرا دیا اور پھر میں نے اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔ اس بے چاری کو نالے کا میرا بی نہ چاہتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لوٹن کے چارے کا بڑا سا گھڑا اٹھانے میں اس کی مدد کرتے ہوئے اس کے سر پر رکھا اور پھر پانی کا گھڑا اٹھا کر چل پڑی۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے حصے کا بوجھ اٹھائے آگے پیچھے چلنے لگے۔ میں اس کے عقب میں چلی جا رہی تھی۔ پانی سے بھرا گھڑا خاصا بڑا اور بھاری بھی تھا۔ بہ طور میں اس کے عقب میں اپنے سر پر گھڑا اٹھائے خاموشی سے چلی جا رہی تھی۔ جلد ہی مجھے اس خراٹ عورت کی غلط بیانی پر فہم آئے لگا۔ کیونکہ اس کے گھر کا قاصطہ خاصا طویل ہوتا جا رہا تھا حالانکہ اس نے مجھ سے کہی کہا تھا کہ اس کی بھونپڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ مگر یہاں تو یہ فاصلہ شیطانی کی آنت کی طرح درواز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خاصی توانا عورت تھی اور بڑا سا لوٹن کے چارے کا گھڑا اٹھانے بڑے آرام سے چلی جا رہی تھی۔ جبکہ اس کے عقب میں چلتے ہوئے میرا جھٹکن سے برا حال ہونے لگا تھا

اور میرا سارا وجود سردیوں کے باوجود بیسے بیسے ہو رہا تھا۔ تاہم مجھے اس بات پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اس خراٹ عورت کی بھونپڑی گھٹھ کے گھروں سے الگ ٹھٹک مقام پر کیوں تھی؟ بہ طور اب تو یہ عورت کسی دیران جزیرے کی بلا کی طرح میرے گلے پڑ چکی تھی اس لیے اسے ٹھٹکتا تو تھا ہی مجھے خود وہ جھاڑی دار میدان کے آخری سرے پر مجھے بھوسے اور گارے مٹی سے لپٹی ہوئی بکلی دیواروں والی ایک بھونپڑی نظر آئی۔ دروازے پر بوسیدہ سارلی کا ٹاٹ جمول رہا تھا۔ وہ بے دھڑک ٹھٹکاٹھا اندر داخل ہو گئی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس کے عقب میں اندر داخل ہو گئی۔ مختصر سے صحن کے ایک کونے میں وہ عورت لوٹن کا گھڑا رکھ چکی تھی۔ پھر اس نے میرے سر سے گھڑا اتارنے میں مدد کی۔

میں بیسے بیسے ہو کر ہانپ رہی تھی۔ سامنے صرف ایک ٹھٹک و تاریک سی کوٹھری نظر آ رہی تھی۔ بوسیدہ صحن کے ایک کونے پر ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک میمنہ بھی تھا۔ مجھے لگا یہ عورت بے چاری اکیلے رہتی تھی۔ اس کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔

”اچھا ماسی! میں اب چلتی ہوں“ ذرا سانس لینے کے بعد میں نے کہا تو وہ عورت بولی۔

”اڑی جھوکی جلدی کس بات کی ہے؟ تو ٹھٹک گئی ہوگی۔ بیٹھ ذرا! میں تجھے جوار اور کھن کی روٹی دیتی ہوں۔ پھر بکری کے دودھ کی چائے پی کر چلی جانا“ اس نے اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں کہا پھر وسط میں بھی ایک جھٹکا سی چار پانی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرا دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس عورت کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ وہ روٹی میں چلی گئی۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں نے جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے سے گارے میں گھڑے کے اندر ہاتھ ڈال کر گھاس بھرا اور پانی پی کر دوبارہ چار پانی پر آکر بیٹھ گئی۔ میری نگاہیں اب بار بار چھپرنا پھوس کے ساتھ تھیں اس ٹھٹک و تاریک کوٹھری کی خالی چوکھٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی موجود تھا۔ اسی لمحے مجھے مختصر سی تاریک چوکھٹ سے دھوئیں کے سرخوے نص کرتے دکھائی دیے اور اسی وقت اندر کوئی کھانے لگے۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ کوئی اندر بیٹھا بیٹھی بی رہا تھا۔

ایک مرد کی اندر موجودی کا احساس ہوتے ہی میں نے چپیں سی ہو گئی۔ ٹھٹک اسی وقت وہ عورت ہاتھ میں ایک بڑا سا چھاپا اٹھائے روٹی سے نمودار ہوئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں جانے کا میلا پیکلا لہجہ بھی تھا جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اندر کوٹھری سے کھانے کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ اس عورت نے شاید میرے چہرے کی بے چینی تازلی تھی

لہذا میرے آگے روٹی کا چھابا اور چائے کا پیالہ رکھتے ہوئے اپنے سامنے چہرے پر اسرار بھری سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے عجیب سے لکھ میں بولی۔  
 ”کیا پریشانی ہوگئی؟“

دے۔۔۔۔۔ممجھے ایسی طاقت دے کہ میں کسی منظر دیکھ کر  
تاب رکھ سکوں۔ کہیں میری دل اپنی کم عمری اور الوہی  
محبت کو اس طرح اچانک اور غیر متوقع حالات میں دیکھ کر خوشی  
سے ہٹ نہ جائے؟ بے اختیار میری آنکھوں میں کرب اور  
خوشی کے لیے جلے آئینہ پڑے۔ میرے اندر جذبات انگیز  
پہلوں جاری تھی اور حواس بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ میرا سامنا بھی مائی مختاراں سے آج اچانک ہی ہوا تھا۔ البتہ بے چارہ پر تل تو یہی ہے مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔ لیکن اگر وہ میری آوازیں سن لیتا تو مجھے فوراً پہچان لینے میں دیر نہیں لگتا۔

”ابھی میں نے اس سے شادی نہیں کی۔ میں تو تیار ہوں پر یہ ابھی نہیں مانتا۔ کہتا ہے پہلے میں اپنی پہلی بیوی کو نکاح سے ایک آخری بار مل لوں۔“ پھر وہ مجھ سے شادی کر لے گا؟ اس کی بات سن کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور میں بہ مشکل اپنے ابال پر قابو پاتے ہوئے چلا کی بولی۔

[illegible]

”مجھے اس سے کیا چھو کر! ہو سکتی ناں عاشق میرے مرد پر۔ چل اٹھ بھاگ یہاں سے۔ چل.....“ اس کے نفرت انگیز درشت لیچے پر جیسے میری رگوں میں خون کھولنے لگا مگر مائی مختار ماں بھی تھکے سے اٹھ نہ سکی۔ چائے کا پیالہ نیچے رکھتے ہوئے ابھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر چار پائی سے کھڑا کر دیا۔ وہ مجھے محسوس کر دروازے سے باہر نکالنے لگی تو جب تک میرے

”کک..... کونجاں! میری کونجاں! تہ..... تہ تو نے مجھے، مم..... معاف کر دیا۔ مم..... مجھے معاف کر دیا تو نے کونجاں!“

اس کی مرتضیٰ آواز میں صدیوں کی پیاس شامل تھی۔ اس

پھر اسے ہوئے دونوں کی ادھوری کہانی کا تب تقدیر  
قرعاً سدل پر مکمل کر رہا تھا۔ پھر جب ایک بہاؤ کی کیفیت  
تقدیر سے کم ہوئی تو ہوش و خرد نے بند باندھے عقل و شعور نے  
فوری فکر فرما سے غننے کے لیے دل و بااں کو مائل سوچ کا تو

[illegible]



میں چاہتا تو ٹرگر دبا کر اس کے وجود کو چھپائی میں بدل دیتا لیکن خواہ مخواہ کا خون خرابا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ انیس کی ہر حرکت جان لیوا تھی۔ اسے یقین تھا اگر وہ میرے ہاتھوں بچ گئی کیا تو شعیب اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس تنظیم کا یہی چلن میں نے دیکھا تھا۔ وہ اپنے نام کام ساتھیوں کو پہلی فرصت میں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ انیس نے اسی خوف کے باعث مجھ سے لڑتے ہوئے مرنے کو ترجیح دی تھی۔

انیس کے چھپنے ہی میں بیک فٹ پر اچھلا اور ایک فرنٹ فلائنگ کلک چلا دی۔ اپنی دروازہ قاسمی کے باعث وہ بہت جلد ہی میرے قریب پہنچ گیا تھا لہذا میرے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر اس کی ٹھوڑی پر لگی۔

وہ ”اوں“ کی آواز خارج کرتے ہوئے پیچھے کو الٹا۔ اس کے زمین بوس ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک فرنٹ پش کلک اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ جالی دار دروازے سے جا بھاگ گیا۔ شاید دروازے کو اندر سے کھینچ کر لگا کر گئی تھی۔ مگر آؤ کے باعث وہ دروازہ ”دھڑ“ سے کھل گیا۔ انیس راہ داری میں پشت کے بل جا کر گر گیا۔

میں کلاشکوف تانے بھر مار کر اندر آ گیا۔ وہ راہ داری انسانی وجود سے عاری تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہاں کوئی آگے آگے نہیں۔ میں نے جھک کر چاروں خانے چٹ انیس کا سر سری جائزہ لیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ اس کے سر کے نزدیک فرش پر خون دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا، انیس کی ٹھوڑی کسی شدید ضرب کے باعث چٹ گئی تھی۔ میں اس کے اوپر سے بھلا کھتے ہوئے تیناؤ قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

اس راہ داری کے دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں ہر کمرے کے دروازے کو دھکیل کر چیک کرنے لگا۔ وہ سب اندر سے بند تھے یا پھر لاک تھے۔ راہ داری کے اختتام پر واضح ایک کمرے کے دروازے کو جب میں نے دھکا دیا تو وہ نہایت ہی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھل گیا۔ میں اس کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں مذکورہ چاپ کی سمت گرنے کو تانتے ہوئے لی اسٹائن بن کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے ایک لمحے سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دوڑنے والے وہ دونوں افراد میری نگاہ میں آ گئے۔ ان میں سے ایک متناسب القادد بڑا پتلا تھا جب کہ دوسرا سیاہ روٹل بے فریبی تھا۔ وہ بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں راہ داری میں داخل ہوئے تھے۔ پھر ان کی گھبراہٹ کا سبب مجھے نظر آ گیا۔ ان

کے عقب میں آٹھ فٹ کی دوری پر صدف موجود تھی اور وہ جیسے کھد بڑے ہوئے وہاں تک لائی تھی۔

میں نے ان بیگمزدوں کو گن پوائنٹ پر رکھ کر جھکنا انداز میں کہا ”ہاٹ!“

وہ ٹھٹک کر رک گئے پھر جب سنبھل کر میری طرف دیکھی تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک انہوں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ وہاں صدف ہاتھ دکائے پھیل کر کھڑی تھی۔ وہ توشیح نظر دے کر مجھے دیکھنے لگے۔

صدف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”وہاں ہمارے جس حد تک بچنے کو چھتا ہے ان دو کے ساتھ مجھے کوئی ٹھوکر آیا۔ تمہاری طرف کیا پوزیشن ہے؟“

”ایک بندہ ادھر راہ داری کے سرے پر بے ہوش ہے۔“ میں نے جالی دار دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں ان بندہ کمروں کی تلاش کر رہا ہوں۔“

صدف نے گھرے ہوئے ان دو افراد کی طرف غور سے دیکھا اور بولی ”ہم ایک ایک کو تاجھاننے کی زور کیوں کریں۔ یہ فریابی کے دو کمرے کسی مرض کی دوا ہیں۔“ مجھے دو کمروں پر اعتراض سے صدف ”اے“ میں نے ردوئے ٹی کی جانب مسخرانہ انداز میں دیکھا ”یہ تو مجھے کیسا سے کم دکھائی نہیں دیتا۔“

صدف نے سہکتے ہوئے لہجے میں کہا ”ان کے لڑا انداز تو یہ بتاتا ہے۔ یہ دونوں ساڑھ ہیں اور نہ ہی بکرے لگے انہیں بھیڑ نہیں کہوں گی۔“ اس نے دبلے پٹے شخص کی طرف اٹھی سے اشارہ کیا ”اس نے پاؤں سے مجھ پر فائر کیا تھا۔ جتنا تک کام آگئی ورنہ میں تو گئی تھی جان سے اور ساڑھ!“ وہ سیاہ روٹل شخص کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی ”میں نے اس کا پٹل چھین کر ادھر عقبی لان میں آ دیا ہے۔ اس وقت یہ دونوں نہتا ہیں۔“

”ان کے تیسرے ساتھی انیس کی گن میرے قے ہے۔“ میں نے کلاشکوف کو چھتیا تے ہوئے کہا ”اب دونوں کے پاس ہمارے احکام کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ

میری بات ادھر ختم ہوئی، ادھر صدف کی لالٹ چلنے لگی۔ دبلے شخص کی پشت پر ایک بھرپور سائیکلنگ مار کر ٹھوکر کھانے والا اپنے ساتھی سے ٹکرایا اور اسے اپنے لیے ہونے زمین بوس ہو گیا۔ میں اچھل کر ان کے

آہٹا۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر دلے تھے۔ آئندہ ایک منٹ کے اندر میرے پاؤں کی طوفانی فوجوں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ سونے کا نام اسلم معلوم ہوا جب کہ بلا تخص موٹی تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی انیس میرے

خون فرش کی کا حذرہ پکھ رہا تھا۔ ایک طرح سے ہم نے بڑی آسانی سے اس بچکے پر ”قاو“ پایا تھا۔

میں نے اسلم اور موٹی کی زبان کھولنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ اس سے کس نہ ہوئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا اگر میں انہیں جان سے بھی گزار دوں تو بھی وہ مجھے راصل کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گئے۔ وہ سی ایف کے رفا داری بھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

صدف بھی صورت حال کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا ”وہاں! تم کسی طرح بندہ کمروں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں ان دونوں پر ”کام“ کرتی ہوں۔“

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں اسے موٹی اور اسلم کے پاس چھوڑ کر راہ داری میں گھوم گیا۔ یہ راہ داری کا آخری حصہ تھا۔ میں سب سے پہلے اس کمرے کی جانب بڑھا جس کا دروازہ کھولنے کے بعد مجھے اندر داخل ہونے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

مجھے حیرت کے ایک شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ مذکورہ دروازہ تقریباً بھڑا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا میں نے دروازے کو پورا کھول دیا تھا۔ دروازہ از خود بند نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اسے کسی شخص نے بند کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ شخص کمرے کے اندر موجود ہوگا۔ گویا ایک ان دیکھا تھا ناؤں میں اس بچکے میں وجود رکھتا تھا۔ یہ خاصی خطرناک صورت حال تھی!

میں نے پیچھے پلٹ کر صدف کو ایک نظر دیکھا۔ وہ مجھ سے اس فٹ کے فاصلے پر اپنے ”کام“ میں مصروف تھی۔ میں مطمئن ہو کر اس پر اسرار دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بند دروازوں کو بعد میں چیک کیا جا سکتا تھا۔

میں نے دروازے کے نیم واپٹ کے ساتھ لگ کر سننے کی کوشش کی۔ کمرے کے اندر خاموشی اور سانے کا آواز تھا۔ میں نے ایک فوری فیصلہ پر پہنچنے کے بعد دروازے کے پاؤں کی ٹھوکر سیدھی اور کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

وہ ایک بیڈروم تھا۔ میں نے اس کی آرائش سے اندازہ لگا دیا وہاں دو افراد شب بھری کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں چوکانا نظر سے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ وہاں

کسی تنفس کے آثار نظر نہ آئے۔ مجھے قدرے باہوشی ہوئی نیچہ میری توقع کے بالکل برآمد ہوا تھا۔ مجھے امید تھی وہاں کوئی دشمن ضرور چھپا ہوگا۔

لیکن نہیں..... میری توقع راکٹا نہیں گئی۔ میں اگلے قدموں کمرے سے نکلے ہی والا تھا کہ میری پشت پر ایک زور دار لات پڑی۔ میں منہ کے بل آگے کو گر کر میرے سامنے ایک بڑبڑا تھا۔ میں سیدھا اس پر آ رہا۔ کلاشکوف میرے نیچے دب کر رہ گئی۔

”تم اس وقت میرے نشانے پر ہو لہذا گن کو چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ!“ مجھے اپنے عقب میں ایک پھٹکاری ہوئی آواز سنائی دی۔

یہ وہی شخص تھا جس نے ایک لمحہ پہلے مجھے دھکا دیا تھا۔ شاید وہ دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا لیکن اب ”شاید اور اگر گن“ کا کوئی سوال نہیں تھا اس لیے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

”گھوم جاؤ!“ اس نے منظر سے ہونے لہجے میں کہا۔ میں گھوم گیا۔ اسی لمحے مجھے پتا چلا دھکا دینے کے ساتھ ہی اس شخص نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ وہ ایک صحت مند اور چاق و چوبند شخص تھا جو مجھے تیز نظر سے گھور رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کا ایک خوب صورت ریو اور چمک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا وہ لیفٹ پیٹریڈ تھا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”واہ بھی وا“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا ”الٹا چور کو تو الٹا کوڑا اٹھائے! یہ تو مجھے پوچھنا چاہئے تم کون ہو؟ لیکن میں نہیں پوچھوں گا۔ جانتے ہو یوں؟“ اس نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد خود ہی بتا دیا ”اس لیے کہ میں جانتا ہوں تم وہاں ہو!“

”پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا“ میں یہاں کس مقصد سے آیا ہوں!“

”نہایت اچھی طرح معلوم ہے۔“ وہ گہری نظر سے میرا پاتا سر جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ وہ میری حرکات و سکنات کو جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ جماتے ہوئے بولا ”تم جس کی بوسہ کھتے ہوئے ادھر آئے ہو افسوس کہ اسے یہاں سے بھی بتا دیا گیا!“

میں تڑپ اٹھا ”کیا کیا رہے ہو؟“ ”میں تمہاری گرل فرینڈ ساحل کی بات کر رہا ہوں۔“

”ساحل کا نام احترام سے لوجنگی کی اولاد!“ میری کن پٹیاں سلگے لگیں۔

وہ پچکارنے والے انداز میں بولا ”زیادہ تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں ہے وجدان۔ گرل فریڈ تو محض گرل فریڈ ہوئی ہے۔ کبھی وہ تمہاری دوست تھی پھر چوہدری نوازش کی بغل میں جا گئی اور اب بک باس شیب“

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئے گی۔ ریو اور برادر نے بے ساختہ چونک کر پیچھے دیکھا۔ میرے لیے یہ مہلت ایک مکمل فرم سے کم تھی۔ اس لعین کی غلیظ زبان میری ساحل کی شان میں اتنی گستاخیاں کر چکی تھی کہ میں اس لمحے کو گنواؤں کا قصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کسی شکاری باز کے مانند غوطہ لگایا اور سپردا ریو اور برادر کے اوپر آ رہا۔ اس نے حتی الوسع پھٹنے کی کوشش کی مگر میں نے حتی الامکان اس کی سعی کا مایاب بنادی۔ جست بھرتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس میں اس خبیث نے ریو اور پکڑ رکھا تھا۔

اس نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور مارا لیکن میں نے اپنی گرفت کو قائم رکھتے ہوئے اس کی ناک پر گھر جڑی دی۔ یہ ایک بڑی دھانسو قسم کی ٹکڑھی تھی۔ اس کی گھیر پھوٹ پڑی۔ وہ آزاد ہونے کے لیے اور زیادہ طاقت صرف کرنے لگا۔ یہ اس کی جھنجھلاہٹ کا ثبوت بھی تھا۔ ناک پر پڑنے والی ٹکڑھی اسے تیز کر رکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی کلائی اس لیے نہیں تھامی تھی کہ اس کے ایما پر چھوڑ دیتا۔ وہ تو کسی گمنے کی طرح مشین میں آئی ہوئی تھی اور اپنی ہڈیوں کا پھور بھوانے کے بعد ہی آزاد ہو سکتی تھی۔ مسلسل ناکامیابی کے بعد اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کا ہاتھ میری گرفت میں نہ ہوتا تو شاید وہ اس موقع پر مجھے ناقابل غلطی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں فائر پر اس کی کلائی کو جھٹکا دیتا۔ جب مجھے کی جھٹکیاں چل چکیں تو میں نے اس کی کلائی کا ”ٹکڑا“ کاٹنے کے بعد ہاتھ کو آزاد کر دیا۔ اس آزادی کے انعام کے طور پر میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک ہک پیچ لگا دیا۔ وہ چیخے کواٹ کر دروازے سے جا گرایا۔

اسی وقت صدف کی تیر چھٹی ہوئی آواز میری سماعت سے گھرائی ”وجدان! اندر کیا ہو رہا ہے۔ دروازہ کھولو فائرنگ کیسی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو؟“

اس کے تشویش سے لب و زب سوالات کو میں نے قتل سے

سنا اور یہ آواز بلند کہا ”فکر کی کوئی بات نہیں۔ اندر اس کا دروازہ ہے تم اپنا کام جاری رکھو۔“

”دروازہ کھولو۔ میں ایک نظر تمہیں دیکھ کر مطمئن ہو جاؤں۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارے اطمینان کا بندوبست ہوں۔“

دروازہ کھولنے کے لیے اس شخص کو دہاں سے ضروری تھا میں نے جس کی کلائی کا سواستیاں مار دیا تھا۔ مضرب و مجرد کلائی کو داسینا ہاتھ سے تھامے کر وہ ہاتھ میں نے اس کی تعریف پر ایک رفٹھار رسید کیا اور مضرب لے کر میں کہا ”سب تک نہیں لیے اپنی کلائی اور دست چلاؤ۔“

”تم کرتے رہو گے؟“

وہ خون خوار نظر سے مجھے گھورتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”شاہا! میں نے طرے لیے میں کہا“ میں تو کچھ تھا تمہیں اٹھانے کے لیے“ کے ایم سی“ والوں کو بلاؤ۔“

”ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا“ کے ایم سی“ ایف کے..... واہ! کیا کبھی نیشن ہے!“

صدف نے ایک مرتبہ مجھے پکارا ”وجدان! دروازہ کھولو میں دیکھوں لگ رہی ہے؟“

”ایک کنگ ساڑھن وار خور دروازے کے سامنے گرا“

”میں نے اندر سے کہا۔“

”تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“ اس نے جرح بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ایک منٹ میں خود ہی اسے ہٹانے کی کوشش کرو۔“

”اس۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے زمین بوس شخص کو ایک فو ماری اور غصیلے لہجے میں کہا ”تم اٹھنے میں اتنی دیر کیوں لگاؤ ہو مرد؟“

اس کے ساتھ ہی میں نیچے جھک کر اسے دہاں ہٹانے کی کوشش کرنے لگا اور اسی لمحے اس شخص نے ایک جھٹکی۔ اس نامعلوم نے اپنے سلامت ہاتھ سے پھڑکی کو تھاما اور بڑی تیزی سے اس کے گوشت میں دھاوا گاڑنے کی کوشش کی۔

کارڈرائے کی چپٹ پر اس کے دانت لگے تو مجھے کچھ کا احساس ہوا۔ موٹے کپڑے کے سبب اس کے فطری دانت گوشت میں نہیں گڑ سکتے تھے۔ میں نے دوسرے سے اس کی کو پڑی پر ایک زوردار ٹھوکہ رسید کیا۔ یہ ایک

تلی پزیر کک تھی۔ وہ پھڑکی کو کاٹنا بھول گیا۔ میری ٹھوکہ کے نتیجے میں چشم زدن میں اس کا منہ کمرے کے پختہ فرش سے گرایا۔ اس کی بلالیاں میں بڑا درد پایا جاتا تھا۔ میں نے اس کے پیٹ میں ایک ٹھٹھا مارا تو وہ تپ کر پیچھے الٹ گیا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ صدف لپک کر اندر آئی اور کمرے کے اندرونی منظر کو دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی ”کیا ہے وجدان؟“

”ایک بھوکا دشت“ میں نے اپنی پھڑکی کو اس کے سامنے کر دیا ”اس نے مجھے یہاں کاٹنے کی کوشش کی تھی۔“

”تم ہی مردار خور کا ذکر کر رہے تھے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ”لیکن اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا یہ زندوں پر بھی دانت آزماتا ہے۔ بہر حال اب تجربہ ہو گیا ہے“ ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا ”باہر والوں کا کیا حال ہے؟“

”دونوں بڑے یکے ہیں۔“ وہ ڈومنی لہجے میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے انہوں نے ساحل کے بارے میں زبان نہیں کھولی!“

”ہاں اس کا یہی مطلب ہے۔“ وہ سفاکی سے بولی۔

”اس لیے میں نے ان کی خواہش کو ہمیں کر دیا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے پھل میں خطرناکی پوشیدہ تھی۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو وجدان!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”میں اس حد تک نہیں جاسکتی۔ بس وہ زبان کھولنے کے موڑ میں نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے سوچا اگر میرے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتے تو کسی دوسرے کے سامنے کیوں بولیں۔“

”اس کا کم از کم آج کی رات تو انہیں امن و سکون سے گہری نیند سونا چاہئے۔ صبح کا اللہ مالک ہے!“

وہ ایک لمحے کو رک کر پھر اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولی ”میں نے انہیں عارضی اور گہری نیند میں پھنچا دیا ہے۔ تم خواہ تو انہیں غم میں نہ پڑو۔“

میں نے سمجھنے سے پہلے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے کہا ”ممکن ہے وہ دونوں واقعی ساحل کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں لیکن یہ مردار خور بہت کچھ جانتا ہے۔“ میں نے زمین پر پڑے مضرب شخص کی طرف اشارہ کیا ”اس نے فطری اور پہلے انکشاف کیا ہے ساحل کو اس پتھلے سے کہیں اور کھڑا کیا ہے۔“

”اور کہاں؟“ صدف نے متوجہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”یہ بات بھی یہی شخص بتائے گا!“

پھر ہم دونوں اس کی طرف ”توجہ“ ہو گئے۔ وہ زیادہ دیر تک ہماری ”توجہ“ کی تاب نہ لاسکا۔ اس کی ناک ٹھوڑی اور ہونٹوں کا میں کھاڑا کر چکا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اپنے سوالات کے جوابات حاصل لیے بغیر اس کی جان نہیں چھوڑوں گا تو اس نے زبان کھول دی۔ اس کا نام جنید تھا اور اس پتھلے کے کرنا دھڑکا تب بھی تھا۔ انیس اسلم اور موسیٰ اس کے اشاروں پر ناچتے تھے یعنی ان کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔

”یہ تینوں تمہارے اشاروں پر ناچتے ہیں تو تم کس کی ڈگڈگی پر اچھل کود جاتے ہو؟“ اے سفاکی سے کہا ”اپنے مداری کا نام نہیں بتاؤ گے؟“

”ہم سب شیب غوری صاحب کے غلام ہیں۔“

”میں نے تمہارے آقائے اعلیٰ کا نام نہیں پوچھا۔“

میں نے درشت لہجے میں کہا ”میں جانتا ہوں کہ یہ بگڑا ”ایٹ“ کی حدود میں آتا ہے۔ یہاں کا قائم مقام سراج الدین ہے جو شیب سے براہ راست ہدایات لیتا ہے۔ میں تو اس پتھلے کے مکالی کا نام پوچھ رہا ہوں تم جس کی نامی میں ہو؟“

”میرے پاس کا نام کلیب مٹانی ہے۔“

”تمہارا پاس اس وقت کہاں ہے؟“

”وہ تو بجے رات اس لڑکی کے ساتھ ایٹ کی طرف گیا ہے جسے تمہاری گرل فریڈ ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور.....“

اس کا جملہ اھوراہہ گیا۔ بے ساختہ میرا ہاتھ گھوم گیا تھا۔ ایک زنانے دار چھپر اس کے گال پر چپکا۔ میں نے بڑے خوف ناک انداز میں کہا۔

”جنید! آخری مرتبہ ہے۔ اب اگر تم نے ساحل کو گرل فریڈ کا ٹائٹل دینا چاہا تو میں تمہاری زبان کو گودگی سے جدا کر دوں گا۔“

وہ کسم کر بڑی ہراسہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں ساحل کے حوالے سے واقعی بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ صدف بھی حیرت بھری نگاہ سے مجھ دیکھنے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ یک وقت کی طوفان اٹھ رہے تھے۔ اگر منہ بوم کے اعتبار سے غور کیا جائے تو جنید نے کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ گرل فریڈ کے سیدھے معنی ہیں دوست لڑکی!

مگر اس کے کہنے کا انداز سلگانے والا تھا رگوں میں کانٹے بچھانے والا روح کو سولی چڑھانے والا۔ ساری بات



انداز کی ہوتی ہے الفاظ کے استعمال کی ہوتی ہے ”یار“ کے معنی ہیں دوست۔ اگر یہی لفظ کسی کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں سے منسوب کر کے ادا کیا جائے تو گالی بن جاتا ہے۔ ساحل کے لیے گرل فرینڈ کے الفاظ مجھے بہت چپ محسوس ہوئے تھے۔ میں نے دو تین سانس کھینچ کر خود کو مستدل کیا پھر جنید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”اچانک ساحل کو یہاں سے ایسٹ کیوں منتقل کیا گیا؟“

”یہ ہائی کمان کا فیصلہ تھا۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”ہائی کمان..... کیا مطلب؟“

”تم اس تنظیم میں رہ کر کچھ عرصہ کام کر چکے ہو۔“ وہ اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے بولا ”تمہیں معلوم ہے بگ باس جو احکام صادر کرتا ہے اس پر کسی سوال کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ دن میں شویت اپ ہے۔ اسی لیے کامیابی سے چل رہا ہے۔“

”کامیابی سے!“ میں نے متحیرانہ انداز میں کہا ”جنید! تم نہیں جانتے تمہاری اس قاتل تنظیم ”سی ایف کے“ کے اندر کلکتی اور کتنے ٹی این ٹی کی بارودی سرنگیں بچائی جا چکی ہیں۔ جب دھماکوں کا آغاز ہوگا تو اس تنظیم کے بچے اڑ جائیں گے۔“ شاید میں ایک مرتبہ پھر جذباتی ہوئے لگا تھا۔ میں ایک لمحے کا توقف کر کے دوبارہ گویا ہوا۔ میری آواز میں مخصوص بھراہٹ تھی۔ میں نے سناتے ہوئے لمحے میں کہا ”ساؤتھ کو دوبارہ اجاڑا جا چکا ہے۔ اب ایسٹ کی باری ہے۔ اس کے بعد.....“

صدف نے قطع کلامی کرتے ہوئے مجھ سے کہا ”وجدان تم ساحل کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے!“

میں سمجھ گیا ”صدف مجھے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور ایک سر منتقل کیا۔ پھر میں جنید کی طرف متوجہ ہو گیا میں نے اس سے دریافت کیا۔

”میری ساتھی ساحل کو بڑی رازداری کے ساتھ اس ہنگامے پر رکھا گیا تھا۔ پھر اچانک منتقلی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”اصل بات تو مجھے معلوم نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے آج صبح ہی سے حالات خاصے خدوش چل رہے ہیں۔ ادھر ڈینس فیز ٹو کے ایک ہنگامے پر بہت بڑا مہم کر ہوا ہے۔ پھر کھڈا مارکیٹ کے قریب بھی بڑی افزائش کی خبریں ملی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی احتیاط کے پیش نظر تمہاری گر..... میرا مطلب ہے تمہاری

ساتھی کو یہاں سے ہٹا دیا گیا ہو!“

”سب سے زیادہ احتیاط پسند تو مجھے تم نظر آتے۔“ میں نے جھکی نظر سے اسے ٹھہرا ”سیدھی طرح یہ خبریں نہیں کرتے کہ تمہارے ساؤتھ کا باجبا دیا گیا ہے۔“

ساتھ ہی تمہارے بگ باس کے نئے رشتے داروں نے آواز کا رعب ڈی ملک کا بھٹا بھٹا میں بھی کوئی کرپچھوڑی گئی۔ جب میں غم ٹھوٹک کر دعویٰ کر رہا ہوں کہ خبر غوری اور چوہدری نواز کو میں نے نقصان پہنچایا۔ کیوں کھونٹ میں رہ کر سرگوشیاں کر رہے ہو؟“

وہ نگاہ چار دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ”میری ساحل کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“

”کچھ نہیں تم یقین کرو۔ مجھے اس سے زیادہ نہیں۔“

میں نے پوچھا ”تمہارا باس کلیب واپس کب لے گا؟“

”میں یہ بھی نہیں جانتا!“ وہ بے بسی سے بولا۔

”پھر تم کیا جانتے ہو؟“ میں چڑ گیا ”دیکھو مجھے مجبور نہ کرو۔“

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر مضبوط لہجے بتاتے لگا ”وجدان! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا تمہاری ماں یہاں سے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔“ کلیب اور سران اللہ کی کوئی بات ہوئی ہوگی۔ میں تو اس وقت چونکا جب تو ایک بند پولیس موہاں اس ہنگامے پر آئی اور کلیب ساحل کا ساتھ اس موہاں میں بٹھا کر لے گیا۔“

”پولیس موہاں میں؟“ میں نے بے یقینی سے اس طرف دیکھا۔

وہ بولا ”وہ بند موہاں اور اس میں موجود تینوں والے نقل تھے۔ ان میں دو تو کانشیل تھے اور ایک سب سے زیادہ رانا احتیاط کے پیش نظر رچایا گیا۔ اس طرح کسی دشمن اس طرف نظر نہ جاتی!“

”یعنی میری نظر؟“ میں نے دانت کچکائے۔

وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کی دہشت نہیں تھی۔

میں نے کہا ”کیا کلیب نے روانہ ہوتے وقت تم بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟“

اس نے نفی میں گردن ہلا دی ”نہیں اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی۔“

”محرم کس بنا پر کہہ رہے ہو وہ یہاں سے ایسٹ گئے ہیں؟“

”میں نے جن تین نقلی پولیس والوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک کو میں جانتا ہوں۔“ جنید نے بتایا ”وہ سب انسپکٹر کی وردی والا۔ وہ شخص ایسٹ کے اسٹاف میں شامل ہے۔ اسی بنا پر میں کہہ رہا ہوں اسل کو اس بنگلے سے ایسٹ میں منتقل کیا گیا ہے۔“

”گویا یہ تہارا اندازہ ہے؟“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔

”مجھے تو پورا یقین ہے۔ تم جودل چاہے سمجھو۔“

جنید نے اس بندے سے مزید کوئی مفید بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے لگا ہوں ہی لگا ہوں میں صدف سے چارلز خیال کیا پھر دوبارہ جنید کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تم یہ بت سمجھنا“ میں انھیں بند کر کے تھوڑی بات کا اعتبار کر لوں گا۔ سال کی تلاش میں میں اس بنگلے کا ایک ایک کوٹا چھانوں گا۔“ پھر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اور اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گے۔“

جنید اس وقت ”نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن“ والی صورت حال سے گزر رہا تھا اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اصولی طور پر تو اسے فوری ملٹی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کی ٹوکروں سے بڑی بری طرح اس کے طبلے کا سلتا تاں مارا تھا۔ وہ اس تکلیف کے اظہار کے طور پر تھوڑے تھوڑے وقتے سے کراہنے لگا لیکن ظاہر ہے وہ اس وقت مجھ سے یہ فرمائش نہیں کر سکتا تھا کہ میں اسے کسی ڈاکٹر کے پاس مرہم بنی کر دانے لے چلوں۔

تا چار اسے میرے احکام کی تعمیل کرنا پڑی۔ آئندہ دس منٹ کے اندر میں نے بنگلے کے ہر کمرے کو کئی بخش انداز میں چیک کر لیا۔ وہ بنگلا ساحل کے وجود سے خالی تھا! مجھے یوں محسوس ہوا اسٹم کا ہر پڑہ میری نقل کرنے لگا اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ساحل اگر میرے پاس نہیں ٹھہری تھی تو کہیں بھی نہیں تک رہی تھی!

جنید جب خالی کار توں سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ رہا تو میں نے اسے بھی اس بنگلے کے ایک دور افتادہ کمرے میں اٹنا فیل کر دیا۔ جو لوگ کسی کام نہ آسکیں ان کا جگنا کس کام کا! اب اس محسوس بنگلے میں رکنا ہے کار تھا۔ جس ہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچے تھے وہ مقصد ہی فوت ہو گیا تھا۔ صدف نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”وہ جان! تم نے بتایا تھا کہ ایسٹ بھی مل پارک کے

نزدیک ہی ہے۔ کیوں نہ اسے بھی دیکھ لیں!“

اس نے ”دیکھ لیں“ کے الفاظ اسی طرح ادا کیے جیسے کسی تصویری نمائش کو دیکھنے کا ذکر کر رہی ہو۔ میں جانتا تھا شیب غوری کے ٹھکانوں میں ایسٹ کی بڑی اہمیت تھی۔ کسی مضبوط قلعے سے کم نہیں تھا۔ وہاں گھسنا اور وہ بھی سوچے سمجھے بغیر موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ان لحاظ میں میں جس ذاتی اذیت سے گزر رہا تھا اس کے زیر اثر میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہ کرتا۔ سال کو یہاں سے روانہ ہونے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بجے تھے اور وہ نوبے ایسٹ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔

میں نے صدف کی بات کے جواب میں کہا ”تم نے شاید اس سکتے پر غور نہیں کیا کہ یہ شخص جنید کا اندازہ ہے سال کو ایسٹ لے جایا گیا ہو گا تاہم۔“

میں جملہ نامہ مل چھوڑ کر ذرا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں جنید کے اندازے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ساحل کے حصول کے لیے میں تاریک عمارتوں اور محنتی چھانڈوں میں بھی اتر سکتا ہوں۔“

وہ میرے پھر سے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولی ”ہمیں پہلی خدمت میں اس بنگلے کو خیر باد کہہ دینا چاہئے۔ بالی ہا میں گاڑی میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہیں۔“

میں نے اسی کے خیال کی تائید کی۔ واپسی کے لیے ہم نے آمد والا پے چیدہ طریقہ کار نہیں اپنایا۔ اس کھٹائی میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم بڑے اعتماد کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو سکتے تھے۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اس بنگلے سے باہر آ گئے۔

میری وہانت شیر ڈیٹا مشوری اسکول کے ڈرائیور سے ہوا تیار حالت میں کھڑی تھی۔ گیٹ کو ہم نے بھیج دیا تھا تاکہ بروقت واپسی کی راہ میں کسی تردد کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں اسکول کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ صدف میرے ساتھ تھی۔ میں نے اسکول کو خیر باد کہنے سے پہلے بوڑھے چوکیدار کو ایک نظر دیکھا ضروری سمجھا۔ وہ میرے ”دست گرم“ کا فیض یافتہ تھا۔ بعض اوقات اپنے مقصد کی خاطر دوسروں کو تھوڑی بہت تکلیف سے گزارنا پڑتا ہے۔

انسان بڑا خود غرض واقع ہوا ہے۔ یہ اپنی غرض کی وضاحت کے لیے مضبوط جواز بھی تراش لیتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہم تسلیم کر س یا نہ کریں!

بوڑھا چوکیدار بڑی سکون کی عین صورت تھا۔ میں نے نزل

کر اندازہ لگایا کہ اسے کسی جسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی۔ میں نے شیر ڈی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے اسکول کی عمارت سے باہر نکال لایا۔

اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔ مل پارک والی سمت سے ایک پولیس موہاں گلی میں داخل ہوئی تھی اور ظاہر ہے اس کا رخ ہماری جانب تھا۔ صدف نے بھی اس موہاں کو دیکھ لیا۔

”ابھن زدہ کچھ میں بولی۔“

”ابھن یہ مصیبت وہی موہاں تو نہیں؟“

اس کا اشارہ ساحل کو لے جانے والی مینیڈ موہاں کی طرف تھا۔

میں نے کہا ”کچھ بھی ہو سکتا ہے!“

میرا یہ مختصر سا جملہ بتا نہیں سکا تھی رکھتا تھا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا میں نے وہ جملہ کس تاثر میں بولا تھا۔ میں ہر شے کو فراموش کر کے شیر ڈی کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ واپسی کا ہر دروازہ بند ہو چکا تھا۔

جب دونوں گاڑیوں کا کراس ہوا تو میں نے موہاں کی پہنچر سیٹ پر ایک گھرے سانولے اور موٹے تازے ٹھس کو بٹھے دیکھا۔ وہ عمدہ قسم کے سوٹ میں لباس تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی پولیس والا تھا۔ خدا معلوم اصلی یا نقلی!

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ جب موٹے کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ یک بہ یک چونک اٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں تشویش کے ساتھ ہی شناسائی کی جھلک بھی تھی جیسے وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا ہو۔ پولیس موہاں اور موٹے کے درمیان نے ایک لمحے میں میرے خیال کو کھلیب کھلیب کر بٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے تن بدن میں چنگاریاں سی بھڑکنی لگی۔ کیا یہ وہی شخص تھا جو میری ساحل کو اپنے ساتھ ایسٹ لے گیا تھا؟

یہ نہایت ہی مہلک سوال تھا جس نے میرے چہرے کے تاثرات کو بگاڑ دیا۔ صدف میری کیفیت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی جہاں کہ میں۔

اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”وہ جان! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔ لگتا ہے کھلیب واپس آ گیا۔“

”گویا تم مجھے پشٹ دکھا کر فرار ہونے کا مشورہ دے رہی ہو؟“ خود مجھے اپنی آواز بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”وہ جلدی سے بولی“ یہ بات نہیں وہ جان! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”مجھے اور سوچنے کا وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“ میں

نے سفاکی سے کہا اور شیر ڈی کا بریک پیدل دبا دیا۔ فضا تاروں کی مخصوص چرچاٹ سے گونج اٹھی۔

اسی لمحے ہمارے عقب میں پولیس موہاں نے بھی بڑی سرعت سے بریک لگا دیے۔ مجھے ایک سواک فی صدیقین تھا موہاں کے ڈرائیور نے اس موٹے کے ٹھس پر گاڑی روکی ہوئی۔ پھر اس نے مل کے میں شیر ڈی سے نکل کر کھلیب کھلیب کی طرف بڑھتا موہاں واپسی کے لیے مڑنے لگی۔

صدف نے میرے کان میں سرگوشی کی ”وہ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ تم گاڑی کو آگے بڑھا دو۔ پھر انہیں کسی مناسب جگہ پر ٹھہر لیتا۔ وہ تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے۔“

صدف نے بروقت ایک قیمتی مشورہ دیا تھا۔ اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ جانے تو دے کہیں دور جا کر انہیں ٹھہرنا زیادہ مناسب رہتا۔ پولیس موہاں نے گھوم کر ہماری جانب رخ کیا ہی تھا کہ میں نے شیر ڈی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ ہمارے درمیان میں مشکل دو سو گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔ اس گلی کا اختتام قریب آیا تو صدف نے کہا ”وہ جان! گاڑی کو بائیں جانب موڑلو۔ اس طرح تم سیدھے شارع فیصل پہنچ جائیں گے۔ پھر تم میرے ساتھ گھر چلو۔ میں دھمکتی ہوں تمہارے دشمن کتنے پانی میں ہیں۔ میرے پاپا۔“

”نہیں!“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطعی لہجے میں کہا اور گاڑی کو راست ٹرن دے دیا ”تم کیا چاہتی ہو ٹھگین اور سفاک موت تمہارے گھر کا راستہ بھی دیکھ لے!“

وہ یک بہ یک خاموش ہو گئی۔ میرے تہورنے اس کے لبوں پر نقل ڈال دیا تھا۔ شیر ڈی مل پارک کو بائیں بغل میں رکھتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ میں مسلسل عقب نما آئینے میں جھانک رہا تھا پھر مجھے پولیس موہاں کی جھلک دکھائی دے گئی۔ ہمارا درمیان فی فاصلہ اب تین سو گز کے قریب پہنچ چکا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے صدف سے کہا ”اگر ہم مل پارک سے سیدھے شارع فیصل کو بکڑنے نکل کھڑے ہوتے تو فوراً دوسروں کی نظر میں آ جاتے اور پھر شارع فیصل ایک معروف مہا بھی والی سڑک ہے۔ پولیس موہاں کو۔ وہاں ٹھہرنے کی کوشش کرنا ٹھگین نقلی ہوتی جب کہ۔“

میں نے جملہ نامہ مل چھوڑ کر شیر ڈی اسپینڈ بڑھائی اور کہا ”جب کہ اس طرف سوسائٹی کا رہائشی علاقہ ہے ہمیں اپنے

کام کے لیے کوئی موزوں مقام میسر آ سکتا ہے۔“  
اجانک مجھے محسوس ہوا پولیس موبائل کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔۔۔ وہ بہ تدریج ہمارے قریب آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا، گلیب عثمائی بڑی شدت سے ہمارے تعاقب میں تھا۔ میں نے شیرڈ کی رفتار کم کی اور بڑی سرعت سے اسے بائیں موڑ لیا۔

یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا لہذا ڈرائیونگ میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے ایک بات ماننا پڑے گی میری بہ نسبت اس علاقے کے بارے میں گلیب عثمائی کی جان کاری زیادہ ہوگی۔ وہ یہاں کا مقامی باشندہ تھا۔ تین چار چھوٹی بڑی گلیوں میں گھومنے کے بعد میں نے گاڑی کو بائیں سمت موڑ کر ایک قدرے کشادہ سڑک پر ڈال دیا۔ یہ سڑک اپنے اختتام پر شارع فیصل سے جاتی تھی۔ صدف نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔  
”تم تو اسی طرف جا رہے ہو جہڑ کے لیے انکار کر چکے ہو!“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“  
”اس کا مطلب ہے تمہارے ذہن میں راستہ بدلنے کا خیال ہے؟“  
”تمہارا انداز بالکل درست ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئی۔  
ایک فوری خیال کے تحت مجھے اپنے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ افراتفری کے عالم میں میرے دھیان میں نہیں رہا تھا ہمارے راستے میں چند گز آگے تھا تا پڑنے والا تھا۔ اب سوچنے اور ارادہ بدلنے کا وقت نہیں تھا کیوں کہ ہم مذکورہ تھانے کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔

میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی شیرڈ کی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے کن انگیٹوں سے بائیں سمت دیکھا۔ تھانے کی چوحدی کے ساتھ سڑک کے کنارے ایک تیار موپائل کھڑی تھی۔ میں مذکورہ تھانے اور اس کے پہلو میں استادہ خوب صورت ہوٹل کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

سٹی اسکول کے پاس سے میں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی کو رائٹ ٹرن دیا اور ہواسے بائیں کرنے لگا۔ اس ڈھلوانی سڑک کا اختتام جمیل پارک پر ہوتا۔ جمیل پارک کے گرد و پیش کا علاقہ قدرے سنسان اور تاریک تھا۔ پولیس موبائل میں سوار گلیب عثمائی سے یہاں دودھ دتا جھک سکتے تھے۔

میں انہی خیالوں سے الجھا ہوا تھا کہ نفا سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ پولیس کے مخصوص سائرن کی آواز تھی۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ گلیب عثمائی والی موبائل نے ابھی تک سائرن آن نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کوئی بڑی گز بوہو تھی۔ ہم دونوں نے یہ یک وقت سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر میری نگاہ عثمائی منظر دکھانے والے آنچہ تک جا پہنچی۔ وہاں ابھرنے والا منظر بڑی اسی تشویش ناک اور فکر انگیز تھا۔

میں نے اپنے عقب میں ساڑھے تین سو گز کے فاصلے پر دو پولیس موبائلز کو دیکھا۔ ان دونوں کے درمیان بھی دوسرے سے زیادہ فاصلہ رہا ہوگا۔ آگے والی موبائل تو دھکی دھکی جس میں گلیب سوار تھا۔ جب کہ اس کے تعاقب میں آنے والے موبائل کی پیشانی پر مخصوص لائٹ گھومتی نظر آ رہی تھی۔ خوف ناک سائرن کی آواز بھی اسی موبائل سے خارج ہو رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا تھانے کے سامنے کھڑی موبائل بھی ہمارے تعاقب میں لگی تھی۔ وہ اسے ”بھائی بندوں“ کی مدد اور ہماری سرکوبی کے لیے ہوا کے ٹھوڑے پر سوار آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

میں محکمہ کھلا قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا، میں نے گلیب عثمائی کو گھیرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور شیرڈ کی رفتار کو ممکنہ حد تک بڑھا دیا۔ گلیب عثمائی اصلی پولیس والوں سے کیسے نمٹتا یہ دیکھنے کا موقع تھا اور نہ ہی وقت۔ میں نے جمیل پارک کے کنارے سے مڑنے کے بعد اپنی گاڑی کو علامہ اقبال روڈ پر ڈال دیا۔

”کیا فلیٹ پر جانے کا ارادہ ہے؟“ صدف نے سرسری ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

میں نے قطعیت سے کہا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!“  
میں ان دونوں جس فلیٹ میں مقیم تھا وہ یہاں سے چند گز کی دوری پر تھا۔  
صدف نے کہا۔ ”میں بھی سمجھی تھی۔“

”میں ایسی خطرناک حیات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ میں نے اٹل انداز میں کہا۔ ”ہمارے تعاقب میں“ ایک ایک اور دو گیارہ مصیبتیں چلی آ رہی ہیں۔ ان میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں طارق روڈ پر رہتا ہوں۔“  
”یہ یک نہ شہد و شد والی صورت حال ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔  
”میں نے کہا۔“ تم اسے ختم شد ہی سمجھو۔“

میں نے لبرٹی چوک کے سگنل کو کراس کیا اور خالد بن ولید روڈ کی طرف بڑھ گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ سگنل کراس کرتے ہی طارق روڈ والا سگنل کھل گیا۔ یعنی ہمارے پیچھے علامہ اقبال روڈ والا سگنل بند ہو گیا۔ یہ بڑا حسین اتفاق تھا۔ میرے جسم و جاں میں ایک اطمینان سا اثر تا چلا گیا۔ لبرٹی والا سگنل تھانین کی راہ میں سگنل رکاوٹ ثابت ہونے والا تھا۔ اصولی طور پر وہ ہمارے تعاقب کے قابل نہیں رہے تھے۔

میں نے خالد بن ولید روڈ کو کراس کرنے کے بعد عقب نما آئینے میں جھانکا۔ ہمارے پیچھے کافی فاصلے تک علامہ اقبال روڈ عالی نظر آئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے کسی ”معدودی“ کا شکار ہو گئے تھے۔  
ٹھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے شیرڈ کو شمیر روڈ پر ڈال دیا۔ میرا ارادہ تھا اس طرح میں سوسائٹی آفس سے گزر کر شارع قائدین کو جوائن کروں گا پھر شارع فیصل پر نکل جاؤں گا۔ آگے کی آگے جا کر سوچے مگر مجھے فوری طور پر اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

اجانک ہمارے عقب میں سائرن بھاتی لائٹ گھماتی پولیس موبائل نمودار ہوئی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے دو ہی مطالب تھے۔ نمبر ایک گلیب عثمائی والی موبائل انہیں جل دے کہ کچھ نکلے میں کامیاب ہوئی تھی۔ نمبر دو گلی اور اصلی پولیس موبائلز کے درمیان کوئی برسر اسراع کا فوری اور ہنگامی ”کچر دماڑ“ ہو گیا تھا! صورت کوئی بھی رہی ہو۔ ہمارے لیے گلیب بڑھ گئی تھی۔

اب شارع فیصل کا رخ کرنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لہذا میں نے اگلی چوکی پر نصف دائرے میں گھومتے ہوئے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا۔ یہ علاقہ قدرے کم رفتاری والا تھا۔ ایک ٹوٹی چھوٹی سڑک سے گزرنے کے بعد میں نے شیرڈ کی اسپید بڑھا دی۔ ہمارے عقب میں پولیس کے مخصوص سائرن کی صدا تو ابھر رہی تھی تاہم اس موبائل کی صورت ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں پولیس والوں کو جزدی طور پر بھل دیتے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کاسمو پولیشن سوسائٹی کی طرف بڑھتے ہوئے ہمیں ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک چوکی پر سڑک کے وسط میں بڑا بڑا ہودھ قسم کا گڑھا تھا۔ میں تیز رفتاری کے پلک میں اس ٹانگڑے کو بروقت نہ دیکھ سکا۔ اس قسم کے گڑھے میں ٹائر پڑ جانا کوئی خاص بات نہیں ہوتی تاہم ان نازک لحاظ میں ہر عام بات خاص ہوتی جا رہی تھی۔

شیرڈ کا ٹائر جیسے ہی گڑھے میں آیا ایک فلک شکاف دھماکا ہوا۔ یہ ٹائر برست ہونے کی مخصوص آواز تھی۔ شیرڈ بڑی طرح ڈگڑگی۔ اس کے اسپرنگ پر گرفت قائم رکھ کر سنبھالنا خاصا مشکل ثابت ہوا۔ میں نے ٹھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔ وہ تو غنیمت تھا اس دقت سڑک پر ٹریفک کا ازدحام نہیں تھا ورنہ حمار قائد کی جانب سے آنے والا گاڑیوں کا ریلہا ہمیں اپنے ساتھ ”بھا“ لے جاتا۔ شیرڈ ہمارے لیے بے کار ہو گئی۔

میں نے ڈرائیونگ سائیز کا دروازہ کھولتے ہوئے اضطراری لہجے میں صدف سے کہا۔ ”فورا گاڑی سے باہر آ جاؤ۔ یہاں ایک لمحے کو کراخ خطرناک ہوگا۔“

صدف نے کونجرو سائیز کا دروازہ کھولا اور برقی رفتاری سے باہر آ گئی۔ پھر ہم نے ایک جانب نیم تاریکی میں دوڑ لگا دی۔ وہ ہانسی علاقہ تھا اور سڑک کے کناروں پر درختوں کی بہتات تھی۔ اسٹریٹ لائٹس کی کمی نے نیم تاریکی کا ماحول تخلیق کر دیا تھا۔ نرس بڑے اٹھے ہوئے اس علاقے کو کم دوز کر عبور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس منحوس سائرن نے ہمارا ہچچا نہیں چھوڑا تھا۔ موبائل ہماری شیرڈ کے قریب رہی تو سائرن کی آواز میں بھی ٹھہراؤ آ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ قاتل آواز ہمارے تعاقب میں لگ گئی۔ اس کا واضح مطلب تھا پولیس موبائل ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ شاید پولیس والوں نے ہمیں نیم تاریکی میں بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”قاٹ!۔۔۔۔۔ مورفاٹ!“ میں نے صدف سے کہا اور بائیں جانب مڑ گیا۔

اس وقت ہم جگر مراد آبادی روڈ کو چھوڑ کر کاسمو پولیشن اور سہوانی سوسائٹی کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ اس غیر مصروف سڑک پر ابھی غامض تاریکی تھی جو ہمارے لیے ایک محفوظ آڑ کا کام کر رہی تھی۔ ابھی تک پولیس موبائل مذکورہ سڑک پر نہیں مڑی تھی میں نے دانستہ سڑک عبور کر کے رائٹ ہٹنے لیا تاکہ فوری طور پر پولیس والوں کی نگاہوں میں نہ آ سکیں۔

اس تاریک فٹ پاتھ پر دوڑتے ہوئے ہم نے ڈیننگ پینٹنگ کے کیراج کو پیچھے چھوڑا پھر ایک مزدور ہوٹل کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ہاسٹل پارک پہنچ گئے۔  
”پھینکے کے لیے یہ پارک خاصا مناسب رہے گا۔“ میں نے صدف سے کہا۔  
صدف نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔ ہاسٹل



# ذاتی منہاجم

مصنف: ڈاکٹر اے ایم پنچس ایم ڈی



- اپنے آپ
- گو پیٹا طائر
- گر کے گپنی
- گنروریاں
- اور
- خولیاں
- دور کریں
- اپنے آپ
- گو پیٹا طائر
- گر کے گپنی
- گنروریاں
- اور
- خولیاں
- دور کریں
- اپنے آپ
- گو پیٹا طائر
- گر کے گپنی
- گنروریاں
- اور
- خولیاں
- دور کریں

قیمت:- 25 روپے ڈاک خرچ:- 23 روپے

کتاویات پبلیکیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313  
5802551  
kitabat1970@yahoo.com

رابطہ کیلئے: 63-C-111 کینٹینس ڈی ایچ اے میں روڈ رولنگی روڈ کراچی

مزرے تھے اس نے ہمارے اندر محکم بھرنے کے ساتھ ہی ہمارے ملیوں کا بھی کڑا کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس مختصر ”پاپ ٹی“ نے پوری کر دی تھی۔ صدف میرے فلیٹ پر پہنچ کر اپنی حالت درست کر سکتی تھی۔ وہاں مناسب میک اپ کے سامان کے علاوہ زرگل کے چند بلیوسا بھی دستیاب تھے۔ میں نے اس کے فیصلے پر صاؤ کر دیا۔  
ای لہجے ایک ہیو کیو بس گئی۔

☆☆☆

اس وقت رات کے بارہ بج چکا تھا!  
تھکی ماندی رینگتی تھکی وہ ناگن صدف شب اپنا آدھا رات ملے کرنے کے بعد نئے دن کا آغاز کر چکی تھی۔ انگریز نے بھی کیا داغ پایا ہے۔ پوری کا کائنات کا دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور یہ نصف شب سے اپنی تاریخ بدلنے ہیں۔ ہم سال ہا سال سے ان کے غلام رہے ہیں لہذا ہمارے غلام ذہن ان کی اندھی تقلید پر آج بھی مجبور نظر آتے ہیں۔ جن قوموں کا اپنا چتر تہذیب و روایت اور اصول و ضوابط نہیں ہوتے انہیں زندگی بھر دوسروں کی دست نگر رہنا پڑتا ہے!

صدف کو رخصت ہوئے آدمے سمجھنے سے زیادہ ہو گیا تھا اور اب میں بھی شاور لینے کے بعد فریش اپ ہو چکا تھا۔ میں جلی فون سیٹ کے پاس آ بیٹھا اور پہلے منہاس باقر کے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ پتھر جگر اور اپنی اعصاب کا مالک تھیں۔ غروب آفتاب سے چند لمحوں پہلے پورے سات افراد کو سپرد خاک کر چکا تھا۔ فرحت بیگم اور واحد تو اس کے قتل کے لمحے اس کی بیوی اور بیٹا تھے مگر وہ اپنے دو گھریلو ملازمین اور خیم سکوری گاؤں کا بھی ان داتا تھا۔  
وہ ان کے دکھ درد کا سامھی اور نفیس تھا۔ گویا اس نے آج شام اپنی جلی کے چھ افراد کو لکھ میں اتارا تھا۔ سہیل کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ اس کی لاش کو آبائی گاؤں بھیجے کا بندوبست کر دیا گیا۔

رابطہ ہونے پر میں نے منہاس سے ایسی بے مقصد باتیں کیں جن سے اس کا غم غلا ہو سکے۔ بعض اوقات بے مقصد اور فضول بات بھی بہت کامیابی اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔ ان کے لیے کہا جاتا ہے کسی شے کو کار خائن قدرت میں بے کار نہ سمجھو۔ ہاں فی الحال تمہیں اس بے گناہ بے کار نظر آنے والی چیز کی افادیت اور کام معلوم نہیں!  
میں مختلف حیلوں بہانوں سے اس کی اٹک شوٹی نما دل جوئی میں لگا رہا۔ چایک وہ موضوع بدل کر میری جانب رخ

میلے کچلے کپڑوں میں ملبوس مفلوک الحال لوگ کس پیری کی حدوں میں داخل تباہ خیال انسان!  
وہ جس بھری سکرشیں بھوک کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ انسان برداشت کی انتہا سے گزرنے کے بعد خود فراموشی کے بارے میں سوچتا ہے وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا چاہتا ہے تاکہ وہ نہ رہے جو مجھے سمت سے مساکل اور مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ وہ وہ بن جائے جسے دنیا جہان کا کوئی غم نہیں۔

ایک انسان کو بچانا گویا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے۔ ہم لاکھوں گروہوں اور اربوں پیچ چاگتے چلتے پھرتے انسانوں کو اپنے درمیان مسمی بھر چکے اور بھڑے ہوئے بے لوگ نظریوں میں آتے۔ ہم بہ حیثیت مجبوس اتنے بے بس کیوں ہو گئے ہیں کہ ان کتنی کے افراد کا مدد انہیں کرتے؟ کیا یہ انسانیت کی تذلیل نہیں!

میں ان سکلتے خیالات کو ذہن میں بسائے پارک سے باہر آ گیا۔ وہ گروہ مندروانی سائڈ می۔ ہم نے خاموشی سے کلپٹین روڈ کراس کی اور کلپٹین روڈ مارکیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر سواری کا انتظار کرنے لگے۔

صدف نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ”ہماری شہر کا کیا ہوگا؟“  
”کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے پُر خیال انداز میں جواب دیا ”زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے۔ جھنجھلائے اور سٹ پٹائے ہوئے پولیس والے اسے اٹھوا کر اپنے قحانے لے جائیں۔ منہاس باقر صاحب خود ان لوگوں سے سخت لیں گے۔ اب ہم تو اس طرف جانے سے رہے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحات کے بعد میں نے پوچھا ”صدف تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں نے سوچا ہے پہلے تمہیں گھر پہنچاؤں پھر اپنے فلیٹ کی طرف نکل جاؤں؟“  
”میں فی الحال تمہارے ساتھ جا رہی ہوں تمہارے فلیٹ پر!“

میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی ”میرے لباس کا حشر دیکھ رہے ہو۔ کیا میں اس ڈریس اور طے میں ما پاپا کے سامنے جاؤں گی؟“ ایک لمحوں کے وقفے سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”پھر میری گاڑی بھی تو تمہارے فلیٹ پر پارکنگ میں کھڑی ہے!“  
اب میرے خاموش ہونے کی باری تھی۔ پچھلے ایک لمحے میں ہم دونوں جس مارا ماری دوڑ بھاگ اور افراتفری سے

سے دادی اماں کی کہانی سننے بیٹھے ہیں۔  
میں نے اس کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جاتے ہوئے کہا ”کوئی انگریز ایشیا کے دورے پر نکلا۔ پناہیں پاکستان کا ہندوستان میں اسے دو حیرتوں سے سامنا ہوا۔ اس نے وہاں کی عورتوں کو ساڑیوں میں ملبوس دیکھا تو تعجب سے سوال کیا ”ان عورتوں نے یہ لباس کس طرح پہنا ہے؟ کسی ظریف نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ”مسٹر! یہ لباس تیار نہیں ہوتا جو کوئی عورت اسے پہن لے۔ پھر انگریز نے پوچھا۔ بتانے والے نے بتایا ”اس لباس کو عورت کے بدن پر رکھ کر ہی تیار کیا جاتا ہے لہذا پہننے اتارنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ لائف ٹائم کا رشتی والا دوسرا ہے انگریز بھائی؟“  
”بوا دل چسپ واقعہ ہے۔“ صدف نے ترنگ سے بھر پور انداز میں کہا۔

میں نے کہا ”اسی انگریز بہادر کو ایک حلوائی کی دکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں گرم گرم جلیبیاں تیار رہی تھیں۔ اس نے عجیب ساخت کی مٹھائی کو دیکھا پھلکا اور حیرت سے بولا ”اس جھلک لگی میں شیرہ کس طرح بھرا گیا؟ کسی من چلے نے برسوں کی غلامی کا بدلہ لینے کے لیے انگریز کو بے وقوف بنانے کی خاطر بتایا۔ پہلے ایک خالص طریقے سے طبیبی تیاری جانی ہے۔ طریقہ اتنا مشکل ہے کہ تیاری سمجھ میں نہیں آئے گا بس اتنا سمجھو کہ تیاری طبیبی کے اندر انجکشن کی مدد سے شیرہ داخل کیا جاتا ہے!“

”ہاؤ انٹرینسٹ!“ وہ دھیمی آواز میں چبکی۔ اس کی چپکرائیں بڑی زندگی تھی۔

میں نے کہا ”اس پاپ کا قصہ بھی کچھ ”ساڑی اور عورت“ جیسا ہی ہے۔“  
وہ خاموش اور گہری نظر سے مجھے کتنی چلی گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا صدف کی نظر میرے پارا تر جائے گی۔ اس کی نگاہ میں عقاب تیزی اور تیزی تھی۔

باہم بہت ہو چکی تھیں لہذا ہم ایک دوسرے میں پیوست اس پاپ سے باہر آ گئے۔ پارک کے اندر جنوز خاموشی اور سکون تھا۔ چند لمحات کے بعد میں اس امن و امان کا راز بھی کھل گیا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا شاید پارک میں داخلے کا وقت ختم ہو گیا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس پارک کا گیٹ ابھی تک کھلا تھا۔ اور شاید ہمیشہ کھلا رہتا ہوگا۔ میں نے پارک میں موجود آدھ دھن پنچر پر مدھوش انسانوں کو سوتے ہوئے پایا۔ ایسا نظارہ میں ایک دو اور پارکس میں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ سب کے سب نشے کے زپر اثر تھے۔

بھیر بیٹھا اور مجھ سے میری تازہ ترین سرگرمیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ بھر سفید شیر ڈ کے بارے میں اپنی تنویش کا اظہار بھی کر دیا۔

وہ سرسری انداز میں بولا ”شیر ڈرتم مٹی ڈالو۔ وہ تمہاری سلاحتی کا پانک بھی نہیں میں اسے پولیس کے قبضے سے اس طرح نکالوں گا جیسے بھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔“ ہمارے درمیان تھوڑی دیر مزید گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے قدرے سنبھلا ہوا محسوس کیا تو اجازت چاہی ”ٹھیک ہے منہاس صاحب! آپ آرام کریں“ بات ہوئی۔ ”تم اپنے عمار پر ڈے رہنا“ اس نے گھبر آواز میں مجھے ہدایت دی۔

”اوکے منہاس صاحب!“ میں نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کر دیا۔

دوسرا فون میں نے منہاس کے زیرِ تعمیر بنگلے پر شہزاد کو کیا۔ شہزاد وہاں زرگل کے ساتھ فیصل کی گھرائی پر مامور تھا۔ فیصل کو میری گھرائی میں تدفین سے تھوڑی دیر پہلے بھائی کالونی والے ٹھکانے سے مذکورہ بنگلے میں منتقل کیا گیا تھا۔

فون زرگل نے ریسیو کیا۔ میری آواز پہچانتے ہی بولی ”تم کیسے ہو وجدان؟“

میں نے اپنے کیسے ہونے کا مختصر احوال بیان کیا تو وہ خاصی افسردہ ہو گئی۔ میں نے پوچھا ”تمہیں تو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہے نا؟“

”ہے ایک پریشانی۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر پوچھا ”کیسی پریشانی زرگل؟“

”یہاں پر تم موجود نہیں ہو۔“

”تو؟“ میں الجھ گیا ”کیا شہزاد کے ساتھ تم ان ایزی ٹیل کرتی ہو؟“

”یہ بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی ”بس میں تمہارے ساتھ ایزی ٹیل کرتی ہوں۔“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”زرگل! میں ایک وقت میں ایک ہی جگہ پر موجود رہ سکتا ہوں۔ خدا نخواستہ میں کوئی خدا تو نہیں!“

وہ موضوع سے کمی کا تے ہوئے بولی ”پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو!“

میں نے اس کے دانستہ احتراز کو سمجھتے ہوئے ٹاپک بدل دیا اور پوچھا ”شہزاد کہاں ہے؟“

لگاتار گیا ہے۔“ زرگل نے بتایا ”وہ بڑا چوکنا اور کھٹا آواز ہے۔“

شہزاد کی اس صلاحیت کا انکشاف میرے لیے کوئی نیا چیلنج بات نہیں تھی۔ میں نے زرگل سے استفسار کیا۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟“

”ابھی تو اس شہر کے توے فی صد لوگ جاگ رہے ہیں۔“

”مگر تم دوسرے شہر سے آئی ہو۔ لاہور میں لوگ جاگ سونے کے عادی ہیں!“

”میں اپنے حالات کی عادی ہوں۔ وہ کیا کہے ہیں جیسا دیں ویسا ہمیں۔“ وہ قلعیانہ انداز میں بولی ”انسان کو حالات اپنے ذہنک میں جینا سکھاتے ہیں۔“ اس نے ذرا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی ”وہی شہزاد واپس آکر اپنی ڈیوٹی سنبھال لے گا۔“

میں سونے کی کوشش کروں گی۔“

اس نے ڈیوٹی کا ذکر کیا تو میرا خیال فیصل کی طرف ہا گیا۔

”ہمارا مہمان ابھی چوہدری زادہ کیسا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خوش باش ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی ”ہمارا خاطر داری میں خاصا ریگس محسوس کر رہا ہے۔ ابھی تو وہ دیر پہلے اس نے شہزاد سے کافی باتیں بھی کی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے وہ ہوش و حواس میں آچکا ہے؟“

”ایسا دیا۔“ وہ دے جوش کا اظہار کرتے ہوئے بولی ”مجھے تو لگتا ہے وہ پوری طرح فٹ ہے۔“

میں نے پوچھا ”شہزاد اسے اس کی باتیں بھی ہیں؟“

”میں نے شہزاد سے پوچھا نہیں۔“ وہ بولی پھر چوٹے ہوئے انداز کے ساتھ کہنے لگی ”شہزاد آگیا ہے لوتم اس بات کرلو۔“

اگلے ہی لمحے مجھے اترپیں میں شہزاد کی مخصوص ”ہیلو“ سنائی دی۔

رکی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا ”عمار کا کیا حال ہے۔ تم میدان جنگ کی سرحدوں کا جائزہ لے کر آگئے؟“

میں نے ذرا معنی انداز میں بنگلے اور اس کے گرد و پیش کی خیریت دریافت کی تھی۔ وہ میرے استفسار کی گھرائی میں اترنے کے بعد بولا ”تم پوری طرح مطمئن رہو۔ میری مرضی کے بغیر یہاں پر ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔“

”دوبی“ لگنے لگے ”مجھے نے سرتاپے والے ایجنڈے میں

کہا پھر پوچھا ”فیصل سے تمہاری کیا بات ہوئی ہے۔ زرگل نے مجھے بتایا ہے وہ خاما اسارٹ نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔“ وہ پوری طرح چاق و چوبند ہے۔“ شہزاد نے تائیدی الفاظ میں جواب دیا ”وہ مجھے سے دو دو تھک بات کر رہا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اور جنہیں بد دل ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ وہ مجھے پیش دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ کہنے لگا یہ تم لوگوں کی کوئی مراد تھی ہے جو مجھے اپنی زنجیروں میں جکڑ کر خوش ہو رہے ہو۔ اگر طاقت اور ٹیکہ کا مقابلہ کرنا ہے تو مجھے آزاد کر کے دیکھو۔ چھٹی کا دودھ

باز دلا دیا تو میرا نام بھی چوہدری فیصل نہیں۔“

”تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ میں نے جھپٹنے والے انداز میں کہا ”چھٹی سا تو اس اور آٹھویں کا دودھ تمہیں یاد ہے یا ڈائریکٹ میزک کا منسوب ہے؟“

وہ میرے لطیف مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”میں تو اس کی منسوب بندی کا خیال بالے بچھا ہوں۔“

اس کے لہجے میں چٹائی کیفیت پائی جاتی تھی ”وجدان! ایک مرتبہ تم فیصل کو میرے حوالے کر دو۔ میں نے بڑے ”ارمان“ نکالنا ہیں۔ اس کی ہڈیوں کا چورا نہ کر دیا تو۔“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے ”یہ چور اس بازار میں فروخت کرو گے؟“

”وجدان! تم تصور نہیں کر سکتے کہ میں فیصل کے لیے اپنے دل و دماغ میں۔“

”مجھے بر بات کا اندازہ ہے۔“ میں نے ایک تہیہ پر اس کی بات کاٹ دی ”تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں دل و دماغ کی آگش بھانے کا موقع ضرور دوں گا۔ کل تم میری ریفری میں اپنی اپنی طاقت کو آزمائو گے۔“

”وہ جو شیے لہجے میں بولا“ تم نے دل خوش کر دیا وجدان!“

”میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں“ فیصل نے مارشل آرٹس کے میدان میں کیا چٹن رکھا ہے!“

”میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا وجدان!“

”ان انشا اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“ وہ یقین سے بولا۔

میں نے کہا ”مجھے تم سے یہی امید ہے۔“

”وہ ایک فٹ موضوع بدل کر مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے لی ای سی ایج سوسائٹی کے بنگلے میں چٹن آنے والے واقعات کی آگاہی دی۔ اس نے پوری

ادبیت پر ایک مستند کتاب

طیبا کا بیٹھکا اور  
مصحف دل و اللہ صبرتی

اپنا پیغام دوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے  
اور ان کے دل کا حال جاننے کا سائنس طریقت

قیمت :- 40/- روپے  
ڈاک خرچ :- 23/- روپے

کتاب کے چند عنوانات

مستقبل بینی	فلسفہ بینی
انسان	خوشی کی مشق
فیصلی صلاحیتوں کا مالک	تجربہ و انصاف
فلسفہ ہمارہ	ادب کی خوشی و لذت
قوتوں کا سرچشمہ	چالاک کی کارنامیاں
مستقبل بینی	لامیت انکار
اصل حقیقت	خیال و طرح و نقش
بعض چشم دید واقعات	اختلال انکار
طاقت و احساسات	ادب کی مشق
مستقبل بینی کے	حضرت اقبال کی فکر
مستقبل بینی کے مضمرات	
ایکے اور دوسرے پہلو	

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313  
kitabiat1970@yahoo.com  
ایمیل: 63-C فیروز آباد



توجہ سے میری بات سنی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ کہنے لگا۔  
”ودھان! تمہارے لیے میرے پاس ایک گڈ نیوز ہے!“  
”گڈ نیوز!“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے، یعنی خوش خبری۔“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”ودھان! میں نے یہ وقت اس جنگ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں گزارا۔ میں ایک گھنٹے کے لیے فیصل کو زلزل کی سپردی میں دے کر باہر گیا تھا اور میں نے اپنے ذرائع سے بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ سونگے تو دل خوش ہو جائے گا۔“

شہزاد نے اپنے جن ذرائع کا حوالہ دیا، میں ان سے بہ خوبی آشنا تھا۔ وہ ایک چلتا پڑھتا شخص کا بندہ تھا۔ کرائم رپورٹر والی حیثیت نے اسے بڑا سوسر والا بنادیا تھا۔ وہ ایک فون سمجھا کر بہت سے ایسے مشکل کام بھی کر لیتا تھا جو بہ ظاہر ناممکنات میں شمار ہوتے تھے۔ کرائم رپورٹر کی تادیبہ اور طلسمی قوت کا مجھے پہلی مرتبہ ادراک ہوا۔ شہزاد کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا، بعض طاقتور کرائم رپورٹر کو تھانے والوں سے باقاعدہ جوتا بھی وصول کرتے ہیں۔ خبروں کی فراہمی تو بہت معمولی سی بات ہے۔ اگر تھانے والے یہ بتا نہ دیں تو رپورٹر ان کی مخالفت میں الٹی سیدھی رپورٹ چھاپ کر ان کا بیٹھا بٹھا دے۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں عمومی طور پر یہی خیال پایا جاتا ہے کہ ان کی اکثریت مرثی ہوئی ہے۔ اسی منظر کو ذہن میں لائیں جب ان لوگوں کو اپنی ساکھ بچانے کے لیے ایک راسی کا کردار نبھانا پڑتا ہوگا!  
ہر بڑی چھٹی چھوٹی بھجلی کو کھاجاتی ہے۔ گویا، کزور ہمیشہ طاقتور کی خوراک رہا ہے۔ اب یہ طاقت والے کی مرضی اور موڈ پر منحصر ہے کہ وہ بے بس اور کزور کو ذہنی طور پر چمڑے یا جسمانی طور پر ہڑپ کر جائے۔ آخر الذکر کو بہر صورت اس کا نوالہ دینا ہوتا ہے!

میں نے شہزاد کی جوش بھری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے پوچھا ”اس خوش خبری کا تعلق کس سے ہے؟“  
وہ بولا ”جے ڈی ملک سے۔“  
میں اچھل کر رہ گیا ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
”مطلب یہ کہ میں نے جے ڈی ملک کا سراغ لگالیا ہے۔“ وہ بڑے رساں سے بولا۔  
میں شہزاد کے ذرائع معلومات سے واقف ہونے کے باوجود بھی پوچھے بتا نہ رہا ”کیسے؟“

اس نے میرے ”کیسے؟“ کے جواب میں جو کچھ بتائی اس کے مطابق جے ڈی ملک عارضی طور پر اپنے ملک سے ہجرت کر گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے دوست صفدر علی جنگلے میں مقیم تھا۔ صفدر علی نامی یہ شخص نارنجہ ناظم آباد علاقے میں رہتا تھا۔

نارنجہ ناظم آباد کے ذکر پر میرا ہاتھ ٹھکا۔ یہ علاقہ ڈسٹرکٹ سینٹرل میں واقع تھا۔ مذکورہ ضلع کراچی کا سب سے زیادہ اہم اور حساس ٹکڑا تھا۔ جس طرح شیعہ غوری نے اپنی تنظیمی ایف کے (کرائم فری کراچی) کا ہر ضلع میں ایک ٹھکانا بنارکھا تھا۔ اس طرح سینٹرل میں بھی اس کا اڈا موجود تھا۔ مجھے اس طرف جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے چوتھے اور ٹھکانے کا سبب یہ تھا کہ کہیں جی ڈی ملک نے شیعہ غوری کے ”سینٹرل“ میں پناہ تو نہیں لے رکھی!  
یہ امکان قرین قیاس تھا کیوں کہ جب سے شیعہ غوری اور چوہدری نواز شمس میں دوستی ہوئی تھی دونوں سرکٹ کے آؤٹس میں مکمل مل گئے تھے۔ اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ ملک اور نادر زمان کا ٹکڑہ جوڑا تھا۔ نادر زمان تو انہیں اب کھار ہوگا۔۔۔۔۔ اور ہوگا بھی انہیں! البتہ شہزاد کے آشکاف سے یہ ضرور سوچا جاسکتا تھا ”صفدر علی نامی وہ شخص ”سینٹرل“ کا کڑا دھرتا بھی ہو سکتا تھا! یہ ایک نہایت ہی اہم اطلاع تھی میرے لیے۔

میں نے شہزاد سے کہا ”میں تمہاری فراہم کردہ معلومات کو خشک کی نظر سے تو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بتاؤ جے ڈی ملک ڈینس سوسائٹی سے نارنجہ کب گیا ہے؟“  
”آج بعد از دوپہر“ اس نے جواب دیا ”اپنے جنگلے پیش آنے والے خونیوں والے کو نشانے کے بعد وہ بھلا لاک کے صفدر علی کے گھر چلا گیا تھا۔“

میں نے کہا ”اپنا بھلا لاک کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے وہ آج کی تاریخ میں وہاں نہیں آئے گا!“ میرا یہ انداز امکانات پر مبنی تھا۔  
”میں نے اس سلسلے میں بھی سن گن لینے کی کوشش کی ہے۔“ شہزاد وضاحت کرتے ہوئے بولا ”وہ ایک دو دن وہاں رکے گا۔ جب تک ادھر کے حالات سازگار نہیں ہو جاتے۔“

عذاب میں مبتلا کرنے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔“  
وہ بے طرح پھٹ پڑا ”تم اتنے اطمینان سے اس لیے بات کر رہے ہو کہ تم نے ان چار کاٹر دز کو ہلاک کر کے اپنے جگر میں ٹھنڈک اتاری ہے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میرے دل و دماغ میں جولاؤ پروٹن ہے میں اسے کس کے خون کے چھینٹوں سے بچاؤں۔ ہر شخص کا اپنا معاملہ ہوتا ہے۔ مجھے ایک بات بتاؤ دودھان!“

وہ بڑے بیجان خیز انداز میں رکا پھر مجھ سے مستر ہوا ”ہم دونوں بھوکے ہوں۔ تم پیٹ بھر کر کھانا کھا لو اور میں سانسے پھٹا لپٹائی ہوئی نظر سے نہیں دیکھتا رہوں۔ کیا اس دیکھن دیکھن میں میری بھوک مٹ سکتی ہے؟“  
”ہرگز نہیں!“ میں نے قطعیت سے کہا۔  
”تو پھر میرے سکون کا کوئی بندوبست کرو!“  
”تم کیا چاہتے ہو۔“ میں نے کہا ”تمہارے ذہن میں کچھ تو ہوگا؟“

وہ بولا ”چار کاٹر دز کو تو تم نے جہنم کا دیرا دلدار کر روانہ کر دیا مگر ان کا باوا آدم ابھی زندہ ہے۔ انہوں نے اسی شخص کے ایما پر منہاس صاحب کے جنگلے کو قبرستان میں تبدیل کیا تھا۔ میں جے ڈی ملک کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں۔“

”ذہن!“ میں نے دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔  
میرا یہ فیصلہ حالات کا تقاضا اور شہزاد کو لاحق انتہائی مرض کا علاج تھا۔ اگر اس موقع پر اسے اپنے اندر گئی آگ کو خنڈا کرنے کا راستہ نہ ملتا تو اس کا دماغ بھی الٹ سکتا تھا اور یہ بھی جے ڈی ملک برے ترین سلوک کو سختی تھا۔ اس کا زندہ رہنا بہت سے انسانوں کے لیے ایک مسلسل عذاب کے مترادف تھا۔

آئندہ دو منٹ میں ہمارے درمیان جے ڈی ملک کو چھاپنے کا منصوبہ زیر بحث رہا پھر ہم اس فیصلے پر پہنچے کہ کل ادھر کا رخ کیا جائے گا۔ شہزاد میری تائید اور تعاون پا کر قدرے مطمئن ہو گیا تو میں اسے نادل کرنے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اسی دوران میں اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔  
”یہ زلزل کیسی لڑی ہے؟“  
اس کے استفسار نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”تم کس حوالے سے پوچھ رہے ہو؟“  
وہ گڑبڑا گیا ”نہیں ایسے ہی۔۔۔۔۔“

ٹھکانے پر پناہ ملی ہو!“  
”تم نے اس زاویے پر اس لیے دماغ نہیں کھپایا کہ تمہاری سوچ کے کیڑوں پر ابھی تک یہ ایف کے پوری طرح ابھری نہیں۔“ میں نے وضاحت کی ”اور نہ ہی چوہدری شیعہ کے الحاق پر تم زیادہ توجہ دے رہے ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منہاس صاحب کے ساتھ پیش آنے والے خون چکانے والے نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو تار تار کیا ہو!“

وہ تائیدی انداز میں بولا ”تم بالکل درست سمت میں قیاس آرائی۔۔۔۔۔ بلکہ حقائق نمائی کر رہے ہو۔ میں آج صبح سے بہت اپ سیٹ ہوں۔“  
”ایسا ہونا بھی چاہیے۔ تمہارا یہ رد عمل عین فطری ہے۔“ میں نے ہمدردی سے بھرپور لہجہ میں کہا ”انسان ایک حساس اور باشعور مخلوق ہے۔ اپنے پیادوں کو ملنے والی خوشی اور غم سے اسے متاثر ہونا چاہیے ورنہ اس میں اور پھر میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔“

وہ سوالیہ انداز میں بولا ”ودھان! جب کوئی شخص قدم قدم پر ہمیں قائلہ پھنچاتا ہے تو ہم اسے خیر خواہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہمیں مسلسل نقصان پہنچانے پر کمر بستہ ہو جائے تو وہ ہمارے دشمنوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں کا حساب تو چیک کرتے رہنا چاہئے؟“

میں بڑی حد تک اس کی بات سمجھ گیا تھا تاہم انجان بننے ہوئے پوچھا ”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتا ہو؟“  
”میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں۔“ وہ وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”منہاس باقر صاحب میرے خیر خواہیوں میں تاپ آف دی لسٹ کا اعزاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر ان گنت احسانات کر رکھے ہیں۔ میں ان سلوک کلمات کو شمار کرنے میں عموماً خود غرق بیت جا رہا ہوں۔“ اس کی آواز میں بھرا ہوا اتر آئی۔ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد بولا۔

”ودھان! کیا میں نے چوڑیاں پہن لی ہیں یا میں اتنا ہی گمراہ ہوں کہ اپنے اس طعنہ جسن کو پہنچنے والے نقصان کا حساب نہ مانگ سکوں؟ کیا فرحت عظیم اور دوا دید کا خون مجھ سے کوئی تقاضا نہیں کرتا؟ میری یہ جان اور طاقت کس کام کی کہ میں ان سفاک قاتلوں کا ایک بال بھی پاؤں کا نہ کر سکوں؟“  
شہزاد اس وقت بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں اسے تسلی دی ”شہزاد! منہاس کے جنگلے پر خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں کو میں نے درو ناک

ایک بات تو یہ طے تھی کہ زرگل اس وقت شہزاد کے قریب موجود نہیں ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اس نے خا صے پر اسرار انداز میں سوال کیا تھا۔ لامل حال مجھے کچھ شک سا ہوا۔ پھر اس کی گڑبڑا ہٹ سے مزید مجھے حذب بذب کر دیا۔

میں نے کریدنے والے انداز میں کہا: ”بس ایسے ہی کا کیا مطلب ہو شہزاد؟“  
وہ اور بوکھلا گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا: ”وہ پچھلے چند دنوں سے تمہارے ساتھ ہے نا..... تم نے اسے کیسا پایا ہے؟“

اس کی بوکھا ہٹ اور ہچکچاہٹ نے مجھے بتایا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے متنی سرخی لہجے میں کہا: ”یار! وہ جب سے میرے ساتھ ہے مجھے اس کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کی سہلت ہی نہیں ملی۔ کیسا پایا اور کیسا کھوایا کے بارے میں کیا بتاؤں لیکن.....“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اپنے شک کی تصدیق کی خاطر پوچھا: ”تمہیں اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع آج ہی ملا ہے اور تم خاصا تیز بھگتے لگے ہو، میرا خیال ہے صبح تک تم زرگل پر ملی۔ آج ڈیڑھ گھنٹے“  
”کیوں مذاق کر رہے ہو!“ وہ جھپٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کی کیا ہٹ نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ میں نے کہا: ”میں مذاق نہیں کر رہا شہزاد! بالکل سنجیدہ ہوں۔ تم بھی اگر زرگل کے بارے میں سنجیدگی اختیار کر لو تو اس میں مضائقے والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔“  
”تم اس کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟“

”نہ ہونے کے برابر“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ”بس مجھے اتنا معلوم ہے اس کا چاچا حکمت یار کوئی بہت برا آدمی ہے جو اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں جاننے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ تم کریدو گے تو ہو سکتا ہے وہ تمہیں اپنی اسٹوری سنا دے۔ باقی تمہارے اپنے کٹس پر منحصر ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم دونوں کے بیچ کوئی سنجیدہ.....“  
وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کا ذہن صاف کر دیا۔  
”واقعی ایسی کوئی بات نہیں..... کم از کم میری طرف سے بالکل نہیں!“

”اور اس کی طرف سے؟“  
”یہ تم معلوم کرنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا: ”ویسے

پھوہاری اور پشتون کی جوڑی غامضی دل چسپ رہے گی۔“  
میرے لہجے میں قدرے طنز کی پانی جاتی تھی۔ وہ انھیں زندہ لہجے میں پوچھ بیٹھا: ”تمہیں تو میری اس کوشش پر کون اعتراض نہیں ہوگا؟“

”ارے بھائی! میں اس کا کوئی دال وارث ہوں جو تم سے اجازت مانگ رہے ہو۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا: ”تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے براہ راست اسی سے کہو۔“  
وہ جذبات میں آکر انگریزی پر اتر آیا: ”اوکے! آئی دل ٹرائی۔“

”یوہڈ ہوٹرائی۔“ میں نے کہا: ”ایڈ ٹرائی اٹ اپ!“  
اس کے ساتھ ہی ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔

میں ریسور کو کرڈل کرنے کے بعد زرگل اور شہزاد کے بارے میں سوچنے لگا۔ شہزاد کے لیے یہ ایک مشکل کام تھا۔ زرگل آسانی سے اس کے قابو میں آنے والی نہیں کی گئی اس کیل میں حتی طور پر کوئی نوٹی جاری نہیں کیا جاسکتا۔ سناور دیکھا بھی ہے کہ اس راہ میں ہر شخص کا تجربہ نیا ہے۔ اگر شہزاد کی لگن سچی اور کوشش سچی ہوئی تو اس کی محنت رانگاہیں جاسکتی تھی۔ حصول اور جو ایک دوسرے کے ساتھ لازماً ملزم رہتے سے بندے ہوئے ہیں۔ کچھ مجب نہیں تھا کہ شہزاد کی جو زرگل کو اس کے قریب لے آتی۔ میں نے ان کے ملاپ کے لیے غلوں دل سے دعا کی اور کمرے میں حاضر ہو گیا۔

دیوار گیر کھاک ساڑھے بارہ بج رہا تھا۔ طارق روڈ ایک شاہجگ ایریا ہے۔ عموماً دس سے گیارہ بجے تک دکانیں کھلتی ہیں۔ اس کے بعد اچانک سناٹا چھا جاتا ہے۔ گانا گانے گاڑیوں کے گزرنے کی آواز کے سوا کوئی صدا نہیں ابھرتی۔ یہاں کی رات خاصی پرسکون واقع ہوئی ہے۔ سونے سے پہلے میں نے ہلکی چٹکی ایک سرساز کا ارادہ کیا اور بیڈ سے اتر کر فرائی پڑ گیا۔

جس طرح زندہ رہنے کے لیے کھانا پینا ضروری ہے اسی طرح مستعد رہنے کے لیے پھر پور نیند بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آج کا پورا دن مار دھاڑ میں گزارا تھا۔ کل کا سامنا کرنے کے لیے میں ڈنڈی اور جسمانی طور پر چاق و چوبند ہو جانا چاہتا تھا۔ لہذا ایک پرسکون نیند ضروری تھی۔ اگر رات سونے سے پہلے کی اکا دکا جسمانی مشقیں کر لی جاسیں تو تمام اعصاب اور پٹے ریلیکس ہو جاتے ہیں جو گہری نیند کے لیے بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک انسانی جسم میں تین حصے بہت اہمیت کے

مال ہیں۔ سر پیٹ اور پاؤں۔ سر میں چہرہ بھی شامل ہے۔ پیٹ میں معدے کو اولیت حاصل ہے اور پاؤں تو اول آخر پاؤں ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے اندر داخل ہونے والی صحت اور بیماری انہی تینوں حصوں کو اپنا راستہ بناتی ہے لہذا ان کی حفاظت نگہداشت اور صفائی بہت ضروری ہے۔ اپنے ذہن میں ہمیشہ مثبت سوچ کو جگہ دینا چاہئے۔ ہر معاملے کو مثبت انداز میں دیکھنا سنا اور بولنا چاہئے۔ معدے کی مضبوطی اور صفائی کے لیے سادہ اور بدوقت غذا ضروری ہے۔ پاؤں کو سختی اور صاف رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے مگر سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم اپنے پاؤں کو بہت حقیر جانتے ہیں ان پر کم سے کم توجہ دیتے ہیں۔ لیکن نہ آئے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں!

یاد رکھیں پاؤں غیر اہم نہیں ہیں۔ ہم اس کو ارض پر انی پاؤں کے ٹھیل جڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں اس دنیا میں ہمارے رابطے کا ذریعہ ہیں۔ اگر ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین چٹائی جائے تو تصور کریں ہم اس کائنات میں کہاں کھڑے نظر آئیں گے؟

میں نے جتھ یوگ کا ایک باب ذہن میں کھولا اور پاؤں کو آرام و سکون پہنچانے والی ایک ہلکی چٹکی مشق کرنے لگا۔ زمین پر بچوں کے بل بیٹھنے کے بعد میں نے اپنے بدن کا سارا وزن ایک ایڑی پر منتقل کر دیا، دوسرا پاؤں بوجھ سے آزاد ہوا تو اس کا ٹک کو کھینچنے کے مقام سے حد کر کے میں نے مذکورہ پاؤں کو دوسرے کھینچے پر لگا لیا جو پہلے ہی ہوا میں معلق تھا۔ دونوں ہاتھوں کو میں نے کمر پر جمایا، نیز ہڈی کو عمودی انداز میں تانے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ پندرہ سیکنڈ کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر..... لیکن عمل دوسرے پاؤں کے ساتھ دہرایا اور مشق ختم کر دی۔

یہ بظاہر ایک سیدھی سادی اور آسان ہی مشق ہے لیکن اس میں ”اتنے“ والا مرحلہ مبتدیوں کے لیے قدرے دشوار ہے۔ ابتدا میں وہ دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر بھی یہ مشق کر سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ جب پریمنس ہو سے اور توازن قائم ہونے لگے تو ہاتھوں کو کمر پر جمایا جاسکتا ہے۔

اس کم وقتی مشق کے بے پناہ فوائد ہیں۔ پاؤں کی ساری کھج کو دھو کر دینی ہے۔ پینڈلیوں اور کھنٹوں کی آنکھیں کو ختم کر کے ٹھوس کو مضبوط بنانی ہے۔ کمر درد اور ضعیف عمری کے مختلف مسائل میں بھی مقوی و معاون ہے۔ ایک وقت میں تین سے پانچ چکر لگانی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے پلو پوچر (پل آسن) لوٹس پوچر (کنول آسن) اور مین پوچر (پچلی آسن) کا ایک ایک چکر مکمل کیا اور ستر پر آ گیا۔

یہ ہر انسان کی عادت ہوتی ہے کہ سونے سے قبل وہ اس روز کے اہم واقعات کو ذہن میں ضرور دلاتا ہے۔ پایوں کہ لیں وہ واقعات از خود سوچ کے اندر سلسلہ وار چلے آتے ہیں۔ میں بھی اس ہنگامہ خیز دن کا ایک ایک لمحہ یاد کرنے لگا۔ یہ میری زندگی کا مصروف ترین دن تھا۔ آج میں نے بہت کچھ کھوایا اور بہت کم پایا تھا۔

اس خیال نے مجھے قدرے افسردہ کر دیا کہ میری ساحل ہنوز مجھ سے دور تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا۔ میں اس کے جتنا نزدیک ہونے کی کوشش کرتا وہ مجھ سے اتنے ہی زیادہ فاصلے پر چلی جاتی اور دوری نزدیک کے اس کیل میں ساحل کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ بے چاری تو میرے دشمنوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جیسے ڈوریاں ہلاتے اسے ان کے اشاروں پر بنا۔

میں اپنی زندگی میں ایسا مجبور اور..... بس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ چودہری نوازش اور شعیب غوری نے میرے بڑے نازک پہلو پر ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ ساحل..... رے لیے کسی دشمنی ہوئی رگ سے کم نہ تھی۔ اس کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو دیکھ کر میں بھی سوچتا: آخر یہ سب کیا ہے؟ میں اس قدر دیوانہ کیوں ہو گیا ہوں؟ کیا یہ میرا پاگل پن نہیں؟ ان تمام سوالوں اور ان جیسے سیکڑوں سوالوں کا صرف ایک ہی جواب آتا..... یہ کچھ بھی نہیں صرف محبت ہے۔ وہ محبت جو مجھے ساحل سے ہوتی ہے!

میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئیں اور آکر چلی گئیں۔ ہمارے درمیان دل لگی بھی ہوئی مگر ان میں سے کوئی تعلق دل کی لگی نہ بن سکا۔ میں نہیں جانتا تھا، خدا نہیں جانتا تھا کہ یہ دل کی لگی کیا ہوتی ہے! مجھے اس جذبے کی گہرائی اور گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ میں تو سمندر کے کنارے پر بیٹھا ہوا وہ تھا جس کو جاتی جاتی لہروں کو گتات رہتا ہے، درگھی یہ معلوم نہیں کر پاتا کہ اس سمندر کی گہرائی کتنی ہے۔ سوچ شماری کا مکمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ سمندر کی گہرائی جاننے کے لیے اس کے اندر اترنا پڑتا ہے خود کو اس کے اندر ڈبونا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر گھر پر مقصود ہاتھ آتا ہے!

میں ساحل کی تلاش میں محبت کے سمندر میں غرق ہوا جا رہا تھا۔ اب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہو رہا تھا کہ ڈوبنے والے ساحل کی تلاش کیوں کرتے ہیں.....

میں نے سونے سے پہلے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی اور اپنی جان تنہا ساحل کے تصور سے لپٹ کر نیند کی نرم آغوش میں دبک گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی چٹکی اور سنانے دار مچی! میں ابتدائی مصروفیات سے فارغ ہو کر ناشتے کے لیے بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ طاری روڑ پر پائے جانے والے ریٹورنٹس عموماً دیر سے کاروبار زندگی شروع کرتے تھے البتہ میری رہائش سے قحورے سے قحورے پر ایک ایرانی ریٹورنٹ ایسا بھی تھا جو علی الصباح مہمان نوازی شروع کر دیتا اور رات گئے تک وہاں آنے والوں کا تانتا بندھتا رہتا۔ مجھے کراچی کے جتنے بھی ایرانی ریٹورنٹس میں کھانے پینے کا اتفاق ہوا میں نے تمام کی تمام ڈشز کو ڈالتے میں ایک جیسا پایا۔ ان کی ریسیپشن بڑا توازن اور استحکام پایا جاتا ہے۔

میں آدھے گھنٹے بعد وہاں فلیٹ پر آ گیا۔ میں راستے میں سے ایک نیوز پیپر بھی خرید لیا تھا۔ اخبار کے مطالعے کے بعد پتا چلا کہ آج روڑ پر اس قدر خاموشی اور ایرانی کیوں تھی۔ اس روز فرانسس ٹرنر نے اسرائیل کا اعلان کر رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا ایڈمن کی قیمتیں کم کی جائیں یا پھر انہیں کرائے میں اضافہ کی اجازت دی جائے۔

بہر حال میں اپنے مطلب کی خبروں کی تلاش میں ورق گردانی کرنے لگا۔ پتی ای سی ایچ سوسائٹی والے واقعات کا کہیں ذکر نہ تھا تاہم بے ڈی ملک اور تار زمان کے بنگلوں پر پیش آنے والے واقعات کی خبریں موجود تھیں۔ اسی طرح منہاس باقر کے بنگلے پر ٹوٹنے والی قیامت کا احوال بھی بڑی تفصیل سے شائع ہوا تھا۔ تبصرہ نگاروں نے مختلف انداز میں اظہار خیال کیا تھا تاہم حکومت کے ذمے دار ادارے ان تین واقعات کو آپس میں نہیں کر کے گھسے پنے انداز میں دہشت گردی کی وارداتیں قرار دے رہے تھے اور عوام کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ یہ معلوم دہشت گردوں کو ”معلوم“ کرنے کے فوراً بعد گرفتار کر کے کڑی سزا دی جائے گی۔

حقیقت کتنی بھی! یہ صرف لوگ جانتے تھے جو ان واقعات کے ذمے دار تھے یا پھر ان واقعات سے متاثر ہوئے تھے۔ میں نے اخبار کو ایک صوفے پر بیٹھ دیا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے تیسری گھنٹی پر فون اٹھ دیا۔ میری ”ہیلو“ کے جواب میں شہزاد کی آواز مجھے سنائی دی۔

”ہیلو وجدان! گڈ مارننگ۔“

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر پوچھا ”خیریت تو ہے شہزاد! اتنی صبح کیوں نہ کیا؟“

”شاید تمہیں معلوم نہ ہو آج ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہے۔“

”مجھے معلوم ہو چکا“ میں نے اخبار میں خبر پڑھ لی ہے۔ ”میں نے کہا“ اور نیچے روڈ کا معائنہ بھی کر آیا ہوں۔

ایک دم سنا اور دیرانی ہے۔ ”اس نے کہا“ تم نے گزشتہ رات شیر ڈکوت کو خبر باد کہہ دیا تھا۔ تمہارے لیے سواری کا مسئلہ ہو جائے گا۔“

اس کی بات میں مجھے کچھ زیادہ اعتماد نظر نہ آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس موضوع کے عقب میں وہ کوئی اور بات کرنا چاہ رہا ہو۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا کیا کھڑا نہیں ہوگا۔ شاید تم نے خبر کو صحیح طور پر نہیں پڑھا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ گڑ بڑا گیا۔

میں نے کہا ”یہ ٹرانسپورٹرز کی اسٹرائیک ہے۔ رکشا نگاری اس سے برا ہیں اور تمہیں تو معلوم ہے میں عام طور پر پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر نہیں کرتا۔ اس صورت میں میرے لیے کیا پرالیم ہو سکتی ہے؟“

”اوہ!“ وہ جلدی سے بولا ”میرا اس طرف دھیان نہیں کیا تھا۔“

”وہ اس لیے کہ..... تمہارا دھیان کسی اور طرف لگا ہوا ہے!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کک..... کیا مطلب؟“ وہ بولکھ گیا۔

”وہی مطلب!“ میں نے اپنے لہجے میں سنجیدگی برفرا رکھی۔

”پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو!“ وہ جان چڑانے والے انداز میں بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا ”کوئی پیش رفت ہوئی؟“

”کس سلسلے میں؟“ اس کے سوال میں الجھن تھی..... ایسا ہوتا ہے!

”خیر چھوڑو۔“ میں نے اس کی گلو خلاصی کرتے ہوئے کہا ”یہ بتاؤ زرنگ کیسی ہے؟“

”خاصی ہارڈ ہے..... تم میرا مطلب ہے وہ بڑی مشکل ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔ وہ مشکل اور پیچیدگی تو ضرور ہے۔“ میں نے کہا ”بہر حال فرہاد اور بیچوں کی مشا میں تمہارے سامنے

ہیں۔ یہ کام اتنا آسان تو نہیں۔ پہاڑ گھوڑ کر دودھ کی نہر نکالنا پڑتی ہے۔“

”جتنے صحراؤں میں آبلہ پانچوہت کا پڑتا ہے۔“

”مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بظاہر شہزاد سے مخاطب ہوں مگر حقیقت میں وہ کام خود سے کر رہا ہوں۔ شہزاد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔“

”میں خود مشکل پسند ہوں۔ محنت مشقت سے نہیں گھبراتا۔ ایک دن میں اس پچر صورت کو موسمی گریز میں ضرور بدل دوں گا۔“

وہ جذبات میں خاصا مکمل کیا تو میں نے کہا ”یہ ہوئی تا مردوں والی بات تمہارے عزم کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے تم واقعی اپنے مقصد کو پا لو گے۔“

پھر ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر بات ہونے لگی۔ میں نے اس سے فیصل کی تازہ ترین کیفیت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ مزید ایک رات کے آرام کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ ہو شیار اور فٹ ہو گیا ہے۔ اور بار بار اسے مقابلے کے لیے اکسار رہا ہے۔ اس کے کندھے کا زخم بھی بہتر ہے وہ اسے خاطر ہی میں نہیں لار رہا۔ آخر میں شہزاد نے یاد دہانی کے انداز میں استفسار کیا ”وجدان تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“

”ابھی طرح یاد ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا ”آج تم اپنی زندگی کے دو اہم ترین سرے کر دو گے۔“

وہ چمکے ہوئے لہجے میں بولا ”دوسرے؟“ پھر خود کلائی کے انداز میں بڑبڑایا ”ایک تو فیصل سے دودھ ہاتھ کرنا ہیں مگر دوسرا کون کون سا ہے؟“

میں نے اس کے چٹکی کی ”کٹنا ہے زرنگ کے تصور نے تمہاری یادداشت کو گڑ بڑا دیا ہے۔ میں بے ڈی ملک کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کا معاملہ بھی آج ہی منٹ جائے تو اچھا ہے۔“

”اوہ!“ اس نے انتقام سے لب زب سانس خارج کی ”اس شیطان کی شرک سے تو میں اتنا بلینڈ فورہ چھڑاؤں گا کہ دو روز تک فضا خون رنگ ہو جائے گی۔“

میں نے کام کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا ”شہزاد! تم نے جی ڈی ملک کے دوست کا نام صفدر علی ہی بتایا ہے نا جو ناگھو ناظم آباد میں رہتا ہے؟“

”میری معلومات تو یہی ہیں۔“ وہ سرسری انداز میں بولا ”بے ڈی ملک ایک دور وازنک اسی کے بنگلے پر رہے گا۔ یعنی دوپٹس رہے گا۔“

”دوپٹس کو روٹا کر ضروری ہے۔“ میں نے خیال میں

ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”در اصل میں صفدر علی اور یوسف ہمدانی میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔“

”یوسف ہمدانی؟“ وہ چمکا ”اوہ! تم اس ریٹورنٹ کے مالک کا ذکر تو نہیں کر رہے!“

”تم بالکل درست سمت میں سوچ رہے ہو۔“ میں نے تائیدی لہجے میں کہا ”صفدر علی اور یوسف ہمدانی میں ”ناگھو ناظم آباد“ قدر مشترک ہے۔“ میں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر

میرسوج انداز میں کہا ”اسی طرح بے ڈی ملک اور اس کے پشت پناہ دوستوں میں ”سی ایف کے“ قدر مشترک ہے۔ یعنی پہلے وہ تار زمان کے پاس رکا اور اب صفدر علی کے بنگلے میں جا چکا ہے۔ یہ دونوں افراد سی ایف کے کے نہایت ہی اہم

مہرے ہیں اور.....“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا وقفہ کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”یہ بات پانچوہت کو کچھ بھی ہے کر رچ روڑ والا وہ لم ڈھینگ ستاری ایف کے کی کا ایک آلہ کار ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں صفدر علی اور یوسف ہمدانی میں بھی تو کوئی خاص تعلق نہیں پایا جاتا!“

”تم نے نہایت ہی اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔“ وہ فکر انگیز لہجے میں بولا ”میں اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا ”اس کے ساتھ تم بے ڈی ملک کو اس کی پناہ گاہ سے باہر لانے کی بھی کوئی ترکیب سوچو۔ میں چاہتا ہوں صفدر علی کے بنگلے پر کوئی ہنگامہ آرائی نہ کی جائے۔ اگر ہم اسے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو

زیادہ ”خوب صورت“ انداز میں کام کرنے کا مزہ آئے گا!“

بات کے اختتام پر میرا لہجہ خاصا سفاک ہو گیا تھا۔

شہزاد نے کہا ”میں دوپہر کے بعد تمہیں فون کروں گا۔ ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے۔ ساحل والا معاملہ تو

سچ میں لک کر رہ گیا ہے!“

میں نے اپنے جگر میں ایک میس سی اٹھی محسوس کی، کسی انجانے خیال کے زیر اثر میں نے ہمدانی کو بولی آواز میں کہا۔

”یہ معاملہ اب لٹکا ہوا نہیں رہے گا۔ آج کی رات فیصلہ کن ثابت ہوگی!“

”اس کا مطلب ہے تمہارے ذہن میں کوئی پروگرام ترتیب پا چکا ہے؟“

”جس ایسا ہی سمجھو۔“ میں نے گہمیر لہجے میں کہا ”مگر ترتیب نہیں بھی پایا تو سورج غروب ہونے سے پہلے یہ کام ہو جائے گا۔ آنے والی رات شعیب غوری اور اہل کی شیطانی

آتش فشاں (193) حصہ 10

تفہیم کے لیے بہت بھاری ثابت ہونے والی ہے۔“  
شہزاد نے مضبوط لہجے میں کہا ”انشاء اللہ اس وقت تک میں بھی فیصلہ درجے ڈی ملک کو ملنا چکا ہوں گا۔ سال والے مشن کے لیے ہم دونوں ایک ساتھ روانہ ہوں گے!“  
”نہیں!“ میرے اس یک لفظی جملے میں بڑی قطعیت تھی۔

دوسری طرف بکسر خاموشی چھا گئی۔  
چند لمحوں کے بعد میں نے اسی کبیر اور حتی لہجے میں کہا ”شہزاد! دوست احباب انسان کے دست و بازو ہوتے ہیں لیکن آج کی رات میں اپنے کسی بھی ہمدرد کو رخصت نہیں دوں گا۔ میں انہیں پہلے ہی بہت سے جھموں میں جھونک چکا۔ ساحل کی تلاش اور حصول والا مرحلہ اب مجھے تنہا ہی طے کرنا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“  
جب کوئی انسان اہل اور دونوں فیصلہ سنا دے تو پھر جرح و بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شہزاد میری ثابت قدمی اور قوت ارادی سے یہ غولی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا میں آگے اٹھنے والے قدم کو واپس نہیں ڈالتا لیکن ایک شخص دوست ہونے کے ناتے وہ مجھے سمجھانے اور قائل کرنے کے فریضے کو نہ بھولتا۔

لیکن اس نے کچھ کہنے کے لیے جیسے ہی زبان کھولنا چاہی میں نے سختی سے منع کر دیا ”نہیں شہزاد! میں نے جو کہہ دیا اس سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں۔ میں اپنوں کو پہلے ہی بہت دکھ پہنچا چکا ہوں۔ اب نہیں۔۔۔۔۔ بالکل نہیں!“  
”ٹھیک ہے بعد میں دیکھیں گے۔“ وہ جی بر مصیحت لہجے میں بولا ”آج کا سورج غروب ہونے میں ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ تمہارا مشن تو ویسے ہی کسی رات ہی کو شروع ہوگا!“  
مزید دو چار گنی باتوں کے بعد میں نے رابطہ ختم کر دیا۔  
شہزاد سے ہونے والی گفتگو پر جب میں نے غور کیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے اس کے ساتھ زیادتی کر دی ہو۔ وہ میرا بے لوث اور جان غار دوست تھا۔ میری ہمدردی سے مجبور کر رہی تھی کہ کڑے وقت میں میرا ساتھ دے کاندھے سے کندھا ملا کر دشمنوں کی صفوں میں گھسلی بچا دے اور میں نے بڑی درستی سے اسے کارز کر دیا تھا۔  
مگر میں کیا کرتا! میں بھی تو اس معاملے میں مجبور تھا۔ میں اپنی دشمنی کی آگ میں کتنوں کھسکا؟ دشمنوں کو تو ایک مشغلہ مل گیا تھا۔ وہ مجھے بھڑکانا چاہتے تھے اور جب میں نشانہ نہ بنیں آتا تھا تو وہ میرے کسی پیارے کو ہار گت بنا لیتے تھے! اس گمان میں کہ شاید میں نے اس ہار گت کے پیچھے پناہ

لے رکھی ہو! وہ گمان سے یقین تک پہنچنے کے لیے بے دریغ ہلاکتیں کر رہے تھے۔ میرے اپنے ”میرے ہمدرد“ میرے پیارے ایک ایک کر کے ان کے ہاتھوں اپنی زندگیوں گنوار رہے تھے۔ یہ حالات میرے لیے سوہان روح تھے دل کا آزار تھے!

میں نے شہزاد سے جس رویے کا اظہار کیا اس پر مجھے افسوس تو ہوا لیکن یہ سوچ کر میں نے خود کو کلی دے لی کہ یہ افسوس اس ذیباں کا پاسنگ بھی نہیں جو میری مستقل ہم راہی میں اس کے حصے آتا۔ پتا نہیں میری یہ سوچ کس حد تک درست تھی! بہر حال اس وقت میرے ذہن کی جو کیفیت تھی اس کے پیش نظر میں اس دائرے سے باہر سوچ نہیں پار تھا۔ ابھی تک میں نے ساحل کو دست یاب کرنے کے لیے لاکھ میل تیار نہیں کیا تھا۔ میرا اشارہ ”ایسٹ“ کی جانب ہے۔ جدید کا دعویٰ تھا ٹھیک بیٹانی ساحل کو اپنے ساتھ پولیس موہاں میں سراج الدین کے پاس ایسٹ لے گیا تھا۔ اگر میں چند کی بات کا یقین بھی کر لیتا تو مجھے بہت سوچ بچھ کر ایک پلان کے تحت اس جانب پیش قدمی کرنا چاہیے تھی اور اس کے لیے یقین دہانی ضروری تھی۔۔۔۔۔ یعنی اسی بات کا پتا چلنا ضروری تھا کہ ساحل واقعی ایسٹ میں موجود بھی ہے یا اسے وہاں سے کہیں اور پہنچا دیا گیا ہے۔

اب تک کچھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ رکھاں والی سے ساحل کو لاہور کے ایک میٹھے ترین اسپتال پہنچایا جانے والا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پتا چلا اسے صفائی ایک شخص کی کوئی پ پہنچا دیا گیا ہے۔ میں صدف کے ساتھ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا تھوڑی دیر پہلے اسے چوہدری ولداری کوئی شکل کر دیا گیا ہے۔ ہم نے پوری تیاری کے ساتھ چوہدری ولداری کوئی پ ایک کامیاب آپریشن کیا جس کے نتیجے میں چوہدری نوادش کا بیٹا فیصل ہمارے ہاتھ چڑھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ پانچویں اطلاع بھی ملی کہ ساحل کو لاہور سے کراچی بھیج دیا گیا ہے۔ اور یہاں کراچی میں۔۔۔۔۔ بڑی خوش اسلوبی سے ساحل اور فیصل کا تبادلہ ہونے والا تھا کہ شعیب غوری نے چوہدری نوادش کو درغلا کر عہد شکنی پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ساحل ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ فیصل ابھی تک میری دست رس میں تھا لیکن میں نے اس کا چارہ ڈالنا تھا کیا؟

تازہ ترین واقعہ کڑ شہزاد نے ہی ایچ ایس کے بچے والا تھا۔ ساحل میرے ہاتھ آتے آتے نکل گئی اور اب ایسٹ! میری سوچ میرے کمرے کے لیے بھی تھی اور میں نے اسی لئے کے پتا نہیں کس حصے میں فیصلہ کیا کہ میں پہلے ایسٹ

ساحل کی موجودی کو کفر میں کروں گا اور پھر مدھر کی بازی کا کر اکیلا ہی اسے شعیب غوری کے پنجوں سے نکالنے وہاں جا پہنچوں گا۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ منہاس باقر بہت بار سوخ اور طاقت ور شخص تھا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی اس کی اچھی یادداشت تھی۔ میں اس کی مدد اور تعاون سے ایسٹ پر چڑھائی کر دیا تھا اور وہ اس کام میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا اس سے پہلے منہاس کے تعاون سے ساؤتھ پر ایک کامیاب آپریشن کر کے وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی جس کے نتیجے میں کبیر شاہ جیسا چنگا دہری دم دبا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ مگر ایک نعمت آج بھی ایک غلط بردار احساس میری زبان کا قفل بن جاتا میری مدد اور تعاون کی یادداشت میں اس کا آشیانہ اجڑ گیا۔ میں اسے اور کتنی آزمائشوں میں ڈالتا؟ البتہ میں اس کے ایک حلق کو استعمال میں لا کر اپنے لیے بہت آسانیاں پیدا کر سکتا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے منہاس باقر کے نمبر ڈائل کیے۔ فون اسی نے ریسیو کیا۔ رکی اور بوہل علیک سلیک کے بعد اس نے میری آئندہ سرگرمیوں کے بارے میں احتیاط کیا میں نے بے ڈی ملک کے بارے میں شہزاد سے ہونے والی گفتگو سے اسے آگاہ کر دیا۔ وہ پوری بات سننے کے بعد کبیر آواز میں بولا۔

”قانون شکن اور سفاک قاتلوں کو عدالت سے قرار واقعی سزا دلوانا خاصا پیچیدہ عمل ہے اور خاص طور پر جب یہ لوگ شعیب غوری اور بے ڈی ملک جیسے طاقتور بھی ہوں تو ان کے خلاف ثبوت و شواہد جمع کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ عدالت تو ہر بات کا ثبوت مانگتی ہے لہذا ان لوگوں سے پانچویں سیکرٹ میں نمٹنا ہی بہتر ہے۔“

منہاس نے بڑے ڈٹے چیمے انداز میں ہمیں کسی بھی سنگین کارروائی کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے کہا ”آپ جیسا سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

”ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔  
”آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔“  
”تمہاری ساحل والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“

”بے ڈی ملک کے بعد اھر کارز کروں گا۔“ میں نے ہنسا جواب دیا۔

”میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دیتا۔“  
”میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے منہاس صاحب!“ میں نے بڑے رساں سے کہا۔

”ہاں ہاں بولو۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“  
”وہ آپ کا جائے والا میک اپ ماسٹر نیم جوہر ہے نا!“ میں نے کہا ”جس نے مجھے سہیل کا روپ دیا تھا۔ مجھے اس شخص کی ضرورت ہے کم از کم دو گھنٹے کے لیے۔“

اس فن کار نے مجھے میک اپ کے بارے میں نہایت ہی اہم نہیں دی تھیں۔ میں اس کے ساتھ دو تین گھنٹے کے ایک ”سیشن“ میں مزید کچھ کیٹنا چاہتا تھا۔  
”خیریت تو ہے تم نیم سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟“

منہاس نے پوچھا۔  
میں نے اپنا مقصد بیان کیا اور کہا ”اس کا بتایا ہوا ایک ایک کتہہ میرے ذہن میں نقش ہے میرا خیال ہے اگر وہ مجھے دو تین گھنٹے اور دے دے تو میں اس سلسلے میں ہر قسم کی محتاجی سے محفوظ ہو جاؤں گا۔“

منہاس نے کہا ”شوہرے متعلق لوگ رات دیر تک بلکہ صبح تک جاگتے ہیں اسی لیے ان کی بیداری دن چڑھے اور بعض اوقات دوپہر کو ہوتی ہے۔ میں نیم کو فون کر کے دیکھتا ہوں وہ کس پوزیشن میں ہے۔“

میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”آپ اس سے یہ بھی کہہ دیجئے گا کہ میک اپ اور گیٹ اپ کا سامان وافر مقدار میں اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں اس سامان کی قیمت ادا کروں گا۔“

”کیا کسی گروپ کا میک اپ کروانا ہے!“ منہاس نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

میں نے وضاحت کی ”یکسٹر اسامان میں اپنے اسٹاک کے لیے منگوا رہا ہوں۔“

منہاس نے میرا کام کرنے کی ہامی بھری اور کہا ”میں نیم سے بات کرنے کے بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔“

ٹھیک دس منٹ بعد منہاس کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ نیم جوہر ابھی سوکر اٹھا ہے ”اس نے کہا ہے وجدان کو میرے اسٹوڈیو پر بھیج دیں۔ وہاں اسے کیٹنے اور کیٹنے میں بہت آسانی رہے گی۔ وہاں ہر نوعیت کے سامان کی وافر مقدار بھی موجود ہے دراصل۔۔۔۔۔ منہاس تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”نیم کو تین بجے کسی نہایت ہی اہم اسائنمنٹ پر جانا ہے۔ اسی سلسلے میں اسے اسٹوڈیو میں کچھ ضروری تیاری کرنا ہے۔ اگر وہ دو تین گھنٹے کے لیے تمہارے پاس آگیا تو اس کا کام متاثر ہوگا۔ اسٹوڈیو میں رہتے ہوئے وہ ہمیں بھی ذیل کر لے گا اور اپنا کام بھی جاری رکھے گا۔“

”ٹھیک ہے“ آپ مجھے اس کا اسٹوڈیو ایڈریس دے دیجئے گا۔“

میں نے ٹھیک فونک رابطہ موقوف کر کے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں یہ مشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ صرف آدمی۔

”وہ تم سے زیادہ دور نہیں۔“ منہاس نے کہا ”تم چاہو تو ملتے ہوئے اس کے اسٹوڈیو تک جاسکتے ہو۔“

وہ جیٹ اور ٹی شرٹ میں بڑی اسارٹ لگ رہی تھی۔ میں نے عموماً اسے مغربی لباس ہی میں دیکھا تھا۔ پتا نہیں اس کی عادت تھی یا وہ میرے پاس آنے کے لیے خاص اہتمام کرتی تھی؟ ہمارے درمیان رکی علیک سلیک ہوئی پھر میں نے اس سے پوچھا۔

اس کے بعد منہاس نے مجھے نسیم جوہر کے اسٹوڈیو کا پتا اور فون نمبر نوٹ کر دیا۔ مذکورہ اسٹوڈیو خالد بن ولید روڈ کے اس پار ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے میں واقع تھا۔ برک ریڈ اور دہائی گرین کمر کا حامل وہ بنگلا آرٹ کا ایک عمدہ نمونہ نظر آتا تھا۔ نسیم جوہر کے اسٹوڈیو تک پہنچنے کے لیے ہاکی گراؤنڈ کے قریب سے گزرتا پڑتا۔ یہ پی ای سی ایچ سوسائٹی کا ایک صاف ستھرا اور عالی شان علاقہ تھا۔

”صرف؟“ ہم لوکل ڈریس نہیں پہنتی ہو؟“

”بہت کم!“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے بولی ”کسی سامی تقریب یا شادی بیاہ کے موقع پر بہن لگتی ہوں درنہ عموماً میں پینٹ شرٹ کو پسند کرتی ہوں۔ اس لباس میں انسان بہت چست رہتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا ”کیا تمہیں یہ لباس اچھا نہیں لگتا؟“

میں نے منہاس باقر کا شکریہ ادا کیا تو وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا ”وہ ان! میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔ اب یہ بھی سن لو میں تمہیں کیوں فون کرنے والا تھا۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا ”تم آج شام سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر آؤ۔ تم سے ایک ضروری کام ہے۔“ اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا اور نہ تم ہر لباس میں اچھی ہی لگتی ہو۔“

”اس تحریف کا شکریہ۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا ”کیا تم۔“ اشنا کر لیا؟“

میں چونک اٹھا ”کیسا کام منہاس صاحب؟“

”تم یہاں آؤ گے تو بتاؤں گا۔“ وہ مبہم لہجے میں بولا۔

میں اور زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا ”خیریت تو ہے نا؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا ”آج کا کیا پروگرام ہے؟“

”ابھی کچھ سوچا نہیں۔“ میں نے دانستہ اسے اپنے پروگرام سے بے خبر رکھا۔

”بالکل خیریت ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”دراصل میں تمہیں کچھ لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں بلکہ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہاں آؤ گے تو بات ہوگی۔ تم کسی گھر میں نہ پڑنا۔ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ سہ پہر کے بعد کسی وقت بھی تھوڑی مہلت نکال کر ادھر کا ایک چکر لگاؤ۔ سب لوگ بیٹھ کر چند باتیں کریں گے۔ وقت اچھا بہل جائے گا!“

وہ بولی ”پھر تو ٹھیک ہے!“

”کیا ٹھیک ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے بتایا ”آج تم مجھے میرے ساتھ کر گے۔“

میں نے اس کی بات کاٹی ”وہ کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں کہتے؟“ اس بات کو چھوڑو۔ تم بتاؤ تمہارے پاپا اور ماما مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

جب کسی جوان لڑکی کے والدین کسی جوان لڑکے سے ملنے کے لیے اسے اپنے گھر کھانے پر بلائیں تو یہ ایک خطرناک اور منفی خیر صورت حالات کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اسی

”اوہ!“ میں الجھ کر رہ گیا اور پوچھا ”کیوں کوئی خاص بات ہے؟“

”میرے ماما پاپا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”مجھ تو ایک بہانہ ہے وہ کیا کہتے ہیں۔ تقریب کچھ تو۔“

میں نے اس کی بات کاٹی ”وہ کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں کہتے؟“ اس بات کو چھوڑو۔ تم بتاؤ تمہارے پاپا اور ماما مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

جب کسی جوان لڑکی کے والدین کسی جوان لڑکے سے ملنے کے لیے اسے اپنے گھر کھانے پر بلائیں تو یہ ایک خطرناک اور منفی خیر صورت حالات کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اسی

حوالے سے بدک کر صدف سے سوال کیا تھا۔  
وہ جلدی سے بولی ”تم جو سمجھ رہے ہو ایسی کوئی بات نہیں!“

اس کے انداز میں شرارت آمیز معنی بختری پوشیدہ تھی۔ میں نے ایک طویل سانس کھینچے ہوئے گہری نظر سے اسے دیکھا اور کہا ”پھر؟“

”پھر یہ کہ وہ تم سے صرف ایک ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”تمہاری بہت تعریف ان تک پہنچی ہے جس کے نتیجے میں ان کے اندر تم سے ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔“

”مجھ میں ایسی تعریف والی کون سی بات ہے؟“ میرا لہجہ سرسری تھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا انہی کو جا کر بتانا!“

”تم نے ہی ان سے میرا تعارف کروایا ہوگا!“

”ہرگز نہیں!“ وہ دونوں انداز اختیار کرتے ہوئے بولی ”تم لاہور میں میرے ڈی ایس بی ماموں سے مل چکے ہو۔ وہ تمہارے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن یعنی میری ماما کو بتایا وہاں سے یہ بات پاپا تک پہنچ گئی ہاں.....“

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا متوقف ہوئی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی ”ہاں مجھ سے صرف اتنا ہوا ہے کہ میں نے تمہاری صلاحیتوں کی تصدیق کی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“

بات ختم کر کے وہ مصحوبیت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی مصحوبیت میں مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے تیر لہجے میں کہا۔

”گوئیاتم نے صرف بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کا کام کیا ہے؟“

”اب تم جو بھی مطلب اخذ کرتے پھرو۔“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے کہا ”صدف! آج یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کھانے کے پروگرام کو پھر بھی پرناں دو۔“

”اس کا مطلب ہے تمہارا آج کا دن بیک ہے؟“

”بالکل ایسا ہی سمجھا!“

”لیکن تھوڑی دیر پہلے تو تم نے کہا تھا ابھی کچھ سوچا نہیں؟“

تک میں واقعی کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا بلکہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

”تو گوئیاتم نے مجھ سے گفتگو کے دوران میں سوچ لیا؟“ وہ شکایت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

یہ بات نہیں تھی کہ میں صدف سے غلط بیانی کر کے اپنے پروگرام سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔ دراصل میں گہری مصلحت کے تحت وہ اوجھڑ کر رہا تھا۔ اگر اسے یہ آج کے ہنگامے خیر پروگرام کی بھگ بھی پڑ جاتی تو وہ سائے کے مانند میرے ساتھ لگ جاتی اور..... میں نہیں تھا وہ خواہ وہ کسی مصیبت کا شکار ہے۔ میں شخص اس کی خاطر یہ چکر چلا رہا تھا۔

اس کے سوال کا جواب دینا ضروری تھا۔ لہذا میں نے گول مول انداز میں کہا ”میں نے“ سب کچھ“ کا دعویٰ نہیں کیا صدف! میں نے تو یہ کہا ہے کہ میں مسلسل سوچ رہا تھا..... میں فی الحال اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فوری طور پر کیا کرنا ہے۔“

وہ ابھن بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی کیا ہے؟“

”مجھے ایک یونیشن سے ملنے جانا ہے۔“

”یونیشن کے پاس۔“ وہ چونکی ”کس سلسلے میں؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں ایک ماہر میک اپ شے کے چند اسرار و رموز سیکھنے جا رہا ہوں تو وہ ٹھکے ہوئی۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ وہاں سے فار ہونے کے بعد ہم کھر جائیں گے۔“

وہ اپنی ضد پر قائم تھی میں نے کہا ”وہاں دو تین گھنٹے زیادہ لگ جائیں گے اس لیے لہج کا پروگرام نہ ہی اچھا ہے۔ میں نے کہا تھا پھر بھی چلوں گا تمہارے گھر۔“

”ٹھیک ہے میں اپنے گھروں کر کے انہیں آج کے منع کر دیتی ہوں۔“ وہ جی بڑ مصلحت انداز اختیار کرتے ہوئے یہ پروگرام بعد میں دیکھا جائے گا لیکن.....“

ادھر اچھوڑ کر تیر نظر سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی پھر لہجے میں بولی ”لیکن میں تمہارے ساتھ بیٹھنے کے با ضرور جاؤں گی!“

میں اپنے خیال میں سر ہل کر رہ گیا۔ یہ ظاہر میں نے گردن کو دو بار فانی میں جیش دی اور ایک گہری سانس کرتے ہوئے اس پست قامت قیامت کو کھینچ لگا۔

آئندہ میں سیکڑ کے اندر اس نے اپنے گھروں کی انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ صدف نے ریسورڈ دکھانے

خبردار کے خبردار کل لگے گا۔

”تو گوئیاتم نے مجھ سے گفتگو میں ہمارے درمیان بھی ملے پایا تھا کہ وہ کوشش گفتگو میں کرے گا لیکن موجودہ حالات میں میں نہیں جانتا تھا“ ہم جوہر کے اسٹوڈیو پر کھڑی دیر لگے گی لہذا

نہیں جانتا تھا“ ہم جوہر کے اسٹوڈیو پر کھڑی دیر لگے گی لہذا

ڈانٹ کی تکمیل پر دوسری جانب کھنٹی بجی۔ دوسری کھنٹی پر

بجی کے فون ریسو کیا۔ میں نے اس کی خبر خیریت دریافت کی تو وہ پوچھنے لگی ”جداں! تم اس وقت کہاں ہو۔ ہماری طرف کب آؤ گے؟“

میں نے تبہم اور محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے جواب دیا ”فلٹ پر ہوں اور آج دن میں کسی وقت ادھر جا کر لگاؤں گا۔“ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی تھی

میں نے استفسار کیا ”شیراد کہاں ہے؟“

”وہ ابھی پانچ منٹ پہلے نکلا ہے۔“ زرگل نے

بتایا ”ایک گھنٹے میں وہاں کبہ کر گیا ہے۔“

تو اس کا مطلب تھا وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ مجھے امید نہیں تھی شیراد نے زرگل کو اس سلسلے میں کچھ تفصیل بتائی

وہ اتنا تصدیق کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”اس نے ہمیں کچھ بتایا وہ کہاں جا رہا ہے؟“

”نہیں“ وہ تعلیت سے بولی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ”تم کسی قسم کی پریشانی

دھنوں میں کر رہی ہو؟“

پھر جلدی سے وضاحت بھی کر دی ”میرا مطلب ہے

میں تمہارے لیے کوئی پرابلم تو پیدا نہیں کر رہا؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولی ”وہ پوری طرح

برسرِ کنٹرول میں ہے۔“

خبردار کے خبردار کل لگے گا۔

”تو گوئیاتم نے مجھ سے گفتگو میں ہمارے درمیان بھی ملے پایا تھا کہ وہ کوشش گفتگو میں کرے گا لیکن موجودہ حالات میں میں نہیں جانتا تھا“ ہم جوہر کے اسٹوڈیو پر کھڑی دیر لگے گی لہذا

نہیں جانتا تھا“ ہم جوہر کے اسٹوڈیو پر کھڑی دیر لگے گی لہذا

ڈانٹ کی تکمیل پر دوسری جانب کھنٹی بجی۔ دوسری کھنٹی پر

بجی کے فون ریسو کیا۔ میں نے اس کی خبر خیریت دریافت کی تو وہ پوچھنے لگی ”جداں! تم اس وقت کہاں ہو۔ ہماری طرف کب آؤ گے؟“

میں نے تبہم اور محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے جواب دیا ”فلٹ پر ہوں اور آج دن میں کسی وقت ادھر جا کر لگاؤں گا۔“ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی تھی

میں نے استفسار کیا ”شیراد کہاں ہے؟“

”وہ ابھی پانچ منٹ پہلے نکلا ہے۔“ زرگل نے

بتایا ”ایک گھنٹے میں وہاں کبہ کر گیا ہے۔“

تو اس کا مطلب تھا وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ مجھے امید نہیں تھی شیراد نے زرگل کو اس سلسلے میں کچھ تفصیل بتائی

وہ اتنا تصدیق کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”اس نے ہمیں کچھ بتایا وہ کہاں جا رہا ہے؟“

”نہیں“ وہ تعلیت سے بولی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ”تم کسی قسم کی پریشانی

دھنوں میں کر رہی ہو؟“

پھر جلدی سے وضاحت بھی کر دی ”میرا مطلب ہے

میں تمہارے لیے کوئی پرابلم تو پیدا نہیں کر رہا؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولی ”وہ پوری طرح

اس دوران میں صدف کھنٹی کھنٹی ہانڈے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ ٹیل فونک رابطہ ختم ہوا تو وہ معنی خیز لہجے میں بولی ”پھلانی

سے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے؟“

وہ اپنی فطری جبلت سے مجبور تھی درنہ میرے اور زرگل کے درمیان ہونے والی گفتگو کے لیے ”راز و نیاز“ جیسے الفاظ

موزوں نہیں تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قدرے خشک لہجے میں کہا۔

”صدف! جو کچھ بھی ہوا تمہارے سامنے ہی تو ہوا ہے کیا تم نے کان بند کر رکھے تھے؟“

وہ تھکے لہجے میں بولی ”میرے کان بند تھے اور نہ ہی

آنکھیں لیکن میں تمہارے خیالات تو نہیں پڑھ سکتی نا!“

میں نے کہا ”خیال خوانی یعنی“ تھاٹ ریڈنگ“ ایک

باقاعدہ علم ہے اگر تمہیں میرے خیالات پڑھنے کا اتنا ہی شوق

ہے تو تم یہ علم سیکھ لو۔“

”تم کبھی چیتھی کا ذکر تو نہیں کر رہے؟“

”ہاں! ٹیلی چیتھی کا ہی آسان انگریزی ترجمہ“ تھاٹ

ریڈنگ“ ہے۔ اردو میں ”خیال خوانی“ کہہ لو۔ ٹیلی وژن ٹیلی

فون اور ٹیلی اسکوپ کی طرح یہ بھی ایک سائنس ہے جس کے

حصول کے لیے بڑی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی

ہے۔“

”مارکٹ میں اس علم پر جو کتابیں موجود ہیں ان کے

مطالعے سے تو ٹیلی چیتھی نہیں سیکھی جاسکتی۔“ وہ تھکی لہجے میں بولی ”بات کو بہت ابھرا کر تحریر کیا جاتا ہے۔“

اس دوران میں صدف کھنٹی کھنٹی ہانڈے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ ٹیل فونک رابطہ ختم ہوا تو وہ معنی خیز لہجے میں بولی ”پھلانی

سے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے؟“

وہ اپنی فطری جبلت سے مجبور تھی درنہ میرے اور زرگل کے درمیان ہونے والی گفتگو کے لیے ”راز و نیاز“ جیسے الفاظ

موزوں نہیں تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قدرے خشک لہجے میں کہا۔

”صدف! جو کچھ بھی ہوا تمہارے سامنے ہی تو ہوا ہے کیا تم نے کان بند کر رکھے تھے؟“

وہ تھکے لہجے میں بولی ”میرے کان بند تھے اور نہ ہی

آنکھیں لیکن میں تمہارے خیالات تو نہیں پڑھ سکتی نا!“

میں نے کہا ”خیال خوانی یعنی“ تھاٹ ریڈنگ“ ایک

باقاعدہ علم ہے اگر تمہیں میرے خیالات پڑھنے کا اتنا ہی شوق

ہے تو تم یہ علم سیکھ لو۔“

”تم کبھی چیتھی کا ذکر تو نہیں کر رہے؟“

”ہاں! ٹیلی چیتھی کا ہی آسان انگریزی ترجمہ“ تھاٹ

ریڈنگ“ ہے۔ اردو میں ”خیال خوانی“ کہہ لو۔ ٹیلی وژن ٹیلی

فون اور ٹیلی اسکوپ کی طرح یہ بھی ایک سائنس ہے جس کے

حصول کے لیے بڑی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی

ہے۔“

”مارکٹ میں اس علم پر جو کتابیں موجود ہیں ان کے

مطالعے سے تو ٹیلی چیتھی نہیں سیکھی جاسکتی۔“ وہ تھکی لہجے میں بولی ”بات کو بہت ابھرا کر تحریر کیا جاتا ہے۔“



جانتا!

وہ قدرے مایوسی سے بولی، "ٹیلی بیسی تو خیالات پڑھنے کا علم ہے۔ کیا اس سے انسان کی نیت بھی پڑھی جاسکتی ہے؟" "بیسیوں کا احوال صرف اللہ کو معلوم ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ خاموش نظر سے مجھے ٹٹولنے لگی۔

میں نے پوچھا، "تم کس کی نیت پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"سبک..... کسی کی نہیں....." وہ گڑبڑا گئی۔

میں اس کی گڑبڑاہٹ کو بہت دور تک سمجھ رہا تھا۔ اس کی کیفیت کے پیش نظر میں نے کہا، "تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے..... یعنی گڈ نیوز!"

"یہی گڈ نیوز؟" اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا، "میرا وہ پوچھواری شہزادہ تمہاری اس پٹھانی زرگل میں دھپکی لے رہا ہے۔"

اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ جھلکانے لگے مگر اپنے تاثرات کی کمی کرتے ہوئے اس نے غیر متعلق انداز میں کہا، "وہ میری پٹھانی کب سے ہوگی۔ تم خواہ تو اسے میرے کھاتے میں کیوں ڈال رہے ہو؟"

"چلو! میں نے اسے اپنے کھاتے میں رکھ لیا۔" میں نے صدف کو چھیڑا، "بہر حال شہزادہ بڑے پھر پورا انداز میں زرگل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھو یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے!"

اس نے کرپنے والے انداز میں پوچھا، "تمہیں شہزادہ کی اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں؟"

"میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا،" میں نے اس کے زاویے کو سمجھتے ہوئے کہا، "ویسے شہزادہ نے مجھ سے 'این اوئی' لے لیا ہے۔"

"اوہ!" صدف نے ایک طویل اور گہری سانس کھینچی۔ اس "اوہ" میں دنیا جہان کا سکون بھرا ہوا تھا۔ زرگل کے حوالے سے اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی اور وہ یہ کہ ساحل کے معاملے میں صدف نے بھی کسی قسم کا کوئی متنی یا اعتراضی رویہ ظاہر نہیں کیا تھا! البتہ وہ زرگل کو مجھ سے دور دیکھنے کی تمنا کرتی تھی۔ میرے انداز سے کے مطابق اس کا یہ رویہ ایک خاص زاویے کا تھا۔ وہ ساحل کے علاوہ کسی لڑکی کو میرے قریب دیکھنے کی راہ روا نہیں تھی۔ اس کی محبت کا یہ پہلو بڑا منفرد اور انوکھا تھا۔ میں نے اس پر غماخ غور کیا، اچھٹا چلا گیا۔

صدف ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں سمجھنا آسان نہیں تھا۔ ان پر غور و فکر سے سمجھ کی چولیس بل کر رہ جاتی ہیں! تھوڑی دیر بعد ہم صدف کی وہانت میں سناٹا اسٹوڈیو کی طرف جا رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کابینہ تھا اور میں ایڈریس کے سلسلے میں اس کی راہ نکالتا تھا۔ میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

"صدف! تمہارے بازو کا زخم اب کیسا ہے؟" لاہور میں چوہدری دلداری کو کوئی پر فعلیہ کو کاٹ کر ہوئے صدف کا بایاں بازو کتنی سے قریب سے ڈھکی ہو کر لگ بھگ دو انچ کا کٹ آیا تھا، بعد ازاں میں نے اس کی ہڈی پر پٹی کر دی تھی۔ صدف خود بھی ایک ڈاکٹر تھی۔ میری سیدھا سادگی اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

اس نے بتایا، "زخم ٹھیک ہے۔ تھوڑی آسٹیشن اور دیر ہے۔ بہر حال یہ بازو استعمال کرنے میں مجھے کمی دکھائی دے رہی ہے۔"

ہم مذکورہ اسٹوڈیو پہنچ گئے۔

نیم جوہر ایک بیوٹیشن ہی نہیں بلکہ وہ ایک بہتر ڈریسر بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے فوٹو گرافی کے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ جس طرح ایک ماہر بلاکسٹر ایک اچھا آرٹسٹ بھی ہوتا ہے، اسی طرح نیم جوہر بھی ایک آرٹسٹ تھا۔ ایک انسان کے چہرے پر کام کر کے اسے دوسرے انسان کا حلیہ دینا آرٹسٹ میں تو اور کیا ہے۔ شاید وہی کد اس نے اپنے "کارخانے" کا نام اسٹوڈیو رکھا تھا۔

صدف نے مجھے بتایا کہ وہ نیم جوہر کے نام اور شہزادہ کے واقف سے تاہم ملاقات کا آج پہلی مرتبہ موقع مل رہا ہے۔ نیم نے پرتپاک استقبال کیا۔ اندر سے میں نے اسے اسٹوڈیو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہاں کی آرٹسٹ دنیا بھر کے الا تواری معیار کی تھی۔ ہماری مختصری تواضع کے بعد وہ صدف سے بات پرا گیا۔

میں نے کہا، "ایک تو آپ مجھے تبدیل کریں یعنی بہتر چہرے کو پہنچ دیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ مزید کارآمد تہذیبی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلے میں خود ہو جاؤں۔"

وہ بات سننے کے دوران میں یہ غور میرے چہرے پر چلتا رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے کہا، "کیا تم مخصوص شخص کے لیے میں آنا چاہتے ہو؟"

"نہیں،" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا، "میں بس اتنا چاہتا ہوں! وجدان نظر نہ آؤں باقی سب کچھ آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

"تمہارے فیس کٹس ماضی کے ایک سپر اسٹار سے بڑی حد تک ملتے ہیں۔" وہ کبھی انداز میں بولا اور مسلسل میرے چہرے کو گھورتا رہا۔

میں نے پوچھا، "کہاں کے سپر اسٹار! ہالی ووڈ یا بھڑلائی ووڈ؟"

"میں ہالی ووڈ کے مایہ ناز اداکار مل براؤن کی بات کر رہا ہوں!"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا، "میں نے مل براؤن کی دو تین فلمیں دیکھی ہیں لیکن ہم دونوں کی مشابہت میں بہت فرق ہے۔"

"میں مشابہت کی نہیں، فیس کٹس کی بات کر رہا ہوں!" "ٹھیک ہے،" آپ مجھے اس کے اریب قریب بتادیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا، "مگر میرے بال سلامت رہنا چاہئیں!"

وہ زبر لب مسکرایا اور بولا، "تم اس کی فکر نہ کرو۔" ہالی ووڈ کا معروف اداکار مل براؤن ٹیلی سولاس کی طرح ہر وقت اپنا سر منڈوا کر رکھتا تھا۔ بے بال سر ان کی مخصوص شناخت تھی۔ تاہم ہمیں محاورے کے مطابق وہ دونوں فارغ البال بھی تھے یا نہیں!

نیم اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے مفید مشوروں سے بھی نوازنے لگا۔ جب اس نے میرا ایک آپ ختم کیا تو میں اس دنیا کے اقل تعداد میں اداکاروں سے آگاہ ہو چکا تھا۔ بس تھوڑی سی پریکٹس کی ضرورت تھی..... پریکٹس ہی کسی شے کو مکمل بناتی ہے!

نیم نے کہا، "میں نے تمہارا جو میک اپ کیا ہے اگر اس کے ساتھ کوئی جیمیز جھاڑنی کی تو یہ جوئیں ٹھنڈوں تک بالکل ایسا ہی رہے گا۔ آج کل موسم میں زیادہ حد تک اس لیے مذکورہ کٹ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد نیم نے مجھے مزید اہم رموز سے آشنا کیا جس میں مختلف قسم کے اسمرنگ پیڈز کی مدد سے چہرے کے حدود خال کو تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ کالیکٹ لیس کے ساتھ ساتھ گالوں اور ہاتھوں کے پھیلاؤ اور سکر او کی ٹیکنیک بھی بتائی۔ ٹیلی مونیٹور اور ڈائمنڈ کا استعمال بھی سکھایا۔ الغرض اس نے تمہیں باقر سے نقل کا حق نبھادیا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو مختلف قسم کے ضروری ساز و سامان کی ایک

بڑی تعداد و مقدار بھی ہمارے ساتھ تھی۔ "اس سامان کے لیے میں کیا پیش کروں؟" میں نے شائستگی سے اخلاقیات نبھانے کی کوشش کی۔ وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بولا، "کچھ بھی نہیں۔ منہاس صاحب نے مجھے اس سلسلے میں منع کر دیا ہے!"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ جرح و بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی لہذا ہم اس کے اسٹوڈیو سے نکل آئے۔ خالد بن ولید روڈ پر آنے کے بعد میں نے صدف سے کہا۔

"ہمیں واپس فلیٹ پر جانا ہے۔"

اس نے گاڑی کو علامہ اقبال روڈ پر ڈال دیا۔ چند منٹ بعد ہم طارق روڈ پر تھے، ہم فلیٹ کے اندر داخل ہوئے تو صدف نے کہا۔

"وجدان! تمہارا بدلا ہوا حلیہ بتا رہا ہے تم کی نہایت ہی اہم مشن پر روانہ ہونے والے ہو، تم مجھ سے چھپا کیوں رہے ہو؟"

میں نے الٹا اسی کو پکڑ لیا، "صدف! تم نے وعدہ کیا تھا، گزشتہ رات والے معرکے کے بعد تم اس آئینہ کیل سے الگ ہو جاؤ گی اور پوری توجہ اپنی تعلیم پر دے گی۔ میں نے اسی وعدے کی بنیاد پر تمہیں کل رات اپنے ساتھ رکھا تھا اور اب تم....."

اس نے میری بات مکمل نہ ہونے دی اور بات کو سنبھالتے ہوئے بولی، "میں کب تم سے ضد کر رہی ہوں کہ آج کے مشن میں بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنا۔" اس کے انداز میں بہت کچھ ڈھکا چھپا تھا، "میں تو صرف جانتا چاہتی ہوں آج تم کس قسم کی ہنگامی مصروفیات میں رہو گے؟"

اس نے بات ایسی کر دی کہ میں اسے بے ڈی ملک کے بارے میں بتانے پر مجبور ہو گیا، صدف ایک قابل اعتماد اور مخلص دوست تھی۔ ایسے جاں نثار ساتھیوں پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ میں تو محض اسے محفوظ رکھنے کے لیے احتراز مت رہا تھا کہ کہیں وہ بھی میرے ساتھ پرواز کے لیے پرہیز نہ کرنے لگے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا، "صدف! تم جان چکی ہو، منہاس صاحب کی فیملی پر جو قیامت برپا کی گئی اس کا ذمہ دار چوہدری نواز شا کا ایک مہرہ خاص ہے ڈی ملک ہے۔ میں نے اس کے آلکار کا چار کاٹھنڈو کو جنم دیا، واپس کر دیا ہے۔ شہزادان کا ٹھنڈو کے "ابا جان" یعنی بے ڈی ملک کو عبرت ناک انجام سے گزارنا چاہتا ہے۔ ہمیں پتا چلا

ہے ملک اپنے ایک دوست صندوقچی کے بنگلے پر چمچا بیٹھا ہے۔  
میں بے ڈی ملک کو ناتھ ناظم آباد کے مذکورہ بنگلے سے نکال کر  
شہزاد کے حوالے کر دوں گا۔ بانی وہ جانے اور اس کا کام!“  
میری بات ختم ہوئی تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔  
میں نے اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا ”صدف“ تم یہ مت سمجھو  
کہ میں تجھیں بالکل ہی نظر انداز کر رہا ہوں۔ آج ایک مشن  
میں تم میرا ساتھ دوگی۔“  
اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ”کون سا مشن؟“  
”پنج مشن!“

”کیا تم میرے ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟“  
 ”کہیں کیا مطلب!“ میں نے تیز بے میں کہا ”آج کا  
 لے جاؤ تمہارا بھروسہ ہوگا۔“  
 وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی ”مگر“ میں تو  
 انہیں منع کر چکی۔“

”تو کیا منع کرنے کے بعد تمہارے گھر والے ہمیں کھانا نہیں دیں گے؟“

”ایسی بات نہیں۔“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی ”میرا مطلب ہے وہ اہتمام.....“

”کسی اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا ”جودال روٹی لے لی گئی کھالیں گے۔ اصل مقصد تو تمہارے باپا ماما سے ملاقات کرنا ہے نا۔ دعوت اور اہتمام پھر کبھی سہی!“

وہ اس دوران میں بیک تک میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جلدی سے بولی: ”لیکن اس وقت تو تم اپنے حلیے میں نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے وجدان کے بجائے کچھ اور بن چکے ہو۔ میں وجدان کی حیثیت سے تمہارا تعارف کس طرح کراؤں گی۔ یہ تو ایک کھلا جھوٹ ہوگا۔ ماموں اور ننگرہب نے جس وجدان کو دکھایا ہے، پاپا اس سے مختلف وجدان کو دکھائیں گے تو نگرہب نہیں ہو جائے گی!“

”کوئی گزیر نہیں ہوگی۔“ میں نے مقتول کے لیے کہا ”اور نہ ہی تمہیں کھلا یا بند جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے۔ تم سیدھا سیدھا کہہ سکتے ہو اس وقت میں ہلکے میک اپ میں ہوں۔ اللہ اللہ خیر سلا!“

وہ مطمئن ہو گئی۔ میں نے میک اپ اور گیٹ اپ کے سامان کو فلپس میں لاک کیا اور صدف کی دہانت سی میں سوار ہو کر اس کے گھر واقع فیروز ٹیٹس سوسائٹی روانہ ہو گیا۔ صدف کی رہائش سی ایف کے کے سابق "ساؤتھ" کے نزدیک ہی تھی جہاں قریب ہی ایک سرسبز و شاداب پارک بھی

کی بنی ایک ایسے شخص کے ساتھ کیوں گھومتی پھرتی ہے جو در در کی خاک چھانے ہوئے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہے؟“

”میں نے تمہاری خوبیاں اور صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔“ وہ خنجیدگی سے بولی ”لہذا پاپا کے دل میں تم سے ملنے کا اشتیاق جاگا۔ پھر انکل اور الفقار زیدی سے بھی پاپا کی بات ہوئی تھی۔“ سیم ٹھہر رہے ہو میں کون سے انکل کا ذکر کر رہی ہوں۔“

میں ڈارلنگ کے ذکر پر چونک اٹھا اور مجھے ائیر پورٹ پر  
پیش آنے والا وہ عجب و غریب واقعہ یاد آ گیا۔ ڈارلنگ نامی  
اس پُر اسرار سفید بلی نے لائیو اسٹاک کنٹینر میں کچھ ہی ایسا  
چکر چلایا تھا کہ وہاں موجود تمام جانوروں کی احتجاجی صدا میں  
ہر طرف گونجنے لگیں۔



کتابیات پ  
3  
فون: 5802552-5895313 فیس: 5802551

ڈارلنگ کا تصور مجھے بہت دور تک لے گیا۔ اس لمبی نے کسی مجبور کے مانند میرے ساتھ کسی شب و روز گزارے تھے اور بالآخر غلطی و جدانے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کا دعویٰ تھا ڈارلنگ کے اندر کوئی بدروح چھپی ہوئی تھی جو مجھے شدید نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ ڈارلنگ کی ہلاکت جن حالات میں ہوئی اس وقت میں غلطی و جدانے کی بات کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن اب جب کہ میں اس بہرہ دے کی طرف سے خاصا بیزار بیٹھا تھا تو ایک خیال ذہن میں یہ بھی آ رہا تھا کہ کہیں ڈارلنگ غلطی و جدانے کی کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہو گئی۔ بہر حال وہ جب تک میرے ساتھ رہی اس ایک مخلص دوست ایک وفادار مجبور کا کردار ادا کیا تھا جب میں غلطی و جدانے کی تیوری کی روشنی میں ڈارلنگ کے اعمال و افعال کا جائزہ لیتا تو اس لمبی کا کردار کسی گہری سازش سے کم دکھائی نہ دیتا۔ میرا ذہن ڈارلنگ کے حوالے سے ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔

صبیحہ بانو کے قلم سے

آج بذریعہ منی آرڈر پیسگی روانہ کریں

کراچی 74200

10 ~~10~~ 20

ہر داعی زین شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے

کتاب کی قیمت: معہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

آتش فشان (203) حصہ 10

ہر داعی زین شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے

کتاب کی قیمت: معہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

آتش فشان (203) حصہ 10

مند ہیں کہ تم ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے کوشاں ہو۔

”اس غائبانہ احسان مندی اور متاثری کے بارے میں میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں!“ میں نے سائے لہجے میں کہا۔ جواب میں وہ کہنے لگی بہت کچھ کہنے لگی اور کہتی چلی گئی!

☆☆☆

شہزاد ایک اچھوتا آنیڈیالا یا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے اور میں تھوڑی دیر پہلے ہی اس زیرِ تعبیر بنگلے میں پہنچا تھا۔ صدف کے گھر پر رنج بہ خیر و عافیت ہو گیا۔ بلی بھلی گفتگو رہی صدف نے مجھے اپنی گھریلو ملازمہ انکس سے بھی ملوایا۔ وہ سائوٹی سلونی باتونی لڑکی اپنے اندر ایک مخصوص قسم کی کشش رکھتی تھی۔ صدف کے باپا خالص ایک کاروباری شخص مجھے یقین ہے اس ملاقات اور سچ کے لیے صدف ہی نے زور مارا ہوگا۔ بہر حال صدف مجھے اپنی گاڑی میں اس ٹھکانے پر چھوڑتی تھی۔ فیصل والا معاملہ اس سے پوشیدہ نہیں تھا لہذا کسی قسم کی پردہ داری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ میری ایک ایسی ساتھی تھی جس پر انھیں بند کر کے بھر دیا جاسکتا تھا۔ میں نے بد وقت رخصت اسے یہاں کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔

میں ایک تک شہزاد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی میں بولا۔ ”وہ جان! بے ذن ملک کو اس کی تازہ ترین پناہ گاہ سے نکالنا بہت آسان ہے۔ بس اس کے لیے مجھے تھوڑی سی نقالی کرنا ہوگی..... اور میرا یقین ہے میں یہ خوبی ایسا کر لوں گا۔“ اس وقت ہم ٹیلی فون والے کمرے میں تھے۔ بنگلے کے ایک دور افتادہ حصے میں زرگل بڑی ہوشیاری سے فیصل کی گھرائی کر رہی تھی۔ میں نے شہزاد کی بات کے جواب میں کہا۔ ”تم کس نقالی کی بات کر رہے ہو؟“

”آواز کی نقالی۔“ اس نے بتایا ”فیصل کی آواز کی نقالی!“

”ذرا تفصیل بتاؤ۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ بولا ”میں نے بڑی گہرائی سے فیصل کو ادھار کیا ہے۔ مجھے یقین ہے میں پورے اعتماد کے ساتھ فیصل کے لب و لہجے میں بات کر سکتا ہوں۔ بے ذی ملک کی پناہ گاہ کا فون نمبر میں نے حاصل کر لیا ہے۔ اگر میں فیصل بن کر اس سے رابطہ کروں اور اسے کسی مخصوص مقام پر پہنچے تو کہوں تو وہ یقیناً میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔ میں (فیصل) اس کے پاس چوہدری نواز شاکر کا بیٹا ہوں گا۔ وہ کسی قسم کی چوں چوں نہیں کر سکتا۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے

ہوئے بولا۔

”اس طے شدہ مقام سے ہم بے آسانی بے ذی ملک کو اغوا کر کے اپنی پسند کی جگہ پر پہنچا سکتے ہیں، تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟“

”آئیڈیا بڑا نہیں ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر پوچھا ”اغوا کے بعد تم بے ذی ملک کو کہاں پہنچانا چاہتے ہو؟“

”سر جانی ناؤن والے ٹھکانے پر۔“ اس نے بتایا ”اس اگلی تھک مقام پر اس سے ٹپٹنے میں بہت مزہ آئے گا۔ اس سلسلے میں تم تھوڑا ذہن دوڑاؤ۔“ وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا ”وہ جان! تم بڑی سرعت سے بے دارغ کہانیاں بنائیے ہو۔ فیصل کے لیے چند لائون کا ایک اسکرپٹ تیار کرو جو وہ فون پر بے ذی ملک سے بولے گا۔ جملے تاثر انگیز اور عمل خیز ہونا چاہئیں۔“

”میں نے ذہن دوڑا دیا۔“ میں نے ایک دم چوکتے ہوئے کہا ”تمہارا آئیڈیا جتنا عمدہ ہے اس کے لیے اسکرپٹ بھی جان دار ہونا چاہئے بالکل جینون۔“ جنہیں کسی قسم کی اداکاری یا نقالی کی ضرورت نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کھٹک کر گھاسا صاف کیا اور کہا ”جب اصلی فیصل ہمارے پاس موجود ہے تو پھر نقالی کا رسک کیوں لیں..... اور سر جانی کی طرف جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس یہ ایک محفوظ ٹھکانا ہے۔ جب ہم فیصل کو یہاں کنٹرول کیے ہوئے ہیں تو ایک بے ذی ملک بھی سہی۔ بندہ اور بندہ نواز کو ایک ہی جھپٹ کے نیچے وقت گزارنا چاہئے۔ چوہدری نواز اور اس کا سپوٹ چوہدری فیصل بے ذی ملک کے ان داناؤں کا ہیں۔ آقا اور غلام کے تعلق کو جڑ سے رہنا چاہئے۔“ میں ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”میں فیصل کے لیے ایک مٹرز اسکرپٹ تخلیق کرتا ہوں تاکہ ہمارا کام آسان ہو جائے۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو مزہ آجائے گا۔“ وہ سرور کن لہجے میں بولا ”انڈرون روف کارروائی کا لطف دو بالا ہو جائے گا۔ فیصل سے ایک خون ریز مقابلہ اور بے ذی ملک سے ایک.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ آئندہ دس منٹ میں میں نے شہزاد کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کر دیا۔ یہ پلاننگ بڑے بنگالی انداز میں میرے ذہن میں ترتیب پائی تھی۔ شہزاد کو فیصل کے پاس جا کر میری مرضی کے مطابق ایک ذیل کرنا تھی۔ اس کام ختم ہونے کے لیے اگر فیصل آمادہ

ہو جاتا تو نہ تھا۔ یہ بصورت دیگر ہم کوئی اور راہ نکالتے۔ مجھے امید تھی، فیصل اپنی آزادی کی خاطر ہماری بات ماننے پر تیار ہو جائے گا۔ وہ اپنی بلالیا گیا اور میں شہزاد کے ساتھ فیصل کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس وقت میک اپ میں تھا اور شہزاد زرگل اس راز سے واقف تھے۔ فیصل کے لیے میں ایک نیا چہرہ ایک ایسی شخص تھا اور دیے بھی مجھے خاموش رہنا تھا، فیصل سے معاملاتی گفتگو شہزاد ہی کو کرنا تھی۔

فیصل کو اس زیرِ تعبیر بنگلے کے انتہائی محفوظ گوشے میں رکھا گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے حرکات و سکنات کے قابل نہیں تھا۔ ذیل مجھے ہم نے اسے تھ ڈال کر رکھی تھی تاہم وہ اگر جیج دھاڑ کر بھی کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی سعی کرتا تو اس کی یہ کوشش رائیگاں ہی جاتی۔ پولیس کی کارروائی کے بعد وہ بنگلا ہمارے لیے اور بھی زیادہ موزوں اور محفوظ ہو گیا تھا۔ گویا ایک طرح سے اسے ”این او سی“ حاصل ہو گیا تھا۔ اب اس طرف کسی کا دھیان جانے کی امید نہیں تھی۔

ہم فیصل کے پاس پہنچے تو وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ شہزاد تو اس کے لیے شناسا تھا لیکن میں نئی انٹری تھا۔ شہزاد نے زیر لب سگراتے ہوئے فیصل کو مخاطب کیا اور بولا۔

”گلتا ہے تمہاری قسمت خاصی یاد ہو رہی ہے!“

”کوئی نئی چال چلنے آئے ہو؟“ وہ بہ دستور مجھے گھورنے ہوئے شہزاد سے بولا۔

شہزاد نے کہا ”میری نیت پر شک نہ کرو۔ میں تمہیں آزادی کی نوید سناتے آیا ہوں۔ تم آج کی تاریخ میں اس غم زدہ زندگی سے نجات حاصل کر سکتے ہو لیکن اگر تم میں تھوڑی سی بھی سمجھ بوجھ ہوئی تو!“

شہزاد نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو فیصل ایک لمبے کا تامل کیے بغیر بولا ”تم کس سمجھ بوجھ کی بات کر رہے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک ابھر آئی تھی۔

آزادی کی خبر ہر انسان کو بے پناہ خوشی پہنچاتی ہے اور طاقت ور انسان اگر چند روز کے لیے بے بسی و بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے تو آزادی اس کے لیے ایک نوعیت غیر مترقبہ کی شکل و حیثیت اختیار کر جاتی ہے وہ اس آزادی کے حصول کی خاطر ہر بات ہر شرط ہر مطالبہ ماننے پر تیار ہو جاتا ہے۔ فیصل کا رد عمل مین فطری اور حالات کے تقاضوں کے عکس مطابق تھا۔

شہزاد نے میری ہدایات کے مطابق ”دیکھل“ جاری

## ایک مقبول ترین سلسلہ

# شاطر

ایک نئی دلچسپ ننگہ آواز میں شہزاد کی جیس میں  
دو تہائی سسٹم اور سلسلہ ذات آواز ہے۔

شاطر شہزاد نامی اپنے وقت کی سب سے زیادہ  
جاندار میں قرار دیا ہے۔

قیمت فی حصہ 60 روپے | 2 حصے مکمل | ڈاک خرچ 23 روپے

### کتابیں مکمل میں شائع ہو چکی ہیں

کتاب کی قیمت بذریعہ پتلی ڈرافٹ سنی آرڈر یا کارڈز چیک اسان دیکھیں

## کتابیات پبلکیشنز

23 ستمبر 2005ء

742006

3802552 3802551 فون

kitabiat1970@yahoo.com

رکھا اور گھیر لہجے میں بولا "فیصل! یہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں۔ خان بہادر! بات ختم کرتے ہی اس نے میری جانب اشارہ کر دیا۔ فیصل نے بڑی گہری اور انجمی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

میں نے مسکراہٹ کے انداز میں ہونٹوں کو سکیزا تا ہم زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ شہزادہ سلسلہ کلام کو دراز کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تم آج کی تاریخ میں آزادی چاہتے ہو تو ان کی فرمائش پوری کر دو۔ میں تمہیں بہ خوشی جانے کی اجازت دے دوں گا۔"

فیصل نے استغابیہ نظر سے مجھ دیکھا اور بولا "کس قسم کی فرمائش؟"

میرے بجائے شہزادے نے اسے بتایا "خان بہادر کی ایک شخص سے بہت پرانی دشمنی ہے۔ مذکورہ شخص نے میرے اس دوست کو بے حساب نقصان پہنچایا ہے۔ اگر تم اس دشمن شخص کو میرے دوست کے حوالے کر دو، تو تمہاری جان چھوٹ سکتی ہے۔"

وہ ایک پتے کی بات کرتے ہوئے بولا "دراصل میں تو وجدان کا قیدی ہوں۔ اگر تم مجھے کسی شرط کے بدلے آزاد کر دو گے تو وجدان کو کیا جواب دو گے اور....." وہ ایک لمحے کو رکھا پھر متذبذب انداز میں بولا "اور ابھی تک تو میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کس شخص کا مطالبہ کر رہے ہو؟"

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" شہزادے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ خان بہادر میرا دوست ہے تو اس کا مطلب یہی ہے یہ وجدان کا بھی دوست ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وجدان سے فون پر میری بات ہوئی ہے۔ میں اسی کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق تم سے سودے بازی کر رہا ہوں۔" وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا۔

شہزادہ کو میں نے جتنا کچھ سمجھایا تھا وہ اس سے بڑھ کر فرام کر رہا تھا..... اور خوب پر فارم کر رہا تھا۔ اس تیار ہنڈیا کو اس نے خوشبودار بگھار لگا تے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے بتانا چلوں کہ وجدان نے اپنی ساتھی ساحل کا سراغ نکالیا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں وہ وجدان کی دست رس میں ہوگی۔ وجدان کے جان نثار دستے نے شعیب غوری کو شدید نقصان پہنچا کر ساحل کو اس کے چنگل سے آزاد کر لیا ہے اور اب تک وہ وجدان کے پاس پہنچ چکی

ہوگی یا پہنچے ہی والی ہوگی۔ خود سوچ اس کے بعد تمہارا حلیہ حشیت وجدان کی نظر میں دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ دو درہاں اجاگر رہتے ہیں ڈالنا چاہتا۔ تم لوگوں سے اس کی جگہ ساحل کا خطرہ ہے۔ جب وہ اس کے قبضے میں آگئی تو سب کچھ سمجھ کر ہو کر رہ جاتا ہے۔ وجدان خواہ مخواہ کی قتل و غارت گری کو نہیں کرتا۔ اس لیے تمہارے ذریعے اپنے ایک دوست خان بہادر کا بھلا چاہتا ہے۔ اب یہ تمہاری سمجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ کس طرح خان صاحب کے کام آتے ہو میں تمہیں..... وہ قطع کلاہی کرتے ہوئے بولا "تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ میں کس شخص کو تمہارے اس دوست خان بہادر کے حوالے کروں اور کس طرح..... میں تو خود تمہارے رحم و کرم ہوں!"

"میں تمہیں یہی سب کچھ بتانے جا رہا تھا لیکن چلانے سے باز نہیں آئے۔" شہزادے نے اسے گھر کا بھرتا جاری رکھتے ہوئے بولا "تم اس شخص سے فون پر رابطہ کرنا۔ بلکہ ہم تمہارا رابطہ کر لیں گے۔ تم اسے ہمارے بتائے ہوئے ایک مخصوص مقام پر پہنچنے کا حکم دو گے۔ وہ تمہارا حکم کن کرنا چلا آئے گا اور....."

"کون دوڑا چلا آئے گا؟" وہ ایک مرتبہ پھر شہزادے بات پوری ہونے کا انتظار نہ کر سکا۔ شہزادے نے اسے بری طرح جھڑکا "لگتا ہے تمہاری زبان میں بڑی خارش ہے۔ مجھے سمجھو نہ کرو کہ میں اس گوشت کے ٹکڑے کو تمہاری گدی سے کھینچ باہر نکالوں!" فیصل ناگواری سے باری باری ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔ شہزادے نے زہر خند لہجے میں انکشاف کیا "تمہارے اس رشتے دار کا نام بے ڈی ملک ہے!"

"جے ڈی ملک!" وہ اس طرح اچھلا جیسے بجلی کا جھٹکا چھو لیا ہو۔

اسے درے درے حیرت کے جھکے لگ رہے تھے۔ یہ خبری کچھ کم غصہ ہی نہیں تھی کہ میں نے ساحل کو دستیاب کر لیا تھا۔ اس پر جے ڈی ملک کی حواگی کا مطالبہ! فیصل کی حالت دیکھ کر میں نے دیکھا کہ جے ڈی ملک نے جب شہزادے ساحل کے حصول کی بات کی تو میرے دل سے "آمین!" نکلا تھا۔ یہ ایک جہ ساختہ جذبہ تھا۔

ہم فیصل سے اچھی خاصی غلط بیانی کر رہے تھے اور وہ سب کچھ سلطنت اور حالات کا تقاضا تھا۔ ہمارے دشمن درودہ جیسے معصوم بچے نہیں تھے اور نہ ہی عبادت گزار نیک و پیر انسان۔ وہ جیسے سفاک اور بے رحم تھے اس کے چہرے نظر

ملک کے متقاضی تھے۔ فیصل کے اچھلے پر شہزادے نے کہا "ہاں میں اسی جے ڈی ملک کا ذکر کر رہا تھا جو تم لوگوں کا کراچی ٹینٹ ورک چلا رہا ہے۔ تمہارے باپ نے میاں زاہد حسین کی جگہ اسے دے دی ہے لیکن یہ ملک سخت نا امان ثابت ہوا ہے۔ اس نے چند روز میں بے درپے اتنی غلطیاں کی ہیں کہ تمہارا باپ بھی اس سے فون نہیں۔"

"لیکن وہ تو باجی کا بہت خاص آدمی ہے۔" فیصل تردد آمیز لہجے میں بولا "اسے کسی دشمن کے حوالے کرنے کے لیے پہلے مجھے بڑے چوہدری صاحب سے بات کرنا ہوگی۔" "اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی آزادی بلکہ زندگی سے کوئی ٹکا نہیں۔" شہزادے نے پھکارے مشابہ لہجے میں کہا "کان کول کر سن لو وجدان نے تمہیں مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا ہے۔ اس کی محبوبہ اسے مل گئی ہے۔ میں اب تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کروں وجدان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور میں تمہارے جسم و جان کو جس عذاب سے گزاروں گا تم اس تکلیف اور اذیت کا تصور کر کے ہی بے ہوش ہو جاؤ گے میں تمہاری روح فنا کر کے رکھ دوں گا۔"

فیصل خاصا شکر نظر آنے لگا۔ اسے شش و پنج میں دیکھ کر شہزادے نے ایک اور رواج چاہا "یہ تمہارے ہاتھ میں آیا ہوا آخری موقع پر فیصل! تم نے اپنی آزادی کے لیے ہمارے ٹیکہ بھری گاڑا سبیل کو ایک کر ڈرو روپے کی پیش کش کی تھی اور یہ تم اسے جے ڈی ملک ہی سے دلوانے والے تھے۔ اس دنیا کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس پر بات کرنا فضول ہے۔ قسمت کی ہدایتی تمہیں ایک اور نادر موقع دیا ہے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو اس غلطی پر پچھتانے کے لیے تم زندہ نہیں رہو گے اینڈ اسٹ ازل اینڈ فائل!"

شہزادے کے لہجے میں پوشیدہ گھٹنی نے فیصل کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ بہیم سے لہجے میں بولا "میں کس طرح جے ڈی ملک کو تمہارے حوالے کروں۔ میں تو خود قید و بند میں پڑا ہوں؟"

"تمہیں اس نیک کام کے لیے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔" شہزادے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہماری 'مہمان نوازی' میں شاید تمہاری یادداشت کو خاصا دھکا لگا ہے۔ خاص طور پر شارت فرم میموری کو۔ ابھی غور کی دیر پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تم صرف جے ڈی ملک کو فون پر ہمارے بتائے ہوئے مقام تک آنے کا حکم دو گے۔ ملک کو مذکورہ مقام سے پک کر کے یہاں لے آئیں

گے اور بس تمہاری جھنٹی!" وہ تعاون آمیز نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔

شہزادے نے کہا "میں تمہیں سوچ بچار کے لیے جارہے دیتا ہوں۔ اگر تم میری بات ماننے کے لیے تیار ہو گے تو میں ٹھیک آٹھ بجے رات جے ڈی ملک سے تمہارا رابطہ کراؤں گا۔ اس سے اپنے حکم کی تعمیل کرنا تمہارا کام ہے۔ میں صرف تمہیں ٹھیک دے سکتا ہوں۔ وہ اگر فوری طور پر اپنی نگاہ کا سے روانہ ہو گیا تو تمیں پینتیس منٹ میں ہمارے مطلوبہ مقام تک پہنچ جائے گا۔" شہزادے میرے رٹائے ہوئے سبق کو بھرا رہا تھا۔

فیصل نے اس کی بات کے اعتقاد پر کہا "پناہ گاہ!" اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔ شہزادے نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "جے ڈی ملک کی رہائش گاہ پر جو قیمت ٹوٹی ہے اس نے سیر پرنا نہیں رکھ کر فرار ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ اس وقت اپنے ایک دوست مفرد علی کے بنگلے پر ناتھ ناظم آباد میں چھپا ہوا ہے۔ میں اسی بنگلے کے فون نمبر پر اس سے تمہاری بات کراؤں گا۔ میں نے اس روپوش ملک کے لیے جیسا تو 'پناہ گاہ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں!"

فیصل گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے انداز سے آمادگی جھلکتی تھی۔ وہ چوہدری زاہد تھا اور ان لوگوں کے نزدیک اپنے ملازموں یا آلہ کاروں کی حشیت کیزے کوڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی، چاہے ایسا شخص جے ڈی ملک ہی کیوں نہ ہو۔ فیصل کی سلامتی کی خاطر درجنوں جے ڈی ملکوں کو قربان کیا جاسکتا تھا۔

میں شہزادے کے ساتھ واپس نئی فون والے کمرے میں آ گیا۔ زرنگر داہن موجود تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی فیصل کے ساتھ ہم نے کس قسم کے مذاکرات کیے ہیں اور اسے یہ سب کچھ جانا بھی نہیں چاہئے تھا۔ اس بنگلے پر آئندہ پانچ بجے گھنٹوں میں جو واقعات پیش آتے وہ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتی۔

میں نے فیصل کو سوچنے کے لیے اتنی زیادہ مہلت اس لیے بھی دے دی تھی کہ میں اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اندھیرا بنے پناہ گاہیوں کا مالک ہے۔ یہ بہت سے عیوب کو اپنے سیاہ سینے میں چھپا لیتا ہے۔ ہم اپنے انتقام کی خاطر جو کچھ کرنے جا رہے تھے وہ بہر حال ایک جرم ہی تھا۔ اندھیرے کی آڑ میں ایسے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ تاریکی جہاں گناہ کو جنم دیتی ہے وہیں وہ اسے تحفظ بھی فراہم کرتی ہے۔

چاہے کچھ بھی ہے، تار کی دفا بھانا جاتی ہے!  
تھوڑی دیر بعد درجن فیصل کی عمرانی کے لیے وہاں سے  
اٹھ گئی۔ میں نے شہزادے کہا: ”اب میں چلتا ہوں۔ شام سے  
پہلے آنے کی کوشش کروں گا اور اگر کچھ دیر بھی ہوگئی تو پھر بھی  
آٹھ بجے سے پہلے تو ضرور لوٹ آؤں گا۔“

میں اسے بتا چکا تھا کہ منہاس باقر نے مجھے اپنے بچکے پر  
بلا یا ہے۔ ہمارے درمیان ضروری نوعیت کے کچھ امور طے  
ہوئے پھر میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو شہزادے نے کہا۔  
”وجدان! تم چاہو تو سوک لے جاؤ۔ مجھے تو کہیں آنا جانا  
نہیں۔“

لائٹ گرین کمر کی ہونڈ اسوک پورج میں کھڑی تھی تاہم  
میں نے اسے لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے تو چند قدم پیدل  
چلنے کے بعد کوئی ٹیکسی مل جانی لیکن اگر اس بچکے پر کوئی  
ایمر جنسی پیش آجانی تو وہ گاڑی بہت مفید ثابت ہوگی۔  
”گاڑی کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔“ میں نے فیصلہ کر  
لیجے میں کہا۔

شہزادے اصرار نہیں کیا اور میں بچکے سے نکل آیا۔  
منہاس باقر کا وہ بگلا ابھی تعمیر کے آخری مراحل میں تھا  
چوں کہ مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے میں اسے بار بار زیرِ تعمیر ہی لکھ  
رہا ہوں حالانکہ اس کی تکمیل میں بہت تھوڑا کام باقی تھا۔ یہ  
بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ منہاس نے تعمیرِ مکمل کو ایک  
عرصے سے کیوں روک رکھا تھا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے  
اس موضوع پر بات کرنے کی مجھے فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔  
میں دو ڈھائی سو گز پیدل چلا تھا کہ ایک ٹیکسی مل گئی۔

منہاس باقر کا بگلا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر  
بعد میں اس کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ نئے گاڑڈ میرے لیے ابھری  
تھے پھر اس وقت میں بھی اپنے اصل چیلے میں نہیں تھا اس لیے  
جان پہچان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جب میں نے  
انہیں اپنا نام بتایا تو وہ انہیں شن ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے مجھے  
ایک اجڑے ہوئے گھر کے سچے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچا  
دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد منہاس باقر میرے پاس تھا۔ ہم نے  
بڑی گرم جوشی سے خاموشی اور جذباتی معافہ کیا پھر وہ سنجیدگی  
سے بولا۔

”دوسرے کمرے میں آ جاؤ۔ وہ سب لوگ ادھر بیٹھے  
ہیں۔“

میں نے رکی علیک سلیک میں منہاس کو اپنے چیلے کے  
بارے میں پہلی فرصت میں بتا دیا تھا مگر اس نے ابھی تک اس

راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا کہ وہ مجھے کن لوگوں سے ملوانا چاہتا  
تھا۔ میں اس کی معیت میں ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔  
پھر میں نے جیسے ہی اس کمرے میں قدم رکھا میرا سر خود بخود  
ندامت سے جھک گیا۔

میری نظر نے وہاں فرید پاشا، قاضی سلطان اور شہزاد  
کے شوہر کو بیٹھے ہوئے دیکھا کسی لمحے فرید پاشا کی آواز میری  
سماعت سے ٹھکرائی۔ وہ منہاس باقر سے پوچھ رہا تھا۔ ”یار  
منہاس! کیا واقعی یہ وجدان ہے؟“

اس وقت تک منہاس نے انہیں میرے تبدیل شدہ چہرے  
کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ قاضی سلطان اور منہاس کے  
داماد بھی شک زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ منہاس  
نے مختصر الفاظ میں انہیں میرے بارے میں بتا کر مطمئن  
کر دیا۔

قاضی سلطان اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھیں داکرنے  
ہوئے میری جانب بڑھا۔ ”بوا! بڑا پایا ہے تم نے وجدان! اس  
کے انداز میں دوا لہا نہ پن تھا۔“

میں بے اختیار اس کے سینے سے جا لگا۔ وہ کافی دیر تک  
مجھے بچکے خاموش کھڑا رہا۔

قاضی سلطان کے بعد فرید پاشا کی باری آئی۔ لاہور کی  
آب دہوا اور خالص خوراک کا دلدادہ وہ شخص بڑے بہت  
بھرے انداز میں مجھ سے بغل گیر ہوا اور کئی لمحات تک ہونے  
والے میری پشت کو چھکتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے  
شبانہ کے شوہر سے معافہ کیا۔

وہ سب لوگ منہاس باقر کا غم ماننے آئے تھے۔ منہاس  
نے مجھے ان کے بارے میں پیشگی کچھ نہیں بتایا تھا لہذا  
ملاقات میرے لیے کسی سر براز سے کم نہ تھی۔ دوستوں پر  
احسان نہیں کیا جاتا لیکن قاضی سلطان اور فرید پاشا بار  
میرے تعاون اور کارناموں کو سراہ رہے تھے جس سے مجھے  
اور زیادہ شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے قاضی سلطان کی گنجائش  
ممتاز کو دو مرتبہ بازیاں کیا تھا۔ ایک دفعہ بنی میں سر میں جب  
ڈاکوؤں نے اسے ہماری تادان کے لیے اغوا کیا تھا اور  
دوسری بار وہ ساحل کے ساتھ اغوا کی گئی تھی ممتاز کو میری  
تمنا میں مگر کوٹ سے برآمد کر لیا گیا مگر میری ساحل تاحال مجھ  
سے دور تھی۔ فرید پاشا کی جواس سال خوب ریویو بنا کر لوگوں  
میں نے ایک رات اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ ان دونوں کا  
احسان مندی کا اظہار ایک طرف لیکن میں اس احساس سے  
بڑی سخت محسوس کر رہا تھا کہ میرے سبب منہاس باقر اور فرید  
پاشا نے بے حد نقصان بھی اٹھایا تھا۔ البتہ شبانہ کا شوہر

اب داری بھاتے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔  
”لوگ منہاس کے پاس تعزیت اور دل جوئی کے لیے  
آتے تھے۔ اس لیے بچکے اعداد میں بات چیت کر رہے  
تھے۔ ان لوگوں سے مل کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا  
تھا۔ اپنے اس احساس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اور  
میں منہاس باقر بھی شامل تھا۔ میں کچھ یوں محسوس کر رہا  
تھا کہ میری زندگی میں ان سے آخری بار مل رہا ہوں!“

یہ باتیں سن کر میں نے اسے آخری بار مل رہا ہوں!  
یہ باتیں سن کر میں نے اسے آخری بار مل رہا ہوں!  
یہ باتیں سن کر میں نے اسے آخری بار مل رہا ہوں!  
یہ باتیں سن کر میں نے اسے آخری بار مل رہا ہوں!

ایک لمحے قاضی سلطان نے کہا۔ ”بھئی ایسے بالکل مزہ نہیں  
نہا۔ میں جس وجدان سے بات کرنا چاہتا ہوں وہ چہرہ نہیں  
نہا۔ میں جس وجدان سے بات کرنا چاہتا ہوں وہ چہرہ نہیں  
نہا۔ میں جس وجدان سے بات کرنا چاہتا ہوں وہ چہرہ نہیں

”یار تم نے پردہ داری بیوں کی طرح کیوں میک اپ  
اٹھ کر نکال رکھا ہے۔“ پاشا نے کہا۔ ”قاضی صاحب بالکل  
یک دم کہہ رہے ہیں۔ اگر تم ہماری یہ نئی صورت دیکھتے رہیں  
تو بات چیت میں خاک لطف آئے گا۔“

منہاس باقر نے میری حمایت میں کہا۔ ”تم لوگ وجدان  
کو اپنا نہیں کرو۔ اس نے اگر ہمیں بدل رکھا ہے تو کسی خاص  
مدد کے لیے یہ رنگ اپنایا ہوگا۔ بات چیت تو ایسے بھی ہو سکتی  
ہے۔“

”میں ہو سکتی ایسے بات چیت۔“ قاضی سلطان نے  
جوابی انداز میں کہا۔

فرید پاشا بولا۔ ”اور تمہیں مل برائز بننے کا اتنا ہی شوق تھا  
جتنی ہی ہو جاتے۔“

وہ ایک میں شخص شوہر سے متعلق تھا اور میرے غم  
کے بارے میں اس سے چپ نہیں سکتی تھیں۔ وہ فوراً حقیقت  
نہا۔ ”کیا تھا قاضی اور پاشا کی باتوں سے مجھے یہ بھی  
پتا چلا کہ ان دونوں میں ابھی خاصی بے تکلفی تھی اور  
میں بھی مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں پیش آیا کہ وہ لوگ  
میں کے بارے میں بھلائی کی کوشش میں پیچھے چھاڑے کام  
کر رہے تھے۔ میں بھی تو وہاں منہاس کا وقت بھلانے ہی آیا  
تھا۔“

میں نے باری باری موجود افراد کے چہروں کو دیکھا اور  
اپنے منہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے ہی لمحے میرے قدم وادش روم  
نہا۔ ”یار تمہیں وہ دنیا میں کہاں کہاں اس کے ساتھ کھوے  
لگا کی“ اور تمہیں وہ دنیا میں کہاں کہاں اس کے ساتھ کھوے  
لگا کی“

میں کمرے سے نکل کر وادش روم میں داخل ہوا تو وہ  
احساس بھی میرے ساتھ ہی اندر پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے  
بڑی شدت سے محسوس ہوا میں ان لوگوں ان چہروں سے  
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والا ہوں۔ یہ صورتیں میرے لیے  
عقبات ہونے والی ہیں!

باد جو کوشش کے بھی جب اس احساس نے میرا پیچھا نہ  
چھوڑا تو میں جھنجھلا کر میک اپ سے پیچھا چھڑانے لگا۔ وہ  
عارضی میک اپ جو دوبارہ تیارہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ اور اب  
میں اس کام کے لیے کسی کا تاج بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے غیر  
خواہوں کے لیے اس ادنیٰ سی شے کی قربانی کوئی حیثیت نہیں  
رکھتی تھی۔

میں اصلی وجدان کی حیثیت سے وادش روم سے نکلا تو وہ  
لوگ ایک مرتبہ پھر اٹھ کر مجھ سے ملے تاہم اس بار انہوں نے  
صرف مصالحت پر اکتفا کیا۔ ان کے اس دوبارہ ملنے نے  
میرے احساس کو ایک دفعہ پھر چونکا یا اور لا محالہ میرے ذہن  
میں ابھرا۔ کیا میرا اختتام آن پہنچا یا پھر وہ چاروں سدا کے  
لیے مجھ سے جدا ہونے والے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ذہن کو جھٹکا اور ایک صوفے پر  
بیٹھ کر ان سے بات کرنے لگا۔ منہاس باقر۔ ”ابھی آیا“ کا  
کہہ کر وہاں سے جانے لگا تو قاضی سلطان بول اٹھا۔

”کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ ادھر  
بیٹھ جاؤ۔“

فرید پاشا نے کہا۔ ”تم نے وجدان کو یہاں بلایا ہے اور  
خود کہیں اور چل دیے!“

منہاس باقر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں  
وجدان ہی کی خاطر جا رہا ہوں۔ اور اسی گھر کے اندر ہوں  
کہیں باہر تھوڑا جا رہا ہوں۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس  
نے اضافہ کیا۔ ”تاہم میں اس نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا ہوگا یا  
نہیں!“

”میں پوری طرح کھانی کر آیا ہوں منہاس صاحب۔“  
میں نے جلدی سے کہا۔ ”اس سلسلے میں کسی تکلف میں پڑنے کی  
ضرورت نہیں۔ لہذا میں نے مدد کے گھر پر کیا ہے۔“

منہاس جاتے جاتے رک گیا اور خاموشی سے ایک  
صوفے پر بیٹھ گیا۔ فرید پاشا نے چونکے ہوئے لہجے میں  
کہا۔ ”یہ مدد وی لڑکی ہے نا جو لاہور میں تمہارے ساتھ کوم  
رہی تھی؟“

”بالکل وی ہے بھائی۔“ منہاس باقر نے گرہ  
لگا کی۔ ”اور تمہیں وہ دنیا میں کہاں کہاں اس کے ساتھ کھوے  
لگا کی“

گی۔ بڑی ضدی لڑکی ہے۔“  
منہاس باقر ایک سنجیدہ اور متین شخص تھا۔ اس کے مندرجہ بالا تبصرے سے لگتا تھا پاشا اور قاضی اس کا کم غلط کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ منہاس کے اس جملے میں ابھی خاصی غشکی پائی جاتی تھی جو کہ ایک مثبت علامت تھی۔ قاضی دوست اپنا فرض نبھانے کی حتی الامکان کوشش کر رہے تھے۔

فرید پاشا نے گفتگو کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا: ”بھئی قاضی صاحب! میں نے تو اس لڑکی کا ذکر سننے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ ایک شلت فلم ہے۔۔۔ ایک ہیرو وڈو ہیروئن والی بے انتہا جذباتی فلم۔ اگر ویدان صدف کے ساتھ بھی ٹھوڑے واقعات آگے بڑھائے تو میں زندہ کرداروں پر مبنی ایک جیتی جاگتی سپر ہیٹ فلم بنانے کو تیار ہوں۔“

”جس طرح صدف اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اس سے تو یہی نظر آرہا ہے ان دونوں کے باہمی واقعات تیزی سے آگے بڑھیں گے۔“ منہاس باقر نے ایک اور پیش گوئی کر دی۔ اگر میں خاموش بیٹھا رہتا تو یہ لوگ مجھ سے تفریح کا عمل جاری رکھتے۔ وہ میرے بچے خیر خواہ اور قاضی دوست تھے اور میں جانتا تھا قاضی اور پاشا مجھے مارکٹ پر رکھ کر منہاس کو تفریح مہیا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کے خوش گوار تاثرات منہاس پر مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ رنج و اندوہ کے بادلوں سے باہر آ رہا تھا۔

فرید پاشا نے منہاس باقر کی بات پر کھڑا لگا ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو منہاس! اب تو صدف کے گھر میں بچا بھی ہونے لگے۔ میں اس لڑکی سے ملا ہوں۔ اپنی کزن کے ساتھ میری کوٹھی پر آئی تھی۔ بڑی آندھی طوفان قسم کی لڑکی ہے وہ۔ مارشل آرٹس کی ٹیمپکن اور میڈیکل کی طالبہ۔ میں تو سوچ رہا ہوں لاہور پہنچنے ہی اس فلم کی ابتدائی تیاریاں شروع کر دوں۔۔۔ بھئی ویدان کی فلم کے لیے تو آجکل پوزٹ ترتیب دینا پڑے گا۔“

قاضی سلطان نے کہا ”پاشا! یہ آپ نے خوب بات بتائی۔ وہ لڑکی ڈاکٹر بھی بن رہی ہے اور لڑائی بھڑائی کے فن کی بھی ماہر ہے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کا اشتیاق جاگ اٹھا ہے۔ یہ بڑا عجیب سا کبھی نہیں نہیں ہے سائیں!“

”ایسا دیکھنا عجیب قاضی صاحب!“ منہاس باقر نے سنجیدگی سے کہا ”لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور آپ نے اشتیاق جاننے کا کیا ذکر کر دیا جناب۔ ویدان ایک فنون گر ہے گا تو وہ

دوڑی چلی آئے گی۔ صدف سے ملاقات کروانا تو اس کا نہیں چنکی کا کھیل ہے۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں مانتی۔“

”خدا خیر کرے ویدان کی۔“ فرید پاشا نے ٹرائیڈ آمیز انداز میں کہا ”دودھ کا تجربہ بڑا خطرناک ہوتا ہے پاشا وہ بچہ یاں ہوں یا مجھو یاں! یہ تو کوئی ہم سے پوچھے! پوچھے! فرید پاشا نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ ناکل اس کے ساتھ شہر میں رہتی تھی جب کہ شاجین نامی چٹکی پیو کی اس آبا کی گاؤں سید پور میں سرسرا میں رہتی تھی۔

اس سے پہلے کہ یہ موضوع کوئی سنگینی اختیار کر جاتا تو قاضی سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”قاضی صاحب! اگر آپ صدف سے ملنا چاہتے ہیں تو میں کسی وقت ان بلاؤں لگا۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا ”اور سائیں! کسی سر کا کیا حال ہے؟“

وہ مجھے اپنے علاقے اور حالات سے آگاہ کرنے لگا۔

ٹھوڑی دیر بعد میں فرید پاشا سے اس کے باپ کے انتقال کی تعزیت کر رہا تھا۔ قاضی اور پاشا اکیلے ہی آئے تھے۔ شاجین شوہر اس دوران میں ٹھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر گھر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ آخر میں میں نے پاشا سے کہہ کر قہری اور فاضلہ کالونی والی کوٹھیوں کے بارے میں دریافت کیا۔

وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا اور ہمیں لہجے میں بولا ”ویدان! تم وہاں لاہور میں بڑا لمبا چوڑا پوڑا ڈال آئے تھے لیکن بہر حال میں نے سارے معاملات سینٹ کر لیے ہیں۔ ذرا دیر کو رک کر وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا ”تعلقات کا ذرا ہے یا! اگر میری جگہ کوئی ہمارا ہوتا تو لگ جاتا ہے چارہ کار تارک کھڑے میں۔“

قاضی دوستی اور حلق کے طفیل بھائی کے اچھے الفاظ سے آشنا تھا۔ فرید پاشا نے پوڑا کا لفظ استعمال کیا تو وہ جتنی خوش سے مجھے دیکھنے کے بعد پاشا سے بولا۔

”ویدان جہاں جاتا ہے وہاں پوڑا ڈال دیتا ہے۔ اندرون سندھ میں بھی اس نے کچھ کم اخراجات کیے چکانی تھی!“

پھر ہمارے درمیان گزرے ہوئے واقعات و حالات کی بات ہونے لگی۔ ممتاز کا دوبارہ آخو لاہور میں چلنے والے خون ریز واقعات پھر کراچی کی بنگلہ۔ خیر سمجھا بیہودہ نواز تنظیم کی ایف کے شیعہ غوری جو بددی و نیٹ ورک الغرض میری زندگی کے تمام ہی اہم شعبے آئے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی

قاضی و پاشا نے ایک مرتبہ بھی منہاس باقر پر ٹوٹنے والی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ دو کئی بھانے کا ایک عمدہ نمونہ تھا! ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ مغرب کی اذان ہونے لگی۔ اس وقت ساحل کا موضوع چل رہا تھا اور میں فی الحال ٹریک سے جتنا چاہتا تھا لہذا وہاں سے رخصتی کے لیے نکلے گا۔ مجھے ہر صورت آٹھ بجے سے پہلے شہزاد کے پاس پہنچنا تھا!

اگلے اور پچھڑنے کا مکمل انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ انسان متخل طور پر کسی ایک حالت ایک مقام پر نہیں رہ سکتا۔ فرید پاشا کو ای رات واپس لاہور جانا تھا اور قاضی سلطان کو اگلے روز کی سر روانہ ہونا تھا تاہم وہ دونوں باری باری مجھ سے بغل پر ہوئے۔

فرید پاشا نے بڑے وثوق سے کہا ”انشاء اللہ! ہم بہت جلد واپس آئیں گے۔“

”انشاء اللہ!“ میں نے مختصر گوئی پر اکتفا کیا۔

دل میں اچانک ایک بے نامی بے چینی اور اضطراب برپا۔ میں نے سمجھ کر کہہ دیا تھا لیکن محسوسات چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے۔۔۔ ہماری آخری ملاقات ہے! اس وقت مجھے کسی کو اپنے احساسات سے آگاہ کرنا ضروری نہ جانا اور لگنے خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ بے تکیا کی طرح مجبور کیا کرتی ہے!

وہ سب یہی سمجھتے ہوں گے یہ ل کر پچھڑنے کی طواریت ہے۔ دوپہی اپنی جگہ ٹھیک ہی تھے مگر ان کو کون بتا کہ یہ ابدی جانی کی غلایت ہے!

☆☆☆

کئی زمانے میں وہ برساتی نالا ہوا کرتا تھا۔ بعد میں شہر آباد ہوتے ہوئے پھیلنا چلا گیا۔ بستیوں اور علاقے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے تو اس نالے کے اندر مرکب بنا کر لائی کی ایچ سوسائٹی اور ای مارکیٹ کو آپس میں ملا دیا۔ یاد دہانہ برساتی نالا جینیسر ہالٹ کے نزدیک ریلوے لائن سے نیچے سے گزرتا تھا۔ اس نالے پر بنی ہوئی پلایا شاید گزرنے والے کے زمانے سے تھی۔

میں نے بے ڈی ملک کو شکار کرنے کے لیے اسی پلایا کا شکار کیا تھا۔ پلایا کے نزدیک دونوں جانب کم از کم پچاس گز فاصلہ تھا کاربن رہتا تھا۔ اکثر و بیشتر پولیس والے اس فاصلے میں چھپ کر کشتار ٹیمیں والوں سے ”ملاقات“ کیا کرتے۔ وہ راستہ خاصا شارٹ کٹ تھا لیکن رکشا ٹیکسی والے ان کے پولیس والوں کے خوف سے ادھر سے جانے کو تیار

نہیں ہوتے تھے۔

میری تازہ ترین معلومات کے مطابق پولیس رات ساڑھے دس کے بعد ہی اپنی کارکردگی کا آغاز کرتی تھی لہذا ہمیں ان کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے تک اپنے مشن سے فارغ ہو جاتے۔

ہماری ہدایت کے مطابق فیصل نے بے ڈی ملک سے فون پر بات کر کے اسے صفدر علی کے بنگلے سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فیصل ملک کے لیے ایک آقا کی حیثیت رکھتا تھا اس کے حکم سے سرٹائی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بے ڈی ملک نے ٹھک ساڑھے آٹھ بجے اس پلایا کے نیچے سے گزرتا تھا۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ اٹکلا آئے۔ اس نے گاڑی کا نمبر بتا دیا تھا اور وعدہ کیا تھا وہ فیصل کی ہدایت کو یاد کرے گا۔

پروگرام کے مطابق بے ڈی ملک کو یہی بتایا گیا تھا کہ فیصل ای مارکیٹ کے نزدیک ایک نان بانی کی دکان کے قریب کسی خفیہ گوشے میں چھپا کھڑا ہوگا اور جیسے ہی وہ بے ڈی ملک کی گاڑی کو دیکھے گا سائے آجائے گا۔ پھر بے ڈی ملک اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ہمارا شکار نیلے رنگ کی ٹویوٹا اسٹارٹ میں آ رہا تھا۔ ای مارکیٹ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ جینیسر ہالٹ والے ریلوے پھاٹک کی طرف سے تھا لیکن شہزاد کی تاکید کے مطابق فیصل نے پلایا کے نیچے سے گزرنے کی شرط لگا دی تھی۔ بے ڈی ملک کو پلایا کے نیچے سے گزرنے پر بائیں جانب مڑنا تھا۔ جہاں چند گز کے فاصلے پر مذکورہ نان بانی کی دکان تھی۔

اس مشن میں شہزاد نے اپنے ایک با اعتماد دوست کو بھی شامل کیا تھا لیکن پلایا والی کارروائی کی حد تک۔ محمود نامی وہ شخص ہرگز نہیں جانتا تھا کہ بے ڈی ملک کون ہے اور ہم اسے کہاں کس مقصد کے لیے لے جانا چاہتے ہیں۔ شہزاد نے اسے اتنا ہی بتایا تھا ایک دشمن کو چھپانا ہے جو ساڑھے آٹھ بجے رات نیلی اسٹارٹ میں پلایا کے نیچے سے گزرے گا۔ شہزاد اور محمود دونوں مسلح تھے اور پولیس کی وردی میں بھی۔ یہ وردیاں شہزاد ہی نے مہیا کی تھیں۔ محمود اپنی موٹر سائیکل بھی لے آیا تھا۔

ہماری پلاننگ کے مطابق شہزاد اور محمود کو پولیس والوں کے جھج میں پلایا کے نزدیک موجود رہنا تھا۔ جیسے ہی نیلی اسٹارٹ پلایا میں داخل ہونے کے لیے ڈھلوان اترتی، محمود اسے رکنے کا اشارہ کرتا۔ لائحہ عمل بے ڈی ملک کو گاڑی روکنا پڑتی۔ پولیس والوں سے خواہ مخواہ بھڑکاؤ کوئی بھی مول نہیں لیتا۔ محمود ملک کو گاڑی سے باہر نکلنے کو کہتا ”بھانہ چینگک وغیرہ کا



ہوتا۔ ملک کے پاس انکار یا اعتراض کی کوئی محال نش نہ ہوتی۔ وہ اس محال کی چنگل کے لیے گاڑی سے نیچے اتر آتا۔ بس وہی لمحہ جاری کارروائی کا ہوتا۔

شہزادہ تھوڑے ہی فاصلے پر موٹر سائیکل کے قریب کھڑا ہوتا۔ میں اس ڈھلوان کے آغاز پر لائٹ گرین ہونٹا سوک میں ریڈ لائٹ بیٹھا ہوتا۔ شہزادہ جیسے ہی بے ڈی ملک کو گمن پوائنٹ پر لاتا، میں سوک کو اس کے نزدیک لے آتا۔ اگلے ہی لمحے شہزادہ بے ڈی ملک کو گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچا کر اپنے قابو میں کر چکا ہوتا۔

یہ ایک صاف ستھری اور بے داغ منصوبہ بندی تھی۔ میں نے جانے وقوعہ اکثر دوران رہتی اس لیے ہمیں اپنی کارروائی میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔ اس مختصر سے انکیشن کے بعد ہم بے ڈی ملک کو اپنے خیمہ ٹھکانے پر لے آتے اور محمود اپنی سوڈی موٹر سائیکل پر گھس چکی روانہ ہو جاتا۔ اور اب ہم اپنی اپنی پوزیشن پر بالکل تیار کھڑے تھے۔

میں نے گاڑی کو ایک ایسی جگہ روک رکھا تھا جہاں گاڑی کے اندر رہتے ہوئے میں عقب نما آئیے میں نیلی اشارت کو اس سڑک پر مڑتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ”پولیس ٹاکنے“ پر بھی میری نگاہ تھی۔ میری گاڑی اس زوایے سے پارک تھی کہ میں پہلی نظر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نظر نہ آتا۔ وہاں نیم تاریکی کا راج تھا۔

پھر وہ گاڑی میری نظر میں آگئی۔ اس وقت آٹھ بج کر کچھ منٹ ہوتے تھے گویا بے ڈی ملک پانچ منٹ پہلے آگیا تھا۔ نرسری کی جانب سے آنے والی سڑک پر سے جب نیلی اشارت ہماری گلی میں مڑی تو میں تن کر بیٹھ گیا۔ میں نے پہلی نظر میں نمبر پلیٹ کو دیکھ کر گاڑی کا نمبر کنفرم کیا پھر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف میری نگاہ اٹھ گئی۔

میں نے سبے ڈی ملک کو رو بہ رو نہیں دیکھا تھا۔ تاہم فیصل کی زبانی اس کا جو جلیہ میری یادداشت میں نقش ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص اس پر فٹ بیٹھا تھا۔ اور وہ گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا ملک نے فیصل کی ہدایت پر من و عنان کر لیا تھا۔

نیلی اشارت میرے پاس سے گزر کر پلہا کی سمت بڑھ گئی تو میں نے نہایت ہی جا بک دیتی سے تیشیق اور شائستہ مزاج ہونٹا سوک کا انجن بیدار کر دیا۔ وہ دو بے سنی خیر نکاح تھے اور سینکڑوں دس دس حصہ بھی ”کام کام اور صرف کام“ کا متقاضی تھا۔

میری آنکھوں نے دیکھا ہے ڈی ملک نے ”پولیس“

کے اشارے پر بڑی شرافت سے گاڑی روک لی۔ میں بالکل تیار کھڑا تھا۔ جیسے ہی ملک اشارت سے باہر آیا میں نے گاڑی کو لمبا جتنیوں کے فطیل اس کے قریب پہنچانے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

وہ میری اس حرکت پر چونکا لیکن میں اس سے پہلے اشارت کے اندر ہونے والی غیر متوقع ”حزکت“ پر چونکا اٹھا تھا۔ اشارت کی عقبی نشست پر میں نے ایک انسانی سر کی نموداری دیکھ لی تھی۔ میرے ذہن نے چشم زدن میں فیصل کا اور میں نے گاڑی روکنے کے بجائے اشارت کی پشت سے نکل کر ادنی۔

یہ ایک اجابک حرکت تھی جو میری گاڑی کی فرنٹ رائٹ سائیڈ نے ملک کی گاڑی کی بیک لینٹ سائیڈ کو مار لی تھی۔ اشارت اشارت تھی۔ وہ میری گاڑی کا دھکا کھا کر شیب بڑا چل نکلی اور اتفاق سے اس کا رخ آنے والے راستے کی جانب ہو گیا۔ اس دوران میں شہزادہ بے ڈی ملک کو مارا بنا چکا تھا۔

اس لیے اشارت کے عقبی حصے سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ لیکن ہم کلی طور پر محفوظ رہے۔ اشارت بڑے بے ڈھنگے انداز میں قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے راگ سائیڈ سے پلہا میں داخل ہو رہی تھی اس لیے فائرنگ کرنے والے کا نشانہ چونک گیا۔ اس موقع پر چونکا ہمارے لیے انتہائی خطرہ ثابت ہو سکتا تھا۔ شہزادہ بے ڈی پھر مرنے کے ساتھ بے ڈی ملک کو سوک کی عقبی نشست پر بٹھا اور خود بھی گھس کر اندر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے گاڑی کو پلہا کے انجین ڈال دیا۔ ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ خطرناک کاشف گرجی لیکن ہم یک سر فائرنگ کی رینگ سے باہر تھے۔ محمود اپنی موٹر سائیکل پر ایک طرف کھسک گیا تھا۔

”اس غیبت نے مجھے ملک کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“ شہزادہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ بے ڈی ملک کے سانچے کی طرف تھا جس نے دو مرتبہ فائرنگ کر کے ہمیں روکنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے عقب نما آئیے میں بیک دیو کا جائزہ لیا۔ اشارت پلہا کے عین نیچے چمک کر رہ گئی تھی۔ سامنے کی طرف سے ایک مردانہ شکل اس کی راہ روک کھڑا تھا۔ کلاں بردار شخص جب تک ڈرائیونگ سیٹ سنہاں کر سیدھے راستے ہمارے تعاقب میں لپکتا تھا ہم اس کی پیچھے سے بہت دور نکل گئے۔ میں نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے سوک محمود آباد گیٹ کی جانب بڑھا دیا۔

اس لیے شہزادہ نے بے ڈی ملک کو بڑی بے دردی سے بٹ کے اوپر سے اپنے پاؤں میں پہنچا دیا۔ پھر اس کے تانے پر رکھتے ہوئے غریبا ”عہد شکن نامرادوں کو میں اپنے زخموں میں رکھتا ہوں۔“ بات ختم ہی اس نے اپنا ایک پاؤں ملک کے سینے پر جمادیا۔

ملک کے لیے یہ ایک غیر متوقع اور ہولناک صورت حال تھی۔ اس کی زبان سے ابھی تک میرا نام خارج نہیں ہوا تھا اس کا یہی مطلب تھا وہ مجھے صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں نے گاڑی کو کار پوریشن سے ٹرن کیا اور کلاں کی طرف ہانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ یہاں اسپید بڑھانے میں خاصی آسانی محسوس ہوئی۔

بے ڈی ملک شہزادہ کے پاؤں تلے دبے دبے مٹاپا ”میں نے کون سی عہد شکنی کی ہے؟“ ”فیصل نے تم سے کہا تھا اکیلے آتا۔“ شہزادہ ترشی سے بولا ”اور تم اپنے اس من بردار چیلے کو گلی میں چھپلا لے لہجہ اور کیا ہوتی ہے؟“

”فیصل کہاں ہے؟“ ملک نے ترت پوچھا۔ ”اگر یہ تمہارا آخری سوال ہے تو سن لو فیصل اس وقت جال بھی ہے تمہیں وہیں پہنچایا جا رہا ہے۔“ شہزادہ نے کہا اور پلہا کے لیے بغیر بولا ”یار! گاڑی کو یاری گیٹ کے بعد بائیں جانب اندر لے لو۔ میں ڈیفنس فیرون کے اندر ہی اندر رہے ہوں ڈیفنس آنسری کی طرف نکل جائیں گے۔ وہاں سے فیصل پلہا کے بڑے لپٹا آگے کا راستہ تمہیں معلوم ہی ہے۔“

میں نے خاموشی سے شہزاد کی بات پر عمل کر ڈالا۔ بے ڈی ملک مجھے دیکھ نہیں پاتا تھا اور شہزاد کی بھی یہی کوشش تھی وہ گاڑی میں پھری موجودی میں آگاہ نہ ہو پائے۔ مجبوری کی بات دوسری تھی۔

شہزاد کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ بے ڈی ملک نے ”بھائو! اگر تم فیصل سے ملوانے جا رہے ہو تو مجھ پر تمہارا خیال رکھو۔ تم ایک شخص دوست کا رول ادا کر رہے ہو میں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تمہارا انداز دشمنوں کا کیوں ہے؟“

ایک بات ماننے والی تھی کہ اس کس پر میری حالت میں بے ڈی ملک نے اپنے حواس کو بے قابو نہیں ہونے دیا فوٹاس کا مطلب تھا وہ مضبوط اعصاب اور خندے دماغ کا انداز تھا کہ اس وقت شہزادہ کے تصور بہت خطرناک نظر آ رہے تھے۔ وہ دھمکی آمیز لہجے میں پھنکارا ”تمہاری سمجھ میں اگر

میری دوستی دشمنی نہیں بیٹھ رہی تو میں اس سمجھ کا آرٹیشن کر دوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ ایک لمحے کو رکھا پھر سناتے ہوئے انداز میں بولا ”تم نے ثابت کر دیا ہے وہ تمہارا آخری سوال نہیں تھا لیکن میں تمہیں بتا دوں گا کہ اگر اب تم نے اپنی نخوس زبان کھولی تو میں اپنی کن تمہارے سینے میں خالی کر دوں گا اور اس کا مطلب یہی ہے کہ کن خالی کر دوں گا جو پوری طرح بھری ہوئی ہے!“

گاڑی کے اندر کامل سناٹا چھا گیا۔ بے ڈی ملک جیسے گھاگ شخص نے صورت حالات کی گتگی اور شہزادہ کے الفاظ کی بے رحمی کو حقیقی معنوں کے ساتھ سمجھ لیا تھا۔

میں ڈیفنس آنسری مسجد والے خوب صورت پارک اور صدف کی رہائش گاہ کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے فیصل ہائی وے (مین کورنگ روڈ) پر آگیا۔ یہاں سے دور استوں کے ذریعے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ سکتے تھے۔ ایک تو فیصل ہائی وے کے اس کرنے کے بعد فیرون کے اندر ہی اندر راستہ تھا اور دوسرا راستہ فیصل ہائی وے پر سفر کرنے کا تھا۔ آگے جا کر ہم میں خیابان اتحاد پر مڑ جاتے جو چند منٹ میں ہمیں منزل مقصود پر پہنچا دیتا۔

میں نے فیرون کے قلب سے گزرنے والے راستے کا انتخاب کیا اور ہونٹا سوک کی رفتار میں بہت درجہ اضافہ کرتا چلا گیا۔ بے ڈی ملک ایک طرح سے اندھا ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے قطعاً یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ اپنے ہی علاقے سے گزر کر کچھ بڑھ چکا تھا۔

ٹھیک ٹوبے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ شہزادہ نے گاڑی کے اندر ہی ایک سیلا پکڑا ہے ڈی ملک کی آنکھوں پر کس کر باندھ دیا تھا۔ یہ گاڑی صاف کرنے والا ایک بدوادر پکڑا تھا جو بے ڈی ملک کے لیے ہماری طرف سے ہونے والی خاطر تواضع کی پہلی ڈش تھی۔ بنگلے میں داخل ہونے کے بعد ملک کو آنکھیں بندھے بندھے ایک محفوظ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ اس بات سے یک سرے پر خبر تھا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

شہزادہ قید و بند کا معقول سامان وہاں پہنچا چکا تھا۔ آئندہ چندہ منٹ میں شہزادہ نے میری مدد سے بے ڈی ملک کو بڑے قسلی آمیز انداز میں ”سیٹ“ کر دیا۔ میں اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ درنگل نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اس کے انداز سے خاصی گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ ٹیلی فون والے کمرے میں آیا اور جلدی سے

پوچھا ”کیا بات ہے زرگل۔ تم اس قدر بوکھلائی ہوئی کیوں ہو؟“

”تمہاری آمد سے ایک منٹ پہلے صدف کا فون آیا تھا۔“ اس نے بتایا ”وہ فوری طور پر تم سے بات کرنا چاہتی ہے اس کے لیے سے میں نے یہ محسوس کیا ہے، وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔“

زرگل کی بات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا ”اس نے کچھ بتایا نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی ”بس اتنا کہا ہے وہ تھوڑی دیر بعد دوبارہ فون کرے گی۔ اس دوران میں وہ تمہیں فلیٹ اور منہاس صاحب کے بنگلے پر فزس کرنے کی کوشش کرے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کوئی سیریس معاملہ ہے!“ میں یک دم متحیر ہو گیا۔

اس دوران میں شہزاد بھی ہمارے پاس آ گیا۔ ہمارے لگے ہوئے چہروں نے اسے پریشان کر دیا۔ اچھے ہوئے لہجے میں بولا ”تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟“

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اس کے سوال کا جواب دیتا، ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے لپک کر ریسور اٹھالیا۔ دوسری طرف صدف تھی۔

وہ بیچانی لہجے میں بولی ”تم کہاں رہ گئے تھے وجدان؟“

”کیا ہو گیا صدف؟“ میں نے اتلا سی سے سوال کر ڈالا۔

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی ”میں نے ساحل کا سراغ لگا لیا ہے۔ تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔“

صدف اتنی بڑی بات کہہ رہی تھی کہ میں اچھل پڑا ”تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟“ میں نے بتائی سے پوچھا۔

”فون پر ہی چوڑی بات نہیں ہو سکتی۔ میں ایک پبلک کال آفس سے بات کر رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے“ میں آ رہا ہوں۔ تم مجھے بالکل درست لوکیشن بتاؤ؟“

”میں عوامی مرکز کے سامنے سڑک کی دوسری طرف اپنی گاڑی میں ہوں۔“ اس نے بتایا ”میں نے اپنی گاڑی سروس روڈ کے کنارے کھڑی کر رکھی ہے۔ فون رکھنے کے بعد میں گاڑی میں بیٹھوں گی۔“

میں نے پوچھا ”تم لال قلعہ والی سائیکل کی بات کر رہی ہو نا؟“

”بالکل صحیح۔“

”تم نے اس بات کا کسی اور سے ذکر تو نہیں کیا؟“

”قطعاً نہیں۔“ وہ دونوں انداز میں بولی۔

”تم میرا انتظار کرو میں آدھے گھنٹے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں نے ریسور رکھا تو وہ دونوں استغیابہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں مختصر احوال سے حال اسے آگیا پھر شہزاد سے کہا۔

”مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ تم دونوں ان دونوں پر گہری نظر رکھو گے۔ انشاء اللہ میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا۔“

شہزاد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن میں نے اسے سختی سے منہ کر دیا اور کہا ”جب تک میں واپس آتا ہوں تو دونوں کی ڈرائنگ تیار کرو۔ پھر میں دونوں مل کر ان میں رنگ بھر رہے۔“

وہ سختی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

شہزاد اور زرگل کی خواہش تھی کہ میں گاڑی میں جاؤں لیکن میں نے ہونٹ اسوک کو زیرِ تعمیر بنگلے پر ہی چھوڑا اور ایک نئی ٹیلی فون کیسی پکڑ کر صدف کی طرف روانہ ہو گیا۔ صدف نے اتنی بڑی خوشخبری سنائی تھی کہ میرا حق بدن ہوا میں اٹھنے لگا تھا۔ میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کو ہوائی گھوڑا بنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں صدف کی دہانت سنی میں جیٹا اس سے استفسار کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے پونے دس بجے تھے۔ صدف نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ ایک حیرت انگیز افسانہ ہی تھا۔ اس کے مطابق وہ اپنی ایک دوست سے مل کر واپس آ رہی تھی کہ کار سائز کے نزدیک اس نے ٹنڈ گلاسز والی ایک سیاہ گاڑی کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ روڈ کی دوسری جانب تھی۔ ٹنڈ گلاسز والی گاڑی کا گزرتا کوئی خاص بات نہیں لیکن اس سیاہ گاڑی کے پیچھے جانے والی پچھڑے صدف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرادی۔ اس نے مذکورہ پچھڑوں کو گھیب مٹھانی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ ایک لمبے کوساٹوٹ ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے وہ گھیب مٹھانی ہی تھا؟“ میری آواز خاصی تیز تھی۔

”ایک سو ایک فی صد یقین ہے۔ میں نے گزشتہ رات اسے نقلی پولیس موپائل میں بیٹھے دیکھا تھا۔“ صدف نے پورے وقوف سے کہا۔

”تم مجھے ساحل کے بارے میں بتانے والی تھیں؟“

”تم نے اس بات کا کسی اور سے ذکر تو نہیں کیا؟“

”وہ دونوں انداز میں بولی۔“

”تم میرا انتظار کرو میں آدھے گھنٹے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں نے ریسور رکھا تو وہ دونوں استغیابہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں مختصر احوال سے حال اسے آگیا پھر شہزاد سے کہا۔

”مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ تم دونوں ان دونوں پر گہری نظر رکھو گے۔ انشاء اللہ میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا۔“

حالات پیش آتے آتے ان سے نمٹ لیا جاتا۔ ہم دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ نگاہوں کی نگاہوں میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا اور اپنی اپنی راہ پر ہو لیے۔

مجھے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کرنا پڑی۔ گیٹ پوری طرح بند تھا اور چوکیدار گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے نہایت ہی ہوشیاری سے دیوار پھاندی اور بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ سامنے ایک وسیع و عریض ڈرائیو سے نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے جسے میں ایک پوائنٹس چوٹی دروازہ موجود تھا۔ جہاں سے عمارت کے اندرونی حصوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔ مذکورہ دروازہ بند تھا۔

میں نے اپنے گرد و پیش پر ایک چوکنا لگا ڈالیا اور مطمئن ہونے کے بعد بعد قدموں نقش دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نے برآمدے کا نصف حصہ ہی عبور کیا تھا کہ میرے قدم یک بہ یک رک گئے۔ اس وقت عقب سے کسی نے لٹکارا۔

”خبردار! ایک قدم بھی اٹھایا تو جان سے جاؤ گے! اس وقت تم ایک خطرناک گمن کے نشانے پر ہو۔ یہ جدید طرز کی ہلاکت تیرے کے ہے۔“

میں ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے ”پنڈ زاب“ ہو گیا۔ حالات کی تسم غریبی نے اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔

میرے عقب میں موجود گمن بردار ذرا قریب آ گیا پھر اس نے مجھے راکفل کے نشانے پر رکھتے ہوئے جامہ تلاش لی۔

اس کا انداز بد اسمری اور تشویشناک والا تھا۔ میں سمجھ گیا اسے کسی مہلک ہتھیار کی تلاش تھی۔ میرے لباس میں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی چنانچہ اپنی تسلی کرنے کے بعد اس نے دوبارہ مجھے حکم دیا۔

”مکھوم جاؤ!“

میں کی ہداری کا بچہ جمہور نہیں تھا جو اس کے ایسے بے ہودہ احکام کی تعمیل کرتا۔ میں تو وہاں ڈگڈگی بجائے آیا تھا جس کی خصوصاً آواز پر ان سب کو نا چننا تھا۔

ہاتھ ہوا میں بلند رکھتے ہوئے میں جٹم زدن میں گھوما لیکن اس سے پہلے میری ویل کک چلی۔ نقض میں ”شائیں“

کی آواز پیدا ہوئی اور میرے پاؤں کی طوفانی ضرب نے گمن بردار کی کپڑی پر دستک دی۔ ٹانگ کے لیے میں اس کے ہاتھ آگئے لہذا اس کی گرفت سے نکل کر برآمدے کے پختہ فرش پر گر گئی۔ وہ ایک غیر متوقع آفت کی زد میں آ گیا تھا۔

میں نے اس بات کا کسی اور سے ذکر تو نہیں کیا؟“

”وہ دونوں انداز میں بولی۔“

”تم میرا انتظار کرو میں آدھے گھنٹے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں نے ریسور رکھا تو وہ دونوں استغیابہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں مختصر احوال سے حال اسے آگیا پھر شہزاد سے کہا۔

”مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ تم دونوں ان دونوں پر گہری نظر رکھو گے۔ انشاء اللہ میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا۔“

وہ سختی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

شہزاد اور زرگل کی خواہش تھی کہ میں گاڑی میں جاؤں لیکن میں نے ہونٹ اسوک کو زیرِ تعمیر بنگلے پر ہی چھوڑا اور ایک نئی ٹیلی فون کیسی پکڑ کر صدف کی طرف روانہ ہو گیا۔ صدف نے اتنی بڑی خوشخبری سنائی تھی کہ میرا حق بدن ہوا میں اٹھنے لگا تھا۔ میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کو ہوائی گھوڑا بنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں صدف کی دہانت سنی میں جیٹا اس سے استفسار کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے پونے دس بجے تھے۔ صدف نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ ایک حیرت انگیز افسانہ ہی تھا۔ اس کے مطابق وہ اپنی ایک دوست سے مل کر واپس آ رہی تھی کہ کار سائز کے نزدیک اس نے ٹنڈ گلاسز والی ایک سیاہ گاڑی کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ روڈ کی دوسری جانب تھی۔ ٹنڈ گلاسز والی گاڑی کا گزرتا کوئی خاص بات نہیں لیکن اس سیاہ گاڑی کے پیچھے جانے والی پچھڑے صدف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرادی۔ اس نے مذکورہ پچھڑوں کو گھیب مٹھانی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ ایک لمبے کوساٹوٹ ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے وہ گھیب مٹھانی ہی تھا؟“ میری آواز خاصی تیز تھی۔

”ایک سو ایک فی صد یقین ہے۔ میں نے گزشتہ رات اسے نقلی پولیس موپائل میں بیٹھے دیکھا تھا۔“ صدف نے پورے وقوف سے کہا۔

”تم مجھے ساحل کے بارے میں بتانے والی تھیں؟“

”تم نے اس بات کا کسی اور سے ذکر تو نہیں کیا؟“

”وہ دونوں انداز میں بولی۔“

”تم میرا انتظار کرو میں آدھے گھنٹے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں نے ریسور رکھا تو وہ دونوں استغیابہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں مختصر احوال سے حال اسے آگیا پھر شہزاد سے کہا۔

”مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ تم دونوں ان دونوں پر گہری نظر رکھو گے۔ انشاء اللہ میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا۔“

وکیل ملک بڑی خطرناک اور سرخ لاش ہو کر ہے اور یہ ملک استعمال کرتے ہوئے تھوڑا سا آگے کو جھکتا پڑتا ہے۔ اس سے حملہ آور کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اگر وکیل ملک نشانے پر نہ بھی لگے تو اس کی باڈی تیر مقابل کے ایک سے محفوظ رہتی ہے۔

میری وکیل ملک اپنے جائز مقام پر لگی تھی۔ مجھے دھمکی دینے والا سر کو تمام کر پیچھے الٹ گیا۔ مگر اس کے قریب ہی مگر ٹی جی دریہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس نے گن اٹھانے کے لیے زمین پر پڑے پڑے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں اس برطلے پر چونکے والا کہاں تھا۔ میں نے فضا میں ایک بچی چپ لگائی اور پیرشک کے انداز میں اپنا پاؤں اس کے ہاتھ پر مارا۔ اس کے حلق سے بڑی دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کا ہاتھ گن اور میرے پاؤں کے بیچ آ گیا تھا۔ وہ اپنے کھائل ہاتھ کو تمام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میں نے جھک کر کلاشکوف اٹھالی۔

اسی لمحے تقسیم چوٹی دردناک کھلا اور دہار۔ سے دو ہتے کٹے افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر فراتفری میں اس کی خبریہ معلوم کرنے آ گئے تھے۔ میرے پاس تیار کلاشکوف دیکھی تو ان کے چہرے دھواں ہو گئے پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے دھواں اندر گھس گئے۔

میں نے اندرونی حصے میں قدم رکھنے سے پہلے برآمدے کے فرش پر موجود تکلیف میں جتنا شخص کی مشکل آسان کی۔ یہ ڈاکٹروں کا آزمودہ کار نسخہ ہے۔ وہ کسی بھی سرخ لاش کو شدید تکلیف سے نجات دلانے کے لیے نیند کا انجکشن دیتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص کو گہری بے ہوشی میں پہنچایا۔ مقصد ایک ہی تھا۔ بس اپنے اپنے طریقہ کار کی بات ہے!

مجھے سچا دیکھ کر بیٹے والے اب تک نہیں ہوں گے۔ انہوں نے یقیناً اندر پہنچتے ہی اپنے ہتھیار سنبھال لیے ہوں گے لہذا مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں اگلے قدم کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ جنگلے کے اندرونی حصے میں بی بی آوازیں ابھریں۔ میں سمجھ گیا صدف نے کارروائی شروع کر دی تھی وہ شیر کی بچی اسی طرح انڈی دیتی تھی۔

میں جنگلے کی سائید لیتے ہوئے پہلو میں آ گیا۔ اس طرف میں نے ایک روشن کھڑکی دیکھی تھی۔ سامنے کے بجائے اس جانب سے اندر داخل ہو کر زیادہ مناسب تھا۔ میں نے کھڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ بندھی اور اس میں نصب شیشے اندر روشنی کا پتا دیتے تھے۔ میں نے سب سے اوپر والے شیشے پر داخل

دستہ مارا اور بیک کرا ایک طرف نکل گیا۔

جھانکے کی تیز آواز کے ساتھ شیشہ ٹوٹا اور اس کی کڑیاں دور تک پھیل گئیں۔ میں نے ایک لمحہ دیوار کے ساتھ کھڑکے سے کر انتظار کیا جب کھڑکی میں کوئی سرگرمی نظر نہ آئی تو میں کچھ گیا اس کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ شکر تھا ابھی تک جنگلے کے اندر کسی فائر کی آواز نہیں کوئی تھی۔

میں آگے بڑھا اور نوٹے ہوئے شیشے میں سے اٹھ کر کھڑکی کی عکس گرا دی۔ اگلے ہی لمحے میں کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

وہ کمرہ میری توقع کے مطابق خالی تھا اور اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ اسی لمحے دروازے کے باہر مجھے دھواں کی چابک سنا دی۔ میں لپک کر نیم وا دروازے کے پیچھے پھنک گیا۔ شاید کوئی شیشے کے ٹوٹنے کا سبب جانے اس طرف آ نکلا تھا۔ بڑی دیر کی تھی اس مہربان نے آتے آتے!

مگر میں کسی دیر کے موڈ میں نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ شخص جھانکنے والے انداز میں کمرے کے اندر داخل ہوا، میں نے بڑی بے دردی سے کلاشکوف کا ہیٹ اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ وہ ایک بے معنی آواز نکال کر منہ کے بل فرش پر گرا۔ اسی لمحے باہر سے کسی نے پکار کر پوچھا۔

”اور بس آیا ہوا۔ یہ آواز کیسی تھی؟“

پتا نہیں اور بس کا ساتھی شیشے کے ٹوٹنے کی آواز کے بارے میں استفسار کر رہا تھا یا اس کے منہ سے خارج ہونے والی بے معنی صدا کا پوچھ رہا تھا۔ ہر دو صورت میں اور بس نا ہی وہ شخص جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اب یقینی تھا اور بس کا ساتھی اس کی کیفیت معلوم کرنے ادھر کا رخ کرتا۔ میں کلاش کو تان کر ریڈارٹ ہو گیا۔ اور بس کے خیر خواہ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ اور بس ادھ کٹے دروازے میں سے صاف زمین بوس نظر آ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ باہر موجود شخص خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا، میں ایک جھپٹے سے دروازہ کھول کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ انہی دو افراد میں سے ایک تھا جو تھوڑی دیر پہلے بڑے برآمدے والے دروازے میں نمودار ہوئے تھے۔ اس تو منہ شخص کے ہاتھ میں مجھے ریو اور دکھائی دیا۔ مجھ پر گاہ پڑتے ہی اس نے ریو اور سیدھا کرنا چاہا لیکن میں نے اسے

ہلت نہ دی۔

میں بڑی تیزی سے ہوا میں اچھلا اور ایک دھواں دھار مٹھا اس کے سینے پر رسید کیا۔ دوسرا اٹھنا اس کے پیٹ کے زیریں حصے پر پڑا۔ ناف کے مقام پر پڑی شدید جوت آتی ہے اور تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ کسی زخمی حواری اونٹ کے مانند ہلایا۔

میں نے اسی پر بس نہ کیا اور اس کے چہرے کے مختلف حصوں کو نشانہ بناتے ہوئے متحدہ خوفناک بیج جڑ دیے۔ اس کا چہرہ بولہبان ہو گیا۔ ان ناگفتہ بہ لمحات میں اسے ریو اور چلانے کا خیال کہاں سے آتا اس کے لیے تو سانس لینا دھیر ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اور ”خاطر داری“ کی اور اسے فرش پر لبا لبا دیا۔ ریو اور کو اٹھا کر میں نے پتلون کی جیب میں رکھا اور ایک طویل راہ داری میں دوڑ گیا۔

اس راہ داری کا اختتام ایک کشادہ کمرے پر ہوا۔ وہاں میں نے صدف کو دو افراد کے ساتھ دھواں دھار انداز میں نبرآزما دیکھا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا اسے میری مدد کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں مطمئن ہو کر اس کا فائننگ اسٹائل دیکھنے لگا۔

یہ اطمینان بڑا عارضی ثابت ہوا اور میں منہ کے بل فرش پر آ رہا۔ کسی نے بڑے خوفناک انداز میں مجھے عقب سے دھکا دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا دے دھواں میرے قریب پہنچا تھا اور میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے مجھے زمین بوس کر دیا تھا۔

میں نے اٹھنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی لیکن اس دوران میں وہ گینڈا مجھے اپنے بطل کے نشانے پر رکھ چکا تھا۔ میں نے ہلک جھپٹے میں اسے پہچان لیا۔ وہ منتشل دروازے سے پلٹنے والا دوسرا شخص تھا۔

میں نے کلاشکوف سیدھی کرنا چاہی تو وہ غرایا ”نو.....“ مگر کو کچھک دو۔ ورنہ بلا سوچے مجھے کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کلاشکوف کو اور پھینک دیا۔ مگر صدف والے کمرے کے دروازہ کے پاس جا کر کڑی۔ اسی وقت پتول بردار شخص نے مجھے وارننگ دی۔

”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے ہاتھ ہوا میں اٹھاؤ۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی ہدایت کو پورا کیا۔ ہم ایک

دوسرے کے رو بہ رو کھڑے تھے۔ ہمارے درمیان بہ مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میرا رخ صدف کی طرف تھا جب کہ پتول بردار شخص اس کی جانب پشت تھی۔ وہ بڑی چونکا نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

اچانک صدف نے جھپٹے ہوئے اپنے تیر مقابل کو فرنٹ فلائنگ کلک ماری۔ گلس تو وہ پہلے بھی چلا رہی تھی لیکن بچی پہلی مرتبہ تھی میری جھپٹیں جس نے سینڈ کے لاکھ دیں حصے میں

مجھے خبر دی کہ صدف نے مجھے پتول کے نشانے پر دیکھ لیا ہے اور مجھے چانس دینے کے لیے اس نے خواہ مخواہ حلق کا استعمال کیا ہے۔ مجھے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔

نتیجہ حسب توقع برآمد ہوا۔ اپنے عقب میں صدف کی تیز چیخ سن کر پتول بردار ایک لمحے کے لیے ٹھنکا۔ میرے لیے وہ لمحاتی وقفہ بہت کافی تھا۔ میں نے فرنٹ اسٹپ کے ساتھ اس کے پیٹ میں قمر سٹ کلک ماری۔ وہ پتول سمیت پیچھے کو لڑکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی تو مشر شروع کر دی۔

اب ہم دونوں بھی صدف والے کمرے ہی میں تھے۔ پتول اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر دور بڑی کلاشکوف کے

**چارلس سوبراج کی سرگزشت**

میں ملاحظہ فرمائیں

74200, 23, 5802551, 5802552-5895313, E-mail: ktlatul1970@yahoo.com

کتابیات سبلی کیشنز

پاس جاگرا۔ صدف نے اپنے دو مقابلین کی ٹھکانی کے دوران میں مجھ سے کہا۔

”وجدان! میں نے اپنی سائیز صاف کر دی ہے۔ بس یہی دو بچے ہیں تین کو میں نے ادھر لٹ کر دیا ہے۔ تمہاری طرف کیا صورت حال ہے؟“

میں نے اپنے دو مقابل کو تھوڑا مار کر زمین پر چٹا اور کہا۔ ”میری سائیز بھی صاف ہی سمجھو۔ جو کچھ بچا ہے تمہارے سامنے ہے۔“

”ان لوگوں کو جلد از جلد بے کار کر کے ہمیں بنگلے کی تلاش لینا چاہئے۔“ صدف نے بلا ٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک جن گمروں سے گزری ہوں وہاں ساحل مجھے دکھائی نہیں دی۔“

”وہ مجھے بھی کہیں نظر نہیں آئی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اسی وقت صدف سے بچنے والے ایک شخص نے موقع پا کر راہ داری میں دوڑ لگادی۔ یہ صدف کے حصے والی راہ داری تھی۔ وہ اس مفرد شخص کے پیچھے لپکی۔ بڑی سرعت سے بولی۔

”وجدان! تم انہیں سننا لو۔ میں اس بھگوڑے کو مزہ چکھا کرتی ہوں۔“

وہ دونوں میرے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ان کا چھلکا اڑا دیا۔ ایک بات کا مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان تین افراد کے سوا ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا کوئی شخص بنگلے میں بھی نہیں بچا تھا۔ گویا ساحل اور میرے درمیان حامل تمام رکاوٹیں اٹھ گئی تھیں!

اس خیال نے مجھے سر تا پا مسرور کر دیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں کی تپائی بچی خطرناک ضربات سے اپنے مقابل دونوں افراد کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ زمین سے اٹھ کر ہمارے کام میں مداخلت نہیں کریں گے تو میں ان پلنٹ بیج کر اس سمت بڑھ گیا جہاں صدف تھی۔

میں ایک دور راہ داریوں میں پھرایا اور پھر اسی کمرے میں آ گیا جہاں سے چلا تھا۔ وہ بنگلا عجیب و غریب طرز تعمیر کا حامل تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے احساس ہوا جیسے میں مجوں مہلبوں میں آٹھلا ہوں۔ عام طور پر رہائش گاہیں اس انداز میں تعمیر نہیں کی جاتیں۔ اگر ساحل کو اس بنگلے میں رکھا گیا تھا تو

اس کی اہمیت بھی تھی۔

ایک مختار انداز کے مطابق صرف وہی شخص باقی بچا تھا جس کے تعاقب میں صدف گئی تھی۔ مذکورہ شخص بہت چٹا۔ اگر وہ قابو آ جاتا تو اس سے ساحل کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ میں نے اپنے تین تمام ممکنہ کمروں میں جھانک لیا لیکن ساحل کا کوئی سراغ نہ آیا۔

میں اس وقت ایک مشین بنا ہوا تھا۔ ایک راہ داری سے گزرتے ہوئے مجھے صدف نظر آ گئی۔ اس نے مذکورہ شخص کو زمین پر گر کر رکھا تھا اور اس کے سینے پر پاؤں رکھے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ زمین پر گرے ہوئے شخص کی حالت خاصی ابتر دکھائی دیتی تھی۔ صدف نے بھجائی لپچ میں کہا۔

”وجدان! اسی طرح اس کی زبان کھلو اور نہ ہم ساحل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

میں نے نیچے جھک کر اس شخص کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی آخری دموں پر تھا۔ میں نے مار پیٹ کے بجائے اسے الٹی جسمانی اذیت پہنچانی کہ تکلیف کی شدت سے اس کا بھٹکا ہوا دماغ چند لمحات کے لیے روشن ہو گیا۔ میں نے گنتی کے ان لمحات کا بڑا بھرپور استعمال کیا اور اس سے اس بنگلے کے ایک کمرے کے بارے میں پوچھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اہم کمرہ جس میں میری ساحل کو قید کیا گیا تھا۔ میرا وجود اس وقت سنی کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

وہ شخص زندگی کی قید سے آزاد ہوا تو ہم دونوں نے سنی خیر نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہمارے قدم اس مخصوص دروازے کی طرف اٹھ گئے جسے کھولنے کا طریقہ کار ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔

وہ دروازہ اسی راہ داری میں واقع تھا جہاں میں نے پتول بردار کی گمت بنائی تھی لیکن اس دروازے کی دھنچک عام دروازوں جیسی نہیں تھی۔ وہ دیوار ہی کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ اس لیے ہمارا اس طرف پہلے دھیان نہیں گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ دروازہ کھولا اور ہم دونوں کے بعد دیگرے اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ اسی وقت ہمیں حیرت کے شدید ہنگامے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمارے کمرے میں قدم رکھتے ہی دروازہ خود کار انداز میں کھٹک سے بند ہو گیا تھا۔

ہم دونوں نے آنکھیں پھیلا کر اس کمرے کی حیرت آفرینی کو اپنی بصارت میں اتارا۔ وہ چمکے فرش والا ایک خالی کمرہ تھا جس کی دیواروں اور چھت میں مختلف آئینے نصب تھے۔ اس کمرے کے در دیوار میں ہم ہی ہم نظر آ رہے تھے۔ ایسا ہی ایک سین میں نے برس لی کی فلم ”انٹرویو ڈرین“ میں دیکھا تھا۔ یہ آئینہ خانہ کرا بھی اس کمرے جیسا ہی تھا۔ برسوں کی کوشاکر کرنے کے لیے فلم کے ویٹین نے وہ کمرہ تیار کر دیا تھا۔

اسی لمحے برق کی رفتار سے ایک سنسنی خیز خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ کیا ہمیں بھی شکار کر لیا گیا ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی میرے وجود میں کیلا دھواں بھرنے لگا۔ ہم دیش بھی کیفیت صدف کی بھی تھی۔ ہم نے انہیں زندہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ بولتا کمرے میں ایک مانوس آواز ابھری۔

میں نے اس ابلیس صفت شخص کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ سی ایف کے کاروبار رواں شعیب غوری تھا۔ وہ اپنی مخصوص زبان سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ویکم..... اینڈ ویل ون مسٹر وجدان!“

میں نے چاروں جانب نگاہ بگھڑا کر آواز کے ماخذ کو کھوجنا چاہا لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اسی وقت شعیب غوری کی زہریلی آواز میری سماعت سے ٹکرانی۔

”کوئی فائدہ نہیں وجدان! تم کچھ بھی تلاش نہیں کر سکو گے۔ میں تمہارے بہت قریب موجود ہوں اور تمہیں دیکھ سن رہا ہوں۔ تم اپنی تمام صلاحیتیں آزمادلو لیکن اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ اگر یقین نہ آئے تو ٹرائی کر سکتے ہو۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ میں نے دشتی سے کہا۔

”بہت ہی خوبصورت سوال کیا ہے تم نے!“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”بیچارے! میں جو چاہتا ہوں وہ بھی تمادوں کا پہلے ضروری کام تو تھا۔“

”ضروری کام!“ میں نے بے ساختہ کہا اور صدف کی طرف دیکھا۔

”دیری گڈ!“ شعیب غوری نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم بڑی جلدی میری سوچ تک پہنچ گئے۔ میں نے جس ضروری کام کا ذکر کیا ہے اس کا تمہاری سامی سے گہرا تعلق ہے۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے بے ہودہ انداز میں

تہقیر لگایا۔

”یہ کیا بکواس ہے!“ میں چیخ اٹھا۔ ”ساحل کہاں ہے؟“

”ساحل کو بھول جاؤ! اسحق۔ ڈوبنے والے ساحل کی ترنا ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوئی۔ میں تمہیں تمہاری اس پست قامت سامی کے ہمراہ شرمناکی کے سمندر میں ڈبو جاتا ہوں۔“

اس کا اشارہ صدف کی طرف تھا۔ میں اس کے متصدکی تک نہ پہنچ سکا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا ”پتا نہیں تم کیا دہائی تائی بک رہے ہو!“

”پتا چل جائے گا..... ابھی سب کچھ سامنے آ جائے گا!“ وہ سفاکی سے بولا۔ ”میں بات ختم کرتے ہی اس بند حیرت انگیز کمرے میں ایک مخصوص قسم کی گیس چھوڑنے والا ہوں۔ وہ گیس تمہاری سانسوں کے ساتھ پیچڑوں میں اترے گی۔ تم دونوں نیم غنودگی کے عالم میں پہنچ جاؤ گے، تمہارے جذبات میں طوفان اٹھیں گے منہ زور اور بے لگام طوفان۔ تمہارے ذہنوں سے ہر تعلق ہر رشتہ مٹ جائے گا۔ تم ایک دوسرے کو صرف ایک مرد اور عورت کی حیثیت سے دیکھو گے۔ تمہارے جذبات میں بلا کا ہیجان پیدا ہو چکا ہو گا۔ تم لپچائی ہوئی بھوک نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھو گے پھر تمہارے جبلی تقاضے منہ بھار کر چیتے لگیں گے اور میں.....“ اس نے

ذرا توقف کیا پھر اسی شیطانی انداز میں بولا۔ ”میں تم دونوں کی کارکردگی کی زندہ مودی تیار کر دوں گا۔ سانپ کو کیلے کے بعد اس کا زہر نکالا جاتا ہے۔ میں بھی تمہیں اس مودی کے ذریعے بانجھ بنا کر رکھ دوں گا۔ وجدان! تمہاری ساری مردانگی اور پھر کی خاک میں مل جائے گی۔“

”بکواس بند کرو کتے!“ میں حلق کی پوری قوت سے دہرایا۔

شعیب غوری کی آواز آنا بند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کمرے کے اندر ایک عجیب سی بو محسوس کیا۔ صدف بھی وہ بوسہ چکی تھی۔ اس نے دشت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔ میں نے پوری قوت سے ایک دیوار پر چڑھا مارا۔ دیوار میں نصب آئینہ چٹچٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی آئینے میں ابھرنے والا میرا عکس بھی بڑ گیا۔ میں نے پلٹ کر بڑی تشویش سے صدف کا جائزہ لیا۔ میں اس کے چہرے پر نظر نہ لگا سکا۔ میں نے نگاہ جھکا لی۔

وہ مخصوص بوسہ بوسہ بوسہ بڑھتی جا رہی تھی!



زندگی سانس کی آمد و شد کا نام ہے!

ہم دونوں زندہ تھے اور سانس لے رہے تھے زندہ رہنے کی خواہش ہمیں سانس لینے پر مجبور کر رہی تھی لیکن اس سانس کے ساتھ ہی ایک خطرناک شے بھی ہمارے پیچھے ٹرڈن میں اتر رہی تھی۔ شیب غوری نے اگر اس مخصوص گیس کے شرم ناک اثرات کا ذکر نہ کیا ہوتا تو شاید میں اس قدر پریشان نہ ہوتا۔ ان نازک لمحات میں میں انسانی نفسیات کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گیا تھا اور دلکش مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ بیجان خیر نہیں میرے جذبات کو بھڑکا رہی تھی کچھ کر گزرنے پر اکسار رہی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے جذبات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یہ شوریدہ سری میرے وجود کے اندر سونے ہوئے جلی قاضوں کو بیدار کرنے لگی۔

میں نے گہرا کر اپنے سر کو جھکا اور گاہ اٹھا کر صدف کی طرف دیکھا۔

وہ بھی اس وقت بڑے آزمائشی مراحل سے گزر رہی تھی۔ ظاہر ہے اس کی کیفیت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ اس کے وجود میں بھی جذبات کا مندر و مرقاں اٹھ رہا ہوگا۔ جب ہم دونوں ایک ایسی فضا میں سانس لے رہے تھے تو پھر ہمارے احساسات کا دھارا در در کیسے ہو سکتا تھا! ہم ایک ہی سمت میں بہہ رہے تھے۔ صدف نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنے اندرون سے خاموش جگ لڑ رہی تھی اپنے خون میں پیدا ہونے والے اشتعال کو چھک چھک کر سلا رہی گی۔

وہ مجھے بہت اچھی لگی اور اچانک میرے دل میں خواہش جاگی کہ آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں بھریوں۔ وہ میرا اوٹ اٹک نظر آ رہی تھی جس کے تنگ لگ کر میں اپنی تکمیل کر سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ یہی جادوئی گیس تھی جو ہرگز نہ لے کے ساتھ میری خواہش کو ہمیز کر رہی تھی۔ پھر مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور میرے قدم خود بہ خود صدف کی جانب اٹھنے لگے۔

ہمارے درمیان یہ مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا جسے دو سینکڑں میں پانا جاسکتا تھا لیکن ان بیجان لمحات میں مجھے وہ دو سینکڑں دو صدیوں سے زیادہ طویل نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ بے بسی کے احساس نے مجھے ہوش سے بے گانہ کر دیا اگلے ہی لمحے میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند دونوں بازو اگلے صدف پر بچھڑا۔

صدف نے آنکھیں کھولیں اور بڑی صفائی سے پہلو میں

کھسک گئی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے بھی مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہودت و بزمِ حیران کی تھا۔ میں اپنی ہی جمگوٹ میں منہ کے علی چکنے فرش پر جا کر گر فری قال ٹیکنیک کے باعث میں کسی ٹھنکین چوٹ سے محفوظ رہا۔ میری دونوں پتیلیوں نے چکنے فرش کو بوسے دیے اور میں رد و لب کرتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔ عقب میں مجھے صدف کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”دج..... دان..... خود کو سنبھالو.....“

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر پلٹیں جھپکاتے ہوئے صدف کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر اسٹانس بنائے کھڑی تھی تاہم اس کے اسٹانس میں مضبوطی اور پختگی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنی ہی کوشش کر کے اس کی آنکھوں میں جھپکاتے۔

صدف کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان خمار آلود آنکھوں میں بڑی مٹی خیر چمک دیکھ کر میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس شیطانی گیس نے صدف کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ شیب غوری نے اپنے مذموم عزائم بڑی وضاحت سے بیان کئے تھے۔ صدف کی ذہنی کیفیت کو مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ ہم اس وقت ایک ایسی کشتی میں سوار تھے جس کے پینڈے میں ایک خطرناک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ اگر ہمیں خود کو ذلت کے سمندر سے ڈوبنے سے بچانا تھا تو پھر اس فتنہ پرور گیس کے اثرات سے نکلنا تھا۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑتا!

پھر میرا دماغ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس گیس نے ہمارے اندر اتر کر جو بیجان پیدا کیا تھا وہ جلی قاضوں کی تکمیل کا تقاضا کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی خواہش مجسم ہو کر رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ ہر مصلحت اور احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر صدف کو حاصل کر لوں! آج اسے اس کا نہ رہنے دوں! اس کا سب کچھ میرا ہوجائے۔ اسی قسم کا شیطانی اشتہار صدف کے ذہن میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ مروجہ کی نسبت عورت زیادہ طرف اور برداشت کی مالک ہوتی ہے۔ وہ اپنے منہ و ہڈی جذبات کو زیادہ بھتر انداز میں لگام ڈالنا جانتی ہے۔ صدف بھی خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں وہ گویا کھل صراط سے گزر رہی تھی۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی آیا کہ اس بیجان اشتہار سے بچنے کے لیے ہمیں کسی اور مصروفیت میں غرق ہوجانا چاہیے۔..... اور دو فائزر کے لیے دنیا کی بہترین تقریبی مصروفیت فائز ہی ہو سکتی ہے!

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنی جگہ سے پرواز کی

اور صدف کو ایک فلائنگ کلک مارنے کی کوشش کی۔ کوشش اس لیے کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ میری کلک میں وہ اکیڑہ کی نہیں تھی جو ہر خاصہ ہی ہے۔ یہ کسی نئے میں ڈوبے ہوئے نفس کا عدم دلچسپی سے معمور حلقہ تھا۔

صدف بہ آسانی ایک جانب ہٹ کر میرے حلقے سے محفوظ ہو گئی اس کے ساتھ ہی وہ میرے ذہن تک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ راستے سے بچنے ہی اس نے ایک ریٹر کلک میری کمر پر جڑی۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی فرنٹ پلٹ کلک میرے پیٹ میں لگی۔ میں سمجھ گیا وہ بھی اپنے خون میں پیدا ہونے والی کری کو کسی اور خداداد پیکال رہی تھی۔

پھر ہمارے درمیان باقاعدہ فائز شروع ہو گئی۔ اپنے ذہنی طور سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ راستہ ہی سب سے زیادہ موزوں تھا۔ ہم بے دریغ ایک دوسرے پر تباہ توڑ حملے کرنے لگے۔ تاہم صدف کی سوانیت ایک لمحے کے لیے بھی میری یادداشت سے غائب نہ ہوئی۔ میں اس پر ایسا کوئی ایک نہیں کر رہا تھا جو شہد نصان کا باعث بنتا۔ میں اسے کوئی مہلک چوٹ لگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی جان و دل مجھ پر بھجوا دینے والی وہ پاکٹ سائز حسین میرے لیے بہت اہم تھی۔

شیب غوری کی شیطانی اور شرم ناک چال سے بچنے کے لیے ہم میں سے کم از کم کسی کا ہوش مندر بہ ضروری تھا۔ اگر ہم دونوں ہی اپنے ہوش و حواس کو بیچنے تو پھر ہمیں حیوان بننے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوتی۔ ہم اس بند آئینہ خانے میں ایک ایسے گھٹاؤنے تکمیل کے درد کردار بن کر رہ جاتے جس کے نتائج ہماری گردنوں کو زندہ بچ کر کے لیے جھکا کر رکھ دیتے۔

ہم دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کر رہے تھے۔ صدف کے ہاتھ پاؤں کسی ٹھنک کے مانند کام کر رہے تھے مگر اس مشین کے موڈ کو شیب کی سازشی چال نے ”سلا“ پر ایڈجسٹ کر دیا تھا۔ ہماری وہ فائز کی فلم کا سلوموشن نظر آتی تھی۔ وہ غیبت ابن غیبت کی دوسرے کمرے میں بیٹھا یہ غور ہمیں دوا کر رہا تھا۔ اب تک ہم نے اس کے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے ایک بھی لغزشی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ میں یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ شیب کو ہمارے ایکٹ سے سخت مایوسی ہو رہی ہوگی۔

اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا میری ہمت جواب دے رہی ہے۔ میں نے اپنی جلی خواہش کے آگے بار دھاڑا جو بند باندھ رکھا تھا اس میں شگاف نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ شاید یہ اس سٹلی گیس کے مسلسل اثرات کا نتیجہ تھا کہ میں

اپنے اندرونی بیجان کے آگے بے بس نظر آنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر میرے دل میں یہ خواہش پوری طرح بیدار ہو گئی کہ صدف کو بھجوا کر رکھ دوں۔ اس سے پہلے کہ یہ شیطانی خواہش مجھے کہیں کا نہ چھوڑتی میں نے نری کا دامن چھوڑ دیا۔

شیب غوری کے مطابق ہماری زندہ مودی تیار کی جا رہی تھی۔ اگر ہم اسی طرح ڈھیلی ڈھالی فائز جاری رکھتے تو کسی بھی مرحلے پر ہمارے قدم ڈمکتا کھٹے۔ میں نے اپنی قوت ارادی کو بھجوا دیا کہ ہمارے انداز میں صدف پر حملے کرنے لگا۔ غدا مت کے احساس سے اپنی روح کو نکال کر نے سے کہیں زیادہ بھتر تھا ہم اپنے جسون کو لہو لہان کر لیے۔ صدف کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں لہذا وہ بھی اس پٹے اور پینے کے محل میں پوری شدہ سے شامل ہو گئی۔ اگر عزت کو بچانا تھا تو ایک دوسرے کو زخمی کرنا لازمی تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم بری طرح پانپنے لگے۔ ہمارے ہاتھوں اور چہروں کے مختلف حصوں پر خون بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو بے دریغ پٹا تھا۔ بعض اوقات اپنے پیاروں کی بھلائی کے لیے ان پر ہاتھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس نامراد گیس نے ہمارے خون میں شامل ہو کر جو سرکشی پیدا کی تھی اس کے جوش میں ہم نے ابھی خاصی معرکہ آرائی کر لی لیکن اب ہمارے بدن ممکن سے چور ہو گئے تھے مزید مقابلے کی ہم میں ہمت باقی نہیں رہی تھی۔

اسی لمحے ایک تشویش ناک احساس نے مجھے اپنی لپٹ میں لے لیا۔ صدف بھی پریشان نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ہمارے جسم ٹھک گئے تھے تاہم کمرے کی فضا میں موجود اس گیس میں کوئی کی دافعتی نہیں ہوئی تھی اور سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ان نکلان زدہ لمحات میں وہ نکلی گیس ہمیں زیادہ آسانی سے شکار کر سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میرے ان خوف ناک خیالات کی تصدیق ہو گئی۔

صدف یک ٹک بڑی مٹی خیر نظر سے مجھے دیکھ کر جاری تھی۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا نشہ اتر آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں اس کے سامنے سے نہ ہٹا تو وہ مجھ کی شیرینی کے مانند مجھ پر چبھت پڑے گی۔ میں نے طرح دینے کے بارے میں سوچا لیکن میری یہ سوچ سوچ ہی رہی۔..... عمل کی صورت اختیار نہ کر سکی کیوں کہ اس وقت جس عمل کے بارے میں بڑی تنبیہ کی سوچ رہا تھا وہ کسی بھی حفاظتی رد و عمل کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس شخص گیس کے بد اثرات نے ہمیں حیوانیت کے دائرے میں دھکیل دیا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر ان شرم ناک خیالات کو اپنے ذہن سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش بے سود رہی۔ اس وقت جبلی تھنے طلق کے گل چٹکنا ڈر رہے تھے۔ بے بسی کے احساس کو فراموش کر کے میں صدف پر بھج پڑا۔ وہ بڑی معنی خیز مہارفت پیش کرنے لگی۔ بیجان انگیز گیس نے اس کے جذبات کو بھی براہِ ہیئت نہ رکھا تھا۔ اس معنی خیز مہارفت میں ہزار جاہان پن تھا۔ لگتا تھا وہ مہارفت نہ ہو بلکہ ایک قسم کی ظالمانہ خود بہرگی ہو!

ہم حیرت آفرین کمرے کے چکنے فرش پر ایک دوسرے سے جھٹک لکھاتے اور درد خیزی جانوروں کی طرح بھنبھونڈ کر ایک دوسرے کو جت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے ذہن سے شرافت اور انسانیت اٹھ گئی تھی جس کی جگہ دھشت اور درد نگہی نے لے لی تھی۔ اگر ہم اپنے حواس میں ہوتے تو اپنے اس ایکٹ پر شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ اس بیرنگی میں ہمیں ہمیں فلک سے توڑ کر قطعِ ذلت میں لانچا تھا۔ فرزانی اور دیوانگی کوسوں دور تھیں۔ اس وقت ہم اپنے جذبات کے غلام دو دنیاؤں تھے جو ایک دوسرے کو لوہے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں ہمارے لباس تار تار ہو رہے تھے۔ اس دھشت میں بڑی بے جا گئی اور خود غرضی پائی جاتی تھی۔

اچانک میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی قوت نے پیچھے ہٹنا چاہا ہو مجھے تباہی و بربادی سے بچالیا ہو۔ اس دماغی جھٹکے کے ساتھ ہی ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا بھی ہوا تھا۔ میرا اندرون منور ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے صدف کو پیچھے دھکیلا اور آنکھیں بند کر لیں یہ سب کچھ جس بھی قوت کے زیرِ اثر ہوا تھا وہ بلاشبہ اس فتنہ انگیز گیس سے زیادہ فعال تھی جب تک تو میں شرم ناک کے گڑھے میں گرتے کرتے بچا تھا۔

جس طرح ڈوبنے والے کو پھینکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے بالکل اسی طرح پھینکے والے کو پھینکنے کے لیے ایک اشارہ بہت ہوتا ہے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پھینکنے کے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کمرے کے چکنے فرش پر پدم آسن جھا کر بیٹھ گیا۔

صدف میرا دھکا کھا کر درد ناک لڑکتی چلی گئی تھی۔ وہ اس وقت مجھے ایک دیوار کے تھر تھر نظر آ رہی تھی اور وہ حیرت بھری نظر سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ہم جس ندامت کے سمندر میں غرق ہونے جا رہے تھے اس کے پیشِ نظر میرے روہنے نے صدف کو الجھا دیا تھا۔ ہم جس عمل سے گزرنے والے تھے اس میں ہم دونوں کی جبلی خواہشات شامل تھیں چاہے وہ کسی ظالم

گیس کے طفیل ہی تھیں۔

میں نے صدف کو حیران و پریشان چھوڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے روئی کا ایک اور جھماکا ہوا اور میری باطنی آنکھ آگ کے ایک گولے پر ٹپک گئی۔ وہ گولہ روشنی اور حرارت کا بیج سورج تھا گویا میں اندرونی آنکھ سے شمس بنی کر رہا تھا۔ پھر بند آنکھوں کے عقب میں ایک کھلا ہوا منظر طلوع ہونے لگا۔ تصور اور خیال کندھے سے کندھا لگا کر بازی گری میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں نے خود کو پہاڑ کی ایک چوٹی پر بیٹھے پایا۔ میری نگاہ کے سامنے ایک دوسرے پہاڑ کے اوپر ڈھکلا موجود تھا جس پر میری نظر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے احساس کی قوت سے اس منظر کو پہچان لیا۔ وہ شاؤن ٹیپل کا بیرونی علاقہ تھا۔ پھر مجھے یاد آنے لگا اپنی تربیت کے دوران میں میں اس پہاڑی پر بیٹھ کر شمس بنی کیا کرتا تھا۔ میرے دادا استاد ماسٹر ہینگ ہائی "چی" کی بیادری کے لیے مجھے اسی پہاڑی پر لے آتے۔ مخصوص مشقوں کے اختتام پر وہ مجھے شمس بنی کا درس دیتے۔ ماسٹر کے مطابق ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھنا بہت مفید تھا۔ اور کتا زونج کے لیے یہ ایک عمدہ مشق ہے۔

ان لمحات میں مجھے ارتکاز کی اشد ضرورت تھی۔ اگر میں اپنے دھیان کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ شرم انگیز میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میرا کچھ نہیں بگاڑنے کا مطلب تھا ہم دونوں کا ایک بال بھی بالکا نہیں کر سکتی تھی۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک بھی سنبھل جاتا تو شعیب غوری کی وہ مذموم سازش ناکام ہو جاتی اور..... میرا خیال ہے میں پوری طرح سنبھل چکا تھا!

میرے تصور کی نگاہ سورج پر جمی ہوئی تھی اور میں اپنے ذہن سے کچھ اس قسم کے خیالات کو گزرا رہا تھا..... یہ سورج بہت مہربان اور دست گیر ہے۔ یہ میرا اہم دوست ہے ایک قلم دوست۔ یہ میری خیر خواہی کا خواہش مند ہے۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں۔ یہ دفا پیش میری سبک سری چاہتا ہے مجھے فخر سے سر اٹھا کر جیتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے اسی لیے یہ میرے تصور میں جا کر ہوا ہے۔

مجھے دوست مشکل وقت میں اسی طرح مدد کو آتا کرتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا میرے اندر پھیلی ہوئی اس بیچلی کیفیت کی ثمرات میں کی داغ ہو رہا شروع ہو گئی۔ صدف کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت سامنے نہیں آئی تھی اس کا بھی مطلب تھا وہ بھی اپنے بجز کے ہوئے جذبات کو سر دکنے کے لیے کسی برف زار میں اتر گئی تھی۔ ہوسکتا ہے میری طرح اسے

بھی کچھ سوچ گیا ہو! وہ بھی انتشار پر قابو پانے والی کسی مشق میں جت گئی ہو۔

میں نے واپس اپنا دھیان سورج کی طرف لگادیا اور آٹو پھینچ (خود تر بھی) کی مدد سے پیش آمدہ حالات سے نمٹنے لگا۔ رنٹہ رنٹہ میرے خون کا آتش فشاں ٹھنڈا ہونے لگا۔ جذبات کے بجز کیلے پن میں کی آئی تو اعصاب چر سکون ہوتے چلے گئے حیوانی جوش و خروش ماند پڑنے لگا اور میں دھیرے دھیرے نارمل ہوتا چلا گیا۔ میں نے ان لمحات میں خود کو بہرہ لگا چکا محسوس کیا۔

آہستہ آہستہ اس کیفیت میں اضافہ ہونے لگا میں تن سہ سے ثابت ہو گیا۔ میرا وجود زمین سے اٹھنے لگا۔ مجھے یوں اُچھے میں ہوا میں پرواز کر رہا ہوں۔ میرے ارد گرد بلند ہوا پہاڑ استاد تھے۔ میں بادلوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرا رخ سورج کی سمت تھا۔ وہ سورج جس کی مہربان کرلوں نے آگے بڑھ کر مجھے ذلت کے گہمڑے غار میں گرنے سے بچالیا تھا۔ میں اس دست گیر روشنی کو جانب بڑھتا گیا۔ یہ بڑھتا غیر ارادی اور بے اختیار تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ میرا تصور شاید اس روشنی سے تابع بننا جو اس کے ایما پر مجھے اس کی طرف اڑانے چلا جاتا تھا۔ مگر یہ پرواز بڑی کیف آور اور خود فراموشی کی حامل تھی۔

چانک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ایک جھماکا ہو رہا تھا۔ ہوش کھو بیٹھا۔ اب مجھے کچھ دکھائی آنا چاہی نہیں۔ بے رہا۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی اور میں بھی اسی روشنی کا حصہ تھا اسی آفتاب کا ایک ذرہ تھا۔

پتا نہیں سورج میرے وجود میں اتر آیا تھا یا میرا وجود ہی فوٹا رہا میں بھر گیا تھا!

☆☆☆

وہ ایک لنگ سا تڑپ عجیب و غریب بھج رہا تھا! اس بھجے کو دیکھ کر بہت سی محسوس ہوئی۔ اس کی شکل ایک عام دیسی بھجے کی سی تھی تاہم ساڑھے دو ایک وسیع و عریض کمرے کو شرماتا تھا۔ اسے ایک گولائی میں ضمیر کیا گیا تھا۔ کشادہ ہال کے ایک حصے میں اس کوئی بھجے کے ایک ٹکڑے ٹیڈ جھوڑے پر نصب کیا گیا تھا۔ مذکورہ جھوڑے کی اونچائی تین فٹ رہی ہوگی۔ بھجے کی تیلیاں اس جھوڑے کے اندر گڑی تھیں۔ لفظ "تیلیاں" اس بھجے کے شانیاں نشان نہ تھا بلکہ تیلیوں کے نام پر دو چم مٹی اپنی سلاخی نظر آ رہی تھیں۔ اس بھجے کا قطر لگ بھگ تین فٹ تھا اور اونچائی کسی بھی طور

چند فٹ سے کم نہیں تھی۔ تمام مٹی اپنی سلاخی ایک خاص زاویے سے اوپر جا کر چند فٹ کی بلندی پر آپس میں مل رہی تھیں۔ اس طرح ایک بڑا سا گنبد تشکیل پاتا تھا۔ ہر دو سلاخوں کے درمیان بہ مشکل پانچ انچ کا فاصلہ تھا گویا اس بیت ناک بھجے میں مقید فص سلاخوں کے بچے سے فراہم ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ بھجے میں آمدورفت کے لیے ایک دروازہ بھی تھا جو پانچ فٹ اونچا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ وہ بھجے چوں کہ زمین سے تین فٹ کی بلندی پر تھا اس لیے اس کے اندر پہنچنے کے لیے تین اسٹیپ کی ایک اٹنی سیر می بھی دروازے کے سامنے موجود تھی۔

مذکورہ حیرت انگیز بھجہ جس ہال میں موجود تھا اس کے دوسرے حصے میں بھی ایک نیم بھجی چھوڑا تھا جس پر تین کرسیاں پہلو پہلو پر رکھی تھیں۔ وہ کرسیاں نہایت ہی قیمتی اور عالی شان تھیں لیکن ان کی شان بڑھانے کے لیے اس وقت کوئی بھی شخصیت وہاں براجمان نظر نہیں آتی تھی۔ وہ وسیع و عریض ہال کم دیش چھپس ضرب پچاس فٹ پانچاس کا حامل تھا اور میں..... میں اس کوئی بھجے کے عین وسط میں ٹھکری کے ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔

میرے جسم پر لباس کے نام پر صرف ایک شارٹ بیکر تھا جو کسی ریشم کے کانچیا سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر اپنی جگہ میں تھے اور ابھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی مجھے یہاں پہنچایا گیا تھا۔ مجھے یہاں تک لانے والے مسافر اہلکارین چہروں والے خاموش انسان تھے۔ ان کی آنکھوں سے دھشت اور سفاکی بھتی تھی۔ میں نے ان کے بھروسے کے تاثرات سے اندازہ لگالیا کہ اگر میں نے ایک ذرا سی زبان بھی کھولی تو وہ مجھے زندگی سے گزرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے۔

میں نے نصف درجن مسلح افراد کے زرنے میں آنکھ کھولی تھی اور اپنے بدن پر اسی اٹھوتے چانکے کو پایا تھا۔ پتا نہیں میں کتنے کتنے ہوش و حواس سے بے جا نہ رہا تھا۔ مجھے تو صرف اتنا یاد تھا کہ صدف سے کس قسم کی اور چیخا بھینچ کے دوران میں اچانک میرا ذہن روشنی میں نہا گیا تھا۔ میں شیطانی گیس کے زیرِ اثر ایک شرم ناک کھیل سے باز آیا تھا۔ اپنے ذہن کو پھینکنے سے بچانے کے لیے میں نے روشنی کے اس ماخذ سے آنکھیں چا کر گئی تھیں۔ خیال اور تصور کا یہ کھیل معلوم نہیں کہاں جا کر ختم ہوا تھا..... واقعی میں اس ہارے میں کچھ نہیں جانتا تھا!

میں نے ہوش و حواس میں لوٹنے کے بعد خود کو اپنی گرفت میں پایا تھا۔ میرے اور میرے لباس کے ساتھ جو کچھ



بھی ہوا وہ میری بے خبری میں ہوا تھا..... اور اب یہ قاتلی ہوش و حواس جو کچھ ہونے والا تھا اس کے بارے میں کل از وقت کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ مگر برادر افراد نے مجھے اس بنجرے میں پہنچانے کے بعد بنجرے کو منتقل کر دیا تھا، پھر وہ خاموشی کے ساتھ اس کشادہ ہال سے کھل گئے تھے۔ اس ہال میں آمد و شد کے لیے صرف دو دروازے تھے اور وہ دروازے نیم چھوڑی چوڑے کے دونوں پہلوؤں میں واقع تھے۔ میرا ذہن اس وقت برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے پہلی ہی بھوک بھی محسوس ہوئی۔ میں نے دوپہر میں صدف کے گھر کچا کھا تھا، اس کے بعد باقاعدہ کھانا کھانے کی بولت نہ آئی۔ ہم دونوں رات دس بجے سفید رنگ کے اس یک منزلہ ٹنگے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد کے حالات ایک فلم کے مانند میرے ذہن کے اسکرین سے گزر گئے پھر میرا تصور صدف پر اٹل ہو گیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اس آئینہ خانے میں بند ہوئے تھے۔ وہاں ہم پر جو گزری وہ تو وہی ایک طرف تشویش ناک بات یہ تھی کہ اب میں اکیلا تھا صدف کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی..... اور اس کے ساتھ کیسا بڑا ڈر کیا گیا ہوگا!

میں صدف کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہال کے دو دروازوں میں سے ایک کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں مجھے غیبیٹ الاخشب شیطان ابن شیطان شیب غوری نظر آیا۔ اس کے پیچھے دو سگ گارڈز تھے۔ شیب غوری نے ہمیشہ کی طرح بے دماغ جیتی سوٹ پہن رکھا تھا۔

مجھ سے لگاؤں میں تو وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر خاموشی سے نیم چھوڑی چوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں گارڈز اسے کمرے میں پہنچا کر واپس چلے گئے اور وہ دروازہ ایک مرتبہ پھر بند ہو گیا۔ شیب کا تن تھا اس وسیع و عریض ہال میں موجود رہتا اس کی بے پناہ قوت اعتمادی کو ظاہر کرتا تھا۔

شیب چوڑے پر مچی تین عالی شان کرسیوں میں سے درمیانی پر بیٹھ چکا تو بڑی دلچسپی سے مجھے تنکے لگا۔ اس نے ملٹی کوئز گلاسز والا نہایت ہی بیش قیمت چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس چشمے کے فریم کی مالیت کم از کم تھی کہ اس رقم سے ایک متوسط گھرانے کا دو ماہ کا راشن خرید ا جاسکتا تھا۔

اس ہال میں روشنی کا مناسب انتظام تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی چکا چوندگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی شو بزنسمن ہونے والا ہو۔ شیب کے دیکھنے کے جواب میں میں بھی اسے ناپسندیدہ نظر سے گھورنے لگا۔ اسی لمحے ہال میں

شیب کی بھاری بھر کم آواز گونجی۔  
”خضہ تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں وجدان۔ خود کو کنٹرول میں رکھو!“

”صدف کہاں ہے؟“ میں نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔

”میں نے کہا، جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ تنگیں لپچ میں بولا، ”تمہاری طرف سے معاملات خاصے گزربڑ ہو چکے ہیں ہماری جانب کا معاملہ بگاڑو گے تو تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

میں مجھے سے اگڑ گیا اور نہایت ہی سخت الفاظ میں کہا، ”مجھے تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں ذلیل انسان۔ میں نے اپنی سامگی کے بارے میں پوچھا ہے؟“

اس نے میرے گستاخانہ انداز کا۔ برا نہ مٹایا۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ سفاک شخص بے پناہ قوت برداشت کا مالک تھا۔ بڑے ضمیر سے ہوئے لپچ میں بولا۔

”مسٹر وجدان! تمہارا بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ پہلے تم نے مجھ سے معاملے کے بارے میں استفسار کیا۔ اب صدف کو پوچھ رہے ہو؟“

”تم میرے سوال کا جواب دو۔ بڑے طوطے کی طرح“ میں نے کہا۔

”بڑی گرمی ہے تمہارے دماغ میں۔“ وہ سر راتی ہوئی آواز میں بولا، ”بدن کی گرمی تو خاصی حد تک کھل چکی۔ لگتا ہے تمہارے دماغ کے ساتھ بھی کوئی ہاتھ کرنا پڑے گا۔“

دماغ کی گرمی جیسے الفاظ اور بڑے پیچھے ہوئے انداز میں بدن کی گرمی کے ذکر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ شیطان ایک مخصوص حوالے سے یہ تذکرہ چھیڑ رہا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں مجھے قلعی سکون حاصل تھا کہ صدف کے ساتھ اس بند آئینہ خانے میں میں ایک شرم ناک کھیل کا کردار بننے سے بال بال بچ گیا تھا۔

میں نے شیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے پردائی سے کہا، ”پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو!“

”ابھی پتا چل جائے گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میری بکواس کو حقیقت کا روپ دھارتے ہوئے تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ میں نے جس زندہ مودی کا ذکر کیا تھا وہ تیار ہو چکی۔ تمہاری شرم ناک کارکردگی کی ایک ایک جنبش ریکارڈ پر آچکی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو میں وعدے کا کتنا پابند ہوں۔ ہم دونوں.....“

”تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس کی بات ختم

ہونے سے پہلے ہی میں جیج اٹھا، ”اس سلسلے میں تم مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں، میرا دامن داغ و دار نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنی قوت ارادی اور صلاحیت کے بل بوتے پر خود کو آلودہ ہونے سے بچالیا۔ تمہارے مذموم عزائم کی تکمیل نہیں ہو سکی میں تمہارے دباؤ میں نہیں ہوں۔“

اس نے ایک نیچا قہقہہ لگایا۔ اس کی آواز بڑے خوب صورت انداز میں چاروں جانب گونجنے لگی۔ اس ہال میں ساؤنڈ انجینئرس کا بھی معقول خیال رکھا گیا تھا۔ اپنی آواز کو ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے کے لیے جیج کر بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عام بول چال کو ہر طرف سنا جاسکتا تھا۔

”وجدان! تمہارا تو وہ حال ہے کہ رسی جل گئی لیکن مل نہ مجھے۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا، ”تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ صورت حالات میں کس قدر تغیر آئی ہے۔ اس وقت تم کا مل طور پر میرے رحم و کرم کے محتاج ہو۔ یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم پر میرا دباؤ نہیں۔ میرے عزائم مذموم تھے یا مسنون اس بحث میں نہ پڑو۔ صرف یہ دیکھو کہ میں اسے مقدمہ میں کا مایاب ہو گیا۔“

”تم بیکتے ہو..... کیواس کرتے ہو.....“ میں نفرت آمیز لپچ میں بولا، ”مجھے اچھی طرح یاد ہے.....“

”تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔“ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے اپنی مخصوص بھاری بھر کم آواز میں بولا، ”تم اور تمہاری وہ پست قامت سامگی اس مخصوص کہیں کے زیر اثر تھے۔ تمہیں کچھ یاد نہیں تھا کچھ دھیان نہیں تھا۔ تم لوگوں کا دھیان تو بس ایک ہی نقطہ پر مرکوز تھا کہ اپنے جذبات کا غبار نکالنا ہے اپنے جنسی قاصوں کو پورا کرنا ہے۔ تم تو اپنے کرد و پیش سے بے گانہ صرف اور صرف ایک ہی کام پر کمر بست تھے لیکن!“ اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑی اور کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں خاموش رہا تو اس نے بات کھل کر دی، ”لیکن کیرے کی آنکھ بے گانہ اور بے خبر نہیں ہوتی۔ آج کل تو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور ذمہ لیس کارمانہ ہے۔ حساس کیرے سارا کچھ چٹا کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے کہا تھا نا، سناپ کو کھینچنے کے بعد اس کا زہر نکال دیا جاتا ہے۔ میں نہ صرف جھپٹیل کھیل چکا بلکہ میں نے تمہارا سارا زہر بھی نکال دیا ہے۔ اب تمہاری حیثیت ایک حقیر کچھوے سے زیادہ نہیں۔ تمہارے اعمال کا جو ریکارڈ میں اپنے پاس محفوظ کر چکا ہوں اس کے ذریعے میں تمہیں اپنے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کر سکتا

ہوں۔“

وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ حقیقت کا تھی یہ میرے اور صدف سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا تھا لیکن وہ جتنے اعتقاد سے بول رہا تھا اس کی بات کو نظر انداز کر جانت ہوئی۔ وہ یہودیوں کا پٹو اور ایک نہایت ہی طاقتور شخص تھا، کچھدار اور منصوبہ ساز بھی تھا۔ وہ کوئی بھی سازش نہ جال چل کر سیاہ کوسفید اور سفید کوسیاہ ثابت کر سکتا تھا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اپنے ہوش کو قابو میں رکھوں اور ہوش کو کام میں لاتے ہوئے اس کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کروں۔ ان فیصلہ کن خیالات نے مجھے شانت کر دیا۔

مجھے خاموش پا کر شیب غوری نے دوستانہ انداز میں کہا، ”اپنی شان دار کارکردگی کی رنگین دڈیو نہیں دیکھو گے؟“

میں نے دماغ کو ٹھنڈا انداز جذبات کو معتدل رکھتے ہوئے کہا، ”اب تم اتنا زیادہ اصرار کر رہے ہو تو دیکھ لیتا ہوں۔ تمہارے اشتیاق کو کچھ نہ کچھ خراج عقیدت پیش کرنا ہی پڑے گا نا!“

وہ میرے انداز پر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ شاید مجھ سے یہی توقع کر رہا تھا کہ میں جیج چلا کر اسے برا بھلا کہوں گا۔ میں نے اس کی توقع کا جتنا وہ نکال دیا تو وہ معاندانہ نگاہ سے مجھے گھورتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور ہال کی ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔

مذکورہ دیوار کے ساتھ ایک ٹرائی پر بڑے اسکرین والا ٹی وی موجود تھا۔ یہ دیوار شیب کے دائیں اور میرے بائیں ہاتھ پر تھی۔ وہ ٹی وی ٹرائی کے نزدیک پہنچا پھر اس کے دونوں ہاتھ وہاں رکھنے کی دی اور دو یو سے مصروف ہو گئے۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ اپنی کرسی پر موجود تھا۔ اس وقت شیب کے ہاتھ میں مجھے ایک ریوٹ کنٹرول بھی نظر آیا۔

وہ چند لمحات تک ریوٹ کنٹرول کے ذریعے ریو اینڈ فائر وڈ کھیل رہا پھر لمبے کاٹن دبانے کے بعد اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری تشویش بھری چونکنا نظر نی وی اسکرین پر جم گئی۔ اس سنگ ساز اسکرین پر کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے جا رہا تھا۔ شیب کا دعوئی کسی خوف ناک طوفان سے کم نہیں تھا!

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹی وی اسکرین روشن ہوا اور وہاں اسی کمرے کا منظر اجاگر ہوا جہاں میں اور صدف شکار

”وہ کیسے بھی؟“ اس نے جھٹسے کے عقب سے آنکھیں  
سکینٹر کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”تم نے تھوڑی دیر پہلے جو دعویٰ کیا تھا، فلم  
اس کی نفی کرتی ہے۔ تم اپنے مذموم عزائم کو پورا نہیں کر سکتے۔“  
اس فلم سے تم مجھے اپنے دباؤ میں نہیں لے سکتے۔“

”کن خوش فیہوں کی تگرری میں محکم رہے ہو احمق!“  
جھارت آمیز لہجے میں بولا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں الجھ کر رہ گیا۔

”کیا تم نے پوری فلم دیکھ لی؟“ اس کا یہ خطرناک سوال  
ظہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ہاں..... آں.....“ میری الجھن میں بے پناہ اضافہ  
ہو گیا۔

شعیب نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔ اس دقت اس  
کے ہونٹوں پر بڑی مکررہ ہنسی کھیل رہی تھی۔ اس کے اسٹاکل  
نے مجھے تجسس میں ڈال دیا۔ میری یادداشت کے مطابق وہ فلم  
ختم ہو چکی تھی۔ اس منظر کے بعد ہی میرے ذہن کو ایک طوفانی  
جھلکا تھا اور میں نے صدف کو دھکا دے کر بہت دور پھینک  
دیا تھا پھر میں نے اس کا توجہ سے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن  
شعیب کا انداز کسی گہری سازش کی نوید دے رہا تھا اس کی  
بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ فلم ابھی ختم نہیں ہوئی..... فلم کا جو حصہ  
دیکھنے سے وہ گیارہ بہت سی سٹنسی خیز اور ذلت آمیز ہوگا۔

شعیب نے گہری سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا اور منظر  
ہوئے لہجے میں بولا ”وہ جان! اس دقت ہماری پوزیشن بالکل  
واضح ہو گئی ہے۔ میں زبردست اور تم زبردست ہو۔ تم کسی خیر  
چوہے کے مانند میری گرفت میں آئے ہوئے ہو۔ میں  
چاہوں تو پلک جھپکتے میں تمہیں نیست و نابود کر سکتا ہوں اور  
تم۔“ وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو  
آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تم تم ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا بال بال ٹانگا نہیں  
کر سکتے اس لیے میں تم پر سب کچھ واضح کر دینا چاہتا ہوں۔  
جو فلم تم نے دیکھی وہ اور ٹیکل ریکارڈنگ ہے۔ اس کے بعد تم  
جو کچھ دیکھنے جا رہے ہو وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔ ذرا تم  
بھی تو دیکھو سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ میں نے تم دونوں  
کے چہروں کے کلوز اپ لے کر اسے ایک بیو فلم کے ساتھ جس  
کیا ہے۔ اس ملک کی کارڈز بہت عمدہ آیا ہے۔ تم دیکھو مجھے تو  
دنک رہ جاؤ گے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کے ہم آغوش  
ہو کر ایک ماسٹر پیس بن گیا ہے۔ لو تم بھی دیدار کرو۔“  
بات ختم کرتے ہی اس نے اسٹل اسکرین کو دوبارہ

کئے گئے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا، شعیب نے ریکارڈنگ  
کے والے سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ ہمیں اس آئینہ خانے  
میں بدعہ شوٹ کیا گیا تھا۔ مذکورہ منظر اس موقع کا تھا جب  
شعیب کی آواز آتا بند ہو گئی تھی اور ہم نے اس غیبت کیس کے  
اثرات کو واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے  
ساتھ اس منظر میں کھوکھلیا۔

منظر میں تبدیلی واقع ہوئی اور کہانی آگے بڑھنے لگی۔  
میں نے دیکھا ایک ایک سین کو دیکھتا چلا گیا۔ ہمارے ساتھ  
اس آئینہ خانے میں جو حالات و واقعات پیش آئے تھے ان  
کی مثل عکس بندی کر لی گئی تھی۔ پھر جب کہانی ہماری جھینا  
جھینا پر پہنچی تو مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی۔  
شعیب زبردست طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے  
زبردستی اور میں دوبارہ فی وی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اب وہاں پر ایسا منظر پیش کیا جا رہا تھا جس کو دیکھنے کی  
مجبوری نہ تھی۔ میں اور صدف دو بھوکے حیوانوں کے  
مانند ایک دوسرے سے کھم کھماتے، حصول کی اس جنگ میں  
ہم نے تمام تر اخلاقیات کو گہرے کونوں میں پھینک دیا تھا اور  
اپنے وحشیانہ جذبات کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے  
لباس کو توجہ رہے تھے۔ میں نے ندامت کے قوی احساس  
کے ساتھ نگاہ جھکا لی۔ صدف کے بدن کے بیشتر حصے کھل گئے  
تھے۔ میں اس جان نثار لڑکی کو بے لباس ہوتے ہوئے کیسے  
دیکھ سکتا تھا۔

اسی لمحے میری سماعت سے شعیب کی شیطانی آواز  
منہ سے نکلی۔ ”جداں! میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔ تم تو  
بالکل بودے ثابت ہو رہے ہو۔ جی جی جی.....“

میں نے کن آنکھوں سے فی وی کی طرف دیکھا۔ شعیب  
نے ڈیڑھ کو اسٹل کر دیا تھا اور وہ آخری شرم ناک منظر اسکرین پر  
جسم ہو کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں شعیب کی آنکھوں میں  
گھورنے لگا۔ میں نے پھر سے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شعیب! میرے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مجھے  
یہ بات ابھی طرح معلوم ہو چکی ہے، تم اس سے بھی زیادہ  
ذلیل اور کمینے ہو۔ میں تم سے ہر گھٹیا حرکت کی توقع رکھتا  
ہوں۔“

وہ ہونٹ بھیج کر بڑی کینہ تو نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر  
بولا ”جانتے، فلم بندی تمہیں پسند نہیں آئی۔ میں تو سوچ رہا تھا  
تم میری کارکردگی کو سراہو گے!“

”یہ شیطانی کارکردگی تمہاری ناکامیابی اور شکست کا بین  
ثبوت ہے۔“

متحرک کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر۔ بعد وہاں جو مناظر ابھرے  
گلے میں انہیں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لہذا میں نے  
آنکھیں بند کر لیں۔

”تکبر اگئے!“ شعیب غوری کی محسوس آواز میری سماعت  
پر نشتر جلائی۔ ”تکبر“ ہے، میں نے دی آف کر رہا ہوں۔ تم  
آنکھیں کھول دو۔ میں اندھوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا  
اور..... ابھی تو میں نے تم سے نہایت ہی اہم گفتگو کرنا ہے!“

میں نے دل میں شعیب پر کس طرح طعن کرتے ہوئے آنکھیں  
کھول دیں۔ بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آگیا ”صدف  
کہاں ہے؟“

”اسی بنگلے میں ہے۔“ وہ ساٹ لہجے میں بولا۔  
”تم نے صدف کو تو قلم نہیں دکھائی؟“  
”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اوہ!“ میں ایک اطمینان بھری سانس لے کر رہ گیا۔  
شعیب نے کہا ”میرا افکار تم ہو۔ صدف تو تمہاری دم  
سے بندھ کر بوس کے طور پر جھمکی ہے۔ بہر حال وہ اس یاد  
کا قلم نہیں تمہاری ہیر دکن ہے۔ اگر تم خدا کر دے تو اسے بھی یہ  
قلم دکھا دوں گا۔“ اس کے اختتامی الفاظ سے بے پناہ مکاری  
چھپتی تھی۔

”ہرگز نہیں!“ میں نے قطعیت سے کہا۔  
”اتس او کے!“ وہ ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا ”تم کبھی  
میرے دوست رہے ہو۔ میں اپنے ایک دیرینہ خیر خواہ کی اتنی

سی فرمائش تو پوری کر ہی سکتا ہوں۔“  
وہ کما حقہ خاموشی کے بعد مجھے بتانے لگا کہ اس شرمناک  
قلم کی کل لسانی چندرہ منٹ تھی۔ دس منٹ کی اور بجل قلم اور  
آخری پانچ منٹ کی شیطانی منسک۔ بات کے اختتام پر اس  
نے کہا۔

”وہ جان! اس قلم کی حقیقت سے اگرچہ تم آگاہ ہو چکے  
ہو لیکن کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ میں نے بلو قلم  
کے کرداروں کا انتخاب کرتے ہوئے تم دونوں کے حشوں اور  
قد کاٹھ کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اس قلم کو دیکھنے والا ہر  
مفحص بلا تار دس کا یقین کر لے گا۔ ساتس اور دیرینا لوجی کی  
ترتی نے انسانی ذہن اور یقین کو فریب دینا بہت آسان کر دیا  
ہے۔“

اچانک میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا ”تم نے اتنی  
جلدی کیپیورٹینا لوجی کا استعمال کر کے قلم منسک کیسے کر لی۔  
یہ کام تو اچھا خاصا وقت مانتا ہے؟“ میں نے شعیب سے  
پوچھا۔

”تم بالکل درست کہتے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں  
گردن کو کنبش دیتے ہوئے شیطانی مسکراہٹ بکھرنے  
لگا۔ ”ٹیکنیکل قسم کے کام واقعی ایک مخصوص وقت کے محتاج  
ہوتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو رک کا پھر اضافہ کرتے ہوئے  
بولا ”میں محسوس کر رہا ہوں، تمہیں اندازہ نہیں کتنا وقت بیت  
چکا ہے درنہ تم“ (اتنی جلدی“ جیسے الفاظ استعمال نہ کرتے۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں الجھ کر رہ گیا۔

”مطلب صرف اتنا ہے کہ تم جمعات کو لگ جھگ رات  
دس بجے سفید بنگلے میں داخل ہوئے تھے اور سوا دس بجے تک تم  
میرے آدمیوں کے ساتھ مارا ماری کرتے رہے پھر اپنے  
خانے میں پہنچ گئے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”تمہاری  
بات اور رد عمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ابھی تک جمعات ہی  
کے تصور میں جو جب کہ.....“

”کیا جب کہ؟“ میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے  
ہی بول اٹھا۔  
”سنو گے تو بتا سکوں گا۔“ وہ ناگواری سے مجھے دیکھتے  
ہوئے بولا ”جمعات گزرنی۔ آج جمعہ ہے اور اس وقت دن  
کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں نے جس واقعے کو قلم بند کیا ہے  
اس کو جیتے کم از کم بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہ تو اچھا خاصا وقت  
ہوتا ہے وہ جان!“  
”اوہ!“ میں ایک طویل بوجھل سانس خارج کر کے رہ  
گیا۔

ان خالوں نے میری بے ہوشی کے دوران میں لباس  
کے ساتھ ساتھ رسد داج بھی اتاری تھی اس لیے مجھے دقت  
اور تاریخ دونوں وغیرہ کا اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ اگر گزری  
میرے پاس ہوتی تو مجھے حالات کو سمجھنے میں اتنی دقت کا سامنا  
نہ کرنا پڑتا۔

میرا دل و دماغ شعیب غوری کے لیے نفرت آمیز فحش  
سے بھر گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے اس سے دریافت  
کیا۔

”تم یہ سب کچھ کس لیے کر رہے ہو؟“  
”بہت دلچسپ سوال ہے۔“ وہ سیر آواز میں بولا ”میں  
جہیں اس کا جواب ضرور دوں گا۔“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور گہری نظر سے مجھے دیکھنے  
لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے ذہن میں خیالات کو ترتیب  
دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔  
”میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ تم نے مجھے کتنا  
نقصان پہنچایا اور جواب میں نے تمہیں کس کس عاز پر ڈک

پہنچائی۔ اس موضوع کو کھولنے کا کچھ فائدہ نہیں سوائے  
پانچون جلانے اور دماغ تپانے کے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے حیرت ہوا۔ میں پوری طرح اس  
کی طرف متوجہ تھا۔ اس وقت وہ بہت ہی سنجیدہ اور بردبار نظر  
آ رہا تھا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا شروع  
کیا۔

”اس گرما گرم جنگ میں میں نے اپنے کئی اہم آدمیوں  
کو گھوٹا۔ جہاں گزیر نواز کبیر شاہ غلام جیلانی، نادر زبان وغیرہ  
بڑی بڑی مثالیں ہیں۔ اسی طرح تمہارے کئی ساتھی بھی اس  
دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے۔“

وہ بولتے بولتے ایک مرتبہ پھر روک گیا۔ اس کے بیان  
میں بڑی علی دروغ کوئی مثال بھی لیکن میں نے اسے روکنا یا  
ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بات  
باری رکھتے ہوئے بولا۔

”وہ جان! میں نے اب تک تمہارے خلاف جو کچھ کیا  
اور یہ جو کچھ کر رہا ہوں یہ سب اس لیے ہے کہ تم یہودی دشمن  
ہو۔ تم یہودیوں سے نفرت کرتے ہو اور ہر لمحہ انہیں نقصان  
پہنچانے کی فکر میں رہتے ہو۔“

”تو بھی بات تمہاری زبان پر آتی مٹی یہودیوں کے  
ٹھکانے میں۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی فرق نہ آیا، سادگی  
سے بولا ”تم میری عظیم سی ایف کے کی جڑوں تک پہنچ چکے ہو  
بات مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تم ہمارے متصادم کو بھانپ  
نے ہو اور اس سیٹ اپ کو بے غوثی سمجھنے لگے ہو لہذا کراچی میں  
نہادی موجودی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔“

اس نے تھوڑا وقفہ دے کر پانچندیدہ نظر سے مجھے دیکھا  
اور بولا ”میں اس سے دفع کرنے سے پہلے میں نے تمہارا ڈنک  
چکایا ہے۔ اب تم مجھے ڈنکے کا تصور بھی نہیں کر سکو گے۔ اگر  
میں نے میری جانب رخ کرنے کی کوشش کی، کراچی میں  
میں ہونے کی نیت یا غم یا پھر پاکستان کی زمین پر قدم  
رکھ کا خیال بھی تمہارے ذہن میں آیا تو سمجھ لیا، میں اس  
فحش قلم کی ایک ایک کاپی ہر دوپو سینئر پر پہنچا دوں  
اور تم یہ بات بڑی اچھی طرح جانتے ہو یہاں کی عوام  
ماتر مند ہے۔ ترے اور ترے ہوئے لاکھوں قلم بین  
انسانی ذہن اس نوعیت کی فکر کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے  
ہے۔ تم کتنے منہ کھانے کے قابل نہیں رہو گے۔“  
میں نے ترش لہجے میں کہا ”میں پاکستان میں پیدا ہوا یہ  
میں ہے۔ تم مجھ سے اس ملک میں رہنے کا حق کس طرح

چھین سکتے ہو۔ اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے؟“  
”میں نے کہا نا اس وقت میں اپنے فائدہ سے نقصان کی  
بات نہیں کر رہا۔“ وہ سخت لہجے میں بولا ”میں یہ سب کچھ اپنے  
بڑوں کے حکم پر کر رہا ہوں۔ تم نے سی ایف کے کو جو بھی نقصان  
پہنچایا ہے، وہ براہ راست انہی کا نقصان ہے۔ تم نے ایک  
طرح سے خدا کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ تم سے سخت ناراض  
ہے۔“

”کیا کہتے ہو؟“ میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔  
وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولا ”میں زمینی خدا کی بات  
کر رہا ہوں..... امریکا بھارا!“

”اوہ!“ میں نفرت آمیز نگاہ سے اسے گھور کر رہ گیا۔  
وہ کہنے لگا ”اب تم یہودیوں سے دشمنی کا مزہ کچھ  
لو گے!“

”میں یہود کا دشمن ہوں اور نہ ہی یہود کا۔“ میں نے  
صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”میں دراصل برائی کا دشمن  
ہوں۔ اس دشمنی میں کسی مذہب و ملت کی تخصیص نہیں۔ میں  
نے ہمیشہ اچھائی کا ساتھ دیا ہے اور برائی کی مذمت کی  
ہے۔“ ایک لمحے کو روک کر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم یہودی ہو..... یا چودہری لو آواز یہودی ہے؟  
میں تو تم دونوں کا دشمن اول ہوں کیوں کہ تم دونوں شیطان  
کے چیلے ہو بڑائی کے علمبردار ہو۔ تم میری پوری ہسٹری سے  
واقف ہو۔ میری زندگی کا ایک ایک ورق پلٹ کر دیکھ لو۔  
تمہیں ہر جگہ میرے الفاظ کی سچائی ملے گی۔ میں نے ہر قدم پر  
شیطان کی ذہنیت کے حامل افراد کے دانت کھٹے کئے ہیں اور  
مظلوم و بے کس کی داد دی کی ہے۔ میں تم دونوں نیک  
انسانیت کو چھوڑنے والا نہیں۔“

”اسی لیے تو میں نے تمہاری یہ دڈیو تیار کی ہے۔“ وہ  
ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”اب ہم دونوں  
تمہارے ہاتھوں محفوظ ہو چکے۔ تم پاکستان میں داخل ہو گے  
اور نہ ہی ہمیں کوئی نقصان پہنچاؤ گے۔ میرے بڑے تمہارے  
ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اس کی مجھے کوئی پروا نہیں۔“ وہ  
تھوڑی دیر روکنے کے بعد بولا ”اور یہ جو تم نے ہسٹری والی بات  
کی ہے تاہم تفصیل میں نے اوپر پہنچا دی ہے بلکہ وہ ریکارڈ  
جو تم نے سی ایف کے میں رکھے ہوئے مرتب کیا تھا۔ تمہیں وہ  
خون ریز واقعات تو یاد ہوں گے جب تم نے اپنے دوست اور  
میرے محکم خوار امتیاز کے ساتھ مل کر سی ایف کے کے پلیٹ  
فارم سے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے تھے؟“  
شعیب غوری جن کارناموں کو عظیم الشان قرار دے رہا

تھا وہ ایک ایک کر کے میرے ذہن سے گزرنے لگے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ہی ایف کے سے وابستگی کے دوران میں بعض اوقات قتل و غارت گری بھی کی تھی لیکن یہ سب کچھ انجام دینے میں ہوا تھا۔ میں ہی ایف کے کو ایک اصلاحی اور انسانی بیہودگی کے علم کا حامل تھا اور اپنی دانست میں میں نے سچائی کا ساتھ دیتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور ظالم کا ہاتھ توڑا تھا۔ بہر حال اب نہ امتیاز باقی رہا تھا اور نہ ہی سی ایف کے سے میری وابستگی!

شعب غوری پورا مکمل گیا تھا۔ میں نے اور منہاس باقر نے اس کے بارے میں جو انداز لگائے تھے وہ صد فی صد درست ثابت ہو رہے تھے۔ میں منہاس ہی کے ایما پر کسی بیہودہ نواز سٹاپ کی تلاش میں نکلا تھا اور تان بالا تری ایف کے پر آن کر ٹوٹی تھی۔ یہ ایک بات ہے کہ میں پہلے سے اس تنظیم سے وابستہ تھا لیکن اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔ شعب غوری بیہودی لابی کے اشاروں پر چلتا تھا اور ان کی مقصد براری کے لیے کوشاں تھا۔ منہاس باقر نے بیہودیوں کے اس پیچھے اور اس کی شیطانی تنظیم کو بڑے اکھاڑ بھینکنے کا عزم کر رکھا تھا اور میں اس کے عزم کی تکمیل کے لیے کوشاں تھا۔ کوئی بھی محب وطن بے برداشت نہیں کر سکتا کہ اغیار اس کی دھرتی کی جانب مبطل نظر سے دیکھیں!

یہ تمام خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزر گئے اور میں سوچنے لگا کہ حالات نے اچانک کسی دایمیت صورت اختیار کر لی تھی۔ شعب غوری نے سب سے زیادہ تشویش ناک انکشاف یہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیہودی آقاؤں کو میری ہتھیاری سے آگاہ کر چکا تھا۔ میں بیہودیوں کی ذہنیت ان کی طاقت اور کام کرنے کے انداز کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ بال کی کمال اور کمال کے بال اتارنے کے ماہر تھے۔ وہ جب کسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر بڑ جاتے تو پھر یہ دنیا اس مستوب کو بڑی تک نظر آئے تھی۔ کوئی بھی محفوظ یا غیر محفوظ نگاہ وہ اس سے آنکھ نہ ملانی اور وہ ایک نادیہ شکاری کے آگے دوڑتے دوڑتے ہانپ جاتا۔ اس کے قدم ڈمگاتے اور وہ منہ کے بل جا کرتا۔

کسی نے سچ کہا ہے انسان محبت اور دوستی میں بہت مار کھاتا ہے۔ میں نے شعب غوری سے دوستی کے نتیجے میں اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ میرے حالات زندگی سے بہ غریبی آگاہ تھا۔ سنگار پور تھا لیکن ہندوستان اور دشمنوں کی بہت سی کہانیاں میں نے اسے سن کر ہی سنی تھیں۔ یہ اس پر میرا اعتماد ہی تھا کہ میں نے اسے

متروک کنوئیں میں ساہا سال سے دفن کر دوڑوں کی بات کے سونے کے راز سے آگاہ کر دیا۔ ازاں بعد اس سلسلے میں بھی اس نے مجھ سے دھوکا کیا اور میرے دشمن دیرینہ سے دوستی کر بیٹھا۔ بہر حال اب ان باتوں کو سوچنے یا ان پر کڑے کا وقت بہت گیا تھا۔ موجودہ صورت حال غامض کی گہری گہری تھی۔ مجھے مسلسل خاموش اور اپنی جانب یک نیک دیکھنے پر شعب غوری نے کہا ”وہ جان! تم کس سوچ میں گم ہو؟ کبھی امریکا بھاڑ کی دہشت علی بہت ہے۔ لگتا ہے تمہاری ٹی کوئی ہے۔ تم اتنے چپ چپ تو بھی نہیں رہا کرتے تھے!“

میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور چار حانہ انداز میں کہا ”تمہارے اس امریکا بھاڑ کو میں اپنے جوتے کی ٹوک پر رکھتا ہوں تم نے اسے زمینی خدا کہا ہے لیکن میری نگاہ میں وہ زمینی شیطان ہے۔ تم قبول چکے ہو میں نے تمہاری سی این کے کو جو بھی نقصان پہنچایا وہ درحقیقت تمہارے بڑوں کا نقصان ہے۔ ایسا خدا کس کام کا جسے مجھ جیسا ایک معمولی انسان بے در پے نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے؟“ میں نے سانس لینے کی خاطر تھوڑا وقف کیا پھر سناتے ہوئے لہجے میں کہا ”میرے نزدیک وہ ایک عظیم فتنہ ہے۔ ایسے فتنے اور زمینی خدائی کے جھوٹے دعوے دار ہر دور میں جنم لے رہے ہیں۔ جو چیز جنم لیتی ہے وہ فطری اصولوں کے تحت ایک دن فنا بھی ہو جاتی ہے۔ تمہارا یہ بدمذہب خود زمینی خدا بھی بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔“

”تم تقریر بہت اچھی کر لیتے ہو۔“ وہ طنز پر انداز میں سراہتے ہوئے بولا ”بہر حال اب ان جوش بھری باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ جنہیں جو کچھ بھی کہتا ہے انہی سے جا کر کہتا جو کچھ کہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ تمہاری دونوں ساتھیوں کو بھی لے جائیں گے بلند و پست کا یہ کبھی نیشن تمہارے ہم رکاب رہے گا۔ ایک پردے کے پیچھے دوسری پردے پر۔“ شعب کی بات ختم ہوئی تو میرے رگ و پے میں کوئی تشویش دوڑ گئی۔ بلند و پست سے اس کی مراد ساحل اور صدف تھی۔ ساحل دراز قامت اور صدف پست قد تھی۔ شعب کی آخری جملے میں بڑی سفاکی شامل تھی۔ اس کی بات کا کیا مطلب نکلتا تھا کہ ساحل کو مجھ سے ملنے نہیں دیا جائے گا۔ وہ پردے کے پیچھے کا کتا ہے استعمال نہ کرتا۔ ساحل سے دروازے کے تصور نے مجھے تڑپا کر رکھا دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

”ساحل کہاں ہے؟“

”دکھی سمندر کے کنارے استاد ہوگا!“ وہ بے پرواہی

ہے بولا۔

”میں اپنی ساحل کی بات کر رہا ہوں؟“ میں نے غراہٹ آواز انداز میں کہا۔

”وہ میرے پاس محفوظ ہے۔“ شعب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ”ساحل اور صدف اسی جنگل کے ایک آرام دہ حصے میں موجود ہیں۔“

میں نے پوچھا ”چلو ان لیا میں نے اور صدف نے مل کر جنہیں اور تمہاری تنظیم کو نقصان پہنچایا ہے یا قبول تمہارے تمہارے آقاؤں کو نقصان پہنچایا ہے لیکن ساحل تو اس معاملے میں کبھی طور لوٹ نہیں پھر اسے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے؟“

”تم سے کس نے کہہ دیا؟“ میں ساحل کو سزا دے رہا ہوں۔ ”وہ عجیب سی نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا ”میں نے تو پھولوں کی طرح سجا کر اسے اپنے پاس سنبھال رکھا ہے۔ دہرے بڑوں کی امانت ہے۔ میں اسے ایک ذرا سی تکلیف پہنچانے کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا۔“ وہ ذرا متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ساحل کو تو کب کا یہاں سے روانہ کیا جا چکا ہوتا لیکن تم اسے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ جنہیں شکار کرنے کے لیے ساحل کا چار استعمال کیا گیا۔ بہر حال اب یہ قہر منٹ چکا۔“ وہ خاموش ہوا تو میں الجھ کر رہ گیا۔ اس ضمنی کلمہ سبب یہ تھا کہ ساحل کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جا رہی تھی۔ وہ تو ایک فزق اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی کے جرم میں نیکی نہیں اٹھا رہی ہے لیکن شعب غوری نے خود فکر کا ایک اور دروازہ کھول دیا تھا۔ جب اس دروازے میں ابھرے والا منظر میری سمجھ میں نہ آتا تو مجھے اسے باور راست شعب ہی سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کا نئے کوڑے میں منگھنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”تمہارے آقا میری ساتھی ساحل میں کیوں دیکھی لے رہے ہیں؟“

”وہ لوگ ساحل میں نہیں بلکہ دھنوں میں دیکھی لے رہے ہیں۔“ وہ شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا ”میں جتنی فوش دانی اس حینہ کی بات کر رہا ہوں جس کا تعلق کمینڈو کے نزدیک واقع ایک بدھ عبادت گاہ سے ہے۔ تم نے اسے بالکل کامیاب کر کے ایک آڑ میں جھپایا تھا لیکن دیکھ لو میرے ذہن کی قیامت کی نظر دیکھتے ہیں۔ انہوں نے دھنوں کو کھوج لایا اور اسے پکڑنے کا فریضہ مجھے سونپ دیا۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا تو وہ ایک تیر دھنوں پر اصرار

کرنے لگے۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا تو میں اس نئے انکشاف پر ششدر رہ گیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”یہ وہ لمحات تھے جب تم میرے دوست ہوا کرتے تھے۔“ ایک کمرہ دوستی کے پلیٹ فارم پر یہ آسانی ذبح کیا جاسکتا ہے سو میں تمہارے اور نزدیک ہو گیا۔ پھر تمہاری ساتھی کو اغوا کر لیا گیا چنانچہ مجھے بہ حالت مجبوری چو پداری نوازش سے دوستی کا ٹھنڈا پڑی اور میں نے دس کروڑ کی رقم چو پداری کے حوالے کر کے دھنوں میں تمہاری ساحل کو حاصل کر لیا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر بڑے زہریلے انداز میں مسکرایا اور بولا ”یہ ایک بات ہے کہ وہ دس کروڑ روپے تمہارے ہی حصے کے تھے۔ اسے کہتے ہیں جس کا جوتا اسی کے سر!“

میں اس کا تبصرہ سن کر سلگ اٹھا تاہم میں نے جوش میں آنے سے احتراز برتا۔ اس وقت اگر میں غصے کا مظاہرہ کرتا تو اصل بات سچ میں لٹک کر رہ جاتی۔ ساحل سے متعلق بیہودی لابی کی دیکھی کے بارے میں جاننا نہایت ہی اہم اور ضروری تھا۔

میں نے متحمل لہجے میں شعب سے سوال کیا ”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تمہارے آقا ساحل کے حصول کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہیں؟“

”پوری بات تو مجھے بھی معلوم نہیں۔“ وہ غصے میں بولا ”جتنا جانتا ہوں وہ تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ آخر کو گزریے دنوں میں تم میرے دوست رہے ہو!“ وہ طنز پر انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد بولا۔

”میں نے اڑنی اڑنی سنی ہے ساحل یعنی دھنوں کے سینے میں کوئی راز دفن ہے۔ ایک بیش بہا خزانے کا راز۔ میرے بڑے اس خزانے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس خزانے کی اہمیت مادی بھی ہے اور روحانی بھی۔ جنہیں تو معلوم ہی ہوگا بیہودی اور بیہودیت کا ماضی اور حال بے حد پراسرار ہے۔ ان کا ایک مخصوص طبقہ دھنوں اور روحانی علوم و فنون میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور یہ لوگ ہر قسم کی مشرکی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دھنوں کی بھی ایسے ہی راز کی امین ہے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔“

شعب کی وضاحت نے بجائے سلیمین کے الجھن پیدا کر دی۔ اس کی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ساحل ایک بے ضرر اور سادہ سی لڑکی تھی۔ اس کے ناز و ادا میں معصومیت پائی جاتی تھی۔ اگر اس کے سینے میں کوئی راز پوشیدہ

ہوتا تو وہ مجھ سے اس کا ذکر ضرور کرتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ اپنے آپ سے دور ہونے لگے۔ ہمارے درمیان کوئی بات راز نہیں رہی تھی۔ سارے پردے اٹھ چکے تھے۔ ہم سن دو سے بہت آگے نکل آئے تھے۔

دوسری طرف میں شعیب غوری کی بات اور اس کے آقاؤں کے دعوے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگ اگر ساحل کو کھوج رہے تھے بلکہ..... حاصل کر چکے تھے تو یہ ساری دودھ دھوپ بے مقصد نہیں ہو سکتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال ابھرا۔

کیا ساحل واقعی اتنی سادہ نہیں تھی جیسی دکھائی دیتی تھی؟ کیا میں اس کی گہرائی نہ جانے میں ناکامیاب رہا تھا؟ کیا وہ معصومیت کا عکس مجھ سے بھی بہت کچھ چھپائے ہوئے تھی؟

ایک سوال نے اپنے پیچھے قطار لگا دی اور ایک کے بعد ایک منی اور سنسنی خیز سوال میرے ذہن میں پھوڑے برسائے لگا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا اور اگلے ہی لمحے میں نے سر جھٹک کر ان فضول استفسارات کو اپنی کھوپڑی سے نکال باہر کیا۔ میری ساحل ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی لمحے شعیب غوری کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وہ جان! صرف ایک چھپی ہوئی حقیقت نے تمہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اگر سارا احوال سنو گے تو تمہارا دماغ چٹ جائے گا۔ تمہاری وہ مضبوط اعصابی اور اکہنی قوت ارادی کیا ہوئی؟ کیا میں کہوں..... ہوا ہوئی؟"

میں نے طیش میں آنے کے بجائے بڑی قہر آمیز نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا "تمہارے آقا ہمیں کہاں پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"بہت ہی اہم سوال کیا تم نے لیکن افسوس۔" وہ خفیف سا ہوتے ہوئے بولا "مائی اولڈ ڈیئر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اپنے بڑوں سے سوال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور از خود انہوں نے اس سلسلے میں مجھے کچھ بتایا نہیں اس لیے..... سو رہی۔"

وہ ایسے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس سے زیادہ کوئی میرا خیر خواہ نہ ہو لیکن میں سمجھ رہا تھا "یہ اس کا طعنے اذیت پہنچانے والا اور ناہنیدہ کی کا انداز تھا۔ میں نے کرید جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"انتا تو تمہیں معلوم ہی ہوگا وہ ہمیں کس ذریعے سے لے کر جائیں گے؟"

"ہاں معلوم ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا

پھر انا مجھ سے مستفسر ہوا "تمہیں یاد ہے ابھی چند روز پہلے لوگ ایک بندے کو پاکستان لے کر گئے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے لیے "موسٹ وائنڈ" تھا۔ وہ امریکی کی آئی اے کا مجرم تھا۔ وہ لوگ کئی سال سے اس کی تلاش میں کرڈول ڈالر خرچ کر چکے تھے بالآخر وہ اسے یہاں سے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسے گرفتاری کے مقام سے فی الفور حکومت وقت کے تعاون سے اسلام آباد پہنچایا گیا۔ میرے آقاؤں کا چارٹرڈ طیارہ اسے اسلام آباد سے سیدھا امریکا لے گیا تھا تم نے اخبارات میں اس واقعے کی تفصیل پڑھی ہوگی؟"

"تمہارا اشارہ اہل کاسی کی طرف تو نہیں؟" اس وقت میرا پورا وجود سنسنی کی لپیٹ میں تھا "پچھلے دنوں جی اس نوعیت کا بڑا واقعہ پیش آیا ہے۔"

وہ کبیر آواز میں بولا "مخل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ بس اتنا جان لو کہ ایک تار چارٹرڈ طیارہ چرنگھوں بعد تم لوگوں کو یہاں سے لے جانے کا شکر ہے۔ میرے آقا اس وقت جنگلے میں موجود ہیں۔ تموزی ہی دیر بعد وہ اس حال اور اس ہال میں تمہارا دیدار کریں گے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہیے تموزی دیر پہلے چوہدری نواز شریف اپنے گاؤں سے یہاں پہنچا ہے۔ اسے نہایت ہی امیر جیسی میں کرنا تھا؟ پڑا لیکن میں اسے اس ہال میں نہیں لے کر آؤں گا۔ تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کے نتیجے میں وہ تمہیں دیکھنے کی شوق کر دے گا اور میں تمہیں پتا چکا ہوں تم اس وقت کا اہمیت اختیار کر چکے ہو۔"

میں نے بے ساختہ پوچھا "میں نے چوہدری کے ساتھ وہ خاموشی سے مجھے کتنے لگا۔ انداز ایسا تھا یہ بھانجے کی کوشش کر رہا ہو کہ کیا میں واقعی اس بارے میں کچھ نہ جانتا یا بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"کیا تم مجھے بے خوف مجھے ہو؟" وہ پھر سے بولے میں مستفسر ہوا۔

"یقین کر دو چوہدری کے ساتھ جو کچھ بھی بنا ہوا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے صاف کوئی مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "میں تو کل رات دس بجے سے اب تک تمہارے جنگلے میں ہوں۔"

"ہوں!" اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتی "ہو لا" پھر وہ تمہارے ساتھیوں کا کارنامہ ہوگا!"

اس کی بات میرے دلے نہ پڑی تو میں نے اصرار

انداز میں دریافت کیا "آخر ہوا کیا ہے؟"

"تم تموزی دیر کے مہمان ہو اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ ہراندہ لہجے میں بولا "کل شام چوہدری نواز شریف کے ایک خاص بندے نے ڈی ملک کو اغوا کیا گیا تھا۔ چوہدری کا قتل جگر پہلے ہی تمہاری قید میں تھا۔ آج علی الصبح وہ دونوں دریافت ہو گئے ہیں۔ ایک زندہ اور دوسرا مردہ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں جج سے مشابہ آواز میں پچھا۔

وہ پھر بھی ہوئی نگاہ مجھ پر گاڑتے ہوئے بولا "حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا،" میں اضطرابی انداز میں بولا۔

وہ بولا "حقائق ایسے ہی سچ اور ناقابل یقین ہوتے ہیں۔"

"ذرا تفصیل بتاؤ۔" میں پوچھے باندھ رہا تھا۔

میرے اس مضطرب سوال کے جواب میں شعیب غوری نے بتایا کہ آج علی الصبح لگ بجک باج بجے "تین ٹکڑا" کے قدموں میں بے ڈی ملک کی لاش اور فیصل کا عبرت ناک وجود دریافت ہوا تھا۔ بے ڈی ملک کو بے پناہ اذیت سے گزارنے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا جب کہ فیصل زندہ تو تھا لیکن اس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے "استغفر اللہ" نکلتا تھا۔ اس کے دونوں کان زبان ناک کا گوشت والا حصہ کاٹ کر جسم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ نچنے کے عقب میں پائی جانی والی حساس رگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ اب وہ زندگی بھر اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی کہنوں کے چوڑے چوڑے اچھی خاصی طبع آزمائی کی گئی تھی۔ بات کے اختتام پر شعیب نے پھکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔

"فیصل تمہاری تحویل میں تھا۔ بے ڈی ملک کا اس کے ساتھ پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے بھی تم نے یا تمہارے ایما پر اغوا کیا گیا تھا۔ اس لیے ان دونوں کے ساتھ ٹپٹ آنے والے واقعات کے قریب ہی ڈنٹے دار ہو گئے۔ میں نے جی چاہے چوہدری کو اس سانحے کی اطلاع دی اور وہ ابھی تموزی دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔ اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟"

آخر میں شعیب نے بڑا معنی خیز سوال کیا تھا جس کا اسی ڈگری پر جواب دینا مجھ پر لازم تھا۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا بے ڈی ملک اور فیصل کا شر خراب کرنے والا شہر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں زرنگ نے بھی اس کی کچھ مدد کی ہو۔ پہلے تو مجھے شہزاد کی اس جذباتی بے

دقوتی پر غصہ آیا تھا لیکن میں اس وقت جس قسم کی صورت حالات سے گزر رہا تھا اس کے تقاضے کے مطابق شہزاد نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔

اس جاں نثار دوست کے لیے میرا دل ہر دوفا کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ اس جی دار پٹھوہاری نے دل بڑھانے اور لہو گرمانے والا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں شہزاد کی بہادری کو سلام کیا پھر پھر سے ہونے لہجے میں شعیب غوری سے کہا۔

"میں نہایت ہی مسرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ بے ڈی ملک اور فیصل کو میرے پیتل پر ٹھونڈ مارتا بتایا گیا ہے اور....." میں نے ذرا توقف کر کے اپنی بات کو مکمل کر دیا۔

"اور..... تم تمہارا وہ نیا ٹیلا دوست چوہدری نواز شریف اور تمہارے آقا سب کے سب میرے اسی یادگار سلوک کا مزہ چکھو گے۔ جلد یا دیر یہ میں تمہاری زندگیوں کو دردناک عذاب کے سپرد کرنے والا ہوں۔"

"بول بول جی جی جاہول کی ہمز اس نکال لو کیوں کہ تم نہیں جانتے" اس پتھرے میں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ تمہیں ایک مخصوص قسم کے چاٹکے میں بلا دیتے تو یہاں نہیں بٹھا یا گیا! آخر کوئی تو مقصد ہوگا تمہارے دونوں ہاتھوں کو اکہنی بندشوں میں پکڑنے کا!"

"کیا مقصد ہے تمہارا؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور میں اپنے برہندہ جود کو دیکھنے لگا۔

"بس گھبرا گئے!" شعیب غوری کی طنزیہ نظر مجھے اپنے پار ہوتی محسوس ہوئی۔

میں نے ہلکا کر پوچھا "مجھے اس جاتی پنجبرے میں کیوں قید کیا گیا ہے؟"

"اس لیے کہ تم بھی کسی جن سے کم نہیں ہو۔" وہ یہ کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ گیا پھر پنجبرے کے نزدیک آ کر بولا۔

"میرے آقا اپنے ساتھ دو نہایت ہی خطرناک فائزر بھی لائے ہیں۔ اس پنجبرے کے اندر تم ان سے مقابلہ کرو گے۔ یہ انتہائی خوفناک اور خون ریز مقابلہ ہوگا جس کا ایک ایک اسٹیپ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہوتا چلا جائے گا۔" وہ تموزی دیر کے لیے رکا پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"خون ریزی اور ہلاکت خیزی میرے آقاؤں کو بہت پسند ہے۔ انہوں نے تو اپنے اسپورٹس میں بھی غیر انسانی حوالہ کو شامل کر لیا ہے۔ اپنی تفریح طبع اور تسکین ذوق کی خاطر وہ کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔"

"تم اور تمہاری شیطانی تنظیم کی ایف کے اسی دشنام

مزاج کا ٹریڈ ہے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحات تک بڑی ممتی خیز نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر معتدل لہجے میں بولا "بہر حال سابق دوستی کا خیال کرتے ہوئے ایک مشورہ میں تمہیں ضرور دوں گا۔ ذرا ہاتھ پاؤں بجا کر مقابلہ کرنا۔ اس ہجرے کو میں نے ڈیڑھ گھنٹہ کا نام دے رکھا ہے۔ آج تک کوئی زندہ یہاں سے باہر نہیں نکلا۔"

"ڈیڑھ گھنٹہ؟" میں زیر لب بڑبڑایا۔

اس نے کہا "میں نے تمام ضروری باتیں تم سے کر لیں۔ اب دوسرے سیشن میں ملیں گے۔" پھر وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے کچھ بھی نہ کہا۔ میری نگلی آبیروں اور نفرت انگیز نگاہ شیب غوری کی پشت پر جم کر رہ گئی۔ وہ میری نظر میں ایک ایسا بزدل حریف ثابت ہوا تھا جو میں میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر چار ہاتھ تھا۔ اوبہ! میں نے دانت کچکپکائے اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

میری تمام تر توجہ اپنے ہاتھوں پر مرکوز تھی!

دونوں ہاتھوں کو پشت پر اپنی پھٹکڑی میں اس طرح فٹ کیا گیا تھا کہ میں انہیں حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں اپنی ہی کوشش کے باوجود بھی اس اپنی بندش سے نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا ورنہ ایک مرتبہ پہلے بھی اسی قسم کی صورت حال سے گزر رہا تھا اور میں نے جسم کی مخصوص جنبشوں کو کام میں لا کر پھٹکڑی کو غیر موثر بنادیا تھا۔ اپنی پھٹکڑی "سیدھی" میں بدل گئی تھی۔ یہ ان دونوں کا واقعہ ہے جب میں زمینی راستے سے پاکستان میں داخل ہوا تھا اور پھر بار کر میں قدم رکھتے ہی ہمیں بے درپے مشکلات سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

پھٹکڑی بڑی مختلف اور پیچیدہ قسم کی تھی۔ میں جتنا سنگ کی ٹیکنیکس کے فطرت سے چمکارا انہیں پاسکتا تھا چنانچہ میں نے "جی" کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے اپنی توجہ بندھے ہوئے ہاتھوں پر مرکوز کر دی۔ اس اپنی گرفت سے جلد از جلد آزادی حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ شیب سے ہونے والی طویل گفتگو نے مجھے گہری تھوڑی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ بندھوئے چوبی اسٹول پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اب میرا مقابلہ کسی علاقائی بد محاش سے نہیں تھا بلکہ شیب کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس دنیا کا سب سے بڑا انڈیا میرے مد مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ شیب جیسے بلک دشمن اور زمین فروش لوگوں کے لیے وہ ارضی خدا سے کم نہیں تھا لیکن میری نگاہ میں وہ علم و برکت کی علامت

تھا اور میں..... میں نے زندگی بھر عالم کے خلاف مظالم کا ساتھ دیا تھا!

میں اس وقت تصور کی نظر سے پھٹکڑی کے لاک کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے جی کی پراسرار اور خفیہ قوت کو اس لاک تک پہنچانا تھا۔ ہجرے کے لاک سے نکلنے کا مرحلہ بعد میں آتا اور یہ ساری کاروائی شیب کی واپسی سے پہلے کرنا تھی۔ اس نے دوسرے سیشن میں ملاقات کی نوید سنائی تھی اور وقت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ پانچ منٹ بعد بھی واپس آ سکتا تھا اور اس آدھ میں چندہ میں منٹ بھی لگ سکتے تھے۔ آنے والے حالات کی گنجینی اور ہلاکت خیزی مجھے اس ہجرے سے جلد از جلد نکلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

میں نے ٹارگٹ کو ذہن میں بٹھانے کے بعد اپنے دھیان کو ناف کے مقام کی سمت منتقل کر دیا۔ جی کی پوشیدہ قوت کا ممکن ناف کے عقب میں زبڑھ کی بڈی کے نزدیک تھا۔ میں اس قوت کو پہلے بھی جی بار استعمال کر چکا تھا اس لیے مجھے اچھی خاصی پریکٹس ہو چکی تھی۔ جلد ہی جی توانائی کے اس ذخیرے سے پھر تصور رانی رابطہ ہو گیا۔ میں نے اس میں باخترانے میں سے تھوڑی سی توانائی چرائی اور اسے اپنے خیال کی مٹھی میں بھر کر جسم کے اندر ہی اندر چلاتے ہوئے کندھوں تک لے آیا پھر یہ پراسرار نادیہ قوت دونوں بازوؤں میں سرکرتی ہوئی بڑی تیزی سے ہاتھوں میں کھینچ گئی۔ یہ سارا مل تصور کے بل بوتے پر انہماں پر ہاتھ اور اس کی تکمیل میں سینکڑوں حصے استعمال ہو رہے تھے۔ تصور کی کارفرمائی اتنی ہی زوردار، تیز رفتار اور تیرہ برف ہوتی ہے کیوں کہ تیسری آنکھ براہ راست اس کی نگرانی کر رہی ہوتی ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہے!

پھٹکڑی کے سبب میری دونوں کلائیوں ایک دوسرے میں باہم جوست تھیں لہذا بازوؤں سے گزر کر وہاں پہنچنے والی قوت کلائیوں کے جڑوں پر چک ہوا تھی۔ اس لمحے میں نے جی کا اسٹریجک پھٹکڑی کے لاک کی جانب بٹھایا۔ ایک ہلکی سی "کھٹاک" ابھری اور میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے۔

میں نے خوشی خوشی اپنی دونوں کلائیوں کو سہلایا اور بے ساختہ میری نگاہ ہجرے کے فرش پر پڑی پھٹکڑی پر جا گئی۔ میں نے حقارت سے اس شکست خوردہ اپنی گرفت کو دیکھا اور ایک عزم کے ساتھ ہجرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ہجرے کے لاک کو اپنے تصور کا ٹارگٹ بناتا تھا مجھے بری طرح چونک جانا پڑا۔ ہال کے دونوں

دروازے ایک بہ یک کھل گئے تھے۔ اگر دروازے کھلے تھے تو اس کا یہی مطلب تھا "اب دوسرا سیشن شروع ہونے والا تھا۔ خون ریز مہم کے کاغذیں!"

مجھے اس بات کا سخت افسوس ہوا کہ ہجرے کا لاک ٹوٹنے سے پہلے ہی دوسرا سیشن شروع ہو گیا تھا۔ اگر میں ہجرے سے باہر نکل چکا ہوتا تو صورت حالات بہت مختلف ہوتی۔ یہ بات تھی کہ میں کسی خطرناک مقابلے سے گھبرا رہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جب سے مجھے پتا چلا تھا "میں یہودیوں کے بد مقابل ہوں" میرے سوچنے کے زاویے میں تھوڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ یہودیوں کی عیاری اور مکاری صدیوں سے مسلح ہے۔ یہ مختلف قسم کے ٹانک کا اہتمام کر کے اپنے مریضوں بلکہ شکاروں کو ابھارتے ہیں انہیں حالات کی گنجینی سے بے دھیان کر دیتے ہیں اور اسی بے پروائی کی کنیت میں وہ اپنے دشمن پر وار کر دیتے ہیں..... گمراہ کیا ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی سرگرمی دکھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے چونکا نظر ہال کے دروازوں کی طرف مبذول کر دی۔

ایک دروازے میں پہلے دو رخ گاڑا نمودار ہوئے۔ یہ وہی دروازہ تھا جو شیب غوری نے تھوڑی دیر پہلے اپنی آمد و شد کے لیے استعمال کیا تھا۔ دونوں گاڑا ہال کے اندر داخل ہونے کے بعد سیدھے ڈیڑھ گھنٹہ کی جانب بڑھے اور کچھ کے دروازے کے دائیں بائیں مجھ پر کنکرتان کر کھڑے ہو گئے۔ یہ مجھے میں مجھے ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوئی کہ انہیں حفظ باقاعدہ کے طور پر سمجھا گیا تھا تاکہ میں کسی قسم کی ہم جونی کا خیال دل میں نہ لاؤں۔ ایک بات سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ شیب غوری اینڈ کمپنی کے دلوں پر میری بھرپور دہشت سوار تھی۔

ہجرے کے فرش پر "جیت" بڑی پھٹکڑی مسلح گاڑا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئی انہوں نے بیک وقت چونگی ہوئی نظروں سے میرے آزاد ہاتھوں کو دیکھا۔ ہجران کے چہرے گہری تھوڑی میں ڈوب گئے۔ میں نے طنزیہ انداز میں زیر لب مسکرائے پر اٹھا کیا۔ لیکن تمہارے میری اس جسارت پر کوئی ایکشن لینے کے ہال میں دیگر افراد کی آمد شروع ہو گئی۔

شیب غوری کسی سے باتیں کرتے ہوئے دوسرے دروازے سے ہال میں داخل ہوا۔ جلد ہی مجھے اس کے مخاطب کا چہرہ بھی نظر آ گیا اور میں اس چہرے کو دیکھ کر واقعتاً چونک اٹھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ ارب جی بڑس مین یہودی انسٹل انگریز نسل آرم تھا۔ ہالی دوڈ کے اداکار بائیل ڈکس سے مشابہ اس یہودی کو میں ہزاروں لاکھوں چروں میں بخوبی پہچان سکتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ گولڈ اکاؤنٹ

بیک کا مالک تھا اور ایک ڈائمنڈ ایکسپورٹ کمپنی کا روبرو اس تھا "رکھال والی" کے متروک کنوینس سے برآمد ہونے والا جیش قیمت سونا تیل آرم کے قبضے میں چلا گیا تھا اور یہ سب کچھ شیب غوری کے فطرت ہوا تھا۔ نسل آرم کے عقب میں اس کی طرح دار سیکر بڑی شیا بھی نمودار ہوئی پھر وہ دونوں شیب کی محبت میں چلتے ہوئے نیم جینز چپوترے پر رکھی تین عالی شان کرسیوں کی جانب بڑھ گئے۔

شیا کو میں نے ایک مرتبہ پہلے کراچی انٹرویو کی عمارت سے نکلے دیکھا تھا۔ وہ انتہائی پرکشش اور گریس فل عورت تھی۔ یہودی عورتیں عام طور پر خوبصورت اور دلکش ہوتی ہیں۔ شیا ایک ہزار یہودیوں کے مقابلہ حسن میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی حقدار تھی۔

شیب غوری ایک یہودی اور ایک یہودوں کے درمیان براہجان ہو چکا تو پہلے والے دروازے سے دو اور افراد ہال میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں اپنی ڈھال چال اور اسٹائل سے فائزر نظر آتے تھے۔ شیب غوری نے شاید اپنی خطرناک فائزر کا ذکر کیا تھا۔ ایک فائزر کے ہاتھ میں مجھے ایک کتے کی زنجیر نظر آئی۔ وہ گلی محلے والا ایک دیسی کتا تھا اور بڑی فرماں برداری سے اس شخص کے ساتھ چل رہا تھا۔ کتا بردار فائزر اپنے چلبے اور ضد خال سے مغربی دکھائی دیتا تھا جب کہ دوسرے کے خال دھندلا اور پتھارے میں چینی رنگ غالب تھا۔

دونوں فائزر آج پر براہجان افراد کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تو گاڑا نے شیب غوری کا اشارہ پا کر ہال کے دروازوں کو بند کر دیا اور ایک ایک دروازے پر پوزیشن سنبھال کر پھرا دیے والے انداز میں استادہ ہو گئے۔

میں ڈیڑھ گھنٹہ کے اندر خاموش کھڑا ایک ایک چہرے کا بہ خور جائزہ لینے لگا۔ نسل آرم خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ شیب نے اپنے امریکی آقاؤں کی آمد کا ذکر کیا تھا لیکن میں جانتا تھا "نسل آرم انگریز بہادر کے ملک انگلینڈ سے تعلق رکھتا تھا البتہ وہ یہودی ضرور تھا۔ پہلے سیشن میں شیب غوری نے مجھ سے جتنی بھی گفتگو کی اس میں سے بہت سی باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ سرفہرست معاملہ امریکیوں کا مجھ میں اور ساحل میں دلچسپی لینے کا تھا اور دلچسپی ایسی گہری کہ ہمیں لے جانے کے لیے ایک چارٹرڈ طیارہ بھی بھیج دیا گیا تھا اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر اس سبج والی ڈرے بازی کی کیا ضرورت تھی۔ وہ لوگ اپنے مشن کو چشم زدن میں سمجھ سکتے تھے پچھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ میری گرفتاری کے بعد انہیں لمحہ بھر یہاں نہیں رکنا چاہئے تھا جیسا کہ ایل کاسی کے سلسلے



میں واقعہ پیش آیا تھا۔ مجھے تو اس ڈرامے کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی نظر آ رہی تھی۔ یہ قصہ اگرچہ میری سمجھ میں نہ تھا۔ میں سمجھ رہا تھا تاہم میں شیب کی بات پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا۔ فی الحال میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اس کے کہے ہوئے کی صداقت کو پرکھ سکوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے سراسر دروغ کوئی سے کام لیا ہو اور اصل معاملہ کچھ اور ہی ہو۔ آنے والا وقت اور پیش آمدہ حالات ہی حقیقت کے چہرے پر پڑے نقاب کو اٹھا سکتے تھے۔

شیب غوری اپنی سیٹ سے اٹھا اور چپوڑے سے نیچے اترا آیا پھر وہ بنجرے کے فرش پر پڑی پھنکری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔  
”مجھے امید تھی تم کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کر دو گے۔ کیا تم نے بنجرے کے دروازے پر طبع آزمائی نہیں کی؟“  
میں خاموشی سے اسے گھور کر رہ گیا۔

اس نے بالکل ویسٹرن اسٹائل میں کندھے اچکائے اور کہا ”بہر حال! میں نہیں جانتا تم نے اس پھنکری کو کیسے کھولا لیکن تمہاری اس کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔“  
میں نے تیل آرمز کی جانب اٹلی اٹھائی اور طنز بھرے لہجے میں استفسار کیا ”کیا تم نے اپنے اسی بیہودی آقا کا ذکر کیا تھا؟“

تیل آرمز اپنے کسی اور تعارف کے حوالے سے میری یادداشت کی چند باتیں گہرے بیٹھا تھا۔  
”یہ تو میرا دوست ہے۔“ شیب نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”تم اسے میرے بڑوں کا نمائندہ سمجھ لو۔ اعلیٰ حکام تو دوسرے کمرے میں بیٹھے ہیں اور یہاں کی کارروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ اس ہال میں ہونے والی ایک ایک حرکت کو مانیٹر کیا جا رہا ہے۔“  
اس ہال میں کوئی اعلیٰ یا مودی کیمرا دکھائی نہیں دے رہا تھا اس کا بھی مطلب تھا کہ ریکارڈنگ اور شوٹنگ نہایت ہی خفیہ طریقے سے کی جا رہی تھی جیسا کہ آئینہ خانے میں کی گئی تھی۔ شیب غوری نے اس بیٹنگ میں حیرت انگیز انتظامات کر رکھے تھے۔

شیب غوری نے بیٹنگ کے کسی دوسرے کمرے میں امریکیوں کی موجودگی کا ذکر کر کے میرے تن بدن میں سنسنی بکھیر دی تھی۔ اگر مجھے اس کہانی بنجرے سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا تو میں امریکیوں سے دو دو ہاتھ منٹ لیتا۔ میری جان تمنا ساحل اور جاں نثار صدف بھی اسی بیٹنگ کے کسی گوشے

میں مقید تھیں۔ ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں دو چار کیا دو چار ہزار دہشتوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ قدرے بے حالات کی بساط پر بڑی چابک دہتی سے مہرے چا دیے تھے۔

شیب غوری نے کتا بردار فائزر کو ایک مخصوص اشارہ دیا۔ وہ اس آواز پر کتے کی زنجیر تھامے دو قدم آگے بڑھ گیا۔ شیب نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے مجھے سے کہا۔  
”وہ جان! آج تمہارے مارشل آرٹس پر کڑی آزمائش ہے۔ یہ ڈیوڈ ہے۔“ اس نے سب بردار فائزر کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کا تعلق امریکا سے ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اس نے اراٹھٹ چیمپئن شپ جیتی ہے۔ ڈیوڈ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بن جائے گا۔“

میں نے ڈیوڈ نامی اس مارشل آرٹس کی آنکھوں میں آنکھ مارا۔ وہاں سفائی اور درندگی جسم میں شیب نے دوسرے فائزر کو آگے بڑھایا اور ایک مرتبہ مجھ سے مخاطب ہو گیا۔  
”یہ چنگ یو ہے۔ چینی مارشل آرٹس کا ماہر۔ تم نے بھی شاؤ لن نیپیل میں رہ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ چنگ یو اپنے ہاتھ پاؤں کی ضربوں سے تمہیں تائے گا۔“ فائزر فوگس طوفان کا نام ہے۔ آج تمہاری ٹائیٹم ہو کر رہ جائے گی۔“

چنگ یو گردن اٹھائے بڑے تکبر آمیز انداز میں کھڑا تھا۔ شیب غوری کی باتوں میں واضح تضاد موجود تھا۔ ایک طرف وہ مجھے اپنے آقاؤں کے لیے نہایت ہی اہم گردان رہا تھا۔ اتنا اہم کہ وہ چوہدری نواز شمس کو اس ڈرامے کے سانسے نہیں لار تھا کہ کہیں وہ مجھے شوٹ نہ کر دے اور دہری جانب وہ ان فائزر کے ہاتھوں میری پڑی پٹی ایک کھینکے کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ میں نے شیب کے اٹھن زدہ اور منافقت آمیز باتوں کو ذہن سے جھٹکا اور حالات پر توجہ مرکوز کر دی۔ مجھے ہر صورت میں ایک ایسا چال لینا تھا کہ بازی پلٹ سکوں۔ امریکیوں کے ہاتھوں بے بسی ہونا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں اس انڈر روپ جنگ کا نقشہ بدلنے کے لیے ہر مشکل سے گزرنے کو کمال تیار تھا۔

فائزر غوری نے تقریر جھانڈنے کے بعد شیب غوری نے ڈیوڈ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا بھی مطلب تھا کہ مجھے ڈیوڈ سے مقابلہ کرنا تھا۔ شیب کا اشارہ پاکر دونوں مارشل آرٹس آگے آگے۔ ایک گارڈ بنجرے کا دروازہ کھولنے لگا جب کہ دوسرے نے بڑی مستعدی سے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تا کہ میں کسی بھی قسم کی ہم جوتی کا خیال دل میں نہ لاؤں۔ بنجرے کا دروازہ کھل گیا اور ڈیوڈ اس ادنیٰ نسل کے

کے ساتھ بنجرے کے اندر داخل ہوا۔ گارڈ نے ڈیوڈ کے داخلے کے ساتھ ہی دروازے کو دوبارہ قفل کر دیا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ ایک کتے کا وہاں کیا کام۔ فوری طور پر ایک منگھڑ خیز خیال میرے ذہن میں ابھرا کہ شاید وہ کتار نظری کے طور پر انٹر ڈیوڈس کر لیا گیا تھا۔ میں نے اس خیال کو معطل کر دیا۔ اس نے کہا ہے کہ شیب غوری کے مطابق وہاں ایک خون ریز مقابلہ ہونے جا رہا تھا۔ جس میں فائزر لپے اور فائزر لپے کی تیز نہیں تھی۔ ایسے رف اینڈ میٹ مقابلوں میں ریفری کی بھی ٹھک ٹھاک پٹائی ہو جاتی ہے۔ ریفری کے حوالے سے مارشل آرٹس کی ایک عظیم قلم ”دی وے آف دی ڈریکن“ میرے تصور میں پھر گئی۔ اس قلم کی آخری فائنٹ سگنٹ فوگس کا اشارہ بروں لی اور قلم کے ویلن چک نورس کے درمیان تھی۔ اس فائنٹ میں ایک بلی نے ریفری کے فرائض انجام دیے تھے۔

میرا حریف بنجرے میں پہنچ چکا تو شیب نے ایک گارڈ کو مخصوص اشارہ کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”وہ جان! اعتلا سے پہلے میں تمہیں ایک چھوٹا سا تمنا دکھانا چاہتا ہوں۔ اس منظر کو دیکھ کر یقیناً تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ گارڈ اس کی اشاراتی ہدایت کے ایک دیوار کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میں گارڈ کو دیکھنے لگا۔ مذکورہ دیوار پر ایک بڑا سا پینٹل نصب تھا جس میں مختلف قسم کے شن اور پنڈل نظر آ رہے تھے۔ گارڈ نے پینٹل کھولنے کے بعد ایک پنڈل کو اوپر اٹھا دیا۔ گویا کسی شے کی پلائی آن کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی پینٹل کے اندر ایک سرخ بلب روشن ہو گیا۔

سرخ بلب خطرے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں ریڈارٹ ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا وہاں کیا پیش آنے والا تھا بہر حال جو کچھ بھی رہنا ہو وہ درزمرہ سے کافی ہٹ کر تھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈیوڈ نے کتنے کی زنجیر چھوڑ دی۔ کتا ”چپاؤں چپاؤں“ کی مخصوص آواز خارج کرتے ہوئے بنجرے کے اندر چکرانے لگا۔

پتا نہیں وہ جانور اب تک شرافت سے چپ کیوں مارے بیٹھا تھا۔ ڈیوڈ کا ہانکا کرنے والے انداز میں کتے کے پیچھے تیز تر قدم اٹھانے لگا۔ سب قوم کا وہ فرزند اس وقت بڑا پر جوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ ہوئی تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں تو کسی سے وہ تمنا نہ دیکھنے لگا۔

معاذ پوڈ نے اس کتے کو ایک ٹھوکر رسید کی۔ یہ فٹ بال والی ایک خوفناک کلک تھی۔ ڈیوڈ کا پاؤں کتے کے پیٹ پر پڑا اور وہ بے چارہ کسی فٹ بال کے مانند ہوا میں پرواز کر گیا۔ اس پرواز کے دوران میں اس کے ہاتھ پاؤں بڑی بے بسی سے مڑھکے تھے۔

پھر وہ تماشا رونما ہوا جس کے بارے میں شیب نے رونگٹے کھڑے ہونے والی بات کی تھی۔ ہوا میں تیرتا ہوا وہ کتا بنجرے کی سلاخوں کے ساتھ ایک دھماکے سے ٹکرایا۔ بے ساختہ کتے نے حفاظت خود اختیاری میں اپنے بچوں سے کتنی بچے کے کی سلاخوں کو تھامنا چاہا۔ پھر وہ ان سلاخوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔

کتے کے وجود میں پیدا ہونے والے ان مخصوص ارتعاش نے سیکنڈ کے دس دس حصے میں مجھے بتا دیا کہ کتنی بنجرے کی سلاخوں میں ایک طاقت در کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کے بعد دیوار میں نصب پینٹل کی حقیقت بھی کھل گئی۔ اس بنجرے کو کھلی کے نظام کے ساتھ بڑی مہارت سے منسلک کیا گیا تھا۔ پینٹل میں موجود پنڈل کو ان کرتے ہی بنجرے میں مہلک کرنٹ رواں ہو جاتا تھا۔

چند لمحات تک کتے کا وجود قہر خیز یا پھر وہ ساکت ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی خزاں رسیدہ بچے کے مانند سلاخوں سے بچھا اور ”دھب“ سے بنجرے کے فرش پر آن گرا۔ اس کے اندر زندگی کی کسی رت کی موجودگی کے بارے میں سوچنا خود کو فریب دینے کے مترادف ہوتا۔ شیب غوری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”وہ جان! اسے کہتے ہیں..... ڈھب کچ!“

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور بنجرے میں موجود ڈیوڈ پر نظر گاڑ دی۔ وہ بنجرے میں داخل ہوتے وقت جینز اور ٹی شرٹ میں لمبوس تھا۔ کتے کو اپنی برہمیت کا نشانہ نہ بنانے کے بعد اس نے ٹی شرٹ اتار دی اور وارم اپ ایکسرسائز کرنے لگا۔

میں بھی ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے جسم کو مخصوص جنبش دے لگا۔ یہ مقابلہ مجھ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ تو میں خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا اور یہ مقابلہ کسی عام اکھاڑے میں نہیں بلکہ ڈھب کچ میں ہو رہا تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا وہ بنجرہ اپنے پاس کسی کی موت کا پیغام رکھتا ہے۔ ڈیوڈ کی صحت اور ہائٹ قابل رشک تھی۔ ہم دونوں میں انجس میں کافرق رہا ہوگا۔ شیب نے اس کے تعارف میں بتایا تھا وہ انٹراٹھٹ چیمپئن شپ کا فاتح تھا اور یہ کوئی معمولی

بات نہ تھی۔ اس سے فائدہ کے دوران میں مجھے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔

دارم اپ ہوتے وقت مجھے ہلکی سی ہموک کا احساس ہوا۔ صورت حالات کی مناسبت سے یہ ایک پلس پوائنٹ تھا۔ دشمنوں نے تو جسمانی طور پر کمزور کرنے کے لیے مجھے ہموک رکھا تھا لیکن ان کی یہ چال اس وقت میرے لیے مفید ثابت ہو رہی تھی۔ میرا تجربہ یہ رہا ہے بھرے ہوئے پیٹ کی بہ نسبت ہلکی ہموک کی کیفیت پر نوعیت کی جسمانی کارکردگی میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے!

ڈیوڈ مقابلے کے لیے تیار ہو چکا تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ میری نظر میں وہ اوجھی اور چھوڑی حرکت تھی۔ شاید اس طرح وہ مجھ پر اپنی دہشت بٹھانا چاہتا تھا۔ وہ جہجہ سے میں رکھے چوٹی اسٹول کے پاس پہنچا۔ مذکورہ اسٹول کی اونچائی لگ بھگ دو فٹ تھی۔ وہ درسا ہجکا اور بریکنگ کے انداز میں اسٹول پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔

ڈیوڈ کے ہاتھ کا دارا اسٹول کے نشست والے تختے پر لگا اور چوٹی اسٹول دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کی سنگینی اور فحاشت پائی جاتی تھی۔

اسی لمحے شعیب کی طنز بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وہ جان! تمہیں میرا مشورہ یاد ہے نا؟ زرا ہاتھ پاؤں بجا کر۔ ڈیوڈ بہت خطرناک فائٹر ہے اور ہاں..... جہجہ سے میں اس وقت مہلک کرنٹ بھی دوڑ رہا ہے۔"

ادھر شعیب کی کواں ختم ہوئی، ادھر ڈیوڈ نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا ٹیک بڑا چار حادہ تھا۔ اس نے چشم زدن میں رائٹ راؤنڈ ہاؤس چلائی تھی۔ میں بڑی سرعت سے بیک فٹ پر آیا اور ایک پہلو کو کھل گیا۔

اسی مقابلے میں ایک اور ہلاک سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ اپنے جسم کو جہجہ سے کس ہونے سے بچایا جائے۔ آگ ہوائی اور بجلی کی کسی سے دوستی نہیں ہوتی نہ ہی انہیں کسی صلاحیت سے اپنا سطح فرماں بردار بنایا جاسکتا ہے۔ یہ اپنی فطرت کے عین مطابق موقع ملنے پر ضرور نقصان پہنچاتے ہیں۔

ڈیوڈ نے ایک لگ پر اسکاٹھ کیا اور میرے سنبھلے ہی اس نے اندر آکر میرے چہرے پر ان سائیز پچ مارا۔ میں نے نیک جگہ کے ٹھیک اپنے چہرے پر بچایا اور اس کے آگے بڑھے ہونے باز دو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ میں اس کی کلائی کو تھامنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی وقت اس نے میرے گھٹنے پر

پاؤں کی ٹھوکریاں سید کر دی۔

میں نے ایک جھکے سے اس کی کلائی چھوڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم پیچھے گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھر پور سائیز کلک اس کی پسلیوں کے سپرد کر دی۔

سائیز کلک بڑی خطرناک ٹھوکہ کا نام ہے اور اگر اس میں غصہ بھی شامل ہو تو یہ برقی مقابل کو قدموں سے اکھاڑ کر پیچھے دیتی ہے۔ ڈیوڈ کے لیے میرے دل میں خیر اور بھلائی کے جذبات نہیں تھے لہذا وہ سائیز کلک کھانے کے بعد دو رنگ لڑھکنا چلا گیا پھر اسی غیر ارادی روٹنگ کے دوران میں وہ اچانک اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

ڈیوڈ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جہجہ کا خاص وسیع دعوے کا دور۔ اس وقت اس کا وجود کسی آہنی سلاح کو سلائی پیش کر چکا ہوتا۔ اس لمبے کے بعد جو کچھ ہوتا اس کے لیے کتے کی ایک مثال کافی تھی۔

ڈیوڈ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے تیور کی خطرناکی بڑھ چکی تھی۔ انٹرا سیٹ جہجہ میں۔ تو مجھ سے ہاتھ کھانے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں میرے قریب پہنچا اور ایک۔ محفوظ اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ مارشل آرٹس کے مقابلوں میں اگر آپ اپنے حریف کا اسٹانس توڑنے میں کامیابی حاصل کر لیں تو یہ نصف فتح کے برابر ہوتا تھا۔ آپ کو حریف پر نفسیاتی سبقت حاصل ہو جاتی ہے۔

ڈیوڈ نے اسٹانس پر ہلکے سا ٹیک بنا کر کھڑا تھا۔ میں نے جہجہ چھڑا کر غرض سے اس کے فرنٹ پیچ پر ایک جگہ کلک کر دی۔ اس نے پیچ کھول کر تھیلی سے میری کلک ہلاک کی اور بیک فرنٹ پر چاتے ہوئے ایک وہیل کلک چلا دی۔

اس کی کلک میرے کندھوں پر لگی اور میں ایک جھکے کے انداز میں لڑکھڑا کر دو قدم آگے چلا گیا۔ اسی وقت ڈیوڈ نے میرے جھکے ہوئے سر پر ایک کر اس کلک مارنا چاہی لیکن میں اس کی کمر کی حرکت سے اس کے عزائم کو بھانپ چکا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے بیک فلک لگائی اور اس کی کلک کی رینج سے نکل گیا۔ وہ کھو کر مجھے دیکھتے ہوئے اپنے پیچوں پر اچھلنے لگا۔

میں نے فرنٹ اسپرنگ لگایا اور اس کے سامنے جھک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ مجھ پر تباہ توڑ ڈھلے کرنے لگا۔ اس نے پیچ کا وایج دیا۔ میں ایک قدم پیچھے گیا تو اس نے فرنٹ ہک کلک میری ٹھوڑی پر مارنے کی کوشش کی۔ میں ایک جھکے سے نیچے بیٹھا اچھلنے لگا۔

ڈیوڈ کی ایک ٹانگ ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ بیک سوپ نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس سے ایک قدم کے فاصلے پر پہنچ جھپٹک کرنے لگا۔ وہ شرمندہ سی صورت لے کر اٹھا اور جیسے ہی سیدھا ہوا۔ میں نے ٹکی کی آواز خارج کرتے ہوئے اس کی ٹانگ پر پیچ مار دیا۔

ڈیوڈ کی ٹانگ خون اگلنے لگی۔ اس دردناک جوت نے اسے وحشی بنادیا۔ اس نے ٹانگ سے نکلنے والے خون کو تھیلی کی پشت سے صاف کیا پھر آلودہ ہاتھ کو منہ کے نزدیک لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تھیلی کی پشت کو زبان سے چاٹنے لگا۔ میں اس کی کردہ حرکت کو دیکھتے ہوئے مسلسل اپنے پیچوں پر اچھل رہا۔ میری سوجھ بوجھ ڈیوڈ کو غصہ دلانے کے لیے بڑی معاون ثابت ہو رہی تھی۔

وہ کسی جہجہ سے ہوئے ساڑھے کے مانند آگے بڑھا۔ ایک نچی چپ لی اور فرنٹ فلائنگ کلک چلا دی۔ میں نے سائیز اسٹپ لے کر اس کی کلک سے خود کو بچایا اور جیسے ہی اس کے قدموں نے زمین کو چھوا میں نے رائٹ کر سینٹ مار دی۔

ڈیوڈ کا ہونٹ کٹ گیا۔ اس کی ٹانگ میں پہلے ہی زخمی کر چکا تھا۔ اس نے خون آلود چہرے کے ساتھ کھانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور مجھ پر ہل بڑا۔ وہ کوئی عام فائٹر نہیں تھا۔ اس کے حملوں میں بڑی طاقت تھی۔ ہمارے درمیان چند ٹیکس کا مقابلہ ہونے لگا۔ اس کے دار کی میں روک ٹپ کرنا اور وہ فوراً میرے حملے کو توڑ پیش کر دیتا۔ حقیقتی معنوں میں مجھے

ڈیوڈ سے مقابلہ کرنے کا مزہ آرہا تھا۔ کافی عرصے بعد کوئی ایسا فائٹر میرے برعکس تھا جس کے سامنے حاضر دماغی کی اشد ضرورت تھی۔ ہال کے اندر ایک پراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہاں موجود ہر شخص بڑی دیکھی سے یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔

کلک فو کی چند ٹیکس کے دوران میں ہمارے جسم ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ اسی مرحلے پر ڈیوڈ کو میرے ایک بازو پر گرفت حاصل ہو گئی اور اس نے غمزدار مگر شے دور پیچک دیا۔ میں لڑھکنا ہوا آہنی سلاحوں کے پاس آیا اور تین انچ کے فاصلے پر میں نے اپنے جسم کو کنٹرول کر لیا۔

ڈیوڈ نے ایک ساتھ دو فلک لگائیں۔ ڈبل بیک فلک نے اسے میرے انتہائی نزدیک پہنچا دیا۔ وہ درحقیقت مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ سلاحوں کے نزدیک فائٹنگ میرے لیے سراسر نقصان دہ ثابت ہوتی لیکن میں نے ڈیوڈ کو خود پروار کرنے کا موقع نہ دیا۔ حالات کی نزاکت اور دیکھی کو میں بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

ڈیوڈ جیسے ہی میرے پاس پہنچا میں نے زمین پر ہی

رہتے ہوئے ایک لمبی روٹنگ کی اور جہجہ کے وسط میں پہنچ گیا۔ ڈیوڈ کی شکارتی کتے کی طرح لپک کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بڑی تیز رفتاری سے یکے بعد دیگرے لیفٹ اور رائٹ راؤنڈ ہاؤس گلس چلائی اور اگلے اسٹپ پر میرے فیس کو ٹھانہ بناتے ہوئے ایک پیچ مار دیا۔

میں نے اس کے حملہ آور بازو کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی ٹانگ میں نیک جگہ سے اپنے چہرے کو بچا چکا تھا اس کی کلائی جیسے ہی میرے قابو میں آئی میں نے ایک زوردار مردوڑ اے کر گرفت کو آزاد کر دیا۔

وہ منہ کے بل جہجہ کے پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس کے قلعے سے ایک دردناک آواز خارج ہوئی۔ یہ اس مقابلے میں کسی پہلے دالے کی پہلی فریادی تھی۔ ڈیوڈ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے فوراً سے چشمتر اس کے منہ پر ایک زوردار فرنٹ ٹو سائیز کلک جڑ دی۔

ڈیوڈ کا بدن چند انچ ہوا میں اچھلا اور وہ دھڑام سے جہجہ کے فرش پر چاروں خانے چت ہو گیا۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے مخصوص انداز میں قدموں پر اچھلنے لگا۔

"فرنٹ ٹو سائیز کلک" دراصل ایک مخلوط کلک ہے۔ فرنٹ اور سائیز کلک کی خطرناکی کو یک جا کر کے ایک نہایت ہی سربلے الاثر کلک بنائی گئی ہے۔ اس کلک کی سرعت اور زادیہ فوری طور پر مد مقابل کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے وہ مار کھا جاتا ہے۔

ڈیوڈ اس کلک کی ہزیمت سے فیض یاب ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اب اس کا انداز قدم سے مختلف تھا۔ وہ غصے کو ٹھوک کر میری طرح نیچی جھپٹک کرنے لگا جلد ہی اس کی جھپٹک میں شدت پیدا ہونے لگی۔

☆☆☆ میں ڈیوڈ سے چند قدم کے فاصلے پر ٹائیگر اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔

جہجہ گزرتے لمحے کے ساتھ اس جھپٹک کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس جہجہ کے بلندی لگ بھگ پندرہ فٹ تھی اور یہ ہائٹ ڈیوڈ نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھی تھی ورنہ وہ کب کا اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔ وہ بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ اونچا نہیں اچھل رہا تھا۔

پھر اس کی جھپٹک میں سمر سالت بھی شامل ہو گئے۔ کبھی فرنٹ سمر سالت اور کبھی بیک سمر سالت اور کبھی ڈبل سمر سالت۔ وہ ایک باہر جتنا سالت کی طرح ٹریپولن کر رہا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ ٹریپولن میں سنے ہوئے کسی کپڑے



مصنف ڈاکٹر جی ایم فلان

پہناٹیزم کے موضوع پر بلا ویش  
کتابیں مستند کتاب

کتاب میں شامل چند عنوانات

- ✦ پہناٹیزم ایک پوشیدہ قوت۔
- ✦ پہناٹیزم کیا ہے؟
- ✦ پہناٹیزم کی ابتدا۔
- ✦ پہناٹیزم کے عملی اصول۔
- ✦ پہناٹیزم اور جرائم۔
- ✦ پہناٹیزم کا استعمال
- ✦ ازدواجی زندگی اور پہناٹیزم
- ✦ بچوں پر پہناٹیزم

قیمت: -/30 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313

کیتابیات1970@yahoo.com

رابطہ کیلئے: 63-C فیئر II پبلیکیشنز ڈی این جی لے بین روڈ لاہور

ڈیوڈ محفوظ رہا۔  
خنگ لکڑی ایک عمدہ قسم کا غیر موصل ہے۔ یہ اپنے اندر  
کسی بھی قسم کی برق رو کو گزر نہ نہیں دیتی۔ چوٹی اسٹول کا  
خف حصہ ڈیوڈ کی زندگی کی حفاظت بن گیا تھا۔ میں نے  
میں نے نصف حصے کو اٹھایا اور غصیلے انداز میں ڈیوڈ کی طرف

دو جگرے کے پتہ فرش پر پڑا حیران اور پریشان نظر  
بجی مجھے اور بھی کرنت زدہ اگنی سلاخوں کو دیکھ رہا تھا۔  
پارے اپنے زندہ بچ جانے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس  
ناجیانی اور پریشانی کو توڑنے کے لیے اس کی تعریف پر  
ابلیں چار شہدے برسائے۔ اس حقیر آمیز سلوک کے بعد  
ڈیوڈ کھڑا ہو گیا اور مختار انداز میں مجھے غور کرنے لگا۔

اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی  
تھیں۔ میں نے جس انداز میں اس کی گت بتائی تھی وہ اس  
کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ لوگ ہمیں اپنا غلام سمجھتے  
تھے۔ ایک ادنیٰ غلام کی ایسی جسارت ڈیوڈ کی نظر میں ناقابل  
مقابلگی۔ لہذا وہ میری طرح ہچکچا رہا تھا۔

دو فرش سے اٹھتے ہوئے اگنی سلاخوں سے فاصلے پر چلا  
یا تھا۔ ٹھوڑی دیر تک ہم پتھر سے پرتے رہے پھر ہمارے  
ایمان کا قاعدہ مارا باری شروع ہوئی۔ کرائے میں اسٹک  
آؤٹ کی جو اہمیت ہے کنگ فو میں وہی مقام اسٹول فائٹ کو  
مائل ہے۔ لیکن ہمارے درمیان ہونے والا وہ مقابلہ اسٹک  
فائٹ تھا اور نہ ہی اسٹول فائٹ ہم دونوں ادھورے اسٹول کو  
دعا دہندہ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔

اسی ”استعمال“ کے دوران میں ڈیوڈ نے میرے بازو کو  
ٹکایا اور تھوڑا دیر مجھے دوڑ پھینک دیا۔ میں اس جھکڑی کے  
نزدیک جا کر گر کر اس نے ٹھوڑی دیر پہلے میری گائیوں کو اپنی  
فٹوں کی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ مگر نے کے دوران میں چوٹی  
اسٹول میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے ”ٹوٹی“ ہوئی  
جھکڑی کو اٹھایا اور اچھل کر خود بھی اپنے قدموں پر استادہ  
تویا۔

ڈیوڈ ایک مرتبہ پھر ادھورے اسٹول سے مجھ پر حملہ آور  
ہوا۔ وہ جھکڑی میرے ہاتھوں میں پہنچنے ہی نہ چوکی  
تھی۔ اس نے اس کی ایک لکڑی کو مضبوطی  
سے تھام لیا اور آزاد لڑی میں ہوا میں مختلف صورت فارمیشن  
نہ لگائی۔ اس کی رفتار میں نہ چوکی تھی تیزی تو نہیں تھی تاہم وہ  
میرا ٹھوڑا حفاظت کر رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ  
سہم کے مختلف حصوں کو بھی یادگار رو سے دے رہی تھی۔

کیا تو وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے اگنی سلاخوں کے قریب پہنچ  
چکا تھا۔ اگر میں اسے ایک بھر پور سائیڈ کک نکالتا تو وہ کرنٹ  
زدہ سلاخوں سے جا کھڑا۔

اس نے شاید میری سوچ بڑھ لی یا پھر اس کی چھٹی حس  
نے اسے میرے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے ہلا  
اور زادیہ بدلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر جتنا اسٹک کے کمالات  
دکھانے لگا۔ میں نے گھوم کر اسے دیکھا تو وہ لمبک کرتے  
ہوئے مجھ سے دور نکل رہا تھا۔ لمبک جتنا اسٹک کا ایک  
خطرناک شعبہ ہے۔ اس میں ہاتھ اور سر کا استعمال کے بغیر  
محض پاؤں کے پنجوں کے سہارے مسلسل ایک سیدھ میں  
سمرسالت لگتا ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی خوب صورت فارمیشن  
ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، کوئی جتنا سٹ لمبک نہ کر رہا  
ہو بلکہ انسانی بدن فٹ ہال بنا کر ایک لائن میں ٹپک کر چلا  
جا رہا ہو۔

ڈیوڈ کے فن کا مظاہرہ تھا تو وہ اس اسٹول کے قریب پہنچ  
گیا جسے مقابلے کے آغاز میں اس نے دوخت کر دیا تھا۔ ڈیوڈ  
نے اسٹول کا ایک حصہ اٹھایا اور بڑے خوفناک انداز میں  
میری جانب بڑھا۔ امریکی سپورٹس بالے آڑائی نسل روٹی کا  
مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی بیودی ہو  
اور مکاری دے ایمانی اسے چھو کر نہ گزری ہو۔ اس قوم نے تو  
اپنے پیٹیر کو بھی بہت ستایا تھا، اہا شکس کھاتے میں  
تھے اعیاری اور جھنڈی ان کے خیر میں رہی ہی تھی۔

اسٹول کا نصف حصہ کسی ہتھیار کے مانند ڈیوڈ کے ہاتھ  
میں سجا تھا اور وہ بڑے خوشوار انداز میں میری جانب بڑھ رہا  
تھا۔ اس کا چہرہ ابھولہاں تھا اور اس کا یہ مشربیرے ہاتھ پاؤں کا  
کیا دھڑا تھا۔ وہ میرے نزدیک آیا اور میرے سر کو نشانہ بنانے  
کی کوشش کی۔

اس کے حملے میں انکوری نہیں تھی، صرف جوش بھرا ہوا  
تھا۔ مسلسل پہنچنے والی چوٹوں نے اسے پوکھا کر رکھا تھا۔ اثر  
اسٹیت جیمین شپ کے دوزخ کو تو نہیں تھی کہ میں اس کے لیے  
لوہے کا چٹا ثابت ہوں گا۔

میں نے اس کے دار کو پر ہلاک سے رد کیا اور ساتھ ہی  
کاؤنٹر ایک کے طور پر اس کے پیٹ میں ٹھہر گئی  
بڑی۔ وہ توپ میں سے نکلنے والے گولے کے مانند ہوا میں  
پہنچی پرواز کرتے ہوئے اگنی سلاخوں سے ٹکرایا لیکن اس صوف  
پر اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور سلاخوں کے قریب  
پہنچنے ہی اس نے ہاتھ میں تھا سے ہوئے اسٹول کو ڈھال کے  
طور پر آگے کر دیا تھا۔ ٹکراؤ اسٹول اور سلاخوں کے درمیان ہوا۔

یا نیٹ پر جتنا اسٹک کے کرب دکھائے جاتے ہیں اور ڈیوڈ  
جگرے کے پتہ فرش پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اسی لیے  
اس کے کمالات میں وہ حسن دیکھنے کو نہیں مل رہا تھا جوڑ۔ بچوں کو  
کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں بلخاریا کی کیلیٹا اور جرسی کی  
نیا لڈوگ کا جواب نہیں!

چند لمحات کے بعد ڈیوڈ نے جتنا اسٹک کی کرب ہاڑی  
موقوف کردی اور اپنے قدموں پر ٹھہر کر ہانپنے لگا۔ اس کا پورا  
بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اگر اس نے یہ شہقت مجھے متاثر  
کرنے کے لیے اٹھائی تھی تو میں واقعی اس کے فن سے متاثر ہوا  
تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خراج تحسین کے طور پر میں  
اس کی مدح سرائی شروع کر دیتا۔

ڈیوڈ جیسے ہی فرش پر ٹھہرا میں نے ہوا میں پرواز کی اور  
میل کرتے ہوئے اس کے سینے پر ایک فرنٹ فلائنگ ماری۔  
وہ اس بری طرح ہانپا ہوا تھا کہ اپنا دفاع نہ کر سکا۔ ہلانگ کے  
لیے اٹھنے والے ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے اور وہ میری زوردار  
کک کھا کر ٹوٹا کرتے ہوئے پیچھے گیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ  
اٹھاتے ہوئے تاہو توڑ دینے لگا۔ میرے پیچڑ اور گلس  
نے اس کے پورے وجود کی بالٹ کر دی۔ اسی مارا باری کے  
دوران میں وہ قدرے سنبھلا اور اس نے میرے دونوں  
ہاتھوں پر گرفت حاصل کر لی۔

ہم ایک دوسرے کے روہ رو کھڑے تھے اور اس نے  
میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ ہمارے  
درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا پیچہ آزائی کرنے والوں کے مابین  
ہوتا ہے۔ اچانک اس نے میرے ہاتھوں کو کلائیوں پر موڑنا  
شروع کر دیا۔ میں نے بڑی سرعت سے بیک سرسالت  
والے انداز میں اچھلتے ہوئے باڈی کو روڑل کیا دوسرے ہی  
لمحے میرے دونوں پاؤں کی یک مشت خوفناک جرک اس  
کے چہرے پر پڑی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلایا اور  
میرے ہاتھ آزاد کر دیے۔

میں بیک سرسالت کی جھنجھیل کے بعد اپنے قدموں پر کھڑا  
ہو گیا۔ ڈیوڈ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامے پیچھے ہٹ رہا  
تھا۔ میرے دونوں پاؤں کی یک تخت ٹھوکر نے اس کا حلیہ  
بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس کی ناک اور ہونٹ کو میں پہلے ہی بری طرح  
زخمی کر چکا تھا۔

اس مرحلے پر میں اسے کوئی چانس دینے کو تیار نہیں تھا۔  
میں جارحانہ انداز میں آگے بڑھا اور اسے اپنے نشانے پر رکھ  
لیا۔ میں نے ڈبل راولڈ ہاؤس اور جمل کک کا کبھی ٹیشن نگل

آبشار فشیات (242) حصہ 10



لینے سے زیادہ مجھے تلاش کرنے میں دلچسپی لے رہے ہوں گے۔ میں نے وہاں جو افراد تفری بچائی تھی وہ ان کے لیے ناقابل یقین ہی نہیں بلکہ ناقابل فراموش بھی تھی۔ ڈیوڈ نیل آرمر اور شیا کی میری باتوں موت انہیں سمجھو کر رکھ دینے کے لیے کافی تھی۔ میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس وقت کیرے کی آنکھ سے محفوظ تھا۔ وہ لوگ وہاں میری موجودی کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔

میں نے جس نیم بیوی چوترے کے عقب میں پناہ لے رکھی تھی، تھوڑی دیر پہلے وہ خاصا آہا تھا۔ اس پر موجود تین عالی شان کرسیوں پر شیب غوری نیل آرمر اور شیا براہمان تھے۔ شیب کو دم دبا کر بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا تھا لیکن نیل آرمر اور اس کی خود دیکر بڑی کوششوں نے کرسیوں سے اٹھنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اس وقت وہ عین میرے سر کے اوپر مردہ حالت میں اپنی کرسیوں میں بڑے تھے۔

میں دم سادھے اس خفیہ گوشے میں دبا کر رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کے باہر پھر زندگی کی مخصوص ہلچل سنائی دی۔ میں نے پہلے ہی وہاں کچھ افراد کی آوازیں سنی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس دروازے کو کھولا جانے لگا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، اندھیرا ہوتے ہی ہال کے دروازے آٹومیک نظام کے تحت بند ہو گئے تھے یا کسی شخص نے انہیں بند کر دیا تھا۔ ایک بات یہ بھی واضح ہو گئی کہ وہ لوگ کسی فی وی اسکرین پر مجھے ہال کے اندر تلاش کرنے میں ناکامیاب رہے تھے۔ کیرے کی ناکامیابی کے بعد ان کے آئینہ کار بہ نفس نفس میری خبر گیری کے لیے ہال میں داخل ہونے والے تھے۔

دروازہ کھل گیا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے دو گن بردار افراد دکھائی دیے۔ میں نے جس مقام پر پناہ لے رکھی تھی وہاں سے دروازہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا تاہم دروازے سے داخل یا خارج ہونے والے افراد مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں نے دیکھا مذکورہ دو مسلح افراد سے دو قدم پیچھے جینی مارشل آرٹس چنگ یو بھی ہال میں داخل ہوا تھا۔ چنگ یو نے تھوڑی دیر پہلے فرار ہو کر اپنی بزدلی کا ٹھیکہ دکھا دیا تھا۔ اس کی نظر میں وہ مصلحت کوئی رہی ہوگی لیکن اس کے طرز عمل نے مجھے خاصا مایوس کیا تھا۔

وہ تینوں ہال کے اندر داخل ہونے کے بعد چونکہ انہوں نے اس وقت دیکھنے لگے۔ انہوں نے دروازے کو بند کرنے زحمت نہیں کی تھی۔ عین ممکن تھا انہوں نے اپنے کسی ہنگامی فرار کے لیے وہ راستہ دارکھا ہوا! میں چاہتا تو اپنی پناہ گاہ سے اچانک نمودار ہو کر ان سے

بھڑ جاتا، پھر جو بھی نتیجہ سامنے آتا، اسے بھگت لیتا لیکن میں ہال کے اندر مزید کسی مار باری کے حق میں نہیں تھا۔ دو دستہ عربین اریکنڈ ہیڈز ہال کی کنگ سائز چوہے دان کی مٹھی میں اب کسی رسک کے موڈ میں نہیں تھا۔

جب وہ لوگ ہال کے وسط میں پہنچ کر تین مختلف سمتوں میں پیش قدمی کرنے لگے تو میں ایک فوری فیصلے کے بعد اپنی جگہ سے متحرک ہوا اور گولی کی رفتار سے رکوع کے بل دوڑنے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ اگر مزید کوئی دنگ فساد اور خون ریزی یا گزری ہو تو وہ ہال کے باہر بھی نکل میں لائی جاسکتی تھی۔

انہوں نے جلد ہی میری حرکت کو نوٹس کر لیا اور بڑی سرعت سے میری جانب پہنچے مگر میں اس وقت تک دروازے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے چشم زدن میں ڈائیو کیا اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر پہنچ گیا۔ اپنے عقب میں مجھے اطمینان فائزنگ کی آواز سنائی دی۔ یقیناً طور پر ان دو مسلح افراد نے پہنچے ہی اپنی گولوں کو مجھ پر کھول دیا تھا..... اور کچھ بعد نہیں تھا کہ ہال کو مائنر کرنے والے کیرے بھی میری مود کو بڑی وضاحت کے ساتھ شوٹ کر لیا ہوا۔

اس لائف سیونگ ڈائیو کے نتیجے کے طور پر میں ایک راہ داری میں گرا اور فالنگ کے قاعدے کے مطابق دو رنگ رول کرنا چلا گیا۔ اسی لمحے مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آواز کی سمت نے مجھے بتا دیا کہ میرا تعاقب کرنے والے ہال کی طرف سے آرہے تھے۔ وہ چنگ یو اور دو مسلح افراد کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔

میری اس رنگ کا اختتام وہ داری کے جس حصے میں ہوا ہاں مجھے زینہ نظر آیا۔ میرے لمبائی اندازے کے مطابق وہ ہمیں سے پچیس اسٹیپ والا ایک پختہ زینہ تھا جس کے اختتام پر ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ مذکورہ ہال اس بنگلے کے عین منٹ میں واقع تھا۔ میں اپنی کن سبب اچھل کر زینے کی آڑ میں چلا گیا۔

اس راہ داری میں مناسب روشنی تھی مگر اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اب میری حرکات و سکنات کو کسی فی وی اسکرین پر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے یہودیوں کے لیے میں ہال سے فرار ہو چکا تھا۔

میں نے زینے کی اوٹ میں خود کو چھپا کر عقل مند کی کا شوب دیا تھا کیوں کہ ہال سے نکلنے کے بعد انہوں نے اسی زینے کو نشانہ بنا کر فالنگ کی تھی۔ میں اس بے دریغ فائرنگ



سے محفوظ رہا۔ وہ راہ داری کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں تھی کہ مجھے ڈھونڈنے کے لیے انہیں کسی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے گن سنبھالنے تیار بیٹھا تھا۔

جب میں انہیں راہ داری میں کہیں نظر نہ آیا تو ایک گن بردار زینے کی جانب بڑھا۔ وہ بھونک بھونک کر قدم رکھتے ہوئے میری ہی طرف آ رہا تھا۔ اس راہ داری میں چھپنے کی جگہ صرف وہی جہاں میں عارضی طور پر پناہ گزین تھا۔ چنگ یو دوسرے گن بردار کے ساتھ زینہ طے کر کے اوپر جانے لگا کہ کہیں میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو گیا ہوں۔ میں نے سانس روک کر گن کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ان

نازک لمحات میں میرے اعصاب پر بے پناہ دباؤ تھا۔ موت اور زندگی کا یہ خوفناک کھیل طویل پکڑتا جا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی مجھے اس شخص کی ٹانگیں نظر آئیں میں نے بلا تردد اس کی ٹانگوں پر ایک برسٹ فائر کیا۔ مختصری راہ داری گن بردار کی ہولناک چیخوں سے گونج اٹھی۔ میں نے ٹانگوں سے ٹکسٹ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب پہلی نظر میں وہ کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

اسی لمحے مجھے زینے کے اوپر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یقینی بات تھی چنگ یو دوسرے گن بردار کے ساتھ واپس لوٹ آیا تھا۔ میری گن خالی ہو چکی تھی میں نے بڑی سرعت سے مضروب شخص کی گن کو اپنے ہاتھوں میں سجالیا۔

مجھے یہ جاننے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ میری فائرنگ نے اس شخص کی ٹانگوں کا پچھور نکال دیا تھا۔ وہ ٹھلے مڑے سے خون میں لت پت بری طرح ترپ رہا تھا۔ ہڈیوں کی ناکارگی کے ساتھ ہی گوشت و پوست میں بھی پگھلا ہوا سیسہ اتر چکا تھا۔ طرزِ تباہی یہ تھا کہ اسے بلبلانے یا چیخنے چلانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ کو پھیلا کر اس کے منہ کا ڈھکن ہٹا دیا تھا۔ میری گرفت اتنی یقینی اور ظالم تھی کہ اس بے چارے کو سانس لینے میں بھی کافی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

چنگ یو سراسر شخص کے ہمراہ زینہ اتر کر مختصری راہ داری میں پہنچ گیا۔ وہ دونوں اس وقت مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں حالات و واقعات کی روٹنی میں ممکنہ اندازہ لگایا تھا۔ نیچے پہنچنے ہی انہوں نے اپنے ساتھی کو تلاش کیا ہوگا..... اور دکھائی نہ دینے پر انہیں میری ہی جانب آنا تھا۔ راہ داری میں چھپنے کے لیے اور کوئی گوشہِ دایع نہ تھا۔ میں نے چشمِ زدن میں ایک ہنگامی فیصلہ کر لیا..... چنگ یو کوشدہ زخمی کرنے کا فیصلہ!

میرے اس فیصلے کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں خدا خواستہ اس چینی مارشل آرٹسٹ سے مقابلے سے ہٹا رہا تھا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی تھا۔ اگر میں کنگ ڈوک جو ہر دکھانے میں مصروف ہو جاتا تو وقت ہاتھ سے نکلے گا توئی امکان تھا۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر میرا وہ فیصلہ انتہائی معقول تھا۔ حالات کے تقاضوں کو نبھانے والے ہی آگے بڑھتے ہیں!

پھر وہ دونوں میری نگاہ میں آ گئے۔

مجھے ان کے جسموں کے زیرِیں حصے نظر آ رہے تھے۔ مخصوص پہناوے کے سبب چینی چنگ یو کو پہچاننے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہ ہوا۔ میں نے اس کے قدموں کو اپنے ذہن میں نوکس کیا اور گن کے ٹریگر پر میری انگلی دب گئی۔

خطرناک گن کے دہانے سے خارج ہونے والی گولیوں نے چنگ یو کے پاؤں اور ہڈیوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں وہ کرب ناک انداز میں چیختے ہوئے ایک جانب لڑھک گیا۔ میں نے اپنی پناہ گاہ کو چھوڑنے ہوئے ایک لمبی لوٹ لگائی اور کئی دور مخالف سمت میں گھبرا گیا۔

میں نے یہ حرکت فطری ردعمل سے بچنے کے لیے کی تھی۔ میری فائرنگ کے جواب میں دوسرا گن بردار میری سمت فائرنگ کرتا اور میرے حساب کے عین مطابق ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں نے اپنی عارضی پناہ گاہ کو الوداع کہا مجھے اپنے عقب میں زخمی آدمی کی بلند تھیں سنائی دیں۔ یہ اس برسٹ کا خوفناک نتیجہ تھا جو دوسرے گن بردار نے مجھے ٹم کرنے کے لیے فائر کیا تھا۔ ان ٹکست خوردہ لمحات میں یہ حقیقت اس کے ذہن سے نکل گئی تھی کہ مجھے مارنے کا مطلب تھا اس نے اپنے پورے خاندان کو سپردِ عذاب کیا۔ میں شعیب خوری کے آقاؤں کا مطلوب تھا۔ وہ میری جاں کا زیاں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے کن کن ٹکھنایوں سے گزرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

میں اس گن بردار کو مزید کوئی موقع دینے کے موذ میں نہیں تھا۔ اس کی فائرنگ سے اسی کا ساتھی چشمِ زدن ہو چکا تھا۔ اس نے بے ساختہ میری طرف گن سیدھی کرنا چاہی مگر میں اس کی حرکت سے قبل ہی ایکشن لے چکا تھا۔ میں ٹرنٹ رول کرتے ہوئے اس کے انتہائی نزدیک پہنچا، پھر سر کو جھکاتے ہوئے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ایک خوف ناک گھر سید کر دی۔

وہ بیک گھر میں ڈگمگاتے ہوئے چنگ یو سے نکل آیا جو۔

ہنچ گیا۔ درحقیقت مجھے یوں کہنا چاہئے میں دوسرے بنگلے سے پہلے بنگلے میں پہنچ گیا۔ سفید بنگلے کا قصبی لان والا حصہ کم و بیش دیباہی تھا جیسا میں دوسرے بنگلے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

یہاں پر مجھے سانے اور ٹکلیے اجالے کی حکمرانی نظر آئی۔ آثار سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بنگلہ بھی انسانی وجود سے خالی ہو لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک تشویش ناک سوال نے ڈبک مارا۔

کیا وہ سب لوگ یہاں اور وہاں سے کہیں اور چاکھے ہیں؟

”جہیں؟“ میں قدرے بلند آواز میں بڑبڑایا۔ میری اس بڑبڑاہٹ میں بڑی شدت تھی۔ میں بے ساختہ اپنے دلی جذبات کو کھول بیٹھا تھا۔ شیب غوری اور اس کے آقا گئے بھاڑ میں میرا تصور تو اس احساس ہی سے لبوہان ہو رہا تھا کہ ساحل اور صدف کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یہ کھوکھ پانا اور اس طرح پانا کہ پانے سے چند لمحات پہلے کھو بیٹا بیاد روح فرسا ہوتا ہے۔ ایسی جدائی کا بھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے مگر ملنے پھرنے کا یہ کھیل تن من پر آبلے ڈال دیتا ہے انسان کا احساس مجلس کر رہ جاتا ہے۔ ان بے وقار اور جادو المات میں میرے دل میں اس خواہش نے شدت سے اگڑائی لی کہ کاش! امن اور جدائی کا یہ ناک ختم ہو جائے۔ میں اپنی ساحل سے اس طرح ملوں کہ پھرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ اس لڑکی نے مجھ سے مجھے چھین لیا تھا!

ذہن میں بے ان خیالات نے میرے پاؤں میں پیسے لگا دیے اور میں ایک دیوار سے پشت ٹکا کر کسی تربیت یافتہ کمانڈر کی طرح بنگلے کے اندرونی حصے کی سمت ریٹک گیا۔ میں نے ایک جھگڑے سے اندرونی حصے میں گلنے والے دروازے کو کھولا اور گھر لہراتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میری بینائی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخری لمحات میں میں نے جو آخری منظر دیکھا وہ تیز روشنی کے ایک جھماکے کا منظر تھا۔ چشم زدن میں کوئی فلڈ لائٹ میری بینائی سے ہم آغوش ہوئی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے لوہی ایک چادری پھینک چکی تھی۔

ردعمل کے طور پر بے اختیار میرے دونوں ہاتھ آنکھوں پر آئے۔ اس سے پہلے ہی گھر چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو دبائے تکلیف کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بند آنکھوں کے پیچھے بھی اسی تیز

چند صدا دینے والی روشنی کا عکس تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سالم سورج میری آنکھوں میں گھس بیٹھا ہو!

پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن میں کوئی گولی اتر گئی ہو۔ وہ ایک بے آواز فائر تھا یا ہو سکتا ہے بینائی کے ساتھ ہی میری سماعت بھی دماغ ہو گئی ہو۔ فائر ہو ہو کر میں اس کی ہلکے مدد اسنے سے قاصر رہا ہوں۔ اگلے ہی لمحے میری کیفیت میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ میری سماعت اور بینائی اچانک لوٹ آئی۔ میں نے چند افراد کو بڑی افزائشی میں بڑبڑاتے اور اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ مجھے آٹا فائو میں مضبوط بندشوں میں جکڑنے میں مصروف ہو گئے۔

میری سماعت اور بینائی کے لوٹنے کا خاک فائدہ نہ ہوا کیونکہ اس داہنی کے ساتھ ہی قوت گویائی اور حرکت کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ میں ایک جسم مضبوط مصل ہو کر رہ گیا تھا۔ میں گھبراہٹ کر اس بہانہ کارروائی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن بے سود۔ میں ہاتھ پاؤں کی جنبشوں سے ان شیطانوں کو جھپٹنے کا دودھ یاد دلانا چاہتا تھا مگر بے فائدہ میں کچھ بولنے، کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اور یہ سب اسی بے آواز ناہنجار خانہ خراب کوئی کا نتیجہ تھا جو میرے بدن میں اتر کر مجھے مفلوج بنا چکی تھی۔ میں بڑی بے بسی سے اپنے ساتھ ہونے والی کارروائی کو دیکھنے لگا!

☆☆☆

آنکھیں لٹکت ہیں..... ایک بہت بڑی لٹکت! اس دنیا کی ساری خوب صورتی، رنگینی اور معنی ہم آنکھوں ہی کی مدد سے دیکھ پاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ راز جانتے ہوں گے کہ ہماری یہ آنکھیں بہت ہی مجبور اور بے بس ہیں۔ کوئی بھی منظر دیکھنے یا ٹھکانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ کسی کیمرے کے لینس کی طرح ہیں۔ دنیا کا ہر کیمرا اور کیمرے کا ہر لینس اپنے کام کے لیے روشنی کا محتاج ہے۔ ہماری آنکھوں کو بھی جب تک روشنی میسر نہ ہو یہ ہمیں کوئی بھی شے دکھائیں سکتیں۔ درحقیقت روشنی کی موجودگی میں مختلف اشیا سے خارج ہونے والی مخصوص شعاعیں ہماری آنکھوں کے لینس پر گرائی ہیں اور پورے پرانے ٹھکانے بناتی ہیں، یعنی اس شے کی شبیہ وجود میں آ جاتی ہے۔ ہمارا دماغ اس شبیہ کو ٹول کر لیتا ہے اور ہمیں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اپنی آنکھ سے اس شے کو دیکھا ہو۔ اگر واقعی یہ آنکھ کا کمال ہو تو پھر وہ شے ہمیں گھپ اندھیرے میں بھی دکھائی دینا چاہیے مگر ایسا

نہیں ہوتا!

میری آنکھوں کے سامنے بھی اس وقت گہری تاریکی تھی اور اس تاریکی کا سبب بھی مجھے معلوم تھا۔ خدا خواستہ میں بینائی سے محروم نہیں ہوا تھا۔ میری بصارت اپنی جگہ قائم و دائم تھی مگر میری آنکھیں کی دیر سیاہ پٹی کی اوٹ میں بے بس ہو کر رہ گئی تھیں کیونکہ روشنی کی ایک موہومی کرن بھی ان تک پہنچنے میں ناکامیاب تھی۔ اس کس کر بانڈھی گئی سیاہ پٹی نے مجھ سے دیکھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو محسوس کرنا چاہا تھا تو سب سے پہلا احساس یہی ہوا تھا کہ میری آنکھوں پر کوئی مضبوط سیاہ پٹی بانڈھ دی گئی تھی۔ میں نے اپنی سننے اور بولنے کی صلاحیت کو آزمایا تو وہ مجھے صحیح سلامت محسوس ہوئیں۔ جب مجھے چند افراد مضبوط رسیوں میں جکڑ رہے تھے تو قوت گویائی اور قوت حرکت غائب ہو گئی تھیں۔ یہ اس پر اسرار کوئی کامال تھا جو میری دھڑکنے والی ران میں گھس بیٹھی تھی۔ اس کرشمہ کار کوئی کا اثر تھا کہ میں خود کو مفلوج محسوس کرنے لگا تھا۔ کیا میں اب بھی مفلوج ہی تھا؟

اس سوال نے میرے اندر تحریک پیدا کی کہ میں اپنے وجود کو ہلا جا کر دیکھوں۔ میں نے پلوں کو جھکنا چاہا۔ پٹی کے باعث میری یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی اور میں آنکھیں نیچا کر رہ گیا تاہم یہ اندازہ ہو گیا کہ میں آنکھوں کو حرکت دے سکتا ہوں۔ یہی تجربہ میں نے ناک کے ساتھ کیا اور کامیاب رہا۔ اگاہہ گھبر کر میں اس کوشش میں بھی مجھے مایوسی نہ ہوئی۔ میری جدوجہد بازوؤں تک پہنچ گئی اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کسی کہنی کرسی کے ہتھوں پر چڑھی ڈور یوں کی مدد سے کس کر بندھے ہوئے پایا۔ لامحالہ میرا دھیان نچلے دھڑکی جانب چلا گیا اور اسی وقت مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

میرے دھیان کی برداز ناف پر جا کر گر گئی تھی جیسے اس کے پر پھڑپھڑانا بھول گئے ہوں۔ اس پر دواز کے راستے میں کوئی نا دیدہ رکاوٹ کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں زیریں بدن کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ میرا نچلا دھڑکی خاص دوا آنکھوں یا پھر کسی بھی سانسٹی طریقے سے مفلوج کر دیا گیا تھا۔ میں ہاتھوں کی بندشوں اور کہنی ہتھوں سے یہ تو سمجھ رہا تھا کہ اس وقت میں کسی کرسی پر بیٹھا ہوں لیکن پیٹنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہی کیفیت میری ہاتھوں اور پاؤں کی بھی تھی۔ اس داہمیت نوعیت کی صورت حالات نے مجھے جھنجھلاہٹ میں جلا کر دیا اور میرا ذہن تیزی سے پیش آہہ واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی وقت ایک نانا لوس

آواز میری سماعت سے گزرائی۔ بولنے والے نے انگلی زبان کا سہارا لیا تھا اور لب و لہجہ خالصتاً امریکی تھا۔ مذکورہ شخص نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔

”وہ جان! ایسی دیکھی سوچوں سے اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔ ابھی تمہیں ایک بہت بڑا امتحان سے گزرنا ہے۔“ میں نے چونک کر بولنے والے کی سمت دیکھا۔ اس دیکھنے کا واضح مطلب یہی ہے کہ میں نے اس سیاہ دھڑکی کے عقب سے آواز کی جانب توجہ مرکوز کر دی۔ باقاعدہ دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ شخص مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا اور اس کے ایکسٹ نے مجھے بتا دیا کہ اس وقت میں امریکیوں میں تھا! کم از کم ایک امریکی کے ساتھ!

میں نے بھی جواباً انگریزی ہی میں پوچھا ”تم کون ہو؟“ ”تمہارے میزبان!“ مجھے بتایا گیا۔ ”میں اس وقت کہاں ہوں؟“ ”یو۔ ایس۔ اے میں۔“

”یو ایس اے میں؟“ میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ ”امریکا میں کہاں..... کس علاقے میں، کس اسٹیٹ میں؟“ بے اختیار میری زبان سے متعدد سوالات پھسل گئے۔

ان سوالات کے اختتام پر اس شخص کی رسمی اور طنز سے لب و لہجہ میری سماعت تک پہنچی۔ میں تھلا کر رہ گیا۔ اسی لمحے اس شخص نے میرے سوالات کے جواب میں کہا۔ ”تم اس وقت پاکستان میں ہو۔“

”مگر تم نے تو بتایا ہے میں امریکا.....“ ”ایک ہی بات ہے۔“ وہ میری بات کو قطع کرتے ہوئے مجھے ضرور انداز میں چسپا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا ”بکواس بند کر۔ تم لوگ کوئی خوب بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ پاکستان ایک آزاد مملکت ہے اور ہمیشہ آزاد ہی رہے گا! اپنی ایک جدا گانہ شناخت کے ساتھ۔ تم چاہے کتنی بھی کوشش کرو اس آزاد ریاست کو اپنی آئینش میں شامل نہیں کر سکتے۔ تمہارے منہ میں خاک!“

میں جب سے پاکستان میں تھا! اکثر سیاسی چٹاوریوں کو جی محفلوں میں یہ پیش گوئی کرتے سنا تھا کہ عزیز پاکستان! امریکا کی ریاستوں میں شامل ہو جائے گا۔ بعض، اندر کی خبر رکھنے والے ماہرین کا فتویٰ صرف کراچی تک محدود تھا۔ ان کے خیال میں امریکا بہادر پورے پاکستان میں نہیں بلکہ صرف کراچی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے بھی سنجیدگی سے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ بادی آخر میں مجھے یہ کی سیاسی

پر دیکھنا اسے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اکثر سیاستدان عوام کی سوچ کا رخ تبدیل کرنے کے لیے اس قسم کے ایجنڈے سامنے لاتے رہتے ہیں۔

یہ تمام خیالات ایک سینکڑ میں میرے ذہن سے گزرے اور اگلے ہی لمحے اس "نادیدہ" امریکی کی آواز میری سماعت سے گھرائی۔ اس کے لہجے میں بڑا اظہارِ آواز اور استحکام تھا۔

"جذبہائی تقریر بہت اچھی کر لیتے ہو مگر ہمیں تمہاری اس صلاحیت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی امریکا کی کوئی نئی اسٹیٹ ہمارا موضوع گفتگو ہے۔"

ہمارے درمیان وہ تمام تر گفتگو انگش میں ہو رہی تھی۔ میں نے اکڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا "پھر مجھے یہاں کیوں پابند کیا گیا ہے۔ تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ میرے نچلے دھڑ کو تم لوگوں نے حرکت کے قابل کیوں نہیں چھوڑا؟"

"کیا سارے پاکستانی ایک سانس میں اٹنے ہی سوال پوچھتے ہیں؟"

"تمہارا تجربہ کیا ہے؟" میں نے ترکی پر ترکی پوچھا۔ "میں نے اس قوم کو بہت ہی جذباتی اور پر جوش پایا ہے۔" وہ زہریلے انداز میں گویا ہوا "یہ جوش میں بہت جلد ہوش کو چھینے لپکتا ہے انہیں شکار کرنا قدرے آسان ہے۔"

پتا نہیں وہ اپنا تجربہ بیان کرنے میں کس قدر راست گوئی سے کام لے رہا تھا۔ اس وقت مجھے تو یوں محسوس ہوا وہ ساری باتیں مجھے سلگانے کے لیے کر رہا ہو۔ پاکستانیوں کی برائی کھول کر وہ نفسیاتی طور پر مجھے مار چکا تھا۔

میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا "ہم ایک زندہ قوم ہیں۔ ہر زندہ قوم میں جوش اور جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ اور جہاں تک شکار کرنے کی بات ہے تو تم لوگوں کو اس کا ذہن پر بری طرح کھست ہوگی۔ ایسے خوش آئند خواب دیکھنا چھوڑ دو۔"

"ہم اپنی مرضی کے خواب دیکھنے پر قدرت رکھتے ہیں اور لگن خوابوں کی تئیریں پہلے سے رقم کر لیتے ہیں۔" وہ رعیت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی تعریف پر لعلت بھیجی اور اپنے مقصد کی طرف آگیا۔ "تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا مسٹر.....؟"

میں نے "مسٹر" کے بعد دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ ادھر اور چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے چال تھی۔ ایسے مواقع پر عموماً سامنے والا اپنا نام تادیا کرتا ہے لیکن وہ کائنات امریکی

میری چال میں نہ آیا اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ "تم اس وقت ہماری گرفت میں اس لیے ہو کہ تم پر تعین الزامات ہیں۔"

"مجھ پر تعین الزامات؟" میں ایک مرتبہ پھر میری طرح اچھل پڑا۔

"ہاں تم پر۔" وہ خوش لہجے میں بولا "اسی لیے ایک مخصوص انکلیشن کے ذریعے تمہارے نچلے دھڑ کو عارضی مدت کے لیے ناکارہ کیا گیا ہے تاکہ تم کسی قسم کی ہم جوتی کا خیال دل میں نہ لاسکو۔ اس سے پہلے تمہاری ران میں ایک مخصوص گولی اتار کر تمہیں دقیق طور پر مطلوب کیا گیا تھا۔ اس وقت تم صرف سوچنے، سننے اور بولنے کے قابل ہو۔ تم ہماری ضرورت اور مقاصد سے زیادہ کسی قسم کی ذاتی اپنی فحش کے قابل نہیں ہو۔ اس قسم کے تمام شعبہ ہمارے ہائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔"

میں الجھ کر رہ گیا۔ شیب خوری کے مطابق اس کے یہودی آقاؤں کو سائل یعنی دھوکا تلاش تھی جو کسی قیمت خزانے کے راز سے واقف تھی۔ مجھے تو صرف چارے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا تاکہ ساحل کو شکار کیا جاسکے۔ پھر میرا قصور یہ تھا کہ میں نے شیب کی تنظیم کی ایف کے کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ شیب خوری یہودیوں کا آلہ کار تھا۔ سی ایف کے کو کھینچنے والا نقصان براہ راست یہودیوں کا نقصان تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ میں سی ایف کے کے پردے میں یہودیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے واقف ہو گیا تھا لیکن وہ امریکی جس انداز میں بات کر رہا تھا وہ خاصا سنگین اور تشویش ناک تھا۔

میں نے وضاحت طلب لہجے میں کہا "تمہارے اس نمک خوار شیب خوری نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم لوگ ساحل کی تلاش میں ہو جو پہلے دھوکا ہوا کرتی تھی۔ اب تم مجھ پر تعین الزامات کا ذکر کر رہے ہو۔ یہ کیا بد معاشی ہے؟"

"دھوکا کا معاملہ الگ ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اس پر کام امریکا کی تنظیم کے بعد شروع کیا جائے گا۔ تم بڑے تین امریکی افراد کے قتل کا الزام ہے۔ ڈیوڈ نیل آرمر اور اس کی خوبرو دیگر بڑی شیا۔ نیل آرمر اگرچہ برطانوی شہریت رکھتا ہے لیکن یہودی ہونے کے ناتے وہ ہمارے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جیسا کہ کوئی امریکی شہری! پھر وہ ہمارے سسٹم کا ایک اہم پرزہ بھی تھا۔"

میں اس کی مکاری پر دل ہی دل میں سگ کر رہ گیا۔ میں نے کہا "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے تمہارے

یہودیوں کو صدمہ پہنچایا ہے ان کا نام نشان مٹا دیا ہے؟"

"ثبوت؟" وہ خوں خوار لہجے میں بولا "میں نے تمہاری کارکردگی کوئی دسی اسکرین پر دیکھا ہے اس ہال میں تیار ہونے والی فلم سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا۔ وہ خوں چکان پر کھارڈنگ اب ہمارے پاس محفوظ ہے۔" اس کی بات وزن سے خالی نہیں تھی لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے نیل آرمر اور شیا میری فائرنگ سے ہلاک ہوئے لیکن ڈیوڈ کو تم کس طرح میرے کھاتے میں ڈال رہے ہو۔ وہ تو ایک خون ریز مقابلے میں مارا گیا ہے۔" وہ "کھینچ" میں ہونے والے مقابلے تو زندگی اور موت کی بنیاد پر ہی مشفق کئے جاتے ہیں۔ ایسے کسی مقابلے کے خارج کو قاتل اور مفتوح کو مقتول تو نہیں کہا جاسکتا۔ اس مقابلے کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس سامنے آسکتا تھا۔ کیا اس صورت میں تم ڈیوڈ کو گھبراہٹ کا قاتل ماننے پر تیار ہو جاتے؟"

اس کی طرف خاموشی چھا گئی۔ میرے سوال میں ایک ہزار نیوشن وزن تھا۔ وہ فوری طور پر بلا جواب ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک خوش حقیقت بیان کی تھی جسے جھٹلانا کسی بھی مقتول آدمی کے بس میں نہیں تھا۔ تاہم مسلسل خاموش رہنا میرے اس ان دیکھے دشمن کی ناکامیابی ہوتی اس لیے ہونا اس پر لازم تھا۔ وہ بولا تو اس کے انداز میں مخصوص نسلی دشمنی اور سفاکی شامل تھی۔

"وہ جان ڈیوڈ نیل آرمر اور شیا کے قتل کی تحقیق اور تفتیش تو امریکا کی تنظیم کر ہوگی۔ ہمارے بڑے تمہاری تقدیر کا فیصلہ کریں گے۔ فی الحال تو اس سے بھی اہم معاملہ درپیش ہے۔ اس مسئلے کو پاکستان میں رہنے ہی حل ہو جانا چاہئے ورنہ تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"اب کون سا نیا مسئلہ سامنے آگیا ہے؟" میں نے بیزاری سے استفسار کیا۔

وہ پھر سے ہونے لہجے میں بولا "مسئلہ نہیں پرانا ہے یہ چند روز پہلے کا واقعہ ہے۔ تم نے ہماری ایک نہایت ہی اہم فائل چوری کی تھی۔ ہمیں اس فائل کی تلاش ہے۔" "کیا کہہ رہے ہو۔ کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟" میں بھڑک اٹھا۔

وہ بدستور سنجیدہ اور سفاک انداز میں بولا "اس طرح ہمدرد کھانے سے بات نہیں بنے گی۔ تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ فائل تم نے کہاں چھپائی ہے۔ فائل والا معاملہ ادھر ہی ختم جائے تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔"

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس فائل کا ذکر لے بیٹھا تھا۔ اس کی پہلی پہلی باتوں کے جواب میں میں نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا "تم نہایت ہی گھٹیا مذاق کر رہے ہو۔ میں ایسی کسی فائل کے وجود سے واقف نہیں ہوں۔"

"تم ثبوت جب اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو زبان سے کئے گئے انکار پر شرم سار ہو جاؤ گے۔" وہ تمہیر آواز میں بولا۔ "تم نے ہمارے جس خفیہ ڈس سے وہ فائل چوری کر لی ہے وہاں پر نصف حساس کیمبرے نے تمہاری اس چوری کو عکس بند کر لیا ہے جو ایک خوش ثبوت کے طور پر ہمارے قبضے میں ہے۔ جھوٹ بول کر یا اس فائل کے بارے میں زبان نہ کھول کر تم اپنے لیے مصائب کو دعوت دے رہے ہو۔ ایسے مصائب جو اس سے پہلے تمہاری زندگی میں نہیں آئے۔"

اس کی باتیں سن کر مجھے غصہ آنے لگا۔ ایک تو یہی بات میری جھنجھلاہٹ کا باعث تھی کہ وہ تو مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اندھوں کی طرح اس کے سامنے بیٹھا اس کی فضول "نیش" نہیں سن رہا تھا۔ وہ بے دریغ جھوٹ بول رہا تھا۔ مذکورہ فائل یا ہتھ کرہ کسی خفیہ ڈس سے میرا دور کا واسطہ نہیں تھی تھا۔ میں اس قدر بیزار بیٹھا تھا کہ اس امریکی کے چلتی لینا ضروری ہو گیا۔

میں نے تجتے ہوئے لہجے میں کہا "تم لوگوں نے دیے تو زمین سے آسمان تک ترقی کر لی ہے لیکن فائلوں کے اسی فرسودہ اور دقیق نوی سسٹم میں چھپے ہوئے ہو۔ یہ کیا تم نے "فائل فائل" کی رٹ لگا رکھی ہے؟"

"فائل سے میری مراد کمپیوٹ ڈسک ہے۔ یعنی سی ڈی؟" وہ رسائییت سے بولا "اس سی ڈی میں تمہارے ملک سے متعلق نہایت ہی اہم معلومات ہیں۔ اگرچہ وہ معلومات ہماری مخصوص خفیہ زبان میں ہیں لیکن کوئی ایک سی ڈی اسے ڈی کوڈ کر سکتا ہے۔ تم نے یقیناً وہ سی ڈی کسی ماہر تک پہنچا دی ہوگی۔"

اب میں اس تجتے پر پہنچا کہ ان کو کیمبرے بارے میں کوئی بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ لیکن کیا غلطی ہوئی تھی؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ بلاوجہ اپنا وقت ضائع نہیں کر رہے تھے۔ میں نے جڑ کر کہہ دیا "اگر تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں تو تم میری غلطی لے سکتے ہو۔"

"بڑی بچوں والی بات کی ہے تم نے۔" وہ حقیر آہیر انداز میں بولا "تم جب سے ہمارے قبضے میں ہو ہم مختلف طریقوں سے متعدد بار تمہاری تلاش کے کرائی بی بی کر چکے ہیں۔ تمہاری کھال اور کھال کے ایک ایک ہال کی اسکیٹنگ کی

چاہتی ہے۔ تمہارے وجود کے کسی حصے یا خفیہ گوشے میں وہی ڈی ہو نہیں سکتی۔ تمہارے چہرے کو بھی مختلف ٹینٹ سے گزار کر دیکھ لیا۔ تم کسی قسم کے ایک اب میں بھی نہیں ہو۔ باقی فکر پریشان بند روپ اور ڈی این اے آئینن کلکشن کا کیا ذکر اورو تو ہر پہلی فرصت میں کر گئے رہتے ہیں۔ ”وہ ایک لمحے کو رکھا پھر ہوا۔“ اس حال ہماری مطلوبہ سی ڈی تمہارے پاس نہیں۔ تمہارے پاس نہیں تو اس کا مطلب یہی ہے، تم نے آگے نہیں پہنچا۔ یہی ہے۔ ہمیں بتاؤ اس وقت وہی ڈی کہاں ہے؟“

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کہ میں اس سی ڈی کے وجود سے آگاہ نہیں تھا مگر پوچھنے والا۔ کی سنجیدگی اور الفاظ کی شدت بتاتی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی حقیقت پنہاں تھی چاہے یہ کسی روپ میں ہو۔ میں نے اپنا ذہن صاف کرنے کے لیے پوچھ لیا۔

”تم جس اہم سی ڈی کا ذکر کر رہے ہو اس میں کون سا

واہ تھا؟“

”میں تمہیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔“

”تم نے ایک لکڑی بات بتائی تھی۔ تم نے میرے

وطن۔ ستان سے متعلق اہم معلومات کا ذکر تو کیا تھا لیکن ان

معدن کی تفصیل یا نوعیت تمہاری زبان سے خارج نہیں

ہوئی۔“

میرے سوال کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس

کھانی۔ ”سردی میں بولا“ ”وہ جاننا! ہمارا اپنا ایک طریقہ

کار ہے۔ ہم اپنے شکار کو چھانسنے سے پہلے اس کے ساتھ

تھیں۔ انہیں لپٹا کر لے جاتے ہیں۔ توڑی جھپٹا کر توڑی دل

دار۔ طرح ہمیں کسی نشست میں بڑے بغیر متعصب تک پہنچنے

میں ہائی حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ فارمیشلی پوری ہو چکی۔“ وہ

چند منٹ کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے تمہارے بہت سے فضول سوالات کے

جواب دے دیے۔ اب سیدھی طرح بتا دو وہی ڈی تم نے

کہیں چھپا رکھی ہے؟“

”میرا جواب اب بھی وہی ہے۔ میں ایسی کسی سی ڈی

کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”چند لمحے خاموش رہا پھر خوش لہجے میں بولا“ ”میں یہ

جانتا تھا کہ وہی ڈی خود بڑا آدمی کے اوپر تک پہنچاؤں۔ اس

طرح میرے کریڈٹ پر ایک کارنامہ آجاتا اور میری ترقی

لازمی تھی لیکن تم میری ترقی نہیں ہونے دو گے۔ تم

ہے۔“ ”کلی آمیز لہجے میں اتنا کہہ کر متوقف ہوا پھر تھی انداز

انتہا کرتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری چوری کے اس فلمی ثبوت کے ساتھ ہی

تمہیں آگے بڑھا دیتا ہوں۔ شرافت کی زبان تو تمہاری سمجھ

میں نہیں آئی۔ آگے والے تم سے بے خوبی منت لیں گے۔ چند

منٹ کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ میرے وجود کے بیدار حصے میں صلیبی

جنگ گئی۔ دل اور دماغ اسی مذکورہ متحرک حصے میں داخل

تھے۔ میرا دماغ نہایت ہی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ پیش

آمد حالات و واقعات کا کھٹ کھٹ تجربہ ہو رہا تھا۔ اس

وقت میری تمام تر توجہ کا مرکز وہ خفیہ ریکارڈنگ تھی جو کسی خفیہ

امر کی آڈے میں کی گئی تھی جس میں مجھے کوئی نہایت ہی اہم

سی ڈی چوری کرتے ہوئے عکس بند کیا گیا تھا۔ امر کی آڈے

سے اس شخص کی مراد کوئی دفتر وغیرہ ہی ہوگی۔ اس ریکارڈنگ

کی موجودی ظاہر کرنی تھی ایسا کوئی دانت پیش تو ضرور آیا ہوگا۔

اچانک میرے ذہن میں نئی وجہان کا تصور جاگ اوروں میں

انجمن پبلک۔ یہ اجملاً انجم کے مخصوص حصوں کا محدود حصہ تھا۔

اس وقت میرے جسم کے بیدار حصوں میں ایک سنسنی سی دوڑ

رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک اس بہرہ دہی کی طرف میرا

دھیان کیوں نہیں کیا تھا۔ شاید یہ حالات کے دباؤ کا اثر تھا کہ

میں اس کے بارے میں نہ سوچ سکا۔ اس قسم کی حرکت بہ زعم

خود میرے برتو کے لیے جنگی بنجانے کے مترادف تھا۔ وہ پہلے

بھی ایسے کئی مشیدے دکھا چکا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آخری

ملاقات میں وہ مجھ سے خاصا مایوس ہوا تھا۔ جب میں نے اس

کی پیش کش کو سنجیدگی سے نہ لیا تو وہ خاصا دل شکستہ ہو گیا تھا۔

رخصت کے وقت وہ بڑا غصے میں بھی تھا۔ اگرچہ اس نے

واضح طور پر مجھے عینک نتائج سے متعلق کوئی دھمکی نہیں دی تھی

تاہم اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ میں اس کے غلوں کو ٹھکرا کر

بہت بچتا ہوں گا! یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم ناور زمان

سے نشتے کی کوشش کر رہے تھے۔

تو کیا اس سی ڈی کی چوری کا سہرا نقلی وجہان کے سر ہی

بندھتا تھا؟ اس نے یہ حرکت مجھے چھانسنے کے لیے کی

تھی؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس کی جانب سے دشمنی کا آغاز

ہو گیا؟

یہ تین سوالات ایسے تھے کہ میں چکرارہ گیا تھا۔ اسی

لمحے ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں ابھر اوروہ یہ کہ آج

تک نقلی وجہان نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہمیشہ وہ میرے کام ہی آیا تھا۔ آخری ملاقاتوں میں وہ اس

بات پر زور دیتا رہا تھا کہ میں جلد از جلد اسے اپنے قابو میں

لے آؤں ورنہ بدی کی کوئی قوت اسے اپنا آلہ کار بنالے گی۔

وہ زیادہ عرصے تک یوں آزادانہ حالت میں اور غیر جانب دار

نہیں رہ سکے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی وہ بدی کی کسی قوت

کے قبضے میں چلا گیا ہو؟

یہ سوال بڑا تھمکنا خیز تھا اور اس سے زیادہ خوف ناک بھی۔

بدی کی کوئی قوت اگر نقلی وجہان کی صورت میں میرے

سامنے آکر لڑی ہوئی تو میرے لیے ان گنت مشکلات پیدا

ہو سکتی تھیں۔ میں آنے والے وقت کے تصور سے پریشان

ہو گیا۔

”کیا بات ہے وجہان! تم چہرے سے کافی فکر مند

دکھائی دینے لگے ہو۔“ اسی امر کی بددیہی کے حامل آواز

نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تو تم..... اس قدر

پریشان اور بے کھلائے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے؟“

اس شاطر نے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے

میری کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب

دینا ضروری نہ سمجھا اور اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔

”سی ڈی کی چوری والا واقعہ کس دن کا ہے؟“

وہ میری تشویش سے شاید یہی سمجھا ہو کہ میں اسے کوئی

اہم بات بتانے جا رہا ہوں۔ اس نے میرے سوال کا مفصل

جواب دیا اور میں ایک مرتبہ پھر چونک کر رہ گیا۔ یہ اس دن

کے بعد آنے والی رات کا واقعہ تھا جب ہم نے ساؤتھ کے کرتا

دھرتا ناور زمان کو ٹھکانے لگایا تھا اور اس مٹن کے اختتام پر نقلی

وجہان مجھ سے خفا ہو کر چلا گیا تھا۔ اس اعلان کے ساتھ کہ وہ

اب بھی میرے پاس نہیں آئے گا۔ میں اس وقت ساحل کے

معاملات میں اس قدر ابھرا ہوا تھا کہ اس کی ٹھکنی پر زیادہ توجہ نہ

لے سکا۔

یہ حالات و واقعات تو سیدھا سیدھا نقلی وجہان کی

طرف ہی اشارہ کر رہے تھے لیکن ظاہر ہے میں اس امر کی

کے سامنے نقلی وجہان کا باب کھول کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے

اسے ایک اور آواز سے دھمکنے کی کوشش کی اور پوچھا۔

”تمہارے اس پٹو شیعہ غوری نے تو کسی خفیہ فائل یا

کی ڈی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تم یہ نیا شوش کہاں سے اٹھالائے

ہو؟“

”غوری کو ہم نے اس معاملے کی ہوا بھی نہیں گئے

دی۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”وہ بے چارہ اس بارے

میں کچھ بھی نہیں جانتا جیسا کہ تم تمہارے بارے میں کچھ نہیں

جانتے تھے!“ وہ ایک لمحے کو رکھا پھر بات کو آگے بڑھاتے

ہوئے بولا۔

”ہمارا مشن دھوکا دہی تھا اور اس سلسلے میں شیعہ

غوری ہماری بھرپور مدد کر رہا تھا۔ پھر دھوکے کے حوالے سے

تمہارا نام سچ میں آگیا۔ شیعہ نے مختلف حوالوں سے تمہاری

بہت تعریف کی۔“ لفظ ”تعریف“ پر اس نے خاصا زور ڈالا

تھا۔ تمہارا سابق ریکارڈ ہمارے پاس پہنچا تو ہم تمہاری ذات

میں بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے۔ سنگاپور تھا

لینڈ نیپال انڈیا شمال چین اور اب پاکستان میں تمہارے

کارناموں کی کوئی حد ہے اور نہ ہی حساب۔ ہم ایسے ہر فن مولا

اور چمکس افراد کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے مقاصد

کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو ہماری بات ماننے سے انکار

کرتا ہے ہم اس کی کمر دہیوں اور مجبور یوں کو ڈھونڈ کر اپنے

قبضے میں کر لیتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ شخص ہمارے اشاروں

پر ناپنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جیسا کہ تم کرو گے!“

وہ سنی خیز انداز میں بات کو مکمل چھوڑ کر متوقف ہوا پھر

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پہلی سی ڈی کی چوری والا

واقعہ پیش آگیا۔“ اس نے کلام کے تسلسل میں اچھی خاصی

ایڈیٹنگ کر ڈالی تھی۔ ”تم نے ہماری ایک نہایت ہی اہم سی ڈی

اڑائی۔ ہم نے غوری کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا

اور تمہیں اپنے دام میں لانے کے لیے سرگرم ہو گئے اور دیکھ

لو اس وقت تم ہمارے رحم و کرم پر ہو!“

میں نے دل ہی دل میں اسے بہت برا بھلا کہا۔ پھر زبان

سے پوچھا۔ ”ایک لمحے کے لیے میں تمہیں سچا سمجھ لیتا ہوں۔ سی

ڈی کی چوری والے واقعے کو حقیقت مان لیتا ہوں لیکن شیعہ

غوری کے بیٹکے میں تم لوگوں نے جو رد یہ بنایا وہ مجھ سے بالاتر

ہے۔ تم لوگ اتنے بے پروا دک سے ہو گئے؟“

”تم کس رویے کی بات کر رہے ہو؟“ وہ غراہٹ سے

مشابہ آواز میں متحضر ہوا۔

میں نے اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

کہا۔ ”اس زمین دوز ہال میں جب میں نے پاسا پٹ دیا تو تم

لوگ دم دبا کر فرار کیوں ہو گئے تھے۔ میں کالی دیر تک سن مانی

کرتا رہا اور تمہارے تنک خواروں سے نہٹ کر جب میں بیٹکے

کے عقبی حصے میں پہنچا تو کسی نے میری راہ نہ روکی اور میں بہ

سہولت ایک بیٹکے سے دوسرے بیٹکے میں پہنچ گیا۔ وہ تو میرے

ذہن میں اپنی ساتھی عورتوں کا سودا سایا ہوا تھا اس لیے ان کی

تلاش میں میں دوسرے بیٹکے میں داخل ہوا تھا ورنہ میرے

فرار میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ میں اگر جانتا تو

اس بیٹکے کی عقبی دیوار بھانڈ کر دیاں سے رو پھر ہو سکتا تھا

میں سانس لینے کی خاطر رکھا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے

کہا۔ ”اگر میں کسی نہایت ہی اہم سی ڈی کی چوری میں ملوث تھا

تو پھر ان لحاظ میں آپ لوگوں نے میری طرف سے ایسی غفلت کیوں برتی؟

”ہوں!“ اس نے ایک طویل سانس کھینچی اور بولا۔  
”پہلے تو تم اس غلط فہمی کو دور کر لو کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری جانب سے غافل ہوئے ہوں۔ اگر تم اسے جھگڑے سے باہر قدم ڈالتے تو تمہیں ہماری چوکی کا اندازہ ہو جاتا۔ ان دونوں جگہوں کی خفیہ نگرانی کے لیے ہمارے مستعد آدمی ہمدن ارٹ تھے۔ وہ تمہیں فوراً قید کر لیتے۔“

وہ چند لحاظ کے لیے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا، ”اور جہاں تک تم نے ہمارے دم دبا کر بھاگنے کی بات کی ہے تو اس میں ذرا بھی حقیقت شامل نہیں۔ دراصل ان دونوں جگہوں کو ہر حوالے سے آپس میں مربوط کیا گیا ہے۔ ہم تو شروع ہی سے سفید جھگڑے میں موجود تھے اور وہیں ایک کمرے میں بیٹھے ہال میں پیش آنے والے واقعات کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ تم غوری کی باتوں سے الجھ گئے اور یہی سمجھ بیٹھے کہ ہم بھی نہ خانے والے جھگڑے میں ہیں کہیں کسی کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے اعتماد پلاننگ اور کارکردگی کا نتیجہ ہی ہے کہ اس وقت تم پوری طرح ہمارے قبضے میں ہو!“

وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو میں ایک گہری سانس لے کر وہ گیا۔ اس کی وضاحت میں اچھا خاصا وزن تھا۔ میں نے دیگر امور پر بحث بھیجے ہوئے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”سائل اور صدف کہاں ہیں؟“

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیتے ہوئے بولا  
”صدف کو ہوش میں لانے کے بعد ہم نے اس کا طویل انٹرویو کیا تھا پھر آئندہ چند گھنٹوں میں اس کے بیان کی تصدیق بھی کر لی۔ وہ ہمارے لیے ایک غیر متعلق لڑکی ہے البتہ تم سے انتہائی متعلق ہے!“ اس کا انداز بڑا معنی خیز تھا۔ ”تمہارا اور صدف کا تعلق ہمارا مسئلہ نہیں۔ وہ اگر تمہاری ذات میں انٹرنل ہے تو اب تمہاری یاد میں آسوی بہا سکتی ہے۔ وہ ہم تم تک نہیں پہنچ سکے گی۔“  
”پہلے کی تو وہ اس صورت نا، اگر اسے معلوم ہوگا کہ تم کہاں ہو۔ اس کی قسمت میں تمہیں یاد کرنا ہی رہ گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں اپنی جان غار ساسی کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر تڑپ اٹھا۔ ”تم لوگوں نے صدف کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”ابھی تک تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ وہ مکاری سے بولا۔  
”لیکن اگر تم نے سی ڈی کے بارے میں زبان نہ کھولی تو اس لڑکی کے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”صدف اس وقت کہاں ہے؟“ اس کے عزائم سے مجھے کسی گہری سازش کی بو آ رہی تھی۔

اس نے بتایا، ”ہم اس غوری کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں۔ وہ بریغال کے طور پر غوری کی تحویل میں رہے گی جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ ہمارے قبضے میں رہے گی۔ ہم جس وقت چاہیں گے اس کا پتا صاف کر دیں گے۔“ وہ صدف کی زندگی کے خاتمے کی بات بڑی بے رحمی سے کر رہا تھا۔ ”اگر تم ہمیں سی ڈی تک پہنچا دیتے ہو تو تمہاری ساسی صدف کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ صورت دیگر اس کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کی عینگی کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”یہ تو سراسر بددلی ہے تم لوگوں کی۔“ میں نے ایک چوٹ کی۔

”یہ ہمارے کام کا طریقہ کار ہے۔“  
”یہ بہت ہی شرمناک اور خطرناک طریقہ کار ہے۔“

اس نے میری ترش کلامی کا برانہ مٹایا اور نہایت ہی ظہرے ہوئے لہجے میں بولا، ”تم نے تین اہم یہودیوں کو قتل کیا ہے اس لیے غوری طور پر تمہارا امریکا پہنچایا جانا ضروری ہے۔ ہم چاہتے تو تمہارے ملک میں بھی تم پر مقدمے بازی کی جاسکتی تھی لیکن یہاں تمہارے ”سلب“ ہونے کے امکانات موجود ہیں اسی لیے ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں قراردادیں سزا دی جائے گی۔“

وہ جملہ اور اورا چھوڑ کر ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا، ”لیکن اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئے تو پھر صدف پر جو جیتے کی اسے تم دیکھنے سے بھی محروم رہو گے۔ اگر کسی طرح اس کا قصہ تم تک پہنچ بھی گیا تو سن کر تم بہرے ہو جاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

اس کا انداز دھمکی سے لب ریز تھا۔ میں جانتا تھا وہ بہت طاقتور لوگ تھے۔ تقریباً دنیا کے ہر ملک میں انہیں آسیائیاں میسر تھیں۔ وہ اپنے الفاظ کو کھلی جانہ پہنانے میں آزاد اور خود مختار تھے۔ صدف کے ان کی کھڑکی میں ہونے نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اگر وہ مجھ میں دیکھی نہ لیتی تو آج اس حال کو نہ پہنچتی۔ اس کو پیش آنے والے ان غدار لحاظ کا ڈر میں دار میں ہی تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے دل میں بہت غلامت محسوس ہوئی۔ کاش! مجھے اس شخص سی ڈی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو میں پہلی فرصت میں یہ معلومات اس شیطان امریکی کے سامنے کھول کر اپنی صدف کو ایک بہت بڑے عذاب سے بچا لیتا!

میں ان لحاظ میں خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہ

بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں اپنے ہاتھ سے وہ سی ڈی ان لوگوں کے حوالے کر دوں تو بھی وہ صدف کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ان کی کینہ پروری سفاکی اور بربریت میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس وقت میں صدف کے لیے اپنے دل میں بہت درد محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہ اس محبت کا اثر تھا جو وہ مجھ سے کرتی تھی۔ میں صدف کے دلی جذبات کو سمجھتا تھا اور نہ دل سے ان کی قدر بھی کرتا تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والی لڑکی تھی۔ غلطی وہ ان کی ایک ممکنہ کارستانی نے اسے ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا تھا!

میں صدف اور غوری و جدان کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص کی آواز میری سماعت سے ٹکرانی، ”تم کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ کیا کوئی فیصلہ کرنے میں تمہیں کسی قسم کی دشواری پیش آرہی ہے؟“

”تم میری دشواری اور آسانی کے چکر میں نہ پڑو۔“ میں نے دھڑکی سے کہا، ”سائل کے بارے میں بتاؤ وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”تم ناہنجا دھنکا پوچھ رہے ہو!“  
”ناہنجا نہیں دھنکا!“ میں نے قطعیت سے کہا۔

وہ بتاتے لگا، ”دھنکا معاملہ تم سے الگ ہے۔ اس لیے اسے تم سے الگ ہی ایک محفوظ جگہ رکھا گیا ہے۔“  
”یہ تم کی نئی بات کر رہے ہو!“ میں نے بڑک کر کہا۔

”تمہارے لیے نئی ہوگی ورنہ.....“ اس نے دانستہ جملہ اورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا، وہ میری مرضی کے مطابق کچھ اگل کر نہیں دے گا پھر بھی اپنے ذہن کی غلط دودھ کرنے کے لیے میں نے اس سے دو چار سوالات کر دیے ڈالے اگرچہ مجھے امید نہیں تھی کہ ان کے درست جواب مجھے ملیں گے۔ میں نے اسے اور اس کے بڑوں کو تپنے کی خاطر پوچھا۔

”کیا تم لوگوں کا تعلق امریکی سی آئی اے سے ہے؟“  
”نہیں۔“ وہ بڑی شرافت سے انکار کر بیٹھا۔  
میں نے پوچھا، ”پھر تم لوگ ایف بی آئی سے متعلق ہو گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ اب اس کے انکار میں زیادہ شدت شامل تھی۔

میں جانتا تھا سی آئی اے اور ایف بی آئی کا دائرہ کار کہاں سے کہاں تک تھا۔ میں نے وہ سوالات محض اسے مطمئن کرنے کے لیے کئے تھے تاکہ وہ میری کم علمی پر دلی دل میں خوش ہو جائے۔ اس کے مسلسل انکار سے میں چڑ گیا

اور دریا یافت کیا۔

”پھر آخر تم لوگ ہو کون؟“

”ہم یہودی ہیں اور یہودیوں کی ایک اہم تنظیم کے اوئی رکن ہیں۔“ وہ ظہرے ہوئے لہجے میں بولا، ”باقی تفصیل تمہیں ہمارے بڑے بتائیں گے۔ اب ہمارے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“

”ہم اس وقت کہاں پر ہیں؟“ اس نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا، ”مسٹر ویدان! خلاف معمول تم سے بہت باتیں ہوئیں۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو ہمیں یہ اطمینان تھا کہ تم مکمل طور پر ہماری دست رس میں ہو کسی قسم کی کوئی گڑبڑ پھیلنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ باتیں تمہیں بعد میں بھی بتا دی جائیں اس لیے وقت گزاری کے لیے میں نے انہیں موضوع بنالیا کیونکہ ہماری پرواز میں کچھ وقت باقی تھا۔“ وہ اتنا کہہ کر متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”دوسری وجہ یہ تھی کہ میں چاہتا تھا سی ڈی والا معاملہ یہیں منٹ جاتا تو اچھا تھا۔ اس طرح میری ترش کا امکان نکل آتا اور تمہاری ساسی صدف کی جان چھوٹ جاتی لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ساتھ اپنی ساسی کے بھی دشمن ہو۔ اگر تمہیں صدف کے بارے میں ذرا سی بھی تشویش ہوئی، تمہارے دل میں اس کے لیے ہمدردی پائی جاتی تو تم فوراً وہی سی ڈی ہمارے حوالے کر دیتے۔“

وہ اب جذباتی بلک مینگ کا سہارا لے رہا تھا لیکن افسوس کہ میں اس لفظی کھینک ڈسک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کو ملیا میٹ کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس وقت میں کہاں ہوں؟“

”یو۔ ایس اے میں پر۔“ اس نے سیاہ لہجے میں بتایا۔  
”اوہ!“ میرے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی آواز خارج ہوئی۔

اس نے اسی بے مہر انداز میں کہا، ”اگر تمہیں حالات کی سطحی اور موعج کی نزاکت کا احساس ہو گیا ہو تو اب بھی اس خفیہ سی ڈی کے بارے میں بتاؤ۔ میں تمہیں آخری چانس دے رہا ہوں۔“

”میرے جواب میں کوئی تہریل نہیں آسکتی۔“ میں نے گہمیر آواز میں کہا، ”کیونکہ میں واقعی کسی سی ڈی کے بارے

میں نہیں جانتا۔“

میرے حتی انکار نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ اس کی سمت خاموشی چھا گئی۔ پھر چند لمحات کے بعد اس خاموشی کو اسی امریکی کی مکروری آواز نے توڑا۔ وہ سرد مہری سے بولا۔

”ٹھیک ہے!“

میں نہیں جانتا۔ یہ مختصر سا جملہ اس نے کس سے مخاطب ہو کر ادا کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے عقب میں زندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ کوئی پہلے سے وہاں موجود تھا یا اس شخص کا اشارہ یا کہ وہاں پہنچا تھا میں اس بارے میں حتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ آنکھوں پر ہندھی دبیز سیاہ بٹی نے مجھے خاصا لالہ چار کر دیا تھا۔ وہاں ہونے والی سرگرمی نے مجھے جلد ہی بتا دیا کہ میرے آس پاس اس شخص کے علاوہ بھی چند افراد موجود تھے جس نے اب تک مجھ سے گفتگو کی تھی۔

میری ہمیشی حس نے مجھے مطلع کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے اس کا اندازہ لگانے کی مجھے مہلت نہ مل سکی کیونکہ اس وقت میں نے اپنے بازو میں کسی آنکھوں کی سوئی پیست ہوتے محسوس کی۔ میرے عقب میں موجود کسی شخص نے پہلو میں آکر مجھے کوئی سربل الاثر آنکھوں دے دیا تھا۔ ایک مخصوص چھین کے ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے تاریکی کی جانب پڑنے لگا۔

اس سے قبل کہ میں مکمل تاریکی میں گھر جاتا، میرے ذہن میں موجود کسی روشنی کی شعری سے کرن نے کام کیا جس کے مکمل میری ساعت ایک مخصوص آواز سننے کے قابل ہوئی۔ وہ کسی طیارے کے انجن کی آواز تھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں اس وقت ایک طیارے میں موجود تھا جو پرواز کے لیے پرواز چکا تھا۔ ہم اب تب میں زمین چھوڑنے والے تھے۔

یہ میری زمین تھی میرا وطن تھا۔ میں نے اس دھرتی پر جنم لیا تھا۔ اس پاک مٹی کا بہت قرض بہت احسان تھا مجھ پر اور آج مجھے اس مٹی سے دور کیا جا رہا تھا اور وہ بھی بہ جبر! اور یہ جبر پہلی مرتبہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ ماضی بعید میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ پیش آچکا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسا میری سوچ کے پر کل آئے ہوں۔ میرا تصور مجھے ماضی میں لے گیا جب میں خفا منا ایک شیر خوار بچہ تھا۔ میرے والدین مجھے اور خود کو دشمنوں سے بچاتے پھر رہے تھے۔ بالآخر حالات کے جبر نے انہیں اپنی پیاری سرزمین چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا وہ اپنے دشمنوں سے چھپے چھپاتے لاہور سے کراچی اور کراچی سے سکس پر چلے گئے تھے

اور آج مجھے زبردستی یہاں سے لے جایا جا رہا تھا۔ مجھے بھی بے کس اور بے بس بنادیا گیا تھا۔ تاریخ خود کو ہر ادھر بھی۔ اگرچہ دونوں واقعات کے مخالف کردار مختلف تھے میرے دشمن الگ الگ تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی ایک قدر مشترک کے مانند مجھ سے لپٹ کر رہ گئی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا مگر بے اندازہ دگر!

یہ تمام احساسات سینکڑ کے ہزاروں ہی صے کی حقیقت تھے۔ روشنی کی وہ شعری کرن کی راہنمائی باؤس کی طرح مجھے ماضی کی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں اس لاپتہ روشنی میں بہت دور سے ہوا تھا۔ پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ اس سربل الاثر آنکھوں نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ میں جیسے تاریکی کے کسی گہرے کوئیں میں جا کر تھا۔

☆☆☆

طیارہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر بچاؤ اٹھاتا تھا۔ مجھے ہوش میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو کھلے آسمان کا منظر دکھا کہ گہرا، پھر مخصوص جسمانی احساسات نے مجھے بتایا کہ میں کسی جہاز میں جو سفر ہوں۔ ہوائی جہاز میں! میری گردن ایک جانب مڑی ہوئی تھی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے خود کو ایک آرام دہ نشست پر نرم دراز پایا۔ پھر گڑا ہوا ایک ایک واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہونے لگا۔

مجھے شعیب غوری کا وہ بنگلا یاد آیا جس کے ایک زمین و درز ہال میں میں نے ڈھونڈ کے اندر ڈیوڑنا می مارشل آرٹس سے ایک خونی مقابلہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہال میں پیش آنے والے خون ریز واقعات اپنی جھلک دکھانے لگے۔ نسل آرمز اور اس کی دل کش نیکری بڑی شیا کی میرے ہاتھوں الٹناک موت۔ شعیب غوری کا بازو نہ فرار۔ مسل گارڈ کی زندگیوں کا خاتمہ اور چینی فائر چنگ پوکا مہر تانک انجام۔ اور آخر میں میرا زبردست اہم!

ان مکار بیودوں نے اپنی ریسرچ کا استعمال کر کے مجھے بے بس بنادیا تھا۔ پھر وہ پھر بھی ابھرا یا جب کسی یو۔ ایس ایٹم بم پر مجھ سے گڑی پوچھتا چکی تھی۔ اس وقت میری آنکھوں کو ایک دبیز سیاہ بٹی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اب اپنی آنکھوں کو میں نے کھلا ہوا پایا تو شہیدانہ حیرت ہوئی۔

اس حیرت نے مجھے تنبیہ کی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نیم دراز پڑا ہوا اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق میں امریکی سی آئی اے والوں کے مجھے چڑھ گیا تھا اگرچہ مجھ سے گفتگو کرنے والے نے اس کا

اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگلا اندازہ میرا یہ تھا کہ مجھے ڈی سی (ڈسٹرکٹ آف کولمبیا) پہنچایا جائے گا۔ امریکا سے باہر لوگ اسے دانشن ڈی سی کہتے ہیں جو یو۔ ایس۔ اے کا دار الحکومت بھی ہے لیکن ہتھیار لوگ صرف ”ڈی سی“ کہنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مجھ پر سنگین الزامات عائد کئے گئے تھے ان کی تفتیش ڈی سی ہی میں ممکن تھی کیونکہ ایف بی آئی والوں کا ہیڈ کوارٹر وہیں پر تھا جہاں ڈی این اے ٹیسٹنگ لیبارٹری بھی موجود تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ہمیں پرواز کرتے ہوئے کتنا وقت گزر چکا تھا اور اس وقت طیارہ امریکا سے کتنی دور تھا۔ اچانک میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ امریکیوں کی بیودوں کو ساحل میں بڑھتی ہوئی دھچکی میرے لیے اچھٹک تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا وہ کسی کشتی یا جہاز کے راز سے واقف ہوئی اور دوسری طرف بیودوں کی سرگرمی کو بھی فضول چارہ جونی کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے طیارے کے اندرونی ماحول کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسی وقت مجھے ایک اور حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ وہ طیارہ نہیں تھا جس میں ایک آہنی کرسی پر مجھے منطوق کر کے ڈی سی کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا اس وقت میں ایک آرام دہ نشست پر موجود تھا۔ بے اختیار میں نے گردن جھکا کر دائیں جانب دیکھا۔ اور پھر دیکھتا رہ گیا۔

مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر طیارے کے دوسری جانب والی کھڑکی کے ساتھ لگی نشست پر ساحل موجود تھی۔ وہ بیک تک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس منظر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا اور بے ساختہ میں اسے پکار بیٹھا۔ میری آواز میں ایک طوفانی بلاغ شامل ہو گیا تھا۔

”ساحل!“

وہ جس سے سن نہ ہوئی اور بہ دستور خاموشی نظر سے مجھے بھی چلی گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں لگے پھر کی دیر نہ لگی کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ تھی۔ لگتا تھا ہمارے دشمنوں نے ساحل کو بھی عارضی طور پر منطوق بنادیا ہو۔ وہ کافی دنوں کے تزیانے والے انتظار کے بعد مجھے دکھائی دی تھی۔ میں اس کھڑے کو دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ وہ نظر بھی آتی تو اس کس پرسی میں کہ میری پکار پر لبیک بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ان جذباتی لحاظ میں مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور بے ساختہ اٹھ کر ساحل کی طرف پکا۔

لیکن یہ کیا؟ میں اپنی نشست پر ایک بے معنی سی حرکت

کر کے رہ گیا۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی مرضی سے اس نشست کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں اس سلسلے میں کسی تعداد کو تیار نہیں تھے۔ میری جھنجھکی کو کھش کے نتیجے میں دونوں ہاتھ پہلوؤں میں ساکت پڑے رہے اور پاؤں بھی اپنی جگہ سے حرکت موجود رہے۔ اس مرتبہ ان خالوں نے مجھے ہاتھ پاؤں سے منطوق کر کے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے دیوانگی کے عالم میں ایک اور کوشش کی لیکن نتیجہ پہلے سے مختلف برآمد ہوا۔ میں دیکھ سکتا تھا، میں سن سکتا تھا اور بول سکتا تھا مگر اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ کیا بے بسی ہی بے بسی تھی۔ میں رات دن ساحل کو دیکھنے کی تمنا کرتا رہا تھا۔ یہ تمنا پوری ہوئی بھی تو ادھوری۔ میں صرف اسے دور سے دیکھ سکتا تھا اسے چھونے یا پکارنے اور ہاتھوں میں بھر نے کی سکت مجھ سے چھین گئی تھی۔ اور ساحل کو بھی ایسا بنادیا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے میری جانب پیش قدمی کرنے کے قابل نہیں تھی۔ میں حالات کی بے رحمی اور واقعات کی ستم ظریفی پر کڑھ کر رہ گیا۔

ہاتھ پاؤں انسانی وجود کے نہایت ہی اہم اعضاء ہیں جن کے بغیر حرکت بے معنی اور محکمہ خیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جو کوشش کی تھی وہ بڑی مایوس کن ثابت ہوئی تھی اور میں تصور میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر حسرت بھری نظر سے ساحل کو دیکھا۔ وہ بہ دستور مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے تاثرات نظر نہ آئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ساحل کا کتنی جسمہ اس نشست پر براجمان کر دیا گیا ہو تاکہ میری دل داری بہ الفاظ دیگر دل آزاری ہوئی رہے۔ شعیب کی زبانی میرے دشمنوں کو بہر حال یہ بات معلوم ہو چکی ہوگی کہ میں اپنے دل میں ساحل کے لیے کس قسم اور کتنی شدت کے جذبات رکھتا ہوں۔ میری یہ دھن ہوئی رنگ ان خالوں کے قابو میں آگئی تھی۔ شعیب غوری اور چوہدری نواز شہ نے ساحل کو میری مجبوری بنا کر پچھلے کچھ عرصے سے میرا عین مذہب کر رکھا تھا اور اب بے معنی دشمن! یہ تو وہ لوہے تھے جن کے اختیار کو کوئی حد تھی اور نہ ہی طاقت کا کوئی حساب میں بیٹھے بٹھائے ایک خوف ناک جن کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

میں نے ساحل پر سے اپنی توجہ ہٹائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بند آنکھوں کے پیچھے روشن ہو گئی۔ اس کے چہرے کا ایک خلوص ابھر کر سامنے آئے لگا۔ یہ وہ صورت تھی جو میری پیاسی تری ہوئی آنکھوں کے لیے ٹھنڈے پانی کے چھٹے



سے کم نہیں تھی لیکن ان عذاب لمحوں میں یہ صورت چکر کی صورت بن کر رہ گئی تھی۔ ہم دونوں کی حالت زار ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ہم حالات کے بارے ہوئے وہ بے پر کے پرندے بن کر رہ گئے تھے۔

مجھے اپنی بے بسی پر سخت غصہ آنے لگا۔ اگر میں یہودیوں کے مجھے نہ چھوڑتا تو سال کی رہائی اور وہابی کے لیے اپنی کسی کوشش کر سکتا تھا لیکن اب تو میری حیثیت کسی عضو معطل جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا کسی اور کی کیا خاک مدد کرتا۔

اسی لیے نقلی وجدان میرے تصور میں دل آ رہا۔ وہ بڑے طعنے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شاید یہ میرے خیال کا کرشمہ ہو۔ میں اس وقت نقلی وجدان کی حرکت کی وجہ سے خاصا بہم۔ میری اسی لاشوری اور شوری ناراضی نے مجھے اس کا طعنے چہرہ دکھا دیا ہو۔ بہر حال اس کی سی ڈی کی چوری والی حرکت میری نظر میں ناقابل معافی تھی۔ میرے اندازے اور تجربے کے مطابق اگر واقعی ایسی کوئی ایسی ہی ڈی چوری ہوئی تھی تو پھر چور اس بہرہ پیچے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے تصور میں اسے بہت کھری کھری سنائیں اور کسی حد تک اپنے دل کی بجز اس نکال لی۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے میرے تصور سے رخصت ہو گیا۔ جیسے مجھے شینگ دکھا کر جا رہا ہوا!

اسی لمحے مجھے آنکھیں کھولنا پڑیں کیوں کہ میری سماعت سے وہی شخص امریکی لب و لہجے والی آواز گرا گئی تھی۔ اب وہ میری نظر کے سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ قامت مضبوط بدن کا مالک۔ اس کی آنکھیں نیلی اور ناک طوطے کی چونچ جیسی مخصوص انداز میں جھکی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے چند فٹ کی دوری پر کھڑا تھا میرے نام سے مجھے مخاطب کر رہا تھا۔

”مسٹر وجدان! اپنی حاضری بلیٹ باندھ لو۔ طیارے کی لینڈنگ میں بہت کم وقت باقی ہے۔“

میں اگرچہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا لیکن آواز کے مخصوص انداز اور اتار چڑھاؤ سے میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یو۔ ایس اے میں پرکشی طیارے کے اندر ہمارے درمیان طویل گفتگو ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت میں اس شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور اب وہ پرکشی نہیں میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا۔ وہاں مجھے سردمہری مسکا کی اور درندگی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ

”ایس او کے!“

”ایس او جواب ہو گئے؟“ میں نے ایک اور چوٹ کی۔

وہ اپنی رست واپس پر نگاہ ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں بولا ”میں پائلٹ روم میں جا رہا ہوں۔ لینڈنگ کے بعد تم لوں سے ملاقات ہوگی۔ ٹیک کیئر۔“

میرے مطابق اندازے کے مطابق اس طیارے کو ڈی سی کی بھی ظاہرہ یا خفیہ ازپورٹ پر اتارنا چاہئے تھا لیکن میں نہ جانتے جاتے اس دروازہ قامت یہودی کے چکی لینا ضروری تھا۔

”یہ تو بتاتے جاؤ۔“ میں نے کہا ”ہم کہاں لینڈنگ کرنے والے ہیں؟“

”ایکوریج کے خوب صورت ازپورٹ پر۔“ اس نے

”ایکوریج!“ میں بڑبڑایا ”یہ نام پہلے سننے میں نہیں آتا۔“

وہ فخریہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایکوریج! الاسکا کا ایک سین شہر ہے۔ دیکھو گے تو طبیعت خوش رہائے گی۔“

”الاسکا؟“ میں بساط بھرا جھل کر رہ گیا۔

”ہاں ہم الاسکا کی زمین پر لینڈنگ کرنے جا رہے ہیں۔“

میں پکڑا کر رہ گیا۔ اگر وہ بد معاش کسی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا تو پھر میرے تمام تر اندازے غلط ہو گئے تھے۔ الاسکا کے بارے میں تو میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ یو۔ ایس۔ اے کی اس ریاست کے خوالے سے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی اسٹیٹ تھی۔ اور اس رقبے کا بڑا حصہ برفانی تو دونوں اور

برف کے پہاڑوں سے اٹا ہوا تھا۔ میں نے بے ساختہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت میں نے اس شاطر یہودی کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔

میں نے الاسکا کا تصور کیا اور ایک وسیع و عریض برف زار تہذیب گاہ پھیل چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے میرا احساس کپکپا کر رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اس برف زار کا حصہ بنتا جا رہا ہوں۔

یہاں نہیں اس موقع پر تقدیر ہم سے کون سا مذاق کرنے جا رہی تھی!

## الف لیلة ڈائجسٹ کے

دلچسپ ترین سلسلے، کتابی شکل میں

شعرا کی ہرگزشت جو اس نے ستر مرگ پر بیان کی

ہرگزشت شخصیت صید بانو کے قلم سے لکھی فیض مرگشت

قیمت 60 روپے (مکمل) ڈاک نمبر 23 روپے

ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک نیکی میں سوکر رہا تھا۔

دنیا کی بڑی بڑی تہمتیں اس کے عقاب میں تھیں۔

اس پر دیکھ کر کوئی اثر کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر۔

کتابیاتیات پبلیکیشنز کی پیشکش ہفت ہجس 23 روپے 74200

فون: 5802551-5895313 فکس: 5802551-5895313 کتابیاتیات1970@yahoo.com

راہیلے کے لئے: 63-فیر 111 بکسٹیشن ڈی ایچ ایس کی روڈ کراچی 75500

تقدیر کے کھیل زلے ہوتے ہیں۔ یہ اپنے انداز میں کھیلتی ہے اور برعقاب کو چاروں خانے چست کر دیتی ہے۔ اس کی حکمت عملی کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے..... تقدیر کے ہاتھوں میں کھلنا ہے آدمی! تاہم تقدیر نا انصاف نہیں۔ یہ بدامیر لوگوں کو پسند کرتی ہے۔ جو لوگ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتے، اپنے معاملات اور مسائل سے نمٹنے کے لیے کسی نہ کسی تدبیر میں لگے رہتے ہیں، یہ ان سے بہت خوش ہوتی ہے۔ ان کی محنت اور جگہ دو کو سراہتی ہے اور ہر چھڑانے کے بعد انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازتی ہے۔ ان کی کوشش کا صلہ ضرور دیتی ہے۔ اسی حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے..... تدبیر تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

سب سمجھ کا ہیر پیمبر ہے۔ فطری اصول ہے، آپ محنت کریں تو اس کا ثمر آپ کو ضرور ملے گا مگر محنت کی تکمیل کے بعد کام کر چکے ہیں۔ گویا تدبیر تقدیر کو نہیں بدلتی بلکہ تقدیر تدبیر کا بدلہ دیتی ہے! آپ کی محنت ہار پاتی ہے، کوشش رنگ لاتی ہے اور آپ کا حرام ٹھہرتے ہیں۔

ہم دونوں اس وقت تقدیر کے رحم و کرم پر تھے۔ چنانچہ، یہ ہمیں کون سا روپ دکھانے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔ ہمیں اس تقدیر کو بدلنا تھا کوئی ایسی سچی کرنا تھی کہ حالات مکمل طور پر ہمارے قابو میں آجائے۔ میرا ذہن تیزی سے کسی تدبیر کے بارے میں سوچنے لگا۔

یہ سچ ہے اور میرا ایمان بھی ہے کہ قدرت انسان کو اس کی بساط اور برداشت کے مطابق آزماتی ہے۔ کسی بھی شخص کو ایسے امتحان سے نہیں گزرا جاتا جس کے سلیبس سے وہ نا آشنا ہو، یہ الگ بات ہے، اس نے سلیبس پر توجہ دینے کی ضرورت نہ محسوس کی ہو۔ میں نے بڑی دشمن اور کڑی زندگی گزار لی ہے۔ آٹھ کھولتے ہی زندگی کے چنگاموں سے آشنا ہو گیا تھا اور حالات بھی بتاتے تھے، آٹھ بند ہونے تک بار بار ماری کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ گویا میرا تو وہ معاملہ تھا..... مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آٹھ سال ہو گئیں۔

میرا ذہن حد پتھر تک کھینچ رہا تھا، یہ بھی زیادہ فعالیت دکھا رہا تھا لیکن ہاتھ پاؤں گویا برف کی کسل بن چکے تھے۔ وہ میرے دماغ کے تابع نہیں رہے تھے۔ دماغی احکام کو ان تک پہنچانے والے مخصوص اعصاب کو کسی زرد اثر اور حیرت انگیز دوا کے ذریعے مفلوج بنادیا گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے روٹھ گئے ہوں۔ میں ہاتھ پاؤں کا نہیں رہا تھا۔ ہمارا جہاز بھی الٹا سا کے عقیم الشان برف زار میں نہیں اترتا تھا لیکن اس

سے پہلے ہی عیار یہودیوں نے ہمارے اجسام میں برف زار اتار دیا تھا۔

میں اپنی بے بسی پر بھینچلا کر رہ گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ انسان اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں کو حرکت بھی بند کر سکے۔ اگر انسان ”کچھ“ ہوتا ہے تو ایسی صورت حال میں اسے اتنی ہی زیادہ بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ میں ایک عام اور بدبخت سادہ انسان نہیں تھا جو کئی بندگی زندگی کا عادی ہوتا ہے۔ اس کے شام و صبح اور دن رات کا معمول مستحکم ہوتا ہے، اس کی لائف میں کوئی اپ سیٹ نہیں ہوتا۔ وہ ایک مخصوص سیٹ اپ میں سانس لے رہا ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ زندگی کو نہیں گزرتا اور ہوتا بلکہ زندگی اسے گزرا رہی ہوتی ہے۔

جب کہ میں زندگی کو گزرا رہا تھا۔ میرے صبح و شام کا کچھ ٹھیک نہیں تھا، میرے حالات میں چرلے ایک نئی کڑوت اگڑائی لیتی تھی اور مجھے کسی راہ پر دھکیل دیتی۔ قدم قدم پر ہنگامے طوفانی بگولوں کے مانند پھرتے نظر آتے۔ وہ مجھے اپنے حصار میں لینے کی کوشش کرتے لیکن میں ہر صدارت کو تباہ کر کے چلتا اور ہر طوفان کو رو دیتا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ میں نے کئی اور ہنگامہ خیز زندگی میں اتنی راہیں، اتنی کڑیاں گاہیں دیکھی تھیں کہ کوئی راستہ کوئی سمت میرے لیے نہیں تھی۔ میں نے زندگی کا ہر کردہ اور خوبصورت پلود کھینچا تھا لیکن.....!

”لیکن“ پر اگر میری سوچ کو ایک جھٹکا لگا اور بے بسی کے احساس نے ایک مرتبہ پھر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں زندگی میں اتنا بھجور آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بے ساختہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ طوطے کی اولاد تھیں امریکی مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز تو میں نے بند آنکھوں کے پیچھے ہی سن لی تھی۔ بے اختیار میں نے دائیں جانب گردن موڑ لی۔ میری نگاہ ساحل پر جا کر ٹک گئی۔ وہ ایک ٹک مجھے نکلے جا رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر کوئی تازگی جذبہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے زندہ کھڑی ہو میرے پار نہیں بہت دور غلامی کی گوری ہو۔

میرے دل سے ایک موم کی ٹیس اٹھی اور میرے دل سے بدن کو ایک اذیت میں جھلا کر گئی۔ ساحل کو پانے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے اپنے دشمنوں کی کشتی لاشیں گرائی تھیں میں نے۔ بدلے میں میرے جسم کی کھلی کھلی ناک قابلِ طمانی زبان ہوا تھا۔ آگ اور خون کے کھیل کا کچا دستور ہے۔ یہ جہنم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دونوں جانب سے

من کھاتا ہے۔ جیسے آگ سو کی لکڑی کو چاٹ جاتی ہے ایسے ہی یہ انسانی زندگیوں کو چاٹ جاتا ہے۔ ایک سنگین غافل نے مجھے میری ساحل سے ملایا تھا تو بڑے لاچار بات میں۔ بس ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور یہ دیکھنے کا معاملہ بھی شاید میری ہی حد تک تھا، ساحل کے بارے میں میں راتوں سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ چھٹی کی صورت، پتھر کی صورت بن کر رہ گئی تھی۔

جیسے کو اگر کسی کنوئیں کی مٹھری پر بٹھا دیا جائے اور اسے کس کے ہاتھ سے ڈول چھین لیا جائے تو اس کی بے بسی دیکھ کر میری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسی معاملہ تھا۔ میں ساحل کے انتہائی قریب تھا مگر ایسی اور باتیں سننے کی کام کی کہ میں اسے چھو نہیں سکتا تھا، اپنے ہاتھ کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اور اسے ملنا نہیں سکتا تھا کہ میں نے اس کی جدائی میں، یہ دن و رات کس کس کرب میں گزارے ہیں۔ میری آنکھوں میں کتنی محنت، کتنی دھن ہے۔ میرے ذہن میں کتنا اضطراب، کتنا عذاب ہے۔ میرے دل میں کیا کیا اربابان ہیں جذبات کے اظہار کے کیا کیا پلان ہیں کچھ نہیں میں کچھ نہیں کر سکتا تھا..... کچھ بھی تو نہیں! میں نے اپنے دھیان کا رخ موڑا اور کوڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ عذاب بچی پرواز کر رہا تھا اتنی بچی کا نیچے کا منہ آنکھوں میں لپکتا تھا۔ میں نے تاحہ نگاہ ایک وسیع و عریض سفید چادر دیکھنے ہوئے دیکھا۔ یہ سفید چادر درحقیقت وہ برف زار تھا کہ تصور الٹا سا کے تصور کے ساتھ تھی تھا۔ میں ایک لکڑی لے کر رہ گیا۔ یہ جبر جبری صرف میرے جسم کے ان حصوں تک محدود تھی۔ ذہن میں ایک خوف ناک خیال ابھرا۔ کیا میں اس برف زار زمین پر بیٹھا جا رہا تھا؟

میں نے امریکا کے بارے میں سنا ہی سنا تھا۔ آج پہلی بار اس بے بسی کی حالت میں اس کی کسی انٹیٹ پر قدم رکھا جا رہا تھا۔ میں وہاں کے کسی مقام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب دیکھا نہیں تھا تو میری معلومات تیسویں صدی کی تھیں۔ اب یہ تیسویں صدی کے بے گھر ہونے والی تھی۔ بات بات کا تھیں تو وقت ہی کر سکتا تھا کہ یہ تجربہ خوشگوار ہو گیا ہوگا!

ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا تھا میں پہلی بار امریکا میں داخل ہو رہا تھا۔ وہاں کی کچھ باتیں عجیب تھیں اور سڑکیں میرے لیے نئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ میں نے ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔ ان کی معلومات کے مطابق میں اس داستانِ حیات میں ہر

شے کا ذکر ایسے ہی کر دیا جیسا وہ ہے یا جیسی۔ تاکہ یہ اظہار اصرار کو لگا اور ہیرا محسوس نہ ہو۔ اپنا بیچ بیان پڑھنے والے کی دلچسپی اور داستان کی خوبصورتی کو دیتا ہے اور میں اپنی کہانی اور اپنے کارکن کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتا!

جہاز حریر نیچے آیا تو ایک یونگر شہر کے آثار واضح ہونے لگے۔ امریکی اپنے ایکسٹ کے اعتبار سے اسے ”ہینکریج“ کہتے ہیں۔ بہر حال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کھڑکی سے باہر نگاہ جمائے تیزی سے ابھرتے ہوئے ہینکریج کے خدوخال کو دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، کسی کشادہ سفید ستر خوان پر مختلف انواع و اقسام کی ڈشیں جن دی گئی ہوں۔ یہ چاروں طرف پھیلی ہوئی سفید برف تھی جس کے سینے پر ہینکریج کا شہر نمودار ہو رہا تھا، عمارتیں پل اور سڑکیں اپنی موجودی کا احساس دلارہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔

مجھے اس حال تک پہنچانے کا سہرا نقلی و دھان کے سر جاتا تھا۔ اب میں گہری تنہائی کے ”سی ڈی“ والے معاملے کو اس کی ذات سے منسوب کر چکا تھا۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتا تو سی ڈی اسے والے اتنی شدت سے میرے پیچھے نہ پڑتے۔ یہ بھی میرا اندازہ ہی تھا کہ مجھے امریکی سی ڈی اسے والے اپنے ساتھ لے آئے تھے ورنہ جس شخص سے اب تک میں گفتگو کرتا آیا تھا اس نے سی ڈی اسے اور ایف سی ڈی سے اپنی دانستگی سے انکار کیا تھا۔ اس کے انکار میں بھی اب خاصا وزن نظر آنے لگا تھا۔ اگر میں امریکی سی ڈی اسے کے مجھے چڑھا ہوتا تو مجھے کہیں اور دھکیلنے کے بجائے سیدھا ڈی سی پہنچایا جاتا۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ یہودی لائی کا چلایا ہوا کوئی اور ہی پتھر ہو اور اقتصادیات ایف سی ڈی یا سی ڈی اسے والے اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔

ہم ہینکریج کی زمین پر اترنے والے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا صورتِ حالات مجھ پر واضح ہونے والی تھی۔ میری تشویش کا باعث نقلی و دھان کی ذات تھی۔ اس نے کوئی نہایت ہی اہم اور خفیہ سی ڈی چرا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب وہ میرا اکلدا دشمن ہے..... بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ وہ میرے کسی دشمن کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا ہے ایک ایسا دشمن جو بدی کا علم بردار ہے اور نیکی کی راہ کو ٹھیک کرنے پر ہر سچے کا رہے!

پھر مجھے وہ سہ پہر یاد آئے گی جب میں منہاس باقر کے پچھلے پڑا خسی سلطان فریہ پاشا اور منہاس باقر سے ملا تھا۔ یہ

سب میرے اپنے تھے۔ اتنے اپنے کہ میں انہیں خود سے زیادہ اپنا قلم اور خبر خواہ سمجھتا تھا جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ ان محاکات میں میرا دل بہت بوجھل اور ذہن بچھا ہوا تھا۔ میں ہمد وقت یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ ان ایثار پسند اور یار ہاں لوگوں کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں نے بہت سوچا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ میں ان سے کچھ نہ والا ہوں یا وہ لوگ مجھ سے اور اب..... میرے اس احساس کا حقیقت لگتی تھی۔ میں ان سے کچھ نہ کیا تھا۔ چنانچہ میں دلی طور پر یا ہمیشہ ہمیش کے لیے!

ایسا سوچتے ہوئے میرا دل خون ہونے لگا۔ ان کچھڑنے والوں میں ایک صدف بھی تو تھی۔ اس عجیب لڑکی نے میری خاطر جاں نثاری کی کون کون سی حدیں تو نہیں کی تھی۔ اپنی جان جو قسم میں ڈال کر میری جان بچاتی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ مجھے چاہتی تھی۔ اس کی چاہت میں بڑی سچائی تھی بڑی شدت تھی بڑی حدت تھی مگر.....

میں اس سے آگے جکھ نہ سوچ سکا۔ اس کے آگے میری مجبوری پر پھیلانے میری سوچ کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ دیانت داری کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میں نے اپنے دل میں بڑی خدمت محسوس کی۔ صدف کی محبت جس روتھل کی متقاضی تھی، وہ میں نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی محبت کا اشتقاق چھین کر گواہ اس کا احتمال کیا تھا!

☆ ☆ ☆  
اسی لمحے میرے خیم کو ایک جھٹکا لگا۔ جہاز کے پیہوں نے غالباً رن وے کو چھو لیا تھا۔ میں آنکھیں کھول کر اپنے ماحول میں حاضر ہو گیا۔

ہم دونوں کو دیکھ کر درمیانی نشست پر بٹھا گیا تھا۔ عقبی نشست پر دو افراد موجود تھے۔ اسی طرح اگلے حصے میں بھی دو افراد نظر آ رہے تھے۔ اسٹیشن دیکھ کر مجھے افراد کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی جن میں دو صید اور چار مہاجر تھے۔

تھا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو چھو سکتے تھے اور نہ ہی آہ بڑھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ چڑھ سکتے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے ایک مخصوص حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیکھ کر اندر دلی فضا میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔ دیکھ کر انا کڑھ پھر بڑے مناسب انداز میں کام کر رہا تھا۔ رگوں کے ماحول کو شدید سردی نے اپنے بچوں میں جکڑ رکھا تھا۔ رگوں میں خون جم کر رہنے والے نمبر جگر کے سبب سرکس دیران اور عارضی سسٹن انظر آ رہی تھیں۔ مجھے جنوری کے سینے میں الاسکا کے اس شہر میں اترنے کا "شرف" حاصل ہوا تھا۔ جنوری کو دہاں کی سردی کی پیک تصور کیا جاتا ہے۔ الاسکا کے دور دراز نشی علاقوں کا تو کیا ذکر یہاں انکرنج میں ان دنوں درج حرارت منفی چھ سے منفی تیرہ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا تھا یعنی آٹھ سے ایس ڈگری فارن ہائٹ۔ ویسے الاسکا کا ریکارڈ درج حرارت تیس جنوری ایس سو اکتھریسویس میں منفی ہائٹ ڈگری سینٹی گریڈ اور ستائیس جون ایس سو چارہریسویس میں اڑتیس ڈگری سینٹی گریڈ نوٹ کیا گیا تھا۔

الاسکا نامی برف کا یہ دیو کی زمانے میں روس کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ یہ خطرہ روس کے لیے بے معنی اور فضول تھا یا یوں کہ لیں کہ ان ٹھنڈے خون والوں نے بھی اپنے اس علاقے کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ جب اپنے کسی شے پر توجہ نہ ہاں تو غیر تا کا جھا کی شروع کر دیتے ہیں چنانچہ الاسکا پر بھی ایک "غیر" کی نگاہ ہو گئی۔ اس شخص نے اس برف زار میں جانے کیا خوبی دیکھی کہ اسے خریدنے پر تیار ہو گیا۔ ہم۔ آج۔ سیدار ڈنامی وہ شخص بہت کانیاں اور موقع شاس تھا۔

اس نے اٹھارہ سو سترھریسویس میں روس والوں کو اپنے شیشے میں اتار اور الاسکا کو صرف سات اعشاریہ دو لین ڈالر میں خرید لیا۔ روس والے خوش تھے کہ بیٹھے بٹھائے ایک برفانی طوفان سے جان چھوٹ گئی اور اچھی خاصی رقم بھی ہاتھ آ گئی۔ ازاں بعد ان کی یہ خوشی اس وقت سمجھتاوے میں بدل گئی جب اسی الاسکا کے برفانی پہاڑوں اور چٹانوں میں مختلف دھاتوں کا سراغ ملا۔ سب سے اہم اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس خطے میں سونے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے تھے۔ دریافت اٹھارہ سو چھپانویسریسویس میں ہوئی۔ سونے کے ذخائر پر مشتمل یہ علاقہ "کلون ڈائیک رینج" کہلاتا ہے۔ الاسکا نامی اس وسیع و عریض برف خانے کو تین جنوری ایس سو اکتھریسویس میں باقاعدہ امریکا کی ریاستوں میں شامل کیا گیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں اس کا نمبر انچاسواں ہے۔ امریکا کی چھاسویں ریاست "ہوائی" ہے جو انیس

اگست انیس سو اکتھریسویس ہی میں اس اتحاد میں شامل ہوئی۔ الاسکا کا دار الحکومت "جون آ" نامی شہر ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ آباد شہروں میں انکرنج، ٹینگر، سیکورڈ، ہومر اور ٹاکینا ہیں۔ انکرنج سب سے بڑا شہر ہے جس کی آبادی لگ بھگ تین لاکھ ہے۔ جو پورے الاسکا کی آبادی کا تقریباً نصف ہے۔ انکرنج کا قبہ ایک ہزار چھ سو ستانوے مربع میل ہے جب کہ مکمل الاسکا بیٹھے لاکھ چھپن ہزار چار سو چھپن مربع میل پر مشتمل ہے جس میں گھٹے جنگلات، ہموار اور پہاڑی زمین، برفانی تودے اور پانی کی سطح پر تیرتی میلوں کی چوڑی برف کی مضبوط چٹانیں سب شامل ہیں۔ ایک مختصراً اندازے کے مطابق امریکا کی اس ریاست میں بسنے والے چھترہ اعشاریہ پانچ فی صد سفید فاقہ چار اعشاریہ ایک فی صد سیاہ فام پندرہ اعشاریہ بیٹھے فی صد ایسٹون تین اعشاریہ بیٹھے فی صد ایشیائی اور ایک اعشاریہ دو فی صد دوسرے لوگ شامل ہیں۔

ہمیں اپنے ساتھ لے کر جانے والی وہ اسٹیشن دیکھ کر تیر رفتاری سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ وہی امریکی یہودی برائمان تھا جو اب تک مجھ سے گفتگو کرتا آتا تھا۔ اس شخص کی شخصیت میں بڑی شدت اور سفاکی پائی جاتی تھی۔ ہمارے عقب والی نشست پر بیٹھے ہوئے دو افراد بھی بالکل خاموش تھے۔ وہ چاروں بظاہر ہماری جانب سے غافل نظر آ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا وہ ہم پر اس قدر متوجہ تھے کہ خدا اپنے آپ سے غافل ہو چکے تھے اسی لیے دیکھ کر اندر نہانے کا راج تھا۔

اگر پورٹ سے نکلنے کے بعد دیکھیں جلد ہی اسپنارڈ روڈ پر آگئی پھر کچھ قافلے طے کر لینے کے بعد وہ "بیٹ ڈیٹرن جیٹ ان" کے پاس سے ہائیں جانب مڑ گئی۔ چند چھوٹی اسٹریٹ میں گردش کرنے کے بعد ہم ایک عظیم الشان عمارت میں داخل ہو گئے۔

طویل اور کشادہ ڈرائیور پر کہیں بھی دیکھ کر دوڑ کا نہیں گیا اور ہمارے سفر کا اختتام ایک بندر روازے پر ہوا۔ وہ کسی گیرج کا دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی کے اندر ہی سے کوئی میکانزم استعمال کیا گیا اور وہ ٹرینا دروازہ اوپر اٹھ گیا۔ قبل ازیں اس عمارت کے میں گیٹ کو بھی ایسے ہی کی میکانزم سے کھولا گیا تھا۔ دیکھ کر ایک کشادہ ہال میں داخل ہوئی تو ہمارے عقب میں دو شہر دوبارہ بند ہو گیا۔

میں اب تک خاموش بیٹھا تھا حالانکہ میری قوت گویائی سلامت تھی۔ میں نے جہاز کے اندر اس طوطے کی چوچ

والے یہودی سے خاموشی تلخ کلامی بھی کی تھی۔ میں اس موقع پر جب نہرہ سکا اور اسی شخص سے پوچھ بیٹھا۔ میں نے اظہار کے لیے انگریزی زبان کو وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا!

"کیا ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے؟"

اس دراز قامت جتنی چوڑی والے نے ٹھہری ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی تاہم زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کی نظر میں دنیا جہاں کی سرد مہری کٹی ہوئی تھی۔ میں ہلک جھپٹے میں سمجھ گیا۔ اب مجھے کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

میں نے اس کے باوجود بھی اتمام حجت جاری رکھا۔ "کیا دیکھ میں بیٹھے ہی تم کو گتے ہو گئے ہو؟" میرا خطاب وہی امریکی تھا "ادھر جہاز میں تو تم نے "ٹینٹ" لگا رکھی تھی؟"

میرے لیے سے ہوئے اٹھارے اور طرکوہ خاموشی سے بی گیا اور دروازہ کھول کر دیکھ کر اتر گیا۔ باقی تین افراد بھی دیکھ کر باہر چلے گئے۔ ایک ہم دونوں ہی ایسے محتاج تھے کہ اپنی مرضی سے جیش نہیں کر سکتے تھے۔ ساحل کی حالت تو مجھ کے بھی زیادہ گئی کر رہی تھی۔ مجھے وہ بولنے کی قوت سے بھی محروم نظر آتی تھی۔ انہیں ان خالوں نے اس کے ساتھ کون سا ہاتھ کیا تھا!

میں حتی الوسع کوشش کر کے اس ہال کا جائزہ لینے لگا جہاں وہ دیکھنے پہنچ کر رہی تھی۔ دیکھ کر ہال کے وسط میں کھڑی تھی۔ وہ تینوں افراد اور ان کا ڈرائیور تھوڑی دیر تک مختلف کوششوں میں مصروف رہے پھر دیکھ کر قریب دو کرسیاں پہنچا دی گئیں۔ وہ دو میل چیز زے مشابہ کرسیاں تھیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب ہمیں دیکھ کر باہر نکال جانے والا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا اور کیے بعد دیکھ کر ان لوگوں نے سہارا دے کر ہمیں دیکھ کر نکالا اور کرسیوں پر بٹھا دیا۔ طوطے کی چوچ بھی ناک والا امریکی ڈرائیور کے ساتھ کسی اندرونی کمرے میں غائب ہو گیا جب کہ دوسرے دو افراد ہماری نگرانی کے لیے ہال میں موجود رہے۔ وہ بہ ظاہر غیر مسلح دکھائی دیتے تھے تاہم مجھے یقین تھا انہوں نے اپنے لباس کے اندر خطرناک ہتھیار ضرور لگا رکھے ہوں گے۔ دیکھ کر انہیں بہ دستور اشارت تھا حالانکہ اس ہال میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔ میں نے سن رکھا تھا الاسکا جیسے برفیلے علاقوں میں اگر کھلی جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے رکنے کی ضرورت محسوس ہو تو گاڑی کے انجن کو سوچ آف نہیں کیا جاتا ورنہ پھر گاڑی بھی اسی خشک کا حصہ بن کر اشارت ہونے کا نام نہیں لیتی۔ سوچ آن کی ہر کوشش ناکامیاب ہو کر رہ جاتی

ہے۔

میرے ذہن نے کہا ان افراد سے تھوڑی تفریح لینا چاہئے۔ میں نے ان میں سے ایک کی آنکھوں میں جھانکا اور سوال کیا "مستر! تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ کسی سنگی بت کے مانند مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں نے ایک اور کوشش کی اور تجلیے لکچے میں کہا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کو مجھے اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو۔ احتیاط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے پوری امریکی قوم کا اعتماد کہیں کم ہو گیا ہوا!"

اس کی آنکھوں میں تحقیر کی پرچھائیں لہرائی۔ پتا نہیں وہ میری جراثیم بھرا کھار کا اثر تھا یا میرے سوال نے اسے جو کچھ پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سوچا "اس موقع پر بات کو آگے بڑھانا چاہئے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک واضح استفسار پڑھ لیا تھا۔"

میں نے کہا "اس جگہ پر اچھی خاصی حرارت موجود ہے اس کے باوجود بھی تم لوگوں نے دیکھنا کہ انہیں اشارت حالت میں چھوڑ دیا ہے۔ پتا نہیں، آپ لوگ مجھ سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں۔ کیا میں کوئی جن ہوں جو تم کو کھانا چاہوں گا؟"

میں اسے اسکاٹے اور تاؤ دلانے کی کوششیں کر رہا تھا لیکن وہ کس سے کس نہ ہوا۔

میں نے ایک اور وار کیا "آپ لوگوں نے اپنی سائنسی ترقی کے مکمل نہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ ہم اپنی مرضی سے حرکت کر سکیں اس کے باوجود بھی تم لوگ ہماری طرف سے بہت محتاط ہو۔ کیا یہ تمہارے طاقتور اختیار کا شرمناک مظاہرہ نہیں؟"

وہ جی ہی جی میں ہل کھا کر رہ گیا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ میں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ایک اور وار کیا۔

"مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے اسکاٹے کے موسم نے تم لوگوں کے جذبات کو بھی فریاد کر کے رکھ دیا ہے جو میری جگہ باتیں بھی تمہارے خون میں ابال نہیں لار ہیں۔ تم دونوں جس بے غریبی اور بے کسی کا مظاہرہ کر رہے ہو وہ یاد رکھنے کے قابل ہے!"

اس شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں بڑی صاف انگلی میں اسے غصہ دلانے والی باتیں کر رہا تھا۔ ایک قیدی اور مجرم شخص جو کسی نفل و حرکت کے قابل بھی نہ ہو، کی زبان سے اس قسم کی زہریلی باتیں سن کر ان دونوں کے

دماغوں کا جو شہر ہوا ہوگا اس کا یہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا تاہم ان میں سے کسی نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ شاید انہیں اسی قسم کی ہدایات دی گئی تھیں۔

میں مزید تھوڑی دیر تک اسی نوعیت کی جھپٹ خانی میں مصروف رہا پھر مجھے یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا کیونکہ طوطا مار کا ناک والا بیہوشی واپس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک باکس نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی فرسٹ ایئر باکس تھا۔ ازاں بعد میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہوئی۔

اس شخص نے وہ باکس کھولا اور ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا وہ انجکشن ہمارے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ پتا نہیں اب مزید وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میرے بدن کے بیدار حصوں میں ایک گہری تشویش دوڑ گئی۔ شاید یہی حال ساحل کا بھی ہوا ہوگا۔

ڈسپوزیبل سرخ میں کوئی سیال بھرنے کے بعد وہ شخص ساحل والی وکیل جینز کے نزدیک آ گیا۔ ساحل کی پروکٹر روہاٹ کے مانند جس حد حرکت پہنچی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوا میں چلی گئی ہو یا پھر شوئیس میں سے کسی انجیو کی پھر پر ادا کاری کر رہی ہو۔

سرخ بردار مسافک شخص نے لباس کے اوپر ہی سے ساحل کے بازو میں وہ انجکشن دے دیا۔ سوئی کی چھین پر ساحل کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی سسکاری خارج ہوئی اور نہ ہی چہرے پر کوئی تاثر ابھرا۔

سرخ میں بھری ہوئی دوا ساحل کے جسم میں انجکٹ ہو چکی تو اس شخص نے وہاں موجود دوا افراد میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ مذکورہ شخص خاموشی سے آگے بڑھا اور ساحل والی وکیل جینز کو مکمل کر ایک طرف لے جانے لگا۔ میں خاموشی سے وہ تماشا دیکھنے پر مجبور تھا۔ میں نہیں جانتا تھا اگلے سرے پر ساحل کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور یہ نہ جانتا ہی میری تشویش کا باعث تھا۔

میری نگاہ ساحل والی وکیل جینز پر جمی ہوئی تھی۔ وہ شخص جینز کو دھکیلے ہوئے ایک دروازے کے قریب لے گیا پھر دروازہ کھول کر وہ ساحل سمیت کسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اس کمرے کے اندر دوئی جھڑکوں میں دیکھ گیا تھا۔ وہ کوئی آپریشن جینز بھی ہو سکتا تھا اور دھجھ جینز بھی! اچانک میری سوچ کا سلسلہ منتقل ہو گیا۔ میں نے اپنی گردن میں کسی کو اتارے محسوس کیا تھا۔ وہ میرے جسم کا

بیدار حصہ تھا۔ لہذا تکلیف کا احساس لازم تھا تاہم میں نے اپنے چہرے سے ایسا کوئی تاثر نہ دیا جس سے میری کمزوری یا کم ہمتی ظاہر نہ ہو۔ میں ان مکار بیہوشیوں کے سامنے سینہ تان کر رہنا چاہتا تھا۔

انجکشن کی پیمائش کے بعد میری وکیل جینز میں بھی حرکت پیدا ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے میں اس ہال کی ایک دیوار کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ہمارا یہ مختصر سا سفر ایک دروازے پر ختم ہوا۔ ایسے ہی ایک دروازے میں ساحل کو داخل کیا گیا تھا۔ تاہم یہ وہ دروازہ نہیں تھا۔ ہم دونوں کو دو مختلف ستون میں روانہ کیا گیا تھا۔

پتا نہیں اسے جدائی کہا جاسکتا ہے یا نہیں! جدائی کے لیے لمن کی شرط ہے، لمن کے بعد ہی جدائی کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاز کے اندر اور پھر دیکھن میں ہم دونوں کا جو مضحکہ خیز اور عبرت انگیز لمن ہوا تھا اس کے بعد جدائی کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا تھا۔

میں انجی سوچوں میں گم تھا کہ میری وکیل جینز ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے کمرے کے ماحول پر نظر ڈالی تو حیرت کا ایک شدید دھچکا لگا۔ وہ ایک کشادہ داش روم تھا۔ مجھے وہاں پہچانے والا شخص داش روم کا دوسرا دروازہ کھول کر خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں داش روم میں تمہارہ گیا۔

تمہاری بڑے انوکھے خیالات کو ختم دیتی ہے۔ میں نے سوچا کیا ساحل کو بھی کسی ایسے ہی داش روم میں پہنچایا گیا ہوگا؟ اگر اس سوال کا جواب "ہاں" میں تھا تو پھر ایک نیا سوال افشا تھا۔ "کیوں؟"

داش روم یا کیزنگی اور لمہارت کے کام آتا ہے۔ نہاد و حو کہ ہم اپنے جسم کو صاف سترا کرتے ہیں۔ اس داش روم میں بھی صفائی ستھرائی کے سارے لوازمات موجود تھے بلکہ وہ حد سے زیادہ ماڈرن یا تھم روم تھا۔ ہاتھ دھو کر دھارے کے علاوہ وہاں اشیاء ہاتھ کا بھی مکمل بندوبست نظر آرہا تھا۔ میں پر غور وہاں کی ایک ایک شے کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔

داش روم کا وہ دروازہ کھلا، مجھے یہاں پہنچانے والا جہاں سے رخصت ہوا تھا۔ میرا دل دھک سے رو گیا۔ وہ نظارہ سانس کی آمد و شد کو رد کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بدن کا سارا خون کی ٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا ہو۔ دو کڑی ہوئی بچلیاں کھلے ہوئے دروازے میں نمودار

ہوئیں اور اگلے ہی لمحے دروازہ ایک مرتبہ پھر بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بچلیاں بھی داش روم میں بند ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو بے زیادہ سیاہ اور دوسری چاندی سے زیادہ سفید تھی!

میں نے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں پھیری سی محسوس کی۔ مجھے یوں لگے جیسے میرے بدن کے خوبہ حصے بیدار ہو رہے ہوں ان میں ایک نئی زندگی دوڑنے لگی ہو۔ پتا نہیں یہ گردن پر لگنے والے اس انجکشن کا اثر تھا یا ان کڑی بچلیوں کا کرنت! میں بڑی خوشگوار حیرت سے ایک تک انہیں کچے جارہا تھا۔ سیاہ و سفید ایک ہی صف میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ کیا صف بندی تھی!

وہ دونوں کمرے ہاتھ رکے پہلو پہ پہلو کھڑی تھیں اور کسی کمان کے مانند تن کو کھڑی تھیں۔ ان کی خوب صورتی اور حسن و جمال میں کوئی کمی نہیں تھی۔ بدن کی شادابی اور کشش بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ اس وقت محض انڈر گارمنٹس میں تھیں جیسے الاسکا میں نہ ہوں بلکہ یورپ کے کسی گرم ساحل پر سن ہاتھ کے ارادے سے آئی ہوں!

اس وقت ان کے ارادے مجھے بڑے خطرناک نظر آرہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے زہر لب سکرا بھی رہی تھیں۔ ان کے زہد و پابندہ لبوں پر کئی بے معنی خیر مسکراہٹ تھیں گہری تشویش میں جھٹکا کر رہی تھی۔ وہ بلیک اینڈ وائٹ کا ایک حسین اور سنگین منظر تھیں۔

میں نے جلدی سے اپنی سوچ کو سنبھالا اور اس کو ان کے رعبہ حسن سے نکالا اور یکے بعد دیگرے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ششہ انگریزی میں سوال کیا۔

"تم دونوں کون ہو؟"

جواب دینے سے پہلے انہوں نے بڑی جھکی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر کالی حینہ نے ایک ادا۔۔۔ سے اپنے کھلے گیسوں کو جوڑے کے انداز میں سیٹھتے ہوئے خالعتا امر لب لب دلچسپ میں کہا۔

"ہم تمہاری خادماں ہیں۔"

اس کے اس والہانہ جواب نے میرے بدن میں سنسنیٹ سی بچا دی۔ میں نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا "یہ اگر مذاقی ہے تو بس ہو چکا۔ مجھے تم لوگوں سے کسی قسم کی کوئی خدمت نہیں کرانا۔"

"یہ تو ہم جانتے ہیں! ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا!" سفید قام آفت بڑی عجبیدگی سے بولی اور میری جانب قدم بڑھا دیے۔

جیڑ پر پیٹھے پیٹھے اس حینہ سے استفسار کیا۔  
”تمہارا نام کیا ہے؟“

میرے لباس کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ منہ بگاڑ کر میرے لہجے میں بولی ”کام بتا دیا یہی کافی ہے۔ نام پوچھ کر کیا کرو گے؟“

”آئی سنگ دل نہ بنو روٹی!“ بلیک بیوٹی نے ہاتھ ب کے پاس کھڑے کھڑے اپنی سامگی کو مخاطب کیا ”بے چارہ کتنی محبت سے پوچھ رہا ہے۔ نام بتا دو گی تو تمہارا کیا چلا جائے گا؟“

میرے سامنے کھڑی گوری نے کہا ”تم نے مجھے مخاطب کر کے نام تو ظاہر کر ہی دیا ہے۔ میرے بتانے نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے روزی؟“

بات ختم کرتے ہی اس نے بے پروایانہ انداز میں کندھے اچکا دیے۔

بلیک تو نینب کے پاس سے ہٹ گئی اور ہماری جانب قدم بڑھاتے ہوئے اپنی سامگی سے بولی ”تو گویا تم نے حساب برابر کر دیا۔ ایک سینٹ اوپر نیچے نہیں ہونے دیتی ہو روٹی!“

ان کی باہمی ٹوک جھوک نے مجھے ان کے نام سے آشنا کر دیا۔ سیاہ سن کا نام روزی تھا۔ اگر وہ روزی تھی تو پھر اسے ”بلیک روز“ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ سیاہ گلاب بھی اپنے اندر اسی قسم کا پراسرار حسن رکھتا ہے۔ روزی کی سامگی روٹی اپنے حسن کی چمک دمک کے باعث دہانت گولڈ کو شرماتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے فیئر میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

پتا نہیں، یہ قدرت کا کیسا حسین مذاق تھا۔ میں اس وقت پردیس میں اپنے دشمنوں کے رحم و کرم پر تھا۔ ان ٹامباہ حالات میں اس نے میرے لیے بڑی عقین روزی روٹی کا بندوبست کر دیا تھا!

میری نگاہ نے ان دونوں کے سچ سے راستہ نکالا اور چاکر ہاتھ ب پر ٹپک گئی۔ ب کے چاکر کر دیا گیا تھا۔ اس میں ایک مناسب رنگ نیک پائی بھرا ہوا تھا۔ پانی کی طرح پر بلیبے دار جھاگ کی حکم رانی تھی۔ گویا بلیک تو نین نے میرے ہاتھ کے لوازمات یک چاکر کر دیے تھے۔ میری نگاہ اگلے ہی لمحے واپس لوٹ آئی۔

روزی (ROSY) نے سوالیہ نظر سے روٹی (ROTY) کو دیکھا اور بولی ”پروگرام شروع کریں؟“

”پہلے اسے ڈریس آؤٹ کرنا ہوگا۔“ روٹی نے میرے

امادس کی رات اٹھاتے ہوئے ہاتھ ب کی طرف چلی گئی۔ گویا انہوں نے کسی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔ کھن ملانی اور برف کی سٹکانی سے پروان چڑھنے والی امریکی حینہ میرے نزدیک آئی تو میں نے بڑے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

”مجھے چھوٹے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھ سے دور رہو!“  
”کیوں؟“ وہ آنکھیں کھمکاتے ہوئے بولی ”تمہیں چھوٹے سے کرنٹ لگتا ہے کیا؟“

بے اختیار میرے ہونٹ مسکرائے۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔ سمندر قطرے سے پوچھ رہا تھا کہیں مجھے اپنے اندر غر قاپ تو نہیں کر دو گے؟ وہ کم بخت کی قہرل پادرا آئین سے کم نہیں تھی اور بڑی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ میں اسے کرنٹ تو نہیں مار دوں گا!

میں نے اپنی سجدگی کو واپس لاتے ہوئے اس سے کہا ”تم مجھے دونوں کے ارادے ٹھیک نظر نہیں آرہے۔ سچ سچ بتاؤ میرے ساتھ کیا کرنے والی ہو؟“

”تمہیں بتایا ہے، ہم تمہاری خدمت کرنے آئے ہیں۔“

”کیسی خدمت؟“ میں اس کے تورو کچھ کر بولکھا گیا۔

”ہم تمہیں ایک شاندار اور یادگار ہاتھ دیں گے!“ وہ بڑے کھلے انداز میں بولی۔

میری بولکھا میں میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ اس نے میرے لباس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ میرے لیے یہ صورت حالات بڑی دہانت تھی۔ بے ساختہ میں نے مدافعت میں اس کے ہاتھ کو روکنا چاہا۔ اس ”چاہنے“ کا مطلب یہی تھا میں نے اپنے ہاتھوں کو بٹس دینے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ وہ بے حس و حرکت ہی رہے۔ اس کے ہاتھ ہی میرا وہ اندازہ بھی غلط ہو گیا کہ گردن پر لگنے والے آنکھن کے اثر سے میرے جسم کے خوابیدہ حصے بیدار ہونے لگے تھے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنے بدن میں جو تحریک محسوس کی تھی اس کا تعلق تصور اور خیال سے تھا۔ درحقیقت میری سوچ میں مل جل رہی تھی جس نے جذبات کو ایک نئی انگڑائی لینے پر مجبور کر دیا تھا اور اس خوش گوار تغیر کا سبب وہی دو بلیاں تھیں جن کے پیچھے چلاتے بلیک ایڈر دہانت جلوے نے میرے احساس میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔

انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا رات اور دن ایک ساتھ کسی داوی میں اتر آئے ہوں!

میں کسی قسم کی رکاوٹ یا مدافعت پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تاہم منہ میں زبان ضرور رکھتا تھا۔ میں نے دلیل

بچہ کی طرف اٹلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ روزی بے پروائی سے بولی ”یہ کام ب کے اندر بھی ہو سکتا ہے۔“

پھر انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا اور بڑی مستندی سے میری جانب ہاتھ بڑھائے۔ روٹی میرے غب میں بیٹھی اور میری نظروں میں اپنے سڈول بازو ڈال دیے۔ روزی نے اپنی صندل ہاتھوں کو میری پندلیوں کے گرد حائل کر کے ناگوں کو مضبوط قہقہے میں جکڑ لیا۔ میرے بازو کے پیچھے ایک گداز رکاوٹ کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

دوسری جانب روٹی نے میری پیشانی کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے پار کیا تھا۔ ان آفت زادوں کی گرفت میں بڑی جان کی جکڑ میں بڑی شان تھی اور جکڑ میں بڑی آن تھی۔

انہوں نے آن واحد میں میرے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور کسی سے باہر نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے مجھے اٹھا کر اس تنگ سائز ب میں پھینک دیا۔ ان کے اس عمل میں بڑی ہمارت اور تجربہ کاری تھی۔ وہ بارود حاز سے بھر پور شاکار تھی۔

وہ ب کی ڈبل بیڈ کے سائز کا تھا جس میں بہ یک وقت تین چار افراد بے آسانی ہاتھ لے سکتے تھے۔ مجھے ہاتھ ب میں بچانے کے بعد وہ دونوں بھی اندر اتر آئیں۔ ب میں بھرا ہوا پانی بڑے مناسب درجہ حرارت کا تھا، جسم کو گور دینے والا۔ اس پانی میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک راحت ہی محسوس ہوئی بدن کو ایک نئی زندگی ملنے لگی۔ پھر وہ دونوں خامدانیوں کی خدمت گزار ہی میں جت گئیں۔

میں ایک تنہا بچہ بن کر رہ گیا تھا۔ میرے جسم کے وہ اعضا میرے تانے بانے میں رہے تھے وہ ان چادر گدازوں کے اشاروں پر رینگ رہے تھے۔ انہوں نے گداز شیخ کی مدد سے خوب مل مل رکھے دھوپ اور دھو دھو کر نہلایا۔ میں کسی فرماں بردار بچے کے مانند ان کے ہاتھوں کا مھلو تیار ہا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ بکلام سے نٹ لیں۔

اس شان دار غسل نے مجھے ہلکا جھٹکا کر دیا تھا۔ نمونے نے نہایت ہی خدمت گزار خادموں کی طرح مجھے ڈریس اپ کر دیا۔ یہ وہ لباس نہیں تھا جو غسل سے پہلے میرے بدن کا پہنا دیا ہوا تھا۔ روزی اور روٹی نے باہمی امداد سے مجھے دوبارہ کرسی پر بیٹھا دیا۔ میں ایک مرتبہ پھر وہیل جیڑ کا مکان بن گیا۔

انہوں نے مجھ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ شاید وہ اپنی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔ مطمئن ہونے کے

بعد انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور ”ہائے“ کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے داش روم سے نکل گئیں۔

اگلے باج منٹ میں میری وہیل جیڑ کو دوبارہ اسی ہال میں پہنچا دیا گیا جہاں آئینشون دیکھ کر کڑی تھی۔ ساحل اپنی وہیل جیڑ پر پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کے جسم پر بھی وہ پہلے والا لباس نظر نہیں آرہا تھا۔ یہنا اسے بھی ایک دارم ہاتھ سے گزارا گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ گھری دکھائی دیتی تھی۔ اس کے کھنار میں ایسی نقش تھی کہ دل خواہ خواہ اس کی طرف لپکتا تھا۔ اسے پکڑنے اور محسوس کرنے کو بھی چاہتا تھا لیکن.....

نکین کے بعد سوچ کے پر پھر پھرانے لگتے تھے خیال کی پرواز ختم جانی اور ایک اذیت ناک بے بسی جذبات کے غبار کو اپنے حصار میں لے لیتی۔ میری درجنوں تری ہوئی راتوں اور گرسوں سلکتے ہوئے دنوں کے انتظار کے بعد وہ مجھے دیکھنے کو ملی تھی اور ایسے ہی تھی کہ بیان سے باہر! ہمارا یمن ہدائی سے زیادہ تر پانے والا تھا بدن میں شتر اتارنے والا روح پر کوڑے برسانے والا!

اچانک ایک خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میں نے خطرناک انداز میں سوچا..... کیا ساحل کو بھی میرے ہی طریقے سے نہلایا گیا ہوگا؟ اس سوال کے عقب میں ایک اور سوال سر اٹھا کھڑا تھا۔ اگر مجھے دو حیناؤں نے غسل کر لیا تھا تو کیا ساحل کو دو مردوں نے ہاتھ کرنا تھا؟..... ایک سیاہ قلم اور دوسرا سفید قلم؟ اور کیا وہ دونوں بھی روزی اور روٹی کی طرح مختصر چائے میں تھے؟ انہوں نے بھی اسی شدت سے ساحل کو اٹھا کر کسی ب میں پھینکا ہوگا!

میں ان ہولناک سوالات کے جواب ڈھونڈنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اس تصور نے ک میری ساحل کو دشمن ہاتھوں نے چھوڑا ہوگا، مجھے بے حال کر دیا۔ اس کے بعد پیش آنے والے حالات کے بارے میں میں سوچنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ خون میری رگوں کے اندر اچھل کر رہ گیا۔

اسی لمحے وہ طوطے کی چوچ والا بیوٹی اس ہال میں نمودار ہوا۔ میں اس سے بہت سارے سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ڈھیروں کیا، مجھے ایک سوال کرنے کا موقع نہ دیا۔ وہ ہاں بیٹھے ہی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنی گردن کے نزدیک کسی سوئی کی جھین محسوس ہوئی۔ یہنا مجھے کوئی آنکھن دیا گیا تھا۔ غسل کے بعد میں خاصا ہلکا جھٹکا ہو چکا تھا اس آنکھن کے بعد مجھے یوں لگا، میرا جسم روٹی کا گلاب بن گیا ہو۔ میری خود کو فضا میں اڑتا ہوا محسوس کرنے

لگا..... نئے میں چور کی آوارہ بادل کی طرح!

ساحل کے بازو میں بھی ایک آنکھن دیا گیا، پھر ہمیں دوبارہ اسی آکھن وینک میں سوار کرایا گیا۔ ایک مرتبہ پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا تاہم اس بار ہمیں عقبی نشست بخشی گئی تھی۔ ہم دونوں کھسکوں کے مانند چپ چاپ اور ساکت بیٹھے تھے۔ ہم دوائے بڑی تھے جو کسی شدید بخڑے کے بعد اپنا جینا مرنے الگ کر گئے تھے!

میں نہیں جانتا تھا ہمارا یہ تمام سفر کہاں جا کر تمام ہوگا! میں یہ جان بھی کیسے سکتا تھا۔ میں تو اس وقت خود اپنے آپ کو بھول رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں فضائے بے ہوا میں کہیں گم ہو رہا ہوں ایک اتھاہ خلا میں تحلیل ہو رہا ہوں۔ میں قفرو قفرو پھل رہا تھا اور ذرہ ذرہ نکھر رہا تھا۔ شاید میں ہوش و خرد سے بہت دور بے خبری کی کسی وادی میں اتر رہا تھا۔

میری آنکھوں نے اس کیفیت میں جو آخری منظر دیکھا وہ دین کے ڈیش بورڈ کا منظر تھا جہاں اسپینڈ میٹر کے ساتھ ہی نارتھ کی اس کا ڈائل بھی تھا۔ نارتھ کی اس (قلب نما) کی سوئی بتا رہی تھی کہ ہم شمال کے شمال کی جانب گامزن ہیں۔ الا کہ تو پہلے ہی کرۂ ارض کے انتہائی شمال میں واقع تھا۔ پتا نہیں یہ شاطر یہودی ہمارے لیے اپنے ذہن میں کیا سوچے بیٹھے تھے۔ کہیں یہ لوگ ہمیں نارتھ پول پر لے جا کر جھینکے کا ارادہ تو نہیں رکھتے!

☆☆☆

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک سنگلاخ کمرے میں پایا۔ میں حیرت اور دلچسپی سے اس کمرے کے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے پر کیا؟ وہاں تو چاروں طرف صرف دیواریں ہی نظر آرہی تھیں دروازے کا نام و نشان کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا البتہ ایک دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی ضرور موجود تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

پہلی مجھے احساس ہوا کہ میں کسی گدے پر ہوں۔ وہ ایک چھوٹا سا ہرنگ والا میٹرکس تھا جس کی لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی محض دو فٹ تھی۔ مذکورہ میٹرکس اس مختصر سے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بچھا ہوا تھا۔ اس سنگلاخ کمرے کا سائر آٹھ ہائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کسی پہاڑی کو بڑی مہارت سے تراش کر وہ کمرہ جو دل میں لایا گیا تھا۔

میں میٹرکس سے نیچے اتر آیا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس پتھر لیے کمرے کی صحت کا اندازہ ہوا۔ فرش اور چھت کے

درمیان بھی آٹھ فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک بچی چھت والا کمرہ تھا۔ میں تو دوسرا سا چپکے اس کمرے کی صحت کو چھو سکتا تھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں مجھے ایک چھوٹی سی چوڑی میٹرکس نظر آئی۔ میٹر پر پانی سے بھری ہوئی ایک بوتل رکھی تھی۔ لہذا یہ پانی میرے ہی لیے تھا کیوں کہ اس کمرے میں۔ میں ہی میں تھا دوسرا کوئی نہیں تھا۔ لامحالہ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔

ہم دونوں کو ایک جیسے "فریشٹ" سے گزارنے کے بعد ایک ساتھ اس آکھن وینک میں سوار کرایا گیا تھا۔ وینک میں بیٹھنے کے توڑی دیر بعد میں اشفاق پھیل ہو گیا تھا۔ میری آنکھ اس چھوٹے سے چٹائی کمرے میں کھلی تھی تو میں ممکن تھا ساحل کو بھی کسی ایسے ہی کمرے میں پہنچایا گیا ہو۔ بہر حال اس مجھ سے الگ کر دیا گیا تھا۔

مجھے پوری سوچ پر خود ہی آگئی۔ الگ کر دینے والی بات تو میں ایسے سوچ رہا تھا جیسے اس سے پہلے وہ میرے ساتھ تھی میرے ہاتھ میں!

میں کمرے کی دھند کھڑکی کے پاس آ گیا۔ وہ نہایت ہی مختصر اور عجیب و غریب کھڑکی تھی۔ اس کی کل پینٹ آٹھ ہائی دس انچ ہوگی۔ دس انچ چوڑی اور آٹھ انچ اونچی۔ کھڑکی کے نیچے حصے میں چوڑائی کے رخ اٹھل کی ایک انچ موٹی سلاخ نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ تقسیم بھی مجھے میں نے آنے والی تھی۔ اس مضبوط سلاخ کی تنصیب نے کھڑکی کو "ان دن" بنا کر رکھ دیا تھا۔ چلا پورن دو ہائی دس انچ کا قلاب کہ اوپر والا حصہ پانی دس انچ کا۔ یہ مخصوص قسم کی کھڑکی تھا کسی مفید کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی بنائی گئی تھی۔

میں کھڑکی کے نزدیک کھڑا اس کی تعمیر کے مقاصد پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب دیوار میں مجھے ایک دروازہ نظر آئی۔ مذکورہ دروازہ دو دیواروں کے سنگم پر ایک کونے میں واقع تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس دروازے کے اندر جھانکا۔ ایک فٹ کے اس خلا کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا دایں دروازہ نظر آیا۔

وہ دروازہ حقیقت ایک فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبائی ایک تنگ سارا ستون جس میں پہلو کے بل ٹھکے ہوئے مذکورہ ہاتھ روم تک پہنچا جاسکتا تھا۔ میں کھڑکی والی دیوار سے پشت کا کر دیر سے میرے ٹھکے اور سر کے ہوئے ہاتھ روم کے اندر پہنچ گیا۔ وہ تین ہائی تین فٹ کا ایک چوکور سا دایں تھا جس میں ایک کونے میں کمزور نصب تھا۔ دوسری جانب دیوار کے ساتھ دایں بین لگا ہوا تھا۔ دایں بین کے دایں ہاتھ دیوار کی روٹ بھی نصب تھا۔ ایک کونے میں چھوٹی سی دیوٹ بین کی

دکانی دے رہی تھی حیرت انگیز طور پر اس ہاتھ روم میں مجھے کھڑکی یا دروازہ دکھائی نہ دیا۔ پتا نہیں دیکھنی لیکن کا کیا بددست تھا۔ وہاں کسی قسم کی بدبو یا کھن محسوس نہیں ہوئی تھی۔ صابن تولیا یا آئینہ نام کی کوئی شے وہاں نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اس دایں روم کو "کمرہ چلاؤ" کا نام دیا اور وہیں دیوار کے ساتھ سرکتے ہوئے اس کوٹری نما چٹائی کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں کسی دروازے کی غیر موجودی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ پتا نہیں اس کمرے میں آمد شد کا کیا ذریعہ تھا۔ انہوں نے مجھے بھی تو اس کمرے میں پہنچایا تھا!

ایسا سوچتے ہوئے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں بے انتہا تعجب سے اپنے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے لگا۔ میرے مذکورہ اعضا میرے تابع تھے اور میری مرضی کے مطابق حرکت کر رہے تھے۔ خدا جانے یہ ہمارے ہونے کے بعد میرا اس طرف وہاں کیوں نہیں گیا تھا؟ آنکھن وینک میں بیٹھنے تک تو یہ بے حس و حرکت تھے۔ شاید یہ اس آنکھن کا اثر تھا جو وہاں سے اتنے وقت میری گردن کے نزدیک دیا گیا تھا یا پھر یہ بھی ممکن ہے میرے دشمنوں نے مجھے اپنے ہاتھ پاؤں کا کرنے کے لیے کولی اور ترکیب آزمائی ہو!

دشمن بھی آسانیاں اور سہولتیں فراہم نہیں کرتا۔ اگر ان یہودیوں نے میرے جسم کو حرکت کے قابل بنادیا تھا تو اس کا بھی مطلب تھا وہ کسی اور انداز میں مجھے پہلے سے بھی کہیں لپٹا دیا ہوتا ہوتا ہے۔ میں وہاں میٹرکس پر آکر بیٹھ گیا اور اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کوٹری کا دھند روزانہ وہ مختصری کھڑکی تھی جس میں میں اس کی مضبوط سلاخ نصب تھی۔ میں اس سلاخ کو بھینچ کر اندازہ لگا چکا تھا وہ دیوار میں بہت دور تک کھنسی ہوئی تھی۔ اسے نکال کر باہر کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بے فرض حال "گرنس" "جی" کی قوت کو آزما کر کھڑکی کو سلاخ سے خارج کر دیا جاتا تو وہی آٹھ ہائی دس انچ کے خلا سے باہر نکلتا نامکن تھا کوئی ایجنٹوں نے مجھے "کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!" والی آزادی دی تھی!

میں میٹرکس پر غم دراز ہو گیا۔ اس گدے پر پھیل کر لیٹا تو دیکھ ہی نہیں تھا۔ میری انگلیں کھنکھن سے نیچے فرش پر پڑیں۔ اگر پاؤں کو گدے پر کھتا تو کھدے کھدے گردن سمیت اٹھ جاسکتے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ میں سٹ پٹا کہہ کیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

ساحل کے حوالے سے ایک سوال ذہن میں جم کر بیٹھ گیا۔

تھا۔ کراچی میں شیعہ غوری اور پھر بعد میں طوٹے کی چونچ جیسی ناک والے یہودی نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ ساحل کسی بیش بہا خزانے کے راز سے واقف ہے جس کی روحانی اہمیت بھی ہے اور یہی بات مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں ساحل کے بارے میں ایسا نہیں سوچتا تھا لیکن یہودی لابی کی سرگرمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں اس سلسلے میں جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا چلا رہا تھا۔ میری سوچ اس کوٹری کی پتھر کی دیواروں اور چھت سے ٹکرا کر واپس آجاتی اور مجھے ہر حال میں ساحل ایک سیدھی سادی اور محسوس لڑکی نظر آتی۔ وہ لڑکی تو اپنے حسن و شباب کے خزانے کا پوری طرح اور اک نہیں رکھتی تھی کسی ارضی یا سادی خزانے سے کیا واقف ہوئی!

اجانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور سوچ کا پھیر والا سا کی اس کوٹری سے پرواز کر کے کھنڈوں کے مضامین میں پہنچ گیا۔ میری نگاہ اس کوٹری کی چٹائی صحت پر گئی تھی لیکن تصویر آنکھ سے میں پکڑا لیا ہوا بدل کھ کی عبادت گاہ کو دیکھ رہا تھا۔ تصور اور حیل حیرت انگیز رفتار سے اڑان بھرے ہیں اور پلک جھپکنے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سر۔ یہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

کھنڈوں کے اس مضامین پہاڑی علاقے میں ناگ پال کے خون خوار آدمی میرے قلاب میں تھے۔ میں زخموں سے چورسما کو سنبھالنے اپنی جان بچاتے ہوئے اس عبادت گاہ کی طرف نکل آیا تھا۔ ساحل یعنی دھن سے میری پہلی ملاقات اسی بدھ عبادت گاہ میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاں باب کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ ساحل (دھن) کا باب تھوڑی بدھ کھنڈوں تھا تاہم اس عبادت گاہ کا انتظام و انصرام اسی کے ذمے تھا۔ تھوڑی بدھ سال پہلے اپنی یہودی ہمیر جانی کی عزت بچاتے ہوئے اس عبادت گاہ تک پہنچا تھا جو ہزاروں سال سے دریا کے کنارے ایک کوہ کے دامن میں موجود تھی۔ یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ میری داستان کے ابتدائی حصے میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

تھوڑی اور ہمیر جانی نے نہ صرف ہمیں پناہ دی بلکہ میرے زخمی ساتھی سب کا حتی المقدور علاج بھی کیا۔ تھوڑی مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کے مطابق میں ہر اسرار کھنڈوں کا مالک ایک سپا انسان تھا۔ اسی اخبار اور خیال کے نتیجے میں اس نے مجھے عبادت گاہ کے درخانے میں پوشیدہ ایک سر بستہ راز سے بھی آگاہ کر دیا۔ میں اس کی معیت میں مختلف خفیہ اور اسرار استوں سے گزر کر عبادت گاہ کے در



خانے میں پہنچا تھا جہاں مہاتما بدھ کا دس فٹ بلند سونے کا مجسمہ تیار تھا جس کا کھیر کی بھی طور پر پانچ فٹ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ اس رخانے اور ہاں تک پہنچنے والے طویل غار میں بھی جابجا سونے کی ڈلیاں پڑی تھیں۔ اسی طرح دیواروں پر بھی سونے کی مخصوص آب و تاب دکھائی دیتی تھی۔ میں اس حیرت کہ سے میں شل دیکھتا تھا۔ میں نے اتنا زیادہ سونا کسی ایک جگہ پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ تعجبی نے اس موقع پر مجھے بتایا کہ اس راز سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں۔ ہر دور کا دلائی لاما اور اس کے قابل اعتماد چند افراد۔ اس عبادت گاہ کی حفاظت کرنے والے شخص کو بھی دلائی لاما کا مستند تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے تعجبی سے پوچھا تھا وہ مجھے کیوں اس راز سے آگاہ کر رہا ہے؟ تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا کہ میں بھی دلائی لاما کی نظر میں قابل اعتماد ہوں۔

کہیں یہ کم بخت یہودی اسی خزانے کی تلاش میں تو نہیں سرخڑے تھے؟

سوال اگرچہ بہت اہم تھا لیکن میں اس سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک بیش بہا خزانہ تھا۔ اگر دلائی لاما کی عمرانی میں تھا تو اس کی روحانی حیثیت اور اہمیت بھی مسلم بھی مگر سائل (دھن) کو اس راز کے ساتھ متعلق کرنا مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ لوگ اس خزانے کے وجود سے آگاہ تھے تو پھر یہی ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ راز صرف توہنجی تک محدود تھا۔ اس نے اپنی بیوی یا بیٹی کو اس راز میں شریک نہیں کیا ہوگا۔۔۔۔۔ اور تعجبی اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ ناگ پال کے وحشی بھینس یوں نے تعجبی اور بھیر جانی کو بھیمانہ انداز میں قتل کر دیا تھا۔

یہ بات صرف مجھ تک محدود تھی کہ مجھے دھن کے ساتھ اس رخانے میں جیسے کی ضرورت پیش آئی تھی اور میں نے یقین کر لیا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ اس جادوگر کی میں اتری تھی۔ بہر حال وہ سونے کے اس راز سے واقفیت حاصل کر چکی تھی۔ اگر اس بنیاد پر یہودی لابی دھن کی تلاش میں تھی تو پھر انہیں اتنی ہی شدت سے میری بھی ضرورت ہونا چاہئے تھی۔ اگرچہ اس وقت ہم دونوں ان کے قبضے میں تھے تاہم وہ لوگ اول آخر سائل کو مجھ سے الگ تصور کر رہے تھے۔ اس کے معاملے کو مجھ سے جدا بیان کر رہے تھے۔ چنانچہ یہ کیسا گورکھ دھندا تھا! میرا ذہن سوچ سوچ کر کھڑکی کے چالے کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اس تاریک گھوٹ میں پھنس کر رہ جاتا مجھے چونک جانا پڑا۔

باہر قدموں کی آواز ابھری تھی۔ یہ مخصوص چاب اس

کونھری کی اکلوتی کھڑکی کے راستے سے مجھ تک پہنچی تھی جیسا کوئی شخص اس طرف آ رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نہیں جانتا تھا اس کھڑکی کے پار کوئی راہ داری تھی یا کوئی ہال وغیرہ۔ دوسرے مناسب روشنی کونھری کے اندر پہنچ رہی تھی تاہم اس روشنی کا خاند دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اندر کا اچالا باہر کارہین منت تھا۔ میں مبر و سکون کے ساتھ آنے والے کا انتظار کرتے لگا۔

پھر کھڑکی میں مجھے اس کی صورت نظر آ گئی۔ وہ راکا ایک لمبے کے لیے جھکا ہوا سیدھا ہو گیا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اس نے کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں میٹر میں چھوڑتا وہ ایک مرتبہ پھر جھک گیا۔

میں سبک قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ کھڑکی اس دیوار کے عین وسط میں نکالی گئی تھی۔ تین فٹ اٹھ انچ جگہ اوپر اور اتنی ہی جگہ نیچے تھی۔ میں کھڑکی کے نزدیک پہنچا تو مجھ کا ہوا بعض ایک باہر پھر کھڑا ہو چکا تھا۔

وہ شکل مصورت سے کوئی امریکی ہی نظر آتا تھا۔ اس نے سکھوں کی گاڑی والی وردی پہن رکھی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے نظر آئی۔ میں نے سواہیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس شخص نے کھڑکی کے زیر پرورش سے وہ ٹرے میری جانب دھکیل دی۔ مطلب یہی تھا میں اس ٹرے کو کھام لوں۔

اس دیوار کی چوڑائی لگ بھگ دو فٹ تھی تاہم اسٹیل کی مضبوط سلاح دیوار کے اندر دینی کنارے کے قریب نصب کی گئی تھی تاکہ دیوار کی چوڑائی کا فائدہ صبر کو نہیں بلکہ صابو کو پہنچے۔ ٹرے سلاح کے نیچے سے میرے ہاتھوں میں پہنچ گیا تو وہ شخص ایک دھنچہ جھکا۔ میں خاموش کھڑا ٹرے کھائے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری اور زبان خاموش تھی۔

دو تین مرتبہ جھٹکے اور اٹھنے کے بعد اس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ اس اٹھک جھٹکے کے نتیجے میں کھانے پینے کی چند اشیاء ٹرے میں منتقل ہو گئیں۔ وہ ان چیزوں کو ٹرے میں رکھ کر وہاں تک پہنچا تھا پھر ایک مٹا کر کرنے والے انداز میں کونھری میں جھٹک پہنچا دیا تھا۔

میں نے ٹرے کو کھائے کھائے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "میں اس وقت کہاں ہوں؟" تو قلع کے مطابق مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ اس سکھوں کی گاڑی نے بڑی سرد مہری سے مجھے گھورا اور اسی جانب

ندیم بڑھادیے ہر دم سے وہ آتا تھا۔ میں ٹرے کے میٹر میں لپکا اور کھانے پینے کے ان لوازمات کا جائزہ لینے لگا۔ ایک خوب صورت اور صاف سترے گم میں خوش بو اڑانی کافی تھی۔ ایک گوشت کی عجیب و غریب ڈش تھی۔ چند ملاسن تھے۔ جام اور چمیلی کے سامنے تھے اور دو نروں۔ یہ بڑا رالائینیشن تھا۔

کسی بھی شے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے میں نے اس سے شدہ کاغذ کا ٹھکانا جو ڈزرنر کے نیچے دیا ہوا تھا۔ بکھرنی گاڑی نے مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں کیا تھا تو کیا ہوا! ایک شاہد تحریر کی طور پر مجھ سے خطاب ہو رہے تھے۔ میں نے نہ شدہ کاغذ کو کھولا اور پڑھنے لگا۔

نہایت سلیس انگریزی میں مجھے خطاب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا "مسترد جان! یہ تمہارا ناشتا ہے۔ بے فکر ہو کر ہر شے کھا سکتے ہو۔ ہم نے کسی بھی آئیٹم میں کچھ نہیں ملا یا۔ تمہاری زندگی ہمیں بہت عزیز ہے کیونکہ تمہارے مستقبل قریب میں بہت مفید ثابت ہونے والے ہو۔ آدمی مجھے بعد برنارڈ لیونم سے ملاقات کریں گے لہذا کھانے کی کچھ طرح فریش ہو جاؤ۔ تمہارا ذہنی اور جسمانی طور پر چاقی جو بند رہنا نہایت ضروری ہے۔"

اس مختصر تحریر نے مجھے معنے میں ڈال دیا۔ اس تحریر کا خطاب الفاظ اور انداز سے دوستی جھلکتی تھی۔ گراچی سے اینکریج تک ہمارے ساتھ جو سولہ گیا تھا وہ بدترین دشمنی کا نماز تھا البتہ اینکریج کی اس عالی شان عمارت میں ہمیں خصوصی "فریٹ" دیا گیا تھا۔ بہر حال یہ تحریر میری سمجھ سے باہر تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ یہودی کوئی نہایت ہی خطرناک چال کے موڈ میں تھے۔ ان کا یہ تازہ ترین رویہ خاصا الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ برنارڈ لیونم تھا اور مجھ سے جس سلسلے میں ملاقات کرنے والا تھا۔ اس تحریر میں برنارڈ لیونم جس عزت و احترام سے بیان کیا گیا تھا اس سے تو یہی لگتا تھا وہ ان کا کوئی نہایت اہم آدمی تھا۔ وہ کوئی رنبی وغیرہ بھی ہو سکتا تھا!

میں نے داش ردم کا معائنہ کرنے کے دوران میں جین برکٹ سے ہو کر چند چھپا کے اپنے چہرے پر مار لیے تھے اور ہاتھوں کو بھی اچھی طرح دھویا تھا لہذا ناشتا شروع کرنے سے پہلے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔

اس وقت مجھے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ٹرے میں موجود سامان خورد و نوش اس بھوک کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا تاہم میں نے اس موقع پر بہت زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ سامان کی ڈش کو تو میں نے بالکل ہاتھ نہیں

لگایا۔ چنانچہ وہ کون سے ایسے دیسے جانور کا گوشت تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا یہودی جانور کا جھکا نہیں کرتے باقاعدہ ذبح کر کے کھاتے ہیں پھر بھی حالات ایسے نہیں تھے کہ میں آنکھیں بند کر کے اس پرچی کی تحریر پر بھروسہ کر لیتا اگرچہ رالم الحروف نے اس سلسلے میں مجھے بڑی تسلی بخشی تھی۔

میں نے جام، چمیلی، ملاسن اور کافی پر اکتفا کیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا اس کا میں بعض نہایت مثلاً معقول جانور بھی پائے جاتے تھے سوئی کھال والی بڑے ساڑی کی بھینز کھائے تیل اور برقانی کھارکین میں کسی قسم کے رسک کے موڈ میں نہیں تھا۔ کیا پتا لگنے ہالوں والا کوئی برقانی رچھ میرے معدے میں اتار دیا جاتا!

میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ نیلی آنکھوں والا وہ سکھوں کی گاڑی کھڑکی کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ ادا کئے بغیر مجھے برتنوں کی واپسی کا اشارہ کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہاں نہایت ہی جیتی ہوں جنہیں استعمال کرتے ہوئے بہت کچھ سوچنا کھانا پڑتا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا وہ شخص کسی مصلحت کے تحت میرے سامنے زبان نہ کھول رہا ہو اسے اس سلسلے میں سخت ترین ہدایات دی گئی ہوں۔ یہ خیال قرین قیاس تھا کیونکہ مجھے خطاب کرنے کے لیے بھی تقریر کے بجائے تحریر کا سہارا لیا گیا تھا۔

میں نے خالی اور بھرے ہوئے برتنوں سمیت وہ ٹرے اس شخص کو واپس کر دی۔ یہ خشکی اسی طریقے سے ہوئی تھی جیسے وہ ناشتا کونھری کے اندر پہنچایا گیا تھا۔ سکھوں کی گاڑی نے ٹرے میں موجود سامان کا یہ غور جائزہ لیا اور خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ ٹرے کو گھورنے کا اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہو میں نے کوئی برتن اپنے پاس تو نہیں رکھا کیا!

تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے باہر ایک مرتبہ پھر اچھل کے آچار نمودار ہوئے۔ میں نے چند چلے ہوئے قدموں کی آواز سنیں اور پوری طرح کھڑکی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آدھا گھٹنا زچکا تھا۔ یہ میں نے اندازہ لگا یا ہے ورنہ وقت بتانے والا کوئی آلہ مجھے میسر نہیں تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا اس وقت دن تھا یا رات! میرے خیال کے مطابق اب مجھے برنارڈ لیونم کے پاس لے جایا جائے والا تھا۔

لیکن اگلے ہی لمحے میرے اس خیال کی تردید ہو گئی۔ وہ لوگ فی الحال مجھے اس کال کونھری سے نکالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ برنارڈ لیونم نامی وہ شخص بہت قریب کھڑکی کے باہر

ہنچنے والا تھا کہوں کہ ایک آرام دہ محفل کرسی کو وہاں رکھ دیا گیا تھا۔ مذکورہ کرسی دو افراد نے وہاں پہنچائی تھی اور وہ جس خاموشی سے آئے تھے اسی خاموشی کے ساتھ کرسی وہاں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ ان کے اجسام پر بھی سکینری گارڈز والے یونیفارم تھے۔

امریکی خصوصاً یہودی وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ برنارڈ یونے بھی مجھے زیادہ انتظار نہیں کرایا اور کرسی وہاں ہنچنے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ اس کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ میں کونکر کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

برنارڈ یونے میری جانب دیکھتے ہوئے سر کو خفیف سی انجمی جنبش دی۔ شاید یہ اس کا ”ہیلو ہائے“ کا انداز تھا۔ میں گہری نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی عمر اسی کے قریب ہو گی تاہم وہ خاصا صحت مند اور فٹ تھا۔ اس کی چوکی کا مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا جب وہ تیز اور مستعد قدموں سے چلتے ہوئے اس کرسی تک پہنچا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ رہا ہوگا، سر کے بال اور بھویریں تک سفید اور پیشانی بڑی حد تک صاف ہو چکی تھی۔ گویا وہاں ”ایٹم“ نمودار ہو چکا تھا۔ رنگت سرخ و سفید چہرہ بیضی آنکھیں نیلی اور حسیلی، ٹھوڑی فریب اور چوڑی جواس کے دولت مند ہونے کی علامت تھی۔ پیشانی کی کشادگی اور آنکھوں کی گہرائی سے ذہانت مترشح تھی۔ اس نے رکی ملیک ملیک کو ضروری نہ سمجھا اور براہ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”مسٹر ویدمان! ہمارا مہمان بن کر تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“

”نہایت ہی دلیلیات!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ششہ انگریزی میں جواب دیا۔ ”لگتا ہے تم لوگ ”مہمان“ کے مفہوم سے نا آشنا ہو۔ مہمان داری تو بہت دور کی بات ہے!“

وہ میری اس ترش کھائی کو بڑے قہقہے سے ہلکی سی ہنسی سے لے لیا۔ ”مہمان نوازی کے آداب اور طریقہ جدا جدا ہیں۔“

”مجھے تم لوگ اپنا دوست سمجھتے ہو۔ یاد رکھیں! میں نے بدستور سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ”اگر تم کہو گے دوست تو مجھے یقین نہیں آئے گا۔ تم لوگوں نے ہمارے ساتھ بدترین دشمنوں ایسا سلوک کیا ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ جانی تم ہو سکتا ہے۔“

ہو اور نہ ہی دشمن۔ تمہارا آئندہ رویہ تمہاری حیثیت کا تعین کرے گا۔“ ایک لمحے کو متوقف ہونے کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ ”بہر حال اب تک تمہارے ساتھ جو بھی ناروا سلوک ہوا وہ ہماری مجبوری تھی۔ تمہاری خطرناکی نے ہمیں بے حد محتاط بنا دیا تھا۔“

میں نے اس سے اپنی خطرناکی کی تفصیل نہیں مانگی اور براہ راست متھد کی بات کی طرف آ گیا۔ میں بھی ایک لمحہ ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔

”تم نے میرے آئندہ رویے اور حیثیت کے تعین کی کیا بات کی ہے؟“

”خاصے سمجھ دار ہو۔“ وہ سر ہلنے والے انداز میں بولا۔ ”میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم تمہیں دوست بنانے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔ اگر تم نے ہماری بات مان لی تو زندگی بھر پیش کرو گے۔“

میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”تم کون لوگ ہو؟“

”ہمارا تعلق یہودی لابی کے ایک اعلیٰ دارن چلتے سے ہے۔“

”تم لوگوں نے امریکی سی آئی اے کے تعاون سے مجھے الٹا سا پہنچایا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی تو یقین ممکن ہے کہ میں اس وقت سی آئی اے والوں کے درمیان ہوں؟“

”میں تمہیں ایسا سوچنے سے روک تو نہیں سکتا البتہ یہ ضرور کہوں گا ہمارا تعلق سی آئی اے اور ایف بی آئی والوں سے ہرگز نہیں۔ ہم جس یہودی تنظیم سے وابستہ ہیں اس کا نام ”جے ڈی لی“ ہے۔ یہ راز ہمارے چند خاص خاص لوگوں تک محدود ہے۔ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے قوی امید ہے ہم تمہیں اپنا دوست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ہر فرض محال اگر ایسا نہیں بھی ہو سکا تو بھی تم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ تم نہیں جانتے اس وقت تم کہاں ہو اور آئندہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟“

اس کے الفاظ میں چھپی ہوئی دھمکی کو میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

”مسٹر لیو! چلو میں تسلیم کر لیتا ہوں تم سی آئی اے یا ایف بی آئی والے نہیں لیکن تم نے جس طرح سی آئی اے والوں کے تعاون سے مجھے مجبور کر کے ہمارے ساتھ لگا کر رکھا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ تمہارے لیے کام کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تم لوگوں کا اچھا خاصا اثر ہے ان پر؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

لہجے میں بولا۔ ”سی آئی اے ہو یا ایف بی آئی یا پھر پشٹاگوں ہو۔ ادارے ہمارے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ تمہیں ”جے ڈی لی“ کی طاقت کا شاید اندازہ نہیں!“

”جے ڈی لی کا لفظ یا الفاظ میرے لیے نئے ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں یہودی لابی اس وقت بہت طاقت میں ہے۔ امریکا کا مدداری نظام ان کی مرضی کے مطابق چلتا ہے۔ وہ جس کو چاہیں کرسی صدارت پر بٹھا دیں اور جسے چاہیں عوام کی نگاہ میں ڈھیل دے سوا کر دیں۔“

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ نے عجیب سا تاثر ابھارا۔ رعوت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہم کنگ میک ہیں۔ صرف امریکا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہماری حکمرانی ہے۔ ہم لوگوں کو قوموں اور ملکوں کی تقدیر لکھتے ہیں۔ تم ہماری دوستی پر ناز کرو گے۔“

میں نے اسے کھنکھنے کی خاطر پوچھا۔ ”مجھ پر سنگین الزامات عائد کر کے پاکستان سے یہاں لے آیا گیا ہے اور اب تم میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو۔ میں تو توقع کر رہا تھا مجھے ڈی سی پہنچایا جائے گا مجھ پر مقدمہ چلے گا اور سخت ترین سزا سے گزارا جائے گا جیسا کہ تم لوگ ایمل کاسی کے ساتھ کرنے والے ہو مگر تمہارا حالیہ رویہ دیکھ کر میں انجمن میں پڑ گیا ہوں۔ یہ تم لوگوں کی کون سی پالیسی ہے؟“

”ایک تو تمہیں غیر متعلق لوگوں کو اپنے ساتھ متنی کرنے کا بڑا شوق ہے۔“ اس نے برا سامنے بتاتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف اپنے بارے میں سوچو، ایمل کاسی اور دھونو تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“

میں تڑپ کر رہ گیا۔ ایمل کاسی سے واقعی میرا کوئی تعلق واسطہ کسی نہیں رہا تھا لیکن دھونو یعنی ساحل تو میرے لیے رگ و جان کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ محسوس برنارڈ یونے سے غیر متعلق کہہ رہا تھا۔ میرے چہرے پر ابھرنے والے ناگواری کے تاثرات کو اس نے فوراً نوٹ کر لیا۔

”ایک تو تم مشرقی لوگ خصوصاً پاکستانی بہت جوشیلے اور جذباتی ہوتے ہو۔ تم میں عمل اور برداشت نام کی کوئی چیز نہیں۔ تمہارے احساسات کو ذرا سی جھٹکے تو فوراً بھڑک اٹھتے ہو۔“

میں نے اس کے تبصرے پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار اس طوطا مار کاٹک والے یہودی نے بھی کیا تھا۔ میں خاموشی سے برنارڈ یونے کو گھورتا رہا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری تسلی کے لیے بتا دوں کہ ایمل کاسی امریکی سی آئی اے کا مجرم ہے۔ اس نے نہایت ہی اہم امریکی انجینئرس کو قتل کیا تھا۔ سی آئی اے والوں نے اسے پکڑنے کے لیے وقت اور الزار بے دریغ خرچ کیے ہیں۔ اب اس پر امریکی قوانین کے مطابق باقاعدہ مقدمہ چلے گا اور اس کا جو بھی حشر ہوگا وہ دنیا دیکھے گی۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شاید یہ بات تمہارے علم میں نہ ہو کہ ایمل کاسی ایک طویل عرصے تک سی آئی اے والوں کے لیے خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں ایک پھوڑا اٹھا اور وہ سی آئی اے کا دشمن ہو گیا۔ اسی خواہ مخواہ کی دشمنی میں اس نے سی آئی اے کے انجینئرس کو قتل کر دیا۔“

”واقعی مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی!“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں غیر متعلق معاملات میں مت کودو۔“

مجھے اس کا انداز بہت برا لگا اور میں نے ناگواری سے کہہ دیا۔ ”ایمل کاسی کا معاملہ تو ایک طرف رہے دو لیکن ساحل میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اسے غیر متعلق نہیں کہہ سکتے؟“

وہ خاموش نظر سے چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”تم دونوں کی مکمل رپورٹ ہم تک پہنچ چکی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے درمیان کس قسم کا تعلق ہے لیکن تمہاری معلومات کے لیے بتا دوں کہ جب تک تم ہمارے دوست نہیں بن جاتے ہم تم دونوں کو آپس میں لے نہیں دیں گے۔ دونوں معاملات کو الگ ڈھیل کیا جائے گا۔ ہماری دوستی کا ہاتھ تمام لینے میں تم دونوں کا فائدہ ہے۔“

شیب غوری اور ازاں بعد سی آئی اے کے انجینئر کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہودی لابی ساحل میں کسی پیش بہا خزانے کی وجہ سے دلچسپی لے رہی ہے۔ اسی لابی کا ایک نمائندہ برنارڈ یونے اس وقت مجھ سے مذاکرات کر رہا تھا۔ میں نے سوچا اس کو کربہ ناچا ہے۔

”مسٹر لیو!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے پتا چلا ہے آپ لوگ کسی قیمتی خزانے کا راز جاننے کے لیے میری ساتھی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ یہ کیا پکڑ ہے؟“

وہ محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”دھونو ایک اصول خزانے کے راز سے واقف ہے۔ وہ خزانہ مادی اور روحانی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے رب کی موت نے ہمیں اس خزانے کو حاصل کرنا چاہیے ہیں۔“

موٹے ہاتھن..... یہ ایک نیا نام سامنے آیا تھا۔ لیو سے لب و لہجے میں شامل ادب و احترام یہ ظاہر کرتا تھا مذکورہ ربی کوئی بہت ہی اونچی چیز تھا۔ میں نے کرید جاری رکھی اور سرسری انداز میں کہا۔

”ساحل یعنی دھنوا تو ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ تم کسی خزانے کے راز کو اس سے منسوب کر کے مجھے حیرت میں ڈال رہے ہو!“

وہ چند لمبے ٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر استفسار کیا ”کیا تم اس خزانے کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے؟“

میں نے بے پروائی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

وہ بے یقینی سے بولا ”دھنوا تمہارے بہت قریب ہی ہے۔ میرا خیال ہے اس نے اس بارے میں بھی نہ بھی تو ذکر کیا ہوگا!“

”اگر اس نے یہ بات مجھے بتائی ہوتی تو میں پہلی فرصت میں وہ خزانہ کھودنے نکل کھڑا ہوتا۔“ میں نے خالصتاً امریکی مزاج کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تمہاری بات پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ یہ دھنوا بہت ہی گہری اور مضبوط لڑکی ہے۔ ابھی تک اس نے ہمیں بھی کچھ بتا کر نہیں دیا۔“

میں آہستہ آہستہ اسے اپنے ٹریپ میں لارہا تھا۔ چاکلک میں نے ایک ہاؤس ربار دیا ”کہیں اس خزانے کا تعلق بدھ متل کنڈ کی عبادت گاہ سے تو نہیں؟“

برنارڈ یو پیکی اور سیدی ہالٹر پر کانی رنز اسکو کر چکا تھا۔ میرے ہاؤس نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ”ہاں وہ خفیہ خزانہ اسی عبادت گاہ کے در خانے میں پوشیدہ ہے۔“

میں لیوں پر طنز پر مسکراہٹ سجا کر اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

اگلے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ لیکن اب کیا جوسکتا تھا ”تیر“ کمان سے نکل گیا تھا۔ وہ نادانستی میں مجھے اپنی سوچ کے بہت قریب لے آیا تھا تاہم وہ ایک یہودی تھا۔ اپنی فطری عیاری کو استعمال کرتے ہوئے اس نے تشویش ناک لمحے میں مجھ سے استفسار کیا۔

”کیا تم بھی اس راز سے آگاہی رکھتے ہو؟“

”بالکل نہیں“ میں نے قطعی طور سے کہا۔

”پھر تم نے بالکل درست حوالہ کیسے دیا؟“ اس پر ایک

کرید سوار ہو گئی تھی۔

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ”میں نے ایک اندازہ لگایا تھا جو اتفاق سے درست نکل آیا۔“

”درست اندازہ لگانا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں!“ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا ”دراصل ساحل (دھنوا) سے میری پہلی ملاقات اسی عبادت گاہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ میرے ساتھ ہی رہی ہے اس لیے میں نے سوچا اگر وہ کسی خزانے کے راز سے واقف ہے تو لا محالہ اس کا تعلق اسی بدھ عبادت گاہ سے ہوگا!“

”ہم تمہارے پیدا ہونے سے لے کر اب تک کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔“ وہ بدھ برانداز انداز میں بولا ”تم ٹھنڈے و مضافات میں واقع اس عبادت گاہ تک کیسے پہنچے اور اس کے بعد اب تک کیا کرتے رہے ہو اس کی ہمیں مکمل خبر ہو چکی ہے۔ تمہاری صلاحیتوں کو ناپنے اور بھانپنے کے بعد ہی ہم نے تمہارا انتخاب کیا ہے ہم کسی پرکاپا ہاتھ نہیں ڈالتے۔ تمہاری ہسٹری کا شاید ہی کوئی صفحہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہو!“

وہ میری ذات کو فکس کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے چالاکی سے موضوع بدل دیا اور کہا ”تم لوگ تو بے پناہ طاقت کے مالک ہوئے جب احباب اختیار رکھتے ہو۔ جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس عبادت گاہ کے در خانے کوئی خزانہ موجود ہے تو تم اسے کھود کر نکال لو۔ خواہ خواہ ساحل کی محتاجی کی کیا ضرورت ہے؟“

”ایسا کرنا اگر ممکن ہوتا تو پھر کیا بات تھی۔“ وہ بے دلی سے بولا۔

”کیوں ایسا کرنے میں کیا مشکل ہے؟“

”مشکل! اس نے غلامی میں گھورا اور بولا ”ہم یہ کوشش کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمارے ربی موٹے ہاتھن کا کہنا ہے اگر عبادت گاہ کے در خانے کو کھودا گیا تو کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا سوائے ہلاکت اور بربادی کے۔ اس خزانے تک پہنچنے کا طریقہ کار صرف دھنوا کو معلوم ہے اور..... ہم بہت جلد اسے تعاون کے لیے آمادہ کر لیں گے۔ وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اسے ربی کی بات ماننا ہی ہوگی۔“

برنارڈ لیو کی بات سن کر میرے ذہن میں توجہی کے الفاظ گونجنے لگے۔ ساحل کے باپ توجہی نے مجھے بتایا تھا جب بھی سونے کے اس بیش بہا ذخیرے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی تو عبادت گاہ میں خون کی ندیاں اٹھ آئیں اور درجنوں سیکڑوں ہلاکتیں وجود میں آئیں۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا

وہ یہودی بھی کچھ ایسی قسم کی باتیں کر رہا تھا اور..... یہ معلومات اس تک ان کے ربی نے پہنچائی تھیں۔ موٹے ہاتھن واقعی کوئی بہت پیچیدگی ہوئی شخصیت تھا۔

میں نے لیو سے پوچھا ”تمہارے ربی نے اس خزانے کی کوئی تفصیل تو بتائی ہوگی؟“

میں درحقیقت یہ جانتا چاہتا تھا وہ لوگ صرف سونے کے ذخیرے تک محدود تھے یا کھانی اس سے بھی آگے کی تھی۔ یہودیوں کا ربی بے پناہ روحانی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا درجہ روحانی اور مذہبی لیڈر استاد اور اسکالر جیسا ہوتا ہے۔ اس کے لیے روحانی پیشوا کے الفاظ زیادہ مناسب ہیں۔ وہ مادی اور روحانی علوم کا ماہر ہوتا ہے۔ ظاہر اور باطن کے بہت سے معاملات پر اسے تصرف حاصل ہوتا ہے۔

لیو نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”ربی موٹے ہاتھن کا کہنا ہے کہ اس عبادت گاہ کے در خانے میں سونے کے ایک بڑے ذخیرے کے علاوہ چاکلک نایاب اور انمول اسٹون بھی موجود ہیں۔ نایاب اور انمول ان معنوں میں کہ ان کے سائز، معیار اور تراش خراش کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ دنیا میں تہا دیکتا ہیں کوئی ان جیسا دوسرا وہ زمین پر نہیں پایا جاتا۔ وہ چاکلک ہائبرکٹ اسٹون روزی انبر الٹیمٹا ٹو پاز اور ڈائمنڈ ہیں۔ یہ پانچوں اسٹون جہاں بھی ایک ساتھ موجود ہوں وہاں بے پناہ روحانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ربی اسی حوالے سے ان میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“

میں صرف سونے کے ذخیرے کے بارے میں جانتا تھا۔ لیو نے اسٹونز کے حوالے سے جو انکشاف کیا تھا اس نے واقعی طور پر میرے ہوش اڑا دیے تھے اور سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی سوال ابھرا تھا کہ کیا واقعی ساحل کسی نایاب خزانے تک پہنچنے کا راستہ جانتی ہے؟ میرا سابق تجربہ اور معلومات اس سوال کا جواب نفی میں دیتے تھے۔ بہر حال یہودیوں کے ربی کے دعوے کو آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر وہ سونے والے ذخیرے کا درست پتہ دے رہا تھا تو اسٹونز والے معاملے کو یکسر درکار نہایت مشکل تھا۔ اس خطرناک سوال کا درست جواب ساحل ہی دے سکتی تھی اور..... ساحل میری دسترس میں نہیں تھی!

میں نے برنارڈ لیو سے پوچھا ”تم مجھے اتنی اہم معلومات دے رہے ہو۔ کیا تمہیں ڈر نہیں کہ میں یہاں سے نکلنے کے بعد تم لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہوں؟“

”مشکلات!“ اس نے نیم طنزیہ انداز میں کہا ”یہ سب تو

اس وقت ممکن ہوگا جب تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد کھیر لہجے میں بولا ”وہاں! تم اس وقت“ بے ڈی پی“ کے ایک نہایت ہی خفیہ آڈے پر ہو۔ تمہارے یہاں سے باہر نکلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم ہمارے دوست بن جاؤ۔“

”میں اس وقت الاسکا کے کس حصے میں ہوں؟“ بے اختیار میں نے پوچھا۔

وہ بڑے اطمینان سے بولا ”یہ بے ڈی پی کا ایک ایسا پراسرار ٹھکانا ہے جس کے بارے میں الاسکا کے پاس کچھ نہیں جانتے۔ یوں سمجھ لو ہم سب کے درمیان بھی ہیں لیکن کوئی آنکھ ہمیں دیکھ نہیں سکتی۔ یہ ایک ان سین زون ہے..... نا دیہ اور ماورائی مقام!“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہیں تم مجھے مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے تو یہ کئی ایسی نہیں چھوڑ رہے؟“ میں نے نفی سے کہا۔

”نہیں!“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا ”ہمیں ایسی کسی کوشش کی ضرورت ہے اور نہ ہی تم ایسی باتوں سے متاثر ہونے والے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

آخری جملہ اس نے میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے ادا کیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اناس سے پوچھ لیا ”تم نے میری بات کا جواب گول کر دیا ہے۔ ابھی تک یہ نہیں بتایا تمہارا یہ خفیہ آڈا الاسکا کے کس علاقے میں واقع ہے؟“

”اس سوال کا جواب تمہیں اس وقت دیا جائے گا جب تم ہماری دوستی قبول کرلو گے۔“ وہ گہری مسیجی کے سے بولا ”بہر حال یہ بہت ہی پاکیزہ اور صاف ستھرا مقام ہے۔ باہر کے لوگوں کو یہاں لانے کی ضرورت پیش آجائے تو پہلے انہیں منہلا دھلا کر اچھی طرح پاک صاف کر لیا جاتا ہے۔ تمہیں منکر تنج میں ملنے والا وہ ریسپیشن تو یاد ہوگا؟“

اس نے لفظ ”ریسپیشن“ پر خاصا زور دیا تھا۔ میرے تصور میں وہ بیجان خیر ہاتھ گھوم گیا جب روزی اور روزی نے مجھے ایک کنگ سائز ہاتھ میں مل کر دھوایا تھا۔ اس یادگار ہاتھ کو میں بھلا کیسے سکتا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں لگ بھگ آدھے بدن سے پیدا تھا لیکن پھر بھی مجھے منہلانے کے دوران میں روزی اور روزی نے اپنی گلاز انگلیوں سے وہ انگھیلیاں کیں جنہوں نے مجھے سنسناتا کر رکھ دیا تھا۔ میری زندگی کا بیش تر حصہ ہٹاک میں گزرا تھا جہاں مساج اندہ ہاتھ بار کی کوئی کمی نہیں۔ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھاں واک بھی ایک مساج پارلر چلائی تھی۔ مجھے یہ خوبی اندازہ تھا ایسے











بیتِ نبویؐ

- ✦ پناٹیزم کی ابتدائی تاریخ
- ✦ پناٹیزم کیا ہے؟
- ✦ پناٹیزم کے مزید طریقے
- ✦ پناٹیزم اور ذہنی گہرائیاں
- ✦ طبی استعمال
- ✦ اثر کی شدت
- ✦ جذباتی الجھنوں کا علاج
- ✦ روحانی قوتیں
- ✦ پناٹیزم کے ذریعے نخعی
- ✦ خامیاں دور

قیمت:- 50 روپے | ڈاک خرچ:- 23 روپے

کتابیات پناٹیزم  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802551-5802552-5895313  
kitabiat1970@yahoo.com  
رابطہ کیلئے:- C-63، III، کشین ڈی جی، مین روڈ، نورنگی روڈ، کراچی

”ہوسکا ہے۔“ وہ تانیہ کی انداز میں بولی ”اگر ہم ابھی مشن شروع کر دیں تو تم دونوں کو کھڑیوں سے نکال کر ایک مخصوص مقام تک پہنچا سکتے ہیں جہاں سے ہمارے دیگر دو ساتھی سمیں اپنے ساتھ لے کر جانے والے ہیں لیکن وہ پردگرم کے مطابق اس مقام پر کل پہنچیں گے لہذا یہ کام آج کر لینا نقصان کا باعث ہوگا۔ تم دونوں کے ساتھ ہی ہم بھی یہودی عتاب میں آجائیں گے۔ میرے بڑوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ تشکیل دیا ہے۔ تم ایک دن ہر کو لو تو اچھا ہے۔“ میں نے کہا ”برنارڈ لو نے مجھے سوچنے کے لیے صرف اسی رات کی مہلت دی ہے۔ صبح اگر میرا فیصلہ ان کے حق میں نہ ہوا تو مجھے ربی موٹے ہاتھن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ پتا نہیں اس کے بعد میرے ساتھ کیا حالات و واقعات پیش آئیں۔ یہ بھی ہوسکا ہے کل اس وقت تم میری کھڑی میں آؤ تو میں سمیں یہاں ملوں ہی نہیں!“

”تم مجھے ضرور یہاں ملو گے!“ وہ چڑوٹو لہجے میں بولی۔

”یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”میرے بڑوں کا منصوبہ بے داغ ہے۔“

”تمہیں اپنے بڑوں پر اتنا ہی بھروسہ ہے؟“

”تم ان سے ملو گے تو مجھ سے زیادہ بھر دسا کرنے لگو گے!“

”دیکھو گا!“ میں نے بے پردائی سے کندھے اچکا دیے۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”میں تمہارے اور لیو کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیل سے تو واقف نہیں البتہ اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہ لوگ تمہیں اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں مگر تمہیں ان کے کسی جال میں نہیں پھنسانا۔ یہ لوگ بہت ہی عیار اور مکار ہیں۔ دوستی کا ہاتھ بڑھا کر شہرگ کاٹ لیتے ہیں۔ اگر کل تمہارا جواب ٹی ٹی ہوا تو واقعی تمہیں ربی موٹے ہاتھن کے سپرد کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ اور میں اس وقت بھی تانے آئی ہوں کہ ربی موٹے ہاتھن کی طرف سے بہت چوکنار ہنا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہ کرنا۔ وہ پناٹیزم کا ماہر ہے فوراً تمہیں اپنے ٹرائس میں لے لے گا۔“

”کیا واقعی؟“ میں نے حرجت آمیز لہجے میں کہا۔

روٹی نے براہی نازک انکشاف کیا تھا۔ ربی اگر واقعی پناٹیزم اور ٹیلی پیٹی جیسی صلاحیتوں کا مالک تھا تو پھر ایک نہایت ہی خطرناک دشمن سے میرا پالا پڑنے والا تھا۔ مجھے اپنی ”جی“ اور یوگا کی قدرت پر اعتماد تھا۔ مارشل آرٹس کا شعبہ

کا کوئی کامل منصوبہ ضرور ہمارا کھا ہوگا۔ ہم تم لوگوں کو ان کے حوالے کر کے اپنے معمول پر آجائیں گے۔ مائیکل بھی میری طرح بظاہر بے ڈی ٹی کے لیے کام کرتا ہے لیکن اس کی دقت داریاں انہی لوگوں سے وابستہ ہیں جن کے لیے میں کام کر رہی ہوں۔“

”تم لوگ ہمیں کب۔ یہاں سے نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میں نے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”کل اسی وقت“ روٹی نے بتایا ”یہ رات کا آخری پہر ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے بعد سورج طلوع ہو جائے گا۔ سورج طلوع ہونے سے میری مراد طلوع کا وقت ہے ورنہ اس کی صورت دیکھنا تو ہرگز نصیب نہ ہوگی۔ میرے خیال میں غرار کے لیے یہ وقت زیادہ مناسب رہے گا۔“

چند لمبے سوچنے کے بعد میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”اگر تمہیں اور تمہارے بڑوں کو ہم سے اتنی ہی زیادہ ہمدردی ہے تو پھر وہاں انکسٹریج ہی میں ہمیں لے اڑائیں۔ اس چوہے دان میں چھسوٹانے کی کیا ضرورت کی؟“

”میں اپنے بڑوں کا حکم مانتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی ”ورنہ انکسٹریج میں تو یہ کام بہت ہی سہل ثابت ہوتا۔ میرا خیال ہے اس میں میرے بڑوں کی کوئی خاص مصلحت پوشیدہ ہے۔“

میں پوچھے باندھ رہا ”کیسی مصلحت؟“

”وہ لوگ شاطر یہودیوں کے منہ پر بڑے زور کا طمانچہ مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ وہ زہر خنجر لہجے میں بولی ”اگر تم دونوں انکسٹریج میں غائب ہو جاتے تو جاسن پلیدر اور دو چار دوسرے افراد کی نااہلی بھی جانی لیکن اگر تم لوگ اس زہر زہنہ۔۔۔۔۔ ٹھکانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو مجھے لا یہودیوں کا اعتماد کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ یہ لوگ اپنے ربی کو خدا جتنا قدرت والا سمجھتے ہیں اور اس کی صلاحیتوں پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ لیڈروں کی دست راست ہے۔ ان دو ظلم المرتبت شخصیات کے چنگل سے تمہارا نکل جانا کسی دھماکے سے کم نہیں ہوگا۔ اگر چہ اس دانے کو عام نہیں ہونے دیا جائے گا کیونکہ یہ ایک نہایت ہی خفیہ مشن ہے مگر تمہارے غرار سے ربی اور برنارڈ یو کی کمرٹوٹ جاتے گی۔۔۔۔۔ اور شاید میرے بڑے بھی چاہتے ہیں۔“

میں نے ایک اور اہم سوال کیا ”اگر آپ لوگوں نے ہمیں یہودیوں کی قید سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر کل کا انتظار کیوں کیا کہ تم آج۔۔۔۔۔ بلکہ ابھی فوری طور پر بھی ہوسکتا ہے؟“

”میں معلوم نہیں ڈی سی میں واقع فوجی ہیڈ کوارٹر پتا کون بھی ربی کے اشارے کو ماننے کا پابند ہے۔“

”یہ بات تو میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے کہا ”لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا۔ تم یہودیوں ہونے کے باوجود بھی یہودیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کیوں کر رہی ہو؟“

”تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی کہ میں یہودی ہوں؟“

”میرا اندازہ ہے!“ میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

وہ جلدی سے بولی ”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں!“

”تمہارے سوال کا تفصیلی جواب میں بعد میں دوں گی“ وہ غلت آمیز لہجے میں بولی ”فی الحال اتنا جان لو کہ میرا باپ ایڈر سن ایک امریکی یہودی تھا جب کہ ماں کا تعلق اسپین سے تھا۔ میرا باپ اتنا برا آدمی تھا۔۔۔۔۔ اس نے میری ماں ابھی کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا کہ اس روئے زمین پر پائے جانے والے تمام یہودیوں سے مجھے شدید نفرت ہو گئی۔“ اس کا لہجہ بے حد سخت ہو گیا۔

”اس کے باوجود بھی تم یہودیوں کی ایک نہایت اہم تنظیم ”بے ڈی ٹی“ کے لیے کام کر رہی ہو؟“ میں نے نیچے لہجے میں پوچھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”یہ میرا کارہ ہے۔“ کبھی فرصت ملی تو میں سمیں اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی۔ اتنا ذہن میں رکھ لو میں یہودیوں کے درمیان رہ کر ان کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ یہ میرے بڑوں کی پالیسی ہے۔ میں ان کا حکم ماننے کی پابند ہوں۔“

”تم نے بتایا ہے تمہارے بڑے ہم دونوں میں مثبت دلچسپی لے رہے ہیں۔“ میں نے اپنی الجھن دور کرنے کی خاطر پوچھا ”تم مجھے اور تمہارا سامنے مائیکل میری ساتھی سائل کو یہاں سے رہائی دلو کر اپنے آدھیوں تک لے جاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی تم کہتی ہو اس خفیہ اڈے تک آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہے جو پیرس دہلی والے فوجی کیمپ سے گزرتا ہے۔ اس صورت میں تم لوگوں کے لیے یہ کام اتنی ہی آسان ہوگا کہ یہودیوں کی ناک کے دو بال نوچ کر فرار ہو جاؤ۔۔۔۔۔ اور یہودی بھی ربی موٹے ہاتھن جیسا روحانی اور مادی صلاحیتوں کا مالک؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولی ”میں اور مائیکل تم دونوں کو اپنے دوسرے آدھیوں تک پہنچائیں گے۔ پہاڑی سے باہر لے جانا ان کا دوسرے پہاڑی ظاہر ہے تمہوں نے یہاں سے فرار

اگ تھا۔ پتا نہیں حالات و واقعات کی یہ نئی بساط میرے خلاف کون سی چال چلنے والی تھی؟  
روٹی تھک چکی تھی مجھ میں کہہ رہی تھی ”رہی موٹے ہاتھن کو اگر یہودی قوم اپنا غذا سمجھتی ہے تو اس کی روحانی صلاحیتوں میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا لیکن میرے بڑے تم سے بہت پر امید ہیں!“

میں نے چونک کر روٹی کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں مجسم سوال کو فوراً سمجھ گئی وضاحت کرتے ہوئے ”روٹی“ میرے بڑے تمہارے اور تمہاری صلاحیتوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ انہیں یہ بات معلوم ہے تم پر نارڈیو کی پیشکش کر بری طرح ٹھکرا دو گئے جس کے نتیجے میں کل تمہیں رہی کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتی ”اس کا یہی مطلب ہے تمہارے بڑے بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔“

”میں اسی لیے اپنے بڑوں کی بات تم تک پہنچانے آئی ہوں۔“ وہ رسائی سے ”روٹی“ تمہیں پہلے محبت اور شفقت سے قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب تم اس کی باتوں میں نہیں آؤ گے تو وہ پتا خرم کی صلاحیت کو آزمائے گا۔ اگر ایک مرتبہ تم اس کے ٹرائس میں آ گئے تو وہ تمہارا پرین واٹش کر دے گا۔ وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے۔ اس لیے تمہیں رہی کے سامنے ہر لمحہ ہوشیار رہنا ہے۔ اس کی آنکھوں میں قطعاً نہیں دیکھنا اور اس کی گونج دار تار انگیز آواز پر بھی زیادہ توجہ نہیں دینا۔ ان یہودیوں نے تمہارے خلاف انتہائی خطرناک منصوبہ بنا رکھا ہے۔“

”مثلاً کیا منصوبہ؟“ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ میرے لہجے میں خاصی تشویش تھی۔

”تمہاری سماجی کے ذہن سے تو صرف یہ خانے کے راز نکلتا ہے۔“ وہ سادھل کو ہاتھ پیر کرتے ہوئے بولی۔ روٹی کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔ لیکن تمہاری برین واشنگ کے بعد وہ جیسے اور تمہاری سوچ کو نئے سرے سے چیر کر رہ گئے۔ تمہاری بے پناہ صلاحیتوں سے وہ آگاہی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ تمہیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیار کر رہ گئے۔ تمہارے منہ میں اس کی زبان بولے گی اور تمہارا ذہن انہی کے مفاد میں سوچے گا۔ یہی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر تم ان کے ایک ناقابلِ فہم رہے ہو گئے!“

”یہ بھی نہیں ہو سکتا!“ بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

روٹی کی باتوں نے مجھے حد درجہ بے چین کر دیا تھا۔ یہ تو لگ بھگ وہی صورت حال تھی جو ٹولی ویدان کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ ادھر وہ کسی بڑی کی قوت کا آؤکار بن کر میرے لیے مشکلات کھڑی کر رہا تھا اور ادھر میں یہودیوں کے ہاتھ کا کھلونا بن کر ان کے فتنے کے کھیل کھیلنے والا تھا۔ میں خواب و خیال میں بھی ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔

”ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔“ روٹی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”اسی لیے میں نے اپنے بڑوں کا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا اور رہی موٹے ہاتھن سے سامنا کرتے وقت بے حد محتاط رہنا۔“ ایک لمحے کو توقف کرنے کے بعد اس نے کہا ”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔“

میں نے دل سے کہا ”روٹی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ پھر اضافہ کیا ”تم نے اپنا فرض تو پورا کر لیا لیکن میرا ایک فرض باقی ہے۔ وہ نہیں چکاؤ گی!“

”کیا فرض؟“ اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھ پر دیکھا۔ میں نے کہا ”تمہیں ”روٹی“ کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے!“

”کیوں اس میں عجیب والی کون سے بات ہے؟“ اس کی پچھلی ہوئی آنکھوں میں حیرت اٹھ آئی میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میری زبان میں روٹی، بریڈ کو کہتے ہیں!“ ”ادو!“ وہ اٹھنے کے انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”گویا واٹش روم کی دیوار سے جاگتی۔ تین ضرب تین ٹٹ کے اس واٹش روم میں اچھلنے یا کودنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ روٹی کے بدکنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اسے بریڈ سمجھ کر فوراً بڑپ کر جاؤں گا۔“

میں نے بڑبڑا کر مسکراتے ہوئے پوچھا ”کیا ہوا؟“ ”کچھ نہیں۔“ وہ جلدی سے ”روٹی“ تمہاری زبان کون سی ہے؟“

میں نے کہا ”میری قومی زبان اردو ہے۔ اور اس زبان کی روٹی کو ہم بڑے حے سے کھاتے ہیں۔ ویسے میں مینڈرن تھائی ہندی انگریزی اور کسی حد تک چینی بھی جانتا ہوں۔“

”اٹس اوکے!“ اس نے بڑی ادا سے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا

اور وضاحت کرتے ہوئے بولی ”روٹی میرا تک غم ہے۔ میں بچپن میں کول منول ہوئی تھی اور میری ماں ابھی مجھے ”روٹی“ کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ میں نہیں جانتی یہ آپشنش لفظ ہے یا کسی اور زبان کا!“

میں نے دل ہی دل میں کہا ”کول منول کی نسبت سے تو تمہارا نام روٹی کے بجائے ڈبل روٹی ہونا چاہئے تھا۔ میں نے روٹی سے پوچھا ”دیسے تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے بتایا ”راکیل ایڈرین“۔ میرے تصور میں راکل دج گھوم گئی۔ میں نے روٹی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شریہ لہجے میں کہا ”اسی لیے اسکرینج کے اس ٹنگ سائز واٹش روم میں تم ”ون ٹین ایئر“۔ سی“ بنی ہوئی تھیں۔ اپنی تمام تر حشر سامانوں کے ساتھ؟“

وہ خفیف سا مسکرا کر رہ گئی۔ میرے اشارے کو اس نے بڑی وضاحت سے سمجھ لیا تھا۔ ہالی ووڈ کی قیامت سراپا اداکارہ راکل دج نے ”ون ٹین ایئر“۔ سی“ میں بڑی ہوش رہا اداکاری کی تھی۔ پوری فلم میں وہ انڈر گارڈنس کے بھی خلاصے کو بدن پر سجائے پورے اسکرین پر اپنی جو بن بھری جوانی کے جوہر دکھائی نظر آتی تھی۔

روٹی یعنی راکل ایڈرین نے ایک مرتبہ بھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ”تم ایک منٹ کے لیے کمرے میں چلے جاؤ۔“

”تم نے وعدہ کیا تھا جاتے وقت مجھے بتاؤ گی اس کوٹری میں آمدورفت کا کیا ذریعہ ہے۔“ میں نے یاد دہانی کے طور پر کہا ”تمہاری باتوں سے لگتا ہے وہ خفیہ راستہ اس واٹش روم میں کہیں ہے؟“ بات ختم کرتے ہی میں اس مختصر سے واٹش روم کی دیواروں کو گھومنے لگا۔

”تمہارا یہ اندازہ بھی درست ہے۔“ وہ بڑی لگاؤٹ سے بولی ”لیکن میں اپنے وعدہ کو ایک دن آگے بڑھاتی ہوں۔ تم ہمارے لیے بہت اہم ہو۔ اگر ابھی تم پر راز کھل گیا تو تم اپنے طور پر کوئی قدم اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتے ہو جس میں کامیابی سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے لہذا میں فی الحال ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ کل رات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا، ہم دونوں اس واٹش روم کے راستے کس طرح کوٹری سے نکلے ہیں!“

”اگر میں یہ وعدہ کروں کہ یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا تو؟“

”خیر ہاں مجھے کچھ پریشانی ہے۔“ وہ بڑے جارحانہ لہجے میں بولی۔

میں خاموشی کے ساتھ ایک فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی دراز کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بڑی دل آواز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتی رہتی تھی کہ میں داہیں کوٹری میں نہیں آ گیا۔ میرے وہاں سے نکلنے ہی اس نے واٹش ٹین کاٹل بند کر دیا تھا۔

میں کوٹری میں میٹر لیس کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ راکل نے مجھ سے ایک منٹ کی مہلت مانگی تھی۔ میں پانچ منٹ کے بعد دوبارہ واٹش روم میں پہنچ گیا۔ راکل وہاں موجود نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا ان سنگلاخ دیواروں میں کہیں جذب ہو گئی ہو۔ وہ جس پراسرار انداز میں میری کوٹری میں نمودار ہوئی تھی اسی جاوٹی طریقے سے غائب ہو گئی۔ ہادی اشعر میں بھی لگتا تھا ”حسن و جوانی کے خزانے سے مالا مال وہ یہودن طلسم چھو نکلنے کی ماہر تھی!“

میں داہیں آکر میٹر لیس پر لیٹ گیا اور گہری گہری



تین صدی کی ایک نہایت بے اسرار خانہ  
صحبہ ہاؤس کی آپ بیتی

دولت مند، آزاد خیال، ہمدرد، مہم جو اور خطرناک سمجھ بٹا، جنہیں لوگ جانتے ہیں مگر نہیں جانتے!  
جرم پیشہ افراد کہیں ”چھلاوا“ کہتے ہیں!  
سمجھ بٹا کی ذمہ آجیٹ عجیب اور خطرناک حالات سے گزر رہی ہے۔ انہوں نے جب اپنی زندگی کے کچھ حالات تمہارے ذہن میں بکھر چڑا دیے تو ان سے اور اس میں جانتے کے حسی ہو گئے اسی لئے ان کی آپ بیتی کی اشاعت اردو زبان میں ایک ریکارڈ ہے۔

سمات (1120) 100 روپے 23 روپے

کتاب کی قیمت بعد ڈاک خرچ بذریعہ پستی آرڈر بھیجی جائے گی

کتابیات پبلکیشنز  
74200  
www.74200.com  
kicabnet@yahoo.com

وہ اس کو گھری کی واحد کھڑکی کے سامنے آیا اور کھردرے لہجے میں بولا "گڈ مارنگ مشرومیں ان!"  
اس کے سلام میں ایسی کرکشی محسوس کی جیسے کسی کو فٹے منہ کا چارہ ہو۔

میں نے جواباً گہری سنجیدگی سے کہا "گڈ مارنگ!"  
"کچھ سوچا تم نے؟" مہاراجہ نے نطوئی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔

"میں بے کار باتوں پر غور و فکر کر کے اپنا وقت برباد اور دماغ خراب نہیں کرتا۔" میں نے رکھائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔  
وہ قہقہہ لہجے میں بولا "گودا ہماری دوستی کو ٹھکرا رہے ہو؟"

"میرا یہی مطلب ہے۔"  
"اگر وہ یہی مطلب ہے تو میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں، میں بھی اس کی آنکھوں میں کیا نظر آرہا ہوں! مجھے تو اس کی آنکھوں میں عیاری، سفاکی اور درندگی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے مجھے گھورنے کے بعد اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔  
"اس ادا کے۔" پورا رایت لبرٹی!"

پھر وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے دہان سے چلا گیا۔  
اس کے جاتے ہی میں نے اپنے سر کو خاصا بھاری محسوس کیا۔ میں نے سوچا شاید یہ بھرپور ناشتے کی وجہ سے ہے پھر میں نے کافی کا بھرا ہوا گلاس بھی محسوس کیا۔ اس کو سنبھالنے کے بجائے سستی بھرنی ہے لیکن یہ اس سے آگے کا معاملہ نظر آرہا تھا۔

کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے مجھے جھک کر آگیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی جتنی الامکان کوشش کی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ملی۔ میرے قدم بری طرح ڈگمگائے اور میں دھڑام سے کوفری کے سنگلاخ فرش پر آن گرا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی خیال جاگزیں تھا..... اس ناشتے میں ضرور کوئی ایسی شے ملائی تھی ہے جو مجھے اپنے آپ سے پیگ نہ کر دے میں چشم زدن میں گہری غفلت میں چلا جاؤں۔

سائیں لینے لگا۔ روٹی کی باتوں نے میرے دل و دماغ میں الجھل جھادی تھی۔ مہربانی سازش کا ایک نیا رخ سامنے آرہا تھا۔ روٹی کی باتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ بہر حال میری دشمن نہیں تھی۔ وہ یہ کام کسی خاص گروہ کے ایما پر کر رہی تھی جس کا مطلب تھا اس کے بڑے میرے دشمن نہیں تھے۔ بعد کے حالات تو وقت سے پہلے نہیں مٹ سکتے تھے۔ ربی موٹے ہاتھن کی روحانی صلاحیتوں کے پیش نظر میں ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنے والا تھا۔ وہ ایک ایسا دشمن ثابت ہوتا۔ جس سے نبرد آزمائی میں مجھے دانتوں پینا آجاتا۔  
میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کے مطابق اس رات کے چھائی تین گھنٹے ابھی باقی تھے۔ میں یہ وقت جاگ کر خواہ خواہ کے آنکھوں میں نہیں گزارتا چاہتا تھا۔ دشمنوں کی نیندیں اڑانے کے لیے اپنی نیند پوری کرنا از حد ضروری ہے۔

میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی اور چند لمحات کے بعد نیند کی گہرا زوہر ہان کو دھکیل دیا۔ وہ کچھ لمحوں میں مانتا کی نرمی اور گرمی شامل تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں اس کو گدا اسیروں پر گرا گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ اس کا ایک سبب تو کڑا کے دار بھوک تھی، گزشتہ صبح میں نے ناشتے کے نام پر فارمیٹیشن پوری کی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ آج کافی سلاسل کے علاوہ آلیٹ پورج، ٹھنک پنیر اور کچھ پھل بھی ٹرے میں نظر آرہے تھے۔ اس صحت مند صبح پر میں نے جی بھر کر ہاتھ صاف کیا۔ گزشتہ رات والا گوشت کا ساٹن اور ڈرور ڈر غائب تھے۔ میں نے لگ بھگ پوری ٹرے کو صاف کر دیا۔ اگر کچھ بچا تھا تو ایک آدھ سیب یا چند سیلے ہی بچے ہوں گے جو دافتر تعداد میں مہیا کئے گئے تھے۔

تکبیر کی گارڈ ناشتے کے خالی برتن لے کر واپس چلا گیا۔ تو براڈ ویو آدھمکا۔ آج اس کے لیے کوئی عالی شان کرسی کی رحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس نے بے داغ قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصا جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ سنجیدگی طاری تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو

جولائی 2006 میں شائع ہوگا

باسمِ سوسى ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

# آتش فشاں



11

قصہ

چو کھٹ باپٹ کے بجائے وہاں جھار کی شکل میں موتیوں والی لڑیاں لگی دکھائی دیتی تھیں ہال کی دیواریں اور فرش سنگابی میں اپنی مثال آپ تھا۔

دوسری میں فنٹ والی دیوار کے ساتھ کتابوں والی الماریوں کے آگے ایک شاندار کرسی اور میز موجود تھی۔ یہ کسی اعلیٰ شخصیت کی نشست گاہ تھی۔ اس پہاڑی کے اندر یہودیوں کے لیے سب سے اہم مسجر اور قابل احترام شخصیت ربی موٹے ہاتھن ہی کی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا چند لمحات کے بعد ربی سے میرا آمانا سامنا ہونے والا ہے۔ میں نے ایک طویل انگڑائی لی اور ذہن و جسم کو پوری طرح چاق و چوبند کر لیا۔ آنے والے لمحات میں کوئی بھی سنگین صورت حال پیش آ سکتی تھی۔ میں ایک عزم کے ساتھ صوفے سے نیچے اتر آیا اور گھوم پھر کر اس ہال کا معائنہ کرنے لگا۔

ہال میں میرے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ میں آدم قد چو لی الماریوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سوئی سوئی جدید اور قدیم کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں پر وہاں کتابیں موجود تھیں۔ سب سے زیادہ ذخیرہ عبرانی (یہودی) زبان کی کتابوں کا تھا۔ عبرانی یہودیوں کی اپنی زبان ہے۔ ازبک علاوہ یونانی، مصری، سنسکرت، عربی، انگریزی اور فرانسیسی کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔ ظاہر ہے ان تمام کتابوں کا قلع قلم دہرے تھا۔

میں الماریوں کے سرسری معائنے کے بعد اس عالی شان کرسی کی طرف بڑھ گیا جس کے سامنے اسی شان کی ایک میز بھی موجود تھی۔ میں میز کے قریب پہنچ کر رک گیا اور وہاں موجود ہر شے کا جائزہ لینے لگا اور اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔ مجھے اپنے کندھے پر ایک نرم سا ہادو محسوس ہوا تھا۔ کوئی میرے عقب میں کھڑا تھا۔ یہ انسانی ہاتھ کا مخصوص دباؤ تھا۔

میں بے ساختہ گھوم گیا اور اسی وقت وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ عجیبی طور پر ربی موٹے ہاتھن ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ، وہ کسی وقت دے بدھ دموں خاشوکی کے ساتھ میرے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے لگتا ہوا تھا۔ رنگت سرخ و سفید اور چہرہ جھریوں زدہ۔ اس کی عمر کی بھی طور ایک سو بیس سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ جسم میں کئی دوزاری پائی جاتی تھی تاہم جھریوں کے باوجود بھی چہرے پر ایک خاص قسم کی تازگی پائی جاتی تھی۔ اس نے عام لباس کے اوپر ایک طویل جبہ پہن رکھا تھا۔ سر پر اونچی ٹوپی تھی اور وہ ہونٹوں پر مہربان مسکراہٹ سجائے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

ربی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور لپک

فرش پر پڑے پڑے میں نے اپنی آنکھوں کو کھولنا چاہا لیکن چونے کی سن دڑی محسوس ہوئے۔ انہوں نے میری کوشش کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے بے سود ہوتے ہوئے وجود کو بزمیرئیس کی جانب کھینچنے کی سعی کی مگر بے سود! میرا ذہن بڑی تیزی سے تاریکی میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں بڑے ہی نرزدانہ انداز میں میں نے سوچا۔

بردار ڈیو ایٹو کوشل میں نا کامیاب ہو کر مجھے ربی موٹے ہاتھن کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر میرا جواب سننے سے پہلے ہی مجھے انٹائفل کرنے کا بندوبست کر دیا گیا تھا تا کہ انہیں بعد میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ حفظ ما تقدم کے طور پر عیار یہودیوں نے مجھ پر بڑا کاری دادا مارا تھا۔

میں نے جی جان کی قوت کو پہنچ کر کے ایک مرتبہ پھر میٹر میں یک رسائی حاصل کرنے کے لیے تک دو کی لیکن اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میرا ذہن اور حواس اپنے ماحول سے یک سرے پر گناہ ہو گئے۔ میں اپنے ہوش و حواس کو بیٹھا۔ جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کشادہ ہال میں پایا۔ میں اس وقت ایک صوفے پر پڑا تھا۔ میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے دماغ یادوں میں کسی قسم کی تھابت یا تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ بالکل یوں لگا جیسے میں اسی صوفے پر بڑے آرام سے سو گیا تھا اور اب میری آنکھ کھلی ہے۔

میں تو ایک مختصر سی سنگار کوٹھری میں تھا، پھر اس وسیع و عریض ہال میں کیسے پہنچ گیا؟ اس خیال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا، پھر میرے ذہن میں وہ واقعہ تازہ ہو گیا جب تاشتے کے بعد میں چکر اکر کوٹھری کے فرش پر گر گیا تھا تو اس کا مطلب ہے میری غفلت کے دوران میں مجھے کوٹھری سے یہاں پہنچایا گیا تھا؟

یہ خیال اور بھی زیادہ تشویش کا حامل تھا کیونکہ اس کا جواب یہی تھا کہ مجھے ربی موٹے ہاتھن نے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں ایک جھگڑے سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور تنقیدی نظر سے اس ہال کا جائزہ لینے لگا۔

وہ وسیع و عریض کمرہ اس کی لاہریری کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کی پینٹس میں پائی تیس فنٹ رہی ہوگی۔ چاروں دیواروں کے ساتھ آدم قد چو لی الماریاں استادہ تھیں جو کتابوں سے بھری نظر آتی تھیں۔ ان الماریوں سے دو فنٹ آگے صوفے رکھے تھے۔ میں بھی انہیں صوفوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔

میں فنٹ والی ایک دیوار میں آدم درخت کا راستہ تھا۔ دروازہ میں نے اس لیے نہیں کہا کہ وہ صرف درہا سنا ہوا تھا۔ اس درے کی اونچائی سات فنٹ اور چوڑائی چار فنٹ تھی۔ کسی

موجود تھی۔ میں نے یہ خاصیت اپنے استاد ماسٹر بنگ بائی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ ربی کے بارے میں مجھے پتا چل چکا تھا وہ بیپنازم اور دیگر ماورائی علوم کا ماہر ہے لہذا میں نے حد متناہی تک اس کی پرکشش آنکھیں اگر مجھے اپنی طرف متوجہ رہی تھیں لیکن میں بھی کوئی عام انسان نہیں تھا۔ جو اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے زیر ہو جاتا۔ میں ربی سے آنکھیں ملا کر ایک لمحے کے طور پر تھا، اسی لمحے میری جگہ میں نے مجھے ایک اچھوتی راہ دکھائی۔

مکار یہودیوں کو کسی مکاری ہی سے اپنے دام میں لایا جاسکتا تھا۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ مجھے یوں ظاہر کرنا چاہئے جیسے میں ربی کی آنکھوں سے متاثر ہو گیا ہوں۔ مجھے عمل کر ہرگز اس کا مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی صلاحیتوں کو مخفی رکھنا چاہئے تاکہ یہ وقت ضرورت آپہنیں استعمال کر کے ربی کو دھوکا دیا جاسکے۔ ربی کو اگر میں خوش گمانی میں مبتلا کر دیتا تو یہ میری کامیابی ہوتی! جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے..... بالکل ایسے ہی کسی سازش کو دھوکا دہی ہی سے تاکہ کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے ربی کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر نظر بھجائی۔ وہ بھی سمجھا ہوگا میں اس کی نگاہ کی تاب نہیں لاسکا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ وہی محبت بھرا مہربان ہاتھ ایک مرتبہ پھر میرے شانے پر آگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ربی لب کشا ہوا۔

”میرے بچے!“ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی گونج اور شفقت پوری پائی جاتی تھی۔ مجھے سخت آسوس ہے کہ یہاں پہنچنے تک تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔“

”تم یہ بات ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہاں پہنچنے کے بعد مجھے نہ نہایت ہی شاعرانہ سلوک کیا جا رہا ہے۔“ میں نے غمی بھرے لہجے میں کہا تاہم نگاہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ربی کی مخصوص نرم خوشگونج دار آواز میری ساعت تک پہنچی۔ ”میرے بچے! مشکلات سے گزرنے کے بعد ہی انسان راتیں پاتا ہے۔ بہر حال مجھے بے حد آسوس ہے کہ تمہیں ہماری طرف سے دکھ اٹھانے پڑے لیکن اس سلسلے کو ختم ہی سمجھو۔ اب تمہاری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ تم آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے نہایت ہی ضروری باتیں کرنے والا ہوں۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ عالی شان کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ میں اسی صوفے پر آ بیٹھا جہاں میری آنکھ کھلی تھی۔ میں

نے ربی صوفے ہاتھ کی طرف دیکھا تو وہ اپنی کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت گہری نظر سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی کے ساتھ ساتھ متناہی پرکشش بھی پائی جاتی تھی۔ میں اپنی روحانی قوتوں کے بل بوتے پر ربی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ چاہے جو بھی برآمد ہوتا مگر مجھے ایسا نہیں کرتا تھا۔ اس کو فریب دینے کے لیے انتہائی..... ضروری تھا کہ میں خود کو اس سے متاثر ظاہر کروں۔ صوفے میں ایک بار پھر نظر بھجائی اور زانو پر رکھے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا۔ اسی لمحے ربی کی مخصوص آواز نے میری ساعت پر دستک دی۔

”وہاں“ میرے بچے!“ اس کی گونجی آواز میں بے بھی پناہ تاثر پایا جاتا تھا۔ ”دوسرے مسلمانوں کی طرح تم بھی یہودیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہو لیکن اس سوچ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہودیوں نے بار بار مسلمانوں کی بددی۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو جنہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا لیکن مسلمانوں کے اندر ایک انتہائی تشدد گردہ پایا جاتا ہے جو ہمیں اپنا ذاتی دشمن سمجھتا ہے۔ یہ چند انتہا پسند لوگ ہائی لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر مسلمان ہم یہودیوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں جو کہ کوئی مثبت قدم نہیں۔ ایسا دشمنی رو بہ اقوام کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتا ہے..... اور ایسا ہو بھی ہو رہا ہے۔ تم خود دیکھ سکتے ہو۔ اس وقت تمہاری قوم کس انتشار کا شکار ہے۔ مٹی اور خافانہ سوچ نے انہیں اندرونی طور پر شکست و ریخت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ کہیں یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور کہیں ہندوؤں سے ان کی دشمنی ہے۔ یہی جیسائیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کسی کی اور قوم کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ انہیں اپنے سوا سب کا کافر نظر آتے ہیں۔ میرے بچے! یہ سوچ یہ وہی دشمنی ہے۔ غیر محنت مند یعنی تیار ہے۔ کیا یہ بچنے کی نشانیاں ہیں؟“

میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ ربی کی باتوں کا ایک سر جھ پراثر ہوا اور نہ ہی میں نے اس سے چھپا کر یہودی کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ محبت اور بھائی چارے کے نام پر کس طرح اقوام عالم کو اپنا غلام بنارہے ہیں۔ خاموش رہ کر اس کی تقریر سننے میں ہی میری بھلائی تھی۔ میں اسے فریب مسلسل میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ وہ سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دوسری اقوام سے نفرت اور دشمنی تو ہی ایک طرف مسلمان خود اپنے اندر بھی بے شمار فرقوں اور طبقات میں بٹ

چکے ہیں۔ ہر طبقہ ہر فرقہ دوسرے کو کافر قرار دیتا ہے اور واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس اندرونی تفرقے نے کیسے کیسے عبقری کھا ڈالی۔ کیسے کیسے اعلیٰ دماغ نفرت کی اس آگ میں جلا لیا۔ لیکن میں تمہیں براہ دیا ضائع نہیں ہونے دوں گا!“

ربی کی گفتگو کا بیش تر حصہ منافقت اور منافرت آمیز ہی سمجھ لیکن ایک بات اس نے بڑی حقیقت افروز کی تھی۔ آج پوری دنیا کے مسلمان خصوصاً پاکستانی مسلمان ”مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“ کی غلامی کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ہر فرقہ ہر طبقہ خود کو کج اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف گنہ گار اور خنجر پر دست ہے۔ یہ داخلی انخوس ناک بلکہ شرم ناک صورت حال ہے جو کسی غیر مسلم کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں چونکہ یہودیوں کے ربی کی عیاری اور چال بازی سے واقف تھا اس لیے خاموشی سے اس کا خلبہ سن رہا۔

”میرے بچے!“ وہ کہہ رہا تھا ”مسلمان قوم میں بڑے بڑے جینس پیدا ہوئے ہیں لیکن بیشتر کے ٹیلٹ کی ٹلی بن کٹے ہی مر جھائی۔ انہیں نفرت اور فرقہ داریت کی پیش نے جھلایا دیا۔ اس قوم کے بعض عاقبت نا اندیش لوگوں نے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ماری مگر میں تم پر ایک ذرا آج نہیں آنے دوں گا۔“

اس نے دوسرے اس حوالے سے خصوصاً میرا ذکر کیا تھا۔ رومل کے طور پر میرا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لازمی ہو گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اسے مجھ پر کوئی ٹک نہ ہو میں نے چونکے ہوئے انداز میں ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جمنا کا پھر نگاہ بھجائی۔ میں اس پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس سے آنکھ ملانا میرے بس کی بات نہیں۔

ربی صوفے ہاتھ میں نے اپنی مخصوص تاثر انگیز آواز میں خطاب جاری رکھا۔ ”میرے بچے! تمہیں ایک نظر دیکھتے ہی مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ تم نے آج تک فضول کاموں میں اپنی توانائی صرف کی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گا، عظیم کارنامے کس طرح سر انجام دئے جاتے ہیں۔ میرے سامنے میں وہ کریم زندگی کے انوکھے تجربے سے گزرو گے اسی لیے میں نے تمہیں امریکی سی آئی اے سے چھینا ہے۔“

اس نے لفظ ”چھینا“ پر کافی زور دیا تھا۔ میں نے بے ساختہ گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا ”یہی سی آئی اے والے بڑے ذہین اور چالاک جتنے ہیں لیکن یہ بے وقوف تمہاری

حقیقت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔ اب بھی دیکھ لو وہ ”سی ڈی“ کی چوری کا اہرام تم پر دھر رہے ہیں حالانکہ وہ سی ڈی تم نے نہیں چرائی جس کی نے بھی چرائی ہے میں جانتا ہوں۔“

مجھے ایک جھکا سا لگا۔ ربی کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے چاہ رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ نہایت ہی سمجھ رہے ہوئے نرم دماغ مل لکھ میں بولا۔

”میرے بچے! تم اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔ میں جانتا ہوں تم چور نہیں ہو سکتے۔ وہ سب تمہارے پر تو کی شرارت ہے۔“

”تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟“

میں داخلی حیرت زدہ تھا۔ ربی کی ماورائی قوتیں کل رہی تھیں۔ یہ راز میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ میرے اچانک سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا۔ ”میرے بچے! میں عمر میں تم سے پانچ مجھے گنا بڑا ہوں لیکن تمہارے لکھ میں وہ احرام نظر نہیں آتا جو ہونا چاہئے۔ تم مجھے جس انداز میں مخاطب کر رہے ہو وہ بدیہی کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنے لب و لہجے اور تہذیبی انسان کی صلاحیتوں کو اسی طرح یاد رکھو بڑا غلامی اور بد تہذیبی انسان کی صلاحیتوں کو اسی طرح یاد رکھو بڑا کر دیتی ہے جیسے لوہے کو زنگ اور لکڑی کو دھبہ۔ آسان بہت بلند بہت بڑا اور بہت اعلیٰ ہے۔ اس کی جانب رخ پھیر کر تھوکنے والوں کا تحوک انہی کے جہروں پر کرتا ہے۔“

ربی ایک کھلی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ میں نے عنایت آمیز نظر سے اسے دیکھا اور ایک مرتبہ پھر گردن بھجائی۔ وہ چاہے یہودیوں کا مذہبی پیشوا تھا لیکن اخلاقیات کا ایک کائناتی اصول بیان کر رہا تھا اس لیے اس کے کہنے کو سننا اور اس پر عمل کرنا لازم تھا۔

”بہر حال میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ اس لیے تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔“ وہ رسائیتم اور محبت کی آمیزش اپنے مخصوص لہجے میں بھرتے ہوئے بولا ”جب میں تمہاری پراسرار جسمانی اور ذہنی بلکہ روحانی صلاحیتوں سے آگاہ ہو گیا ہوں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا وہ پر تو کیا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ اس کی شرارتیں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ سی ڈی کی چوری کے بعد بھی اس نے ایک تازہ ترین کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں پوچھے بناندرہ کا البتہ اس دفعہ میرے لہجے میں احترام شامل تھا۔

”اس شریر نے تمہاری ساتھی صدف کو شہید غوری کی



قید سے نکال لیا ہے۔" ربی نے میری ساعت پر ایک خوفناک دھماکا کیا " دلچسپ بات یہ ہے کہ صدف اے اسکی وجدان ہی سمجھ رہی ہے اور..... اس میں اس بے چاری کا بھی کوئی قصور نہیں۔"

میں دیکھ رہی تھی وہ ربی موٹے ہاتھن کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی اسپرنگ جھلک اپروچ کا قائل ہو گیا۔ وہ بے پناہ روحانی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس وقت میں براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے اندر اترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بے ساختہ میں نے نگاہ جھکا لی۔

اسی لمحے ایک خطرناک سوال نے میرے ذہن میں جنم لیا۔ اگر ربی نے واقعی کسی روحانی صلاحیت سے وہ احوال معلوم کیا تھا تو پھر اس بات کے امکانات بھی روشن تھے کہ وہ ردی والے منصوبے سے بھی واقف ہوگا بلکہ اسے تو یہ بھی جانتا چاہئے کہ ردی اس کی نہیں بلکہ کسی مخالف گروہ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس خیال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ میرا ذہن یہودیوں کی اذلی مکاری کی طرف جا رہا تھا اور ربی اپنی طرح سے یہودیوں کا سردار تھا۔ اس کی مکاری اعلیٰ کو اتنی کی ہوتی۔ میں نے تنقیدی انداز میں سوچا ممکن ہے ربی مجھے متاثر کرنے کے لیے وہ باتیں کر رہا ہو۔ شیب غوری یہودی لائی کا پلانیٹڈ تھی۔ صدف غوری کی قید سے نکل گئی ہو۔ وہاں کی ساری خبریں ربی تک پہنچ گئی ہوں اور اب یہ مجھ پر رعب جھانڈنے کے لیے ہے براہ راست اختیار کر رہا ہو؟

ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ربی کے ایک انکشاف پر میں واقعی حیرت زدہ تھا اور وہ یہ کہ قطعی وجدان کی کوڑی وہ خوب لایا تھا۔ سی ڈی کی چوری والے معاملے کی حقیقت صرف مجھ تک محدود تھی۔ اس سلسلے میں ربی نے واقعی مجھے حیران کر دیا تھا۔ میرا دھیان بالعمامہ صدف کی طرف چلا گیا۔

ربی کے مطابق "صدف قطعی وجدان کو اصل سمجھ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ بد معاش اس کے ساتھ کیا کیا بد معاشیاں کر رہا ہوگا! صدف مجھے بے پناہ چاہتی تھی۔ اپنے چاہنے والوں کو کبھی منہ نہ دیکھتا تھا۔ صدف میری ایک منتخب ساتھی تھی۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے کئی بار اپنی جان کو داؤ پر لگایا تھا۔"

"یہاں فون کی سہولت موجود ہے؟" میں نے بے اختیار ربی سے استفسار کیا۔ وہ زہرباں مسکراتے ہوئے نرمی سے بولا "ہاں میرے

بچے! یہاں سے پوری دنیا میں ڈائریکٹ کسی بھی جگہ فون کیا جاسکتا ہے۔" پھر مجھ سے پوچھا "تم کس انجمن میں گرفتار ہو؟"

"میں فوری طور پر صدف سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم اپنے پر تو کی وجہ سے فکر مند ہو؟"

"بالکل سبکی بات ہے۔"

"میں نے کہا تھا تم ہرگز گھر پر بیٹائی کو ذہن سے جھٹک دو۔" ربی شہنائے لہجے میں بولا "سب ٹھیک ہو جائے گا میرے بچے! میں ہوں نا تمہاری پشت پر تم دیکھ لینا میں بہت جلد تمہاری ساتھی کو تمہارے پاس پہنچا دوں گا اور وہ تمہارا پر تو! وہ ایک لمحے کو راکٹ جیٹ پر آواز میں بولا "اس کا بھی ہندوستان ہو جائے گا۔ تم اپنے ذہن کو پرانہ گندہ مت کرو۔"

ربی کی باتوں میں بڑی قوی تسلی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا اور فوراً گفتگو کو مسائل کی جانب موڑ دیا۔ میں نے ربی موٹے ہاتھن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میرے انداز سے واضح ٹھیک تھا۔

"محترم ربی! میری ایک ساتھی ساحل بھی آپ کی قید میں ہے!"

"قید نہیں میرے بچے!" وہ ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ بولا "وہ میری پناہ میں ہے۔"

میں نے کہا "برتاؤ ڈیو نے ساحل کے حوالے سے مجھے جو تفصیلات بتائی ہیں وہ انتہائی حیرت انگیز اور چونکا دینے والی ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ساحل کی انمول خزانے کے راز سے آگاہ ہے اور وہاں تک رسائی کا ذریعہ بھی جانتی ہے؟"

"ہم بے مقصد باتوں میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کرتے!" وہ نرمی انداز میں بولا۔

"لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ساحل اتنی گہری بھی ہو سکتی ہے؟"

"تم نے مسجد کی سے بھی اس کی گہرائی نہ اپنے کی کوشش ہی نہیں کی میرے بچے!" وہ رمانیت سے بولا "جو لوگ اوپر سے سیدھے سادے اور معصوم نظر آتے ہیں وہ اپنے اندر کئی سمندر چھپائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تم نے اپنی ساتھی ساحل کو ہمیشہ ایک عام لڑکی سمجھا ہے۔ بہر حال تمہیں بہت جلد یقین آجائے گا کہ ساحل کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں تمہیں ساحل سے ضرور ملاؤں گا مگر فوری طور پر یہ ممکن نہیں..... بلکہ یوں سمجھو سر دست یہ مناسب نہیں..... تمہیں دو دن مزید انتظار کرنا ہوگا اس کی یاد میں ٹھوڑا اور ترپنا ہوگا۔" وہ خاموش ہو کر خلا میں گھومنے لگا۔ چند لمحات کے بعد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"وجدان! میرے بچے! کسی کی یاد میں ترپنا اور اس طرح ترپنا کہ تمہاری تڑپ کسی کو نظر نہ آئے بہت مشکل کام ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تم یہ مشکل کام کرنے میں ناکامیاب ہو رہے ہو حالانکہ میں جانتا ہوں تم اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل اور مشکل کام کر سکتے ہو۔ تمہارے اندر بے پناہ حوصلہ اور قوت برداشت ہے مگر عشق کے میدان میں تم مار کھارہے ہو!" وہ خاموش ہوا تو میں نے افسردہ انداز میں پوچھا "پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ ایک ٹک میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حنا طبعی کشش تھی۔ اگلے ہی لمحے میں نے نگاہ جھکا لی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اس سے آنکھ ملانے کی قدرت نہیں رکھتا تھا بلکہ میں یہ سب کچھ ایک خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ربی موٹے ہاتھن کی نگاہ سے بے حد تعمیری قوت پوشیدہ تھی مگر میں بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا جو اس سے زیر ہو جاتا۔ میں نے زندگی میں بارہا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا اور کبھی اس سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ تاثیر دہانی شے موت ہے جو بڑے بڑوں کو ہلکا کر رکھ دیتی ہے۔ میں موت سے کبھی نہیں ڈرا تھا تو ربی کے سامنے کیا سرگوں ہوتا۔ میرا ستار ہونا ایک مکمل تھا جو میں یہودیوں کے سب سے بڑے ربی موٹے ہاتھن کے ساتھ مکمل رہا تھا۔ پتا نہیں اس اعصابی مکمل میں ہارنس کا مقدر بننے والی تھی اور جیت کس کا نصیب چکانے والی تھی۔ میں اس بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتا تھا۔

میری نظر ٹھیک تو ربی نے گونج دار آواز میں کہا "میرے بچے! تم جتنی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کے مالک ہو ابھی تک تم نے اس کا معرہ عمیق بھی استعمال نہیں کیا بلکہ تمہاری کئی صلاحیتیں تو بڑے بڑے رنگ آلود ہو رہی ہیں اور بعض کو تم اپنی جذباتیت سے کندہ کر رہے ہو لیکن گہر نہ کرو میں تمہارے ذہن کو بالکل کر دوں گا تمہاری صلاحیتوں کو مکمل کر کے تمہیں شخصیت کے اعتبار سے یو یو بیل بنا دوں گا۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا میرے بچے! اب سب کچھ میں کروں گا۔ تم بس خاموشی کے ساتھ میری ہدایات پر عمل کرتے جانا۔"

وہ آہستہ آہستہ مجھے اپنی راہ پر لا رہا تھا۔ میں بھی یہی ظاہر کرنے لگا کہ میں نے اس کے بچھانے ہوئے جال میں قدم ڈال دیا ہے۔ اسی پالسی کو اختیار کر کے میں اسے کسی مرحلے پر چٹ کر سکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا۔ اس وقت میری اداکاری عروج پر تھی۔

"ٹھیک ہے محترم ربی! میں آپ کو فالو کرنے کی کوشش کروں گا۔"

اگر میری جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس کی جال ربی سے زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ تو اللہ کا شکر اور میرے استاد ماسٹر جنگ بالی کا احسان تھا کہ میں ربی کے سامنے ثابت قدمی سے ڈٹا ہوا تھا "جی" کی پوشیدہ قوت اور یوگا ٹریننگ میرے لیے ایک مضبوط ڈھال ثابت ہو رہی تھی۔ میری اطاعت مندی پر ربی خوش ہو گیا۔

"شبابش میرے بچے! تم نے میرا دل بڑھا دیا ہے۔" وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

میں کسی بچے ہی کی طرح ہل کر بولا "دو دن بعد آپ مجھے ساحل سے ملوادے گا نا؟"

"ضرور میرے بچے! میرا تم سے وعدہ ہے۔"

میں نے پوچھا "محترم ربی! آپ نے بتایا ہے ساحل آپ کی پناہ میں ہے۔ اس سے تو یہی یہ بھٹکتا ہے اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہے؟"

"تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔" وہ مرعیانہ انداز میں بولا "میرے بچے! ساحل کے بیٹے میں جتنا راز پوشیدہ ہے اس کے حصول کے لیے تو سارا عالم اس کا دشمن بن سکتا ہے لیکن فی الحال ایک خاص گروہ اس کے تعاقب میں ہے اسی لیے احتیاط کے پیش نظر اسرائیل کے بجائے اسے الٹا لایا گیا ہے۔ بعد میں تم دونوں کو اسرائیل بھیج دیا جائے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "لیونے تمہیں اس بارے میں بتواتا ہوگا؟"

"صرف اس حد تک کہ پہلے ہمیں اسرائیل پہنچایا جانے والا تھا پھر کسی مصلحت کی بنا پر الٹا لایا گیا ہے۔" میں نے بے دستور نگاہ جھکاے ہوئے کہا "اس نے کہا تھا اس سلسلے میں تفصیل سے آپ آگاہ کریں گے۔"

"اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔" ربی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "تفصیلات کے سلسلے میں ترقی فی الحال اتنا جان لو کہ ایک گروہ تمہاری ساتھی کی تلاش میں ہے۔ دراصل وہ لوگ بدھ کے پیروکار ہیں اور اسرائیل میں بھی ان کے کچھ آدمی ہمیں بدل کر کام کر رہے ہیں۔ مجھے ان کے منصوبے کی ہلک بھلک پڑی۔"

اس کے بعد بھی ربی اپنی شان اور اختیارات کے ذیل

میں نے ربی موٹے ہاتھن سے استفسار کیا ”محترم ربی!“

اس کی آواز میں ترغیب کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری طرف سے ہرگز نہیں آئے گا۔ یہ بڑا ہی ادا اور مہم پر عمل تھا۔ اگر میں بھرپور اداکاری کے مظاہرے کرنا چاہتا تھا تو اس کی مذموم عزائم مجھے ہر روز روشن کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ مجھے اس سے تعاون کرنا تھا، یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کے خلاف میں کیا گیا ہوں۔ وہ مجھے چھوڑنا نہ

”میں تمہارا ربی ربی مومن ہوں۔ تم مبر۔  
ت کو تو ج سے کن رہے ہو۔“ مجھے اس کی آواز پُر تازگی لگی۔

تھی۔۔۔۔۔ اس لیے بھی کوئی اور آواز تہاری ساعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ تم اس وقت مکمل طور پر میرے قبضہ قدرت میں ہو۔ تمہارے دماغ پر میری حکمرانی ہے۔ تمہارا دماغ کسی صاف شفاف سلیٹ کے مانند ہے۔ وہاں یادداشت کے نام پر ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ میں اب جو بھی بات تمہارے ذہن میں نقش کروں گا وہ تمہاری لائٹ ٹرم میموری کا حصہ بن جائے گی۔ یہی تمہاری شخصیت تمہاری بنیاد ہوگی۔ بعد میں جب تمہاری ٹریننگ ہوگی تو تم از خود شارٹ ٹرم میموری بناتے چلے جاؤ گے۔ اب میں تمہارا ایک چھوٹا سا ٹیسٹ لوں گا۔“

اتنا کہہ کر وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اپنی مخصوص تاثر انگیز اور کوئی دار آواز میں سلسلہ تر غیبات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں تم سے ایک آسان سا سوال پوچھتا ہوں۔ ذرا سوچ کر بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟“

رہی نے ایک شاطرانہ چال چلی تھی۔ اس طرح وہ اپنی کارکردگی اور میری ٹھوکی کو بھی چیک کرنا چاہتا تھا۔ رہی کے مطابق میرا دماغ اس وقت اس کے ہنسے میں تھا۔۔۔۔۔ اور میں اسے اسی خوش فہمی میں جتا رہتا تھا لہذا میں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تاہم آنکھیں بند رکھتے ہوئے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا کر لیے۔ میں رہی پر یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے میں اپنا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے اس کوشش میں ناکامیابی ہو رہی ہو۔ رہی نے اپنی دانست میں میرا دماغ صاف کر دیا تھا۔ پھر میں اپنا نام بتانے کی غلطی کیوں کر کر سکتا تھا!

”تم اپنے ذہن پر زور مت ڈالو میرے بیٹے!“ رہی کی مشتاق دھیران آواز میری ساعت تک پہنچی۔ اس آواز میں کامیابی کا نغمہ بھی شامل تھا۔ ”تمہارا ذہن کسی صاف سلیٹ کے مانند ہے اس وقت تمہاری یادداشت کے تمام خانے بالکل خالی ہیں۔ میں تمہاری یادداشت رقم کرتا ہوں۔ تمہارا نام راجہ ہے۔۔۔۔۔ بولا تمہارا کیا نام ہے؟“

”راجہ۔۔۔۔۔“ میرے ہونٹ فشرمائے۔ اس وقت میں چٹ آنکھیں بند کئے خاموش اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میری اداکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں یہودیوں کے ایک جید عالم کے سامنے بڑی کامیابی سے اپنا خود منتخب کردہ رول ادا کر رہا تھا۔ اور بڑی کام کی پرفارمنس دے رہا تھا۔

”میں تمہارا رہی مربی ہوں۔۔۔۔۔ موٹے ہاتھن!“

”آپ میرے رہی میرے سب کچھ ہیں۔“

”آج کے بعد تم صرف میرا علم مانو گے۔“ رہی نے کہا۔

”آپ جیسا کہہ رہے ہیں میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا۔

وہ بچپن کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے بولا ”اسندہ بھی تمہیں میں اسی طرح تو بخوبی عمل کے دوران میں خصوصی ہدایات دیا کروں گا جو تمہارے ذہن میں نقش ہونی چاہئیں گی۔ تم اس عمل کا یا ان باتوں کا کسی سے بھی ذکر نہیں کرو گے۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے کزور مگر قطعیت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ”میرے رہی! میں صرف اور صرف آپ سے تعلق رہوں گا اور ہر قسم کی ہدایت آپ ہی سے لوں گا۔“

”شاباش میرے بیٹے! رہی کی آواز میں خوشی کا عنصر شامل ہو گیا۔

میں نے جسمانی طور پر خود کو ایک سرے سادہ ثابت کیا اور ایک آنکھ ذرا سی کھول کر ماحول کا جائزہ لیا۔ میں چونکہ سر کے کل انٹالک رہا تھا اس لیے سب سے پہلے پتہ راہ داری کا فرضی میری نظر میں آیا پھر میری نگاہ ان افراد کے قدموں پر چلی گئی۔ میں اس سے زیادہ راہ داری کا جائزہ نہ لے سکا کیونکہ اسی وقت میری آنکھ نے ایک ایسا منظر دیکھا تھا کہ میری تمام تر توجہ اسی جانب مبذول ہو گئی۔

راہ داری نیم روشن تھی اور ہم جس دیوار کے نزدیک کھڑے تھے اس میں اچانک ایک شگاف سامع ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے دو بڑے پتھر سلائیڈ تک ڈور کے مانند سائڈز میں ٹھک گئے ہوں۔ اس شگاف کی دوسری جانب مجھے وہی کھڑی دکھائی دی جو پہلے بارہ چندہ گھنٹوں سے میری قیام گاہ رہی تھی۔ مجھے یہیں سے لے جایا گیا تھا۔

اس راز سے پردہ اٹھا تو میرے ذہن میں بدھ ٹیل کنڈ کی عبادت گاہ کے دروازے کا منظر کھل گیا۔ ساحل کے باپ تھوپی نے فائلک بدھا کے پاؤں کے نزدیک واقع پتھروں سے ٹھوڑی پتھر جھاڑ کی جھڑی اور اسی سلائیڈ تک انداز میں نہ خانے میں داخلے کا راستہ کھل گیا تھا۔ یہیں ممکن تھا یہاں راہ داری کی اس دیوار میں بھی کوئی دیباہی مکانزم موجود ہوا۔

رہی کے مطابق وہ دانش روم کے کسی خفیہ راستے سے اندر آئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا اس کھڑی میں آمد و شد کے لیے ایک سے زیادہ راستے موجود تھے!

میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے کھڑی کے اندر پہنچا دیا گیا۔ میں نے اپنی نیم وال آنکھوں کو بڑی صفائی سے بند کر لیا۔ میں چاہتا تو کن انہیوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا لیکن اس مرحلے میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے بڑے جمل اور محنت سے یہ کھیل بنایا تھا۔ ایک ذرا سے شوق دینا میں اس کھیل کو بگاڑنے کی حمت نہیں کر سکتا تھا!

انہوں نے مجھے میز پر لانا اور جس خاموشی سے وہاں پہنچے تھے اسی خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ اب مجھے کم از کم چار گھنٹہ تک تنہی نیند کا ناکہ کرنا تھا۔۔۔۔۔ رہی کو یقین دلانا تھا کہ اس کا ”تجربہ“ کامیاب رہا۔ اس کا یقین، میری کامیابی کی جی تھا!

☆ ☆ ☆

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا!

میں نے جسمانی طور پر خود کو ایک سرے سادہ ثابت کیا اور ایک آنکھ ذرا سی کھول کر ماحول کا جائزہ لیا۔ میں چونکہ سر کے کل انٹالک رہا تھا اس لیے سب سے پہلے پتہ راہ داری کا فرضی میری نظر میں آیا پھر میری نگاہ ان افراد کے قدموں پر چلی گئی۔ میں اس سے زیادہ راہ داری کا جائزہ نہ لے سکا کیونکہ اسی وقت میری آنکھ نے ایک ایسا منظر دیکھا تھا کہ میری تمام تر توجہ اسی جانب مبذول ہو گئی۔

راہ داری نیم روشن تھی اور ہم جس دیوار کے نزدیک کھڑے تھے اس میں اچانک ایک شگاف سامع ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے دو بڑے پتھر سلائیڈ تک ڈور کے مانند سائڈز میں ٹھک گئے ہوں۔ اس شگاف کی دوسری جانب مجھے وہی کھڑی دکھائی دی جو پہلے بارہ چندہ گھنٹوں سے میری قیام گاہ رہی تھی۔ مجھے یہیں سے لے جایا گیا تھا۔

اس راز سے پردہ اٹھا تو میرے ذہن میں بدھ ٹیل کنڈ کی عبادت گاہ کے دروازے کا منظر کھل گیا۔ ساحل کے باپ تھوپی نے فائلک بدھا کے پاؤں کے نزدیک واقع پتھروں سے ٹھوڑی پتھر جھاڑ کی جھڑی اور اسی سلائیڈ تک انداز میں نہ خانے میں داخلے کا راستہ کھل گیا تھا۔ یہیں ممکن تھا یہاں راہ داری کی اس دیوار میں بھی کوئی دیباہی مکانزم موجود ہوا۔

رہی کے مطابق وہ دانش روم کے کسی خفیہ راستے سے اندر آئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا اس کھڑی میں آمد و شد کے لیے ایک سے زیادہ راستے موجود تھے!

میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے کھڑی کے اندر پہنچا دیا گیا۔ میں نے اپنی نیم وال آنکھوں کو بڑی صفائی سے بند کر لیا۔ میں چاہتا تو کن انہیوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا لیکن اس مرحلے میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے بڑے جمل اور محنت سے یہ کھیل بنایا تھا۔ ایک ذرا سے شوق دینا میں اس کھیل کو بگاڑنے کی حمت نہیں کر سکتا تھا!

انہوں نے مجھے میز پر لانا اور جس خاموشی سے وہاں پہنچے تھے اسی خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ اب مجھے کم از کم چار گھنٹہ تک تنہی نیند کا ناکہ کرنا تھا۔۔۔۔۔ رہی کو یقین دلانا تھا کہ اس کا ”تجربہ“ کامیاب رہا۔ اس کا یقین، میری کامیابی کی جی تھا!

☆ ☆ ☆

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا!

کرتے ہی اس جانب بڑھ گیا۔ میں چار فٹ طویل دروازے آخری سرے پر پہنچا تو وہ آمد کے شگاف کو بند کر کے پلٹ چکی تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھی جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی۔ میں نے واٹس ہین والاٹھ کھولنے کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کوٹھری میں آمدورفت کے ذرائع سے واقف ہو چکا ہوں۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھا پھر بے ساختہ سگڑادی۔ اس کے دانت ہموار اور صاف شفاف تھے جن کے سبب اس کی مسکراہٹ میں آٹھ چاند لگ گئے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی شاید اس لیے کہ وہ اس وقت انتہائی مقول لباس میں تھی۔ رابیل عرف روٹی نے جنور پر فل سلیو گرم ہائی ٹیک پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں مخصوص قسم کے جوگرز تھاپے جوتے تھے۔ اس نے اپنی زلفوں کو شانوں پر آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ لباس سے محروم حسن سوچ میں بیچان تو پیدا کرتا ہے تاہم روح کی سرشاری اور ذہن کی تازگی کا سامان نہیں کرتا۔ ہر حسن کا اپنا ایک لبادہ ہوتا ہے اور یہ اسی میں اچھا لگتا ہے۔ حدود و قیود اس کی فلاحی کو سمجھنے کے لیے احساس کی نزاکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

روٹی نے میرا تعقید جاریہ لیا اور سولایہ انداز میں بولی ”پلیس؟“

”ہائلز پلیس۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی رستہ واپس پر نگاہ ڈالی اور بولی ”اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ ہمیں ٹھیک ساڑھے تین بجے ایک مخصوص مقام پر پہنچنا ہے۔“

”آدمے گھنٹے کا مارجن ہے۔“ میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے وہ مخصوص مقام یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے؟“ میری آواز میں سرکشی کی سی لہریں۔

وہ روک کر مکمل ٹھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی ”فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ لگ بھگ پانچ سو میٹر ہوگا تاہم احتیاط کے پیش نظر کچھ زیادہ وقت رکھا گیا ہے۔ مائیکل ٹھیک سواتین بجے اس مقام پر پہنچے گا۔“

مائیکل کے ذکر پر میرا دھیان ساحل کی طرح چلا گیا۔ روٹی کے مطابق، مائیکل نے ساحل کو کوٹھری سے نکال کر کسی مقام پر پہنچانا تھا جہاں سے ان کے دیگر دو ساتھی ہمیں اپنے ساتھ اس پہاڑی خلیہ ٹھکانے سے کہیں دور اپنے لوگوں میں لے جاتے۔ اس کا مطلب یہی تھا ساحل کو مجھ سے پہلے کوٹھری

سے نکالا جائے والا تھا اور عین ممکن تھا وہ اس وقت کوٹھری سے باہر نکل چکی ہو!

میں روٹی سے کوئی سوال کئے بغیر اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔ وہ کموڈ کے نزدیک روک کر مکمل جھک کر عقیق دیوار کے ساتھ کوئی جھپڑ جھڑ کر رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس جھپڑ جھڑکا نتیجہ برآمد ہو گیا۔ کموڈ کے پیچھے واقع دیوار میں لگ بھگ ایک فٹ کا شگاف پیدا ہو گیا۔ وہاں کی پتھری دیوار سلائیڈ کرتے ہوئے ایک جانب ہٹ گئی تھی۔

روٹی سیدھی کٹھری ہوئی اور آواز دبا کر بولی ”راستہ مکمل گیا ہے۔ آ جاؤ۔“

میں نے اس کے بیان کردہ راستے میں جھانک کر دیکھا۔ مجھے اس کوہ میں دور تک تاریکی ہی تاریکی نظر آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”یہ راستہ تو بہت تنگ و تاریک ہے!“

”اس کی تنگی اور تاریکی میں مزہ ہے۔ تم ڈرو نہیں۔“

”میں کوٹھری کی دیوار میں موجود ایسے ہی ایک چور راستے سے واقف ہوں۔“ میں نے کہا ”میرے خیال میں ادھر زیادہ آسانی رہے گی۔ وہ راستہ اس کی بہ نسبت خاصا کشادہ ہے۔“

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”میں ہر راستے کے عواقب و جوانب سے آگاہ ہوں۔ کھلا ہوا راستہ آسان تو ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انتہائی غیر محفوظ بھی ہوتا ہے۔ اچانک کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو توقف ہوئی پھر بولی۔ میں اس معاملے میں تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں یہ تنگ راستہ ہماری کامیابی کی ضمانت ثابت ہوگا۔ تم مجھ پر میرے تجربے پر بھروسہ رکھو۔“

وہ بڑے اعتماد سے سرگوشیاں انداز میں بول رہی تھی۔ میں نے اپنی جانب بڑھے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ پہلے روٹی اس تاریک کوہ میں پہلو کے بل داخل ہوئی پھر مجھے بھی اندر کھینچ لیا۔ اس کے بعد اس نے مخصوص ٹیکنیک استعمال کر کے وہ شگاف بند کر دیا۔ ہم دونوں اس تنگ و تاریک کوہ کے اندر بند ہو گئے۔

اس راستے کی چوڑائی ایک فٹ کے قریب تھی۔ لہذا اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ روٹی نے کہا ”ہمیں لگ بھگ پچیس فٹ تک اسی طرح کھسک کر آگے بڑھنا ہوگا۔ تم یہاں پر اپنے چار فٹ کے تجربے کو استعمال کر سکتے ہو۔“

آمدورفت کے راستے کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ دروازے ایک فٹ چوڑی اور چار فٹ طویل تھی۔ ایک دیوار کے تجربے کے بعد مجھے اس ”گھٹنے“ میں اچھی خاصی مہارت حاصل ہوئی تھی۔ وہ تنگ سارائے کاٹنی کشادہ محسوس ہونے لگا تھا۔

ہمارے پہلو ایک دوسرے میں پیوست تھے اور ہم اچھ اچھ آگے سر کر رہے تھے۔ وہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ہم اپنے ہاتھوں کو آگے پھیلا سکتے لہذا ہمارے بازو پہلوؤں میں لٹک رہے تھے۔ روٹی مجھ سے آگے تھی اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو میرے بائیں ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ اس کا انداز کھینچنے والا تھا جیسے وہ اپنی گائینڈس کی روشنی میں مجھے آگے بڑھا رہی ہو۔ اس تنگ و تاریک کوہ ہمارے راستے میں کسی قسم کی ٹھن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ خامیت یہاں کی فقیر کا طرہ امتیاز تھا۔

ہم دو فٹ آگے بڑھے تو روٹی نے کہا ”میں جھپٹ رہی کے پاس لے جایا گیا تھا۔ وہاں خبریت تو رہی تا؟“ اس کی معلومات اب ڈیٹ تھیں۔

”تمہارا اندازہ درست نکلا۔“ میں نے اس کے ساتھ پیوست رہتے ہوئے جواب دیا ”وہ واقعی میری برین واشنگ کا ارادہ رکھتا ہے۔“ باتوں کے دوران میں ہمارا آگے کا سفر بھی جاری رہا۔

وہ بولی ”وہ میرا اندازہ نہیں تھا بلکہ میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی۔ کیا اس نے جھپٹنا چاہا یا کیا تھا؟“ روٹی کے اس سوال سے بڑی تشویش محسوس ہوئی۔

”وہ ایک سیشن مکمل کر چکا ہے دوسرا باقی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ درگزر پریشان نظر سے مجھے کھنکے گی۔ میں تاریکی کے اعٹ اس کی آنکھوں کو اب ان میں موج زن تاثرات کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی پریشانی کا اندازہ ہم نے اس کے بدن کی اضطرابی جنبشوں سے لگایا۔ اس اندازے کی توثیق روٹی کی متلاطم سانس نے کر دی۔ اس کا سیدھوٹھوٹھو کی طرح چل رہا فادور بے ترتیب سانس میرے چہرے پر رگڑ کر رہی تھی۔

میں نے اس کی ذہنی دولی کیفیت کو محاسبہ کیا۔ کسی کے حساس اور جذبات کو سمجھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ درجہ پیمانی سے محروم افراد انتہائی بے حس اور پھر دل بوٹے اردوئی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس کی فطرت کی خاطر بس نے کہہ دیا ”تمہیں فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ لی نے پناہ گزین کے پہلے سیشن میں جتنی تک بک کی اس کا جذبہ منتقل اثر نہیں ہوا اور دوسرے سیشن کی انشاء اللہ نوبت ہی

نہیں آئے گی۔“

”تم یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان!“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”اس کی آواز میں بڑی سنی خیر سرسراہٹ تھی۔ زہنی کا کوئی عمل بے اثر کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نے اسے پہلو سے ٹھوکا دیا اور کہا ”تم آگے بڑھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔“

وہ گریزی جنبش سے تھوڑا سا کھسکی اور بڑبڑانے والے انداز میں بولی ”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں وجدان!“

میں نے اسے آگے دھکیلے ہوئے کہا ”دراصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے ربی کو کچھ زیادہ ہی پاس پر چڑھا رکھا ہے۔ ناقابل شکست اور قادر مطلق صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی ہر میر کے لیے خدا نے سوا میر بنا رکھا ہے۔ ہر میر کو اپنے سے کم درجن پر ظلم کرتے ہوئے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ طاقتور اور ظالم ہو سکتا ہے۔“

میری یہ سنی خیر باتیں روٹی کی سمجھ میں نہ آئیں تو میں نے آسان الفاظ میں وضاحت کر دی اور آخر میں کہا۔

”پہلے سیشن میں ربی نے میری شخصیت تبدیل کرنے کا عمل کیا تھا۔“ وہ بڑی توجہ سے میری بات سننے لگی ”لیکن دیکھ لو میں وہی وجدان ہوں جو کل اسی وقت تم سے ایک طویل ملاقات کر چکا ہے حالانکہ ربی اپنی دانت میں مجھے اپنا منہ د فرماں بردار راجہ نامی ایک شخص بنا چکا ہے۔ اس راجہ میں باقی فینک وہ بعد میں کرے گا۔“

وہ ایک مرتبہ پھر کھڑکی۔ اس کے اس رکنے میں بیچانی کیفیت پائی جاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے پر اس کی چڑھی ہوئی سانس کی پیش محسوس ہوئی۔ تھیناؤ ہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنا چہرہ میری جانب پھیر لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے جذبات میں ڈوبی ہوئی روٹی کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ اس کے غمر غمراتے ہوئے ہونٹ میرے کان کو چھو رہے تھے۔

”وجدان! میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا ہے تم اس سے بھی آگے کی شے ہو۔“

اس کے لہجے میں موجود حیرت نے آواز میں ایک خاص قسم کا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے پہلو سے چپکے چپکے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں آگے کی شے ہوں اور نہ ہی پیچھے کی۔ تم مجھے زمین پر ہی رہنے دو تو اچھا ہے۔“

”تم خود کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ اس نے لہجے کی بے یقینی برقرار رہی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا "ایسی دیکھ کوئی بات نہیں۔  
"رہی جیسے ماہر عملیات کے اثر سے نکل آنا کوئی معمولی  
بات نہیں!"

"رہی ایک دھوکے باز ہے۔ کسی دھوکے باز کو بے  
دوقف بن کر سائی سے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا "بس  
اس کے لیے تھوڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم خواہ خواہ  
بات کو طول دے رہی ہو!"

اس کی تسلی نہ ہوئی، مضطرب لہجے میں بولی "تم نے جو  
کچھ کیا ہے وہ تھوڑی ذہانت کا کھیل نہیں وجدان۔ آئی  
سویرا تم مجھے پکڑ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"خواہ خواہ تمہیں کھا کر اپنا دین ایمان خراب نہ کرو۔"  
میں نے جھنجھلاہٹ آہیز انداز میں کہا "یہاں انکی گنجائش کہاں  
ہے جو میں تمہیں کوئی پکڑ دوں گا۔"

"تم الفاظ بدل کر مجھے بہلا نہ سکو گے!"  
"پھر تم کیسے بھلو گے؟"

"اپنے بارے میں سچ سچ بتا دو۔"

"میں نے ابھی تک تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"  
میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا "تم خواہ خواہ کی جرح  
بحث میں پڑ کر وقت ضائع کر رہی ہو۔ ہمیں جلد از جلد اس  
مقام پر پہنچنا ہے جہاں مائیکل ساحل کو پہنچانے والا ہے۔ ابھی  
بچی کی طرح آگے بڑھو۔ چاہیں یہ بے ہودہ راستہ اور کتنا باقی  
ہے!"

"ہم اس تنگ و تاریک راستے سرے پر کھڑے  
ہیں۔" روٹی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ باتوں ہی  
باتوں میں ہمیں فٹ کا فاصلہ ملے ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی  
سے بولی "اگر تم مجھے اپنی حقیقت نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں اس  
سنگناخ دیوار کے اس پار نہیں پہنچاؤں گی۔۔۔۔۔ اور تم جانتے ہو  
عقب میں داش روم والا راستہ بھی بند ہو چکا ہے۔ فیصلہ  
کر لو تمہیں اپنی ساسھی ساحل تک پہنچنا ہے یا اسی کموہ میں باقی  
زندگی گزارنا ہے؟"

"کیا باقی کی اس زندگی میں تم بھی میرے ساتھ  
ہو گی؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"ظاہر ہے میں کہاں جاؤں گی۔ ہم دونوں اسی کموہ میں  
رہیں گے!"

"پھر تو میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔" میں نے جلدی  
سے کہا "اس روٹی کے سہارے میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ نہ  
بابا! مجھے کالو یہاں سے۔"

میں جانتا تھا روٹی اپنی دھمکی پر کسی بھی طور پر عمل نہیں  
کر سکتی تھی۔ اس کا تو مشن تھا، ہمیں یہاں سے نکالنے کا۔ وہ

"میر تو میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔" میں نے جلدی  
سے کہا "اس روٹی کے سہارے میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ نہ  
بابا! مجھے کالو یہاں سے۔"

میں جانتا تھا روٹی اپنی دھمکی پر کسی بھی طور پر عمل نہیں  
کر سکتی تھی۔ اس کا تو مشن تھا، ہمیں یہاں سے نکالنے کا۔ وہ

اپنے بڑوں کے احکام کے خلاف کیوں کر جاسکتی تھی۔ وہ محض  
مجھ سے جھجھکا کر زبردستی تاکہ میں اپنا آپ اس کے سامنے  
کھول کر رکھ دوں۔ جواب میں بھی اس سے بڑا ہی سنجیدہ مذاق  
کر رہا تھا۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی صورت حال  
تھی۔

وہ سرور لہجے میں بولی "کیا واقعی مجھے اپنی اصلیت بتا دو  
گے؟"

"تم میری نیت پر شک نہ کرو۔" میں نے کہا۔  
"پھر بتاؤ جلدی سے۔" وہ چلی گئی۔

میں نے بتایا "میرا نام وجدان ہے۔ میں مارشل آرٹس کا  
ماہر ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی پختہ کار ہوں۔ بس!"

"تم مجھے اپنی اصلیت کے بارے میں بتاؤ جس کی  
مدد سے رہی ہو شے بائیں کو دھکا دیا ہے؟" اس کی اضطرابی  
آواز میں کڑیہ کا عنصر نمایاں تھا۔

اس "پٹ پٹ" کرنے والی روٹی کی زبان بندی ضروری  
ہو گئی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میرا نام وجدان خواہ  
خواہ ہی نہیں رکھا گیا۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ میری زبان  
اردو تمہارا سمجھ میں نہیں تھوڑی آئے گی!" اب میں مجبوراً واقعی  
اسے الو ہٹا رہا تھا۔

"تم بتاؤ۔۔۔۔۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے!" وہ بہت ہی  
پرجوش ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "میرے نام میں 'ن' ایک لاک کی حیثیت  
رکھتا ہے۔ باقی حروف کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ دو تو جادو  
بنتا ہے۔ میں جادو جانتا ہوں۔۔۔۔۔ آئی مین نیجک!"

اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ یہ جان  
خیز لہجے میں بولی "او! مائی گاڈ! تم نیجک جانتے ہو۔۔۔۔۔ یعنی  
نیجکشن (جادو گر) ہو؟"

"ہاں میں جادو گر ہوں۔" میں نے غصے سے لہجے میں کہا۔  
"کوئی جادو دکھاؤ! وہ فرمائش کر رہی ہوں۔"

میں نے نہایت ہی آہستگی کے ساتھ اپنا چہرہ اس کے  
چہرے پر جکڑا دیا۔ اس کی فرمائش پوری ہوئی۔ میرے چلائے  
ہوئے جادو نے چند لمحات کے لیے اس کی قوت گویائی چھین  
لی۔ تنگ و تاریک کموہ میں موت کا سناٹا پھیل گیا۔ اس سناٹے  
میں دو دل دھڑک رہے تھے۔

☆ ☆ ☆  
ہم اس کموہ سے باہر نکلے تو میری پشت پر ایک وزنی بیگ  
کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم مکمل شیب کی طرف جا رہے تھے۔ وہ  
پتھر پتھر راسر ہوا تھا اور اس کی چوڑائی آگ۔ پتھر جس فٹ  
رہی ہوئی۔ راستہ رات کے آخری پتھر بالکل خاموش اور

ہم اس کموہ سے باہر نکلے تو میری پشت پر ایک وزنی بیگ  
کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم مکمل شیب کی طرف جا رہے تھے۔ وہ  
پتھر پتھر راسر ہوا تھا اور اس کی چوڑائی آگ۔ پتھر جس فٹ  
رہی ہوئی۔ راستہ رات کے آخری پتھر بالکل خاموش اور

آتش فشاں (14) حصہ 11

پران تھا کچھ سو یا سا!  
میں نے روٹی سے پوچھا "کیا اس راستے پر چلے ہوئے  
میں کے اندر اتر رہے ہیں؟"

"نہیں" وہ غماض قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے  
لی "ہم زمین پر اتر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔  
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "رہی نے اپنا یہ خفیہ  
کاندہ رخ زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کے اندر  
لایا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے مطلوب مقام تک پہنچنے کے لیے کم از کم  
ٹھ سو فٹ نیچے اترنا ہوگا۔ اس کے بعد ہماری منزل کا رخ  
ل جائے گا۔"

میں نے اس کے ساتھ ساتھ ڈھولائی راستے پر اترتے  
کے کہا "اس دیوتا قاتل پہاڑ کے اندر اس قسم کا ٹھکانا بنانا  
لڑنا کبھی ہوسکتا ہے۔ ارضی اور پہاڑی تغیر و تبدل  
ما کے اندر بہت ہی نقصان دہ تبدیلیاں بھی لاسکتے ہیں۔"

"تمہاری تشویش کسی حد تک درست ہے۔" وہ دیوار  
لے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی "لیکن یہاں کی  
برست حال بالکل مختلف ہے۔ مائنٹ ملنے سال کے بارہ  
چنے برف کی موٹی تہ میں ڈھکا رہتا ہے اس لیے اس کے اندر  
اور پہاڑی تغیر و تبدل کے امکانات بہت کم ہیں۔ مکمل  
گرم پہاڑ اپنے اندر اس قسم کی تبدیلیوں کے زیادہ امکانات  
لیجے ہیں اور پھر۔۔۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ اس کے  
تھوڑی سی قدم بھی رک گئے۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مجھے وہیں خاموش  
رہنے کا اشارہ کر کے نہایت ہی غماض قدموں سے  
گے بڑھ گئی۔ چند فٹ کے فاصلے پر مجھے ایک موڑ نظر آ رہا  
ا۔ موڑ کے اس طرف مناسب روشنی کے آثار دکھائی دیتے  
تھے۔ ہم نے اس ایک جس دس فٹ راستے پر سفر کیا تھا وہاں  
بالکل روشنی موجود تھی۔ ایک اندازے کے مطابق ہم دو سو  
فاصلے طے کر چکے تھے۔

چند سیکنڈ بعد روٹی واپس آ گئی اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے  
آ "آؤ آگے راستہ کیسے ہے۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔"  
میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ موڑ کے بعد راستے کی چوڑائی  
بافت ہو گئی تھی۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے  
کے بتایا "میں یہ کہہ رہی تھی کہ رہی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے  
بچے کے باہر ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے  
ماٹ ملنے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر  
آ۔ ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام

خفیات ماہرین کی نظر میں بھی ہوں گے لہذا ان کا کوئی نہ کوئی  
سد باب بھی کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رہی اپنے خوار یوں کے  
ساتھ اتنے اطمینان سے یہاں موجود نہ ہوتا۔"

روٹی، ایک معقول اور وزن سے مبرور بات کر رہی  
تھی۔ میں نے اسے چھیڑا "مجھے تو لگتا ہے رہی نے اس خفیہ  
ٹھکانے کی تعمیر کے سلسلے میں تم سے بھی خدمات لی ہوں گی!"

وہ رک کر ابھرن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی "تم کہنا کیا  
چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔  
میں نے کہا "تم بھی کسی ماہر ارضیات سے کم تو نہیں  
ہو!"

وہ شکایتی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی "تمہیں  
باتیں بنانا خوب آتی ہیں!"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کی تقلید میں قدم اٹھاتے  
ہوئے کہا "ایک بات تو بتاؤ، روٹی؟"

"ہاں بولو۔" وہ میری طرف بغیر بولی۔  
میں نے پوچھا "تمہارا نام مجھے ابھرا رہا ہے۔ کچھ میں  
نہیں آتا تمہیں رائل کھوں یا روٹی؟"

"اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ مت ڈالو۔" وہ رک کر معنی  
خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی "جب بھوک محسوس ہوتی روٹی کہہ  
لیا کرو۔ ورنہ رائل کھوں بھی چلے گا!"

اس کھلی ڈلی امر کی حینہ نے اپنے بے ہاک انداز سے  
مجھے پسینے میں نہلا دیا۔ میں اس کے جھلکے کو بڑی وضاحت سے  
سمجھ گیا تھا۔ یہ بات میں نے ہی اسے بتائی تھی کہ اردو میں  
روٹی بڑی کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے یہ بھوک مٹانے کے کام آتی  
ہے۔

وہ مجھے سوچوں کے ایک لافانی امتحان میں ڈال کر بے  
پردائی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے انسانی فطرت کے عین  
مطابق اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ انسان کو بھوک ہو یا نہ  
ہو یہ ہر وقت رزنی روٹی کی تلاش میں رہتا ہے! تاہم ان  
لمحات میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں رائل اینڈرزن کو بعض  
رائیل ہی کہوں گا۔

رائیل نے مجھے بتایا کہ اس موڑ تک پہنچتے ہوئے ہم نے  
دوسو میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو سو فٹ نیچے  
بھی اتر آئے تھے۔ اس میں فٹ چوڑے راستے میں بہ نسبت  
زیادہ ڈھلان تھی۔ رائل کے مطابق اب ہمیں اس راستے پر  
کم و بیش تین سو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا! اس کے ساتھ ہی  
میرے پیچھے سو فٹ نیچے بھی اترنا تھا اسی سبب ڈھلان کا زاویہ  
بڑھ گیا تھا۔

جب ہم اپنے مطلوب مقام پر پہنچیں گے تو گگ بھگ

جب ہم اپنے مطلوب مقام پر پہنچیں گے تو گگ بھگ

جب ہم اپنے مطلوب مقام پر پہنچیں گے تو گگ بھگ

جب ہم اپنے مطلوب مقام پر پہنچیں گے تو گگ بھگ

پانچ سو میٹر یعنی آدھا کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے ساتھ ساتھ سو فٹ بلندی سے نیچے اتر چکے ہوں گے۔" رائیل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

"مگر تم نے تو کہا تھا ریل کی یہ خفیہ ٹھکانا سطح زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے؟" میں نے ابھمن زدہ لہجہ میں سوال کیا۔

وہ یوں "میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ ہم اپنے مطلوبہ مقام سے راستہ بدل دیں گے۔ وہ مقام سطح زمین سے دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور یہ راستہ جس پر اس وقت ہم سفر کر رہے ہیں آگے جا کر تیس فٹ چوڑا ہو جائے گا۔ لگ بھگ ایک ہزار میٹر (ایک کلومیٹر) کے بعد یہ راستہ اس زمین دوڑ راستے سے چالے گا جو سیدھا پیرس ویل والے فوجی کیمپ تک پہنچاتا ہے لیکن مطلوبہ مقام پر پہنچ کر ہماری سمت بدل جائے گی۔ تم پہاڑی کے اندر ہی اندر کچھ فاصلہ طے کر کے دوسری جانب سے باہر نکلے گے۔"

"تم نے مجھے ابھما دیا ہے رائیل!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری باتوں سے لگتا ہے اس پہاڑ سے باہر نکلنے تک ہمارا ساتھ رہے گا اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے تم مجھے کسی مطلوبہ مقام پر پہنچا کر واپس چل جاؤ گی؟"

"تمہارا دوسرا احساس درست ہے ودھان!" وہ اپنی رست واضح کرنا دھڑکتے ہوئے یوں "ہمارا ساتھ مطلوبہ مقام تک ہی ہے۔ تمہیں وہاں پہنچا کر مجھے واپس آنا ہوگا۔ رائیل بھی واپس آئے گا۔ ہم دونوں انہی لوگوں کے درمیان رہیں گے ہائل پہلے کی طرح۔۔۔۔۔ ان کے وفادار بن کر!" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یوں۔

"مطلوبہ مقام پر ہمارے دو آدمی موجود ہوں گے۔ ان کے نام ریمنڈ اور ٹینکس ہیں۔ تم دونوں ان کی راہنمائی میں پہاڑ سے باہر نکلے گے پھر وہ تمہیں ریل کی کچھ سے بہت دور اپنے لوگوں میں پہنچا دیں گے۔" بات ختم کرتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر رست واضح کر دیتے تھے۔

باتوں کے دوران میں ہم مسلسل سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے رائیل گہری میں دقت دیکھ لیتی تھی۔ میں دقت ہٹانے والے اس آلے سے محروم تھا مجھے نہیں معلوم تھا اس وقت رات کا کیا بجنا ہوگا۔ خطاط انداز سے کے مطابق ہمیں کوٹھری سے نکلے ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آ رہا تھا۔ میں نے رائیل سے پوچھا۔

"تمہاری رست واضح کیا دقت بتا رہی ہے؟"

"تین بجیں!" اس نے جواب دیا۔

"اُدھ اس کا مطلب ہے ابھی پانچ منٹ کا سفر باقی

ہے!"

"میرا خیال ہے ایک منٹ بعد ہم اپنے مطلوبہ مقام پر ہوں گے۔" رائیل نے آشفتہ کیا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "اتنی جلدی؟"

رائیل نے میرے حیرت بھرے جملے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ثابت قدمی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے قدموں کے تعاقب میں قدم اٹھانے لگا۔

ذرا غور کیا تو یہ حقیقت میری سمجھ میں آگئی۔ اس وقت ہم دھولائی راستے پر سفر کر رہے تھے۔ ہم کہیں تھے ہمارا سفر مسلسل جاری رہا تھا۔ بلندی سے اترتے وقت لامحالہ رفتار بڑھ جاتی ہے اور توانائی بھی کم خرچ ہوتی ہے جب کہ اس کے بالکس چڑھائی چڑھتے وقت رفتار کم ہو جاتی ہے اور توانائی بھی زیادہ صرف کرنا پڑتی ہے۔ مجھے حالت بے ہوشی میں یہاں لایا گیا تھا۔ جو بھی فوت خرچ ہوئی ہوگی وہ گاڑی کے انجن ہی کو ہٹا ہوگا۔

میں نے تاحقہ نگاہ دھڑکتے دل سے جائزہ لیا۔ رائیل کے مطابق ساحل کو سوا تین بجے مائیکل کے ساتھ اس مطلوبہ مقام پر پہنچنا تھا اور اب ساڑھے تین بجتے والے تھے۔ مجھے دور دور تک ساحل اور مائیکل کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے رائیل سے پوچھا۔

"ساحل کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ اسے تو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تم نے بتایا ہے ایک منٹ بعد ہم۔۔۔۔۔؟"

"اب وہ ایک منٹ بھی گزر گیا۔" رائیل نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔"

میں نے بے قراری سے ہر سمت نگاہ دوڑائی اور میری نگاہ واپس لوٹ آئی۔ میں نے بے تاب لہجے میں رائیل سے استفسار کیا "ساحل اور مائیکل کہاں ہیں؟"

"ابھی دکھائی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے یوں اور پہاڑی دیوار کے ساتھ مصروف ہوئی۔

میں خاموشی سے اس کی کارروائی کو دیکھنے لگا۔

رائیل نے اس دیوار کے مختلف حصوں کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی خفیہ راستہ کھولنے کے لیے مخصوص ٹیکنیک کا استعمال کر رہی تھی۔ لہذا اس دیوار کے عقب میں ہی وہ مطلوبہ مقام واقع تھا جہاں ساحل کو مائیکل نے اور مجھے رائیل نے پہنچانا تھا پھر ریمنڈ اور ٹینکس ہمیں ساتھ لے کر آگے بڑھ جاتے۔ اس کا مطلب یہی تھا جب ہم دیوار کے پیچھے اس مقام پر پہنچیں گے تو بیک وقت ساحل

مائیکل ریمنڈ اور ٹینکس سے ملاقات ہو جائے گی۔ اگر رائیل مجھے مطلوبہ مقام تک پہنچانے میں کامیاب رہی تو مائیکل کی کامیابی بھی یقینی تھی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد رائیل اپنے مقصد میں پوری اتری۔ اس دیوار کے دو بڑے پتھر سلائیڈنگ ڈوڑ کے مانند دائیں بائیں سرک گئے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے چار بائی چار فٹ کا ایک شکاف کھل گیا۔ فوراً سرست سے میرا چہرہ مکمل اٹھا۔

ہم دونوں نے اس شکاف کے اندر داخل ہونے سے پہلے متنی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اسی وقت ہم چمک اٹھے۔ نشیب کی طرف ہمیں کسی ہیوی گاڑی کی پٹ لائش دکھائی دیں۔ وہ گاڑی انجن کی مخصوص آواز کے ساتھ چڑھائی چڑھتی اور یقینی طور پر اس کا رخ ہماری ہی سمت تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس لمبے لمبے نور بکھیر رہی تھیں۔ یہ لحاظ دیکر ان لائٹس کے عقب میں وہ گاڑی ہمارے نزدیک آتی رہی تھی۔

ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور شکاف کے اندر کود گئے۔

اندر پہنچتے ہی رائیل نے دیوار پر مختلف مقامات سے لٹکی چھڑ چھاڑ کی اور وہ دونوں پتھر سلائیڈ کرتے ہوئے اپنے اصل مقام پر آگئے۔ شکاف بند ہو گیا۔ میں نے خود کو ایک طویل راہ داری میں پایا۔ وہ راہ داری لگ بھگ دس فٹ بڑی تھی۔ تھوڑے فاصلے کے بعد آگے اندر چرائی اندھیرا

1۔

رائیل نے دیوار پر چڑھی ہوئی ایک لائٹ کو اس کے اسٹینڈ سے نکال لیا اور اس کی روشنی میں ہم آگے بڑھنے لگے۔ میں نے کہا "رائیل! یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا؟"

"مائیکل ساحل کو لے کر یہاں پہنچا تو ہے۔" وہ بڑے قی سے یوں۔

"پھر وہ دونوں کہاں ہیں؟" میرے سوال میں احتجاج مل تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا اور دھیمے لہجے میں مائیکل کو "ارا" مائیکل۔۔۔۔۔!"

اس کی جیمیں آواز راہ داری میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔ ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ رائیل کی پکار کے جواب میں کوئی آواز نہ ابھری۔ وہ ابھرنے لائٹ کو تھامے اور آگے بڑھ گئی اور ایک مرتبہ پھر اس نے مائیکل کا نام لے کر اسے آواز دی۔

اس بار بھی مائیکل نے اس کی پکار کا جواب نہ دیا۔ مجھے آتش فشاں

جھجلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے قدرے ترش لہجے میں اس سے پوچھا۔

"رائیل! کیا تمہیں یقین ہے مائیکل اس غار میں پہنچ چکا ہے؟"

"میرے یقین کی نشانی یہ لائٹ ہے۔" وہ ابھرنے لائٹ کو جھلاتے ہوئے یوں۔

"یہ لائٹ۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟" میں الجھ کر رہ گیا۔

"ہمارے درمیان پہلے سے یہ طے تھا جب مائیکل یہاں پہنچ جائے گا تو وہ اس لائٹ کو ان کر کے دیوار پر ٹاٹک دے گا۔" رائیل وضاحت کرتے ہوئے یوں "اس لائٹ کی موجودگی ظاہر کرتی ہے وہ یہاں پہنچ چکا ہے۔" وہ بات کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔

"پہنچ چکا ہے تو پھر نظر کیوں نہیں آ رہا۔" میں جھٹا گیا "کیا اس نے سیلیٹائیو ٹی وی بین لی ہے؟"

"یو مین۔۔۔۔۔ سولوسن کیپ؟" وہ رکے بغیر استفسار یہ انداز میں یوں۔

"لیس! آئی مین اٹ!" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے رائیل کی چیخ سنائی دی۔ وہ ایک بے ساختہ چیخ تھی۔ میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کسی شے سے ٹھوکر کئے باعث لاکھڑا لگی تھی۔ وہ قدرے سنبھلی اور دھشت زدہ لہجے میں یوں۔

"ودھان! مائیکل۔۔۔۔۔ مائیکل یہاں۔۔۔۔۔ پڑا ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے ابھرنے لائٹ لے لی اور جب کہ اس کا گھما کر کرنے لگا پھر رائیل نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں پتھر بے فرش پر ایک شخص بے ترتیب پڑا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا "وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ گردن کی ہڈی تو زکرا سے موت کے گھاٹ اتار گیا تھا۔"

میں نے مائیکل پر سے روشنی ہٹائی اور رائیل کی طرف دیکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر سوال کیا "مائیکل کو کس نے قتل کر دیا؟"

"مجھے کیا معلوم؟" اس کے لہجے سے دھشت برس رہی تھی۔

میں گہری تشویش میں ڈوب گیا۔ مائیکل کی موت اور ساحل کی غیر موجودگی کسی سنگین صورت حالات کا اعلان کر رہی تھی۔ رائیل کا دعویٰ تھا وہ دونوں اس مقام پر پہنچے تھے۔ مائیکل کی لاش اس کے دعوے کو جزوی طور پر سچا ثابت کر رہی تھی۔ اس دعوے کی روشنی میں کہا جاسکتا تھا ساحل بھی وہاں



غنی تھی۔ اگر وہ ہانگیل کے ساتھ وہاں پہنچی تھی تو بھر نظر کیوں  
میں آ رہی تھی؟

اس نے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ بولتا اس خفیہ پناہ  
اہ کے باہر کسی ہیوی انجن والی گاڑی کے رکنے کی آواز  
بھری۔ ہم دونوں نے یہ یک وقت متحوش نظروں سے ایک  
دوسرے کو دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں کے ذہنوں میں ایک  
ناظرین کا سوال تھا۔

کیا ہمیں اس پناہ گاہ میں داخل ہوتے دیکھ لیا گیا ہے؟  
پھر فوراً ہی اس خوفناک خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہم  
نے اپنے عقب میں وہ خفیہ پتھر کا سلائیڈنگ ڈور کھلنے  
دئے سنا۔ بے اختیار ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ کھلے ہوئے در  
کے پار ایک ہیوی ٹرک کھڑا نظر آیا۔ اب اس بات میں کسی  
ٹک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ اس ٹرک کی ہڈی  
ہمیں میں ہمیں اس پناہ گاہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا گیا  
تھا۔ یہ بہت ہی دہشتناک صورتحال تھی منزل پر پہنچ کر منزل کا  
نشان کھودینے والی بات تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے راکیل کو  
دیکھا اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ جان ابھاکو..... وہ آ رہے ہیں۔“

میں نے اس کی وحشت بھری آواز پر مڑ کر اس کھلے  
ہوئے در کو دیکھا۔ وہاں سے تین چار بارودی افراد بڑے محتاط  
انداز میں اندر داخل ہو رہے تھے۔

یہ سوچنے کا نہیں بلکہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ میں نے ہاتھ میں  
پکڑی ہوئی ایمر جنسی لائٹ کو پتھر جی سنگلاخ دیوار پر دے  
مارا۔ اگلے ہی لمحے وہ پناہ گاہ تاریکی میں ڈوب گئی۔ پھر ہم  
دونوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر اس طویل اندھے غار میں  
دوڑ لگا دی۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں جھمکانے والی آواز سنائی  
دی ”خبردار! رک جاؤ تم جو کوئی بھی ہوساٹنے آؤ۔ میں تین  
تیک گنوں گا۔ اگر تم لوگوں نے میرا حکم نہ مانا تو بھون کر رکھ  
دوں گا۔“

دھمکی دینے والی آواز سے تابت ہوتا تھا وہ لوگ ہمیں  
پہچان نہیں سکے۔ میں تو وہاں انجینی تھا۔ راکیل کو بھی نہ پہچانا  
ہمارے لیے مفید تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا ”رک کر  
ذرا ان سے نمٹ لیا جائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری  
رفتاری میں کمی آنے لگی۔

راکیل نے بڑی شدت سے میرے بازو کو کھینچتے ہوئے  
کہا ”وہ جان! ان شیٹالوں کی دھمکی میں نہ آنا۔ یہ لوگ ہم پر

گوئی چلانے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ بھاگتے رہو!“  
میں نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے ابھمن زدہ لہجے میں  
استفسار کیا ”تم یہ بات اتنے دوثق سے کس طرح کہہ رہی  
ہو۔“ ”کیونکہ ہم اس وقت بارود کے خطرناک ذخیرے کے  
درمیان سے گزر رہے ہیں۔“

میرے پورے بدن میں ایک سرایتی سی سرایت  
کرمی۔ لرزیدہ آواز میں میں نے راکیل سے پوچھا ”کیا تم  
کوئی سنگین مذاق کر رہی ہو؟“

”نہیں“ وہ مسلسل دوڑتے ہوئے قطعیت سے بولی ”یہ  
خفیہ پناہ گاہ درحقیقت یو۔ ایس آری کا ایمرجنس ڈپو ہے۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں  
ہلاکت خیز مادے کے کسی ماڈٹ منگلنے پر بیٹھا ہوں اور میرے  
دشمن ہاتھ میں دیاسلائی تھاے بڑے کردہ انداز میں مجھے دیکھ  
رہے ہوں..... اور اب جب میں وہ بارود کا ڈھیر ایک دھماکے  
سے اڑ جانے والا ہوں اور اس کے ساتھ ہی.....

میں اس سے آگے اور کچھ نہ سوچ سکا۔ میری سوچ کو  
راکیل کی وحشتناک سچے سے بریک لگا دیے تھے۔ وہ کسی  
شے سے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ اس نے چونکہ..... میرا ہاتھ پڑی  
مضبوطی سے قہام رکھا تھا اس لیے مجھے بھی شدید ہچکناک اور  
میں منہ کے بل زمین کی طرف آ رہا۔

میں نے حفظ بقا قدم کے طور پر اپنے چہرے کو ہتھی فرش  
سے ٹکرانے سے بچانے کے لیے دونوں ہاتھوں کو آگے پھیلا لیا  
اور اسی وقت میرے ہاتھ کسی انسانی جسم سے ٹکرائے۔ وہ  
انسانی جسم راکیل نہیں تھی بلکہ راکیل اسی جسم سے ٹھوکر کھا کر  
گری تھی اور مجھے بھی جزوی طور پر گرنے کے لیے مجبور کر دیا  
تھا۔ وہ انسانی جسم سنگلاخ زمین پر اوڑھنا پڑا تھا۔

میں نے بے اختیار اس کے چہرے کو ٹٹولنے کی کوشش کی  
اور جب میرے ہاتھ اس کے سر تک پہنچے تو میرا دل اچھل کر  
طلق میں آ گیا۔ مجھے اپنے بدن پر چوڑیاں سی ریشمی محسوس  
ہوئیں۔ میرے ہاتھ کسی حسد کی دروازہ ریشمی زلفوں کے گداز  
سے ہمکنار ہو کر پتھر کے ہو گئے تھے۔

میرے دل نے تڑپ کر کہا ”نہیں یہ میری ساحل نہیں  
ہو سکتی!“

اس سے پہلے کہ میں بے سدھ پڑی اس حسد پر مزید  
کوئی دستکاری کرتا مجھے اپنے عقب میں دوڑنے سے روکنے  
قدموں کی آواز سنائی دی۔

میں موت وحیات کے بیچ سوالیہ کاٹنا بن کر رہ گیا!



نہر کے تو ہم بے دریغ فائرنگ شروع کر دیں گے۔ یہ اندھا  
دھند تہارار ادائی ممکن بن کر رہ جائے گا۔“

یہ آواز میرے عقب میں پیپس فٹ کے فاصلے سے ابھری  
تھی اور اس میں ایک خاص قسم کا حکم پایا جاتا تھا۔ اس سے یہ  
ثابت ہوا کہ مسلسل تعاقب کرتے ہوئے وہ لوگ ایک مخصوص  
فاصلے سے زیادہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ یہ محتاج روری اس  
اندھیرے کے باعث تھی جس نے غاری کی آنکھیں چھین لی  
تھیں۔

میں یک لخت رک گیا۔ میرے تعاقب میں دوڑنے  
والے قدم بھی اٹھنا بند ہو گئے۔ اب وہ مجھ سے اتنی دوری پر  
تھے کہ ان کی ہانپتی کانپتی ہوئی سانس میری سماعت تک  
رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ میں دیوار کی پشت سے پشت لگا کر  
سانس روک کے کھڑے تھا لہذا وہ مجھے کسی بھی انداز سے  
لوکت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ یوگا کا اعجاز تھا کہ میں کئی منٹ تک  
مسلسل سانس روک سکتا تھا۔ یوگا زندگی کو آسان اور  
خوب صورت بنانے کے ساتھ ساتھ اعصابی قوت میں بھی اضافہ  
کرتا ہے۔

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے قریب سے ایک جھلساؤ آوا  
ابھرتی سنا دی۔ یہ ہی شخص تھا جو اس سے پہلے بھی پونا آ  
تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”وہ دونوں رک گئے  
ہیں۔ انہیں فوراً حراست میں لے لو۔“

”سرا! اندھیرے میں وہ کہیں دکھائی نہیں دے  
رہے۔“ ایک محوم آواز ابھری۔ لہجے میں بے بسی رہتی  
تھی۔ ”انہیں کیسے پکڑا جائے؟“

”یو.....“ مجاز اسرغریا ”فریڈ اٹم اتنے احمق کیوں ہو  
اندھیرا ہے تو تاریق آن کر دو۔ کیا تمہارے پاس تاریق نہیں  
ہے؟“

”سر رامبٹ! میرے پاس تاریق ہے۔“ یہ ایک تیر  
آواز تھی۔

”ٹھیک ہے رابن۔“ رامبٹ نے فیصلہ کن انداز  
کہا ”تم اپنی تاریق جلاؤ اور انہیں تلاش کرنے کی کوشش کر  
کم آن بھری اب میں نے بڑے غور سے انہیں دیکھا ہے۔  
دونوں نیچے ہیں آسانی سے ہمارے قابو میں آ جائیں گے۔  
ان چاروں کے ”سرخند“ مسٹر رامبٹ کا مشاہدہ قابل  
تھا۔ اب کی ہا بھی تنگدستی میں تین کے نام سے واؤ  
ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ رابن اپنی تاریق کو روشن کرتا  
دیوار کے ساتھ ساتھ پشت کو رکھتے ہوئے بیک ٹوڈی پوٹا  
کھسکا شروع کر دیا۔

ہوئے لہجے میں کہا ”اور تم فکر نہ کرو۔ ایسے مواقع پر میں  
خود بھی بہت سفاک اور خطرناک بن جاتا ہوں۔“

وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی پھر سراسیمہ لہجے میں بولی۔  
”وہ جان انجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

راکیل ایک عملی لڑکی تھی۔ وہ جس نوعیت کے مشن میں  
حصہ لے رہی تھی وہ نہایت ہی اہم اور دشمن تھا۔ اس کے بدوں  
نے کچھ سوچ کر ہی اسے منتخب کیا ہوگا۔ وہ بدزل اور ڈر پوک  
نہیں تھی۔ اس کا شمار چھوٹی موٹی لڑکیوں میں نہیں ہوتا تھا۔  
تاہم اس وقت ہم جس قسم کی صورت حال سے گزر رہے  
تھے اس میں راکیل کا کفیوز ہو جانا کوئی خاص بات نہیں تھی۔  
وہ اپنا مشن ناکامیاب ہوتے دیکھ کر گہری تشویش میں مبتلا  
ہو گئی تھی۔ اسے اپنے بدوں کو جواب دینا مشکل نظر آ رہا تھا۔

میں نے زبردستی سے خود سے الگ کیا اور تھقی آہیز لہجے  
میں کہا ”تمہیں خوف زدہ ہونے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔  
خاموشی سے یہاں کھڑے ہو کر تماشا دیکھو..... دیکھو نہیں، بلکہ  
سماعت کرو۔ کیونکہ دیکھنے کے لیے روشنی درکار ہے وہ ہمیں  
میسر نہیں۔“

وہ چاہتے تھے کہ کیا کیا کہنے والی تھی۔ زبان سے پہلے  
اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور ایک مرتبہ پھر مجھے خود  
سے پیوست کرنے کی کوشش کر ڈالی تاہم میں اس کی سعی  
کو ناکامیاب بناتے ہوئے تاریک غار میں آگے بڑھتا  
چلا گیا۔ تعاقب موت ایسے چوٹیلوں کی کہاں اجازت دیتی  
ہے!

یہ میری ایک چال تھی جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر چلی  
تھی۔ میں اور راکیل خاصی تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے  
تھانہ میں سے اچھے خاصے فاصلے پر نکل آئے تھے مگر راکیل  
سے ہونے والی تنگدستی کے فاصلے وہ فاصلہ گھٹ کر بہت کم رہ گیا  
تھا۔ میں اس غار میں مسلسل دوڑ کر اپنے دشمنوں پر یہ ثابت  
کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے ان کی دھمکی کا اثر نہیں لیا اور آگے ہی  
آگے بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔

میں دوڑتے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بارود کے ایک عظیم  
ذخیرے کے پھونچے واقع وہ اندھا غار کتنا طویل ہوگا۔  
داخلے کے وقت اس کی چوڑائی دس فٹ معلوم ہوئی تھی۔ میں  
بہ تدریج دوڑوں میں جا رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ راکیل  
سے اتنے فاصلے پر آ جاؤں کہ اپنے حقائق میں سے مدبھیز کے  
دوران میں کسی بھی طور راکیل پیٹ میں نہ آئے۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں ایک مرتبہ پھر دھمکی آمیز  
آواز سنا دی ”یہ آخری وارننگ ہے۔ اگر تم دونوں کے قدم

یہ میری ایک خطرناک حرکت تھی تاہم سانس روکے رکھنے کے سبب میں محفوظ رہا اور ان کی توجہ میں آئے بغیر میں ان سے پیچھے نکل آیا۔ جب راہن کی نارنج آن ہوئی تو میں ان سے دس فٹ پیچھے غار کے آغاز کی جانب بچھڑ چکا تھا۔

خیریت کمزوری کہ ان چاروں کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے سر کئے کا مکمل جاری رکھا اور راکٹل سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنے لگا تاہم میں اس وقت اس غار کی دوسری دیوار سے چپکا ہوا تھا راکٹل کی مخالف دیوار سے!

تھوڑی دیر تک نارنج کی مخصوص روشنی کا دائرہ غار سے اُدھر اُدھر اچھلتا رہا پھر ایک شخص نے جھنجھلاہٹ بھرے لیے میں کہا "لگتا ہے وہ دونوں کوئی خفیہ درکھول کر اندر گھس گئے ہیں۔ اگر یہاں ہوتے تو نظر میں ضرور آ جاتے۔"

یہ اس چوتھے شخص کی آواز تھی جس کا نام ابھی تک میرے علم میں نہیں آ سکا تھا۔ اس کا یہ تیسرا خاصا خطرناک تھا لیکن رابرٹ نامی سینئر نے اسے ڈانٹ ملا دی۔

"اسٹیورٹ! لگتا ہے تمہارے دماغ کا کوئی اسکرپو ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اگر وہ لوگ اندر کسی اسٹور میں داخل ہوئے ہوتے تو راستے کے کھلے اندر بند ہونے کی آواز ضرور آتی۔ ہم نے ان کے رکتے ہوئے قدموں کی آواز سنی پھر پین ڈراپ سنا چھا گیا۔ اس کے بعد ہم ہی باری باری پو لے ہار ہے ہیں۔"

رابرٹ نے ایک جھنجھکی نکتہ بیان کیا تھا۔ وہ خاصا معاملہ فہم اور درویش رائیش لگتا تھا۔ میں اس تصور ہی سے تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ ہمارے دونوں جانب دیواروں کے عقب میں مختلف اسٹور وجود رکھتے تھے جن میں آنے جانے کے لیے مخصوص راستے کھولے اور بند کئے جاتے ہیں۔ راکٹل مجھے بتا چکی تھی غار نما وہ خفیہ ایڈو۔ ایس آری کا ایموونیشن ڈپو تھا۔ رابرٹ کے اظہار سے راکٹل کی بات تصدیق ہوتی تھی۔ اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ لوگ ہرگز ہرگز غار تک نہیں کریں گے میں نے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تاریک غار میں ان چاروں سے نمٹنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اگر ان میں سے کوئی واپس چلا جاتا یا غار کے اندر ہی سے باہر والوں کو یہاں کے حالات کی خبر دے دیتا تو ہم ایک ایسی مشکل سے دوچار ہو جاتے کہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ یہ دیکھی ہی مورتی جلال ہو جاتی کہ..... میں تو چھوڑتا ہوں مگر مکمل نہیں چھوڑتا!

یہاں سے کسی کو باہر جانا چاہیے تھا اور نہ ہی یہاں پیش

آنے والے حالات کی کوئی اطلاع رہی موشے ہاتھ تک پہنچنا چاہیے تھی! اس عزم کے ساتھ میں حرکت میں آئے ہی والا تھا کہ نارنج کی قمر کی ہوئی لائٹ کا دائرہ میرے جسم کو گھیرے میں لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین آوازیں بے یک وقت ابھریں۔ ان کے مشترک لہجے میں حد درجہ استعجاب پایا جاتا تھا۔

"ایک تو وہ رہا.....!"

یہ جملہ مکمل ہونے تک میں وہاں نہ رہا جہاں مجھے فریس کیا گیا تھا۔ میں فضا میں اچھلا اور فرنٹ سرسالت لگاتے ہوئے دوسری دیوار کی طرف چلا گیا۔ اس غار کی سمت میری کوفری کی بہ نسبت خاصی بلندی پر داغ بھی لہذا سرسالت کی جھیل میں مجھے کسی دیواری یا چھٹی دیواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ کام میں نے چشم زدن میں نمٹا دیا۔

میری توقع کے عین مطابق نارنج کی روشنی کا ہالہ چپ کر کے اس دیوار کی طرف چلا گیا جہر میں نے اڑان بھری تھی لیکن دشمنوں کی اس فطری حرکت کے لیے میں پہلے ہی وقتی طور پر تیار تھا لہذا میں اس روشن دائرے میں داغ نہ ہو سکا۔

سرسالت کی جھیل کے ساتھ ہی میں نے ایک مخصوص زاویے سے دوسری دیوار کی جانب بیک فلک لگانا شروع کر دیے پھر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک یہ سلسلہ تین مرتبہ دہرایا۔ وہ اس طرح کہ ہر دیوار کے ساتھ میرا آنا اور جانا لگ بھگ ساتھ کا زاویہ بنا رہا تھا۔ نارنج کی روشنی مجھے فریس کرنے کے لیے اُدھر اُدھر پھرتی رہی اور میں اسے ایک کامیاب عمل دے کر نارنج بردار کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔ اس اچھل کود میں یہ شکل دس سے پندرہ سینکڑے صرف ہوئے ہوں گے۔

نارنج بردار راہن مسئلہ ناکامی سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس نے مجھے روشنی میں لانے کے لیے نارنج میری جانب سیدھی کرنا چاہی لیکن مجھے اس کی چاہت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے اس کے نارنج والے ہاتھ پر جھپٹا مارے ہوئے اس کے پیٹ میں ایک زوردار گھٹا سید کر دیا۔

نارنج میری دسترس میں آگئی۔ اس کے ساتھ ہی راہن کے حلق سے ایک دردناک چیخ خارج ہوئی۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر باقی تین حریفوں پر نارنج کی روشنی ڈالی۔ وہ تینوں بڑے خون خوار انداز میں میری طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔

میں نے نارنج کو آف کر دیا اور پہلو میں کھسک کر ایک محفوظ اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں یک بے یک میری پہلے

والی جگہ پر پہنچے میں نے اندازے کی بنا پر اپنی ہاڈی کو تلو بٹاتے ہوئے تین چار لگاتار فرنٹ وکیل گھس چلا دیں۔ میرے پیش تر نشانے درست ثابت ہوئے اور وہ تاریک غار ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر نارنج آن کی اور اس کی روشنی میں ان تینوں کی گھسٹ وریخت کا جائزہ لیا۔ ان کی حالت مجھے خاصی ابتر نظر آئی۔ اسٹیورٹ اور فریڈرک میں یوس پڑے تھے اور ان کا کمان دار رابرٹ ان دونوں کے اوپر لدا ہوا تھا۔ میں نے روشنی کے دائرے کو سائیڈ میں حرکت دی تو راہن پیٹ بکڑ کر اٹھا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے نارنج آف کر کے اپنی پوزیشن کا زاویہ بدل دیا۔

وہ چاروں یو۔ ایس سو بھر تھے لیکن مسلح ہونے کے باوجود بھی حالات کی قسم طریقے نے انہیں خاک بکھر..... سنگلاخ زمین چھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی کسبہ کسبی پر میں ایش ایش کر اٹھا۔ وہ بڑول یا کروڑ نہیں تھے ان کے پاس بے انداز طاقت اور بے حساب اختیار تھا لیکن اس ایموونیشن ڈپو نے انہیں بس اور لاچار بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے گولیوں سے بھونے اور میرے جسم کو جھلی ٹھونڈے بنانے پر قدرت رکھتے تھے مگر اپنی گز کے بیڑے سے ایک کو بھی غارت کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ سنگل شاٹ ایک ایسی دیاسلائی ثابت ہوتا کہ بھر.....!

اس کے آگے سوچنے سے خیال بھگ سے اڑنے لگتا تھا۔ اگر چہ ایموونیشن کے وہ خطرناک ذخائر اس تاریک راہ واری میں نظر کے سامنے نہیں رکھے تھے۔ چھری دیواروں کے عقب میں ان خوف ناک اور ہلاکت خیز ہتھیاروں کا سکین تھا مگر میرے دشمنوں کی تیار دی اور احتیاط پسندی بتاتی تھی کہ وہ زور و اثر رسک لینے کو تیار نہیں۔

تاریکی میں وہ چاروں مجھے چھانے کے لیے پیش قدمی کرنے لگے۔ ان کے پاؤں کی آہٹوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پوہیپ میں میری سمت بڑھ رہے تھے جیسے گھبراہٹ کر مجھے بکڑنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میرا اپنی ساعت کو ان قدموں کی مخصوص چاپ پرچم اس مقرر کر دیا اور سانس روک کر ان کے محدود فاصلے تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جیسے ہی وہ مجھ سے تین فٹ کی دوری پر آئے میں نے ہوا میں پرواز کی اور ان کے اوپر سے گز کر عقب میں چھپ گیا۔

یہ ہائی جیب کا ایک عمدہ مظاہرہ تھا مگر اس تاریک غار میں تالیاں پیٹ کر داد دینے والا کوئی نہیں تھا۔ فطری رد عمل کے طور پر وہ چاروں بجلی کی سی سرعت سے چلے۔ اسی وقت

میں نے ایک لمحے کے لیے نارنج آن کر کے آف کر دی۔ میں درحقیقت ان کی تازہ ترین پوزیشن کا اندازہ لگانا چاہتا تھا اور میرا مقصد ایک لمحے میں حاصل ہو گیا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں مجھے بلائڈ فائٹ کے لیول سے بھی گزرا رہا تھا۔ میں نے اپنے استاجرم ہاسٹر ہنگ بائی کی منضی میں، آنکھوں پر دھیر پٹی باندھ کر درد خطرناک فائزرے خون ریز مقابلہ کیا تھا اور اس ٹیمپل میں کامیاب رہا تھا۔

شاؤلن ٹیمپل کی وہ تربیت اس اندھے غار میں میرے کام آئے گی۔ میں اپنے دشمنوں پر تادیب توڑ چلے کرنے لگا۔ اندازے کی ایک دو غلطیوں سے میرے ہاتھ پاؤں چھری دیواروں سے بھی ٹکرائے تاہم مجموعی طور پر میں نے انہیں اچھا خاصا پیٹ ڈالا۔ ان کے لیول سے بڑی کرب ناک آوازیں خارج ہوئی تھیں۔

اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے میں نے ایک مرتبہ پھر نارنج روشن کر لی اور اسی لمحے مجھ پر ایک خوف ناک انکشاف ہوا۔ ان تینوں کا لیڈر رابرٹ بڑی تیزی سے داخلی دروازے کی سمت دوڑ لگا رہا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ سے میری بڑبڑاہٹ ہی نے مجھے بتایا تھا وہ رابرٹ تھا۔ اسے دو تین مرتبہ سننے کے بعد میں نے لب و لہجہ کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے روشن نارنج کا مخصوص دائرہ رابرٹ کی پشت پر مرکوز کیا اور اس کے پیچھے پیکا۔

رابرٹ کو کسی بھی صورت غار سے باہر نہیں لگنا چاہیے تھا۔ اگر وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارے لیے مشکلات کا ایک لامتناہی سلسلہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ہمارے درمیان جس جگہ پر وہ اندھا مگر کہ ہو رہا تھا وہ مقام داخلی دروازے سے لگ بھگ ایک سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ مذکورہ چارہائی چارٹ کا وہ درکھلا ہوا تھا اور اس کھلے ہوئے شکاف میں سے باہر روڈ پر ایک چھوٹا فوجی ٹرک کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چاروں اسی بیوی ڈیوٹی ٹرک میں سوار ہو کر وہاں پہنچے تھے۔

میں نے تھوڑا آگے جا کر رابرٹ کو چھاپ لیا۔ اسے بھی میری "آہ" کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹا اور اپنی گن کو لائٹ کے انداز میں ٹھکرایا۔ اس نے میرا کی انداز میں میری کھوپڑی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنا تاریل جھجھانے کے لیے اس کے قریب نہیں آیا تھا جو شرافت سے کھڑا رابرٹ کے حلقے کو کامیاب ہونے دیتا!

اس کا ہاتھ مٹھونے سے پہلے ہی میں نے بڑی سرعت سے ایک بینک لگا کر پھر اسی تیزی سے اٹھتے ہوئے رابرٹ

تیسرے نے میرے پیچھے آکر مجھے کمرے پہنچا دیا۔ وہ اپنی گن سمیت پوری طرح محکم چکا تھا لہذا اس خطرناک پہنچاؤ نے اسے منہ کے بل نیم تاریک راہ داری میں گرنے پر مجبور کر دیا۔ راہ داری کا یہ حصہ داخلی دروازے سے پچاس میٹر کی دوری پر تھا اس لیے ٹھوڑی بہت روشنی وہاں پہنچ رہی تھی۔ یہ ٹھوڑی بہت روشنی میرے لیے بہت کافی تھی۔ میرا زبردست دھکا کھانے کے بعد گن اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں ادھر اُدھر ہو گئی تھی۔

راہٹ اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں پہلے سے تیار تھا۔ وہ بڑے جارحانہ بلکہ بڑے مسکری انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کی کارکردگی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ وہ ایسے فراغت کے لحاظ نہیں تھے کہ میں راہٹ کو اپنے مارشل آرٹس کے چکارے سے متاثر کرنے کی سعی کرتا۔ راکیل کی فکر بھی میرے ذہن کے ایک کونے میں مقیم تھی۔ میں پچاس میٹر پیچھے اسے تین خطرناک یو۔ ایس سو بلجز کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا تھا۔ اگرچہ وہ راکیل کی لوکیشن سے آگاہ نہیں تھے لیکن آگاہ ہو سکتے تھے!

میں نے ہاتھ پاؤں کی بے درپے ضربات سے راہٹ کو زمین یوں ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا اور مزید پہلی کے لیے اپنا مخصوص داؤ استعمال کر کے اسے آئندہ دو تین گھنٹے کے لیے اس دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ میں ابھی اٹھ کر پوری طرح کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پلٹا اور اسی وقت راکیل پر میری نگاہ پڑ گئی۔

وہ بھاگتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی اور دیگر تینوں افراد اس کے تعاقب میں تھے۔ ان کے درمیان کم و بیش پندرہ فٹ کا فاصلہ حاصل تھا۔ میں کسی طوفان کے مانند ڈٹ کر ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

راکیل میرے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکی بلکہ داخلی دروازے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع تھی لیکن سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ تینوں جنہمی بلاؤں کے مانند میرے سر پر آن پہنچے تھے۔ پہلے ان سے دو دو ہاتھ کرنا ضروری تھا راکیل کو بعد میں بھی دیکھا جاسکتا تھا!

وہ تینوں جیسے ہی میری ریچ میں آئے میں نے انہیں نیچے ہاتھوں لیا۔ وہ مجھ سے ابھی خاصی درگت بننا چکے تھے لہذا مجھے ان پر نفسیاتی برتری حاصل تھی۔ میں نے ایک کے وارکو روکا اور دوسرے کو راؤڈر ہاؤس تک رسید کر دی۔

میں نے اپنے دشمنوں سے فارغ ہو کر دوست کی طرف متوجہ ہو گیا۔ راکیل نے اب تک ایک ہمدرد اور مخلص دوست

تیسرے نے میرے پیچھے آکر مجھے کمرے پہنچا دیا۔ وہ اپنی گن سمیت پوری طرح محکم چکا تھا لہذا اس خطرناک پہنچاؤ نے اسے منہ کے بل نیم تاریک راہ داری میں گرنے پر مجبور کر دیا۔ راہ داری کا یہ حصہ داخلی دروازے سے پچاس میٹر کی دوری پر تھا اس لیے ٹھوڑی بہت روشنی وہاں پہنچ رہی تھی۔ یہ ٹھوڑی بہت روشنی میرے لیے بہت کافی تھی۔ میرا زبردست دھکا کھانے کے بعد گن اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں ادھر اُدھر ہو گئی تھی۔ راہٹ اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں پہلے سے تیار تھا۔ وہ بڑے جارحانہ بلکہ بڑے مسکری انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کی کارکردگی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ وہ ایسے فراغت کے لحاظ نہیں تھے کہ میں راہٹ کو اپنے مارشل آرٹس کے چکارے سے متاثر کرنے کی سعی کرتا۔ راکیل کی فکر بھی میرے ذہن کے ایک کونے میں مقیم تھی۔ میں پچاس میٹر پیچھے اسے تین خطرناک یو۔ ایس سو بلجز کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا تھا۔ اگرچہ وہ راکیل کی لوکیشن سے آگاہ نہیں تھے لیکن آگاہ ہو سکتے تھے!

میں نے ہاتھ پاؤں کی بے درپے ضربات سے راہٹ کو زمین یوں ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا اور مزید پہلی کے لیے اپنا مخصوص داؤ استعمال کر کے اسے آئندہ دو تین گھنٹے کے لیے اس دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ میں ابھی اٹھ کر پوری طرح کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پلٹا اور اسی وقت راکیل پر میری نگاہ پڑ گئی۔

وہ بھاگتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی اور دیگر تینوں افراد اس کے تعاقب میں تھے۔ ان کے درمیان کم و بیش پندرہ فٹ کا فاصلہ حاصل تھا۔ میں کسی طوفان کے مانند ڈٹ کر ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

راکیل میرے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکی بلکہ داخلی دروازے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع تھی لیکن سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ تینوں جنہمی بلاؤں کے مانند میرے سر پر آن پہنچے تھے۔ پہلے ان سے دو دو ہاتھ کرنا ضروری تھا راکیل کو بعد میں بھی دیکھا جاسکتا تھا!

وہ تینوں جیسے ہی میری ریچ میں آئے میں نے انہیں نیچے ہاتھوں لیا۔ وہ مجھ سے ابھی خاصی درگت بننا چکے تھے لہذا مجھے ان پر نفسیاتی برتری حاصل تھی۔ میں نے ایک کے وارکو روکا اور دوسرے کو راؤڈر ہاؤس تک رسید کر دی۔

کردار ادا کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل اس کی جانب سے بدمان ہوا تھا جب میں نے اسے داخلی دروازے کی طرف بے دروغی بھاگتے دیکھا تھا۔ اس لمحے میرے ذہن میں خدشائی خیال ابھرا تھا کہ کہیں وہ اپنی پوزیشن بچانے کے لیے وہاں سے فرار تو نہیں ہو رہی۔ رائیل نے ابھی ناپائیدار دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اندھا اعتماد قائم ہونے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے!

رائیل اب ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ میں ٹرک کی سمت بڑھ گیا۔ اسی وقت وہ مجھے ٹرک کے عقب سے کھل کر اپنی جانب آئی دکھائی دی۔ ٹرک کے پیچھے وہ عظیم شکاف اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ رائیل نے داخلے کے اس ذریعے کو بند کر دیا تھا۔

مجھ سے لگا ہلے ہی وہ مسکرائی ”وہدان! اب فکر والی کوئی بات نہیں۔ میں نے یہاں تک رسائی کا راستہ لاک کر دیا ہے۔“

”لاک؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ہاں لاک!“ پھر وہ مجھے لاک اور بند کافرٹی بتانے لگی ”اس راستے کی اندرونی جانب ایسا نادیہ میکانزم موجود ہے کہ جس کی مدد سے اس راستے کو لاک بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب یہ راستہ باہر سے نہیں کھولا جاسکتا۔ ہم اندر ہر قسم کی بے حرمتی مداخلت سے محفوظ ہیں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ”پہلے تم نے اس راستے کو لاک کیوں نہیں کیا تھا۔ خواہ وہ اتحادت ضائع ہو گیا اور مارا باری الگ ہوئی۔ ان چار فوجیوں اور ٹرک کی گمشدگی زیادہ دیر تک راز نہیں رہے گی۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو وہدان۔“ وہ ناپائیدار انداز میں بولی ”ویسے تو تمہاری اور ساحل کی روپوشی بھی زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہے گی۔ تمہارے غیاب کا راز کھلنے ہی رہی گئی آدی تم دونوں کی تلاش میں کل کھڑے ہوں گے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح تمہاری بوسختی پھریں گے مگر مجھے اطمینان ہے وہ اس بارودی غار میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔“

”تمہاری وضاحت اپنی جگہ مگر یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“

وہ میرے چہرے کو ٹوٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی ”تمہارے سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ پہلے میں تمہیں یہاں پہنچا کر اب اس جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں مائیکل کی موت بہت سے بندر از کھول

دے گی۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں لہذا تم میری دہائی کے امکانات معدوم ہی سمجھو۔ میں تمہاری اہم راعی میں آگے ہی آگے بڑھوں گی۔“

میں ایک طویل اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ رائیل نے جس حقیقت کا اظہار کیا تھا وہ کوئی مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ واقعی اس کی دہائی میں خطرات کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا۔

”تم تو سچے جادوگر ہو۔“ رائیل نے حیرت بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ زمین پوس چار پو۔ ایس سو بلگرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ”تم نے جادو کی جھڑی تمہارے انہیں دہم دھماکا سے بہت دور پہنچا دیا ہے۔“

میں نے اس کی نیلی اور گہری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا اور نہایت ہی بے نظریے ہوئے لہجے میں کہا ”تم بھی کچھ کم جادوگری نہیں ہو۔ ایک تنگ سے راستے کو ضرورت کے وقت الاسٹک کی طرح کھینچ کر پھیلا لیتی ہو۔ وہ راستہ جہاں سے اب کسی چیونٹی کے نکلنے کے امکانات بھی صفر کے برابر ہیں، تم اپنی مہارت کے بل بوتے پر وہاں سے ایک گراں ڈیل بدست بھی کوگز اولائی ہو۔“ میں نے فوجی ٹرک کی جانب اٹلی اٹھائی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اس کے سوا تو نہیں تو کیا ہو۔ یہ کسی عظیم الجذہ جگہ سے کم تو نہیں!“

”اوہ!“ وہ شرارت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”یہ سب تکنیک کا کمال ہے۔“

”اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں تم بڑی ماہر کارگر ہو!“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ مجھے اس راستے کی تکنیکی خوبیاں بتانے لگی۔ رائیل کے مطابق، وہ راستہ تین مختلف سائز میں کھولا جاسکتا تھا۔ چار ہائی چار فٹ، آٹھ ہائی دس فٹ اور دس ہائی پندرہ فٹ۔ ان تینوں سائز کو کھولنے کا حساب کتاب اور تکنیک جدا جدا تھی۔ میں رائیل کے ساتھ چار ہائی چار فٹ کے درے سے گزرا تھا اور رائیل نے وہ فوجی ٹرک دس ہائی پندرہ فٹ کے شکاف سے گزرا تھا۔ بہر حال اب وہ شکاف ناپود ہو کر ایک سنگناخ اور سرد موتی دیوار کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

فوجی ٹرک کی ہیڈ لائٹس اس غار کو بہت دور تک روشن کر رہی تھیں۔ ہم زیادہ دیر تک ٹرک کا انجن اشارت حالت میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس انجن سے اچھا خاصا شور پیدا ہو رہا تھا۔ میں ان چار پو۔ ایس سو بلگرز پر لہجہ بھج کر مائیکل کی طرف بڑھ گیا۔

مائیکل کی موت کو کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں بڑی سرعت سے اس دروازے کے زلف شخص کی جانب بڑھ گیا۔ اندر سے میں رائیل جس سے شوکر کھا کر گر گئی تھی۔ رائیل بھی میرے پیچھے لپک آئی۔ پھر کئی زلفوں والے اس شخص کے نزدیک پہنچ کر وہ بھی اس کے لمحوں سے قمر قرانی ہوئی آواز ارج ہوئی۔

”وہدان..... تو نیشن ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ نیشن ان دو افراد میں سے ایک تھا جو نے اور ساحل کو اپنے بڑوں تک پہنچانے والے تھے۔ نیشن ابھی موت سے ہم کنار ہو چکا تھا۔ اس کے سینے میں ایک بڑا کھنجر دسے تک بیٹھا تھا۔ نیشن کا ساتھی ریمینڈ کہیں لڑ نہیں آ رہا تھا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا ”نیشن اور مائیکل تو دہائی سے دھڑک کر موت کو گلا گھونٹ رہے ہیں۔ ریمینڈ کھانسی میں دے رہا۔ کہیں وہ بھی تو ختم نہیں کیا جا چکا؟“

”ڈرانے والی باتیں نہ کرو وہدان!“ وہ میرے پہلو سے نکلتے ہوئے بولی۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”میں ڈر اور خوف سے بہت آگے کل آیا ہوں۔ ریمینڈ کے ساتھ ساتھ میری ہی ساحل بھی غائب ہے۔ اب وہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ساحل اس مقام پر پہنچی ہی نہیں۔ نبردوار اگر وہ پہنچی تو پھر ریمینڈ اسے ساتھ لے گیا ہے کہاں؟“ یہ نہیں پلانا ہوگا اور.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے ”اور..... کیا؟“

”اور..... دوسری صورت ایک سنسنی خیز تیسری صورت بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔“ میں نے خیالات ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”مگر واقعی ریمینڈ ساحل کو اپنے ہاتھوں سے لے گیا ہے تو پھر مائیکل اور نیشن کو اسی نے قتل کیا؟“

وہ جھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”یہ تم ناپائیدار کر رہے ہو؟“

میں نے گہری تنبیہ کی ہے کہا ”اس اندھے غار میں ابھی ریمینڈ اور ساحل دکھائی نہیں دیے تمہارے دعوے مطابق مائیکل نے ساحل کو اوپر تم نے مجھے یہاں پہنچانا تھا۔ اور ریمینڈ ہمیں اسے ساتھ کہیں لے جاتے۔ تمہارے سے کے مطابق مائیکل ساحل کو یہاں پہنچانے میں سب رہا ہے جیسا کہ تم مجھے یہاں پہنچا چکی ہو۔ مائیکل اور

نیشن کی لاشیں ہم دریافت کر چکے ہیں۔ تم اور میں زندہ حالت میں اس وقت گفتگو کر رہے ہیں۔ ہائی پچھے ہیں ساحل اور ریمینڈ۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں ساحل اس تاریک غار میں دو شاطر افراد کے خون میں ہاتھ رنکے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پھر آ جا کر ریمینڈ ہی باقی بچتا ہے!“

وہ چند لمحات تک ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے استفسار کیا ”تم ساحل کے بارے میں اتنے بُر وثوق کیوں ہو؟“

”اس لیے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ ریمینڈ اپنے ہی دو ساتھیوں کو قتل کیوں کرے گا؟“

”یہ تو مجھ سمجھ رہی ہو نا وہ تمہارا ساتھی ہے!“

”کیا مطلب؟“ وہ اچھل کر رہ گئی ”تم کیا کہنا چاہتے ہو وہدان!“

میں نے کہا ”رہی موٹے ہاتھ، اس کا دست راست برنارڈ لیو اور یہاں کا دیگر افسانہ بھی تو تمہیں اور مائیکل کو اپنا ساتھی اٹھانا یاد دہانتی ہے مگر کیا یہ حقیقت ہے؟“

اس کے چہرے پر بیجا کیفیت نمودار ہوئی۔ حسین کھنڈے پر بیجان کا اظہار بڑا عجیب تاثر پیدا کرتا ہے۔ نیشن ناک لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو ریمینڈ ہمارے دشمنوں سے ملا ہوا ہے؟“

”یہ بعید القیاس تو نہیں۔“ میں نے غصے لہجے میں کہا ”ریمینڈ کو دشمنوں سے ملنے کی کیا ضرورت ہے یہ بھی تمہیں ممکن ہے وہ دشمنوں ہی کا پلانیٹل ہو..... جیسا کہ تم اور مائیکل اپنے دشمنوں کے اندر رہتے ہوئے کسی اور کے لیے کام کرتے ہو اسی طرح ریمینڈ تم لوگوں کے اندر رہتے ہوئے رہی وغیرہ کے لیے کام کر رہا ہو۔“

وہ ایک جھرجھری لیے ہوئے بولی ”اس کا مطلب ہے ریمینڈ نے بلیک ہیپ کارول ادا کیا ہے!“

میں نے اسے یہ جھلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ اور مائیکل بھی کالی بھیڑوں (بلیک ہیپ) ہی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ دراصل یہ سمجھ اور زواہ کے اہل سمجھ رہے۔ ایک ملک کا بھروسہ دشمن ملک کے لیے بدترین دہشت گرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ رائیل اور مائیکل رہی کے خفیہ ٹھکانے پر رہتے ہوئے اپنے بڑوں سے وفاداریاں نبھاتے رہے۔ ۱۹۱۱ء طرح میں ممکن تھا ریمینڈ نے ان کے دھڑے کے اندر رہتے ہوئے رہی کے لیے کوئی کارروائی کی ہو۔ زواہ بدل جانے



نے دو طرفہ سنگناخ دیواروں کی جانب یکے بعد دیگرے اشارہ بھی کر دیا۔

اس کی بات بلکہ سنگین اعشاش سن کر میں گہری تشویش میں گھر گیا۔ راکیل بڑی گہری لڑکی تھی۔ اس کی معلومات خطرناک حد تک حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھیں۔ میں نے چند لمحات کے توقف کے بعد اس سے پوچھا۔

”کیا ریمینڈ اور ٹیلن ہمیں اسی رات سے باہر لے جانے والے تھے؟“

”میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ وہ سادگی سے بولی۔

دو چپ کھڑے کھڑے وقت برہادر مقل مندی نہیں تھی۔ میں نے راکیل سے کہا ”چلو تم ٹرک کی ڈرائیونگ سین سنبھالو۔ میں تمہارے آگے آگے چلا ہوں۔ اس دس فٹ کے راتے کو تو طے کرلو۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

راکیل کوئی سوال کیے بغیر ٹرک کی جانب بڑھ گئی۔ جب ٹرک حرکت میں آیا تو روشن راہ داری میں اس کے آگے چلے لگا۔ میں جلد ہی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ان چار یو۔ ایس سو لجرز سے ڈبہ بھڑ ہوئی تھی۔ راہ داری کے فرش پر مجھے راہروں کی نارنج پڑی ملی۔ فائننگ کے دوران میں نے وہ نارو ایک جگہ ڈال دی تھی۔ پھر اس بیگ پر میری نگاہ مگنی جو راکیل نے کوٹھری سے نکالتے وقت میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے وہ دو نو چیزیں اٹھالیں۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔

راہ داری کے فرش پر دو گنو بھی پڑی نظر آ رہی تھیں۔ جن حالات سے گزر رہے تھے ان میں کسی بھی وقت آتشیں اسلحہ کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ حفظ بقا قدم کے طور پر میں نے وہ دو نو گنو بھی اٹھالیں۔ میں سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ راکیل بھی ٹرک کے ڈرائیونگ مین سے باہر آ گئی۔

”ان چیزوں کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ وہ میرے ہاتھ میں موجود گنو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اس بیگ کے اندر ہماری ضرورت کا تمام سامان موجود ہے۔“ بات کرتے ہی اس نے سیاہ بھاری بھر کم بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

اب مجھے اس پر اسرار دیوی بیگ کی اہمیت کا اندازہ معنوں میں ہوا تھا۔ راکیل کو یا پوری تیاری کے ساتھ لگے گنو میں نے اس کے حسبِ مشال کو اور نارنج کوراہ داری کے فر پر پھینک دیا۔

راکیل نے میرے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور ایک جا

سے الفاظ اور افعال کے معنی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھو تو چاند آسمان پر نظر آتا ہے اور اگر چاند پر جا کر گاہ اور انھا تو یہی زمین آسمان پر دکھائی دے گی!

میں نے راکیل کی تشویش کے جواب میں گول مول جملہ کہہ دیا ”تم بیک ہیپ کی بات کرتی ہو، وہ کم بخت ریمینڈ تو مجھے پورا باہایک ہیپ لگتا ہے۔“

”اسی لیے وہ باہا تھاہاری بے بی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ میری سائل کا ذکر کر رہی تھی۔ میں یک دم سنجیدہ ہو گیا اور جذبات سے عاری لہجہ میں کہا ”راکیل اتم اس ٹرک کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے لاؤ۔۔۔۔۔ جہاں تک بھی ممکن ہو۔“

”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ٹرک کی ہیڈ لائٹس میں دور تک، اس اندھے غار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا ”ممکن ہے کچھ اور تیر تیس ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔“

راکیل نے بتایا ”یہ غار لگ بھگ ڈھائی سو میٹر طویل ہے۔ یو۔ ایس سو لجرز کو تم نے جس مقام پر گھیرنے کی کوشش کی تھی وہ داخلی دروازے سے ایک سو میٹر کی دوری پر ہے۔ اس سے آگے یہ دس فٹ کا راستہ پھیل کر پچاس فٹ پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس طرح مزید ڈیڑھ سو میٹر طے کرنے کے بعد ہم اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں پہاڑی سے باہر نکلنے کا راستہ ہے۔ یہ کل ڈھائی سو میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ہم زمین کی سطح سے اور قریب ہو جائیں گے۔ جب ہم پہاڑی سے باہر نکلیں گے تو دیہاتی پینٹل پارک کی زمین سے محض سو فٹ کی بلندی پر ہوں گے جب کہ اس غار میں داخلے کے وقت یہ بلندی دوسو فٹ بھی مگر میں ایک بات واضح کر دوں کہ جہاں دس فٹ والا راستہ ختم ہو گا اس سے آگے ٹرک کو نہیں لے جایا جاسکتا۔“

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ تم عجیب بات کر رہی ہو۔ ابھی تم ہی نے بتایا ہے آگے جا کر یہ راستہ پچاس فٹ کا ہو جائے گا پھر ٹرک کے مزید آگے بڑھنے میں قیاحت ہے؟“

”میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا“ وہ رسانیت سے بولی ”سو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد راستہ داخلی پچاس فٹ چوڑا اور ڈیڑھ سو میٹر طویل ہو جائے گا مگر یہ سارا علاقہ انتہائی خطرناک زون ہے۔ یو ایس آری کا ایجنیشن ڈپو ادھر ہی واقع ہے۔۔۔۔۔ پھر ان پتھر ملی دیواروں کے عقب میں، وافر مقدار اور تعداد میں اسلحہ چھپا کر رکھا گیا ہے۔“ اس

اشارہ کرتے ہوئے بولی "آؤ چلیں۔"

"اس قرب کا انجن تو بند کر دو۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"بے چارہ بیدار ہے اسے بیدار ہی رہنے دو۔ زبردستی سلاتے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بے پردائی سے بولی "ہمارا کیا ہے رہا ہے۔ اس کی رشتہ میں ہم زیادہ سے زیادہ سے فاصلے طے کر لیں گے۔ جب اس کی بیٹری ڈاؤن ہوگی تو خود ہی بند ہو جائے گا۔"

"مگر اس کا شور کسی کو بھی ادھر متوجہ کر سکتا ہے!"

"تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی "اس وقت ہم ماؤنٹ منگلے کے جس حصے میں ہیں وہاں سے کوئی آواز یا ہر نہیں جائے گی۔"

میں اس کی ارضیاتی معلومات کو پیچ کر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تاہم آگے بڑھنے سے پہلے میں نے زمین سے خارج اٹھالی۔ راکٹیل نے کوئی اعتراض نہ کیا اور خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔

میں نے کہا "لاؤ یہ بیگ مجھے دے دو۔ کافی وزن ہے۔"

کہاں اٹھائے اٹھائے بھر دی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ مسلسل آگے بڑھتے ہوئے بولی "یہ بیگ اس لیے وزن ہے کہ اس میں میں نے اچھا خاصہ وزن بھر رکھا ہے۔ تم کافی دیر سے اسے اٹھائے ہوئے ہو۔ اب میری باری ہے۔"

امریکی معاشرے میں مرد اور عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں برابری کا درجہ حاصل ہے۔ وہ دکھ اور سکھ ہانت کر اٹھاتے ہیں۔ اس بات سے بحث نہیں کہ یہ برابری کس حد تک درست ہے تاہم بعض اوقات برابری کا یہ رویہ بڑا مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھ جائیں تو مرد اور عورت اپنا اپنا بل خود ادا کرتے ہیں۔ سینما جانے کا اتفاق ہو تو دونوں کو اپنا ٹکٹ اپنی جیب سے لینا پڑتا ہے۔ اس معاشرے کے پاس کہتے ہیں..... آخر اس میں برائی کیا ہے؟ بظاہر کوئی برائی نظر نہیں آتی مگر منصف کرخت کا منصف نازک کے ساتھ یہ سلوک خاصا غیر مہذب اور ناانسانگ لگتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ امریکی قوم کی اپنی کوئی تہذیب اپنا کوئی تمدن نہیں اس لیے وہ ان بڑا کنوں کا خیال نہ رکھتے ہوں۔ پوری امریکی قوم اس وقت "پلیس گواہڈ" اور "آئی ڈونٹ کینز" کے اصولوں پر یہ زعم خود کا مبنی کی جانب رواں دواں ہے۔ ماضی اور انداز کا پاس وہی اقوام کرتی ہیں جن کا اپنا کوئی ماضی..... اپنی کوئی قدریں ہوتی ہیں!

راکتیل بھی اسی معاشرے کی پروردہ تھی لہذا میرے ہاتھ سے بیگ لے کر گویا وہ میرا ہاتھ بٹاری تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے ہو گیا۔ جلد ہی ہم ہلاکت خیز آتشیں اسلحے کے ذخیرے کے درمیان سے گزرنے لگے۔ ڈک کی ہیل لائسن کافی حد تک اندر کے منظر کو واضح کر رہی تھیں چنانچہ میں نے خارج جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں بتائیں سکتا "اس وقت ہمارے احساسات کیا تھے۔ ایک ذرا سی چنگاری بھی اس بارود کے عظیم ذخیرے کو نوازہ جہنم بنا سکتی تھی۔ ہم بے حد محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے اس طویل ہال نمازون کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ یہ ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

راکتیل نے اپنے کندھے سے بیگ اتارا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولی "اب ہم پیچ کر لیں گے۔" پھر وہ بیگ کو کھول کر کچھ کھنڈوں لگی۔

میں نے پوچھا "کیا پیچ سے تمہاری مراد لباس تبدیل کرنے سے ہے؟"

"ہاں کسی حد تک۔" وہ بیگ میں سے مختلف گرم کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔

"تمہارا..... کسی حد تک میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "ابھی تمہاری دیر بعد ہم ماؤنٹ منگلے سے باہر نکل جائیں گے۔ یہ اندر والی فرحت اور معتدل درجہ حرارت باہر نہیں ملے گا۔ پہاڑی کے باہر اس وقت درجہ حرارت کم از کم منفی چارہ ڈگری سی گریڈ ہو گا۔ اب تم خود اندازہ لگاؤ اگر ہم اس لباس میں باہر نکلے تو ہمارا کیا حشر ہو گا!" وہ ایک لمبے کو سانس لینے کی خاطر رکی بھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"کسی حد تک لباس تبدیل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے اس لباس کے نیچے اور اوپر بھی چند مخصوص کپڑے پہنیں گے تاکہ موسم کی شدت بری طرح ہم پر اثر انداز نہ ہو سکے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے چند کپڑے میری جانب بڑھا دیے اور مختلف رنگ و نسل کے چند لباس دے خود سمیٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ میں الجھن زدہ نظر سے اسے لنگھنے لگا۔

اس نے جلد ہی میری مشکل کو بھانپ لیا اور سولہ انداز میں بولی "کوئی پرابلم ہے جیڈن؟"

"ہاں۔" میں نے جڑ بڑھتے ہوئے کہا "اوپر سے کپڑے پہننے والی بات تو ٹھیک ہے لیکن موجودہ لباس کے اندر کچھ پہننے کے لیے اس لباس کو اتارنا ہو گا۔"

"سو ہاٹ؟" وہ موالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں حذب لہجے میں کہا "کیا ہم اپنا لباس ایک دوسرے کے سامنے نہیں اتاریں گے؟"

"اس میں ہچکچاہٹ والی کون سی بات ہے؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

راکتیل جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اسے تین ہالک درست کہہ رہی تھی۔ میرے سامنے لباس تبدیل کرنے میں اس کے لیے کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو مگر میں حد درجہ متاثر تھا۔ اگرچہ لباس کی یہ تبدیلی اندر کا شش کی موجودی میں ہوتی تاہم پھر بھی میں اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ بس اپنی اپنی کچھ بات ہے۔ راکٹیل جس بات کو بہت ایزی لے رہی تھی وہ میرے لیے نہایت ہی دشوار تھی۔

میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ اندر سے راکٹیل کو دیکھ رہا تھا کہ وہ خوشی سے بولی "تم بتائیں کن سوچوں میں کم ہو۔ میں تو لباس تبدیل کرنے لگی ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے فل سیلو ہائی ٹیک اتارنا شروع کر دیا۔ وہ میری طرف سے مکمل غفلت برتتے ہوئے اپنے کام میں جت گئی۔ ان لمحات میں میری سمجھ میں یہی آیا کہ رخ پھیر کر میں بھی لباس تبدیل کرنا شروع کر دوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا یہ تھا کہ میری شکل آسان ہو گئی۔

فوجی ڈک کی ہیل لائسن اچانک مجھ کی قمیض اور انجن کا شور بھی ناپید ہو گیا تھا۔ میں ڈوٹھی سے نہیں کہہ سکتا تھا اس کی بیٹری بیٹھ گئی تھی یا پھر کوئی اور ٹھیک خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا تھا میرے حق میں بہتری ہوا تھا!

چندہ منٹ کے بعد ہم پوری طرح ڈریس اپ ہو چکے تھے۔ اب ہمارے اجسام پر اتنا لباس موجود تھا جو یہاں کے شدید موسم میں نہیں ایک محفوظ ڈھال پیش کرتا۔ ہمارے پاؤں کے جوڑے بھی بدل گئے تھے۔ سردی پر مخصوص قسم کی گرم ٹوپیاں جی جی میں اور آنکھوں پر بھی خاص نوعیت کے جتنے نظر آرہے تھے۔ ہمارے ہاتھ بھی حرارت بخش دستاؤں کی لپٹ میں تھے۔ اپنی تیاری کے آخری مراحل ہم نے خارج جلا کر طے کیے تھے۔ اب ہم اپنے چلیے اور وضع قطع سے دوہم جو دکھائی دیتے تھے اور دیکھنے والا یہ اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا کہ ہم میں سے ایک مرد اور دوسری کوئی عورت ہے۔ راکٹیل نے اپنے ہال سمیٹ کر گرم کوٹ کے اندر چھپا لیے تھے۔ ہم اس گیٹ اپ اور سیٹ اپ میں دوسروں کی نظروں میں آئے بغیر کسی محفوظ مقام پر پہنچ گئے تھے۔

راکتیل نے اس سیاہ بیگ کے اندر سے ایک زرد بیگ

کالا اور سامان کو تقسیم کر کے دونوں بیگز میں رکھ گئی۔ وہ ضروریات زندگی کا عام اور خاص سامان تھا۔ اس میں سب سے اہم دو چیزیں تھیں..... ڈالر کے بنڈل اور پمپل۔ ڈالر کی کھل میں وہ ایک بخاری رقم تھی جو راکٹیل نے تقسیم کر کے دونوں بیگز میں ڈال دی۔ ایک خوب صورت اور خطرناک لیڈی پمپل اس نے اپنی جیب میں فٹوس لیا اور دوسرا میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے پمپل ہاتھ میں لے کر اس کا کلپ چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ میں نے راکٹیل کو تین چار مہرے ہوئے گلیٹس بیگ میں رکھتے ہوئے دکھ لیا تھا۔ وہ بڑی خطرناک تیاری سے آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ اپنی مصروفیت سے فارغ ہوئی تو زرد بیگ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"وہاں! یہ تمہارا ہے۔ یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے ہم اپنا اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔"

میں نے پوچھا "میرے ساتھ آگے بڑھنے کا تمہارا یہ فیصلہ ہنگامی بنیادوں پر کیا گیا ہے ورنہ تو مجھے یہاں پہنچا کر واپس جانے والی تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ پوچھنا تمہارا حق ہے۔" وہ ٹھیکسی انداز میں بولی "فی الحال تو ہمیں یہاں بیٹل نیٹش پارک سے لگتا ہے۔ آگے کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔"

میں نے کہا "دینی ایک بیٹل پارک ہے۔ لوگ یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ مجھے امید ہے ہمیں کوئی لفٹ وغیرہ مل جائے گی۔"

"ایسی امید کو اپنے ذہن میں چھٹکنے بھی نہ دینا۔" وہ تنبیہ کرنے والے انداز میں بولی "ہمیں اس وسیع و عریض پارک میں شاید ہی کوئی شخص نظر آئے۔ سیر و تفریح کے شائق افراد صرف صبح سے آگست تک ادھر کارخ کرتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ شہر کے وسط تک۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد شدید۔۔۔ موسم اس طرح منہ دینے کی اجازت نہیں دیتا اور..... آج کل جو ری چل رہا ہے..... سردی کی بیک۔ تم کسی قسم کی لفٹ یا انداز کے دہم و گمان میں نہ رہنا جیڈن۔"

میں اس کی معلومات افزا تہن سن کر سنانے میں آ گیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی "میں اپنی مدد آپ کے تحت میلوں پیدل چل کر اس پارک سے لگتا ہو گا۔ اس موسم میں یہ پارک عموماً دیران اور انٹانے دار رہتا ہے البتہ بیٹل لیول کے موٹو بیگز اور گلیٹس پمپل کو ادھر آگے کی اجازت

ہے اور یہ اجازت بھی اسٹیٹ گورنری دیتا ہے۔ یہ ہاشاکے  
ن کی بات ہیں۔“

وہ ایک لمحے کو سانس ہوا کر نے کی خاطر رکی پھر سلسلہ  
لام کو جاری رکھتے ہوئے بتائے لگی ”مسی سے اگست تک اس  
رک میں ابھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ پرائیویٹ گاڑیوں کو  
ن پارک میں داخلے کی اجازت نہیں۔ پارک کے مین گیٹ  
کے اندر ایک مخصوص مقام پر اپنی گاڑیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔  
ہاں سے پارک انتظامیہ نے اپنی شکل ہمیں چلا رکھی ہیں۔  
پیلے رنگ کی یہ لمبی لمبی بسیں سیر و تفریح کی غرض سے پارک میں  
نے والوں کو اپنے اندر سوار کر کے خوب گھمائی ہیں۔ یہ  
سافروں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جہاں چاہیں بس روک کر  
رہ جائیں۔ وہاں ہی میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا۔ مذکورہ پمپلی بسیں  
میں آتے جاتے ہر وقت مل جاتی ہیں۔ ازیں علاوہ  
’ہینکریج‘، ’فیئر بینکس‘، ’ایکسپریس‘ نامی ایک ٹرین بھی دریائی  
پیش پارک کے ایک مخصوص حصے سے گزرتی ہے۔ یہ ٹرین  
’ہکریج‘ سے ’فیئر بینکس‘ تک جاتی ہے۔ اس کے مسافر ٹرین کے  
دور رہے ہوئے دریائی پارک کے نظارے سے محفوظ ہوتے  
ہیں۔“

”تہااری فراہم کردہ معلومات نہایت ہی دلچسپ اور  
رحت بخش ہیں لیکن انھیں اس وقت تک کہ ہم جن حالات سے گزر رہے  
ہیں ان میں دریائی پارک کے روح پرور نظاروں کو انجوائے  
ہیں کر سکتے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم مجھے  
ہتاؤ وہاں ہم باڑی سے نکل کر کدھر کا رخ کریں گے۔ میرا  
طلب ہے دریائی پیش پارک کو چھوڑنے کے بعد ہم کہاں پہنچ  
اسیں گے؟“

”یہاں سے قریب ترین مقام اولڈ کرمل ہے۔ ہم  
ڈنٹ منگٹے سے باہر نکلنے کے بعد جنوب مشرق کی سمت سڑ  
لریں گے اور شام سے پہلے ’اولڈ کرمل‘ پہنچ جائیں  
گے۔“ راکیل نے بتایا۔

میں چونک اٹھا ”شام سے پہلے کیا مطلب؟ ابھی تو صبح  
می نہیں ہوئی۔ کیا اولڈ کرمل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی لہا  
ڈرافٹا صلے کرنا ہوگا؟“

”فاصلہ بہت زیادہ نہیں اور اسے کم بھی نہیں  
لہا جاسکتا۔“ وہ ہر سوچ انداز میں بولی ”اگر راستہ مبدائی ہوتا  
در موسم بھی خوشگوار تو یہ فاصلہ چار پانچ گھنٹے کی کار تھا لیکن میں  
نے احتیاطاً موسم کی بے ہودگی کو دیکھتے ہوئے جہیں زیادہ  
نت بتایا ہے۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی ہم اولڈ کرمل میں  
وں۔“

”تم نے جنوری کی مناسبت سے دریائی پارک کے جو  
حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے ہم دونوں  
ہی اس پارک میں جو ستر نظر آئیں گے۔“ میں نے ایک ممکنہ  
خوشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”کیا اس صورت میں ہم  
دشمنوں کی توجہ کا مرکز نہیں بن جائیں گے؟“

”اس بات کے تھوڑے بہت امکانات تو ہیں۔“ وہ  
اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”اسی اندیشے کے  
پیش نظر میں نے یہ طے بنائے ہیں۔ ہمیں دور سے دیکھنے والا  
کوئی بھی شخص یہی سوچے گا کہ ہم ہم جوتی کے شائق دو ایسے  
افراد ہیں جنہیں زندگی سے زیادہ اپنے شوق سے پیار ہے۔  
ایسے ہر پھرروں کی دنیا میں کوئی کی نہیں دھند ان!“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اپنی بات پوری کرتے  
ہوئے بولی ”ہمیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑے گا  
دھند۔ راستے میں اگر کوئی افتاد آن پڑی تو آن دی اسپاٹ  
اس سے بھی نمٹ ہی لیں گے۔“  
میں شک زدہ نظر سے اسے گھورنے لگا۔ وہ بے چین  
ہو گئی اور جلدی سے بولی۔

”تم مجھے ایسے کیوں دیکر رہے ہو؟“  
واضح رہے کہ اس منصوبہ بداندہ ہا ہی گفتگو کے دوران  
میں ہم نے چشمے اتار رکھے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں  
میں دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ میں نے بہ دستور راکیل  
کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

”تم جس ترتیب اور تفصیل کے ساتھ اپنے حزام کا  
اظہار فرما رہی ہو اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے پہلے ہی  
میرے ساتھ جانے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ یہ تیاری  
اور تمام جہاز تہاارے ارادے کی چٹلی کھاتے ہیں۔ کیا میں غلط  
کہہ رہا ہوں؟“

اس نے اقرار کیا اور نہ ہی انکار گہری سنجیدگی سے  
بولی ”دھند ان! میری نیت پر شک نہ کرو۔ یہ سب کچھ ایک  
سکین اتفاق کے تحت ہو رہا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا  
ہے تہااری بہتری اور فائدے کے لیے کیا ہے۔ ’پلیز‘ اس  
سلسلے میں سوال کر کے میرے ذہن کو ڈمرب نہ کرو۔ میں  
انتہائی سکون کے ساتھ بہت کچھ سوچتا چلتی ہوں۔“

”تمہیں ان لمحات میں کون سا ریاضی کا مسئلہ درپیش  
ہے؟“ میں نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔

وہ منت ریز لہجے میں بولی ”میں نے کہا نا دھند ان! مجھے  
توجہ سے آگے کے بارے میں سوچنے دو۔ میں تمہیں صحیح  
سلامت اپنے بڑوں کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ ہم اس پارک

سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں پھر میں کسی طرح اپنے سینئر  
سے رابطہ کروں گی۔ وہ دہان! تم فکر نہ کرو میں تمہیں کسی قسم کی  
حکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

”فکر کیسے نہ کروں راکھل!“ بالاخر دل کی بات میری  
زبان پر آئی گئی۔ میں بڑی دیر سے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ میں  
یہاں سے اکلارا نہ ہوں۔ میری سامی سائل کا کچھ پتا  
نہیں وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔“

وہ ٹکی ایئر لیج میں بولی ”سائل کا بھی سراغ مل جائے  
گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری سامی کو تم تک پہنچانے  
میں میں تم سے بھرپور تعاون کروں گی۔ مجھے پوری امید ہے  
میرے بڑے سائل کی موجودہ پوزیشن سے ضرور آگاہ ہوں  
گے۔ مجھے ذرا ان تک رسائی حاصل کر لینے دو۔ پھر ریمنڈ اور  
سائل کی سنٹری پر سے پردہ اٹھ جائے گا۔“

راکھل کا ایک ایک لفظ غلوس اور اپنا بیت سے بھر اہوا  
تھا۔ اس کے دوستی سے لب رہ لیجے نہ مجھے کوئی اور سوال نہ  
کرنے دیا اور میں خاموش نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ ایک طرح  
سے اس کا ساتھ دینے کے لیے میری رضامندی تھی۔

اس نے کہا ”اولڈ کرمل“ میں روڈ یعنی ہائی وے قمری پر  
واقع ہے۔ اگر ہم بیکسٹریج سے فیوٹیکس کی طرف جائیں تو یہ  
ختم کر کے بعد پڑتا ہے ”کری“ وہ جگہ ہے جہاں سے رلی  
موشے ہائمن کے بندے پیرس وین جانے کے لیے مڑتے  
ہیں۔ اگر ہم صحیح سلامت اولڈ کرمل پہنچ جاتے ہیں تو پھر  
”جھوڑا ایک طرح سے ہم آزاد ہوں گے۔ ہم ہائی وے پر سسر  
کریں یا فرین پکڑیں“ ہمیں کوئی روکے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔“

راکھل بڑی عرق ریزی سے مجھے لائحہ عمل کی تفصیل  
بتا رہی تھی اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنی  
سائل کے تصور میں گویا ہوا تھا۔ وہ سائل جس کے تصور میں  
”میں مجرور سمندر کے طوفانی تیزیز سے کھار ہا تھا مگر ہزار کوشش  
کے باوجود بھی اس تک رسائی ممکن نہیں ہو رہی تھی۔

پتا نہیں میرے مقدر میں کوئی خرابی تھی یا قدرت کی طرف  
سے ایک سنگین آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا۔ سائل میرے  
انداز اس طور سائی بیٹھی تھی کہ اس کی جدائی کے بارے میں  
سوچتے ہوئے دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگی تھیں!

☆☆☆

جنوری کا مینا الاسکا کے لیے بڑا قیامت خیز ثابت ہوا۔

ہے۔

عامی بات ہے! جب ہم قیامت کا ذکر کرتے ہیں تو  
ہمارے تصور میں ایک آگ سی جلنے لگتی ہے ہمارا احساس پیش

کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور تاحہ نگاہ بتائی دیر بادی کے مناظر  
اجبرنے لگتے ہیں مگر یہ جنوری کا قیامت خیز مینا الاسکا کی  
شخصک میں اضافہ کرنے کے سوا کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام  
نہیں دیتا۔ یہاں کی زندگی دیران اور جاڑ ہو کر رہ جاتی ہے۔  
سورج دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں اور رات دن کا شمار  
گھڑیوں کا مہو ہونے منت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم محض گھڑی میں  
وقت دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس لمحے دن ہے یا  
رات، صبح ہے یا شام؟ کسی فحاشی اور بے بسی کی زندگی ہے۔

میں نے اپنی رست دا بچ پر گناہ ڈالی۔ شام کے پانچ بجے  
والے تھے۔ دیکھو ضروری اشیاء کے ساتھ ہی یہ گھڑی بھی راکھل  
نے مجھے دی تھی۔ ہم خدا خدا کر کے دنیا کی پینٹ پارک سے نکل  
آئے تھے۔ اس وقت ہم اولڈ کرمل میں ہائی وے قمری کے  
کنارے کھڑے تھے۔ ماڈٹ ملنے سے اولڈ کرمل تک

جنوب مشرق میں ہم نے دنیا کی پینٹ پارک کا جو حصہ پاتا تھا  
اس کی کھٹائیوں کی تفصیل میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔  
کھٹائی تو آخر کھٹائی ہی ہوتی ہے۔ چھوٹی یا بڑی ہونے سے  
کیا فرق پڑتا ہے! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ کسی ناخوشگوار واقعے  
کے ظہور کے بغیر۔ ہم بہ خیر عافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے  
تھے۔ یعنی میرے تئیں ایک نامعلوم منزل کے پہلے زینے پر  
ہم ہائی وے کے کنارے جس مقام پر کھڑے تھے وہاں  
قریب ہی ایک گیس اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔ امریکا والے پیٹرول  
پمپ کو گیس اسٹیشن کہتے ہیں۔ بہر حال مذکورہ گیس اسٹیشن کے  
ساتھ ہی ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور بھی موجود تھا۔ راکھل میری  
طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ دہان! تم دو منٹ یہاں روکو۔ میں ذرا اسٹور میں  
جاری ہوں۔“

”کیا کوئی کھانے پینے کا سامان خریدنے جا رہی ہو؟“

میں نے پوچھا۔  
ہمارے بیگز میں اشیائے خورد و نوش کا اچھا خاصا ذخیرہ  
موجود تھا۔ سب سے زیادہ مقدار ڈیٹا کی فردش کی تھی جو اس  
موسم میں زندگی کی حرارت قائم رکھنے کے لیے از حد ضروری  
تھی۔

راکھل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”میں  
اسٹور میں سے اپنے بڑوں کو ایک فون کے موجودہ صور سے  
حالات سے۔۔۔ آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا اتنی اہم باتیں اسٹور کے فون پر کرنا ٹھیک ہے؟“  
”اس پر فیملی موسم میں یہ اسٹور دیران ہوگا۔“ راکھل  
نے کہا ”مجھے نہیں امید کہ ایک سیکڑ میں کے علاوہ بھی اندر کوئی

جود ہو۔ پھر میں نہایت ہی مختصر اور کام ہی کی بات کروں  
ان لوگوں سے جلد از جلد رابطہ کرنا بہت ضروری ہے۔“

میں نے ایک فوری اور اچھوتے خیال کے تحت  
”راکھل! پہلے میں ایک فون کر کے آتا ہوں۔ اس کے  
برقم جاتا۔“ اس وقت میرا ذہن نہایت ہی برق رفتاری سے  
مگر رہا تھا۔

”تم کے فون کرنا چاہتے ہو؟“ وہ حیرت آمیز نظر سے  
دیکھنے لگی۔

”رلی کو؟“ میں نے سناتے ہوئے لیجے میں کہا۔  
”رلی موشے ہائمن؟“ اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل  
گئیں۔

میں نے اثبات میں ہاسر ہلایا۔  
وہ توشلیں ناک لیجے میں بولی ”بہت ہی خطرناک ہوگا  
ہاں! ابھی تو ہم کسی محفوظ پناہ گاہ تک بھی نہیں پہنچے۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔ میں رلی سے ”ہیلو ہائے“ کر کے  
پہنچ آ جاؤں گا۔“ میرے ذہن میں ایک منفرد منصوبہ از خود  
تیب پاتا چلا جا رہا تھا۔

”تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ وہ بے حد ابھی ہوئی تھی۔  
”میں اس وقت انتہائی سمجیدہ ہوں۔“

اس نے پوچھا ”تمہارے پاس رلی کا فون نمبر ہے؟“  
”اس کا نمبر تم مجھے دو گی۔“ میں نے قلعیت سے

”راکھل! میرے سامنے اسے اقرار کر چکا ہے کہ اس کے خلیہ  
کانے میں ٹکی فون کا نظام موجود ہے جہاں سے دنیا کے کسی  
ملک۔۔۔ اور ملک کے کسی بھی علاقے سے فون کیا جاسکتا  
ہو اور تم۔۔۔ میں نے جملہ مکمل چھوڑ کر تھوڑا وقف کیا پھر  
ہا۔“

”راکھل! تم ایک عرصے سے رلی کے سایے میں کام  
رہی ہو۔ وہاں کے فون نمبر تو تمہیں اذہر ہوں گے۔ کیا  
بالطبع کہہ رہی ہو؟“ بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی نیکی  
ٹھوس میں جھانکا۔

”تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے  
”رلی بولی“ مجھے وہاں کا فون نمبر یاد ہے لیکن یہ ضروری نہیں  
ہے۔ اس نمبر پر براہ راست تمہاری رلی سے بات بھی  
جائے۔“

”تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ میں رلی کو کیسے آن لائن  
رہا ہوں۔“ میں نے ٹھوس لیجے میں کہا ”یہ میرا دوسرا نمبر ہے۔ تم  
میرا ہاں کا نمبر بتاؤ؟“

”سیکس اینٹ قہری۔“ فو قہری فو قہری! اس نے نمبر

دہرایا پھر عجیب سے لیجے میں بولی ”پتا نہیں تم کیا کرنے کا  
ارادہ رکھتے ہو!“

میں نے مذکورہ فون نمبر کو اپنے ذہن میں نقش کیا۔ اس  
نمبر میں ”بیٹے سوترا سی“ تو دنیا کی پہنچ کا نمبر تھا نیکی وہاں کا  
ایر یا کوڈ۔ ہائی ”دو ہزار تین سو پینتالیس“ رلی کے لکھنے کا  
نمبر تھا۔ یہ بڑے کام کے فکر دھیرے ہاتھ آگئے تھے!

میں نے راکھل سے کہا ”میں جو بھی کرنے کا ارادہ رکھتا  
ہوں وہ ابھی تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم تو جانتی ہو میں  
ایک چادر گر ہوں۔ پھر خواہ خواہ کے اندیشوں میں کیوں گم رہتی  
ہوں؟“

”چادر گر!“ اس کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار اور آسودہ  
سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

میں اسے وہیں چھوڑ کر اسٹور کی جانب بڑھ گیا۔  
راکھل کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس نمبر سے  
پہنچے ہوئے اسٹور میں سیکڑ میں کے سوا کچھ کوئی اور بندہ  
بشر دکھائی نہ دیا۔ کوئی گاہک اور نہ ہی کوئی اسٹاف نمبر۔ اس  
اسٹور کا اکلوتا سیکڑ میں کسی تازہ ترین پرلوگر ایک سیکڑ میں کے  
مٹانے بلکہ مشاہدے میں غرق تھا۔ میری آمد پر اس نے نگاہ  
اٹھا کر بڑے سرسری انداز میں مجھے دیکھا اور میرا ہاتھ جاکھانے  
کے بعد دوبارہ اس ہوش رہا سیکڑ میں کی رنگین دھنیں نغماؤں  
میں سانس لینے لگا۔ باہر کی بہ نسبت اسٹور کے اندر کا ماحول  
درجہ حرارت کے اعتبار سے خاصا فرحت بخش تھا۔ میں پہلی  
فرصت میں اپنے کام سے لگ گیا۔

ڈانگ کی پینٹل کے بعد تیسری ٹھنٹی پر دوسری جانب فون  
انڈیز کر لیا گیا۔ انڈیز میں مجھے ایک سمجیدہ نسوانی آواز سنائی  
دی۔ ”ہیلو!“

”میں راجہ بات کر رہا ہوں۔“ میں نے ایک سوچے  
سمجھے منصوبے کے تحت کہا شرمندہ کیا ”رلی سے میری بات  
کر دو۔“

”رلی؟“ اس عورت نے اپنی سمجیدگی پر برقرار رکھتے  
ہوئے کہا ”یہاں کوئی رلی نہیں ہوتا۔“

”میں رلی موشے ہائمن کی بات کر رہا ہوں۔“  
”مسٹر راجہ! یہ ایک اسٹیکس بار ہے۔“ اس نے  
کہا ”سوری راکھل نمبر۔“

اس بات کا مجھے پہلے سے خدشہ تھا کہ وہ فون نمبر رلی  
موشے ہائمن کے نام سے یا اس کی تنظیم کے نام سے نہیں  
ہوگا۔ سلسلہ جو بھی ہو لیکن کسی اسٹیکس باری کی توقع ہرگز  
نہیں کر رہا تھا۔ میں نے قدرے برہمی سے کہا۔

”اسٹیکس بار ہے یا تم اسٹیک چارمر ہو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر فوری طور پر تم نے ربی موٹے ہاتھن سے میرا رابطہ نہ کر لیا تو ربی اور اس کے مشن میں بہت بڑا رخ پڑ جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو؟“

”مسٹر راجر! اگر تمہیں کسی ربی سے ملنا ہے تو سیدھے سانا گامگ چلے جاؤ۔“ اس نے پہلے والی سنجیدگی کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

سانا گامگ (SYNAGOGUE) یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔ اس مخصوص طرز کی عمارت میں ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی پیشترے بازیاں ترتیب دی جاتی ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کی بعض مسجدوں میں بھی مذہب کے ساتھ ساتھ سیاست کا عمل دخل دیکھنے میں آتا ہے۔ کاش ہم آپس میں فرقوں اور لسانی و فرقہ واریت سیاست کو فراموش کر کے ایک ہو جائیں۔ ایک ہو جائیں اور نیک ہو جائیں۔ بھر کوئی دھچک نہیں کہ اس دنیا کے آخری حکمران ہم مسلمان ہی ہوں گے۔ کاش.....!

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا دوسری طرف پس منظر میں مجھے ایک ہماری بھرم کردار آواز سنائی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس آواز کو میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہے اور اس ساعت کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ وہ ممکنہ شناسا شخص نیلی فون والی سے پوچھ رہا تھا ”سوزن! کس سے اچھے رہی ہو؟“

”کوئی مسٹر راجر ہے۔ میں کہہ چکی ہوں راجک نمبر لیکن وہ بہ ضد ہے کہ.....“

”لاؤ ریسیور مجھے دو۔“ سوزن کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی اس شخص نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے اڑ نہیں میں مجھے اس کی مخصوص آواز سنائی دی۔

”ہیلو مسٹر راجر؟“

وہ پورے محطرات سے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ربی موٹے ہاتھن کا دست راست برنارڈ لیو تھا۔ میں نے اپنی پالیسی کے مطابق کہا۔

”تم کون ہو؟ مجھے فوری طور پر ربی سے بات کرنا ہے۔ پلیز دیر نہ کرو ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“

نے برنارڈ کو پہچاننے سے انکار کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ربی کا چلایا ہوا جادو ابھی تک پوری طرح مجھ پر اثر انداز ہے۔ دوسری جانب سنانا جھما گیا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا برنارڈ لیو بھی میری آواز کو پہچان گیا ہوگا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے گھبر آواز میں کہا ”پلیز ہولڈ آن مسٹر..... راجر!“

تھیں سیکنڈ بعد ربی موٹے ہاتھن کی آواز میری ساعت سے ٹکرائی ”میرے بچے! تم کہاں ہو؟“ اس کی آواز میں تشویش سے زیادہ تجسس بھرا ہوا تھا۔

میں نے سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت کہا ”میرے محترم ربی مرہ! میں نہیں جانتا کہ اس وقت کہاں ہوں۔ بس احساس ہے آپ سے مجھے دور درگیا ہے۔“

”تم فکر نہ کرو میرے بچے۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولا ”میں تمہیں دوبارہ بہت جلد خود سے قریب کر لوں گا۔ مجھے بتاؤ تمہیں مجھ سے جدا کرنے والے کون لوگ ہیں؟“

”جناب! میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔“ میں ربی کو قریب مسلسل میں جتلا رکھتے ہوئے کہا ”یا پھر یہ جا ہوں کہ میرا نام راجر ہے اور میں صرف آپ سے متعلق ہوں۔“

”اوہ میرے بچے!“

ربی موٹے ہاتھن نے یہ مختصر سا جملہ ایسے جذباتی انداز میں ادا کیا جیسے وہ میری جدائی میں اپنی آنکھوں کے سونے خشک کر چکا ہو۔ اس کے اظہار میں مانتا کی جھلک بھی لیکن چونکہ اس کی بدینتی اور مکار ذہنیت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا اس لیے اس کے جذباتی ڈانٹا لگے کے پیچھے میں دے ہوئے جوش کو میں نے فوراً بھانپ لیا۔ وہ اس امر پر دل و سر سے نہال تھا کہ اس نے مجھ پر چٹا ٹوم کا جو ٹل کیا تھا صدی صد کا سیلاب رہا تھا۔ یہی اور یوگا کی نوازش تھی کہ مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کر کے ایک سپر سائیکیم میل تھا۔ ربی موٹے ہاتھن جیسے جیتہ عالم کو چکر دینا کوئی آسان بات نہیں تھی۔

میں نے اپنی آواز میں اس گم شدہ بچے کی ٹھنکنی یا سیت بھری جو بھرے پڑے میلے میں اپنی ماں کی انگلی چھو جانے سے بچھڑ جاتا ہے ”میرے ربی! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے اپنے پاس بلا لیں۔“

”میں ابھی بلاتا ہوں۔“ وہ منافقت آمیز رقت کا جام دکھاتے ہوئے بولا ”جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا کہ تمہیں کیسے اور کن لوگوں نے مجھ سے جدا کیا ہے میں تمہیں ٹرک نہیں کر سکوں گا۔ پریشانی سے نکلو اور ذرا غور کر کے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا واقعات پیش آئے ہیں؟“

میں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے بے سے کہا ”میں ان لوگوں سے واقف نہیں ہوں۔ انہوں

یہاں سے انہو اکیا گیا ہے۔“

اردی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ”اسی میرے محترم اسی لئے آپ نے اپنے راجے کا فون نمبر بلا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے آپ میرے دوہرو

انہوں نے کہ اس وقت میں ربی موٹے ہاتھوں سے بہت دور اس لیے اس کے چہرے پر بے چینی کے بھان آئیں۔  
ات کو انہوں نے ہونے دیکھنے سے محروم رہا۔ میں نے بات  
میں بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بھرمیں فوراً اس انشور میں آیا اور اب آپ سے فون پر  
 کر رہا ہوں۔ یہ۔ یہ مجھے کیا۔ ہو رہا ہے۔“ میں  
 اچانک اپنی آواز اور الفاظ میں ہائی کوائٹی ڈارے کو شامل  
 کیا۔ ”یہ کیوں میرا لگا رہا۔۔۔“ میرے حلق سے پھنسی پھنسی  
 کی خارج ہوئی جو رفتہ رفتہ محسوس ہوتی چلی  
 گئی۔ ”میرا۔۔۔ لگا۔۔۔!“ بھرمیں خاموش ہو گیا۔

میں نے دانستہ فون بند نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف سے  
 اکی گھبراہٹ آواز ابھر رہی تھی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا..... اور  
 پکار میں احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

”راجہ! کیا تم میری آواز سن رہے ہو.....؟ تم میری  
 ناک جواب کیوں نہیں دے رہے ہو راجہ؟ تم ٹھیک تو ہو  
 ان؟ راجہ..... وہ جان..... تمہیں کیا ہو گیا ہے.....؟“  
 میں نے دیر سے سے ریسپورڈ کر ڈیٹ کر کے ٹیلی فونک  
 بلد ہونف کر دیا۔

میں نے اگرچہ ربی سے کلام کرتے ہوئے اپنی آواز کو  
مادامیرا کھاتھا پھر بھی ہمارے درمیان جس قسم کی گفتگو ہوئی  
اس سے بے شمار مین کا جو تک جاننا لازمی تھا مگر وہ اللہ کا بندہ

یہیں کاغذ اسی طرح ننڈو میگزین پر سرجمکائے خاموش لافعلی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے اور اس کے شوق کو دل ہی میں "شباباشی" دی اور اسٹور سے باہر نکلنے کے لیے پلٹا تو علی بیگم کاہنہ پڑ گئی۔ شاید وہ باہر کے شدید موسم سے آگاہ کر رہی تھی۔ یہ حال اگر کاہنہ فیصل درست تھا۔

میری نظر سے اس کی نظر ملی تو وہ معنی خیز انداز میں  
 راہ دی۔ اس کی آنکھوں میں جھلکنے والے رنگوں نے مجھے  
 یاد کیا کہ کلزمین نے نہ سہی لیکن راکلین نے بڑے خوشنوع  
 نوع سے میری باتیں سنی تھیں۔ جواب میں بھی زہرا لب  
 راہ دی۔

دو فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دھیرے سے  
 ”تم صرف جادوگر ہی نہیں بلکہ بازی گر بھی ہو..... ایک  
 بے شکاک چکر باز!“

کہا "جھک بوبالی رہ پیکلڈ رہی!"

اس نے چوٹے ہوئے لہجے میں سوال کیا ”جہیں انوا  
 کرنے والے اب کہاں ہیں۔ انہوں نے جہیں آزاد کیوں  
 چھوڑ رکھا ہے؟“

”میں کچھ نہیں جانتا میرے ربی!“ میں نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا ”جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اس ہائی وے کے کنارے کھڑے پایا اور پہلی عرفیت میں

آپ کو فون کر رہا ہوں۔“

”بڑی عجیب سی صورت حال ہے۔“ وہ جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا پھر تشریحات ناک انداز میں پوچھا ”تجربہ کیا ہے جہاں کا ٹیلیفون نمبر کے دیا؟“

میں نے حاضر دماغی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”آپ نے محترم رہی!“

”وجہ..... راجہ ایس ایم کیا کہہ رہے ہو؟“

رہی کے لفظ میں موجود تعجب نے مجھے یاد رکھا کہ وہ

میری بات سن کر ایسے اچھلا ہوا جیسے اس نے ہائی لینڈس ڈانکو ننگے پاؤںوں سے چھو لیا ہو۔ پوکھا ہٹ میں دو مجھے ”وعدہ“ کہہ کر پکارنے والا تھا لیکن ”وج“ کی ادائی کے بعد ہی منجیل گیا۔

ہوتے ہوئے بکسیر مگر سعادت منداناہ لچے میں کہا "میرے  
عظیم رب پر ملی! جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے ذہن میں  
آپ کو کہتے ہوئے سنا۔ آپ اپنی مخصوص آواز میں مجھ سے  
کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو فون کروں۔ میں آپ کی ہدایت  
سر کرانچہ کیا ہوں کیونکہ آپ کا ٹیلی فون نمبر مجھے معلوم نہیں  
تھا۔"

رہی اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو راکل نے بھی سنی تھی۔ اسی طرح راکل اور اس کے کسی سینئر کے مابین جو باتیں ہوئیں وہ میں نے سنی تھیں تاہم ہم دونوں ایک طرف ہالوں کے سامع تھے۔ یعنی میں نہیں جانتا تھا راکل کے سینئر نے اس سے کیا کہا اور راکل کو معلوم نہیں تھا دوسری طرف رہی مجھ سے کیا کہہ رہا تھا البتہ ہم نے اپنے طور پر کچھ اندازے قائم کر لیے تھے۔

میں نے آئندہ کا پروگرام جاننے کے لیے راکیل سے استفسار کیا ”اب کیا کرنا ہے؟“

اس نے مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ منتر کی اس میں ایک سینٹر سے بات ہوگئی ہے "اس کا نام دواگک شو ہے۔ دواگک شو نے کہا ہے کہ ہمیں فوری طور پر دینالی کے ایک ہوٹل "ہارپر لاج" پہنچنا ہے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ ہمارے لیے ایک گاڑی بھیج کر رہا ہے جو ہمیں تحفظ دینالی کے مذکورہ ہوٹل پہنچا دے گی۔ اس ہوٹل کے ریسپشن پر ملی یاگک نامی ایک لڑکی سے ہمیں ملنا ہوگا۔ باقی آکسیجن مکمل وہ لڑکی ہی ہمیں بتائے گی۔"

راکیل خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا ”کیا تم نے  
 ہینکریج میں اپنے کسی بڑے سے بات کی ہے؟“  
 ”بڑے کے اسسٹنٹ سے“ اس نے بتایا ”ہینکریج میں  
 ڈاکٹر موگ ریڈو نے اس مشن کو کنٹرول کر رہا ہے۔ داگ شو  
 ڈاکٹر کا اسسٹنٹ ہے۔ اس نے بتایا ہے لی الحال ہینکریج میں  
 ہمارا داخلہ بہت خطرناک ہوگا۔ یہودیوں کی جی ڈی پی نامی  
 تنظیم پوری طرح سرگرم ہو چکی اور وہ بڑی شہرہ سے ہمیں  
 تلاش کر رہے ہیں۔“

”کیا وہ کچھ شے ریمنڈ یا ساحل کے بارے میں کہہ  
تایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں،“ وہ فنی میں گروں جھکتے ہوئے بولی ”اس سے  
تمہارے سامنے تو بات ہوئی ہے۔ وہ کچھ کر میں ڈاکٹر  
موکے سے تفصیلی بات کروں گی۔“ مجھے اپنی ہوزیشن بھی کیسے کرنا  
اور اس مسئلہ کے لیے دعا بات بھی لینا ہیں۔ رنی اور اس کی تنظیم

میں والہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“



جن چار فوجیوں کو لہا لٹا آئے تھے انہیں کبھی نہ کبھی بیدار بھی ہوتا تھا پھر ہمارا کارنامہ زیادہ دیر تک چھپا نہ رہتا۔ میں جانتا تھا رلی موٹے ہاتھن بہت جلد اس حقیقت تک پہنچ جائے گا کہ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ میں راکیل کے ساتھ اپنی مرضی سے فرار ہوں۔ راکیل کی حیثیت خداری اور میں مفرد تھا مگر میں نے ذہنی طور پر رلی کو جس طرح الو بنایا تھا وہ خاصا محفوظ کن تھا۔

راکیل نے پتا نہیں میری سوچ پڑھ لی تھی، جلدی سے بولی "تم نے رلی موٹے ہاتھن کو بری طرح بے وقوف بنایا ہے۔"

میں نے کہا "جو لوگ حد سے زیادہ شاطر اور چال باز ہوتے ہیں انہیں پکڑنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ بس اس سلسلے میں تمھوڑی ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ تم ہائی دے لو پر کھڑے کیا کر رہے تھے؟"

"مجھ بھی نہیں۔" میں نے کہا میں نے تو ایسے ہی ایک ہائی دے کا نام لے دیا تھا۔ جب ہائی دے قمری ہوتی ہے تو ہائی دے تو بھی نہیں نہ کہیں ہونا چاہیے البتہ "دیکھ تو فینر بیکس" اور "فائیٹو میگز" کے سلسلے میں میں نے سراسر کلکا کیا تھا۔

"پتا نہیں یہ تمہارا کس قسم اور کس مزاج کا ہے!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کیوں کیا ہو گیا؟" میں نے عجیدگی سے پوچھا۔ وہ بولنا یہ اپنی سمت اور رخ کو ایک لمحے کے لیے نہیں بھولتا۔ سیدھا حائل پر جا کر نکلا ہے۔ "ہات ختم کر کے وہ مجھے ٹٹونے والی نظر سے دیکھتی تھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" میں الجھ گیا کیا میں نے اس نکتے کے پردے میں کوئی حقیقت کھول دی ہے؟ تمہارے انداز سے تو محسوس ہو رہا ہے ویکم ہائی دے اور فائیٹو میگز میں بڑا دم ہے!"

وہ پھر لہجے میں بولی "کوئی ایسا یادام!" پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے بتایا "ہائی دے قمری کی طرح الاسکا میں ہائی دے تو بھی موجود ہے اور واقعی یہ روڈ فینر بیکس سے نکلتی ہے۔ ہائی دے تو جنوب شرق میں ایک طویل فاصلہ طے کرے کے بعد سیدھی کینیڈا کی سرحد سے جا ملتی ہے۔ راستے میں ڈیٹا بکشن پر اسی ہائی دے سے ہائی دے نور فلکی ہے جو انتہائی جنوب میں "کاتا کی طرف جاتی ہے۔ کینیڈا سے ٹھوڑا پہلے ہائی دے نو میں سے ٹوک کے مقام پر ہائی دے دن نکلتی ہے جو جنوب مغرب میں ملتے ملتے بالآخر

کلکاٹا سے جا ملتی ہے۔ ہائی دے دن "ٹوک" اور "کلکاٹا" ملا کر وہی کام سرانجام دیتی ہے جو ہائی دے نور ڈیٹا بکشن اور کلکاٹا کو آپس میں ملانے پر انجام دیتی ہے اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ.....

وہ بات ادھوری چھوڑ کر تھوڑا استغراق ہوئی پھر مڑھ ہوئے لہجے میں بولی "ہائی دے نو پر فینر بیکس سے پانچ کلور پہلے واقعی "ویل کم فینر بیکس" کا بورڈ نصب ہے۔"

"اوہ! میں نے اس کے انکشاف پر چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے چہرے کے تاثرات کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا "محض ایک اتفاق ہے۔"

"محض نہیں بلکہ..... خاصا جان دار اتفاق ہے۔" میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے موضوع کو ٹوٹ کر دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم نے جو کرائی اور جیٹا کوئی میں کچھ کر رکھا ہے۔ لگتا ہے تم نے الہ کا چہا چہا دیکھ رکھا ہے؟"

"مجھ سے زیادہ تم نے!" وہ ذہنی لہجے میں بولی اور دستور کو جتنی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ میں بے چینی پائی جاتی تھی "مجھے نہیں لگتا تم پہلی مرتبہ الاسکا آ ہو!"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اوٹانک شوکی بھیجی ہوئی گاڑی آ گئی۔ وہ قمری کار ریٹل پینل کی ایک چاق و چوبند گاڑی جس کی سائینڈ میں قمری (THRIFTY) پینل کا خصوص مولوگرام بنایا ہوا تھا۔ مذکورہ گاڑی ٹش پش تھی تاہم الاسکا موسم اور فضا میں موجود دھند کھرنے اس کی چم چھامت لگایا دیا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بھاری تن و توٹ کا مالک محض بر اجماع تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی کے اندر ہی رہتے ہوئے راکیل ایک مخصوص اشارہ کیا۔ راکیل نے اثبات میں سر ہلایا اور سرکوشیا نہ لہجے میں مجھ سے کہا "وہ جان میں اسے جانتی ہوں یہ ہمارا ہی بندہ ہے لیکن بظاہر کار ریٹل پینل میں ملازم ہے اس کا نام گاچی ہے۔ چلو گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔"

میں نے راکیل کی تقلید کی اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچ چکے تھے۔ گاچی نے مطمئن انداز میں گاڑی آگے بڑھا دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی سے ہاتھیں کرنے لگی۔ یہ ہوا سے ہاتھیں کرتا دھبی سرکوشیا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ غیر برقانی علاقوں کی نسیم سے یہ رفتار کچھ بھی نہیں تھی البتہ الاسکا میں خصوصاً جنوری میں اتنی رفتار کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ ہمارا رخ "اولڈ کریک"

سے "دینائی" کی جانب تھا" گویا ہم انتہائی شمال کی سمت بڑھ رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد راکیل نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ میں نے بھی نشست کی پشت گاہ سے لپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ گاڑی کے اندر مخصوص حرارت کے سبب بڑا خوشگوار موسم تھا۔ پتا نہیں اس وقت راکیل کے ذہن میں کیا چل رہا تھا، میں رہی اور ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔ رہی موٹے ہاتھن میرے بجائے ہوئے ٹریپ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے کنگھو کے آخری مرحلے میں، بھجان خیر لکھا لہٹ کے زیر اثر مجھے راجر کے بجائے دھدان کہہ کر مخاطب کیا تھا، گویا احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ رہی کی اس مضطرب سوچ کا تصور کر کے مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ وہ یہودیوں کا ایک جید عالم تھا۔ ہر مذہب کے عالم واجب الاحرام ہوتے ہیں لیکن رہی موٹے ہاتھن کی اصلیت مجھ پر مکمل چمکی گئی۔ میں نے اپنی مضبوط قوت ارادی سے کام لے کر اس کی خفرت کا سازش کو بے نقاب کر دیا تھا اس لیے..... میرے دل میں اس کے لیے احترام کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

رہی کے مطابق ساحل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ میں مانگیل اور ٹیلن کی لاشوں کو تاریک عمار میں چھوڑ آیا تھا۔ ریمنڈ اور ساحل کی پراسرار گمشدگی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ غار کے حالات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا، مانگیل اور ٹیلن کو ریمنڈ ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کس مقصد کی خاطر؟

اس سوال کا سیدھا سیدھا جواب ذہن میں یہ آتا تھا..... ساحل کے حصول کی خاطر! مگر اس جواب کے بعد آنکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلتا تھا۔ ریمنڈ نے اپنے دو ساتھیوں کو ہلاک کیوں کیا؟ وہ ساحل کو کیوں حاصل کرنا چاہتا تھا؟ میں ابھی تک ریمنڈ کو راکیل کے کپے کی کالی، بھیر پڑی سمجھ رہا تھا اور توقع بھی تھی وہ ساحل کو رہی موٹے ہاتھن کی خدمت میں پیش کرے گا لیکن رہی کی جھنجھلاہٹ نے یہ راز کھول دیا تھا کہ ساحل اس کے پاس نہیں پہنچائی گئی تھی..... پھر ریمنڈ ساحل کو لے کر کہاں چلا گیا؟ ایک توجہ طلب سوال یہ بھی تھا کہ ریمنڈ اس اندھے بارودی غار سے نکل کیسے تھا؟

فی الحال میرا ذہن ایسے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ میری سوچ ایک مخصوص دائرے میں گردش کر رہی تھی۔ وہ ان سوالات سے نشیٹے ہوئے لا جواب ہو جاتی اور ایک مرتبہ پھر زید پوچھا اٹھ سے اپنا کام آغاز کر دیتی۔ پتا

نہیں یہ کیسا دائرہ تھا جس کے اندر میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے صرف یہ نظر آ رہا تھا، مذکورہ دائرہ ساحل کے گرد گھومتا تھا، گویا وہ ان لا جواب سوالات کے حلقے میں بندھی۔ ایک نادیہ حصار کے ترے میں تھی۔ کاش..... وہ میری ہاتھوں کے حصار میں بند ہو جاتی!

☆☆☆

"ہار پراج" ہوئی کی عظیم الشان عمارت دینائی پینٹل پارک کے داخلی گیٹ کے نزدیک دریائے نیانا کے قریب واقع ہے۔ دریائے نیانا (NENANA RIVER) ہائی وے قمری کے سوازی بپتا ہے۔ ہوئی کے زیادہ تر کمروں سے اس برقیانی دریا کا دلکش نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں ہار لاج کا کمر نمبر تین سو تین ملتا تھا جہاں سے دریائے نیانا تا حد نگاہ دکھائی دیتا تھا۔

ہار پراج کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ اس کا افتتاح ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس ہوئی میں مونا صاحبہ حیثیت لوگ ہی ٹھہرتے تھے۔ یہ دینائی کا سب سے مہنگا ہوئی تھا۔ ڈبل روم کا ایک دن کا گراہ ایک سو تیس یو۔ ایس (امریکی ڈالرز) اور ڈی گس سوئٹ کا ایک دن کا گراہ دو سو تیس یو۔ ایس تھا۔ یہ ریش سیزن (مٹی تسمتیر) کے تھے البتہ آؤٹ سیزن میں بہ نسبت کم کرائے پر اور یہ آسانی بھی کمرہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہار پراج میں عمدہ ریستورنٹس، ریکریشن ہال، جنازہ اور سونگم پلڑی سہولت بھی موجود ہے۔ پارکنگ کا دھرا بندوبست ہے۔ گراؤنڈ فلور پر ہوئی نے فیشنل ہر خاص و عام اپنی گاڑی پارک کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وسیع پارکنگ ایریا ہوئی کے بیس منٹ میں بھی موجود ہے جو صرف "ممبرز" کے لیے مخصوص ہے۔ اس ایریا میں "شیر ڈی پارٹنز" اور "چینج ڈی پارٹنز" جیسے ڈرائے ہوتے ہیں۔ اس ٹھیل کو ان دی ریکارڈ "شیر ڈی بیجک" ایک "ڈرائیو ان کی کلب" کی حیثیت کا حامل ہے!

رہبشیں پر لی یا بگ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پیشہ ورانہ دل کش مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ راکیل نے وائیک شو کا حوالہ دیا تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ ہم کون ہیں اور کس مقصد سے وہاں پہنچے ہیں۔ اتفاق سے لی یا بگ اس وقت رہبشیں پر اکٹلی ہی تھی۔ اس نے ہاری ہاری ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ مسٹر ڈسلاوا ہیں۔" اس کا اشارہ میری جانب تھا۔ پھر وہ راکیل کی جانب ہنسنے لگی "آپ گارشیوا ہو۔ آپ دونوں

دوست ہیں اور اس قیامت خیز موسم میں آپ کے ذہن میں ہم چلی کا سودا ہلکا ہے۔ آپ ایک دن کے لیے اس ہوئی میں ٹھہریں گے۔ کل کی وقت آپ کو چیک آؤٹ کرنا ہوگا۔"

انتا کہہ کر مڑی اور اپنے عقب میں دیوار پر نصب کی بورڈ سے پھینچا کر کرنے لگی پھر ایک کمرے کی چابی رہبشیں پر میرے جانب بڑھاتے ہوئے بولی "آپ کو اس ہوئی کا کمرہ نمبر تین سو تین دیا جا رہا ہے۔ یہ ریمنڈ سیزن آپ لوگوں نے فون پر کرائی ہے۔ کیا میں سب کچھ کہہ رہی ہوں!"

لی یا بگ بڑی صاف انگریزی بول رہی تھی تاہم اس کا ایکسٹ غیر امریکی تھا۔ راکیل نے قرب و جوار میں نگاہ دوڑائی اور مطمئن ہونے کے بعد سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔ "مسٹر وائیک شو نے بتایا تھا کہ تم ہمیں آئندہ کے لانچز عمل کے بارے میں....."

وہ راکیل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی "مجھے سب یاد ہے۔ آؤٹ سیزن ہونے کے باعث میں رہبشیں پر اکٹلی ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد میرا آف ہو جائے گا۔ پھر میں آپ لوگوں کے کمرے میں آکر تفصیلی بات کروں گی۔ ازاں اؤٹ کے!"

"بس اؤٹ کے۔" میں نے کہا "جب تک ہم نہیں بھی ہو جائیں گے۔"

ہم اپنے سامان کے نام پر ایک ایک بیگ کے ساتھ ہوئی کے روم نمبر تین سو تین میں پہنچ گئے۔ بدن ممکن سے چور تھا۔ ہم ایک طویل ٹھکانے والی ہم سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے اور حالات ہمیں آگے کہاں تک لے جانا چاہتے تھے اس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

روم نمبر قمری ٹاٹ قمری ایک ڈبل روم تھا اور ہماری ضرورت کے عین مطابق بھی۔ ایک بڑی سی سلائیڈنگ دھڑلور باریے نیانا کے رخ پر کھلتی تھی تاہم ان دونوں حد سے زیادہ گرمے ہوئے درجہ حرارت کے باعث دریا میں کوئی جولاہی روانی اور بہاؤ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کمرہ مکمل طور پر اکرکڑیٹین تھا جہاں رہنے کے لیے کسی اضافی گرم کپڑے کی ضرورت نہیں تھی۔

میرے شورے پر پہلے راکیل نے ہاتھ لیا پھر میری باری آئی۔ وہ دانش روم میں سے جتنی قمری قمری برآمد ہوئی تھی اس سے لگتا تھا یہ ممکن کس ہاتھ مجھے میری روٹی کے مانند ہلکا ہلکا کر دے گا۔ میں شاور کے نیچے کھڑے ہو کر وائیک شو اور ڈاکٹر مونگ ریوٹے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وائیک شو خاصا سچہ دار تھا۔ اس نے میرے فرضی نام

ڈسلاوا سے یہاں بھج کر رکائی تھی۔ یہ نام مشرق اور مغرب میں یکساں چلتا ہے۔ راکیل کا گارشیوا ہونا ایک عام کی بات تھی۔ سب سے اہم پوائنٹ یہ تھا کہ ڈاکٹر مونگ ریوٹے نے ہمارے بارے میں کیا سوچ رکھا تھا۔ اگرچہ ابھی تک میری اس ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی اور نہ ہی ملاقات تاہم اس کے نام کے حوالے سے میرے ذہن میں اس کی شخصیت کا جبر تصور اور اثر ابھر رہا تھا وہ بہت ہی تجربہ کار زبردبار اور عمدہ جہت شخص کا تھا۔ راکیل نے بتایا تھا ڈاکٹر لمکنرچ میں رہتے ہوئے اس آرٹین کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس سے بھی یقین ظاہر ہوتا تھا وہ راکیل کے بدوں کے لیے نہایت ہی اہم شخص تھا۔ ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہو سکا تھا راکیل کے بڑے دور حقیقت کون لوگ تھے؟ میرے اندازے کے مطابق ان کا تعلق بدہمکنوں ہی سے ہو سکتا تھا۔ کس سطح پر؟ اس کا علم آگے چل کر ہی ہو سکتا تھا!

الاسکا کے نہایت ہی داہیات موسم میں شاور کا پانی کسی غیر مرتزقہ قیمت سے کم نہیں تھا۔ میں گرم شاور کے نیچے کھڑا ہوا تو پھر وہاں سے ہٹنا ہی بھول گیا۔ اس فرحت بخش غسل نے وقت گزرنے کا احساس منادیا تھا جتنی کہ جب میں فارغ ہونے کے بعد ہاتھ روم سے باہر آیا تو لی یا بگ راکیل سے ملاقات کر کے جا چکی تھی۔

"کیا تم دانش روم میں ہو گئے تھے؟" راکیل نے پوچھا۔ میں نے کہا "اگر سو گیا ہوتا تو پھر صبح سے پہلے باہر نہ آتا۔"

راکیل نے مجھے بتایا کہ لی یا بگ سے اس کی بات ہو گئی ہے "اس کے مطابق ہمیں کل صبح کے بعد یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ الاسکا کی معروف ریل روڈ "لمکنرچ" غیر ٹیکس ایکسپریس "میں ڈسلاوا اور گارشیوا کے نام سے ہماری ریزرویشن ہو چکی ہے۔ یہ فرین دینائی میں رکنے کے بعد آگے بڑھتی ہے۔"

"بس یا اور کچھ؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"فی الحال بس!"

"اتنی سی بات کے لیے لی یا بگ کو استعمال کیا گیا ہے۔"

میں نے بیزار کرک انداز میں کہا "یہ اطلاع تو وائیک شو بھی تمہیں فراہم کر سکتا تھا۔"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولی "وہ لوگ بے حد احتیاط سے کام لے رہے ہیں وچدان....."

"وچدان نہیں ڈسلاوا!" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

"اوہ سوری!" وہ غامت آمیز لہجے میں بولی پھر

تایا۔ بی بی بگ کمرہ کی تھی یہ ٹرین بہ سہولت ہمیں دہلی سے  
لے کر پنجپور کی پھر رات دس بجے ”ٹی ڈبلیو اے“ کا ایک  
طیارہ ہمیں لے کر لے کر پنجپور سے سیٹل روانہ ہو جائے گا۔ ٹرانس  
درلڈ ائر لائنز کے پاس طیارے میں ڈاکٹر موگ ریفرے بھی  
ہمارے ساتھ جائے گا۔“

”اوہ!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر الجھن  
زدہ انداز میں دریافت کیا ”ہم سیٹل کیوں جائیں  
گے..... اور کیا یہ سیٹل بھی ایسا سا ہی کا کوئی علاقہ ہے؟“  
”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور میری  
معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی ”سیٹل دراصل  
امریکن اسٹیٹ ڈیفنس کا کینٹرل ہے۔“  
”یعنی کینٹرل کا بھی کینٹرل؟“ میں نے حیرت سے  
آنکھیں پھیلانیں۔

وہ ایک لمحہ مجھے سوچتی ہوئی نظر سے دیکھتی رہی پھر  
بولی ”شاید تم ڈیفنس کے ذکر سے ڈی سی کی طرف چلے گئے  
ہو۔“

”تو؟“ میری الجھن ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”ڈی سی (ڈسٹرکٹ  
آف کولمبیا) کو امریکی ریاستوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ  
درحقیقت درجنیہ اور میری لینڈ نامی دو ریاستوں سے حاصل  
کیے گئے تھوڑے تھوڑے علاقے کے مجموعے کا نام ہے۔  
امریکی صدر ہارچ ڈیفنس کا پایہ تخت یہاں قائم کیا گیا تھا اور  
اب یو ایس اے کے لیے ڈی سی کی حیثیت ایک دارالحکومت  
ایسی ہے۔“ وہ چند لمحات کے متوقف ہوئی پھر اپنے بیان کو  
آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔

”سیٹل کے حوالے سے میں نے جس امریکی ریاست  
ڈیفنس کا ذکر کیا ہے وہ ”یو ایس کینڈا“ کی سرحد پر واقع  
ہے۔ یہ ریاست یو ایس اے کے انتہائی شمال مغرب میں واقع  
ہے اور..... اس کی باؤڈری موناٹا اور ریگان آئڈا ہونامی  
ریاستوں سے ملتی ہے۔“

میں نے اس کی تفصیل سے مستفید ہوتے ہوئے سوال  
کیا ”ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا وہ ڈاکٹر موگ  
ریفرے ہمارے ساتھ سیٹل کیوں جا رہا ہے؟“

”ڈاکٹر موگ رات دس بجے اسی کمرے میں فون پر ہم  
سے بات کرے گا۔“ اس نے بتایا۔ باقی کی تفصیل وہی بتائے  
۔ میں اتنا جانتی ہوں سیٹل، میں ہمارے بہت سے  
اہم آدمی موجود ہیں۔“

”سائل کے ہارے میں کوئی خیر خبر؟“ میں نے گہری

خجندی سے پوچھا۔

”بی بی یا تم کو سائل والے معاملے سے دور رکھا گیا  
ہے۔“ راکیل نے بتایا ”اس سلسلے میں ڈاکٹر موگ سے  
پوچھیں گے۔“

میں نے ایک طویل انگڑائی لی پھر اس میں کہہ کر  
اضافہ کرتے ہوئے کہا ”کارشیا! مجھے تو زبردست جھوک محسوس  
ہو رہی ہے..... اور نیند بھی آ رہی ہے۔“

”میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔“ میری دیکھا دیکھی  
اس نے بھی منہ کھول کر ایک طویل جھابی لے ڈالی۔  
ڈاننگ ہال میں چلتے ہیں۔ کھانا کھا کر وہیں آئیں گے تو  
بچے ہی والے ہوں گے۔ پھر ڈاکٹر موگ سے بات کرنے  
کے بعد ہی تان کر سو جائیں گے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ خواب ناک نظر سے ڈبیل بیز کو  
دیکھنے لگی۔ وہ نگ سائز بیڈنا تالہا چڑا تھا کہ یہ یک وقت چار  
افراد بہ سہولت اس پر ایک گہری اور پرسکون نیند لے سکتے  
تھے۔ آج کی رات مجھے راکیل کے ساتھ اس بیڈ پر سونا تھا۔ یہ  
تصور میرے لیے بڑا انفیوزنگ تھا!

ہم تھری ناٹ تھری کو لاک کر کے زینے کی جانب بڑھ  
گئے۔ راکیل نے پوچھا ”اوپر جانا ہے یا نیچے؟“  
”اوپر نیچے کیا مطلب؟“ میں نے متذبذب نظر سے  
اسے دیکھا۔ ”ہمیں ڈاننگ ہال میں جانا ہے۔“

وہ بولی ”اس ہوٹل میں دو ڈاننگ ہالز ہیں۔ ایک گراؤنڈ  
فلور اور دوسرا اسکھ فلور پر۔“ بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظر سے  
مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا ”ہم تیسرے  
فلور پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ نیچے ہی چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے  
گر اؤنڈ فلور زیادہ مناسب رہے گا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اور میرے ساتھ چل  
پڑی۔

ہمارا چلاچ میں ملنے والا کھانا بلاشبہ بہت لذیذ تھا۔ وہاں  
پونے اور مینو دونوں قسم کے ڈیزر کا بندوبست تھا۔ میں نے  
مینو والے پورشن کو ترجیح دی اور چند منتخب چیزیں منگوالیں  
انتہائی ”محفوظ“ تھیں۔

کھانے کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ ایک مضمحل  
تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ہم سے چار  
میزیں چھوڑ کر ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہال میں چونکہ  
برائے نام پرسن تھا اس لیے بھی میں نے اس کے تازے کو نوٹ  
کر لیا۔ اس کا انداز خاصا مشکوک تھا۔ میں نے بھی نظر بچا

چیکے چیکے... دیکھنا شروع کر دیا۔  
 ۱۔ مہر چالیس سے چاندنی۔ نیلی آنکھیں، ہلکی سنہری موچیں، اس کے بال بھی گولڈن ہی تھے۔ اس نے بڑی بڑی تکیں چھوڑ رکھی تھیں اور دائیں گال پر گہرے سمورے رنگ کا ایک مساکھا جو سمورے دانے کے برابر ہوگا۔ وہ ایک مضبوط کاک کا مالک تھا تاہم اس کے ساتھ موجودگی کی صحت کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ وہ کافی دلوں کے قاتل سے یا پھر کسی پیچیدہ و پوشیدہ انسانی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ چندہ سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔  
 جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شخص وقفہ وقفہ سے خاص طور پر ہمیں ہی دیکھ رہا ہے تو میں نے راکیل کی توجہ اس جانب مبذول کرانی "پتا نہیں ہے شخص ہمیں کیوں واقف کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔  
 مذکورہ شخص راکیل کی عقبی سمت میں تھا۔ اس نے گردن موڑ کے پیچھے دیکھا پھر میری طرف منہ پھیرتے ہوئے بولی "اوہ! یہ تو ڈوگ ٹینگ ہے!"  
 "کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟" میں نے کھانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔  
 اس نے اثبات میں گردن ہلاتی اور بتاتے گئی "ایک میں کیا اسے تو سارا الاسکا جانتا ہے۔ ڈوگ ٹینگ (DOUG GEETING) یہاں کا معروف موٹیفنر اور کلیشیر پائلٹ ہے۔"  
 "مگر یہ کہہ پتا نہیں کیوں تاک رہا ہے؟"  
 "دیکھتے دو، ہمارا کیا جاتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی "یہ تو ہمارے لیے آنر کی بات ہے کہ ایک پیش پیرو بڑی دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہا ہے ورنہ لوگ تو اس کے آٹو گراف کے لیے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ اس سے ساتھ وقت گزارنا تو اور بھی اعزاز کی بات ہے۔"  
 "کیا یہ پیش پیرو اسی قسم کی لڑکیوں کو اعزاز بخشتا ہے؟" میں نے راکیل کے عصب میں دیکھتے ہوئے کہا۔  
 وہ چونکی "کیا مطلب۔ میں سمجھ نہیں سکتی تم کتنا لپیٹا رہے ہو۔"  
 میں نے کہا "تمہارا یہ بہرہ کوہ پتا جس لڑکی کے ساتھ ڈنفر بار رہا ہے وہ مجھے تو برسوں کی بناظر نظر آتی ہے یا پھر لگتا ہے اس نے کافی عرصہ صوبالیہ کے قلعہ زدہ علاقے میں گزارا ہو۔ دیکھو اس کی آنکھیں اور گال کی طرح اندر کو دھسنے ہوئے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "مجھے تو یہ خاصی نو عمر بھی لگتی ہے۔ میرے خیال میں چندہ

سال سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔"  
 "میں تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتی۔" وہ جھوٹے لہجے میں بولی "میرا اندازہ ہے یہ لڑکی انیس سے آٹھ نہیں ہوگی البتہ اس کی صحت واقعی قابل غور اور تشریش تاک ہے!"  
 "پتا نہیں تم کس بنا پر اتنا بڑا اندازہ قائم رہی ہو؟" میں نے سوچنے والے انداز میں کہا۔  
 وہ بولی "امریکا کی ہر اسٹیٹ میں بلوغت کی عمر الگ الگ ہے جو سولہ سال سے انیس تک جاتی ہے۔ گرم اسٹیٹ میں جلدی اور سرد میں دیر سے بلوغت کا سر تقطیع جاری کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اس لڑکی کو انیس سے کم کا نہیں ہونا چاہیے۔ سن بلوغت کو پیچھے بغیر قانون ڈسٹنگ کی اجازت نہیں۔"  
 وہ پتا نہیں، مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا اس کو پتا کہ تاک جھانکی اس دوران میں مسلسل جاری رہی تھی۔ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں راکیل سے کہا۔  
 "بہر حال تمہارا یہ موٹیفنر ذوق کے معاملے میں بہت ہی بد ذوق واقع ہو ہے۔"  
 راکیل نے میری رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ہم ڈاز سے فارغ ہونے کے بعد وہاں قمری ناٹ قمری یعنی کمر انبر تین سو تین میں آ گئے۔  
 ہم نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون سیٹ بیڈ کے کنارے کے ایک چھوٹی سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں راکیل کو اشارہ کیا وہ میرے اشارے کی تائید میں ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔  
 اس وقت الاسکا کے وقت کے مطابق رات کے ٹھیک دس بج رہے تھے۔ قوی امکان اس بات کا تھا کہ وہ کال ڈاکٹر مونگ کی ہوگی۔  
 میں نے اندازہ لگایا راکیل نے پہلے ہوئی لی ٹیلی فون آپریٹر سے بات کی تھی اس کے بعد ہی آپریٹر نے کال ختم کر دی۔ راکیل نے اشارے سے مجھے بتایا کہ دوسری جانب ڈاکٹر مونگ ہے پھر وہ فون سیٹ کے مختلف بٹن کے ساتھ جھنجھرائی کرنے لگی۔  
 اس فون سیٹ میں بائیک اور اسٹیکر کی سہولت موجود تھی۔ راکیل نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا اور ہم تینوں صولی اعتبار سے ایک دوسرے کے رو بہ رو ہو گئے۔ راکیل نے ڈاکٹر مونگ کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔ وہی علیک سلیک کے بعد

ڈاکٹر مونگ راکیل سے ہاتھ کرنے لگا۔  
 "خیر، تم محسوس کیا کہ راکیل سے کوئی خاص یا اہم بات نہیں کر رہا تھا۔ اس گفتگو کا پہلا باب یہ تھا کہ راکیل میرے ساتھ بہرہ ور ریل روڈ ایجنٹ بن چکے گی۔ پھر وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے کر ایجنٹ سے سبیل کی جانب پرواز کر جائے گا۔ راکیل کی آئندہ سرگرمیوں اور مصروفیات کے بارے میں ادھر سبیل ہی میں فیصلہ کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔"  
 راکیل کے بعد ڈاکٹر مونگ ریفرشے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے صرف اس کا نام سن کر اپنے دل میں اس کے لیے جو احرام محسوس کیا تھا وہ تاثر غلط نہیں تھا۔ وہ اپنی آزاد اور بات چیت سے بھی بہت مجھا ہوا ایک تجربہ کار اور دردمند ایجنٹ محسوس لگتا تھا۔ ایک سرد گرم چشیدہ انسان!  
 وہی "بیلو ہائے" کے بعد میں فوراً اپنے مقصد کی طرف آ گیا "ڈاکٹر مونگ! یہ تو مجھے معلوم ہو چکا مجھے دیکھنے سے ایجنٹ اور ایجنٹ سے سبیل پہنچایا جانے والا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ آپ لوگ مجھ پر اس قدر مہربانی کیوں کرتے؟ اور سب سے اہم پوچھنا ہے کہ آخر آپ لوگ ہیں کون؟"  
 "فی الحال تم اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو اور یقین کر لو کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔" وہ تبصرہ ہوئے تاثر انگیز لہجے میں بولا "تمہاری خیر خواہی اور تم پر مہربانی کا سبب یہ ہے کہ ہمارا وطن..... بلکہ ہمارے وطن مشترک ہیں۔ چالاک اور عیار بیودوں کا ایک شاطر ٹولا جو بدھ نسل کندی عبادت گاہ کو دھوا لاکر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ ان باجے نایاب پتھروں تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہے ہیں جنہیں حاصل کرنے کے بعد وہ پوری دنیا پر حکمرانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دہلی موٹے ہاتھ ان پتھروں کی افادیت اور روحانی قدر قیمت سے پوری طرح آگاہ ہے اور....."  
 وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اور ہم سب نے لکھ بیودوں کی اس ناپاک سازش کو کامیاب نہیں ہونے دینا۔ زمین کا راز اسی کے پیچھے میں دفن پر ہوتا ہے۔"  
 "کیا تمہارا تعلق بدھ مت سے ہے؟" میں نے احرام بھرے لہجے میں دریافت کیا۔  
 اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا "میں بھی تمہاری طرح شاذ و نادر تکمیل کا فارغ تحصیل ہوں لیکن یہ پیچھے چھپیں سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو عملی زندگی گزار رہا ہوں۔"  
 اس کی بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے

بھان فیر لہجے میں پوچھا "تمہیں یہ کس نے بتایا کہ میں نے شاذ و نادر تکمیل ایسی عظیم الشان تربیت گاہ سے ٹریننگ حاصل کی ہے؟"  
 "میرے بیوں نے۔" وہ مسخری لہجے میں بولا "میں اس کے علاوہ بھی تمہارے بارے میں بہت سی باتیں جانتا ہوں۔"  
 "کیا بیوں سے تمہاری مراد..... اس دور کا دلائی لاما ہے؟" میں نے پیچھے لہجے میں سوال کیا۔  
 "دلائی لاما کے بارے میں زبان کھولنے کی مجھے اجازت ہے اور نہ ہی میں اپنے انداز اس گفتار کی سکت رکھتا ہوں۔" ڈاکٹر مونگ ریفرشے احرام سے بھرپور لہجے میں بولا "میرے بڑے ادھر سبیل میں ہیں۔ میں جنہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ ہائی کی باتیں جنہیں میرے بڑے بتائیں گے۔"  
 "تو پھر تمہارے سبیل والے بڑے دلائی لاما سے رابطے میں ہوں گے؟"  
 بدھ نسل کندی عبادت گاہ میں دھن (سائل) کے باب نے مجھے دلائی لاما کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ چوٹی نے یہاں تک کہا تھا کہ دلائی لاما نے مجھ پر اتنا اعتماد ظاہر کیا تھا..... اور اب یہ لوگ میرے عقائدوں سے ایک صیہونی سازش کو ناکام بنانا چاہتے تھے اور وہ سازش بدھ نسل کندی عبادت گاہ سے متعلق تھی لہذا لالچالہ بار بار میرا دھیان دلائی لاما کی طرف چلا جاتا تھا۔  
 ڈاکٹر مونگ ریفرشے نے ایک مرتبہ پھر حضرت خواہانہ انداز اختیار کیا اور بولا "اس بارے میں میں کچھ نہیں جانتا کہ میرے بیوں کا کوئی تعلق دلائی لاما سے یا نہیں!"  
 میں نے اس سلسلے میں زیادہ کرپہ مناسب نہ سمجھی اور موضوع بدلتے ہوئے کہا "ڈاکٹر مونگ! کیا ٹیلی فون پر اپنی اہم گفتگو کرنا مناسب ہے؟"  
 "عام حالات میں تو قطعاً مناسب نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "لیکن میں نے اپنی حکمت عملی سے عام حالات کو اس وقت خاص بنایا ہوا ہے۔ لی یا بیک کی طرح جولی بھی میری وقار دار ہے لہذا اگر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے علاوہ کوئی بھی غیر متعلق شخص یہ گفتگو نہیں سن رہا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "جولی سے میری مراد اس ہوئی کی ٹیلی فون آپریٹر ہے۔"  
 میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا۔ "ڈاکٹر مونگ! اب تک آپ لوگوں کا جو رویہ سامنے آیا ہے بدھ انتہائی دوستانہ اور غلط ہے۔" میں نے نظر اٹھا کر مسخری تیرنگاہ

کا جذبہ اہمارا۔ مجھے یہ قطعاً اچھا نہیں لگا تھا کہ وہ میری ساحل کے لیے "ہماری دھن" جیسے لفظ استعمال کرے۔ میں نے ترش آمیز لہجے میں کہا۔  
"تم میری ساحلی کو میری مرضی کے بغیر کیسے کہیں لے جاسکتے ہو؟"

"اس لیے لے جاسکتا ہوں کہ وہ تمہاری ساحلی تو بہت بعد میں بنی ہے۔ ہماری تو وہ شروع ہی سے ہے۔" اس کا انداز اچانک سرسرایوں ایسا ہو گیا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے بھڑے بازو سے مخاطب ہوں یا پھر کوئی فتنہ پرور سالانہ میری اوقات یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"بدھ نخل کنڈ کی عبادت گاہ والا معاملہ نہایت ہی اہم ہے۔ ہم دھن کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں کر سکتے۔ رہی موٹے ہاتھن کسی بھی طرح اسے دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور اس کے اندر سے وہ راز باہر لاسکتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ کافی عرصے سے بے چین ہے۔۔۔۔۔ پانچ مجوزہ روزگار اور مفاد خیزوں کا حصول۔۔۔۔۔  
ڈاکٹر امیر اللہ روبری سیفائز نو پاز۔"

یہ سن کر مجھے دلی اطمینان ہوا تھا کہ میری ساحل بہ خیر و عافیت صحتی و درندہ ایسی تک تو اس کا کوئی سراغ ہی ہاتھ نہیں آ رہا تھا مگر ڈاکٹر موگ ریٹوٹے جس طرح ساحل پر اپنا حق جتلا رہا تھا وہ دل جلانے والی باتیں تھیں۔ اس کے کلام کی قطعیت بتاتی تھی وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کبھی گزرے گا۔ اس وقت ساحل ان لوگوں کے قبضے میں تھی۔ میری ذرا سی جذبہ باتیت بنے بنائے کھیل کو بگاڑ سکتی تھی۔ ڈاکٹر واضح طور پر بتا چکا تھا کہ ڈیلا آئر لائنز کا طیارہ کل شام میں ساحل کو فیر بینکس سے اٹکرتی پہنچانے والا تھا۔ ہم بھی ریل روڈ (ٹرین) کے ذریعے دینالی سے اٹکرتی پہنچائے جانے والے تھے پھر پروگرام کے مطابق "ڈاکٹر موگ" ہمیں اپنے ساتھ میٹل لے جانے والا تھا۔ ڈاکٹر موگ سے "اتفاق" میں ایک فائدہ تو یہ حال تھا اور وہ یہ کہ کل شام اٹکرتی میں میں ساحل کے ساتھ ہوتا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کے بارے میں ساحل سے ملنے کے بعد ہی سوچوں گا۔ فی الحال ڈاکٹر موگ کے ساتھ دینے میں مجھے اپنا بھلا نظر آ رہا تھا۔ ایک حتی فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے ڈاکٹر موگ کو گھسنے کی کوشش کی۔ میرا انداز ایسا تھا کہ وہ میرے ارادے تک نہ پہنچ سکے۔

"اگر میں آپ لوگوں سے مطالبہ کروں کہ ساحل کو

سے اپنے سامنے بیٹھی راکیل کو دیکھا اور کہا "لیکن کیا ضروری ہے کہ میں آپ لوگوں کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھوں؟ مجھے جو کچھ کرنا ہوگا میں اپنے طور پر کروں۔۔۔۔۔ اور آپ لوگ اپنا کام کریں!"

راکیل نے نگلی آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اسے میری بات پسند نہیں آئی تھی۔ اسی لمحے ڈاکٹر موگ کی مخصوص تاثر بھری آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

"مسٹر ڈسلا! مجھے اوپر سے خصوصی ہدایت ہے کہ میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی نہ کروں۔" وہ احتیاط کے پیش نظر مجھے دھندلے کے بجائے ڈسلا کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا "تم اپنی مرضی اور عمل کے لیے بالکل آزاد ہو لیکن یہ بات تمہیں بھی معلوم ہوگی کہ جب مقصد ایک ہو تو پھر مل کر کام کرنے سے جلدی کامیابی ہو جاتی ہے۔ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے! بالفرض میں تنہا اس مشن کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "ایسی صورت میں تم کیا کہو گے۔۔۔۔۔ مجھے فوری طور پر کیا کرنا ہوگا؟ اس کے بعد تم کیا کرو گے؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی غرض سے تشدد سوالات کر ڈالے۔

"ایسی صورت میں" میں تمہیں تمہاری مرضی پر آزاد چھوڑ دوں گا۔" وہ ترتیب وار میرے سوالات کے جواب دیتے ہوئے بولا "تم اس وقت جہاں بھی جانا چاہو جاسکتے ہو۔ کوئی تمہیں روکے گا اور نہ ہی کسی قسم کی ٹھکرانی کی جائے گی۔۔۔۔۔ اور جہاں میرے کچھ کرنے کا سوال ہے تو میں اپنے حصے کے کام کو پروگرام کے مطابق آگے بڑھا دوں گا۔ دھن ریمینڈ کے ساتھ بہ ضاعت فیر بینکس پہنچ چکی ہے۔ اسے فیر بینکس سے ڈیلا آئر لائنز کے ذریعے کل شام میرے پاس اٹکرتی پہنچا دیا جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ اسی جہی میٹل لے جانے والا تھا لیکن اب۔۔۔۔۔!"

اس کے انکشاف نے میرے اندر ایسا ہیجان جگادیا تھا کہ میں اس کی بات مکمل ہونے کا بھی انتظار نہ کر سکا اور اضطرابی لہجے میں کہا "تم میری ساحل کی بات کر رہے ہوتے؟"

"میں ہماری دھن کی بات کر رہا ہوں۔ وہ جتنی لڑکی جو تھوچی اور سمجھ جانی کی اٹکوتی بنی ہے۔" ڈاکٹر موگ نے تمکیر لہجے میں کہا "یہ ایک اتفاق ہے کہ وہ تمہاری ساحل بھی ہے۔ بہر حال میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر موگ کی اس وضاحت نے میرے اندر حسد

وہ بولا "کنکا پڑی ہیں۔ ویکنور سے تم لوگ ملائیشیا ائر لائنز میں بیٹھو گے اور تائے بی سے مجھے سپینک کالمیارہ جہیں نیماں پہنچائے گا۔" ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے خرگشوار کے لیے اضافہ کیا "یہ ساری باتیں ایک دوست سمجھ کر بتا رہا ہوں۔ مجھے یقین تھا..... کیونکہ بدوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تم اپنی جانب بڑے ہوئے دوستی کے ہمارے ہاتھ کو بڑی مضبوطی سے تھام لو گے۔ تم ہماری دوستی پر ہمیشہ غرور

ڈاکٹر مونک ریفرنس نے کہا "ٹرن کی بجگے  
بارے میں تمہیں بتایا جا چکا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر تمہیں ریفرنس  
کر لیا جائے گا۔ تمہارے ٹکٹ نمبر اور ایڈریس نمبر میرے بارے  
میں ہے۔ میں تاہم تمہیں ہوٹل پہنچانے سے پہلے ایک کام کرنا

رائیل کی آنکھیں بند تھیں اور سانس کی آمد و رفت سے  
سوس رہا تھا وہ اس وقت گہری نیند میں تھی۔ رات کو سوتے  
وقت ہم نے اس جہازی سائنٹسٹ کے دو کتارے پکڑ لیے  
تھے۔ لیٹنے کے بعد ہمارے درمیان کم از کم پچھنٹ کا فاصلہ

رابطہ ہونے پر میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا ”روم نمبر قہری  
ناٹ قہری کا اڑکنڈیشنر کام نہیں کر رہا۔ پلیز اسے جیک



کر لیں۔“

”ٹھیک ہے میں دکھاتی ہوں۔“ حلقہ شب سے مجھے جواب موصول ہوا۔

میں رہیہ دور رکھ کر بیڈ کے کنارے پر تک گیا اور کسی ماہر ملکیک کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد دروازے پر بڑی تشقیش دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

میں کسی میل ملکیک کی توقع کر رہا تھا لیکن اس وقت میری نگاہ کے سامنے ایک باردوری دل کش حسینہ کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہینڈی کٹ تھی جس میں بھینا مختلف نوعیت کے پتلی کے اوزار ہوں گے۔

مجھ سے نگاہ ہٹے ہی وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی ”آپ کے اڑکنڈ بھنر میں کوئی برائلم ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے دخول کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ کمرے کے اندر پہنچی ایک کھوجتی ہوئی نظر سونی ہوئی راکیل پر ڈالی اور بڑوانے والے انداز میں یہ جملہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے اڑکنڈ بھنر کی جانب بڑھ گئی۔ ”اڑکنڈ بھنر تو واقعی کام نہیں کر رہا!“

میں اس حسین ملکیک کے پیچھے اڑکنڈ بھنر کے پاس پہنچ گیا۔ اس دوران میں وہ اڑکنڈ بھنر پر تھوڑی طبع آزمائی کر چکی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑے ہی اس نے ایک ناب کو مٹھایا اور بڑے غریبہ لہجے میں بولی۔

”لوہیہ آن ہو گیا!“

واقعی اب اڑکنڈ بھنر کام کرنے لگا تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ”لگتا ہے تمہاری انگلیوں میں کوئی جادو ہے۔ تم نے تو چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کر دیا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا ”ویسے اسے کیا ہو گیا تھا؟“

وہ اپنی ٹول کٹ کو اٹھانے کے بعد بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ میں بڑا پڑاسرار اور معنی خیز سوال تھا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ الٹا مجھے ہی استدعا یہ نظر سے گھور رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے کہا۔

”دیری سپل۔۔۔۔۔ اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔“

”کیا مطلب۔“ میں چونک اٹھا ”اگر کچھ نہیں ہوا تھا تو پھر بند کیسے ہو گیا؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ”یہ کس وقت بند ہوا تھا؟“

”میں صبح وقت تو نہیں بتا سکا۔ رات ہم سوئے تھے تو یہ آن ہی تھا۔“ میں نے کہا ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میری آنکھ کھلی

تو یہ بند پڑا تھا۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔ بیٹھے بٹھائے اس میں کون سی خرابی پیدا ہوگئی تھی؟“

وہ چند لمحے سنجیدہ اور ٹٹولنے والے انداز میں مجھے جتنی رہی۔ اس کی نگاہ میں بے یقینی کا تاثر پایا جاتا تھا۔ جیسے اسے میرے بتانے کا اعتبار نہ ہو۔ میں اس کے اس رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بڑی سادگی سے بولی ”اس میں آن آف کی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ آپ کا اڑکنڈ بھنر آف تھا“ میں نے صرف اسے آن کیا ہے۔۔۔۔۔ اور دیکھ لو یہ آن ہو گیا ہے۔ سپل از دیٹ!“

لیڈی ملکیک کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ اڑکنڈ بھنر کس نے آف کیا تھا۔ اس کمرے میں صرف میں اور راکیل ہی تھے۔ میں اپنے بارے میں تو دعوے سے کہہ سکتا تھا اڑکنڈ بھنر میں نے آف نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اور اگر راکیل نے آف کیا تھا تو پھر یہ سوال اٹھنا تھا۔۔۔۔۔ کیوں؟

اب کمرے کا درجہ حرارت بڑی حد تک معتدل ہو چکا تھا۔ میں ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف ٹپکتے ہوئے راکیل اور اڑکنڈ بھنر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اڑکنڈ بھنر بڑی سبک خرابی سے چل رہا تھا اور راکیل بڑی بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ اس حالت میں وہ بڑی معصوم دکھائی دیتی تھی۔۔۔۔۔ کیا وہ واقعی ایسی ہی معصوم اور بے خبر تھی۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ اڑکنڈ بھنر راکیل نے آف کیا تھا۔ اس کی خطرناک شرارت کی تہ میں پہنچ جانے کے بعد مجھے یقین ہو چلا کہ وہ اس وقت سو نہیں رہی تھی بلکہ سونے کی بھرپور اداکاری کر رہی تھی۔

میں اس کے پاس رک کر چند لمحے اسے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر ایک میٹ کے طور پر میں نے نہایت ہی دھیمی آواز میں اسے پکارا ”راکیل۔۔۔۔۔ گار شا۔۔۔۔۔“

یہ محل میں نے دو تین مرتبہ دہرایا لیکن وہ اس سے مس نہ ہوئی۔ گویا اپنی اداکاری سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ میں نے اس کا ”یقین“ کر لیا۔ اس یقین کرنے میں میرا کیا جاتا تھا۔ پردہ داری اور پردہ درکی میں فرق تو قائم رہنا چاہیے نا!

میں خاموشی سے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس ٹیبل کے ایک کونے میں ایک خوبصورت مستطیل کاک رکھا تھا۔ مذکورہ کاک کے دو خانے تھے یا سمجھے۔ اوپر والا حصہ گول تھا اور اس حصے کے اندر ایک نہایت ہی گھڑی نصب تھی جب کہ نیچے والا خانہ مستطیل تھا اور اگلی

خانے میں ایک مخصوص میکانیک فیڈ قائم کیا گیا تھا جس کے اندر تین میٹلک رنگ تین مختلف ایکسیز (AXIS) میں مسلسل گھوم رہی تھیں۔ کہنے کو یہ ایک ڈیکوریشن نہیں تھی تاہم ایکسپریڈ والی ایکسیز زیادہ ایکسیز میں لگا کر گھومتی ہوئی وہ رنگز بڑا مہو بی تاثیر پیدا کر رہی تھیں۔ دیکھنے والے آنکھ اس سحر پر جم کر رہ جاتی تھی۔ یہ فریم آف ریفرنس کی بڑی عمدہ جادوگری تھی۔

میں چند لمحات تک اس کلاک کی چٹکاری دیکھ رہا تھا کہ کڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دبیز پردہ ہٹایا تو سامنے سلائیڈنگ وڈو موجود تھی۔ اس کڑکی کے اس پار دریائے نیپا ناسوایا ہوا تھا۔ مٹی چدرہ ڈگری ننگی کر کے آس پاس درجہ حرارت ہو کر دریا کا بہنا سمجھ میں نہیں آتا لہذا "نیپا" کا "سویا ہونا" ہی مناسب الفاظ ہیں۔ برف کی موٹی دھ کے نیچے اگر پانی کی کوئی لکیر چمک رہی ہوتی یہ بات دوسری ہے۔

میں نے گرین لینڈ اور انڈیا کلاک میں مٹائی جانے والی دستاویزی فلموں میں ایسے مناظر دیکھے تھے جب بیگمناں اور برفانی ریچھ شکار کی تلاش میں برف کی دبیز دھ کو توڑ کر نیچے اتر جاتے ہیں۔ رزق کا حصول بڑا ہی نازک مسئلہ ہے اور تاہم کھن گھنٹن بنا کر رکھ دیتا ہے۔

میں کچھ دیر بعد اس سلائیڈنگ وڈو سے ہٹا تو ذہن میں ایک چھوٹی سی کڑکی کل چکی تھی۔ یہ کڑکی مجھے ساحل تک پہنچا سکتی تھی۔ مجھے حیرت اور انہوش ہوا کہ ابھی تک اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں کیا تھا۔ رہی موٹے ہاتھن کی قید میں میں نے بڑے خشوع و خضوع سے ساحل کا تصور کیا تھا اور میرے خیال کی قوت نے چند سیکنڈ کے لیے مجھے ساحل تک پہنچا دیا تھا۔ یہ درحقیقت مینٹل گینڈ (PINEAL GLAND) کی کارفرمائی تھی جو انسانی کھوپڑی کے سامنے والے حصے میں پیشانی کے بالکل عقب میں واقع ہوتا ہے۔ بعض ماہر روایات اسے تیسری آنکھ یا تیسری آنکھ بھی کہتے ہیں۔ اگر یہ گینڈ انسان کی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے تو پھر اس کی آنکھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں رہتا۔ یہ آپ کے خیالات آپ کی سوچ اور آپ کی خواہش کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے۔ بس مینٹل گینڈ کو بیدار کرنے کے بعد کام میں لانے کی بات ہے جس کے لیے اورنگز توجہ پر مبنی کڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں ایک طویل عرصے سے پوگا اور جی کی ایڈوانس مشین کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس وقت میرا مینٹل گینڈ متحرک ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ تو مجھے اسی سنگلاخ کوٹھری میں ہوا تھا۔ اور اس نے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ میرا تجربہ ابھی کچا تھا

کیونکہ تصور نوٹنے ہی میں نے ساحل تک رسائی حاصل کرنے کی دودھ مارہ کوشش کی تھی اور مجھے ناکامی ہوئی تھی۔

میں کام کو بار بار کرنے سے اس میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر میں مینٹل گینڈ کی کارکردگی کو بار بار آزماتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس کے استعمال پر قدرت حاصل کر لیتا۔ یہ بیدار ہو چکا تھا۔ اب مسلسل پریکٹس کی ضرورت تھی اور..... اس سلسلے میں پوگا دہی کی ایڈوانس مشین بہت مفید اور مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔

اس وقت میرے دل میں شدید خواہش چلی کہ ابھی ساحل کا تصور قائم کروں اور دیکھوں کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ ڈاکٹر موگ ریلوے مجھے بتا چکا تھا کہ ساحل فیر پنکس میں تھی اور بالکل خیر و عافیت سے تھی لیکن میں اپنے سینے میں ساحل کے لیے جو جذبات رکھتا تھا وہ سالہا ڈاکٹر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں نے "سویٹینڈ" کی ادکاری میں میری صرف راکل ایڈر سن عرف "وٹی" پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی اور کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ "مٹی" کے تم دار مسائل سے دو چار انسان روزی کا رہتا ہے اور نہ ہی روٹی کا..... اور روٹی بھی ایسی کہ جو اپنے رچر میں رہتا پسند نہ کرتی ہو!

پھر حال برفانی ریچھ کی گرم مزاجی ادن سے تیار شدہ موٹے بلبل نے اس مختصر لباس حینہ کو ایک رچر میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہ تو ہی تاسکتی تھی کہ اب اسے مزید کی حرارت کی ضرورت تھی یا نہیں؟

میں کمرے کے کونے میں لوٹ پوچھ بنا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر موگ کے مطابق ساحل اس وقت فیر پنکس میں تھی جو دینیائی کے مین شمال میں واقع ہے اور میرا رخ اس وقت شمال ہی کی طرف تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چند گہری ہوا سانس لینے کے بعد اپنے تصور کو ساحل پر مرکوز کر دیا۔

میرے ذہن کے اسکرین پر اس وقت ساحل کا سراپا روشن تھا۔ اس کا ایک ایک نقش میرے دل پر نقش تھا میری روح میں بیوست تھا۔ میں اس صورت کو کس صورت بھلا سکتا تھا! اس وقت میری تمام توجہ اپنی باطنی آنکھ کی مینٹل گینڈ پر مرکوز تھی۔ چند لمحات کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساحل کا سراپا بگڑ رہا ہو۔ میں قدرے پریشان ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میری پریشانی دور ہو گئی۔

درحقیقت میرے تصور میں ساحل کا سراپا بگڑ نہیں تھا بلکہ سنور گیا تھا۔ یہ سب کچھ پانی کی سطح پر بننے والے عکس کے مانند ہوا تھا۔ اگر پانی میں ارتعاش پیدا ہو جائے تو سطح پر

اُبھرنے والا عکس بھی لہرانے اور ڈمگانے لگتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی غمر جاتا ہے۔ ساحل کا سراپا بھی میرے تصور میں لچائی طور پر زبردست پھر پھر غمر گیا..... اور یہ غمرنا ایک لمحے سے زیادہ کا نہیں تھا کیونکہ غمر او کے فوراً بعد ہی اس تصور کی منظر میں تحریک پیدا ہو گئی تھی..... میں ساحل کے ماحول میں پھنسی گیا تھا۔

وہ کسی آرام دہ نشست کی پشت سے لٹک لگائے آہٹھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کا ماحول بڑا پرسکون اور روشن روشن تھا۔ میں اس ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ یہ جائزہ تصور کی نگاہ کا کمال تھا۔ وہ تصور جس کی پرداز نے مجھے ساحل تک پہنچنے کا راستہ دکھایا تھا۔ میں اسی تصور کی چھٹی تھی جسے ساحل کے ارد گرد کھینچنے لگا اور اسی وقت مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

ساحل کے آس پاس موجود خواتین و حضرات بھی اسی کی روح اپنی آرام دہ نشوونما پر بیٹھے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ لگی کہ وہ کسی ہوائی جہاز کا اعدنی ماحول تھا..... تو کیا ساحل اس وقت کی طیارے میں ستر رہی تھی؟

یہ سوال اتنا سسکی خیز اور تھکناکیز تھا کہ اس نے میرے سور کی چوٹیں ہلا کر رکھ دیں۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں ل وقت گھرے مرا تھے کی کیفیت میں ہوں۔ ساحل کا کسی ہائی جہاز میں ستر کرنا اتنا بڑا انکشاف تھا کہ میں اپنی حرکات و لمحات پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول لی۔

آنکھ کھلتے ہی میں بار بار لاج کے کراہنے پر تھری ٹاٹ قہری ماحاضر ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا میرا پورا وجود پسینے میں یا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کیفیت پر غور و فکر کرنے کے بجائے بارہ آنکھیں بند کر لیں اور ساحل کو کھوجنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے اعزازہ ہو گیا "اب اس کوشش کا کوئی فائدہ نا۔ میں نے تھک ہار کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے اندر یہ جونی صلاحیت اجاگر ہوئی تھی اس میں اکوئی کی یا کزوری موجود تھی یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے اس حیرت سے بھرپور استفادہ کرنا آتا ہو..... میں اس کے مال کا مناسب طریقہ کار نہ جانتا ہوں۔ بہر حال یہ ایک نئی ٹی اور بھی کئی چیز کھینچنے اور اسے استعمال کرنے کے لیے اذیت دہکار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کسی ماہر روایت ضرور دکھانا چاہیے تھا۔

ساحل کے حالیہ تصور نے میرے اندرون کو بڑی طرح گھن کر دیا تھا۔ وہ اگر کسی ہوائی جہاز پر سوار تھی تو پھر یہ مانعہ ابھرتا تھا کہ کہاں جا رہی تھی یا کہاں سے آ رہی تھی؟

ڈاکٹر موگ ریلوے کے مطابق وہ اس وقت فیر پنکس میں تھی اور کل شام کو اسے ہٹکر نہ پہنچنا تھا۔ ڈاکٹر موگ نے بھی بتا چکا تھا وہ ڈیلیٹا از لائنز کے طیارے سے ستر کر کے زمین کل شام میں ہوا بھی چدرہ مولہ کھینچے ہوتی تھے جب کہ فیر پنکس سے ہٹکر تاج آنے کے لیے کسی بھی طور ڈھانی ٹین کھینچنے سے زیادہ وقت درکار نہیں تھا۔

ساحل والے معاملے نے نہ صرف یہ کہ مجھے ذہنی طور پر بڑی طرح الجھا دیا بلکہ میں گہری تشویش میں بھی مبتلا ہو گیا۔ اگر ساحل رات کے اس آخری پھر فیر پنکس سے ہٹکر تاج چار ہی تھی تو پھر ڈاکٹر موگ نے مجھ سے جموت بولا؟ اور اگر موگ نے دروغ کوئی سے کام نہیں لیا اور واقعی ساحل کل شام ہی کو ہٹکر نہ پہنچنے والی تھی تو پھر اس وقت وہ کی طیارے میں سوار ہو کر کہاں جا رہی تھی؟ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میرے تصور نے مجھے دھوکا دیا ہو۔

میری ذہنی الجھن کو صرف ایک ہی شخص دور کر سکتا تھا اور وہ شخص تھا ڈاکٹر موگ ریلوے! یہ بھی ہو سکتا تھا پھر وگرام میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہو اور ساحل کو واقعی اسی وقت ہٹکر نہ پہنچایا جا رہا ہو۔ میں ڈاکٹر موگ کو فون کر کے اس بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی پلٹا راکل سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا "تم کب آئی ہو؟"

وہ بڑی معنی خیز نظر سے سرتا ہوا میرا جائزہ لیتے ہوئے "بولی" تھوڑی دیر پہلے داش روم جانے کے لیے اچھی تھی۔ جنہیں اس کونے میں خاموش بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ شاید تم کوئی عبادت وغیرہ کر رہے تھے۔ میں نے سن رکھا ہے مسلمان نماز میں بہت زیادہ پڑھتے ہیں اور اکثر رات گئے عبادت بھی کرتے ہیں!"

وہ لباس کے خلاصے میں لمبوس میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے دھڑلے سے بات کر رہی تھی۔ اس بے خوف حینہ کا حوصلہ قابل دید اور قابلِ داد تھا۔ اگر میں اس کے حسن اور بہادری کی تعریف کرنے بیٹھ گیا تو اپنے مقصد سے دور ہو جاؤں گا۔ میرے پاس ان گنت سوال تھے جو اس موقع پر راکل سے پوچھے جاسکتے تھے۔ سب سے اہم اور نازک سوال تو یہی تھا کہ اس نے ان گنت پھر کو کیوں بند کیا تھا! اس حرکت سے اس کا مطلب کیا تھا لیکن میرا ذہن اس وقت ساحل والے معاملے میں الجھا ہوا تھا اس لیے میں راکل کو پیچھے کر کوئی نیا کاڈ نہیں کھولنا چاہتا تھا لہذا اس کے جواب میں

نہایت ہی سادگی سے کہا۔

”تم نے مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ سن اور دیکھ رکھا ہے اسے فی الحال اپنے ذہن سے نکال دو۔ تمہاری آسانی کے لیے اتنا بتا دیتا ہوں کہ میں ادھر کونے میں بیٹھا کوئی عبادت نہیں بلکہ یوگا کی ایک مشق کر رہا تھا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”رات ابھی باقی ہے۔ خاموشی بے ہتیر جا کر سو جاؤ۔ اگر تم اس حالت میں زیادہ دیر تک کھل سے دور رہیں تو جھپٹیں غنڈ لگ جائے گی۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے وجود پر چسپاں لباس کے ٹریڈر کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے عجیب سی نظر سے انگریزیشنر کو دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی ”کیا جھپٹیں غنڈ نہیں لگتی؟“

”میرے سینے میں جو آتش فشاں دھک رہا ہے اس کی تپش ہر غنڈ کا احساس ملادیتی ہے۔“ میں نے تمکیر لہجے میں کہا ”تم اس سلسلے میں کلمہ مند نہ ہو۔“

”بعض اوقات تم بڑی مشکل باتیں کرنے لگتے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کے لیے ذہن کو تھکانا نہیں چاہیے۔

”کیا مطلب؟“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے محکور نے لگی۔

میں نے کہا ”مطلب بہت واضح ہے۔ ایسی باتوں پر سوچنے سے ذہن الجھتا ہے اور الجھے ہوئے ذہن سے نیند کو سوں دور بھاگتی ہے جب کہ جھپٹیں اس وقت برافانی ریجھ کی ادن سے تیار کردہ کھل میں دھک کر سوتا ہے۔“

وہ ایک آنکھ دبا کر بولی ”اور جھپٹیں تو کھل میں نہیں دیکھا تا؟“

”مجھے کھل سے بہت ڈر لگتا ہے!“ میں نے یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کھل سے ڈر..... وہ کیوں؟“

”کیا تم نے کھل اور انسان کی کہانی نہیں سن رکھی؟“

”نہیں تو۔ سناؤ کیا کہانی ہے؟“ وہ اچانک جھلجھلی۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے وہ کہانی سنا دی جس میں ایک انسان شدید سردی سے بچاؤ کی خاطر ایک سیاہ ریجھ کو کھل سمجھ کر اوڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر نتیجے کے طور پر لوہیت یہاں پہنچ جاتی ہے کہ وہ تو کھل کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن

کھل اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا!

کہانی سن کر رامکھل کی ہنسی کھل گئی بڑے کھلے ڈالے

انہ میں بولی ”میں نہیں جانتی کہانی والے سیاہ ریجھ کا تعلق

دنیا کے کس خٹلے سے تھا! البتہ الاسکا کا برافانی سفید ریجھ ذرا مختلف مزاج کا ذائقہ ہوا ہے۔ اگر کوئی اسے اوڑھنے کی کوشش کرے تو یہ بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتا ہے اور تھوڑے بہ بعد خود ہی الگ ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی شکوہ شکایت کے! اس کے ایک ایک لفظ سے معنی آخری تک نکلتی تھی۔

”ہاں اس کا ایک ثبوت تو میری نظر سے بھی گزرا ہے۔

لگتا ہے تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو!“

”کون سا ثبوت؟“ وہ منٹوں والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”رات تم اس کھل کو اچھی طرح اوڑھ کر سوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ خود ہی تم سے الگ ہو گیا۔ بغیر کسی شکوہ شکایت کے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تا؟“

وہ جڑبڑہاتے ہوئے بولی ”میں سفید ریجھ کی بات کر رہی تھی!“

”بھئی یہ کھل بھی تو اسی ریجھ کی ادن سے بنا ہے تا!“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”سفید برافانی ریجھ کے اچھے خاصے خصال اس میں بھی آگئے ہوں گے؟“

”کیا یہ کوئی سنجیدہ مذاق ہے؟“

”جھپٹیں تمہاری بیان کی ہوئی ایک حقیقت ہے۔“

وہ سٹ پٹاتے ہوئے تیوروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

لا جوابی کے اثرات تھے!

میں نے کہا ”تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔ چہرے پر خاصی کشیدگی پائی جاتی ہے۔ اسے کشادگی میں بدلنے کے لیے جھپٹیں بھر پور نیند کی ضرورت ہے۔ میرا مشورہ ہے تم کھل اوڑھ کر..... میرا مطلب ہے اس شریف انفس برافانی سفید

ریجھ کو اوڑھ کر اطمینان سے سو جاؤ۔ بات کے اختتام پر میں نے بیڈ پر پڑے مذکورہ کھل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

رامکھل نے پوچھا ”کیا تمہارا سونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟“

”مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔“ میں نے کہا ”اس کے بعد ہی سوؤں گا۔“

”فون..... اس وقت!“ اس نے دیوار گیر کھاک برنگہ ڈالتے ہوئے کہا ”پونے تین بج رہے ہیں۔ اتنی رات کھٹے تم کس سے بات کرو گے؟“

میں اس وقت ہر صورت میں ڈاکٹر مونگ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا اور رامکھل کے علم میں لانے بغیر ڈاکٹر کوڈر..... نہیں تھا! البتہ میں نے اس سے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔

”میں ڈاکٹر مونگ کو فون کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہوتا نہ نظر سے مجھ دیکھنے لگی۔ اس نظر میں حیرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی شامل تھی "وہ جان! تم اس وقت ڈاکٹر مومک کو جگاؤ گے۔ کیا کوئی بہت ہی امیر جنسی میٹر ہے؟"

"ہاں! اسے امیر جنسی ہی سمجھو۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

کچھ مجھے بھی بتاؤ "دوسرے رات ہوئی آواز میں پوئی۔ مجھے یقین ہو گیا وہ آسانی سے نلنے والی نہیں تھی۔ اسے بہتر تک پہنچانے کے لیے خود بخود وہاں جانا ضروری تھا ورنہ رات کا باقی حصہ پوئی کھڑے کھڑے سوال و جواب میں گزار دیتی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں کھڑے ہوں۔

"ڈاکٹر مومک سے جو بھی بات ہوگی تمہارے سامنے ہی ہوگی لہذا اچھے بچوں کی طرح کھل میں بکھج جاؤ۔ میں ڈاکٹر مومک کا بغیر طوار ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی میں بیڈ کے اس کنارے کی جانب بڑھ گیا جہاں چھوٹی سی سائڈ ٹیبل پر نئی فون سیٹ رکھا تھا۔ جب تک میں آپریٹر سے ڈاکٹر مومک کو ملوانے کے لیے کہتا رہا کھل بیڈ کے دوسرے کنارے پر سوار ہو کر کھل اوڑھ چکی تھی۔

مجھے امید تھی آپریٹر رات کے آخری پہر ڈاکٹر مومک کو ڈسٹرب کرنے پر مجھیں پہنچیں ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نئی فون پر آپریٹر کی فون تو دکھائی نہیں دے رہی تھی تاہم الفاظ اور آواز میں بھی کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ڈاکٹر مومک آپریٹر کے لیے ایک پاس کی طرح تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا "ڈاکٹر مومک نے ہمارے سلسلے میں جولی ہی ایس ٹیلی فون آپریٹر کو خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں۔ کوئی سوال کیے بغیر آپریٹر فوراً ڈاکٹر کو ملوا دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انہیں میں مجھے ڈاکٹر ریوٹو کے "ہیلو" سنائی دی۔ اس کی آواز سے لگتا تھا وہ گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر!" میں نے کہا "میں ڈسٹرا بول رہا ہوں۔ بیچتا ہوں؟"

"بیچان گیا" اس کی گھبر آواز میری سماعت سے کھڑکی "خیریت تو ہے۔ اس وقت فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ سکتی؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا "ڈاکٹر! تم نے بتایا تھا میری ساسی اس وقت فیر پینکس میں ہے۔ کیا وہ اپنی فیر پینکس میں ہے؟"

"ہاں ہاں مگر کیا تم نے یہی سوال کرنے کے لیے مجھے

اس وقت فون کیا ہے؟" ڈاکٹر مومک کی آواز سے الجھ جھکتی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا جواب دیے بغیر سوال داغ دیا "اور اس پر فوراً م میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ میری ساسی کل شام میں تمہارے پاس پہنچے گی؟"

"فی الحال تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔" ڈاکٹر مومک نے نہایت ہی غصہ سے ہونے لگے میں کہا "لیکن تمہاری آواز اور انداز سے لگتا ہے کوئی بڑی کڑبڑ ہو چکی ہے یا پھر... نے والی ہے۔" ایک لمبے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا "مسٹر ڈسٹرا! آخر بات کیا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

میں نے کہا "میرے خیال میں میری ساسی اس وقت کسی ہوائی جہاز میں سفر کر رہی ہے۔"

"کیا... یہ کیا کہہ رہے ہو؟" ڈاکٹر مومک کے لہجے کی پھلکا ہٹ چکی تھی۔

"میری ساسی کی طیارے پر سوار ہے! میں نے زور دے کر اپنے الفاظ دہرائے۔

دوسری طرف چند لمحات کے لیے خاموشی چھا گئی پھر ڈاکٹر مومک کی گھبر آواز ابھری "تم کس ہا پر اتنے وقت سے یہ بات کہہ رہے ہو؟"

"فی الحال میں اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "تم فیر پینکس کو فوراً چیک کرو۔"

"تم اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو تو چیک کرنا ہی پڑے گا ڈسٹرا! وہ تشویش ناک لہجے میں بولا "تم فون رکھ دو میں تھوڑی دیر بعد تم سے رابطہ کرتا ہوں۔"

میں نے ریسور رکھا تو راکھل چپے جہاز کے میرے پیچھے بڑھ گئی۔ وہ اس نئی فونک مٹھکو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گئی۔ اس نے ٹوٹنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے متحد سوالات کر ڈالے لیکن میں نے اس کے کسی بھی اہم یا غیر اہم سوال کا جواب نہیں دیا اور بڑے تہی لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر! فون آنے کے بعد اس معاملے پر بات کریں گے؟"

وہ کچھ نہیں پوئی اور خاموشی کے ساتھ بیڈ سے اتر کر داش روم کی جانب بڑھ گئی۔ راکھل کی اس ادھر مجھے قدرے تعجب بھی ہوا لیکن اس وقت میرا ذہن ساحل کی تھپی سے بھر دیا تھا۔

لہذا میں نے راکھل کی اس حرکت کا نوٹس نہیں لیا۔ ڈاکٹر مومک نے تھوڑی دیر بعد فون کرنے کو کہا لیکن جب دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تو میری فکر میں اضافہ ہو گیا۔

اس فکر میں ایک حیرت اس وقت شامل ہو گئی جب راکھل داش روم سے برآمد ہوئی۔ پوری طرح ڈر میں آپ ہو چکی تھی۔ یوں نظر آرہا تھا جیسے وہ اسی وقت کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتی ہو! میں نے چونک کر اسے دیکھا اور اس سے پہلے کہ اس غیر متوقع تیاری کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرتا فون کی گھنٹی بج گئی۔ میں نے فوراً فون انیڈ کیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر مومک ریوٹو تھے۔ اس نے بڑے تشویش ناک انداز میں کہا۔

"فیر پینکس میں واقعی کوئی کڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی کڑبڑ... اس کا بھی کچھ بتا چلا؟"

"دکھی سے رابطہ ہو چکا ہے۔" ڈاکٹر کی جھکی ہوئی آواز میری سماعت سے کھڑکی "فیر پینکس میں میرے جن لوگوں کے پاس دھن کو رکھا گیا تھا وہ سب خاموش ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی فون انیڈ نہیں کر رہا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ وہ زندہ ہوں اور فون انیڈ نہ کریں۔ لگتا ہے انہیں خاموش کر دیا گیا ہے۔"

"اس سے بھی پائینشوت کو کچھ کیا کہہ ساری مارا ماری مائل کے حصول کے لیے کی گئی ہے۔ جواب کی طیارے میں ستر کر رہی ہے۔"

"تم دو پہر کی ٹرین پر لست بھیج دو اور میرے پاس چلے آؤ۔" وہ اضطرابی لہجے میں بولا "میں اسی ڈرائیور کو ریکٹرل کار کے ساتھ تمہارے ہونے کی سچ دوں گا جس نے تم دونوں کو اوڈل کر لے دینا ہی چاہتا تھا۔ وہی سونا گا گا۔"

"میں بے شکج آنے کے بجائے سیدھا فیر پینکس کیوں نہ چلا جاؤں!" میں نے قدرے جھج لہجے میں کہا۔

"فیر پینکس کی طرف رخ کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔" وہ جھانے والے انداز میں بولا "ورنہ میں اسی وقت تمہارے پاس آجاتا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ فیر پینکس روانہ ہو جاتے۔"

"فی الحال ناممکن کیوں ہے؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"رات شدید برف باری ہوئی ہے اور سڑک والا راستہ ناقابل استعمال ہو کر رہ گیا ہے۔" ڈاکٹر مومک نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا "میں یہ ساری معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ دینا ہی سے فیر پینکس تک پانی دے قمری کیسے بھی برقی موسم میں خاصی خطرناک ہو جاتی ہے۔"

"کیا کسی خطرناک کی خاطر ہم کمرشل میں بند بیٹھے رہ جائیں گے؟" میرے لہجے میں خود بہ خود کڑواہٹ گھل گئی "تمہارا تو کچھ پتا نہیں لیکن میں اس موقع پر خاموش نہیں

رہ سکتا۔"

وہ غصہ سے ہونے لگے میں بولا "تم اس وقت بہت جذباتی ہو رہے ہو۔ دھن جنسی تمہارے لیے اہم ہے اس سے کہیں زیادہ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ میں ایک اور سبب بھی فیر پینکس کا رخ کرنے سے منع کر رہا ہوں۔ اب ادھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہے ہو۔ تھوڑی وضاحت کرو؟"

وہ بولا "اگر چہ تم نے اپنے ذرائع سے پردہ نہیں اٹھایا تاہم میں پھر بھی تمہاری بات کی روشنی میں کہوں گا کہ دھن کے حصول کے لیے فیر پینکس کی طرف جانا بے سود ہے۔ تمہارے دعوے کے مطابق تو وہ اس وقت کسی ہوائی جہاز میں ستر کر رہی ہے!"

میں ایک بوجھل اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مومک ریوٹو سے خاصی معقولیت کی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبے کے لیے غور کیا تو پتا چلا میں واقعی اس وقت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی غصہ سے ہونے لگے میں اس سے کہا۔

"ڈاکٹر مومک! ٹھیک ہے میں کل صبح تمہاری طرف سے بھیجی گئی گاڑی کا انتظار کروں گا۔"

"دیش گڈ!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں ریسور رکھ کر راکھل کی جانب مڑا۔ اس وقت وہ جوتے پہن رہی تھی۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ سے باہر تھی۔ رات کے سوا تین بجے وہ پتا نہیں کہاں جانے کی کھانے بیٹھی تھی۔ مجھ سے نظری تو میں نے پوچھ لیا۔

"راکھل! کہاں جانے کی تیاری ہے؟"

اس نے ایک بھر پور نگاہ مجھ پر ڈالی اور بولی "نہیں جاؤں؟"

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں!"

"اچھا ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو نہیں جاتی ہوں۔" بات ختم کرتے ہی اس نے شوز اتارنا شروع کر دیے۔

میں ہکا بکا اس امر کی حید کو سمجھنے لگا۔ اس نے میرے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔ اپنی ہی طرف سے بولی جارہی ہو۔ اس کی خود کار حرکات و سکنات تو کوئی دینی عامل کامل دیکھ لیتا تو یہ تو فی سادہ کرنے میں ایک لمبے کا خیر نہ کرتا کہ اس خوبصورت لڑکی پر کوئی جن آگیا ہے! اس نونے کے ساتھ ہی وہ یہ پیش کش بھی کر دیتا کہ وہ اس خطرناک جن کو ہگانے کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کو تیار ہے!

راکھل نے صرف شوز اتارنے پر اکتفا نہیں کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پہلے والی حالت میں آگئی پھر اس نے گنگ سائز پر سوار ہو کر سفید برقی رچھ کو اڑھ لیا۔

میں نے کہا ”اب چپ چاپ اس کبل میں دیکھا رہنا۔ مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔“

”پھر ایک ضروری فون؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ گئی۔

”میں نے کہا تھا..... چپ چاپ.....“ میں نے جتنی انداز میں اسے دیکھا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ ان لمحات میں وہ بڑی فرمانبرداری کا ثبوت دے رہی تھی۔ میں نے ہوٹل کی آپریٹر کا کال کیا اور پوچھا۔

”جولی! کیا مجھے اور سیزنبرٹل مل سکتا ہے؟“  
”آف کورس..... آپ سیزنبرٹل ہیں۔“

آپریٹر کے لہجے میں ایک مخصوص احترام شامل تھا اور یہ سب ڈاکٹر موگ کی مہربانی سے تھا۔ دیے بھی یورپ اور امریکا کے ہونٹلر کا اضافہ بہت تعلیم یافتہ اور مہذب ہوتا ہے۔ میں نے جولی کو صدف کا نمبر نوٹ کر دیا۔

صدف کی طرف سے میرا دل بہت بے یقینی تھا۔ جب سے رینی موٹے ہاتھن نے مجھے بتایا تھا کہ آج کل علی و دھوان صدف کے ساتھ ہے اور وہ اسے اصلی و دھوان سمجھ رہی ہے میں پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ فتنہ پرور کیا کیا گل افشاں بن کر رہا ہوگا۔ پہلے وہ میرا دگر بنایا تھا لیکن اب بدگیا تھا اور اگر وہ کسی بدی کی قوت کے مجھے چڑھ گیا تھا تو پھر صدف کو اس سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اگرچہ رینی موٹے ہاتھن نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد صدف کو میرے پاس پہنچا دے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ علی و دھوان کا بھی کوئی بندوبست کر دے گا لیکن میں اپنے طور پر بھی صدف کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

آپریٹر نے لائن ٹھوڑکی تو اٹھائیں میں مجھے انگس کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا ”صدف کو بلاؤ۔ میں و دھوان بات کر رہا ہوں۔“

”اچھا جی ابھی بلاتی ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی اور مجھے ہولڈ پر ڈال دیا۔

انگس صدف کی گھریلو ملازمت تھی۔ میں اس سے ایک مرتبہ مل چکا تھا۔ سالوئی سلوئی اس کرچن لڑکی کے خطوط میں بے پناہ نقش تھی۔ اس کے ہاتھنی پن نے اس صلاحیت کو اور بھی مشکل کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس سے خواہ مخواہ

بات کرنے کو جی چلتا تھا۔  
صدف لائن پر آئی اور الجھن زدہ لہجے میں بولی ”ہلو و دھوان! تم نے تو کہا تھا آج فون نہیں کرو گے۔ خیر تو ہے۔“

اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ وہ یقیناً نقلی و دھوان کا حال دے رہی تھی۔ میں نے کبھی انداز میں کہا ”صدف خیریت نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ میں اس وقت کوئی لمبی چوڑی گفتگو نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ایک لانگ ڈسٹینس اور سیزن کال ہے۔ سننے اور یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ تم نقلی و دھوان کے فریب میں آگئی ہو۔ اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ میں اس وقت تم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر اپنے دشمنوں سے سنٹ رہا ہوں۔“

اس کے لہجے میں یقین اتر آیا ”و دھوان!“ وہ لرز چڑھا اور میں بولی ”کیا تم کوئی مذاق کر رہے ہو؟“

”مذاق نہیں بلکہ میں ایک حقیقت تم پر محمول رہا ہوں۔“ نقلی و دھوان کے چکر میں نہ آنا۔ وہ اب ہمارا اٹھارہ تھمن ہے میں اس کی چال کو سمجھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے ذریعے مجھے کڑوا بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر کہا ”وہ بہرہ دینا نقلی و دھوان اس وقت بدی کی قوتوں کے چنگل میں ہے۔ تم نے اس کی فتنہ انگیزیاں تو دیکھی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر تمہیں وارن کرتا ہوں کہ اس بد معاش کے کپا چل فریب میں نہ آنا۔“

”یقین میں کیسے یقین کر لوں کہ تم اصلی و دھوان ہو؟“

”خند بذب لہجے میں بولی۔“  
اس کے سوال سے میرے دل پر ایک گھونسا لگا۔ وہ جس قسم کی صورت حالات سے دو چار تھی اس میں یہ سوال کرنا اتنا کا حق بنتا تھا۔ وہ اصلی اور نقلی کے چکر میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

میں نے کہا۔  
”میں تمہیں یقین دلانے کے لیے فی الحال اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں یہاں کا فون نمبر دے دوں تم رنگ بیک کر گے میری بات کی تصدیق کر سکتی ہو۔“ میں نے مزید کہا ”مجھے لا سال کو بڑی عبوری کی حالت میں پاکستان سے بہت دور سات سمندر پار پہنچایا گیا ہے۔“

”تم اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟“ صدف نے پوچھا۔

”الاسکا۔“ میں نے کہا۔  
”اوہائی گاڈ!“ وہ استعجاب لہجے میں بولی ”اس برف خانے میں تو اس وقت ہر طرف برف

مخاطب ہوں گی اور بڑی حکمت عملی سے آہستہ آہستہ اس سے  
پچھا چڑھوں گی۔“

”اس سے بہ آسانی پچھا چڑانے کا ایک کریم  
ہے۔“ میں نے کچھ سوچے ہوئے کہا۔  
”ہاں بتاؤ میں تمہاری بات پر عمل کروں گی۔“  
میں نے بتایا ”تمہارے انیم بی بی ایس کے فاضل  
استحاثات ہونے والے ہیں۔ نقلی دھڑان سے کہو وہ جہیں پیر  
آؤٹ کر کے دے دے۔ تم اس سے یہ بات فرمائیں گے  
انہاں میں کہنا اور زور دینا کہ وہ اپنے تعلقات کو استعمال کر کے  
تمہارا یہ چھوٹا سا کام کر دے۔ دیکھ لیوہ چند گھنٹوں کے اندر  
تمہارا یہ کام کر کے دکھائے گا۔ اس بہرہ دے کے اس عمل سے  
تم پروا صبح ہو جائے گا کہ وہ میں نہیں ہوں کیونکہ میں نے ہمیشہ  
جہاں میں صحت، سخت محنت کی تلقین کی ہے۔ میں پرچہ جات کو  
آؤٹ کرنے والی صحت کی محنت نہیں کھینچ کر سکتا۔“ میں ایک لمبے کو  
متوقف ہوا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اور جیسے ہی وہ شیطان پر چڑھتا تھا اسے حوالے کر کے تم بڑے کھلے الفاظ میں اس سے کہہ سکتی ہو کہ وہ تمہارا وجدان نہیں..... بلکہ وجدان کی کھال میں چھپا ہوا وہ بہرہ دیا ہے جسے چند روز پہلے وجدان نے بری طرح جھڑک کر بھگادیا تھا۔ اپنی اصلیت کا انکشاف ہوتے ہی وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ یہ بالکل ایسا ہوگا جیسے لاحول پڑھنے سے شیطان اودھو گیا ہو جاتا ہے۔“

”یہ ہوئی ناہات..... ایک حیر سے دو شکار کرنے والی۔“ صدف نے خوش ہو کر کہا پھر قدرے گمبھیر لہجے میں بولی ”وہ جان! اپنا راز اعلیٰ جانے کے بعد وہ کہیں کوئی انتقامی کارروائی تو نہیں کرے گا؟“

میں نے پُرسوج انداز میں کہا ”بظاہر تو اس کا امکان نظر نہیں آتا اور بالفرض اگر وہ کوئی پر پرزے نکالنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو کیا تم اس سے ڈیرتی ہو؟“

”میری ڈرتی ہے جوتی۔“ وہ بے ساختہ بولی۔  
میں نے کہا ”بس تو بھر ٹھیک ہے۔ تم آگھیس اور دماغ  
کھلا کر کہ حالات کے سامنے ڈٹی رہو۔ مجھے امید ہے وہ اپنا  
بھاضا اچھوٹ جانے کے بعد خود ہی تم سے کئی کانٹے لگے گا۔  
ویسے اسے کیلئے کے لیے یہودیوں کا ایک چپر ربی بھی ہاتھ  
پاؤں مار رہا ہے۔ مجھے امید ہے بہت جلد اس نعلی وجدن سے  
تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔“  
”تم امریکا پہنچی کر یہ کس قسم کی مصروفیات میں پڑ گئے  
ہو؟“ وہ الجھ کر بولی۔

”فرمت میں تفصیل سے بتاؤں گا۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”میں نے کہا“ ہارولا ج کے کمرانمبر قحری تاٹ قحری میں اس وقت میرے ساتھ ایک امریکی حیزہ راکیل بھی موجود ہے اور وہ دھوکہ دینے میں ہے۔“ میں نے دانستہ توڑا سا جھوٹ بولا۔ یہ مصلحت اندازی کا تھا جیسا تھا“ راکیل کا شمار دشمنوں میں نہیں ہوتا۔ بس یا اور کچھ؟“

”ہونے والی ہے..... تم دعا کرنا!“ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

”اچھا آئیڈیا ہے۔ میں نے سنا اپنے والے انداز میں کہا  
مگر کچھ سوچنے ہوئے اضافہ کیا“ صدف! ہمارا جب بھی سامنا  
ہوگا تم کہنا..... ہاسا سنگھ پارک۔ اس کے جواب میں  
کہوں گا..... پاپ میں پتاہ! کہو یہ کوڈورڈز ٹیک ہیں  
.....؟“

صوف کی آواز میں موجود ایک خاص قسم کی جوشی  
رنگ کو میں نے فوراً محسوس کر لیا۔ ہاسانگہ پاکر اور پائپ  
میں پناہ کے ذکر پر اس کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ ہو گیا جب  
میں دلوں اپنے دشمن کے آدمیوں سے چھپتے چھپاتے مذکورہ  
رنگ میں داخل ہوئے تھے اور ایک ادھورے سلائیڈ رنگ  
سپ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے

دو چار رکی باتوں کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔ میں نے ریسپورڈ کرڈل کیا تو راکیل سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بے مدد کے درمیان زیادہ تر بات چیت اردو میں ہوئی تھی لیکن غلطی و جدان اور اصل و جدان کا کثیر اور اکیل کے ذہن میں کلیکار ہاتھ اس لیے اس نے بہت سی باتوں کا مفہوم کنسیو کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھ پچھتی، میں نے انکو آڑی والے انداز میں کہا۔  
”تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟“

”ہاں، صدف پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں رہتی ہے۔“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ”اور یہ میری کزن ہے۔“

”تم ان چٹروں میں نہ پڑو آرام سے سو جاؤ۔“ میں نے  
تندرے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

محبوبی کے لیے یہاں سے کہیں ایک شرط ہے۔“

ہا۔ راکیل کی اس بات میں ذرہ برابر حقیقت نہیں تھی کہ اسے  
بند نہیں آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کے اندر تڑپ تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے کہا ”شرط صرف اتنی سی ہے  
 کہ سونے کے بعد تم از کندیغز کو آف نہیں کرو گی!“

”جملہ مہل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کی گویائی کو  
ک کر دیا۔ شاید وہ یہ پوچھنا چاہتی تھی کیا مطلب ہے

ہمارا آئین مطلب مط سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ اس مطلب پورا ہو گیا تھا۔



”شاید میں نے تمہیں اپنی اس عادت کے بارے میں نہیں بتایا کہ عام لوگوں کی یہ نسبت مجھے زیادہ بھوک لگتی ہے۔“ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”شاید نہیں بلکہ ہینا تم نے مجھے اپنی اس عادت کے بارے میں پہلے نہیں بتایا تھا۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا ”میں تو تمہاری اس عادت کا سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔“

میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ گھمانا بند کر دیا اور پوچھا ”تمہیں کیا تشویش ہو رہی ہے؟“ ”جی! میں نے اپنی پوری زندگی میں کہیں دیکھا اور سنا نہیں کہ کسی روٹی کو کبھی شدید تشنگی بھوک لگتی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اچانک اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بڑے فراخ دلائی انداز میں قہقہے لگانے لگی پھر رک کر گہری سنجیدگی سے بولی ”وہاں! میں بڑی عجیب و غریب روٹی ہوں۔ بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی لہذا۔“ وہ ایک لمبے کوڑی بھر فیصلہ کن انداز میں بولی ”لہذا ناشتے کے آرڈر میں کوئی کی نہیں ہو سکتی۔ میں تمہیں ساری ٹیلیں صاف کر کے دکھاؤں گی۔“

”دیکھوں گا!“ اس کے دعوے کے جواب میں میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

تقریبی کارڈنیشل کا ڈرائیور مونا گاجی لگ بھگ گیارہ بجے ہمیں لینے آگیا۔ لگتا تھا اس نے کارڈنیشل کمپنی میں لوگزی محض دنیا دکھاوے کے لیے کر رکھی ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ ڈاکٹر موگ کے لیے کسی جراحی جن ایسی مشین رکھتا ہے جو اس کے احکام کی نسیل کے لیے ادھر ادھر جاننا پھرتا ہے۔

ہم ہوٹل سے روانہ ہونے کو ابھی دس بجے تقریبی آتے ہی اندازہ ہو گیا کہ رات ابھی خاصی برف باری ہوئی تھی چنانچہ جس رفتار سے گاجی نے ہمیں اولڈ کریل سے دینالی پہنچایا تھا اسے برقرار رکھنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ گاڑی کا انجن طاقتور تھا تاہم گاجی جس سے زیادہ رفتار بڑھانے کا رسک نہیں لے رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم شام سے تھوڑی دیر پہلے لیٹرنگ پہنچ گئے۔ کمری اور چیز کے بعد راستہ قدرے آسان ہو گیا تھا اس لیے بھی ڈرائیونگ کی مشکلات میں کمی آئی اور گاجی نے چیز سے لیٹرنگ کے درمیانی ٹکڑے میں رفتار کو کم کرنے میں تک پہنچا دیا تھا۔

ڈاکٹر موگ ریفریج کے رہائش گاہ، ایئر پورٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ لیٹرنگ والا سکا کا سب سے زیادہ آبادی پر مشتمل بھی خاصا سویا سویا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں دنیا کے دوسرے

ات دیر سے سوئے تھے اس لیے دوسری صبح دیر سے اٹھ کر۔

میں نے بیدار ہونے کے بعد ایک طویل سکون بخلا، لی اور گردن موڑ کر راکل کی جانب دیکھا۔ وہ آسودگی بھری بندھ رہی تھی۔ میں نے اسے سوتا چھوڑا اور دواش روم میں جا گیا۔

شستے سے پہلے پی یا نگ ہمارے کمرے میں چلی آئی۔ اس رات میں راکل بھی فریش ہو چکی تھی۔ وہ بڑی ٹھہری کھمرا نظر آ رہی تھی۔ پی یا نگ نے ایک بیوی بکس ٹائپ شے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس میں میک اپ کی مکمل رینج موجود ہے جو تم دونوں کی فریاد کے لیے کافی ہوگی۔ ناشتے کے بعد تم واقعتاً ڈسکو ورگ ریشا بن جانا۔“

میں نے پی یا نگ سے کہا ”تمہیں ہمارے پروگرام کی تبدیلی کے بارے میں تو معلوم ہو گیا ہوگا؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا ”ڈاکٹر موگ سے تھوڑے دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔ تم دونوں کو لے جانے والی ٹری جیسے ہی یہاں پہنچتی ہے میں تمہیں بتا دوں گی۔“

راکل نے کہا ”ناشتا ہم اپنے کمرے ہی میں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے“ میں روم سروس سے کہہ دیتی ہوں۔ ”اس نے پھر پوچھا ”آرڈر کے بارے میں کچھ بتا دو؟“ راکل کٹا کٹ اے ناشتے کا آرڈر کھوانے لگی۔ میرے حساب سے وہ کم از کم چار افراد کا ناشتا تھا۔ میں نے راکل کو لکنا مناسب نہ سمجھا۔ جب پی یا نگ ہمارے کمرے سے نکلتی تو میں نے کہا۔

”کیا تم نے کسی اور کو بھی ناشتے پر مدعو کر لیا ہے؟“ ”کیوں کیا ہو گیا!“ وہ چپک کر بولی۔ اس کے چہرے میں بے خاص قسم کی اٹھلاہٹ تھی۔

میں نے کہا ”ہم صرف دو افراد ہیں اور تم نے ہماری ضرورت سے دیکھنا ناشتا منگو لیا ہے!“

اس کی چپکار میں قدرے اضافہ ہو گیا۔ بڑے دلولہ انگیز انداز میں بولی ”وہاں! جی بات یہ ہے کہ مجھے شدید تشنگی ہو کر آگ رہی ہے۔ معدے میں کچھ اس طرح کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں جیسے پچھلے دو تین دن سے میں نے کچھ کھانا نہ کھایا۔“ ”حیرت کی بات ہے۔“ میں نے کہا ”حالانکہ رات تم نے پہلا خاصا ڈاکٹر ڈنک کیا تھا!“

شہروں والی مخصوص مہما بھی اور شور شرابا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ایک ہزار بیسے سوساتو سے مرحلہ میل پر پہلے ہوئے اس شہر کی کل آبادی لگ بھگ ڈھائی لاکھ ہے۔ کراچی اور لاہور کے بعض بڑے شہروں میں اتنی آبادی ہوتی ہے پھر تناسب بھی تو دیکھیں! یہ ہزار مرحلہ میل سے بھی زیادہ رقبہ اور اس قدر کم آبادی! اس نسبت تناسب کے علاوہ موسم کی شدت نے بھی لوگوں کو گھروں کے اندر بند کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر مونگ نے بڑی گرم جوشی سے معافہ کیا اور فوراً مجھے اپنی رہائش گاہ کے ایک مخصوص کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر مونگ بڑی تاثر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سامنے سے اپنا ادھار منڈا رکھا تھا۔ پچھلے نصف حصے پر بال موجود تھے اور بڑی شان سے موجود تھے۔ بالوں کی طوالت کے پیش نظر ڈاکٹر مونگ نے عورتوں کی طرح ہاتھ کا قاعدہ انہیں ایک چوٹی کی شکل دے رکھی تھی۔ لباس کے نام پر اس نے تنگ پانچوں والا پاجامہ پہن رکھا تھا جس کے اوپر کرتہ لٹا کر لٹائی تھی۔ اس کرتے کی آستینیں حد سے زیادہ کشادہ تھیں۔ اس کٹے ڈلے کرتے کے نیچے ڈاکٹر مونگ نے اور کیا کچھ پہن رکھا تھا جس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بہر حال اس کا لباس جس بھی تراش خراش اور ڈیزائن کا ہو وہ ایک عمدہ اور قیمتی کپڑے سے تیار کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مونگ کے چہرے پر ایک مستقل سنجیدگی باقی جاتی تھی جس میں خفیف مسکراہٹ کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ وہ بولتا تھا تو لگتا تھا جیسے تاثر کا کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ بے ساختہ اس کے لیے دل میں ادب و احترام کے جذبات ابھرنے لگتے تھے۔ میں نے اس کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ اس کی شخصیت میں تغیر کی خاصیت موجود تھی۔

ہم اس وقت جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ نہایت ہی مختصر تھا یعنی اتنا مختصر کہ اس میں ایک چھوٹی سی میز کے گرد صرف دو کرسیاں ہی رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر میں اور دوسری پر ڈاکٹر مونگ براجمان تھا۔ میز پر دو گھٹی مٹی پیالوں کے ساتھ ایک کیتلی رکھی تھی۔ مذکورہ کیتلی میں خوشبودار تھوہ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اس بے حد لذت بخش تھوہ سے میری ابتدائی تواضع کر رہا تھا۔ راکل کو وہاں بیٹھنے ہی مجھ سے الگ کر دیا گیا تھا۔

سائل کے حوالے سے اس وقت میرے دل میں ایک طوفان سا مچل رہا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ ڈاکٹر مونگ ملاقات پر سب سے پہلے اسی کا ذکر کرے گا لیکن وہ شاذ و نادر تکمیل اور وہاں کی تربیت کا موضوع لے بیٹھا۔ ڈاکٹر مونگ

نے پچیس پچیس سال پہلے اس عظیم تربیت گاہ میں ٹریننگ حاصل کی تھی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب محلی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اپنے بعض ایسے اساتذہ کے نام بھی لیے جن سے مجھے بھی کچھ نہ کچھ سیکھنا کو موقع ملا تھا۔ اگرچہ جیتے دنوں کو یاد کرنا ایک دلچسپ مصروفیت ہے لیکن اس وقت مجھے یہ تذکرہ کل رہا تھا چنانچہ میں نے کہہ ہی دیا۔

”ڈاکٹر مونگ! شاذ و نادر تکمیل پر ہم بعد میں بھی باتیں کر سکتے ہیں۔ تم مجھے سائل کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ اس کا کچھ سراغ ملایا نہیں؟“

وہ اپنے ہاتھوں پر بڑی سنجیدہ مسکراہٹ بکھرتے ہوئے بولا ”وہدان! میں کافی دیر سے تمہاری بے چینی کو محسوس کر رہا ہوں۔ یہ ہماری تکمیل ملاقات ہے اور تمہاری کیفیت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم دھوکے کے لیے خاصے سنجیدہ ہو۔“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کوئی دوسرا ہی موضوع نکال لیا تھا۔ میں نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا ”ڈاکٹر مونگ! تم جتنا محسوس کر رہے ہو میں اس سے بھی نہیں زیادہ سنجیدہ ہوں لیکن تم سے میری ایک درخواست ہے۔“

وہ اسی مسکراہٹ بھری سنجیدگی کے ساتھ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم کی درخواست کرنے والے ہو؟“

میں نے کہا ”تم اس جتنی لڑکی کے لیے دھوکے بجائے سائل کا لفظ استعمال کرو تو مجھے خوشی ہوگی۔ کم از کم میرے سامنے یا مجھ سے گفتگو کرتے وقت تم اسے سائل کے نام ہی سے پکارا کرو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بڑی فراخ دلی سے بولا ”مجھیں دوست بنایا ہے تو تمہارے جذبات کا احترام بھی ضروری ہے۔ میں تمہاری یہ فرمائش ضرور پوری کروں گا۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا شانہ چھپچھپایا اور کہا ”اور کچھ؟“

میں نے کہا ”اب سائل کے بارے میں تازہ ترین حالات سے بھی مجھے آگاہ کرو۔“

وہ بولنے بولنے رک گیا تو میں نے کہا ”یہ تو تمام وہی باتیں ہیں جن کی میں بھی توقع کر رہا ہوں۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم نے سائل کے کسی طیارے میں سفر کرنے کی تصدیق کیسے کی؟“

”میں نے ہنگامی حالات میں اپنے ہڈوں سے رابطہ کیا تھا۔“ ڈاکٹر مونگ نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا ”سینٹل میں موجود میرے سینئر نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فیکٹر ٹیکس سے اخراج کرنے کے بعد تمہاری سامی کو کسی طیارے میں سوار کیا گیا ہے۔“

”پھر تو تمہیں یہ بھی بتایا چاہا ہوگا کہ وہ طیارہ سائل کو کہاں پہنچانے والا ہے؟“

”جی نہیں اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔“

”اور تم نے پوچھا بھی نہیں؟“

”میں اپنے ہڈوں سے سوالات کی جرأت نہیں رکھتا۔“

دھوکوں اور سنجیدہ لہجے میں بولا ”میں نے انہیں تمہارے خیال سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا ہم وہدان کے خیال کو ضرور چیک کریں گے۔ اس کے خیال اور اندازے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“

تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارا یعنی وہدان کا خیال ٹھیک ہے۔ وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”سینٹل والے ہڈوں نے مجھے یقین دلایا کہ سائل بالکل خیریت سے ہے اور یہ کہ وہ بہت جلد اسے رہی موٹے ہاتھن کے قبضے سے نکال لیں گے۔“

میں نونٹتی ہوئی نظر سے ڈاکٹر مونگ رہیوٹے کو دیکھنے لگا۔ اس کی باتوں میں بہت گہرائی اور گیرائی باقی جاتی تھی۔ اس کی باتوں پر یقین کرنے کو دل چاہتا تھا۔ مجھے خاموش اور سوچنا ہوا یا کہ اس نے کہا۔

”مجھ سے تو سب کچھ پوچھ لیا۔ میرے ایک سوال کا جواب بھی دے دو۔“

”کون سا سوال؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بولا ”تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا سائل کس طیارے میں سفر کر رہی ہے؟“

وہ دھڑکتے ہمارے یا مجھے خوش کرنے کے لیے اب دھوکے بجائے سائل کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے کہا ”تمہارے سوال کا سن کر میرے ذہن میں ایک فوری جواب آیا ہے جو تمہاری طرف سے ہر سوال کا دروازہ بند کرے گا لیکن میں نہیں وہ جواب نہیں دوں گا بلکہ سیدھا اور معقول جواب دوں گا۔“

وہ گہری دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”معقول اور سیدھا جواب تم بعد میں دینا پہلے بتاؤ کہ کون سا جواب ہے جو میرے سوالات کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ کھڑی کر دے گا؟“

میں نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا ”تمہارے اس سوال کے جواب میں میں تمہاری طرح بے چینی کہہ سکتا ہوں کہ سائل کے کسی ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔“

”تم ذہین ہی نہیں بلکہ خاصے عیار بھی ہو۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے بھی اسی انداز میں کہا ”ڈاکٹر مونگ! میں گزشتہ دو دن اور دو رات سے ایک بیہوش کے ساتھ ہوں۔ تھوڑا بہت اثر تو ہو گا نا۔ ممکن ہے اس رفاقت نے میرے اندر بھی کچھ عیاری بھری ہو۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”راکیل بڑی زیر دست لڑکی ہے۔“

اس کے اس مختصر سے تبصرے سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ راکیل کے بارے میں وہ اپنا تجربہ بیان کر رہا تھا یا مشاہدہ۔

بہر حال میں نے اس کے سوال کا معقول جواب دیتے ہوئے بتایا کہ مجھے سائل کے بارے میں کیسے پتا چلتا تھا۔

وہ بڑے انہماک سے میری بات سن رہا تھا پھر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی تقلید میں میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے دالہ انداز میں مجھ سے ایک پُر جوش مصافحہ کیا پھر دوبارہ بیٹھنے ہوئے بولا۔

ایک اچھوتی سرگزشت

چھلاوا

میں مدلی ایک نہایت اسرار خاتون

محبوبہ بانو کی آپ بیتی

صفحہ 1120

بیت 130

صفحہ 29

کتابیات پبلشرز

23

7428000

75300

”مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کائنات کی سب چیزیں باسب کے لیے نہیں ہوتیں۔ بعض محالوں کے لیے بعض لوگ مخصوص ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی جی کی صلاحیت کو اس درجہ بڑھانے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی حالانکہ میں نے مارشل آرٹس کے دیگر شعبوں میں جو کچھ حاصل کیا ہے اسے سنو کے تو حیرت زدہ رہ جاؤ گے!“

میں نے کہا ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر مونگ! میں نے ہمیں دوست جان کر اپنا یہ راز بتا دیا ہے۔ اسے خود تک ہی رکھنا۔ دیکھو! یہ ابھی میری اس صلاحیت میں کچا پن ہے۔“

”کچا پن بھی آجائے گا۔“ مشق جاری رکھو۔ وہ دوستانہ انداز میں بولا ”جس حد تک ممکن ہو سکا میں بھی تمہاری مدد کروں گا اور جہاں تک راز کو راز رکھنے کا تعلق ہے تو تم اس میں بے فکر ہو جاؤ۔ میرا سینہ بہت وسیع اور گہرا ہے۔“

ڈاکٹر مونگ ریفرنش کے ایک ایک لحاظ سے ہمدردی ظاہر کیا اور سچائی پہنچتی تھی۔ اس کی باتوں پر یقین آتا، اس کی ڈیڑھ پر اعتماد کرنے کو بھی جانتا تھا اور اب تو ہمارے درمیان دو کارشتہ استوار ہو چکا تھا جو منہ بولے رشتوں میں دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے درمیان کالی در تک باہمی دلچسپی کے امور پر چیت ہوتی رہی۔ مجھے ڈاکٹر کی ایک حیرت انگیز صلاحیت کا چلا کر وہ فلائٹ ٹائٹنگ کا بھی ماہر تھا۔ یہ خاصیت بہت کم فائز میں پائی جاتی ہے۔ ہوا میں پرواز کرتے ہوئے لڑائی کرنا آسان نہیں۔ میں نے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا۔ یہ سونامانی دیر سے میری سوچ میں گردش کر رہا تھا۔

”تم نے کس شے میں ڈاکٹر پیٹ کر رکھا ہے؟“

”چینی طب میں!“ اس نے غصہ سے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ یہ ایک اور حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ چینی طب کے بارے میں میں نے بہت کچھ سیکھ رکھا تھا۔ ویسے بھی ہمارے تہذیبی لحاظ سے کافر مان ہے کہ علم حاصل کر دیا جائے اس حصول کے بغیر۔ چینی ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اس سے یہ تو مسلم ہوتا ہے کہ چینی علم دھرم کا گواہ ہے۔ میں چینی طب کے بارے میں سب سے زیادہ واقفیت سے بھی آگاہ تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم رواجی کی چابی کرنے لگے۔ ڈاکٹر مونگ نے اس موقع پر ایک عجیب حیرت کی۔ اس نے اپنی چوٹی کو گردن پر سے کاٹ ڈالا۔ ان سات اچھے لمبے بالوں میں سے آگے اس نے سر کے اگلے حصے پر گرا لیے، یعنی منڈا ہوا حصہ بالوں سے ڈھک گیا۔ کچھ

بال سائیز پر اور باقی پیچھے ڈال دیے۔ صرف اس چھوٹی سی حرکت سے اس کے چہرے میں نمایاں تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ میں نے جب حیرت سے اسے دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”جس طرح تمہارے مذہب میں مخصوص حالات میں جان بچانے کے لیے بعض اوقات حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح کس نہایت ہی خاص الحاح سے موقع پر ہم بھی چوٹی کو ادا دیتے ہیں۔ اس عمل سے تم اس شے کی اہمیت کا اندازہ لگا لو۔“

میں خاموشی سے اس کی منظر انداز باتیں سن رہا تھا۔ میرے اور راکل کے چہروں میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ جب ساری تیاری ہو چکی تو ہم اتر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اتر پورٹ ڈاکٹر مونگ ریفرنش کی رہائش گاہ سے قریب ہی تھا۔ ہم ٹھیک لو بجے گھر سے نکلے۔ فلائٹ دس بجے کی تھی۔ ہمارا یہ سفر ریشل کار میں شروع ہو جو تقریباً تالی گھنٹے کے لیے ایک ڈرائیور گاڑی کے حوالے کر رہی تھی۔ وہ بے چارے یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ موت کا گچھی کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

گھر سے اتر پورٹ اور پھر اتر پورٹ پر کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ ہم یہ خیر دعائیت جہاز میں سوار ہو گئے۔ مقررہ وقت پر جہاز نے ٹیک آف کیا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر میں نے نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پرواز متوازن ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ ڈاکٹر مونگ اور راکل بھی میرے ساتھ سوچے پرواز تھے۔ ہم سب کی منزل ریاست واشنگٹن کا شہر سیٹل تھا جہاں ڈاکٹر مونگ کے بڑے موجود تھے۔ مجھے نالوے فیصلہ امید تھی تھی کہ ان لوگوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دلائی لاما سے ضرور تعلق ہوگا۔ بہر حال، جو کچھ بھی تھا، چند گھنٹوں بعد سامنے آنے والا تھا۔

میں نے تمام ادھر ادھر کے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور ساحل کا تصور قائم کرنے لگا۔ یہ اچھا موقع تھا۔ اگر میں اپنے ارتکاز کی عمل سے اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو مجھے ساحل کی تازہ ترین پوزیشن کا علم ہو سکتا تھا۔ میری ایک دو منٹ کی کوشش رنگ لے آئی۔ میں ساحل کے تصور کو چھوئے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کاہر اپا میری تیسری آنکھ کے سامنے روشن ہو گیا۔ ٹینیل گینڈ بڑی فرماں برداری سے کام کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا..... اور بڑی توجہ سے دیکھا کہ ساحل

ایک جہاز سے باہر آ رہی تھی۔ وہ کسی ہوائی جہاز کے جسم کو خیر باد کہنے کے بعد اتر پورٹ کی عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اسطوری انداز میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی تاکہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس اتر پورٹ پر اتر رہی ہے۔ بہت احمق تھا..... میں ساحل کی منزل کا سراغ پانے والا تھا لیکن.....

اس لیکن کے بعد ایک افراتفری تھی اور اس افراتفری نے میرے انہماک، میرے ارکان کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ ہم جس جہاز میں سوار تھے وہاں مسافروں کے لیے کوئی خاص اعلان ہو رہا تھا۔ میں راکٹ کی کہنی کی اس لٹوئی ضرب سے منتشر ہوا تھا جو اس نے میری توجہ مبذول کرانے کے لیے میری پسلیوں پر رسید کی تھی۔ وہ جہاز میں ہونے والی آوازوں سے منٹ سے مجھے باخبر کرنا چاہتی تھی۔ میری آنکھیں بند دیکھ کر شاید اس نے مجھے کیا تھا کہ میں سوچا ہوں۔

راکت کی اس حرکت پر مجھے فصد توجہ آیا کہ میں اپنی ساحل کا سراغ کھو بیٹھا تھا۔ وہ فصد دکھانے کا موقع نہیں تھا۔ اس حرکت میں راکٹ کی کوئی دانستہ کوئی شامل نہیں تھی۔ جہاز میں واقعی ایک سنسنی خیز اعلان کیا جا رہا تھا۔ میں پوری توجہ سے اس آواز کو سننے لگا۔

وہ اس لڑکی کی آواز نہیں تھی جو اب تک میں نے دو تین مرتبہ سنی تھی بلکہ میرا تو یہ خیال تھا کہ وہ جہاز کے محلے میں سے کسی کی بھی آواز نہیں تھی۔ الفاظ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا، وہ کوئی غیر متعلق شخص ہے جو جہاز کے مسافروں کو کوئی تکلیف دے رہا ہے۔ وہ شخص کہہ رہا تھا۔

”سنی عجیب بات ہے، بلکہ اتفاق ہے کہ کئی ڈبلیو اے (فرانس ورلڈ انٹرنیشنل) کا یہ طیارہ آپ لوگوں کے دم قدم سے آباد ہے۔ اسی اتر لائنز کا ایک یونٹ جیٹ لائنز سیون فور سیون پچھلے سال آپ ہی جیسے لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ نیویارک سے ہیرس جانے والے تھے۔“ میں ٹی ڈبلیو اے کی فلاحی خبر آٹھ سو کی بات کر رہا ہوں۔ آپ میں سے بہت سارے لوگ اس فلاحی کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے۔“

اتنا کہہ کر وہ رکا۔ میری چٹائی حس پکار اٹھی، کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اعلان کرنے والا دوبارہ مسافروں سے مخاطب ہوا۔

”بہر حال، آپ لوگوں میں سے جو اس فلاحی کے بارے میں نہیں جانتے ہیں ان کی معلومات کے لیے مانتا جا

زندگی بڑی پیاری شے ہے اس لیے سب کو پیاری ہے۔ یہ صرف ایک بار ملتی ہے اور انسان اس ایک بار کی باتیں جڑا کر ہٹا جاتا ہے اس پیاری شے کو پیار کرنا ہے اسے گلے سے لگا کر رکھنا چاہتا ہے۔ گلے کے ہار کر ایک کانٹے لگ آئیں تو دم کھٹنے لگتا ہے۔ اسی طرح زندگی کی بڑے خطرے سے دوچار ہوجائے تو انسان گرہ جاتا ہے خوف و ہراس اسے اپنے حلقے میں جکڑ لیتا

طیارے کی اندرونی فضا میں اس وقت ایک کھلیلی بچی تھی۔ تمام مسافر خصوصاً لیزب کی حالت دیدہ تھی۔ اس خیر اعلان نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اعلان نے والے نے وعدہ کیا تھا کہ اگر مسافروں نے ان لوگوں کو نادم کیا تو انہیں اور اس طیارے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس وعدے پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ گزشتہ فلاحی حادثے کی خبر ہونے والے جس طیارے کا حوالہ دیا تھا وہ مسافروں کے ذہنوں میں سراسیمگی پھیلانے کے الی تھا..... اور ہم تینوں بھی ٹی ڈبلیو اے کے اسی یونٹ پر دو سیون کے مسافروں میں شامل تھے!

اس ہم اور سنسنی پھیلانے والے اعلان کو پہلے راکٹل بنا تھا۔ میں اس وقت اپنے تصور کے ساتھ ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ساحل کسی ہوائی جہاز سے اتر رہی تھی راکٹل کی مدخلت نے مجھے جاننے دیا کہ ساحل کس کس شہر کے کس اتر پورٹ پر پہنچی تھی۔ راکٹل نے اپنی کی ضرب میری پسلیوں پر لگا کر میرے تصور کا شیرازہ دیا تھا۔ بہر حال اس کا یہ عمل میں فخری تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر مونگ ریٹوشے کی جانب اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں اور وہ بڑے مبرور سکون بیٹ کی پشت سے ٹپک لگا رہے بیٹھا تھا۔ اس کی یہ لاشعری بے خبری مجھے عجیب لگی۔ طیارے کو فضا میں پرواز کیے آدھا کھٹا کر رہا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا، کوئی شخص اتنی تھکن میں گہری نیند میں اتر جائے..... اور شخص بھی ڈاکٹر ریٹوشے جیسا طاقتور اور درویش!

میں ڈاکٹر مونگ کے اس رویے کو کسی خانے میں فٹ نہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ راکٹل نے مجھے بازو لڑکائی کی جانب کھینچا اور سر کو نشانہ انداز میں بولی۔

”میرا خیال ہے یہ جہاز آٹھ سو لاکھ لیا گیا ہے۔“ اس کی ماہر پوچھ سے متاثر ہوئی۔

”تمہارا خیال خاصا تقویت بخش ہے۔“ میں نے کہا۔

”جہیں ان لمحات میں بھی مذاق موجود ہے؟“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ میں نے اسی انداز میں کہا۔

”طیارے کے تباہ ہوجانے سے اس کا خواہ جہان خاصا اطمینان بخش ہوگا۔ کیا تم نے ٹی ڈبلیو اے کی فلاحی خبر آٹھ سو کا حوالہ نہیں سنا؟“

”وہ حادثہ میرے ذہن میں نقش ہے۔“ وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”اس فلاحی سے میری ایک دوست بھی نیویارک سے ہیرس جا رہی تھی۔ دانی کا ڈا“ وہ ایک لمحے کو توقف ہوئی پھر بھر جھری لیتے ہوئے بولی۔

”لاگ آئی لیٹر کے پاسوں نے فضا میں ایک خوف ناک دھماکے کی آواز سنی تھی اور پھر ان کی نگاہوں میں آگ کا ایک عظیم الشان گولہ گھوم گیا تھا۔ بعد کی تحقیق نے اس فلاحی حادثے کو دہشت گردی کی ایک واردات قرار دیا تھا۔“

میں نے ایک ایک نقطہ پر زور دیتے ہوئے کہا ”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اللہ کا شکر ادا کر دے یہ طیارہ تباہ و برباد ہونے نہیں چاہا“ صرف آٹھ سو اے۔

ہمارے درمیان وہ گفتگو سرگوشیاں انداز میں ہو رہی تھی۔ دیے اگر ہم بے آواز بلند بھی بات کرتے تو کوئی ہماری جانب دھیان دینے والا نہیں تھا۔ اس خوف ناک اعلان نے مسافروں کے ذہنوں کو ٹپک کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سب اپنے بارے میں اپنے حلقہ کے لیے سوچ اور بول رہے تھے..... اور بہت بڑے چہرہ کر بول رہے تھے۔ طیارے کے ماحول میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔

راکت کی جھنجھلائی ہوئی آواز میری سماعت سے گھرائی ”تم اپنے اعصاب کو کیا کھلاتے چلاتے ہو۔ اس سنگین صورت حال میں بھی جہیں خود پرڈ کنٹرول حاصل ہے؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور ڈاکٹر مونگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”اسے کیا ہوا ہے؟“ میرے استفسار میں ڈاکٹر کے لیے ایک احترام شامل تھا۔

اس سے پہلے کہ راکٹل کچھ بولتی، جہاز کے اندر ایک مرتبہ پھر وہی مخصوص آواز سنائی دینے لگی جس نے مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ سنسنی خیز اعلان کیا تھا۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔



اٹھ کر گرگاہ میں کھڑا ہو چکا تھا۔ میں سمجھ گیا یہ دونوں گمن بردار  
 خواہ کنگدان کے سامنے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے اعلان کرنے  
 والے نے انہی دو گمن برداروں کا ذکر کیا تھا۔ اس جہاز کو بڑے  
 طریقے سے اس کے سامنے لایا گیا تھا۔ جلد ہی ان دونوں گمن برداروں  
 نے بڑی مہارت سے مسافروں کو اپنے کمرے میں لے لیا۔  
 گمن کو دیکھ کر جس عورت کی سچ لکھائی گئی تھی، وہ وہم کر  
 دیکھ گئی تھی تاہم اس کے ساتھ کو جلال آگیا۔ وہ میکانیکی انداز  
 میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور گمن بردار کو اپنی سیدھی سنانے لگا۔  
 اس کے انداز میں اچھا خاصا اشتعال پایا جاتا تھا۔  
 ”تم لوگ بہت بے حس اور سفاک ہو۔“  
 ”کیپ سائلٹ!“ گمن بردار غراہا۔

مخاطب کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ ”تم لوگوں نے یہ جہاز  
 خواہ کر لیا۔ اتنا کافی نہیں کیا؟ ہم سب مکمل طور پر تمہارے رحم و  
 کرم پر ہیں۔ اب اسلئے کی تمناں کر کے عورتوں اور بچوں کو  
 کیوں ڈراتے ہو؟“

گمن بردار اس شخص کے قریب ہی تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے  
 مڑا ہوا اس کا گمن والا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔  
 اگلے ہی لمحے بولنے والا اپنی پیشانی تمام کر رہ گیا۔ گمن  
 کا فولادی دستہ اس کے ماتھے پر لگا تھا۔ یہ ایک عجیبی طرح  
 تھی جو بجلی کی سی سرعت سے لگائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی  
 گمن بردار کی فراہم بھری آواز ابھری۔

”یہ فرسٹ وارنگ ہے۔“ آئندہ قریب کرنے کی کوشش کی  
 تو گمن سے بے آواز کوئی نکلے گی جو تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے  
 بے آواز کر دے گی!“

گمن بردار کی دھمکی میں بڑی قطعیت تھی۔ چپنے والی  
 عورت نے اپنے ساتھ کی بڑی مضبوطی سے تمام لیا جیسے خدشہ  
 ہو، وہ دوبارہ اٹھ کر گمن بردار سے الگ ہو جائے گا۔ اپنی پیشانی پر  
 گمن کا دستہ کھانے والا شخص چپ سادہ کر بیٹھ گیا اور وہاں  
 سے رتنے والے خون کو صاف کرنے لگا۔

اسی وقت ہمارے عقب سے ایک آواز ابھری۔ کوئی  
 بڑی برہمی سے خواہ کنگدان کے مخاطب تھا۔ ”تم لوگوں کا  
 جھوٹ تو پہلے قدم پر ہی کھل گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا  
 تھا جہاز کے مسافروں سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ تم اپنے  
 مطلوبہ افراد کو قابو کر چکے ہو پھر یہ کیسی درنگ کا مظاہرہ ہو رہا  
 ہے۔ تمہارا وعدہ کیا ہوا کہ ہماری سلامتی محفوظ رہے گی؟“

میں نے گردن گھما کر اس جنا لے کر دیکھ کر تھوڑی  
 سمجھا اور پھر اس بولنے والے شخص کو دیکھتے ہی میں ٹھک اٹھا۔  
 وہ الاسکا کا پینٹل ہیرڈوگ کیٹنگ تھا۔ وہی مونچھر اور گلیشیر

پاکٹ جسے میں نے ہار پراج کے ڈاننگ ہال میں ایک  
 مرلے کی لڑکی کے ساتھ ڈنکر کرتے دیکھا تھا۔ اب وہ قلعہ  
 لڑکی اس کے ہمراہ نہیں تھی۔

میں ڈوگ کیٹنگ کے جہاز کے اندر دیکھ کر حیران رہ گیا۔  
 نہیں وہ اب تک میری نظر سے کیسے بچا ہوا تھا۔ میری حیرت کا  
 سبب یہ نہیں تھا کہ وہ طیارے میں ستر گر رہا تھا بلکہ میں اس کی  
 طرف سے ایک بے نام کی تشویش میں مبتلا تھا۔ ہونے کے  
 ڈاننگ ہال میں وہ بڑے مشکوک انداز میں مجھے اور اسکیل کو  
 تازہ تارہا تھا چنانچہ اس طیارے میں ڈوگ کیٹنگ کی موجودگی  
 لاعلم مجھے بہت عجیب سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھے اس بات کا  
 اطمینان تو تھا اس وقت ہم تبدیل شدہ جہازوں میں تھے لہذا  
 ہمیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ ہار پراج میں وہ ہمیں اصلی صورت  
 شکل میں دیکھ چکا تھا۔

ڈوگ کیٹنگ کے نزدیک ہی وہ گمن بردار کھڑا تھا جسے  
 میں نے سیاہ بریف کیس میں سے گمن برآمد کرتے دیکھا تھا۔  
 اس کے دوسرے سامنے نے بھی ایسا ہی طریقے پر عمل کر کے  
 ہتھیار کو جہاز کے اندر پہنچایا ہوگا۔ ان کا طریقہ کار بڑا یونانی  
 تھا!

گمن بردار شخص نے ڈوگ کیٹنگ کے سینے کی طرف اٹلی  
 اٹھاتے ہوئے فوس لہجے میں کہا ”میں مانتا ہوں تم الاسکا کے  
 پینٹل ہیرڈوگ ہو لیکن اس وقت تم الاسکا میں ہو اور نہ ہی یہاں  
 جہاز کے اندر کوئی مونٹین اور گلیشیر ہے لہذا ہیرڈوگ کی کوئی  
 عجائبات نہیں۔ چپ چپ اپنی سیٹ پر بیٹھے رہو ورنہ۔“  
 ”ورنہ“ کے بعد گمن بردار نے جملہ مکمل چھوڑ دیا تھا اور  
 اس اور میرے جملے میں ایک سنگین دھمکی پوشیدہ تھی۔ الفاظ کی  
 قطعیت بتاتی تھی دھمکی دینے والا کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے  
 سے دریغ نہیں کرے گا۔ شاید انہیں اس سلسلے میں خصوصی  
 ہدایات دی گئی تھیں۔

میری تھنڈ میں راکل بھی پینٹل ہیرڈوگ دیکھ رہی تھی۔ اس  
 نے سر سرائی ہوئی آواز میں کہا ”ہیرڈوگ ہی ہوتا ہے!“  
 ”اور ہیرڈوگ واقعی زبرد ہوتا ہے۔“ یہ ڈاکٹر مونگ کی آواز  
 تھی۔

میں نے جلدی سے پلٹ کر اپنے ہاتھیں پہلو میں دیکھا۔  
 ڈاکٹر مونگ ”بیدار“ ہو چکا تھا اور خاصا سمجیدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھ  
 سے لگاؤ کی تو گہری سنجیدگی سے بولا۔

”ہیرڈوگ اتنا مشکل نہیں جتنا ہیرڈوگ کو برقرار رکھنا۔  
 حالات و واقعات دشمنی پر اتار آئیں تو ہیرڈوگ بوجھنے میں  
 ایک لمحہ نہیں لگتا۔“ تھوڑے وقت کے بعد اس نے اضافہ

کیا ”گمن بردار کچھ غلط نہیں کہہ رہا۔ واقعی یہاں جہاز میں کوئی  
 ہیرڈوگ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی برقیاتی ڈوہ دکھائی دیتا ہے۔“  
 ڈاکٹر مونگ کے جملے کی معنی آخری پر میں غور کر رہی رہا  
 تھا کہ اس بات پر اعلان کرنے والا پینٹل ہیرڈو  
 مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”ڈوگ کیٹنگ! ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ آپ  
 لوگوں کی سلامتی کو اس بات سے مشروط کیا گیا تھا کہ آپ کسی  
 قسم کی بد امنی پھیلانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اگر آپ  
 لوگ اپنے جذبات کو قابو میں رکھو گے تو ہم لوگوں کے ساتھ کوئی  
 بد سلوکی نہیں کی جائے گی۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ سب کو یاد  
 دلاتا ہوں کہ سائبرگالوں سے انجتنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر  
 آپ لوگ شرافت کا ثبوت دیں گے تو محفوظ رہیں گے۔“

بولنے والے کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا وہ کسی بھی دلی  
 سے ہمیں دیکھ رہا تھا اور جہاز کی اندرونی صورت حال اس کے  
 علم میں تھی۔ وہ خاموش ہوا تو ڈوگ کیٹنگ نے کہا۔

”اپنے دعوے کے مطابق تم لوگ مطلوبہ افراد کو اپنے  
 قابو میں کر چکے ہو لیکن ہم نے جہاز کے اندر کسی قسم کی سرگرمی  
 دیکھ لی۔ یہ خفیہ آپریشن کب کیا گیا؟“

طیارے کے اندر اس وقت پینٹل ڈوگ خاموشی چھائی  
 ہوئی تھی۔ ڈوگ کیٹنگ گویا تمام مسافروں کا ترجمان بن گیا  
 تھا۔ سب نہایت انتہاک سے اسے بولتے ہوئے سن رہے  
 تھے۔

انجیکر کے توسط سے ہم کلام شخص نے کہا ”جب تم نے  
 سے خفیہ آپریشن کا نام دے ہی دیا ہے تو یہ بھی ذہن میں رکھو  
 کہ خفیہ کام علی الاطلاق نہیں کیے جاتے۔ ہم نے بھی نہایت  
 پاکدستی سے اپنے مطلوبہ افراد کو اپنی دھڑس میں کیا ہے۔  
 جہاز میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی کلاس میں تو بیٹھے لیکن  
 ہمیں سیٹوں پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا ہم نے بڑی صفائی سے  
 ہمیں چھٹی میں اچک لیا۔“

”اگر ایک منٹ کے لیے تمہاری بات کا یقین کر لیا جائے  
 زہر سوال یہ پیدا ہوتا ہے اس وقت وہ تینوں افراد کہاں  
 ہیں؟“ ڈوگ کیٹنگ واقعی بڑی جرأت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اسے جواب دیا گیا۔ ”گویا طیارے کے مسافروں کو  
 بتایا گیا“ اس وقت ہمارے تینوں مطلوبہ افراد جہاں بھی ہیں  
 وہ ہماری گرفت میں ہیں۔ پاکٹ ہمارے اشاروں پر تپتے  
 کے لیے مجبور ہے کیونکہ یہ افراد کی سلامتی کا سوال ہے۔  
 ہر سب سے بڑی بات یہ کہ پاکٹ ہمارا اپنا آدمی ہے۔ اس  
 لیے بھی ہمیں کافی آسانیاں حاصل ہو گئیں۔“ وہ ایک لمحے کو

متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ”یہ تفصیل بتانے کا  
 ایک خاص مقصد ہے کہ آپ لوگوں کے ذہن صاف ہو جائیں  
 تاکہ چند گھنٹوں کے اس سفر میں آپ ہمارے لیے مشکلات  
 کھڑی کرنے کے بارے میں سوچیں۔ ایک بات کا یقین  
 کر لیں کہ یہ جہاز اپنے تمام تر جملے کے ساتھ اس وقت مکمل  
 طور پر ہمارے قبضے میں ہے لہذا کسی بھی قسم کی ہم جوئی آپ  
 لوگوں کو کسی بھی بھلائی انجام سے دوچار کر سکتی ہے۔“

ڈوگ کیٹنگ سوال کرنے سے باز نہ آیا۔ اس نے  
 پوچھا ”اس جہاز کے خواہ اور ان تین افراد کو برقیاتی بنانے سے  
 آپ لوگ اپنا کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

یہ ایک نہایت ہی حساس اور اہم سوال تھا۔ مجھے امید تھی  
 ڈوگ کو ذرا ہٹ پھٹا کر چپ کر دیا جائے گا۔ میں پوری توجہ  
 سے اس کے جواب دے دالے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ میری  
 توقع کے برعکس ڈوگ کو بتایا گیا۔

”ہمارا ایک بہت ہی خاص خاص آدمی نیویارک کی جیل  
 میں بند ہے۔ ہمیں اس کی رہائی چاہیے۔ نہایت ہی محفوظ  
 اور یقینی رہائی!“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ  
 گویا ہوا۔

”جب ہمارا آدمی صحیح سلامت ہماری بتائی ہوئی جگہ پر  
 پہنچ جائے گا تو ہم ان تین برقیاتیوں کو آزاد کر دیں گے۔“  
 ”اور جہاز کے باقی مسافروں؟“ ڈوگ نے ایک گہری  
 سانس لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”میں نے بتایا تھا آپ لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی ہے  
 اور نہ ہی دوستی۔“ اس شخص نے دونوں انداز اختیار کرتے  
 ہوئے کہا ”آپ لوگوں کی حیثیت اس وقت گمن کی سی ہے جو  
 گیموں کے ساتھ ساتھ ہے۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ کر ڈنڈے دار  
 افراد سے بات کریں گے۔ اگر ہمارا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو ہم  
 اپنے مطلوبہ افراد کو جہاز سے اتار کر اس جہاز کو پرواز کی  
 اجازت دے دیں گے۔ اس جہاز میں اتنا اندھن موجود ہے  
 کہ تم لوگ اس مقام سے پہ آسانی اپنی منزل یعنی سیٹل تک  
 جاسکو گے۔“

اس شخص کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی منزل  
 زیادہ دور نہیں تھی اور ہم چند گھنٹوں میں کہیں لینڈ کرنے والے  
 تھے۔ اعلان کرنے والے شخص نے ابتدا میں بتایا  
 تھا ”ہم گلف آف الاسکا“ کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ اس  
 سے کچھ ظاہر ہوتا تھا۔ اس علاقہ کی سمت شمال سے جنوب کی  
 جانب تھی۔ اور اس جنوبی سمت میں سیکڑوں میلوں تک  
 پیٹنک آوشین (بحرالکابل) پھیلا ہوا تھا۔ اس بحرے کو اس







”لودیکودہ آرہا ہے۔“ میں نے رائی کے ہاتھ میں اپنے دائیں ہاتھ سے دہاتے ہوئے کہا ”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو تم خود اس سے پوچھ لو۔“ وہ سرزنش آمیز نظر سے مجھے گھور کر رہ گئی۔ میں نے بال بردار پر نگاہ جمادی۔

وہ بڑے چاقو دھبہ انداز میں ہمارے پاس سے گزر عجب میں چلا گیا۔ میرے ذہن نے اعلان کر دیا کہ وہ ڈاک گینگ کی طرف جارہا تھا۔ بے اختیار میں نے پلٹ کر دیکھا تو ذہن کی فراہم کردہ اطلاع بالکل درست نکلی۔ وہ ڈاک گینگ کے پاس کھڑا اس سے کہہ رہا تھا۔

”الاسکا کے پینٹل ہیرو! آپ بھی آج آؤ۔ ہم نے آپ کے لیے بھی تھوڑی بہت شوٹنگ نکالی ہے۔ ادھر آپ کا انتظار رہا ہے۔“

ڈوگ نے برہمی سے کہا ”میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔ جو کہتا ہے یہاں سب کے سامنے کہو۔“

پتول بردار کو توجہ نہیں تھی ڈوگ اڑی پر اتر آئے گا۔ خاصے چار حانہ انداز میں بولا ”ہم تم سے کچھ خاص باتیں رونا چاہتے ہیں جو سب کے سامنے نہیں ہو سکتیں!“

”اور میں تمہارے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گا!“

وگ حتیٰ لچہ میں بولا۔

”تم الاسکا کے پینٹل ہیرو ہو۔ یہاں عام مسافروں کے دیمان بیٹھے اچھے نہیں لگتے۔“ پتول بردار نے طنز یہ لچہ لکھا ”تمہاری کلاس نہیں تمہیں تو ہائی اتھارٹیز کے ساتھ ہونا ہے۔“

جہاز کے مسافروں میں سے صرف دو افراد نے جرات لکھ کر توجہ نہیں دی۔ ڈوگ گینگ۔ خواہ کنڈگان کو ڈی شدت سے اس بات کا احساس ہوگا کہ جی دو افراد ان کے لیے کوئی بڑی مشکل کھڑی کر سکتے ہیں لہذا انہیں بڑی سنائی سے وہ کارز کرنے کے موڈ میں تھے۔ ڈاکٹر سوگ کو

ہاں سے لے جایا جاتا تھا اب ڈوگ کی باری تھی۔ ڈوگ کی بھی یہی طور پتول بردار کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔ اسے اپنے سامنے سے اچھے دیکھ کر دوسرا گن بردار بھی اس کی مدد کو آگیا۔ میں بے ساختہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑ ہو گیا۔

یہ میرے لیے ایک غیر محسوس اشارہ تھا کہ اب مجھے حرکت میں آ جانا چاہیے کیونکہ کاک بٹ کی جانب سے ایک دھماکے کی آواز ابھری تھی۔

تمام مسافروں کی نگاہیں غیر ارادی طور پر چکر وار میزمری کی سمت اٹھ گئیں۔ وہ آواز اس نوعیت کی تھی جیسے ایک شخص نے

کسی دوسرے شخص کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا ہو۔ میرے دل نے پکار کر کہا..... ڈاکٹر سوگ ان ایشن!

میں تقریباً اچھل کر اپنی سیٹ سے باہر نکلا اور تیزی سے ڈوگ گینگ کی جانب بڑھ گیا۔ جب ڈاکٹر سوگ نے ادھر کا محاذ سن سنا لیا تھا تو میں ادھر کیوں کر خاموش بیٹھ سکتا تھا! میں جیسے ہی ان دونوں سب افراد کے قریب پہنچا جہاز کے اندر فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ آواز کی سمت تلاش کرنے میں مجھے بہ مشکل سیکنڈ کا دس واں حصہ لگا ہوگا۔ وہ فائرنگ یقینی طور پر بالائی حصے کے اندر ہوئی تھی۔

اس فائرنگ نے دونوں مسلح عکرائوں کو بھٹکا دیا اور وہ ڈوگ گینگ کو فراموش کر کے بڑی سرعت سے پیچھے ہٹے۔ ان کے عقب میں ’میں موجود تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مجھے دہاں باکرچہ کے اوپر میں نے اسی لمحے کے دوران میں ان کی آؤ بھگت شروع کر دی۔ وہ دو مختلف راہ داریوں میں تھے۔

اس گزرگاہ میں اتنی محاکش نہیں تھی کہ کوئی باقاعدہ فاصلے کی جانی اور نہ ہی اس کا موقع تھا۔ میں نے قریبی گن بردار کے ہاتھ پر ایک فرنٹ جک بک رسید کی اور جھکا کر دینے والے انداز میں نیچے بیٹھ گیا کیونکہ اسی لمحے دوسرے مسلح عکرائے نے زومل کے طور پر اپنی گن کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔

گن چلی اور گولی کی مخصوص ”ٹھک“ نے جہاز کے مسافروں کو جھنجھنے پر مجبور کر دیا۔ میرا بردت بیٹھ جانا کام آگیا۔ ورنہ وہ بے آواز گولی میرے پیچھے کے پار ہو جاتی۔ میں نے جس مسلح عکرائے کے ہاتھ پر بک مار کی تھی وہ بڑے بڑے دھکے انداز میں پیچھے کو الٹا تھا اور گن اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں ادھر ادھر ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی توجہ فائر کرنے والے شخص کی جانب مبذول کر دی کیونکہ وہ دوبارہ مجھے نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ میری مخالف سمت والی گزرگاہ میں تھا۔

اس کا گن والا ہاتھ جیسے ہی سیدھا ہوا میں نے اپنی جگہ سے ڈانڈ کیا اور سیٹوں کی بڈل روکے اوپر سے گزرتے ہوئے دوسری گزرگاہ میں پہنچ گیا۔ اس نے بھٹکا کر اپنے ہاتھ کا زاویہ تبدیل کیا۔ مگر میں اسے کسی فائر کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اس کے گن والے ہاتھ پر ایک جھپٹا مارا اور اس کے ساتھ ہی ٹریگر پر اس کی انگلی ڈب گئی۔ گن سے ایک اور بے آواز گولی برآمد ہوئی اور ایک مرتبہ پھر جہاز مسافر کی تیز چیخوں سے گونج اٹھا مگر خبریت گزری کہ سابق فائر کی طرح اس گولی نے بھی کسی مسافر کو کوئی جانی نقصان نہ پہنچایا۔

گولی دھڑکھاس میں لگی تھی جب کہ دوسری گولی نے جہاز کی محبت کا مزاج پوچھ لیا تھا۔

وہ مسکھران میری گرفت سے اپنا ہاتھ چڑانے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اس کے اسی ہاتھ میں گن دہلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کالی کو ایک تیلی کی مروڑا دیا اور ایک ہتکے سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

بڑی ٹوٹنے کی مخصوص آواز ابھری اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جہاز کے فرش پر جا گری۔ اس کے بعد محروپ شخص کے قلعے سے بڑی دردناک آواز خارج ہوئی۔ میں نے اس کے ہتکے ہوئے سر پر گھسنے کی ایک خوفناک ٹھوکہ رسید کی اور وہ بری طرح ہلکاتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ میں نے فوراً اس کی گن فرش سے اٹھا کر اپنے قلعے میں کر لی۔

اس بدلتی ہوئی صورت حالات نے مسافروں میں حوصلہ پیدا کر دیا اور پانچ بھی افراد اپنی سیٹوں سے نکل کر اس محروپ شخص پر ٹوٹ پڑے جو فرش پر پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔ میرے ہتکے کی ٹھوکہ کرنے اس کی ناک اور ہونٹوں کا کبڑا کر دیا تھا۔ مسافروں نے جس انداز میں اسے دبوچا تھا اس نے مجھے اس شخص کی جانب سے بے فکر کر دیا۔ میں تیزی سے دوسرے گمران کی طرف پلٹا جو میری لک کھا کر چند لمبے پہلے فیر کر رہا تھا۔

میں نے ڈوگ میٹنگ کو نہ کہ شخص سے دودھ ہاتھ کرتے دیکھا۔ ڈوگ ایک تندرست دو آنکھ پٹا تھا اور اس وقت اغوا کنندگان کی جانب سے اس کا دل دردناغ غم دھسنے سے بھی بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے شکار کر بری طرح رکیڈے ہوئے ہاتھ پاؤں سے اس کی خاطر خواہ توضیح بھی کر رہا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے نکل کر ادھر ادھر ہو جانے والی گن کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو اسی لمبے اپنے عقب میں مجھے راکیل کی آواز سنائی دی۔

”یہ میرے پاس ہے ڈسٹو!“ اس نے گن کو لہراتے ہوئے کہا۔

میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے ہاتھ میں گن موجود باکر مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس بار باری کے دوران میں راکیل بھی کسی وقت اپنی سیٹ سے اٹھ کر سرگرم ہو گئی تھی۔ میں نے بڑے ہنگامی انداز میں اس سے کہا۔

”تم ادھر کے معاملات پر نظر رکھو میں ادھر ادھر پر کاک چٹ کی طرف جا رہا ہوں۔ پچاس تین ہمارے ساتھی کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟“

بات ختم کرتے ہی میں نے کاک پٹ تک جانے والی

گول سیر کی جانب دیکھا۔ میری بے قرار نگاہ کو گمرانوں کے تیسرے ساتھی کی تلاش تھی۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا حالانکہ اسے اپنے دو ”مصیبت زدگان“ ساتھیوں کی مدد کے لیے فوراً اپنایا چاہیے تھا۔ اس کے غیاب کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ آٹو بیگ گن بردار اپنے بالائی ساتھیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں ہونے والی فائرنگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ہوگا۔ اس نے مسافروں والے حصے کی جانب آنے کے بجائے ادھر جا ضروری سمجھا ہوگا۔

راکیل مجھ سے کہہ رہا تھا جی نہیں میں نے اسے کچھ بولنے کو متوجہ نہ کیا اور کہا ”تم گن تھامے پوری طرح مستعد رہو۔ مجھے امید تو نہیں کہ مختل مسافران دو افراد میں اپنی بھی سکت باقی رہنے دیں کہ وہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی کسی کو اڑا سکیں لیکن پھر مجھ کی حفظ بالقدم کے طور پر کہہ رہا ہوں اگر ان میں سے کوئی اسارٹ بننے کی کوشش کرے تو بے دریغ اس کے سینے میں شگاف ڈال دینا!“

راکیل نے اثبات میں گردن ہلائی اور میں اپنی منزل کی سمت لپک گیا۔

گول سیر می پر قدم رکھنے سے پہلے میں نے عقب میں نگاہ دوڑا کر مسافروں والے حصے کا جائزہ لیا اور وہاں کی صورت حالات کو ”کلی بخش“ پایا۔ مسافروں نے اندھا دھمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں گمرانوں کی ایسی کم تیزی کر دی تھی۔ میں مطمئن انداز میں پلٹ گیا۔ اور اسی وقت مجھے ایک زوردار دھچکا لگا۔

سیر می والے حصے میں سے انسانوں کا ایک ریل یا بھنگلا۔ وہ کل بارہ یا کم بیش اتنے ہی افراد تھے۔ ان کے لباس دیکھ کر مجھے ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ جہاز کے قلعے سے متعلق تھے۔ مجھے انہی لوگوں کا دھچکا لگا تھا اور میں ان میں خلط ملط ہو کر رہ گیا تھا۔ میں جہاز کی ایک ”دیوار“ سے ٹکا اس ”انقلاب“ کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بالائی حصے کی جانب سے حرکت کرنے والے ڈاکٹر مونگ ریٹوٹنے کی آواز ابھری۔

”بے فکر ہو کر جاؤ۔ وہاں کے حالات کو کنٹرول کر لیا گیا ہے۔“ وہ جھگڑے کے انداز میں کاک پٹ سے نکلنے والے قلعے کے افراد سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز میں بڑا اعتماد اور تسلی پائی جاتی تھی ”وہاں کے مسافروں کو تم لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ انہیں اینڈ کر دو۔ ہری اپ!“

ڈاکٹر مونگ کے اسٹائل نے مجھے بتا دیا کہ وہ پائلٹ دم کے حالات پر قابو پا چکا تھا ورنہ وہ یوں کسی کماثر کے مانند

احکام صادر نہ کر رہا ہوتا۔ جب میں نے اس جانب فائرنگ کی آواز سنی تو بے نایک لمحے کے لیے ڈاکٹر کی طرف سے متحرک ہو گیا تھا پھر دوسرے لمحے میں مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور میں دونوں گن بردار گمرانوں سے نبرد آزما ہو گیا۔

جہاز کا حملہ مسافروں والے حصے میں پہنچ کر ادھر ادھر پھیل گیا تو میں بڑی سرعت سے اوپر پہنچ گیا۔ پھر وہاں کے نقشے نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ڈاکٹر مونگ مجھ سے نگاہ ملنے ہی بڑی سنجیدگی سے مسکرایا اور بولا۔

”ڈسٹو! یہاں کے حالات تو تمہارے سامنے ہیں۔ ادھر کیا پوزیشن ہے؟“

میں نے مسافروں کی ہائی کلاس اور کاک پٹ میں ادھر ادھر نظر گھماتے ہوئے جواب دیا ”ادھر سب خیریت ہے۔ دو مسلح گمرانوں پر قابو پایا گیا ہے، تیسرا ادھر ہی آیا تھا مگر یہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ یہ جہاز تو اب شاید پرواز کے قابل نہیں رہا!“ میں نے محبت تک نصب مختلف قسم کے ڈاکٹر کے حشر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں ابھی خاصی فائرنگ ہوئی تھی۔

”یہاں ہونے والی فائرنگ نے ان آلات کو غیرہ کو نقصان پہنچایا ہے۔“ اس نے بتایا ”اگر میں فائرنگ کرنے والے گاڑی بے نہ بگاڑتا تو تینوں موی زندہ نہ بچتے۔“

میں نے چونک کر ڈاکٹر مونگ کو دیکھا اور پھر تجسس لہجے میں استفسار کیا ”الاس کا کی ہائی اتھارٹیز کہیں نظر نہیں آ رہیں اور وہ انوکھ کنڈگان.....؟“

میرا سوالیہ جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور بولا ”بدھا کا شکر ہے، وہ تینوں زندہ اور محفوظ ہیں اور..... انوکھ کنڈگان کو میں نے داگی لینڈ سلا دیا ہے۔ یہاں ہونے والے صر کے کی تفصیل میں تمہیں بعد میں سناؤں گا۔ بس سمجھ لو، سب کچھ ختم دن میں ہو گیا۔

لارڈ بدھا کا بڑا احسان ہے۔“

ڈاکٹر مونگ کے مطابق اسے صرف تین ہائی جیکرز سے نمٹنا پڑا تھا۔ ایک ان کا سرخندہ جو بار بار اعلان کرتا رہا تھا۔ دوسرا شخص کو پائلٹ تھا اور تیسرا دو گن بردار تھا جو وہاں ہونے والی فائرنگ سے متاثر ہو کر اندر کھس آیا تھا۔ یہ تینوں افراد ورنہ حالت میں اس خلا میں ٹھونس دیے گئے تھے جو دونوں پائلٹس کی سیٹوں کے سامنے، پاؤں رکھنے والی جگہ پر واقع ہوتا ہے۔ یہ کارنامہ ڈاکٹر مونگ کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے بار بار کے سوالیہ انداز میں دیکھنے کے نتیجے میں ڈاکٹر مونگ نے جہاز کے پائلٹ سمیت مسٹر بردس لوئر اور اس کے دو ساتھیوں فران ہونیل وٹوئی وولمر کو اس حصے سے ”برآمد“ کر لیا جہاں اتر ہوئیں مسافروں کی خاطر تو وضع کے لوازمات جمع رہتی ہیں۔ مسافروں کی ہائی کلاس میں اتفاق سے الاس کا کی صرف بھی تین اتھارٹیز ستر کر رہی تھیں اس لیے ڈاکٹر مونگ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی مگر ورنہ جانی نقصان کا اندیشہ بہر حال تھا! اب چونکہ جہاز کے کسی حصے میں کوئی ”خطرہ“ موجود نہیں تھا اس لیے وہ اہم افراد سامنے آ گئے جن کی خاطر اس ہونگ کو ہائی جیک کیا گیا تھا۔

جہاز کا حملہ معاملات سنبھال چکا تو مسافروں کے چہرے خوشی سے دکھ اٹھے۔ یہ جان کر سب میں زندگی دوبارہ لگی تھی کہ وہ ہائی جیکرز کے چنگل سے نکل آئے ہیں۔ دو ہائی جیکرز کو حراست میں لے کر ان پر کڑی نگرانی مقرر کر دی گئی۔ یہ وہی دو افراد تھے جو مسافروں کو کنٹرول کرنے کا فرض ادا کر رہے تھے۔ میری بروقت مداخلت نے انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔

مسٹر بردس لوئر اور اس کے دونوں ساتھی بری طرح سہمے ہوئے تھے اور بار بار ڈاکٹر مونگ کا شکر یہ ادا کر رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر مونگ کو پوچھنے کے نام سے پکار رہے تھے کیونکہ ہماری طرح وہ بھی تبدیل شدہ نام سے ستر کر رہا تھا۔ ہم تینوں کے قلعے بھی تبدیل تھے۔

جب حالات قابو میں آ گئے تو جہاز کے پائلٹ گلفورڈ نے سب سے پہلے کاک پٹ میں نصف خلائی آلات اور مختلف ڈاکٹر کا طبیکی جائزہ لیا۔ اس جائزے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ جہاز فوری طور پر پرواز کے قابل نہیں رہا تھا۔

مسٹر بردس لوئر اور پائلٹ گلفورڈ کی باہمی کوشش سے ہینکریج اور سیٹل کے متعلقہ حکام کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا گیا۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ ہائی جیکرز نے وہ عیارہ زوندار آئی لینڈ کے ایک زیر بحیل اتر پورٹ پر اتارا تھا۔ زوندار آئی لینڈ میں صرف ایک باقاعدہ اتر پورٹ تھا جہاں ریگولر فلائٹس کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ یہ دوسرا اتر پورٹ جو اپنی بحیل کے آخری مراحل میں تھا، ابھی فلائٹس کے لیے کھولا نہیں گیا تھا۔ اس کے رن وے کو بھی ابھی فائل بچ نہیں دیا گیا تھا اس لیے میں نے لینڈنگ کی ناہمواری فوراً محسوس کر لی تھی۔

متعلقہ حکام نے فوری طور پر جہاز خالی کرنے کے احکام صادر کر دیے۔ اس سلسلے میں زوندار آئی لینڈ کے ریگولر اتر

پورٹ سے رابطہ کر کے ماہرین کی ایک ٹیم کو وہاں سے طلب کر لیا گیا جو مسافروں کو یہ حفاظت یہاں سے وہاں لے جاتے۔ جب تک ان کا کوئی مناسب بندوبست ہوتا، انہیں کسی پُر سکون جگہ پر ٹھہرانا ضروری تھا۔ ان ماہرین کی ٹیم میں ڈاکٹر، کیمسٹریز بھی شامل تھے جو جہاز کا باقاعدہ ”چیک اپ“ بھی کرتے کہ اس کا، زیر تکمیل اور پورٹ پر یونٹی ٹھہرا جہاں کہیں خطرناک تو نہیں!

زود تار آ کی لیٹر پر انتہائی مختصر قیام کے دوران میں مجھے اس جزیرے کے بارے میں جو چیدہ چیدہ معلومات حاصل ہوئیں ان کا تذکرہ وہیں ہی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں، میں بورونار ائر پورٹ سے معلوماتی بات چیت کر رہا تھا یا تھا اور ہوٹل ائر پورٹ کے استقبال سے بھی کافی مواد حاصل ہو گیا تھا۔

پہلی مرتبہ ایک ڈچ سیاح نے سولہ سو تیس عیسوی میں اس جزیرے پر قدم رکھا پھر اٹھارہ سو پینتالیس عیسوی میں مختلف جگہوں پر جب خانہ جنگیوں کا سلسلہ موقوف ہوا تو زونارا آئی لینڈ پر باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی اور کنگ ڈولا اول ہمسرا اقتدار آیا۔ اٹھارہ سو نوے عیسوی میں کنگ ڈولا دوم نے تخت سنبھالا۔ انیس سو تیس عیسوی میں کنگ ڈولا سوم بادشاہ بنا اور انیس سو پندرہ عیسوی میں کنگ ڈولا چہارم نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس وقت اسی بادشاہ کی بادشاہت تھی۔ کنگ ڈولا چہارم کا نام تو ہار اول تھا۔ تو ہار اول ڈولا انیس سو اٹھائیس عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ اب وہ خاصا عمر ہو چکا تھا۔ زونارا آئی لینڈ تاتھہ پینک اوٹین میں پینتالیس ڈگری تاتھہ اور ایک سو پچیس ڈگری دیٹ میں واقع ہے۔ یہ اتنا چھوٹا سا جزیرہ ہے کہ عام طور پر نقشہ جات میں اس کی نشاندہی مشکل سے ملتی ہے۔ زونارا آئی لینڈ میں بادشاہت قائم ہے۔ اس کی کل آبادی لگ بھگ پندرہ ہزار ہے اور رقبہ صرف ایک سو تیس مربع میل۔ اس کا پینچل بورونارا ہے، دوسرا "شہر" کشی ہار ہے جہاں نیا ایئر پورٹ زے فیر ہے۔ مقامی زبان زونارین اور انگش برابرہ کی اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آبادی میں اکثریت پولی نییشیاں اور یورپی افراد کی ہے۔ یہاں کی کرنسی ڈرم کہلاتی ہے۔ تین ڈرم ایک امریکی ڈالر کے برابر ہوتے ہیں۔ یہاں کی پیدوار میں کھانا، پالسی، کوکونٹ اور وینلا وغیرہ شامل ہیں۔ مصیبت کا دار و دربار مایہ گیری اور سیاحوں کی آمد و رفت پر ہے۔ یہاں کے باشندوں میں ہر دوسرے آدمی کے پاس ایک ریڈیو موجود ہے اور ہر تیس افراد میں ایک کو ٹیلی فون کی سہولت میسر ہے۔ پڑھے لکھے افراد کا تناسب اتنا ہونے

دیے تو ارباب قریب میں زونارا آئی لینڈ کا کوئی بڑی دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر دور دراز لگا دوڑائی جائے تو جنوب مشرق میں ”مڈوے آئی لینڈ“ اور انتہائی جنوب میں مشہور ”جزیرہ ہوائی“ نظر آتا ہے۔ یہی اس کے دو نمکدھاسے ہیں۔

ہم ہوٹل اتر پورٹ میں پہنچ کر تھوڑے ریسٹس ہوئے ہی تھے کہ مسٹر بردس لوٹو ہمارے کمرے میں آ گیا۔ الاسکا کی اس ہائی اتھارٹی کو ہم روک نہیں سکتے تھے لہذا اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

اب وہ خاصا ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔ جہاز کے اندر جس سرائیکی نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اب وہ دور دور نظر نہیں آ رہی تھی۔ جہاز کے زمین سے لگنے اور متعلقہ حکام سے رابطہ ہو جانے کے بعد اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور اس وقت وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ واقعی الاسکا کی ہائی اتھارٹی لگ رہا تھا۔

”مسٹر یوآن ماؤ!“ اس نے ڈاکٹر موگ ریفوشے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”آپ لوگوں نے آج جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔“

اس گفتگو سے پہلے ہمارا مختصر تعارف کر دیا گیا تھا۔ میں اسلوا اور راکیل گارشیاسیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر موگ نے احتیاط کے تقاضے سمجھتے ہوئے ہمارے ضروری کاغذات بھی اسی مناسبت سے تیار کر دیا تھے۔ ہم دونوں دوست تھے اور مسٹر یوآن ماؤ نے ملے بہترین آئے تھے اور اب وہ ہمارے ساتھ سیٹل جا رہا تھا۔

یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ ڈاکٹر موگ بہترین میں یوآن ماؤ کے نام سے رہائش پذیر تھا اور وہاں ایک مارشل آرٹس سینٹر چلاتا تھا۔ اس کے اصل نام اور کام سے قابل اعتماد اور قریبی لوگ ہی واقف تھے۔ ہم تینوں اس وقت تبدیل شدہ طبلوں میں تھے۔ میرا اور راکیل کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن ڈاکٹر موگ کی طرف سے مجھے ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ اس نے تو اپنی چوٹی تک کاٹ ڈالی تھی طبلے میں رو بدول الگ تھا۔ بردس لوٹو اس کی طرف سے کسی بھی وقت ٹھک سکتا تھا۔

”ہم نے جو کچھ بھی کیا“ وہ انسانیت کے ناتے ہمارا فرض بننا تھا۔“ ڈاکٹر موگ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اس انخوس ناک واقعے کو ہم نے جس طرح ٹھیک کیا ہے اس سے آپ کو مارشل آرٹس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔“

”بالکل..... بالکل.....“ وہ اثبات میں سر ہلاتے

ہوئے یوآن ”یہ تمام تر فنون واقعی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔“ ”مجھے امید ہے“ آپ انگریج میں میرے سینئر کی سرپرستی کریں گے۔“ ڈاکٹر موگ نے کہا۔

”بے شک!“ بردس لوٹو نے بڑے قطعی اور تعاون آمیز لہجے میں کہا ”میں تمہارے نام اور مارشل آرٹس سینٹر سے تو واقف ہوں لیکن روبرو آج پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہے۔ تم فکر نہ کرو مجھ سے جو بھی ہوگا میں تمہارے سینئر کی ترقی کے لیے ضرور کروں گا۔“

”تھنک یو سوچ!“ ڈاکٹر موگ نے تشکرانہ انداز میں گردن کو جھکاتے ہوئے کہا۔

میرے سنے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ یہ جان کر قدرے تسلی ہوئی کہ بردس لوٹو ڈاکٹر موگ کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ تاہم ایک کاٹنا سا بدستور میری سوچ میں نہہر رہا کہ جب بردس لوٹو بہترین میں ڈاکٹر موگ کو سینٹر بلاتے ہوئے گاہک کے تاثرات کیا ہوں گے۔ وہاں ڈاکٹر موگ اپنے اصلی طبع بشمول چوٹی کے روہ رہا تھا۔ یہ ایک ایسا گھبرائیل تھا کہ اس پر ڈاکٹر موگ سے بات کیے بنا میری تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔

بردس لوٹو نے بڑے سرسری انداز میں کہا ”میں دراصل اس وقت آپ لوگوں کو ایک اہم اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے اعلیٰ حکام اور متعلقہ تمام افراد سے بڑی مفصلی بات چیت کر لی ہے۔ ہماری یہاں سے روانگی کل دن میں گیارہ بجے ممکن ہو سکے گی۔ یورونارا اتر پورٹ سے کل گیارہ بجے ایک فلائٹ ہوو لو (جزیرہ ہوائی) جانے والی تھی۔ اس فلائٹ کو ہنگامی بنیادوں پر کیسل کر کے ہمارے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ ہم کل گیارہ بجے مذکورہ فلائٹ سے سیٹل روانہ ہو سکیں گے۔ آپ لوگ اطمینان سے لمبی تان کو سوجھاؤ۔ صبح آرام سے اٹھو پھر ملاقات ہوگی۔“

میں نے قدرے اچھے ہوئے انداز میں کہا ”مسٹر بردس لوٹو! جس فلائٹ کا آپ.....“ ”نہ کہہ کر کیا ہے اس کے ریگولر مسافروں کا کیا ہوگا۔ وہ تو اس سیٹ اپ سے سخت برہم ہوں گے!“

”ان کے لیے قہارل بندوبست کر دیا گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”یہ بات ایسے کہہ رہا تھا جیسے کسی مرکزی سڑک کی تعمیر ہو رہی ہو اور اس سڑک سے ریگولر گزرنے والوں کے لیے ”قہارل راستہ“ کا پورڈ نصب کر دیا جائے۔ میں نے پوچھا ”کس قسم کا قہارل بندوبست کیا گیا ہے؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے یوآن ”اسی اتر پورٹ سے دوپہر دو بجے ایک فلائٹ جی جانے والی ہے۔ اس فلائٹ میں اچھی سی مینجمنٹ تھی۔ ہوائی جانے والی فلائٹ کے مسافروں کو (FID) جانے والی فلائٹ میں بٹھایا جائے گا۔ مذکورہ فلائٹ ہوو لو میں بریک جرنی کرے گی پھر اپنی منزل جی کی طرف روانہ ہو جائے گی۔ ہوو لو (جزیرہ ہوائی) کے مسافر راستے میں اتر جائیں گے۔ بس اتنی سی بات ہے!“

”یہ جو بس اتنی سی بات ہے..... یہ خاصی بڑی بات ہے مسٹر بردس لوٹو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اٹر ٹیک کے آنکھوں میں ایسی تبدیلیاں کرنا کوئی..... معمولی کام نہیں۔“

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے یوآن ”لیکن جب ہمارے اعلیٰ حکام اوپر سے ڈوریاں ہلاتے ہیں تو ہر نامکن کام ممکن ہو جاتا ہے۔“

اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا ظفر خراسا بھرا آیا۔ یہ مخصوص احساس امریکا بھار اور پوری یہودی قوم کا طرہ امتیاز ہے۔ میں نے بردس لوٹو کے دعوے کے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور محض گردن کو اٹھائی جنبش دے کر رہ گیا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہمیں ”گڈ نائٹ“ کہہ کر کمرے سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر موگ سے کہا ”میرے خیال میں ابھی خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بردس لوٹو آج پہلی مرتبہ یوآن ماؤ سے بالمشافہ ملا ہے۔ تمہارا یہ بدلا ہوا طبع اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ جائے گا۔ خواہ کتنے گان سے نٹنے والا واقعہ اتنا بڑا اور اہم ہے کہ بہترین میں یہ شخص تم سے ضرور ملے گا۔ وہ الاسکا کی ہائی اتھارٹی ہے۔ تمہارے لیے ذہنی شکل ہو جائے گی ڈاکٹر موگ۔ تم اس تبدیل شدہ طبع کے ساتھ تو اپنا مارشل آرٹس سینٹر چلا سکتے۔“

”میرے لیے اور چوٹی کے مسائل تو اس وقت درپیش ہوں گے جب میں بہترین پہنچوں گا۔“ ڈاکٹر موگ نے پُر وقیع انداز میں کہا ”نی الحال تو میں فوری طور پر اس شخص سے بان چڑانے کے بارے میں ذہن دوڑا رہا ہوں۔ اگر یہ مارے ساتھ چکا رہا تو سمجھ لو سیٹل پہنچ کر ہمارا جلوس نکلے گا۔ ہم پریس اور پولیس کے جمعیلوں میں ایسے پھنس لے کر ہمارا راز راز نہیں دے سکے گا..... اور یہ بہت برا ہوگا۔“

تھوٹیں ناک انداز میں بات ختم کر کے ڈاکٹر موگ اموش ہوا تو میں نے کہا ”میں بھی اس جزیرے ”زونارا“ پر رننے سے لے کر اب تک اسی نکتے پر غور کر رہا ہوں۔ اگر ہم

نے خود کو ان ہائی اتھارٹیز سے الگ نہ کیا تو ہمارا مشن تو کھوٹا ہوگا ہی اس کے ساتھ ہی یہ راز بھی فاش ہو جائے گا کہ راکیل اور وہاں یوآن ماؤ کی بناء میں ہیں پھر یہودی لابی یہ جاننے میں قطعی دیر نہیں لگے گی کہ یوآن ماؤ کا تعلق بدھ ازم سے ہے اور پھر وہ لوگ کڑی سے کڑی ملاتے جائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

ڈاکٹر موگ نے خلا میں گھومتے ہوئے بڑے پُر معنی انداز میں گردن ہلائی۔

راکیل کا پی دیر سے خاموش بیٹھی ہمارے بائین ہونے والی گفتگوں سے رہی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ راکیل ڈاکٹر موگ کے سامنے بڑی باادب پاملاحظہ ہو شیار رہتی تھی۔ اس معاملے پر اس نے لب کشائی کی اور مشورہ دینے والے انداز میں بولی۔

”میرا خیال ہے“ ہمیں اس ہوٹل سے غائب ہو جانا چاہیے۔“

میں نے اور ڈاکٹر موگ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ڈاکٹر نے صرف ایک لفظ میں استفہار کیا ”کہاں؟“

”کہیں بھی۔“ وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولی۔

میں نے کہا ”اس وقت ہم ایک جزیرے پر ہیں یعنی ہمارے چاروں جانب تاحہ نگاہ بانی ہی پانی ہے۔ اگر ہم اس ہوٹل سے سب کی نظریں بھا کر نکل جاتے ہیں تو اول آخر زونارا آئی لینڈ پر ہی رہیں گے۔“ ایک لمبے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ”کیا تمہارا مستقل طور پر اسی جزیرے پر رہنے کا ارادہ ہے؟“

وہ بوکھلا گئی پھر ذرا تامل کرتے ہوئے بولی ”میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اس وقت تک اس جزیرے میں کہیں روپوش ہو جاتے ہیں جب تک گیارہ بجے والی فلائٹ یورونارا اتر پورٹ سے ٹیک آف نہیں کر جاتی۔“ وہ ایک لمبے کا توقف ہوئی پھر اپنی تجویز کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”زیادہ سے زیادہ احتیاط برتتے ہوئے ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جی کی طرف جانے والی فلائٹ کے اڑنے کا انتظار کر لیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے بردس لوٹو کی جانب سے کوئی ”خطرہ“ نہیں ہوگا۔ آئندہ کے بارے میں بعد میں سوچا جاسکتا ہے۔ اس جزیرے سے نکلنے کے لیے ہم یہ بہانہ کر سکتے ہیں کہ ہم سیر تفریح کے لیے ذرا ہوٹل سے نکل گئے تھے پھر کسی ایسی معیبت میں پھنس گئے کہ بروقت ہوٹل یا اتر پورٹ نہیں پہنچ سکے لہذا ہمیں آئندہ کسی ممکنہ فلائٹ سے سفر کی اجازت دی جائے۔ ہم ایک پائدار لائحہ عمل تیار کرنے کے بعد یہاں سے



دوسرے سے چار ہو گئیں۔

راکھل نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے کہا

”ڈاکٹر موگ کہاں گیا ہوگا؟“

”اگر میں تمہارے سوال کا سیدھا سیدھا جواب دوں تو تم کہو گی میں تمہیں ادھر ادھر کھارہا ہوں۔“ میں نے ایک طویل جماعتی لیتے ہوئے کہا ”بہر حال وہ تمہارے سامنے و گیا اور تم نے دیکھا ہے وہ کچھ بھی بتا کر نہیں گیا۔“

”میں تمہارا اندازہ جانا چاہتی تھی؟“ وہ قدرے کھٹا ہو گئی۔

”نی الحال میں اندازہ کاری کے موڈ میں نہیں۔“ ہم نے رستہ واضح پر گناہ ڈالتے ہوئے کہا ”مجھے شدید نیند آ رہی ہے..... پھر ڈاکٹر نے بھی ہدایت کی ہے، ہمیں اچھے انسانوں کی طرح چپ چاپ سو جانا چاہیے۔“ بات ختم کرتے ہی ہم نے ایک اور جماعتی لے ڈالی ”ڈاکٹر کو فافا کو کتنا مفید ہوتا ہے۔“

راکھل باتوں کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ میں جا تھا، اگر میں نے اس کی تمویزی حوصلہ افزائی کی تو پھر تمویزی دیر بعد زوردار کا سورج ہماری آنکھوں کے سامنے ظور ہوگا۔ میں ڈاکٹر موگ کی اس بات سے صدفیدہ شفق تھا کہ نہیں آنے والا دن ہمارے لیے کون سے ہنگامے لانے والا تھا۔

میں نے ایک اور طویل جماعتی لی اور ڈاکٹر موگ ہدایت کے مطابق لمبی تان کر سو گیا۔ اس لمبی تان کی بھی ایک حد تھی۔ سونے سے پہلے میں نے اپنے دماغ کو دو گھنٹے ہر شام پیشانی بیداری کا حکم دے دیا تھا۔ ذیلی ہدایت کے علاوہ نہیں۔

☆☆☆

ٹھیک سات بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گہرا میں وقت دیکھا تو پتا چلا میری نیند کے دوران میں کوئی معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا ورنہ مقررہ دو گھنٹے سے پہلے میں بیدار ہو جاتا۔

میں نے راکھل پر نظر ڈالی تو وہ مجھے بے خبر سوتی ہوئی۔ میں نے اس کے قریب جا کر مابہرہ جائزہ لیا۔ وہ وقت گہری نیند میں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ اس کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ دو گھنٹے زراہم کے باوجود بھی ڈاکٹر موگ ابھی تک وہاں نہیں لوٹا تھا۔ لہذا ذیل زمین میں یہ آیا کہ ممکن ہے وہ واش روم میں ہو۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور واش روم میں ڈاکٹر موگ چپک کر نے کی کوشش کی۔ واش روم مجھے خالی ملا۔ اس کا

ردانہ ہونے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ کسی کو بھی ہمارے کمرے پر شک نہیں؟ ہمارے پاس ایسے تمام ثبوت موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں ہم ڈیڈیو اے کے اس طیارے کے مسافر ہیں جو ہینکریج سے نیشنل چار ہا تھا..... اور اب وہ طیارہ کاشی ہمارے زیر تحویل ایئر پورٹ پر کھڑا ہے۔“

بات ختم کر کے راکھل نے داد طلب نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ اس کے شیطانی دماغ میں واقعی ایک وزنی منصوبہ آیا تھا لیکن میں نے ایک خاص پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بے شک تمہاری تجویز بہت عمدہ اور پیش آنے والے حالات کے عین مطابق ہے مگر میرے خیال میں بروس لوئر آسانی سے ہماری جان نہیں چھوڑے گا۔ ہماری حیثیت اس آریٹشن کے سرجنوں جیسی ہے۔ وہ ہمیں ہر ممکن طریقے سے تلاش کروانے کی کوشش کرے گا اور اگر اسے اس کوشش میں ناکامی ہوئی تو پھر وہ کچھ ایسا بندوبست ضرور کر جائے گا کہ ہم جیسے ہی یہ جزیرہ چھوڑنے کے لیے ایئر پورٹ پہنچیں، ہمیں بڑے تپاک سے ”خوش آمدید“ کہا جائے۔ سمجھ رہی ہوں؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور الجھن بھرے انداز میں بولی ”پھر کیا کریں؟“

”نی الحال کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ڈاکٹر موگ نے بڑے غم سے ہونے اور فیصلہ کن لہجے میں کہا ”صبح دیکھیں گے کیا کیا جا سکتا ہے۔ تم دونوں آرام سے سو جاؤ۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کا سونے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

”اور تم؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ سرسری انداز میں بولا ”مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔ اس کمرے میں بند بیٹھے سے بھرتے ہیں ایک چکر نیچے کا لگا آؤں۔ میں کمرے کی چابی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں تاکہ جب واپس آؤں تو تمہاری نیند میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔“ وہ دروازے کے قریب جا کر کارڈ اور تائیدیہ انداز میں بولا۔

اس رات کا جو جوڑا بہت وقت باقی بچا ہے اسے باتوں میں نہ گزاردینا۔ اچھے انسانوں کی طرح سکون سے سو جاؤ۔ کل کا سورج بتائیں ہمارے لیے کون سے ہنگامے لے کر آنے والا ہے!“

بات ختم کرتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور ایک لفظ مزید بولے بغیر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہماری نگاہیں بند دروازے سے گھرا کر واپس آئیں پھر ایک

ہی مطلب تھا اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی..... اس مطلب نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

میں ڈاکٹر سوگ کے خیال کو ذہن میں بٹھا کر دواش روم میں ٹھس گیا اور چندہ منٹ بعد فریش اپ ہو کر باہر نکل آیا۔ اب میرے ذہن میں ساحل کا خیال رجسٹریں چکا تھا۔ راکیل ہنوز گہری نیند میں تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کروں۔ ممکن ہے میرا تصور اس کے کل وقوع تک پہنچے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر ایک مرتبہ مجھے اس کی درست لوکیشن کا اندازہ ہو جاتا تو میں اڑ کر اس تک پہنچ جاتا۔

میں نے سوچی ہوئی راکیل پر ایک آجپتی کی گاہ ڈالی اور ایک آرام پیئر پر ہم دروازہ ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے مذکورہ کرسی کو شمال رخ کر لیا تھا۔ شمال سے جنوب کی سمت پہنچنے والی مقامی لہریں اس قسم کی ارتعاشی مشقوں اور مراقبہ جات کے لیے بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے چار پانچ گہری سانس لیں۔ سانس لینے کا یہ مخصوص انداز یوگا کی نفث میں پرانا نام (PRANAYAM) کہلاتا ہے۔ اس عمل کی پیمائش کے بعد میں نے ساحل کے سراپا کا تصور کیا۔ اس کے خال و خط کو اپنے خیال میں ابھارنے کی کوشش کی۔ اس وقت میری پوری توجہ صرف اور صرف ایک نقطے پر مرکوز تھی اور وہ نقطہ تھا..... ساحل! میرے تصور کی بے قرار موجیں میرے خیال کی بے چین لہریں اس ساحل کی آغوش میں سر گھٹا چاہتی تھیں! اس مہربان سائے میں پناہ کی تلاشی تھیں۔

نی ڈبلیو اسے کی پرواز ہوا رہتے ہی میں نے ساحل کو کھینچنے کی کوشش کی مگر اور وہ مجھے کسی اثر پورٹ کی نوبت میں نظر آئی تھی لیکن کس اثر پورٹ پر؟ یہ جاننے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ میں نے اس کھوج کے بارے میں ڈاکٹر سوگ یا راکیل کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ڈاکٹر سوگ نے انکرتہ نہ بنے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جی کی او. ن. حاجت کو بار بار آزماتا رہوں۔ میری باتیں آٹھ (THIRD EYE) کھل چکی ہے۔ پمیل گیٹھنے کے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر میں مشق کو جاری رکھوں گا تو کچا پن کے پتے جن میں بدل جائے گا۔ مجھے پمیل گیٹھنے کے استعمال میں مہارت حاصل ہو جائے گی..... اور ڈاکٹر سوگ کے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔

مجھے ساحل کا تصور کے بمشکل ایک منٹ گزارا ہوا کہ اس پر دس کا سراپا میرے تصور کی نگاہ میں روشن ہو گیا۔ میں نے بڑی وضاحت سے اسے دیکھا۔ وہ ایک آرام دہ کاؤچ پر

دراز تھی! ایک دم چٹ..... اور اس وقت اس کی آنکھیں ٹھس..... دونوں بازو پھلوؤں میں دروازے تھے۔ وہ کچھ پوزیشن میں لیٹی تھی جیسے اس دروازی میں اس کی مرضی شامل ہو بلکہ کبھی ہدایت پر اسے یوں لیٹا پڑا ہو۔ وہ جس کا کای چٹ پڑی تھی ایسے کاؤچ پر تو اسپتال میں ہوتے ہیں ماہرین نفسیات کے کلینک میں۔

کیا ساحل بیمار ہے؟ میرے ذہن نے ایک لمحے لیے سوچا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں ساحل کے تصور رہتے ہوئے اس کمرے کا جائزہ لینے لگا جہاں ایک کاؤچ پر وہ موجود تھی اور دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ کہ ساحل کی اسپتال میں تھی اور نہ ہی کسی نفسیاتی کلینک بلکہ وہ ایک بیدار دم رہی تھی!

میں بیدار دم میں ایک محال پاتی جی کاؤچ کے پار میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کمرے میں مجھے کسی اور طرح موجودگی کا احساس ہوا۔ کوئی با آہستگی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میرے تصور کی نگاہ کسی حساس کمرے طرح ریڈ الارٹ ہوئی! پھر دوسرے ہی لمحے نوادہ میرا میں آ گیا۔ میرے تصور نے اسے فوکس کر لیا تھا اور فوکسنگ کے بعد مجھے ایک شدید ترین جھٹکا لگا۔ وہ فوکس ہونے لگا تھا۔

میں اس دروازہ کا قوت اور طویل العمری کو ایک نظر پیمان کیا اور اس پیمان نے میرے تصور کی نگاہ میں جلو بھری۔ میری ساحل ایک مرتبہ پھر اس عیار ربی کے چنگل چا پھنسی تھی۔ وہ بڑے سچے قدموں سے اس کی چم بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ساحل کو کسی خاص تگزارنے والا ہو..... یا عمل سے گزار چکا ہو اور کارکردگی چیک کرنے آیا ہو۔ ساحل کا کسی جی کاؤچ پر جس درخت پر سے ہونا مجھے بہت بکسوچنے پر مجبور کر رہا تھا اس مرتبہ میں نے کوئی جذباتی غلطی نہیں کی اور اپنی تمام ذرا ربی کی سرگرمی پر مرکوز کر دی۔ اس مستقل مزاجی اور قدیم نے میرے تصور میں کوئی رخنہ نہیں آنے دیا۔

رہی موٹے ہاتھیں ساحل والے کاؤچ کے نزدیک کر رک گیا۔ چند لمحے وہ بڑے انہماک سے اس کے چہرہ دیکھتا رہا پھر مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس کے منہ مجھے بتا دیا وہ اپنی کوئی کارگزاری چیک کرنے آیا تھا۔ اس کی حالت اور پوزیشن جیج جیج کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ تو نی عمل سے گزارا گیا تھا۔ وہ پتا تک نیند میں تھی۔ میں اس بیدار دم کو دیکھ کر قطعاً یہ اندازہ نہیں لگا سکا

تارل انداز میں کہا "دراصل میں یہ دیکھنا چاہتا تھا تم مجھے غصے میں دیکھ کر کیا رد عمل ظاہر کرتی ہو۔" "پھر دیکھ لیا؟" وہ بے یقینی سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا "تم بڑی برداشت والی لڑکی ہو۔"

اس کی نگاہ میں میری وضاحت کے لیے بے اعتباری موجود رہی! شاکی لہجے میں بولی "میں سمجھ رہی ہوں تم مجھے بھلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم خود ہی نہیں بتانا چاہتے تو میں امرار نہیں کروں گی۔"

وہ دقتی پسائی کا مظاہرہ کر کے بڑی حتمی کا ثبوت دے رہی تھی۔ میں نے موضوع کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا "کیا ڈاکٹر سوگ ابھی تک واپس نہیں آیا؟"

اس سے پہلے کہ راکیل میرے سوال کے جواب میں کچھ کہتی کمرے کا دروازہ کھلا اور تذکرہ ہالا ٹھس اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں نے سنی خیر لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر میں نے ڈاکٹر سوگ سے پوچھا۔

"تم تو ذرا سی ٹہل قادی کرنے گئے تھے۔ پورے تین گھنٹے بعد لوٹے ہو۔ خیریت تو کئی؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے دیوار کلاک کی جانب اشارہ کیا۔ کلاک کی سوئیوں آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ڈاکٹر سوگ ایک کرسی سنبھالنے کے بعد بولا۔

"نگہ بندی والی کوئی بات نہیں۔ میری چھل قادی تو بڑی دروازہ ہو گئی تو میں نے سوچا کچھ اپنا بندوبست بھی کر ہی لیا جائے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"راکیل کی تجویز مجھے عملی لگی ہے۔ ہمیں پہلی فرمت

کر دے کہ اس عمارت میں اور وہ عمارت کس شہر کس ملک میں واقع ہے۔ اگر میرے تصور کی نگاہ کو اس بیدار دم سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا تو میری مراد یہ آ سکتی تھی۔ میں نے رہی موٹے ہاتھ کو اپنا ٹارگٹ بنالیا۔ اگر وہ بیدار دم سے نکلتا تو میں ساحل کیڑیں اور ٹریک کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

ایک منٹ کے تعقیدی جائزے کے بعد رہی مڑا اور ایک قدموں سے دروازے کی سمت بڑھا۔ میرے تصور کی آنکھ کو اس کی پشت پر چپک کر رہ گئی۔ وہ بیدار دم کے دروازے پر پہنچ کر روکا مگر ساحل پر ایک بھر پور نگاہ ڈالی اور جیسے ہی اس نے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا سب کچھ برہم ہو کر رہ گیا۔

راکیل کی تیز آواز نے میرا تصور ہاش ہاش کر دیا۔ میرے وجود کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے ہڑبوا کر آنکھیں کھولیں۔ وہ آواز دینے کے ساتھ ہی کندھے سے پکڑ کر مجھے بھجوز بھی رہی تھی۔ اس کے یہ الفاظ میری ساعت تک پہنچے۔

"وہ جان! کیا تم جیسے جیسے سو گئے۔ کھڑکی سے باہر نکلو اس جڑے کی کھنکھائی ہے۔"

"جہنم میں کیا یہ جڑے اور اس کی صبح....." میں خاصی دہلی آواز میں چلا گیا۔

راکیل کھڑکی سے ہٹ گئی اور میرے سامنے آ کر نرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ "تمہیں کیا ہوا ہے وہ جان! کد در برہم کیوں ہو رہے ہو؟" "کیا تم چند منٹ صبر کر لیتیں تو کوئی قیامت آ جاتی؟" تو بڑی دروازہ ہو گئی تو میں نے سوچا کچھ اپنا بندوبست بھی کر ہی لیا جائے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

راکیل کی بے جا مداخلت نے میرے کپے کرائے پر زنی بھیر دیا تھا۔ میری برہمی اور ناراضی اپنی جگہ درست تھی لیکن جب میں نے حقیقت پسندی سے سوچا تو وہ مجھے بے تصور نظر آئی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ میں اس وقت کتنے اہم کام میں مصروف تھا۔ وہ یہی سمجھی ہوگی! میں آنکھیں بند کیے آرام پیئر پر پمیلکس بیٹھا ہوں۔ راکیل کی ایسی ہی ایک فطری حرکت نے طیارے کے اندر بھی میرے تصور کا خانہ خراب کر دیا تھا۔

وہ بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "تمہاری حالت ٹھیک نظر نہیں آ رہی وہ جان! کیا پالم ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں اس وقت تک خود پر قابو پا چکا تھا

سپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ  
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے

**طالوت**

3 حصوں میں (مکمل)

قیمت فی حصہ 17.60 روپے۔ ڈاک فرج فی حصہ 2.25 روپے  
تین حصوں کا مجموعی قیمت 54.75 روپے

74200157

بندے نے کس قسم کا پلان بنایا تھا؟ اور یہ ہانگ چوکون تھا؟  
کی لالچ میں وہ ہمیں سوار کرانا چاہتا تھا!

پندرہ منٹ بعد ہمارے ستر ایک چھوٹے سے ریسٹور  
کے سامنے جا کر ختم ہوا۔ ڈاکٹر موگ نے ٹیکسی والے کو  
کیا اور ہمیں اپنے ساتھ ریسٹورنٹ کے اندر آنے کو کہا۔  
چون درجہ اس کی تقلید میں آگے بڑھ گئے۔

ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں تھا بلکہ رش بالکل  
تھا۔ ہمارے علاوہ صرف دو میز پر آباد تھیں اور وہ بھی خا  
فاصلے پر۔ ڈاکٹر موگ نے دیر کی آمد پر مختصر سے نا  
آرڈر یا پھر ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ اس وقت ہم دو  
سے بیک وقت مخاطب تھا۔

”انسان کی زبان کی اس دنیا میں بڑی اہمیت ہے  
ہم زبان آپ کو جہاں بھی مل جائے آپ اس کے لیے  
دل اور معمولات میں مبالغہ نش کمال ہی لیتے ہیں۔ میں مینڈ  
زبان بڑے طریقے سلطے سے بولتا اور سمجھتا ہوں۔ ہانگ  
ایک چینی ہے۔ اس کا تعلق چین کے علاقے شنگائی سے۔  
میں نے مختصر سے وقتے میں ہانگ چو سے اچھی خاصی راہ  
بنائی ہے۔ مجھے مینڈرن بولنے دیکر وہ خوشی سے پھول  
جزیرہ زونارا میں آکاڈ کا چینی بھی آباد ہیں۔ ہانگ چو  
طور پر ایک ماہی گیر ہے۔ آج لو بجے اس کی لالچ سندھ  
رواں ہوئی، پھر شام سے کچھ پہلے ہی وہ واپس لوٹے گا۔  
آج کا دن اس کے ساتھ لالچ پر گزاریں گے۔“ وہ ایک  
کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہو  
ہوا۔

”اس دوران میں دونوں پروازیں اپنی منازل  
جانب روانہ ہو جائیں گی۔ رات کو واپس آ کر سوچیں  
آجیدہ کیا کرنا ہے۔ پردس نو لڑ اور دیگر اہم افراد سے  
چھڑانے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ملے گا۔ تم چا  
میں نے اپنے ہتھکنڈوں سے ہانگ چوکو کو گہرا دوست  
ہے۔“

میں نے رست واپج پر نگاہ ڈالی اور شکر لیے  
”ساڑھے آٹھ تو بج رہے ہیں اور تم نے بتایا ہے ٹھیک  
ہمیں ہانگ چوک کی لالچ پر سوار ہونا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا  
ابھی تو ہم نے ناشائستہ شروع کیا ہے؟“

”سب ہو جائے گا۔“ وہ بڑے مطمئن انداز میں  
”اس ریسٹورنٹ سے صرف تین منٹ میں پیدل چلے گا  
ہم ہانگ چوک کی لالچ تک پہنچ جائیں گے۔ وہ جگہ بہال  
دور نہیں۔“

میں اس ”فاظتے“ سے الگ ہو جانا چاہیے اور میں نے اپنی  
روپوشی کا بڑا مقول انتظام کر لیا ہے۔ تم دونوں چلنے کے لیے  
تیار ہو جاؤ۔“

میں نے ابھمن زدہ انداز میں کہا ”کچھ معلوم تو ہو تم  
کیا انتظام کر کے آئے ہو؟“

”یہاں سے نکلنے کے بعد میں جہیں تفصیل بتا دوں  
گا۔“ وہ رسائیت سے ہولا ”ابھی تک ہوٹل میں زیادہ چہل  
پہل نہیں ہوئی۔ یہ ہمارے ”فرار“ کے لیے اچھا موقع ہے۔  
ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر نو چکر ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک لو بجے  
ہمیں ہانگ چوک کی لالچ میں پہنچنا ہے۔“

”ہانگ چو!“ میں نے حیرت بھری نظر سے ڈاکٹر  
موگ کو دیکھا۔

وہ ہولا ”کہا ہے نا یہاں سے نکلنا پھر تفصیل بتاتا ہوں۔  
دس منٹ کے اندر ایک ایک کر کے ہمیں ہوٹل چھوڑنا ہو گا تاکہ  
کسی کو ہمارے ”فرار“ کا فوری طور پر احساس نہ ہو۔ میں پہلے  
چار ہوں۔ ہوٹل سے باہر دائیں جانب سوزن کے فاصلے پر  
ایک نیندز اسٹینڈ ہے۔ تم بھی یکے بعد دیگرے وہاں پہنچو  
اور..... ہوٹل چھوڑنے سے قبل ذرا اپنے حلیوں کی چنگ ضرور  
کر لینا۔“

ڈاکٹر موگ اس وقت راکیل کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ  
ابھی ابھی سو کر ابھی تھی اور اس کا حلیہ قدرے ”منتشر“ ہو رہا  
تھا۔ میں نے فریش اپ ہوتے وقت اپنی لکٹی نیوٹی کا خاص  
طور پر خیال رکھا تھا۔ نسیم جو ہر نے کراچی میں مجھے بیک اپ  
کے جو اسرار درموز سکھائے اور بتائے تھے وہ قدم قدم پر کام  
آ رہے تھے۔ نسیم جو ہر واقعی بڑے جواہر کا مالک تھا۔

ڈاکٹر موگ بات ختم کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اس  
دوران میں راکیل داتش روم میں ٹھس چکی تھی۔ دینالی کے  
بار پر لالچ ہوٹل میں ٹیلی فونک منٹگو میں ڈاکٹر موگ نے  
راکیل کی بیڈ نیٹل مہارت کے بارے میں مجھے تفصیل آگاہ کیا  
تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد ہم دونوں مذکورہ نیندز اسٹینڈ پر ڈاکٹر  
موگ کے پاس پہنچ گئے۔

ڈاکٹر موگ نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم اس کے اندر  
بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر موگ پنچر ڈیٹ پر تھا جبکہ راکیل میرے  
ساتھ ٹیکسی کی عقبی نشست پر براجمان تھی۔ اس مختصر سے سفر  
کے دوران میں ٹیکسی میں کامل خاموشی چھائی رہی۔ ڈاکٹر  
موگ نے کچھ کہا اور نہ ہی ہم میں سے کسی نے ایک لفظ بول  
کر دیا۔ میرے ذہن میں ڈاکٹر موگ کے منصوبے کے  
حوالے سے اصل پتہ چل جی ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس خدا کے

”آئینہ یا عہدہ ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔  
راکیل نے غریبہ نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولی۔ اس کی نگاہ کا غر بجا تھا۔ بلاشبہ یہ اس کی بھائی ہوئی راہی۔

ڈاکٹر موگ نے کھانے پینے کی اشیاء پر تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا ”تم کوگ جلدی سے فارغ ہو جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

راکیل سب سے پہلے فارغ ہوئی اور میز چھوڑ کر واٹ مین کی جانب بڑھ گئی۔ ڈاکٹر موگ تیزی سے میری جانب مڑا اور سرگوشیانہ انداز میں بولا ”ڈسلا!.....! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی سوال نہ کرنا کہ وقت بہت قلیل ہے۔ میں گارڈیا کو اس گفتگو میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔“ اس کا راز دارانہ اور رجز اسرار انداز دیکھ کر میں چونک اٹھا پھر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ راکیل ایک طرح سے اس کی ماتحت تھی۔ اگر وہ اس کے سامنے ہاتھ نہیں کرنا چاہتا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا وہ بات ٹاپ ٹیکٹ ہوگی۔

ڈاکٹر موگ نے بچے تھے الفاظ میں بتایا ”میں نے ہانگ چوکوشے میں اتارنے کے علاوہ بھی ایک اہم کام کیا ہے۔ سیشن میں اپنے بڑوں سے رابطہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ طیارے کا انخواب ان کے علم میں آچکا ہے۔ وہ لوگ بھی اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ گورنمنٹ سے متعلق افراد ہمارے ساتھ تھی ہو کر سیشن پہنچیں۔ بدوس ٹولہ وغیرہ سے سیشن میں جان چھڑانا ممکن نہیں ہوگا لہذا ہمیں پہلی فرصت میں الاسکا کی ہائی اتھارٹیز سے الگ ہو جانا چاہیے اور اس کے لیے مجھے ایک منصوبہ بھی دے دیا گیا ہے۔“

وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے بڑوں کے کسی منصوبے کا سن کر میں الجھ گیا تھا۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میرے بڑوں کا حکم ہے کہ ہم اس قافلے سے سلب ہو جائیں اور حالات و واقعات میں سے ایک مناسب موقع نکال کر جاپان پہنچنے کی کوشش کریں۔“

”جاپان!“ میں تقریباً اچھل کر رہ گیا۔ تاہم آواز پر کنٹرول رکھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”اس وقت ہم ایک سوچیں ڈگری دیٹ یعنی طول البلد پر ہیں۔ ایک سو اسی ڈگری پر انٹرنیشنل ڈیٹ لائن واقع ہے۔ اگر ہم مذکورہ لائن کو

قبول کر لیں تو جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق انٹرنیشنل ڈیٹ لائن ذونارا آئی لینڈ اور ٹوکیو کے وسط میں واقع ہے۔ میں نے ہانگ چوکو ایسا سٹ کر دیا ہے کہ وہ ہمارے ٹوکیو تک جانے کا کوئی بھی مقول یا ناقول فیضی قانونی یا غیر قانونی بندوبست کر دے گا پھر ٹوکیو سے تائے پی اور تائے پی سے نیپال تک پہنچنا ہمارے لیے چند اس مشکل نہیں ہوگا۔ نیچے سیشن کی طرف جانے سے منع کر دیا گیا ہے اور ٹوکیو میں ایک ایسے بندے سے ملنے کو کہا گیا ہے جو ہمارے لیے آگے کے سفر کے انتظامات کرے گا۔“

ڈاکٹر موگ کی باتیں انکشاف انگیز تھیں۔ ہمارے پروگرام میں یہ چاک جیڈیلی خاص سسٹم خیر اور مہمانی تھی لیکن میرا ذہن اس وقت ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ابھی تک ڈاکٹر موگ کو صبح والے تجربے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں اسی ادھیڑ میں تھا کہ شاید ڈاکٹر موگ نے میری سوچ پڑھ لی۔ بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔

”وہن..... ساحل کے حوالے سے تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”کیسا؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر موگ میرے سوال کا جواب دیتا، راکیل واپس آئی ہوئی دکھائی دی۔ ڈاکٹر موگ مخصوص انداز میں کھکھراتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ ہماری بات ادھر لگا رہ گئی۔

ادھر اور اعظم ہو یا کوئی بیان بڑا اہم تھا ڈالٹا ہے۔ ڈاکٹر موگ نے میرے نازک پہلو کو چھو کر میرے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ پتا نہیں وہ ساحل کے حوالے سے مجھے کون سی خوش خبری سنانے والا تھا۔ وہ واضح طور پر بتا چکا تھا کہ اس موضوع کو راکیل کے سامنے ڈسکس نہیں کرے گا لہذا مجھے اس وقت کا انتظار کرنا تھا جب تمہاری میں اس سے بات کرنے کا موقع ملے۔ انتظار کے یہ لمحات میرے لیے قیامت خیز اور دشمن انگیز تھے۔

ناشائتم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر موگ نے تل ادا کیا اور ام ریٹورنٹ سے نکل آئے پھر واقعی ٹھیک ٹو بجے ہم ہانگ چوکو لائیج پر سوار ہو رہے تھے۔

ہانگ چوکو لائیج بڑی شان دار دار جدیہ سہولیات پر آراستہ تھی۔ ریڈیو اور اسپینڈ میٹر کے علاوہ اس میں نفاذ دہاؤ درست سمت رخ درجہ جات اور آبی تغیر تبدیل کے بارے میں بتانے کے لیے حساس آلات نصب تھے۔ ہانگ چوکو

لائیج کو چونکہ خشک (ماہی گیری) کے لیے استعمال کر رہا تھا اس لیے اس کے اندر کوئلہ اسٹوریج بھی موجود تھا جہاں بکڑی جانے والی مچھلیوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ ہانگ چوکو مرگ ہرگ پچاس سال رقی ہوئی۔ اس کی وضع قطع اور طریقہ عام مچھلیوں جیسا تھا۔ سر پر اس نے مخصوص پچی ٹوٹی لگا رکھی تھی۔

ہانگ چوکے علاوہ اس لائیج میں دو اور افراد بھی موجود تھے۔ پندرہ سالہ ہنگ لی اور پینتیس سالہ جی فان۔ یہ دونوں خشک وغیرہ میں ہانگ چوکو مدد کرتے تھے۔ ہنگ لی اور جی فان کی شہیت ہانگ چوکے ملازمین کی سی تھی۔ اس لائیج میں دیگر ضروریات کے ساتھ ساتھ آٹھ دس افراد کے کھانے پینے کا بھی بندوبست تھا۔ ہانگ چوکے اپنے ملازمین سے ہمارا تعارف سہانوں کے طور پر کر گیا تھا جنہیں وہ سیر و تفریح کی غرض سے مکمل سمندر میں لے آیا تھا۔ ہانگ چوکے انداز نے مجھے بتا دیا کہ ڈاکٹر موگ کی متاثر کن شخصیت نے یہاں بھی بہت کام دکھایا تھا۔

ہم مکمل سمندر میں ایک مخصوص رفتار سے آگے بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ذونارا آئی لینڈ کے آثار معدوم ہو گئے۔ اب ہمارے چاروں طرف تاحد نگاہ پانی پانی تھا۔ ہانگ چوکے مطابق ابھی ہم سمندر کے اس حصے میں نہیں پہنچے تھے جو مچھلی پکڑنے کے لیے موزوں ترین تھا۔

اچانک راکیل کو انجن روم اور لائیج کے مختلف حصے دیکھنے کا شوق اٹھا۔ ہانگ چوکا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ذرا سی تھکی میسر آتے ہی میں نے ڈاکٹر موگ سے استفسار کیا۔

”تم مجھے ساحل کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سچیدگی سے بولا ”مجھے اپنے بڑوں سے پتا چلا ہے کہ تمہاری سامگی ساحل کو مین مین (نویارک) پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اس وقت سخت پہرے اور حفاظت میں ہے۔ بہر حال.....!“ وہ ایک لمبے کور کا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میرے بڑے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لاؤ بڑھا ہمیں جلد کامیابی دے گا۔“

میں نے تشریح میرے لہجے میں کہا ”میری سامگی ادھر میں ہیں میں ہے اور تم مجھے اپنے ساتھ جاپان لے جانا چاہے ہو۔ یہ کسی منطق ہے ڈاکٹر موگ۔ میری ذہنی کی یہ جنگ تو ساحل کے حصول کے لیے ہے اور تم مجھے محاذ سے کھد بڑ کر ہرک میں دھکیلنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے اور تمہارے بڑوں

کے منصوبے کو سمجھ نہیں پایا ہوں؟“

اس نے بڑی سلی سے میری بات سنی اور پھر بے ہوش لہجے میں بولا ”میں تمہیں تمہارے مقصد سے نہیں ہٹا رہا بلکہ ایک چھوٹے سے بڑے محاذ پر پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جاپان ہماری منزل نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے تاہم ٹوکیو سے تائے پی اور تائے پی سے نیپال پہنچیں گے جہاں بدھ نیشنل کنڈ کی عبادت گاہ میں یہودیوں سے ہمارا اصل مرکز ہوگا۔“

”اور ساحل؟“ میں نے ابھمن بھری نظر سے اسے دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”ساحل کو بہت جلد یہودیوں کے چنگل سے نکال لیا جائے گا۔ تم بے فکر رہو وہ سیشن میں محفوظ رہے گی۔“

ڈاکٹر موگ کی وضاحت سن کر میں تھلا اٹھا۔ وہ واضح طور پر مجھے ساحل سے الگ کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ اس کا انداز بہت بہم اور قابل غور تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک سازشی سالانہ نظر آیا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے صبح والے تجربے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں بڑی اچھی طرح یہ جان چکا تھا کہ میری ساحل اس وقت ربی موٹے ہاتھن کے قبضے میں تھی۔ اب ڈاکٹر موگ نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ نیویارک کے علاقے مین مین میں تھی۔ اگر میں کسی طرح نیویارک پہنچ جاتا تو پھر ساحل تک رسائی حاصل کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہ رہتا۔ میں نے اپنے تازہ ترین خیالات کو ڈاکٹر موگ پر ظاہر نہیں کیا اور اسے بھٹتے ہوئے پوچھا۔

”تم جتنی شد و مد سے مجھے نیپال لے کر جانا چاہتے ہو اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ربی موٹے ہاتھن نے ساحل کے اندر سے دراز نکال لیا ہے جو خفیہ خانے تک پہنچا سکتا ہے..... اور اب ربی کے اشارے پر طاقت ور یہودیوں کی ایک منظم ٹیم کسی بھی وقت بدھ نیشنل کنڈ کی عبادت گاہ پر دھاوا بولنے والی ہے؟“

”پہلی بات تو یہ کہ تمہیں اپنے ساتھ نیپال لے جانا میرا نہیں بلکہ میرے بڑوں کا فیصلہ ہے۔“ وہ بڑے رساں سے بولا ”اور جہاں تک ساحل کے اندر سے کوئی راز اگھوانے کی بات ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ربی اپنی کوشش میں کامیاب ہو یا نہ ہو بہر حال وہ لوگ بدھ نیشنل کنڈ کی عبادت گاہ کو ٹارگٹ تو بنا چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اس پر چڑھائی کر سکتے ہیں۔ میرے بڑوں نے کچھ سوچ سچو..... یہی یہ فیصلہ کیا ہے۔“

گنگو کے دوران میں وہ بندہ بار بار اپنے بڑوں کے آتا تھا اور اس آڑ میں اسے فرار کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کے بڑوں کے ذکر سے مجھے چڑی ہونے لگی تھی۔ ساری دنیا کے بھیمزے رہیں ایک طرف مجھے سب سے پہلے اپنی سائل سے مطلب تھا۔ بچی اور ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میں ڈاکٹر مونگ اور اس کے بڑوں کا ساتھ دینے کے لیے شخص اس لیے تیار ہو گیا تھا کہ سائل ان کے قبضے میں تھی۔ ان لوگوں کے ایک آدمی نے سائل کو ماؤنٹ منگلے سے نکال کر بحفاظت فیئر بینکس پہنچا دیا تھا لیکن جب سے دوبارہ رہی کے آدمیوں نے اسے اڑا لیا تھا میں ایک عجیب سے تعبیر میں تھا۔ ڈاکٹر مونگ کا ساتھ دینے کے سوا مجھے کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اب صورت حال خاصی بدل چکی تھی۔ میں سائل کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گیا تھا لہذا میری ہر مجبوری اور بے بسی گھٹ کر رہ گئی تھی۔

میں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا ”کیا تمہارے بڑوں نے یہ معلوم کر لیا کہ سائل میں بینکس میں کس شخص کے قبضے میں ہے؟“

”نہیں یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔“ اس نے جواب دیا ”مگر بہت جلد میرے بڑے اس کا کھوج لگا لیں گے۔“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا ”وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہہ جاری رہی ”ڈاکٹر مونگ! اگر تم برا نہ مانو تو میں یہ جانا چاہتا ہوں تمہارے بڑوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میری سائل کو ریاست الاسکا کے شہر فیئر بینکس سے اخراج کر کے نیویارک کے پوسٹ ملاتے میں بیٹھیں میں پہنچا دیا گیا ہے؟“ میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اور وہ لوگ یہ جاننے میں ابھی تک ناکام کیوں ہیں کہ سائل کی درست لوکیشن کیا ہے اور وہ کس دشمن کے قبضے میں ہے؟“

میں نے نہایت ہی جیتے ہوئے اور اہم سوالات کیے تھے۔ وہ جلد میری گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھتا رہا مگر ضمیر سے ہوئے لہجے میں بولا ”تمہارے اندر جس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور جب تک کسی معاملے میں تمہاری تسلی نہیں ہو جاتی تمہاری روح کو سکون نہیں ملتا۔“

”لیکن رائل کا تو میرے بارے میں یہ خیال ہے کہ میں بہت بے پروا ہوں!“

”رائل کوئی الحال اس اہم گنگو سے دور ہی رکھو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اپنے سر کو مخصوص انداز میں جھکا دیا اور پوچھا ”کیا تم جس حراج کا حامل ہونا کوئی بری بات ہے؟“

میں اس دوران میں مسلسل ڈاکٹر مونگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ جب سے مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے میں اس کی اور اس کے بڑوں کی طرف سے بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ یہ حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت تھی۔

وہ بولا ”اس عادت کو برا تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے سبب معاملات میں بگاڑ اور حالات میں خرابی داغ بن پیدا ہو سکتی۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔“

”اس وقت ایسا کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے حیرت سے پچس جھپکا نہیں۔

وہ محسوس لہجے میں بولا ”میں محسوس کر رہا ہوں تمہیں میرے کہے کا اعتبار نہیں!“

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں!“ میں نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

”بہر حال!“ وہ بحث سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولا ”کسی چیز کا جاننا نہ جانا صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی ایک ہمتی ہے اور کوئی شخص کوئی قوت اور کوئی صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔ ہر جگہ حدود اور قود کا نظام لگا کر ہے۔“ وہ ایک لمحے کو راکٹر سلسلہ نظام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میرے بڑوں نے جہاں تک معلوم کیا اور جونی الحال معلوم نہیں کر سکی اس کے درمیان ایک بفر زون ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی اس کے آگے معلوم نہیں کر سکیں گے۔ کوشش جاری ہے رکاوٹ ہٹا دی جائے گی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو کوشش کا دوسرا تیسرا ذریعہ آزما لیا جائے گا۔ پراسرار علوم میں ان داؤچ اور داؤچ گچ کا سامنا لازمی ہے۔ جیٹ فریکس کا شعبہ بڑا عجیب و غریب ہے!“

”جیٹ فریکس!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں جیٹ فریکس!“ وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”جس عمل کو سادہ الفاظ میں دیکھنا گمان کیا جاتا ہے سائنس تحقیق اسے میڈیٹیشن اور جیٹ فریکس کے خانے میں دفن کرتی ہے۔“

اس کے بعد ڈاکٹر مونگ نے مجھے جیٹ فریکس (باہر الطبیعیات) پر ایک مختصر سا بیچر دے ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری ”پتی“ کی صلاحیت کی مثال بھی دی جو رفتہ رفتہ اپنے سامنے حامل حدود اور رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے اپنا دائرہ کار وسیع کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی باتیں پرمختی اور تہی برکت

تھیں لیکن میں یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا کہ وہ محسوس میری توجہ ہٹانے کے لیے ایسی عالمانہ موشگافیاں کر رہا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے بڑے سائل کا سراغ پانے میں اور وہ نہیں چاہتے کہ میں ان کے مشن کو چھوڑ چھاؤں کہ سائل کے پیچھے دوڑ پڑوں۔ اسی لیے رہی والی حقیقت کو مجھ سے چھپی رکھا جا رہا تھا۔

وہ لوگ جو کچھ مجھ سے چھپا رہے تھے میں اس تک رسائی حاصل کر چکا تھا لہذا ان کے لیے ”استعمال“ ہونے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ میرے لیے دنیا بھر کے خزانے سائل کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے چنانچہ میں نے ڈاکٹر مونگ سے دو لوگ انداز میں کہہ دیے۔

”ڈیکھو ڈاکٹر! تم نے مجھ سے دوستی کی ہے اور میں ایک دوست ہونے کے ناطے تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے تمہیر انداز میں کہا ”بدھ نکل کنڈ کی عبادت گاہ میں کون کون سے اصول خزانے پوشیدہ ہیں مجھے ان سے کوئی وجہ نہیں۔ میں سیدھا یہاں سے نیویارک جانا چاہتا ہوں۔“

”میرے بڑوں کا خیال ہے بدھ نکل کنڈ کی عبادت گاہ پر ہونے والی بیوروں کی پیلار کو صرف اور صرف تم ہی روک سکتے ہو!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”اسی لیے ہم نے اپنے مشن میں تمہیں ہر قدم پر ساتھ رکھا ہے۔ تم گزشتہ چند روز کے واقعات پر نگاہ ڈالو۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا ”اگر ہم چاہتے تو رہی موشے ہائمن کی ماؤنٹ منگلے والی پناہ گاہ سے صرف سائل کو نکال لاتے اور یہ ہمارے لیے قدرے آسان ہوتا۔ اس کے بعد بھی ہم نے تمہیں پوری اہمیت دی ہے جس کے نتیجے میں تم میرے ساتھ اب نیپال جانے والے ہو۔“

”میں نیپال نہیں نیویارک جانے والا ہوں!“ میرے لہجے میں تلقین تھی۔

وہ جلدی سے بولا ”بدھ نکل کنڈ والی عبادت گاہ سے متعلق مشن میں تمہاری جواہریت ہے وہ میں تم پر واضح کر چکا ہوں اور۔۔۔۔۔“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں مستعصر ہوا ”ڈاکٹر مونگ! تم بدھا کے پیر دکار ہونا؟“

اس نے تذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”ہاں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے لاڈ بدھا سے بھی اونچی چیز سمجھتے ہو؟“

”فطرتی نہیں!“ وہ اظہار ہی انداز میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

”مگر تم حوصلہ رکھو اور ہر گز اندیشے کو ذہن سے جھٹک دو۔“ میں نے محسوس لہجے میں کہا ”سائل کے باب تو مجھے نے مجھے بتایا تھا کہ جب بھی اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی انسانی خون کی ندیاں سی بہہ نکلیں۔ اس خزانے کے طلسم رکھنے والی کی موت مارے گئے۔ آج تک کوئی شخص اس خزانے تک رسائی حاصل نہیں کر سکا کیونکہ ہر دور کا دلائی لاما اس پیش قیمت خزانے کا نگہبان ہوتا ہے۔ میرے خیال میں دلائی لاما اور لاڈ بدھا ان معاملات کو بخوبی سنبھال لیں گے۔ میری شمولیت یا غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”لاڈ بدھا اور محترم دلائی لاما تم جیسے ہر نر مولا لوگوں ہی سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو!“

میں نے اٹل لہجے میں کہا ”ڈاکٹر مونگ! میں صرف ایک ہی صورت میں تم لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں کہ بدھ نکل کنڈ والے مشن میں سائل بھی میرے ساتھ ہوں!“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”تمہارے بڑوں کی اہمیت کے سامنے تو ایک بفر زون آن کھڑا ہوا ہے۔ اب میں ہی نیویارک پہنچ کر کوئی کوشش کرتا ہوں۔“

میں جانتا تھا میرے یہ سخت الفاظ ڈاکٹر مونگ کو بہت چبے ہوں گے۔ ان لمحات میں میں خاصا تلخ ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے کسی قسم کی ناگواری ظاہر نہ ہونے دی۔ چند لمحات تک بڑی کجوتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے ہم زندہ رہنا پہنچ کر اس موضوع پر بات کریں گے۔“

میں نے اس موقع پر اسے اس کا وعدہ یاد دلانا ضروری سمجھا اور کہا ”ڈاکٹر مونگ! تم نے مجھے بتایا تھا تمہارے بڑوں نے تمہیں تاکید کر رکھی ہے مجھ پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ میں جب اور جہاں جانا چاہوں میرے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا جائے۔“

”مجھے یہ وعدہ یاد ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”میں تمہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا

ہوں۔ مجھے ہر صورت میں نیا پارک پہنچنا ہے۔ تم اس سلسلے میں میری کیا۔ درکیتے ہو؟  
 ”میں نے کہا نا، واپس زونارا پہنچنے کے بعد اس معاملے پر بات کریں گے۔“

میں نے کڑی اور استفسار کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ ڈاکٹر موہک ریٹوٹے زونارا پہنچنے کے بعد ہمیں اپنے بڑوں سے رابطہ کر کے کئی ہدایات لینا چاہتا تھا۔

دو پہر کا کھانا ہم سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ ہانگ چو اپنے دو گھروں کے تعاون سے مای گیری میں مصروف رہا۔ یہ کام دوسروں میں کیا گیا۔ پہلا مرحلہ سچے پہلے کا تھا اور دوسرا سچے کے بعد کا۔ ہانگ چو نے ہمیں بتایا کہ کھانے کے بعد وہ صرف ایک گھنٹے تک خشک کریں گے پھر واپسی کی راہ لی جائے گی تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے زونارا آئی لینڈ پہنچ جائیں۔

دوسرا مرحلہ آغاز ہوا۔ ابھی توڑی دیڑ گزری تھی کہ ایک سنسنی خیز واقعہ پیش آ گیا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ ہمیں اپنے عقب میں زونارا آئی لینڈ کی جانب ایک لالچے کے آثار نظر آئے۔ وہ لالچہ بڑی تیز رفتاری سے ہماری سمت چلی آ رہی تھی۔ اس کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں ہمارے سر پر ہوگی۔

ہانگ چو بوجھ پر کار مای گیری تھا۔ اس کی پوری زندگی اسی سمندر میں مای گیری کرتے گزری تھی۔ اس لالچے کے چور دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹھکانا اور اس نے تشویش ناک لہجے میں ڈاکٹر موہک سے کہا۔

”مجھے کوئی کڑ بولگ رہی ہے۔“  
 ”کیسی گڑ بڑ؟“ ڈاکٹر موہک کے بجائے میں نے پوچھا۔

وہ بدستور اس لالچے پر نگاہ جما کر بولا ”نی الحال میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ لوگ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔“  
 اب ہم تینوں بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ان کا آگے بڑھنے کا انداز تو یہی بتا رہا تھا کہ وہ دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دشمن تھے تو کس کے؟ ہانگ چو کے یا ہمارے!

یہ بڑے فکر انگیز سوالات تھے۔ اس دوران میں ہانگ چو نے ادھر ادھر محکمہ پھر کر ایک ریلو اور برآمد کر لیا اور بڑی غلج میں بولا ”میں اپنی حفاظت کے خیال سے اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی

ہے۔“ اس نے بڑے باہر انداز میں ریلو کو جیب میں ڈھونڈا اور ہماری جانب دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سے بولا۔  
 ”تم تینوں توڑی دیڑ کے لیے خود کو روپوش کرلو۔ اگر خیریت گزری تو میں تمہیں باہر نکال لوں گا۔“

پھر ہمارا جواب سننے بغیر اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور لالچے کے ایک ڈھکے ہوئے حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اگر ہم اس حصے میں پناہ لے لیتے تو دوسری لالچے والے ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

ہمیں محفوظ کرنے کے بعد ہانگ چو نے نامحاذ انداز میں کہا ”جب تک میں آواز دے کر نہ بلاؤں تم لوگ یہاں سے باہر نہیں آؤ گے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں وہ کون لوگ ہیں اور کیا ارادے باندھ کر ادھر آئے ہیں!“

ہم نے اشارتی جنبشوں سے اسے یقین دلایا کہ اس کی ہدایت پر کتنی سے عمل کریں گے۔ ہانگ چو نے اس موقع پر ڈاکٹر موہک کو مخاطب کرتے ہوئے مینڈرن میں کلام کیا تھا۔ میں مینڈرن زبان سے بہ خوبی واقف تھا۔ میں نے سنا پور میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا جہاں کا ہر دوسرا باشندہ مینڈرن بولتا ہے۔

اب وہ لالچہ ہماری لالچے کے انتہائی قریب پہنچ گئی تھی۔ اس قربت کا اندازہ ہمیں اس کے انجن کے شور اور سمندری موجوں کے تھوچ سے ہوا۔ وہ یقینی طور پر ہماری لالچے سے کافی بڑی تھی۔ ہمارے ماحول میں اس قدر شور موجو تھا کہ اگر ہم بہ آواز بلند بھی گفتگو کرتے تو ہماری آوازیں اس خلیہ پناہ سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا ”موہک ریٹوٹے! اگر وہ لوگ دشمن ہیں تو پھر ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہانگ چو کی بھرپور مدد کریں۔ اس بوڑھے چینی نے ہماری بانی کا حق ادا کر کے ہمارے دل جیت لیے ہیں۔“

”صورت حال واضح ہو جانے دو۔“ ڈاکٹر موہک سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا ”اگر وہ لوگ واقعی دشمنی کرنے آئے ہیں تو انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہم ہانگ چو کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس شریف انسان نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔“

ڈاکٹر موہک کے لہجے سے چٹائی عزم جھلکتا تھا۔ اس دوران میں مذکورہ لالچہ ہماری لالچے کے قریب آ کر ٹھہر گئی تھی۔ ان کے ٹھہرنا سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ وہ لوگ ہم سے دوگنا یا دشمنی نبھانے آئے تھے۔ ہانگ چو اور دوسری لالچے والوں کے درمیان کیا مذاکرات ہو رہے تھے اس کی ہمیں خبر نہیں تھی۔

ہم نے باہر کی صورت حال جاننے کے لیے اپنی ساتھیوں کو شور سے خبردار کر دیا۔

دو منٹ بعد ہمیں چونک جانا پڑا۔ ہم نے واضح طور پر محسوس کیا چند افراد ہماری لالچے پر کودے تھے۔ اگر اپنی توجہ کسی خاص نقطے پر مرکوز کر دی جائے تو انسان کے حواس غصہ میں جبرت انگیز توانائی بھر جاتی ہے۔ ان سنسنی خیز لحظات میں ہم قوتِ شامہ کو آزار پہ تھے لہذا انتہائی شور کے باوجود بھی ہم نے اپنی لالچے پر کودنے والوں کی آواز ساعت کر لی تھی۔ اور یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ چنانچہ انہیں کس شے کی تلاش تھی؟

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا ”ہانگ چو اور اس کے ساتھیوں پر بڑا کڑا وقت آن پڑا ہے۔ ڈاکٹر موہک نے بھی محسوس کر لیا کہ ہانگ چو وغیرہ سے سخت استفسار کیا جا رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے ایک دروناک جھج جھج کے دوش پر سفر کرتے ہوئے ہم تک پہنچے۔ میں نے اس آواز کو آن واحد میں شناخت کر لیا۔ وہ میرے بھائی بھائی اور مہربان ہانگ چو کی آواز تھی میں ڈوبی ہوئی فریاد تھی۔ یقینی طور پر اسے زردوب کیا جا رہا تھا۔

میری نگاہ میں وہ مظہر محکم کیا جب کچھ عرصہ پہلے میں ساحل (دشمن) کے ساتھ بدھ تیل کنڈ والی عداوت گاہ کے خانے میں روپوش تھا اور میری تلاش میں سرگرداں ناگ پال کے ہاتھ غنڈوں نے سمجھ جاتی اور توہنجی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ ساحل کے والدین نے میرے دشمنوں کا جبر سہا لیکن میرے خلاف زبان کھول کر نہیں دی۔ میرے دل سے ایک صدائیں یا پتا نہیں یہ میری چھٹی حس کی پکار تھی! مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس لالچے پر میرے خون کے پیاسوں نے دھاوا بولا ہو اور مجھے پانے کے لیے وہ ہانگ چو کو دروناک عذاب سے مگرارتا جا رہے ہوں۔

”یہ نہیں ہو سکتا!.....!“ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر ایک جھٹکے سے اس پناہ گاہ کو خیر باد کہہ دیا۔

جلد ہی میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ہانگ چو اور اس کے دونوں ساتھی دوسری لالچے والوں کے نرسے میں زیادتی برداشت کر رہے تھے۔

وہ کل تین افراد تھے اور تینوں ہی مسلح۔ ان کے ہاتھوں میں مجھے آٹھ چھ گھنٹہ دکھائی دیں۔ میری اچانک آمد نے حملہ آوروں کو چونکے پر مجبور کر دیا۔ وہ بڑی سرعت سے پلٹے لے کر کو ان کی نگاہوں میں شناسائی کی چمک ابھری اور انہوں نے اپنا گن کو میری جانب سیدھا کیا لیکن میں انہیں کوئی موقع

دینے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے چپ کی اور لالچے سے چھ فٹ ہوا میں بلند ہو گیا۔ اسی لمحے ان کی گنوں کے دہانے کھل گئے۔ انہوں نے بے دریغ مجھے فائرنگ میں بوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا تو ان کی گولیوں کا نشانہ نہ بنا۔ دار خالی جاتے دیکھ کر انہوں نے گنوں کے بیڑ ہوا میں اٹھا دیے مگر میں نے انہیں دوسری مرتبہ زبردستی دہانے کی مہلت نہ دی۔ میں ہوا میں اپنی باڈی کو رول کرتے ہوئے ان کے اوپر آن کر اٹھا۔ میرا گنا ایسا ہی تھا جیسے وہ جنگی جہاز میں سے گرائے گئے کسی مہلک بم کی زد میں آ گئے ہوں۔

وہ تینوں اپنی کنو سمیت ایک دوسرے سے الجھ کر زمین بوس ہو گئے۔ یعنی لالچے کے فرش سے جاگے پھر میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ فرش نشین ہوتے ہوئے ایک حملہ آور کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ اسے نہتا ہوتے دیکھا تو ہانگ چو ایک لیچی فائن نے اپنی ہزیت کا بدلہ دوسرے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ تینوں بھوکے چیتوں کے مانند اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دوسرے دونوں گن بردار اٹھ کر کھڑے ہوئے تو میں نے ہوا میں اچھل کر ایک ڈبل سائیڈ فلنگ گن کھینچ لی۔ میرے دونوں پاؤں نے فرد افراد ان کے چہروں کا حراج پوچھا۔ وہ سائیڈز میں الٹ گئے۔ ہانگ چو نے لالچے میں اتنی تیزی سے چھپاؤ کیا کہ وہاں کسی رنگ فائن کا اجماع ہو سکے۔ میرے لیے اتنی جگہ بہت کافی تھی۔ میں بڑی خوش دلی سے اپنے ”کام“ میں مصروف ہو گیا۔

میرے ذہن میں وہ لمحہ نقش ہو کر رہ گیا تھا جب مجھ پر نظر پڑتے ہی حملہ آوروں کی نگاہوں میں شناسائی چمکی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور میری یہ تلاش میں اس لالچے تک پہنچے ہیں۔ ان کا انداز کھلے دشمنوں دھدھان کے نہیں بلکہ ڈسٹو کے دشمن تھے۔ اس جزیرے میں دھدھان یا ڈسٹو کی کسی سے دوستی یا دشمنی نہیں تھی۔ ان تین حملہ آوروں کی تازہ ترین دشمنی صرف ایک ہی جانب اشارہ کرتی تھی کہ وہ ہوان کا حلق ہائی بیکرز سے ہو سکتا تھا۔ ہمارے طیارے کو انہیں کرنے والے اگر زونارا آئی لینڈ پر اتارے تھے تو یہ بات یقینی تھی یہاں ان کے ساتھی ان کے حمایتی ضرور موجود ہوں گے۔ ہم نے انہیں کنگمان کا منصوبہ پر ہر خاک کر دیا تھا۔ ان کے حمایتیوں کی برہمی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے کہ حملہ آور ہائی بیکرز



کے ساتھی تھے۔

یہ تمام تر خیالات ٹیکنڈ کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن سے گزر رہے ہوں گے۔ ایسے ہیگامی حالات میں میری کھوپڑی میں نصب ذہن نامی یہ مشین کسی حساس کمپیوٹر سے بھی زیادہ فعال ہو جاتی تھی اور ہاتھ پاؤں ایک نادیہ جلال کے اشاروں پر حرکت کرنے لگتے تھے۔

میری ڈبل سائیزڈ فلٹنگ کھانے والے اٹنے کے بعد اٹھے۔ اس دوران میں میں ایک کراہنے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک سلاٹنگ کلک ماری۔ وہ ایک اسٹیپ پیچھے سرکا۔ میں نے ہوا میں اچھل کر اس کے سینے پر ایک فرنٹ ہٹنگ کلک رسید کی۔ میرا ٹارگٹ اس کا مقام قلب تھا۔

اس کے مٹنے سے ”او“ سے مشابہ ایک بے معنی آواز خارج ہوئی اور وہ گن سمیت پیچھے اٹ گیا۔ اس کے دوبارہ اٹھنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

اس دوران میں میں دوسرے حملہ آور کی طرف سے ایک لمبے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ جب تک وہ سبھل کر اپنی گن کو سیدھا کرتا میں اس کے سامنے کونٹا چکا تھا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا آئی کہ وہ فائرنگ کرنے کے بجائے اپنی گن کو لاٹھی کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے میری جانب دوڑا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اس کی آنو پیچ گن میں راڈ ٹرنڈ ہوتی نہیں ہے تھے۔ وہ اپنا ”اکاؤنٹ“ صاف کر چکا تھا۔

اس کا انداز ”اللہ دے اور بندہ لے“ والا تھا۔ میں کبھی کشاں آگے بڑھا اور اسی لمحے مجھے حملہ آور کے عقب میں ڈاکٹر موگ ریٹو نے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ ایک چوٹی ستون سے ٹک لگے بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر راکیل بھی یہ تماشا ملاحظہ کر رہی تھی۔

گن بردار نے مجھے غافل سمجھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور کپھازی کے دار کی طرح اپنی گن میری کھوپڑی پر برساتا چلی۔ میں نے ڈاکٹر موگ کا جائزہ لیتے ہوئے حملہ آور کی حرکات و سکنات کو اپنے دفاع میں نیند کر رکھا تھا لہذا اسے اپنی خوش فہمی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

اس نے جیسے ہی میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی میں نے بڑی سرعت سے فرنٹ فٹ پر حرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دونوں ہاتھوں کو سر سے بلند کرتے ہوئے ”بیزرڈ ہینڈ ٹینس“ کی ٹیکنیک کو آزمایا۔

میرے بازوؤں کے کراس نے حملہ آور کے گن بدسٹ ہاتھ کی کلائی پر ایک دھواں دھار ”پوسر“ دیا۔ گن میرے سر سے ایک ڈیڑھ فٹ پیچھے ہوا میں معلق ہو گئی۔ اس روک کے ساتھ ہی میں نے برقی رفتار سے اپنے کراس بازوؤں میں اس کی کلائی کو جکڑ لیا۔ وہ ابھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے میں نے اپنی گرفت میں آئی ہوئی اس کی کلائی کو سر دڑا دے کر ایک خوفناک جھٹکا دیا۔

بڑی ٹوٹنے کی مخصوص آواز پیدا ہوئی اور وہ شخص اپنے مٹنے سے ٹک کٹا فٹ پیچھے خارج کرنے لگا۔ میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے اس کے پیٹ میں ایک چنگی سائیزڈ کلک رسید کر دی۔

وہ قوپ میں سے نکلے ہوئے کسی خوفناک گولے کے مانند ہوا میں بلند ہوا اور نیچے پرواز کرتے ہوئے ڈاکٹر موگ کے قدموں میں جا کر۔

اسی لمحے فضا فائرنگ کی تیز تر واہٹ سے گونج اٹھی۔ میں اپنی سمجھا اس حملہ آور کو ”ہوش“ آگیا ہے جو مجھ سے دل پر ”چوٹ“ کھا کر گن سمیت پیچھے اٹ گیا تھا۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھ اور مذکورہ شخص کو بے حس و حرکت پایا۔ اسی وقت میں نے اپنے اوپر سے کسی دیوتا قاتل پرندے کو پرواز کرے ”محسوس کیا۔ بے اختیار میری نگاہ اوپر کو اٹھ گئی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ کوئی پرندہ نہیں بلکہ ڈاکٹر موگ ریٹو تھے جو ہمارے لالچ سے فٹائی کر کے حملہ آوروں والی لالچ کی طرف جا رہا تھا۔ گویا اس نے اپنے خاص الخاص فن کا مظاہرہ کیا تھا۔

بلک جیسے میں ڈاکٹر موگ کی اذان کا سبب میری سمجھ میں آگیا۔ ذہن لالچ میں مجھے ایک گن بردار کی جھلک دکھائی دی۔ ٹھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ بھینچا اس شخص نے کی تھی اور ڈاکٹر موگ نے اس کی ”مزاج برسی“ کے لیے اھر کا رخ کیا تھا۔

آن واحد میں ڈاکٹر موگ نے ذہن لالچ پر ”لیڈنگ“ کی پھر اس گن بردار کو دوسرا برسٹ مارنے کا موقع نہ دیا۔ میں ڈاکٹر موگ کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اپنی لالچ میں حاضر ہو گیا اور اسی وقت راکیل کی ایک تیز چنگ میری ساعت سے گرا لی۔

میں نے تیزی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جو اس باختہ کی پینڈر زاب کھڑی تھی۔ اس حواس باختگی کا سبب وہ شخص تھا جسے میں نے ٹک مار کر ڈاکٹر موگ کے قدموں میں

پہنچایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے آٹو بیگ گن نظر آئی۔ اس نے مذکورہ گن راکیل پر تان رکھی تھی۔ یہ خاصی تشویش ناک صورت حال تھی۔

اس شخص نے چند لمحے پہلے اپنی گن کو لاٹھی کے سے انداز میں میری کھوپڑی پر آزمائے کی کوشش کی تھی اور میں نے اس کی دائیں کلائی کا جلوس نکال دیا تھا۔ بڑی ٹوٹنے کی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور وہ فضا میں پرواز کرتے ہوئے اھر جا پہنچا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں جو گن نظر آ رہی تھی وہ بھینچا اس حملہ آور کی تھی جو ہانگ چود وغیرہ کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے جس لمحے ڈاکٹر موگ کی پرواز ملاحظہ کی، اس محسوس شخص نے مذکورہ گن کو قاتلوں میں لاکر راکیل کو نشانہ پر کر لیا۔

گن بردار کی پشت میری جانب تھی اور وہ مجھ سے شخص بارہ فٹ کی دوری پر تھا۔ مجھ سے تو اس رخ کرانے والا اس کا ہاتھ کسی تڑکی کے مانند کلائی پر لٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت تکلیف کی جس شدت سے گزر رہا تھا وہ میں جانتا تھا پھر وہ مجھے اسید نہیں تھی کہ اس حالت میں وہ فائرنگ کر کے راکیل کو کوئی نقصان پہنچا سکے گا۔ اگر اس کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو ٹرکیر دہانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ زندگی کے معاملات میں کلائی تاخیر محروم کی بیا میرا ثابت ہوتی ہے!

میں نے چشم زدن میں حساب جوڑا اور لٹکانے والے انداز میں گن بردار سے مخاطب ہوا ”تم اس وقت میرے نشانہ پر ہو۔ گن بیگ دوڑ نہ چلی کر دوں گا۔“ اس نے گن تو نہیں جھینگی البتہ بڑی سرعت اور بے چینی سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میرے لیے یہ کلائی مہلت کافی تھی۔ اس کا دھیان جیسے ہی راکیل پر سے ہٹا، میں نے لاک ڈاؤن لگاتے ہوئے تیزی سے فرنٹ رول کیا۔ یہ ایک مہکا گیٹ مل تھا۔

روٹیل کے طور پر گن بردار پوری طرح میری جانب مڑا اور گن مجھ پر سیدھی کرنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ سے کسی ورنی آٹو بیگ گن کو کنٹرول کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ شخص میری طرح محسوس بھی تھا۔ جیسے ہی اس کا گن بے دست لڑتا ہوا ہاتھ میری طرف اٹھا اس وقت تک میں روٹنگ مکمل کر کے اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔

میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا پھر ایک قدم اندر آتے ہوئے اس کے گن کے والے ہاتھ کو لیٹ آؤٹ ہلاک کیا۔ گن کے ساتھ ہی اس کے وجود کو بھی ایک جھٹکا لگا۔ اسی لمحے میں اس کے پیٹ میں ایک زوردار گھٹنا مارا۔

وہ ذبح ہوتے ہوئے کسی جانور کی طرح ڈکرایا اور

ٹوکھڑا تے قدموں سے پیچھے کی سمت گیا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے سینے میں سائیزڈ کلک رسید کر دی۔

وہ پورے گھبر میں اچھلا اور پشت کے بل اسے بنا ستون سے جا گرایا جہاں ٹھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر موگ نے کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ رہا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل کر راکیل کے نزدیک جا کر۔

میں نے آگے بڑھ کر گن کو اٹھایا اور اس کے ”اکاؤنٹ“ کو چیک کیا۔ دوسری گن کی طرح وہ بھی اپنے ہینڈل سے محروم ہو چکی تھی۔ میرے سینے سے ایک اطمینان بخش گہری سانس خارج ہوئی اور میں نے گن کو راکیل کی جانب بڑھا دیا۔ راکیل نے فوراً گن تمام لی۔

اسی لمحے مجھے اپنے پہلو میں حرکت محسوس ہوئی۔ میں برقی رفتار سے بڑھا اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ہاتھ بھی گھما دیا۔ میرا ہاتھ اس شخص کے ٹھوڑے پر پڑا جو چند لمحے پہلے چوٹی ستون سے گھرا کر زمین یوں ہوا تھا۔ مجھے اس کی ہتھ کی داد دینا پڑی کہ مجھ سے بری طرح بچنے کے بعد بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی حالت پر رحم بھی آیا کہ وہ بری طرح لہو لہان ہو رہا تھا۔ چوٹی ستون سے گھراؤنے اس کے چہرے کے مختلف حصوں کو کھول دیا تھا اور وہاں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس کی صورت خاصی خوفناک ہو رہی تھی۔

وہ حملہ کرنے سے باز نہ آیا تو مجھے بھی جواباً ہاتھ پاؤں کو زحمت دینا پڑی۔ اب اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور وہ بازو پھیلا کر مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے کوشاں نظر آیا۔ میں نے تاخیر کرنا سناں بنایا اور دعوت دینے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

میرے اس دیکھنے نے اس کے رستے ہوئے زخموں پر ٹھک پاشی کا کام کیا۔ وہ آپے سے باہر نکل آیا اور کسی برہم درندے کے مانند جھجھکاڑے ہوئے مجھ پر چھٹا۔ میں نے پہلو میں سرکتے ہوئے بڑی صفائی سے وہیلنگ چلا دی۔ اس کے منہ سے ایک دردناک آواز خارج ہوئی۔

میرے پاؤں کی ایڑی اس کی ٹھوڑی پر لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے دہانے سے خون اگلنے لگا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس کی زبان دانتوں تلے دب کر بری طرح چلی گئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے ہونٹ صاف کئے اور ایک رتبہ پھر مجھے دلوپنے کے لیے آگے بڑھا۔

میں نے اس کے ساتھ اٹھ کھڑا شروع کر دیں۔ اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر میں نے ایک چنگی راڈ

ساتھی کانی دیر سے خاموش ہے۔“

وہ مجھ سے مینڈروں میں بات کر رہا تھا۔ پیش آنے والے واقعے نے اسے ہراساں یا پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ خاصے مضبوط اعصاب کا مالک اور ”مہمان نواز“ چینی تھا۔ اس کے جذبے اور جرأت نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ میں نے دشمن لالچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی لالچ کو ذرا اس کے قریب کر دو۔ مجھے اپنے ساتھی کی طرح اڑنا نہیں آتا۔ میں ادھر جا کر دیکھتا ہوں کیا حالات ہیں!“

اس سحر کے کے دوران میں دونوں لالچوں میں اچھی خاصی ددڑی پیدا ہو گئی تھی حالانکہ جب تین مسلح حملہ آور ہماری لالچ پر کودے تھے تو یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ہانک چو انجن روم کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

”تم میرے دونوں ملازمین کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ میں لالچ کو ادھر کرتا ہوں۔“

ہانک چو کی بات ختم ہوئی تھی کہ مجھے ڈاکٹر مومگ کی جھک نظر آئی۔ وہ اس لالچ سے اس لالچ کی طرف پرواز کرتے ہوئے آ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی ”فلائٹ“ نے ”لینڈنگ“ کر لی۔ میں نے اس کی زبانی سنا تھا کہ اسے فلائٹ فائٹنگ میں مہارت حاصل تھی۔ اس کی ارضی یا فضا کی فائٹنگ دیکھنے کا تو ابھی مجھے موقع نہیں ملا تھا مگر اس کی فلائٹ کو میں نے ملاحظہ کر لیا تھا۔

اس نے لالچ میں پہنچنے ہی وہاں کے حالات کا ایک نظر میں جائزہ لے لیا پھر مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”دونوں طرف امن دمان قائم ہو گیا ہے۔“

اس کا تبرہ ہماری تسلی کے لیے کافی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا ”یہاں کے حالات کا تو تم نے جائزہ لے لیا۔ ادھر کی ساد؟“

”اس لالچ پر صرف دو افراد تھے۔“ ڈاکٹر مومگ نے بتایا ”ایک وہ جس کی فائٹنگ نے مجھے ادھر جانے پر مجبور کر دیا اور دوسرا اس لالچ کا کپٹین۔ بہر حال!“ وہ ایک لمحے کور کا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا ”اب وہ دونوں مردہ حالت میں وہاں پڑے ہیں۔“

”تمہیں اتنی دیر کیوں لگ گئی؟“ میری پوری طرح تعجب نہیں ہوئی تھی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”میں ان سے ایک کا انٹرویو لینے کے لیے تھوڑی دیر وہاں رک گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا کہ وہ لوگ ہماری خلاص

ہاں چلائی۔ وہ تھوڑا ڈنگ لگایا پھر فرماتے ہوئے میری جانب مڑا۔ میں جھکا کر دے کر دوسری سمت نکل گیا۔ وہ میری جانب پلٹا تو میں نے ہوا میں بلند ہوتے ہوئے اس کے منہ پر ہینڈ فلائنگ کلک جڑ دی۔ وہ ٹوکھڑا لیا۔ میں نے زمین پر تے ہی اس کے سولر پر بچ مار دیا۔

وہ دونٹ اچھلا اور پشت کے بل اپنے اس ساتھی پر لڑا جو میری فرنٹ پش کلک سینے پر کھاکر انا غفلت ہو گیا تھا۔ تپتے ہیں محبت میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھ سے بچنے والا اپنے قحط کی محبت میں پہنچتے ہی جسے حرکت ہو گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا جائزہ لیا۔ میں اس کے اندر رگ کی کوشش کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اس کے نیچے دے گئے غصے کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی انسان کے سینے میں یا فرام سے تھوڑا اوپر سولر ایک ایسا مقام پر جس پر ٹھوکر لگتے سب سے پہلے دل ”بے وفا“ی“ کرتا ہے۔ ان دونوں نے ہ سے ایک ہی مقام پر چڑھیں کھائی تھیں۔ لہذا وہ حالت تیز کر میں بے سادہ پڑے تھے زندگی سے دور۔ بہت ررا میں نے انفس ناک انداز میں گردن ہلائی اور باجگہ۔ چو لیہرہ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لوگ اپنے ہتھکڑ کو بری طرح مار کوٹ کر رسی میں جکڑ چکے تھے۔ لالچ کے حالات قابو میں آئے تو مجھے ڈاکٹر مومگ یغوشے کی فکر ہوئی۔ اسی لمحہ راکیل میرے قریب آگئی۔

اس نے میرے بازو سے لگتے ہوئے کہا ”ادھر تو سب ٹھیک ہو گیا۔ تاہم ادھر ڈاکٹر مومگ کا کیا حال ہے۔ وہاں تو مجھے خاموشی نظر آ رہی ہے۔“

راکیل کی بات نے مجھے چوکنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی حملہ اوروں والی لالچ کی طرف کامل سناٹے کا راج تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میں بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ڈاکٹر مومگ شہید فائٹنگ کے جواب میں اس لالچ سے اس لالچ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس لالچ میں فائٹنگ کرنے والے کی جھک دیکھی تھی لیکن اب وہاں کوئی صورت دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں دوسری لالچ کی طرف جانے کے بارے میں سوچ

ہی رہا تھا کہ ہانک چو میرے پاس آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں وہ آٹو ٹیک کن اشیا رکھی تھیں جو میری فرنٹ پش کلک کھاکر انا غفلت ہونے والے حملہ آور کے ہاتھ سے گری تھی۔

اس گمن میں چند راز ڈھائی باقی تھے۔

اس نے کبیر انداز میں کہا ”ہمیں دوسری لالچ پر جا کر وہاں کی صورت حال کے بارے میں جاننا چاہیے۔ تمہارا

میں ہی ادھر آئے تھے۔ ان کا تعلق زونا دار آئی لینڈ کے ایک ایسے گروہ سے ہے جو ہائی جیکرز کا سماجی ہے۔ ہم نے چونکہ ہائی جیکرز کا منصوبہ بنا کام بنایا ہے اس لیے وہ ہمیں تاپنے کی فکر میں تھے۔ ہائی جیکرز کے اس سماجی میزبان گروہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے ہمارے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں اور ہماری خفیہ گرائی کرنے لگے۔ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا؟ تم پر خوبی اُغلاؤ گا سکتے ہو!"

بات ختم کرتے ہی اس نے مخصوص انداز میں کندھے اچکا دیے۔ میں نے اپنے حصے میں آئے ہوئے خالص سے ختم ہوئے ان کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا تھا ڈاکٹر موگ نے گویا اس کی تصدیق کر دی۔ میں نے کہا "اس خفیہ گرائی کا آغاز ہوئی اتر پورٹ سے ہوا ہوگا۔ جب تم علی الصبح ہو گئے تھے کل کر ہانگ چو سے ملے آئے تو تمہارا تعاقب کیا گیا، پھر ہم تینوں اس طرف آئے تو تھیں تعاقب کے سلسلے میں کوئی قتل نہیں آیا ہوگا۔ جب ہم ہانگ چو کی لاٹج میں بیٹھ کر کھلے سمندر میں پہنچ گئے تو ہائی جیکرز کا سماجی گروہ ہمیں چھاپنے آن پہنچا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔"

چھٹکوں پر چاروں یعنی ہانگ چو اور ہم تینوں کے درمیان مورچہ بازی ہوئی۔ ہانگ چو نے اپنے دونوں ملازمین کو زیر حراست حملہ آوروں کے سامنے کی گمراہی پر مامور کر دیا تھا۔ وہ ہم سے اتنے قاصدے پر تھے کہ ہماری آواز ان کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے ہم اہمیت کا خاصہ دیکھتے انداز میں بات کر رہے تھے۔ ملازم آخر ملازم ہی ہوتا ہے اسے ملازمت تک ہی محدود رہنا چاہیے!

اس صورت حال نے ہانگ چو کو قدرے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہمیں دقتی پناہ دے کر بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا تاہم اس نے ہم سے کوئی شکوہ شکایت کرنے کے بجائے ڈاکٹر موگ سے استفسار کیا۔

"تم نے جس بندے سے پوچھ کچھ کیا ہے کیا اس نے اپنے گروہ کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟"

"وہ شنی موگ کا نام لے رہا تھا!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ہانگ چو گہری تشویش میں گھر گیا اور زیر لب بڑبڑایا "شنی ماٹا!"

"کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

اس کے چہرے کے تجزی سے بدلتے ہوئے تاثرات نے مجھے ایک تعبیر میں ڈال دیا۔ وہ میرے سوال کے

جواب میں بولا "شنی ماٹا، سنگ تو ہمارا ڈولا چہارم کا ہے!"

"اوہ!" میں ایک پر نظر سانس خارج کر کے رہ گیا۔ مکان کا ایک بندہ ہائی جیکرز کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ کیا شنی خاندان بھی اس سازش میں ملوث ہے؟ وہ ٹہنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "نہیں ایسا! نہیں۔" پھر ہانگ چو نے ہمیں قہقہہ دیا۔

"دراصل شنی موگ سنگ کے مخالف گروپ سے تعلق ہے۔ یہ ایک طرح سے فتنہ پرور ڈولا ہے جن کا سرخرو کا بیچ بچا شنی موگ ہے۔ سنگ ڈولا ڈولا ڈرینے سے محروم ہے اس کی صرف ایک بیٹی ہے۔ رسانی نامی یہ لڑکی سنگ کی ترقی کا مرکز ہے۔ وہ رسانی کو زونا دار آئی لینڈ کی ملکہ بنانے ہے اور اس کی شادی اپنے ایک معتد خاص سے کرے خواہش مند ہے۔ یہ بات شنی موگ کو قطعاً پسند نہیں۔ شنی سے شادی کر کے زونا دار آئی لینڈ کا تخت سنبھالنے کا خیال دیکر رہا تھا لیکن سنگ ڈولا اس سازش شخص سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ شنی کے مذہم عزائم سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ بہر حال شنی موگ اس قسم کی شیطانی سرگرمیوں میں معروف ہے۔" وہ ایک لمبے کاغذ پر ہانگ چو کے خلاف زور دے رہا تھا۔ "یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔ شاید میں شنی کی دشمنی کا مقابلہ نہ کر سکوں۔" اس کی فکر مندی سبب تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "لجے میں کہا" اس طرف سے بے فکر ہو جاؤ ہانگ چو۔" میں نے ہم تینوں کو اپنی لاٹج میں بٹھایا ہی نہیں تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے!" وہ انجمن زدہ نظر سے مجھے لگا "وقت پیچھے کو نہیں بہتا۔ شنی موگ اور اس کے آدمی یہ جانتے ہیں کہ تم تینوں میری لاٹج میں سوار ہو کر کھلے سمندر آئے ہو۔ اس حقیقت کو کیسے بدلا جاسکتا ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لجے میں کہا "انسان اگر عقل کو مناسب انداز میں استعمال کرے تو وقت بھی الٹا ہے اور حقیقت کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔" میں ڈرا دیر کو قہقہہ ہوا۔

ہانگ چو کے علاوہ ڈاکٹر موگ اور راکل بھی ہمیں اٹھاک سے بچنے میں رہے تھے۔ میں نے سلسلہ کا کام لیا رکھتے ہوئے کہا "دوسری لاٹج میں ہم تک پہنچنے والے شنی کے آدمیوں میں سے چار اڑتی ابدی خاموش ہو چکے ہیں کسی کو اس واقعے اور ہمارے بارے میں کچھ بتانے کے نہیں رہے اور..... جو شخص رسی کی جکڑ بندوں میں قید ہے

کوئی نہ کوئی مناسب سائبند دست کر لیں گے۔ تمہارے بلازم یہ نہیں جانتے کہ شنی موگ کے آدمیوں نے ہم پر ہاتھ۔ اگر تم انہیں کسی طرح "سمجھا بجھا" سکو تو پھر تم پر کوئی نہیں آئے گی۔"

ڈاکٹر موگ نے میری پلاننگ میں حصہ لیتے ہوئے حملہ آوروں کے زندہ قہقہہ جانے والے بندے کو ہم اپنے لے جائیں گے۔ اس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے اس میں لاٹج میں پڑی ہوئی دیگر دو افراد کی لاشوں کو اس میں بچھا دیتا ہوں۔ دو لاشیں وہاں پہلے ہی پڑی ہیں۔ تم آج کو ایک لہجہ بھولی چکرے کے دروسے رن پر لے جاؤ اس میں راز دے سے جبر سے میں داخل ہونا مجھے تم اس میں آئے ہی نہیں تھے۔ جب دشمنوں کی لاٹج میں چار کی لاشیں ملیں گی اور ان کا پانچواں سامی غائب ملے گا تو وہاں یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ وہ پانچواں آدمی اپنے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر کہیں رو پش ہو گیا ہو۔ موگ اس شخص کو تلاش کرتا پھرے گا اور ہماری طرف سے قہقہہ ہٹ جائے گی۔"

ہانگ چو نے دو تین مرتبہ ٹہنی میں گردن ہلاتی پھر پریشان انداز میں بولا "قہقہہ ہٹ جائے گی۔ لاٹج والوں کے سامنے وہاں جبر سے میں ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تو وہ اپنی نہیں پہنچیں گے لیکن جب ہماری لاٹج جبر سے جا کر لگے گی تو شنی موگ کے آدمی ہمیں گھیر لیں گے۔ اور ٹہنی میری لاٹج میں موجود ہو گے۔ تاہم میں ان لوگوں کیسے جان چھڑاؤں گا؟"

ڈاکٹر موگ نے میری جانب دیکھتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا "تم عقل کے استعمال کے بارے میں کچھ بتا رہے ہو۔"

اس دوران میں راکل خاموشی سے باری باری ہمارے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ میزبان زبان سے واقف نہیں تھی۔ ہم تینوں مردوں کے درمیان وہ تمام تر گفتگو مذکورہ زبان میں ہو رہی تھی۔

میں نے ہانگ چو کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے "تم نے جس انداز میں ہماری میزبانی کا حق ادا کیا ہے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی جان کو داؤ پر لگا کر بھی تم پر کوئی نقص نہیں آنے دیں گے۔" میں ایک لمبے کور کا وہ سوالیہ نظر مجھے بکھیر رہا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑے راز دارانہ لہجے کہا "میں تمہاری سی تمہاری اور سادہ صاف پانی کی

ضرورت ہوگی۔ کیا تم یہ دونوں چیزیں ہمیں مہیا کر سکتے ہو؟" "ہاں ہاں مہیا کر سکتا ہوں۔" وہ احتجاجیہ انداز میں بولا "لیکن میں سمجھا نہیں آفرم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے بدستور راز دارانہ انداز میں کہا "میں میک اپ کرنے کا ماہر ہوں۔ اگر ہمیں تمہاری سی مہلت اور تمہاری میسر آجائے تو میں اپنے سمیت ان دونوں کے حلیوں کو بھی اس طرح بدل کر کہ دوں گا کہ کسی کا ہاب بھی نہیں پہچان سکے گا۔ وہی تین افراد جو زونا دار آئی لینڈ کے کسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور آج صبح کو بچے تمہاری لاٹج میں سوار ہوئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" وہ جبر ہوتے ہوئے بولا "لیکن اگر تم تینوں پر انہیں شک ہو گیا اور انہوں نے تم لوگوں کا میک اپ اتار کر دیکھا تو پھر کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔" میں بے پروائی سے بولا "میں ایسا میک اپ کروں گا کہ جب تک میری مرضی شامل نہیں ہوگی، کوئی مانی کا لال اسے اتار نہیں سکے گا۔" پھر میں نے اس کا کندھا چھوئے ہوئے کہا "ہانگ چو! بے فکر ہو جاؤ۔ تم ان مہمانوں کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکو گے۔"

وہ چند لمبے لمبے ٹہنی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔ تمہاری دیر بعد اس نے میری فرمائش پوری کر دی اور ہمیں ایک محفوظ پناہ گاہ میں ہمارے سامان سمیت چھوڑ کر اپنے ملازمین کو "سمجھانے" چلا گیا۔

تمہاری میسر ہوتے ہی ڈاکٹر موگ نے مجھ سے سوال کیا "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہم اپنے اصلی حلیوں میں آرہے ہیں۔" میں نے دلوک انداز میں کہا۔

"کیا؟" اس کے سوال میں گہری تشویش تھی۔

میں نے کہا "شنی موگ اور اس کے ساتھیوں کی نظر میں ہم ان کے بچے دشمن ہیں اس لیے پہلی فرصت میں ہمیں ان بدلے ہوئے حلیوں سے نجات حاصل کرنا ہے تاکہ زونا دار آئی لینڈ پر کوئی ہمیں ان افراد کی حیثیت سے شناخت نہ کر سکے جنہوں نے نہ صرف اپنی جان کی بازی لگا کر ایک جہاز کو ہائی جیکرز کے قبضے سے نکالا ہے بلکہ ان ہائی جیکرز کو کیڑا کرار تک پہنچانے کا بھی بڑا مقبول بندوبست کیا ہے۔" میں ایک لمبے کا خاموش ہوا۔ پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس طرح ہم نہ صرف شنی موگ سے محفوظ ہو جائیں گے بلکہ اس کا بھی ہائی اثرات بھی اگر ہمارا سراغ لگے گی تو کوشش کریں گی تو انہیں کامل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔" ہو کیا



سیدھا تہااری طرف آ جاؤں گا۔ پوسٹ آفس پندرہ منٹوں کے قدامی قافلے پر ہے۔ اس جزیرے پر صرف ایک ہی پوسٹ آفس ہے جو صبح سے رات گئے تک کھلا رہتا ہے۔ کسی نے پوچھو گئے تو تمہیں بتا دے گا۔“ وہ ایک لمحے کو خوفناک اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اگر حالات گڑبڑ ہو جاتے ہیں تو.....!“  
میں نے اس کی بات مقلد نہ ہونے دی اور کہا: ”ہرگز بڑے غم سے ہم بالآخر پوسٹ آفس ہی پہنچیں گے ہم سے ملے ادھر ہی آ جانا۔ ہم تمہارا کریں گے۔“  
وہ منہ سے کچھ نہیں بولا خاموشی سے اثبات میں گرجا کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو سے کہا: ”اب تم جلدی لاؤ لاؤ کا انتظام سنبھال لو تمہیں ایک لمبا پکڑ کاٹ کر دوسرا زاویے سے جزیرے تک پہنچانا ہے۔“  
وہ گردن کو ایک بڑے زاویے کا غم دے کر انجمن دم طرف بڑھ گیا۔

تمہاری میسر آتے ہی راکٹیل نے انجمن بھرے لہجے میں کہا: ”سب معاملات تو طے ہو گئے لیکن ابھی تک اس شخص بارے میں کوئی فیصلہ سامنے نہیں آیا جو ادھر مچھلیوں کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔ کیا اسے اپنے ساتھ جزیرے پر لے کر مناسب ہوگا؟“

راکٹیل کی بات مکمل ہوئی تو اس کے ساتھ ہی میں نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر مونگ کو دیکھا۔ وہ کھیر لہجے میں بولا: ”بدبخت کو جزیرے پر کون لے کر جا رہا ہے؟“  
”تو؟“ راکٹیل پوچھے بنانہ نہ سکی۔

وہ سناتے ہوئے لہجے میں بولا: ”ہانگ چو لاؤ کو دوسرے رخ پر لے جائے پھر اس شخص کو اس کی من سہا سہراؤں کو دیا جائے گا۔“ ایک لمحے کے وقفے سے وہ اظہار کرتے ہوئے بولا۔ جب انسان کا اس سمندر کی مچھلیوں کا حق ہے تو جواب میں وہ بھی کچھ استحقاق رکھتی ہیں! بدبختی نیز انداز میں بات ختم کرتے ہوئے اس نے ایک نیا کھاتہ کو دہرایا۔  
اس کھاتہ کا مفہوم کم دیشیہ یہ بتاتا تھا..... ختم کم کھا پاک!

میں نے بدبخت کے افراد کو عوامی رقیب القلب اور ہاں پسند پایا تھا۔ بعض کٹر بدبختوں کو ایک چوٹی کو مارنا بھی آتا ہے جن کو عقیم بدھا کی جیسی تعلیمات ہیں۔ بہر حال: دنیا کی صورت حال عام بدھ کے پیروکاروں میں دکھائی نہیں دیتی

ساتھ کسی بھی قسم کے حالات پیش آ سکتے ہیں۔ اگر یہ رقم تمہارے پاس ہوگی تو تم قسم کھا کر اور یہ رقم دکھا کر خود کو سچا ثابت کر سکتے ہو اور یہ قسم بھوٹی بھی نہیں ہوگی۔ اس میں کوئی شک اور غلط بیانی نہیں کہ یہ رقم ہم نے ہی تمہیں دی ہے۔ یہ رقم تمہاری حفاظت کرے گی۔“

بات اس کی سمجھ میں آئی۔ رقم کو جب میں رکھتے ہوئے اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا: ”آپ لوگوں نے میری حفاظت اور نجات کا بندہ مست کر دیا لیکن اپنے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے۔ اگر جزیرے پر پہنچ کر شنی مونگا کے آدمیوں سے سامنا ہو گیا تو کیا کرو گے؟“

”جب کی جب دیکھیں گے۔“ ڈاکٹر مونگ بے پردائی سے بولا: ”ابھی زونا راکٹیل لینڈ پر پہنچنے میں کافی وقت باقی ہے۔ ویسے آنے والی رات میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ یہ رات تو بہر حال ہمیں جزیرے پر ہی گزارنا ہوگی! ہم کل صبح ہی یہاں سے نکل سکیں گے۔“

”میں تم لوگوں کی ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔“ وہ دوستانہ انداز میں بولا: ”ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم لوگوں نے خود کو جہاز کے مسافروں سے الگ کیوں کر لیا۔ تم تو اس واقعے کے ہیروز ہو کر تمہارا انداز اور تیور خامے اٹھے ہوئے ہیں؟“

اس کا الجھنا میں نظر نہ تھا۔ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا: ”جزیرے پر پہنچ کر ذرا سونو کا سانس لیں تو پھر ہم تمہیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے۔ بے فکر ہو کہ ہم جرائم پیشہ یا غلط قسم کے لوگ نہیں ہیں۔“

”تم نہ بتاؤ پھر بھی یہ حقیقت چھپی ہوئی نہیں۔“ وہ مرعوب لہجے میں بولا: ”اگر تم لوگ غلط ہوئے تو اس جہاز کو ہائی جیکرز کے چنگل سے نہ نکالتے اور تین اہم افراد کو رہائی نہ دلاتے۔ تمہارا موجودہ طرز عمل کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت ہے!“

”تم نے ہمارے حالات کا بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”ہم اس وقت واقعی حالات کے ہاتھوں مجبور ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس مصلحت کی وضاحت ہم ضرور کریں گے مگر جزیرے پر پہنچ کر۔“

وہ مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا پھر سنجیدگی سے بولا۔  
”اگر حالات بالکل نا اہل رہے ہیں تو تم تینوں جزیرے پر پہنچ کر خاموشی کے ساتھ لاؤچ سے اتر جانا اور پوسٹ آفس کے قریب رک کر میرا انتظار کرنا۔ میں لاؤچ کے معاملات سے غم کر

جزیرے پر قدم رکھتے ہی شی مونگا کے گرد سے کھڑا ہو جائے گا۔ ہم نے ساڑھے چھ بجے تک اندر ادھر ٹھہر کر ہانگ چھا انتظار کیا پھر ایک متوسط ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ وہاں پوسٹ آفس کا مین گیٹ بڑی وضاحت سے دکھائی دیتا تھا اس وقت تک اندر چرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور فضا میں انگر خاص خنکی رینج بس گئی تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے دیر میں کو تین کانی کا آرڈر دے دیا راکیل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”مجھے تو لگتا ہے ہانگ چھاب بھی واپس نہیں آئے گا۔ بے چارہ ہماری وجہ سے ایک مصیبت کو لگے گا بیٹھا ہے۔ اس کا انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”تمہاری سوچ سے مایوسی محسوس ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر مونگ نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ میں عسوس کر رہا ہوں موجودہ حالات نے تمہارے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ سیٹل پیج کر تمہیں چند روز مکمل آرام کرنا چاہیے۔ وہ ڈاکٹر مونگ ریفرنس سے نظیر چرا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں کیا ہٹ گئی۔

میں نے کہا ”ہمیں ہانگ چوک کی طرف سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وفاداری اور مین داری کے آثار دیکھے ہیں۔ ممکن ہے وہ کسی اہم مسئلے میں الجھ گیا ہو اس لیے اس نے میں دیر ہو گئی۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“ ڈاکٹر مونگ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”امکانات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اگر ہانگ چوک واقعی کسی مسئلے سے دوچار ہو گیا ہے تو بہرہ مسئلہ جتنی طور پر شی مونگا سے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ سوچنے والے انداز میں خاموش ہو گیا۔ ویٹرس نے آرڈر سرد کر دیا تھا۔ ہم کافی کی چسکیاں لینے لگے۔ اس دوران میں ہم گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر پوسٹ آفس کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر مونگ نے کہا۔

”ہم آٹھ بجے تک ہانگ چوک کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ یہاں نہیں پہنچتا تو پھر اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہم نو ساری رات اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہ سکتے ہیں اور ہی پوسٹ آفس کے سامنے ٹھہر لگنا مناسب ہوگا۔ یہ تو اچھا ہوا م اس وقت اپنے اصلی حلیوں میں ہیں ورنہ شی مونگا اور لوہر کا دھرا لالگ تھا۔“

ہم نے اچھا خاصا وقت ریسٹورنٹ میں بتایا اور تشریف

مجھے اس مذہب کے ماننے والوں کے قریب رہنے کا بہت موقع ملا ہے اور میں نے دوسرے مذہب کی طرف ان لوگوں میں بھی مختلف درجے دیکھے ہیں۔ بدھا کی تعلیمات پر پوری طرح عمل پیرا بدھ بکشتو بدھا کی تعلیمات سے انتہائی دور زندگی گزارنے والے لوگ اور ایک بڑا طبقہ ان افراد کا جو یہ وقت ضرورت بدھا اور بدھ عبادت گاہ کا رخ کرتے ہیں اور وقت یا ضرورت نکل جانے کے بعد پھر اپنی مصروفیات میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بہر حال جس طرح اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، بالکل اسی طرح ہر مذہب کے پیروکاروں میں بھی ہر قسم کے افراد مل جائیں گے کیوں کہ..... کوئی بھی مذہب ہو یا ملت فرقہ ہو یا قوم وہ اسی دنیا میں موجود ہوتا ہے لہذا اس میں ایسے بے افراد بھی شامل ہوتے ہیں!

میں چند لمبے ٹوٹتی ہوئی نظریے ہانگ چوک کو دیکھا کہ پھر پر معنی لہجے میں کہا ”تمہاری مارشل آئرس ٹیکنیکس کی طرح بعض اوقات سوچ بھی محل (مہلک) ہو جاتی ہے۔“ مارشل آئرس میں ایسے داؤبچ کو محل ٹیکنیکس کہا جاتا ہے جن کا استعمال برقی مقابلے کو پلک جھپکے میں موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ انسانی جسم پر سامنے اور عقبی حصے میں ایسے نازک اور حساس مقامات پائے جاتے ہیں جن پر گلتے والی ضرب جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ مارشل آئرس کی زبان میں یہ مقامات پریشر پوائنٹس کہلاتے ہیں۔ پریشر پوائنٹس کی تعداد سات ہے۔ چار سامنے اور تین عقب میں۔ بھی ان پوائنٹس کی وضاحت بھی کر دوں گا۔

ڈاکٹر مونگ نے میرے سوال کے جواب میں کہا ”دشمن صرف دشمن ہوتا ہے۔ اسے دشمنی کرنے کے لیے کبھی کوئی موقع نہیں دینا چاہیے ورنہ اپنی زندگی خطرات میں بھر جاتی ہے۔“

اس کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ محبت اور جنگ کے اپنے اصول ہیں جن کی پاس داری بہر حال لازمی ہوتی ہے۔ میں کسی انکار یا انکار کے موڈ میں نہیں تھا لہذا خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆☆

پوسٹ آفس خاصے بارونق علاقے میں تھا۔ ہم ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ گئے۔ ہانگ چوک نے غلط نہیں کہا تھا۔ ساحل سے پوسٹ آفس تک بے مشکل چندرہ فٹ کا پیدل کا راستہ تھا۔ زدنارا آئی لینڈ تھا یہ کتابت اور جیکب آئے میں دیر گئی! خدا کا شکر تھا لالچ سے اتارے وقت کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا ورنہ توڑے فی صد اس بات کا امکان تھا کہ



سازمے سات بجے اٹھ گئے۔ باقی کاٹے شدہ وقت ہم نے پوسٹ آفس کے سامنے منگشت کرتے ہوئے گزارا۔ پھر ٹھیک آٹھ بجے ہم ہانگ چو کی طرف سے ناامید ہو چکے تھے کہ اس کی صورت نظر آگئی۔

ہم تینوں نے متنی خیر نفلوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور نتیجے میں اس کی جانب بڑھ گئے۔ چند سیکنڈ کے بعد ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔ ہانگ چو نے پہلے تو اس تاخیر کے لیے ہم سے معذرت کی پھر تاحیر کا سبب بیان کرتے ہوئے بولا۔

”میں دراصل پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد آپ لوگوں کی طرف آنا چاہتا تھا تا کہ آگے کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ میں نے نہ صرف آپ کے رات گزارنے کا محفوظ بندوبست کر لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر آیا ہوں کہ افوا شدہ طیارے کے تمام مسافر زونا ر آئی لینڈ سے رخصت ہو گئے ہیں۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ”کیا الاسکا کی وہاں اتار تیز بھی، جن کی خاطر اس طیارے کو ہائی جیک کیا گیا تھا؟“

ہم لالچ پر ہانگ چو کی ٹی ڈیلیو اے کے ہونگ سیون فور سیون اور ہروس ٹولو وغیرہ کے بارے میں مختصراً بتا چکے تھے۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینے ہوئے بتایا۔

”ہاں، وہ تینوں افراد بھی روانہ ہو چکے ہیں۔ آپ تینوں یہاں رہ گئے ہیں۔“

میں ایک طویل اطمینان بھری سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو سے سوال کیا ”تم نے ہماری رہائش کا کیا بندوبست کیا ہے؟“

”یہاں قریب ہی ساحل کے ساتھ ساتھ مختلف ٹپس بنے ہوئے ہیں جو چپک کے شوشین افراد کے کام آتے ہیں یا پھر وہ سیاح یہاں قیام کرتے ہیں جو زونا ر آئی لینڈ پر رات گزارنے کے ارادے سے آتے ہیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟“

ہانگ چو نے اپنی آنکھوں اور ہاتھوں کو ایک ساتھ بڑے متنی خیر انداز میں حرکت دی۔ ہم چونکہ اس کی بات کا مطلب بڑی وضاحت سے سمجھ گئے تھے اس لیے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس جزیرے کی رات، خصوصاً ساحل پر گزاری جانے والی رات کا اپنا ایک لطف ہے۔ اس فضا میں پروا دیوان اور چاشنی ہے۔“ سی نیکیٹ کو بیان نہیں بلکہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سیزن ۵: ۱۰۔ اس جگہ ملتا تقریباً ناگنن ہوتا ہے مگر آج کل آرٹ سیزن ہے اس لیے اکثر ٹپس خالی پڑے ہوئے ہیں۔“

وہ سانس لینے کو رکھا پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا ”میرا دوست چینگ یہاں ایک ہٹ کا چوکیدار ہے۔ میں نے اس سے بات کر لی ہے۔ وہ مجھ سے کا آدی ہے۔ اس کے ہاتھ پر تھوڑی رقم رکھ دو گے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر وہاں رات گزار سکتے ہیں۔ چینگ کے لیے یہ اضافی آمدنی ہوگی جو سراسر اس کی جیب میں جائے گی۔ وہ جی جان سے آپ لوگوں کی خدمت بھی کرے گا اور حفاظت بھی!“

اس بات چیت کے دوران ہم ہانگ چو کے ساتھ ایک طرف چل بھی رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا ”کشی مونگا یا اس کے گردہ سے سامنا تو نہیں ہوا؟“

اس نے لٹی میں گردن ہلا دی۔ پھر قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی ہم سے بیس فٹ آگے جا کر روکی۔ ہانگ چو نے ٹیکسی ڈرائیور سے مقامی زبان ”زونارین“ میں کچھ مکالمات کی۔ اس کے لیے ہم ٹیکسی کے اندر تھے۔

چند رہیں منٹ بعد ہانگ چو نے ایک اوسط درجے کے ریسٹورنٹ کے سامنے ٹیکسی روکائی۔ ہم نے مذکورہ ریسٹورنٹ میں ڈر کیا۔ اس دوران میں ہانگ چو نے ہمیں بتایا کہ وہ جس ہٹ میں ہمیں لے جا رہا تھا، ریسٹورنٹ وہاں سے محض پانچ منٹ میں پہنچا جاسکتا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر اس نے منزل سے پہلے ہی ٹیکسی چھوڑ دی تھی۔ اس کی پینٹا روڈی مجھے پسند آئی۔

ٹھیک نو بجے رات ہم مذکورہ ہٹ میں تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا ہٹ تھا جو عام سائز کے دو بیڑو مز پر مشتمل تھا۔ کمرے کے آگے مختصر سا برآمدہ اور پھر پچیس پانی دس فٹ کا احاطہ۔ ہٹ کا دوسرا رخ سمندر کی جانب تھا۔ ہٹ سے سمندر کی طرف جانے کے لیے لگ بھگ تیس اسٹپس کی ایک پختہ سیڑھی اترنا پڑتی تھی۔ بہر حال سمندر کا پانی اس سیڑھی سے پچاس فٹ کی دوری پر تھا۔

چینگ تیس سال کا ایک صحت مند، چاق و چوبند اور پتہ قامت شخص تھا۔ اس نے بڑے بڑے جوتے انداز میں ہمارا استقبال کیا اور جب ہانگ چو کے ایما پر میں نے دس امریکا ڈالر اس کی پگھلی پر رکھے تو اس جوش و خروش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اسے پیٹھے بٹھائے جس ڈالر لینڈ تیس ڈورم کی آمدنی ہوگئی تھی اور یہ آمدنی خالصتاً اس کی جیب میں جانے والی تھی۔ چینگ نے ہمیں بتایا کہ بنوری کا مینہ عمر ما یونگا کھیاں مارے کر رہا تھا، بس بھی کھار ہمارے جیسے مہربان

اور کارخ کر لیتے تھے۔

ہانگ چو کو وہاں جانے کی جلدی تھی اور وہ ہمارے ساتھ کچھ ضروری باتیں بھی کرنا چاہتا تھا۔ راکل، چینگ کے ساتھ سمندر کا جائزہ لینے کے لیے کئی تھی تو ہم دونوں ہانگ چو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسے زیادہ فکر ہماری روانگی کی تھی اور یہی سوال اس نے سب سے پہلے کیا۔

”آپ لوگوں کا اس جزیرے پر زیادہ دیر بھرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا ”اگر ش مونگا کو آپ کے میک اپ زدہ چہرے پر ذرا بھی شک ہو گیا تو آپ کے ساتھ میرے لیے بھی بڑی مشکل ہو جائے گی۔ وہ بے جا رہہ بھی بھڑک رہا تھا، ہم تینوں میک اپ میں ہیں جبکہ ہم اپنے اصلی طیلوں میں تھے۔ وہ ایک لمحے کو رکھا پھر پوچھا ”آپ کب تک یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟“

میں نے اس کی پوزیشن کو سمجھتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا ”تم فکر نہ کرو ہانگ چو! ہم کل کسی وقت اس جزیرے کو چھوڑ دیں گے۔“

یہ بات میں نے روانی میں کہہ دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، ڈاکٹر مونگ نے اس سلسلے میں کیا سوچ رکھا تھا تاہم وہ اس موقع پر خاموش رہا۔

ہانگ چو نے سولہ نظر سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر بولا ”دو دیے آپ لوگوں کے لیے میدان کی صاف ہے۔ طیارے کے عام اور خاص تمام مسافر یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آپ کل کی فلائٹ سے بہ سہولت اپنی منزل کی طرف سفر کر سکتے ہیں لیکن..... ظاہر ہے، اس کے لیے آپ لوگوں کو یہ میک اپ اتارنا ہوگا اور.....“

اس نے اوجھڑا جملہ چھوڑا پھر بڑے رازدارانہ انداز میں بولا ”اگر آپ لوگ اپنی تہذیب شدہ طیلوں میں سفر کا ارادہ رکھتے ہیں تو بھی میں آپ کے لیے ایک راہ نکال سکتا ہوں۔“

میں نے اور ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو کی طرف سولہ نظروں سے دیکھا پھر پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ وہ ہماری نگاہوں سے جھٹکتے استفسار کو سمجھ گیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”کل دوپہر کے بعد، دو بجے نادر چین کرڈ لائن کا ایک شپ (بحری جہاز) زونا ر آئی لینڈ سے لاس اینجلس روانہ ہونے والا ہے۔“ ایس ایس۔ ناروے“ نامی یہ دیو بیگل بحری جہاز دنیا کا سب سے بڑا مسافر بردار جہاز سمجھا جاتا ہے۔ میں کوٹش کر کے ایس۔ ایس۔ ناروے میں آپ لوگوں کو کوفٹ کر داسکتا ہوں۔ اس سے اتنا تو ہوگا کہ تم یو ایس اے

میں داخل ہو جاؤ گے۔ سیٹل (واشنگٹن) نہ ہی، لاس اینجلس (کیلے فوریا) ہی سہی۔ میرا خیال ہے، آپ لوگوں کے لیے آگے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔“

ہانگ چو خاموش ہو کر سولہ نظر سے ہمیں دیکھنے لگا۔ وہ ایک اچھا آئینہ پیش کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے متنی خیر نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہماری نگاہوں میں اس وقت ایک ہی منہموم ہوا تھا اور وہ یہ کہ..... نادر چین کرڈ لائن کے بحری جہاز میں ہم اپنی اصلی شکل و صورت سے سڑ کر سکتے تھے۔ میں نے ہانگ چو سے پوچھا۔

”کل دوپہر دو بجے زونا ر آئی لینڈ سے روانہ ہونے والا“ ایس ایس۔ ناروے“ ہمیں کب لاس اینجلس پہنچائے گا؟“

”کم دیش ایک ہفتہ تو لگے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سربست لٹی میں گردن ہلا دی ”تمہو تو بے کار ہے۔“

”بحری جہاز کی رفتار بہت زیادہ نہیں ہوتی۔“ ہانگ چو بتانے لگا ”ایس ایس ناروے نے آسٹریلیا سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ پھر مارشل آئی لینڈ، مڈوے آئی لینڈ، ہوائین آئی لینڈز سے ہوتے ہوئے وہ زونا ر آئی لینڈ پہنچا ہے۔ اب یہاں سے سیدھا لاس اینجلس جائے گا۔ لاگ روٹ کے بحری جہازوں کو کمپنیوں سمندری سفر میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔“

”سمندر اور سمندری ذرائع آدھ رفت کے بارے میں تمہاری معلومات قابل رشک ہیں مسٹر ہانگ چو؟“ میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”یہ میرا پروفیشن ہے۔ میرا پورا دن سمندر میں گزرتا ہے۔ اس قسم کی معلومات تو رکھنا پڑتی ہیں نا؟“

”ٹھیک ہے ہانگ چو!“ ڈاکٹر مونگ نے کہا ”ہم آج رات میں سوچ بچار کر کے کسی فیصلے پر پہنچ جائیں گے۔ صبح چھبیں بتا دیں گے کہ ہم ہائی سی سفر کا ارادہ رکھتے ہیں یا پانی اتر!“ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

”دوے تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کل ہم اگر ہائی اتر چانا چاہیں تو کس فلائٹ سے سفر کریں گے اور کتنے بجے؟“

ہانگ چو نے جواب دیا ”کل صبح مقامی ائر لائنز کی ایک ائر بس“ اے قمری قمری“ یہاں سے ٹھیک آٹھ بجے پرواز کرے گی۔ اس فلائٹ کی منزل سیٹل ہے۔“

میں نے بہت سارے شکر پے کے ساتھ ہانگ چو کو

نہیں ہوا! وہ میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا "اگر میں ادھر کا رخ کرنا چاہوں تو تم میرا ساتھ دو گے؟" میں نے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"ہوں!" وہ ایک بڑی معنی بھاری ہنسی کر رہ گیا۔ میں نے اس کا دھیان بنانے کی خاطر منگو کا زانو پر بدل دیا "ڈاکٹر موگ نے ہانگ چوک لالچ پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جزیرے پر پہنچتے ہی تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو گے۔ میں اگر نیویارک جانا چاہتا ہوں تو تم مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا "تم میری طرف سے آزاد ہو۔ نیویارک جاؤ یا میکسیکو، میں تمہاری راہ میں رکاوٹ کھڑی نہیں کروں گا۔ اور یہ تو جیسے بھی اندازہ ہے کہ تم اکیلے اس جزیرے سے کہیں نہیں جاسکتے۔ تمہیں بہر حال، میری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا "یہ مدد؟" میں نے تم سے مانگی مگر اس سلسلے میں تم نے بھی کہا تھا، زونارا آئی لینڈ پہنچنے کے بعد ہم اس موضوع پر بات کریں گے؟" ایک لمبے کا توقف کر کے میں نے یاد دہانی کے انداز میں کہا۔

"اور..... اس وقت ہم زونارا آئی لینڈ پر ہی ہیں!" وہ چند لمحات تک سوچی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر غہرے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے اپنی کہی ہوئی ایک ایک بات یاد ہے۔ ہم اس جزیرے سے نکل جائیں، پھر مجھ سے جو بن پڑا، میں تمہارے نیویارک جانے کے سلسلے میں ضرور کروں گا۔"

میں ڈاکٹر موگ ریفرش کے ارادوں کو بڑی اچھی طرح بھانپ چکا تھا۔ وہ پہلی اور آخری کوشش کر کے مجھے "اپنے بدوں" کے پاس سیٹل پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے ہانگ چوک لالچ پر جاپان جانے والی جہاز کی تھی، میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے بدوں کا حکم تھا یا خود ڈاکٹر موگ کی اپنی تجویز!

ڈاکٹر کی بات کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ میں نے جب سنجیدگی سے موجودہ حالات کا تجزیہ کیا تو مجھے بھی یہی بات موزوں اور درست لگی کہ پہلے کسی بھی صورت مجھے اسٹیشن میں داخل ہو جانا چاہیے۔ ڈاکٹر موگ کے مطابق (ڈسلاوا) اور راکیل (گارٹیا) دونوں دوست تھے اور دانشمن کے علاقے سیٹل سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے تمام ضروری کاغذات اس

رخصت کر دیا۔ جاتے ہوئے میں نے اسے یہ بات سمجھا دی تھی کہ ہم مذکورہ اتر بس سے سفر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے لہذا وہ ہمیں علی الصبح "ٹنگ" کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم اپنی روانگی کے بارے میں اسے بعد میں خود بتا دیں گے۔ میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ وہ خالی ہاتھ رخصت نہ ہو۔ اس کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود بھی میں نے اسے دوسو ڈالر برقی تھما دیے۔ اس نے جس طرح ہم سے تعاون کیا اور جس طرح ہمارے کام آ رہا تھا، یہ رقم اس کا معاوضہ نہیں تھی۔ یہ تو ایک تھوڑا سا جوہم نے اپنے اچھے غلطی اور دوست پیشہ میزبان کو پیش کیا تھا۔ اس رقم کو وہ مقامی کرنسی میں بدلنا تو یہ چھوڑ دیا جاتے۔

ہانگ چوک کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر موگ سے پوچھا "تم کانی دیو سے گہری سوچ میں ہو۔ کیا بچار ہو رہی ہے؟" اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا، اپنے مخصوص لہجے میں بولا "میں اس وقت صرف تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو دوست؟" "ہانگ چوک سے ہونے والی تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم کل صبح آٹھ بجے بورڈ نار ائر پورٹ سے روانہ ہونے والی اتر بس میں سفر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بحری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ہی تم انکاری ہو۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، تم زونارا آئی لینڈ پر چند روزہ قیام کے بارے میں سوچ رہے ہو۔" "یہ تم کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر موگ؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا "میں نے جو محسوس کیا وہی کہہ رہا ہوں۔"

"تم جانتے ہو ڈاکٹر موگ، میں پہلی فرصت میں نیویارک پہنچنا چاہتا ہوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "ایس ایس ناروے" نامی وہ کردز لائن ایک ہفتے تک مجھے سمندر کے چھ سو الٹان کے مانند لٹکائے رکھے گا۔ میں ایسے کسی بھی سمت رفتار ذریعہ سفر کا تحمل نہیں ہو سکتا۔" وہ قدرے شاک کی لہجے میں بولا "اور سیٹل جانے والی اتر بس میں کیا خرابی ہے؟"

"وہ..... وہ....." میں گڑبگڑا گیا "وہ تو میں نے ایسے ہی ہانگ چوک نالے کے لیے کہہ دیا تھا۔" "اس کا مطلب ہے، تم سیٹل جانے سے سراسر انکاری

مناسب سے تیار کروائے گئے تھے۔ یو ایس اے میں داخل ہونے کے بعد ہم صرف اپنی "آئی ڈی" پر ایک اسٹیٹ سے دوسرے اسٹیٹ تک بہ سہولت سفر کر سکتے تھے۔ اسٹیٹس میں "آئی ڈی" ایک شناخت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ آپ کا کسی بھی قسم کا شناختی کارڈ، آپ کا ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ۔ آپ کی "آئی ڈی" اسٹیٹس قوانین کی نظر میں آپ کو قانونی جبر و سادہ ہوتی ہے۔ گویا "آئی ڈی" آپ کے "اوکے" ہونے کا ثبوت ہے!

چنانچہ، کیا بات بھی کہ میں ڈاکٹر مونگ سے جتنا کتنے کی کوشش کر رہا تھا، حالات اتنا ہی زیادہ مجھے اس سے تھمی کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس سے کتنے بار دور ہونے کا سبب ہرگز یہ نہیں تھا کہ خدا خواستہ اس نے مجھے کوئی نقصان پہنچایا تھا یا میرے اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات رکھتا تھا۔ قطعاً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس سے اور اس کے بڑوں سے بدکنے کی وجہ نفسیاتی تھی۔ وہ لوگ پہلے کھلم کھلا اور اب در پردہ میری ساحل پر اپنا حق جتا رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں، ان کا رویہ مجھے کھلتا تھا۔ میں خود کو بلا شرکت غیر سے ساحل کا حق دار سمجھتا تھا۔ اس "حق" میں مجھے کسی کی رتی بھر شرارت قبول نہیں تھی۔ میں اپنی اس ذہنی اور دلی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ احساس کی زبان سے سمجھنے اور محسوس کرنے والا معاملہ ہے۔ پتا نہیں، یہ میری دیوانگی تھی یا پاگل پن! یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بہت عزیز تھا۔

ڈاکٹر مونگ کافی دیر سے سوالیہ انداز میں مجھے تنک رہا تھا۔ میں نے ایک سوال پر اپنی جواب اس کی جانب اچھال دیا۔ "دوست! اگر براندہ مناد تو میں یہ کیسے بتا نہیں رہوں گا کہ تم میری مدد کرنے کا وعدہ اس شرط کے ساتھ کر رہے ہو کہ پہلے میں تمہارے ساتھ سیٹل جاؤں!"

"یہ میری شرط نہیں بلکہ حالات کا تقاضا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں نے صرف اتنا کہا "ہاں، حالات سے تو یہی نظر آرہا ہے، مجھے تمہارے ساتھ سیٹل جانا ہوگا۔"

"تمہارے اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔" وہ فاتحانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا "اگر لاڈلہ بدھا کی مرضی ہوئی تو ہم صبح آٹھ بجے والی اڑیں سے سیٹل کے لیے پرواز کر جائیں گے۔ کیسے؟" وہ اتنا کہہ کر کہ پھر ڈرامائی انداز میں بولا۔

"یہ سارے نکمیزے تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اس سلسلے میں دماغ کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے نیند پوری کر دو۔"

سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے اس سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ سب کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ یقیناً اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ ہوگا ورنہ وہ اتنے وثوق سے یہ بات نہ کرتا۔ میں نے اس کے پچھلے پروگرام پر بھی ایک لفظ نہ کہا کہ وہ جاپان جانے کا ارادہ کیا ہوا۔ اس کے پاس ایک ریڈیو میڈ وضاحت موجود تھی۔ وہ اپنے بڑوں کی آڑ میں صاف بچ نکلتا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تا کیڈی لہجے میں بولا۔

"میں دوسرے کمرے میں سوئے جا رہا ہوں۔ راکیل سے کہا "وہ بھی سکون سے سو جائے۔ صبح ہمیں بہت جلدی اٹھنا ہوگا۔"

"راکیل کو تم اپنے کمرے میں سلا لو تو اچھا ہے۔ وہ باتوں میں لگ گیا تو آٹھ گھنٹوں میں رات کٹ جائے گی۔" میں نے کہا "تم سے وہ ڈری سبھی رہتی ہے۔ تم قریب موجود ہو گے تو خاموشی سے دب کر سو جائے گی۔"

"اوکے۔" وہ ہنٹ کی میز جیوں والے حصے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "نزدہ آ رہی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔" بات ختم کرتے ہی وہ اس جانب بڑھ گیا۔

میں نے بریٹیل تذکرہ ڈاکٹر مونگ سے پوچھ لیا "دوست! ایک بات تو بتاؤ، تم نے میرے کس رویے سے یہ اندازہ لگایا کہ میں زونارا آئی لینڈ پر چند روزہ قیام کا ارادہ رکھتا ہوں؟"

"اوہ! تمہارا ذہن ابھی تک اسی میں اٹکا ہوا ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا "میریک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "میں نے سوچا، شاید تمہارے دل میں رستا کے لیے کوئی ہمدردی جاگ گئی ہو۔ میں مونگا، تنگ تو ہارا ڈولا کے تاج و تخت کے ساتھ ہی اس کی بیٹی رستا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ تم نے ہمیشہ باطل کے خلاف حق کا ساتھ دیا ہے۔ یہاں بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال ہے!"

ڈاکٹر مونگ نے اگر یہ کوئی مذاق کیا تھا تو میں نے سنجیدہ مذاق پہلے ہی دیکھا یا سنا نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے جھلکی سنجیدگی کے پیش نظر میں نہ تھا۔

"ڈاکٹر مونگ! حق و باطل کی جنگ میری زندگی کا مقصد ہے لیکن اس جزیرے کے اندرونی معاملات میں الجھ کر میں اپنی راہ کھوئی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے لیے جو وسیع دعویتیں بساط مینیشن میں بچائی جا رہی ہے، جزیرے کے حالات اس کا پاسک بھی نہیں ہیں۔ میں کسی بڑی بازی کے لیے پکنا جا چکا ہوں۔"

وہ مٹی خیز انداز میں خفیف سا مسکرایا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں سونے سے پہلے کی ضروریات سے نمٹا اور بستر پر آ گیا۔ اس وقت میری رست داغ رات دس بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ یہ زونارا آئی لینڈ کا مقامی وقت تھا۔ ہوٹل انٹر پورٹ نکلنے وقت ہم نے اپنی گھڑیوں کو مقامی وقت کے مطابق سیٹ کر لیا تھا۔

میں بستر پر دراز ہوا تو آپوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں نے آج صبح اسے کسی بیڈروم میں، حالت نیند میں تصور کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر مونگ کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اسے مین مین (نیویارک) پہنچا رہا گیا تھا۔ ایک بات میرے ذہن کو برابر الجھا رہی تھی۔ نیرینٹلس سے اگر ساحل کو ڈائریکٹ مینیشن لایا جاتا تو زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے صرف ہوتے جبکہ یہاں وقت کی ایک بہت بڑی پیچ دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دنیا کی ہر پر لاج میں صبح تین بجے ہمال کو کسی طیارے میں سوار دیکھا تھا پھر تقریباً اسی گھنٹے بعد جبکہ میں ڈبلیو اے کے طیارے میں ڈاکٹر مونگ اور راکیل کے درمیان بیٹھا تھا تو نگاہ تصور نے مجھے ساحل کو کسی طیارے سے نکل کر ایک انٹر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور اس کے بعد کم و بیش گھنٹے بعد یعنی آج صبح وہ مجھے کسی بیڈروم میں دکھائی دی۔ یہ اعداد شمار اور وقت کا حساب تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ اسے براہ راست الاسکا سے نیویارک نہیں لایا گیا تھا۔ ہر حال، یہ بات خاصی تشویش ناک تھی کہ وہ دوبارہ روٹی موٹے ہاتھن کے چنگل میں جا پھنسی تھی۔

میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ مجھے اسی وقت ساحل تک تصوراتی رسائی حاصل کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس حال میں ہے۔ کیا پتا، اس کو کوشش کے نتیجے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ اس وقت مینیشن میں کہاں موجود ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہنٹ کا چوکیدار باہر برآمدے میں موجود تھا۔ میں نے اسے پیشکش کی مگر وہ بھی میرے دالے کمرے میں بستر لگے لیکن اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔ "وہ برآمدے ہی میں ٹھیک ہے۔ اگر ہماری حفاظت کے سلسلے میں اس سے کوئی کوتاہی ہوئی تو وہ ہانگ چوک گیا جواب دے گا۔ چنانچہ نہایت ہی فرض شناس چوکیدار تھا۔ راکیل اور ڈاکٹر مونگ دوسرے کمرے میں تھے۔

میں نے چند لمحات تک کمرے میں موجود ہر شے کا

تقصیری جائزہ لیا پھر ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت میری تمام تر توجہ کا مرکز باطنی آنکھ یعنی پینسل (PINEAL) گھنٹہ تھا۔ انسان کی پیشانی کے مین وسط میں، دماغ کے سامنے والے حصے پر موجود یہ گھنٹہ بڑے کام کی چیز ہے۔ میں "جی" کی ایڈوانس مشقوں کے ذریعے پینسل گھنٹہ کو بیدار کر چکا تھا۔ اب اس نے میرا کہنا "ماننا" شروع کر دیا تھا۔ میں اس "قرض آئی" کے تجربات سے گزر رہا تھا۔

لیکن پتا نہیں، کیا بات تھی، اس وقت تصور قائم کرنے میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ پینسل گھنٹہ مجھ سے تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت کے ساتھ ہی انتہائی کوتاہی محسوس ہوئی پھر جلد ہی پینسل گھنٹہ کے عدم تعاون کا سبب بھی میری سمجھ میں آ گیا۔

میں اس وقت بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور اعصاب بھی ایک دم تنیدہ تھے۔ میں نے ایک پرسکون نیند لینے کا فیصلہ کیا اور کرسی کو چھوڑ کر بستر پر آ گیا پھر میں نے اپنے دماغ کو صبح تین بجے تک نہایت ہی میٹھی اور گہری نیند کی ہدایت دی اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اگر میں پانچ گھنٹے کی بھرپور نیند لے لیتا تو میرے اعصاب چاق و چوبند ہو جاتے۔

سوچے ہی سوچتے نیند کی گداز نہیں نے مجھے اپنی مہربان گرفت میں لے لیا۔

☆☆☆

ٹھیک تین بجے میری آنکھ کھل گئی۔ نیند پوری ہونے کی وجہ سے بدن ہلکا ہلکا اور اعصاب مستعد ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے دماغ کو بیدار اور ہشاش بشاش پایا۔ پانچ منٹ کے اندر میں اپنی مشق بلکہ کل کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

میں نے ایک آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ کر ساحل کا تصور کیا اور اس پر مرتبہ پینسل گھنٹہ نے کسی چرائی جن کے مانند میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں پینسل گھنٹہ کی تیز رفتاری پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ادھر میں نے ساحل کے خال و خط کو اپنے ذہن میں ابھارا، ادھر میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے تصور کی نگاہ کو بند کرنا پڑا۔

ساحل کی دواش روم میں شاد رہی تھی۔ تصور کی نگاہ بند ہوئی تو ظاہر آنکھیں کھل گئیں۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس سانس میں کامیابی کا مخصوص نغمہ اور ترنم شام تھی۔ میں نے رست داغ پر نظر ڈالی۔ وہ تین دس کا وقت بتا رہی تھی۔ یہ زونارا آئی لینڈ کا

مقامی وقت تھا۔ تاہم زندہ کے حساب سے اس وقت نیویارک میں صبح کے ساڑھے اڑھائی بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا، جب میں نے صبح ہوٹل اڑ پورٹ میں ساحل تک تصوراتی رسائی حاصل کی تھی تو نیویارک میں لگ بھگ دو پہر کا وقت تھا۔ دن میں ساحل کا کسی کا ڈیوچ پر گہری نیند میں ہونا بڑی تشویش کی بات تھی تاہم یہ تشویش حالیہ تجربے کے بعد جاتی رہی تھی کہ ساحل اس وقت پورے ہوش و حواس سے ساحل میں مصروف تھی۔

میں بھی ایک دوسرے زادے سے اپنے تصور کی نگاہ کو رہی کی  
ہمشت سے چپکا کر بیڑوم کے دروازے تک لے گیا تھا پھر  
راکیل کی پکار نے سب کو دوہم، دوہم کر دیا تھا۔ اگر رہی ایک  
مرتے پھر میری تصوراتی نگاہ کے فریم میں آ جاتا تو میں کسی  
الو کھے اور کامیاب تجربے سے گزر سکتا تھا۔ اس خوشگوار  
احساس نے مجھے سرور کر دیا۔

جاگ اپنے بستر پر نیم دراز تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف دیکھا اور ڈاکٹر مونگ کے سلسلے میں استفادہ کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک گھنٹہ پہلے ڈاکٹر مونگ ہٹ سے نکلا تھا۔ جاگ نے جب اس کی واپسی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ جائے گا۔ اس کے بتائیوں کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔

تمہاری دوست کو پیرس پہنچایا اور نہ ہی نیویارک میں رہنے دیا۔“

مستقبل یعنی	نظمی یعنی
انسان	خوش بینی کی مشق
نیز صوفی ملا سیتوں کا مالک	حق شناسی
نفس مارا	اور اس کی مشقِ قوت
قوتوں کا سرچشمہ	چلت کھانڈا فرمایاں
مستقبل بینی	بائیت انکار
اس حقیقت	عجائب طر و ترش
بہن عمر و عدا اوقات	استعمال انکار
طاقت و احساسات	اور اس کی مشقیں
مستقبل بینی سمجھنے	معصرت استعمال انکار
مستقبل بینی کی معصرت	
ایکھا اور مئے پہلو	

وہ متوجہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کا جواب

اس نے ساحل کے سامنے سے ناشتے کے برتن سینے  
اس سے چند باتیں بھی کیں۔ میں نے دونوں کے ہونٹوں  
جنبشوں کو بڑی وضاحت سے ”دیکھا“ لیکن کسی قسم کی  
آواز مجھ تک نہ پہنچی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ جب ساحل  
پلٹے میں چھپ چلا رہی تھی تو اس نگرار سے ایک مخصوص قسم

وہ کانٹوں اور انظار کی سی کیفیت میں کھڑی ہو گئی۔ ذہن  
کے کچھ استاد وہ مجھ سمجھے عجیب سا لگا۔ میں اندرونی  
سکے باعث اس شخص کے اعلیٰ تصوراتی جائزہ لینے پر مجبور  
وہ کانٹوں سے تیار کیا گیا کسی طاقتور سا لڑکا مجھ سے تھا۔

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، راکیل کی یہ حالت میرے چہرے کے تیزی سے بدلتے ..... بلکہ گزرتے ہوئے تاثرات

آتش فشاں (123) حصہ 11

کے سبب ہوئی تھی۔ اپنے ٹارگٹ کو غائب پا کر میں بڑی بیانی کیفیت میں جھٹا ہو گیا تھا اور راکیل نے میرے چہرے کی حالت کو نوٹس کر لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ ان لمحات میں بستر پر نہیں بلکہ میرے آس پاس ہی موجود تھی، جیسی میرے چہرے کا تعقیر تبدیل اس کی نظر میں آ گیا ورنہ وہ بستر پر میری پشت پر تھا۔

یہ اندازے اور خیالات ٹیکنے کے دس ویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے، اگلے ہی لمحے میں راکیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ لگائے ایک طرے سے مجھ پر سوار تھی۔ میری آنکھوں میں بڑی تشویش ناک انداز میں جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”تمہیں کیا ہو گیا تھا وجدان۔ تمہارے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے، تم سخت تکلیف میں ہو۔ کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔ ”کیا میں مینٹن کی کسی ڈب پانچ پر کسی ساڈھ کا مجسمہ نصب ہے۔۔۔ بہت ہی شاندار لکھی کا مجسمہ؟“ وہ میرے اس غیر متعلق سوال پر تعجب بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی مگر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی ”جیہا تم نے کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھا ہے۔ آج پتا نہیں، مین مینٹن کیوں تمہارے ذہن پر سوار ہے!“

میں نے تبصرہ لے کر کہا ”تم میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں مین مینٹن کے بارے میں اپنی معلومات پر بڑا فخر ہے نا۔۔۔!“

وہ چند لمحے ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر چونک اٹھی۔ یہ چونکنا اس کے کئی فوری خیال کا نتیجہ تھا۔ اضطرابی انداز میں اس نے کہا۔

”ہاں، ایسا ایک مجسمہ وال اسٹریٹ کی فٹ پاتھ پر نصب تو ہے مگر۔۔۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ”وال اسٹریٹ مین مینٹن میں کس طرف واقع ہے؟“

”وال اسٹریٹ، ٹرانسٹل ڈسٹرکٹ میں ہے۔ یہ ڈاؤن ٹاؤن میں مین مینٹن میں آتا ہے۔ تم نے ساڈھ کے جس نئے کے بارے میں پوچھا ہے وہ ”دی بروزن بل آف وال اسٹریٹ“ کہلاتا ہے۔ اسے منظم امریکی معیشت کی علامت

سمجھا جاتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر سوال کر سے باز نہ آئی۔

”وجدان! یہ اچانک تمہیں بروزن بل کا خیال کیسے آیا؟“ اس سے پہلے کہ میں اسے ٹالنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرتا، ہٹ کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میری رگ رگ سے گہری تشویش دوڑ گئی۔ راکیل نے بھی وحشت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ہٹ کے باہر کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

پھر وہ گڑبڑ ہٹ کے احاطے کے اندر داخل ہو گئی۔ نے چپاٹک کو کسی شخص سے ٹکرا کر تے ہوئے سنا۔ وہ وہ مقامی زبان میں بے آواز بلند بول رہے تھے۔ ان کے الفاظ اتار چڑھا دیتا تھا، وہ لوگ اندر کمرہ تک رسائی حاصل چاہتے ہیں اور چپاٹک ان کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں اور گڑبڑ ہے۔

میں کرسی سے نکل کر کسی عملی اقدام کے بارے میں ہی رہا تھا کہ کمرے کے باہر کوئی گمن گرجی۔ ایک خراب برسات کی آواز، خاموش فضا کو تار تار کر گئی۔ فائرنگ کی مخصوص بڑبڑاہٹ میں ایک انسانی چیخ بھی بلند ہوئی۔ میں مینٹن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا، وہ دروازہ چپاٹک کی بھی پاس کے کسی مخالف کی۔ اس چیخ کے ساتھ میری کرسی سے اٹھنے کی کوشش بھی ناکام۔۔۔ ہوئی کیونکہ لمحے راکیل بڑے بے اختیار انداز میں، میری آنکھوں آگری تھی۔

راکیل کا پورا بدن کسی وحشت زدہ ہرنی کے مانند ہکا تھا۔ میں نے بے ساختہ اسے اپنی ہاتھوں میں بھریا۔ اٹا کمرے کے باہر، برآمدے میں ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ اس دھماکے کی آواز ایسی زناٹے دار تھی کہ مجھے ساعت رخصت ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے بڑی سرعت راکیل کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے بدن کو میرے دود میں بیوست کر لیا جیسے خدشہ ہو کہ اسے جدا ہوئی تو اس کے سینے سے سانس جدا ہو جانے کی لمحات میں، میں اس کے لیے آکسیجن کا سیلنڈر بن گیا تھا کہ میں اسے اپنی آنکھوں میں بھر کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو گن بردار بھاری مارا پھران کی کنو ہاری ست اٹھ گئیں!

ان کے ہاتھوں میں کھلونا گول نہیں تھیں جو محض دھماکنے کے لیے انہوں نے ہم پر تان لی ہوں۔ وہ اصل فٹا ہلاکت پر تیار تھے تاہم گن بردار افراد نے ٹریگرز پر بھی اپنی آنکھوں کو زحمت دینے میں تھوڑا تکلف برتاہم پر نگاہ پڑتے ہی اگلے لمحوں کے لیے ہر ایک نے خون خوار نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا ”تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟“

”کیا دو سے کام نہیں چلے گا؟“ میں نے الٹا اسی سے پوچھا۔ اس دوران میں میرا ذہن دشمنوں کو ناپے تولنے میں تیزی سے مصروف تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بے دریغ بائیں جانب نہ کر کے انہوں نے یہ تو ثابت کر دیا تھا کہ وہ ضروری چپاٹک سے پہلے میں ٹھکانے لگانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ ایک خوش آئند اور عمل پر اکتانے والی بات تھی۔

”جو اس بند کرو۔“ دوسرا گمن بردار چپاٹک ”تم سے جو پوچھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو۔“ وہ لوگ انگریزی میں بات کر رہے تھے تاہم ان کے لب و لہجے سے گوارا بن جھٹکتا تھا۔ میں انہیں ہاتھوں میں الجھا کر ایکشن کا موقع نکالنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں کھلے ہوئے دروازے کے اندر کھڑے تھے جب کہ میں راکیل کو اٹھائے کرسی کے نزدیک موجود تھا۔ ہمارے درمیان وہ بیڑ جاٹ تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں نے لگ بھگ پانچ کھینے نیند لی تھی۔ میں نے چہرے سے کوئی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ اگر انہوں نے ڈائینگ کا دروازہ کھول ہی دیا تھا تو اس سے فائدہ اٹھانا لازم ہو گیا تھا۔ میں نے بے آہستگی راکیل کو کرسی کے اندر ڈالا اور کھڑے ہوتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

”تھینکا تم لوگوں کو کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ہمارا کوئی ساتھی نہیں، ہم صرف دو ہی ہیں۔“ ان میں سے ایک اپنی گن کو بڑے خطرناک انداز میں لگاتے ہوئے بولا ”تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ ہم بالکل ٹھیک پر آئے ہیں۔ علیحدہ کر لیں اگر ہماری آنکھوں میں دھول جھونکا جائے تو تو تم تعین غلطی کر رہے ہو۔ اپنے تیرے ساتھی کے بارے میں شرافت سے بتاؤ ورنہ تم دونوں کو پھانسی کرنے کے بعد ہم تمہارے ساتھی کی تلاش میں نکلیں گے۔ میں تم تک نہیں گا۔ اگر تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو کھولنا ہماری کنو کے دہانے پر عمل جائیں گے۔“

الٹی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ شنی موٹا سے نکل کر کھڑے تھے۔ علیحدہ کرنے کا خواہش نہیں سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ اتنی شور مچا دوڑنا دھڑلانا انداز میں شنی موٹا ہی نہیں

تلاش کر داسکتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا ان میں کوئی شنی موٹا بھی ہے یا یہ لوگ اس کے اشاروں پر ناپے والی کھ پٹیاں ہیں! میں نے ایک رسک لیتے ہوئے گہری چال چلی اور ان میں سے ایک گمن بردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم میں سے کئی موٹا کون ہے؟“ یہ ایک انتہائی خطرناک سوال تھا۔ انہوں نے بڑی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”تمہیں شنی موٹا سے کیا کام ہے؟“

”اس کا مطلب ہے تم میں سے کوئی شنی موٹا نہیں۔“ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”تم اس کے ہاتھ کتے ہو۔ مجھے شنی موٹا سے جو کام ہے وہ تمہیں نہیں بتایا جا سکتا!“

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گرا دیے۔ گلو کے ٹکانے پر آتے وقت تو میرے دونوں ہاتھ راکیل کے ساتھ مصروف تھے لیکن اسے کرسی پر ڈالنے کے بعد میں نے گمن بردار افراد کی سلی کے لیے خود کو رخا کرانہ طور پر ”پنڈر زاپ“ کر لیا تھا۔

میری زبان سے اپنے لیے ذلت آمیز کلمات سن کر ایک گمن بردار تھلا اٹھا اور اس نے ہاتھوں میں دہلی ہوئی گن کو اس انداز میں حرکت دی جیسے ایک برسٹ مار گہری دھجیاں نکھیرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن دوسرے گمن بردار نے اسے اس کوشش سے پہلے ہی روک دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے اگلے لمحے میں منتشر ہوا۔

”تمہیں شنی موٹا سے جو کام ہے، ہمیں بتا دو۔ تمہارا پیغام شنی موٹا تک پہنچا دیا جائے گا لیکن۔۔۔ تمہاری موت کے بعد!“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”پنڈر زاپ!“

اس مشکوکے دوران میں میرا ذہن میدان جنگ کا نقشہ تیار کر چکا تھا۔ میں نے اس کے حکم پر ایک مرتبہ پھر اپنے ہاتھ ”اپ“ کر دیے اور ستا سفادہ انداز میں کہا۔

”میں دراصل شنی موٹا کو اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔“

”آگے ناپڑی؟“ اس گمن بردار نے زہر خند لہجے میں کہا جو چند لمحے پہلے مجھے شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

دوسرا اضطرابی انداز میں پوچھ بیٹھا ”تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے۔۔۔؟“

میں نے بڑی سرعت سے ان کے عقب میں دیکھا اور اس کے ساتھ ہی کہا ”دور ہا۔۔۔ تمہارے پیچھے۔۔۔“



میر میں پیچھے کو گیا اور بے طرح اس کرسی سے جا کھڑا۔  
میں نے راکیل کو بٹایا تھا۔ کرسی اس شخص کے دھکے سے  
مٹی اور وہ راکیل کے ساتھ غلط ہو کر رہ گیا۔ اس کی  
نیچے میں راکیل کے قلع سے ایک وحشت ناک کچ  
ہوئی۔ وہ کرسی میں سے نکل کر کافی دور جا کر بیٹھی۔

میں نے تشویش بھری نظر سے راکیل کو دیکھا اور پھر  
مجھے قدرے اطمینان ہو گیا کہ مجھ سے تو واضح کر دیا ہے  
ہو گیا تھا۔ کرسی کی سمت جاتے ہوئے کن اس کے دم  
نکل کر کہیں ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ میں اپنے تہ مقابل کی  
متوجہ ہو گیا۔

مجھ سے غور بڑا سکوانے والا بڑا برہم تھا۔ اس نے  
تین جھکے دے کر خود کو سنبالا اور گن سیدھی کرتے  
بڑے چار حانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ یہ حملہ فلاح  
مشتمل تھا۔ میں نے ٹھیکہ دے سے پیش تر ہائی چپ  
اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے عقب میں کھینچ لیا۔

وہ جھنجھلا کر پیچھے مڑا اور میں نے اس کی جھنجھلاہٹ  
تھکے لگا دیے۔ میری ایک برق رفتار ہاف تک اس کا  
ٹنگی۔ ہاف تک میں مل تک سے دو گنا طاقت ہوئی تھی  
اس کے ہاتھ سے اس طرح نفا میں اچھی جیسے کسی ہاتھ  
کے ہاتھ سے وقت نکل جاتا ہے!

اس کے دونوں ہاتھ دہائی دینے والے انداز میں  
ہوئے۔ میں نے اسی لمحے پیچھے ہوئے ایک بیک سوئپ کا  
اس کے قدم اکٹھے کر کے اور وہ منہ کے بل پیچھے آ رہا۔ وہ  
زمین پر پہنچا۔ میں نے اس کی پشت پر ایک جھکے سے  
جرک لگ کر سید کر دی۔

وہ اپنی تشریف پر قصد بقی مہر عبت کر دینے کا  
حرکت میں آیا اور "حرکت میں برکت" کے اصول  
کرتے ہوئے بیل کے دڑنی پائے سے جا کھڑا۔ مہما  
تک اس کی جودرگت بٹائی تھی یہ اس میں ایک شانہ  
اضافہ تھا۔

اس کے قلع سے ایک درد ناک کچ برآمد ہوا  
دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تمام کر فرش پر لوٹ پوٹ  
لگا۔ میں نے اسی لوٹ پوٹ حالت میں اسے ایک ڈ  
لک ماری اور دور لڑھکا دیا۔ وہ بے ترتیب رول  
ہوئے اپنے ساتھی کے قریب پہنچ گیا۔

اسی لمحے مجھے راکیل کے ہاتھ میں گن دکھائی دیا  
تسل بخش سانس میرے سینے سے خارج ہوئی۔ اس  
سے پٹنے والے مسلح شخص کے ہاتھ سے نکلنے والی گنا

انہوں نے بے ساختہ میری نگاہ کے تعاقب میں پلٹ کر  
پیچھے دیکھا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت کافی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے کسی پچھتے کے مانند ایک زبردستی  
اور ہنر مند طور پر کن کن بردار افراد کے قدموں میں کھینچ لیا۔ یہ  
سب کچھ چشم زدن میں پیش آیا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں کو  
اگلے ہی لمحے اپنے بے وقوف بن جانے کا احساس ہو گیا۔ وہ  
بڑے چار حانہ انداز میں اپنی گنوں سے پلٹے اور مجھے نشانہ  
بنانے کی کوشش کی۔ میں اب وہاں نہیں رہا تھا جہاں ان کی  
گنوں میں تھی۔

میں ان کے قریب پہنچ کر کسی مٹی کے مادہ کی طرح  
کونا پکڑ کر خاموش نہیں بیٹھ گیا تھا۔ بے وقوف بننے کے بعد وہ  
جس نوعیت کا زہل ظاہر کر سکتے تھے اس کا مجھے بے خونی اندازہ  
تھا۔ وہ پلٹ کر مجھے کو لیوں سے بھوننے میں ایک لمحے کی تاخیر  
نہ کرتے۔ اور انہوں نے اسی ہی کوشش کی تھی۔

میں نے ان کی کوشش ناکام۔۔۔ بنادی۔ میں جھلاٹک  
لگانے کے بعد جیسے ہی ان کے نزدیک فرش پر پہنچا۔ میں نے  
اپنے کندھے پر ٹکا کر ایک جھکے سے دونوں ناگوں کو ہوا  
میں بلند کر دیا۔ پھر میں نے کمر کی ٹوٹ کے سہارے اپنی  
ناگوں کو کسی سیٹنگ چین کے بلڈز کے مانند تیزی سے مہمیا دیا۔  
نتیجہ میرے حسبِ فضا برآمد ہوا۔

ان دونوں کی میری سمت آنٹی ہوئی گنوں پر میرے پاؤں  
کی شدید ٹھوکریں پڑیں۔ فائرنگ کے زوایے پلک جھپکتے میں  
تبدیل ہو گئے۔ وہ جو ایک سو آتی ڈگری پر درست مار کر میرے  
وجود کو ادھیڑ ڈالنا چاہتے تھے ہٹ کر دیواروں اور چھت پر  
کولیاں برسا کر رہ گئے۔

اس ناکامی نے انہیں میری لوکیشن سے آگاہ کر دیا  
تھا۔ انہوں نے بڑے بھرے ہوئے تہوں کے ساتھ میری  
طرف رخ کیا لیکن میں اب انہیں گنوں کے استعمال کا کوئی موقع  
نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے بجلی کی سی تیزی سے ایک پیٹل پیش اب لگایا اور  
کسی اسپرنگ کے مانند اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں ان  
دونوں کے درمیان تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی گنوں کو مجھ پر  
آزماتے۔ میں نے بڑی تیزی سے ایک کے پیٹ میں فرنٹ  
پیش لک ماری پھر ایک قدم پیچھے آتے ہوئے دوسرے کے  
تھوہڑے پر دھمیل لک جڑی۔ میں نے یہ دونوں گنوں سے لگائی  
انداز میں چلائی تھیں لہذا وہ ان ٹھوکروں کی زد میں آ گئے۔ وہ  
شاید مجھ سے ایسی تیزی اور طراری کی توقع نہیں کر سکتے تھے!  
پیٹ میں فرنٹ لک کا نذرانہ وصول کرنے والا بیک

کر لیا تھا اور اپنے قریب بڑے ہوئے نیچے شخص کو نشانے پر رکھے کھڑی تھی۔ اس موقع پر راکیل نے خاصی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر زمین پر بڑے ہوئے شخص کو کالر سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ میں اس سے چند سوالات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس موقع پر اس نے بڑی عجیب حرکت کی۔ اس نے بڑی سرعت سے اپنی گردن کو جھکا دیا اور کسی وحشی دوندے کے مانند جڑے کھول کر میری کلائی میں دانت پیوست کرنے کی کوشش کی "کوشش" کا لفظ اس لیے کہ میں نے اسے اس انسانی حرکت میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

میں نے اس کے کالر کو چھوڑتے ہوئے ایک ٹھٹھا اس کے آگے بڑھے ہوئے تھو بڑے پر رسید کیا۔ نرم ہڈی کے بحروح ہونے کی دھیمی سی مخصوص آواز پیدا ہوئی اور وہ شخص ذبح ہوتے ہوئے تیل کے مانند ڈرنا لگا۔ وہ قربانی کا تیل نہیں تھا لہذا میرا برداشت اسے چھو کر نہیں گزرا تھا۔

میں نے ایک گھٹنے پر بس نہیں کی۔ چار پانچ بچی نکلس لگا تا رہا اس کے منہ سینے اور پیٹ پر رسید کر دیں۔ ان ٹوکروں میں ایک جنون بھرا ہوا تھا۔ مغرب شخص چاروں خانے چت ہو کر ہاتھ پاؤں بچھکنے لگا۔

میں نے راکیل سے مخاطب ہوتے ہوئے گھیر لہجے میں کہا "یہ بد بخت تمہاری صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ تم ہی اس کی خاطر مدارات کرو۔" اس شخص نے خالص زنا نہ انداز میں میری کلائی کو چپٹا جانا تھا۔

میرا اشارہ پا کر راکیل بھوک شیرنی کے مانند آگے بڑھی اور گن کو کسی لٹے کے طور استعمال کرتے ہوئے زمین پر شخص کی ہڈیوں کی حراج برسی کرنے لگی۔ یہ منظر بڑا دلچسپ اور تفریحی تھا۔ سینے والا شخص بری طرح ہلکا رہا تھا اور راکیل کسی سوا من کی پھر چلی دھو من کے انداز میں اس کے پکڑوں کو جسم سمیت کوٹ کوٹ کر اجلا کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

میں اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد دوسرے شخص کی جانب بڑھ گیا۔

اس کا چہرہ بڑا بھیا یک منظر پیش کر رہا تھا چہرے کے ایک ایک حصے سے وحشت بریں نمی۔ بیٹھ کے دڑنی بائے سے ہونے والے ٹکڑاؤں نے اس کے منہ تک سے خون چھڑا دیا تھا۔

اس کا خون اگلا دہانہ چب چب کر اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ زبان کے کنارے کے علاوہ اس کے چند دانت بھی اپنے مسکن کو چھوڑ چکے تھے۔ ایک ہی نظر میں میں نے اس کا تنقیدی جائزہ لے لیا۔ وہ اب کسی قسم کی حراست کے قابل نہیں رہا

تھا۔ یہی بہت تھا کہ وہ زندہ تھا۔۔۔۔۔ اور اپنے کیے پر بخیر شرمندہ تھا!

اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے راکیل کی جانب دیکھا۔ اس نے مار مار کر اپنے شکار کا بھرتا بھرتا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاتھ روک لو گارشیا! یہ کہیں جان ہی سے نہ گز جائے۔"

"ڈسلاو لوگ ہماری جان لینے آئے تھے۔" وہ بھڑکے ہوئے لہجے میں بولی "ڈرا ان کو تپتا چلے جان کیسے لگتی ہے؟" حملہ آوروں کا خیال تھا ہم نے میک اپ کے ذریعہ اپنے چلے تبدیل کر کے ہیں درنہ ایک سوا یک ہی صدمہ دو لوگ ہیں جنہوں نے انوکھنگان کے کچے پکائے حلوے میں مٹی بھر مرچ ڈال دی تھی۔ وہ جب ہمیں شنی موٹا اور انوکھنگان کا دشمن سمجھ رہے تھے تو پھر احتیاط کا تقاضا تھا ہم ایک دوسرے کو اپنی ناموں سے پکاریں جوئی ڈی اے کے مسافروں کی حیثیت سے ہمارے تھے۔

ڈسلاو گارشیا اور یو آن ماؤ!

دیے میں نے جب راکیل کو گارشیا کے نام سے پکارا تو اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئینہ ابھری آیا تھا اس آئینہ کے مندرجات واضح نہیں تھے تاہم ذہن کو سوچ کے لیے ایک روزن مل گیا تھا اور۔۔۔۔۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

میں نے راکیل سے کہا "یہ بھلے ہماری جان کے ڈر سہی مگر ہم ان کے غلیظ خون سے اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کرنا گے۔ ان کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ ان کی جان ہمارے کام آنے والی ہیں۔"

راکیل نے میرے اس معنی خیز خیال کے جواب میں کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے مزید کہا "دیے مجھے امید تو نہیں کہ ان دو لوگوں میں سے کوئی گز بڑی کوشش کرے تاہم تم انہیں مس نہ کرنا رکھنا۔ اگر کوئی ہیر دینے کے موڈ میں دکھائی دے تو ہاتھ ہاتھ چھلی کر کے رکھ دینا۔ میں ڈرا ہا ہر کی صورت حال کا جائزہ لے آتا ہوں۔"

راکیل نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور دم سوخت کر کھڑی ہو گئی۔

میں تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ جس دورہ میں میں کمرے کے اندر ان دو گن بردار افراد سے تیرا رہا ہا ہر محل سناٹا طاری رہا تھا اور یہ خاصی تشویشناک

تھی۔ گھیسر صورت حال بہت سے معنی خیز اشارے کر رہی تھی۔ چپاٹ کی مسلسل خاموشی زنا نے داردو کا فائرنگ کی مخصوص نرزا بہت انسانی چب۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ! میرا ذہن شدید ابھمن کا شکار تھا۔

بیدروم کے باہر کی گز بڑ کا احساس ہوتے ہی میں نے چپاٹ اور حملہ آوروں میں تکرار کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد ہی کوئی گن گرجی تھی۔ اس کی گرج میں انسانی چب بلند ہوئی اور پھر ساعت ٹھنک دھکا!

میں انہیں تشویش ناک خیالات کو ذہن میں بٹھانے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا اور پھر وہاں کے منظر نے مجھے درطاعت میں ڈال دیا۔ چپاٹ کا جسم مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر ادھر ادھر بٹھا ہوا تھا۔ برآمدے کے آخری سرے پر ایک شخص کی لاش نظر آرہی تھی۔ وہ شخص مقامی تھا اور یقینی طور پر حملہ آوروں کا ساتھی!

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ حملہ آوروں کا تیسرا ساتھی چپاٹ کی فائرنگ سے ہلاک ہوا تھا اور۔۔۔۔۔ چپاٹ کے وجود کے دجیاں بکھرنے والا ان دو افراد میں سے کوئی ایک تھا جو پیکسرس کی حالت میں اندر بیدروم میں راکیل کا ٹارگٹ بنے ہوئے تھے۔

چپاٹ کے حسرت ناک انجام نے مجھے طویل کر دیا۔ اس نے ہماری حفاظت میں اپنی جان دے دی تھی۔ میرے ذہن میں یک بہ یک وہ ساعت ٹھنک دھکا کو گونج رہا تھا چپاٹ کو کسی دقتی بم سے اڑا لیا گیا تھا۔ اس غیر یقینی حرکت سے حملہ آوروں کی نفسیات ٹھٹکی تھی۔ وہ بہت ہی اچڑ اور وحشی مزاج کے حامل تھے۔ خدا کا شکر تھا ان کی وحشت ہم تک پہنچنے سے پہلے سوالات کی سرائے میں لکائی قیام کر رہی تھی ورنہ پتا نہیں کیا ہوا تھا!

میری زندگی میں بار بار ایسے مواقع آئے ہیں کہ میرے اور موت کے درمیان فاصلے مٹ گئے لیکن وہی بات ہے جسے اللہ کے ارے کون چھپے؟ بہر حال چپاٹ کی الٹناک موت کا مجھے دلی رنج ہوا اور میں جو میل قدموں کے ساتھ دابھیں کمرے میں آگیا۔ تقدیر کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اس ایثار پیشہ محافظ کی موت اسی طرح ٹھٹکی تھی!

آئندہ چندہ منٹ کے اندر میں نے ہٹ میں سے تھوڑی کوشش کے بعد ایک مضبوط ری تلاش کی پھر راکیل کی دوسرے مغلوب افراد کو میں نے واٹس روم میں پہنچا دیا۔ انہیں اوجھڑت ترتیب دینے کے بعد میں نے تائیگون کی ری کی مدد سے کمر کا بانڈھ دیا۔ میں نے بند میں لگاتے وقت اس بات

کا خیال رکھا تھا کہ ان کی آزادی حاصل کرنے کی کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکے۔ اگر وہ میری لگائی ہوئی گرجوں کو کھولنے کے لیے جسمانی طاقت صرف کرتے تو وہ گرجیں اور مضبوط ہو جاتیں۔

واٹس روم کے دروازے کو باہر سے کھڑی لگانے کے بعد میں نے راکیل سے کہا "تم اپنا بیگ کھول لو اور میک اپ والا ہاسک نکال کر شروع ہو جاؤ۔"

ہم نے میک اپ کا ضروری سامان راکیل کے بیگ میں رکھا تھا۔ ایک خوبصورت اور فیشن ایبل عورت ہونے کے ناطے اس کے پاس وہ سامان دیکھ کر کی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے ایسی خنجر کا ٹھیکس کا ذخیرہ کیا تھا جو ہماری ضرورت کے عین مطابق ہو۔ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اچھوتے آئینہ کے پیش نظر راکیل کو وہ ہدایت دی تھی۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک واضح نقشہ ترتیب پا چکا تھا۔

راکیل نے ابھمن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی "میں سمجھ نہیں سکی کہی شروع ہو جاؤں؟"

"جتنی جلدی ممکن ہو سکے تمہیں گارشیا بٹھانا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اور مجھے ڈسلاو۔ ہم دونوں دوست ہیں جن کا تعلق واقفشن کے علاقے سیٹل سے ہے۔"

"اوہ!" اس نے ایک طویل سانس خارج کی پھر پوچھا "اور ڈاکٹر موگ؟"

میں نے جواب دیا "جب تک ڈاکٹر موگ ریلوے دابھیں آتا، ہم اپنے مبینہ ملیوں میں آچکے ہوں گے۔ پھر اسے بھی یو آن ماؤ بٹھانے کا۔"

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ کوئی سنسنی خیز پلاننگ کر چکے ہوں۔" وہ بیگ کھول کر بیوی ہاسک باہر نکالتے ہوئے بولی۔

"تم باہل ٹھیک محسوس کر رہی ہو۔" میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

ہم اس دقت ای کمرے میں تھے جہاں تھوڑی دیر پہلے معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ زبردست دونوں دشمنوں کو میں نے دوسرے کمرے کے واٹس روم میں قید کیا تھا۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ان دونوں کی ساعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

دوران میک اپ۔۔۔۔۔ راکیل نے کہا "وہدراں! یہ کیسی عجیب بات ہے جب ہم اپنے اصلی چلے میں تھے تو حملہ آوروں نے ہمیں میک اپ میں سمجھا اور جب ہم نے اپنا میک اپ اتارا تھا تو ہاتھ چو اپنی دانت میں ہمیں میک اپ میں دیکھ

کر حیران رہ گیا تھا!"

"مجھے بھی اس پر حیرت ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے یہاں اریب خریب میں ہمارے سوا اور کوئی موجود ہی نہ ہو۔"

"قانون کے محققوں کو تو اس واقعے کا لوٹ لینا چاہیے تھا!"

میں نے کہا "چند روز ہزار نفوس کی کل آبادی میں قانون کے محقق بھی کتنی ہی کے ہوں گے اور رات کے آخری پہر ممکن ہے وہ لوگ گہری نیند میں ہوں۔ اس جزیرے زونا و آبی لینڈ کا رقبہ ایک سو تیس مربع میل ہے لہذا آبادی خاصی محدود رہی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس ہٹ سے میلوں کے فاصلے تک کوئی قانون کار کھولا یا چوکی موجود ہی نہ ہو!"

"شاید ایسی ہی بات ہے۔" وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے مجھ سے پوچھا "وہ جان! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی گہری نیلی آنکھوں میں جھانک کر سنجیدہ لہجہ میں کہا "ہم دونوں ڈی ڈی بلیوے کے مسافروں، گارٹیا اور ڈسلا کا روپ دھار چکے ہیں۔ ڈاکٹر مونگ بھی داہنی پر یو آن ماڈ کا حلیہ اختیار کرے گا۔ ہم تینوں گزشتہ صبح چہل قدمی کے ارادے سے ہوٹل اتر پورٹ سے نکلتے ہیں۔ باجی منٹ بعد نینڈرا شیڈز کے قریب ہمیں چند ایسی افراد گھیر لیتے ہیں پھر گمن پوائنٹ پر ہمیں مجبور کر دے وہ اس ہٹ میں لے آتے ہیں اور ہمیں ایک کمرے میں قید کر دیا جاتا ہے۔" میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا۔ راکیل بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہم ان افراد کے ہمارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن وہ اپنے رویے اور سلوک سے ہمارے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ ہم انہیں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہمیں آزاد نہ کیا تو ہماری فلاح نکل جائے گی لیکن جواب میں وہ ہمیں شنی مونگا نامی کا شخص کا حوالہ دے کر دھمکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے آنے کے بعد ہی ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ ہم اس دوران میں اپنے اندازے سے بہرہ لیتے ہیں کہ شنی مونگا ان کی سرخند کا نام ہے اور وہ لوگ ہائی جیکرز کے حمایتی ہیں۔ ہماری جہاز والی کارروائی انہیں پسند نہیں آئی لہذا وہ ہمیں کسی سخت ترین سزا سے گزرتا رہا ہے ہیں مگر انہیں شنی مونگا کی آمد کا انتظار ہے۔"

"ابھی تو ڈی دیر پہلے تک ہم تینوں ان لوگوں کے دم کرم پر تھے۔ اس دوران میں ہمیں نہیں معلوم زونا و آبی لینڈ پر کیا حالات پیش آچکے ہیں۔ ہماری فلاح اس جزیرے سے

"ہم جس راہ کے مسافر ہیں اس میں کام بہ کام ایسی عجیب و غریب صورت حالات سے سامنا ہوتا رہتا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "حالات و واقعات کا زاویہ بدلی جائے تو جڑ کے کے نتائج میں بھی ایک واضح تبدیلی آجاتی ہے۔" ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"زمین پر کھڑے ہو کر آسان کی طرف نگاہ اٹھائیں تو چاند ہمیں اوپر دکھائی دیتا ہے جب کہ چاند کی سطح پر کھڑے ہو کر اگر زمین کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ بھی آسان پر ٹھہری نظر آتی ہے۔ زاویہ نگارہ (پوائنٹ آف ویو) کی تبدیلی سے مشاہدے کے نتائج خود بخود بدلی جاتے ہیں۔"

وہ اپنے میک اپ کو فائل کچھتے ہوئے بولی "پتا نہیں ان منحوسوں نے ہمارا سراغ کیسے لگایا جب کہ ہماری صورت شکل میں نمایاں "تبدیلی" موجود تھی!"

"یہ لوگ ہمارے طیلوں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں نہیں پہنچے ہوں گے۔" میں نے بھی میک اپ کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا "اگر ایسی بات ہوتی تو یہ لوگ رات کے ابتدائی حصے میں ہی ہمیں چھاپنے کی کوشش کرتے، ہمیں اتنی سہلت ہرگز نہ دیتے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تاہم میرا اندازہ ہے ایک دور دراز اور غیر آباد ہٹ کو آباد ہوتے دیکھ کر یہ ہماری طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا ہوگا کہ تین غیر مقامی افراد رات کو یہاں آئے ہیں تو انہیں اس "قیام" سے تشویش ہوئی ہوگی۔ ازاں بعد چپاٹنگ کی مزاحمت نے ان کے شک کو یقین میں بدل دیا ہوگا۔ جن تین افراد کی انہیں تلاش ہے وہ ہم ہی ہیں۔ بہر حال فی الحال حتی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

وہ بیزار سی بولی "ان شیطانوں پر لعنت بھیجو۔" پھر اس کی آواز بھرا گئی "مجھے چپاٹنگ کی موت کا سخت انوس ہے۔"

میں نے راکیل کو چپاٹنگ کی "کیفیت" سے آگاہ کر دیا تھا تاہم اس نے چپاٹنگ کی لاش کے ٹکڑے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چپاٹنگ کی موت کا مجھے بھی بہت انوس تھا لہذا کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے میں خاموش ہی رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد راکیل نے کہا "یہاں ابھی خاصی فائرنگ ہوئی ہے اور ایک بم بھی بلاست ہوا ہے لیکن ابھی تک کوئی شخص اس طرف متوجہ نہیں ہوا!"

روانہ ہو چکی ہے یا نہیں ہم نہیں جانتے۔ اس سے آگے کہانی میں ایک ٹرنک پوائنٹ آتا ہے۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں نے ذرا توقف کیا اور سوالیہ نظر سے رائل کو دیکھا۔ جب وہ خاموش رہی تو میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”رات کے آخری پہر ان لوگوں کی تم پر یعنی گارڈیا پر نیت خراب ہو جاتی ہے۔ وہ تمہیں ایک کمرے سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے جاتا چاہے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ڈسٹو اور پوائنٹ ماؤ کو کن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے لیکن ان لمحات میں عورت کی ہوس نے انہیں پہلے پھٹا چاقو بچہ بند نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ ہمیں اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہم فوراً انٹیکشن میں آ جاتے ہیں اور پھر بازی ہلت جاتی ہے۔ اس صحنے میں ان کے دو آدمی انہی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار جاتے ہیں۔ باقی دو کو ہم بے دست دیا کر کے ہاتھ ردم کی فرش کشی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا لہذا اسے ان کا سامنی ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم نے ان لوگوں پر کیوں کر غلبہ پایا؟ ہم سے یہ سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ زونڈ آئی لینڈ والوں کو اب تک اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم نے ہائی جیکرز پر کس طرح قابو پایا تھا۔ کسی کو ہمارے تازہ ترین ”کارنامے“ پر حیرت نہیں ہوگی اور جہاں تک ان دو شیعوں کا تعلق ہے تو ان کی کون سنے گا۔ شنی مونگا کنگ تو ہمارا ڈولا کا بھتیجا بھی لیکن اس کا شمار کنگ کے دشمن افراد میں ہوتا ہے۔ جب یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ شنی مونگا ہوئی جیکرز کا پشت پناہ ہے تو کنگ اس باغی جیسے کا جلوس نکال دے گا۔ ممکن ہے، کنگ کو آج تک ایسا جاندار کوئی موقع نہ ملا ہو۔ یہ موقع اسے ہم فراہم کر دیں گے۔ اس کے بعد ہمیں یہاں سے جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ کنگ کے خصوصی صحنے سے ہمیں ہماری ہی خواہش برہمائی اڑا لائیں گی اڑیں۔“ اے۔“ قہری قہرئی“ سے ٹھیک آٹھ بجے بیج سیٹل جانے کی اجازت مل جائے گی۔ مردوں نوڈو غیرہ کل دن میں گیارہ بجے یہاں سے روانہ ہو گئے تھے لہذا اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ سیٹل اڑ دیتا!“

”دس سیٹل اڑ دیری دغز فل!“ وہ جوش بھرے لہجے میں بولی ”وہدان! تم تو اچھے خاصے فکشن رائٹر ہو۔ کبھی اس شبیہ میں غرائی کی؟“

میں نے مذاق کے رنگ میں کہہ دیا ”اگر امریکا کا کوئی پبلشرس موقع تو میں کوشش کرنے کے بارے میں سوچ سکتا

ہوں۔ میں نے سن رکھا ہے یہاں اس کام کا بہت زیادہ معاوضہ ملتا ہے۔“

”تم نے کچھ غلط نہیں سنا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”فکشن رائٹر کو بھی اس کی کلاس کے مطابق ہی معاوضہ ملتا ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس کام سے ٹھیک ٹھاک گزارہ کر لیتے ہیں البتہ بعض ہاٹ ٹیک بیٹس سیکرڑاے فکشن رائٹر بھی ہیں جن کا ایک ناول ان کی زندگی بھر کی روزی روٹی کا باندہ دست کر دیتا ہے۔“

مجھے مذاق سوچا ”میں نے برجستہ پوچھا ”رائیکل! تم کس فکشن رائٹر کے معاوضے کا نصف بہتر ہو؟“

اس نے روزی روٹی کے لیے ”برڈ اینڈ بولس“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں اس کے ٹک غم ”روٹی“ کے حوالے سے اس سے خاصی اٹھیلیاں کر چکا تھا لہذا اس نے میرے مذاق کو بڑے بھروسہ انداز میں انجوائے کیا۔ اگلا انجوائٹ میرے سوال کا تسلی بخش جواب تھا۔

میں نے رست واپس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”میں جلد از جلد اس ہٹ سے کل کر کنگ کے کسی آدمی سے رابطہ کا چاہیے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے قدرے اضطرابی لہجے میں کہا ””

”جیسے یہ اللہ کا بندہ ڈاکٹر مونگ کہاں رہ گیا!“ ڈاکٹر مونگ کے سلسلے میں رائل کو بھی تشویش تھی۔ چنانچہ کے مطابق ڈاکٹر کنگ ہنگ دو بجے رات ہٹ سے گا تھا اور اس نے چنانچہ کو ٹھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہا تھا۔ اب سوچا رنج رہے تھے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر مونگ کی ”ٹھوڑا دیر“ کتنی طویل و درغیض تھی!

رائیکل نے ایک اہم سوال اٹھایا ”اگر ہم علی الصبار یہاں سے نکل جاتے ہیں تو ہانگ جو ہمارے بارے میں کیا سوچے گا۔ آخر کو وہ ہمارا میزبان ہے۔ اور اس نے ہر ممکن تعاون کیا ہے؟“

”ہانگ جو کو جب ہمارے بارے میں سوچنے کا غلط آئے گا ہم زونڈار آئی لینڈ کی زمین کو چھوڑ چکے ہوں گے۔ میں نے رائل کے غیاب میں ہانگ جو سے ہونے والی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ”ہم اسے صاف متع کر چکے ہیں اڑیں سے سزا کا ارادہ نہیں رکھتے لہذا وہ ہمیں مت تعجب کرنے نہ آئے۔ میرے خیال میں وہ دس بجے سے اوپر کا رخ نہیں کرے گا۔“ ٹھوڑا توقف کرنے کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اس کے بعد ہانگ جو ہمارے میں جو بھی سوچے اس کا حق ہے۔ ہم کسی وضاحت

لیے واپس تو نہیں آ سکتے!“

وہ مسی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گئی پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی رونما ہوئی جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آئی ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے سوال داغ دیا۔

”وہدان! وہاں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تمہاری حالت کیوں بگڑ گئی تھی؟“

میں ہلکے جھپکے میں سمجھ گیا اس کا اشارہ میری کون سی حالت کی طرف تھا۔ ہوئی اڑ پورٹ کی طرح یہاں بھی میں نے اسے خوبصورتی سے ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نے نہایت ہی جھجکی سے کہا۔

”رائیکل! جب کوئی شخص میری بات نہیں مانتا یا مجھ سے وعدہ خلافی کرتا ہے تو مجھے بہت دکھ پہنچتا ہے۔ بس پھر میری ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے!“

اس نے عجیب نظر سے مجھے دیکھا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی ”وہاں آرام کرسی پر بیٹھے بٹھائے کس نے تم سے وعدہ خلافی کی؟ تمہاری کون سی بات نہیں مانی۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا کس نے کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ کس نے تمہیں دکھ پہنچایا؟“

”تم نے رائل!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بھونچا سی رہ گئی ”میں نے.....!“

”ہاں تم نے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی تھی۔“

”تاہم میں تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے ”پتا لگاتے“ ہوئے کہا ”رائیکل! میں نے کرسی کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے تم سے کہا تھا ”تم میرے بستر پر آرام سے سو جاؤ۔ پھر میں نے تم سے چند منٹ کی رخصت مانگ کر تمہیں بند کر لی تھی اس بدایت کے ساتھ کہ تم خاموش رہو گی اور میرے کام میں مداخلت نہیں کرو گی۔“ میں نے جملہ اور دہرا چھوڑ کر کشا کی نظر سے اسے دیکھا اور سلسلہ نظام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب تم نے بازو سے چھوڑ کر اور زبان سے پکار کر مجھے جگایا تو میں نے اپنی کلی آنکھوں کے سامنے نہیں پایا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے تم نے نہ صرف وعدہ خلافی کی بلکہ میری بات بھی نہیں مانی۔ تم خاموش رہیں اور نہ ہی میرے کام میں مداخلت سے باز آئیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس سوال کے جواب میں مجھے ایک خوشگوار دھکا لگا۔

رائیکل ایک دم مجھ پر ڈھسے سی گئی تھی۔ بڑی خوشی سے بولی ”تم بڑے بد معاش ہوو جہدان!“

ایک آزاد خیال امریکی حسینہ کے بے لاگ لبوں سے اپنے لیے بد معاش کا لفظ سن کر مجھے عجیب سے لگا۔ رائل نے اس تبصرے پر بس نہیں کیا بلکہ مجھ پر گرتی ہی بدن کو دھکیلا چھوڑ دیا۔

میں اس وقت بیڈ کے کنارے پر تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ہم دونوں قسم گھما زمین پر پڑے نظر آتے۔ میں نے اپنا توازن بگڑتے دیکھا تو بے ساختہ میرے ہونٹوں سے نکلا ”اررر..... رے! یہ کیا کر رہی ہو رائل! تم گر جاؤ گی۔“

”مجھے پورا یقین ہے تم مجھے گرنے نہیں دو گے۔“ وہ میرے ساتھ غلط غلط ہوتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی ”اس وقت تم کرسی پر بیٹھے ہو..... اور نہ ہی کن پوائنٹ پر ہونے تو مجھے اس وقت بھی بخوبی سنجال آیا تھا!“

میں نے اس کے یقین کو ٹھیس میں پہنچتے دی۔ اس کا یقین ٹوٹ جاتا تو وہ بھر کر رہ جاتی۔ میں نے اسے قہقہہ لیا۔ اس دوران میں ہم اپنا توازن کو بیٹھے تھے۔ کشش ثقل نے اپنا کام دکھایا اور رائل مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے اس طرح فرش تک پہنچی کہ مجھے لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ گندم سے بھری سونگھی خوشبوداری کی پوری کے مانند مجھ پر لد گئی۔

وقت کے بکھر دینے کو یا اپنے جگہ سیٹ لیے۔ اس کی پرواز ختم گئی۔ ان لمحات میں زمین اپنے غور پر انکسرت بددعاں بھی لہذا کشش ثقل کا کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں تھا۔ ہم دو اجسام۔ نقصانے بیہوش میں مطلق ہو کر رہ گئے۔ اس کائنات میں ہم نیٹوں کے افندہ کردہ قانون تجاذب کی تحلیل کرنے لگے۔ رائل کی خود سپردگی، میری دارنگی کا سبب بن گئی۔ میں اپنے محور پر ڈگ مگا کر رہ گیا۔

بعض متقاضی حالات میں مجبور محض بن کر انسان کو اپنے مقام سے گرنے میں بازو آتا ہے۔ فوم کے دبیز اور آرام دہ بستر کو چھوڑ کر زمین پر سونا بھلا لگتا ہے!

☆☆☆

زونڈارین اڑا لائیں گی اڑیں۔“ اے۔“ قہری قہرئی“ نے ٹھیک آٹھ بجے صبح بودار اڑ پورٹ سے ٹیک آف کیا۔ ہم تین ڈسٹو اور پوائنٹ ماؤ کی حیثیت سے اس جہاز کے مسافروں میں شامل تھے۔ اس عمارت کی طرح ہماری منزل بھی واضح نہیں تھی۔

ڈاکٹر مونگ ریفرے ساڑھے چار بجے واپس آیا تھا۔ ہٹ کے ”حالات“ نے ٹھوڑی دیر کے لیے اسے متذبذب

وقت آگاہ و محاورہ نہ دے اپنے یقین کا اظہار نہ کرتا۔ ڈاکٹر کا گریہ دیکھتے ہوئے میں سمجھ گیا کہ اس ذیل میں پوچھے گئے میرے کسی سوال کا وہ سیدھا جواب نہیں دے گا لہذا میں نے کرپڈ اور نثر کا خیال دل سے نکال دیا اور موضوع بدلنے ہوئے اس سے پوچھا۔

اس نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر بے لطف لہجے میں بولا "ہاں مجھے ایک کیس اسٹیشن سے سیٹل فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ تمہارے سیٹل جانے پر ساگ فو مطمئن ہیں۔" اس نے ایک اور چوکا دینے والی بات کی تھی۔ "ازکر سے سیٹل جانے کا پروگرام میں نے اس کی فیئر موجودی ٹیوٹلے کیا تھا پھر وہ کسی ساگ فو سے میرے سیٹل جانے کو کیسے ڈسکرس کر سکا تھا۔" ازکر مومک کی شخصیت اور "حرکات"۔

جواب دینے سے پہلے اس نے چند کلمات تک بڑا  
مہر پر نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا "ساگ فوسٹل ہے  
ہمارے سب کچھ ہیں سب بڑوں سے بڑے ہم انہی۔  
اشاروں پر حرکت کرتے ہیں۔"

البت سے واقف ہوں وچان اس لیے.....  
ہمارے درمیان وہ گفتگو سرگوشیاں انداز میں ہو رہی تھی  
اس نے جملہ ادھر ادھر کا خاموشی اختیار کی تو میں پوچھے،  
رہ سکا۔

ڈاکٹر کی ہمت میں آمد کے بعد ہم نے ایک سیکل دور  
واقع پولیس چوکی سے رابطہ کر کے کنگ کے حالات حاضرہ سے  
آگاہ کرنے پر زور دیا سارے دروازے خود بہ خود کھلے چلے  
گئے۔ ٹی ڈبلیو۔ اے کے یونگ سیون فور سیون کو پیش آنے  
والا واقعہ زیرے میں ”برنگ ٹاپک“ بنا ہوا تھا اور ہم اس  
کامیاب آپریشن میں ہیروؤں کی حیثیت رکھتے تھے لہذا ہمیں  
ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہماری خاطر کنگ کو اپنی نیند خراب کرنا  
پڑی اور وہ پوری مستعدی کے ساتھ احکام صادر کرنے لگا۔

”تم! کیا کچھ اٹھ کر ہٹ سکتے ہو؟ کہاں چلے گئے تھے؟“  
 ”بس ذرا ایک تھیل لگانے نکل گیا تھا۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔

میں اس کے آخری جیلے پر چوبک اٹھا۔ اس جیلے کا دار  
مطلب یہی تھا وہ ہٹ پر پیش آنے والے واقعے سے قبل

وہ لبیر آواز میں ہوا "تھینک یو!"

میں ”بیمبکی نیند“ کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا، بعض ہنگامی حالات میں، میں خود بھی اس ٹیکنیک سے استفادہ کر چکا تھا لیکن دس سال ایسے طویل عرصے کا سن کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی۔ یہ نائیکسن... حد تک حیران کن تھا۔  
 ”دس سال!“ میں نے تعجب لہجے میں دہرایا۔

میں نے اسے تو مسمیٰ نظر سے دیکھا اور کہا ”میں بھی اس عادت کو اپنانے کی کوشش کروں گا۔“ پھر اپنی معلومات کے لیے پوچھ گیا ”کیا مسلسل ایک طویل عرصے تک ایسا کرنے سے انسان کی مجموعی صحت پر کسی قسم کے برے اثرات تو مرتب ہوتے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ قطعیت سے یوں ”تم مجھے دیکھ لو۔  
مگر زبے ہوئے دس سال نے میری ذہنی، جسمانی اور روحانی  
صحت کا کیا زلزلہ ہے۔ البتہ.....“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا  
پھر اہم بات طے کرتے ہوئے لگا۔

”ابتدا میں اس نیند کی پریچس سے انسان الہما ضرور ہے لیکن رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نہایت ہی پیچیدگی سے اگر کوئی بھی کام کیا جائے تو کامیابی ضرور قدم چوستی ہے۔ بس اس کے لیے عادت قدمی اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے جو تم میں بڑی دافر مقدار میں موجود ہیں۔“

پریکٹس میں لگ جاتا ہوں۔“ میں نے پُر عزم لہجے میں کہا  
 ”میں بس نوعیت کی زندگی گزار رہا ہوں اس میں یہ ایک ہتھیار  
 ہے کم نہیں۔“

وہ یوں "فرصت نہیں ملی، حاصل کرنا پڑی ہے۔ موقع بہر بار ہاتھ نہیں آتا، کلانا پڑتا ہے۔" جیسے میں نکال لیتا ہوں۔" بات ختم کرتے ہی وہ اپنی نشست پر غور از ہی ہوا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سمجھ گیا، وہ چھپکلی نیند میں چلا گیا تھا۔ میں رائلز کی طرف موجود ہو گیا۔

جہاز نے مقررہ وقت پر، پہلے ان پورٹ کے کمرے کو  
مچھو لیا۔ اس وقت میری رست واپس ساڑھے بارہ بج رہی  
تھی۔ زوارا آئی لینڈ اور سیٹل کے مقامی وقت میں کل بج  
ڈھائی گھنٹے کا تفاوت ہے۔ گویا اس وقت سیٹل کی گھڑیاں سپر  
تیم بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ مختلف ملکوں کے مابین وقت کا  
فرق بھی بعض اوقات حیران کن نتائج سامنے لاتا ہے۔ ہم نے  
ٹھیک ساڑھے چار گھنٹے انز بس میں گزرے تھے مگر انز پہل  
تاخم زون پر یہ ساڑھے چار گھنٹے ہمارے لیے سات گھنٹوں  
میں بدل گئے تھے۔ شام دھمکی گردش کے مطابق، ہم آٹھ  
بجے صبح ہمارے میں زوارا آئی لینڈ سے اڑے اور تین بجے  
سہ پہر سیٹل کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ جو لوگ ملکوں  
ملکوں سفر کرتے رہتے ہیں، وہ بارہا اس حیرت آفریں تجربے  
سے گزرے ہوں گے۔

اثر پورٹ سے ہم نے ایک شان دار مجلس لی اور کچھ  
 جگہ چار بجے ہم اپنی منزل پر پہنچے جسے اس میں وہ وقت بھی  
 شامل ہے جو لینڈنگ کے بعد اثر پورٹ سے نکلنے میں صرف  
 ہوا۔ امریکا کی سمجھان آباد اٹلیس کی بہ نسبت واقعتاً خاصا کھلا  
 کھلا اور کشادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ تجزیہ مختلف اٹلیس میں  
 گھومنے کے بعد کا ہے۔ سیٹل میں ہماری منزل پانچر اسکوائر  
 جمی۔

پانیز اسکوائر بڑی خوب صورت جگہ ہے جو دو ایونوز اور دو اسٹریٹس کے باہمی ملاپ کے نتیجے میں وجود پاتا ہے۔ فرسٹ ایونو اور سیکنڈ ایونو، چہری اسٹریٹ اور تیس اسٹریٹ کو کراس کرتے ہوئے متوازی سفر کرتی ہیں۔ ان چاروں سڑکوں کے ایک دوسرے کے اوپر سے گزرنے سے، مربع صورت پانچ اسکوائر بن جاتا ہے۔ امریکا اور دیگر مغربی ممالک میں اسٹریٹ کا مطلب اچھی خاصی سڑک ہے، نہ کہ ہماری طرح کوئی چھوٹی سی گلی!

ڈاکٹر مومگ ریغوشے کی ہدایت پر ڈرائیور نے فیکسی ایک بڑی سی فکے لاشاب کے سامنے روک دی۔ انواع و

قسم کے رنگ برنگے پھولوں سے بھی اس بڑی سی دکان کے پہلو میں واقع زینے کے ذریعے ہم عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔

اس عمارت کا زیریں حصہ ساگ فواد اس کے آدمیوں کے استعمال میں تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے مجھے بتایا کہ ساگ فو کے علاوہ وہاں سات اور افراد بھی موجود تھے۔ چار مرد اور تین عورتیں۔ چیری اسٹریٹ پر واقع فلورل شاپ اور اس کے برابر میں موجود ریٹورنٹ ساگ فو کی ملکیت تھی۔ عقیبی حصہ رہائش کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں یہاں ایک بڑی سی دکان شاپ ہوا کرتی تھی ساگ فو نے کئی سال پہلے عمارت کا زیریں حصہ خرید لیا اور اپنے خاص بندوں کے ساتھ یہاں کاروبار شروع کر دیا۔ یہی سات افراد مذکورہ ریٹورنٹ اور فلورل شاپ (پھولوں کی دکان) کا نظام سنبھالتے تھے۔ ساگ فو بظاہر، چیری اسٹریٹ کا ایک سیدھا سادہ کاروباری آدمی تھا لیکن دنیا داری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ”آزم“ کے لیے بھرپور کار کر رہا تھا۔ اس کے عقیدت مندوں میں جب ڈاکٹر مونگ ریٹورنٹ جیسے مقبری موجود تھے تو پھر اس کی اپنی عقلی دہلاہرہ صلاحیتوں کا کیا ٹھکانا ہو سکتا تھا۔

رات آٹھ بجے مجھے ساگ فو سے ملنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مونگ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں فرش نشست کا اہتمام تھا۔ امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایسی نشست گاہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر مونگ مجھے وہاں پہنچا کر واپس چلا گیا تو میں بخور اس چھوٹے سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے کے اندر داخلے کے دو دروازے تھے جو مقابل دیواروں میں نظر آ رہے تھے۔ فرش نشست کے علاوہ اس کمرے میں کوئی قابل ذکر شے مجھے دکھائی نہ دی۔ کمرے کے فرش پر پہلے رنگ کا سٹیکٹیک کارپٹ بچھا تھا۔ ایک کونے میں تین ضرب تین ٹیٹ کا ایک چھوٹا سا سرخ کارپٹ بھی موجود تھا۔ قالین کا یہ سرخ ٹکڑا اچیلے کارپٹ کے ادھر بچھایا گیا تھا۔ میں اس کمرے کی سادگی اور سونے پن پر غور کر رہا تھا کہ ایک دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔

یہ وہ دروازہ نہیں تھا جو ڈاکٹر مونگ نے آمد رفت کے لیے استعمال کیا تھا بلکہ یہ اس کے مقابل والا دروازہ تھا اور اس دروازے سے جو شخصیت اندر داخل ہوئی اس پر نگاہ پڑنے ہی میں احزانہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ساگ فو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

ساگ فو نے خالص آسانی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لباس

زیب تن کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے استاد محترم باسٹر ہنگ پائی کو کئی بار اس قسم کے لباس میں دیکھا تھا۔ ساگ فو نے بڑی مہربان مسکراہٹ کے ساتھ مجھے ایک مخصوص انداز میں سلام کیا۔ میں نے اس کے ”سلام“ کا جواب دیا تو اس نے مجھے جینے کا اشارہ کر دیا۔

میں ابھی کھڑا ہی تھا کہ ساگ فو قالین کے سرخ ٹکڑے پر جا بیٹھا۔ میں بھی چندفٹ کے فاصلے پر اس کے قریب پہلے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ساگ فو کی عمر ستر کے نزدیک نظر آتی تھی۔ اس کے سر پر آدمی انچ کے برابر بال تھے جو پوری طرح چاندی میں بدل چکے تھے۔ ہلکی موجیں بھی سفیدی دکھائی تھیں۔ آنکھوں پر بڑا سویرہ چشمہ تھا۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ وہ چشمہ نظر کا تھا یا پھر محض حفظان چشم کی کوئی کوشش!

ساگ فو کی شخصیت انتہائی متاثر کن تھی اور صورت میں کسی حد تک کاسمارکس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ رسی ملیک ملیک کے بعد ہمارے رومین بڑی اہم ٹکنگو ہوئی۔ ساگ فو کو مینڈرین، چینی، ہندی، اور انگلش زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ تاہم ہمارے رومین اس وقت اول آخر انگلش میں بات ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک ہمارے بیچ بدھ ٹیل کنڈ کی عبادت گاہ، ربی موٹے ہاتھن، جیہوئی سازش اور پوری دنیا کو اپنا غلام بنانے کی یہودی کوشش جیسے موضوعات زیر بحث رہے پھر زادی ٹکنگو ساحل کی جانب مڑ گیا۔ میں نے احترام بھرے لہجے میں کہا۔

”محترم ساگ فو! ڈاکٹر مونگ کی زبانی مجھے پتا چلا تھا، آپ نے ساحل کا سراغ لگایا ہے۔ وہ نیویارک کے سب سے پوش علاقے مین مین میں ہے لیکن مین مین میں کہاں، یہ پتا نہیں چل سکا؟“

وہ خفیف سا مسکرایا اور استفسار یہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے تو اس سے آگے بھی کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی!“

ساگ فو کا انداز بتاتا تھا وہ میری کوشش اور جزوی کامیابی سے آگاہ ہے۔ میں نے اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اتنا معلوم کر چکا ہوں کہ ساحل کو ڈاؤن ٹاؤن مین مین کے فائنل ڈسٹرکٹ میں واقع، وال اسٹریٹ کی کسی عمارت میں رکھا گیا ہے مگر پتا نہیں چل سکا کہ کون سی عمارت میں، کس جگہ!“



پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے وال اسٹریٹ کی فنٹ ہاؤس پر نصب "بروز ٹیلی" اور ساحل کی نگران عورت کے بارے میں بتایا۔ وہ اس دوران میں بڑے سنی خیر انداز میں مجھے یک تک دیکھ رہا۔ آخر میں، میں نے قدرے جھجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر رلی موٹے ہاتھن میری گرفت میں آجاتا تو میں آسانی سے ساحل تک پہنچ سکتا تھا۔" گلتا ہے، اس نے کسی مخصوص عمل کے ذریعے خود پر کوئی ایسا خول چڑھا رکھا ہے کہ میرے تصور کی پرواز اس تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔ وہ بہت راست میری ریش میں نہیں آتا۔

"رلی موٹے ہاتھن پر اسرار علوم کا باہر ایک کا پائیاں محض ہے۔" ساگ فو نے مجھ پر آواز میں کہا "میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی محض ہوا ہے۔ بہر حال، رلی سے تو ہم بعد میں منٹ لیں گے، پہلی ضرورت ساحل تک پہنچنا ہے۔ نہ صرف اس تک رسائی حاصل کرنا ہے بلکہ اسے رلی کے چنگل سے صحیح سلامت باہر بھی لانا ہے۔ وہ اگر چاہے مقصد میں جزدی طور پر کامیاب ہو چکا ہے لیکن ہم اس لڑکی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے۔"

میں نے چونک کر ساگ فو کو دیکھا۔ لڑکی سے اس کی مراد ساحل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ رلی کے اپنا مقصد حاصل کرنے کا ایک ہی مطلب تھا، وہ بدھ تیل کنڈ کی عبادت گاہ کے ذخانے تک پہنچنے کا راز جان چکا تھا اور..... یہ راز یہ تھا اس نے ساحل کے خوابیدہ، چٹان ناز ڈھن سے نکالا ہوگا۔

میں نے اپنی بے چینی ساگ فو پر ظاہر کی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر دیا۔

میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا "آپ کو یہ اطلاع کیسے ملی؟ کیا آپ نے رلی تک رسائی حاصل کر لی ہے یا.....؟"

میں جملہ ادھر اچھوڑ کر بے تابی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس نے بتایا "تمہاری طرح میں بھی ابھی تک رلی کو اپنے "دائرے" میں نہیں لاسکا۔ وہ ایک ظلمت کدے میں بند ہے۔ دوسری طرف ساحل زیادہ تر تیندیں میں رہتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو توقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے تھوڑی دیر پہلے جو کچھ کہا ہے، اس کا ایک سبب ہے اور سبب یہ ہے کہ ادھر کنڈ کے پہاڑی مضافات میں واقع بدھ عبادت گاہ کے آس پاس بڑی نپراسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ چند امریکیوں کا ادھر حوجہ

دنا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرف سے مجھے جس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے، رلی نے خوبی عمل کے ذریعے ساحل کے ذہن میں پوشیدہ راز کو اپنے لیے راز نہیں رہنے دیا۔ وہ جان چکا ہے عبادت گاہ کے خفیہ ذخانے میں پہنچنے کا طریقہ کار کیا ہے اور..... اس ذخانے کے اندر کتنا بڑا خزانہ موجود ہے یہ بات تم بھی جانتے ہو، میں بھی جانتا ہوں اور رلی موٹے ہاتھن بھی۔ میرا خیال ہے، آنے والے ایک دو روز میں وہ لوگ ادھر کوئی کارروائی کریں گے۔"

"یہ تو بڑی تشویش ناک صورت حال ہے!" میں نے کہا۔

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر شبہ سے ہوئے لہجے میں بولا "ہاں، صورت حالات تو واقعی تشویش ناک ہے لیکن میں نے ڈاکٹر موگ کو معاملات سنہالانے کے لیے ادھر روانہ کر دیا ہے۔ لاؤ ڈھابا صاحب ٹھیک کر دیں گے۔"

ڈاکٹر موگ کی روانگی پر میں ایک مرتبہ پھر چونکا اور پوچھے "تائیں رو سا" ڈاکٹر موگ تھوڑی دیر پہلے تک تو سنبھلا تھا وہ کب یہاں سے گیا؟"

"تمہیں اس کمرے میں پہنچانے کے بعد وہ سیدھا سبیل اتر پورٹ کی طرف چلا گیا ہے۔" ساگ فو نے بڑی رسالت سے بتایا "تم لوگوں کے یہاں پہنچنے ہی میں نے ڈاکٹر سے میننگ کر کے پردرگام طے کر لیا تھا۔ ٹھیک تو ہے اس کی فلائٹ ہے۔ وہ ملائیشیا اتر لائنز کے طیارے بوئنگ سیون سیون سیون سے سیدھا کوالا لپور پہنچے گا پھر وہاں سے کوئی اور فلائٹ کپڑ کر نیپال کی طرف چلا جائے گا۔" بوئنگ ٹرینا سیون، بڑا بیکارڈ میننگ طیارہ ہے۔ پچھلے سال دو اپریل کو اس جہاز نے صرف بیالیس گھنٹے میں پوری دنیا کے اوپر دوڑ کر کے ایک نیاریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز سبیل سے کیا اور اٹلانٹک اوشین کے اوپر سے گزر کر کوالا لپور پہنچ گیا پھر کوالا لپور سے اتر اور پینٹیک اوشین کے اوپر سے اڑتے ہوئے واپس سبیل پہنچ گیا۔ بہر حال..... وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر تھوڑا توقف ہوا پھر موضوع کی طرف آئے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر موگ سے آج صبح، بلکہ رات کے آخری پہ میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے ملائیشیا

لائنز میں اس کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔ مجھے امید ہے، وہ وہاں کے حالات کو کنٹرول کر لے گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے شا کی نظر سے مجھے دیکھا جیسے بد زبان خوش کہہ رہا ہو، اگر میں اس عکاز کی کمان سنہالانہ تو زیادہ اچھا ہوتا۔ میں نے اس کے احساسات کے پیش نظر ذہن دامت بھرے لہجے میں کہا۔

"میرے محترم! مجھے محسوس ہے کہ میں آپ کی توقع پر پورا نہیں اتر سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بڑے سنی انداز میں خلیفہ سا مسکرایا "ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔" پھر گویا میرے آرا بردار دیکھتے ہوئے بولا "میں تمہیں بدھ تیل کنڈ والے مشن سے ہرگز ہرگز الگ نہیں دیکھ رہا ہوں۔"

ساگ فو کے آخری جملے میں کئی اسرار پوشیدہ تھے۔ میں اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ تھوڑے تو وقف کے بعد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"وہاں اتہارا آجیدہ کا کیا پروگرام ہے؟" میرا خیال تھا، ساگ فو (ڈاکٹر موگ کا بڑا) میرے کنڈھو جانے پر زور دے گا کیونکہ اب تک کے ڈاکٹر موگ کے رویے سے میں نے یہی اخذ کیا تھا۔ وہ مجھے ہر صورت میں سبیل لانے کے لیے اس طور مصرح کر میں کوئی اور اندازہ لگا نہیں سکتا تھا۔ اس حوالے سے اس نے دلائی لاما اور لاؤ ڈھابا کا ذکر بھی کیا تھا لیکن ساگ فو کا سوال، صورت حال میں تبدیلی کا مظہر تھا۔

میں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا "میں ساحل کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، کسی بھرے ہوئے سمندر کو ساحل ہی کی تلاش ہوتی ہے!" وہ کھیر لہجے میں اتنا قبول کرنا خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر موگ نے مجھے ایک روز پہلے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ کنڈھو والے مشن کے لیے میرا انتخاب کیا جا چکا ہے اور میں یہ امید بھی کر رہا تھا کہ سبیل پہنچنے کے بعد اسی حوالے سے مجھ پر زور دیا جائے گا لیکن..... میں اپنی بات احموری چھوڑ کر تھوڑا توقف ہوا پھر کہا۔

"میں آپ کا رویہ میرے لیے ناانصافی قرار دیتا ہوں۔" میں اپنے ذہن کی انجمن کو بیان کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

ساگ فو نے مدبرانہ انداز میں کہا "اگر انسان کی ہر توقع پوری ہونے لگے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ انسان ایک اعتدال، ایک توازن کا نام ہے۔ اس کی ایک مخصوص ریش ہے۔ اسے اس ریش ہی میں رہنا پڑتا ہے۔ نہ ایک ڈگری نیچے اور نہ ہی

ایک ڈگری اوپر۔ نارل تو نارل ہے۔" بیلودی نارل" اور "ایلودی نارل" ہر شے ایب نارل کہلاتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ سنی خیر انداز میں توقف ہوا پھر سرسری لہجے میں بولا۔ "جہاں تک بدھ تیل کنڈ والے مشن میں تمہاری شمولیت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر موگ نے تم سے غلط نہیں کہا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ تم پوری طرح اس مشن میں ہمارے ساتھ ہو۔"

ساگ فو کی ہم بیانی نے مجھے جی طور پر الجھا دیا۔ میں پوچھے "تو یہ ساگ فو کا مختصر، آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے نا؟"

"مجھے جانے گی۔" وہ بڑے سنی انداز میں بولا "میں نے کہا ہے نا، ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ نہ ایک بل ادھر، نہ ایک بل ادھر۔ تم بھی انتظار کرو۔"

جب مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ میرے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دے گا تو میں نے خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ چند لمحات تک ہمارے درمیان سکوت کی چادر تنی رہی پھر اس چادر کو ساگ فو نے چاک کیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔

"وہاں! سبیل سے نیو یارک کے لیے دو اوپن ٹکٹ خرید لیے گئے ہیں۔ آج رات ساڑھے بارہ بجے یونائیٹڈ اتر لائنز کی ایک فلائٹ سبیل سے نیو یارک جا رہی ہے۔ اگر تم کہو تو ٹکٹ کنفرم کروادوں؟"

"دو ٹکٹ؟" میں نے حذبذب انداز میں کہا "ڈاکٹر موگ تو کوالا لپور روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ دوسرا کون نیو یارک جائے گا؟"

"رائیل ا" ساگ فو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا لیکن زبان سے کچھ خاص وجہ سے تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ایک تو وہ نیو یارک کے چپے سے واقف ہے، دوسرے ساحل تمہاری اور ہماری مشترکہ ضرورت ہے اس لیے بھی اس کے حصول کے لیے کوئی ایک فرد تو ہماری طرف سے بھی ہونا چاہیے۔" وہ تھوڑی دیر کو رکنا پھر مجھ سے مستشرق ہوا "اگر تمہیں رائیل کو ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض ہے تو پھر دوسری بات ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تم دونوں میں ابھی غامبی

انڈر میڈنگ بھی پیدا ہو چکی ہے!“

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور جواب دیا  
”ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں!“

سامک فونے مجھے اسی کمرے میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی  
اور خود اندھ کر باہر چلا گیا۔ میں سمجھ گیا، وہ کلک کنفرم کرانے کے  
سلسلے میں کسی کو ہدایت دینے گیا تھا۔

پانچ منٹ بعد وہ ابس آیا اور بتایا ”اگر لارڈ بدھا کی  
مرضی ہوئی تو تم دونوں آج ہی رات سیٹل کی فضا سے نکل جاؤ  
گے۔ میں نے اس سلسلے میں گھوڑا دوڑا دیا ہے۔“

میں نے پوچھا ”ڈاکٹر موگ کمشنڈ کی طرف گیا ہے۔ پتا  
نہیں اسے وہاں کتنے دن لگ جائیں اس دوران میں اسکرینج  
والے مارشل آرٹس سینٹر کا کیا ہوگا۔ ہم کسی طرح بروس ٹوٹر کی  
نظر بچا کر زونا آئی لینڈ سے سیٹل تو آگئے ہیں لیکن بروس ٹوٹر  
اور الاسکا کا دیگر ہائی اتھارٹیز وہاں اسکرینج میں ڈاکٹر موگ  
سے ضرور رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح معاملہ  
گڑ بڑائیں ہو جائے گا؟“

”تمہارے ذہن میں ایک اچھا سوال آیا ہے۔“ سامک  
فونے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”لیکن میں  
اس پہلو کو بھولا نہیں ہوں۔ اسکرینج والے سینٹر اور ڈاکٹر موگ  
کی وہاں حاضری کا مکمل بندوبست کر دیا گیا ہے۔“

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا لیکن یہ نہیں پوچھا کہ  
اس نے کس قسم کا بندوبست کیا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے  
بعد اس نے خود ہی بتایا۔

”ڈاکٹر موگ نے اپنے چلے میں جو قہوڑی بہت تہذیبی  
کی تھی اس فعل و صورت کا ایک شخص میرے اسٹاف میں شامل  
ہے۔ اس کو تیر نظر رکھتے ہوئے ہی وہ پروگرام ترتیب  
دیا گیا تھا۔ میں جنہیں مذکورہ شخص سے ملواؤں گا۔ تم اسے دیکھ  
کر حیران رہ جاؤ گے۔ ایک آدھ دن میں وہ سیٹل سے اسکرینج  
روانہ ہو جائے گا پھر الاسکا کی ہائی اتھارٹیز کو وہ سنبھال لے  
گا۔ تمام حالات اس کے علم میں ہیں۔“

سامک فو کی وضاحت پوری طرح مجھے ہمغم نہیں ہوئی۔  
میں نے ابھمن زدہ لہجے میں پوچھا ”اور ڈاکٹر موگ کے  
اسٹوڈنٹس کا کیا ہوگا وہ تو اسے کسی اور ہی صورت سے پہچانتے  
ہیں؟“

”تم ایک بہت بڑے مشن پر جا رہے ہو لہذا ان چھوٹی  
چھوٹی باتوں سے اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔“ سامک فونے  
بڑی نرمی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ”جو شخص ڈاکٹر موگ  
بن کر اسکرینج جائے گا وہ مختلف قسم کے میک اپ کا ماہر ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تمہارے اور راکیل کے چہروں پر بھی کام  
کرے گا تو جنہیں اس کی مہارت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ  
جنہیں آسان اور فوری ماسک میک اپ کے سلسلے میں ضروری  
میس بھی دے گا جو تمہارے بہت کام آئیں گے۔ ویسے راکیل  
بھی اس فن میں کسی سے کم نہیں!“ وہ چند لحات کے لیے  
ظہر ابھرا اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

”یو آن ماؤ بھی تمہارے ذہن میں ابھمن بیٹا کر رہا  
ہوگا۔ اس سے پہلے کہ تم اس سلسلے میں کوئی سوال کرو یا غور  
ہی جنہیں بتا دیتا ہوں۔ موگ کے اسٹوڈنٹس اسے صرف ڈاکٹر  
کہہ کر پکارتے ہیں یا پھر ماسٹر کہتے ہیں اور ان اسٹوڈنٹس میں  
بھی اکثریت ہمارے اپنے ہندوں کی ہے۔ غیروں میں سے  
کوئی نہیں جانتا وہ موگ ریڈوشے ہے یا یو آن ماؤ اس لیے  
تمام معاملات کو سیٹ کر لیا جائے گا۔ جنہیں اس سلسلے میں ذہن  
کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔“

میں ڈاکٹر موگ اس کے مارشل آرٹس سینٹر اور الاسکا کی  
ہائی اتھارٹیز کے خیالات سے بے حسر باز آ گیا اور ساری قوم  
خود پر مرمر کوڑ کرتے ہوئے سامک فو سے استعفا کر گیا۔

”کیا میں ڈسٹو کی حیثیت ہی سے نیویارک  
جا رہا ہوں؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ”جنہیں ڈسٹو اور  
راکیل کو گارڈ شیا بناتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا  
گیا ہے کہ جنہیں میک اپ وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ ممتد  
کرنا پڑے تم دونوں اصلی ڈسٹو اور گارڈ شیا سے بہت حد تک  
مشابہت رکھتے ہو خصوصاً چہروں کی ساخت کے حوالے  
سے۔“

”اوہ!“ میرے سینے نے ایک طویل سانس خارج ہوئی  
”تو اس کا مطلب ہے اصلی ڈسٹو اور گارڈ شیا بھی وجود رکھتے  
ہیں؟“

”یہ دونوں ہمارے ہی آدمی ہیں۔“ سامک فونے بتایا  
”تم دونوں کو جو کاغذات وغیرہ فراہم کیے گئے ہیں وہ بالکل  
اصلی ہیں۔ تمہارے پاس ان دونوں کی مینٹن آئی ڈی ہے لہذا  
کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ جب تک تم متحرک رہ  
گئے اصلی ڈسٹو اور گارڈ شیا میری ہدایت کے مطابق منظر عام  
نہیں آئیں گے۔ ان کی آئی ڈی پر تم دونوں پورے امریکا  
میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دندناتے پھرو۔ بس  
ایک بات کا خیال رکھنا کہ کسی بڑی قانون شکنی کا ارتکاب نہ کرنا  
اور..... مجبوری میں ایسا ہو جائے تو پھر پولیس کے ہتھے نہ  
چڑھنا ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“ وہ تھوڑا متوقف

ہوا بھارت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بہ فرض حال اگر تم قانون کی مضبوط گرفت میں آجاتے ہو تو مجھ کو ہمارے اندر سے وجدان کو باہر نکال لیں گے۔ اس کے بعد تمہیں اپنی سمجھ بوجھ سے معاملات کو سمجھنا ہوگا۔ یہ اندریک کی پولیس نہیں جو تمہاری جیب نرم اور اپنی منہی گرم کر کے تمہیں چھوڑ دے گی۔ خاص طور پر ”این وائے بی ٹی“ کو ہر قسم کی جدید سہولت مہیا ہے۔ وہ لوگ اگر کسی پر مضبوط ہاتھ ڈال دیں تو پھر چند گھنٹوں میں اس کا کچا چٹا کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ تم دونوں این وائے بی ڈی (نیو یارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) کے قلب (مین مین) میں اترنے جا رہے ہو۔ اس ”دل“ میں امن و امان سے بے رہنا کیونکہ وہیں پر تمہارا ایک طاقتور دشمن رہی ہوئے ہائیں بھی ڈیرا ڈالے بیٹھا ہے جس کے قے میں تمہاری روح ہے۔ تمہیں اپنی روح کو اس شیطان کے چنگل سے لگانا ہے اور ذہن میں رکھنا ہے کہ رہی ہوئے ہائیں ”این وائے بی ڈی“ سے کہیں زیادہ اختیارات کا مالک ہے۔ اس کے ایک اشارے پر امریکی صدر بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا ”تمہاری ہسٹری سے میں جس حد تک واقف ہوں اس کے مطابق رہی ہوئے ہائیں جیسا طاقتور شخص آج تک تمہارے مقابل نہیں آیا۔ ہاں پتا چلے گا تمہاری صلاحیتوں کا۔ ایک ایک قدم چھوٹ کر کیسے کی ضرورت ہے۔“

”ساک فو نے اپنی بات مکمل کی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ واقعی اس مرتبہ میرا مقابلہ ایک بہت ہی باکمال اور ہاتھیار شخص سے تھا۔ میں نے ماؤنٹ ملکے والے رہی کے ٹھکانے سے فرار ہو کر اسے جوڑ کا لگا دیا تھا۔ وہ اب تک خون کی اس گیرکے چاٹ رہا ہوگا۔ ذہنی مقابلہ اور زیادہ خطرناک ہو جاتا خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ذمہ آپ نے اسے دیا ہو۔“

”میں نے اس زخم کے علاوہ اسے ایک دھوکا بھی دیا تھا جب اولڈ کرل (الاسکا) کے ایک گیس اسٹیشن (پٹرول پمپ) سے راجر کی حیثیت سے میں نے اسے نوں کیا تھا۔ نوں پر ہونے والی وہ گفتگو اس کا سکون برباد کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا رہی اب تک میرے فریب میں جلتا تھا میری چالاکی اس کی سمجھ میں اتر گئی۔ ویسے رہی کی طبیعت اور صلیح کے پیش نظر امکان اسی بات کا تھا کہ وہ میری چال سے واقف ہو گیا تھا ورنہ وہ ماؤنٹ ملکے والا انتہائی محفوظ ٹھکانا چھوڑ کر مین ہائیں کا رخ نہ کرتا!

ساک فو نے میری صلاحیتوں کا حوالہ دیا تو میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا پھر اسی خیال کے تحت میں نے اسے کہا ”آپ اگر اجازت دیں تو مجھے میری سال کی خبریں معلوم کر کے آتا ہوں۔“

”وہ خبریت سے ہے اور اس وقت اس پر گہری غور قلم ہے۔“ وہ پھر ہی ہوئی آواز میں بولا ”میں نے چند لمبے اصرار کیا تھا۔“

”میں چونک اٹھا۔“ آپ کا مطلب ہے مجھ سے گفتگو کرنے کے دوران میں؟“

اس نے میری حیرت کا نوٹس نہیں لیا اور بہ دستور پھر لہجے میں بولا ”تم بھی ڈرائی کرلو۔“

میں نے آنکھیں بند کیں۔ اپنے تصور کو ساحل کے سر پر مرکوز کیا۔ میرے پنیل گلیڈ نے کام دکھایا اور میں اس بیڑوم میں پہنچ گیا جہاں میں نے ساحل کو بے سدھ پڑا دیکھا تھا۔ ساک فو کا کہنا بالکل درست تھا۔ ساحل گہری پور میں تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور ساک فو کے سامنے حاضر ہو گیا۔

اس کے لبوں پر شہنی تبسم ابھر اس نے میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا شروع کیا۔ اس کا انداز کسی استاد کا تھا۔ ماسٹر بینک پائی اسی انداز میں مجھے لیکچر دیا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں شادولن پمیل کی وہ پہاڑی آن کڑی ہوئی جس کے دامن میں ماسٹر بینک پائی تھی ”جی“ کی خصوصیت فرینک دیا کرتا تھا۔ آج ڈاکٹر سوگ کا بوا ”ساک فو“ کی اسی انہماک سے مجھے کچھ بتاتے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”وہ جان! میں تم سے بہت ضروری باتیں کا چاہتا ہوں اسی لیے میں نے تمہیں بیٹل بلایا ہے۔ اگرچہ ساتھ بہت مختصر ہے لیکن میں اپنی بات پوری کر لوں گا۔ بات تم سے رد پر ہونے کی ہو سکتی گی۔“

اس کے لہجے کی کیمبرتا اور سنجیدگی سے ظاہر ہوتا تھا کوئی بہت بڑا راز مجھ تک منتقل کرنے والا ہے۔ اس کی کہنے نے مجھے بتایا کہ وہ قدرے طول بھی تھا۔ میں نے کہا۔

”محترم! اگرچہ ہم آج تھوڑی دیر کے لیے لے لی ہیں لیکن اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ میں ساک فو کو حاصل کرنے کے بعد سیدھا آپ کے پاس بیٹل ہی آؤں گا۔“

جہ میں یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔“

”دوسرا جہم!“ میں نے حجب نظر سے اسے دیکھا ”محترم ساک فو! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں نے وہی کہا ہے جو تم نے سنا ہے!“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

میں بدھ ازم کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ بدھ مت کے ماننے والے آخرت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہندومت کی طرح وہ دوسرے تیسرے جہم پر یقین رکھتے ہیں۔ بدھ ازم کے مطابق انسان اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کرتا ہے ان اعمال کی بنا پر اسے دوسرا جہم ملتا ہے۔ ایک نیک اور صالح انسان کو دوسرے جہم میں اعلیٰ اور اچھے خصال کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور برے اعمال کا حامل شخص سزا کے طور پر بڑی جبرتناک صورت میں دوسرا جہم لیتا ہے۔ بہر حال اس عقیدے سے قطع نظر ساک فو نے اس وقت جو بات کی تھی اس نے میرے اندر گھلبلی سی چمادی اور میں بے یقینی باندھ رہا تھا۔

”محترم آپ کس کے دوسرے جہم کی بات کر رہے ہیں۔ اپنے باپ!“

”میں اپنے دوسرے جہم کا ذکر کر رہا ہوں۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ”تمہاری تو ابھی انتہی جاتی ہے جب کہ میں زندگی کا سفر پورا کر چکا ہوں۔ پتا نہیں کب یہ چراغ بجھ جائے۔“

وہ انتہائی سنجیدگی سے مستقبل کا احوال بیان کر رہا تھا۔ میں نے دل جوئی کے انداز میں کہا ”آپ کو کچھ نہیں ہوگا میرے محترم۔ ہم غریب بیٹل میں دوبارہ ملاقات کریں گے۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”بس میں تو ایک لباس سے نکل کر دوسرے لباس میں چلا جاؤں گا۔ ہم واقعی دوبارہ ملیں گے لیکن بیٹل میں نہیں بلکہ تبت میں۔“

”تبت میں؟“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

”ہاں۔“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا ”ہماری دوسری ملاقات تبت میں ہوگی۔ میں تمہیں چار سال کے ایک خوبصورت بچے کے اندر ملوں گا۔ اس بچے کا نام بھی ساک فو ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے تم مجھے دیکھتے ہی پہچان لو گے۔“

ایک مسلمان ہونے کے ناتے ساک فو کا فلسفہ اور بیان میرے لیے فضولیات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہمارا عقیدہ اور مذہبی تعلیمات اس سے مختلف ہیں۔ بہر حال میں نے ساک فو سے کسی قسم کی جرح بحث مناسب نہ سمجھی اور خاموش بیٹھا رہا۔

چند لمحے کے سکوت کے بعد اس نے کہا ”مجھے یقین ہے تم سے زیادہ سنجیدگی اور شدد سے ساحل کو اور کوئی تلاش نہیں کر سکتا۔ ساحل کا حصول اگرچہ آسان نہیں لیکن تمہارے عزم اور مستقل مزاجی سے کچھ بعید بھی نہیں۔“ وہ زور دیر کو خاموش ہوا پھر گفتگو کے سلسل کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”جب تم ساحل کو حاصل کر لو تو اس کی قدر کرنا۔ اس نے تمہاری خاطر بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ میں ساحل کا ایک بزرگ ہونے کے ناتے اسے تمہاری سپردگی میں دیتا ہوں۔“

وہ ایک مرتبہ پھر بڑے سخی خیر انداز میں چپ ہو گیا۔ اس کی یہ خاموشی اسرار اور روزگار میں تھی۔ مجھے ان لحاظ میں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سرسبز مرگ پر اپنی زندگی کی آخری سانسیں سکن رہا ہو اور اپنی دانست میں ایک لائق اور قابل پھر دو سالو جوان کے ہاتھ میں اپنی حیات جگر کا ہاتھ تھا کہ بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کی سعی کر رہا ہو۔ لیکن یہ سپردگی یہ خواہی اور یہ عطیہ کتنی مضحکہ خیز اور عجیب و غریب تھی۔ ساک فو ایک ایسی شے مجھے دے رہا تھا جو اس کے پاس تھی ہی نہیں تھی۔ یہ گویا ہینڈ ٹیک کی ایک ناقابل یقین مثال تھی۔ بہر حال اس میں میرے لیے اطمینان کا پہلو موجود تھا۔ ساحل کے کرتا دھرتا مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو رہے تھے۔ ساک فو کی حلقہ کے جواب میں میں نے صرف اتنا کہا۔

”محترم! میں اس مہربانی کے لیے زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔“

اس نے دیوار گیر کلاک پر ایک نظر ڈالی اور بولا ”وقت بہت کم ہے۔ اس اہم بات چیت کے علاوہ بھی بہت سارے کام ہائیں ہیں لہذا میں پہلے تمہاری ذات کو نشاندوں۔“

پتا نہیں وہ میرے بارے میں مزید کیا کہنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کچھ بولنے کے بجائے سننے پر ہی اکتفا کیا۔

اس نے کہا ”وہ جان! میری بات کو ذرا دھیان سے سنا اور اس گفتگو کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ماسٹر بینک پائی کی نگرانی میں تم نے ”جی“ کی بیداری کا آغاز کیا تھا۔ تمہاری قہر ڈاک (پنیل گلیڈ) خاطر خواہ محترم ہو چکا ہے لیکن ابھی اسے مزید مستعد اور کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ جب بھی اور جتنی بھی فرمتم ملے تم اس اند کو دیکھ کر تصور بنا کر مشتق

کرتے رہو۔ یہ تمہاری منزل نہیں جہیں اور آگے جاتا ہے۔  
وہ سانس لینے کو رکھتا جا رہا ہے رکھتے ہوئے بولا۔  
”انسانی جسم میں موجود یہ غدود (گیٹنڈز) بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ پنل گلیٹنڈ (PINEAL GLAND) کی مدد سے آپ اپنی سوچ اور خواہش کو قصور کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ گویا آپ کی باطنی آنکھ ہے۔ اگرچہ یہ پوری طرح عمل جانے تو بھر کوئی پردہ پردہ نہیں رہتا۔ یہ غدود دماغ کے سامنے والے حصے پر واقع ہے۔ دونوں آنکھوں کے چ۔ پیشانی کے عین وسط میں۔“

اس نے ایک انگلی سے اپنی پیشانی کو چھوا۔ یہ وہ مقام تھا جس کے پیچھے پنل گلیٹنڈ موجود ہوتا ہے۔ ہندو عورتیں اور پنڈت عین اسی مقام پر سرخ بندیا لگاتے ہیں۔ انسانی آنکھ کو نظر آنے والے رنگوں میں سرخ رنگ کی طول موج (WAVELENGTH) سب سے زیادہ ہوتی ہے جسے پرچمکنے والی سرخ بندیا غور و فکر کرنے والوں کے لیے مکی درک ہوتی ہے۔

”باطنی آنکھ کی طرح ایک باطنی کان بھی ہوتا ہے۔“ ساگ فو کہہ رہا تھا۔ ”میں انسانی دماغ کے عقبی حصے میں موجود پیچٹری گلیٹنڈ (PITUITARY GLAND) کی بات کر رہا ہوں یہ غدود انسان کے لیے باطنی کان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ کنٹرول میں آجائے تو آپ تصور کی گاہ سے دیکھ گئے مگر کا ساؤڈسٹم آن کر سکتے ہیں۔ وہاں پیدا ہونے والی ہر آواز کو سن سکتے ہیں اور اپنی آواز کو وہاں پہنچا بھی سکتے ہیں۔ اگر پیچٹری اور پنل دونوں گلیٹنڈز آپ کے فرماں بردار بن جائیں اور یہ دونوں آپس میں بھی اچھی اظہار شنیدنگ پیدا کر لیں تو ان کی کارکردگی سے وقوع پانے والی صلاحیت نئی دینی کہلاتی ہے مگر۔۔۔۔۔ یہ تمہارا شعبہ نہیں۔“

”پھر آپ مجھے اس بارے میں اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہے ہیں؟“ میرے لبوں سے بے ساختہ یہ سوال پھسل گیا۔

وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ”اس لیے اگر کبھی جہیں کہیں سے پیچٹری گلیٹنڈ کی اہمیت کے بارے میں پتا چلے تو تم اس کی مشقیں کرنے نہ بیٹھ جاؤ۔ ایسی کوئی بھی کوشش وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ ماسٹر بینک پالی نے تمہاری ناپسند کے بعد ہی ”جی“ کے میدان میں ڈالا تھا۔ ہر انسان کی میسٹری دوسرے سے مختلف ہے اور ہر صلاحیت ہر انسان

کے لیے نہیں ہوتی۔ تم ”جی“ اور پنل گلیٹنڈ تک محدود رہو۔ جہاں سے لیے یہی بہتر ہے کیونکہ جہیں ”دنیا داری“ کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ عظیم پہاڑوں کی گھاٹیں اور تنگ و تاریک غار جہاں آسکن نہیں ہیں۔ تم کوئی راہب کوئی بھکشو کوئی تارک الدنیا قسم کے شخص نہیں۔ غیبت و روجیت کے معاملات تمہارے لیے نہیں ہیں۔ جہیں انسانوں کے چ۔ انسانوں کی طرح رہا ہے اور انسانوں کی مدد کرتا ہے۔ مظلوم کے تحفظ کے لیے ظالم کا ہاتھ توڑتا ہے۔ تم معرکوں کا دھماکا دہاگل کے لیے مخصوص ہو۔ اس جنگ میں مارشل آرٹس یوگا اور جی تمہارے ہتھیار ہیں۔ انتہائی ضرورت کے تحت تم قہر ڈال کر استعمال بھی کر سکتے ہو۔“ ایک لمحے کو متوقف رہنے کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا ”وہاں! میں نے تمہاری حدود و قیود کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔ یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کر دیا۔ اب تم اپنا فرض پورا کرو گے اور کبھی مجھ سے بھی ان حدود و قیود کو بھلا گئے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

”محترم! میں نے آپ کی ہدایت کو اپنے ذہن میں قفل کر لیا ہے۔“ میں نے تعظیم سے بھرپور لہجے میں کہا ”میں اپنا فرض پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔“

”اسی میں تمہاری بھلائی اور بہتری پوشیدہ ہے۔“ وہ عجیب آواز میں بولا۔ ”حدود تو ذکر تم سراسر خسارے میں رہ گئے۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو تم خود کو آزمائش میں ڈال سکتے ہو۔“

”میں ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہ کر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ”اب کچھ تذکرہ تمہارے اس ہم شکل کا ہو جائے جس نے اوجہ پاکستان میں خاصی گزربز چارنگی مچی۔۔۔۔۔“

”آپ اس بہرہ دہنے کم بخت نقلی وجدان کی بات کر رہے ہیں؟“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ میرا یہ سوال بے ساختہ اور اندرونی اضطراب کا اظہار تھا۔

اس نے سر کو اٹھاتی جنبش دی اور کہا ”ہاں میں اسی مذہر کا ذکر کر رہا ہوں۔“

ساگ فو نے ”مگربز چارنگی مچی۔“ ایسے الفاظ استعمال کیے تو میں جو کچھ بغیر نہ رہ سکا۔ ان الفاظ سے کچھ مفہوم نہ ہوتا تھا کہ اب نقلی وجدان پاکستان میں موجود نہیں تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ساگ فو سے استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ اس وقت کہاں ہوگا کیونکہ ہزار کوشش کے بعد بھی میں اس تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں اسے پاکستان سے نکال لیا گیا ہے۔“

میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا ”اسے پاکستان سے کس نے نکالا ہے؟“

”رہی ہوئے ہائمن نے۔“ وہ غصے سے لہجے میں بولا۔

”کیا؟“ میں سناٹے میں آ گیا۔

ساگ فو نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔  
ماؤنٹ مکتلے میں، مجھے اپنے ٹرائس میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے رہی ہے اپنے عزائم کا اظہار تو کیا تھا۔ اس نے مجھے قتل دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد وہ میرے پرتو نقلی وجدان کو اپنے قابو میں کر لے گا لیکن مجھے امید نہیں تھی اسے اتنی آسانی سے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ میں ساگ فو کی اطلاع کو بھلائے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے ایک پوجبل سانس خارج کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ میرے الفاظ سے بھلا ہٹ بھٹکتی تھی۔

”میرے محترم! یہ تو بہت برا ہوا!“

”اس دنیا میں یا تو اچھا ہوتا ہے اور یا پھر برا ہوتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر برا ہی ہوتا ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا ”اس میں بے چاری دنیا کا کوئی قصور نہیں کیونکہ اس دنیا میں اکثر لوگ برے ہوتے ہیں۔“

ساگ فو ایک صحیح حقیقت بیان کر رہا تھا لہذا اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے تذبذب انداز میں کہا ”نقلی وجدان اگر رہی کے ہاتھ کا کھلوتا بن گیا تو بڑی افراتفری پھیلے گی۔ میں رہی ہوئے ہائمن کی ذہنیت اور عزائم کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ وہ سب سے پہلے اسے میرے خلاف استعمال کرے گا۔“

”کیا تم نقلی وجدان سے ڈرتے ہو؟“ ساگ فو نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے دانت کچکچائے ”نقلی وجدان۔۔۔۔۔ مائی فٹ!“  
”تم میں سے کبھی سننا چاہتا تھا۔“ وہ مشتعل انداز میں میرے عزائم کو سراہتے ہوئے بولا ”رہی ہوئے ہائمن بلاشبہ ایک عالم کامل اور عالم فاضل شخص ہے۔ وہ تمہارے پرتو سے کوئی حیرت انگیز کام ہی لے گا۔“ لینے دو۔“ وہ تھوڑی دیر کو راکھرا اضافہ کرتے ہوئے بولا ”رہی تو تم پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔ تم قابو میں نہیں آئے تو نقلی وجدان ہی سہی۔“

ساگ فو نے آخری الفاظ اور انداز میں ادا کئے تھے

مجھے کہہ رہا ہوں۔ تو نہ سہی تیری تصویر ہی سہی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ہماری وہ طویل مگر نہایت ہی اہمیت کی حامل ملاقات اختتام پذیر ہو گئی۔ اس ملاقات نے میری عملی زندگی کے خطوط دشمن کر دیے تھے۔

ساگ فو اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے اس کی تقلید کی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا ”آؤ میں جہیں دوسرے اہم لوگوں سے ملواتا ہوں۔“

میں گردن جھکا کر اس کے پیچھے ہولیا۔

☆☆☆  
یوٹائیڈ اٹلانٹر کے طیارے نے ٹھیک ساڑھے نو بجے ”لاگاریڈیا“ ائرپورٹ کے رن وے کو چھو لیا۔ سیٹل اور نیویارک کے درمیان لگ بھگ چھ گھنٹے کی فاصلت ہے جب کہ مقامی وقت کا فاصلت تین گھنٹے ہے۔ لاگاریڈیا ائرپورٹ آؤٹ پورڈ ”ٹوئیز“ میں واقع ہے۔ ڈومینک فلائٹس کا زیادہ لوڈ اسی ائرپورٹ پر ہے جب کہ جے ایف کینیڈی انٹرنیشنل ائرپورٹ زیادہ تر بین الاقوامی پروازوں کی وجہ سے مصروف رہتا ہے تاہم بعض فلائٹس بھی اس ائرپورٹ سے ڈیل ہوتی ہے۔

ائرپورٹ سے باہر آکر ہم نے ایک چھپاتی میڈی لین کب لے لی۔ اپنے وطن کی طرح نیویارک میں جیسی ڈرائیور کو اپنی منزل تک لے جانے کے لیے اس کی خوشامد درآمد نہیں کرنا پڑتی۔ روک روک کے مل جھک کر اس سے یہ نہیں پوچھنا پڑتا کہ بھائی فلاں جگہ جاؤ گے؟۔۔۔۔۔ اور نہ ہی وہ روغنٹ میرے انداز میں کہتا ہے نہیں میں تو کہیں اور جا رہا ہوں۔ اگر جیسی خالی ہے تو اس کا مطلب ہے اسے جانا ہے۔۔۔۔۔ اور جہاں آپ چاہتے ہیں وہیں جانا ہے۔ آپ جیسی کا دروازہ کھولیں اور بے دھڑک اندر بیٹھ جائیں۔ کرایے کے لین دین پر بھی کوئی جھگڑا پیدا نہیں۔ مختلف جمع تفریق کے حساب کتاب سے گزرنے کے بعد اوسطاً تین ڈالر فی سیل کرایہ پڑتا ہے۔ ہر سیل کا پہلا چوتھا فی صلاڈیڑھ ڈالر میں باقی ہر چوتھا فی سیل پچاس سینٹ میں۔ اگر اپنی مرضی سے۔ کچھ دقت کے لیے کہیں جیسی کوکانا چاہیں تو جہیں سینٹ فی منٹ الگ چارج ہوگا۔ انگیٹنڈ کی نسبت امریکا میں جیسی خاصی سستی پڑتی ہے۔ ہم ہیلو میڈی لین کب کی عکسی نشست پر بیٹھ چکے تو ہر سیل نے جیسی ڈرائیور سے کہا ”مین مین ڈاؤن ڈاؤن۔۔۔۔۔ اسکوائر!“

سیاہ قارم جیسی ڈرائیور نے استفسار کیا ”کیسٹم اسکوائر۔۔۔۔۔ چائناٹاؤن؟“

”لیں چائنا ٹاؤن۔“

”آسٹوریا سے نکلوں؟“

”نکلو مگر میں مین میں داخل نہیں ہوتا۔“ راکیل نے کہا۔

”کیسی ڈرائیور نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ لوگ میں مین نہیں جا رہے؟“

”جا رہے ہیں لیکن ہمیں چائنا ٹاؤن پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں۔“ راکیل نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس لیے میں مین میں آپ ٹاؤن سے گھسنے کی ضرورت نہیں۔ تم سیدھا ”ٹو سیوٹی ایٹ“ چکو اور نیو یارک سٹی کے درمیان سے گزر کر مین مین بروج پر پہنچو اور بروج کراس کر کے چائنا ٹاؤن میں داخل ہو جاؤ۔“

”اس طرح کرایہ اور فاصلہ ڈیڑھ گناہ ہو جائے گا۔“ کیسی ڈرائیور نے سیاہ چہرے پر موجود سفید آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

”جانتی ہوں۔“ وہ مخصوص امریکی انداز میں بولی۔

سیاہ فارم کیسی ڈرائیور نے کندھے اچکائے اور سیدھا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے ہمارے اور ڈرائیور کے درمیان پارٹیشن گلاس حائل ہو گیا۔ ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کے ساتھ جھپٹ جھار کر کے ہمیں پرانی دیکس فراہم کر دی تھی۔ اب ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ڈرائیور کی ساعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہمیں کوئی بے وقف یا فضول خرچ جوڑا سمجھتا تھا جو خواہ مخواہ پچاس فی صد زیادہ کرایہ دینے پر تیار بیٹھا ہو!

یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ہماری باتیں ڈرائیور تک نہیں پہنچیں گی، میں نے راکیل سے پوچھا ”تمہارا یہ فیصلہ ڈرائیور کی سمجھ میں نہیں آیا۔“

”سہ آئے۔“ اس نے کندھے جھٹکے اور بولی ”در اصل میں اب ٹاؤن سے مین مین میں داخل نہیں ہونا چاہتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول اب ٹاؤن میں مین مین اسٹریٹ دن ٹو سٹی دن سے دن تھرٹی فائیو تک ”ہارلم“ کا علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ متصحب کالوں کا علاقہ ہے۔ رات تو رات دن میں بھی سوچ سمجھ کر ادھر کارخ کرنا چاہیے اور کیسی کے ذریعے تو بالکل نہیں جانا چاہیے۔ میں بعد میں ”ہارلم ٹریڈی“ کے بارے میں تفصیلاً بتاؤں گی۔ دوسری وجہ ”ٹریڈیک جیم“ ہے۔ وہ ایک لمحے کو رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہیں۔

”آخر ہم آسٹوریا سے مین مین کی طرف جائیں تو ہمیں

”فرانی بورو بروج“ سے گزر کر اب ٹاؤن تاحہ اسٹریٹ دن ٹو سٹی فائیو ایٹ پر آنا ہوگا۔ پھر ٹھہراؤ ایو نیو چکنا ہوئی۔ اس ایو نیو پر سڑک کرتے ہوئے ہمیں آدھے اپ ٹاؤن اور پورے ٹاؤن سے گزرنا ہوگا۔ پھر اسٹریٹ فورٹین ایٹ سے ہم ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہو جائیں گے اور کوپر اسکوائر سے ”بادری“ اسٹریٹ چکر سیدھے ”مسم اسکوائر“ (چائنا ٹاؤن) پہنچ جائیں گے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مین مین کی ایک سے لے کر بارہ ایو نیو تک بے حد معروف ہیں اور ٹریڈیک جوں کے مانند رہتا ہے خاص طور پر ٹاؤن میں مین مین کی بھی ایو نیو پر ڈرائیورنگ کے لیے نہایت ہی مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ۔۔۔۔۔“

وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر تھوڑی دیر کو متوقف ہوئی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ”جب کہ نیو یارک سٹی کے اندر سے گزرنے والی ”ٹو سیوٹی ایٹ“ ایک ایکسپریس ہائی وے ہے جو ”بروکلین۔ ٹو نیوز ایکسپریس ہائی وے“ کہلاتی ہے۔ اس پر ڈرائیورنگ ظاہر ہے زیادہ اعصاب صحت مند اور تکلیف دہ نہیں۔ ہم مین مین بروج پر اس ہائی وے کو چھوڑ دیں گے اور پل عبور کر کے چائنا ٹاؤن میں داخل ہو جائیں گے۔“

میں بڑی توجہ سے راکیل کی فراہم کردہ معلومات کو ذہن نشین کرتا رہا۔ اس نے مجھے آسٹوریا کے بارے میں بھی پتہ چھڑا دیا۔ آسٹوریا میں غالب آبادی یونانی افراد کی ہے۔ کئی زمانے میں جب ابھی ہالی وڈ فلم انڈسٹری قائم نہیں ہوئی تھی تو آسٹوریا ہی میں فلم انڈسٹریز ہوا کرتے تھے۔ ”آسٹوریا اسٹوڈیوز“ اپنے وقت کا بڑا مشہور اسٹوڈیو رہا ہے۔ روڈولف ویلیگیو اور گوریا سوساٹن نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز آسٹوریا ہی سے کیا تھا۔

میں نے راکیل سے پوچھا ”ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟“

”کم از کم چالیس منٹ۔“ اس نے جواب دیا ”اس وقت میں دس منٹ تک کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”او کے! پھر میں تو سٹی سی نینڈ لے لیتا ہوں۔“ میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ”جب ہم چائنا ٹاؤن میں داخل ہوں تو مجھے چکا دیتا۔“

میں دراصل اس دوران میں اپنی ٹھہراؤ آئی سے راکیل جھانکنا چاہتا تھا۔ راکیل میری اس بات جھانک کی حقیقت بے پرواہی سے بڑھانے لگا۔ ”کیا تم واقعی نینڈ لینے جا رہے ہو؟“

”کیا تمہیں کوئی شک ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے بڑی چالاکی سے بولی ”پھر بات بدل کر کہیں گی۔“ کیا علم الشان مین مین بروج سے گزرتے ہوئے تم ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ نہیں کرو گے۔ ایٹ ریور کو اس پل کی مدد سے عبور کرنا بڑا ہیجان خیز ہوتا ہے۔“

”او کے!“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ”جب ہم ایکسپریس ہائی وے کو چھوڑ کر بروج میں داخل ہونے لگیں تو تم مجھے بیدار کر دیتا۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ راکیل نے اس موقع پر بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور میرے ”کام“ میں کسی قسم کی مداخلت کی کوشش نہیں کی۔ میں راکیل کی بات سے ایک سو ایک فی صد متفق ہوں کہ مین مین بروج اور بروکلین بروج سے ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ واقعی قابل دیدہ اور ناقابل فراموش ہے۔ یہ دونوں بروج ایٹ ریور پر واقع ہیں جو بروکلین کو ڈاؤن ٹاؤن مین مین سے ملاتے ہیں۔ بعد میں کی مرتبہ مجھے اس حسین نظارے کا تجربہ ہوا۔

آنکھیں بند کرتے ہی میں اپنے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔ گزشتہ روز ساگ فو سے میری بڑی اہم اور تفصیلی میٹنگ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں میں راکیل کے ساتھ اس وقت نیو یارک میں موجود تھا۔ ساحل کی تلاش کے سلسلے میں راکیل ساگ فو کی نمائندگی کر رہی تھی۔ راکیل ساحل اور میرے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی کہ بڑی حد تک اسے میری ”جی“ اور ”تیسری آنکھ“ والی صلاحیت کی بھی خبر ہو گئی تھی۔ میرا مشن اس کے ذہن میں روز روشن کی طرح واضح تھا۔ وہ اب تک ایک قابل اعتماد دوست کا کردار ادا کرتی آتی تھی لہذا اس پر بھروسہ کر کے میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں کرتی۔

سلسل میں ساگ فو نے مجھے اپنے اس بندے سے بھی طوا دیا تھا جو ہر قسم کے میک اپ میں مہو رہتا تھا۔ خاص طور پر مائیک میک اپ میں اسے بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اس نے مجھے نہایت ہی مفید نہیں بھی دیں۔ اس کا نام جاؤ یان تھا۔ ساگ فو کے مطابق ایک آدھ دن میں ہی یو آن ناؤ (ڈاکٹر سوگ) کی حیثیت سے وہ انکریج (الاسکا) روانہ ہونے والا تھا۔

ساگ فو کی بزرگانہ ہدایت کے مطابق مجھے اور راکیل کو چائنا ٹاؤن (مین مین) میں پہنچنا تھا۔ اس نے ہمیں ”دنگ

ہنگ“ نامی ایک شخص کا ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا وہ ہمارے نیو یارک پہنچنے سے پہلے دنگ ہنگ کو فون بھی کر دے گا۔ دنگ ہنگ کو ہمارے مشن سے آگاہ نہیں کیا جاتا تاہم ساگ فو کے مطابق دنگ ہنگ مین مین میں ہم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کا پابند ہوتا۔ وہ ساگ فو کا گہرا عقیدت مند تھا اور بدھ مت سے متعلق رکھتا تھا۔ چائنا ٹاؤن میں اس کی نو فوگرائی کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ میں اور راکیل ”گار شیا اور ڈسلاوا کی حیثیت سے جا کر اس سے ملے۔ ہم ایک طرح سے اس کے مہمان رہتے جو سیٹل سے آئے تھے۔۔۔۔۔ اور اس وقت ہم سیدھے ”مسم اسکوائر“ (چائنا ٹاؤن) دنگ ہنگ کے پاس ہی جا رہے تھے۔

میں گہری سنجیدگی سے ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے لیے سب سے بڑا اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ ساگ فو نے بڑی شرافت سے ساحل کو مجھے سوپ دیا تھا اور اس کی دل گرفتہ باتوں سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا۔۔۔۔۔ وہ چند گھنٹوں چند دن یا چند ہفتوں کا مہمان تھا ساگ فو کو سب اپنا بڑا ماننے تھے جب اس نے ساحل کو میرے حوالے کر دیا تھا تو دوسرے کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اب یہ مجھ پر منحصر تھا کہ میں کتنی جلدی ساحل تک پہنچ جاؤں!

آخری مرتبہ میں نے جب ساحل کی طرف جھانکا تھا تو وہ حالت نیند میں تھی۔ اس وقت میں ساگ فو کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ میں نے ساحل کو اسی بیڈروم میں پایا تھا جہاں وہ رہتی ہوئے تھے۔ یان کی قید میں تھی۔ اس کے بعد میں نے ساحل کی خبر نہیں لی تھی۔

میں نے اپنے تصور میں ساحل کے خال و خلو کو ابھارا اور اگلے ہی لمحے میری ہلکی آٹھ نے مجھے اس کے ماحول میں پہنچا دیا۔ میں نے اسے ایک بندہ پرست لینے ہوئے پایا۔ وہ قطعی طور پر اس وقت جاگ رہی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بیڈروم نہیں تھا جہاں میں نے اسے ایک چڑی کا ڈبچ پر حالت نیند میں دیکھا تھا۔ اس بیڈروم کا ماحول اس بیڈروم سے قطعی مختلف تھا۔ ممکن ہے یہ اسی بلڈنگ کا کوئی دوسرا بیڈروم ہو یا یہ بھی ہو سکتا تھا ساحل اس وقت کسی دوسری جگہ پر ہوا!

آخر الذکر خیال نے اندرونی طور پر مجھے چھوڑ کر رکھ دیا اور بے ساختہ میرے دل سے یہ صدا بلند ہوئی۔ نہیں، اب ساحل کو کسی نئی جگہ منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنا ساحل ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔ رہی کو میرے سامنے کھٹے نیکانی ہو گی!

اس غزم نے میرے اندر ایک نئی توانائی بھری اور میں

نے اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز کر دی۔ وہ اس وقت جاگ رہی تھی مکمل ہوش و حواس میں تھی۔ میں نے دھتے دھتے سے اس کی پلوں کو جھپٹتے ہوئے محسوس کیا۔ میں جانتا تھا اور سناگ فونے اس جاننے کی تصدیق بھی کرتی تھی کہ میری آواز کہیں اور اور کہیں اور کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے صرف تصور کے دو پوئیکیشن سے کام لینا ہوگا "آڈیو کیشن میری رسائی میں نہیں آ سکتا لیکن ساحل کو ایک بیڑہ دروازہ دیکھ کر میرا دل جھل گیا۔ میں نے بے اختیار ہلکے ہلکے زبان خاموشی اسے پکارا۔ اس عمل کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ میری پکار اس تک نہ پہنچ سکی۔ وہاں کی بھی کوئی آواز میری ظاہرہ یا فانی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ جھنجھلا کر میں نے کوشش ترک کر دی اور بیڈروم کے ماحول کی جزئیات کو اپنے ذہن میں نقش کرنے لگا۔

اس بیڈروم میں ساحل بالکل اکیلی تھی۔ میں نے کمرے کے سائز وہاں موجود تمام اشیاء دروازے کے رنگ اور ڈیزائن پر دوس کے رنگ، کپڑے اور تراش خراش کے علاوہ فرش پر پھینچے ہوئے دیوار تائیں کو بھی ذہن نشین کر لیا۔ اسی طرح الیکٹرونک لائٹ کی تفصیل بھی میری نظر سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں انتظار کرنے لگا کہ کوئی اس کمرے میں داخل ہو، تاکہ میں اس کا "ماحول" پکڑ کر بیڈروم سے باہر "کل" سکوں۔ ساحل کے از خود بیڈروم سے باہر قدم رکھنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ وہ عورت مجھے نظر آجائے گی جس کا بیچھا پکڑ کر میں دال اسٹریٹ تک چلا آیا تھا۔ میری کائناتی تصوراتی غفلت سے وہ ایشیائی عورت میری دسترس میں نہیں رہی تھی۔ دس منٹ کے مسلسل انتظار کے بعد بھی جب میری امید پوری ہونے کے آثار واضح نہ ہوتے تو ایک بے نام سی آگنا ہٹسے پر سے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسی آگنا ہٹ میں ایک چوکانا دینے والا خیال میری سوچ میں نمودار ہوا۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں تصور کی نگاہ سے اس ایشیائی عورت کے ماحول میں اترنے کی کوشش کروں؟

یہ ایک اچھوتا خیال تھا۔ مذکورہ عورت کے خدخال میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ میں نے اس کی بادی آنکھوں چوڑی چپٹائی، بیضی چہرے، گلابی ہونٹوں اور سنوٹاں ناک کا تصور کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اسی کے آفس میں پایا۔ وہ ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی بڑی توجہ سے کسی کام میں مصروف تھی۔ میں نے مائیکرے اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ وہاں نظر آنے والی

تحریر سے مجھے اندازہ ہوا وہ اشاک ایجنٹ سے متعلق کوئی فائل کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ اس وقت اپنے دفتری کام میں مصروف تھی۔ میں پانچ بجے منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ وہ اپنی سیٹ چھوڑے اور مجھے بھی اس کے ساتھ موو کرنے کا موقع ملے لیکن میرا انتظار رنگ نہ لاسکا۔ اس کے اشاک کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا "ابھی کتنوں اس کے اٹھنے کا کوئی امکان نہیں۔

نیویارک کے وقت کے مطابق اس لمحے ساڑھے دس بجے تھے۔ میں نے زوردار آئی لینڈ کے ہٹ سے جب ساحل کو نشانہ کرتے ہوئے دیکھا تھا تو اس وقت نیویارک میں لگ بھگ نو بجے تھے۔ کم دہش نو بجوں پر وہ ایشیائی عورت مختلف راہ دار یوں سے گزرنے کے بعد وائل اسٹریٹ پر نکل آئی تھی اور جب میں نے اسے "کھویا" تو صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اس حساب کتاب کو اگر ذہن میں مناسب جگہ دی جائے تو پھر یہ نتیجہ سامنے آتا تھا کہ وہ ایشیائی خوبصورت عورت ساحل کو نشانہ کرانے کے بعد کسی دفتر میں آکر بیٹھ گئی تھی اور اشاک ایجنٹ سے متعلق کوئی ضروری کام کرتی تھی مگر کس آفس میں اور کہاں؟ یہ ایسے سوالات تھے جنے کافی الحال میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا!

جب مزید پانچ منٹ تک بھی مذکورہ عورت کے اپنی سیٹ سے اٹھنے کا کوئی امکان نظر نہ آیا تو میں اس کے آفس کے ماحول کو ذہن میں بسا کر وہاں سے چلا آیا۔

میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے تازہ ترین صورت حالات پر غور کرنے لگا۔ آنکھیں کھولنے کا مطلب تھا راکل کی بوتلی کا ڈھکن اٹھا دینا اور فی الحال اس موڈ میں نہیں تھا۔ اسی سوچ بچار میں میرے ذہن میں خیال آیا کہ ایک مرتبہ پھر رلی کو ٹرائی کروں۔

میں نے رلی موٹے ہاتھن کے نقش و نگار اور تاثر انگیز شخصیت کو اپنے تصور میں تازہ کیا اور اس کے ماحول میں اترنے کے لیے اپنی قہر ڈالی کو زحمت دی لیکن تاریکی کی ایک موٹی دیوار نے میری تصوراتی بصارت کا راستہ بلاک کر دیا۔ میں رلی کے ماحول تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ دو تین مرتبہ کی سعی کے بعد جھنجھلا کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ رلی نے خود تک پہنچنے والے ہر راستے کو اپنے کسی پراسرار عمل سے بند کر رکھا تھا۔ اس کا نام... کوشش سے ایک نہایت ہی اہم نکتہ میرے ہاتھ آ گیا۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس نکتے پر غور کرنے لگا۔

میں براہ راست رلی کو نشانہ بنا کر اس کے ماحول میں

نہیں جھانک سکوں گا۔ ہاں البتہ وہ جس ماحول میں موجود ہو وہاں کے کسی اور کردار کے ذریعے میں اس ماحول تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں جیسا کہ ساحل والے معاملے میں ہوا تھا۔ جب وہ چرمی کاؤچ پر دراز تھی تو میں رلی کا تعاقب کرتے ہوئے بیڈروم کے دروازے تک چلا گیا تھا۔ اب مجھے کسی بھی طرح اس ماحول تک رسائی حاصل کرنا تھی جہاں رلی موٹے ہاتھن موجود ہو۔ اس طرح میں رلی کی سرکریوں پر نگاہ کر سکتا تھا اور یہ جانتا نہایت ہی دشوار کام تھا کہ رلی کی کس وقت کس ماحول میں کن لوگوں کے ساتھ موجود ہوگا اور آیا ان لوگوں میں سے میں کسی کا صورت آشنا بھی ہوں گا یا نہیں! یہ موقع سوائے اتفاق کے میرے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔

یہ سچ ہے جانتا بہت بڑا عذاب ہے اور قبل از وقت کی جان کا رلی ایک عظیم عذاب! جو انسان جتنا زیادہ باخبر ہوتا ہے وہ اتنی اور جسمانی طور پر اتنی ہی زیادہ اذیت سے گزرتا ہے۔ ملاحظہ کیے جاسکتا ہے ہوا پانی یا پھر روحانی ہوا اپنے استعمال کے جواب میں وہ ہم سے بھی "قضا" کرتی ہے۔ وہ ایک مخصوص "خراج" حاصل کے بغیر جان نہیں چھوڑتی۔

اس سسٹم میں جس کا ہم حصہ ہیں ادائی کے بغیر کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادائی البتہ پری پیڈ بھی ہو سکتی ہے اور پوسٹ پیڈ بھی۔ بالکل کرڈٹ اور ڈیبٹ کارڈ کی طرح۔ یہ سسٹم "اس ہاتھ لو اس ہاتھ دو۔" کے تحت دو اور دو چار کی طرح کام کرتا ہے۔ جو لوگ واقعی باصلاحیت ہیں اور سسٹم کے "مطلوبہ داروں" کو جانتے ہیں وہ شب و روز اس تجربے سے گزرتے رہتے ہیں۔ غور و فکر کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جب سے میں نے تیسری آنکھ کا استعمال شروع کیا تھا، مذکورہ تجربے سے گزر رہا تھا۔

میں نے ادھر ادھر کے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے تصور کے گھوڑے کو قہر ڈالی کے چابک سے ساحل کی جانب دوڑایا۔ وہ اسی بیڑہ پر موجود تھی لیکن اب اس کی آنکھیں بند تھیں اور سینے کا زبردیم بتاتا تھا وہ حالت نیند میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ سونے کا وقت تو نہیں تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا اسے زیادہ تر بے ہوش یا نیند کی حالت میں رکھنے کے لیے کوئی مخصوص دوا دی جا رہی تھی۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا رلی نے خود ہی عمل کے ذریعے اس کی نیند کو اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر دیا ہو!

میں نے آنکھیں کھول دیں اور ٹیکسی میں حاضر ہو گیا۔ اسی وقت راکل پر میری نگاہ پڑی۔ وہ زبردست مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نظری تو اس نے

استفسار کیا "جہیں کیسے جتا چلا کہ میں جہیں جگہ نے ہی دالی ہوں؟"

"بس اندازے ہی سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری نیند پوری ہو گئی!" وہ شرارت بھرے ہلچل میں متحضر ہوئی۔

میں نے سرزنش آمیز نظر سے اسے دیکھا لیکن خاموش رہا۔

وہ خاموشی نہ رہ سکی اور پوچھ بیٹھی "کوئی کامیابی ہوئی؟"

میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

میرے انکار کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں دانستہ اس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ وہ میری صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ میں اس وقت تک خود بھی کسی نیچے پر نہیں پہنچا تھا راکل کو کیا بتاتا۔ تھوڑی دیر بعد میڈیٹین کلب نے ایک سپر بیس ہائی دے کو چھوڑ دیا اور ایک نیم بیچری دائرے میں سفر کرتے ہوئے سیدھی فلیٹ بش ایونیو میں داخل ہو گئی۔ فلیٹ بش ایونیو میں میٹن برج کے اوپر سے گزر کر سیدھی جانتا ناؤن میں داخل ہو جاتی ہے۔ برج کے اختتام پر یہ ایونیو کینال اسٹریٹ اور کریمک اسٹریٹ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

وہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا اور درجہ حرارت صفر کے آس پاس چل رہا تھا۔ فضا میں اچھی خاصی دھند بھی موجود تھی۔ نیویارک کو امریکا کی سرد ترین ریاستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ انتہائی شال میں کینڈا اسے جڑی بیٹھی ہے۔ موسم سرما میں یہاں کا درجہ حرارت بعض اوقات منفی دس درجہ تک گریڈ تک چلا جاتا ہے۔ دھندلگی فضا کے سبب میں میٹن ڈاؤن ناؤن بھی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس نظارے میں ایک عجیب سے محرک کا تاثر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں میٹن برج پر سے گزر کر ہم خواہوں کے کسی جزیرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

نیویارک خصوصاً میں میٹن خواہوں کا ایک جزیرہ ہی ہے۔ موسیقار اور شاعر لوگ بھی بڑے کمال کے ہوتے ہیں۔ معاشرے کی بڑی گہری عکاسی کرتے ہیں۔ جس طرح ہر تصویر کے دورخ ہوتے ہیں اچھا اور برا۔ ڈراک اینڈ لائٹس بالکل اسی طرح نیویارک کے بھی دورخ ہیں۔ انتہائی خوبصورت اور دل کش نیویارک..... اور گندا غلیظ نیویارک! کسی زمانے میں جیز (JAZZ) موسیقاروں نے نیویارک کی چکاچند اور دل کشی کے پیش نظر اسے بگ اپل (BIG APPLE) کا خطاب دیا تھا۔ بعد میں اس خطے کے تاریک پہلو دکھانے کے لیے "ہولو زگروپ" نے اس ریاست کو بگ



بن (BIG ONION) قرار دیا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ یارک کی بعض گھیسوں میں موجود پکڑے کے متعلق انباروں کے قریب سے گزر رہی تو آنکھوں میں دیکھے ہی پانی آتا ہے یہ بیاز کو کاٹتے وقت! مرحوم اشفاق احمد نے اس جزیرے کے ریک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

رائیل نے مجھے بتایا کہ ہر سال لگ بھگ پینتیس ملین زائد یارک یا تر آکوتے ہیں۔ ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز د خرابوں کا جزیرہ ”مین مین“ ہی ہوتا ہے۔ مین مین کو بے طریقے طریقے سے آباد کیا گیا ہے۔ جنوب اور شمال کے ریمان بننے والی تمام سڑکیں ایونڈز ہیں جب کہ جزیرے کے مشرق کو مغرب سے ملانے والی چھوٹی سڑکیں اسٹریٹس کہلاتی ہیں۔ مین مین میں فقہ ایونڈ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ جزیرے کے قلب سے گزر کر اسے مشرق اور مغرب میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ہر ایسٹ اسٹریٹ جب فقہ ایونڈ کو کراس کرتی ہے تو وہ ڈیٹ اسٹریٹ میں بدل جاتی ہے مگر اس کا نمبر تبدیل نہیں ہوتا۔ مین مین میں شرقاغرب ایک سو اکیس اسٹریٹس ہیں۔ ڈاؤن ٹاؤن مین مین ایک سے تیرہ اسٹریٹس تک ہے۔ اسٹریٹ چودہ سے اٹھ تک ڈاؤن مین مین ہے اور اسٹریٹ ساٹھ سے ایک سو اکیس تک اپ ڈاؤن مین مین کہلاتا ہے۔ متعصب اور نسل پرست کالوں کا خطرناک علاقہ ”ہارلم“ اپ ڈاؤن میں ہی واقع ہے۔

ہم بذریعہ ہیلو میڈیٹین مین مین برج کو عبور کر کے جانتا ڈاؤن میں داخل ہو گئے۔ ہیلو میڈیٹین کیب کو نیو یارک کی لائنس یافتہ ٹیکسی ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور اس کا اترانا لائنس یافتہ پونی (PONY) سے کہیں زیادہ ہے۔ پونی ایک مخصوص شناخت ہے جو لائنس یافتہ ”پرائیویٹس آف نیو یارک“ کی پہچان ہے۔

کیب نے کینال اسٹریٹ پر تھوڑا فاصلہ طے کیا اور بائیں جانب پادری اسٹریٹ پر مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم کیتھم اسکوائر میں تھے۔ ڈرائیور نے گلاس پارکیشن کو ہٹایا اور ہم سے استفسار کیا۔

کیتھم اسکوائر میں کہاں روکوں؟“ اس دوران میں رائیل مسلسل باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک سمت ڈرائیور کی توجہ مبذول کرانی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا ”اس بینک کے سامنے روک دو۔“

ٹیکسی مذکورہ بینک سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے رکتی۔ کرایہ صرف اکیس ڈالر ہوا تھا۔ رائیل نے ڈرائیور کو پینتیس ڈالر ادا کیے اور ”کیپ دی پیچ“ کہتے ہوئے

ٹیکسی سے اتر گئی۔ اگر ہم دوسرے راستے سے مین مین میں داخل ہوتے تو کم دیش میں ڈالر کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ رائیل نے چار ڈالر ڈرائیور کو پیسے کی مدد میں دے دیے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ٹیکسی والے کو پندرہ فیصد سے زیادہ پیسے نہیں دی جاسکتی۔ اکتیس پر چار کا تناسب تقریباً اتنا ہی بننا تھا۔ امریکا میں کرسی لوٹ کا استعمال بہت کم اور بجلی سٹاپ ہوتا ہے۔ میں ڈالر سے نیچے نیچے۔ اس سے اوپر عموماً کیش ڈیلنگ نہیں ہوتی بلکہ ادائی خالصتاً کریڈٹ کارڈز کے ذریعے کی جاتی ہے۔ کیش کے معاملات صرف بینک محدود ہیں۔ اوپن مارکیٹ ہسٹریوں، وکالوں وغیرہ میں کیش قبول نہیں کیا جاتا۔ امریکی کرسی ایک ”ڈیپاچ“ دس ”میں“ پچاس اور سو ڈالر کے ٹوٹوں پر مشتمل ہے پانچ سو ایک ہزار پانچ ہزار دس ہزار اور سو ہزار کے ٹوٹ عام نہیں ہیں۔ یہ تمام بڑے ٹوٹ فیڈرل ریزرو سسٹم اور پریڈری ڈیپارٹمنٹ کی ڈیلنگ کے لیے ہیں۔ سب سے زیادہ اہمیت میں ڈالر کے ٹوٹ کو حاصل ہے آج کل ”ریکارڈ“ جو حالات ہیں ان کے پیش نظر اس سال کے وسط تک فیڈرل ریزرو بینک پانچ سو ڈالر کا ٹوٹ عام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ امریکی عوام کی طرف سے حکومتی سطح پر کی جانے والی اس ”حرکت“ پر شدید احتجاج کی توقع ہے۔ سننے میں یہ بھی آ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں بینک دولت پاکستان بھی میں پانچ ہزار اور دس ہزار کے کرسی ٹوٹ کے اجراء کی تیاریوں میں ہے۔ امید نہیں کہ پاکستانی عوام اس کا کوئی سنجیدہ ٹوٹ لے..... کیونکہ یہ ایک بے بس عوام ہے امریکی عوام کی طرح طاقتور اور حقوق یافتہ نہیں..... اور یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے!

ٹیکسی چھوڑنے کے ٹیک ایک منٹ بعد ہم ”دگ بینک فوٹو آرٹ“ میں داخل ہو رہے تھے۔ دگ بینک کا یہ شان دار فوٹو اسٹوڈیو کیتھم اسکوائر میں ”مین مین سٹیو بینک“ کے نزدیک ہی واقع ہے۔ بینک کی عمارت کی کینائزیشن سے مشابہ ہے۔ قریب ہی تھوڑے فاصلے پر عظیم جینی فلسفی کے نام پر تعمیر کی جانے والی عمارت ”کنفیو شس پلازا“ استادہ ہے۔

دگ بینک نے ہمارا پرتاپ کا استقبال کیا۔ وہ چالیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ میانہ قد اور جسم مائل بہ فربہ۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ ساگن فونے اسے ہماری آمد کی اطلاع دے دی تھی اور اس کے روپے سے یہی ظاہر ہوا تھا وہ ہمارے لیے سراپا تھا۔ ہمارے درمیان رکی ہو چکی تھی۔

”فوری طور پر میں آپ لوگوں کے لیے کیا کروں؟“

دھک ہنگ انگلش کے علاوہ میٹزن بھی روانی سے بولا تھا تاہم اس وقت ہمارے درمیان۔ بات چیت انگریزی ہی میں ہو رہی تھی۔ ساہگ فو نے ہمارا تعارف اپنے خاص آدمیوں کی حیثیت سے کر لیا تھا اس لیے بھی دھک ہنگ بچا جارہا تھا۔ اسے ہمارے مشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ہم چند دن میں یمن میں گزار کر واپس چلے جائیں گے اور اس دوران میں اسے ہماری ضروریات کا خیال رکھنا ہوگا۔ میری طرح راکل بھی اس سے پہلی مرتبہ مل رہی تھی۔ البتہ ساہگ فو نے اسے ہمارے ماسک میک اپ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ہماری شخصیت کی تبدیلی نے اسے بھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس وقت ہم کسی خاص ماسک پر تھے۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”مسٹر ہنگ! اگر آپ چاہنا ہوں گے کہ کسی متوسط ہوگی میں ہمارے لیے قیام کا بندوبست کر دو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔ فی الحال ہماری ضرورت یہی ہے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔“

وہ مسکرایا اور بولا ”چاہنا ہوں میں ہوئے برائے نام ہی ہیں اور یہاں کا ماحول بھی آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ غیر چینی افراد کے لیے بڑے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو توقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”اگر تم لوگ محسوس نہ کرو تو میرا قلیٹ حاضر ہے۔ وہ قلیٹ کی طرز پر بنا ہوا ایک خاص کھر ہے جہاں میں اکیلا رہتا ہوں یا میرا کھر ملے ملازم ہوتا ہے۔ میں آپ کو لوگوں کو ایک کمرادے سکتا ہوں۔“

یہ اچھا آئیڈیہ تھا۔ کسی ہوئی کی بہ نسبت ایک مقامی شخص کا گھر ہمارے لیے زیادہ موزوں اور محفوظ تھا۔ میں نے اس کے مشورے سے فوراً اتفاق کر لیا اور پوچھا ”مسٹر ہنگ! تمہارا وہ قلیٹ یہاں سے کتنا دور ہے؟“

”کچھ دور نہیں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور بتانے لگا ”یہ اسٹوڈیو تھیم اسکوائر میں ہے اور قلیٹ ادھر موٹ اسٹریٹ پر بدھ عبادت گاہ کے نزدیک۔ میں ابھی جا کر چھبین دکھا دیتا ہوں۔“

آئندہ دس منٹ میں میرے اور راکل کے درمیان طے ہو گیا کہ ہم دھک ہنگ کے قلیٹ پر ہی قیام کریں گے۔ میں نے واضح الفاظ میں اس سے کہا۔

”مسٹر ہنگ! ہم عموماً رات گزارنے ہی تمہارے قلیٹ پر آئیں گے۔ دن کا سارا وقت ہم باہر ہی گزاریں گے۔“

”ٹھیک ہے“ میں قلیٹ کی ایک چابی تمہیں دے دیتا

ہوں۔“ اس نے اپنی جھڑکی دروازہ کھولتے ہوئے کہا ”دیکھو میرا ملازم کھر ہی میں رہتا ہے۔ بہر حال احتیاطاً چابی رکھ لو اور میرے ساتھ چل کر قلیٹ بھی دیکھ لو۔“

”ہمیں ایک گاڑی بھی چاہیے۔ کیا ریکشل کار کبھی۔۔۔۔۔“ اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ قطع کادی کرتے ہوئے بولا ”میرے پاس دو گاڑیاں ہیں۔ ایک تم استعمال میں لے آؤ۔ میں شیوی تمہیں دے سکتا ہوں۔ ماڈل چند سال پرانا ہے لیکن نئی گاڑیوں سے زیادہ کارکردگی کی حامل ہے۔“

”اوکے ڈن!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”ہمیں تمہاری شیوی (شیورٹ) قبول ہے۔“

اس کے بعد دھک ہنگ ہمیں اپنے ساتھ گھر دکھانے لے گیا۔ اس کے قلیٹ کا راستہ بہت ہی آسان تھا۔ ہم کیتھم اسکوائر سے واپس باوری اسٹریٹ پر آئے اور کینال اسٹریٹ سے پہلے ہی بائیں جانب بیاڑڈ اسٹریٹ پر مڑ گئے۔ بیاڑڈ اسٹریٹ آگے جا کر موٹ اسٹریٹ سے جاملی۔ ہم نے دائیں جانب ٹرن لیا اور سیدھے بدھ عبادت گاہ کے سامنے کھڑے ہوئے۔ پھر ہمیں ہنگ کے گھر تک پہنچنے کے لیے بہ شکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔

☆☆☆

دو پہر کا وقت تھا۔ فضا میں رنگوں میں خون محمد کر دینے والی ٹھنڈک رہی، بس تھی۔ صبح سے اب تک سورج نے ایک مرتبہ بھی نیویارک کے باسیوں کو آنکھ دکھانا کوارا نہیں کیا تھا پورے کھڑے کی جلوه نمائی تو بہت دور کی بات تھی۔ تاہم اس شہ پر موسم کے باوجود بھی نیویارک میں کاروبار زندگی اپنے معمول پر تھا۔

میں اس وقت راکل کے ساتھ فورٹی فائیو ڈویژن اسٹریٹ پر ”کینٹن“ میں بیٹھا تھا۔ کینٹن (CANTON) اپنی نوڈ ڈش کے حوالے سے بہت معروف ہے جو یمن میں برنج کے نزدیک ہی چاہنا ٹاؤن میں واقع ہے۔ ناشاپا نے گاڑی اس لیے ہی منگوائی تھی۔ مجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی لیکن بھوک کے معاملے میں راکل بڑی بے مبری اور کھٹی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے پیٹ پوچھا کیے بغیر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میں پہلی فرصت میں وال اسٹریٹ پہنچنا چاہتا تھا مگر راکل کی کمزوری کا خیال کرتے ہوئے اس ریسٹورنٹ میں چلا آیا تھا۔

کھانے کے بعد ہم نے کیریٹ کارڈ سے ادائیگی کی اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ گارشیادو سلسلہ کا تعلق سیٹل تھا۔ وہ امریکن سیٹل تھے اور اسی حیثیت سے ”ان دونوں“ کے پاس مختلف کیریٹ کارڈز بھی تھے۔ یعنی ہمارے پاس ڈائری

کلب ڈیر اور ماسٹر کارڈز تھے۔ کیریٹ کارڈز کے باوا آدم، ”ماسٹر کارڈ“ کم امریکا والے ”ایکسیس“ کا نام دیتے ہیں۔ ماسٹر کارڈ یعنی ایکسیس (ACCESS) کو سب سے زیادہ خوش دلی سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈائریز کلب (DINERS CLUB) کو بھی ”عزت“ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

دھک ہنگ نے اپنی گاڑی کے بارے میں بالکل درست کہا تھا۔ شیوی کے انجن میں بے پناہ طاقت تھی اور رفتار میں اضافے کے ساتھ ہی وہ گویا سڑک پر چبھتی چلی جاتی تھی۔ پورے امریکا میں ٹریک لیفٹ بینڈ ڈرائیو کے اصول پر دوڑاں دوڑاں ہے اور سکتا نیشنل ایسے مربوط انداز میں کی گئی ہے کہ آنے جانے والوں اور دائیں بائیں مڑنے والوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بس ٹریک قوانین سے آپ کو واقف ہونا ضروری ہے۔

سکتے ہم نے ریسٹورنٹ سے نکل کر ڈویژن اسٹریٹ پکڑی اور تھیم اسکوائر پہنچ گئے۔ ظاہر ہے گاڑی کی ڈرائیو تک سیٹ پر اس وقت راکل ہی براجمان تھی۔ میں تو ڈاؤن ٹاؤن میں مین کو سمجھنے اور ذہنی نشیں کرنے میں مصروف تھا۔ کیتھم اسکوائر سے راکل نے شیوی کو پارک رو پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد ہم ٹی ہال کے قریب سے گزر رہے تھے۔ بروکلین برج بھی یمن میں آنے والوں کو ٹی ہال (سوک سینٹر) ہی پہنچاتا ہے۔ ٹی ہال اور کرسٹل کوٹ کو جیسے چھوڑتے ہوئے ”ہماری“ شیوی بڑی آن بان کے ساتھ ”بڑاؤنے“ میں داخل ہوئی۔ ہم نے ٹھوڑی دیر بعد بڑاؤنے کو ختم کر دیا اور وال اسٹریٹ پر مڑ گئے۔

اس وقت میرے دل کی دھڑکن میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ وہی اسٹریٹ تھی جہاں کہیں فٹ پاتھ ”بروز مل“ استاد تھا۔ اس کے آس پاس ہی کہیں دو عمارت موجود تھیں جہاں میری سائل کو رکھا گیا تھا۔ میں اسطراحی انداز میں وال اسٹریٹ کو اور اس کی عمارتوں کو دیکھنے لگا۔

وال اسٹریٹ پر کھڑی بلڈنگز میں میٹرو۔ ای۔ بی۔ ایس کے مقابلے میں کم بلند ہیں تاہم انہیں فلک بوس کہا جاسکتا ہے۔ ڈیٹل لین ٹریٹیک جاری دساری تھا۔ وال اسٹریٹ کے عین وسط میں ایک کشادہ فٹ پاتھ موجود تھی۔ فٹ پاتھ کے بائیں طرف کچھ کھیرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ میں ”بروز مل آف وال اسٹریٹ“ کو جس فٹ پاتھ پر استاد دیکھا تھا اس کے بائیں طرف ایسے ہی تھے۔ میرے رگ دپے میں ایک سسٹی سی ڈور تھی۔

میں نے بھان خیر انداز میں راکل سے کہا ”گاڑی کی رفتار کم کر دو۔“

”کیوں کچھ نظر آ گیا؟“ اس نے پوچھا۔

”نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ مگر آئے ہی والا ہے۔“ میں نے جمبیر آواز میں کہا ”تم یہ دسلی فٹ پاتھ دیکھ رہی ہونا کاشی کا وہ ساڑھی راستے پر کھڑا تھا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی ”جانتی ہوں۔ ہم بروز مل کے نزدیک پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ سامنے دیکھو۔“ میں نے راکل کے اشارے کے تعاقب میں ٹھہر کر دھک ہنگ کی نظر اٹھایا۔ میں نے جلدی سے کہا ”راکل! اتھم وہاں کھڑی کارڈی روک دیتا۔ میں اس ساڑھی اور اس کے گرد دلوچ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔“

دھک ہنگ نے اس ساڑھی پر ٹھہر کر دھک ہنگ میری نظر میں آجائے کی جہاں سے میں نے اس خوبصورت ایشیائی عورت کو برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ مذکورہ بلڈنگ کسی ہیولے کے مانند میری بادداشت میں لہر رہی تھی۔

راکل نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا ”میں بروز مل سے ٹھوڑا آگے جا کر شیوی کو روک لوں گی۔ تم گاڑی سے اتر کر بروز مل کی طرف آ جانا۔ میں ٹھوڑی دیر بعد تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ اس طرح ہماری سرگرمی کسی کی نظر میں نہیں آئے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”اگر چاس وقت ہم بدلے ہوئے عیوں میں ہیں لیکن احتیاطاً برتاؤ ہی بات نہیں۔“

ہم بھگے ہوئے ساڑھے کے جیسے سے آگے گزر گئے تو راکل نے سڑک کے کنارے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ میں نے پیچھے سرسبز سائیکل دروازہ کھولا اور پیدل چلے ہوئے مذکورہ فٹ پاتھ پر آ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں ساڑھے کے جیسے کے قریب پہنچ گیا۔ اڑیس فٹ میں نے اسے اپنی تیری آنکھ کی مدد سے دیکھا تھا۔ اس نظارے اور اس نظارے میں رنی بجز فرق نہیں تھا۔ بلکہ تصور اور حقیقت زیادہ واضح تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ بائیں آنکھ ظاہر دو آنکھوں سے زیادہ صاف دکھائی ہے۔

میں بروز مل کے نزدیک یوں کھڑا ہو گیا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔ وہ ایشیائی عورت بھی کچھ اسی انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس دوران میں میں ارد گرد کی عمارتوں کو بھی یہ غور دیکھ رہا تھا وہاں قدیم اور جدید دونوں طرح کی عمارتیں استاد تھیں

گاڑی کے اندر بیٹھنے کے بعد میں نے راکیل سے کہا "میں چند منٹ کے لیے غروب ہو رہا ہوں۔ تم خاموش رہنا۔ اس ازوری امپارٹنٹ۔"

"اوہ! وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی" یہاں غروب ہو کر کہاں طلوع ہونے کا ارادہ ہے؟

"ساحل کی اینڈنٹ کے آفس میں" میں نے سرسری انداز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

مذکورہ عورت کے نقش ونگار میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ میں نے اپنی تیسری آنکھ کے سامنے اس کا سراپا روشن کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے دفتر میں تھا۔ میں نے اسے گلوزنگ کی پوزیشن میں دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کمپیوٹر آف کیا پھر قلم اتیسریز کو کور سے ڈھانپ دیا۔ صبح کی طرح اس وقت بھی وہ اس آفس میں ایکی ہی تھی۔ اس کا آفس ایک چھوٹے سے چیمبر پر مشتمل تھا۔

دفتری اشیا کسمینے کے بعد اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا پھر پرس سے بے بی سررنگل کر لیں ٹچنگ کرنے لگی۔ میک اپ کے نام پر اس نے صرف اپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک تکلف ہی تھا ورنہ اسے کپ اپ اسٹک کی ضرورت نہیں تھی۔ گوری چٹی رنگت پر زندگی سے معمور اور رعنائی سے مہر پور لگا ہوا ہونٹ کسی کا سمیک زپور کے محتاج نہیں تھے۔

ہناؤ سنگار عورت کا بنیادی حق ہے۔ اس کو "ضرورت" کے خانے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی حسین ترین عورت کو بھی بننے سنورنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کسی میک اپ کی محتاج عورت کو!

وہ اپنے اس ازلی ادبی حق کو استعمال کر کے فارغ ہوئی تو اس کی حرکات و سکنات نے مجھے بتا دیا کہ وہ اپنے دفتر سے نکلے والی تھی۔ دفتر سے نکلنے کے دو ہی مطالب تھے۔ یا تو وہ ساحل کو اینڈنٹ کرنے جا رہی تھی یا پھر اس عمارت سے باہر آنے والی تھی۔ میں نے اپنے رگ دے دیے میں ایک سنسنی سی دوڑی محسوس کی پھر میں نے تیسری آنکھ کو پورے انہماک سے اس پر مرکوز کر دیا۔

اس نے پرس اٹھا لیا اور اپنے آفس سے نکل آئی۔ میں کسی ماہر جاسوس کی طرح اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ مگر اس وقت تینس ہائڈ ڈیل اوسپن مجھے دیکھ لیتا اور اس کی سمجھ میں آ جاتا کہ میں کیا کر رہا ہوں تو وہ میری کارکردگی پر ایش کر اٹھتا! میں اس کی دھڑکنے پر اس کا باپ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا سیدھا اپنے معصوم این فٹنگ کے پاس

پہنچتا اور اس سے میرے لیے کوئی ظم کھوانے کی درخواست کرتا۔

میرا رگٹ مختلف راہ دار یوں سے گھوم پھر کر جب عمارت کے زیریں حصے میں پہنچا تو میں نے سانس روک لی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ایٹیا کی عورت اس عمارت سے باہر قدم رکھنے والی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ عمارت کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھی میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے بے ساختہ اپنے ہائیڈ کا دردازہ کھولا اور شیوی سے باہر آ گیا۔ اپنے عقب میں میں نے راکیل کو کہتے ہوئے سنا "یہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کر کہاں چل دیے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور پیلے پتھروں والی بیس منزلہ عمارت کے مین گیٹ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تیزی سے ادھر بڑھنے لگا۔ اگر میری نظر ایک لمحے کو بھی چوک جاتی تو میں ایک بار پھر اس عورت کو کھودیتا۔ حالات و واقعات یہی بتاتے تھے وہ اس عمارت سے باہر آنے والی ہے۔

لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں مذکورہ عمارت کے سامنے فٹ تھم پر موجود رہا۔ اس دوران میں راکیل نے بھی مجھے جوائن کر لیا تھا۔ یہ اس مضطرب انتظار میں دس منٹ گزر گئے تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ راکیل کے انتظار پر میں نے اسے صورت حالات سے آگاہ کیا تو اس نے کہا۔

"کیا ضروری ہے کہ وہ اسی عمارت سے باہر آنے والی ہو!"

"میرا تصور مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے معکم انداز میں کہا۔

راکیل ایک لمحے تک گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر گھمبیر آواز سے بولی "وہ جان! ابھی ٹھوڑی دیر پہلے تم نے اس عمارت کو نیچے سے اوپر تک ڈزٹ کیا ہے۔ ہم اگر چہ ایک ایک کمرے میں نہیں جھانک سکتے لیکن تم نے مختلف فلورز کی لائٹ اور کوری ڈزڈر کو توجہ سے دیکھا ہے۔ کیا اس اینٹین عورت کے ماحول میں بھی یہی سب کچھ موجود تھا؟"

راکیل نے بڑا ہی کانٹے کا سوال کیا تھا۔ میں جو بپ جذبات میں اس طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔ اب جو غور کیا اور ذہن کے یادداشتی خانے کو کھنگالا تو مجھے اس اور اس ماحول میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ میں نے اس عورت کو ابھی آنکھیں کھول کر نگاہ سے جن راستوں سے گزرتے دیکھتا تھا وہ اب بلڈنگ سے بچ نہیں کرتے تھے جس کے سامنے اس وقت ہم

ہے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا وہ عورت اس میں بھی اور نہ ہی یہاں سے نکلتی تھی۔

میں نے چونک کر راکیل کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا اسٹریٹ کی کسی اور بلڈنگ میں بھی اسٹاک ایکسچینج سے نہ کام ہوتا ہے؟"

"تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

"میں نے اس عورت کو کمپیوٹر پر اسٹاک ایکسچینج سے متعلق انفال کو لے دیکھا تھا۔" میں نے بتایا۔

راکیل نے بتایا "وال اسٹریٹ کی اکثر عمارتوں میں اسی ت کے دھندے ہوتے ہیں مگر اس کام کا مرکز "نیویارک ل ایکس پیچ" ہے۔"

"یہ یہاں سے کتنا دور ہے؟" میں نے جلدی سے سوال کیا۔

"وال اسٹریٹ ہے ہی کتنی طویل کہ کچھ دور ہو۔" وہ مجھے اچکاتے ہوئے بولی "جب ہم براڈوے کو چھوڑ کر اسٹریٹ میں داخل ہوئے تھے تو دائیں جانب جو دوسری داخ ہے وہ براڈ اسٹریٹ کہلاتی ہے۔ براڈ اسٹریٹ وال اسٹریٹ سے بننے والے کوئے پر جو بلڈنگ کھڑی وہی نیویارک اسٹاک ایکس پیچ ہے۔ ایڈریس کے پے پی ٹی براڈ اسٹریٹ کہلاتے گی۔ کیا تم اس طرف نہ کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ بولی "ادھر دیکھو وہ سامنے ہی تو ہے نیویارک اسٹاک ایکسچینج" اس نے ایک جانب اشارہ بھی کر دیا "چلو پیدل ہی چلو۔"

"پیدل نہیں" میں نے گاڑی کی طرف بڑھاتے ہوئے لکھی لکھی میں کہا "اس عورت کو کسی بھی عمارت سے نکلنے کے کم از کم دس منٹ ہو گئے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی گاڑی کی رڈ پر ہوئی یا پھر کسی اور عمارت میں۔ ہم شیوی میں اس ٹھگنو کے دوران ہی میں ہم شیوی کے قریب آ گئے۔

لی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد مجھ سے "کس طرف چلو؟" پوچھا۔

اس کا سوال کرنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں نے ماکھن کر لیا ہو۔ میں نے کہا "نی الجال کی سمت بھی چل رہی ہیں اس عورت کی درست لویشن معلوم کر کے نہیں بتاتا بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ راکیل

کی بڑبڑاہٹ سے مشابہ آواز مجھ تک پہنچی "میں براڈوے ہی کی طرف نکلتی ہوں۔"

میں اس کے بیان پر توجہ نہیں دی اور رشتہ تصور کو خوب روایتی عورت کے تعاقب میں دوڑا دیا۔ اگلے ہی لمحے میری ہانپی آنکھ نے مجھے اس کے ماحول میں پہنچا دیا۔ وہ ایک شاندار گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا وہ ابھی تک اپنی منزل تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے چند لمحات تک اس کے ماحول کو سمجھا پھر آنکھیں بند رکھتے ہوئے راکیل سے کہا۔

"وہ اس وقت سرخ کیڈک میں موجود ہے۔"

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ مجھے حدشہ تھا کہیں بولنے سے میرا تصور کچھ کچھ نہ ہو جائے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے راکیل سے بات کی مگر لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا اور سرخ کیڈک کے اندر اس حسین عورت کے ساتھ موجود رہا۔ میرے لیے یہ تجربہ نہایت ہی خوش آئند تھا۔ گویا میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے کسی بھی مقام کی منظر کشی اور وہاں پیش آنے والے واقعات پر رواں تیرہ کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے تن بدن میں مسرت سے مہر پور ایک لہری دوڑی محسوس کی۔ اسی لمحے راکیل کی بیجان آواز میری سماعت سے مگرانی۔

"وہ جان! یہ معلوم کرنے کی کوشش کرؤ وہ اس وقت کہاں سے گزر رہی ہے تاکہ میں اس کے قریب پہنچ سکوں۔ ابھی تو تاحہ نگاہ کوئی سرخ کیڈی (کیڈک) دکھائی نہیں دے رہی۔"

میں پوری طرح اس عورت کی گاڑی میں جم کر "چپ" ہو گیا۔ کیڈی کے اندر رچے ہوئے میں نے دفتر اسکرین کے پارنگاہ دوڑائی اور ایک عمارت کو دیکھ کر چونک گیا۔ وال اسٹریٹ کی طرف آتے ہوئے ہم اس عمارت کے قریب سے گزرے تھے لیکن اس وقت مجھے مذکورہ عمارت کا دوسرا رخ نظر آرہا تھا۔

"راکیل!" میں نے بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے راکیل کو مخاطب کیا اور بتایا "سرخ کیڈی اس وقت ٹلی ہال کے پاس ہے مگر یہ وہ رخ نہیں جدر ہے ہم آتے تھے۔"

"اوہ!" راکیل نے ایک طویل سانس خارج کی اور شیوی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے بولی "اس کا مطلب ہے وہ ابھی براڈوے پر ہی ہے۔ مگر ہم سے آگے۔"

میں نے اپنا کام جاری رکھا اور ٹھوڑی دیر بعد راکیل کو بتایا "اس کے دار میں ہاتھ میں پٹین پلازا ہے اور۔۔۔ اور اب

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا“ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“  
میں نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا  
”کیا ہم اس عمارت کے اندر جا سکتے ہیں؟“  
”کیوں نہیں۔“ اس نے کندھے اچکائے اور علم  
”ابھی وزیرز آرزو ختم نہیں ہوئے۔ ہم اس بلڈنگ کی سر  
کر سکتے ہیں۔“

پھر آئندہ پانچ منٹ میں ہم دونوں اس عمارت کے اندر  
تھے۔ میں نے پورے ایک گھنٹے تک نیچے سے اوپر اس عمارت  
کو جھانک ڈالا اور عمارت کے کسی بھی حصے میں ایسے آواز  
میں نہ آنے کے دکھاوا کوئی بیڈروم بھی ہوگا..... اور ایسا ڈانگ  
بھی ہوگا جہاں میں نے ساحل کو نشانہ کرتے ہوئے دیکھا تھا  
اول آخر وہ پوری عمارت کا درباری مقاصد کے لیے استعمال  
ہو رہی تھی۔ اس میں نیچے سے اوپر تک مختلف کمپنیوں کے دفاتر  
کھلے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حالات نے مجھے چکر کر دیا  
دیا اور میرا ذہن لالچالہ رہی موٹے ہاتھن کی کسی عیاری نہ  
بارے میں سوچنے لگا۔

اس عمارت کے ایک ایک کمرے کے اندر جھانکنا ممکن  
نہیں تھا لہذا مایوس ہو کر ہم عمارت سے باہر نکل آئے۔ ہم  
ایک مریجہ پھر بروڈویل کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور تازہ ترین  
حالات کا جائزہ لینے لگا۔ اگر ساحل کو اسی عمارت میں رکھا  
تھا تو پھر یہ راز رہی موٹے ہاتھن اور اس کے چند قابلِ اعتماد  
افراد تک ہی محدود ہوگا..... اور اس رہائشی حصے کو بھی کیا ہے؟  
خفیہ رکھا گیا ہوگا۔ یہاں کام کرنے والے ہزاروں افراد  
ساحل کی اقامت گاہ کی بجائے بھی نہیں ہوگی۔ وہ نائن ٹوائف  
کے چکر میں روزانہ یہاں آتے جاتے ہوں گے۔  
اسی سوچ بچار کے دوران میں ایک مریجہ پھر اس دل  
ایشیائی عورت کا چہرہ میرے خیال میں روشن ہوا۔ اس  
ساتھ ہی میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور  
نے بے اختیار راکیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ”چلو!“  
”کہاں؟“ وہ میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے  
ہند بڈب لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ”شیوہ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے  
ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“

اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ضروری  
کے بارے میں استفسار نہیں کیا اور میرے ساتھ چلتی رہی  
نے ”بروڈویل آف وال اسٹریٹ“ کو عقب میں چھوڑ  
تا نگر والے فنٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اپنی گاڑی کے پاس  
گئے۔

پھر میری نگاہ پہلے پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت پر ٹپک  
گئی۔ میری یادداشت نے کوئی دہائی کے ساحل کی اینڈنٹ وہ  
ایشیائی عورت اسی عمارت سے نکلی تھی۔ مذکورہ عمارت کے  
زیریں حصے میں بلند ہالاعمرائیں بنی ہوئی تھیں۔ بالائی حصہ  
ویسا ہی تھا جیسے دوسری عمارتوں کا ہوتا ہے۔ میری نگاہ نے اشار  
کیا تو مجھے اندازہ ہوا وہ پہلی عمارت میں منزل تھی۔ اس  
اندازے میں ایک آدھ منزل کی کمی بیشی ممکن تھی۔ میں نے  
مذکورہ عمارت کے مین گیٹ پر نظر جمادی۔

اس عمارت میں مسلسل لوگوں کی آمد و شد جاری تھی جس  
سے یہی ظاہر ہوتا تھا وہاں مختلف قسم کے دفاتر ہوں گے۔  
ویسے تو پورا فائنل ڈسٹرکٹ ہی دفاتر کا مجموعہ ہے لیکن وال  
اسٹریٹ خاص طور پر اس نوعیت کے لیے مشہور ہے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں الجھ گیا۔ مجھے ایک سو ایک فی  
صد یقین تھا کہ ساحل کی دیکھ بھال کرنے والی عورت اسی  
عمارت سے نکلی تھی۔ اگر یہ عمارت خالصتاً کاروباری مقاصد کی  
حالی تھی تو پھر وہ بیڈروم کیا حیثیت رکھتا تھا جہاں میں نے  
ساحل کو رہی موٹے ہاتھن کی قید میں دیکھا تھا؟

میں انہی خیالات کی جمع تفریق میں غرق تھا کہ راکیل  
میرے قریب آ گئی۔ پھر سرسری انداز میں بولی ”کیا تم اپنی  
مطلوبہ عمارت کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے؟“  
جواب میں میں نے پہلے پتھروں سے تعمیر شدہ عمارت کی  
جانب اشارہ کر دیا۔

راکیل نے ہند بڈب انداز میں میری طرف دیکھا اور نفی  
میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے وجدان!“  
اس کا اسانس سرگوشیا نہ تھا ”اس عمارت میں کسی کی رہائش کا  
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں یہاں شیئرز  
کا کاروبار ہوتا ہے۔ تم شناخت میں کہیں غلطی تو نہیں کر رہے؟“

کیسے راکیل نے شیئرز کا حوالہ دیا تو میرے ذہن میں اسٹاک  
ایجنسز کی وہ فائل کھوم گئی جو میں نے ایشیائی عورت کے  
سامنے رکھے کمپیوٹر کے بائینر پر دیکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ  
عورت اسی عمارت کے کسی کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ ایک  
مرتبہ میں اس تک پہنچ جاتا تو پھر ساحل کا سراغ لگانا مشکل نہ  
رہتا۔

راکیل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے  
کہا ”میں ہر جگہ کوئی غلطی نہیں کر رہا۔ ساحل کو اسی عمارت کی  
کسی بیڈروم میں رکھا گیا ہے۔“  
”بیڈروم!“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلایں۔ گئے۔

مجھے اسی سمت میں فیڈرل آفس بلڈنگ اور کسٹمر کورٹ دکھائی دے رہا ہے۔

”نیک ہے۔ اس نے براڈوے کو بڑی مستقل مزاجی سے پکڑ رکھا ہے۔“ راکیل نے کہا ”وہ جان! تم تو آنکھیں بند رکھتے ہوئے بھی بہت کچھ دیکھ رہے ہو لیکن میں کھلی آنکھوں سے ابھی تک سرخ کیڈی کو نہیں دیکھ سکتی ہوں۔“

میں نے راکیل کو کوئی جواب دینے کے بجائے اپنا مشاہدہ جاری رکھا ”اب ہماری یعنی اس عورت کی بائیں جانب مجھے فرینکلن پلازا نظر آ رہا ہے۔ وہ اس پلازا کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہی ہے۔“

”کیا تم کیڈی کا نمبر معلوم کر سکتے ہو؟“

”اس کے لیے مجھے کیڈی سے باہر نکلنا ہوگا۔“ میں نے کہا ”گاڑی کی نمبر پلیٹ کو سامنے سے یا پیچھے سے جھانکنا ہوگا اور..... فی الحال میں کیڈی سے باہر آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”اوہ۔“ راکیل ایک بوجھل سانس لے کر رہ گئی۔

میں نے کیڈی کے بدلتے ہوئے تہہ در تہہ کیچے تو جلدی سے کہا ”راکیل! وہ دائیں جانب مڑنے والی ہے اور..... اور اس نے گاڑی کو موڑ لیا۔“

راکیل نے کہا ”فرینکلن پلازا کے بعد براڈوے کینال اسٹریٹ کو کراس کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ کینال اسٹریٹ میں داخل ہوئی ہے۔“

”کیا یہ وہی کینال اسٹریٹ ہے جو مین ہٹن برج سے جا ملے گی؟“

”بالکل وہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ جانا ناؤن کی طرف جاری ہے۔“

آہستہ بہی دکھائی دیتے ہیں۔“

”تم رفتار کو اور بڑھاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”ہم اس وقت فرینکلن پلازا کے نزدیک ہی ہیں۔ تم گرنڈ کروڈہ فچ کر نہیں جائے گی۔“

میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے اس ایبائی عورت سے چپکا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے شیوی کو دائیں جانب مڑنے محسوس کیا۔ اس کا یہی مطلب تھا راکیل نے گاڑی کو کینال اسٹریٹ پر ڈال دیا تھا۔ وہ چائنا ناؤن سے گزرتے ہوئے بڑی تیزی سے مین ہٹن برج کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس دوران میں اس نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اپنے موبائل فون پر کوئی کال بھی ریسیو کی۔ افسوس کہ میں اس کی

آواز نہیں سن سکتا تھا وہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے کمر پات کی بھی۔ موبائل پر بات ختم ہوئی تو اس نے موبائل پچھڑ سیٹ پر رکھ دیا۔ اسی لمحے راکیل کی تیز آواز ساعت سے نکلی۔

”وہ جان! کیڈی کے پیچھے ہی جانا ہے یا چیز کروں؟“

”بیوی!“ میں اچھل پڑا۔

راکیل نے بیوی نہیں بیوی کہا تھا۔ بیوی روزن! اس کے الفاظ پر میں نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھولیں اس وقت ہماری گاڑی ایک سٹپل پر کھڑی تھی۔ میں نے کر راکیل کی طرف دیکھا اور پوچھا ”تم کس بیوی کی کر رہی ہو؟“

اس نے بائیں سمت بچتے ہوئے ٹریفک کی طرف کیا اور بولی ”ابھی ابھی میں نے اپنے سامنے سے ایک میں برنارڈ لیو کو گزرتے دیکھا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میری لیے یہ بہت بڑا اور تھا۔ برنارڈ لیو اور یہاں..... ہمیں کوئی مفاد تو نہیں ہو ”لیو اور رنی کے قتلے میں مجھے کوئی مفاد کچھ ہے۔“ وہ اسٹیرنگ پر غرور ڈلی انگلیوں سے دستک دے بولی ”میں نے اپنے طویل عرصہ ماؤنٹ مکملے میں اس کے ساتھ گزرا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت باورڈ کینال اسٹریٹ کو کراس کر رہی ہے۔ میں اسی اسٹریٹ نیوی بلیو بیوی (بی ایم ڈبلیو) کی غمی نشست پر براجمان دیکھا ہے۔ وہ گاڑی باوری کی طرف جا رہی جلدی فیصلہ کر۔ سٹپل مکملے ہی والا ہے۔“

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا شادیا ”تم نیوی بلیو بی ایم ڈبلیو کا تعاقب کرو۔“ میں نے کہا

کی خبر گیری کر کے آتا ہوں۔“

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ سٹپل کل گیا۔

خوب صورت ایبائی عورت کا تصور کیا اور ایک مرتبہ سرخ کیڈی میں قہقہہ کیا۔ وہ مین ہٹن برج کو پیچھے کینال اسٹریٹ پر آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکو آواز پر پہنچ کر اس نے کیڈی کو ایسٹ براڈوے اور سیوارڈ پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک

ایبائٹس بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔ میں نے یہ سچے سچے کہنا ہی نہیں برتی کہ وہ عورت سیوارڈ پارک اپارٹمنٹ تھی۔ میں اس کی پشت سے چپکا رہا اور اپارٹمنٹ تک پہنچ گیا پھر میں اس کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ کے

ہو گیا۔

قرنی فور ایک شاد اور گھڑی اپارٹمنٹ تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ عورت اس اپارٹمنٹ میں بالکل اکیلی تھی۔ اس نے اپنی اقامت گاہ کے جن جن حصوں میں گردش کی وہ تمام گوشے اور کونے کھدوے میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیے۔ پھر جب اس نے داش روم کا رخ کیا تو میں اس کے بائیں کو ”ہائے ہائے“ کہتے ہوئے شیوی میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت ہماری گاڑی باوری اسٹریٹ پر ستر جاری رکھے ہوئے ”باوری“ میں داخل ہو چکی تھی۔

مجھے آنکھیں کھولتے دیکھا تو راکیل نے اپنے سامنے ساٹھ گز دور اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ نیوی بلیو گاڑی دیکھ رہے ہو؟ اس میں ہے لیو۔“

”میں نے نقد ترقی کی خاطر آنکھیں بند کیں اور لیو کے مرابا کو ذہن میں لاتے ہوئے اسے اپنے ذہن میں اجاگر کرنے کی کوشش کی اور میری یہ کوشش صد فی صد کامیاب ٹھہری۔ اگلے ہی لمحے میں بی ایم ڈبلیو کے اندر تھا۔ برنارڈ لیو گہری سنجیدگی کے ساتھ بیوی کی غمی نشست پر بیٹھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باوری شیو کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ لیو جہاں بھی جا رہا تھا بڑے ترک و احتشام کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

راکیل نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا ”تلی ہوئی؟“

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

اس نے استفسار کیا ”کیڈی والی کا کیا ہوا؟“

”وہ سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس میں پہنچی ہے اور اس وقت گرم شاد لے رہی ہے۔“

”اوہ! تو تم اس کے داش روم میں بھی گھس گئے؟ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

”میں صرف داش روم کے دروازے تک اس کے ساتھ رہا پھر لوٹ آیا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”وہ اپارٹمنٹ برقرنی فور میں رہتی ہے۔“

”وہ جان! میں سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس کے بارے میں جتنا جانتی ہوں اس کے مطابق وہاں نو باریک کے حتم لوگ رہتے ہیں۔“

”میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے ذمہ داری ادا کر لی۔

اس نے آنکھیں پھیلانیں ”میں سمجھی نہیں!“

میں نے کہا ”جب اس حینہ کا پتا ٹھکانا معلوم ہو گیا تو مجھے وہاں گھسنا بھی ہوگا۔ کیا میں یہ ہمت کر سکتا ہوں۔ تم مجھے بھی کوئی ایسا غیر اتوا نہیں سمجھ رہی ہو؟“

وہ میرے لطیف مذاق کی حد میں پہنچ کر اور جلدی سے بولی ”تمہیں کہیں بھی گھسنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی سے اجازت لینے کی۔ تم تو تھوڑی دیر پہلے بلا اجازت غیر محسوس طریقے سے اس کے اپارٹمنٹ کو کھنگال آئے ہو۔“ وہ ایک لمحے کو بھی پھر اضافہ کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی ”میری مراد وہاں رہائش اختیار کرنے سے تھی۔“

میں نے برکت کہا ”کون کا فر یہاں رکھنے آیا ہے!“

لعل اگلی اور باوری کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم ایسٹ دلچ میں داخل ہو گئے۔ بیوی اس دوران میں ہم سے آگے لگ

بھگ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ہی رہی۔ ہم دونوں تبدیل شدہ حلیوں میں تھے لہذا فکر اور پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی۔ برنارڈ لیو بولے سے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ جو دو افراد ان کے لیے ”موسٹ ڈانڈی“ کی حیثیت رکھتے ہیں وہ چند گز کے فاصلے پر اس وقت اس کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔

میں اس ایبائی عورت کا کھوج لگا چکا تھا لہذا کسی بھی وقت اسے چھپا جا سکتا تھا۔ اب لیو کی منزل اور نو باریک میں آمد کا مقصد جانا تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی ماؤنٹ مکملے کو چھوڑ کر مین ہٹن تو نہیں آیا ہوگا اور جب کہ..... اس کا گرد و لبی موسھے ہائمن بھی نہیں موجود تھا۔ میں رنی کی کسی گہری سازش کے بارے میں سوچتے ہوئے ہائی الٹ ہو گیا۔ مین ممکن تھا لیو رنی ہی کے پاس جا رہا ہو!

میں نے سرسری ہوئی آواز میں راکیل سے کہا ”نیوی بلیو بی ایم ڈبلیو کو گاہ سے اوچل نہیں ہونے دینا۔ میں محسوس کر رہا ہوں ہم رنی کے قریب پہنچنے والے ہیں۔“

”اگر ایسا ہو گیا تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔“ وہ پر عزم لہجے میں بولی ”دیے میرے خیال میں اوچل اور ظاہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ہوتا!“

اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور دوبارہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بولی ”میں نے سرخ کیڈی اور اس میں موجود ایبائی عورت کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا اور تم یہاں میرے پہلو میں رہتے ہوئے اس کے داش روم تک ہو آئے ہو! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

بات ختم کرتے کرتے اس کا انداز بہت شوخ اور چھیڑ

جھاڑ والا ہو گیا تھا میں نے کوئی تیسرہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور  
دھڑا کرین کے پار نیوی بیوی بچی کو دیکھتا رہا۔

شیوی ایسٹ ویلج سے گزری اور باوری اسٹریٹ پر  
رہے ہوئے ایسٹ فورٹین اسٹریٹ میں داخل ہو گئی۔ پھر  
یونین اسکوائر سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ چودھویں اسٹریٹ میں  
آنے کا مطلب تھا ہم ڈاؤن ٹاؤن سے مڈ ٹاؤن میں مین  
میں داخل ہو گئے تھے۔ اسٹریٹ چودہ سے اسی تک مڈ ٹاؤن کا  
علاقہ تھا۔ میں مین کا سب سے زیادہ چکا چوند علاقہ!

اس دوران میں میرے اور راکیل کے بیچ موجودہ  
حالات پر انتہائی سنجیدہ گفتگو بھی جاری تھی۔ ہم برنارڈ لیو کی  
گازی کا تعاقب کرتے ہوئے ایسٹ فورٹین اسٹریٹ کو چھوڑ  
کر ففٹھ ایونو میں داخل ہو گئے۔ اب ہم مین مین کے قلب  
سے گزر رہے تھے۔

کچھ دیر تک جنوب سے شمال کی جانب ہمارا یہ سفر جاری  
رہا۔ ہم نے میس دیں اسٹریٹ پر براڈوے کو کراس کیا پھر  
میڈیسن اسکوائر پارک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے چونتیس دیں  
اسٹریٹ کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان دونوں سڑکوں کے ملاپ  
سے جو کارنر بنتا ہے وہیں پر مشہور معروف ”ایمپائر اسٹیٹ  
بلڈنگ“ استادہ ہے۔

کسی زمانے میں اسی جگہ ”والڈورف آسٹور ہاؤس“  
ہوا کرتا تھا۔ پھر اکتوبر انیس سو انیس عیسوی میں اس ہاؤس کو ختم  
کر دیا گیا اور دو سال سے بھی کم مدت میں اسی مقام پر  
ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کھڑی کر دی گئی۔ اس زمانے میں اس  
بلڈنگ کی تعمیر پر ڈھائی کروڑ ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ ایک سو دو  
منزلہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے اوپر دو سو تین فٹ اونچائی دی  
انٹینا نصب ہے۔

ہم اس عظیم الشان بلڈنگ کے قریب سے گزرے پھر  
نیو یارک پبلک لائبریری ”راک فیلر سینٹر“ سینٹر پیٹرک  
کیٹھیڈرل اور جی۔ ایم کارپوریشن سے گزرتے ہوئے  
سینٹرل پارک پہنچ گئے۔ سینٹرل پارک کے آغاز سے اپ ٹاؤن  
مین مین شروعات ہو جاتا ہے۔ یہ پارک اسٹریٹ ساتھ سے  
لے کر اسٹریٹ ایک سو دس تک جنوباً پھیلا ہوا ہے۔  
اس تعاقب سے اب مجھے کوئی محسوس ہونے لگی تھی۔  
پتا نہیں برنارڈ لیو کہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے  
بیزاری سے یہی سوال جب راکیل کے سامنے رکھا تو وہ  
نہ اسرار لہجے میں بولی۔

”ود جان! میرا خیال ہے بیوی کی منزل آگئی۔ دیکھو  
اس کی رفتار بہت تیز ہے۔“

اس وقت ہم اسٹریٹ اسٹھ سے اسٹھ کی جانب بڑھ  
رہے تھے۔ میں نے غور کیا تو راکیل کے اندازے کو بالکل  
درست پایا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے برنارڈ لیو والی گاڑی  
اسٹریٹ اسٹھ کے کارنر پر رک گئی۔ اسی وقت راکیل نے سسٹی  
خیسر کوٹھی کی۔

”اوہ! یہ تو سانا گاگ ہے۔“

راکیل کا اشارہ اس عبارت کی جانب تھا جس کے سامنے  
نیوی بیوی ایم ڈبلیو سٹریٹ تھی۔ راکیل کا انکشاف رگوں میں  
پارادوڑانے والا تھا۔ برنارڈ لیو کی سانا گاگ (اہلی بیوی کی  
عبادت گاہ) پہنچا تھا تو اس کا بھی مطلب تھا ”وہ کسی ربی سے  
ملاقات کرنے آیا تھا۔“ موٹے ہاتھن کے مین مین میں ہونے  
ہوئے وہ بھلا کسی اور ربی سے کیوں ملتا! میرے رگ دپے میں  
بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

اس دوران میں راکیل نے بہت عقل مندی کا مظاہرہ  
کیا اور شیوی کو اسٹریٹ اسٹھ میں موڑنے کے بعد فوراً روکا  
نہیں بلکہ دو بلاک آگے جا کر میڈیسن ایونو کے نزدیک سڑک  
کے کنارے کھڑا کر دیا۔ سانا گاگ تک جانے کے لیے ہمیں  
اسٹریٹ اسٹھ کو عبور کرنا پڑتا جو اب دو بلاک پیچھے ہمارے  
عقب میں تھا۔

راکیل نے مجھ پر لہجے میں کہا ”ہم دونوں کا سانا گاگ  
کے اندر داخل ہونا تو فی الحال ممکن نہیں اور وہ بھی کسی پلانک  
کے بغیر۔ تم ہی ذرا اندر جھانک کر حالات کا جائزہ لو۔ پھر  
سوچتے ہیں کیا کیا جاسکتا ہے!“

راکیل کو ابھی تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ربی کے سلسلے  
میں میری یہ صلاحیت فی الحال کسی کام کی نہیں۔ میں نے  
ماؤنٹ ملٹن میں ربی کے تنویری عمل کے جواب میں اسے جس  
طرح بیوقوف بنایا تھا اس بارے میں راکیل کو سب معلوم تھا۔  
میں نے ربی والا لکھتا اس پر واضح کیا اور کہا۔

”نہمہر دہیں برنارڈ لیو کو چپک کر تاروں۔“

اس بار میں نے ایک نیا تجربہ کیا۔ آٹھویں بند کے پلہ  
میں نے تیسری آنکھ کو زحمت دینا چاہی لیکن مجھے اس میں  
کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ تین چار مرتبہ کی ناکامیاب کوشش  
کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ظاہر آٹھویں کو بند کے پلہ  
باطنی آنکھ سے کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس نتیجے کے بعد میں  
ایک اور تجربے کا خواہاں تھا جو سروسٹ ممکن نہیں تھا۔ میں جب  
اندھیرے میں بیٹھ کر جہاں ہاتھ کو ہاتھ سمجھا نہ رہا  
ہو آٹھویں کھلی رکھ کر تھرڈ آئی کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ فی  
الحال ایسی گہری تاریکی مجھے میرے نہیں تھی لہذا میں نے



آکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کے توسط سے برنارڈ لیو کے ماحول میں جھانکنے لگا۔ اور اسی لمحے میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

برنارڈ لیو اپنے گرد رلی موٹے ہاتھن کے ساتھ ایک کمرے میں موجود تھا۔ وہ دونوں ایک چمکی کاؤچ کے پاس تعبیر صورتیں بنائے کھڑے تھے۔ چمکی کاؤچ پر کوئی چت پڑا تھا۔ اس کا گردن سے نیچے کا بدن ایک سفید شیشے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جت لپٹے ہوئے انسان کے چہرے کی جانب نگاہ گمما کی تو مجھے حیرت کا ایک اور زبردست جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پھٹکا ہوا سیما میرے خون میں اغریل دیا ہو!

میں ان لمحات میں دانتوں کو بھونچ کر رہا تھا کہ میری تصوراتی نگاہ ساحل کے چہرے کو یوں دے گی لیکن میری نظر اپنے ہی چہرے سے گھرا کر رست بھول بیٹھی تھی۔ میں نے ہڑپڑا کر آنکھیں کھول دیں اور بے اختیار بڑبڑایا۔

”ودھان..... اور یہاں!..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“  
”کیا ہوا ودھان؟“ راکیل نے گھرمندی سے میری جانب دیکھا۔ ”تم خس ودھان کا ذکر کر رہے ہو!“  
”نعلی ودھان — میرا ڈاکٹریٹ.....“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ بڑی حیرت سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔  
بار پلاچ ہوئی میں نے جب صدف کو کون کیا تھا تو راکیل بھی اس وقت پرست پر میرے ساتھ موجود تھی۔ اس روز تک نعلی ودھان کراچی ہی میں تھا۔ یہ چار پانچ دن پہلے کی بات تھی۔ اس شیطان کی مین اینٹیں میں موجودی ظاہر کرتی تھی پچھلے چار روز ہی میں اسے پاکستان سے امریکا پہنچایا گیا تھا۔ رلی موٹے ہاتھن بہت با اثر شخصیت تھا۔ دہانت ہاؤس کے علاوہ امریکی سی آئی اے اور ایف بی آئی والے بھی اس کے اشاروں کو پہلی اہمیت دیتے تھے۔ مجھے اور ساحل کو سی آئی اے کے ایجنٹ جاسن پلیدر نے ایک چارٹرڈ طیارے میں کراچی سے لنکرنج پہنچایا تھا۔ ایسے کام ان لوگوں کے لیے نہیں تھا کہ مکمل بن کر رہ گئے ہیں۔ اس وقت دنیا کا ہر باشندہ محسوس ہے اور اک رکھتا ہے کہ یہودی قوم کس قدر طاقت ور ہو چکی ہے اور امریکا بہادر کو فرٹ پر رکھ کر وہ اقوام عالم کو اپنا غلام بنانے کی سعی میں مصروف ہیں۔ کوئی شوقین اور صاحب حیثیت شخص لاکھوں روپیا خرچ کر کے امریکا کی سیر کو جانا چاہے تو دیر آؤںس والے سوالات کر کے اس کے دماغ کی چوٹیں ملا دیتے ہیں۔ ایک انتہائی پے پیچہ اور لائسنسی دینا

فارم کو بھرنے کے بعد جب خواہش مند ہوں تو کہیں آئمز سلوک والے انٹرویو میں نکل ہو کر دیر آؤںس سے باہر آتا ہے تو اس کی حالت آنسوؤں ناک ہوتی ہے۔ امریکا جانے کا خیال تو اس کے دل سے نکلا ہو یا نہ نکلا ہو البتہ اور بہت سی مفید چیزیں اس کے دماغ سے خارج ہوجاتی ہیں۔ جو لوگ اس جنگ آئمز تجربے سے گزرے ہیں وہ میرے جذبات کو محسوس کر سکتے ہیں اور اس بات میں متحیر کئے کو کچھ سکتے ہیں!

یہ وہی صرف عام اور امریکا کے لیے غیر مفید لوگوں کے ساتھ ہے۔ البتہ مختلف اقوام اور ممالک کے وہ افراد جو زندگی کے کسی بھی شعبے میں اپنا جانی نہیں رکھتے اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے امریکا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اس کی مزید اور لامتناہی ترقی میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں ان ہنرمند اور جعری افراد کے لیے امریکا کی ساری نیر جہیں کھلی ہوئی ہیں اور ہر سرحد داخل کے ہر راستے پر ”ڈول“ ”کمر“ کا پورڈ آؤںس ہے..... آؤںس اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو امریکی خواہم یہودی نسل کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کر دو۔ تمہیں کیا چاہے؟ چاہا نا وہ ہم مدد مانگا دیں گے۔ پتا نہیں کیسے کیسے دماغ انہی یہودی پالیسیوں کا ایندھن بن گئے۔ صیہونی سازش کو کھٹنا آسان نہیں۔ آج امریکا تری اور بدلتی کے جس مقام پر فائز نظر آتا ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس میں یہودی قوم کا کوئی کمال ہے تو وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے۔ یہ تو ان ہنرمندوں کی محنت کا ثمر ہے جو دنیا کے مختلف خطوں سے اپنی ذہن کو چھوڑ کر امریکا میں آباد ہیں اور اس کی مزید ترقی کے لیے کوشاں!

مجھے فون پر صدف سے بات کرتے دیکھ کر راکیل تشویش میں جھلا ہو گئی تھی۔ اس وقت اس نے پوچھا بھی تھا کہ میری کزن (میں نے راکیل سے صدف کا تعارف کزن کی حیثیت سے کرایا تھا) کے ساتھ کیا مسئلہ ہے لیکن کوئی واضح جواب دینے کے بجائے میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ جب میں راکیل سے اتنا زیادہ بے تکلف نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ میرے معاملات میں پوری طرح شامل ہوئی تھی مگر اب صورتحال مختلف تھی۔

کردہ ہر معاش نعلی ودھان بھی ان سے متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور یوں لگتا تھا ”وہ گہری نیند میں ہو..... پتا نہ ک نیند۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نعلی ودھان کو رلی نے مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا تھا تو یہ رلی کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ نعلی ودھان ہمارے ہاٹا کے ٹرانس میں آنے والی چیز نہیں تھا۔ میں اسے ایک عرصے تک بھگت چکا تھا اور اس وقت میری تشویش کا سبب یہ تھا کہ پتا نہیں اور کتنے عرصے تک اور کس کس انداز میں اسے بھگتنا ہوگا۔ اس میں کسی لک ڈھبے کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ رلی اس فتنہ پر دور کو اپنے حق میں اور میرے خلاف استعمال کرنے والا تھا۔ محترم ساجد فونے بھی کچھ اسی قسم کی پیش گوئی کی تھی۔ نعلی ودھان ایک مٹی قوت کی شکل میں میرے مقابل آنے والا تھا جس کی گام خاطر انشا طربین رلی موٹے ہاتھن کے ہاتھ میں ہوتی اور یہ ایک نونگر یہ تھا!

میں نے سانا گاگ کے اس حصے میں رہتے ہوئے اپنے طور پر یہ اندازہ قائم کیا کہ رلی لیو کو نعلی ودھان کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں میں دوسرے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ مجھے کوگوں میں رہنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد رلی لیو کو اپنے ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں آگیا۔ میں خوش ہو گیا کہ وہ دونوں یونہی کمرہ کر رہے ہوتے ہوئے شاید ساحل کے پاس پہنچ جائیں یا یہ بھی ہوسکتا تھا وہ سانا گاگ ہی سے باہر نکل آئیں۔ کسی سانا گاگ میں ایک بیڈروم کا تصور خاصا مضحکہ خیز نظر آتا ہے لیکن جب کسی شیز مارکیٹ میں ایسا بیڈروم وجود رکھتا تھا تو پھر ممکن اور ناممکن کی کیا اہمیت تھی!

دوسرے کمرے میں آنے کے بعد رلی نے برنارڈ کو بھی ایک چمکی کاؤچ پر بلا دیا۔ وہ لیو پر کوئی خاص عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایک گروہ مختال اپنے چیلے جانے کو کسی کوئی دنیا سبق تعلیم کرنے جا رہا تھا۔ میں سانس روک کر رلی کی حرکات و سکنات کا جائزہ لےنے لگا۔

رلی کا ”تمنا“ شروع ہوئے یہ مشکل دومنٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک لائٹ جلی گئی ہو۔ میں رلی کے ساتھ سمندر میں مچل گیا۔ اس دیرانی اور بے سرو سامانی سے گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میں شیوی کے اندر راکیل کے پہلو میں بیٹھا تھا اور سب کچھ دیکھ رہا تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ راکیل نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا ہوا؟ تم خاصے خروس دکھائی دے رہے ہو؟“  
”ابھی آکر بتاتا ہوں۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور تھوڑی آنکھ کے توسط سے برنارڈ لیو تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن متحدہ پارکی سٹی کے بعد بھی جب میری تیسری آنکھ کے سامنے ایک دھیر سیاہ جادوئی رسی تو بھنجا کر میں نے کوشش ترک کر دی۔ رلی اپنے عمل کے دوران میں برنارڈ لیو کو کسی ایسے فتر میں لے گیا تھا جہاں تک تیسری آنکھ کے ذریعے دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں یہودیوں کا وہ رلی مرلی کیسے کیسے پھونکنا جانتا تھا۔

مجھ پر بھنجا ہٹ تو سوار ہو ہی چکی تھی۔ اس کو فٹ زدگی میں میں نے براہ راست رلی کو ٹریس کرنا چاہا لیکن نتیجہ سابق تجربے کی صورت میں برآمد ہوا۔ سٹ پنا کر میں نے شیطان کے فرسٹ کزن نعلی ودھان کا رخ کیا اور اس مرتبہ بھی مجھے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میری تیسری آنکھ اس سانا گاگ کے کسی بھی گوشے تک رسائی کے قابل نہیں رہی تھی۔ آنکھ پہلی دوسری ہو یا تیسری اسے دیکھنے کے لیے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر آکھیں بصارت کے لیے روشنی کو واسطہ بنانی ہیں جب کہ باطنی آنکھ بصیرت کے لیے کسی میڈیم کی تلاشی ہوتی ہے۔ میرے میڈیم کو رلی موٹے ہاتھن نے اپنے کسی تیرہ ہدف عمل کی مدد سے کیوں فلاح کر دیا تھا۔ بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرے چہرے کے تاثرات کوئی راکیل سے مجھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ گھرمندی سے ”یو“ ”ودھان! تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو۔ سانا گاگ کے اندر کیا صورت حال ہے؟“ میں نے اسے اندر کی صورت حال اور اپنی معذوری سے آگاہ کر دیا۔

اس کی گھرمندی میں اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆☆

ہم اس وقت ”گولڈن یونی کارن“ میں بیٹھے ہوئے ڈز کا حذر اڑا رہے تھے۔ ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ بے گھری سے مزے اڑاتے پھرے تا ہم ہیٹ پوچا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن نہیں اور اپنے حالات سے خبر آسانی کے لیے زندہ رہنا ہوتا ہے!

رلی موٹے ہاتھن نے برنارڈ لیو کو اپنے کسی طعنے عمل سے گزار کر میرے لیے بے کار کر دیا تھا۔ نعلی ودھان پیسے ہی میری دھڑس سے کوسوں دور تھا اور رلی..... اس تک بھی میں ابھی براہ راست رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا چنانچہ ایسٹ ہاٹ

اسٹریٹ والے سائنا گاہک میں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ وہاں کی حساس اور انتہائی فعال سیکورٹی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اندر سے تیل کی طرح اندر گھسنا سراسر حماقت ہوئی۔ یہ خواہ مخواہ خود کی مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہوتا۔

ویسے بھی رلی یا اس کا چپلا لیویری فوری ضرورت نہیں تھے۔ مجھے اپنے ساحل کی تلاش تھی اور اس تک مجھے وہ ایشیائی عورت ہی پہنچا سکتی تھی جسے میں سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس میں چھوڑ آیا تھا۔ راکیل سے باہمی مشورے کے بعد ہی میں نے واقعی کا قصد کیا اور اس وقت ہم ”گولڈن یونی کارن“ میں موجود تھے۔

گولڈن یونی کارن ”لذت کام و دہن“ کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہاں عمدہ فہم کا بونے ڈنر صرف پچیس ڈالر فی کس میں کیا جاسکتا تھا اور یہاں بیٹنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یہ طعمہ گاہ ”سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس“ سے بہت قریب تھی۔ گولڈن یونی کارن اٹھارہ ایسٹ براڈوے تیرن اسٹریٹ پر واقع تھا۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں ”جھاٹکا“ تھا۔ وہ عورت سو رہی تھی۔ یہ سونے کا وقت نہیں تھا۔ ابھی تو رات کا آغاز ہوا تھا۔ مجھے اس ایشیائی خوبصورت عورت کی اس حرکت پر سخت حیرت ہوئی اور میں نے راکیل سے تذکرہ کیا تو وہ بولی۔

”ہوسکتا ہے“ چہ چاری کی کوئی لیٹ ٹائٹ ڈیٹ ہوا“ میں نے چونک کر راکیل کو دیکھا اور ہور دانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ”دن بھر کھپوڑ کے سامنے بیٹھے بیٹھے تھک بھی تو جاتی ہوگی۔ اگر واقعی اس کی کوئی لیٹ ٹائٹ ڈیٹ ہے تو پھر آرام کرنا اس کا حق بنتا ہے۔“

راکیل نے کہا ”اور یہ ڈیٹ اور ٹائٹ کی بھی ہوسکتی ہے کیونکہ کل چھٹی کا دن ہے۔“

”اوہ!“ میں نے حاسفانہ انداز میں راکیل کی طرف دیکھا۔

پھر ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر بات ہونے لگی۔ بونے ڈنر میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معقول رقم میں آپ انواع و اقسام کے کھانے ٹیٹ کر سکتے ہیں اور اچھا خاصا وقت بھی گزارنے کو مل جاتا ہے ”ٹیٹ کرنے“ کے الفاظ میں نے اس لیے استعمال کیے ہیں کہ کسی ایک ڈش کو پیٹ بھر کر کھالیا بونے کی تو پہن ہے۔

میں دقت دقت سے تھری فور میں بھی جھاٹکا رہا تھا اور راکیل سے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ

عورت سو کر اٹھے گی تو اپارٹمنٹ سے باہر ضرور نکلے گی اور میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں اسے چھاپنے کی کوشش کروں گا پھر اس سے ساحل کا پتا اگلوں میرے لیے چند اس مشکل نہ ہوتا۔ میں تو دو گھنٹے پہلے ہی اسے گھیرنے کے موڈ میں تھا لیکن برٹارڈ لیو کی اچانک انٹری نے ہمارا رخ پھیر دیا تھا۔

دس بجے رات میری امید برآئی وہ عورت بیدار ہوئی۔ دس پندرہ منٹ اس نے فریٹس اپ ہونے میں لگانے پھر پھر تو بچ کے عین مطابق وہ تیار ہو کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی۔ اپارٹمنٹس بلڈنگ سے وہ اپنی سرخ کینڈک ہی میں برآمد ہوئی تھی۔ اس دوران میں ہم دونوں بھی گولڈن یونی کارن سے اٹھ کر اپنی شیوی میں بیٹھ چکے تھے۔

سرخ کینڈی جب ایسٹ براڈوے پر آئی تو ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اب چونکہ وہ ہماری نظروں کے سامنے تھی اس لیے میں ہلٹی آٹھ کا شٹر کر کر راکیل کے پہلو میں حاضر ہو گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر یہ دستور راکیل کا قبیضہ تھا۔ ویسے پچھلے چند گھنٹوں میں ہم نے مین مین کی اسٹریٹس اور ایونیوز کی جو خاک چھائی تھی اس کے نتیجے میں مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ اکیلے ڈرائیونگ کا کام میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مین مین بہت ہی طریقے پلٹے سے آباد کیا گیا ہے نا جائز تجاوزات کا وہاں کوئی تصور نہیں۔

کینڈی اسٹریٹ اسکوائر سے کینال اسٹریٹ پر آئی تو چالیس پچاس گز کے فاصلے پر اس کے تعاقب میں تھے راکیل نے کہا ”کہیں یہ واپس اپنے دفتر تو نہیں جا رہی؟“ ”کیوں اس وقت دفتر جا کر کرے گی کیا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”کیا وہاں کچھ بھول آئی ہے؟“

سرخ کینڈی کینال اسٹریٹ کو چھوڑ کر جب ہارڈ اسٹریٹ میں داخل ہوئی اور اس کا رخ شمال کی سمت ہو گیا راکیل نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا ”یہ دفتر کھولے بلکہ کہیں اور ہی جا رہی ہے۔ ممکن ہے سائنا گاہک میں رہا ہو شے بائسن کے پاس جا رہی ہو!“

راکیل کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ یہ عین ممکن تھا کہ ایسٹ ہاٹھ اسٹریٹ پر واقع بیود عبادت میں رہی ہے یا جا رہی ہو۔ یہ راستہ تو اسی سمت اشارہ کرتا تھا۔ ہم خود برٹارڈ لیو کی بیوی کا تعاقب کرتے ہوئے اسی راستے سے گزر چکے تھے۔ اگر وہ ایشیائی عورت واقعی رہی ہے تو اس کا یہی مطلب تھا وہاں سائنا گاہک میں کوئی تھکاتی خطرناک پانک ٹانگ ہو رہی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ یہ دستور آنکھیں بند کیے اسی بیڈروم میں بیٹھ ہوئی تھی۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔ مجھے اس کی کیفیت پر شدید حیرت ہوئی۔ آج صبح لگ بھگ ساڑھے دس بجے میں نے اسے اسی بیڈروم میں جو خواب دیکھا تھا۔ تو کیا وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے اسی حالت میں تھی؟

اس ہولناک سوال نے مجھے لرز کر رکھ دیا پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے خود کو تیل دی کہ ممکن ہے اس دوران میں وہ چند گھنٹوں کے لیے جاگتی بھی رہی ہو۔ بہر حال ایسا تھا بھی تو اس کی کنڈیشن اور توجہ میں میرے لیے انتہائی تشویش ناک تھی۔ میں آنکھیں کھول کر گاڑی میں حاضر ہو گیا۔

راکیل کو میں نے ساحل کے بارے میں مختصر آتا ہوا اس نے کہا ”جس دوران میں تم ساحل کے پاس تھے سرخ کینڈی والی نے موہاں فون پر کسی سے بات کی ہے۔“

میں اس وقت کینڈی پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ راکیل کی بات سن ہوئی تو میں نے دیکھا اس ایشیائی عورت نے ایک مرتبہ پھر موہاں اپنے کان سے لگایا تھا۔ میں جان نہیں سکتا تھا وہ موہاں پر کس سے کیا بات کر رہی تھی اور یہ نہ جانتا مجھے ایک عجیب سے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا۔

دھل اٹھی اور ہادری کے اندر سے گزری پھر ہادری اسٹریٹ پر ہی رہتے ہوئے اس نے ایسٹ وینچر عبور کیا اور یونین اسکوائر سے وہ ایسٹ فورٹین اسٹریٹ پر مڑ گئی تو میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اگر وہ آگے جا کر فقہ ایونیو پہنچتی تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ وہ سائنا گاہک ہی جا رہی تھی کراس نے میری توقع کے بالکل عمل کیا۔

سرخ کینڈی فقہ ایونیو کراس کے اسٹریٹ فورٹین پر آگے ہی پڑھتی چلی گئی۔ مجبوراً میں بھی تعاقب میں اس کے پیچھے ہی آنا پڑا۔ ایسٹ فورٹین اسٹریٹ فقہ ایونیو کے بعد وینچر فورٹین اسٹریٹ میں بدل گئی تھی۔ کینڈی نے فقہ کے پورے کھنڈہ ”سیونٹھ“ دیکھا اور نا کچھ ایونیو بھی کراس کیا اور چار سو تیس ایسٹ فورٹین اسٹریٹ پر جا کر روک گئی۔ ہم نے اسی اسٹریٹ پر تھوڑا آگے جا کر ٹینچہ ایونیو کے آغاز پر اپنی گاڑی پارک کے کنارے لگا دی۔ وہ ایشیائی عورت اپنی گاڑی سے نکل کر ایک عمارت میں داخل ہو گئی۔

”یہ یہاں کس سے ملنے آئی ہے؟“ میں نے راکیل کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ تشریف ناک کچھ میں بولی ”یہ پوچھو وہ یہاں کیا

کرنے آئی ہے؟“ ”کیا مطلب؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

”وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگی ”کیا تم واقعی پوچھ نہیں جانتے؟“

”کیا نہیں جانتے مطلب؟“ راکیل کے انداز نے مجھے مزید الجھا دیا۔

”میں کلب (CLIT CLUB) کی بات کر رہی ہوں۔“ راکیل کی نگاہ میں بے یقینی موجود رہی ”وہ عورت کلب میں داخل ہوئی ہے۔“

”تو؟“ میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ اس نے انفس ناک انداز میں گردن جھٹکی اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم کلب کی حقیقت سے بے خبر ہو۔“

”کیا یہ کوئی کوکلب ٹائپ کا کوئی کلب ہے؟“ ”مگر گوا!“ وہ استہزا بے انداز میں بولی ”کلب کلب“ کوکو سے کہیں آگے کی چیز ہے۔

”میں کچھ سمجھا کہیں؟“ راکیل کا ڈھکا چھپا انداز میرے لیے الجھن کا باعث تھا۔

اس کو وضاحت کرنا پڑی۔ بیک دیویر میں وہ سرخ کینڈی کا جائزہ لینے کے بعد بولی ”کلب کلب ایک لڑکھن کلب ہے۔ کس پیشہ لڑکھن کلب!“

”اوہ!“ میں الجھت سے بدانداز رہ گیا۔

کس پیشہ لڑکھن کلب..... یعنی مختلف الاقوام اختلاف ہم صفوں کی مظاہرہ گاہ! میں نے اپنے کانوں کی لوڑ کو تپتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے لڑکھن عورتوں اور ان کے کرتوتوں کے بارے میں صرف سن ہی سن رکھا تھا اور یہ سنا ہوا بھی روکتے کھڑے کر دینے والا تھا۔ آج ایک لڑکھن کلب (LESBIAN CLUB) کو باہر سے دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے راکیل سے استفسار کیا ”مجھے تو اس عمارت پر کسی کلب وغیرہ کا کوئی ساٹن نظر نہیں آیا۔ تم نے کس بنا پر یہ دھوئی کیا ہے کہ وہ عورت لڑکھن کلب میں گئی ہے؟“

”ایسے کلب کے کھلم کھانیوں ساٹن آویزاں نہیں کئے جاتے۔“ راکیل نے بتایا ”بلکہ جس عمارت میں کوئی لڑکھن یا گئے کلب موجود ہو وہاں صنف کی مناسبت سے ایک مخصوص نشان بنادیا جاتا ہے۔ تم اسے خیر پہنچی سمجھ لو۔ ضرورت مند

میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں راکیل نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا ”کیا ہوا؟“  
”تم بالکل درست کہہ رہی تھیں۔“ میں نے اس کے دعوے کی تصدیق کر دی۔

راکیل نے مجھے بتایا کہ ایسے کلنر عام نظر سے ادھر رکھے جاتے ہیں۔ کلب میں داخل ہوں تو فرنٹ پر ایک ہاروم دکھائی دیتا ہے۔ بادی انکسر میں وہ کوئی شراب خانہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک میز مختلف کارڈز رکھے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق اس کارڈ کے اندر اندراج کر دیں۔ باقی معاملہ باروالے خود ہی دیکھ لیتے ہیں یہاں ”آپ“ سے میری مرا لڑ بکڑ ہے۔“

وہ ڈرا دیرو کر کی بھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہو۔ بولی ”بظاہر ایک بار نظر آنے والے کمرے کے عقب میں ایک پوشیدہ کمر ابھی موجود ہوتا ہے جہاں لڑ بکڑ عورتیں ام فن اور لیبیکس کا مظاہرہ کرتی ہیں۔“

”بھارت میں جا میں یہ عورتیں اور ان کے فنی مظاہرے میں نے برا سامنے نہاتے ہوئے کہا ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں وہ ایبیا کی عورت کلٹ کلب سے کب باہر نکلے گی؟“

”اپنے پروگرام کے بارے میں تو ٹھیک طور پر دہی سکتی ہے۔“ راکیل نے میری بیزارگی اور جھجکاہٹ سے غم ہوتے ہوئے چمپڑے والے انداز میں کہا ”اگر تم کہو تو اس سے پوچھ کر آ جاتی ہوں۔“

”فصل ہائیں نہ کرو۔“ میں بڑبڑایا۔  
وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

میں امریکا کی اس ترقی اور آزادی کے بارے سوچنے لگا۔ یہ واقعہ تو کچھ عرصہ پہلے کا ہے جب ڈکے انداز میں سکی نیویارک میں کئی لڑ بکڑ اور گاہے کلنر کھلے ہوئے تھے۔ آج کل تو وہاں ہم جس افراد کی شادی کو قانونی دے دی گئی ہے۔ اگر آپ مرد ہیں تو اپنی پسند کے مرد شادی کر سکتے اور عورت ہیں تو اپنی پسند کی عورت سے کر سکتی ہیں۔ امریکی ”ماہرین“ اسے ”ایڈز“ سے بچاؤ کا راستہ بھی بتاتے ہیں لیکن اس غیر فطری اختلاط کے نتیجے آگے جا کر جو ناقابل علاج اور مہلک بیماریاں سامنے آ گئی ہیں ”ماہرین“ کے ہاں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ خطرناک اور موذی امراض کے سامنے ”ایڈز“ تو بے جا جمعہ جمعہ اٹھنے کا پچھلے نظر آئے گی۔ امریکا کی تہذیبوں ہلے باندھنے والے دیسی افراد کے لیے یہ ایک لمحہ نکلے گا۔

کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ میں اس مخصوص نشان کو دیکھ کر ہی یہ بات کہہ رہی ہوں۔ ”وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”فورٹین ویسٹ اسٹریٹ کے اس کلٹ کلب کے بارے میں میں نے کسی میگزین میں ایک فچر پڑھا تھا۔ یہ کلب کچھ عرصہ پہلے ہی قائم ہوا ہے۔ اس کی روح رواں اور آرگنائزر زور دو عورتیں ہیں جن کے نام جوسلین ٹیلر اور جولی ٹولنٹیو ہیں۔ اس فچر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس کلب میں ”ایڈز فری سیف ٹیکس“ پر مملو مانی کیچرز بھی دیے جاتے ہیں اور یورن ویڈیوز بھی دکھائی جاتی ہیں۔ جوسلین ٹیلر اور جولی ٹولنٹیو مستقبل قریب میں نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کے تمام بڑے اور ماڈرن شہروں میں ”کلٹ کلبز“ کی بنیاد چلانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“

”تہہاری معلومات حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہیں؟“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”کوئی بھی معلومات نہ تو خطرناک ہوتی ہے اور نہ ہی محفوظ۔ اس کا استعمال اس کی نوعیت کا تعین کرتا ہے۔ میں ہر قسم کے میگزین کا مطالعہ کرتی ہوں۔ خود کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنا پڑتا ہے۔“

راکیل بالکل درست کہہ رہی تھی۔ مجھے اس کی بات سے سونی صداقتاں تھا۔ اس کے ذریعے جو معلومات ہر ایک پہنچتی تھی اگر میں اس کا شفی استعمال نہ کرتا تو وہ کسی بھی پہلو سے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی تھیں لیکن میرے ذہن میں پیدا ہونے والا سوال ہنوز تشنہ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر راکیل سے اس عورت کی یہاں آمد کے بارے میں پوچھا تو خوشی سے بولی۔

”تم خود ہی ذرا ادھر جھانک کر دیکھ لو۔“  
”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے اسے گھورا

اس نے کہا ”پریشانی کی کوئی بات نہیں وجدان۔ ابھی تو وہ آئی ہے۔ اس نے آتے ہی اپنے کفن کا مظاہرہ تو شروع نہیں کر دیا ہوگا۔ تم ایک نظر ادھر ڈال کر واپس آ جاؤ۔ اس کا ماحول جھمبیں سمجھا دے گا وہ اس وقت کہاں ہے!“

راکیل کی تجویز مقبول تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ مذکورہ خود ہر ایبیا کی عورت کا تصور کیا اور پلک جھپکے میں اس کے ماحول میں انٹر ہو گیا۔ وہ اس وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی جہاں کوئی نیڈ فٹم دکھائی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ چند اور عورتیں بھی تھیں جن میں سے دو حسین و جمیل ”امریکیٹیں“ اپنے کفن کے جوہر دکھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

اگر ہر قسم کی بے راہ روی کو آزادی کا نام دے دیا جائے اور اس آزادی کو ترقی کا زینہ سمجھ لیا جائے تو بھریے ترقی ہی بڑی ہی گھٹیا ترقی ہوگی۔ فطرت سے متصادم ہونے والا بے پند نہیں سکتا۔ جلد یا بدیر! اس تباہ ہونا ہوتا ہے۔ خدا نے عورت کے لیے مرد اور مرد کے لیے عورت کو پیدا کیا ہے۔ اس فطری اصول سے انکار درحقیقت خدا کا انکار ہے اس کے آفاقی قانون کا پامال ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے!

سرخ کیدی دالی ایٹیشی عورت رات ایک بجے کے بعد  
کس نیشنز کلب سے برآمد ہوئی۔ یہ وقت ہم نے کس  
کوٹ میں اور کہاں کہاں گھوم پھر کر گزارا اس کی تفصیل میں  
جانے کا کوئی فائدہ نہیں، بہر حال اس دوران میں ہمارے  
درمیان ایک لاتعلیقل تریب پا چکا تھا..... اس عورت کو ٹریپ  
کرنے کا منصوبہ!

میں، بچپن لینے لگے تھی۔  
میں نے بتایا ”پنک ش۔“  
”اوہ.....“ اس نے حیرت

# خوف!

وقت جمہیں کوئی تکلیف.....“

”بس بس رہنے دو یہ تکلفات۔“ وہ بے تکلفی سے بولی ”یہ سب کچھ اغریا ہی میں اچھا لگتا ہے۔ میں نے تمہارا باتوں سے اندازہ لگالیا ہے کہ تم ایک بھلے آدمی ہو۔ مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے استفسار کیا ”تم میری ذات سے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا۔

باقی کا راستہ بالکل پھلکی گنگو میں گٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے شمار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں ”میں نے اپنی کامل اداکاری کے جوہر دکھائے اور کسی ”اب سیٹ“ کے بغیر ہم ٹھیک دو پچاس رات سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس میں پہنچ گئے۔

چینارے لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے اپارٹمنٹ کے اندر پہنچی تھی۔ میں نے سوچا تھا کھر کے اندر محفوظ ہوجانے کے بعد میں اس سے دودھ ہاتھ کروں گا۔ اس وقت وہ پوری طرح خن خن لہذا اس کی زبان سے اپنا مقصد اگھوانے میں مجھے کوا وقت پیش آئی اور نہ ہی کوئی خاص محنت کرنا پڑی لیکن اس نے اندر داخل ہوتے ہی میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

ہم جیسے ہی اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے سے اندر آئے چینارے ٹول کر دروازہ بند کر دیا پھر ہینکے ہینکے ہاتھوں سے اپنے پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ میں یہی سمجھا کہ کوئی اگھ چائی ڈھونڈ رہی ہے جس سے بیرونی دروازے کو ڈبل لاک کرنا چاہئے مگر جب اس کا تلاش کیا تھا پرس سے برآمد ہوا تو ہم ٹھک کر رہ گیا۔

اس کے ہاتھ میں مجھے ایک چمکتا ہوا خطرناک لہذا چمکتا نظر آیا۔ اس نے مجھے ٹارگٹ پر رکھے ہوئے غراہما آئینہ لہجے میں کہا ”کون ہو تم؟“

میں چینارے سے صرف چند قدم کی دوری پر تھا اور اس کے توہ بتاتے تھے اگر میں نے اس کے سوال کا جواب دیا میں لمبے بھر کی تاخیر بھی کی تو وہ میرے سینے میں جان بولہا ڈال دے گی۔ ان کلمات میں وہ مجھے نارمل سے کہیں زیادہ ہوش دھواں دکھائی دی۔ گویا وہ ہوش کا وہ ناک مجھے سمجھانے کے لیے تھا۔ میں اسے مد ہوش سمجھ بیٹھا تھا جب کہ میرے ہوش اڑانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔ یہ تو وہی بات تھی۔

لو آپ اپنے دام میں صبا آ گیا!

تھے۔ وہ نشے میں ضرور تھی تاہم میں نے محسوس کیا وہ اپنی ذات کو میرے سوالات سے بچانے کے لیے پوری طرح حساس تھی۔ بس اس نے اپنی زبان سے جو بتا دیا بتا دیا۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

”میری پریشانی کی کہانی بہت طویل ہے۔ سونگی تو تم بھی خواہ مخواہ پریشان ہو جاؤ گی اس لیے رہنے ہی دو۔“ میں نے بڑے دل شکستہ انداز میں توقف کیا پھر اپنے لہجے میں مسکینیت بھرتے ہوئے اضافہ کیا ”بس سمجھ لو کہ ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہے۔ میرا پاسپورٹ دیگر ضروری کاغذات اپنی سامان میرے پاس نہیں رہا۔ بس جیب میں سو ڈیڑھ سو ڈالر بچے ہیں۔ اگر کسی سستے ہوٹل میں رات گزارنے کا موقع مل جائے تو.....“

”میں میٹن میں اتنی رات مجھے جمہیں کسی ہوٹل (سستے ہوٹل) میں کوئی جگہ نہیں ملے گی اور پھر تم غیر اہم کی بھی ہو اور تمہارے پاس کوئی دستاویز یا ”آئی ڈی“ بھی نہیں۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی ”تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ میں نے اپنے لہجے میں اس شخص کی بے بسی شامل کر لی جس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔

”تم کیا کرو گے“ میں ہی کچھ کرتی ہوں۔“ وہ ہونٹ سکڑتے ہوئے بولی ”ایسا کر دنی الحال تم میرے ساتھ چلو۔ یہ رات میرے اپارٹمنٹ پر گزرا لو۔ صبح کی صبح دیکھیں گے۔“ اس کی پیشکش نے میرا کام آسان ترین کر دیا۔ اگر وہ مجھے اپنے کھر کے اندر لے جاتی تو پھر میں اسے زیر کر کے ساحل کے بارے میں سب کچھ اگھوا سکتا تھا۔ اسے زیر کرنا کون سا مشکل تھا۔ وہ اپنے اعمال کے ہاتھوں اس وقت خود ہی زیر و زبر ہو رہی تھی۔ البتہ اس صورت میں رائل ضرور پریشان ہو جاتی۔ مجھے امید تھی کہ پریشانی کے بعد وہ سمجھ جاتی کہ میں کس پتویشن میں ہوں لہذا وہ سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس کے قریب ہی موجود رہتی۔

”کس سوچ میں تم ہو؟“ چینارے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”آں ہاں۔“ میں نے چپکے کی اداکاری کی ”کک..... کچھ نہیں۔“

”کیا میری پیش کش پسند نہیں آئی؟“

”ایسی بات نہیں۔“ میں متذبذب انداز میں بولا۔

”پھر؟“

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا ”وہ دراصل میں اس

کھیل کر گیا تھا۔ مجھ سے ہونے کھیل کو بھانا آسان نہیں ہوتا، خاص طور پر جب اس کامیاب بگاڑ کے پیچھے کسی خوب صورت عورت کا ہاتھ ہو۔ حالات کو اپنے حق میں پھرنے کے لیے پھر ”میم“ سے کام لینا پڑتا ہے۔ منافقت، مکاری اور کھنکاری!

چنارائے مجھے بدستور نشا نے پر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر غرائی ”میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہوتا؟“ میں نے کچھ دیر پہلے شروع ہونے والی اداکاری میں کوئی قطع نہ آنے دیا اور حیرت بھرے لہجے میں کہا ”میں جیسا بتا چکا ہوں، میرا نام ڈی سوزا ہے اور میں پنک سٹی.....“

”بکواس نہیں، میں حقیقت چاہتا جانتی ہوں!“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی خوں خوار لہجے میں بولی پھر ناگوں میں تھوڑا پھیلا پید کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ کو بھی ہٹل تک پہنچا دیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے سفاکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

اس موقع پر حاضر دماغی اور اداکاری ہی سے کام لیا جاسکتا تھا تا کہ ”حرکت“ کے لیے کوئی راہ نکل سکے۔ ہمارے درمیان صرف چار قدم کا فاصلہ تھا۔ میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں تھا۔ بس، ہٹل والی کو یہ احساس دلانا تھا کہ میں اس قسم کی ”حرکت“ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میرے ساتھ ایک یعنی دوکا ہوا تھا..... اور اس کے باوجود اثرات کو کسی دھوکے ہی سے کاٹا جاسکتا تھا۔

میں نے اچانک اپنے چہرے پر پرہیزی کے آثار پیدا کیے اور کہا ”اگر تم مجھے لوٹنے کا ارادہ ہی رکھتی تھیں تو وہیں کلب کے سامنے ہٹل دکھا کر میری جب خالی کروائیں۔ اتنا لمبا ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر میرے پاس ہے ہی کیا۔“ میں نے بے بسی سے کندھے جھٹکے اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں تو پہلے ہی سب کچھ گنوائے بیٹھا ہوں۔ یہ عزت اور سو، ڈیڑھ سو ڈالر پہنچے ہیں۔ کیا تم ان پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہو؟“

اس نے بڑی زہریلی نظر سے مجھے دیکھا اور سننا تے ہوئے لہجے میں بولی ”میں نے کہا، میں تمہاری حقیقت چاہتا جانتی ہوں۔ شرافت سے متادو، تم کون ہو اور کس مقصد سے میرے تعاقب میں لگے ہوئے ہو۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو وہ خود تم سے پوچھ لیں گے جو تھوڑی دیر بعد یہاں پہنچنے والے ہیں۔“ پرس میں سے ہٹل نکالنے کے بعد ہندی کو بیکسر بھول کر وہ

امر کی انگریزی پر اتر آئی تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہٹل کو غیر محسوس حرکت دی اور بولی ”تم آن!“

میں اس کے انکشاف سے چونک اٹھا تھا تاہم میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے اپنے تعاقب اور کسی کے یہاں پہنچنے کا ذکر کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا ہمارا ”راز“ بڑی حد تک اس پر مکمل کیا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ میں نے جھجکا ہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”پتا نہیں، تم کس قسم کی عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو۔ میں بھلا تمہارا تعاقب کیوں کروں گا اور..... یہاں کون آنے والا ہے؟“

”اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی ”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تم شیڈولٹ میں جس لڑکی کے ساتھ میرا تعاقب کر رہے ہو، وہ اب تک میرے آدمیوں کے قابو میں آ چکی ہوگی..... درودعی لوگ تم سے ملے یہاں آ رہے ہیں۔“

راپکھل اور شیڈی کے بارے میں چنارائے کا انکشاف سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں سناٹے میں آ گیا۔ مجھے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو نہ رہا اور اضطرابی لہجے میں میرے منہ سے نکلا..... ”پس ہوسکتا.....“ یہ میرا ایک فطری رد عمل تھا۔ اس دوران میں چنارائے مسلسل میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بڑے نیچے الفاظ میں بولی۔

”یہ ہو چکا ہے حق! تم نادانی میں ایک عفریت کے جڑے میں قدم رکھ بیٹھے ہو..... اور میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ اس نے حقارت بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی اور کہنے لگی۔ ”جیسا اداکاری کی اسے لی ہی نہیں آتی لیکن جیسا آپس والی زینہ سکھا سکتا ہوں۔ کیا تم جانتی ہو، اسے سے پہلے اور زینہ کے بعد کیا آتا ہے؟“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میرے انداز نے اسے اور ہوشیار کر دیا، یعنی وہ ”ڈیڑھ ہوشیار“ ہوگی۔ بڑی فراخ دلی سے پوچھنے لگی ”دھات ڈیڑھ میں؟“

ڈیڑھ ہوشیار ہمیشہ مار کھاتا ہے اور بڑی بڑی مار کھاتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترکی پر ترکی کہا ”آئی مین، یو آر وری مین..... اسٹنگی!“

”دھات نان بنس؟“ وہ غضب ناک لہجے میں بولی۔ اس سے پہلے کہ چنارائے کی آنکھوں سے چھوٹنے والی

پچھریاں مجھ تک رسائی حاصل کرتیں، میں حرکت میں آ گیا اور اس وقت یہ حرکت بڑی ہی باہرکت ثابت ہوئی۔

میں نے ٹوٹنے والے انداز میں اپنے ہاتھوں سے چپٹ کی جیپوں کو چھینچھینایا اور چہرے پر اضطرابی کیفیت طاری کر لی پھر بڑبڑانے والے انداز میں کہا ”پتا نہیں، کہاں چلی گئی.....؟“

”اے، ہینڈ اپ!“ وہ خطرناک انداز میں ہٹل کو لہراتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔ میں تو اپنی جیپوں میں وہ چابی تلاش کر رہا تھا جس سے تمہارا سبق شروع ہوتا۔ میں تمہیں اسے پہلے اور زینہ کے بعد.....“

”شٹ یور ماؤتھ۔“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلائی ”ٹرن اراؤٹ!“

میں نے اس کی ”ٹرن اراؤٹ“ والی ہدایت پر یقین عمل کیا۔ میں بڑے شرفازانہ انداز میں، ہاتھوں کو سر سے بلند رکھتے ہوئے گھوم گیا لیکن اس گھماؤ کی تکمیل سے قبل ہی میری رائٹ وکیل لگ اٹھا کہ کام کھانچ گئی تھی۔ ہٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر بائیں دیوار سے جا ٹکرایا۔

قیمت تھا، ٹیکر پر چلا کی اٹھی نہیں دلی ورنڈر فکری آواز لوگوں کو اس اپارٹمنٹ کی طرف متوجہ کر دیتی۔ میری وکیل لگ نے ہٹل جھڑانے کے ساتھ ساتھ اس کے ہٹل بردار ہاتھ کا حراج بھی پوچھ لیا تھا۔ وہ مضروب ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے پتول کی سمت مٹی کراپ میں اسے کسی کارکردگی کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے ایک طویل جست بھری اور چنارائے کو عقب سے دھوکا لیا پھر ہم ایک دوسرے سے متحمس گھٹا فرش پر لوٹ پٹ ہو گئے۔ وہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ افواج کا مظاہرہ کیا جاتا۔ اگر آس پڑوس میں سے کسی کی توجہ ہماری جانب مبذول ہو جاتی تو میرے لیے بے انتہا مشکلات کھڑی ہو چکی تھیں۔ چنارائے کے خوف ناک انکشاف نے پہلے ہی میرے دماغ میں ہٹل چار کھنچ گئی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا، آج ان واحد میں کرنا پڑتا تھا۔

میں نے جتنا کہ نسوانی خطوط کا لحاظ اور اس کی خوب صورتی کا خیال رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ہٹا رکھا اور آئندہ ایک منٹ کے اندر میں نے اسے مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیا۔ جب وہ بے بسی کی تصویر میں ڈھل گئی تو میں نے ایک بیڈ شیٹ سے کسی پٹی پھاڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں کو پشت پر جکڑ دیا اور

اپنی ہاتھوں میں اٹھا کر بیڈروم میں لا چلا۔ وہ بیڈ کے اوپر کرسی فٹری کے باندھ اچھل کر رہ گئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سننا تے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”سائل اس وقت کہاں ہے؟“

”سائل.....“ اس کی آنکھوں میں سراپسنگی تیر گئی پھر وہ جلدی سے بولی ”مم..... میں کسی سائل کو نہیں جانتی۔“ ”تم جانتی ہو..... اور بڑی اچھی طرح جانتی ہو۔“ میں نے اسی کے ہٹل کو اس کی پیشانی پر ٹکاتے ہوئے کہا ”تم میری سائل کی اینڈنٹ بنی ہوئی تھیں لیکن اب سائل کو وال اسٹریٹ والے ٹھکانے سے ہٹا دیا گیا ہے۔ وہ کسی دوسرے بیڈروم اور نئے ماحول میں ہے..... اور اس بیڈروم، اس ماحول تک تم مجھے پہنچاؤ گی۔“

چنارائے کو بیڈروم تک پہنچانے کے بعد میں اس کا ہٹل اٹھا لیا تھا اور اس وقت وہ اپنی ہی گھن کے نشا نے پر تھی۔ ”میری سائل“ کے الفاظ نے اس کی دھشت بھری آنکھوں میں اچھا خاصا پھیلا پید کر دیا تھا۔

”کک..... کیا تم..... وجدان ہو.....؟“ وہ سراسیمہ لہجے میں مضطرب ہوئی۔

میں نے کمبیر لہجے میں کہا ”میں کون ہوں، تم اس پکڑ میں نہ پڑو۔ وجدان کا نام زبان پر لا کر تم نے ثابت کر دیا ہے، تم رہی موشے ہاتھن کے لیے کام کرتی ہو۔ اب شرافت سے سائل کا ٹھکانا بھی متادو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تمہارے وہ دھتکتے لگتے جنہوں نے میری ساتھی کو قابو کیا ہے اور تمہارے بھول، وہ یہاں پہنچنے ہی والے ہیں، میں ان سے ملاقات کا ہرگز ہرگز ارادہ نہیں رکھتا لہذا میں جو پوچھ رہا ہوں، متادو..... اگر تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے تو درنہ.....“

میں نے ہٹل کی نال کو اس کی پیشانی میں چھوئے ہوئے دانستہ خطرناک انداز میں جھلے ادھورا چھوڑا تو اس کی آنکھوں میں موجود دھشت دو چھوٹ گئی۔ وہ کھٹ زدہ انداز میں بولی۔

”مم..... میں نہیں جانتی، وہ لڑکی اس وقت کہاں ہوگی۔“

”اس کا مطلب ہے، تم زندہ نہیں رہتا جانتی ہو؟“

”میری بات کا یقین کرو.....“

ایک لمحے کے توقف سے میں نے درشت لہجے میں کہا ”سائل کا پتا بتاتی ہو یا میں تمہارا قصہ تمام کروں؟“

”تم میری بات کا یقین کرو۔“ وہ تھوک لگتے ہوئے بولی۔



”آج علی الصباح اس لڑکی کو وال اسٹریٹ والے ٹھکانے سے کہیں اور نکل کر دیا گیا ہے۔“

”اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔“ میں غرایا ”تم مجھے بتاؤ، ساحل کو کس جگہ پہنچایا گیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ آئی سویر!“ وہ بے بسی سے بولی

”اس لڑکی کو رنی کے حکم پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہے۔ وہی اس کے بارے میں جانتے ہیں۔“

چینا رائے کی حالت بتاتی تھی، وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی ہے تاہم تھدیق کی خاطر میں نے ایک چال چلی اور غما کی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، جب تم ساحل کے بارے میں کچھ جانتی نہیں ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ تمہارے ساتھی جب یہاں پہنچیں گے تو انہیں تمہاری لاش ملے گی۔“

وہ گڑغڑانے لگی ”فارگا ڈسک.....“

اس کا جملہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

یہ چینا کا موبائل تھا جو اس کے پرس میں رکھا تھا۔ میں پسل کے ساتھ اس کے پرس کو بھی بیڈروم میں اٹھالایا تھا۔ چینا بات ادھوری چھوڑ کر اپنے پرس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارے ساتھیوں کی کال ہوگی۔ ٹھہرو، میں سنتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پرس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی ”موبائل مجھے دو، میں اسٹیڈ کروں گی۔“

”تمہارا کھیل ختم ہو چکا چینا۔“ میں نے پرس میں سے موبائل فون باہر نکالتے ہوئے کہا ”یہاں سے میرا کھیل شروع ہوتا ہے۔ تم چپ چاپ خاموشی سے دیکھتی رہو۔“

اس دوران میں موبائل فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بج چکی تھی۔ میں نے ”یس“ کا جتن دبانے کے بعد موبائل کان سے لگالیا۔ میں نے ”ہیلو“ کہنے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

”ہیلو رائے!“ دوسری طرف سے ٹھہرے ہوئے انداز میں چینا کو مخاطب کیا گیا ”ہم نے اس کی ساتھی پر قابو پالیا ہے۔ اس وقت وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ لعل اٹلی کے اختتام پر ہم اس نے اس کی شیورلٹ کو گھیر لیا تھا پھر اسے اپنی گاڑی میں منتقل کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ تم نے بھی اپنے شکار پر قابو پالیا ہوگا؟“

آخری جملہ بولنے والے نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تھا لیکن میں چپ سادھے رہا۔ میری اس خاموشی نے دوسری

طرف سے بولنے والے کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ ابھرے لہجے میں بولا۔

”رائے! تم خاموش کیوں ہو۔ ہیلو رائے!“ اس کی آواز میں بھجان بھرنے لگا۔ ”تم ٹھیک تو ہو۔ کیا موبائل اس وقت تمہارے ہی ہاتھ میں ہے؟ جواب دو رائے؟ ہمارے آدی اسٹراس اسکوائرے ایسٹ برادوے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ تمہارے اپارٹمنٹ پر ہوں گے اپنی پراہم؟“

اگرچہ میں اس دقت بڑی پراہم میں تھا لیکن پوچھنے والے نے رائے کی پراہم کے بارے میں استفسار کیا تھا لہذا میں نے ”لو“ کا جتن دبا کر کال منقطع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موبائل کو آف کرنے کے بعد بیٹھ کر جب میں ٹھوس لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے چینا رائے کو الوداع نظروں سے دیکھا تو وہ پوچھ پٹھی۔

”کس کا فون تھا؟“

”تمہارے رشتے دار کا۔“

”تم نے مجھ سے بات کیوں نہیں کرائی؟“ وہ برہمگی سے بولی۔

”بات کر کے کیا کرتیں، وہ دس منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا ”تم ان کے مل کر روٹا اور درود کر انہیں اپنا احوال سنانا۔“ پھر میں اس کی بند دوشوں کا جائزہ لیا اور انہیں اطمینان بخش پایا۔ ہم نے اس کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہونے سے قبل نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو رائے! میں نہیں جانتا تم نے مجھے اپنا نام بتایا ہے یا غلط، البتہ تم ”رائے“ تو ضرور ہو۔ موبائل فون پر تمہیں رائے کہہ کر ہی مخاطب کیا گیا تھا۔“

”میں جیسا رائے ہی ہوں۔“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”اوکے چینا!“ میں نے اس کی وحشت بھری صراحتوں میں جھانکا ”ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ تم بے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت ایک فرصت نہیں۔“ پھر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی بند دوشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تم جیسی خوب صورت عورت کے ساتھ یہ سلوک کرنے کا مجھے افسوس ہے مگر میں ہوں..... اور مجھے مجبور کرنے والی بھی تم ہی ہو۔ گڈ نائٹ۔“

”قت..... تم میرا پسل اور موبائل تو دے جانا۔“

”معتجیانہ انداز میں بولی۔“

میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا بھی گوار نہ کیا، جواب دینا تو دور کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے میں چارے کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ چارے میں پاتا چنچا دھوئے، مجھے اس کے رونے دھونے سے کوئی سروکار نہیں تھا!

☆☆☆

میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا ان میں دس منٹ دس گھنٹوں سے زیادہ اہم اور طویل ہوتے ہیں۔ میں نے چنا کے اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد، سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس کو چھوڑنے میں بہ مشکل تین منٹ لگائے ہوں گے۔ یعنی راکیل کو قابو کرنے کے دھوے دار افراد کے، سیوارڈ پارک اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں قدم رکھنے سے پانچ منٹ پہلے۔ اس وقت مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اطمینان سے بیٹھ کر میں راکیل کے ماحول میں جھانک سکتا۔

میں سیوارڈ پارک میں داخل ہو گیا۔ دلیم۔ ایچ سیوارڈ پارک ایک کوسے میں بنا ہوا ہے اور اسٹراس اسکوائر سے جڑا ہوا۔ موہاں فون پر بات کرنے والے نے اپنے اسٹراس اسکوائر پر ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا، اب تک وہ لوگ یہاں سے گزر کر ایسٹ براڈوے پر آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ اور اب جب میں وہ چارے کے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے والے ہوں گے۔ ان کی بعد میں بھی خبر گیری کی جا سکتی تھی۔ میں راکیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

پارک میں اس وقت نیم تاریکی اور خانا تھا۔ اٹاکو کا گارڈن لائٹ روشن تھیں۔ یہ ماحول میرے لیے بہت سازگار تھا۔ اگرچہ موسم اپنی شدت دکھا رہا تھا اور اسی شدت کے سبب پارک میں دیرانی تھی لیکن میرا ذہن موسم کی شدت اور حالات کی حدت کو خاطر میں لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ایک خالی بیچ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کیں اور تھڑ آئی کے توسط سے راکیل کے ماحول میں پہنچ گیا اور وہاں پہنچتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔

میں نے بند آنکھوں کے پیچھے راکیل کا تصور کیا تھا، گارشا کا نہیں۔ اور میرے تصور نے مجھے راکیل اینڈرسن ہی کے ماحول میں پہنچایا تھا۔ اس کے چہرے پر موجود گارشا کا نیکی اپ اتارا جا چکا تھا۔ وہ اس وقت چار افراد کے نرنے میں تھی جو اس سے مختلف قسم کے سوالات کر رہے تھے۔ راکیل ان کے استفسار کے جواب بھی دے رہی تھی لیکن ظاہر ہے، وہاں کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچ پاری تھی۔ اس لیے میں وہاں ہونے والی گفتگو سے ناواقف تھا۔ راکیل کے ماحول سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت ایک کمرے میں موجود

تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا، موہاں پر بات کرنے والے کے دوسرے ساتھی راکیل کو اپنے ساتھ نہیں اور لے گئے تھے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ راکیل کا راز، راز نہیں رہا تھا۔ گو یا میرا راز بھی کھلے والا تھا۔

یہ بڑی داہیات صورت حال تھی۔ میں نے جھانک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر مجھے سالک کا خیال آیا اور ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کر کے میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ بدستور اسی بیڈروم میں تھی جہاں میں نے آخری مرتبہ اسے دیکھا تھا اور وہ گہری نیند میں لگی تھی۔ رات کے آخری پہر اسے نیند ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ میں چند لمحے اس کے ماحول میں رہا اور پھر مطمئن ہو کر پارک میں حاضر ہو گیا۔

وہ بارہ راکیل کی طرف تصوراتی چھلانگ لگانے سے قبل میں نے چارے کو جھانکنا چاہا اور اس کے خال و خطا پر توجہ مرکوز کر کے میں تیسری آنکھ کے فیکل اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں پہنچ گیا۔ میں نے اسے دو افراد کے ساتھ اسی بیڈروم میں پایا جہاں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ تاہم اب اس کے ہاتھ پاؤں کی بندشیں کھول دی گئی تھیں اور وہ خاصا ریٹیکس محسوس کر رہی تھی۔ اس کے پاس جو دو افراد موجود تھے، وہ اپنی صورتوں میں سے مجھے ہونے بدعاش نظر آتے تھے لیکن چونکہ وہ چنا کے ساتھی تھے اس لیے اس کے ساتھ کوئی بدعاشی نہیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس وقت میں ہی ان کی ہاتوں کا مرکز و محور ہوں گا۔ میں ان پر لعنت بھیج کر وہاں سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ چونک اٹھا۔

جیسے چور، چوری سے ہاڑ آئے مگر میرا جیبری سے نہیں بالکل اسی طرح وہ بدعاش بھی شرافت کے مظاہرے کے بعد کہنے پن پر اتر آئے۔ ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے سالٹنگر لگا پھل برآمد کیا اور پلک جھپکتے میں، دو گولیاں چا کے سینے میں اتار دیں۔ کوئی فانی آواز پیدا ہوئی اور نہ ہی چارے کی چیخ خارج ہوئی۔ وہ سینے میں دو گولیاں ڈلو کر کئے ہوئے ضمیر کے مانند زمین بوس ہوئی۔ اس کی جینی ہٹا آنکھوں میں، میں نے حیرت اور استعجاب کی مٹی جلی کیفیت واضح طور پر محسوس کی۔ شاید اسے اپنے بھیا یک انجام کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بھی اینڈوں کے ہاتھوں!

ایسا ہوتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہاتھوں اٹھاتا ہے جو اس سے زیادہ قریب ہوتا ہے قربت دراصل اعتماد پیدا کرتی ہے۔ دوسروں پر بھروسہ یقین ہونے لگتا ہے، پھر انسان آنکھیں بند کر کے ان پر اعتبار

کرنے لگتا ہے۔ انہیں اپنا سمجھنے لگتا ہے۔ خود سے بھی زیادہ اہم! اور یہیں سے دھوکے اور دغا کا دروازہ کھلتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنی زندگی کو گمراہ کرتا ہے اور وہ بھی ایک دن اسے دغا دے جاتی ہے۔ آج تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ دوسروں پر بھروسہ کرنا چاہیے یا نہیں مگر یہ طے ہے کہ آنکھیں کھول کر اعتماد کرنا چاہیے۔ اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے!

میں دوبارہ راکیل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اسکی تھی اور ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کو کرسی کے ہتھوں پر بڑی مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا اور پاؤں بھی کرسی کی ٹانگوں سے جکڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند اور سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ اگر اس وقت نہیں رہی تھی تو پھر حالات حاضرہ پر غور کر رہی ہوگی۔ اس صورت حال میں سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پتا نہیں، وہ چاروں افراد کہاں غائب ہو گئے تھے جنہیں میں نے تھوڑی دیر پہلے راکیل سے استفسارات کرتے دیکھا تھا! میں بڑی تشویش سے، راکیل کو پیش آنے والے حالات پر غور کرنے لگا تاہم تصوراتی طور پر میں اس کے ماحول ہی میں رہا۔ موہاں فون پر چارے سے بات کرنے والے نے بتایا تھا کہ انہوں نے راکیل کو لٹل اٹلی کے اختتام پر گھیرا تھا۔ چارے کی سرخ کینڈی میں بیٹھنے کے بعد میں راکیل پر مسلسل نظر نہیں رکھ سکا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو بیجا کوجھ پر شک ہو جاتا اور اس سلسلے میں، میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ اس سرے کے اختتام پر جب چنانے اپنا رنگ دکھایا تو میری خوش فہمی خفاک میں مل کر رہ گئی۔

کینڈی کے اندر چنا سے متعلق گفتگو کے دوران میں، میں گا بے گا بے راکیل کا جائزہ لیتا رہا۔ فورٹین اسٹریٹ پر تو برابر وہ ہمارے تعاقب میں رہی تھی پھر یونین اسکوائر کراس کرنے کے بعد وہ بادی اسٹریٹ پر بھی مڑی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں، چنا کو گھیرنے کے لیے جو ہلکا سا خاکہ بنایا تھا، اس کے مطابق ”ایسٹ ویچ“ موزوں جگہ تھی۔ بادی اسٹریٹ اس کے اندر سے گزرتی تھی لیکن اس دوران میں چنا مجھے اپنے ساتھ جانے کی دعوے جگہ جگہ اپنا زماں راکیل کی طرف سے خاصا بے پروا ہو گیا تھا۔ مجھے امید تھی، وہ کینڈی کا تعاقب کرتے ہوئے سیدھی سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس تک پہنچ جائے گی۔

میں کینڈی کے اندر چارے کے ساتھ ایسا معروضہ منٹھو ہوا کہ مجھے پتا ہی نہ چل سکا، ہم ایسٹ ویچ سے کب

”بادری“ میں داخل ہوئے اور بادی کو چھوڑ کر کب ”لٹل اٹلی“ سے گزرے جہاں میں یہ نہ جان سکا کہ ہمارے دشمنوں نے کس وقت لٹل اٹلی کے اختتام پر راکیل کو گھیر لیا تھا اور شیوی کو وہیں چھوڑ کر راکیل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے؟

شیوی والا معاملہ مجھے الگ پریشان کر رہا تھا۔ وہ دنگ ہنگ کی گاڑی تھی۔ اگر میرے دشمن اس کی پڑتال میں لگ جاتے تو ہمارے دشمن بے چارے دنگ ہنگ کے لیے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے دنگ ہنگ اور شیوی کا کوئی مناسب بندوبست بھی کرنا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا، وہ لوگ گاڑی کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے، لٹل اٹلی ہی میں چھوڑ گئے تھے۔

میں نے راکیل والے کمرے میں دو افراد کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو ریڈارٹ ہو گیا۔ یہ انکی چار میں سے دو تھے جنہیں میں پہلے راکیل کے قریب دیکھ چکا تھا۔ راکیل کے چہرے پر سے گارشا کا میک اپ اتر چکا تھا اور اب وہ اس کے فگر پرش لے رہے تھے۔ راکیل والا معاملہ میری توقع سے زیادہ سمجیر ہوتا جا رہا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ راکیل ربی موٹھے بائسن کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ فگر پرش اسے مکمل طور پر راکیل ثابت کر دیتے جس کے بعد ربی کو یقین ہو جاتا کہ راکیل کے ساتھ ڈسٹو کے ہمیں میں دھڑان چپا ہوا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی، راکیل میرے خوالے سے زبان کھولے گی لیکن اگر اس کی زبان کھولانے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کیا جاتا تو میں نتائج کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ربی کے نزدیک راکیل کی حیثیت ایک باغی کی سی تھی۔ بغاوت اور غداری کی سزا ہمیشہ بدترین ہی رہی ہے۔

امریکا میں انہیں سوا کسٹھ بیوی اور اس کے بعد پیدا ہونے والے تمام افراد کا فگر پرش پر کارڈ محفوظ ہے۔ جیسے ہی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے، سب سے پہلے اس کے فگر پرش لیے جاتے ہیں۔ راکیل بہر حال انہیں سوا کسٹھ سے بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ریکارڈ تک رسائی حاصل کرنا ربی کے ہاتھ میں ہاتھ کا کام تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ اور دیگر سرکاری ادارے اس کے اشارہ اور ہدایت پر حرکت میں آ جاتے۔ راکیل اس وقت بڑی مصیبت میں گھر گئی تھی اور یہ مصیبت اس نے مجھے ربی کے پھل سے ٹکا لے کے لیے مول لی تھی۔ اس سے پہلے کہ راکیل کو کسی ناروا سلوک سے گزارا جاتا، مجھے آذر اس کے پاس پہنچنا تھا۔ مگر کیسے اور کہاں؟

یہ سوالات مجھے ایک بندگی میں لاکڑا کرتے۔ راکیل

پندرہ روز سے میرے ساتھ تھی لیکن یوں محسوس ہوتا تھا، وہ صدیوں سے یونکی میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہو۔ اس نے انتہائی نرے وقت، میں میری مدد کی تھی، اب مجھ پر لازم تھا، میں بھی اسے ان کڑے حالات سے باہر نکال دوں۔ میں اس پر نگاہ تصور مرکوز رکھتے ہوئے بڑی تیزی سے سوچنے لگا۔

رائیل کے پاس اس وقت جو دو افراد موجود تھے، ان میں سے ایک نے اس کے فکٹر پر پنس حاصل کیے اور دوسرے نے اس کے ہارو میں ایک انکیشن دے دیا۔ اگلے ہی لمحے رائیل کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ یقینی طور پر اسے بے ہوشی کا انکیشن دیا گیا تھا۔ ویسے رائیل کو کمرے کے ساتھ اتنی مضبوطی سے جکڑا گیا تھا کہ اس کی طرف سے کسی مہم جوئی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی تاہم اسے دے جانے والے انکیشن سے ظاہر ہوتا تھا، وہ دو رائیل کے معاملے میں بے حد محتاط ہیں۔

میں بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا کہ وہ لوگ کمرے سے باہر جائیں..... اور اگر اس رہائش گاہ سے بھی باہر نکل پڑیں تو سبحان اللہ! اس صورت میں، میں ان کی لوکیشن سے آگاہ ہو جاتا۔ میری خواہش کا سوا استیفاء نہ رہتا ہوئے وہ رائیل والے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہاں دیگر دو افراد بھی موجود تھے۔ پھر وہ چاروں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ وہاں سے باہر نکلنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو میں جھنجھلا کر پارک میں حاضر ہو گیا۔

اس وقت رات کے (صبح کے) تین بجے تھے اور درجہ حرارت صفر یا صفر سے نیچے رہا ہوگا۔ میں خود کو بڑی برداشت والا سمجھتا ہوں اور اس وقت میں مناسب گرم لباس میں بھی تھا لیکن بقول کہے، تلفی ہی جم کر رہ گئی تھی۔ رات کا باقی حصہ اسی پارک میں بیٹھ کر نہیں گزارا جا سکتا تھا لہذا میں نے بیچ بھڑوڑی اور پارک سے باہر نکل آیا۔ اس مقصد کے لیے میں نے پارک کا دوسرا رخ استعمال کیا۔ اب میں ایسٹ براڈوے کے بجائے ایکس اسٹریٹ پر تھا۔

میں جیسے ہی سیوارڈ پارک سے باہر آیا، میرے ذہن میں کوئی جھنجھلاہٹ نہ رہی۔ اس لمحائی روشنی میں مجھے رائیل تک رسائی کا راستہ نظر آ گیا۔ چنانچہ رائے کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے والے یقیناً اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچیں گے۔ اگر میں ان کا تعاقب کرتا تو رائیل تک پہنچ سکتا تھا۔ ان دونوں کے چلے میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ میں ان سفاک اور بدعاش صورتوں کو کیوں کر بھلا سکتا تھا۔

جلدی مجھے ایک میڈیلین کیبل مل گئی۔ اگلے ہی لمحے میں فیکسی کی پیپر بیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس تیزی کا ایک سبب اس فیکسی کا ڈرائیور بھی تھا۔ وہ صورتِ شکل میں بنانا یا پاکستانی تھا۔ اس نے فیکسی کو آگے بڑھانے سے پہلے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ مطلب یہی تھا، مجھے کہاں جانا ہے؟ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہہ دیا ”لعل اٹلی چلو۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور فیکسی لیسکس اسٹریٹ پر شمال کی سمت دوڑنے لگی۔ میں نے اپنے اندرونی تجسس کے باعث ڈرائیور سے پوچھا ”تجہرا نام کیا ہے؟“ اس نے منہ اور لہجہ بگاڑے بغیر جواب دیا ”وسیم۔“ ”اوہ، تم مسلم ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مسلم پاکستانی۔“ اس کے جواب نے ہیرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

میں اس وقت ڈسٹو کے بہروپ میں تھا اور امریکن نیشنل ہونے کی وجہ سے خالص امریکی لب و لہجہ میں اس سے بات کر رہا تھا۔ وسیم سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس وقت اس کی یو کیبل میں اس کا ایک ہم مذہب پاکستانی بھائی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے فکٹر کو آگے بڑھاتے ہوئے دانستہ اردو میں اس سے پوچھ لیا ”اگر تم پاکستانی ہو تو پھر تمہیں اردو بھی آتی ہوگی؟“

لیسکس اسٹریٹ پر فیکسی تھوڑا سا لہرائی۔ یہ اس ذہنی جھٹکے کا نتیجہ تھا جو مجھے اردو بولنے سن کر دم کو کم پہنچا تھا۔ وہ تو غیبت تھا، رات کے آخری پھر سڑک سنسان تھی ورنہ ایک سیڈنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ فیکسی لہراتے ہوئے اپنی لین سے دوسری لین میں جا گھسی تھی۔

وسیم کی حیرت بھری لرزیدہ آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ”کیا آپ کو بھی اردو آتی ہے؟“

یہ جملہ وسیم نے اردو میں ادا کیا تھا اور اس کا لہجہ چٹلی کھاتا تھا کہ اس کا حلق پنجاب سے ہے۔ میں نے دغ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ساٹ لہجہ میں کہا ”آتی جانی رہتی ہے۔“ ”آپ پاکستانی تو نظر نہیں آتے؟“ میرے منہ سے اپنی قوی زبان سن کر اس کے انداز میں ایک خاص احترام رچ بس گیا تھا۔

میں نے اپنے لہجے کی تنقید کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دیکھنے کے بجائے تم اپنی نظر اور توجہ ڈرائیو تک مرکوز رکھو۔ اردو ایک اہم زبان ہے جسے کوئی غیر پاکستانی بھی

استعمال کر سکتا ہے۔ بہر حال، میرا تعلق بھی پاکستان ہی سے ہے۔  
 دسم نے ایسیکس اسٹریٹ جموزی اور کیب کو پوسٹر اسٹریٹ پر ڈال دیا مگر مسرت بھرے لہجے میں بولا "ایک پاکستانی سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے لیکن آپ کی صورت مجھے ذہنی طور پر اچھا رہی ہے۔ بہر حال، السلام علیکم"

میں نے بھرپور انداز میں دسم کے سلام کا جواب دیا اور کہا "صورت پر زیادہ بھر دسا نہیں کرنا چاہیے، یہ اکثر دھوکا دے جاتی ہے۔ تمہارا اطمینان کے لیے بتا دوں کہ میں بھی تمہاری طرح ایک مسلمان پاکستانی ہوں۔" میں نے ایک لمحے کو توقف کیا مگر دسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 "اب تم جموزی دیر تک مجھے مخاطب نہ کرنا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ ذرا احتیاط سے ڈرائیونگ کرو۔ میں کسی معمولی حادثے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔"

دسم نے بڑی فرمائندہ داری سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بلیک پوسٹر اسٹریٹ پر آگے بڑھتی چلی گئی۔ دسم سے بعد میں بھی گفت و شنید ہو سکتی تھی۔ پہلے میں ان کی خبر لینا چاہتا تھا چونکہ طور پر مجھے راکیل تک پہنچانے کا سبب بن سکتے تھے۔

میں نے ان بد محاشوں میں سے ایک کے ضد و خال کو اپنے تصور میں ابھارا اور دوسرے ہی لمحے ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک گاڑی میں پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے یعنی ایک نے اسٹریٹنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسرا پیچھے بیٹھ کر موجود تھا۔ میں ان کے ماحول میں رہتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کون سے علاقے سے گزر رہے ہیں!  
 چہارے کو انہوں نے جس سلوک سے گزرا تھا، اس سے ان کی دھشت اور بربریت کا پتا چلتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں چہارے اور ان میں کیا مکالمات ہوئے تھے لیکن میں محسوس کر رہا تھا، چہا کو میرے فرار کی سزا دی گئی تھی۔ وہ راکیل کے بعد مجھے بھی اپنے قابو میں دیکھنا چاہتے تھے اور چہا اس سلسلے میں ناکام ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا، چہا اب ان کے لیے کسی کام کی نہ رہی ہو اور انہوں نے اپریل احکام پر اس کا پتا صاف کر دیا ہو۔ بہر حال، سر دست دھوٹی سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ میری جستجو رنگ لائی اور میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ لوگ اس وقت باری کے اندر سے گزر رہے تھے۔ گاڑی باری اسٹریٹ پر رہتے ہوئے شمال کی سمت بڑھ رہی

تھی۔ میں اس اسٹریٹ سے گزر چکا تھا لہذا راستہ پہچاننے میں مجھے زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ ان لوگوں کا شمال کی طرف سفر کرنا مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ کہیں وہ ہاتھ اسٹریٹ والے سائنا گارگ میں رہی موٹے ہاتھن کے پاس تو نہیں جا رہے؟ اس تناظر میں ذہن اس نتیجے پر پہنچتا تھا، راکیل کو بھی وہیں کہیں پہنچایا گیا تھا۔ میں آنکھیں کھول کر دیکھی میں حاضر ہو گیا۔

دسم میری جانب متوجہ ہوا تو اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی میں نے پوچھا "مطل اٹلی پہنچنے کے لیے اور کتنی دیر لگے گی؟"

اس نے بتایا "ہم اس وقت پوسٹر اسٹریٹ پر ہیں، یہ آگے چل کر راجڈ، ایلن اور کٹی اسٹریٹ کراس کرے گی پھر ہم باری اسٹریٹ پہنچ جائیں گے۔ لٹل اٹلی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ دیے آپ کو لٹل اٹلی میں کہاں جانا ہے؟"  
 "جب ہم لٹل اٹلی کے قریب پہنچیں گے دیکھنا دوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "تم دیکھی کی رفتار کو مکمل حد تک بڑھا دو۔ میں کچھ اور سوچنا چاہتا ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس گاڑی کے ماحول میں پہنچ گیا جو ہمارے آگے شمال کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ لوگ باری کے آخری کنارے پر تھے۔ اگر وہ باری اسٹریٹ پر ہی رہتے تو ایسٹ ویچ میں داخل ہو جاتے لیکن ہوشن اسٹریٹ سے انہوں نے گاڑی ایک جانب موڑ لی تھی وہ ایسٹ ہوشن اسٹریٹ پر آ گئے۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ اسٹریٹ آگے کہاں جانے کی گمریہ واضح ہو گیا کہ وہ ایسٹ ہاتھ اسٹریٹ پر سائنا گارگ میں نہیں جا رہے تھے اور یہ ایک نئی بات تھی۔ میں ان کے ساتھ چپکار ہا اور وہ مغرب کی سمت بڑھتے رہے۔ تموزا آگے جا کر براڈوے کو عبور کرنے کے بعد وہ دائیں طرف سرس اسٹریٹ میں سڑ گئے۔ سرس اسٹریٹ کی ہائیں جانب مجھے رہائشی علاقہ نظر آیا۔ میں نے بڑی محنت سے اس علاقے کے بارے میں معلوم کر لیا۔ وہ واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز تھے۔ ان لوگوں کی گاڑی واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز کے احاطے میں داخل ہوئی تو میں ہائی لارٹ ہو گیا پھر آئندہ چند منٹ میں، میں ان کا سایہ بن کر ہاؤسز نمبر انیس میں داخل ہو گیا جب وہ دونوں اپنے ان چار ساتھیوں کے پاس پہنچے جو راکیل کے ارد گرد موجود تھے تو میرے بچے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ میں راکیل کا سراپا لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی وقت دسم نے مجھے مخاطب کیا "سر! ہم لٹل اٹلی میں

داخل ہو رہے ہیں۔ آگے کے بارے میں کچھ بتائیں۔"  
 ہمارے درمیان اب ہا کا قدرہ اردو میں بات چیت ہو رہی تھی اور اس سے مجھے ایک خاص قسم کی خوشی بھی مل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر گھڑکی سے باہر دیکھا اور دسم سے کہا "تم باری اسٹریٹ پر ستر چاروی رکھو لیکن رفتار قدرے کم کرلو۔"

وہ ایک لفظ ادا کے بغیر میرے حکم کی قبول کرنے لگا۔ میں مسلسل دیکھی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے شیوی کی تلاش تھی۔ چہارے سے موبائل فون پر بات کرنے والے نے بتایا تھا کہ انہوں نے راکیل کو لٹل اٹلی کے اختتام پر گھیرا تھا۔ اس وقت وہ لوگ شمال سے جنوب کی سمت ستر کر رہے تھے۔ جب کہ ہم جنوب سے شمال کے رخ بڑھ رہے تھے اس لیے ہماری شیوی کو لٹل اٹلی کے آغاز پر کہیں سڑک کے کنارے کھڑا ہونا چاہیے تھا اور پھر وہ مجھے نظر آگئی۔

میں نے دسم سے دیکھی روکنے کو کہا اور دیکھی روکنے پر میں باہر نکل کر شیوی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ فیصبت تھا کہ ہم اپنا سامان دنگ ہنگ کے قلیب پر رکھ آئے تھے۔ صرف ڈرائیونگ لائسنس اور چند دیگر ضروری کاغذات ہمارے ساتھ تھے۔ شیوی کے مختصر محاسبے سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ لوگ راکیل کے ساتھ ہی وہ کاغذات بھی لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے کریڈٹ کارڈ بھی میں نے راکیل کو تھا دیے تھے۔ میں اپنی جیب میں سو، پڑھ سو ڈالر رکھ کر چہارے کو چھاپے لگا تھا اور خود ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

میں واپس آ کر دیکھی میں بیٹھا اور دسم سے کہا "باروی اسٹریٹ پر آگے بڑھو اور ہوشن اسٹریٹ پر پہنچنے کے بعد لٹل کو سڑ جانا۔ ہمیں "واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز" تک جانا ہے۔"

"یہ ہاؤسز واشنگٹن اسکوائر کے نزدیک ہی ہیں۔" دسم نے بتایا "یہ گرین ویج ویچ کا علاقہ ہے۔ نیو یارک یونیورسٹی بھی ادھر ہی ہے لیکن سرا" وہ ابھن زدہ انداز میں مجھے بھر کو خاموش ہو کر پوچھے گا "آپ کو تو لٹل اٹلی تک جانا تھا، گرین ویج ویچ کا پروگرام کیسے بن گیا؟"

"مطل اٹلی میں کام ختم ہو گیا۔ باقی کام ادھر واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز میں ہوگا۔" میں نے قدرے رکھا لے کر کہا "کیا تمہیں گرین ویج ویچ کی طرف جانے پر کوئی اعتراض ہے؟"  
 "نوسرا" وہ جلدی سے بولا اور توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر دی۔

میں نے جنمو میں ہاتھ ڈال کر چہارے کا موبائل برآمد کیا۔ اس کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوتے وقت میں موبائل فون اور لیڈی ہینڈل اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ سلم ماڈل خطرناک ہینڈل میری دوسری جیب میں تھا۔ میں نے موبائل سیٹ آن کیا۔ فون کی بیٹری کئی گھنٹے سے سٹاپ ہو کر رہی تھی دیگر سٹاپ ہو چکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، چہا کے موبائل میں کریڈٹ کی کیا صورت ہے۔ میں اس وقت چاہتا تھا کہ اس میں مشرو دنگ ہنگ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے شیوی کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینا چاہتا تھا اور نہ وہ بے چارہ خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے کسی بڑی مصیبت سے دوچار ہو جاتا۔ راکیل کو لے جانے والے اہم کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے اسٹیٹ کوڈ نوڈن نوٹج کرنے کے بعد موبائل کو ککان سے ہنگ کا نمبر ملایا اور اوکے کرنے کے بعد موبائل کو ککان سے لگایا۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رات کے آخری پہر پہلی یاد دوسری گھنٹی پر فون اینڈ کر کے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی لہذا میں انتظار کرنے لگا۔ آخر گھنٹی گھنٹی پر رہی اور اٹھایا گیا اور دنگ ہنگ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو۔ کون؟" میں نے اس کی آواز میں شامل جھلاہٹ کو واضح طور پر محسوس کیا۔  
 یہ تو ثابت ہو گیا کہ موبائل میں کریڈٹ۔۔۔۔۔ جو دھکا۔ کتنا؟ اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس موبائل سیٹ کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں۔

دنگ ہنگ کے اختصار کے جواب میں، میں نے کہا "دنگ ہنگ! میں ڈسٹو اہات کر رہا ہوں۔ اس وقت تکلیف دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن سمجھ لو میری جیب ہے۔" وہ میرا نام سننے ہی ہشاش بشاش ہو گیا اور نوند نہ لہجے میں بولا "ہاں ڈسٹو! اتنا دیکھا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "مسئلے کی تفصیل تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم میرے چند سوالات کے جواب دو۔۔۔۔۔ اور جیسا میں کہوں، تم دیا ہی کرنا۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔  
 اس کی فرماں برداری سا گتہ فون کی ہدایات کا نتیجہ تھی۔ میں نے پوچھا "مسٹر ہنگ! تم نے جو شیورٹ میں دے رکھی ہے، اس کے بارے میں اور کس کو پتا ہے؟"  
 "صرف میرے ملازم کو۔ وہ پھر سے کا آ دی ہے۔"  
 "جب وہ ہمارے پاس نہیں آتی تو رات کو تم اسے کہاں پارک کرتے تھے؟"

”اپنے اسٹوڈیو کے سامنے ہی۔“ اس نے بتایا ”لیکن مسئلہ کیا ہے؟“

”میں نے کہا“ مسئلہ خاصا کمبیر ہے۔ ہمارے ساتھ گزب ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں تمہاری شیوی لٹل اٹلی میں ایک سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔“ پھر میں نے اسے شیوی کی درست لوکیشن بتائی اور کہا ”تم جی جب اپنے اسٹوڈیو جاؤ گے تو شیوی کو غائب پاؤ گے حالانکہ رات تم نے اسے وہیں پارک کیا تھا۔ تم فوراً اپنی گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کرواؤ گے۔ تم ہمیں بالکل نہیں جانتے اور نہ ہی تم نے ہمیں گاڑی دی تھی۔ اپنے ملازم کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

میں سوالیہ انداز میں متوقف ہوا تو اس نے پُرسوج لہجے میں کہا ”تم فکر نہ کرو ڈسٹو! میں تمہاری بات کی نہ تک پہنچ گیا ہوں۔ تم جو کہہ رہے ہو، میں وہی کروں گا۔“

میں نے نتیجی انداز میں کہا ”کسی بھی حوالے سے تمہارا ہم سے کوئی تعلق یا واسطہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”اوکے، میں حالات کی نزاکت کا خیال رکھوں گا۔“ اس نے یقینی لہجے میں کہا۔

”میں بعد میں تم سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے موبائل پر رابطہ متوقف کر دیا۔

اس مرتبہ میں نے موبائل کو آف نہیں کیا اور اسی حالت میں جب میں روک لیا۔ دسم نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور کیا ”کیا آپ کا نام ڈسٹو ہے؟“

پوچھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آیا۔ دسم مجھے بھلا آدمی معلوم ہوا تھا۔ چائیں، کیوں میرا جی

چاہ رہا تھا کہ میں اس سے جھوٹ نہ بولوں۔ شاید یہ ہمارے ہم مذہب اور ہم وطن ہونے کا اثر تھا۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غیر مذہب اور غیر وطن افراد سے غلط بیانی کرنی

چاہیے۔ میں اپنے احساسات کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دسم پر اعتبار کرنے اور اسے اپنے قریب لانے کے

لیے میں غیر ارادی طور پر سوج رہا تھا۔ دیا پر غیر میں کوئی اپنا مل جانے تو شاید سب کو اسی قسم کے احساسات کا سامنا ہوتا ہے!

میں نے دسم کے سوال کا جواب دیا ”یہ میرا فرضی نام ہے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بعد میں تفصیلاً بتاؤں گا۔“

”مجھے تو نام کی طرح آپ کا چہرہ بھی فرضی لگتی نظر آ رہا ہے۔“ وہ خشک زدہ لہجے میں بولا۔

”تمہارا انداز درست ہے۔ میں اس وقت میک اپ

میں ہوں۔“

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ”ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے فون پر کسی سڑک ہنگ سے جو ٹھنڈی سی ہے میں نے اندازہ لگایا ہے، آپ نہایت ہی خطرناک حالات سے گزر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور آپ اکیلے نہیں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

دسم کے لہجے میں حد درجہ ہمدردی اور خلوص بھرا ہوا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔ میری ایک ساتھی دشمن کے قبضے میں ہے۔ انہوں نے اسے اوپر دافٹیشن اسکوائر ہاؤسز میں رکھا ہوا ہے۔ میں اپنی ساتھی کو چھڑانے کے لیے ہی اوپر جا رہا ہوں۔ وہ لوگ اس وقت ہاؤس نمبر انیس میں ہیں۔“

”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں بھائی؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”دسم نے ”بھائی“ کا لفظ اتنے خلوص اور اپنائیت سے ادا کیا تھا کہ میں روح تک متاثر ہو گیا۔ وہ دل کی گہرائی سے میری مدد کرنے کا خواہاں تھا۔ ایسے سچے جذبات والے پُر خلوص لوگ بہت آہستہ آہستہ ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی ہاتھ آجائے تو اس کے احساسات کی قدر کرنی چاہیے۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی تو یوں لگا، وہ دسم نہ ہو بلکہ امتیاز ہو۔۔۔۔۔ شہزادہ ہو!

امتیاز، شہزادہ اور دسم تو محض پیمان ہیں۔ ایسے لوگوں کے اندر ایک جیسا جوہری پوشیدہ ہوتا ہے۔ اخلاص اور وفا کا علم بردار، دوست کی خاطر گردن تک ٹکوانے کے لیے تیار! میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یقین کر لیا کہ قدرت نے دسم کی شکل میں مجھے ایک وفا پیشہ شخص سے ملوایا تھا۔

میں نے بڑی توجہ سے دسم کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا ”دسم! تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”میں نے آپ کو بھائی کہا ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔“ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

میں نے کہا ”مجھے بھائی بھی کہتے ہو اور میرے ہی سامنے جان دینے کی بات بھی کرتے ہو۔ تمہیں ڈراما بھی جانا ہے؟“

اس نے اپنی آنکھوں کے نم ہوتے گوشوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور اپنی آواز کی رزش پر قابو پاتے ہوئے بولا ”مجھے یقین چلانا آتی ہے یا پھر لڑائی بھرائی جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو تم بولیں، میں کرنے کو تیار ہوں۔“

”میں اتنا بھی بہت ہے۔“ وہ ”آپ“ سے ”تم“ پر آیا تو مجھے اچھا لگا ”فی الحال، مجھے تمہاری انہی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

وہ خوش ہو گیا اور اسی خوشی میں اس نے کسی کی رفتار کو بھی بڑھا دیا۔ جلد ہی ہم ہاروی اور لٹل اٹلی کو پیچھے چھوڑ کر ہوشن اسٹریٹ میں داخل ہو گئے ”منزل“ پر پہنچنے سے پہلے دسم نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے مطابق، وہ گزشتہ دو سال سے نیویارک میں قید سیلا رہا ہے۔ ان دو سالوں سے پہلے کا عرصہ بے کاری میں گزرا تھا۔ اس کی رہائش میں مین اپ ٹاؤن میں تھی۔ ”شکر مل“ کا علاقہ اگرچہ ہارلم میں واقع تھا تاہم یہ بہ نسبت محفوظ حصہ تھا۔ شکر مل میں بدل کھاس لوگ رہتے تھے۔ میں نے دسم سے جب حسبِ سیاہ قلم کا ذکر کیا تو اس نے بڑی عجیب بات کی۔

کہنے لگا ”یہ کالے صرف جتنی چوری والوں کے دشمن ہیں اور ان کا سارا تعصب انہی لوگوں سے ہے۔ ہم چاہے کتنے بھی گورے کیوں نہ ہوں، یہ لوگ ہمیں ہلکی سی سمجھتے ہیں اس لیے ہم پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔“ گاڈا کا واقعات کی بات الگ ہے۔ دسم کو شہرہ روڈ گورنر والہ کا رہنے والا تھا اور قسمت بنانے نیویارک آیا تھا۔ قسمت بنی یا نہیں بنی، البتہ وہ نیویارک کا ہو کر رہ گیا۔

اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے موبائل کو جب سے نکالا اور کال انیڈ کی۔ دوسری جانب وہی شخص تھا جس کی آواز میں نے چنارائے کے قلیٹ پرستی تھی۔ میری ”ہیلو“ کے جواب میں اس نے کہا۔

”وہ جان! تمہارا بھید مکمل چکا ہے اپنی ساتھی کی داہمی کس حالت میں چاہیے؟“

اس نے مجھے براہِ راست وہ جان کے نام سے پکارا تو ایک لمحے کو میں غصا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں سنبھل گیا اور کہا ”میری دو ساتھی تم لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ تم کس کی داہمی کی بات کر رہے ہو۔ ساحل یار! کیل؟“

جب ہمارا راز، راز نہیں رہا تھا تو میں نے بھی دو ٹوک انداز اختیار کر لیا۔ بات کرنے والے کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا، وہ ان مجھے میں سب سے اور بے اختیار تھی۔ اس کی ہماری آواز ایک مرتبہ میری سافٹ سے ٹکرانی۔

”راکھل کو بھول جاؤ۔ اس نے ہم سے غداری کی ہے۔ ایک خدار اور باقی کی جو سزا ہونا چاہیے وہ اس سے بھی کم نہیں زیادہ بدترین سزا اسے گزرے گی۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے تمہاری ساتھی

ساحل کا ذکر کیا ہے۔“

”مجھے اپنی دونوں ساتھی زندہ سلامت چاہئیں۔“

”تم سے بحث کرنا فضول ہے۔“ وہ تجھلاہٹ آمیز انداز میں بولا ”بہر حال میں نے تم سے رابطہ اس لیے کیا ہے کہ اس موبائل کو آف نہ کرنا محترم رہی کسی بھی وقت تم سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہی ہوا، تم راتے کے اپارٹمنٹ سے موبائل اٹھالائے ورنہ تم سے رابطہ کیسے ہوتا۔“

وہ مجھے بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، وہ مجھے ٹریس کرنے کے لیے موبائل فون کو آن رکھنے کی بات کر رہا تھا۔ ممکن ہے، ان لوگوں کے پاس ایسی کوئی الیکٹرانک سہولت موجود ہو جس کی مدد سے وہ موبائل کی درست لوکیشن معلوم کر سکتے ہوں۔ اس شخص نے رہی کا حوالہ دیا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ رہی کا کوئی خاص آدمی ہے۔ میں نے اس کی مکاری کو سمجھتے ہوئے کہا۔

”تم رابطہ نہیں بھی کرتے تو میں تمہارے رہی سے بات کرنے ہی والا تھا۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیسے؟“ اس کے استفسار میں حیرت تھی۔

میں نے بتایا ”ایسے کہ میں اس وقت رہی موٹے ہاتھن کے قریب پہنچنے والا ہوں۔ میری ایک بات ذہن نشین کر لو اور اپنے رہی کو بھی سمجھا دو۔ میری ساتھیوں کا ایک ہال بھی ہاٹا نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمہارا یہ کڈ بیٹ نیویارک اور اس کی فلک بوس عمارتیں لمبے کے ڈھیر میں بدل جائیں گی۔“

”تم بات دو بول، بول رہے ہو جب کہ رہی اب بھی اپنے دل میں تمہارے لیے بہت محبت رکھتے ہیں۔“

اس شخص نے مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”تم چنارائے کا بھل اور موبائل فون اٹھالائے۔ اگر ہم چاہے تو فوراً اس کی لائن بند کر دیتے۔ موبائل تمہارے لیے بے کار ہو کر رہ جاتا مگر ہم نے۔۔۔۔۔“

”میں نہیں بند کر سکتا۔“ میں نے بات کاٹنے ہوئے کہا ”میں نے بہت سن لی تمہاری بک بک۔ میں تو صرف اس کا بھل اور موبائل اٹھالایا ہوں، تم لوگوں نے تو اس کا جنازہ اٹھا دیا!“

”مجھے بھروسہ ہے تم نے وقت کیا۔ اس وقت میں دوسری طرف بولنے والے کو ایک جھکے کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ میں نے انکشاف ہی ایسا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھ بولتا، میں نے یہ کہتے ہی موبائل آف کر دیا۔“

”میں رہی سے رابطہ کرنے یا اس تک پہنچنے کے لیے کسی موبائل فون کا محتاج نہیں ہوں اس لیے۔۔۔۔۔ دس بول بیڈ ک۔ آف آل آف۔“





ہو گیا اور اچھے روزگار، اعلیٰ عہدہ پر پہنچنے کے لیے تیار رہا۔



وہ سبھی ہوئی آواز میں بولا ”کیا تم کوئی جادو جانتے ہو؟“

”میں کیا کیا جانتا ہوں، یہ جانتا تھا ہمارے لیے ضروری نہیں۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا ”اور اب میں تمہاری زبان سے کوئی سوال نہ سنوں۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کی مہلت دے رہا ہوں۔ ان ساٹھ سیکنڈ میں اچھی طرح غور و فکر کرو، تمہیں مرنے یا راکیل کے بارے میں درست معلومات فراہم کر کے زندگی کو انجوائے کرنا ہے۔ اور تمہارا وقت شروع ہو گیا!“

سامعین کو میرے سلوک اور انکشاف نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس پر میں نے ایک منٹ کی مہلت دے کر کوہیا اس کی زندگی کے ساتھ کاؤنٹ ڈاؤن ٹائم بم ٹھسک کر دیا۔ اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے میں نے رسٹ ڈانچ پر گتہ لگا دی جس پر گزرنے والا ہر سیکنڈ موت کو اس کی زندگی کے قریب لانے کا اعلان کر رہا تھا۔ ان لحاظ میں سامعین کی حالت دیدنی تھی۔ پیشانی کے ایک ہی مقام پر پڑنے والی دو چوٹوں نے ایک ”آلو“ کو جنم دے دیا تھا۔ اس کے ماتھے کا گوشت کسی بڑے ٹکڑے آلو ہی سے مشابہ تھا۔ تاکہ سے ٹٹکے والے خون نے اس کے چہرے کو مزید بے بیا تک بنا رکھا تھا۔ اگر سامعین دہشت اور خوف کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا تو میری دہشت اور جنون کی ڈگری بھی معمولی نہیں تھی۔

اس دوران میں دیم نے نہایت ہی چابک دستی سے کیب کو ایسٹ لفٹ سے اسٹریٹ میں موڑ کر سیکنڈ ایویو کو خیر باد کہہ دیا پھر کوہیا کو اسٹریٹ سے قہرڑ ایویو میں داخل ہو گیا۔ اب وہ قہرڑ ایویو پر شمال کی سمت میڈ لین کو بھاگے چلا جا رہا تھا۔ اس کا موڈ اور توجہ یہی ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اپنا ڈاؤن مین مین میں ہارلم کی جانب بڑھ رہا ہے۔ دیم کی رہائش ہارلم کے قدرے محفوظ علاقے ”شوگر ہل“ میں تھی۔

”ایک منٹ پورا ہو گیا سامعین!“ میں نے گمن اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سفاکی سے کہا ”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”مجھے مار کر تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا!“ دوسرا سید لہجے میں بولا۔

”اسی لیے تو تم سے راکیل کا پتا ٹھکانا پوچھ رہا ہوں۔ میں تمہیں زندہ رکھ کر راکیل کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی سفاکی میں کوئی کمی لائے بغیر کہا۔

سامعین کی آنکھوں میں متضاد کیفیت کے رنگ ایک ساتھ لہرائے اور وہ مجھے تذبذب کی انتہا پر کھڑا دکھائی دیا۔ میں

نے گمن کی نال کو اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والے اڑھارے کو اوپر نگاہ دیا اور اس کی آنکھوں میں گھورنے لگا۔

سامعین کے چہرے پر زبردی کھنڈنی اور مردہ کی آہ میں بولا ”وہ جان! تم مجھے باہر ہی دو تو اچھا ہے کیونکہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم راکیل کو کسی حاصل نہیں کر سکتے۔“

”کیوں؟“ میری غراہٹ نے سامعین کو دہلا دیا۔ کے ساتھ ہی میں نے اس کے پیٹ کے نازک حصے پر کاری شوکر لگا کی اور کہا ”تسلطوں میں بات نہ کرو۔ جلد راکیل کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا ہے اور وہ اس وقت ہے؟“

”دریائے ہڈن کی تہ میں۔“ سامعین نے جھجھکاؤ میں بتایا۔

مجھے اپنی سادہ سادہ بریقین نہ آیا۔ میں سمجھا، شاید مجھ ہوا ہے۔ سامعین نے کچھ اور کہا اور میں نے کچھ اور سنا۔ تھوڑی دیر پہلے تک راکیل ہاؤس نمبر انیس میں موجود تھی ہڈن ریور کی تہ میں کیسے پہنچی تھی۔

میں نے چیخ کر پوچھا ”کیا ایک رہے ہو؟“ اس نے میرے اس چیخے ہوئے سوال کے جواب

جو کچھ بتایا وہ بہت ہی اندہ ہناک اور دل خراش تھا۔ اُس کے مطابق، اگر اہم نے راکیل کے بازو میں جو ایکشن ڈیورہ حقیقت ایک خطرناک بازن تھا۔ جس نے چند سیکنڈ راکیل کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ پھر ان کے دو ساتھی سمیت راکیل کو ہاؤس نمبر۔۔۔ انیس سے دریائے ہڈن طرف لے گئے تھے۔ یہ وہی دو افراد تھے جنہوں نے چٹان کے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اسے ٹھکانے لگایا تھا۔ سامعین مجھے بتایا کہ راکیل کو اسی آہنی کرسی پر بندھا کر دیا گیا تاکہ کافی دنوں تک راکیل کا کوئی سراغ نہ ملے۔ لیکن انہوں نے جو بندوبست کیا تھا اس کے پیش نظر تو یہ سراغ مل گیا۔ آہنی کرسی دریائے ہڈن کی تہ میں پڑی رہی اور اسے ڈیڈ ہاؤس۔۔۔!

میں اس سے آگے کچھ سوچ سکا اور نہ ہی سن سکا۔ سامعین سے مزید کوئی سوال بھی نہ کیا۔ میرے سوال بے جواب ہو کر رہ گئے تھے جب راکیل ہی اس بات پر نہیں رہی تھی تو پھر میں بے سود سوالات میں وقت برباد کرتا۔ اب پتا چلا کہ ہاؤس نمبر انیس میں راکیل دکھائی کیوں نہیں دی گئی!

اس وقت میرا دماغ کسی تھوڑے کا مانند دیکر رہا۔ بے میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ راکیل چند

کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی۔ سامعین کو جن حالات سے گزرا رہا تھا ان میں وہ دزدی کوئی جیسی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے جو بتایا، دیا ہوا ہوگا۔۔۔

سب کچھ رلی موٹے ہاتھن کی منظوری بلکہ حکم پر ہوا تھا۔ کے لیے میرے دل میں نفرت کا ایک پھاڑ کھڑا ہو گیا۔ راکیل نام تک موت نے میرے دماغ کو پہلے ہی منتشر کر ڈالا۔ میرا جنون انتہا کو پہنچ گیا۔ میں نے گمن کی نال کو کی پیشانی میں گڑایا اور خون خوار لہجے میں کہا۔ ”اگر راکیل ہڈن ریور کی تہ میں پہنچ گئی ہے تو تم آؤٹ ڈاؤن کیا کر رہے ہو؟“

اس نے آنکھیں بند کر لیں کوہیا اسے یقین ہو گیا، ”اب باؤبل کے لیے زندہ ہے۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے نے گتت خوردہ لہجے میں کہا ”میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تم اب بھی زندہ رہ سکتے ہو۔“ میں نے ایک چال

اس نے بڑبڑانے والے انداز میں آنکھیں کھول دیں بے یقینی سے مجھ دیکھتے ہوئے منتنا ”کیسے؟“

میں نے اپنی چال کو آگے بڑھایا ”اگر تم مجھے ساحل کے میں بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دو تو میں تمہیں اسی وقت گاڑی کے تاروں سے لٹا کر اسی جگہ چاہے جہاں پر ساحل مل گیا ہے۔“

”وہ جان! میری موت تمہارے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔“ اس نے بے یقینی کی آخری حد کو چھوئے ہوئے کہا ”اگرچہ ہمارے وعدے کا اعتبار نہیں لیکن میں زندگی بچانے کے ضرور سک لیتا مگر انیسویں کہ مجھے ساحل کے ٹھکانے کا علم ہے۔“

”تمہیں علم نہیں تو پھر اس کے ٹھکانے کے بارے میں اچھا ہے؟“ میں نے دھتکی سے کہا ”پہلے تو چارائے کو اسٹریٹ والے ٹھکانے پر ساحل کی دیکھ بھال کے لیے لیا تھا بعد میں رلی نے حکم پر اسے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ اب تو چارائے بھی باقی نہیں رہی!“

وہ ٹھیک ٹھیک کی سے بولا ”میرے خیال میں محترم رلی ہوا اس ٹھکانے سے کوئی اور واقف نہیں، رائے کی راکیل میں شک ہو گیا تھا اس لیے اسے ختم کر دیا گیا۔“ موت کو چند سانس کے فاصلے پر کھڑا دیکھ کر وہ جھجھکے ہوئے ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کی گتتگی کو برقرار رکھے ”سامعین سے پوچھا، چلو، اپنے رلی کے ٹھکانے کے

بارے میں ہی بتا دو۔ میں ساحل کا پتا براؤن باسٹ اسی سے معلوم کر لوں گا۔“

”میں محترم رلی کے ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کوئی رابطہ نمبر؟“

”نہیں۔“

”اس کے احکام کس دہلے سے تم تک پہنچتے ہیں؟“

”محترم رلی کے دست راست برنارڈ لیو ایم سے رابطہ کرتے ہیں۔“ سامعین نے جواب دیا ”اس کام کے لیے وہ اپنا موبائل فون استعمال کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا، لیو کا قیام کہاں ہے؟“

سامعین نے میرے آئندہ متوقع سوال کا جواب خود ہی دے دیا تو میں نے پوچھا ”تمہیں برنارڈ لیو کا سیل نمبر یاد ہوگا؟“

تھوڑے تامل کے بعد اس نے مذکورہ نمبر بتا دیا۔ میں نے وہ نمبر اپنے ذہن میں بٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے رحمی سے کہا ”سامعین! تمہارے لیے کوئی چانس نہیں بچا۔ جب تم میرے کسی کام نہیں آ سکتے تو رلی کے لیے بھی نہیں مفید رہو۔ گنڈا ہے!“

اس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کر لیں، اس یقین کے ساتھ کہ میں کسی بھی صورت اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے ذہن کی گھرائیوں سے موت کو قبول کر لیا تھا۔

میں نے اس کے یقین کا پاس کیا اور گمن کے کلپ میں موجود باقی ماندہ گولیوں کو سامعین کی پیشانی پر نمودار ہونے والے آلو میں اتار دیا۔ خس کم، جہاں پاک!

☆☆☆

صبح کے ساڑھے چار کا وقت تھا۔ اس وقت سارا نیویارک سو رہا تھا، سوائے میرے جیسے شب بیدار اور خانماں خراب افراد کے۔ میرے ساتھ دیم بھی جاگ رہا تھا۔ سامعین کے بے جان وجود کو ہارلم ریور میں پھینکنے کے بعد ہم دیم کی رہائش گاہ پر آگئے تھے۔ دیم اپنے ایک دوست کے ساتھ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اس کا دوست لوہ ایک ہوٹل کے کچن میں کام کرتا تھا لیکن ان دنوں وہ چھٹی پر تھا اور عید منانے پاکستان گیا ہوا تھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ نہایت ہی چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل تھا۔ شوگر ہل میں زیادہ تر ڈل کلاس سیاہ فام رہتے ہیں۔ ڈیج اسٹائل میں بنی ہوئی پانچ منزلہ عمارتوں میں زیادہ تر مجبورے پتھر اور سرخ اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

راکیل کی موت نے میرے دل کو جھل اور ذہن کو گھٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے دکھ کو شیر کرنے کے لیے سبیل میں محترم سا گھوڑا فو کو فون کیا۔ دسم کے اپارٹمنٹ میں فون کی سہولت موجود نہیں تھی لہذا مجھے مجبوراً چارے والا موہاگل فون استعمال کرنا پڑا۔ دانشن اسٹیٹ کا کوڈ نو زیرو سکس ڈائل کرنے کے بعد میں نے ساگ فو کے نمبرز سچ کیے۔ اگلے ہی لمحے میرا اس سے رابطہ ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر اور مؤثر الفاظ میں ساگ فو کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ میری بات فتم ہوئی تو اس نے ایک نمبر سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔  
"اس جنم میں راکیل کی سانس پوری ہوگئی تھی۔"  
"میرے لیے کیا ہدایت ہے؟" میں نے پوچھا۔ "گارشا اور ڈسلا کا سیدھ مل گیا ہے۔ کیا میں اسی میک اپ میں رہوں یا مجھے اپنی آئی ڈی تبدیل کرنا ہوگی؟"

"گارشا اور ڈسلا کا راز رلی اور اس کے قابل اعتماد لوگوں پر انشا ہوا ہے لہذا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ڈسلا کی آئی ڈی کو استعمال میں رکھ سکتے ہو۔ عام لوگوں کو ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں کہ تم دھدان ہو، ڈسلا ہو یا کوئی اور ہو! بہر حال، رلی اور اس کے بندوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے استفسار کیا، "اور اصلی گارشا ڈسلا کا کیا ہوگا۔ ہم ان کے نام سے جاری شدہ کریڈٹ کارڈ وغیرہ استعمال کر رہے تھے۔ کیا رلی کے آئی ڈی کو کھنچ لگاتے ہوئے آپ تک نہیں پہنچ جائیں گے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ قطعیت سے بولا، "تم نے بتایا ہے کہ ضروری کاغذات اور سامان وغیرہ تم لوگ دنگ ہنگ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ صرف تمہارے کریڈٹ کارڈ رلی کے آئی ڈی کے ماتھے چڑھے ہیں اور وہ بھی تمام نہیں، صرف دو!" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اصلی ڈسلا اور گارشا نے اپنی ضروری اشیا کی، چوری کی رپورٹ درج کر دادی تھی۔ اس لیے ان پر کوئی دہال نہیں آسکتا۔ میں نے مطمئن نہیں سبیل تک پابند کر رکھا تھا۔ اب بھی وہ میرے حکم کے مطابق اسی اسٹیٹ میں رہیں گے۔ ایک دو روز میں انہیں سنے کاغذات مل جائیں گے۔ میں نے رپورٹ والی بات دانستہ تم سے چھائی تھی۔ بہر حال، یہ احتیاط کام آگئی۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ رلی یا رلی کے آدی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس پولیس والوں سے براہ

راست کوئی ٹکرن لینا اور نہ ہی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔" نے دنگ ہنگ کو تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دیں۔ رلی کی جی مسئلہ ہو، تم بلا تکلف اس سے کہہ سکتے ہو۔ سبیل کی بیڑی شاید ڈاؤن ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ بات کے بعد میں نے رابطہ قائم کر دیا۔ پھر موہاگل سیدھ دکھاتے ہوئے کہا، "یار! اس کے چارجر کا کوئی بندوبست یہ بڑے کام کی چیز ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میرا اضافہ کیا، "ڈر اس کا بیٹنس بھی چیک کرو۔"

دسم نے موہاگل اپنے ہاتھ میں لیا۔ پھر اسے گھما کر دیکھنے کے بعد بولا، "یہ ایک ہائی فائی سبل ہے اور اس کی پوسٹ پیڈ ہے۔ بیڑی واقعی خاصی لو ہو رہی ہے۔ بہر حال میں اس کی چارجنگ کا انتظام کرتا ہوں۔ میرا مشورہ ہے اس کا فون ایڈریس دیکھ ڈالو، ممکن ہے اس لسٹ میں تمہارے کام کا کوئی نمبر موجود ہو!"

دسم کا مشورہ منید تھا لہذا میں نے موہاگل فون کا ایک کونکھ کا نشان شروع کر دیا۔ وہاں پر بے شمار فون نمبرز لیکن کسی بھی نمبر کے ساتھ مجھے رلی کا نام یا حوالہ نظر نہ آیا۔ سامن نے اپنی موت سے قبل مجھے برنارڈ لیو کا جواہر دیا تھا۔ چارے کی فون بک میں موجود تھا۔ اگر موہاگل کی بیڑی ہو رہی ہوتی تو میں اسی وقت اس سے رابطہ کرتا۔ بہر حال، توڑی پھیر چھڑاؤ کے بعد میں نے وہ سبل دسم کے پاس کر دیا۔

میں اس وقت شدید محسن اور نیند محسوس کر رہا تھا۔ انیس میں گھٹنے مسلسل ہماگ دڈ میں گزرتے تھے۔ راکیل کی جدائی نے بھی میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ چند روزہ ساتھ میں راکیل نے مجھے اپنا عادی بنا لیا تھا۔ اس کی فرقت کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ بکری کا بچہ چند دن تک آپ کے ساتھ رہے تو آپ سے بھی گہری انسیت پیدا ہو جاتی ہے، راکیل تو ایک عام انسان کی۔

میں نے جب دسم کو بتایا کہ میں سونا چاہتا ہوں تو نے گھر کے فریق میں سے میرے لیے کھانے کے بندوبست کر دیا۔ میں نے رات راکیل کے ساتھ کارن میں پونے ڈنر کیا تھا۔ سرد موسم میں انسان کو زیادہ بھوک لگتی ہے اور میں مسلسل دڈ دھوپ میں تھا۔ تاہم مجھے اس وقت کھانے کی کوئی خاص طلب نہ ہو رہی تھی۔ اس میں زیادہ ہاتھ راکیل کو پیش آنے والے کام بھی تھا۔ سامن کے مطابق، گراہم نے اس

میں زہر لگا دیا تھا۔ دسم نے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہ سب کچھ رلی کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹک کر اہم کی وہ درگت بتائی تھی کہ اس کا کچھ نکل کر رہ گیا تھا۔ اسی وقت مجھے یہ معلوم تھا تھا، راکیل کی موت کا ڈنٹے دار وہی شخص ہے وہ نہ تھا نہیں میں اس کا کیا حشر کرتا۔ ویسے میں نے اسے جس سلوک سے گزارا تھا اس کے پیش نظر گراہم کی زندگی کے امکانات مفرے زیادہ نہیں تھے۔

دسم کے اصرار پر میں نے ٹھوڑا زہر بار کر لیا تو اس نے کہا، "پانچ بجتے والے ہیں۔ تم پانچ بج گئے تک المینان سے نیند لے لو۔ میں گیارہ بجے سے پہلے گھر سے نہیں نکلتا۔"

میں نے دل کا بوجھ اور ذہن کا انتشار کم کرنے کے لیے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں گہری نیند میں مبتلا ہو گیا۔ اس سرعت میں میری تھکاوٹ کا بھی غالب ہاتھ تھا۔

دس بجے کے قریب دسم نے مجھے جگا دیا۔ موہاگل فون پر کسی کی کال آ رہی تھی۔ میری نیند کے دوران میں دسم کہیں سے ڈھونڈ کر اس موہاگل کا چارج لے آیا تھا اور موہاگل کو آن رکھتے ہوئے چارجنگ پر لگا دیا تھا۔

"میں نے سوچا، کوئی ضروری کال نہ ہو اس لیے تمہیں اٹھا دیا۔" دسم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

میں نے کوئی تبصرہ کیے بغیر سبل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس پر "آر ایل" لکھا ہوا آرہا تھا۔ میں نے فون بک میں بہت سے نمبروں کے ساتھ اس قسم کے مختلف کوڈ لکھے دیکھے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ "آر ایل" کس شخص کا کوڈ تھا۔ بہر حال، میں نے کال ریسیڈ کر لی۔

میرے "ہیلو" کے جواب میں دوسری طرف جو آواز ابھری اس نے مجھے سمجھو کر رکھ دیا۔ وہ رلی موٹے ہاتھن کی مخصوص تاثر انگیز آواز تھی۔

"گڈ مارنگ میرے بچے!" اس نے بڑی شفقت سے کہا۔

"تو یہ "آر ایل" تمہارا کوڈ ہے؟" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

وہ نرمی سے بولا، "آر ایل کا مطلب ہے، ریسیڈنگ لاؤ۔" مجھے اسی انداز میں غائب کرنی تھی۔ بہر حال، تم سٹائلیٹ سن۔ اتنے غصے میں کیوں ہو؟"

میں نے اس کے استفسار پر لعنت بھیجی اور طوریہ لہجے میں کہا، "وہ تمہارا اتنا احترام کرنی تھی اور تم نے اس کا بڑا بھیا ک انجام کیا۔ اس بے چاری کو تم نے یہ اچھا صلہ دیا ہے؟"

"وہ فیروں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئی تھی۔" رلی کی منافقت سے لبریز آواز میری ساعت تک پہنچی۔ "اس کی وجہ سے مجھے ساحل کا ٹھکانا بدلنا پڑا۔"

میں نے چارے کے جرم کی تفصیل نہیں پوچھی اور کیلے انداز میں کہسا، "شاہد تم نے راکیل کو بھی اسی لیے مہرت ناک انجام دیا ہے دو چار کر دیا ہے کہ وہ میرے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی تھی۔"

"تم سمجھ دار اور معاملہ فہم ہو میرے بچے!" اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ رلی پراسرار صلاحیتوں کا مالک تو تھا ہی، اس کے ساتھ ہی ہلکا آواز کا بھی تھا۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا، "وہ دھدان اٹم جاتے ہو، خداری اور بھادت کی ہر ایڈی کڑی ہوتی ہے۔ رائے نے ہم سے خداری کی اور رولی نے بھادت۔ وہ دونوں اپنے حقیقی انجام کو پہنچ گئیں۔ تم سے میری کوئی دشمنی نہیں اس لیے اب تک میرے کسی آدی نے آکھ اٹھا کر بھی تمہاری طرف نہیں دیکھا۔"

وہ چند لحظات کے لیے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا، "حالانکہ تم نے قدم قدم پر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مجھ سے غلط بیانی بھی کی ہے۔ میں نے تمہاری بات کا یقین کیا اور بھی سمجھتا رہا کہ کسی نے تمہیں خواہ کر لیا ہے۔ تم نے راجر بن کر مجھ سے طویل بات کی اور میں نے تمہاری دودھ گولی پر شک کرنے کے بجائے تمہاری سچی ساحل کو تلاش کر دیا اور بالآخر اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اور پھر چنانچہ کر کے اس کے اندر سے ان تاپا پتھروں کا راز اٹھوا لیا جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے خانے میں ہیں۔" میں نے زہر میں بچے ہوئے الفاظ میں کہا، "اور آج کل ادھر کھنڈو کے مضافات میں کچھ پراسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ غالباً تمہارے آدیوں نے عبادت گاہ کو نشانہ بنانے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی ہے!"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا میرے بچے!" رلی کی منافقت پورے عروج پر تھی۔ لیکن تمہارے لہجے سے میں محسوس کر رہا ہوں، کسی نے میرے خلاف تمہیں زبردست درغلادیا ہے۔ تم کو میں نے بڑا فرماں بردار پایا تھا!"

رلی کی مکاری بڑی کلاس کی تھی۔ وہ مجھے اخلاق اور نیت کی مار مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بدستور اکھڑ لہجے

میں کہا ”مجھے کسی نے نہیں درغلا یا۔ میرا یہ زخم، تمہارے محل کا نتیجہ ہے۔ میں اب بھی وہی پہلے والا دھند ہوں۔“

”بیٹے رہو میرے بچے!“ اس نے بڑے غلوں سے مجھے دعا دی اور بڑی شفقت سے دریافت کیا ”میرے کس محل نے تمہیں نہیں پہنچایا ہے۔ اپنے دل کا غبار نکال دو دھند! تمہارے ذہن میں جولا دھند لپک رہا ہے، اسے بہہ جانے دو۔ مجھے بتاؤ، تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟“

رہی موٹے ہاتھن میرا ہر تصور، ہر غلطی معاف کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ یہ اس کی ایک گہری چال تھی۔ مجھے ماننا پڑا، وہ عمر کے اس حصے میں بھی بے پناہ اعصابی قوت کا مالک تھا۔ اگر میں اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوتا اور اس کے عزائم تک مجھے رسائی حاصل نہ ہو چکی ہوتی تو میں آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لے آتا۔ میں چونکہ اس کی اصلیت کو جانتا تھا اس لیے منافقت کے حال کو منافقت ہی کے بلبلے سے کانٹے کا فیصلہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ میری قرص آئی والی صلاحیت سے آگاہ نہیں تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ میری ”تفہیم“ کو کسی پشت پناہ کی ”مدد“ سے تعبیر کر رہا تھا۔ جب ساگ فو، رہی اور اس کی صلاحیتوں سے باخبر تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ بدھ ازم اور یہودیت کی اس ارضی چپقلش میں رہی، ساگ فو کے بارے میں نہ جانتا ہو!

رہی موٹے ہاتھن چونکہ کارڈز چمپا کرکھیل رہا تھا لہذا میں نے بھی اسے اپنی اپروچ کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور نہ ہی اسے یہ احساس ہونے دیا کہ میں اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر گزشتہ رات ایٹ باسٹھ اسٹریٹ والے سانا گاگ میں جا رہا تھا۔ اس کے محبت بھرے استفسار کے جواب میں میں نے جوابی کہا۔ لو، ہالو، ہر کوئی طرح کا فتا ہے!

”مجھے تم سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ایک طرف تم مجھے بہت ہی عزیز سمجھتے ہو اور دوسری جانب تم نے میری ساری کو مجھ سے چمپا کرکھا ہوا ہے؟“

”اوہ!“ اس نے ایک گہری اور گھبر ساس خارج کی ”چائیں، آج کل تم کن لوگوں کی صحبت میں بیٹھے لگے ہو۔“

اس کا اشارہ واضح طور پر ساگ فو کی سمت تھا ”تمہارا لہجہ خاصا خراب ہو گیا ہے، اس میں سے احترام اور تقدس کا تار رہا ہے۔ پہلے تو اس تو مذاق سے بات نہیں کرتے تھے۔ بہر حال۔“

وہ لمبے لمبے کسوختہ ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میرے مائل کو تم نے نہیں بلکہ اس کے دشمنوں سے چمپا کر رکھا۔! ہے۔ میں تو اس کا ہاتھ، تمہارے ہاتھ میں دینے کو تیار ہوں۔“

”بھروسہ کی بات کی ہے؟“ میں نے ترش لہجے میں کہا۔ وہ نرمی سے بولا ”دیر تو تمہاری طرف سے ہو رہی تھی میرے بچے! میں اس دوران میں مسلسل تمہاری تلاش میں رہا ہوں۔ اب جا کر تم ملے ہو۔ میں آج ہی ساحل کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

رہی کی اس مہربانی سے کسی گہری سازش کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ہر بات کو زیر نظر رکھتے ہوئے اپنے اسٹائل میں نرمی پیدا کی اور پوچھا۔

”آپ کب اور کہاں ساحل کو مجھ سے ملو رہے ہیں؟“

”شاہاں میرے بچے! تمہارا تسلطیق انداز واپس لوٹ آیا ہے جس کی مجھے بے حد خوشی ہے۔“ وہ مجھے خوشی کی باتیں پڑھاتے ہوئے بولا ”میں نے آج رات ایک شان دار ڈرامہ دو دنوں کی ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے۔“

”محترم رہی! آپ یہ بھی بتادیں، یہ ڈرامہ کون سا ہوگا؟“

میں نے احترام بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا ”میں نے تمہارے اور ساحل کے لیے نیو پارک کے ایک منگے ترین ریستورنٹ ”ڈیڈ وڈ آف دی ورلڈ“ میں ٹیکل ریزر کروادی ہے۔ کیا تمہیں اس شاندار ریستورنٹ کے بارے میں معلومات ہیں؟“

میں ”ڈیڈ وڈ آف دی ورلڈ“ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لہذا نفی میں جواب دیا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ریستورنٹ لوٹن ٹاورز کے ایک سوسائٹ دیں فلور پر بنا ہوا ہے۔“

”لوٹن ٹاورز!“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ”یعنی ورلڈ ٹریڈ سینٹر؟“

”اس وقت تک ٹائن لیون والا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور لوٹن ٹاورز ”آ“ اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر“ میں نہیں بدلا تھا۔“

”میرا مطلب وہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔“ موٹے ہاتھن نے جواب دیا ”تم دو دنوں ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے سے منگھڑے ہوئے ہو۔ حالات جو بھی رہے ہو، بہر حال مجھے تمہارے جذبات کے باال ہونے کا احساس ہے۔ لوٹ کر لو، تم دو دنوں کے لیے جو ٹیکل ریزرو کر گئی ہے۔ اس کا نمبر ”دن او فائٹ“ ہے، وقت پر پہنچ جانا۔ کہیں وہ بے چاری تمہارا انتظار نہ کرنی رہ جائے۔ ساحل ٹیکل نو بجے رات ٹیکل نمبر ایک سو پانچ پر موجود ہوگا۔“

”اور آپ!“ میں نے انھیں زدہ انداز میں پوچھا ”میرے محترم! کیا آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟“

”جوانوں کی بھیڑ میں اس بڑھے کا کیا کام!“ اس نے عجب سے لہجے میں کہا۔

میں نے اداکاری کی ضرورت کو مسلم جانا اور کہا ”مجھے آپ کی کثرت سے محسوس ہوئی میرے محترم!“

”مجبور ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”ایک تو میں ریستورنٹ وغیرہ میں جاتا نہیں ہوں۔ دوسرے، میں اس وقت امریکا میں نہیں ہوں۔“

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے لگ بھگ دس منٹ پہلے رہی موٹے ہاتھن کو ایٹ باسٹھ اسٹریٹ والے سانا گاگ میں دیکھا تھا۔ پھر میں نے سوچا، ممکن ہے کہ وہ واقعی امریکا سے باہر چلا گیا ہو! اپنی معلومات اور اس کے بیان کی تصدیق کی خاطر میں نے پوچھا۔

”میرے محترم! آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”اسرائیل میں!“ اس نے بتایا۔

رہی کے جواب نے اس کے جھوٹ کا بول بکھول دیا لیکن میں نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا اور کہا ”ٹیکل ہے محترم! آپ کا ٹیکل نمبر اس سوپاٹل سیٹ کی فون بک میں موجود ہے۔ مجھے جب ضرورت ہوگی، میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“

”بڑی خوشی سے میرے بچے۔“ وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا ”اچھا ہوا، یہ سوپاٹل سیٹ تمہارے پاس پہنچ گیا۔ یہ ایک پوسٹ پیڈ کنکشن ہے۔ جتنا جی چاہے، استعمال کرو۔ ٹیکل کی گزرت کرنا۔ وہ میرے اکاؤنٹ سے ادا ہوتا رہے گا۔“

میں نے اس عنایت خردانہ پر اس کا بھرپور شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے اور ساحل کو ڈیویڈس دعائیں دیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔

پھر میری سیٹی اور کھری نظر آنے والی رہی کی اس میز می چال پر میں گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے میری سوچ کو ایک سوائیڈن پوسٹ کے لیے ڈال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگر کسی چیز کے آسانی سے حاصل ہونے کے آثار پیدا ہو جائیں تو انسان کو یقین نہیں آتا۔ یہ ایک انہونی ٹیکل تھی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رہی اتنی شرافت سے ساحل کو نمبر سے حوالے کر دے گا۔ اس کے پیچھے اس کی بھینچ کوئی ہالاک جھمی ہوئی تھی۔ اس کی عیاری اور مکاری کو مجھ سے زیادہ بھلا اور کون جان سکتا تھا!

اس کے باوجود میں نے رسک لیتے ہوئے ریستورنٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ساحل کا معاملہ ہی ایسا تھا کہ کسی رسک کو خاطر میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس بات کے قوی

امکانات تھے کہ یہ ”دھوت“ رہی نے مجھے گھبرنے کے لیے دی تھی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا کہ اس اہتمام کے ساتھ مجھے ساحل سے ملوایا۔ بہر حال ایک چال باز کو کسی چال بازی ہی سے شکست دی جا سکتی تھی۔ مجھے ہر صورت ریستورنٹ پہنچنا تھا اور مضبوط پلاننگ کے ساتھ پہنچنا تھا۔

ناشتے کے بعد دس بجے دھندے پر ٹکٹوں سے انکار کر دیا ”آج کا دن تمہارے نام ہے دھند!“ اس نے غلوں سے کہا۔

میں نیو پارک میں ٹیکسی چلانے والوں کے مسائل سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایک دن اگر ان کا پیپارک جاتا تو اچھا بھلا نقصان ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کے ایثار سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے جذبات کو محسوس کر رہا ہوں دس بجے! تم خواہ مخواہ اپنا نقصان کیوں کرتے ہو۔ تم حسب معمول اپنے کام پر نکلو۔“

”جہیں ہو سکتا۔“ وہ قلعیت سے بولا ”ایک دن میڈیٹین گھڑی رہے گی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ آج تو ایسے بھی بھٹی کا دن ہے تو ایسے بھی سکتا۔“

جب وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر دوگ بھگ کے پاس پہنچ گیا۔ دس بج کی کب کو ہم نے احتیاطاً شوگر مل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس ٹیکسی کے راز سے صرف سامعین ہی آگاہ تھا اور وہ درجائے ہارلم میں ابدی ”سکونت“ اختیار کر چکا تھا بہر حال ”کم از کم ایک دن کی احتیاط تو ضروری تھی۔ دس بجے اس دن ٹیکسی نہ نکالنے کا فیصلہ کر کے محل مندی کا جھوٹ دیا تھا۔ ہم ایک ٹیکسی پکڑ کر دوگ بھگ کے گھر پہنچ گئے۔

رہی ٹیکسلیک کے بعد بھگ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ اس کا انداز کسی بڑی گزبھ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں سمجھا شاید شیوی دالے معاملے میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ تمہاری میسر آتی ہے میں نے سوال داغ دیا۔

”مشر بھگ! تم نے شیوی کی چوری سے متعلق رپورٹ درج کروادی؟“

اس نے انہماک میں سر ہلا دیا اور بولا ”سب منٹ گیا۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”پھر کیا مسئلہ ہے۔ تم اس قدر پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟“

اس نے حذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور تامل کرتے ہوئے بولا ”تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے۔“

آتش فشاں (196) حصہ 11



لشیں کر لیا پھر کہا ”مجھے کچھ رقم کی بھی ضرورت ہوگی۔“  
 ”آج چھٹی کا دن ہے اس لیے تمام ہینک بند  
 ہیں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”سہر حال میں ڈسٹ  
 کارڈ (اے ٹی ایم) استعمال کر کے دس ہزار ڈالر تک کا  
 بندوبست کر سکتا ہوں۔“  
 میں نے مطمئن لہجے میں کہا ”بس اتنی ہی رقم کافی ہے۔  
 کام چل جائے گا۔“

”تمہاری پوری کہانی کے پیش نظر میں اس نتیجے پر پہنچا  
 ہوں کہ تم اب ڈسٹو کے ہمیں رو یا ودھان کی حیثیت  
 سے گھومو پھر ڈسٹو اسے کوئی فرق نہیں پڑے۔ تم نے جن دشمنوں  
 کی خاطر اپنا حلیہ تبدیل کیا تھا وہ تمہاری شخصیت سے پوری  
 طرح واقف ہیں۔ تم کو تو میں تمہارے لیے نئے کریڈٹ  
 کارڈ بھی بنوادیتا ہوں۔“

”کارڈ کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں  
 گے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”پہلے ذرا میں آج کے  
 مشن سے نمٹ آؤں۔“

مسٹر ہنگ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں نے  
 اسے اپنے اور ڈسٹو کے طیلوں میں تبدیلی سے متعلق آگاہ کیا۔  
 اس نے کہا ”یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ڈسٹو کو لگ بھگ ڈسٹو اور  
 تمہیں جو کچھ تمہیں بنادوں گا۔“ میں نے اسے اپنی میک اپ  
 میں مہارت کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا ”ودھان!  
 ساک فو جیسے شخص نے اگر تمہاری تعریف کی ہے تو یہ کوئی عام  
 بات نہیں ہو سکتی۔ تمہیں میک اپ کے سلسلے میں جو بھی سامان  
 درکار ہو میں مہیا کر دوں گا اور..... رقم کا بندوبست کرنے میں  
 ابھی جا رہا ہوں۔“

اس کے بعد وہ مجھے اور ڈسٹو کو اپنے گھر میں چھوڑ کر باہر  
 نکل گیا۔ میں نے دراصل وہ رقم ڈسٹو کے لیے منگوائی تھی۔ میں  
 مذکورہ دس ہزار ڈالر ڈسٹو کے اکاؤنٹ میں ڈالوانا چاہتا تھا۔  
 میں نے فیصلہ کیا تھا ”آئندہ چند روز میں ڈسٹو کے ساتھ ہی  
 رہوں گا۔ دنگ ہنگ سے بار بار ملنا اس کے لیے خطرناک بھی  
 ثابت ہو سکتا تھا۔ ڈسٹو میرا ہم وطن اور جی دار بندہ تھا میں نے  
 انہیں دانشمندانہ سکواڑ ہائوسز میں اس کی ”کارکردگی“ کو  
 اطمینان بخش پایا تھا۔ از بس علاوہ اس کے فلیٹ میں فی الحال  
 میرے لیے ایسے خاصی گنجائش بھی تھی۔ لوہے کے بوتھ میں  
 ابھی کافی دن باقی تھے۔

دیے بھی ہارلم کا علاقہ میرے لیے زیادہ ”محفوظ“ تھا۔  
 رہی یا اس کے گناہوں کا بھول کر بھی اس طرف دھیان نہیں  
 جاسکتا تھا۔ وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں شوگر

لی (ہارلم) میں کہیں چھپا بیٹھا ہوں۔

ہنگ کے جانے کے بعد میں ڈسٹو سے باتیں کرنے لگا۔  
 ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خود سے متعارف کرایا۔ ہم  
 ایک باہر ڈاکر کا تھا۔ میں نے بعض نہایت ہی حساس پیلوڈز  
 کو چھوڑ کر اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ میری  
 سیدھی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا اور بھرائی ہوئی آواز میں  
 بولا۔

”یار ودھان! مجھے بھی اس جنگی فن کا بہت شوق  
 ہے..... یہ شوق ابتدائی مرحلے ہی میں دم توڑ گیا!“ وہ اتنا کہ  
 کر خاموش ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصا افسردہ ہو  
 گیا تھا۔

میں نے کہا ”انسان کا شوق کبھی دم نہیں توڑتا۔ یہ افزا  
 سانس تک جاری رہتا ہے اور انسان کے ساتھ ہی قبر میں اتر  
 ہے۔ تمہاری اداسی کو دیکھ کر گلتا ہے تمہارے ساتھ کوا  
 ٹریچڈی ہوئی ہے؟“

”تم ایک کہتے ہو یا را“ وہ ایک طویل سانس لے کر  
 گیا۔

میں نے سنجیدگی سے پوچھا ”کوئی لڑکی وغیرہ؟ یا  
 تھا؟“

اس نے متاملانہ انداز میں مجھے دیکھا اور بولا ”ہاں  
 بھی تھا.....“

”وہ بھی تھا.....“ میں نے اسی کے ادا کردہ الفاظ کو دہرایا  
 اور یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”

کا مطلب ہے تم نے ایک سے زیادہ چکر چلا رکھے ہیں؟“  
 ”نہیں یا را اب تو سب چکر ختم ہو گئے۔“ وہ جلدی  
 بولا ”ہاں تو میں تمہیں اپنے شوق کے بارے میں بتا رہا ہوں

اس شوق کے دم توڑنے میں کسی لڑکی کا ہاتھ نہیں بلکہ سب  
 بڑی وجہ میرے انٹرکس تھے۔“ میں نے واضح طور پر محسوس  
 وہ لڑکی والے موضوع سے کئی کاٹ رہا تھا۔ میں نے کہا

میں کسی وقت اس سلسلے میں اسے گھبروں گا میں اس کی بات  
 متوجہ رہا۔

”انٹرکس!“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا  
 انہوں نے تمہیں سکھانے سے انکار کر دیا تھا؟“

”انکار تو نہیں کیا مگر سکھا بھی نہیں۔“  
 ”تم ایک ابھی ہوئی بات کر رہے ہو ڈسٹو۔“ میں

سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔  
 اس نے ایک گہری سانس لی اور بتانے لگا

والے بارے میں ایک بہت معیاری مارشل آرٹس سٹیل  
 11 حصہ

اسنے علاقے کا ذکر کر رہا تھا۔ ”میں اسٹرکٹر مقصود محل سے یہ فن سیکھ رہا تھا۔ مقصود صاحب ہر فن سیکھ لیتے۔ ہمارے درمیان استاد شاگرد کے علاوہ دوستی کا رشتہ بھی تھا۔ سینٹر سے باہر بھی ہم اکثر ساتھ ہی نظر آتے۔ رات کو دو دو تین تین بیچے تک کنگ فو کی ڈاکو میٹری بھی دیکھتے۔ مدرسہ کی ایک ایک اسٹیپ کی ہم پر پیکش کرتے۔ پھر مقصود صاحب اچانک سینٹر چھوڑ کر سودیہ چلے گئے۔ سینٹر وہاں کے جانے کے بعد بھی چلتا رہا مگر میں پھر ایک دن بھی وہاں نہ گیا۔ بس دل بھجھ گیا تھا۔“

”اچھا کیا واقعی؟“  
وہ سختی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔  
آئندہ آدمے کھٹے میں میں نے دس کمزرات والے مشن سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی۔ اس دوران میں اس کے چہرے کے تاثرات میں کشمکش سی دوڑتی رہی۔ جو شخص لڑائی جھڑائی کا ماہر ہو اس قسم کے اسائنمنٹ اس کے اندر ایک کرنٹ سا دوڑا دیتے ہیں۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے کہا۔

”ہمارا یہ بیڑا ہاں کچھ رقم لے کر واپس آنے والا ہے۔ میری خواہش ہے وہ رقم تم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر دو۔ تمہارے ڈیپٹ اور کریڈٹ کارڈز سے میں بھی استفادہ کرتا رہوں گا۔“

دس ویں ایپریل (امریکن ایکسپریس) اور ایکسیس (ماسٹر) کارڈز استعمال کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے پاس ڈیپٹ کارڈ (اسے ٹی ایم) بھی تھا۔ میں نے اپنے استفادہ کرنے والی بات دانستہ ہی گئی تاکہ اس کے پاس انکار یا گھنچا ہمت کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ میرا یہ حربہ کامیاب رہا اور بلا جہن و چرا اس نے میری بات مان لی۔

پچھلے دنوں میں ایک دنک ہنگ کے ساتھ کیا اور پہلی پھلکی شاپنگ کے لیے میں دس کمزرات کے ساتھ باہر نکل گیا۔ وہمشی کا دن تھا تاہم ایک ڈاکٹر مول (مال) اور ڈیپٹ کارڈ استعمال کھلتے تھے۔ میں نے ہم واپس دنگ ہنگ کی رہائش گاہ، واقع موٹ اسٹریٹ پہنچ گئے۔

چائنا ٹاؤن میں موٹ اسٹریٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک تو بدھ عبادت گاہ اسی اسٹریٹ پر واقع ہے۔ دوسرے چائیز پی نیو ایئر کے موبیل پر یہاں سب سے زیادہ روٹی دیکھنے کو ملتی ہے۔ موٹ نیو ایئر اور جیولری اسٹریٹ کو دہلی کی طرح سجاایا جاتا ہے۔ آگ کی شہبہ گری اور ڈرنگین ڈائس اس محلے کی اہم گزریاں ہیں۔ موٹ اسٹریٹ کے چنگے سے بہت ہی دلورہ انگیز اور مہلک ظن ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق چائنا ٹاؤن میں لگ بھگ تین لاکھ چینی آباد ہیں۔ اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیئن میں قدم رکھ دیا ہو!

چینی کینیڈو کے مطابق نیا سال انیس جنوری کے بعد پڑنے والے پہلے مکمل چاند سے شروع ہوتا ہے۔ چینی کیلنڈر کی اور قمری گردشوں کے سمجھنے سے تیار کیا گیا ہے۔ اس حساب سے ان لوگوں کا نیا سال عموماً جنوری یا فروری کی

کسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ ان دنوں بھی چینی نیو ایئر کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ اس سال میں تہوار فروری میں منایا جانے والا تھا۔

”ڈیڈ وز آف دی ورلڈ“ کی طرف روانگی میں ابھی دیر تھی۔ میں نے تھوڑے آرام کو ترجیح دی۔ اگر مجھے بچے تک ایک مختصر مگر گہری نیند لے لی جاتی تو زیادہ مستعدی کے ساتھ میں اپنے مشن کو سر کر سکتا تھا۔ ہماری تیاری کے لیے ایک کھٹا کاٹی تھا۔ ہم ہنگ کی رہائش گاہ پر ہی دو الگ کمروں میں ٹھہر گئے۔

میں نے خود کو نیند کی ہانپوں میں دینے سے قبل تھوڑی سی تصویراتی آوارہ گردی کو ضروری سمجھا اور آٹھ گھنٹیں بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ ادھر ظاہرہ آٹھ گھنٹیں بند ہوئیں ادھر ہانپنی آٹھ کا شکر مکمل کیا۔ میں تھوڑا سی کھانے کا سامان کے پاس بچھ گیا۔

ساحل کے ماحول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے لگ بھگ بارہ گھنٹے پہلے اسے جس بیڈروم میں دیکھا تھا وہ اس وقت بھی وہیں موجود تھی فرق صرف اتنا تھا کہ صبح کے تین بجے وہ گہری نیند میں مجھے نظر آئی تھی اور اب سہ پہر تین بجے وہ پوری طرح بیدار تھی۔ میں بڑے اچانک سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بستر پر جت لیٹی جھٹ کو دیکھ رہی تھی۔

اس بیڈروم کی ایک ایک شے کو میں نے ذہن میں کندہ کر رکھا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ کمراس عمارت میں واقع ہے تو میں کسی کاغذ ڈیموئل کے مانند اپنا راستہ بتاتے ہوئے ساحل تک پہنچ جاتا لیکن انفس کوئی فی الحال مجھے یہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔

تقدیر اور تدبیر کی جنگ انسان کو بڑا لاتی ہے۔ ہاتھ دیر لوگوں کے ساتھ تقدیر سب سے زیادہ اٹھیلیاں کرتی ہے اور انہیں قدم قدم پر بے بسی کے احساس سے دو چار کر کے یہ یاد دلاتی ہے کہ تمہاری تدبیر کو ہلکے جھپٹے میں ملیا میٹ کیا جا سکتا ہے لیکن تدبیر کرنے والے کو حملہ نہیں ہارتے۔ وہ اپنی تنگ دود کو جاری رکھتے ہیں اور بالآخر ایک روز اپنی کسی تدبیر سے مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں!

اس وقت ساحل مجھے بہت پیار تھا۔ اسے پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد اسے ابھی تک کوئی کھٹا ایسا نہیں گزرا تھا کہ وہ مجھے چار دیوگی ہو لیکن وہ میری دسترس میں تھی اب پہنچنے سے دوڑ ہوئی تھی۔ جس نے حاصل مشکل ہو جائے وہ زیادہ پرسش ہو جاتی ہے۔ حالات کی ستم خیزی نے ایک طویل عرصے سے ساحل کو مجھ سے جدا کر رکھا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے جانے والے ہاتھ بدلے رہے لیکن میری تکلیف

میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ درجہ دہائی اور کرب فراق بڑھتا گیا۔

چوہدری نواز علی دو کھلے کاٹھا تھا۔ ساحل جب تک اس کی تحویل میں رہی وہ میری نظر سے اجمل بھی رہی۔ پھر شعیب خوری دلیں بن کر سامنے آیا۔ میں نے تو جان گیا تھا خوری یہودی لالی کا آلنگار ہے اور ان کے مفاد کے لیے پاکستان، خصوصاً کراچی میں کام کر رہا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا وہ ساحل کو پکار کر یہودیوں..... اپنے خود خنجر کردہ باپوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اور اب یہ براہ راست یہودی لالی سے میری ٹھن کی تھی۔ رہی سوئے ہاتھن کی معمولی شخص کا نام نہیں تھا۔ میں اس غیر معمولی شخص کے حصار کو تو ذکر اس پر ثابت کر چکا تھا کہ وہ بھی مجھے کوئی چلتا پھرتا لو جو ان کے مجھے میں اس کے لیے لوہے کا چننا ثابت ہوں گا۔

سوئے ہاتھن نہایت ہی عطا اور بڑے شخص تھا۔ وہ مجھے کیلنے کے لیے دوستی اور محبت کا مہتر پڑھ رہا تھا۔ وہ بڑی شفقت اور بزرگی سے مجھے اپنے ہاتھ کے نیچے لانے کی ہنگ دے میں تھا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا میں اس کے سایے میں آتا ہوں یا پھر سایے ہان ہی کو چیر بھاڑ کر رکھ دیتا ہوں۔

مجھے رہی کے وعدے کا رتی بھرا اعتبار نہیں تھا لیکن میں پھر بھی اس کی دعوت پر رستورنٹ جانے والا تھا۔ اگر یہ دھوکا ہی تھا تو پھر مجھے رہی کی طرف سے یہ آخری دھوکا بھی کھانا ہی تھا تاکہ زندگی میں جب بھی ہمارا سامنا ہو تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھور سکوں اور لگا ہوں کی زبان میں اس سے کہہ سکوں..... میرا نام دھان ہے۔ میں جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا کر آتا ہوں اور اس طرح پہنچا کر آتا ہوں کہ وہ خود اپنی نظر میں گر جاتا ہے!

میں نے محسوس کیا میں رہی کے بارے میں سوچنے ہوئے خاصا عجیب اور ہاتھ تھا۔ میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور اپنی ساحل کو دیکھنے لگا۔ میں کاٹی دیر تک اس انتظار میں رہا کہ وہ بستر سے اٹھے اٹھ کر چلے اور چل کر کمرے سے باہر نکلے..... یا پھر اس کو دیکھنے کے لیے کوئی کمرے کے اندر داخل ہوتا کہ میری ”سرگرمی“ کی راہ کھلے لیکن میری خواہش پوری نہ ہوئی۔

میں اس سوچ کے ساتھ ساحل کے ماحول سے نکل آیا کہ رات کو بچے ڈیڈ وز آف دی ورلڈ میں اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ ویسے ایک بات کا مجھے اطمینان تھا اور وہ یہ کہ ساحل کی محبت اور طبیعت مجھے پہلے سے کافی بہتر محسوس ہو رہی تھی

گو یاری اس کا خاصا "خیال" رکھ رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ لیٹ رہا پھر رُبی کے چنگی لینے کے لیے تیری آنکھ کو زحمت دی۔ گزشتہ سے پیوستہ اس بار بھی مجھے ناکامیابی کا سامنا ہوا۔ دوسری کوشش کے طور پر میں نے برنارڈ لیو کی جانب چھلانگ لگائی۔ اس مرتبہ بھی میں اپنا ہدف حاصل نہ کر سکا۔ تیری ٹرائی میں نے اس آفت زادے پر باری جو رُبی کے کسی "چنگار" کے متعلّق کراچی سے نیویارک پہنچا تھا اور میں نے برنارڈ لیو کے توسط سے اسے ایسٹ ہانڈ اسٹریٹ والے سائنا گارگ میں دیکھا تھا۔ وہ براہ راست میری رسائی میں نہیں تھا۔ ازاں بعد رُبی نے لیو کو بھی کسی ایسے عمل سے گزرا کہ وہ بھی میری پہنچ میں نہ رہا۔ اس دفعہ بھی میں نکل دھان کا سراغ نہ پاسکا۔ برنارڈ لیو اور نکل دھان رُبی کے زیر اثر تھا۔ پتا نہیں وہ انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا! میں "سہمی" میں ناکامیاب ہو کر واپس لوٹ آیا۔

میں نے گزشتہ روز رات آٹھ بجے سائنا گارگ میں لیو کے توسط سے رُبی کو دیکھا تھا۔ پھر چودہ گھنٹے بعد آج صبح دو بجے سیل پر میری اس سے بات ہوئی اور اس نے بتایا کہ وہ اسرائیل میں ہے۔ میں نہیں جانتا تھا "امریکا سے چودہ گھنٹے میں اسرائیل پہنچا جاسکتا تھا" نہیں۔ رُبی کی مکاری مجھ پر مکمل چکی تھی اور وہ میری نگاہ میں ایک ناقابل اعتبار شخص نظر چکا تھا لہذا میں اس کے اسرائیل میں ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دو شک سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور اب ..... ان خبیثوں کو دیکھ کر وہیں انہیں گھنٹے بہت گئے تھے۔

مجھے ایک شرارت سوچیں اور میں نے سیل سے لیو کو کال کی۔ لیو کا سیل نمبر میرے موبائل میں موجود تھا۔ وہ میرے تصور میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس واسطے سے میں اس سے بات تو کر سکتا تھا۔ میری یہ کوشش بھی ناکام ہوئی ..... برنارڈ لیو کا سیل آف تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ مذکورہ سیل اب اس کے استعمال میں تھا بھی یا نہیں! رُبی کی چڑاسراں سرگرمیوں سے تو مجھے جواب سامنے آتا تھا..... نہیں!

میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی کہ میں شام چھ بجے تک نہایت ہی پرسکون، مٹھی اور گہری نیند سوؤں گا لیکن اس دوران میں اگر اس اقامت گاہ پر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے آثار ابھرے تو وقت مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ کھل جائے گی۔

اس ہدایت کی تعمیل کے چند سیکنڈ بعد میں نیند کی گداز ہانہوں کے ریشمی کتبے میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کتبے سے

امیری اور ہائی کا استخراج جھلکتا تھا۔

☆☆☆

ٹھیک آٹھ بجے ہم چائنا ٹاؤن سے نکل آئے۔

میں دسم کے ساتھ سیلو میڈیٹین کی غصی لفٹ پر ارجان تھا۔ میرے اور دسم کے قد کاٹھ میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ دسم کے چہرے پر ہلکا چمکا میک اپ کر کے اسے دسم کے ہمیں میں یا پھر کسی اور ہی رنگ میں آزاد یہ آزادی میرے حق میں جاتی تھی میں نے دسم کو ڈسٹواسے قریب تر کرنے کی کوشش کی تھی۔ رُبی نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ مجھے وہ جان کے روپ میں وہاں پہنچانے یا ڈسٹواسے طور پر نکل کر دن اوقاتیو پر پہنچنا چاہتا تھا اور خوشی بسر دن اوتارن پر اور اور کا جائزہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اپنے حلیے میں یک اس نوعیت کی تبدیلی کی تھی کہ میں وہ جان رہا تھا اور نہ ڈسٹواسے! اہر حال میرا نام "دسم" تھا۔ رُبی اگر مجھے چھپانا چاہتا اس کے لیے اتنی ہی کافی تھا کہ نیکل ہیرون اوقاتیو والے بندے پر ہاتھ ڈال دیتا۔ پروگرام کے مطابق وہ جان کو مجھے اس میز تک پہنچاتا تھا۔

سفر کے دوران میں ہمارے درمیان بات چیت جاری رہی۔ ڈرائیور ہماری گفتگو کا ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا کیونکہ دونوں "پارٹیوں" کے بیچ شیشے کی دیوار حاصل تھی۔ لیو ڈیپارٹمنٹ کا یہ انتظام قابل تحریف تھا۔

ہم تمام اسکوئرز پر پہنچے پھر پارک رو پر سڑک کرتے ہوئے ہمیں یونیورسٹی کے قریب سے گزرے اور سیٹ پال جھلے سیلو کیب لفٹن اسٹریٹ میں داخل ہو گئی۔ مذکورہ اسٹریٹ آگے جا کر جیج اسٹریٹ سے مل گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر واقعیت چار اسٹریٹس کے اندر "بند" تھا۔ ٹوئن ٹاورز نے اچھی غماں جگہ گھیر رکھی تھی۔ لوکیشن کے اعتبار سے تاریخ تار بلڈنگ اور ساؤتھ ٹاور بلڈنگ جیج اسٹریٹ پر "لبرٹی اسٹریٹ" اور دیمے اسٹریٹ کے درمیان استادہ تھے۔ ویسٹ اسٹریٹ عقب میں تھی۔ شیشے اور فولاد سے بنے اس "ایک سوڈی سٹیل سینٹر" میں پچاس ہزار سے زیادہ افراد کام کرتے تھے۔

جیج اسٹریٹ کے آغاز پر ہم نے سیلو کیب کو چھوڑا اور ایک شاگرد کا کافی ہاؤس میں آجینے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج کر کچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں چند منٹ یہاں رک کر آئندہ کے لیے لانڈجیل تریب دینا چاہتا تھا۔

کافی ہاؤس کے اندر سکون ہی سکون تھا۔ سوچ بچارے لیے یہ خاصا سا گارماحول تھا۔ ہم نے کافی کا آرڈر دیا۔ دسم کو چند لمحات تک خاموش رہنے کا اشارہ کر کے میں نے

میں صرف بیٹیس منٹ باقی تھے۔ میں کوئی قدم اٹھانے سے قبل ساحل کی تازہ ترین پوزیشن کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں آج دھڑ دھڑ آف دی ورلڈ میں جس ہستی کے ساتھ ذکر کرنے والا تھا اس کی خبر گیری بہت ضروری تھی۔

میں نے اسی ہستی کے ان منٹ خال و خط کو تیری آنکھ کے سامنے بھارا دوسرے ہی لمحے میں اپنے ساحل سے جاگا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ساحل ہنوز اسی بیڈروم میں بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ بیڈروم میں اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا اور ساحل اس وقت جاگ رہی تھی!

رُبی کی ششہا نہ دھت کا راز فاش ہو گیا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ ساحل کا چار لاکھ کر مجھے شکار کرنا چاہتا تھا۔ اگر ساحل کو میرے ساتھ ذکر کرنا تھا تو اس وقت وہ بیڈروم میں لیٹی کیا کر رہی تھی۔ اسے تو ریسٹورنٹ میں ہونا چاہیے تھا پھر راستے میں!

اس رخ پر سوچتے ہوئے ایک فوری خیال میرے ذہن سے گزرا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا "ساحل والا وہ بیڈروم وڈر ڈف دی ورلڈ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہو۔ میں نے ساحل کو بیڈروم میں چھوڑا اور کافی ہاؤس میں حاضر ہو گیا۔ اس "واپسی" کا سبب سیل کی مخصوص ٹون تھی۔ موبائل پر کسی کی کال آرہی تھی۔

اس دوران میں کافی سرگردی تھی۔ میں نے سیل کو جب سے نکالا تو اسکرین پر "آرائیل" کے الفاظ دکھائی دیے۔ دور رُبی کی کال تھی جو اپنے عقیدت مندوں کے لیے ریسپیکٹ فیل لارڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے کال ریسپونڈ کرتے ہوئے احترام بھرے لہجے میں کہا۔ احترام کا اظہار بھی ضروری تھا۔ "ہیلو!"

"گنڈا یونگ میرے بیچے!" اس نے منہ بھر کر محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس وقت کہاں ہو۔ اب تو ساڑھے آٹھ بجتے والے ہیں؟"

میں نے اس کی مکاری کو فوراً گرفت میں لے لیا۔ "محترم رُبی! آپ تو اس وقت اسرائیل میں ہیں۔ کیا وہاں بھی ساڑھے آٹھ بجتے والے ہیں؟"

"وہ گڑبگڑا گیا۔ میں نے اس کے لہجے میں واضح طور پر لڑش محسوس کی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"وہ جان! میں نیویارک کے وقت کی بات کر رہا ہوں۔

ٹھیک نو بجے ہمیں ریسٹورنٹ میں پہنچنا ہے!" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر صفائی پیش کرتے ہوئے بولا "میں تو اس وقت اسرائیل ہی میں ہوں لیکن مجھے وہاں کی بل کی خبر رہتی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو! میں نیویارک کا ذکر کر رہا ہوں۔"

وہ اپنے جھوٹ کو بھانسنے کے لیے یہ ساری لیا پوتی کر رہا تھا۔ میں نے بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اس وقت امریکا ہی میں تھا اور میں ممکن تھا ہمارے بہت قریب بھی ہو۔ میں نے جھوٹے اس کے گھر کی راہ دکھاتے ہوئے منافقت آمیز لہجے میں کہا۔

"محترم رُبی! میں آپ کے اختیارات کو مانتا ہوں۔ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر ذرا بھر کا احوال جان سکتے ہیں۔ وہ تو دیسے ہی میں نے ایک بات کہہ دی تھی۔ آپ نے بتایا ہے کہ آپ اسرائیل میں ہیں تو پھر یہی بات درست ہے۔"

وہ جیسے لہجے میں بولا "کوئی بات نہیں۔ انسان کا ذہن خیالات کی گنجشہ ہے۔ اس میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں سوچنے والے کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ صرف بولتے وقت محتاط رہنا چاہیے۔ بہر حال۔"

وہ لمبے بھر کو کار پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔ "تم اس وقت کہاں ہو۔ مجھے اپنی درست لوکیشن سے آگاہ کرو؟"

میں نے اینٹ کا جواب پھر سے دیتے ہوئے کہا "میں اپنے ٹھکانے سے نکل چکا ہوں اور اس وقت ایک گیس میں دور رُبی کی کال تھی جو اپنے عقیدت مندوں کے لیے ریسپیکٹ فیل لارڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے کال ریسپونڈ کرتے ہوئے احترام بھرے لہجے میں کہا۔ احترام کا اظہار بھی ضروری تھا۔ "ہیلو!"

"اوہ!" اس کی تاسف بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی "تم تو ابھی کافی دور ہو۔"

"میں ٹھیک نو بجے وڈر ڈف دی ورلڈ میں نیکل ہیرون اوقاتیو پر موجود ہوں گا۔" میں نے اپنے لہجے کو حتی المقدور مٹنی بناتے ہوئے کہا "آپ اس سلسلے میں زیادہ گہر مند نہ ہوں۔ میں ساحل کو ایک لمحے بھی انتظار کی کوفت سے نہیں گزرنے دوں گا۔"

"وہ تو گز رہی ہے!" رُبی نے شاعرانہ انداز میں کہا۔ میں نے تشریح بھرے لہجے میں پوچھا "کیا ساحل ریسٹورنٹ میں پہنچ چکا ہے؟"

"وہ پچھلے دس منٹ سے میز پر موجود ہے۔"

میں اس جھوٹوں کے سردار کے بیان پر دل ہی دل میں

مسکرا کر رہ گیا۔ میں اپنی مسکراہٹ کو رہی تک نہیں پہنچانا چاہتا تھا لہذا ابھی میں کسی شوٹی کو جگہ نہ دی اور یہ پوچھنے بغیر کہ وہ کل از وقت ریسٹورنٹ کیوں پہنچی گئی تھی میں نے کسی انتہائی فرما میرا در بچے کے مانند جلدی سے کہا۔

”مجھے سخت افسوس ہے۔“ میری آواز سے غمناک جھلکتی تھی ”میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ اوکے گڈ بائے۔“

میں کال کو قطع کرنے ہی والا تھا کہ رہی کی اضطرابی آواز ابھری ”یہ تو بتاؤ تم کس طبقے میں ریسٹورنٹ آرہے ہو؟“

”ڈسٹو کے روپ میں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے رہی نے رابطہ ختم کر دیا۔

میں موبائل فون کو میز پر رکھ کر دیکھ کر دیکھنے لگا۔ اس نے یہ تمام تر گفتگو کی تھی فکر مند لمحے میں بولا ”وہ جان نہیں سمجھنے کے لیے زبردست حال پھیلا جا رہا ہے۔ وہ تمہاری لوکیشن اور طبقے سے تمہیں ٹریس اینڈ ٹریپ کرنا چاہتا ہے۔ تم نے سینٹرل پارک کا خوالہ دے کر اسے اچھا خاصا گمراہ کر دیا ہے۔“

میں دیکھ کر یہ بتا چکا تھا کہ وہ کال یہودیوں کے رہی بہت محترم موٹے ہاتھن کی تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا ”میں نے رہی کو اتنا گمراہ نہیں کیا جتنے لیے چوڑے چکروں میں وہ مجھے ڈال رہا ہے۔“

پھر دیکھ کے استفسار پر میں نے اسے تازہ ترین صورت حالات سے آگاہ کیا۔ اس دوران میں ہم کافی کو ختم کرنے کی کوشش میں بھی مصروف رہے۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے انجمن زدہ لہجے میں کہا۔

”میں تمہاری بات پر شک نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ جانا چاہتا ہوں تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ تمہاری سامگی ساحل ریسٹورنٹ میں موجود ہیں اور انی سلسلے میں ہر امر غلط بیانی سے کام لے رہا ہے؟“ دیکھ کر انجمن بجا اور برحل تھی۔

”میں اپنے سوس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے مصلحتی بھرے انداز میں کہا۔ دیکھنے میں مندی کا ثبوت دیا اور اس سلسلے میں مجھے کرینے کی کوشش نہیں کی۔

اس نے کہا ”چلو کوئی بات نہیں۔“ پھر موبائل فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”اس کو فوراً آف کر دو۔ رہی تمہاری لوکیشن جاننے کے لیے سخت مضطرب ہے۔ امریکا میں موبائل فون ایمرسٹم کے تحت کام کرتے ہیں۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے تمہاری اس سے خاصی طویل بات ہوئی ہے۔ اس کے

ذرائع کا تم ذکر کر چکے ہو۔ وہ نیٹ ورک کو حکم دے گا کہ اس وقت کو معلوم کر سکتا ہے کہ تم اس وقت کون سا ایجنٹ استعمال کر رہے تھے۔ تمہارے موبائل کے سکنڈر نہیں بتا دیں گے کہ اس وقت نیویارک کے کون سے علاقے میں موجود ہو۔“

میں نے جلدی۔ سیل کو آف کر دیا اور کہا ”ایسا محض اس وقت ممکن ہے جب میں اپنے سیل کو استعمال کر رہا ہوں۔ کال کے دوران میں یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ موبائل کا حال اس وقت نیٹ ورک کا کون سا ایجنٹ استعمال کر رہا ہے۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”سیل میں مصروف نہ ہونے کی صورت میں بھی مجھے ٹریس کیا جا سکتا ہے؟“

”نہیں!“ اس نے قطعیت سے کہا ”یہ ممکن نہیں لیکن سیل کو آف رکھنا محض مندی ہوگی۔ تم کسی کو نوں کر دیا نہ کر دیا کہ تم سے رابطہ کر سکتا ہے۔ رہی جیسے وسیع ذرائع کے مالک محض نے نیٹ ورک والوں کا ناک میں دم کر رکھا ہوگا۔ وہ اس وقت ہائی الرٹ ہوں گے۔ ادھر تمہارا موبائل نیٹ ورک سے جڑا ادھر وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو گئے کہ سیل تک کسی علاقے کے انجینا سے سکنڈر پہنچ رہے ہیں۔“ وہ ٹھوڑی دیر پہلے پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اگر واقعی تمہارا دشمن رہی اس وقت نیٹ ورک کو اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے تو تمہارا یہ جھوٹ بھی اس پر عمل چکا ہوگا کہ تم سینٹرل پارک کے ارد گرد ہو۔ سینٹرل پارک اور چھ اسٹریٹ کے درمیان اچھا خاصا قافلہ ہے اور اس اچھے خاصے قافلے میں کئی انجینا نصب ہیں۔“

دیکھ کر تشویش بجا تھی۔ میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے رہی یہ جان چکا ہے اس وقت ہم کس علاقے میں ہیں اس لیے۔“ میں فوراً یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ وہ اپنے گھر کے کونگہ کرتے ہوئے اس کا کافی ہاؤس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے!“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے مگر اس میں ان لوگوں کو تھوڑا وقت لگے گا۔“ دیکھ کر ”بہر حال ہمیں ڈیجیٹل زون سے فوراً باہر نکل جانا چاہیے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور کہا ”ڈیجیٹل زون سے باہر نکلنے کا مطلب ہے مشن سے متبردار ہو جانا۔ اور یہ مجھے گوارا نہ ہوگا دیکھ!“

”تم کس مشن کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے بڑب نظر سے مجھ سے دیکھا ”تم نے بتایا ہے ساحل کو ریسٹورنٹ میں نہیں پہنچایا گیا۔ تمہارا مشن تو ساحل کے حصول سے مشروط

ہے!“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو!“ میں نے گھیر آواز میں کہا ”یہاں سے نکل پھر بات کرتے ہیں۔“

ہم نے مل کر ادا کیا اور کافی ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ اس وقت میری دست و پاؤں رات آٹھ بج کر پچاس منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ میرے پاس صرف دس منٹ تھے فیصلہ کرنے کے لیے۔ یہ فیصلہ کہ مجھے ”ڈیٹورڈ آف دی ورلڈ“ میں قدم رکھنا ہے یا نہیں؟

میں ٹوئن ٹاورز کی جانب بڑھتے ہوئے سوچنے لگا۔ دیکھ کر ”انجینا“ سکنڈر اور نیٹ ورک کے حوالے سے جو بات تھی وہ خاصی قابل غور اور گہرا انگیز تھی۔ موبائل فون کا استعمال کسی بھی لمحے میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے مقابل کوئی ناہاش دشمن نہیں تھا۔ موٹے ہاتھن وہ شخص تھا جس کے احکام کو دہانت ہاؤس بھی اولین اہمیت دیتا تھا۔ ٹیلی کیو ٹیلیویشن والے ”اے“ ”اے“ ”اے“ اور اگر اسے ٹریسنگ اسی لمحے سے جاری تھی جیسے سے یہ سیل میرے ہاتھ لگا تھا تو یہ اور بھی تشویش ناک بات تھی۔ میں نے شوگر مل میں رہتے ہوئے اس سیل پر رہی ساک فو غیرہ سے بات کی تھی۔ پھر مل اٹلی کے علاقے سے مسٹر ہنگ کو بھی ایک کال کی تھی لیکن میرے خیال میں اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ اول لمحے سے مجھے ٹریس کیا جا رہا ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو کم از کم دیکھ ہنگ ضرور کسی دہال میں گھر جاتا۔ ہم نے اس کی گاڑی کو استعمال کیا تھا۔ شیوٹی (شیورلٹ) اور دراکل رہی کے آدمیوں کے تحفے چڑھ گئی تھی اور ہنگ نے اپنی گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کر دئی تھی۔ اگر وہ لوگ دیکھ ہنگ کو گھم کرتے تو ہماری چائنا ڈن میں موجودی کا راز کھل سکتا تھا۔

میں نے ابھی سہ پہر میں اسی سیل سے برادر لیو کو بھی کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں مسٹر ہنگ کے گھر تھا اور جہ پاچ گئے تھے وہیں موجود رہا تھا جو فریڈنگ کی لٹی کرتا تھا۔ بہر حال جو بہت گیا سو بہت گیا۔ آئندہ کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ مجھے ابھی ایک قدم چھوٹ کر اٹھانا۔

وہ تو ایمر کا زمانہ تھا۔ آج کل جی ایس ایم رائج ہے۔ اس حدید ترین سسٹم پر نیٹ ورک والے کوشش کر کے نیٹ ورک کو استعمال کرنے والے ”موبائل“ کے حامل شخص کی بالکل درست لوکیشن بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ ٹریس کیا جا سکتا ہے موبائل استعمال کرنے والا شخص کس مقام پر موجود ہے۔ یہ انگ بات کہ وہ شخص استعمال کے فوراً بعد اپنی پوزیشن بدل دے!

”جی ایس ایم“ ایک حیرت انگیز ٹیکنالوجی ہے مگر صاحب! امریکی قوم اس سے کہیں زیادہ پیچ دار اور قدم قدم پر حیرت زدہ کر دینے والی ”عقلوں“ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے امریکی ماہرین اور نائن میں حدید ترین ٹیکنالوجی ”جی ایس ایم“ کا فراوانی سے استعمال ہو رہا ہے لیکن امریکا میں اب بھی ”ایمر“ سے کام چلایا جا رہا ہے۔ اور بڑے دھڑلے سے چلایا جا رہا ہے (جی ایس ایم کا استعمال نہایت ہی محدود بنانے پر ہے) اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکا نیٹ ورکنگ کی دنیا میں ترقی کا خواہاں نہیں! آئی ٹی کے میدان میں سب سے زیادہ ترقی اسی نے کی ہے۔ اس پر بھی اگر وہاں ایمر استعمال ہو رہا ہے تو اسے فرسوی نہ سمجھا جائے۔ یہ ”یہودی“ ہے۔ ایک مخصوص شاطرانہ ذہنیت! ایمر کی افادیت کو وہ دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس شعبے کے ماہرین پتا نہیں میری بات کو تسلیم کریں گے یا نہیں! یہودی کوئی بھی کام خواہ خواہ اور بغیر کسی مفاد کے تو نہیں کر سکتے!

لو جیتے میں پاچ منٹ باقی تھے کہ میں نے دیکھ کر اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ”تم یہیں رک کر میرا انتظار کرو گے۔ میں ریسٹورنٹ کے اندر جاؤں گا۔“

اس وقت ہم ہوٹل وزٹ انٹرنیشنل کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ نیویارک میں بہت کم ایسے ہوٹل ہیں جن میں سوئٹنگ پول بھی موجود ہیں۔ وزٹ انٹرنیشنل فائنل ڈسٹرکٹ کا ایک عالی شان ہوٹل ہے جس میں پچاس فٹ لمبا سوئٹنگ پول موجود ہے۔ وزٹ ایک ہائی فائی ہوٹل ہے۔ سنگل روم دوسو ڈالر کے درمیان ہے اور سوئٹ ساڑھے پانچ سو ڈالر سے لے کر ایک ہزار دوسو پچاس ڈالر تک مل جاتا ہے۔ یہ تمام کرایہ جات ایک رات گزارنے کے لیے ہیں۔ اس اماؤنٹ سے ہوٹل کی ادنیٰ حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وزٹ انٹرنیشنل ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ساڈھ تھوڑا بلڈنگ کے سامنے ویسٹ اور برنی اسٹریٹ کے سنگم پر واقع ہے۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ دیکھ کر ”دیکھ کر“ ”وہاں! میں تمہیں تنہا تو نہیں جانے دوں گا جب کہ ادھر ریسٹورنٹ کے اندر تمہارے لیے ایک خطرناک پھندا بھی لگایا جا چکا ہے۔“

”اس میں خطرناکی والی کوئی بات نہیں پار۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے اس کے بچے چڑھنے سے متاثر ہوتے ہوئے کہا ”اس وقت میں وہاں ہوں اور نہ ہی ڈسٹو۔ میں

دوست مائیکل لومانا کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ مجھ سے ہر بار تعاون کیا جائے!

انہی خیالات کے تانے بانے سے گزرتے ہوئے میں  
 ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ایک سوسائٹ میں حضور پر واقع ”دعوتِ آزاد  
 دی ورلڈ“ میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے میری رسدِ واقع رات  
 کے نوں کا وقت ہمارا بھی۔

میں ایک تک اس صورت کو دیکھ رہا تھا!  
میرے دیکھنے میں حیرت اور بے چینی شامل تھی۔ دونوں  
بیزوں میں اگرچہ ایک رو کا فاصلہ تھا، مگر اس فاصلے کے  
باوجود بھی میں اسے آسانی دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے ہر ایک  
پانچ پر موجودگی اور اس کا رخ ہمیں ہی جانب تھا اس لیے  
میرے نظارے میں کوئی رکاوٹ حاصل نہیں تھی۔ وہ ہو ہو  
ساحل تھی۔ میری حیرت اور بے چینی کا سبب یہ تھا کہ وہ ساحل  
کیوں کر ہو سکتی تھی؟ پھر بے حساب سے ساحل تو اس وقت  
ایک بیڈروم میں موجود تھی۔ زیادہ دیر اس بے چینی کی کیفیت  
میں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا لہذا میں نے آنکھیں بند کر لیں۔  
ظاہرہ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے تمام تر توجہ تیسرا  
آنکھ پر مرکوز کر دی۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف اور  
صرف ساحل ہی کا تصور تھا! اس کا سراپا میری سوچ کی رنگ  
رنگ میں منعکس ہو رہا تھا۔ تھوڑا آئی نے آن واحد میں مجھے  
ساحل تک پہنچا دیا۔

گھبرنے کے لیے بڑا منظم بندوبست کیا گیا ہے۔ مجھے ٹھیک ہے، تمہارے دشمنوں کو وہاں تمہاری موجودگی کا پتا چل گیا ہے۔“

”یہ ممکن نہیں!“ میں نے غماص الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا، ”میرا مشورہ ہے، فوراً وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ نیچے تمہارے لیے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے پولیس کی ایک ہماری نفری کو بھی متحرک دیکھا ہے۔“  
 ”ہم ڈسلاؤ ایک ایک میں تھا چنانچہ خطرات کی تمام زمرے دار اس وقت اسی کے ساتھ تھی۔ میں نے پوچھا، ”تم کہاں ہو؟“

”میں نیچے کے حالات دیکھتے ہی دڑنا انگریزوں سے دور ہٹ گیا ہوں۔“ ”ہم نے بتایا، میں اس وقت سب دے انٹرنس گلوب کے نزدیک ہوں اور ایک پبلک ہتھیار سے جھپٹ کال کر رہا ہوں۔“

”دیری گڈ!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا، ”سب دے گلوب کے پاس ہی رہو۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم ہر حال میں وہیں پر میرا انتظار کرنا۔ اؤکے۔“

رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے کارڈ لیس کو میز پر رکھ دیا۔ اب یہاں مزید رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ”ہم نے نیچے کی جو صورت حال بتائی تھی وہ غیر معمولی اور تشویشناک تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ خود دڑنا سے ہٹ کر سب دے گلوب کے پاس پہنچ گیا تھا۔“ ”سب دے“ نیویارک کی انڈر گراؤنڈ ٹرین کو کہا جاتا ہے۔ لندن میں ریلوے کا ایسی نظام ”نیوب سسٹم“ یا محض ”انڈر گراؤنڈ“ کہلاتا ہے۔ سب دے انٹرنس کی نظامی محض ”S“ والے گلوب سے کی جاتی ہے۔

ویٹر کارڈ لیس لینے کے لیے میری میز پر پہنچا تو میں نے اس سے داش روم کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بتایا، ”ڈائننگ ہال سے باہر دایا جانے۔“

میں نے سرکوشاقتی جنبش دی اور میز چھوڑ کر اس طرف بڑھ گیا۔ چار دیوڑی نے راہ نمائی کی تھی۔ داش روم میں جانے کا قلعہ کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو ڈائننگ سے نکلنے کے لیے ایک ایسا فوری بہانہ چاہیے تھا کہ کچھ دیر تک میری غیر حاضری کو محسوس نہ کیا جائے۔ ویٹر نے میرے اٹھتے ہی ٹیبل پر ایک مخصوص فلک رکھ دیا تھا جو میری عارضی غیر حاضری کی ”وضاحت“ تھا۔

میں ڈھیلیٹ پر نگاہ رکھتے ہوئے میز کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ایک مناسب سے ڈنر کا آرڈر دے دیا۔ اس دوران میں ڈائننگ ہال میں بھی نہایت ہی غماص انداز میں نگاہ دوڑاتا رہا اور میری اس احتیاط نگاہ نے یہ جانچ لیا کہ وہاں ڈھیلیٹ کی نگرانی بھی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ رہی کے سامور کردہ لوگ ہوں گے۔ وہ اس انتظار میں وہاں موجود تھے کہ جیسے ہی کوئی ڈسلاؤ نمبر ایک سو پانچ پر آ کر بیٹھے وہ اسے چھاپ لیں۔ اچھا ہی ہوا، میں اکیلا ریسٹورنٹ میں آیا تھا ورنہ دسیم کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔

میں اس موقع کی تاک میں تھا کہ کوئی اس ڈھیلیٹ سے بات کرے، اس کے قریب آ کر کوئی اشارہ وغیرہ دے تاکہ میں اس خاص شخص کے چلیے کو اپنی یادداشت میں رقم کر سکوں۔ ڈھیلیٹ سے تصوراتی رابطہ کرنے کی کوشش مجھے اصلی سائل تک پہنچا دیتی۔ میں نے یہاں جن نگاہوں کو ڈھیلیٹ کا نگہ ان محسوس کیا تھا، ان کے جلووں کو بھی یاد کر لیا تھا تاہم میرے خیال میں ان کی افادیت کے سلسلے میں کل اوقات کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

وڈرز آف دی ورلڈ جیسے عجیبے ریسٹورنٹ میں آرڈر پلیننگ اور سرورنگ میں تھوڑا وقت لگتا ہے لہذا انٹری آوارہ گردی کے لیے میرے پاس کافی فرصت تھی۔ میں بہ ظاہر میز کارڈ کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے ”آوارہ گردی“ وغیرہ کا بیوقوف پورا کرنے لگا۔  
 ”ایکسپریز می!“

ایک شانستہ آواز نے مجھے جھٹکا دیا۔ اس وقت میں میز کارڈ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کارڈ پر سے نگاہ اٹھائی تو نظر کے سامنے ایک درودی پوش ویٹر کو پایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک کارڈ لیس تمام رکھا تھا۔ میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ کارڈ لیس کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا، ”سرا! آپ کے لیے کال ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لیس لے لیا۔ مجھے اس کال پر حیرت تو بہت ہوئی تھی لیکن چہرے کے تاثرات سے میں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ ویٹر خاموشی سے ایک جانب بڑھ گیا تو میں نے کارڈ لیس کو کان سے لگا لیا۔ میں نے ہاتھ پر ہاتھ کیا، ”ہیلو!“

دوسری طرف دسیم تھا۔ اس کی تشویش بھری آواز میری سماعت سے گرائی، ”دجدان! اس وقت ڈیلیٹیو سی (ورلڈ ٹریڈ سینٹر) کے احاطے میں چر اسرار سرگرمیاں جاری ہیں۔ تمہیں



میں ہر احماد انداز میں چلتے ہوئے ڈانٹنگ سے باہر آیا اور  
واش روڑ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس سمت بڑھ گیا جو  
راستہ لٹک کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں دغورڈ آف دی  
ورلڈ ہی سے نہیں بلکہ ٹوٹن ہارور کے احاطے سے بھی باہر تھا۔ دسم  
نے جس "سرگرمی" کا ذکر کیا تھا وہ میری نگاہ سے بھی گزری اور  
میں نے اپنے دشمنوں کی نظر بجا کر سب دے انٹرس کی طرف  
قدم بڑھانے لگا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا دسم کا مشہور مان کر  
میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی!

رہی نے مجھے ہٹا کر کرنے کے لیے بڑا مضبوط جال بچھایا تھا  
اور میں اس جال کے پاتال سے ہوا تھا۔ موٹے ہاتھن جیسا  
شاہر شخص میری اس چالاکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رہی نے  
ایک "سیا ہاکا" بن کر چال چلی تھی۔ اب یہ مجھ پر فرض تھا کہ میں  
سایہ نوے کی سیانہ بنی کا ہتارہ نکال دوں۔ اس وقت رہی کے  
لیے میرے دل و دماغ میں نفرت کا ایک طوفان بلاخیز اٹھ رہا  
تھا۔ میں انہی انتہائی سکتے ہوئے خیالات کے ساتھ سب دے  
گلوب تک پہنچ گیا۔

دسم کی مجھ پر نظر پڑی تو یک کر میرے قریب آ گیا "رہی  
مسلل کال کر رہا ہے لیکن میں نے ایک مرتبہ بھی انیڈ کرنے کی  
کوشش نہیں کی۔" اس نے نیل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔  
"میں اس کی تکلیف کو سمجھ رہا ہوں۔" میں نے ذہر خدا انداز  
میں کہتے ہوئے نیل اس کے ہاتھ سے لے لیا "اس کی تکلیف کو  
دور کرنا مجھ پر فرض ہو گیا ہے سب دے!"  
دسم سمجھ گیا تھا کہ انتہائی خطرناک موڈ میں ہوں۔ میرے  
لہجے کی پیش نے اسے میرے عزائم سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن آواز  
میں پوچھنے لگا "تاؤ کیا کرتا ہے ہاس؟"

"ہم ایسٹ ہاسٹہ اسٹریٹ والے سانا گاگ جا رہے  
ہیں!" میری آواز سے چنگاریاں ہی پھوٹ رہی تھیں "ابھی اور  
اسی وقت۔ رہی کی سرکوبی ضروری ہو گئی ہے۔"

"کیسی بکڑوں؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔  
میں نے گلوب کی طرف اشارہ کیا "کیسی رہی رہے گی!"

"سب دے نیو یارک میں ستر کا تیر تین ذریعہ ہے۔" دسم  
نے بتایا "اس انیشن سے سب دے کی تین لائنز (فرینس) اپ  
ٹاؤن کی سمت جاتی ہیں مگر ایسٹ ہاسٹہ اسٹریٹ تک براہ راست  
کوئی نہیں جانے کی۔ ہمیں ویسٹ ہالیس اسٹریٹ کے انیشن پر  
اترنا ہوگا۔ پھر کسی بکڑ کر آگے جانا ہوگا۔"

"او کڈن!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں مین  
کے سینے پر بہت ستر کر لیا۔ اب ذرا اس کے پیٹ میں جھانک کر  
دیکھتے ہیں وہاں کون کون سی ابلابھری ہوئی ہے۔"

ہم نیچے اترنے ہی والے تھے کہ رہی کی کال آئی۔ میں نے  
سوچا پہلے اسے ایک تعادری ڈوز پلا دوں پھر آگے بڑھتا ہوں۔  
رہی میری آنکھ کا غار بن گیا تھا۔

"ہیلو!" میں نے کال ریسپونڈ کرتے ہوئے کہا۔  
اس کی پہلی جین آواز میری ساعت تک پہنچی "وہدان۔۔۔  
میرے بچے! تم کہاں رہ گئے۔ اب تو بونے دس نکارے ہیں۔ تم  
خیریت سے تو ہو۔ میں اتنی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں تو تم انیڈ  
کیوں نہیں کر رہے تھے؟"

اس کے متعدد سوالات کے جواب میں میں نے صرف اتنا  
کہا "میں اس وقت ایک ہوائی جہاز میں ہوں۔ یہ غور فگر کرنا  
آپ کا کام ہے کہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر کوئی موبائل سیٹ کار  
آدرہ سکتا ہے یا نہیں؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے  
امضاد کرتے ہوئے کہا "آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے اور وہ  
یہ کہ میں نے ساحل کا خیال اپنے دل سے نکال دیا ہے اور اب  
براہ راست میں آپ کے پاس اسرا نکل آ رہا ہوں!"

ہاتھ مکمل کرتے ہی میں نے رابطہ منقطع کر دیا پھر آگے ہی  
لمحے میں نے نیل کو آف کر دیا۔

پلیٹ فارم کی سمت بڑھتے ہوئے دسم نے کہا "ہمیں یہاں  
زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ہر دس منٹ بعد ایک ٹرین  
موجود ہوتی ہے۔"

دسم نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ ٹھیک دس بجے رات ہم دونوں  
سب دے کی ٹرین "ای لائن" پر سوار ہو رہے تھے "ای لائن ورلڈ  
ٹریڈ سینٹر کے انیشن سے چل کر نیچر ڈسٹرکٹ اسپرنگ اسٹریٹ  
گرین دی ویچ اور پینسلوانیا انیشن سے گزرتے ہوئے ویسٹ  
ہالیس اسٹریٹ کے انیشن پر پہنچی تو ہم نے "E لائن" سب دے  
کو چھوڑ دیا۔

ہم زیر زمین پلیٹ فارم سے باہر نکلے اور بس ڈسٹل کے  
قریب سے ایک ٹیکسی بکڑ لی۔ دسم نے کہا "اس تو اچھا تھا میں  
اپنی کیمپی ہی لے آتا۔ کم از کم آدرہ فٹ کا مسئلہ حل ہو جاتا۔"

"پہلے سے اگر انسان کو انے والے حالات کا علم ہو جائے تو  
مسائل حل ہونے کے بجائے بڑھ جاتے ہیں۔" میں نے سمجھ  
آواز میں کہا "آگے کے عذاب سے وہی لوگ آشنا ہیں جو روز  
شب اس تجربے سے گزرتے رہتے ہیں۔"

دسم خاموش رہا۔ میری ہر اسرار سمجھ کی اور سمجھ تانے اسے  
تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ہم دونوں کے بیچ ایک ایسی خاموشی مائل  
ہو گئی جو کسی چیخے دھانڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والا  
تھی۔ ہماری کیمپ اسٹریٹ ہالیس پر پہنچے ہوئے ہاتھن سکاؤ  
سے گزری پھر ہینٹ پارک اور نیو یارک پبلک لائبریری کو پہنچے

چھوڑتے ہوئے فقہ ایونو پر مڑ گئی۔ فقہ ایونو پر ستر کرتے  
ہوئے ہمیں سیدھا ایسٹ ہاسٹہ اسٹریٹ والے سانا گاگ پہنچنا  
تھا۔

میں نہیں جانتا تھا ان لحات میں دسم کے دماغ میں کیا چل  
رہا تھا لیکن میں پوری یک سوئی سے رہی موٹے ہاتھن کے  
بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس شاطر کی گردن تک میرے ہاتھ  
پکچ جاتے تو میں ساحل کو حاصل کر سکتا تھا۔ مجھے تو امید تھی وہ  
اس وقت اگر سانا گاگ میں نہ بھی مل سکا تو وہاں سے اس تک  
پہنچنے کا کوئی راستہ ضرور دکھائی دے جائے گا۔ سانا گاگ میں  
داخل ہونے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ میں بڑی تیزی  
سے "اس" داخلے کے سلسلے میں غور فگر کرنے لگا۔

ہیلو ایک کو ہم نے تھوڑا آگے آکر ایسٹ ہینٹہ اسٹریٹ پر  
ٹیمپل لیمونل کے سامنے چھوڑ دیا اور پیڈل ہی پیچھے کو چل  
پڑے۔

دسم نے پوچھا "وہدان! سانا گاگ کے بارے میں سوچا  
ہے؟"

"اس وقت تو میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"  
میں نے اس کے چہرے پر لگاؤ دہڑاتے ہوئے کہا "رہی اور اس  
کے آدمیوں کو جس وہدان کی تلاش ہے، وہ ڈسٹلو کے میک اپ  
میں ہلڈز اٹھانے کے لیے کسی حکاکار کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔  
تمہارا میک اپ فوری طور پر اترنا بہت ضروری ہے۔"

وہ اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے بولا "تم ہائل ٹھیک کہہ  
رہے ہو!"

نیو یارک خصوصاً مین مین میں پبلک ٹرانسپس کا بڑا کال  
سے دن بھر گردش میں رہنے والے افراد اپنی ضرورت کو پورا  
کرنے کے لیے ریسٹورنٹس اور ریسٹ روڈ کے واٹس روڈ کو  
استعمال کرتے ہیں۔ ایسٹ ٹریڈ اسٹریٹ پر ایک ریسٹ روڈ  
موجود تھا۔ ہم نے ادھر کا رخ کیا اور چندہ منٹ بعد جب ہم  
وہاں سے نکلے تو دسم اپنی اصلی شکل و صورت میں آچکا تھا البتہ  
پھر سے چہرے پر ایک "مجمعی" غصے کا ہلکا پھلکا میک اپ موجود  
تھا۔

کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کی عبادت گاہ کا تقدس  
بہت اہم ہوتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں کوشش کروں  
گا سانا گاگ کے اندر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی نوبت نہ آئے۔  
رہی کو بڑے طریقے پہنچنے سے وہاں سے نکالنا تھا پھر جیسے بھی  
مکن ہوتا اس کی "تبرکیزی" کر لی جاتی!

ایسٹ ہاسٹہ اسٹریٹ پر پہنچ کر میں نے دسم سے کہا "تم  
ادھر ہی روکدیں مکن لے کر آنا ہوں۔ اگر سانا گاگ کے اندر

گھسنا پڑا تو میں تمہیں اشارہ کر دوں گا۔" اس وقت ہم ایسٹ  
ہاسٹہ اسٹریٹ اور فقہ ایونو کے کنارے پکڑے تھے۔

دسم نے اثبات میں سر ہلایا تو میں سانا گاگ کے داخلی  
دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دسم کو جہاں روکا تھا وہاں  
سے گاگ کا دروازہ بڑے واضح طور پر نظر آتا تھا۔

میرے ذہن نے ایک سیدھا سادہ منصوبہ ترتیب دے لیا  
تھا۔ اگر سب کچھ نامول رہتا تو میں اس منصوبے پر عمل کر کے بہ  
آسانی گاگ کے اندر رسائی حاصل کر سکتا تھا۔

میں سیدھا گاگ کے گھرانے کے پاس پہنچا۔ سرکی مخصوص  
جنینش سے اسے "ہیلو" کہا پھر بتایا "میرا نام جیری ہے۔" میں  
"لا" سے آیا ہوں۔

"جیری!" اس نے سر تا پا تھیدی نظر سے میرا جائزہ لیا اور  
بولا "لا (اس انجیس) سے آئے ہو۔ بولو کیا کام ہے؟"

"مجھے رہی سے ملتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں  
دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی رستہ واضح پر لگاؤ دہڑائی پھر بھریں اچکا کر  
بولا "اس وقت رہی سے کیا کام پڑ گیا؟"

اس وقت رات کے سوا کیا رہ بچ رہے تھے۔

میں نے کہا "رہی تو اتنی ہر دور اور عظیم شخصیت ہے کہ ان  
سے کسی کو کسی بھی وقت کام پڑ سکتا ہے۔" ایک لمحے کا توقف  
کر کے میں نے اضافہ کیا "لا (ایل اے) کے ایک رہی سیوسٹل  
نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اس کا ایک ضروری پیغام مجھے یہاں  
کے رہی تک پہنچانا ہے۔ پلیز مجھے جلدی سے رہی تک پہنچا دو۔"

"رہی تو ٹھیک میں موجود نہیں ہے۔" اس نے ایک مرتبہ  
پھر بڑی بھر پور نظر سے مجھے دیکھا "وہ لگ بھگ دس بجے یہاں  
سے چلے گئے تھے۔"

"کہاں چلے گئے؟" میں نے قدرے الجھن کی اداکاری  
کی۔

"ظاہر ہے! اپنی رہائش پر گھرے ہیں۔" اس نے کندھے  
اچکائے "جہاں وہ روز جاتے ہیں۔" پھر رک کر اس نے  
استفسار کیا "تھری فرینٹنگٹن سے ملنے آئے ہوتا؟"

"اوہو!" میں نے مخصوص امر کی لہجے میں کہا "میں رہی  
موٹے ہاتھن کی بات کر رہا ہوں جو الا سکا سے آئے ہوئے  
ہیں۔ رہی سیوسٹل کا پیغام مجھے موٹے ہاتھن تک پہنچانا ہے۔۔۔۔۔  
یا پھر ان کا رات پینڈر برٹراڈ لیول جانے!"

آخری جملہ میں نے خاص چال کے طور پر ادا کیا تھا۔ اس  
نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا "سوری! میں سمجھا تم اس گاگ  
کے رہی فرینٹنگٹن کے پاس آئے ہو۔" پھر تھوڑے وقف کے بعد

اس نے اضافہ کیا "میں سوری زلی موٹے ہاتھ سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکتی البتہ برنارڈ لیون فرینکلن کے ساتھ ہی ان کے گھر گئے ہیں۔"

یہ بھی ایک "خوشخبری" ہی تھی مگر میں نے چہرے کے تاثرات سے اپنی اندرونی خوشی ظاہر نہ ہونے دی اور قدرے باؤس لہجے میں استفسار کیا "رہی موٹے ہاتھ سے ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"وہ کل رات میں ہمیں سے چلے گئے تھے۔" اس نے بتایا۔

مجھے ایک جھکا سا لگا۔ میں نے کل رات آٹھ بجے اپنی سائنا گگ میں تصویر لگا رکھی ہے رہی موٹے ہاتھ برنارڈ لیون فرینکلن کے ساتھ ساتھ۔ اگر اس شخص کی اطلاع درست تھی تو اس کا مطلب تھا رہی نیویارک بلکہ امریکا سے باہر چا چکا تھا۔ تو کیا وہ واقعی اس وقت امریکہ میں تھا؟ اگر وہ امریکہ میں تھا تو پھر میری ساحل کہاں تھی؟

یہ تمام تر سوالات سیکنڈ کے خزاں میں مجھے میرے ذہن میں گزرے اور میں نے گگ کے نگران سے پوچھا "رہی موٹے ہاتھ کل رات کب اور کہاں گئے ہیں؟"

"کہاں گئے ہیں اس بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا "البتہ میرا اندازہ ہے وہ اس وقت نیویارک میں نہیں ہیں۔ اس گگ سے وہ کل رات کم و بیش اسی وقت نکلے تھے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے اپنی رست واضح پر نظر ڈالی۔

"اوہ!" میں نے اپنے چہرے پر موجود باؤس کے تاثرات میں اضافہ کیا اور کہا "نہیک ہے رہی چلے گئے تو ان کے دست راست مسٹر لیو کے بارے میں بتاؤ۔" میں انہی سے مل لیتا ہوں۔ رہی فرینکلن کی رہائش کس طرف ہے؟ "LA" سے بار بار تو نہیں آیا جاسکتا۔ ممکن ہے لیو کو معلوم ہو موٹے ہاتھ اس وقت کہاں ہوں گے؟"

اس بندے نے اپنے سر کو کچھ اس طور اٹھائی جنبش دی جیسے کہہ رہا ہو..... ہاں یہ بات لیو کی کو معلوم ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے بڑی شرافت سے مجھے رہی فرینکلن کے گھر کا پتا بتادیا۔ مذکورہ رہی ایسٹ اسٹریٹ پر واقع سن شائن اپارٹمنٹس میں رہتا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کا نمبر سی۔ سسٹی تھا۔ گویا یہ علاقہ سائنا گگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سن شائن اپارٹمنٹس ایسٹ اسٹریٹ پر پارک ایویو اور لیون فرینکلن ایویو کے درمیان واقع تھے۔ میں نے گگ کے نگران کے لیے حد شکر بے ادبیا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس مشکوکہ دوران میں میں نے اس شخص کے خال و خلو

کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام مورگن بتایا تھا مجھے نہیں لگتا تھا اس نے مجھ سے کوئی غلط بیانی کی ہو۔ میں اپنے طور پر کبھی بھی وقت اسے چپک کر سکتا تھا۔ وہ جب بھی گگ کے اندر جاتا تھا اس کے طبلے کی انگلی بکڑ کر اس کے بیان کی تصدیق کر سکتا تھا۔ ویسے برنارڈ لیو کا سراغ مل جانا بھی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں دسم کے ساتھ پیدل مارچ کرتے ہوئے ایسٹ اسٹریٹ اسٹریٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

دسم نے گہری تجویز سے پوچھا "ادھر کہاں؟"

"رہی تو نیویارک میں موجود ہیں۔" میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا "البتہ اس کے ایک خاص آدمی برنارڈ لیو کا پتا چل گیا ہے۔ وہ سن شائن اپارٹمنٹس میں رہی فرینکلن کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔" پھر اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا رہی فرینکلن کون ہے؟ میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "فرینکلن ایجنٹ ہاسٹس اسٹریٹ والے سائنا گگ کا رہی ہے۔" پھر میں دسم کو برنارڈ لیو کے بارے میں مختصر بتانے لگا۔

ہم نے ایسٹ اسٹریٹ کے آغاز پر فٹھو ایویو کو چھوڑ دیا اور اپنی مطلوبہ اسٹریٹ میں داخل ہو کر مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ میرے جی میں آئی کہ میں موٹے ہاتھ کو کال کر کے خوب کھری کھری سناؤں لیکن پھر حریف درک ٹریک کے خیالی نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ ٹریک اینڈ ٹریکنگ ڈیوٹس کا استعمال کوئی ہلکی کھیل نہیں۔ کسی مخصوص موبائل کے سگنلوں کے ذریعے اس کی لوکیشن معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ وہ ان محلات میں کون سا اینٹینا استعمال کر رہا ہے خاصا مشکل کام ہے..... اور یہ مشکل کام رہی موٹے ہاتھ جیسے باخبر شخص کے اشارے پر ہی ممکن تھا ورنہ نہیٹ درک والے اس نوعیت کی درجہ بندی کے چکر میں نہیں پڑتے۔ قصہ مختصر مجھے اگر موبائل فون استعمال کرنا تھا تو پھر جلدی جلدی پیشینہ تبدیل کرنے کی ضرورت تھی یعنی ایک کال اس علاقے سے کی اور فوراً کسی دوسرے علاقے میں منتقلی گئے تاکہ دوسری کال کسی دوسرے پیشینہ کے توسط سے ہو..... اور فی الحال یہ ممکن نہیں تھا لہذا اسٹریٹ کو آف رکھنے ہی میں غایت تھی!

ہم نے ایسٹ اسٹریٹ پر پہنچے ہوئے پارک ایویو کو کراس کیا اور سن شائن اپارٹمنٹس کے قریب پہنچ گئے۔ مذکورہ اپارٹمنٹس طرز تعمیر کا عمدہ نمونہ پیش کر رہے تھے۔ میں نے دسم کو اپنے لاکھٹل سے آگاہ کیا۔ پروگرام کے مطابق دسم کو اپارٹمنٹ کے باہر ہونا تھا۔ مجھے اندر داخل ہونا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق اس وقت سی۔ سسٹی فون میں رہی فرینکلن اور برنارڈ لیو کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور ان دونوں سے نمٹنا میرے لیے چندرا مشکل نہیں تھا۔ اگر میں اندر داخل ہونے کے بعد چہرہ منت تک دسم سے رابطہ نہ کرنا تو

چہرہ بھی اپارٹمنٹ کے اندر پہنچ جاتا ورنہ وہ بیرونی حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا۔

میں نے موبائل فون اور رائے سے چھینا ہوا ہتھیار دسم کے پاس چھوڑ دیا اور ایک خطرناک خبر کو اپنے پاس رکھ کر سی۔ سسٹی فون کے داخلی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ مذکورہ خبر ایک بڑے چاقو سے مشابہ تھا۔ میں نے دسم کے ساتھ آج جانا ناؤن میں جو شاہجک کی کئی یہ خبر اسی کا نتیجہ تھا۔ ایک دکان کے شوکیس میں رکھا ہوا یہ نسخہ سا خبر یا بڑا سا چاقو مجھے بے حد پسند آیا تھا اور اسے خریدنے میں میں نے ایک لمبے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

میں نے سی۔ سسٹی فون اپارٹمنٹ کی ڈور تیل کا ہنر دیا اور ایک طرف کھڑا ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اس وقت تبدیل شدہ طبلے میں تھا۔ کس کے طبلے میں تھا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ سائنا گگ کے نگران کو میں نے اپنا نام جبری بتایا تھا۔ یہاں بھی میں دی کارڈ کھینچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں ممکن تھا نگران مورگن نے فون پر فرینکلن کو بتادیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک حینہ کی صورت میری نگاہ سے متصادم ہوئی۔

میں نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا اور اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام جبری ہے۔ میں لاس انجلس سے آیا ہوں۔" میں رہی۔ سیوسٹیل کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے برنارڈ لیو سے ملنا ہے۔ میں سائنا گگ گیا تھا۔ مورگن سے پتا چلا کہ لیون فرینکلن کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں موجود ہیں؟"

میں نے ایک ہی سانس میں اپنے بارے میں بہت کچھ بتادیا۔ وہ کھڑی آنکھیں پٹ پٹانی رہی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے انہیں اس سے سوال کیا "کیا مورگن نے یہاں فون کر کے میری آمد کے بارے میں آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتایا؟"

"ایک منٹ ٹھہرو۔" وہ دھوکا دہانت آہٹ لہجے میں بولی "میں فرینکلن کو سمجھتی ہوں؟"

اتنا کہہ کر وہ "یہ جاؤ اور وہ جا" ہو گئی۔ اس کی ضرورت غائب ہونے سے کل دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں خاموشی سے اندر کے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ دروازہ کھولنے والی حینہ کی موجودی غیر متوقع تھی۔ پتا چلتا اور کون کون اس فلیٹ میں اپنا وجود رکھتا تھا!

میں اگر جاتا تو دروازہ کھلتے ہی میرا درکار اندر داخل ہو جاتا مگر یہاں میں قدرے مختلف حکمت عملی کا اپنانا پاتا تھا۔ میں نے جبری بن کر جس کھیل کا آغاز کیا تھا، اس میں مجھے اچھا خاصہ مزہ آرہا تھا۔ گگ میں ہی فرخت پر رہا تھا لہذا اب بھی میں نے

دسم کو پیچھے ہی رکھا تھا۔ اس بات کے امکانات بڑے قوی تھے کہ مورگن نے فون کر کے رہی فرینکلن کو کسی جبری کی آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔

اسی حینہ کا چہرہ دوبارہ مجھے دکھائی دیا اور اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں نے مسکرا کر سر کو اٹھائی جنبش دی اور اس کے اشارے پر اپارٹمنٹ کے اندر قدم رکھ دیا پھر اگلے ہی لمحے میری کپڑی پر کسی نے نرم گن کی سرد تال آ کر ٹک گئی۔

حینہ نے ایک منٹ کے دروازہ بند کیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں غرائی ہوئی ایک آواز سنا دی "آج بھی! اس کی تھلائی لو۔ یہ انجلس سے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا کوئی رشتے دار ہو!"

بولنے والا وہی تھا جس کی گن کی آہنی تال میری کپڑی کا مزاج پوچھ رہی تھی اور اس کی مخاطبہ وہ حینہ تھی جس نے بڑی فراخ روی سے مجھے دیکھ کر گن کے بعد کھٹاک سے دروازہ بند کیا تھا۔

انجلی نامی وہ عورت مہکا کی انداز میں میری سمت بڑھی پھر میرے بالائی لباس کو کھینچا کر اس میں کسی ہتھیار کی موجودی کا سراغ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بات تو فوراً میری سمجھ میں آ گئی کہ ان لوگوں نے میری رہی۔ سیوسٹیل دانی کہاں ہی پر اعتبار نہیں کیا تھا اور اس گن بردار کا انداز بتاتا تھا اسے خود پر اور اپنی صلاحیت پر بڑا بھروسہ ہے۔ میں ہینڈ زاب کھڑا کر کے اسے گرفت میں لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور..... انجلی نے فوراً ہی مجھے ایسا موقع فراہم کر دیا۔

اس کے "تھپ تھپ" کرتے ہاتھ بالائی جسم کا معائنہ کرنے کے بعد جب میری راتوں تک پہنچے تو میرے رگ دپے میں ایک سنسنی دی ڈونگی۔ یہ سنسنی جذباتی اور محسوساتی دونوں نوعیت کی تھی۔ اگر وہ میری دائیں پنڈلی تک رسائی حاصل کر لیتی تو پھر کیس کے اندر چھپا ہوا خبر اس کی دسترس سے دور نہ رہتا اور..... میں یوں بے دست و پا ہونے کے موڈ میں قطعاً نہیں تھا۔ گھٹنوں تک پہنچنے کے لیے انجلی کو روک کے بل جھکا پڑا۔ اس سے اچھا مل کا کھار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی عبادت کے طریقہ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے روک دیا۔

مجھ نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے کرتے اچانک ہی ایک پھر تیل حرکت کر ڈالی۔ میرا گھٹنا انجلی کی پیشانی پر پڑا۔ یہ ٹھوکر اتنی شدید اور تیز تھی کہ وہ عقب میں ہٹنے کے بجائے میرے قدموں میں منہ کے بل آ رہی لیکن میں نے اسے قدم بوی کا موقع نہ دیا۔ اگر میں انجلی کو ایسا موقع دے دیتا تو کپڑی پر کئی گن میری کھوپڑی میں ضرور ایک ہوادان بتا دیتی۔

ہماری کمر اور گھٹنے نے ایک ساتھ حرکت کی۔ گھٹنا اٹھنے کی پٹیاں پر بڑا اس کے ساتھ ہی میں نے کمر کی ٹوائسٹ سے خود کو ہوائیں روٹیت کیا۔ میرا پورا جسم کسی اسپنڈل کے مانند گھومار میں توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند پیچھے کو آیا۔ میری اس غیر متوقع اور فوری حرکت نے گن برداروں کو بھلا دیا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں ایک دھکے سے اس کے اوپر آیا۔ اسے فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ عین ممکن ہے اسے ایسی کوئی ہدایت دی نہ ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے زمین پر ہوس گئے۔

گمنان ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ انجیلی کی دردناک پیچ نے اپارٹمنٹ میں بالکل عجادی۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ کوئی کھو جاتا تھا کہ میں بری طرح گھبرایا جاتا۔ قدموں کی آوازیں بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔

میں نے مگن بردار کو ڈھال بنانے کے لیے تھوڑی "معت" کی۔ دو ہمارے پیچھے ہوا تھا۔ میں نے اس کے مگن والے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور سیلف ڈیفنس کی ایک مخصوص ٹیکنیک سے اس کی کلائی کی ہڈی کا ٹکڑا کاٹ ڈالا۔

اس کے خلق سے بڑی دشت ناک بلحاظ خارج ہوئی۔ میں نے اس کی کلائی کو آڑا کیا اور ایک ہینڈ اسپرنگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے زمین پر دروازہ قائم کرنا شروع کیا۔ اس کے سامنے کھڑا کیا اور اس کی منہ کو اس کی گردن میں دھنسا دیا۔ اس دوران میں انجیلی انٹے کی کوشش میں نظر آئی تو میں نے اس کے کولے پر دھواں دھار فوکر رسید کی۔ وہ لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی مجھ سے دس فٹ دور چلی گئی۔ اس لڑکھنے کا اختتام ایک دیوار سے ٹکراؤ کی صورت میں سامنے آیا۔ انجیلی کا سرائتی شدت کے ساتھ اس دیوار سے متصادم ہوا کہ وہ پھراٹھ نہ سکا بے حس و حرکت ہو گئی۔ ان لحاظ میں مجھ پر ایک عجیب سا جنون سوار ہو گیا تھا۔

اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں والوں کی صورتیں میری نگاہ میں آ گئیں۔ ایک صورت کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ برنارڈ لیو تھا۔ اس کے ساتھ جو دوسرا شخص تھا وہ رینی فریمنکلن ہو سکتا تھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتاتے تھے وہ مجھے تسلیم کر رہے تھے۔ وہ جہان کی حیثیت سے پہچان نہیں پاتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی وحشت غمیر کر رہی تھی۔

متوقع رہی فریٹنگن نے درشت لہجے میں مجھ سے دریافت  
 کیا "کون ہو تم؟"

”میں تمہارا باپ ہوں..... جیری!“ میں نے سگتے ہوئے

## آتش فشاں

## آتش فشاں

مداخلت نہیں کروں گا۔“

برنارڈ براؤ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”جیری! تم میرے لیے ربی سوسٹیل کا کیا پیغام لے کر آئے ہو؟“

موجودہ پوزیشن نے برنارڈ لیو کو مصلحت کوئی پر مجبور کر دیا تھا لیکن میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا اس کی مصلحت کوئی منافقت سے لبریز تھی۔ آخر کو وہ ربی موٹے ہاتھن کا دست راست تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے وہ ایک سو ایک فیصد مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس کا یہ شک بجائی تھا۔

میں ربی فرینکلن کے انتہائی قریب آ گیا اور کن کے زور پر بے بس کر کے اس کی گردن کو اپنے بازو کی پلٹ میں لے لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوری ربی! میں تمہاری کبات پر بھروسہ نہیں کر سکتا لہذا تمہیں کسی مداخلت کے قابل نہیں رہنا چاہیے۔ خصوصاً کہ تم۔۔۔“

خدا خواہ ہمارے بچ آگئے!“

”یہ۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟“ میرے الفاظ کی تکنی اور سفاکی نے لیو کو چپختے پر مجبور کر دیا ”ربی فرینکلن کو چھوڑ دو۔۔۔ اس کا دم گھٹ جائے گا۔“

”دیکھ لیو کیا کر رہا ہوں۔ تم سے کچھ چھپا کر تھوڑی کر رہا ہوں۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا اور بات کے اختتام پر ربی فرینکلن کی گردن کو ایک مخصوص جھکے سے لواز۔

برنارڈ لیو نے اپنے میزبان کا شہر نشہ دیکھا تو سر اسے لہجے میں بولا ”نت۔۔۔ تم جیری نہیں ہیرا چھری ہو۔ بب۔۔۔ تاؤ۔۔۔ کون ہو تم؟“

میں نے فرینکلن کے غیر متوازن بدن کو دراز قامت شخص کے پاس فرش پر پھینک دیا اور لیو کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”تم نے بالکل صحیح کہا لیو! میں واقعی ایک بہت بڑی ہیرا چھری ہوں۔ تمہاری محبت مجھے اپنا نام بتانے پر مجبور کر رہی ہے۔ میں تمہاری موت وجدان ہوں!“

اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ میں نے ان حرمت بھری آنکھوں میں بے پناہ وحشت اور دہشت کو موجزن پایا۔ اس کی لڑکھائی ہوئی زبان سے صرف اتنا خارج ہوا۔

”وجدان۔۔۔ تم یہاں۔۔۔؟“

”کیوں! میں یہاں نہیں آ سکتا کیا؟“ میں نے غصیلی نظر سے گھور کر اسے دیکھا اور گن بہ دست آگے بڑھتے ہوئے کہا ”اگر تم میرے کام کے ثابت نہ ہوئے تو میں اگلی چھلانگ میں ربی موٹے ہاتھن کے پاس ہوں گا۔“

”نت۔۔۔ تم بہت غلط کر رہے ہو!“ اس کے الفاظ جھپٹی

کھاتے تھے کہ وہ میری وجدان والی حیثیت پر ایمان لا چکا ہے۔ ورنہ یوں اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اڑتیں۔

میں نے ہانپا ”میں غلط کر رہا ہوں اور تم لوگوں نے میرے ساتھ بہت صحیح کیا ہے؟“

اس نے ایک نظر زمین پر پڑے ہوئے آٹھیلی فرینکلن اور دراز قامت شخص کو دیکھا پھر مجھ سے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی اور وہ جانب خمی دروازے والی۔

میں اس اٹھا بیچ میں دوسرے رخ پر آ گیا تھا۔ ہمارے درمیان بہ مشکل دس فٹ کا فاصلہ حائل رہا ہوگا۔ لیو کتنا بھی تیز بھاگتا لیکن میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل جست بھری اور دروازے سے شخص ایک فٹ پہلے اسے چھاپ لیا۔ میں اسے اہم آدی کو یوں آسانی سے فرار ہوتے ہوئے بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح جھلنے لگا۔

میں نے جیسے ہی برنارڈ لیو کو پکڑ کر اپنی سمت کھینچا اپنا رشتہ کا بیرونی دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے سے دست اندر آ گیا۔

میں نے دراز قامت شخص سے جھپٹی ہوئی گن دسیم کی طرف بڑھا دی اور کہا ”تم ان تینوں کا ”خیال“ رکھو۔“ میرا اشارہ فرش نشینوں کی جانب تھا ”مجھے امید تو نہیں کہ ان میں سے کوئی تمہیں پریشان کرے گا۔ بہر حال اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو اس سائنسنگی گن کو بے دریغ استعمال کرنا۔ لو کہ۔“

دسیم نے اثبات میں گردن ہلاتی اور بولا ”تم بے فکر ہو کر اس کا ”انٹرویو“ کرو۔ میں ادھر کے حالات کو سنبھال لوں گا۔“

میں برنارڈ لیو کو کسی ذبح شدہ جانور کے مانند گھٹنے ہوئے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ ایک لیوٹک روم تھا۔ ابھی تک اس اپارٹمنٹ میں جو بھی کارروائی ہوئی تھی اس کی خبر از کر باہر نہیں چاسکی تھی اور یہ ہمارے حق میں بہت ہی اچھا تھا۔ دیسے تو اگر کوئی گولی وغیرہ بھی چل جاتی تو پھر بھی کسی کے اس جانب متوجہ ہونے کے امکان نہیں تھا اس گن پر سائنسنگ تھا۔

میں نے لیو کو ایک صوفے پر پھینکا اور پھنکار سے مشابہ آواز میں پوچھا ”شرافت کے ساتھ انٹرویو دو گے یا پھر تمہاری بد معاشی کو روکنے کا میں کوئی اور بندہ دوست کروں؟“

میرے اب تک کے سلوک نے اسے بری طرح دہشت میں مبتلا کر دیا تھا لکت زدہ لہجے میں بولا ”وجدان! ہم تو تمہارے دوست ہیں۔ تم خواہ مخواہ۔۔۔“

اس کی بات ادھر رہ گئی۔ میں نے اٹنے کا تھکا کا ایک زمانے دا دھماکا اس کے ہونٹوں پر سید کیا اگلے ہی لمحے اس کے

منہ سے خون جاری ہو گیا۔ میرے تھمڑے اس کے ہونٹوں کو زخمی کر دیا تھا۔ اس کی دھشت میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔

میں نے سنا تے ہوئے لہجے میں کہا ”تم نے ثابت کر دیا ہے کہ شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی لہذا.....“ میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑا اور اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کیس سے باہر نکال لیا۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے لیو! اگر جینے کی تمنا رکھتے ہو تو میرے ہر سوال کا سیدھا جواب دینا ورنہ آج تمہارا ربی تمہیں میرے غماب سے بچا نہیں سکے گا۔“ کبھی تم نے مجھے ایک کال کوٹھری میں بند کر کے میرا اثر دیکھا تھا؟ آج یہی کڑا وقت تم پر آن پڑا ہے۔ ماؤنٹ منگلے لاورن شائن اپارٹمنٹس میں جتنا فرق ہے میں اس خنجر کی ایک جنبش سے اس نقاد کو مٹا دوں گا اور.....“ میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم عیار یہودی کسی غیر یہودی کے دوست ہو ہی نہیں سکتے لہذا اس ذیل میں اپنی ناپاک زبان سے ایک لفظ نہ لگانا ورنہ میں اثر دینے کے لیے بغیر یہ تمہیں ”پاس“ کر دوں گا۔“

وہ بے حد سراسیمہ نظر سے خنجر کی چمکتی ہوئی دھار کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں موت کے سائے رقصاں تھے۔ ماؤنٹ منگلے (الاسکا) والی خلیہ پناہ گاہ میں میں نے برنارڈ لیو کے اندر جو ششکا اور کرفرو دیکھا تھا، وہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے اس کے سامنے وجدان نہیں بلکہ ملک الموت موجود ہو!

میں نے اس کی ڈری سہمی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سوال کیا ”میری ساحل کو کہاں رکھا گیا ہے؟“

”مم..... میں نہیں جانتا۔“ وہ دھشت زدہ انداز میں ہلکایا۔

میں نے بجلی کی سرعت سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی، اگلے ہی لمحے برنارڈ کے ہاتھیں گال پر ایک سرخ لکیری نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس لکیر سے خون اگلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لیو کے حلق سے ایک دہلی دہلی چیخ بھی برآمد ہوئی۔ میں نے غرا کر کہا ”تم نہیں جانتے یا تمہیں بتانے سے روکا گیا ہے؟“

”ت..... تم میری بات کا یقین کرو دو جدان۔“ دوسرا سیمہ انداز میں بولا ”مجھے ساحل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں.....“

بات ختم کرتے ہی اس کے منہ سے ایک چیخ خارج ہوئی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک کاری چڑکا لگا دیا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے کیمبر لہجے میں ردیافت کیا۔

”ساحل کو پہلے وال اسٹریٹ والے ٹھکانے پر رکھا گیا تھا۔ پھر اس کا ٹھکانا بدل دیا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تم لوگوں کی سرگرمیوں

سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ نیویارک آنے کے بعد تم نوی بلویئر لی ایم ڈبلیو میں ایسٹ ہاسٹ اسٹریٹ والے سائنا گاک پہنچے تھے۔ اس گاڑی کا نمبر ”ایٹ فائیو۔ لی۔ سیون فور ڈبل زیرو“ ہے۔ اس سائنا گاک میں رہنے کے تم پر اور میری ڈیٹا لیکٹ پر کوئی عمل بھی کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے کسی اور ہی سیارے کی مخلوق سمجھ رہا ہو۔ میرے انکشافات اسے درپردہ حیرت میں مبتلا کر غرق کرنے کے لیے بہت کافی تھے۔ میں نے اس کی توشیح آ میر حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم لوگوں نے مجھے گھبرنے کے لیے وہ ڈرو آف دی ورلڈ والا چکر چلایا۔ وہاں ٹیکل نمبرون ادفائیو پر ساحل کی ڈیٹا لیکٹ کو پہنچا کر مجھے شکار کرنا چاہا۔ تمہارا ربی مجھ سے دوستی کا دم بھرتا ہے اور تم مجھی اسی کا راگ الاچتے ہو۔ کیا میں اتنا ہی احمق ہوں کہ آنکھیں بند کر کے تم لوگوں کا فریب کھالوں گا؟“ میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے دیکھا اور مزید کہا۔

”لیو! میں تمہیں زندہ رہنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ سیدی طرح بتا دو میری ساحل کہاں ہے ورنہ تم لیو نہیں رہو گے میں تمہیں ”کالی کالی بکری“ بنا کر بے دریغ ذبح کر ڈالوں گا۔ پھر تمہاری ”میں میں“ سدا کے لیے بند ہو جائے گی!“

میرے الفاظ کی سمجھنی نے اسے ایک صحت مند جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا پھر اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی بے بسی جھلکنے لگی بڑے مسکین سے لہجے میں گویا ہوا ”وجدان تم یقین کر دو میں تمہاری ساتھی کے ٹھکانے سے واقف نہیں ہوں۔“

میں نے اس کے سامنے بیٹھے بیٹھے ایک جھٹکے سے لات چلائی۔ میری فرنٹ جرک کلک نے اس کی مکمل ٹھوڑی کا مزاج پوچھا۔ وہ بری طرح ہلپٹا تے ہوئے صوفے کی پشت سے جا گر لیا۔ میں نے خنجر کی نوک سے اس کے ہاتھ پر دو تین خویش لکیریں چکا میں اور غراہٹ پھرے لہجے میں کہا۔

”مگر میں تمہارے ٹھکانے سے ضرور واقف ہوں۔ تم آئندہ چند لمحوں میں جہنم واصل کیے جانے والے ہو۔“

اس کے بے بسی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ”تم قرقراتی ہوئی آواز میں بولا ”وجدان! میں تمہیں یقین نہیں دلا سکتا۔ میں بہت مجبور ہوں۔“

”میں تم سے بھی زیادہ مجبور ہوں لیو۔“ میں نے خنجر کی دھار کو اس کی گردن پر ٹکاتے ہوئے کہا ”جب تم مجھے ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے تو پھر تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔“

اس نے بے بسی کی انتہا کو پہنچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ایک نئی چال آزمائی ”چلو مرنے سے پہلے اپنے

مرد گھنٹال کے بارے ہی میں بتا دو۔ روٹی موٹے ہاتھن اس وقت کہاں لے گا؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”میں ربی ہی سے ساحل کے بارے میں پوچھوں گا۔ وہ گرگ باران دیدہ و ضرور میری ساتھی کے ٹھکانے سے واقف ہوگا؟“

”ربی اس وقت اسرائیل میں ہیں۔“ لیو نے نمیف سی آواز میں بتایا۔

”تم ربی کے کتے چلے ہو لیو۔“ میں نے چونکا کر کہا ”اس کی طرح بڑا بچھوٹ بول رہے ہو۔“

وہ منہ بیا ”میں تم سے غلط نہیں کہہ رہا۔ ربی واقعی امریکا میں نہیں ہیں۔“

”کل رات آٹھ بجے تو وہ سناٹا گامگ میں موجود تھا؟“

”ہاں وہ لو بجے کے قریب نیویارک سے اسرائیل روانہ ہو گئے تھے۔“

”جہیں کیسے معلوم؟“ میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا ”تم تو اس وقت ربی کے کسی پراسرار عمل کے زیر اثر گہری نیند میں تھے؟“

”وہ..... وہ.....“ وہ شیشا کر رہ گیا پھر جھوٹ کا سہارا لے کر اپنی بات کو سنبھالتے ہوئے بولا ”میرا مطلب ہے ربی نے مجھے اپنے پردگرم سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔“

مجھے یقین ہو گیا ”وہ دروغ گوئی کر کے مجھے چکرو دینا چاہتا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ربی امریکا میں تھا یا اسرائیل میں میں نے دو ٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”تم ربی کے پردگرم سے تو آگاہ ہو گئے تھے لیکن جہیں نہیں معلوم میں نے تمہارے بارے میں کیا پردگرم بنا رکھا ہے۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہیں ایک مشتمل ختم کر دوں گا۔ میں تمہیں قسط وار ماروں گا۔“

میں نے تمہارا توقف کیا پھر خنجر کو اس کے گلے سے ہٹاتے ہوئے سفاک ہلچل میں کہا ”اس ڈیل کی پہلی قسط پکڑو۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے ہرنارڈ کی ناک پر خنجر کی دھار کو آزمایا۔ میرے لیو کے چہرے کو ناک کے بوجھ سے نیچے سے اوپر مودمنت نے لیو کے چہرے کو ناک کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔ مقام ناک پر ایک بھیا تک خامودار ہو گیا۔

رد کی شدت نے لیو کو ذبح ہوتے ہوئے بکھرے کے مانند ڈکرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔ میں نے اس پر کس نہیں کی اور اس کے ایک کان کو کچی اڑا کر رکھ دیا۔

”لڑیہ دوسری قسط بھی وصول کرو۔“ میں نے تمام تر سفاکی سے کہا۔

لیو کی تکلیف کا بالکل صحیح انداز تو وہ ہی لگا سکتا ہے جو کبھی اس آتش فشاں (220) حصہ 11

اذیت ناک تجربے سے گزرا ہو۔ اس کی حالت بڑی مھوکی تھی۔ شاید اس لیے بھی میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ ان لحاظات میں ایک جنونی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اسی کیفیت میں میں نے اسے دوسرے کان سے بھی فارغ کر دیا۔ وہ گرم ریت پر پڑا ہوئی پھلی کے مانند ترپنے لگا۔

میں نے موت سے بھی زیادہ سفاک لہجے میں کہا ”تمہارا ایک ایک عضو اسی طرح میرے خنجر کی پیاس بجھاتا رہا گا۔ جب تک تم زبان نہیں کھولو گے میں ہاتھ نہیں دوں گا۔“

سے آخر میں تمہاری زبان کی باری آئے گی۔ اگر باقی اعضا محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو بتا دو ربی کہاں ہے؟“

”میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں ربی اس وقت اسرائیل میں ہیں۔“ بات کرتے ہوئے اس کے آنسو بھی نکل آئے۔

”تم انہیں فون کر کے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔ تمہارے پاس ان کا موبائل نمبر موجود ہے۔“

لیو جن لحاظات سے گزر رہا تھا ان میں کسی سے جھوٹ کی ڈر کم ہی کی جاسکتی ہے۔ میں نے ربی کے اسرائیل میں ہونے یقین کر لیا اور لیو کو حیرت مچنے سے روک دیا۔

”میں مان لیتا ہوں ربی کل رات یہاں سے چلا گیا تو میں ضرورت محسوس کروں گا تو اس کو کال بھی کروں گا۔ تم انہیں بچوں کی طرح اب یہ بھی بتا دو کہ ساحل کہاں رکھا گیا ہے؟“

”م..... میں ساحل کے ٹھکانے سے آگاہ نہیں ہوں۔“ بڑی بے چارگی سے بولا ”اب تو مجھے اتنا پتا ہے تمہارا وہ ہم اس بارے میں ضرور پتا چلتا ہوگا۔“

اس کا اشارہ ملے دھندلے دھندلے کی طرف تھا۔ میں چونک اٹھا ”ہو گا کیا مطلب؟“

”ربی اس شخص اور تمہاری ساتھی کے بارے میں تو منصوبہ بنا رہے تھے۔“ لیو نے میرے دیے ہوئے زخموں اذیت کو برداشت کرتے ہوئے کہا ”آئندہ ان دونوں کو ساتھ ل کر مود کرنا تھا۔“

لیو کا انکشاف نہایت ہی اہم تھا۔ اگر وہ غلط بیانی نہیں کرتا تھا تو ساحل اس وقت ملے دھندلے دھندلے کے پاس ہو سکتی تھی۔ ربی نے ہی کا نیال اور مکار فحش تھا۔ وہ ساحل کو ملے دھندلے کے ساتھ کر کے مجھے کزور بنانا چاہتا تھا۔ اس خیال نے مجھے ہلکا کر دیا کہ ساحل تو اسے اسلحہ دھندلے ہی سمجھتی ہوئی جیسے چند روز تک صدف سمجھ رہی تھی۔ ربی میری کمزوریاں بخوبی جاننا اور یہ بڑی توشیح ناک بات تھی۔

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ بولا ”ہاں یہ جانتا ہوں وہ نیویارک میں ہیں۔“

”وہ ساحل کے ساتھ کس ڈائریکشن میں مود کرنے والے ہیں؟“

”ربی کے منصوبے کے مطابق ان دونوں کو کھینچ دیا جاتا تھا۔“

اس نے بتایا۔

میں ربی کی مشاطہ چال پر دنگ رہ گیا۔ اس نے ساحل کو کبھی خود بدل کٹنے کی عبادت گاؤں تک پہنچانے کا اجماع طریقہ وضع کیا تھا۔ ساحل بے چارہ یہی سمجھتی کہ وہ اپنے وجدان کے ساتھ اپنی ہر بات پر دہاں جاری ہے۔ اس چال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نیال میں ابھی ربی کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ورنہ ساحل کو اس طرف روانہ کرنے کی کوئی تک نہیں ہوتی تھی۔ ویسے ایک بات ہے ربی کو اس سلسلے میں بہرہ دے پر ابھی خاصی منت کرنا پڑی ہوگی۔

میں نے لیو سے پوچھا ”اگر وہ آفت زادہ ابھی تک نیویارک میں ہے تو اس کا مطلب ہے ساحل بھی یہیں نہیں ہو سکتا۔ کیا میرا ہم عمل تمہارے معاملے میں ہے؟“

ہرنارڈ لیو نے اس بہرہ دے کو براہ عمل کہا تھا لہذا میں نے بھی ایسی الفاظ استعمال کیے۔ اس نے جواب دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو مجھے شک ہوا وہ کچھ چھپانے کے موڈ میں ہے۔

میں نے فوراً خنجر کی نوک اس کی شرک پر رکھ دی۔

”کوئی پتہ نہیں لیو؟“ میں نے سنگین لہجے میں کہا ”ورنہ ابھی خنجر کر دکھوں گا۔“

وہ ان لحاظات میں پوری طرح میری دہشت کے شکار تھا۔ کسا ہوا تھا۔ جھوٹ بول کر وہ اپنی زندگی سے جانا تنہائی بے چارگی کے عالم میں اس نے بتایا۔

”ہم دونوں ایک طرف ذرا بٹلے میں ہیں۔ یعنی وہ چاہے تو مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں۔ ربی نے سخت سے ہدایت کر رکھی ہے میں تمہارے ہم عمل کی ہر ممکن ہدایتوں کی نگرانی کروں گا۔“

بات پوری کرنے کے بعد لیو نے وال کاٹاک کی جانب کن ہٹا دیا۔ دیکھا تو وہی دیر پہلے بھی اس نے ایسی ہی حرکت کی تھی لیکن میں نے اس وقت دھیان نہیں دیا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ کسی خاص مقصد سے ناگم و دیکھ رہا ہو اس کی نگاہ میں منتظر کی کیفیت تھی۔ میرے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ میں خنجر کی نوک کو گوشت کے ذائچے سے آشنا کرتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ آفت زادہ یہاں بھی آتا رہتا ہے؟“

اس نے جواب دینے میں تمہارا تامل کیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ”فیک ہے“ سمجھ گیا میں۔ وہ تمہاری رہائش گاہ سے

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

واقف ہے۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا پھر پوچھا۔

”کیسا اس وقت بھی تم اس کی آمد کی امید کر رہے ہو؟“

ہرنارڈ لیو نے جواب دینے کے لیے اپنے زبانی داکے ہی تھے کہ ڈور بتیل نے اپنی مخصوص آواز سے کسی کی آمد کا اعلان کر دیا۔ میں نے لیو کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سوالیہ انداز میں بھروسہ اچکا نہیں۔ وہ فوراً سے پیشتر سمجھ گیا، میں اس سے کیا پوچھ رہا ہوں۔ جواب میں اثبات کے طور پر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اطلاعی معنی بجائے والا میرا پرتو ملے دھندلے دھندلے میرے اعصاب کلف زدہ ہو گئے۔

میرے پاس سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ میں نے نئے لوے خنجر کو ہرنارڈ لیو کی شرک پر چلا دیا۔ ادھر دھار نے کام لکھا۔ ادھر گندے خون کا ایک نوارہ سا جھوٹ گیا۔ میں ایک کر ایک جانب ہٹ گیا۔ اگر میں یہ قدم اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کر دیتا تو میرا اس آلودہ ہو جاتا۔

میں لیو کو ترپنا پھر کتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ دسم میری ہی طرف آرہا تھا۔ دھندلے دھندلے مجھ سے پوچھے بغیر دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پھر اطلاعی معنی اپنا فرض پورا کر چکی تھی۔ بیرونی دروازے کے قریب ہی فرش پر زاپا رشت کے اندر تین افراد دو دنیا دہانیا سے بے خبر پڑے تھے۔ جن میں سے آخری کی زندگی کا امکان باقی تھا۔ ربی فریختوں اور دروازے کا مت شخص کا تو میں نے منکا توڑ دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی لونی ہوئی گردوں سمیت اب کسی اور ہی دنیا کے ہاسی تھے۔

جب تک تیسری ہاتھ نہیں جتنی ہم دونوں لگا ہوں ہی لگا ہوں میں لاکھل کر تہیب دے چکے تھے۔ میں دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا اور دسم سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ دسم نے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھانے سے قبل من گن کو جیب میں رکھ لیا تھا۔

آنے والا جو کوئی بھی ہوتا بہر حال وہ ہمارا دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے زیادہ امکان ملے دھندلے دھندلے میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس سے یوں دن نو دن میرا سامنا ہوگا۔ میں نے اسے لفٹ نہ کر کر کریم کر دیا تھا اور ربی نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے میرے مقابل لاکھڑا کیا تھا۔ ویسے میں ملے دھندلے کی ایک بات کو مان گیا تھا اس نے کہا تھا کہ میں نے اس پر تعریف حاصل نہ کیا تو وہ بدی کی کسی قوت کے ہاتھ کا کھلو تانہ جانے گا۔ ربی کا اب تک جتنا کر دار مجھ پر کھلا تھا وہ اس تحریف پر پورا اترتا تھا۔

دسم نے میرے اشارے پر جیسے ہی دروازہ کھولا ایک قد آور شخص اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ دسم کی صورت کا رنگ بدل

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“

میں نے لیو سے استفسار کیا ”اس وقت وہ شیشا“



میا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے استعجاب کا پہلو نظر آیا۔ دسم اس کے لیے ایک اجنبی چہرہ تھا لہذا وہ بھی تھوڑا سا چونکا پھر اس سے پہلے کہ وہ تین فرش نشینوں کو دیکھ کر مزید چونکا میں نے اسے ایک لات کی سلائی پیش کرنا ضروری جانا۔

اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ایک فرشتہ پریش کنگ اس کی تشریف پر رسید کی۔ وہ کھڑے قدموں سے تھوڑا آگے گیا پھر پلٹ کر عقب میں دیکھا۔۔۔۔۔ اور میری توقع کی تصدیق ہوئی۔

اس وقت میں اپنے ہی سامنے کھڑا تھا یعنی نقلی وجدان میرے روبرو تھا۔ وہ جب تک صرف میرا پرتو تھا تو ادوار بات تھی۔ اب تو وہ ایک سوا یک فیصد نقلی وجدان تھا رُنی نے اپنی پراسرار صلاحیتوں کے طفیل اس میں بہت کچھ بھرنے کی کوشش کی تھی۔

نقلی وجدان نے چونکہ میری لات کھائی تھی لہذا اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں کسی اور کے میک اپ میں تھا چنانچہ وہ فوری طور پر میری اصلیت سے واقف نہ ہو سکا البتہ فرشتہ پر دراز تین بے حس و حرکت افراد کو دیکھ کر اس نے صورت حال کا اندازہ لگالیا تھا۔

میں امید کر رہا تھا وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ میں اس کے لیے پوری طرح وقتی طور پر تیار کھڑا تھا مگر اس موقع پر اس نے بڑی عجیب حرکت کی۔ اس حرکت میں ہلا کا اعتماد پایا جاتا تھا۔

وہ ہم دونوں کو یک سر نظر انداز کر کے اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ برٹارڈ لیو کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں ذرہ برابر اہمیت نہیں دی تھی۔ ہم دونوں نے سختی خیز اور تعجب انگیز لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”دسم! یہ شخص یہاں سے نکل کر نہیں جانا چاہیے۔ برٹارڈ لیو سے میں معلوم کر چکا ہوں میری ساتھی ساحلی اس کے قبضے میں ہے۔“

”کیا یہ تمہارے میک اپ میں ہے؟“ دسم نے میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے انھیں زدہ لہجے میں سوال کیا۔

میں نے کہا ”اس کے بارے میں میں تمہیں بعد میں تفصیلاً بتاؤں گا۔ لیکن الحالی اتنا جان لویہ کسی میک اپ وغیرہ میں نہیں اپنی اصل شکل و صورت میں ہے۔“

دسم حیران و پریشان میرے ساتھ دوڑتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں میں نے بڑی بددوری سے برٹارڈ لیو کو ذبح کیا تھا۔ نقلی وجدان اس وقت متاسفانہ انداز میں لیو کی اجڑی بجزی لاش کو یک تک دیکھ رہا تھا۔ ہماری موجودگی کو محسوس کر کے وہ ایک جھٹکے سے پلٹا۔ ہم دونوں سے سامنا ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹی دیکھیں اور نہ ہی کسی قسم کی برہمی

کے آثار مجھے نظر آئے۔ یہ عجیب و غریب صورت حال رقم نہیں رُنی نے اسے پتہ تاثر کر کے کیا سے کیا بتادیا تھا۔ یہ نہیں ہوا کرتا تھا۔

وہ ہم پر ایک اپنی ہی نگاہ ڈال کر واپس جانے کا اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ”وجدان! اٹھو! ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی اصلی آواز لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ اس کا چونک جانا میں نے غلطی سمجھی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اس کے چہرے پر سفسفانہ سلوٹھی دکھائی دیں۔ وہ پھر بے لہجے میں گویا ہوا۔

”تو تم نے بھی مجھیں بدلنا شروع کر دیا۔ مجھے نقلی کچھ خود کسی کی نقل بنے محسوس رہے ہو۔ واہ بھی واہ۔ تمہارا بھی نہیں۔“

”زیادہ ڈائلاگ مارنے کی ضرورت نہیں۔“ ہم بھڑے ہوئے لہجے میں کہا ”بتاؤ تم نے میری ساحلی کو کھانا رکھا ہے؟“

وہ ذائقہ اڑانے والے انداز میں بولا ”نیو یارک بم ہے اور اسے کئی ساحل لگتے ہیں۔ ذرا اس کا طواف کرتے اور ادھر ادھر نگاہ دوڑاؤ۔ ہو سکتا ہے گوہر مقصود ہاتھ آجائے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اس پر حملہ کیا۔ نے تین زبردست کلکس کے کبھی نشین سے اسے پیچھے ہوئے دیوار کے قریب دسم کے پہلو میں پہنچا دیا۔ اسی۔

اس پر ہل پڑا۔ اس کے انداز میں بڑا جاہل حانہ بن گیا۔ میرے ٹیکو (نقلی وجدان) نے دسم کو آڑے ہاتھ لگاتی کوشش سے دسم کی گردن اس کے ہاتھ میں آگئی۔

دسم کی گردن دبوچ کر اس کو اوپر اٹھالیا۔ دسم ہوا میں پاؤں جھٹکنے لگا۔ یہ بڑی واہیات صورت حال تھی۔

میں دسم کی مدد کو لپکا اور ایک لمبے اسٹیپ والی سیٹ ٹیکو کی پشت پر رسید کر دی۔ وہ تھوڑا سا ڈمک گیا اور دسم کوڑے سے تھامے تھامے دوران جھال دیا۔ دسم ایک دیوار سے ٹکرا کر آ رہا۔ میں نے ٹیکو بتاؤ تو زخمی شروع کر دیے۔

اس نے میرے ہر ایک کو مناسب طریقے سے کرنے کے بعد کاؤنٹر ایک کیا پھر ہم دونوں میں ہاتھ مچھی۔ کبھی وہ مجھ پر حاوی آنے لگا اور کبھی میں اس کا آجاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے آپ سے لڑ رہا

میں اس پر جو بھی حملہ کرتا اس کے پاس اس کا توڑ موجود تھا۔ وہ میرے ہی داغ سے سوچ رہا تھا۔

پانچ منٹ کی فافکا فافکی میں ہم نے ایک دوسرے

خاصی ضربات پہنچائیں۔ بلا ٹنگ کرتے ہوئے میری دونوں کہنیاں جیسے سی ہوئیں۔ میں نے ایک ہرپور کرینٹ کاک سے اس کے بالائی ہونٹ کو زخمی کر دیا۔ اس دوران میں دسم ایک طرف ساکت کھڑا نہیں یک ٹک دیکھا رہا۔ اس نے اس نوعیت کی فائز زندگی میں پہلا تجربہ ملاحظہ کی ہوئی۔

ہمارا مقابلہ جاری ہی تھا کرینکھو نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے ایک ہائی چپ لگائی اور میرے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے کافی فاصلے پر چلا گیا۔ اب وہ میرے اور داخلی دروازے کے درمیان تین انچ کا فاصلہ تھا۔ اس نے ایک قہقہہ دلانے والی معنی خیز گاہ مجھ پر ڈالی اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میں نے اسے پکڑنے کے لیے دوڑ لگادی۔ دسم نے بھی میری تقلید کی اور جب تک ہم اس تک پہنچے وہ دروازہ کھول کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔

”دسم“ کسی قیت پر اسے نگاہ سے اور جمل نہیں ہونے دینا۔ بڑی مشکل سے مجھے ساحل تک پہنچنے کا ایک راستہ ملا ہے۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا تو غضب ہو جائے گا۔“

ہم اندھا دھند دوڑتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر آئے۔ نیکیو مجھے نہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس کی تلاش میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ دسم نے بیجان خیر کچے میں کہا۔

”وہ جان! اوھر دیکھو وہ کتنے اطمینان سے ٹپکتے ہوئے جا رہا ہے۔“

میں نے دسم کے اشارے کا تعاقب کیا تو وہ بد معاش مجھے نظر آ گیا۔ نقلی دھوان ایسٹ اسٹریٹ پر چلتے ہوئے الیکٹرک ٹرانسپورٹ کی سٹ بڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ہلاک سکون بھرا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بانگا جھیلنا یا کر آدھی رات کو سڑگشت کرنے لگا ہو۔ ہم نے اپنے پاؤں میں بگولے باندھے اور آدھی طوفان کی رفتار سے بھاگتے ہوئے اس کا تعاقب کرنے لگے۔

اس کے اطمینان اور ہمارے اضطراب نے درمیانی فاصلہ بتدریج کم کر دیا۔ ہم جب اس سے محض پچاس گز کی دوری پر پہنچے تو وہ ایک سب دے گلوب کے پاس رگ گیا۔ اس نے ایک نظر گلوب کو دیکھا پھر خصوص انٹرنس میں داخل ہو گیا۔

”دسم“ نے فرار ہو رہا ہے۔“ دسم نے پچھو تو دسم ٹھک کر رک گیا۔

”گلوب کا رنگ دیکھ رہے ہو؟“ وہ الجھن زدہ لہجہ میں بولا۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ مجھے نیویارک کے سب دے کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ میں نے کہا ”گلوب کا رنگ سرخ ہے پھر؟“

”سرخ گلوب کا مطلب ہے یہ انٹرنس عارضی طور پر بند ہے۔“ دسم نے وضاحت کی ”یہ پلٹ فارم پر بے گھر افراد جرائم پیشہ اسٹریٹ ہاؤسز اور نشانات کے عادی لوگوں کا قبضہ ہوا ہے۔ تم اسے چھوٹی موٹی کرائم مارینٹ بھی کہہ سکتے ہو۔ صرف وہ پلٹ فارم ہارڈن اور اسٹینل میں ہوتے ہیں جن کا انٹرنس گلوب سبز رنگ ظاہر کرتا ہو۔“

”جو بھی ہو، میں اندر اترتا ہے کیونکہ ہمارا افکار ای طرف گیا ہے۔“ میں نے حتی لہجہ میں کہا ”اس کو پکڑنے کے لیے میں پاتال میں بھی غوطہ کھا سکتا ہوں۔“

دسم نے کوئی جرح نہیں کی اور ہم سب دے انٹرنس میں داخل ہو گئے۔

پلٹ فارم تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں حیرت کا شہ پہنکا لگا۔ سب دے کا وہ اسٹیشن پوری طرح آباد تھا۔ دسم نے غمری ہوئی آواز میں کہا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نیکیو کے چٹکار پہلے ہی کی طرف دیکھ چکا تھا لہذا غمیرے ہوئے لہجے میں کہا ”آج سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔“

وقت کو تمام کر رکھنا آسان نہیں۔ یہ بڑا کج ادا ہے پلٹ کر دیکھتا ہے اور نہ ہی پوچھتا۔ اپنی مخصوص رفتار سے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ انسان اس کے تعاقب میں دوڑنے پر مجبور ہے ورنہ یہ ریت کی طرح پھسل کر مچھے سے نکل جاتا ہے!

اس وقت میری ہتھیلیاں جھنجھکی ہوئی تھیں اور میں اندھا دھند سکس لائن کی جانب دوڑ رہا تھا۔ دسم بھی میری تقلید میں تھا۔ مجھے ہر صورت وقت کو اپنی گرفت میں لینا تھا۔ اگر وہ آفٹ زادہ نقلی دھوان میرے پیچھے چڑھ جاتا تو میں چٹکی بجاتے میں وقت کو بچھاڑ سکتا تھا۔ نقلی دھوان کے قابو آنے کا مطلب تھا میں نے ساحل کو حاصل کر لیا۔

ہم نے ٹرین کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ آٹو بیک سلم کے تحت اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہمیں اگرچہ مجھ۔ کی تاخیر بھی ہو جاتی تو ٹرین چھوٹنے کا قوی امکان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب دے سکس لائن حرکت میں آگئی۔ ہم اسی لوگی میں سوار ہوئے تھے جس کے اندر میں نے اس بد معاش کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ سب دے لائنز (ٹرینوں) کی کپڑائی پر اور ہر لوگی کے دروازے پر اس کا خصوصی نمبر درج ہوتا تھا تاکہ مسافروں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں اس وقت تخت پر بیٹھا تھا کیونکہ میں کوئی عام مسافر نہیں تھا تو نہ ہی کسی معمول کے کام سے سڑ کر رہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی مشن تھا اور میری پریشانی کا سبب وہ نیکیو تھا جو مجھے کبھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے مغلوب قدم اور تلاش نگاہوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ ایک سیٹ پر اکیلا بیٹھا تھا۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی میرا دل کینٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس کیسے نے اپنے چہرے کے سامنے کوئی میگزین کھول رکھا تھا جس کے سبب اس کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی تاہم میں نے غصے دیکھے بغیر بھی اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہ کی۔ میری دیکھا دیکھی دسم کی نگاہ بھی اس کیسے کی طرف پڑ گئی۔ اس نے پھر سے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی سرگوشی میں کھری تشویش تھی۔

”وہ جان! اس کے ساتھ ایک عورت بھی ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ وہ کبھی نظر نہیں آ رہی!“

میں نے بھی سرگوشیانہ انداز ہی میں جواب دیا ”گلتا ہے اس بد معاش نے اسے کبھی اوھر اوھر کر دیا ہے۔ اس سے کوئی بھی حیرت انگیز بات بعید نہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”مجھے شک ہے اس کی ساتھی عورت ساحل

کے سوا اور کوئی نہیں۔“

”اس شک کی تصدیق کر لیتے ہیں۔“ دسم نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا تاہم لہجے کو دھماکا رکھا۔ ”یہ چلتی ہوئی ٹرین سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ آؤ اس کا حراج پوچھتے ہیں۔“

”غصہ نہ!“ میں نے اس کا ہاتھ دبا تے ہوئے مجھ پر آواز میں کہا ”تم اس آفٹی پر نظر رکھو۔ میں چند سیکنڈ میں آتا ہوں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ دو آنکھیں بند ہوئے ہی تیسری آنکھ بیدار ہو گئی۔ میں نے ساحل کے خال دخل کو تھڑا آئی کے سامنے اجاگر کیا۔ اس کام میں اب مجھے خاصی مہارت حاصل ہو چکی تھی، بلکہ جھپکے بغیر میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا اور یہ جان کر مجھے حیرت کا شہ پہنچا کہ وہ اس وقت ٹرین میں نہیں تھی۔

میری ساحل کی سکس لائن میں غیر موجودگی اتنی زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔ نیکیو کے پہلو میں چپٹی ہوئی عورت کی شکل میں سے نہیں دیکھی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ وہ ساحل ہوگی۔ بعض اوقات قوی انداز سے بھی غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا وہ کوئی غیر متعلق عورت ہو۔ نیکیو کے نزدیک اسے دیکھ کر میرا دھیان آپ اس ساحل کی طرف چلا گیا ہو۔ ہاتھ تمام لینا مغرب خصوصاً امریکا میں ایک عام سی بات ہے۔ وہ میری نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ نقلی دھوان ایسے فریب دینے کا باہر تھا۔ سب دے انٹرنس گلوب کے ساتھ بھی اس نے کچھ اسی قسم کا ہاتھ دکھایا تھا۔ میں جس قسم کی صورت حالات سے گزر رہا تھا اس میں اس ڈگر پر سوچنا مین فطری بات تھی۔ اب میرے اضطراب..... بلکہ غصہ کا سبب یہ تھا کہ اس وقت ساحل ایک بندوبست میں سڑ کر رہی تھی۔ میں نے آخری مہر جی ایسے اسی بیڈروم میں دیکھا تھا جہاں وہ پچھلے دو دن سے موجود تھی۔ کسی دین میں اس کا محسوس ہونا حالات میں بہت بڑی تبدیلی کی جانب ایک واضح اشارہ تھا۔ میں اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے میں اس ماحول کا حصہ بن گیا۔

وہ ایک ڈیل کیمین والی دین تھی۔ ساحل کو عقیبی کیمین میں رکھا گیا تھا اور وہ وہاں اکیلی تھی۔ فرنت کیمین میں ڈرائیور کے علاوہ اور کون کون موجود تھا میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ساحل کی آنکھیں بند میں اور وہ ایک آرام دہ سیٹ پر دراز تھی۔ میں دھوکے سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس وقت سوری تھی

نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی میری جانب سیدھا ہوا میں نے مختصر سے اسٹیپ کے ساتھ اس کے سینے پر ایک پٹل لگ کر سید کر دی۔

اس لک میں ایک زوردار دھکا پوٹیدہ تھا۔ وہ دو قدم پیچھے گھبرا اپنے عقب میں ٹرین کی ”دیوار“ سے جا ٹکرایا۔ اس نے اسی پر پٹل نہیں لگی بلکہ بیک پٹل کی مدد سے وہ تقریباً ہوا میں تیرتے ہوئے میری سمت آیا۔ اس کا انداز فلائنگ لک مارنے والا تھا۔

میں نے سائیڈ بلاک کیا۔ ٹرین میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ ہم آزادانہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہو سکتے۔ میرا ہر تو جذبات میں آکر کچھ زیادہ ہی الجھن کو چارہ تھا شاید اسی لیے اسے بار بار ٹاکا کی... کا منہ دیکھنا پڑا تھا جبکہ اس کے برعکس میں اسٹریٹ فائٹ کے اصولوں پر کاربند تھا۔ موقع کی نزاکت انہی اصولوں کی منتہی تھی۔

میری بلا لک کے نتیجے میں وہ ایک مسافر کے اوپر جا گرا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں معزوب مسافر کی گالیاں بلند ہوئیں۔ میرے مد مقابل نے اس مسافر کے منہ پر ایک چھڑ رسید کیا اور اٹھ کر میری جانب بڑھا۔ اسی لمحے میں نے اس کی ناک پر ایک زوردار دھکا کر دیا۔

وہ اپنی ناک تمام کر پیچھے کو گیا۔ میں نے اس کی پسیوں میں ایک پریشگر لگا دی۔ وہ ٹرین کے فرش پر پھیلا اور اسی مسافر کے قدموں میں جا گرا جس کے منہ پر اس نے لمحہ بھر پہلے طعنہ مارا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا اور خاصاً محین اتفاق تھا۔ میرے دشمن کی ہزیمت قابل دیدی گئی!

وہ مسافر بہت برہم تھا۔ اس نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ! اپنے بوٹ نکلی دھدان کے سینے اور پیٹ پر برسا نا شروع کر دیا۔ یہ اس کے غصے اور کمزوری کا اظہار تھا اور میں فطری رد عمل تھا۔ وہ بے چارہ بے نیس جانتا تھا، غلطی سے کس مصیبت کے منہ میں ہاتھ دے بیٹھا ہے۔ جلد ہی اسے اس غلطی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

فرش پر پڑے ہوئے آفت زادے نے مسافر کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھایا پھر اسے اپنے پاؤں پر رکھتے ہوئے پوری قوت سے دریا چھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑی سرعت سے ہینڈ اسپرنگ لگا کر ایک جھکے سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

مسافر نے لغضا میں لپاتی پرواز کی اور ٹرین کی دھڑ دھڑ سائیڈ سے جا ٹکرایا پھر ایک جھکے سے فرش پر آ رہا۔ چند مسافر ہمدردی سے معزوب مسافر کی جانب بڑھے اور اسے سنبھالنے کی

کوشش کرنے لگے۔ نقلی دھدان نے اپنے طرز عمل سے مسافروں کے دلوں کو کندہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سب نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے، تاہم اس کے خطرناک تصور دیکھتے ہوئے کسی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموش تماشا بنی رہے رہنے میں اپنی عافیت محسوس کر رہے تھے۔ پرانی آگ میں کون کونتا ہے!

یہ صورت حالات میرے من میں ساڑ گا رہی۔ میں چشم زدن میں وہاں موجود افراد کی ہمدردیاں سمیٹ چکا تھا۔ ہمارے مابین ہونے والی مکالمے بازی نے انہیں بے بسی ہار کر لیا تھا کہ وہ ظالم اور میں مظلوم ہوں میری کسی سماجی عورت پر اس نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتیں ہر حال میں کل کر رہتی ہیں، چاہے وہ کسی بھی شکل میں برسرِ پیکار کیوں نہ ہوں!

اجانک مجھے پٹ پٹا پڑا۔ میں نے اپنے پہلو میں ایک غیر معمولی حرکت محسوس کی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے غافل باکرہ کینہ میرے قریب آ گیا تھا اور عقب سے مجھے اٹھانے کے لیے اپنے دونوں بازو میری... کمر کے گرد حائل کرنے ہی والا تھا کہ میں بجلی کی سی تیزی سے گھبرا اور میری دائیں کتھی اس کی کینٹیٹی پر پڑی۔ چوٹ اگرچہ شدید تھی مگر وہ بڑے عمل سے ہلی گیا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکاری برآمد ہوئی تاہم اس دوران میں اس نے میری کمر پر گرفت قائم کر لی۔ اسی حالت میں اس نے مجھے اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے بائیں کتھی کو پہلے والے انداز میں آزمایا۔ نتیجہ تو رے مختلف برآمد ہوا۔

اس مرتبہ کینٹیٹی کے بجائے میری کتھی نے اس کی گردن کا مزاج پوچھا۔ پھر میں نے ان حملہ آور ”حکوتوں“ کو بے در پے آزمایا شروع کر دیا۔ وہ پٹا رہا مگر اس نے اپنی گرفت ڈھکی نہ کی اور ٹھہرے ہوئے انداز سے معزوب قدموں کے ساتھ ٹرین کے دروازے کی جانب بڑھتا رہا۔ اس کے تیر سے بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ یونہی اٹھائے اٹھائے مجھے ٹرین سے باہر پھینکنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

ٹرین کے دروازے آٹو چیک سسٹم کے تحت لاک تھے۔ انہیں اپنی مرضی سے نہیں کھولا جاسکتا تھا۔ ٹرین سے متعلق ذمے دار شخص ہی اپنی باجھر کی مسافر کی درخواست پر وہ دروازہ کھول سکتا تھا اور وہ بھی ٹرین رکے کے بعد۔ چلتی ہوئی ٹرین میں تو یہ ممکن نہیں تھا البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ شیطان زادہ دردی سے مجھے دروازے پر دے مارتا..... اور اتفاق سے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں دروازہ کھل جاتا۔

میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اتفاق سے بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ واقعی مجھے ٹرین سے باہر پھینک دیتا تو میری سلامتی کے امکانات محدود ہو جاتے۔ اگرچہ گراؤ ڈھچکری محدود سرنگ میں دوڑنے والی وہ ٹرین میری آخری سواری ثابت ہوئی اور اس سے باہر پہنچنے ہی میرا جوش ہوتا وہ سننے اور دیکھنے والوں کے رد گھنٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔

میں نے لمحہ بھر میں ایک فیصلہ کیا اور جب ہم دروازے سے تین فٹ کی دوری پر تھے تو میں نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد بھی کر ڈالا۔ اس کام کے لیے مجھے بھرپور مکاری دکھانا پڑی۔ میں نے کچھ ظاہر کیا جیسے میں اس کی گرفت سے نکل کر نیچے پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ میرے پکڑ میں آ گیا۔ میں نے پھر اس کو دھکا دینے کے دوران ہی میں اچانک اپنے بدن کو جھکا دیا۔ میرا جسم کتھی ٹھری کے مانند ہوا میں بلند ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نقلی دھدان کی گرفت میں رہتے ہوئے دونوں ٹانگیں سامنے کی سمت کھول دیں۔ یہ ایک بے ساختہ اور بھرپور ایجنشن تھا۔

میرے پاؤں دروازے کے ہینڈل سے ٹکرائے اور میں نے چشم زدن میں ہینڈل پر پاؤں کے دباؤ سے زبردست پٹل حاصل کیا اور اپنے پر تو کو ایک جھکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ شاید میری اس اچانک کارروائی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں میں لغزش نمودار ہوئی۔ میرے لیے یہ لپاتی مہلت کی سنہری موقع سے کم نہیں تھی۔ میں نے کسی نیچے کی پروا کیے بغیر اپنے بالائی بدن کو آگے کی جانب جھکایا اور دونوں ٹانگیں فولڈ کر کے پاؤں کی ایڑیاں اس شیطان زادے کے پیٹ کے زیریں حصے پر رسید کر دیں۔

ایڑی اور کتھی کی ضرب اپنے اندر دردناک عذاب کا خزانہ سمیٹے ہوئی ہے۔ اس تکلیف کی شدت کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو کسی بد قسمتی سے اس تجربے سے گزرا ہو۔ یہ زبانی کلامی سمجھ میں آنے والی بات نہیں..... اور میں نے ایڑیوں کی یہ ضرب نقلی دھدان کے جسم کے جس حصے پر پہنچائی تھی وہاں اس کی شدت میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

میری میکانیکی حرکت نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اس بہرہ دے کے ملحق سے ایک تکلیف دہ آواز خارج ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خود کو ٹرین کے فرش کی جانب منہ کے بل گرے ہوئے پایا۔ میری ضرب نے نقلی دھدان کی گرفت چھڑا دی تھی۔ وہ اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا۔ وہاں

ہاتھوں کی گرفت قائم رکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کے معزوب متاثرہ حصے کو دبائے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس سے پیشتر کہ میرا چہرہ ٹرین کے فرش سے ٹکراتا، میں نے دونوں ہاتھوں کی پھلیاں فرش پر ٹکرائیں اور ہینڈ پٹل کے ذریعے اپنی ہاڈی کو ہوا میں اچھالا۔ ہر اچھال نیچے درجے کی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔

اسی وقت میں نے نقلی دھدان کو سنبھال کر اپنی سمت بڑھتے ہوئے پایا۔ ہم دونوں یہ مشکل ایک دوسرے سے مجھے فٹ کی دوری پر راہ گزر میں کھڑے تھے۔ ہمارے درمیان فرش سے جھٹ تک وہ فولادی ڈھڑا استادہ تھا جو کھڑے مسافروں کے لیے سہارے کا باعث ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے سہارے کے لیے ٹرین کی جھٹ سے آگے ذرا نیچے والے کپ بھی لنگ رہے تھے۔ نقلی دھدان کا چہرہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کے ہاتھ لگاؤ وہ مجھے چنگیوں میں سل ڈالے گا۔ یہ اس انویسٹمنٹ کا کمال تھا جو میں نے اس پر کی تھی۔

میں اس پر نگاہ رکھتے ہوئے فولادی ڈھڑے کے قریب آیا پھر اسے مضبوطی کے ساتھ تمام کر ہوا میں گھوم گیا۔ یہ میری ایک اچانک اور خطرناک حرکت تھی۔ مد مقابل کو ہلکا کر رہ گیا۔ اس کی ہولکاٹھ کے دوران میں میری ٹانگیں اپنا کام دکھا چکی تھیں۔

میں نے فولادی ڈھڑے پر گرفت قائم رکھتے ہوئے اس کے چہرے کو کٹھانہ بنایا، پھر بازو ڈکراس لکس کی برسات کر دی۔ رد عمل کے طور پر مدافعتی انداز میں اس کے ہاتھ چہرے کی جانب اٹھ گئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ایک ڈبل پٹل لک اس کے سینے پر رسید کر کے دروازہ کھلی دیا۔ وہ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے چدرہ فٹ تک لڑھکا چلا گیا۔ میں نے فولادی ڈھڑے کو چھوڑا اور جم کر قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سکس لائن کی رفتار کم ہو رہی ہو۔ یہ بات نقلی دھدان نے بھی لوٹ کر لی تھی۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور اٹھتے ہی ایک طرف دوڑ لگا دی۔

یہ بڑی دایمیت صورت حال تھی۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ ٹرین کی رفتار کم ہوئی رفتار اس بات کا اعلان تھا کہ ہینڈ کال کا انکیشن آ گیا ہے۔ اگرچہ نقلی دھدان نے تھوڑی دیر پہلے یہی بتایا تھا کہ وہ ساحل کے ساتھ

یہ ہارلم کی طرف جارہا ہے لیکن اس کی بات پر مجبور سا نہیں لیا جاسکتا تھا۔ وہ کم بخت جموں کا سردار تو اس بات کا دعوے اور بھی تھا کہ ساحل اس وقت ٹرین میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی جب کہ میں اپنی ساحل کو ایک بندوین میں محو سفر کیچہ چکا تھا۔

ایسٹ ہارلم کا اسٹیشن ایسٹ ایک سو دس دس اسٹریٹ پر قلعہ تھا۔ ہنر کالج ایسٹ اڑتھہ پر تھا۔ اس اسٹیشن کے بعد لس ایسٹ سٹریٹ، ایسٹ چھپاسی، ایسٹ چھپانو نے ایسٹ ایک دس اسٹریٹ سے گزرنے کے بعد ایسٹ ہارلم کے اسٹیشن پر پہنچی۔ سب دس کے اس ٹریک پر تین ٹرینیں (فور لائن ٹائیو ٹن اور سکس لائن) مین مین کے مشرقی حصے میں ڈاؤن ڈن اور اپ ٹاؤن کے درمیان ٹالا جنو باؤڈ ڈی رہتی تھیں۔ ساحل و جدان کے اس بیان پر یقین کرنے کو قطعاً تیار نہیں تھا۔ یہ وہ ساحل کے ساتھ ایسٹ ہارلم کی طرف جارہا تھا۔ عین لپٹا ہوا ہنر کالج کے اسٹیشن پر ٹرین سے اتر کر فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھ سے چند منٹ میں بھیجی درگت بخوا چکا اس کے پیش نظر فرار ہی میں اس کی غایت تھی۔

اگلے ہی لمحے میں اس کے پیچھے لپک گیا۔ اس کام میں م خاصوش نہ رہا اور بڑی سرعت سے میرے ساتھ ہولیا۔ ہم ڈیڑے قدموں سے اس جانب بڑے جھدھر اس کہنے نے دوڑ کی تھی۔ یہ یوگی کا وہ حصہ تھا جہاں داش روم بنایا تھا۔ ٹرین ارفاد ہندرتج کم ہو رہی تھی۔

جب ہم مذکورہ مقام پر پہنچے تو وہ ہماری نظروں سے ابل ہو چکا تھا۔ ”وہ داش روم میں چھپا ہے۔“ دیکھنے نے برائی آواز میں کہا۔ ”نہیں اور نہیں جاسکتا۔“

میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کیونکہ وہاں چھپنے کے لیے داش روم سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی نہیں تھی۔ ہم داش روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔ میں نے اضطراری آواز میں دروازے کے ہینڈل کو جھنجھوڑ ڈالا۔

دیکھنے نے کہا ”اگر وہ اندر ہے تو اسے باہر لانا ہوگا۔ فوراً نہ کہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ٹرین رکنے والا ہے۔ اس یوگی کے مسافروں میں سے جو کوئی بھی اترے وہ یہاں جیل آنے والے حالات کو بھی اپنے ساتھ لے گئے گا۔ پھر متعلقہ پولیس والے سکس لائن کو ہنر کالج سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ تمہارے ہم محل کے ساتھ ہتا سادہ کیا سلوک کریں گے لیکن ہم ضرور اس جیلے میں الجھ کر رہ جائیں گے پھر شائن اپارٹمنٹ میں پیش آنے والے

واقعات ہمارے گلے کا پھندا بن جائیں گے؟“

”پھر؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر دیکھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں پہلی فرصت میں ٹرین کو چھوڑ دینا چاہیے۔“ دیکھنے نے سنجیدہ لہجہ میں کہا ”دیکھو ٹرین رکنے ہی والی ہے۔ ہم سب سے پہلے نیچے اتر کر پلٹ فارم کی بجائے ٹرین میں ہو جاتے ہیں۔“

میں نے کھیر آواز میں کہا ”یہ کم بخت بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے۔ کیا اسے یونہی چھوڑ دوں؟“

”بھوری ہے داش روم کا دروازہ اس نے اندر سے بند کر رکھا ہے۔“ دیکھنے نے فکر مند لہجہ میں بولا ”اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔۔۔۔۔ بلکہ بالکل نہیں ہے۔“

”ہم ٹرین سے ضرور اتریں گے اور اس شیطان کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

”مگر کیسے؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”اس نے دروازے کو اندر سے۔۔۔۔۔“

”دروازہ اندر سے بند ہے یا باہر سے؟“ تم اس پکر میں نہ پڑو۔“ میں نے قطع کلائی کی اور سنسنائی ہوئی آواز میں کہا ”اور تمہارے“ کیسے“ کا جواب یہ ہے۔۔۔ دیکھتے جاؤ۔“

میرے لیے ایک ایک لمحہ بہت جلدی تھا اور میں نے حتی طور پر سوچ لیا تھا ”آج یہ آفت زادہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جائے گا۔ کوئی بند دروازہ کھولنا میرے ہاتھ کا کام نہیں تھا۔ میں داش روم کے دروازے کے سامنے ہارس اسٹالس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بریلنگ پوزیشن تھی۔ میں نے چپ کی قوت کو آزمائے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ ایک بردقت فیصلہ تھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل کے اوپر ٹکا جھانکی ایک طویل سانس کھینچ کر بھیجڑوں کو ہوا سے بھرا پھر تیل کرتے ہوئے بھیجڑوں کی ہوا کو ایک دھکے سے منہ کے راسے خارج کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری دائیں ہتھیلی نے میکانیکی انداز میں حرکت کی اور ہاتھ کا ایک قیامت خیز پش پشڈل پر متعلق ہوا۔ یہ تینوں اسٹیپ بہ مشکل ایک سیکنڈ میں مکمل ہوئے تھے۔

داش روم کا دروازہ اس انداز میں کھلا جیسے کسی چنچنے چکھناڑتے ہاتھی نے اسے اپنی بدستی کا نشانہ بنایا ہو۔ دروازہ کھلنے کی مصیبت آواز میں لاک ٹوٹنے کی صدا کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید تھارخانے میں طوطی کی آواز والا محاورہ ایسے مواقع ہی کے لیے ہے۔

ہم دونوں ہٹکا ہٹکا داش روم کے اندر دیکھ رہے تھے۔ ہماری حدود رجحرت کا باعث یہ تھا کہ داش روم کا سونا بن ہمارا منہ چڑھا رہا تھا۔ یہ ہمارے لیے ناقابل یقین صورت حال

تھی۔ پتا نہیں وہ غیبیت ہمیں کھل دے کہ کدھر کل گیا تھا۔ بوگی میں تو وہ نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

دانش روم کے سامنے کھڑے ہو کر دقت بردار کدھر سے اس امر حاققت ہوئی۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بات کی اور تیزی سے دروازے کی جانب بھاگے۔ اس دوران میں سکس لائن ہنز کالج کے اسٹیشن پر رگڑ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے آٹوبیک سسٹم کے ہائپر دروازے کھل گئے۔

میں اپنے ٹیکسٹ کو اس ٹرین کے اندر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اسے فریسن کرنے کا وقت نہیں تھا۔ دسم کے مشورے میں اچھا خاصہ وزن تھا۔ ہماری بوگی میں ہونے والی کارروائی ایم ٹی اے (میٹرو پولیٹن ٹرانسپورٹیشن اتھارٹی) پولیس سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ امریکا کی پولیس چاہے کسی ڈیپارٹمنٹ کی ہی کیوں نہ ہو، بال کی کھال اور کھال کے بال اکھاڑنے کی باہر سے..... اور مجھے کسی بھی صورت براہ راست پولیس سے نہیں اکھٹا تھا۔ چاہے وہ "ایم ٹی اے" والے ہوں یا "ایم ٹی اے" والے لی ڈی ڈی" والے ای محترم سائیک فو کا مشورہ تھا۔ اس شخص کا مشورہ میرے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔

میں نے ٹرین چھوڑنے سے قبل ایک مرتبہ پھر فلیک ویدان کی تلاش میں اپنی نگاہ کو اس بوگی کے طول و عرض میں دوڑایا لیکن بوگی کو اس کے وجود سے خالی پایا۔ پھر ہم باہر نکل آئے۔ ہم نے ہنز کالج اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ کھینچنے نظر آ گیا۔ وہ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر کسی عورت کا ہاتھ تھا۔ تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت سکس لائن کی آخری بوگی کے پاس سے گزر رہے تھے۔ میں نے دسم کی اس جانب توجہ دلائی اور اندھا دھند ان کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔

اس وقت میرے ذہن میں ان گنت طوفان چل رہے تھے۔ میرا ٹیکسٹ پتا نہیں کن آنکھیلیوں کے موڈ میں تھا۔ سکس لائن پر سوار ہوتے وقت بھی ایک عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس وقت بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ میں ٹھوڑی آنکھ کے ٹیکسٹ میں معلوم کر چکا تھا وہ عورت میری ساحل نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا وہ کون ہے جو ٹرین میں داخل ہوتے ہی غائب ہو گئی اور اب دوبارہ وہاں آ گئی؟ پھر یہ بھی توجہ طلب بات تھی کہ فلیک ویدان کہاں کم ہو گیا تھا اور وہ کب اور کیسے فرین سے اترتا؟

ان تمام تر سوالات کے جواب صرف وہی دونوں بھگوڑے دے سکتے تھے۔ ان لمحات میں میرے جی میں یہ بھی آئی کہ میں ایک نظر ساحل کو بھانج کر اس کی تازہ ترین

پوزیشن کے بارے میں معلوم کروں مگر یہ سب درست ممکن نہیں تھا۔ تیسری آنکھ سے استفادہ کرنے کے لیے نہیں رکنا اور رگڑ کر آنکھیں بند کرنا ضروری تھا اور ایسا کرنے کی صورت میں میں اس بھگوڑے کو کھو بیٹھتا۔ فی الحال میں یہ نقصان اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

جب تک ہم دوڑتے ہوئے سکس لائن کی دم تک پہنچے وہ دوبارہ حرکت میں آ چکی تھی۔ اس دوران میں فلیک ویدان اور اس کی ساتھی عورت پلیٹ فارم سے اتر کر ریلوے ٹریک والے حصے میں داخل ہو گئے تھے۔ پتا نہیں ان کی منزل کہاں تھی اور انہوں نے اپنے ذہن میں کیا سوچ رکھا تھا۔ ان کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم اس بات کی دلیل تھے کہ وہ اپنے تعاقب سے ابھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کی پشت ہماری جانب تھی، لہذا ابھی تک میں اپنے ٹیکسٹ کی ساتھی کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ایسٹ اسٹیشن (ہنز کالج) سے بہت پیچھے نکل آئے۔ سرگ کے اس حصے میں بہت کم رگڑ تھی۔ اندر گراؤ ڈھیرین کی آٹھ درواگی کے لیے ایک ضلعو سرگ کی سرگ تیار کر کے زیر زمین ریلوے ٹریک بچھایا جاتا ہے۔ یہ سرگ لمبا طویل راستہ سنگل پلاز کی روشنی کا مروجہ منت ہوتا ہے سب سے آٹھ لائن اور پلیٹ فارم کی چکا چوند اس تعریف سے باہر ہے۔ ہم اسی لمبی روشنی میں ان کا تعاقب کر رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

میرے ٹیکسٹ کا ہاتھ تمام کر بھاگنے والی عورت کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ کراچے ہوئے منہ کے بل نیچے گرنے لگی۔ اگر اس کا ہاتھ فلیک ویدان کی گرفت میں نہ ہوتا تو اسے گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بہر حال اس صورت حال نے اسے قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی ساتھی کو سنبھالنے کے لیے رکا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پلیٹ فارم پر فائر کر دیا۔ یہ اس کی ایک غیر متوقع حرکت تھی۔ پتا نہیں اس نے کب ایک خطرناک گن اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ فائرنگ کے ذریعے نے پلک جھپکتے میں بتا دیا وہ ہمیں اپنی جانب بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے براہ راست ہمیں شوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میرے رکتے ہوئے قدموں نے صورت حال کو بھانپ لیا اور میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کی جانب دوڑ لگا دی۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ اگر وہ چاہتا تو آسانی سے ہمیں نشانہ بنا سکتا تھا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ محض ہمیں خوف زدہ کرنے کا ارادہ رکھتا

فلا۔ اس کا یہ ارادہ میرے لیے مفید تھا۔

فلیک ویدان نے اپنی ساتھی کو ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ اس طرح کہ اب اس کا گن بردار ہاتھ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی ٹھکڑ میں میں نے اس عورت کے چہرے کی ایک نگاہ بھی دیکھ لی..... اور وہاں مجھے ساحل کی صورت نظر آئی۔ اب اب کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ جو کئی بھی ساتھی ساحل کے بھرپور سیک اپ میں تھی۔ عین ممکن تھا یہ وہی عورت ہو جسے آج رات کے ابتدائی حصے میں میں نے ڈیوڈ آف دی ورلڈ میں دیکھا تھا!

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ میری دیکھا دیکھی میرے جی نے اپنی ساتھی کو بغل میں دبا دیا اور مرکز کراسی سمت دوڑ لگا دی۔ پہلے چار ہاتھ۔

اسی لمحے سرگ کی اندرونی فضا میں ایک مرتبہ پھر فائر کی آواز گونجی۔ اس گونج کے نتیجے میں ایک سرگی سوانی جج بلند ہوئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دسم نے بھگوڑوں کو روکنے کے لیے چار رائے والی گن کا استعمال کیا تھا۔ میں نے مذکورہ گن اور سواکل فون دسم کو دے رکھا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ دسم کی گن سے نکلنے والی گولی نے فلیک ویدان کی ساتھی فلیک ساحل کو ناقابل حلانی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ کسی مردہ جھپٹ کے مانند اس کے ہاتھوں سے نکل کر سنگلاخ زمین پر جا گری۔

فلیک ویدان نے گن والا ہاتھ بلند کیا اور میرے قدموں میں فائر کر دیا۔ ہمارے درمیان اس وقت بہ مشکل میں فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میں نے اپنی سمت آنے والی گولی کی پروا نہیں کی اور دوڑتے ہوئے قدموں کے ایک اسٹیپ کو گراؤ ڈھیرین ہانک کر فضا میں فرٹ سرسالت لگا دیا۔ یہ ایک بلی فلا بازی تھی کیونکہ سرگ کی سمت کل کھیلنے کے لیے ساڑھیں تھیں۔

میرے جسم سے ہوا میں پچی گردش کی اور فلیک ویدان سے لادوم کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر چونکا اور اس سے چشمہ کہ وہ کوئی ایسی دیکھی حرکت کرتا تھا جس جلدی سے فرٹ فٹ پر آیا اور کھینچ کر اس کے منہ پر چھڑر رسید کرنے کی کوشش کی۔

میری یہ کوشش جلدی طور پر کامیاب رہی یعنی جلدی تک پہنچا کامیاب ہو گئی۔ جب تک میرا ہاتھ اس کے چہرے سے رسائی حاصل کرتا وہ گن کو ایک جھٹکے سے گھما چکا تھا۔ ایک زانے دار ملچہ اس کی گردن پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میری کمر پر اس کے پاؤں کی اپڑی لگی۔ اس نے گھونسنے کے ساتھ ہی ایک ریزنگ چلا دی تھی۔ یہ اس کا فطری رد عمل تھا۔

اس کی ٹنگ نے مجھے کوئی قابل ذکر نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کی تشریف پر ایک زور دار پریشرنگ جزدی۔ وہ گرنے کی پوزیشن میں چند قدم جھک کر آگے بڑھتا چلا گیا مگر گرا نہیں زمین بوس ہونے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔

میں اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اس کے پہلو میں سائیڈنگ مارا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پسپا ہوا اور بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اندر آتے ہوئے ایک بچی راؤڈ ہاؤس چلائی پھر اچھل کر مجھے فرٹ تک مارنے کی کوشش کی۔

یہ ٹنگ اگر میری ٹھوڑی پر لگ جاتی تو جڑے کا سوا سٹیا ناس ہو سکتا تھا۔ میں اس کے اچھلنے ہی بیک فٹ پر رد کر گیا تھا۔ ردنگ کے اختتام پر میں نے ہینڈ پش لیا اور لگا تار تین بیک فلیک لگائیں۔ بجاؤ اس کی کوشش میں میں اپنے دشمن سے دس فٹ دور چلا گیا اور اس دوری سے اس شیطان نے پھر پورا فائدہ اٹھایا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور اپنی سمت میں دوڑ لگا دی۔ وہ کوئی کمزور اور بزدل نہ تھا۔ مقابل نہیں تھا۔ اس لیے اس کا بار بار پسپا ہونا مجھے ٹھنک رہا تھا اور اس مرتبہ وہ اپنی ساتھی کو بھی ہمارے دم و دم پر چھوڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ان ناگہانی لمحات میں اس کے ذہن میں کون سا منصوبہ چن رہا تھا!

مجھ پر بھی ایک خمدی سوار ہو گئی۔ میں بھی فلا نہیں بھرتے ہوئے زیر زمین سرگ میں اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ یہ تعاقب ایک منٹ سے زیادہ جاری زیرہ سکا اور میں نے ہانپتے کا پتہ اس کو چھایا۔ اس کا سینہ بھی دھونکی کا مکمل پیش کر رہا تھا۔ وہ رکا اور اس بار مجھ کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کے پیچھے سے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

دسم اور ساحل کی ڈپلیٹ ہم سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دسم کا میرے پیچھے نہ آنا ظاہر کرتا تھا اس نے ٹیکسٹ کی ساتھی کو "سنبھال" لیا تھا۔ یہ اس کا ایک محض مندانہ فیصلہ تھا۔ اس عورت کو آڑ چھوڑ دینا بے وقوفی ہوتی، جب کہ وہ دشمن بھی تھی۔

ہم چند لمحات تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ٹھوڑے رہے۔ پھر ہمارے درمیان ایک خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ جب سے وہ مجھ سے ناامید بلکہ برگشتہ ہوا تھا میں یہ سوچ رہا تھا پتا نہیں زندگی کے کس موڈ پر کس انداز

میں اس سے سامنا ہوا! اس قسم کے گمراہی میں بہر حال میں نے توقع نہیں کی تھی اور اس میں آدھے سے زیادہ ہاتھ رہی ہوئے ہائیں کا تھا۔

اس کی ایک لوزر راؤڈ ہاؤس کلک بولا کہ کرتے ہوئے مجھے سے غلطی ہوئی اور اس کا پاؤں میری بغل میں لگا۔ یہ ایک بھرپور چوٹ تھی۔ میں ڈنگا یا اور دو قدم پیچھے چلا گیا۔ اس نے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک دھل گلاٹنگ چلا دی۔ اس بار بھی میں جلدی طور پر خود کو بچا یا۔ اس اور میری کامیابی نے اسے فتح کے نشے میں مبتلا کر دیا۔ وہ بھی سمجھا کہ میں اس سے زبردستی والا ہونا چاہتا ہوں۔ وہ احتیاطی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے انتہائی قریب آ گیا۔ اس نے ایک باسکر کا سا اسٹانس بنا رکھا تھا اور ہولے ہولے قدموں پر اچھل رہا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ایک فرنٹ جاک کلک ماری۔ اس کا اسٹانس ٹوٹ گیا اور وہ کسی بھی چیز کے مانند غرا کر مجھ پر پل پڑا۔ وہ دھواں دھاروں سے میرے چہرے کو بگاڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے بڑی ثابت قدمی سے اس کے تین تیز رفتار پچ بولا کیے تو وہ جھجھکا گیا اور چنگ چھوڑ کر اس نے مجھے چھا ڈال دیا۔

اس کی گرفت میں کسی جھنگی رہنے کی سی تھی اور مضبوطی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر پتھر جی زمین پر پٹختے کی کوشش میں تھا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس کے بازوؤں میں بجلیاں ہی بھری ہوئی تھیں۔ میں اس کے کٹھنے میں کسی گتے کے مانند کس کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش ترک کر دی۔ نتیجے میں وہ اپنی ہی ہونک میں لڑکھڑکیا کیونکہ وہ میرے کٹھنے کے لیے زور مار رہا تھا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس وقت ہم مسئلہ پول کے انتہائی نزدیک تھے۔ میں نے ڈبل کلک کے انداز میں دونوں پاؤں پول پر مارے۔ کھینچا تانی میں وہ میرے عقب میں ہو گیا تھا۔ اس زبردستی میں نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ ہم ایک دوسرے کو لپٹے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔

وہ پشت کے بل میرے پیچھے پڑا تھا۔ میں نے زمین پر آتے ہی اپنی دونوں کہلیاں اس کے پیٹ میں رسید کر دیں۔ وہ تکلیف کی مشرت سے کراہ اٹھا۔ فرار کی کوشش میں تھینا لیکن اس کے ہاتھ سے نکل کر ادھر ادھر ہو گئی۔ درنہ ہزیمت کے ایسے موقع پر زبردستی مسلح شخص اپنے ہتھیار سے یاری ضروری سمجھتا ہے۔ ایسا دوست کس کام کا جو بد وقت ضرورت ساتھ نہ

دے۔ ہتھیار تو ہاتھ کا یا رہتا ہے!

میں ہاتھ آئے ہوئے اپنے ٹیکو کی بری طرح رکھنے لگا۔ فرصت اور "آسانی" کے لحاظ میں میں اس کے چہرے سے اور پیٹ میں ٹھیکن نوعیت کی ضربیں بھی لگا رہا تھا۔ جواب میں مجھے بھی اس کی جانب سے شدید چوٹیں مل رہی تھیں۔ اسی لوٹ پوٹ میں ایک موقع پر وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ سواری حاصل ہوتے ہی اس نے میری گردن دہانہ شروع کر دی۔

میں اس کے ہاتھوں میں پھنسی ہوئی گردن جھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک سرنگ کی روشنی میں اٹھانے ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص آواز بھی میری سامنے تک پہنچ گئی۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک خیال نے جنم لیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دو گتے گڑے ہو گئے۔

ہم اسی وقت ریلوے ٹریک سے کھسک کر ایک بڑبڑھانے کی دوری پر "تیرڈ آڑیا" تھے۔ وہ مخصوص روشنی اور آواز (الٹا ٹرین) کی آمد کا اعلان تھا۔ زمین کی لرزش بھی اس بات کی تصدیق کر رہی تھی کہ کوئی لائن مقرب ہمارے نزدیک سے گزرنے والی ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ ڈاکٹر ناڈون سے آپ ناڈون آئے والی کوئی لائن تھی۔ فور لائن یا فائو لائن یا پھر سکس لائن۔ نیویارک کے سب سے بڑے منٹ بعد ایک ٹرین چھوٹی ہے اور ہماری والی سکس لائن کوٹر کالج "ایسٹ اسٹوڈنٹس" کے اسٹیشن سے روانہ ہوئے کہ جیسی اتنا وقت ہو گیا تھا۔

وہ بڑے سستی خیر کلمات تھے۔ ٹرین کی آواز اور روشنی بہ لمحہ ہمارے قریب پہنچ رہی تھی۔ یہ نامکن تھا کہ میرے مقابلے نے وہ آواز نہ سنی ہو۔ میری گردن پر اس کے ہاتھ کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ وہ مجھ پر سوار تھا اس لیے طاقت اور کامیابی کے نشے میں چور تھا۔ میں نے اس کی "غفلت" سے فائدہ اٹھایا اور گردن جھڑانے کی کوشش کے دوران ہی میں نے ایک جھٹکے سے ٹانگیں فولڈ کر کے اپنے دونوں پاؤں اس کے پیٹ سے لگا دیے۔

وہ چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر ابھرا جیسے میرا ارادہ بھانپ گیا ہو مگر میں نے اسے کچھ سوچنے دیا۔ مہلت نہ دی۔ میرے پاس مہلت تھی ہی کہاں جو میں اپنا سرعام بانٹا چھڑا! اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا سراسر حماقت ہوئی اور اس وقت کسی حماقت کی محاکمات نہیں تھیں تھیں۔ یہ موت زندگی کے درمیان کھڑا ایک سہری موقع تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا قریب قریب کوئی مدافعتی

کرنا میں نے سیکڑ کے لاکھوں حصے میں اپنے ارادے پر عمل کر ڈالا۔ چونکہ جانے کے باعث میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت قدرے ڈھیلی ہو گئی تھی۔ میں نے نتائج کی برائے کئی نظر لی و جہاں دو کدوؤں پاؤں کے پٹس سے ریلوے ٹریک کی جانب اچھال دیا اور خود بیک رول کرتے ہوئے ایک سے چند فٹ دور گھل گیا۔ اسی لمحے میں نے اپنے نزدیک سے تیز رفتار لائن کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس بات میری آنکھیں بند تھیں اور تصور کی نگاہ اس آفت زادے کے خطر کو شکار کرنے میں مصروف تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اب اس کی بات کا تلاش کرنا بھی مشکل ہوگا۔

میں بہ یک وقت احتیاط احساسات میں گھر گیا، دکھ اور نوکے احساسات۔ مجھے اس بات سے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ ایک بڑے فتنے کو میں نے نیست و نابود کر دیا اور ساتھ ہی اس احساس نے دل کو بوجھل کر دیا کہ وہ جیسا بھی تھا..... میں تھا!

میں آخر الذکر احساس کو کوئی نام دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر بڑبڑھانے میں سرنگ کی محدود فضا ایک مخصوص نظر کی قید سے گونج رہی تھی۔ میں نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے میرے پیچھے تھا اسے وہ گھل چکی تھی۔

سرنگ میں موجود دلکش روشنی جو منظر واضح کر رہی تھی اس نے مجھے کئی دھندلاؤں اور نظر کی قید کے حامل ہستی کہیں دکھائی دیں۔ اپنے ٹیکو کے بارے میں تو میں سوچ سکتا تھا۔ مگر وہاں ٹرین نے اس کا قیصر بنادیا ہوگا۔ اس کے جسم کی قیادت سرنگ کی دیواروں اور ریلوے ٹریک پر کہیں تلاش کی گئی تھی لیکن وہ مخصوص قیصر جس ہستی کی طرف اشارہ کر رہا تھا اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ میری سماعت نے اس کی آواز یا نہ سمجھ سکی ہو۔

ایک لمحے کے لیے اس دیران زبردستی میں سرنگ میں اپنے والے نظر کی قید کے دس سوا گتے۔ جس نے پلک پلک میں شناخت کر لیا تھا۔ وہ ملکہ کوڈ سار میٹلر کی جانی پال اور مانی ہوئی آواز تھی!

☆☆☆

مج کے تھن بیٹے والے تھے۔ ہم اس وقت شوگر مل کے آدھے دسم کے اپنا وقت میں تھے۔ ہم تھوڑی دیر پہلے ہی ان بیٹے تھے۔ ہارلم اس وقت گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ نلی وان کا کانٹا لٹکایا تھا لیکن اس کی جبین ہاتی بھی اور یہ جبین

سکڑوں اندیشوں کو جنم دے رہی تھی خاص طور پر میٹلر کی کے مخصوص قیصر نے مجھے زور دے کر کے اٹھا ہندو میں لایا جیسا تھا۔ زمین دوز ریلوے ٹریک پر اس کی غیر مرئی موجودگی عقل میں سامنے والی بات نہیں تھی۔

میٹلر سے ہونے والی آخری ملاقات میرے ذہن میں نقش تھی۔ پوئیت رخصت وہ از حد طول اور دل گرفتہ تھی۔ وہ مجھ سے شاک تھی کہ میں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس نے تن من دھن مجھ پر بھجوا کر دیا لیکن میں اس کا نہ ہوسکا۔ میں پتا نہیں اپنا بھی تھا یا نہیں۔ اس کا کیسے ہو جاتا۔ یہی گتہ کلی دھندلاؤں کو بھی تھا۔ وہ میرے تصرف میں آنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے دفعہ پر اٹھانا نہ جانا۔ ریلوے کے طور پر وہ مجھ سے بڑک کر شقی قوت کے ہاتھ کا سیل بن گیا اور اب ریلی کو اس سے ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے۔ میں نے شاطر ریلی کے ہاتھوں کا سیل نکال کر زمین دوز ریلوے سرنگ کی دیواروں پر پوت دیا تھا اور نہ کسی کم جہاں پاک!

میٹلر کی مثبت طرز فکر کی حامل تھی۔ وہ تو میری کج ادائی سے شاک تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر رکھنا چاہتی تھی لیکن میں اسکی باندی کا قائل نہیں تھا۔ میری زندگی کا طور اپنا تھا کہ میں اپنے پاؤں میں نہ بچھڑاؤں ڈال سکتا تھا چاہے وہ زخم.....!

ایسا سوچتے ہوئے اچانک میری سوچ کو ایک جھٹکا لگا اور آجوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف مرکزا۔ وہ ایک ایسی زنجیر تھی کہ جس کی تھن نے مجھے تڑپا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کے حصول کے لیے میں دوردور کی خاک چھان رہا تھا۔ وہ کبھی بھی مجھ سے دور نہیں رہی مگر زردی کے باوجود مجھ اس کے حصول میں ان گنت دیواریں اٹھتی چلی گئی تھیں..... اور اب تک اٹھ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض دیواریں تو آسمان تک بلند تھیں۔ ان کے قد کاٹھ تاجے تاجے میری گردن جھٹکتے تھے، آنکھوں میں سرچیں ہی بھر جاتی اور میں سست پٹا کر رہ جاتا۔

پتا نہیں میں نے اس کا نام ساحل کیوں رکھ دیا تھا۔ ڈوبنے والے ساحل کی خواہش میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ وہ انہیں چند ہاتھ کی دوری پر دکھائی دیتا ہے لیکن یہ چند ہاتھ بھی ختم نہیں ہوتے، حتیٰ کہ ان کے ہاتھ پاؤں بے دم ہو جاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا 'میری سوچ میں مایوسی رآئی تھی۔ یہ صحت مند نشانی نہیں تھی مگر ہر انسان اپنی نفسیت سے مجبور ہوتا ہے اور حالات کے پیش نظر اسے عملی اور خوش کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور میں بھی ایک انسان ہی تھا۔ میں نے





ذہن میں اس وقت جو طوفان مچ رہا تھا، اس نے مجھے تھوڑا سا غیر متاثر بنادیا۔ میں بیڈ سے نیچے اتر اور دس کم والے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

وہ جاگ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "نیند نہیں آ رہی کیا؟" "تم نے میری نیند اڑا دی ہے وجدان!" اس نے بھجان خیر لکچ میں کہا اور ایک طویل جماعتی "یہ کج بحث ابھی رہی ہے اور نہیں بھی آ رہی۔"

میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور حیرت بھرے لہجے میں پوچھا "میں نے کس طرح تمہاری نیند میں ہوائی جہاز کا انجن فٹ کر دیا؟"

"تمہارے حالات کئی فلائنگ سائرس (اڑن طشتری) سے کم نہیں ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہم شکل نقلی وجدان اور اس کے بھیاک انجام نے میری آنکھوں میں حیرتوں کے سمندر اغریل دیے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے نیند کیوں کر آئے گی!"

"تو ایسا سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"سوچتا میرے بس میں تو نہیں وجدان!" "تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "انسان جس قسم کی تجویزین سے گزر رہا ہوتا ہے، اس بارے میں غیر ارادی طور پر بھی سوچتا چلا جاتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔"

"تم کیوں نہیں سوئے؟" اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ میں نے کہا "میں ایک ضروری فون کرنے کے بعد سوؤں گا۔"

"ضروری فون!" اس نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا پھر قدرے فکر مند سے بولا "اس کے لیے تو ہمیں کسی پبلک فون بوتھ تک جانا ہوگا۔ تم جانتے ہو اس اپارٹمنٹ میں فون کی سہولت موجود نہیں اور موہاں فون تو.....!"

"ہم موہاں فون کو ہی استعمال کریں گے لیکن باہر جا کر۔" میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا "اور یہ اس موہاں کا میرے ہاتھوں آخری استعمال ہوگا!"

میرے لہجے کی حمیت نے دس کم کو باور کرا دیا کہ میں کوئی فیصلہ کرنے کے بعد ہی اس کے پاس آیا ہوں۔ وہ بستر چھوڑتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے ہم اسی وقت باہر جا رہے ہیں لیکن اتنا تو بتا دو یہ ایریز جیسی کال ٹم کسے کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ شخص جو اس موہاں کا مل بھرنے کا ٹھیکہ دار بن گیا ہے۔" میں نے متنی خیر لکچ میں کہا "میں اس سیل سے بھٹکا رہا ہوں۔" اس نے کہا "میں نے فیصلہ کر چکا ہوں بھریوں نہ اس کے ٹھیکہ دار سے دو باتیں کر لی جائیں!"

"اودہ تم رہی موہے ہاتھن کو رینگ کرنا چاہتے ہو؟" دس نے تاسف آمیز انداز میں کہا۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم یلو میڈیٹین میں بیٹھ کر شوگر مل سے نکل رہے تھے۔ دس نے اپنی ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ میں اس کے برابر میں پیئرز سیٹ پر موجود تھا۔ میں نے موہاں کو ان کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میں ملکی میں کوئی مسئلہ فری ابویو بھی ہے؟"

"رات کے آخری پہر میں تم تمام ابویوڈ کو مسئلہ فری ہی سمجھو۔" اس نے جواب دیا "سخت ترین سرد موسم میں کسی کو سڑکوں پر رش لگانے کی مصیبت نہیں پڑی۔ ہم جس بھی ابویو یا اسٹریٹ میں داخل ہوں گے وہ تاحد نگاہ ہمیں خالی ہی نظر آئے گی۔" ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا "وہ تمے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے گہری نظر سے سے دیکھا اور کہا "کیا تم کوئی گھبراہٹ محسوس کر رہے ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا "گھبراہٹ کسی" میں نے کہا "خیر چھوڑو..... ہاں سنو۔" میں چند لحات کے لیے متوقف ہوا پھر ضمہری ہوئی آواز میں اضافہ کیا "تم بس جیسی کوڈڈ راتے جاؤ۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ تم کہاں کہاں سے گزرو گے اور کیسے گزرو گے۔ جس جیسی کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکتا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا موہاں! ممکنہ طور پر دوران میں بیڈ درک کا کوئی بیٹھینا (ٹاور) ہماری لوکیشن کو جانچنے میں کامیاب ہو۔ ٹریک اور ٹریک کے امکانات کو ایک لمحے کے لیے بھی ذہن سے خارج نہ کرنا!" "او کے ہاں!" اس نے غصے سے لہجے میں کہا "جیسی مجھ سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوگی۔ تم نہایت اطمینان سے رہنا موہے ہاتھن کے ٹریڈنگ کر سکتے ہو۔"

میں مطمئن ہو کر موہاں کے کی پیڈ سے "کھینچے۔" اگلے ہی لمحے رہی سے رابطہ ہو گیا۔ میں نے اس کے "ہیلو۔" کے جواب میں چھوٹے ہی کہا "ریسیکلیڈ لارڈ! کیسے ہو؟" میرے لب و لہجے سے رہی کے لیے منافقانہ احترام بھی رخصت ہو گیا۔ حالات جس رنج پر پہنچ گئے تھے وہاں کی مصلحت یا منافقت کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے کھلے دشمن تھے اور اس حقیقت کو کسی منع کاری سے گزرا نہ

کا ب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”میرے بچے وجدا۔۔۔“

”چاپلوسی اور منافقانہ شفقت کا وقت گزر چکا موٹے ہاتھن!“ میں نے نہایت ہی سخت الفاظ میں کہا تو اس کا جملہ ادھر اڑ رہا گیا۔ ”بتاؤ۔۔۔ کب کہاں اور کن شرائط پر ساحل کو میرے حوالے کر دے گا؟“

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کر کے اور سر سرائی ہوئی آواز میں بولا ”تو میری ساری محنت ضائع ہوگئی!“

”عقرب تم بھی ضائع ہونے والے ہو۔“ میں نے ٹرش لہجے میں کہا ”جس طرح رات کے درمیانی حصے میں تمہارا دست راست ہمارا ڈیو آواز کا زنگی وجدان اس کی سامنے ڈھکیٹ آف ساحل ریٹائٹ ہاسٹہ اسٹریٹ والے سانپا گالک کا ربی فریٹنگن اور اس کا درواز قامت سامنے میرے ہاتھوں ضائع ہو چکے ہیں۔“ میں سانس لینے کو رکھا پھر کہا ”تم تو بڑے با اختیار اور با خبر رہو۔ دنیا میں کہیں بھی موجود ہو تو ترین اطلاعات تمہاری دسترس میں رہتی ہیں۔ یہ بخیر تو تمہاری اپنی ہیں۔ بھینا تم تک پہنچ چکی ہوں گی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس کی ٹھٹھکار سے مشابہ مگر ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”وجدان! اس نشان اپارٹمنٹ اور زمین دوڑ ریلوے ٹریک پر جو آفسوس ناک واقعات پیش آئے اس سلسلے میں تمہاری ہر غلطی کو معاف کرنے۔۔۔“

”تم کون ہوتے ہو معاف کرنے والے؟“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی درشت لہجے میں کہا۔

”دہ سنگین نری سے بولا“ وجدان! میں تمہیں دوست بنانا چاہتا۔۔۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی ”ہم کبھی دوست تھے اور نہ آئندہ بھی بن سکتے ہیں۔ میرے کیا تم یہودی کسی بھی غیر یہودی کے دوست نہیں ہو سکتے۔ آج تک تم لوگوں نے جس سے بھی دوستی کی وہ گیا کام سے۔ تم لوگ جس ملک میں دوست بن کر قدم رکھ دو ہاں غلط سال اور فائدہ کسی کی لوبت آ جاتی ہے۔ اس دنیا کے کتنے ہی ممالک کو تم لوگوں نے دوستی کی آڑ میں دشمنوں سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ یہودی صرف یہودی کا دوست ہے اور ذاتی مفاد کی خاطر وہ کسی بھی مصلحت کی بنا کر اسے کا خار جان کر اپنے دوست کا پتا بھی صاف کر سکتا ہے۔ اور تمہیں یہ دوستی کا ناکہ رچاتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آ رہی؟ تم نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے ریٹا کو ساحل کے بہرہ پر میں دھڑ دھڑ آف دی ورنڈ میں بھیج دیا اور

کہتے ہو تم مجھ پر بہت شفیق اور مہربان ہو۔ وہ تو میری حکمت عملی کا مگنی رور میں تمہاری جھوٹی دوستی کی نذر ہو چکا ہوتا۔ یہ ہے تمہاری محبت اور دوستی؟“

”مصلحت اور منافقت کے درمیان حائل تمام پردے اٹھ گئے تو وہ بھی بدلے ہوئے انداز کے ساتھ بولا“ تم بھی مجی میری دسترس سے باہر نہیں رہے۔ میں جب جاؤں گا پھر ایک لوں۔ میں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا مگر اب کرنا ہوگا۔ میری ذمیل کا تم نے غلط مطلب لیا۔ تمہیں میرے اختیارات کا اندازہ نہیں۔“

”یہ ڈائلاگ کسی مرحوب اور مستحب شخص کے سامنے مارتا۔“ میں نے زہر خنہ لہجے میں کہا ”میں مانتا ہوں کہ یہی اونچی اپرچر والے ہو لیکن یہ بات کو اس ہے کہ میں تمہاری دسترس میں رہا ہوں۔ اگر تمہیں میرے بارے میں ذرا سامنے سراغ مل جاتا تو تمہارا ہر کارے کے لیے مجھ میں کچھ جاتے پھر میری شرمگاہ اور تمہارا ہاتھ ہوتے؟“

”وہ پھر بیلے لہجے میں بولا“ فکر نہ کرو اب ایسا ہی ہوگا۔ مجھ سے مرحوب نہ کہیں لیکن مستحب ضرور ہو۔ تم پر چار امر کی شریوں ہمارا ڈیو ربی فریٹنگن ریٹا اور اٹھ منڈ کے کل کا اٹھ ہے (ایڈمنڈ وہ درواز قامت شخص تھا جو فریٹنگن کے پہلو میں مردہ پڑا تھا) دنیا کا کوئی ممالک تمہیں پناہ دینے کی غلطی نہ کرے گا۔ بھاکو۔۔۔ میں دیکھتا ہوں تم کتنا تیز بھاگتے ہو!“

”وہ شاطر بڑی صفائی سے نقلی وجدان کا تذکرہ کوئل کر رہا تھا۔ اس کے عزائم کی خطرناکی سے متاثر ہوئے بغیر میں نہ کہا۔

”ربی! اس نوعیت کا ایک الزام پہلے بھی مجھ پر ٹھکانا گیا تھا جب کراچی میں میں نے یہودی انسٹل ارب کی طرف نکل کر اس کی خوب روک کر بڑی شیا اور امر کی فائز ڈال کر کتے کی موت مارا تھا۔“ ایک لمحے کو متوقف ہو کر فرمایا ”ناؤٹ ملنے کی بارودی گزرو گاہ سے فرار ہونے وقت میں نے بولے۔ ایس آری کے چند افراد کو نقصان پہنچا دیا یہاں میں یٹین میں الطریقہ گرام اور سامن کو میں نے جو عذاب سے گزارا ہے وہ بھی تم سے بھی نہیں اور آئندہ بھی جانتے فتنہ پرور یہودی میرے ہاتھوں۔۔۔“

”سب۔۔۔ سب۔۔۔ جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کی اضطرابی آواز میرے سماعت سے ٹکرائی۔“ ان سب اموات کو تمہارا کھاتے میں درج کیا جائے گا۔ جھوٹی دوستی تم ایک درجن امریکی یہودیوں کو قتل کر چکے ہو۔ تم

مستحب ہی نہیں بلکہ ”مطلوب“ کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔ موٹ و ٹھنڈ پر سن فاری اینڈ آئٹش۔“

میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا ”ربی! تم تو مجھے ایل کاس کا بھی گردنات کرنے پر تلے بیٹھے ہو!“

”ایبل نے چند اہم افراد کو قتل کیا تھا۔ تم اس سے کہیں بڑے مجرم ہو۔“

”سی آئی اے کے ایجنٹ کہتے ہوئے تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے جو ”اہم افراد“ جیسے الفاظ استعمال کر رہے ہو۔“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کت چلا گیا۔“ ایبل کا جرم اسے پوری دنیا میں دوڑا تا پھر اور بالآخر ہم نے اسے گرفتار کر لیا اور وہ بھی تمہارے ہی ملک سے۔ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں خفاور ”آئی“ اب وہ ہماری گرفت میں ہے۔ اس پر امریکا میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور عقرب اسے بدترین سزا سے بھی گزرا جائے گا۔“

اس وقت تک ایبل کاس کا انجام نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”موٹے ہاتھن! میں ایبل نہیں ہوں جو سی آئی اے کے ایجنٹوں کے ڈر سے ایک ملک سے دوسرے ملک بھاگتا پھر دوں گا۔ میں اس وقت تم لوگوں کے اندر گھسا بیٹھا ہوں۔۔۔ اور اندر وہ کر رہی تمہارا کبڑا کرتار ہوں گا۔“

”سی آئی اے کی یونین!“

میری زبان سے ادا ہونے والا آخری جملہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ ایسا پہنچ آج تک کسی شخص نے امریکا بھاد کو نہیں دیا ہوگا۔ دوسری جانب ایک لمحے کے لیے موت کا سامنا کرنا ہوگا۔

”کیا تم اس ہت دھری اور یہود دشمنی میں اپنی ساتھی کو بھی فراموش کر دو گے۔ اگر تم آئٹش ہی میں بیٹھے رہے تو اس کا کیا ہوگا؟“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی خوف ناک ککڑے نے میرے دل کو ابی گرفت میں لے لیا ہو۔ میں تصور کی نگاہ سے اسے ایک ہوائی جہاز میں جو پرواز دیکھ چکا تھا اس کا غالب مطلب یہی تھا کہ امریکا سے باہر کہیں جا رہی تھی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا میں اپنے وجود کے سب سے اہم عضو کو فراموش کر رہا ہوں!

”کس سوچ میں تم ہو؟“ میری لمبائی خاموشی کے پیش نظر رہی نے مجھے غائب کرتے ہوئے ایک تجویز دی ”تمام تر دشمنی کے باوجود بھی میں تمہارے لیے ایک دردناک کھلا چھوڑ رہا

ہوں وجدان۔ تم اس دروازے سے گزر کر اپنی ساحل تک پہنچ سکتے ہو!“

میں پوچھے ”بتاؤ وہ سا“ ”تم کس دروازے کا ذکر کر رہے ہو؟“

”وہ بولا“ ”تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے سوال کیا تھا۔۔۔ میں کب کہاں اور کن شرائط پر ساحل کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔۔۔ تو لوٹ کر لو۔“

”وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔“ یہ شرائط نامہ صرف ایک شخص ہی فرمائش پر مشتمل ہے۔ اگر ساحل کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلی فرمت میں میرے پاس اسرائیل چلے آؤ۔“

”وہ بہت ہی گہری چال چل رہا تھا۔ اس پیش کش کے زور پر وہ مجھے پناہ گاہ سے نکال کر منظر پر لانا چاہتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی ناکامی کا اعتراف بھی تھا۔ اس کا یہ دعویٰ نہ دیوار کی سی حیثیت کا حامل تھا کہ وہ جب اور جہاں چاہے مجھے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے!

میں نے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے اس نے کہا ”اسرائیل آنے کی دعوت تو تم مجھے اس طرح دے رہے ہو جیسے ساحل بھی وہاں موجود ہو!“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ ”وہ رعب دار آواز میں بولا“ ”صرف اتنا بتاؤ کب اور کس فلائٹ سے اسرائیل پہنچ رہے ہو۔“ ”ایئر پورٹ پر میرے خاص آڈی تمہارے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں سیدھا میرے ٹھکانے پر پہنچا دیں گے۔“

”ربی! میں تمہارے ظرف اور مہمان نوازی کو سیلیوٹ کرتا ہوں۔“ ”میرے الفاظ میں طنز کے نشتر جیسے تھے درجن ہزار افراد کے قاتل کو تم تنہا کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہے ہو!“

”یہ بھی دشمنی کا ایک انداز ہے۔“ ”وہ غریب لہجے میں بولا“ ”تمہاری مجرمانہ حیثیت اپنی جگہ لیکن اگر تم امریکا سے اسرائیل آجاتے ہو تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا کر دوں گا۔ تم ساحل کو یہاں پاؤ گے۔“

”میری اس سے بات کراؤ۔“ میں نے اچانک ایک ہانسر مارا۔

”وہ ہکاری سے بولا“ ”وہ اس وقت ہاتھ لے رہی ہے۔ ابھی ابھی سوکر اٹھی ہے۔ سوری میں تمہاری فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔“

مجھے اس کی عیاری پر غصہ آ گیا ہے۔ بے ساختہ میرے

منہ سے نکلا: "کاش! لاکھوں کروڑوں یہودیوں کو یہ پتا چل جائے کہ ان کا ربی مرتی کتنے فرمائے سے جھوٹ ہوتا ہے۔" نیز بھی صورت والے کسی شخص کو آئینہ دکھا دیا جائے تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ ربی کی سیرت میں نیز ہا اور نہایت میں پھر تھا میرے الفاظ کی جتنی نے اسے آتش زریہ کی کیفیت میں پہنچا دیا میری ہی سے بولا۔

"کیا بک رہے ہو؟"

"میں یہ فرما رہا ہوں کہ ساحل اس وقت ایک ہوائی جہاز میں سبز کر رہی ہے۔"

دوسری جانب متافانہ خاموشی چھا گئی پھر ربی کی سرسراہٹ ہوئی آواز ابھری "اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں میرا برا انداز درست ہے!"

میں نے اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ میرے بارے میں کس قسم کی انداز سے بازی کرتا رہتا ہے۔ ربی کا واضح اشارہ میری اس غلطی صلاحیت کی جانب تھا جس کے طفیل میں ساحل کی توقع پذیری سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے ربی کی ٹھہری ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی۔

"لوہک جہادان! میں تمہیں اپ گریڈ کر رہا ہوں۔" "اور گریڈ اور ڈی گریڈ نہ کرنا۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔" میں نے مسخرانہ انداز میں کہا "ہائی سب گریڈ چلیں گے!"

وہ میرے نظروں سے گزر کر نظر انداز کرتے ہوئے بولا "اگر تمہاری سامی اس وقت طیارے میں ہے تو میرے ہی حکم پر ہے۔ اس وقت یہاں اسرائیل میں دن کے بارہ بجتے والے ہیں۔ جب نیویارک کی گھڑیاں اس وقت کو چھوٹیں گی تو ساحل میرے پاس پہنچ چکی ہوگی۔ اور اب اس کی حیثیت مہمان کی نہیں بلکہ قیدی ایسی ہوگی۔ تم اپنی کسی بھی ذہنی اور روحانی صلاحیت کے بل بوتے پر اس تک کسی بھی قسم کی رسائی حاصل نہیں کر سکو گے۔ تم جانے ہو میں عملیات کے شعبے میں کیا کیا کر سکتا ہوں۔ نیویارک میں تو بارہ بجیں گے ہی میں نے تمہارے بھی بارہ نہیں بجادیے تو میرا نام بھی ربی موٹے ہاتھ نہیں! میں دیکھتا ہوں تم کب تک اور کس بل میں چپ کر بیٹھے رہے ہو۔ میں تمہارے لیے ایسا شیرہ لگاؤں گا کہ کسی دیوانی کبھی کے مانند تم سر دھتے ہوئے میری جانب لپکو گے۔ اسرائیل میرے قدموں میں پہنچو گے!"

"میں تمہارے لیے عزرائیل بن کر اسرائیل پہنچوں گا۔" میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا "تو یو بیڈ لک کبی لوٹے ڈیمن!"

ہات ختم کرتے ہی میں نے سبل کو آف کر دیا پھر بڑے اطمینان سے اپنی سائیکل کا شیشہ گرہا اور اس دیتی موہا لکڑیوں کو کھڑکی سے باہر بین بینوں کی ٹھہری ہوئی نغصا میں دور اچھل دیا۔ یو کیب اتنی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ اس ایجنٹ نے میرے دیے ہوئے "تختے" کا کس طور استقبال کیا یہ معلوم نہ ہو سکا۔

میں شیشہ چڑھا کر سیدھا ہوا ہی تھا کہ دیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اگر اب تک تم فریس آؤٹ نہیں ہوئے یا فریس آؤٹ نہیں کیا گیا تو آئندہ اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔ ربی سے ہونے والی تمہاری طویل گفتگو بڑی خطرناک اور اچھل چانے والی ہے۔ تم اس وقت ہائی رسک پر ہو۔"

"تم نہیں..... ہم کا لفظ استعمال کرو۔" میں نے وڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا "تم نے ٹریک اور رسک کے حوالے سے دھماکا مینڈا پایا ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس وقت میں ایک ایجنسی کیسی والے کے ساتھ بیٹھا ہوں جو مجھے میری منزل پر پہنچانے کے بعد کرایہ وصول کرے گا اور آگے بڑھ جائے گا۔"

ربی سے ہونے والی بات چیت کو یک طرفہ طور پر دیم نے بھی سنا تھا اور نفس گفتگو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کی تشویش بھی مجھے اس وقت بہت مختلف موڈ میں تھا۔ یہ اسے آزمانے کا موقع بھی تھا لہذا میں دھوکا رہا۔

"آئی ایم ویری سوری یار۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں جلدی سے بولا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم دونوں اب ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا دکھ کچھ نفع نقصان مشترک ہے۔ پتا نہیں ہے دھیانی میں میرے منہ سے کیا نکل گیا۔" "ایمن آئی ایم سوری۔"

"وسم!" میں نے بدستور وڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے غصے لہجے میں کہا "میری تو ساری زندگی ریڈارٹ اور ہائی رسک پر گزری ہے لہذا ربی سے بڑے والا دھل میرے لیے معمول کی بات ہے۔ البتہ تم اگر یہ محسوس کر رہے ہو کہ....."

"سوری بول دیا یا یار۔" وہ بخلی آواز انداز میں بولا "کو تو اسٹرینگ چھوڑ کر تمہارے پاؤں پڑ جاتا ہوں۔ اس طرح اور کچھ ہونہ ہو رہی کا کام ضرور آسان ہو جائے گا۔ ہائی اسپڈ! دوڑتی ہوئی کسی گاڑی کا اسٹرینگ چھوڑنے کا مطلب جانتے ہوتا؟"

"کافی کاموڈ ہو رہا ہے!" میں نے سادگی سے کہا۔ دیم کی دوستی اور اخلاص کو کسی آزمائش کی ضرورت نہیں

تھی۔ وہ سوال میں نے اپنے حالات کے دھاؤ کے تحت اس سے کیا تھا۔ اس نے گزشتہ رات میرے ساتھ جس سڑک کا آغاز کیا تھا آگے چل کر وہ پتا نہیں اسے کیا کیا رنگ دکھاتا اس لیے ابتدائی مرحلے پر ہی اس کی ڈرائیگ کیلنگ مناسب تھی۔

کانی کے ذکر پر اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور کانی دیر تک خاموش نظر سے دیکھتا چلا گیا۔ میری سنجیدگی میں جب کوئی فرق نہ آیا تو اس نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس وقت کون سا کانی ہاؤس کھلا ہوگا!"

میرے دل و دماغ میں نفرت کا ایک الاؤ روشن تھا۔ مخصوص منافقانہ اور دغا بازی بودی ذہنیت سے نفرت کسی بھی قوم کے سارے افراد ایک جیسے نہیں ہوتے مگر یہودی دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جن کے عمومی حجاز میں قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ میں اس وقت ایک خاص کیفیت میں تھا اس لیے دیم کی بات کے جواب میں کہا۔

"یار ایہ میں نہیں ہے! امریکیوں کا لنڈا ہاؤس۔ اس کا نام تو نئے منہ ہونا چاہیے۔" میں ایک ترک میں ہوتا چلا گیا "اپنا پیارا وطن سب سے اچھا ہے۔ پاکستان کے دل لاہور اور دماغ کراچی میں ہے "بے روٹی" تو دیکھنے میں نہیں آتی!"

"میں ہمیں کے بعض کیسینو تو ساری رات کھلے رہتے ہیں۔" دیم نے ڈرائیو تک جاری رکھتے ہوئے کہا "مگر کسی کانی ہاؤس کا آن سرورس شام حال ہے۔"

میں نے مذاق کے رنگ میں جلدی سے کہا "کیسینو اور دم میں جانے کا مجھے شوق نہیں۔ اگر کانی نہیں مل سکتی تو واپس اپارٹمنٹ چلو۔"

"میں ٹیمیز ڈسٹرکٹ کو فرامی کرتا ہوں۔" دیم نے کہا "شاہیڈ ٹائمز اسکوائر میں بات بن جائے۔ وہاں کی رونق آسانی سے ختم نہیں ہوتی۔"

تیرہ میل طویل اور دو میل عریض مین مینن کے علاقے کو مختلف اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے اور وہاں کی خصوصیت کے ٹیپا نظر اضلاع کے نام رکھے گئے ہیں۔ بینکنگ، اشاک ٹریڈ اینڈ ٹرانس کے لیے فائٹل ڈسٹرکٹ۔ بلوسات شوڈ بیوٹی سلیون اینڈ پارلر ٹکنر اور ہر قسم کے پہناوے کا مرکز کارمنٹ ڈسٹرکٹ۔ شوپز اور پیچہ ہاؤسز کی منڈی ٹیمیز ڈسٹرکٹ وغیرہ وغیرہ۔

ہر دیم کا اپنا ایک چلن ہوتا ہے۔ خوش یا بد اس سے بحث نہیں! سکھ ایونڈ لیٹھ ایونڈ ویسٹ فورٹی اسٹریٹ

اور ویسٹ ترمین اسٹریٹ کے درمیان واقع منطیل قطعہ میں ہمیں "ٹیمیز ڈسٹرکٹ" کہلاتا ہے اور ٹائمز اسکوائر اس ڈسٹرکٹ کا دل ہے۔ ٹائمز اسکوائر درحقیقت براڈوے سینتھ ایونڈ اور ویسٹ چوالیس اسٹریٹ کے انٹرکشن سے وجود پاتا ہے۔ اس کا کک نیم "ڈی کر اس روڈز آف دی ورلڈ" ہے۔ یہاں ہر وقت رنگ و رنگ کا ایک سیلاب سا آہا رہتا ہے۔ آپ یہاں کی عمارتوں کو نیون سائز کی باریک سمجھ لیں۔

دیم نے یلو ڈیلیٹین "ایم۔ ٹی دی" براڈ کا شنگ بلڈنگ کے نزدیک سے گزاری اور دوسری جانب میکڈونلڈ کو پہلو میں چھوڑتے ہوئے "ڈی ڈی اسٹور" پہنچ گیا۔ ڈی ڈی اسٹور کے اندر متحد ریٹوڈنٹس کانی ہاؤسز، ہوٹل، پھول اور دفاتر واقع ہیں۔ اتفاق سے ہمیں اپنے مطلب کا ایک کانی ہاؤس کھلا مل گیا۔

اپنی طلب پوری کرنے کے بعد جب ہم واپس شوگر مل پہنچے تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔ دیم حد سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس سنجیدگی میں ایک خاص قسم کی انہمن پائی جاتی تھی۔ میں نے اسے نولنے کے لیے ربی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"پتا نہیں اس بندے کے ذرائع اطلاعات کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سن شائن اپارٹمنٹ اور سب دے ٹریک والے واقعات کو چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ برنگ اسٹوریز اس تک پہنچ گئیں۔ میری تو سمجھ کام نہیں کر رہی!"

دیم میری چال میں آگیا "سنجیدگی کو توڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا "وہاں ار بی تو جو ہے سو ہے مگر تم بھی بہت اونچی چیز ہو۔ تمہارا نیوڈ میٹ ورک میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"نیوڈ میٹ ورک؟" میں نے تعجب نیز نظر سے اسے دیکھا۔

"اور نہیں تو کیا۔" وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا "ہم نقلی ویدان اور اصل سیاحل کے پیچھے لپک کر سس لائن پر سوار ہوئے لیکن جب فرین کے اندر ساحل نظر نہیں آئی تو تم نے فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ فرین پر سوار ہی نہیں ہوئی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں، تمہیں ساحل کے بارے میں یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنے جگے کو آگے بڑھا جاتے ہوئے بولا۔

"اور تھوڑی دیر پہلے تم نے ربی کے منہ پر الفاظ کا طمانچہ رسید کرنے کے لیے انکشاف کیا کہ ساحل اسرائیل میں نہیں بلکہ کسی ہوائی جہاز میں موجود ہے۔ یہ اچھا کج خرم تک کیسے

پہنچی؟ رلی نے تمہارے انکشاف کی تردید نہیں کی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

”تم غلط کہہ رہے ہو اور نہ ہی تمہارے سوال کرنے پر کوئی پابندی عائد ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اسے گلے سے لگایا پھر اس کی پیٹھ پیچکتے ہوئے بڑے رसान سے کہا۔

”میں نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کے بارے میں بعض باتیں تمہیں نہیں بتائی تھیں۔ چھپانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا بلکہ میں اس گفتگو کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔۔۔۔۔ اور میرا خیال ہے اب وہ مناسب موقع آ گیا ہے۔“

دیسم نے مجھے سختی سے سمجھنے لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے وجود الگ ہوئے تو دونوں کی آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی۔ یہ غم کی نہیں خوشی کی نمی تھی۔ اعتبار اور اعتماد کی دلیل تھی جو ہم ایک دوسرے پر کرنے لگے تھے۔ اس ایثار اور قربانی کا ثبوت تھی جس کے جذبات ایک دوسرے کے لیے ہم اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔

آئندہ ایک گھنٹے میں میں نے دیسم کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

دنیا میں جتنے بھی منہ بولے رشتے پائے جاتے ہیں ان میں سب سے پائیدار اور کھرا رشتہ دوستی کا ہے۔ ہمارے درمیان یہ رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اگر خالص رشتے کی عمارت کھڑی کرنا ہو تو بنیادیں پر رکھنا چاہیے!

☆☆☆

دماغ کو مخصوص ہدایات دے کر سونے کا فائدہ یہ ہے کہ نیند کے دوران میں یہ کسی ہوشیار کو چھوڑ کر کی طرح نہ صرف بیدار رہتا ہے بلکہ آپ کے احکام کی نیل بھی کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

میں سات بجے صبح سونے کے لیے لیٹا اور اپنے دماغ کو دوپہر گیارہ بجے تک مسکون اور محفوظ نیند کی ہدایت کی مگر وہ بجے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا میرے ماحول میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی ورنہ یوں مقررہ وقت سے پہلے میری آنکھ نہ کھلتی۔

میں نے بستر پر لیٹے لیٹے پہلے اس کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں سب ٹھیک تھا۔ میں نے بستر چھوڑ دیا اور دیسم والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ خبرسور ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ کے دیگر حصوں میں بھی امن و امان قائم تھا۔ اس کا بھی مطلب تھا جو بھی غیر معمولی بات ہوئی تھی اس کے اثرات ابھی تک

اپارٹمنٹ کے اندر نہیں پہنچے تھے مگر۔۔۔۔۔ کسی بھی وقت پہنچ سکتے تھے۔

میرے کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی سمت کھلتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور مذکورہ کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اپارٹمنٹ اس بلڈنگ کے سیکینڈ فلور پر واقع تھا۔ میں نے پردہ ہٹانے بغیر ہاتھ ڈال کر ایک مخصوص فلٹیک سے کھڑکی کھول لی اور ایک سائیز سے مختلا انداز میں پردہ سرکا کر باہر سڑک کا جائزہ لینے لگا۔ اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ میرے دماغ نے بردقت مجھے ایک بڑے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ نیچے سڑک پر پولیس کی تین گاڑیاں آگے پیچھے آکر رکیں اور درجن بھر پولیس والے باہر نکل کر اس عمارت کے داخلی دروازے کی سمت بڑھے جس میں دیسم والا اپارٹمنٹ واقع تھا۔ میرے اعصاب تن گئے اور میکا کی انداز میں نے دیسم والے بندروں کی جانب قدم بڑھا دیے۔

پولیس والے اپنی مخصوص نیلی یونیفارم میں تھے۔ انہی کے کچ میں نے ایک دوسو ٹیڈ یونیٹ افراد کو بھی مستعدی سے آگے بڑھتے دیکھا تھا۔ اس کا بھی مطلب تھا یہ پولیس سے کچھ اوپر کا معاملہ تھا۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا، دس مقصد سے عمارت میں داخل ہوئے ہیں مگر پیش آمدہ حالات کی بنا پر میرے ذہن نے یہی فیصلہ دیا کہ وہ میری تلاش میں وہاں آئے ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ تلاش ہائی لیول پر کی جا رہی ہے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ہمارے دروازے پر تیز دستک سنائی دیتی!

میں محض پانچ سیکنڈ میں دیسم تک پہنچا اور آئندہ میں سیکنڈ کے اندر میں اسے بھجوا کر بیدار کر چکا تھا۔ اس کے اعصاب مضبوط تھے کہ آنکھ کھولنے کے بعد اس نے کسی بڑبڑاہٹ اور افراتفری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تفصیل بیان کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا اور کہا۔

”ہمیں ابھی اور اسی وقت اپارٹمنٹ سے باہر نکلنا ہے ورنہ یہ فلیٹ ہمارے لیے جو ہے وہ ان کا ثابت ہوگا!“

اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میرے چہرے پر پہلے ہوئے مرتعش تشویش تاثرات نے اسے حالات کی نزاکت سے روشناس کر دیا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ہم اپارٹمنٹ کو لاک کر کے اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سیکینڈ اوپر تھڑ فلور کو ملانے والے زینے کی ٹرنک پر کوٹنے میں ایک کنگ سائز گملا رکھا تھا جس میں انڈر وئیلز کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ مذکورہ گملا تین ہائی تین فٹ کا تھا۔ اس کی اونچائی بھی کم و بیش اتنی تھی۔ نکل اس کے کہ پولیس والے

سیکینڈ فلور تک رسائی حاصل کرتے ہم لپک کر اس کھلے کے عقب میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ میں وہاں رک کر یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ واقعی میرے طلب گار ہیں!

دیسم نے سرگوشی کی ”وعدہ! کیا افتاد آن پڑی ہے؟“ میں نے این دوائے لی ڈیسی کی ہماری نظری کو اس عمارت میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔“ میں نے بھی سرگوشیانہ انداز ہی میں جواب دیا ”اگر وہ رلی کے حکم پر میری تلاش میں ادھر آئے ہیں تو سمجھو بہت بڑی افتاد نے تمہارے اپارٹمنٹ کا راستہ دیکھ لیا ہے۔“

”اوہ!“ اس نے متاسفانہ انداز میں سانس خارج کی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں کھلے کی اوٹ سے راہ داری کے دوسرے سرے کو نکلنے لگا۔ اس راہ داری کے دونوں سروں پر زینے بنے ہوئے تھے۔ میری نگاہ جس زینے پر جمی تھی وہ فرسٹ فلور کو سیکینڈ فلور سے ملاتا تھا اور جس زینے کے کوٹنے میں کھلے کے پیچھے ہم نے پناہ لے رکھی تھی وہ سیکینڈ اوپر تھڑ فلور سے ملاتا تھا۔ پولیس والے سیکینڈ فلور پر قدم رکھتے تو فوراً ہی میری نظر میں آ جاتے۔ اگلے ہی لمحے وہ میری نظر میں آ گئے۔ وہ صرف چار افراد تھے جب کہ نیچے میں نے درجن بھر کو دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کی حکمت عملی سے تو یہی لگا کہ باقی نیچے رک گئے ہیں تاکہ میرے فرار کی ہر کوشش کو نا کامیاب بنایا جاسکے۔ یہ بڑی سنسنی خیز صورت حال تھی۔

دوسیکینڈ بعد اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ لوگ میرے فراق ہی میں وہاں پہنچے تھے۔ ان چاروں کے قدم دیسم والے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کے سامنے رک گئے۔ وہ چاروں نہایت ہی مستعد اور مسلح تھے۔ دیسم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا تھا کہ پولیس کو اتنی شدہ سے اس کی تلاش ہوئی۔ وہ مجھے ہی سمجھتے ہوئے وہاں نازل ہوئے تھے۔ پتا نہیں رلی نے انہیں میرا کون سا استعمال شدہ پیز استعمال کیا تھا کہ وہ بالکل درست مقام تک چلے آئے تھے۔ دیسم اگرچہ جرم میں ملوث نہیں تھا تاہم مجھ سے دوستی اس کی جان کا وہاں بننے والی تھی۔ ایک پولیس والے نے اپارٹمنٹ کی ڈور پر بل پرانگی رکھ دی۔ ان کے توجہ بتاتے تھے اگرچہ چند لمحات میں دروازہ نہیں کھلا تو وہ اسے تو ذکر اندر گھس جائیں گے۔

”انہیں یہاں کے بارے میں کس نے بتایا؟“ دیسم کی مشکور سرگوشی ابھری۔

”یہ ساری باتیں بعد میں بھی سوچی جاسکتی ہیں۔“ میں نے ٹھہری ہوئی سرگوشی کی ”یہ بتاؤ اس عمارت میں آمدورفت کا“

کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

دیسم کا اپارٹمنٹ اس کھلے سے بچاؤ کی دوری پر تھا۔ ہماری سرگوشیاں پولیس والوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں پھر بھی ہم بہت زیادہ احتیاط کر رہے تھے۔ دیسم نے تجویز دی۔

”انہیں اپنی تسلی کر کے جانے دیں۔ اس وقت ہم یہیں پیچھے رہتے ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ اتنی آسانی سے نہیں ملیں گے بلکہ دروازہ تو ذکر تمہارے اپارٹمنٹ میں ڈھال کر بیٹھ جائیں گے۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر پولیس والوں نے دروازہ توڑنے کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ دیسم نے انہیں زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کندھے اچکا تے ہوئے کہا۔

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“

اس کے چہرے پر عاری تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس دوران میں پولیس والے اپنی توڑ پھوڑ کی کارروائی میں کامیاب ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارا کر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گئے۔

میں نے دیسم کے کندھے کو تھپکا اور سنستا تے ہوئے لہجے میں کہا ”چلو!“

اس نے نہیں پوچھا کہاں چلو! میں جیسے ہی تنگ سائز کھلے کی آڑ سے نکل کر اوپر جانے والے زینے کی سمت بڑھا، دیسم نے بھی میرے تعاقب میں قدم اٹھا دیے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ ہم عمارت کی چھت کا رخ کرتے۔ ممکن ہے وہاں سے فرار کی کوئی راہ دکھائی دے جاتی۔ نیچے کی جانب حرکت کرنا تو ایسا ہی ہوتا جیسے خود کو موت کے منہ میں دھکیل دینا۔ کسی غلطی میں کی جانے والی ہماری یہ حرکت بڑی بے برکت ثابت ہوئی!

ہم تھڑ فلور پر۔۔۔۔۔ مد میں پہنچے پولیس والوں کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ دونوں فلور کے درمیان زینے کے چودہ پندرہ اسٹیپ تھے۔ ہم نے وہ اسٹیپ تقریباً دوڑتے ہوئے طے کیے لیکن تھڑ فلور پہنچتے ہی ہم نے اپنی رفتار نازل کر لی۔ ہماری خوش قسمتی کہ راستے میں دیسم کا کوئی شناسا نہیں ملا اور ہم یہ تھڑ فلور کی عمارت کی چھت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شوکر بل کی وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ دیکر کئی رہائشی عمارتوں سے جڑی ہوئی تھی۔ ان میں سے اکثر پانچ منزلہ تھیں۔ ان عمارتوں کی تعمیرات کی ایک اور قدر مشترک سرخ انٹیش، بھورے پتھر اور ڈیج اسٹائل تھا۔

ہم ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت کے

اور سے گزرتے ہوئے کافی دیر کھل آئے۔ ہم اس وقت اس رہائشی علاقے کی آخری چھت پر کھڑے تھے۔ اگر مذکورہ عمارت کے زینے اگر تک ہم باہر نکل جاتے تو اس دوائے ملی ڈی (نیو یارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) والوں کا باپ بھی ہمارے پاؤں کی گرد کو نہیں چھو سکتا تھا!

میں چھت اور زینے کے بیچ حائل دروازے کی جانب بڑھا تو معلوم ہوا اسے دوسری طرف سے لاک کیا گیا ہے۔ یہاں مجھے جی کی قوت کو آزمانا پڑا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ہم اس عمارت کا زینہ اتر کر باہر شریک پر قدم رکھ چکے تھے۔

لو سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا تاہم سورج کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گہری دھند نے پورے نیویارک کو اپنی پلیٹ میں سیٹ رکھ رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا اگر مزید ٹھوڑی دیر تک پوری مٹی فضا میں رہا تو کانپنے لگوں گا۔ درجہ حرارت اگر صفر سے نیچے نہیں تو اس پاس ضرور تھا۔ اس وقت ہمارے جسم پر مناسب گرم لباس بھی نہیں تھا۔ جس ڈریس میں سوئے تھے اسی میں اٹھ کر بھاگنا پڑ گیا تھا۔ میرا سامان تو دھک ہنگ کے گھر رکھا تھا۔ دیکھ بھی جس افراتفری میں بھاگا تھا اس میں کوئی سامان سینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ غیبت تو کہ دالت اس کی جب میں موجود تھا وہ نہ دم کے سلسلے میں بڑی مشکل ہو جاتی۔

دواسٹریٹ تک "چھل قدمی" کرنے کے بعد ہم نے ایک بلیو کب پکڑی۔ دیکھنے سے ڈرائیور کو "لی ناکس" ایونو چلنے کو کہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا لی ناکس (LENOX) ایونو کہاں ہے اور دیکھ وہاں کیوں جانا چاہتا ہے۔ سردست سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہم جائے وقوعہ سے دور جا رہے تھے۔ پتارے والی کن اپارٹمنٹ پر ہی رہ گئی تھی جب کہ خطرناک خنجر اپنے کیس کے اندر ہماری پنڈلی پر موجود تھا۔ میں نے اس ہتھیار کو اپنے جسم کا حصہ بنا لیا تھا۔

جیسی میں سفر کے دوران میں ہمارے درمیان گفتگو نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اپنی اپنی سرگرمیوں میں ڈوبے رہے۔ دیسٹ دن ٹوٹی سکس اسٹریٹ پر دیکھنے کی جگہ کو دیکھ کر ایسا دکھانے کے بعد ہم نے جیسی چھوڑ دی۔ ہم اسٹریٹ کے کنارے پیدل ہی چلنے لگے تو میں نے دیکھ سے استفسار کیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"سولویا!" اس نے ایک لفظ پر اپنی جواب دیا۔

"سولویا!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا "کیا یہ کوئی تمہاری گریڈ ہے؟"

وہ زرب ب سنجیدگی سے مسکرایا اور بتانے لگا "سولویا ایک کوالٹی فور ریسٹورنٹ ہے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں بیٹھنا ہی ہے تو کیوں نہ لگے ہاتھ ناشتا بھی کر لیں۔"

"اچھا ہے۔" میں نے متنی خیر انداز میں کہا۔

اس نے بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کیا "دیکھ بغیر ہی فیصلہ سنا دیا۔"

میں سمجھ گیا دیکھ کا اشارہ سولویا ریسٹورنٹ کی جانب تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں ریسٹورنٹ کی نہیں تمہارے آئیڈیا کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ!" اس نے دو مٹی انداز میں مجھے دیکھا اور بولا "وینے ریسٹورنٹ بھی رہیں اور..... اس کی مالکن سولویا اپنی عمر سے بیس سال کم لگتی ہے۔"

اب کے میں نے ایک طویل "اوہ!" خارج کی اور پوچھا "وینے اس کی اصل عمر کتنی ہے جو وہ بیس سال کم کی دکھائی دیتی ہے؟"

"وہ بچاس کے بیچے میں ہے۔" دیکھ نے بتایا۔

"کیا تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

"اکثر نہیں مگر ہمارا..." اس نے بتایا۔

"تمہاری سولویا سے دعا سلام تو نہیں؟"

"اے نہیں یار!" وہ جلدی سے بولا "سولویا کے بارے میں یہ معلومات تو ہمارے ہر دوسرے بندے کے علم میں ہیں۔ میرا اس سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں۔"

میں نے اطمینان بھری سانس چھوڑی۔ دراصل میں نے یہ تمام تر سوالات دیکھ سے اس لیے کیے تھے کہ کہیں سولویا کے ذہن میں یہ نہ رہ جائے کہ آج دیکھ کے ساتھ میں نے اس کے ریسٹورنٹ میں ناشتا کیا تھا۔ میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا اس کے پیش نظر یہ احتیاط ضروری تھی۔

تین سو انیس لی ناکس ایونو اور دیسٹ ایک سو چھپیس اسٹریٹ کے سنگم پر واقع "سولویا" نامی وہ ریسٹورنٹ واقعی ایک عمدہ مرکز تھا۔ اس کا اندرون جھلک کرین اور لین پلو وال بیچرز سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر بڑی بڑی عالی شان پلاسٹک کی موسم تیار اور فریم شدہ تصاویر آویزاں تھیں۔ یہ سب مشہور شخصیات کی تصاویر تھیں جن میں جیسی جیکسن، مسز میمر ڈکنز، ڈینی منڈیلا اور خود سولویا کی فریم شدہ تصویر سب سے زیادہ نمایاں تھیں "سولویا" کی خصوصی ڈشز میں کارن بریڈ، خربزہ، چکن سیب، آکھوس والے مشرو اور میٹھے آلو شامل ہیں۔

ہم نے ایک ہلکا چمکا آرڈر دیا اور دیکھ مجھے لہجے میں باتیں

کرنے لگے۔ میرے حالات میں پہلے ہی ایمر جیسی نافذ تھا تاہم ترین صورت حال نے مزید غصے کی دوڑا دی۔ میں تو در بدر "ایمر" کے ساتھ اب دیکھ کی بھی شامت آگئی تھی۔ پولیس یقیناً میری تلاش میں راہ سوچتے ہوئے اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچی تھی۔ وہ پتارہ اب گھر جانے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہا تھا اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا!

میں نے سمجھ لیا کہ میں اس سے پوچھا "تم گزشتہ دو سال سے نیویارک میں جیسی چار رہے ہو۔ کیا تم نے ایسا بھی کوئی دوست بنایا ہے جس کے پاس ایک آدھ دن قیام کیا جاسکے۔" فی الحال تمہارے اپارٹمنٹ کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے بتایا "فونی کیٹ نامی ایک لڑکی سے میری اچھی دوستی ہے۔ میں اسے فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔"

"فونی کیٹ!" میں نے زرب ب دہرایا "یہ کیوں ہے اور کیا کرتی ہے؟"

وہ بولا "فونی کیٹ ایک کلب ڈانسر ہے۔ ایل بار یو (EL BARRIO) میں رہتی ہے۔ ایل بار یو ہسپانوی کمیونٹی کا علاقہ ہے فونی بھی ہسپانوی ہے۔ ایل بار یو والے انکس کس ہسپانوی بولتے ہیں جس کا نام انہوں نے سپر انکس یعنی (SPANGLISH) رکھا ہوا ہے۔ اس علاقے کے تمام نوجوان سنسر "انکس" انکس "ہی میں دکھائی دیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا ایل بار یو یہاں سے قریب ہی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا "فونی کیٹ" ڈانس ٹیریا "نامی کلب میں جا رہی ہے۔ ڈانس ٹیریا (DANCE TERIA) میڈیسن ایونو اور پارک ایونو کے درمیان ایسٹ انٹیس اسٹریٹ پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے عالمی شہرت کی حامل گلوکارہ اور رقاصہ میڈیڈا نے اپنے کیریئر کا آغاز ڈانس ٹیریا ہی سے کیا تھا۔ اس کلب میں "ڈاک اینڈ رول" ٹنکری کا عجیب "بھی ہوتا ہے۔ اس کا عجیب میں سب سے زیادہ جتنی کشش رکھنے والے بدن کے حامل کونسل تین سو ڈاک انکس نامی دیا جاتا ہے۔"

میں نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور اس دوران میں ناشتے میں بھی مصروف رہا۔ میرے لیے ٹھکانے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اصولی طور پر مجھے سیدھا دھک ہنگ کی طرف رخ کرنا چاہیے تاہم پولیس کا تیزی سے حرکت میں آنا مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں ممکن تھا کہ اسی وقت این

دائے ملی ڈی کی دو تین گاڑیوں میں پولیس والوں نے دھک ہنگ کے ٹھکانے پر بھی چڑھائی کر ڈالی ہو۔ میں سب تک وہاں کی صورت حال سے آگاہ نہ ہو جاتا، ڈانوں کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے دیکھ سے کہا "تم ناشتا جاری رکھو۔ میں پانچ منٹ میں ایک ضروری فون کر کے آتا ہوں۔"

"فون کہاں سے کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے بتایا۔ پبلک فونز زیادہ مناسب رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تمہاری جب میں ہیں؟"

"ہاں سو ڈیڑھ سو ڈاکر کے ہیں۔"

"پبلک فونز استعمال کرنے کے لیے ریزگاری چاہیے ہوگی۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "فون ٹین میں ایک کوارٹر (پچیس سینٹ) کا سکہ ڈالو تو کام چلے گا۔" بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے بٹوں سے ایک ڈاکر کا لوٹ نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور بولا "نیزو بیچر بھی بکڑلو۔ اس طرح ٹھکانا بھی ہو جائے گا۔"

دیکھ کی تجویز انتہائی محقول تھی۔ میں ایک ڈاکر کا لوٹ جیب میں رکھ کر کھانا ہاں لے کر آیا۔ نیزو اسٹینڈ کے لیے مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ میں نے "دی نیویارک ٹائمز" پائیس سینٹ میں خریدی۔ اس طرح ایک ڈاکر میں سے ساٹھ سینٹ مجھے واپس مل گئے۔ پچیس سینٹ والے دو سکے اور ایک دس سینٹ والا۔ امریکی ڈاکر کی ریزگاری پانچ دس پچیس اور پچاس سینٹ کے سکوں پر مشتمل ہے۔ پانچ سینٹ کا سکہ کھل "دس سینٹ کا سکہ ڈانم" پچیس سینٹ کا سکہ کوارٹر اور پچاس سینٹ کا سکہ ہاف ڈاکر کہلاتا ہے۔ ہاف ڈاکر کے سکے پرسون لی انٹونی کی شبیہ موجود ہے۔ پچیس سینٹ کا سکہ سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ ٹیلیفون فونز سگریٹ وغیرہ اور دیگر مشینوں میں استعمال کے لیے اسی کی زیادہ مانگ ہے۔

شدیدہ اخبار کو میں نے بغل میں ڈبایا اور داخل انداز میں چلے ہوئے ایک پبلک ٹیلیفون فون میں کھس گیا۔ اگلے ہی لمحے میں چائنا ٹاؤن میں دھک ہنگ کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ میں نے پبلک گھر کو ڈالی کیا تھا۔ میری فرائیڈ کا میاں رہی۔ تیسری گھنٹی پر مسٹر ہنگ نے فون ریسید کر لیا۔

میری آواز پہچانتے ہی وہ تشریف بھرے لہجے میں بولا "تم کہاں ہو دو جہاں! امی پوری رات تمہارے انتظار میں جاگتا رہا ہوں۔ تم خود آئے اور نہ ہی کوئی فون کیا۔"

آتش فشاں (247) حصہ 11

آتش فشاں (248) حصہ 11



”بس حالات اتنی تیزی سے پیش آئے کہ میں تم سے رونا نہ کر سکا۔“ میں نے غلط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا ”تم سناؤ وہاں چاکنا ناؤں میں تو سب خیریت ہے۔“ پولیس نے میرے حوالے سے تمہیں بچ کر کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟“

دنک ہنگ نے بتایا ”ابھی تک تو خیریت ہی ہے لیکن تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم کسی لمبے پھندے میں پھنس گئے ہو!“

”ہاں ایسی ہی صورت حال ہے۔“

”میرے پاس چلے آؤ۔“

”آئیں بھڑکے منہ اٹھائے نہیں آ سکتا۔“ میں نے کہا ”این دائے ٹی ٹی والوں نے دسم کے اپارٹمنٹ پر ریڈ کیا ہے۔ ہم بڑی مشکل سے فلیٹ سے نکلے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں خواہ مخواہ تمہیں کسی بڑی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن تم سے ملنا بھی ضروری ہے۔ بہت سی اہم باتیں ڈسکس کرتا ہوں۔“

”تم اس وقت کہاں پر ہو۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا ”اپنی درست لوکیشن بتاؤ۔“

”میں دسم کے ساتھ سولاریٹورنٹ میں بیٹھا ہوں۔“

”تم کی ناکس ایوینو دالے سلاو کی بات کر رہے ہو؟“

”بالکل وہی۔“ میں نے کہا اور اپنی میز کی لوکیشن بھی اسے بتادی۔

”وہیں بیٹھو۔ میں دس منٹ میں تمہیں کال کرتا ہوں۔“ اس نے گھبر آواز میں کہا ”میں جوزف کے نام پر تمہیں فون کروں گا۔“

”کیا یہاں کا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟“

”ہاں ہے۔“ اس کے احماد سے ظاہر ہوتا ہے وہ سولویا میں آتا رہتا تھا۔ مذکورہ ریٹورنٹ کا نمبر دہراتے ہوئے اس نے کہا ”ڈیٹل ناٹن سکس زیر دھلی سکس زیر۔“

میں نے ریسیور کو کو بیل کیا اور پوچھ سے نکل آیا۔

جب میں سولویا کے اندر پہنچا تو دسم ناٹن سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھ سے فون کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور اخبار کھول کر پڑھنے لگا۔ ایک منٹ بعد ہی اس نے چونکے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔

”اب سمجھا پولیس میرے اپارٹمنٹ تک کیسے پہنچی ہے؟“

اس کی آواز دھیمی مگر لہجہ شیر خیز تھا۔ میں نے چونک کر

اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ”کیا تمہارے بارے میں کوئی خبر شائع ہوئی ہے؟“

”لو تم خود ہی پڑھ لو۔“ اس نے حلقہ منٹے پر کھلا ہوا نیویارک ٹائمز میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے وہ خبر پڑھی اور سانسے میں رہ گیا۔ واضح سن اسکوئر ہاؤسز کے ہاؤس نمبروں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا تھا۔۔۔ ایک روز پہلے مذکورہ اپارٹمنٹ میں کل اور غواہ کی جو واردات ہوئی تھی اس سلسلے میں مزید باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس واردات میں ملوث شخص ایک امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد ہے۔ اس نے ہاؤس نمبر انیس میں گرامر اور نارمن نامی دو افراد کو قتل کیا ان کے ایک ساتھی افریقہ کو مار پیٹ کر بے ہوش کیا اور چوتھے شخص سامن کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ ابھی تک سامن کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ پولیس کو اس کی ایک کاپی تلاش ہے جس میں وہ دہشت گرد واضح سن اسکوئر ہاؤسز تک پہنچا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی ڈراما بھی اس دہشت گرد کا کوئی ساتھی ہے۔ افریقہ کو قتل کرنے سے جلد ہی ہوش آگیا اور اس نے ایک کاپی کا نمبر لٹ کر لیا۔ یہ نمبر کچھ یوں ہے ”فور ناٹن۔ ای۔ ون ناٹن تھری ناٹن۔“ شہر یوٹا سے تیز زور دہلی ہے جیسے ہی کسی کو یہ کیس نظر آئے وہ فوراً پورے راکو طالع دے۔ سامن کی پراسرار کشمکش کا مطلب تھا ہارلم۔ پورے ابھی تک اس کی لاش دستیاب نہیں ہوئی تھی جس نے اخبار کے دیگر صفحات بھی دیکھ ڈالے مگر ناٹن شائن اپارٹمنٹ اور زمین دوز ریلوے ٹریک پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا تو دانستہ کی مصلحت کی بنا پر وہ خبر روک دی گئی تھی اور باہر یہ تفصیل ابھی اخبارات تک پہنچی نہیں تھی۔

”میری کیب کا نمبر اخبارات کی زینت بن گیا۔ کسی نے ہمیں سڑکیں ناٹنے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔“ دسم گہری تشویش سے بولا ”اسی لمحے پولیس کی ہماری جمعیت نے میرے اپارٹمنٹ تک رسائی حاصل کر لی۔ اب میں اپنے اپارٹمنٹ جا سکا ہوں نہ کسی استعمال کا رسکا ہوں اور نہ ہی فوٹی کیٹ مجھے پناہ دینے کو تیار ہوگی۔ اس معاملے میں پولیس بلا راست ملوث ہو گئی ہے۔ ایک امریکن مشین ہونے کے باوجود فوٹی کیٹم کا رسک نہیں لے گی۔ وہ میری کیب کے نمبر سے آگاہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے ہم اس کے پاس جائیں تو وہ مجھے پھانسنے ہی سے انکار کر دے!“

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے وہ تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی

پھانسان لے۔“ میں نے مختصر لہجے میں کہا تاہم انداز میں

رہی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ دسم نے حذب نظر سے

مجھے دیکھا۔

میں نے اپنا مطلب واضح کرتے ہوئے کہا ”امریکی عوام ایک لحاظ سے قابل ستائش ہے کہ یہ قانون کی مدد کرنے کے لیے اپنی جان کو جو کم میں ڈال دیتے ہیں۔ پولیس کی فعالیت میں ان کے تعاون کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔“ ایک لمحے کو خوف ہونے کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ یقین ممکن ہے تمہاری وہ سپالوی فوٹی کیٹ ہمیں دیکھنے ہی خوشی سے بھول جائے۔ وہ تمہارے ساتھ مجھے دیکھ کر فوراً سمجھ جائے کہ میں ہی وہ پاکستانی دہشت گرد ہوں جس نے واضح سن اسکوئر ہاؤسز والی واردات کی ہے۔ نیویارک ہٹزم میں شائع ہونے والی خبر سے واضح ہے کہ اسی خاطر میں کل کے اخبارات میں بھی اس واقعے کی خبریں شائع ہو چکی ہیں۔ امریکی عوام بہت باخبر اور ہاشور ہیں۔ فوٹی نے کل کے اخبارات ضرور دیکھے ہوں گے۔ وہ ہمیں بڑے چاڑے اپنے گھر کے اندر بٹھانے کی پھر پولیس کو فون کر کے ہمیں گرفتار کر دے گی۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔“ وہ گھر مند لہجے میں بولا ”کاش ہم نے کل کے اخبارات دیکھے ہوتے!“

”سانپ نکل جانے کے بعد کبیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے کہا ”فوٹی کیٹ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں میں کچھ اور بندوبست کر رہا ہوں۔“

”کیا بندوبست؟“

”دیکھتے جاؤ۔“ میں نے بہم لہجے میں کہا ”دیے اس خبر سے کہیں بے ظاہر نہیں ہوتا کہ تم اس پاکستانی دہشت گرد یعنی میرے ساتھی ہو۔ تم کہہ سکتے ہو میں نے گن پوائنٹ پر تمہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کیا تھا۔ یہ بات میں نے محض اس کی جمل کے لیے کہی تھی ورنہ صورت حال ایسی سیدھی سادی نہیں تھی۔

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھکتے لگا ”نہیں دھواں! شاید تم نے خبر کو غور سے نہیں پڑھا۔ پولیس کو میری جی کا نمبر بتانے والا افریقہ ہے۔ یہ وہی شخص ہے جسے میں نے فی مادیار کرنا قتل کیا تھا۔ ہم دونوں جبرائیل میں جس طور داخل ہوئے تھے اس انداز سے یہی ظاہر ہوتا ہے ہم دونوں ساتھی ہیں۔ میرے لیے دانی کا ہر دروازہ بند ہو چکا تھا۔“

”میں تمہیں داپس نہیں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دلی آواز میں کہا ”اب ہم ہر قدم ایک ساتھ اٹھا میں گے۔ تم اپنے اپارٹمنٹ اندر کیب کو

## کے عملی طریقے

### کتابیں سال پندرہ سو

- ♦ پیناٹیرم کی ابتدائی تاریخ
- ♦ پیناٹیرم کیا ہے؟
- ♦ پیناٹیرم کے مزید طریقے
- ♦ پیناٹیرم اور ذہنی گہرائیاں
- ♦ طبی استعمال
- ♦ اثر کی شدت
- ♦ جذباتی الجھنوں کا علاج
- ♦ روحانی قوتیں
- ♦ پیناٹیرم کے ذریعے شخصی خامیاں دور

قیمت: 50/- روپے

ڈاک خرچ: 23/- روپے

### کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313  
کس 5802551  
kitabiat1970@yahoo.com

رابطہ کیلئے: C-63 فیروز آباد  
یکسٹینشن ڈی ایچ اے میں ریلوے روڈ کراچی

# ٹیلی ویژن کی جدید تحقیقات

(باتصویر)

پاکستان کے سب سے بڑے ٹیلی ویژن چینل کی کتاب  
جس پر پہلی بار تحقیقی حقائق درج ہیں

کتاب کے چھ حصوں کی تفصیلات

- ▶ ٹیلی ویژن کی ایک علم، ایک سائنس
- ▶ ٹیلی ویژن کا ماضی اور حال
- ▶ ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی مختلف مشقیں
- ▶ ٹیلی ویژن میں یوگا کا استعمال
- ▶ غیر معمولی حس اور الٹے روایتی وقتیں
- ▶ مستقبل کی پیش گوئی

قیمت: 45/- روپے ڈاک خرچ: 23/- روپے

کتابیات پبلیکیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313 پکس 5802551  
kitabiat1970@yahoo.com

رابطہ کیلئے: 63 نیو الائنس سٹیشن ڈی این اے میں روزانہ کئی روز کراچی

اس کے بعد یہ ٹریک دن 'نو' قہری اور نائن لائن کی گزرگاہ بن جاتا۔  
ہم قہری لائن میں بیٹھے تھے۔ مذکورہ اسٹیشنوں کو بھیجے ہوئے وہ اسٹریٹ چمپاؤ نے اسٹریٹ پہنچا۔ لیکن سینئر اسٹریٹ اسٹیشن کو لیبیا سرکل اسٹریٹ پائیس بائیس اسکوٹر اسٹریٹ چوتیس پھولسٹا اسٹیشن اسٹریٹ چودہ ہولٹن اسٹریٹ کینال اسٹریٹ' جیمیز اسٹریٹ پارک پلئس' فلٹن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے وال اسٹریٹ کے اسٹیشن پر جا رہی۔  
ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو بائیں جانب اسٹریٹ پر سلیٹی رنگ کی وہ گاڑی موجود تھی جس کا نمبر مسٹر ہنگ نے مجھے بتایا تھا۔ مذکورہ گاڑی میں ننڈ گھاس نصب تھے۔ ہم ایک لمبے خلیجے گاڑی کے اندر جا بیٹھے۔  
"وہ کم اینڈ کم رنگ" ایک دنگ ہنگ نے گردن گھما کر مکرانے ہوئے چہرے سے ہمیں دیکھا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

میں پوچھے بناندرہ کا "مسٹر ہنگ ایہ سب کیا ہے؟"  
"کل ایک ایونگر میں تمہارے بارے میں خبر چمپی تھی۔ وہ ہاتھ پیرے تھے" تمہارے جانے کے بعد وہ اخبار پری نظر سے گزرا۔ خبر میں واٹکشن اسکوٹر ڈاؤن والا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ میں ایک مسٹر ایونگر (شام کا اخبار) کی بات کر رہا ہوں۔ "وہ ایک لمبے کوساں لینے کے لیے دکان پر جاتے ہوئے ہوا۔"  
"آج صبح کے تمام اخبار میں اس واقعے سے متعلق مزید خبریں چمپی ہیں۔ ڈھکے چمپے الفاظ میں تمہیں پاکستانی دہشت گرد اور امریکا دشمن قرار دیا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ سب بکھرے ہوئے ہاتھوں کے اشارے پر کیا گیا ہے۔"  
دنگ ہنگ میرے پیش آدہ تازہ ترین حالات سے بہ فوٹی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا "آج کل یہودی لابی سے ہماری بے گناہی ہوئی ہے۔"  
میں نے کہا "میں نے دی نیویارک ٹائمز میں ایسی ایک خبر پڑھی ہے۔"

"اس خبر کے بعد بھی بہت سی سسٹی خیر خبریں چل رہی ہیں دھواں!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو مسٹر ہنگ؟"  
ہنگ نے گاڑی وال اسٹریٹ سے نکال کر براڈوے ہاسلے کی اور کہا "جب تمہارا فون آیا اس وقت میں ناشتے سے

نکلتی تھی" فون پر تفصیلی بات کرنا مناسب نہیں تھی۔ تم دونوں فوراً سلیو سے نکلو۔ ایک اسٹریٹ کا فاصلہ پیدل طے کر دو۔ پھر ویسٹ ایک سو پچیس اسٹریٹ پر تمہیں سب دسے گا انٹرنل گلوب نظر آئے گا۔ تم وہاں سے "ایک پیرس قہری لائن" پکڑو اور سیدھے وال اسٹریٹ پہنچ جاؤ۔ جب تم وال اسٹریٹ والے اسٹیشن سے باہر نکلو تو بائیں جانب روڈ پر چمپیں سلیٹی رنگ کی ایک گاڑی ٹھہری نظر آئے گی۔ تم دونوں خاموشی کے ساتھ مذکورہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اندر چمپے جانا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں تمہیں بیٹھا ہوا ملوں گا۔ گاڑی کا نمبر "سی۔ ٹریل فورزیر وائیٹ ہے۔"

"اس قدر ازاداری سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ....."  
"پلیز وقت بہت کم ہے۔" اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنی ہی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔  
میں حیران پریشان نگاہ سے کارڈیس کو دیکھنے لگا۔  
دیس نے اٹھتے ہوئے لمبے لمبے پوچھا "کس کا فون تھا؟"  
"دنگ ہنگ کا۔" میں نے بتایا "میں فوراً وال اسٹریٹ پہنچا ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"  
"وہیں جا کر پتا چلے گا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد ہم نے سلیو میں ناشتے کا کل ادا کیا اور ریٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ سلیو ویسٹ ایک سو پچیس اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ویسٹ ایک سو پچیس والے انٹرنل گلوب تک پہنچنے میں ہمیں بہ مشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ ٹیکس دس بجے ہم ایک پیرس ٹرین "قہری لائن" پر سوار ہو گئے۔  
تھے۔ نقد پر کی بازی گری پڑی عجیب ہے۔ اب سے ٹیکس ہمارے گھنے پہلے یعنی گزشتہ رات دس بجے ہم دونوں پریڈیڈیٹی سی والے اسٹیشن سے "ای لائن" پر سوار ہوئے تھے اور..... نہ جانے کہاں کہاں سے کس کس "لائن" پر سوار ہونا نصیب ہوا تھا!

ویسٹ دن ٹوٹتی فائبر والے سب دسے اسٹیشن سے صرف دو ٹرینیں (نو اینڈ قہری لائنز) چلتی تھیں۔ یہ دونوں ٹرینیں لی ٹاکس ٹریٹل اور برکس کی طرف سے آتی تھیں۔  
اسٹریٹ ایک سو سولہ اور اسٹریٹ ایک سو دس کے اسٹیشنوں سے گزرنے کے بعد یہ سینٹرل پارک کے نیچے سے دوڑنے ہوئے اسٹریٹ ایک سو تیس سے ایک سو ٹریک میں داخل ہو جاتیں۔ اسی ٹریک پر واٹکشن ہائوس اور کنکڑ برج کی جانب سے آنے والی دو ٹرینیں (دن اینڈ نائن لائنز) بھی آتیں۔

زہن سے جھٹک دو۔"  
"جھٹک دیا۔" اس نے ہاتھ گردن کو جھٹکا اور بولا "ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی" یہ پاکستانی دہشت گرد اور امریکا دشمن والا آئیڈیا پیرس والوں کو کہاں سے مل گیا؟"  
میں نے پرسوج انداز میں کہا "اس کے پیچھے مجھے رہی کا مکار زہن کا کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ وہ ایک طرف مجھ سے دوستی کی کوشش میں تھا اور دوسری جانب پولیس کے توسط سے اس نے اپنا کام جاری رکھا تھا۔ اس کی منافقت آجرو دوستی دشمنی آجرو مصلحت پر مبنی تھی۔"

"وہ ابھی تک اگر ڈھکے چمپے انداز میں پولیس کو ایک امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد یعنی تمہارے پیچھے دوڑا چکا ہے تو آئندہ وہ کل درکار کرے گا۔" دس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "تم نے اس سے جو طویل بحث منگوائی ہے اس کے رد عمل کے طور پر اس کے اشارے پر تمہارا نام بھی منظر عام پر آ سکتا ہے۔ سن شائن اپارٹمنٹ اور سب دسے ٹریک والے واقعے کو وہ آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔"

"ہاں اب سب کچھ ممکن ہے۔" میں نے رمانیت بھرے لہجے میں کہا "ہمیں ہر نوعیت کی سنگین صورت حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اس نے پوچھا "وجدان احم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ فوری طور پر پناہ کے لیے تم کیا بندوبست کر رہے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا ایک دیگر کارڈیس تھانے جوزف کی تلاش میں ہماری میز کے قریب آ گیا۔ میں سمجھا کہ وہ دنگ ہنگ کا فون تھا۔ دیگر کارڈیس میں مجھے تمہا کر چلا گیا تو میں نے ریسیور کو کان سے لگا کر مائیکرو سیشن میں دھیرے سے "ہیلو" کہا۔

جواب میں دنگ ہنگ کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت سے گزری "اس وقت تم کس محلے میں ہو؟" وہ میرا نام لیے بغیر مخاطب ہوا تھا۔ اس کی احتیاط کو دیکھتے ہوئے میں سمجھ گیا کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے بھی غلط انداز میں جواب دیا "ایک اجنبی کے محلے میں اس محلے کو تم پہچان سکتے ہو۔"

میں نے دنگ ہنگ کے سامنے ہی میک اپ کیا تھا۔  
"اور تمہارا سامنا؟" اس نے دس کا نام لینا ضروری نہ سمجھا۔

میں نے جواب دیا "اپنے اصلی رنگ روپ میں۔"  
"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کیا۔  
میں نے پوچھا "کوئی گڑبڑ ہے؟"  
"بہت زبردست۔" اس کی سنگین آواز میری سماعت

”جبکہ دیا۔“ اس نے باقاعدہ گردن کو جھٹکا اور بولا ”ایک بات سمجھیں آری یہ پاکستانی و ہشت گرد اور امریکا دشمن والا آئیڈیالوژی پر بس والوں کو کہاں سے مل گیا“

میں نے ہر سوچ انداز میں کہا "اس کے پیچھے مجھے رہی کا مکار ذہن کا کام کھانا نظر آ رہا ہے۔ وہ ایک طرف مجھ سے دوستی کی کوشش میں تھا اور دوسری جانب پولیس کے توسط سے اس نے اپنا کام جاری رکھا تھا۔ اس کی منافقت آمیز دوستی دشمنی آمیز مصلحت پر مبنی تھی۔"

”وہ ابھی تک اگر ڈھکے چھپے انداز میں پولیس کو ایک امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد یی تنہا رہے بیچے دوڑا چکا ہے تو آئندہ وہ مکمل کردار کرے گا۔“ دسم نے ایک اہم نکتہ اٹھایا ”تم نے اس سے جو طویل علاج کھینکی ہے اس کے رد و بدل کے طور پر اس کے اشارے پر تمہارا نام بھی منظر عام پر آسکتا ہے۔ سن شائن اپارٹمنٹ اور سب دے فریک والے واقعے کو وہ آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔“

”ہاں اب سب کچھ ممکن ہے۔“ میں نے رسالت  
مجرے لکھ میں کہا ”ہمیں ہر نوعیت کی سنگین صورتِ حالات  
کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

اس نے پوچھا ”وہ جان اتم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ فوری طور پر پناہ کے لیے تم کیا بندوبست کر رہے ہو؟“

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا، ایک دیگر کارڈ لیس تھا۔ جسے جوزف کی تلاش میں ہماری میر کے قریب آ گیا۔ میں سمجھ گیا، وہ دو ہنگ کافون تھا۔ دیگر کارڈ لیس مجھے تھا کہ چلا گیا تو میں نے ریسور کو کان سے لگا کر ماؤتھ سیکشن میں دیر سے سے ”ہیلو“ کہا۔

جواب میں دنگ ہنگ کی سرسراہی ہوئی آواز میری سماعت سے گزرائی، ”اس وقت تم کس طبقے میں ہو؟“ دوسرا نام لے لے بغیر غائب ہوا تھا۔ اس کی احتیاط کو دیکھتے ہوئے میں سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے بھی محتاط انداز میں جواب دیا ”ایک اجنبی کے طبقے میں اس طبقے کو تم پہچان سکتے ہو۔“

میں نے دنگ بنگ کے سامنے ہی ایک اپ کیا تھا۔  
 ”اور تمہارا سامنی؟“ اس نے وسیم کا نام لینا ضروری نہ  
 سمجھا۔

میں نے جواب دیا "اپنے اصلی رنگ روپ میں۔"  
 "ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کیا۔  
 میں نے پوچھا "کوئی گڑبڑ ہے؟"

”بہت زبردست۔“ اس کی سنگین آواز میری سماعت

نیک بختی "نون پر فصلی بات کرنا مناسب نہیں۔ تم درووں نوراً  
 سلویاے نگو۔ ایک اسٹریٹ کا قافلہ پیدل طے کرو۔ پھر  
 ویسٹ ایک سو پچیس اسٹریٹ پر تمہیں سب دے گا انٹرنس  
 گلوب نظر آئے گا۔ تمہاں سے "ایک پیرس قمری لائن" نکلا  
 اور سیدھے وال اسٹریٹ پہنچ جاؤ۔ جب تم وال اسٹریٹ  
 والے انٹیشن سے باہر نکلو تو بائیں جانب دروازہ پر تمہیں نیلی  
 رنگ کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئے گی۔ تم درووں خاموشی کے  
 ساتھ مذکورہ گاڑی کا قطعی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ جاؤ۔  
 ڈرائیونگ سیٹ پر میں تمہیں بیٹھا ہوا ہوں گا۔ گاڑی کا نمبر  
 "سی۔ ٹریل فوربز روایت ہے۔"

”اس قدر ازداری سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ.....“  
 ”پلیز، وقت بہت کم ہے۔“ اس نے میری بات پوری  
 ہونے سے پہلے ہی انہی کئی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں حیران پریشان ہوا سے کارڈ لیس کو دیکھنے لگا۔  
وسیم نے اٹھے ہوئے لہجے میں پوچھا ”کس کا فون تھا؟“  
”دنک ہنگ کا۔“ میں نے بتایا۔ ”ہمیں فوراً وال

اسٹریٹ پہنچتا ہے۔  
 ”کیا کوئی خاص بات ہے؟“  
 ”دوہ جا کر تپا چلے گا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا

ہو گیا۔

اس کے بعد ہم نے سلویا میں ناشتے کا کمال ادا کیا اور  
ریٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ سلویا ویسٹ ایک سو چوبیس  
اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ویسٹ ایک سو چوبیس والے انٹرنس گلوب  
بنک پہنچے میں ہمیں یہ مشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ ٹھیک  
دس بجے ہم ایکسپریس ٹرین "نٹری لائن" پر سوار رہے  
تھے۔ تقریر کی بازی گری بڑی عجیب ہے۔ اب سے ٹھیک بارہ  
گھنٹے پہلے یعنی گزشتہ رات دس بجے ہم دونوں پردیسی ڈیپوٹی  
سی والے اسٹیشن سے "ای لائن" پر سوار ہوئے تھے اور  
جانے کہاں کہاں سے کسی کسی "لائن" پر سوار ہونا نصیب  
لگتا تھا!

دیسٹ ون ٹوٹھی فائو والے سب وے اسٹیشن سے  
صرف دو ٹریٹیں (ٹو انڈ تھری لائنز) چلتی تھیں۔ یہ دونوں  
ٹریٹیں لی ٹاکس ٹریٹل اور بروکس کی طرف سے آتی تھیں۔  
اسٹریٹ ایک سوسولہ اور اسٹریٹ ایک سو دس کے اسٹیشنوں  
سے گزرنے کے بعد یہ سینٹرل پارک کے نیچے سے دوڑنے  
ہوئے اسٹریٹ ایک سو تین سے ایک نئے ٹریک میں داخل  
ہو جاتیں۔ اسی ٹریک پر اسٹیشن ہائوس اور کنکریٹ برج کی جانب  
سے آنے والی دو ٹریٹیں (ون انڈ تھری لائنز) بھی آتی تھیں۔

[illegible]

ہم اسٹیج سے باہر نکلے تو بائیں جانب اسٹریٹ پر سلیش  
رنگ کی دو گاڑی موجود تھی جس کا نمبر مسٹر ہنگ نے مجھے بتایا  
تھا۔ مذکورہ گاڑی میں شیڈ گلاس نصب تھے۔ ہم ایک لمحہ ضائع  
کے بغیر گاڑی کے اندر جا بیٹھے۔

”دیل کم اینڈ مارٹک ا“ دنگ ہنگ نے گردن کھما کر  
سکراتے ہوئے چہرے سے ہمیں دیکھا اور گاڑی آگے  
بڑھا دی۔

میں پوچھے باندھ رہا تھا۔ ”مسٹر ہنگ ایسے سب کیا ہے؟“  
 ”کل ایک ایجنٹر میں تمہارے بارے میں خبر چھپی  
 تھی۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ ”اگر تمہارے جانے کے بعد وہ اخبار  
 پر کیا نظر سے گزارا۔ خبر میں اس کو سزا دیا۔“ وہ دوا  
 قہہ نکالنے سے بیان کیا گیا تھا۔ میں ایک مسٹر ایجنٹر (شام کا  
 اخبار) کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے  
 لیے کالج میں جاتا رہے ہوئے ہوا۔

”آج صبح کے تمام اخبار میں اس واقعے سے متعلق مزید خبریں چھپی ہیں۔ دیکھ لیں، پچھلے الفاظ میں جنہیں پاکستانی روشت گرد اور امریکا دشمن تر اور پایا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ سب بکھری ہوئے سامعین کے اشارے پر کیا گیا ہے۔“

دنک ہنگ میرے پیش آہدہ تازہ ترین حالات ہے یہ غرضی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا، آج کل یہودی لابی سے میری ملوثی کی طرف سے ہوئی ہے۔

خبر بھی ہے۔“ میں نے دی نودیار۔“ منتر میں ایسی ایک  
 ”اس خبر کے بعد بھی بہت سی سنسنی خیز خبریں چل گئی ہیں  
 (دعا)“

مہمان نے چونکہ اس کی طرف دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

ہم نے گاڑی وال اسٹریٹ سے نکال کر براڈوے  
ہالے لی اورد کہا ”جب تمہارا فون آتا اس وقت میں ناشتے سے

# ٹیلی ویژن کی جدید تحقیقات

**(تصویر)**

یہ کتاب کے مؤلف نے بیرونِ کربلا کی کتاب  
میں لکھی ہوئی شش ماہیہ سال ۱۳۸۵

تربیتی چیلر

یہی ایک علم، ایک سائنس  
 ٹیلی پتھی کا ماضی اور حال  
 ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی  
 مختلف مشقیں

▲ نیلی پتھری میں یوگا کا استعمال  
▲ غیر معمولی حسِ ادراک اور روحانی قوتیں  
▲ مستقبل کی پیش گوئی

بہت :-/45 روپے ڈاک خرچ :-/23 روپے

کتابیات و مطالعات اسلامی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802551-5895313-5802551 ٹیکس  
kitabiat1970@yahoo.com  
بٹلے کیلئے: C-63 فیز 11- تحریک ختم ہو جائے گی میں مرد کو کوئی روکڑ کرچی

فارغ ہو کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں ٹی وی بھی کھلا ہوا تھا۔ اخبار میں چھپنے والی تمہاری خبر میں نے پڑھی تو تم مجھے بہت یاد آئے۔ میں کل رات ہی سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔“

وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکھتا تو میری ربیودیت آئینہ مکاری پر دل ہی دل میں اسے سلووا تھی۔  
سے باز رہ سکے۔ اس نے طلحی دھدھان کے انجام کو اتنی  
کے ساتھ منظر سے ہٹایا یعنی ہٹایا تھا کہ بس! امریکا  
جمہوری ملک ہے اور وہاں کے پریس کی آزادی ہے اور  
دنیا واقعہ ہے لیکن انفس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے اور  
چھپی ہوئی حقیقت ہے کہ وہاں کا پریس صرف غیر امریکی  
خصوصاً کی حد تک ہی آزاد ہے ورنہ جہاں ”یہودی کار“  
معاہدہ آن پڑتا ہے تو کھر کی جینی کا قصہ سمجھ کر ناک کھینچ  
بجائے کے لیے عرب جعل پر دیز چارڈ ڈال دی جاتی ہے  
کہ طلحی دھدھان کے سلسلے میں ہوا تھا۔ ربی نے اس کی بجا  
موت کو سرے ہی سے غائب کر دیا کہ اس کی لاش (جہر)  
بڑے چند بارچہ جات کے نمبر (ڈاکو بھی کیش کر لیا تھا۔  
دھدھان ڈکلیئر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے ٹیکس  
سے ہٹایا جاتا اور ربی نے کچھ اسی قسم کا چکر چلایا تھا۔

ہنگ نے مزید بتایا "میری لنگ نیوز کے اختتام پر  
کاسٹرنے کہا ہے کہ اس بلوکیب والے کا نام ٹھکانا معلوم کر  
کی کوشش کی جارہی ہے۔ جلد ہی وجدان کو اس کے ٹھکانے  
سے گرفتار کر لیا جائے گا۔ سن شائن اپارٹمنٹ والے سہ-  
میں بھی دو بندہ وجدان کے ساتھ تھا لہذا پولیس کو بتائیں کہ  
وجدان نے اسی کے ٹھکانے پر پناہ لے رکھی ہے۔" "اوپر  
لے کر کو تھوٹے ہو اور پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”تمہاری ذمہ داریوں کے فریم بھی ٹی وی اسکرین پر دکھائے گئے ہیں۔ ایک اصلی تصویر دھندان کی صورت میں اور دوسری دھندان کے میک اپ میں۔ اس کے ساتھ ہی ٹی وی نے دھندان کے میک اپ کے ہاسیوں سے درخواست کی ہے کہ وہ ان میک اپ کے حامل افراد کو دھندان کے لیے اچھے میک اپ رکھیں اور جیسے ہی دھندان یا دھندان کہیں دکھائی دے گا، پولیس کو اطلاع دیں۔ تمہارے معاملے کو پیش کیے گا۔“

”اوہ!“ میں نے اضطرابی انداز میں اپنے چہرہ  
الٹایا سرسراتے ہوئے کہا ”شکر ہے میں اس وقت  
وہاں ہوں اور نہ ہی دسوا کے روپ میں۔ تم واقعی  
کہتے ہو مسٹر ہنگ! اب جس پتے پر مجھے تلاش کیا جا رہا  
وہ واقعی خطرناک صورت حال ہے۔“ پھر میں نے نہایت  
مختصر الفاظ میں اس شوگر ملی والے دسے کے اپنا  
پولیس کی ریڈ اور اپنے فرا کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

11-400-25

”اب تم دونوں این دوائے پی ڈی کو مطلوب ہو۔۔۔۔۔ اور ہو سکتا ہے آگے چل کر ایف پی آئی بھی اس کیس میں کود پڑے۔ امریکا کی پولیس اور فیڈرل ایجنسی جس معاملے میں دیکھی لینے لگے اس کے اوٹ کو کسی نہ کسی کرٹ بٹھا کر ہی دم لیتے ہیں۔“

”ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے اضطرابی انداز میں کہا۔

”دو بڑے سکون سے بولا“ میں کچھ کرنے ہی تو لگا ہوں۔ پس دیکھتے جاؤ۔“

ہات کے اختتام پر مسٹر ہنگ نے ننڈ گھاسر والی لگوری سٹی گاڑی ایک تین منزلہ شاندار عمارت کے سامنے روک دی۔ مذکورہ بلڈنگ پر ”سٹیری۔ ٹوئٹی دن۔“ کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ یہ عمارت ہائیں کورٹ لینڈ اسٹریٹ پر بڑا درے اور چرچ اسٹریٹ کے درمیان واقع تھی۔

مسٹر ہنگ نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا اور بولا ”میں ٹھوڑی دیر کے لیے اس عمارت میں جا رہا ہوں۔“ اس نے سٹیری ٹوئٹی دن کی جانب اشارہ کیا ”تم دونوں گاڑی کے اندر بیٹھو۔“ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ننڈ گھاسر کی بدولت باہر سے گزرنے والے لوگ گاڑی کے اندر ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے جب کہ ہم یہ آسانی باہر کی ہر چیز کا مشاہدہ اور نظارہ کر سکتے تھے۔ ہنگ نے ننڈ گھاسر والی گاڑی بہت سوچ سمجھ کر منتخب کی تھی۔ وہ جس عمارت میں گیا تھا وہ دیکھنے میں ایک چھوٹا ڈیپارٹمنٹل اسٹور نظر آتا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہاں کچھ خریداری کرنے گیا تھا۔

میرا یہ اندازہ درست لگتا کیونکہ جب وہ وہیں آیا تو اس کے ہاتھ میں تین چار شاہک بیگز موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”وہاں! تم بیچرز سیٹ پر آ جاؤ۔ فی الحال تمہارے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔“

میں نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور گاڑی کی عقبی نشست سے بیچرز سیٹ پر پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے ہنگ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”میں تم لوگوں کے لیے کپڑے جوئے اور میک اپ کا سامان خریدنے گیا تھا۔“ ہنگ نے بتایا ”تمہیں فوری طور پر ایک نئے روپ میں آنا ہوگا۔ عارضی یا مستقل اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں تمہیں نیویارک سے نکال دوں گا۔ یہاں تمہارے لیے خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔ تم اپنی سامی دالے معاملے کو بعد

میں دیکھ لینا“ آخری جملہ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ میری سامی سے اس کی مراد ساحل کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔

میں نے کہا ”مسٹر ہنگ! میری سامی کو مجھ سے پہلے یہاں سے رخصت کیا جا چکا ہے۔ آج لگ بھگ دوپہر با بجے وہ رہی ہوئے ہائیں کے پاس اسرائیل پہنچ جائے گی۔“

”رہی کب یہاں سے لکھا؟“ بے ساختہ اس کی زباں سے خارج ہوا۔

میں نے اسے رہی اور ساحل کے حوالے سے تفصیل سے پوری طرح آگاہ کیا اور کہا ”تمہارا آئیڈیا مجھے پسند مسٹر ہنگ! میں پہلی فرصت میں اسرائیل نکال جانا چاہوں گا ویسے تم نے ہمیں کدھر بھیجے کے بارے میں سوچا ہے؟“

”فی الحال میں تمہیں نیویارک اسٹیٹ سے ننڈ اسٹیٹ میں شفٹ کر رہا ہوں۔ یہ دونوں اسٹیٹ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔“ ہنگ نے گہری سنجیدگی سے کہا ”نیو جرسی میں میرے فوٹو اسٹوڈیو کی ایک برانچ ہے۔ دونوں تین چار دن تک وہاں قیام کر دوں گے۔ اس قیام کا پورٹ اور دیگر اہم کاغذات کی تیاری کا کام مکمل کر لوں گا میں ایک ایسے ایجنٹ کو جانتا ہوں جو ہماری معاوضہ لے اس قسم کے کام کرتا ہے۔“

”اوہ! میں نے ایک گہری سانس خارج کی تو کیا امریکا میں بھی ایسی ”ادراواتیں“ کھلے عام ہوتی ہیں۔“

”کھلے عام نہیں بڑے طریقے سلیطے سے چھپ کر ایسے کام کیے جاتے ہیں۔“ ہنگ نے بتایا۔

”امریکا میں بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ جو کام ہو دنیا کے انسان کرتے ہیں وہ یہاں بھی ہوتا ہے۔ پس مشکل سے ہوتا ہے اسی لیے معاوضہ زیادہ لیا جاتا ہے۔“

”مذکورہ ایجنٹ کو چالیس ہزار میں راضی کیا ہے۔“

”چالیس ہزار امریکی ڈالر؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ظاہر ہے! امریکا میں امریکی ڈالر ہی چلتے ہیں۔“

”کیا یہ وہ افراوکی ”تیس“ ہے؟“ میں نے لفظ نہیں

اجھا خاصا باؤ ڈالا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا ”اس رقم کے عوض تم دونوں کی فوٹو آئی ڈی ڈرائیونگ لائسنس ایف پی آئی پر (پیس) اور پاس پورٹ۔۔۔۔۔ امریکن پاسپورٹ تیار کر دے گا۔ تم دونوں ایسے غیر امریکی ہو گے جو طویل عرصے یہاں رہ رہے ہو اور مختلف مراحل سے گزر کر پہلے تمہارا

کارڈ بنا دو پھر تم گرین کارڈ ہولڈر بن گئے۔“

میں نے حیرت سے پلٹیں جھپکائیں اور پوچھا ”کیا یہ تمام دستاویزات اصلی ہوں گی؟“

”ایک دم اصلی۔۔۔۔۔ ریکارڈ کے ساتھ۔“ وہ یقین سے بولا ”اسی بات کے تو وہ ایجنٹ چالیس ہزار ڈالر وصول کرے گا۔ بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔ وہ تو پچاس ہزار سے ایک ڈالر نیچے نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال ایک آپشن میں نے رکھ چھوڑا ہے۔“

”کیا آپشن؟“ میں نے سوال کیا۔

”ظہرذاتنا ہوں۔“ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ کو قابو میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا موبائل نکال لیا پھر کی بیڈ پر ٹون ٹون۔ قہری ڈبل فائبر سیون ٹریل فائیو کے نمبر بیچ کرنے کے بعد موبائل کو کان سے لگاتے ہوئے بولا ”پہلے بیچ کے لیے ٹیبل بک کروالوں پھر بات کرتے ہیں۔“ اگلے ہی لمحے وہ کسی ریسٹورنٹ کے ریسپشن سے مخاطب تھا۔

”ہیلو دعوت ادرہ جعفری سے بات کروادیں۔“

شاہد دوسری طرف سے کہا گیا کہ ادرہ جعفری موجود نہیں ہے۔ ہنگ نے براہ راست بتایا اور بولا ”ٹھیک ہے“ جعفری سے بعد میں بات ہو جائے گی۔ فی الحال آپ تین افراد کے بیچ کے لیے کوئی مناسب لوکیشن کی ٹیبل روک لیں۔ میرا نام دنگ ہنگ ہے۔ جعفری مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ وہ میرے پاس چائنا ٹون آتی رہتی ہیں۔“

دوسری جانب سے ریزرویشن کی یقین دہانی کرائی گئی ہوگی چنانچہ ہنگ نے سلسلہ متعلق کر دیا۔ دعوت اور جعفری کے الفاظ نے مجھے اور دیم کو بے طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا اور ہمارا یہ چونکا ہنگ سے چھپائیں رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس سے کوئی سوال کرتا اس نے خود ہی وضاحت کر دی۔

”دعوت نامی ریسٹورنٹ مین ہائیں کا نمبر دن اٹھ پین ریسٹورنٹ ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ آج آپ لوگوں کی دیکھ لکھانوں سے تواضع کی جائے“ دعوت“ میں داخل ہو کر آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے اڈاپاک کے کسی اعلیٰ کوائٹی شاخراہ ریسٹورنٹ میں قدم رکھ دیا ہو۔“

”ادریہ ادرہ جعفری صاحبہ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

ہنگ نے بتایا ”ادریہ جعفری اس ریسٹورنٹ کی روح رواں ہے اور میری شہاسا بھی ہے۔ ادرہ ایک اعلیٰ بائے کی کوکری رائٹر ہے۔ کوکری رائٹر لکھنا پکانے سے متعلق کھانے والا ہوتا حیرت کی بات نہیں کیونکہ وہ ایک کامیاب ریسٹورنٹ چلا رہی ہے۔ کمال تو اس خاتون کا یہ ہے کہ وہ ایک

بھترین ایکٹریس بھی ہے!“

ٹھوڑی دیر تک ہنگ ہمیں ”دعوت“ میں پیش کئے جانے والے کھانے اور ان کی خصوصیات سے آگاہ کرتا رہا پھر اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”وہاں! میں آپشن کی بات کر رہا تھا۔ دراصل ساک فو کی ہدایت کے مطابق مجھے تمہارا ہر طرح کا خیال رکھنا ہے۔ میں نہیں جانتا تمہارا یہ کیسی ڈرائیور دوست کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بھی مذکورہ دستاویزات چاہئیں یا نہیں۔ مستقل میں یہ تمہارا ساتھ دے گا یا نہیں! تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا۔ میں درحقیقت تمہارے پروگرام سے آگاہ نہیں ہوں اس لیے میں نے بھی ایجنٹ سے بات فاصل نہیں کی۔ اگر دسم تمہارے ساتھ نہیں تو پھر صرف تمہارے کاغذات ہی تیار کر دانا ہوں گے!“

”میں تمہاری بات کو بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں مسٹر ہنگ!“ میں نے ٹھہرے ہوئے مگر خوش کوار لہجے میں کہا ”جس طرح تم ساک فو کی ہدایت کے مطابق میرا خیال رکھنے کے پابند ہو، بالکل اسی طرح میری ہدایت پر دسم کا خیال رکھنے کی پابندی بھی قبول کرلو۔ کیا تمہیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔

میں دسم کی جانب مڑ گیا اور پوچھا ”تمہیں میرے ساتھ جانے میں کوئی حرج محسوس ہو رہا ہو تو بتاؤ؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو وہاں! وہ نکلی آئیز لہجے میں بولا ”میں اپنی ساری کشتیاں چلا کر تمہارے ساتھ چلا ہوں۔ اب موت ہی ہمیں جدا کر سکتی ہے۔“

”دیل سیڈ۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور دوبارہ مسٹر ہنگ سے مخاطب ہوا ”دونوں کے کاغذات تیار ہوں گے لیکن اس سلسلے میں میری کچھ ترجیحات ہوں گی۔“

یہ بات میں نے دور بینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہی تھی۔ ہنگ نے پوچھا ”کیسی ترجیحات؟“

میں نے اپنے منہ سے بلکہ دور اندیشی کے پیش نظر کہا ”دسم کے کاغذات تو دیے ہی نہیں گے جیسا تم نے کہا ہے یعنی ایک ایسا پاکستانی جو طویل عرصے سے امریکا میں مقیم ہے اور مختلف مراحل سے گزر کر پہلے اسے دہشت کارڈ ایٹا ہوتا ہے اور ازاں بعد گرین کارڈ۔ اس کے نام اور علیے کا مسئلہ بعد میں حل کر لیں گے مگر۔“ میں نے ہمبر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر میرے تمام ڈاکومنٹس ایک امریکن بیوڈی کی

”تم اپنی سامھی ساحل کورنی کے چنگل سے آزاد کرانا چاہے ہو اور..... یہ لوکی بھی دھنوی۔ بدھ نسل کنڈ کی عبادت گاہ کے بکشتو تنو جی کی بنی..... دھنواس عبادت گاہ کے تھانے میں دفن ایک سربستہ راز کی امین بھی ہے۔ ربی نے اسی لیے دھنوی شہر رگ پر اپنے ناپاک پنچے گاؤں کے ہیں کہ وہ بدھ عبادت گاہ کے خزانے پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ دھنوی تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی بہت اہم ہے۔“

میں نے دو ٹوک انداز میں کہا ”دھنوی اہمیت تم لوگوں کے نزدیک بدھ اہازم اور عبادت گاہ میں پوشیدہ بیش بہا خزانے کے طفیل ہوگی لیکن مجھے ان تمام مسائل سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ماضی والی تمہاری دھنوی اب حال میں میری ساحل ہے وہ میرا سب کچھ ہے اور ہمیشہ سب کچھ رہے گی۔ وہ میری محبوبہ ہے۔ محترم ساگنہ تو مجھے اس کا مختار بنا گئے ہیں۔“

میں خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ مگر اس جذباتیت میں کوئی اہال نہیں ایک ٹھہراؤ تھا چنان کی سی ہمت اور پہاڑ کا سا عزم تھا۔ اس کے بعد ہنگ نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ ڈرائیونگ اس دوران میں مسلسل جاری تھی۔ چنانچہ ہمیں کسی نہ کسی منزل تک پہنچنا ہی تھا۔

”ویڈیال ساسون“ کے سامنے ہنگ نے گاڑی روک دی۔ یہ ایک میجر کٹ اور بیوٹی سیلون جیسی جگہ تھی مگر نہایت ہی پرسکون اور فرحت بخش۔ ویڈیال ساسون نفعہ ایونیو کی ایک قابل ذکر جگہ تھی جو اتحادیوں اور انسٹھ اسٹریٹ کے درمیان واقع تھا۔ ہنگ کی ہدایت پر ہم گاڑی سے نکلے اور ویڈیال ساسون کی سمت بڑھ گئے۔

ہنگ کا آئیڈیا تھا، وہ مجھے یل براتز کے قریب تریپن رکھے گا۔ بس فرق اتنا ہوگا کہ میں سر کے بال نہیں منڈواؤں گا بلکہ بالوں کی مانگ ختم کر کے ان میں گھونگر ڈالواؤں گا۔ اس بیوٹی سیلون میں ہم بالوں کی سٹیلنگ کے لیے آئے تھے۔ دیم کے بال ترشوا کر اس کا میجر اسٹائل تبدیل کروانا تھا۔ یہیں ہم نے لباس بھی تبدیل کیا۔ مذکورہ میجر کٹ اینڈ سیلون سٹر ہنگ کے ایک جاننے والے کی بیجنٹ میں چل رہا تھا۔

حیثیت سے تیار ہونا چاہئیں اور نام ہوگا راجہ!“ یہ نام ربی موٹے ہاتھن نے خوبھی عمل کے دوران میرے لیے ”خوبز“ کیا تھا۔ افسوس کے اس کی خوبز شرمندہ تکمیل نہ ہوئی۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سیکے گا کہ میں راجہ کا نام اختیار کر کے اس کی گردن پرک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس نام سے بڑے فائدے اٹھا سکتا تھا۔

مستر ہنگ نے کہا ”تمہارے فیس کٹس ہالی ووڈ کے ایک سابق اشار سے بہت کلوز ہیں۔ تمہیں چلیے میں بہت زیادہ تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں تم سے.....“

یہ بات راجہ کی میں میک اپ آرٹسٹ نسیم جوہر نے بھی کہی تھی۔ میں نے بے ساختہ ہنگ کی بات کاٹی اور کہا ”تم یل براتز کی بات کر رہے ہو جو سرمندہ اکرفلوں میں کام کرتا تھا؟“

”ایگزیکٹو نیلی!“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلانے ہوئے بولا ”میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم ایک امریکی یہودی کی آئی ڈی کیوں چاہتے ہو؟“

”کیا اس میں کوئی پرابلم ہے؟“ میں نے التماس سے سوال کر دیا۔

”کوئی پرابلم نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا ”بجٹ کو دس ہزار زیادہ دینا ہوں گے۔ جو کام چالیس میں ہو رہا تھا اب پچاس ہزار ڈالر میں ہو جائے گا۔ میں صرف اپنی نسلی اور معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں!“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ”ربی موٹے ہاتھن نے مجھے جس دکانی ہوئی آگ میں اتارا ہے وہ اب آسانی سے سر نہیں ہوگی۔ یہ گرم جنگ ہمارے درمیان چنانچہ کتنا عرصہ چلے۔ مجھے فوراً طور پر اسرائیل روانہ ہونا ہے۔ ایک امریکی یہودی کو یہ آسانی اسرائیل کا ویزا مل جاتا ہے۔ اپنی مطلوبہ آئی ڈی کے طفیل میں بڑی سہولت سے یہودیوں کے اندر گھس سکوں گا۔ کیا تم جانتے ہو میں یہ سارا کٹ کس کی خاطر افکار ہا ہوں؟“

میرا آخری جملہ ایک ایسا بلی شارت تھا جسے فیڈ کرنا ہنگ کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ رزیدہ آواز میں بولا۔

جرم سے ڈول، نہانہ زنجست، بچوں کی کہانیاں، عمران ڈاؤنٹ

0301-7283296

آتش فشاں

جو جنوری 2007ء میں شائع ہو رہے ہیں



فیلم و تئاتر بهار ۱۳۸۵  
**آتش فشان**



جب میں بالوں میں کرل ڈلوانے کے لیے مخصوص گداڑ سیٹ پر بیٹھا تو دن کے پونے بارہ کا وقت تھا۔ یہ نیویارک کا وقت تھا۔ رلی نے دھمکی دینے والے انداز میں مجھے کہا تھا کہ جب نیویارک کی گھڑیاں بارہ بجائیں گی تو میرے بھی بارہ بج جائیں گے کیونکہ اس وقت تک ساحل اس کے پاس پہنچ چکی ہوگی۔

بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے لہذا میں نے سوچا کہ جب تک میٹر سٹاپنا کام کرتا، میں ڈرا ساحل کی خیر خبر لے آؤں۔ میں نے آنکھیں بند کیں، بند آنکھوں کے پیچھے تیسری آنکھ کو زحمت دی ساحل کے نقش میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ ادھر میں نے اس کا تصور کیا ادھر میرے تصور نے اڑان بھری اور ساحل کے ماحول میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ کام میں کوئی زندگی میں پہلی مرتبہ نہیں کر رہا تھا کہ مجھے کوشش کرنا پڑی۔ میں نے اپنے تصور کے کوشش کرنے کی جو بات کی ہے تو اس کا مطلب بھی ہے میری وہ کوشش بار آور نہیں ہوئی تھی۔ میرے تصور کی وہ ساحل کے سراپا کو چھونے میں کام ہوئی۔

اس ہاکامی نے مجھے مجبور کر رکھا تھا۔ اسی لمحے رلی کے کہے ہوئے سنگین الفاظ میرے دماغ میں چپکنے لگے۔ جب میں نے اسے آئینہ دکھانے کے لیے یہ انکشاف کیا تھا کہ ساحل اس وقت اس کے پاس نہیں بلکہ کسی ہوائی جہاز میں ستر کر رہی ہے تو اس نے میری اس صلاحیت کے پیش نظر پورے معنی خیز انداز میں کہا تھا..... میں تمہیں اپ کر گئے کر رہا ہوں وہ جان۔ تمہارے بارے میں قائم کردہ میرا ہر انداز درست ہے اتم جانتے ہو میں ملیات کی دنیا میں کس درجے پر ہوں۔

تو کیا رلی نے میری ساحل کو کسی عمل سے گزار کر میری تصوراتی نگاہ کو دسترس سے دور کر دیا تھا؟ یہ سوال بڑا ایسا ایک اور لڑا دینے والا تھا۔ میرے پاس ساحل کی خبر و عافیت جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا۔ اگر رلی نے اس دے لیے پر بھی اپنے کسی عمل کا نقل ڈال دیا تھا تو یہ بڑے گھائے والی بات تھی۔ رلی ایسا کرنے کی صلاحیت تو رکھتا تھا۔ ساحل اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی ایک بے بس ہر ہر تھی..... لیکن نہیں!

اچانک میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا ساحل تو ہوائی جہاز میں ستر کر رہی تھی اور رلی اس کا ہم راہی نہیں تھا۔ ساحل کا طیارہ بارہ بجے (نیویارک ہائم کے مطابق) اسرا نیل پہنچا تھا اور اس میں انجی کم از کم دس منٹ باقی تھے پھر رلی کی طرح ساحل کو کسی عمل سے گزار سکتا تھا۔

ہال یہ البتہ ہو سکتا تھا کہ جہاز کی لینڈنگ کے سلسلے میں رلی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو۔ ساحل بارہ سے بہت پہلے اسرا نیل کی زمین پر قدم رکھ چکی ہو اور اب تک وہ قریبی رلی نے اس پر کوئی رکاوٹی عمل کر ڈالا ہو۔ یہ خیال قرین قیاس تھا کیونکہ یہودیوں کا وہ رلی مرلی مجھ سے پہلے بھی متعدد غلط بیانیوں کر چکا تھا۔ اس کی بات کا اعتبار کرنا سماعت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند رکھتے ہوئے ساحل کے ماحول میں پہنچنے کی نین چار مرتبہ کوشش کی۔ جب ہر بار ایک ہی جیسا نتیجہ برآمد ہوا تو مجھ پر کھل کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اسی لمحے ایک سلا تھپہ میری سماعت میں دس گھول گیا۔ اس نسوانی شہدلی آواز نے مجھے چونک کر اڑھ اڑھ دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میری اس افسردہ حرکت کو ابھر آؤش نے خاص طور پر نوٹ کیا۔ وہ اتھارو کر کچھ سے پوچھنے لگا۔

”اینی براہلم سر؟“

”لو براہلم۔“ میں نے برجستہ یہ کہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

بند آنکھوں کے پیچھے ایک حسین چہرہ روشن ہو گیا۔ پتا نہیں یہ میرے خیال کی کارڈ مانی تھی یا پھر وہ واقعی اپنی اپنی حقیقت کے مکمل میرے تصور میں مجسم ہو گئی تھی۔ میں اس من سوانی صورت کو لاکھوں کرڈوں چروں کے سچ ایک نگاہ میں شناخت کر سکتا تھا۔ وہ نیل گر کی نیلگری تھی!

میں نے یہ آنکھی آنکھیں کھول دیں۔ اس کا تصور ہوا ہو گیا۔ میں نے آزمانے کے لیے دوبارہ آنکھیں بند کیں لیکن وہ پھر نظر نہ آئی۔ چنانچہ وہ میرے تصور کا دھوکا تھا یا سماعت کا فتور اگر شہ رات بھی میں نے زمین دوز سب دے ٹریک پر اس کا نظری تھپہ سماعت کیا تھا۔ میں اس مخصوص ریلی ٹھنک اور سریلی چمک والی آواز کو شناخت کرنے میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اسرا روں کی شہزادی کو ہساروں کی ملکہ میری زندگی میں کون سا نیلا گل کھلانے کا ارادہ رکھتی تھی!

نیلگری نے کراچی میں مجھ سے مایوس ہونے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ اب بھی مجھ سے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے سر کے بل چل کر اس کے پاس پر جٹوں کے تاج تک پہنچنا ہوگا۔ اگر گزشتہ چوبیس گھنٹے کے اندر مجھے اس کی آواز کا وہ دفعہ تجربہ ہوا تھا تو پھر میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ نیلگری نے اپنا وعدہ توڑ دیا تھا اور یہ بہت ہی عجیب بات تھی!

اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں غمراؤ آئی کے توسط سے اپنے ہر شناسا کے ماحول میں پہنچ جاتا تھا..... تو کیوں نہ میں نیلگری کو بھی غرائی کرنا۔ اگر میں تصور کی

نگاہ کے سامنے اس کے خال و خال اس کا سر اٹھا فوکس کرتا تو اس کے ماحول میں پہنچ سکتا تھا۔ پھر وہ مجھ سے کہیں نہ رہتی۔ میں جان جاتا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔ اور کیا کر رہی ہے!

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور پری وشن نیلگہری کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ شہد ہار کی کوشش کے بعد جب میں اس کا اور اس کے ماحول کا سراغ پانے میں ناکام رہا تو مایوس ہو کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

مجھ پر عجیب سی ہزاری اور اکتاہٹ سوار ہو گئی تھی۔ مہر آرٹسٹ کا کام ختم ہو گیا تو ہم "ویڈیل ساسون" سے باہر نکل آئے۔

ہماری اگلی منزل افریقین ریسٹورنٹ "دعوت" تھا جہاں ہم تینوں نے ایک شاندار ویڈیو کیجنگ تناول کرتا تھا۔ میں اور دیکم تو پاکستانی تھے۔ عرصے سے خالص ویڈیو کمانے کو ترسے ہوئے چین دنگ ہنگ کسی شامل باسے کی طرح ہمارے ساتھ تھا بلکہ ہمارا بھائی تھا۔

بعض اوقات مہمان اور بھائیوں کا ایسا کیمی نیشن بھی دیکھنے کو ملتا ہے!

☆☆☆

ایک نئے مہر کٹر اور منتر دانشاں کے ہمارے چہروں کو بڑی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ میک اپ والا معاملہ بعد کا تھا۔ وہ مرحلہ ہم نے ہنگ کے گھر جا کر طے کرنا تھا۔ دنگ ہنگ ایک پروفیشنل فوٹو گرافر ہونے کے ساتھ ہی اہلی پائے کا میک اپ آرٹسٹ بھی تھا۔ ہمارے چلنے کا انتخاب اور ڈاکومنٹس کے لیے تصاویر وغیرہ اسی کو ماننا تھیں "دعوت" میں دعوت اڑانے کے بعد پھر دیگر ام کے مطابق ہمیں سیدھا ہنگ کے گھر جانا تھا۔

اب تک کے حالات بتاتے تھے کہ ہنگ میرے حوالے سے پولیس یار رہی ہے ہر کارروائی کی نگاہ میں نہیں آتا تھا لہذا اس کی اقامت گاہ ہمارے لیے ایک محفوظ ٹھکانا تھی۔ ویسے بھی صرف آج ہی کے دن کی قیادت تھی۔ ہنگ بڑے دعوے سے کہہ چکا تھا "آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ہمیں نیویارک سے ٹال کر نیو جرسی پہنچا دے گا۔ بالوں کو ایک نئی لک دینے کے بعد دیکم بالکل بدلا دیا دکھائی دینے لگا تھا۔ انسان کے چلنے میں دو چیزوں کی بہت زیادہ اہمیت ہیں۔ مہر اشاں اور آنکھیں۔ ان میں معمولی سی تبدیلی بھی انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ آنکھیں بدلنے والا حمار وہ ایسے ہی نہیں بن گیا۔

لفظہ ایونڈ مین ایمین کی سب سے مہنگی اور معروض شاہراہ ہے۔ مصروفیت کے باعث یہاں پارکنگ کا بھی اکثر مسئلہ رہتا ہے لیکن یہ مسئلہ دیکھ کر نہیں جیسا لاہور اور کراچی میں نظر آتا ہے۔

ہم لفظہ ایونڈ پر واقع ویڈیل ساسون سے نکلے تو ہنگ نے کہا "گازی کو یہیں پارک رہنے دیجئے ہیں۔ تھوڑی چہل قدمی بھی کرنا چاہیے۔ ویسے اب تم دونوں لہاس اور مہر اشاں کی تہذیبی کے بعد اسے بدل گئے ہو کہ میں ایمین کی سڑکوں پر بے خوف و خطر گھوم پھر سکتے ہوں۔"

"مسٹر ہنگ! تم تو یہ بات اس طرح کہہ رہے ہو جیسے دعوت نامی وہ ریسٹورنٹ یہاں قریب ہی ہوتا" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ یوں "بہت زیادہ قریب ہے اور نہ ہی دور۔ ہم اس وقت لفظہ ایونڈ پر اسٹریٹ اٹھادوں اور اٹھادے کے درمیان کھڑے ہیں "دعوت" بھی ایسٹ اٹھادوں اسٹریٹ پر ہی ہے مگر سینکڑوں اور فوٹو گرافروں کے درمیان۔ ہمیں اسٹریٹ اٹھادوں پر رہتے ہوئے مشرق کی سمت حرکت کرنا ہوگی۔"

"تو ہم اللہ کریں۔" میں نے دیکم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "شاہرے حرکت میں بڑی برکت ہوتی ہے!"

یہ جملہ میں نے آدرو میں ادا کیا تھا۔ مسٹر ہنگ چونک کر میری طرف جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے چلنے کا مطلب جب اس پر واضح کیا تو وہ جلدی سے انتہات میں گردن جھٹکتے لگا "پھر گھبراہٹ کیجی" سے یوں۔

"ویڈیل سٹریٹ میں وہاں احکارت زندگی اور سکون موت کا نام ہے۔ زندہ انسان کو کسی سکون میسر نہیں آسکتا۔ چاہیں پھر بھی وہ سکون کی تلاش اور حصول کی خاطر کیا کیا کرتا پھرنا ہے!"

میں نے ٹھہرے ہوئے لچے میں کہا "ہنگ! اس میں انسان کا کوئی تصور نہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ تلاش اور خواہش صرف اسی شے کی جاتی ہے جو مہیا نہ ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں اگر پوری دنیا میں امن و آسائی کا بول بالا ہو جائے یہ خطہ کائنات یوں بچا یا کا مضر پیش کرنے لگے تو پھر انسان تھوڑے ہی عرصے میں اس ماحول سے اکتا جائے گا۔ اسے یوریت اور بھولا ہٹ محسوس ہونے لگے گی۔ وہ کچھ تبدیلی کا خواہاں ہوگا۔ امن و سکون کے ماحول میں تبدیلی کا مطلب ہے بد امنی اور بے سکونی۔ وہ فضا اور ماحول میں تبدیلی لانے کے لیے عجیب عجیب قہقہے جگانے میں مصروف ہو جائے گا۔ جن لوگوں کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا وہ

قند بچانے میں بے لوث رہ سکتے ہیں۔"

"امین ویڈیل سٹریٹ" مسٹر ہنگ نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا۔

"آئی ایمری وڈیل سٹریٹ" میں چٹکی چٹکھ کر تے ہوئے "دعوت" کے ہم اسی قسم کی چٹکی چٹکھ کر تے ہوئے "دعوت" کے اندر پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ کا اندرونی ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہنگ نے سرسری طور پر بیان کیا تھا۔ آدرو اور اٹھادے پاک کے ریسٹورنٹس کی طرح ڈانک ہال میں ایک ٹی وی بھی موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ اس وقت وہ آن بھی تھا۔ ہم اپنے لیے مخصوص میز پر پہنچے اور تھوڑی دیر بعد ہم میزوں میں سے انتخاب کر رہے تھے۔

ہیری کی دو مختلف ڈشز منگوائی گئیں۔ ایک چکن کی کوئی مخصوص ڈش تھی۔ اس ریسٹورنٹ کے سوسے اور سوپ اپنی مثال آپ تھے۔ پیکش کا انداز اگرچہ روایتی مشرقی نہیں تھا لیکن کمانے کی لذت اور ڈانک قابل فراموش تھا۔ میں نے اور دیکم نے سلو پاریٹورنٹ میں بس گزرا رہا تھا کیا تھا لہذا پانچ خوب ڈش کر کیا گیا۔ سرد موسم میں ویسے بھی بھوک زیادہ لگتی ہے۔ وہ دھوری کا اختتام تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ میں ایمین میں ابھی تک سورج کی کل دکھائی نہیں دی تھی حالانکہ یہاں کے آسماں اسکرپر (ٹالک بوس عمارتیں) تو سورج کو چھونے کی دعوے دار نظر آتی ہیں۔ بس وہی بات کہ جو جتنا زیادہ با اختیار نظر آتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ مجبور اور بے بس بھی ہوتا ہے! لچے اپنے عروج پر تھا کہ ٹی وی پر بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ ہم تینوں نے ٹیک وقت چونک کر ٹی وی کی جانب دیکھنے لگے کیونکہ وہ نیوز ہمارے ہی متعلق تھی۔ نیویارک کی عوام کو پولیس کے بے کار نامے سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔ نیوز کا سٹر پیڈے جوش و خروش ہے ہماری جگہ کی نیویارک پولیس کو پچھلے دو دن سے جس پاکستانی دہشت گرد کی تلاش تھی، اس کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا گیا ہے مگر امریکا دشمن و جہاد نامی وہ دہشت گرد پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے میں کامیاب ہو گیا۔ و جہاد کے جیسی ڈرائیور رسائی کا نام دیکم معلوم ہوا ہے۔ و جہاد کی طرح وہ بھی پاکستانی ہے۔ و جہاد ان دیکم کے اپارٹمنٹ میں چھپا ہوا تھا۔ شرک علی ہارلم میں واقع مذکورہ اپارٹمنٹ پر پولیس کی ہماری حمایت نے چھپا ہوا بارائین مطلوبہ دیکم اور و جہاد اپارٹمنٹ پر نہیں ملے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ انہیں دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے لہذا پولیس کی آنکھ بھا کر ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ بہر حال پولیس نے اپارٹمنٹ پر گزری ہنگرانی مقرر کر دی ہے۔ پولیس پورے نیویارک میں بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ نیویارک خصوصاً مین ایمین کے قیام ہوٹل ریسٹورنٹ "گیمسٹ ہاؤس" ہارڈ شاپنگ مالز اور

ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کے مالکان سے خصوصی درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور ہر عرصوں کی گرفتاری کے سلسلے میں پولیس سے ہمہ پور تعاون کا مظاہرہ کریں۔

آخر میں میرے اور دیکم کے فوٹو گراف کے فریم بھی دکھائے گئے۔ دیکم کی تصویر بنانے کیسے پولیس والوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر کئی تین فریم دکھائے جا رہے تھے۔ ایک فریم میں دیکم کی تصویر تھی دوسرے میں و جہاد کی یعنی میری اصل صورت اور تیسرے میں ڈسٹو کی تصویر تھی۔ این وائے ٹی وی کی کارکردگی وائے قلمی داؤد تھی۔ اس بریکنگ نیوز کی بجائے لائن بڑی سستی خیر تھی جس میں بتایا گیا کہ ڈسٹو کی آئی ڈی کا استعمال کرنے والا یہ پاکستانی دہشت گرد و جہاد نہایت ہی خطرناک انٹرنیشنل کرسٹل ہے امریکا

## مستفاد کی مشعل کا بیان

### روشنی کے مینار

اسلام کے روشن مسلمانوں  
ادبائے کرم کے عجیب  
اور شرفاقت  
شہداء شہداء کی قلم سے

قیمت: 225/- روپے ڈائجسٹ 25/- روپے

### عظمت کے مینار

ضیاء، تسنیم بیگم  
کے مضامین  
مختار دوسرا مجموعہ

قیمت: 225/- روپے ڈائجسٹ 25/- روپے

### ایمان کا سفر

محمد الہی خاں کی  
معارف شریعت کی بیرون کا مجموعہ  
وہ فن پارے  
بن گئی آپ کو نورشہ

قیمت: 150/- روپے ڈائجسٹ 25/- روپے

### پچرا گھر

محمد الہی خاں کی  
گناہوں کا دوسرا مجموعہ  
جسے آپ آنکھیں نہ بین  
دل سے چھیننے

قیمت: 100/- روپے ڈائجسٹ 25/- روپے

500/- روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک چارج صاف  
یہ مانتے ہیں جس کی آرڈر سال کر رہے ہیں اسلئے بھی

**کتابیات**  
 74206  
 kitabiati970@yahoo.com

میں قدم رکھنے سے پہلے یہ دیا کہ بہت سے ممالک میں بڑی  
افرائی پھیلا چکا ہے لہذا اس شخص کی گرفتاری کے لیے عوام  
پوری طرح پولیس سے تعاون کرے۔  
”وہ دھڑکتا ہوا ہم تہہ پل شدہ ملیوں میں تھے وہ نہ کوئی بھی  
من چلائی یا کہ ہم پر ہاتھ ڈال دیتا۔ دیکھ کر سرگوشیاں انداز  
میں کہا ”موریت حالی بڑی خوفناک ہوتی چارہ ہے۔“  
”کیا تم کسی قسم کا ڈر محسوس کر رہے ہو؟“ میں نے  
استفسار کیا۔  
”وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”ہات ڈر اور خوف کی نہیں  
ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“ میں الجھ کر رہ گیا۔  
”مسٹر ہنگ بھی پوری طرح ہماری جانب متوجہ تھا۔  
ہمارے درمیان وہ ٹھنڈا انگش میں ہو رہی تھی۔ دیکھ کر  
استفسار کے جواب میں تامل کرتے ہوئے بولا۔  
”یار! میں اپنے گھر والوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

”تمہیں انہیں وہاں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا؟“  
”وہ جانتے ہیں میں شوگر مل میں رہتا ہوں اور یہاں پر  
فیکس چلاتا ہوں۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا ”اگر یہ  
خبریں ان تک پہنچ گئیں تو وہ کیا سوچیں گے۔ میں تو پوری دنیا  
میں ایک خطرناک مجرم کے طور پر مشہور ہو گیا ہوں۔“  
”اس کی تشویش بھرا اور فکر برحق تھی۔ میں جس راہ کا مسافر  
تھا یہ کام مکمل والوں کے بس کا نہیں۔ دیکھ نے میرے ساتھ  
چلنے کا عزم کر کے جس آگاہی کے میں چلا گیا تھا وہ  
اسے اور اس کی فیملی کو جلا کر بھسم کر دیتا۔ میں نے اسی لیے  
فیصلہ کر لیا کہ اسے پاکستان ہی میں کہیں سیٹ کرنے کی کوشش  
کردوں گا۔ تفصیلات کے بارے میں بعد میں سوچا جاسکتا تھا۔  
فی الحال اسے ایک بھر پور ملٹی کی ضرورت تھی لہذا میں نے یہ  
کام ضرور کیا۔“

”دیکھو دیکھ! میں نے آواز نیچی رکھتے ہوئے کہا ”اول تو  
یہ خبر ایک لوکل چینل سے نشر کی گئی ہے اس لیے فی الفور اس کا  
پاکستان پہنچنا سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ  
پاکستان پہنچنے کے بعد بھی یہ خبر تمہاری نیٹنی تک رسائی حاصل  
کر سکے۔ تم ایک کام کرو۔“

”کیا کام؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔  
”میں نے پچھا ”گھر والوں سے تمہارا رابطہ کس طرح  
قائم ہے؟“

”نئی فون..... دونوں ذرائع سے۔“

اس نے جواب دیا ”ادھر سے خط آتا ہے میں ادھر سے فون  
کرتا ہوں۔“

”آخری رابطہ ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟“  
”لگ بھگ ایک ماہ“ اس نے جواب دیا۔  
”دش گزشتہ“ میں نے ایک بے آواز چٹکی بھائی ”تم  
آج ہی اپنے گھر فون کرو اور انہیں بتاؤ کہ چند روز پہلے تم اپنی  
رہائش اور روزگار تبدیل کر لیا ہے۔ اب تم نیو جرسی میں کسی نو  
گراف کی دکان پر کام کرتے ہو۔ ایڈریس وغیرہ انہیں بعد میں  
بھی بھیجا جاسکتا ہے۔“

”اور وہ جو میرے پاکستان گیا ہوا ہے۔“ دیکھ کر  
اشارہ اپنے اپارٹمنٹ سائیڈ کی طرف تھا ”وہ میرے گھر  
بھی جائے گا۔ اس طرح میرا جھوٹ بکڑ جائے گا۔“  
”میں سر ہل کر رہ گیا۔ مجھ پر بھجلاہٹ سوار ہونے لگی تو  
میں نے دیکھ کر کہا ”بہت دور کی سوچنے کی فی الحال ضرورت  
نہیں۔ اپنے تازہ ترین اور ایمر میں حالات پر توجہ مرکوز کرو۔  
میں تم سے جو کہہ رہا ہوں اس اتنا ہی کرو۔ بعد کی بعد میں  
دیکھی جائے گی۔ میں تمہارے مسئلے کو پوری طرح حل کرنے کی  
کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے یہ مسئلہ ضرور حل ہوگا۔“

دیکھ خاموش ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ دیکھ کر پاکستان  
میں سیٹ کرنے کا میرا فیصلہ انتہائی مناسب تھا۔ اگر پاکستان  
میں اس کے روزگار کا کوئی مناسب سیٹ اب بن جاتا تو وہ  
اپنی فیملی کے قریب ہو سکتا تھا اور اس کے لیے یہی بہتر تھا۔  
فوری طور پر میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنا  
ضروری نہ سمجھا۔ یہ بات اسے آرام ہی سے سمجھا جاسکتی  
تھی۔

اس دوران میں مسٹر ہنگ خاموش بیٹھا ہماری منتظر رہا۔  
جب ہم خاموش ہوئے تو وہ بول اٹھا ”ایک بات ضرور کہوں  
گا۔ چاہے آپ لوگوں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔“

”ہم دونوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”آپ دونوں دو  
مختلف راہوں کے مسافر ہو۔“

”وہ صدی کی حد درست کہہ رہا تھا۔ دیکھ کی تازہ ترین  
کینیٹ کو دیکھتے ہوئے میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ظاہر ہے  
جس کی فیملی ہوگی وہ ان لوگوں کے لیے پریشان بھی ہوگا۔ اگر  
نہیں ہوگا تو پھر وہ انسان نہیں ہوگا۔ انسان اور پریشان لازم و  
ملزم ہیں!“

”مسٹر ہنگ! اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں  
گے۔“ میں نے نہایت ہی عین آواز میں کہا اور ساتھ ہی دیکھ

ہنگ کو آنکھ کا مخصوص اشارہ بھی کر دیا۔  
”دیکھ اس وقت تکمل پر رکھنے اپنے اہل گھر کو گھور رہا تھا۔  
”فلس اوکے!“ ہنگ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے جلدی سے  
بولا۔

”ہم ”دھوت“ سے اٹھنے والے تھے کہ ایک نا خوشگوار  
واقعہ پیش آیا۔ دیکھ تو میں جس قسم کے دہائیات حالات سے  
گزر رہا تھا، اس میں خوشگواریت کو زیادہ عمل دخل نہیں رہا تھا۔  
پھر بھی دھوت میں جو حالات سامنے آئے وہ سنگینی میں بھی  
خفیف نوعیت کے تھے۔

اچانک دو بارودی پولیس والے ریسٹورنٹ میں داخل  
ہوئے اور ریسپشن پر کھڑے ہو کر بڑی چونکا نظروں سے  
ڈانٹک ہال کا جائزہ لینے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک نے پیش  
آمد حالات کی روشنی میں یہی سمجھا کہ وہ وجدان اور دیکھ کی  
حفاظت میں وہاں جمائے آئے ہیں۔

چور کی ڈانٹ میں جتا ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ جتا اتنا  
بھاری ہو جاتا ہے کہ کسی کے توجہ دلائے بغیر ہی محسوس ہونے  
لگتا ہے اور کچھ کا حال چیل چیل کر پوری دنیا کو بتا رہا ہوتا  
ہے۔ ”جی چور ہوں..... میں ہوں چور!“

پولیس والوں پر نگاہ پڑتے ہی دیکھ فردس ہو گیا۔ اس کا  
ذہن پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ اسی پریشانی میں اس سے ایک  
اضطراری حرکت سرزد ہو گئی۔ اس کا ہاتھ سالن والی ایک  
ڈش (ڈوٹے) سے ٹکرا گیا اور ڈوٹے گیز کو چھوتے ہوئے فرش  
پر جا گر اس۔

ریسٹورنٹ کا چٹنا فرش پھیل دار عمدہ پالٹو ٹانگوں سے  
سجھا تھا۔ ڈوٹے اور فرش کے باہمی ٹکرائے سے ایک مخصوص چمک  
..... دار آواز پیدا ہوئی۔ چٹنی کا بنا ہوا ڈوٹے ٹکڑوں میں تقسیم  
ہوا اور سارا سالن فرش پر پھریا۔

اس وقت ریسٹورنٹ کا ڈانٹک ہال تقریباً بھرا ہوا تھا مگر  
اس چمک کے کی آواز نے پولیس والوں کو ہماری جانب توجہ  
کر دیا۔ یہ ان کی ایک عین نظری پیش قدمی تھی۔ وہ اگر اس  
ریسٹورنٹ میں کسی کی حفاظت میں آئے تھے تو انہیں ادھر ہی کا  
رہ کرنا چاہیے تھا۔

دیکھ صورت حال سے آگاہ ہوا تو ایک دائیہ سنبھالے فی  
الغز ہماری ہیز کی جانب بڑھا لیکن اس سے پہلے پولیس والے  
ادھر سے قریب پہنچ گئے۔ میں نے کسی کی طرف دیکھے اور کسی کو  
خاطب کیے بغیر آواز میں سرکشی کی ”کا فیڈلس!“

میرا یہ ایک قطعی مشورہ مسٹر ہنگ اور دیکھ تک پہنچا نہیں  
بہر حال میں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اگر اس موقع پر ہم

بھر پور اتحاد کا مظاہرہ کرتے تو صورت حالات کو اپنے ہاتھ  
میں لیا جاسکتا تھا اور میں نے اس مظاہرے میں جھلک کی۔  
دائیں دروازہ دردی پوش و دیر پولیس والوں کی وجہ سے  
ٹھنک کر رک گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے برہمی  
سے کہا ”کھڑے کھڑے ہمارا کیا کیا دیکھ رہے ہو کیا یہ سارا  
بکرا بھنی بھجلا رہی ہے؟“

”اس نکالیں“ ”کھڑے“ کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور  
اس کی خوشنودی کا ہر صورت خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک  
کا صاحب کار و بار کا یہی اصول اور مقتول کار و بار کی یہی  
نشانہ ہے!

”دیکھ“ ”سوری سر..... سوری سر۔“ کہتے ہوئے آگے  
بڑھا۔

پولیس والوں نے اس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی  
کوشش نہیں کی۔ وہ ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ ان کی توجہ کا  
مرکز میں اور دیکھ تھے۔ ہنگ شکل و صورت میں ہم سے الگ  
تھلک تھا لہذا پولیس والوں کا صرف ہمیں مرکز نگاہ بنانا یہی  
ظاہر کرتا تھا کہ وہ ہماری ہی کھونج میں ہیں۔  
”میں آفیسر!“ میں نے ایک پولیس والے کی آنکھوں  
میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ میرے چہرے کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے  
ہوئے بولا ”شوہر آئی ڈی!“

”آئی ڈی؟“ میں نے غلطی آمیز لہجے میں کہا ”کیا میں  
اپنی فائلیں اور ڈاکٹمنٹس ساتھ ساتھ لیے کھڑا ہوں۔ میرا نام  
سلطان ہے اور یہ میرا دوست سلمان ہے۔“ میں نے دیکھ کی  
جانب اشارہ کیا پھر ہنگ کی ذات کو پردے کی اوٹ میں  
چھپاتے ہوئے کہا ”انہوں نے اپنا نام ریمینڈ شو بتایا ہے۔  
”ابھی ابھی اسی ریسٹورنٹ کے باہر ہماری ملاقات..... ملکہ  
دوستی ہوئی ہے۔“

”یہ امریکا ہے یہاں کی پولیس سے جھوٹ بولنا ہوتا  
ٹھنک ٹھنک تیار کی تو کر لیتا چاہیے۔“ مجھ سے مخاطب آفیسر  
نے طنز یہ لہجے میں کہا ”ریسپشن سے ہمیں بتا چل چکا ہے یہ  
میرا دیکھنے پہلے کسی مسٹر ہنگ نے تین افراد کے کچ کے لیے  
ریزرو کرائی تھی۔“ وہ ایک لمحے کو کا پھر اضافہ کرتے ہوئے  
بولا ”اپنی آئی ڈی شو کرانے کے لیے فائلوں کے پلندے کی  
ضرورت نہیں۔ تم اپنا کوئی بھی لیگل پیپر دکھا سکتے ہو۔ آفس  
کارڈ، مرس کارڈ، ڈرائیو لائسنس وغیرہ وغیرہ۔“

میں نے کہا ”سوری آفیسر! اس وقت میرے پاس ایسی  
کوئی آئی ڈی موجود نہیں۔“ ”میرا الجھ اگر چہ محضرت خواہا تھا

## علم پنازم پر ایک نئی کتاب

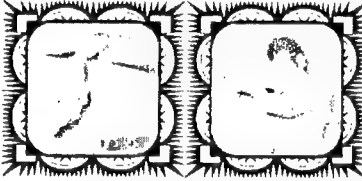
جسے ایک ماہر پنازم نے تحریر کیا ہے

یا نصویر

## پنازم کی جدید تحقیقات

ت 60 • 23

اودو زبان کی پہلی کتاب جس میں اس  
فصل کی حقیقی تصاویر دی گئی ہیں



- پنازم کے بارے میں آج تک کی تمام تحقیقات کا نچوڑ
- جدید طریقے اور مشقیں
- پنازم کی مشقوں کیلئے مکمل لائحہ عمل اور پورا پروگرام
- بے شمار سوالات کے جواب
- پنازم کے موضوع پر ایک مکمل اور مستند کتاب جس میں مصنف کے ذاتی تجربے بھی شامل ہیں

ارتکاز توجہ کیلئے سیاہ دائرہ  
اور مشقوں کو سمجھنے کیلئے

## حقیقی تصاویر



وہ راستے میں کہیں بھی ہمیں ٹھکرا کر لیتے۔ انہیں ڈانچ دینا ضروری تھا۔

ہمارے پاس اگر کوئی گمن ہوتی تو ہوائی فائر کر کے چاروں طرف سے ان کا راستہ روکا جاسکتا تھا۔ ایسی کوئی سہولت ہمیں ”میسر“ نہیں تھی۔ ہم آگے پیچھے بھاگتے ہوئے ایک سو سترائیس تک چلے آئے پھر آگے گھڑاؤ ایونٹس شروع ہو جاتا۔ ہماری پے نسبت پولیس والوں نے کم تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں بائیں فاصلہ بہ تدریج بڑھتا چلا گیا۔

اچانک میں نے اپنی رفتار میں کمی کی اور دائیں ہاتھ پر واقع ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی ہنگ اور دسم بھی اسی بلڈنگ میں محسوس ہوئے۔ ہم لفٹ کو نظر انداز کر کے بلا ٹکلف بیڑیوں کی جانب بڑھ گئے۔ ہمارے انداز میں ایک خاص قسم کی جلد بازی بائی جاتی تھی!

فرسٹ فلور تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے ہی میں نے دائیں بائیں چلتے ہوئے دسم اور ہنگ سے کہا ”میری بات توجہ سے سنو اگر پولیس والوں سے چھٹکارا پاتا ہے تو تمہیں میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔“

”ہاں یو آؤ تم کیا کہتے ہو؟“ ہنگ نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔ گویا وہ مجھے باس تسلیم کر چکا تھا۔

میں نے کہا ”ہمیں پہلی فرصت میں بھڑک جانا چاہیے۔ اگر ایک ساتھ رہے تو فوراً پولیس والوں کی نظر میں آ جاؤ گے۔ ہمیں انفرادی طور پر گاڑی تک پہنچنا ہے۔ تاؤ تمہاری سلیٹی گاڑی کی درست لوکیشن کیا ہے؟“

ہنگ نے میرے سامنے نقشہ ایونٹ پر گاڑی گھڑی کی تھی لیکن میں ایڈریس کے خوالے سے وہ سوال پوچھ رہا تھا تاکہ کیب بکڑ کر وہاں پہنچ سکوں۔ دسم اور ہنگ کے لیے وہ ایونٹس اور اسٹریٹس کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ من مہلن کی ایک ایک گلی سے آگاہ کر رکھتے تھے۔

اس دوران میں ہمارے قدم مسلسل ابر کو اٹھ رہے تھے۔ بیڑیوں والا راستہ لفٹ کی پے نسبت زیادہ محفوظ تھا اسی لیے میں نے یہ راہ اختیار کیا تھی۔ جب ہم نے فرسٹ سے سیکنڈ فلور کی سمت بڑھنا شروع کیا تو دسم نے کہا۔

”کیوں نہ ہم ”ویڈیو ایسٹاٹ“ کے سامنے ملیں۔ وہاں سے گاڑی زیادہ دور نہیں۔“

میسر ہنگ نے اس کی تجویز کی تردید کی اور کہا ”زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم ”دی پام کورٹ“ میں ملیں ”دی پام کورٹ“ ہوگی پلازا کی لابی میں واقع ہے۔ ہم کیب یا بس دیمبرہ میں بیٹھ کر وہاں پہنچ سکتے ہیں لیکن پہلے ان پولیس والوں سے جان

تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ہمیں گرفتار پہلے کرتے اور بات بعد میں۔ وہ معمول کی کارروائی کے تحت چیکنگ کرتے اور دسم کی اضطرابی حرکت نے انہیں ہماری جانب متوجہ کر دیا تھا پھر ہم نے آئی ڈی چین نہ کر کے ان کے ٹک کوٹھنیز کر دیا۔ انہوں نے ہمیں اپنے درمیان رکھ لیا۔ ایک گمن بردار پولیس والا سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دسم اور ہنگ پھر میں تھا۔ دوسرا پولیس والا میرے عقب میں گمن سونے چل رہا تھا۔ جب ہم ڈائنگ ہال کے مین وسط میں پہنچے تو میں نے کارروائی کا آغاز کر دیا۔

میں بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور پولیس والے کی گمن پر ہال لگ مار دی۔ گمن اس کے ہاتھ سے ٹکل کر فضا میں اچھل۔ وہ مجھ سے ایسے کی ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کے بوجھت چھوڑے۔ ہر ایک دھواں دھار پھیل رہا تھا۔ وہ پیچھے کی جانب لڑکھایا تو میں نے اچھل کر اس کے سینے پر ایک فرنٹ ہٹ لگ کر جڑ دی۔ وہ بیڑوں اور کرسیوں کو اٹھتے ہوئے دس فٹ دور چلا گیا۔

اس دوران میں دسم بھی حرکت میں آچکا تھا۔ اسے تو میری جانب سے محض اشارے کی ضرورت تھی۔ میں نے دیکھا وہ پولیس والے کی گردن میں لاک لگائے کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پولیس والے کے پیٹ میں ایک طوفانی گھٹنا رسید کیا تو وہ ہلکا اٹھا۔ اسی لمحے دسم نے اس کی گردن پر سے گرفت ختم کر دی۔ پولیس والا دھڑام سے پھٹے فرش پر جا رہا۔

یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ وہاں جم کر کوئی باقاعدہ مقابلہ کیا جاتا۔ پولیس والوں پر چارہانہ ہاتھ ڈال کر ہم ایک ممکنہ جرم کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ہمیں پہلی فرصت میں وہاں سے غائب ہونا تھا۔ اگر ہم بد قسمتی سے ان کے قابو میں آجاتے تو بڑی مصیبت آجاتی۔ میری تخلید میں دسم اور ہنگ نے ریسٹورنٹ کے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

ریستورنٹ میں موجود کسی شخص نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو دو پولیس والے اٹھ کر ہمارے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔ ہم دروازے سے نکلے گئے تو انہوں نے ہم پر فائر کر دیا تاہم ہم محفوظ رہے اور باہر ایسٹ اٹھاون اسٹریٹ پر نکل آئے۔

”دھوت“ ریسٹورنٹ دو سو دس ایسٹ اٹھاون اسٹریٹ پر سیکنڈ اور تھرڈ ایونٹس کے درمیان واقع تھا۔ اس ٹکڑے میں ایڈریس کے ایک سو بیسٹھ سے دو سو پچاس تک گھر چلتے تھے۔ ہنگ کی سلیٹی گاڑی نقشہ ایونٹ پر پارک تھی۔ اگر ہم وہاں تک دوڑے ہوئے جاتے تو پولیس والوں سے فضا نہیں سکتے تھے۔

تاہم اس میں اعتماد کی کوئی گنجائش تھی ”اور تم جو ریزرویشن کی بات کر رہے ہو وہ غلط نہیں البتہ ریسٹورنٹ والوں نے شاید نام سننے میں غلطی کی ہے۔ ریزنڈ کو انہوں نے ہنگ سمجھا لیا۔“

وہ ریزرویشن کے قصبے کو پہنچتے ڈالتے ہوئے بولا ”ٹھک ہے تمہارے پاس اتفاق سے اس وقت کوئی آئی ڈی نہیں مگر ان دو کے پاس تو ہوگی؟“

”اتفاق سے نہیں ہے۔“ ہنگ نے زری سے کہا۔ ”یہ بڑا خطرناک اتفاق ہے۔“ پولیس آفیسر زہرے نے انداز میں مسکرایا ”آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔“

میں نے مسخرانہ انداز میں کہا ”کہیں آپ لوگ ہمیں وہ خطرناک جرم تو نہیں سمجھ رہے جنہوں نے پولیس والوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ ہم نے اسی ریسٹورنٹ کے ٹی وی پر ان کے بارے میں انجی بریکنگ نیوز دیکھی ہے۔“

”تمہارے تمام سوالات کے جواب ہیڈ کوارٹر چل کر مل جائیں گے۔“ وہ رکھائی سے بولا اور گمن نکالی۔

صورت حال کی سنگینی مسلم تھی۔ رلی نے ہماری سرکوبی کے لیے پولیس کو ہائی لیول پر متحرک کر دیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو گھبراہٹ میں ”عمل کا پیغام“ دیا اور اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”اوکے آفیسر! ہم تمہارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنے کو تیار ہیں۔“

میری دیکھا دیکھی وہ دونوں بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تاہم انہوں نے میری پلاننگ کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ ایسا سوال حماقت کے ذمے میں آتا۔ میرے ذہن میں اس وقت کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا۔ بہر حال یہ بے تھا کہ ہمیں ان کے ساتھ نہیں جانا۔ اگر ایک مرتبہ ان کی گھڑی میں چلے جاتے تو پھر یہ راز کھلنے میں ڈراہ نہ گھٹی کہ سلطان اور سلمان نام بتانے والے درحقیقت وہی مفرد خطرناک جرم ہیں پولیس کو جن کی تلاش تھی۔ میسر ہنگ بے چارہ ہماری وجہ سے مصیبت میں ٹنگ جاتا۔

یہ تمام تر خیالات سینکڑوں کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن سے گزر رہے۔ میں ان لحاظ میں ایک لیڈر کا رد کر رہا تھا۔ مجھے جو بھی عملی قدم اٹھانا تھا اسی ریسٹورنٹ کے ڈائنگ ہال میں اٹھنا تھا لوگوں کی موجودگی میں پولیس والے ہم پر بے دریغ فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں یہاں سے رونو پھر ہونا تھا۔ ویسے ایک بات کا میں نے بہ خوبی اعتراف لگایا تھا اور وہ یہ کہ انہیں ہم پر مقبوضہ ٹھیک نہیں

چھڑا نا ہوگی۔

”سمجھ لو ان سے تو جان چھوٹ گئی۔“ میں نے چنگی بجاتے ہوئے کہا ”دی پام کورٹ والا آئیڈیا ڈن ہے۔ اب میری بات فور سے سنو۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اپنے فوری منصوبے سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم سینکڑوں قتلور پہنچنے والے ہیں۔ مسٹر ہنگ! تم یہاں ہم سے چھڑ جاؤ گے۔ ہم دونوں انکی سیز میوں سے قتلور قتلور کی سمت بڑھیں گے۔ مسٹر ہنگ! تم سینکڑوں قتلور پر ہتھن چاؤ وقت گزارلو۔ اس کے بعد ہاتھ پاؤں بچا کر مہارت سے نکلنا اور سیدھے پلازا اہول کی لابی میں لٹکی جانا۔ اوکے؟“

”بھوسہ لٹکی اوکے۔“ وہ اٹھت میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے میں لوگوں کے جھوم میں شامل ہو کر لٹک کے راستے نکل جاؤں گا۔ یہ ترکیب زیادہ موثر رہے گی۔“

”تم ہانگل درست اور محفوظ خطوط پر سوچ رہے ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”پولیس والوں کو تین بجو گڑوں کی تلاش ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم یوں کھر کر لوگوں کے جھوم میں انہیں چل دے جائیں گے۔ میں اور دیم بھی یہی طریقہ آزما سیں گے لیکن عظیمہ علیحدہ۔ اس مقصد کے لیے دیم قتلور قتلور کو اور میں فوجہ قتلور کو استعمال کروں گا۔ ہماری کارروائی میں پانچ پانچ منٹ کا وقفہ ہوگا تاکہ کہیں پھر کسی ایک لٹک میں ہم تینوں یک چاند نہ جائیں۔ پانچ منٹ میں یہ ایکسپریس نفس ادھر سے نیچے مہارت کے کئی چکر لگاتی ہیں۔ تمہیک سے مسٹر ہنگ! سینکڑوں قتلور آگیا۔ اب تم ہم سے جدا ہو رہے ہو۔ ہم نہیں جانتے تم کون ہو۔ پائے۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں دیم کے ساتھ قتلور قتلور کی سیز میاں چڑھنے لگا۔ اس کی حرکت ہماری سرکشی میری ساعت تک پہنچی۔

”وہ جان! تم انسان ہو یا مشین! انگین ترین صورت حالات میں تمہارا دماغ زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ تم مجھے اس وقت ایک ایسا کاٹھ نظر آ رہے ہو جو سیکڑوں سپاہیوں کے دے کو میں مقام جنگ پر کاری بدایات دے رہا ہوں۔“

”اور تم۔۔۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا ”ہنگامی حالات میں سائن سے مجھے بے ڈونگے گراتے رہتے ہو۔ انسان کو اتنا بھی کمزور اعصاب نہیں ہونا چاہیے۔“

”آئی ایم سوری وہ جان! وہ نہامت مجھ سے کچھ میں بولا ”وہ میری ایک غیر ارادی حرکت تھی۔ پتا نہیں کیسے اس ڈونگے سے میرا ہاتھ لگ گیا۔ میں ذہنی طور پر بری طرح الجھا

ہوا تھا۔“

”نہامت اور مہذرت کا موقع مل تو دیکھ لیا کرو یا۔“ میں نے غصے سے ہونے لکھے میں کہا ”قتلور قتلور آگیا ہے۔ باقی بائیں بعد میں ہوں گی۔ اعصاب کو قابو میں رکھو۔ اگر اب کوئی غیر ارادی اضطرابی غلطی سرزد ہوگی تو ہمیں چھڑانے کے لیے مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر پر دھوا دیونا پڑے گا۔“

اس نے متکبرانہ جذبات سے کئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا ”تم ایک عظیم انسان ہو۔“

”میری تحریکوں میں وقت ضائع کر کے تم پھر دی غلطی کرنے جا رہے ہو جو پولیس کے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچا دے گی۔“ میں نے غصے سے کہا ”کون؟“

”مجھ میں پیچھے پلے بغیر تو قتلور کی جانب جانے والے

☆ ☆ ☆

ہوئی پلازا کی شاندار مہارت فوجہ ایونڈ اور دیمٹ اسٹو ایسٹریٹ کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کے نزدیک ہی گرینڈ آرڈی پلازا اسٹادہ ہے۔ ٹھیک ٹھیں بجے میں ہوئی پلازا کی لابی میں واقع دی پام کورٹ میں موجود تھا۔ ہوئی پلازا ایک ہنگ ہوئی ہے لہذا دی پام کورٹ بھی ہمارا شکار کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اس ریسٹورنٹ میں اگر آپ سہ پہر کی چائے پی کر اچھا وقت گزارنا چاہتے ہیں تو جب میں کم از کم ساتھ سترڈر ضرور ہونا چاہئیں کیونکہ ایک بیانی چائے پلاس ڈالرنگ میں پڑتی ہے۔ ہم قتلور سے قتلور سے وقفے سے وہاں پہنچے تھے اور یہ پہنچے تھے وہاں غافیت تھی۔ پولیس والے پتا نہیں اس وقت ہمیں کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے۔ میری حکمت عملی انتہائی کامیاب رہی تھی۔ سہر حال اس سے حالات کی سنگینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہرگز روتے لمحے کے ساتھ ہماری تلاش میں شدت ہی آگئی۔

”دی پام کورٹ“ میں چائے کے بہانے دو تین گھنٹے آرام سے گزارے جا سکتے تھے۔ وہاں کا ماحول بہت ہی پرسکون اور حسین تھا۔ لگتا تھا مجھے میں بینٹ کی ساری خوب صورتی وہیں سمٹ گئی ہو۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ وہاں موجود تھی۔

چائے سرزد کی گئی تو میں نے دنگ ہنگ سے کہا ”مسٹر ہنگ! میں اور دیم تو بدلے ہوئے حلیوں میں ہیں مگر آپ کے ساتھ ٹھیک نہیں ہو۔ خاص طور پر یہ بات پولیس کے ریکارڈ پر آگئی ہے کہ تین افراد کے لیے آپ نے میز بک کرائی تھی۔“

”اس میں خرابی والی کون سی بات ہے؟“ ہنگ نے

منجھوٹ لکھ میں پوچھا۔

میں نے کہا ”اگر اس ریسٹورنٹ کی مالک مہر جعفری کے سامنے تمہارا نام آیا اور میز بک کرنے والے نے مہر کو یہ بھی بتایا کہ تم نے ہنگ سے پہلے اپنا نام اور چائے ڈن کا حوالہ بھی دیا تھا تو جعفری فوراً پچچان جائے گی کہ تم کون سے ہنگ ہو۔ پھر پولیس والے اپنے جھاد کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ بے پروائی سے

بولتا۔

”تمہارا یہ خیال کس بنیاد پر ہے؟“

”دیکھو وہ جان!“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”اول تو یہ کہ دعوت کا اسٹاف مجھے پہچاننا نہیں۔ میں یہاں بہت کم آیا ہوں۔ ریڈریشن کے وقت میں نے فون پر اپنا نام بتانے کے بعد کہا تھا کہ مہر جعفری میرے پاس چائے ڈن آنی رہتی ہے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ مہر سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے عقل سے اس کی بات سنی اور کہا ”یہ تو ”اول“ ہوا۔ ”دوم“ کیا ہے؟“

”دوم اول سے زیادہ سادہ اور پرکار ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ مٹی خیر انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں اور دیم خطرہ سوائے نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ مسٹر ہنگ ہماری ہوئی طبیعت اور منجھوٹ اعصاب کا مالک تھا ”دعوت“ میں ہمیں جو صورت حال پیش آئی اس میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہرا یا نہیں تھا۔

چھ لمحات کی تجر اسرار خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا ”در اصل اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کروا سکتی میں نے فون کر کے تمہیں فراد کے لچے کے لیے میز بک کرائی تھی۔ میرا نام استعمال کر کے کوئی اور شخص بھی تو یہ حرکت کر سکتا ہے!“

”تمہاری بات میں وزن ہے لیکن اس آئیڈیہ میں ایک بہت بڑی خامی بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کسی خامی؟“ وہ عجیبی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”تم نے ریڈریشن والی کال اپنے موبائل فون سے کی ہے۔ ہوئی والے فون سیٹ پر تمہارا نمبر آگیا ہوگا۔ اس طرح یہ فریس کیا جا سکتا ہے کہ اس نمبر والی سیل فون لائن کس شخص کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اس راہ کو چلا کر پولیس بے آسانی تم تک رسائی حاصل کرے گی۔“

”دور کی کوڑی لائے ہو۔“ وہ سناٹا انداز میں بولا۔

”لیکن یہاں میں شیوی والا آئیڈیہ استعمال کر سکتا ہوں۔“

میں نے چونک کر ہنگ کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ”یعنی گمشدگی والا آئیڈیہ؟“

”ایگزیکٹو پلیس۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔

مسٹر دنگ ہنگ کی دی ہوئی گاڑی شیورن عرف شیوی ایک موٹو پر رہی کے ادیسوں کے ہاتھ چڑھ گئی تھی۔ اس گاڑی میں راکیل بھی موجود تھی۔ وہ گاڑی کو وہیں جھوڑ کر راکیل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے پھر وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مجھ سے چھڑ گئی۔ اس موٹو پر میری ہدایت کے مطابق دنگ ہنگ نے گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کر دوا دی تھی۔

راکیل کی یاد نے میرے دل کو اسرہ کر دیا۔ وہ عجیب و غریب لڑکی الا سکا سے نوبت یار تک میرے ساتھ آئی تھی۔ اس دوران میں ہمیں تاحہ چنگ اوشین کے ایک مختصر سے جزیرے ”زونا آئی لینڈ“ پر بھی کچھ وقت گزارنے کا موٹو ملا تھا۔ ہمارا اختیار خواہو نے کے بعد مذکورہ جزیرے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ میں نے راکیل کے ساتھ بہت ہی یادگار اور ناقابل فراموش لمحات گزارے تھے۔ اس کے کئی ایک احسانات میرے ادھر تھے۔ رہی موٹے ہانسن کے ڈائونٹ مٹلے والے خفیہ ٹھکانے سے مجھے رہائی دلانے کا سہرا بھی راکیل ہی کے سر تھا۔ وہ رہی کے سیٹ آپ کے اندر رہتے ہوئے بدھ ازم کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس بنادت اور غدار (بیہوشی کی نظر میں) کی سزا کے طور پر رہی کے حکم پر اسے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دراصل اس نے اپنے کار کے لیے جان دی تھی۔

یہ وقعت اور ہنگ کا اصول ہے۔ ایک ملک کا میرڈ دوسرے ملک کے لیے دہشت گرد کی حیثیت رکھتا ہے! چچی سے بھی محبت کرنے والے بھی معاشرے کی نظر میں ایک سنگین جرم کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔ یہ عمومی رویے کی بات ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے مزید کہا ”میں موبائل مٹی والوں سے رابطہ کر کے اپنی لائن بند کر دواؤں گا۔ میں کہہ سکتا ہوں میرا سیل نہیں کھو گیا ہے یہ عامی بات ہے کوئی اس پر زیادہ دھیان نہیں دے گا۔ میں یہاں کا ایک مستر شہری ہوں۔ میری بات پر یقین کیا جائے گا۔“

”تم میں بات کو معمولی کہہ رہے ہو۔ وہ میری نظر میں بہت اہم ہے۔“ میں نے پرتشیش لکھ میں کہا ”ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں ان میں معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شیوی اور سیل کی چوری یا گمشدگی میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی ”بارانی“ کے ہاتھوں استعمال ہوئے۔ یعنی امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد



دھواں! میں ایک لمبے کے لیے حوقف ہوا ہجرات جاری رکھتے ہوئے تھا۔

”دعوت میں تو تم پھر نہیں موجود تھے اور دوائے افراد کے ساتھ تھے جو پولیس کی نظر میں انتہائی مشکوک ٹھہر چکے ہیں۔ سڑک ہنگ تھاری جان آسانی سے چھوٹنے والی نہیں۔“ وہ ایک لمبے سوچنے کے بعد بولا ”اگر کوئی میرا سیل استعمال کر سکتا ہے تو وہ میرے میک آپ میں ”دعوت“ میں بھی جاسکتا ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں؟“

اس کی بات خاصی وزن والی تھی۔ میں نے تائید کرتے ہوئے کہا ”ہاں یہ ناممکن تو نہیں مگر اس صورت میں تمہارا ایک دشمن جنم لیتا ہے جو تمہاری صورت بنا کر ”دعوت“ پہنچتا ہے اور ”محموسوں کے لیے وہ تمہارے ہی موبائل فون سے میز پر دروگر کرتا ہے۔“

”میرا کوئی دشمن جنم لیتا ہے یا میرا جاتا ہے“ اس سے کیا فرق پڑتا ہے دھواں! وہ پھر بھی ہوئی آواز میں بولا ”جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یہ شخص ایک ”بجی بزم“ ہوگا۔“ ”بہر حال۔“ میں نے مشکو کو مختصر کرتے ہوئے کہا ”تمہیں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔“

ہمارے لیے میں اس کرکٹ میں بھی مرکز سے نہ جاتا۔ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا ”مجھے اس سکیل کے انجام کی پروا نہیں۔ دے دیے میں نے احتیاط کے سلسلے میں انتظام کر دیا ہے۔ آج کا دن تو میں میں میں ملے لکھ نیو یارک میں ہی نہیں ہوں۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ اتنے لگا ”کل اور آج کے اخبارات کی خبریں پڑھ کر اور صبح تمہارا فون سننے کے بعد میں نے تمہارے بارے میں ایک اہم فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے کاغذات دھیرہ کے بارے میں میں نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے گھر سے روانہ ہوتے وقت اپنے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ آج کا دن میں چائنا ٹاؤن سے باہر بہت مصروف گزاردوں گا اور میں ممکن ہے میں نیوجرسی کا بھی پھیرا لگاؤں۔ امکانی بات میں نے دانستہ لکھی تھی تاکہ حالات دو اوقات کو دیکھتے ہوئے اس میں ضروری تبدیلی کی جاسکے۔ دے دیے میں نے سوچا تھا ”آج تمہیں نیوجرسی پہنچا ہی دوں گا۔ اس سلسلے میں میں نے وہاں تم لوگوں کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔“

”سڑک ہنگ!“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے

کہا ”تمہاری گنگو میں ”قا“ تھا۔“ کی گھر سے تو میں محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہو؟“

”تک تو نہیں کیا لیکن موجودہ صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ اس سلسلے میں پہلے تمہاری رائے جان لوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”تمہاری طرف آتے ہوئے میں نے ایجنٹ سے سرسری سی بات کی تھی۔ فائل میں کل کروں گا۔ اب تم مجھے بتا دو ایک آدمی کا کام کرنا ہے یا دو لوں گا؟“

میں ہنگ کے تذہب کو سمجھ گیا۔ دسم نے جس قسم کے رویے کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کی کھلی کے حوالے سے جو باتیں سامنے آئی تھیں، ان کے پیش نظر وہ چنگا پھٹ میں پڑ گیا تھا لیکن میرا ذہن دسم کے معاملے کو بہت دور تک دیکھ چکا تھا۔ میں نے نیکی لکھے میں کہا۔

”سڑک ہنگ! کام تو دوں ہی کا ہوگا۔ میں اپنا نام راجر خنب کر چکا ہوں۔ کاغذات کے مطابق میں امریکی یہودی ہوں گا جب کہ دسم کی ڈاکو ٹینین ”مسلمان“ کے نام سے ہوگی۔ ایک ایسا پاکستانی جو طویل عرصہ امریکا میں رہنے کے بعد مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر امریکی شہریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایڈریس اور کام کی نوعیت تم اپنی مرضی سے رکھ سکتے ہو۔“

”فیک ہے“ میں نے فائل لے ہو گیا۔ ”وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا ”میں کل ایجنٹ سے مل کر کام کے ڈن ہونے کا بتا دیتا ہوں۔ وہ بہت چلن پڑن کا بندہ ہے۔ مجھے امید ہے دو دن میں تم لوگوں کے تمام ضروری کاغذات تیار ہو کر مجھ تک پہنچ جائیں گے۔“

”ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔“ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”میرے ذہن سے ایک بہت بڑا پوچھتاڑا جاتا ہے گا۔ ہم امریکا کے اندر اور امریکا سے باہر بہ آسانی مود کر سکیں گے۔ میں تو پہلی فرصت میں اسرائیل جانا چاہوں گا۔“

”تمہارے ارادے سے تو میں ظاہر ہوتا ہے کہ تم اکیلے ہی اسرائیل جانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“ ہنگ نے ٹوٹنے والے انداز میں کہا۔

میں نے کن آنکھوں سے دسم کو دیکھا اور سرسری انداز میں کہا ”یہ کیوں تھی بات نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کی ہے۔ اصل فیصلہ تو کاغذات بن جانے کے بعد ہوگا۔“ پھر میں نے اس سے پوچھا ”تمہیں ان کاغذات کی تیاری کے سلسلے میں کیا کیا چاہیے ہوگا؟“

”تم لوگوں کے فوٹو گرافیٹر، شہر پر جس اور مخصوص

مقامات پر تمہارے دستخط۔“ اس نے جواب دیا ”نیوجرسی روانہ ہونے سے پہلے یہ کام ختم ہونا ہوگا۔ میں فوٹو گرافی کا تمام ضروری سامان ساتھ لے آیا ہوں ”میک آپ کے لوازمات“ ”سٹیجری ٹوکنی دن“ سے خرید لیے ہیں۔ بس اب ایک محفوظ ٹھکانے پر بیٹھ کر تمہارا وہ میک آپ کرنا ہوگا جس شناخت کے مطابق تمہارے کاغذات تیار کر دئے جائیں گے۔ میجر اسٹائل کا مرحلے ہو چکا۔ میک آپ کرتے ہوئے میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھوں گا کہ تمہارے چہروں کی معمولی جھجک سے کام چلایا جائے تاکہ دس چہرہ منٹ میں تم خود بھی بہ وقت ضرورت یہ کام کر سکو۔ میک آپ کے بعد میں تمہارے فوٹو گرافس بنائوں گا اور وہیں پر مذکورہ ایجنٹ کو بھی بلواؤں گا۔ وہ اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد چلا جائے گا۔“

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”سڑک ہنگ! میں محسوس کر رہا ہوں نیوجرسی روانہ ہونے سے پہلے تمہیں جس محفوظ ٹھکانے پر لے جانے والے ہو وہ چائنا ٹاؤن میں نہیں آتا۔“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ تائید میں سر ملاتے ہوئے بولا ”ہم یہاں سے اٹھنے کے بعد سیدھے ”ٹرائی بیکا“ جائیں گے۔ ٹرائی بیکا (TRI BECA) چائنا ٹاؤن سے زیادہ دور نہیں۔ بس شرق اور مغرب کی سمت کا فرق ہے۔ میں انہیں کے دونوں علاقوں کو کینال اسٹریٹ آپس میں ملاتی ہے۔ ٹرائی بیکا میں میرا ایک محفوظ ٹھکانا ہے جہاں رازداری کے ساتھ ہم اپنا کام نشا کھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ”ہائیڈرٹل“ کے ذریعے دوبارے ٹرین کو گراس کریں گے اور یہ۔ ایس انٹر اسٹیٹ سٹیٹ اینٹ پلازہ سیدھے نیوجرسی کے علاقے ”جرسی سٹی“ پہنچ جائیں گے۔ میں نے اپنے جس فوٹو اسٹوڈیو کا ذکر کیا ہے وہ جرسی سٹی ہی میں واقع ہے۔ ہائیڈرٹل کے ذریعے سفر تمہارے لیے عجیب تجربہ ہوگا۔“

دس کے بعد وہ ہنگ ہمیں مین مینن برج اور ٹیل کے بارے میں بتانے لگا جو مین مینن کو گروڈرواح کے علاقوں سے ملاتے تھے۔ دسم اس ساری گنگو کے دوران میں خاموش بیٹھا ہمیں سن رہا تھا۔ ہم خاموش ہوتے تو وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔

”میں اپنے اپارٹمنٹ سے نکلنے وقت صرف ہوا اعلیٰ لاسکا ہوں۔ میرا پاپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات ادھر ہی رہ گئے ہیں۔ اس سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟“

”اول تو کسی گڑبڑ کے امکانات نہیں ہیں۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ”تم ایک دو دن میں دسم سے سامان بننے والے ہو۔ دسم والا پاپورٹ اور دیگر کاغذات تمہارے لیے بیکار ہیں۔“ میں ایک لمبے کو حوقف ہوا ہجرات جاری رکھتے ہوئے تھا۔

”اب یہ تو نہیں سکا کہ پولیس تمہاری تلاش میں امریکا سے پاکستان تک کا سفر کرے اور خواہ مخواہ تمہاری کھلی کو پریشان کرتی پھرے۔ دے دیے انہیں صرف دھواں کی تلاش ہے۔ تم مجھے پناہ دینے کے گناہگار ہو۔ وہ تمہاری خاطر اتنا کٹ نہیں اٹھا میں گے۔ اس قسم کے منصوبہ جاتی پروگرام وہ اصل کا کسی جیسے اہم افراد کے لیے چلاتے ہیں۔“

میری اس تسلی سے وہ قدرے مطمئن دکھائی دینے لگا۔ ”دسم ہنگ نے اس سے پوچھا ”کیب تمہاری اپنی تھی یا کرایے کی؟“

”اپنی کہاں بھیجی۔“ دسم نے سرسری انداز میں کہا ”کرایے کی تھی۔ میرے دوست لوہے نے اپنی گاڑی پر مجھے دلائی تھی۔ اب وہ واپس آئے گا تو اس پکارے کے لیے بھی اچھے خاصے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

میں نے کہا ”کچھ نہیں ہوگا۔ تم اندیشہ دور دراز سے اپنے ذہن کو مت پریشان کرو۔“

ایسی بات نہیں کہ دسم کوئی بڑا دل فضا تھا۔ میں اس کی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ بس موجودہ صورت حال نے اسے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بعد وہ اس کیفیت سے نکل آئے گا۔

ہم لگ بھگ چار بجے ”دم نام کورٹ“ سے نکل آئے۔ باہر ہمارے لیے خطرہ اگرچہ کم ہو گیا تھا مگر بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ اصل مرحلہ ہوش سے گاڑی تک پہنچنے کا تھا۔ ایک مرتبہ ہم ننڈ گھاسز والی سلیٹی گاڑی کے اندر پہنچ جاتے تو پھر گڈرائی کوئی بات نہیں تھی۔ ننڈ گھاسز کی بدولت باہر والے انہیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے جب کہ یہ سہولت ہمیں میسر رہتی۔

ہنگ کی مذکورہ گاڑی وڈیال ساسون کے نزدیک کمزری تھی جو ہوئی پلازہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے تھوڑا فاصلہ رکھ کر اسٹریٹ الٹھ پر چلتے ہوئے ننڈ گھاسز کی طرف چلے آئے پھر وڈیال ساسون کی جانب بڑھ گیا۔ ہنگ دس منٹ بعد سلیٹی گاڑی ننڈ گھاسز کی شمال سے جنوب کی سمت دوڑ رہی تھی۔

واشنگٹن اسکوائر پہنچنے کے بعد ہم نے سکھ ایو نیو پکڑی۔



ستاروں کی چال بھی دیکھ لیتا۔ مجھے بتاؤ ساحل کب لے گی؟“  
آخری ہلہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔ اس جملے سے اس ڈوبنے والے شخص کا کرب جھٹکتا تھا جو جھ سندر میں ناکام ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے یہ سوچ رہا ہو کہ اس کا ساحل اسے کب لے گا!

میں اپنی ساحل کے حصول کے لیے دن رات ہاتھ پاؤں کو مصروف رکھے ہوئے تھا مگر میری ہر کوشش آخری مرحلے میں ناکام ہو جاتی تھی۔ میں ساحل کو حاصل کرتے کرتے کھو بیٹھتا تھا۔ تھری کی یہ آنکھ بچوں کا کافی عرصے سے جاری تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ کب تک جاری رہے گی! جس طرح ڈوبتا ہوا شخص نیچے کو بھی سہارا سمجھ لیتا ہے بالکل اسی طرح بے در پے ناکامیانی کی وجہ سے وہ جملہ میرے منہ سے نکل گیا تھا کہ ستاروں کی چال کے مطابق میں کب ساحل کو حاصل کر سکوں گا۔

مابوی ایک بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ یہ فنی سوچ کو جنم دیتی ہے۔ میں زندگی میں بھی مابوی نہیں ہوا مگر ساحل کی ہدایت بھی مجھے اس کیفیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ درحقیقت یہ مابوی نہیں بلکہ ایک افسردگی تھی..... افسردگی بھی تھی تو کیوں تھی؟ میں نے جھجکا کر ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو

جھک دیا تاہم وہ دونوں میری تازہ ترین صورت حال سے آگاہ ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے دیگر موضوعات میں الجھا کر میرا دل بہلانے کی کوشش شروع کر دی۔ تاہم انہوں نے نہیں جانتے تھے یہ انوکھا لاڈلا آسانی سے ماننے والا نہیں۔ اسے بھلا کون بہلا پایا ہے!

ٹھیک ٹو بجے ہم ہنگ کی گاڑی میں باہر نکل آئے۔ کھانے کا موڑ ہو رہا تھا۔ مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہنگ گاڑی کو گرین دیج اسٹریٹ اور فرینٹن اسٹریٹ کے سنگم پر لے آیا پھر اس نے ”ٹرائی بیکا گرل“ کے سامنے گاڑی روک دی۔ اس ریسٹورنٹ میں ڈنر ہنگ کا مشہور تھا۔ ٹرائی بیکا گرل (TRI BECA GRILL) کی تحریف و توصیف بیان کرتے ہوئے اس نے یہ بھی بتایا کہ مذکورہ ریسٹورنٹ ہالی ووڈ کے ہر اہلکار اور فلم سیکراریٹ ڈی نیردی ملکیت ہے۔

دس بجے ہم ٹرائی بیکا گرل سے باہر نکل آئے۔ ہر دگرام کے مطابق گاڑی ہمارے پاس راہی اور ہنگ سیلو میڈیمین پکار کر چائنا ٹاؤن کی طرف نکل جاتا۔ یہ وقت رخصت میں نے یاد دہانی کے طور پر اس سے کہا۔

”مسٹر ہنگ! تمہارا موہا بل کم ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی

کارروائی کو بھولنا نہیں۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”اسی لیے میں نے سب کو مسلسل آف رکھا ہوا ہے۔“

ہنگ بلکہ بیک میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو ہم سلیٹی گاڑی میں واپس اپارٹمنٹ آ گئے۔ میں اس وقت ابھی خاصی خند محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات کے آخری پہرہ آج صبح سونے کا بہت کم وقت ملا تھا اور ہنگ کی حالات میں ہمیں شوگرمل والے اپارٹمنٹ سے نکلنا پڑا تھا۔ وہ کم حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ آج کا پورا دن بھاگ دوڑ میں گزارا تھا۔ بدن صحت سے چور ہو رہا تھا لہذا ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے تندرستی کو بحال کرنا چاہیے۔ مسائل پر سوچنے اور انہیں حل کرنے کے لیے ساری عمر بڑی تھی!

خود کو تندرستی کی آغوش میں ڈالنے سے پہلے انہوں کی خیریت معلوم کرنا ضروری تھا اور انہوں میں سب سے زیادہ اپنا ساحل تھی۔ میں نے ہسپتال پر لیٹ کر انہیں بند کر لیں اور تصور کی نگاہ کو ساحل کی جانب جھانکنے کی زحمت دی مگر اگلے ہی لمحے تصور کا پرندہ پھر پھر اکر رہ گیا۔ میں اپنی ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے بہت نہ ہار لی اور کوشش پر کوشش کرتا چلا گیا لیکن چندہ منٹ کی ناکامی کے بعد میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور دل ہی دل میں رہی ہوئے ہاتھوں کی مکاری کو کھری کھری ستانے لگا۔ اس عیار نے گویا مجھے بانہ کر ڈال دیا تھا۔

رہی کے دعوے کے مطابق ساحل کو آج دوپہر (نویسٹارک کے وقت کے مطابق) اسرائیل پہنچنا تھا۔ اگر اس نے اسرائیل کے حوالے سے دروغ کوئی بھی کی تھی تو پھر بھی اب تک ساحل کی منزل پر پہنچ چکی ہوگی۔ کہاں؟ اس بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں نیلگری کا خیال آ گیا۔ ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد پچھلے چوبیس گھنٹے میں میں نے دوبارہ اسے محسوس کیا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے تصور کا دھوکا ہو۔ اگر یہ دھوکا بھی تھا تو پھر ابھی خوب صورت دھوکا تھا۔ میں نے اس کے فزکی تجزیے اور فزکی ہوئی تھی کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا تھا۔

نیلگری کا خیال آتے ہی میں نے پیڑروم میں اس کی مخصوص خوشبو کو پایا۔ بے اختیار میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمر نیلگری کے وجود سے خالی تھا تاہم اس کی موجودگی کا

احساس اس کے بدن کی منفرد جھک پیڑروم کے ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا نیلگری کی ذہن میں تقسیم ہو کر کمرے کی فضا میں نفوذ کر چکی ہو۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی ڈرے میں بھی آفتاب کو کھانے کا فن جانتی تھی۔

میرے ذہن میں ایک سسٹمی خیر سوال نے سر اٹھایا۔ کیا نیلگری میرے آس پاس کہیں موجود ہے؟ یہ بڑا خطرناک سوال تھا کیونکہ اگر وہ ہمیں موجودگی تو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے جب بھی اس کے وجود کی خصوصیات محسوس کی، اگلے ہی لمحے وہ میرے سامنے حاضر ہوتی۔ یہ عجیب ڈھب کی انگیلیاں میری سمجھ سے باہر تھیں۔

میں نے نیلگری کو نہیں کرنے کے بارے میں سوچا۔ حالانکہ پہلے میری ایسی ہی ایک کوشش سراسر نفل ہو چکی تھی جب میں میجر آرٹسٹ کے سامنے دیوال ساسون میں بیٹھا اپنے ہاتھوں کو کرلی کر دار تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کیں اور تصور کی انگلی پکڑ کر نیلگری کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجہ حسب سابق برآمد ہوا۔ میری تھڑا آئی نے نیلگری کا منظر اجاگر کرنے سے انکار کر دیا۔

ایسا ہوتا ہے۔ بے اختیار شخص بھی بعض معمولی نوعیت کے معاملے میں بے اختیار ہو جاتا ہے۔ انسان کے ساتھ ایسا اتفاق ہو سکتا ہے کہ اس کی جیب ٹوٹوں سے بھری ہو اور وہ اس قسم کی دہائیات و مصروفیات میں مجھس جائے کہ اسے دن بھر کھانا کھانے کی فرصت نصیب نہ ہو۔ وہ بھری ہوئی جیب اور خالی پیٹ کے ساتھ پورا دن گزار دے۔

دو مسلسل ناکامیابیوں کے بعد مجھ پر کوفت سوار ہونے لگی۔ اسی کوفت نے فزکی دھدھان کی موت کا منظر میری نگاہ میں روشن کر دیا۔ وہ بڑی بڑی تھک اور بھیا تک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کا یہ حشر میری ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اگر وہ فتنہ پرور شیطان زادہ زندہ رہتا تو پتا نہیں کون کون سی آفت ڈھاتا، کیسی کیسی قیامت برپا کرتا اور کون کن فتوں کو جنم دیتا۔ وہ پہلے ہی زبردست تھا۔ رہی کا ہاتھ گلے سے پیٹل ہو گیا تھا۔ وہ کراچی میں میری ایک ساتھی صدف کو دھوکا دینے کی پوری کوشش کر چکا تھا۔ وہ تو میں نے صدف کو بد وقت خبردار کر دیا ورنہ وہ تو اسے بالکل اصلی دھدھان ہی سمجھ رہی تھی۔

صدف کا خیال آیا تو دل بے اختیار اسے دیکھنے کو چلا۔ صدف کے ساتھ میں نے پاکستان میں بہت اچھا دوست...

گزرا تھا۔ وہ مجھ سے ہزاروں میل دور، ساڑھے دس گھنٹے کے فزکی حادثات پر تکی تھی۔ اس وقت نیویارک میں رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے جبکہ پاکستان میں آئندہ روز صبح کے دس بج رہے ہوں گے۔ میں فوری طور پر یہ نفس نہیں اس کے پاس پہنچ سکتا تھا لہذا تیسری آنکھ کا ذیل استعمال کیا اور صدف کے ماحول میں قدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ دبائیت سی تھی۔ ایک رو سے گزرا رہی تھی اور یہ خیر دعائیت تھی۔ میں نے کراچی میں قیام کے دوران میں تقریباً ساری بڑی چھوٹی سڑکیں دیکھ لی تھیں۔ دس منٹ تک صدف کو داغ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میڈیکل کالج کی جانب جاری تھی پھر جب وہ اپنے کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو میں نے تصوراتی تعاقب کو توڑ دیا یہی کی راہ اختیار کی۔

صدف زندہ سلامت اور خیریت سے تھی لہذا میرے دل کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ میں نے سوچا، کل کسی وقت اسے فون کر کے دو ہاتھیں کر دوں گا۔ انہوں بھی ہوا کہ ابھی تک مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا تھا!

انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ اس کے پاس جو کچھ موجود ہوتا ہے، وہ اس سے بڑھ کر خواہش رکھتا ہے اور خواہشات کا یہ لاشعاری سلسلہ بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ تھڑا آئی سے استفادہ کرتے ہوئے، میرے دل میں بھی یہ خواہش چلتی تھی کہ کاش! میں جس ماحول کا حصہ بن جاتا ہوں وہاں موجود افراد کی آوازیں بھی سن سکوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے ٹیلی فون اور پی کے باہمی روابط سے باہمی آنکھ کی روشنی حاصل کی تھی اور اس روشنی میں، میں صرف دیکھ سکتا تھا۔ اگر میں پیچھے ٹری ٹیٹل کو بھی پی کے بال میل سے متحرک کرنے کی کوشش میں لگ جاتا تو ساڈھ ڈالا سیکشن بھی اوپن ہو سکتا تھا مگر محترم ساڈھ کو نے مجھے ایسی ہی کوشش کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اور میرے نزدیک مستند تھا، ساڈھ کو کا فرمایا ہوا!

ساڈھ کو کی یاد آئی تو ڈاکٹر موہک ریٹوشے کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ چہاری آخری ملاقات وائنٹن اسٹینٹ کے شہر نیٹل میں ہوئی تھی اور اب اس بات کو بھی چار دن گزر گئے تھے۔ ڈاکٹر موہک، ساڈھ کو کی ہدایت پر چار روز پہلے ٹھنڈا دراندہ ہوا تھا۔ اسے بدھ نکل کنڈ والی مہادت گاہ میں رہی کی سرگرمیوں کو روکنا تھا، اس تاہم اور بے بہا خزانے کی حفاظت کرنا تھی جو مہادت گاہ کے درخانے میں کئی برسوں سے سورا تھا۔ اس راز سے چند افراد ہی آگاہ تھے جن میں ساحل

اور میں شامل تھا۔ ربی ہاتھ دھو کر اور پنجہ جھاڑ کر اس اہول خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ساحل اور میرا خواہی اس لیے کیڑیاں تھیں۔ میں تو اس کی قید سے آزاد ہو گیا تھا تاہم ساحل ہنوز اس کے پیچھے تکیا میری۔

میں نے ڈاکٹر موگ کے غدد خال کو تیسری آنکھ کے سامنے اٹھارہ اور ایک جھپکے میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ بائیں رہا تھا اور مسلسل دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس منظر میں وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کا ہاتھ تھا جسے کوئی عورت بھی اپنی بساط کے مطابق دوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دور دور تک پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس سلسلہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ کھنڈ کے مضافات میں پہلے ہوئے بلند دہلا پہاڑ تھے۔ انہی پہاڑوں میں سے ایک کے دامن میں بدھ شیل کنڈ کی عبادت گاہ آباد وجود رکھتی تھی۔ میں سانس روک کر اس منظر میں جذب ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈاکٹر موگ کی سامی عورت اس زاویے سے بھاگ رہی تھی کہ میں ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ بھر مجھے یہ موقع حاصل ہو گیا۔

اس عورت کا پاؤں الٹا اور وہ منہ کے بل پہاڑی زمین کی جانب آ رہی۔ ڈاکٹر موگ نے اس کا ہاتھ قلم رکھا تھا لہذا وہ گرنے سے محفوظ رہی۔

اسی لمحے ڈاکٹر موگ نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا اور ایک جھپکے سے اس عورت کو اپنی گود میں اٹھالیا، اگلے ہی لمحے وہ اس کی ماں کی سی مہارت کے ساتھ پہلو سے چٹائے دو بارہ دوڑنے لگا۔

اس عورت نے ڈاکٹر کے پہلو میں پیچھے ہی اپنا سر اس کے کندھے پر رکھا دیا تھا۔ میری تصوراتی نگاہ اس عورت کے چہرے پر گئی تو میں سانسے میں آ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں، میری ساحل تھی!

میں نے بے اختیار بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساحل اور کھنڈ کے مضافات میں! یہ کیسے ممکن ہے۔ اسے تو اس وقت اسرائیل میں ہونا چاہیے تھا یا پھر وہ جہاں بھی ہوئی، ربی کی کڑی نگرانی میں ہوئی۔

بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت پر بھی یقین نہیں آتا۔ میں بھی اس وقت کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ان حذب بکلمات میں، میں سوچنے جھنکنے کی صلاحیت کو بیٹھا تھا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور ڈاکٹر موگ کے تصور کے پیچھے لپک گیا۔

منظر میں تھوڑی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ ساحل کا سر ہنوز

ڈاکٹر کے کندھے پر رکھا تھا اور ڈاکٹر آدھی طوفان کی رفتار سے بھاگ رہا تھا مگر اب ان کے تعاقب میں نصف درجن افراد بھی دوڑ رہے تھے۔ وہ سب کے سب خطرناک ہتھیاروں سے مسلح تھے اور آوازوں اور ہاتھوں میں ڈاکٹر موگ تک رسائی حاصل کرنے کے متمنی نظر آتے تھے۔

میں نے پہلے جب ڈاکٹر موگ کو جھانکا تو وہ منظر ایسے حقائق کے شر سے پاک تھا۔ پائین، وہ بد بخت کہاں سے نمودار ہو کر ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ڈاکٹر انہی لوگوں سے کچھ جھڑانے کے لیے بھاگ رہا تھا اور یہ بات سننے کی کہ وہ سب کے سب ڈاکٹر موگ کے دشمن تھے۔ ساحل اس وقت ڈاکٹر کی تحویل میں تھی لہذا وہ یقینی طور پر اس کے بھی کلمے دشمن تھے۔

میں بے بسی اور بے چارگی کی اختیار کرکڑا دماغ کھولا رہا تھا۔ نیویارک سے ہزاروں میل دور کھنڈ کے مضافات میں، میں ان کی کیا بدھ کر سکتا تھا! میری ساحل سفاک فالتوں کے رحم و کرم پر تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کسی قسم کی غلطی تھی، کیا غضب تھا؟

اسی لمحے اس سے بھی بڑا غضب ہو گیا۔ ڈاکٹر موگ ساحل کو "سنبھالو" ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ حقائق میں چالیس چالیس قدموں کی دوری پر اس کے پیچھے تھے۔ ڈاکٹر جہاں کھڑا تھا وہ پہاڑی کا آخری کنارہ تھا۔ آگے بڑھنے کا مطلب یہ تھا، پہاڑ سے نیچے اترنا، پھر اس سے پیش تر ڈاکٹر کی فیصلے پر پہنچ کر کوئی قدم اٹھانا، حقائق میں نے اپنی گنوں کے دہانے کھول دیے۔

میں فائرنگ کی آواز سننے سے قاصر تھا۔ گنوں کی مخصوص حرکت نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ میرے ساتھیوں کو گولیوں سے بھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یا پھر ڈاکٹر موگ کے رد عمل نے اس امر کی تصدیق کی کہ ان پر شدید قسم کی فائرنگ کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر موگ ساحل سمیت ہوا میں اچھلا اور پہاڑی کے قریب میں لڑھکنا چلا گیا۔ وہ طاقت فالت کا باہر تھا مگر فالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ پہاڑی ہزاروں فٹ اونچی تھی لہذا وہ کسی طاقت در پرندے کے مانند پرواز کرتے ہوئے زمین تک نہیں جاسکتا تھا۔ اسے لڑھکا ہی تھا اور وہ ساحل کو ساتھ لیے بے دریغ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پہاڑی سے نیچے آ رہا تھا اور..... وہ نصف درجن خون آشام بمیں لڑے اپنی گنوں کو ان دونوں کے رخ پر رکھ کر مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔

اچانک لڑھکتے ہوئے دو بچے بدن ایک جھپکے سے رک گئے۔ یہ رکنا بڑا مہیا کی تھا۔ ان کے بے حس و حرکت جسم دیکھ کر، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ خوں چکان پھر میری تصویر اتنی نگاہ سے اوپر اٹھ گیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے ایک تاریک پناہ دور تک پہنچتی چلی گئی۔

میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت میرا دماغ کی طور کے مانند دھک رہا تھا۔ میں نے ہنر جھوڑا اور ایک جھپکے سے فون کی جانب لپک گیا۔ وہ سب حرکات میں سوچ کچھ کر نہیں بلکہ ایک خطرہ میں بے اختیار کر رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، میں کیا کرنے والا ہوں۔ میرے دماغ کا کوئی حصہ ان ہنگامی حالات میں آؤ پر نیون ہو گیا تھا۔ اپنی رفتار سے سوچتا میرے بس میں نہیں تھا جتنی تیزی سے میں عمل کر رہا تھا۔

میں نے ریسورٹا کر چاہتا تھا کہ میں دھک چپک کے گھر کا نمبر ملایا۔ تیسری شخص پر دوری جانب کال ریسورٹ کر لی گئی۔ مجھے اتر نہیں میں مسٹر ہنگ کی "ہیلو" سنائی دی۔

"ہاں ہنگ! تمہارے پاس ڈاکٹر موگ کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟" گمان سے چھوٹنے لگا تھا۔

"اس کا سبب نمبر ہے میرے پاس۔" وہ ہنرمندی سے بولا "کیوں، کیا ہو گیا؟"

"تم فوری طور پر اس کا سبب نمبر دو۔" میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔

"کچھ تازہ تو سنی دھان؟"

"میں نے کہا تھا، موگ کا سبب نمبر دو۔" میرے لہجے میں یقین اتر آئی تھی، "فضول باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔" وہ بحث میں بڑے بغیر مصلحت آمیز لہجے میں بولا "عظموں میں فون انڈیکس میں دیکھ کر بتا دوں۔"

ایک منٹ کے لیے ہمارے درمیان خاموشی کی دیوہت ابھرائی۔ یہ ایک منٹ میری زندگی کا طویل ترین منٹ تھا۔ گمان نے اس ایک منٹ میں ایک ہزار صدیاں گزاریں اور ان صدیوں کا نتیجہ والا ایک ایک لمحہ میرے دل پر ایک تیرہ سا گیا۔ میرے روح کو اتنے ہی ششروں نے گھائل کیا۔ میں اس وقت اپنی زندگی کے سب سے عذاب ناک لمحات سے دوچار تھا۔

ہنگ کی مخصوص آواز اتریں میں ابھری تو میں ریڈیو الٹ ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر موگ کا سبب نمبر دو بتا دیا۔ میں نے ہلکے جھپکے میں وہ نمبر اپنی یادداشت میں نقش کیا اور پوچھا۔

"کیا اس اپارٹمنٹ کے فون سے میں یہ سب نمبر ڈیک کر سکتا ہوں؟"

"بالکل کر سکتے ہو۔" ہنگ کی آنکھوں کے بوجھ سے دہلی آواز ابھری "وہاں! پلٹر کچھ تو بتاؤ، آخر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔"

"قیامت کبریٰ کچھ لو۔" میں نے یہ کہتے ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

میں مانتا ہوں، ہنگ کے ساتھ مجھے اس رویے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تاہم میں بھی کیا کرتا، حالات کا دھارا میرے ساتھ کون سا رویہ اپناتے ہوئے تھا۔ میری روح گولیوں کی بوجھا میں میری شہرچی اور میں..... میں.....! میں نے ذہن میں نقش ڈاکٹر موگ کے سبب نمبر کو اس فون سے ملایا۔ اگلے ہی لمحے اس کے سبب نمبر پھٹنے جانے لگی۔

میں دھڑکن روک کر فون انڈیکس ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن اس طرف کھنڈ تو مسلسل جاری تھی مگر سبیل کو کوئی انڈیکس نہیں کر رہا تھا۔

"کیا ڈاکٹر موگ اب اس قابل نہیں رہا کہ موہل کا ایک مختصا شن بھی دہا سکے؟"

اس روح کش سوال نے میری جان نکال دی کیونکہ اس سوال کے ساتھ ہی ایک اور روح فرسا سوال بھی تھی تھا..... اتر ڈاکٹر موگ..... تو کیا ساحل بھی؟

اسی لمحے بیڈروم میں گہری تاریکی چھا گئی۔ نیویارک میں لائٹ جانے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہاں صارفین اپنے ہاتھ ہی سے سوچ آف کر کے لائٹ بجھاتے ہیں۔ ہمارے اپارٹمنٹ کی لائٹ چلی گئی تھی تو اس کا بھی مطلب تھا، دانستہ اس سہلائی کو کاٹا گیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ دشمن لائٹ کاٹنے کے بعد دے پاؤں میرا گھلا کٹنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو۔

میں نے ریسورٹ کر کرڈیل پر چننا اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والی تاریکی میں بیڈروم کے دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

میں نے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا تھا کہ برابر والے بیڈروم میں سے ایک دردناک انسانی چیخ بلند ہوئی۔ اس بیڈروم میں دس سو رہا تھا، یہ چیخ اسی کی ہو سکتی تھی۔

وہ چیخ اتنی بھیا کہ اور اہم ناک کی جیسے کسی جانور کو کندھ چھری سے بے دریغ ذبح کر دیا گیا ہو۔ میں اپنے سن سن دہنی پاؤں پر سناکت کھڑا رہ گیا!

تاریکی اور سکوت موت کی علامات ہیں! نادیہ موت اس اپارٹمنٹ میں قدم رکھ چکی تھی۔ اگر میں گھبراؤں تو میرے میں ساکت کھڑا رہتا جاتا تو مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آتی مگر میں اتنی آسانی سے اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ یہ تو راضی خوشی خود کو موت کے حوالے کرنے والی بات ہوئی۔

ایسے نازک حالات میں عموماً انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے لیکن اس ناگہانی صورت حال نے میرے دماغ کو حد سے زیادہ مستعد کر دیا۔ دروازے کے پینڈل پر جھکا ہوا میرا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اگلے ہی لمحے اس کے عقب میں پناہ گزین ہو گیا۔

اب اس بیڈروم میں داخل ہونے والے مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تاریکی آنکھ کی راہ میں سب سے بڑی مزاحمت تھی پھر دروازے کی اوٹ نے مجھے کوہرا محفوظ کر دیا تھا۔ اس آڑ میں پیچھے ہی میں نے آنکھیں بند کیں اور تھڑا آئی کے توسط سے دسم کے ماحول میں قدم رکھ دیا۔

وہ بیڈروم بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں کی موہوم حرکات و سکنات نے مجھے باور کرایا کہ دسم تین چار افراد کے ساتھ بند آ رہا تھا۔ اندھیرے کے باعث وہ لوگ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہ میرا تصوراتی قیاس تھا کہ دسم ان کے بری طرح پٹ رہا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ دسم تو انہیں دیکھ نہیں پاتا تھا مگر حملہ آور اس اندھیرے میں بھی بہ خوبی دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے اپنی آنکھوں پر اینٹی ڈارک لینس یا پھر اینٹی ڈارک گھڑ لگائے ہوئے تھے!

یہ بڑی نشوونما ناک صورت حال تھی۔ میں دروازے کی اوٹ میں کسی خاموش تماشا کی طرح کھڑا دسم کو بچنے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حیرت اس بات پر بھی کہ ابھی تک کسی حملہ آور نے میرے بیڈروم کا رخ کیوں نہیں کیا تھا؟

میں نے دسم کی مدد کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میری یہ حیرت دور ہوگئی۔ میں جیسے ہی دروازے کی آڑ سے نکل کر بیڈروم سے باہر آیا دو افراد سے خوف ناک تصادم ہو گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے اس بیڈروم کی طرف آئے تھے لہذا اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہم تینوں بیڈروم کے اندھا گھر گئے۔

یہ میرا اندازہ تھا کہ مجھ سے ٹکرانے والے افراد کی تعداد دو تھی ورنہ میں گہری تاریکی میں انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔ فرش پر گرنے کے بعد اٹھنے میں نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی۔ لمحے کا دواں حصہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا تو شدید نقصان

کا اندیشہ تھا۔ میں نے بیک پیٹ کی مدد سے ایک فعال ہینڈ اسپرنگ لگایا اور اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا مجھ سے ٹکرانے والے کس کس پوزیشن میں تھے۔ میں نے کھڑے ہوتے ہی حفظ ما تقدم کے طور پر لیفٹ رائٹ دو کرینٹ نکس چلا دیں۔ میری دونوں نکس خالی نکیں۔ اس سے ثابت ہوا حملہ آور ابھی سنبھلے نہیں پائے تھے۔ عین ممکن تھا وہ ابھی تک بیڈروم کے فرش پر ہی پڑے ہوں۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی حرکات و سکنات کو محسوس کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ ایک طاقت ور بازو عقب سے ”موادار“ دو اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میری گردن کو گرفت میں لے لیا۔ اس کی یہ حرکت اتنی بد وقت اور نپٹی تھی مگر جیسے وہ دیکھ بھال کر میری جانب بڑھا ہو۔ اس کا یہی مطلب تھا حملہ آور اس اندھیرے میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اینٹی ڈارک لینکس والا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔

میں اپنی گردن کو چھڑانے کی تک دو میں مصروف تھا کہ دوسرے حملہ آور نے مجھے ناگوں سے دبوچ لیا پھر وہ مجھے ڈھرا ڈھرا کر کے بیڈروم سے باہر لانے لگے۔ ان دونوں کے ایکشن میں اتنا ربط ضبط تھا جیسے وہ بخوبی ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ ان کی گرفت میں بڑی مضبوطی تھی۔ اگر میں خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا تو پتا نہیں وہ میرا کیا شتر کرتے!

میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے لہذا میں نے سب سے درست انہیں استعمال کیا۔ جس شخص نے میری گردن دبوچ رکھی تھی میں نے اس کے پہلو میں ہاتھ ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دونوں ناگوں کو ایک جھٹکے سے سمیٹ لیا۔ اس جھٹکے نے اس شخص کو آگے جھٹکے پر مجبور کر دیا جس نے میری ناگوں ہاتھ رکھی تھیں۔ اسی لمحے میں نے پوری قوت سے کلک مارنے والے انداز میں دونوں ناگوں کو کھول دیا۔ میری یہ حرکت ایک طوفانی ڈبل پیٹ کلک جیسی تھی۔

میرے پاؤں نے آگے پیچھے ہٹنے کی ہی سرعت سے حرکت کی تو ناگوں اس شخص کی گرفت سے آزاد ہو گئیں۔ میں نے اسی لمحے دوسرے شخص کے پہلو میں ہاتھوں کو مضبوطی سے استعمال کرتے ہوئے ایک جھک سے خود کو اوپر اٹھالیا۔ میں اس کے سر پر پہنچا تو میں نے اس کے پہلو کو آڑا کرتے ہوئے ایک بیک سرسائٹ لگایا اور اس کے عقب میں پیچھے ہی ایک بیک کلک جڑ دی۔

یہ بڑی زوردار کلک تھی۔ وہ ایک اندازے کے مطابق

روک کے بل جھٹکے ہوئے آگے بڑھا ہوگا۔ پھر مجھے اس کے ٹکراؤ کی آواز سنائی دی تو یہ اندازہ درست نکلا۔ وہ اپنے ہی سانچے سے تصادم ہو گیا تھا۔ یہ تصادم خاصا خطرناک ثابت ہوا کیونکہ اگلے ہی لمحے ان کی کراہیں میری سماعت تک پہنچیں۔ آواز اگرچہ بجتی ہوئی مگر تاہم تکلیف دہ تھی جیسی نہیں تھی۔

میں نے ان دونوں پر لنت بھیجی اور لاؤنچ کی جانب رینگ گیا۔ اصولی طور پر مجھے دسم والے بیڈروم کی طرف جانا چاہیے تھا لیکن ان نازک لمحات میں میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال چمکا تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا لاؤنچ داخلی دروازے کے قریب تھا اور لاؤنچ کی ایک سلائیڈنگ وڈر باہر کو کھلتی تھی۔ اگر میں مذکورہ کھڑکی کو سلائیڈ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اپارٹمنٹ کی انتہا تاریکی میں اچالے کی نقب لگائی جاسکتی تھی۔ اس طرح ہمیں بھی وہی آسانی میسر ہو جاتی جو اس وقت حملہ آوروں کو حاصل تھی۔ مجھے پورا یقین تھا صرف ہمارے اپارٹمنٹ کی الیکٹرک سلائیڈ منقطع کی گئی تھی۔ ہمارے سوا وہ اپارٹمنٹس بلڈنگ اور پورا فرنی بیکاروشی سے مستفید ہو رہا ہوگا۔

انہی خیالات کے ساتھ میں سلائیڈنگ وڈر تک پہنچا اور پھر اگلے ہی لمحے میرے ہاتھوں کی حرکات نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی۔ کھڑکی کھلتے ہی لاؤنچ میں گھبراہٹ مچ گئی۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودی محسوس ہوئی اور میں ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔

مجھ سے پٹنے والے وہ دونوں افراد میرے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ اب میں انہیں بہت واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ان کی آنکھوں پر مجھے سیاہ شیشوں والے گھڑ دکھائی دیے۔ عین طور پر یہ اینٹی ڈارک گھڑ تھے۔ ان گھڑوں میں کمائی کے بجائے اسٹریٹ لگے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ہاتھوں زیر و زبر ہونے کے باوجود وہ بھی مذکورہ گھڑان کے چروں پر موجود تھے۔ اسٹریٹس نے انہیں بڑی حفاظت سے سنبھال رکھا تھا۔

وہ دونوں بڑے خطرناک تھوڑے سے میری جانب بڑھے۔ ایک کے ہاتھ میں مجھے سائیکلنگ گئیں گن صاف نظر آرہی تھی۔ دسم والے بیڈروم میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ قرآن سے اندازہ ہوتا تھا یہی دونوں حملہ آور پہلے دسم سے نبرد آزما تھے۔ دوسرے فارغ ہونے کے بعد میرے بیڈروم کی طرف آئے تھے۔ دسم کی جانب چھائی خاموشی سے ظاہر

ہوتا تھا اسے زیر کرنے کے بعد ہی وہ میری سمت بڑھے تھے۔

”ہینڈ زاپ!“ گن بردار نے کرخت لہجے میں کہا۔ اس کا سانچہ بڑی سرعت سے آگے بڑھا۔ میں نے گن بردار کی ”آنکھوں“ میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا ”کون ہو تم لوگ؟“

”ایف بی آئی!“ اس نے چمک کر کہا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

وہ اپنی آنکھوں پر سے گھڑ ہٹاتے ہوئے بولا ”اس میں جھوٹ والی کون سے بات ہے؟“

اس کے لہجے سے حد درجہ حیرت جھلکتی تھی۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”ایف بی آئی والے یوں چوروں کی طرح کارروائی نہیں کرتے۔ یہ ملک کی ایک نہایت ہی طاقت ور ایجنسی ہے۔ اس سے متعلق افراد بڑے شاندار طریقے سے موقع پر پہنچتے ہیں اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی آئی ڈی شو کرتے ہیں۔ تم نے اپنی شناخت نہیں کرائی“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے زہریلے انداز میں کہا ”کیا ایف بی آئی نے تمہیں آئی ڈی کارڈ جاری نہیں کیے؟“

اس دوران میں گن بردار کا سانچہ میرے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا اندازہ بتاتا تھا وہ میری جامع تلاش کا ارادہ رکھتا تھا۔ گن بردار سے میری مکالمات نے اسے کھانی تھمے میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوا لہجے سے گن بردار کو کھینچے لگا۔ گن بردار کی دیکھا دیکھی اس نے بھی سیاہ گھڑ کو آنکھوں پر سے ہٹا دیا تھا۔

گن بردار مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”ہم اپنی آئی ڈی بعد میں شو کریں گے“ پہلے ذرا آپ دونوں کا حدود اور بعد معلوم کر لیں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے سانچے کو تھکانا اشارہ کیا۔

اس اشارے کا واضح مطلب یہی تھا وہ میری تلاش کا کام شروع کر دے۔

میں نے اس موقع پر پھر بورادکاری کا مظاہرہ کیا۔ میں نے بڑی شرافت سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ یہی سمجھے میں ان کی ایف بی آئی والی دھڑوں میں آ گیا ہوں۔ ویسے میں ان لمحات میں بہت سی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ اصلی ایف بی آئی والے ہیں یا اس آڑ میں کسی خفیہ مشن پر ہیں۔ گن بردار اس دوران میں وقت و وقفے سے اپنی رست واضح پر بھی نگاہ ڈال رہا تھا۔ اس کا اندازہ بتاتا تھا انہیں واپسی

کی جلدی ہے۔ میری تلاشی کی غرض سے آگے بڑھنے والا شخص جب مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر پہنچا تو میں شرافت اور مرحومیت کے لہادے کو ایک طرف پھینک کر حرکت میں آگیا۔ میرا یہ فوری اور غیر متوقع رد عمل ان کے لیے بولکھا ہٹ کا باعث بن گیا۔

اس شخص نے تجھمانہ انداز میں صرف ایک مختصر سا جملہ ادا کیا "اباؤٹ ٹرن!" میں بجلی کی سی سرعت سے ایک ایڑی پر گھوما اور اسی اثنا میں دوسری ٹانگ چلا دی۔ میری برق رفتار بیک پش کلک اس شخص کے سینے پر پڑی۔ میں اپنی ہی جھونک میں ٹھوڑا آگے آیا اور سامنے والی پرواز سے ہینڈ بیلے کر تڑپیں ڈبل بیک فلیک لگا دی۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی حرکات کا زادیہ ایسا رکھا تھا کہ ان دونوں کے پہلو میں لگن جاؤں تاکہ گمن بردار اگر فائر کرے تو میں کسی نقصان سے محفوظ رہوں۔

مجھے اپنے مقصد میں کامیابی تو حاصل ہوئی لیکن اسی دوران میں فائر کی مخصوص "ٹھک" بھی سنائی دی۔ مجھ سے کلک کھانے والا بیک گیز میں سفر کرتے ہوئے اپنے گمن بردار سامنے ہی سے جا گرایا تھا اور شاید اسی گراؤ کے نتیجے میں کوئی چل گئی تھی تاہم میں اپنی حکمت عملی کے باعث کسی قسم کے نقصان سے محفوظ رہا۔ گمن کی نال پر سائینسز لگا ہوا تھا لہذا وہ مخصوص "ٹھک" اس اپارٹمنٹ سے باہر نہ جاسکی۔

قدموں پر کھڑے ہوتے ہی میں نے پراسرار دھنوں کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اچھے ہوئے لاؤنج کے فرش پر پڑے تھے۔ میں تیزی سے ان کی جانب بڑھا اور اسی لمحے میری نگاہ گمن بردار کے ہاتھ پر گئی۔ وہ گمن سیدی کرتے ہوئے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا۔

میں چیپے کے مانند اس کی طرف لپکا اور اس کے گمن والے ہاتھ پر اپنے بوٹ کی کاری ضرب لگائی۔ ادھر اس کے ہاتھ سے گمن لگی، ادھر اس کے حلق سے کرب ناک سسکاری برآمد ہوئی۔ میں اس گمن پر قبضہ کرنے کے لیے جھکا تھا کہ معزوبہ کے سامنے نے یہ کارنامہ انجام دے ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک لمبی روٹنگ کرتے ہوئے مجھ سے پانچ قدم کی دوری پر چلا گیا۔

میں نے پلک جھپکتے میں اس کے خطرناک ارادے کو بھانپ لیا۔ وہ دور جا کر مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے معزوبہ شخص کے چہرے پر ایک فٹ بال کلک رسید کی اور دو بیک فلیک لگاتے ہوئے گمن بردار کے قریب پہنچ گیا۔ میری

میں نے سرسری انداز میں ان کی تلاشی لی۔ ایک کی گمن نے اپنا کردار ادا کر دیا تھا۔ دوسرے کی گمن کو میں نے اس کے لباس میں سے برآمد کر لیا۔ اس تلاشی میں ان کے سرس کا رڈ بھی میرے مجھے لگ گئے جن پر نگاہ پڑے ہی میں جان

یہ حرکت اس کے لیے خلاف توقع تھی۔ مجھے نزدیک آنے کے بجائے اس سے دور بھاگنا چاہیے تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے بولکھا گیا۔ یہ لمحہ میرے لیے ایک صدی کے برابر تھا۔ میں نے اس کی بولکھا ہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی تیزی سے ایک کریسنٹ کلک چلا دی۔ کلک اس کے گمن بردار ہاتھ پر لگی۔ گمن نے مخصوص ٹھک کے ساتھ ایک گولی اٹکی۔

میں اب بھی بالکل محفوظ رہا۔ اس نے میری کھوپڑی میں ہوا دان بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن بھلا ہو کریسنٹ کلک کا۔ اس کلک کے دوران میں جسم کا بالائی حصہ پینٹا لیس درجے کے زاویے پر پیچھے کو جھک جاتا ہے۔ گولی میرے سر کے ایک فٹ اوپر سے گزرتی۔

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور کریسنٹ کی پیمیل پر جیسے ہی میرا پاؤں زمین پر آیا میں نے فرنٹ فٹ پر حرکت کی اور اندر آتے ہوئے گمن پر جھینامار، رد عمل کے طور پر اس نے اپنے گمن بردار ہاتھ کو پیچھے کھینچا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالے اور ٹھٹھوں کی درجے پر ٹھوکریں اس کے پیٹ کی زریں حصے پر برساتا شروع کر دیں۔

وہ تکلیف کی شدت سے بلہا اٹھا۔ اس افتاد کے دوران میں اسے گمن استعمال کرنے کا ہوش نہ رہا۔ میں نے اس کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اپنی کارروائی جاری رکھی اور بالآخر تھرمیڈار کر اسے اپنے اوپر سے پیچھے اچھال دیا۔

اس نے ہاتھ پاؤں جھٹکتے ہوئے فضا میں بے ڈھنگی پرواز کی اور لینڈنگ کے لیے اپنے زمین بوس سامنے کا انتخاب کیا۔ اس "لینڈنگ" نے ان دونوں پر جو قیمت ڈھالی، وہ بیان سے باہر ہے۔ پرواز کے دوران میں گمن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑھ اوڑھ ہو گئی تھی۔ میں اچھل کر ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

وہ فرش پر سے اٹھنے کی کوشش میں تھے۔ میں نے یکے بعد دیگرے ان کے ٹھوہڑوں پر ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ معزوبہ چہروں کو تمام کر پیچھے کو الٹ گئے۔ میں آگے بڑھا اور ہاتھ پاؤں کی ضربات سے انہیں روٹی کے مانند دھک کر رکھ دیا۔ دو منٹ کے بعد وہ میرے قدموں میں پڑے ہانپ رہے تھے۔



کیا ان کا تعلق ایف بی آئی سے تھا۔ یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ اصلی اور نقلی کے پتھر میں بڑے تغیر اگر وہ واقعی ایف بی آئی والے تھے تو پھر حالات کی بھی ہزار گنا بڑھ جاتی تھی۔ میں ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے اس بیڑوم میں لے آیا جہاں دسیم کو ہونا چاہیے تھا۔

میرے استفسار پر پزیرا م آئے ہوئے ایف بی آئی کے دونوں ایجنٹوں کو بتانا پڑا کہ انہوں نے ہمارے اپارٹمنٹ کی لائٹ کے ساتھ کیا کیا تھا۔ ان کی نشان دہی پر میں نے مین سوئچ آن کیا تو اپارٹمنٹ میں بجلی کی فراہمی بحال ہو گئی۔ ہمیں شکار کرنے کے لیے انہوں نے مین سوئچ کو آف کر دیا تھا۔ دسیم غیم بے ہوش تھا تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ اس کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد میں ایف بی آئی والوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس دوران میں میں ان کی طرف سے ایک لمبے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور کہا۔

”اس بات کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا کہ تم ایف بی آئی والے ہو بھی یا نہیں، تمہارے سروں کا ڈاؤنڈر کو میرے قبضے میں ہیں جنہاں باری شناخت کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔“ اپارٹمنٹ کی بجلی بحال ہوتے ہی میں نے ”کھوٹی ہوئی“ مگر بھی ڈھوڑی تھی ”فی الحال اتنا متاؤ کہ اس اپارٹمنٹ میں تم کیسے اور کس مقصد سے داخل ہوئے تھے۔ ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟“

ایک نے نفرت انگیز نظریں مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا ”دوستی اور دشمنی کا ہمیں پتا نہیں۔ ہم صرف احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔“

”کس کے احکام کی؟“

”اپنے سینئر کے احکام کی۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے۔“ میں نے زہر خند انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنے مخاطب کے قدموں میں ایک فائر کر دیا۔

اس گن پر بھی سائیکلر موجود تھا۔ مخصوص ٹھک اس کی تیز چمچ میں فنا ہو کر رہ گئی۔ خاموش گولی نے اس کے پاؤں کا خانہ خراب کر دیا تھا۔ میں نے دشت تک لہجے میں کہا۔

”اگر تم لوگوں نے میرے سوالات کے درست جواب فراہم نہ کیے تو اگلی گولی تم میں سے ایک کے سینے میں اترے گی۔ اس کے بعد دوسرے کی باری آئے گی!“

میرے لہجے کی سنگینی نے انہیں باور کرا دیا کہ میں جو کچھ

کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنے میں بھی کسی تاخیر سے کام نہیں لوں گا۔ میں نے جس کے پاؤں کا کپڑا کیا تھا وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ دوسرے نے کہا۔

”ہمیں حکم دیا گیا تھا ہم تم دونوں کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کریں اور اگر تمہاری ذات مشکوک ٹھہرے تو تمہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔“

میں نے بے چینی سے اسے دیکھا اور کہا ”اصلیت جاننے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ تم نے اپارٹمنٹ کا مین سوئچ آف کر دیا اور ہمیں کاہنہ کرنے کے لیے اپنی آنکھوں پر اسٹینڈرڈ مارک لگا کر چلا لے؟“

میرے انکشاف نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں جس سے مخاطب تھا اس نے رد کے لہجے میں کہا ”ہمارا کام کرنے کا اپنا ایک طریقہ ہے۔“

”اور میرا بھی اپنا ایک منفرد طریقہ ہے۔“ میں نے سفاکی سے کہا اور اس کے پاؤں کو نشانہ بنا کر ایک گولی داغ دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا ”کہو میرا طریقہ کار پسند آیا؟“

وہ مجھے بے نقطہ شانے لگا۔ مغلظات کی اس برآمدگی پر میں نے ایک مرتبہ پھر ان کی ٹھکانی شروع کر دی۔ وہ تکلیف کے باعث گرا رہے تھے بلکہ اڑ رہے تھے مگر ان کے کس بل تھے کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا دونوں گن پر سائیکلر فٹ تھے۔ میں نے باری باری ان کا بھرپور استعمال کیا اور ان کے گولس کو ایف بی آئی کے ایجنٹوں کے ہاتھ پاؤں پر پھالی کر دیا۔ مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ میں امریکا کی زمین پر اس کی ایک طاقتور ایجنسی کے دو ایجنٹوں کا کیا حشر کر رہا ہوں۔ ربی موسے ہائمن کے اشارہ پر دو ہاں کی پولیس مجھے ”امریکا دشمن“ کا ٹائٹل دے چکی تھی۔ ایمن دوائے بی ڈی ڈی والے بوی سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہے تھے اور بریٹنگ نیوز کے ذریعے بار بار نیویارک کے عوام سے اپیل کی جا رہی تھی کہ میری گرفتاری یا ہجرتی کے سلسلے میں وہ پولیس سے بھرپور تعاون کریں۔ مجھے پرورجن بھر یہودیوں کے بہانہ قتل کا الزام عائد کیا جا رہا تھا۔ میں صحت الزام سے تو انکاری نہیں تھا مگر لفظ ”بہانہ“ پر مجھے سخت اعتراض تھا۔ یہ بہانہ نہیں بلکہ میرا امن پسندانہ اقدام تھا۔

ایف بی آئی کے دونوں ایجنٹ تکلیف کی شدت کے باعث ڈھیر سے تھکے ہوئے جا رہے تھے۔ لاؤنچ سے بیڑوم کی طرف آتے ہوئے میں نے سلائیڈنگ وڈو کو بند کر دیا تھا چنانچہ ان دونوں مصیبت زدگان کی آہ دیکھا

اپارٹمنٹ سے باہر رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ بجلی کی فراہمی بحال ہو جانے کے بعد کڑی کا کھلا ہوا ضروری نہیں تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر ان دونوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میرے ایک ایک لفظ سے سنگینی اور سفاکی کچک رہی تھی۔

”تم نے دیکھ لیا؟ میں کس انداز میں کام کرنے کا عادی ہوں۔ میں تم دونوں کو ایک آخری موقع دے رہا ہوں۔ سچ سچ بتا دو تم کیا سوچ کر اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے اور..... اس سے پہلے یہ متاؤ کہ تم اپارٹمنٹ کے اندر کیسے پہنچے۔ داخلی دروازہ تو میں نے لاک کر دیا تھا اور وہ ابھی تک لاک ہے؟“

لاؤنچ میں ان پر سبقت حاصل کرنے کے بعد میں نے آن واحد میں تین کام کیے تھے۔ میں نے سائیکلر گن کی تلاش کی، سلائیڈنگ وڈو کو بند کیا اور اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کو چپک کیا تھا۔ مجھے جتنی شدت سے تلاش کیا جا رہا تھا اس کے پیش نظر ذرا سی کوتاہی یا بے احتیاطی بھی کسی بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی جب کہ وہ دونوں ایف بی آئی کے ایجنٹ ہونے کے بھی دعوے دار تھے۔ اسی دوران میں دسیم کوشش آئے لگا اور یہ ایک محنت مند علامت تھی۔

میں اور دسیم تبدیل شدہ طبلوں میں تھے حتیٰ کہ ہم جو صورتیں لے کر اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے، وہ بھی اب کامیاب میک اپ کے پیچھے نہا لے چکے تھیں۔ یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ ایف بی آئی کے وہ ایجنٹ وجدان کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے یا کوئی دوسرا اسی معاملہ تھا!

ہاتھ پاؤں سے بے کار ہونے کے بعد انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اب بھی انہوں نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو میں انہیں ختم کرنے میں کسی حیل و دھت سے کام نہیں لوں گا چنانچہ ایک نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم تینوں جب رات نو بجے اپارٹمنٹ سے نکلے تو ہم نے ”ٹرائی بیکارل“ تک تمہارا تعاقب کیا تھا۔ تم ریٹورنٹ میں داخل ہوئے تو ہم داہنیں آکر اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ انہم اندر کیسے پہنچے! اس نوعیت کے کام ہمیں بہ خوبی آتے ہیں۔“

”اوہ!“ میں نے چونک کر اسے دیکھا ”تم تو بے سارے گیارہ بجے تک اس اپارٹمنٹ میں چھپے بیٹھے رہے اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ خیر تم متاؤ کارروائی کے لیے تم لوگوں نے اتنا انتظار کیوں کیا۔ تم ہمارے پاس آتے ہی سرگرمی دیکھا سکتے تھے؟“

”اس کا حکم نہیں تھا۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا ”ہمیں

خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی سارے گیارہ کے بعد ہم میدان میں اتریں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے رسد داغ پر نگاہ ڈالی۔

اس کے انداز میں چھپی بے چینی نے مجھے چونکا دیا۔ بے اختیار میری نظر دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ کلاک رات گیارہ بجاس کا وقت بتا رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں تاریکی چھانے سے لے کر اب تک صرف دس بارہ منٹ گزرے تھے۔ میں نے خود سے مخاطب غصے سے پوچھا۔

”اب یہ بھی بتا دو تم دونوں کو کس مقصد سے ہمارے پیچھے لگایا گیا تھا؟“

اس کے چہرے پر متاملانہ تاثرات نمودار ہوئے تو میں نے اسے ایک ہیوی ڈوڈ دینا ضروری جانا۔ اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

”سچ بول کر تم اپنے لیے رعایت حاصل کر سکتے ہو اور یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد میں تم دونوں کے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہوں وہ تمہارے تصور میں نہیں آ سکتا۔“

اس کی آنکھوں میں مجھے موت کے سامنے لہراتے دکھائی دیے۔ اس دوران میں دسیم پوری طرح ہوش دحواس میں آچکا تھا اور اس نے محاذ کا دوسرا اسرائیلی بخش انداز میں سنبھال لیا تھا۔ ان دونوں بد بختوں نے اندر میرے کی آڑ میں اس کے ساتھ بڑا ظالم سلوک کیا تھا۔ وہ اس وقت بڑے خطرناک موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے جس انداز میں صورت حال کو اپنے حق میں پھیرا اس نے دسیم کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

میں نے جس سے سوال کیا تھا وہ منمنائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم چاہے میری بات کا یقین کر دیا نہ کرو لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں تم لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ہم محض یہ جانتے ہیں تم دونوں اپنی آئی ڈی تبدیل کرنے والے ہو۔ کوئی ایجنٹ آج کل تم سے رابطہ کرنے والا ہے۔ اس اپارٹمنٹ میں تمہارا قیام عارضی ہے۔ کاغذات بننے ہی تم دونوں امریکا سے نکل جاؤ گے۔“

اس کے انکشافات بڑے سنسنی خیز تھے۔ ہماری آئی ڈی کی تبدیلی والی بات صرف چار افراد کو معلوم تھی۔ یعنی میں دسیم، دنگ ہنگ اور مسٹر جونی جو ہمارے کاغذات تیار کرنے والا تھا۔ یہ راز اگر ایف بی آئی والوں تک پہنچا تھا تو اس کا بھی مطلب تھا انہی چار افراد میں سے کسی نے غداری کی تھی۔ مسٹر ہنگ میرے لیے بھروسے کا آدمی تھا۔ میں اور دسیم اپنے پاؤں پر اپنے ہاتھ سے کھڑی مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آج اگر مسٹر جونی ہی چٹا تھا۔ کیا اس نے ایف بی آئی

ہوں؟“

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ جان سکوں ایف بی والوں کو کس کی تلاش ہے۔ کیا وہ اس سرگرمی کے ذریعے وجدان یعنی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ویسے مجھے اس کی امید نہیں تھی کیونکہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ اتنی سست روی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ میں تو اس وقت کا رہنما تھا۔ ایک تھا۔ مجھے چھاپنے کے لیے محض دو ایجنٹ ناکافی تھے۔ اگر انہیں یہ شک تھا کہ آئی ڈی کی تبدیلی کے بعد امریکا سے نکلنے والے ویکم اور وجدان ہیں تو پھر وہ ہماری جمیعت کے ساتھ اس اپارٹمنٹ پر دھاوا بولتے۔ اس سلسلے میں وہ ایک لمحے ضائع کرنا بھی انورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

وہ تھوڑے تامل کے بعد بولا ”میں نہیں جانتا تم کون ہو مگر اچھا مجھے معلوم ہے کہ تم ایک خطرناک دشمن ہو۔ تمہارے حالیہ عمل نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم نہایت ہی سفاک ہو۔“

”میں ایف بی آئی اور سی آئی اے والوں سے زیادہ سفاک اور عالم نہیں ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک مرتبہ پھر رسٹ وایج پر نگاہ ڈالی۔

میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا ”جہیں کس کا انتظار ہے؟“

”ٹھیک پانچ منٹ بعد جہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔“

اس وقت رات کے گیارہ بجپن ہوئے تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد کا مطلب تھا مین رات کے بارہ بجے۔ اس کا انداز بتاتا تھا بارہ بجے کوئی وہاں پہنچنے والا ہے اور..... یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ میرے پاس صرف پانچ مردہ تھے۔ اسی قلیل وقفے میں مجھے اپنے بچاؤ کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا تھا۔

وہ دونوں ایجنٹ میرے لیے بیکار تھے۔ ویسے وہ فی الحال خود اپنے لیے بھی بیکار ہو چکے تھے۔ میں نے انہی کی گمنوں کو استعمال کر کے ان کے ہاتھ پاؤں سے ایسی ”مہندی“ لگا دی تھی کہ وہ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے میں نے ان سے جنگ ہنگ کے بارے میں پوچھنا ضروری سمجھا۔

”ہم اپنے جس سماجی کے ہمراہ ٹرائی بیکار مل نامی ریسٹورنٹ میں گئے تھے اس پر تم نے کوئی کام نہیں کیا؟“

والوں کو ہمارے منصوبے کے بارے میں بتادیا تھا؟ جونی مسٹر ہنگ کی نگاہ میں قابل اعتماد تھا لیکن میں جس قسم کے حالات سے دوچار تھا ان میں کسی امریکی پر تو قطعاً اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ پھرے حوالے سے میں یمن میں جس قسم کی ایمرجنسی نافذ تھی اس میں کسی بھی اپ سیٹ کی توقع کی جاسکتی تھی۔

یہ تمام پرتشویش خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے نہایت ہی جیتے ہوئے لہجے میں ایف بی آئی ایجنٹ سے استفسار کیا ”تم لوگوں کو یہ کیسے پتا چلا کہ ہم دونوں آئی ڈی تبدیل کرنے کے بعد امریکا سے نکلنے والے ہیں؟“

”ہمارے اپنے سورسز ہوتے ہیں۔“ وہ نجف سی آواز میں بولا اور ایک مرتبہ پھر اپنی رسٹ وایج پر نظر ڈالی۔ اس نظر میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے تاثرات کا خصوصی نوٹس لیا۔ اس کے انداز سے اضطراب چھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی خاص لمحے کا انتظار ہو۔ میں نے وقت کے ایک ایک پہلے کا درست استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”تم ظاہر نہ کرو مگر میں جہیں بتاتا ہوں تم لوگوں کی معلومات کا ذریعہ مسٹر جونی ہے وہ ایجنٹ جس کے توسط سے ہماری نئی آئی ڈی بننے والی ہے۔“

”تو گویا تم نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی؟“ اس کی آواز میں کمزور سا غرور تھا۔

میں نے قطعی لہجے میں کہا ”میں نے اپنی نہیں مسٹر جونی کی اصلیت کھولی ہے۔ ویسے آپ لوگوں نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

اس نے حیرت بھری سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا مگر خاموش رہا۔

میں نے کہا ”میں نے ایف بی آئی نامی اس ایجنسی کی بہت تعریف سنی تھی۔ ایک عالم اس سے خوف زدہ ہے مگر تمہاری کارکردگی کو دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم لوگ ایسی ہی سست رفتار سی کام کرتے ہو؟“

اس نے جواب دینے سے قبل ایک مرتبہ پھر دہشت گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا ”بہت جلد جہیں ہماری کارکردگی اور رفتار کا اندازہ ہو جائے گا۔ ہم دو افراد کو زیر کر کے تم پتا نہیں کیا سمجھتے تھے؟“

”میں خود کو ہی سمجھ رہا ہوں جو ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا ”تم جانتے ہو میں کون

وہ پلک جھپکتے ہیں میرے سوال کی غرض و غایت تک پہنچ گیا۔ انھوں نے لہجے میں بولا "ہماری معلومات کے مطابق جونی اسی شخص کے ایما پر تہہاری بی بی کی ڈی تیار کرنے والا تھا۔ اور پر والے تہہارے سامنے کے ساتھ کیا سلوک کریں گے ہم نہیں جانتے۔ ہمارے بڑوں نے اس کے بارے میں بھی کچھ سوچ ہی رکھا ہوگا۔ ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور غیر ضروری سوال نہیں کرتے۔ ہمارے لیے صرف یہی احکام تھے کہ تم دونوں کو تیار کریں اور بارہ بجے۔"

اس نے اس انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اس کے آخری الفاظ "بارہ بجے" نے مجھے بتا دیا تھا کہ چار بج منت بعد کچھ ہونے والا ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ اسی اپارٹمنٹ میں ہونے والا ہے۔ میرے ہاتھ میں صرف چار منٹ کا وقت باقی تھا۔ اس شخص نے جونی اور آئی ڈی کی تبدیلی کا پڑو تو ذکر کر کے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ ہمارے سلسلے میں جونی ہی ہے خداری کی تھی۔ اس حساب سے دنگ ہنگ کی ذات بھی خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ اگر ایف بی آئی آئی ڈی تبدیل کر کے امریکا سے نکلنے والوں میں دھجی لے رہی تھی تو پھر ان کے لیے دنگ ہنگ کی شخصیت بھی خالی از دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے میں نے مسٹر ہنگ سے آخری گفتگو کی تھی اور اس وقت تک وہ بخیر و غایت تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ فوری طور پر مجھے مسٹر ہنگ سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اسے یہاں پیش آنے والے حالات اور تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ کہیں وہ بے خبری ہی میں نہ مارا جاتا۔

میں نے نگاہ ہی نگاہ میں دسم کو اشارہ کیا اور آئندہ دو منٹ کے اندر ہم نے ان دونوں ایف بی آئی ایجنٹ کو کھینٹ کر ایک دواں روم میں پہنچا دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں سے بری طرح ڈھکی تھے۔ اپنے قدموں پر چل کر وہ اپارٹمنٹ سے باہر نہیں جاسکتے تھے تاہم احتیاط کے پیش نظر انہیں دواں روم میں پہنچانے کے بعد میں نے دروازے کو لاک کر دیا۔ ان کے سردس آئی ڈی کارڈ اور کونجی میں نے دواں روم کے فرش پر پھینک دیں۔ یہ سب میرے لیے بیکار تھا۔ ان سے متعلق اشیاء انہیں کے پاس رہیں تو زیادہ اچھا تھا۔ یہ دسم والے بیڈ روم کا دواں روم تھا۔ جب تک باہر سے اس دواں روم کا دروازہ کھولا جاتا وہ ہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ٹیلی فون سیٹ کی جانب لپک گیا۔ میرے اور ایف بی آئی ایجنٹ کے درمیان

ہونے والی تمام تر گفتگو دسم نے بھی سنی تھی۔ تشویش بھرے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔

"وجدان! ہمیں فوری طور پر اس اپارٹمنٹ سے نکل جانا چاہیے۔ اس دوائے بی ڈی کے بعد اب ایف بی آئی بھی ہمارے پیچھے پروٹی ہے۔"

میں نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے لیکن اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے میں ایک ضروری کال کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس کو؟" اس نے پوچھا۔  
میں نے ڈائنگ روم مل کرنے کے بعد کہا "مسٹر ہنگ کو۔"

وہ فکرا میرا خاموش نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ ڈائنگ کی کچل کے ساتھ ہی دوسری جانب کھنٹی بجنے لگی۔ یہ دنگ ہنگ کے گھر کا نمبر تھا۔ لگ بھگ آدھا گھنٹہ پہلے اسی نمبر پر میری اس سے بات ہوئی تھی۔ میں نے ہنگ سے ڈاکٹر مونگ ریٹھو سے کالیں نمبر لیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اور ساحل کو میں انتہائی غیر یقینی جوشن میں چھوڑ کر آیا تھا۔ پتا نہیں وہ اب کس حال میں ہوں گے۔ ایف بی آئی والوں کی "شیطانی" نے مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں دی تھی کہ میں کھنڈر کے مضافات میں ایک "نگار" ڈال سکوں۔ ابھی تک حالات کی یہ ستم ظریفی جاری تھی۔ میرا ذہن اس وقت متحدہ دکھائی دے رہا تھا۔

پانچویں کھنٹی پر دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا گیا تھا پھر انہیں میں مجھے مسٹر ہنگ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "ہیلو وجدان! کیا یہ تم ہو؟"

کار آئی ڈی سے اس نے سمجھ لیا تھا۔ ٹرائی بیکا کے اپارٹمنٹ سے فون کیا جا رہا ہے۔ میں نے جواب میں کہا "ہاں میں وجدان بات کر رہا ہوں۔ یہاں بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ فون پر تفصیلی بات نہیں ہو سکتی۔ تم خبریت سے تو ہو؟"

"ابھی تک خبریت سے ہوں لیکن آئندہ کے بارے میں دھوکے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ "وہاں تمہاری طرف گڑبڑ ہو چکی ہے اور یہاں میری جانب ہونے والی ہے۔ تم فوری طور پر اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ دو۔ میں گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔ میں ریسیور رکھنے کے بعد عارضی طور پر اس رہائش گاہ کو چھوڑ رہا ہوں۔ تم ایک سیل نمبر نوٹ کر لو۔"

"ہاں بولو۔" میں نے وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "بارہ بجتے ہیں صرف ایک منٹ باقی تھا۔"

اس نے مذکورہ نمبر دہرایا۔ میں نے سروسٹ اس نمبر کو اپنے ذہن کے یادداشتی خانے میں فیڈ کر لیا۔ وہ بولا "یہ میرے ایک پرائیویٹ سیل کا نمبر ہے۔ تم اس نمبر پر بعد میں مجھ سے رابطہ کرنا۔ اس کے بارے میں..... گڈ نائٹ!"

میں نے بھی جواب میں اسے گڈ نائٹ کہا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ میرا رات کا سلام اس تک پہنچا ہوگا کیونکہ اسی لمحے ہنگ نے ریسیور گرڈل کر دیا تھا۔

مسٹر ہنگ سے ہونے والی اس مختصر گفتگو سے پتا چلا کہ اس کی طرف بھی ایف بی آئی والوں نے کوئی کارروائی ڈال دی تھی یا پھر ڈالنے والے تھے۔ ہنگ نے مختلف مراحل میں ہماری مہر پر مدد کی تھی اور جونی والا معاملہ تو بالکل تازہ تھا۔ ہمارے ڈاکٹر مونگس والی ڈیل ہنگ ہی کے توسط سے مسٹر جونی سے ہوئی تھی۔ اگر ایف بی آئی والے "وجدان" کی تلاش میں نہیں بھی تھے تو بھی یہ صورت حالات ہم سب کے لیے انتہائی خطرناک تھی۔ آنے والے لمحات سکین سے سکین تر ثابت ہو سکتے تھے۔

ہم نے اپنے ضروری سامان کو ایک بیگ میں بھرا اور بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میں گاڑی اور اپارٹمنٹ کی چابیاں اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ میں اپارٹمنٹ کو لاک کر کے جانا چاہتا تھا اور فرار کے لیے ہمیں ایک گاڑی کی ضرورت بھی تھی۔

ہم بیرونی دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اطلاعی کھنٹی بج اٹھی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ آدھی رات کو ہم سے ملنے وہاں کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ آنے والے یقیناً انہی کے ساتھی تھے جنہیں میں نے دواں روم میں بند کر دیا تھا۔

میں دروازہ کھول کر ایف بی آئی والوں کو "دیکھ، نہیں کر سکتا تھا۔ یہ..... آئیں مجھے مارا والی بات ہوئی۔ میں نے دسم کو اشارہ کیا اور اپنے بیڈ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پھر کھنٹی بج اٹھی۔ باہر جو کوئی بھی تھا ایک خاص انداز میں جن دبا رہا تھا جیسے اندر موجود افراد کو کوئی اشارہ دے رہا ہو۔ ایسی اشارے بازی کرنے والا ہمارا ملاقاتی نہیں ہو سکتا تھا!

وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر واقع تھا۔ میں نے بیڈ روم میں داخل ہوئے ہی دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ دسم نے پوچھا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہم اس بلڈنگ سے فرار ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا

اور سلائیڈنگ وڈو کی سمت بڑھ گیا۔

میرے بیڈ روم کی ایک کھڑکی عمارت کی عقبی جانب کھلتی تھی۔ میں آدھ شدہ کاروائی راستہ اختیار کر کے خود کو موت کے منہ میں نہیں ڈھکیل سکتا تھا۔ ان نازک لمحات میں ہمیں وہ راہ اپنانا بھی جو غیر روایتی ہو۔ وہ چاہے کتنی بھی پرخطر کیوں نہ ہو لیکن اس راہ پر چلتے ہوئے ایف بی آئی والوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ نہ ہو!

میں نے پردہ ہٹا کر وڈو کو سلائیڈ کیا اور جبکہ کر باہر جھانکنے لگا۔ عمارت کی عقبی جانب مجھے سکون کے آثار دکھائی دیے۔ ہر طرف امن اور خاموشی تھی۔ اگر ہم فرسٹ فلور کے اس اپارٹمنٹ سے کسی طرح زمین پر پہنچ جاتے تو ایف بی آئی والوں کو قبل دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

میں پیسے ہی سیدھا ہوا دسم نے ہنڈ بڈ لہجے میں کہا "کیا تم اس کھڑکی کے راستے نیچے پہنچنا چاہتے ہو؟"

"اور کوئی ذریعہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "اور نہ ہی کوئی نیا ذریعہ تلاش کرنے کا وقت ہے۔ اگر ہم چند منٹ مزید یہاں رک گئے تو بے موت مارے جائیں گے۔ کھنٹی بجانے والے ہماری جانب سے کوئی پڑو مل نہ پا کر شرافت سے واپس نہیں چلے جائیں گے۔ وہ اپارٹمنٹ کا دروازہ تو ڈرگہ بھی اندر داخل ہو سکتے ہیں!"

ادھر میری بات ختم ہوئی "ادھر اپارٹمنٹ کے باہر فائر کی آواز کوئی۔ اس کے ساتھ ہی دھاڑے دروازہ کھٹنے کی صدا ابھری۔ میں نے سینڈ کے دسویں حصے میں اندازہ لگایا۔ پہلے فائر کر کے دروازے کا لاک توڑا گیا تھا۔ انہیں بعد دروازہ کھول کر وہ اندر گھسے ہوں گے۔ میں ممکن تھا وہ بھی مل اس بیڈ روم کے دروازے کے ساتھ بھی کوہرا میں۔ ایف بی آئی والوں کے پاس کوئیوں کی کھنٹی اور نہ ہی اختیار رات کی!

دسم نے بیگ کے اسٹریپ کو گرونگ کے اوپر سے گھما کر کندھے پر لٹکایا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "چلو وجدان! میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

ہم یکے بعد دیگرے سلائیڈنگ وڈو سے باہر نکلے۔ وہ وڈو زمین سے کم دہش چدرہ فٹ کی بلندی پر واقع تھی۔ یہاں سے ایک مخصوص ٹیکنیک کے ذریعے ہم بہ آسانی عمارت کے عقب میں پہنچ سکتے تھے۔ شاؤلن پمپل میں مارشل آرٹس کی تربیت کے دوران میں مجھے اس ٹیکنیک کی پریکٹس بھی کرائی گئی تھی۔ یہ ایک طرح کی سلائیڈنگ تھی جو انھوں پر دستانے ہونے کی صورت میں زیادہ سہل اور محفوظ بھی چلتی تھی۔ بہر حال ایمرینسی میں ہمیں دستاؤں کے بغیر ہی کام

چلا نا تھا۔

آوازیں سنائی دیں۔ یقینی طور پر یہ آوازیں دسم نے بھی سنی تھیں۔ ہماری رفتار میں کمی گناہ اضافہ ہو گیا۔ جب موت تعاقب میں ہو تو زندگی کو بچانے کی کوشش انتہا سے گزر جاتی ہے۔ ہم بھی ایک نامعلوم رفتار سے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ جلد ہی ہم فائرنگ رینج سے باہر نکل آئے۔

ہمارے سامنے کوئی متحین منزل نہیں تھی۔ بلڈنگ کی پارکنگ کی طرف جا کر گاڑی نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایف بی آئی والے خوشخوار بھڑیلوں کے مانند ہمیں سوگھ رہے ہوں گے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان کی چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے ورنہ انہوں نے ابارشمنٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی سے فائرنگ کر کے ہمیں بھونسنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ واشنگٹن مارکیٹ پارک کے نزدیک تھی۔ ہم بے دریغ بھاگتے ہوئے ہیرمین اسٹریٹ پر نکل آئے تھے۔ سڑک ایک بڑے اسٹور کے عقب میں چلڈرن پلے گراؤنڈ واقع تھا۔ ہم سانس ہموار کرنے کے لیے گراؤنڈ کے گیٹ کے نزدیک رک گئے۔

وہ صبح بستہ موسم سرما کی آدمی رات کا عمل تھا۔ پارک میں ہو کا عالم تھا البتہ گاڑوں لائسنس روشن تھیں۔ میں ایک ایسے حصے کی جانب ریمک گیا جہاں خاصا اندھیرا تھا۔ دسم کے بازو نے مجھے تشریش میں جھٹکا کر دیا تھا۔

میں نے تاریکی کی پناہ میں آتے ہی دسم بے پوچھا ”تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟“ ”گولی لگی ہے۔ حال کا اندازہ تم خود ہی لگا لو۔“ وہ جیداری سے بولا۔

میں نے اس کے زخمی بازو کو ٹوٹلے ہوئے کہا ”اندر ٹھس بیٹھی ہے یا صرف چھو کر زہری ہے؟“ ”میرا خیال ہے، ٹھس چھو کر زہری ہے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ”میں اپنے بازو میں بڑی تکلیف دہ جلن سی محسوس کر رہا ہوں۔“

اس دوران میں میری ٹوٹل تجزیہ خیز ثابت ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی کارنگری سے یہ جان لیا تھا کہ گولی اس کے بازو کے گوشت کو پھیلنے ہوئے گزری تھی۔ یہ زیادہ تشریش ناک بات نہیں تھی۔ بازو میں سے رسنے والے خون نے آستین کو بھگو دیا تھا تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ اگر بازو پر کوئی کپڑا اس کر باندھ دیا جاتا تو خون کے رساؤ کو روکا جاسکتا تھا۔

ہم نے اس وقت چلڈرن پلے گراؤنڈ کے نزدیک جس

میں نے وڈو کے نیچلے حصے پر دونوں ہاتھ جمائے اور ہاڈی کو نیچے لٹکا دیا۔ میرا فٹ جیسے فٹ سے لٹکا ہوا تھا۔ گویا پندرہ فٹ کی بلندی میں لگ بھگ سات فٹ کی کسی واقع ہو گئی ایک فٹ کی کٹر باز دوں نے پوری کر دی تھی۔

میں نے دیوار کے ساتھ دونوں ہتھیلیوں کو جمائے ہوئے جسم کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس دوران میں میری تمام تر توجہ اس پیش پر کسی جو میں ہتھیلیوں کے ذریعے دیوار پر پھسل کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں زمین پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے ایک خوف ناک فائر کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں نے بے ساختہ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دسم بھی میرے انداز میں کھڑکی سے نیچے لٹک رہا تھا لیکن ابھی اس نے سلائیڈنگ شروع نہیں کی تھی۔ فائر کی آواز نے اسے گڑبڑا دیا اور وہ جھپٹنے کے بجائے کودنے والے انداز میں نیچے آگیا۔

اس دوران میں میں اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ دسم جس بے ڈھب انداز میں نیچے آیا تھا اس میں اسے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور اسی مہلت میں میں نے کھلی ہوئی کھڑکی میں ایک شخص کا چہرہ نمودار ہوتے دیکھا۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چند لمحے پہلے میں نے فائر کی آواز سنی تھی اس گولی کے ذریعے بیڈروم کے دروازے کا لاک توڑا گیا تھا۔ میں نے کھڑکی میں نمودار ہونے والے چہرے میں حرکت محسوس کی اور دوسرے ہی لمحے ایک گردن بردار ہاتھ بھی میری نگاہ میں آگیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ہمیں نشانہ اجل بنانے والا تھا۔

میں نے چیخ کر دسم کو پکارا ”بھاگو!“

اس سے پہلے کہ دسم اٹھ کر میرا ساتھ دیتا، کھڑکی میں نمودار ہونے والے شخص نے گولی داغ دی۔ میں اس دوران میں ایک سمت دوڑ لگا چکا تھا۔ فائر کی مخصوص آواز سنتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

دسم ایک بازو کو تھا ہے ہوئے میری سمت آرہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ گولی اس کے بازو میں گئی تھی۔ اس موقع پر دسم نے حواس باختہ ہونے کے بجائے بڑی بہادری اور ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ اور ترچھا دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گیا۔ پھر ہم نے ایک سمت میں بھاگنا شروع کر دیا۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں متعدد گولیاں چلنے کی

مقام پر پناہ لے رکھی تھی وہاں زیادہ دیر تک قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ہیرین اسٹریٹ ڈاکٹھن مارکیٹ پارک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم ایف بی آئی والوں کو کوئی طور پر پناہ دے آئے تھے لیکن ان کی طرف سے بے فکرگی کسی ناقابل تلافی نقصان کا پتہ ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے دیم کے کندھے سے بیک اتار لیا اور اسے کھول کر کسی ایسے کپڑے کی تلاش میں مصروف ہو گیا جو پٹی کی صورت اس کے زخمی بازو پر باندھا جاسکے۔

جب مجھے مطلوبہ کپڑا مل سکا تو میں نے بیک میں رکھی ہوئی اپنی ایک شرٹ کی آستین کو پھاڑ کر ایک لمبی پٹی حاصل کر لی پھر جتنی جلدی ممکن ہو سکا میں نے دیم کے کھال بازو کو بندھنا شروع کیا۔ پھر دیا۔ توڑی دیر بعد ہم اس عارضی پناہ گاہ سے باہر نکل آئے۔

ہیرین اسٹریٹ پر بنے تھے قدموں سے چلتے ہوئے ہم گرین وچ اسٹریٹ پر نکل آئے۔ اس وقت ہمیں بڑی شدت سے کسی بلیو کی تلاش تھی لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ گرین وچ اسٹریٹ پر بائیں جانب مڑنے کے بعد ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ توڑی دیر بعد ہم ٹرائی بیکارگرل ریسٹورنٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔ مذکورہ ریسٹورنٹ ہمیں سو گھنٹہ گرین وچ اسٹریٹ پر واقع ہے۔ آج ہم تینوں نے اسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے سامنے سے فرینکلن اسٹریٹ نکلتی ہے۔ دیم نے کہا۔

”جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، فرینکلن اسٹریٹ پر سب دے انٹرس موجود ہے۔ ہمیں فوری طور پر خود کو اوڑھ کر اڑ کر لینا چاہیے۔“

”تو کو یا تم آئین دالے بی ڈی کے الزام کی تائید کر رہے ہو!“ میں نے اسے چھیڑا۔

وہ میری بات کو سمجھ نہیں سکا، بولا ”کیا مطلب؟“ میں نے کہا ”این دالے بی ڈی (نیو یارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) دالے مجھے ”امر کا دشمن“ کا ٹائٹل دے چکے ہیں، یعنی میں انڈر گراؤڈ مافی کی ٹیم کا مجرم ہوں۔ تم میرے ساتھ انڈر گراؤڈ ہو کر ان کے خیال کی تصدیق کرنا چاہتے ہو!“

”اوہ!“ اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی ”ان سنگین لمحات میں بھی تمہیں تفریح کی سوجھ رہی ہے۔“ وہ میری بات کو نہ سمجھ سکا۔

میں نے کہا ”حالات سنگین ہوں یا تمہیں، تمہیں ہونے سے انہیں بدلائیں جاسکتا۔ پھر کیوں خواہ مخواہ ذہن کو پریشان

کیا جائے۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ وہ میرے ساتھ فرینکلن اسٹریٹ پر قدم بڑھاتے ہوئے بولا ”میں تمہارے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔“

اس وقت فرینکلن اسٹریٹ کا کاروبار زندگی اختتام پذیر تھا۔ ہم اسٹریٹ سے توڑا ہٹ کر شاہین اور بائو کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ اس طرح ہمیں بعض جگہ مکمل اور بعض جگہ نیم تاریکی کی آڑ بھی مل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا، چلتے ہوئے دیم ٹھوڑا انگڑا رہا تھا۔ شاید اس کے پاؤں میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اپارٹمنٹ کی کڑکی میں سے اس نے جس انداز میں چلا تگ لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا!

”کیا تم اپنے پاؤں میں تکلیف محسوس کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، سیدھے پاؤں کی ایڑی میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”مگر اپارٹمنٹ کے پچھواڑے سے تو تم نے دوڑ میں میرا ساتھ دیا تھا۔“ میں نے انہیں زور انداز میں سوال کیا۔ ”کیا اس وقت تمہیں یہ تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی؟“

”نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا ”شاید اس وقت چوٹ گرم تھی اس لیے درد محسوس نہیں ہوا۔ اب ہماری رفتار کم ہونے اور سرد موسم کے باعث یہ تکلیف اہٹارنگ دکھا رہی ہے۔“

میں نے محسوس کیا وہ ابھی خاصی مشکل میں مبتلا تھا۔ ایک تو پہلے ہی اس کا بازو زخمی تھا اور اب یہ پاؤں والا معاملہ سامنے آ گیا تھا۔ میں نے نیم تاریکی میں اس کے بائیں بازو کا معائنہ کر کے بتی تو پناہ دہی بھی لیکن صحیح صورت حال جاننے کے لیے روشنی میں تفصیلی چیک اپ کی ضرورت تھی۔

چاروں جانب چوکنظر سے دیکھتے اور محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے میں نے دیم سے پوچھا ”سب دے انٹرس یہاں سے کتنی دور ہے۔ میں کہیں آرام سے بیٹھ کر تمہارے پاؤں کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھ کو ہم بھیجتے ہی دالے ہیں۔“ وہ تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔

دیم کی موجودہ حالت سے مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایف بی آئی کے خطرناک ایجنٹ ہمیں ٹرائی بیک کی سڑکوں پر ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک وہ ہم تک رسائی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اگر اچانک ان

لوگوں سے منہ بھڑ ہو جاتی تو میرے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ دیم اب اس مستعدی کے قابل نہیں رہا تھا جس کا قہوری دیر پہلے اس نے مظاہرہ کیا تھا۔ انہی گمراہ اندیشہ حالات کے ساتھ خدا خدا کر کے ہم سب دالے انٹرس میں داخل ہو گئے۔

دیم نے کہا ”اس سب دے ٹریک پر چار ٹرینیں چلتی ہیں۔ دن لائن اور نائن لائن تو فرینکلن اسٹریٹ کے اسٹیشن پر نہیں کی مگر نو لائن اور قہری لائن بغیر کے آگے بڑھ جائیں گی۔ ہمارے پاس دن اور نائن میں سے انتخاب کا اختیار ہے اور اس سے پہلے یہ فیصلہ بھی کرنا ہو گا کہ ہمیں اپنا ڈاؤن جانا ہے یا ڈاؤن ٹاؤن۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”ٹرین میں سوار ہونے سے زیادہ ضروری ایک اور کام بھی ہے۔“ میں نے ایک الگ تھلک بیچ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”پہلے میں تمہارے پاؤں کا معائنہ کروں گا۔“ ایک لمبے وقفے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو صبح بھی اسی ٹریک پر ہم نے اپ سے ڈاؤن ٹاؤن سفر کیا تھا۔“

وہ تائیدی انداز میں بولا ”بالکل درست۔ ہم قہری لائن میں سولیا سے وال اسٹریٹ تک پہنچے تھے۔ قہری لائن ایک ایکسپریس ٹرین ہے فرینکلن اسٹریٹ پر وہ نہیں رکتی۔“

میں نے جس بیچ کا انتخاب کیا اور خاصی خاموشی اور سکون تھا۔ ویسے بھی آدھی رات کے بعد سب دے اسٹیشن پر اوریل جیل اور روٹن نظر نہیں آتی جو صبح شام اور دن میں دکھائی دیتی ہے۔ میں نے دیم کے متاثرہ پاؤں والا جوتا اڑوایا اور جیسے ہی اس کا پاؤں موزے سے باہر آیا میں اسے دیکر چونک اٹھا۔

مذکورہ پاؤں مجھے کے مقام سے اچھا خاصا سوجا ہوا تھا۔ کل نظر میں نہیں محسوس ہوا کہ اس کے ٹخنے میں شدید نوعیت کی سوج آچکی ہے اور یقیناً یہ سوج کھڑکی کے کودنے کے نتیجے میں آئی تھی۔ میں نے تمہا پھر اکر اچھی طرح اس کے پاؤں کا جائزہ لے لیا۔ گوشت کہیں سے نہیں پھٹا تھا تاہم ٹخنے پر ٹھوڑا ہونے والا درم تشویش ناک تھا۔ اس کا بائیں بازو اور دائیں بازو ایک طرح سے بے کار ہو کر رہ گئے تھے۔ بازو والا زخم تو گرم جھٹک کے اندر چھپا ہوا تھا اور دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرتا تھا مگر پاؤں کی سوج موزے اور چوڑے کے اندر پوشیدہ ہونے کے باوجود بھی چال کی نظر آ رہی تھی۔

”تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“ میں نے

گھمبیر لہجے میں کہا۔

”اس وقت کسی اسپتال کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“

”ہاں ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

وہ دائیں ہاتھ سے دائیں پنڈلی کو دباتے ہوئے بولا ”پھر کیا کریں۔ پاؤں کی تکلیف تو رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے اور خاص طور پر یہاں بیٹھنے کے بعد میں محسوس کر رہا ہوں کہ شاید اب اس پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکوں گا۔“ میں اس کی تکلیف کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ہڈی پر لگنے والی چوٹ بڑی سنگین ہوتی ہے۔ اگر گرم چوٹ کے ساتھ متاثرہ حصے کو بہت زیادہ حرکت دے دی جائے تو ازراں بعد بہت بھیاک نتائج جھلکتا پڑتے ہیں۔ دیم کے ساتھ بھی ایسا ہی البتہ پیش آیا تھا۔ ایف بی آئی والوں کی بے دریغ تازنگ سے بچنے کے لیے ہم نے اندھا دھند دوڑ لگائی تھی۔ اس وقت تک دیم مجھے کی اس چوٹ سے بے خبر تھا۔ اب خبر ہوئی تو پلوں کے اوپر سے بھی پانی بہہ چکا تھا۔ اس کا معاملہ بہت سیرھا ہو گیا تھا۔

میں نے پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک جائزہ نگاہ ڈالی اور دہان کی صورت حالات کو اپنے لیے نقصان دہ نہ پا کر اطمینان کی سانس لی پھر دیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”تم بیک کے ساتھ اسی بیچ پر بیٹھے رہو۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے متذبذب انداز میں استفسار کیا۔

میں نے کہا ”میں تمہارے پاؤں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔“

پتا نہیں میرے اس معنی غیر جملے سے اس نے کیا مطلب اخذ کیا، میں اسے بیچ پر بیٹھا چھوڑ کر ایک فون بوتھ کی جانب بڑھ گیا۔

میں دیم کو اس حالت میں اپنے ساتھ ساتھ بھاگے نہیں پھر سکتا تھا۔ میں فون کے مخصوص سوراخ میں سکہ ڈالنے کے بعد میں نے دیم کو ہنگ کے سیل کا نمبر ڈال کیا۔ یہ نمبر توڑی دیر پہلے میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کیا تھا۔ مسٹر ہنگ نے نمبر دیتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ یہ اس کا ایک خفیہ موبائل ہے۔

دوسری کھنٹی پر مسٹر ہنگ نے کال ریسپونڈ کر لی۔ میری

آواز پہنچاتے ہی اس نے کہا ”وہاں وجدان! تم لوگ خیریت سے تو ہو؟“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی ”خیریت“ سے آگاہ تو وہ فکرمند لہجے میں بولا ”تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟“

”فرینکلن اسٹریٹ کے سب دے پلیٹ فارم پر۔“  
”اوہ“ اس نے ایک گہری سانس لی ”اس حالت میں دسم کو لوگوں کے ہجوم سے دور رہنا چاہیے۔ تمہیں اندازہ نہیں تم دونوں کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔“

میں نے کہا ”مجھے بخوبی اندازہ ہے مسٹر ہنگ۔“ پھر اضافہ کیا ”ہم اس وقت پلیٹ فارم کی ایک الگ تھلک بیچ پر لوگوں سے دور بیٹھے ہیں۔ تم فوراً اپنے کسی کوشش کرو۔ ہم زیادہ دیر تک یہاں رک نہیں سکتے اور..... میں دسم کو اس حالت میں اکیلا سنبھال نہیں پاؤں گا۔ مجھ کو وہ اپنے قدموں سے چلنے کے قابل نہیں۔“

”میں اس وقت گاڑی میں ہوں۔ اور تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا ”تم ہوشیار ہو کر دس بیٹھے رہو۔ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں ریسیور کوک کر کے دس واپس دسم کے پاس گیا۔ وہ بیچ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے گردن کو پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں حالانکہ میں نے جاتے وقت اسے تاکید کی تھی کہ وہ گردن دواغ پر گہری نظر رکھے۔ ہم جن حالات سے گزر رہے تھے، ان میں ایک ایک قدم بھونک کر اٹھانے کی ضرورت تھی۔

میں دسم کے قریب آیا تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس نے درد کی شدت سے مجبور ہو کر آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار موجود تھے۔ میں نے بیچ پر اس کے نزدیک بیٹھے ہوئے کہا۔

”دسم! ہنگ دس منٹ تک یہاں پہنچ جائے گا ہمیں کسی سب دے میں سوار نہیں ہونا بلکہ اس کے ساتھ جانا ہے۔“  
اس نے آنکھیں کھول دیں اور ابھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تاہم اس موقع پر اس نے کوئی سوال کرنے کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ترجیح اس اکتاہٹ، بیزاری اور تکلیف کا نتیجہ تھی جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا۔ میں نے اس کے پاؤں اور بازو کی حالت دیکھی تھی اور مجھے اندازہ تھا وہ بڑی تکلیف میں تھا۔

میں نے سادہ سے لہجے میں کہا ”اب آنکھیں بند کرنے کی میری باری ہے۔ جب تک مسٹر ہنگ یہاں نہیں پہنچ جاتا“

پھر اس نے قہر سے کہہ کر وہ مجھ سے کسی سلسلے میں کوئی استفسار کرتا میں نے بیچ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت آنکھیں بند کرنے کا میرا صرف ایک ہی مقصد تھا..... ڈاکٹر موگ سے تصوراتی رابطہ سائل تک تھیلانی رسائی!

میں نے پینل (PINEAL) گلیڈ یعنی اپنی حر و آبی کو زحمت دی۔ تیسری آنکھ کے سامنے ساحل کے خال و خلو کو ابھارا اور اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کوشش میں واضح ناکامی ہوئی۔ یہ سلسلہ تیسری ناکامی تھی۔ اس سے پہلے ڈیڈل سائنوں میں بالوں کی سیٹنگ کرانے کے دوران میں بھی اس کے ماحول کو چھو نہیں پایا تھا اور آدھا پوتا گھٹنا تل جب میں واشنگٹن پارک والے اپارٹمنٹ میں ایسی ہی ایک کوشش کر رہا تھا تو مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ پتا نہیں رہی مونے بائسن نے اس پر کیسی بندش لگا دی تھی۔ میری باطنی آنکھ اس بندش دیوار کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتی تھی البتہ اس مرتبہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ ڈاکٹر موگ ریوٹے کے توسط سے وہ مجھے نظر آ گئی تھی۔

میں نے ساحل والے عمارت پر کوشش ترک کی اور حر و آبی کا بیٹھنا ڈاکٹر موگ کی جانب پھیر دیا۔ اس مرتبہ مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر موگ کو میں نے ایک بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ماحول نے مجھے بتایا ”وہ کسی بندرگاہ کے قیدی حصے میں تھا اور وہ ٹرک پہاڑی راستے پر طوفانی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر موگ کے ماحول میں مجھے ساحل نہیں دکھائی نہ دی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لگ بھگ پوتا گھٹنا پہلے میں نے ان دونوں کو ایک ساتھ گھنٹنہ دکی پہاڑیوں میں دوڑتے اور پھر گلیوں کی بوجھار میں گر کر بے حس و حرکت ہوتے دیکھا تھا۔

اب ڈاکٹر موگ اکیلا نظر آ رہا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ ساحل کو اس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور وہ نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی؟

ڈاکٹر موگ تک رسائی حاصل کر کے مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ میں نے آخری منظر میں انہیں نصف درجن مسخ افراد کے ٹکڑے پر دیکھا تھا۔ وہ سفاک لوگ انہیں روکنے کے لیے اپنی گنوں کے دہانے کھول چکے تھے۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر موگ کا بچ جانا ایک معجزہ ہی تھا۔ پتا نہیں یہ معجزہ ساحل کے ساتھ بھی ہوا تھا یا نہیں!

اجانک میرے ذہن میں ایک خوفناک سوال ابھرا۔ کہیں ڈاکٹر موگ بھی میری طرح دھوکا تو نہیں کھا گیا۔ عین ممکن تھا ”رہی“ نے ساحل کی ایک ڈیپٹی کیٹ گھنٹنہ کے مضامین میں بھی پہنچا دی ہو۔ اس مکار شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ ہمارا واسطہ رہتا تھا جس ڈیپٹی کیٹ سے پڑا تھا ”دسم کی چلائی ہوئی گولی نے زمین دوڑیلو سے ٹریک پر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ ریٹا سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم اسے سب سے ٹریک پر ہی چھوڑ آئے تھے۔

سوچ کو ایک نیا زاویہ ملا تو میں ایک خاص انداز میں غور کرنے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نتیجہ پہلے سے مختلف برآمد ہوا۔ میں اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر موگ اگرچہ بے ہوشی کی حالت میں تھا میں پھر بھی اس کے ماحول میں داخل ہو گیا تھا..... پھر ساحل کے سلسلے میں معذوری کیوں تھی؟

ان حالات میں صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی اور وہ یہ کہ ڈاکٹر موگ کے ساتھ میں نے جس عورت کو دیکھا ”وہ ساحل نہیں تھی۔ میری ساحل اس وقت رہی کے دعوے کے مطابق اسرا نیل میں تھی۔ اس عیار نے ساحل پر کوئی ایسی طلسماتی گرہ لگائی تھی کہ وہ میری دسترس سے دور ہو گئی تھی۔

ذہن بہت زیادہ الجھے لگا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

مسٹر ہنگ ایک پرانی سی سیاہ فورڈ میں ہم تک پہنچا تھا۔ ہم دونوں نے ٹل کر باہمی سہارے سے دسم کو گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچا دیا۔ میں ہنگ کے ساتھ پھر ذیبت پر بیٹھ گیا۔ فورڈ فرینکلن اسٹریٹ سے نکل کر ہڈن اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ اس دوران میں ہمارے درمیان خاموشی حاظر رہی۔ دسم عقبی نشست پر پہنچنے ہی لمبا لیٹ گیا تھا۔ اس کی حالت خاصی تشویش ناک ہو رہی تھی۔ شاید وہ تکلیف کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا!

مسٹر ہنگ نے نہایت ہی محتاط ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایرکسن پلازا کے قریب سے گاڑی کو موڑ لیا اور ہڈن اسٹریٹ کو چھوڑ کر مین ٹرائی بک میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب سیاہ فورڈ سرگ نما ایک راستے میں داخل ہونے لگی تو میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”مسٹر ہنگ! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”نیو جرسی!“ اس نے غصہ سے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ!“ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

اس نے کہا ”ہم ہالینڈ ٹنل کے ذریعے دریائے ہڈن کو عبور کر رہے ہیں۔ یہ ٹنل ہمیں نیویارک سے نیو جرسی پہنچانے کے لیے پھر کر رہے ہیں۔ ایس انٹر اسٹیٹ سینٹرل ایئر پورٹ سیدھے جرسی ٹی بیچ جا میں گے جہاں میرا فوٹو اسٹوڈیو ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا ”شاید تمہارا ٹرائی بک یا اس رات گزارنا بدھا کو منظور نہیں اسی لیے یہ افراتفری مچی ہے۔“

ابھی تک ہمارے درمیان موجودہ ہنگامی صورت حال پر بات نہیں ہوئی تھی۔ میری طرح شاید وہ بھی کسی مقام پر پہنچ کر اطمینان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور کی بازی گری سے ”لفظ اندوہ“ ہونے لگا۔ میں نے پہلی چھلانگ ساحل کی طرف لگائی اور منہ کے بل گرا۔ میں اٹھا ”سنبھلا اور ڈاکٹر موگ کی جانب جست بھری۔ اس مرتبہ میں گرنے کے بجائے اپنے قدموں پر آیا اور ڈاکٹر کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

وہ ابھی تک اسی بندرگاہ کے اندر موجود تھا اور اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ وہ غالباً گہری بے ہوشی میں تھا۔ بند ٹرک کے عقبی حصے میں کسی بستر پر پایا جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے دوستوں میں تھا جو اس کی شکل کشائی کے لیے بیٹھنا کسی اسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔ اگر وہ دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوتا تو وہ آرام دہ بستر کا تکلف ہرگز نہ کرتے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ٹرک کے نیچے فرش پر ڈال دیے۔

میں ڈاکٹر موگ کے ماحول سے نکلنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک بجلی سی چمک اٹھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہنگ سے استفسار کیا۔

”تم ڈرائیونگ نہیں کر سکتے۔“

اس نے سوچتی ہوئی ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور کوٹ کی اندرونی جیب میں سے سیل نکال کر میری سمت بڑھاتے ہوئے کہا ”کس کو توں کرو گے؟“

”ڈاکٹر موگ کو۔“ میں نے صاف گولی سے کام لیتے ہوئے کہا۔



کر رہا ہو! بلکہ میں اس وقت اسے خاصا الجھا ہوا محسوس کرتا ہوں اور خود میری حالت بھی کچھ ایسی قسم کی تھی چنانچہ خاموش رہا۔

ایک سوا ایک بجے رات ہم جڑی میں تھے۔ وہ ایک کافوٹو اسٹوڈیو ڈائٹین ایونیو پر واقع تھا۔ اس نے اسٹوڈیو کے سامنے سے گاڑی گزاری پھر انٹرنیٹ کو چھوڑ کر گاڑی پر آگیا اور تھوڑا آگے جا کر کینیڈی بلیوارڈ پر مڑا اور اسی سمت گاڑی بڑھا دی۔

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ”اسٹوڈیو اس وقت بند ہے اس لیے ہم شون کے گھر جا رہے ہیں۔ کی رہائش اور ٹکٹن پارک کے نزدیک ہے۔“

”شون؟“ میں زیر لب بڑبڑایا۔ میری بڑبڑاہٹ کے جواب میں اس نے بتایا ”مفتض کا نام شان ہے لیکن امریکی لب و لہجہ کی مہربانی سے شان سے شون ہو گیا ہے۔ جیسے مال سے مول اور کال۔ کول.....“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات چلا کرتے ہوئے بولا۔

”شون کا تعلق انڈیا سے ہے۔ یہاں کافوٹو اسٹوڈیو کی گھرائی میں چلتا ہے۔ ٹکٹن پارک والے اپارٹمنٹ میں اپنی فلیپٹکی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ شون لگ بھگ دس سال سے میرے ساتھ ہے۔ دونوں میاں بیوی بہت محنتی اور ذرا شناس ہیں۔ اسٹوڈیو کا نظام انہوں نے مل کر سنبھال رہا ہے۔ انہوں نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ان۔ مل کر چھپیں بڑی خوش ہوگی۔ بظاہر ان کی حیثیت میرے ملازمین کی سی ہے لیکن درحقیقت وہ میرے سیٹ اپ۔ لوگ ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“ آخری جملہ نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا۔

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

پھر وہ مجھے شون (شان) اور اس کی فلیپٹکی بیوی لی یا کے بارے میں خاص خاص باتیں بتانے لگا۔ وہ خاموش تو میں نے پوچھا۔

”کیا یہ شان مسلم ہے؟“

اس نے کندھے اچکانے اور بے پروائی سے بولا ”ہی“ نے کبھی اس سلسلے میں ریسرچ نہیں کی کیونکہ یہ اس کا نازک پہلو ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کا باپ مسلم تھا۔“ نے ایک ہندو عورت کو مسلمان کر کے اس سے شادی کی تھی اس کے بعد شون کے والدین انڈیا میں مختلف جگہوں پر چھپے پھرے کیونکہ اس کی ماں کا گھر انڈیا میں تھا۔

وہ شکایتی لہجے میں بولا ”اور یہ نہیں بتاؤ گے؟ کیوں؟“ اس کی شکایت بد وقت اور بجا تھی۔ میں نے اس سے ڈاکٹر مونگ کا سیل نمبر لیتے وقت خاصا بڑا اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن میں ان لحاظ میں جس پتویشن سے گزر رہا تھا مجبوری اس کا تھا خاصگی۔ میں نے ڈاکٹر مونگ کا سیل نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

”تا دوسرے“ کہیں آرام سے بیٹھے کاموقع تو ملے۔“ میں نے تمہیں ڈاکٹر کا نمبر دینے کے بعد اسے فون کیا تھا۔“ وہ ہالینڈ ٹنل کے اندر محتاط ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا ”لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔“

میں نے کہا ”میری بھی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔“ ڈاکٹر کی کھجیل کے بعد خاموشی کے چند لمحات گزرے پھر ریکارڈنگ سٹاپ دینے لگی جس کے مطابق وہ فون فی الحال کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ میں نے یہ سوچ کر ڈاکٹر کو کال کی تھی کہ اگر سیل اس کے قریب ہی کہیں موجود ہوا تو اس کی کھجیل بج اٹھے گی اور میں ممکن ہے ڈاکٹر کھجیل کی آواز سن کر بیدار ہو جائے مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ واپس ہو کر میں نے سیل ہنگ کی جانب بڑھا دیا اور تجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ڈاکٹر کا سیل یا تو آف ہے یا پھر اپنی طبعی عمر پوری کر چکا۔“

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا ”محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔“

میں نے پوچھا ”یہ ٹنل کب ختم ہوگی؟“ ”بس ہم اس سے برآمد ہونے ہی والے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”ہم نیویارک اسٹیٹ سے نکل کر نیوجرسی اسٹیٹ میں تو داخل ہو چکے ہیں۔“

کافی دیر سے عقیقی نشست کی جانب سے دسم کی کوئی آہ کراہ سنا نہیں دی تھی۔ میں عقیقی سیٹ کا منظر دکھانے والے آئینے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سوچکا تھا یا پھر نیم بے ہوش تھا۔

میں نے ہنگ سے پوچھا ”کیا تمہارے پاس دو موبائل کنکشن ہیں؟“

”ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

میں نے پھر اسے اس سلسلے میں کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ دانستہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش

دسم کا بابا یاں باز کہنی سے تھوڑا اوپر بری طرح زخمی تھا۔  
پبلڈرن پلے گراؤنڈ کے نزدیک نیم تاریکی میں میں باریک  
بجی سے اس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اب روشنی میں دیکھا تو

اس کے بعد میں نے ہنگ کو ڈاکٹر موگ کی تازہ ترین ریشن سے بھی آگاہ کر دیا۔ ساحل کی ڈبلی کٹ رپا کے

وہ محسوس لہجے میں بولا، 'تم اپنی صلاحیت کو آزما کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کر دو کہ انٹر کمونیگ کی طرف کیا پوزیشن ہے۔ میں خود بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انٹر کمونیگ کمیٹیڈ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جہاں ٹھہرا ہوا ہے وہاں کانگریس بھی ہے میرے پاس۔ پہلے میں وہاں ٹرائی

میں نے پہلے ساحل کی خیر خبر ضروری سمجھی اور اس کے نقش کو تیسری آنکھ کے سامنے اٹھارتے ہوئے تصور کے گھوڑے کو دوڑایا۔ رشتہ تصور اگلے ہی لمحہ زمین بوس ہو گیا۔ میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دو تین بار کی ناکامی کے بعد میں باقی آنکھ کے طفیل ڈاکٹر

مونگ کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت کسی اسپتال کے صاف شفاف بستر پر موجود تھا۔

اس کے چہرے پر آنکھیں ماسک کی موجودی ظاہر کرتی تھی، اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے بدن سے مختلف مانیٹرنگ مشینیں منسلک تھیں۔ ایک ڈاکٹر بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے عقب میں کھڑی خوبصورت نیپالی نرس لوٹس لے رہی تھی۔ میں دھڑکنے ہوئے دل کے ساتھ اس حوال میں موجود رہا۔

معائنے کے بعد ڈاکٹر نے امید افزا انداز میں گردن ہلائی اور کمرے سے نکل گیا۔

میں نے ڈاکٹر کا پیچھا پکڑا اور اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ وہ مختلف راہ داریوں میں گھومنے کے بعد ایک کمرے میں پہنچا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے کپ بورڈ پر لگے کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور کھڑی پر لگا ہوا ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسپتال سے رخصت ہو گیا۔

میں اس کے ساتھ چپک کر اسپتال سے باہر نکلا تھا لہذا یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ ڈاکٹر مونگ اس وقت کھنڈر کے ٹی اسپتال میں تھا۔ لگ بھگ دو گھنٹے پہلے میں نے اسے ایک ہندو فرک کے عقبی حصے میں پہاڑی راستے پر سسر کرتے دیکھا تھا۔ اسپتال میں زیر علاج اسے دیکھ کر ثابت ہو گیا کہ ٹرک میں اسپتال تک پہنچانے والے اس کے خیر خواہ تھے۔

اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جو خوفناک سوال ابھرا اس نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر مونگ کو اگر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا تو پھر میری ساحل کہاں تھی؟

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دنگ ہنگ سے کہا ”ڈاکٹر مونگ کو تشویش ناک حالت میں ٹی اسپتال کھنڈر پہنچا دیا گیا ہے لیکن ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کامیابی نہیں ہو سکی۔“

”اس کو بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔“ وہ تیزی سے فون سیٹ کی جانب پکا۔

میں اس کو دیکھتے ہوئے موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔

ہنگ نے ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد مختصر بات کی اور فون سیٹ کے قریب رکھی لوٹ بک پر ایک نمبر لکھ لیا۔ پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں نے مذکورہ اسپتال کا نمبر لے لیا ہے۔ اب میں کھنڈر کے اس اسپتال سے رابطہ کر رہا ہوں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔

اگلے ہی لمحے وہ ٹی اسپتال کھنڈر سے جڑ چکا تھا۔ اس نے تین منٹ تک متعلقہ افراد سے بات کی۔ میں یک طرفہ گفتگو سنتا رہا۔ ریسیور کرڈیل کرنے کے بعد اس نے مجھے بتایا۔

”وہاں! آج لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے دوپہر دو زخمی اور بے ہوش افراد کو اس اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان میں ایک مرد اور دوسری عورت ہے تاہم ان کے نام ڈاکٹر مونگ اور دھو یا ساحل نہیں ہیں۔ تم تصدیق کر رہے ہو کہ اس اسپتال میں ڈاکٹر مونگ موجود ہے تو پھر سوچا جاسکتا ہے انہوں نے وہاں اپنے اصل نام ظاہر نہ کیے ہوں۔ بہر حال!“

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”زخمی مرد اور عورت کو الگ الگ کمروں میں رکھا گیا ہے اور بڑی توجہ سے ان کا علاج جاری ہے۔ ڈاکٹر مونگ کے ساتھ تم نے جس عورت کو دیکھا تھا، وہ بھی اسپتال پہنچادی گئی ہے۔ وہ دھو یا ساحل ہے یا نہیں اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

نوجہری اور کھنڈر کے مقامی وقت میں کم و بیش سو اگیارہ گھنٹے کا فرق ہے۔ اگر کھنڈر کے وقت کے مطابق انہیں ساڑھے بارہ بجے دوپہر اسپتال پہنچایا گیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا اس وقت یہاں رات کا سو اگیا بجتا تھا۔ اور یہ وہی لحاظ تھے جب ہم دیم کے معائنے میں مصروف تھے۔ اس کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال میں ہمیں خاصا وقت لگ گیا تھا۔

میں نے ہنگ سے کہا ”اس وقت تک ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں جب تک ڈاکٹر مونگ کو ہوش نہیں آجاتا۔ ایک مرتبہ کی طرح براہ راست اس سے ہماری بات ہو جائے تو صورت حال کی صحیح شکل سامنے آسکتی ہے۔“

”لا رہا ہوں مجھے امید ہے سورج طلوع ہونے سے پہلے ڈاکٹر مونگ کو ہوش آجائے گا۔“ وہ پردوٹو انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا ”نوجہری کا سورج یا کھنڈر کا؟“

”میں یہاں کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا ”وہاں کھنڈر میں تو اس وقت رات کا آغاز ہو چکا ہوگا۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“ میں اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ بولا ”اس دوران میں تم تھوڑے تھوڑے وقفے سے اگر چاہو تو ادھر جہاں تک بھی سکتے ہو کہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“

”پھر تم مجھے کون سا مشورہ دینے والے ہو؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے غصے سے بولے ”مجھے میں کہا“ آرام سے سو جاؤ اور اپنی نیند پوری کرو۔ بدھانے چاہا تو صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جن خیر خواہوں نے ڈاکٹر کو اسپتال تک پہنچایا ہے وہ اور وہاں کے ڈاکٹر سب مل کے اس کا بہت خیال رکھ رہے ہوں گے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں بھی ایک بھر پور نیند کی ضرورت ہے۔“

”اور تمہیں تو بالکل نہیں ہے نا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا ”میں جانے کی تیاری کر دوں گا۔“

”اس وقت کہاں جاؤ گے؟“

”کہیں بھی۔“ وہ پھر اسرار انداز میں بولا ”دسم تو فی الحال کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا لیکن تمہارے ڈاکٹرس کی تیاری بہت ضروری ہے۔ اگر یہ کنفرس ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر کے ساتھ دھو بھی اس اسپتال میں پہنچائی گئی ہے تو پھر میرا خیال ہے تم اسرا نکل کے بجائے نیپال جانے کو ترجیح دو گے!“

”تمہارا خیال بالکل درست ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”اسی لیے میں سونے کے بجائے ڈاکٹر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر دوں گا کھنڈر کے اس اسپتال کا نمبر میری یادداشت میں محفوظ ہو چکا ہے۔“

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”اگر اس دوران میں ڈاکٹر کو ہوش آجی جاتا ہے تو بھی اسپتال والے براہ راست اس سے تمہاری بات نہیں ہونے دیں گے۔“

”میں ان لوگوں میں سے کسی کو فون تک لانے کی کوشش کر دوں گا جنہوں نے ڈاکٹر کو اسپتال پہنچایا ہے۔“ میں نے کہا ”ان میں سے کوئی نہ کوئی اسپتال میں ضرور موجود ہوگا۔ وہ ڈاکٹر اور ساحل کے بارے میں مجھے بتا سکتے ہیں۔“

”مجھے اس کی امید نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تم ان لوگوں سے اور وہ تم سے واقف نہیں ہوں گے۔ ایک ایسی کوڈ بھی تمہیں بتائیں گے۔“

میں نے کہا ”میں محسوس کر رہا ہوں تم ان سے جانکاری نکل سکتے ہو۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”تو ٹھیک ہے تم ہی ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔“

میں نے کہنے کو یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن میرے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ میں رات کے باقی حصے میں سونے کے بجائے ڈاکٹر مونگ کی خبریت اور ساحل کی ”حقیقت“ جاننا چاہتا تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ میں نے کھنڈر کے مضافات میں پھیلے ہوئے بلند بالا پہاڑوں میں جس عورت کو ڈاکٹر مونگ کے ساتھ کوئیوں کی برسات میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا وہ میری ساحل ہی تھی یا پھر کوئی اور دھو کا عورت!

”ٹھیک ہے تو پھر میں چلا ہوں۔“

ہنگ نے ایک مرتبہ پھر جانے کی بات کی تو میں نے کہا ”تم واپس چائنا ناؤن تو نہیں جا سکتے۔ وہاں کے حالات بھی خاصے گڑبڑ ہیں۔ کیا کسی نئے ٹھکانے کی طرف رخ کرنے کا ارادہ ہے؟“

وہ بولا ”میں نے جانے کی بات اس لیے کی تھی کہ تم آرام سے سو جاؤ۔ رات میں صبح ہی یہاں سے روانہ ہوں گا۔ میں دوسرے کمرے میں رات کا باقی حصہ گزاروں گا اور جہاں تک چائنا ناؤن کا تعلق ہے۔“ وہ لمبے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مجھے واپس چائنا ناؤن ہی جانا ہے۔“

اس کے لہجے کی تعلیق نے مجھے چونکا دیا۔ ہمارے درمیان ایف بی آئی والوں کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی بات ہو چکی تھی اس کے باوجود بھی وہ چائنا ناؤن جا چاہتا تھا تو میں اس کے فیصلے پر حیران تھا۔ میں نے کہا۔

”یہ خود کو پریشانیوں میں پھنسنے والی بات نہیں ہوتی؟“

”ہوگی!“ اس نے کندھے اچکے ”لیکن فرار راستہ اختیار کرنا مجھے گوارا نہیں۔ تمہارے منظر سے ہٹ جانے کی بات دوسری ہے لیکن میں چائنا ناؤن کا ایک معزز اور دیرینہ رہائشی ہوں۔ ابھی تک میں تمہارے سلسلے میں ملوث ثابت نہیں ہوا۔ میں چائنا ناؤن میں رہ کر حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر دوں گا۔ اور مجھے یقین ہے میں ایسا کر لوں گا۔“

وہ سانس لینے کو رکا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”مجھے جیسے ہی حالات کی سنگینی کا پتا چلا میں اپنے ٹھکانے سے ہٹ گیا۔ میں دراصل تم لوگوں کی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا تھا۔ اب مجھے تمہاری طرف سے بے فکری ہو گئی ہے۔ تم یہاں آرام اور اطمینان سے وقت گزار سکتے ہو۔ لی بان اور شون تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ میں نیویارک کے

معاملات کو سنہال لوں گا۔ ویسے بھی آج کا دن میں میں بیٹن میں نہیں ہوں اس لیے وہاں ہونے والی کسی بھی قانونی یا غیر قانونی سرگرمی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکا۔ اپنے میں بیٹن سے باہر ہونے کی بات میں تمہیں دوپہر میں بتا چکا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا، ”مگر مجھے تمہاری جان آسانی سے چھوٹی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔ ٹرائی بیکا والے ابارٹمنٹ میں جو کچھ پیش آیا اور ایف بی والوں نے جس انداز میں تمہارا ذکر کیا تھا اس کے پیش نظر تمہارے لیے بھی حالات اتنے ہی سنگین ہیں جتنے ہمارے لیے۔ بہر حال!“

”تم سب مجھ پر چھوڑ دو نا!“ وہ دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے چھوڑ دیا۔“ میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ”میں کسی وقت بھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تم آرام سے اپنی نیند پوری کرو۔ بدھا نے چاہا تو کل دن میں کسی وقت ملاقات ہوگی۔ میں لی بان اور شون کو تمہارے متعلق خصوصی ہدایات دے جاؤں گا۔ جنہیں یہاں کی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہو۔“ میں نے تشکرانہ لہجے میں کہا ”میرے ڈاکو بیٹنس کے سلسلے میں دیکھ بھال کر کسی سے بات کرنا۔ تمہارا قابل اعتماد بندہ مسٹر جونی تو بہت ہی یو دا ثابت ہوا ہے۔“

ہم جونی کی ”کارکردگی“ پر تفصیلی بات کر چکے تھے۔ ہنگ نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میں ابھی تک کفرم نہیں ہوں کہ جونی نے بدعہدی کا ارتکاب کیا ہوگا!“

”تم بھی کمال کی بات کرتے ہو!“ میں نے الجھن بھری نظر سے اسے دیکھا ”ایف بی آئی والوں نے خود اس کے ”کارنائے“ کا ذکر کیا تھا؟“

”جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں ایف بی آئی والوں نے جنہیں تلف کیا ہے۔“ وہ بڑی رسوائیت سے بولا ”تم نے مجھے جو واقعات بتائے ہیں ان سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہارے منہ سے جونی کا نام سن کر انہوں نے اس کردار کو کہاں میں انٹر کر دیا ہے درندہ اپنی معلومات کے بل بوتے پر وہاں پہنچے تھے۔ تم ایف بی آئی اور دیگر خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹوں کو نہیں جانتے۔ یہ بلا کے دروغ کو اور موقع پرست ہوتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات پوری کرتے دے بولا۔

”اگر مسٹر جونی کی جبری پردہ شام ہی سے ہمیں داچ

کر رہے تھے تو پھر انہیں ہم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے آدھی رات تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہارا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ وہ ایک لمحے کی تاخیر کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ اوپر والے ان کی ایسی تم تسکی کر دیں گے۔“

وہ بیک وقت دو متضاد باتیں کر رہا تھا۔ ٹرائی بیکا والے ابارٹمنٹ کو چھوڑنے سے پیشتر جب میں نے اسے اپنے حالات بتانے کے لیے فون کیا تھا تو اس نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہاں چائنا ٹاؤن میں بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں اس لیے وہ اپنا ٹھکانا چھوڑ رہا ہے اور اب وہ اتنے اطمینان سے باتیں کر رہا تھا جیسے اس کے لیے کہیں کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس کے متضاد رویے نے مجھے الجھا دیا تاہم میں نے اس سے کوئی جرح نہ کی اور معتدل لہجے میں کہا۔

”بہر حال مسٹر ہنگ! تم زیادہ بہتر جانتے ہو۔“

”ریٹلیکس مائی فرینڈ۔“ اس نے میرا شانہ چھپتھپایا ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔“

میں زرب لب سکرا دیا۔ وہ مجھ سے شیک پیڈ کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ خود بہ خود سب ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ سب ٹھیک کرنے کے لیے بہت پاپڑ پلٹا رہتے ہیں۔

ہم نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ گفتگو کی تھی۔ ہنگ کے جانے کے بعد میں اس کمرے میں آگیا جہاں دیکم موجود تھا۔ وہ اس وقت گہری نیند میں تھا۔ مرم پٹی کے بعد لی بان نے اسے درد کش اور ممکن انجکشن بھی دے دیا تھا۔ ہنگ میرے لیے الگ بیڈ روم میں سونے کا بندوبست کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے دیکم کے ساتھ ہی رہنے کو ترجیح دی۔ ویسے بھی اس ابارٹمنٹ میں تین بیڈ روم تھے۔ دو ہم ٹھیک کر بیٹھ جاتے تو میرا بے چارے کہاں جاتے جب کہ ہنگ بھی اس رات وہیں رک رہا تھا۔

ہنگ کا رویہ مسلسل مجھے الجھن میں ڈال رہا تھا۔ پہلے اس نے کہا کہ وہ وہیں جا رہا ہے پھر بتایا کہ وہ رات بیٹن گزرا رہے گا۔ مجھ کو شب بخیر کہنے سے پہلے اس نے یہ بھی سنا دیا کہ اب کل دن میں کی وقت ملاقات ہوگی۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے، ان کے پیش نظر اسے ہتار پتھوٹیں ہونا چاہیے تھا وہ اتنا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے ٹھہراؤ اور اطمینان کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا تھا اس نے اپنے ذہن میں کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے اور اس ”کچھ اور“ سے فی الحال مجھے آگاہ نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے رست داچ پر نگاہ ڈالی۔ رات..... یعنی صبح کے

تین بج رہے تھے۔ اس وقت کھنڈو میں اگلے روز دوپہر دو سو اودھ بج رہے ہوں گے۔ میں شدید نیند محسوس کر رہا تھا لیکن خود کو نیند کی آغوش کے سپرد کرنے سے پہلے میں نے اپنا ہسپتال کھنڈو میں جھانکنا ضروری سمجھا۔

میں نے بیڈ پر دروازہ ہونے کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ڈاکٹر مومک کے خدو خال کو اپنے تصور میں ابھار کر تھرد آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ ہنوز سو رہا تھا۔ میں ڈوٹن سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ اس وقت بے ہوش تھا یا نابل نیند کے زیر اثر تھا۔ اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے ماحول کا حصہ بننا رہا پھر وہاں سے واپس آ گیا۔

میرا ذہن تیزی سے ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ براہ راست کوشش پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی بار آور نہ ہوگی۔ اسی لیے ایک میرے تصور میں اس نرس کا چہرہ محسوس کیا جسے میں نے ایک ڈاکٹر کے ساتھ ڈاکٹر مومک والے کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے ساحل تک پہنچانے کا سلیڈ بن سکتی تھی۔

میں نے مذکورہ نرس کے سراپا اور صورت کو تیسری آنکھ کے سامنے روشن کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا مگر..... اس سے اگلے لمحے مجھے واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ وہ اس وقت کمرے کے ساتھ ہی اور دو دلوں ایسی حالت میں تھے کہ اخلاقیات انہیں دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ وہ مرد اس کا شوہر تھا یا پھر بوائے فرینڈ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے بہت قریب تھا۔ وہ من و تو کی دنیا سے بہت دور نکل گئے تھے۔

میں آنکھیں کھول کر بیڈروم میں حاضر ہو گیا۔ کمرے کی لائٹ کو میں نے جلتا چھوڑ دیا تھا۔ دسم کی جانب نظر گئی تو میں نے اسے بے سدھ سوئے ہوئے پایا۔ لا محالہ میرا ذہن دوبارہ اس نرس کی طرف چلا گیا لیکن اس مرتبہ میں نے تصور کی نگاہ کو زحمت نہیں دی بلکہ اسے محض سوچ کی حد تک محدود رکھا۔

ایک بات یقینی تھی کہ وہ اس وقت اپنی ڈیوٹی پر نہیں ہو سکتی تھی۔ عام طور پر ہسپتالوں میں ایک یا دو بچے کے قریب ڈیوٹی تبدیل ہو جاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو تصور کی نگاہ سے اس ہسپتال سے رخصت ہونے دیکھا تھا۔ عین ممکن تھا اس نرس کی ڈیوٹی بھی آف ہو گئی ہو۔ جب تک وہ دوبارہ ہسپتال میں ان نہ ہوتے میں ان کے توسط سے ساحل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی تک اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ ڈاکٹر

ساحل کے ساتھ زخمی حالت میں ہسپتال پہنچائی جانے والی عورت ساحل ہی تھی یا کوئی اور۔ یہ تصدیق صرف دو افراد ہی کر سکتے تھے۔ نمبر ایک ڈاکٹر مومک ریوٹے! اور وہ فی الحال میرے رابطے میں نہیں تھا۔ نمبر دو رتی موٹے ہاتھن!

رتی کا خیال آتے ہی اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس عارضے نے مجھے نچا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کے سامنے میری روحانی صلاحیتیں بے اثر ہو کر رہ جاتی تھیں۔ جب سے اسے میری تیسری آنکھ والی صلاحیت کے بارے میں بہم پتا چلا تھا اس نے ساحل کے حوالے سے میرے تصور کے سامنے ایک ایسی دیوار کھینچ دی تھی کہ میں براہ راست ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔

ساحل رتی کے لیے بہت قیمتی تھی۔ وہ بدھ نسل کھنڈو کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ ”راز“ تک رسائی کی ٹیکنیک سے آگاہ تھی۔ ایک موقع پر رتی نے ڈھکے چھے الفاظ میں اقرار کیا تھا کہ کھنڈو والے محاذ پر اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اور اسے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ ساحل کو کھنڈو کے مضامیناتی پہاڑوں تک پہنچانے میں درپیش نہیں کرے گا۔ عین ممکن تھا اسراٹیل کے حوالے سے اس نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو ساحل کو اس نے اپنے شاطر بندوں کی نگرانی میں کھنڈو پہنچا دیا وہ مجھے اسراٹیل کا راگ شخص اس لیے سنا رہا ہو کہ اس راگ پر مست ہو کر میں دوڑا چلا آؤں گا!

یہ ایک خاصا تو ای امکان تھا۔ بدھ نسل کھنڈو کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں انمول خزانہ دفن تھے۔ رتی کا خصوصی ٹارگٹ وہ پانچ قیمتی پتھر تھے جو پوری دنیا میں اپنا جانی نہیں رکھتے تھے۔ رتی کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ ان پتھروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ دنیا کا طاقتور ترین شخص بن جائے گا۔ ڈاکٹر (ہیرا) امیر اللہ (پنا) روتی (یا قوت) سیٹار (نیل) اور ٹوپاز (پھر راج) کا وہ بھی عین طاقت اور سر بلندی کی علامت تھا۔ قدیم عبرانی کتابوں میں اس کی روحانی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ رتی موٹے ہاتھن مہرہ (عبرانی) کا ماہر تھا اور اس نے اپنی روحانی صلاحیت کو استعمال کر کے یہ جان لیا تھا کہ یہ پانچ لاثانی پتھر کہاں پوشیدہ ہیں۔ ان کے حصول کے لیے وہ زمین آسمان ایک کرنے کو تیار تھا۔

انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ یہ کبھی ایک مقام پر قناعت نہیں کرتا۔ اس کا شمار نہیں کرتا کہ اسے کیا کیا حاصل

ہے بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ اسے کیا حاصل نہیں۔ اس کے حساب سے لیے وہ سر پٹتا رہتا ہے۔ رتی موٹے ہاتھن کی حالت اختیار کرنے کی کلام نہیں تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے بااثر ملک کا صدر رہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہاٹ ہاؤس میں اس کی چلتی تھی۔ اس کے اشارہ اور ہر امر کی صدور کی تقرری اور ترقی عمل میں آتی تھی لیکن عین بااثر شخص اپنے اثر میں اضافے کی خاطر پانچ بے مثال پتھروں کے حصول کا خواہاں تھا اور اس خواہش کے لیے وہ خون کی ندیاں بہانے کو بھی تیار تھا!

دوسری جانب اس زیر زمین دھننے کی بھی ایک خوزیز تاریخ موجود تھی۔ آج تک جس کسی نے بھی اس تک پہنچنے کی کوشش کی وہ بے موت مارا گیا۔ ہر دور کا دلالی لا ما اس خزانے پر خصوصی نظر رکھتا تھا اور اپنے چندہ بندوں کے توسط سے وہ اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کرتا تھا۔ پتا نہیں اس مرتبہ یہ حصول اور بچاؤ کی کنگڈن کون سا خون رنگ نقشہ تیار کر رہی تھی!

ڈاکٹر مومک کی کوشش اور محترمہ ساگ فو کی خواہش تھی کہ کھنڈو والے مشن میں ان کے ساتھ رہوں لیکن میرا دھیان کہیں اور ہی لگا ہوا تھا۔ ایک موقع پر میں نے ساگ فو سے ندامت آمیز انداز میں کہہ بھی دیا تھا میرے محترم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقع پر پورا نہیں اتر سکا۔

اس نے مسکرا کر کہا تھا کوئی بات نہیں۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ میں تمہیں بدھ نسل کھنڈو والے مشن سے ہرگز ہرگز الگ نہیں دیکھ رہا ہوں!

اس کے پراسرار اور مہینہ خیز جملے نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہماری آخری اور پہلی ملاقات تھی۔ ساگ فو بہت ہی گہرا شخص تھا۔ اگر مجھے بدھ نسل والے مشن میں اپنے ساتھ دیکھ رہا تھا تو پھر میں بھی.....!

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا اور سوچ خود بخود اس پٹری پر دوڑنے لگی کہ حالات مجھے باندھ کر کھنڈو کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اگر ساگ فو کے بہم الفاظ کی پیش گوئی کا حصہ تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا میری ساحل کو رتی نے کھنڈو پہنچا دیا تھا اور مجھے خزانے کی حفاظت اور ساحل کے حصول کے لیے ادھر ہی کا رخ کرنا پڑا۔

اس سوچ نے مجھے بے چین کر دیا اور میں بستر سے اتر کر کمرے کے فرش پر پھیلنے لگا۔ حالات و واقعات کھنڈو کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میری ساحل کھنڈو کے کسی ہسپتال

میں زخمی پڑی تھی اور میں اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تڑپ رہا تھا۔

میری زندگی میں بہت کم ایسے مواقع آئے ہیں جب مجھے پر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔ میں عقلی دلائل کو بہت اہمیت دیتا ہوں اور عقل کا تقاضا یہ تھا کہ جب تک ساحل کے حوالے سے تصدیق نہ ہو جائے مجھے کھنڈو کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ تصدیق کرنے والوں میں سے ایک بے ہوش تھا یعنی ڈاکٹر مومک اور دوسرا یعنی موٹے ہاتھن اسراٹیل میں بیٹھا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں رتی کے چٹکی لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کا سبب نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں اسے فون کر کے الٹی سیدھی سنا سکتا تھا۔ ممکن تھا اس کے نتیجے میں اس کی زبان سے کوئی اہم بات خارج ہو جاتی۔ موٹے ہاتھن اس وقت میرا ذہن اول تھا اور اس کے ایما پر مجھے ایک خطرناک پاکستانی دہشت گرد قرار دیا جا چکا تھا۔ ایسے ”خبر خواہوں“ کی گاہے بگاہے خبر لیتے رہنا چاہیے!

لیکن مصیبت یہ تھی کہ اسے فون کرنے کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے سوس سے کال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کر داسکتا تھا چنانچہ پارٹنٹ والا فون استعمال کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر مجھے مسٹر ہنگ کے موبائل فون کا خیال آ گیا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر ہنگ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت شون اور لی یان کے ساتھ کسی سفید گھٹنگو میں مصروف تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑنے ہی حیرت بھرے لہجے میں اس نے کہا۔

”تم سوئے نہیں؟“  
”میں کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کافی!“ ہنگ نے حیرت سے دہرایا ”کافی پی کر تو تمہاری رہی کسی نیند بھی اڑ جائے گی۔“

میں نے ان کے قریب بیٹھے ہوئے کہا میرے ساتھ انا معاملہ ہے چائے کافی اور دیگر برین اسٹیمولٹ میرے اعصاب کا سماج کر کے مجھے نیند کی گود میں لے جاتے ہیں۔ اگر اس وقت مجھے ایک کال مل جائے تو میں پرسکون نیند سو سکوں گا۔“

”یہ تو عجیب و غریب رسپونڈ ہے۔“ شون نے آنکھیں پھیلائیں ”میں نے پہلے تو کسی شخص کو ایسی عادت میں گرفتار نہیں دیکھا!“

ہنگ نے کہا ”مسٹر ود جان کے ساتھ بہت کچھ عجیب و غریب ہے۔“ پھر وہ لی یان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”ود جان کے لیے ایک گنگ کافی چاہیے۔“

”شیور!“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی ”میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔“

لی یان کمرے سے نکل گئی تو ہنگ نے مجھ سے استفسار کیا

یہاں کے بچے بچے سے آگاہی رکھتی ہے۔ اپنا کام کرنے کے بعد تم واپس آ جانا۔ کسی عورت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے تم زیادہ محفوظ رہو گے۔“

دو ذاتی چل گئی۔ کینیڈی بلیوارڈ کو چھوڑ کر ہم ”دن سکسٹی نائن“  
 نوخوڑی ہائے ”وے“ پر آئے۔ یہی اے دے آگے جا کر نوخوڑی  
 کی حدود میں ”فورٹونیو نیویارک ہائی وے“ میں بدل گئی  
 اور اسی پر سفر کرتے ہوئے ہم نیویارک کے ایک  
 جزیرے ”اسٹین آئی لینڈ“ میں داخل ہو گئے۔



یہ ثبوت ہے کہ میں نے ساحل کو اسرائیل کے بجائے کنھنڈو پہنچا دیا ہے؟“

”سب سے بڑا ثبوت تو تم ہی ہو!“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہہ رہا ہوں، کنھنڈو والی بات تم ہی نے مجھے بتائی ہے!“

”کبومت!“ وہ پھنکارا، اتنا بڑا راز میں جھپس کیونکر.....!“

میں نے لائن کاٹ دی اور اگلے ہی لمحے موبائل فون کا سوچ آف کر دیا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا میں نے رلی کو تاؤ دلا کر اس کے منہ سے وہ حقیقت اگوالی بھی جس کی تصدیق نہیں ہو پاری تھی۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کا امکان باقی نہیں تھا کہ میری ساحل اسرائیل میں نہیں بلکہ کنھنڈو میں تھی۔

میں نے سول کالج میں رکشے کے بعد لی یان سے کہا، ”واپس چلو کام ہو گیا۔“

وہ نیویارک ہائی وے فورورٹی پر تھوڑا آگے آئی پھر ویلہ بروک پارک کے نزدیک سے اس نے گاڑی کو پو۔ ایس انٹر اسٹیٹ ٹوی سیوٹی ایٹ پر موڑ لیا۔ ہم نے اسی روڈ پر سفر جاری رکھتے ہوئے اسٹیٹ حد دو کو عبور کیا اور نیویارک سے نیوجرسی میں داخل ہونے کے بعد پو۔ ایس انٹر اسٹیٹ ٹائن فائیو پکڑ لی۔

لی یان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”وجدان! میں تمہارے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ ہمارے حلقے میں پچھلے چند دنوں سے تمہارا ذکر ہونے لگا ہے۔ ابھی زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے تمہارے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔ تم زبردست ایڈ وینچر میں ہو!“

لی یان کے ليچے سے سرت آمیز جہرت جھلکتی تھی۔ میں نے اس کے توصیفی کلمات کے جواب میں کہا، ”ٹھیک کہتی ہو۔ ہم دونوں کے طرز زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ تم سارا دن فوٹو اسٹوڈیو میں دکان داری کرتی ہو اور میری زندگی مسلسل حرکت میں ہے۔ یہ تفاوت بھی بہت اہم ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں تم اپنی زندگی سے کچھ پور ہو۔“

”ایسی بات نہیں وجدان!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی، ”ہمیں متحرک زندگی گزارنے کا سوچ ملتا رہتا ہے۔ کبھی ایک ساتھ مل کر اور کبھی علیحدہ علیحدہ مگر جو حشر تمہاری زندگی کا خاصہ ہے اس کا تجربہ ابھی تک نہیں ہوا۔“

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا، ”دل چھوٹا نہ کر دلی یان!

قدرت جھپس بھی ایسا موقع ضرور دے گی۔ ویسے ایک بات بتا دوں اس قہرل میں ہر لمحہ زندگی داؤ پر لگی رہتی ہے۔“

”اسی میں تو حروہ ہے۔“ وہ بھائی لیچے میں بولی۔

پھر ہمارے درمیان ہلکی بھلکی گفتگو ہونے لگی۔ لی یان نے مجھے بتایا کہ وہ اور شون، مسٹر ہنگ کے احکام کی تعمیل کرنے کے بائند ہیں۔ بظاہر وہ لوگ دوستوں کی طرح رہتے ہیں مگر ہنگ کی حیثیت ایک پاس کی سی ہے۔ وہ انہیں مختلف مقاصد کے ليچے کام میں لانا رہتا ہے۔ فوٹو اسٹوڈیو تو ایک آڑ ہے اور کارڈ بار کا کارڈ بار بھی ہے۔ اس اسٹوڈیو پر دو ملازم بھی انہوں نے رکھے ہوئے تھے۔ لی یان اور شون عمرانی اور منجھٹ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔

تھوڑی بے تکلفی ہوئی تو لی یان نے مجھے نجی زندگی کے بارے میں بھی بتایا۔ ان کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک وہ بے اولاد تھے۔ ان کی عمر دی کاسن کر مجھے افسوس ہوا۔ میں نے ہمدردانہ ليچے میں کہا۔

”اولاد بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے بغیر شاوی شدہ جوڑے کی زندگی مکمل نہیں ہوتی۔“

وہ یک دم سنجیدہ ہوئی اور خاموشی سے دھڑا اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے میری بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا تاہم اس کا رد عمل بہت کچھ ظاہر کر رہا تھا جب وہ مزید پانچ منٹ بھی خاموش رہی تو میں پوچھنے پر آمادہ نہ رہ سکا۔

”تم اچانک اتنی سنجیدہ کیوں ہو گئی ہو؟“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ معنوی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”بات تو ہے۔“ میں نے کہا، ”اگر بتانا نہیں چاہتی ہو تو یہ الگ مسئلہ ہے۔“

اس نے کہا، ”میں زندگی کے ليچے اولاد کو ضروری نہیں سمجھتی۔“

اس کے خیالات نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا، ”کیا تمہارا شوہر شون بھی انہی نظریات کا حامل ہے؟“

جواب دینے کے بجائے وہ زیریں ہونٹ پر ظلم کرنے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھی۔ میرا نے کریدنے والے انداز میں پوچھا، ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا لی یان؟“

”شون کو بچے کی بہت خواہش ہے۔“ وہ جزیز ہوتے ہوئے بولی، ”میں ہی اس کے ليچے تیار نہیں ہوں۔“

”اوہ!“ اب مجھے شون کی بے چارگی پر افسوس ہونے لگا۔

ایان نے قدرے تلخ لہجے میں کہا ”کیا ضروری ہے اپنا ہی بچہ پیدا کیا جائے!“

میں نے استہجابیہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا ”تم کہنا کیا جانتی ہو۔ انسان اپنا ہی بچہ پیدا کرتا ہے دوسروں کا تو نہیں۔ تمہاری بات نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے!“

”میں اڈاپشن کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ میری جانب دیکھتے بغیر بولی۔

”کیا تم کوئی بچہ اڈاپٹ کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟“

”ہاں مگر شون کو یہ آئیڈیہ پسند نہیں۔“ اس نے برا سامنا بتایا ”وہ اپنا بچہ چاہتا ہے۔“

”میرا خیال ہے اس کا مطالعہ بلکہ خواہش جائز ہے۔“

”تم مرد ہو نا..... اسی کا ساتھ دو گے!“

”یہ بات نہیں لی یان!“ میں نے اس عجیب و غریب لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”میں نے ایک جائز اور اصولی بات کی ہے۔ اس میں مرد کی طرف داری کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولی ”تم شاید امریکا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ یہاں ان دھندلے بے ہیز (جن چاہتے بچے) کا ریشہ بہت زیادہ ہے۔ لائقہ اونچے لاداروں کی طرح مختلف فلاحی مراکز میں پلتے ہیں۔ اگر ہم وہاں سے کوئی بچہ اڈاپٹ کر لیں تو ایک انسان کو بہتر زندگی فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے نیکی کا کام بھی ہوگا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے مجھ سے سوال کیا ”کیا شون کی طرح تم بھی اڈاپشن کو برا سمجھتے ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی ”میں اڈاپشن کو ہرگز برا نہیں سمجھتا مگر یہ کام اگر نظریہ ضرورت کے تحت کیا جائے تو واقعی اس سے بڑی اور کوئی نیکی نہیں۔“

”نظر یہ ضرورت سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اگر کوئی شادی شدہ جوڑا بچہ پیدا کرنے کی قدرتی صلاحیت سے محروم ہو تو اس صورت میں اڈاپشن نظریہ ضرورت کے تحت ہوگی۔“ میں نے وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”کیا تم لوگوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی پرابلم ہے؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”پھر میں یہی کہوں گا تم غلطی رہو!“

”میں کیا کروں۔“ وہ استغیر تک پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ”بس میں بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ میں تین بار ابارشن کروا چکی ہوں۔“

”تم فطرت سے کھلی جنگ کر رہی ہو۔“ میں نے کہا ”اور اس جنگ میں آج تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی!“

لی یان کے خیالات کے بارے میں جان کر مجھے اس کی حالت پر افسوس اور بے چارے شون پر ترس آنے لگا۔ یہی طور پر وہ کسی نفسیاتی پیچیدگی کا شکار تھی۔ بعض اہل اور بعض نااہل والدین اولاد کی خواہش کی خاطر علاج معالجے پر لاکھوں کروڑوں لٹا دیتے ہیں اور ایک لی یان کی جو قدرت کے ساتھ جنگ پر کمر بستہ تھی۔ میں نے آخر اس سے پوچھ لی۔

”تم فطرت کے ساتھ کیوں لڑ رہی ہو؟“

”بس..... مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“ وہ دھڑاکنے کے بارے میں دیکھتے ہوئے بولی ”میں زچگی کے مراحل سے گزرنا نہیں چاہتی۔ میں ڈرتی ہوں۔“

میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ میں کوئی سوشل لیچر نہیں تھا کہ اسے سمجھانے کے لیے کوئی بی چھوڑی دھواں دھار تقریر بھجھا دوں۔ لی یان کی اپنی زندگی تھی۔ اس کی مرضی وہ اسے جیسے بھی گزاری۔ اللہ نے وسیع و عریض دنیا پیدا کی ہے اور اس دنیا کے اندر ہر نوعیت کا کردار رہتا ہے۔ اس کی قدرت سے نہرو آکر دربار بھی نظر آئیں گے اور فطرت کی پیروی کرنے والے کردار بھی دکھائی دیں گے۔ لی یان بھی اسی جتنی جانتی دنیا کا ایک کردار تھی!

ہم یو۔ ایس انٹراسٹیٹ ٹائن فائیو پر سفر جاری رکھتے ہوئے نیوآرک انٹرپورٹ کے پہلو سے گزرے اور ”نیوآرک“ کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ جرسی کی طرح نیوآرک بھی نیو جرسی کا ایک اہم حصہ ہے۔ انٹرنیشنل انٹرپورٹ کی وجہ سے اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

نیوآرک کے اندر سے گزرتے ہوئے ہم نے ٹائن فائیو انٹراسٹیٹ کو چھوڑ کر پولاکی اسکاٹی وے پکڑی اور ایک لمبا پکڑ کاٹ کر ٹکن پارک پہنچ گئے۔

ہم ابارٹمنٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہنگ نے چھوٹے ہی پوچھا ”تم لوگ دور نکل گئے تھے کیا۔ بہت دیر لگا دی۔“

”اسٹین آئی لینڈ!“ ہنگ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں ”تم جس قسم کی صورت حالات سے گزر رہے ہو اس میں نیو یارک کے کسی بھی حصے میں قدم رکھنا تمہارے لیے انتہائی خطرناک ہے۔“

”دیکھو میں صحیح سلامت واپس آ گیا ہوں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”بہر حال!“ وہ جلدی سے بولا ”تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے وجدان!“

میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا ”کیسی خوشخبری؟“

”میں نے مکینڈو میں اسپیکر شیوا سے بات کی ہے۔“ وہ جوش بھرے لہجے میں بولا ”اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ڈاکٹر موگ کے ساتھ دھوا (ساحل) کو بھی سی ایس ایسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ وہ دونوں شدید زخمی ہیں اور انتہائی تکبداشت کے شیعے میں انہیں رکھا گیا ہے۔ سی ایس ایسپتال پولیس کی کڑی نگرانی میں ہے۔ اسپیکر شیوا اس مشن کا نگران اعلیٰ ہے۔“ وہ ایک لمحے کو توقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر موگ یا دھو سے فی الحال براہ راست بات نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ان کے قدرے بہتر ہو جانے کا انتظار کرنا ہوگا!“

”اس بات کی تصدیق کیسے ہوئی کہ ڈاکٹر موگ کے ساتھ ساحل ہی کو اسپتال پہنچایا گیا ہے؟“ میں نے ایک ضروری سوال کیا حالانکہ میں اس سلسلے میں پہلے ہی مکفرم ہو چکا تھا۔ رتی سے ہونے والی وہ اہم گفتگو میرے اطمینان کے لیے کافی تھی ”وہ لوگ تو اسپتال میں اپنے اصلی ناموں سے داخل نہیں ہیں!“

دنگ ہنگ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”اسپیکر شیوا کے علاوہ مجھے جالوس سے بات کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ جالوس کی حیثیت مکینڈو میں ڈاکٹر موگ کے میزبان کی سی ہے۔ جالوس اس وقت اسپتال ہی میں تھا جب اسپیکر شیوا سے میرا رابطہ ہوا۔ جالوس نے تصدیق کی ہے کہ ڈاکٹر موگ کے ساتھ جس لڑکی کو اسپتال پہنچایا گیا ہے ماضی میں اس کا تعلق بدھ مت کی عبادت گاہ سے رہا ہے۔ وہ وہاں کے ایک بھکشو کی بیٹی ہے۔“

”اوہ!“ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی ”یہ تصدیق بڑی مستند ہے۔“

ہوں۔ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو مسٹر ہنگ؟“

ہنگ نے شون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم کل شام میں یعنی آنے والی شام کو یہاں سے روانہ ہونے والے ہو۔ ہم نے اس سلسلے میں ابتدائی پروگرام مرتب کر لیا ہے۔ باقی باتیں ابھی طے کر لیتے ہیں۔“

”میرے ڈاکوٹیکس کا کیا ہوگا؟“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

وہ بولا ”ڈاکوٹیکس کا مسئلہ بھی حل کر لیا گیا ہے۔ تم شون کی آئی ڈی پر نیو جرسی سے مکینڈو تک سفر کرو گے۔“

”شون کی آئی ڈی؟“ میں نے چونک کر باری باری ہنگ اور شون کو دیکھا۔

ان کے درمیان پہلے سے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی تھی ان کے چہروں کا اطمینان اور غمراہی ابھی بتاتا تھا۔

ہنگ نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑے سانس سے بولا۔

”شون اور تمہارے قہ کاٹھ اور صحت میں انہیں میں کا فرق ہے۔ ہمیں شون بتانے کے لیے مجھے تمہارے چہرے پر بہت کم کام کرنا پڑے گا۔ میک اپ کی دنیا میں دو نہایت ہی اہم ٹیکنیکس استعمال ہوتی ہیں۔ تقیم اور کلر اسکن!“

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تقیم والی ٹیکنیک میں پورے چہرے کو بدل کر رکھ دیا جاتا ہے جبکہ کلر اسکرین ایک مائیکریم کا میک اپ ہے۔ اس میں صرف چہرے کی اسکلنگ کی جاتی ہے اور اسے مطلوبہ چہرے کے قریب ترین بنایا جاتا ہے۔“

وہ ایک مرتبہ پھر تھوڑی دیر کے لیے توقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تم دونوں ایشیائی ہو۔ انڈوپاک سے تمہارا تعلق ہے۔ تم لوگوں کے رہن بہن اور بول چال میں بھی زیادہ فرق نہیں۔ ہمیں شون کی کالی کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم کہیں انک گئے تو لی یان تمہاری مدد کے لیے موجود ہوگی!“

ہنگ کے آخری جملے نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ لی یان کا حوالہ اس نے ایسے دیا تھا جیسے وہ میرے ساتھ مکینڈو جا رہی ہو۔ میں نے تعجب فیو لہجے میں استفسار کیا۔

”لی یان کی موجودی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

جواب دینے سے پہلے ہنگ نے ایک مرتبہ پھر شون کی جانب دیکھا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا ”میں نے سروسٹ جو پروگرام ترتیب دیا ہے، اس کے مطابق تم شون کی حیثیت سے اپنی ”بیوی“ لی یان کے ہمراہ نیو جرسی سے

کھینڈ چار ہے ہو اور اس سفر کا مقصد سیاست کے علاوہ قدرتی فوٹو گرافی بھی ہے۔  
میں نے شون کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ہنگ نے کہا ”کتنی دلچسپ اور عجیب بات ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے باشندوں کو امریکا کا دیرا حاصل کرنے کے لیے جتنی دشواریاں اٹھانا پڑتی ہیں اسی کام کے لیے امریکی شہریوں کو اتنی ہی آسانیاں حاصل ہیں۔ جیسے شون لی یان کے ساتھ نیپال کے دیڑا کے لیے کوشش کرے گا اور معمولی سی کاغذی کارروائی کے بعد انہیں دیڑا جاری کر دیا جائے گا۔ کٹ کا بندوبست بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ بدھ کا مرضی ہوئی تو شام سے پہلے پہلے تمام تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔“  
ہنگ اور شون نے ہماری غیر موجودگی میں بڑا جاندار منصوبہ بنایا تھا۔ میری طرح لی یان کے لیے بھی یہ ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے میں نے اس سے دریافت کیا۔

”تم اس سلسلے میں کیا کبھی ہوئی یان؟“  
”میں بہت سستی محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں پیچھے ہونے لگی۔

ہنگ نے کہا ”یہ بھی کافی دنوں سے اسٹوڈیو میں بیٹھے بیٹھے پور ہو رہی تھی۔ اسی بہانے اسے بھی ہاتھ پاؤں کھولنے کا موقع مل جائے گا۔“

ہنگ نے ہاتھ پاؤں کھولنے کے الفاظ اس انداز میں ادا کیے تھے کہ میں پوچھنے پر ہانہ رہ سا۔ ”کیا لی یان یہاں ہاتھ پاؤں بند کیے بیٹھی تھی؟“

”تمہاری طرح یہ بھی مارشل آرٹس جانتی ہے!“ ہنگ نے ایک اور انکشاف کیا۔

میں تعریفی نظر سے لی یان کو دیکھنے لگا۔

وہ بولی ”وہ جان! کسی شخص میں تمہارا ساتھ دے کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ بھی ہوگا۔“

”اور شون کا کیا ہوگا؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میرے اس سوال کا اثر سب نے بہت مختلف لیا۔ تھوڑی دیر پہلے نیو یارک سے نیوجرسی کی طرف آتے ہوئے میرے

اور لی یان کے درمیان جس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی، اس کے پیش نظر شون بے چارہ بہت مظلوم نظر آتا تھا۔ لی یان نے غیر

فطری روئے بلکہ ضد نے شون کو ایک عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہر شہر پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ باپ بنے۔ ہر بیوی

بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ ماں بنے لیکن ان دونوں میاں بیوی

کے درمیان عجیب سی کشش جاری تھی۔ لی یان کسی بے آسرا بے سہارا بچے کی اڑان میں کے لیے تو تیار تھی مگر اپنی کھوکھلی بری کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب نفسانی خوف میں مبتلا تھی۔ اس موضوع پر ہمارے درمیان بڑی مختصر اور ادھوری بات ہوئی تھی۔ اب ہمیں ایک ساتھ چند دن گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اس کی برین واشنگ ضرور کروں گا۔ اس نے اپنے ذہن میں جو خواہ خواہ کے اندیشے بال رکھے ہیں انہیں دور کر کے لی یان کو شون کی طرف راغب کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب نے چونک کر میرے سوال کو جدا جدا تناظر میں محسوس کیا تھا اس لیے ان کا جواب بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لی یان نے شرائط آمیز لہجے میں کہا۔

”شون مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ یہ بے تابلی سے میری داہنی کا انتظار کرے گا۔“  
ہنگ بولا ”میں نے فوٹو اسٹوڈیو سے اسے چند روز کے لیے چھٹی دے دی ہے۔ یہ پوری توجہ سے دیکھ کر تیار داری کرے گا۔ اسٹوڈیو کے معاملات کو ملازمین سنبھال لیں گے۔ وہ برسوں کے آزمائے ہوئے تجربہ کار ملازم ہیں۔ جب تم شون سے کامیاب لوگوں کے تو دیکھ سکتے ہو۔“

اور چاقو دو بند لگا۔  
شون نے کہا ”وہ جان! لی یان کا بہت خیال رکھنا۔ یہ ایک امانت کے طور پر تمہارے ساتھ جاری ہے۔“

”ڈونٹ وری!“ میں نے اس کا شانہ شہ چھپایا۔ داہنی پر جب ہمیں پہلے سے زیادہ سدھری ہوئی لٹکی۔ میں اس کے دماغ کی نیڑھ لٹکے کی بھی کوشش کروں گا۔ یہ تمہاری امانت اور میری ذمہ داری ہے۔“

ہنگ نے ایک طویل جواہی لیتے ہوئے کہا ”ہائیں بہت ہو جائیں۔ اب نیند پوری کرنا چاہیے۔ سب لوگ اچھے بچوں کی طرح اپنے بستر پہنچ جائیں۔“

میں خاموشی سے اٹھا اور اس بیڈ روم میں آگیا جہاں دیکم موجود تھا۔ یہ رات مجھے اسی بیڈ روم میں گزارنا تھی۔ آئندہ رات ہوئی جہاز میں گزرنے والی تھی۔ ان لمحات میں شاید قدرت مجھ پر ہرمان ہو گئی تھی کہ کوئی ایسا شخص جو این دوائے لی ڈی اور ایف بی آئی کو مطلوب ہو وہ اتنی آسانی سے امریکا

چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا جیسا بندوبست میرا ہو گیا تھا۔

ہنگ کی ذہانت اور تجربہ کاری کی داد دینا پڑی۔ اس نے لی یان کو میرے ساتھ رکھنے کی مشق کو ہر قسم کے خطرے سے پاک کر دیا تھا۔ شون اور لی یان امریکن نیشنل تھے اور کئی مرتبہ

امریکا سے باہر دیگر ممالک کا سفر کر چکے تھے۔ امریکن نیشنل ہونے کا مطلب ہے حکومت اور قانون کی نظر میں مستر ہونا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شون کے ہمیں میں ویدان امریکا کو ٹھونکا دکھا کر ”ہائے ہائے“ کرنے والا تھا۔ وہ ویدان جسے ”امریکا ڈکٹن“ قرار دیا جاتا تھا۔

میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے دیکھ کا جائزہ لیا اور اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نہیں جانتا تھا دیکم کو جب میرے پروگرام کاظم ہوگا تو وہ کیا رد عمل ظاہر کرے گا لیکن یہ بات طے تھی کہ میرے پروگرام میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا نیوجرسی سے روانہ ہوتے وقت میں دیکم کے بارے میں دیکم ہنگ کو خصوصی ہدایات دے دوں گا۔

میں اس وقت نیند کے شدید غلبے میں تھا۔ جی چاہ رہا تھا آکھیں بند کروں تو برسوں بعد ہی بیدار ہوں۔ میں نے خود کو نیند کے حوالے کرنے سے پہلے ساحل کو اپنے تصور میں چکایا اور قردو آئی کے توسط سے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

میری یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ وہ رنی کے قبضے میں تو نہیں رہی تھی تاہم اس کی ڈالی ہوئی گرہ پائی تھی۔ رنی نے میرے تصور کی راہ میں ساحل کے آگے ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی کہ میرے خیال کا پرندہ اس دیوار سے سرنگرا کر رہ جاتا۔ تھوڑی سی تصوراتی دوڑ دوچھپ کے بعد میں داہنی آگیا۔

اس کے بعد میں نے تیسری آنکھ کے سامنے ڈاکٹر مومک کے خندہ خال کو اچا کر کیا اور اگلے ہی لمحے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے

ایک لمحے کی دیر ہوئی۔ ماحول میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کے کمرے سے کسی کو نکلنے ہوئے دیکھا۔ میں نے یو یو گرام سے پہچاننا وہ کوئی نرس تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے اس کا سراپا میری یادداشت میں محفوظ نہ ہو سکا

ورنہ میں اس کے ساتھ چپک کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ ممکن ہے وہ ڈاکٹر کو اینڈ کرنے کے بعد ساحل کی طرف

جاتی۔ اس طرح میں ساحل کا دیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ میں ڈاکٹر والے کمرے ہی میں رہا اور اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا اور کھلی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی صحت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے اطمینان اور

کان نظر آیا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ گھروالی کوئی بات نہیں۔ جب میں اس کے پاس پہنچوں گا تو وہ اپنے نڈموس پر کھڑا ہو کر مجھ سے معاملہ کرے گا۔

حرید باجی منٹ تک سٹی اسپتال کھینڈو کے کمرے میں رکنے کے بعد میں داہنی لیکن پارک نیوجرسی کے اپارٹمنٹ میں حاضر ہو گیا۔

ساحل تک پہنچنے کا تصور بڑا امنی خیز تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ پہلی مرتبہ مجھے کھینڈو کے مضافات میں ملی تھی اور دوسری بار بھی کھینڈو ہی میں ملنے والی تھی۔ میں نے کھینڈو (نیپال) میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور وہاں نہایت ہی مطمئن اور پرسرار واقعات سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ اس وقت نیپال کے بارے میں سوچتے ہوئے کئی چہرے تصور کی نگاہ کے سامنے ڈوبنے لگے۔

ان میں دوستوں اور دشمنوں کے چہرے شامل تھے۔ انسپٹر اعظم خان انسپٹر پرچندرا نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ شو بہا بھلا مایاستی اور نیلگری کی یادیں بھی میرے ذہن میں تازہ تھیں۔ میں گوتم بھوش چانگ لی اور ناگ پال کی دشمنی کو بھی نہیں بھولا تھا۔ ان میں سے کئی افراد اب زندہ نہیں تھے۔ اور جو زندہ تھے وہ بھی پتا نہیں کہاں کہاں بکھر چکے ہوں گے!

نیپال اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک میں نے محسوس کیا جیسے اس کمرے میں میرے اور دیکم کے علاوہ بھی کوئی موجود ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں لیکن اپنے اور دیکم کے سوا کسی کو نہ پایا۔ میرے محسوسات نے مجھے دھوکا دیا تھا؟

نہیں یہ دھوکا نہیں تھا! وہ بھی وہاں موجود تھی۔ میں نے کمرے میں اس کے بدن کی مخصوص سمور کن خوشبو کو محسوس کیا۔ میں اس خوشبو کو ہزاروں خوشبوؤں میں الگ پہچان سکتا تھا۔ یہ خوشبو کبھی میرے جسم کا حصہ بھی رہی تھی۔ وہ پریتوں کی ملکہ نیلگری کی مخصوص خوشبو تھی۔

میں نے کمرے میں چاروں جانب نظر دوڑائی اور دھیرے سے اسے پکارا ”نیلگری!“

میری اس پکار کا کوئی جواب موصول نہ ہوا مگر وہ بھیجی بھیجی مہک بہ دستور محسوس ہوئی رہی جو نیلگری کی وہاں موجودی کا یقین ثبوت تھی۔ میں نے دہمیں بار اور اسے آواز دی لیکن جواب میں اس کی جانب خاموشی طاری رہی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت میری ساعت میں اس کی ریشمی آواز رس

مکھولے لگی۔ اس نے ٹھٹھا ہوا ایک سبک خرام قہقہہ لگایا تھا۔ میں اس نفرتی قہقہے کے طلسم میں ٹھوکر رہ گیا۔ اس ٹھٹکا کی شیرینی میرے اعصاب کو شانتی میں بھگونے لگی۔ میں اسی مدحوشالہ میں زیرو زبر ہو رہا تھا کہ کمر اس کے وجود سے خالی ہو گیا تاہم اس کے ایک انگ سے پھوٹنے والی مدھر اور کیف آور خوشبو اس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک کمرے کی فضا اور درود یوار میں قیام پذیر رہی۔

یلگری نے نیا پیئرا بدل کر مجھ سے نئے انداز کی انکلیاں شروع کر دی تھیں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ میں یہ نہیں جان سکتا تھا کہ میرا تصور اور جو اس مجھے فریب دے رہے ہیں۔ اس کی آمد تو ہو رہی تھی مگر یہ انداز دگر!

کراچی میں ہونے والی آخری ملاقات میں اس نے دعویٰ کیا تھا اب وہ میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی لیکن ٹیلی وڈان کے بھیا تک انجام کے بعد اس نے دوبارہ انٹری مارنا شروع کر دی تھی۔ حیرت اور ابھمن اس بات کی تھی کہ وہ اب مجھ پر ظاہر کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ پردہ نشینوں کے مانند میرے ماحول میں وارد ہو کر کیا ثابت کرنا چاہتی تھی!

اچانک ایک خیال نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں امریکا سے نیپال جانے والا تھا اور نیپال سے یلگری کا استھان زیادہ دور نہیں تھا۔ کیا میں غیر محسوس انداز میں ملکہ کو ہمارے نزدیک جا رہا تھا؟

☆☆☆

آئندہ روز دس بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ دیم مجھ سے پہلے بیدار ہو چکا تھا اور ایک ٹکے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ خفیف انداز میں مسکرایا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور بستر چھوڑ دیا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“ میں نے قریب آ کر اس کے دغلوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

اس کا بایاں بازو اور دایاں پاؤں ٹیچوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ نقابہ بھرے لہجے میں بولا ”پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ بہت معمولی درد محسوس ہو رہا ہے۔ یہ میری مرہم پٹی کس نے کی ہے؟“

رات جب لی یان ایک نرس کا رول ادا کر رہی تھی تو دیم نیم بے ہوش تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اسے کس قسم کا میڈیکل ٹرینٹ دیا گیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے سوال کیا۔

”تم کب سو کر اٹھے ہو؟“ ”کوئی دس منٹ پہلے۔“ اس نے جواب دیا ”بہننے کو جی چاہ رہا تھا اس لیے ٹکے سے ٹیک لگالی!“ ”اس کا مطلب ہے تم ابھی تک بیڈ سے نیچے اترے ہو اور نہ ہی تم کمرے سے باہر ملے ہو؟“ ”نی الحال یہ میرے بس میں نہیں۔“ اس نے اپنے پاؤں کی معدوری کی جانب اشارہ کیا۔ ”ادو!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

پھر میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے ان حالات کے بارے میں بتایا جو اس کی خبری کے دوران میں واقع ہوئے تھے۔ وہ تو سب دے سے نکلنے کے بعد ہنگ کی گاڑی میں بیٹھے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے نیویارک سے نیوجرسی پہنچنے اس کی میڈیکل ٹرینٹ اور شون و لی یان کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑی توجہ اور حیرت سے میری بات سنتا رہا اور میرے خاموش ہوتے ہی اس نے سوال کر دیا۔

”کیا اس اپارٹمنٹ میں ہمارے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہیں؟“

”میں جب رات کو سونے کے لیے اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو ہنگ کے علاوہ شون اور لی یان بھی یہاں موجود تھے۔“ میں نے کہا ”موجودہ صورت حال کے بارے میں دیکھ کر کیا بتا سکتا ہوں۔“

”خاموشی اور سناتے سے تو یہ محسوس ہوتا ہے ہمارے سوا کوئی ذی روح اس اپارٹمنٹ میں موجود نہیں۔“ وہ زنجی پاؤں والی ٹانگ کو دراز کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”ممکن ہے وہ لوگ ابھی تک سو رہے ہوں۔ صبح پانچ بجے تک تو ہم جاگ رہے تھے۔“ ”ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس سے پوچھا ”تجسّیس داش روم جانا ہو تو میں سہارا دے دوں؟“

”میں ٹھوڑی دیر بعد داش روم جاؤں گا۔“ اس نے کہا ”اور میرا خیال ہے میں کسی سہارے کے بغیر ٹھوڑا لنگڑا کر چلی لوں گا۔“

میں نے کہا ”تجہارے پاؤں کی حالت ٹھیک نہیں۔ لی الحال تجسّیس بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا سہارا نہیں لینا چاہئے تو دیوار کو پکڑ کر داش روم تک چلے جانا۔“ اس نے نمونیت بھرے انداز میں سر کو اٹھائی جنبش دی۔ میں نے ایک انگڑائی لی اور فریش اپ ہونے کے لیے داش روم میں مہس کیا۔

سازمے دس بجے تک ہم دونوں ناشتے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ میں دسم کو بیدارم میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اپارٹمنٹ کے باقی دونوں بیدارم اور سنگ روم مجھے خالی ملا۔ اس بات پر مجھے حیرت بھی ہوئی۔ پتا نہیں وہ لوگ ہمیں یہاں چھوڑ کر جہاں چلے گئے تھے!

جن کی جانب سے کھٹ پٹ کی آواز پر میں چونکا اور بے ساختہ میرے قدم اس طرف اٹھ گئے۔ لی یان جن میں موجودگی اور اس کی کارروائی سے اندازہ ہوا وہ ہمارے لیے ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ چپک اٹھی ”مڈم رنک!“  
”مارنک!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا ”وہ دونوں کہاں چلے گئے؟“  
وہ میرا اشارہ سمجھ گئی بولی ”مسٹر ہنگ تو اسی وقت چلے گئے تھے شون ایک گھنٹا پہلے تیار ہو کر اسٹوڈیو کی طرف گیا ہے۔“

”ہنگ نے کچھ بتایا کہ وہ کہاں گیا ہے؟“  
”نہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔  
میں سمجھ گیا وہ اس سلسلے میں ڈسکس نہیں کرے گی۔ میں نے کہا ”اپارٹمنٹ میں پہلی ہوئی خاموشی سے تو میں یہی سمجھا تھا آپ لوگ ہمیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہوں!“

”شون کا اسٹوڈیو چار ضروری تھا۔“ اس نے ہاتھ روک کر بغیر کہا ”ملازمین کو مختلف ہدایات دینا ہے تاکہ دو تین روز تک وہ کام کو اچھے طریقے سے سنبھال سکیں۔ انہیں یہی بتایا جائے گا کہ ہم دونوں کیل فورنیا تک چارہ ہیں اور دو تین دن میں واپس آ جائیں گے۔“ وہ تھوڑی دیر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”دیے مجھے معلوم ہو گیا تھا تم دونوں بیدار ہو چکے ہو اسی لیے میں تم لوگوں کے لیے ناشتا بنانے میں لگ گئی۔ تم اپنے دوست کو سہارا دے کر ادھر ہی لے آؤ۔ ناشتے کے بعد میں اس کی چوٹی کا معائنہ بھی کروں گی۔“  
اپارٹمنٹ کا کچن خاصا کشادہ تھا اور ڈاننگ روم بھی اس کے اندر ہی لگی ہوئی تھی۔ میں نے لی یان کی بات کے اختتام پر کہا۔

”یہ دو تین دن کے لیے کیل فورنیا والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر ہمیں واپس میں ہفتہ دس دن لگ گئے تو اس اسٹینٹ کا کیا ہوگا؟“

”یہ ایک ڈمی اسٹینٹ ہے۔“ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ”اور اسے مسٹر ہنگ کے حکم پر تیار کیا گیا ہے۔ تین

سے بعد انہیں یہ بھی بتا دینا کہ تم نے میں ہمیں اور کسی ڈرائیوری کو ترک کر دیا ہے۔ اپنی نئی جاب اور پتے ٹھکانے کے بارے میں تم انہیں بعد میں بتاؤ گے۔“

اس نے اثبات میں گھونٹ لائی تو میں نے لی یان سے فون کے بارے میں معلومات کی۔ اس نے بتایا کہ اس اپارٹمنٹ کے فون سے اور ریڈیو ڈاننگ ہو سکتی تھی چنانچہ دسم نے پورے دس منٹ تک اپنے کمر والوں سے بات کی۔ وہاں چاند نظر آ گیا تھا اور اگلی صبح وہاں عید منائی جانے والی تھی۔

اس کی دیکھا دیکھی مجھے بھی طراری آ گئی۔ عید خوشی کا ایک بہت بڑا موقع ہے اور انہوں سے دور رہنے والوں کو اس کی اہمیت کا کچھ زیادہ ہی احساس اور قدر ہوتی ہے۔ پاکستان میں میرے بھی بہت سے خیر خواہ موجود تھے مگر میں اپنے حالات کے پیش نظر فردا فردا سب سے بات نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے صرف ایک نام کو مکرمل کیا اور اس کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میری مطلوبہ ”آواز“ ”ہیلو“ کی صورت میں ساعت تک پہنچی تو میں نے بے اختیار کہا ”صاف! چاند رات مبارک ہو..... اور صدم کی بھی پیشگی مبارکباد قبول کر دو!“  
”ادو دھدان!“ اس کی جھان بھری آواز مجھے سنائی دی ”تم کہاں غائب ہو؟“

میں نے کہا ”تمہارے کان میں بول رہا ہوں۔ کیا مجھے دس نہیں کرو گی؟“  
”تمہیں بھی بہت بہت عید مبارک ہو!“ وہ جذبات سے لہر یز آواز میں بولی ”میرے فون کا کارڈ آئی ڈی ڈائل ہو اس اے کا کوئی نمبر ضرور رہا ہے۔ میں نہیں جان سکتی تم کس اسٹیٹ میں ہو۔ البتہ ایریا کوڈ سیون تھری نو لکھا ہوا آ رہا ہے۔“

”سیون تھری نو..... نیو جرسی اسٹیٹ کا ایریا کوڈ ہے اور میں جرسی سٹی سے بات کر رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”نیو جرسی کا دوسرا ایریا کوڈ ڈسکس زیر نائن ہے۔“  
”تم سے بات کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی ”کب تک امریکا میں رہنے کا ارادہ ہے؟ پاکستان کب آ رہے ہو؟“

وہ ایک ہی سانس میں دو سوال پوچھ گئی۔ میں اس کی بے تابی اور اپنے حالات کی نزاکت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا ”ابھی آ جانا کب میرے اختیار میں تھا۔ میں یہاں کے وقت کے مطابق آج رات کسی وقت امریکا

سے پرواز کر جاؤں گا۔ میری اگلی منزل نیپال کا شہر کھٹنڈو ہوگی۔ بہر حال۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”انشاء اللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔“

”سائل کا کیا حال ہے؟“ اس نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا ”تم اسے پانے میں کامیاب ہو گئے ہو؟“  
ہماری جب بھی بات ہوتی وہ سائل کی خیریت ضرور معلوم کرتی تھی۔ وہ سائل کے لیے بڑی فکر مند رہتی تھی اور یہ فکر مندی مصنوعی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھی۔ میں صدف کے جذبات اور احساسات کو پوری تفصیل سے جانتا تھا۔ میرے اور سائل کے درمیان جس نوعیت کی دوری حاصل ہوئی تھی، اس کی روداد سنانے کا وقت نہیں تھا چنانچہ میں نے نہایت ہی مختصر سا جواب دیا۔

”میں سائل کے سلسلے ہی میں کھٹنڈو جا رہا ہوں۔“  
”کھٹنڈو میں تمہارا قیام کس جگہ ہوگا؟“  
”فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ میری بھوری کو سمجھتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے وعدہ کرو تم کھٹنڈو پہنچ کر مجھ سے رابطہ کر دو گے اور مجھے اپنے پتے ٹھکانے سے بھی آگاہ کر دو گے!“

میں نے یہ وعدہ کرتے ہوئے الوداعی کلمات کا استعمال کیا اور خدا حافظ کہہ کر ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر دیا۔ صدف میری زندگی کے ایک بڑے حصے پر قابض تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔ صدف بہت ہی کھلے دل اور کشادہ ذہن کی مالک تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں آنے والی لڑکیوں سے اسے بہت مختلف پایا تھا۔ میرے تجربے کے مطابق صدف ایک ایسی لڑکی تھی جو میرے مسئلے کو جانتی تھی..... اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ بعض انسان ساری زندگی ایک ساتھ گزار دیتے ہیں مگر ایک دوسرے کے مسئلے کو سمجھ نہیں پاتے اس کے حل کرنے کی بات تو نہیں آگے کی ہے!

ہم فون سے فارغ ہوئے تو لی یان دسم کی چوٹی کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔ بازو والے زخم پر اس نے نئی بیڈنچ کی اور کہا ”خون کا ساؤر کر گیا ہے۔ میں نے جوتی پٹی باندھی ہے اسے دو دن تک کھولنے کی ضرورت نہیں۔ آج کل موسم خاصا ٹھنڈا ہے لہذا لڑکی کو کی بات نہیں۔“

”مجھے کی چوٹ کے بارے میں کیا کہنی ہو؟“ میں نے استفسار کیا۔

وہ بولی "میں محسوس کر رہی ہوں! انکسے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" دم میں خاصی کی واقع ہوئی ہے۔ اگر فریڈر و غیرہ کا مسئلہ ہوتا تو اب تک سوچن اور بھی بڑھ چکی ہوتی۔ بہر حال ہفتہ بھر تو اسے آرام کرنا ہی ہوگا۔ ہمارے جانے کے بعد شون بے آسانی اس کی دیکھ بھال کر لے گا۔

لیان کے آخری جیلے پروڈیم نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ابھی تک میں نے اسے اپنی کھنڈ درواگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"وہ جان! آپ لوگ کہیں جا رہے ہو؟"

میں نے انہات میں گردن ہلا دی۔

"کہاں؟" اس کے لہجے کی حیرت دو چند ہو گئی۔

میں نے کہا "ابھی بتاتا ہوں۔"

لیان یہ بھی کہ شاید میں اس کی موجودی میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ فرسٹ ایڈ باکس کو سینٹے ہوئے بولی "تم لوگ گپ لگاؤ میں دیگر کام دیکھ لو۔" چھانے سے پہلے ایک مناسب سی تیاری بھی کرنا ہے۔"

لیان نے دوسری مرتبہ جانے کا ذکر کیا تو ڈیم بے حد الجھن زدہ نظر سے مجھے نکلے لگا اور جب لیان کمرے سے رخصت ہوئی تو وہ پھٹ پڑا۔

"یہ جانے کا کیا پتہ ہے وہ جان؟"

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی ہنگامی پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس نے نہ صرف پوری توجہ سے میری بات سنی بلکہ وہ معاملے کی نزاکت کو بھی بخوبی سمجھ گیا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"وہ جان! اگر تمہیں ساحل کا کوئی سراغ مل گیا ہے تو پہلی فرصت میں تمہیں اس کی جانب روانہ ہو جانا چاہیے۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "اس مجبوری نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔"

اس نے اپنی بندھے پاؤں کی جانب اشارہ کیا "افسوس کہ میں اس مشن میں تمہارا ساتھ دینے کے قابل نہیں ہوں۔ دس یوگنڈا!"

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا اور اس کا شانہ چپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا "تم فکر نہ کرو یا راناشاء اللہ ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ اگر میں تمہارے پاس نہ آسکا تو تمہیں اپنے پاس بلوا لوں گا۔ تم تک کر اور پوری توجہ سے اپنا علاج کرو۔"

ڈیم کو دوا کھلانے کے بعد اس کمرے سے اٹھ آیا۔ وہ مجھ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں چاہتا تھا وہ

تھوڑا آرام کر لے۔ دوا میں ایک گولی بھی تھی جو اعصاب کو سکون پہنچا کر نیند طاری کرتی تھی۔ اگر وہ کھنڈا دو کھنڈا اور سو لیٹا تو یہ اس کے حق میں بہتر تھا۔

لیان اپنے بیڈروم میں کپڑوں والی الماری کو کھول کر دیکھ کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم شنگ روم میں بیٹھے آئندہ کے پروگرام پر گفتگو کر رہے تھے۔ لیان ایک پچھڑی لڑکی تھی۔ وہ زندگی میں قہر ل کی خواہش تھی۔ ایڈو جبر کا اسے سوچ تو ہمارا ہوتا تھا مگر وہ اس سے بڑھ کر چاہتی تھی۔ عجیب لڑکی تھی جس کا ہاڈ پر سرگرمی دکھانے کی ضرورت تھی وہاں وہ بے ریشی اور آسائش کا شکار تھی۔ جب سے مجھے اس کی نفسیات کی ٹیڑھ کا علم ہوا تھا میں اس کے علاج کے لیے تنبیہ کی سے سوچنے لگا تھا۔

انسان کی فطرت ثانیہ اس کے ماحول سے بھی بہت اثر قبول کرتی ہے۔ جولوگیاں اور عورتوں دن بھر مردوں کے درمیان رہ کر امور زندگی سر انجام دیتی رہتی ہیں ان کی سوچ میں ایک مخصوص قسم کی سختی آ جاتی ہے۔ ایسے ہی مردانہ شوق اپنانے والی عورتیں بھی خاصی جنگجو یا نہ خیالات کی مالک ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مارشل آرٹس اور رینگنگ وغیرہ کیلئے والی خواتین کے مزاج میں ایک خاص قسم کا جارحانہ پن آ جاتا ہے۔ لیان نے بھی نون حرب و ضرب کی تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے مسئلے کی د میں اترنے کے لیے اس کی ہسٹری لینا ضروری تھا۔ میں ان خود اس کے مسئلے کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں البتہ اگر وہ اس موضوع کو دوبارہ زندہ کرتی تو میں اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔

اس نے پوچھا "وہ جان! کیا تمہیں کبھی کسی ایک جگہ ٹھہر کر زندگی گزارنے کا موقع بھی ملا ہے؟"

"مجھے تکہ تو ایسا موقع نہیں ملا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری خواہش تو ہوگی؟"

"ہر انسان اپنی زندگی میں آرام و سکون کا خواہاں ہوتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن میں ایسے آرام و سکون کا قائل نہیں جس سے زندگی ٹھہری ٹھہری سی لگنے لگی۔ بہر حال مجھے بھی کہیں کتنے کاموں میں مل سکا۔"

"میں نے سنا ہے تم جس لڑکی کے پیچھے کھنڈ جا رہے ہو اس کا تعلق بدھ مت سے ہے؟"

"تم نے بالکل درست سنا ہے۔" میں نے تائید کی۔

"اس کا نام دھوتو تھا تم نے بدل کر ساحل کر دیا؟"

"ہاں یہی حقیقت ہے۔"

"کیا نام کے ساتھ تم نے اس کا مذہب بھی تبدیل کر دیا؟"

"میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر تم یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "میرا اندازہ تھا تم نے ایسا کیا ہوگا؟"

"تمہارا یہ اندازہ کس بنا پر تھا؟"

"میں نے سنا ہے مسلمان عموماً یہی کرتے ہیں۔"

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "اور تم بھی ایک مسلمان ہو؟"

"الحمد للہ! میں مسلمان ہوں۔" میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "لیکن تمہاری سنی سٹائی کو فارمولہ نہیں پایا جاسکتا۔ میں نے بھی اس حوالے سے ساحل پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔"

"اصل میں میرے سامنے ایک مثال موجود ہے میں اس لیے کہہ رہی تھی۔" وہ شون کے والدین کی شادی کا حوالہ دیتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا "کیا کبھی شون نے بھی تم پر زور دیا کہ تم اس کا مذہب اختیار کر لو؟"

"نہیں تو! اس نے آنکھیں پھیلانے ہوئے کہا۔

"اس مثال کو بھی اپنی یادداشت میں محفوظ کرلو۔" میں نے فضا میں اٹکی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم باتوں میں جت کر دیتے ہو!" وہ بے ساختہ بولی۔

میں نے اس کے بے ساختہ اظہار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گفتگو کے موضوع کو مارشل آرٹس کی جانب موڑ دیا۔

ہمارے درمیان کھنڈا بھراس ٹاپک پر ڈسکس ہوتا رہا۔

گلچ ہم تینوں نے ایک ساتھ کیا۔ اس وقت تک شون اور ہک کی داہنی نہیں ہوئی تھی۔ گلچ کے بعد لیان نے کہا کہ وہ تھوڑا آرام کرے گی۔ رات اس کی نیند پوری نہیں ہو سکی تھی اور وہ خود کو خاصا محسوس کر رہی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر دھم دالے کمرے میں آ گیا۔

اب اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ ہاتھ پاؤں کی جڑوں کو تو اپنے وقت پر ہی ٹھیک ہونا تھا تاہم وہ تکلیف دہ کیفیت سے نکل آیا تھا۔ تنہائی میرا آتے ہی اس نے پوچھا لیا۔

"ہمارے ڈاکو میٹس کا مسئلہ تو ایک کیا تھا۔ پھر تم کس طرح نڈھری سے کھنڈا تک سفر کر گئے؟"

اس کے سوال کے جواب میں میں نے اسے تفصیل بتادی۔

وہ بولا "یار وہ جان! یہ مسٹر ہنگ تو تمہارے ساتھ بہت کچھ کر رہا ہے۔"

"کیا کر رہا ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ گڑبڑا گیا بولا "میرا مطلب ہے تمہارا بہت خیال رکھ رہا ہے۔"

"خیال کیسے نہیں رکھے گا۔ ایک طرح سے میں ان لوگوں کا دامان ہوں!"

"اوہ!" اس نے ایک گہری سانس لی اور میری بات کی د میں پہنچ گیا۔ پوچھنے لگا "کیا تمام بدھ مت اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں؟"

میں نے جمبیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "انسان کے اچھا یا برا ہونے کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اچھے برے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ کسی بھی مذہب کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ دنیا کے تمام مذاہب بنیادی طور پر اچھائی ہی کا درس دیتے ہیں اور برائی کی مذمت کرتے ہیں۔"

وہ حیرت سے آنکھیں مہاڑ مہاڑ کر مجھے نکلے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ اٹکے ہوئے لہجے میں بولا "وہ جان! تم آخر چیز کیا ہو؟"

"میں چیز ہوں اور نہ ہی مارچرین۔" میں نے زہر لب مسکراتے ہوئے کہا "مجھے تم کو چیز ہی سمجھو۔"

میں دانستہ ڈیم سے مذاق کے رنگ میں بات کر رہا تھا کہ اس کا دل بہلتا رہے۔ وہ ایک قابل بھر دسا اور سچا انسان تھا۔ ہمیں ایک ساتھ بہت کم وقت گزارنے کا موقع ملا تھا اور آئندہ میرے حالات کا اونٹ کس کر دت بیٹھنے والا تھا، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا!

"تم بھی انتہائی دنیا دار نظر آنے لگتے ہو اور کبھی دین دار بن جاتے ہو۔" وہ مجھے ٹوٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "پتا نہیں تم نے کیا کیا بڑھ اور کچھ رکھا ہے؟"

"میں نے زندگی کا سبق بڑھ رکھا ہے اور انسانوں کی نفسیات سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میں جو کچھ بھی کہتا ہوں وہ میرا تجربہ ہے۔"

"تم بڑے تجربہ کار ہو وہ جان! " وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں اسے مزید تجربے کی باتیں بتانے لگا۔

پانچ بجے کے قریب مسٹر ہنگ شون کے ساتھ داہیں



آگیا۔ وہ دونوں الگ الگ اس اپارٹمنٹ سے نکلے تھے مگر میں نے قسم تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔“  
یوں محسوس ہوتا تھا وہ پورا دن ایک ساتھ ہی رہے ہوں۔ ہنگ نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ کام ہو گیا تھا۔ ہمیں رات بوجے کی فلائٹ سے جو جری کو خبر باد کہنا تھا۔ وہ میرے اداریہ یان کے لیے ضروری شاپنگ بھی کر لایا تھا۔ وہ خاصا تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اسے تمام امور سے خستے کے لیے بڑی دودھ دھوپ کرنا پڑی ہوگی! ہنگ نے کہا: ”اب میں تمہارے چہرے پر کام کروں گا۔“ ہنگ نے کہا: ”مگر اسکتی زیادہ لمبا چوڑا کام نہیں مجھے اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

میں نے پوچھا: ”کھنڈروں میں مزید کوئی رابطہ ہوا؟“  
”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”چائنا ٹاؤن کا کیا حال ہے؟“

”میں ادھر نہیں جا سکا۔“ اس نے بتایا: ”ایک ہلکے ہاتھ سے میں نے اپنے ملازم سے بات کی تھی۔ اس نے بتایا ہے وہاں سب ٹھیک ہے۔“

”حیرت ہے۔“ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا: ”کیا ایف بی آئی والے اتنے ہی سست اور کام چور ہیں؟“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا: ”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا ہے۔ بہر حال حقیقت جلد ہی سامنے آ جائے گی کہ ٹرائی بیکا والے اپارٹمنٹ پر چڑھائی کرنے والوں کا تعلق ایف بی آئی سے تھا یا پھر وہ کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا: ”تم اس سلسلے میں اپنے ذہن کو یکسو نہ رکھو۔ میں ہوں نا! چائنا ٹاؤن ٹرائی بیکا حتیٰ کہ نیو جرسی میں بھی جو حالات پیش آئیں گے میں ان سے نمٹ لوں گا۔“

پھر میں نے اس سلسلے میں ہنگ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے محسوس کر لیا: ”وہ کسی مصلحت کی بنا پر مجھ سے کچھ چھپا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی گزبزداتی ہو چکی ہو جس کا ذکر کر کے وہ مجھے پریشان نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔“

ایک گھنٹے بعد ہنگ نے اپنا کام مکمل کر لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: ”میں نے انہیں میں کے فرق سے تمہیں خون بنادیا ہے۔ اب تم لی یان کے ساتھ اس کے شوہر کی حیثیت سے آسانی سنبھال سکتے ہو۔ چھوٹی موٹی مشکلات کو لی یان خود نیکل کر لے گی۔ تم خود بھی میک اپ میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہو۔ اگر ضرورت پڑی تو اپنے چہرے کی فینک کر سکتے ہو۔ تمہاری ضرورت اور حالات کو دیکھتے ہوئے

میں نے قسم تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔“  
اس کے بعد مجھے شون کے دستخط کرنے کی پریکٹس کرائی گئی۔ اس کے نام سے جاری تمام کریڈٹ کارڈز اب میرے استعمال میں آنے والے تھے۔ میں نے تھوڑی کوشش کر کے ان کے پن کوڈز کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اس کے علاوہ ان پاس ورڈز کو ایک ڈائری میں بھی نوٹ کر لیا۔ لی یان کے پاس بھی اس کے ذاتی کارڈز موجود تھے۔ کریڈٹ کارڈز نے زندگی کو خاصا آسان بنادیا ہے بشرطیکہ آپ ان کو انورڈ کر سکتے ہوں۔ جو ہنگ آپ کو یہ سہولت دیتا ہے وہ اپنے فائدے کو پہلے دیکھتا ہے۔ امریکا میں اور اب تو تقریباً پوری دنیا میں کریڈٹ کارڈز بڑی فراوانی سے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پچھلے ایک دو سال سے پاکستان میں بھی ان کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے۔

لی یان نے اس دوران میں پینک کر لی تھی۔ مجھے کسی قسم کے سامان کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم دونوں سیاحت کے لیے نیپال جا رہے تھے لہذا بعض تھانے ہمارا ضروری تھے۔ ہم دونوں نے ایک ایک سٹری بیگ اور نوٹو گرائی کی ضروری آلات رکھ لیے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں ذرا جلدی گھر سے لکنا تھا۔ نیو آرک ایئر پورٹ کے نزدیک ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کچھ کھاتے بیچے، پھر میں اور لی یان ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہو جاتے۔ شون کو دیکم کے پاس گھر ہی میں رہنا تھا۔ ہنگ ریسٹورنٹ تک ہمارا ساتھ دیتا اور وہیں سے ہمیں رخصت کر دیتا۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ہنگ نے مجھ سے کہا: ”میں ڈراکھنڈو میں جانوس سے رابطہ کر کے اسے تمہاری آمد کے بارے میں کنفرم کر دوں تاکہ وہ لوگ تمہیں ایئر پورٹ سے سیدھا حاشی اسپتال لے جائیں جہاں پر ڈاکٹر مونگ اور ساحل موجود ہیں۔“

”یہ کچھ عجیب سا نہیں ہو جائے گا مسٹر ہنگ!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا: ”ہم سیاحت کی غرض سے نیپال جا رہے ہیں۔ اصولی طور پر ہمیں ایئر پورٹ سے نکل کر کسی ہوٹل کا رخ کرنا چاہیے۔“

وہ جو شلے انداز میں بولا: ”میں نے اس کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ کھنڈروں کے اناپورنا ہوٹل میں تم دونوں کے نام سے ایک کمرہ ایل کر دیا ہے۔ اناپورنا خوبصورت لوکیشن کا ہوٹل ہے۔“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور تو صغی نظر سے ہنگ کو دیکھا۔

اناپورنا ہوٹل میرا دیکھا ہوا تھا۔ اناپورنا کے معنی بلندی کے ہیں۔ مذکورہ ہوٹل بھی خاصی بلندی پر واقع تھا۔ ویسے اناپورنا کے نام سے وہاں ایک پہاڑ بھی موجود ہے۔ ہم اپارٹمنٹ سے رخصت ہونے لگے تو شون نے سر ہلانے انداز میں مجھ سے کہا: ”لی یان خاص ٹھیکسی ہوئی عورت ہے اس کی کسی ایسی حرکت کا برا نہ منانا۔“  
”ڈونٹ ڈری اینڈ ٹیک ہارٹ“ میں نے اس کے شانے کو پیچھا: ”میں اسے ہینڈل کر لوں گا۔“ ایک لمحے کو رک میں نے اضافہ کیا: ”اور کوشش کروں گا“ جب یہ ہمارے پاس آئے تو ٹھیکسی ہوئی نہیں بلکہ سدرھی ہوئی ہو۔ تم بری بات سمجھ رہے ہو نا؟“  
وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

ہم اپارٹمنٹ سے روانہ ہوئے اور ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ یہ وقت رخصت دیکم بڑے جذباتی انداز میں مجھ سے گفتگو ہوا تھا۔ میں زبان سے کچھ بولنے کے بجائے لسل آہندہ انداز میں اس کی پیٹھ جھٹکا رہا۔ ہم بڑے جذباتی انداز میں جدا ہوئے تھے۔

مسٹر ہنگ بہت چپ چاپ اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بولا: ”شاید بدھا کی مرضی نہیں کہ ہم ایک ساتھ کسی خوشی کو اچھوائے کر سکیں، خیر۔“ وہ ذرا دیر کو حریف ہوا پھر برائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم ٹیک ایم مشن پر جا رہے ہو۔ بدھا تمہیں کامیابی دے۔ خوشیوں کے اور مواقع بھی آتے رہیں گے۔“

میں نے اپنے اندازے کے پیش نظر اس سے سوال کیا: ”کیا تم نے کوئی خاص پروگرام بنا رکھا تھا؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی: ”چند روز بعد بائسٹل شروع ہونے والا ہے۔ چائنا ٹاؤن میں بڑے جوش و خروش ہے۔ ”پٹی نیو ایر“ کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ ایک ٹین کا سا سال دیکھنے کو ملتا ہے۔“

”تم چینی نئے سال کی آمد کی بات کر رہے ہو نا!“  
”بالکل! میں نے اس مروجہ یہ تہوار تمہارے ساتھ ملنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔“

میں نے پوچھا: ”ویسے چینی سال کب سے شروع ہو رہا ہے؟“

”اس سال..... بارہ فروری سے چینی نئے سال کا آغاز ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

ہنگ ہی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ چینی نئے سال کے آغاز کے لیے ایک خاص فارمولا موجود ہے۔ ہر عیسوی

کیلنڈر میں انہیں جنوری کے بعد جو بھی پورا چاند آتا ہے۔ وہاں سے چینی کیلنڈر کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اس سال عید الفطر یعنی یکم شوال آتیس جنوری کو پڑ رہا تھا۔ امریکا میں اس وقت اٹھارہ جنوری کی رات ہوئی اس حساب سے پورا چاند یعنی چودہ شوال بارہ فروری کو پڑتا۔

میں نے مسٹر ہنگ کی اداسی دور کرنے کی خاطر کہا: ”زندگی رہی تو انشاء اللہ خوشی کا یہ موقع میں تمہارے ساتھ ضرور اچھوائے کروں گا۔“ تھوڑا رک کر میں نے اضافہ کیا: ”اور تم یہ کیوں سمجھتے ہو اس سال ہم پٹی نیو ایر ایک ساتھ نہیں مناسکیں گے! اس ایونٹ میں ابھی پورے چندہ دن باقی ہیں۔“

وہ خاموش رہا تاہم اس خاموشی میں بھی اس کے ہونٹوں پر ایک مسخیز سرکھٹاں لگی رہی۔ میں نہیں جانتا: وہ اس وقت اپنے ذہن میں کیا سوچ رہا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ مجھ سے پچھڑ کر بے حد طول تھا۔

ایئر پورٹ پہنچنے کا وقت ہوا تو ہنگ نے ہمیں ٹیک خواہشات کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ہم ایک کیمپ میں بیٹھ کر ایئر پورٹ پہنچے اور مختلف ”ایئر پورٹی“ مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر طیارے میں جا بیٹھے۔ مذکورہ مراحل میں کہیں بھی کوئی اڑجن پید نہ ہوئی گویا مجھے اصلی شون ”سلیپ“ کر لیا گیا تھا۔ اس ”سلیپ درخشا“ میں مجھے لی یان کا ایڈوائس حاصل تھا۔

طیارے میں سوار ہونے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک بے چین رہا اور کسی بھی ناخوش گوار واقعے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار رکھا۔ ایک مرتبہ کھنڈروں ایئر پورٹ پر میں ایک ناخوشگوار واقعے سے گزر چکا تھا۔ میں شو بھا اور دھنو (ساحل) کے ساتھ کھنڈروں سے دہلی جانے کے لیے ایک طیارے پر سوار ہوا تھا اور پرداز سے پہلے ہی ہمیں نیچے اتار لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم ٹینوں کو جس سلوک سے گزرا کر اگیا وہ آج تک میری یادداشت میں محفوظ تھا۔

میں اس وقت بھی کھنڈروں جا رہا تھا۔ شاید کھنڈروں کے حوالے سے وہ دھم میرے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا تاہم خیریت گزری اور اپنے مقررہ وقت پر طیارے نے زمین چھوڑ دی۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

کھنڈروں اور ہانگ ہانگ کے ایئر پورٹ کو لینڈنگ کے

پنجرہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر جالوس! کیا ہم سٹی اسپتال نہیں جا رہے؟“  
 ”نہیں مسٹر شون!“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”پھر کہاں جا رہے ہیں؟“

”فریک اسٹریٹ۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ دونوں کی رہائش کا بندوبست وہیں کیا گیا ہے۔“

میں نے قدرے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا: ”ہماری رہائش کوئی مسئلہ نہیں۔ انا پورنا ہوٹل میں ہمارے لیے کرایہ کیا ہے۔ تم ہمیں جلد از جلد ڈاکٹر مونگ تک پہنچا دو۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا: ”میں آپ لوگوں کو ڈاکٹر مونگ کے حکم پر ہی فریک اسٹریٹ لے جا رہا ہوں۔ وہاں میرا ایک شاندار بنگلا موجود ہے۔ ڈاکٹر مونگ نے کہا ہے جب آپ بنگلے پر پہنچیں گے تو وہ آپ سے بات کریں گے۔“

”بات کریں گے؟“ میں نے ابھین زدہ لہجے میں کہا: ”ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

”اب خاصے بہتر ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کیا ڈاکٹر مونگ سٹی اسپتال میں ہی ہیں؟“

مجھے اثبات میں جواب ملا۔

”اور ساحل..... میرا مطلب ہے دھن؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

اس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا پھر بولا: ”وہ بھی ڈاکٹر مونگ کے ساتھ سٹی اسپتال ہی میں ہے۔“

یہ سوچ کر کہ میں اپنی ساحل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

چاہتا تھا ابھی اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں مگر جالوس مجھے فریک اسٹریٹ کے کسی بنگلے میں پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھ سے میرا نہ ہوسکا اور میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

”مسٹر جالوس! میں ابھی اور اسی وقت سٹی اسپتال جانا چاہتا ہوں۔“

”تم مجھے کی کوشش کر دھن!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا: ”ڈاکٹر مونگ نے کسی مصلحت کی بنا پر ہی تمہیں میرے بنگلے پر ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔ وہ بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں یہاں ہم کتنے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں۔“

”میں یہاں کے حالات کی عین کوسب سے زیادہ جانتا ہوں۔“ نہ چاہے ہوئے بھی میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا۔ ”تم گاڑی کو سٹی اسپتال کی جانب مڑواتے ہو یا پھر کوئی ٹیکسی

حوالے سے دنیا کے مشکل ترین انزپورٹ میں شمار کیا جاتا ہے؟ کمینڈو خطرناک پہاڑیوں کی وجہ سے اور ہانگ کا ہانگ سمندر کے باعث... طیارہ پاگلٹ کے لیے ایک کڑا امتحان ثابت ہوتے ہیں۔ بہر حال ہمارے طیارے نے پیچ و دوڑ کا اپنی منزل کو چھو لیا۔ نیو جرسی سے کمینڈو تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو طیاروں میں سفر کرنا پڑا تھا۔ راستے میں ایک گھنٹے کا بریک جرنی تھا۔ کیونکہ ہمیں ڈائریکٹ فلائٹ نہیں مل سکی تھی۔ میں نہیں جانتا، یہ وقت کی مجبوری تھی یا پھر نیو جرسی سے کمینڈو تک کوئی ڈائریکٹ فلائٹ آئی نہیں تھی۔

انزپورٹ پر جالوس پچیس پچیس ہماری ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ پلے کارڈز کا سہارا لے کر وہ ہم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ میں شون اور لی یان کے ناموں والے پلے کارڈز دیکھ کر خود ہی ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مسٹر ہنگ نے جالوس کو ہمارے بارے میں بڑی وضاحت سے بتا رکھا تھا۔ کوڈورڈز کے تبادلے کے بعد ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کو تیار ہو گئے۔ جالوس کے ساتھ ایک باوردی شوفر بھی موجود تھا۔

جالوس لگ بھگ پچاس سال کا ایک سالو لا شخص تھا۔

دراز قامت اور مضبوط بدن اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے اور چند بڑی وضاحت سے چمکتی نظر آ رہی تھی۔ جالوس کے مزاج میں ایک اکڑ پن جھلکتا تھا۔ اس نے معنوی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے مصافحہ کیا اور ہم اس کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ اگلے ہی لمحے گاڑی پارکنگ سے نکل کر کمینڈو کی ایک کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

میں نے نیپال اور خصوصاً کمینڈو میں خاصا وقت گزارا تھا اور یہاں کی راہ رسم سے بخوبی آگاہ تھا۔ انسپٹر بریڈر انسپٹر اعظم خان نمایاں شوبھا اور دھن (ساحل) کے ساتھ میں یہاں کی سڑکوں پر بہت گھوما تھا۔ کمینڈو ہی میں ہیلگری سے میرا پہلا تعارف بھی ہوا تھا۔

ہیلگری کا خیال آتے ہی میں اس کے تصور میں کھو گیا۔ اس پر اسرار ہستی نے میری زندگی میں بڑا طبعی کردار ادا کیا تھا..... اور ابھی تک کر رہی تھی۔ اس نے کراچی میں کئی اے ایس ایم کے ایک بنگلے میں اپنے ناپیدہ طبعی چکر کے ذریعے مجھے زندگی کے جس تجربے سے گزارا تھا میں اسے ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم کسی اور سمت جا رہے ہیں۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جو سٹی اسپتال تک جاتا تھا۔ میں نے

پکڑوں؟“

”تم بہت جذباتی ہو رہے ہو مسٹر شوٹ!“

”ہاں انکی ہی بات ہے۔“

لی یان میری بیوی کی حیثیت سے کمینڈو پہنچی تھی لہذا بیویوں والا کردار ادا کرنے سے غافل نہیں تھی۔ وہ بار بار میرے بازو کو کھینچ کر اس طرح کلائی سے منہ کر رہی تھی۔ جانوس نے کہا ”جذباتی ہونے سے معاملہ بڑ جائے گا۔ ڈاکٹر موگ بڑی خوبصورتی سے حالات کو نیکل کر رہے ہیں۔ چند روز میں منٹ بعد ہم فیک اسٹریٹ والے ہنگامے پر پہنچ جائیں گے۔ پھر میں ڈاکٹر موگ سے تمہاری بات کروادوں گا۔ تم ان سے تصدیق کر لینا کہ میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ رہا ہوں، صرف ان کے احکام کی تعمیل کر رہا ہوں۔“

جانوس کی بات ختم ہوئی تھی کہ اس کے شوٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”سر ہمارا قاتل کیا جا رہا ہے۔ میں ایک سرخ جیب کو اپنے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر اتر پورٹ سے ہمارے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔“

جانوس کے ساتھ ہی میں نے بھی پلٹ کر سرخ جیب کی طرف دیکھا اور شوٹر کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ جانوس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”ڈائریکٹ فیک اسٹریٹ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ مختلف سڑکوں پر اس جیب کو اپنے پیچھے دوڑاؤ۔ ڈرہا تو چلے ان کا مقصد کیا ہے!“

”اوکے سر!“ شوٹر نے نہایت ہی فرمانبرداری سے کہا۔ جانوس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے گن برآمد کی۔ بڑی مہارت کے ساتھ اس کا کلپ چیک کیا اور مطمئن ہونے کے بعد گن کو چروٹی جیب میں ڈال لیا۔ نیچے یقین تھا اس کا شوٹر بھی غیر مسلح نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس کسی قسم کا کوئی اٹشیں اٹھیا رہا موجود نہیں تھا۔

”تم دیکھ رہے ہو مسٹر شوٹ!“ جانوس نے گاڑی کا عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا ”ہمارے دشمن یہ بات جانتے ہیں کہ ڈاکٹر موگ کا مجھ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ سرخ جیب کسی دشمن کا ہی سلسلہ ہے۔ اسے ڈانج دے کر ہینگے تک پہنچنا ہوگا ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔“

وہ مجھے اسی طرح سمجھا رہا تھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ جانوس سے ہمارا تعارف ڈاکٹر موگ کے دوستوں کی حیثیت سے کر لیا گیا تھا۔ ہماری اصلیت صرف اور صرف ڈاکٹر موگ کو معلوم تھی۔ نیوجرسی سے رخصت ہوتے وقت مسٹر ہنگ نے

مٹی اسپتال میں جو فون کیا تھا اس میں ڈاکٹر سے اس کی سی بات بھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا ”مسٹر جانوس! اس سرخ جیب کو ہم باغیہ کر گئی کی گومنا یا دیکھ کر خیر ہے۔“

وہ میری بات میں پوشیدہ اشارہ سمجھ گیا ”یولا“ پھر ”جائے؟“

”دودو تھ!“ میں نے غصے سے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے ہم گاڑی روک کر ان سے جائیں؟“

”گاڑی روکنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ان پھرنے کی!“

”پھر دودو تھ کچھ کیسے ہوں گے؟“

”وہ اگر چاہیں گے تو اللہ ضرور ہوں گے۔“

”پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ وہ آگاہت انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”سیدھی سی بات ہے اگر ہماری گاڑی اسپید کم ہو جائے تو انہیں ہمارے قریب آنے کا موقع مل جائے گا۔ اس طرح ان کی نیت کھل کر سامنے آجائے گی۔“ میں ایک لمبے لمبے سانس لینے کی خاطر ڈاکٹر ہنگ کی بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ لوگ صرف یہ جاننے کے لیے ہمارا تعارف کر رہے ہیں کہ ہماری منزل کا پتا لگائیں تو اسپید کم ہوتے وہ ہمیں یا تو اور ٹیک کر کے آگے نکل جائیں گے یا پھر اپنی جیب کی رفتار کم کر کے عقب میں کچھ فاصلے پر آجائے رہیں گے۔“

میں نے ایک بار پھر توقف کیا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ان کیسے اگر وہ خطرناک ارادوں سے ہمارے پیچھے آئے ہیں تو پھر ہماری رفتار کم ہوتی ہے وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔“ جانوس نے گھمبیر لہجے میں کہا ”مگر خطرناک بھی ہے۔“

”پھر تم انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہینگے پر لے جاؤ۔“ میرا نظریہ جانوس کو بہت برا لگا تاہم اس نے اپنی نگاہیں اٹھائیں۔ اپنے اندرونی احساسات کو چھپاتے ہوئے اس نے معتدل لہجے میں کہا ”سنگھا! سرخ جیب کو ڈانج نہ کر ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔“ اس کا فائدہ پادری ڈرائیور تھا۔

”سر! پیچھا چھڑانا اب اتنا آسان نہیں رہا۔“ سنگھانے جلدی سے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

دراصل جب میرے اور جانوس کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی تو سنگھانے غیر ارادی طور پر گاڑی کی رفتار کم کر دی تھی اور اس دوران میں قاتل میں آنے والوں کو موقع مل گیا تھا۔ ان کی راہ اس حوالے سے بھی ہموار تھی کہ اس وقت ہم ایک غیر مصروف سڑک پر سے گزر رہے تھے لہذا احتیاطی تدابیر زیادہ آسانی فراہم ہو گئی تھیں۔

کہا جاتا ہے انسان کا پہلا تاثر ہی اس کا آخری تاثر ہوتا ہے! اس تجربے کے تحت میں نے اور جانوس نے ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا تھا۔ ہماری سوچ اور اپروچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ڈاکٹر موگ کا میزبان تھا اور میں ڈاکٹر کا مہمان لہذا ہم ایک دوسرے کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ سرخ جیب والے ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ اب تپ میں نہیں گھرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس جیب میں غالباً چار افراد سوار تھے۔ میں نے جانوس کے چنگی کی اشاریہ جی کی کہا۔

”کیوں نہ رک کر ان سے بات کر لی جائے۔ پتا نہیں وہ کس ضرورت سے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں!“

اس نے گھور کر مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے سنگھانے سے کہا ”ڈرائیور اسپید کم کو تھوڑا اور بڑھاؤ۔ پھر اچانک بریک لگا دو!“

سنگھانے سوالیہ نظروں سے اپنے پاس کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ جانوس اسے کسی قسم کی ہدایت دیتا، فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ سرخ جیب میں سے ہماری گاڑی کے عقبی پٹیوں پر برست مارا گیا تھا۔

میں نے میکائی انداز میں لی یان کو اپنے بازو کی پیٹ میں لیا اور کھینچ کر نیچے جھکا لیا۔ احتیاطی دوسرا برست ہماری زندگیوں کے چراغوں کو گل کرنے کے لیے بھی فائر کر سکتے تھے۔

فائرنگ سے ہماری گاڑی کے تازہ محفوظ رہے تاہم ڈرائیور کی بولکھاٹ نے اسے لہرا کر سڑک سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ظاہر ہے گاڑی کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ اسی اثنا میں سرخ جیب ہماری گاڑی کے متوازی آگئی۔

وہ بہت ہی نازک اور مہلک لمحات تھے۔ موت کے ہر کارے سرخ جیب میں سوار ہو کر ہمارے سر پر آن پہنچے

تھے۔ جانوس نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا ”سنگھا! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔“

میں نے سیٹ پر جھکے جھکے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور جانوس کے کوٹ کی جیب کے اندر پہنچا دیا۔ اگلے ہی لمحے میرے اس ہاتھ میں جانوس کی گن آچلی تھی۔ جانوس میری اس حرکت کو محسوس نہ کر سکا۔ وہ اس قدر بولکھایا ہوا تھا کہ اسے ڈرائیور پر پہنچنے کے سوا کسی اور بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔

اس دوران میں سنگھانے گاڑی واپس سڑک پر پہنچا کر اس کی رفتار بڑھا دی۔ سرخ جیب والوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں ہماری گاڑی کی باڈی میں سوراخ بنا رہی تھیں۔ ایک جانب کے تازہ براہ راست فائرنگ کی زد میں تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ احتیاطی کی فائرنگ نے گاڑی کے ایک سائیڈ کے ٹائرؤں کو بے کار کر دیا۔ گاڑی ایک مرتبہ پھر بڑے خوفناک انداز میں لہرائی۔ میں نے دیکھا جانوس اس وقت بہت غصے میں تھا کیونکہ وہ اپنی گن سے دشمن جیب پر فائرنگ کرنا چاہتا تھا اور گن تھی کہ وہ اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔

ڈرائیور کے لیے گاڑی کو آگے بڑھانا ممکن نہ رہا تو وہ اسے روکنے پر مجبور ہو گیا۔ ہماری گاڑی سڑک کے کنارے رکی ہی تھی کہ سرخ جیب بھی ہماری گاڑی کے سامنے آگئی۔ پھر اس کے دروازے دھڑا دھڑھ کھلنے لگے۔ میں نے دو گن بردار افراد کو جیب میں سے نکل کر اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ آٹومیک گنوں کو بڑے خوفناک انداز میں تھامے ہوئے تھے۔

کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ اگر جانوس نے بروقت میرا مشورہ مان لیا ہوتا تو ہم ایسی صورت حال سے دوچار نہ ہوتے۔ بہر حال اب تو اس صورت حال کا سامنا کرنا تھا۔

ایک گن بردار نے سنگھا اور جانوس کو نشانے پر رکھ لیا دوسرے نے ہماری جانب اشارہ کر کے ہونے درشت لہجے میں کہا۔

”تم دونوں باہر آ جاؤ۔“ ایک بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ وہ ہم دونوں کے گلاکے تھے اور دوسری بات یہ کہ وہ ہمیں جان سے نہیں مارنا چاہتے تھے ورنہ وہ اب تک اپنی گنز کو اشارہ کر کے ہمیں موت کی نیند سلا چکے ہوتے۔ ان لمحات میں ہم پوری طرح ان کے رحم و کرم پر تھے۔

میں نے گمن کو سائینڈ پاکٹ میں ڈالنا چاہا تو اس نے پھکار سے مشابہ آواز میں کہا ”اے اچیلے اے باہر پھینکو۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے آگے بڑھ کر خوفناک گمن کی نال میرے سینے کی جانب اٹھا دی۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور جانوس والی گمن گاڑی سے باہر پھینک دی۔ ٹھوڑی دیر پہلے جانوس اسی گمن کو اپنی جیب میں تلاش کر رہا تھا۔ اپنی گمن میرے پاس سے برآمد ہوتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تاہم ان لحاظ میں اس کی حیرت کو نوٹس کرنے کا وقت نہیں تھا۔

گمن بردار نے ایک مرتبہ چہرہ نہیں حکم دیا ”اب تم دونوں باہر آ جاؤ۔ جلدی!“

میں نے سرگوشیانہ انداز میں لی یان سے کہا ”میں دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلوں تم دونوں سیٹوں کے درمیان واقع خلا میں خود کو گرالینا۔“

پھر میں نے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا اور ایک جھپکے سے اسے کھول کر باہر آ گیا۔ باہر نکلنے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ”پینڈز اب“ ہونے والے انداز میں اوپر اٹھا دیا۔ دراصل یہ ایک جھانسا تھا۔ وہ شخص میرے جھانسنے میں آ گیا۔

گمن بردار بھی سمجھا کہ میں شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”پینڈز اب“ ہو رہا ہوں مگر یہ سمجھنا اس کی زندگی کی سب سے خطرناک بھول تھی۔ میں نے ہوا میں ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ہی بجلی کی سی سرعت سے اپنی لات کو بھی حرکت دی۔

اگلے ہی لمحے میری رائٹ فرنٹ پٹلی لگ گمن بردار کے پیٹ میں لگی۔ وہ میری طرف سے ایسے کسی جارحانہ عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ میری ”شرافت“ کے مظاہرے کو دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا اور یہ لگائی اطمینان اسے بہت مہنگا پڑا۔

وہ پیٹ میں میری لات کھا کر پیچھے کو گیا اور اپنے دوسرے گمن بردار سامنے سے جا کھرا یا۔ بوکھلاہٹ میں اس کی گمن گرج اٹھی۔ میں نے لی یان کو جو ہدایت کی تھی وہ کام آگئی۔ جانوس بھی جان بجانے کے لیے ڈیش بورڈ کے نیچے تقریباً ٹھس گیا تھا۔ بے چارہ سٹکھا فائرنگ کی ریخ میں آ گیا۔ اس کا وجود چھلنی ہو کر رہ گیا۔

گمن بوکھلاہٹ میں چلی تھی لہذا گمن بردار کو سنبھل کر دوبارہ فائرنگ کرنے کے لیے لگائی مہلت درکار تھی مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔ میری لیفٹ رائٹ ہاؤس کلک ایک

جھپکے سے چلی اور اس کے گمن بردار ہاتھ پر بڑی۔ وہ اب پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے ایک جی سائینڈ لگ مار کر اسے دور پھینک دیا۔

اس دوران میں پہلا گمن بردار اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گمن کو میری جانب سرور کر چکا تھا۔ میں فضا میں اچھلا اور ڈبل فلائنگ اس سے چہرے پر بڑی۔ وہ پیچھے کواٹ گیا۔

پھر میں نے اسے پھینکے کا موقع نہ دیا اور ہاتھ پاؤں کی پے در پے ٹھوکروں سے اسے دھوکہ دے دیا۔ گمن اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا کر گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر گمن اٹھالی اور بڑے خطرناک انداز میں سرخ جیب کی طرف بڑھا۔

اس دوران میں جیب کی طرف سے کوئی تیار عمل سامنے نہیں آیا تھا اور اس بات پر مجھے حیرت بھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق جیب میں کم از کم دو افراد موجود تھے مگر جب جیب کے قریب پہنچا تو اسے خالی پایا۔ پتا نہیں وہ لوگ کس وقت وہاں سے نکل کر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔

میں نے پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور لی یان کو سرگرم پایا۔ وہ میرے چھوڑے ہوئے شکاروں پر ”ہاتھ صاف“ کر رہی تھی۔ جانوس ابھی تک گاڑی کے اندر ہی دیکا ہوا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں دوبارہ جیب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اسی لمحے مجھے کمر پر کسی گمن کی اپنی نال کا ٹپو کا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھکانا انداز میں کہا ”چلو جیب کے اندر نچو۔۔۔۔۔ اور اس سے پہلے گمن کو پھینک دو۔“

میں حکم دینے والے کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ غالباً وہ جیب سواروں ہی کا ساتھی تھا جو نظر بچا کر باہر شکاری دکھا کر میدان کارزار گرم ہوتے ہی جیب سے نکل کر اس کے پیچھے نہیں چھپ گیا تھا اور اب موقع پاتے ہی اپنی ”پناہ گاہ“ سے نکل آیا تھا۔

میں نے ”دھنکی گمن بردار“ کے حکم پر گمن پھینکنے کے بعد دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور بڑی شرافت کے ساتھ جیب کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان پندرہ فیٹ فٹ کا فاصلہ حائل تھا اور وہ اس زاویے سے کھڑی تھیں کہ میرے ساتھ ہونے والی کارروائی کو لی یان دیکھ نہیں سکتی تھی۔

میں گمن بردار کے آگے چلتے ہوئے جیب کے دروازے کے پاس پہنچا۔ مذکورہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ غالباً وہ شخص اسی دروازے سے نکل کر جیب کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”چلو اندر!“ مجھے اپنے عقب میں اس کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے جھک کر جیب کے اندر ایک قدم رکھا اور اس طرح ہڑبڑا کر پیچھے پلٹا جیسے اندر کوئی خوفناک شے موجود ہو۔ میری یہ ہڑبڑاہٹ ایک سوچی سمجھی فوری اسکیم کے تحت تھی۔ میں نے اسی ہڑبڑاہٹ کے دوران میں بڑی صفائی سے ایک بریکر لگ چلا دی۔

میرا پاؤں اس کی گمن پر لگا اور وہ گمن سمیت پیچھے کو اٹ گیا۔ بریکر لگ مارتے ہی میں فضا میں اچھلا اور بیک سر سالٹ لگاتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا۔

میری یہ حکمت عملی مفید ثابت ہوئی کیونکہ گمن بردار نے زمین پر گر کر ہی میری سمت فائرنگ کی تھی۔ اگر میں جیب کے دروازے کے پاس موجود رہتا تو یقیناً فائرنگ کی زد میں آ جاتا۔ مجھے وہاں نہ پا کر وہ حیران ہوا اور زمین پر پڑے پڑے اس نے گردن گھما کر میری سمت دیکھا۔

اسی وقت میں نے اس کے چہرے پر ایک فٹ بال لگ ماری۔ میرا دھواں دھار ٹھنڈا کھا کر وہ بلبلاتا اٹھا۔ میں نے ہوا میں جپ لگائی اور دونوں پاؤں سے اس کے سینے پر آ رہا۔ یہ ایک طرح سے ڈبل پش لگ تھی۔ اس کے وجود نے ایک جھٹکا کھایا اور پھر ساکت ہو گیا۔

میرے پاس یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہوا تھا یا پھر یہ دنیا اور مافیہا ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ گئے تھے۔۔۔۔۔!

اس ”کام“ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جیب کا جائزہ لیا اور اسے انسانی وجود سے خالی پایا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ صرف تین افراد تھے۔ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

وہاں لی یان نے میدان مار لیا تھا۔ جانوس بھی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا لیکن وہ وہ حملہ آور مجھے کہیں دکھائی نہ دیے جنہیں میں لی یان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جیب کی طرف بڑھا تھا۔ میں نے سوائیل نظر سے لی یان کو دیکھا تو اس نے میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

”بھاگ گئے دونوں۔“

”اوہ!“ میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ جانوس نے کہا ”وہ کہیں بھی بھاگ جائیں میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ ہم پر قحطانہ حملہ ہوا ہے۔ میرے ڈرائیور کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میں اس معاملے کی چھان بین کرواؤں گا۔“

وہ اس معاملے کی چھان بین کرتا یا پھر اس واقعے پر بیٹھا بین بجا رہتا تھا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے دو ٹوک انداز میں اس سے کہا۔

”مسٹر جانوس! تم اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کارروائی کرو۔ ہم تو جا رہے ہیں۔“

”تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”کہیں بھی چلے جائیں گے۔“ میں نے مبہم انداز میں کہا اور لی یان کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ جانوس کی طرف متوجہ ہو گیا ”یہاں کے حالات کو میں نے کنٹرول کر لیا ہے۔ جیب کے اس طرف ایک حملہ آور بے ہوش پڑا ہے۔ دو حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان لوگوں کی جیب اور چھوڑی ہوئی آٹو ٹینک میں بھی یہاں موجود ہیں۔ تم ان لوگوں کے خلاف جو بھی کارروائی کرنا چاہتے ہو اس کے لیے آزاد ہو۔ ہم جا رہے ہیں اگر اللہ نے چاہا تو دوبارہ بھی ملاقات ہو سکتی ہے!“

میں نے ذرا توقف کیا۔ جانوس غصے اور شرمندگی کے طے چلے تاثرات کے ساتھ تک تک مجھے دیکھتا گیا۔ میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا ”اس ایک بات ذہن میں رکھنا کہ آج ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ تم اس معاملے کو ہمارا ذکر کے بغیر پینڈل کرنے کی کوشش کرنا اور۔۔۔۔۔ اگر بہت دل چاہے تو ڈاکٹر سوئگ سے میری شکایت بھی کر دینا۔“

اس دوران میں لی یان میری خاموش ہدایت پر گاڑی کے اندر سے بیک اٹھلائی تھی۔ میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ جانوس نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ اس سلسلے میں وہ کیا کوشش کرے۔

ٹھوڑی دیر بعد ہم ایک ٹینگی میں بیٹھ کر ہولٹ اپنا پوتا کی طرف جا رہے تھے۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد لی یان نے کہا ”وجدان! یہاں تو پہلا قدم ہی الٹا پڑ گیا۔“

”لیکن ہم نے کوئی نقصان اٹھائے بغیر اگلے قدم کو سیدھا کر لیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”اور میں وجدان نہیں شون ہوں!“

”اوہ! آئی ایم ویری سوری۔“ وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی ”مگر تنہائی میں تو میں تمہیں وجدان کہہ کر پکار سکتی ہوں نا۔ یہاں ہولٹ کے کمرے میں ہمیں کون دیکھ سنا رہا ہے!“

# ٹیلیکامنیٹیکس اور مستقبل بینک

ایٹانیا ۱۴ دو سروس کے ڈھنوں تک پہنچانے اور ان کے دل کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ

قیمت: 40/- روپے ڈاک خرچ: 23/- روپے

مستقبل بینک	ٹیلیکامنیٹیکس
انسان	مخفیہ جی کی مشین
غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک	تحت اشعور
فارس مارہ	اور اس کی موت
قوتوں کا سرچشمہ	جالت کی کارفرمایاں
مستقبل بینی	لامحسوس افکار
اصل حقیقت	تجربوں کی روشنی
مخفیہ زندگی و واقعات	اشغال افکار
طاقت و احساسات	اور اس کی مشینیں
مستقبل بینی کے	مستقبل اشغال افکار
مستقبل بینی کے معجزات	
ایکے اور دوسرے پہلو	

کتابیات پبلیکیشنز  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313  
5802551  
kitabiat1970@yahoo.com  
رابطہ کیلئے: C-63 II بکینش ڈی ایچ ای ٹی ٹی روڈ گڑھی

ہوتا ہے۔ سکورٹی انچارج نے کہا: ”آپ ہر قسم کی ضروری باتیں اس شخص کی موجودگی میں کر سکتے ہیں۔“  
میں متذبذب نظر سے بھی انپکٹر اور سبھی انچارج کو دیکھنے لگا۔  
انچارج نے کہا: ”تم سمجھ لو میں اس وقت تنہا ہی ہوں۔“  
میں نے پولیس انپکٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”مگر یہ انپکٹر شیوا ہے تو مجھے اس کی موجودگی میں بات کرنے میں کوئی باک نہیں۔“  
”رائٹ یو آر!“ انچارج کے بجائے انپکٹر نے تیز آواز میں کہا: ”میں انپکٹر شیوا ہی ہوں اور..... اگر میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو تم دونوں نیوجرسی امریکا سے آئے ہو لیکن.....“  
اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور ابھرن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔  
میں نے کہا: ”تم کوئی غلطی نہیں کر رہے انپکٹر شیوا!“  
پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: ”لیکن کے بعد تم رک کیوں گئے۔“  
”پہلے تو لو پھر بتاتا ہوں۔“ اس نے بڑی گرجوٹی سے باری باری ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔ ہم سے ملنے پر خوشی کا اظہار کیا پھر بولا: ”میرا خیال ہے تم دونوں کو اس وقت فریک اسٹریٹ والے جنگے پر ہونا چاہیے تھا۔ مسٹر جانوس کے پاس!“  
”تمہارا خیال درست ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا: ”لیکن اتر پورٹ سے فریک اسٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے ایک اپ سیٹ ہو گیا اور ہم یہاں پہنچ گئے۔“  
”کیسا اپ سیٹ؟“ وہ ایک دم چونکا ہوا گیا۔  
میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسپتال کے سکورٹی انچارج کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں پوشیدہ مقصد تک پہنچ گیا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔  
”شیوا! اس ذرا ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔ کافی دیر سے کرسی میں ٹھنسا بیٹھا ہوں۔ ڈاکٹر نے کھانے پینے میں احتیاط کے ساتھ چلنے پھرنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ یہ مٹا پا تو لگتا ہے میری جان ہی لے لے لگا۔“  
پھر وہ انپکٹر کا جواب سنے بغیر کمرے سے نکل گیا۔  
سکورٹی انچارج ایک نہایت ہی موٹا تازہ شخص تھا۔

گھٹا اتار دیا تھا۔ مایامتی جس اسپتال میں نرس تھی اتر کا نام ”ٹیکو“ تھا۔  
اسپتال کے ریسپشن پر پہنچ کر میں نے ڈاکٹر موگ کے بارے میں استفسار کیا تو ریسپشنسٹ سے بحث مناسبت نہ بھی اور اسپتال کے سکورٹی انچارج کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔  
جنگ نے مجھے بتایا تھا: ”ڈاکٹر موگ اور ساحل کی حفاظت کی خاطر وہاں سادہ لباس میں پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جن کی کمان انپکٹر شیوا کے ہاتھ میں تھی۔ یہ خفیہ نگرانی اسپتال کی سکورٹی سے خفیہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اسی مقصد کی خاطر سکورٹی انچارج سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر انپکٹر شیوا سے میری ملاقات ہو جاتی تو ڈاکٹر موگ اور ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوتی۔“  
اسپتال کا سکورٹی انچارج اپنے کمرے میں موجود تھا اور اس کے ساتھ ایک اور باوردی شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وردی ظاہر کرتی تھی اس کا تعلق نیپال پولیس سے ہے۔ اس کے شولڈر بیجز اسے پولیس انپکٹر ظاہر کر رہے تھے۔ اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ ہونہو یہ انپکٹر شیوا ہے!

سکورٹی انچارج وزن اور جتنے کے اعتبار سے مسٹر نیوجرس نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی متورم آنکھیں ہم پر مرکوز کیں اور سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ میں نے کہا: ”انچارج! میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر تنہا ہی میں!“  
بات ختم کرتے ہی میں نے پولیس انپکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ گہری اور سنجیدہ نظر سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔  
سکورٹی انچارج نے مجھ سے پوچھا: ”تمہاری ضروری باتوں کی نوعیت کیا ہے مسٹر.....؟“  
”شون!“ اس کے ادھورے چہلے کے جواب میں میں نے فوراً کہا پھر اپنی ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اس کا نام لی یان ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں اور.....“ میں نے سانس لینے کا توقف کیا پھر انچارج کے سوال کا جواب دے دیا: ”باتوں کی نوعیت بہت خاص ہے اور تعلق اسی اسپتال سے ہے۔“

سکورٹی انچارج سے بات کرتے ہوئے میں پولیس انپکٹر کے چہرے کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ادراک میں ان کے تعارف پر وہ ایک خاص انداز میں چونکا تھا۔ ایک مرتبہ پھر میرے ذہن نے اشارہ دیا: وہ انپکٹر شیوا

”ہر کمرے کی دیوار پر بھی ہوتی ہیں۔“ میں نے لہجے کی سنجیدگی پر تکرار رکھتے ہوئے کہا: ”اور تم نے یہ تو سن ہی رکھا ہوگا..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں؟“  
”ٹھیک ہے میں آئندہ احتیاط برتوں گی۔“ وہ مصلحت آمیز انداز میں بولی پھر بوجھا: ”اب کیا پروگرام ہے؟“  
میں نے کہا: ”پلیٹ فریش اپ ہو جائیں۔ پروگرام بعد میں بھی بنایا جاسکتا ہے۔“  
پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ پہلے لی یان ہاتھ لے گی اس کے بعد میں۔ وہ اس پروگرام کے مطابق واش روم میں داخل ہوئی تو میں اس والے روم پر غور کرنے لگا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈی کی ایک سڑک پر پینس آیا تھا۔ پتا نہیں وہ سرخ چپ والے کون تھے اور کس مقصد سے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کے رویے سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ ہماری طلب میں تھے۔ وہ ہمیں گاڑی سے اتار کر اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے تھے؟ کہاں؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا کافی الجھان کوئی جواب میرے ذہن میں موجود نہیں تھا بالکل اس سوال کی طرح کہ وہ لوگ کون تھے؟ ڈاکٹر موگ ہی اس ابھرن کو سلجھن میں بدل سکتا تھا۔

میرے چہرے پر ہنگ نے ہلکا جھلکا ”کام“ کر رکھا تھا لہذا ہاتھ لیتے وقت مجھے بہت محتاط رہنا پڑا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم تیار ہو کر ہوٹل سے نکل آئے۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے نئی اسپتال چلنے کی بات کی اور ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی نے چند سڑکوں کی سیر کرانے کے بعد ہمیں مذکورہ اسپتال پہنچا دیا۔

میرے ذہن میں ساحل کے حوالے سے بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ایک طویل انتظار کے بعد اس سے ملنے کی سبیل بنی تھی۔ میں جھک لگا کر اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر صبح اتر پورٹ پر جانوس ہمیں لینے نہ آ جاتا اور وہ فریک اسٹریٹ جانے کے لیے ڈاکٹر موگ کی ہدایت کا ذکر نہ کرتا تو میں اتر پورٹ سے سیدھا اسپتال ہی پہنچتا۔ بہر حال دیر آید درست آید کہ مصداق میں نے دل کو تسلی دے لی۔

اسی شہر کے ایک اسپتال میں مایامتی نرس ہوا کرتی تھی۔ مایامتی بدھ کی پیروکار تھی۔ میں نے ٹھنڈی دھن میں مایا کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا اور مجھے اس کے اسپتال میں ”داخل“ ہونے کا بھی موقع ملا تھا۔ مایا بہت اچھی لڑکی تھی لیکن انفسوس کہ اب وہ اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ میرے ماضی کے دشمنوں نے اسے بڑی بیدردی سے موت کے

اس پر نگاہ پڑتے ہی ذہن میں ہاتھی گینڈے اور دریائی گھوڑے کا تصور ابھرتا تھا۔ سیوری ایک انتہائی حساس اور نازک شعبہ ہے اور اس شعبے سے متعلق لوگوں کو اسرار اور چال چو بند ہونا چاہیے۔ اور عموماً ایسا ہوتا بھی ہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں اس انچارج جیسے ست الوجود دکھائی دے جاتے ہیں۔

تسلیم کہ اسے ڈاکٹر نے مٹایا دور کرنے کے لیے چلی قدی کا مشورہ دے رکھا ہوگا لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس وقت وہ ہمیں تنہائی میں بات چیت کا موقع فراہم کرنے کے لیے کمرے سے نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد انکسپٹر میری جانب متوجہ ہو گیا اور توشیٹن ناک لہجے میں بولا۔

”مسنر شون! تم کسی اپ سیٹ کے بارے میں پتہ چاہتے ہو؟“

مجھے اندازہ ہوا ڈاکٹر مونگ نے اسے ہمارے بارے میں کافی کچھ بتا رکھا تھا تاہم وہ یہ نہیں جانتا تھا شون کے ہمیں میں وجدان یعنی میں چھپا ہوا ہوں اور یہ میرے حق میں اچھا ہی تھا۔ نیو جرسی سے رخصت ہوتے وقت ہنگ نے ہٹلرز و میں جو ٹیلی فونک رابطہ کیا تھا اس میں میری کسی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ہنگ ہی نے مجھے بتایا تھا اس کی ڈاکٹر مونگ سے مختصر بات ہوئی تھی۔ ہنگ نے ڈاکٹر کو ہمارے بارے میں بتا دیا تھا اور ڈاکٹر مونگ نے اپنے طور پر انکسپٹر شیوا کو کے بریفنگ دی ہوگی۔

میں نے نہایت ہی جامع الفاظ میں شیوا کو اس واقعے کے بارے میں بتایا جو اتر پورٹ سے فریک اسٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے اخطاری انداز میں کہا۔

”اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا ڈاکٹر مونگ کو اس کی اطلاع ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے کندھے اچکائے ”میں تو ہوٹل سے سیدھا یہاں پہنچا ہوں۔ تم ڈاکٹر کو میری آمد کی اطلاع دو۔ میں خود اسے بتا دوں گا۔“

وہ میری سنی ان کی کرتے ہوئے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔ میں حیرت زدہ اور اچھن سے اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا پھر ریسیور کان سے لگا کر الارٹ ہو گیا۔ فوری طور پر میں بھی اندازہ قائم کر سکا کہ وہ ڈاکٹر مونگ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی یہ کوشش میری سوچ کو اندیشوں کے سپرد کر رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر مونگ اور ساحل کو

اس وقت سٹی اسپتال میں ہونا چاہیے تھا جہاں ہم موجود تھے۔ ڈاکٹر تک کسی اطلاع کو پہنچانے کے لیے فون کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شیوا نے جتنی لمبی چوڑی ڈانٹنگ کی تھی اس نے انٹرکام کے امکان کو رد کر دیا۔ وہ جتنی طور پر کھنڈ ویا نیپال کے کسی دوسرے شہر میں رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال ابھرا۔

کیا ڈاکٹر مونگ اس وقت اسپتال میں موجود نہیں؟ اس سوال نے مجھے انکسپٹر سے استفسار کرنے پر مجبور کر دیا ”شیوا! تم کو فون کر رہے ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ میرے استفسار کا جواب دیتا دوسری طرف فون امیٹڈ کر لیا گیا۔ شیوا باادب بلاخط ہو کر بات کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے سنے ہوئے واقعے کی رپورٹ پیش کی پھر ہمارے اسپتال پہنچنے کا ذکر کیا اور دس بیس مرتبہ ”لیس سر لوسر“ کہنے کے بعد ریسیور ہٹل کر دیا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کمی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ اس وقت ڈاکٹر مونگ سے بات کر رہا تھا۔

”شون! ڈاکٹر مونگ کو اس افسوس ناک واقعے کی خبر جانوس کے ذریعے مل چکی ہے۔“ شیوا نے غم سے بھرے لہجے میں بتایا۔

میرا ذہن مزید الجھ گیا۔ جانوس نے مجھے بتایا تھا جب وہ ہمیں فریک اسٹریٹ والے ہنگ پر پہنچا دے گا تو ڈاکٹر مونگ ہم سے بات کرے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر مونگ اور ساحل اسپتال میں ہیں تاہم یہ معلومات فراہم کرتے ہوئے اس کا انداز متاثر نہ تھا۔ اس وقت بھی میرا ہاتھ ٹھکا تھا اور اب تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ڈاکٹر مونگ اور ساحل اس اسپتال میں موجود نہیں ہیں۔

میں تیسری آنکھ کے ذریعے ڈاکٹر کے ماحول میں داخل ہو کر یہ معلوم کر سکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اگر وہ اسپتال کے کمرے میں ہوتا تو مجھے پتا چل جاتا۔ میں دو تین مرتبہ اس کمرے میں اسے دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت میں دھیان گیان کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے براہ راست شیوا ہی سے پوچھ لیا۔

”انکسپٹر! میں محسوس کر رہا ہوں ڈاکٹر مونگ اسپتال میں موجود نہیں؟“

”تم بالکل ٹھیک محسوس کر رہے ہو۔“ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا ”ہم اس وقت ڈاکٹر مونگ کے پاس چل رہے ہیں۔ اس نے آپ دونوں کو فوراً بلا لیا ہے۔ میں آپ کو اپنی سرکاری جیب میں ڈاکٹر تک پہنچاؤں گا۔“

اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تو میں پوچھنے باندھ رہا ”ڈاکٹر اس وقت کہاں ہے؟“

”رتنا پارک کے نزدیک وہ ایک ہنگلے میں غمخوار ہوا ہے!“ اس نے سپاٹ آواز میں بتایا۔

”رتنا پارک!“ بے ساختہ میری زبان سے ادا ہوا۔ میری آواز اتنی اونچی تھی کہ انکسپٹر چونک کر مجھے دیکھنے لگا ”کیوں کیا ہوا؟“

میں نے فوراً خود پر کنٹرول کر لیا اور کہا ”کچھ نہیں“ پھر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”چلو ہم ڈاکٹر مونگ کے پاس جا رہے ہیں!“

لی بان بھی میری تھلید میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شیوا کے ساتھ ساتھ وہ بھی میری بلند آواز سن کر چونکی تھی اس نے شیوا کے برعکس سوال نہیں کیا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے اسپتال سے باہر آئے اور پھر انکسپٹر شیوا کی جیب میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اگر ڈاکٹر مونگ اسپتال میں نہیں تھا تو اس کا بھی مطلب تھا ساحل بھی وہاں نہیں ہوگی۔ ساحل کی اہمیت میرے اور ڈاکٹر سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تصدیق کی خاطر انکسپٹر سے پوچھ لیا۔

”ڈاکٹر مونگ کب یہاں سے گیا ہے؟“

”مگر شیشہ رات!“ اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت جیب میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے سوال کیا ”کیا ساحل بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہے؟“

”ساحل!“ وہ تھوڑی دیر کے لیے متذبذب نظر آیا پھر پوچھنے لگا ”کہیں تم اس جتنی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہے جو ڈاکٹر کے ساتھ اسپتال پہنچی تھی؟“

”بالکل! میں اسی کی بات پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے ہڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا ”اس کا پیدائشی نام دھنو ہے۔ میرے لیے وہ ساحل ہے جس کی تلاش میں میں دردر کی خاک چھان رہا ہوں۔“

میرے اندازے نے شیوا کو بتا دیا کہ میں اپنے دل میں ساحل کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد غم سے بھرے لہجے میں بولا۔

”ہاں وہ لڑکی بھی ڈاکٹر مونگ کے ساتھ ہی رتنا پارک والے ہنگلے پہنچی ہے۔“

”پھر اسپتال میں خفیہ نگرائی اور حفاظت کا سلسلہ کیوں

جاری ہے؟“

”ڈاکٹر مونگ کے دشمن ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ قطعی سے ابھی تک اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر اور اس جتنی لڑکی کو نہایت ہی محسوس انداز میں اسپتال سے رتنا پارک والے ہنگلے میں منتقل کیا گیا ہے۔“

پھر وہ مجھے اس منتقلی کی تفصیل بتانے لگا۔ اس کے مطابق ڈاکٹر مونگ اور ساحل (جتنی لڑکی) کو مردوں کے جھس میں اسپتال کی ایبولینس میں وہاں سے نکالا گیا تھا اور مختلف سڑکوں پر ایبولینس دوڑانے اور اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد کہ ان کا تعاقب نہیں کیا گیا انہیں رتنا پارک والے ہنگلے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ تفصیل سننے کے بعد مجھے اطمینان بھی ہوا کیونکہ کیسے بھی میری حال میری ساحل ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئی تھی۔

میں نے ٹرائی بکا والے ابارٹمنٹ میں رہتے ہوئے تصور کی نگاہ سے ڈاکٹر مونگ کی ”بھاگ دو“ کا جو خچیاں منظر دیکھا تھا اس نے میری روح تک کو لرزہ کر دیا تھا۔ پھر اسپتال میں بھی میں نے ڈاکٹر کو توشیٹن ناک حالت میں دیکھا اور اب اس کی بجفاغت منتقلی میرے ذہن کو ایک حوالے سے الجھا رہی تھی۔ میں نے شیوا سے پوچھا۔

”انکسپٹر! ڈاکٹر اور ساحل کی طبیعت کیسی ہے۔ انہیں شدید ذہنی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا؟“

اس نے تھوڑا تامل کیا پھر بولا ”اب وہ دونوں ٹھیک ہیں۔“

اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتانے پر مجبور نہیں کیا کیونکہ تھوڑی دیر بعد میں ڈاکٹر مونگ اور ساحل کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔ یہ تفصیل میں ڈاکٹر ہی سے پوچھ لیتا۔ کھنڈ ویا نیپال کے مضافات میں پھیلے ہوئے سلسلہ کوہسار میں میں نے تصور کی نظر سے جو خچیاں منظر دیکھا تھا اس کے حوالے سے میرے ذہن میں سیکڑوں سوالات سر اٹھائے کھڑے تھے۔

میں نے انکسپٹر سے پوچھا ”اس وقت تم سرکاری گاڑی میں ہمیں ڈاکٹر مونگ کے ٹھکانے پر پہنچانے جا رہے ہو۔ اگر دشمنوں نے تعاقب کر کے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی یا ہماری دم سے بندھ کر وہ غیر محسوس انداز میں رتنا پارک کے اس ہنگلے تک پہنچ گئے تو کیا ہوگا؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ وہ حقیقت سے بولا ”وہ لوگ ہمارا تعاقب کر کے کبھی بھی ڈاکٹر مونگ والے ٹھکانے تک رسائی

حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم براہ راست رتنا پارک نہیں جاسکتے۔ پہلے ہم کماری چوک کے ایک بنگلے پر پہنچیں گے پھر اس بنگلے کے اندر سے ہم نہایت ہی خفیہ انداز میں آگے بڑھیں گے جس کی تفصیل تمہیں کماری چوک کے مذکورہ بنگلے کے اندر پہنچنے کے بعد پتا چل جائے گی۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اگر بالفرض ہمارا تعاقب کیا بھی گیا تو متحقیق زیادہ سے زیادہ کماری چوک والے بنگلے تک رسائی حاصل کر نہ پاؤ گے۔ کامیاب ہوں گے اور اس کامیابی کے نتیجے میں انہیں کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ کسی بھی صورت یہ جان نہیں پائیں گے کہ ہم وہاں سے رتنا پارک کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔“

انسپکشنیو ایڈی ایچ بھی ہوئی باتیں کر رہا تھا لیکن میں نے اس سے سوال وجواب میں وقت ضائع نہیں کیا اور شہر کی پست سے ایک لگا کر انھیں بند کر لیں۔

رنا پارک کے ڈکرنے میرے ذہن میں پھل جھادی تھی۔ میں اس پارک اور اس سے وابستہ یادوں کو بھلا کیسے بھلا سکتا تھا۔ رتنا پارک میں نیلگری سے میرا پہلا تعارف ہوا تھا۔ اس وقت وہ کرٹل کے ایک جیسے کی صورت میں تھی جس کے دو حصے ہو چکے تھے۔ میں نے اس کوٹے ہوئے جیسے کو بڑی حفاظت اور محبت سے سمیٹا تھا اور اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی بڑی عجیب و غریب رات تھی۔

میں نیلگری کے کرٹل جیسے کوٹے آ رہا تھا لیکن اس کے حسن نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے کوشش کر کے جیسے کے دونوں حصوں کو ٹیپ کی مدد سے جوڑا تو وہ ”زندہ“ ہو گئی پھر اس نے ایک نادیہ اور کچھ میں نہ آنے والی زبان میں مجھ سے باتیں کی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ میری زندگی میں داخل ہوئی مگنی اور اب تک داخل تھی۔ بس یہ کہ اس کے ”دل“ کا انداز بدل گیا تھا!

میں نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت دور نکل گیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک نظر ڈاکٹر موگنگ پر بھی ڈالنا چاہیے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حال میں ہے۔ اس کے ماحول میں میری سائل بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر کی خیریت سے مجھے سائل کی خیریت مل سکتی تھی۔ میں براہ راست سائل سے تصور رانی رابطہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے بالواسطہ اس تک پہنچنے کے لیے مجبور تھا!

میں نے ڈاکٹر موگنگ کے خدوخال کو اپنے تصور میں تیسری آنکھ کے سامنے آ جا کر کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے

ماحول میں پہنچ گیا۔ اس کا ماحول حد درجہ متحرک تھا۔ وہ اس وقت بیک وقت چار افراد سے نیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چاروں کوئی لٹو چوٹم کے فائز نہیں تھے۔ ڈاکٹر موگنگ کو ان کا مقابلہ کرنے میں خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔

میں نے ڈاکٹر کو میدان جنگ میں چھوڑا اور سائل کا تصور قائم کر کے اس کے ماحول میں کودنے کی کوشش کی۔ میں ایک مرتبہ پھر چاروں خانے جت ہو گیا۔ سائل کا ماحول میری رسائی میں نہ آ سکا۔ پتا نہیں رہی موٹے ہاتھن نے کسی بندش ڈال دی تھی۔

میں واپس پلٹا اور ڈاکٹر موگنگ ریٹوٹے کے ماحول میں چھلانگ لگا دی۔

اسی لمحے مجھے آنکھیں کھولنا پڑیں۔ ہماری گاڑی ایک جھلکے سے رکی تھی۔ میں نے بے اختیار جیب سے باہر دیکھا اور میرے رگ دپے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایک ہولناک منظر میرا منتظر تھا!

جیب رکنے کا سبب وہ ٹرک تھا جو ہمارے آگے کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں میری سمجھ میں یہی آیا کہ ٹرک نے اچانک بریک لگائے ہوں گے جس کی وجہ سے انسپکشنیو کو بھی مجبوراً بریک پیدل دہانا پڑے۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جائی تو جیب ٹرک کے اندر گھر چکی ہوئی۔

اس سے پہلے کہ صورت حال میری سمجھ میں آتی، جیب کے عقب میں ایک تیز رفتار گاڑی نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی ہماری قریب پہنچ گئی۔ شیوا جیب کو ٹرن کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ٹرک کے باعث سیدھا آگے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

جب تک ہماری جیب سڑک پر راہ حاصل کر پاتی، عقب میں آنے والی گاڑی ہمارے پہلو میں پہنچ کر رک جچکی تھی۔ رکی ہوئی گاڑی میں سے کوئی باہر نہیں نکلا تاہم ہماری جانب کھلنے والے اس کے شیشوں میں سے دو آٹو میک رائفلوں کے بیرل برآمد ہوئے۔ اگلے ہی لمحے وہ بیرل ہماری طرف موت اچھالنے لگے۔

ہم اس وقت کوئیوں کی بوجھ میں تھے! موت کا ایک دن مچنے سے گھر اس دن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ انسان زندگی کی آخری سانس تک اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور ہم بھی کر رہے تھے۔ یہ رفاقت حقیقت تمام تر شگنی کے ساتھ ہمارے مقابل میں کھڑی ہوئی تھی۔ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ

ہمیں نیست و نابود کر کے ہی دم لیں گے۔

ہم بڑی دہشت صورت حالات سے دو چار تھے۔ یہ ”آگے آئے کٹاؤں“ جیسے کھائی، والی پوزیشن تھی۔ سائینڈ اسٹریٹ سے برآمد ہونے والے ٹرک نے میں روڈ پر آ کر آگے بڑھنے کا راستہ مسدود کر دیا تھا اور عقب میں وہ گاڑی تھی جو کم دیش ہمارے پہلو میں آ کر رکی تھی۔ اس گاڑی میں موجود افراد ہمیں بھون کر رکھنے کے لیے اپنی گھٹوں سے مسلسل گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ اندھی بے زبان گولیاں ہماری جیب کی باڈی کو چھلنی میں بدل رہی تھیں شیشوں کو چھتا چور کر رہی تھیں اور ہمیں مجبور کر رہی تھیں کہ جان بچانے کے لیے ہم جو بھی کر سکتے ہوں کر گزریں۔ اگر نہیں کریں گے تو پھر یہ جان لیوا گولیاں ہمیں زندگی سے گزاردیں گی!

میں نے خطرناک رائفلوں کو اپنی جانب اٹھتے دیکھ کر بیک کی انداز میں لی یاں کو دھکا دے کر سیٹ پر گر ادا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں خود بھی اس کے اوپر لیٹ گیا تھا۔ غوری طور پر خود کو محفوظ کرنے کا اس سے زیادہ موزوں اور کوئی اقدام نہیں ہو سکتا تھا۔ ہماری دیکھا دیکھی یا اپنی مرضی سے بہر حال اسلینڈر شیوا نے بھی پینجر سیٹ کی جانب لپک کر خود کو برسی گولیوں کی زد سے بچا لیا۔

ایک لمحے کے لیے فائرنگ میں وقفہ ہوا تو مجھے سوچنے کا موقع ملا۔ سوچ کا عمل تو مسلسل جاری رہتا ہے یوں سمجھیں اس لمحے میں مجھے مکمل کرنے کا موقع ملا۔ اس فیصلے پر عمل کرنے کا موقع جو حالات کی شگنی کے پیش نظر ہنگامی انداز میں میرے ذہن نے کیا تھا۔ میں نے جیب سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس فیصلے کے ساتھ ہی میں نے لی یاں کے کان میں سرگوشی کی ”میں جیب کا دروازہ کھول رہا ہوں۔ ہمیں رد لنگ کرتے ہوئے ٹرک کی طرف جانا ہے اور اس کے نیچے پناہ گزین ہوتا ہے۔ کیا میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟“

ہماری جیب قائل بردار گاڑی اور ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے درمیان کھڑی تھی۔ جیب اور ٹرک کے درمیان بے مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا تھا اور یہ فاصلہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب شیوا نے آگے راستہ نہ پا کر جیب کو موڑنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ایک مرتبہ ہم ٹرک کے نیچے پہنچ جاتے تو براہ راست گولیوں کی زد سے محفوظ ہو سکتے تھے۔

لی یاں جزدی طور پر میرے نیچے دی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بدن کی اثباتی جنبش سے میرے سوال کا جواب دیا اور سرگوشیانہ انداز ہی میں بولی ”اوکے“ آئی ایم ریڈی۔ تم دروازہ کھولو۔“

میری مستفسر مگر گشتی شیوا کی سماعت تک بھی رسائی حاصل کر چکی تھی۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا ”شون! میں بھی تیار ہوں۔ اگر ہم چند لمحوں کے لیے جیب میں ٹھہرے تو یہ جیب ہمارا بدن بن جائے گی لیکن ٹرک کے نیچے پناہ لینا ٹھیک نہیں۔ مجھے ایک سوانیکی فیصلہ لینا ہے یہ ٹرک بھی ہمارے دشمنوں کی ہے جو میری راہ کھولنے کرنے کے لیے سڑک کو روک کر کھڑا ہو گیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو شیوا!...! ہمارے ٹرک کے نیچے پہنچنے ہی وہ ہمیں روندنے کے لیے ٹرک کو آگے بھی بڑھا سکتے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہا ”ہم ٹرک کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کریں گے۔ تمہارے پاس گمن وغیرہ تو ہوگی؟“

”ہاں! گمن میری جیب میں ہے۔ میں اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں۔“

شیوا کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت فضا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی مخصوص تڑ تڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ حملہ آوروں کو ہماری خاموشی پسند نہیں آئی تھی۔ شاید وہ یہ جانتا چاہتے تھے کہ آیا ہم نے دانستہ چپ سا دھڑکی ہے یا پھر ہماری یہ خاموشی ازلی ابدی ہے!

میں نے کہا ”میں تین تک متقی گھنوں گا اور تین کے بعد جیب کا دروازہ کھول کر باہر لڑھک جاؤں گا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ جیب کے اندر دیک کر بیٹھے رہنا خود حکومت کے منہ میں دھکے کے مترادف ہے۔“

ادھر میری بات پوری ہوئی، ادھر قائل بردار گاڑی کے دروازے کھلنے کی مخصوص آواز ابھری۔ وہ لوگ ہماری جانب مکمل خاموشی پا کر ادھر کی صورت حال جاننے کے لیے اپنی گاڑی سے باہر آ رہے تھے۔ یہ بہت ہی نازک اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ اگر وہ ہتھیار بدست ہمارے سروں پر پہنچ جاتے تو زندگی کو موت سے معاف کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس سنبھلی اور ”ایک دو تین“ کہتے ہوئے ٹرک والی سائینڈ کا دروازہ کھول دیا پھر لی یاں کے اوپر سے ایک طویل فرنٹ رول کرتے ہوئے ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے نیچے پہنچ گیا۔ میں ٹرک کے نیچے کرکٹیں بلکہ رد لنگ کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسری سمت نکل گیا۔

میں جیسے ہی رکاوٹ کا درک کر اپنے عقب میں نگاہ ڈالی تو لی یاں کو تین قدم کے فاصلے پر پایا۔ اسی لمحے لی یاں نے غیر متوقع طور پر ایک لمبی جست بھری اور مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے ٹرک کی فرنٹ سائینڈ کی سمت لڑھک گئی۔



اسی اضطراری رولنگ کے دوران میں میری نگاہ نے وہ منظر دیکھ لیا جو لیان کی غیر متوقع جست کا سبب بنا تھا۔ ٹرک کا اس طرف والا دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں ایک گمن بردار موجود تھا۔ یعنی بات سچی مذکورہ گمن بردار نے مجھے نشانہ بنانا چاہا ہوگا اور لیان نے بروقت مجھے لڑھکا کر فائرنگ ٹارگٹ سے باہر نکال دیا تھا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ رولنگ کے اختتام پر میں ایک لمحے کے لیے بھی زمین پر نہیں رکا۔ بیک رول کرتے ہوئے اپنے قدموں پر آیا اور پالی جپ کے ایکشن میں اچھل کر ایک بیک سرسالت لگا دیا۔ گمن بردار میری اڑان کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ میرے لیے اس کی یہ معمولی سی غفلت کسی سنہری موقع سے کم نہیں تھی۔

سرسالت کے وسط میں اس سے چند انچ کی دوری پر تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کے گن والے ہاتھ پر ایک طوفانی چھٹا مارا اور ہتھیار کو اپنے قابو میں کرتے ہوئے دوسری سمت نکل گیا۔

اسی لمحے ٹرک کی دوسری جانب فائرنگ سنائی دی۔ اس فائرنگ نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شیوا ابھی تک ہماری طرف نہیں پہنچا تھا۔ بھینٹا حملہ آوروں سے اس کی مٹھ بھیر ہو گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر لیان کی طرف دیکھا۔

وہ اس ”گمن بردار“ سے نبرد آزما تھی جواب نہتا ہو چکا تھا۔ اس کی گن پر میرا کامل قبضہ تھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں موجود شخص کو لیان نے کھیت کر نیچے کھینچ لیا تھا اور چار ہاتھ پاؤں سے اس کی درگت بنانے کا فریضہ ادا کر رہی تھی۔ میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔

ٹرک کی دوسری سمت ایک مرتبہ پھر سناٹا چھا گیا۔ ادھر کے حالات جاننا از حد ضروری تھا کیونکہ شیوا ابھی تک ہماری طرف دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں دے قدموں سرکتے ہوئے ٹرک کی عقبی جانب بڑھ گیا پھر جیسے ہی میں ٹرک کے پیچھے پہنچا ایک اجنبی چہرے سے سامنا ہو گیا۔

وہ بھینٹا حملہ آوروں ہی کا کوئی ساتھی تھا۔ گمن اس کے ہاتھ میں موجود تھی لیکن میں نے اسے گن استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جیسے ہی اس نے مجھے نشانہ بنانے کے لیے گمن سیدھی کرنا چاہی، میں حرکت میں آ گیا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ لہذا اس کے عمل میں وہ اکیڑہ کی منتقد تھی جس کی اس موقع پر ضرورت تھی۔

جیسے ہی فائرنگ کے لیے اس نے گمن کو میری جانب

سیدھا کیا، میں نے اپنی گن کو لاٹھی کے سے انداز میں تھما کر اس کی گن پر مارا۔ نتیجے میں اس کی گن جلی ضرورتاً ہم، میں اس کی فائرنگ سے سراسر محفوظ رہا۔ خطرناک برست اس ٹرک کے ایک حصے کو درتک ادھیڑا چلا گیا پھر اس کے سنبھلے سے پہلے ہی میں نے اس کی خاطر تواضع شروع کر دی۔

میری ایک زبردست پریشر کلک اس کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم پیچھے گیا۔ خطرناک گمن بدستور اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ اسی لڑکھڑاہٹ کے دوران میں ایک مرتبہ پھر اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تو میں نے پیچ کے مانند ایک طویل جست بھری اور اس کے سولر پر ایک خوفناک سائیکلک جڑی۔ سولر پر لگنے والی معمولی سی شوکر، ننھا سا پیش بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے اور..... سائیکلک اسٹپ کلک کی خطرناکی کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے کبھی یہ مہلک کلک کھائی ہو یا مذکورہ کلک لگانا جانتا ہو۔

میں یہ کلک بار بار غولی جانتا تھا اور میرے مد مقابل نے میری کلک کھائی تھی لہذا نتیجتاً ہی مہلک برآمد ہوا جتنا بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ ”اوس“ کی آواز خارج کرتے ہوئے بیک گیر

میں اچھلا اور بیک فٹ پر سفر کرتے ہوئے ”ٹرک کے عین وسط میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اسی اثنا میں ایک دوسرا حملہ آور ٹرک کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بے دریغ اس کے پاؤں میں فائرنگ کر دی۔ جس عمارت کی بنیاد ہلا دی جاتے وہ اپنی قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ میں نے گمن بردار حملہ آور کے قدموں کو چھلکی بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ وہ کسی ایسی فلک بوس عمارت کے مانند زمین بوس ہو گیا جس کے نیچے سے اچانک زمین کھینچ لی گئی ہو!

میں اس کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھا۔ گمن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری تھی اور وہ بڑی کسپہری کے عالم میں سنگلاخ ٹرک پر زخمی ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر بڑے سفاک انداز میں اس کے چہرے پر زخمی بوٹ کی تین چار اذیت بھری شوکریں رسید کیں۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلاتا تھا۔ میں اس کا مزید حشر خراب کرنا چاہتا تھا کہ لیان کی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا اور منظر کی عین

نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لیان کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ایک گہری خونخاک نال لگی ہوئی تھی اور یہ وہ شخص نہیں تھا، تھوڑی دیر پہلے وہ جس کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ مذکورہ شخص پانچ فٹ کی دوری پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ لیان نے اسے بڑے آرام سے لگا دیا تھا۔ اب وہ خود دشمن کے نشانے پر تھی۔

میں نے لیان کو مصیبت میں دیکھا تو بے ساختہ میری گھن اس سمت اٹھ گئی۔ اسی لمحے لیان کو نشانے پر رکھنے والا گھن بردار غرایا۔

”کوئی حرکت نہیں، گھن کو دور پیچید کر دو!“

میں تذبذب کے عالم میں ایک لمحہ یونہی گھن تھا سے کھڑا رہا۔

”کیا تم چاہتے ہو میں اس عورت کا بھیجا ہوا میاں اڑا دوں؟“ اس نے بڑے سنگین انداز میں گھن کی نال سے لیان کی کھوپڑی پر ہنوک دیا۔

ظاہر ہے میں ویسا نہیں چاہتا تھا جیسا اس شخص نے بیان کیا تھا لہذا میں نے لیان کی سلاستی کے لیے گھن کو دور ٹرک کے نیچے پیچید دیا۔

”دو دن ہاتھ اوپر اٹھاؤ!“ وہ ایک مرتبہ پھر حکمانہ انداز میں غرایا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

ہمارے درمیان دس فٹ سے زیادہ فاصلہ حائل تھا۔ میری کوئی بھی بدافیتی چال لیان کی زندگی کو انتہائی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ میں کوئی ایسا رسک لینے کو تیار نہیں تھا جس کے نتیجے میں میری سامھی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا۔

اس شخص نے اپنے حکم کو آگے بڑھایا ”گھوم جاؤ۔“

میں کی مداری کے بچے جھوڑا کی طرح گھوم گیا۔

اسی لمحے کو لیان نے شخص کو آواز سنائی دی۔

میں نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ گھن کے زور پر مجھے دھکے لانے والا کسے ہوئے کسی شہتیر کے مانند زمین کی جانب جھک رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ گھن اس کے ہاتھوں سے نکل کر اس سے پہلے زمین بوس ہو چکی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی دھپ سے سڑک پر جا کر ا۔

لیان نے ایک وحشت بھری نظر اس پر ڈالی پھر اس کی نگاہ ٹرک کے اوپر کی گئی۔ میں نے غیر ارادی طور پر لیان کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ٹرک کے ڈرائیونگ کیمین

کی جھپٹ پر مجھے انسپکٹر شیوا کی صورت نظر آئی۔

مجھ سے نظری تو اس نے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے ایک ہاتھ کو اوپر اٹھادیا پھر خود بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک جڈی ریوالتور موجود تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ شیوا نے ڈرائیونگ کیمین کی جھپٹ پر لینے لینے اس گھن بردار حملہ آور کو مار گرایا تھا، جولی یان کو نشانے پر رکھ کر مجھے اپنے احکام کی تعمیل پر مجبور کر رہا تھا۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔

اسی لمحے شیوا کسی ماہر کو پیا کی طرح ٹرک سے نیچے اتر آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”مسٹر شون! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات اپنے کنٹرول میں ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور لیان کی طرف بڑھ گیا۔

لیان کو ایڈوانچر بہت پسند تھا۔ وہ اپنی زندگی میں سب سے خیر کی خواہاں تھی۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے اس کا یہ شوق تو پورا ہو رہا تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے اس نے موت کو اتنے قریب دیکھ لیا کہ وہ اس وقت کسی ہرنی کے مانند سبکی ہوئی تھی۔ میرے قریب آتے ہی وہ مجھ سے چپک گئی۔ اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں نے اس کو خود سے دور کرنا مناسب نہ سمجھا!

آجندہ دو منٹ کے اندر ہم نے حملہ آوروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ کل چار افراد تھے۔ ایک ہوی ڈیوٹی ٹرک میں سے برآمد ہوا تھا اور لیان سے درگت بنوانے کے بعد وہ ”بے فکری“ سے لمپاٹ گیا تھا۔ تاہم اس میں زندگی کے آثار باقی تھے۔

دیگر تین میں سے ایک انسپکٹر شیوا کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ لیان کا بھیجا ہوا میاں اڑانے کی دھمکی دے رہا تھا اور اب اس کا اپنا بھیجا خاک میں مل رہا تھا۔ شیوا کے بچے نشانے نے اس کی کھوپڑی میں خاصا کشادہ ہوا دان بنادیا تھا۔

انسان بڑا بڑ بولا ہے۔ طاقت کے نشے میں پتا نہیں کہاں کہاں کی ہولنا چلا جاتا ہے مگر جیسے ہی یہ نشہ ٹوٹتا ہے وہ فلک سے زمین پر آگرتا ہے۔ انسان پر وہ خود کو آفتاب و مہتاب سمجھنے والا کتنے بیلیوں کے پاؤں کی دھول بن کر رہ جاتا ہے۔ نشہ کبھی بھی شے کا بؤبڑا ہے کیونکہ اس میں انسان اپنی اوقات میں نہیں رہتا۔

میں نے دو حملہ آوروں کی مزاج پر سی کی تھی جن میں سے ایک اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس

نے اپنے سینے پر میری سائیز سولر کک کا تمغا سجایا تھا۔ دوسرا شدید زخمی اور بے ہوش تھا۔ اس کے گھائل پاؤں خون میں تر جرتے تھے۔

ہماری جیب کی ایک سائیز گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی۔ ہائر بھی ناکارہ ہو چکے تھے۔ لیان کی قسم کے ستر کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس سائیز کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے تھے جہاں سے ہم نے راہ فرار اختیار کی تھی۔

شیوا نے کھلے ہوئے دروازے میں سے ڈیڑھ پورڈی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”میں موبائل فون پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے مزید کک منگواتا ہوں۔ حالات اگرچہ قابو میں ہیں مگر اس چوٹی کو پینڈل کرنے کے لیے مزید نفری کی ضرورت ہوگی۔“

وہ موبائل نکال کر سیدھا ہوا تو میں نے گمبیر آواز میں کہا ”اگر ہم سوچ کی کارروائی میں اٹھ گئے تو اچھا خاصا وقت برباد ہو جائے گا جب کہ مجھے فوری طور پر ڈاکٹر سوگ کے پاس پہنچنا چاہیے۔ وہ اس وقت بڑی مشکل میں ہے۔“

”مشکل؟“ اس نے کی پیز حرکت کرتی انگلی کو روک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اٹل لہجے میں کہا ”اگر ڈاکٹر سوگ رتنا پارک کے کسی بنگلے میں قیام پذیر ہے تو سمجھو وہاں بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔“

انسپکٹر شیوا کی حیرت دو چند ہوئی ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں بیچے مسٹر شون! بتائیں! تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ رتنا پارک والے بنگلے میں کس قسم کی گڑبڑ ہوئی ہے؟ اور..... اور تمہیں یہ خبر کیسے ہو گئی۔ تم تو اسپتال سے میرے ساتھ یہاں آئے ہو؟“

انسپکٹر شیوا کے چہرے پر شوک و شبہات کی ایک دبیر چادر تھی ہوئی تھی۔ میں اس کے سوالات کے جواب میں اپنی غرڈ آئی والی صلاحیت کو ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ باطنی آنکھ دالے معاملے کو ہر کسی پر ظاہر ہوتا نہیں چاہیے تھا لہذا مصلحت کی راہ اختیار کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

”دیکھو شیوا! فضول کے بحث مباحثے میں سوائے وقت ضائع کرنے کے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم میری بات کی تصدیق کے لیے رتنا پارک والے بنگلے پر فون کر کے ڈاکٹر سوگ کی خبریت معلوم کر سکتے ہو۔“

اس کی تسلی تو نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے ایک معقول بات کی تھی اس لیے وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر سوگ کے نمبر رینج کرتے ہوئے وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا

انداز گھورنے والا تھا۔ نگاہ میں کسی عتاب ایسی تیزی تھی جیسے وہ میری سوچ پر ہنسنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس دوران میں میں بھی اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا جن میں ہرگزرتے لمحے کے ساتھ گمبیر تاثرات جاری تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے شکست خوردہ اور تشویش ناک انداز میں کہا ”ڈاکٹر فون اینڈ نہیں کر رہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ادھر حالات سازگار نہیں رہے۔“

”اس کے سیل پر ٹرائی کرو۔“

”کر چکا ہوں۔ وہ بھی بندل رہا ہے۔“ وہ مجھے ہنسنے لہجے میں بولا۔

میں نے ڈاکٹر سوگ کے سیل کا نمبر دہرایا اور پوچھا ”کیا تم نے اسی نمبر کو ٹرائی کیا ہے؟“

”نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس دوسرا سیل ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

پھر میری فرمائش پر شیوا نے مجھے مذکورہ سیل نمبر بتا دیا جو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔ اگر اس وقت اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو پارہا تھا تو بعد میں ایسی کوشش کی جاسکتی تھی۔

شیوا اکبر سے تذبذب میں مبتلا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے ٹولنے کی سعی کی ”مسٹر شون! تم نے بتایا نہیں، تمہیں رتنا پارک والے بنگلے میں ہونے والی گڑبڑ کا کیسے علم ہوا؟“

”میرا خیال ہے اب ہم واقعی وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ میں نے شیوا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ یہاں جو کچھ پیش آچکا ہے اس کو تہیٰ نے ذیل کرتا ہے۔ تم مجھے رتنا پارک والے بنگلے کا نمبر اور لویشن بتا دو۔ کھنڈ و میرا دیکھا بھلا ہے۔ میں بہ آسانی ڈاکٹر سوگ تک پہنچ جاؤں گا۔ تمہارا یہاں رکنا اور ضروری کارروائی نشتا ضروری ہے۔“

بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے میری مطلوبہ معلومات فراہم کیں پھر ایک طویل اور بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں ڈاکٹر سوگ کا قدادار ہوں لیکن قانون سے دفعتاً ہی بھی ضروری ہے۔ میں یہاں سے فارغ ہوتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ تم فوراً رتنا پارک کی طرف روانہ ہو جاؤ۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کا سیل نمبر لینے کے بعد کہا ”وہاں پہنچتے ہی میں تمہیں صورتِ حالات سے آگاہ کروں گا۔ تم یہاں کے معاملات کو نشانے کی کوشش کرو اور.....“ میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر اس واقعے میں ہمارا کہیں ذکر نہ آئے تو اچھا ہے!“

”ٹھیک ہے میں تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا۔“  
ہم اس وقت ایک غیر مصروف سڑک پر کھڑے تھے۔  
ہسپتال سے نکلنے کے بعد شیوا نے دانستہ لہجہ اور کم مصروف  
روٹ لیا تھا۔ وہ کماری چوک تک نہپتا آسان راستے سے کم  
وقت میں بھی پہنچ سکتا تھا، بہر حال ہر شخص کے کام کرنے کا اپنا  
ایک انداز ہوتا ہے۔ حملہ آوروں پر قابو پانے کے بعد شیوا نے  
ہیوی ڈیوٹی ٹرک کی ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھ کر اس کا رخ  
پھیر دیا تھا تاکہ اس کی وجہ سے ٹریفک میں خلل واقع نہ ہو مگر  
ابھی تک ادھر سے کوئی گاڑی نہیں گزری تھی۔

میرے ذہن میں مسلسل یہ سوال کا بلارہا تھا کہ یہ حملہ آور  
کون تھے اور ان کے مقاصد کیا تھے۔ آج صبح اسی طرح کا  
ایک اور حملہ بھی ہم پر ہو چکا تھا۔ جب ہم جانوس کے ساتھ اس  
کی رہائش گاہ فریک اسٹریٹ کی طرف جا رہے تھے۔ اس  
معرکے میں جانوس کا پادری شو فرنگھا مارا گیا تھا۔ ہمیں  
گھنٹہ دو میں قدم رکھے ابھی آدھا دن بھی نہیں گزرا تھا اور دو  
بار ہم پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ ان سنگین واقعات کو نظر انداز  
نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اسپیکر شیوا سے کہا ”حملہ آوروں میں سے دو  
زندہ سلامت ہاتھ لگے ہیں۔ ان کی گاڑی اور ٹرک بھی  
تمہارے قبضے میں ہے۔ مجھے امید ہے تمہاری فیتیش کے نتیجے  
میں ان بدعاشوں کا کچا چٹا صل جائے گا۔“  
”لاڈلہ دھاسب ٹھیک کر دے گا۔“ وہ تلی آمیز لہجے میں  
بولا ”میں بہت جلد اس سلسلے میں تمہیں کوئی بہت بڑی خبر  
سناؤں گا۔“

اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک ٹیکسی اس طرف آتی  
دکھائی دی۔ شیوا نے ٹیکسی کو روک لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے نیپالی  
میں کوئی بات کی اور ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے شیوا  
سے مصافحہ کیا اور لی یان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر رتاپارک کی  
طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت ہم خالی ہاتھ تھے۔ اپنے سری بیگ ہم نے اتنا  
پورنا ہوئی میں چھوڑ دیئے تھے۔ ٹیکسی نے مختلف سڑکوں پر  
گھومنے کے بعد دریائے دشنتو کی عبور کیا اور ٹیکو کی طرف  
بڑھنے لگے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں دریائے دشنتو اور  
درائے بھاگ متی آپس میں ملتے ہیں۔ کالا ہسپتال ہوئی  
دلی ویو اور سینٹرل نیلی گراف آفس کو پیچھے چھوڑتے ہوئے  
جب ٹیکسی کافی پتھ میں داخل ہوئی تو میں نے اطمینان کی

سانس لی۔ کافی پتھ پر سبز کرتے ہوئے ہم سیدھے رتاپارک  
پہنچ جاتے۔

ڈاکٹر مومگ کی طرف جھانکے ہوئے کافی دیر ہوئی تھی۔  
تجربہ بات تو یہ ہے کہ پیش آمدہ ہنگامی حالات نے مجھے ایک  
لحظے کی فرصت نہیں دی تھی۔ اگرچہ اس وقت ہم ڈاکٹر مومگ  
ہی کی طرف جا رہے تھے لیکن ڈاکٹر کے حوالے سے میرے  
ذہن میں کھلبلی سی کچھ ہوئی تھی۔ میں اسے انتہائی غیر یقینی  
حالات میں چھوڑ کر اپنی جگہ یعنی شیوا کی سرکاری جیب میں  
حاضر ہوا تھا۔ میری رگ جان ساحل حاصل شدہ معلومات کے  
مطابق ڈاکٹر کے ساتھ تھی۔ اگر ڈاکٹر غیر یقینی حالات میں تھا تو  
ساحل کے لیے بھی خطرات ہو سکتے تھے۔

میں نے لی یان سے کہا ”میں تھوڑی دیر تک آنکھیں بند  
کر کے خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ جب  
ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں تو تم مجھے ڈسٹرب کر سکتی  
ہو۔“

اسپیکر شیوا نے ٹیکسی ڈرائیو کو رتاپارک والے پتھکے کا  
ایڈریس ابھی طرح سمجھا دیا تھا۔ میری بات کے جواب میں لی  
یان نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہ انہیں کیا اور اثبات میں سر  
ہلا کر رہ گئی۔ تاہم اس کے چہرے اور آنکھوں میں پچھلے ہوئے  
ان گنت سوالات کو میں نے محسوس کر لیا۔ وہ سوالات کے  
جوابات کا وقت نہیں تھا لہذا میں نے نشست کی پشت سے بیگ  
لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دو ہند آنکھوں کے پیچھے میں نے تیسری آنکھ کا شراٹھایا  
اور ڈاکٹر مومگ کے خدو خال کی اگلی بکڑی تصویر نگاہ سے اس  
کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ اس وقت پولیس والوں میں مگر ابھی تھا۔ تین پولیس  
والے اس سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں چونکہ ان کی آواز تک  
رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا لہذا یہ نہیں جان سکا ان کے  
درمیان کس موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی۔ اندازہ یہی تھا  
کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے تصویر کی کرشمہ کاری کے طفیل ڈاکٹر  
مومگ کو جن حالات سے نبرد آزما دیکھا تھا پولیس والے اسی  
سلسلے میں اس سے پوچھتا چہ کر رہے ہوں گے۔ میں نے  
آخری مرتبہ جب ڈاکٹر مومگ کے ماحول سے تصوراتی رابطہ  
کیا تو وہ چار انتہائی مشتاق فائزر کے تہہ قاتل عایت قدی  
سے جما ہوا تھا۔

میرے تصور کی یہ جین نگاہ جس صورت کو دیکھنے کی متنی  
تھی۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب تک حاصل ہونے  
والی معلومات کے مطابق گزشتہ رات ساحل کو ڈاکٹر مومگ

جب آتی دکھائی دی۔ میرے ذہن نے بتا دیا کہ یہ وہی پولیس  
والے ہیں جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر مومگ سے ”بیننگ“  
کر رہے تھے۔ پولیس جیب ہمارے قریب سے گزر گئی۔  
آہندہ چند سیکنڈ میں ہم اس پتھکے کی گھنٹی بج رہے تھے جہاں  
ڈاکٹر مومگ کو ہونا چاہیے تھا۔

دوسری گھنٹی پر ایک ملازم صورت نیپالی نے گیٹ کھول  
دیا۔ وہ پوری طرح متحہ تھا لیکن اس کے بدن پر سیکورٹی گارڈ  
والی مخصوص یونیفارم موجود نہیں تھی۔ اس نے سوالیہ نظر سے  
ہمیں دیکھا تو میں نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا۔  
”ہم ڈاکٹر مومگ کے مہمان ہیں امریکا سے آئے ہیں۔“

تم ڈاکٹر کو جا کر ہمارے بارے میں بتاؤ۔“  
امریکا کے ذکر پر وہ اس طرح چونکا جیسے اسے ہماری آمد  
کی خبر ہو۔ اس نے پوچھا ”آپ لوگوں کو تو اسپیکر شیوا کے  
ساتھ آنا تھا؟“

”شیوا ایک قانونی معاملے میں الجھ گیا ہے۔“ میں نے  
کہا ”اس لیے مجبوراً ہمیں اکیلے ہی آنا پڑا۔“

نیپالی ملازم ہمیں انتظار کی زحمت دیتے ہوئے پتھکے کے  
اندر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پتھکے کے اندر ایک  
کمرے میں ڈاکٹر مومگ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر مومگ  
نے جس گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اس بیان کو الفاظ کا  
جامہ پہننا ناممکن نہیں۔ رسی علیک سلیک کے مراحل طے ہو گئے  
تو میں نے لی یان سے کہا۔

”تم نے ابھی خاصی محنت کی ہے۔ فریش اپ ہو جاؤ۔  
باقی باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“ میں دراصل لی یان کی  
غیر موجودگی میں مومگ سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر ڈاکٹر مومگ کی راہ نمائی پاکر لی یان ایک دانش روم  
میں گھس گئی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی اور وہ  
یہ کہ ڈاکٹر مومگ بڑی دھکی نظر سے ہار باری لی یان کو دیکھ رہا تھا  
جیسے اسے کسی قسم کا افسوس پامال ہو۔ تھائی پاتے ہی میں نے  
سب سے پہلے ساحل کے بارے میں پوچھا۔

”ڈاکٹر! ساحل کہاں ہے؟ وہ مجھے نظر کیوں نہیں  
آ رہی؟“ میرے استفسار میں بے تابی کی۔  
”بالکل محفوظ ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے  
ہوئے بولا۔

اس کے انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ ذہن کی سوچ میری  
زبان تک آگئی ”کیا وہ اس پتھکے میں موجود نہیں؟“  
”نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا ”میں نے احتیاط کے  
پیش نظر اسے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔“

کے ساتھ سٹی اسپتال سے رتاپارک والے پتھکے پر منتقل کیا گیا  
تھا۔ انہیں دوسروں کے ہمیں میں ایک ایسپولٹس میں ڈال کر  
یہاں تک لایا گیا تھا۔ اس وقت میں ڈاکٹر مومگ کے چہرے  
پر جو اطمینان دیکھ رہا تھا اس سے اندازہ ہوا ساحل بہ خیر و  
عافیت ہوئی۔ افسوس کہ میں براہ راست ساحل کے ماحول  
میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ربی موٹے ہاتھن کے  
کسی شاطر عمل نے میرے تصور کے پرندے کے پر کاٹ  
ڈالے تھے۔ بار بار کے ناکام تجربات کے بعد بھی میں نے  
کوشش جاری رکھی اور ایک مرتبہ پھر ساحل کے ماحول تک  
رسائی حاصل کرنے کے لیے تیسری آنکھ کو زحمت دی لیکن نتیجہ  
وہی ڈھاک کے تین بات!

میں آنکھیں کھول کر ٹیکسی میں حاضر ہو گیا۔

لی یان نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور معنی خیز انداز  
میں بولی ”شون! میں نے تو تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا تھا؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا ”تم تو بہت ابھی بچی  
ہو!“

”بچی!“ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔  
”م..... میرا مطلب ہے تم گڈ گرل ہو۔“ میں نے  
جلدی سے کہا۔

وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولی ”ہاں اب ٹھیک ہے۔“  
”م..... میرا مطلب ہے تم گڈ گرل ہو۔“ میں نے  
جلدی سے کہا۔  
ہمارے درمیان امریکی انگلش میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم  
امریکا سے آئے تھے تو ہمیں اسی انداز میں بات چیت کرنا  
چاہیے تھی۔ نیپالی کی قوی زبان ”نیپالی“ ہے۔ تاہم تمام  
سرکاری دفاتر، ہوٹلوں اور ایسے مقامات جہاں سیاحوں سے  
واسطہ رہتا ہے انگلش فرارنے سے بولی جاتی ہے اس حوالے  
سے ٹیکسی ڈرائیور بھی عام طور پر انگلش سے واقف ہوتے ہیں  
کیونکہ ہر سیاح کو اس مخلوق سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ مجھے  
یقین تھا یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہماری گفتگو کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوگا۔  
تاہم اس میں فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ بہت کم ہی خطا انداز  
میں باتیں کر رہے تھے۔ دو ایسے سیاحوں کی طرح جو نیپالی کی  
خوب صورتی سے انجوائے کرنے آئے ہوں۔ سیاحت نیپال  
کے لیے آمد کی ایک بڑا ذریعہ ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہماری ٹیکسی کافی پتھکے چھوڑ کر رتاپارک  
کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ رتاپارک گھنٹہ دو کی ایک معروف  
تفریح گاہ ہے جس کے آس پاس متحول لوگ عایشان جنگوں  
میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ پارک شاہ نیپال کی ملکہ عالیہ ”ملکہ  
رتنا“ کے نام سے موسوم ہے۔

ہم مطلوبہ جگہ میں داخل ہوئے تو سامنے سے ایک پولیس

”مگر اسپتال سے تو تم دونوں ایک ساتھ یہاں پہنچے تھے؟“ میں نے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں کہا ”اور انپکٹر شیوا نے بھی مجھے یہی بتایا تھا“ جتنی نفوش والی لڑکی تمہارے ساتھ اس بنگلے پر ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی ”شیوا سمیت میرے سیٹ اپ کے بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ساحل اس بنگلے میں موجود ہے۔ یہ بات میرے علاوہ اب صرف تم جانتے ہو کہ ساحل یہاں نہیں ہے۔“

”پھر وہ کہاں ہے؟“ میرے استفسار میں احتجاج کی آمیزش تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میرے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے بولا ”میں تمہاری ذہنی کیفیت اور جذبات کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے، توڑا اور کلو۔ آج رات میں ساحل سے تمہاری ملاقات کروادوں گا۔ میں نے اسے بستی میں روپوش کر دیا ہے۔ وہ بہت ہی محفوظ اور مضبوط ہاتھوں میں ہے۔“

”تم کس بستی کا ذکر کر رہے ہو؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہی بستی جو ہائی وے کے نزدیک ہے۔“ اس نے بتایا ”وہ تمہارا دیکھا علاقہ ہے۔“

ڈاکٹر موگ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے اس بستی میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں بدھ نسل کنڈ کی عبادت گاہ سے نکلتے کے ذریعے اس بستی تک پہنچا تھا۔ مذکورہ بستی ہائی وے پر واقع تھی اور کھنڈر شہر سے لگ بھگ ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھی۔

”ساحل کو اس بستی میں رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مقصد صرف حفاظت ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”جہیں اندازہ نہیں رہی کے خون خوار بھیڑیے کس شدومد سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو تھوڑی دیر پہلے شاید کوئی بہت بڑا آپ سیٹ ہو جاتا۔ میں ابھی ابھی ایک خون ریز معرکے سے نسا ہوں۔“

”ہاں میں نے تمہیں چار تربیت یافتہ فائزرز سے لڑتے دیکھا تھا۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

ڈاکٹر موگ میری تھڑا آئی دالی صلاحیت سے واقف تھا۔ میرے بے اختیار جملے پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ سر کی اس جنبش میں بڑی گیرائی اور گہرائی تھی۔ اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے رہی کے آدمیوں سے ساحل کو چھین کر انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ کھنڈر کے پچھے پچھے اس کی یوسو کھینچے پھر رہے ہیں۔ ساحل کے بغیر ان کا کھنڈر نامکمل ہے۔ وہ ایک مرتبہ ثرائی کر چکے ہیں لیکن عبادت گاہ کے نہ خانے تک رسائی حاصل کرنے میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری ثرائی وہ ساحل کے ساتھ کرنے والے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر رہی نے ساحل کو یہاں پہنچایا تھا۔ وہ بذاتہ خانے میں پوشیدہ لیکن پتھروں کے لیے پاگل ہوا جا رہا ہے۔ دو دن پہلے تک میں عبادت گاہ ہی میں تھا لیکن اپنے مخصوص ذرائع سے جب مجھے پتا چلا کہ تمہاری ساتھی کو یہاں پہنچایا جا رہا ہے تو میں اپنا مورچا چھوڑ کر سرگرم ہو گیا۔ یہ بات سننے سے کہ اگر رہی کے بندے ساحل کی راہنمائی میں نہ خانے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ساحل نہ خانے کا راز جانتی ہے اور وہ اس وقت مکمل طور پر رہی کے ٹرانس میں ہے۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے کہا ”ہاں یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے۔ میں جب بھی اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ رہی نے میرے راستے میں کون سی رکاوٹ کھڑی کر دی ہے؟“

”میں تمہاری ساتھی کا علاج بھی کر رہا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”تم جانتے ہو میں نے چینی طب میں ڈاکٹریٹ کر رکھا ہے۔ لا رڈ بدھانے چاہا تو وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گی۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

پھر ڈاکٹر موگ مجھے اس خون ریز معرکے کی تفصیل بتانے لگا جب اس نے ساحل کو رہی کے آدمیوں سے چھینا تھا۔ اس معرکے کا ایک خوب منظر میں نے بھی ثرائی بیک کے اپارٹمنٹ میں رچے ہوئے تصور کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ موگ نے مجھے بتایا کہ اس کے اپنے آدمی بروقت پہنچ گئے تھے جنہوں نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر کے ان دونوں کو کھنڈر کے سنی اسپتال تک پہنچا دیا تھا۔ میرے لیے ایک خوشی کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر موگ ساحل کو ساحل کہہ کر ہی اس کا ذکر کر رہا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ”دھنڑ“ پر انک کر رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے دل سے مجھے اپنا ”بھونٹی“ تسلیم کر لیا تھا۔ جب اس کا بڑا ساگ فوجیہ اپنا ”داداڈ“ سمجھتے ہوئے ساحل کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے چکا تھا تو پھر ڈاکٹر

موگ اعتراض کرنے والا کون ہوتا تھا!

محترم ساگ فو اب انجمنی ہو چکا تھا۔ ہمارے درمیان ساگ فو کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ ساگ فو کا انتقال ڈاکٹر موگ کی غیر موجودگی میں ہی ہوا تھا۔ موگ کے لیے ساگ فو کی خصوصی بدانتہی کہ وہ مشن کو چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا اور اس نے اپنے بڑے بے حکم کی فیمل کی تھی۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا بلکہ ساحل کو رہی کے آدمیوں سے چھین کر اس نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ رہی ساحل کے بغیر اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا لہذا اس حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ رہی کے آدمی ساحل کی تلاش میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ جنونی یہودیوں کا وہ شیطانی ٹولہ آسانی سے ہار مائے والا نہیں تھا۔ میں نے اس حقیقت کا ذکر ڈاکٹر سے کیا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولا۔

”جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے ساحل کو ایک ایسے مقام پر چھپا دیا ہے جس طرف ہولے سے بھی کسی کا دھیان نہیں جاسکتا۔ وہ لوگ یہی توقع کر رہے ہوں گے کہ ساحل کو عبادت گاہ سے دور رکھنے کی کوشش کی جائے گی جب کہ میں نے اسے عبادت گاہ سے قریبی بستی میں پہنچا دیا ہے۔ اگر لا رڈ بدھا کی مرضی شامل حال رہی تو آج رات ساحل سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ تم نے اس کے انتظار میں بڑی ٹیکنیں اٹھائی ہیں۔“

اس کی بات نے میرے تن بدن میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ ساحل سے ملنے کا تصور بڑا ہوش ربا اور نشاط انگیز تھا۔ ڈاکٹر نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں نے اس کے حصول کی خاطر بہت ہی دکھ اٹھائے تھے۔ میں اس وقت بڑے جذباتی انداز میں ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر موگ مسلسل میرے چہرے پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ اپنے دل کا راز افشا ہوتے دیکھتا تو میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ کوئی بھی شخص اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا اس کے دلی معاملات تک پہنچ جائے۔

”ڈاکٹر! تم جس حالت میں اسپتال پہنچائے گئے اس کے پیش نظر تو تمہیں ہفتہ دس دن تک وہیں رہنا چاہیے تھا مگر تم جتنے ہشاش بشاش نظر آ رہے ہو اس سے تو یہی لگتا ہے تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔“

”ہوا تو بہت کچھ لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ انسان کے دکھ اور سکھ کا تعلق اس کے محسوس کرنے سے ہے۔ اگر کوئی شدت سے یہ محسوس کرے کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا تو

بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ایک تو یہ سوچ دوسرے میں نے ڈاکٹر کی علاج کے ساتھ ساتھ چینی طب کو بھی آزمایا ہے۔ یہ ایک جرت انگیز طریقہ علاج ہے۔ میں اس وقت بالکل ٹھیک تو نہیں ہوں۔ تاہم کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“

میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”ڈاکٹر! تم تو مارشل آرٹس کے باہر اور مضبوط اعصاب کے مالک ہو لیکن ساحل اس مہارت اور مضبوطی میں تمہارا عشر غیر بھی نہیں۔ وہ بھی دشمنی حالت میں اسپتال پہنچائی گئی تھی۔ کیا اس وقت وہاں بستی میں وہ بھی تمہاری طرح ہنس مسکرا رہی ہو گی؟“

”اگر وہ مسکرا نہیں بھی رہی تو بھی تکلیف میں نہیں ہوگی۔“ وہ پورے یقین سے بولا ”ایک تو اسے پہنچنے والی چوٹیں شدید نوعیت کی نہیں ہیں دوسرے میں نے اس کا مناسب علاج بھی کیا ہے۔ مجھے امید ہے آج رات جب تم اس سے ملاقات کرو گے تو اسے نارمل پاؤ گے۔“

ڈاکٹر موگ نے ساحل کے سلسلے میں دو تین مرتبہ رات میں ملاقات کا ذکر کیا تو میں سوال کیے بنانہ رہا۔ اس سوال میں ہزاروں سال سے پیاسے کی بے تابی اور ممکن شامل تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”رات ہی کو کیوں ڈاکٹر۔ میں ابھی اور اسی وقت ساحل سے ملنے کیوں نہیں جاسکتا؟“

”جانتے ہو لیکن میرے بغیر وہاں جہیں کوئی لفٹ نہیں کرائے گا۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”بلکہ تم اگر ایک ایک شخص سے بھی ساحل کے بارے میں پوچھتے پھر دو گے تو مجھے کوئی اس کی دہاں موجودگی کا اقرار نہیں کرے گا۔ تمہاری ساتھی کو نہایت ہی خفیہ انداز میں ایک گھر میں ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ اس وقت بدلے ہوئے گیٹ اپ میں ہے اور اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے وہاں موجود ہے۔ اس گھر کے تمام افراد میرے وفادار ہیں۔ تم مصیبت اور احتیاط پسندی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جانوس نے بھی مجھے بتایا ہے تم خاصے جذباتی ہو رہے ہو۔“

ڈاکٹر موگ نے جانوس کا حوالہ دیا تو مجھے یاد آگیا ”میں نے اس شخص کے ساتھ خاصا متخار رو یہ اختیار کیا تھا۔ میں نے پوچھا ”کیا جانوس نے ہیری کوئی شکایت کر دی؟“

”ہاں۔“ موگ نے اثبات میں گردن ہلائی ”مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری ایک اپنی اہمیت ہے۔ جانوس کی شکایت کو میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا ہے۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر! اپنی بات تو یہ ہے تمہارا یہ آدمی جانوس میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”میں نے کہا تمہاری اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔“ وہ تاکید سے کہنے لگا ”بہر حال اتنا بتا دو کہ جانوس کھٹنڈو کی ایک بااثر شخصیت ہے۔“

میں نے جانوس کے موضوع کو پس پشت ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا ”تم کہہ رہے ہو تمہارے بغیر میرا ہستی میں جانا بیکار ہے۔ میں کسی بھی صورت اپنی ساحل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا مگر پھر تم ابھی میرے ساتھ ادھر کیوں نہیں جاتے۔ کیا ایسا کرنے میں کوئی قباحت ہے؟“

”قباحت تو کوئی نہیں مگر میں شام سے پہلے شہر کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”یہاں مجھے نہایت ہی اہم امور فحشاء ہیں۔ ربی کے وفادار بڑی سرگرمی سے ساحل کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تم لوگوں پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ بھی ہوا ہے۔ وہ لوگ میرے ہر تعلق والے کو ”قتل“ کر رہے ہیں۔ جہاں بھی میرے کسی جاننے والے کے ساتھ کوئی کپل دکھائی دیتا ہے وہ یہی سمجھتے ہیں یہ کپل میرے اور ساحل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ ربی کے حکم پر ساحل کو حاصل کرنے کے لیے کھٹنڈو کو دھوکا دے کر قاتل کر رہے ہیں۔ میرے بچنے پر جو مار دھاڑ کا کارروائی ہوئی وہ بھی اسی تلاش کے سلسلے کی کڑی ہے۔ انہیں یہاں ساحل تو نہیں ملی البتہ میں نے انہیں ڈرائی کلین کر کے ”رخصت“ کیا ہے۔ اب وہ کبھی اس طرف منہ دینے کی ہمت نہیں کریں گے۔ میں نے اس واقعے کو پولیس تک پہنچا دیا ہے۔ تمہاری آمد سے تھوڑی دیر پہلے ہی چند پولیس والے یہاں کی رپورٹ تیار کر کے لے گئے ہیں۔“

ڈاکٹر مونگ جن پولیس والوں کا ذکر کر رہا تھا میں نے ٹیکسی میں رجبے ہوئے اپنی بائیں آنکھ سے انہیں ڈاکٹر کے ہنگے میں بیٹھ دیکھا تھا لیکن ڈاکٹر نے ابھی مجھے جو معلومات فراہم کیں ان میں مجھے چونکا دینے والی دو باتیں تھیں۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر ان دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھی۔ یہ بات تو میرے علم میں آچکی تھی کہ جانوس نے ڈاکٹر کو صبح دالے واقعے کی رپورٹ پیش کر دی تھی لیکن ڈاکٹر مونگ نے اپنے بیان میں دو قاتلانہ حملوں کا ذکر کیا تھا۔ میں نے پوچھا ”ڈاکٹر مونگ! کیا ہماری یہاں آمد سے قبل انسپکٹر شیوا سے تمہاری بات ہوئی تھی؟“

اس کے ہونٹوں پر نیم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ میرے سوال

کے متعدد تک پہنچ گیا تھا۔ دھیمے لہجے میں اس نے جواب دیا ”ہاں! تمہاری آمد سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے میری شیوا سے طویل بات ہوئی ہے۔ میں نے ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔ جب تم لوگوں کے آنے کا متوقع وقت گزر گیا تو مجھے تشویش ہوئی اور میں نے شیوا کو نون کھڑا کیا۔ اس نے مجھے دوسرے قاتلانہ حملے کے بارے میں بتایا ہے۔ دو لاشوں اور دو زخموں کو پولیس تحویل میں اسپتال پہنچایا جا چکا ہے۔ جلد ہی کوئی بڑا انکشاف ہونے والا ہے۔ مجھے امید ہے ان لوگوں کا تعلق ربی کی بھیجی ہوئی ٹیم ہی سے ثابت ہوگا۔“

میں نے انھیں زدہ لہجے میں دریافت کیا ”ڈاکٹر! اس خون ریز واقعے کے بعد انسپکٹر شیوا تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر رابطے میں اسے ناکامی ہوئی۔ ایسا کیوں کر ہوا؟“

”میرا موبائل آف تھا۔“ وہ بڑی رसान بولا ”اور گھریلو فون کو میں نے دانستہ اندیشہ نہیں کیا یا یوں سمجھ لو مجھے فون کا ریسیور اٹھانے کی مہلت نہیں مل سکی۔ مثنیٰ تھوڑی دیر تک بجتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ دراصل اس وقت میں حملہ آوروں سے نکلنے میں بے حد مصروف تھا۔“

اس کا جواز مقبول تھا لیکن میں ایک اور زاویے سے بھی اسے ذہن کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا ”ڈاکٹر مونگ! تم نے بتایا ہے اس ہنگے پر ہلا ہونے والے چار خفہ ناک فائرنگ کا تعلق ربی کے گروپ سے ہے اور وہ تمہاری اور ساحل کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ ٹھیک ہے ساحل تو یہاں تھی ہی نہیں انہیں کیا تسلی مگر وہ یہ جاننے میں تو کامیاب ہو گئے کہ تم اس ہنگے میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ یہ بھی کچھ کم تشویش ناک بات نہیں ہے!“

”اپنے ذہن کو مت الجھا دو جدان!“ وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا ”تو پولیس والوں سے میٹنگ کرنے اور تمہارے استقبال کے لیے میں نے اپنے چہرے کو صاف کیا ہے ورنہ ان چار حملہ آوروں کی تو میں نے کسی اور ہی روپ میں خدمت کی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ڈاکٹر مونگ سے پچھلا کر گئے ہیں۔“

”اوہ!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شیوا کی جیب میں سے جب میں نے مونگ سے تصوراتی رابطہ کیا تو وہ چار ماہر مارشل آرٹس سے نبرد آزما تھا۔ اس لحاظی جھانک میں اس کے چہرے کے بارے میں غور نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے میں یہ نہ جان سکا کہ وہ اپنے اصلی حلیے میں تھا یا میک اپ میں۔ بہر حال میرا تصور مجھے کسی

غلط جگہ پر نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سنی اسپتال میں میں نے جب بھی ڈاکٹر کے ماحول میں جھانکا وہ مجھے اپنی ہی صورت میں نظر آیا۔ اس حوالے سے میں نے اس سے استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

”ہاں! اسپتال میں بعض مجبوریوں کے باعث میں تمام وقت میک اپ میں نہیں رہ سکا۔ البتہ جب ہمیں مردوں کے ہمیں میں اسپتال سے نکالا گیا تو اس سلسلے میں سب سے بڑا سہارا میک اپ ہی کا استعمال کیا گیا۔“

میرے ذہن میں ساحل کے حوالے سے ایک کانٹا سا چھپا ہوا تھا۔ دراصل اصل اور ٹکی کا چکر اتنی بار چلا کہ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ کھٹنڈو میں پائی جانے والی ساحل کے حوالے سے اب تک جو بھی شہادتیں حاصل ہوئیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا یہ میری ہی ساحل ہے کوئی ڈی نہیں تاہم میں نے ڈاکٹر مونگ سے استفسار ضروری سمجھا۔

”ڈاکٹر! کیا تمہیں یقین ہے جس لڑکی کو تم نے ہستی میں پہنچایا ہے وہ میری ساحل ہی ہے؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

ہماری آخری ملاقات چند روز قبل سیٹل میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں زوندار آئی لینڈ سے سیٹل پہنچے تھے۔ ساگ فون نے ہنگامی فیصلہ کر کے ڈاکٹر مونگ کو نیپال اور مجھے میری خواہش کے مطابق نیویارک روانہ کر دیا تھا۔ نیویارک خصوصاً مین مین میں میں جن سنسنی خیز حالات سے گزرا ان کا خلاصہ میں نے ڈاکٹر مونگ کے گوش گزار کیا اور ڈی ساحل کا قصہ بیان کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہیں اس شاطر ربی نے ہمیں یہی نہیں دھوکا دینے کے لیے یہاں بھی کوئی ساحل کی ڈپلی کیٹ تو نہیں بھیج دی۔ تم نے تسلی کر لی تاہم ہماری ساحل ہی ہے؟“

وہ پھر اعتماد انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”میں نے تو تسلی کر لی۔ اب تم رات میں اس سے ملاقات کر کے اپنا اطمینان کر لینا۔“

میں نے ایک اہم سوال کیا ”ہم کب تک یہاں سے روانہ ہوں گے؟“

”رات نو بجے۔“ اس نے جواب دیا ”اور اگر لارڈ بدھا کی مرضی شامل حال رہی تو ٹھیک دس بجے ہم ہائی وے والی اس ہستی میں ہوں گے۔“

جس طرح ہم مسلمان اپنے روزمرہ کے کاموں میں خدا

کی مرضی اور مصلحت کو بہت اہمیت دیتے ہیں بالکل اسی طرح بدھ کے پیر و کار لارڈ بدھا کا ذکر کرنا نہیں بولتے۔ بس اپنے اپنے عقیدے اور اعتقاد کی بات ہے۔ انسان کو جس سہارے جس دیلے سے فائدہ پہنچنے لگتا ہے وہ اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مذہب کی روح کو سمجھ کر اختیار کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ نسبتاً کم رہی ہے چاہے وہ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو۔ دیکھا دیکھی کسی تہذیبی و تمدنی مجبوری اور نظریہ ضرورت کے تحت خود کو بڑا مذہبی ظاہر کرنے والوں کا تناسب ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے تسلیم کریں یا نہ کریں!

میں نے لگے ہاتھوں ڈاکٹر مونگ سے یہ بھی پوچھ لیا ”دن کا باقی حصہ کھٹنڈو میں گزار کر تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی اپنی مصروفیت کے بارے میں بتا دو۔ ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آ جاؤں!“

”جدان! تم ہر حالے اور زاویے سے میرے لیے مفید ہو اور اپنے کسی منصوبے کے بارے میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“ وہ دوستانہ لہجے میں بولا ”لیکن میں یہ چاہوں گا کہ تم رات تک مجھے سے الگ نہ رہو۔ زیادہ مناسب یہی ہے اسی ہنگے میں اپنی ساتھی کے ہمراہ آرام کرو۔ تمہارا کام رات کے بعد شروع ہوگا۔“

”میں سمجھ نہیں سکا ڈاکٹر!“ میں نے متذبذب انداز میں ڈاکٹر مونگ کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”مجھے باخبر ذرا لگے سے پتا چلا ہے کہ آج آدمی رات کے بعد ربی کی ٹیم ایک اور کوشش کرے گی۔ وہ لوگ بدھ عبادت گاہ کے خفیہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شب خون ماریں گے۔ آج کی رات بہت اہم ہے۔ عبادت گاہ میں خون کی ندیاں بھی بہہ سکتی ہیں۔“ وہ ایک لمبے کوساس لینے کے لیے توقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس عبادت گاہ کی تاریخ سے تم بھی بے خوں آ گاہ ہو۔ آج تک جس کسی نے بھی بیش بہا خزانے تک پہنچنے کی کوشش کی وہ بے موت مارا گیا۔ ربی پہلی کوشش میں بہت ساجانی اور مالی نقصان اٹھا چکا ہے۔ دوسری کوشش وہ ساحل کی راہنمائی میں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن یہ تین گنہگار ان کے ہاتھ سے پھسل کر میرے قبضے میں آ چکا ہے لہذا آئے والی رات وہ ساحل کے بغیر ہی۔۔۔ دوسری کوشش کریں گے۔ ساحل کی تلاش بھی بڑی شدومد سے جاری ہے۔“

ڈاکٹر مونگ نے ساحل کو کوئی ٹھہرے سے تعبیر کیا تو مجھے بہت دکھ ہوا لیکن میں اپنی تکلیف کا اظہار کیے بغیر پوری طرح

اس کی جانب متوجہ رہا۔ تھوڑے وقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”میں اپنے دشمنوں کے حتی پروگرام کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ رہی کے چند آدمی بدھ نسل کنڈ والی عبادت گاہ کے آس پاس موجود ہیں۔ رہی کا ایک نائب جی نوڈ اس مشن کی کمان سنبھالے ہوئے ہے۔ امریکا بھاردار کا پوری دنیا میں جواڑو سوخ سے اس سے تم پر خوبی واقف ہو۔ ان لوگوں کو ہر جگہ آسانیاں میسر آ جاتی ہیں۔ شہنشاہ کی ایک طاقت ور سیاسی شخصیت جی نوڈ کا ساتھ دے رہی ہے۔ جو کنڈر پال نامی یہ سیاسی شخصیت ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے یہاں بہت مشہور ہے۔ اس سے تم حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتا، تم میرے ساتھ باہر نکلو اور کسی نئی مصیبت میں الجھ کر واپس نہ آ سکو۔ ہمیں ٹھیک نو بجے رات یہاں سے بستی کی طرف روانہ ہونا ہے۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرنا ہے اور پھر آگے روانہ ہو جانا ہے تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

بات کے اختتام پر ڈاکٹر موگ نے گہری سواہی نظر سے مجھے دیکھا اور میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ آگے بڑھنے کا مطلب تھا بدھ نسل کنڈ کی عبادت گاہ کی حفاظت کرنا۔ مجھے یہ بھی پر خوبی اندازہ تھا کہ وہ بستی میں میری خاطر ہی تھوڑی دیر رکنا چاہتا تھا۔ میں نے بریکسٹل تذکرہ پوچھ لیا۔

”ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ باہر نہیں نکلوں گا۔ لی یان کے ہمراہ جانے کی اجازت تو ہے نا؟“

”تم لوگوں پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جتنی بھی احتیاط کروا چکا ہے۔ دیے جو تمہاری مرضی۔“

اس نے فیصلے کی گیند میری کورٹ میں پھینک دی تو میں نے کہا ”ہمارا سامان وغیرہ انا پورا ہوٹل میں رکھا ہے۔ ہم شام سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے نکلیں گے۔ اپنا سامان لے آئیں گے اور کچھ سیر وغیرہ بھی ہو جائے گی۔ ویسے.....“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک نظر ڈاکٹر موگ کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ویسے بھی ابھی تک یہی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ قاتلانہ حملہ ہم پر نہیں بلکہ تم سے متعلق لوگوں پر ہوا ہے اور تم نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے۔ ہم تو امریکا سے سیاحت کی غرض سے نیپال آنے والے دو میاں بیوی ہیں۔ ہمارا کسی بھڑے بھڑے سے کیا واسطہ؟“

”میں تمہاری دلیل نوڈ نہیں کروں گا۔“ وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن ان دونوں قاتلانہ حملوں میں تم میرے ساتھیوں کی گاڑیوں میں پائے گئے ہو۔ نہ صرف پائے گئے ہو

بلکہ حقیقی معنوں میں تمہی نے حملہ آوروں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا ہے۔ اس کا مطلب ہے اب تم دونوں پر بھی میرے ساتھیوں کا ٹیل چسپاں ہو چکا ہے۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ”میں یہ فیصلہ تم پر چھوڑ چکا ہوں۔ اگر تم نہیں رکے والے تو ایک چھوٹا موٹا چکر لگالینا باہر کا۔ مگر احتیاط کے ساتھ۔“

ڈاکٹر موگ کے آخری جملے میں ایک تنبیہ پر شبیدہ تھی۔ میں نے کہا ”اب ہاتھ پاؤں باندھ کر پورا دن گھر کے اندر رہی تو نہیں گزرا جا سکتا!“

جواب میں ڈاکٹر موگ نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کا بندوبست ڈاکٹر موگ کے سہ ملازم چندر نے کیا تھا تاہم اس دوران میں پولیس کے دو سادہ لباس جوان بنگلے کی حفاظت کے لیے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں نہایت ہی مستعد اور عقابانی نگاہ رکھنے والے پولیس اہلکار تھے۔ یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے پر چار افراد نے دھاوا بولا تھا۔ پولیس کا فرض بنتا تھا وہ اس بنگلے میں بسنے والوں کی حفاظت کا انتظام کرے اور اس نے یہ انتظام کر دیا تھا۔

کھانے کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر موگ بڑی اداس نظر سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد لی یان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ کھانے کے اختتام پر جب لی یان ہاتھ دھوئے کے لیے اٹھی تو میں نے ڈاکٹر موگ سے پوچھ لیا۔

”ڈاکٹر لی یان کے حوالے سے تم کیا سوچ رہے ہو؟“

”آں!“ وہ چوکا ”کچھ نہیں۔“ اس نے بات تھمادی۔

میں نے کہا ”بتانا نہیں چاہتے تو دوسری بات ہے لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم جب بھی لی یان کی طرف دیکھتے ہو تو تمہاری آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی بھر جاتی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

اس نے ایک گہری سانس چھوڑی اور گہیر آواز میں بولا ”وہ جان! میں اپنے احساسات کی وضاحت نہیں کر سکتا لیکن اتنا جان لو کہ مجھے اس لڑکی طرف سے گہری تشویش ہے!“

”دہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”تمہاری تشویش مجھے بھی پریشانی میں مبتلا کر رہی ہے۔“

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اس کی پراسرار خاموشی سے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میں نے پوچھا ”کیا لی یان کی بھی حوالے سے میرے لیے صحر ثابت ہو سکتی ہے؟“

”یہ بات نہیں وچدان۔“ وہ جلدی سے بولا ”لی یان بہت اچھی اور متوازن لڑکی ہے۔ میری تشویش اور فکر مندی کا سبب یہ ہے کہ میں محسوس کر رہا ہوں عقرب لی یان کو کوئی بہت بڑا صدمہ پہنچنے والا ہے۔“

میں نے چونکے ہوئے انداز میں سوال کیا ”کس نوعیت کا صدمہ؟“

”میں فی الحال اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔“ ڈاکٹر موگ نے حذب ذہب انداز میں کہا۔

اسی وقت لی یان واپس آگئی اور ہم اس موضوع پر مزید گفتگو نہ کر سکے۔

ڈاکٹر موگ نے با آواز بلند کہا ”کھانے سے تو فارغ ہو گئے۔ میرا مشورہ ہے تم دونوں تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لو۔ تم لوگوں نے صبح سے بڑی ”مشقت“ اٹھائی ہے۔ شام میں فریٹس اپ ہو کر سیر سہانے کو نکل جانا۔ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ”ڈ“ میں تم لوگوں کو کمراد کھادوں۔“

اسی وقت ڈاکٹر کا نیپالی ملازم چندر وہاں پہنچا اور اطلاع دی کہ جانوس لٹے کے لیے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چندر کو کوئی اشارہ کیا تو وہ اٹلے قدموں واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر نہیں کرادکھانے کے لیے ہمارے ساتھ ہوا۔

چند سیکنڈ بعد ہم ایک شاندار بیئر روم میں تھے۔ ڈاکٹر ہمیں بیئر روم میں چھوڑ کر چلا گیا تو لی یان کی صورت پر نگاہ پڑتے ہی ڈاکٹر کی معلوم تشویش میرے ذہن میں چکرانے لگی۔ ڈاکٹر موگ ایسا شخص نہیں تھا کہ اس کی کسی بھی بات کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔ وہ سامگ فوجی عظیم المرتبت شخصیت کا خلیفہ (نائب) تھا۔ میں سامگ فوجی روحانی ملائیٹوں کا محرف تھا، ڈاکٹر موگ ریفوشے کے کئی کمال بھی میرے تجربے میں آچکے تھے۔ لی یان کے حوالے سے اس نے اپنے جن مبہم احساسات کا اظہار کیا تھا اس سے میں بھی اچھا خاصا فکر مند ہو گیا۔

یہ فکر مندی چہرے سے چھلکی تو لی یان پوچھے ”بانا رہ سکی“

”کیا ہو وچدان.....“ میرا مطلب ہے شون!“ وہ گڑبگڑائی بھر سنبھل کر بولی ”تم خاصے لکھے ہوئے دکھائی دے رہے ہو؟“

میں اپنی پریشانی کے بارے میں اسے کیا بتاتا اس کا دھیان بنانے کے لیے کہہ دیا۔ ”جب تم مسلسل غلطی پر غلطی کیے

جاؤ گی تو میں الجھوں گا نہیں تو پھر کیا کروں گا؟“

”میں نے کیا کیا ہے!“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”میں وچدان نہیں شون ہوں۔ تمہارا شوہر شون!“

میں نے اس کی غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے بات تھمادی ”اور یہ نکتہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا؟“

”میں سنا کہ اس کی کسی نکل بھی پھر دہشت جلی گئی۔“

اس کی اس حرکت نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اس پر مضحکہ مار کر ہنسا جاتا۔ میں یک دم سنجیدہ ہو گیا اور قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

”لی یان! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بے طرح ہنسے چلی جا رہی ہو۔ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنا دیا ہے؟“

”یہ لطیفہ نہیں تو اور کیا ہے؟“ وہ ہنسی کو روکتے ہوئے بولی۔

میں مزید الجھ گیا ”کیا مطلب؟“

”تم نے کہا..... تم میرے شوہر شون ہو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے ہم میاں بیوی کا رول کر رہے ہیں۔ تم میرے شوہر ہو اور نہ ہی میں تمہاری بیوی۔ میرا خیال ہے کم از کم تمہاری میں تو اس ڈھونگ کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اتنا ڈوب کر میاں بیوی کا رول کرنے لگے تو تمہاری کے کلمات میں کوئی سنجیدہ مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔“

وہ ایک فطری بات کر رہی تھی۔ اس قسم کا کوئی مسئلہ کھڑا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اس موضوع کو بحث نہیں بننے دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”بس اتنی سی بات پر تم جتنے لگا رہی تھیں؟“

جواب میں وہ ایک مرتبہ پھر ہنس دی ”دراصل بات یہ ہے کہ شون ایک بورنگ انسان ہے۔ مجھے اس بات پر ہنس آئی تھی کہ تم شون کیسے ہو سکتے ہو۔ تمہاری زندگی تو ایڈوچر اور سنسنی خیزی سے بھری پڑی ہے۔ ایک دو نظارے تو دیکھ چکی ہوں۔ آئندہ یہ آنکھیں پتا نہیں کیا کیا دکھائیں گی!“

بات ختم کرتے ہی وہ غصہ خیز انداز میں مسکرای۔

میں بے حد محتاط نظر سے اس غلیظاتی حسینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ اس وقت مجھے خطرے کی ایک گھنٹی دکھائی دے رہی تھی۔ جب کوئی عورت کسی مرد کے سامنے اپنے شوہر کے عیب گواتے ہوئے اس کی تعریف کرے تو ”اس“ کو الٹ ہو جانا چاہیے۔ لی یان مجھے ایڈوچر اس اور شون کو بورنگ کہہ رہی تھی۔ اگرچہ یہ حقیقت بھی ہوتی تو مجھی اسے اس اظہار میں احتیاط

کرنا چاہیے تھی لیکن امر کی کلچر کے پروردہ مرد وزن بڑے بے دھڑک اور سن موچی ہوتے ہیں اور اکثر معاملات میں عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ بولڈ نیس کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لی یان اگر چہ فلپائن کی تہذیب تاہم ایک طویل عرصے سے وہ امریکا بہادر کی نفاذ میں سانس لے رہی تھی۔ اس کا بہادر بن جانا منطقی بات تھی۔

میں نے موقع کی مناسبت سے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا ”شون تمہاری نظر میں یورجنگ ہوگا مگر میرا خیال تم سے بہت مختلف ہے۔“

”اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے کیا اختلاف ہے؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا ”میری نظر میں شون کے لیے ”بے چارہ“ کا ٹائٹل زیادہ موزوں رہے گا!“

”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم اپنے طرز عمل کو دیانت داری سے ناپو تو تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ”کیا تم مسلسل چار سال سے اس کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی چلی آ رہی ہو؟“

”تم مردانہ ہلاک بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

”میں ذہنی حقیقت اور فطری اصول بیان کر رہا ہوں۔“

”میں نے بھی تمہیں اپنی مجبوری بتادی تھی۔“

”ٹھیک ہے“ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔“ میں نے کہا۔

لی یان میرے حساب سے کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھی۔ شون سے اس کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے مگر ابھی تک وہ دوسرے تین نہیں ہوئے تھے۔ لی یان بچہ پیدا کرنے سے گریز ابھی اور اس دوران میں اس کے تین اہلکار ہو چکے تھے۔ وہ ڈائجسٹ کے حق میں تھی لیکن ڈیپوری کے مراحل سے گزرتے ہوئے اس کی جان جاتی تھی۔ خیر ڈیپوری بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ آج کل آپریشن کا زمانہ ہے۔ لی یان کی پریشانی کئی ماہ پر مشتمل وہ عرصہ تھا جس کے بعد ڈیپوری کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اس عرصے کے تشیب و فراز تو بہر حال اسی کو جھیلنا تھے اور وہ اسی سے خوف زدہ تھی۔ میں اس کے مسئلہ کو بڑی حد تک سمجھ گیا تھا اور اس کے ”سائیکو لاسس“ کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس کے بالکس شون کو اپنے بچے کی شدید خواہش تھی!

”بعد میں بھی یہی بات ہوگی وجدان..... شون!“ وہ

زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”تم آرام کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ڈرائیونگ جالوس کیا خبر لایا ہے!“ میں نے کہا ”جلدی واپس آ جاؤں گا۔“

پھر اس کا جواب سنے بغیر میں وہاں سے چلا آیا۔ جالوس اور ڈاکٹر مونگ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے لی یان کے حوالے سے میرا ذہن متضاد خیالات میں گھرا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لی یان کے مترنم اور زندگی سے معمور قہقہے سنے تھے اور ڈاکٹر مونگ کا احساس بتاتا تھا ”اے کوئی بہت بڑا مقدمہ ملنے والا ہے۔ میں اپنے مشاہدے اور ڈاکٹر مونگ کے تجربے کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا شاید اسی لیے میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سے دکھ سے ہلکتا ہوئے والی تھی؟

میں ڈاکٹر مونگ اور جالوس کے ساتھ جا بیٹھا۔ انہوں نے میری آمد کو ”محسوس“ نہیں کیا اور اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ جالوس اس وقت مونگ کو صبح والے دانے کی تفصیلی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ اس کے مطابق ”سرخ چپ جس میں تین سال افراد نے آج صبح ہمارا تعاقب کیا“ وہ چوری کی ثابت ہوئی تھی۔ ہم نے مسلح حملہ آوروں کی وہ درگت بتائی تھی کہ ان میں سے دو موقع پاتے ہی وہاں سے فرار ہو گئے۔ تیسرا تو واضح کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس بے ہوش شخص کو جالوس نے پولیس کے حوالے کر کے تحقیق کرائی تو کوئی اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ وہ ایک تھرڈ ریٹ فنڈ تھا جو معاوضہ لے کر لٹ و غارت گری جیسے کام بندوق کرتا تھا۔ کسی نامعلوم شخص نے بھاری معاوضے کے عوض اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس شخص نے سارا الزام ان دو بھگتوزوں پر ڈال دیا جو صبح سے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ شخص ابھی پولیس کی تحویل میں تھا اور اس پر مزید تفتیش جاری تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے پوری بات سننے کے بعد گھبراہٹ میں کہ ”مجھے تو ان دولوں واقعات میں ایک خاص ربط نظر آ رہا ہے کہ حملہ آوروں کا تعلق بلا واسطہ یا بالواسطہ ہمارے دشمنوں سے ہے۔“

مونگ کا یہ جملہ احتیاط کا دامن تھا ہے ہوئے تھا۔ ہم سمجھ گیا اس کا اشارہ مونے ہائمن اینڈ کمپنی کی جانب تھا۔ ذہن نہیں جالوس نے اس سے کیا مطلب اخذ کیا تھا۔ میں یہ



نہیں جانتا تھا ڈاکٹر نے اس معاملے میں جانوس کو کس حد تک انوالو کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر کو میں نے بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اس کا میزبان مجھے ایک ذرا پسند نہیں آیا۔ اسی لیے وہ گفتگو کے دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کر رہا تھا۔ جس پر ہم دونوں کا بیک وقت اظہار رائے ضروری سمجھا جاتا۔ ڈاکٹر مونگ مجھے جانوس کے باثر ہونے کے بارے میں تو بتا ہی چکا تھا۔ اس موقع پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ جانوس نے کھنڈ میں خفیہ پراپرٹی بھی بنا رکھی ہے۔ بہت سے کاروبار جن کا مالک لوگ مکی اور شخص کو سمجھتے ہیں وہ درحقیقت جانوس کی ملکیت تھے۔ ان میں ایک مثال ”ہول بیلو میگو ڈا“ کی تھی۔ کتنی پاتھ پر واقع شان دار ہوٹل ”بیلو میگو ڈا“ کا اصل مالک جانوس ہی تھا۔

یہ سنجیدہ گفتگو جاری ہی تھی کہ انکسپر شیوا کا فون آگیا۔ فون ڈاکٹر مونگ ریفوشے نے ریسیور کیا۔ شیوا پولیس ہیڈ کوارٹر سے بات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر بڑی توجہ سے اس کی رپورٹ سننے لگا۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر پلٹی جلی کیفیت نمودار ہوتی رہی۔ کبھی وہ انتہائی سنجیدہ ہو جاتا اور کبھی اس کے تاثرات سے نظر جھٹکے لگتا۔ ریسیور کئے کے بعد اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔

”دو مردہ افراد کی شناخت نہیں ہو سکی۔ شدید زخمی اور بے ہوش افراد نے ابھی تک زبان نہیں کھولی۔ ان پر ہونے والے تشدد سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہیں اور تھانہ نیبل وغیرہ ان کے لیے نئی بات نہیں۔ سرخ جیب کی طرح وہ گاڑی اور ہیوی ڈیوٹی ٹرک بھی چوری شدہ ثابت ہوئے ہیں۔“ وہ چند لمحات کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکھ کر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دونوں قاتلانہ وارداتوں میں بہت سے اشارے مشترک ملتے ہیں۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ واقعات ایک ہی ہیڈ کی دو شاخیں ہیں بہر حال شیوا کی انکیم مجھے پسند آتی ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے دوبارہ متوقف ہوا پھر بتانے لگا ”شیوا آج کی رات انہی دونوں افراد پر مختلف انداز میں ”دباؤ“ ڈال کر ان کی زبان کھلوانے کی کوشش کرے گا۔ اگر صبح تک اسے کامیاب نہ ہو تو پھر انہیں رہا کر دیا جائے گا۔“ ”انہیں رہا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا ڈاکٹر مونگ!“ جانوس نے متعرض لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر بولا ”یہ رہائی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوگی۔“ تھانے سے انہیں رخصت کرنے سے پہلے ہی ان کی نگرانی کا مکمل بندوبست کر لیا جائے گا۔ یہ دو ہوشیار قسم کے سادہ لباس پولیس والے سائے کے مانند ان کے وجود کا حصہ بن جائیں گے۔ وہ ریسر اور ڈریکٹر کا کام کریں گے۔ اس طرح پولیس ہیڈ کوارٹر زکوان دو افراد سے متعلق لمحہ بہ لمحہ رپورٹ ملتی رہے گی اور یہ بتا چل جائے گا کہ ان لوگوں کا ٹھکانا کہاں ہے۔ وہ کس کے لیے کام کرتے ہیں اور اس سے رابطے کے لیے کیا ذریعہ اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح فساد کی جزئیات رسائی حاصل ہو جائے گی۔“

”ایک سیلٹ!“ ڈاکٹر مونگ خاموش ہوا تو میں نے سراپے والے انداز میں کہا ”شیوا ایک ذہین پولیس انسپکٹر ہے۔“

جانوس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”اس نوعیت کا کوئی حربہ اس شخص کے ساتھ آزمانے کی ضرورت نہیں جیسے میں نے پولیس کے حوالے کیا ہے۔ اس پر تو سیدھا سیدھا قتل کا مقدمہ چلے گا۔ اس واردات میں میرا ایک بیٹی آدمی جان ہار گیا ہے۔ میں اپنے شو فرنگسٹھا کی موت کو آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔“

ہمارے درمیان مزید تعویذ و تریک اسی نوعیت کی گفتگو جاری رہی پھر جانوس ڈاکٹر مونگ سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”وہ جان! میں اب باہر نکلنے کی تیاری کروں گا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام میک اپ اور گیٹ اپ ہے۔ اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں۔ تم دونوں تو پانچ کے بعد ہی نکلو گے۔ میرا مشورہ ہے تم بھی لی یان کی طرح تھوڑا آرام کرو۔“ وہ ایک لمحے کے وقفے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا ”تم لوگوں کو گاڑی کی ضرورت ہے یا جیکسی میں سبز کرنا پسند کرو گے؟“

”میرا خیال ہے جیکسی زیادہ مناسب رہے گی۔“ میں نے جواب میں کہا ”ہم دونوں ٹورسٹ ہیں۔ کسی بھی ایجنسی اور غیر ملک میں ٹورسٹ جیکسی اور ہوٹل میں ایک گھر اترتے پانا جاتا ہے۔ ہوٹل کو ہم چھوڑ رہے ہیں کم از کم جیکسی سے تو ہمارا تعلق بحال رہنا چاہیے۔“ آخر کو ہم ٹورسٹ ہیں!“

آخری جملہ میں نے معنی خیز انداز میں ادا کیا تو ڈاکٹر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ابھی ہوٹل انا پورٹا سے چیک آؤت نہیں کرو۔ وہاں چاؤ ضرور اور انتہائی ضروری سامان بھی اٹھالو۔“ دیکھتے ہی اس ہوٹل میں

تہہ کی تین دن کی بنگ ہے۔ تم وہاں قیام کر دیا نہ کرو مگر بنگ کو چلے دو۔ اس طرح ٹورسٹ ہوٹل اور جیکسی کا ثالث قائم ہو رہا ہے۔ اور یہ فائدہ بھی ہر وقت تمہارے ہاتھ میں رہے گا کہ کسی ایجنسی کی صورت میں ان تین دنوں کے دوران تم ہی وہاں خاموشی سے ”پناہ“ حاصل کر سکتے ہو۔“ ”آئیڈیا عمدہ ہے ڈاکٹر۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”سمجھو میں نے تمہارا مشورہ مان لیا۔“

”سیر و تفریح کے لیے جہیں رقم کی ضرورت ہو تو مجھ سے ملو۔“ ڈاکٹر مونگ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

میں نے کہا ”وہ تو یہ ہم دونوں کے پاس اپنے اپنے کریڈٹ کارڈز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ڈالر کی صورت

میں کر کے نوٹ بھی ہیں۔“ ”کھنڈ میں صرف ایم۔ ایکس (امریکن ایکسپریس) اور ویزا کارڈ قبول کیے جاتے ہیں۔“ ڈاکٹر مونگ نے بتایا ”ڈالر کے مقابلے میں یہاں کارکنی ایجنسی اٹھاون روپے فی امریکی ڈالر ہے۔ اس حساب کتاب کو بھی ذہن میں رکھنا۔“ ”میں کوئی پہلی مرتبہ نیپال نہیں آیا ہوں مونگ۔“ میں نے غصے سے لہجے میں کہا ”یہاں کے رسم و رواج اور ادب آداب سے مجھے گہری واقفیت حاصل ہے۔ تم گلہ نہ کرو میں کسی بھی عاذ پر براہیں کھاؤں گا۔“

”دش گڈ۔“ اس نے ایک مختصر سا جملہ ادا کرنے پر اکتفا کیا۔

نیپال میں اغیار اور پاکستان کی طرح رد پنا چلتا ہے۔ تاہم ویلیو وغیرہ میں فرق ہے۔ امریکی ڈالر اور نیپالی روپے کا حساب تو ڈاکٹر مونگ نے بتا دیا۔ اغیار روپے کے مقابلے میں نیپالی روپے کی قدر و قیمت کم ہے۔ ایک سو اغیار روپے ایک سو اڑھائی نیپالی روپے کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ نیپال کے کرنی نوٹ ایک ہزار پانچ سو ایک سو پچاس ”دس“ پانچ ”دو“ اور ایک روپے کی صورت میں ہیں جبکہ دو پانچ ”دس“ پچاس اور پچاس روپے کے سکے رائج ہیں۔

میں نے ڈاکٹر کی اس گفتگو میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی۔ اسی حوالے سے میں نے پوچھ لیا ”ڈاکٹر! میں محسوس کر رہا ہوں جب ہم شام میں یہاں سے نکلیں گے تو اس وقت تک تمہاری داہنی ٹانگیں ہوئی۔ تم سے ملاقات کیے بغیر ہی ہمیں جانا ہوگا۔“

”ہاں! ایسا ہو سکتا ہے!“ اس نے ڈیو بلیک جواب دیا۔ میں نے اس سلسلے میں زیادہ کرید نہیں کی اور اپنے مطلب کی بات پوچھ لی۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک

کاٹا سا پیوست تھا اور جانوس کی موجودگی میں ہونے والی بات چیت کے بعد تو یہ کاٹا کچھ زیادہ ہی چبھنے لگا تھا۔ میں اس چبھن کو پہلی فرصت میں دور کرنا چاہتا تھا۔

”مونگ! ساحل کی روپوشی کا راز تمہارے علاوہ اور کس کو معلوم ہے؟“

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اٹل لہجے میں بولا ”مجھے اس شخص کو جس کے گھر میں ساحل کو چھپایا گیا ہے اور جہیں اس کے سوا کسی شخص کو بھگ بھی نہیں ہے۔“

میں نے ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ساحل کے حوالے سے ہمارے درمیان ہونے لگا ہوئی اس کی لی یان کو خبر نہیں تھی۔ اس وقت وہ ہاتھ لے رہی تھی اور موجودہ بات چیت بھی اس کی غیر موجودگی ہی میں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر مونگ نے ایک مرتبہ پھر رخصت طلب نظر سے مجھے دیکھا تو میں اٹھ کر لی یان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ لگ بھگ پانچ بجے شام ہم تیار ہو کر بنگلے سے نکل آئے۔ چندر نے بڑے احترام سے ہمیں رخصت کیا۔ دیگر سادہ لباس پولیس گارڈز بھی مستعدی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ میری توقع کے عین مطابق ڈاکٹر مونگ ابھی تک اپنے مشن سے واپس نہیں لوٹا تھا۔

رٹنا پارک کا کافی پاتھ اور دربار پاتھ کے وسط میں واقع ہے۔ ہم اپنی اسٹریٹ سے نکلے اور پارک کی چوٹی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دربار پاتھ کی طرف آگئے۔ موسم خوشگوار ہو رہا تھا اس خوشگواریت میں ابھی خاصی خشک رچی بسی تھی۔ وہ جنوری کی آخری تاریخیں تھیں۔ نومبر سے فروری کے دوران میں نیپال شدید سردی کی لپیٹ میں رہتا ہے خصوصاً دسمبر اور جنوری یہاں موسم سرما کی پیک تصور کی جاتی ہے۔ ان دنوں درجہ حرارت مٹی چھ سے مٹی پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خضنی ٹھار ہوا میں بھی قطعی جمانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ہم نے مناسب گرم لباس پہن رکھا تھا۔

دربار پاتھ پر واقع بس اسٹاپ سے ہمیں جیکسی مل گئی۔ دن کے اوقات میں کھنڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے کے لیے جیکسی والے چالیس سے ساٹھ روپے وصول کر لیتے ہیں جبکہ شام اور رات میں یہی رقم پچھتر سے سو روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے جیکسی والے کو کھاک ٹاور چلنے کو کہا اور اندر بیٹھ گئے۔

کھاک ٹاور کے نزدیک ہی دربار مارگ پر ہوٹل انا پورٹا واقع تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا ایک بیک میں تمام انتہائی

ضروری اشیاء بھر کر لے آؤں گا، دوسرے بیک کو عام اور غیر ضروری چیزوں کے ساتھ ہوکل ہی میں چھوڑ دوں گا تاکہ اگر واپس بھی اس ہوکل میں آنے کے امکانات پیدا نہ ہو سکیں تو کسی شے کے زیاں کا احساس نہ ہو۔

ٹیکسی میں سڑک کے دوران میں لی یان نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور تازہ ترین حالات پر کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بالکل نیپال کے موسم اور وہاں موجود قدرتی حسن پر ہم گفتگو کرتے رہے۔ ہماری گفتگو سے پہلا اور آخری تاثر یہی ابھرتا تھا کہ ہم ٹوریٹ ہیں۔ ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ہوکل والی "کارروائی" مکمل کرنے کے بعد ہم اپنا پورا ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ لی یان کافی کی طلب محسوس کر رہی تھی۔ موسم کی شدت سے منٹنے کے لیے اس کی طلب بر عمل تھی۔ ویٹر منیجر چھوڑ کر چلا گیا تو لی یان نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کیا لوگے شون؟"

"تم کافی لے رہی ہو تو میں بھی یہی لے لوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

وہ ہنستے ہوئی "مگر تمہیں تو چاہئے کافی کے استعمال سے نیند آنے لگتی ہے؟"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "لیکن موسم کی ٹھنڈک کو شکست دینے کے لیے ایک کپ کافی پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"یہ کچھ ایب نارمل سا نہیں ہے شون؟" وہ احتیاطاً وجدان کے بجائے مجھے شون کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

میں نے چونک کر پوچھا "کیا ایب نارمل ہے سردی کو بھگانے کے لیے کافی پینا؟"

وہ گڑبڑائی "میں میرا مطلب ہے عام طور پر تو یہی سننے میں آیا ہے کہ چائے کافی کے استعمال سے نیند آ جاتی ہے لیکن تمہارے ساتھ معاملہ بالکل الٹ ہے۔"

"معاملہ ہم دونوں کے ساتھ ہی الٹا ہے۔" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میرے ساتھ کیوں..... اور کیسے؟" وہ متذبذب لہجے میں بولی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میرا مطلب ہے عام طور پر تو یہی سننے میں آیا ہے کہ شادی کے بعد عورت ماں بننے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن تمہارے ساتھ معاملہ....."

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔" وہ میری بات پوری کیا؟

ہونے سے پہلے ہی قطع کلائی کرتے ہوئے بولی "ہم دونوں ہی سیدھے ہیں۔ مطلب یہ کہ..... ہمارے ساتھ کچھ بھی الٹ نہیں..... اوکے؟"

میں لی یان کی اس فرارنا وضاحت پر زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ میری متنی خیر مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"یہاں سے اٹھنے کے بعد میں شون کو فون کروں گی۔ اس نے رخصت کے وقت مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ کھنڈ دیکھنے ہی میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کروں لیکن یہاں قدم رکھتے ہی جس نوعیت کے واقعات سے واسطہ پڑا اس میں یہ بات میرے دھیان میں نہیں رہی۔"

میں نے اس کی خواہش پر صاف کرتے ہوئے کہا "متم ٹھیک کہتی ہو میں بھی دسم کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تم شون سے بات کر چکو تو ریسورنٹ مجھے دے دیتا۔"

وہ عجیب سی نظر سے مجھے گتے لگتی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو..... بات کر چکوں کیا مطلب! میں اس وقت شون ہی سے قہار کر رہی ہوں؟

انسان اس کائنات کا سب سے حیرت انگیز مخلوق ہے۔ یہ موقع محل کی مناسبت سے اس طور رنگ بدلتا ہے کہ گرت گرت کی آنکھیں بھی مٹکی کی ٹھکرا رہ جاتی ہیں۔ انسان نظریہ ضرورت کا استعمال کر کے اپنی غلط بات کو تسلیم کروانے کے لیے دوسرے کی ناجائز بات کو بڑی دھڑائی سے قبول کر لیتا ہے۔ لی یان..... ذاتی بچے کے حوالے سے سوچ میں واقع اپنی ایب نارملٹی کو درست ثابت کرنے کے لیے میرے ذہن کے ایک مختلف رد عمل کو صحیح ماننے کے لیے فوراً تیار ہو گئی تھی۔

کافی پینے کے بعد نیند جری فون کرنے کی کوشش کی گئی۔ کوشش ان محنتوں میں کہ نئی فونک رابطہ ہوئیں سکا۔ دو تین مرتبہ کی لڑائی کے بعد یہ بتا چلا کہ دوسری جانب کوئی فون انیڈ نہیں کر رہا۔ یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ بہر حال ہم اپنا پورا ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ ہم صبح بھی اپنا پورا (ANNAPURNA) سے نکل کر سٹی اسپتال کی طرف گئے تھے لیکن اس وقت سب نارمل تھا جبکہ اب کی بار میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اب اس ہوکل کی طرف میرا آنا نہیں ہوگا۔ کم از کم ان تین دنوں میں تو نہیں جب تک کی بنگ تھی۔

میں اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ پیش کرنے سے قاصر تھا۔ ٹیکسی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے لی یان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا "وجدان! شون نے فون کیوں نہیں انیڈ کیا؟"

وہ پریشانی میں مجھے وجدان کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ شون کہہ کر مجھ سے شون کا ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ جب سے ہم ایک ساتھ تھے میں نے بعض مراحل میں اسے خاصی الجھن اور مذہب میں پایا۔ میں اس کا شوہر نہیں تھا مگر اس کے شوہر کے روپ میں تھا۔ شون کے میک اپ میں میں ہو ہوشوں ہی نظر آتا تھا۔ میں لی یان کی مٹلانہ بے بسی کو سمجھ رہا تھا۔ بعض بازگ جذباتی موز پر وہ چکر اکر رہ جاتی تھی۔ اس کی تشویش دور کرنے کے لیے میں نے سلی آئیز لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے شون اس وقت گھر میں موجود نہ ہو۔"

"گھر میں موجود نہ ہو کیا مطلب؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھ دیکھنے لگی۔ "ہم یہاں جس تاریخ کی شام کو گزر رہے ہیں وہاں نیو جرسی میں ابھی اس تاریخ کا سورج طلوع نہیں ہوا۔"

نیو جرسی اور کھنڈ کے مقامی وقت میں گیارہ گھنٹے سے زیادہ کا تفاوت ہے۔ میں نے لی یان سے کہا "پھر تو تم نے بہت بڑی غلطی کی۔ شون وہاں نیو جرسی میں اس وقت گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔ تمہیں موقع محل اور وقت دیکھ کر اسے فون کرنا چاہیے تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان!" غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ معتدل ہو گئی۔

میں نے کہا "ہم ڈاکٹر موگ کے بنگلے پر پہنچ کر نیو جرسی فون کریں گے۔ تم فکر نہ کرو یہاں سے رخصت ہونے سے قبل شون دسم اور مسٹر ونگ بنگ کی خیریت معلوم ہو جائے گی۔"

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر چونک کر بولی "کیا ہم یہاں سے نہیں اور جا رہے ہیں؟"

ہاںی دے والی ہستی کی جانب جانے کا پروگرام لی یان کی غیر موجودی میں ترتیب پایا تھا چنانچہ وہ میرے اور ڈاکٹر موگ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ نہیں تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اس کے سوال کا جواب دے دئے ہوئے کہا۔

"ہاں! آج رات کو بچے ہم ڈاکٹر موگ کے ساتھ اس شہر سے نکل جائیں گے۔"

"اوہ!" وہ جوشیے انداز میں بولی "اس کا مطلب ہے تمہاری ساسی کا سراغ مل گیا۔"

"ہاں! ایک سر اٹھ تو آیا ہے۔" میں نے ہم انداز میں کہا۔

لی یان نیو جرسی سے میری بیوی بن کر یہاں کھنڈ ونگ پہنچی تھی۔ وہ دنگ بنگ کے لیے کئی کارنامے انجام دے چکی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا وہ قابل بھروسہ ہے۔ دنگ بنگ نے اسے یہاں کے مشن کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔ بدھ

نیل کنڈ والی عبادت گاہ اور ساحل والا معاملہ اس سے پوشیدہ نہیں رکھا گیا تھا لہذا میرا محتاط اور ہم انداز دیکھتے ہوئے وہ شا کی لہجے میں بولی۔

"وجدان! میں محسوس کر رہی ہوں تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ خاص طور پر اپنی ساسی کے حوالے سے؟"

"ایسی بات نہیں لی یان!" میں نے غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا "فی الحال ڈاکٹر موگ نے مجھے بھی زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ بس اتنا بتا چلا ہے کہ میری ساسی ساحل کو کھنڈ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر پائی دے پر واقع ایک ہستی میں رکھا گیا ہے۔ ہم یہاں سے اس ہستی تک جائیں گے پھر کچھ دیر وہاں غصہ کرنے کے بعد آگے بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کی طرف بڑھ جائیں گے۔ آج آدھی رات کے بعد عبادت گاہ میں ایک خون ریز مہرک ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق رتی موٹے ہاتھن کی ٹیم عبادت گاہ کے خانے میں پوشیدہ ہیں بہا خزانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور ہمیں..... میں نے تھوڑا توقف کر کے سانس ہموار کی پھر بات پوری کرتے ہوئے لی یان کو بتایا۔

"ہمیں..... اپنے دشمنوں کی اس کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔ ڈاکٹر موگ رتی کے ٹکڑوں کے عزائم جانے ہی گیا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ لوگ کس انداز میں کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

میری وضاحت نے لی یان کو قدرے مطمئن کر دیا مگر میرے اندر ایک نامعلوم ہی بے چینی نے گھر کر لیا۔ یہ بے چینی لی یان سے متعلق تھی۔ میں نہیں جانتا کیا ہونے والا تھا لیکن ڈاکٹر موگ نے لی یان کو کوئی بڑا صدمہ ملنے والی جو بات کی تھی اس نے میرے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا تھا اور ان لمحات میں یہ الجھن کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

ہم ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ ٹیکسی نے ہمیں دربار اسکوائر میں گھما پھر سنگھار دار باریک پٹرل بلڈنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ آرام شاہ ہاتھ پر آگئی۔ کچھ دیر بعد ہم دربار ہاتھ پر آگئے اور پھر رتنا پارک پہنچ گئے۔ ٹیکسی پارک کے پہلو سے گزرنے لگی تو میں نے ایک فوری خیال کے تحت ڈرائیور سے ٹیکسی روکنے کو کہا "ایک منٹ بھائی۔ پارک کے مین گیٹ پر اتار دو۔"

لی یان نے مجھ سے پوچھا "کیا سیدھا بنگلے کی طرف جانے کا ارادہ نہیں؟"

میں نے کرایہ دے کر ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور پارک کے گیٹ کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے لی یان سے کہا "میں

تھوڑی دیر اس پارک میں گزارنا چاہتا ہوں، پھر یہاں سے ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف نکل جائیں گے۔ اس پارک سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔“  
وہ مزید کوئی سوال کیے بغیر میرے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔

رتنا پارک بہت ہی فرحت بخش جگہ ہے۔ کھنڈ میں قیام کے دوران میں میں روزانہ صبح یہاں آیا کرتا تھا۔ یہی پھلکی ایکس سائز بھی ہو جاتی اور کچھ جوگنگ بھی۔ میں شب و روز جس قسم کے ہنگامی حالات سے نبرد آزما رہتا تھا ان کے لیے جسمانی طور پر چاق و چوبند اوفٹ رہنا ضروری تھا۔

اس پارک میں عموماً رات دس بجے تک خوب روشنی رہتی تھی لیکن موسم کی شدت کے باعث آج کل لوگ جلدی دھاں سے رخصت ہو جاتے۔ پورے پارک میں مناسب فاصلے سے کھبوں پر گارڈن لائٹس روشن تھیں جو پارک کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث تھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں نیلگہ کی کا خیال رہا تھا۔ اس پر اسرار ہستی سے میری پہلی ملاقات اسی پارک میں ہوئی تھی۔ لی یان خاموشی سے میرے ساتھ آگے بڑھتی چلی آئی۔ میں بے اختیار پارک کے اس حصے کی جانب جا رہا تھا جہاں مجھے نیلگہ کی کا ٹوٹا ہوا مجسمہ پڑا تھا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے۔ اس طرف درختوں کی بہتات تھی اور یہ جگہ عام پتھر روشوں سے ذرا ہٹ کر تھی۔ اس سے تھوڑا آگے پارک کا حفاظتی جگہ تھا۔ میں کچھ دیر تک بے سبب یونہی ادھر ادھر پھلتا رہا۔ اسی جگہ کرشل کے ٹوٹے ہوئے ٹکسے سے مجھے ٹھوکر لگی کی اور میں اس حسین ترین ٹکسے کو اپنی گاڑی میں رکھ کر گھر لے آیا تھا..... پھر وہ زندہ ہوئی تھی۔

اس وقت پارک کے ماحول میں..... نیلگہ کی کے وجود کی مخصوص مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی درخت کی آڑ میں چھپی کھڑی ہو اور مجھے حیرت زدہ کرنے کے لیے اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آجائے گی۔ نیلگہ نے میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے غائب رہنے کے بعد وہ دوبارہ مجھے اپنے وجود کا احساس دلانے لگی تھی مگر قدرے مختلف انداز میں اور اس کا یہ نیا انداز میرے لیے تشویش کا باعث تھا۔ چنانچہ اب وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی۔

نیلگہ تو کسی درخت کی اوٹ سے برآمد نہیں ہوئی۔ تاہم لی یان نے بے معنی حرکات سے پورے

ہوئے کہا ”ودھان! تم مجھے پارک کے اس نیم تاریک حصے میں کیوں لے آئے ہو؟ میں محسوس کر رہی ہوں جیسے تمہیں کسی خاص شے کی تلاش ہو۔“  
”ہاں وہ بہت ہی خاص تھی۔“ میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

”وہ کون؟“ لی یان کی چونکی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔  
میں سنبھل گیا اور بات بتاتے ہوئے کہا ”میں اپنی ایک دوست کے ساتھ یہاں ایکس سائز کرنے آیا کرتا تھا۔ بس اس کی یاد آگئی۔“

”اوہ!“ لی یان نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور بولی ”چلو کوئی بات نہیں۔ تمہاری دوست کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہم بھی تھوڑی ایکس سائز کر لیتے ہیں۔ موسم کا تقاضا بھی نبھ جائے گا اور کچھ ہاتھ پاؤں بھی مل جائیں گے مگر پارک کے کسی روشن حصے کی طرف چلو۔“

مجھے شرارت سوچیں اور میں نے بے ساختہ کہہ دیا ”کیا یہاں نیم تاریک میں بھی تمہیں مجھ سے ڈر کر رہا ہے؟“  
”اگر میں تم سے ڈر رہی ہوتی تو نیو جرسی سے کھنڈ تک نہ آتی۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”تم تو مجھے کہیں سے بھی خطرناک نہیں لگے۔“ پھر وہ بڑے دلدادہ انداز میں ہنس دی۔

اس نے آخری جملہ بہت معنی خیز انداز میں ادا کیا تو مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سسٹنی سی ڈورٹی محسوس ہوئی۔ اس دوران میں وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ میں اس کے انداز کی گینگی کو بھانپ گیا اور سنبھلتے ہوئے کہا۔  
”ٹھیک ہے ہم جوگنگ ٹریک کی طرف چلتے ہیں۔ ادھر میں نے گھاس کے ایک قتلے پر چند افراد کو درزش کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“

اس نے کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی کسی قسم کی بھٹ چھیڑی۔ ہم نیم تاریک حصے سے نکل کر مذکورہ مقام کی طرف چل پڑے۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد لی یان نے کہا ”ودھان تمہاری میں میں تمہیں ودھان کہوں تو تم اعتراض تو نہیں کر گئے؟“

”اس وقت تم کیا کر رہی ہو مجھے ودھان کہہ کر ہی تو پکار رہی ہو۔“ میں نے معتدل لہجہ میں کہا ”میں نے کون سا اعتراض کیا ہے۔ وہ تو میں نے احتیاط کے پیش نظر کہہ دیا تھا کہ وہ یاروں کے بھی کان ہو تے ہیں۔ بہر حال بعض سبکدوش بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

میں بارک کے نیم تاریک گوشے سے نکل کر قدورے روشن حصے میں پہنچا تو محسوس ہوا جیسے نیلگری کی وہ مخصوص خوشبو بھی میرا تاقب کرتے ہوئے ادھر آگئی ہو۔ دراصل پارک میں داخل ہونے کے بعد سے میں مسلسل نیلگری کے پارے میں سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اب یہ میری سوچ کا نتیجہ تھا یا واقعی وہ ہستی میرے ساتھ تھی۔ اگرچہ مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ میری پکار پر لبیک کہے گی۔ تاہم پھر بھی میں نے اپنی تسلی کی خاطر اسے زرباب پکارا "نیلگری.....!"

جواب میں خاموشی رہی۔ اس نے میری پکار پر لبیک نہیں کہا تاہم اس کے حیرت انگیز وجود کی سحر کا خوشبو مسلسل میری سانسوں میں بھرا کیے رہی۔ میں اس خوشبو کو کتنی مرتبہ سانس کے راستے اپنے خون میں جذب کر چکا تھا اور کئی ڈی اے اسیمون کے ایک بیٹے میں تو میں نے نیلگری کی سحر انگیز وجود کی کرمہ کاری بھی دیکھ لی تھی۔ وہ رات میری زندگی کی ایک تاریخ ساز اور ان مٹ رات تھی۔ اس ناقابل فراموش رات میں پرجوں کی ملکہ نے مجھے لذت حیات سے روشناس کرایا تھا۔

ہم نے لگ بھگ آدھا گھنٹا ایکس سائز کی پھر ایک سٹی بیچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے لی یان سے کہا "میں آنکھیں بند کر کے غوراً آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟"

"مجھے کیوں اعتراض ہوگا.....!" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "تمہاری آنکھیں ہیں آرام کرنے کے لیے انہیں بند کر دیا ہلا کر بنے دو تمہاری مرضی ہے۔"

لی یان اس وقت بلی پھٹکی چھپر چھڑ کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ میں نے بھی جواباً خوشی سے پوچھ لیا "اچھا! اگر میں آرام کرنے کے لیے تمہاری آنکھیں استعمال کروں گا تو تمہیں جب اعتراض ہوگا؟"

"تب بھی نہیں ہوگا۔" وہ ہلکھلا کر ہنس دی۔

میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور سٹی بیچ کی پشت سے لبیک لگا کر آنکھیں (اپنی) بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی انسان اپنے اندر بند ہو جاتا ہے۔ میں بھی خود میں بند ہو کر خود کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ میرے وجود کا انوث انگ مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ میں نے غمزد آئی کے سامنے ساحل کے سراپا کو اجاگر کیا اور رخش تصور کو اس کی جانب دوڑا دیا۔

نتیجہ حسب سالیق برآمد ہوا۔ میں اپنے وجود کے "انوث انگ" تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک نامعلوم ایک بے نام سی خفاک دیوار ہمارے بیچ حائل رہی۔ ڈاکٹر مومک کو بعد فیصد یقین تھا کہ اس نے جس لڑکی کو ہائی

دے والی ہستی میں پہنچایا ہے وہ میری ساحل ہی ہے۔ مجھے ڈاکٹر مومک کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا لیکن دل کی اپنی جھلن بھی یہ بتنے کے سبب سے کٹوڑ کھلی فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا تھا اور ایک ایسی اڑان بھر کر اپنی منزل..... میری ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا مگر تپا نہیں کس سبب یہ "پرندہ" پر پھر بھڑا کر رہ جاتا منزل کا سراغ پانے سے پہلے ہی بے دم سا ہو کر زمین سے آگٹا۔ رہی موشے ہائمن کی شاطرانہ چال نے میری زندگی کی بساط کو نپٹ کر رکھ دیا تھا۔ ساحل کو مجھ سے دور کرنے میں اسی کامیاب تھا۔

رہی کے تصور نے میری سوچ کو زہر پلا کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ کش میں ناکامی اور موشے ہائمن کے بارے میں سوچنے کی کئی میرے چہرے سے ہو رہی تھی۔ یہ تاثرات لی یان نے نوٹ کر لیے "گہری تشریص سے بولی۔

"کیا بات ہے وجدان! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟"

"میں ٹھیک ہوں، تم فکر نہ کرو۔"

"چلو کھرچلے ہیں۔" وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولی۔

"چلتے ہیں ایک منٹ....." میں نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اس بار میں نے تیسری آنکھ کے توسط سے نیلگری کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں بھی مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جھجھلا کر میں آنکھیں کھولنے ہی والا تھا کہ ایک بالوس آواز میری سماعت سے مگرانی۔

"تم یہاں بیٹھے تصور کی کرتب بازیاں دکھاتے رہو اور وہاں.....!"

جملہ ادھر ادھر چھوڑ کر آواز معدوم ہو گئی۔ اس بات میں ایک فیصد بھی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ آواز نیلگری کی تھی۔ وہ یہیں کہیں میرے آس پاس موجود تھی مگر مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی مخصوص آواز سننے ہی میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو لی یان بھی پوچھ لگائی۔

"کیا ہوا وجدان؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے نیلگری کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"کچھ تو ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

"میں محسوس کر رہی ہوں تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش ہے۔" میں نے ایک لمحے کے تامل کے بعد اسے اپنی کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر مومک دوستی کے بعد میرے بہت قریب ہو گیا تھا۔ الاسکا میں اس کے بارشل آرٹس سینٹر میں ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر بڑی بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ وہ میری "جی" اور غمزد آئی والی صلاحیت سے بھی آگاہ تھا بلکہ غمزد آئی کے سلسلے میں تو وہ مجھ پر رشک کر رہا تھا۔ اس نے بھی اس شعبے میں کافی محنت کی تھی لیکن میری طرح اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی البتہ وہ "جی" کی قوت سے دیگر بہت سے کام لیتا رہتا تھا۔ فلائنگ فائٹ بھی "جی" ہی کے طفیل تھی۔ وہ بھی میری طرح شاؤن نیپل ہی سے تربیت یافتہ تھا مگر یہ بہت عرصہ پہلے کی بات تھی۔

میری بات اور نیلگری کے خوالے سے تشریص کو اس نے پوری توجہ سے متاد کر لیا۔ "تم اس سلسلے میں پریشان نہ ہو۔ ہمارے پردگرم میں کوئی تبدیلی واضح نہیں ہوئی۔ ہم ہلکا سا کھانا کھا گئے ہیں اور پھر ہائی دے والی ہستی کی چاب روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کیا صورت حال ہے۔"

ڈاکٹر کی تسلی سے میری تشریص میں قدرے کمی تو ہوئی لیکن دل کی بے گنجائش ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مومک سے پوچھا "کیا یہاں سے کسی طرح اس ہستی میں رابطہ نہیں کیا جاسکتا؟"

"اس گھر میں فن کی سہولت موجود نہیں جہاں ساحل کو رکھا گیا ہے۔" ڈاکٹر نے نثر خیال انداز میں جواب دیا "وہ بہت چھوٹی ہی ہستی ہے جس کے اکثر کمزور بات زندگی سے عاری ہیں۔ اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تو شاکا ضرور مجھے اس کی اطلاع دیتا۔"

"کون شاکا؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے بتایا "شاکا اس قابل اعتماد شخص کا نام ہے جس کے گھر میں میں نے تمہاری ساتھی ساحل کو چھپا رکھا ہے۔ ساحل وہاں شاکا کی بیٹی ہندیا کے بھیس میں رہ رہی ہے۔ ہندیا اور ساحل کے قد کاٹھ میں نمایاں فرق نہیں اس لیے مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ شاکا اپنی بیوی بھانسی اور بیٹی ہندیا کے ساتھ اس ہستی میں رہتا ہے..... اور وہ اتنا عام سا آدمی ہے کہ بھولے سے بھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں جاسکتا۔"

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

میں نے ایک لمحے کے تامل کے بعد اسے اپنی کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر مومک دوستی کے بعد میرے بہت قریب ہو گیا تھا۔ الاسکا میں اس کے بارشل آرٹس سینٹر میں ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر بڑی بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ وہ میری "جی" اور غمزد آئی والی صلاحیت سے بھی آگاہ تھا بلکہ غمزد آئی کے سلسلے میں تو وہ مجھ پر رشک کر رہا تھا۔ اس نے بھی اس شعبے میں کافی محنت کی تھی لیکن میری طرح اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی البتہ وہ "جی" کی قوت سے دیگر بہت سے کام لیتا رہتا تھا۔ فلائنگ فائٹ بھی "جی" ہی کے طفیل تھی۔ وہ بھی میری طرح شاؤن نیپل ہی سے تربیت یافتہ تھا مگر یہ بہت عرصہ پہلے کی بات تھی۔

میری بات اور نیلگری کے خوالے سے تشریص کو اس نے پوری توجہ سے متاد کر لیا۔ "تم اس سلسلے میں پریشان نہ ہو۔ ہمارے پردگرم میں کوئی تبدیلی واضح نہیں ہوئی۔ ہم ہلکا سا کھانا کھا گئے ہیں اور پھر ہائی دے والی ہستی کی چاب روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کیا صورت حال ہے۔"

ڈاکٹر کی تسلی سے میری تشریص میں قدرے کمی تو ہوئی لیکن دل کی بے گنجائش ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مومک سے پوچھا "کیا یہاں سے کسی طرح اس ہستی میں رابطہ نہیں کیا جاسکتا؟"

"اس گھر میں فن کی سہولت موجود نہیں جہاں ساحل کو رکھا گیا ہے۔" ڈاکٹر نے نثر خیال انداز میں جواب دیا "وہ بہت چھوٹی ہی ہستی ہے جس کے اکثر کمزور بات زندگی سے عاری ہیں۔ اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تو شاکا ضرور مجھے اس کی اطلاع دیتا۔"

"کون شاکا؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے بتایا "شاکا اس قابل اعتماد شخص کا نام ہے جس کے گھر میں میں نے تمہاری ساتھی ساحل کو چھپا رکھا ہے۔ ساحل وہاں شاکا کی بیٹی ہندیا کے بھیس میں رہ رہی ہے۔ ہندیا اور ساحل کے قد کاٹھ میں نمایاں فرق نہیں اس لیے مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ شاکا اپنی بیوی بھانسی اور بیٹی ہندیا کے ساتھ اس ہستی میں رہتا ہے..... اور وہ اتنا عام سا آدمی ہے کہ بھولے سے بھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں جاسکتا۔"

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

"اور اصل ہندیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہ بھی اسی گھر میں ہے۔" ڈاکٹر مومک نے جواب دیا

ڈاکٹر مومگ نے کہا ”ہم ٹھیک آٹھ بجے کھانے کی میز پر ہوں گے۔ اس وقت سارے سات بجنے والے ہیں۔ ہمیں خلاف معمول کافی جلدی بلکا چھکا ڈنر کرنا ہوگا۔ ٹھیک نو بجے ہماری روائی ہے۔ تمہارے پاس آج آگھا کھنٹا ہے۔ نہادھو کر فریٹش ہو جاؤ اور اچھا ہے۔ پتا نہیں آگے کون سے حالات ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ کہیں منہ دھونے کی فرصت بھی ملے گی یا

”میں اس میک اپ وغیرہ سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ  
جدان کی اصلی صورت کے ساتھ عا آگے بڑھوں گا یا نہ  
ہرے سامنے کتنے ہی خطرات کیوں نہ نہ کھولے کھڑے  
ہوں“ البتہ لی یان کے چہرے پر تھوڑی فینک کرنا ہوا  
ہوؤا امیر اسٹائل میں تبدیلی بھی ضروری ہے تاکہ پہلے

☆☆☆

آتش فشاں 97 حصہ 12

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا لیکن میں اس دور میں مل نہیں تھا۔ میں آئندہ چند گھنٹوں تک بیدار مغز اور ہشاش  
اش رہنا چاہتا تھا۔ لگ بھگ دو گھنٹے بعد میری ایک ایسی ہستی

سے ملاقات ہونے والی تھی جس کی تلاش میں میں نے پاکستان سے لے کر یہاں تک دردر کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ ہزاروں لاکھوں عذاب میرے میری زندگی میں سے گزرے تھے کروڑوں مرتبہ میں نے اپنی جان تنہا کی آرزو کی تھی۔ ساحل مجھ سے اس طور پھنکڑی تھی کہ میرے اندر کا موسم مجھ سے روٹھ گیا تھا۔ میں نے جدائی کے اس تمام تر عرصے کو جس طرح برداشت کیا اس کا اندازہ ہی فیض لگا سکتا ہے جس نے فرقت اور جدائی میں سانس لیا ہوں۔

پونے نوبے ڈاکٹر موگ نے بتایا "ہم ٹھیک چندر منٹ کے بعد یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔" "ہم ہستی تک کس ذریعے سے جائیں گے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے اس سفر کے لیے ایک ہوی انجن والی جیپ کا بندوبست کر رکھا ہے جو پہاڑی راستوں کے لیے نہایت ہی موزوں ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "آری گرین ٹریک یہ جیپ رات کی تاریکی میں اور بھی زیادہ محفوظ ہے۔ اس جیپ میں مناسب اسلحے کے علاوہ پیٹرول کی وافر مقدار بھی موجود ہے۔ جیپ کا ٹینک تو فل ہے ہی ازیں علاوہ اس کے پچھلے حصے میں پانی ٹینک والے دو ٹینک بھی بھرے رکھے ہیں۔ مذکورہ جیپ ساتھ والے بنگلے کے پورچ میں کھڑی ہے۔ میں نے اپنا ضروری سامان جیپ کے اندر پہنچا دیا ہے۔ تم لوگ جو کچھ لے جانا چاہو اپنے بیگ میں بھر لیتا۔"

میں نے ڈاکٹر کی بات پوری توجہ سے سنی اور ایک انکشاف پر ابھمن زدہ انداز میں دریافت کیا "ڈاکٹر! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ جیپ ساتھ والے بنگلے میں کیوں کھڑی ہے؟"

"محض احتیاط اور حفاظت کی خاطر۔" ڈاکٹر نے منہ پر ہونے لگے میں جواب دیا "ساتھ والے بنگلے میں کوئی بھی رہائش پذیر نہیں۔ وہ میرے ہی تصرف میں ہے۔ یہ بات جالوس کے علاوہ چندر کو بھی معلوم ہے۔ یہ دونوں بنگلے مجھے جالوس نے فراہم کر رکھے ہیں جو اس کی خفیہ پراپرٹی میں شمار ہوتے ہیں۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ جیپ والا آئیڈیا مجھے پسند آیا تھا۔

ڈاکٹر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "دوسرے اس "خاموش" بنگلے کا بندوبست میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس وقت ہم جن دشمنوں سے خطر بازی کر رہے ہیں وہ بہت ہی بااثر ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہالو اسلحہ امریکا سے لا رہے

ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"تم ہالو اسلحہ کی بات کر رہے ہو ڈاکٹر۔ میں تو بلا واسطہ بھی پچھلے دنوں امریکا سے منت رہا تھا۔ نیویارک کے دل میں ہمیں میں جو واقعات پیش آئے ہیں جنہیں ان کی تفصیل بتانا ہوں۔ میرے انہی "کارناموں" کے طفیل تو مجھے "امریکا دشمن" کا ٹائٹل ملا ہے۔"

"ہوں!" ڈاکٹر موگ نے ایک گہری سانس لی اور منہ پر ہونے لگے میں بولا "امریکا سے کہیں زیادہ خطرناک واقعات یہاں نیپال میں بھی پیش آ سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایک ایک قدم چھوٹ کر۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی لمحے ہمیں چھت پر کی کے کونے کی آواز سنائی دی۔ ہم تینوں نے بیک وقت چوڑھ کر کمرے کی چھت کی طرف دیکھا وہ آواز اگرچہ بہت دم تھی لیکن ہم نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگالیا "کوئی نہایت ہی محتاط قدموں سے چھت کے اوپر چل رہا تھا" جلد ہی محتاط قدموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

ہم نے ایک دوسرے کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا اور بیک وقت اٹھ کر کمرے ہو گئے۔ میرے اعصاب اچانک تن گئے تھے۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ کم از کم نصف درجن افراد اس رخ پرست موسم میں بنگلے کی چھت پر موجود تھے اور ظاہر ہے وہ کسی اچھی نیت سے وہاں نہیں پہنچے تھے۔

"آپ دونوں اسی کمرے میں رہو۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر موگ نے اضطرابی لہجے میں کہا اور دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

اسی لمحے بنگلے کے بیرونی حصے میں بحث و تھکرار کی آوازیں ابھریں۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چندر یا سادہ لباس پولیس والوں سے الجھ رہا ہو وہ زبردستی بنگلے کے اندر کھنسا جاتا ہو اور بنگلے کے محافظ اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہوں۔

یہ بحث و مباحثہ کتنی ثابت ہوا اور اگلے ہی لمحے فائرنگ کی تیز تر زڑا ہٹ نے ٹھنڈے ٹھار ماحول کی خاموشی اور سانے کو پاش پاش کر دیا۔ ڈاکٹر موگ نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور ہماری نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔

اسی لمحے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ اگر پہلی فائرنگ حملہ آوروں کی طرف سے تھی تو پھر جوابی فائرنگ چندر وغیرہ کا کارنامہ ہی ہو سکتا تھا اور صورت حالات اس کے برعکس بھی متوقع تھی۔ آخر الذکر فائرنگ کے ساتھ ہی فضا میں انسانی چیخوں کی بھیا تک آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ یہ ان بدست

افراد کی چیخیں تھیں جو براہ راست گولیوں کی زد میں آ گئے تھے۔ گلتا تھا ہم میدان جنگ میں کھڑے ہوں! میں نے تشویش بھری نظر سے لیان کو دیکھا وہ مضبوط لہجے میں بولی "ہمیں ڈاکٹر موگ کی مدد کرنا چاہیے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے درجن بھر کالی بلاؤں نے اس بنگلے پر شب خون مارا ہو۔"

لیان کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ہمارے کمرے کے باہر کوریڈر میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کمرے سے نکلے وقت دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ تین بات تھی باہر جو کوئی بھی تھا یا تھے وہ یہ اندازہ دے اندر ہی آتے۔ دوڑتے ہوئے قدموں سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا وہ ایک دو ہیں یا اس سے زیادہ!

وہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ اگر ہم یوں ہی کھڑے رہ جاتے تو موت بڑی بے رحمی سے ہمیں اپنی آغوش میں سیٹھ لیتی۔ اس طرف چڑھائی کرنے والے ہمارے دوست تو ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ دوست یوں گولیوں کی برسات کے ساتھ لے کے لیے نہیں آتے۔

میں نے پلک جھپکتے میں ایک فوری فیصلہ کیا اور لیان کو بازو سے تھام لیا پھر میں اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے کھلے دروازے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ دروازے کے پٹ نے ہمیں پوری طرح اپنے پیچھے چھپایا۔ باہر سے اندر داخل ہونے والوں کو ہم پہلی نظر میں دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔

ہم نے دروازے کے عقب میں پناہ لی ہی تھی کہ فضا ایک مرتبہ بھر فائرنگ کی بھیا تک آواز سے گونج اٹھی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں محمد دین نے پر انسانی چیخیں بگڑے ہوئیں جس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ حملہ آوروں کی مزاحمت بھر پور انداز میں نہیں کی جا رہی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خوفناک خیال چکا کہ چندر اور دونوں پولیس والے اس افراد اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ میں نے سیکنڈ کے جزاؤں میں حصے میں یہ سوچا اور میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ اسی اثنا میں ایک مرتبہ بھر بنگلے کے مختلف حصوں میں برست فائرنگ کی بھیا تک صدائیں بلند ہونے لگیں۔ لیان کی مجھ سے لگی کھڑی تھی اسے اختیار وہ مجھ سے بچت ہو گئی۔ میں نے اس کے نازک بدن کی مخصوص دھجی پر غور اٹھ کر اپنے وجود پر محسوس کیا۔ وہ کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن وہاں خوفناک تھیں اس طور کج رہی تھیں کہ دلوں پر ایک عجیب سی ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق حملہ آور ایل ایم جی اور ایس ایم جی کا استعمال کر رہے

تھے۔ لیان بری طرح مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ میں نے حفاظت کا سیٹھ اور اپنی تمام تر سہولت کو کوڑیوں کی سمت مبذول کر دیا۔ تین سیکنڈ کے بعد وہ دوڑتے ہوئے قدم ہمارے کمرے کے سامنے پہنچ کر روک گئے۔ اگلے مرحلے میں وہ لوگ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو جاتے۔ میں نے لیان کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

"تم یہیں کھڑی رہنا۔ میں آنے والوں سے نمٹتا ہوں۔"

سرگوشی کے دوران میں میرے ہونٹ اس کے کان سے مس ہو گئے تھے۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ تاہم اس نے مجھے اپنی اضطرابی گرفت سے آزاد کر دیا۔

باہر رکنے والوں نے ایک لمحہ کمرے کے اندر جھانکا۔ کمرے کی لائٹ ان کی آنکھوں میں باہر کھڑے ہو کر اندر کی انسان کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اصولی طور پر انہیں کمرہ خالی دیکھ کر آگے بڑھ جانا چاہیے تھا لیکن ڈاکٹر کے مانند بنگلے پر چڑھائی کر کے انہوں نے کون سے اصولوں کی پاسداری کی تھی جو اب ان سے ایسی کوئی توقع رکھی جاتی۔

وہ اندر داخل ہوئے تو مجھے ان کی تعداد کا علم ہوا۔ وہ تین افراد تھے اور تینوں ہی سنا۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے ان کی جھلک دیکھی۔ اس وقت ان کی پشت میری طرف تھی اور ان کے سروں کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے اپنے چہروں پر لمبے نقاب چڑھا رکھے ہیں۔ اس قسم کے نقاب سر سے لے کر گردن تک کے حصے کو اچھی طرح ڈھانپ لیتے ہیں۔ صرف دیکھنے کے لیے آنکھوں کے سامنے دو چھوٹے چھوٹے سوراخ چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہ سارا بندوبست شاخت کو چھپانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کون تھے ان کا شجرہ نسب کیا تھا۔ اس وقت وہ صرف دشمن تھے اور دشمنوں کو ہتھیار استعمال کرنے سے پہلے بے دست دبا کر دینا چاہیے۔ کمرے کو خالی با کر وہ پیچھے کوڑے اور یہ عزت ان پر غضب ڈھا گیا۔ اسی لمحے میں دروازے کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے اپنے مقابل دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بوکھلا گئے۔ اس بوکھلاہٹ سے فائدہ نہ اٹھانا زندگی کی سنگین ترین غلطی ہوئی۔

میں توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند ان

اسی وقت باہر کوریڈور میں دو حریف نقاب پوش نمودار ہوئے۔ میں نے پلک جھپکتے میں فارنگ کر کے انہیں زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے انہیں گھائل کرتے ہوئے اس

کوریڈور کے اختتام کر میں سے مڑ کر پیچھے دو بکھا۔ لی  
 یان مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ بیچلے کے عقبی حصے کی جانب نکل گئی  
 گئی۔ وہ دو بیل کوریڈور بیچلے کے سامنے والے حصے کو عقبی حصے  
 سے ملاتا تھا اور اس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے  
 تھے۔ میں اس وقت جہاں کھڑا تھا وہاں سے سامنے والا لان  
 نظر آ رہا تھا۔ اگر میں تھوڑا آگے نکل آتا تو کیم کا منظر دیکھ  
 سکتا تھا اور وہ منظر کسی بھی طور دیکھنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔  
 میں نے گہرے کسوختے سے نیچے جانظر سارہ اور دیکھا

اسی اثنا میں کوئٹہ در میں احتجاج کی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ آدھ سے لکل کر کوئٹہ در کی جانب لیکے والا بھگڑا کسی سے نکل گیا ہے۔ اور توئی امکان اس بات کا تھا یہ بکراؤڈ اکثر مونگر ریفرنسے سے ہوا ہوگا۔ اب وہ بھگڑا اپنے ہی کسی بھائی بندے سے تودھیکا مشتکی کرنے سے رہا! میں فارغ تھا، لیکن ان غصی جسے کی طرف گئی تھی۔ آ جا کر

میں نے فوری ایکشن کا فیصلہ کیا اور اس شخص کے اتنا قریب آ گیا کہ یہ آسانی سے چھو سکوں پھر میں نے ایک ہاتھ اگے بڑھا کر اس کے شانے پر دستک دی۔



وہ اس طرح اچھل کر پلٹا جیسے کسی بھیاںک خواب سے چونک کر جاگ گیا ہو۔ میں نے آندھی طوفان کی رفتار سے اسے واپس بھیاںک خواب میں دھکیل دیا۔ اس کا نقاب پوش چہرہ جیسے ہی میری جانب بھرا میں نے اس کی ناک پر ایک اسٹریٹ لچ بڑوایا۔

اسٹریٹ لچ کسی وزنی ہتھوڑے کے مانند کام کرتا ہے۔ یہ ہمہ رخ بھی کہلاتا ہے۔ اگر یہی لچ سر پر سرایا جائے تو ہمہ رخ ہیڈ لچ کہلاتا ہے۔ اپنی پوشیدہ ناک کو وہ میرے ظاہرہ کے سے سکوانے کے بعد ذبح ہوتے ہوئے کسی جانور کی طرح بلبلایا اور لٹکھڑاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گیا، مگر اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر دور جا گری، قدموں کی لٹکھڑاہٹ اس کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ اسی لمحے لی یان کسی شیرینی کے مانند اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو کر ان کا تماشا دیکھنے لگا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، اس نقاب پوش نے مگر کے زور پر لی یان کو دقتی طور پر بے بس کر رکھا تھا ورنہ اس کے لیے سوا سیر سے کم نہیں تھی۔ لی یان نے دل کھول کر اپنی ہزیمت کا بدلہ چکایا اور ہاتھ پاؤں کی شوکروں سے صرف تین منٹ کے اندر اس نقاب پوش دشمن حملہ آور کو کھلانادیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس زمین یوں شخص کا جنازہ لیا۔ وہ زندہ تھا مگر آنے والے دو تین گھنٹے تک وہ اٹھ کر اپنے قدموں پر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر موجود ایک مخصوص نل کو بڑی تکنیک سے مسل کر اس کی انشا غلیبی کو یقینی بنادیا پھر کھڑے ہوتے ہوئے لی یان کو دیکھا۔

اس کا سینہ کسی لوہار کی موٹائی کے مانند چل رہا تھا، سانس کی آمد و شد بتاتی تھی، اس وقت لی یان کے سینے میں کس قیامت کا زبردست پیرا ہو رہا تھا۔ اس طوفان کو محسوس کرنے کے لیے کسی خاص روشنی کی ضرورت نہیں تھی، اس قسم کے معاملات میں آنکھ روشنی کی محتاج نہیں رہتی!

میں نے ذہن کو جھٹکا اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم اس جنگی کے مجھے کس طرح چڑھ گئیں؟“

”بس اچانک ہی اس نے عقب میں پھینچ کر مجھے مگر پوائنٹ پر رکھ لیا“ وہ اپنے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی ”میں نے فائرنگ کر کے سامنے سے آنے والے بندے کو بے کار کر دیا تھا۔ اسی لمحے میں اس کی گرفت میں آ گئی۔ چنانچہ، یہ مردرد کہاں گھات لگے کھڑا تھا۔“ اس نے نفرت انگیز نظر سے زمین پر پڑے مذکورہ شخص کی طرف دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اس کے حکم پر، میں مگر بھینکنے پر مجبور ہوئی تھی لیکن اس خبیثت نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ میرے بالوں کو بھی اپنی مٹھی میں جکڑ لیا پھر مگر پوائنٹ پر رکھتے ہوئے وہ مجھے اس طرف لے گیا۔“

”دوسرے کوشیوں میں تمہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا؟“

”وہی جو کوئی نہ یہ مرد، کسی عورت کو اپنے سامنے بے بس دیکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی پھر مگر ہری جینڈی کے پوچھنے لگی ”اندر کیا پوزیشن ہے؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے زمین پر پڑے انشا غلیبی غدیہ سے مرد پر تیرہ کرنا ضروری سمجھا ”یہ تو امتحان کا سردار نکلا۔ اس ہنگامے میں ہر سو موت کی سبیل لگی ہوئی تھی اور یہ بے وقوف تمہارے حسن کی سوغات کے چکر میں تھا“ پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”بہر حال، اندر سب امن و امان ہے، آؤ میرے ساتھ۔“ وہ میرے قدم سے قدم ملاتے ہوئے بولی ”یہ تم نے میری تعریف کی ہے یا اس بد معاش کی برائی؟“

میں لی یان کا اشارہ واضح طور پر سمجھ گیا۔ میں نے اس کے حسن اور غدیہ سے مرد کی حماقت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے دو معنی انداز میں کہا ”اگر اس مردود کی برائی کرتے ہوئے تمہاری تعریف کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو اس میں کوئی غلط بات ہے؟“

”میں غلط اور صحیح کی بات نہیں کر رہی“ وہ ابھسن زدہ انداز میں بولی، پھر پوچھنے لگی ”کیا میں واقعی حسین ہوں؟“ ”اس میں کیا شک ہے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

عموماً لڑکی چاہے واپسی ہی شکل و صورت کی مالک کیوں نہ ہو لیکن وہ خود کو حلقہ حسن سمجھتی ہے اور ایک لی یان تھی، مستند حسین ہونے کے باوجود بھی اسے اپنی خوبصورتی کا یقین نہیں تھا اور ہے یہی بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی، پھر اس نے میری ابھسن کو درد کر دیا۔

وہ جزبہ ہوتے ہوئے بولی ”شک تو کوئی نہیں مگر شون نے آج تک تمہاری طرح کھل کر میرے حسن کی تعریف نہیں کی!“

”وہ تمہارا شوہر ہے نا..... اس لئے.....“ میں نے کہا۔

وہ چلنے چلنے رک گئی ”شوہر ہے تو؟“

”شوہر عام طور پر اپنی بیویوں کی تعریف نہیں کرتے۔“

”اوہ!“ وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔

میں نے کہا ”بہت کم شوہر ایسے ہوتے ہیں جو پیٹھ پیچھے اور سامنے سنی اپنی بیویوں کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ جیسے بہت کم بیویاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں کے لیے اولاد دیدار کرنے سے خائف ہوتی ہیں!“

وہ بھی نظر سے مجھے گھور رہ گئی۔

اسی لمحے سامنے سے ڈاکٹر موگ آتا دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر کھیرتا چھائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہم بھی انتہائی سنجیدہ ہو گئے۔ اس بنگلے میں پچھلے دس پندرہ منٹ میں جو کچھ ہو چکا تھا، اس میں ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا تھا۔ میں تو لیان کی کوفت کو دودھ کرنے کے لئے وہ اٹھیلیاں کر رہا تھا۔ ورنہ اس قسم کی چھیز چھاڑ کا موقع نہیں تھا۔

”میں فوراً طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا“ ڈاکٹر موگ نے ہمیں صبح سلامت دیکھ کر اطمینان کی سانس لی ”آؤ میرے ساتھ“

ہم نے خاموشی سے ڈاکٹر کے پیچھے قدم برہا دیے۔ وہ ہمیں لیتے ہوئے بنگلے کے ایک دور افتادہ کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ اس نے کوئی نمبر ڈائل کیا پھر رابطہ ہونے پر اس نے مختصر الفاظ میں یہاں کی صورت حال سے کسی کو آگاہ کیا اور آخر میں کہا ”میں یہاں سے نکل رہا ہوں۔ تم یہاں کے معاملات کو اپنے طور پر ہینڈل کرنے کی کوشش کرنا۔ کیا تم کر لو گے؟“

پھر وہ پوری توجہ سے دوسری طرف بولنے والے کی بات سننا رہا اور بولا ”ٹھیک ہے، تم جو چاہے کہانی گھڑ لو، بس ایک بات کا خیال رکھنا، یہاں جو کچھ ہوا ہے، میری غیر موجودگی میں ہوا ہے۔ تم دو پارٹیوں کا آپس میں ٹکراؤ بھی بیان کر سکتے ہو، ویسے پولیس والے تمہاری بھی مانتے ہیں اور یہاں تو ان کے اپنے دو آڑی بھی مارے گئے ہیں۔۔۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ آج دن میں بھی مجھ پر ایک ایسا ہی قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے، میرا خیال ہے، جنہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی“ اس نے ایک مرتبہ پھر دوسری طرف کی بات سنی اور جتنی لکچر میں بولا ”میں تم سے بعد میں رابطہ کروں گا“ اتنا کہتے ہی ڈاکٹر موگ نے ریسپورڈر بڈل کر دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ بولا ”میں نے جانوس کو فون کیا ہے۔ وہ یہاں کے حالات کو کنٹرول کر لے گا۔ ہمیں فوری طور پر ہسپتال کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ اگر مزید کچھ دیر یہاں رک گئے تو خواہ مخواہ کی پولیس کا رروائی میں وقت برباد ہوگا اور اس بات کا بھی امکان ہے۔۔۔۔۔ ہم پر کوئی

تیسرا قاتلانہ حملہ بھی ہو جائے، دوسری جگہ کی ناکامی کے بعد ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمیں منظر سے ہٹ جانا ہوگا“

وہ میری ساحل کی طرف روانہ ہونے کی بات کر رہا تھا، میں بھلا کیسے انکار کر دیتا۔ آئندہ پانچ منٹ میں ہم نے اپنا بیگ تیار کر لیا پھر ڈاکٹر موگ کی ہدایت پر ایک کمرے میں بچکے گئے

ڈاکٹر نے کہا ”ہم یہاں سے دوسرے بنگلے میں داخل ہوں گے پھر جیب میں پیٹھ کر روانہ ہو جائیں گے۔ ہم روادا کی کے وقت سے پندرہ بیس منٹ لیٹ ہو چکے ہیں“

میں ڈاکٹر کی بات سن کر چونک اٹھا اور پوچھا ”اس کمرے سے دوسرے بنگلے میں کیسے داخل ہوں گے؟“

”ایسے“ وہ کمرے کے ایک کونے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا ”دیکھتے جاؤ“

میں دیکھتا گیا بلکہ میرے ساتھ ساتھ لیان بھی دیکھتی چلی گئی۔

ڈاکٹر نے کمرے کے مذکورہ کونے سے قالین کو اٹھایا تو نیچے پختہ فرش کے بجائے لکڑی کا تختہ نظر آیا۔ یہ تختہ تین پالی تین فٹ کے سائز کا تھا۔ کمرے کے فرش میں یہ ایک خاص قسم کی تبدیلی تھی جس طرف کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مخصوص تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے مذکورہ چوٹی تختے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا۔ یہ ایسا ہی عمل تھا جیسے کسی کنکر کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے۔

وہ ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بولا ”میں اس کے اندر اتر رہا ہوں۔ تم بھی ہاری ہاری میرے پیچھے آ جاؤ“

پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس خلا میں غائب ہو گیا جو تختہ اٹھ جانے سے پیدا ہوا تھا۔ میں نے لیان کی طرف دیکھا اور کہا ”پہلے تم اس کڑھے میں اتر دو۔ تمہارے بعد میں اتر دوں گا“

لیان کو یہ ہدایت دینے سے پہلے میں اس خلا میں اچھی طرح جھانک کر اپنا اطمینان کر چکا تھا۔ ویسے مستند تھا ڈاکٹر موگ کا فرمایا ہوا۔ وہ ایک قابل اعتماد اور تجربہ کار شخص تھا۔ میں اس کی بات پر یقین کر سکتا تھا۔ وہ نہ دل سے ہماری مدد کر رہا تھا اور وہ بھی ایک ذمے دار بزرگ کے مانند۔

لیان نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح میرے حکم کو تعمیل کی اور کڑھے کی جانب بڑھ گئی۔ میں دیکھ چکا تھا، اس خلا کے اندر اترنے کے لیے باقاعدہ زینہ بنا ہوا تھا، لیان کے بعد میں نے بیگ سنبھالا اور خلا میں قدم ڈال دیا۔ وہ لگ بھگ

دس اسٹیپ کا زینہ تھا۔ میں آہستگی ایک ایک اسٹیپ طے کر کے نیچے پہنچ گیا جہاں لیان اور ڈاکٹر موگ موجود تھے۔ وہ ایک تنگ سی راہداری تھی۔

یہاں پر ایک بلب روشن تھا۔ ڈاکٹر نے کہا ”تم ایک منٹ کے لیے رکھو اس راستے کے داخلی حصے کو کچ کر کے آتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ اس زینے کی جانب بڑھ گیا جس کے ذریعے ہم اس راہداری میں پہنچتے تھے۔ میں سمجھ گیا، داخلی حصے کو کچ کرنے سے اس کی مراد یہی تھی کہ وہ اس راستے کو بالکل دیا ہی کر دے گا جیسا وہ پہلے تھا تاکہ اوپر کمرے میں آنے والے کسی شخص کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ وہاں کوئی چور راستہ بھی موجود ہے۔ یہ دونوں بنگلے جانوس کی خفیہ جاکد اد میں شمار ہوتے تھے۔ وہ یقیناً اس پراسرار راستے کے راز سے واقف ہوگا۔

تین منٹ بعد ڈاکٹر موگ ایک مرتبہ پھر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم اس کی معیت میں اس تنگ سی راہداری میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ڈاکٹر جس بنگلے کو ہم خیر باد کہہ آئے ہیں اس میں چودہ پندرہ افراد خاک و خون میں نہائے پڑے ہیں جن میں ہمارے تین افراد کی لاشیں بھی شامل ہیں، جانوس کو یہ کھیر صورت حالات سنبھالنے میں دشواری تو پیش نہیں آئے گی؟“

میں نے جن چودہ پندرہ افراد کا ذکر کیا ان میں چھ شدید زخمی اور نو کے قریب لاشوں میں بدل چکے تھے، چندر اور دونوں سادہ لباس پولیس والے بھی لاشوں کی قطار میں تھے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس بنگلے میں اچھی خاصی خونریزی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا ”جانوس ایکی بچویشن سے منٹے کا بھر ہے۔ میرا خیال ہے، وہ بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو نیکل کر لے گا، لاؤ بڑھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم تینوں بالکل محفوظ ہیں۔“

وہ ایک عملی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ واقعی یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس مختصر سے معرے میں ہمیں کسی قسم کا جانی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میں نے ڈاکٹر موگ سے دریافت کیا۔

”فائرنگ کی آواز سننے کے بعد تم کمرے سے نکلے تو اسے غائب ہونے کا پھر پلٹ کر نظر نہیں آئے۔ میں نے ہمیں اس معرے کے اختتام پر دوبارہ کو بیڈور میں دیکھا جب تم ہمیں تلاش کرتے ہوئے ادھر آ نکلے تھے۔ اس تمام

عرصے میں تم کیا کرتے پھرے؟“

وہ صبر سے ہوئے لکچر میں بولا ”ہم دونوں ایک ہی نوعیت کے کام میں مصروف تھے، بس فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے یہ کام نہایت ہی خاموشی سے انجام دیا اور تم نے کافی ”ہلا گلا“ مچایا ہے۔ میں نے اس کمرے میں اور اس کے سامنے والی راہداری میں تمہارے کارنامے کے نتائج ملاحظہ کیے ہیں، جنہیں بھی میری خاموش کارکردگی دکھائی دی ہوگی۔“

”بالکل دکھائی دی ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا پھر ڈاکٹر موگ کو لیان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا ”لیان کے لیے یہ ایک بڑا محاذ ہے۔ اس سے پہلے یہ چھوٹے موٹے مشن میں کام کر چکی ہے۔ مجھے امید ہے اس مشن میں اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا“ اس کا تجربہ بلوفت کے زینے پر قدم رکھ دے گا۔“

اس دوران میں لیان بالکل خاموش ہمارے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ لیان ڈاکٹر کا بے حد احترام کرتی تھی اور اس کی بھی ایک خاص وجہ زیادہ تر خاموشی ہی رہتی تھی اور اس کی بھی ایک خاص وجہ۔ لیان اور اس کا شوہر نامہ راشون، مشر ونگ ہنگ کے لیے کام کرتے تھے اور ڈاکٹر موگ ونگ ہنگ کا بڑا تھا۔ وہ دونوں ہنگ کے ساتھ تھے بے تکلف دوستوں کی طرح رہتے تھے مگر موگ کے ساتھ ایسا رویہ نہیں اختیار کر سکتے تھے۔ وہ ایک طرح سے ان کے پاس کا بھی باس تھا، لیان کو پہلی مرتبہ ڈاکٹر موگ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے بھی وہ کچھ زیادہ ہی محتاط اور سنجیدہ نظر آتی تھی۔

ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ایک زینہ طے کر کے دوسرے بنگلے کے کسی کمرے میں نمودار ہو جاتے۔ جو عمل اس بنگلے کے کمرے سے نہ خانے میں اترنے کے لیے کیا گیا تھا وہی عمل ایک مرتبہ پھر وہاں ہی کے رخ پر اختیار کیا گیا اور ہم زینہ زمین خیز راستہ استعمال کر کے یہ آسانی دوسرے بنگلے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس بنگلے کے ایک کمرے میں نمودار ہونے کے بعد ڈاکٹر موگ نے اس خفیہ راستے کے آثار کو قالین کے نیچے چھپا دیا اور ہم جیب میں آ بیٹھے۔

جیب بنگلے سے باہر نکلی تو ہم نے اس کے گیٹ کو دیے ہی لاک کر دیا جیسے وہ پہلے تھا پھر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت میری گھڑی رات کے نو بجیں کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ

.... اعلان ان کانوں کی زبانی تھا جو گھڑی کے ڈائل پر اپنی مخصوص حرکات سے دقت بتانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس حساب سے ہم پورے پچیس منٹ لیٹ تھے۔

ڈاکٹر مونگ نے جیب کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ میں لی بان کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہماری سیٹ کے پیچھے بھی ایک تنگ سا خلا موجود تھا جس میں پٹرول کے دو برے تین رنگے تھے جو اپنے اسٹینڈ میں ٹکس تھے۔ خلا کے دوسرے کونے میں ہمارا بیک پڑا تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے اپنے ضروری سامان اور جس اسٹیک کا ذکر کیا تھا، وہ جیب میں بچھے دکھائی نہیں دیا۔ بھینا یہ چیزیں اس نے جیب کے کسی خفیہ گوشے میں محفوظ کر رکھی ہوں گی۔

ہماری جیب گلی سے نکلی اور رتنا پارک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس دقت تک جانوس یا کوئی اور اس ہنگامہ پر درہنچکے تک نہیں پہنچا تھا اور یہ ہمارے جیسے ایک اطمینان بخش بات تھی۔ کسی کو ہماری روانگی کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہماری جیب رنگ روڈ پر نکل آئی۔ رنگ روڈ (RING ROAD) کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سڑک نے پورے کھنڈ کو اپنی آغوش میں سیٹ رکھا ہے۔ کھنڈ وہیں نہیں سے بھی داخل ہوں یا اس شہر سے خارج ہوں کہیں نہ کہیں رنگ روڈ سے ضرور واسطہ پڑ جاتا ہے۔ یہ پورے شہر کے لیے ایک بائی پاس کا کام کرتی ہے۔ ہم نے رنگ روڈ کو چھوڑا اور ہائی وے پر نکل آئے پھر ہم کھنڈ شہر کے آثار کو اپنے پیچھے چھوڑتے چلے گئے۔ ہائی وے ایک طرح سے دریا بن چکی تھی۔ سبز بستہ موسم نے اس کی خاموشی اور سناٹے میں اضافہ کر رکھا تھا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے ہمیں رفتار بڑھانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی مگر دس پندرہ منٹ بعد احتیاطاً ہمیں رفتار کم کرنا پڑی۔ ڈاکٹر مونگ نے بتایا "کھنڈ کی حدود میں ہائی وے بڑی ہموار اور کشادہ ہے مگر اب وہ پہلے سی بات نہیں رہی لہذا ہمیں محتاط رہ کر آگے بڑھنا ہوگا۔"

میں اس ہائی وے پر سفر کر چکا تھا اور اس راستے کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھا اس لیے ڈاکٹر مونگ کے اظہار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گفتگو کو اس کی طرف موڑ دیا۔ میں نے ڈاکٹر سے استفسار کیا۔

"ڈاکٹر! آخری مرتبہ ہمیں کب اطلاع ملی کہ وہاں بستی میں سب ٹھیک ہے؟"

اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا

"لگ بھگ شام چھ بجے۔"

"کاش کوئی ایسا ذریعہ بھی ہوتا کہ ہم اپنی مرضی سے وہاں رابطہ کر سکتے۔" میں نے پُر خیال انداز میں کہا "تاکہ وہاں کی پل پل کی خبر ہمیں ملتی رہتی۔"

ڈاکٹر بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا میرے استفسار میں اتنی بے تابی کیوں ہے۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "میں تمہیں بتا چکا ہوں اور تم خود بھی اس بات کو دیکھ چکے ہو کہ وہاں کی کیا صورت حال ہے۔ بمشکل پچاس گھنٹوں پر مشتمل اس بستی میں تمام ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہیں کیلی فون کی سہولت ایک دو جگہ پر ہے۔ اسی لیے میں از خود شاکا سے رابطہ نہیں کر پاتا۔ وہ خود ہی کسی کال آفس سے مجھے فون کرتا ہے۔ تمہاری ساسی کو اس بستی میں منتقل کیے زیادہ دقت نہیں ہو۔ اس دوران میں شاکا مجھے اس کی خبریت سے تین مرتبہ آگاہ کر چکا ہے اور میں وہاں کے حالات سے مطمئن ہوں۔"

وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "آج شام چھ بجے جب شاکا سے میری بات ہوئی تو میں نے اسے بتا دیا تھا رات دس بجے تک ہم اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ویسے تم خود بھی تو وہاں کی خبر لے سکتے ہو۔"

ڈاکٹر مونگ نے آخری جملہ بڑے ڈٹکے چپے انداز میں ادا کیا تھا اور یہ اس نے اجماعی کیا۔ لی بان میری جی اچھی طرح آئی دانی صلاحیت سے واقف نہیں تھی۔ ڈاکٹر اگر عمل کر بات کرتا تو پھر جلد یا بدیر مجھے لی بان کے ڈیڑھ سوالات کے جوابات دینا پڑتے۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر مونگ کی معیت میں وہ خاموشی اختیار کیے رہتی لیکن جیسے ہی اسے تمہاری بات کرنے کا موقع ملتا وہ میرا دماغ چٹانے کی ضرورت کو محسوس کرتی۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ حساس اور متحسں ہوتی ہیں اسی لیے ان کی جذباتیت کا اگر ابھی قدرے ادراک ہوتا ہے اور اگر معاملہ کسی مرد کا ہو تو ان کا تجسس آسان کو چھوٹے لگتا ہے۔ اگر لی بان کو میری خفیہ صلاحیتوں کی بھنگ بھی مل جاتی تو وہ تفصیل جانے بغیر پُرسکون نہیں ہو سکتی تھی۔ میں فی الحال اسے جی اچھی طرح آئی کے معاملات سے بے خبر ہی رکھنا چاہتا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ انسان کا اختیار صرف تھوڑے تک محدود ہے تقدیر کا مالک کوئی اور ہی ہے اور وہ تقدیر بد کرنے کے سلسلے میں کسی سے مشورہ یا رائے لینے کا پابند ہے اور نہ ہی محتاج!

میں نے بھی ہم انداز میں ڈاکٹر مونگ سے کہا "کاش!"

میں وہاں کی خبر لے سکتا۔ اس شاطر ربی نے میرے راستے میں اپنے کسی عمل کی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ میں اس دیوار سے سرنگرا کر رہ جاتا ہوں۔ تاہم یہ مجبوری تک تب میری کوشش کی راہ میں حائل رہے گی!"

میری سوچ میں ایک نامعلوم سی مایوسی در آئی۔ ڈاکٹر نے میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

"دل چھوٹا نہ کرو۔ میں نے تمہاری ساسی کا علاج شروع کر دیا ہے۔ اگر لاڈ بڑھانے مہربانی کی تو وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گی۔ اسے بنیادی طور پر کوئی بیماری نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ربی موٹے ہاتھن نے پیناؤم کے مختلف ٹیشن میں اس کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے وہ اپنے ذہن میں ربی کے لیے بہت احتیاط اور احاطہ بندی کی کوشش کر رہی ہے اور جہاں تک تمہاری ناک کی کا قلعہ ہے۔" وہ کلمے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں ربی نے اپنے کسی عمل سے تمہاری ساسی کے گرد ایک طلسمی حصار سا قائم کر دیا ہے جو تمہارے راستے کی رکاوٹ بن کر سامنے آ رہا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! میں اس حصار کی کاٹ میں لگا ہوا ہوں۔ لاڈ بڑھا مجھے جلد ہی کامیابی دے گا!"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا پھر میں نے کیلے لہجے میں کہا "اس مکار ربی نے اپنے گرد بھی ایسا ہی حصار کھینچ رکھا ہے جیسا تمہارے ہو۔ ان دونوں محاذوں پر میں مسلسل ناکامی کا سدھار رہا ہوں۔"

"فکر نہ کرو آدمے! ہونے کھنے بعد تم اپنی ساسی کا منہ دیکھنے والے ہو۔" ڈاکٹر مونگ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "پھر تمہاری ساسی حکمن ناپوسی اور کلفت دور ہو جائے گی۔"

میں نے ڈاکٹر مونگ کی اس خوش خبری کے جواب میں کچھ نہ کہا اور آنکھیں بند کر کے ساحل کے تصور میں کھویا۔ اس کا تصور بڑا سہانا بڑا امتنا تھا۔ یہ متناہ تصور مجھے دیوانہ بنا دیتا تھا۔ انسان کو جس شے کی شدت سے طلب ہو اس کے حصول کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اسے یقین نہیں آتا کہ وہ اپنے کسی دیرینہ مقصد کو پا نے والا ہے۔ میں بھی اسی بے یقینی کا شکار تھا اور اس میں میرا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ میں ایسا سوچنے اور محسوس کرنے کے لیے لاشعوری طور پر مجبور تھا۔

ساحل کو مجھ سے پچھڑے اب اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا۔ اس دوران میں بار بار ایسے مواقع بھی آئے کہ مجھے یوں محسوس ہوا ساحل مجھ سے ایک ہاتھ کی دوری پر ہے۔ میں ہاتھ بڑھاؤں گا اور وہ میری دسترس میں ہوگی لیکن میرا یہ احساس سراب ثابت ہوا۔ شاید اس لیے بھی میں بے یقینی کا شکار تھا۔

میں نے اس کی تلاش میں کیا کیا نہیں کیا تھا۔ خود تو جو صد مات اٹھائے تھے وہ اپنی جگہ مسلم تھے لیکن اس کے جواب میں میں نے دشمنوں کے دانت بھی کٹے کٹے تھے یہ لگ بات کہ اس راہ میں میرے ذہن بدلتے رہے شیطان مختلف روپ دھار کر میرے مقابل ڈٹا رہا۔ وہ چوہدری لوازش علی ہو شیب غوری ہو یا پھر ربی موٹے ہاتھن..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان سب کرداروں کا ایک ہی مقصد تھا ساحل کو مجھ سے جدا کرنا۔ چاہے وہ کسی بھی سبب میری رگ جاں کو مجھ سے الگ کر رہے ہوں..... اور ان میں ربی موٹے ہاتھن میرا سب سے زیادہ خطرناک اور طاقت ور دشمن تھا اور حقیقی معنوں میں میں نے سب سے زیادہ نقصان بھی اسی شخص کو پہنچایا تھا۔ امریکا میں تو مجھے "پاکستانی دہشت گرد" اور "امریکی دشمن" جیسے تائٹل سے نوازا جا چکا تھا۔ میں نے ربی کے درجنوں آدمیوں کی لاشیں گرانی ٹھیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری تھا۔ میں امریکا میں ہوں یا نیپال میں اس دقت میری موٹے ہاتھن ہی سے ٹھنی ہوئی تھی..... میں نہیں جانتا تھا ہمارے درمیان یہ جنگ کب تک جاری رہے گی۔ میں ساحل کے حصول کی خاطر اس سے نگرار ہا تھا اور اب میری ساسی اس کے قبضے سے نکل کر میرے ایک انتہائی ہمدردی بناہ میں آ چکی تھی۔ میں ڈاکٹر مونگ کے اس عظیم احسان کو زندگی بھر بھول نہیں سکتا تھا۔

ساحل کا تصور میرے رگ و پے میں ایک گدگد گہری سی چاٹ دیتا۔ دل میں ایک ترنگ ایک امنگ سی کروت لپٹنے لگتی۔ میرے احساسات اس کی خوشبو سے جگمگانے لگتے اور میں اپنے تن بدن میں ایک کیف سا دوڑتا ہوا محسوس کرتا۔ ساحل کا خیال میری روح کی سرشاری کا باعث تھا۔ درجنوں پارکی ناکائی کے بعد بھی اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کو جی جھل جاتا۔ کیا تھا اس مرتبہ کامیابی قدم چوم لے..... کیا تھا! میں نے تیسری آنکھ کے سامنے ساحل کے نقوش کو ابھارا اور اپنی تمام پراپتی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی پھر میری یہ کوشش ایک بار تک محدود نہ رہی! میں نے متعدد مرتبہ ساحل

کے ماحول کو چھوٹا چاہا مگر ہر دفعہ میرے تصور کے پر جل کر رہ گئے۔ میں اپنی جان تنہا کے ماحول میں داخل نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور آنکھیں کھول کر جیب میں حاضر ہو گیا۔

ڈاکٹر مونگ میری اس ”کارروائی“ کو عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میری ناکاکی اس سے چھپی نہ رہی۔ میرے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہا۔ میں اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی لیان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیان کا پی دیر سے خاموش تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو اسے شنو کی کی حالت میں پایا۔ وہ ایک طرح سے مجھ پر لدی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کے بوجھ ہی نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ سونے کا وقت نہیں تھا حالانکہ اس نے اور ڈاکٹر مونگ نے کافی بھی لی تھی۔ میں لیان کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہی سمجھا کہ آج صبح سے رات تک ہونے والی معرکہ آرائی نے اسے بری طرح تھکا دیا ہے شاید اسی سبب وہ نیند کی آغوش میں سر ڈالنے کو کچل رہی ہے۔

میں نے اس کا کندھا چھتھپایا تاکہ وہ سیدی ہو کر آرام سے لیٹ جائے مگر اس نے چھتھپا ہٹ کے جواب میں آنکھیں نہیں کھولیں اور مزید میرے اوپر گر بیٹھی۔ اسے گرنے سے بچانے کے لیے مجبوراً مجھے گھٹنے کا سہارا لینا پڑا۔ میں نے ایک ٹانگ کو ڈرا سا اوپر اٹھایا اور گھٹنے پر اس کا سر ٹکا دیا۔ اسی لمحے اس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ منہ کے بل میری ران پر آ رہی۔ اب ٹانگ کو واپس اس کی جگہ پہنچانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا۔ میں اس عمل سے گزرا تو وہ میری ران کو گھٹنے بنائے بڑے مزے سے سورہی تھی۔ اس کی تراشیدہ ہزم و ملائم زلفوں نے میری ران پر پوری طرح قبضہ جما لیا۔

”چائے نہیں اے کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ڈاکٹر مونگ کی آواز ابھری ”بے چاری تھک گئی ہے۔“

آج اس نے حد سے زیادہ مشقت کی ہے۔“

”تھک گئی ہے تو آرام سے سو جائے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”بے چاری سو تو رہی ہے اور کیسے سوئے گی؟“ وہ

جبریت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”میں چاہتا ہوں یہ پوری سیٹ پر آرام سے

آ جاتا ہوں لیکن لگتا ہے یہ میری سننے کی پوزیشن میں نہیں رہی۔“

”ہاں لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا پھر اچانک پوچھا ”کیا تمہیں اس کے سر کا بوجھ ناگوار محسوس ہو رہا ہے؟“

”نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”پھر خواتین اس کی نیند کیوں خراب کرتے ہو۔ ایسے ہی لیٹے رہتے دو۔“

میں نے ڈاکٹر مونگ سے کوئی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور کھٹک کر سیٹ کے آخری کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس طرح اس سیٹ پر لیان کے لیے زیادہ گنجائش نکل آئی۔ میں نے اس کے آرام کی خاطر آگے جھک کر اس کی ٹانگوں کو سیٹ اور اٹھا کر سیٹ پر پھیلا دیں۔ وہ خود آسائش کی اور کڑوت بدل کر اپنے منہ کو میرے پیٹ سے لگا دیا۔ اس کی گرم سانس میرے پیٹ کے زیریں حصے کو گھونکنے لگی۔ کڑوت بدلنے کے دوران میں اس نے اپنی ٹانگیں بھی فولڈ کر لی تھیں۔ اب وہ گھٹنے اپنے پیٹ میں دبائے اور منہ میرے پیٹ سے لگائے بڑے مزے سے سورہی تھی۔

میں چند لمحات تک خوابیدہ حسن کو دیکھتا رہا۔ چست چمڑے اس کے جسمانی خطوط کو خاصا نمایاں کر دیا تھا۔ وہ خیال کی ایک سرد ترین رات تھی اور جیب کے اندر بھی خوشگوار نمی موجود تھی اس کے باوجود بھی مجھے اپنے بدن پر پسینہ سارنگتا محسوس ہوا۔ وہ بڑے آزارناک لمحات تھے۔ میری دسترس میں جسم خوابیدہ فلپائی حسن پناہ گزین تھا۔ پناہ دینے والا ایسی امانت میں خیانت نہیں کرتا۔ لیان میرے پاس شون کی امانت تھی۔ میں نے نیو جرسی سے روانہ ہوتے وقت شون سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی بیوی کا خیال رکھوں گا۔ اور میں نے اس کا خیال رکھا ہوا تھا۔

میری کنپیاں سنگلے گلیں تو میں نے ڈاکٹر مونگ کو مخاطب کر لیا ”تمہیں اپنی جگہ لیکن لیان کی یہ اچانک نیند میری سمجھ سے باہر ہے حالانکہ آپ دونوں نے تو کافی بھی لی تھی۔ آپ لوگوں کو مجھ سے زیادہ ہشاش بشاش ہونا چاہیے۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ”رات کے کھانے سے پہلے تک تو لیان بہت اکیلی تھی۔ ہم نے رتنا پارک میں اچھی خاصی ایکسرسائز بھی کی تھی۔ پتا چلتا

اب اسے کیا ہو گیا ہے!“

”تم اس وقت جھجھکائے ہوئے ہو اس لیے لیان کی

نیند کو ایسا ہمارا ہے ہو۔“ ڈاکٹر مونگ نے آئینے میں مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کا اشارہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ ساحل کے ساحل تک رسائی میں ناکاکی پر میری جھجھکاہٹ کا ذکر کر رہا تھا ”میں سمجھتا ہوں“ تمہیں نے اسے یہ حال کر دیا ہے۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں برداشت کی قوت کم ہوتی ہے۔ اسی لیے انہیں صنف نازک کہا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر مونگ! تم چاہے کچھ بھی ہو میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مگر میں محسوس کر رہا ہوں ہم نے جو ذکر کیا ہے اس میں کوئی گڑبڑ بھی!“

”کیا کیا چاہتے ہو؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا ”تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو میں کس طرف اشارہ کر رہا ہوں۔“

وہ ٹٹولے والے انداز میں متفہم ہوا ”کیا تم بھی اپنے اندر کوئی گڑبڑ محسوس کر رہے ہو؟“

اس کا استفسار یہ ظاہر کرتا تھا ”وہ میرے اشارے کی تیک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے جواب میں بتایا ”ہاں میں بھی اپنے اعصاب اور عضلات میں کافی اشتعال محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھر رہی ہے کہ کبھی تان کر سو جاؤں۔“

”تم عجیب بات کر رہے ہو دودھان!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”ہم تینوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا ہے۔ اگر اس کھانے میں کوئی ایسی دیکھی شے لی ہوئی تو تمہاری طرح میں بھی.....“

اس کا جملہ ادھر ادھر گیا کیونکہ اسی وقت اس نے ایک طویل جھائی لی تھی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”ڈاکٹر! تمہیں ماننا پڑتا ہے گا ہم تینوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے ورنہ رات کے پہلے ہی پھر تمہاری یہ طویل جھائی کیا معنی رکھتی ہے؟“

”میں اب اپنی آنکھوں میں جلن سی بھی محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ بوجھل آواز میں بولا۔

میں نے کہا ”مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔“

”میں تمہارے خدشے پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں دودھان۔“ ڈاکٹر نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”مجھے یقین ہو چلا ہے رات کے کھانے میں کوئی بھی نشہ آور اور اعصاب کو متاثر کرنے والی شے ضرور ملی ہوئی تھی۔“

میں نے پڑوٹن انداز میں کہا۔

ڈاکٹر کے لہجے سے گہری پریشانی جھلک گئی۔ متذہب

انداز میں بولا ”مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے!“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔“ میں نے ہزاری سے کہا۔

وہ بولا ”رات کا کھانا میں خود باہر لے کر آیا تھا۔ فاسٹ فوڈ میں خاص طور پر ہمارے لیے کوئی ملاوٹ کیوں کرے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔“

”تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ پولیس والوں کے لیے چندر بھی کھانا لے کر آیا تھا۔“ میں نے اس کی توجہ چندر کی جانب مبذول کر دیتے ہوئے کہا ”اسی کھانے کا کچھ حصہ ہماری ٹیمبل پر بھی پہنچا تھا اور.....“ میں سوچنے والے انداز میں ذرا دیر کو رک کر پھر بھاری آواز میں بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اور..... اگر ان دونوں کھانوں میں پہلے سے کچھ بھی ملا ہوا ہو تو سر د کرتے وقت تو ملایا جاسکتا ہے نا؟“

”تم بہت خطرناک باتیں کر رہے ہو دودھان!“ وہ گھمبیر آواز میں بولا ”کھانا میرے ہا اعتماد ملازم چندر نے سر د کیا تھا۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو، چندر نے کھانے میں کسی اعصاب کشیدہ شے کی ملاوٹ کر دی ہوگی؟“

”ایسا ہونا نامکن تو نہیں ڈاکٹر مونگ!“

”لیکن چندر بھروسے کا آدمی ہے!“

”کس کے بھروسے کا؟“ میں نے چپٹے ہوئے کہا ”جسہیں کھنڈوں میں ڈیرا ڈالے ابھی چندر زندہ ہوئے ہیں۔ کیا تم

چندر کو بھی سیٹل سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے؟“

”چندر، جالوس کا برسوں کا آزمایا ہوا ہے۔“

”جالوس..... ادنیہ!“ لا محالہ میرے لہجے میں ترشی در آئی۔

میرے انداز نے ڈاکٹر مونگ کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا، ابھمن زدہ لہجے میں بولا ”جالوس کی نیت پر شک کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور..... جالوس کے لیے چندر ایک قابل مجرم و ساجاں نثار ہے۔“

میں نے قدرے لڑکھائی ہوئی آواز میں کہا ”ڈاکٹر! تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو۔ جرائم کی دنیا میں وفاداریاں بدلتے ہوئے دیر نہیں گزرتی۔ میں ممکن ہے، چندر ہمارے دوستوں کے ہاتھوں بک گیا ہو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے کہا ”تم رتنا پارک والے جس بنگلے پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں تم پر دومرتبہ قاتلانہ حملہ ہوا۔ پہلی بار تم نے چار

انتہائی خطرناک فائزر زکوم دیا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری دفعہ درجن مجرم مسلح افراد نے شب خون مارا۔ ہماری خوش قسمتی

کہ ہم زندہ ہیں اور وہ حملہ آور عبرت ناک انجام سے دو چار

اس کی بات ختم ہوئی تھی کہ جیب بری طرح لہرائی۔  
میں نے سیدھا ہوتے ہوئے تیز لہجے میں کہا: ”نہیل کر ڈاکٹر!  
اس وقت تین زندگیاں تمہارے رحم و کرم پر ہیں۔“  
میرے اچانک اچھل کر سیدھا ہونے کے باعث لی یان  
کا سر میری ران سے ہٹ کر سینٹ پر چلا گیا۔ وہ ذرا کسمپاسی  
پھر ساکت ہو گئی۔ یہ ایک جھٹکا اس کی نیند توڑنے میں ناکام  
رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سب سے زیادہ وہی متاثر ہوئی  
تھی۔

ڈاکٹر نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور جیب کو سڑک سے  
اتار کر ایک سایڈ میں کھڑا کر دیا۔ سڑک کی باقاعدہ سیاہ پٹی  
کے ساتھ ساتھ دونوں جانب آٹھ آٹھ فٹ تک زمین کو ہموار  
کر کے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں گاڑی  
کو کنارے لگایا جاسکے۔ اس طرح دونوں طرف سے رداں  
دواں ٹریفک میں کوئی تعطل واقع نہ ہوتا۔ ویسے ٹھنڈی ٹھار  
رات میں وہ سڑک کسی سسٹان قبرستان کا منظر پیش کر رہی تھی۔  
جب سے ہم ہائی دے میں داخل ہوئے تھے، ہم نے ہشکل  
تین گاڑیوں کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا تھا۔  
”اب کیا ارادہ ہے ڈاکٹر؟“ میں نے پُر تشویش انداز  
میں استفسار کیا۔

وہ بولا: ”لی یان حُرے سے سوتی رہے، اس سے کوئی فرق  
نہیں پڑتا لیکن ہم دونوں جس حالت میں ہیں، اس میں  
ڈرائیونگ کو جاری نہیں رکھا جاسکتا۔“  
”وہی تو پوچھ رہا ہوں، اب کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے  
کہا: ”آگے بڑھنا بھی ضروری ہے۔ آج آدھی رات کے بعد  
بدھنیل کنڈ والی عبادت گاہ میں قیامت آنے والی ہے اور اس  
قیامت کا مقابلہ ہمیں ہی کرنا ہے۔۔۔۔۔ اور اس سے پہلے مجھے  
ہائی دے والی ہستی میں ساحل سے ملنی ملاقات کرنا ہے۔“  
”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے“ ڈاکٹر نے  
اسٹیرنگ کو سنبھالتے ہوئے کہا: ”رفتار کی کسی کے باعث ہم  
کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔ کچھ وقت وہاں بیٹھنے میں ہونے  
والی مارا ماری میں نکل گیا۔ ہمیں جلد از جلد ہستی تک پہنچنا  
ہوگا۔“

”آئیڈیا کیا ہے، تمہارے ذہن میں؟“  
وہ بولا: ”جیب سے باہر اچھا خاصا ٹھنڈا موسم ہے۔ اگر  
ہم اس موسم میں نکل کر اپنے ہاتھ پاؤں کو کچھ زحمت دیں تو  
اعصاب اور دماغ پر چھائی ہوئی یہ کسل مندی چھٹ سکتی  
ہے؟“

”نیک خیال ہے“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”مجھے

ہو چکے ہیں۔“  
میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اپنی آواز پر قابو پاتے  
ہوئے مزید کہا: ”اگر میری تیوری کے مطابق سوچا جائے تو  
چندر ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں کا کھلوتا بن گیا تھا۔ تمہیں  
نہایت ہی رازداری کے ساتھ سٹی اسپتال سے رتھ پارک کے  
اس بیگلے پر منتقل کیا گیا۔ یہ راز جانوس، انسپکٹر شیڈ اور چندر  
کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں تھا۔ ذرا سوچو، چار مشتاق  
فائزر کیونکر تمہارا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے، یقیناً چندر  
نے اپنے نئے آقاؤں کو اس بارے میں بتایا ہوگا۔ انہوں نے  
حم سے ٹھنڈے کے لیے مارشل آئرس کے بہترین ماہرین کو بھیجا۔  
ان کی بد قسمتی کہ وہ منہ کی کھا کر یہاں سے بھاگنے پر مجبور  
ہو گئے۔ اس کے بعد سٹاف افراد کی ایک ہماری جیت کو روانہ  
کیا گیا جو بے دریغ فارنگ کرتے ہوئے اس بیگلے کی اینٹ  
سے اینٹ بجاتا چاہتے تھے“ میں نے ذرا دیر کو رک کر سانس  
درست کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس مرتبہ انہوں نے پولیس والوں سمیت چندر کو بھی  
گولیوں سے بھون ڈالا تاکہ ثبوت کے طور پر نہ رہے ہانس اور  
بعد میں نہ بچے بائرس۔ حملہ آوروں کو یقین تھا کہ کھانے میں  
ملی ہوئی نشہ آور دوائی کے باعث ہم خاصے کمزور ہو چکے ہوں  
گے لہذا انہیں مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ بڑی  
آسانی سے ہمیں خاک و خون میں نہلا کر چلتے نہیں گے لیکن  
ہماری مضبوط اعصابی ان کے لیے غلط ہی بن گئی۔ ہم نے  
پوری طرح ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور اپنے بجائے انہیں  
خاک و خون کا ٹھنڈا دیا مگر۔۔۔۔۔ مضبوط اعصابی کب تک چلے  
گی۔ لی یان تقریباً بے ہوش پڑی ہے اور ہم دونوں بھی غنودگی  
کی طرف جا رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے ڈاکٹر، جیب کی رفتار  
قدرے کم کر دو۔ اس اونچے نیچے پہاڑی راستے پر سبز کرتے  
ہوئے اگر اسٹیرنگ پر تمہارے ہاتھ ہبک گئے تو ہم بیٹھے  
بنھائے موت کی آغوش میں پہنچ جائیں گے۔ موت کو ٹھیک  
ٹھیک کر سلاتا خوب آتا ہے!“  
”میں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی رفتار کافی کم کر دی  
ہے“ ڈاکٹر نے انکشاف کیا۔

میرے لیے یہ اس صورت انکشاف تھا کہ رفتار کی کمی کو  
میں محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اس کا مطلب تھا، مجھ پر ”ڈز“ نے  
اچھا خاصا اثر کیا تھا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔  
”کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آ رہا کہ ہم کسی گہری  
سازش کا شکار ہو گئے ہیں؟“

”یقین آ گیا ہے۔“ وہ پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔

سے ہائی دے والی ہستی کی جانب ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ اب ہم دونوں پوری طرح ہوش و خواس میں تھے۔<sup>۱۱</sup> ڈاکٹر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”شاکا ہماری طرف سے پریشان ہو رہا ہوگا۔ میں نے اسے دس بجے تک ہستی میں پہنچنے کے بارے میں بتایا تھا اور اس وقت رات کے ساڑھے دو بج رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی ہم کمشنر داد بستی کے وسط میں موجود ہیں۔ بستی تک پہنچنے کیلئے ہونو نہی جا چکے گے۔“

میں نے کہا ”اگر شاکا ہماری وجہ سے پریشان ہوگا تو اسے چاہیے فون کر کے تم سے اس تاخیر کا سبب معلوم کرے۔ کیا اس کے پاس تمہارا موبائل نمبر بھی ہے؟“

”میں نے اسے اپنے تمام نمبرز کھوار کھے ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے شاکا بڑے حیرے سے دہاں بستی میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ میں نے غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا ”اگر اسے تمہاری جانب سے کوئی پریشانی لاحق ہوئی یا پھر ہاں بستی میں کسی قسم کی کوئی گڑبگ کا امکان ہوتا تو وہ اب تک تم سے ٹیلی فونک رابطہ کر چکا ہوتا۔“

وہ غصہ لہجے میں بولا ”لارڈ ہڈا خیر کرے۔“ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”دیئے اس وقت تک بستی دہاں میں بند ہو چکی ہوں گی۔ اگر شاکا کو ٹیلی فون کی ضرورت محسوس ہوئی بھی تو وہ فون نہیں کر سکے گا۔“

”ڈاکٹر موبائل! سائل والا معاملہ بہت ہی اہم ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”جہیں باپے تھا ایک آدھ موبائل فون شاکا کو بھی دلوادیتے تاکہ بے وقت وہ تمہاری رسائی میں رہتا۔“

وہ بولا ”موبائل فون والا آئیڈیا پہلے میرے ذہن میں ہی آتا تھا لیکن پھر میں نے کچھ سوچ کر اسے رد کر دیا۔“

”کیا سوچ کر تم نے اس معقول اور مفید آئیڈیا کو رد کر دیا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا ”شاکا اس بستی کا ایک عام اور بے ضرر انسان ہے، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ وہ موبائل جیسی ہولت کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے شاکا کی ذات پر کوئی ٹھک کی نظر ڈالے۔“

میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سے بحث کرنا ضروری نہ سمجھا حالانکہ مجھے اس کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ میرے سب سے شاکا کے پاس موبائل فون بہت ضروری تھا۔ وہ

12۔

انسان کے اعضا اور اعصاب میں ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے اور یہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر آپ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھو کر آرام سے لیٹ جائیں تو اعصاب میں بھی نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی ہے پھر خواہ مخواہ ہی نیند آنے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر اعصاب کسی شے کے زیر اثر ہوں تو ہاتھ پاؤں خود بخود ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ آخر الذکر صورت حال تھی۔

ہم پوری طرح فٹ ہو کر بیپ کی جانب بڑھے ہی تھے کہ ہمیں چونک جانا پڑا۔

- درویشی میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اچھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ وہی سمت تھی جہاں سے ہم آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا، ہماری طرح کوئی اور بھی کھنڈہ وکی طرف سے ہائی وے پر چلا آ رہا تھا۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ڈاکٹر مونگ کو اشارہ کیا اور ہم اپنی جیب میں آ بیٹھے۔

کی بیان ایسی تک اس طرح تھی کہ اس نے اس کے چہرے کی جانب مڑنے والا کھڑکی کا شیشہ اگردیا تاکہ کھڑکی کے راستے اندر پہنچنے والی ٹھنڈک اس کے حواس کا مساج کر سکے اس طرح وہ خود بخود گہری غفلت نہ نیند سے بیدار ہو جاتی۔ اگر وہ باہر روزمرہ کی کنسیدور ہی ہوئی تو توشیش والی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ ہمیں کھانے میں کوئی ایسی دیکھی چیز کھلا دی گئی ہے لیان کا جلد از جلد ہوش میں آ جانا بہت ضروری تھا!

کھڑکی اور تختے والی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد  
میں پینجر زیٹ پر آ بیٹھا اور ڈاکٹر موگیل نے جیب کو کچے میں  
سے نکال کر باقاعدہ سڑک پر پہنچا دیا۔ ایک مرتبہ پھر ٹھنڈ

ڈاکٹر نے عقب نما آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا: "گناہ ہے ان لوگوں کو کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔ وہ بہت غیر محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہے ہیں۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی حرکات سے اندازہ ہوتا ہے وہ جیسے اچھلتے کودتے آگے بڑھ رہے ہیں ان کی رفتار خاصی خطرناک ہے۔"

ڈاکٹر مومک اس گاڑی کا ذکر کر رہا تھا جس کی ہیڈ لائٹس میں نے بھی دور قریب میں چمکتی ہوئی دیکھی تھیں۔ میں نے ہر سہری انداز میں کہا ”جلدی تو ہمیں بھی ہے ڈاکٹر! ہم اپنے پرورگم سے ایک گھنٹا یا دو گھنٹے ہیں لیکن میں تمہیں رات ڈرائیونگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ہم تاریک رات میں اس وقت ایک خطرناک پہاڑی راستے پر سفر کر رہے ہیں۔ جلدی میں ہونے والی کوئی بھی غلطی ہمیں منزل کے بجائے یہیں اور بھی پہنچا سکتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگے۔  
 ”تم فکر نہ کرو میں بہت احتیاط سے اور دیکھ بھال کر جیپ کو  
 آگے بڑھا رہا ہوں۔“

میں نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں لی  
 بان کا جائزہ لیا۔ وہ هنوز غفلت کی نیند کے ”عرے“ لوٹ رہی  
 تھی۔ میں اس کی طرف سے خاصا متحکم تھا۔ مجھے فکر مند ہونا  
 بھی چاہیے تھا۔ میں نے شون سے اس کی حفاظت کا وعدہ  
 کر رکھا تھا۔

پہاڑی راستے کے سبب پہنچنے والے جھکوں اور پتھروں  
 نے غبی نسبت پر لیان کی پوزیشن بدل دی تھی۔ یہ بھی ممکن  
 تھا کہ کڑی کے راستے اندر پہنچنے والی خنڈ کے اسے اسے  
 بدلنے پر مجبور کر دیا ہو۔ عقب نما آئینے میں اس کا چہرہ مجھے  
 صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ وہ بے خبر تھی  
 کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ویسے جیب روکنے کے بعد  
 میں نے اوور ڈرائیونگ کے بڑی توجہ سے اسے چیک کیا تھا۔  
 ریک کے ڈرائیو سائیزر تسلی بخش تھے۔ بس وہ غفلت کی نیند میں  
 تھی۔ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

کیا ان کی معصوم صورت کو دیکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ہم نے اس کے چہرے کی ہنگام اور ہمیں اسٹائل کی تبدیلی کا ہورگرام بنایا تھا لیکن رتنا پارک والے جنگل میں وہ ٹونڈیا واقعات اتنی تیزی سے دوہرا ہوئے کہ ہمیں خود رتوج

دینے کا ہوش نہیں رہا تھا، لی یان کے میک اپ کے بارے میں کب سوچتے۔ ان حالات میں پہلی فرصت میں اس بنگلے کو خیر باد کہنا ضروری تھا..... اور یہ ضروری کام ہم نے پہلے کیا تھا۔ لی یان کے چہرے کی فنگ اور میئر اسٹائل کے بارے میں ہستی میں پہنچنے کے بعد بھی سوچا جا سکتا تھا۔ ہم جو ایک ایسے ساتھ لے کر آئے تھے اس میں میک اپ کے حوالے سے مکمل ریٹج موجود تھی۔

”دُجدان! یہ لوگ تو سر پر چڑھے آرہے ہیں۔“ ڈاکٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے بھی ٹھوڑا سا جھک کر عجبیہ منظر دکھانے والے  
آنکھیں میچا کر انکو تشویش میں مبتلا ہو گیا ہمارے پیچھے آنے  
والی گاڑی دوائی بو بڑے خطرناک انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔  
اس کی رفتار اور راستے کی صورت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا  
اس گاڑی میں موجود افراد کو اپنی زندگی سے ذرا سا بھی پیار  
نہیں۔ میں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر ڈاکٹر کو مشورہ  
دیا۔

”ڈاکٹر میونگ! جیب کو ایک طرف ہٹا کر اس گاڑی کو  
اودر ٹیک کا موقع دؤ ورنہ مجھے تو یوں لگ رہا ہے یہ لوگ ہمیں  
رد نہتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔“

ادھر سیری بات ختم ہوئی ادھر اس گاڑی نے اور دیکر  
کے لیے مارن بجاتا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا انہوں  
نے ہماری شکستوں کی ہو۔ اگرچہ باحول میں ہر سوار کی رچی  
بہی تھی تاہم ہیڈ لائٹس کی روشنی نے ہمیں بتا دیا کہ کدو کی بیوی  
گاڑی تھی۔ میرا اندازہ انٹینشن دیکن کا تھا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس گاڑی کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتا، تاریک بخ بستہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

ہمدردوں نے تشویش بھری نظروں سے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے جیب کی اسپیل میں اضافہ کر دیا۔ میں نے کہا ”کیا کر رہے ہو ڈاکٹر؟“

”کیا کر رہا ہوں!“ اس کی جھلکی ہوئی آواز ابھری۔

میں نے بیچ سے مشابہ آواز میں کہا ”یہ بہت خطرناک ہے۔ تاریکی اور راستہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم کوئی بہت بڑا نقصان اٹھالیں گے۔“

”ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔“ وہ جیپ کی رفتار کو بہتر متعین کر رہا تھا۔

میں نے وحشت زدہ نظر سے عقب میں دیکھا۔ ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی نے ہارن بجانا بند کر دیا تھا تاہم اس کی

رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بڑے لرزہ خیز انداز میں تارک سڑک پر دوڑنے لگیں۔ میں نے واضح طور پر دیکھ لیا۔ وہ ایک اسٹیشن دیکھ گئی۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ لوگ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے اور تھوڑی دیر پہلے چلنے والی کوئی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے دشمن تھے۔ وہ فائر یقیناً ہماری جیب پر کیا گیا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جیب اس گولی سے محفوظ رہی۔

ڈاکٹر نے ڈرائیونگ پر کنٹرول برقرار رکھتے ہوئے اپنے ایک پاؤں کو کلک کے سے انداز میں جیب کے ڈیش بورڈ کے نیچے واقع خلا میں چلایا۔ کلک کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ وہی خلا تھا جہاں میں نے پاؤں رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے سرسرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں نے ایک خفیہ خانہ کھول دیا ہے۔ وہاں دو آٹو ٹینک راکٹس رکھی ہیں۔ وہ لگ بھگ ان لوگوں کو تعاقب سے روکتا ہوگا۔“

میں نے پلک جھپکتے میں تھوڑا جھک کر دونوں مذکورہ راکٹس اس خفیہ خانے سے برآمد کر لیں۔ وہ پوری طرح لوڈ تھیں۔ ایک گن کو میں نے ڈاکٹر کی سیٹ کے ساتھ کھڑا کر دیا دوسری کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ وہ دونوں سیون ایم ایم گنیں تھیں۔

فائر کے بعد متعاقب گاڑی کی طرف سے مزید کوئی گولی نہ چلی انہوں نے ہارن کی ضرورت بھی محسوس نہ کی البتہ انہوں نے ہمیں روکنے اور دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ اپنایا۔ میں جیسے ہی گن تھام کر سیدھا ہوا ہماری جیب کو ایک خوفناک دھچکا لگا۔

بات ختم کرتے ہی ڈاکٹر مونگ نے جیب کی اندرونی لائٹ کو آف کر دیا۔ جیب کا اندرونی ماحول اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اب باہر اور آس پاس سے جیب کے اندر جھانکنے جاسکتا تھا۔ میں نے ایک طرف کے محاذ کو پوری ذہنی بیداری کے ساتھ سنبھال لیا۔

میں نے پیچڑ سیٹ والی کھڑکی کا شیشہ گر لیا اور اپنے بالائی نصف دھڑ کو ٹھنڈی ٹھار فضا کے سپرد کر دیا۔ جسم کے اسی حصے میں میرے دونوں ہاتھ بھی پیوست تھے اور ان ہاتھوں میں ایک خطرناک سیون ایم ایم دلی ہوئی تھی۔

میں نے جیب سے باہر نکلے ہوئے اپنے جسم کو ایک خاص زاویے سے موڑا اور سیون ایم ایم سے اسٹیشن دیکھنے کی ہیڈ لائٹ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ممکن ہے وہ گاڑی کے پہلوں پر فائرنگ کرتا مگر میں نے ایک خاص وجہ سے ہیڈ لائٹ کو چنا تھا۔ میرے سامنے اس وقت متعاقب اسٹیشن دیکھنے کے ”جسم“ کے تین حصے کھلے ہوئے تھے۔ پاؤں پیٹ اور آنکھیں۔ میں اپنی جیب میں رچے ہوئے باسانی اسٹیشن دیکھنے کے ٹارڈول ڈیٹا اسکرین اور ہیڈ لائٹ کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اس بد بخت کو مجروح یا معذور کرنے کے بجائے اندھا کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے ہی لمحے سیون ایم ایم گن گرج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیشن دیکھنے کی لائٹس چمکنا چور ہو گئیں۔ میں نے نشانہ باندھ کر جو برست مارا تھا اس نے متعاقب گاڑی کو دونوں آنکھوں سے اندھا کر دیا۔ اب وہ اسٹیشن دیکھنے تارک رات میں ہماری جیب کو ”دیکھنے“ کے قابل نہیں رہی تھی۔

میں واپس پیچڑ سیٹ پر پہنچا اور ڈاکٹر مونگ سے کہا ”جیب کی رفتار کو بڑھا دو۔“

کے پاؤں کو گھما ل کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یہ بھی نظریہ ضرورت کا ایک رخ تھا۔

میں نے جیسے ہی سیون ایم ایم کو سیدھا کر کے ٹریگر دبا نا چاہا ہماری جیب کو ایک شدید جھجکا لگا۔ اسی لمحے اسٹیشن دیکھنے نے عقب سے جیب کو ٹکر ماری تھی۔ وہ اسٹیشن دیکھنے کم بخت ہماری جیب کی دم سے گویا بندھی چلی آ رہی تھی۔ میں دھکا کھانے کے سبب اپنے ٹارکٹر پر فائر نہ کر سکا۔ دوبارہ سنبھال کر جیب میں نے یہ کوشش کرنا چاہی تو میدان جنگ کے نقشے میں تھوڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اسٹیشن دیکھنے میری فائرنگ رینج میں نہیں رہی تھی۔

دوسری مرتبہ وہ ڈرائیونگ سائیڈ میں نمودار ہوئی۔ اب اس کا انداز اور ٹیک کرنے والا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ ہم سے آگے نکل کر ہماری راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہونے کا عزم رکھتے ہیں۔ اگر اسٹیشن دیکھنے ہماری جیب کے سامنے پہنچ کر ایسی کوئی کوشش کرتی تو لاعلمی ہم جیب روکنے پر مجبور ہو جاتے بصورت دیگر ہمیں اسٹیشن دیکھنے سے مرگنا ہوتا۔

میں نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی نشست کے اوپر سے ہوتے ہوئے عقبی نشست پر پہنچ گیا۔ میں نے سرسری انداز میں لیان کا جائزہ لیا۔ وہ فٹ میٹ پر بے سدھ پڑی تھی۔ میں پوری توجہ سے محاذ پر ڈٹ گیا۔

میں نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کا شیشہ اتارنا سنبھال لیا جہاں سے میں گن کے بیروں کو باہر نکال سکوں۔ اسٹیشن دیکھنے اب تقریباً جیب کے متوازی چل رہی تھی۔ دیکھنے کی کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ اس لیے میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اس کے اندر کتنے دشمن موجود ہیں۔

میں نے جیسے ہی اسٹیشن دیکھنے پر سیون ایم ایم کو استعمال کرنا چاہا وہ گولی کی رفتار سے آگے بڑھ گئی۔ میں پلٹیں جھپکا کر رہ گیا۔ میری نگاہ نے ایک ناقابل یقین نظارہ دیکھا تھا۔ میں نے سیکڑوں ہزاروں اور لاکھوں گاڑیوں کو اور ٹیک کرتے دیکھا تھا مگر ایسی سرعت کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے سینکڑوں دس دس حصے میں یہ حیرت انگیز منظر دیکھا اور اگلے ہی لمحے میری حیرت کی وضاحت ہوئی۔

رات کی تاریکی اور شائے میں ٹارڈوں کی مخصوص جھجکاہٹ ابھری اور میں اپنی جگہ پر توازن قائم نہ کر سکے۔ اگلے ہی لمحے صورت حال میری سمجھ میں آگئی۔ ڈاکٹر نے ایک جیب کے بریک لگا دیے تھے جس کے سبب اسٹیشن دیکھنے جیب کے پہلو سے گولی کی طرح آگے نکل گئی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر آگے جا کر وہ دیکھنے بھی رک گئی۔ اس

دوران میں ڈاکٹر مونگ بھی آؤٹسٹیک سیون ایم ایم سنبھال چکا تھا۔ میں نے اپنی گن پر کنٹرول حاصل کیا اور سفاک لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

”ان خبیثوں سے یہیں نمٹ لیا جائے تو اچھا ہے ورنہ یہ ہمارے ساتھ ہی ہستی تک پہنچیں گے۔“

”میں نے ان سے نمٹنے کے لیے ہی جیب روکی ہے۔“ ڈاکٹر نے چٹائی لہجے میں کہا ”انہیں اپنے ساتھ کسی تک لے کر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے غصہ سے ہونے انداز میں پوچھا ”کیا ہم ان کے استقبال کے لیے جیب سے باہر نکل جائیں؟“

ڈاکٹر نے اپنے سامنے سڑک پر کھڑی اسٹیشن دیکھنے کو گہری نظر سے دیکھا اور بولا ”میرا خیال ہے ہمیں ان کے برآمد ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ہم سے ”ملاقات“ کی خواہش وہ لوگ اپنے دلوں میں بسا کر یہاں پہنچے ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اسٹیشن دیکھنے اور جیب کے مابین فاصلے کو نگاہ میں تولے ہوئے کہا ”وہاں کھڑے کھڑے تو وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے۔ انہیں دیکھنے کے نکل کر ہماری طرف آنا ہوگا۔ ہم جیب کے اندر رہتے ہوئے انہیں آسانی سے دھکا کر سکتے ہیں۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر وہ اسٹیشن دیکھنے دوبارہ حرکت میں آگئی۔ یہ حرکت اس نے ریورس گیز میں کی تھی۔ ڈاکٹر نے گن کو پیچڑ سیٹ پر رکھا اور قہر قہرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”میں ایک چال چل رہا ہوں۔ تم پوری طرح ہوشیار رہنا۔ جیسے ہی اسٹیشن دیکھنے فائرنگ رینج میں آئے تم سیون ایم ایم کا دباؤ کھول دیتا۔“

”اوکے..... آئی ایم ریڈی!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نہیں جانتا تھا ڈاکٹر نے کون سی چال چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہر حال میں ریڈ الرٹ ہو کر آنے والے سنگین لحاظ کا انتظار کرنے لگا۔

اسٹیشن دیکھنے بیک گیز میں چلتے ہوئے تیزی سے پیچھے آ رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ رینج میں آئی، ڈاکٹر نے ایک جھپکے سے جیب کو آگے بڑھا دیا۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آنے لگیں۔ وہ بہت ہی نازک لحاظ تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا اور اس ”ہونے“ کا نتیجہ دونوں پارٹیوں کے لیے مختلف اثرات کا حامل ہوتا۔ میں اپنی گن سے گولیاں برسانے کا ارادہ کر رہی رہا



تھا کہ انٹین وین کی طرف سے فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔ ڈاکٹر جیسے اس ماحول سے بچنا نہ ہو گیا تھا۔ وہ نتائج کی پروا کیے بغیر جپ کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ انٹین وین والوں کی کوشش تھی کہ وہ اپنی گاڑی کو جپ سے ٹکرا دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ جپ کی جانب گولیاں بھی اچھال رہے تھے تاکہ ہمیں کسی جوابی کارروائی کا موقع نہ مل سکے لیکن میں تو دشمنوں کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔

جب دونوں گاڑیوں کے بیچ اتنا فاصلہ رہ گیا کہ کسی بھی لمحہ وہ ایک عظیم الشان تصادم کو جنم دے سکتی تھیں تو ڈاکٹر نے بڑی صفائی سے اسٹرنگ کو ایک جھک دی اور جپ کو ایک مخصوص زاویے سے آگے بڑھاتا چلا گیا۔

اس لمبائی جھک نے جپ کو لڑا کر رکھ دیا۔ تاہم اس دوران میں مجھے پھر پور فائرنگ کا موقع مل گیا۔ جیسے ہی انٹین وین ہماری جپ کے قریب پہنچی میں نے اس کے عقبی ٹائرز پر ایک طویل برست مارا۔ بیک گیر میں گاڑی کو کنٹرول میں رکھنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے پھر ہماری جپ بھی لہرائی ہوئی آگے بڑھی تھی لہذا میری فائرنگ سے انٹین وین کے ٹائر محفوظ رہے۔ البتہ وہ جپ کی سائیڈ کٹنے سے تھوڑا ڈمگا جھکی تھی چنانچہ میری گن سے نکلنے والی گولیوں نے انٹین وین کی گاڑی کا مزاج پوچھ لیا پھر ہمارے درمیان دو طرفہ فائرنگ ہونے لگی۔

میں نے ڈاکٹر موگ سے کہا ”ہمیں جپ سے باہر نکل کر ان پر فائرنگ کرنا چاہیے تاکہ ان کی فائرنگ کا زاویہ تبدیل ہو سکے۔ ابھی تک تو ہماری جپ محفوظ اور ستر کرنے کے قابل ہے۔ اگر کوئی اندھی گولی اس کے ٹیول ٹینک میں گھس گئی تو ہم خود کو نارنجیہم کے حصار میں پائیں گے۔ جپ کے عقبی حصے میں خطرناک انجن حصے سے بھرے ہوئے دو تین بھی رکے ہیں۔۔۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری ایک سامی اس جپ کے فٹ پیٹ پر بے ہوش پڑی ہے۔“

میری تجویز ڈاکٹر کی سمجھ میں آگئی۔ ہم اپنی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر جپ سے باہر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر جپ کے انٹین میں سے چابی نکالنا نہیں بھولا تھا۔ ہم دونوں سیون ایم ایم سے ایس مختلف سمتوں میں تارکی کا سہارا لیتے ہوئے تیزی سے دوڑتے چلے گئے۔ اس دوڑ کے دوران میں ہم فائرنگ کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

نتیجہ ہماری توقع کے عین مطابق برآمد ہوا۔ اب انٹین وین دالے دشمنوں کی فائرنگ کا رخ بدل گیا تھا۔ وہ اس دقت دورنی فائرنگ کر رہے تھے کیونکہ میں اور ڈاکٹر دو مختلف

سمتوں میں نکلے تھے تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر موگ کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ ختم کیا۔ میں نے بھی اپنی گن کو ”رحمت“ سے بچالیا البتہ انٹین وین والے وقفے وقفے سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہماری خاموشی سے یہ تاثر لے سکتے تھے کہ ہم وہاں سے فرار کی کوشش میں ہیں۔ اگر وہ واقعی ایسا سوچ رہے تھے تو زندگی کی ایک بہت بڑی حماقت کر رہے تھے۔

جپ سے نکلے وقت ہمارے درمیان آئندہ کا لائحہ عمل طے نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ ہمیں اپنی گاڑی سے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے۔ جپ کے اندر لی پان بے سدھ پڑی تھی۔ اگر ہمارے دشمن جپ کے اندر چھپنے کے لیے اس طرف نکل آتے تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا ڈاکٹر نے اس چویش سے نمٹنے کے لیے اپنے ذہن میں کیا سوچ رکھا ہے میں نے البتہ ایک مٹی شیڈول بنالیا۔ یہ ایک فوری فیصلہ تھا۔ مجھے جپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں جانا تھا اور دشمنوں تک رسائی بھی حاصل کرنا تھی۔

میں نے جپ کو فائرنگ رینج میں رکھ لیا تاکہ اگر کوئی دشمن اس طرف جانے کی کوشش کرے تو میں اسے گولیوں سے بھون سکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نیم دائرے میں انٹین وین کی سمت قدم اٹھانا شروع کر دیے۔

دونوں گاڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں اور وہ ایسے بے ہودہ انداز میں کھڑی تھیں کہ نہ آتی ہوئی نظر آتی تھیں اور نہ ہی جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھار تارکی میں ان کے ہولے بڑا ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو بھوت آسنے سامنے کھڑے ہوں۔ انٹین وین کی ہیڈ لائٹس پر فائرنگ کر کے میں نے اس کی آنکھیں بجھیں لی میں اور ڈاکٹر نے جپ کے انٹین میں سے چابی نکالتے وقت انجن کو بند کر دیا تھا۔

میں مختلط قدموں سے انٹین وین کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مخالف سمت میں مجھے شدید فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی سمت تھی جہر ڈاکٹر موگ گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے محاذ کو نظر انداز کر کے اپنے محاذ پر توجہ مرکوز کر دی۔ ڈاکٹر اپنے ”معاملات“ سے نمٹنا جانتا تھا۔

اچانک میرے نزدیک ہی ایک گولی چلی اور مجھے اپنے بازو میں چکاریاں سنیں۔ محسوس ہوئی۔ کوئی مجھ پر بھی گناہ رکھے ہوئے تھا اور اس نے میری زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو میری خوش قسمتی کہ پھونکوں سے اس چراغ

کو بجھا نہیں جاسکتا تھا جب تک کہ ہوا کا فائوس میری حماقت کر رہا تھا۔ یہ وہی بات تھی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے! میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس سمت اندھیرے میں فائرنگ کی جہر سے آنے والی گولی نے میرے کندھے میں جیسے آگ کی لگادی تھی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں ایک طویل اذیت ناک انسانی چیخ بلند ہوئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا یا تو شدید زخمی ہو گیا تھا یا پھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

میں نے ایک لمبی روٹنگ کی اور اپنی جگہ سے خاصے فاصلے پر چلا گیا۔

کھلی جگہ پر گن فائٹ کے دوران میں اپنی پوزیشن کو بدلتے رہنا چاہیے ورنہ شدید نقصان پہنچ جاتا ہے میں جیسے ہی روٹنگ مکمل کر کے اپنے قدموں پر آیا، ایک اور دشمن سے سامنا ہو گیا۔ وہ اپنی گن کو میری سمت سیدھا کر رہا تھا کہ میں نے اچھل کر ڈبل فرنٹ فلائنگ کلک اس کے سینے پر ماری۔

وہ عقبی سمت میں اچھلا اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں گم ہو گئی۔

میں اس لیے کہ وہاں ابھی خاصی تارکی تھی۔ میں یہ جاننے سے قاصر تھا کہ وہ گن کہاں گری ہوگی۔ مجھ سے کلک کھانے والا پھر بیٹلا ثابت ہوا۔ وہ زمین پر پشت لگاتے ہی کی اسپرنگ کے مانند اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مارشل آئرس سے واقف تھا۔ میں اس اندھیرے میں فائٹ کو طویل دے کر اپنا اداں کا وقت پر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ساحل کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی اور اس بد بخت کو موت آواز میں دے رہی تھی۔ موت کی آواز پر لبیک کہنا اس پر لازم تھا۔ مجھ پر جو کچھ لازم تھا میں نے صرف اس پر دھیان دیا۔

وہ جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا، میں نے اس کے سینے پر فائرنگ کر دی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ دباتے ہوئے کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند خمد یوں ہو گیا۔

اسی لمحے میں نے تھوڑے فاصلے پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی، اندھیرے کے باعث میں اتنی دور تک دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم مجھے اندازہ ہو گیا، کوئی وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھا۔ میں نے جن دو افراد کو ابھی ابھی جہنم داخل کیا تھا، وہ بھی یقیناً انہی کا کوئی ساتھی ہوگا۔

میں نے اندازے سے اس سمت فائرنگ کر دی جہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری تھی

جواب میں کوئی انسانی چیخ فضا میں بلند نہ ہوئی۔ اس کا

ایک ہی مطلب تھا۔ یا تو وہ فائرنگ رینج سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا یا پھر وہ میرے نشانے پر نہیں آیا تھا۔

میں مختلط قدموں سے آگے بڑھنے لگا، رات کی تاریکی کے باعث وہ انٹین وین کسی ہولے کے مانند نظر نہ آ رہی تھی۔ میں اس وقت دیکن کی عقبی سمت میں تھا۔ دیکن مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی تاہم اس کا انجن اشارت تھا جس کی مخصوص ”گھون گھون“ ایک توڑ کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔

میں دو تکی کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انٹین وین میں بھر کر کتنے دشمن ہمارے تعاقب میں لپکے تھے۔ دو کو میں نے مار کر لیا تھا، تیسرا ممکنہ طور پر فرار ہوئے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چوتھے کی کرب ناک چیخ میں نے اس سے اسے ابھرتی سنی تھی جہر ڈاکٹر موگ نے مورچا سنبھال رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اگر ان کا کوئی اور ساتھی بھی تھا تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

جاننے کے لئے انٹین وین کے نزدیک جانا ضروری تھا اور میرے مختلط قدم اسی سمت اٹھ رہے تھے۔

موسم کی شدت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس سخت ترین موسم کی ٹھنڈک نے جلد ہی میرے بازو کے زخم کو بھی جما کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر پہلے میں جو اس میں شرارے سے بھرے محسوس کر رہا تھا، اب اس جن اور تکلیف میں خاصی کمی آگئی تھی۔ میں زخمی بازو کی پروا کیے بغیر انٹین وین کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

میں نے اپنی سانس روک لی اور بے آواز قدموں سے آگے بڑھنے لگا مگر دیکن کے اندر اور آس پاس مجھے سناٹے کا راج دکھائی دیا۔ وہاں کس بھی شخص کے آگاز نظر نہیں آ رہے تھے۔ دیکن کی کھڑکیوں پر چونک پڑے کر۔ ہوئے تھے اس لئے میں اس کے اندر دیکھنے سے قاصر تھا۔ اگر میں دیکن کے سامنے والے حصے کی طرف نکل جاتا تو ممکن تھا، دھڑا اسکرین کے پار، دیکن کے اندر کچھ دکھائی دے جاتا۔ میں اس وقت عقبی سمت میں تھا۔

میں نے انٹین وین کے بیچ بست پہلو کو چھو کر دیکھا اور اس پر دستک دیتے ہوئے آگے نکل آیا۔ اگر وہاں آس پاس یا دیکن کے اندر کوئی موجود ہوتا تو وہ میری اس دستک پر چونک جاتا اور چونکے کے بعد کوئی نہ کوئی زخم بھی ضرور پیش کرتا!

مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دیکن کے گرد دھواں کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں اس وقت دیکن کے ڈرائیونگ سائیڈ والے پہلو میں تھا۔ دو سینڈ بعد میں ڈرائیونگ کہیں کے قریب پہنچ گیا۔ تھوڑا سا جھک کر میں نے

لگادی، شاید اس کی غالب وجہ یہ تھی کہ وہ نہتا تھا اور میرے ہاتھ میں اس نے ایک خطرناک من نے جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ ممکنہ موت سے بچنے کے لیے زندگی کی طرف لپکا تھا۔ زندگی..... جو ایک بے وفا شے کا نام ہے!

اس کی بھگڑوں والی حرکت پر میں ایک لمحے کے لیے حیران ہوا پھر اس کے تعاقب میں لپک گیا۔

اتفاق سے وہ اس طرف جا رہا تھا جدھر ہماری جیب کھڑی تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ اس طرح میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے جیب کے قریب پہنچ جاتا، جیب کے اندر لی پان بے ہوش پڑی تھی۔ چنانچہ اب وہ کس حال میں تھی۔

میں پوری تیز رفتاری سے بھاگا اور جیب سے محض بائیں فٹ کی دوری پر اسے چالیا۔ جب کوئی راہ فرار نہ رہی تو اس نے موت کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور میرے مقابلہ میں کم کھڑا ہو گیا۔

میں نے خطرناک سیون ایم ایم کو جیب کے قریب زمین پر ڈالا اور اس شخص کی جانب بڑھا۔ اس نے زور سے انداز میں مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے حملے میں دیسی پن تھا یعنی وہ لڑائی بھڑائی کا شائق تو نظر آتا تھا مگر مارشل آرٹس کی ٹیکنیکس سے نااہل تھا۔

اس نے دونوں بازو داکر کے مجھے اپنی گرفت میں دبوچنے کی کوشش کی۔ اس کا انداز جن چھانڈ لے والا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی دبوچ میں آ جاتا۔ میں اپنے قدموں کی حرکات سے تھوڑا پیچھے ہٹا اور ایک اسٹیپ لے کر اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر فرنٹ ٹک مار دی۔

میرے فٹ درک کرنے کے بعد دو پارہ اندر کو آ گیا۔ میں اس کے انداز سے سمجھ گیا، وہ جھوٹا اور اکاذیب کی ٹیکنیکس سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے میری ٹانگ پر ٹانگ مارنا چاہی۔

میں نے بیک فٹ پر جاتے ہوئے اپنی ٹانگ کو بچایا اور وہیں پیٹھ گرفت سوئپ چلا دی، میری ہڈی کے سامنے والی ہڈی اس کی ہڈی کے گوشت پر لگی۔ وہ قدموں سے اکھڑا اور پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے تکلیف دہ ”او“ خارج ہوئی۔

وہاں کی زمین پتھر لی تھی جس نے اس کی تشریف کا دلولہ انگیز خیر مقدم کیا۔ میں ایک اسٹیپ لے کر اس کے نزدیک پہنچ گیا اور اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ زمین پر گرے ہوئے تیر مقابلہ پر حملہ کرنا سچے مارشل آرٹس کی توہین

دیکھنے کے اندر جھانکا۔ ڈرائیور والی کھڑکی پر چونکہ پردہ موجود نہیں تھا اس لیے مجھے اندر کا ماحول نظر آ گیا۔ دیکھنے کے اندر ریڈنگ لائٹ آن تھی مگر کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس دیکھنے میں ہمارا تعاقب کرنے والے تمام افراد ہمیں ادھر ادھر ہو گئے تھے۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا جسے کوئی میرے عقب میں موجود ہو۔ یہ بڑا سنسنی خیز احساس تھا۔ میں دیکھ چکا تھا، تھوڑی دیر پہلے وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن میں اپنے احساس کو جھٹلا نہیں سکتا تھا، چنانچہ فوری ایکشن کا فیصلہ کرتے ہی میں محل کے میدان میں اتر آیا۔

اس وقت میں رکوع کے بل جھک کر دیکھنے کے اندر جھانک رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ گاڑی کی باڈی پر ٹکے تھے جن میں سیون ایم ایم بھی موجود تھی۔ جیسے ہی مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، میں نے سیکنڈ کا ہزاروں حصہ ضائع کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، وہیں جھکے جھکے میں نے گاڑی کی باڈی سے ہینڈلش لیا اور عقب میں فٹائی کرتے ہوئے ایک تیز رفتاری ریزرکک چلا دی۔

اس کک کے جواب میں ایک انسانی چیخ بلند ہوئی اور کوئی دزدی نے ”دھپ“ سے زمین پر گر گئی۔ زمین پر قدم پڑتے ہی میں نے بیک سرسالت لگایا اور متاثرہ قطعہ زمین سے کافی فاصلے پر پہنچ گیا۔

اسی وقت میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک دزدی پتھر بھی نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے ”دھپ“ کی جواز دہشتی دہنیا اسی پتھر کے زمین پر گرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ شخص عقب سے پتھر پھینک کر میرا کام تمام کرنا چاہتا تھا۔

مذکورہ شخص اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کا ایک ہاتھ ہونٹوں کی حراج پر ہی میں مصروف تھا، میری ریزرکک کک نے اس کی ٹانگ اور ہونٹوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔

ریزکک (بیک کک) بہت ہی خطرناک تصور کی جاتی ہے اور گراؤنڈ ریزکک کی نسبت فلائنگ ریزکک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ شخص نہتا، حاصل شدہ تمام تر نقصان کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا، اندھرے کے باعث ہم ایک دوسرے کے خدو خال کی تفصیل تو نہیں جان سکتے تھے تاہم ایک دوسرے کو دیکھ ضرور سکتے تھے۔

مجھے امید تھی، وہ سنبھلتے ہی مجھ پر حملہ آور ہوگا لیکن چنا نہیں، اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے ایک جانب دوڑ

ہے۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس ٹانگ کو بری طرح جھٹکنے لگا جس کی ہڈی پر میں نے خطرناک فرسٹ سوپ ماری تھی، (ہڈی کی ہڈی) کی ضرب بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ کی تیز دھار تلوار کے مانند کام کرتی ہے اور اس کے برابر نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ اس طرح کن (SHIN) پر لگنے والی چوٹ بھی دن میں تارے دکھا دیتی ہے۔ مصدوب کافی دنوں تک لنگڑا کر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی لیے مارشل آرٹس کی فائٹ کے دوران میں دونوں فائٹرز زن کارڈز کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔

میرا مقابلہ جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا، میں نے اچھل کر فرسٹ فلائنگ کلک چلا دی۔ وہ خود کو بچانے کے لیے تیزی سے پیچھے کو گیا۔ وہ میری کلک سے تو محفوظ رہا تاہم اندھا صند پیچھے ہٹنے کے باعث اس کا پاؤں ایک آڑے میز سے پھر پر گیا۔

وہ بری طرح لڑکھڑایا اور ایک مرتبہ پھر پیچھے کے بل زمین پر جا گرا۔

اس مرتبہ پہلے کی نسبت اسے زیادہ چوٹ لگی تاہم وہ پہلے کی نسبت جلدی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں، میں اس کے سر پر پینچ گیا تھا پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

میں نے ہاتھ پاؤں کی مسلسل ٹھوکروں سے اسے دھوکہ رکھ دیا۔ وہ مجھ سے بری طرح پٹ رہا تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ایک دوسرے اس نے وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے اس کے فرار کی ہر راہ مسدود کر دی۔ اس کی موت میرے ہاتھوں لگی تھی لہذا وہ کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ میں دل سے اس بات کا خواہاں نہیں تھا کہ اس کی جان لوں مگر تقدیر کے کھٹکے کو کون ٹال سکتا ہے۔

میں تو شخص اسے ناکارہ بنا کر چھوڑنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وہ ایک مرتبہ میری دھال پر ایسا آیا کہ اس کی زندگی کی کہانی کو ”دی ایڈ“ کا نیشنل بن گیا۔

وہ مجھے اٹھا کر پھینکے کی کوشش میں جوڈو کی ایک مقبول عام ٹیکنیک ”تھرو“ کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا داؤا ہی بولنا دیا اور ”زیورس تھرو“ مارکر اسے دور پھینک دیا۔ ان ٹیکنیکات میں اچھل اس کے آس پاس ہی کھوم رہی تھی۔ وہ جس جگہ جا کر گرا وہاں چھوٹے بڑے کی پھر موجود تھے۔ اس بد بخت کا سر ایک بڑے پتھر سے جا ٹکرایا۔ کھوپڑی اور پتھر کے تصادم سے ایک مخصوص آواز پیدا ہوئی۔ میں نے پلک جھپکے میں جان لیا اس کا ناریل بری طرح جھج گیا تھا۔ میں لپک کر اس کے نزدیک پہنچا تو مجھے اس کا وجود

خطرناک انداز میں جھٹکنے لیا ہوا نظر آیا۔ وہ اس وقت جان کی کے عالم میں تھا۔ اندھیرے کے باعث میں اس کی کھوپڑی پر ٹوٹنے والی قیامت اور اس کے نتیجے میں پہنچنے والے نقصان کا اندازہ تو نہیں کر سکتا تھا تاہم اس کی حالت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہل دہل کا مہمان تھا۔ وہ آخری مرتبہ اس دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی بد قسمتی کہ دنیا کے آخری نظارے کی صورت میں تاریکی کے سوا کچھ بھی اس کے حے میں نہیں آیا تھا۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ انسان کی طاقت درجن کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر نصیب سے نہیں لڑ سکتا کیونکہ یہ براہ راست نصیب بنانے والے سے لڑائی ہوگی۔ نصیب بنانے والا سب سے زیادہ قدرت والا ہے۔ آج تک کوئی اس سے جیت سکا ہے اور نہ ہی کبھی جیت سکے گا!

میں واپس جیب کی طرف پلٹا تو سامنے سے ڈاکٹر موگ آتا نظر آیا۔ میں نے اس کے کیٹ اپ کی وجہ سے اسے پہچان لیا تھا وہ نہ تاریکی میں اس کا سراپا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اب تک جو دارماری کی تھی وہ درحقیقت دو ہیروں کا تصادم ہی تھا جن میں ہر دفعہ ایک ہیولا میں رہا تھا۔ ہم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ ہمارے مقابل میں یہاں پہنچنے والے دشمنوں کا صفایا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے فگر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب تمہیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“  
”تھرو!“ میں نے سختی لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔

ہم دونوں چند سیکنڈ کے وقفے سے جیب کے اندر آ بیٹھے۔ ڈاکٹر موگ نے جس سابق ڈائیوٹنگ سیٹ سنبھال لی۔ میں پیچتر زیٹ پر براجمان ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جیب اشارت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا کیا حال ہے؟“  
اس کا اشارہ لیان کی طرف تھا۔ میں نے مڑ کر جیب کے عقبی حے میں نگاہ دوڑائی۔ لیان بدستور فٹ سیٹ پر پڑی تھی تاہم اس کے وجود میں مجھے حرکت نظر آئی۔ وہ بے ہوشی کے عالم سے واپس آ رہی تھی۔

”یہ ہوش میں آ رہی ہے۔“ میں نے سرسراہتی ہوئی آواز میں کہا۔  
”تم عقبی نشست پر چلے جاؤ اور اس کی مدد کرو۔“ ڈاکٹر نے بڑی رمان سے کہا۔  
میں ڈاکٹر کی ہدایت پر جیب کے عقبی حے میں پہنچ گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے لیان کی مدد کرنے کو کہا تھا۔ میں اس کے اشارے کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا میں جلد از جلد لیان کو ہوش میں لے آؤں۔ وہ ٹیکنیکل گینت سے نکل آئی تھی۔ میری مذکورہ کوشش آسانی سے بار آور ہو سکتی تھی۔

اس دوران میں ڈاکٹر موگ نے چار پانچ بار کی کوشش کے بعد بالآخر کسی نہ کسی طرح جیب کو اشارت کر ہی لیا۔ سخت زہن سرد موم کے باعث جیب کے ہیوی انجن کو ”ٹھنڈ“ لگ گئی تھی۔ اس لیے وہ تعاون کرنے سے گریزاں تھا اور اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر نے جاتے وقت اس کا انجن سوچے آف کر دیا تھا۔ اگر اس جیب کے بجائے کوئی چھوٹی موٹی گاڑی ہوتی تو اس کنڈیشن میں اس کے اشارت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جیب ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو میں لیان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

میں نے بڑی احتیاط سے اس کے گھٹری وجود کو اپنی ہاتھوں میں سمیٹا اور اٹھا کر سیٹ پر رکھ دیا۔ اس کے جسم میں بے ربط جیش پیدا ہوئی اور اس نے کوشش کر کے اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ اس کوشش میں میں نے اس کا بھرپور ہاتھ بنایا۔

میں نے اس کے داہلے سائیز کو ایک مرتبہ پھر چیک کیا۔ ٹکلی ہو جانے کے بعد میں نے اسے بیدار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جب کے ٹھنڈے ٹھارٹ سیٹ پر کھلے پڑے رہے اس کے وجود میں ابھی خاصی ٹھنڈک اثر آئی تھی۔ اور یہ اس کے لیے مفید بھی ثابت ہوا تھا۔ اسی ٹھنڈک کے باعث وہ ہوش میں آنے کے قابل ہوئی تھی۔

میں نے اس کی پچھلی ہوئی جینو لمبوس ٹانگوں پر ایک گرم کپڑا ڈال دیا اور اس کے بالوں میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ہلکا ہلکا مساج کرنے لگا۔ پہلے اس نے اپنی بے فہمی میں میری ران کو ٹکھ بٹایا تھا اب میں نے دانستہ اسے یہ نون فرام کیا۔ میں انگلیوں کے مساج کے ساتھ ساتھ گھٹنے کے سہواں جھٹکے سے اسے جھولامی جھلا رہا تھا۔ یہ ایک طرح کی نوری تھی۔

لوری عموماً جاتے ہوئے انسان کو نیند کی دادی میں پہنچا دیتا ہے۔ سر کا مساج بھی خاص نیند آور ہوتا ہے لیکن اگر یہی نہیں مل سکتا تو سوتے ہوئے یا بے ہوش انسان پر آزمائے جائیں تو نتائج اس کے بالکل برآمد ہوتے ہیں۔ سوتا ہوا آدمی بیدار ہو جاتا ہے۔  
لیان پر بھی میری یہ کوشش خاصے حوصلہ افزا اثرات

مرتب کر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ جیب کے ماحول میں واپس آ رہی تھی۔ میں نے اس سے آگے بڑھ کر ایک اور ٹیکنیک بھی آزمائی۔ میں نے وقفے وقفے سے اس کی ناک کو دو انگلیوں کی چٹکی میں پکڑ کر دہانہ شروع کر دیا۔ اس طرح اس کی سانس کا سلسلہ لحاظی طور پر کا تو اسے اپنے وجود میں ایک بے چینی یا پھینسی محسوس ہوئی۔

بالآخر اس نے چینی اور سانس کے قحطی نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔  
لیان نے آنکھیں کھول کر حیرت سے اپنے ماحول کو جانچنے کی کوشش کی۔ ششاپھروں پر نظر لگی تو اسے یہ اطمینان ہوگا کہ انہوں میں ہے۔ آئندہ پانچ منٹ بعد وہ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ اسے یہ جاننے کی بڑی تشویش تھی کہ پچھلے میں جچیں منٹ میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں جچیں منٹ نہیں بلکہ وہ اس سے دگنے وقت تک اپنے آپ سے بیگانہ رہی ہے پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا گیا۔

”کھانا تو ہم تینوں نے ایک ساتھ کھایا تھا۔“ وہ اٹھنے ہوئے لہجے میں بولی ”پھر آپ دونوں پر کوئی اثر کیوں نہیں ہوا؟“

”ہوا تھا۔“ میں نے کہا ”لیکن ہم نے کوشش کر کے اس اثر کو زائل کر دیا مگر تم اس نشہ آور کھانے کی وجہ سے گہری بے ہوشی میں چلے گئے۔ بہر حال اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ فگر کی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔“

پھر ہمارے درمیان راستے میں پیش آنے والے واقعے پر بات ہونے لگی۔ ڈاکٹر موگ نے کہا ”اب تو یہ بات پایہ تجوٹ کو پہنچ گئی کہ رات کے کھانے میں کسی سازش کے تحت کچھ ملایا گیا تھا اور یہ حرکت چندر کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“

”جس کسی کی بھی حرکت تھی اب اس کا ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے کہا ”سازشی اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گیا۔“

ڈاکٹر نے کہا ”ہمیں شکار کرنے کا منصوبہ خامے وسیع بنانے چاہیے۔“ پہلے چار فائزر کو بھیجا گیا۔ ناکامی کے بعد کن برادر اس جھٹکے پر تڑھوڑے اور اب یہ بیچ راہ میں ایک اور حملہ آور ہم نے ہمیں گھرنے کی کوشش کی تھی۔  
”اس سے تو ہمیں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے سطوں کو ختم نہیں سمجھنا چاہیے۔“ میں نے کہا ”آج کل کبھی ایسا ہی کوئی

نا خوشگوار واقعہ اور بھی پیش آ سکتا ہے۔“

”وہ جانے! تم خواہ خواہ ڈرانے والی باتیں کر رہے ہو!“  
لیان نے کہا۔ اب وہ اپنے حواس میں مکمل طور پر آچکی تھی۔

میں نے کہا ”میں نے ایک حقیقت اور متوقع حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیا تمہیں اس سے ڈر لگ رہا ہے؟“

”میرے دل میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ہی ذہن میں کوئی خوف۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی ”میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں جو بیت کیا، سو بیت کیا۔ ہمیں اچھی اور خوش آہند باتیں کر کے باقی کاروائی کا شفا چاہیے۔“

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے نتیجے لہجے میں کہا ”تم کیوں اتنی گرمند ہوتی ہو۔ اگر آگے چل کر پھر مکی دشمن نے ہمیں گھبرنے کی کوشش کی تو تم بے ہوش ہو جانا۔ اللہ اللہ خیر“

”سلا!“

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر مونگ نے میری شرارت میں دم باندھتے ہوئے کہا ”اس میں تم دونوں کا بھلا بھی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کن دونوں کا؟“ یہ سوال میں نے ڈاکٹر مونگ سے کیا تھا۔

”میں تم دونوں“ میاں ہوئی“ کا ذکر کر رہا ہوں۔“

اس نے لفظ میاں بیوی پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔ میں پوچھنے باندھ رہا تھا ”اس میں ہم دونوں کا کیسے بھلا ہے؟“

اس نے کہا ”بھئی سیدی سی بات ہے، بیوی بے ہوش ہو کر خون ریز واقعات دیکھنے سے محفوظ ہو جائے گی اور شوہر کو اسے ہوش میں لانے کا نادر موقع ہاتھ آ جائے گا۔“

ڈاکٹر کی اس لطیف چیمیز چھاڑ پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ باقی کا سفر بھی بخوشی اور خیر و عافیت سے گزر گیا اور ہم لگ بھگ رات ساڑھے گیارہ بجے ہائی دے والی ہستی میں پہنچ گئے۔

پچاس گھروں پر مشتمل وہ چھوٹی سی ہستی اس شخص سے ٹھار موسم میں سوئی سوئی نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر جب کو ہستی کے اندر سے گزرا کہ سیدھا شاکا کے گھر کی طرف لے گیا۔

شاکا کا گھر ہستی کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ جب کو شاکا کے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے ڈاکٹر نے مخصوص انداز میں تین مرتبہ ہارن بجایا اور بتایا۔

”ہمارے درمیان یہ پہلے سے طے ہے۔ ہارن کی آواز سن کر شاکا کا گھر کا دروازہ کھول دے گا۔“

میں تجسس نگاہ سے اس دروازے کو دیکھنے لگا جس کے عقب سے شاکا نمودار ہونے والا تھا۔ جب پانچ منٹ اس

انتظار میں گزر گئے تو مجھے گہری تشویش ہوئی۔

میں نے کہا ”ہمیں نیچے اتر کر خود دیکھنا چاہیے۔“

ڈاکٹر بولا ”شاکا کو اب تک دروازہ کھول دینا چاہیے تو لیکن۔۔۔۔۔۔“

وہ جملہ ادھر ادھر چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر تجسس کرنا کو بھینچنے ہوئے واضح طور پر محسوس کیا۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ڈاکٹر! گھر کے اندر چھائی ہوئی خاموشی مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہی ہیں۔ چلو جب سے نیچے اتر دو دیکھنے ہیں، وہاں کیا صورت حال ہے!“

ہم تینوں کے بعد دیگرے جب سے باہر آئے۔ پھر شاکا کے گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازہ کھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک ایک لمبے لمبے لیے ایک ایک صمدی کے برابر تھا۔

جب تین دستک پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دروازے کے پٹ پر دباؤ ڈال کر دیکھا۔ اس دباؤ کے نیچے میں دروازہ خود بہ خود کھلتا چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔

میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور لپک کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

میری پہلی نگاہ نے گھر کے اندر جو منظر دیکھا وہ روگتے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میرے پیچھے ڈاکٹر مونگ اور لیان بھی گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ بھی پہلی پہلی نگاہوں سے اس خوفناک منظر کو دیکھ رہے تھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان لحاظات میں وقت ختم کیا ہوا!

سینٹر ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ  
جسے تاریخ آج تک نہیں بھولے

**طالوت**

③ حصوں میں (دس)

قیمت فی حصہ ۱۰۰ روپے۔ ایک ترقی فی حصہ 2۱ روپے  
تین حصوں کا مجموعی قیمت ۳۰۰ روپے

74200

معلومات کے مطابق اس چھوٹے سے گھر میں چار افراد کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ شا کا اس کی بیوی بھانجی ان کی بیٹی بندیا اور میری رگ جاں ساحل!

شا کا کی عبرت اثر لاش باہر میں پڑی تھی۔ باقی تین افراد کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں ایک کر دوسرے کمرے میں پہنچا اور اس کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے پاؤں من من کے ہو گئے۔ میری بصارت کو ایک خوشگام منظر نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کمرے کے فرش پر دو عورتوں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی اور دوسری ادھیڑ عمر عورت تھی۔ ان دونوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وہ کئی ہوئی گردلوں کے ساتھ کمرے کے فرش پر ایک دوسرے سے ابھی پڑی تھیں۔ اس کمرے میں بھی پاک کی چربی سے جملے والا ایک دیاروش تھا۔ تبت اور نیپال کے دور دراز علاقوں میں پاک کا گوشت کھانے میں اور چربی جلانے میں استعمال کی جاتی ہے۔

ملکی روشنی میں دو انسانوں کی موت کے منظر نے مجھے دھلا کر رکھ دیا۔ وہ آپس میں ختم گھٹا پڑی تھیں اور ان کی نصف کٹی ہوئی گردلوں سے بہنے والے خون نے کمرے کے فرش کو دور تک سرخ کر رکھا تھا۔ موسم کی ٹھنڈک نے اس خون کو جما دیا تھا۔ وہ اس طرح ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا ایک نے دوسری کو بجائے کی کوشش کی ہو مگر سفاک درندوں نے وہ کمزور کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ زندگی دونوں سے روکھ گئی۔ گھر کے محن میں شا کا کو بھی اسی انداز میں گردن کاٹ کر موت سے ہمکنار کیا گیا تھا۔ قاتلوں نے فائرنگ سے اجتناب برتا تھا۔

یہ اندازہ لگانے میں مجھے ذرا دیر نہ لگی کہ کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی ان دو لاشوں میں سے کسی کا تعلق میری ساحل سے نہیں تھا۔ ساحل کو اس "مردہ خانے" میں نہ پا کر مجھے اطمینان سامحوس ہوا۔ تاہم اس مختصر سے خاندان کے عبرت ناک انجام نے مجھے ان نکات میں دل گرفتہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا کہ اگر ساحل وہاں موجود نہیں تو پھر کہاں ہے؟

اس سوال کا فوری اور منطقی جواب یہی تھا کہ جن۔ فاک وشیوں نے شا کا اور اس کی کنبلی کو حسرت بھری موت دی وہی ساحل کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ بلکہ زیادہ درست یہ تھا کہ ساحل کو حاصل کرنے کے لیے ہی اس جہنم لے گھرانے کا چراغ گل کر دیا گیا تھا۔ شا کا بھانجی مٹی اور بند ب نہایت ہی خفیہ انداز میں ساحل کی حفاظت پر مامور تھے۔

وقت تھکتا نہیں رکتا نہیں۔ یہ ایک مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے لیکن بعض اوقات اسے غیر یقینی انداز میں پیش آتے ہیں کہ انسان کی سوچ کو یا ختم ہی جاتی ہے۔ یہی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے وقت کے پاؤں پکڑ لیے ہوں وہ ایک جگہ ٹھہر گیا ہو!

ہم بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے دو کردوں پر مشتمل ایک مختصر سا کوارٹر تھا جس کے محن میں اس وقت ہم کھڑے تھے۔ ہم سب کی نظریں ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ نقطہ اتنا جیم تھا کہ آدمی رات کو بھی ہم اسے بے سائی دیکھ اور پہچان سکتے تھے۔ ہم شا کا کے کمرے میں ایسے کسی منظر کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے ہمارے دماغ ہماری سوچ ایک لمحے کے لیے جیسے رک گئی تھی۔ ہم تینوں متحوش نگاہوں سے اس خوش منظر کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ اس لمحے میں ہمارے لیے ایک طرح وقت واقعی ختم سا گیا تھا۔

اس صیب اور موت ایسے شانے کو ڈاکٹر مومگ کی سرسراتی ہوئی آواز نے مجرد کر دیا۔ وہ اضطرابی انداز میں گویا خود کا می کرتے ہوئے بولا "یہ..... یہ تو شا کا معلوم ہوتا ہے!"

یہ جملہ ادا کرتے ہی وہ میکاگی انداز میں آگے بڑھا۔ ہم دونوں نے اس کی تقلید کی۔ وہ جیم نقطہ کسی انسان کی لاش تھی۔ مومگ کی اضطرابی آواز نے تصدیق کر دی کہ وہ شا کا کی لاش تھی۔ میرے دل و دماغ میں ایک طوفان سا اٹھا اور میں نے بے اختیار ان کردوں کی جانب قدم اٹھائے جو محن کے اختتام پر پہلو پہلو لے کر گئے تھے۔ اس وقت میرا ذہن تیز آنکھوں کی زد میں تھا۔

شا کا وہ شخص تھا جس کی پناہ میں میری ساحل کو رکھا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر مومگ کا منصوبہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک مقتول اور بے وارغ منصوبہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی میرا دل اس طرف سے مطمئن نہیں تھا اور..... میری یہ لگتی ہے اطمینان کی کوئی رنگ لے آئی تھی۔ شا کا کی لاش کی بہت بڑے بھونچال کی آمد کی خبر دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا ڈاکٹر مومگ کا منصوبہ داغ دار ہو گیا ہو!

میں دھڑکتے دل اور دوڑتے ہوئے قدموں سے ایک کمرے میں پہنچا۔ مذکورہ کمرہ کسی انسانی وجود سے خالی تھا۔ نیچے جھت والے اس کمرے کی ایک پتھر لی دیوار میں طاق کے اندر ایک دیاروش تھا۔ فضا میں رچی بٹی خصوص ہونے مجھے بتا دیا وہ دیا پاک کی چربی سے روٹن کیا گیا تھا۔ میری

انہیں اس فرض کی ادائیگی پر کڑی سزا دی گئی تھی! ایک بے درد سزائے موت!

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ شا کا کے گھر پر میرے ہی دشمنوں نے شب خون مارا تھا اور اس وقت میرا سب سے بڑا دشمن تھا..... ربی موٹے ہاتھن! موٹے ہاتھن ان پانچ نایاب پتھروں کے حصول کی خاطر دیوانہ ہو رہا تھا جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں موجود تھے۔ مذکورہ خفیہ تہ خانے تک صرف اور صرف ساحل ہی اسے پہنچا سکتی تھی۔ ساحل پچھلے کچھ عرصے سے اسی شیطان کی تحویل میں تھی۔ ساحل کو ربی کے قبضہ قدرت سے نکلانے کے لیے میں نے اسے ناقابل فراموش نقصان پہنچایا تھا۔ جس کے بدلے میں وہ میری جان کا دشمن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر موگ نے پچھلے دنوں ساحل کو ربی کے بندوں سے چھین کر جو کارنامہ انجام دیا تھا یہ اسی کا رد عمل تھا۔ جواب آن غزل میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے!

نیپال خصوصاً کھٹمنڈو میں جی فوڈ آر بی کے عزائم کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل تھا۔ اسے یہاں کی ایک طاقتور سیاسی شخصیت کے اخیر باد حاصل تھی۔ جو کدھر پال نامی وہ سیاسی شخص حکم کھلا اور درپردہ دونوں طریقوں سے جی فوڈ آر بی کو مدد کر رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا اس ہستی میں جی فوڈ آر کے بندوں ہی نے کارروائی کی ہوگی۔ ربی نے بدھ نیل کنڈ والا مشن جی فوڈ آر کو سب روک رکھا تھا۔

میں گہرے رنج و دکھ سے ان دولاٹوں کو سکے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر موگ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا ”وہ جان! سب کچھ ختم ہو گیا۔ یہاں اب ہمارے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ دونوں میری بے خبری میں لاٹوں والے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔

”سب کچھ ختم نہیں ہوا ڈاکٹر!“ میں نے گنبد گھر پرانی ہوئی آواز میں کہا ”ان تینوں کو دردناک موت کے منہ میں دھکیلنے والے میری ساحل کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ہمیں فوراً ان تک پہنچنا ہوگا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اس سے پہلے کہ سب کچھ ختم ہو جائے!“

ڈاکٹر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”یہ جی فوڈ آر کے آدمیوں کی دھشاندہ کارروائی ہو سکتی ہے۔ ساحل کو اس کے قبضے سے نکال کر میں نے اسے جو چوٹ دی تھی یہ اسی کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر افسردہ نظر سے فرش پر پڑی بھان تھی اور ہندیا کی لاٹوں کو دیکھنے لگا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن..... جی فوڈ آر اس کے آدمی یہاں تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔ یہ ٹھکانا تو اتنا محفوظ اور خفیہ تھا کہ.....“

”یہ بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔“ میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”نیپال میں فوری طور پر ساحل کا تعاقب کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں وہ لوگ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کی طرف گئے ہوں گے۔ تم نے بتایا تھا آج آدمی رات کے بعد وہ عبادت گاہ پر بلا ہو سکتے گے اور اب آدمی رات بھی ہو گئی۔“

ڈاکٹر نے میرے شانے کو چھتپاتے ہوئے کہا ”میں تمہارے خیال اور تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ وہ جتنا ساحل کو اپنے ساتھ عبادت گاہ ہی لے کر جائیں گے کیونکہ اس کے تعاون کے بغیر وہ لوگ عبادت گاہ کے تہ خانے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ تم فکر نہ کرو ہم سیدھے ادھر ہی جائیں گے۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکھا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ایک بات کا مجھے پورا یقین ہے وجدان! وہ لوگ ساحل کو کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں بھول کر بھی نہیں سوچ سکتے۔ ساحل اس خزانے کی نگہی ہے جس کے حصول کے لیے ربی موٹے ہاتھن پاگل ہو جا رہا ہے اور ساحل ان لوگوں کے پاس ایک طرح سے ربی کی امانت کی حیثیت رکھتی ہے۔“ ڈاکٹر کی بات وزن سے خالی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک اندیشے نے سر اٹھارہ ”موگ!“ میں نے تشویش ناک لہجے میں ڈاکٹر کو مخاطب کیا ”کیا اس بات کا امکان ہے کہ وہ لوگ ساحل کے توسط سے تہ خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں؟“

ڈاکٹر موگ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پاک کی چربی سے روشن چراغ کی مدھم روشنی میں ڈاکٹر کا چہرہ تشویش اور فکر کا مرتع نظر آتا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا!“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”دیکھو وجدان! اگر ساحل نارمل ہوتی تو پورے دھوکے سے کہا جاسکتا تھا وہ اپنی جان دے دیتی مگر کسی دیوانے کو اس گراں قدر خزانے تک پہنچانے کا وسیلہ بنتی لیکن تم جانتے ہو اس کی دہنی اور روحانی صحت قسلی بخش نہیں۔ ربی نے اسے چنانچہ مختلف سیشنوں سے

گزار کر تقریباً خود سے بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ ربی کی کھینچنے پر اثر ہے۔ مجھے اس کے علاج کا خاطر خواہ موقع نہیں مل سکا۔“

وہ تجویز دیکر اور کابھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ لوگ عبادت گاہ کے تہ خانے میں داخل ہو جائیں۔ شاید اسی لیے محترم مساتگ ذکی خواہش تھی کہ ہم دونوں مل کر اس خزانے کی حفاظت کریں۔“

مساتگ فوڈاکٹر موگ کا بڑا تھا۔ مساتگ فوڈاکٹر کر کے وہ افسردہ ہو گیا کیونکہ محترم مساتگ فوڈاکٹر جہانی ہو چکا تھا۔ اس نے پہلی اور آخری واحد ملاقات میں مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس کی صحبتیں میرے لیے مشکل راہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس کی باتوں سے میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا بدھ نیل کنڈ والے مشن میں ڈاکٹر موگ کے ساتھ مجھے بھی دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مساتگ فوڈاکٹر مجھ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالتا تھا لیکن حالات خود بخود مجھے یو ایس اے سے کھینٹ کر یہاں کھٹمنڈو میں لے آئے تھے۔ ”ہم دونوں“ سے ڈاکٹر موگ کی مراد بھی وہ اور میں ہی تھی۔

میں نے پوچھا ”ڈاکٹر فوگ! ان دنوں جو بدھ بکاشو اپنی پہلی کے ساتھ عبادت گاہ کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے ہے اس کا کیا ہوا۔ میری معلومات کے مطابق وہ شخص بھی خفیہ تہ خانے اور وہاں موجود بیش بہا خزانے کے راز سے واقف ہے۔ ربی کے پیچھے ہوئے وحشی دہندے اس کی زبان کھولنے کی کوشش بھی تو کر سکتے ہیں؟“

ڈاکٹر موگ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور ایک بنگ بھان متی ہندیا کی لاٹوں کو دھچکتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر جھانپتی بکاشو ظاہر کرتی تھی وہ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے ہمیں ادھر بھی پہنچا ہوا تھا۔

اس کی خاموشی کے دوران میں لی بان کو بولنے کا موقع مل گیا۔ پہلی مرتبہ ہمارے درمیان جاری گفتگو میں حصہ لینے ہوئے اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا ”میرا خیال ہے آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں شا کا کی لاش کو بھی محسن سے الٹا کر اندر کمرے میں ڈال دینا چاہیے۔“ پھر وہ افسوس ناک انداز میں گردن جھپکنے ہوئے بولی ”اوہ..... بے چارے!“

ڈاکٹر موگ جیسے کسی موقع کی تلاش ہی میں تھا جلدی سے بولا ”ہاں وجدان! آؤ شا کا کی لاش کو اٹھا کر اندر لاتے ہیں۔“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا وہ میرے سوال کا جواب دینے سے کترایا تھا۔ بہر حال وہ کرید کا وقت اور موقع نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ہی محسن کی جانب قدم بڑھا دیے۔ آہستہ پانچ منٹ کے اندر ہماری باہمی کوشش سے شا کا اپنی ”نیل کنڈ“ کا قریب حاصل کر چکا تھا۔

میں لاٹوں پر مشتمل اس ”نیل کنڈ“ پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے بے ساختہ میرے ہونٹوں سے پھسل گیا ”ان بد بختوں نے بھی کیا سہرت ناک موت پائی ہے۔ کاش ہم سرشام ہی یہاں پہنچ گئے ہوتے!“

”سرشام؟“ ڈاکٹر موگ نے چونک کر وضاحت طلب نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”میرے اندازے کے مطابق آج شام کو اس گھر پر یہ قیامت ٹوٹی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو وجدان؟“ ڈاکٹر موگ کا چہرہ فکری لکیروں کے جال میں قید ہو گیا ”آج شام جو جیجے تو شا کا نے مجھے ”سب ٹھیک ہے“ کی اطلاع دی تھی میں یہ بات تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم کس بنا پر سرشام اس خوں چکانے والے کی وقوع پذیری کی بات کر رہے ہو؟“

میں نے اس کے سوالات کے جواب دینے کے بجائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”میرے اندازے کے مطابق یہ واقعہ آج شام تک بنگ سات بجے پیش آیا ہے!“

یہ اندازہ قائم کرتے ہوئے میرے ذہن میں تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ میں خود کو رتا پارک میں بیٹھا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ لی بان بھی میرے ساتھ ہی پارک کی ایک سنگی بیٹھی تھی۔ میں آنکھیں بند کیے تیسری آنکھ کے استعمال میں مصروف تھا۔ اسی مصروفیت کے دوران میں اچانک ایک بانوس ٹھکنی ہوئی آواز میری سماعت سے عکرائی تھی۔ تم یہاں بیٹھے تصور کی کربت بازیاں دکھاتے رہو اور ہاں.....!

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ آواز محدود ہو گئی تھی۔ میں جل ترنگ۔ بجائی اس سحر آفریں آواز کو لاٹوں کے زوڑوں آوازوں میں بالکل الگ شناخت کر سکتا تھا۔ وہ ملکہ کو ہمارے یلگر کی جادو اثر اور کیف آور آواز تھی۔ اس دھمکی بردار آواز نے مجھے یک لحظ آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ یلگر کی آواز اور الفاظ نے مجھے کسی خطرے کی آگاہی دینا چاہی تھی۔ وہ بعض اوقات ایسی ہی اشاروں کتابوں والی ہوجاتی تھی۔ اس وقت میں جن حالات میں گھرا ہوا تھا اس

میں سب سے زیادہ اہمیت ساحل کی تھی۔ میگلری کی وارننگ نے میرا دھیان ساحل کی جانب پھیر دیا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا؟ موجودہ حالات میں ساحل کے بارے میں سوچوں اور میرے چہرے سے پریشانی ظاہر نہ ہو!

اسی پریشانی کو سب سے پہلے لی یان نے نوٹ کیا کیونکہ وہی ہستی اس وقت میرے سب سے زیادہ قریب بھی تھی۔ اس نے ان بارے میں مجھ سے استفسار بھی کیا تھا لیکن میں نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔ اس سے میزی اندرونی بے چینی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ میں راستے بھر ساحل کے بارے میں سوچتا اور فکر مند ہوتا رہا۔

گھر پہنچے تو ڈاکٹر مونگ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے میری پریشانی کو چہرے سے بھانپ لیا۔ علیحدگی میسر آتے ہی اس نے پوچھ لیا۔ میں نے میگلری کے حوالے سے ساری بات بتادی تو اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا، فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم پروگرام کے مطابق ہستی کی طرف جائیں گے اور..... یہ کہ شام چھ بجے شاکا کے اسے ”سب ٹھیک“ ہے کی اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹر مونگ کی تسلی تقفی سے میرے دل کی بے گلی رفع نہ ہو سکی۔ اس کے بعد حالات میں ایسی ہنگامہ خیزی نے چلک بٹائی کہ تنہائی اور آرام سے اس بارے میں سوچنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اب میں محسوس کر رہا تھا، اس وقت فکر مند ہونے کی ضرورت تھی۔ میگلری کی کوئی صدا، کوئی ادا خالی از معنی نہیں ہو سکتی۔ اس نے بھینسا مجھے اسی واقعے کے بارے میں اشارہ دیا تھا لیکن اب تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس خون ریز واقعے کو جیتے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزار گئے تھے۔ اگر جی نوٹ آ کے آدی ساحل کو اپنے ساتھ لے کر بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کی طرف گئے تھے تو وہ کب کے وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ اس ہائی دے والی ہستی سے عبادت گاہ تک پہنچنے کے لیے کم بیش ڈیڑھ گھنٹہ درکار تھا۔

ڈاکٹر مونگ کافی دیر سے خاموش کھڑا مجھے نکلے جا رہا تھا۔ میں امید کر رہا تھا، وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا لیکن سوال کرنے سے بجائے وہ گھبراہٹ سے باز رہا۔

”میرا خیال ہے اب میں بدھ نیل کنڈ کی جانب روانہ ہو جانا چاہیے۔“

میں نے اور لی یان نے خاموشی سے اس کی تقلید کی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تاہم بدھ نیل شاکا کے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے گھوم پھر کر اچھی طرح دونوں کردوں کا جائزہ لیا تاکہ حملہ آور قاتلوں کے بارے میں

کوئی سراغ مل سکے لیکن اس سلسلے میں ہمارے ہاتھ کسی کامیابی تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

میرے مشورے پر اس ”مرہ خانے“ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تاکہ اگلی صبح ہستی والے پہ آسانی کی تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس طرح وقت پر ان کے عقیدے کے مطابق آخری رسومات کی ادائیگی ممکن ہو جاتی۔ میں گھر کا داخلی دروازہ بھی کھلا چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر اب قسم کے خطرے سے آزاد ہو گیا تھا۔

کوئی بھی مکان، کینٹون سے ہوتا ہے۔ جس مکان میں کینٹون موجود ہوں وہ گھر ہو جاتا ہے۔ وہ گھر اب خالی مکان میں بدل گیا تھا۔ اس مکان میں بسنے والے اب اس دنیا کے باقی نہیں رہے تھے لہذا وہاں موجود کسی بھی شے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ انسان کی زندگی کی بس اتنی ہی حقیقت ہے! جس گھر کے ایک دو یا اس سے زیادہ افراد کسی دشمنانہ کارروائی کی بھیشت چڑھ جائیں، انہیں کوئی دوبارہ زندہ تو نہیں کر سکتا لیکن دستورِ زمانہ ہے کہ باقی زندہ بچ رہے والے افراد کی اٹھک ٹوٹنے کے لیے ان کی بھرپور مالی مدد کردی جاتی ہے۔ افسوس! ہم شاکا کی پہلی کے ساتھ دستورِ زمانہ بھی نہیں نبھاسکتے تھے۔ ہم لاکھوں کروڑوں بھی اس مکان کے درو دیوار پر بھجوا کر دیتے، وہاں کی جگہ پاش ویرانی اور ہولناک سانے میں ہمارا ایک چھوٹا سا گھر بھی نہیں لاسکتے تھے۔

بعض حالات میں انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسا مجبوری میں بھی محسوس ہوتا ہے انسان ازل سے مجبور ہے اور اب تک مجبور ہی رہے گا۔

ہم پوچھ لیا، ڈھنوں پڑمرہ دلوں اور جھگے ہوئے قدموں کے ساتھ بیرونی دروازے کے قریب پہنچے تو دروازے کی پشت پر نگاہ پڑنے ہی میں چونک اٹھا۔ دروازے کی اندرونی کنڈی کے ساتھ ایک کانڈھ لٹکا ہوا دکھائی دیا۔

جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تھے تو کسی کو دروازے کی طرف دھیان دینے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کنڈی میں سے وہ کانڈھ نکال لیا۔ وہ ایک رول کیا ہوا فل ایکسپ کانڈھ تھا جو کنڈی کے کپ میں بڑی مہارت سے بھنسا یا گیا تھا۔

میں نے رول کیے ہوئے کانڈھ کو ایک خاص انداز میں کھول لیا اور اس پر موچوڑ پر پرنگہ دوڑانے لگا۔ اس مقصد کے لیے مجھے ماچس جلانا پڑی جو میں اندر ایک کمرے کے طاق سے اٹھا لیا تھا۔ یہ میری ایک اضطرابی حرکت تھی۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ چلو اچھا ہوا، یہ ماچس اب کام آ رہا

تھی۔ وہاں شفاف اور شستہ انگش میں ایک مختصر سا پیغام درج تھا۔ ڈاکٹر مونگ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا:

فلکوں کے سردار! تمہارا بھائی یا سر موچوڑ کیا رہا؟ اگر میری راہ میں دوبارہ آنے کی کوشش کی تو یہ اسٹر تمہاری شدہ رگ پر بھی چل سکتا ہے۔ اپنے تین وفاداروں کا حشر دیکھ کر بھینسا نہیں عہرت ہو گئی ہوگی!

اس مختصر دھمکی آمیز پیغام کے اختتام پر ”جے۔ ایف“ درج تھا۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، جے۔ ایف کا مطلب سید سیدھا ”جی نوٹ“ تھا۔ اب جے۔ ایف کینیڈی تو ہونے سے رہا!

بدھ کے پیروکار عموماً اپنے سر کو منڈوا کر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مونگ کو اسی مناسبت سے فلکوں کا سردار کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ کا اپنا آدھا سر آگے سے منڈا ہوا تھا۔ تاہم چونی کاٹنے کے بعد اس نے پچھلے بالوں کو آگے گر کر ایک مخصوص اسٹائل بنالیا تھا۔ جب ہم الہا سکا سے واشٹن آ رہے تھے تو ڈاکٹر مونگ ریفرے نے اپنی چونی کاٹ ڈالی تھی اور چلیے میں بھی مناسب تبدیلی کر لی تھی۔ جی نوٹ آ کی اس دل جلانے والی تحریر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ ڈاکٹر مونگ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ رولی نے اس سلسلے میں اس قسم کی معلومات فراہم کی تھیں۔

”کیا لکھا ہے اس کانڈھ پر؟“ ڈاکٹر کی سرسراہٹ ہوئی۔ آواز میری ساعت تک پہنچی۔

اسی وقت ماچس کی تیلی اپنے جلاؤ کے اختتام تک جا پہنچی۔ میں نے نئی تیلی جلانے کے بجائے دروازے سے باہر قدم نکالتے ہوئے کہا۔

”جیب میں بیٹھ کر آرام سے پڑھ لیتا ڈاکٹر!“

اس نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ دونوں بھی شاکا کے گھر سے نکل آئے۔ گھر کے بیرونی دروازے کو پروگرام کے مطابق کھلا چھوڑ دیا گیا۔ ہم پہلے والی پوزیشن میں جیب کے اندر آ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے ریڈنگ لائن جلائی اور گردن موڑ کر ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔

وہ ڈرائیوگ سیٹ پر موجود تھا جبکہ میں لی یان کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر کے دراز ہاتھ کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے جی نوٹ آ کا سند یہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ رول کیا ہوا کانڈھ میرے ہاتھ سے لے کر پڑنے لگا۔

اسی لمحے میرے پہلو میں کئی کا لٹکا سا بند لگا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے بھوئی اچکا نہیں تو وہ منہ سے کچھ نہ بولی تاہم

میں نے اس کی آنکھوں میں محسوس ہوا کہ آسانی پڑھ لیا۔ وہ بھی مجھ سے اس دھمکی آمیز رشتے کے بارے میں بے زبانی خاموشی پوچھ رہی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ممبر کی تفلین کی اور ڈاکٹر مونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس دوران میں وہ اس کانڈھ کی تحریر پڑھ چکا تھا، گھبراہٹ واز میں بولا۔

”اس رشتے نے ثابت کر دیا کہ یہاں ہونے والی بھینسا کارروائی جی نوٹ آ کی کارستانی ہے!“

”میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے انداز میں کہا۔

”تو یہ کانڈھ لی یان کو بھی پڑھاؤ۔“ وہ مذکورہ کانڈھ میری سمت بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ اس مشن میں ہمارے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ اس کی معلومات بھی آپ نوڈیٹ رہنا چاہئیں۔“

لی یان جی نوٹ آ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں جی نوٹ آ کا پس منظر اس کے گوش گزار کیا پھر وہ رعدا سے حمادیدہ۔ وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”اوہ.....!“

لی یان کی یہ ”اوہ“ ڈاکٹر مونگ تک رسائی حاصل نہ کر سکی کیونکہ اسی لمحے اس نے جیب کے بیدار بجن کو احکام کی تعمیل پر مجبور کر دیا تھا۔ جیب حرکت میں آئی تو ہمارے پہلو ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ ہم نے لگ بھگ آدھا گھنٹہ کھلے میں گزارا تھا۔ وہ گھنٹہ کے سرد ترین موسم کی ایک خنڈی ٹھنڈی رات تھی۔ ایسے ظالم موسم میں لگ کر بیٹھنا بھلا محسوس ہوتا ہے۔ میں نے لی یان سے دور ہٹنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس نے ضرورت سمجھی۔ جیب کے اندر خاموشی کا راج تھا اور یہ جیب ماحول کے سنانے کو چہرے سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ہنسی سوئی سوئی لگ رہی تھی۔ اس ہنسی کے گھر میں آج قیامت برپا ہو گئی تھی مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی شخص کو کالوں کا ان اس سانس کی خبر نہ ہو۔

جلدی ہی ہم ایک نیم بیٹوئی چکر کاٹنے کے بعد اس راستے پر نکل آئے جو ہمیں اس ہستی سے بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کی طرف لے جاتا۔ ہماری اگلی منزل وہ عبادت گاہ ہوتی جہاں آج رات رولی کی بیٹی ہوئی ٹیم کوئی ”عظیم کارنامہ“ انجام دینے والی تھی۔

ہم اپنے راستے پر کوئی پانچ سو میٹر آگے نکل آئے تو مونگ ریفرے نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔



”وجدان! تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟“

یہ ایک غیر متوقع سوال تھا۔ میں امید کر رہا تھا وہ جی فوٹو یا ٹیکل کنڈ کے بارے میں بات کرے گا۔ میں اسٹیشن دیکھنے والے دشمنوں سے ہنسنے کے بعد جب جیب میں آکر بیٹھا تھا تو ڈاکٹر کو اپنے زخمی بازو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس کے بعد جب لی یان پوری طرح ہوش و حواس میں آگئی تو وہ بھی میرے گھاس بازو کی ہسٹری اور سسری سے آگاہ ہوگئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی اپنے بازو سے غافل ہو گیا تھا۔ شاید یہ شاک کے کھر میں پیش آنے والے اس افسوس ناک خونچکان واقعے کا اثر تھا۔ اب ڈاکٹر مونگ نے یاد دلایا تو مجھے بازو میں تکلیف کا احساس ہوا۔

”ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے اپنے معصوب بازو کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ممتی خیز انداز میں بولا ”وجدان! جس طرح قطرہ قطرہ ل کر دریا بن جاتا ہے بالکل اسی طرح ہلکا ہلکا ل کر ہماری ہو جاتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں لینے کے دیے پڑ جائیں اس لیے۔“ وہ جملہ ادھر چھوڑ کر رادیو کو خاموش ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے جیب کی رفتار انتہائی کم کر دی تھی۔ اپنے احمورے بیان کو مکمل کرنے کے لیے اس نے اضافہ کیا۔

”کیوں نہ پہلے تمہارے زخم کا معائنہ کر لیا جائے۔ ہمارے پاس فرسٹ ایڈ کا تمام سامان موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک خوب صورت فلپائی نرس کا ساتھ بھی ہمیں میسر ہے۔“ اس نے غبی نشت کا منظر دکھانے والے آئینے میں لی یان کو دیکھا اور استفسار یہ انداز میں بولا ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”لوسر۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ مؤدب انداز میں بولی۔

ڈاکٹر مونگ ریفرشے کی شخصیت لی یان کے لیے ہر لحاظ سے واجب الاحرام تھی۔ ساگ فو کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مونگ ایک ہنگ کا بڑا تھا اور لی یان دشمن مسٹر ہنگ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ لی یان کے لیے مونگ جگ باس کی حیثیت رکھتا تھا۔

ڈاکٹر مونگ نے نگاہ کا زاویہ تبدیل کیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”تم کیا کہتے ہو وجدان؟“

میں نے تھوڑی دیر پہلے جو خوں ریز مظاہرہ دیکھے تھے وہ سنجیدگی افسردگی اور کھیمبر کا تقاضا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مونگ کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ ماحول میں طاری سنگینی

اور دل گرفتگی کو کم کرنے کا خواہاں تھا جیسی اس نے جھجھکاؤ والا اسٹائل اپنایا تھا۔ یہ ایک طرح سے ٹھیک بھی تھا۔ ہم جتنے بڑے معر کے پر جا رہے تھے اس کے لیے اعصاب کو پرسکون اور ہاتھ پاؤں کو کھاتیت ہی مستعد ہونا چاہیے تھا۔ اگر اعصاب ہمارے قابو میں رہتے تو ہم پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ وہ میدان مار سکتے تھے۔ میں نے بھی ہلکے پھلکے پھلکے انداز میں کہہ دیا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اس وقت ایک تجربہ کار ڈاکٹر اور ایک خوب صورت نرس کے درمیان آپہنسا ہوں۔ تم جو چاہو میرے ساتھ سلوک کرو۔ میں اتفک نہیں کروں گا۔“

”لارڈ بدھانے جا ہا تو ہم تمہارے ساتھ اچھا سلوک ہی کریں گے۔“ ڈاکٹر مونگ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا اور جیب روک دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے بازو کی ”تجاورداری“ کے بغیر آگے نہیں بڑھے گا۔

لی یان نے فرسنگ کورس کر رکھا تھا۔ نیوجری میں میرے دوست ویم کو دی اسٹینڈ کرنی رہی تھی۔ ہم اس وقت جس جیب میں سفر کر رہے تھے اس میں غبی نشت کے پیچھے ایک خلا بنا ہوا تھا جہاں ایک طرف پانچ پانچ میلین پیٹروں والے دو دیکھن اپنے اسٹینڈز میں ٹھس تھے دوسرے کونے میں ہمارا بیگ رکھا تھا۔ ہمارے بیگ کے ساتھ ہی فرسٹ ایڈ باکس بھی موجود تھا۔

آئندہ دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر اور نرس نے مل کر میرے بازو کا ماہرانہ معائنہ فرمایا اور یہ رپورٹ دی کہ زخم خطرناک نہیں۔ گولی میرے بائیں بازو کے خرابی سپ مسل کو چھیلنے ہوئے گزرتی تھی۔ لی یان نے میرے خرابی سپس (TRI CEPS) کو اچھی طرح ایک اسٹیل سپیک لوشن میں روٹی جھگو صاف کیا پھر زخم پر ایک مینٹک آئٹمنٹ پھیلا کر ڈرینگ کر دی۔

”کسی بین کلر کی ضرورت تو محسوس نہیں کر رہے ہو؟“ ڈاکٹر مونگ نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے مختصر کہا۔

ڈاکٹر نے ایک مرتبہ پھر جیب آگے بڑھادی۔ ہائی وے والی ہستی سے مدھمکل کنڈ کی عبادت گاہ تک کم بیش ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا لیکن طے شدہ پروگرام کے تحت ہمیں یہ فاصلہ پانے میں ڈھائی سے تین گھنٹے لگ سکتے تھے اور کچھ بید نہیں کہتیں گھنٹے سے بھی زیادہ!

دراصل مزید چند کلومیٹر آگے جانے کے بعد ہمیں اپنا

رخ تبدیل کرنا تھا۔ ہم اس راستے سے عبادت گاہ تک نہیں پہنچنا چاہتے تھے جو عام گزرگاہ تھی۔ ہمارے دشمن اس وقت ہماری تعداد میں دہاں موجود تھے اور عام گزرگاہ خصوصاً عبادت گاہ کے نزدیک ہمارے لیے کئی گنا توں کا بندوبست ہوگا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ عبادت گاہ سے چند کلومیٹر پہلے ہم اپنا راستہ تبدیل کر دیں گے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر عبادت گاہ کی دوسری سمت پہاڑی سلسلے کے پیچ نمودار ہوں گے۔ یہ وہی رخ ہوتا چدرے میں پہلی مرتبہ اس عبادت گاہ تک پہنچنا تھا۔ وہ سمت ہمارے دشمن کے لیے زیادہ سودمند تھی۔

اس خیال نے میرے تصور میں ماضی کی وہ رات بھرا دی جب میں زخمی سب کے ہمراہ ایک لینڈ کروزر میں سوار اپنے دشمنوں سے بھانٹا پھرتا اس عبادت گاہ کی طرف اتفاقاً نکل آیا تھا۔ تب جاگ لی کے غنڈوں نے ہمیں ایک حویلی میں قید کر کے بری طرح چڑا تھا۔ گویا انہوں نے میرا جواز کھول کر رکھ دیا تھا۔ سب کی حالت قابل رحم تھی۔ حویلی سے فرار کے لیے ہمیں ایک لینڈ کروزر جیب حاصل ہوگئی اور ہم چٹانی راستوں کی دشواریوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس عبادت گاہ تک پہنچے جس میں کامیاب ہو گئے تھے جس کے د خانے میں ایک انمول خزانہ موجود تھا مگر اس وقت یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔

بہر حال اب اگر ہم عبادت گاہ کی اس سمت رسائی حاصل کر لیتے تو دشمن کی نظر سے محفوظ رہ سکتے تھے اور اس سمت تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک لمبا دشوار گزار چکر کاٹنا تھا جس کے سبب وقت دگنا لگتا۔ ایک مختلط انداز سے کے مطابق اگر راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آتا تو ہم ساڑھے تین بجے تک اپنے مطلوب مقام پر پہنچ جاتے۔

ہماری جیب اونچے نیچے پہاڑی راستے پر چھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک تو وہ مشکل ترین راستہ اور پھر سے رات کا وقت۔ ڈاکٹر مونگ بڑی مضبوطی سے احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ ایک ڈرائی غلطی میں تینوں کو موت کے منہ میں پھینک سکتی تھی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا پھر بھی ہم شدید زخمی ضرور ہو جاتے۔ جیب کو جو نقصان پہنچتا وہ ہماری راہ کوئی کرنے کا وسیلہ بن جاتا۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک خاموشی رہی پھر ڈاکٹر مونگ نے قدرے شکایتی انداز میں کہا ”وجدان! وہاں شا کا کے گھر میں تم نے ایک بات بڑے وثوق سے کہی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تمہارے وثوق کی بنیاد کیا تھی؟“

”تم کس بات کا ذکر کر رہے ہو ڈاکٹر؟“ میں نے

چونک کر پوچھا۔

”اس واقعے کے پیش آنے کا وقت تم نے بڑے اعتماد سے بتایا تھا!“

”اوہ!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر کہا ”ڈاکٹر! جس جھمبیں اس بارے میں بتا چکا ہوں۔ جھمبیں یاد ہوگا آج شام جب میں باہر سے آیا تھا تو تم نے مجھے اچھا ہوا یا کڑی سوالات کر ڈالے تھے اور میں نے تمہیں اپنی ذہنی شخصیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان نیلگري بھی ڈسکس ہوئی تھی۔ میں نے نیلگري کے ایک جملے کی بنا پر وہ بات کی تھی۔ جب نیلگري نے مجھے کس ان جانے خطرے سے آگاہ کیا اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔“

اس مرتبہ ڈاکٹر مونگ نے طویل سانس خارج کی ”اوہ.....!“

نیلگري کے ذکر پر لی یان کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سات بجے شام میرے ساتھ کی اور ہم دونوں اس وقت رتا پارک کی پیچ پر بیٹھے تھے جب کا یہ ذکر ہے۔ نیلگري کی ”اطلاع“ کے بعد میرے چہرے پر جو اثرات نمودار ہوئے اور میں نے فوری طور پر جس اضطرابی رویے کا مظاہرہ کیا وہ لی یان سے چھپا نہیں رہا تھا۔ اس نے اس وقت مجھ سے استفسار بھی کیا تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ دھیروں سوالات کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے ڈاکٹر مونگ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے لی یان کو یہ موقع فراہم نہیں ہونے دیا۔

”ڈاکٹر! میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا“ تم نے بھی میرے ایک اہم سوال کا ابھی تک جواب نہیں دیا حالانکہ وہ سوال خاصا وضاحت طلب تھا؟“

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ”تم سوال دہراؤ۔ میں وضاحت کر دیتا ہوں۔“

”میں نے تم سے عبادت گاہ میں موجود بدھ بکشو اور اس کی فٹیلی کے بارے میں استفسار کیا تھا؟“

”اوہ وہ لوگ!“ ڈاکٹر مونگ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں پوچھنے بنا نہ رہ سکا ”کیا وہاں لوگوں کو؟“

”جیسا کہ تم جانتے ہو بدھ بکشو نے خانے والے راز سے واقف تھا.....“ ڈاکٹر مونگ نے اتنا کہہ کر جملہ ادھر اور چھوڑ دیا۔

میرا دماغ سنسناتا تھا۔ رگ وے میں ہل چلی سی جگہ گئی اور دل کی دھڑکن یک دم بڑھ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا ڈاکٹر ماضی کے کسی قلعے کو حال کے کرداروں کی مناسبت سے بیان

کرنے جا رہا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے اسی عبادت گاہ میں خون رنگ تماشا ہوا تھا۔ چائنگ لی اور ناگ پال کے غنڈوں نے وہاں انسانی خون کی ہولی کھیلی تھی۔ تھوہنجی اور بھیر جانی کی تشدد خندہ لاشیں میرے تصور میں محوم نکلیں۔

تھوہنجی ایک طویل عرصے سے اس عبادت گاہ میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ وہ بھی یہ خانے والے راز سے آگاہ تھا۔ اس کی بیوی بھیر جانی اور دھو (ساحل) اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ تھوہنجی نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے وہ راز میری آنکھوں کے راستے میرے سینے میں منتقل کیا تھا پھر میرے توسط سے دھو بھی یہ خانے والے خزانے اور وہاں تک رسائی کے طریقہ کار سے آگاہ ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ کہیں اس عبادت گاہ کی تاریخ کو ہرایا تو نہیں جا چکا!

یہ تمام تر خیالات سینکڑوں دس دس حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں دوبارہ ڈاکٹر موگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں“ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ بدھ بھکشو خانے والے راز سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ کافی عرصہ پہلے دقت و قفے سے اس عبادت گاہ کے پھیرے بھی لگا رہا تھا۔ اس وقت تھوہنجی زندہ تھا۔ دونوں بھکشو عبادت گاہ کے اندر جا کر گھنٹوں غائب رہتے تھے۔ وہ یہ خانے میں اتر کر راز و نیاز کرتے رہتے۔ اس بدھ بھکشو کا تعلق دلائی لاما کے دلش دھرم شالا سے تھا۔ وہ اپنی ادھیڑ عمر بیوی اور دو نو عمر بچوں کے ساتھ تھوہنجی کے انتقال کے بعد اس عبادت گاہ میں ”قیامت“ ہوا تھا۔ تھوہنجی کی موت کے بعد دلائی لاما نے اسے عبادت گاہ کے انتظام اور اس کے خانے میں موجود خزانے کی حفاظت کے لیے یہاں بھیجا تھا مگر.....“

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”مگر یہ تو بتاؤ اس بھکشو اور اس کی بیوی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ تمہاری پراسرار خاموشی مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی ہے!“

ڈاکٹر نے فوراً میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے گہری سوچ میں ڈوبے پایا تو انتظار کرنے لگا۔ اس انتظار کے ساتھ ہی میرا ذہن ماضی میں بھی جھانک رہا تھا۔ دلائی لاما کے بارے میں بہت سی معلومات مجھے ساحل کے باپ تھوہنجی سے حاصل ہوئی تھیں۔ تبت سے جلا وطنی کے بعد دلائی لاما نے اغایا کی شمالی ریاست ہماچل پردیش میں سکونت اختیار کی۔ ہماچل پردیش کے صدر مقام دھرم شالا میں دلائی لاما کو وہ تمام مراعات حاصل تھیں جو کبھی بھی جلا وطن ہیڈ آف

اسٹیٹ کو حاصل ہو سکتی تھیں۔ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے یہ خانے میں جو خزانہ پوشیدہ تھا وہ ہر دور کے دلائی لاما کی نظر میں رہتا تھا اور تھوہنجی کے مطابق دلائی لاما نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔

سننے بدھ بھکشو کو میری موجودگی میں ہی اس عبادت گاہ کا چارج دیا گیا تھا۔ ان دنوں میں گھنٹہ دو میں مایا متی کے گھر میں ٹھہر رہا تھا۔ مایا متی کیونامی ایک اسپتال میں نرس تھی۔ تھی یوں کہ ازاں بعد ناگ پال کے غنڈوں نے اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ نیا بدھ بھکشو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دھرم شالا سے سیدھا مایا متی کے گھر پہنچا تھا۔ اس وقت دھو بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ اس بھکشو کو دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔ وہ عبادت گاہ میں اپنے باپ کے پاس اسے آتے جاتے دیکھ چکی تھی۔ بہر حال میں نے اس بھکشو سے تفصیلی ملاقات کی اور اگلے روز اس کے بریدار کے ساتھ اس بھکشو کی عبادت گاہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اسی بھکشو کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ دلائی لاما تھوہنجی کی موت کی خبر مل گئی تھی اور اس نے اسے تھوہنجی کی جگہ عبادت گاہ میں قیام کرنے کو بھیجا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی تھی کہ وہ لوگ پہلے میرے پاس آئیں پھر عبادت گاہ کا رخ کریں۔ یہ دلائی لاما کا بے پناہ اعتماد تھا جو اس نے مجھ پر کیا تھا۔

ڈاکٹر کی سرسراہٹ ہوئی آواز نے میرا انتظار ختم کر دیا۔ وہ گھمبیر انداز میں مجھے بتا رہا تھا ”رہی کی بھیجی ہوئی ٹیم نے جب پہلی مرتبہ عبادت گاہ کے یہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ بدھ بھکشو اور اس کے بیوی بچے بھی ان کے تشدد کا نشانہ بنے پھر ان ظالموں نے اس مختصر سے خاندان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ماضی میں ناگ پال کے غنڈوں نے تھوہنجی اور بھیر جانی کے ساتھ کیا تھا۔“

گو کیا میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ڈاکٹر موگ نے نہایت ہی مناسب الفاظ میں بھکشو اور اس کی بیوی کی موت کا اعلان کر دیا تو میں ایک افسوس بھری سانس خارج کر کے وہ گیا۔ ڈاکٹر موگ کی آواز دوبارہ ابھری۔

”رہی کی ٹیم نے پہلی پیش قدمی اس وقت کی جب ساحل ابھی یہاں نہیں پہنچے تھے۔ اس صبح کے میں دونوں طرف شدید نقصان ہوا۔ دوسری کوشش وہ ساحل کی معیت میں کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے جی فوڈ کے چنگل سے ساحل کو کال لیا پھر مجھے چتا چلا کہ آج آدھی رات کے بعد وہ دوبارہ ساحل کے بغیر ہی یہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے پھر.....“

”اور اب تو ساحل بھی نہیں حاصل ہوگئی ہے!“ میں نے ڈاکٹر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

وہ انہات میں سر ہلا کر رہ گیا۔  
اس کی خاموشی مجھے کھٹکنے لگی تو میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا ”ڈاکٹر! بدھ تیل کنڑ کی وہ عبادت گاہ کھنڈو کے ایک تھانے کی حدود میں آئی ہے۔ چار افراد کی ہلاکت کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ مجھے عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے پولیس سے مدد لینا چاہیے گی۔ اس سلسلے میں انسپکٹر شیوا بہت اہم کردار ادا کر سکتا تھا؟“

مجھے اچھی طرح یاد تھا، جن دنوں میں کھنڈو میں سرگرم عمل تھا، انسپکٹر بریدر امیر سے بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے بھی نیپالی پولیس کی مختلف مراحل پر بھر پور مدد کی تھی پھر جب تھوچی اور بھیر جانی کو بڑے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا تو بریدر نے پولیس کی ایک تفتیشی ٹیم ترتیب دے کر باقاعدہ کارروائی کرانی تھی۔ اس کے بعد یہی فیصلہ ہوا تھا کہ دھنو (ساحل) اب میرے ساتھ رہے گی۔

”تم کیا سمجھتے ہو؟ میں اس دوران میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا ہوں!“ ڈاکٹر مونگ نے میرے سوال کے جواب میں کہا ”وہاں عبادت گاہ کے اندر جو لوگ اس وقت دیکھ بھال کے فرائض انجام دے رہے ہیں ان کا تعلق پولیس سے ہے۔ وہ سادہ لباس میں وہاں کی لڑکی گرائی کر رہے ہیں۔“

”اور وہاں آس پاس بھی فوڈ کے آدمی بھی موجود ہیں؟“ میں نے کہا۔  
”ہاں وہ بھی ہیں۔“ وہ تاہم یہ انداز میں بولا ”شدید ترین نقصان اٹھانے کے بعد بھی انہوں نے مورچا نہیں چھوڑا۔ اور اب تک تو ان کے پاس نئی ملک بھی پہنچ گئی ہوگی جس میں سب سے خطرناک ہتھیار تہنہاری ساتھی ساحل ہے۔“

ڈاکٹر مونگ نے رتا پارک والے بنگلے پر گفتگو کے دوران میں ساحل کو حقیقی مہرے سے تعبیر کیا تھا اور اب وہ اس کے لیے خطرناک ہتھیار جیسے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ میرے اور ساحل کے درمیان جس نوعیت کا حساس تعلق تھا وہ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے بہت دکھ ہوا تھا اور اب بھی میں ایک تکلیف سے گزر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا ڈاکٹر مونگ نے میری دل آزاری کے لیے وہ سب نہیں کہا تھا لہذا میں الفاظ کے وہی تاثر کو فراموش کر کے اس کی طرف توجہ ہو گیا۔

”ہمارے پاس اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟“ میں نے

ظہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”وہی دو آٹو بیگ رائلٹیں ہیں جن کا تم ویدار کر چکے ہو۔“ اس نے جواب دیا ”ان کے گودیش ایک ہزار راکٹوں اور بھی موجود ہیں۔ گولیوں والی بمبلی گولیوں نے ایک دوسرے خفیہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔“

ڈاکٹر کا اشارہ ان دبیوں ایم ایم گنوں کی جانب تھا۔ ہم ہائی وے والے مہرے میں استعمال کر چکے تھے۔ ڈاکٹر نے ڈاکٹر نے ڈیش بورڈ کے نیچے واقع ایک خفیہ خانے سے برآمد کی تھیں۔ وہ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔  
”عبادت گاہ کے اندر ہمارے کل چھ افراد موجود ہیں۔

ان میں چار سادہ لباس پولیس والے اور دو میرے اپنے آدمی ہیں۔ یہ چھ کے بچھ پوری طرح مسلح ہیں اور ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے ماہر ہیں۔ مجھے کنو وغیرہ کے استعمال سے دلچسپی نہیں۔ یہ دو گنوں میں نے تم دونوں کے لیے رکھ لی تھیں۔“

میں نے کہا ”میں بھی آتھیں اسلحے کے استعمال سے ممکنہ حد تک پرہیز کرتا ہوں لیکن بعض حالات میں ہاں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جیسے اسٹیشن وینن والے دشمنوں کے خلاف اگر ہم ہتھیار نہ اٹھاتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔“

”تم قہقہے کہتے ہو؟“ وہ ظہرے ہوئے لہجے میں بولا۔  
میں نے پوچھا ”ڈاکٹر! جیب میں فیول کی کیا خبر ہے؟“

”وس گیلن پیٹرول تو دو دین میں فاضل رکھا ہے۔“ اس نے بتایا ”اور جیب کے ٹینک میں فیول کی پوزیشن بتانے والا سوئی اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ ہم اسی ایندھن سے واپس کھنڈو بھی جا سکتے ہیں۔“

”دیش کنڈ!“ میں نے ظہرے ہوئے لہجے میں کہا۔  
اسی وقت مجھے لی یان پر جھک جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے جیب کو مرکز کی راستے سے ہٹا کر ایک تنگ اور مدید وشار گزارا پر ڈال دیا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بجنا تھا۔ اگر ہم ان راستے پر سفر جاری رکھتے تو گھم گھم پونے دو بجے ہم عبادت گاہ تک پہنچ جاتے۔ اب راستہ بدل گیا تھا۔ ہمیں ایک طویل چکر کا کر عبادت گاہ تک پہنچنا تھا جس میں زیادہ وقت صرف ہوتا یعنی بات تھی۔

میں جب کے ٹرن کی وجہ سے لی یان پر جھکا تو وہ مرے آگے جھٹکتی چلی گئی۔ ہم دونوں کا جھکاؤ ایک ہی سمت میں تھا۔ ہم عینی نشست پر گویا ایک دوسرے پر گر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”درا سنہیل کر بھئی۔ آگے تو اور بھی خطرناک ٹرننگ آگے گی۔“

ہم دونوں سنہیل گئے۔ مرہم پٹی سے پہلے لی یان پرے ہائیں پہلو میں بیٹھی تھی۔ ڈریک کے بعد میرے دائیں طرف آگئی تھی تاکہ زخمی بازو زیادہ سے زیادہ محفوظ رہے۔ گھاس بازو تو ہر ایک طرف لی یان کی پوزیشن بدل جانے سے میں بازو دے دیگر میں بھی اچھی خاصی ”تکلیف“ محسوس کرنے لگا تھا!

موسم سرما میں انسانی جسم کو زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا معدہ نسبتاً تیز کام کرتا ہے۔ ہم نے رتا پارک والے بنگلے پر رات آٹھ بجے ڈر کیا تھا۔ کچھ کھائے ہیں لیکن لگ بھگ پانچ کھتے ہو گئے تھے۔ ان دونوں کا تو پتا نہیں مگر میں بھوک محسوس کر رہا تھا۔ ہائی وے پر اسٹیشن وینن والے دشمنوں سے جو مارا ماری ہوئی اس نے اچھی خاصی توانائی کھالی تھی۔

”ڈاکٹر مونگ! کیا تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟“ میں نے دیشی آواز میں کہا۔  
”نہیں۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا ”البتہ اگر تم لوگ کچھ بھوک محسوس کر رہے ہو تو کھل کر کہتے ہو۔ تمہارے بیک کے اندر میں نے ایک مٹی باکس رکھا ہوا ہے جس میں پیٹ پوچا کا مناسب بندوبست موجود ہے۔“

ڈاکٹر جس مٹی باکس کا ذکر کر رہا تھا، میں اس سے واقف تھا۔ ڈاکٹر نے چٹنگ کے وقت مذکورہ باکس ہمارے بیک میں رکھوا دیا تھا۔ باکس میں باقاعدہ کھانا تو نہیں تھا البتہ ایک خاص قسم کی مٹھائی موجود تھی جو سوچی اور مختلف قسم کے ڈرائی فرائز کی آمیزش سے تیار کی گئی تھی۔

بدھ کے پیر کاروں (کنڑ) کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ دوپہر ڈھلنے کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔ بننے والی اشیاء بھی مٹی پائی، جوس اور سافٹ مشروب پر گزارہ کرتے ہیں لیکن یہ ان لوگوں کا اصولی تھا جو دنیا تیاگ کر ایک طرح کا جنگ لے لیتے ہیں۔ باقی بدھ مت بھی ویسی ہی زندگی گزارتے ہیں جیسی دوسرے عام لوگ۔ ڈاکٹر مونگ کے خاٹے سے میں نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ رات کے کھانے کے بعد سے دوسری صبح تک کچھ نہیں کھاتا تھا۔

میں نے لی یان کی طرف صلح مارنے والی نظر سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے تاہم دکھائی دی۔ میں نے مخصوص مٹھائی والا وہ باکس کھولا اور ڈاکٹر مونگ کے مطابق، ہم اس

ڈرائی فروٹس والی مٹھائی سے شغل کرنے لگے۔ اس دوران میں ہمارے درمیان بلی بھٹکی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ زیادہ تر بدھ عبادت گاہ کے خانے میں پوشیدہ خزانے اور جی نوڈا کے بارے میں باتیں ہوئیں پھر ہماری گفتگو کا زاویہ شیون کی جانب مڑ گیا۔

رتا پارک والے بنگلے میں آج شام ڈاکٹر مونگ نے مجھے نیو جرسی کے خاٹے سے جو تازہ ترین اطلاعات فراہم کی تھیں وہ میں نے ڈاکٹر کی اجازت باکری لی یان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ وہ شیون کے لیے پریشان ضرور تھی تاہم اس پریشانی کو اس نے خود پر طاری نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی برداشت والی عجیب و غریب لڑکی تھی۔

وہ اپنے نظریات کے خاٹے سے عجیب اور ان کے ثمرات کے باعث واقعی غریب تھی!

ڈاکٹر مونگ ہماری بات چیت میں شریک ضرور تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا اس کی تمام توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں کھنڈو کے مضافات میں میلوں تک پہلے ہوئے اس سلسلہ کو کہ پہلے بھی بھگت چکا تھا۔ یہ خطرناک اور دشوار گزار میز سے میز سے راستہ قدم قدم پر موت کے مانند منہ کوٹے بیٹھے تھے۔ ایک ذرا سی غفلت یا کوتاہی کی سزا زندگی بھر کا بچھٹا تھا۔

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ چاند کی ابتدائی بارشیں تھیں اس لیے بھی فضا میں کچھ زیادہ ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سیاہ رو کے چہرے پر کا لک لٹ دی گئی ہو۔ ہماری جیب او نیچے نیچے چٹائی راستے پر آگے بڑھتے ہوئے اچھل کود چٹائی تو اس کی باڑی جنبشوں کی مناسبت سے ہیڈ لائٹس کی روشنیوں بھی ٹھٹھکتی۔ ہیڈ لائٹس کے اونچے نیچے حرکت کرتے ہوئے وہ دھمکتے ہوئے تاریک رات کے پتے پر بڑا خطرناک نظر کر رہے تھے۔ فضا میں ٹھنڈک اور تاریکی ایک خاص تناسب سے نفوذ کیے بیٹھی تھیں۔

ڈاکٹر مونگ نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس ہوی انجن والی آری گرین جیب کا انتخاب کیا تھا۔ وہ پتھر پلے اور ریلے دونوں قسم کے راستوں پر بھاگنے کے لیے یکساں موزوں تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور گاڑی ہوتی تو بھی کا جواب دے چکی ہوتی۔ وہ بظاہر دیکھنے میں ایک پرانی سی بلی جیب نظر آتی تھی مگر اس کا انجن کسی دیو کی طاقت اور ٹائرس جن ایسی گرفت کے حامل تھے۔ میں جب زخمی سب کے ساتھ ناگ پال کے حویلی نمائندی خانے سے فرار ہوا تھا تو ایک لینڈ

..... کروزر میرے مجھے چڑھ گئی تھی۔ تمام تر راستے میں اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جما بیٹھا رہا تھا لہذا میں ان ڈھلوانی چٹانی راستوں کی ہلاکت خیزی سے بخوبی آگاہ تھا۔ ہمارا سفر ایک مخصوص رفتار سے جاری رہا۔ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا تو محسوس کیا جاسکتا تھا کہ ہم ایک دائرے میں سفر کر رہے تھے اور یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ ہم نے جس مقام سے راستہ بدلا تھا اگر وہاں سے ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جاتے تو نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں پہنچ جاتے۔ اب ہمیں نصف دائرے میں ایک لمبا قوسی سفر طے کرتے ہوئے عبادت گاہ کی دوسری سمت ٹھوڑا فاصلے سے باہر لنگھتا تھا۔

اس وقت ہم جس راستے سے گزر رہے تھے وہ ایک طرح سے متروک راہ گزر تھی۔ اس لیے بھی وہاں صفائی ستھرائی نظر نہیں آتی تھی۔ جن راستوں سے باقاعدہ سواریاں گزرتی رہیں وہ چھوٹی موٹی رکاوٹوں اور دیگر آلائشوں سے پاک ہو جاتے ہیں مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ راستہ صدیوں پہلے آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا رہا تھا اور ایک زمانے سے اس طرف کسی گاڑی وغیرہ کا گزر نہیں ہوا تھا۔

اس قوسی سفر کا ابھی نصف راستہ ہی طے ہوا تھا کہ ہماری جب دوطرفہ چٹانوں میں داخل ہو گئی۔ وہ حقیقت وہ راستہ آگے جا کر نسبتاً تنگ ہو گیا تھا اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم دوطرفہ چٹانوں میں داخل ہو گئے ہوں حالانکہ وہ چٹانیں پہلے بھی کچھ فاصلے پر موجود تھیں۔ اگرچہ اوپر آسمان نظر آرہا تھا لیکن تنگ و تاریک راستے کے سبب یہی لگتا تھا جیسے ہم کسی اندھے غار میں بوجسز ہوں۔ اس تصور کے ساتھ ہی گفتگو بھی محسوس ہونے لگی۔

یہ سب تو چل رہی رہا تھا اس پر مستزاد چڑھائی شروع ہو گئی۔ جب جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی چڑھائی کا زاویہ بھی بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہماری جب سب سے زین سے ساتھ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے آگے لپٹی اوپر کو بڑھنے لگی۔ یہ انتہائی خطرناک صورت حال تھی۔ اس موقع پر جب کے ہوی ڈیوٹی انجن نے کسی دفادار سامنے کا کردار نبھایا۔ اگر خدا خواستہ جب کا انجن ہم سے خفا ہو کر چپ سادھ لیتا تو ہمارے لیے ایک بڑی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ خدا کا شکر کہ ہم بخیر وعافیت اس ڈھلوانی راستے کے عروج پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد چند گز تک ایک سطح میدان سا تھا۔ کچھ آگے جا کر وہ پتھر پلا راستہ پھر کمرائے امتحان کی صورت اختیار کر گیا۔ اب ہم ایک خطرناک ڈھلوان پر سفر

کر رہے تھے۔

چڑھائی کی بہ نسبت اترائی کا سفر زیادہ مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ چڑھائی میں صرف گاڑی کے انجن کا امتحان ہوتا ہے ڈرائیور کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جبکہ اترائی میں گاڑی کا انجن بہت ریلیکس ہوتا ہے اور ڈرائیور کو اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھنے کے لیے بہت پاپڑ بیٹنا پڑتے ہیں۔ ہر لمحے موت کے منہ میں جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

ڈھلوان پر آتے ہی راستے کا زاویہ بڑی تیزی سے نشیب کی سمت بڑھنے لگا۔ اس راہ پر جا جب جھونے پڑے پتھر بھی موجود تھے۔ ہماری جب کے طاقت ور ٹائر ان پتھروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے گویا اپنے ”پاؤں“ سے روندتے چلے جا رہے تھے۔ چڑھائی کی بہ نسبت اترائی کی یہ راہ اس لیے بھی زیادہ خطرناک تھی کہ اب اس کے دائیں بائیں چٹانوں کا وہ سلسلہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جو ایک طرف سے حفاظتی بندکام کر رہا تھا۔ اب اگر کسی پیری پتھر کے سبب ہماری جب اچھل کر بے قابو ہو جاتی تو اسے سنبھالنا مشکل ہوتا..... اور اس بات کے قوی امکانات موجود تھے کہ ہم جب سمیت ہزاروں فٹ کے تاریک نشیب میں کہیں کم ہو کر رہ جاتے۔

ہم بہ خیر وعافیت ڈھلوانی سفر طے کر کے عروج پر تو پہنچ گئے تھے مگر اب بھی میں ہم نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ ایک مصیبت منہ کھول کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ وہ مصیبت ایک بڑا سا بڑا پتھر تھا جو کسی چٹان کے مانند ہمارے راستے میں استادہ تھا۔ اس پتھر نے کچھ اس طور آگے بڑھنے کی راہ سدود کر رکھی تھی کہ اس کے دائیں بائیں بھٹکل تین تین فٹ کا راستہ بچا تھا۔ ہم اس پتھر سے کسی کاٹنے ہوئے جب کو دائیں یا بائیں سے آگے نہیں بڑھا سکتے تھے لہذا بریک لگانا لازم ٹھہرا۔ اس کے علاوہ ہر چارہ موت کا ہر کارہ تھا!

ڈاکٹر مونگ نے یہ آنکھیں بریک لگائے اور جب کو اس ظلمی پتھر کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا پھر گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ”ہمیں باہر نکل کر اس بد معاش پتھر کو اپنی راہ سے ہٹانا ہوگا ورنہ یہیں کھڑے رہیں اور ہماری جب سردی میں ٹھہر کر رہ جائے گی۔“ ”آ جاؤ۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا ”اس پتھر سے بھی مل لیتے ہیں۔“ بات ختم کرتے ہی وہ پھر عزم انداز میں ڈرائیونگ سائیڈ

والا دروازہ کھول کر جب سے نیچے کود گیا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں باہر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم آرام سے اندر بیٹھ کر تماشا دیکھو۔“

”یہ بات تو تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے واقعی کوئی جادو تماشا دکھانے والے ہو۔“ وہ چپک کر بولی۔

لی یان کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی اور اس کی یہ خاموشی بگ بگ پاس ڈاکٹر مونگ کے احترام میں تھی۔ وہ اس کی موجودگی میں بھٹکا اور باادب بالا کھڑ رہتی تھی۔ اب وہ جو اچانک بولی تو مجھے اس کی آواز کچھ زیادہ ہی چمکی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں معنی خیز انداز میں دیکھا اور کہا ”کسی جادو کے مظاہرے کے بغیر تو وہ جتنا ہی پتھر اپنی جگہ سے ہٹے گا نہیں۔ تو مجھے یہ دیکھنا پڑا کہ کیا کھیل تماشا ہوتا ہے۔“

وہ خالص امریکی لہجے میں بولی ”اوگا ڈا! اتنے سنسنی خیز اور ہم جو محظروں میں کیا جب کے اندر بیٹھ کر دیکھوں گی۔ نہیں.....“ اس نے بھائی انداز میں گردن کو خفی جنبش دی اور دلوں انگیز لہجے میں بولی ”میں بھی باہر آ رہی ہوں۔“

”اگر قطعی جمانے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے تو چلی آؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ کندھے جھٹکتے ہوئے بولی ”اگر قطعی جم گئی تو اسے ڈرائی فروٹ کی حرارت سے دوبارہ پگھلا لیں گے۔ ہمارے بیک میں رکھا ہوا وہ پچ باکس آخر کس مرض کی دوا ہے!“

میں لی یان کو اس کے حال پر چھوڑ کر جب سے باہر نکل آیا۔ وہ جب کے اندر رہنے یا باہر آنے کے لیے اپنی مرضی کی مالک تھی۔ ویسے ڈاکٹر کے جب چھوڑتے ہی اس کی جون بدل گئی تھی۔ اس کے شوخ مکالمات سے ظاہر ہوا کہ وہ اندر سے اتنی افسردہ اور غمزدہ نہیں تھی جتنی اوپر سے دکھائی دیتی تھی۔ اس کی خاموشی سنجیدگی اور ٹھہراؤ محض ڈاکٹر مونگ کی موجودگی کی وجہ سے تھا۔

میں نے جب سے باہر آ کر اس پتھر کی جانب ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ اپنے عقب میں ”دھپ“ کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ لی یان نے میرے نقش قدم پر پاؤں ڈال دیا تھا۔ میں خاموشی سے ڈاکٹر مونگ کی طرف بڑھ گیا جو اس چٹان نما پتھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ پھر اپنی ذات میں کسی چٹان سے کم نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کس طرح بچ رہا تھا پتھر بچ گیا تھا۔ اسے اٹھا کر وہاں رکھنا کسی

انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ منوں وزنی وہ دیوتا کا مت پتھر بالکل گول تو نہیں تھا تاہم اس کا قطر کسی بھی طور پانچ فٹ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ اونچائی بھی کم دیش اتنی ہی تھی۔ ایک بات طے تھی کہ اسے راہ سے ہٹانے بغیر اس کے بڑھنا ممکنات میں سے نہیں تھا یعنی جب سمیت!

ڈاکٹر ٹھونک بجا کر اس پتھر کا معائنہ کر چکا تو سوال یہ نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر! کیا خیال ہے اس پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا ”یہ اصلاً سلا ایک وزنی چٹانی پتھر ہے۔ اگر یہ فلوں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والا ہوا بھر کو لی راکر کولا ہوتا تو ہم ایک زوردار فٹ بال کک سے اسے دور گہرائی میں اچھال دیتے۔ میرا خیال ہے تمہارا کیس ہے۔“

”میرا کیس؟“ میں نے متحجب نظر سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ”یہ تو مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے کہ یہ فلمی شوٹنگ میں استعمال ہونے والا کوئی مصنوعی پتھر نہیں مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میرا کیس کیسے ہو گیا؟“

”تم نے شاید کینپل میں اچھا حادثہ گزرا ہے!“ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا اس کا اشارہ میری پوشیدہ قوت چمکی کی جانب تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”تم بھی تو اسی تربیت گاہ کے فارغ التحصیل ہو؟“ ”بھئی! میں تو اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اس پتھر کے سلسلے میں میری چمکی کی قوت کو آزماتا چاہتا تھا ورنہ نہ وہ بوڑھا ہوا تھا ورنہ ہی اس میں پراسرار قوتوں اور اعلیٰ صلاحیتوں کی کمی تھی۔ اسے بھی چمکی پر عبور حاصل تھا۔ فلائنگ فائٹ وہ چمکی کے مل بوتے پر کرتا تھا۔

میں نے اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کہا ”ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔“

وہ زبردست مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ لی یان تک نہیں پہنچی کیونکہ وہ ہمارے عقب میں چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ تاریکی اس کی نگاہ کا غارت ثابت ہو رہی تھی۔ ہماری جب اسی پتھر کے سہارے کھڑی تھی۔ اگر پتھر کو ہٹا دیا جاتا تو اس خطرناک ڈھلوان پر جب دوڑ لگانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتی اور ہم اپنے دشمن کے اس سر طے میں جب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ان فور نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے کہا ”ڈاکٹر! پتھر کو ہٹانے سے پہلے ہمیں جیپ کو اس کے قدموں پر روک رکھنے کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔“  
”ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی ”میں یہ بندوبست ابھی کر دیتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ کسی شے کی تلاش میں تھوڑا نشیب میں اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مناسب سائز کے چار چھوٹے پتھر وہاں جمع کر چکا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے وہ پتھر جیپ کے چاروں پہیوں کے آگے لگ کر روک پیدا کر دی اور ہاتھ جھڑتے ہوئے بولا۔

”میں نے اس جیپ کو باندھ کر قدموں پر کھڑا کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ اب کہیں نہیں جائے گی۔ تم اپنا کام شروع کر دو۔“

بات ختم کرتے ہی وہ جیپ کی طرف مڑا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ مجھے امید تھی اس نے بڑیک پیڈل کو بھی دبا رکھا ہوگا اور پیڈل بڑیک کے استعمال سے بھی غافل نہیں ہوگا۔ جیپ کو روک رکھنے کے لیے تین مختلف محاذوں سے کوشش کی جا رہی تھی حالانکہ اس مقصد کے لیے ایک کوشش بھی کافی ہوتی مگر ہم جن سنگین ترین حالات سے گزر رہے تھے ان میں حتی الامکان احتیاط کی ضرورت تھی۔

میں اس جیم چٹائی پتھر سے لگ بھگ ایک فٹ کے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا چہرہ ہزاروں فٹ گہرے نشیب کی طرف تھا جو مجھ سے محض آٹھ فٹ کی دوری پر واقع تھا۔ پانچ فٹ قطر کا وہ پتھر آدے مڑے تین فٹ خالی جگہ۔

چی کا استعمال کرتے ہوئے اس پتھر کو کھسکا کر میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اسے کھسکانے سے ہمارا مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ میں اگر اسے سر کا کر کنارے تک پہنچا دیتا یا کنارے سے تھوڑا آگے بھی جھکا دیتا تو بھی ہماری جیپ کو آگے بڑھنے کے لیے جتنی گنجائش کی ضرورت تھی وہ پیدا نہ ہو پاتی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی تھا کہ میں اپنی جلی قوت کو بروئے کار لا کر اس پتھر کو گہرے نشیب میں لٹھا دیتا۔

میں نے خود کو تیار کرنے کے لیے ایک منٹ تک پرانا یام (PRANAYAM) کی مشق کی۔ خوب ڈوب کر ہواوار .... گہری گہری سانس لیں۔ اس مخصوص انداز کی بڑیک (BREATHING) سے دماغ اور روح کو تازگی ملی تو میں پوری طرح اس پتھر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سب سے پہلے میں ہارس پوزیشن میں آیا۔ مارشل آئرس میں اس پوزیشن کو بنیادی انسان کی حیثیت حاصل ہے۔ گھٹنے ایک خاص زاویے پر جھک جانے کے باعث میں پتھر کے قد

کا ہو گیا۔ میں نے دلوں ہاتھوں کو آگے پھیلا کر دیکھا۔ میرے اور پتھر کے درمیان محض ایک فٹ کا فاصلہ حاصل تھا۔ میرے ہاتھوں کی پھلیوں نے اس چٹائی پتھر کو بڑے بھرپور پوسے دیے۔ دلوں ہاتھ پوری طرح پھیلائے کے لیے مجھے کم از کم دو فٹ جگہ درکار تھی جو یہاں میسر نہیں تھی اور یہی اس ٹیکنیک کا کامیابی کی ضرورت تھی۔ اس پتھر پر ایک بھر پور پیش اسی پوزیشن میں کھڑے ہو کر لگا جا سکتا تھا۔

ہاتھوں کی حرکات اور پتھر کی وقوع پذیری کو ذہن میں نقش کرنے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے میں تصور کی نگاہ سے .... اس پتھر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک متوازن سانس کھینچ کر اپنے پیچھڑوں کو بھرا پتھر اس سانس کو ایک مخصوص اسٹروک سے نیچے کی جانب مقام چی کی طرف منتقل کر دیا۔ چی کی مخصوص جگہ ناف کے پیچھے بڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کے قریب واقع ہے۔ اس عمل کو تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ”چی“ کے طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ جائیں!

طاقتور سانس نے ہلک جھپٹے میں چی کو متحرک کر دیا۔ مجھے اپنے اندر توانائی کا ایک سمندر ٹھانیں مارتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک پھونک مار کر پہاڑ کو بھی ہوا میں اڑا سکتا ہوں۔ یہ طاقت اور تصرف کا ایک علاقائی احساس تھا۔ سادہ الفاظ میں اس وقت میں اپنے وجود میں بے پناہ قوت اور توانائی کو محسوس کر رہا تھا۔ پیٹ کے زیریں حصے میں طاقت کا طوفان بجل رہا تھا۔

چی کے متحرک ہوتے ہی میں نے اپنی سانس کو داہیں پیچھڑوں کی طرف بلایا اور اسٹروک بڑیک (STROKE BREATHING) کی ٹیکنیک کا استعمال کرتے ہوئے دلوں ہاتھوں کو ایک جھپٹے سے پتھر کی جانب بڑھایا۔ میری کھلی پھلیوں کے قیامت خیز پیش نے پتھر کے ”قدم“ اکھاڑ دیے۔ سانس خارج کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں کو جو بھی حرکت دی جائے اس میں بے حد حساب توانائی موجود ہوتی ہے۔ میرے پیش میں ہزاروں نیوٹن قوت بھری ہوئی تھی۔

پتھر کے اپنی جگہ سے ہٹنے ہی مخصوص آواز پیدا ہوئی۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ ثبوت ملتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ رکاوٹی پتھر تیزی سے لڑھکتے ہوئے نشیب کی طرف جارہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی جہازی ساز دبانہ رکھنے والی توپ میں بھر کر داغا گیا ہو .... یا پھر اس کا یہ لڑھاؤ

کسی طاقت ورنہ خلیق کا کارنامہ ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتھر پل بھر میں تاریک گہرائی میں اتر گیا۔ نشیب کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں سے اس کے ٹکراؤ کی مخصوص ہیئت ناک آواز کچھ دیر تک ابھرتی رہی پھر ماحول کا سناٹا واپس لوٹ آیا۔

میں واپسی کے لیے پلانا تو اپنے عقب میں لی یان کو کھڑے پایا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی ترچھے زاویے سے اس کے چہرے پر شکس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ششدر کھڑے پایا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک تک اندھیرے میں اس سمت دیکھ رہی تھی جہاں تاریک نشیب واقع تھا۔

پتھر لڑھکے کے منظر نے اسے ساکت و مہموت کر دیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لچے میں اسے پکارا "لی یان.....!" وہ دس سے سس نہ ہوئی۔

میں نے قدرے بلند آواز میں اس کا نام دہرایا "لی یان!"

اس کے باوجود بھی لی یان کے وجود میں جنش پیدا نہ ہوئی تو میں نے آگے بڑھ کر اسے کندھے سے پکڑ کر بھنجوڑ ڈالا "لی یان! ابوش میں آؤ۔"

اس نے گردن کو حرکت دے کر اپنے سکتے میں نہ ہونے کا یقین دلایا اور حوش نظر سے میرے چہرے کو کتنے لگی۔ میں جانتا تھا اس کی حیرت اور جب کا سبب میں اور وہ پتھر تھا۔ پتھر کو وہ اندھے نشیب میں غائب ہوتے دیکھ چکی تھی اور میں اس کی نگاہ کے سامنے موجود تھا۔ یہ نگارہ اس کی زندگی کے ناقابل فراموش مشاہدے میں ایک گراں قدر اضافہ تھا۔

اس کی تمام تر سوایل نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اس کا شانہ چھپا کر اور پیکار نے والے لچے میں کہا "پہاں کچھ دیر اور کھڑی رہو تو سوری سے جہم ک برف بن جاؤ گی۔ گاڑی کے اندر جا کر بیٹھو۔ چلا شاہ۔"

اس نے کوئی سوال نہ کیا اور پتھر حوش نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے جب کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ڈاکٹر موگ جی اور اس کے کرشمات سے یہ خوبی آگاہی رکھتا تھا۔ میرا اس بھاری پتھر کو اندھیرے میں دھکیلتا اس کے لیے ایک شعبہ تھا لیکن اس حیرت ناک منظر نے لی یان کی شئی کم کر دی تھی۔

میں نے یہ آواز بلند ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر موگ! تم جب کے بریکس کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ میں اس کے "پاؤں" کی "بندشیں" کھول رہا ہوں۔"

پھر میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ جیب کے چاروں پہیوں کے آگے رکھے ہوئے رکاوٹی پتھروں کو ہٹا دیا اور جیب کے اندر آ کر لی یان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے جیب کا انجن اس دوران میں بیدار رکھا تھا۔ انگلی ہی لمبے ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

چند لمحات تک جیب کے اندر موت جیسا سناٹا طاری رہا پھر لی یان کی سرسرائی آواز نے اس خاموشی میں نقب لگائی۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ سر اسمد لچے میں بولی۔

"وجدان! میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟"  
"نہیں۔" میں قطعیت سے بولا "تمہاری آنکھوں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ ایک کھلی حقیقت ہے اور یہ حقیقت اب پیچھے رہ گئی ہے۔ تم اس منظر کے ٹرائس سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ پچھان خیز لچے میں بولی۔  
"بعض چیزیں ناقابل یقین ہوتی ہیں۔" میں نے

گہری سنجیدگی سے کہا "خاص طور پر وہ جن سے زندگی میں پہلی مرتبہ واسطہ پڑتا ہے۔ ایسا واسطہ انسان کے ذہن کو ابھما کر رکھ دیتا ہے۔ غریب بھی اسی لیے انجمن محسوس کر رہی ہو لیکن فکر نہ کرو۔" میں نے تھوڑا تو توقف کیا پھر گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں نظر آنے والی وحشت اور سر اسمدی اب کافی حد تک زائل ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ پر تجسس اور حیرانی نے قبضہ جمایا تھا۔ میں نے اس کی کسلی کی خاطر مزید کہا۔

"رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا لی یان! اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔ لی ری ٹیکس پلیر!"

وہ اپنے ہاتھوں کے مخصوص نسوانی گداز کو، گھٹنوں پر رکھے میرے ہاتھوں میں اتارنے لگی یہ اس کی مخرطی انگلیوں کی اضطرابی جنبشوں میں خاموش تجسس پہنا ہوا تھا۔ وہ انگلیاں میرے ہاتھوں پر سرسراتے ہوئے اس راز سے آگاہی کی خواہاں تھیں جس کا مظاہرہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اس ٹھنڈی غمراہ راہ گزر پر کیا تھا۔ میں نے لی یان کی حتمائی انگلیوں کی جستجو کے راستے میں دیوار بننے کی کوشش نہیں کی اور اس مرمز میں لمس سے آشنائی لیتا رہا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں ایک ہی جملے کی تکرار کرتی جا رہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! آئی ڈونٹ بیلو۔"  
ڈاکٹر نے کھٹاکر لی یان کو مخاطب کیا تو اس نے اپنے ہاتھ بڑی سرعت سے سمیٹ کر گود میں رکھ لیے اور پوری

طرح اپنے جگہ باس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

ڈاکٹر موگ نے نہایت ہی مختصر اور آسان انداز میں اسے پراسرار قوت "جی" کے بارے میں بتایا پھر وہ اسے اس قوت سے لیے جانے والے مختلف کاموں کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

"وجدان نے ایک طویل عرصہ شاولن ٹیپل ایسی عظیم المرتبت مارشل آرٹس کی تربیت گاہ میں ٹریننگ حاصل کی ہے۔ شاولن ٹیپل میں زیر تربیت افراد میں سے چندہ کو "جی" کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے وجدان بہت خوش قسمت ثابت ہوا ہے کہ شاولن ٹیپل میں اسے جید اساتذہ کی توجہ اور قرب حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی جی کی قوت کو بیدار کر لیا ہے۔ اس قوت کی مدد سے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں۔" جی "در اصل چینی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں پراسرار عقلی قوت۔ اس قوت کا پورا نام جی گوگ (GI GONG) ہے۔"

"کیا میں بھی اپنے وجود میں جی کی قوت کو بیدار کر سکتی ہوں؟" وہ ایک ایسے معصوم بچے کے مانند چل کر بولی جو دنوہ سرست سے کہہ رہا ہو۔ "میں بھی جی کا ڈاکٹر ہوں گا!"

در اصل جی کا موضوع ہی بہت پریشانی اور دلچسپ تھا۔ جو بھی اس کا ذکر سنتا اس کے حصول کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس میں بے چاری لی یان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ "کیوں نہیں! ڈاکٹر موگ نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "جس انسان کے اندر جی لگن ہو وہ محنت سے نہیں گھبراتا اور تم نے یہ تو سن رکھا ہوگا محنت بھی ضائع نہیں جاتی۔"

اس کے بعد بھی ڈاکٹر کچھ دیر تک لی یان کو جی اور اسکی بیداری کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا رہا۔ ان کی گفتگو میں ذرا سا وقفہ آیا تو میں نے ڈاکٹر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

"ڈاکٹر موگ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ بیماری پھر کس نے اور کس مقصد سے بچا ہوا میں ڈال دیا تھا؟"

"میں نے بھی اس بارے میں بڑا غور کیا ہے۔" وہ دیرانداز انداز میں بولا "اور ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی ہے اور وہ یہ کہ..... یہ بندروں کی کارستانی ہے۔"  
"بندروں کی کارستانی؟" میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

وہ ہونٹ سیٹھ کر بولا "اس میں اتنا حیران ہونے کا کیا

سبب ہے؟"

"تم بھی کمال کرتے ہو ڈاکٹر!" میں نے بے یقینی سے کہا "اس پتھر کو راستے میں کھڑا کرنے میں بھلا بندروں کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

لی یان نے کہا "کیا بندروں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ منوں وزنی پتھر سے انگیلیاں کر سکیں؟" اس کے سوال سے انجمن عیاں ہو گئی۔

ڈاکٹر موگ نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں باری باری ہماری طرف دیکھا اور بولا "بندروں کا بڑا فائدہ ہے وجدان۔ اس پہاڑی سلسلے کی اکثر چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اس موسم میں بندروں کے لیے سب سے اہم ترین مسئلہ خوراک کا ہوتا ہے۔ وہ راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی کر کے آنے جانے والوں کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے ان پر باجماعت حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ حملہ اسر مصنوعی ہوتا ہے لیکن کوئی مسافر بندروں کے ذہن کو نہیں پڑھ سکتا۔ اس سلسلے میں تجربہ ہی کام آتا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ اکثر مسافروں کے پاس نہ ایسا تجربہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بندروں کی مخصوص نفسیات سے واقف ہوتے ہیں اس لیے مارکھا جاتے ہیں۔"

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر معلومات کے دریا کو مزید بہاتے ہوئے بولا "بے چارے مسافر اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد پر خوف زدہ ہو کر اپنی سواری اور سواری میں موجود سامان کو بھجوز کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح بندروں کو سامان خور دلوش پر ہاتھ صاف کرنے کا بھرپور موقع مل جاتا ہے۔ بعد میں جب دور کھڑے مسافر ان کی چالاکی اور بد معاشی کو سمجھ کر غصے کا اظہار کرتے ہیں تو یہ شکم سیر بندر "کھی کھی" ہنستے ہوئے اچھلتے کودتے، تلاپھیں بھرتے پہاڑوں میں کم ہو جاتے ہیں۔ ایسی کارروائیاں بندر عموماً دن کی روشنی میں کرتے ہیں۔ رات کو وہ بڑے آرام کی نیند سوتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے بندروں نے اپنے شکار کو پھانسنے کے لیے پتھر کا وہ "پھندا" دن میں کی دقت لگایا تھا۔" میں نے ڈاکٹر کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا "اور ظاہر ہے یہ "پھندا" ہمارے لیے نہیں تھا۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لچے میں بولا "تمہاری بات ٹھیک ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے یہ رکاوٹ انہوں نے آج نہ کھڑی کی ہو بلکہ اس پتھر کو راہ میں حائل ہونے کی روز پائی

ماہ گزر گئے ہوں!“

میں نے اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے کہا ”ہاں بھئی“ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بظہرے بندر۔ ان سے کیا بعید ہے!“ ڈاکٹر مونگ نے لی پان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تم نے تھوڑی دیر پہلے بندروں کی طاقت کے حوالے سے ایک سوال کیا تھا تو سن لو اس ذہن جانور میں وجدان کی طرح ”چی“ کی قوت تو موجود نہیں ہوئی البتہ یہ ”چو“ سے مالا مال ہوتے ہیں۔ میں خاص طور پر پہاڑی بندروں کی بات کر رہا ہوں۔“

”چو؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

وہ وضاحت میں ہم دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”چو..... جو دراصل پہاڑوں سے نکلنے والا ایک مخصوص سیال ہے جو سیاحی مائل سمورے رنگ کا ہوتا ہے۔ جب یہ سیال پہاڑوں کے اندر سے خارج ہوتا ہے تو اس کی شکل مائع کیسی ہوتی ہے بعد میں یہ سوکھ کر سخت ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں میں آباد بندر چو نامی اس سخت شے کو گاہے بگاہے چانتے رہتے ہیں جس کے سبب چو کی طاقت ان کے معدوں میں کچھ کر جڑو بدن بنی رہتی ہے۔ اسی لیے جنگلی بندر کی یہ نسبت پہاڑی بندر زیادہ جفاکش اور طاقتور ہوتا ہے۔ چو کی قوت اسے بہادر بنا دیتی ہے۔“

ڈاکٹر مونگ نے انہیں کس ”چو“ کی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا چو کی کوئی ارضی حقیقت بھی سی یا ڈاکٹر وقت گزاری کے لیے ایک دلچسپ قصہ لے بیٹھا تھا لیکن اس وقت میرا دماغ حتمی طور سے ہزاروں میل دور پاکستان کے پہاڑی قبائلی علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ وہاں گلگت چیلاس اور چترال وغیرہ کے پہاڑوں سے بھی ایسی ہی ایک طاقتور شے برآمد ہوتی تھی جسے عرف عام میں ”سلاجیت“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بندروں والی کہانی سلاجیت سے بھی منسوب ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ سلاجیت بڑھاپے کے بہتر امراض کا علاج ہے!

لی پان بار بار عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جی کے مظاہرے کے بعد سے میرے لیے اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی متاثر کن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ کی موجودگی کا لحاظ تھا ورنہ وہ فرط جذبات میں جانے کیا کر بیٹھتی۔ بہر حال وہ پھر بھی یہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

”وجدان! تم گریٹ ہو۔ میں تمہارے یہ ہاتھ چومنا چاہتی ہوں جن سے تم نے وہ کا نامہ انجام دیا ہے۔ تم بہت مختلف اور عام انسانوں سے برتر ہو!“

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اپنا خلیفہ اور تمام کائناتی مخلوقات کا سردار قرار دیا ہے لیکن چنانچہ انسان انسان کو انسان کیوں نہیں رہنے دیتا۔ کبھی یہ اس کے مقام سے گرا کر جانوروں سے بھی بدتر رہے پر لے جاتا ہے اور کبھی ایسا بانس پر چڑھتا ہے کہ اللہ معاف کرے.....! لی پان کی فرمائش کو ڈاکٹر مونگ کی تائید نہ کر سکا۔ فحاش حاصل ہوئی تو مجھے ان دونوں کے سامنے سہرا ڈالنا پڑی۔ لی پان اپنی خواہش پوری کر چکی تو میں نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے اور کہا۔

”تم دونوں باتیں کرو۔ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آرام کرنے کے لیے آنکھیں بند کرنا لازمی نہیں تھا۔ یہ احتیاط میں نے اسے لیے برتی تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھے مخاطب نہ کرے۔ اگلے عرصے میں میں اسے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ حالات جن کی گتینی بل بل بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

یہ سچ ہے کہ اس وقت ہم ایک اہم مشن پر جا رہے تھے۔ ربی کی بھیجی ہوئی ٹیم ہم نیکل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھی۔ اقتدار اور اختیار کی اندھی ہوس نے ربی کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ ضرورت ان پانچ نایاب پتھروں تک پہنچنا چاہتا تھا جن کی ایک روحانی حیثیت مسلم تھی۔

غیر معمولی ساخت اور سائز کے حامل وہ پانچ حاکم پتھر ڈاکٹرنڈ (بہرا) امیرالذ (زمر) رولی (باتوت) سیفاز (نیکم) اور ٹوپاز (بکھراج) جس کسی کے بھی ہتھے چڑھ جائے اسے ایک خاص قسم کی روحانی قوت اور تصرف حاصل ہو جاتا..... اور ہمیں ان قیمتی پتھروں کو چوری ہونے سے بچانا تھا۔

اگر معاملہ صرف ان پتھروں کی حفاظت تک محدود ہوتا تو میں کبھی بھی اس عبادت گاہ کا ہمنند و کارخ نہ کرتا۔ مجھے ایسے خزانوں سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر میں لاٹچی فطرت کا مالک ہوتا تو اس دور کا دلی لاٹا بھی مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار نہ کرتا۔ جس بدھ بکاشو کو میں انیسویں صدی کے توسط سے کچھ عرصہ پہلے اس عبادت گاہ میں چھوڑ گیا تھا اس نے ایک آزمائش کی خاطر مجھے بڑی پرکشش پیش کش کی تھی۔ جب میں اس سے رخصت ہو رہا تھا تو اس نے کہا تھا۔ اس وقت ہم عبادت گاہ کے خفیہ تہ خانے میں تھے۔



”دلائی لاما نے اجازت دی ہے کہ تم یہاں سے جتنا سونا چاہو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔“

اور میں نے نہایت ہی غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا تھا ”اگر مجھے سونا لے جانا ہوتا تو مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ میرے اختیار میں تھا۔“

میں تو اپنی جان تنہا کی تلاش میں درد کی خاک جھانچے ہوئے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اگر ساحل اس دیس میں نہ پہنچائی گئی ہوتی تو میں بھول کر بھی ادھر کارخ نہ کرتا۔ ساحل کی یاد نے میرے سینے کے جلتے ہوئے زخموں کو ہوا دی۔ میں جسم و جاں سے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ ربی موٹے ہاتھوں نے ساحل کو چپتا ٹوم اور جانے کون کون سے ازم سے گزار کر میری رسائی سے بہت دور کر دیا تھا۔ میں باطنی آنکھ رکھتے ہوئے بھی اسے اپنی دسترس میں نہیں لایا ہوا تھا۔ خرد آئی کی راہ میں ایسی نادیہ رکاوٹ کبھی ہوئی تھی کہ اس طرف پرواز کا سوچتے ہی میرے تصور کا پھیر و چاروں خانے جٹ ہو جاتا۔ تیسری آنکھ پھر اکر بند ہو جاتی اور میں ناکامی... کی ایک اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا!

مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں ہمت ہار بیٹھتا اور کوشش ترک کر دیتا۔ یہ تو اس حقیقت کی نفی ہوتی کہ ہمت مردانہ دھندل! میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر اس ذات باری کی رحمت مدد اور عنایت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے ساحل کا تصور کیا اور تیسری آنکھ کے توسط سے اس کے ماحول میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ساحل کے خال و خط کو یاد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کا سراپا میری سوچ میں کندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ یوں کر میری نس نس میں دوڑ رہی تھی اور مجھے اپنے پیچھے دوڑا رہی تھی..... جسائی اور خیالی دونوں طور پر!

اس کوشش میں تین بار ناکامیابی کے بعد میں نے برجوں کی ملکہ نیلگری کا رخ کیا کہ شاید ساحل کے سلسلے میں ٹوکی اور اشارہ مل جائے لیکن وہ بھی میرے قابو میں نہ آسکی۔ اگلی ٹرائی میں نے اپنے ذہن خاص ربی موٹے ہاتھوں پر ماری۔ یہ سارا کھٹ راگ اس شاطر کا پھیلا ہوا تھا۔ میں اس کو اور اس کے ماحول کو اپنے دام میں نہ لاسکا۔ میں نے تصور میں ربی پر اندازت کیجانی اور آنکھیں کھول دیں۔

جب کی رفتار بہت دھیمی ہو چکی تھی۔ میں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں ڈاکٹر موگ نے جب کو ایک سایہ میں روک دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو جیپ کو روکنے کا سبب سامنے آگیا۔ اس دوران میں وہ موبائل فون کو جب

سے نکال کر کان سے پیوست کر چکا تھا۔

ڈاکٹر موگ جاری رکھتے ہوئے فون اینڈ کیا جا سکتا تھا لیکن اس خطرناک پہاڑی راستے پر ڈاکٹر نے ایسا کوئی ریسک لینا مناسب نہ سمجھا جس کے نتائج کو ہم اس وقت انفرڈ نہیں کر سکتے تھے۔ فون پر بات کرتے ہوئے اس کی آواز کبھی میرا نہیں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ بھاری گونج دار آواز میں محض ”ہوں ہاں ٹھیک ہے اے اے کے رات۔“ وغیرہ پر اکتفا کرتا رہا۔

ڈاکٹر کے پراسرار انداز نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میرے اندر سے کسی نے جج کر کہا ”کوئی بڑی گڑبڑ واقع ہو چکی ہے۔ کیا؟ اس کے بارے میں تو ڈاکٹر موگ ہی بتا سکتا تھا۔ میں اس کے فارغ ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

اس نے سیلور ٹنگٹو ختم کرتے ہوئے موبائل کو جب میں رکھا اور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر نارتے ہوئے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

”کیا ہوا ڈاکٹر؟“ میں نے اظہاری لہجے میں پوچھا۔

”دیکھ چک! اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اس مختصر کوئی نے میری تشویش میں اضافہ کر دیا۔ میں نے پوچھا ”وہاں امریکا میں خبر توتو ہے نا؟“

دھبک دھبک کے ذکر پر لی بان بھی پوری طرح ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس نے استفسار کیا ”محترم! آپ کی خاموشی کی بہت بڑے طوفان کا پتا دے رہی ہے!“

”ہاں ایسی ہی بات ہے۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ڈاکٹر کا ہم انداز مجھے بری طرح الجھا رہا تھا۔ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا ”ڈاکٹر بلبل! صاف صاف بتاؤ وہاں کی کیا صورت حال ہے؟“

”اے اے!“ اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور ہمیں دھبک سے ہونے والی ٹنگٹو سے آگاہ کر دیا۔

ڈاکٹر کے مطابق وہ دھبک دھبک نے انتہائی ابھرنے میں وہ کال کی تھی۔ ادھر نیویارک اور نیوجرسی میں بازی پلٹ گئی تھی۔ ایف بی آئی اور این وائے ٹی ڈی والے شون کا سراغ لگانے اور اسے حراست میں لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دہم بھی ان کے پیچھے چڑھ گیا تھا۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر شون اور دہم کو کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل ہونا پڑا تھا مگر امریکی خفیہ ادارہ ظاہرہ ایجنسز نے سرگرمی دکھا کر انہیں ڈھونڈ نکالا تھا۔

انٹیر ویشنیل سیل میں جب ان سے پوچھ بچھ کی گئی تو وہ

آئیں ہائیں شائیں کرنے لگے۔ ربی موٹے ہاتھوں امریکا کے حساس ترین اداروں کی مدد سے مجھے اور ویم کو تلاش کر دیا ہوا تھا اور ان کی تلاش کا محور امریکا کی دور یا سٹیں نیویارک اور نیوجرسی بنی ہوئی تھیں۔ ذہنی دہم ان کے ہتھے چڑھا تو وہ اس سے میرے بارے میں پوچھنے لگے۔ اس نے جب میری خاطر زبان نہ کھولی تو ان خالوں نے تندہ کی انتہا کر کے اسے زندگی کے ہر دکھ سے آزاد کر دیا۔ ویم کو میری دوستی کی سزا دی گئی تھی۔۔۔۔۔ میرا دل بھرا آیا۔

شون پر بھی کڑی تفتیش کی گئی۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ میں نے اور دہم نے شون کے اپارٹمنٹ پر وقت گزارا تھا۔ شون اور اس کی بیوی لی یان نے ہمیں پناہ دی تھی۔ شون حتی الامکان ان کے سوالات کے سامنے ڈٹا رہا لیکن جب اس کی بیوی کے غیاب کے بارے میں استفسار کیا گیا تو مکمل بھڑ گیا۔ اس نے ایف بی آئی والوں کو بتایا کہ لی یان چند روز کے لیے سیلف نو فرما گئی ہے۔ اس کے بیان پر ایک جھپٹے میں متعلقہ فلائٹ کی ایگزٹ کنٹرول لسٹ چیک کی گئی تو وہ جھوٹا ثابت ہوا۔ اس پر سختی رد کر کے ہوئے ان ایک دونوں میں نیوجرسی اسٹیٹ کے ”نیو آرک“ انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے روانہ ہونے والی تمام فلائٹس کی ای سی ایل (ایگزٹ کنٹرول لسٹ) چیک کی گئیں تو شون کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ ایف بی آئی والے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ نیویارک ایئر پورٹ سے شون اور اس کی بیوی لی یان نے کھنڈو کے لیے پرواز کی تھی۔

جب کسی معاملے کا ایک سرا ایف بی آئی والوں کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کے آخری سرے تک پہنچنے میں تاخیر سے کام نہیں لیتے۔ نیو آرک ایئر پورٹ سے اپنی بیوی کے ساتھ کھنڈو روانہ ہونے والا شون نے فٹس نہیں ان کے سامنے موجود تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا شون کی آئی ڈی پر لی یان کے ساتھ کوئی اور امریکا سے باہر نکل گیا تھا۔ دہم کا شون کے ساتھ پایا جانا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ لی یان کے ساتھ میں امریکا سے ”فرار“ ہوا تھا۔ ایک میں ہی منظر پر نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایف بی آئی والوں کے اس وٹو کو اس وقت تعویذ مل گئی جب انہیں شون کے لیکن پارک والے اپارٹمنٹ سے میرے فرار کی مصدقہ اطلاع موصول ہوئی۔ ایف بی آئی کے دو ایجنٹ اس اپارٹمنٹ میں دھڑا دیے بیٹھے تھے کہ پاکستان سے مصدقہ قانون آگیا۔ وہ مجھ سے کسی ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسی اپارٹمنٹ کے فون سے مصدقہ

آتش فشاں 143 حصہ 12

کو عید مبارک دی تھی۔ ایف بی آئی کے ایجنٹس نے بڑے فریب سے خود کو میرے سامنے ظاہر کرتے ہوئے مصدقہ سے یہ انگولیا کہ میں نے اس سے کہا تھا ”میں نیوجرسی سے کھنڈو پہنچنے والا ہوں۔ ازاں بعد واشٹن ایوینو والے اسٹوڈیو سے شون کے دونوں ملازمین کو بھی شامل تفتیش کر لیا گیا۔ ان کے مطابق شون اور لی یان دو تین دن کے لیے کیلے فورنیا گئے ہوئے تھے۔ شون کا جھوٹ پر جھوٹ کھٹا چلا گیا۔ کڑی سے کڑی مل کر میرے فرار کی زنجیر مکمل ہو گئی۔ ربی موٹے ہاتھوں اور ایف بی آئی والے اتنے بدھو نہیں تھے کہ صورتِ حالات کو سمجھنے کے لیے انہیں باؤ بیٹا پڑے۔

مستر ہنگ نے مختصر الفاظ میں ڈاکٹر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا اور جواب میں ڈاکٹر کبھی انداز میں ”ہوں ہاں“ کرتا رہا تھا۔ دھبک دھبک کی فراہم کردہ تشویش ناک اطلاعات کو ڈاکٹر موگ نے پھیلا کر ہمارے سامنے پیش کیا تو حالات کی سنگینی ہم پر واضح ہوئی۔

دہم کی کڑی تشدد و موت کا مجھے گہرا صدمہ پہنچا۔ اسے پیش آنے والے حالات نے مجھے شانے میں پہنچا دیا تھا۔ اسی شانے میں لی یان کی لرزت ہوئی تشویش بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ڈاکٹر موگ سے پوچھ رہی تھی۔

”محترم! ایف بی آئی والوں نے شون کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

ڈاکٹر نے ایک افسردہ سانس چھوڑی اور افسوس ناک لہجے میں بولا ”شون کو جب انٹیر ویشنیل سیل سے لاک اپ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اسے ہم جوئی کی سوجھی۔ ہتھ کڑی کے باوجود بھی اس نے ایک گارڈ کے ہولسٹر سے اس کا سر دس رہا اور اچک لیا اور خود کو فرار کے قابل بنانے کے لیے اس نے بے درخ فائرنگ شروع کر دی۔ گارڈ کو جوابی فائرنگ پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ اسے زخمی کر کے فرار سے روکنا چاہتے تھے لیکن بھام دوڑ میں وہ ذہنی کرنے والی حد تک تھک دھند رہ سکے۔ دو گارڈز شون کی فائرنگ سے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور جواب میں شون.....؟“

ڈاکٹر نے جملہ ادھر اور چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی خاموشی میں ناجی رنگ غالب تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ شون ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لیے گم ہو چکا تھا۔ میرا دل وسم کی موت کا سن کر پہلے ہی بہت بوجھل تھا۔ شون کی ”رحمتی“ نے اس کو بھروسہ میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ میں نے افسوس ناک انداز میں سر جھٹکتے ہوئے گردن جھکا لی۔ میرے اور موٹے ہاتھوں کے درمیان دشمنی اور انتقام کی جو

آتش فشاں 143 حصہ 12

آگ روشن تھی اس نے دہم اور شون کو بھی نگل لیا تھا۔ میرا دل و دماغ رلی کی طرف سے شدید نفرت سے لبریز ہو گیا۔ میں اس کے "احسانات" کے بوجھ تلے پوری طرح دب کر رہ گیا۔ یہ اس کا مجھ پر قرض تھا جسے چکانا اور سود و سود چکانا میرا قرض تھا!

شون کی موت کی خبر نے لی یان کو بے حد افسردہ اور طولی کر دیا۔ بس، اس کے آنسو ہی نہیں نکلے ورنہ وہ اس شدید غم کی لپیٹ میں دکھائی دیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کس طرح لی یان سے تعزیت کروں۔ شون نے لی یان کو اپنی امانت کہہ کر میری حفاظت میں دیا تھا۔ میں نے اس امانت کو محکمہ تحفظ دیا تھا۔ میں لی یان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ آج وہ بھی اس کا خیال رکھوں۔ شون کو اداس لانا میرے بس میں نہیں تھا!

لی یان کی خاموشی کو توڑنے کے لیے ڈاکٹر مونگ اس سے تسلی بخشی کہ باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بھی میں اس مرہم کاری میں شامل ہو گیا۔ چندہ بیس منٹ تک ہم دونوں مل کر لی یان کے دکھ کو ہانپنے کی کوشش کرتے رہے اور ہمیں اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ لی یان نے حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے بڑی حد تک خود کو سنبھال لیا۔

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا "دنک ہنگ کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟"

"دور پوش ہے۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے کہا "وہاں مین پٹین کے چائنا ڈون میں مسٹر ہنگ کا فوٹو اسنوڈیو اور ہائٹس گاہ واقع ہے اس دن وائے لی ڈی (نیو یارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) اور ایف آئی ڈی والے اس کی جان نہیں چھوڑیں گے وہ کب تک دور پوش رہے گا؟"

"جب تک لاڈ بھاگنا منظور ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

میں سمجھ گیا وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف پانچ منٹ اور۔"

میں نے اپنی رستہ داغ پر نگاہ ڈالی۔ رات، یعنی صبح کے تین بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے محض پانچ منٹ کی مہلت مانگی تھی۔ اس کا مطلب تھا "وہ تین بج کر بیس منٹ تک وہاں رکنا چاہتا تھا۔ بتائیں اس ٹھہراؤ میں کیا حکمت پوشیدہ تھی! میں سردست ڈاکٹر سے کوئی سوال

کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ اس نے میرے آخری سوال کا جواب دینے کے بعد آنکھیں بند کر لی تھیں یوں محسوس ہو رہا تھا "وہ دھیان گیان میں مصروف ہو گیا ہو! اس کی یہ ادا اسرار در رموز سے لبریز تھی۔ خدا جانے وہ کہاں مصروف ہو گیا تھا!"

میرے پاس سوائے صبر اور انتظار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب ڈاکٹر مونگ نے بیوی ڈیوٹی جیپ آگے بڑھائی تو میں پوچھے "باندہ رہا۔" ڈاکٹر! تم نے کس مقصد کی خاطر وہ پانچ منٹ لیے تھے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو میرے مجلس کی تسکین کے لیے بتا دو۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے غصے لہجے میں بولا "کائنات کے گوشے گوشے میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم جس دنیا کے باسی ہیں وہاں کے چپے چپے پر تین بج کر بیس منٹ اور بیس منٹ سینکڑوں سالے وقت کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ اس لمحے کا سبک ریز (کائناتی شعاعیں) براہ راست اس دنیا کے ہر خطے پر مرکوز ہوتی ہیں کاسمک ریز کی موجودگی میں اگر کوئی روحانی مشق یا دھیان گیان کیا جائے تو اس کے نتائج زیادہ نمایاں اور فوائد بے حد حساب حاصل ہوتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"بس بھی کسی ایسی "نادروٹا باب" لمحے کو حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔"

ڈاکٹر مونگ اپنی قیامی پوری کے مطابق ایک خاص وقت کی افادیت کو اجاگر کر کے خاموش ہو گیا تو میرا دھیان ایک اور ہی نقطے پر جم گیا۔ میں مذہب اسلام کی حقانیت اور ہمہ گیری پر غور کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک لمحے کی اہمیت بیان کی تھی اور میں اس پورے فیر کو ہی بہت اہم اور سودمند سمجھ رہا تھا صبح کا ڈب کے پاس کا وقت ہر لحاظ سے مفید ہے۔ تھوڑے گھنٹوں میں میری بات کو زیادہ وضاحت سے سمجھ رہے ہوں گے!

چار بجے صبح ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے جیپ کو راستے کے کنارے پر روک دیا اور اس کا انجن بند کرنے کے بعد مجھے سے مخاطب ہوئے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے بڑی ہی چٹان دکھائی دے رہی ہے؟" رات کی تاریکی میں مذکورہ چٹان کسی ہیئت تک دیو کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس چٹان کی بلندی اچھی بیولے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس چٹان کی بلندی اچھی

خاصی تھی۔ اترائی کے اعتقاد پر ہماری جیپ نے کچھ فاصلہ ایک سطح میدان میں طے کیا تھا۔

"ہاں! نظر تو آ رہی ہے۔" میں نے ڈاکٹر کی جانب سوا لی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اس چٹان کے عقب میں بدھ نکل کڈوالی وہ عبادت گاہ ہے جو ہماری منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔"

"اوہ!" ہم نے ایک طویل اطمینان بھری سانس خارج کی۔

ڈاکٹر نے کہا "ہم اپنی جیپ کو اس چٹان کی اوٹ میں کھڑا کر کے عبادت گاہ کا رخ کریں گے۔ اس جگہ پر موجود رچے ہوئے ہماری جیپ کسی کی نگاہ میں نہیں آئے گی" ماسوائے ان کے جو ہماری راہ پر چل کر ادھر آئیں۔ اور اس بات کے امکانات فی الحال نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے انجمن زدہ لہجے میں کہا "مگر تم نے اس چٹان تک پہنچنے سے پہلے ہی جیپ کیوں روک دی ہے۔ نہ صرف جیپ روکی ہے بلکہ اس کا انجن بھی بند کر دیا ہے۔"

وہ جمل انداز میں بولا "وہ محض اس لیے کہ انجن کی آواز سے کوئی ہماری جانب متوجہ نہ ہونے پائے۔ اس کو ایک احتیاطی تدبیر سمجھو۔"

لی یان نے پوچھا "پھر ہماری جیپ اس چٹان تک کیسے پہنچے گی؟"

"پہلے سے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "ہم جیپ کو دھکیلنے ہوئے اس محفوظ مقام تک لے جائیں گے۔"

جہاں ہماری جیپ کڑی تھی وہاں سے وہ چٹان کم دہش دوسو گز کے فاصلے پر واقع تھی اور یہ اچھا خاصا فاصلہ تھا قمری یان نے اس حوالے سے کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے میرے پیش کا چستہ کا۔۔۔ کچھ جلی تھی۔ وہ میری جانب ایسی نظر سے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔۔۔ جیپ کو پٹن میں دوں گا!

ڈاکٹر نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تمہاری ذاتی کیفیت یہاں ہے۔ کیا تم خود کو ایک آسان ہی ڈرائیونگ کے قابل سمجھ رہے ہو۔ ایسی ڈرائیونگ جس میں اسٹیرنگ پر کنٹرول رکھتے ہوئے محض بریکس کا استعمال کرنا ہوگا؟"

اس نے جواب میں سر کو اٹھائی جنبش دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر کی پلاٹنک کے تحت لی یان ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ میں اور مونگ ریٹونے دھیرے دھیرے

جیپ کو دھکیلنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم جیپ سمیت مطلوبہ محفوظ مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

آجندہ دس منٹ میں ہم پوری تیاری کے ساتھ جیپ کو چٹان کی آڑ میں چھوڑ کر عبادت گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سیون ایم ایم کنٹرول ڈاکٹر کے ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ان میں سے ایک گن میرے پاس اور دوسری لی یان کے پاس تھی۔ فاضل راؤ ڈیڑی اچھی خاصی تعداد ہم نے اپنے گرم لباس میں چھپا رکھی تھی۔ ڈاکٹر مونگ خالی ہاتھ تھا۔

میں کچھ عرصہ پہلے جب دن کی روشنی میں یہاں آیا تھا تو مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا تاہم کچھ دن وہاں گزارنے کے بعد میں وہاں کے ماحول اور اونچے نیچے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ بدھ نکل کڈ کی وہ عبادت گاہ ایک جیکو ڈا کی شکل میں بلند نیلے پر دریا کے کنارے واقع تھی۔ یہ مقام بھاگ متی کی طرف جانے والی سڑک سے لگ بھگ پانچ میل ہٹ کر تھا۔

تشیب میں بیٹے والے دریائے بھاگ متی کی دوسری جانب دور تک سرسبز دشا دشا وادی پھیلی ہوئی تھی لیکن وادی کی ساری سرسبزی اور شادابی کو اس وقت رات کی مہیب تاریکی نے نگل رکھا تھا۔ یہ قدیم بدھ عبادت گاہ سیکڑوں سال پرانی تھی۔ دور سے عبادت گاہ کی جیکو ڈا نما مہارت چھوٹی نظر آتی تھی لیکن قریب پہنچ کر یہ اچھی خاصی بڑی دکھائی دینے لگتی۔

ہم نہایت ہی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے عبادت گاہ کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس دوران میں ہم نے عبادت گاہ کی طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز ابھرے نہیں سنی تھی۔ ہم ایک محفوظ مقام پر رک کر لائٹس بجھ کر ترتیب دینے لگے۔ ہماری آواز سرگوشیوں سے مشابہ تھی۔

ڈاکٹر نے غصہ سے ہوئے دھجے لہجے میں کہا "عبادت گاہ کے اندر اور قریب وجوار میں پھیلنا ہوسانا اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یا تو سب خیریت ہے اور یا پھر کچھ بھی خیریت نہیں۔"

لی یان نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا "جیپ سے لے کر یہاں تک پہنچنے میں بھی فوڈا کے کسی آدمی سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ لوگ یا تو ادھر آئے ہی نہیں یا پھر اپنا کام کر کے یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔"

لی یان نے ڈاکٹر مونگ کے تجربے کی عیالفاظ بدل کر دہرا دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اسے شوہر کی موت کی خبر سنائی گئی

تھی لہذا اس کا ذہنی طور پر اپ سیٹ ہونا ایک فطری بات تھی۔ میں لی یان کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر مونگ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تم نے بتایا تھا عبادت گاہ کے اندر تمہارے چھ افراد موجود ہیں چار سادہ لباس پولیس والے اور دو تمہارے خاص آدمی۔ وہ عبادت گاہ کی نگرانی اور حفاظت کے لیے یہاں چھوڑے گئے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ سب کے سب ایک ساتھ سو گئے ہوں۔ ان میں سے کم از کم دو تین افراد کو تو جاگ کر پہرا دینا چاہیے تھا لیکن اس طرف چھائی خاموشی مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کہیں.....“

میں نے تشویش ناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ڈاکٹر نے سرسرائی ہوئی سرگوشی کی ”مجھے یقین ہے وہ پوری طرح مستعد ہوں گے۔“ پھر فیصلہ سناتے ہوئے اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور کہا۔

”میں عبادت گاہ کے سامنے والے حصے سے پیش قدمی کرتا ہوں۔ تم دونوں عقبی حصے کو آؤ۔ ہمیں بیکھر کر اپنے ٹارگٹ پر پہنچنا ہے اور سب سے پہلے مقتعد کو سیٹ لینا ہے۔“ ڈاکٹر نے بڑے خوب صورت الفاظ میں کارروائی کا نقشہ کھینچ ڈالا تھا۔ میں نے اپنی گمن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ تم رکھ لو۔ میں اگر ضرورت محسوس کروں گا تو لی یان سے گن لے لوں گا۔“

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا، گمن کا استعمال مجھے پسند نہیں ہے۔“

”میرے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے ڈاکٹر!“

وہ متذبذب نظر سے مجھ سے دیکھنے لگا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا ”ڈاکٹر! ہم یہاں سے دو ٹویوں میں ہٹ کر اپنے مقتعد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ تمہاری ٹولی صرف ایک فرد دینی تم پر مشتمل ہے۔

ایسی صورت میں اصولی طور پر تو تمہارے پاس زیادہ اسلحہ ہونا چاہیے۔ چلو زیادہ نہ سہی کم از کم اس ہلاکت خیز خود کار حالت، میں دونوں جانب توازن تو ہونا چاہیے نا!“

میں نے گن بردار ہاتھ کو یہ دستور آگے بڑھا رکھا تھا۔ ڈاکٹر کی ہچکچاہٹ طول پکڑنے لگی تو میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”رکھ لو ڈاکٹر! اگر تمہیں گمن چلانا پسند نہیں تو اپنے کسی بندے کو دے دیتا۔ اس خطرناک گمن کی انہیں بہت ضرورت

ہوگی۔“

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ سے وہ ہلاکت خیز سیون ایم ایم آٹو ٹیک رائفل لے لی۔ ہمارے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا پھر وہ اس راستے پر ہولیا جو ذرا گھوم کر عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں نمودار ہوتا۔

بدھ تیل کنڈ کی اس عبادت گاہ کا سامنے والا بیرونی حصہ ایک وسیع و عریض ہال نما فضا پر مشتمل تھا جس کے عین وسط میں ایک چوڑے پر مہاتما بدھ کا مجسمہ استادہ تھا۔ فاسٹنگ بدھا (فاتحہ زدہ بدھا) کا یہ مجسمہ کم و بیش تین فٹ بلند تھا جو سرخ پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ فاسٹنگ بدھا کا وہ مجسمہ کسی سنگ تراش کی ذکاوت پرانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندر کودھنے ہوئے پیٹ کے دائیں بائیں بدھ کی پللیاں بہ آسانی گنی جاسکتی تھیں۔

عبادت گاہ کا عقبی حصہ ایک عظیم چٹان سے جڑا ہوا تھا۔ مجھے اور لی یان کو اسی سمت سے عبادت گاہ کی طرف بڑھنا تھا۔

میں لی یان کے ساتھ احتیاط سے قدم اٹھانے لگا۔ چاروں جانب ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس ہولناک سناٹے میں ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔

ایک جگہ لی یان اچانک رک گئی اور گن کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی ”وعداں! یہ تم لے لو۔ میری حفاظت کے لیے تم موجود ہو تو پھر مجھے کہا پڑا ہے۔ ویسے بھی آتشیں اسلحے کا زور مردوں ہی کو بچتا ہے۔“

اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میں نے اس کے چہرے پر چھن اور استحصال کو ٹھٹھ کر لیا۔ وہ تازہ تازہ بیوہ ہوئی تھی۔

اس صدمے کے اثرات اس کی آواز سے ہویا تھے۔ اس نے عام بیویوں کی طرح روننا پیننا تو نہیں چاہی تھا، نہ ہی اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹپکا کر وہ یہ حد بخیرہ نظر آنے لگی تھی اور یہ بخیرہ کی اس بخیرہ کی قطعی مختلف تھی جو ڈاکٹر مونگ کی موجودگی کے باعث احترام اڑھ کر اس پر غالب آ جاتی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے گن لے لی اور ہم خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رک جانا پڑا۔ ایک سایہ سایہ کی نگاہ کے سامنے لہرایا تھا۔ مجھے یوں لگا، کوئی انسانی ہیولا کسی چھلاوے کے مانند ادھر سے ادھر گیا ہو۔

میں گن سونے جتنا غلط نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن وہاں مجھے کوئی دکھائی نہ دیا۔ ایک لمبے کو میں نے بھی سوچا، شاید وہ میرے تصور کی کرشمہ کاری تھی۔ ہم جس قسم کے

حالات سے گزر رہے تھے۔ ان میں وہ اپنے تخلیق ہونا کوئی خاص بات نہیں تھی مگر وہ میرا دایہ یا نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے میری ساعت سے ایک غرائی ہوئی آواز نکل رہی تھی۔

”گمن بھینک کر شرافت سے سیدھے کھڑے ہو جاؤ!“

یہ ٹھکانا آواز ہمارے عقب سے ابھری تھی۔ لب دلچہ خالص امریکی تھا۔ تاہم اس نے غراہٹ بھری آواز کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیا تھا۔ بھینکا یہ وہی شخص تھا جس کا سایہ سامنے نے تاریکی میں لہراتے دیکھا تھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”کسی گمن کی میں نہ رہنا۔ میں اس وقت تمہارے بہت قریب ہوں۔ تم دونوں میرے نشانے پر ہو۔ اگر تم نے تین گمن تک گن نہیں بھیجی تو پھر تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“

”گمن کون ہو؟“ میں نے اسے ہاتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا۔

میں اس کی آواز سے مابین فاصلے کا اندازہ لگا چکا تھا۔ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے میں اس کی پوزیشن کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک مگر چہرہ غرایا۔

”سوالات نہیں کرو۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

”گولی چلانے والے مکالمات کے چکر میں نہیں پڑتے۔“ میں نے کہا ”مہر حال، تمہارے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری بک بک سے ظاہر ہو گیا کہ تم امریکی ہو۔“ پھر میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا ”تم امریکا سے ہزاروں میل دور یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

”میں جہیں جنم واصل کرنے کے لیے یہاں تعینات کیا گیا ہوں۔“ وہ ٹھنک لہجے میں بولا ”تین گمن کی مہلت تم نے کھودی۔ اب جلدی سے گمن بھینک کر سیدھے ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں بھی وہیں پہنچا دوں گا جہاں اس وقت تمہارے ساتھی بیٹھے ہوئے ہیں۔“

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا ”ہمارے ساتھی“ سے اس کی مراد بھینکا وہ افراد تھے جو عبادت گاہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ اب اس طرف خاموشی اور سناٹے کا سبب سمجھ میں آ رہا تھا۔ ہمارے بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

”ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی، میں گمن بھینک رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”میں مرنے کا کوئی شوق نہیں۔“

اس کے ساتھ ہی میں ذرا سا آگے کو جھکا گیا۔ مقتعد یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں گمن کو بعد احترام پھر لی زمین پر رکھنے جا رہا ہوں مگر میرے ذہن میں اس وقت کوئی اور پروگرام ہی

چل رہا تھا لیکن مجھے اپنے پروگرام میں ہنگامی طور پر تعویذی تہذیبی کرنا پڑی۔

میں پیچھے ہی آگے کو جھکا، عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی جانب سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہمیں نشانے پر رکھنے والا فائرنگ کی اس آواز سے چونکا نہ ہو، خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو تلف کرنے کا بھی دعوے دار تھا۔

میں نے اس کے لگائی چوکنے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور چشم زدن میں ایک جھٹکے سے گھوم کر اپنے عقب میں فائرنگ کر دی۔

یہ ایک رنگی اسٹیپ تھا لیکن میں چونکہ اس کی پوزیشن کو ذہن میں نقش کر چکا تھا اس لیے میرے اندازے نے کام دکھایا اور فائرنگ کی تیز تر تڑاہٹ میں انسانی چیخوں کی آواز غلام ملط ہو کر رہ گئی۔

میں نے تیزی سے پلٹ کر اس جانب گن سیدھی کر لی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی گن سمیت الٹا پڑا تھا۔ میری گن سے نکلنے والی گولیوں نے اس کے وجود کو چھلنی میں بدل دیا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی موت کی تصدیق کی اور گن اٹھا کر لی یان کی طرف بڑھا دی۔

وہ چھوٹے سائز کی ایک خود کار گن کی اور پوری طرح لوڈ بھی تھی۔ لی یان کو اس کے استعمال میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں سیدھا ہوا ہی تھا کہ اسی لمحے ایک مرتبہ پھر فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی پھر اس کے جواب میں فائرنگ ہونے لگی۔

میں نے لی یان کے ساتھ ایک جانب دوڑ لگا دی۔ تاہم اس دوڑ میں ہم نے احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں مہادت گاہ کے سامنے والے حصے کی جانب سے ابھری تھیں اس کا بھی مطلب تھا، ڈاکٹر مونگ بھی اس طرف ”مصر و غم“ ہو گیا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ میں نے لی یان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے کہا ”اگر ہم ٹھنڈے میں ہوتے اور شون کے بارے میں کوئی ایسی ویسی اطلاع ملے تو میں تمہیں ہرگز ہرگز اپنے ساتھ نہ آنے دیتا۔ یہ ایسا وقت نہیں کہ تم مارا ماری کی کارروائی میں ہمارا ساتھ دیتی۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”زندگی اور موت کا کھیل بڑا بھیا کہ ہے وجدان!“

وہ ٹھوس لہجے میں بولی ”اس میں انسان کو ایک لمحے کے آرام کی مہلت میسر نہیں آتی۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہم جس مشن میں ہیں، اس میں موت ہماری زندگی سے نہیں کھیلے گی؟“

”ہاں اس بات کی گارنٹی تو واقعی کوئی نہیں دے سکتا۔“  
 ”تو پھر ہمیں موت اور زندگی کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”یہ دونوں آس پاس جو سفر ہیں اور ہر لمحے ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے پیچھے کی کوشش میں رہتی ہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”شون کی موت کا مجھے دکھ ضرور ہے لیکن میں اس سچائی کو تسلیم کرتی ہوں کہ اس کی زندگی پوری ہوئی تھی اس لیے وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ ایک روز ہماری زندگی کو بھی موت چڑپ کر جائے گی اور..... ہم بھی بہت لوگوں کو دکھ میں مبتلا کر جائیں گے۔“

لی یان کی ہنسی پر حقیقت باتوں نے مجھے متاثر کیا۔ وہ اس وقت پہلے دالی لی یان نظر نہیں آ رہی تھی۔ پتا نہیں، یہ اس کا اصل روپ تھا یا حالات کی سلیفٹی نے اس کے دماغ کو ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حالات دو واقعات انسانی سوچ پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس کے بعد کوئی ہماری راہ میں نہ آیا اور ہم پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے اس چٹان کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ لی یان نے اس عبادت گاہ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا مگر میں پہلے بھی یہاں چند روز گزار گیا تھا اور عبادت گاہ کے ایک ایک راز سے بخوبی آگاہ تھا۔

باہر سے سنگلاخ اور ٹھوس نظر آنے والی وہ عظیم الجذہ چٹان اندرونی جانب سے خاصی کھلی تھی اور اس کے کھلاؤنے ایک غار سامنے آیا تھا۔ اس غار میں داخل ہونے کا راستہ دوسری سمت آخری کنارے پر تھا۔ ہم ایک تنگ سی راہداری کو عبور کرتے ہوئے اس راستے تک پہنچ گئے۔ اسی لمحے غار کے اندر غارنگ کی آواز گونج اٹھی۔

ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ لی یان کی آنکھوں میں مجھے استفسار نظر آیا۔ تاریکی کے باوجود بھی میں نے سمجھ لیا کہ وہ اشاروں کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہی تھی..... یہاں کھڑے ہو کر کچھ دیر انتظار کریں یا اندر داخل ہو جائیں!

میں نے وہیں رک کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی اور غار کے اندر مجھے اشباح کی مخصوص آواز صاف سنائی

دے گئی۔ میں سمجھ گیا، اس طرف ڈاکٹر موگ و دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ میں نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ آگے قدم بڑھا دیئے۔

ہم دونوں غار کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ غار ایک ہال نما تھا اور تقریباً مربع شکل کا تھا۔ اس کی دیواروں کی لمبائی ساٹھ فٹ کے قریب تھی اور ”چھت“ بھی کم و بیش اتنی ہی بلندی پر واقع تھی۔ غار کے وسط میں مہاتما بدھ کا ایک عظیم الجسامت مجسمہ کھڑا تھا۔ اس مجسمے کی اونچائی لگ بھگ تیس فٹ تھی اور اسے ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا جس کا گھیر کر ویش چندرہ فٹ تھا۔ اتنے بڑے مجسمے کو تراش کر باہر سے اندر لانا تو ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا، غار کے اندر پہلے سے کوئی بڑی چٹان موجود ہوئے ترش کر مجسمے کی شکل دے دی گئی تھی۔ غار کی دیواروں پر بھی جا بجا پتھر تراش کر بدھ کی شبیہ ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسی ہی ایک سنگلاخ دیوار میں نصب مخصوص اسٹینڈ میں ایک مشعل روشن تھی۔ مشعل کی محدود روشنی اگرچہ غار کو پوری طرح اجاگر کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم ہم اسی کے طفیل غار کے اندرونی مناظر کو دیکھ بارہے تھے۔ وہ ماحول سمجھنے میں مجھے اس لیے بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ سب کچھ میرا دیکھا بھالا ہوا تھا!

ہم اس مجسمے کے عقب سے گھوم کر پہلو میں پہنچے تو وہاں غار کے فرش پر مجھے دو انسان پڑے ہوئے نظر آئے۔ ان کی حالت سے لگتا تھا وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ میں نے قریب پہنچنے کے بعد ٹھنڈے مار کر ان کو سیدھا کیا پھر نشتانے پر رکھتے ہوئے ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ ان دونوں کی صورت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مقامی تھے۔ یہ بات میں دھوکے سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ جی فوڈز کے آدمی تھے یا ان چھ افراد میں سے دو جو اس عبادت گاہ کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی صورت ممکن ہو سکتی تھی۔ جی فوڈز کو ایک مقامی طاقت ور شخصیت جو گنڈر پال کا تعاون حاصل تھا۔ جو گنڈر پال اسے مقامی جاں نثار بھی مہیا کر سکتا تھا۔

اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ دشمنوں کے آدمی ہوں گے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے غار کے اندر اشباح کی آواز سنی تھی۔ یہ دو لائیں اسی کا نتیجہ تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کارروائی ڈاکٹر موگ نے کی تھی لیکن وہ خود غار میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں لاشوں کے قریب

فرش پر ان کی گھنٹیں بھی بڑی تھیں جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا، انہوں نے ہی ڈاکٹر پر فائزنگ کی ہوگی۔

ہم تھوڑا آگے بڑھے تو ایک اور آدمی اندھا بڑا ہوا۔

میں نے اسے سیدھا کیا تو وہ صورت شکل سے امر کی نظر آیا۔

اس کی گن بھی ہاتھوں میں دلی وہیں اسی کے ساتھ ہی بڑی تھی۔ میں نے وسیع و عریض ہال نما غار میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی، ہال میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں پلٹا اور مجھے کے ہاتھ پاؤں کی طرف آگیا۔

یہ مجھ سے اپنے اندر ایک خطرناک راز چھپائے ہوئے تھا۔ اس کو دیکھ کر، چھو کر اور چاچ کر کوئی ناواقف یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے اندر بھی داخل ہوا جاسکتا ہے۔ وہ بظاہر ایک ٹھوس ترشی ہوئی چٹان تھی جس کی سنگناخی کا باہر ہاتھوں نے بدھا کے مجھے میں ڈھال دیا تھا لیکن میں جانتا تھا، اس مجھے کے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے۔ میں داخلے کے مخصوص طریقہ کار سے بھی واقف تھا۔

میں نے جبکہ کر مجھے کے دونوں پاؤں کا جائزہ لیا۔ دونوں تکی پاؤں کے درمیان تقریباً چارٹ کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ٹھوس چٹانی پتھر پر مشتمل تھا۔ دونوں پاؤں کی ایزویوں کو جب مخصوص انداز میں دیا جاتا تو چارٹ کا یہ چٹانی پتھر اپنی جگہ سے سرک جاتا تھا اور وہاں ایک ٹھڑکی نما خلا پیدا ہوا جاتا تھا۔ اس خلا میں سے گزر کر مجھے کے اندر پہنچا جاسکتا تھا۔ میں اس تجربے سے گزر چکا تھا۔

وہ ٹھوس پتھر اپنی جگہ پر ثابت قدم کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، ہمارے دشمنوں میں سے کوئی اندر داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک اطمینان بخش صورت حال تھی لیکن میرا اندرون بے اطمینانی اور اضطراب کی آگیا جگہ بنا ہوا تھا۔ میرا دل جس صورت کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے دیوار میں نصب مشعل کو اس کے اسٹینڈ میں سے نکال لیا۔ سیون ایم ایم کو اسٹریپ کی مدد سے کندھے پر لٹکا یا اور مشعل کو ہاتھ میں تمام کر آگے بڑھنے لگا۔ اس غار نما ہال میں ڈاکٹر کو غیر موجود پا کر میں یہی سمجھا کہ وہ عبادت گاہ کے کسی دوسرے حصے کی طرف بڑھ گیا ہے۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اس جانب بڑھنے لگے جو راستہ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی طرف جاتا تھا۔ اسی لمبے غار کے آخری سرے پر فائزنگ کی آواز ابھری۔ ہم ٹھیک کر رک گئے۔ فائزنگ کے ساتھ ہی انسانی تجلیں بھی بلند ہوئیں۔ میں نے مشعل کو ہاتھ پھیلا کر اپنے وجود سے کافی دور

کر دیا تاکہ روشنی دیکھ کر اگر کوئی ہماری سمت فائزنگ کھول دے تو ہم ہلاکت خیز کوئیوں سے محفوظ رہیں مگر ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ چند لمبے کے انتظار کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔

اس غار کے اندر بدھا کے مجھے کو ٹھیک حالت میں دیکھ کر اگرچہ مجھے اطمینان سا ہو گیا تھا لیکن موجودہ فائزنگ بتاتی تھی وہاں سب ٹھیک نہیں بلکہ کوئی بڑی گڑبڑ موجود ہے۔ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر کے میں اس سمت بڑھنے لگا جہاں سے ایک لمبے پہلے فائزنگ اور انسانی چیخوں کی آواز ابھری تھی۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اچھی طرح اس ہال نما غار کا جائزہ لیا تھا اور وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چاچک کس نے کس پر فائزنگ کی تھی۔ انسانی چیخوں نے کسی کی ہلاکت کی خبر بھی دی تھی۔

ہم نہایت ہی محتاط قدموں سے اپنے ٹارگٹ کی جانب بڑھتے رہے اور غار کے اس حصے میں جا پہنچے جہاں ایک تنگ سی راہداری موجود تھی جس میں ہیشکل دو افراد پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ اس راہداری کے اندر، خاصے فاصلے پر مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ تاہم اس روشنی کا ماخذ کہیں دکھائی نہ دیا۔ راہداری کی تنگی کو دیکھتے ہی مجھے یاد آگیا کہ دھو (سائل) کے باپ نے مجھے اس راہداری کے بارے میں بتایا تھا۔

لی یان نے کہا ”ودان! ہمیں اس طرف جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ ڈاکٹر کو مگ کی خطرے سے بھی دو چار ہو سکتا ہے!“

اس کے لہجے میں ڈاکٹر کو مگ کے لیے احرام بھری تشویش موجود تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، اس طرف راہداریوں کا کیسا اوجھا ہوا چال پھیلا ہے۔ وہ ان بھول بھلیوں کی سیجینی اور سحر آفرینی سے آگاہ نہیں تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ تھوچی نے بھی ان راہداریوں کے بارے میں مکمل کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ بہم انداز میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ ادھر بڑے اہم اور ترسرا راز پوشیدہ ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بدھا کے عظیم الجثہ مجھے کے اندر سے لگایا تھا جہاں میں نے سونے کا ایک بے بہا ذخیرہ دیکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے پوری دنیا سے تمام تر سونا اکٹھا کر کے وہاں ذخیرہ لگا دیا گیا ہو جس میں بدھا کے طلائی مجھے کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

اس سنسنی خیز خبر پر اپنی نظارے کا تصور کرتے ہوئے مجھے اپنے وجود میں ہیجان سا پھیلا محسوس ہوا۔ کوئی عام آدمی

سونے کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھ لیتا تو حیرت سے اس کا دماغ الٹ جاتا۔ رہی موٹے ہاتھوں ایسے ہی تو اس نے خانے کا دیوانہ نہیں بنا دیتا تھا!

رہی کے خیال نے میرا دھیان اس کی خواہش کی طرف پھیر دیا۔ رہی نے خانے میں پوشیدہ ان پانچ تبرک پتھروں کو حاصل کرنا چاہتا تھا جن کی نیچائی ایک بہت بڑی روحانی قوت کا وسیلہ تھی۔ اس قوت کا حامل شخص پوری دنیا کو اپنے سامنے بٹھکے پر مجبور کر سکتا تھا۔

تھوچی نے بڑی وضاحت کے ساتھ مجھے سونے کے اس ذخیرے سے آگاہی دی تھی۔ میں نے کہیں دیکھا اور نہ ہی تھوچی نے ان پانچ عظیم المرتبت پتھروں کا ذکر کیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ رہی کی جستجو کا تعلق انہی بھول بھلیوں سے تھا جن کی سمت جانے والے راستے پر ہم اس وقت کھڑے تھے۔ وہ نادر و نایاب پتھر اس طرف نہیں محفوظ کیے گئے تھے۔

لی یان کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا ”ودان! ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

سونے کے ذخیرے اور پانچ روحانی پتھروں کے بارے میں میرے ذہن نے محض پانچ سیکنڈ سوچا ہوگا اور اسی فطری حیثیت نے لی یان کو، مجھے دوبارہ مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”او کے..... کم آن.....!“

میرے منہ سے یہ الفاظ خارج ہوئے ہی تھے کہ غار کے قریبی حصے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ یہ وہی سمت تھی جہاں سے ہم اس ہال نما غار میں داخل ہوئے تھے۔ گویا کوئی ادھر بھی ادھر رہا تھا۔ قدموں کی چاپ بتاتی تھی، اہم الزم دو افراد ہوں گے اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ اندر سے دھن ہی ہوں گے!

میں نے لی یان کا بازو دھما اور ایک کرنک سی راہداری میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے وہ غار کوئیوں کی تڑتڑاہٹ سے ٹوٹا اٹھا۔ ہمیں اس راہداری میں چناہ لینے میں اگرچہ بھرکی تھوڑی جاتی تو ہمارے وجود نامی کوئیوں کی راہ میں حائل ہو۔

راپے اندر کی سوراخ بولا لیتے۔ وہ فائزنگ براہ راست اندر سمت کی تھی۔

جلدی ہی اس کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ میرے ہاتھ میں موجود مشعل، فائزنگ کے لیے مشعل براہ راست تھی۔ میں نے اسی طور پر اس مشعل کو غار میں ایک جانب اچھال دیا۔ اگر اندر سے پاس رہی تو دشمنوں کے لیے سیرا راہ ثابت ہو سکتے

تھے۔ میں اس مشعل کو اپنے دشمنوں کے اسلحہ بردار ”سفینوں“ کی راہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس کا کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

وہ مشعل میرے ہاتھ سے جدا ہونے کے بعد لگ بھگ دس فٹ کے فاصلے پر ہمارے اور بدھا کے جسم کے وسط میں گری گئی اور بدستور روشنی تھی اور اس نے اپنی روشنی سے ارد گرد کے ماحول کو بھی کافی حد تک روشن کر رکھا تھا۔

میں نے لی یان کا ہاتھ تھاما اور اس کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی ”ہم غار کے نسبتاً تاریک حصے کی طرف جا رہے ہیں۔ آذمیرے ساتھ۔“

اس نے میری معیت میں قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ جلد ہی ہم بھول بھلیوں کی سمت جانے والی تنگ سی راہداری سے باہر نکل آئے۔ فائزنگ کرنے والے ابھی ہماری نظر میں نہیں آئے تھے۔ ہم پتھر لی دیوار کے ساتھ چپک کر سرسکتے ہوئے غار کے ایک کونے میں پہنچ گئے۔ اب ہمارے اور مشعل کے درمیان بدھا کا دیو قامت سنگی مجسمہ حائل تھا۔ اس وجہ سے بھی اس کونے میں مناسب تاریکی موجود تھی۔ اگر بہت گھور گھور کر اس کونے کا جائزہ لیا جاتا تو ہمارے لیے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

اس غار میں داخل ہونے والے تازہ ترین دشمن مجھے نظر تو نہیں آ رہے تھے۔ تاہم محتاط انداز میں اس تاریک راہ داری کی جانب بڑھتے ہوئے ان کے قدموں کی دھبی چاپ کو میں بڑی وضاحت سے محسوس کر رہا تھا۔ پوزیشن کے لحاظ سے وہ دشمن مشعل تنگ راہداری اور دشمنوں کے قدموں کے درمیان آگئی تھی۔

لی یان مجھ سے چپک کر کھڑی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی ”تم پوزیشن سنھالے یہیں الٹ کھڑی رہو۔ میں دوسری سمت سے انہیں گھبرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے اپنی آواز کو اس حد تک مدہم رکھا تھا کہ لی یان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے محض میرے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔ ان لحاظات میں ایک ذرا سی آواز دشمنوں کو ہماری جانب متوجہ کر سکتی تھی۔ اس سرگوشی کے دوران میں میرے لب لی یان کے کان کی لو سے کس ہوئے تو مجھے اپنے وجود میں سنسنیاتی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ دل گویا کنبھینوں میں دھڑکنے لگا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پانا اور لی یان کا ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں دبانے کے بعد کئی مجھے کی طرف بڑھ

دہ پیٹ کو دبائے کھڑا تھا۔ میں نے گھوم کر ایک ریئر  
کلک اس کے چہرے پر جڑ دی۔ وہ اگلے قدموں پیچھے کو گیا

کر دیئے۔  
صرف تین منٹ کی ٹھوکا پیٹی کے بعد وہ عمار کے پھر

”تم لوگوں نے ہائی دے والی ہستی کے ایک گھر میں  
خاست پھا کر کے وہاں سے ایک لڑکی کو اغوا کیا تھا۔“ میں نے

”تم نے بتایا ہے کہ تم لوگوں نے بڑی کامیابی سے  
ہاں لے کر کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔“ میں نے اس  
لی آکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”یہاں پر جو لوگ عبادت  
کا یہ محتاط اور دیکھ بھال کا فرض انجام دے رہے تھے وہ

کہاں گئے؟ تم لوگوں نے انہیں کس سلوک سے گزرا؟“  
میری معلومات کے مطابق، بدھ نیک کنڈ والی عبادت گاہ کے اندر اور باہر چھ افراد کھاننی اور حفاظت وغیرہ کا کام سنبھالے ہوئے تھے جن میں دو ڈاکٹر مونگ کے اپنے آدمی تھے اور چار سادہ لباس افراد کا تعلق نیپال پولیس سے تھا۔ اس شخص کے جواب نے میرا خون کھولا کر رکھ دیا۔  
”وہ چھ کے چھ ہے کسی کی موت مارے گئے!“

تعداد کا ذکر کر کے اس نے اس بات کی بھی تصدیق کر دی کہ اب ہم تینوں یعنی ڈاکٹر مونگ کی یان اور میرے سوا اس عبادت گاہ میں ہمارا اور کوئی ساتھی زندہ موجود نہیں تھا۔  
میں نے گن کی نال کو نیچے پڑے ہوئے اس امریکی شخص کی پیشانی سے نکادیا اور موت سے بھی زیادہ سرد لہجے میں کہا ”وہ چھ کے چھ مارے گئے تو تم کیوں زندہ ہو؟“  
”پلیز مجھے نہ مارو۔“ وہ متوجہ نہ ہو کر لہجے میں بولا۔

”کیوں نہ ماروں؟“ میں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی سی لگی۔

”مم..... میں..... جہادری منت کرتا ہوں کہ.....“  
”ان چھ افراد نے بھی تم لوگوں کی بہت منت کی ہوگی۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”کیا تم میرے کسی کو ان پر ترس آیا تھا؟“

پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی منحوس زبان سے مزید کوئی التجا کرے، وہ بال نما غار فائرنگ کی تیز آواز سے گونج اٹھا۔  
سیون ایم ایم کے ایک مختصر سے برمت نے اس کی کھوپڑی کو نابود کر دیا۔ اگلے ہی لمحے غار میں ایک مرتبہ پھر موت کا سا ساٹنا پھیل گیا۔

میں نے گن کو سیدھا کیا اور مرکز کی یان کو دیکھنے لگا۔  
اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلۂ خیال کیا پھر اس جانب بڑھ گئے جہدہری یان کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے گھرے تھے۔ لی یان نے گن کا بروقت استعمال کر کے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔

جلد ہی ہم مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ میں نے مشعل کی روشنی میں دیکھا وہ دونوں خون میں نہائے ہوئے تھے۔ لی یان نے ایک خطرناک برمت مار کر ان کے جسموں کے عجیبے اڑا دیے تھے۔ ان میں سے ایک مقامی اور دوسرا سفید فام تھا۔ وہ دونوں ہمارے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے اور اس بات کی تصدیق اس شخص نے کی تھی جو چند لمحے پہلے میرے ہاتھوں زندگی کے بعد کے کڑے سزا پر روانہ ہوا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں نے سیون ایم ایم کو روک لیا۔ لی یان والی گن بھی خالی ہو گئی تھی۔ مذکورہ گن میں استعمال ہونے والی گولیاں ہمارے پاس نہیں تھیں۔ ہمارے فاضل ایویوشن میں موجود گولیوں کا کھلیاں پر مختلف تھا۔ لی یان والی گن راور ڈز کے بغیر ایک آہنی لاشی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی لہذا اسے ہم نے وہیں پھینک دیا۔ اب ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا تھا کہ کس طرف کا رخ کیا جائے!

اس وقت میرے ذہن میں بڑی الجھن لگی ہوئی تھی۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ جی فوڈ عبادت گاہ کے اندر کہیں موجود تھا؟ کہاں؟ یہ ہمیں معلوم کرنا تھا۔ میرے ہاتھوں موت سے ہم کنار ہونے والے شخص نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ جی فوڈ ادھان آیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، آج شام سات بجے جی فوڈا نے ہائی دے والی ہستی کے ایک گھر میں خون کی ہولی کھیل کر میری ساحل کو وہاں سے اغوا کر لیا تھا۔ شا کا کے گھر کے داخلی دروازے کی اندرونی کنڈی میں لٹکا جی فوڈا کا ”پیغام“ ہم نے پڑھ لیا تھا۔ اس نے اس خوش واردات کا تحریری اقبال کیا تھا۔ یعنی بات تھی کہ وہ ساحل کو اپنے ساتھ اس عبادت گاہ میں لایا ہو گا مگر یہاں جی فوڈا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی ساحل کا کوئی سراغ دکھائی دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر مونگ ریلوے بھی پڑا سر اور طور پر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ پتا نہیں یہ سب لوگ کہاں چلے گئے تھے!

لی یان نے اس تنگ سی راہداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو آگے جا کر راہداریوں کی بھول بھلیوں کو جنم دیتی تھی ”میرا خیال ہے ہمیں ادھر جانا چاہیے۔“

اس کا خیال معقول اور حالات کے تقاضے کے عین مطابق تھا لیکن میں نے اس کے خیال کی تردید کر دی ”پہلے ہم عبادت گاہ کا پیر والی اور ہاشی حصہ دیکھ لیں پھر ادھر جائیں گے۔“ میں نے حتیٰ لکھے میں کہا۔

اس نے میری تجویز پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ اس تجویز میں ایک قسم کا حکم پایا جاتا تھا۔ بھول بھلیوں والے اس دھانے کے حصے کے بارے میں تھوپی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ خاصا اطمینان بخش تھا۔ کوئی انجان شخص اگر بھول بھلیوں کی اس ٹکری میں قدم رکھ دیتا تو واپسی اسے نصیب نہ ہوتی اور..... کسی ”واقف“ شخص کا اس طرف جانا تشویش ناک نہیں تھا۔ بہر حال اس جانب ہونے والی فائرنگ ضرور تشویش کا باعث تھی!

ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نما غار کے داخلی



راستے تک پہنچ گئے۔ عبادت گاہ کے رہائشی حصے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں تھوڑا گھوم کر ادھر جانا تھا۔ لی یان نے بڑی مضبوطی سے مشعل تھام رکھی تھی۔ وہ خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ پہلے ڈاکٹر مومگ کو نہ پا کر فوراً مجھ سے بے تکلف ہو جاتی تھی۔ ہمارے درمیان زندگی کے ہر موضوع پر بات ہوتی۔ میں اسے چھیڑنے اور اس کا نفسیاتی علاج کرنے کے لیے گفتگو کو اس کی ذہنی تیز چوڑی طرف موڑ دیتا اور وہ واقعی چھڑ جاتی۔ یہ موضوع اس کی زندگی کا بڑا نازک پہلو تھا اور شون کی موت کے ساتھ ہی اس موضوع کی بساط بھی لپٹ گئی تھی۔ اس کی خاموشی اور گہری سنجیدگی بھی بیوگی کے سبب ہی تھی! مجھے نہیں امید تھی کہ وہ دوبارہ شادی کے بارے میں سوچے گی بھی۔

دیے مستقبل کے بارے میں محض اندازے ہی قائم کیے جاسکتے ہیں! کوئی حتمی بات کہنا سراسر حماقت کے زمرے میں شمار ہوگا کیونکہ مستقبل کا حال کوئی اور ہی چاہتا ہے اور وہ ذات پاک بہت ہی قدرت والی ہے۔ انسان اگر پوری طرح ماضی کے حال تک ہی رسائی حاصل کر لے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ اس کا تصرف تو حال تک محدود ہے اور اسے اپنے حال کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر کسی کا حال ٹھیک نہ ہو تو ماضی اور مستقبل دونوں کی صورت بگڑ کر رہ جاتی ہے!

ہم عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں آ گئے۔ وہاں خاموشی اور سنائے کا راج تھا۔ مشعل کی روشنی کے طفیل ہم ایک دوسرے کے سرے میں چکراتے پھرے۔ اس چلت پھرت کے دوران میں کئی ہولناک مناظر نے ہماری آنکھوں میں جگہ پائی۔ کم و بیش آٹھ انسانی لاشوں نے ہمارا "استقبال" کیا۔ ان میں اپنوں اور بیگانوں کی لاشیں شامل تھیں۔ بیرونی حصے کا مکمل معائنہ کرتے ہوئے بھی پہاڑی ڈھلوان پر تین چار افراد مردہ حالت میں پائے گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی بدھ بیگہ ڈانما عبادت گاہ میں نہ ہوں بلکہ انسان کے بے گور و وطن شیر خاموشاں میں چھل دی کر رہے ہوں۔

اس تلاش میں مجھے صرف تین افراد کو دیکھنے کی خواہش تھی اور وہ تین افراد تھے میری سائل ڈاکٹر مومگ ریفوشے اور شیطان اعظم کی موتیوں سے ہنسنے کا چیلنجی فوڈا۔ مگر یہ تینوں صورتیں ہنوز آنکھوں سے اوجھل تھیں۔

میں لی یان کے ساتھ واپس عبادت گاہ کی عقیقتی سمت نکل آیا۔ اس طرف چنان کے ساتھ چلتے ہوئے ہمیں ہال نما عمارت تک پہنچنا تھا۔ اب بھول بھلیوں کی طرف جانے والی راہداری میں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس طرح لی یان کی

تشویش بھی دور ہو جاتی کیونکہ اس طرف ہم نے فائرنگ اور انسانی بیچوں کی آواز بہر حال نہ سنی۔

غار کے اندر داخل ہوتے وقت میں ٹھٹک کر رک گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غار کے اندرونی حصے میں کوئی مشعل جل رہی ہو۔ میں نے وہاں واضح طور پر روشنی کے آثار دیکھے تھے۔ تنگ راہداری کے دور افتادہ کسی حصے سے روشنی سفر کر کے اس غار تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جب ہم مشعل لے کر غار سے باہر نکلے تھے تو وہاں گھپ اندھیرے نے خیمہ ڈال دیا تھا۔

اب اگر وہاں کسی قسم کی روشنی دکھائی دے رہی تھی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہاں کوئی ہے!

"کوئی ہے" کے الفاظ تنہا بدن میں تشویش دوڑانے کا باعث تھے۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ جی فوڈا یا ڈاکٹر مومگ یا پھر میری جان تنہا سائل!

میرے دل نے ان لحاظ میں بڑی شدت سے پکارا..... کاش وہ میری سائل ہو!

لی یان کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "رک کیوں گئے جدان؟"

وہ میرے پیچھے تھوڑے فاصلے پر تھی اس لیے غار کے اندر نظر آنے والی روشنی کا اسے احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی پکار بلکہ استفسار نے سائل کے تصور کو ذہن سے مٹا دیا اور میں پوری طرح اپنے ماحول میں حاضر ہو گیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ سائل کے بارے میں سوچتے ہوئے میں بعض اوقات اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتا تھا وہ ماحول کیا بیچتا تھا سائل کی یاد کے سامنے!

"آں..... آگے کچھ گڑ بڑ ہے لی یان!" میں نے جلدی سے بات بنائی۔

"آگے؟" وہ ابھمن زدہ انداز میں بولی "لیکن مجھے تو کوئی گڑ بڑ دکھائی نہیں دے رہی!"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے..... اس غار کے اندر!"

"غار کے اندر کسی گڑ بڑ کو تم نے باہر رہتے ہوئے کیسے دیکھ لیا؟"

جواب میں میں نے اسے اندر نظر آنے والی روشنی کے بارے میں بتا دیا۔ میری بات سننے کے بعد وہ بھی تشویش مٹا جتا ہو گئی "ہاں یہ تو واقعی بڑی ہی گہروالی بات ہے۔"

میں نے کہا "لی یان! یہ سن کر تم اپنے ہاتھوں میں تمام مشعل مجھے دے دو۔"

"اور تم؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا "تم اس مشعل کے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟"

"میں اس مشعل کو غار کے اندر پھینکوں گا جیسا کہ پہلے پرکا تھا۔" میں نے فوری طور پر ذہن میں آنے والے آئیڈیا کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لی کو بتایا "اندر جو کوئی بھی ہے وہ نظری انداز میں رد عمل کے طور پر مشعل کی سمت بے دریغ نازک کرے گا۔ اس سے ہمیں دو فائدے حاصل ہوں گے۔"

"مثلاً..... کون کون سے دو فائدے؟" وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔

"نمبر ایک" میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا "اس فائرنگ میں اس شخص کا اچھا خاصا انیوشن کام آ جائے گا۔ اگر وہ ہمارا دشمن ہے تو یہ ہماری ایک اہم کامیابی ہوگی اور دوسرے....." میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا وقفہ کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

"نمبر دو" ہمیں اس کی درست لوکیشن معلوم ہو جائے گی۔"

"آئیڈیا عمدہ ہے۔" وہ سناٹھی انداز میں بولی۔

میں نے مزید کہا "اس کے بعد میں چیکے سے غار کے اندر داخل ہو جاؤں گا۔ اگر وہاں میرے ساتھ کوئی ایسی دہی بیوٹیشن پیدا ہوگی تو تم سنہال لیا۔ تم اس خطرناک سیون ایم بم کے ساتھ غار کے اندر موجود نہیں پر ہلا ہو سکتی ہو!" وہ میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں بولی "ڈن!"

ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ بجا یا اور اس کے ہاتھوں میں چھڑی ہوئی گمن اور مشعل کا تیار کر لیا۔ اگلے لمحوں میں اس ہال نما غار کے داخلی راستے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چند قدم آگے آ کر میں نے غار کے اندر موجود روشنی کا تھیکہ جانزہ لیا اور پھر اپنے منصوبے کے پہلے مرحلے پر عمل پیرا ہوا۔ مشعل کو اندر پھینکنے کے بعد میں ایک کراہٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس طرح مجھے ایک نئی آواز میسر آ گئی۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ اگر غار کے اندر چھپا ہو کوئی دشمن مشعل کے روشنی زاویے کو پکڑ کر میری جانب فائرنگ کرے تو بھی میں غلطی کی زد میں نہ آتا۔

مشعل "شون" کر کے غار کے اندر پہنچی پھر اس کے سنگی کنارے پر گر کر اس کی مخصوص آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی وہ آواز بڑی کی بڑی کی طرح ٹھنڈی ہو گئی۔ لہذا وہ کسی

ایسے زاویے سے جا کر فرش پر گر گئی تھی کہ اس کا مزید روشن رہنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ بے چاری بھی کب تک اس پھینکائی کی تاب لائی مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ غار کے اندر کسی بھی نوعیت کی فائرنگ سنائی نہیں دی۔

اندر موجود شخص کی اس بے اعتنائی نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اب اندر داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔ غار کے اندر وہ دم روشنی ابھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دیے قدموں غار کے اندر پاؤں ڈال دیے اور ایک دیوار کے ساتھ پیوست ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ یہ رسک لیے بغیر اندر کی صورت حال سے آگاہی ممکن نہیں تھی۔

سب سے پہلے بدھا کا عظیم الجثہ مجسمہ میری نگاہ میں آیا اور میں جان سکا کہ مذکورہ روشنی اس مجسمے کی دوسری جانب سے پھوٹ رہی تھی۔ میں روشنی کے مخرج کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اندازہ یہی تھا کہ وہ کوئی مشعل ہی ہوگی۔ مجسمے کے ادھر ماحول روشن ہونے کے سبب ادھر کا ماحول خاصا تاریک ہو گیا تھا۔ میں نے اس تاریکی کا فائدہ اٹھایا اور اچک کر تجسمے کے عین پیچھے پہنچ گیا۔ یہ ایک بہترین آڑ تھی جہاں میں ہر قسم کی فائرنگ سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

میں نے اس آؤ کو ڈھال ہی کی طرح استعمال کرتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں گردن اور آنکھوں کو مختلف زاویوں میں گھمانے کے بعد یہ معلوم کر لیا کہ وہ ہال نما غار کسی زندہ انسان کے وجود سے خالی تھا سوائے میرے۔ یہ ایک ابھمن زدہ اور کچھ میں نہ آنے والی صورت حال تھی۔

میں تجسمے کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور اس سمت بڑھنے لگا چہرہ وہ مشعل رکھی تھی۔ وہ مشعل اس رخ والی سنگی دیوار میں لٹکی ہوئی تھی جہاں سے بھول بھلیوں کی طرف تنگ سی راہداری جاتی تھی۔ میں مشعل سے ابھی چند قدم کی دوری پر ہی تھا کہ مجھے حیرت کا ایک شدید ہلکا پہنچا۔

ہم اس مقام پر دو افراد کی لاشوں کو چھوڑ کر گئے تھے لیکن اب لاشوں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک فوری کتنی کے مطابق وہاں چھ افراد کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے دو تو وہی تھے جنہیں لی یان نے شکار کیا تھا۔ باقی چار کہاں سے آئے تھے یہ سوچتے ہوئے دماغ گھوم رہا تھا۔ ان لحاظ میں لا محالہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا..... کہیں میرے ساتھ پھر کوئی طلسماتی چکر تو نہیں شروع ہونے والا؟

میں نے آواز دے کر لی یان کو غار کے اندر بلایا۔ وہ میرے پاس پہنچی تو لاشوں کی تعداد میں گراں قدر اضافے

نے اسے سشدرد کر کے رکھ دیا۔ استعجاب میں ڈوبی ہوئی آواز میں وہ بولی۔  
 ”لاشیں..... کس نے یہاں ڈالی ہیں؟“  
 ”تم از کم میں نے تو نہیں ڈالیں۔“ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

وہ میرے بازو سے لگتے ہوئے بولی ”ہذا حق نہیں کرو و ہذاں!“  
 اس کی آواز خاصی سہمی ہوئی تھی۔ وہ کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ لاشوں کو وہ سے چھ میں بدلے دیکھ کر وہ بھی یہی سمجھتی تھی کہ وہاں کوئی پراسرار کھیل شروع ہو گیا ہے۔ اس عبادت گاہ اور اس کے خانے سے متعلق بہت سی شخیر آئیر کہانیاں اس نے بھی سن رکھی تھیں..... اور مزید بہت سے کھیل تماشے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں لی یان! ان لاشوں کے یہاں پہنچنے کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔“  
 ”اوہ!“ وہ خوف زدہ نگاہ سے کبھی مجھے اور کبھی ان لاشوں کو دیکھنے لگی۔

اسی وقت ہمیں ہمارے تمام تر سوالات کے جوابات مل گئے۔ تنگ راہ داری میں مجھے ڈاکٹر موگ کی صورت دکھائی دی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ دو بے سدھ افراد کو ہاتھ سے پکڑ رکھتے ہوئے راہ داری سے باہر لا رہا تھا۔ اس کا انداز بڑا ناپا چلتا تھا۔

مجھے نظر ملی تو وہ معنی خیز انداز میں دھیرے سے مسکرایا لیکن اس نے اپنے ”کام“ سے غفلت نہیں برتی اور ان دو یقینی لاشوں کو لاکر بھی پہلے سے موجود چھ افراد کی لاشوں کے اوپر ڈھیر کر دیا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے ڈاکٹر؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس نے کندھے اچکائے ”لاشیں ہیں!“  
 ”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہی ہیں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا ”لیکن یہ ماجرا کیا ہے؟“

وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے کے بعد گویا ہوا ”اجرا کچھ نہیں ہے۔ یہ گندے لوگ اپنے ناپاک مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے آکر ہر جگہ راہ داریوں کی طرف چلے گئے تھے پھر بھول بھلیوں میں کھو کر خود کبھی بھول بیٹھے۔ اگر ان کی لاشیں ادھر راہ داریوں کے اندر پڑی رہیں تو خواہ

خواہ نقص پھیلے۔ میں نے غلیظ لوگوں کے مردہ جسموں کو وہاں سے اٹھا کر راہ داریوں کے تقدس کی حفاظت کی ہے۔ اب اس طرف سب ٹھیک ہے۔ کسی فکر پریشانی کی ضرورت نہیں۔“ بات ختم کر کے وہ تنگ سی راہ داری کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر نے معنی خیز انداز میں ڈھیروں انکشافات کر ڈالے تو مجھے اپنے وجود میں سنناہٹ سی دڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے دھکے چپے الفاظ میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ اس کے مطابق یہ لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے ان بھول بھلیوں کی طرف گئے تھے۔ اس وقت ہمارے دشمنوں کا سب سے بڑا مقصد ان پانچ ناپاک چھروں کا حصول تھا جن کے لیے رنی موٹے ہاتھن بے دریغ انسانی خون بہانے پر تیار ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے ظہری ہوئی نظر سے ڈاکٹر موگ کی طرف دیکھا اور اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا ”تمہارا مطلب ہے وہ پانچ متحرک چھروں ان بھول بھلیوں میں نہیں موجود ہیں؟“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”ان بھول بھلیوں سے بھی آگے ایک جہاں حیرت اپنا وجود رکھتا ہے۔ وہ چھروں جہاں کے ایک نایہ محفوظ گوشے میں موجود ہیں۔“

”اوہ!“ میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ”بہر حال۔“ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں نے کہا تھا فکر اور تردد کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ چھروں سلامت اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کوئی ناواقف شخص اگر کسی طرح اس تنگ سی راہ داری تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو بھی وہ بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اسے واپس کرنا اسے نہیں ملتا وہ اس سے آگے اور کہاں جائے گا۔“ پھر اس نے زمین پر پڑی لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

”اگر یہ لوگ آپس میں نہ لڑیں تو بھول بھلیوں میں چکراتے رہ جاتے۔ بہر حال۔“  
 اس نے کندھے اچکا کر جملہ ادھر ادھر چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا ”یہ آپس میں کیوں لڑیں گے؟“  
 ”ان کے دماغ خراب ہو گئے تھے۔“ وہ تجھیرا آئیر انداز میں بولا ”بھول بھلیوں کے سحر انگیز ماحول نے ان کے ذہن الٹ دیے۔ یہ خود پر قابو نہ رکھ سکے اور۔۔۔“ وہ جملہ باطن چھوڑ کر ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سفاک لہجے میں بولا ”طرح کے ہم کو اکثر فحش تر خطرات سے دوچار ہوتے رہتے

ہیں۔ یہ جاننا یو ا نتائج ہم کوئی کالامی حصہ ہیں۔“  
 میں نے محسوس کیا وہ بھول بھلیوں تک رسائی حاصل کرنے والے دشمنوں کی اسوات کے بارے میں کل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس کے اس رویے سے ظاہر ہوتا تھا شاید اسی نے ان لوگوں کو موت کے کھاتے اتارا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اسے زیادہ نہیں کرید اور ایک اہم سوال کیا۔

”ڈاکٹر! تم نے بتایا ہے وہ قیمتی پراسرار چھروں سلامت اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ تمہارے پُر دلتوق الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے ان چھروں کو محفوظ مقام پر رکھا دیکھ کر آ رہے ہو؟“

اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ”ہاں“ اسی کی بات ہے!“

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ڈاکٹر موگ میرے انداز سے بڑھ کر پراسرار بات ہو رہا تھا۔ وہ محترم سا رنگ فو کا نائب تھا۔ سا رنگ فو جیسے عظیم شخص کی نائیکی ایسے ہی حاصل نہیں ہو جاتی۔ بہر حال یہ بھی ایک خوشگوار امر تھا کہ میں پچھلے کچھ عرصے سے ڈاکٹر موگ جیسے نایزرد زگار کے ساتھ کل کر مصروف عمل تھا۔

میرے ذہن میں ایک فوری خیال پیدا ہوا اور اس میں نے لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موگ سے استفسار کیا ”ان بد بختوں میں جی فوڈ کی لاش بھی موجود ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی ”مجھے اسی کی تلاش۔۔۔“

”نہایت اس کے صورت آشنا ہو؟“

اس نے زبان ہلانے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا ”ساحل بھی کبھی نظر نہیں آ رہی۔ ہم نے اس عبادت گاہ کے بیرونی اور باہشی حصے میں بھی جھانک لیا ہے۔ ادھر کوئی زندہ انسان موجود نہیں۔ اپنے اور بیگانے لاشوں کی صورت سمجھ رہے ہوئے ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا ان میں کون اپنا ہے اور کون بیگانہ!“

”میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”ہمارے جو چھ افراد یہاں موجود تھے ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ دشمنوں کے بھی کئی افراد مارے گئے ہیں۔ بہر حال دو طرزد لڑائی میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا دشمن کی صورت میں صرف جی فوڈ ا

بچا ہے؟“  
 پھر میں نے اسے ان افراد کے بارے میں بھی بتا دیا جنہیں میں نے ادوریان نے ہٹا کر کیا تھا۔ ڈاکٹر موگ نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

”اس بارے میں میں فی الحال دلتوق ہے کچھ نہیں کہہ سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے دشمنوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔“ وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا ”اب ہمیں سب سے پہلے ساحل اور جی فوڈ کو تلاش کرنا ہے۔“

میں نے کہا ”اس عبادت گاہ کے اندر باہر اور خانے میں پھیلے ہوئے موت ٹھاسائے تو یہی لگتا ہے اب کوئی بھی زندہ بشر زندہ حالت میں باقی نہیں بچا۔ ساحل اور جی فوڈ انتظار سے غائب ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انہیں کہاں تلاش کیا جائے!“

”حالانکہ سب سے پہلے یہ تمہاری ہی سمجھ میں آنا چاہیے تھا۔“

ڈاکٹر موگ کے معنی خیز جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا ”ہاں نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا پہلے میری سمجھ میں کیوں آنا چاہئے تھا؟“

”اس لیے کہ تم سوئے والے عظیم الشان ذخیرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔“ وہ محسوس لہجے میں بولا ”نہ صرف دیکھ چکے ہو بلکہ اس طرف رسائی حاصل کرنے کے طریقہ کار سے بھی واقف ہو۔“

”تت..... تمہارا مطلب ہے.....؟“ میں نے جملہ ادھر ادھر چھوڑ کر بدھا کے عظیم الجثہ جسم کی طرف حیرت بھری نظر سے دیکھا۔

”ہاں..... میرا یہی مطلب ہے!“  
 ”اوہ!“ بے ساختہ میری زبان سے ادا ہوا۔

ڈاکٹر موگ نے ظہرے ہوئے لہجے میں کہا ”کچھ لوگوں کا ان بھول بھلیوں والی راہ داریوں تک رسائی حاصل کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جی فوڈ کی ٹیم کو عبادت گاہ کے خانے سے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ ان کی معلومات کا وسیلہ کچھ بھی رہا ہو ہمیں اس سے غرض نہیں۔“

”ان کو حاصل ہونے والی معلومات کا ذریعہ صرف اور صرف رنی ہی ہو سکتا ہے۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا ”چاہے رنی نے یہ معلومات اپنے تئیں فراہم کی ہوں۔ یا پھر ساحل کے دماغ سے نکالی ہوں!“

”ساحل کے دماغ سے نکالنے والی بات سمجھ میں نہیں

آری۔“ وہ اچھے ہوئے لہجے میں بولا ”اگر ربی اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو پھر ساحل کو اسرائیل سے ٹھنڈا بھیجے گی کیا ضرورت تھی اس کے دماغ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ربی کے آدمی یہاں عبادت گاہ میں کارروائی کر سکتے تھے۔“

”تم بھی غلط نہیں کہہ رہے ہو ڈاکٹر۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”رہی کے آدمی بھی عبادت گاہ پر ایک چڑھائی کر چکے ہیں جس میں وہ بری طرح ناکام رہے مگر آج والی کارروائی بہت منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس دے خانے اور بھول بھلیوں تک رسائی بہت کچھ سونے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آج شام ہی ساحل بھی ان کے ہاتھ چڑھی ہے۔“

ڈاکٹر موگ نے نئی نئی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں بڑی کھوج تھی۔ مشکل کی ناکانی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات بڑے مختلف رنگ میں اجاگر ہو رہے تھے۔ چند لمحوں تک مجھے دیکھنے کے بعد وہ کھیر آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

”کیا تم ایسا سوچ رہے ہو کہ آج شام کے بعد ہی ساحل کے دماغ سے اس دے خانے سے متعلق معلومات حاصل کی گئی ہیں؟“

”میں کیا سوچوں گا“ حالات خود ہی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا ”دشمنوں کی پہلی اور دوسری یلغار میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق نتائج کی صورت میں بھی سامنے آ رہا ہے۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا اور لاشوں کے انبار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس دے خانے تک رسائی حاصل کرنے کے بعد بھی فوٹو اے آدمی پراسرار بھول بھلیوں میں بھی جا گھسے تھے۔ یہ کوئی معمولی اور نظر انداز کردینے والی حقیقت نہیں۔ جو لوگ اس دے خانے کے رازوں کے امین ہیں ان میں سے صرف ایک اس وقت ہمارے دشمنوں کے قبضے میں ہے اور وہ ہے میری ساتھی ساحل!“

میرے دونوں انداز نے ڈاکٹر موگ کو گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔ میں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سیدھا سیدھا پیش آمدہ حالات کا حقیقت پسند انداز تھی۔ یہ تھا اور ایسی تجزیہ نگاری کے لیے کسی خاص صلاحیت یا قوت کی ضرورت نہیں آتی۔

”اگر تمہاری بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساحل کے دماغ سے مذکورہ معلومات

کس نے نکالی ہوں گی۔“ ڈاکٹر موگ نے ایک خاص زاویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”پینٹاگرم اور دیگر روحانی علوم کا ماہر ہمارا دشمن تو اصرار اسرائیل میں بیٹھا ہوا ہے جب کہ ساحل پچھلے چند روز سے یہاں نیپال میں ہے۔“ تھوڑا توقف کر کے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو ربی وہاں اسرائیل میں بیٹھ کر یہاں نیپال میں ساحل کے دماغ کو کنٹرول کر رہا ہے؟“ ”میں فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے کہا ”میں نے موجودہ حالات میں جو دیکھا اور محسوس کیا وہی بیان کر رہا ہوں۔“

ڈاکٹر موگ نے کہا ”ساحل کے دماغ سے دے خانے کے بارے میں معلومات نکالنا اگر ربی کے اختیار میں ہوتا تو وہاں اسرائیل ہی میں یہ کام سرانجام دے چکا ہوتا۔ ساحل اس کے لیے اتنا قیمتی اور اہم مہرہ تھا کہ وہ اسے اپنے قبضے میں رکھ کر تمہیں اپنے سامنے بٹھنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ وہ ساحل کو اسرائیل سے نیپال روانہ نہ کرتا۔“

وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”رہی نہایت ہی مقیم المراجھل سے تم نے اس کے چنگل سے نکل کر اسے گہری چوٹ دی ہے اور اس کے بعد بھی اس ”گہری چوٹ“ پر پے در پے چوٹیں لگاتے جا رہے ہو۔ تم نے انہیں دیگر نقصانات کے ساتھ ساتھ درجنوں لاشوں کے تحائف بھی پیش کیے ہیں جس کے نتیجے میں ان دوائے فی ڈی اور ایف بی آئی والے وہاں اسرائیل میں تمہاری بوسھوٹے پھر رہے ہیں۔ تمہیں ”اسرینا دشمن“ کا ٹائٹل دیا جا چکا ہے۔ تم ان کی نظر میں وہ پاکستانی دہشت گرد ہو گئے وہ ہر قیمت پر تلاش کر کے عبرت ناک سزا دیے جا چکے ہیں اور اب۔۔۔“

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر تھوڑا وقفہ کیا پھر بولا ”اب تو یہ راز بھی فاش ہو چکا ہے کہ تم شون کی آئی ڈی پراس کی بھٹی لی یان کے ساتھ نیو آکرک (نیو جرسی) سے پرواز کر کے ترکی بھون (کھٹنڈو) پہنچے ہو (نیو آکرک اور ترکی بھون اسی اتر تیبہ نیو جرسی اور کھٹنڈو کے اتر پورس ہیں) تمہاری تلاش اور سرکوبی کے لیے اب تو سی آئی اے والے بھی سرگرم ہو چکے ہوں گے اور ربی جانتا ہے کہ تمہیں حکاکر نے کے لیے ساحل سے زیادہ تر کشش چار اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا اس لیے مالی ڈیزا۔“

اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اگر ربی نے

ساحل کے دماغ سے کسی بھی طرح اس دے خانے کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہوتیں تو وہ تمہیں پکڑنے کے لیے ساحل کو اپنے قبضے میں رکھتا۔ یوں اسرائیل سے نیپال نہیں بھیج دیتا۔“

ہمارے درمیان جو گفتگو جھڑپ تھی اس کا اختتام بہت دور نظر آتا تھا مگر وہ موقع اس بحث کے لیے مناسب نہیں تھا لہذا میں نے بات چیت کا رخ بدل دیا اور کہا۔

”یہ باتیں تو ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں ڈاکٹر۔ فی الحال ہمیں ساحل اور جی فوٹو اکو تلاش کرنا چاہیے۔“ ”میں۔۔۔ دیکھ اڑ۔“ وہ گہری تجزیہ کی سے بولا ”آؤ انہیں وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے لارڈ بدھا کے کنگ مائز جسے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ڈاکٹر کی ایک بات نے مجھے سوئے پر مجبور کر دیا۔ سی آئی اے والے اگر میری تلاش میں لگ گئے تو میری معمولی بات نہیں تھی۔ اب مجھے ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا تھا اور پھر اچھی طرح دیکھ بھال کر اسے زمین پر سے اٹھانا تھا۔

ہم جسے کے سامنے پہنچے تو ڈاکٹر موگ نے پرستی انداز میں میری جانب دیکھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں مشکل اٹھارہ کی تھی۔ مشکل اس زاویے پر رکھی کہ اس سے پھوٹنے والی روشنی پوری طرح ڈاکٹر کے چہرے پر نہیں پڑتی تھی جس کے باعث اس کے چہرے پر بڑے عجیب و غریب تاثرات دکھائی دیتے تھے تاہم میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

میں نے سیون ایم ایم لی یان کی طرف بڑھادی اور خود مجھے کی جانب بڑھ گیا۔ ڈاکٹر موگ نے اپنی کن کے ساتھ ہانے کیا کیا تھا۔ جب وہ ہم سے رخصت ہوا تھا تو میں نے دوسری سیون ایم ایم آؤ ٹیکر رائل اسے تھمادی تھی اور جب دوبارہ نظر آیا تو اس کے ہاتھ میں کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔

میں نے جسے کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس کے پاؤں کی طرف آ گیا۔ میں نے پہلے بائیں پاؤں کی ایڑی کی جگہ پھر کو ہلا اور پھر مکمل دوسرے پاؤں کی ایڑی کے ساتھ بھی نہرایا۔ اس کے بعد میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے جسے کے زیریں حصے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے دونوں پاؤں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہاں کا ٹھوس پتھر اپنی جگہ سے سلائیڈنگ کے سے انداز میں ہٹنے لگا۔ یہ سلائیڈنگ دو طرفہ تھی یعنی پتھر کا ایک حصہ دائیں جانب اور دوسرا بائیں طرف جسے کے وجود

کے اندر غائب ہو رہا تھا۔ میرے اور ڈاکٹر موگ کے لیے یہ کوئی حیرت انگیز نظارہ نہیں تھا لیکن لی یان مبہوت کھڑی اس پتھر کی سلائیڈنگ کو دیکھتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پتھر کی جگہ ایک کھڑکی نما خلا نمودار ہو گیا۔ اس خلا کا منہ بس اتنا سا تھا کہ وہاں سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی ہی اندر داخل ہو سکتا تھا۔

مشعل بردار ڈاکٹر موگ آگے بڑھا اور اس کھڑکی نما خلا میں داخل ہو گیا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھا اور کہا ”اب تمہاری باری ہے۔“

اس نے کوئی سوال کیے بغیر میری بات کی تقلید کی اور گرن مجھے تھا کہ ڈاکٹر کے پیچھے اس خلا میں اتر گئی۔ اس کے بعد میں بھی اندر پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے اندر سے بھی کھوکھلا تھا۔ بڑی محنت اور جاں فشانی سے تراش کر اسے اندر سے کھوکھلا کیا گیا تھا۔ اس حصے میں چار پانچ افراد بہ آسانی چل پھر سکتے تھے۔ یہاں سے مزید نیچے جانے کے لیے دائیں جانب تنگ سی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”وہ جان! اس راستے کو بند کر دو دھڑے گز کر ہم یہاں پہنچے ہیں۔“ میں آگے بڑھا اور اس خلا کی ایک تنگی دیوار پر لگا ہوا آہنی کبکھنچ کر وہ خلا بند کر دیا۔ دونوں پتھر بہ آہستگی سلائیڈ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آ گئے۔ باہر سے دیکھنے والا کوئی بھی محض یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس عظیم الجثہ جسے کے پیٹ کے اندر اس وقت تین جیتے جاگتے انسان موجود ہوں گے۔

میں اپنا کام ختم کر کے مڑا ہی تھا کہ فائزنگ کی صدا سنائی دی۔ وہ فائزنگ کسی اندرونی دروازہ سے آئی ہوئی تھی۔ ہم تینوں نے بے یک وقت چوک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یقیناً اس حصے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی موجود تھا۔ یا تھے۔۔۔ اور یہ خاصی تشویش ناک بات تھی۔

ڈاکٹر نے دھیمی آواز میں کہا ”تو میرا شک نما اندازہ درست نکلا۔ ہم سے پہلے بھی کوئی یہاں موجود ہے۔ فائزنگ کی آواز سے ظاہر ہوتا ہے وہ ہم سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ مجھے یقین ہے انہوں نے ہماری آمد کو محسوس نہیں کیا ہوگا۔“ ”میرا خیال ہے جی فوٹو اور اس کے دیگر ساتھی یہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ میں نے کھیر انداز میں کہا ”اور اغلب امکان یہی ہے ساحل اس وقت جی فوٹو کے قبضے میں ہوگی۔ ہمیں بہت احتیاط برتنا ہوگی!“

”اگر یہ بات ہے تو پھر جی فوٹو ساحل ہی کے توسط

ہم دائیں جانب بنی ہوئی تنگ سیڑھیوں کی طرف  
 بڑھ گئے۔ بارہ اسٹیپ کا وہ زینہ اتر کر ہم نیچے پہنچے تو خود کو  
 ایک تہ خانے میں پایا۔ گویا اب ہم دہ دہ تہ خانے میں کھڑے  
 تھے۔ دہ تہ خانہ بھی ایک وسیع و عریض عمارت پر مشتمل تھا۔ میں تو  
 یہاں پہلے بھی آچکا تھا لیکن ڈاکٹر سومگ کے انداز سے بھی  
 یہی معلوم ہوا کہ وہ بھی اس عظیم الشان خزانے سے واقف  
 نہیں البتہ نیاں دیدے بھاڑ بھاڑ کر ایک جانب دیکھ رہی  
 تھی۔

اس وقت لی یان کی تمام توجہ بدھا کے اس مجھے پھر کو دھکی جو ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر اساتذہ تھا۔ مشعل کی روشنی میں اس مجھے سے منکس ہونے والی طلا کی چمک نے لی یان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ دس فٹ قامت کا بامک مجھ سے ٹھوس سونے کا بیانا ہوا تھا۔

لیا جان کی محویت کو فارنگ کی آواز نے توڑ دیا۔ اس غار میں ایک مرتبہ پھر گولیاں چلی تھیں تاہم اس بار فارنگ کی آواز کے ساتھ انسانی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ غار کے کسی دور افتادہ حصے میں زبردست قسم کی خون ریزی جاری تھی۔

میں ساحل کی طرف بے انتہا شکر تھا۔ اگر اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جاتا تو مجھے یوں ہی محسوس ہوتا جیسے کسی نے میرے جگر میں زہر میں پینچا ہوا خنجر اتار دیا ہو گا۔ یہ کہ یہاں خطرناک فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے جتنی لچے میں ڈاکٹر کو تک غائب کر کے ہوائے کہا۔

”ڈاکٹر! میری سائل کو کچھ نہیں ہونا چاہیے!“  
 ”لارڈ بدھانے چاہا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ وہ یقین سے  
 بولا۔

میں نے محسوس کیا ان لحاظات میں میں انتہائی جذباتی اور ڈاکٹر موگ انتہائی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اپنے اپنے درجہ و پستی کی بات ہوتی ہے۔ اس عبادت گاہ اور اس کے تہ خانے میں پوشیدہ ان مول خزانے کے سلسلے میں ہم دونوں کی ڈگری آف انجمنٹ میں نمایاں فرق تھا۔ میری جذباتیت ساحل کے حوالے سے بھی اور اس کی سنجیدگی کا تعلق اس بیش بہا خزانے کی حفاظت اور عبادت گاہ کے تقدس سے تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے متعقد کو پیش نظر رکھے ہوئے تھے۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ اس تہ خانے میں ہمارے دھن دی مگھے بیٹھے تھے۔ میں نے

اس کشادہ محسنِ نثار کے آخری سرے تک نگاہ دوڑائی اور ڈاکٹر مومک سے کہا۔  
 ”تم لوگ یہاں رک کر میرا انتظار کرو۔ میں ادھر کی خبر  
 خبر لے کر آتا ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”اندر ہم تینوں آئے ہیں آگے بھی ہم ایک ساتھ ہی ہو چکے ہیں۔“

وہ وقت بحث و مباحثہ کے لیے ٹھیک نہیں تھا لہذا میں نے آگے قدم بڑھا دیے۔ ڈاکٹر نے چند قدم آگے آنے کے بعد کہا ”تم حق دلوں سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر سائبر پر چلا ہوں۔ ہمیں ایک نئی بنا کر پیش قدمی نہیں کرنا چاہیے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ ایک طرف کھٹک گیا۔ مصلیٰ اس کے ہاتھ میں بھی لہذا ہمارے ماحول میں روشنی نہ تھا تو ہم کوئی۔ میں لی یان کو آڑ میں رکھتے ہوئے، کن تھاے آگے بڑھنے لگا۔ وہ دارے اپنے اختتام پر ایک سرنگ جیسے راتے میں بدل جاتی تھی جو آگے جا کر مرکز تک پہنچ جاتی اور اس کے ساتھ ہی اپنی بجلی بھی کھو کر اوجھک کر چلا جاتا تھا۔

ہم اس وقت جس غار میں سے گز رہے تھے اس کی سنگلاخ دیواروں پر بھی طلائی چمک موجود تھی۔ اگر نکل نظر کرنا اس چمک کا نظارہ دیکھا جاتا تو آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں جی کہ غار کی زمین میں بھی سونے کی آبروز موجود تھی۔ بالاعداد چھوٹے بڑے سونے کے ٹکڑے بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو کوئی سونے کا پہاڑ وہیں کے اندر سونے ہی کا بدھا کا مجسمہ استادہ کر دیا گیا ہو اور شاید یہی حقیقت تھی۔

اس کشادہ غار کے اندر بائیس تین چارنگ اور چھ چھوٹوں والی سرنگیں بھی نکلتی تھیں جن کی ٹھوس اور ہموار دیواریں بھی خالص سونے کی تھیں مگر ہم اس وقت جس سرنگ کی طرف بڑھ رہے تھے وہ قدرے کشادہ تھی۔

چارنگ اور انسانی بیچوں کی آواز اسی سمت سے ابھری تھی۔

پھر ایک جتہہ بنائی دیا۔ وہ ایک مردانہ جتہہ تھا جس میں ہلاک و رغبت اور دیوانگی پائی جاتی تھی۔ یہ آواز بھی اسی سرگ کی طرف سے آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہاں کسی مشعل کی روشنی بھی حتمی ہوئی دکھائی دی۔ کوئی مشعل بردار اُدھر سے اُدھر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیوانگی بھرا جتہہ دوبارہ بلند ہوا۔ اب الفاظ واضح طور پر سمجھ میں آرہے تھے۔ وہ بڑے سرور میں ہوتا تھا۔

”آہا..... ہاہا..... ہاہا.....“ اس کی آواز میں کسی کم

ظرف فاتح کا سانچہ جھلکتا تھا۔ ”میں نے سب کو ختم کر دیا۔ اب کوئی مجھ سے حصہ نہیں مانگے گا۔ کوئی بزارے کا مطالبہ نہیں کرے گا کیونکہ میرے سوا کوئی زندہ ہی نہیں بچا۔“

وہ ایک لمحے کو سوسٹھ ہوا پھر ایک اور قہقہہ بلند کر کے  
ہوئے اسی بدستی میں یونان چلا گیا "اُس سونے کے ذخیرے کا  
میں اکیلا مالک ہوں۔ کوئی مجھے سے سوال نہیں کر سکتا۔ میں کسی  
کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔۔۔۔۔ ربی کو بھی وہ انہیں نکلے دوں گا۔ اب  
دینا کو پتا چلے گا، جی کسی طاقت کا نام ہے۔ میں یہ سارا سونا  
خاطر پیٹنے سے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ میں  
بھی فوج!..... دینا کا امیر ترین شخص بن جائے گا۔ آہ.....

بابا بابا..... آئی دوڑی دی کنگ آت دی ورنہ!۔۔۔  
صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔ جی  
نونا اپنے ساتھیوں کو اس سرگ میں فنا کے گھاٹ اتار کر  
واپس آ رہا تھا۔ اس کے الفاظ کی لڑکھانٹ اور آواز کے  
زبردحم سے محسوس ہوتا تھا وہ اس وقت گھرے نئے میں  
ہے۔ بتائیں یہ کیا تھا۔ دوشربا مٹی ڈوب کر تو اس اہم  
مشن پر نہیں نکل سکتا تھا۔ یقیناً یہ اس سونے کے ذخیرے کا  
علم تھا۔

اس دوران میں ڈاکٹر مومج بھی ہمارے قریب آ گیا۔  
یوانے کی یہ تمام تربیہ اس نے بھی سنی تھی۔ صاف ظاہر تھا  
ہمارے مقابل اس وقت بھی اکیلا تھا اور اس کی آواز کی...  
ڈاکٹر اہٹ اطلاع فراہم کر رہی تھی کہ اس سے منٹوں کے لیے  
کسی بل تیلی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ہم ایک پتھری دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔  
 ہماری یہ دیوار سرنگ میں سے باہر آنے والے کو نظر نہیں  
 آ سکتی تھی۔ ڈاکٹر مونگ ہماری طرف آتے ہوئے مشکل کو  
 دوسری دیوار ہی میں اٹکا آیا تھا۔ ادھر روشنی کم ہونے کے  
 باعث ہم کچھ زیادہ ہی محفوظ ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر مونگ نے دھیرے سے سرگوشی کی "سو نے کی  
 ہلکے ہلکے اس گدھے کا داغ دیا ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے۔  
 بگیا اور ہوس پرست انسان جب کسی ایک جگہ پر اتنی بیش بہا  
 دولت کو دیکھ لیتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو جاتی  
 ہے۔ ادھر بھول بھلیوں دالی راہدار یوں میں بھی کچھ ایسی قسم کی  
 مروت حال پیش آتی تھی۔ وہ سب آپس میں لڑ کر ختم  
 ہو گئے۔ مجھے ان کی لاشیں ڈھونڈ کا کام کرنا پڑا۔"

جب ڈاکٹر نے مجھے بھول بھلوں والی کہانی سنائی تھی تو  
 ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے خود  
 ڈاکٹر ہی نے ان دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا ہو لیکن جی فونڈ کا

”اقبالِ جرم“ ڈاکٹر کے بیان کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔ یہاں کی سچویشن کے مطابق، جی کا حالت دیوانگی میں کہا ہوا ایک بھی لفظ سنا کہ درجہ رکھتا تھا کیونکہ تمام تین ثبوت بھی یہاں موجود تھے۔

میں نے ڈاکٹر کی سرگوشی کی روشنی میں کہا ”اگر سونے کے اس ذخیرے کو دیکھ کر کسی لالچی انسان کی ایسے ہی مت ماری جانی ہے تو پھر پھر رہی موشے ہائمن کو یہاں لاکر چھوڑنا چاہیے۔ وہ بھی اختیار اور اقتدار کی جھوک میں مرا جا رہا ہے۔ پوری دنیا پر حکمرانی کا خواب اسے ایسی خطرناک مہم جوئی پر اکساتا رہتا ہے۔“

”موٹے ہاتھن بڑا سانا ہے۔“ ڈاکٹر موگے نے زہریلے لہجے میں کہا ”وہ ایسے بھی تھی جے ہوئے بٹھے میں براہ راست اپنی ٹانگ نہیں بھنساتا۔ اس کے پاس ایسے مشنر کے لیے قربانی کے چاروںوں کی کمی نہیں۔ وہ اس آگ میں ہمیشہ اپنے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کو جھونکتا ہی آیا ہے۔ دئیے بھی ایسے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کا کیا فائدہ جو دقت پر ”کام“ نہ آسکیں! جی فوڈا ہر مارڈیو اور غریب نکلن ایسے ہی جاں نثاروں میں شمار ہوتے ہیں۔“

ڈاکٹر نے لفظ ”کام“ پر خاص زور دیا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھ لیا ”تمہاری گن کہاں ہے ڈاکٹر سوگ؟“

”ایک محفوظ مقام پر پڑی ہے۔“ اس نے سٹا آواز میں جواب دیا۔

اس کا یہ جواب اتنا معنی خیز تھا کہ میں کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اگر میں اس سے مبینہ محفوظ مقام کے بارے میں استفسار کرتا تو ممکن تھا وہ کہتا کہ محفوظ مقام ایک انتہائی ناقابل عبور سدِ دنیا میں واقع ہے۔ میں چونکہ اس کے اساطیل سے واقف تھا اس لیے مزید کہہ نہیں کی۔ اگر اسے کوئی بات نہیں بتانا ہوتی تھی تو وہ ایسی ہی مثال منول سے کام لیتا تھا۔ میں نے سرگِ دالے کھلے سرے پر لگا ہٹا دی اور جی فوٹو کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس نے خمار کی حالت میں اپنی زبان سے جو الفاظ ادا کیے تھے ان میں میری سائل کا کہیں ذکر نہیں تھا اور میرے لیے یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ جی فوڈا نے پتہ لگاتے ہوئے بڑے فخر سے کہا تھا..... ”میں نے سب کو فخرم کر دیا۔“ میری سائل ”سب“ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی ایک ہوا گانہ بیہوش تھی۔ میرے دل کو یہ تقریت حاصل تھی کہ سائل کو اشاء اللہ کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس تعقبت میں ڈاکٹر موگ کا بھی حصہ شامل تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا لاڈ بڑھانے چاہتا ہوں کچھ بھی نہیں ہوگا ڈاکٹر موگ اگر پورے اعتماد سے کوئی بات کہتا تھا تو وہ خالی خالی نہیں ہوتی تھی۔

ہماری گہری توجہ کے دوران میں تنگ سرگ کے اندر مشعل کی روشنی ٹھہرتے ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اس کا یہی مطلب تھا، جی تو خدا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ سرگ میں پیچس فٹ سے زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے آگے وہ اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ سیدھے کھڑے ہو کر چلنا ممکن نہیں تھا۔ جی تو خدا بھینا سرگ کے سامنے دالے جسے ہی میں تھا۔

ڈاکٹر موگ نے ایک حیرت انگیز انکشاف کرتے ہوئے بتایا ”اس غار سے نکلنے والی یہ واحد سرگ ہے جو آگے..... بہت آگے جا کر انہی بھول بھلیوں سے جا ملتی ہے جہاں سے میں نے دشمنوں کی لاشیں ڈھوئی ہیں۔ بدھ عبادت گاہ والے اس عظیم المرتبت پہاڑ میں راہدار یوں اور بھول بھلیوں کا ایک ایسا جال پھیلا ہوا ہے جسے سمجھنا کسی لالچی اور فشی ذہن رکھنے والے انسان کے بس کا درجہ نہیں۔“

”پھر تو اس خزانے کی حفاظت کی ضرورت.....“ میرا وہ سرگوشانہ جملہ اور وارہ گیا کیونکہ اسی لمحے جی تو خدا سرگ سے باہر نکل آیا تھا۔ میں اپنی بات نامکمل چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے تہمتوں کے دورانیے میں مجھے معذہم ہوا تھا کہ وہ جی تو خدا ہے۔

میں نے ڈاکٹر کی طرف استفسار یہ نگاہ سے دیکھا تو اس نے گردن کی خفیف سی جھنجھ سے میرے استفسار کا جواب دے دیا۔ گویا اس نے اس شخص کے جی تو خدا ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔

جی تو خدا ایک قد آور اور مضبوط البدن شخص تھا۔ سر کے بال بڑھے ہوئے اور بے ترتیب۔ ز پرناک ہماری موچیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں بھل تمام رکھا تھا۔ قدموں میں لاکڑا ہٹ اور آنکھوں میں ایک عجیب سی مستی نظر آتی تھی۔ وہ ایک تک بدھا کے طلائی ٹھوس جسے کی طرف دیکھتا رہا پھر چونک کر بڑبڑایا۔

”یہاں یہ لائٹ کیسی نظر آ رہی ہے۔!“ اس کی بڑبڑاہٹ مشعل کی روشنی کے بارے میں تھی۔ میں نے اپنی من ڈاکٹر موگ کو تسلی اور اطمینان کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

یہ میرا ایک اضطرابی عمل تھا۔ جی تو خدا کو دیکھ کر مجھے خود

پر اختیار نہیں رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو میری ساحل کے بارے میں جانتا تھا۔ اگر جانتا تھا تو مجھے بھی بتا سکتا تھا۔ میں اس کی زبان کھلو کر ساحل کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ ڈاکٹر موگ نے مجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے غصے روکنے کی کوشش نہیں کی اور لی پان کے ساتھ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔

اچانک ایک انسان کو اپنے سامنے جا کر جی تو خدا پکڑا کر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں میچا میں اور بگڑے ہوئے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا ”تم کون ہو؟“

انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی بادشاہ سلامت کی حیرت شخص سے بات کر رہا ہو۔ وہ تھوڑی دیر پہلے سستی میں خود کو مستقبل کا چہ انیسو تو دیکھ کر ہی چکا تھا۔ جو شخص خود کو گنگ آف دی ورلڈ کہنے لگے اس سے کسی بھی روپے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں نے اس کے بھل دالے ہاتھ پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا ”میں ڈیریم بریکر ہوں۔ احفانہ خوابوں کو بچنا چور کرتا ہوں۔ جو لوگ پوری دنیا پر عکراتی کے خواب دیکھتے ہیں میں ان کی ایسی کہنیں کر دیتا ہوں چاہے وہ مونے ہائیں ہو یا اس کا شیر خوار جی تو خدا!“

میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ چونکا اور اس کے ساتھ ہی اس کا بھل والا ہاتھ بڑی سرفت سے حرکت میں آیا۔ میں اگر پہلے سے بھل کو گاہ میں نہ رکھتا تو بھینا اس موقع پر مار کھا جاتا۔ جی تو خدا نے مجھے شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوشش ان معنوں میں کہ اسے اس عمل میں کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ میں گولی چلنے سے پہلے ہی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ کے زاویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک ہائی جپ لگا لی اور پلک جھپکتے میں اس کے کندھوں پر سوار تھا۔

میں نے وہاں صرف ایک لمحہ قیام کیا اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ایک زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے پیچھے کو چلا گیا۔ میرے پاؤں کی خطرناک ٹھوکر نے اس کے ہاتھ سے پستول تو نہ چھڑایا تاہم اس دوران میں وہ فریگر پر انگلی دبا چکا تھا۔ غار کے مہیب سناٹے میں گولی چلنے کی مخصوص آواز ابھری لیکن میں محفوظ رہا۔

پہلی نا کامیابی کے بعد وہ خوں خوار انداز میں میری جانب پلٹا لیکن اس کا بھل والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں نے لات چلا دی۔ زوردار ڈنڈا اس کلک اس کی کلائی پر لگی۔ اس مرتبہ وہ گن پر گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ بھل اس کے ہاتھ سے نکل کر دروازہ چا کر۔

اس نے سر کو جھپکتے ہوئے ہوش و حواس میں آنے کی

کوشش کی اور مشعل سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اسے کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ جی تو خدا کی مناسب سی خاطر تواضع بہت ضروری تھی۔ مجھ سے جسم کے مختلف حصوں کی ”مالش“ کروانے کے بعد ہی وہ سونے کے طلسم سے باہر آ سکتا تھا۔ جب تک اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہ ہو جاتی اس کی زبان سے کام کی کوئی بات نہیں اگوائی جا سکتی تھی۔ اور مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا!

اس کے مشعل پر دراز ہاتھ کے حملے کو میں نے اندر آنے ہوئے ڈنڈا کو ہلاک کیا پھر اس کے سینے پر اپنی کلی پھینکی تاکہ ایک اسٹریٹ ہٹ دے دیا۔

اس پیش میں بے پناہ قوت چھپی ہوئی تھی۔ وہ لاکڑا تے ہوئے قدموں کے ساتھ جا رنٹ پیچھے چلا گیا۔ میں نے اسی وقت ایک لہسا اسٹیپ لے کر سائڈنگ تک مار دی۔ میرے پاؤں کی دھواں دھار ٹھوکر اس کی پسیلیوں میں لگی اور وہ مشعل سمیت پیچھے کو الٹ گیا۔

میں اطمینان سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسے ایک انہونی میں گرفتار پایا۔ اگر پیچھے کو الٹتے ہوئے اس کے ہاتھ سے مشعل نکل جاتی تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوتا۔ ایسا نہیں ہوا چنانچہ مشعل کے شعلوں نے لباس بغل گیر ہو کر جی تو خدا کو ایک مصیبت میں ڈال دیا۔ اس کا لباس آگ بجڑ چکا تھا۔ وہ مشعل کو ایک جانب جھپکتے ہوئے خود کو پھینکا رہا تھا۔ یہ اضطرابی کوشش دراصل آگ بجھانے کے لیے تھی۔ وہ مجھے بھول کر خود کو بجھانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔ اچانک کوئی افتاد ٹوٹ پڑے تو انسان اپنے بارے میں پہلے سوچتا ہے!

مگر میں اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ تاہم میرے دل و دماغ کے غصے نے اسے جھپکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح کم از کم وہ مکمل ہوش و حواس میں تو آ جاتا۔ آدھے منٹ کی ”تنگ دود“ کے بعد وہ اپنے لباس میں لگی آگ بجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کوشش کے دوران میں اس کے سر کے بال بھی اچھے خاصے بھل کر رہ گئے تھے۔ بے ترتیب بڑھی ہوئی کوئی جھازی ہو یا سر کے بال ہوں کوئی بھی بن بٹائی مصیبت لا سکتے ہیں۔

وہ ایک جھپکنے سے اٹھ کر بیٹھا پھر اگلے ہی لمحے کھڑے ہوتے ہوئے میری جانب دیدے پہاڑ چا کر دیکھنے لگا۔ اب اس کی حالت کافی حد تک ”نیشنل“ چلی تھی۔ وہ نہ اندر مٹکی والی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ وہ آنکھیں کھول بیچ کر تھوڑی دیر تک مجھے پیچھا کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر لرزتی ہوئی

آواز میں بولا۔

”وہاں..... تم..... اور یہاں.....؟“

وہ ہماری پہلی ”ملاقات“ تھی۔ زندگی میں میں نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا اس نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ مجھ سے شناسی نکل آنے کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ اسے میری تصویر دکھائی گئی ہوگی۔ میں اس وقت اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا۔

میں نے اس کی حیرت میں گرہ لگاتے ہوئے طرہ یہ لہجے میں کہا ”چھا ہوا تم نے مجھے پہچان لیا ورنہ پتا نہیں اپنی شناخت کرانے کے لیے مجھے جہیں کون سے جہنم میں پھینکا پڑتا۔ یہ تھوڑا سا جھلسا کام دکھا گیا۔ اب شرافت سے یہ بھی بتاؤ میری ساحل کہاں ہے؟“

”ساحل..... کون ساحل؟“ وہ مجھ پر نگاہ جھاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”اگر تم مجھے دیکھ کر پہچان گئے ہو تو بھینا میری اور ساحل والی کہانی سے بھی واقف ہو گئے لہذا ان جانے پن کی ادکاری کا تم نہیں آئے گی۔ میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جسے تم نے آج شام ہائی دے والی ہستی سے انوا کیا تھا..... اور وہاں کے ایک گھر میں آدھین مصوم افراد کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے دروازے کی کھڑکی میں انکا ہوتا ہوا بیچا ہوا اقرار جرم بڑھ لیا ہے۔ نہ صرف بڑھ لیا ہے بلکہ اسے متعلقہ شخص یعنی ڈاکٹر موگ ریفرنس کو بھی پڑھوا دیا ہے۔ اب تو تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا“ میں کس ساحل کی بات کر رہا ہوں؟“

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے مستفسر ہوا ”مگر تم تو امریکا میں تھے؟“

”ہاں“ کبھی میں امریکا میں تھا۔ اب یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔“ میں نے سفاکی سے کہا ”اور پندرہ سینڈ کے اندر اگر تم نے مجھے ساحل کے بارے میں نہ بتایا تو ہو سکتا ہے“ میں تمہاری قبر پر یہ کتبہ نصب کرتا ہوا پایا جاؤں..... یہ ایک خارش زدہ کتے کی قبر ہے۔ یہاں آنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ فاصلہ برقرار رکھیں ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

ادھر میں نے اپنی بات پوری کی ادھر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے وارے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی مارشل آرٹس سے واقفیت رکھتا تھا۔ پہلے وہ کسی طلسمی کیفیت کے تحت ہاتھ پاؤں چلاتا آیا تھا اب باقاعدہ ہوش و حواس میں وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔

اس نے ہوا میں اڑتے ہوئے مجھے فرنٹ فلائنگ کلک ماری۔ میں دو قدم پیچھے کو ہٹا اور اس کی کلک کو ہلاک کرتے ہوئے ایک سائیڈ میں نکل گیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور مجھے فرنٹ جرک کلک مارنے کی کوشش کی۔

میں نے ایک دم نیچے بیٹھتے ہوئے بیک سوئپ چلا دی۔ میری پنڈلی کی جھٹکے دار ضرب نے اس کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ پشت کے بل غار کے پتھر پر فرش پر جا گرا۔ پشت کے بل گرنے سے سب سے زیادہ نقصان تشریف کو پہنچتا ہے۔ وہ بھی جسم کے مذکورہ حصے کو سہلاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اسی وقت تین کلک کا کبھی نیشن بنایا۔ میری لیٹ رائڈر ہاؤس تیزی سے چلی۔ وہ تھوڑا پیچھے ہٹا تو میں نے رائٹ رائڈر ہاؤس محمدی اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی بڑی سرعت سے وہیں کلک ماری۔

میری دونوں رائڈر ہاؤس گیس سے تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچا مگر ڈبل کلک نے اس کے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ میرے پاؤں کی ایڑی نے اس کی کھوپڑی بجا کر رکھ دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کو گیا تو میں نے فائنل ٹچ لگاتے ہوئے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک بھر پور سائیڈ فلائنگ کلک بھی لگا ڈالی۔

جی نوڈر اڈم گایا اور پھر لڑھکتے ہوئے دور تک چلا گیا۔ اس کے لڑکھڑاؤ کا اختتام اس طرف ہوا جہر دیوار میں ہمارے والی مشعل بھی تھی۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ چاروں خانے جت پڑا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے غرا کر کہا۔

”میں ساحل کے بارے میں تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم یہ سنہری موقع متوا کر موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“

ایک لمبے کوچھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے سوال کا جواب دینے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن یہ اس کی طرف سے ایک تاثری دھوکا تھا اگلے ہی لمحے اس نے جو حرکت کی وہ کسی بھی مارشل آرٹس کو زیب نہیں دیتی۔

جی نوڈر اٹنے دونوں ہاتھوں سے میرے بوٹ پر پش پاؤں کو تھاما اور گردن اٹھا کر میری پنڈلی پر کانٹنے کی کوشش کی۔ یہ بہت ہی ٹھنڈا اور عجیب عمل تھا۔ وہ ایک نچا آرٹس ثابت ہو رہا تھا لہذا میں نے اسے اس حرکت کی فوری سزا دی۔

میرا آزاد پاؤں بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کی ایک غلام ٹھوکر جی نوڈر کی ٹھوڑی پر پڑی۔ اس کے

طنق سے ایک دردناک جھج بھرا آواز ہوئی اور وہ میرے پائوں کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اسی کے سینے پر سے پاؤں کا پھیل لیا اور بیک سرسالت لگاتے ہوئے چارنٹ دور چلا گیا۔

جی نوڈر اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے دونوں ہاتھوں نے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا وہ دوبارہ زیادہ خون خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوگا لیکن کم ظرف اور چٹا انسان ہمیشہ کمینی حرکت ہی کرتا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور غار کے اس حصے کی جانب دوڑ لگا دی جہر دیوار سے باہر نکلنے کا راستہ واضح تھا۔

اس نے واضح طور پر فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں اس کی کوشش کو کامیاب ہونے دیتا تو میرا نام وجدان نہیں تھا۔ میں نے لپک کر اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دی اور دس فٹ آگے جا کر اسے پایا۔ وہ اس وقت غار سے باہر پہنچانے والے ننگے سے زینے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے اس کی پشت پر ایک فرنٹ فلائنگ پش کلک جڑ دی۔

وہ اس جھٹکے سے مستحیل نہ پایا اور منہ کے بل پھریلے فرش پر جا گرا۔

میں اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ تاہم اس مرتبہ میں نے اتفاقاً سلسلہ برقرار رکھا کہ وہ کوئی ایسی دیکھی اور کبھی حرکت نہ کر سکے۔ چند لمحات کے بعد وہ گھٹنوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میری نگاہ اس کے چہرے پر لگی اور میں چونک اٹھا۔

جی نوڈر کا چہرہ لہلہا ہوا ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ سبکی فرش سے منہ کے بل ٹکرانے کا نتیجہ تھا یا میرے پاؤں کی مشعل ٹھوکر نے اس کے چہرے اور منہ سے لہو چھڑا دیا تھا۔ میں نے اپنے وزنی بوٹ سے اس کی ٹھوڑی پر جو ٹھوکر برسائی وہ دونوں اور زبان کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد ناک منہ سے خون جاری کرنے کے لیے بہت متفہم تھی۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر کھڑا ہوا اور خون خوار نظر میں مجھے تولے لگا۔ غار کے اس حصے میں روشنی ناکافی مقدار میں پہنچ رہی تھی۔ لہذا خون آلود گھائل چہرہ بڑا بھیانک منظر پیش کرتے لگا۔ کوئی راہ فرار نہ پا کر اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ خون بھرے چہرے نے اس وحشت میں آٹھ چاند لگا دیے مگر جی نوڈر کے حالات میں کوئی روشنی پیدا نہ ہو سکی۔ میں اس وقت جی نوڈر زینے کے درمیان کھڑا تھا۔ زینے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے راستے سے ہٹنا ضروری

تھا۔ ڈاکٹر موگ اور لی یان نے ایک مکمل چپ سادھ لی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سانس بھی نہ لے رہے ہوں۔ جی ابھی تک ان کی غار میں موجودگی سے آگاہ نہیں ہوا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا اس وقت ہم دونوں ہی وہاں موجود ہیں۔ جب سے اس کا مجھ سے سامنا ہوا تھا میں نے اسے سر کھانے کی فرصت نہیں دی تھی وہ کسی اور طرف دھیان بھی کیسے دیتا پھر لی یان اور ڈاکٹر موگ ایسے زاویے پر کھڑے تھے کہ ان کی طرف نظر بمشکل جاتی۔

جی نوڈر چند لمحات تک غصے، حیرت اور نفرت کے طے جلے تاثرات سے میری جانب دیکھتا رہا پھر نہ جانے مامند نہ بائے رفتن۔۔۔ کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے دوپٹے کے لیے فری لانس آگے بڑھا۔ میں نے ریزل کے طور پر اسے جھکا لی دی اور ایک سائیڈ میں نکلے ہوئے اپنا دایاں گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ یہ ایک ترچھی اور بھرپور ضرب تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر دھیرا ہو گیا۔

میں فائنل اسٹیپ مکمل کرنے کے بعد اس کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل ڈھائی فٹ کا فاصلہ حاکم تھا۔ میں نے اپنے قدموں پر کھڑے کھڑے اسے ایک بھر پور ریر (بیک) کلک لگا دی۔

وہ پیٹ کو تھامے مجھ سے ملنے والے مددے کو ”انجوائے“ کرنے میں غرق تھا۔ ریر کلک کے جھٹکے نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ دروغ کے بل جھٹکے جھٹکے کی قدم آگے نکل گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور لاگ اسٹیپ والی ایک دھواں دھار سائیڈ کلک اس کی تشریف پر جڑ دی۔

اس کی رفتار میں کمی گنا اضافہ ہو گیا اور وہ بوٹ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند سامنے والی پتھر کی دیوار کی سمت ”پرواز“ کر گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ مذکورہ دیوار سے ٹکرایا اور ”دھپ“ کی آواز پیدا کرتے ہوئے سبکی فرش پر اوندھا ہو گیا۔

دیوار سے ہونے والے انکڑاؤ بہت شدید تھا۔ اس تصادم کے نتیجے میں اس کے چہرے اور سر کو زیادہ نقصان پہنچا۔ وہ فرش پر گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کا جسم ہولے ہولے ٹھکر رہا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر اپنی مدد آپ کے تحت اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زمین پر بے بس پڑے دیکھ کر میں اس کی ”مدد“ کو لگا۔ آخر کو۔۔۔ یہ تو میرا فرض تھا!

اسی وقت ڈاکٹر موگ مشعل کو لے کر ہمارے قریب پہنچ گیا۔ مگر کو اس نے لی یان کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے مشعل کی روشنی میں جی کو سیدھا کیا۔ وہ بڑے تسلی بخش انداز میں زندہ تھا اور اس پر ہرگز شرمندہ نہیں تھا بس فی الوقت اٹھتے بیٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لی یان اور ڈاکٹر موگ کو اپنے قریب کھڑے دیکھ کر وہ اور بھی ٹھہرا گیا۔ ابھی تک وہ یہی سمجھ رہا تھا اسے صرف مجھ ہی سے ٹھنڈا ہوگا۔ دیے ایک بات سے لی یان اور موگ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ششاسانی کی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا وہ انہیں پہچان نہیں تھا۔ لی یان اس کے لیے ابھی بھی اور ڈاکٹر موگ ایک آپ کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا!

میں آگے کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس کے زخمی چہرے پر ایک زناٹے دار پتھر رید کرتے ہوئے کہا ”کچھ یاد آیا یا تمہاری یادداشت کو مزید دھونڈ پڑے گا۔ میں نے تم سے ساحل کے بارے میں پوچھا تھا؟“

ڈاکٹر موگ کے اشارے پر لی یان نے سیون ایم ایم کا رخ جی نوڈر کی جانب پھیرتے ہوئے اس کی خطرناک نال کو اس کی کھوپڑی سے لگا دیا۔ جی کی آنکھوں میں موت کے سایے لہرانے لگے۔ وہ متحش نظر سے باری باری ہم تینوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے لی یان اور ڈاکٹر موگ کو میرا۔۔۔ ساتھی سمجھا تھا۔

میں نے سفاکی سے کہا ”جی نوڈر! تمہارا کھیل بگڑ چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ تمہاری قسمت بگڑ جائے مجھے ساحل کے بارے میں بتادو۔ سچ بول کر تم اپنے لیے کچھ آسانیاں حاصل کر سکتے ہو!“

اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تو زبان کھولنا اس کی مجبوری بن گئی۔ مفاد پرست لوگوں کے لیے سب سے اہم ان کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لیے ہر قسم کی سودے بازی پر تیار ہو جاتا ہے جس سے اس کے گھائل لب ٹھہر تھرائے۔

”دہ لڑکی یہاں نہیں ہے۔۔۔“

”پھر کہاں ہے؟“ میں غرایا ”تم ہاں دے والی بستی سے اسے انوا کر کے اسے ساتھ ادھر ہی لائے تھے۔ جموٹ بولو گے تو تمہاری سانسیں ٹھٹ کر صفر کے برابر ہو جائیں گی۔ گلے بے تمہیں زندگی کی ضرورت نہیں رہی؟“

”میں جموٹ نہیں بول رہا ہوں۔“ وہ ٹھکیا ”میری بات کا یقین کرو۔ میں تمہاری سانس کی کو یہاں لے کر نہیں آیا۔“



# خواتین کے محدود صار پر آپ کی پسندیدہ مصنفات کے خوبصورت ناول

نیا نیا شریعت کی بارگاہ میں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی  
آزاد جودری  
سیپ صرف  
اور ساحل

صفحات 450 سے زائد  
قیمت 350 روپے

آسمہ مرزا  
ہری ہے شاخ  
تمنا ابھی

صفحات 850 سے زائد  
قیمت 450 روپے

صفحات 300 سے زائد  
قیمت 250 روپے

ماہ صہبہ اہم اے

بہتے پانی  
پہ مکان

صفحات 300 سے زائد  
قیمت 250 روپے

ماہ صہبہ اہم اے

دھوپ بارش اور سائے

صفحات 400 سے زائد  
قیمت 350 روپے

ماہ صہبہ اہم اے

یہ کیسا جیون

صفحات 176 سے زائد  
قیمت 125 روپے

ڈاکٹر خرقہ کی کتاب = 50 روپے

کتابیں اور بیانیہ کی مشور

74200 کی 74200

لطف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکے ہوئے سوال کیا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے یہاں تک پہنچنے والے تمہارے تمام ساتھی قتل ہو چکے ہیں؟“

اس نے متوجہ نظر سے مجھے دیکھا اور سر اسیدہ آواز میں بولا ”میں صرف ان تین کی موت سے آگاہ ہوں جو ادھر تک کی سرگ میں بڑے ہیں۔“

”اور تم سنی کی کیفیت میں ان کے قتل کا اقرار کر چکے ہو۔“ میں نے نگین لہجے میں کہا ”اور اسی قسم میں تم دنیا کے امیر ترین شخص بننے کا خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ کئی کہ اس وقت تو تم اپنے ربی مرلی کو بھی خاطر میں نہیں لارہے تھے۔“

اس کی آنکھوں میں موجود وحشت کی گنا بڑھ گئی۔ میں نے کہا ”بہر حال اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارے تمام ساتھی لقمہ اجل بن گئے تمہیں بھی جہنم کا اندھن بننا ہے۔ یہی اس عبادت گاہ کا دستور ہے اور یہی اس دہانے کی تاریخ ہے۔ کوئی بھی غیر متعلق شخص یہاں تک رہائی حاصل نہیں کر سکتا اور جو بد قسمتی سے ان خزانوں کو دیکھنے کا گناہگار ہو جاتا ہے بڑی سنگین موت مرتا ہے۔“

”مگر..... وہ بھلا کیا تم نے مجھے..... آسانیاں فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا.....؟“

”میں عہد شکن نہیں ہوں۔“ میں نے غصہ سے بولے لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھ اس کی گردن کی جانب بڑھا دیے۔

”جی! میں کیا کر رہے ہو.....؟“ وہ تڑپ اٹھا۔

”جی! میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔“ میں نے پکارنے والے انداز میں کہا ”میں اپنے ان ہاتھوں سے تمہیں دائمی آسانیاں فراہم کر رہا ہوں۔ اب تمہاری زندگی میں کوئی دکھ باقی نہیں رہے گا۔ بس ایک ہلکا سا جھکا۔“ میں نے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیا اور کہا ”اس جھکے کے بعد تمہیں زندگی کی تمام تر مشکلات سے نجات مل جائے گی۔ یہ یوں.....“

اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھوں نے مخصوص انداز میں ہلکا جی حرکت کی اور اس پر بہت غار میں جی کی گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوئی۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ہم تینوں تک کی سرگ کی جانب بڑھ گئے۔ وہ تین لاشیں دریافت کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہ ہوئی ان کے قریب ہی تین گھنٹہ بڑی ہوئی مل گئیں۔ ہم نے ان کو کمیت کر سرگ سے باہر نکالا تو ایک حیرت انگیز

”میں نہیں جانتا۔“ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں نے نگین لہجے میں کہا ”تم نے ساحل کو جو گندہ پال کے جس ٹھکانے پر پہنچایا ہے اس کا ایڈریس بتاؤ؟“

اس نے مجھے ایک عایشان بنگلے کا ایڈریس اور لوکیشن بتانے کے بعد کہا ”یہ پشور کا شہر ہے علاقہ اسرائیل ایسیسی کے پچھواڑے واقع ہے۔“

یہ علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا۔ تمام وہاں کے کسی بنگلے میں جانے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کمینڈو کے اس حصے میں زیادہ تر ملکوں کے سفارت خانے موجود ہیں۔ اسرائیل ایسیسی دراصل سیکرٹریٹ تو فعلیت انالین ایسیسی اور فرنیچ ایسیسی کے درمیان واقع ہے۔

میں نے جی نوڈر کو زندگی کے دکھوں سے نجات دلانے سے پہلے ایک اہم سوال کیا ”تم لوگ عبادت گاہ کے دہانے میں کیسے داخل ہوئے ہو۔ یہاں تک تو ہمیں صرف اور صرف ساحل ہی لاسکتی تھی اور تم اسے ڈین ہاروے کے پاس پھوڑ آئے ہو؟“

”میں نے تمہاری ساتھی کو لگ بھگ نو بجے رات جو گندہ پال کے بنگلے پر پہنچایا تھا۔ مجھے ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ طلب کر لیا گیا۔ دس بجے مجھے نئی ہدایت کے ساتھ عبادت گاہ پر چڑھائی کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ اس دہانے میں داخلے کا طریقہ کار بھی مجھے ڈین ہاروے ہی نے بتایا تھا۔“

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ ڈین ہاروے کوئی بہت ہی پیچھے ہوئی شے ثابت ہو رہا تھا۔ جیٹا دہانے میں داخلے کا راز اس نے ساحل ہی کے ذہن سے نکالا تھا۔ یہ سوچنا تو سرسراہٹ ہوئی کہ ڈین ہاروے ربی سے بھی اوپر کا کوئی آدمی ہوگا۔ بہر حال یہ بات طے تھی کہ ربی ہی نے اسے اسرائیل سے یہاں بھیجا تھا۔ اس معاملے کی انکوائری تو ڈین ہاروے سے ”طاعات“ کے بعد ہی ہو سکتی تھی!

میں نے ڈاکٹر موگ کا ایک مخصوص اشارہ پا کر جی نوڈر سے آخری سوال کیا ”تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ ساحل کو ہائی وے والی پستی میں شا کا کے گھر کے اندر رکھا گیا تھا؟“

”یہ اطلاع مجھے جو گندہ پال کے اسی خفیہ بنگلے سے ملی تھیں۔“

”یعنی ڈین ہاروے سے؟“

اس کی آنکھوں میں انباتی تاثر ابھرا۔

میں نے سوالیہ نظر سے ڈاکٹر موگ کو دیکھا۔ اس نے تائیدی انداز میں گردن کو مخصوص جھنجھ دی۔ میں جی نوڈر کی

”یہاں نہیں لے کر آئے تو پھر اسے تم نے کہاں پہنچایا ہے؟“

”میں نے اسے جو گندہ پال کے ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچایا دیا تھا۔“

”جو گندہ پال!“ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ”میری معلومات کے مطابق جو گندہ پال یہاں کمینڈو میں جنہیں ہر قسم کا کور دے رہا ہے۔ ساحل کا تعلق سر اسٹرم لوگوں کے مشن سے ہے پھر تم نے اسے جو گندہ پال کے کسی خفیہ ٹھکانے پر کیوں پہنچا دیا۔ جو گندہ کو ساحل سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی؟“

”میں تو حکم کا غلام ہوں۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا ”مجھے جو حکم ملا میں نے اس کی تعمیل کر دی۔ مجھے ساحل کو اس عبادت گاہ کی طرف لے جانے کے بجائے جو گندہ کے ٹھکانے پر پہنچانے کی ہدایت دی گئی تھی۔“

”اچھا! تو یہاں تم سے اوپر بھی کوئی ہدایت دینے والا بیٹھا ہوا ہے؟“

اس کی آنکھوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے تامل جھلکتا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی چہرے پر ایسے تاثرات بھی نمودار ہوئے جیسے اسے اس راز انشائی کی غلطی کا سنگین احساس ہو گیا ہو۔ میں نے سر دھلچے میں کہا۔

”یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے کوئی پکڑ دے کر قتل نہ کرو۔“

ربی کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے تمہارے پاس کوئی موقع باقی نہیں بچا۔ تم اتنا اگلے گھر آئے ہو کہ وہاں کی راہ نگاہ سے اوچھل ہو گئی ہے۔ تم میرے ساتھ تعاون کر کے ہی اپنے لیے کچھ آسانی حاصل کر سکتے ہو۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

”بتاؤ! تم نے کس شخص کی ہدایت پر ساحل کو جو گندہ پال کے ٹھکانے پر پہنچایا ہے۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا! ایسا حکم دینے والا جو گندہ پال نہیں ہو سکتا!“

”اس شخص کا نام ڈین ہاروے ہے۔“ وہ کمزوری آواز میں انکشاف کرتے ہوئے بولا ”وہ آج صبح ہی اسرائیل سے یہاں پہنچا ہے۔ ڈین ہاروے جو گندہ پال کے اس ٹھکانے پر ٹھہرا ہوا ہے۔“

”ڈین ہاروے اگر اسرائیل سے آیا ہے تو جیٹا اسے موٹے ہاتھوں نے بھیجا ہوگا!“ میں نے نفرت اُٹھ لہجے میں کہا ”اس نے میری ساحل کو اپنے پاس بلانے کا حکم کیوں دیا تھا؟“



انکشاف یہ بھی ہوا کہ ان لوگوں کی جیسیں سونے کی ڈلیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ سونے کے عظیم الشان ذخیرے کو دیکھ کر واقعی ان کے دماغ الٹ گئے تھے اور انہیں موت کے منہ میں دھکیلنے والا بھی نوعِ انسانی کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے اب کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ لالچ اور ہوس نے ان تمام لوگوں کی زندگیوں کے چراغ کل کر دیے تھے۔

میں نے کچھ عرصہ پہلے ماضی کی ایک یادگار فلم میکناز گولڈ دیکھی تھی جس میں چند افراد سونے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور بالآخر وہ سونے کے ذخائر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن نتیجہ وہی سامنے آتا ہے جو اس عبادت گاہ کے ذخائر میں ظاہر ہوا تھا۔ یہاں بھی آج رات میکناز گولڈ جیسی کہانی ہی دہرائی گئی تھی۔

ڈاکٹر مومک کے نزدیک عبادت گاہ کا تقدس بہت اہم تھا لہذا ہم سب نے کوشش کر کے اس عبادت گاہ کے اندر باہر اور ذخائر خانے میں موجود تمام لاٹوں کو عبادت گاہ سے باہر ایک چٹان کے نزدیک ڈھیر کر دیا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اپنے چھ ہندوں کی لاٹوں کو ان سے الگ کر دیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا ڈاکٹر مومک نے اپنے ذہن میں کیا منصوبہ پال رکھا ہے۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ دشمنوں کی لاٹوں کو ٹھکانے لگانے اور انہوں کی لاٹوں کو سنبھالنے کے بارے میں اس نے بھینچ کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ ان چھ افراد میں چار پولیس والوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ کسی نہ کسی قسم کی کارروائی تو بہت ضروری تھی۔

ہم ذخائر خانے کے تمام تر راستوں کو بند کر کے عبادت گاہ کے بالائی حصے میں آ گئے۔ اس وقت تک سپیدہ مخرمہ ہمارے ہو چکا تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اگلے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے انداز میں ایک خاص قسم کا اضطراب محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

ہمارے درمیان اس خوفناک واقعے پر مختصر بات ہوئی پھر میں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ”ڈاکٹر! اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں ساحل کی طرف جانا چاہیے۔“

”صرف دس منٹ اور رک جاؤ پھر چلتے ہیں۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے پوچھا ”تمہیں کسی کا انتظار ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی ”میں نے مارا ماری کے دوران میں موقع ملنے ہی شیوا کو نوٹ کیا تھا۔ اس وقت تک مجھے اپنے آدمیوں کی

ہلاکت کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں سے مزید کھنگھولنا ہے۔ مجھے انہی لوگوں کے پیچھے کا انتظار ہے۔ اس عبادت گاہ کو یونہی بے اسرارہ پہ سہارا نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

مجھے بے ساختہ ہی آگئی لیکن میں نے اس کے اظہار پر حتی الامکان قابو رکھتے ہوئے کہا ”میرا یہ خیال ہے۔ اور یہ خیال تجربے کی کسوٹی سے گزرنے کے بعد یقین میں بدل چکا ہے کہ اس عبادت گاہ کو درحقیقت کسی حافظہ کی ضرورت نہیں۔ اس کے ذخائر خانے کا طعم یا اس دور کا دلائی لایا تمہارا لارڈ بدھا یا میراجدا۔۔۔ تم کچھ بھی کہہ لو مگر اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہاں کی حفاظت کی خود کار نظام کے تحت ہو رہی ہے۔ ماضی میں بھی ایسے ہی واقعات ملیں گے جب کچھ لوگوں نے اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کی اور کتے بلیوں کی طرح مارے گئے اور ابھی تو وہی دیر پہلے پیش آنے والے واقعات تو میرے خیال کا تین ثبوت ہیں۔“ میں نے توڑا تو نف کا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”چاہے جیسے بھی معلوم کیا ہو لیکن ہمارے دشمنوں کو عبادت گاہ کے ذخائر خانے تک رسائی کا طریقہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے وہ عظیم الشان خزانے تک پہنچ بھی گئے لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ وہ سب کے سب عبرت ناک موت سے دوچار ہو گئے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ خزانہ مٹی ذہن رکھنے والوں کے لیے ہیں ہی نہیں۔ لہذا اس سلسلے میں تمہیں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ خزانہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے اپنی بات کو ایک گنبدی سوال پر اختتام دیا تو ڈاکٹر مومک زہر پل مسکرایا اور نہایت غم سے ہوئے کچھ میں بولا ”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن فرائض کی ادائیگی بھی بہت ضروری ہے۔“

اس نے آخری جملہ بڑے معنی خیز اور اچھے ہوئے انداز میں ادا کیا تو میں پوچھتا ہوں کہ ”تم کس فرض کی بات کر رہے ہو؟“

”فرض کرو ایک مریض کسی ایسے مرض کے فاسل سلیج میں ہے جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں رہی کہ اس کی موت اور اس کی زندگی کے درمیانی فاصلے کو بھی ناپا چکا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ چند دنوں یا چند ہفتوں کا مہمان ہے۔ تو کیا ایسی صورت میں ہم اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیں گے؟“

”نہیں نہیں ہمارا یہ رویہ سراسر غیر انسانی ہوگا۔“ میں

نے کہا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا ”فرض کرو کوئی اسٹوڈنٹ بہت ہی ذہین اور قابل ہے۔ اس کے اساتذہ کو معلوم ہے کہ اگر اسے مشکل سے مشکل تر امتحان میں بھی بٹھا دیا جائے تو وہ جہلی پوزیشن حاصل کرے گا لیکن کیا ایسا ممکن ہے کہ امتحان لیے بغیر ہی اسے ڈگری دے دی جائے صرف یہ سوچ کر کہ یہ تو اس کا حق بنائے؟“

”ڈگری تو اسے اس وقت ملے گی جب وہ امتحان میں بیٹھ کر اپنی لیاقت کو ثابت کر دے گا۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”بس تو ثابت یہ ہوا کہ ہر کام کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔“ وہ غم سے ہوئے لہجے میں بولا ”یقینی موت کے قریب کھڑے مریض کا علاج کرنا قابل ترین اسٹوڈنٹ کا بھی امتحان لے کر اسے شعلیت جاری کرنا اور کسی ذخائر خانے میں پوشیدہ راز کی حفاظت کرنا اپنی اپنی نوعیت کے ایسے تقاضے ہیں جو فرائض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جس پر جو فرض عائد ہوتا ہو اسے اس فرض کو ضرور ادا کرنا چاہیے۔“

ڈاکٹر کی بات ختم ہوئی تھی کہ عبادت گاہ کے باہر بیوی انجن والی گاڑیوں کا مخصوص شور سنائی دینے لگا۔ ڈاکٹر مومک نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر! لگتا ہے تمہاری طلب کی ہوئی کھ آگئی ہے۔“

وہ اٹھا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کھڑکی کے پاس چلا گیا جہاں سے دور تک وہ سیدھا راستہ دکھائی دیتا تھا جو کبھی سے اس عبادت گاہ تک آتا تھا۔ ایک لمحے بعد ہی وہ کھڑکی کے پاس سے واپس لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش پائی جاتی تھی۔

میں نے سوال کیا ”کیا ہوا ڈاکٹر!“

”اس طرف تو کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں بھی الجھ کر رہ گیا ”گاڑیوں کی آواز تو ہم نے سنی ہے اور اب بھی سن رہے۔۔۔“

میں نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر گاڑیوں کے ہندار انجنوں کی آواز پر توجہ مرکوز کر دی اور اسی لمحے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ آواز عبادت گاہ کے عقب سے آ رہی تھی۔

پلک جھپکتے میں ڈاکٹر بھی اس حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

”کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے وجدان۔ اس طرف تو ہماری

جیب بھی کھڑی ہے!“

اس کے آخری جملے نے مجھے بتا دیا کہ وہ بھی انجنوں کی آواز کی درست سمت کو بھانپ چکا تھا۔

میں نے پوچھا ”کیا کھ کو اس طرف سے آتا تھا؟“

”نہیں“ میں نے یہاں کی صورت حال کو ”نہلی بخش“ پاکر شیوا کو ہدایت کی تھی کہ وہ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے سے آئے لیکن یہ تو مجھے کوئی دوسرا ہی معاملہ نظر آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”چلو اس معاملے کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے عبادت گاہ کے عقب میں ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے نے عبادت گاہ کے دروازے کو بھی گویا ہلا کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قریب ہی کوئی طاقت ور بم پھٹا ہو۔ ہم اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے۔

ڈاکٹر نے ایک جانب جست لگائی۔ میں دوسری طرف گرا۔ لی بلان میرے پہلو میں زمین پر پڑی تھی۔ عبادت گاہ کی دیواروں اور چھت میں سے چھوٹے چھوٹے پتھر ٹوٹ کر ہمارے اوپر گر رہے تھے۔ ہم ابھی یہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کیا کیا جائے کہ اسی لمحے ایک اور خوفناک دھماکے کی آواز نے فضا میں تہلکہ ڈال دیا۔

یہ دھماکا پہلے سے بھی زیادہ شدید اور ہلاکت خیز تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قیامت کا دن طلوع ہو چکا ہو۔ اس دھماکے نے لی بلان کو بری طرح ہلکا دیا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی گرفت سے لگتا تھا وہ جیسے صدیوں سے یہیں بیٹھتے ہو۔

پتا نہیں کون سی قیامت برپا ہونے جا رہی تھی!

**بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات**

**روشنی کے مینار**

قیمت 225/- روپے

ڈاکٹر خراج 25/- روپے

**مستند حیلہ سنیہ بالکلام**

کتابیات پیبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کرچی نمبر 1

یہ قیامت سے پہلے دالی قیامت تھی! مجھے بعد دیگرے ہونے والے اُن دو دھماکوں نے گویا عبادت گاہ کے درو دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوا تھا، بیٹھے بیٹھے کوئی بڑا زلزلہ آ گیا ہو۔ شراکتیں دھمک نے ہماری ساعت کو کھانچا تو پر مجروح کر دیا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا یہ سلسلہ دو دھماکوں تک ہی محدود رہے گا اس کے بعد بھی دھماکے ہو سکتے تھے اور قبل از وقت ان کی شدت اور ہلاکت خیزی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ہمیں فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

زلزلے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ کسی عمارت کے اندر ہیں تو پہلی فرصت میں اس عمارت کو چھوڑ کر کسی کھلی جگہ پر نکل آئیں۔ اگر عملاً ایسا کرنا ممکن دکھائی نہ دے رہا ہو تو حفظ بقا قدم کے طور پر کسی مضبوط میز کے نیچے پناہ لے لیں تاکہ اس زلزلے کے نتیجے میں چھت اور دیواروں سے گرنے والا ملبا آپ کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو۔ ہم جس نوعیت کی صورت حال سے دوچار تھے اس میں ایسی کوئی محفوظ آؤ میسر ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ اگر عبادت گاہ کی چھت اور پتھر پٹی دیواریں منہدم ہونے کا فیصلہ کر لیتیں تو ہم ایک سنگلاخ بدکن میں "امر" ہو کر رہ جاتے۔ دھماکوں کی شدت بتاتی تھی ایسا بھی ہو سکتا ہے!

میرے ذہن نے سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں عبادت گاہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے دکن فٹ دور پڑے ڈاکٹر مومگ کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اس کی تائید باتے ہی میں ایکشن میں آ گیا۔ ڈاکٹر مومگ نے بھی میرے ساتھ ہی ہی سرعت سے حرکت کی۔

میں نے لی یان کو اپنے بدن میں پیوست رکھتے ہوئے ایک لمبی روٹنگ کی۔ میں نے اس دوران میں رخ کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم اس سٹی کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ سنگلاخ فرش پر رول کر کے ہوئے ہمارے اجسام کو چھوٹی موٹی چٹوئوں سے بھی واسطہ پڑا۔ مگر ان لحاظ میں ایسی چٹوئوں کو محسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم مذکورہ کمرے سے باہر نکلے اور اٹھ کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔ اسی لمحے تیسرے خوف ناک دھماکے کی لرزہ خیز آواز نے ہماری ساعت تک رسائی حاصل کی مگر خیریت گزری کی کہ اس وقت تک ہم چھت کے نیچے سے نکل کر کھلے آسمان تلے آ گئے تھے۔ یہ عبادت گاہ کا سامنے والا بیرونی حصہ تھا۔ وسیع دعبض ہال اور اس کے وسط میں ایک چوڑے پر استادہ فاشنگ بدھا کا مجسمہ ہم سے بہت پیچھے رہ گیا۔ ہم

دو افتتاح عبادت گاہ کی عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔

اجالا جھپٹنے لگا تھا تاہم ٹھنڈے کج بست ماحول نے اس صبح کو خنجر ا رکھا تھا۔ اس ٹھنڈی غبار فضا میں ہم خود کو کسی فریزر میں کھڑے محسوس کر رہے تھے۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ لی یان میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دیے بھاگ رہی تھی، میرے رکنے نے اسے بھی روک دیا۔ میں نے پلٹ کر عبادت گاہ کی طرف دیکھا۔ عبادت گاہ کی عمارت اپنی جگہ پر صبح و سالم کھڑی تھی لیکن ڈاکٹر مومگ مجھے نہیں نظر نہ آیا۔ پتا نہیں وہ کہاں رہ گیا تھا!

یہ ایک تشویش ناک صورت حال تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، ڈاکٹر نے بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے کے پتھر لیے فرش پر رول کیا تھا پھر دروازے سے نکلنے کے بعد ہمیں حزرک پیچھے دیکھتے دکھتے ہوش نہیں رہا تھا اور اب دیکھا تو وہ غائب تھا۔ لی یان نے میرے چہرے پر پھینکی ہوئی تشویش کو بھابھ لیا، اضطراب لیے لیے میں وہ بولی "ڈاکٹر مومگ دکھائی نہیں دے رہا۔ لگتا ہے وہ کسی اور طرف نکل گیا ہے!"

"ہاں! مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" میں نے متشکر انداز میں کہا۔

"اسے ڈھونڈتے ہیں۔" لی یان کے لہجے میں ڈاکٹر مومگ کے لیے اچھی خاصی تشویش موجو تھی۔

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں لی یان! جمہیں اندازہ ہو جاتا ہے ڈاکٹر بڑے پراسرار انداز میں مود کرتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگا خیریت ہی سے ہوگا۔ ہم سب کو۔۔۔ بہر حال اپنی جیب تک پہنچنا ہے لہذا اس کی سمت بڑھنا چاہیے۔"

"مجھے ڈاکٹر مومگ کے ساتھ کسی مشن میں حصہ لینے کا پہلی مرتبہ موقع مل رہا ہے۔" لی یان عبادت گاہ کی جانب متلاشی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی "واقعی اس کا انداز بہت ہی پراسرار ہے۔"

"میں نے ہمیشہ اسے "ادھر ڈوے ادھر ابھرے۔" والے انداز میں متحرک پایا ہے۔" میں نے کہا "وہ جب بھی ابھرنا خیریت ہی سے ابھر۔" میرا اندازہ ہے وہ عبادت گاہ کے عقبی حصے کی طرف نکل گیا ہوگا۔ اگر اس طرف آیا ہوتا تو ہماری نگاہوں سے اوچھل نہیں رہا ہوتا تھا۔"

فائرنگ کی آواز نے لمحے بھر کو فضا میں "چچم" چپاکی پھر خاموشی چھا گئی۔

لی یان متوجہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مجسم سوال کو پلک جھپکتے میں پڑھ لیا۔ اس کی تمام تر تشویش ڈاکٹر مومگ کے حوالے سے تھی۔ اس نے بھی میری طرح یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ فائرنگ ڈاکٹر مومگ کو شکار کرنے کے لیے کی گئی ہوگی۔

میں نے سیون ایم ایم کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا شانہ چھتیا یا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا "تم پریشان نہ ہو لی یان! ڈاکٹر مومگ ان کے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوگا۔ وہ انہیں کبھی کا ناچ نچا کر رکھ دے گا۔"

اس کے چہرے پر لمحائی سکون ابھرا۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا وہ اندر سے مطمئن نہیں تھا اور یہ اس کا ایک فطری رد عمل تھا۔ وہ بار بار میری گن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہ میں سائنس کی جھلک تھی۔ اس مشن کے ابتدائی حصے میں لی یان نے گن میرے پاس رکھنے پر اصرار کرتے ہوئے کہا تھا "انٹیش ہتھیار مرد کا زیور ہوتے ہیں۔ اسلحے کا زیور مردوں کو ہی بچتا ہے میری حفاظت کے لیے تم موجود ہو تو مجھے کیا پروا ہے!"

اس کی سائنس بھری نگاہ سے ظاہر ہوتا تھا میرے ہاتھ میں مردانہ زیور کی صداقت سے اسے بڑی تقویت مل رہی تھی۔

عبادت گاہ کو ہنگامی حالت میں خبر یاد کیتے ہوئے میں نے لی یان کے ساتھ سیون ایم ایم کو بھی بڑی مہارت سے سنبھال رکھا تھا۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے ورنہ ہم تینوں باہم پیوست جس طرح رول کرتے ہوئے کمرے سے نکلے تھے اس حالت میں پورے دو تھوڑے سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کس نے کس کو سنبھال رکھا تھا۔

اس چٹان کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے میں توقع کر رہا تھا کہ دوبارہ بھی فائرنگ ہوگی لیکن جب چند لمحے فضا میں پراسرار سکوت طاری رہا تو میں نے صورت حال کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ میں نے لی یان کو وہاں بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور ایک جانب جھک کر اس چٹان کے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی۔ فائرنگ کی آواز اسی سمت سے سنائی دی تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا فائرنگ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں ہوئی تھی یا پھر اس کے پچھواڑے عظیم الشان بڑی چٹان کی طرف کیونکہ لوکیشن کے اعتبار سے مذکورہ دونوں مقامات اس وقت ہمارے عقب میں واقع تھے۔ ہم عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں خاصاً آگے نشیب میں اتر آئے تھے۔

بدھ نمل کنڈ والی وہ عبادت گاہ ایک ہیگو ڈا کی صورت بلند نیلے پر بنائی گئی تھی۔ نیچے نشیب میں بھاگ متی نامی ایک دریا بہتا تھا۔ ایک طرح سے عبادت گاہ دریائے بھاگ متی کے کنارے واقع تھی۔

میں نے بلندی کی جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ میری وہ متلاشی نگاہ جہاں تک منظر کو گرفتار کر سکی وہاں تک امن و امان ہی نظر آیا۔ عبادت گاہ کی چھت والی آگے کو بڑی موٹی پتھر پٹی منڈیر کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا اور وہاں سے یہاں تک چٹانی سلسلہ تھا جہاں کسی قسم کی گڑبڑ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا وہ فائرنگ عبادت گاہ سے عقبی حصے میں ہوئی تھی اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ڈاکٹر مومگ ادھر عظیم الشان چٹان کی طرف نکل گیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا ہمارے دشمن آپس میں ایک دوسرے کو ہی نشانہ بنانے میں لگ جائیں!

میں مطمئن ہو کر لی یان کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی آواز گونج اُٹھی۔ اس بار برست فائر نہیں کیے گئے بلکہ تین چار سنگل شاٹس سنائی دیے۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں انسانی چیخوں کی مخصوص آواز بھی ابھری۔ لگتا تھا بڑے تاک تاک کر نشانہ لگائے گئے تھے۔ میرے دل نے کہا "ادھر ڈاکٹر مومگ نے مورچا سنبھال لیا تھا۔"

وہ جب ہم سے رخصت ہوا تو خالی ہاتھ تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا یا تو اس نے کسی دشمن کی گن پر قبضہ جمایا تھا یا پھر وہ سیون ایم ایم برآمد کر رہی تھی جو اس کے بقول اس نے ایک محفوظ مقام پر رکھ چھوڑی تھی۔

"ہمیں فوراً ڈاکٹر مومگ کی مدد کے لیے اس طرف جانا چاہیے۔" لی یان نے تمغیہ آواز میں کہا۔

وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس فائرنگ اور ڈاکٹر مومگ میں گہرا تعلق ہے۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے یا کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی تمام تر ساعت کو ماحول پر مرکوز کر دیا۔

فائرنگ اور انسانی چیخوں کے بعد ایک مرتبہ پھر مہیب خاموشی چھا گئی تھی۔ میری توجہ کا مرکز عبادت گاہ کا عقبی حصہ تھا جدھر وہ عظیم الشان چٹان واقع تھی جس کے عقب میں ہماری جیب کھڑی تھی۔ مجھے اس طرف کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی کہ عبادت گاہ کے اندر ہم نے جن کا زیور کے بیدار انجنوں کی مخصوص آواز سنائی تھی وہ بھی اب خاموش ہو چکے تھے۔

میں نے فیصلہ کن انداز میں لی یان کی طرف دیکھا اور

اس کا ہاتھ تمام کر چنان کی اوٹ سے نکل آیا۔ ہم ایک نیم بجنوی پکڑ کاٹ کر عبادت گاہ کے عقب میں پھینک دیے۔ میں نے کہا "ساری گزرا دوسری معلوم ہوتی ہے۔"

لیان کو پہاڑی راستوں پر سبز کرنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا اس لیے آگے بڑھنے میں اچھا خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ ہم ڈھلوانی فاصلے طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی علاقے میں چڑھائی کی بہ نسبت اترائی میں توازن قائم رکھنے میں زیادہ دقت محسوس ہوتی ہے۔ ویسے میں لیان کی ہمت اور جوصلے کو مان گیا تھا۔ وہ جس نصیحت کے حالات سے گزر رہی تھی ان میں اعصاب برائی کا مہیا کی کے ساتھ قابو رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی پیش قدمی کو دیکھتے ہوئے گتا ہی نہیں تھا کہ اسے یہ وہ ہوئے ایک دن بھی نہیں گزرا!

میں ایک جگہ پر رک جانا پڑا۔ میں نے قریب ہی کبھی کسی کے قدموں کی مخصوص آواز نہ سنی۔ وہ آواز اتنی دھیمی تھی کہ لیان کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر پائی تھی۔ کوئی بڑے پتلا انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ادھر سے گزر رہا تھا۔ لیان میرے اچانک رک جانے پر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے اس کے قدموں کی جانب جھک گیا۔ وہ میری اس حرکت سے جانے کیا سمجھی کہ بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اس کے بدکنے نے میرے منصوبے کو دقت سے پہلے محسوس تک پہنچا دیا۔ پیچھے ہٹنے ہوئے اس کے پاؤں سے ایک پتھر کو ٹھوکر مٹی، ٹھوکر گھا کر مذکورہ پتھر نشیب میں دوڑ تک لڑھکنا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا فارتنگ کی صدا سے گونج اٹھی۔ اس لڑھکتے ہوئے پتھر کو نشانے پر رکھتے ہوئے کسی شخص نے فارتنگ کی تھی اور میں نے پلک جھپکنے میں جان لیا کہ وہ نقص میرے بائیں پہلو میں پندرہ میٹرز فٹ کے فاصلے پر موجود تھا اور.....

میں دراصل لیان کے قدموں میں پڑے ہوئے اسی پتھر کو اٹھا کر دوڑ جھپکنے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ آس پاس موجود شخص کی لوکیشن کا اندازہ ہو سکے۔ اس بات کے روشن امکانات تھے کہ اگر وہاں موجود شخص مسخ ہے تو وہ پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر اس پر فارتنگ ضرور کرے گا۔ اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ میرے منصوبے کو لیان کی ایک اضطراری حرکت نے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب صورت حال لیان پر واضح ہو چکی تھی۔ وہ ایک

بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اسی پتھر کی اوٹ میں خاموش بیٹھی رہے۔ میں اس شخص کی خبر لے کر آتا ہوں۔ اس نے پہاڑی اور کچھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اگلے ہی لمحے میں دیے قدموں ایک سمت بڑھ گیا۔

میں نے گمن کی لوکیشن کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور اسے بڑے طریقے سے گھیرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے تھوڑا گھوم کر اس کی سمت بڑھنا پڑا تاکہ اسے میری پیش قدمی کا احساس نہ ہو اور وہ مقام بھی میری نگاہ سے اوجھل نہ ہوئے بائیں جہاں میں لیان کو چھوڑ آیا تھا۔ اس کی حفاظت میرے فرائض میں شامل تھی۔

میں گمن تھا یہ محتاط قدموں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا اور دو منٹ کی کوشش کے بعد اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق دشمن کو تین چار فٹ آگے میرے نشانے پر ہونا چاہیے تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

میں متلاشی نظر سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ لیان کی چیخ نے مجھے اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ میری نگاہ میں وہ بڑا سا پتھر آگیا جس کے عقب میں میں نے لیان کو چھوڑا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ مسخ شخص اس طرف لیان کے پاس جا پہنچا تھا اور اس نے لیان کو گمن پوائنٹ پر رکھا تھا۔

میرے لیے وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ مجھے فوری طور پر وہاں پہنچنا تھا۔ ویسے ایک بات کی مجھے تھی کہ وہ بد بخت لیان کو کوشش نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو لیان کے چپٹے سے پہلے ہی فائر کھول دیتا۔ لیان کی زندگی کو سر دست کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں اوندھے منہ پتھر لی زین پر لیٹ گیا اور کراٹھ کرتے ہوئے اس پتھر کی سمت بڑھنے لگا جس کے پیچھے وہ دونوں موجود تھے۔ جلدی میں اس پتھر کے اوپر پہنچ گیا اور پتھر لیان میری نگاہ میں آگئی۔

وہ زین پر اتر کر ڈنڈی تھی۔ گمن بردار شخص تین فٹ کے فاصلے پر اس پر گرنے لگا تھا۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک تڑپنے والے سے اس کی پشت میری سمت تھی۔ میں نے اوندھے لیے لیے گمن بردار کی ٹھوڑی کیسیون ایم ایم کے ٹارگٹ پر رکھا یا پھر ٹھکانا لے کر فرار کر گیا۔

"گمن بیٹیک دوسرا!"

میری آواز پر وہ میکائی انداز میں اچھلا اور تیزی سے گھوم کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی صورت دیکھتے ہی اندازہ لگالیا۔ اس کا تعلق امریکا سے تھا۔

اس کی کوشش کو لیان نے پلک جھپکنے میں خاک چٹائی۔ وہ شخص جیسے میری جانب مڑا لیان نے پتھر لی زین پر بند پٹاں لیا اور اچھل کر دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ میں رسید کر دیں۔ یہ ایک زبردست ڈبل کلک تھی۔

گمن بردار نے میری طرف گھومتے وقت دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے تھے لہذا لیان کا نشانہ بڑا کاری ثابت ہوا۔ گمن بردار توازن قائم نہ کر سکا اور پیچھے کولاہک گیا۔ اس دوران میں ٹریڈ پر اس کی انگلی دب گئی۔ ٹریڈ پر انگلی دبنے کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے..... فائرنگ!

پیچھے کولاہکتے ہوئے اس کی گمن نے بھی متعدد گولیاں اگلیں لیکن ٹارگٹ بگڑ جانے کے باعث ہم دونوں گولیوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے۔ لیان نے اسی برس نہیں کی بلکہ وہ اچھل کر گمن بردار کے تعاقب میں لپک گئی۔ میں پتھر سے کود کر نیچے آیا اور ان کا نشانہ دیکھنے لگا۔

پیچھے کولاہکتے ہوئے گمن اس شخص کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ دس فٹ نشیب میں جانے کے بعد سنبھلا اور گمن کی تلاش میں ادھر ادھر گھا دوڑانے لگا۔ مذکورہ گمن اس کی دائیں جانب چار فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔ اس نے گمن کی طرف جست بھری۔

اسی وقت میں حرکت میں آگیا۔ گمن بردار سے پہلے میں گمن کو دیکھ چکا تھا اور گمن بردار کا ارادہ بھی میں نے بھانپ لیا تھا میں نے سیون ایم ایم کو سپردھا کیا اور گمن کی سمت بڑھنے والے اس کے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ یہ گمن کیسے تھا کہ میں اسے لیان پر سوا میرے ہونے کا موقع دیتا!

اس نے ایک بیج ماری اور اپنی مادری زبان میں گالیاں بکتے ہوئے زخمی ہاتھ کو تیزی سے جھپکنے لگا۔ اس دوران میں لیان اس کے سر پر پہنچ گئی۔ جھجلاہٹ میں وہ زخمی ہاتھ ہی سے لیان پر حملہ آور ہوا۔

اس کا انداز پتھر مارنے والا تھا۔ لیان نے جھکا کی دے کر خود کو بچایا اور اس کی پسیلیوں میں پاؤں کی ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ لڑھکھڑاتے قدموں سے پیچھے کولیا پھر سنبھل کر خون خوار انداز میں لیان کی طرف بڑھا۔ اس کی پیش قدمی میں بڑی جارحیت پائی جاتی تھی۔

لیان ایک محفوظ اسٹانس بنائے تیار کھڑی تھی۔ اس شخص نے غصیلے انداز میں ایک فٹ بال کلک چلائی۔ لیان

نے بیک فٹ پر جاتے ہوئے اس کی کلک کو بلاک کیا اور اسی لمحے گھوم کر ایک خطرناک پھیل کلک ماری۔

لیان کی بڑی اس شخص کی کیش پر پڑی اور وہ سر کو تمام کر ایک طرف جا کر۔ لیان تیزی سے اس کی طرف لپک اور سنبھلنے سے پہلے ہی اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ اس شخص کا اسٹائل یہ ظاہر کرتا تھا اس نے باقاعدہ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل نہیں کی تاہم لڑائی بھڑائی کا اسے وسیع تجربہ تھا۔ لیان کی جگہ کوئی اور اس کے مقابل ہوتا تو وہ اسے چنگیوں میں مسل کر رکھ دیتا۔ لیان بڑی تندی سے اس کے سامنے ڈٹی ہوئی تھی۔

لیان کو اس مشن میں پہلی مرتبہ ہاتھ پاؤں کھولنے کا موقع مل رہا تھا۔ اب تک ساری "کسرت" میں نے اوڈر اکثر موگ نے ہی کی تھی۔ لیان بڑے بھر پور اور کسل بخش انداز میں اس شخص سے منہ رہی تھی۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ لیان کا مقابلہ طاقتور اور مضبوطی میں اس پر سبست رکھتا تھا۔ اس میں کسی گیند سے جیسی قوت بھری ہوئی تھی۔ لیان کی پھرتی اور مہارت نے اسے ابھی تک اس شخص کے قابو میں آنے سے بچا رکھا تھا۔

وہ بری طرح پٹ رہا تھا اور جھجلا کر بار بار لیان پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ میں بڑی توجہ سے وہ فرائی اسٹائل فائنٹ دیکھتا رہا۔ لیان نے مقابل کی تاک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بار بار اپنے چہرے کو صاف کرتا جا رہا تھا۔ لیان کے انداز میں غضب کا غلیظ دھبہ بھرا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ شون کی موت کا ذمے دار اس شخص کو سمجھ رہی ہو..... اور اس "کوتاہی" کے لیے وہ اس سے سود در سود وصول کرنے کا ارادہ رکھتی ہو!

بھری ہوئی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک کلک چلاتے ہوئے لیان توازن قائم نہ کر سکی۔ پتھر لی ڈھلوان زین پر اس کا پاؤں پٹ گیا اور اس شخص کو موقع مل گیا۔ کسی قسم کا چارحانہ حملہ کرنے کے بجائے اس نے لیان کو اپنے کلاہے میں لے کر دبا ٹھوڑ کر دیا۔ لیان پوکھلا کر رہ گئی۔

اس شخص کی گردن میں کسی ساڑھی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے کسی مرتبہ لیان کو اوپر اٹھا اور پیچھے کی کوشش کی لیکن لیان نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ جب بھی اسے جھپکنے لگتا لیان اپنا بازو یا ٹانگ اس کے جسم کے کسی حصے سے الجھا دیتی۔ لیان اس کے لیے ایک ایسی نئے ثابت ہو رہی تھی جسے وہ اگل سکتا تھا اور نہ ہی ننگے کی ہمت ہو رہی تھی۔

اس شخص کی جھنجھلاہٹ حد درجہ بڑھ گئی اور اس نے خود کو منہ کے بل زمین پر گر جانے کے لیے اپنے وجود کو ایک جھٹکا دیا۔ لی یان ہنوز اس کی گرفت میں تھی۔ اگر وہ اندھا زمین پر گرتا تو اس سے پہلے لی یان کا جسم زمین سے ٹکراتا۔ یہ بڑی داہیات صورت حال تھی لیکن زمین تک پہنچنے سے پہلے علی یان نے بازی پلٹ دی۔ یہ اس کا ایک ٹوری اور ہمدقت فیصلہ تھا۔

اس سے قبل کہ وہ دلوں اوپر تلے زمین سے آکر  
 نکراتے، لیان کا داؤد چل گیا۔ اس نے زمین کی طرف آتے  
 ہوئے ترقی مقابل کے جسم کے ایک نازک حصے پر پاؤں کی  
 خطرناک ٹھوکا رسید کی۔ وہ بلبلا اٹھا اور اسی بلبلا ہٹ میں لی  
 یان کے جسم پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم ہوگئی۔ لی  
 یان نے خود کو آڑا محسوس کرتے ہی وہاں میں رو لیا اور چند  
 فٹ دور جاگری۔

وہ شخص توازن کو بیٹھا تھا ہندو سنبھلنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔ وہ آنا فائنا منہ کے بل پتھر لی زین سے نکل آیا۔ اس نگرار کے نتیجے میں اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی۔ یقیناً اس کے چہرے کا واسطہ تناس ہو گیا تھا۔ جتنی دیر میں وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہوا، لیان دو قدم کے فاصلے پر اس کے استقبال کے لیے ایک خطرناک اسٹانس کے ساتھ موجود تھی۔ پھر ان کے درمیان ایک مرتبہ پھر صحرہ آرائی شروع ہوئی جس میں لیان کا بلہ بھاری تھا۔

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں یں ان کو دل کے ارمان نکالنے کا پورا موقع فراہم کر تا کہیں ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان میں اس فائنٹ کو دل دینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کا معاملہ ”نشتائے“ کا ارادہ کیا ہی تھا کہ مجھے ایک دوسرے محاذ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

دو گن برادر اچانک ہی میری نگاہ میں آ گئے۔ وہ شیب سے ہماری سمت بڑھ رہے تھے۔ میں ایک ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ وہ شیب میں ہونے کے باعث مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے ہمارے دشمن ہی ہو سکتے تھے کیونکہ انہیں شہزاد کی طرف سے آنے والی کمک ابھی تک یہاں نہیں پہنچ پائی تھی۔ میرے لیان اور ڈاکٹر موک کے سوا یہاں پایا جانے والا ہر شخص فی الحال ہمارا دشمن ہی تھا۔ وہ دونوں گن برادر یقیناً فائرنگ کی آواز سن کر ہماری طرف متوجہ ہوئے تھے یا پھر لیان سے پٹنے والے کی چیخیں بھی ان کی توجہ اس جانب مبذول کرنے کا باعث ہو سکتی تھیں۔ میں نے سیون ایم ایم برگزٹ مضبوط کی اور ان کے استقبال کے لیے تیار

جب وہ لی یان اور اس کے برعکس کے قریب پہنچے تو صورت حال ان کے لیے بڑی سازگار ہو چکی تھی۔ لی یان کی ایک کریسنٹ کک نے برعکس کو تین فٹ دور اچھال دیا۔ اگر وہ دونوں آپس میں محکم گھما ہوتے تو آنے والے کن ہرارافرو کو کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑتا۔ لی یان برکی جانے والی فائرنگ ان کے سامنے کو بھی چھٹی میں بدل گئی تھی!

موجودہ صورت حال میں ان دونوں بڑی سرعت سے اپنی گنوں کی بان کی طرف سیدھا کیا پھر اس سے پہلے کہ ٹریگر پر ان کی انگلیاں حرکت کرتیں، میں نے ان کے اجسام کے زیریں حصوں کو نشانہ بنائے ہوئے ایک خفہ ناک برسٹ مارا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی پروا نہ ہو جاتی تو ان کا داؤد چل چکا ہوتا۔ وہ لی بان کو بھوننے کا مکمل فیصلہ کر چکے تھے۔

فائرنگ کی مخصوص ترتیب اسٹیشن نے فضا میں خوف ناک ارتعاش پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی مٹاؤ افراد کی اذیت ناک چیخیں گونج اٹھیں، میں نے انہیں بڑی کس پرسی میں لٹکھڑاتے، ڈھنگاتے اور پھر زمین پوس ہوتے دیکھا۔ گنواں کے ہاتھوں سے کھل کر ردور جا گری تھیں۔ سیون ایم ایم کے ایک ہی بریسٹ نے ان کی راتوں اور ٹخنوں کا کباڑا کر دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اب کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں گے۔

اس منظر نے لی یان اور اس کے برعکس قابل کو بھی درط  
حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا  
اور چونک اٹھا۔ لی یان کی کریسنٹ کلک کھا کر وہ شخص جہاں  
مگر اتھا وہیں مجھے اس کی کن بھی پڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ شخص  
بھی گمن کی وہاں موجودی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے اس  
کی آنکھوں میں تیزی سے بدلے ہوئے تاثرات کو ملک  
جھپٹتے میں لوٹ کر لیا۔ میرے طرف سے ہونے والی فائرنگ  
نے شاید اسے ہلکا دیا تھا ورنہ وہ کب کا گمن کا جانب ہاتھ  
بڑھا چکا ہوتا..... اور اب میں اسے کوئی موقع دینے کے موڈ  
میں نہیں تھا۔ اس کا ارادہ مہانپ لینے کے بعد تاخیر جس بات  
کی!

میں نے ایک جھگڑے سے سیون ایم ایم کے خضر ناک ہریل کا زویہ تبدیل کیا اور ٹریگر پر انگلی دبا دی۔ فضا میں آٹو پیک سیون ایم ایم کا ایک موت بدر وقت چہرہ گونجا اور اس کی گلے سے وہ شخص اپنے ہی خون میں لت پت تڑپتا ہوا نظر آیا۔ اس کے وجود نے چند سزئی جھگڑے کے لیے پھر وہ خدا ہوا۔ اس کا ایک

پاتھ اب بھی حسرت ناک انداز میں آگے کو بڑھا ہوا تھا جہاں ٹھوڑی..... ٹھنڈی ایک فٹ کی دوری پر اس کی وہ گھن بڑی ٹھنڈی جیسے اٹھانے کے لیے اس نے ہاتھ پھیلا لیا تھا۔ وہ کسی گھن کی ضرورت سے بہت دور جا چکا تھا۔

انسان اس دنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ ہی لوٹ جاتا ہے۔ سینے اور لپٹنے کے جگر میں زندگی بھر اس کے دونوں ہاتھ مختلف زاویوں میں پھیلتے اور سکتے رہتے ہیں جن کی بعض اوقات یہی ہاتھ بیک کے لیے بھی دراز ہو جاتے ہیں مگر یہ ضرور نہیں کہ سب کو بیک میں مل ہی جائے۔ کچھ بد نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں حالات کی ستم ظریفی انہیں موقع کی بیک دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس بد بخت کا گھر کی سمت پھیلا ہوا ہاتھ بھی کوئی ایسی ہی کہانی سنار ہاتھ!

میں نے اس پر ایک افسوس ناک نظر ڈالی اور اس کے ساتھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دونوں بھرتی زمین پر لوٹ لوٹ ہو رہے تھے۔ میری مکن سے خارج ہونے والی گولیوں نے ان کی رالوں اور گھٹنوں میں کئی ہوادان ہا دیے تھے۔ پڑ لیاں بھی اس سلوک سے محروم نہیں رہی تھیں۔ ہادی اسلٹر میں ان کے ٹٹوں، پٹریوں، گھٹنوں اور کولہوں کی ہڈیوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ وہ کرب ناک انداز میں کراہتے اور سسکتے ہوئے مجھے مخاطبات میں تول رہتے تھے۔

میں نے کوہِ سبک کو مل جھک کر ان کی حالت کو اندازے کی نگاہ میں تول لیا۔ وہ نواری طور پر کسی قابل نہیں رہے تھے۔ اگر وہ ہزار کوشش کر کے دیکھ لیتے تو جی نہیں کوئی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ان کی جان لینے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا! انڈین گن سونے سیدھا حکم اہو گیا۔

اسی لمحے یان کی ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت سے کھائی ”وہ جان! ان مردوں پر بھارت بھیجو۔ ہمیں فوراً ایکٹر موہک کی طرف جانا چاہیے۔“

وہ میرے عقب میں موجود تھی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا اس کے ہاتھ میں مجھے وہی گن نظر آئی جس کے حصول کے لیے اس کا تہہ مقابل جان ہار بیٹھا تھا۔ وہ ایک خطرناک شاٹ گن تھی۔

لیا جان کی تجویز میں معقولیت تھی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اس کے ایما پر ان دونوں ”معدور افراد“ پر لعنت بھیج کر ہم آگے بڑھ گئے۔

میں نے ایک جگہ رک کر بڑی سرعت سے سیون ایم ایم

کوری لٹو کیا اور اسٹریچنگ کی مدد سے اسے گردن اور بازو کے اوپر سے گزرا کر پھیلو میں لٹکایا۔ یہ میرا بابا یاں پہلو تھا۔ اسی بازو کے ٹرائی سینکس (TRICEPS) پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ کندھے کا رخ اگرچہ تشویش ناک نہیں تھا لیکن پچھلے دو گھنٹے سے عبادت گاہ کے اندر اوپر باہر جو مارا ہوئی رہی تھی اس کے طفیل اس معمولی رخ کی تکلیف میں غیر معمولی اضافہ ہوا تھا؛ خصوصاً خوف ناک دوام کو کے بعد جب میں نے لی یان اور سیون ایم ایم کے ساتھ باہم پیوست رول کرتے ہوئے عبادت گاہ سے باہر نکلنے کی جگہ دو دو کی تو کندھے کی چوٹ کے ساتھ اچھی خاصی زیادتی ہو گئی تھی۔

دھماکوں کے خیال کے ساتھ ہی باد آیا کہ تیسرے دھماکے کے بعد یہ ہلاکت خیز سلسلہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ عبادت گاہ کے عقبی حصے کی طرف کافی دیر سے فائرنگ کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ میں نے لی یان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے سنا سکی لمحے میں کہا۔

”تم نے تو کمال کر دیا لی یان! میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی اچھی فاسٹر ہو۔“

اس نے رک کر بے یقینی سے میری آنکھوں میں دیکھا اور گہری سنجیدگی سے پوچھی ”تم میرا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ رہے ہو؟“

”دل رکھنے اور رکھوانے کا معاملہ تو رہا ایک طرف۔“  
میں نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا ”میں نے اس وقت  
تمہاری تعریف میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا۔“

”ادوہ.....“ وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”اس تعریف کا شکریہ۔ اگر تم مجھے ایک اچھی فائزر کہہ رہے ہو تو میرے لیے یہ بات کسی سبز کا درجہ رکھتی ہے۔ تم کوئی عام انسان نہیں ہو۔“

لیان ہمارے ساتھ سنگین حالات سے گزر رہی تھی، اس کے ساتھ ہی دنگ ہنگ کے فون نے اس کے لیے ان حالات کو سنگین بھی بنادیا تھا۔ شون اس کا شوہر تھا اور شوہر کی موت کسی بھی بھڑی کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہوا کرتی ہے۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ڈاکٹر موگ لیان کو اس صدمہ سے باہر لانے کے لیے کئی جھکی جھکتوں سے کام لے رہا تھا۔ میں نے بھی ڈاکٹر کی روشنی کو اپنانا مناسب سمجھا اور قدرے بے تکلف انداز میں کہا۔

”لی یان! یہ خاص و عام کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم کس بنا پر مجھے عام انسانوں کی فہرست سے خارج کر رہی ہو؟“

وہ گڑبڑا گئی۔ رکے بغیر جلدی سے بولی ”مم..... میرا مطلب ہے تم ایک خاص ایک منفرد شخص ہو!“

”یہ بات تو میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔“  
”کیا مطلب؟“ یہ سوال کرتے ہوئے وہ رک گئی۔  
”مطلب یہ کہ تم بھی اپنی ذات میں بہت منفرد ہو۔“  
میں نے کہا جیسی انفرادیت میں نے آج تک کسی اور انسان میں نہیں دیکھی لہذا..... تم بھی کوئی عام نہیں بلکہ ایک خاص انسان ہو۔“

وہ ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر الجھن زدہ انداز میں بولی ”تم میری کس انفرادیت کی بات کر رہے ہو؟“  
اگر حالات نارمل ہوتے تو شاید وہ فوراً میری بات کی تہ میں پہنچ جاتی لیکن موجودہ جوشین نے اس کے ذہن کو ٹپٹ کر رکھا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جسے سچ کی خواہش تو ہو لیکن وہ بغیر اور تخلیق کے عمل کو پسند نہ کرتی ہو بلکہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اڈاپشن کو زیادہ مناسب سمجھتی ہو!“

موجودہ حالات میں مجھے لیان سے اس نوعیت کی گفتگو کرنا تو نہیں چاہیے مگر علاج کچھ ایسی قسم کا تقاضا کر رہا تھا۔ وہ جس انداز کی نفسیاتی پیچیدگی میں گھری ہوئی تھی اس سے نکالنے کے لیے ایسا ہی کوئی موقع موثر ثابت ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر بعض اوقات مریض کی جان بچانے کے لیے اسے خطرناک آریٹھن سے بھی گزرتا ہے یعنی اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم کے کسی خاص حصے پر تیز دھار نشتر کو آزمائے میں کسی تردد اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لیے دل کو سخت اور انداز کو خفاک بنانا پڑتا ہے۔ میں بھی لیان کو ایک نفسیاتی عارضے سے نجات دلانا چاہتا تھا اس لیے بھی نہ چاہتے ہوئے میں نے اس خطرناک موضوع کو کھول دیا تھا۔

میری وضاحت سن کر اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑی کامیابی سے خود کو سنبھال لیا جلدی سے بولی۔  
”تم کہیں کی ہوا اٹھا کر ہیں لے جاتے ہو!“  
میں بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی مگر اس کے ادا کردہ الفاظ کسی اور کے لیے قابل فہم نہیں تھے۔ بڑبڑاہٹ میں وہ ایک الجھا ہوا جملہ بول گئی تھی۔ میں نے

دانتہ انجان بچتے ہوئے کہا۔  
”چنانچہ تم کہیں کر رہی ہو۔ میں نے تو کچھ بھی اٹھا کر کہیں بھی نہیں رکھا!“

وہ زچ ہوتے ہوئے بولی ”میں دراصل تمہاری صلاحیتوں کی بنا پر انفرادیت کی بات کر رہی تھی۔ راستے میں آتے ہوئے تم نے جو ”جی“ کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی عام انسان کے بس کا وردگ نہیں۔“

پتا نہیں تم میں اور کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں!“  
”میں محسوس کر رہا ہوں تم بڑی خوب صورتی سے مجھے موضوع سے ہٹا رہی ہو۔“ میں نے اس کی اداس آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا ”حالانکہ تم نے اٹھانے اور لے جانے والی بات کسی اور پس منظر میں کہی تھی!“  
”کس پس منظر میں؟“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

یہ وہ سادگی تھی جس پر..... ہائے کر کے کوئی بھی مر سکتا تھا۔ میں نے شکی لہجے میں کہا ”اگر تمہیں پسند نہیں تو میں آج کے بعد اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔“  
”ایسی بات نہیں دہدان!“ وہ جان چمڑانے والے انداز میں بولی!

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
اس کی جان خود بہ خود چھٹ گئی۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے سے بچ گئی کیونکہ اسی وقت عبادت گاہ کے عقبی حصے میں ایک مرتبہ پھر فارنگ کی آواز گونج اٹھی تھی۔ وہ اضطرابی انداز میں آگے بڑھ گئی۔  
”میں نے کہا ”رک جاؤ لیان!“  
وہ رکی اور پلٹ کر حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔  
”کیا ہوا وجدان؟“

”تم نے تجھوڑی دیر پہلے کہا ہے، چنانچہ میرے اندر کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا ”ایک گن تو یہ بھی ہے کہ میں بعض اوقات آگے بڑھنے کے موقع پر متغیر چاہتا ہوں۔“  
”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”میں نے کہا رک جاؤ اور تم رک گئیں۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو میں کیا کہنے اور کرنے جا رہا ہوں۔“

میں نے بات کو بہم انداز میں ختم کیا اور ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ لیان پار قدم دور کھڑی الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے مزید ایک لفظ ادا کیے بغیر

آنکھیں بند کر لیں۔  
دراصل اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا تھا۔ میں کسی محفوظ اور پرسکون جگہ پر بیٹھ کر تصور کی نگاہ سے ڈاکٹر مونگ کے ماحول میں جھانکنا چاہتا تھا اور یہ جگہ اس کام کے لیے نہایت ہی موڈول تھی۔ یہاں پر ایک آدم قد چٹان کی آؤ میسر تھی۔ مجھے یقین تھا میرے تصوراتی تماشے کے دوران میں لیان کن سوئے ریزلٹ کھڑی رہتی۔

پہلے دو جگہ پاس دھماکوں کے بعد جب ہم نے عبادت گاہ کو چھوڑا تھا، اس کے بعد سے مجھے ڈاکٹر مونگ کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اس وقت عبادت گاہ کے عقبی حصے میں موجود تھا۔ ہمیں ہر صورت اسی کی سمت بڑھنا تھا کیونکہ ادھر ہی کچھ فاصلے پر ہماری جیب بھی کھڑی تھی۔ ہم نے عبادت گاہ کے اندر، ہیوی انجن والی جن گاڑیوں کی آواز سنی تھی، وہ کافی دیر سے چپ سادھے بیٹھی تھیں۔ ادھر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ہی ان کی درست لوکیشن کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کرنے کے بعد ڈاکٹر مونگ کے خال و خلو کو اپنی تیسری آنکھ کے سامنے اجاگر کیا۔ اس کا سراپا میرے تصور میں چکا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا ہینٹیل گلیڈ PINEAL GLAND کام کرنے لگا۔

وہ اس وقت ایک جیب کے اندر تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں سمجھ لیا وہی جیب تھی جس میں سٹر کے ہم ٹھنڈو ٹھہرے یہاں بیٹھے تھے۔ ہیوی انجن والی آری کریں کلر جیب کو پھانسنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بالکل آگے جب کوئی مٹھر دکھائی ہے تو دیکھنے والا اس مٹھر کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ بھلا وہ، ماسٹر بینک پائی کا جس نے شاؤلن ہینٹیل میں تربیت کے دوران میں مجھے ”جی“ کی بیداری کے لیے خصوصی مشقیں کرائی تھیں اور وہ بھی اپنی نگرانی میں۔ ماسٹر بینک پائی ایک طرف سے میرا دادا استاد بھی تھا۔ میرا استاد ہمارا راج داگ ونگ پائے، شاؤلن ہینٹیل میں بینک پائی کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اب یہ دونوں عظیم ہستیاں آج بھائی ہو چکی تھیں۔

ماسٹر بینک پائی نے میرے اندر ”جی“ کے خوالے سے جوش و خروش کی تھی، میں نے پھر اسے کبھی سمجھ نہیں دیا بلکہ ماسٹر کی باتنی ہوئی یوگا کی ایڈوانس مشقیں خود کر کے اس قوت کو پوری طرح بیدار کر لیا تھا۔ اس کے بعد ماسٹر وک بریدنگ کی مدد سے میں نے متحرک کر لی تھی۔ انسانی دماغ کے سامنے

والے حصے میں واقع یہ گلیڈ بہت کام کی چیز ہے جیسے باطنی آنکھ یا تھوڑا آئی بھی کہا جاتا ہے۔ متحرک کرنے کے بعد اس سے کام لینا آتا ہوتا انسان کو بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ پچھلی سطحوں میں گاہے بہ گاہے جی اوڈنٹیل گلیڈ کی بیداری کے سلسلے میں، میں یوگا کی مخصوص مشقوں کے بارے میں تفصیلاً بیان کر چکا ہوں۔ یہ دونوں جو ہر انسان کے اندر موجود ہیں۔ اگر جی لگن سے محنت کی جائے تو منزل ضرور حاصل ہو جاتی ہے!

یہ تمام تر خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزر گئے اور میں جب کے اندر حاضر ہو گیا۔ ڈاکٹر مونگ اس وقت جیب میں اکیلا بیٹھ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی کیفیت کسی پرغالی جیسی تھی۔ وہ دونوں جیب کی عقبی نشست پر تھے۔ ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے، وہ مذکورہ شخص سے نہایت ہی اہم سوال و جواب میں مصروف تھا۔ دام میں آیا ہوا شخص متاعی نہیں بلکہ ایک سفید قام تھا اور یقیناً اس کا تعلق ہمارے دشمنوں ہی سے تھا۔

افسوس کہ میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی مکالمات کو سن نہیں سکتا تھا۔ ہینٹیل گلیڈ کے متحرک ہونے سے میرے دماغ کا صرف دیکھ پوسٹم کام کرنے لگا تھا یعنی دماغ کے اس حصے کا دیکھ پوسٹم جو تیسری آنکھ کے معاملات کو کنٹرول کرتا تھا۔ آڈیو پوسٹم کو کارآمد بنانے کے لیے پیچوٹری گلیڈ (PITUITARY GLAND) پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر پیچوٹری گلیڈ بھی متحرک ہو جاتا اور ”ہینٹیل پیچوٹری لنک“ بھی قائم ہو جاتا تو میں اس ماحول میں پیدا ہونے والی تمام آوازیں سن سکتا تھا جو تھوڑا آئی کے توسط سے مجھے نظر آرہا ہو مگر محترم ساگک نے مجھے ایسی کسی بھی کوشش سے صاف منع کر دیا تھا اور میں..... واقعی باز ابھی گیا تھا۔

میں تجھوڑی دیر تک اس جیب کے ماحول میں موجود رہا پھر نگاہ دوڑا کر درگاہ کا جائزہ لیا اور..... جہاں تک میری نظر نے کام کیا، مجھے ہیوی بالائٹ انجن والی کو گاڑی کھڑی دکھائی نہ دی۔ ڈاکٹر مونگ کے تہور بتاتے تھے، حالات پر اسے عمل کنٹرول حاصل تھا۔ میں مطمئن ہونے کے بعد اپنی جگہ پر حاضر ہو گیا۔

میں آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ لیان کے چہرے پر نگاہ مگنی۔ اس نے چھوئے ہی پوچھ لیا۔ ”وجدان! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“  
”میں..... میں تو یہیں تمہارے سامنے موجود ہوں۔“

میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔

وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”تہارا جسم تو یہاں موجود تھا لیکن مجھے یقین ہے، ذہنی طور پر تم کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔“

”اچھا! میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔۔۔ تم ایسا سمجھ رہی ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا۔“

”جی“ والا معاملہ مکمل جانے کے بعد وہ مجھ میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس کا انداز کھوجنے والا ہوتا۔ تھوڑی دیر پہلے تو وہ اس شک بلکہ یقین کا اظہار بھی کر چکی تھی کہ میرے اندر بہت سے گمن جیسے ہوئے ہیں۔ میرے جواب نے اس کی تشفی نہ کی اور وہ ڈھونڈتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم جتنی سادگی سے جواب دے کر مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو، اتنے سیدھے اور سادے تم نہیں!“

”سادہ نہیں تو پھر پیچیدہ ہوں گا!“ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے بہلا رہے ہو۔“ اس کے لہجے اور نگاہ کا شک دور ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”میں کوئی تمہارا مقروض نہیں ہوں جو ٹالنے کی کوشش کروں گا اور نہ تم بھی اپنی ہوجو میں تمہیں بہلانے کے چکر میں لگ جاؤں۔ بہر حال جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی۔ یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے قدم بڑھا دیے۔ وہ میری تقلید کرتے ہوئے بولی ”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“

”چدر پہلے جا رہے تھے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”یعنی ڈاکٹر مونگ کی طرف مگر اب لمبا چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم براہ راست ادھر کا رخ کر سکتے ہیں۔“

وہ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی ”یہ بات تم اتنے وثوق سے کہہ رہے ہو جیسے تم جان چکے ہو، ادھر ڈاکٹر مونگ نے صورت حال کو اپنے ہاتھ میں کر لیا ہے؟“

اس کی باتوں میں شک اور استفسار کی آمیزش شامل رہی۔ وہ میری اور میرے معاملات کی طرف سے مطمئن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے گول مول جواب دے کر گزرا وہ چلانے کی کوشش کی ہے۔

”ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے کہا ”ڈاکٹر مونگ اس وقت اپنی جیب میں موجود ہے اور لگتا ہے اس نے ادھر دھنسی پر مکمل قابو پایا ہے۔“

”ایسا کیوں کر لگتا ہے؟“ اس نے گہری تجزیہ کی سے کرید جاری رکھی۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہہ دیا ”میں خود اچھا آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

”رنگی؟“ وہ ایک مرتبہ پھر رکرتھیں نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے بات بتاتے ہوئے کہا ”بھئی! جب جہیں مجھ میں چپے ہوئے گمن نظر آتی تھے ہیں تو یہ فرض کر لینے میں کیا حرج ہے کہ میں یہاں بیٹھے بیٹھے۔۔۔ ڈاکٹر مونگ کی خبر لے آیا ہوں!“

”تم جان چھڑانے کے لیے بات کو گھما رہے ہو!“ میں نے جلدی سے کہا ”لیاں! تم ایسی تو نہیں ہو کہ تم سے جان چھڑانے کے بارے میں سوچا جائے!“ یہ بات میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھی۔ ”اچھا ہوا تم نے بات کو گھمانے کا ذکر کیا۔ اگر تم یہ کہیں کہ میں تمہیں گھما رہا ہوں تو میں تمہارا کیا لگا دیتا؟“

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی ”وہ جان! تم بہت خطرناک ہو!“

”خطرناک شے سے انسان کو ڈر لگتا ہے۔“ میں نے کہا ”کیا میری سمیت میں تم بھی ایسا ہی محسوس کر رہی ہو؟“

”تمہاری صحبت میں مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔“

”گویا میں تمہارے لیے خطرناک نہیں ہوں۔“

”ہاں نکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا، تم اپنے پہلے بیان کی نفی کر رہی ہو۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”تمہارے خیال میں، میں خطرناک نہیں ہوں؟“

”جانتی نہیں!“ وہ جڑبڑھوتے ہوئے بولی۔

”اس اوکے۔“ میں نے اس بحث کو طول دینے سے اجتناب برتا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان بہت کم بات ہوئی زیادہ ہم خاموش ہی رہے۔ مختلط انداز میں چلتے ہوئے ہم عبادت گاہ کے پہلو سے گزرے اور پھر عقی چٹان تک جا پہنچے۔ راستے میں ہمیں کسی دشمن کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، ڈاکٹر مونگ نے میدان صاف کر دیا تھا۔ زادے بدلنے سے چونکہ ہمارا راستہ بھی خاصا کم تک تبدیل ہو گیا تھا لہذا اس طرف آتے ہوئے دشمنوں کی کوئی لاش ہماری نگاہ سے نہیں گزری۔

چندہ منٹ کی پہاڑی مسافت کے بعد ہم اپنی منزل!

پہنچ گئے لیکن جیب ہمیں خالی ملی۔ میں تصور کی نگاہ سے تھوڑی دیر پہلے اس جیب کی عقبی نشست پر ڈاکٹر مونگ کو ایک دشمن کا خاص الحاح ”انٹرویو“ کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ میں ڈاکٹر مونگ کی جیب میں موجودگی کے بارے میں لی یاں کو بتا چکا تھا لہذا اس کے غیاب پر وہ بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

یہ تو ممکن نہیں تھا کہ تیسری آنکھ نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ اس آنکھ کا تعلق بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مونگ اگر جیب میں نہیں تو اسے یہیں کہیں آس پاس موجود ہونا چاہیے تھا۔

میں نے تلاش انداز میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو میری یہ کوشش کامیاب ہو گئی۔ وہ مجھے ایک بڑی سی چٹان کے عقب سے نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ یہ وہی محافظ چٹان تھی جس کی آڑ میں ہماری جیب نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس چٹان کے عقب میں کچھ فاصلے پر بدھ نیل کنڈ کی وہ عبادت گاہ ایک نیلے پرستی جہاں آدمی رات کے بعد اسے اب تک ہنگامہ آرانی کا سلسلہ جاری تھا۔ چٹانیں اس سلسلے میں حرید کہاں تک درواز ہوتا تھا۔ اس عبادت گاہ کے نیچے، اوپر، اندر اور باہر درجنوں افراد وقفہ اعلیٰ بن چکے تھے اور خصوصی طور پر یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ یہاں موت کی آگ کا جولاؤ روشن ہوا تھا وہ حرید کتنے انسانوں کی زندگیوں کو چاٹ کر سرد ہوگا۔ وہ ایک انتہائی غیر یقینی صورت حال تھی۔

میرے گھر سے اور مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ اگر قدرت نے کچھ خزانوں کو زمین پوشیدہ کر رکھا ہے تو ان کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر ہے، اس پوشیدگی میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ جب بھی ایسے خزانے کو کھوجنے اور نکلنے کی کوشش کی گئی تو ایک بڑی تباہی، ایک عظیم الشان خون ریزی سامنے آئی۔ اس تلاش و جستجو میں سب سے زیادہ نقصان انسانوں ہی نے اٹھایا اور وہ بھی ہلاکتوں کی صورت میں!

ہوں اور لالچ (کم یا زیادہ) ہر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اسے کنٹرول میں رکھنا بڑے کمال کی بات ہے۔ جب یہ دونوں حد سے بڑھ جائیں تو پھر انسان کو سوچ بخی رخ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ بڑی زمین پوشیدہ خزانوں کی تلاش میں کل ٹھہر ہوتا ہے، قناعت سے زیادہ لوٹ کھسوٹ پر توجہ دیتا ہے اور کسی ایسی طاقت کے حصول میں سرگرداں نظر آتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ پوری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے پر قادر ہو جائے۔ اس خواہش کے لیے خاص دعام یا ادنیٰ داخل کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایسا شخص کوئی ایرافیرا۔ تھو خیرا بھی

ہو سکتا ہے اور رہی موٹے ہاتھ بھی! مجھ پر نگاہ پڑی تو ڈاکٹر مونگ چوکانیں بلکہ نیچے تلے قدموں سے چلتے ہوئے وہ ہمارے قریب پہنچا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”دشمن کا ایک مفید بندہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ادھر آ ہوں۔ تم دونوں تو خیریت سے ہونا؟“

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور کہا ”محسوس کر رہا ہوں، تم اس مفید بندے سے فارغ ہو کر نہیں بلکہ اسے فارغ کر کے آ رہے ہو تھوڑی دیر پہلے تم جس کا انٹرویو، جیب کی عقبی نشست پر لے رہے تھے!“

”ہاں! ایسی ہی بات ہے۔“ وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”اس دشمن کا نام کلارک تھا۔ میں نے اس انٹرویو میں کلارک سے بہت اہم باتیں اگوا لی ہیں۔“ ایک لمبے کے وقفے کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”آؤ جیب کے اندر بیچہ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا ”ہم بھی اس طرف دو دشمنوں کو زندگی بھر بے چارگی کے عالم میں چھوڑ آئے ہیں۔ ایک اپنی حرکتوں کی وجہ سے فنا کے گھاٹ اتر گیا۔“

”میں نے اس طرف آٹھ دس افراد کو موت کا سرہ چکھایا ہے۔“ ڈاکٹر مونگ نے جیب کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”لگتا ہے، یہاں پر موجود سب دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ کلارک بھی مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے چلا گیا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں توقف یا تو میں اس کے استفسار پر اثبات میں گردن ہلا کر دیا۔ وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا ”تم جن دو افراد کو لالچ بنا کر ہاں چھوڑ آئے ہو، میں انہیں بھی دیکھ لوں گا تم فکر نہ کرو، یہاں کے حالات لارڈ بھاکے فٹاسے قابو میں ہیں۔“

”اگر تمہاری طرف آنے کی جلدی نہ ہوتی تو میں بھی ان دو ”مغذ دروں“ سے ضرور پوچھتا چھڑتا۔“ میں نے کہا ”وہی وہ ایسی کسمپرسی میں وہاں پڑے ہیں کہ ان کی طرف سے کسی نوعیت کی مزاحمت کے امکانات صفر کے برابر ہیں۔ تم کافی دیر سے غائب تھے اس لیے بھی ہم اس طرف آ گئے۔ لی

یاں تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی تھی!“

وہ لی یاں کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے سے مستفہر ہوا

”وہ جان! مجھے امید ہے، تم نے اسے زیادہ پریشان نہیں ہونے دیا ہوگا؟“

آتش فشاں (183) حصہ 12



اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو، میں نے اسے زیادہ پریشان نہیں کیا ہوگا؟  
میں نے ایک نظری یان پر ڈالی اور جلدی سے کہا  
”بالکل نہیں ڈاکٹر!“

”ہوں!“ وہ مہنی خیز انداز میں ہنکاری بھر کر رہ گیا۔  
میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا ”وہ گاہریاں  
کہیں نظر نہیں آ رہیں جن کے طاقتور انجنوں کی خصوص  
غراہٹ ہم نے عبادت گاہ کے اندر سنی تھی۔ ان گاہریوں کو  
یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا؟“

”ہاں، وہ دونوں جیپیں اس چٹان کی دوسری طرف  
کھڑی ہیں، اپنے خواہیدہ انجنوں سمیت۔“ ڈاکٹر نے  
مٹھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”آؤ، جیپیں بھی  
دکھا دوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ اگلے قدموں واپس پلٹ گیا۔  
میں اور لی یان بھی اس کی تقلید میں قدم اٹھانے لگے۔ ہم  
چٹان کی دوسری جانب پہنچے تو دو لینڈ کرورز جیب دہاں نظر  
آ گئیں۔ دونوں کے اندر نصب ہوئی انجن اس وقت خاموش  
تھے۔ ان جیپوں سے چند فٹ آگے گہرا نشیب تھا جس کی  
گہرائی ہزاروں نہیں تو سیکڑوں فٹ ضرور تھی۔ مجھے یہ سمجھے  
میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر موگ نے کلاڑ کو  
اسی عین گڑھے کے سپرد کیا ہوگا۔ ہم نے اپنی جیب کو اس  
چٹان کی اوٹ میں ایسے کھرا کیا تھا کہ وہ عبادت گاہ کی سمت  
سے دکھائی نہ دے جب کہ وہ دونوں جیپیں عبادت گاہ کے  
رخ پر اس چٹان کی دوسری طرف مٹھرائی گئی تھیں اسی لیے  
جب میں نے ڈاکٹر کے ماحول میں جھانکا تو مذکورہ جیپیں مجھے  
نظر نہیں آئی تھیں اور ہم چونکہ ڈراگھوم کو اس طرف آئے تھے  
اس لیے بھی وہ جیپیں ہماری نگاہ میں نہ آ سکیں۔ اس امر میں  
کسی شک و شبہ کے بغیر ان کی گنجائش ڈراگھوم نامی ممکن نہیں تھا کہ وہ دونوں  
جیپیں ہمارے والے راستے پر سبز کرتے ہوئے اس چھوٹے  
سے سطح میدان تک پہنچی تھیں۔ چنانچہ ہماری جیب ان  
لوگوں سے چھپی نہیں رہی ہوگی۔

ہم ایک مرتبہ پھر چلے ہوئے اپنی جیب کے قریب  
پہنچے۔ ڈاکٹر موگ نے ڈراگھوم کا سائیز والا دروازہ کھولا۔  
میں یہی سمجھا کہ وہ جیب میں سوار ہونے جا رہا ہے لیکن اگلے  
ہی لمحے میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ وہ میری طرف اشارہ  
کرتے ہوئے بولا۔

”وعدہ! ان ڈراگھوم کی سیٹ پر آ جاؤ۔“  
میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اسٹیئرنگ

سنبھال لیا۔

ڈاکٹر موگ کا اشارہ پا کر لی یان یاں پنجر زینٹ پر آ بیٹھی تو  
ڈاکٹر عقبی نشست والا دروازہ کھول کر جیب کے اندر آ گیا۔  
میں نے اپنے وجود پر لگی ہوئی سیون ایم ایم کو اتار کر ڈیش  
بورڈ کے نیچے واقع خفیہ خانے کی طرف بڑھایا تو چونک اٹھا۔  
دوسری سیون ایم ایم وہاں پہلے سے موجود تھی۔ یقیناً ڈاکٹر ہی  
نے وہ کن دہاں رکھی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ڈاکٹر سے  
مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”تو گویا تم نے اس کن کو اس  
”محموظ مقام“ سے نکال لی یا۔ یقیناً اسی کن کے بل بوتے  
پر تم نے درجن بھر دشمنوں کو کھٹکانے لگایا ہے؟“  
وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، مہنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ  
گیا۔

میں نے کہا ”ڈاکٹر! تم ہمیں کلاڑک کے بارے میں  
کچھ بتانے جا رہے تھے؟“  
وہ چند لمحے سمیر انداز میں خاموش بیٹھا رہا پھر مٹھرے  
ہوئے لہجے میں میں میں ہمیں کلاڑک سے حاصل ہونے والی  
معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔ کلاڑک ان تمام افراد میں  
سب سے سینئر تھا جو ان دو ہی لینڈ کرورز جیپوں میں دہاں  
پہنچے تھے۔ وہ لگ بھگ ایک درجن افراد تھے اور اپنے  
ساتھیوں کی مدد کو آئے تھے جو نصف شب سے قبل عبادت گاہ  
کے درخانے میں ایک خاص مشن، بھی فوڈ اسی سرکردگی میں  
انجام دے رہے تھے۔ جس طرح بھی فوڈ اپنے درجن بھر  
ساتھیوں کے ہمراہ اس وقت سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا  
بالکل اسی طرح کلاڑک کے ساتھ بھی واقعات پیش آئے  
تھے۔ کلاڑک اور جی فوڈ ایک ہی حیثیت کے مالک تھے اور

ڈین ہاروے ان کا پاس تھا۔  
ڈین ہاروے کی طرف سے اسے خصوصی ہدایت تھی کہ وہ  
لوگ عام گزراگاہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے اپنے  
ٹارگٹ تک پہنچیں۔ کلاڑک نے اپنے پاس کے حکم کی تعمیل کی  
اور جب وہ لوگ یہاں پہنچے کے بعد اپنی جیپوں سے باہر نکلے  
تو انہیں ایک وحشت ناک اور غیر متوقع صورتحال سے  
واسطہ بڑا۔ وہ جیسے ہی عبادت گاہ کی طرف بڑھے، ایک  
ساعت شکن دھماکے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ وہ بوکھلا کر رہ  
گئے۔ اسی اثنا میں دوسرا دھماکا بھی ہو گیا۔ کلاڑک نے جیج کر  
اپنے ساتھیوں کو احکام صادر کیے کہ وہ لوگ پھیل کر عبادت گاہ  
کی جانب بڑھیں اور دشمنوں کو کھل کر رکھ دیں۔  
”یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟“ میں قطع کلاہی پر مجبور

ہو گیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”کیوں، کیا ہو گیا؟“  
ڈاکٹر کے انکشاف نے میرے ذہن میں پہلے بچاوی  
تھی۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا، وہ جیٹوں دھماکے ہمارے  
نوادار دشمنوں کا کارنامہ ہیں لیکن ڈاکٹر تو کوئی اور ہی کہانی  
سن رہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ تین خونخوار دھماکے، ہم  
تینوں میں سے کسی نے نہیں کیے تھے۔ کلاڑک بھی اگر ان  
دھماکوں کی ذمہ داری قبول نہیں کر رہا تھا تو پھر سوال یہ پیدا  
ہوتا تھا، وہ دھماکے آخر کس نے کیے؟“

میرے سوچنے کے دوران میں ڈاکٹر کھب جانے والی  
نگاہ سے یک ننگ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ابھرنے لہجے  
میں استفسار کیا ”میں تو یہی سمجھ رہا تھا، وہ دھماکے آنے والے  
دشمنوں نے کیے ہیں۔ اگر انہوں نے نہیں کیے تو پھر اس کا  
ذمہ دار کون ہے؟“

”تمہاری طرح میرا بھی یہی خیال تھا“ وہ مٹھرے  
ہوئے لہجے میں بولا ”لیکن کلاڑک کے بیان نے ہمارے اس  
خیال کی تردید کر دی ہے۔“

میں نے اپنے سوال کو دہرایا ”پھر ان دھماکوں کی  
ذمہ داری کس کے کھاتے میں جائے گی؟“  
”لارڈ بدھائی بہتر جانتا ہے“ وہ چرسوچ انداز میں گویا  
ہوا۔

ڈاکٹر موگ جب گفتگو کے دوران میں لارڈ بدھاکو  
لے کر آتا تھا تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا تھا، اب وہ کسی  
سوال کا واضح جواب نہیں دے گا۔ میں ٹوٹتی ہوئی نظر سے  
اسے دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحات کے گمیر تو قنف کے بعد دوبارہ  
گویا ہوا۔

”ہاں تو میں بتا رہا تھا۔ کلاڑک کے احکام کی بنیاد میں  
وہ درجن بھر افراد دین سمیت سے عبادت گاہ کی طرف بڑھے  
تاکہ اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کر سکیں۔ دھماکوں نے انہیں  
گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ عبادت گاہ کی جانب چند  
قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ تیسرا دھماکا ہو گیا۔ اس دوران میں  
ہم عبادت گاہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ لوگ  
ہمارے حصے میں آ کر موت سے ہٹ کر ہوتے چلے گئے۔ بس  
اتنی ہی بات ہے!“

ڈاکٹر تو ”بس اتنی ہی بات“ کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن  
میرا ذہن پہلے سے بھی زیادہ الجھ گیا۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ  
وہ دھماکے اپنی مرضی سے خود ہی ہو گئے ہوں۔ ان کا  
کوئی محرک، کوئی مقصد تو ضرور تھا اور مجھے یقین تھا، اس محرک

اور مقصد سے ڈاکٹر موگ بے خوبی آگاہ تھا مگر اس وقت ڈاکٹر  
کی زبان سے کچھ اگلوں اگلوں وقت ضائع کرنے کے مترادف  
ہوتا۔ بس اطمینان بخش بات یہی تھی کہ ان تینوں دھماکوں میں  
ہم تینوں کو کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچا تھا اور مجھے یقین  
تھا، عبادت گاہ بھی اندر اور باہر سے محفوظ رہی تھی۔ ہمارے  
نوادار دشمن سراسر کھٹکانے میں رہے تھے۔ ڈاکٹر موگ کے  
مطابق، ان دھماکوں کے بارے میں اگر لارڈ بدھائی بہتر  
جانتا تھا تو اس میں مجھے کوئی اعتراض کیوں ہوتا؟

میں نے کہا ”کلاڑک نے اور کیا کیا بتایا ہے؟“  
”اس نے زیادہ تر دہائی باتیں بتائی ہیں جو ہم جی فوڈ  
سے معلوم کر چکے ہیں“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔  
”کلاڑک نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ڈین  
ہاروے ایک دل کش یہودن کے ہمراہ کل صبح ہی اسرائیل  
سے یہاں پہنچا ہے۔ وہ دونوں جو گنڈر پال کے اسی ٹھکانے پر  
قیام پزیر ہیں جو اسرائیل ایٹمی کسی کے عقب میں، شہر کے پوش  
علاقے میں واقع ہے۔“

میں نے پرخیز انداز میں کہا ”تو گویا کلاڑک نے جی  
فوڈ اسے بڑھ کر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس غیبی جی فوڈ  
نے تو دل کش یہودن کا ذکر گول ہی کر دیا تھا!“  
میرے اس اظہار پر ڈاکٹر فوگ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔  
”ڈین ہاروے کے ساتھ یہاں پہنچنے والی یہودن کا کیا  
نام ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”کلاڈیا!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔  
میں نے پوچھا ”کیا کلاڑک نے میری ساحل کے  
بارے میں بھی کچھ بتایا ہے؟“  
”کچھ خاص نہیں“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”پھر بھی..... کوئی عام بات ہی سہی.....؟“ میں گویا  
مچل کر رہ گیا۔

ڈاکٹر اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا ”کلاڑک  
اور ڈین ہاروے، ڈین ہاروے سے احکام لینے کے پابند تھے۔  
انہیں گا بے گناہ۔ گنڈر پال والے اس ہنگامے پر طلب کر لیا  
جاتا، جہاں ڈین ہاروے صہرا ہوا ہے۔ گنڈر پال تو بے ہی  
فوڈ اٹنے ساحل کو ہائی دے والی ہستی سے ڈین ہاروے کے  
پاس پہنچایا تو کلاڑک بھی وہاں موجود تھا۔ ایک لمحے کے بعد  
جب ڈین ہاروے نے جی فوڈ کو عبادت گاہ کی طرف روانہ  
کیا تو کلاڑک اس وقت بھی اسی ہنگامے میں تھا لیکن یہ بات اس  
کے علم میں نہیں تھی کہ ڈین ہاروے عبادت گاہ کے درخانے  
تک رسائی کا راز جان گیا ہے اور وہ یہ بات بھی نہیں جانتا تھا



کہ جی نوٹرا کو کس نوعیت کی چڑھائی کے لیے عبادت گاہ کی طرف بھیجا جا رہا ہے؟ ڈاکٹر لکھے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

”جب کلارک انتہائی ایمرجنسی میں خصوصی ہدایات کے ساتھ عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جی نوٹرا کو دیکھنے کے لیے جا رہے ہیں۔“

میں نے سرسراہٹ سے بولی آواز میں کہا، ”کسی شخص کو شکل یا مصیبت میں دیکھ کر اس کی مدد کی جانی ہے۔ اگر کلارک کو کسی ایمرجنسی میں ادھر بھیجا گیا تھا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، ڈین ہاروے یہاں کی صورت حالات سے کافی حد تک آگاہ ہے۔ اگر آگاہ نہیں بھی ہے تو کم از کم اسے یہاں ہونے والی کسی گڑبڑ کا احساس ضرور ہے۔ میں تصور میں اس شخص کو گہری تشویش میں دیکھ رہا ہوں۔“

”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں“ وہ دھوس لکھے میں بولا۔

میں نے کہا، ”اس کا مطلب ہے، عبادت گاہ پر ایک اور چڑھائی بھی ہو سکتی ہے۔ کلارک اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی ہم نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ ڈین ہاروے بڑا باخبر اور ادراک خیز شخص ثابت ہو رہا ہے۔ وہ یہاں کے تازہ ترین حالات سے بھی آگاہی حاصل کر سکتا ہے جس سے اس کی تشویش میں کمی بڑا رہنا اضافہ متوقع ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، یہاں خون ریزی کا ایک نیا باب کھلنے والا ہے!“

”تم بے فکر رہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا“ ڈاکٹر مونگ نے پورے یقین سے کہا۔

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہاں کے حالات کے بارے میں اگر اتنا ہی مطمئن اور یقین تھا تو یہ کچھ بے سبب نہیں تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں میدان کا کوئی خاص نقش پوری جزئیات کے ساتھ کھلا ہوا تھا۔ میں نے کرپہنے والے انداز میں کہا۔

”ڈاکٹر! تمہارے اطمینان کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا ہے جیسے تمہیں کوئی بھرپور مدد حاصل ہو گئی ہو؟“

”میں لا رہا ہوں کہ مدد یقیناً رکھتا ہوں“ وہ ہنسنے ہوئے لکھے میں بولا۔

ڈاکٹر مونگ ایک راح العتیدہ شخص تھا۔ انسان کا تعلق چاہے کسی بھی مذہب دلت سے ہو، اپنے مذہب کے بیان کردہ اوصاف میں ڈھلنے اور اس کے شرات سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے لیے راح العتیدہ ہونا بہت ضروری ہے۔

لا رہا ہوں کہ مدد یقیناً رکھتا ہوں“ وہ ہنسنے ہوئے لکھے میں بولا۔

ڈاکٹر سے پوچھا، ”تم نے عبادت گاہ کے اندر کیا تھا، صرف دس منٹ اور درگ جاؤ۔ اس کے بعد ہم ساحل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ تمہیں شیوا کی بھیجی ہوئی کمک کا انتظار تھا لیکن اب تو اس بات کو کوئی ”دس منٹ“ گزر گئے ہیں۔ ہم کب تک اس کمک کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے میں فوری طور پر ساحل کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں“ وہ دھوس لکھے میں بولا، ”اور تمہیں اب ایسا ہی کرنا ہوگا۔“

ڈاکٹر کے انداز نے مجھے شگ کیا، ”اب ایسا ہی کرنا ہوگا کیا مطلب؟“ میں نے قدرے احتجاجی لکھے میں کہا، ”کیا اس سے پہلے میں کچھ اور کر رہا تھا؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا، ”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا، تم پہلی فرصت میں ممکنہ طور پر روانہ ہو جاؤ۔“ پھر اس نے جیب کی چابیاں اپنی جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔

میں نے سوالیہ نظر سے پہلے چابیوں کے سمجھے کہ اور پھر ڈاکٹر مونگ کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے واضح تھا کہ وہ میرے ساتھ آگے بڑھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر مونگ کا یہ فیصلہ میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ میں نے چابیوں والے پچھے کو چھوئے بغیر اس سے پوچھا۔

”اور تم؟“

میرے اس دوغلی جملے میں ستر صفحات کے برابر استفسار موجود تھا۔ وہ ایک لمحے تک میری آنکھوں میں دیکھنے کے بعد بولا۔ اس کی آواز میں طبعیت شامل تھی۔

”مجھے کم از کم ایک ہفتے تک یہاں رکنا ہوگا!“

نہ چاہتے ہوئے بھی میرا الجھنہ قدرے طرے ہو گیا۔ ”کیا شیوا کی طرف سے آنے والی کمک ایک ہفتے کے بعد یہاں پہنچ پائے گی؟“

”ایسی بات نہیں“ اس کی سنجیدگی اور لکھے کے اٹل پن میں ختمہ برابری واقع نہ ہوئی، ”شیوا والی کمک تو کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ میرا ایک ہفتے تک یہاں رکنا اس لیے ضروری ہے کہ میں اس عبادت گاہ کو یوں ہی بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ میں یہاں کے انتظامات کو ابھی شکل دینے کے

بعد ہی یہاں سے رخصت ہوں گا۔ زندگی رہی اور لا رہا ہوں کہ مدد یقیناً رکھتا ہوں“ وہ ہنسنے ہوئے لکھے میں بولا۔

میں نے مضبوط لکھے میں کہا، ”تو تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ آج ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، چاہے عارضی طور پر ہی کیا!“

”یہی حقیقت ہے“ وہ بدستور گھبرایا آواز میں بولا، ”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے وہاں ممکنہ طور پر ہر بات کو مدد اور تعاون کا بھرپور بندوبست کر دیا ہے۔ تمہیں اپنے مشن میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ انسپکٹر شیوا اور جانوس تمہاری خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں نے خاص طور پر جانوس کو تمہارے بارے میں بریفنگ دے دی ہے۔ تم اس کی طرف سے اپنا دل صاف رکھو۔ وہ برا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ اب تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

میں گہری نظر سے ڈاکٹر مونگ کے چہرے پر موجود تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس وقت حد سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر مونگ کا قناعت تھا۔ میں اس کے ساتھ مل کر اس لیے آگے بڑھ رہا تھا کہ ہمارے مقاصد نے قدم سے قدم ملا رکھا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا، اب ہمارے مقاصد کے چچا چھا خاصا فاصلہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس حقیقت کا ادراک ہونے کے باوجود بھی میں ڈاکٹر مونگ سے شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”ڈاکٹر!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لکھے میں کہا، ”تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا ہے، ممکنہ طور پر مجھے اپنے مشن میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“ اپنے مشن کے الفاظ تم نے ایسے استعمال کیے ہیں جیسے یہ صرف میرے اکیلے کامشن تھا، تم خواہ خواہ میرے ساتھ اپنا وقت برباد کرتے ہو رہے تھے!“

لی یان اس گفتگو کے دوران میں پکا پکائی ڈاکٹر مونگ کی صورت دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کی چابیوں والا کچھ تھوڑا ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ابھی تک اس کی جانب اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ میں پہلے ڈاکٹر کی سننا چاہتا تھا۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو پہلی مرتبہ میرے سامنے آ رہا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے دھرا!“ وہ میری شکایت کے

جواب میں بڑی رسائی سے بولا، ”اب تک یہ ہم دونوں کا مشترکہ مشن تھا اسی لیے محترم ساگ فو کی خواہش تھی کہ ہم شائے سے شائد ملا کر آگے بڑھیں مگر یہاں پہنچ کر ہمارے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ ساگ فو کی خواہش کی تکمیل ہو گئی۔ یہ میرے لیے بڑی خوشی، اعر اور فخر کی بات ہے۔“

میں دل میں کچھ نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا، ”کیا ہمارے راستے اس لیے جدا ہو گئے کہ اس تجربے سے تمہیں اور تمہارے بڑوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی ذریعے سے عبادت گاہ کے مکانے میں اترنے کا طریقہ معلوم کر لے پھر بھی وہ اپنے ذمہ عزم غم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مکانے میں پوشیدہ گراں قدر خزانہ ہر حال میں محفوظ رہے گا؟“

وہ خفیف سا مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لکھے میں بولا۔

”لا رہا ہوں کہ مدد یقیناً رکھتا ہوں“ وہ ہنسنے ہوئے لکھے میں بولا۔

”پہلے ہی سے تھا۔“

”پھر اس جواخت دیکھ کر کیا ضرورت تھی؟“ میری آواز قدرے بلند ہو گئی۔

”یہ دلائی لاما کی خواہش تھی۔“

”دلائی لاما!“ میں اچھل پڑا، ”پہلے تم اسے ساگ فو کی خواہش کہہ رہے تھے۔ اب اسے دلائی لاما سے منسوب کر رہے ہو؟“

”محترم ساگ فو کی خواہش دلائی لاما کی مرضی کے سبب ہی تھی“ اس نے جواب دیا۔

”ادو!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ بد وقت رخصت انکشاف پر آشکاف کیے جا رہا تھا۔ میرے لیے وہ تمام تر باتیں انتہائی اہم اور دلچسپ تھیں۔ اپنی معلومات کو درر تک پہنچانے کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں کہ دلائی لاما کی خواہش بری ساگ فو نے عمل کرتے ہوئے ہمیں اس مشن کے لیے جین لیا تھا لیکن حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے میں یہ اندازہ قائم کر رہا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی پیش آیا، اس کے بارے میں تمہیں پہلے سے خبر تھی؟“

”تمہارا اندازہ درست ہے“ وہ دھوس لکھے میں بولا۔

میں نے کہا، ”میری معلومات کے مطابق، تم ہر قسم کی ہدایات اور احکام ساگ فو سے لیا کرتے تھے۔ محترم ساگ فو کی موت کے بعد اپنے حلقے میں تم سب سے بڑے ہو۔ لی یان، دوگ ہنگ اور دیگر لوگ تمہیں اپنا بڑا ماننے ہیں لیکن میں

محسوس کر رہا ہوں کہ تم بھی کسی اور بڑے کے زیر سایہ چل رہے ہو" میں ایک لمحے کو راگ بھراں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"کیا تم دلائی لاما سے براہ راست رابطے میں ہو؟" "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" وہ بات کو گھماتے ہوئے بولا۔

میں نے اصرار ہی انداز میں کہا "مجھے فرق پڑتا ہے، تم میری تسلی کی خاطر ہی بتاؤ؟"

"پلیز وچدان!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

ان لمحات میں ڈاکٹر موگک مجھے بہت ہی عجیب اور بے بس نظر آیا۔ میں نے اس کا خیال کرتے ہوئے اپنی ضد کے ہتھیار پھینک دیے اور معتدل لہجے میں کہا۔

"چلو اتنا ہی بتا دو، دلائی لاما مجھے اس مشن میں کیوں رکھنا چاہتا تھا۔ میرا اشارہ بدھ متل کنڈوالی عبادت گاہ کے خانے والے معاملات کی طرف ہے؟"

"وہ تمہیں ایک آزمائش سے گزارنا چاہتا تھا۔" وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "مبارک ہو کہ تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے ہو۔"

"آزمائش..... امتحان.....!" میں بے ساختہ بولتا چلا گیا "پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس نے کہا "مختم دلائی لاما یہ ثابت کرنا چاہتا تھا، تم ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔ تمہارا مقصد نیک اور جستجو راجح ہے۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو، اس مسافرت کی اہلیت رکھتے ہو۔"

میں نے قطعی لہجے میں کہا "ڈاکٹر! تم بات کو ابھرا کر پیش کر رہے ہو۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ دلائی لاما مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کر چکا ہے پھر اس کھٹراک کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی جیسی تو یہ کھٹراک پھیلا یا گیا ہے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"میں تو تمہیں بھی پوچھ رہا ہوں؟" میں نے اسی کے انداز میں کہا۔

وہ چند لمحات تک گہری نظر سے مجھے نکتا رہا پھر میری بولی آواز میں بولا "وچدان! تم ایک بدھ مت لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو، دھنوں سے محبت کے دعوے دار ہو" وہ ایک ٹرائل کی کیفیت میں بولتے ہوئے ساحل سے دھنوں پر آگیا تھا۔ مختم دلائی لاما کے چند قریبی افراد کو تمہاری اس

جسارت پر سخت اعتراض ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عبادت گاہ کے خانے کے حوالے سے دلائی لاما نے تم پر بھرپور اعتماد ظاہر کیا ہے۔ ایک غیر بدھ مت پر دلائی لاما کی ایسی توازن انہیں پسند نہیں آتی۔ کسی میں اتنی ہمت تو نہیں ہے کہ وہ اپنے اعتراضات اور تاپسندیہ کی گواہ راہ راست دلائی لاما کے سامنے پیش کرے مگر دلائی لاما اس قسم کی غلط فہمیوں کو پالنے کا قائل نہیں۔ اس نے اپنے قریبی معترض افراد پر تمہاری اہلیت ثابت کرنے کے لیے تمہیں اس آزمائشی مشن میں ڈالا تھا اور تم اس کڑے امتحان میں سرخرو ہو گئے تمہاری کامیابی نے بدخواہوں کے منہ بند کر دیے۔ ایک طرح سے اب تمہیں ایک سند ہی مل گئی ہے۔ اعتراض کرنے والوں پر واضح ہو گیا کہ دلائی لاما نے تم پر اعتماد کر کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔"

وہ ذرا دیر کو توقف ہوا پھر قدرے جھکمانہ لہجے میں بولا "وچدان! یہاں بیٹھ کر وقت پر پابند کرو۔ تمہیں فوراً ساحل کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر چایوں والا چھامیری کی جانب بڑھا دیا۔

اس بار میں نے اس کے ہاتھ سے مذکورہ گچھا تمام لیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "وچدان!

تمہارے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مختم دلائی لاما نے نہ صرف یہ کہ تم پر اعتماد کیا بلکہ اس اعتماد کو تجربے کے عمل سے گزار کر تمہیں اہل اور سچا ثابت بھی کر دکھایا ہے۔ تم نے عبادت گاہ کے خانے میں پوشیدہ خزانے کی حفاظت کے لیے جس طرح سرگرمی دکھائی وہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ میں ساحل کے حصول کے لیے مزید تمہارا ساتھ دیتا لیکن میرے فرائض کچھ اور تقاضا کر رہے ہیں۔ تم نے اندازہ لگایا ہوگا، مختم ساگ فو کے بعد میری ذمے داریوں میں کدور اضافہ ہو گیا ہے۔"

"اس سلسلے میں تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر!" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "ہر شخص کو اپنی ذمے داریوں کی طرف دیکھنا چاہیے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم آج سے اپنی اپنی راہ کے ہو گئے اور اپنی راہ پر چل کر ہم اپنے فرائض کو زیادہ احسن طریقے سے پورا کر سکیں گے۔ تم نے اس سلسلے میں اب تک میری بہت مدد کی ہے میں اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا ہوں۔"

بات کے اختتام پر میری آواز اٹھ اٹھی۔ ڈاکٹر موگک ریفوشے کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کا بہت اچھا وقت گزارا تھا اور اس دوران میں مجھے بہت کچھ سمجھنے اور دیکھنے کا

موقع بھی ملا تھا۔ میری آواز کی بھراہٹ اسی تعلق کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر سے چدائی کا مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ میرے لیے ایک دوست استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔

"وچدان!" وہ بڑی محبت سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا اور اوپر سے مجھے اس کی خصوصی ہدایت کی گئی تھی میں نے تمہارے ساتھ جو وقت گزارا ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تم ایک عظیم اور مخلص دوست ہو، میں لاڈ بڑھا سے التجا کروں گا کہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی ملے۔"

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، میرے "مقصد" سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ یقیناً ساحل کے حصول کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے خلوص، محبت اور ہم درہم رودی کو دیکھتے ہوئے بے اختیار میری زبان پر یہ سوال آگیا۔

"ڈاکٹر موگک! تمہارے خیال میں، میں کب تک اپنے مقصد کو پاؤں گا؟"

اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں خطرناک اشتعال نظر سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ پتا نہیں، وہ میرے اضطرابی سوال کے جواب میں کیا کہنے والا تھا۔ جس شے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ ہو اس سے متعلق خواہ مخواہ تجسس ابھرتا ہے۔ میں ساحل کی تلاش میں درود کی خاک چھان چکا تھا اور پتا نہیں، اور کتنے گرو کی کوچے مجھے جھانکتا تھے۔ وہ ہستی میرے قریب آ کر اچانک دور ہو جاتی تھی۔ ایک لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اگلے لمحے میں اسے پالوں گا لیکن وہ اگلا لمحہ آئے میں کی گھٹنے، دن، ہفتے اور مہینے گزر جاتے۔ ان لمحات کے پکر میں، مجھے لمحے بھر کا سکون میسر نہیں تھا۔ وہ ہر وقت میری نگاہ میں پھرتی رہتی، اس کا سراپا میری سوچ کا بیڑ لفظ بن گیا تھا۔ میں اس کے بغیر کچھ بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں! اس کے تصور سے خالی ایک لائن سوچنا سوہان روح تھا۔ میں ایک ایک سانس اس کے حصول کے لیے کوٹاں تھا۔ وہ میری زندگی کا حاصل بن گئی تھی اس لیے۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک بہت بڑی عبادی تو ہے ساختہ میری زبان سے یہ سوال پھسل گیا۔

ڈاکٹر نے آنکھیں کھولیں اور غمیرے ہوئے لہجے میں بولا "دیکھو وچدان! میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تم کب ساحل کو حاصل کرو گے مگر اس بات کا مجھے پکا یقین ہے کہ ساحل..... وہ لڑکی جس کا نام بھی دھنوں ہوا کرتا تھا، وہ اب صرف اور صرف تمہاری ہے۔ اسے تمہارے نام لکھ دیا گیا ہے۔ تم ایک نیا ایک دن اس کو ضرور پا لو گے" اتنا کہہ کر اس نے ذرا دیر کو خاموشی

اختیار کی پھر پُر خیال انداز میں بولا۔ "مختم دلائی لاما کی عام آدم کو آزمائش سے نہیں گزار سکتا۔ وہ دنیا میں بسنے والے تمام بدھ... افراد کے لیے مذہبی اور روحانی پیشوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ دیگر مذہب سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد بھی مختم کی علیت اور مقام و مرتبے کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ مختم کا رویہ اور سلوک خاص الخاص ہے۔ جب اس نے اپنے قریبی اہم افراد پر تمہاری اہلیت ثابت کی ہے تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ وہ تمہارے معاملات کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا کہ لاڈ بڑھا تم پر مہربان ہو، تم اپنی منزل کو پا لو!"

ڈاکٹر موگک نے بڑے بے تلبے اور محتاط الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میرے معاملے کو دلائی لاما کی تائید حاصل ہے۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ایک نہ ایک دن ہجرت فرماؤں گے یہ شب و روز کٹ جائیں گے میرے اور ساحل کے سچ حاصل فاصلے مٹ جائیں گے اور ہمارے وصال کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی!

ان لمحات میں، مختم ساگ فو سے ہونے والی پہلی اور آخری ملاقات میری نگاہ میں گھوم گئی۔ اس ملاقات میں، میں نے اپنی زندگی کی نہایت ہی اہم گفت گو کی تھی۔ دیگر امور کے علاوہ ساحل کا معاملہ بھی زیر بحث آیا تھا۔ مختم ساگ فو نے بھی مجھے ساحل کا سچا طلب گار تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا..... ساحل کا حصول اگرچہ آسان نہیں لیکن تمہارے عزم اور مستقل مزاجی سے کچھ بعید بھی نہیں پھر اس نے مجھے ایک بزرگانہ مشورہ دیا تھا..... جب تم ساحل کو حاصل کر لو تو اس کی قدر کرنا، اس نے تمہاری خاطر بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ میں ساحل کا ایک بزرگ ہونے کے ناتے اسے تمہارے سپردگی میں دیتا ہوں۔ ساحل کے کرتا دھرتا مختم ساگ فو اور مختم دلائی لاما مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے اس کا حق وار تسلیم کر چکے تھے۔ یہ اس بات کی نادیہ سندھی کہ ایک روز اپنی ساحل کو ضرور پا لوں گی۔

ان مسرت انگیز خوش آئند خیالات نے میرا انگ انگ مہکا دیا۔ میں ساحل کی خوش بو کو اپنے وجود میں پکراتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے میں اس کے ساحل میں سانس لے رہا ہوں۔ واقعی، میرا ماحول اس لڑکی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا تھا!

ڈاکٹر موگک کی سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی آواز نے مجھے ان نشا انگیز خیالات سے جو کچا دیا، وہ کہہ رہا تھا "وچدان!



تبدیلی کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ جانوس تمہارے لیے رقم کا بندوبست بھی کر دے گا۔ شون اور لی یان کے کریڈٹ کارڈز کو استعمال کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا!“

ہم دونوں نے ڈاکٹر موگ کی بات پر صا د کیا۔

ٹھیک سات بجے ہم ڈاکٹر سے رخصت ہو کر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

لی یان چپ چپ اور اداس تھی۔ میں اس کی اداسی کا سبب جانتا تھا۔ میں شون کو تو واپس نہیں لاسکتا تھا البتہ اسے پُر سکون اور نارمل کرنے کے لیے حیلہ وسیلہ کرنا میرے اختیار میں تھا۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے جیب کو مڑ کر کے کنارے روک دیا۔

”کیا ہوا؟“ لی یان نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی تو بہت کچھ ہو جائے گا!“

اس کی آنکھوں میں الجھن سی تھی ”تم یہاں دیرانے میں جیب روک کر مجھ سے کون سی بات منوانا چاہتے ہو؟“

”مانتا ہوں۔“ میں نے مگر اسرار انداز میں کہا ”پہلے تم پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹ جاؤ۔“

اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہو گئی ”پھر؟“

”پھر..... بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا ”پہلے وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ چلو، شاباش۔“

میں نے اسے کسی غلطی کی بجائے پکارا تو وہ تھوڑے تابل کے بعد اپنی سائیکل کا دروازہ کھول کر جیب سے باہر نکلی اور خاموشی کے ساتھ غصی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک جھٹکے سے جیب کو آگے بڑھا دیا اور کہا ”میں نے بیٹھنے کی نہیں بلکہ لیٹنے کی بات کی ہے۔“

”تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟ وہ گڑبڑ اگئی۔

”اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟“ میں نے کہا۔

”کیوں، کیا ہوا ہے میری شکل کو؟“ اس نے حیرت بھرے انداز میں دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھو کر دیکھا۔

میرے غیر متوقع اور بے عمل سوال نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا ”پانچ گھنٹے..... پہلے ہی وہاں پورے بارہ بج رہے ہیں۔ ممکن اور نیند نے تمہیں بڑھ حال اور بے حال کر رکھا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے آرام سے اس سیٹ پر سو جاؤ گی تو فریض ہو جاؤ گی۔“

صورت حال واضح ہوئی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ”تمہارا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے وجدان! میری بہ نسبت تم نے کہیں زیادہ محنت و مشقت کی ہے۔“

”فکر نہ کرو، اپنی باری پر میں بھی آرام کروں گا۔“ میں نے کہا ”ہائی دے والی ہستی تک میں ڈرائیونگ اور تم آرام کرو گی۔ ہستی سے کھینڈ و شہر تک ہم اپنی ڈیوٹی بدل لیں گے۔

”کہو، کیسا آئیڈیا ہے؟“

”فخفا سٹک!“ وہ اداسی اور شہید کی کو قدرے کم کرتے ہوئے بولی۔

”پھر اس فخفا سٹک آئیڈیا پر عمل درآمد کی میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔“ میں نے غصی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا ”تم ابھی تک بیٹھی ہوئی نظر آ رہی ہو؟“

اور میری بات ختم ہوئی، اور لی یان پہ آہستگی نشست پر دراز ہو گئی۔ پھر ایک خاص انداز میں بولی۔ ”ہاؤ کیٹری یو آر!“

میں لی یان کی افسردگی کم کرنے کے لیے دانستہ ہلکی ہلکی گفتگو کر رہا تھا..... اس کے آخری جملے سے ظاہر ہوا کہ مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔ کسی کا دکھ بانٹنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ لی یان سے بات کرتے ہوئے میرے لہجے میں محبت اور شفقت شامل ہوئی تھی۔ محبت بڑا طاقتور جذبہ ہے۔ یہ خوشیوں کو ضرب اور غموں کو تقسیم کرتا ہے۔ میں لی یان سے لگاؤت بھرے انداز میں گفتگو کر کے دراصل اس کے غم کو ازل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیٹری اور ڈیوٹری کا فیصلہ کھینڈ و شہر میں پہنچ کر کریں گے۔“ میں نے کہا ”فی الحال تم اچھے بچوں کی طرح فوراً آٹھویں بند کر کے نیند کی بانہوں میں سٹ جاؤ کیونکہ تمہارے آرام کا وقت شروع ہو چکا ہے۔“

اس نے کسی فرماں بردار بچے کے مانند آنکھیں بند کر لیں۔

میں نہیں جانتا تھا، وہ سونے کی کوشش کرے گی یا یونہی آنکھیں بند کیے پڑی رہے گی مگر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے خست اثرات نے مجھے مطمئن کر دیا۔ میں اسے دکھ ٹکری سے بچنے کا باہر لانے میں خاصی حد تک کامیاب رہا تھا۔

دن کی روشنی کے باعث واپسی کا سفر بہ نسبت آسانی سے طے ہوا اور کسی بد مزگی کے بغیر ہم بہ خیر و عافیت ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے دو پہر کھینڈ و شہر کی حدود میں داخل ہو گئے۔

ہائی دے والی ہستی ہے پروگرام کے مطابق لی یان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور میں چھپکلی نیند کے لیے پچھلی

سیٹ پر چلا گیا تھا۔ ہستی سے کھینڈ و شہر کا فاصلہ گنگ بنگ ایک گھنٹے کا تھا، چھپکلی نیند میں نے اس لیے کہا کہ پہاڑی راستے پر سفر کرتے ہوئے پُر سکون اور گہری نیند سونا ناممکنات میں سے تھا۔ لی یان کے مطابق، وہ اچھی طرح سوئی تھی اور اس ”اچھی طرح“ کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا!

اب میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اور لی یان پچھریز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے جیب کو کوکرنگ روڈ پر چڑھایا تو لی یان نے کہا۔

”وجدان! کہیں رک کر پہلے جانوس کو فون کر لو تاکہ ہمیں معلوم ہو، جانا کہاں ہے!“

میں نے ناگواری سے کہا ”یہ فیض مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اگر ڈاکٹر موگ کی اصرار نما خواہش کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتا۔“

”اب تو مجبوری ہے۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی ”ویسے ڈاکٹر موگ نے یقین تو دلایا ہے کہ جانوس کو تمہارے بارے میں خصوصی برائیات دی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے، اب وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے تمہیں کسی قسم کی کوفت کا سامنا کرنا پڑے۔“

”تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں!“ میں نے جیب کے باہر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا ”فون تو تھک نظر آ جائے، پھر میں جیب روکتا ہوں۔“

وہ قدرے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”کیا تمہیں ڈاکٹر کی کہی ہوئی بات کا یقین نہیں ہے؟“

میں فوراً سمجھ گیا، اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر تو مجھے پورا بھروسہ ہے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں لیکن.....“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا اور غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا ”تمہاری بات ماننا بھی تو ضروری ہے!“

وہ اداسی کی کیفیت سے بڑی حد تک باہر نکل آئی تھی، میری بات سن کر وہ خاصی متعجب ہوئی۔ ایک طرح سے میں اسے ڈاکٹر موگ پر یقین دے رہا تھا۔ ڈاکٹر موگ اس کے لیے ”بڑے“ کا درجہ رکھتا تھا اس لیے اس کا الجھنا عین فطری بات تھی۔ اسی الجھن میں اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

”وجدان! میری بات ماننا تمہارے لیے کیوں ضروری ہے؟“

”اس لیے کہ اس وقت تم میری ساتھی ہو!“

”اوہ!“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”وجدان! تم

معمولی سی بات کے لیے بے پناہ سپنس پیدا کر دیتے ہو۔“

میں نے قدرے خوشی سے کہا ”میری ساتھی ہونا تمہارے نزدیک گویا معمولی سی بات ہے؟“

”اوہ..... نو.....!“ وہ سٹ بنا گئی ”تم غلط سمجھ رہے ہو وجدان تمہاری ساتھی ہونا تو میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ وہ میں نے تو سپنس کے حوالے سے اس بات کو معمولی کہا تھا۔ میرا مطلب ہرگز تمہاری ساتھی ہونے سے نہیں تھا۔ آئی ایم سوری!“

”سوری کی ضرورت نہیں۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا ”اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ”ساتھ“ میں سب چلتا ہے۔ سوری، ٹھیک یو اور پلیر، ایکسیکے زی کو پلیٹ کر ایک طرف رکھ دو۔“

”اوکے!“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم ابھر آیا۔ اس کے لبوں کے نظارے نے مجھے حقیقی خوشی دی۔ وہ خفیف سا تبسم میری بہت بڑی کامیابی تھی۔ مجھے امید تھی، میں لی یان کی افسردگی اور اداسی کو بہت جلد بھاگے پر مجبور کر دوں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”لی یان! اوگ بنگ کی حیثیت تمہارے لیے ایک پاس کی تھی۔ مسٹر بنگ، ڈاکٹر موگ ریفوشے کو اپنا بڑا بھتیجا ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر موگ تمہارا بگ پاس ہوا۔ عبادت گاہ سے رخصت ہونے سے پہلے ڈاکٹر نے تمہاری موجودگی میں مجھ سے بڑی اہم باتیں کی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، ڈاکٹر موگ تم پر بڑا بھروسہ کرتا ہے۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے بہ دستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا ”مسٹر بنگ اور ڈاکٹر کا تعلق بدھ مت سے ہے۔ کیا تم بھی بدھ مت ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے ٹہنی میں گردن ہلائی۔ ”مذہب کے لحاظ سے کہتے ہیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے!“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی ”میں کوئی کٹر مذہبی نہیں ہوں۔ انسان کو اپنے کار پر نظر رکھنا چاہیے۔ اگر سوچ مثبت، مقصد نیک اور عمل تعمیری ہو تو کسی کے ساتھ بھی مل کر کام کیا جاسکتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ پچھلے دو روز سے میں تمہارے ساتھ ایک مشن میں شامل ہوں اور آئندہ چٹانیں، کب تک ہم قدم سے قدم ملا کر چلتے رہیں گے!“

میں نے مذہب کی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لی

یاں!“

لی یان کا تعلق فلپائن سے تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے امریکا میں رہ رہی تھی اس لیے اس کے لب و لہجے اور انداز و اطوار پر خاص امریکی رنگ چڑھا ہوا تھا تاہم وہ اپنے خال و خط اور تین نقش میں پوری فلپائن تھی۔۔۔ فلپائن میں عیسائی (کریجن) ہماری تناسب سے موجود ہیں۔ ملک کی بڑی آبادی روسن کیٹوکل پر مشتمل ہے یعنی تراسی فی صد۔ اس کے بعد پروٹسٹنٹ کا نمبر آتا ہے، یعنی نو فی صد۔ فلپائن میں لگ بھگ پانچ فی صد مسلمان بھی بستے ہیں۔ لی یان فلپائن کے دارالحکومت ”منیلا“ کی رہنے والی تھی۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ایک سفید گاڑی بڑی مستقل مزاجی سے مجھے پیچھے آ رہی تھی۔

میں نے ذرا غور کیا تو معلوم ہوا، وہ ٹینیڈ گلاسز والی ایک گھڑی کی طرح تھی۔ وہ ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر ہماری راہ تاپ رہی تھی میں نے لی یان سے اس متعاقب گاڑی کا ذکر کیا تو وہ بولی۔

”ہاں، میں نے بھی یہ بات نوٹ کر لی ہے۔“  
”پھر کیا ارادہ ہے۔“ میں نے بیک دیوہر میں اس گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”میں کبھی یاساے انگلیاں کرنے دیں؟“

”میرا خیال ہے، جب تک وہ لوگ کوئی مداخلت نہ کریں، ہمیں اپنی طرف سے پیش قدمی نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہمیں پہلی فرصت میں کسی طرح جانوس سے رابطہ کرنا چاہیے۔“

ادھر لی یان کی بات ختم ہوئی، ادھر متعاقب گاڑی کی رفتار میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ ہم اس وقت رنگ روڈ سے گزر رہے تھے اور اتفاق سے زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ میں نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری فرمائش پر کوئی پیش قدمی نہیں کروں گا لیکن اگر دوسری طرف سے کوئی ”شرارت“ کی گئی تو پھر ان سے نمٹنا لازم ٹھہرے گا لہذا تم شات گن کو تیار حالت میں بڑی مستعدی سے تیار ہونا۔“

یہ وہی گئی جو عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں ایک دکن کے ہاتھ سے گری تھی۔ اب اس شات گن پر ہمارا قبضہ تھا۔ واپسی پر ہم نے اسے بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ دو خطرناک سیون ایم ایم گن بھی ڈیش بورڈ کے نیچے ایک خفیہ خانے میں موجود تھیں۔

لی یان نے مضبوط لہجے میں کہا ”تم فکر نہ کرو۔ میں تیار ہوں۔“

متعاقب سفید گاڑی بڑی شرافت سے ہماری جیب کے پیچھے پچھی پھر اسی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ہمیں اور ٹیک کرنے لگی۔ پتا نہیں، ان لوگوں نے کیا سوچ رکھا تھا۔ اگر وہ ہمارے دشمن تھے تو اب تک انہیں ہلکی یا ہماری فائرنگ کا مظاہرہ کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے دانستہ اپنی جیب کی رفتار کم کر دی۔ اس سے اتنا ہوا کہ سفید گاڑی نے تہمتا جلدی ہمیں اور ٹیک کر لیا۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کندھے اچکالایے۔ وہ بولی ”کوئی سن چلا معلوم ہوتا ہے!“

ٹینیڈ گلاسز کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ اس گاڑی میں کتنے افراد سوار ہیں لہذا وہ من چلا کے بجائے من چلے اور دل چلے بھی ہو سکتے تھے۔ ہمیں اور ٹیک کرنے کے بعد وہ گاڑی بالکل ہمارے سامنے آگئی اور ایک مخصوص انداز میں اس کے انڈی کیئرز چلتے بچنے لگے تاہم خیریت گزری کہ ابھی تک اس طرف سے ایک کوئی نہیں چلی تھی۔ یہ ایک مثبت صورت حال تھی۔

میں نے لی یان سے کہا ”یہ کیا انگلیاں کر رہے ہیں بھی!“

”میرا خیال ہے، یہ ہمیں رکنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔“  
”کیوں؟“ میں نے بے ساختہ کہا۔  
”یہ تو رکنے کے بعد ہی معلوم ہوگا!“  
”کیا میں جیب کو روک دوں؟“

”ہاں، روک دو۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔  
میں نے جیب کو روک کے کنارے روک دیا۔  
سفید گاڑی ہم سے چندہر میں فٹ آگے رک گئی۔

لی یان نے کہا ”نیچے اتر کر دیکھنا چاہیے۔ انہیں کیا تکلیف ہے!“  
”جنہیں تکلیف ہے، نیچے بھی وہی اتریں گے۔“ میں نے حقیقی لہجے میں کہا ”وہ اپنی گاڑی سے باہر نکلیں تو میں ان کی تکلیف دور کر دوں گا!“

اسی وقت سفید گاڑی کے انڈی کیئرز ”خاموش“ ہو گئے۔ پھر اس کا عقبی نشست والا دروازہ کھلا۔ ہم دونوں سانس روک کر آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگے۔ لی یان نے شات گن کا بالکل تیار حالت میں تھام لیا۔ یہ تو ثابت ہو گیا کہ انہوں نے ہمیں روکنے کے لیے ہی انڈی کیئرز والا

کھیل کھیلایا تھا۔ وہ ہمیں روکنا چاہتے تھے تو کیوں؟ یہ ایک گہمیر سوال تھا جس کا جواب بھی انہیں لوگوں میں سے کسی کو دینا تھا جو ہمیں روکنے کے خواہش مند تھے!

گاڑی کا دروازہ کھلنے کا ایک ہی منظر تھا اور وہ یہ کہ عقبی نشست سے کوئی اٹھ کر باہر آنے والا تھا، پھر وہ باہر آ گیا۔ وہ ایک سوئڈ بوئڈ شخص تھا۔ باہر نکلتے کے بعد جب اس نے ہماری جانب چہرہ موڑا تو میں اچھل کر رہ گیا۔ وہ صورت میرے لیے انتہائی عجیب تھی۔

”جانوس!۔۔۔۔۔!“ بے ساختہ میرے لبوں سے خارج ہوا۔

لی یان بھی اسے پہچان گئی، حیرت بھرے لہجے میں بولی ”یہ یہاں کیا کرتا پھر رہا ہے؟“  
”اسی سے پوچھنا!“ میں نے قدرے سختی سے کہا ”وہ ہماری ہی طرف آ رہا ہے۔“  
پتا نہیں کیوں، میں جانوس کو دیکھتی ہی بدحوہ ہو گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ زندگی میں دوبارہ بھی اس شخص سے ملاقات ہوگی۔ کم از کم خود تو کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔ اگر ڈاکٹر مومگ کی خواہش نہ ہوتی تو میں اس سے دور ہی رہتا۔ بہر حال، ڈاکٹر کا دعویٰ تھا کہ اس نے جانوس کو میرے سلسلے میں ہدایت دے دی ہیں۔ وہ مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گا۔ میں نے دل میں کہا، ٹیک ہے۔

دیکھتا ہوں اس میں کیا تبدیلی آئی ہے!  
جانوس تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری جیب کے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر غیر متقدمانہ سکراہٹ تھی۔ میں نے بھی جواباً سکراہٹ کا جواب سکراہٹ سے دیا۔ وہ میرے پاس آ کر غلط لہجے میں بولا۔

”آپ لوگوں سے مل کر مجھے خوش ہو رہی ہے۔“  
کل قہقہہ اٹھ بچے بھی اسی جانوس نے تری بھون انٹرنیشنل ائر پورٹ پر ہمارا استقبال کیا تھا لیکن یہ جانوس گزشتہ روز والے جانوس سے قطعی مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی تختی اور لہجے میں کا اکٹرا پن کبھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ممکن ہے، اس گرم مزاج شخص کو چھوڑ کر سر دیکھو مٹانے واؤنٹ ایورسٹ کی طرف نکل گئے ہوں! ان کے لیے قریب ترین ”تفریح گاہ“ واؤنٹ ایورسٹ ہی تھی۔

وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، ڈاکٹر مومگ کی ہدایت سے مجبور ہو کر رہا تھا۔ یہ اس کا اپنا مزاج نہیں تھا۔ وہ ایک ہدایت کار کے اشارے پر اداکاری کر رہا تھا لہذا میں بھی اپنے موڈ مزاج کے خلاف عمل پر مجبور تھا۔ ہمارے درمیان رکھی علیک

سلیک ہو گئی تو وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے دوبارہ چوکنالہجے میں بولا۔

”آپ دونوں اپنا بیگ لے کر میرے گاڑی میں آ جائیں۔“

”کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے اس کے شائستہ رویے کے جواب میں شائستگی ہی برتی۔  
”دہ گہمیر انداز میں بولا ”شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”کس کے لیے؟“ لی یان نے استفسار کیا۔  
وہ بولا ”خصوصاً تم دونوں کے لیے۔ اسی لیے میں ٹینیڈ گلاسز والی گاڑی لے کر آیا ہوں۔“  
”تم کب سے ہمارے تعاقب میں لگے ہوئے تھے؟“

میں نے پوچھا۔  
”پلیز! پلیز! آپ لوگ میرے گاڑی میں جا کر بیٹھیں۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا ”باقی باتیں ہم وہیں کریں گے۔ اس جیب کو فوری طور پر چھوڑ دیں ورنہ بڑی کڑ بڑ ہو جائے گی۔“

”اوہ!“ میں نے ایک طویل سانس کھینچی پھر لی یان کی طرف دیکھا۔  
اس کی آنکھوں میں مجھے تائیدی تاثرات نظر آئے۔

اگلے ایک منٹ کے اندر ہم اپنے بیگ کے ساتھ جیب سے نکل کر ٹینیڈ گلاسز والی سفید گاڑی کی عقبی نشست پر منتقل ہو چکے تھے۔ جانوس نے نیپالی میں ڈرائیور کو کچھ ہدایت دیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر ہماری جیب کی طرف بڑھ گیا۔ میں نہیں جانتا، اس نے کیا کہا تھا اپنے ڈرائیور سے تاہم خراش بتاتے تھے، ڈرائیور اب ہماری جیب کو کبھی پہنچائے گا۔ کہاں؟ جہاں کے لیے جانوس نے اسے ہدایت کی تھی۔

جانوس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ایک جھٹکے سے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔  
”میں سب سے پہلے تم سے معذرت چاہوں گا وچوہاں!“ گاڑی کے اندر پہنچی آواز جانوس کی ابھری۔

”کس بات کی معذرت؟“ میں نے اٹھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔  
وہ نرمی سے بولا ”ڈاکٹر مومگ نے مجھے بتایا، مختصری ملاقات میں تمہیں مجھ سے ڈھیر ساری شکایات پیدا ہو گئی ہیں۔ میں کوشش کر دوں گا۔ آجیہہ ایسا کوئی موقع نہ آئے۔“  
”کوئی بات نہیں مسٹر جانوس!“ میں نے قدرے....

بے تکلفی سے کہا ”میں گزری ہوئی باتوں کو بھول گیا۔ تم بھی بھول جاؤ۔“

”گویا تمہیں اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے؟“  
”نہیں! وہاں کے مسٹر جانوس! ڈونٹ ڈسٹر بے یور سیلف۔“  
”اوہ ٹھیکس!“ وہ بیوقوفیت بھرے لہجے میں بولا۔

ایک بے نام سے مجس نے میرے دماغ کو کسی آکٹو پس کے مانند جکڑ رکھا تھا۔ میں فوراً کام کی بات کی طرف آ گیا۔ ”مسٹر جانوس! اب تو... ہم تمہاری ٹیفڈ گلاسز والی گاڑی کے اندر محفوظ بیٹھے ہیں۔ تباہ شہر میں ہمارے لیے کس قسم کے خطرات پیدا ہو چکے ہیں؟ اور یہ بھی جانتا چاہوں گا، تم کب سے اور کہاں سے ہمارے تعاقب میں لگے ہوئے تھے؟“

اس نے ایک تشویش بھری طویل سانس خارج کی اور میرے سوالات کے جواب میں بتایا ”ڈاکٹر مونگ نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، تم لوگوں کو گمراہ اور بارے بجے کے درمیان کھینچ دھکر کی حدود میں داخل ہونا تھا لہذا میں ساڑھے دس بجے سے ہی اس گاڑی میں شہر کے داخلی راستے پر موجود تھا۔ یہ وجہ میں تمہیں دہاں رد نہیں پایا۔ تم کسی چھلاوے کے مانند آگے بڑھ گئے۔ مجبوراً تمہارا تعاقب کرتے ہوئے مجھے یہاں تک آنا پڑا۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”اب جیپ کو فوری طور پر چھوڑنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہمارے دشمن اس کا میک اور نمبر جان چکے ہیں۔ مذکورہ جیپ کو اور تم دونوں کو بڑی سرگرمی سے پورے کھنڈرو میں تلاش کیا جا رہا ہے۔“

وہ آگے بھی کچھ بولنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ ”ہماری جیپ کے بارے میں دشمنوں کو کیسے خبر ہو گئی اور یہ بات انہیں کس نے بتائی کہ میں اور لی یان اس جیپ میں سوار عبادت گاہ کی طرف سے کھنڈرو آرہے ہیں؟“

”شاید میں جنہیں ٹھیک طرح سے اپنی بات سمجھا نہیں سکا!“ وہ گاڑی کو رنگ روڈ پر جنوب کی سمت بڑھاتے ہوئے غجالت آمیز لہجے میں بولا ”جب میں تم لوگوں کے سوار ہونے کی بات میں نے اپنے تجزیے کی بنیاد پر کہی ہے۔ ہمارے دشمنوں تک صرف یہ بات پہنچی ہے کہ مذکورہ جیپ عبادت گاہ کے عقبی حصے میں ایک چٹان کے پیچھے کھڑی دیکھی گئی ہے۔“  
”اوہ۔“ میں گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ”دشمنوں

تک یہ خبر کیسے پہنچی؟“ میں پر خیال انداز میں بڑبڑایا۔

بھری بڑبڑاہٹ کے جواب میں جانوس نے بتایا ”ڈاکٹر مونگ کا خیال ہے، آج علی الصباح دشمنوں کی جو دو لینڈ کروزر وہاں پہنچی ہیں، ان میں سوار افراد میں سے کسی نے یہاں اپنے بڑوں کو اس جیپ کے بارے میں اطلاع دی ہے۔ وہ دونوں جیپیں ہماری جیپ کے قریب ہی چٹان کی دوسری طرف کھڑی کی گئی تھیں۔“

جانوس کے انکشاف سے ظاہر ہوا کہ ڈاکٹر مونگ نے اسے ہمارے موجودہ حالات کے بارے میں کچھ بہت بتا رکھا تھا۔ جانوس کے بیان سے پتا چلتا تھا۔ ہمارے عبادت گاہ سے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر مونگ نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ ہم وہاں سے سات بجے صبح روانہ ہوئے تھے اور وہ دونوں لینڈ کروزر جیپیں لگ بھگ چھ بجے صبح عبادت گاہ کے پیچھاڑے پہنچی تھیں۔

”ڈاکٹر مونگ سے تمہاری آخری بات کب ہوئی تھی؟“ میں نے اپنے اندازے کے تصدیق کے لیے پوچھا۔  
اس نے بتایا ”تو بجے صبح۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر میں تم لوگوں کو ”ریسیو“ کرنے اور آدھ آگیا تھا۔“

”ہوں!“ میں نے ایک ہنگامہ بھرا ”اس کا مطلب ہے۔ ڈاکٹر نے قابو میں آنے والے دشمن کے آدمی کلارک ہی سے یہ بات اگلوئی ہو گی کہ ہماری جیپ کی دہاں موجودگی کے بارے میں... یہاں کھنڈرو میں اطلاع دے دی گئی ہے!“

”یہ اطلاع اسی شیطان کلارک نے اپنے بڑوں کو دی تھی۔“ جانوس نے بتایا ”ڈاکٹر مونگ نے مجھے تمہارے حوالے سے عبادت گاہ میں پیش آنے والی بہت سے واقعات سے آگاہ کر دیا ہے۔“

میں الجھن کا شکار ہو گیا۔ ”لیکن ڈاکٹر نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟“

”حفظ ماتقدم کے طور پر۔“ وہ عجبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں مجھ دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیسا حفظ ماتقدم؟“

”آگر ڈاکٹر تم لوگوں کو یہ بات بتا دیتا کہ جس گاڑی میں تم لوگ کھنڈرو چارہ ہو، دشمن اسے ”ہاتھوں ہاتھ“ لیں گے تو تمہارے اعصاب ایک عجیب سے تباہ کا شکار رہتے۔ ڈاکٹر چاہتا تھا، تم دونوں بالکل ری لیکس انداز میں کھنڈرو پہنچو۔“  
جانوس نے مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ”تم لوگوں

کی حفاظت اور خبر داری کے لیے ڈاکٹر نے مجھے یہاں کھنڈرو میں متحرک کر دیا اور دیکھ لو... میں جنہیں نہ صرف یہ حفاظت اپنے ساتھ لے کر چارہا ہوں بلکہ اس ”مٹکوک“ جیپ کی روپوشی کا بھی مناسب بندوبست کر دیا ہے!“

جانوس پہلی مرتبہ مجھے ایک معقول آدمی لگا۔ ڈاکٹر مونگ کی ہدایت نے داخلی اس پر اثر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر مونگ کے لیے میرا دل محبت کے جذبات سے بھر گیا۔ اس نے ہمیں کسی ذہنی کوفت اور اعصابی دباؤ سے بچانے کے لیے بڑا خوب صورت انتظام کیا تھا لیکن اس حوالے سے میرے دل میں ایک معمولی سا کھانکھور ہوا تھا۔ میں نے اس چٹان کو نکالنا ضروری سمجھا اور جانوس سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، ڈاکٹر نے ہمیں اس از وقت اس جیپ کے ”محاطے“ سے آگاہ نہ کر کے محفل مندی کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ اس جیپ کے بجائے ہمیں دشمنوں کی ایک لینڈ کروزر میں داخل بیچ دیتا!“

وہ بڑی رسان سے بولا ”ہاں، ایسا ہو سکتا تھا۔“ پھر اس نے تھوڑا وقفہ کیا اور کھنڈرو کے انتہائی جنوب میں پہنچنے کے بعد رنگ روڈ کو خیر باد کہہ کر گاڑی کو بانسیور روڈ پر ڈال دیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر نے ایسا اس لیے نہیں کیا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، یہ جیپ بدھ مت کی عبادت گاہ کی طرف بھی گئی ہے۔“  
وہ کل شام سے وہاں موجود ہیں اور شر پسند عناصر کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک رات میں دوسرے عبادت گاہ پر چڑھائی کی گئی اور دونوں مرتبہ ڈاکٹر مونگ نے حملہ آوروں کے دانت کٹے کیے۔ عبادت گاہ کے اگلے حصے میں وہ گاڑیاں موجود ہیں جن میں جی پی فوڈ اور ان کے ساتھ وہاں پہنچے تھے اسی لیے عبادت گاہ کے عقبی حصے میں بھی ان گاڑیوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آتا چاہے جن میں کلارک اپنے خاریوں کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر نے جنہیں ان لینڈ کروزر میں سے کوئی جیپ نہیں لائے دی۔ عبادت گاہ کے اندر اور باہر چاروں طرف ایسی واقعاتی شہادتیں موجود ہیں جن کی بنیاد پر مضبوط سے مضبوط ترکیں بنانے میں پولیس بنانے میں

پولیس کو بھر پور مدد ملے گی۔ پہلے رتار پارک والے جنگل پر دوسرا دہاں پولیس والے مارے گئے۔ پھر وہاں عبادت گاہ میں، چار سادہ لباسی الیکاروں کے ساتھ ہی ہمارے دو افراد کی اموات بھی واضح ہوئی ہیں۔ یہ تمام لوگ حملہ آور شیطانوں کی یورش کو ختم کرنے کے لیے کٹ مرے۔ ہمارے دشمنوں کی دو درجن لائیں بھی گواہی دیں گی۔ ڈاکٹر مونگ

ریلوے کے دو آدمیوں اور چار سادہ لباس پولیس والوں نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر عبادت گاہ کی حفاظت کی ہے۔“ وہ سانس لینے کے لیے لمحے بھر کورکا پھر بانسیور (BANESWAR) روڈ پر گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہاں نیپال میں مذہب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ نیپال میں لگ بھگ پانچ فی صد بدھ مت آباد ہیں۔ ان کی اکثریت عبادت گاہوں (بدھ اسٹوپا) میں باقاعدگی سے جاتی ہے۔ یہ لوگ عبادت گاہ کے تقدس اور حفاظت کو ہر شے پر مقدم سمجھتے ہیں۔ شاید جنہیں معلوم نہیں کہ دنیا کا ایک بڑا اسٹوپا (بدھ عبادت گاہ) بھی یہاں کھنڈرو میں ہی داخلی ہے جو ”اسٹوپا آف بودھ تاتھ“ کہلاتا ہے!“

نیپال میں غالب آبادی ہندوؤں کی ہے یعنی نوے فی صد! ”میں یہ بات جانتا ہوں۔“ میں نے اس کے گویائی وقفے میں کہا۔

”دیر کی گزرا!“ وہ سر اٹھنے والے انداز میں بولا پھر بتانے لگا ”جب ڈاکٹر مونگ سے میری آخری بات ہوئی تو اس نے بتایا تھا، انسپکٹر پولیس کی ہماری وجہیت کے ساتھ خود بھی وہاں پہنچ چکا ہے۔ عبادت گاہ کے اندر اور باہر پولیس کی تعیناتی کا ردروانی جاری ہے لہذا جنہیں اس طرف کی فکر کرنا چاہیے۔ وہاں ڈاکٹر مونگ اور انسپکٹر شیوا معاملات کو اچھی طرح سنہالیں گے۔ ہمیں یہاں کھنڈرو میں ان لوگوں سے نمٹنا ہے جنہیں وجدان اور لی یان کی تلاش ہے۔... اور مجھے پورا یقین ہے، ہم بڑے ٹھیک ٹھاک انداز میں ان سے نمٹ لیں گے۔“

جانوس پر اعتماد انداز میں اپنی بات مکمل کی تو میں نے کہا ”تمہارا اشارہ جو گندہ پال اور اسرائیل سے آنے والی ذہین ہاروے کی طرف ہے نا؟“

”ہاں!“ جانوس نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنے مونٹے سر کو اثباتی جنبش دی اور بڑی ترمیم میں بولا ”جو گندہ پال اور ذہین ہاروے کے علاوہ ہاروے کی بیہودن سائنس کی طرف بھی!“

وہ اب خاصا بے تکلف ہو کر بات کر رہا تھا، گلٹا تھا کلاڈیا کو دیکھ کر اس کی رال بے قابو ہو گئی ہے۔ اس کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آ رہا تھا لیکن میں نے یہ بات بھی خاص طور پر محسوس کی کہ لی یان کے لیے اس کی آنکھ اور انداز و اطوار میں ایک احترام موجود تھا۔ گویا وہ صبح داری اور کردار کے لحاظ



سے ایک قابل بھروسہ انسان تھا۔

جانوس کی بات سے ظاہر ہوا کہ وہ تازہ ترین حالات سے بڑی گہری واقفیت رکھتا تھا۔ یہ اس کی اپنی محنت کی یا اس سلسلے میں ڈاکٹر مومگ نے اس کے اندر کچھ اندازہ کیا تھا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا باخبر اور آگاہ ہونا میرے لیے ہر حال سے مفید تھا۔ جانوس نے بارہوے کی یہودوں سے کہا کہ جس انداز میں ذکر کیا تھا، اس نے مجھے اس کے چنگی لینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”مسٹر جانوس! ڈاکٹر نے تمہاری تعریف کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا تم دل کے بہت اچھے ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں ”اچھا دل“ اس دشمن یہودوں کی طرف جھک رہا ہے۔ لیکن تم میری لیے کوئی نئی برائیت نہیں کھڑی کر دو گے؟“

”نہیں یار!“ وہ بے تکلفی سے بولا ”دشمن تو ہر حال میں دشمن ہی ہوتا ہے اور اس کا ہر سا بھی دشمن ہی میں شام ہوتا ہے۔ ویسے کلا ڈین بڑی زبردست شے ہے۔ تم دیکھو گے تو میری بات کا یقین آجائے گا“ وہ کلا ڈین کے حوالے سے خاصا کھل کر بول رہا تھا جس سے پتا چلا کہ وہ زندہ دل بھی ہے۔

”ٹھیک ہے، دیکھ لوں گا کلا ڈین کو بھی اور اس کے ساتھی فراڈیا (ڈین باروے) کو بھی“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”یہ دونوں دشمن مجھ سے بچ نہیں سکیں گے“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”کیا تم نے اسرائیل سے آنے والے کلا ڈین اور فراڈیا پر نظر رکھی ہوئی ہے؟“

اس نے بڑے فخر سے بتایا ”آج صبح چھ بجے سے لے کر اب تک وہ بگلا پوری طرح نگاہ میں ہے جہاں جوگندر پال نے ان دو اسرائیلیوں کو گھیرا ہوا ہے۔ میرے دو نہایت ہی مستعد سادہ لباس آدمی اس جینگے کی نگرانی پر مامور ہیں اور مجھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہاں کے حالات کی خبر بھی دے رہے ہیں۔ ڈین باروے اور کلا ڈین میں سے کوئی بھی اس جینگے سے باہر نہیں نکلا۔ جوگندر پال صبح سے دو چکر وہاں کے لگا چکا ہے۔ مجھے امید ہے، ہم مذکورہ جینگے پر چڑھائی کر کے بہ آسانی تمہاری ساتھی کو ان کے چنگل سے چھڑا لیں گے۔“

اسی وقت جانوس کے موبائل فون کا بزرخ اٹھا۔ اس نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اپنی جیب سے سیل نکال کر اس کے ڈسپلے پر ایک نگاہ ڈالی پھر سیل کو فوراً کان سے لگا لیا اور تھکسانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنے سیل کا نام سے بات کر رہا تھا۔

”ہاں بولو، کیا رپورٹ ہے؟“

پھر وہ ”ہوں، ہاں اوکے“ جیسے الفاظ بولتے ہوئے دوسری طرف کی بات سننا شروع کر دیا اور آدھے منٹ کی اس گفتگو کے بعد اس نے موبائل فون جیب میں رکھ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”اپوری تھکنگ ازاد کے مسزود جان!“

”میرا خیال ہے، یہ ان دونوں میں سے کسی نگران کا فون تھا جنہیں تم نے اسرائیل کی ایسی کسی جگہ پر جوگندر پال کے جینگے کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہے؟“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

وہ تھکاتی انداز میں بولا ”تمہارا خیال سینٹ پر سینٹ درست ہے“

میں نے ایک اطمینان بخش طویل سانس خارج کی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹینڈر گاڑ کا یہی سب سے بڑا کمال ہے۔ باہر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ گاڑی کے اندر کیا ہو رہا ہے جب کہ اندر موجود افراد بڑی آسانی سے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہم پائیسور روڈ پر ”ایورسٹ شیرٹن انٹرنیشنل ہونٹ“ کے قریب سے گزر رہے تھے۔ روڈ کے دونوں طرف استادہ عمارتیں دھلی دھلائی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے دائیں جانب ایورسٹ شیرٹن ہونٹ اور بائیں طرف رائل ڈرگ ریجسٹر، انکم ٹیکس آفس وغیرہ کو پیچھے چھوڑا اور اگلے چوراہے سے سیدھے ہاتھ کوڑ گئے۔ اب ہماری گاڑی رام شاہ ہاتھ پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے جانوس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہم کس طرف جا رہے ہیں مسز جانوس؟“

رام شاہ ہاتھ جنوب سے شمال کی طرف جاتا ہے یا یوں سمجھ لیں شمال سے جنوب کی سمت آتا ہے۔ ہم اس وقت ٹھنڈے کے جنوب۔ شمال کی جانب جا رہے تھے۔ دربار ہاتھ اور کا قاتی ہاتھ میں رام شاہ ہاتھ کے متوازی چلتے ہیں۔

جانوس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا ”میں تم لوگوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرف لے کر جا رہا ہوں۔ ٹیکسل ایک ذاتی فلیٹ ہے۔ ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ وہ فلیٹ تم دونوں کے لیے بہت موزوں رہے گا۔ ویسے میں نے تم دونوں کے لیے ایک متبادل رہائش کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ لاڈ بھانے چاہا تو تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”تمہاری رہائش گاہ تو ادھر فریک اسٹریٹ پر ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں ہے۔۔۔۔۔ لیکن ادھر جانا ان حالات میں بہت

خطرناک ہوگا۔“

”اور متبادل رہائش کا کہاں بندوبست کیا گیا ہے؟“

”میں نے کسی ایمر جنسی کی صورت میں، تم دونوں کے لیے ایک ہونٹ میں بھی کرلیک کلا دیا ہے۔“

”اور یہ کراہینا تمہارے ہونٹ ”نیلیو بیگوڈا“ میں ہوگا؟“

ڈاکٹر مومگ نے مجھے بتایا تھا، قاتی ہاتھ پر واقع سی۔ کلاس ہونٹ ”نیلیو بیگوڈا“ کا اصل مالک جانوس ہی تھا۔ اسی طرح خفیہ طریقے سے اس بندے نے ٹھنڈے میں اپنی بہت سی پراپرٹی بنا رکھی تھی۔ جانوس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے اندازے کی ایسی تپسی کرتے ہوئے بولا۔

”قاتی ہاتھ والا نیلیو بیگوڈا تمہارے شایان شان نہیں۔ تم اسے کلاس ہونٹ اپنا پورا نام بکھ دت گزار چکے ہو۔ اب کم از کم لی۔ کلاس ہونٹ تو ہو“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے ابھی جس ہونٹ میں تم دونوں کے ایمر جنسی کا بندوبست کیا ہے اس کا نام ”ہونٹ ٹنگریا“ ہے۔ یہ ہونٹ لازم پت کے علاقے میں واقع ہے۔“

”لازم پت“ کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ اسرائیل ایسیسی بھی اسی علاقے میں واقع تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا، ہونٹ ٹنگریا، جوگندر پال کے اس جینگے سے زیادہ دور نہیں ہوگا جس میں ڈین باروے اور کلا ڈین گھم رہے ہوئے تھے اور۔۔۔۔۔

میری ساحل ان دو خبیثوں کے قبضے میں تھی۔

میں نے اضطرابی لہجے میں کہا ”بہتر یہ ہوگا، ہمیں سیدھا ہونٹ ٹنگریا لے چلو۔“

”میں تمہاری بے قراری کو سمجھ رہا ہوں وجدان!“ وہ نہایت ہی دوستانہ لہجے میں بولا ”تم لازم پت کا نام سن کر جھل گئے ہو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، تم اس علاقے سے بہ خوبی واقف ہو!“

میں نے کہا ”جس اسرائیل ایسیسی کے عقب میں میری ساحل کو جوگندر پال کے جینگے میں رکھا گیا ہے وہ بھی لازم پت ہی میں واقع ہے حتیٰ کہ خفیہ توصلیت، فرنیچ ایسیسی ہونٹ ٹنگریا ہونٹ ایسیسی اور ہونٹ ٹنگریا وغیرہ سب لازم پت ہی میں آتے ہیں اس لیے میرا اچھا جانا لازمی بات ہے۔ میں ہونٹ ٹنگریا کو چھوڑ کر ٹیکسل کے کسی فلیٹ میں کیوں ٹھہروں گا؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”جانتا ہوں، سب جانتا ہوں۔ جن ہونٹوں کے تم نے نام گھنوائے ہیں ان میں سب

سے موزوں ہونٹ ٹنگریا ہی ہے۔ یہ ہمارے ٹارگٹ سے قریب ترین ہے اسی لیے میں نے اس ہونٹ میں تمہارے ٹھکانے کا بندوبست کیا ہے“ وہ لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”یکس نے کہہ دیا کہ تم ٹیکسل والے ٹھکانے پر ہی ٹھہرو گے۔ ہم فی الحال وہاں جا رہے ہیں۔ دشمن پر آگے بڑھنے کے لیے کچھ ضروری تیاری بھی کرنا ہے۔ تم کچھ دیر تک وہاں قیام اور آرام کرو گے پھر ہم سیدھے ہونٹ ٹنگریا پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا، ہمارے منصوبے میں کوئی کمی یا کمزوری باقی رہے اور ہمیں وقت پر نا کام ہو جائیں۔ ہمیں ہر حال میں تمہاری ساتھی ساحل کو جوگندر پال والے جینگے سے نکالنا ہے۔ ازات کیسز؟“

اس نے جو کچھ کہا وہ بہت واضح تھا اس لیے میں اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”ییس!“ جانوس کے عزائم اور دلو لے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ پہلے والا جانوس نظر نہیں آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ ساحل کو ڈین باروے کے جینگے سے نکالنے کے سلسلے میں مجھ سے بھی زیادہ بے تاب ہو۔ ڈاکٹر مومگ کی ہدایات حد سے زیادہ کام دکھا رہی تھیں۔

اس کے جذبے سے متاثر ہوتے ہوئے میں نے قدر کی نگاہ سے اسے دیکھا اور پوچھا ”مسٹر جانوس! یہی تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے، جوگندر پال کے جینگے پر چڑھائی کرنے کے سلسلے میں تم نے کچھ تو سوچ رکھا ہوگا؟“

”کافی کچھ سوچ رکھا ہے۔“ وہ پُر سوچ انداز میں بولا ”باقی تمہارے مشورے سے طے کر لیا جائے گا۔ پہلے ہم فلیٹ پر پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کریں گے۔“

میں نے محسوس کیا۔ وہ دانستہ ابھی اس ٹاپک کو زیادہ کھولنا نہیں چاہتا تھا لہذا میں بھی کریدے باز آگیا اور ایک مرتبہ پھر ٹینڈر گاڑ سے گاڑی کے باہر دیکھنے لگا۔ اس دوران میں لی یان گم گم خاموش بیٹھی تھی۔ جانوس سے تمام تر گفتگو میں نے ہی کی تھی۔

ہماری گاڑی ہائی کورٹ۔ بھدر کالی مندر، مٹی پال، سینٹرل ایگريشن آفس سے گزرتے ہوئے باغ بازار پہنچی یہاں گاڑی روک کر جانوس نے کچھ شاپنگ کی۔ اس دوران میں ہم ٹینڈر گاڑ سے دالی گاڑی میں اندر ہی بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور ایک مرتبہ پھر گاڑی رام شاہ ہاتھ پر آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی ہم مکمل پوکھاری کے علاقے میں پہنچ گئے۔ مکمل پوکھاری سے گزرنے کے بعد جانوس نے گاڑی کو



دائیں جانب نیکسل روڈ پر موڑ لیا۔

کل صبح جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس کی حفاظت کے لیے ایک باڈی گارڈ ڈرا بیور بھی اس کے ساتھ تھا لیکن آج اس نے اپنے ساتھ آئے والے ڈرائیور کو جب کے ساتھ کہیں اور روانہ کر دیا تھا۔ نگہانی اس باڈی گارڈ نے کل صبح ہماری آنکھوں کے سامنے موت کو گلے لگا کر اپنی ڈیوٹی کا حق نبھادیا تھا۔

باڈی گارڈ کو باڈی کی حفاظت کے لیے رکھا جاتا ہے اور اکثر وہ کسی دوسری باڈی کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے اپنی جان کا بڑا خطرہ پیش کر دیتا ہے اور یہی اس پیشے کا تقاضا بھی ہے درندہ ایسے باڈی گارڈ کی مثالیں بھی موجود ہیں جو مخالف پارٹی سے کسی چوڑی رقم کھا کر اپنی ہی کن سے اس شخص کے جسم کو پھینک کر دیتے ہیں جس کی حفاظت پر انہیں مامور کیا گیا ہوتا ہے! بہر حال، اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں!

میں نے جانوس کے سامنے نگہا کا ذکر کیا تو وہ افسردہ ہو گیا۔ یہ ایک مالک کا اپنے وفادار ملازم کے لیے اظہارِ ہمدردی اور اظہارِ افسوس تھا۔ گاڑی میں تھوڑی دیر کے لیے سوکار خاموشی طاری ہوئی۔ اس وحشت ناک سناٹے میں صرف تین دل دھڑک رہے تھے یا پھر ہم تینوں کے سانس لینے کی مخصوص دھیمی صدا میں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت ہم تینوں اپنی اپنی کیفیت کے مطابق تین مختلف محاذوں پر سوچ بچار کی جنگ میں مصروف تھے۔

میرا دھیان ساحل میں لگا ہوا تھا، جانوس اپنے جاپان ٹار گارڈ نگہا کے بارے میں سوچ رہا تھا اور لی یان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا تھا، وہ شون کی یاد میں گھوٹی ہوئی!

نیکسل روڈ پر چلتے ہوئے ہماری گاڑی ایکسپریس ہاؤس کے قریب سے گزری پھر بنگلہ دیش کی ایسیکسی سے تھوڑا پہلے ایک ذیلی سڑک پر مڑنے کے بعد ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اندر داخل ہوئی۔ ”پیوورا اپارٹمنٹس“ نامی یہ بلڈنگ دراصل بنگلہ دیش ایسیکسی اور ایکسپریس ہاؤس کے درمیان واقع تھی۔ کچھ دیر بعد ہم اپارٹمنٹ نمبر دو سو ایک کے اندر موجود تھے۔

پیوورا اپارٹمنٹس میں جانوس کے ایک آدمی کا شاؤلوک ہر فن مولا شخص ہے۔ یہ ہماری ہر قسم کی مدد کے لیے فلیٹ میں موجود رہے گا۔ کا شاؤلوک کا تعلق بدھ مت سے تھا اور وہ مکمل ہی سے ہمہ رس سے آدمی لگتا تھا۔ وہ فلیٹ تین آرام دہ بیڈروم پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد ہم جانوس کے ساتھ ایک بیڈروم میں

آگئے۔ جانوس نے بیڈروم کا دروازہ بند کر دیا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

”میں جانتا ہوں، تم لوگوں نے آج ناشائیں کیا۔ کل رات رتنا پارک والے بنگلے پر جو کچھ کھایا تھا اسی کے سہارے چل رہے ہو اور اس دوران میں تم دونوں نے ابھی خاصی مارا ماری بھی کی ہے لہذا اس وقت تم دونوں شدید بھوک محسوس کر رہے ہو گے“ وہ سانس لینے کو رکھا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”میں جانتا ہوں، تم لوگوں کی بھوک میں اور شدت پیدا ہو جائے اس لیے تم دونوں پہلے اچھی طرح نہا دھولو، فریش ہو کر جب تم داش روم سے باہر آؤ گے تو اس وقت تک میں تم لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کر چکا ہوں گا۔ باقی باتیں کھانے کے بعد ہوں گی۔ اوکے!“

جانوس کی تجویز نہایت ہی معقول اور وقت کے تقاضے کے عین مطابق تھی۔ کل رات سے اب تک میں اور لی یان جن حالات سے گزر رہے تھے ان کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے ایک طویل اور گرم شاور بہت ضروری تھا۔ جانوس ہمیں بیڈروم میں چھوڑ کر باہر نکلا تو ہم نے اپنا بیگ کھول لیا پھر صاف لباس نکال کر ہم دو مختلف داس روم میں گھس گئے۔

ٹھیک ایک بجے دوپہر ہم تینوں ڈاننگ ٹیبل پر بیٹھے لذت پر ترین کھانے سے انصاف کر رہے تھے۔ یہ کھانا جانوس نے کا شاؤلوک سے منگوایا تھا۔ نیپال میں سب سے زیادہ جو کھانا کھایا جاتا ہے، وہ بے سادہ چاول اور کڑی جو کہ بڑی چٹ پٹی اور مسالے دار ہوتی ہے یہ کڑی عموماً بھاری بھرے کے گوشت سے تیار کی جاتی ہے ہمارے کھانے میں یہ خصوصی ڈش بھی شامل تھی۔ علاوہ ازیں، کباب اور انڈین ڈچینی ڈشز بھی موجود تھیں۔

ہم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد موسمی کی مناسبت سے کافی کا دور چلا۔ حسب معمول میں نے اس دور میں حصہ نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا، جانوس نے آجہدہ کے لیے کیا لائحہ عمل تیار کر رکھا ہے۔ ہوسکتا تھا، ہمیں فوراً اپنے مشن پر روانہ ہونا ہو۔ میں کافی پی کر خواہ خواہ خود کو مست نہیں کرنا چاہتا۔ چائے کافی وغیرہ مجھے پھر الٹا اثر کرتی تھیں!

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم ایک بیڈروم میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ کا شاؤلوک کا سن روم میں پہرے دار کی حیثیت سے موجود رہا۔ جانوس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور قدرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”اگر آپ لوگوں کو برا محسوس نہ ہو تو میں ایک سگریٹ

پیچا چاہوں گا۔“

میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”کوئی بات نہیں مسٹر جانوس! تم اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں کھانے کے بعد جب تک ایک آدھ سگریٹ نہ لے لوں، میرا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔ اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہو تو میں باہر جا کر اپنی طلب پوری کر لیتا ہوں۔“

میں نے اس کی تسلی کی خاطر ایک مرتبہ پھر کہا ”ہمیں کوئی اعتراض نہیں مسٹر جانوس! تم سگریٹ سلگا لو۔ تمہاری اسوگنگ کے دوران ہی ہم اہم امور پر گفتگو بھی کریں گے۔“ اس نے سگریٹ سلگانے سے پہلے مہینیت بھری نظر سے ہمیں دیکھا پھر لگا دواؤں کو دھونے کے بعد ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ میں اور لی یان ہم تن گوش ہو گئے۔

”جو گندہ پال نے آج رات اسرائیل سے آنے والے ڈین ہاروے اور کلاڈیا کے اعزاز میں ایک ڈانس پارٹی رکھی ہے جس میں کھانے پینے اور پینے پلانے کا بھی بھر پور بندوبست ہوگا اور یہ خاص پارٹی اسی بنگلے پر دی جارہی ہے جہاں تمہاری ساسی کو رکھا گیا ہے“ جانوس اپنی معلومات کا دریا بہاتے ہوئے بولا ”اس ڈانس پارٹی میں صرف چند منتخب افراد ہی حصہ لیں گے۔ اسرائیلی مہمانوں کے علاوہ جو گندہ پال اور دو چار اس کے قریبی ساسی وہاں پہنچیں گے۔ البتہ، شہر کے ایک بدنام زمانہ نامت کلب سے دو کائے کی ڈانسرز کو بھی بلایا گیا ہے جو ہر قسم کے ڈانس کی ماہر ہیں۔ یہ ڈانسرز جو گندہ پال کی کوشش سے آنے پر راضی ہوئی ہیں درندہ اپنے کلب کے سوا کہیں اور فنی مظاہرے کے لیے جاتی نہیں ہیں۔ اس بنگلے میں ایک بہت بڑا ہال بھی موجود ہیں۔ یہ ڈانس پارٹی اسی ہال میں ترتیب دی جارہی ہے۔“

وہ ایک لمحے کو رکنا تو میں نے پوچھ لیا ”مسٹر جانوس! یہ اہم معلومات تم تک کیسے پہنچیں؟“

”ٹھیک ہے، مانا کہ جو گندہ پال اس شہر کی ایک طاقتور سیاسی شخصیت ہے لیکن تمہارا یہ دوست!“ اس نے اپنا سینہ ٹھونکا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کسی سے تم نہیں۔ میں نے اپنے خفیہ ذرائع سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ جو گندہ پال کے سیٹ اپ میں میرے بھی ایک دو بندے موجود ہیں جو مجھے ادھر کے حالات سے گا بے گا بے آگاہ کرتے رہے ہیں لیکن افسوس کہ اس بنگلے کے اندر میرے کسی آدمی کو رسائی حاصل نہیں۔۔۔۔۔ خیر!“

وہ بڑے سخی خیر انداز میں متوقف ہوا پھر ہر عزم لہجے

میں بولا ”اس بنگلے کے اندر آج رات ہم رسائی حاصل کریں گے!“

جانوس کے آخری جملے سے ظاہر ہو گیا، وہ رات میں اس بنگلے پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں جانتا تھا، وہ اپنی بات پوری کر لے، اس کے بعد میں کچھ کہوں گا۔ اس کا ہر اسرار انداز سننے پر مجبور کر رہا تھا۔

جانوس نے ایک مرتبہ پھر درپے چار س لگائے اور ایک چوتھائی بج رہنے والی سگریٹ گواش ٹرے میں سسلے کے بعد دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کے ساتھ جو سٹک کیا تھا اس سے اندازہ ہوا، اس کی طلب پوری ہو گئی تھی!

”میں نے اس بنگلے میں گھسنے کے لیے بڑا محفوظ طریقہ سوچا ہے۔ وہ اپنے منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے بولا ”اس شہر میں مہین نامی ایک شخص کیٹرنگ کا کام کرتا ہے۔ لارڈ بدھانے اس کے کام کو بڑی وسعت دی ہے۔“ وہی آئی ٹی ”کیٹرنگ سروس کمپنڈ میں ایک نام اور مقام رکھتی ہے جو گندہ پال نے اس ڈانس پارٹی کے لیے ”وی آئی ٹی“ والوں سے رجوع کیا ہے۔ وی آئی ٹی والے نہ صرف وہاں کھانے پینے کا اہتمام کریں گے بلکہ اس کمپنی کے دو افراد مستقل وہاں موجود بھی رہیں گے تاکہ ”پارٹی“ کی ہر ضرورت کو ہمہ وقت پورا کر سکیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ وہ دو افراد وکرم اور دودو ہوں گے۔ دودو قد کا ٹھنڈا اور قشنگار میں تمہارے زیادہ قریب ہے لہذا مناسب سے میک اپ کے بعد تم اس کی جگہ لے لو گے۔ اس طرح تمہیں اس بنگلے کے اندر اچھا خاصہ وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔ اندر رہتے ہوئے تم ہمارے لیے رلا ہو مار کر بیٹھو۔“

میں نے پوچھا ”کیا ضروری ہے کہ وی آئی ٹی والے دونوں کو درم کے ساتھ اس بنگلے میں بھیجیں؟“

”میں نے اس سلسلے میں یقینی معلومات حاصل کرنے کے بعد یہی منصوبہ بنایا ہے۔“

لی یان نے کہا ”ٹھیک ہے، جھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں، تمہاری معلومات صدنی صدر دست ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، وجدان اس بندے یعنی دودو کی جگہ کب اور کیسے لگا۔ کیا تم دودو کے انخوا کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“

”ہرگز نہیں“ اس نے گردن کوئی میں جھٹکا ”اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ دودو خود چل کر ہمارے پاس آئے گا۔ ہم

اسے اپنے پاس رکھ کر وجدان کو اس کے میک اپ میں آگے بڑھا دیں گے۔  
میں نے انھیں زدہ لہجے میں کہا ”مسٹر جانوس! تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے، وی آئی پی کیئرنگ کمپنی کا ملازم دونوں ہی یہ شخص دراصل تمہارا بندہ ہے جو تمہارے احکام کی تعمیل کرے گا؟“

”دودو جو کچھ بھی کرے گا، اپنے پاس کے حکم پر کرے گا۔“ وہ غرے لہجے میں بولا ”دراصل میں نے وی آئی پی کیئرنگ سروس کے مالک مسٹر موہن کو اپنی سخی میں دیکھا ہے۔ کسی زمانے میں، میں نے اس پر ایک احسان کیا تھا۔ مجھ سے لیے ہوئے قرض کی مدد سے اس نے سندھیانا تو کیرنگ کا کام شروع کیا تھا۔ ازاں بعد اس نے میرا قرض تو چکا دیا لیکن جب بھی ملاقات ہوتی ہے، وہ بڑے ارمان سے کہتا ہے۔۔۔ مسٹر جانوس! ابھی مجھے ہی خدمت کا موقع دیں کوئی کام ہو تو بتائیں۔ میں آپ کے احسان کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، آپ ہی کی وجہ سے ہوں۔“  
”مسٹر موہن بہت ہی احسان شناس اور مخلص شخص ہے۔ میں اس سے احسان کا بدلہ تو نہیں چاہتا تھا لیکن یہ اتفاق ہے کہ اس دوران میں مجھے بھی اس سے کام ہی نہیں پڑا اور اب۔۔۔“

وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر باری باری ہم دونوں کو انکشاف انگیز انداز میں دیکھنے لگا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”اب سوچا، موجودہ حالات میں اس سے بچھوٹا سا کام لے ہی لیا جائے۔ اس طرح کم از کم اس کی یہ غلطی تو نکل ہی جائے گی کہ وہ کبھی میرے کام نہیں آیا! میں نے موہن سے تفصیلی بات کر کے اسے تعاون کے لیے آمادہ کر لیا ہے۔ ہم ٹھیک سات بجے اس فلیٹ سے ہوٹل منتقل ہوا جائے گا۔“ ہم ”ہم“ سے میری مراد تم دونوں ہو۔ اس نے اٹھی اٹھا کر باری باری ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا ”اس منتقلی سے پہلے تم دونوں کے چروں پر ضروری میک اپ کر دیا جائے گا۔ وجدان، دودو کے علیے میں اور لی یان ایک انجینیئرنگ کی روپ میں اس کو محفوظ ہوجائے گی۔ ٹھیک نو بجے رات موہن فون کر کے دودو کو جوگندر پال کے بنگلے سے تھوڑی دیر کے لیے بلائے گا۔ دودو، وکرمل جلدی واپس آنے کا تہہ کرہاں سے چلا آئے گا۔ موہن دودو کو لے کر میرے پاس آجائے گا۔ مجھے ان دونوں سے خصوصی ”میننگ“ کرنا ہے۔ دودو جیسے ہی بنگلے کو چھوڑے گا میں تمہیں فون پر اطلاع دے دوں گا اور تم ہوٹل سے نکل کر بنگلے کی

جانب بڑھو گے۔ اوکے؟“

”اور لی یان؟“ بے ساختہ میرے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

”میں لی یان کے ساتھ بنگلے کے باہر موجود ہوں گا۔“ جانوس نے حتمی لہجے میں کہا ”میں تمہیں کے پاس موبائل فون ہوں گے جس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔ میں موہن وغیرہ والی ”میننگ“ سے فارغ ہو کر سیدہ حالی یان کے پاس پہنچوں گا۔ بنگلے کے اندر ہمارے داخلے کا بندوبست تم کرو گے اور میرا خیال ہے۔ یہ تمہارے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا؟“

”میں یہ کر لوں گا“ میں نے تین سے کہا ”مگر اصلی دودو کا کیا ہوگا؟“

وہ مسٹر موہن کے ساتھ کہیں بھی چلا جائے گا مگر جوگندر پال والے بنگلے کی طرف نہیں آئے گا“ اسی وقت جانوس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی!

وہ ہماری طرف سے توجہ ہٹا کر موبائل کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ چند سیکنڈ کی معنی خیز ”ہوں ہاں“ کے بعد اس نے رابطہ ختم کر کے موبائل کو سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا۔

”ادھر سب خیریت ہے۔ ڈین ہاروے اور اس کی بیویوں سامنے گاڑا پانچلے کے اندر ہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے“ ساحل بھی بنگلے ہی میں ہے۔ میرے آدی نے مجھے بتایا ہے پانچ منٹ پہلے جوگندر پال وہاں پہنچا ہے۔“

میں نے کہا ”جانوس! تمہارے مطابق اس بنگلے میں جوگندر کا یہ تیسرا چکر ہے۔ پتا نہیں وہ کس چکر میں ہے“ جوگندر کا روپ مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

”اس کے چکر کا بھی پتا چلاں گے“ وہ ہنس مچا کر انداز میں بولا ”پہلے میں ذرا گوتم کی خبر لے لوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹیلی فون اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا جو بیڈروم کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ گوتم۔۔۔ ایک نیا نام سامنے آیا تھا لہذا میں خاموشی اور توجہ سے جانوس کی حرکات و سکنات کو ٹھٹھ کر رہا۔

وہ ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر میرے قریب ہی آ بیٹھا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر فون کے ڈائل پر فورون ڈیل زید فانیو دن کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف رابطہ ہونے پر اس نے کمرانمبرون اوکس مانگ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی محترم سے بات کر رہا تھا۔

ان کے درمیان یہ مشکل چندہ سیکنڈ بات ہوئی ہوگی۔

ریسیور کڑکٹ کر مٹنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور بتایا ”ہوٹل منتقل ہوا میں بھی ہر قسم کی خیریت ہے؟“  
”تم نے ہوٹل کے کمرانمبر ایک سو چھ میں بات کی ہے“ میں نے کہا ”کیا گوتم اس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔۔۔ اور یہ گوتم ہے کیوں؟“

”گوتم میرے بھروسے کا آدمی ہے“ جانوس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ”کمرانمبرون اوکس میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ آج ہی ہمارے کھنڈرو پہنچا ہے“ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“ وہ معنی خیز انداز میں ذرا متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تم دونوں اس کے ملاقاتیوں کی حیثیت سے ہوٹل میں پہنچو گے لہذا کسی کو تم پر کوئی شک نہیں ہوگا۔ کمرانمبرون اوکس میں گوتم ایک وفادار ملازم کی طرح تم دونوں سے پیش آئے گا“

”اچھا“ تو تم نے ایسی منصوبہ بندی کر رکھی ہے!“ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ”میں نے تو اپنی ٹانگ کے بارے میں جہیں تفصیلاً بتایا۔ اب تم کہو کیا کرنا ہے؟“

”تمہارا منصوبہ اچھا ہے مگر کسی کھٹ راگ کے مانند شرٹا غرابھیلا ہوا ہے“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پھر؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”پھر۔۔۔ یہ کہ میں اسے تھوڑا ایڈٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں بتاؤ۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے“ موہن سے تفصیلی بات کر کے اسے تم نے تعاون کے لیے آمادہ کیا ہے“ میں نے گہرے انداز میں کہا ”میں پہلے یہ چاہتا ہوں کہ موہن نامی یہ شخص ہمارے معاملات سے کس حد تک واقف ہے؟“

جانوس نے جواب دیا ”ہمارے منصوبے کی اسے مطلق خبر نہیں۔ اسے اصل حالات سے آگاہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے تو موہن سے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ دودو کو لے کر میرے پاس آجائے۔ مجھے ان دونوں سے ایک ضروری کام ہے۔ اس پر موہن نے کہا کہ دودو میرے مطلوبہ وقت پر وہاں جوگندر پال کے بنگلے میں مصروف ہوگا تو میں نے کہا ”وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے بلا لے۔ اس پر وہ راضی ہو گیا ہے۔ بس اتنی ہی بات ہے“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ”میں صرف اتنا چاہتا ہوں دودو رات نو بجے کچھ دیر کے لیے اس بنگلے سے ہٹ جائے تاکہ

تمہیں وہاں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ تم رات نو بجے سے پہلے ہی دودو کا روپ دھار چکے ہو گے۔ اس سلسلے میں تمام انتظامات مکمل ہیں۔“

پھر وہ مجھے ان انتظامات کی تفصیل بتانے لگا۔ باغ بازار سے جانوس نے جو شاپنگ کی سخی اس میں دیگر ضروری اشیاء کے علاوہ میک اپ کے جملہ لوازمات بھی شامل تھے۔ میری فرمائش پر اس نے ایک دکان سے میرے لیے ایک خوب صورت منجر بھی خرید لیا تھا جس کے ساتھ ایک دیدہ زیب چھڑے کا کیس بھی موجود تھا۔ دودو اور وکرمل کی پوسٹ کارڈ سائز تصاویر بھی حاصل کر لی گئی تھیں تاکہ میرے میک اپ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور وکرمل کے خال و خفا کو بھی میں اپنے ذہن میں نقش کر لوں۔ مجھے رات نو بجے کے بعد جوگندر پال کے بنگلے میں دودو کی حیثیت سے وکرمل کی معیت میں وقت گزارنا تھا۔ جانوس نے مجھے وکرمل اور دودو کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں بھی بتا دیا تاکہ اسے ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

اس سیٹ اپ کو دیکھتے ہوئے میں مطمئن ہو گیا اور جانوس نے کہا ”تم نے بڑا پھر پور بندوبست کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ہم اسے انتہائی مختصر کر سکتے ہیں!“

”ہاں بولو میں سن رہا ہوں؟“ وہ ہنسنے لگا۔  
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم دودو اور موہن کے ساتھ کیا کرتے ہوئے سوچنا تمہارا کام ہے۔ میں صرف اتنا چاہوں گا کہ دودو ٹھیک نو بجے رات وکرمل سے تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر بنگلے اور پھر دوسرے بجے سے پہلے ادھر کا رخ نہ کرے بلکہ ممکن ہو تو وہ آج رات ادھر آئے ہی نہیں۔ موہن اسے کسی بھی کام میں ابھاردے۔ تم ان دونوں سے جو بھی میننگ کر دو گے“ وہ اس فلیٹ پر نہیں ہوگی تو دودو کے جوگندر پال کے بنگلے سے غائب کی وجہ سے ان دونوں پر کوئی معصیت بھی نہیں آئے گی۔ اس قسم کی محفوظ پلاننگ کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”یہ ہو جائے گا۔ آگے بولو؟“ جانوس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”میں دودو کے اور لی یان کی انجینیئرنگ کی روپ میں ساڑھے آٹھ بجے اس فلیٹ سے نکلیں گے۔ میرے جسم پر وی آئی پی کیئرنگ کمپنی کی مخصوص یونی فارم ہوگی جو تم مجھے مہیا کرو گے۔ ہم دونوں کے پاس تمہارے دیے ہوئے موبائل فون ہوں گے۔ ہم لازم پت کے علاقے

میں بڑی شرافت کے ساتھ سڑکیں تاپتے رہیں گے۔ جب تم فون کر کے مجھے بتاؤ گے کہ دودا اس بنگلے سے نکل آیا ہے تو دس پندرہ منٹ کے بعد میں دودا کی حیثیت سے دکر م کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پھر لیان کو بنگلے کے اندر کس طرح بلانا ہے یہ میں سوچ لوں گا۔" میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا "نی الجال ہوٹل شکر بلایا جا چکا رہے دو۔ اس پناہ گاہ کو بعد میں کسی فوری ضرورت کے تحت استعمال کر لیں گے۔"

"اور میں....." بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "میں اس مشن میں کہیں نظر نہیں آ رہا؟"

"تم بھر پور تعداد کی صورت میں قدم قدم پر ہمارے ساتھ ہو" میں نے کہا "تم اس فلیٹ پر ہماری داپھی کا انتظار کرنا۔ ہم اپنے مشن میں کامیابی کے بعد سیدھا یہیں آئیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا وجدان!" وہ بھرا لی ہوئی آواز میں بولا "میں تم دونوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے کسی بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میں موہن اور دودا سے فارغ ہو کر تمہاری طرف آ جاؤں گا اور ایک اسٹیشن دیکھ کر جو گندہ پال کے بنگلے کے قریب ہی کی محفوظ آڑ میں موجود ہو گا۔ تم جب بنگلے سے نکلے گے تو مجھے موبائل پر رنگ دے دینا میں اسٹیشن دیکھ کر ساتھ بنگلے کے گیٹ پر پہنچ جاؤں گا۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا پھر بڑے عجیب سے لہجے میں بولا "تم ازم اتنا تھو تو مجھے بھی بتانا ہے دودا وجدان!"

"ٹھیک ہے یہی طے ہو گیا" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس کے بعد آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان دیگر اہم امور پر بات چیت ہوتی رہی۔ جالوس نے دوسوا ہل فون ہمارے حوالے کیے اور اپنا رابطہ نمبر بھی ہمیں بتادیا۔ یہ نمبر ڈاکٹر مونگ کے توسط سے پہلے ہی مجھے تک پہنچ چکا تھا۔ جالوس نے تین پوسٹ کارڈ تصاویر بھی مجھے دکھائیں۔ ان میں دودو دودا اور دکر کی تصویریں تھیں اور تیسری کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ جو گندہ پال کی تصویر ہے۔

"جو گندہ کے ساتھ جو دو تین افراد آج رات اس بنگلے پر پہنچیں گے" وہ متابی ہیں "جالوس نے بتایا۔" لہذا ڈین ہارو سے اور کلاڈیا کو بھیجئے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ وہ دونوں رنگ دسل کے اعتبار سے ان سب سے خاصے مختلف ہوں گے۔ میں ان یہودیوں کی تصاویر حاصل نہیں

کر سکا۔"

میں نے کہا "جالوس! گاڑی میں جب ہمارے درمیان ڈین ہارو سے اور اس کے ساتھی کلاڈیا کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی تو تم نے ایک خاص انداز میں کلاڈیا کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا وہ بڑی زبردست شے ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے تم اسے دیکھ چکے ہو؟"

"میں نے اپنی ان آنکھوں سے تو نہیں دیکھا" وہ بڑی حسرت سے دونوں آنکھوں کو چھوتے ہوئے بولا "میں سنا ہی سنا ہے۔ جن لوگوں نے اس سربا قیامت کو دیکھا ہے ان کی رائے گور نہیں کیا جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے اگر یہ بات ہے تو ہم بھی دیکھیں گے" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے پوچھا "تم لازم بت کی طرف جاتے ہوئے کس قسم کی گاڑی استعمال کرنا چاہو گے؟"

"کسی بھی قسم کی نہیں" میں نے قلعیت سے کہا "ہم یہاں سے ٹیکسی جائیں گے اور لازم بت کے اندر سے گزرتے ہوئے پانی پوکھاری کی طرف نکل جائیں گے۔ رائل گیٹ ہاؤس سے تھوڑا آگے جا کر ہم ٹیکسی والے کو فارغ کر دیں گے اور چند قدم واپس چلنے کے بعد "پالودر" روڈ سے دوسری ٹیکسی لے لیں گے اور اٹالین آہستہ آہستہ قریب پہنچ کر اس ٹیکسی کو بھی چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد ہم اپنے ٹارگٹ کے نزدیک رہتے ہوئے تمہارے فون کا انتظار کریں گے" میں نے سانس لینے کے لیے وقف کیا پھر کہا "جب تم اسٹیشن دیکھ کر ساتھ اس بنگلے کے نزدیک ہی موجود ہو گے تو پھر ہمیں کسی گاڑی کا اپنا ڈالنا ہے کیا؟"

جالوس نے تسلی بخش انداز میں گردن ہلائی اور بولا "ٹھیک ہے" پھر پوچھا "تم لوگوں کو کوئی خاص ہتھیار چاہیے ہو تو بتاؤ؟"

میں نے کہا "میرے لیے تو خنجر کافی ہے۔" جالوس نے باغ بازار سے جو خریداری کی تھی وہ تمام چیزیں اس وقت میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ جالوس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے مذکورہ خنجر کو اٹھایا تھا۔ آٹھ انچ پھل والے اس خنجر کے ایک طرف تیز دھار تھی جبکہ دوسری جانب خطرناک دندانے بنے ہوئے تھے۔ اس خنجر کا دست لگ بھگ چار انچ لمبا تھا۔

جالوس نے ایک غماز میں لیان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تمہارے لباس میں بڑی آسانی سے چھپ جائے گا اور بد وقت ضرورت انتہائی مفید ثابت ہوگا۔"

لیان نے کسی تردد کے بغیر وہ لمبی پھل رکھ لیا۔

جالوس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "اب میں چلوں گا۔ مجھے کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔ میں لگ بھگ چھ بجے واپس آ جاؤں گا اور رات کے کھانے کے لیے بھی کچھ لینا آؤں گا۔ پھر جب تک تم دونوں یہاں سے روانہ نہیں ہو جاتے" میں اسی فلیٹ میں موجود رہوں گا۔ تمہارے ایک

اپ کے مراد میں میری نگاہ کے سامنے طے ہوں گے۔ وہ لمحے بھر گور کا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "کاشا لوک اس دوران میں مسلسل یہاں کامن روم میں موجود رہے گا۔ یہ ہر فن مولانا قسم کا آدمی ہے۔ تم لوگ اس سے کوئی بھی کام لے سکتے ہو۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے" اس نے باری باری سوالیہ نظر سے ہم دونوں کو دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولا "تم لوگوں کو جتنا وقت مل رہا ہے انہی طرح آرام کر لو اور ہونے کے تو ایک پرسکون نیند بھی لے لو۔ آجیہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے منہ پر ہونے لہجے میں کہا "ہم تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔" پھر وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر فلیٹ سے رخصت ہو گیا۔

میں نے لیان کے ساتھ گھوم پھر کر اس فلیٹ کا جائزہ لیا۔ راہ نمائی اور معلومات کی فراہمی کے لیے کاشا لوک ہمارے ہم راہ رہا۔ وہ فلیٹ بنیادی طور پر تین بیڈروم اور ایک کامن پر مشتمل تھا اور خاصی محفوظ بلڈنگ میں واقع تھا۔ چوراما پارٹمنٹس کا شمار کمینڈو کی پوش رہائشی عمارتوں میں ہوتا ہے۔

ہم واپس اپنے بیڈروم کی طرف آنے لگے تو کاشا لوک نے احرام بھرے لہجے میں کہا "اگر آپ لوگوں کو کسی شے کی ضرورت ہو تو میں کامن میں موجود ہوں۔"

کاشا لوک کا تعلق بدھ مت سے تھا اور وہ بڑی روانی سے انگلیں ہلاتا تھا۔ وہ مضبوط بدن کا مالک ایک چاقو دچو بند غصہ تھا۔ آنکھوں کی چمک بتاتی تھی وہ ڈین اور بیدار سفر بھی ہے۔ کاشا لوک نے مجھے گور منڈا وار کا تھا۔ اس سے اس کی شخصیت کچھ اور نمایاں ہوئی تھی۔

میں نے زہر لب منکراتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے بتا دیں گے۔" پھر ہم دونوں بیڈروم کے اندر بند ہو گئے۔ لیان نے کہا "وجدان! مجھے تو بالکل نیند نہیں آ رہی۔ کیا تم سونے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے رست واپچ پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت سہ پہر کے

تین بجتے والے تھے۔ میں نے لیان سے کہا "کوئی خاص نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی لیکن جانوس کے مشورے پر عمل کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تم سونے کی کوشش کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں ایسی ہی بات ہے" میں نے کہا "تمہیں اگر نیند نہیں آ رہی تو لی دی دیکھ لو۔"

"لی دی کی آواز تمہیں ڈسرب نہیں کرے گی؟"

میں نے بے ساختہ کہہ دیا "ڈسرب تو وہ ہوتا ہے جو پرسکون ہو۔"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "لی دی کو بند ہی رہنے دو۔ میں کوئی میگزین دیکھ لیتی ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ گلاس ٹاپ کارز بیل کی طرف بڑھ گئی جہاں مختلف قسم کے میگزینز رکھے تھے۔ اس نے فیشن اور فوٹو گرافی سے متعلق دو میگزینز اٹھائے اور واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس بیڈروم میں ڈبل بیڈ کے علاوہ ایک مکمل صوفہ سیٹ بھی موجود تھا اسی طرح وہ بیڈروم سنگ روم بن گیا تھا۔

میں نے جوتے اتارے اور بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کہا "لیان! تم لی دی کی آواز دہی کر رکھ کر اسے آن کرلو۔ میں بالکل ڈسرب نہیں ہوں گا۔"

"اوکے" وہ اشارت میں سر ہلاتے ہوئے بولی "دیکھتی ہوں اگر میگزینز میں دل نہ لگتا تو لی دی آن کرلوں گی۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور لیان پر یہی خیال ہر کرنے لگا جیسے میں سونے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن جی بات یہ ہے کہ مجھے بھی نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت میرا ذہن مسلسل ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کا سربا روشن ہو گیا۔ ساحل تو میرے لیے جاگتی آنکھوں کا خواب بن گئی تھی بند آنکھوں کے پیچھے روشن کیسے نہ ہوتی! میں نے اس کے خدو خال پر توجہ مرکوز کی اور تھوڑا سی وقفہ اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا..... اور اس مرتبہ مجھے مکمل ناکامی نہیں ہوئی۔

میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ مچی۔ میری جان تنہا اس وقت ایک آرام دہ بستر پر چرت پھرت تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا وہ فطری نیند کا مرحلہ لوٹ رہی ہے یا اس پر مصنوعی نیند طاری ہے۔ وہ ان دلوں ربی اور اس کے چیلوں کے جن تجربہ بات کا نشانہ بنی ہوئی

تھی، ان کے پیش نظر مصنوعی نیند کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ جی نے عبادت گاہ کے نہ خانے میں اپنی زندگی کی سائیں پوری کرنے سے پہلے مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں ان کے مطابق، موٹے ہاتھن کے بیجے ہوئے ڈین ہاروے نے کسی طرح ساحل کے اندر سے نہ خانے کے خفیہ راستے کا راز اگلوایا تھا۔ جی نوٹ کے انکشاف نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ موٹے ہاتھن کی طرح ڈین ہاروے بھی پراسرار صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔ آخری خبروں تک ساحل ڈین ہاروے کے قبضے میں تھی لہذا یہی کہا جاسکتا تھا کہ اس وقت ڈین ہاروے ہی کے کسی ساحری عمل کے زیر اثر تھی۔

اس کمرے میں زیر و بار کا بلب روشن تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ دوڑا کر اس بیدرد کام جائزہ لے لیا۔ وہ ایک عام سائبرڈرم تھا۔ میں ساحل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کالی دون کے بعد میرے تصور کی گرفت میں آئی تھی۔ میں خاصی دیر تک ایک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ ان لحات میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت ایک مقام پر رک گیا ہو اور وہ مقام صرف اور صرف ساحل تک محدود ہو۔ وہ ہے جس حرکت خاموش یعنی تھی۔ اس کے چہرے سے نگاہ ہنسی تو تھوڑا نیچے آگئی۔ میں بڑی تشویش سے اس میں زندگی تلاش کرنے لگا۔ اس کے سینے کا زبردست ظاہر کرتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور گہری بے ہوشی میں ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔ پتا نہیں، موٹے ہاتھن نے میری تیسری آنکھ کی راہ میں کون سی طلسماتی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی کہ تصور کا پرندہ اس رکاوٹ کو عبور کرنے سے پہلے ہی پھڑ پھڑا کر زمین یوں ہو جاتا۔ اب میں اس کے ماحول میں پہنچا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا ڈین ہاروے نے ساحل کی یادداشت میں سے نکل نکٹڈا بدھ عبادت گاہ کے نہ خانے کا راز اگلوایا ہے کہ لیے جو جی روحوانی عمل کیا تھا اس نے موٹے ہاتھن کے لگائے ہوئے لاک کو کھول دیا تھا۔

میرے ذہن میں شدت سے اس خیال نے سراپا ہارا ..... اس سے پہلے کہ ساحل کو کسی ایسے دیے عمل سے گزار کر پھر مجھ سے میری باطنی آنکھ کی رسائی سے دور کر دیا جائے مجھے فوراً اس تک پہنچ جانا چاہیے۔ یہ خیال اتنا طاقتور تھا کہ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ بیڈ پر میرے پہلو میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ لی یان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا وہاں جانا! لگتا ہے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب

دیکھ لیا ہے۔“ میں ساحل کے تصور میں کھوکھراپے گرد و لواح سے بکسرے گا نہ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں لی یان کس وقت بستر پر آ کر دروازہ کھولی تھی۔ مجھے ہڑ بڑا کر اٹھتے دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور متوش نظر سے مجھے نکلنے لگی۔

میں نے سرسری انداز میں کہا ”کچھ نہیں لی یان!“

”بہت کچھ ہے“ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولی ”تم نہ بتاؤ مگر تمہارا چہرہ چٹلی کھارہا ہے۔ تم نے یا تو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے یا پھر اچانک ہی کوئی خطرناک بات تمہارے ذہن میں آئی ہے؟“

”تمہارا دوسرا انداز درست ہے“ میں نے اس زود فہم لڑکی کے سامنے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔

وہ تشویش بھرے لہجے میں متفہم ہوئی ”وہاں! کیا مسئلہ ہے؟“

”ہم اسی وقت جو گنڈر پال کے بیٹکے کی طرف جا رہے ہیں“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ادوہ!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی ”کیا تم پر دو گرام میں اس اچانک تبدیلی کے بارے میں جانوس کو بتاؤ گے؟“

”نہیں!“ میں نے قطعیت سے کہا۔

میرے دونوں لہجے نے لی یان کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ میرے اسٹائل کو بہ خوبی سمجھنے لگی تھی ایک بھی سوال کیے بغیر اس نے سنی لہجے میں کہا ”اوکے وی آر لیوگ۔“

میں نے اس خوبصورت خطرناک خنجر کو لیدر کیس سمیت اپنی چنڈی پر باندھ لیا۔ لی یان نے بھی لیڈی ہٹل کو اپنے لباس میں رکھا اور چر اعتماد لہجے میں بولی ”آئی ایم ریڈی!“

ٹھیک دس منٹ کے بعد ہم پوری طرح تیار ہو کر بیڈروم سے نکل آئے۔ یہ تیاری اگرچہ چنگاری بنیادوں پر تھی لیکن ضرورت کے عین مطابق تھی۔ ہم کاسن روم میں پہنچے تو کاشاٹوک ہمیں دیکھ کر چمک اٹھا۔

”آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟“ وہ حیرت زدہ لہجے میں متفہم ہوا۔

میں نے جواب دیا ”ہم باہر جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔“

”میں بھی ساتھ چلوں“ وہ ہلکے ہوئے انداز میں پوچھ بیٹھا۔

”نہیں! اس کی ضرورت نہیں“ میں نے کہا ”کھٹنڈو میرا دیکھا بھلا شہر ہے۔“

اس نے پوچھا ”کیا آپ نے مسٹر جانوس کو اس بار سے ملنا دیا ہے؟“

”ہاں جانوس نے میری بات ہو گئی ہے“ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ مطمئن تو نہیں ہوا لیکن بہر حال اس نے مزید کوئی سوال بھی نہیں کیا اور ہمیں جانے کی ”اجازت“ دے دی۔ ہم پیورا ہاٹا پارٹمنٹس سے نکل کر کینسل روڈ پر آ گئے اور ایک سپر سٹور ہاؤس کی طرف پیدل ہی چلے گئے۔

لی یان نے کہا ”تمہارا کیا خیال ہے وہاں! کاشاٹوک جانوس کو ہمارے بارے میں نہیں بتائے گا؟“

”میرا خیال ہے“ یہ پہلی فرصت میں جانوس سے رابطہ کرے گا“ میں نے جواب دیا۔

”پھر تم نے اس سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے؟“

میں نے لی یان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے جیب سے نکل نکالا اور کی پیڈ پر جانوس کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف رابطہ ہونے کے پورے عینک سلیک کے چکر میں پڑے بغیر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”جانوس! کیا تم مجھے جو گنڈر پال کے بیٹکے کا فون نمبر بتا سکتے ہو؟“

”شیو!“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا ”ایک منٹ!“

میرے ساتھ قہقہہ اٹھاتے ہوئے لی یان مسلسل سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایک منٹ سے پہلے ہی جانوس کی مانوس آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

”نمبر لوٹ کر لو..... فورڈ ڈیل دن تقری ڈیل دن۔“

یہ اتنا آسان نمبر تھا کہ فوراً ذہن نشین ہو گیا۔ میں نے کہا ”لوٹ کر لیا۔ تمہارا شکریہ۔“

”کیا تم اس بیٹکے پر فون کرنا چاہتے ہو؟“

”اگر موڈ بہن کیساتھ فون کروں گا۔“

”ایک بات کا خیال رکھنا“ اس نے تاکید لہجے میں کہا ”اس مقصد کے لیے وہ فلیٹ دالافون استعمال نہ کرنا۔ کار

آئی ڈی گز بڑ کر دے گی۔ وہ فلیٹ ہمارے لیے لی الحال ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔“

میں نے کہا ”تم فکر نہ کرو۔ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں کسی پبلک کال آفس کو روانہ کروں گا۔ اس وقت ہم دیے بھی سیرپائے کے لیے باہر نکلے ہوئے ہیں۔“

”سیرپائے کے لیے!“ اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت بھری ”تم فلیٹ کے اندر آرام سے سونا چاہتے

تھے؟“

میں نے سرسری انداز میں کہا ”بس“ فینڈ نہیں آرہی تھی اس لیے تھوڑی جھل تندی کے لیے نیچے اترا آئے ہیں۔“

”زیادہ دور تک چھل تندی کے لیے نہ نکل جانا“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا ”اور اپنے گرد و لواح پر کڑی نظر رکھنا۔ کھٹنڈو کی فضا قدم دونوں کے لیے یوں آزاد کھولنے کے لیے سازگار نہیں ہے۔“

”میں شہدائی فصاحت کو یاد رکھوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

لی یان نے اضطرابی انداز میں کہا ”جانوس کو تو تم نے ادھر ادھر کی پیپک کر مطمئن کر دیا لیکن میں محسوس کر رہی ہوں تم ایک خطرناک منصوبہ کے رقبے سے نکلے ہو۔ کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

میں نے سب کو جیب میں رکھا اور چوراسے پر سے دائیں جانب مڑتے ہوئے لی یان کو بتایا ”داعی“ میں کسی کال آفس سے جو گنڈر پال کے بیٹکے پر فون کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم بہ نفس نفیس اس بیٹکے پر چڑھائی کریں گے“ ایک لمحے کو رک کر میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں ساحل کے سلسلے میں رات ڈھلنے کا انتظار نہیں کر سکتا لی یان!“

وہ تھوڑی دیر تک مجھے حیرت بھری متذبذب نظر سے دیکھتی رہی پھر سپاٹ آواز میں بولی ”اس بیٹکے پر چڑھائی کے لیے تم نے کیا منصوبہ بنایا ہے؟“

”منصوبہ فون کرنے کے بعد بتاؤں گا“ میں نے گول مول انداز میں کہا۔

اس کے بعد لی یان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے میرے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر کے پاس سے گزرے تو تھوڑا آگے جا کر ہالوٹر روڈ پر ہی ہمیں ایک پبلک کال آفس نظر آ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں کال آفس میں داخل ہونے کے بعد جو گنڈر پال کے بیٹکے کا نمبر مل رہا تھا۔

ڈائلنگ کی جھجھک کے بعد دوسری طرف کھٹنی بجنے لگی۔ تیسری کھٹنی پر کسی نے ادھر سے ریسپونڈ کیا اور ہماری لہجے میں استفسار کیا ”ہیلو کون؟“

میں نے فرضی تعارف کا سہارا لیتے ہوئے کہا ”میں دشوانا تھا بول رہا ہوں۔ جو گنڈر پال سے بات کر دایں“

میں نے کوشش کی کہ میری اصل آواز نکل نہ سکے۔

دوسری طرف بولنے والے کا ب دہجہ خالص مغربی

تھا۔ وہ جوگندر پال یا کوئی اور مقامی تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ میری درخواست کے جواب میں اس نے کہا۔

”جوگندر پال اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔ اس سے بات کرنا ہے تو رات آٹھ بجے کے بعد فون کریں۔“

”آپ کون بول رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے ریسیور کیڈل کر دیا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ جوگندر پال وہاں سے جا چکا تھا اور رات آٹھ بجے سے پہلے اس کے ادھر آنے کا امکان نہیں تھا۔ جوگندر کے وہاں نہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس بنگلے پر زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوگی۔ ذہین ہاروے گلاڈا کے علاوہ سیکرٹری گاؤڑ کے نام پر دو تین افراد کی موجودگی متوقع تھی۔ کسی قسم کی ہنگامی کارروائی کے لیے یہ انتہائی مناسب موقع تھا۔ اگر میں کسی طرح اسرائیل ایجنسی کے چھوڑنے واقع۔ بنگا نمبر ”بے۔ ٹو ہنڈرڈ“ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر سال تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کوئی تیس روک سکتا تھا۔ اور یہ کام مجھے ہر صورت میں کرنا تھا۔

ہم کال آفس سے باہر نکلے تو لی یان نے استفسار کیا

”منصوبہ کیا؟“ اس کے سوال میں اتنی سادگی تھی کہ میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھوکا بچہ بڑی معصومیت سے اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو۔ ”مما! کھانا پک گیا؟“

”ہاں پک گیا“ میں نے گھمبیر انداز میں جواب دیا

”بس دم پر لگا ہوا ہے!“ وہ قدرے جھجکاؤ سے ”کیا بنگلے کے اندر داخل ہونے کے بعد بتاؤ گے؟“

”جیسی جیسی ہے نکلنے کے بعد!“ ”جیسی!“ وہ ابھن زدہ لہجے میں بولی ”کون سی جیسی؟“ وہ جان! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اس کے استفسار میں تشویش درآئی ”اس وقت ہم پیدل چل رہے ہیں۔ تم کون سی جیسی میں سے نکلنے کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا ”جس جیسی میں ہم بیٹھے جا رہے ہیں؟“

پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی اور سوال کرتی، میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی جیسی کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ اگلے ہی لمحے ہم مذکورہ جیسی کی عقبی نشست پر براجمان ہو چکے تھے۔ میں نے جیسی ڈرائیور سے چائیز

ایجنسی چلے کو کہا۔

جیسی بالووتر (Baluwatar) روڈ پر شال کی سمت بڑھنے لگی۔ میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

جالوس نے فلیٹ پر مجھے .... جوتین پوسٹ کارڈ تصاویر دکھائی تھیں ان میں ایک تصویر جوگندر پال کی بھی تھی۔ میں نے نوڈو کریم اور جوگندر کے غمگین خیال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے جوگندر پال کے نقش نگار کو ذہن میں ابھارا اور تیسری آنکھ کے طفیل اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت ایک گھڑی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا کبھی چارہا تھا۔ میں ٹھوڑی دیر تک اس کے ماحول میں رہا پھر جیسی میں حاضر ہو گیا۔ اس طرح اس شخص کی بات کی تصدیق ہو گئی جس سے ٹھوڑی دیر پہلے میں نے دشواریات کی حیثیت سے بات کی تھی۔ اب رات آٹھ بجے سے پہلے جوگندر پال ادھر کارخ کرنے والا نہیں تھا۔

جیسی چائیز ایجنسی کے قریب پہنچی تو میں نے ڈرائیور سے کہا ”سیدھا چلے ہوئے ٹھوڑا آگے جاؤ اور نیپال راستہ ایک کے پاس روک دینا۔“

جیسی ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ہمیں مطلوبہ مقام پر ڈراپ کر دیا۔ اس وقت ہم بالووتر روڈ پر چائیز اور رینن ایجنسی کے قریب واسط میں کھڑے تھے۔ جیسی وہاں سے رخصت ہو گئی تو لی یان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے اب تو تمہارا منصوبہ دم سے اتر آیا ہوگا؟“

”بالکل اتر آیا ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو .... بتاؤ!

میں نے بتایا ”ہم اندرونی گھیس میں سے ہوتے ہوئے ٹھوڑا داپس آئیں گے تو اس پرش رہائشی علاقے میں پہنچ جائیں گے جہاں جوگندر پال کا بنگا نمبر ”بے۔ دو سو“ واقع ہے۔ ہم مذکورہ بنگلے کے گرد دلواح کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اندر داخل ہو جائیں گے۔ بس اتنا سا منصوبہ ہے“ میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکھا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم بنگلے کی عقبی جانب سے اندر پہنچو گی اور میں سامنے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ ہمارا ٹارگٹ ساحل

ہے جو اس بنگلے کے کسی بیڈروم میں اس وقت گہری نیند میں ہے۔ ہمیں اس تک پہنچنا ہوگا۔ مخصوص جتنی فوجی کے سبب تم اسے آسانی شاخست کر لو گی۔ دن دہاڑے ساحل کے علاوہ اس بنگلے میں موجود تمام افراد جاگ رہے ہوں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

لی یان نے دو چار اہم سوال ”کے“ تمہارے اندازے کے مطابق اس بنگلے پر اس وقت کتنے افراد موجود ہوں گے؟“

”میرا خیال ہے“ ذہین ہاروے اور گلاڈا کے علاوہ دو تین سیکرٹری گاؤڑ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔“ میں نے اپنے اندازے کا اظہار کر دیا۔

وہ پر احتیاط انداز میں بولی ”پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ان لوگوں سے نمٹنا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہوگا۔“

”تو پھر چلیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی ”واپسی میں سواری کے لیے تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟ وہاں بنگلے میں کوئی بھی سنگین صورت حال پیش آ سکتی ہے اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ہمیں ہنگامی حالت میں وہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”ٹھیک کہتی ہو“ میں نے کہا ”مجھے امید ہے بنگا نمبر ”بے۔ دو سو“ میں کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور موجود ہوگی جو ہمیں وہاں سے فرار میں مدد دے سکتی ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو.....“ میری آواز بھراؤنی ”تو..... میں ساحل کو پانے کے بعد تو ہوا میں اڑ کر بھی یہاں سے جا سکتا ہوں۔“

میرا آخری جملہ جذبات کی غلو بیت کا غماز تھا۔ میں بھلا کیوں کر اڑ سکتا تھا لیکن ان نکات میں لی یان نے ذرا سا بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ میری حیرت انگیز صلاحیتوں کے اتنے مناظر دیکھ چکی تھی کہ شاید میری اس اڑنے والی بات کو بھی سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے کوئی وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔

جلدی ہم بنگا نمبر ”بے۔ دو سو“ تک پہنچ گئے۔ ہم نے آئینہ دس منٹ میں اچھی طرح گھوم پھر بنگلے کا جائزہ لے لیا۔ وہ ایک عالی شان سنگل اسٹوری بنگا تھا۔ عقبی دیوار کی اونچائی آٹھ فٹ رہی ہوگی۔ اسی دیوار کے اوپر کسی قسم کی حفاظتی خاردار باز نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی کسی طرح کے گانچے کے ٹکڑے نصب تھے۔ گویا اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ اندر کی جانب کوئی رخ گاڑ ہو سکتا تھا۔

میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”اس دیوار کو بھلا کب کر اندر چلی جاؤ گی یا میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کروں؟“

”میں یہ کام کر لوں گی“ وہ پرعزم لہجے میں بولی ”تم بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچو۔ اندر پہنچ کر ہمیں ایک ساتھ ریڑ کرنا چاہیے۔ بنگا سنگل اسٹوری ہے اس لیے میرا خیال ہے ہم جلد ہی ایک دوسرے سے آملیں گے۔“

”اوکے!“ میں نے الوداعی نظر سے لی یان کو دیکھا

”دش پو کڈک!“ ”سم ٹو ٹو“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے سامنے والے حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ پہلے پھیرے میں میں نے بنگلے کے گیٹ پر ایک مسل سیکرٹری گاؤڑ کو مستعد کھڑے دیکھا تھا۔ اب اس سے فٹاؤ کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اپنے ٹرائی بیڈر جی ایس ایلم کیو کو سائنٹ الرٹ پر رکھ کر جنر میں ٹھونس لیا۔

میں بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچنے کے بعد گیٹ کی طرف بڑھا تو گاؤڑ حد سے زیادہ الرٹ ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سر کی خفیف سی جھٹ سے اسے ”ہیلو“ کیا پھر پوچھا۔

”کیا مسٹر جوگندر پال یہیں رہتا ہے؟“ ”تم کون ہو..... اور جوگندر پال کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“ وہ اکثر لہجے میں بولا۔

”میں اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے چونکا نظر سے گاؤڑ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

وہ میرے انداز کو دیکھتے ہوئے اور مختاط ہو گیا ”جوگندر پال اس وقت بنگلے میں نہیں ہے اور..... تم اپنی شناخت کرائے بغیر اندر نہیں جا سکتے۔“

”شناخت!“ میں نے برہمی سے اسے دیکھا ”میں جوگندر کا باپ ہوں۔ کیا تم مجھ سے شناخت مانگو گے؟“ بات کے اختتام تک میرا انداز جھک آمیز ہو گیا۔

میں دانستہ اس قسم کی جارحانہ گفتگو کر کے اس کو فرائض سے ”غافل“ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاؤڑ میرے سوال کا جواب دیتا، اندر سے کسی نے پوچھا ”کس سے الجھ رہے ہو؟“ ”کوئی شخص خود کو جوگندر صاحب کا باپ بتا رہا ہے“ دے نامی اس گاؤڑ نے متاملانہ انداز میں کہا ”راجیش! تم آکر دیکھو کیا چکر ہے؟“ ”میں آ رہا ہوں۔“ اندر سے راجیش نے کہا۔

وہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ ایک گارڈ کو میں باتوں میں الجھا چکا تھا، دوسرا بھی سامنے آنے والا تھا۔ اگر میں بہ یک وقت ان دونوں کو شکار کر لیتا تو ماحرمت دم توڑنے پر مجبور ہو جاتی۔ پھر کاڈیا اور فرافڈیا (ڈین ہارڈے) سے غمنا ہمارے لیے مشکل نہ رہتا!

میں یہ سوچ رہی تھا کہ دوسرا راجیش نامی گارڈ گیت پر نمودار ہوا۔ اس نے باہر آ کر ایک تنہیدی نظر مجھ پر ڈالی پھر قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھتا، بنگلے کے عقبی حصے میں گولی چلنے کی مخصوص آواز ابھری۔ اس آواز نے گویا مجھے گرین سٹیل دکھادیا۔

میں چشم زدن میں سمجھ گیا، اس طرف لی یان نے محاذ سنبال لیا تھا۔ میں بھلا کیوں کر اس سے پیچھے رہ سکتا تھا۔ گولی کی آواز پر دونوں گارڈز نے انھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، لمبے بھر کے لیے ان کی نگاہیں مجھ سے ہٹ گئیں۔ میرے لیے دھمدھمدیوں کی مہلت کا حامل تھا۔

میں نے بڑی سرعت سے حرکت میں آتے ہوئے دجے کو ایک زوردار فرنٹ کلک ماری۔ راجیش کی جانب متوجہ ہونے کی وجہ سے اس کی پشت میری سمت ہو گئی تھی۔ میری ٹک بڑے بھر پور انداز میں اس کے کندھوں کے مین وسط میں لگی اور وہ ٹکڑا تے ہوئے راجیش کی طرف گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر اچھے اور کھلے ہوئے گیت سے اندر جا بیچے۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک لمبی جست بھری اور ان کے سر پر پھینک گیا۔ اب ہم تینوں بنگلے کے اندر تھے۔ میں نے گیت کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگادی اور ان گارڈز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد پر بری طرح ہلکھلے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر مجھے اپنی گمن کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے، میں نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔

دجے اٹھ کر جیسے ہی میری سمت پلٹا، میں نے اس کے گمن بردار ہاتھوں پر ایک تیز رفتار کریسنٹ کلک ماری۔ گمن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دوران پر جا گری۔ میں نے فرنٹ فٹ پر آتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک دھانسو قسم کا شیج رسید کر دیا۔ وہ جلتا تے ہوئے پیچھے گویا۔ میں پلٹ کر راجیش کی جانب متوجہ ہو گیا۔

راجیش اس دوران میں سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہ سے

اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے جیسے ہی گمن میری جانب سیدھی کی، میں نے ایک خطرناک راؤڈ باؤنس کلک چلا دی۔ میری کوشش تھی کہ اس بنگلے میں فائرنگ کی نوبت نہ آئے۔ میں خواہ مخواہ آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میری زوردار راؤڈ باؤس راجیش کی بغل میں مگی تو روٹھل کے طور پر اس کے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھ گئے۔ میں نے تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بیک سوئپ چلا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل ڈرا بچو دے کے پتھر فرش پر آ رہا۔

گمن ہنوز اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر اس پر ایک بھر پور حملہ کر دیا۔ میرے پاؤں کی دھواں دھار ٹھوکر اس کی کلائی پر لگی تو اس کے ہاتھ گن کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ میں نے ایک فیصلہ اٹھا، مار کر راجیش کی گن کو بھی دجے کی گن کے پاس سرسبز لان پر پہنچا دیا۔

راجیش تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے مرہم کاری میں لگ جاتا۔ میں نے نیچے جھک کر اس کی چربی گردن کو اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لیا اور ایک مخصوص جھٹکا دے کر اسے دو ٹکڑوں کے لیے اٹھائیں کر دیا۔ اب اس کی طرف سے کسی قسم کی ماحرمت کا اندیشہ باقی نہیں رہا تھا۔

کھڑے ہونے سے پہلے مجھے ایک اور ہنگامی قدم اٹھانا پڑا۔ چہرے پر میرے شیج کا تنہا سچا کر منہ موڑنے والا دجے واپس لوٹ آیا تھا اور عقب سے مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی نیت کو بھانپتے ہوئے اپنے بدن کو ایک خاص زاویے سے ٹوئسٹ کیا اور ہاف وٹیل کلک چلا دی۔ فل وٹیل کلک کی بہ نسبت اس میں دگنی قوت پوشیدہ تھی۔

میرے پاؤں کی ایڑی نے اس کی ٹھوڑی پر بوسہ دیا۔ وہ کراچے ہوئے پیچھے گویا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے کون پر رکھ لیا۔ میرے خون خوار دچخز نے اس کی ناک منہ سے خون چھڑا دیا۔ اس کی کبھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیوں کر میرے تاب توڑ تھیلے کا جواب دے۔ وہ بڑی مشکل میں تھا۔

اسی ناچھی کے دوران میں نے اس کی گردن پر واقع ایک مخصوص نرس کو دبا کر اسے بھی اس کے سامنے کے پاس پہنچا دیا۔ اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ اب وہ بھی راجیش سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے ان دونوں پر اٹھینان بھری نظر ڈالی اور لان کی سمت بڑھ گیا۔

میں نے لان کی گھاس پر سے دونوں گن کو اٹھا لیا اور

میں نے انداز سے بنگلے کی اندرونی جانب قدم اٹھانے لگا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں ایک فائر کے بعد کسی قسم کی کوئی آواز نہیں ابھری تھی اور اندرونی جانب بھی سانے کا راج تھا۔ اس صورت حال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

ایک لمبے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ کہیں وہ بنگا خالی تو نہیں۔ لی یان کو اندر داخل ہونے پہلے پانچ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ابھی تک وہاں اٹھانچ شروع ہو جانا چاہیے تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لی یان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو!

نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا! میرے ذہن نے فوراً تردید کر دی۔ پتا نہیں میرے اندر کی وہ کون سی قوت تھی جو لی یان کی سلامتی کے لیے پریقین تھی۔ شاید میں اسے کوئی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے گیت پر دجے اور راجیش سے جو باراماری کی تھی اس کی خبر گیری کے لیے بنگلے کے اندرونی حصے سے نکل کر کسی کو گیت کی طرف ضرور آنا چاہیے تھا۔ یہ پراسرار خاموشی مجھے ان گنت دماہوں میں ڈال رہی تھی۔ میں نے سلیک کال آفس سے ٹھوڑی دیر پہلے اس بنگلے میں فون پر ایک شخص سے بات کی تھی۔ پھر اس سانے اور خاموشی کا کیا مطلب تھا؟

بنگلے کے اندرونی حصے میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے لی یان کی خبر لینے کے بارے میں سوچا اور عقبی جانب بڑھ گیا۔ موجودہ صورت حال نے مجھے اس کی طرف سے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ گن کو میں نے ایک محفوظ آڑ میں چھپا دیا اور بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

وہاں میں نے ایک باوردی سچ گارڈ کو اوندھے منہ زمین پر پڑے دیکھا تو فوراً سمجھ گیا، اسے لی یان نے شکار کیا تھا۔ میں نے جھک کر اس گارڈ کا جائزہ لیا۔ اس کی وردی میں عین دل کے مقام پر نمودار ہونے والے سوراخ نے مجھے بتا دیا کہ وہ دنیا دہیا سے بہت دور جا چکا تھا۔ سیدھا ہونے کے بعد میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر لی یان مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ عمارت کے اندر ہی حصے میں داخل ہو چکی ہے۔

میں نے ایک دروازے کے پینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں عمارت کے اندر تھا۔ اور اسی وقت مجھ پر مشکف ہوا کہ اس طرف اتنی خاموشی اور سناٹا کیوں تھا؟ میں نے خود کو ایک ساؤنڈ پروف زون میں پایا۔ ساؤنڈ پروف فضا کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ اندر قدم رکھتے ہی وہ خاموشی اور سناٹا یکسر جاتا رہا۔ کسی قریبی

حصے سے ابھرنے والی اٹھانچ کی مخصوص آوازیں میری سماعت تک پہنچیں تو مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں مدد ملی کہی وقت کا سامنا نہیں ہوا کہ لی یان اس طرف نیرو ڈاڑھی۔ وہ ییل (Yell) کرتے ہوئے کسی پر حملہ آور ہو رہی تھی۔

میں نے اسی سمت دوڑ لگا دی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میری سلاخی نگاہ اس ہیڈروم کو کھنچ رہی تھی جہاں میں نے قہر ڈالنے کے توسط سے ساحل کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا کہیں ایسا ہیڈروم مجھے نہیں دکھائی نہ دیا البتہ اس تلاش میں ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں لی یان بڑے خطرناک سے موجود تھی۔ وہ دو افراد سے بیک وقت غمٹنے میں مصروف نظر آئی۔

ان میں سے ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ڈین ہارڈے اور کلاڈیا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اس عورت کی میری جانب پشت تھی لہذا میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ مرد کی صورت بڑی حد تک امریکی صدر کلنٹن سے ملتی جلتی تھی اور درحقیقت وہی لی یان کے مقابل ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا سے مارشل آرٹس کی جھلک نظر آتی تھی۔

اسی کمرے میں میرے دخول نے سب کو چونکے پر مجبور کر دیا۔ لی یان کے چہرے پر اطمینان ابھرا، لیکن بل کلنٹن کی مشابہت رکھنے والا مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ایسے اچلا جیسے موت اچانک آن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں شاسانی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی ضرورت نہیں تھی کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

باراماری میں پیدا ہونے والے اس لمحاتی قتل سے عورت نے فائدہ اٹھا لیا اور اس کمرے سے نکل کر کوریڈور میں لپک گئی۔ میں نے بڑے نکلشی انداز میں لی یان کو اس شخص سے مقابلہ کرتے دیکھا تھا لہذا اس کی طرف سے بے پروا ہو کر میں نے عورت کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔

میں ابھی تک اس کی صورت نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ کلاڈیا ہوگی۔ مجھے اپنے عقب میں لی یان کی تشویش سے بھری آواز سنائی دی۔

”وہ جان! اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھنا، یہ عورت کوئی جادوگر کی ہے۔“

لی یان کی اس ہدایت نے مجھے بری طرح چونکا دیا تاہم میں نے اس جادوگر کی کے تعاقب میں کوئی کوتاہی نہ برتی اور



کورڈور کے آخری سرے پر اسے چالیا۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ میں نے عقب سے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔

وہ ٹھکراتے ہوئے منہ کے بل کمرے کے قالین پوش فرش پر گری۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ لی یان نے بڑی شدت سے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس عورت کی آنکھوں میں نہ دیکھوں اور اس تاکید نے میرے اندر ایک ضد کو ابھار دیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اس عورت کی آنکھوں میں ایسا کیا ہے جو لی یان نے اسے جادوگر کی سے تعبیر کیا تھا؟

دو فرش پر پڑی دھیرے دھیرے کراہ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اٹھ کر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بادی انظر میں یہی لگتا تھا کہ اسے کوئی ایسی شدید چوٹ پہنچی ہے کہ وہ فرش سے اٹھنے کے قابل نہیں رہی۔

میں مختار قدموں سے اس کی پائنتی سے سر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی طرف سے کسی حملے کی امید نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے اندازے کی بنا پر اسے پکارا۔

”کلاؤ یا! اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ۔ تمہارا مکمل ختم ہو گیا۔“

اس نے میری پکار کے جواب میں کچھ کہا اور نہ ہی فرش سے اٹھنے کی کوشش کی البتہ اس کے صلق سے بیٹھی بیٹھی کراہیں خارج ہوتی رہیں۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ شاید اس کے جسم کے کسی نازک اور حساس حصے پر کوئی خطرناک چوٹ آگئی ہے جو وہ اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

میں اس کے قریب ہو گیا اور اسی وقت کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی عورت نے میرے اندازوں کی ایسی ہیسی کر دی۔ اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی پاؤں کو ایک خاص انداز سے رول کیا اور میرے پاؤں کو اپنی ناگوں کی پٹی میں جکڑ کر فرش پر گھوم گئی۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت کے نتیجے میں میں زمین پر آ رہا۔ وہ کسی بندر یا کے مانند اچھلی اور میرے سینے پر سوار ہو گئی۔

میں اس کی اس جسارت پر ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کہ وہ مجھ پر چھلی اور اپنے ہاتھوں سے میری گردن کو دو بوج کر برا راست میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میں ہکا بکا اس دل کش عورت کو دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اتنی حسین عورت اپنی زندگی میں پہلے بھی اور نہیں دیکھی تھی۔ وہ بنی بنائی یونانی دیوی تھی۔ آنکھیں گہری نیلی اور جاذبِ خال و خط پر نقش اور رنگت سرخی مائل سفید۔ اس کے

شہدیلے بال بڑے دلربا انداز میں ترشے ہوئے تھے۔ وہ حسن کا ترانہ میرے اوپر کسی زہری طرح سجا ہوا تھا۔

یہ منظر سیکڑ کے لاکھوں حصے میں آنکھوں کے راستے میرے حافظے تک منتقل ہوا میرے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر میرے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اگرچہ دونوں ہاتھوں سے میری گردن کو گرفت میں لے رکھا تھا لیکن اسے دبانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی تمام تر توجہ میری آنکھوں پر مرکوز تھی۔ اسی لمحے اس کی پرتاثر آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”وہ جان!..... تم خود کو بھول رہے ہو..... سب کچھ بھول رہے ہو..... صرف میری آنکھیں نہیں یاد رہیں گی۔ تم صرف میری آواز سن رہے ہو..... باقی تمام آوازیں تمہاری سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم میری آنکھوں کے اسیر ہو..... یہ آنکھیں تمہارے دماغ میں بیوست رہیں گی اور تمہیں جب بھی جو کچھ حکم دیں گی تم فوراً بلاسو پے سمجھے اس کی تعمیل کر دو گے۔“

میں یک تک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو دھتے ہوئے انکارے رکھ دیے گئے ہوں۔ وہ گویا دو طاقتور مقامات تھے جو بڑی شدت سے مجھے اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ خدا کی پناہ! ایسی غضب ناک آنکھیں میرے نظارے میں پہلی مرتبہ آئی تھیں۔

بلاشبہ وہ عورت کوئی بہت بڑی ساحرہ تھی۔ وہ مجھے مسراتز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری جگہ اگر کوئی اور شخص اس کے مقابل ہوتا تو اب تک اچھا چارہ بیچنے کر اس کے قدموں میں جیسں رکھ چکا ہوتا۔ یونانی حسن کا شاہکار وہ عورت ایسی ماہ جیسں دول شیں تھی کہ ہزاروں مرد اس کی پابوسی کے لیے قطار بنا کر اپنی باری کا انتظار کر سکتے تھے۔

”آج کے بعد تم صرف مجھے یاد رکھو گے“ وہ اپنی جیشوں کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ”تم میرے غلام ہو..... میرے اشاروں پر بنا جو گے۔“

اس کی آواز اور الفاظ میں ہلکا سا اعتماد تھا۔ اسے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ مجھے اپنے فرانس میں لالچے سے لیکن یہ اس کی بھول تھی ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملنے ہی میں پورے حواسوں سے ریٹارٹ ہو گیا تھا۔ لی یان کے الفاظ مسلسل میرے دماغ میں گونج رہے تھے۔ وہ جان! اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھنا یہ

عورت کوئی جادوگر کی ہے! وہ اپنی جادوگر کی تھی۔ اپنے جادو کے زور پر مجھے غلام بنا کر رکھنے کی خواہش مند تھی مگر میں بھی نادان نہیں تھا۔ وہ جان تھا۔ اپنے شیعے کا سلطان تھا اور اللہ میرا نگہبان تھا۔ اگر میں اس جادوگر کی کے فرانس میں آ جاتا تو یہ میری نہیں میری ملا جلا جیتوں کی شکست ہوتی۔ اس نازک مرحلے پر میں ہار کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو ڈانٹ مکلفے میں اس کے گرد گھٹنٹال رہی موٹے ہاتھوں کو چوناگا آ جاتا تھا۔ یہ جیلی چائی کلاؤ یا دلایا میرے سامنے کیا نتیجہ تھی!

کہتے ہیں منہ دیکھ کر کھنجر مارنا چاہیے۔ سامنے والے کی پال کے عین مطابق اپنے ہرے کو آگے بڑھانا چاہیے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں دوڑتی ڈیٹا لگ مار کر یہ سمجھتی تھی کہ اس نے وہ جان ایسے پہاڑ کو جت کر لیا۔ میں نے اسے اسی خوش فہمی میں جتلا رہے دیا۔ وہ اپنی بھول میں ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔

”وہ جان! اب تم آنکھیں بند کر لو گے۔ میں تین تک گنوں گی تو تمہاری آنکھیں بند ہو چکی ہوں گی۔ ایک..... اس نے پہلے بھی مجھے وہ جان کہہ کر پکارا تھا۔ اس کو مطلب تھا، ذہن ہاروے کی طرح وہ بھی مجھے پہچان چکی تھی دیے لی یان کی پکار کا نتیجہ بھی ہوسکتا تھا۔ اس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے اس جادوگر کی سے خبردار کیا تھا۔

”دو.....“ وہ چند سیکڑ کے وقفے سے بولی۔ ”تین!“ میں نے کسی فرماں بردار بیٹے کے مانند پلٹیں جھپکائیں اور نہایت ہی شرافت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ یہ عمل کلاؤ یا کو خوش فہمی میں جتلا کرنے کا شوقیلیق تھا۔

اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اس نے شاداب بدن کو اپنے سینے پر سوار محسوس کر رہا تھا۔ کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں کوئی بہت بڑا ذخیرہ اندوز ہوں جس نے حسن و جوانی کے ایک عظیم الشان ذخیرے کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔

کلاؤ یا کا سراپا میری یادداشت میں اس طور چھپ گیا تھا کہ تصویر کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے مجھے اس کے خدخال کو باز کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ظاہر آنکھیں بند رکھے ہوئے باطنی آنکھ کا سوچ آن کیا تو اس کا لکھونی حسن نری نگاہ میں پھیل گیا۔

اسی وقت وہ تھوڑا سا کسمائی اور میرے سینے سے نیچے لڑکھی بھر مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو کر مجھے آتش فشاں 212

دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اطمینان اور کامیابی کے آثار نظر آئے۔ اپنی دانست میں وہ مجھے غلام بنا چکی تھی۔ اس نے مجھ پر ایک حقیر آمیز نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

وہ بڑے مطمئن انداز میں چلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو میں نے زمین پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند رکھتے ہوئے نہایت ہی نرسکون لہجے میں اسے پکارا۔

”کلاؤ یا! تم تو ریلیکس ہو کر جاری ہو۔ مجھے کون اطمینان دلانے کا؟“ وہ اس طرح اچھل کر مڑی جیسے چاک اس کا ہاتھ بجلی کے نیچے تار سے چھو گیا ہو۔ وہ بڑی تیزی سے میرے قریب پہنچی اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسی وقت میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک جھکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میرے ہونٹوں پر بڑی زہری لکڑاٹھ تھی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے اس نے قیامت سے پہلے قیامت دیکھی ہو۔

”دج..... دان..... تم.....“ وہ حیرت کی شدت سے بھلا اٹھی۔

میں نے کہا ”یقین نہیں آ رہا؟“

”مگر تم تو..... تم تو.....“ وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ ”شاید تمہارے رولی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ جان کس طوفان کا نام ہے“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا ”میں نے کہا“ تمہارا مکمل ختم ہو گیا۔ اب میں کلاؤ یا اور تم تماشائی ہو۔ بتاؤ“ تم لوگوں نے میری ساحل کو اس بنگلے کے کس کمرے میں بند کر رکھا ہے؟“

کلاؤ یا کی مسرورانی ملا جیتوں کو دیکھ کر میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ ساحل آج کل اسی ساحرہ کے ظلم میں گرفتار تھی اور اس کے ذہن سے بدھ تیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے والا راز بھی اسی ساحرہ نے نکالا ہوگا!

کلاؤ یا نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مارشل آرٹس سے بھی گہری واقفیت رکھتی تھی۔ اسے ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی صلاحیتوں پر عبور حاصل تھا۔

کوئی اور قارع موقع ہوتا تو میں فائنٹ کو طول دے کر بھر پور انجوائے کرتا۔ اس وقت مجھے بڑی شدت سے ساحل کی تلاش تھی۔ میں نے اب تک جتنے کمرہ میں جھانکا تھا وہاں وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ کلاؤ یا کی زبان کھلوانے کے لیے اسے بے بس کرنا بہت ضروری تھا۔ اور اسے بے بس کر کے اپنے بس میں لاتے ہوئے مجھے چھوٹک



پھونک کر ہاتھ پاؤں کو استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ عمل چوبی ہتھوڑے کی مدد سے کالج کی دیوار میں آہنی میخ ٹھونکنے کے مترادف تھا!

اس کا ایک ایک دست قدرت کی صنائی کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ لگتا تھا خالق نے اسے بنانے کے بعد وہ سانچہ ہی توڑ ڈالا تھا۔ اس کے پرخورد جسمانی خطوط کو ہاتھ پاؤں کی بے رحم ٹھوکروں سے لگانا ایک گناہ عظیم تھا۔ یہ کچھ میں ہی جانتا تھا دس منٹ کی کڑی آزمائش کے بعد میں نے کلاڈیا کو کس طرح زبرد کیا!

جب وہ پوری طرح میرے قابو میں آگئی تو میں نے بیڈ شیٹ میں سے دوسری لمبی پٹیاں بچھا لیں۔ ایک پٹی سے میں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانچ کر اچھی طرح کس کر باندھ دیا۔ دوسری پٹی کی مدد سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر بائیم پیوست کر کے بڑی مضبوطی سے جکڑ دیے۔ اب وہ ان ہاتھوں کی مدد سے آنکھوں والی پٹی نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کے بعد میں کلاڈیا کو کسی اسیر کے مانند دھکیلتے ہوئے اس کمرے میں لے آیا جہاں لی یان کو ڈین ہاروے کے ساتھ تیز ذرا چھوڑ گیا تھا۔

اس کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک زوردار دھکے کا سامنا کرنا پڑا۔ لی یان توپ میں سے نکلے کسی گولے کے مانند آ کر مجھ سے ٹکرائی تھی اور اسے اس طرف بھیجنے والا ڈین ہاروے تھا۔ میں نے لی یان کو سنبھالا اور تیز لہجے میں کہا۔  
”تم کلاڈیا کو دیکھو میں اس سورما سے نمٹتا ہوں۔“

ڈین ہاروے کلاڈیا کی حالت زار دیکھ کر بری طرح چونکا اور لنگھے لیے اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے مجھے فلائنگ کک مارنا چاہی۔ میں یک دم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے اوپر سے فلائی کرتے ہوئے کھلے ہوئے دروازے سے باہر گرد پڑو میں پھینچ گیا۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کلاڈیا کی طرح فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے قدموں پر آتے ہی واپس مڑا۔ اس دوران میں میں بھی کوہنہ پر تھک گیا تھا۔ پھر ہمارے درمیان باقاعدہ مارشل آرٹس کی ٹیکنیکس کا تبادلہ ہونے لگا۔

لی یان نے اس کی اچھی خاصی درگت بھادی تھی تاہم وہ اس پر پوری طرح قابو پانے میں کامیاب نہیں رہی تھی۔ لی یان کو ایک نظر دیکھتے ہی میں نے مہمان لیا تھا ڈین ہاروے نے بھی اسے ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچایا تھا۔ دونوں طرف ٹوٹ پھوٹ کا تناسب برابر ہی رہا تھا۔

ڈین ہاروے مارشل آرٹس سے بخوبی آگاہ تھا لیکن میں نے اس مرحلے میں چند آزمودہ کارشارٹ کس استعمال کر کے اسے زمین چبانے پر مجبور کر دیا۔ لی یان نے اسے اچھا خاصا تھکا دیا تھا لہذا وہ میرے دھواں دھار حملوں کے سامنے زیادہ دیر محنت نہ کر سکا۔ میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑاتے ہوئے کلاڈیا کے پاس پہنچا دیا۔

لی یان نے لیڈی ہٹل لباس میں سے نکال کر کلاڈیا کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ کلاڈیا اور ڈین ہاروے پر قابو پا کر ہم نے گویا اس بنگلے پر تسلط جمایا تھا۔ اس بنگلے میں اگر ان کا کوئی اور حمایتی موجود ہوتا تو اب تک ضرور سامنے آ جاتا۔ حالات پوری طرح کنٹرول میں آ گئے تو میں ایک کرسی کھینچ کر ڈین ہاروے کے قریب بیٹھ گیا۔

لی یان سمجھی گئی کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ریڈ الارٹ ہو گئی۔ اس نے خطرناک نکتے ہٹل کو اس انداز میں تمام رکھا تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ٹھنسی دکھانے کی کوشش کرتا تو وہ بے دریغ اس کی کوشش کو ناکامی کا منہ دکھا دیتی۔

میں نے اپنی ہنڈلی پر بندھے ہوئے پیاسے خنجر کو اس کے کیس میں سے نکالا اور بڑے خطرناک انداز میں ڈین ہاروے کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔  
”سائل کہاں ہے؟“

میرے لہجے میں اس درجے کی سفاکی موجود تھی کہ اس کا چہرہ خنجر ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس کے لب خنجر قرار کر رہے تھے۔ وہ متحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی دھشت میں اضافہ کرنے کے لیے خنجر کی نوک کو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے بیچ رکھا اور کہا۔  
”ڈین ہاروے! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے اس بنگلے کا ایک ایک کونہ کھدرا جھانکنے کی زحمت نہ دو۔ اس کے بدلے میں تمہیں زندہ رہنے کا موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ تاہم میری سامگی کو تم نے کس کمرے میں بند کر رکھا ہے؟“

”وہ..... وہ یہاں نہیں ہے“ وہ خوف زدہ انداز میں ہکھلایا۔

میں نے خنجر کی نوک کو ایک حد تک اس کی پیشانی میں گزایا اور پھکار سے مشابہ انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے تم زبان بند کر کے موت کو گھٹنے لگانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“ تکلف کی شدت نے اس کے چہرے کے نقوش کو بری طرح بگاڑ دیا۔ وہ کراہے ہوئے بولا۔ ”تم میری بات کا یقین

کر دوسائل یہاں نہیں.....“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کرب ناک آواز خارج ہوئی۔ میں نے میکا کی انداز میں اس کی پیشانی پر ایک جھکا دیا تھا۔ اس کی حالت دیہی ہو گئی۔

”میں تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتا ڈین ہاروے!“ میں نے دوبارہ خنجر کو اس کے چہرے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سائل اسی بنگلے کے کسی بیڈروم میں بند ہے! ایسا بیڈروم جس میں زبردیاور کا بلب جل رہا ہے۔ تم لوگوں نے کسی عمل کے ذریعے اسے بے خبری کے عالم میں پہنچا رکھا ہے۔“

”میں یہی کہوں گا، تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہو!“ وہ سر اسید لہجے میں بولا۔ ”سائل آدمی رات کے بعد یہاں سے چلا گئی تھی۔“  
”چلی گئی تھی؟“ اس کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”کہاں چلی گئی؟“

”جہاں سے آئی تھی“ کلاڈیا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”واپس وہیں چلی گئی۔“

میں نے سوال ڈین ہاروے سے کیا تھا لیکن جواب کلاڈیا نے دیا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اور ہاتھ جکڑے ہوئے تھے تاہم آلہ گفتار آزاد تھا۔ میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ ڈین ہاروے کے بالکل دہشت اور دھشت سے بہت دور تھی۔

”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو سائل اسرائیل چلی گئی ہے؟“ میں نے جھجھکاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈین ہاروے نے بتایا۔ ”گزشتہ رات وہ رائل نیپال انٹرنیٹ کی ٹائٹ کوچ سے گئی ہے۔ اس کی عارضی منزل نئی دہلی تھی وہاں ایک گھنٹا گزارنے کے بعد وہ صبح پانچ بجے دوسری فلائٹ کے ذریعے نئے دہلی سے اسرائیل روانہ ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ تل ابیب میں ہے۔“

ڈین ہاروے کے انکشافات حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ اگر واقعی سب کچھ یوں ہی پیش آیا تھا تو اس سیٹ اپ سے ”ہندو بیود گھٹ جوڑ“ کی بو آتی تھی۔ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”سائل کی صحت اور حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ تنہا سفر کر سکے۔ کیا یہاں سے اس کے ساتھ بھی کوئی گیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”محترم ربی کا ایک خاص آدمی اپنی حفاظت اور نگرانی میں اسے گھنٹہ دو سے تل ابیب تک لے کر گیا ہے۔“

”سائل چلی گئی تو پھر تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”ہم تمہاری وجہ سے یہاں رکے ہوئے ہیں۔“  
”میری وجہ سے..... کیوں؟“

”سائل کا یہاں کام ختم ہو گیا تھا اس لیے فلہنگ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔“ وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ محترم ربی کا حکم ہے ہم تمہیں قابو کر کے اسرائیل پہنچائیں لیکن دقت سے پہلے ہی کھیل بگڑ گیا۔“

اس نے کھیل بگڑنے کے سلسلے میں ”دقت“ کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ مجھے محسوس ہوا انہوں نے مجھے گرفت میں لینے کے لیے کوئی خاص منصوبہ ترتیب دے رکھا تھا۔ میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا میں نے انصطرابی انداز میں استفسار کیا۔

”تاہم تم لوگوں نے مجھے گرفت میں لینے کے لیے کیا منصوبہ بنا رکھا تھا؟“

”چھوڑو..... اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔“  
”فائدہ ہے!“ میں نے دہاز سے مشابہ انداز میں کہا۔

”تمہیں بتانا ہو گا ورنہ.....؟“  
بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی دھار کو اس کی شررگ پر رکھ دیا۔ وہ کمزور سے لہجے میں منہایا۔

”کیا کر دے گا پوچھ کر؟“  
”اٹ اٹھن آف یور بزنس!“ میں نے بے رحمی سے کہا اور خنجر کے دسے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ ”میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا سیدھا سیدھا جواب دو ورنہ میں تمہیں سرسکا شیطان بنانے میں بہت لطف محسوس کروں گا۔“

موت کی دہشت نے اس کے سرخ و سفید چہرے کو سیاہی مائل کر دیا۔ زندگی بڑی پیاری شے ہے اور موت کو سامنے کھڑا کر دینا تو اور بھی حسین لگنے لگتی ہے۔ انسان اپنی زندگی بچانے کے لیے موت سے ہر قسم کی مفاہمت پر تیار ہو جاتا ہے۔ ڈین ہاروے بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا۔

”میں چلا تھا“ تم آج رات نو اور دس بجے کے درمیان اس بنگلے میں داخل ہو گے۔“  
دہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں گویا ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کمرے کے دروازہ پر گردش میں آ گئے ہوں۔

ہمارے غصہ منسوبے کی خبر وہاں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ میری طرح لی یان بھی جب نظر سے ڈین ہاروے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے مزید بتایا۔

”جوگندر پال نے آج رات یہاں ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اس میں کیرنگ پٹی کے ایک ملازم کی حیثیت سے بنگلے میں داخل ہو گئے جو آج کی پارٹی کے لیے یہاں سروس دے رہی ہے۔ تم ہمیں ایک یادگار سبق سکھانے کا ارادہ لے کر یہاں آگئے تھے لیکن تم تمہارے استقبال کے لیے تیار ہوئے۔ تمہیں فوراً گرفت میں لے کر کلاڈیا کے حوالے کر دیا جاتا“ وہ تھوڑی دیر کو توقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کلاڈیا چنانچہ ٹرم کی ماہر ہے۔ محترم ربی نے بڑے خاص انداز میں اس کی تربیت کی ہے۔ یہ چند منٹ میں تمہیں اپنا مطبخ دفر ماہر دار بنالیتی“ وہ سانس لینے کو رک کر کھانے پر آگیا۔

کلاڈیا نے میرے سینے پر سواری ڈال کر ایسی کوشش کی تو بھی! وہ حسرت ناک انداز میں بولا ”ایک مرتبہ تم ہماری جگہ میں آ جاتے تو پھر تمہیں محترم ربی کے قدموں تک پہنچانا ہمارے لیے مشکل نہ ہوتا مگر“

اس نے ”مگر“ پر جملہ ادھورا چھوڑا تو میرا ذہن تیز آندھیروں کی زد میں آ گیا۔ ہمارے منصوبے کو صرف تین افراد جانتے تھے یعنی..... میں لی یان اور جانوس۔ ہم تینوں میں سے کسی نے یہ معلومات دشمنوں تک پہنچائی تھیں۔ میں اور لی یان تو ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ آ جا کر جانوس جانوس پر ٹوٹی جی..... تو کیا جانوس دوستی کی آڑ میں ہم سے کوئی ہیکہ دشمنی کرنے جا رہا تھا؟

اس سوال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے دل نے کہا ”فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن جیسا محاورہ بنانے والا کوئی ایویں سا آدی نہیں ہو سکتا۔ جانوس سے پہلی ہی ملاقات نے مجھے اس کی طرف سے آف کر دیا تھا۔ اس کے تازہ ترین رویے نے اگرچہ پہلے تاثر کو کافی حد تک زائل کر دیا تھا لیکن اب ثابت ہو رہا تھا جانوس کسی آستین کے سانپ سے کم نہیں تھا! حیرت ہے ڈاکٹر مونگ جیسا زیرک آدمی بھی اس کی اصلیت کو نہ جان سکا؟

ایک حتی نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے ذہن کو جھکا اور ڈین ہاروے سے استفسار کیا۔ ”میرے پروگرام کے حوالے سے یہ خطرناک معلومات تم لوگوں تک کس نے پہنچائی ہیں؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا“ وہ خوف زدہ

انداز میں بولا ”یہ جوگندر پال کی محنت کا ثمر ہے۔“

میں نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”لی یان! تم ان دونوں کو اسی طرح کور کے رکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی کارکردگی دکھانے کے موڈ میں نظر آئے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی کھوپڑی میں ہوادان بند دیتا۔“

لی یان نے پورا اعتماد انداز میں سرکواپنی جیش دی۔

میں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں ”جا کا جھانکی“ کرنے لگا۔ ڈین ہاروے نے ساحل کے سلسلے میں جو بیان دیا تھا اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی لیکن میں اپنی نسلی کی خاطر اس بنگلے کے ایک ایک کمرے کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ اس تلاش کے نتیجے نے ڈین ہاروے کے بیان کی تصدیق کر دی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے ساحل کو جس بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا وہ بیڈروم ٹھنڈی نہیں بلکہ جل ایب میں تھا۔ میں واپسی کے لیے پلای تھا کہ فائر کی آڈرس کر چوکی اٹھا۔ گولی چلنے کی آواز اس طرف سے آئی تھی جہاں لی یان نے ڈین ہاروے اور کلاڈیا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ فائر کی آواز کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ..... ان دونوں میں سے کسی کے ذہن میں کارکردگی دکھانے کا کیزا کلبلیا تھا۔

میں مذکورہ کمرے میں پہنچا تو ڈین ہاروے کو فرش پر چپت پڑے دیکھا۔ اس کا زیریں بدن جان کی رخصتی پر جھٹکے لے رہا تھا۔ ڈین ہاروے کے لباس کو سینے پر سرخ دمیکھ کر میں جان گیا کہ لی یان نے اس کے دل کو چھید ڈالا تھا۔

”یہ..... یہ اس کی آنکھوں والی پٹی کھولنا چاہتا تھا“ لی یان نے کلاڈیا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے صورت حال کی وضاحت کی۔

”تاکہ یہ اپنی آنکھوں کی مدد سے تمہیں ٹرانس میں لے لے“ میں نے زہر خند لکھے میں کہا۔

ڈین ہاروے کے جسم نے ایک دو جھٹکے کھائے اور ٹھنڈا ہو گیا۔

لی یان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”وہاں! تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ اس بنگلے میں ساحل تمہیں نہیں نہیں ملی!“

”تم نہیں ریڈنگ میں غلطی نہیں کر رہی ہو۔“

”میں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے“ وہ اضطرابی انداز میں بولی۔

میں نے کہا ”بالکل! ہم نکل رہے ہیں“ پھر کلاڈیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا ”اس ناگن کو بھی ہم

اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ یہ سینے پر سوار ہو کر اپنی زہرناک آنکھوں سے ڈستی ہے۔“

”تم لوگ بوخطرناک ٹکیل ٹکیل رہے ہو“ کلاڈیا نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

”زی جلی کی گرل نہیں سمجھئے“ میں نے طنز پر لہجے میں کہا ”کلاڈیا! اس سنگین ڈرامے میں تمہارا کردار پورا ہو گیا“ اب کس بل بوتے پر دھمکاری ہو۔ تم اپنی صلاحیت سے دوسروں کو زیر دام لاتی رہی ہو میں تمہیں بتاؤں گا کہ دام کیا ہوتا ہے..... اور اسے زیر و زبر کیسے کیا جاتا ہے“ ایک سانس کا توقف دے کر میں نے سفاک لہجے میں اپنی بات کو آگے بڑھا دیا۔

”کلاڈیا! ہم خطروں کے کھلاڑی ہیں۔ افسوس کہ تمہارے ساتھ کسی پرسکون ماحول میں بیٹھ کر ”اکڑ بکڑ کھلے بو“ نہیں کھیل سکتے۔“

پتا نہیں میری بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں! وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولی ”تم جو کچھ کر رہے ہو اس کی تمہیں بڑی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔“

اس سے قبل کہ میں کلاڈیا سے قیمت کے بارے میں کوئی استفسار کرتا مجھے اپنی ران میں تیز تر قمر خرابت محسوس ہوئی۔ میں نے موبائل فون کو جینز کی اسی جیب میں رکھا تھا۔

یہنا اس بل پر کسی کی کال آ رہی تھی۔ سیل کا سائلٹ الارٹ

مجھے باخبر کر رہا تھا۔ فون کی جملہ گھنٹیاں میں نے سوچ آف کر رکھی تھیں۔

میں نے موبائل کو جیب سے نکالا اور ڈیسلے پر جانوس کا موبائل نمبر دیکھ کر چونک اٹھا۔ اسی نمبر سے دل داغ سے شدید نفرت کی ایک لہر اٹھی اور میں نے ”یس“ کا ہنر دہا کر سیل کو کان سے لگایا۔

”ہیلو!“ میں نے آواز کو جی الامکان معتدل رکھتے ہوئے سپاٹ لکھے میں کہا۔

”وہاں! تم کہاں غائب ہو پار!“ اس نے منافقانہ بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”ابھی ابھی میری کاشالوک سے بات ہوئی ہے۔ اس نے بتایا ہے تم ابھی تک واپس فلیٹ پر نہیں پہنچے۔ تم لوگوں کے لیے وہ بھی بڑا گرمند ہے۔“

”ہمارے لیے گرمند ہونے کی کسی کو کوئی ضرورت نہیں“ میں نے جذبات سے جاری لہجے میں کہا۔ ”ہم جہاں بھی ہیں خیر و غایت سے ہیں۔“

”نہیں تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں! تم اس وقت کہاں ہو؟“

”جاننا چاہتے ہو یا تصدیق کے لیے فون کیا ہے؟“

”تصدیق..... کیا مطلب؟“

”کاش! اس وقت میں تمہارا منافقانہ چہرہ ملاحظہ

## جاسوسی انجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

### علی یار خان کی سرگزشت

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے



کتابی صورت  
(گیارہ حصوں میں)  
تیسرا حصہ

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر عیاقی قیمت ف 600 روپے ڈاک خرچ معاف



کرتا تھا۔ میں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔  
”تم نے اپنے جن دوسادہ لباس بندوں کو جو گندہ پال کے  
بٹیکے کی نگراں پر مامور کر رکھا ہے انہوں نے تمہیں کچھ نہیں  
تایا؟“

”وہ جان اتم بد اعتدائی کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“  
اس کے لیے مجھ میں اگرچہ غلطی شامل تھی لیکن مجھے یہ محسوس  
کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ غلطی سراسر معنوی  
تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اعتقاد اور بد اعتدائی کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ چیزیں  
بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ یہ بتاؤ اس وقت تم کہاں ہو؟“

وہ صوبت کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں  
اس وقت بمبئی میں نیپل کے قریب“ اپنے ایک دوست کے  
پاس بیٹھا ہوں۔“

میں نے آنکھیں بند کیں اور تصور کے گھوڑے کو  
اگر جیسی دوڑ میں ڈال دیا۔ جانوس سے بات کرتے ہوئے  
اس کا سراپا میرے تصور میں زندہ تھا۔ رخش خیال تھروڈ آئی  
کے دروازے سے بھیجے ہی نکلا۔ اس کا اگلا قدم منزل پر تھا۔  
میری باطنی آنکھ نے مجھے جانوس کے ماحول میں پہنچا دیا اور  
اسی وقت میں نے اس کی دروغ گوئی پکڑ لی۔

جانوس سرخ رنگ کی ایک اسٹیشن دیکھ کر سوار تھا اور  
وہ دیکھ کر اس وقت میں روڈ کو چھوڑ کر بڑے رف انداز میں  
شیڈیالی اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ شیڈیالی اسٹریٹ بمبئی  
سین نیپل سے میلوں کے دروازہ پت کے علاقے میں واقع تھی  
اور دلچسپ بات یہ کہ اسی اسٹریٹ پر جو گندہ پال کا بنگلا نمبر  
”جے۔ ٹو ہنڈریڈ“ واقع تھا جس کے اندر ہم موجود تھے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور جانوس سے کہا ”تم  
اپنے اسی دوست کے پاس بیٹھے رہو میں ناراد پوی کے مندر  
کے پاس سے گزر رہا ہوں۔ دریا نے دشمنی کو کراس کر کے  
میں اچھی تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ دس یو بیڈنگ مسٹر  
منوس“

بات ختم کرتے ہی میں نے سیل کو آف کر دیا۔ لی یان  
نے یہ تمام تر گفتگو سن لی اور حالات کی سنگینی کو پوری طرح  
محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بھی اپنی جیب میں سے موبائل  
فون برآمد کیا اور میری تقلید میں اسے آف کر دیا۔ اس کے

بعد ہم کلاڈیا کی جانب بڑھ گئے۔

کلاڈیا کی آنکھوں پر میں نے ایسی مضبوطی سے بٹی  
باندھی تھی کہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی  
پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ میری کوشش تھی کہ ہم جانوس کے

دہاں پہنچنے سے پہلے بٹیکے سے نکل جائیں۔ وہ بنگلا شیڈیالی  
اسٹریٹ کے آخری کنارے پر تھا۔ ہمارے پاس فرار کے  
لیے صرف دو تین منٹ ہی تھے۔ جانوس میرے سامنے بے  
نقاب ہو چکا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش  
باقی نہیں رہی تھی کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کی طرح  
جانوس اور جو گندہ پال ایک دوسرے کے حریف ہونے کے  
باوجود آپس میں مل گئے تھے۔ جانوس نے ہمیں جس جہنم میں  
پھنسنے کا منصوبہ بنایا تھا اس سے ”جانوس جو گندہ پال جوڈ“ کی  
قلبی کھل گئی تھی۔

جانوس ہمارے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا  
اس نے جو گندہ پال ان حالات سے باخبر نہ کیا ہو۔ ہمارے  
سامنے بے یک وقت کئی محاذ کھلنے والے تھے۔ میری چھٹی حس  
نے فضا میں جھلکی ہوئی بارود کی ہلک بھلکی محسوس کر لیا۔ میرا  
وہ جان چچ چچ کر مجھے مطلع کر رہا تھا۔ ایک بڑی خوں  
ریزی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔

ہم کلاڈیا کو اپنے ساتھ ایک کمرے سے دھکیل کر  
دوسرے کمرے میں پہنچے تو فون کی مخصوص گھنٹی نے میری  
ساعت پر دستک دی۔ پھر اس کمرے میں اسٹینڈ پر رکھا ہوا وہ  
ٹیلی فون سیٹ بھی نظر آ گیا جس میں سے گھنٹی کی آواز ابھری  
تھی۔ مخصوص توقف کے بعد دوبارہ گھنٹی کونٹ آئی۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں  
رک کر فون اسٹینڈ کرتا۔ حالات کی سنگینی کی اور ہیمل کا تقاضا  
کر رہی تھی لیکن پتا نہیں میرے جی میں کیا آئی کہ میں کمرے  
کے دروازے کی سمت قدم اٹھانے کے بجائے ٹیلی فون کی  
جانب بڑھ گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا ان لمحات میں میرا وجود آہن سے  
کسی ذخیرے میں بدل گیا ہو اور ٹیلی فون کی طاقت ور  
مقتضی کے مانند مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ اور پھر میں  
بے اختیار ادھر کھینچا چلا گیا۔ گھنٹی کی آواز بڑے دل نشیں انداز  
میں مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے بیکار انداز میں ٹیلی فون کا ریسپونڈر اٹھا کر کان  
سے لگا لیا اور خاموش رہا۔ اسی لمحے اڑبیس میں ایک رعب  
دار آواز ابھری۔ مجھے اپنی ساعت پر یقین نہ آیا۔ بولنے  
والا تھکسا نہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”ڈین! اپنی آواز سناؤ تاکہ میں کال تھرو کروں۔ محترم  
رہی! تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں!“  
حالات کی اس ستم ظریفی پر میں چکر اکر رہ گیا۔

وقت بڑا بے رحم اور ہفاک ہے!

بعض اوقات یہ انسان کو اس طور باندھ کر رکھ دیتا ہے کہ  
گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔  
میں بھی اس وقت کچھ اسی نوعیت کے حالات سے دوچار تھا۔  
موت ہم سے دو تین منٹ کی دوری پر تھی۔ مجھے یقین تھا  
جانوس نے جو گندہ پال کو بھی یہاں ہونے والی گڑبڑ کے  
بارے میں بتا دیا ہوگا۔۔۔۔۔ اور جانوس کے پیچھے جو گندہ پال  
اپنے لاؤ لٹکر کے ساتھ دہاں پہنچنے والا تھا۔ ان سنگین ترین  
لمحات میں مجھے زوری اور ہنگامی فیصلہ کرنا تھا۔

”ڈین! تم خاموش کیوں ہو؟“ دوسری طرف تھکسا نہ  
انداز میں بولنے والے نے عجیب سا ہو کر استفسار کیا تو میں  
چونک اٹھا۔ وہ پوچھ رہا تھا ”تم نے ریسپونڈر اٹھایا ہے تو بولو  
بھی۔ محترم رہی۔۔۔۔۔“

”ڈین اور کلاڈیا کی کہانی ختم ہو گئی۔“ میں نے اس کی  
بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ”اس لیے ان میں سے  
اب کوئی بھی نہیں بولے گا۔“

”سنگ۔۔۔۔۔ کس کا فون ہے؟“ کلاڈیا بے اختیار بول  
اٹھی۔

اس کا جملہ مکمل ہونے پر کمرے میں ایک زنانے راتینڈر  
کی آواز ابھری۔ لی یان نے کلاڈیا کے منہ پر ایک کرارہ  
طمانچہ رسید کیا تھا۔ کلاڈیا کی آنکھوں پر میں نے ایک مضبوط  
بٹی کس کر باندھ دی تھی اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پر  
جکڑے ہوئے تھے۔ زبان آزاد تھی چنانچہ وہ اس کے  
استعمال سے باز نہ آئی۔ لی یان نے اسی آواز پر اسے  
سزا دی تھی جواب میں کلاڈیا اسے سلیگٹو میں تولنے لگی۔

کلاڈیا کی گال پر گنتاڑ آمیز چچ پکاروں کے ذریعے ٹھنڈو  
سے اسراٹل پہنچ گئی۔ دوسری طرف بولنے والے رہی کے  
غلام نے بے چین ہو کر اضطرابی لہجے میں استفسار کیا ”کلاڈیا!  
دہاں کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ڈین کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں نے کہا ہے نا“ کلاڈیا اور ڈین کو بھول جاؤ!“ میں  
نے اپنے لہجے کو سختی الامکان سنگین بناتے ہوئے کہا ”رہی سے  
کہو وہ اپنے موبائل فون کو آن رکھے۔ میں کسی بھی لمحے اس  
کی خبر لینے آ سکتا ہوں۔“

اس نے نہایت ہی برہم لہجے میں مجھ سے استفسار کیا  
”تم کون ہو؟“

”میں تمہارے رہی کا معالج ہوں!“ میں نے ٹھہرے  
ہوئے لہجے میں کہا ”مجھ گئے نا؟“

”نہیں سمجھا۔“ وہ دانستہ مجھے چکر دینے کے لیے بولا۔

”تم اپنے تعارف میں کوئی گڑبڑ کر رہے ہو۔“  
میں نے کہا ”میں تعارف میں روکی سوچی نہیں بلکہ عملاً  
گڑبڑ کرتا ہوں۔ کیا تم، جدان کے نام سے واقف نہیں ہو؟“  
”وہ جان۔۔۔۔۔!“ اس کی آواز ڈانواں ڈول ہو گئی۔  
”دی موسٹ وانڈر پرنس فار پوربوری!“ میں نے یہ کہتے  
ہوئے ریسپونڈر پکڑ لیا۔

لی یان کلاڈیا کو سنبھالے تیار کھڑی تھی۔ اس کے  
ٹھانچے نے اچھا خاصا اثر دکھایا تھا۔ کلاڈیا اس وقت بڑی  
شرارت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے حالات کی سنگینی  
کو محسوس کر لیا تھا یا اس خاموشی کے پیچھے وہ کسی گہری چال کی  
منصوبہ بندی کر رہی تھی!

ہم آگے پیچھے اس کمرے سے نکل آئے۔ ٹھوڑی ہی دیر  
بعد ہم دہاں پہنچ گئے چدر سے میں اس بٹیکے کی اندرونی  
عمارت میں داخل ہوا تھا۔ سامنے نظر آنے والے اس آخری  
دروازے کو کھول کر اگر عمارت سے باہر نکل جاتے تو ہم بٹیکے  
کے عقبی حصے میں پہنچ سکتے تھے۔ ابھی تک بٹیکے کے بیرونی حصے  
میں کسی قسم کی افراتفری کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے اور اگر  
کوئی گڑبڑ پھیل چکی تھی تو اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچ پائی  
تھی۔ کیونکہ اس وقت ہم اس بٹیکے کے ساڈا ڈیڑ پروف زون  
میں تھے۔ اس کی وجہ سے باہر ہونے والی کسی سرگرمی کی آواز  
ہماری ساعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

لی یان بھی غالباً اپنی دروازے سے گزر کر ساڈا ڈیڑ پروف  
زون میں پہنچی تھی لہذا اس نے سوائیل نظر سے میری طرف  
دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موجود سوال کو بڑھ لیا اور  
پُر اعتدال انداز میں کہا ”تم چند سیکنڈ کے لیے یہاں رکو۔ میں  
باہر کی خبر خیر لے کر آتا ہوں۔“

لی یان نے خاموش رہتے ہوئے آنکھوں سے کلاڈیا کی  
طرف اشارہ کیا۔

میں نے سفاکی سے کہا ”اگر یہ اسارٹ بننے کی کوشش  
کرے تو اسے بھی ڈین باروے کے پاس پہنچا دیتا۔ ویسے بھی  
میں نے ان دونوں کی کہانی ختم ہونے کا اعلان کر دیا ہے!“  
لی یان نے اثبات میں گردن ہلائی تو میں دروازہ کھول  
کر عمارت کے اندرونی حصے سے باہر نکل آیا۔ میں تیز قدموں  
سے چلتے ہوئے عقبی لان تک پہنچا ہی تھا کہ بٹیکے کے گیٹ کے  
سامنے ایک ہیوی گاڑی آ کر رکی پھر اس کے دروازوں کے  
کھلنے اور بند ہونے کی مخصوص آواز ابھری اور مجھے یہ سمجھنے میں  
چند اسی کوئی دقت پیش نہ آئی کہ جانوس سرخ اسٹیشن دیکھ کر  
دہاں پہنچ گیا تھا۔

میری احتیاط بردت کام آگئی۔ اگر میں لی یان اور کلاڈیا کے ساتھ بے دھڑک بنگلے سے باہر نکل آتا تو ایک ناگہانی پلے پڑ جاتی۔ میں ویسے بھی جانوس سے کئی کاٹ کر وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جیسے کردار کا مظاہرہ کیا تھا اس کے لیے وہ بدترین سزا کا حق نہیں چکا تھا۔ اور یہ سزا اسے میرے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

جانوس اگر اس بنگلے تک پہنچ گیا تھا تو اسے اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بنگلے میں داخل ہونے کے بعد میں نے دے اور اور اجیش کو پچھنی کا دودھ یا دولا کر انا قنیل کر دیا تھا۔ ان کی گھوٹی میرے پتے پر محفوظ پڑی تھیں اور اب ان کے استعمال کا وقت آ گیا تھا۔ میں اس مقام کی جانب بڑھ گیا جہاں میں نے دو گنو چھائی تھیں۔ اس سے قبل کہ جانوس بنگلے کے اندر پہنچتا میں نے گنو کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ ہلاکت خیز ہتھیار موت کے خریدار تھے! دے اور اور اجیش سے منٹنے کے بعد میں نے بنگلے کے بیرونی گیٹ کا اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔ چنٹی دیر میں جانوس گیٹ کھلو کر اندر آتا میں گنو بدست واپس لی یان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”باہر کیا صورت حال ہے؟“

”ابھی نہیں ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”پھر؟“ وہ بیک لفظی جملہ بول کر خاموش ہو گئی تو میں نے کہا۔

”باہر کی صورت حال کوئی الجال ہم اندر رہتے ہوئے کنٹرول کریں گے۔“

ساحل کو کمر اور کمر تلاش کرتے ہوئے میں اس بنگلے کے اندرونی حصے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ میرے اشارے پر لی یان کلاڈیا کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ میں چند سیکنڈ بعد انہیں ایک ایسے کمرے میں لے آیا جو کئی بڑے ہال سے مشابہ تھا۔ اس ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چاروں جانب قیمتی صوفے لگے ہوئے تھے۔ جو گندر پال نے آج رات اپنے اسرائیلی مہمانوں کے امرا میں جو ڈانس پارٹی رکھی تھی وہ اسی ہال میں ہونے والی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس پارٹی کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے ایک بدنام زمانہ نائٹ کلب سے دو ”ماہرین“ ڈانسرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

لی یان نہیں جانتی تھی میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ فیصلہ میرے ذہن نے ہنگامی طور پر کیا تھا اور اب اس پر عمل کرنا تھا۔ میں نے ایک گن لی یان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم لیڈی پھل کو اپنے لباس میں چھپالو۔ وہ پھر کسی موقع پر کام آجائے گا۔ فی الحال اس گن کا استعمال ضروری ہے۔“ لی یان نے برست فائر کرنے والی خطرناک گن کو تھام لیا اور غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی ”کرنا کیا ہے؟“

”اس صوفے کی آڑ لے کر اطمینان سے یہاں بیٹھ جاؤ۔“ میں نے ایک گنگ سائز صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس ہال کے داخلی دروازے کے قریب ہی تھا ”ہمارا جو بھی دشمن اس دروازے میں نظر آئے اسے بھون کر رکھ دیتا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ کیا یہ مشکل کام ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ پوری مستعدی سے بولی۔

میں نے جس صوفے کے پیچھے لی یان کو مورو چاسٹھالے کی ہدایت دی وہ خاصی محفوظ پوزیشن میں تھا۔ باہر سے آنے والے اگر بے دریغ فائرنگ بھی شروع کر دیتے تو لی یان کا ہال بانکا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے کلاڈیا کو ایک طرف چلنے کے لیے فوب کا دیا۔ وہ پھرے ہوئے لہجے میں غرائی ”وہ جان! تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

میں نے ایک ہاتھ سے اس کا کھلا ہوا منہ ڈھانپ دیا۔ میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ سسک کر رہ گئی۔ میں نے پھنکارے مشابہ آواز میں کہا۔

”کلاڈیا! میں نہیں جانتا کلاڈیا کارڈنیل سے تمہاری کیا رشتے داری ہے بہر حال کلاڈیا کارڈنیل تو بہت اچھی تھی لیکن تم نے جس انداز کا مظاہرہ کیا ہے اس نے مجھے تمہاری طرف سے چونکا کر دیا ہے۔ بس کچھ نوٹیں اسی لیے کچھ اچھا نہیں کر رہا ہوں!“

میں نے ذوقی انداز میں اپنی بات مکمل کی تو لی یان نے پوچھا ”تم کہاں جا رہے ہو وہ جان؟“

”میں بھی اسی ہال میں ہوں اور کہاں جاؤں گا؟“ میں نے کلاڈیا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے جواب دیا ”میں نے تمہیں جوڑے داری سوچی ہے۔ اس کے لیے شکاروں کا بندوبست بھی کرنا ہوگا ورنہ کیا تم ادھر صوفے کے پیچھے گن پر ہاتھ رکھنے کی ہمت کر سکتی ہو؟“

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھ دبا کر لی یان کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اس کے بعد اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ میں کلاڈیا کو دھکیلتے ہوئے ہال کے دوسرے سرے پہنچ گیا۔ اس طرف بھی ایک دروازہ موجود تھا۔ لی یان کو میں نے جس دروازے کے قریب متعین کیا وہ بنگلے کی اندرونی جانب

کھلا تھا جبکہ یہ دروازہ بیرونی سمت میں۔ میں بھی کلاڈیا کے ساتھ ایک صوفے کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اس کے منہ کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

”کلاڈیا! میں نے لی یان کے سامنے خاصی رعایت سے کام لیا ہے لیکن اب اگر تم نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا کیا تو میں تمہارے منہ کو بند کرنے کے لیے کسی ہاتھ کا سہارا نہیں لوں گا!“

میرے لہجے میں اس قدر رعین اور سفاکی بھری ہوئی تھی کہ وہ سہم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دبیز پتلی کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ میں ان حسین آنکھوں میں ابھرنے والی سراسیمگی کے اثرات کو نوٹ نہ کر سکا۔ تاہم اس کے مرمریں بدن کی اضطرابی جنبشوں نے اس کے اندر پھیلے ہوئے ہر اس کو میرے دو جنک ضرور متل کر دیا۔ ہم اس وقت ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔ اس باہم پوچگی کے عالم میں جب وہ سانس لیتی تو اس کے سینے کا زبردست دھڑکن میرے جسم میں بجلی سی چکا دیتا۔

میں نے ٹانگ دراز کر کے اپنی جھوکی جب میں سے ٹرائی بیڈ جی ایس ایم موپائل فون نکالا اور اسے آن کرنے کے بعد کلاڈیا سے کہا ”میں اس شخص کو کال کرنے جا رہا ہوں جس کے توسط سے تم لوگ مجھے قایم کرنے والے تھے۔ اتفاق سے وہ تم۔“ لوگوں کا دوست تھا اور میں اسے اپنا دوست سمجھتا رہا۔ خیر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!“

میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر خطرناک گن کی نال کو اس کی نسوانی پالیوں سے نکاتے ہوئے نہایت ہی سفاکی سے کہا ”تم بھی ممکن ملائی عورت کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے مجھے بہت افسوس ہوگا لہذا زندہ رہنے کی تمنا تو چھپ چاپ شرافت سے پیش کر رہنا۔ میری بات سمجھ رہی ہونا؟“ میں نے اس کی پالیوں کے ساتھ گھٹی ہوئی گن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

وہ صورت حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے“ میں تمہارے کام میں کوئی مداخلت نہیں کروں گی۔“

”کلاڈیا کارڈنیل بھی کسی کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرتی تھی!“ میں نے ذوقی انداز میں کہا ”اسی لیے وہ بہت اچھی تھی۔“

میں نے بات ختم کرتے ہی آنکھیں بند کیں اور تھوڑی آنکھوں کے جانوس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ مجھے اس بات کا ایڈوانسج حاصل تھا کہ کلاڈیا کی آنکھوں پر دبیز پٹی

بندھی ہوئی تھی در نہ مجھے آنکھیں بند کرتے دیکھ کر وہ کوئی بھی ایلی فینسی دکھانے کی کوشش ضرور کرتی۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے جب جانوس کو سرخ دین میں سوار شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا تو اس کے ساتھ دو افراد بھی انٹیشن دین کے اندر موجود تھے۔ دین کے جس طوفانی انداز میں میں روڈ کو چھوڑا اس سے اندازہ ہوتا تھا وہ انتہائی خطرناک موڈ میں تھے اور واقعی ایسا ہی تھا۔ اس وقت وہ تینوں مجھے بنگلے کے اندر دکھائی دیے۔ جانوس خالی ہاتھ تھا جب کہ دوسرے دو افراد خونخوار گنو سے لیس تھے۔ وہ کسی طرح گیٹ کو کھولنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں بنگلے کے اندر سامنے والے حصے میں دیکھا اور آنکھیں کھول دیں۔

اگلے ہی لمحے میں نے جانوس کا نمبر ڈائل کیا اور سیل کو کان سے لگالیا۔ دوسری تھکی پراس نے کال ریسیور کر لی۔ میں نے اس کے ”ہیلو“ کے جواب میں کہا۔

”مہیم سین پیمپل اور تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟“

”وہ جان! تم کسی غلطی میں۔“

”گومت!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”قت۔۔۔۔۔۔ تم میری بات تو سنو۔“ وہ گڑ بڑا گیا۔

”میں تمہاری بات سننے کے لیے ہی تو یہاں آیا ہوں۔“ میں نے زہر لود لہجے میں کہا ”سوچا تم مہیم سین پیمپل میں بیٹھے سوکتے رہو گے۔ میں ہی تمہارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ وہ بیچانی انداز میں بولا۔

”اسی بنگلے کے اندر جس میں تم ابھی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ داخل ہوئے ہو!“ میں نے طرہ لہجے میں کہا ”کیا دے اور اور اجیش کے بے سدھ وجود یہ سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اس بنگلے میں وہ جان دم رکھ چکا ہے؟“

اس نے پوکھا ہٹ اور گھر میں لائن کاٹ دی۔

میں نے لی یان کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ”جانوس اپنے دو ساتھیوں سمیت بنگلے میں داخل ہو چکا ہے۔ میں انہیں گھر گھار کر ادھر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم تیار رہنا۔۔۔۔۔۔ اور اپنے سیل کو بھی آن کر لو صرف میری کال سننے کے لیے۔ اب میں یوں بہ آواز بلند نہیں جھگڑوں گا۔ اوکے؟“

”اوکے وہ جان! آئی ایم ایور ریڈی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے جانوس سے بڑے دھیمے لہجے میں بات کی تھی۔ میری آواز لی یان تک تو نہیں پہنچ سکی۔ تاہم کلاڈیا نے سن د

من وہ مختصری گفتگو سن لی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

”وہ جان! تم کیا چکر چلانے والے ہو؟“ اس کا انداز حیرت اور برہمی سے لبریز تھا۔

میں نے کہا ”تم مجھے چکر چلانے پر مجبور کر رہی ہو۔ میرے ایک ہاتھ میں گنن اور دوسرے میں سیل ہے۔ اگر تمہاری زبان کو قہر آندہ آیا تو مجھے کوئی اور راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ یہ آخری وارننگ ہے بعد میں مجھ سے شکوہ نہ کرنا۔“

وہ کسمپاسی اور ایک جھرجھری سی لے کر رہی۔ اس کے بدن کی جنبش تو یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ میری دھمکی سے خوف زدہ ہو گئی ہے۔ میں اسے باور کرانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ اگر اب اس نے زبان کھولی تو میں ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کی زبان پر قفل ڈال دوں گا۔ اگرچہ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ بہر حال وہ جو بھی بھی ہو مجھے تو اس بات سے غرض تھی کہ وہ شانت پڑی رہے۔ گنن کی نال کو بدستور اس کی نازک پللیوں سے نکلے میں نے آنکھیں بند کیں اور جانوس کے ماحول میں بچھ گیا۔

وہ اس وقت تک بیٹھنے کے اندرونی حصے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ وہ اس کے ہمراہ ہی اندرونی عمارت میں بیٹھے تھے۔ جانوس نے انہیں ہماری ہی تلاش میں ادھر ادھر دوڑایا ہو گا۔ ایک بات کی میں نے تصدیق کر لی کہ ہمیں صرف انہی تین افراد سے نمٹنا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں براہ راست بھی ان سے ٹکرا سکتا تھا لیکن اس طرح آنکھ پھولی میں گھیر کر انہیں شکار کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا۔

میں نے جانوس کے سیل نمبر کو ری ڈائل کیا۔ موبائل کے دیگر فرائڈ تو اپنی جگہ ہوں گے لیکن ایک بار افائدہ یہ بھی ہے کہ آپ براہ راست دالے کمرے میں پہنچ کر بات کرتے رہیں مگر دوسرے شخص کو یہ پتا نہیں چل سکتا کہ آپ اس سے کتنے فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ بے وقوف بننے اور بنانے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے البتہ آج کل ڈیو فون کی ٹیکنالوجی بھی متعارف کرانی چاچکی ہے۔ ڈبل کیمرا موبائل فون نے اس ”آنکھ پھولی“ میں بہت بڑا رخسہ ڈال دیا ہے۔

جانوس نے کال ریسیو کی اور جھلائے ہوئے لہجے میں بولا ”تم کہاں ہو شیطان؟“

”میری بات!“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں اسے سرزنش کی ”اپنے دوستوں کو اس قسم کے القابات سے یاد نہیں کیا کرتے۔ لگتا ہے تمہاری دوستی اور خیر خواہی کی بلی اچھل کر

ایک ہی جھکے میں تھیلے سے باہر آگئی ہے۔“ وہ چٹپٹا کیا ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”یہ تمہارے اختیار میں نہیں جانوس!“ میں نے زہریلے انداز میں کہا ”اول تو میری جان اس ذات کے قبضہ قدرت میں ہے جو زندگی دیتی بھی ہے۔ دوم تم جن لوگوں کے سامنے دم ہلا کر اپنے لیے ہڈی کی توقع لگائے بیٹھے ہو وہ مجھے زندہ بچنے کے خواہاں ہیں۔ مجھے معمولی سا ضرر پہنچا کر بھی تم ان کے غیظ کو آواز دو گے۔ اس کو تا ہی پر تمہارے آقا تمہیں جیل کوڈن سے بچا سکتے ہیں۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جانوس! یہ لوگ تمہیں گندی نالی کے کسی مختیر اور غلط کپڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی خوش نودی کی خاطر تم نے مجھے اور ڈاکٹر موگ کو دھوکا دیا ہے۔ میں تمہارے آقاؤں کے دانت تو کھٹے کر چکا ہوں اب تمہاری ٹکا بونی کرنے والا ہوں۔ بولو میں تمہیں کہاں سے کاٹنا شروع کروں؟“

سیل پر بات کرنے کے دوران میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور تیسری آنکھ کے پٹیل جانوس کے ماحول میں بھی موجود تھا۔ وہ میری نمک پاشی سے بری طرح تھلکا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہو رہے تھے کہ اگر میں اس کے سامنے موجود ہوتا تو وہ مجھے کچا جاتا۔ تیسری آنکھ کا لعلق پٹیل گینڈ کی باطنی چٹکاری سے ہوتا ہے جو بے آواز دوڑیو تک محدود ہے۔ آپ تھوڑا آئی کے توسط سے کسی بھی منظر تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس ماحول میں پیدا ہونے والی آوازوں کو نہیں سن سکتے۔ یہ کی میرا سیل بڑے بھر پور انداز میں پوری کر رہا تھا۔ میری طہریہ گفتگو نے جانوس کو چراغ پا کر دیا بڑے بے ہودہ انداز میں وہ مجھ سے منتظر ہوا۔

”تم کس چو ہے دان میں چھپے بیٹھے ہو۔ سامنے کیوں نہیں آتے؟“

میں نے متحرانہ انداز میں کہا ”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں جانوس! یہ بھلا دانی کسی چو ہے دان سے کم نہیں۔ میں نے اسی چو ہے دان کی مدد سے پہلے دے گا راجیش کو شکار کیا ہے اس کے بعد تم لوگوں کے اسرا کی معزز آقاؤں کی ”عزت افزائی“ کی ہے۔ اور اب تم تینوں کی باری ہے۔“ میں سانس لینے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں کہیں چھپ کر نہیں بیٹھا ہوں جانوس! تم نے مجھ

بتایا تھا! اس بیٹکے کے بڑے ہال میں آج رات ایک بڑی مٹھی ڈلی ڈال پارٹی ہونے والی ہے جس میں کسی نائٹ کلب سے آنے والی دو ڈانسرز اپنے فن اور ننگے پن کا مظاہرہ کریں گی۔ اتفاق سے وہ پارٹی وقت سے پہلے ہی شروع ہو گئی ہے۔ میں ادھر ہال میں بیٹھا ہوں۔ مجھ سے ملاقات کا شوق ہو تو چلے آؤ۔ تم مجھ سے دو تین کمرہ کی دوری پر ہی تو ہو!“

میری بات کے اختتام پر وہ بری طرح چونکا اور بے اختیار پوچھ بیٹھا ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم تین افراد ہیں؟“ میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس کے دونوں ساتھی لوٹ آئے۔ ان کے چہروں سے ناکامیابی اور مایوسی چھلکتی تھی۔ میں نے جانوس سے کہا۔

”کیا میں نے غلط کیا تھا۔ دیکھ لو تمہارے دونوں ساتھی مختلف کمرہ میں پکڑے گئے بعد خالی ہاتھ واپس آ گئے ہیں۔ اب یہ تمہیں اپنی ناکامیابی کا قصہ سنائیں گے۔“

جانوس میری بات سن کر ایسے اچھلا جیسے میں نے داش روم میں جھانک کر اسے نہاتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ میں نے اس کی بولکھاٹ میں دھماکے دار اضافہ کرتے ہوئے کہا ”بیڈ لک مسٹر جنوس!“

اس کے ساتھ ہی میں نے سیلر لارڈ موقوف کر دیا۔ گلاڈیا چپ نہ رہ سکی۔ میں نے ابھی جانوس سے جو گیم کھیلا تھا وہ اسے درطجرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا اس کی جگہ اگر کوئی اور بھی ہوتا تو اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی۔ گلاڈیا کی جھرجھری ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی۔

”وہ جان! تم بڑے خطر.....!“

اس کا جملہ سچ راہ میں دوڑ گیا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والے ”خطر“ نے مجھے ایک لحظے بے خطر کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے الفاظ ”ناک“ تک پہنچتے ہیں نے زیر ناک رسائی حاصل کر لی۔ لی یان کی طرح میں اس دگش عورت کے گلاب گال پر چاٹنا مارا اسے خاموش نہیں کر سکتا تھا۔ گلاڈیا حسن و رعایت کا ایک ایسا انمول خزانہ بھی جو دیکھنے والی آنکھ کو لچکا اور چوری پر اکساتا تھا۔ چند لحظات کے لیے میں بھی چور بن گیا اور سیپ سے موتی چرا نے لگا۔ وہ ذرا سا کسمپاسی پھر شانت ہو گئی۔

کچھ دیر پہلے گلاڈیا نے میرے سینے پر سوار ہو کر مجھے زیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فشب کی سارہ تھی اور مجھے اپنا معمول بنانے کی خواہش مند تھی۔ میں اسے دھوکا دینے کے

لیے بالکل انجان بن گیا تھا! اس کے شاداب بدن کو اپنے سینے پر بہارے سبکی ظاہر کرتا رہا کہ میں اس کے ٹرائس میں آ گیا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے جھیشور دیتی رہی لیکن اب حالات بدل گئے تھے مجھے زیر کرنے والی خود زیر ہو رہی تھی۔ گلاڈیا کی ساحر آنکھوں پر دبیز پٹی بندھی تھی۔ میں آنکھوں کے راستے جھیشور نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ دوسری راہ اپنائی۔

☆ ☆ ☆ بند آنکھوں کے پیچھے کھلی ہوئی آنکھ کے توسط سے میں نے دیکھا۔ جانوس جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ ان کی آواز میں جس تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ تاہم میں نے یہ اندازہ لگالیا کہ جانوس انہیں میری تلاش میں ہال کی جانب بھیجنے کی بات کر رہا ہے۔ وہ دونوں جانوس کے احکام لے کر کمرے سے نکلے تو میں ان کے ماحول کا حصہ بن گیا۔

وہ ایک سے دوسرے کمرے میں سے گزرتے ہوئے ہماری طرف بڑھنے لگے تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے لی یان کے سیل پر اسے دو دشمنوں کی آمد کی اطلاع دے دی اور گلاڈیا کو کنٹرول کرنے لگا۔

وہ دونوں کن برادر بیٹکے کی عمارت کے اندرونی حصے سے آرہے تھے اس لیے ہال میں داخل ہونے کے لیے انہیں وہی دروازہ استعمال کرنا تھا جہاں لی یان مورچا سنبھالے تیار بیٹھی تھی۔ میں تھوڑا آئی کو دوبارہ زحمت دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہال کا دروازہ ایک جھکے سے کھل گیا۔

میں جس مقام پر پوزیشن سنبھالے بیٹھا تھا وہاں سے دروازے میں نمودار ہونے والے چہروں کو کہیں دیکھ سکتا تھا لیکن لی یان یہ کام بخوبی کر سکتی تھی..... اور اس نے کیا بھی! اگلے ہی لمحے ہال ایک خوفناک برہست کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں کی فضا میں کرب ناک انسانی چیخوں کی فریاد بھی نفوذ کر گئی۔ موت کا قہقہہ اتنا طاقتور تھا کہ دو انسانوں کی زندگی کی آخری فریاد تھا قہقہا خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

میں اگر چاہتا تو جانوس اور اس کے ساتھیوں کو خود بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن لی یان کے ہاتھوں یہ کام کروانے کا میرا ایک خاص مقصد تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کا نفسیاتی ٹریٹ منٹ بھی تھا۔ شون کی الناک موت نے اسے کم مہم کر دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دشمنوں کو شکار کرنے سے اس کے جذبہ انتقام کی تسکین ہوتی اور وہ بہت جلد اس ذہنی

مدے سے باہر آ جاتی۔ میں اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہا۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور ان دو افراد کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سینے سے ایک ہوجھل سانس خارج ہوئی۔ لی یان کے برست نے انہیں بھون کر رکھ دیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور جانوس کے سہل کے نمبر پر ڈائل مارا پھر دوبارہ آنکھیں بند کر کے ٹھہر ڈالی کے توسط سے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

اس وقت میں باطنی اور ظاہر دونوں اقسام کی سانس کو برائے کار لا رہا تھا۔ میری تیسری آنکھ نے پلک جھپکنے میں مجھے جانوس کے ماحول میں پہنچا دیا اور جب اس نے میری کال ریسپو کی تو اس ماحول کا آڈیو سسٹم بھی میرے لیے آئے ہو گیا۔ میرے لیے یہ ایک خوشگوار تجربہ تھا۔

آن جہاں محترم سا بگ فون نے سختی سے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں کبھی پیچو ٹری گلیڈ کو متحرک کرنے کی کوشش نہ کروں اور میں اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ پینل گلیڈ کی تحریک نے مجھے اس قابل بنادیا تھا کہ میں کسی بھی شاسا کردار کے ماحول تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ یہ محض بصری رسائی ہوتی۔ میں اس ماحول میں پیدا ہونے والی آوازوں کو سن نہیں سکتا تھا۔ پینل گلیڈ تصور کے ڈیو سسٹم کو کنٹرول کرتا ہے جبکہ پیچو ٹری گلیڈ آڈیو سسٹم کو۔ بہر حال کمپیوٹر سائنس کی یہ تازہ ترین ایجادات سافٹ ویئر جی اینڈ جی ایس ایم سیل بڑی حد تک پیچو ٹری گلیڈ کا کام کر رہا تھا۔

میں جانوس کے ”پاس“ پہنچا تو اسے شدید افراتفری کے عالم میں پایا۔ اس نے کال ریسپو کی تو میں نے کہا ”جانوس! یہاں ہال میں بیٹھا میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا اور تم نے قربانی کے دو کمردن کو میری طرف بھیج دیا قربانی کے کمردن کے لیے میں نے ”بھینٹ کے جانوروں“ کے الفاظ استعمال کیے تھے ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم جتنے بودے دوست ثابت ہوئے ہو اس سے کہیں بڑھ کر بوس دشمن ثابت ہو رہے ہو۔ تمہارے پاس بھینٹ کا کوئی جانور نہیں رہا۔ تباہ ذاب کے میرے چروں میں کاٹو گے؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے شپٹائے ہوئے انداز میں ایک جانب دوڑ لگا دی۔ یہ خیال بلکہ احساس اسے دشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ میں کہیں بیٹھا اس کی ایک ایک حرکت کو مانیٹر کر رہا ہوں۔ اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ چسکا کس طرح دکھا رہا ہوں۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو وہ ذہن کو الجھاتی

ہے۔ وہ بھی الجھ رہا تھا اور اسی الجھن میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جانوس! کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“  
”قت..... تم کسی آ سیب سے کہیں نہیں۔“ وہ سبکی ہوئی آواز میں بولا ”تم نے واقعی میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ پتا نہیں تم کون سا جادو جانتے ہو؟“

میں نے اس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا ”میں کالا سفید نیلا..... ہر قسم کا جادو جانتا ہوں۔ اگر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تو سیدھے میرے پاس ہال میں آ جاؤ۔ میں جنگی بجائے میں تمہارا علاج کر دوں گا۔“

”تم رکش ہو..... کوئی خوفناک بلا ہو۔“ وہ دشت زدہ انداز میں بولا ”تم نے میرے دو آدمیوں کی جان لے لی۔ میں نے درد میں ڈوبی ہوئی ان کی جینیں سنی ہیں۔ میں..... میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔“

میں نے پکارنے والے انداز میں کہا ”ٹھیک ہے تم وہیں ٹھہر دو میں تمہیں دیکھنے آ رہا ہوں۔ بعض اوقات لاچار مریضوں کو کھرے جا کر بھی اینڈ کرنا پڑتا ہے۔“

”میرے پاس مت آنا۔“ وہ دیوانگی کے عالم میں چلایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل فون کو کھینچ کر سامنے والی دیوار پر دے مارا۔

یہ اس کی ایک اضطرابی اور مراسیمہ حرکت تھی۔ میرے مسائل نے اسے بری طرح دشت زدہ کر دیا۔ موبائل فون دیوار سے ٹکرانے کے بعد ٹکڑا ہوا۔ ایک طرف اور بیٹری دوسری جانب جا گری۔ روح کے بغیر جسم کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسے مردہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہ موبائل بھی بیٹری نکل جانے کے بعد ڈیڈ ہو گیا تو میں جانوس سے صوفی رابطے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اپنے سیل کو جیب میں رکھا ہی تھا کہ جانوس نے عمارت کے قریبی کمرے میں پہنچنے کے بعد لان کی سمت ٹھٹھکے والے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اوہ! یہ تو فرار ہو رہا ہے۔“ میں بے اختیار بڑبڑا اٹھا اور آنکھیں کھول دیں۔

اسی لمحے میں نے لی یان کو بھی بوتے ہوئے سنا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی ”کیا ہوا جدان؟“  
میں صوفی کی آڑ میں سے نکل آیا اور بے آواز بلند کہا ”جانوس فرار ہو رہا ہے۔“

لی یان بھی اپنی ”پناہ گاہ“ سے نکل آئی اور گن کو لہراتے ہوئے پھر عزم لہجے میں بولی ”کدھر گیا ہے وہ؟“

میں نے کہا ”تم کھا ڈیا کے پاس آ جاؤ“ میں جا کر اسے دیکھتا ہوں۔“

وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند اس طرف آئی۔ مجھے اس کے انداز سے یوں محسوس ہوا جیسے کھا ڈیا کو سنبھالنا اس کا پسندیدہ کام ہو۔ میں ان زبرد زبردوں کو وسیع و عریض ہال میں ایک دوسرے کے دم دم پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

جب میں تقریباً دوڑتے ہوئے عقبی لان میں پہنچا تو جانوس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ہنگامے کے پہلو سے نکل کر سامنے والے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ میں مکند رفتار سے اس کے پیچھے لپک گیا۔

انسان کے دوڑنے کی رفتار کا دار و مدار حالات اور موقع کی نزاکت پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاص مقصد یا مجبوری پیش نظر نہ ہو تو کس کا فر کا دوڑنے میں جی لگے گا۔ اس کے برعکس اگر شکری کتے کی تعاقب میں ہوں تو وہ جیتے جی رفتار کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ میرے تعاقب میں تو نہیں البتہ پیش نظر انہی خصلت کا حامل ایک جاندار اس ہنگامے سے فرار کی کوشش کر رہا تھا لہذا میں نے جیتے سے اسے انداز میں لپک کر اسے چلیا۔

جانوس ابھی عمارت کے پہلو ہی میں تھا کہ میں نے اس سے آگے نکل کر راستہ روک لیا۔ وہ ٹھٹھک کر رکھا اور دشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔

”کہاں جا رہے ہو مہاراج؟“  
اس کے سیاہ چہرے پر ملٹی کلر جملہاٹ ہونے لگی۔ میری دشت اور دشت نے اسے بری طرح بدحواس کر رکھا تھا۔ اسے اسید بھی تھی کہ میں یوں اچانک اس کے سر پر آن کھڑا ہوں گا لیکن اس حقیقت کو بدانا اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ میں نے نفس نہیں اس وقت اس کے سامنے موجود تھا۔

اس نے جب ”نہ پائے رنن نہ جائے مانن“ جیسی صورت حال دیکھی تو مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں اس کی طرف سے بہت سادہ ار کا کھائے بیٹھا تھا جس کی سودور سوداہی بہت ضروری تھی۔ اس نے ٹھہراہٹ میں بڑے جنگی پن کا مظاہرہ کیا اور کسی رچھ کے مانند مجھے دو بونے کی کوشش کی۔

میں نے اسے جھکا دی اور کمر کو ٹوٹ کرتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔ وہ اپنی ہی جھوک میں جھک کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے پہلو میں آنے کے بعد اس کی تشریف

پرایک جرکی سائڈ کلک جڑی۔

میری زبردست کلک کا پابش لے کر وہ اس طرح ”روانہ“ ہوا جیسے کسی غریب کے دل سے آہ رخصت ہوئی۔ ہے۔ میں نے اس کی پرواز میں قطعی کوئی دخلت نہیں کی۔ اس کی فلائٹ کا اختتام چند دیوار کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں ہوا۔ جانوس کے طبق سے بڑی دشت ناک بلبلات خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر زیں بوس ہو گیا۔

میں اچھل کر اس کے قریب پہنچا اور تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ دیوار سے تصادم کے نتیجے میں اس کا کمرہ سیاہ چہرہ بری طرح بجز چکا تھا۔ تکلیف کی شدت نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔

اس کے لیے میرے دل دو بارغ میں نفرت اور غصے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے والے اور کسی کے اعتماد کو دھوکا دینے والے کسی رورعبیت کے متحقق نہیں ہوتے۔ انہیں طرح طرح دینا گویا بہت سے لوگوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے کیونکہ موڈی کو اگر بے ہمار چھوڑ دیا جائے تو وہ گاہے بے گاہے غلوئی خدا کوڑنے کا کام جاری رکھتا ہے..... کل المودی قبل از ایلہ۔

میں نے ایک فیصلہ غلطی جانوس کی کھوپڑی پر رسید کرنے کے لیے جیسے ہی اپنے پاؤں کو عقبی سمت کھینچا اس نے ایک خلاف توقع حرکت کی۔ اس نے اپنے انتہائی قریب میری موجودی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے مجھ سے ایک محدود فاصلے پر چلا گیا۔ اب اگر میں غلطی برساتا بھی تو اس کی نخوس کھوپڑی کو ٹارگٹ نہیں بناسکتا تھا۔ میں نے اسے ضرب شدید پہنچانے کا ارادہ ترک کیا ہی تھا کہ اس نے مجھ پر فائر کر دیا۔

لوٹ پوٹ ہو کر پیچھے جانے کے دوران میں اس نے بڑی ہوشیاری سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پینل نکال لیا تھا اور اسی گن سے اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اگر لیٹ سائڈ روٹنگ میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کرتا تو میں ممکن تھا اس کے پینل سے نکلنے والی گولی میرے جسم کے کسی حصے میں پست ہو جاتی۔

میں نے ہنگامی انداز میں روٹنگ کی تھی اور فوراً ہی مجھے اس کا خیا زہ بھی جھٹکتا پڑا۔ میرا لیٹ شولڈر پہلے ہی کھاکل تھا۔ اس بازو کے ٹرائی پکس کو ایک گولی نے اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ چوٹ پر چوٹ لگے تو ایک قیامت برپا



میں نے جانوس کی کیفیت کو چمک کرنے کے لیے اس کے پیٹ کے زیریں حصے میں ایک دھواں دھواں شوکر رسید کی۔ وہ پیٹ بکڑ کر تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ چہرے کے کرب ناک تاثرات سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا شانہ

”جسٹ اے مسٹیک!“ میں نے اسی کے الفاظ کو زیرِ طے انداز میں دہرایا ”میں بھی ایسی ہی جسٹ اے مسٹیک کرنے جارہا ہوں تاکہ تمہارے گندے خون سے اس گھاس کا کچھ بھلا ہو سکے۔“

جانوس کو فٹا کے گھاٹ اتارنے کے بعد میں سیدھا ہوا  
 تھا کہ لی بان سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس نے ایک  
 تھ میں وہی عمن تمام رکھی تھی جو میں اسے سونپ آتا تھا۔ وہ

”ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی ”اب اس حصہ 12



بٹنگے میں ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔

لی یان نے ذی بات کی بھی جس کا اظہار میں نے کیا تھا لیکن الفاظ ایسے ذمہ داری سے استعمال کیے کہ بہ آسانی ان الفاظ کی مدد سے اس کے بیان کو کوئی اور رنگ بھی دیا جاسکتا تھا۔ اور میں کوئی اور رنگ دینے کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو رہا تھا۔ شاید یہ چور کی داڑھی میں تنگے والی بات تھی!

ہم دونوں گھروں سے پہلو پہ پہلو چلتے ہوئے بٹنگے کے سامنے والے حصے میں پہنچے۔ وہاں پورچ میں ایک جیتی گاڑی کھڑی تھی۔ بٹنگے میں داخل ہوتے وقت ہم نے سوچا تھا" واپسی میں اگر ہنگامی طور پر ہمیں کسی گاڑی کی ضرورت پیش آئی تو ہم یہ بیش قیمت گاڑی استعمال کریں گے۔ مذکورہ گاڑی کے نزدیک پہنچ کر لی یان نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے حتیٰ لچے میں کہا "نہیں..... ہم یہاں سے نکلنے کے لیے کسی گاڑی کا سہارا نہیں لیں گے۔ خواہ وہ ایک جیتی چنگھاڑی شاخت کو اپنے ساتھ ساتھ دوڑاتے پھرتا مضل مندی نہیں۔"

"اور اس انٹیشن دیکھن کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ہم گیت کے قریب پہنچے تو لی یان نے اس انٹیشن دیکھن کی جانب اشارہ کیا جس میں جالوس اور اس کے دو ساتھی وہاں پہنچے تھے اور لی یان اس بات سے آگاہ نہیں تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا "نہیں!"

"پھر؟" وہ انجمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے بٹنگے کے گیت کے نزدیک بے سدھ پڑے دے اور راجیش پر ایک تنہیدی نگاہ ڈالی۔ وہ دنیا دہانیا سے بے خبر میرے "تماشے" سے محظوظ ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں جس قسم کی نیند میں پھنپایا تھا وہاں سے ان کی فوری واپسی کے امکانات نہیں تھے۔ لی یان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"ہم یہاں سے پیدل ہی نکلیں گے۔ اس علاقے سے تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ کدھر کارخ کیا جائے اور....." میں نے ہاتھ میں موجود نم کو ذرا نیچے دے میں دور اچھال دیا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا "یہ ان لوگوں کی امانت ہے۔ اسے ادھر بٹنگے میں ہی رہنا چاہیے۔ بات ختم کرتے ہی میں نے دے اور راجیش کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

لی یان نے چشم زدن میں میری تقلید کی اور اپنے ہاتھ کی خطرناک گھن کو وہیں ایک طرف ڈال دیا پھر ہم تیزی سے

گیت کی سمت بڑھ گئے۔

ہم نے جیسے ہی بٹنگے سے باہر قدم نکالا ایک نیکی تیزی سے شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ شیوالی اسٹریٹ اسرائیل انجمن کی تقریباً عقب میں واقع تھی جس میں جوگندر پال کا بنگا نمبر ہے۔ دو سٹوڈیو دیر پہلے میدان کار زار بنا ہوا تھا۔

اس نیکی کا شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہونا کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس کے انداز نے مجھے ہلکے پر مجبور کر دیا۔ وہ طوفانی رفتار سے سیدھی ہماری طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نیکی ڈرائیور ہمیں کچلنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں نے پہلو بچا کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔ لی یان بھی میرے تعاقب میں بھاگی۔ ہم نیکی کی مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔ نیکی کے خوف ناک تہرہ دیکھ کر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ جوگندر پال کے بندے ہمارے فرار کو ناکام.... بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس وقت جن حالات سے گزر رہے تھے ان میں اسی انداز میں سوچا جاسکتا تھا۔

چند سیکنڈ ہی میں نیکی نے ہمیں آلیا۔ وہ ہمارے انتہائی قریب پہنچ گئی۔ اس سے قبل کہ میں پلٹ کر عقب میں دیکھتا میری ساعت سے ایک مالوس آواز گر گئی۔

"وہ جان رک جاؤ..... آگے تمہارے لیے خطرہ ہے۔" کوئی مجھے میرے نام سے پکار رہا تھا اور کسی بڑے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ اب رکنا اور رک کر اس کی بات سننا ضروری ہو گیا۔ میرے قدم تھمے تو لی یان بھی رک گئی۔ ہم نے بیک وقت پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور چونک اٹھے۔ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر وہ نیکی بھی ٹھہر گئی تھی۔

نیکی ڈرائیور نے اپنی سائیڈ والے شیشے سے گردن باہر نکالی ہوئی تھی اور ہاتھ سے ہمیں اشارہ بھی کر رہا تھا۔ میں اس کی صورت پہچان کر ٹھنک گیا۔ وہ جالوس کا خاص آدمی کا شاٹوگ تھا!

دشمن کے ایک اہم آدمی نے مجھے اتنی خیر خواہی سے پکارا تو حیرت ہوئی۔ ہمیں رکنا دیکھ کر اس نے ٹھہرے ہوئے لچے میں کہا "وہ جان! نیکی کے اندر آ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں!"

میں اس وقت عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ لی یان بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ کا شاٹوگ کی اس بات میں

کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ گلی ہمارے لیے ڈھچھ اسٹریٹ کی حیثیت حاصل کرنے والی تھی۔ کا شاٹوگ ہمیں جس دوستانہ انداز میں نیکی کے اندر بلاتا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا اسے جالوس کو پیش آنے والے حالات کی خبر نہیں۔

ایک لمحے کے تاثر کے بعد میں نے لی یان کو اشارہ کیا" دوسرے ہی لمحے ہم کا شاٹوگ کی نیکی کی عقبی نشست پر موجود تھے۔ میں نے اس رنگ پر نیکی میں بیٹنے کا فیصلہ کیا تھا کہ کا شاٹوگ تو تازہ ترین حالات سے آگاہ نہیں اور وہ ہمیں جالوس کے معزز مہمان ہی سمجھ رہا ہے۔ ویسے آگے جا کر اگر اس کی سوچ کا کوئی گھٹا سامنے آجی جاتا تو میں اس کچلے سر والے کا شاٹوگ سے بخوبی نمٹ لیتا۔

ہم نے جیسے ہی نیکی میں بیٹھ کر دروازہ بند کیا" کا شاٹوگ نے نیکی کو ایک بٹنگے سے آگے بڑھا دیا" پھر وہ ہوائی رفتار کے ساتھ نیکی کا شیوالی اسٹریٹ میں دوڑانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہم اسٹریٹ کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ کا شاٹوگ نے نیکی کی رفتار کم کی اور بڑی مہارت سے اسے مین روڈ پر لے آیا۔ میں نے گردن موڑ کر اسٹریٹ کی طرف ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور مجھے ایک مرتبہ پھر چونک جانا پڑا۔ ہماری مخالف سمت سے تین گاڑیاں یکے بعد دیگرے شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوئی تھیں جن میں سے آخری گاڑی پر میں نے اسرائیل کا جھنڈا بھی لگا ہوا دیکھا۔ میرے رگ دپے میں ایک سنسنی دہانگی۔

اسرائیل انجمن چند قدم کے فاصلے پر واقع تھی۔ جھنڈے والی گاڑی کا سیدھا سیدھا ایک ہی مطلب تھا کہ یہودی میرے خلاف سرگرم ہو گئے تھے۔ ڈین ہاروے اور کلاڈیا کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ میری زبانی رلی موٹے بائسن کے کسی نائب تک یہاں کی تازہ ترین صورت حال کی خبر پہنچ گئی تھی۔ عین ممکن تھا رلی ہی کے حکم پر اسرائیل انجمن والے متحرک ہوئے ہوں۔ بانی دو گاڑیوں میں جوگندر پال وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ رلی کی طرف دھیان جاتے ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے ٹھوڑی دیر بعد اس کے موہاگل پر رابطہ کرنے کا "وعدہ" کیا تھا۔ کا شاٹوگ کی موجودی میں میں نے یہ رابطہ مناسب نہ سمجھا۔ پہلے اس کی پوزیشن کا اندازہ لگانا ضروری تھا۔ رلی سے بعد میں بھی بات ہو سکتی تھی۔

کا شاٹوگ بڑی مستعدی اور مہارت سے ڈرائیونگ

کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ نیکی نیپال راستہ اینک کے پاس سے گزرتے ہوئے بالوٹر روڈ پر آگئی۔ کا شاٹوگ کی پراسرار خاموشی مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ ہم ٹگ بھگ ساڑھے تین بجے اپارٹمنٹ سے نکلے تھے اور اس وقت وہ وہیں پر موجود تھا۔ میری معلومات کے مطابق کا شاٹوگ" جالوس کا چاں شار اور وقادار تھا..... پھر وہ ہمیں کسی بڑے خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد نیکی میں اپنے ساتھ کیوں لے جا رہا تھا؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کیسے معلوم ہوا" ہم اس وقت جوگندر پال کے بٹنگے میں سے نکل رہے ہیں۔ وہ یکسلسل سے لازم پت کے علاقے میں کیوں پہنچا؟

یہ تمام تر سوالات ایسے تھے جن کے درست جوابات کا شاٹوگ ہی دے سکتا تھا۔ اس نے ابھی تک دشمنوں والی کوئی حرکت نہیں کی تھی لہذا میں نے اسے ٹوٹا ضروری سمجھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کا شاٹوگ! تم تو وہاں یکسلسل والے اپارٹمنٹ میں تھے۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہاں ہم پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟"

لی یان بھی میری طرح کا شاٹوگ کی طرف متوجہ تھی۔ تازہ ترین صورت حال اس کی سمجھ سے بھی باہر تھی۔ کا شاٹوگ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے رویے نے مجھے اور زیادہ تشویش میں ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اس سے استفسار کرتا اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ایک ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک ٹھا سا موہاگل فون موجود تھا۔ میں نے چونکے ہوئے لچے میں پوچھا "کیا ہے؟"

"میں نے اس سیل پر ایک نمبر ڈائل کیا ہے۔ تم بات کرلو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لچے میں بولا۔

میں نے وہ سیل اس سے لے کر اپنے کان سے لگا لیا اور بائیک میں کہا "ہیلو!"

"گند ہونوگ!" سیل کے اہلکار سے خارج ہونے والی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"سب کیا پکڑ ہے ڈاکٹر موگ؟" میں نے حیرت بھرے لچے میں پوچھا۔

اس نے مختصر اکھا "کا شاٹوگ بھروسے کا آدمی ہے!"

"جالوس پر بھی تم نے اپنے اہتمام کا اظہار کیا تھا۔" میرا لہجہ خود بخود تلخ ہو گیا۔

وہ کبیر آواز میں بولا "جالوس کی اصلیت مجھ پر کھل گئی

تھی لیکن میں نے دانستہ اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ رتنا پارک والے بنگلے میں جو انفس ناک واقعات پیش آئے ان کے پیچھے جانوس ہی کا ہاتھ ہے۔

میرے لیے میں احتجاج شامل ہو گیا۔ ”اس کے باوجود بھی تم نے ہمیں اس آستین کے سانپ کے حوالے کر دیا؟“ ”وہدان! میں جو کچھ جانتا ہوں، ممکن ہے تم اس سے زیادہ جانتے ہو۔ اسی طرح میں بھی بعض معاملات میں تم سے زیادہ معلومات رکھ سکتا ہوں۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”ہر کام کا ایک وقت اور طریقہ کار مخصوص ہوتا ہے۔ جانوس تمہارے ہاتھوں ہی اپنے قرار واقعی انجام کو پہنچا؟“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا ”بہر حال لی یان کیسی ہے؟“

میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ”تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ ”ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔“ وہ مشفقانہ انداز میں بولا ”تمہیں ابھی بہت سے محاذوں پر اسے استعمال کرنا ہے۔“ اس کا اشارہ میرے ذہن کی طرف تھا۔ بات کے اختتام پر اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا ”لی یان کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟“ ”ہم دونوں خیریت سے ہیں۔“ میں نے گول مول جواب دیا ”کیا تم یہاں کے تازہ ترین حالات سے آگاہ ہو؟“

”بڑی حد تک!“ وہ پھرے ہوئے لہجے میں بولا ”جب آج سہ پہر میں تم دونوں اپارٹمنٹ سے نکلے تو کاشانوک نے مجھے تمہارے بارے میں بتادیا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ تمہارا ”خیال“ رکھے۔ تم اسے جانوس کے وفادار کی حیثیت سے جانتے ہو۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ کبھی اس حوالے سے کوئی غلط فہمی پیدا ہونے لگے تو وہ مجھ سے رابطہ کر کے تمہاری بات کرادے۔۔۔۔۔ اور ہم بات کر رہے ہیں۔“ وہ سانس لینے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کاشانوک پر اعتماد کرو۔ یہ تمہارے بہت کام آئے گا۔“

ڈاکٹر مونگ کا انداز الجھا دینے والا تھا۔ میں نے پوچھا ”کیا تم جانتے ہو جانوس کے ساتھ کیا واقعات پیش آچکے ہیں؟“ ”جانوس ڈین ہاروے اور کلاڈیا کے عبرت ناک انجام کی مجھے خبر مل چکی ہے۔“ اس نے غصے میں جواب دیا۔

اس کے ہمہ گیر اس انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ چاہنے کے باوجود بھی میں اس سے نہ پوچھ سکا کہ اس کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔ اگر میں یہ سوال کرتا تو وہ مجھے کبھی غیر واضح جواب سے اطمینان دلانے کی کوشش کرتا لہذا میں نے ایسا ارادہ ترک کرنا ہی بہتر سمجھا۔

”رہی ہے بات ہو تو خوب بڑھ چڑھ کر بولنا۔“ ڈاکٹر مونگ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”اس سے ڈرنے یا دہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر صورت میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے اسی لیے اس نے تمہاری سہمی کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ جب تک تم اس کے قابو میں نہیں آ جاتے وہ ساحل کو بہت سنبھال کر رکھے گا۔ ساحل کی سلامتی تمہارے حصول کے لیے بہت ضروری ہے۔ رہی اسے کوئی گزند نہیں پہنچنے دے گا اور یہ تمہارے لیے ایک پلس پوائنٹ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہاری طرف سے باپوس ہو جائے تم اس تک رسائی حاصل کرلو۔ وہ جانتا ہے تم سال تک پہنچنے کی پوری کوشش کرو گے۔۔۔۔۔ اور اسی کوشش کے دوران میں وہ تمہیں اچک لے گا لہذا چھوٹ چھوٹ کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے!“ میں اس وقت ساحل کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا جب ڈاکٹر مونگ نے یہ بات کی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری سوچ بڑھا رہا ہو۔ اگر ایسا نہیں بھی

تھا تو بھی ڈاکٹر کچھ نہ کچھ ضرور کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بڑے محترم سانگ فو کی صحبت میں عمر گزار لی تھی۔ سانگ فو کی روحانی اور باطنی صلاحیتوں کا میں بھی مستفید تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اب ڈاکٹر مونگ ہی ”بڑا“ تھا۔ اس کی ہر اسرار صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ ساحل اور رہی کے بارے میں مزید کیا جانتا ہے۔

”تھوڑی دیر بعد رہی سے میری بات ہونے والی ہے۔“ میں نے کہا ”اس نے کچھ عرصے سے مجھے جس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے تو وہ حاصل کر سکے گا یا نہیں لیکن میں اپنی ساحل کی ضرورت پہنچ جاؤں گا۔ مجھے ہر صورت اسراٹکل جانا ہو گا۔“

میرا لہجہ اتنا محسوس تھا کہ خود مجھے بھی اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ ساحل کے حصول کے لیے بہت آکھ بچولی ہو چکی تھی۔ اگر رہی بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے درخانے میں پوشیدہ قیدی پھر دوں برال نہ نیکار رہا ہوتا تو وہ ساحل کو اسراٹکل سے نکال کر کھنڈ و تک بھی نہ بھیجتا۔ یہاں کھنڈ و میں

اسے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اپنے ارادے سے باز آیا تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور اس پر واضح ہو گیا تھا کہ اگر وہ پانچ نایاب پتھروں کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو مجھے اپنے قبضے میں کرنا ہو گا۔ ایک میں ہی ایسا شخص تھا جو ان اصول پتھروں کو عبادت گاہ کے درخانے سے نکال کر باہر لاسکتا تھا۔۔۔۔۔ اور مجھے قابو کرنے کے لیے سال کو اپنی تحویل میں رکھنا بہت ضروری تھا لہذا یہ بات تلخ تھی کہ وہ اب ساحل کو اسراٹکل سے باہر نہیں نکالے گا۔ مجھے ہی اپنی جان تمنا تک پہنچنا ہو گا۔

یہ تمام تر خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزرے اگلے ہی لمحے ڈاکٹر مونگ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”وہدان! تم نے اسراٹکل کا ذکر کیا ہے تو یہ بات ذہن میں نقش کرلو کہ اس وقت کھنڈ و میں اسراٹکل ایسی ہی پوری طرح تحریک ہو چکی ہے۔ تم یہودیوں کی طاقت اور وسیع اختیارات سے بخوبی واقف ہو۔ تمہیں اور لی یان کو کھنڈ و کے چپے چپے پر تلاش کیا جا رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد دوبارہ کہہ دیا۔

”میں نہیں جانتا“ تم نے آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل ترعیب دیا ہے لیکن جب تک کھنڈ و میں ہو تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میری مالتو تو ایک آدھ دن کے لیے بالکل محظوظ سے آؤت ہو جاؤ۔ کاشانوک اس سلسلے میں تمہاری ہر قسم کی مدد کر سکتا ہے۔“

یہنا اسی نوعیت کی ہدایات اس نے کاشانوک کو بھی دے رکھی ہوں گی۔ میں نے ڈاکٹر مونگ سے سرسری لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔“ ”لی یان کا بہت خیال رکھنا۔“ اس نے سفارش کرنے والے انداز میں مجھے تاکید کی۔

میں نے توجہ کی نظر سے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی لی یان کو دیکھا اور کہا ”بہت خیال رکھا ہوا ہے۔“

الودامی کلمات کے بعد ہمارے درمیان سیلور رابطہ موقوف ہو گیا۔ جب ہم بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ سے رخصت ہوئے تھے تو اس وقت بھی ڈاکٹر مونگ نے لی یان کا خیال رکھنے کے سلسلے میں مجھے تاکید کی تھی اور اس کی یہ تاکید خالی از علت نہیں تھی۔ لی یان میرے مشن میں شامل تھی اور اسی شمولیت نے اس کے شہرہ روشن کی جان لے لی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ اس کا خیال رکھنا مجھ پر لازم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اگر نہ بھی کہتا تو میں اس ڈتے داری میں کوئی کوتاہی نہ برتا۔

ان لحظات میں شون کی خواہش شدہ میرے ذہن میں

پھر گئی۔ اسے اولاد کی بڑی تمنا تھی لیکن اس سلسلے میں لی یان اس سے قتادن پر آمادہ نہیں تھی۔ ان کی شادی لگ بھگ چار سال رہی لیکن وہ اولاد ایسی نعمت سے محروم ہی رہے۔ اس دوران میں ضد کر کے لی یان نے دو تین مرتبہ بارش کر لیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اسے بچوں سے نفرت ہو۔ وہ بچہ تو چاہتی تھی لیکن ان طویل مراحل کو طے کرتے ہوئے گھبرانی تھی جن سے گزرے بغیر کوئی عورت فطری ماں نہیں بن سکتی۔

اس کا رجحان اڈاپشن کی جانب تھا مگر شون اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان کی شادی شدہ زندگی کے یہ چار سال بڑی جذباتی اور نفسیاتی کشش میں گزرے تھے۔ اس سلسلے میں شون کا مطالبہ جائز تھا مگر پتا نہیں لی یان اپنے سینے میں کس قسم کی ممتا چھپائے بیٹھی تھی!

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور موبائل فون کاشانوک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”تم میری نظر میں معتبر تو ہو گئے ہو۔ اب یہ بھی بتاؤ ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہو؟“

کاشانوک بڑی روانی سے انگلیں ہلاتا تھا۔ اس نے جواب دیا ”نی الحال ہم بودھ ناتھ دیلی کی طرف جا رہے ہیں۔ آئندہ کا پروگرام وہاں پہنچنے کے بعد ترتیب دیں گے۔“ ”کیا یہ دیلی بودھ ناتھ اسٹوپا کے نزدیک ہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ”اسٹوپا کے گرد نواح میں زیادہ تر بدھ مت آباد ہیں اسی لیے یہ علاقہ ایک وادی کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ بودھ ناتھ اسٹوپا کی موجودگی کے باعث یہ وادی ”بودھ ناتھ دیلی“ کہلاتی ہے۔“ دیلی میں میرا ایک محفوظ ٹھکانا ہے جہاں تم بے فکرگی سے جتنا چاہو وقت گزار سکتے ہو۔“

اس گفتگو کے دوران میں کاشانوک نے جیسی کو مختلف سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے بالآخر رنگ روڈ پر ڈال دیا تھا۔ بودھ ناتھ کا اسٹوپا شہر کے شمال مشرقی حصے میں آخری کنارے پر واقع تھا۔ اس کے جنوب میں کھنڈ و کا تری بھون انٹرنیشنل ایئر پورٹ تھا۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا۔ مختصر بات چیت کے بعد کاشانوک خاموش ہو گیا تو میں لی یان کی طرف متوجہ ہوا۔

بودھ ناتھ دیلی تک پہنچنے میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ میں نے اس سے کہا ”تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟“

میرے استفسار پر اس نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور مجھے لہجے میں بولی ”نہیں پوریت والی کیا بات ہے؟“

”نہیک ہے تم بیٹھو..... میں آتا ہوں۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔  
وہ چونک اٹھی ”تم کہاں جا رہے ہو جدان؟“  
”ابھی وہاں آکر بیٹھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
اس کی انجمن دو چند ہوئی۔

میں نے متنی خیر انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ٹیکسی کی نشست سے ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے مجھے ڈسٹر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب میری اس عادت کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ میں بند آنکھوں کے پیچھے کون سا مہلک کھیتا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ میں دھیان لیان کرتا ہوں۔ وہ میری بہت سی دیکھی اور ان دیکھی ملا جلیوں سے یکساں طور پر متاثر تھی۔

جانوس نے مجھے جو تین پوسٹ کارڈ تصاویر دکھائی تھیں۔ ان میں ایک تصویر جو گندر پال کی بھی تھی۔ میں جو گندر کی تازہ ترین خبر لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے شک تھا کہ اسرائیلی جہنڈے والی گاڑی کے علاوہ جو دو گاڑیاں شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوئی تھیں ان میں جو گندر پال اور اس کے آدمی ہو سکتے تھے۔ اس وقت اسرائیلی ایس سی میں رپہ کے اشارے پر ایک بچل سی پٹی ہوئی۔ تو دیکھنا تو چاہیے تھا شیوالی اسٹریٹ کے بنگلہ نمبر ہے۔ تو ذیل زیر وہیں کیا ہوا ہے؟  
جو گندر پال کے ماحول تک میں پہلے بھی رسائی حاصل کر چکا تھا لہذا اس سلسلے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا اور اس کے خدو خال کو ذہن میں لاتے ہی میں تیسری آنکھ کے توسط سے بنگلہ نمبر ہے۔ نو ہنڈر بیٹھ میں پہنچ گیا۔

وہاں ایک افراتفری پٹی ہوئی تھی۔ کوئی درجن بھر افراد ادھر سے ادھر چکراتے بھر رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ انہوں نے دےئے راجیش جانوس ڈین ہاروئے کلاڈیا اور اس سیکورٹی گاڑی کا لاشیں دریافت کرنی ہوں گی جو لیان کے ہاتھوں لٹھا اجل ہاتھا۔ جو گندر پال کو جانوس کے ذریعے بنگلے میں میری سرگرمی کی اطلاع مل گئی تھی۔ ازیں علاوہ میں نے رپہ کے کسی فیصلے کی اسے جس انداز میں بات کی تھی وہ بھی میری ”کارکردگی“ کو سمجھنے کے لیے کہا تھا۔ میں سب کو جھوڑ کر جو گندر پال سے چپک گیا جو چنی چڑی والے دو افراد کے ساتھ ایک کمرے میں کوئی خفیہ میزنگ کر رہا تھا۔ ان دونوں سفید فام افراد کا تعلق یقیناً اسرائیلی ایس سی سے تھا۔ میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو تو نہیں سن سکتا تھا البتہ میرا اندازہ تھا کہ ان کے درمیان اس وقت میں ہی موضوع بنا ہوا ہوں گا۔ وہ دو لوگ جلد از جلد مجھے چھاپنے کی منصوبہ بندی

میں مصروف تھے۔

میں نے ان سب پر لعنت بھیجی اور اس ماحول سے نکل آیا۔ مجھے جو کتنا تھا وہ گزر رہا تھا۔ اب ان کی باری تھی۔ مجھے خاموشی سے ان کا تماشا دیکھنا تھا۔

میں نے بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے تھوڑا آئی کو تھوڑی اور زحمت دی اور ایک جھپٹکے میں اپنی رپہ جہاں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت بھی اسی کمرے میں تھی جہاں میں نے آج سے پہلے اسے دیکھا تھا مگر اس وقت وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا وہ ہوش و حواس کھانے میں مصروف تھی۔ اس لیے کھنڈروں میں شام کے پانچ سوا پانچ بجے تھے۔ اس حساب سے وہاں اسرائیل میں دوپہر کا لگ بھگ ایک بجنا ہوگا۔ پھر پانچ کا وقت تھا اور ساحل بوڑے سیلے طریقے سے بچ کر رہی تھی۔

کھنڈروں کے مقامی وقت کے مطابق سہ پہر تین بجے جب میں نے ساحل کو جھانکا تھا تو اس وقت بیڈروم میں زیر و پاد کا بلب روشن تھا لیکن اس وقت یہ کمرہ اباقاعدہ پوری طرح روشن تھا۔ میں نے ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے نگاہ دوڑا کر اس بیڈروم کا تنقیدی جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ ساحل کے سوا وہاں اور کوئی بندہ بھروسہ جو نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا اگر اور کوئی شخص وہاں دکھائی دیتا تو میں اس کا ماحول پلا کر اس بیڈروم سے باہر نکل جاتا۔ پھر یہ جاننے میں مجھے قطعاً کوئی پریشانی نہ ہوئی کہ ساحل والا بیڈروم کس عمارت میں واقع ہے..... اور وہ عمارت تل ابیب کے کس حصے میں پائی جاتی ہے۔

مجھے یہ معلوم تھا اسرائیل میں رپہ نے اپنا ٹھکانا تل ابیب میں بنا رکھا تھا اور یہ بھی یقینی تھا کہ ساحل کو اس نے خود سے دور نہیں ٹھہرایا ہوگا۔ مجھے اول آ خر ساحل تک پہنچنا تھا اور میری آئندہ منزل اسرائیل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے قوی امید تھی یہودیوں کی اس سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی لائٹ ہاؤس دریافت کر لی لوں گا۔

دیے ایک بات سے مجھے بڑا اطمینان حاصل ہوا تھا کہ اب میں یہ آسانی اپنی ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہونے لگا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے رپہ نے اپنے کسی پراسرار عمل کے ذریعے میری تیسری آنکھ کی راہ میں حد درجہ رکاوٹیں ڈال رکھی تھیں۔ میرے تصور کی پرواز اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتی..... مگر اب ایسا نہیں ہو رہا تھا اور..... یہ بہت اچھا ہو رہا تھا۔

میں بڑی لگاؤ اور توجہ سے ساحل کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے مدتیں گزر گئی تھیں۔ کراچی میں جب وہ مجھ سے جدا ہوئی اس کے بعد سے میری زندگی ایک عذاب مسلسل بن کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی یاد میں بہت بھر کر کھانا کھانا تھا اور نہ ہی آنکھ بھر کر سو سکا تھا۔ ریم دنیا اور دستور باندہ الگ بات ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہی میرا سب کچھ لے گئی تھی۔ اس کے بغیر میں خود کو خالی خالی سامھوس کرتا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا ہو۔ وہ میری زندگی کا حاصل بھی مگر مجھے حاصل نہیں تھی۔ کیا میں زندہ تھا؟

آہ اتنی راتیں میں اس کی صورت دیکھنے بغیر سو یا تھا اور کتنی بھینس میری آنکھوں نے اس چہرے کو دیکھنے بنا آغا زکی تھیں۔ ان بے کیف صبحوں اور درمیانی شبکی شاموں کے ساتھ میری زندگی گویا ایک رستا ہوا ناسور بن گئی تھی جسے ساحل کا مرہم ہی شفا دے سکتا تھا۔

میں ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک تک اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ میری دسترس سے باہر تھی۔ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو نہیں سکتا تھا۔ دور بیٹھ کر دیکھنے پر مجبور تھا اور وہ بھی تصور کی نگاہ سے۔ انسان کے بس میں جتنا ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ میں بھی خیل کی نگاہ سے اسے چوٹے لگا۔ ان لحاظ میں وہ مجھے ایک ہاتھ کی دوری پر بیٹھی محسوس ہوئی۔ انسان کا خیل اگر طاقتور ہو تو ہر شے سب کر اس کی آنکھ میں آ جاتی ہے۔ ساحل بھی میری آنکھ میں آ گئی تھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کھینچ کر ساحل کو مجھ سے جدا کر رہا ہو۔ میں نے بڑی مضبوطی سے اسے تھام لیا لیکن یہ مضبوطی کسی کام نہ آئی۔ وہ میرے تصور کی گرفت سے نکلتی چلی گئی۔ دور..... دور دور..... پھر وہ نگاہ تصور سے اوجھل ہو گئی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔

اسی لمحے ایک مالوس قہقہہ میری ساعت سے نکل آیا۔ میں نے اس فقری آواز کو سینکڑوں کے لاکھ دس حصے میں شناخت کر لیا۔ وہ ٹیکری کا مخصوص قہقہہ تھا۔ میں نے ہڑ بوا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں ٹیکسی کی عکسی نشست پر لیان کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”کوئی پر اہلم ہے جدان؟“  
”لو پر اہلم!“ میں نے مختصر جواب دیا اور ٹیکسی کے باہر دیکھنے لگا۔

کاشانوک کی ٹیکسی اس وقت تارکون ہوٹل کے قریب سے گزر رہی تھی۔ بوجھ تھا وہ لیان تارکون ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی گویا ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے تھے۔ میں گہری تنہائی کے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

اس بات میں کسی شک کی گنجائش تلاش کرنا ناممکنات میں سے تھا کہ میں نے ٹیکری کی باقی مخصوص قہقہہ ساعت کیا تھا۔ وہ ایک سوا یک فیصد ٹیکری تھی۔ میں اس کی آواز کو لاکھوں کروڑوں آوازوں میں بالکل الگ پہچان سکتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کوئی دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بے طرح پرچوں کی اس ملکہ کے بارے میں سوچنے لگا اور اسی لمحے ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔

میں نے ٹیکسی کی اندرونی فضا میں ایک مخصوص خوش بو رچی ہی محسوس کی۔ میں اس خوش بو سے ابھی طرح آشنا تھا۔ یہ ٹیکری کے وجود کی منفرد بھگ تھی۔ وہ جس ماحول میں بھی جاتی اسے مہکا کر رکھ دیتی تھی۔ تو کیا ٹیکری ٹھوڑی دیر پہلے اس ٹیکسی میں موجود تھی؟

اس سوال نے میرے اندر بے چینی بھردی۔ میں بے قرار ہو کر ٹیکری کے بارے میں سوچنے لگا کہ کوئی اور اس کے بدن کی فطری خوشبو کو چھو سکتا تھا اور نہ ہی اپنا سکتا تھا۔ میں بارہا اس فطری خوشبو کے تجربے سے گزر رہا تھا اور وہ رات تو میری زندگی کی ایک ناقابل فراموش رات تھی جب کے ڈی اے اسکیم دن کے ایک بنگلے میں اس نے مجھے لذت حیات سے روشناس کرایا تھا۔ وہ میری زندگی کا ایک انوکھا اور منفرد تجربہ تھا۔

میں نے محسوس کیا اس دوران میں لیان مسلسل میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے چہرے کے تاثرات سے میری بدلتی ہوئی کیفیت کا اندازہ لگایا تھا۔ میں اس کی سمیت میں پہلے بھی دو تین مرتبہ ایسی کیفیت سے گزر رہا تھا اور جب اس نے مجھ سے استفسار کیا تو میں ”کچھ نہیں.....!“ کہہ کر نال کیا تھا۔ اس دفعہ اس کے استفسار کا انداز بالکل جدا تھا۔

”وجدان! کوئی یاد رہا ہے؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں گڑ بڑا کر رہ گیا ”مجھے کون یاد آئے گا!“ میں نے جلدی سے کہا۔

”کوئی یاد آنے والی شے.....؟“ اس نے جملہ ادھر اور چھوڑ دیا۔  
”چنانچہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ میں جھٹکا کر رہ گیا۔  
”میں کلاڈیا کی بات کر رہی ہوں!“ وہ متنی خیر انداز

میں بولی۔

”اوہ!“ میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

وہ زہر بھرا مسکرا دی۔

میں اس کی شوخ مسکراہٹ اور شریر نظر کی تاب نہ لا سکا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ نگاہ جڑانے کا اس سے زیادہ فوری طریقہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

کلاڈیا کے حوالے سے وہ پہلے بھی مجھے چھیڑ چکی تھی۔ اگرچہ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر لیتیں لیکن لیان کا انداز ایک مخصوص پہلو کی جانب اشارہ کر رہا تھا اور میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

عورت بڑی زود حس اور کھوجی فطرت کی مالک ہوتی ہے۔ مرد کو جس بات کا شک ہو وہ اس بارے میں پُر یقین ہوتی ہے۔ کلاڈیا کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے لیان کی آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات چھل چکے تھے کہ اس نے میری چوڑی پٹری پٹری! ☆☆☆

یودہ ناٹھ کا اسٹوپا کھنڈرو کے شمال مشرقی حصے میں شہر کے آخری کنارے پر واقع ہے۔ اس کے گرد ارد گرد بدھ مت افراد کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اس طرح یودہ ناٹھ دہلی وجود میں آ گئی ہے۔ دہلی میں بسنے والے بدھ مت کی اکثریت کا تعلق تبت سے ہے۔ کاشاٹوک خود بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اتفاق سے وہ بھی تبت سے آ کر کھنڈرو میں آباد ہوا تھا۔ دہلی میں رہنے والے تو بے فیصد بدھ مت غالیجہ بانی کے پیچھے سے وابستہ ہیں۔ کاشاٹوک ہمیں دہلی کے اندر سے گزرتے ہوئے آخری سرے پر لے گیا اور ایک گھر کے سامنے لے جا کر ٹیکسی روک دی۔

اس گلی میں ہشکل پانچ گھر ہوں گے۔ کاشاٹوک نے ہمیں ٹیکسی میں سے اترنے کو کہا اور خود بھی ہمارے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ ہم دونوں ٹیکسی کے قریب ہی ایک طرف کھڑے ہو گئے تو کاشاٹوک نے اس گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔

میں نہیں جانتا تھا وہ کس کا گھر ہوگا۔ راستے میں کاشاٹوک نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ہمیں اپنے کسی خفیہ اور محفوظ ٹھکانے پر لے جا رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہی گھر اس کا ٹھکانا ہو۔

دستک کے جواب میں ایک شخص نے دروازہ کھول دیا۔ میرے اندازے کے مطابق تپتی نفوس والے اس بوڑھے

فحش کی عمر بچپن اور ساتھ کے درمیان رہی ہوگی لیکن میرا یہ اندازہ سراسر غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ تبت میں رہنے والے بڑی عمدہ صحت اور طویل عمر پاتے ہیں۔ عین ممکن تھا وہ شخص بچپائی یا بونے کے پینے میں ہو۔

اس شخص نے عقیدت اور احترام کے جذبات کے ساتھ کاشاٹوک کا استقبال کیا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد ہم اس گھر کے اندر موجود تھے۔ کاشاٹوک ہمیں ایک کمرے میں لے آیا اور کہا۔

”آپ لوگ جب تک جی چاہے یہاں رہ سکتے ہیں۔ دشمن کا بھولے سے بھی اس طرف دھیان نہیں جائے گا۔ میرا یہ ٹھکانا ہر طرح سے محفوظ اور آرام دہ ہے۔“

میں نے ایک اہم سوال کیا ”یہ بوڑھا کون ہے؟“ ”میرا ملازم ہے۔“ کاشاٹوک نے بتایا۔ ”اسی گھر کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ میری غیر موجودگی میں یہ یہاں کی چوکیداری کرتا ہے۔ اس کا نام فلوچی ہے۔ تم فلوچی پر بھروسہ کر سکتے ہو۔“ وہ ایک لمبے کو متوقف ہوا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”آؤ پہلے میں تم لوگوں کو اس گھر کا معائنہ کرادوں۔“

ہم اس کے ساتھ ہو گئے۔

وہ گھر چار بیڈروم اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ ڈرائنگ روم اور ایک چھوٹا بیڈروم پورے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں بائیں واقع تھے۔ مذکورہ چھوٹے بیڈروم میں فلوچی رہتا تھا۔ دیگر تین بیڈروم گھر کے قریبی حصے میں واقع تھے جن کے آگے ایک کشادہ کھنڈ تھا۔ کاشاٹوک نے مجھے بتایا کہ اس گھر کو وہ ”پے ایک گیٹ ہاؤس“ کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ یودہ ناٹھ اسٹوپا کی یا تر کے لیے در دروازے سے آنے والے لوگ انتہائی کم کر پے پر وہاں قیام کرتے تھے۔ قیام کے ساتھ ساتھ وہاں طعام کی سہولت بھی مہیا تھی۔ یہ کام فلوچی خود اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا جب کسی خاص تہوار کا موقع ہوتا تو یودہ ناٹھ دہلی یا تریوں سے بھر جاتی تھی۔ ان دنوں کاشاٹوک کا گیٹ ہاؤس بھی آباد ہو جاتا تھا اور نہ راکا مڑکا افراد ہی وہاں قیام کرتے تھے۔ آج کل وہ گیٹ ہاؤس مہمانوں کے وجود سے خالی تھا۔

کاشاٹوک ہمیں گھر میں گھما پھرا کر داخل کرے میں لایا تو میں نے اس سے پوچھا ”تم نے فلوچی کو ہمارے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

”میں نے مختصر الفاظ میں اسے تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔“ کاشاٹوک نے جواب

دیا ”تم لوگ میرے خاص مہمان ہو۔ تم دونوں جب تک یہاں قیام کرو گے فلوچی تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھے گا اور اس دوران میں وہ کسی اور مہمان کو بھی گیٹ ہاؤس میں نہیں ٹھہراے گا۔ وہ بہت اچھا یاد رکھتی بھی ہے۔ تم مت ہی کھاؤں کے علاوہ فرمائش کر کے بھی اس سے کوئی ڈس تیار کروا سکتے ہو۔ مجھے امید ہے تمہیں یہاں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔“

کاشاٹوک کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں وہاں چھوڑ کر کہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”مجھے فوری طور پر نیکسل والے فلیٹ پر جانا ہوگا۔“ اس نے بتایا ”وہاں کے حالات اور معاملات کو نارتھ انداز میں نیکل کرنا ضروری ہے۔ آن ریکارڈ میں جانوس کا ایک خاص آدمی ہوں۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ میری دقا واریاں ڈاکٹر مونگ کے لیے ہیں لہذا مجھے وہاں بہت سے معاملات کو نمٹانا ہوگا۔ دشمنوں کے کچ رہتے ہوئے مجھے تازہ ترین حالات کی خبر بھی رہے گی۔ میں اب کل صبح ہی اس طرف آؤں گا۔ تم لوگ اطمینان سے یہاں آرام کرو۔۔۔۔۔ اور اگر گھر سے باہر نکلنے کا موڈ ہو تو بہت زیادہ محتاط رہنا۔ دہلی سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے خیال میں اس دہلی کے اندر تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے“ میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”تم کل جب یہاں آؤ تو میرا ایک کام کرتے آنا۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔“ وہ ہوا لیلے نظر سے مجھے دیکھتے لگا۔ میں نے جھوکی جب میں سے موبائل فون نکال کر اسے دکھایا اور کہا ”مجھے اس سٹیل کا چارجر چاہیے ہوگا۔“

جانوس نے مجھے اور لیان کو جو موبائل فونز دیے تھے وہ ایک ہی ٹیکسی کے تھے لہذا ایک چارجر ہم دونوں کے استعمال میں آ سکتا تھا۔ جانوس کے ساتھ ہی اس کی یادداشت اور معاملات بھی فٹا ہو گئے تھے چنانچہ ہم ان موبائل فونز کو پے فکری سے اپنے کام میں لا سکتے تھے۔ اس بات کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا کہ فوری طور پر کوئی ہمارے کنکشن کو بند کر دے گا۔ جب تک گاڑی چل سکتی تھی اسے چلانا چاہیے تھا۔

کاشاٹوک نے ہائی فائی ٹرائی بیڈ جی ایس ایم موبائل فون کو ہاتھ میں لے کر ٹھہری نگاہ سے دیکھا اور بولا ”ٹھیک ہے میں اس ٹیکسی کا چارجر لے آؤں گا۔۔۔۔۔ اور اسکرینج کارڈز بھی۔“ پھر ایک لمبے کو توقف دے کر اس نے

پوچھا ”تمہارے پاس لائن کون سی ہے؟“ میں نے اسے اپنے موبائل کا نمبر بتا دیا اور کہا ”اسے نوٹ کر لو۔ کسی ہنگامی صورت میں کام آئے گا۔ لیان کے پاس بھی اسی ٹیکسی کی لائن ہے۔“

اس نے میرا نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کرنے کے بعد اپنا نمبر بھی مجھے دے دیا اور بولا ”نیکسل والے اپارٹمنٹ میں تم لوگوں کا سامان بھی رکھا ہے۔ میں وہ بھی ساتھ لے آؤں گا۔ دیکھ اس کمرے کی الماری میں میرے کچھ کپڑے رکھے ہیں۔ فی الحال تم ان سے گزارہ کر لو۔ میں بھی ایک آدھ رات یہاں بھی ٹھہر جاتا ہوں۔“

”گزارہ تو ہم کر ہی گئے لیکن تم ہمارے سامان کو اسی اپارٹمنٹ میں ہی رہنے دو تو اچھا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”جانوس نے جو گنڈر پال کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا لہذا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ شک تمہاری طرف چلا جائے۔ تم ہمارے سامان کو نارتھ انداز میں جوں کا توں وہیں چھوڑ دو ہاں البتہ موبائل فونز والی جینٹل کو پہلی فرصت میں ضائع کر دینا۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ میں کل آتے ہوئے تمہارے لیے ضروری سامان اور کپڑوں وغیرہ کا بندوبست بھی کر دوں گا۔“

اس کے بعد وہ اپنی ٹیکسی میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ کاشاٹوک کے جانے کے بعد فلوچی ہمارے پاس آیا اور رات کے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ گزارہ چلاؤ انگریزی بول لیتا تھا۔ میں نے اس سے جو بھی مختصر گفتگو کی اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک بردبار اور معاملہ فہم انسان تھا۔ میں نے اسے کھانے کے بارے میں بتا دیا کہ دو گھنٹے بعد کھائیں گے۔ وہ ہمیں اس کمرے میں چھوڑ کر گھر کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔

میں نے لیان سے کہا ”کیا نہا نے کا موڈ ہے؟“ ہم نے ایک بجے دوپہر نیکسل والے اپارٹمنٹ میں پھر بوڑھا ہاتھ لیا تھا لیکن جو گنڈر پال والے جنگلے میں ہم جن حالات سے گزر رہے تھے وہ ایک طویل شاور کا تقاضا کر رہے تھے۔ تمکھن نے ہمارے جسموں کو بے حال کر رکھا تھا۔ پچھلے دو دن سے ہم باراماری میں اس قدر مصروف رہے تھے کہ پوری طرح آرام کرنے کا موقع ہمیں مل سکا تھا۔ اس حوالے سے آنے والی رات ہمارے لیے کسی خفے سے کم نہیں تھی۔ ہم بے فکری سے اپنی نیند پوری کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ اور سونے سے قبل اگر گرم شاور لے لیتے تو یہ سونے پہ سہاگا دالی بات

ہوتی۔

”اس میں موڈ کی کیا بات ہے۔“ اس نے جواب میں کہا ”میں ایک بھر پور ہاتھ کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں لیکن کیا نہانے کے بعد بھی ہم یہی لباس دوبارہ پہنیں گے؟“ اس کا سوال بہت احمق تھا۔ جواب دینے سے پہلے میں اس دیوار گیر الماری کی جانب بڑھ گیا جس کا ذکر کاٹھنڈو نے کیا تھا۔ میں نے مذکورہ چوبی الماری کھول کر اندر جھانکا۔ وہاں اچھے خاصے کپڑے موجود تھے جو باقاعدہ کسی لائڈری سے دھل کر آئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد جینز اور ہر قسم کی شرتس کی تھی۔ ایک جانب بیگر پر دو گرم جیکٹس بھی لٹکی دکھائی دیں۔ جینز ایک ایسا لباس ہے جسے مرد وزن ایک سا استعمال میں لاسکتے ہیں۔ کاٹھنڈو کی ہائیت ہم دونوں کے درمیان تھی۔ اس کی جینز میرے جسم پر تو چل جاتی البتہ لی پان کو پانچے فولڈ کرنا پڑتے۔ ٹھوڑا سا مسئلہ کر کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا بہر حال مجبوری شکر ہے کا نام ہے۔ سو کمرات گزارنے کے لیے وہ لباس برا نہیں تھا۔

”کام بن گیا!“ میں نے لی پان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پہلے تم شاور لے لو۔ بعد میں میں لوں گا اور اپنے لیے کسی لباس کا بھی انتخاب کرلو۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے الماری کی جانب اشارہ کر دیا ”نہانے کے بعد تمہیں میلا لباس پہننے کی ضرورت نہیں۔“

لی پان نے نظریہ ضرورت کے تحت اپنے لیے لباس منتخب کر لیا۔ جب وہ واش روم کی طرف جانے لگی تو میں نے کہا ”اٹھنا سنبھل مجھے دے دو۔“

اس نے اپنی جیب میں سے موبائل فون نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

میں اپنے سیل کو کافی استعمال کر چکا تھا لہذا اس کی بیٹری تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ جب کہ لی پان کے سیل کی بیٹری فل چارج شوکر رہی تھی اس نے موبائل فون کو برائے نام ہی استعمال کیا تھا اور وہ بھی کال سننے کی حد تک۔

اس وقت میں ربی موٹے ہاتھوں سے ہم کلام ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے جو گندور پال کے بچکے میں سے اس تک یہ اطلاع پہنچا دی تھی کہ وہ اپنے موبائل کو آن رکھے۔ میں ٹھوڑی دیر بعد اس سے رابطہ کر دوں گا۔ اور یہ ٹھوڑی دیر اب لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے میں بدل چکی تھی۔

میں ایک آرام جینز پر ایزی ہو کر بیٹھ گیا اور لی پان والے موبائل سے ربی موٹے ہاتھوں سے لی پان کے سیل پر فون کیا۔ شاید وہ بڑی بے تابی سے میری کال کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلی گھنٹی پر

ہی اس نے بسییشن دیا۔

”ہیلو!“ اس کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”بیڈ آفٹرن موٹے ہاتھوں!“ میں نے کہا ”تم تیلو لڑو نہیں کر رہے تھے؟“

”اوہ یہ تم ہو!“ اس نے میری آواز پہچان لی۔

”کیا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟“ میں نے سگائے والے انداز میں کہا۔

”تم نے اپنے جرائم میں بڑا سنگین اضافہ کر لیا ہے وجدان!“ وہ پھٹکارے سے مشابہ آواز میں بولا۔ میں نے ترکی پڑ کر کہا۔

”اور تم قدم قدم پر نیکیاں کما رہے ہونا؟“

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”بتاؤ تم نے

ڈین اور گلاڈیا کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے تمہیں ان کے حسرت ناک انجام کی خبر مل چکی ہے۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا ”وہاں جو گندور پال کے بچکے پر اسرائیل آرمی کے حملے کے چند افراد موجود ہیں جو تمہارے اشارے پر ہی حرکت میں آئے ہیں۔

تم یوں انجان بن کر اپنا دامن بچانے کی کوشش نہ کرو!“

”ہوں!“ اس نے ضمیر آواز میں کہا ”تم نے جو گندور پال کے بچکے کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے وہاں سے کافی دور ہو؟“ وہ ٹوٹنے والے انداز میں بولا۔

”اس بچکے سے تو کیا میں تمہارے وہم و گمان سے بھی دور کھل چکا ہوں۔“ میں نے اسے پکڑ دینے کی خاطر کہا ”تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں اس وقت کھنڈو سے باہر..... بلکہ نیپال سے باہر جا چکا ہوں۔“

”ناممکن!“ وہ قطعیت سے بولا ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”تم کسی خوش فہمی میں جلا رہے کے لیے میری طرف سے آزاد ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ بڑی رحمت سے بولا ”میں نے کھنڈو میں تمہارے لیے ایسا جال بچھا دیا ہے کہ تم اب کسی بھی راستے وہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ بہت جلد تمہیں پکڑ لیا جائے گا۔“

”ایسے کئی چال تم نے امریکا میں بھی میری راہ میں بچھائے تھے۔“ میں نے اس کے زخموں پر ہلکے پاشی کرتے ہوئے کہا ”لیکن دیکھ لو میں نے کس طرح تمہارے جالوں کا سواستیاناس مار کر رکھ دیا۔“ میں ایک لمحے کے لیے رکا پھر

اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہاری تعلیم سننے کے لیے فون نہیں کیا۔

بتاؤ میری ساحل کو کب واپس کر رہے ہو؟“

”تم جب چاہو گے ساحل مل جائے گی!“

”میں نے کب اس کی چاہت نہیں کی؟“

”تمہاری چاہت کھو چکی ہے وجدان!“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے کہا ”میں تمہیں ایک شرط پر ساحل دینے کو تیار ہوں۔“

”اور وہ شرط یہ ہے کہ میں خود کو تمہارے حوالے کر دوں۔“ میں نے غی سے کہا۔

”پہلے یہی شرط تھی لیکن اب میں نے تمہاری خاطر اپنے

مطالبے کو گھبراہٹ میں کر لیا ہے۔“

”میں تمہاری نری کا لفظی مظاہرہ دیکھنے کو بے قرار

ہوں۔“ میں نے طنز سے انداز میں کہا ”بتاؤ تم مجھ پر کون سی

مہربانی کرنے والے ہو؟“

وہ میرے ترش الفاظ کو براہ منہ بنائے بغیر ہی گیا اور ضمیر انداز میں بولا ”وجدان! تم نے مجھے یہودی قوم کو اور امریکا کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ تمہارے جرائم کی فہرست اتنی طویل اور سنگین ہے کہ تمہیں کم از کم پانچ سو سال کی سزائے سخت ملنی چاہیے۔“

”جاننا ہوں۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے

کہا ”تم لوگوں نے مجھے ”امریکا دشمن“ کا ٹائٹل دے رکھا

ہے۔ میں تمہاری نظر میں دہشت گرد نمبر ون ہوں اور

تمہارے لیے ”موسٹ وائنڈ“ کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں

لیکن یہ بھی تو دیکھو یہ سب کچھ تم ہی لوگوں کا کیا دھرا ہے!“

میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکھا پھر سلسلہ کلام کو

جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں نے جو کچھ بھی کیا“ خالصتہ خود

اختیاری میں کیا یا پھر تمہاری اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ذرا

اسنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لو۔ تم لوگ جو بھی کر دو

جرائم کی فتح کئی کھلانے کا اور تمہاری زیادتی و ظلم کے خلاف

اگر کوئی آواز بلند کرے تو تم لوگ اسے دہشت گرد قرار دے

دیتے ہو۔ تمہارا یہ خود ساختہ اصول بہت ہی منافقانہ اور

ظالمانہ ہے۔ درحقیقت تم لوگ اس زمین کے سب سے

بڑے غنڈے اور دہشت گرد ہو۔“

میں نے دل کا غبار نکالنے کے لیے ربی کو کمری کمری

سنا ڈالیں۔ وہ کھل لہجے میں بولا ”وجدان! تم بہت عمدہ

جذباتی تقریر کر لیتے ہو۔ بہر حال میں تمہیں بتا رہا تھا کہ

تمہارے سلسلے میں میں نے اپنی پانسی کو بڑی حد تک نرم کر لیا

ہے۔ میں تمہارے سنگین ترین تمام جرائم معاف کرنے کو تیار

ہوں اور اس کے ساتھ ہی ساحل کو بھی تمہارے حوالے

کر دوں گا۔ بس تمہیں میری صرف ایک بات ماننا ہوگی۔“ ”جلدی سے وہ بات بھی بتا دو۔“ وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”مجھے صرف وہ پانچ نایاب پتھر چاہیں گے جو بدھ تیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے میں محفوظ ہیں۔ ایک ہاتھ دوا ایک ہاتھ لو..... کے اصول کے مطابق تم وہ پتھر میرے حوالے کر دو میں ساحل کو تمہیں سونپ دوں گا۔“

وہ کم بخت میری ساحل کو رنگ پر رنگ پتھروں میں تول رہا تھا ایک انسان کو کئی میں رول رہا تھا۔ اس کی بات سن کر میں تاؤ میں آ گیا۔ میں نے کیلئے لہجے میں کہا۔

”تم تو اس دنیا کے سب سے زیادہ با اختیار انسان ہو۔

پھر ایک معمولی سے کام کے لیے میرے محتاج کیوں ہو؟“

”یہ معمولی کام نہیں ہے وجدان!“ اس کی آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا ”میرے تجربے اور مشاہدے نے مجھے بتایا ہے یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا یہ ظاہر دکھائی دیتا ہے..... اور میں اس نیچے پر بھی کچھ کیا ہوں کہ یہ شکل کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا!“

گویا ربی موٹے ہاتھوں نے مکمل کر اپنی ناکامی.... کا اعتراف کر لیا تھا۔

میں نے کہا ”ربی! تم بھی عجیب متغاد باتیں کر رہے ہو۔ ایک طرف کہتے ہو تم نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کھنڈو کے چپے چپے پر پہرے بٹھار کئے ہیں۔ اس کے

ساتھ ہی دوسری جانب یہ بھی وعدہ کر رہے ہو کہ اگر میں عبادت گاہ کے تہ خانے سے وہ پانچ قیمتی پتھر نکال کر تمہارے حوالے کر دوں تو تم بڑی شرافت سے میری ساحل کو آزاد

کر دو گے۔ یہ منافقانہ پن کی انتہا نہیں ہے؟“

”تمہاری سمجھ کا بہر پتھر ہے وجدان!“ اس نے غصے سے لہجے میں کہا ”دروغ میں نے تو ایک نہایت ہی سبیل بات کی ہے۔ تم جذبات میں بیٹے جا رہے ہو۔ شاید تم نے میری بات کو توجہ سے نہیں سنا۔“

میں نے کہا ”میں توجہ سے سنوں یا عدم توجہی سے اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے کوئی یاغریب دینے کی کوشش میں ہو۔“

”میں تمہاری بدگمانی کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔“ وہ

برہمی سے بولا۔

میں نے کہا ”علاج کی مجھے نہیں بلکہ تمہیں ضرورت ہے

اور تمہارا علاج میں ہی کر دوں گا۔“

”تم الٹی کھوپڑی کے آدمی ہو۔“ وہ میرے الفاظ کی کڑواہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”میں نے تم سے ایک سیدھی اور کھری بات کی ہے۔ تم بتائیں کیا کیا مطلب نکال رہے ہو؟“

”تم اور سیدھے..... اور کھرے بھی!“ میں نے استہزاء سے لہجے میں کہا ”میرا تہجد لگانے کو جی چاہ رہا ہے۔“

”تہجد لگانا یا رونا یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“ وہ ٹھنکی آہ لہجے میں بولا ”میں اپنی پیشکش کو ہر بار ہا ہوں۔ میری بات کو غور سے سنو۔“

میں نے کچھ نہ کہا اور سیل کو کان سے لگائے خاموش بیٹھا رہا۔

اسی دوران میں لی یان داش روم سے نکل آئی۔ مجھے سیل کے ساتھ مصروف دیکھ کر وہ چپکے سے بیڈ کے کنارے پر آ بیٹھی۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور رہی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”دجدان! اگر تم میرے مطلوبہ پانچوں پتھر عبادت گاہ کے نہ خانے سے نکال لاؤ تو میں جہاں تم کہو گے تمہاری ساحل کو وہیں پہنچا دوں گا۔ پہلے تم ساحل کو وصول کرنا پھر پتھر میرے آدمی کے حوالے کر دیتا۔ بولو منظور ہے؟“

”اور اس کے بدلے تم میری اگلی پہچانی ساری خطائیں معاف کر دو گے؟“

”بالکل!“ وہ طبیعت سے بولا ”تم اسے ایک صاف شفاف قسم کی سودے بازی سمجھ لو۔“

”میں اپنی مرضی سے سوداگری کرتا ہوں۔“ میں نے کہا ”اس لیے تمہاری پیشکش مجھے منظور نہیں۔“

”تم اپنی زندگی کے آخری گولڈن چانس کو گنوارا ہے ہو!“ اس کے لہجے میں دھمکی شامل ہو گئی۔

میں نے اسی کے انداز میں کہا ”میں اپنا اچھا بچا بھولتی سمجھتا ہوں۔ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو کہ وہ بستی پتھر تم اپنی زندگی میں بھی حاصل کر سکو گے۔ تم انہی کے تصور میں حسرت ناک موت مرد گے۔“

کاش اس وقت میں ڈیو یون پر رہی سے ہم کلام ہوتا۔ میرے جیسے الفاظ نے اس کے چہرے کے نفوس کو جس طرح بگاڑا ہوگا وہ نظارہ بڑا مخطوط کن ثابت ہو سکتا تھا۔ میں تصور میں اسے بیچ دتا ہوا کھاتے ہوئے دیکھ رہی ہوں تھا کہ اس کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی۔

”دجدان! میرے پاس طاقت اور اختیار کی کوئی کمی نہیں اور تم جوانی و تجربے کی طاقت سے مالا مال ہو۔ یاد رکھو

جب بھی اختیار اور جوانی کی طاقت آپس میں ٹکراتی ہے تو بڑی آفت چماتی ہے پھر سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔“

”یہ دونوں تو میں پہلے کچھ عرصے سے آپس میں ٹکراتی چلی آ رہی ہیں۔“ میں نے مقتدل انداز میں کہا ”اور فریقین اس ٹکراؤ سے خاطر خواہ نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔ تم اس وقت مجھے کون سی نئی پڑھا رہے ہو؟“

”افسوس!.....“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا ”اس وقت تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا اس لیے فائدے کی کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی بہر حال میں نے تمہارے سامنے جو پیشکش رکھی ہے وہ دھند دھند کے لیے ہے۔ اس کے بعد ہمارے درمیان مصالحت کی کوئی محاش باقی نہیں رہے گی۔“

میں نے دو ٹوک انداز میں اس پر واضح کر دیا ”دیکھو موٹے ہاتھن! یہ محترم اور قابل صد تقلید رہی تم دوسروں کے لیے ہو گے۔ میں اول آخر تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں چنانچہ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہاری کسی چال میں آ جاؤں گا۔ ان پانچ پتھروں کی طرف سے تو تم منہ دھو رکھو..... اور مجھے بھی دوست بنانے کی کوشش ترک کر دو۔“

میں سانس لینے کے لیے تھوڑا توقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”انجی بات یہ ہے کہ تم ان پتھروں کے حصول کے سلسلے میں بری طرح مایوس اور ناکامیاب ہو چکے ہو اس لیے میری منت خوشامد بر مجبور ہو جبکہ میں نے کبھی مایوس ہونا نہیں سیکھا۔ مجھے پورا یقین ہے میں ایک دن اپنی ساحل کو تمہارے چنگل سے ضرور آزاد کرالوں گا..... اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے۔ کیپ ان مانند موٹے ہاتھن!“

اس نے جھلا کر فون بند کر دیا۔ یہ بھی اس کی ناکامی... کا ایک نین جوت تھا۔

یہودیوں کی چال بازی اور مکاری پوری دنیا میں مشہور ہے۔ میں اگر یہ سوچتا کہ رہی میرے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتا ہے تو ایسا سوچنا سراسر حماقت ہوتی۔ اس کی رگوں میں کینہ پرورد اور فتنہ انگیز خون دوڑ رہا تھا۔ وہ میری ہمدردی اور بھلائی کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا۔ امریکا اور پوری یہودی قوم مجھے ایک خطرناک دہشت گرد قرار دے چکے تھے۔ یہ لوگ تو اپنے خلاف ایک لفظ بولنے والے کو معاف نہیں کرتے۔ اس پر ڈھیروں لائے سیدھے مقدمے بنا کر ساری زندگی کے لیے آگئی سلاخوں کے پیچھے فٹ

کر دیتے ہیں۔ میں نے تو رہی اور اس کی لابی کو جتنا نقصان پہنچایا تھا وہ دن رات اس کے شمار میں مصروف تھے اور اسے ضرب در ضرب کرنے کے پتھر میں تھے۔ میں رہی کی کسی سازش نہ چال میں کیونکر آ جاتا۔

لی یان میرے اور رہی کے درمیان جاری رسائی سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ بھی رہی کے لیے اپنے دل و دماغ میں بہت زیادہ غصہ رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کی المناک موت کا ذمے دار بھی رہی ہی تھا۔ میں نے سیل کو آف کر کے ایک طرف رکھا تو وہ میری جانب متوجہ ہو گئی۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں رہی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ گفتگو کا آخری حصہ اس نے بھی سن لیا تھا۔ میری بات مکمل ہوئی تو اس نے کہا۔

”دجدان! رہی کی کسی بھی طریقے سے جھمپیں اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ یہ نئی چال بھی اس نے اسی سلسلے میں چلی ہے۔“

میں نے کہا ”میں اس کی چال بازیوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔“

”تم نے اس سے ساحل کی خرید و بیعت بھی پوچھی؟“

”ہاں وہ اس کی قید میں ٹھیک ہے۔“

لی یان کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے یہ بات اپنی طرف سے کہہ دی تھی۔ اس کے علم میں نہیں تھا کہ میں کیسی میں سفر کے دوران میں ساحل کی خرید و بیعت معلوم کر چکا تھا۔ وہ یہ تو سمجھتی تھی کہ میں جب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو کسی خاص کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ کس کام میں.....؟ شاید اس بات کا اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں تھا۔ لی یان جتنی میرے تجربے میں آتی تھی اس کی بنا پر میں نے اسے بھروسے کے قابل پایا تھا۔ اس نے اب تک ڈٹ کر میرے دشمنوں کا صفایا کیا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ میری خاطر اپنی جان کو تو داؤ پر لگا سکتی ہے لیکن مجھے نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کے بارے میں میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ کسی مناسب موقع پر میں اسے اپنی آنکھیں بند کرنے کے ”راز“ سے آگاہ کر دوں گا تاکہ اس کا ذہن خواہ مخواہ کسی الجھن میں گرفتار نہ ہو۔

لی یان ایک بھر پور ہاتھ لے چکی تھی۔ اب میری باری تھی۔ رہی موٹے ہاتھن نے اپنی منہا تھانہ باتوں سے میرے دماغ کا درجہ حرارت خاصا بلند کر دیا تھا۔ لوہا لوہے کو کاٹنا ہے۔ میں بھی گرم شاور کے ذریعے اپنے وجود میں پھٹکی ہوئی چپل کو ٹھنڈا کرنے لگا۔

رات کا کھانا ہم نے آٹھ بجے کھایا۔ کاشانوک نے فلو جی کی بجا تعریف کی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی بہت لذت تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لی یان سے کہا۔

”باہر کاراؤنڈ لگانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اس ڈیس میں تو میں ہرگز باہر نہیں نکلوں گی۔“ اس نے جنوری کی طرف اشارہ کیا۔

میں زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ تھوڑا سا خفیف ہوئی تاہم خاموش رہی۔

بات دراصل یہ تھی کہ کاشانوک کا لباس میرے لیے تو بڑی حد تک مناسب رہا تھا۔ جنوری کی لمبائی ویسے بھی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے جس نے ہمارے درمیان قامت کے تفاوت کا مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن لی یان اس سلسلے میں خاصا ان ایزی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے جنوری کے پانچو تو موڑ لیے تھے لیکن ویسٹ پر اہم کر رہی تھی حالانکہ اس نے جنوری میں بیٹل بھی لگا لیا تھا۔ مگر میں ایک دواغ کا فرق ہوتا چل جاتا ہے مگر چار پانچ کا فرق بیٹل لگانے کے ہاں جو بھی ایک مصیبت گھڑی کر دیتا ہے۔ نتیجتاً ہم نے گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ پورا دن اور اس سے گزشتہ والی رات ہم نے مسلسل سفر اور مارا ماری میں گزاری تھی۔ اس دوران میں اگرچہ عبادت گاہ کی طرف سے کھنڈرات آتے ہوئے ہمیں تھوڑی نیند پوری کرنے کا موقع ملا تھا لیکن کسی آرام دہ بستر پر دراز ہو کر لی جانے والی پرسکون نیند اور چپ کی جھکولے دار سیٹ پر مجبوری کی حالت میں آ جانے والی نیند میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے چنانچہ جب ہمارے پیٹ میں خوش ذائقہ کھانے نے جگہ بنائی اور ہمارے سامنے فی الحال کوئی مصروفیت بھی دکھائی نہ دی تو جسم و جان کی ساری کھنکھن اچانک ہی ہم پر حملہ آور ہو گئی۔

لی یان نے ایک طویل بھائی لینے ہوئے کہا ”میرا توجی چاہ رہا ہے ایسی لمبی تان کر سوؤں کہ پھر روزِ شری آ کھ کھلے۔“

”تم لمبی تان کر ضرور سوجاؤ لیکن روزِ شری کو ذہن میں لانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کی نیند بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”بس زیادہ سے زیادہ کل صبح تک بیدار ہو جانا۔ ہمیں آئندہ کا پروگرام بھی بنانا ہے۔ میں تمہارے جاننے کے انتظار میں قیامت تک یہاں بیٹھا نہیں سو سکتا۔“

اس لطیف مذاق پر وہ دھیرے سے مسکرا دی اور کمرے

میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی ”ہم سوئیں گے کس طرح؟“

میں اس کے سوال کی تہ میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں درمیانے سائز کا صرف ایک ہی بیڈ بچھا ہوا تھا۔ اس بیڈ کے علاوہ ایک آرام چیز، چھوٹی سی ڈریسنگ ایک دیوار گیر چوبلی الماری وہاں موجود تھی۔ کمرے کا فرش قالین پوش تھا۔ لی یان نے ایک بیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے سونے والی بات کی تھی۔ میں ناراض وقت کی کلفت کو دھونے کے لیے تھوڑا غیر سنجیدہ ہو گیا، لی یان سے تفرقہ لیتے ہوئے کہا۔

”سونے کا ایک نہایت ہی آسان ٹوکان مجھے معلوم ہے!“ وہ ابھن زدہ نظر سے مجھ دیکھنے لگی ”تم کون سے ٹوکنے کی بات کر رہے ہو؟“

”کہیں بھی کمرے ہو کر یا بیڈ کر یا پھر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لو۔“ میں نے انتہائی سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ”اور بس..... سو جاؤ۔“

”وہ جان! کیا تم ایسے حالات میں بھی مذاق کر لیتے ہو؟“ وہ حیرت سے بولی۔

میں نے بھی حیران ہو کر پوچھا ”کیا ہنسی مذاق کے لیے کسی خاص قسم کے حالات درکار ہوتے ہیں؟“

”مم..... میرا مطلب تھا کہ.....“

”مطلب کی بات بعد میں کریں گے۔“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ”فی الحال سب سے اہم موضوع اور ضرورت ہماری نیند ہے۔ شرافت سے اس بیڈ پر لیٹ جاؤ اور پلک بھپکتے میں واڈی نیند میں اتر جاؤ۔“

”اور تم.....!“ وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی ”کیا تمہارا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟“

”میں آرام چیز پر اپنی نیند پوری کر لوں گا۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔

وہ معنی خیز انداز میں بولی ”یہ آرام چیز نہیں آرام چیز ہے!“

”تم نے سنا نہیں نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے؟“

”تو پھر اس سولی پر مجھے ہی چڑھنے دو۔“

”یہ نہیں ہو سکتا لی یان!“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“

میں نے اس سے بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور نالے والے انداز میں کہا ”میں تھوڑی دیر بعد سوؤں گا۔ اگر

آرام چیز پر نیند نہ آ سکی تو نیچے قالین پر لیٹ جاؤں گا۔ فی الحال میں فلو جی سے تھوڑی کپ شپ کرنے جا رہا ہوں۔ تم اطمینان سے بیڈ پر سو جاؤ۔“

اس نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی اور جا کر بستر پر دراز ہو گئی۔ میں کمرے سے جانے لگا تو اس نے کہا ”جلدی آ جانا وچدان!“

”کیا تمہیں میری غیر موجودگی میں ڈر محسوس ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی ”میں تمہارے آرام اور نیند کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے“ میں تمہاری بات کو ذہن میں رکھوں گا۔“ میں نے اس پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”بہر حال! میرا اتنا خیال رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔“

وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

کاشانوک نے فلو جی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اعتماد اور مجھ دے کا آدمی ہے لیکن میں اس رائے پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جس نوعیت کے سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان میں بعض اوقات اپنے سائے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں بے ہمارے کسی دشمن کا ہولا تو نہیں۔ لہذا فلو جی کو چیک کرنا از حد ضروری تھا۔ فلو جی اس گھر اور گھر میں قیام کر۔ نے والوں کی حفاظت اور نگہداشت پر مامور تھا لہذا جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس کا کمر آٹھ بائی دس فٹ کا رہا ہو گا۔ یہ گھر کے ابتدائی حصے میں لمبوترے ڈرائنگ روم کے سامنے واقع تھا۔ ڈرائنگ روم کی پینٹش میرے اندازے کے مطابق کوئی آٹھ مربع چوبیس فٹ کے قریب تھی جس کے ایک حصے میں بڑی سی ڈرائنگ ٹیبل بھی بچھی ہوئی تھی۔ ہم نے ڈرائی ٹیبل پر کیا تھا۔ مذکورہ ٹیبل پر بیک وقت درجن بھر افراد بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ ڈرائنگ کم ڈرائنگ روم کی سینگ بے ان کیسٹ ہاؤس کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی۔

میں لگ بھگ آدھے گھنٹہ تک فلو جی کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا رہا اور کاشانوک کی رائے سے اتفاق کرنے کو تیار ہو گیا۔ فلو جی اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سادہ مزاج فرض شناس اور قادرِ قیاس تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں میرا حدسہ بالکل درست ثابت ہوا۔ میں نے اس کی صورت کو دیکھتے ہوئے بچپن سے ساٹھ تک کا اندازہ قائم



کیا تھا لیکن وہ میرے خدشے کے عین مطابق ستر کا ٹکڑا تھا۔  
تبت اور چین کے ہاں خاصے مرد دراز اور عمر چروا دیے ہوئے  
ہیں۔

جب میں فلوچی کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں واپس  
آیا تو ایک حیرت انگیز منظر نے میرا استقبال کیا۔ کمرے کی  
لائٹ آن تھی اور لی بان سگری کئی ہوئی آرم چیئر کے اندر  
گھسی بیٹھی تھی۔ میں یہی سمجھا شاید وہ میرے انتظار میں جاگ  
رہی ہے۔ اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ اسے کمرے میں  
ڈرہوس نہیں ہوگا لیکن اس حوالے سے میں غور تو کی ایک  
مخصوص نفسیات سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے کمرے کا  
دروازہ بند کرتے ہوئے یہ آہستگی اسے آواز دیا "لی  
یان.....!"

جب اس نے میری پکار کا جواب نہ دیا تو میری حیرت دو  
چند ہوئی۔ کرسی کی پشت میری جانب تھی چنانچہ میں فوری طور پر  
اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں لپک کر اس کے سامنے پہنچ  
گیا۔

وہ گھٹنوں کو پیٹ میں دبائے اور غور سے دیکھنے پر  
بے خبر سو رہی تھی۔ میں جب فلوچی کی طرف گیا تھا تو دست پر  
لیٹی ہوئی تھی۔ میری جانے کے بعد وہاں سے اٹھ کر اس  
کرسی میں دھکی گئی اور مقصد بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ چاہتی  
تھی، میں آرام سے بیٹھ رہا ہوں۔

یہ ممکن تھی کہ میں آرام سے پچھل کر پورے بیڈ پر  
سوؤں اور وہ بے سکوئی سے آرم چیئر میں گھسی رہے وہ موسم  
سرمایہ کی ایک سردرات تھی۔ سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے  
کمرے میں ہیٹنگ سسٹم موجود تھا لیکن اس کے باوجود بھی  
کچھ نہ کچھ اوڑھنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے وہاں گرم  
کپڑے موجود تھے۔

میں چند لمبے خاموش کھڑا سوئی ہوئی لی بان کو دیکھتا رہا۔  
اس کی سانس لینے کی آواز کمرے میں ابھر رہی تھی جس سے پتا  
چلتا تھا، وہ گہری نیند میں ہے۔ پہلے میرے جی میں آئی کہ  
اسے جگا کر بستر کی طرف جانے کو کہوں لیکن پھر میں نے یہ  
ارادہ ترک کر دیا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ خند کر سکتی تھی کہ  
میں ادھر بستر پر سو جاؤں۔

میں ایک فوری خیال کے تحت نیچے جھکا اور دونوں طرف  
سے ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ  
میری اس عمل سے کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ میرا خدشہ  
غلط ثابت ہوا۔ میں نے اسے کسی بے خبر سوئے ہوئے بچے  
کے مانند اٹھا کر کرسی سے باہر نکال لیا۔ میرا ایک بازو اس کی

گردن کے نیچے اور دوسرا گھٹنوں کے نیچے تھا۔ میں نے اسی  
طرح اٹھائے اٹھائے اسے لاکر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔

وہ واقعی گہری نیند میں تھی۔ میں نے غمگینی کی صورت  
مجھے ہی اسے بستر پر ڈالا وہ اسی پوزیشن میں بے حس و حرکت  
پڑی رہی۔ میں نے گھٹنوں پر مڑی ہوئی اس کی ٹانگوں کو بہ  
آہستگی سیدھا کر دیا اور اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔

لی بان نے جینو کو کمر پر سہارا دینے کے لیے چوڑے ہیکل  
والا بیلٹ لگا لیا تھا اور احتیاط میں وہ اس حد تک کڑی تھی کہ اس  
نے بیلٹ کو کچھ زیادہ ہی ٹانگ کر دیا تھا۔ حکم سیری کے بعد  
ظاہر ہے، بیلٹ کا پھیلاؤ بڑھ جاتا ہے لہذا وہ بیلٹ ضرورت  
سے زیادہ ٹانگ ہو گیا تھا، خاص طور پر اس کا چوڑا دھاتی ہیکل  
لی بان کے پیٹ میں بڑی بے دردی سے دھسا ہوا تھا۔ وہ  
گہری نیند میں نہ ہوتی تو اس دھن کو فوراً محسوس کر لیتی۔ میں  
نے بے خبری کی اس تکلیف سے اسے نجات دلانے کا فیصلہ  
کر لیا۔

میں نے یہ آہستگی وہ بیلٹ کھول ڈالا۔ اس کی کمر جکڑ  
سے آزاد ہو گئی اور جینو، عرب گلوکارہ شاکرہ کی جینو کا نقشہ  
پیش کرنے لگی۔ میں نے ایک لمحوں اس کے پیٹ پر سے نگاہ  
ہٹائی اور اسے گرم کپڑے اوڑھانے کے بعد آرم چیئر کی طرف  
آگیا۔ لی بان کی کیفیت کو دیکھ کر میری کن پٹیاں سلگنے لگی  
تھیں۔

میں آرم چیئر میں بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔  
یوگا کے مخصوص سانس لینے کے انداز میں جب میں نے ان  
جمل اور ایگزیکٹیل کیا تو میرے وجود میں پھیلنے والے انتشار کو  
قرار آ گیا۔ پرانا کام کی مشق نے مجھے شانت کر دیا۔

میں غور سے دیکھتا رہا اس طرح خاموش بیٹھا رہا پھر آنکھیں  
کھول دیں۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ ذرا نیلگہری کی خبر لینا  
چاہیے۔ اس نے یہ کیا تھا شاکرہ لگا رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے  
وہ چپ چاپ میرے پاس آنے لگی تھی حالانکہ کراچی میں  
جب ہماری آخری ملاقات ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بڑے  
واجح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ اب از خود بھی میرے پاس نہیں  
آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس ہالیو کی گود میں آنے پر مجبور  
کر دے گی اور اس وقت میں ہالیو کی گود سے چند کلومیٹر کے  
فاصلے پر ٹھنڈو میں تھا۔ ان حالات میں خواہ مخواہ ذہن یہ  
سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کہیں میں نیلگہری کے چلائے  
ہوئے کسی چکر میں پھنس چکا ہوں تو ادھر کھینچا چلا نہیں آیا؟  
یہ ظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے امریکا سے ٹھنڈو  
تک پہنچنے کی فحش و جہالت تھیں اور اس مشن میں میرے

ساتھ اور بھی بہت سارے لوگ شامل تھے لیکن ملکہ کو سار  
نیلگہری سے بھی کچھ بعید نہیں تھی۔ وہ عظیم ساحرہ تھی اور ہر قسم کا  
محر چھوٹنا جانتی تھی۔ افسوس کہ اس کا کوئی جادو مجھ پر نہ چل سکا  
اور اسی سبب وہ مجھ سے خفا ہو کر چلی گئی تھی۔

میں کچھ عرصہ پہلے تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے  
ناراض ہے لیکن اس کی دوبارہ پراسرار آمد و شد نے مجھے غصے  
میں ڈال دیا تھا۔ اگر واقعی وہ مجھ سے خفا تھی تو دوبارہ میرے  
پاس کیوں آنے لگی تھی اور اگر ناراض نہیں تھی تو پھر وہ پراسرار  
انداز میں خاموشی سے آکر کیوں چلی جاتی تھی۔ اچھی شام  
میں، جو گندہ پال کے بنگلے سے اس طرف آتے ہوئے بھی  
میں نے نیلگہری میں اس کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ اس کے  
بدن کی مخصوص خوش بو میری سانسوں کے راستے تن میں  
اتر کر مجھے سرشار کر رہی تھی۔ پتا نہیں، یہ کیا عظیم تھا؟

میں اس ساحرہ کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، ذہن اتنا  
ہی الجھتا چلا جاتا۔ تیسری آنکھ کے توسط سے میں نے جب بھی  
اس کے ماحول میں جھانکنے کی کوشش کی، مجھے کام یابی حاصل  
نہیں ہو سکتی تھی۔ اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی کا مزہ چکنا پڑا۔

ابھی تک نیلگہری اور رلی موٹے ہاتھن ہی دو ایسی  
ہستیاں تھیں جن تک میں اور میری قرقر آئی رسائی حاصل نہیں  
کر سکتی تھی اور یہ دونوں اپنے شیعے کے مہاسا کرتے۔ پتا نہیں،  
انہوں نے میری رسائی کی راہ میں اپنے عمل کی کون سی دیوار  
جھین اٹھا رکھی تھی!

رلی کا خیال آئے اور ساحل کی یاد نہ سٹائے، یہ بھلا کیسے  
ہو سکتا تھا! میں نے بند آنکھوں کے پیچھے قرقر آئی کو زحمت دی  
اور ہلک جھپٹتے اسی مہلت میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔  
اسرائیل کے وقت کے مطابق اس لمحے شام کے ساڑھے  
پانچ بج رہے تھے۔ ساحل اسی کمرے میں دکھائی دی جہاں  
گزشتہ دو مرتبہ میں نے اسے پایا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور  
ایک ایڑی چیئر پر بیٹھی لی دی دیکھ رہی تھی۔ لی دی پر اس وقت  
اسپورٹ کا کوئی پردہ گرام نشتر کیا جا رہا تھا۔ حسب معمول وہ  
کمرے میں تھامی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میں جب بھی اس  
کے ماحول میں پہنچتا تو وہ ابھی ہوتی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس  
کے علاوہ کوئی اور شخص اس کمرے میں قدم ہی نہ رکھتا ہو۔ کھانا  
اور اس کی ضرورت کی دیگر اشیا تو اسے کسی انسان کے توسط  
ہی سے پہنچائی جاتی ہوں گی!

میں بڑی دل چسپی اور دل ربائی کے ساتھ اسے لی دی  
دیکھتے ہوئے ٹکرا رہا۔ وہ بہت ہی پرسکون اور مطمئن نظر آ رہی  
تھی۔ ان لحاظ میں مجھے اس پر بہت پیارا آیا۔ جی میں آئی کہ

میں کوئی پرندہ بن جاؤں اور پرواز کرتے ہوئے آن واحد  
میں اپنی ساحل تک پہنچ جاؤں مگر عملاً یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ میں  
دل سوس کر رہ گیا۔ پھر یہ کہتے ہوئے خود کو تسلی دی کہ چلو، یہ  
بھی غنیمت ہے کہ میں اس تک رسوائی حاصل کرنے  
کے قابل ہو گیا ہوں ورنہ پہلے تو رلی نے ظلم کی انتہا کر رہی  
تھی۔

میں نے دل ہی دل میں ساحل کو بڑی محبت سے پکارا  
..... مگر نہ کرو تجمہاری اسیری کے بہت ہی کم دن باقی رہ گئے  
ہیں۔ میں بہت جلد تجمہارے پاس اسرائیل پہنچنے والا ہوں اور  
تجمہارے رلی موٹے ہاتھن کی قید سے نکالنے والا ہوں۔ ہماری  
جہائی کی گھڑیاں اختتام پذیر ہو رہی ہیں۔ اب کوئی ہمیں ملنے  
سے روک نہیں سکتا!

میں جانتا ہوں، میرے یہ جذبات اور عزائم ساحل تک  
نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن اس اظہار سے میں خود کو بہت پرسکون  
محسوس کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی چند روز بعد اپنی  
ساحل کے پاس ہوں گا۔ ان احساسات کا تعلق میری سوچ  
اور ارادے سے تھا۔ میں نے ہر قیمت پر اسرائیل میں داخل  
ہونے کا مصمم فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے صدیقین تھا، میں  
ایسا کرگزروں گا!

میں نے آنکھیں کھولیں تو لی بان سے نظریں چار  
ہوئیں۔ اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی  
میں نے اسے گہری نیند میں اس کرسی میں سے نکال کر وہاں  
بیڈ پر پہنچایا تھا۔ پتا نہیں، وہ کب اور کیسے بیدار ہو کر میرے  
پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ میری ابھن اور حیرت زبان پر  
آگئی۔

"لی بان! تم گہری نیند سو رہی تھیں؟" میں نے سوالیہ  
انداز میں کہا۔

وہ خوار آلود جمائی لیتے ہوئے بولی "تم ٹھیک کہتے ہو۔  
میں واقعی بے خبر سو رہی تھی۔ پتا نہیں اس کرسی سے بیڈ پر کیسے  
پہنچ گئی!"

"میں نے جھپٹتے اٹھا کر وہاں ڈالا تھا۔" میں نے  
وضاحت کی۔

"کمال ہے! مجھے ذرا پتا نہیں چلا!" اس نے سرفی مائل  
آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "اس لیے کہ تم باقی گھوڑے بچ کر سو رہی  
تھیں۔"

"تم کب واپس آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔  
"چندہ میں منٹ ہوئے ہوں گے۔"

اس نے ایک اور محمور جماعتی اور خاصی بے تکلفی سے بولی ”چلو یہ کرسی خالی کر دو۔ میں یہاں سوؤں گی۔“ اس کا لہجہ جتنی تھا ”تم ادھر بیٹھ کر جا کر سو جاؤ۔“

”یہ مناسب نہیں کہ میں بیٹھ کر سوؤں اور تم کرسی میں پڑی اکڑی رہو۔“ میں نے کہا۔

”میں بھی یہ ٹھیک نہیں سمجھتی ہوں کہ تم کرسی پر بے آرام ہوتے رہو۔“

”چلو میں نیچے قالین پر بستر لگاتی ہوں۔“

”پھر میں بھی نیچے سو جاتی ہوں۔“

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ میں بولی ”ہم دونوں ایک جیسے تھے ہوئے ہیں اور تمہارا تو بڑا بھی زنجی ہے۔ تمہیں مجھ سے زیادہ آرام وہ بستر کی ضرورت ہے یا تو ہم دونوں بیٹھ کر سوئیں گے یا پھر نیچے قالین پر۔ میں تمہیں تکلیف میں ڈال کر آرام نہیں کروں گی۔“

اس کے لہجے کی قطعیت نے مجھے یاد کر دیا کہ اگر میں نے اس کی تجویز پر غور نہ کیا تو وہ خود بھی بے آرام ہوگی اور مجھے بھی بے آرام کرے گی۔ میں آرام اور پرسکون نیند کی اشد ضرورت تھی لہذا اس کی بات ماننے پر تیار ہو گیا۔

بیڈ کی موجودگی میں قالین پوش فرش پر رات بسر کرنا خاصا ناانہیکشیک تھا چنانچہ ہم بستر پر ڈبل گرم کپڑوں میں دبک کر موسم کی شدت کا مقابلہ کرنے لگے۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی اجلی اور گھری گھری سی تھی!

گزشتہ رات کے بھرپور آرام اور پرسکون نیند نے ہمارے جسم میں سرایت کرنے والی محسوس کو چپکے سے زائل کر دیا تھا۔ ہم خود کو بہت ہلکا ہلکا اور زندگی سے معمور محسوس کر رہے تھے۔ شہنشاہی ہمارے موسم میں گرم شادروں نے ہمارے بدن میں مزید تازگی بھری۔ اس دوران میں قلوبی نے ہمارے لیے ناشتا لگا دیا۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو کاشالوک آگیا۔ وہ آج بھی اسی ٹیکسی سے آیا تھا جس کے ذریعے کل شام ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں اس سے پوچھنے پر تیار نہ تھا۔

”کیا فارغ وقت میں تم یہ مشغول بھی کرتے ہو؟“

وہ میرا اشارہ سمجھ سکا اور اصرار نہ کرنے لگا۔

”میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔“

”میرا مطلب ہے“ کیا تم ٹیکسی ڈرائیور بھی کرتے ہو؟“

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ”یہ میرے ایک دوست کی ہے۔ ہنگامی حالات میں استعمال کے لیے میں بھی کبھی اس سے لے لیتا ہوں۔ اس قسم کی صورت حال میں یہ خاصی محفوظ سواری ہے۔“

وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ میں نے استفسار کیا ”شہر کی لیا خبریں ہیں؟“

”کھنڈ و شہر اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے۔“ اس نے جواب دیا ”لیکن تم دونوں کے لیے حالات انتہائی ناسازگار ہو چکے ہیں۔ شہر کے ایک ایک انچ پر تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہاں جو گنڈر پال کے بیٹے پر جو کچھ ہوا ہے اس پر پولیس ہیڈ کوارٹر میں بڑی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ دو سرانہ سیکورٹی محاذ کا سہارا نہ ملنے کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ بات تمہاراں میں ہے!“

وہ لہجے میں کھنڈ و شہر کا سوالیہ لہجہ تھا مجھے دیکھنے لگا۔ میں جواب میں خاموش رہا تو وہ خود ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جانوس اور جو گنڈر پال آپس میں بدترین حریف ہیں۔ بنگلانہ کے ٹو ہنڈ ریڈ میں پیش آنے والا خوفناک واقعہ پولیس سے چھپا نہیں رہا۔ عوام کی سوچ یہ رہا تھا کہ یہ واقعہ اس کی طرف اشارہ ہے۔“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”جو گنڈر پال چار ہونٹ بڑی مصیبت میں آگیا ہوگا!“

”ہاں عوامی سطح پر یہی صورت حال ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”لیکن جو گنڈر پال کو اس کی زیادہ پر ادھیڑیں۔ وہ جن طاقت ور اسیروں کا آلہ کار بنا ہوا ہے وہ حقیقت سے واقف ہیں لہذا جو گنڈر کے لیے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ وہ عوامی ڈراموں سے بخوبی نمٹ لے گا۔ پولیس والے اسے پریشان نہیں کر رہے اس کے لیے یہ اطمینان بخش بات ہے۔“

”اس کا مطلب ہے پولیس والے بھی یہودی لابی کے دباؤ کے تحت کام کر رہے ہیں؟“ کیان نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو کو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

کاشالوک اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا ”تمہارے لیے یہاں کے حالات کیسے ہیں۔ تم جانوس کے خاص آدمی تھے؟“

”جو گنڈر پال یہ بات جانتا ہے کہ میں جانوس سے وابستہ تھا۔“ اس نے جواب دیا ”لہذا اس نے مجھ سے رابطہ

کر کے مجھے اپنے بیٹے پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں مختصر بتایا ہے اور تاکید کی ہے کہ میں اب اس کے پاس آ جاؤں ورنہ میری جان کو بھی خطرہ ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بنگلہ پر رکھنا چاہتا ہے۔“

”پھر تم نے اس کی تجویز کے جواب میں کیا کہا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ہمارے درمیان گزشتہ رات بات ہوئی تھی۔“ کاشالوک نے بتایا ”اور میں نے اس سے کہا تھا کہ میں کل کی وقت اس کے پاس آ جاؤں گا۔ یعنی آج!“ وہ لہجے میں کھنڈ و شہر کا سوالیہ لہجہ تھا ”میں اگر جو گنڈر کے بیٹے پر یا اس کے ساتھ رہوں گا تو مجھے اس کی سرگرمیوں کی تازہ ترین اطلاعات ملتی رہیں گی۔ اس طرح میں تمہیں ان کی ہر حرکت کے بارے میں آگاہ کرنا رہوں گا۔ ہمارے درمیان سیلر رابطہ رہے گا تو کافی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ تمہارے خیال میں میں نے درست فیصلہ کیا ہے نا؟“

”تم پہلے بھی دشمنوں کی مفوس میں مجھے بیٹھے تھے اور یہ بھی اسی نوعیت کا فیصلہ ہے۔“ میں نے پھر خیال انداز میں کہا ”وہ اس سلسلے میں تمہیں ڈاکٹر مونگ سے مشورہ کرنا چاہیے!“

”اس سے میں مشورہ کر چکا ہوں۔“ اس نے بڑے رسان سے کہا ”اسے میرا فیصلہ بہت پسند آیا ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا ”تم آج کب تک جو گنڈر پال کی طرف روانہ ہو گئے؟“

”میں نے دوپہر کے بعد ادھر جانے کے بارے میں سوچا ہے۔“

”ہمارے کام کا کیا ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک درمیانے سائز کے بیک کو کھول لیا۔ یہ بیک وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس بیک میں ہمارے لیے کی گئی تازہ ترین شاہنگ کا سامان بھرا ہوا تھا۔ یہ سامان ہمارے لباس، میک اپ کی ضروری اشیاء اور موہاں چارجر پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے موہاں فون میں جو سیلر لائن استعمال ہو رہی تھی اس کے مختلف اسکریننگ کاڈز بھی شامل تھے۔ بیک کے اندر کھنڈ و شہر کے شائع ہونے والا منظر کا ایک اخبار بھی رکھا تھا۔ کاشالوک نے وہ اخبار نکال کر ہمارے سامنے پھیلا دیا اور ہمارے بارے میں چھپنے والی خبروں کی نشان دہی کرنے لگا۔

ان خبروں کے مطابق ”وہ جان نامی ایک خطرناک پاکستانی دہشت گرد پچھلے دو تین دن سے کھنڈ و شہر میں سرگرم عمل تھا۔ وہ اپنی ایک فلپائی ساسی لی یان کے ہمراہ امریکا سے یہاں پہنچا تھا۔ ان دونوں مجرموں نے وہاں امریکا میں بھی شہر دار اور ادا تیں کی تھیں۔ ان کی زندگی کا مقصد امریکا خصوصاً یہودیوں کو شدید ترین نقصان پہنچانا ہے۔ ہمارے مشن کو انتہائی خوفناک قرار دیا گیا تھا۔“

اس کے بعد ڈین ہاروے اور کلاڈیا کی موت کا بڑا وحشت ناک نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جو گنڈر پال کے بیٹے پر جو واقعات پیش آئے انہیں یہ بائگ ویل ہم سے منسوب کر کے کھنڈ و شہر کے عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ہم پر گہری نظر رکھیں اور ہم جہاں کہیں بھی دکھائی دیں وہ فوراً پولیس کو مطلع کر دیں۔ ان خبروں کے ساتھ ہی میری اور لی یان کی تصاویر بھی شائع کی گئیں تھیں جو پھیلتی رہنے کے احکام پر متعلقہ افراد نے اخبار والوں کو فراہم کی ہوں گی۔

میں انتہائی خطرناک ثابت کرنے کے لیے اخبار نے دو چار اور واقعات بھی ہم سے جوڑ ڈالے تھے جن میں جانوس کے پاؤں کا گارڈ ڈرائیور کھٹکا کی موت، کماری چوک پر پیش آنے والے خون ریز واقعات رتھ پارک کے بیٹے میں پھیلنے والی امتری ہائی دے پر ہونے والی معرکہ آرائی، ہستی میں رونما ہونے والا خوفناک واقعہ اور بدھ تیل کنڈ والی عبادت گاہ میں برپا ہونے والی قیامت شامل تھی۔ عوام کے دلوں میں ہمارے لیے غم و غصے کا چاگر کرنے کے لیے عبادت گاہ کے تقدس وغیرہ کا بڑا بڑا چھڑکھنڈ و شہر دیا گیا تھا۔

دیے یہودی بڑے ہی شاطر اور مکارانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔ یہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنا جانتے ہیں۔ اس اخبار کی خبروں میں ہمارے کردار کو بالکل الٹ کر دکھائی انداز میں پیش کیا گیا تھا جس کی تردید کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری ایسی کوئی بھی حرکت خود ہمارے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی۔ سامنے آتے ہی ہمیں دھریا جاتا۔

عوام کا ذہن بتانے میں اخبارات اور نیوز چینلوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر امریکا کی اجارہ داری ہے۔ آپ اسے صحافت اور سیاست کا عامی غنڈا کہہ سکتے ہیں۔ عوام چاہے کسی بھی ملک کی ہو وہ ”بے چاری“ ہی ہوتی ہے۔ ان کا ڈن بھڑکا ہوتا ہے۔ وہ حالات اور تصاویر کے پیچھے چھپے ہوئے حقائق تک رسائی نہیں رکھتے چنانچہ اخباری خبروں

کی سنسنی خیزی کو دیکھتے ہوئے وہ اسی پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ آج کے اخبارات میں شائع ہونے والی ہماری خبروں نے عوام کے دلوں میں ہمارے لیے نفرت بھردی ہوگی۔ خصوصاً عبادت گاہ میں پیش آنے والے واقعات نے انہیں جذباتی صدمات سے دوچار کیا ہوگا اور..... ان کی نظر میں اس انفس ناک واقعے کے ذمے دار صرف اور صرف ہم تھے!

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور اخبار کو ایک طرف پھینک دیا۔ کاشاٹوک نے کہا ”یہ تو وہ باتیں ہیں جو عوام تک پہنچانی مافی ہیں۔ اس کے علاوہ نیپالی پولیس کے ذریعے یہودی تم لوگوں کے خلاف جو کارروائی کر رہا ہے وہ زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے تم حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہو۔“

”تم تو جہاں بھی جاتا ہوں حالات خود بخود سنگین ہو جاتے ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولا ”ظاہر ہے یہ اخبار بودھ تانھ دلی میں بھی پہنچا ہے۔ یہاں بدھ مت افراد کی اکثریت آباد ہے اور یہ لوگ عبادت گاہوں کے تقدس کے حوالے سے بہت حساس ہوتے ہیں۔ میں چونکہ خود بھی بدھ مت ہوں اس لیے یہ بات زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ عوام چونکہ حقائق کی اصل تصویر سے عموماً بے خبر ہوتی ہے لہذا اس دلی کے لوگ بھی اس وقت تم دونوں کے خلاف بھرے بیٹھے ہوں گے۔ ان حالات میں میرا مشورہ یہی ہے کہ تم لوگ اس گھر سے فی الحال باہر نکلنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ کوئی بھی شخص اپنے مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر یا پھر کسی انعام کے لالچ میں تمہارے لیے کوئی سنگین مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے!“

میں کاشاٹوک کی بات کو بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ یہودی لائی مقامی پولیس کو ناسل پر رکھ کر یہاں بھی ہمارے خلاف سرگرم ہو گئی تھی۔ یہ رہی کا اسلی چہرہ تھا۔ وہ منافقت کا نقاب لگا کر بڑے دوستانہ انداز میں مجھ سے سودے بازی بھی کر رہا تھا اور دوسری طرف میرے خلاف اس کی سنگین کارروائی بھی جاری تھی۔ اگر میں یہودی ذہنیت اور رہی کی مکاری سے آگاہ نہ ہوتا تو اس کی باتوں پر یقین کر کے کسی بھی لمحے بے موت مارا جاتا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا ”کاشاٹوک! فلوجی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس کے دل میں انعام حاصل کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہو سکتی؟“

”وہ سب سے زیادہ مجھ پر اعتبار کرتا ہے۔“ وہ ٹر احتاد لہجے میں بولا ”میں اسے حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔ لہذا

تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”ہوں!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کاشاٹوک نے پوچھا ”وہاں! ویسے تمہارے ذہن میں آجہدہ کے لیے کیا پروگرام ہے؟“

”میں پہلی فرصت میں کھٹنڈو سے کل کر اسرائیل پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لیے تمہیں ایک آدھ دن انتظار کرنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔

”ڈاکٹر سوگ نے کہا تھا تم اس سلسلے میں میری ہر قسم کی مدد کرو گے۔“ میں نے کہا ”مجھے نیپال سے اسرائیل تک پہنچنے کے لیے اہم کاغذات کی ضرورت پیش آئے گی جن میں سر فہرست پاس پورٹ کا معاملہ ہے۔“

”کیا تم دونوں ایک ساتھ ہی اسرائیل جانا چاہتے ہو؟“

”ڈاکٹر سوگ کی خواہش تو یہی ہے!“

کاشاٹوک ڈاکٹر سوگ کے لیے کام کرتا تھا اور اس کا وقادار تھا۔ وہ ڈاکٹر کی خواہش کے آگے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ غمیرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا ”تم دونوں کے ضروری کاغذات اور پاس پورٹ وغیرہ ہونا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن میں اس سلسلے میں تم دونوں کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا اور اس کی ایک وجہ بھی ہے۔“

”پہلے وجہ بتاؤ اور پھر مشورہ دو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ”کھٹنڈو کے حالات کا تم نے بخوبی اندازہ لگایا ہے۔ میری معلومات کے مطابق کھٹنڈو سے باہر نکلنے والے ہر شخص کی اور ذہنی راستے پر تمہاری تلاش کے لیے انتہائی سخت چیکنگ کا بندوبست کر دیا گیا ہے، خصوصاً کھٹنڈو ائر پورٹ تو تمہارے لیے بہت خطرناک ہو چکا ہے اور اسرائیل جانے کے لیے تمہیں ائر پورٹ کو استعمال کرنا ہوگا۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رک کا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اب میرا مشورہ بھی سن لو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی اور ملک سے اسرائیل کے لیے پرواز کرو۔“

”یعنی تمہارا مطلب ہے ہم نیپال سے پہلے کسی اور ملک میں جائیں؟“

”بالکل! میرا یہی مطلب ہے!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

لی یان نے کہا ”آئیڈیا اچھا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی نگاہیں کھٹنڈو یا زیادہ سے زیادہ نیپال کے ائر پورٹس پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر ہم کسی طرح نیپال سے نکل کر کسی اور ملک میں پہنچ جائیں تو وہاں سے زیادہ محفوظ انداز میں اسرائیل کی طرف پرواز کر سکتے ہیں۔“

”میرے ذہن میں بھی یہی ہے۔“ کاشاٹوک نے کہا ”میں چاہتا ہوں تم دونوں کے پاس پورٹس اور دیگر ضروری کاغذات بھی اسی ملک کی مناسبت سے تیار کروائے جائیں جہاں سے تم اسرائیل روانہ ہو گے تاکہ تمہارے دشمنوں کو ذرا سا بھی شک نہ ہو اور تم بحیرہ عافیت اسرائیل پہنچ جاؤ۔“

میں نے تقریبی نگاہ سے کاشاٹوک کو دیکھا۔ آئیڈیا وہ واقعی بہت عمدہ لایا تھا۔ میں نے پہلی ملاقات میں اس کی آنکھوں میں ذہانت کی جو چمک دیکھی تھی وہ اب اس کا عملی ثبوت بھی دے رہا تھا۔ تاہم میرے ذہن میں کچھ باتیں کلک رہی تھیں۔ اپنی تسلی کے لیے میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”تمہارے خیال میں نیپال سے نکل کر ہمیں کس ملک میں جانا چاہیے اور کیا وہاں تمہارے لیے یہ آسانی ہوگی کہ تم ہمارے پاس پورٹس اور دوسرے ضروری کاغذات تیار کروا سکو؟“

وہ غمیرے ہوئے لہجے میں بولا ”نیپال سے قریب ترین ممالک میں انڈیا، بنگلہ دیش، بھوٹان اور تبت کا شمار ہوتا ہے اور..... میرے خیال میں ان میں تبت ایک ایسا ملک ہے جہاں کام کرنے کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ آسانیاں حاصل ہوں گی۔ میں خود بھی تبت کے مشہور شہر لہاسا کا رہنے والا ہوں۔ میں اپنے تعلقات کے ذریعہ وہاں کی مناسبت سے تمہارے ضروری کاغذات تیار کروا سکتا ہوں۔ اگر تم دونوں کو تبت کی شہریت حاصل ہو جائے تو پھر لہاسا سے اسرائیل کی طرف مود کرنا تمہارے لیے انتہائی آسان اور محفوظ ہو جائے گا۔“

تبت نیپال کے شمال میں واقع تھا۔ میں نے اس ٹراسر اور سر زمین سے متعلق بہت سی حیرت انگیز داستانیں سن رکھی تھیں۔ کاشاٹوک نے تبت کا ذکر کیا تو از خود میرے دل میں خواہش جاگی کہ مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے۔ ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے میں نے کاشاٹوک سے پوچھا۔

”کیا لہاسا سے اسرائیل کے لیے کوئی ڈائریک فلائٹ ہے؟“

”میں معلوم کر لوں گا۔“ وہ ہونٹ سیکھتے ہوئے بولا۔

”ویسے لہاسا (LHASA) اور کھٹنڈو کے درمیان تو باقاعدہ پروازیں آتی جاتی ہیں۔“

میں نے استفسار کیا ”کھٹنڈو سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناک بندی کر دی گئی ہے اور بڑی شدت سے ہمیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ہم کھٹنڈو سے تبت تک کیسے پہنچیں گے؟“

”اس مسئلے کا حل میں سوچ چکا ہوں۔“ وہ غمیر آواز میں بولا ”کھٹنڈو سے تبت کی طرف اور تبت سے ادھر بدھ یاتریوں کے چھوٹے بڑے قافلے سفر کرتے رہتے ہیں خصوصاً بودھ تانھ کے اسٹوپا میں ان کا لازمی آنا ہوتا ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں آج کل میں ادھر سے کون سا قافلہ تبت کی طرف جا رہا ہے۔ چاہے ہمیں ایک دو دن تک انتظار کیوں نہ کرنا پڑے لیکن یہ ذریعہ سفر ہمارے لیے زیادہ محفوظ رہے گا۔“

”کیا ہم ٹرین کے ذریعے کھٹنڈو سے تبت تک نہیں جاسکتے؟“ لی یان نے پوچھا۔

میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا ”نیپال میں ریلوے کا نظام وجود نہیں رکھتا لہذا ٹرین کے چلنے یا رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

کاشاٹوک مزید دس منٹ تک ہمارے پاس رک کا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”میں معلومات حاصل کر کے کھٹنڈو کھٹنڈے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بدھ یاتریوں کا کوئی قافلہ کب یہاں سے روانہ ہونے والا ہے۔“

میں نے کہا ”کاشاٹوک! تمہارے ترتیب دیے ہوئے پروگرام کے مطابق تو تم بھی ہمارے ساتھ تبت جاؤ گے۔ کیا اس صورت میں یہاں کھٹنڈو میں تمہارے لیے مسائل کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ جو گندہ پال تمہارے لیے کوئی مشکل تو پیدا نہیں کر دے گا؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”جو گندہ نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سوگ کی ہدایت کے مطابق جو گندہ سے ہاں بھری ہے۔ اس فیصلے کو بدلنا بھی جاسکتا ہے۔ جو گندہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ تو نہیں رکھ سکتا۔ میں نے تو ادھر کی ”خیر خیر“ رکھنے کے لیے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا۔ بہر حال!“ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رک کا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس سلسلے میں مجھے ڈاکٹر سوگ سے ضرور مشورہ کرنا ہوگا۔“

رضعت ہو گیا۔

کاشا نوک کے جانے کے بعد ہم اس بیک کا معائنہ کرنے لگے جو وہ ہمارے لیے لایا تھا۔ وہ میرے اوڑنی پان کے آؤٹ فٹ کا خیال رکھتے ہوئے مختلف لباس بھی خرید لایا تھا۔ لی یان نے اپنے تاپ کی ایک جھوٹائی اور بڑبڑاتے ہوئے واشر روم کی جانب لپک گئی۔

”میں پہلے اس تینو سے تو نجات پاؤں!“

تبہو کا لفظ اس نے شاکرہ فیم اس جھوٹے لیے استعمال کیا تھا جو اس کی کمر پر بے حد ڈھکی تھی۔ میں بے ساختہ زہر لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ جھجکا ہٹ میں گویا شاکرہ سے شکر یہ بننے جا رہی تھی!

میں نے اپنے موبائل فون کو چار جگہ پر لگانے کے لیے جیب سے نکالا تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ اس کا اسکرین بالکل ڈیڑھ ہور ہا تھا جیسا کہ عمو موبائل کو آف کرنے کے بعد ہو جاتا ہے لیکن مجھے انجی طرح یاد تھا کہ میں نے سیل کو آف نہیں کیا تھا۔

میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ ممکن ہے بیڑی ختم ہو جانے کے بعد یہ خود بخود آف ہو گیا۔ میں نے اس خیال کی تصدیق کے لیے لی یان کے موبائل کا معائنہ کیا تو وہاں بھی یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ اب میری حیرت دو چند ہو گئی۔ میں نے رات اسی سیل پر بری سے بات کی تھی اور بات کے اختتام پر سیل مناسب بیڑی شوکر رہا تھا۔ جب یہ الجھی ہوئی صورت حال میری سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے دونوں موبائل کو ایک طرف رکھ دیا اور لی یان کے واشر روم سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ باہر آئی اور میری ”فرمائش“ پر اس نے اپنے اور میرے موبائل کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد یہ توئی صادر کر دیا ”سم کارڈز کام نہیں کر رہے۔ لگتا ہے ہمارے کنکشنز منسوخ کر دیا گیا ہے!“

سیل کے حوالے سے میری معلومات لی یان سے زیادہ نہیں تھیں۔ لہذا اس کے تونے کو ماننا پڑا اور اس کے ساتھ ہی میرا حیان رہی ہوئے سائمن کے وسیع وسیع اختیارات کی طرف چلا گیا۔ میں نے رات لی یان والے موبائل سے رہی کو کال کی تھی۔ لازمی بات ہے یہ نمبر اس کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔ یہ دونوں موبائل فون ہمیں ختم مکانی جالوں نے فراہم کیے تھے تو لی یان کے کنکشنز اسی کے حاصل کردہ تھے۔ میں نے جو گنڈر وال دالے بیگلے میں جالوں سے تمام تر گنگو اپنے سیل سے کی تھی لیکن میرا نمبر اس کی کال ریسیونگ سے نہیں بچتا

چا سکتا تھا۔ میری دہشت نے وہاں بیگلے میں اسے اتنا بکھلا دیا تھا کہ اس نے اپنا سیل ایک دیوار سے دے مارا تھا جس کے نتیجے میں اس کی بیڑی کھل کر دروازے جا گری تھی گویا ریسیونگ ریکارڈز ایک جھگڑے سے تلف ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم دونوں کے نمبر اوپر پہنچے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا میری کی وجہ سے یہ معلوم کر لیا گیا ہو کہ یہ دونوں کنکشنز جالوں نے حاصل کیے تھے۔ بہر حال جو بھی صورت رہی ہو حقیقت یہ تھی کہ ہمارے موبائلز درست استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔

ہم موجودہ صورت حال پر غور و خوض کرتے رہے لیکن اس مسئلے کا کوئی حل سامنے نہ آ سکا۔ اب یہ تو ہمیں سکتا تھا کہ ہم موبائل کنکشن والوں کے پاس پہنچ جاتے اور انہیں کھری کھری سناتے کہ انہوں نے ہمارے سم کارڈز کیوں ہلاک کر دیے ہیں۔ یہ گویا از خود کسی بڑی معصیت کو گلے لگانے والی بات ہوتی۔ اگر رہی کے اشارے پر ہمارے کنکشنز منسوخ کیے گئے تھے تو پھر اس بات کے قوی امکانات موجود تھے کہ مختلف کسٹمرز سرورس سینٹر پر ہماری گرفتاری کا معقول بندوبست بھی موجود ہوگا۔

دوپہر کے کھانے سے تھوڑی دیر پہلے کاشا نوک ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے شکوہ کیا ”میں کافی دیر سے تم دونوں کے نمبر ڈرائی کر رہا تھا لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ مجبوراً مجھے خود یہاں آنا پڑا۔ کیا تم لوگوں نے اپنے موبائل آف کر رکھے ہیں؟“

”ہاں ہمارے فون آف کر دیے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب ہے دجہ ان؟“ وہ الجھ کر رہ گیا۔

میں نے وضاحت کر دی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر دونوں موبائلز کو مختلف طریقوں سے ”چیک“ کرنے لگا۔ بالآخر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے ہمارے خدشات کی تصدیق کر دی۔ کبھی کی جانب سے ہمارے سم کارڈز ہلاک کر دیے گئے تھے۔ نتیجتاً یہ کام کسی اونچی سوسر سے کیا گیا تھا کیونکہ جالوں کو اب زندہ نہیں رہا تھا۔

کاشا نوک نے کہا ”وچدان! تم فی الحال میری سم استعمال کرلو۔ میرے پاس ایک اور کنکشن بھی ہے۔ میں اس سے گزرا رہا چلاؤں گا۔ بعد میں سمجھ جائیں گے۔“

مجھے بات تو یہ ہے کہ موبائل فون میری فوری ضرورت نہیں تھی۔ میں جلد از جلد کنکشنڈ سے نکل کر اسرائیل پہنچنا چاہتا تھا، باقی سب باتیں جالوی اور فروی تھیں۔ میں نے

کاشا نوک سے کہا۔

”موبائل فون کے موضوع کو بعد میں ڈسکس کریں گے، پہلے تو یہ بتاؤ ہمیں فون کیوں کر رہے تھے؟“

اس نے جواب دیا ”میں نے تم لوگوں کے بہ حفاظت کنکشنڈ سے نکل کر ریت کھینچ کر بندوبست کر لیا ہے کل صبح سات افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ بودہ نا تھا اسٹوپا سے روانہ ہوگا۔ اس قافلے میں پانچ مرد اور دو عورتیں شامل ہیں۔ تم دونوں کو شمولیت کے بعد یہ تعداد بڑھ کر نو ہو جائے گی، یعنی چھ مرد اور تین عورتیں میں نے قافلے کے سردار بدھ بکشو تھا جو کوآئینا میں نے کساری صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے لہذا پریشانی دالی کوئی بات نہیں۔“

”ایک منٹ!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا ”کیا تم ہمارے ساتھ تبت نہیں جا رہے ہو؟“

”میں تو ضرور جاؤں گا“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”پھر یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ قافلے میں شامل افراد کی تعداد اوس ہو جائے گی!“

”اوہ سوری!“ وہ چونک کر بولا ”میں خود کو شمار کرنا بھول گیا تھا۔“

”لیکن دیکھو ہم ہرگز جہیں نہیں بولے“ لی یان نے زہر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد کاشا نوک ہمیں بدھ صفت قافلے کے بارے میں تفصیلاً بتاتا لگا۔ بدھ بکشو ”تھاچو“ ان کا راہ نما تھا۔ وہ سب بدھ کے پیروکار تھے اور کنکشنڈ سے تبت کی طرف جا رہے تھے۔ اس طرح کے چھوٹے بڑے قافلے ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے رہتے تھے۔ لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور جنی الامکان ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ جس طرح ہر مذہب میں، اس مذہب کے عالم کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ایسے ہی بدھ کے پیروکار بھی ان راہبوں اور بدھ بکشوؤں کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ یہ جہاں بھی جاتے، ان کے کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے اور آرام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، یہ الگ بات کہ یہ لوگ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں اور آرام و آسائش سے انہیں بدھ واسطے کا بھر ہے۔ بہر حال، ہم ایسے کسی قافلے کی معیت میں، دشمنوں کی نظروں میں آئے بغیر بہ حفاظت تبت پہنچ سکتے تھے۔ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک سبب بن گیا

تھا۔

کاشا نوک نے مزید بتایا ”کل علی الصباح یہ قافلہ بودہ نا تھا اسٹوپا سے روانہ ہو جائے گا۔ ہمیں ان کی روادگی سے پہلے قافلے میں پہنچنا ہوگا۔ یہ لوگ یہاں سے سیدھے بدھانکا تھا پہنچیں گے۔ مذکورہ مقام کنکشنڈ سے نو گھنٹہ شمال میں، شیو پوری ہل کے دامن میں واقع ہے۔“ بدھانکا تھا ”میں تھوڑے آرام اور ایڑاڑا کے بعد قافلہ آگے روانہ ہوگا اور وہاں سے کم و بیش چار گھنٹہ شمال میں سفر کرنے کے بعد ہم سندری جل پہنچ جائیں گے۔“ سندری جل ”پہاڑی آبشاروں پر مشتمل ایک حسین اور دل کش وادی ہے۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے ہم تھوڑا سا ساڑا دیہہ تبدیل کریں گے اور تبت کی سرحد پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے ”کوداری“ پہنچ جائیں گے۔“

”کیا یہ واقعی قصبہ کوادری ہے جو چائنا روڈ پر واقع ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اضطرابی لہجے میں کہا۔

”کوداری“ کے ذکر پر اچانک مجھے مایامتی یاد آگئی تھی۔ میں نے مایامتی کے ساتھ ماسی میں بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ مایامتی کنکشنڈ کے ٹیکو اسپتال میں نرس تھی۔ وہ تبت کی سرحد کے نزدیک، چائنا روڈ پر واقع کوادری قصبے کی رہنے والی تھی اور کئی سال پہلے کنکشنڈ میں آئی تھی۔ مایامتی کو یاد کر کے میرا دل افسردہ ہو گیا کیوں کہ وہ اب آنجہانی ہو چکی تھی!

کاشا نوک نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ”پائلکل، میں اسی کوادری کی بات کر رہا ہوں۔ کیا تم اس سے واقف ہو؟“

”صرف نام کی حد تک واقف ہوں، وہاں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا“ میں نے بوجھل آواز میں کہا ”میری ایک دوست کا تعلق اسی قصبے سے تھا جو اب زندہ نہیں۔“

لی یان نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن خاموش رہی۔ کاشا نوک نے کہا ”ہمیں اس قافلے میں شامل ہونے کے لیے خاص اہتمام بھی کرنا ہوگا۔ بدھ بکشوؤں دالے مخصوص لباس کا میں بندوبست کر لوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک قربانی جہیں بھی دینا ہوگا دجہ ان!“

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے پوچھا۔

”کیسی قربانی؟“

”سمجھیں میری طرح سر کے بال منڈا دنا ہوں گے!“

”اوہ!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

کاشانوک نے غم سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ تمہاری سیفٹی کے لیے بہت ضروری ہے۔ دشمن جتنے خطرناک انداز میں جگہ جگہ تمہارے تلاش میں گھات لگائے بیٹھے ہیں انہیں جمل دینے کے لیے پتہ کرنا ہوگا۔“

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے، میں یہ کرلوں گا۔“

لی یان میرے اس فیصلے پر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میری نگاہ میں کئی سال پہلے کا ایک ایسا ہی منظر گھوم گیا۔ اس وقت میں بارہ تیرہ سال کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ دارا اور اس کے حواری میرے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔

چاچا پر تاب سنگھ میرے والد کا ایک سچا اور مخلص دوست تھا۔ وہ دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مجھے سنگ پور سے انڈونیشیا اور انڈونیشیا سے تھائی لینڈ لے کر آیا تھا۔ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں چاچا پر تاب کے استاد محترم مہاراج وانگ وانگ دنگ یانے کا ایک بہت بڑا مارشل آرٹس سینٹر تھا۔ چاچا نے مجھے مہاراج کے پاس تربیت کے لیے چھوڑا اور خود زندگی ہار گیا۔ انہی دنوں میرا سر موٹہ دیا گیا تھا اور مجھے موٹک والا لباس بھی پہنایا جاتا تھا۔ اب میں بچہ رہا تھا، نہ ہی چاچا...

پر تاب سنگھ اور مہاراج وانگ وانگ دنگ یانے اس دنیا میں باقی رہے تھے۔ سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا۔

کاشانوک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ”میں رات کو دیر سے کسی وقت یہاں آ جاؤں گا۔ پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے ہم اپنی تیاری مکمل کر لیں گے۔ آپ لوگ اس منصوبے پر عمل کرنے کو تیار ہونا؟“

”ڈن!“ میں نے ہر اعتماد لہجے میں کہا۔

میں نے جو فیصلہ سنایا تھا وہ لی یان کے لیے بھی قابل قبول تھا۔

کاشانوک نے جانے سے پہلے اپنے سیل میں سے سم کارڈ نکال کر مجھے دے دیا، اور بولا ”تم لی یان اس سے کام چلاؤ۔ میں دوسرا نمبر استعمال کرلوں گا۔ ہمارے درمیان رابطے کا وسیلہ ہر حال ضرور ہوتا جائے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سم کارڈ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

مشکل خیز ہو سکتی تھی۔

میں نے اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں جاننے کے لیے پوچھا ”کیا بات ہے لی یان! تم مجھے معنی خیز نظر سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

جواب میں وہ بے طرح ہنس دی۔

اس کی اس حرکت پر مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا ”یہ کیا مذاق ہے لی یان؟“

اس نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور تھقبے پر تھقبے لگاتی چلی گئی۔ اب میں انہیں محسوس کرنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے جینے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس کا جن اتارنا مجھے آ گیا تھا۔ میں نے تجربہ سنز پھونکا تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

جب وہ اعتماد پر آئی تو میں نے پوچھا ”اب بتاؤ تم مجھے دیکھ کر کتنی کیوں چلی جا رہی تھیں؟“

”میں تمہیں دیکھ کر تھوڑی ہنس رہی تھی!“ وہ خوشی سے بولی۔

”پھر؟“ میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

”میں تو گھنے وجدان کو دیکھ رہی تھی۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی ”وجدان! تم سرمٹو وا کر کیسے لگو گے؟“

”جیسے دوسرے“ فارغ البال لگتے ہیں۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا ”کاشانوک کو نہیں دیکھا؟“

”کاشانوک کی بات دوسری ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی ”اسے تو میں نے اول آخر بغیر ہالوں کے ہی دیکھا ہے۔ اس لیے میرے ذہن میں اس کا ایک تاثر بن گیا ہے مگر تم.....!“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر بھینے لگی۔

میں نے کہا ”گہری کھیتی ہے“ کچھ ہی دنوں بعد سر ہنرود شاداب نظر آنے لگے گی۔“

پتا نہیں وہ میری بات کے منہم تک پہنچی کہ نہیں البتہ اس کی شوخ و شرارہنسی میں کوئی خاص کی واضح نہ ہوئی۔ میں مطمئن تھا کہ وہ جنونی انداز کے تہمتوں سے باہر نکل آئی تھی۔ اب اسے کسی مجرب نسخے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

کسی سرگرم اور عملی انسان کو اگر چند گھنٹوں کے لیے فارغ بنادیا جائے تو وہ خود کو اپنا چرما محسوس کرنے لگتا ہے۔ میری ساری زندگی بے پناہ مصروفیت میں گزری ہے اور مصروفیت بھی ایسی کہ ایک ایک لمحہ میرا دل جگ کا آئینہ بناتا ہے۔

میں نے غم سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ تمہاری سیفٹی کے لیے بہت ضروری ہے۔ دشمن جتنے خطرناک انداز میں جگہ جگہ تمہارے تلاش میں گھات لگائے بیٹھے ہیں انہیں جمل دینے کے لیے پتہ کرنا ہوگا۔“

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے، میں یہ کرلوں گا۔“

میری نگاہ میں کئی سال پہلے کا ایک ایسا ہی منظر گھوم گیا۔ اس وقت میں بارہ تیرہ سال کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ دارا اور اس کے حواری میرے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔

چاچا پر تاب سنگھ میرے والد کا ایک سچا اور مخلص دوست تھا۔ وہ دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مجھے سنگ پور سے انڈونیشیا اور انڈونیشیا سے تھائی لینڈ لے کر آیا تھا۔ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں چاچا پر تاب کے استاد محترم مہاراج وانگ وانگ یانے کا ایک بہت بڑا مارشل آرٹس سینٹر تھا۔ چاچا نے مجھے مہاراج کے پاس تربیت کے لیے چھوڑا اور خود زندگی ہار گیا۔ انہی دنوں میرا سر موٹہ دیا گیا تھا اور مجھے موٹک والا لباس بھی پہنایا جاتا تھا۔ اب میں بچہ رہا تھا، نہ ہی چاچا...

پر تاب سنگھ اور مہاراج وانگ وانگ دنگ یانے اس دنیا میں باقی رہے تھے۔ سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا۔

کاشانوک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ”میں رات کو دیر سے کسی وقت یہاں آ جاؤں گا۔ پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے ہم اپنی تیاری مکمل کر لیں گے۔ آپ لوگ اس منصوبے پر عمل کرنے کو تیار ہونا؟“

”ڈن!“ میں نے ہر اعتماد لہجے میں کہا۔

میں نے جو فیصلہ سنایا تھا وہ لی یان کے لیے بھی قابل قبول تھا۔

کاشانوک نے جانے سے پہلے اپنے سیل میں سے سم کارڈ نکال کر مجھے دے دیا، اور بولا ”تم لی یان اس سے کام چلاؤ۔ میں دوسرا نمبر استعمال کرلوں گا۔ ہمارے درمیان رابطے کا وسیلہ ہر حال ضرور ہوتا جائے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سم کارڈ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

کسی سرگرم اور عملی انسان کو اگر چند گھنٹوں کے لیے فارغ بنادیا جائے تو وہ خود کو اپنا چرما محسوس کرنے لگتا ہے۔ میری ساری زندگی بے پناہ مصروفیت میں گزری ہے اور مصروفیت بھی ایسی کہ ایک ایک لمحہ میرا دل جگ کا آئینہ بناتا ہے۔

میں نے غم سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ تمہاری سیفٹی کے لیے بہت ضروری ہے۔ دشمن جتنے خطرناک انداز میں جگہ جگہ تمہارے تلاش میں گھات لگائے بیٹھے ہیں انہیں جمل دینے کے لیے پتہ کرنا ہوگا۔“

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے، میں یہ کرلوں گا۔“

میرا آخری جملہ سوالیہ انداز کا حامل تھا۔ اس نے پوچھا ”جو گنڈر پال کے کون سے حوالے کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے جواب دیا ”جو گنڈر نے تمہیں اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی تھی نا۔ کل صبح تم ہمارے ہمراہ یہاں سے روانہ ہو رہے ہو۔ اپنی روانگی کو کس طرح جسنی فانی کرو گے؟“

”اوہ..... ہاں!“ وہ ایک گہری سانس لینے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر مونگ سے تذکرہ کیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ میں جو گنڈر سے ہفتے بھر کی چھٹی لے لوں۔ اس طرح سارے معاملات بخوبی منٹ جائیں گے۔“

”بھرتم نے اپنی چھٹی منظور کر لی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میں نے اس سلسلے میں جو گنڈر پال سے بات کی ہے۔“ اس نے بتایا ”وہ اس بات کے لیے راضی ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میں چند روز کے لیے اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں واپس آ کر اس کی خدمت میں جت جاؤں گا۔ اس نے مجھے گاؤں جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے اسے بتادیا ہے کہ کل صبح میں کھنڈو سے کل جاؤں گا۔“

”لیکن تمہیں تو آج رات کسی وقت ہمارے پاس آنا ہے؟“

”ہاں وہ تو ہے!“ اس نے جواب دیا۔ ”بھرتم بڑ نہیں ہو جائے گی؟“

”کیسی گڑبڑ؟“

”جو گنڈر پال تمہارے رات ہی کو غائب ہو جانے پر تشویش میں مبتلا ہو سکتا ہے!“ میں نے کہا۔

وہ بے پروائی سے بولا ”جو گنڈر پال اس وقت بہت زیادہ مصروف ہے۔ مجھے نہیں امید کہ دوبارہ اس سے میرا سامنا ہو۔ اسے میرے غائب ہو جانے کی خبر نہیں ہو سکے گی۔ اس طرح یہ معاملہ بھ جائے گا۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جو گنڈر پال کے ایک دوسرے بنگلے پر۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ! تو کیا تم شیوالی اسٹریٹ میں واقع بنگلا نمبر ہے۔ دوسو نہیں ہو؟“

”میں اس وقت جو گنڈر کے جس بنگلے میں ”ڈیوٹی“ دے رہا ہوں وہ شیوالی اسٹریٹ سے کافی فاصلے پر واقع

ہے۔“ کاشانوک نے جواب دیا ”مذکورہ بنگلا اردوڑا کالج کے نزدیک ہے اور اس بنگلے کا نمبر ہے آر۔ ٹوٹھی!“

کاشانوک یہ ایک نئی اطلاع دے رہا تھا۔ اردوڑا کالج دراصل دلی بازار سینٹرل ایگریکیشن آفس اور ریشن ایجنسی کے وسط میں واقع تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”ادھر سے ادھر تمہاری منتقلی کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”میں وجہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ کاشانوک نے پراسرار انداز میں جواب دیا ”اس بنگلے پر میں نے کچھ خفیہ سرگرمیاں محسوس کی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے آج رات یہاں کچھ ہونے والا ہے۔“

اس کی بات سن کر میرے کان کڑے ہو گئے۔ میں نے زور دے کر کہا ”اپنے کام سے لگے رہو..... اور جیسے ہی کوئی اہم بات تمہیں معلوم ہو فوراً مجھے اطلاع دینا۔“

”ٹھیک ہے دھدان! میں بعد میں تمہیں کال کروں گا۔“ وہ آواز دبا کر بڑے مختصراً انداز میں بولا ”کوئی میری طرف آ رہا ہے۔“

”وش یو لڈ لک!“

میرے دعائیہ کلمات کے ساتھ ہی اس نے سیلوں رابطہ منقطع کر دیا۔

کاشانوک کے اس بہیم مگر سنی خیر انکشاف نے مجھے بے چین کر دیا۔ اس تمام تر گفتگو کے دوران میں لی یان میرے قریب موجود رہی تھی۔ میں نے سب کو ایک طرف رکھا تو وہ میرے چہرے پر بچھلی ہوئی تشویش کو دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔ وہ ایک طرز گفتگوں پائی تھی اس لیے بھی زیادہ الجھ رہی تھی۔

”خیریت تو ہے دھدان؟“

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

میں چونکہ خود بھی اس بارے میں ابھی زیادہ نہیں جانتا تھا لہذا ہماری گفتگو قیاسات تک محدود رہی۔ اسی دوران میں فلوچی نے ہمیں اطلاع دی کہ رات کا کھانا میز پر لگایا جا چکا ہے۔

سرد موسم میں انسانی جسم کو زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے لہذا نظام انہضام کا کارکردگی کی گنا بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجے میں زیادہ جھوک لگتی ہے۔ ہم نے دو چہرے کے کھانے کے بعد ایک لمبی چوڑی نیند لی تھی اس کے باوجود بھی میں اس وقت ابھی خاصی جھوک محسوس کر رہا تھا۔

ہم نے ڈنٹ کر ڈنٹ کر ایک اور ایک مرتبہ چہرے کمرے میں آ گئے۔ فلوچی نے ڈانٹک کم ڈرانگ روم ہی سے ہمیں

”گنڈ نائٹ“ بول دیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ جب تک جاگ رہا ہے پوری طرح چوکنار ہے اور سونے سے پہلے کمر کیوں دروازوں کو ابھی طرح چیک کر لے۔

”آپ نگر نہ کریں جناب۔“ وہ سینہ جھلاتے ہوئے بولا ”میں نصف صدی سے چوکیداری اور نگرانی کا کام کر رہا ہوں۔ آپ پورے اطمینان کے ساتھ جا کر سو جائیں۔ رات کو جس وقت بھی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو آپ بے دھڑک میرے پاس آ سکتے ہیں۔ میں رات میں نہیں بلکہ دن میں نیند پوری کر لیتا ہوں۔“

کمرے میں آنے کے بعد ہم نے دروازے کو بند کر لیا۔ اس وقت ہم دونوں میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی لہذا فوری طور پر سوئے گا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہم گزشتہ رات اور آج دن میں کئی روز کے بعد پڑ سکون نیند سو سکتے تھے ایک گہری اور آسودگی سے بھرپور نیند!

لی یان نے نرسنگ کورس کر رکھا تھا اور میڈیکل کے شعبے میں اس کی معلومات اور تجربہ کسی کو الی فائیڈ ڈاکٹر سے کم نہیں تھا۔ ذرا فرصت میری آئی تو وہ میرے بازو کی تمارداری میں لگ گئی۔ کاشانوک سے ہم نے فرسٹ ایڈ کا ضروری سامان بھی منگو لیا تھا جو اس وقت کام آ رہا تھا۔

ڈاکٹر مونگ کے ساتھ رہتا پارک والے بنگلے سے ہائی وے والی ہستی کی طرف جاتے ہوئے دشمنوں سے جو مارا ماری ہوئی تھی اس میں میرے ہاتھیں بازو کا ڈرائیو سپر ڈیجی ہو گیا تھا جو اس وقت لی یان کے ہاتھوں تمارداری کا ”لطف“ اٹھا رہا تھا۔ لی یان کی شخصیت میں کئی تضاد پائے جاتے تھے۔ وہ ایک طرح سے مجموعہ تضادات بن کر رہ گئی تھی۔ میدان کارزار میں وہ مارشل آرٹس کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے تہ مقابل کے چٹکے چھڑا دیتی تھی لیکن جبروت کی تمارداری کے دوران میں وہ موسم کی گڑبائی جانی نازک اور نرم و ملائم۔ معمولی سی آج اس کی نرمی میں کئی گنا اضافہ کر دیتی۔ اسے پہلے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ

دلی لی یان ہے، مکی میدان میں جس کے ہاتھ پاؤں تیز دھات جڑوں کے مانند شاخیں میں شائیں کرتے ہوئے دشمنوں کا مفاہیا کرتے چلے جاتے ہیں۔

جب تک وہ میری مرہم پٹی میں مصروف رہی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی انگلیوں میں سمجائی کا ایسا انداز اور کس کا ایسا گداز نہاں تھا کہ اس کے چھوٹے ہی پیار خود کو شفا یاب ہوتا محسوس کرنے لگتا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو مجھ سے پوچھا۔

”اسے میری مرہم پٹی میں مصروف رہی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی انگلیوں میں سمجائی کا ایسا انداز اور کس کا ایسا گداز نہاں تھا کہ اس کے چھوٹے ہی پیار خود کو شفا یاب ہوتا محسوس کرنے لگتا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو مجھ سے پوچھا۔“

”تم نے بتایا ہے مایامی اب اس دنیا میں باقی نہیں۔“ لی یان کی کریم کا سلسلہ جاری رہا ”اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں

”یہ مایامی کون تھی؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دن میں جب کاشانوک نے کوادری قصبے کا ذکر کیا تو میں نے اسے بتایا تھا کہ میری ایک دوست کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔

کاشانوک کے جانے کے بعد لی یان نے میری اس دوست کا نام پوچھ لیا تھا اور مزید تفتیش اب کر رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”تمہاری طرح مایامی بھی ایک نرس تھی..... اور میری ایک اچھی دوست تھی۔“

”کیا تم مجھے بھی اپنی ایک اچھی دوست سمجھتے ہو؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متفہم ہوئی۔

”اس میں شک والی کون سی بات ہے؟“ اٹا میں نے اسی سے پوچھ لیا ”کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتی ہو؟“

”میں اپنے نہیں تمہارے احساسات جاننا چاہتی ہوں؟“ وہ ڈلی رہی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”ہم قربت کی جن منزلوں سے گزر چکے ہیں وہ مضبوط دوستی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ میں اپنے احساسات کو اس سے زیادہ واضح انداز میں بیان نہیں کر سکتا۔“

”ہوں!“ وہ ایک معنی خیز سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”کیا تم مایامی کے بھی اتنے ہی گہرے دوست تھے؟“

میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس کے چہرے پر ایک بے نام سا اطمینان جھلکنے لگا۔

بھر وہ مایامی کے بارے میں کریم کریم کر پوچھنے لگی۔ میں نے اس کی تشفی کی خاطر بتایا کہ مایامی کا تعلق بدھ مت سے تھا۔ وہ تبت کے سرحدی قصبے کوادری (KODARI) کی رہنے والی تھی اور کھنڈو کے معروف ”نیکیو ہسپتال“ میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ یہاں کھنڈو میں اس کی رہائش آرنیکو پانی دے پر اندر چوک سن کوئی بازار میں تھی۔ مجھے اس کے گھر میں رہنے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔

”تم نے بتایا ہے مایامی اب اس دنیا میں باقی نہیں۔“ لی یان کی کریم کا سلسلہ جاری رہا ”اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں

”اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا ”میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھے سے دوستی رکھنے والے خاصے ماسٹر ہوتے ہیں۔ یہاں کھنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے خنڈوں



سے میری طویل معرکہ آرائی رہی تھی۔ وہ بھی اسی پچپنشل کی بجائے چڑھ گئی۔

لی یان کافی دیر تک خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر عام سے لہجے میں بولی ”ودھان! ذرا سوچ کر بتاؤ، تمہیں دوست بنانے میں زیادہ وقت لگتا ہے یا دشمن بنانے میں؟“ ”تم بھی بچپنلے کچھ عرصے سے میرے ساتھ ہو!“ میں نے جواب دینے کے بجائے انہی سے استفسار کر ڈالا ”تم نے میری دوستیوں اور دشمنیوں کو جتنے اور مجڑے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟“

”میرا خیال ہے تم دوست زیادہ آسانی سے بنا لیتے ہو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”بلکہ تمہیں تو دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا فن آتا ہے۔ میں اس سلسلے میں تازہ ترین مثال پیش کر سکتی ہوں۔“

لی یان کے آخری جملے نے مجھے کھٹکے پر مجبور کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی شرارت کے موڈ میں ہو۔ میں نے اس کی شریر سوچ کو بے نقاب کرنے کے لیے سادگی سے کہا ”ہاں وہ تازہ ترین مثال کیا اور کسی کی ہے؟“ ”بھئی! میں کلاڈیا کی بات کر رہی ہوں۔“ اس کے لبوں پر تبسم کھینے لگا۔

تو ثابت ہو گیا، میرا کھٹکا بے سبب نہیں تھا۔ وہ کلاڈیا کے حوالے سے مجھے ”بھئی“ مارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں مزید انجان بن گیا اور بڑی شرافت سے اپنی ”پہلی“ پیش کرتے ہوئے کہا ”ہاں تو کیا ہوا تھا کلاڈیا کو؟“ ”یہ بھی میں ہی بتاؤں؟“ وہ تیز نظر سے مجھے گھورنے لگی۔

”اور کون بتائے گا؟“ میں نے کہا ”یہ ذکر کس نے نکالا ہے!“

وہ اچانک پٹری بدلتے ہوئے بولی ”سیدھی سی بات ہے۔ کلاڈیا ایک خطرناک دشمن کی حیثیت سے تمہارے سامنے آئی اور اس نے شیوالی اسٹریٹ والے بچکے پر اپنی مہر پور دشمنی کا ثبوت بھی دیا لیکن جب ہم بڑے ہال میں مورچے لگائے بیٹھے تھے تو تم نے کلاڈیا کی دشمنی کو دوستی میں بدل دیا۔ وہ تمہاری ایسی فرماں بردار دوست بن گئی کہ تمہارے اشاروں پر تانے لگی۔ تم نے کہا ”خاموش! میں آواز نہیں سنوں۔۔۔۔۔ اور وہ واقعی خاموش ہو گئی؟“

میں لی یان کی چمپیر خانی کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ اس کی بات کے اختتام پر میں نے بھی ایک داڈ مار دیا ”لی یان! میں نے تو تمہاری اور عارضی طور پر کلاڈیا کو

خاموش کیا تھا مگر تم نے میری تازہ بہ تازہ دوست کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا؟“

”کیا تمہیں کلاڈیا کی موت کا دکھ ہوا ہے؟“ ”میرا خیال ہے دشمن اور دشمنی چیزوں کے فنا ہونے کا سب کو دکھ ہونا چاہیے۔“

میرے منہ سے کلاڈیا کی تعریف لی یان کو اچھی نہ لگی جلدی سے بولی ”ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

میں نے کہا ”وہی تو اپنے اپنے خیال اور محسوسات کی بات ہے لیکن میرے نزدیک ایک بچے آرٹسٹ کو خود دار اور حسن پرست ہونا چاہیے۔ ہم دونوں مارشل آرٹسٹ ہیں۔ کیا تم میرے خیالات کی نفی کرتی ہو؟“

میں نے اس سے خاصا مشکل سوال کر ڈالا تھا لیکن وہ جواب دینے کے مرحلے سے بچ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ زبان کھولتی میرے تیل کا بڑبڑاٹھا۔

میں نے تیل کو فوراً ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس کے ڈسپلے پر کلاڈیا کوک کا نمبر لکھ کر رہا تھا۔ میں نے لیس کاغذ پر لیس کرنے کے بعد تیل کوکان سے لگایا اور کہا ”پیلو!“

”پیلو ودھان!“ کلاڈیا کوک کی بانوس آواز میری سماعت میں سرسرائی۔ ”میں اس وقت لمبی چوڑی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ کیا تم فوری طور پر اس بچکے میں آ سکتے ہو؟“

کلاڈیا کوک کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”آخر ہوا کیا ہے؟“

”مجھے بڑی بکلی خرابی ہے کہ آج رات دس بجے اس بچکے پر تمہارے سلسلے میں ایک خفیہ ہنگامی اجلاس ہونے والا ہے۔“ کلاڈیا کوک نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ”اس امیرجنسی میننگ میں جو گنڈر پال کے علاوہ چند اسرائیلی معزز افراد بھی شرکت کریں گے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جو بدھ نسل کنڈوالی عبادت گاہ میں ہونے والی مذہب کا روایتیوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ہیں۔ میں انہیں آج ہی فنا کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہوں اور اس نیک کام کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

جولوگ رتی موٹے ہاتھن کے ایما پر بدھ نسل کنڈوالی عبادت گاہ میں کسی بھی قسم کی خرابی کا روایتیوں میں شامل رہے تھے، وہ براہ راست میرے بھی دشمن تھے کیونکہ بچپنلے چند دنوں میں انسانی خون کے زیاں سے یہاں جو کھیل کھیل چارہا تھا اس میں میری سائل کو ایک مہرے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کا بڑا اٹکل تھا اور یہ فتن

میری روح میں کسی چھانسن کے مانند بیوست تھا۔ ان تمام ”ڈسے دار“ افراد کو سزا دینا میرا فرض بننا تھا۔ اس طرح رلی کا کچھ نہ کچھ قرض ”چیتا“ کیا جاسکتا تھا۔ اس سنگین خیال نے میرے وجود میں تنہائی سی دوڑا دی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کلاڈیا کوک سے پوچھا۔

”تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“ ”ہر قسم کی!“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے! میں آ رہا ہوں۔“ میرے لہجے میں بھی قطعیت شامل ہو گئی۔

”ایک کام کرتے آنا۔“ اس نے اضطرابی انداز میں کہا ”میری کچڑوں والی الماری کے زیریں حصے میں دھماکا خیز مواد کی اچھی خاصی مقدار موجود ہے۔ وہ بھی اپنے ساتھ لے آنا۔ اسی خانے میں آتھیں اسلحہ بھی رکھا ہوا ہے۔ اس میں سے اگر کسی ہتھیار کی ضرورت محسوس کر دو تو اپنے پاس رکھ لیں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے توقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس سلسلے میں میں نے ڈاکٹر موگ سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیور کر رہا ہے۔ یہودیوں نے ہماری عبادت گاہ کے تقدس کو پامال کر کے جس طرح درجنوں افراد کا خون بہایا ہے اس کے لیے انہیں سخت ترین سزا سنائی چاہیے اور یہ موقع اس کام کے لیے انتہائی موزوں ہے۔“

پھر وہ مجھے الماری کے خفیہ خانے کو کھولنے کے لیے خصوصی ہدایات دینے لگا۔ میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور کہا ”تم فکر نہ کرو۔ میں وہ میننگ شروع ہونے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت رات کے نو بجے ہیں۔ ہمارے پاس پورا ایک گھنٹا پڑا ہے۔ تاکہ میں کہاں آ کر تم سے ملوں؟“

”میری ڈیوٹی بچکے کے عقبی حصے میں لگائی گئی ہے۔ میرے علاوہ ایک اور شخص بھی وہیں مستحق ہے لیکن مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ بوقت ضرورت میں بچکے کے اندر بھی آ جاسکتا ہوں۔ میں نے اپنے تیل کو سائیکل الارٹ پر لگا رکھا ہے اور اس کی جملہ گھنٹیوں کو بھی آف کر دیا ہے۔ تم بچکے کی عقبی سمت میں پہنچ کر مجھے تیل مار دینا پھر میں تم سے ضروری سامان لینے اور تمہیں اندر پہنچانے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لی ہوں گا۔“

ایک لمحے کو رک کر اس نے مجھے بچکے کی لوکیشن بتائی ”بگلا نمبر آ۔ نو زیر دارو کا کچھ اور سینٹرل امیگریشن آفس

کے درمیان واقع ہے۔ اس کی پشت شمالی سمت میں دلی بازار کی طرف پڑے گی۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے! میں آ رہا ہوں۔“

سیلر رابطہ ختم ہوا تو مجھے لی یان کے سامنے حالات کی وضاحت کرنا پڑی۔

وہ حتیٰ لکچے میں بولی ”ودھان! میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔“

”تمہارا دہاں کوئی کام نہیں ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”تم ادھر ہی آرام کرو میں بہت جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

”نہیں ودھان!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے رات والی ضد پر اتر آئی ”یا تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی یا پھر تم بھی ادھر ہی رہو گے۔“

میں نے کہا ”لی یان! صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرو!“

”مجھے کچھ بعد ہی تو کہہ رہی ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

لی یان مجھے بدلی بدلی سی نظر آئی۔ بولڈ اور بے باک تو وہ پہلے بھی تھی۔ امریکی معاشرت انسان کو اور کچھ دے یا نہ دے لیکن بولڈ نہیں اور بے باکی ضرور دیتی ہے مگر گزشتہ رات کے تجربے کے بعد سے میں اس میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا انداز جل گزری کا سا ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے وہ میرے کندھوں پر سوار ہو۔

یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں بحث میں پڑ کر وقت برباد کرتا۔ جب وہ کسی بھی طور سمجھے میں نہ آئی تو میں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

کلاڈیا کوک نے اپنی الماری میں سے دھماکا خیز مواد لانے کو کہا تھا۔ میں نے دیوار گیر چوٹی الماری کو کھول لیا پھر اس کی ہدایت کے مطابق زیریں دروازہ کھینچ کر باہر نکلا۔ دروازہ اٹال ہاف باکس نما چوٹیا پوری طرح باہر نکل آیا تو اس کے نیچے مجھے وہ خفیہ خانہ نظر آ گیا جس کا ذکر کلاڈیا کوک نے کیا تھا۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ٹیکنیک استعمال کر کے مذکورہ خفیہ خانے کو کھول لیا۔

اس خانے کے اندر چھوٹے بڑے ہر قسم کے آتھیں ہتھیار موجود تھے۔ میں نے ایک خوب صورت پستل کا انتخاب کر لیا۔ لی یان کے پاس جانوس جہنم مکانی کا فراہم کردہ نفا سائلیڈی پستل موجود تھا۔ اس خانے میں آتھیں





سوی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

# آنش فشال



# آتش فشاں

راوی : وجدان علی  
تحریر : حسام بٹ

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانہ کمی سختوں اور حالات قہرستان آباد تھا۔ وہ اپنے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک ”انصاف“ کے ترازو میں تولنے کا خواباں تھا۔ وہی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن ٹیمپل گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی گوشت و پوست کے انسان میں ہارا بھر کر اسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پاؤں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہو گئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لہک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چپتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور انہیں حرف غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

ظالم جبر کی فضا میں سانس لینے والا ایک سرایا انتقام چھٹی کیا جس کی لڑنے خواہش

آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”میں بس موقع کی تلاش میں تھا کہ اس کے خلاف مجھے یکا بوت مل جائے تاکہ میں کوئی انتقامی کارروائی کر سکوں۔“ میں چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر اس سے پوچھا ”تمہارے خیال میں شعیب غوری نے امتیاز علی اور روٹی کو کیوں قتل کر دیا تھا؟ امتیاز تو اس کی آنکھ کا تار تھا، وہ اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔“

”شعیب غوری کے نزدیک آنکھ کا تار اور جوتے کا مارا کی کوئی حیثیت و اہمیت نہیں۔“ وہ غفلت میں بولا ”وہ جس تیزی سے کسی در و در کو سر آنگھوں پر بٹھاتا ہے اسی تندی سے وہ اسے اپنے قدموں میں بھی جک سکتا ہے۔ وہ امتیاز دراصل تم سے بہت زیادہ گلوڑ ہو گیا تھا۔ وہ تم سے اپنے دل اور دماغ کی ہر بات کہنے لگا تھا۔ شعیب غوری کا خدا تھا کہ کہیں وہ اہم تنظیمی راز بھی تمہاری طرف منتقل نہ کر دے۔ امتیاز کو اس طرح ختم کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک حادثہ معلوم ہو..... اور پھر ایسا ہی ہوا۔ روٹی اور میر بخش، امتیاز کے ساتھ کھن کی حیثیت سے پس گئے۔“

جہانگیر کی باتیں میری رگوں میں آگ لگا رہی تھیں۔ وہ شعیب غوری کے ایک ایسے چہرے کو اجاگر کر رہا تھا جو انتہائی سچ اور مکروہ تھا۔ میں وہ چہرہ دیکھنے کا روادار نہیں تھا کیوں کہ

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کون سا راگ سنا رہا ہوں۔ میں جہانگیر کو دانت اس الگ تھلک کمرے میں لے آیا تھا۔ شہزاد کے سامنے شعیب غوری اور اس کی تنظیم ”سی ایف کے“ کے بارے میں اچھی خاصی گفتگو ہو چکی تھی۔ جہانگیر کو تو میں نے فواد کی داغی زبان بندی کا مشورہ دے دیا تھا لیکن میں اپنے سامھی پر یہ فارمولہ ہرگز نہیں آزما سکتا تھا تاہم اتنا میں ضرور کر سکتا تھا کہ وہ میرے اور ”سی ایف کے“ کے باہمی معاملات سے کم از کم واقف ہو۔

جہانگیر نے تامل کرتے ہوئے کہا ”تم مجھے زعمہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟“

”تاکہ تم ”سی ایف کے“ کے اندر رہتے ہوئے میرے لیے کام کر سکو؟“

”اوہ!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی ”اس کا مطلب ہے، تم پہلے ہی سے بگ باس کی طرف سے خاصے بدگمان ہو؟“

”ہاں، مجھے شروع ہی سے اس کی نیت پر شک رہا ہے۔“

میں نے واشگاف جھوٹ بولا اور یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے دل کو ایک جھٹس پینچی کیوں کہ درحقیقت میں شعیب غوری کو اپنا چچا اور خالص دوست سمجھتا آیا تھا۔ میں نے بات کو

میں نے ہمیشہ اس کا مخلصانہ اور دوستانہ چہرہ ہی دیکھا تھا۔  
میں نے جہانگیر کی باتوں پر صد فیصد یقین نہیں کیا البتہ  
شک کا سیاہ ناگ میرے ذہن میں نہیں پھیلا چکا تھا۔ میں نے  
اپنے اندر کی ایک الجھن کی خاطر جہانگیر سے پوچھا۔

”بوٹ بین والے واقعے سے بہت سے عوامل وضاحت  
طلب ہیں۔ تم ان کی کیا توجہ پیش کرو گے؟“  
”مثلاً کون سے عوامل؟“ وہ اپنی زخمی گردن پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے بولا۔  
میں نے کہا ”اس رات تم دونوں خالی کلاشکوفز کے مل پر  
ہمیں گھیرنے کیوں پہنچے تھے اور پھر ہماری کارروائی پر موقع  
سے فرار کیوں ہو گئے تھے؟ دوسری بات یہ کہ جب وہاں  
پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز پہنچی تو کمرے پھاروسٹک  
پر جوں کی توں کیوں کھڑی رہی۔ تم دونوں تو جب کے بھی  
حصے سے برآمد ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی کوئی نہ کوئی  
موجود ہوگا۔ پولیس کا سائرن سن کر وہ وہاں سے فرار کیوں نہ  
ہو گیا۔“

”تم دونوں“ سے میری مراد جہانگیر اور فوڈ اینڈس تھی بلکہ  
جہانگیر اور اس کا دوسرا مگن بردار ساتھی تھا جو کمرے پھارو میں  
تغاقب کرتے ہوئے بوٹ بین تک پہنچے تھے۔ اگر اس کا  
دوسرا ساتھی فوڈ اینڈس تھا تو میں پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیتا۔

جہانگیر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ”وہ  
سب ایک ڈراٹا تھا۔ تمہارا ذہن بنانے کے لیے ایک ٹھیل  
رچایا گیا تھا۔ اس تغاقب اور پھر بوٹ بین والے واقعے کا  
صرف یہ مقصد تھا کہ تمہیں باور کرایا جائے کہ دشمن ہاتھ دھو کر  
تمہارے پیچھے بڑا ہوا ہے تاکہ بعد میں جب امتیاز علی وغیرہ کی  
موت کی خبر تم تک پہنچے تو تم واقعات کے تسلسل کو آپس میں  
نتیجہ کر سکو۔ وہ تو تمہاری بد وقت چالاکی بلکہ اس خبیث جانور  
کی کمینہ حرکت سے باور کرایا گیا اور ہماری خالی گنوں کا راز تم  
پر کھل گیا ورنہ ہمارا پروگرام تو بیک تھا کہ وہاں تمہارے ساتھ  
چند ڈائنامک ہوں گے۔ اسی دوران میں پولیس چپ کا  
سائرن سنائی دے گا اور ہم اپنی پھارو میں بیٹھ کر اس موقع سے  
فرار ہو جائیں گے جیسے پولیس کی آمد نہ ہمیں بھانسنے پر مجبور  
کر دیا ہو۔“

”تو گویا، وہ پولیس چپ اور اس کا سائرن بھی اس  
ڈرامے کا ہی حصہ تھا؟“ میں نے آنکھیں سکیڑ کر سوالیہ نظر سے  
اسے دیکھا۔  
اس نے اثبات میں جواب دیا ”ہاں، اس گاڑی میں  
ہمارے ہی ساتھی تھے۔“

جہانگیر کے انکشاف نے جہاں میرے ذہن کی بہت سی  
الجھنوں کو سلجھا دیا تھا۔ وہیں شعیب غوری اور ”سی ایف کے“  
کے معاملے میں میری سوچ کو بہت پرانگندہ کر دیا تھا۔ اب تک  
شعیب نے میرے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنایا تھا جس سے  
مجھے کوئی شکایت پیدا ہوئی بلکہ اس نے قدم قدم پر میری ہر ہر  
مدد کی تھی۔ ساحل سمندر والا لکڑی ٹلیٹ، پچھلی ٹیلی شیز ڈاس  
کا تختہ تھی۔ اس نے سنگار پور سے آنے والی میری کثیر رقم کو  
بہت ایمانداری اور خوش اسلوبی سے میرے بینک اکاؤنٹس  
تک پہنچایا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کثیر المالیات  
سونے کی بازیابی کے لیے ایک ناقابل فراموش اور اہم کردار  
ادا کر رہا تھا۔ اس نے آج رات کو اس سلسلے میں مجھے بہت  
بڑی خوش خبری سنائی تھی۔ سونے والے معاملے پر اگر میری  
سوچ مسٹر ٹیل آرمز کی جانب مڑی۔ سونے کی بازیافت اسی  
کی نگرانی میں عمل میں آئی تھی اور اب وہی شخص اس سونے کو  
ٹھکانے لگانے والا تھا۔

ٹیل آرمز سے بارے میں سوچنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہودی  
انسل تھا۔ انگلینڈ کا ایک ارب بتی سرمایہ دار بزنس مین۔ وہ  
گولڈ اکاؤنٹ بینک کا مالک تھا اور ہیروں کے بیویاں میں  
اسے یورپ کا بے تاج بادشاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہی ٹیل آرمز  
شعیب غوری کا گہرا دوست تھا اور اسٹرڈیشٹر اس سے ملنے  
کراچی آتا رہتا تھا۔ شعیب غوری ”سی ایف کے“ کا بگ  
باس تھا اور ایک یورپی یہودی سے اس کا ریلوے ایسی حقیقت کو  
سوچنے پر مجبور کرتا تھا جو تحقیق منہاس باقر نے اب تک فرمائی  
تھی۔ یہ بین ممکن تھا، شعیب غوری یہودی لابی ای کا نمائندہ ہو  
اور ان کے مقاصد کے لیے کام کر رہا ہو!

میں فوری طور پر شعیب غوری کے خلاف محاذ نہیں بنا سکتا  
تھا۔ مجھے ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اگر وہ میرے عزائم سے  
آگاہ ہو جاتا تو پھر اس پر قابو پا کر نامکمل نہیں ہوتا۔ وہ نہایت ہی  
کایاں اور طاقتور شخص تھا۔ اسے خبر رکھ کر ہی شکار کیا جا  
سکتا تھا اور میں نے ایسا ضرور کرنا تھا! میں اپنے ملک کو نقصان  
پہنچے اور اسے بدنام ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے،  
میری تمام عمر پاکستان سے باہر گزری تھی مگر اس سے کیا ہوتا  
ہے۔ میں پیدا تو اسی دھرتی پر ہوا تھا۔ یہ میرے اور میرے  
آباد اجداد کا ملک تھا، ان کی ملکیت تھا۔ کوئی اپنی پراپرٹی کو  
نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ انسان کو اتنا غیرت مند تو  
ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملک کی جانب اٹھنے والی اغیار کی  
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے!

یہ تمام خیالات مشکل سے پانچ سیکنڈ میں میرے ذہن

سے زورے ہوں گے۔ ہاں، ذہن اتنا ہی تیز رفتار ہے۔ یہ  
ایک چمپکے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا  
پہنچتا ہے۔ اس کی پرواز، خیالات کے پتار پر ہوتی ہے جن کی  
راہ میں کوئی گتلی یا ٹریفک جیم نہیں آتا۔ ان کا انجن ٹپل ہوتا  
ہے اور نایمن ختم ہوتا ہے۔ یہ اپنی مخصوص رفتار سے رواں  
دوڑاں رہتے ہیں۔  
جہانگیر کی آنکھوں سے اضطراب چمک رہا تھا۔ میں نے  
اپنی رست و اوج پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت رات کے..... یعنی صبح  
کے پونے چار بجے تھے۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے  
گھبراہٹ میں کہا۔

”جہانگیر! میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ حزیہ  
زندگی کے لیے تمہیں اپنے ساتھی فوڈ سے کس طرح ”عثمتا“  
ہے، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر اس کی بے ہوشی ہی میں  
کوئی کارروائی کر ڈالو تو اچھا ہے، تمہیں کہانی بنانے میں  
آسانی رہے گی۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اس کی  
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم سے میں کس حد تک توقع  
رکھوں؟“

اس کے چہرے پر ایک چمک سی ابھری اور وہ جذبات  
سے لرزے آواز میں بولا ”تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ میں  
ظاہر ”سی ایف کے“ میں کرتا رہوں گا لیکن میں درپردہ تمہارا  
”عزم ہالوں گا۔“  
”اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق  
میں بہتر نہیں ہوگا!“

”ایسا نہیں ہوگا وجدان!“ وہ پرجوش انداز میں بولا  
”تم نے اختیار اور موقع رکھتے ہوئے بھی میری جان بخشی کی  
نہے، میں تمہیں دھوکا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔  
یہ زندگی اب تمہاری امانت ہے۔ اگر بھی موقع ملا تو تم پر ہار کر  
دوں گا۔“

وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کی آواز کی لرزش بتا رہی  
تھی، وہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میں  
نے اس موقع پر ایک مستند فارمولے پر عمل کیا تھا۔ میں نے  
کھیل بڑھا تھا..... مارنے سے ڈرانا زیادہ بہتر ہوتا ہے اور  
موت دھکا کر پیاری پر راضی کر لینا چاہیے۔ میں نے جہانگیر کو  
ڈرا کر اپنا پیار بتا لیا تھا۔ مجھے امید تھی، وہ زندگی کی آخری  
سانس تک وفاداری تمنا تارے گا۔

اگر میں چاہتا تو اسے فوراً ختم کر کے اپنے ساتھیوں کی  
بیویانہ موت کا انتقام لے سکتا تھا لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ  
نہیں پہنچتا؟ صرف یہ کہ میرے انتقامی جذبے کی تسکین ہو

جاتی مگر اسے زندہ اور اپنا اسیر بنا کر چھوڑ دینے میں فائدہ ہی  
فائدہ تھا۔ ”سی ایف کے“ میں اس کی موجودگی کے باعث  
میں اس تنظیم کی جڑوں کو کھوکھلا کر سکتا تھا۔ گویا، یہودی لابی کو  
بے بہا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس طرح میرا ملک بڑے نقصان



تاریک برعظم کے پاسرار ماحول میں ختم لینے والی ایک حیرت انگیز  
راستان جہاں کالے جادو اور سٹلی کے مقابلے برپا ہوتے تھے۔  
دشمن قبائل اور ان کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابل یقین  
سرگزشت..... ان تاریک اور گمراہ جزیروں کی کہانی.....



وحشی قبیلوں کی ایک سرکش حینہ جس کا حسن لازوال تھا  
جس کے حصول کیلئے موت کا بازار بھڑک مرم رہتا تھا..... خون  
کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز  
واقعات جسے سمندر کی سرکش موجوں نے اٹھا کر اقبال کے  
دہلیس میں اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

کتابی محل میں پہلی بار شرم عام پڑا ہے

قیمت فی حصہ 60 روپے ..... ڈاک خرچ 23 روپے  
کتابیات پبلی کیشنز  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802551-5895313-5802551  
kitabiat1970@yahoo.com  
رابطے کے لیے: 63-111 عیش ڈی ایچ جے میں کوئی روزگار 75500

اور بدنامی سے بچ جاتا۔ ذاتی مقاصد کو وطن عزیز کی بھارت  
نیک نامی پر کبھی ترجیح نہیں دینا چاہیے۔

میں اچھو کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج گئی۔ ایک  
گھنٹی اندر دینی کمرے میں بھیجی گئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا،  
اس فون کی ایک ایکسٹینشن اندر بھی موجود تھی۔ میں نے  
جہانگیر کو رکنے کا اشارہ کیا اور اندر بیڈ روم میں جا کر نواد کو فون  
رہنوی کرنے سے منع کر دیا۔ میں واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو  
تیسری گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے جہانگیر سے کہا۔

”تم ٹارنل انداز میں فون اینڈ کر دو۔ یہ تمہارے لیے  
ایک ٹیٹ کیس بھی ہے۔“  
چوتھی گھنٹی پر اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور  
نہایت ہی معتدل لہجے میں اس نے ماؤتھ پیس میں کہا  
”ہیلو“

اس نے دوسری جانب کی آواز سنی اور بولا ”ہاں، میں  
جہانگیر بات کر رہا ہوں۔ یہاں کے تمام انتظامات تسلی بخش  
ہیں۔“

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ یقیناً دوسری طرف بولنے  
والے کی بات سن رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ٹھنڈی آواز میں  
کہا ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔  
انشاء اللہ یہ آپریشن نہایت کامیاب رہے گا۔“  
پھر وہ ریسیور کو پھینک کر اپنے کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے  
دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”ٹیٹ کیس کی رپورٹ کیا ہے جہانگیر؟“  
وہ بے انتہا سنجیدہ نظر آنے لگا پھر اس نے جواب دیا  
”وجدان! اچھا ہوا، یہ ٹیٹ اس موقع پر سامنے آ گیا اس  
طرح مجھے تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس  
ٹیٹ رپورٹ سے تم میری وفاداری کا یقین کر لو گے۔“  
”اسی لیے تو میں نے رپورٹ کے بارے میں سوال کیا  
ہے!“ میں نے کہا۔

”میں تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں وجدان۔“  
اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا پھر اس نے نہایت ہی ٹھہرے  
ہوئے انداز میں ایک خوفناک انکشاف کیا۔ میں حیرت آمیز  
انداز میں اسے سن رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، وہ بہت ہی  
خوفناک اور چاہ نہ تھا۔ میرے دل و دماغ میں ”سی ایف  
کے“ کے لیے غم و غصے کی ایک لہر بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے  
اس نے ماؤنٹ اور سٹ کی شکل اختیار کر لی۔ جہانگیر نے بتایا  
کہ کل..... یعنی آنے والی دس بجے ایک پوری ملک کا سفیر  
کراچی پہنچ رہا ہے (بدوجہ ملک کا نام ظاہر نہیں کیا جا رہا)۔

جم براؤن نامی وہ سفیر انٹیر پورٹ سے سیدھا ہوٹل پہنچے گا اور  
اس سفر کے دوران میں اسے زیادہ تر شاہراہ فیصل سے گزرنا  
ہو گا۔ مذکورہ پوری ملک پاکستان کے لیے خیر سگالی اور  
ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں مگر یہودی لابی کو یہ بات ایک  
آنکھ نہیں بھائی۔ انہوں نے ”سی ایف کے“ کے ذریعے  
پاکستان اور اس ملک کی دوستی کو کھٹائی میں ڈالنے کا خطرناک  
پروگرام بنایا ہے۔

”کیسا پروگرام؟“ میں پوچھتے بغیر نہ رہ سکا۔  
جہانگیر نے بتایا ”جم براؤن نامی اس پوری سفر کو ہوٹل  
پہنچنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ یہ سیدھی  
سادہ دہشت گردی کی ایک واردات ہوگی۔ یہودی پہلے ہی  
پاکستان کو دنیا میں دہشت گرد نمبروں ملک گردانتے ہیں۔ اس  
واردات کے بعد ان کے موقف کو مزید توانائی ملے گی اور  
مذکورہ دونوں ملکوں کے باہمی دوستانہ تعلقات پر جو اثرات  
مرتب ہوں گے، اس کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو!“

میں بخوبی اندازہ لگا چکا تھا۔ میں اس وقت اپنے وجود  
میں ایک سنسنی خیز کرنٹ سا دوڑتا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے  
تشویش ناک نظر سے اسے دیکھا اور ابھمن زدہ انداز میں کہا۔  
”میں نے سفیروں اور وزیروں یا دوسری ”ڈی وی آئی  
”بی“ شخصیات کو ہوٹل سے انٹیر پورٹ یا انٹیر پورٹ سے کسی  
سرکاری رہائش گاہ کی طرف متعدد بار آتے جاتے دیکھا ہے۔  
پاکستان میں تو ان لوگوں کی حفاظت کا بڑا تسلی بخش بندوبست  
کیا جاتا ہے۔ میلوں تک ٹریفک کو روک کر ان کے لیے روڈ  
خالی کر دیا جاتا ہے پھر پروٹوکول کی تمام گارنٹیاں بشمول سہمان  
کی گاڑی، ایک سوسائٹھ کی اسپینے سے لگی اوپر دوڑتی ہے۔  
اس محفوظ ترین صورت حالات میں کسی قتل کرنا مجھ میں نہ  
آنے والی بات ہے!“

”سی ایف کے کا پلیٹ فارم ناممکن کو ممکن بنانا جانتا  
ہے۔“ وہ اسی سنجیدگی سے بولا ”تم دیکھنا، یہ ضرور اپنے مقصد  
میں کامیاب ہوں گے۔“

”دن سنسنی سے اوپر والی گاڑی کو کس طرح نشانہ بنایا جا  
سکتا ہے؟“ میں نے متحجب انداز میں اسے دیکھا۔  
وہ زبردست مسکراتے ہوئے بولا ”مصنوعی ایمرجنسی کی  
صورت حال پیدا کر کے گاڑی کی اسپینڈ کو کم کیا جاسکتا ہے،  
انٹیر پورٹ سے نکلنے وقت یا پھر ہوٹل میں داخلے کے وقت بھی  
تو جم براؤن کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔“  
”جم براؤن کے قتل کے لیے مقام کا انتخاب تو ہو چکا ہو  
گا؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا ”ہاں، اس آپریشن میں  
مقام کا انتخاب سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جم براؤن  
کے لیے زمری کا ایک انتہائی حساس حصہ چننا گیا ہے۔ اس  
مقام پر مصنوعی ایمرجنسی پیدا کر کے غیر ملکی مہمان کو شکار کیا  
جائے گا۔“  
میں نے بے چینی سے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا ”اس  
مصنوعی ایمرجنسی کی نوعیت کیا ہوگی؟“  
”اس معاملے سے مجھے بے خبر رکھا گیا ہے۔“

”پھر تھوڑی دیر پہلے تم نے فون پر کسی کو کس بات کی تسلی  
دی ہے؟“ میں نے استفسار کیا ”تم نے کہا تھا، آپ بے فکر ہو  
جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ یہاں کے انتظامات تسلی  
بخش ہیں۔ انشاء اللہ یہ آپریشن ضرور کامیاب رہے گا۔“ میں  
نے ایک سانس میں متعدد سوالات کر ڈالے ”اور یہ تم نے بتایا  
ہی نہیں، فون پر تم کس سے بات کر رہے تھے؟“

وہ ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا ”یہ فون کال  
میرے پاس سلیم واسطی کی طرف سے تھی۔ وہ ”لیٹر“ کا کرتا  
دھرتا ہے۔ آج کل میں اسی کے اسٹاف میں شامل ہوں۔ سلیم  
واسطی نے جن انتظامات کی رپورٹ مجھ سے مانگی تھی ان کا  
تعلق میرا سر اس فلیٹ سے ہے۔ زمری والا آپریشن ”ساؤتھ“  
کی زیر نگرانی میں ہوگا اور کالوں کو محفوظ بنانا فرام کر رہے۔  
واردات کے بعد، ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق مختلف  
مرائل سے گزر کر دروازہ اس فلیٹ پر پہنچیں گے اور کچھ دنوں  
تک وہ یہاں روپوش رہیں گے۔ میں نے اس کو یہاں کے  
انتظامات کے بارے میں بتایا ہے۔“

میں نے چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے جہانگیر کا  
جائزہ لیا پھر جتنی لہجے میں کہا ”ابھی تم نے مجھے جو خطرناک  
معلومات فراہم کی ہیں یہ تمہارے ٹیٹ کی ابتدائی رپورٹ  
ہے۔ اس کو فائل رپورٹ ہی سے چیک کیا جائے گا۔“  
”فائل رپورٹ!“ اس نے چونکے ہوئے انداز میں  
مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”گر کل دس بجے تمہارے کہنے کے مطابق جم  
براؤن پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تو مجھے یقین آ جائے گا، تم مجھ سے  
واقعی خلص ہو اور تم نے مجھے بالکل درست معلومات فراہم کی  
ہیں۔ یہ ہوگی فائل رپورٹ جو اس ابتدائی رپورٹ کو تسلی کرے  
گی۔“

اس نے کہا ”میں تو غلوس نیت سے تمہیں سب کچھ  
ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔ آگے جو بھی ہو لیکن میں محسوس کر رہا  
ہوں۔“ وہ ٹھوٹکی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”اب

شاید ایسا نہ ہو سکے۔ تم جم براؤن کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرو  
گے۔“  
”تم بالکل درست اندازہ لگا رہے ہو۔“ میں نے صاف  
گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”میں اس غیر ملکی سفیر کو بچانے کی  
پوری کوشش کروں گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تمہارے  
بیان کو چپک کر نہ مانع نہیں ملے گا۔ میں یہ جان لوں گا کہ  
تمہارے مطابق زمری کے اس حساس مقام پر قاتل موجود  
تھے یا نہیں۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس اس مقام کی درست  
نشان دہی کرو۔“

اس نے میری فرمائش پوری نہیں کی اور معذوری ظاہر  
کرتے ہوئے بولا ”میں اس مقام سے واقف نہیں ہوں۔  
میں جتنا جانتا تھا وہ تمہیں بتا چکا۔“

میں نے اس کی کمرنگی اور معذوری کو مان لیا۔ اگر زمری  
والا آپریشن ”ساؤتھ“ کی نگرانی میں ہو رہا تھا تو اس کا مطلب  
یہی تھا، اس کی کمان کبیر شاہ کے ہاتھ میں ہوگی لیکن اس سلسلے  
میں شاہ جی سے کوئی سوال کرنا انتہائی خطرناک ہوتا۔ وہ کبھی  
مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا بلکہ میرے سے اپنی لامعلومی  
کا اظہار کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی وہ میری جانب سے محتاط  
ہو جاتا..... اور میں یہ کسی بھی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔ ”سی  
ایف کے“ کے جوڑوں میں بیٹھنا اور اس کی جڑوں میں بارود  
فٹ کرنے کے لیے ضروری تھا، ان کو میرے خیالات اور  
عزائم کی بھٹک بھی نہ پڑے۔ اس سلسلے میں رازداری ہی  
کامیابی کی ضمانت تھی!

جہانگیر کے ساتھ میں ایک مضبوط گھوڑ کر چکا تھا۔ اس  
کی طرف سے کچھ کا امکان نہیں تھا اور ہا میرا سوال تو میں اہم  
رازدوں کی حفاظت کرنا جانتا تھا۔ البتہ منہاس باقر کو کسی حد تک  
اس معاملے میں شیئر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کا باندہ شہزاد علی  
ہمارے درمیان ہونے والی چیدہ چیدہ باتوں سے آگاہ ہو چکا  
تھا اس لیے یہ میری مجبوری تھی۔

میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل جہانگیر سے کہا  
”تمہاری گردن شدید زخمی ہے اور تمہارا سامھی بے ہوش پڑا  
ہے۔ تمہارے پاس نہ ہونے چارے فون کو کیا تھا۔ ان حفاظتی  
اور اعداد و شمار کو نظر میں رکھتے ہوئے کوئی زبردست اور قابل  
یقین کہانی گھڑ لو کہ تمہارے معاملات کو تنظیم شک کی نظر سے  
نہ دیکھے۔ تمہاری سلامتی اور بقا اسی میں ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”تم جو کہو گے، میں  
وہی کروں گا۔ میں نے تم سے وفاداری کا عہد کر لیا ہے لیکن  
میری تم سے ایک درخواست ہے!“

”کہو؟“ میں نے سوال نظر سے اسے دیکھا۔

”وجدان!“ وہ کرب انگیز لہجے میں بولا ”کسی طرح مجھے اس دلدل سے نکالو۔ میں گناہ اور جرائم کی زندگی گزار رہا ہوں۔ تم جاو تو مجھے اس راستے سے ہٹا سکتے ہو۔ میں اس راہ پر چلتے چلتے اتنی دور نکل آیا ہوں کہ از خود میری واپسی ممکن نہیں رہی، میں خود میں اتنی بہت نہیں باتا۔“ وہ ایک لمحے کے توقف سے نہایت شجیدگی سے گویا ہوا ”یقیناً جانو، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، میں ایک دیوانگی اور مجبوری کے عالم میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ میرا اندر، میرا ضمیر مسلسل ملامت کرتا رہتا ہے۔“

اس کے انداز میں دکھ ہی دکھ بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے اس وقت ایک لمحے بس اور بے کس، مجبور دلا چار پوڑھا نظر آیا جس کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہو۔ بری اور بھلی جیسی بھی گزری ہو، اس میں اس کی مشا شامل نہ ہو۔ اس نے زندگی کو نہیں بلکہ زندگی نے اسے گزارا ہوا۔

جرائم کی دنیا اور مجرموں کو کچھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ میں نے اس ”کمر خیدہ خیف و زار پوڑھے“ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

”جہا تکیر! کوئی بھی انسان پیدائشی طور پر مجرم نہیں ہوتا۔ حالات اسے تاریک راہوں کی طرف لے جاتے ہیں اور زندگی کے کسی مرحلے پر اس کا ضمیر ضرور ملامت کرتا ہے۔ انسان کا اندرون اسے جو کچھ لگا تا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ غلط ہے مگر وہ پھر بھی کرتا چلا جاتا ہے۔“

”کیا تم مجھے اس تاریک راہ سے روشنی کی طرف واپس نہیں لاسکتے؟“

”لا سکتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے صدقہ دل سے کہا ”اور انشا اللہ، ایسا بہت جلد ہوگا۔“

بلکہ ایسا ہو چکا ہے۔

”کیا..... کیسے؟“ وہ روانی میں بول گیا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”آج سے ہم دوست ہیں۔“ پھر میں نے معاملے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کہا ”میں جتنی جلدی ممکن ہو سکا، تمہیں ”سی ایف کے“ سے نکال لوں گا۔ فی الحال تمہارا اس تنظیم میں رہنا ہم دونوں کے لیے سودمند ہے۔ تم اندر سے اور میں باہر سے اس تنظیم پر حملے کروں گا، نادیہ ہٹے! اور ایک روز اس تنظیم کا ڈھانچا زمین یوں ہو جائے گا لیکن۔“ میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا اور اضافہ کیا ”اگر ہم نے جلد بازی دکھائی تو کوئی نہ کوئی

سنگین غلطی کر بیٹھیں گے جو ہمارے مقصد کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ اتنی تنظیم اور مربوط تنظیم کو گہری پلاننگ ہی سے تباہ کیا جا سکتا ہے۔“

وہ اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولا ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان! ہمیں ایک ایک قدم چھوٹ چھوٹ کر اٹھانا ہوگا۔“

”میں آج لاہور جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”چند روز بعد واپس آ جاؤں گا اور اس دوران میں بھی تم سے رابطہ رکھوں گا۔ تمہارا نوٹنبر میں اپنے ذہن میں محفوظ کر رہا ہوں۔ تم نمبر دہراؤ۔“

اس نے میرے حکم کی قیامت کی۔ میں نے کہا ”میں شعیب غوری یا کبیر شاہ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ ہم دونوں کس قسم کے عزائم باندھ چکے ہیں۔ میں پہلے کی طرح اس سے دوستی بھاتا رہوں گا۔ تم بھی یہی کرنا۔ اپنے پاس سلیم واسطی کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہونے دینا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے کہا ”تنظیم میں رہتے ہوئے تم مجھ سے کلوز ہونے کی کوشش بھی نہ کرنا!“

”میں امتیاز علی کا حشر دیکھ چکا ہوں۔“ وہ ایک جھنجھری لے کر بولا۔

”شعیب غوری اور اس کی تنظیم کا حشر اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا ”میں لاہور والے معاملات نمٹا آؤں، پھر اس کے خلاف مجر پور پلاننگ کریں گے۔“

اس نے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے معاہدہ کیا اور ہم دونوں اس کمرے میں آ گئے جہاں شہزاد علی موجود تھا۔ وہ ہمیں اس انداز میں دیکھ کر چونکا تو میں نے کہا۔

”شہزاد! اب ہم واپس جائیں گے۔“

”اور یہ دونوں؟“

”ان کو تم بھول جاؤ۔“

اس نے پھل کو جب میں رکھتے ہوئے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ”میں تمہاری بات کو کچھ نہیں سکا۔“

”راستے میں سب سمجھا دوں گا۔“ میں نے اسے رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔

”ہم یہاں جس مقصد سے.....“

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

آئے تھے، وہ پورا ہو چکا ہے شہزاد اس لیے اب ہمیں جلد از جلد یہاں سے چھوٹ لینا چاہیے۔“

شہزاد نے پہلے جہا تکیر اور پھر فرش پر بے حس و حرکت

پڑے نواد کو دیکھا اور متذبذب قدموں سے میری تھلید کر دی۔

”ہم اس اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر آ کر گرین ہائی روف میں بیٹھے تو میری رستہ واپس چاروں کا وقت بتا رہی تھی۔ شہزاد کے چہرے پر بے جواب سوالات نے ایک جال سا بن دیا تھا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی اشارت کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

واپسی کے راستے میں پہلے پانچ منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ میں نے کوئی بات کی اور نہ ہی شہزاد منہ سے کچھ بولا۔ وہ ایک کانیاں اور کچھ دار بندہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور مہارت چمکتی تھی۔ فلیٹ سے نکلنے وقت اس نے میرے انداز کو دیکر محسوس کر لیا تھا کہ میں کتنی نیچے پر پہنچ چکا ہوں اور اس نیچے سے اسے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

اگرچہ اس کی اس سوچ میں حقیقت نہیں تھی تاہم میں اسے زیادہ مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کو مسلسل خاموش دیکھ کر میں نے کہا ”تم گہری سوچ میں کیوں ڈوب گئے شہزاد؟“

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ”جب انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب نہ ملیں تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

”تمہارا اشارہ حالیہ واقعات کی طرف تو نہیں؟“

”تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو!“

اس نے دانش مندی کی بات کی تھی۔ میں نے کہا ”میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کو تیار ہوں۔ تاہم، تمہیں کون سی بات الجھا رہی ہے؟“

وہ سنجیدگی سے بولا ”فلیٹ سے رخصت ہونے سے قبل تم نے جس رویے کا مظاہرہ کیا ہے وہ میرے لیے ناقابل فہم ہے۔“

”خٹا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”خٹا..... جہا تکیر اور نواد کو یونہی چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔“ اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے کہا ”وہ بعد میں ہمارے خلاف کوئی بھی کارروائی کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا ”تم سے یہ بات کس نے کہہ دی کہ میں نے انہیں یونہی چھوڑ دیا ہے؟“

”کیا مطلب۔“ وہ چونکا ”یونہی نہیں چھوڑا تو پھر.....؟“

میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا ”دیکھو شہزاد! ہم جس مقصد سے یہاں آئے تھے وہ ہم نے حاصل کر لیا یعنی جہا تکیر اور نواد کو ان کی مقامی تنظیم سے وابستہ ہیں اور وہ تنظیم یہودی لابی کے لیے کسی طرح کام کرتی ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ

میں مذکورہ تنظیم یعنی ”سی ایف کے“ سے پہلے ہی واقف ہوں

مگر بڑے مثبت انداز میں۔ ہماری مطلوبہ معلومات ہمیں حاصل ہو چکیں۔ ہم جب چاہیں اس تنظیم کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان دونوں سے زیادہ میں جانتا ہوں ”سی ایف کے“ کے بارے میں۔ انہیں چھوڑ کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔“ چند لمحات کے لیے میں سانس لینے کو رکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے اور جہا تکیر کے درمیان ڈرائیونگ روم میں جو گفتگو ہوئی ہے، تم اس سے واقف نہیں ہو، شاید اس لیے بھی تمہیں میرے رویے سے زیادہ الجھن ہو رہی ہے۔“

وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا ”کیا وہاں کوئی خاص بات سامنے آئی ہے؟“

”بات نہیں، بلکہ باتیں کہو۔“ میں نے پرسوج انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”ان میں سے بہت سی سامنے آئی ہیں اور چند ایک پیچھے چلی گئی ہیں۔ نتیجہ ہمارے حق میں برآمد ہوا ہے۔“

وہ شکایتی لہجے میں بولا ”مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے وجدان!“

”کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”ضرور بتاؤں گا مگر اس وقت میں مختصر الفاظ کا سہارا لوں گا۔ بعد میں کبھی زندگی نے فرصت دی تو تمہیں تفصیل سے بھی آگاہ کر دوں گا۔“

میں وڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے یوں ظاہر کرنے لگا جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔ شہزاد ڈرائیونگ کے شعبے میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے کوئی جواب دینے سے پہلے ماضی قریب کے واقعات پر غور کیا۔ شہزاد کے سامنے میرے اور جہا تکیر کے درمیان جو مکالمہ ہوئی تھی اس سے شہزاد صرف یہی جان سکا تھا کہ ان دونوں کا تعلق ”سی ایف کے“ نامی ایک تنظیم سے تھا جو یہودی لابی کے اشاروں پر پانچ کر شہر کا امن وامان غارت کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ وہ اغیار کے مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر ایجنٹوں کا لہو اچھالنے میں کوئی دریغ نہیں کرتی تھی۔ ان لوگوں کی وجہ سے ملک اور مسلمان پوری دنیا میں کتنے ذلیل و رسوا ہو رہے تھے اس بات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی تنظیم کے پاس شعیب غوری کے ایک اشارے پر میرے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ شہزاد اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اور فی الحال اسے جانتا بھی نہیں چاہیے تھا۔ میں ان تمام معاملات اور

معلومات کو اپنے ذہن میں مسلسل (FILTER) اور



(CENTRIFUGE) کر رہا تھا اور اس سے ایک ایسا (EXTRACT) حاصل کرنے کی کوشش میں تھا جو محفوظ بھی ہو اور منہاس باقر کے ذہن کے لیے قابل قبول بھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کے سامنے بھی رپورٹ پیش کرنا پڑی۔

میں نے ایک سختی نتیجہ پہنچتے ہوئے شہزاد سے کہا "ڈیئر! دشمن کو ختم کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے، اسے اپنا مطیع و فرماں بردار بنالیا جائے۔"

"تم باتیں بہت گہری کرتے ہو۔" وہ چہرے پر خشکوار تاثرات سماتے ہوئے بولا۔ "ابھی تم نے جو بات کی ہے وہ بہت بڑی حقیقت ہے مگر یہ کام اتنا ہی زیادہ مشکل بھی ہے۔" میں نے کہا "انسان کو ختم کر کے تو مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میں تمہاری بات میں پوشیدہ نکتے تک پہنچ رہا ہوں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو..... میرے انداز کے مطابق تم جہانگیر کو اپنے قابو میں چکے ہو!"

"تم واقعی غلطی نہیں کر رہے۔" میں نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "جہانگیر اب 'سی ایف کے' میں رہتے ہوئے میرے لیے کام کرتا رہے گا۔ دنیا کی ہر تنظیم میں کچھ ایسے کردار بھی ہوتے ہیں جو بیک وقت اپنے اور اپنے دشمن کے لیے خدمات انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ڈبل ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ وہ حقیقت وہ کسی کے دوست ہوتے ہیں اور نہ دشمن۔ وہ سب کچھ اپنا ہی ہوتے ہیں۔ اپنے دوست، اپنے دشمن!"

"ایسے لوگ تو بہت خطرناک ہوتے ہیں!"

"میں ان کی خطرناکی سے فائدہ اٹھانا جانتا ہوں۔"

وہ بولا "تمہارے ساتھ رہتے ہوئے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پست گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

منہاس باقر بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں ٹھیک ساڑھے چار بجے اس کے دفتر پہنچا تو اس نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔ منہاس کے اخبار کا دفتر میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ وہ شام کے ایک اخبار کا ایڈیٹر و پبلشر تھا۔ صبح دھام کے بیشتر اخبارات کے دفاتر میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) پر ہی پائے جاتے ہیں، علاوہ انہیں مختلف ڈائجسٹ و رسائل کی تیاری کے مراکز بھی اسی تاریخ ساز سڑک پر یا اس

کے دائیں بائیں موجود ہیں۔ میکلوڈ روڈ پبلشنگ مارکیٹ کی سی حیثیت کی حامل ہے۔

منہاس باقر نے حالیہ حالات پر ڈسکس کرنے سے پہلے ایک عجیب و غریب سوال کیا "بھئی! یہ تم کیا شے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ تمہاری طرح یہ بھی انتہائی حیران کن ہے!"

میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اس شے کو تلاش کرنے لگا جس کا ذکر منہاس باقر نے کیا تھا۔ مجھے اس کوشش میں ناکامیاب پا کر اس نے کہا۔

"بھئی، میں تمہاری ٹیلی کی بات کر رہا ہوں!"

"اوہ!" بے ساختہ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی "تو آپ ڈارلنگ کی بات کر رہے ہیں۔"

میں شہزادہ کیساتھ گلستان جو ہر روانہ ہوتے وقت اپنی ٹیلی شیر ڈور ڈارلنگ کو سینیں چھوڑ گیا تھا۔ منہاس باقر نے سختی خیر انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تو تمہاری اس ٹیلی کا نام ڈارلنگ ہے!"

"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی "یہ کل..... یعنی آج میرے ساتھ لاہور جا رہی ہے۔" پھر میں نے ذرا توقف کے بعد پوچھا "آپ نے اسے حیران کن کیوں کہا۔ کیا اس نے آپ کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا تھا؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا "دراصل، میں نے اپنے ایک ملازم سے کہہ کر تمہاری ڈارلنگ کی کچھ خاطر داری کرنا چاہی لیکن اس نے ہماری کوششوں کو لفٹ نہیں دی بلکہ وہ تو تمہاری گاڑی سے باہر آنے پر ہی تیار نہیں کیا یہ کچھ کھاتی جیتی نہیں؟"

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے آج تک اسے کھاتے پیئے نہیں دیکھا تھا۔ ہا نہیں، وہ اپنی ضروریات کب اور کس طرح پوری کرتی تھی۔ اسی طرح ربح حاجات کا بھی اس کا اپنا ہی کوئی شیڈل تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کبھی گھر کو گندا کیا تھا اور نہ ہی کسی اور طور مجھے شکایت کا موقع دیا تھا۔

"بس جناب! یہ بڑی موڈی ٹیلی ہے۔" میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔

وہ زہریلے مسکرایا "ڈارلنگ کو موڈی ہی ہونا چاہیے۔" پھر ہم اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اسے حالیہ مشن کے بارے میں بتایا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ جہانگیر کو میں نے اپنی مرضی اور دور رس مفید نتائج کی خاطر چھوڑ دیا ہے، وہ اب میرے ایک وفادار کی حیثیت سے "سی ایف کے" میں کام کرتا رہے گا۔

میں نے اسے اپنے حلق صرف اتنا بتایا کہ اتفاق سے اس تنظیم کے بگ باس سے میرے دوستانہ مراسم ہیں لیکن یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی کہ "سی ایف کے" بظاہر ایک اصلاحی اور سماجی تنظیم ہونے کے ساتھ ساتھ یہودی لابی کی بھی آلہ کار ہے۔

"اب تو تمہیں یقین آ گیا نا؟" اس نے نہایت ہی سنجیدگی سے پوچھا۔

"مہذہب! میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

وہ جھیر آواز میں بولا "تم میرے خیالات اور عزائم سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہو وہ جہاں!"

"ہاں، میں جانتا ہوں، آپ ایک سچے پاکستانی اور محبت وطن انسان ہیں۔ پاکستان کی سالمیت اور اس شہر کے امن و امان کو غارت ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔" میں نے اس کے خیالات کی حقیقی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "جو بھی یہودی قوت کسی بھی اندرونی قوت کے توسط سے اپنی پاکستان سرگرمیوں میں ملوث پائی گئی، آپ اس کے خلاف جنگ کریں گے۔ یہودی لابی، سی ایف کے کے پلیٹ فارم سے کراچی میں دہشت گردی کی وارداتیں کر رہی ہے تاکہ پاکستان کو "دہشت گرد نمبر ایک" ملک ثابت کیا جاسکے، ایسا کہہ تو وہ کافی عرصے سے رہے ہیں۔"

منہاس باقر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "یہود ہندو بھی مسلمان کے دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے حالانکہ اس دعوے کا سب سے زیادہ ڈھنڈورا ابھی دونوں قومیں بجاتی ہیں۔ یہ مختلف قسم کی سنہری جالوں اور دلفریب آپیٹائز کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ہمد تن مصروف رہتے ہیں خصوصاً یہودی اس "کارخیز" میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کے قلعے کو بھی خواہ نظر آتے ہیں اور دوسری جانب وہ اسلام کے قلعے کو "نمبرون دہشت گرد" ثابت کرنے کے لیے خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بھی ملوث دکھائی دیتے ہیں۔" وہ سانس لینے کی خاطر رک پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ابھی تم نے جم براؤن کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اگر یہودی لابی، 'سی ایف کے' کے توسط سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے تو ہمارے ملک خصوصاً اس شہر کراچی کے لیے یہ کتنی بڑی بدنامی کا مقام ہوگا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

"میں آپ کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"صرف اتفاق؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"چند روز قبل میں نے تم سے ذکر کیا تھا کہ میں تمہیں ایک نہایت ہی اہم مشن سوچنے والا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا "میرا مشن اب تمہارے سامنے کھل چکا ہے۔ میں اپنے شہر، اپنے ملک سے یہودی لابی کی جڑیں اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہوں..... اور اس سلسلے میں میرا پہلا نشانہ "سی پی ایف" ہوگی۔"

"سی پی ایف؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

وہ بولا "ہاں، میں نے 'سی ایف کے' کا نام تبدیل کر دیا ہے۔ اب میرے ذہن میں یہودی لابی کی آلہ کار اس تنظیم کا نام "سی پی ایف" ہی نقش رہے گا..... یعنی "کرائم پروڈیوسنگ فیکٹری!"

"ڈنڈر فل!" میں نے سراپنے والے انداز میں کہا۔

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا، بولا "کیا تم مجھ سے مکمل تعاون کرنے کے لیے تیار ہو؟ ذرا سوچ مجھ کو جواب دینا کیوں کہ اس تنظیم کا پاس تمہارا دوست بھی ہے!"

میں نے ٹھہری ہوئی نگاہ سے اسے دیکھا اور ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے دونوں لہجے میں کہا "اس کا دار و مدار آپ پر ہے منہاس باقر صاحب!"

"دوسرے طرح؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "پاکستان صرف آپ کا نہیں، بلکہ میرا بھی ملک ہے۔ یہ کم از کم چودہ کروڑ افراد کا ملک ہے۔ آپ کی طرح اس ملک کا کوئی بھی دشمن میری آنکھ میں بھی غاری طرح کھٹکتا ہے، چاہے وہ یہود ہو یا ہندو ہو..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کا اس مشن میں آپ کا ساتھ دوں تو پھر آپ کو میری بھی ایک تجویز ماننا ہوگی۔"

"کون سی تجویز؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "منہاس صاحب! 'سی ایف کے' یا بقول آپ کے 'سی پی ایف' کینسر کے مرض کے مانند ہے جو پورے شہر میں پھیلنے لگا ہے۔ اس کے کسی ایک حصے کے آپریشن سے بات نہیں بنے گی بلکہ ہمیں آہستہ آہستہ اسے اندر سے کزور کرنا ہوگا تاکہ اس کی جڑوں کو کوکھلا کیا جاسکے۔ میں نے تنظیم کے خفیہ معاملات کی خبر گیری کے لیے جہانگیر کو مقرر کر دیا ہے۔ وہ میرے دوست کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب شعیب غوری بھی میری دوستی کا دم بھرتا ہے۔ میں اس پر غاڑ نہیں ہونے دوں گا کہ میں



اس کی اصلیت جان چکا ہوں۔ شعیب کا ایک برطانوی یہودی دوست مسٹر نیل آرمر بھی مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔“ میں نے کثیر المالیت سونے اور اس کی بازیابی کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا۔ منہاس باقر میرے موجودہ بینک بینکس سے بھی واقف نہیں تھا۔ سنگاپور سے آنے والی رقم کے بارے میں صرف شعیب غوری ہی جانتا تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں شعیب غوری کا دوست رہے ہوئے بہ آسانی نیل آرمر کے قریب ہو سکوں گا۔ مجھے شک ہے، نیل آرمر یہودی لابی کی نمائندگی کر رہا ہے۔ لابی اور شعیب کے درمیان رابطے کا ذریعہ یہی شخص ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے، اس تنظیم سے تعلق رکھتے ہوئے زیادہ بہتر طور پر اس کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔ اسے وقتی اور عارضی طور پر ختم کرنا سودمند نہیں ہوگا بلکہ مضبوط پلاننگ سے ہم اسے نیست و نابود کر سکتے ہیں اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ آپ فی الحال ”سی ایف کے“ کو بھول جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا ”یہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے!“

میں نے کہا ”منہاس صاحب! معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ واقعی مجھے اس مشن میں شامل رکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو میرے ذہن سے سوچنا ہوگا اور میری پلاننگ کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ میں ایسے سینٹ اپ میں مود نہیں کر سکتا جہاں میری حیثیت کسی آلہ کار کی سی ہو اور مجھے کسی دوسرے کے اشاروں پر چلنا پڑے۔“

”تمہاری صاف کوئی مجھے پسند آئی وجدان!“ منہاس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”قاضی سلطان اور اس کی بیٹی ممتاز کی زبانی میں تمہارے بارے میں جو کچھ سنا ہے اور ابھی ممتاز اور ساحل کے تازہ ترین افواہ سے متعلق بھی جو حالات سامنے آئے ہیں ان کے چٹنی نظر میں تمہاری بہادری، جرأت مندی، ذہانت اور معاملہ بندی کا قائل ہو گیا ہوں۔ تمہاری کارکردگی نسلی بخش ہی نہیں بلکہ قابل رشک ہے۔ اسی بنا پر میں نے یہودیوں کی سرکوبی والا مشن تمہیں سوپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری طرف سے تم اپنی مرضی سے مود (MOVE) کرنے کے لیے آزاد ہو۔ تمہیں جس قسم کا تعاون اور مدد درکار ہو، میں تمہیں فراہم کرنے کو تیار ہوں۔ ایک اخبار کے مالک کی حیثیت سے میری پہلی بہت دور تک ہے۔ شہری انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے میں تقریباً ہر نوعیت کی مدد اور ہولت حاصل کر سکتا ہوں۔ بولو، تم کیا چاہتے

ہو؟ تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟“

میں نے اسے پکارنے کی خاطر کہا ”منہاس صاحب! اگر آپ کو میری کوئی بات بخموس ہوئی ہو تو میں ایک سربراہ پھر معذرت چاہوں گا۔ آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آپ قاضی سلطان کے دوست بھی ہیں اس لیے میں واضح الفاظ میں کہوں گا، اگر آپ میری بات سے اتفاق نہ ہو تو میں اس صورت میں ایک حد سے زیادہ آپ سے تعاون نہیں کر سکتوں گا۔“

اس نے کوئی سوال نہیں کیا، خاموش اور کوجبی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا ”بر دست میں آپ کو ”سی ایف کے“ کے دو ٹھکانوں اور وہاں کے ٹرانوں کے نام اور سب سے بتا سکتا ہوں۔ تیسرے ٹھکانے کے ٹھکان کا صرف نام مجھے معلوم ہے، ٹھکانے کا ایڈریس میں نہیں جانتا۔“ پھر میں نے اسے ”سادھ“ اور ”ایسٹ“ کا مکمل پتا سمجھانے کے بعد کہا ”سادھ اور ایسٹ میں میرا جانا ہوا ہے۔ سادھ کا کرتا دھرتا کبیر شاہ ہے جبکہ ایسٹ کی کمان سراج الدین کے ہاتھ میں ہے۔ چھانگیر کی زبانی ”پلیئر“ کے پاس کا نام تسلیم واسطی معلوم ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ”سی ایف کے“ کا ”سینٹرل“ اور ”ویسٹ“ میں بھی ایک ایک ٹھکانا موجود ہے۔ آپ اپنے طور پر جس طرح چاہیں کسی بھی قسم کی کارروائی کر سکتے ہیں، مجھے آپ سے کوئی شکوا گھڑ نہیں ہوگا۔ اس بات کو ایک لمحے کے لیے بھی ذہن میں نہ لائیں کہ اس پراسرار تنظیم کا بگ باس شعیب غوری میرا دوست ہے۔۔۔۔۔ اور اس کو پہنچنے والا نقصان میرے لیے تکلیف کا باعث۔۔۔۔۔“

منہاس باقر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ”مجھے کچھ نہیں کرنا، بس ایک بات ذہن نشین کر لو وجدان!“ وہ چند لمحے بڑی گہری نگاہ سے مجھے دیکھتا رہا پھر تیسرا دواڑ میں بولا ”میرا مشن اور تم لاڈل و ملزم ہو چکے ہو۔ اب یہ تمہارے ہی ہاتھوں تکمیل کو پہنچے گا۔ تم جتنا دلدردی طور پر چھینیں کیا کرنا ہے! اس پلان کے ماسٹر تہی ہو۔“

میں نے اطمینان بھری سانس کھینچی اور کہا ”ٹھیک ہے، میں نے یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں لیکن آپ سے ایک درخواست ہے، اس معاملے کو بہت رازداری میں رکھا جائے۔“

”ایسا تو یقیناً کرنا ہوگا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”یہ بات میرے ہاتھوں سے اور شہزاد کے درمیان رہے گی۔“

”اور اگر آئندہ کسی مرحلے پر آپ کو پولیس وغیرہ کی مدد لینا پڑی تو پھر کیا صورت رہے گی؟“ میں نے ایک امکانی بات کی ”ایسا سوچ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔“

وہ بولا ”ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے معاملات کو چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا ”آپ معاملات کو چھپائیں یا سامنے لائیں، یہ میں آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔ بس میں اتنا چاہوں گا، اس سلسلے میں میرا کہیں ذکر نہیں آنا چاہیے۔ آپ شہزاد کو یا خود کو آگے رکھ کر ٹھیکیں، میں در پردہ آپ کی مدد و رہنمائی کرتا رہوں گا۔“ مجھے منظور ہے! وہ میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہوتے لہجے میں کہا ”میں تو لاہور جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد کامیاب لوٹوں گا۔ اس کے بعد میری پوری طرح ”سی ایف کے“ کے خلاف سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ اس دوران میں آپ ایک چھوٹا سا کام نہ لائیں۔“

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”کون سا کام وجدان؟“

”آج ٹھیک دس بجے یورپی ملک کا سفیر جرم براؤن ائیر پورٹ پہنچے گا۔ اڑان بعد اسے سرکاری تزک و احتشام کے ساتھ ائیر پورٹ سے ہول تک پہنچایا جائے گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ”میں آپ کو تمام امور سے آگاہ کر چکا ہوں کہ وہ کس طرح نرسری کے مقام پر شکار کیا جائے گا۔ آپ کو اس پیشگی اطلاع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آپ کی پہنچ دور تک ہے۔ آپ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس طرح آپ ذمہ دار افراد تک اس خطرناک خبر کو پہنچا سکتے ہیں اور کیسے وہ لوگ اپنے مہمان سفیر جرم براؤن کی زندگی کی حفاظت کریں گے۔ بہر حال، یہ آپ کے لیے بڑی کرڈٹ کی بات ہوگی کہ آپ کے تعاون سے ملک کی عزت محفوظ رہی ورنہ جرم براؤن کے سہیانہ قتل سے ہمارے ملک کا نام کتنا بدنام ہوگا، یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں!“

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، پھر اچانک آواز میں بولا ”میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گا بلکہ میں ابھی سے اپنے ٹھکانے دوڑانا شروع کرتا ہوں۔ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے مگر۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک کا اور کچھ سوچنے کے بعد بولا ”مجھے سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے، ایسی بھی ایک سازش کی پیشگی اطلاع مجھ تک کی پہنچ کی؟“

میں نے خمسوں کیا، منہاس باقر کچھ زیادہ ہی مجھ سے متاثر

ہو گیا تھا۔ وہ ایک کامیاب صحافی تھا، شام کے معروف اخبار کا ایڈیٹر و پبلشر تھا لیکن یہ سوال اس نے مجھ سے کچھ ایسے انداز میں کیا تھا جیسے وہ میری انگلی پکڑ کر چل رہا ہو۔

میں نے کہا ”جنا! آپ کے لیے یہ کیوں سا مشکل کام ہے۔ آپ کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہیں پھر کیا ضروری ہے، آپ ان لوگوں کو اپنا سورس (SOURCE) بھی بتائیں!“ آخر میں، میں نے مذاق کے رنگ میں کہا ”باخبر ذرا دل“ اور ”نامعلوم افراد“ کے معاملے میں تو دیے بھی شام کے اخبارات خاصے ماہر ہیں!“

وہ زبرد پر مسکرایا ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کچھ کرتے ہیں۔“

”ایک بات یاد رہے منہاس صاحب!“ میں نے کہا ”جرم براؤن والے معاملے کے بارے میں، میں نے شہزاد کو کچھ نہیں بتایا۔ آپ بھی اس پر یہی ظاہر کریں کہ آپ کو کسی اور ذریعے سے پتا چلا ہے۔۔۔۔۔ یا جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔“

میں خاموش ہو کر اپنی کلائی پر بندھی رسٹ وایج کو دیکھنے لگا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اب مجھے وہاں سے اٹھ جانا چاہیے تھا۔ میرا بیک فلیٹ پر رکھا تھا جس میں میرے دیگر سامان کے ساتھ، پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ بھی موجود تھے۔ میں نے منہاس باقر سے رخصت کی اجازت چاہی تو وہ دعا بیے انداز میں بولا۔

”میری دلی خواہش ہے کہ تم اپنی ساتھی ساحل کے ہمراہ بہت جلد واپس آؤ۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اپنے ایک دوست کا پتا لکھ کر دیا اور کہا ”فرید یا شامیرا دیرینہ دوست ہے۔ تم اس کے پاس جا کر میرا نام لو گئے تو وہ لاہور میں تمہارا ہر مسئلہ حل کر دے گا۔“ پھر احتیاطاً منہاس باقر نے فرید یا شامیرا کا فون نمبر بھی اسی پرپے پر درج کر دیا۔ ”مجھے امید ہے، یہ شخص تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔“

میں منہاس باقر سے معافہ کر کے اس کے دفتر سے نکل آیا۔

☆☆☆

ٹھیک سوا پانچ بجے میں اپنے فلیٹ میں تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں بچا تھا کہ ایک بھر پور نیند نہ سکا۔ مجھے ساڑھے چھ بجے ائیر پورٹ پہنچنا تھا جس کے لیے چھ بجے گھر سے نکلتا ضروری تھا۔ گزشتہ پوری رات پہ درپہ

معرکہ آرائی میں گزری تھی۔ مجھے آرام کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آ سکا تھا۔ بدن ٹوٹ رہا تھا اور جی چاہتا تھا، لمبی تان کرو سو جاؤں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اگر میں بے فکری سے ٹانگیں پھار کر سو جاتا تو فلائٹ میرا انتظار نہ کرتی۔ فلائٹ، ٹرین اور اسی قسم کی دوسری سواریاں وقت کے مانند ہوتی ہیں اور وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

یوگا..... ہمیشہ سے میرے لیے ایک ایسی نعمت خداوندی ثابت ہوا ہے جس کا میں جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہوگا۔ اس کی بعض مشقیں گھنٹوں، بلکہ دنوں کی ٹکان چنگیوں میں اتار دیتی ہیں۔ ایسے یوگی بھی میری نظر سے گزرے ہیں جو باقاعدہ سوئے بغیر سالوں گزار دیتے ہیں۔ وہ ”چھپکی نیند“ کے سہارے ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ ”چھپکی نیند“ ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لمبی نیند۔ اس نیند کے ماہر یوگی کو جب بھی چند لمحات سکون کے میسر آتے ہیں، وہ آرام دہ جگہ پر بیٹھ کر جسم کو ڈھیل چھوڑ دیتا ہے پھر آنکھیں بند کر کے لمبی سانس لے جاتی ہیں اور اس کے بعد ”چھپکی نیند“ اس نیند کا دورانیہ چند سیکنڈ سے چند منٹ تک ہو سکتا ہے لیکن اس کے طویل انسان گھنٹوں نیند کی ضرورت محسوس نہیں کرتا..... اور جب ضرورت پڑی، ایک اور ”چھپکی“ لگائی۔

میرا چھپکی نیند سے استفادہ کرنے کا تو کوئی ارادہ نہیں تھا تاہم سانس کی بعض مشقیں بہت ضروری تھیں۔ میں آج کل ”جی“ کی ایڈوانس پریکٹس کر رہا تھا اس لیے اس نیک کام کا تسلسل جاری رکھنا بھی اشد ضروری تھا۔ اگلے دس منٹ میں، میں نے ایک مرتبہ پھر شاہ لیا اور تازہ دم ہو کر یوگا کی مشق میں مصروف ہو گیا۔

میں نے سمندری کی جانب کھٹنے والا سلائیڈنگ ڈور مکمل طور پر سلائیڈ کر دیا۔ ٹھنڈی اور نمکین سمندری ہوا کے جھونکے گھر کے میں پہنچنے لگے جو بدن سے ٹکرا کر ایک عجیب سی گدگدی کا احساس جگاتے تھے۔ رگوں میں ایک خوشگوار سنسنی دوڑنے لگتی اور کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی جانب دل مائل ہو جاتا۔ علی الصباح کی سمندری ہوا بڑی تحریک آمیز ہوتی ہے۔ اس کی جذبات انگیزی کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

میں اپنے بندھن میں قالین پر شمال رخ کھڑا ہو گیا اور پہلے تھ یوگ (باڈی یوگا) کی ایک سادہ اور آسان سی مشق کرنے لگا۔ یوگا میں ”رخ“ کی بڑی اہمیت ہے، خاص طور پر اگر سانس کی مشق کرنا ہو تو پھر شمال رخ کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ دراصل شمالی اور جنوبی دو قطبین کے درمیان مسلسل

مقناطیسی لہروں کا سفر جاری رہتا ہے۔ اگر شمال کی جانب رخ کر کے کوئی مشق کی جائے تو اس کی نہ صرف افادیت بڑھ جاتی ہے بلکہ مقصد کے حصول کے لیے ٹائم پیرڈ میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ شمال سے جنوب کی طرف پھیلے ہوئے مقناطیسی جال میں انسان کا جسم اور ذہن اگر ٹیون (TUNE) ہو جائے تو کیا کہنے! اس بات کو آسانی سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جس طرح سیٹلائٹ ریسیور کی مدد سے فضا میں بکھری ہوئی لہروں کو کچل کر کے ٹی وی سیٹ میں ٹیون کر لیا جاتا ہے۔ ریسیور کی فریکوئنسی جس ٹی وی چینل سے کچل کر چلائے۔ اس کی نشریات ٹی وی تک پہنچنے لگتی ہیں۔ ٹی وی ٹرانسمیشن میں جو رول سیٹلائٹ ریسیور ادا کرتا ہے، اسی سے ملتا جلتا کردار یہ مقناطیسی لہریں بھی ادا کرتی ہیں۔ ان کی (TUNING) کے سبب کسی بھی مشق سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

میں نے شمال کی سمت رخ کر کے دونوں پاؤں کو آپس میں ملایا، ہاتھوں کو پہلوؤں پر رکھا اور ہلکی چھپکی مشق کا آغاز کر دیا۔ اس دوران میں میری آنکھیں بند تھیں۔ میں نے دھیرے دھیرے (INHALE) کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھانا شروع کیا اور سانس کے اختتام پر میرے دونوں ہاتھ سر سے بلند ہوئے درجے کا زاویہ بنا رہے تھے۔ اس مقام پر میں نے تین سیکنڈ (STAY) کیا۔ اس وقت کو شمار کرنے کے لیے باقاعدہ کسی گھڑی کی ضرورت نہیں۔ آپ نہایت دھیمے انداز میں تین تک گنتی بھی گن سکتے ہیں۔ اس لمبی قیام کا مطلب یہ ہوا کہ تین سیکنڈ تک ہوا میرے ہچکچڑوں میں مقید رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے (EXHALE) کرتے ہوئے بازو نیچے آنے لگے۔ نہ صرف بازو بلکہ کمر سے اوپر کا پورا بدن بھی زمین کی جانب جھکنے لگا۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک میری ہتھیلیوں نے فرش سے قالین کو نہیں چھو لیا۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے پھر تین سیکنڈ کا قیام کیا، گویا اس پوزیشن میں، میں نے تمام سانس جسم سے خارج کر دی تھی۔ لمبی قیام کے بعد (INHALE) کے ساتھ ساتھ میرا بدن پھر بلند ہونے لگا اور واپس ابتدائی حالت میں آ گیا۔ اس سادہ اور معصوم سی مشق کا ایک چکر مکمل ہو گیا تھا۔ میں نے تین چکر کی تکمیل کے بعد مشق ختم کر دی۔

اس مشق میں سانس کی آمد و شد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سانس پہنچنے یعنی (INHALE) اور سانس چھوڑنے یعنی (EXHALE) میں ایک ردھم (RHYTHM) قائم رہنا چاہیے اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سانس کو ناک

کے راستے پھپھروں میں اتار جائے اور منہ کے راستے خارج کیا جائے۔

اس کے بعد میں نے (HEAD STAND) لگایا۔ یہ بہت ہی نازک، حساس اور خطرناک مشق ہے جس پر بعد میں کبھی تفصیلی روشنی والوں گا۔ فی الحال اتنا جان لیں کہ جس طرح جنگل کا پیادہ شیر ببر، پھولوں کا راجا گلاب، پھولوں کا شہنشاہ آم اور قیمتی پتھروں کا سر تاج ڈائنڈ ہے، بالکل اسی طرح جھ پوگ (ہاڈی پوگ) اور راج پوگ (دما پٹی پوگ) میں ہیڈ اسٹینڈ (HEAD STAND) کو تمام مشقوں کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پوگ کی اس مشق کو ماہرین فن، پوگ کے دو شعبوں یعنی ”ہتھ“ اور ”راج“ پوگ میں بہ یک وقت شمار کرتے ہیں۔ میں نے ہیڈ اسٹینڈ (CANDLE POSTURE) کو بہت ہی مفید اور مشق کل پایا ہے۔ اس مشق کو عام اور سادہ الفاظ میں ”سر کے بل ٹھہرے ہونا“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس پوچر کے درجنوں انداز اور طریقے رائج ہیں۔

ہیڈ اسٹینڈ یعنی کیڈل پوچر کے بعد میں نے سانس کی مشقوں کا شعبہ یعنی پرائانام (PRANAYAM) آزمایا اور ”جی“ میں اپنی استعداد بڑھانے کے لیے اسٹروک بریتھنگ (STROKE BREATHING) کرنے لگا۔ میں نے بشکل تمام پندرہ منٹ میں پوگ کا سیشن مکمل کر لیا۔ اس کے بعد کرسی پر سیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ پندرہ میں منٹ بعد مجھے فلیٹ سے نکل جانا تھا۔ اس لیے میں تھوڑا ریلیکس ہو رہا تھا۔

اچانک میرے سر کو ایک جھکا سا گ، جیسا اونگھنے کے دوران میں ہوتا ہے۔ میں یہی سمجھا، شاید چند سیکنڈ کے لیے واقعی میری آنکھ لگی تھی۔ میں نے آنکھیں بند رکھے ہوئے کمرے کے ماحول کو محسوس کرنا چاہا اور دوسرے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی کا احساس ہوا۔

میرے چونکنے کا سبب ایک مخصوص قسم کی خوشبو تھی۔ میں اس خوشبو کو ہزاروں، لاکھوں خوشبوؤں کے درمیان شناخت کر سکتا تھا۔ یہ خوشبو ایک براسر اذات سے منسوب تھی اور اس کی آمد کے ساتھ ہی آتی تھی۔ میں نے بے ساختہ ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

کمر اٹھ گیا تھا۔ میں نے متلاشی نگاہ درود پوار پر ڈالی لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی جس کی مخصوص خوشبو سے کمر ابھرا ہو تھا۔ میرا دل یک بارگی دھڑکنے لگا اور اسی لمحے میری نظر

سلائیڈنگ ڈور سے باہر چلی گئی۔ پوگ کی مشق سے پہلے میں نے سلائیڈنگ ڈور کو پوری طرح کھول دیا تھا اور اس کھلے ہوئے دروازے کے باہر میں نے اس کے آثار دیکھ کر ایک جھرجھری لی۔ اس وقت تاریک رات کا اندھیرے دھیرے دھیرے چھٹنے لگا تھا۔ اس نیم تاریک فضا میں وہ کسی مشعل کے مانند روشن روشن میری سمت تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کا وہ سالہ سلائیڈنگ ڈور سے اندر داخل ہو گیا۔ میں کھلی آنکھوں سے اس بجز روزگار کو دیکھ رہا تھا۔ پر جوں کی وہ شہزادی، مجسمہ حسن و جمال میرے سامنے ہوا میں غلط تھی۔ اس کے بدن سے شہنشاہی آنکھ والی دلکش روٹیش روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں یک دم ہالی کی اس ساحرہ نیلگہری کو دیکھتا چلا گیا۔

وقت گویا ختم کر رہ گیا۔ اچانک نیلگہری کے باقوتی لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر میں نے ان نازک لبوں میں ان دیہی جنبش محسوس کی۔ اسی وقت میری سماعت میں شہد کی مکھیوں ایسی جھنجھٹ گونج اٹھی۔

نیلگہری کے کلام کا یہی طور تھا۔ وہ ہونٹوں سے کچھ نہیں بولتی تھی مگر اپنی بات کو سانسے والے تک پہنچانے کا ہنر اسے بخوبی آتا تھا۔ وہ پہلے کبھی کبھی مرتبہ مجھ سے اسی انداز میں گفتگو کر چکی تھی۔ میں نے واضح طور پر سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”وہ جان! کیسے ہو؟“

بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ”جیسا بھی ہوں، تم سے پوشیدہ نہیں۔“

اس کے چہرے پر بخند، ظاہر ہوا۔ مجھے یوں لگا، میرے جواب نے اسے تکلیف پہنچائی ہو مگر میں بھی کیا کرتا۔ اس نے چند روز قبل لپٹی کے جلو میں مجھے جو چوٹ دی تھی، میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے لہجے میں آپوں آپ کی در آئی تھی۔

نیلگہری نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ مجھے اپنے بدن سے پار ہوئی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے دیکھن اور دیکھن میں ایک عجیب قسم کا ظلم پایا جاتا تھا۔ اس نے قدرے نرم اور دل جوئیانہ انداز میں استفسار کیا ”مجھ سے ناراض ہو؟“

”ہاں نیلگہری!“ میں تم سے خفا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اس خفگی کی وجہ کیا ہے؟“

”تم میری ناراضی کا سبب اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”اگر تمہارا اشارہ لپٹی والے واقعے کی جانب ہے تو میں

بھی کہوں گا، تمہاری خفگی، ناراضی اور شکوہ جائز نہیں۔“ وہ یک دم بخیدہ ہو گئی۔

میں نے تیز آواز میں پوچھا ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

نیلگہری کی بات نے مجھے غصہ دلا دیا تھا تاہم میں نے اس پر اپنے غصے کا اظہار کیے بغیر ہی سوال کیا تو وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”دیکھو وہ جان! میں تمہیں اپنا محبوب مانتی ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ اس روز سے جب تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تم نیپال کے رتھ پارک میں میرا ٹوٹا ہوا کرشل کا سمجھ اٹھا کر اپنے فلیٹ پر لے گئے تھے۔ تم نے اس رات نہ صرف میری حفاظت کی بلکہ باقاعدہ اس کا شپ سے تم نے میری ”مرہم پٹی“ بھی کر ڈالی۔“

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئی ”اس کے بعد بھی تم دفعتاً تو قمار میرے کام آتے رہے جس سے میرے قلب کی نظر میں تمہاری محبوبیت بڑھتی چلی گئی۔ مجھ پر تمہارا سب سے بڑا احسان تو وہ ہے جب تم نے مجھے یوگی گوتم بمشور کے قبضے میں جانے سے بچایا۔ ”گوپو“ کی بدھ عبادت گاہ میں تم نے ہدی کی قوتوں کے خلاف ایک حکم کھلا جنگ لڑی جس میں تمہیں فتح نصیب ہوئی اور۔۔۔۔۔“

میں نے فطرتی کلائی کرتے ہوئے کہا ”یہ تمام واقعات میری بادشاہت میں محفوظ ہیں لہذا انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تم نو دی پوائنٹ بات کرو اور مجھے تاؤ، لپٹی والے واقعے پر میری خفگی، ناراضی اور شکوہ کیوں جائز نہیں؟“

اس کے چہرے پر دکھ کے سائے بھر گئے۔ شکوہ کناں لہجے میں بولی ”تم بڑے کمزور ہو وہ جان!“

میں خاموش نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ حسن بے مثال کی مالک ایک براسر راستی تھی جس کی خفگیوں کو میں دیکھتا اور مانتا چلا آیا تھا لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے اس نے میری زندگی میں جو رول ادا کیا تھا، اس نے مجھے اس کی طرف سے خاصا بدلگان کر دیا تھا، خاص طور پر، لپٹی کے بنگلے پر پیش آنے والے واقعات کا تصور کر کے مجھے اپنی شکست کا احساس ہوتا تھا۔

میں بچپن سے اب تک بڑی در بدری کی زندگی گزارتا آیا تھا اور اس فکر گرجتے والی زندگی میں خوبصورت لڑکیوں کی بہتات رہی تھی جن میں سے اکثر مجھ پر مرتی تھیں، بعض نے تو مجھے حاصل کرنے کی جیسی جیسی کوششیں بھی کر ڈالیں۔ چاکی دیوی، رانی روپ متی، سونیا، تھانی، وانگ۔۔۔۔۔ ایک طویل فہرست ہے۔ بنگاک میں، مارشل آرٹس سینٹر چلانے والی

کوشلیا نامی ایک لڑکی نے تو زبردستی مجھے حاصل کرنی کی کوشش بھی کی تھی جو میں نے ناکامیاب بنادی تھی مگر لپٹی۔۔۔۔۔ میں اس سرمنی حسینی کی ظلم گری کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ اس شعلہ جوالہ، آفت کی پرکالہ نے وہ کام دکھایا کہ میں دیکھنا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔

نیلگہری نے میرے خیالات پڑھ لیے۔ وہ خیال خوانی کی بھی ماہر تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے انداز سے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میں نے مضطرب نظر سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔

”وہ جان! تم لپٹی اور اس کے ”کارنائے“ پر برہم بھی ہو اور اس کے بارے میں مسلسل سوچتے بھی جا رہے ہو!“

”اس کا یہ ”کارنائہ“ تمہارا رچین منت ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ شوخی سے بولی ”پھر تو تمہیں میرے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”تم پھر اصل موضوع سے ہٹ رہی ہو نیلگہری!“

”میں اسی کی طرف آ رہی ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا اور خاموش ہو گئی۔

اس کی خاموشی اور اس کی سنجیدگی میں بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ یہ درحقیقت رعب حسن اور دبدبہ قوت تھا۔ وہ لاہ زوال حسن اور بے پناہ قوتوں کی مالک تھی۔ میں ٹھہری ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ کبھی یوں محسوس ہوتا، اس نے نہایت ہی یقین لہاس زیب تن کر رکھا ہے اور کبھی یہ احساس آنکھوں کا دھوکا لگنے لگتا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا، اس نے لہاس کو پہن رکھا ہے یا لہاس نے اسے!

”میں نے تمہیں اپنا بنانے کی ہر کوشش کر ڈالی۔“ نیلگہری کی شیریں بیانی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ”مگر تم نے میری ہر کوشش ناکام بنادی۔ اس کے بعد ہی میرے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا کہ اب میں تمہارے پیچھے نہیں بھاگوں گی بلکہ تمہیں اپنے تعاقب میں دوڑاؤں گی۔ تم کچے دھاکے سے بندھے اور سر کے بل چلتے ہوئے میرے پاس آؤ گے۔۔۔۔۔ میرے استعان پر۔ وہاں تک پہنچنے کا راستہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میرا مسکن کہاں ہے؟ جلد یا بدیر، آج نہیں تو کل تمہیں آنا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ آنا ہی ہوگا وہ جان!“

وہ خاموش ہو گئی اور بڑی فاحشہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں گویا موتی کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اتنی روشن اور گہری آنکھیں اور کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے بڑی معنی خیز، مجسم آمیز اور فکر انگیز بات کہہ کر

خاموشی اختیار کر لی تو میں اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے الفاظ کی معنی آفرینی اور اپنی پڑیری سے انکار ممکن نہیں۔ جب کسی معاملے میں انکار ناممکن اور اقرار لازم سمجھ کر تو انسان کی بے گلی میں حدود و اجازت ہوتا ہے۔

”تمہاری باتوں میں بڑے پیچ و خم ہیں نیلگری!“ میں نے تڑپ کر کہا۔

”اے مجھ کو کی زبان سے میں اسے اپنی تعریف سمجھوں گی۔“ وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

میں نے بے قراری سے پوچھا ”تم آج میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟“

”صرف تمہیں یہ بتانے کا اب میں تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گی۔“ وہ ایک دم بہت اداں دکھائی دینے لگی ”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ ہمالیہ کی گود میں تمہاری راہ دیکھوں گی اور میری.....“

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا ”.....اور میری کیا؟“

”رہنے دو..... کچھ آنے والے وقت کے لیے بھی چھوڑ دو۔“ وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی ”مستقبل کا ایک ایک لمحے تمہارے سامنے کسی کتاب کی طرح کھلتا چلا جائے گا۔ انتظار کرو اس وقت کا جب مستقبل، حال میں اور حال، ماضی میں بدل جائے گا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہ کر بڑی والہانہ نگاہ سے مجھے دیکھتی رہی پھر بڑی لگاؤ سے بولی ”میں نے تو اپنے محبوب کو حاصل کر لیا ہے، اب تم اپنی محبوبہ کو تلاش کرتے پھرو۔ الوداع میرے محبوب، الوداع! اس کا نکات کی کُسر کھتی تمہیں سلامت رکھے!“

اپنی بات ختم کر کے وہ ہوا میں تیرتی ہوئی میری جانب بڑھی، پھر وہ میرے انتہائی نزدیک پہنچ گئی۔ ان لمحات میں، میں گویا کوئی سنگی بن گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں حرکت کا خیال نہ آیا۔ نیلگری نے اپنے سر میں ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ سجایا، پھر صراحتی دار گردن جھکا کر اپنے منگرتی لب میری پیشانی پر بٹھ کر دیے۔

ان لمحات میں زمین کی گردش رک گئی تھی، وقت گویا ایک مقام پر جم گیا ہو۔ میں نہیں جانتا، کیونکہ کادو کون سا حصہ تھا جس میں نیلگری نے اپنی خواہش کی تکمیل کی۔ اس کا یوسہ لا زوال اور باکمال تھا۔ مجھے اپنی پیشانی میں ایک لطیف احساس اترتا ہوا محسوس ہوا جس نے میری روح کو سرشار کر دیا۔ میں کیف و انبساط کی جادوگری میں کھو کر رہ جاتا اگر نیلگری مجھے مخاطب نہ کرتی۔ اس کی شہدیلی جھنجھٹ نے میری ساعت کا دروازہ

تھپتھپایا۔ میں نے اسے کہتے ہوئے محسوس کیا۔ ”وجدان! میں جا رہی ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ کسی ابر بارے کے مانند ہوا میں تیرے ہوئے مجھ سے دور ہونے لگی۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ وہ اٹنے قدموں یعنی اپنے عقب میں سفر کر رہی تھی۔ اس کی فضا کی چال میں سب خزاں اور مستی کی سی کیفیت بھری تھی۔ میں نے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی ہوئی نیلگری کے نورانی پیکر سے مخاطب ہوتے ہوئے بس اتنا کہا ”جانی ہو..... جاؤ۔ میرا اللہ تمہیں بھی سلامت رکھے۔ اور یہ سلامتی تا قیامت ہو!“

”شکر ہے میرے محبوب!“ اس کے ہونٹ جسم ریز انداز میں متحرک ہوئے۔

اس کی مسکراہٹ کا ملکوتی حسن ٹھٹھیں مار رہا تھا۔ مجھے اپنا دل زبردست ہوتا محسوس ہوا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک فوری اور نہایت ہی اہم سوال نے سر اٹھایا۔ میری سوچ دلی کیفیت پر حاوی ہو گئی اور میں نے نیلگری سے سوال کیا۔

”جانتے جاتے میری ایک الجھن ہی ختم کرنی چاہی!“

اس کی مسکراہٹ میں کوئی کی دافع نہ ہوئی تاہم آنکھوں میں سوالیہ تاثر ابھر آیا۔ میں نے محسوس کیا، وہ میری الجھن جاننا چاہتی ہے۔

میں نے کہا ”بھیلے کچھ عرصے سے ایک سفید بلی میرے ساتھ تھی۔ وہ مجھ سے اتنی مانوس اور میری حراج آتشا ہو چکی ہے کہ میں نے خوش ہو کر اس کا نام ”ڈارلنگ“ رکھ دیا ہے۔ ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر کبھی بھی مجھے شک ہوتا ہے، کہیں اس کے روپ میں تم نہ ہو!“

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور ایک غنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی ”وجدان! تمہیں بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں تمہیں اپنے من کا دیوتا سمجھتی ہوں۔ تم میرے محبوب ہو۔ یاد رکھو، محبوب کی قربت حاصل کرنے کے لیے جو بھی جن کیے جاتے ہیں ان میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہم اپنے محبوب کو خوبصورت اور خوش نما نظر آئیں۔ اس عمل کے پیچھے ہماری لاشعوری کوشش ہوتی ہے کہ محبوب ہم پر نظر کرم کرے، ہماری جانب متوجہ ہو..... اور ہمیں اپنا محبوب بنا لے۔ اس بات کا ہمیں خود بھی احساس نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔“

وہ چند لمحات کو ساکت ہو کر مجھے دیکھتی رہی پھر بڑے متنی خیز انداز میں بولی ”تم نے محبت کی راہ پر قدم رکھ دیا ہے۔ آہستہ آہستہ تمہیں بھی ان منزلوں سے گزرنا ہے۔ جب تجرے سے گزر دو گے تو بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔“

بہر حال، میں تمہارے نزدیک آنے کے لیے کسی حقیر جانور کا سہارا نہیں لے سکتی۔ میرے پاس حسن ہے، جوانی ہے اور بے پناہ ایسی خفگیں ہیں جن کی مدد سے میں اور بہت کچھ حاصل کر سکتی ہوں۔ جنہیں بھاننے اور اپنی جانب مائل کرنے کے لیے میں خود کو حیرت تو کھار سکتی ہوں لیکن ایک بلی کے جسم میں روپوش نہیں ہو سکتی۔ تمہارا خیال بے غلط ہے۔“

”میں نے ڈارلنگ کی غیر معمولی اور پراسرار حرکتوں کے باعث ایسا سوچا تھا۔“

”ڈارلنگ غیر معمولی شے ہی کا نام ہے!“ اس نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ دوبارہ اپنے فضا کی سفر کو جاری رکھتے ہوئے بولی ”اور جہاں تک تمہاری ڈارلنگ کی پراسرار حرکتوں کا تعلق ہے، تو یہ راز بہت جلد تم پر کھل جائے گا۔“

”راز..... کیسا راز.....؟“

”دھیر دھیر وجدان!“ وہ مجھ سے دور ہوتے ہوئے زہر لب مسکرائی ”ہر کام کا ایک سے (وقت) مقرر ہے۔ نہ اس سے پہلے اور نہ ہی بعد میں۔ ہمیں ہر حال میں اس سے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ تم بھی انتظار کرو۔ ڈارلنگ کا راز کھلنے کا تمہاری محبوبہ معاملے کے نلنے کا، میرے محبوب وجدان کے نلنے کا..... انتظار، انتظار..... بس انتظار!“

اس کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی، اس کے ساتھ ہی میری نگاہ میں اس کا نورانی پیکر بھی وحشلانے لگا۔ وہ چٹانیں، کہاں سے آئی تھی! میں نے دور آسمان پر، بادلوں کے اندر سے اسے نمودار ہوتے دیکھا تھا اور وہ واپس انہی بادلوں کا حصہ بن گئی تھی۔

میں سلائیڈنگ ڈور سے باہر، نیلے آسمان پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا کہ اچانک میں نے اپنے قدموں میں ایک سرسراہٹ کی محسوس کی۔ ایک کے ساتھ ہی ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”میاؤں!“

میں یک لخت ڈارلنگ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو کر اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے اسے اختیار سے اٹھا کر گود میں لے لیا۔ وہ میرے سینے پر اپنا منہ رکھنے لگی۔ میں دھیرے دھیرے اس کے بدن پر اپنا ہاتھ بھر رہا تھا۔ میرے ہاتھ کے پیار بھرے لمس نے اس کے وجود میں سننا نہایت دوڑادی۔ وہ تھوڑی دیر اٹھیلیاں کرتی رہی پھر شانت ہو گئی۔

میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اس کا منہ اوپر اٹھا یا اور بڑی توجہ سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میں غیر ارادی طور پر ڈارلنگ کی آنکھوں میں نیلگری کو تلاش کر رہا تھا۔ اگرچہ نیلگری نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بار بار کہنے کی کوشش کی تھی کہ ڈارلنگ سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں مگر یہاں مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا تھا اور پھر نیلگری نے ڈارلنگ کا اسرار جلد کھلنے کی بات کر کے ڈارلنگ کی طرف سے مجھے اور زیادہ الجھن کر دیا تھا۔

ڈارلنگ میرے اس گمورنے کو پتا نہیں، کہا سمجھی۔ اس نے اپنے اگلے پنجے منہ پر رکھ لیے۔ چہرہ چھپانے کی اس کی یہ معصوم کوشش بڑی دلفریب تھی۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک رو مانوی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

”تم بہت شریرو ہوتی جا رہی ہو!“

”میاؤں!“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا ”جانتی ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں کون آیا تھا؟“

ایک مرتبہ پھر مجھے ”میاؤں“ کی آواز سنائی دی۔

میں نے ایسے ہی پوچھا ”کیا تم نیلگری کو جانتی ہو؟“

اس نے رٹا رٹا یا جواب دیا ”میاؤں!“

میں نے اسے گود میں سے اتار کر قالین پر فرش پر رکھ دیا۔ وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب دوڑ گئی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کلاک پانچ بجاس کا وقت بتا رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنی رست و راج میں وقت دیکھا۔ وہاں بھی اتنے ہی بجے تھے۔ مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے پونے چھ بجے یوگا کی مشق ختم کی تھی۔ تو کیا تب سے اب تک صرف پانچ منٹ ہی گزرے تھے؟ یہ کیسے ممکن تھا! کم از کم چار منٹ تو میں نے ڈارلنگ کے ساتھ بھی گفت و شنید کی تھی اور نیلگری سے گفتگو کا وقت تو کسی بھی طرح دس منٹ سے کم نہیں تھا۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ نیلگری سے میری ملاقات وقت کی قید سے آزاد تھی۔ وہ وقت کو روکنا یا ان میں سے چند لمحات کو چرانا جانتی تھی۔ میں نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنا سفری بیگ ریکی چیک کرنے لگا۔

نیلگری نے اپنی بات چیت میں ایک دوسرے ساحل کا تذکرہ بھی کیا تھا اور اس کا انداز بڑا سرسری تھا۔ نیلگری اپنے دعوے کے مطابق مجھے چاہتی تھی اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک

نہیں کہ میں دل و جان سے ساحل کا تہائی تھا۔ اس کے انوا کے بعد سے تو یہ تہا اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ اگر ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز رفتار کوئی سواری ہوتی تو میں یہی ساحل تک پہنچنے کے لیے اسی ذریعے کا انتخاب کرتا۔ آج صبح ساحل لاہور پہنچائی جانے والی تھی اور میری فلائٹ لگ بھگ سوانو بجے وہاں پہنچتی۔ ہم دونوں آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ لاہور پہنچنے والے تھے مگر یہ ”ساتھ ساتھ“ اور ”آگے پیچھے“ الفاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہوئے جسمانی طور پر ایک دوسرے سے دور ہی تھے۔۔۔۔۔ اور اس دوری کے باوجود بھی ہم اپنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

یہ سن اور جدائی کا رشتہ بھی بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی ہجر کا مزہ وصل کی گھڑیوں پر بھاری پڑنے لگتا ہے اور کبھی شب وصال و فرقت کے لمحات کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اس کیفیت کا ادراک وہی لوگ رکھتے ہیں جو بھی اس تجربے سے گزرے ہوں۔

☆☆☆

ہیلو کیپ آندھی کی رفتار سے ایئر پورٹ کی جانب اڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے نیلی شیر ڈو اپارٹمنٹس بلڈنگ کی پارکنگ میں چھوڑ دیا تھا اور چائنا ٹاؤن والے کارنر سے یہ ٹیکسی پکڑی تھی۔ صبح کے وقت اور وہ بھی ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور منہ ہٹا کر نقادھا کرتے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کی خواہش پوری کرتے ہوئے ٹیکسی ہٹا کر تھی۔ رقم میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور پھر میں اس وقت ایک ایسی ہستی کی سمت سفر کر رہا تھا جس کے حصول کی خاطر دولت کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

ڈارلنگ میرے ہیلو میں عقیب نشست پر بڑی شان سے براجمان تھی۔ ڈرائیور نے ایک دوسرے اپنے سر کے اوپر لگے آئینے میں حیرت سے دیکھا اور پھر اس سے مبرا نہ ہوسکا۔ بالا خرہ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

”صاحب! آپ کی ٹیلی کے تو بہت حرے ہیں۔ لگتا ہے، آپ کو اس سے بہت محبت ہے۔“

”ہاں، وہ تو ہے۔“ میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی نہ لینے ہوئے کہا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا ”کیا یہ آپ کی پاتولی ہے؟“

اور میں اس قسم کی فضول گفتگو میں الجھ کر اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”دیکھو میاں!“ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو خامے بارعرب انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا ”بلیاں صرف دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک پاتولی اور دوسری فالتو! کوئی فالتوی نہ تو ٹیکسی میں ستر کرتی ہے اور نہ ہی بالی انیئر کراچی سے لاہور جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ڈارلنگ تالی یہ بلی سراسر پاتولی ہے۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے تسکین انداز میں کہا ”اب تم اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھ کر مجھے جلد از جلد ایئر پورٹ پہنچانے کی کوشش کرو۔ مجھے سمجھئے؟“

”جی صاحب، بالکل سمجھ گیا۔“ وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے عقیب پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے کل رات آخری پہر کے واقعات کو ذہن میں دیکھنے لگا۔ جہانگیر نے بڑے ہوشیار انکشاف کیے تھے ”سی ایف کے“ کا اصلی چہرہ میری نگاہ میں آیا تو اس تنظیم اور شیب غوری کے لیے میرے دل میں نفرت کا سیل آب آگیا۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت شیب کو فون کر کے کھری کھری شاڈالوں مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا، الٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ تو اچھا ہوا، منہاس باقر کی سمجھ میں بھی میری بات آگئی۔ میں لاہور سے واپسی پر شیب غوری اور اس کی تنظیم کی طرف رخ کرنے والا تھا۔ جب تک سونے والا معاملہ بھی صاف ہو چکا ہوتا۔

شیب غوری اور جہانگیر کے بارے میں سوچتے ہوئے رخش خیال امتیاز علی کی جانب بڑھ گیا۔ یہ شخص عقیب تیزی سے میرے قریب آیا تھا، اسی رفتار سے واپسی جلدائی دے کر رخصت ہو گیا۔ میر بخش، روٹی اور امتیاز علی کا اصل قاتل شیب غوری تھا اور میں اسے کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں شیب کو ایسے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا چاہتا تھا جو روٹنے کے کڑے کرنے کی ایک مثال بن کر رہ جائے۔

امتیاز علی کے علاوہ روٹی اور میر بخش کی موت نے بھی میرے سینے میں گہرے گھاؤ ڈالے تھے۔ میر بخش نے میری خاطر بہت قربانیاں دی تھیں۔ وہ ایک جانثار سامی تھا۔ میں اس کے زیاں کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا اور شہابی رنگت کی مالک روٹی! اس نے تو مجھے بھائی بنالیا تھا۔ میری کوئی سگی بہن نہیں۔ روٹی سے منہ بولا رشتہ قائم ہوا تو وہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ شیب نے شخص امتیاز علی کا پتا صاف کرنے کے لیے روٹی اور میر بخش کو بھی سمیٹ چڑھا دیا۔ یہ سفاک شخص کسی بھی طور معافی کے

قابل نہیں تھا۔

جہانگیر کے انکشاف کے بعد میرے ذہن شروع میں، جہانگیر کے انکشاف کے بعد میرے ذہن میں فوری طور پر یہ سوال آیا تھا کہ امتیاز تو ”سی ایف کے“ کا بہت اہم رکن تھا پھر شیب نے اس کا قصہ کیوں تمام کر دیا؟ پھر جلد ہی میں اس راز کو پک گیا۔ شیب غوری نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ امتیاز مجھ سے بہت گھور ہو گیا تھا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں امتیاز مجھے تنظیم کی اصلیت سے آگاہ نہ کر دے۔ ایک دو موقع پر میں نے محسوس بھی کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، کوئی بہت ہی خاص، ذاتی اور اہم بات۔ شاید وہ راز کی بات بھی سمجھی! مگر امتیاز کی اب کشتی سے پہلے ہی شیب غوری نے اس کے لیوں پر وائی مہر سکوت ثبت کر دی تھی۔ امتیاز مجھ سے گہری دوستی کی پاداش میں جان گوا بیٹھا تھا۔ گہری دوستی تو شیب بھی مجھ سے ظاہر کر رہا تھا بلکہ اس دوستی کے ثبوت کے طور پر اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا بھی تھا۔

اب مجھے اس کے لیے کرنا تھا۔ دوستی کا جواب دوستی سے دیا جائے تو میرے ہر نہیں۔ شیب کی زہریلی دوستی، زہر آلود جواب ہی کی متقاضی تھی اور میں۔۔۔۔۔ اس ناقابل فراموش جواب کے لیے ذہن و دل سے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ میرے اندر اتنا زہر بھرا ہوا تھا کہ اس کو سنبھالنے اور سمیٹنے میں شیب غوری کی سائیں بھول جاتی۔

میں انہی خالوں میں کم تھا کہ ٹیکسی نے مجھے ایئر پورٹ پہنچا دیا۔ خدا کا شکر ہے، میں بروقت وہاں پہنچ گیا تھا۔ پہلے میں نے ریسٹورنٹ میں جا کر ہلکا ہلکا ناشتا کیا پھر ضروری معاملات کی انجام دہی کے لیے ایئر پورٹ کے عملے سے بھرپور تعاون کرنے لگا۔ پاکستان میں ایئر پورٹ کا اسٹاف ظاہر یہی کرتا ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں پیش پیش ہے، درنہ درحقیقت آپ ان سے تعاون کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے دلس کی بات ہی نہ کرنا ہے۔

میں ڈارلنگ کو اپنے بازو پر اٹھائے لائیو اسٹاک بنگ کاؤنٹر پر پہنچا اور انہیں ڈارلنگ کی بنگ کے بارے میں بتایا۔ میرے گفتگوات اور اپنے ریکارڈ کو چیک کرنے کے بعد انہوں نے مجھے ایک چوبی بنجرہ (WOODEN CAGE) مہیا کیا۔ میں نے ڈارلنگ کو اس بچ میں داخل کر دیا۔ وہ کسی سمجھ دار اور فرمانبردار بچ کی طرح شرافت سے بچ میں بیٹھ گئی۔ اس کی حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اپنے ستر کی پوری خبر ہو۔

اس بنجرے کو بند کرنے کے بعد اس کے ساتھ ضروری

کارروائی کی گئی پھر اسٹاف کا ایک شخص بنجرے کو زلیاں پر رکھ کر اس راہداری کی جانب بڑھ گیا جو سیدھی جہاز تک جاتی تھی۔ پاتولی جانوروں کو پانی اتر لانے لے جانے کے لیے بڑا خوبصورت بندوبست کیا جاتا ہے۔ ہر جہاز کی دم میں، بچ کے پیچھے لائیو اسٹاک کنٹینر موجود ہوتا ہے جس میں مختلف جانوروں کے بنجرے کو فکس کرنے کا نظام بڑے اچھے انداز سے کام کرتا ہے۔ بنجرے کو کنٹینر کی دیواروں پر اس طرح نصب کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ، کسی بھی صورت میں ہل نہ سکیں۔ جہاز کے اس حصے میں بڑی بھرپور کولنگ ہوتی ہے تاکہ لائیو اسٹاک کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے پائے۔ جانوروں کے لیے انسانوں کا یہ حسن سلوک قابل رشک ہے!

میں دیگر مراحل سے محسن و خوبی گزر کر ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچ گیا۔ مجھے بورڈنگ کارڈ مل گیا تھا اور یہاں سے مجھے سیدھا جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ میں نے اس وینک روم میں بیٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے افراد وہاں موجود تھے وہ یہیٹا پنجرے اور

تھوڑی دیر بعد جہاز میں سوار ہونے والے تھے۔

میں وقت گزاری کے لیے انگش میگزین کا مطالعہ کرنے لگا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ مجھے میگزین سے نگاہ ہٹا کر سامنے دیکھنا پڑا۔ کسی نے مجھے پکارتا تھا اور آواز خالص نسوانی تھی۔

”ہیلو جیہ! تم یہاں؟“

میں نے خود کو ”وجیہ“ کہہ کر پکارنے والے کی جانب دیکھا اور میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ صدف تھی۔ بھرے بھرے جسم اور پست قامت والی صدف جو میڈیکل کے فائل ایئر میں تھی۔

میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سمجھاتے ہوئے کہا ”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔ تمہیں تو اس وقت میڈیکل کالج میں ہونا چاہیے تھا!“

اس نے چونکہ مجھے ”تم“ سے مخاطب کیا تھا اس لیے میں نے بھی یہی طرز خطاب اختیار کیا تھا۔ اس انداز میں بے تکلفی کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ کدہ مے سے بیک کو اتار کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی اور میرے سوال کے جواب میں بولی۔

”اگر مجھے اس وقت میڈیکل کالج میں ہونا چاہیے تو تمہیں بھی اب تک لاہور پہنچ ہی جانا چاہیے تھا۔ میرے حساب سے تو تم کافی دن پہلے لاہور روانہ ہونے والے تھے!“

اس نے بات ختم کر کے شرارت آمیز انداز میں مجھے

دیکھا بھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”خیر، میں تو انہی خیال..... یعنی لاہور جا رہی ہوں۔“

”میں بھی اپنے گھر لاہور ہی جا رہا ہوں۔“ میں نے غماض انداز میں کہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم اکیلی ہی ہو یا تمہارے ساتھ بھی کوئی ہے؟“

”بالکل اکیلی ہوں۔“ وہ سادگی سے بولی ”ایک ہفتے کے لیے جا رہی ہوں پھر امتحانات شروع ہو جائیں گے اور فرصت نہیں ملے گی۔“

صدف خاصی بولڈ اور باتوں لڑکی تھی۔ اس نے پہلی ملاقات ہی میں میرے کان کھڑے کر دیے تھے۔ یہ ملاقات چند روز قبل ”سادتھ“ کے نزدیک ایک خوب صورت پارک میں ہوئی تھی۔ اس کا مشاہدہ اور حافظہ بہت قوی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ مجھے پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔ اس کے ماموں سرفراز خان بے پور (اٹلیا) میں لیدر کا برنس کرتے رہتے۔

اس نے مجھے وہیں دیکھا تھا۔ میں ان دنوں بے پور میں تھا کہ بھانوت سنگھ اور رانی روپ متی کے ساتھ تھا اور وہاں کے ہندو پنڈتوں سے میری خوب بحثی ہوئی تھی۔ صدف نے کسی مقامی اخبار میں میری تصویر دیکھی اور ”کارنائے“ پڑھے تھے۔

اسے میرا نام بھی اچھی طرح یاد تھا مگر میں نے اس کے ان تمام سنسنی خیز افکاشات پر یہ کہتے ہوئے خطہ تنبیہ سمجھ دیا کہ تو میرا نام دجوان ہے اور نہ ہی میں کسی گھارے بھانوت سنگھ یا رانی روپ متی کو جانتا ہوں۔ بے پور تو کیا، میں زندگی میں بھی انڈیا بھی نہیں گیا۔ میں نے صدف کو اپنا نام وجہ اور غلطی لاہور سے بتایا تھا۔ انارکلی میں میرے والد کی جیولری کی دکان تھی اور ہم اچھرہ میں رہتے تھے۔

صدف نے اس روز بڑی بے یقینی سے میری وضاحت سنی تھی۔ اس کی بے یقینی مجھے غماض رہنے پر مجبور کر رہی تھی اور میری یہ غماض روئی اس وقت اسے چمچڑ چھاڑ پر اکسا رہی تھی ورنہ ہمارے درمیان بے تکلفی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے سوچا، صدف کے سامنے مجھے اپنے تاثرات اور حرکات و سکنات کو بالکل نازل رکھنا چاہیے ورنہ اس کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ ہم دونوں چونکہ ایک ہی فلائٹ سے لاہور جا رہے تھے اس لیے گفتگو کے معاملے میں نہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں کسی بھی طور اس پر کھلتا نہیں چاہتا تھا۔

اپنی جانب متوجہ یا کر میں نے اس سے پوچھا ”تمہاری نھیال تو لاہور میں ہے مگر تم نے اپنی ودھیال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

وہ بولی ”میرے پاپا سرمد بخاری کا تعلق کراچی ہے۔ وہ بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ ان کے برنس کا گھوڑا شوٹینگ انڈسٹری سے ہے۔ لیدر کا برنس ہماری خانہ ساخت ہے۔“

ہمارے درمیان اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا ”مسٹر وجدان! یہ کون عجیب کی بات ہے!“

وہ لڑکی میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہو رہی تھی بلکہ اس کے لیے ”خطرناک“ کا لفظ زیادہ موزوں تھا۔ اس نے ردِ ارادی میں مجھے وجدان کہہ کر غماض کیا تھا تاکہ میں انجانے میں غلطی کر بیٹوں مگر میں اسے ڈیپارچر لاؤنچ میں دیکھتے ہی انجانا نہیں رہا تھا بلکہ بہت زیادہ جانا ہو گیا تھا۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ وجدان نامی شخص ہے میرا کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے اپنے لہجے میں نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے سرزنش والے انداز میں کہا ”مگر تمہاری سوتلی ابھی تک وجدان اور بے پور پر ہی انگی ہوئی ہے۔“

”سوری مسٹر وجہ!“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ اس کی معذرت میں پشیمانی یا ندامت شامل نہیں تھی جس کا کلمہ مطلب تھا، وہ اب بھی گڑبگڑ رہی ہے۔

مجھے خاموش یا کر اس نے کہا ”میں نے تھوڑی دیر پہلے جس عجیب بات کا ذکر کیا ہے، اسی زیادہ مشابہت! اس وجدان اور رکھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے، اتنی زیادہ مشابہت! اس وجدان اور اس وجہ میں۔ میں تمہاری بات کو بھی نہیں سمجھ سکتی اور اپنی یادداشت کو نظر انداز کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں۔“

اس کی بے بسی میں اداکاری رچی بسی تھی۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا ”صدف! اگر تمہاری جگہ اور کلمہ شخص اس حیرت کا اظہار کرتا تو مجھے اچھٹا نہ ہوتا مگر تم میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو پھر مشابہت والا معاملہ تمہارے ذہن کو کیوں الجھا رہا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے، بے پور میں وجدان نامی کوئی شخص مجھ سے ملتی جلتی شکل و صورت کا ہو۔ اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔“

وہ میری جانب بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولی ”یہ کیم ہم شکل والی اسٹوری تو نہیں؟“

”ہم شکل اور جڑواں والی اسٹوری فلم میں ہوتی ہے کہ صدف۔“

”تم نہیں مجھے بے وقوف تو نہیں بتا رہے ہو؟“

”اس میں میرا کیا فائدہ ہوگا؟“

”تفریح کی خاطر۔“

”میں ایسی تفریح کا قائل نہیں جس میں دوسروں کو ہنسی

اذیت اور جذباتی کوفت سے گزارا جائے۔“ میں نے سمجھ آواز میں کہا ”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں تمہیں اپنے والدین سے ملاؤں گا پھر تمہاری تسلی ہو جائے گی کہ میں وجدان ہوں یا وجہ۔ اگر تمہاری خواہش ہوگی تو میں تمہیں اپنا برتھ شوٹنگ بھی دکھا دوں گا۔“

میں نے یہ جملے اس سے چمچا چمکانے کے لیے کہے تھے ورنہ میں اپنے وجہ ہونے کا ایسا کوئی خاندانی ثبوت پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری چال کامیاب رہی اور وہ لا جواب ہو کر بے بسی سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا وہ میری وضاحت سے قائل نہیں ہوئی۔

انسانی دماغ بہت ہی حیرت انگیز مشین ہے۔ کوئی دوسرا ذہن اپنے دلائل سے اسے لا جواب تو کر سکتا ہے مگر قائل کرنا ممکن نہیں، خاص طور پر اس صورت میں کہ سامنے والا کسی بہت ہی خطرناک ملک میں مبتلا ہو۔ کہتے ہیں، وہم اور خشک کا علاج تو حکیم نکلان کے پاس بھی نہیں تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ صدف کسی اور زاویے سے مجھ پر کوئی اور سوال کرتی، اے ایس ایف (پرائیویٹ سکیورٹی فورس) کے تین افراد بہت تیزی سے چلتے ہوئے ڈیپارچر لاؤنچ میں داخل ہوئے۔ ان کے چہروں سے حد درجہ پریشانی مترجہ تھی۔ انہوں نے تلاشی نظروں سے چاروں جانب دیکھا پھر ان میں سے جو سب سے تیز تھا، اس نے بے آواز بلند استفسار کیا۔

”آپ میں سے مسٹر وجہ کون ہیں؟“

اپنا اعتباری نام اس کی زبان سے سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں نے ایک ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا ”میں ہوں وجہ۔ کیا بات ہے؟“

وہ تینوں جلدی سے میرے پاس آ گئے۔ اسی سینئر نے مجھ سے پوچھا ”کیا ڈارلنگ نامی بی بی آپ ہی کی ہے؟“

”بالکل، وہ میری ہی بی بی ہے۔“

ان تینوں نے گہرائی سے دیکھا تو میں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی۔ میں نے پوچھا ”آپ ڈارلنگ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟“

”وہ تو خیریت سے ہے مگر اس کی وجہ سے دوسرے جانوروں کی خیریت خطرے میں پڑ گئی ہے۔“ مجھے بتایا گیا۔

”میں بھی الجھ گیا۔“ ایسا کیا ہو گیا جناب؟“

”آپ کی ڈارلنگ نے بڑی گڑبگڑ دی ہے وجہ صاحب۔“ سینئر نے مجھے بتایا ”مختلف اسٹاف نے جیسے ہی ڈارلنگ کے بچرے کو لاٹو اسٹاک کینٹین میں پہنچایا، وہاں پہلے سے موجود جانوروں نے اودھم مچا دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان پر بہت بڑا عذاب نازل کر دیا گیا ہو۔ وہ جھل رہے تھے، پھڑک رہے تھے اور اپنے بچروں میں اچھل اچھل کر احتجاج کر رہے تھے ان کا بس چلنا تو اپنے بچرے تو ذکر باہر آ جاتے۔ مجبوراً ہمیں ڈارلنگ والے بچرے کو کینٹین سے باہر لانا پڑا۔“ وہ ایک لمبے کوساں ہموار کرنے کے لیے رکا پھر جھجھری لیتے ہوئے بولا ”گلتا ہے، آپ کی بی بی کوئی شیطانی روح حلوں کر گئی ہے۔ آپ نے یہ بی بی کہاں سے لی تھی؟“

ایئر پورٹ سکیورٹی فورس کا وہ سینئر کسی شیطانی روح کا ذکر کر رہا تھا اور میرا ذہن نیلگہ کی پیش گوئی میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے دو گھنٹے پہلے بتایا تھا، ڈارلنگ کا اسرار بہت جلد کھلنے والا ہے..... تو کیا وہ اسرار یہی تھا؟

فلائٹ کی روانگی میں صرف دس منٹ باقی تھے اور میں سوچ رہا تھا، موجودہ صورت حال میں چٹانیں، میں لاہور جا بھی سکوں گا یا نہیں؟

موسیقی کے شائقین کے لئے  
انہی طرز کی اچھوتی کتاب

ابجد موسیقی

اس کتاب کے مطالعے سے آپ کو نہ صرف گانا بلکہ ہارمونیم بجانا بھی آ جائے گا اور طبلے کے بارے میں بھی واقفیت ہو جائے گی

قیمت 150 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

ہتس 23 کراچی 74200  
5802551-5895313 فون  
5802551-5895313 فون  
kitabiat1970@yahoo.com  
75500 ریلوے کے 63C



آن انسان ایک مفری تھا، اپنے دور کا سینٹ۔ اس جہان رنگ و بو کی حقیقت کو اس نے بخوبی پالیا تھا۔ اس کے مطابق یہ دنیا اور اس میں پائی جانے والی ہر شے دھوکا ہے۔۔۔ ایک خوبصورت اور دلفریب دھوکا، جو چیز بھی نظر آتی ہے وہ دیکھیں نہیں ہوتی۔ انسان اپنے مقصد کے پیچھے اندھا و حند دوڑتا ہے اور گوہر مقصود ہاتھ آئے پر پتا چلتا ہے، یہ وہ نہیں، جس کی طلب میں ہم نے غرار تھے۔ یہ اب دیکھنا نہیں رہا جیسا حصول سے قبل دکھائی دیتا تھا۔ ہم ایک فریب مسلسل میں سانس لیتے ہوئے اس ظلم کدے میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

ڈارلنگ کے حوالے سے سیکورٹی آفیسر کا انکشاف حیرت انگیز اور تعجب خیز تھا۔ وہ معمولی نرم و نازک بلی ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ متحقد جالور اس کو دیکھتے ہی خوفزدہ ہو جائیں، ایسا تو میں نے بھی سوچا تھا اور نہ ہی اب تک محسوس کیا تھا۔ چند تھکے ہوئے نیلگری نے صرف اتنا بتایا تھا، ڈارلنگ کا بھید بہت جلد کھلنے والا ہے۔ سیکورٹی آفیسر نے خدشہ ظاہر کیا تھا، اس بلی میں کوئی شیطانی روح حلول کر گئی ہے جس سے دوسرے جالور وحشت زدہ ہو گئے ہیں۔ اس میں کیا حقیقت تھی اور کتنا فائدہ، اس بارے میں حتی طور پر فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ زندگی کے تجربے نے اب تک مجھے یہی سکھایا ہے کہ آن انسان جیسا ہر جیسک غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے جو بھی کہا ہے، کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا اور تاریخ گواہ ہے، مستند ہے اس شخص کا فرمایا ہوا!

از پورٹ سیکورٹی فورس کے وہ تینوں جوان ایک تک میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان میں سے جو سینئر تھا، اس کی نگاہ میں متحقد سوالات تھے۔ اس کی فراہم کردہ اطلاع کو میں نے بے یقینی سے سنا، تھوڑا الجھا اور تامل کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہو چکا ہے مسٹر وجیہ!“ اس نے دونوں کے لیے میں کہا ”مجھے خواہ مخواہ جھوٹ بول کر آپ کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا ”اور آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ ڈارلنگ نے لائیو اشاک کنٹینر میں کوئی بھڑکی کی ہے! میں تو آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ جیسے ہی متعلقہ عملے نے ڈارلنگ والا کنج کنٹینر میں پہنچایا، وہاں پہلے سے موجود درجہ پھر جالور بری طرح چلا اٹھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی بے ہوشہ خوفزدہ ہو گئے اور اچھل اچھل کر بچرہوں سے باہر

آنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کا یہ احتجاجی شور و غل بتا رہا تھا، وہ ڈارلنگ کو اس کنٹینر میں داخل کرنے کے خلاف ہیں۔ ان کی یہ مخالفت کسی ڈر خوف کے سبب ہے یا کوئی اور وجہ رہی ہو بہر حال، آپ کی ڈارلنگ اس فلائٹ سے نہیں جاسکتی۔“ لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے۔“ میں نے رسوا واضح پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”اور جہاز کی پرواز میں چند من بات ہیں۔“

”یہ بات ہمیں زیادہ اچھی طرح معلوم ہے کہ فلائٹ میں کتنا وقت باقی ہے۔“ سیکورٹی آفیسر نے کہا ”اگر آپ اس فلائٹ سے جانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو اکیلے ہی جانا ہوگا، ڈارلنگ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ فی الحال ہم نے اس کے کنج (CAGE) کو بچگی کا ڈنٹر پر رکھوایا ہے۔ آپ فوراً فیصلہ کر لیں۔ تمام مسافروں کو بورڈنگ کارڈز جاری ہو چکے ہیں اور اب ہم انہیں جہاز میں سوار کرنے ہی والے ہیں۔“ سیکورٹی آفیسر خاموش ہوا تو میں نے کہا ”پلیز، آپ ڈارلنگ والا کنج یہاں لے کر آئیں یا مجھے وہاں لے چلیں۔ میں ڈارلنگ سے بات کروں گا، اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”آپ ایک بلی سے بات کریں گے، اسے سمجھانیں گے؟“ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

میں نے غور سے لکھے میں کہا ”ہاں، وہ میری بات سمجھتی ہے اور میرے کہے کی عمل بھی کرتی ہے۔ آپ اسے میرے پاس لائیں۔ میں معلوم کروں گا، وہاں کنٹینر میں کیا حالات ہیں آئے ہیں۔ اگر آپ کا بیان درست ہے تو پتا چل جائے گا، وہاں موجود جالوروں نے اس کی آمد کو ناپسند کیوں کیا؟ ان کے خوف کی وجہ کیا ہے؟ ان کا احتجاج کیا تھی رکھتا ہے؟“

”آپ تو یہ بات اسنے دوتوں اور اعتماد سے کر رہے ہیں جیسے ڈارلنگ کسی انسان کی طرح آپ کی بات کو سننے سمجھتی ہے اور آپ کے سوالات کا جواب بھی دے گی!“ سیکورٹی آفیسر نے طنز سے لکھے میں کہا ”ایسی بلی میں نے کبھی دیکھی ہے اور نہ ہی اس کا ذکر سنا ہے!“

اس کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے برہمی سے کہا ”آفیسر! آپ اپنے تجربے اور مشاہدے کو بڑھا لیں۔ دنیا میں بہت کچھ دیکھتے، سننے اور پرکھنے کو موجود ہے۔ میں نے ڈارلنگ کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں وہ سچی برج ہیں۔ میں اپنے الفاظ کو ثابت کر سکتا ہوں۔“ ”آپ فضول بحث کر رہے ہیں۔“ وہ سخت لکھے میں بولا۔

”اپنی منگھو کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”مدف پہلی مرتبہ ہماری بات چیت میں شامل ہوئی۔ اس نے آفیسر کی جانب دیکھتے ہوئے معتدل لکھے میں کہا ”پچیس جناب! ڈارلنگ، مسٹر وجیہ کی ملکیت ہے، اس کی چینی باتوں کی بے ہنداد وجیہ سے زیادہ اس کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ اگر کہہ رہا ہے کہ ڈارلنگ کو کھالے گا تو یقیناً یہ ایسا کر کے دکھائے گا۔ پلیز، آپ ڈارلنگ والے کنج کو یہاں لے آئیں یا ہمیں وہاں لے چلیں، جہاں وہ کنج رکھا ہے۔“

سیکورٹی آفیسر نے کچھ جوتی ہوئی نظر سے اس خود راہ اور بھر پور حید کو دیکھا پھر سرسری انداز میں پوچھا ”آپ بھی مسٹر وجیہ کے ساتھ ہیں؟“

”جی، میں مسٹر وجیہ کے ساتھ ہوں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”مدف ایک موقع شناس لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ ڈارلنگ والا معاملہ اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔ میں نے ابھی تک اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس نے بڑی خوب صورتی سے معاملے کو نیکل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے انداز سے ناواقفیت یا کسی قسم کا تردد ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا رویہ میری فحور میں تھا جو میرے لیے قابل غور بات تھی۔“

سیکورٹی آفیسر نے کہا ”آپ کو ہمارے چیف کے پاس جانا ہوگا۔ یہ معاملہ یہاں منتقل نظر نہیں آتا۔ آپ کی وجہ سے دوسرے مسافر خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔“

اس کے لکھے سے ظاہر تھا، وہ کسی صورت ڈارلنگ والے کنج کو یہاں نہیں لائے گا۔ وہاں موجود مسافروں کے چہروں سے ٹھکر اور بیزاری جھلکتی تھی۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ ان کے چیف سے مل لیا جائے۔ شاید وہ مکمل میری بات کو بہتر طور پر سمجھ جاتا۔

”تمہارے چیف صاحب کہاں بیٹھے ہیں؟“ میں نے تیز لکھے میں دریافت کیا۔

”دو بلا!“ آپ ہمارے ساتھ آئیں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے دونوں سامھی بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔ میں نے ایک نظر مدف کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑا۔

ہم دونوں از پورٹ سیکورٹی فورس والوں کی راہنمائی

میں ان کے چیف کے پاس پہنچ گئے۔ ہم سے پہلے ڈارلنگ کا ”قصد“ وہاں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے سیکورٹی آفیسر نہیں اپنے چیف کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس نے یقیناً چیف کو ہمارے بارے میں بریف کر دیا ہوگا۔ چیف کے اشارے پر ہم نے کرسیاں سنبھال لیں۔ وہ چند لمبے گہری نظر سے ہاری ہاری ہمیں دیکھتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”مسٹر وجیہ! ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کی بلی کون ہے، کیسی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے امن و امان کی صورت حال میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔۔۔۔۔ اور ڈارلنگ نے لائیو اشاک کنٹینر میں جو اودھم مچایا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

چیف نہایت ہی غصہ سے ہوئے لکھے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں حدود حق متغولیت پائی جاتی تھی۔ چہرے سے وہ ایک ذہین اور معاملہ فہم شخص نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے خاموش ہونے پر ڈارلنگ کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”سر! حقیقت یہ ہے کہ اودھم ڈارلنگ نے نہیں بلکہ وہاں موجود دوسرے جالوروں نے مچایا ہے۔“

”بہر حال اس اودھم کی وجہ آپ کی بلی ہے!“ اس کے لکھے میں تقلیت تھی۔

”مجھے تو ابھی اس واقعے کا یقین نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے یقین ہے، ایسا ہوا ہوگا۔“ چیف نے زور دے کر کہا ”میرے آدمی مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتے، خاص طور پر جو سیکورٹی آفیسر آپ کو لے کر میرے پاس آیا ہے، وہ میرا برسوں کا آزمایا ہوا قابل بھر دسا آدمی ہے۔“

سی ایس او (چیف سیکورٹی آفیسر) کی آنکھوں سے ذہانت حشر تھی۔ میں نے اس سے بحث مباحثہ مناسب نہ جانا اور درخواست آمیز لکھے میں کہا۔

”سر! اگر واقعی لائیو اشاک کنٹینر میں ایسا کوئی واقعہ ڈارلنگ کی وجہ سے پیش آیا ہے تو آپ مجھے اس سے ملنے کا موقع دیں۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں، وہ میری بات سمجھ لے گی۔ انشا اللہ! اب انہیں ہوگا۔“

”پلیز! آفیسر، آپ ڈارلنگ والا کنج یہاں منکوا لیں۔ ابھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ مدف نے سی ایس او سے کہا ”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں سر!“

مجھے ہر گزرتے لمبے کے ساتھ مدف پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس شیر کی بچی نے ابھی تک مجھ سے ڈارلنگ کے



بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا تھا اور ظاہر یہی کر رہی تھی، وہ مجھے اور میری ڈارلنگ کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔

چیف بیکورنی آفیسر نے صدف کی بات سننے کے بعد متحمل لہجے میں کہا، "بالفرض، آپ اپنی بیوی کو کسی طرح کچھ بھی سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہاں موجود درجن بھر جالورڈوں کو کون سمجھائے گا۔ انہوں نے کسی بھی سبب ڈارلنگ کی آمد پر شدید احتجاج کیا ہے، ان کے رد عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"پھر تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "ڈارلنگ کو نہیں!" "ہمارے لیے ممکن نہیں۔" وہ حتیٰ لہجے میں بولا "اس لیے آپ کی بی بی اس فلائٹ سے نہیں جاسکے گی۔ آپ اپنے بارے میں پانچ منٹ میں فیصلہ کر لیں۔ آپ اس بی بی کے بغیر جانا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ ہی یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو کوفت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "آفیسر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے ڈارلنگ سے چند باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو میں اس پیچیدگی کو حل کر لوں گا۔ مجھ سے ہدایت لینے کے بعد جب وہ لائیو اسٹاک کنٹینر میں جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی جانور اس کی وجہ سے ان ایڑی (Uneasy) نہیں ہوگا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"میں آپ کے وعدے پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

"میں مسر دجیہ کے وعدے کی گارنٹی دیتی ہوں۔"

صدف نے سنجیدگی سے کہا۔

"سی ایس او نے چونک کر صدف کو دیکھا اور پوچھا "کیسی گارنٹی؟"

"یہ گارنٹی کہ مسر دجیہ جیسا کہہ رہے ہیں، ایگزیکٹو دیا ہی ہوگا۔"

"آپ کے اس وثوق کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟"

"آپ کو میری زبان پر یقین کرنا ہوگا۔"

"مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تو آپ کو نہیں جانتا۔"

بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا تھا اور ظاہر یہی کر رہی تھی، وہ مجھے اور میری ڈارلنگ کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔

چیف بیکورنی آفیسر نے صدف کی بات سننے کے بعد متحمل لہجے میں کہا، "بالفرض، آپ اپنی بیوی کو کسی طرح کچھ بھی سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہاں موجود درجن بھر جالورڈوں کو کون سمجھائے گا۔ انہوں نے کسی بھی سبب ڈارلنگ کی آمد پر شدید احتجاج کیا ہے، ان کے رد عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"پھر تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "ڈارلنگ کو نہیں!" "ہمارے لیے ممکن نہیں۔" وہ حتیٰ لہجے میں بولا "اس لیے آپ کی بی بی اس فلائٹ سے نہیں جاسکے گی۔ آپ اپنے بارے میں پانچ منٹ میں فیصلہ کر لیں۔ آپ اس بی بی کے بغیر جانا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ ہی یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو کوفت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "آفیسر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے ڈارلنگ سے چند باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو میں اس پیچیدگی کو حل کر لوں گا۔ مجھ سے ہدایت لینے کے بعد جب وہ لائیو اسٹاک کنٹینر میں جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی جانور اس کی وجہ سے ان ایڑی (Uneasy) نہیں ہوگا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"میں آپ کے وعدے پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

"میں مسر دجیہ کے وعدے کی گارنٹی دیتی ہوں۔"

صدف نے سنجیدگی سے کہا۔

"سی ایس او نے چونک کر صدف کو دیکھا اور پوچھا "کیسی گارنٹی؟"

"یہ گارنٹی کہ مسر دجیہ جیسا کہہ رہے ہیں، ایگزیکٹو دیا ہی ہوگا۔"

"آپ کے اس وثوق کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟"

"آپ کو میری زبان پر یقین کرنا ہوگا۔"

"مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تو آپ کو نہیں جانتا۔"

وہ الجھ کر بولا۔

بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا تھا اور ظاہر یہی کر رہی تھی، وہ مجھے اور میری ڈارلنگ کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔

چیف بیکورنی آفیسر نے صدف کی بات سننے کے بعد متحمل لہجے میں کہا، "بالفرض، آپ اپنی بیوی کو کسی طرح کچھ بھی سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہاں موجود درجن بھر جالورڈوں کو کون سمجھائے گا۔ انہوں نے کسی بھی سبب ڈارلنگ کی آمد پر شدید احتجاج کیا ہے، ان کے رد عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"پھر تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "ڈارلنگ کو نہیں!" "ہمارے لیے ممکن نہیں۔" وہ حتیٰ لہجے میں بولا "اس لیے آپ کی بی بی اس فلائٹ سے نہیں جاسکے گی۔ آپ اپنے بارے میں پانچ منٹ میں فیصلہ کر لیں۔ آپ اس بی بی کے بغیر جانا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ ہی یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو کوفت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "آفیسر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے ڈارلنگ سے چند باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو میں اس پیچیدگی کو حل کر لوں گا۔ مجھ سے ہدایت لینے کے بعد جب وہ لائیو اسٹاک کنٹینر میں جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی جانور اس کی وجہ سے ان ایڑی (Uneasy) نہیں ہوگا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"میں آپ کے وعدے پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

"میں مسر دجیہ کے وعدے کی گارنٹی دیتی ہوں۔"

صدف نے سنجیدگی سے کہا۔

"سی ایس او نے چونک کر صدف کو دیکھا اور پوچھا "کیسی گارنٹی؟"

"یہ گارنٹی کہ مسر دجیہ جیسا کہہ رہے ہیں، ایگزیکٹو دیا ہی ہوگا۔"

"آپ کے اس وثوق کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟"

"آپ کو میری زبان پر یقین کرنا ہوگا۔"

وہ الجھ کر بولا۔

بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا تھا اور ظاہر یہی کر رہی تھی، وہ مجھے اور میری ڈارلنگ کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔

چیف بیکورنی آفیسر نے صدف کی بات سننے کے بعد متحمل لہجے میں کہا، "بالفرض، آپ اپنی بیوی کو کسی طرح کچھ بھی سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہاں موجود درجن بھر جالورڈوں کو کون سمجھائے گا۔ انہوں نے کسی بھی سبب ڈارلنگ کی آمد پر شدید احتجاج کیا ہے، ان کے رد عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"پھر تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "ڈارلنگ کو نہیں!" "ہمارے لیے ممکن نہیں۔" وہ حتیٰ لہجے میں بولا "اس لیے آپ کی بی بی اس فلائٹ سے نہیں جاسکے گی۔ آپ اپنے بارے میں پانچ منٹ میں فیصلہ کر لیں۔ آپ اس بی بی کے بغیر جانا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ ہی یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو کوفت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "آفیسر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے ڈارلنگ سے چند باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو میں اس پیچیدگی کو حل کر لوں گا۔ مجھ سے ہدایت لینے کے بعد جب وہ لائیو اسٹاک کنٹینر میں جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی جانور اس کی وجہ سے ان ایڑی (Uneasy) نہیں ہوگا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"میں آپ کے وعدے پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

"میں مسر دجیہ کے وعدے کی گارنٹی دیتی ہوں۔"

صدف نے سنجیدگی سے کہا۔

"سی ایس او نے چونک کر صدف کو دیکھا اور پوچھا "کیسی گارنٹی؟"

"یہ گارنٹی کہ مسر دجیہ جیسا کہہ رہے ہیں، ایگزیکٹو دیا ہی ہوگا۔"

"آپ کے اس وثوق کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟"

"آپ کو میری زبان پر یقین کرنا ہوگا۔"

وہ الجھ کر بولا۔

میں نے صدف کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا ”تم نے اپنی ذہانت سے صورت حال کو کنٹرول کر لیا ہے ورنہ یہ لوگ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور کھڑی کر دیتے۔ تمہارے باپا کے دوست ذوالفقار زیدی کا حوالہ خوب کام آیا۔“

”وہ حوالہ ہی کیا جو دقت پر کام نہ آئے۔“ وہ چمک کر بولی ”تم نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا، دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔ اگلے زیدی اگر آج میرے کام نہ آتے تو باپا سے ایسی دوستی کا کیا فائدہ؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا ”ایک سوال کروں، ٹھیک ٹھیک جواب دوں گی؟“ ”پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ میں نے کہا ”جب پارک میں تم مجھ سے ملی تھیں تو میرا حلیہ خاصا مختلف تھا۔ اب اس بدلے ہوئے حلیے میں تم نے مجھے دیکھتے ہی کیسے پہچان لیا ہے؟“

”میں نے تمہیں دیکھتے ہی نہیں بلکہ تعویذی عنت اور غور و فکر کے بعد پہچانا ہے۔“ وہ انتہائی سادگی سے بولی ”کوئی اور سوال؟“

”تم نے کس برے پر میری ضمانت دی ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”اگر ڈارلنگ نے میری ہدایات کے مطابق عمل نہ کیا تو تمہاری سبکی ہوگی اور تمہارے ساتھ، تمہارے اکل ذوالفقار زیدی کی بھی۔ تم نے ایک انجانے معاملے میں قدم رکھ کر غلطی نہیں کی؟“

وہ کھیر آواز میں بولی ”پہلی بات تو یہ کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے امید ہے، ملی تمہارے نیچے پر ضرور عمل کرے گی۔ بالخصوص حال اس نے اب بھی کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کیا کیا جا سکتا ہے، ایلی تو پھر ملی ہے۔ ایک جانور سے کسی بھی قسم کے رویے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں نے.....“ وہ سانس لینے کو رکھ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”دراصل تمہاری ملی پر نہیں، بلکہ تم پر اعتماد کرتے ہوئے گارنٹی دی ہے۔“

اس کی بات ختم ہوئی تو میں بہت کچھ سوچنے لگنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”مجھ پر اس اندے اعتماد کی وجہ؟“

”میں نے اندھا نہیں، بلکہ آنکھیں کھول کر تم پر اعتماد کیا ہے۔“

”چاہے جیسے بھی کیا ہے، میں اس کی وجہ جاننا چاہتا

ہوں۔“ میں نے کرید جاری رکھتے ہوئے کہا ”تمہاری دوسری سرسری ملاقات ہے۔ اسے تم عرصے میں کسی بے اعتماد.....“

وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بولی ”کسی پر مجبور سا کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی کاٹتی ہوتا ہے مسٹر وید جان!“

میں شہنشاہ کرہ گیا۔ اس کی سوئی وید جان پر ایک کرہ مٹی تھی۔ میری اب تک کی ساری وضاحتیں، ساری عنت برہادہ مٹی تھی۔ میں اسے یہ یقین دلانے میں ناکامیاب رہا کہ میں وید جان نہیں، وجہ ہوں۔ جب اس نے میری اس بات کا یقین نہیں کیا تو پھر یہ بھی نہیں مانا ہوگا کہ میں سبکی سے پور یا اڑیا نہیں گیا، میں کسی رانی روپ مٹی اور خاکر بھالوت شک کو نہیں چاہتا اور یہ کہ چمک مٹی (جے پور) کے پنڈتوں اور بچاریوں سے میرا کوئی بھڑا نہیں رہا۔ وہ اپنی سوچ اور بیان پر ثابت قدمی سے بھی مٹی اور..... خطرناک بات یہ بھی کہ اس کی اس سوچ اور بیان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی!

اس دوران میں وہ بڑی گہری نظر سے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے اپنی جانب متوجہ باکراس نے پیچھے ہٹنے سے روک دیا تھا۔ ”مجھے بھلانے کے لیے کوئی نیا بہانہ سوچ رہے ہو؟“

”تم کوئی بچی نہیں ہو جو میں تمہیں بھلاؤں گا۔“ میں نے چڑ کر کہا ”اور مجھے کوئی نیا پرانا بہانہ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم خواہ مخواہ وید جان کا راگ آلاپ رہی ہو۔ اگر تم یہ سب کچھ سوچے سمجھے کسی منصوبے کے تحت کر رہی ہو تو تمہارا یہ منصوبہ تمہیں مبارک ہو۔ میں آئندہ اس سلسلے میں کوئی وضاحت کروں گا اور نہ ہی ضمانتی پیش کروں گا۔ تم میری باتوں پر یقین کرو یا مجھے جھوٹا سمجھتی رہو، اس بات سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا!“ میرے انداز میں غلطی، ناراضی اور ہیزواری کی آمیزش تھی تاہم مجموعی طور پر میرا لہجہ قائل اعتراض یا تکلیف دہ نہیں تھا۔

”اس پوری تقریر میں، میں صرف تمہاری ایک بات سے اتفاق کرتی ہوں۔“

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ”کون سی بات؟“

”وہ بولی ”میں کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں!“

میں نے ہلکے جھپکے میں اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو کر رہ گئی۔ وہ دہائی بچی نہیں تھی کوئی بچی میڈیکل کے آخری سال کی اسٹوڈنٹ کیسے ہو سکتی ہے؟

اسی وقت ڈیپارچم لاؤنج میں موجود مسافروں کو جہاز میں لے جانے کا ارادہ لایا کا آغاز ہو گیا۔ اس سرگرمی کا واضح مطلب بھی تھا کہ ڈارلنگ نے اس مرتبہ کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی۔ میں نے ایک اطمینان بخش سانس لینے ہوئے قاتمانہ نظر سے صدف کی طرف دیکھا۔

وہ اعتماد انداز میں بولی ”دیکھا تم پر میرا بھروسہ کتنا سچا تھا۔ ڈارلنگ ہی اس ملی نے تمہاری ہدایات پر عمل کیا ہے ورنہ کوئی اور ہجر کی یا جھپک کی سامنے آتی۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور اپنے سفری بیگ کا جائزہ لینے لگا۔ میری یہ سنجیدگی اسے پسند نہ آئی۔

”سوئی مسٹر وجیہ!“ میری ساعت سے صدف کی آواز گھرائی ”میں نے خواہ مخواہ آپ کو وجیہ اور وید جان کے چکر میں الجھا دیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ وید جان آپ سے ملتا جلتا کوئی اور شخص ہوگا۔ آپ تو وجیہ ہیں..... صرف وجیہ! مجھ سے شکین غلطی ہو گئی۔“

وہ اپنی ہجر پر اداکاری سے مجھے ایک مرتبہ پھر چکر دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ پہلے اس سے کوئی شکین غلطی نہیں ہوئی تھی بلکہ غلطی تو وہ کر رہی تھی..... اس غلطی کی چٹلی اس کا طرز خطاب کھارہا تھا۔ ”وہ فوراً“ ”تم“ سے دوبارہ ”آپ“ پر آگئی تھی۔

اس ذہن لڑکی سے بے تکلفی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر مجھے اپنا وجیہ دلاہم قائم رکھنا تھا تو پھر صدف سے کسی کاٹنا ضرور ضروری تھا!

☆☆☆

کراچی سے لاہور تک کم دیش اسی منٹ کی فاصلت ہے۔ اس حساب سے ہمیں مقررہ وقت کے مطابق نو میں پر لیڈ کر لینا چاہیے تھا لیکن ڈارلنگ والے معاملے نے چند منٹ کی تاخیر کر دی تھی چنانچہ وہ جہاز لگ بھگ پونے دس بجے لاہور ایئر پورٹ پر اترا۔ مختلف مراحل سے گزر کر ہم ایئر پورٹ کی گمارت سے باہر آئے تو صدف نے کہا۔

”وجیہ! تمہارے پاس سواری کا بندوبست ہے یا تم ٹیکسی لو گے؟“

کبیر شاہ نے جس ہوٹل میں میرے لیے بنگ کر دئی تھی اس کی ٹرانسپورٹ ایئر پورٹ پر موجود تھی لیکن میں نے دانستہ اس سے استفادہ نہیں کیا تا کہ صدف کے کان نہ کھڑے ہوں۔ میں اسے اپنے تئیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

”میں ٹیکسی میں گھر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ وہ جلدی سے بولی ”ٹیکسیوں نہ ہم ایک ٹیکسی لے لیں۔ میں تمہیں چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلی جاؤں گی۔“ وہ نہایت ہی عجاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس آخر کے ذریعے وہ میرا کھردہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے من سے یقین کو پختہ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنوار رہی تھی۔ میں اس غصے نیچے پر پہنچا کہ وہ مجھے وجیہ کی حیثیت سے کسی بھی صورت قبول نہیں کرے گی۔ وہ مجھے وید جان سمجھتی ہے اور یہی سمجھتی رہے گی۔ اس کی سوچ روکی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ چاہے مجھے کچھ بھی سمجھتی رہتی، قابل توجہ بات یہ تھی کہ وہ نیچے جھانک کر میری ٹوہ میں لگ مٹی تھی۔ میں نے غصوں کیا، وہ میری وضاحت کو غلط اور اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ اس پر مٹی ٹیکسی گھر سر پھری لڑکی کو ہینڈل کرنے میں مجھے خاصی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانا اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے اس کی چال اسی پر لٹواتے ہوئے کہا ”یہ بھی ہو سکتا ہے، میں تمہیں چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کی طرف لھل جاؤں۔ تم اس وقت میرے شہر میں ہو، گریا میری مہمان ہو۔ اتنی ہی مہمان داری کا حق تو مجھے ملنا چاہیے۔“

”میں نے ایسا مہربان زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سستی خیر انداز میں بولی ”جو مہمان کی خاطر مدارات کے لیے اپنے گھر کے بجائے اسی کے گھر کو استعمال کر رہا ہو۔ خیر؟“ وہ گندھے اچکاتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور بولی ”ایز یوش مسٹر وجیہ!“

ہم دونوں ٹیکسی تک پہنچے۔ صدف نے مجھے بتایا تھا، اس کی تخیال لاہور کے ایک پوتھ علاقے شادمان کالونی میں ہے۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے شادمان جانا ہے۔ اس کے بعد اچھرہ۔“ پھر اس نے میری جانب دیکھا اور اختصار کیا ”وجیہ! تم اچھرہ میں کس جگہ جاؤ گے؟“

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ”سلطان احمد روڈ۔“ ”ٹھیک ہے۔“ وہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی ”مجھے شادمان کالونی کے جانا چوک بڑا پرک کر کے تم مسٹر وجیہ کو اچھرہ لے جانا۔ یہ سلطان احمد روڈ پر جہاں کہیں تم آئیں پہنچا دیتا۔“

ٹیکسی ایئر پورٹ کے علاقے سے نکل کر شادمان کالونی کی سمت بڑھنے لگی۔ سلطان احمد روڈ کا نام یوں سنگھ کے حوالے

سے میرے ذہن میں نقش تھا۔ وہ مونا سکھ اجپہرہ میں سلطان احمد روڈ پر ہی رہتا تھا۔ اس مرد دق سے خشونت سنگ سے دوستی کا حق ادا کر دیتا تھا۔ میرے والد صاحب مرحوم کی قیمتی ڈائری کو اس نے بڑی حفاظت سے اپنے پاس سنبھالے رکھا اور جب لاہور میں ملک نواز شعلی کے فنڈوں نے اس کا رخ کیا تو وہ اس "رازدار" ڈائری کو جیسے سے لگائے کراچی پہنچ گیا۔ کروڑوں کی مالیت کے سونے کا راز اس ڈائری میں دھم تھا۔ شاید یوں سنگھ اس ڈائری کو بچھ تک پہنچانے کے لیے ہی اب تک زندہ تھا۔ جس روز وہ ڈائری میری تحویل میں آئی، اسی رات یوں سنگھ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ وہ ملک نواز شعلی کے تنگ خوار، میاں زہد حسین کے بندوں کے ساتھ لگ گیا تھا۔ ڈائری کی حفاظت والے جرم بے گناہی میں یوں سنگھ کو دردناک موت کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے اس کی موت سے دلی رنج ہوا تھا اور ازاں بعد میں نے اس کا بدلہ بھی لے لیا تھا۔

یہ تمام باتیں سوچتے ہی مجھے اپنے اعصاب میں تناؤ سا محسوس ہوا۔ میاں زہد حسین اپنے صبر تانک انجام کو پہنچ چکا تھا تاہم ان جرم زاروں کا پادا آدم ملک نواز شعلی ابھی زندہ تھا۔ نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس نے میری رگوں جاں پر اپنے خون آشام دانت بھی گاڑ دیے تھے۔ ساحل اب تب میں اس کے پاس پہنچنے والی تھی۔ مجھے نہ صرف اس کے قہقے سے ساحل کو ٹکانا تھا بلکہ اس سے برسوں کا حساب بھی کرنا تھا۔ وہ حساب جو نسل در نسل چلا آ رہا تھا۔ میں چوہدری نواز شعلی کے "قرض" میں گروں تک ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے حرامی باپ نے میرے دادا پر..... اور خود اس نے میرے باپ پر جو "قرض" چڑھا ہوا تھا۔ وہ تمام کا تمام میں نے "ادا" کرنا تھا..... اور سود در سود "ادا" کرنا تھا۔ اس ادائی میں اب زیادہ وقت نہیں بچا تھا۔

اس وقت میرے سامنے دو محاذ کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرف مجھے شیعہ غوری اور اس کی تنظیم سے نمٹنا تھا، اس کا قلع قمع کرنا تھا، مگر نہایت ہی خاموشی اور رازداری کے ساتھ۔ دوسری جانب نواز شعلی تھا۔ اس محاذ پر مجھے بے دریغ اور حکم کھلا چنگ کرنا تھی۔ وہ جنگ جو میرے دادا کے وقتوں سے جاری تھی۔ یہ جنگ مرحلہ وار آگے بڑھتی تھی اور اب اس کا ڈراپ سین ہونے والا تھا۔

میں انہی سوچوں میں غم تھا کہ ٹیکسی ایک شان دار کوشی کے سامنے رکی۔ چائنا چوک شادمان کالونی کا بہت ہی خوبصورت اور دلکش علاقہ ہے۔ سرسبز شاداب۔ اس کے پہلو

سے ایک نہر گزرتی ہے جس کے کناروں پر استاد بلند و پرست درخت، سب خرام اور ٹھنڈی میٹھی ہوا محسوس ہوتے ہیں۔ وہ فضا کی فرحت آفرینی کو اپنے تن میں اتار کر مستی میں بے خود حرکتیں کرتے ہیں۔ ان کی شاخیں اور پتے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر انھیلیاں کرتے ہیں۔ پانی کی خواہش پر ان کا عکس بڑا دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ درخت ہوا میں نہ جم رہے ہوں بلکہ نہر کے پانی میں اپنے حسن کا نظارہ کر رہے ہوں!

صدف نے ٹیکسی ڈرائیور کو دادی کے لیے پرس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا تو میں نے اسے اس حرکت سے روک دیا۔ "مہمان کو یہ زیب نہیں دیتا جو تم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو!"

اس کا ہاتھ رک گیا مگر اس نے میری جانب شکست خوردہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، اپنی منزل پر پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور سے تم خود ہی نمٹنا۔" ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا "آئندہ تم سے رابطہ کیسے ہوگا وجہ! میں نے تو تمہارا گھر بھی نہیں دیکھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "میں نے تو تمہارا مکان کا اندازہ لے لیا ہے۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔ دیکھو تم احتیاطاً یہاں کا فون نمبر بھی دے دو۔ ممکن ہے، کسی وقت مجھے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔ بڑے بڑے افراد سے تمہارے بہت اچھے مراسم ہیں۔"

میرا اشارہ کراچی انٹرپورٹ والے واقعے کی طرف تھا۔ صدف کے پاس سرحد بخاری کے دوست اور انٹرپورٹ منیجر ڈاکٹر افتخار زیدی نے واقعی ڈارلنگ والے معاملے میں ہم سے بہت تعاون کیا تھا۔

"میں ہفتہ دن دن ہی یہاں قیام کروں گی۔" صدف نے ڈارلنگ کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس کے بعد اگر رابطہ کرنا ہو تو میں کراچی میں ملوں گی۔ تم وہاں کا فون نمبر بھی نوٹ کر لو۔" پھر اس نے مجھے دونوں مقامات کے فون نمبرز لکھوا دیے اور ڈارلنگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی "بیاری بی! اب اودھم دالی کوئی حرکت نہ کرنا۔ انشا اللہ! ہم پھر ٹیکس گے..... بہت جلد۔ اگے ہی یو!"

وہ ڈارلنگ کی طرف دیکھتے ہوئے یہ الفاظ ادا کر رہی تھی لیکن میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا، وہ مجھے شانے کے لیے وہ گھات دہرا رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی تنصیلات میں تھوڑا وقت گزارنے کی پیشکش بھی کی لیکن میں نے ضرورت پیش کر دی وہ مجھے "اللہ حافظ" کہتے ہوئے ٹیکسی سے اتر گئی تو میرے کہنے پر ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ٹیکسی طوبہ

اب وہ اجپہرہ کی سمت سفر کر رہا تھا۔

میں لاہور پہلی مرتبہ آیا تھا اور یہاں کے بارے میں میری معلومات سفر کے انتہائی نزدیک تھی۔ جب ڈرائیور نے لگ بھگ ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تو میں نے اس سے کہا۔ "ٹیکسی کو مال روڈ کی طرف موڑ لو۔" پھر میں نے اسے اپنے مطلوب ہوٹل کا نام بھی بتا دیا۔

کبیر شاہ نے جس ہوٹل میں میرے لیے سوئٹ (Suite) بک کر دیا تھا، وہ مال روڈ (شاہراہ قائد اعظم) پر واقع تھا۔ یہ ہوٹل خاصا معروف تھا۔ میرا سوئٹ اس ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا اور اس کا نمبر دوسرا آٹھ تھا۔ اس سوئٹ میں ایک بستر روم، ایک تنگ روم کے علاوہ دیگر تمام سہولیات بھی موجود تھیں۔ یہ معلومات کبیر شاہ نے مجھے پہلے ہی فراہم کر دی تھیں۔

ڈرائیور نے میری ہدایت پر ٹیکسی کا رخ تو موڑ لیا لیکن یہ پوچھے بغیر نہ رہا کہ "صاحب! آپ کو تو اجپہرہ جانا تھا، سلطان احمد روڈ پر؟"

"اب مجھے مال روڈ جانا ہے، اپنے ہوٹل۔" میں نے سیدھی سی کہا "تم اجپہرہ وچھرو کڈو جن سے نکال دو۔"

اس کے چہرے پر مجھے مذہب کے آثار نظر آئے۔ میں نے پوچھا "تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"وہ صاحب جی! وہ داخل کرتے ہوئے بولا "ہات یہ ہے کہ مال روڈ کا فاصلہ اجپہرہ کی نسبت....."

میں نے جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی اس کی بات کاٹ دی اور کہا "ٹھیک ہے۔ تم فاصلے کی پروا نہ کرو۔ میں تمہیں زیادہ کراہ دے دوں گا۔ اس بارے میں تمہیں غور مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مطمئن ہو کر لاہور کی شفاف سڑکوں پر ٹیکسی دوڑانے لگا۔ جب میں نے مذکورہ ہوٹل پہنچ کر اپنے سوئٹ میں قدم رکھا تو میری رست واضح ساڑھے گیارہ واقت بتا رہی تھی۔

میں کوئی لمبی فضا کی مسافت طے کر کے یہاں نہیں پہنچا تھا کہ محسن کا سوال پیدا ہوتا لیکن اس کے باوجود بھی میرا پورا وجود ٹکٹوں سے چوڑھوا تھا اور آنکھوں میں شدید جسم کی جلن بھی ہورہی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ ساری رات میں بے حد "معصوف" رہا تھا اور مجھے ایک لمحے کو بھی آرام کا موقع نہیں مل سکا تھا، نیز لیٹا تو دور کی بات ہے۔ اس رات بے درپے ایسے ہنگامہ خیز حالات پیش آئے کہ مجھے مارا ماری سے فرمت نہ تھی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا، ایک بھر پور نیند کے لیے

جو توں سمیت بستر میں گھس جاؤں اور جب تک میرا جسم پھول ایسا ہلکا نہ ہو جائے، آنکھ کھولنے کا تکلف نہ کروں۔ مگر فوری طور پر اس خواہش کی تکمیل ممکن نہیں تھی۔ اس سے پہلے چند ایک اہم کام نمٹانا ضروری تھے۔

میں نے داش روم میں جا کر خود کو فریش کیا اور تھوڑا ایڑی ہونے کے بعد کراچی فون نمٹا دیا۔ ہوٹل میں قیام کی وجہ سے ظاہر ہے، یہ فون اس ہوٹل کے توسط سے ہی کیا گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے جہانگیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ شب میں نے اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی جس کے نتیجے میں ہماری دوستی وجود میں آئی تھی۔ اس کا پایاں شانہ جوڑے خاصا ستارہ ہوا تھا، اور کا سامنے والا دانٹ جڑ سے اکھڑ گیا تھا اور میرے دلدار خنجر نے اس کی گردن پر متعدد جھلک گھس (Cuts) لگائے تھے۔ اس کے کیے کی لی الجال اتنی سزا کا کافی تھی۔ ہائی سزاہ مرحلہ دار، مجھ سے دوستی نبھا کر کاٹ لیتا۔

تیسری یا چوتھی محنت پر دوسری طرف ریسورٹ اٹھا لیا گیا۔ میں نے اتریں میں جہانگیر کی انتہائی مختار "ہیلو" سنی۔ اس کی آواز میں بے پناہ خوف اور تر دیا پایا جاتا تھا۔

"ہیلو جہانگیر! میں ہوں۔" وہ جان۔" میں نے تیز آواز میں کہا۔

"اچھا تم ہو۔" اس کے منہ سے اطمینان بھری آواز برآمد ہوئی "کیا تم لاہور پہنچ گئے یا ابھی کراچی ہی میں موجود ہو؟"

"میں اس وقت لاہور سے بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" وہ طویل سانس کھینچ کر رہ گیا۔

"کیا بات ہے جہانگیر! تم کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، بلکہ بہت زیادہ گھبرایا ہوا ہوں۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے استفسار کیا "آخر بات کیا ہے۔ تمہاری گھبراہٹ کا سبب کیا ہے؟"

"وہ جان! تمہارے جانے کے بعد یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"ٹیکسی گڑبڑ؟" میں نے پوچھا۔

"نہو! ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہو گیا بھائی! وہ تو تمہارے قلیت میں بے ہوش پڑا تھا؟"

میں نے انھیں زندہ لہجہ میں کہا ”تم یہ کسی عجیب بات کر رہے ہو۔ جب میں تمہارے غلیٹ سے رخصت ہوا تو فواد بیڈروم کے فرش پر بے سہ پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم والی ”میٹنگ“ کے دوران میں ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ ہمارے جاتے ہی تم فواد کا ایسا ”ہندوستان“ کر دو گے کہ وہ تمہارے پاس تسلیم واسطی کے سامنے زبان کھولنے کے قابل نہیں رہے گا۔ کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی غفلت برتی تھی؟“

”ٹم ٹھیک کہہ رہے ہو ویدان۔“ وہ سبے ہوئے انداز میں بولا ”میں شدید قسم کی غفلت کا مرتکب ہو چکا ہوں اور اب سو ایک فیصد امکان اس بات کا ہے کہ فواد یہاں سے نکلنے کے بعد پاس سے رابطہ کر چکا ہو گا یا کرنے ہی والا ہو گا۔“ وہ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولا ”مجھے محسوس ہو رہا ہے ویدان، جیسے میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ موت اب تب میں مجھے اپنے خوشیں جبروں میں دوپٹے والی ہے۔ میں سخت غمزہ ہوں ویدان! تم نے مجھے دشمنی راس آئی ہے اور نہ ہی دوستی پھل رہی ہے۔“

”تم اس دوران میں کیا کر رہے تھے؟“ میں نے پوچھا  
 ”تم نے تھوڑی دیر پہلے اپنی کسی غفلت کا ذکر کیا تھا!“  
 وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”وہ دن! میں تمہیں دل میں  
 اپنا سچا دوست تسلیم کر چکا ہوں اس لیے تم سے کسی قسم کی غلط  
 بیانی نہیں کروں گا۔“ اس نے یہاں تک پہنچ کر ایک لمحے کا  
 توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا ”میری اس  
 غفلت کا قتل تابندہ رہا۔۔۔ وہی کال گرل جسے تم نے ہاتھ  
 روم میں بندھنے کا حکم دیا تھا۔“  
 بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تاہم وضاحت کی  
 خاطر میں نے پوچھا ”تابندہ سچ میں کہاں سے آگئی؟“  
 اس نے بتایا ”جب تم دونوں یہاں سے رخصت ہو گئے  
 تو اسی وقت تابندہ ہاتھ روم سے نکل آئی شاید اس نے تمہاری

اس نے ایک پوچھل سانس خارج کی اور سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا، ”وہ حرافہ اس وقت مجھے پہلے سے کہیں یاد نہ تھی۔“ ہم اسے دو ہزار روپے کے عوض رات بھر کے لیے اپنے قلیق پر لائے تھے۔ رقم کی ادائیگی پہنچی اس کے ایجنٹ کو ہم کر چکے تھے۔ تائبندہ فوری طور پر دہاں سے جانا چاہتی تھی۔ وہ چلی جاتی تو ہمارے دو ہزار بھی چلے جاتے۔ تائبندہ کے سراپا میں ایسا رخ تھا کہ میں بے خود ہو گیا۔

نوادہ والے انتہائی اہم معاملے کو بحول کر میں تائبندہ کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس وقت میرے سر پر صرف ایک ہی بھوت سوار تھا..... اور وہ یہ کہ مجھے اپنے دو ہزار ڈوبنے سے بچانا ہیں۔ اس رقم کی ایک ایک پائی تائبندہ سے وصول کرنا ہے۔“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا ”اس کے بعد کیا ہوا ہوگا جو تخیلی اندازہ لگا سکتے ہو!“

”اندازہ تو میں لگا چکا ہوں جہا نکیر!“ میں نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا ”ہوس نے تمہاری آنکھوں پر ایسی دوہیر پڑی تائبندہ کی تھی کہ تم اپنے دو ہزار پورے کرنے کے پتھر میں نہایت قیمتی آدمی نوادہ کو گنوا بیٹھے ہو۔ وہ تمہاری اس غفلت نہ مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر رو پتھر ہو گیا۔ یہ دو ہزار روپے وصول کر کے تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے جہا نکیر۔ وہ ہماری ابتدائی گفتگوں کا تھا۔ تم نے جو مجھے ودھان کی حیثیت سے اور میں نے تمہیں گرے پھارو کے حوالے سے شناخت کر لیا تھا پھر ہمارے درمیان کی بیہوشی لابی اور ”سی ایف کے“ کے باہمی رابطے اور تعلق پر بھی مکالمے بازی ہوئی تھی۔ نوادہ نے تسلیم واطمی کو اس واقعے سے باخبر کر دیا ہوگا اور اس نے بگ باس شعیب غوری تک یہ اطلاع پہنچا دی ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ شعیب غوری میری اس کارروائی اور آئندہ عزائم سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے لہذا.....“ میں نے پروج انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور تھوڑے توقف کے بعد کثیر آواز میں کہا ”اب مجھے شعیب غوری کی جانب سے محتاط رہنے ہوئے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا۔ جہا نکیر! تمہاری ذرا سی جذباتی بحول اور نفسانی خواہش نے بتایا یہ کیل بگاڑ دیا ہے۔ بتاؤ، اب میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں!“

”ودھان! تم بہت باتیں انسان ہو۔“ وہ حاجت آئین لہجے میں بولا ”خدا کے واسطے مجھے بگ باس کے خطاب سے بچنا

اس کی سر اسبہ آواز سے میں نے محسوس کیا کہ اس نے میری بات کے اختتام پر ایک خوفناک جھرجھری لی ہوگی۔ ایر پیس (EARPIECE) میں اس کی ڈری سبھی آواز ابھری تھی۔ ”وہ جان آدمی بتاؤ، میں کہاں جاؤں۔ اوپر خدا ہے اور نیچے تم۔“ تم دونوں کے سوا میرا کوئی سہارا اور آسرا نہیں!“

میں نے کہا ”اوپر والے پر محمد رسول اللہ میری ہدایت پر عمل کر دو۔ انشاء اللہ تمہارے حق میں برآمد ہوگا۔“

”تم مجھے کدو، میں کیا کروں!“

”تمہیں فوری طور پر اس محسوس غلیظ کو چھوڑ دینا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں نکل رہا ہوں۔“ وہ دریاں برداری سے بولا ”بتاؤ، یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں؟“

میں نے اسے منہاس باقر کے دفتر کا پتا سمجھایا اور کہا ”جب تک میں وہاں فون کر کے تمہارے بارے میں آسانیاں فراہم نہ کر دوں، تم اس دفتر سے ہٹنا نہیں سکتی۔ یہ فیصلہ بعد میں کریں گے کہ اس کے بعد تمہیں کہاں جانا ہے۔“

”اوکے وہ جان! میں تمہارا یہ احسان بھی زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”تم یہ بات کہہ کر اس دوستی کی توہین کر رہے ہو ہمارے دو مہمان کا تم ہو سکی گے۔“ میں نے ابھی سے کہا ”دوستوں پر احسان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے کام آفراز اکلین ہوتا ہے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا ”میں آج وہاں بات کا خیال رکھوں گا۔“

فون بند کرنے سے پہلے میں نے اس سے چند ایک ضروری سوال کیے۔ میں نے کہا ”آج صبح تمہارے بیان کے مطابق پاکستان کے ایک دوست یورپی ملک کا سفیر مسٹر جم براؤن کراچی پہنچے والے تھا۔ اس کے جہاز نے ٹھیک دس بجے لینڈ کرنا تھا اور ہوٹل پہنچنے سے قبل ہی ”سی ایف کے“ کے دو دست گردوں نے مہمان سفر کو زبردستی کے مقام پر قتل کیا۔“

جہاں گیر نے میرے سوالات کے جوابات میں بتایا ”اس سلسلے میں خود میں بھی بہت پریشان ہوں۔ نجیب اللہ اور سراج احمد نے جم برادرن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد مختلف مراحل سے گزر کر ٹھیک ساڑھے دس بجے میرے پاس آنا تھا لیکن ابھی تک نہ وہ آئے ہیں اور نہ ہی اوپر سے کسی قسم کے احکام۔ لگتا ہے، کوئی لمبی عرصہ گزر ہو گئی ہے۔“

”ہاں، لگتا تو یہی ہے۔“ میں نے بڑے خیال انداز میں کہا ”جتنی لمبی گزر ہو چکی ہے اس سے بھی کہیں زیادہ طویل و عریض گزر ہوئے والی ہے لہذا تم نے انور اس فلیٹ سے نکل کر میرے بتائے ہوئے مقام پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں بعد میں پھر کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔“

پانچ منٹ کے وقفے سے میں نے دوسرا فون منہاس پافر کو کیا۔ اس وقت میری رسٹ وائج گیارہ بجاس بجارہی تھی۔ منہاس سے فوراً رابطہ ہو گیا کیونکہ وہ دفتری میں موجود تھا۔ فون پر میری آواز سننے ہی وہ جو شیلے لکھ میں بولا۔

”وہاں! تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔“

”جم براؤن کو ایک بال بھی باک نہیں ہوا۔ ہے نا؟“  
 ”رائٹ یو آر!“ وہ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا  
 ”تفصیلات بڑی شگفتہ ہیں۔ ہم نے متوقع قاتلوں کو گرفتار  
 کر لیا ہے..... ہم سے مراد، ہماری پولیس ہے۔“  
 میں نے سر اٹھنے والے اعجاز میں کیا ”مبارک ہو منہاس  
 صاحب! آپ کی زبانی اس کامیابی کی تفصیل سننے سے پہلے  
 میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی توخوڑی دیر بعد جہاں گیر  
 آپ کے دفتر پہنچنے والا ہے۔ اس کی جان کو سخت خطرہ ہے۔  
 آپ اسے پناہ دیں گے اور اس کی حفاظت کا بھی بندوبست  
 آپ ہی کے ذمے ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلی بات بعد  
 میں ہوگی۔ فی الحال آپ ذہن میں یہ بات رکھیں کہ جہاں گیر  
 کی حیثیت میرے ایک دوست کی سی ہے!“

”تم جہاں گیر کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ و جدان!“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”اس کی حفاظت اور نگہداشت اب میرے ذمے ہے۔ وہ تمہارا دوست ہے، میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔“

میں نے مطمئن ہونے کے بعد کہا ”ٹھیک ہے منہاس صاحب! اب آپ مجھے سفیر مسٹر جم براؤن کے بارے میں بتائیں؟“

وہ بتانے لگا ”تمہاری فراہم کردہ اطلاعات نے میرے اندر کھلی بھادی تھی۔ کوئی اور شخص اگر مجھے اس بارے میں بتاتا تو میں اس کی بات پر دھیان نہ دیتا مگر تمہاری تو بات ہی دوسری ہے۔ میں تم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے لگا ہوں و جدان!“

”یہ آپ کی محبت ہے منہاس صاحب!“ میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

وہ بولا ”محکمہ پولیس کے ایک ڈی ایس بی خورشید شاہ سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ خورشید ایک ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہے۔ تمہارے جاتے ہی میں نے خورشید کو فون کیا اور اسے تازہ ترین متوقع پیش آمدہ صورت حالات کے بارے میں بتایا۔ اس نے فون پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً مجھ سے ملنے چلا آیا۔ خورشید شاہ جم براؤن کی آمد سے آگاہ تھا اور حسن اتفاق دیکھو و جدان کہ خورشید شاہ پر دو ٹوکول کے اس دے میں شامل تھا جو سفیر جم براؤن کے ساتھ انٹر پورٹ سے ہوئی تک پہنچنے والا تھا۔ خورشید شاہ نے پہلی فرصت میں اپنے اہل آفیسرز سے رابطے کیے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر مہمان یورپی سفیر کی حفاظت اور متبادل قیام کا بندوبست کر لیا گیا۔“

”متبادل قیام؟.....“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

اس نے بتایا ”ہاں و جدان! اعلیٰ عہدوں پر فائز دے دار افراد نے آپس میں ہنگامی میٹنگ کی اور یہ طے پایا کہ مہمان سفیر کو اس کی طے شدہ قیام گاہ کے بجائے کہیں اور پہنچایا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ہوائی اتر پورٹ کا انتخاب کیا گیا اور نہایت ہی رازداری کے ساتھ وہاں مہمان سفیر جم براؤن کو ٹھہرانے کے انتظامات کر دیے گئے۔ مذکورہ ہوائی اتر پورٹ سے چند قندوں کی دوری پر ہے لہذا جم براؤن کو بہ حفاظت وہاں پہنچا دیا گیا ہے۔“

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا تو میں نے پوچھا ”منہاس صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ متوقع قاتلوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ لوگ کس طرح پولیس کے ہتھے چڑھ گئے؟

انہوں نے تو زسری کے قریب گھات لگا کر جم براؤن کو ہٹا کر مارتا تھا!“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو و جدان!“ وہ تائید کرتے ہوئے بولا ”مہمان کو بحفاظت ہوئی انٹر پورٹ پہنچانے کے ساتھ یہ پروگرام بھی طے پایا تھا کہ ملک دشمن متوقع قاتلوں کو ضرور گرفتار کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر زسری کے پورے علاقے کو سادہ لباس پولیس والوں نے اپنی نگاہ میں رکھ لیا۔ خاص طور پر لال کوٹھی سے لے کر گورکھ پور تک شارع فیصل کی دونوں جانب جو کتنا نظر رکھے والا مسلح پولیس اہلکار تعین کر دیے گئے تھے کہ کسی بھی غیر معمولی حرکت پر وہ فوراً عقاب کے مانند جھپٹا مار کر مشتبہ افراد کو اپنی گرفت میں لے لیں۔“

منہاس باقر کے بیان میں خاصا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ کامیابی اور ناکامیابی ایک انتہائی جذباتی اور حساس معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں انسان خود پر اختیار نہیں رکھ پاتا۔ بعض اوقات کسی خوشی کے موقع پر فطرطہ جذبات سے انسان کے آنسو نکل آتے ہیں اور کسی غم کی صورت حالات میں آنکھ سے ایک قطرہ نہیں ٹپکتا۔ غم و خوشی اور کامیابی و ناکامیابی انسان کو بے اختیار کر دیتی ہے۔ منہاس باقر بھی اس وقت کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”و جدان! متوقع قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پولیس کو ایک ڈراما ایجنٹ کرنا پڑا۔ مہمان سفیر جم براؤن کو تھپکے سے انٹر پورٹ سے نکال کر ہوئی پہنچا دیا گیا تھا لیکن ڈی پروٹوکول کو انٹر پورٹ سے اس ہوئی کی جانب روانہ کیا گیا جہاں پہلے جم براؤن کے قیام پر پروگرام تھا۔ اس پروٹوکول میں وہ گاڑی شامل نہیں تھی جو غیر کوٹھی کے جانے کے لیے استعمال ہوتی۔

”تم جانے ہو و جدان! پروٹوکول کی گاڑیاں ہائی اسپید پر چلتی ہیں تاکہ کہیں سے انہیں نشانہ نہ بنایا جاسکے۔ ایک سو ساتھ سے اوپر رفتار کو اگر گت بنانا ناممکنات میں سے ہے پھر جو تم نے بتایا تھا کہ زسری کے مقام پر کوئی معنوی ایمریشن پیدا کر کے اس پروٹوکول کی اسپید کو کم کرنے یا انہیں روکنے کی کوشش کی جائے گی تو بالکل دیکھا ہوا۔ پروٹوکول میں سب سے آگے ٹریفک پولیس کا دستہ ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس والوں کا دستہ۔ پولیس والوں کے عقب میں مہمان شخصیت کو رکھا جاتا ہے۔ اس وی دی آئی کی شخصیت کے پیچھے پھر پولیس کا ایک کورنگ (COVERING) دستہ موجود ہوتا ہے۔ ہمارے اس ڈرامے میں جم براؤن کی گاڑی موجود نہیں تھی

چنانچہ طے یہ پایا تھا کہ پولیس کے دونوں دستوں میں فاصلہ بڑھا دیا جائے اور اگر زسری کے کسی مقام پر رکاوٹ پیدا کی جائے تو وہاں ضرور بریک لگائے جائیں۔ متوقع قاتلوں کو ٹکڑا مقصد تھا اس لیے ہر قسم کی صورت حال کے لیے سب کے ذہن تیار تھے۔ جم براؤن کی گاڑی کو غیر موجود یا گرفتار ہو چکا جاتے اور اس کو کھلا ہٹ میں ان سے کوئی ایسی فاش غلطی سرزد ہو جاتی جس کی بنا پر وہ پولیس کی پکڑ میں آ جاتے۔“

منہاس باقر ذرا دیر کو رکا تو میں نے کہا ”قاتلوں کو پکڑنے کا منصوبہ خاصا دلچسپ ہے لیکن خطرناک بھی۔ پولیس نے اس قسم کا فیصلہ کر کے ہائی ریسک لیا تھا۔“

”و جدان! عام طور پر ہماری پولیس کسی طرح کا ریسک لینے کی عادی نہیں۔“ منہاس باقر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”لیکن ڈی ایس بی خورشید شاہ کا شمار ان پولیس آفیسرز میں ہوتا ہے جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے پھر جم براؤن والا معاملہ کلی عزت و وقار کا مسئلہ تھا۔ اگر اس یورپی سفیر کو کچھ ہو جاتا تو پوری دنیا میں پاکستان کی بہت رسوائی ہوتی۔ ان حالات میں پولیس کو ہائی ریسک (HIGH RISK) لینا پڑا۔ جانے ہو، اس چال کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ متوقع قاتلوں کو کیسے گرفت میں لیا گیا؟“

میں نہیں جانتا تھا اس لیے جلدی سے کہا ”آپ بتائیں منہاس صاحب!“

اس نے بتایا ”پروٹوکول میں شامل ٹریفک پولیس کے ہر اول دستے نے جیسے ہی زسری کا محل کر اس کیا، فٹ اتھ کے قریب کھڑا ایک موٹر لا کا بھاگتا ہوا سڑک پر آ نکلا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو بالٹیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ایک بالٹی میں بجھے ہوئے تھے اور دوسری میں بجنی ہوئی ٹکی ٹکی لڑکے کی عمر بارہ تیرہ سال رہی ہوگی۔ اس عمر کے بچوں کو تم نے بالٹیاں اٹھا کر شہر میں موگ بجلی مٹی اور بنے بیچے دیکھا ہوگا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس لڑکے کے عقاب میں ایک شخص بھی سڑک پر آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے مسلسل با آواز بلند گالیاں دے رہا تھا اور ساتھ ہی اسے ”جیب کترا، چور، حرائی“ اور جانے کیا کیا کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ وہ اس آدمی کی جیب کاٹ کر رہا ہو رہا تھا۔

”سڑک کے صحن وسط میں پہنچ کر بالٹی بردار لڑکا منہ کے ٹل کر۔“ بالٹیاں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا کر گئیں اور ان میں موجود مٹی وچنے کے دانے سڑک پر دور دور تک پھیر

گئے۔ وہ لڑکا اپنے عقاب کی پردا کے بغیر بڑی تیز رفتاری سے اپنے ”مال“ کو سینے میں مصروف ہو گیا۔

وہاں موجود ٹریفک پولیس والے چیخ کر انہیں روڈ سے ہٹنے کو کہہ رہے تھے مگر وہ دونوں جیسے کسی کی بات پر دھیان نہیں دے رہے تھے۔ لڑکا تین دفعی سے اپنے کام میں مصروف تھا اور اس کے پیچھے آتے والے شخص لڑکے کو پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ یہ پورا واقعہ بمشکل پانچ سیکنڈز میں پیش آیا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے پولیس کی گاڑیاں متوقع پہنچ گئیں پھر ان کے ٹائروں کی تیز چرچاہٹ فضا میں گونگی۔ طے شدہ پروگرام کے تحت پولیس والوں نے گاڑیاں روک لی تھیں۔

بریکس کی آواز کے ساتھ ہی سروس روڈ سے ایک ہوٹرا دونوں فائیو تیزی سے نکلی۔ اس موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے جنہوں نے اپنے چہروں کو چھپانے کے لیے ہیلمٹ لگا رکھے تھے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ایک خطرناک گن واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کا رخ شارع فیصل کی جانب تھا۔ وہ یقینی طور پر جم براؤن کی گاڑی پر فائرنگ کی خاطر آگے بڑھے تھے لیکن اسی اثنا میں پولیس والوں کا بھجلا دستہ بھی متوقع پہنچ گیا۔ پولیس والے متوقع قاتلوں کی سازش سے پیشگی آگاہ تھے اور یہ سارا ڈراما محض انہیں گرفتار کرنے کے لیے رچا گیا تھا لہذا موٹر سائیکل سوار فوراً ان کی نگاہ میں آ گئے۔ پہلے سے ریڈ لارٹ پولیس والوں نے ہوٹرا دونوں ٹو فائیو کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے اپنی تیار گنوں کے دھانے کھول دیے۔ اس فائرنگ میں ان دونوں کے پاؤں بھی شدید زخمی ہو گئے اور موٹر سائیکل سڑک کے کنارے الٹ گئی۔ مستعد پولیس والوں نے پیچھے بیٹھے ہوئے مسلح شخص کو گن سیدھی کرنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا پھر چند سیکنڈز میں ان دونوں موٹر سائیکل سواروں کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے کر آہنی زپور سے آرامتہ کر دیا۔ گن بردار کا نام سراج احمد اور اس کے ساتھی کا نام نجیب اللہ معلوم ہوا ہے۔ پولیس کی کینٹین جاری ہے تاہم ابھی تک انہوں نے زبان نہیں کھولی لیکن ان کی مزاحمت طویل نہیں چلے گی۔ پولیس زبان بندی اور لب کشائی کے ایک سواک ”ہنر“ جانتی ہے۔“

میں حیرت اور خوشی کے طے جلد جذبات کے ساتھ منہاس باقر کی رپورٹ سن رہا تھا۔ جہاں گیر نے مجھے متوقع قاتلوں کے یہی نام بتائے تھے جو پولیس والوں کے ہتھے چڑھے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میرا ملک ایک بہت بڑی بدنامی سے نکل گیا تھا۔ میں نے منہاس باقر سے پوچھا۔ ”وہ چنے مٹی والے لڑکے اور اس کا غصیلنا عقاب کرنے

والے شخص کا قصہ کیا ہوا؟ وہ اس معاملے کے اہم کردار ہیں۔  
 ”پولیس نے ان دونوں کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔“ منہاس  
 باقر نے بتایا ”انہیں اس ڈرائے میں کر دیا اور ادا کرنے کے لیے  
 خرید گیا تھا۔ ہماری معاونت کے لالچ نے انہیں یہ خطرناک  
 رول کرنے پر مجبور کر دیا۔ لڑکے کا نام بخت واحد ہے اور  
 دوسرے شخص کا نام امداہلی پتا چلا ہے۔ بخت واحد کا تعلق ایک  
 منطوق الحال گھرانے سے ہے اور چنے مٹی وغیرہ بیچتا اس کا  
 ذریعہ روزگار ہے۔ بخت واحد اور امداہلی نے وہ خطرناک  
 ”حرکت“ نجیب اللہ وغیرہ کے کہنے پر ہماری رقم کے لالچ میں  
 کی تھی۔“  
 ”حصول رزق حلال کو اسی لیے عین عبادت کا درجہ دیا  
 گیا ہے۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا ”ورنہ پیٹ کا دوزخ  
 جانے کیسے کیسے شرمناک چکروں میں پھنسانے کے لیے تیار  
 رہتا ہے۔“  
 ”تم ٹھیک کہتے ہو وجدان!“ وہ تائیدی انداز میں بولا  
 ”اب پولیس اس غریب چنے بیچنے والے لڑکے کو بناؤں چنے  
 چبانے پر مجبور کر دے گی۔“  
 ہمارے درمیان اس تازہ ترین موضوع پر مزید چند  
 باتیں ہوئیں پھر منہاس باقر نے پوچھا ”تم تو خیریت سے  
 لاہور پہنچ گئے ہونا۔“  
 میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا ”اب تک تو  
 اس طرف مکمل خیریت ہے۔“  
 ”انشاء اللہ! آئندہ بھی خیریت ہی رہے گی۔“ وہ پر  
 یقین لہجے میں بولا ”فریڈ یا شا میرا بہت ہی پر غلوص دوست  
 ہے۔ میں نے آج صبح فون کر کے اسے تمہارے بارے میں  
 بتا دیا ہے۔ اس سے کسی قسم کی مدد لینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ  
 نہ کرنا۔ وہ تمہارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔“  
 میں نے پوچھا ”مثلاً اس سلسلے میں وہ مفید ثابت ہو سکتا  
 ہے؟“  
 ”بھئی تمہارے مشن کے سلسلے میں!“  
 میں چونکا ”میں آپ کی بات سمجھا نہیں؟“  
 وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”وجدان! تم اپنی ساتھی  
 ساحل کی بازیابی کے لیے لاہور گئے ہونا۔ وہ تمہارے ایک  
 دیرینہ دشمن اول کے قبضے میں پھنچ چکی ہے یا پتہ چلے دالی ہے۔  
 تمہارا دشمن لاہور کے ایک سرحدی گاؤں موضوع رکھا دالی کا  
 اثر میں داردار چوہدری ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“  
 ”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں جناب۔“ میں ابھی  
 تک ابھن زدہ تھا ”مگر آپ کے دوست فریڈ یا شا کا رکھنا

دالی یا چوہدری نوازش علی سے کیا تعلق ہے؟“  
 وہ سہمہ رہے ہوئے لہجے میں بولا ”ان دونوں چیزوں سے  
 بلاشبہ اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ اس سلسلے میں تمہاری بھرپور  
 مدد کر سکتا ہے۔ دراصل فریڈ یا شا ایک صاحب حیثیت زمین  
 دار خاندان کا فرد ہے۔ اس کے خاندان کے دیگر افراد اب  
 بھی گاؤں میں رہتے ہیں اور زمین داری کرتے ہیں۔ ان کا  
 گاؤں لاہور کے نواح میں واقع ہے۔ سیاست میں بھی ان  
 لوگوں نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔ صرف فریڈ یا شا  
 ہی نے شہر کا رخ کیا اور وہ بھی یہ جینوں کی مگر کی کارخ۔ فریڈ  
 کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی لہذا اس نے فلم انڈسٹری  
 میں کٹھن محسوس کی اور آج کل وہ ایک کامیاب پروڈیوسر کی  
 حیثیت سے فلمیں بنا رہا ہے۔ لاہور میں اس کی ایک عالی شان  
 رہائش گاہ ہے جہاں کامیاب فلمیں نکلتی رہتی ہیں۔ فریڈ  
 جب بھی لاہور جاتا ہوں تو اسی کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ فریڈ  
 اگرچہ بہت مصروف رہتا ہے لیکن دوستوں کے لیے وقت نکالنا  
 اسے خوب آتا ہے۔ جینوں کے جمرٹ میں گھر سے اس شخص  
 سے مل کر تمہیں یقیناً خوشی ہوگی۔ کسی فلم پر ڈیوسر کی اپرویج  
 سے تم بخوبی آشنا ہو۔ مجھے یقین ہے فریڈ یا شا ہر حوالے سے  
 تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ تم رکھاں دالی والے مشن میں  
 اس سے مدد لے سکتے ہو۔“  
 ”ٹھیک ہے، میں اس کام کے بندے سے ضرور ملوں  
 گا۔“ میں نے کہا۔  
 ”میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو ہوں وجدان!“  
 ”شکر ہے منہاس صاحب۔“ میں نے سرسری انداز میں  
 کہا پھر اضافہ کرتے ہوئے اسے بتایا ”آپ کو جہاں گیر کی  
 حفاظت اور پناہ کا بندوبست کرنے کے ساتھ ایک اور اہم کام  
 بھی کرنا ہوگا۔ تازہ ترین صورتِ حالات کے پیش نظر میں نے  
 کچھ ہنگامی فیصلے کیے ہیں۔“  
 ”ہاں کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ وہ یک دم سنجیدہ  
 ہو گیا۔  
 میں نے کہا ”یہودی لابی والی اور ”سی ایف کے“ یا بقول  
 آپ کے ”سی بی ایف“ کے سلسلے میں آپ کو کبھی انتظار کرنے  
 کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو ”سی ایف کے“ والوں  
 کے دو اڈوں ”ساؤتھ“ اور ”ایسٹ“ کے بارے میں تفصیلاً  
 بتا دیا ہے۔ وہاں کا ایڈریس اور قائم مقام کا نام آپ کے پاس  
 درج ہے۔ تیسرے اڈے ”لیٹر“ کے بارے میں جہاں گیر کو  
 ہر قسم کی معلومات حاصل ہیں کیونکہ اس کا تعلق ”لیٹر“ ہی سے  
 تھا۔ آپ اپنے دوست ڈی ایس بی خورشید شاہ اور دیگر فرض

شاس پولیس آفیسر کو اتحاد میں لے کر ان اڈوں پر ریڈ  
 (RAID) کریں اور اس غیبتِ عظیم کو جتنا زیادہ نقصان پہنچا  
 سکتے ہیں، اس میں ایک لمحے کا تاخیر نہ کریں۔ ان لوگوں کو  
 موقع دینا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔“ میں نے  
 ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا  
 ”آپ کو آپ کے لیے اس جواب دہی کا مسئلہ بھی نہیں رہا کہ  
 ان خطرناک لوگوں کے بارے میں آپ کو کہاں سے معلومات  
 حاصل ہوئیں۔ ”سی ایف کے“ کے ”ساؤتھ“ والے اڈے  
 سے وابستہ دو افراد کا تعلق حملے کے الزام میں پولیس کے قبضے  
 میں ہیں۔ ان پر دباؤ ڈال کر بہت کچھ اگلوایا جا سکتا ہے۔ مگر  
 پولیس کا کوئی با اختیار اعلیٰ آفیسر آپ کی بات کو سمجھ جائے تو  
 آپ کامیابی کے بہت سے مجنوں اپنے نام سے گاڑ سکتے  
 ہیں۔“  
 ”یہ سب تو میں کر لوں گا۔“ وہ تذبذب انداز میں بولا  
 ”مگر تم نے اچانک اپنے پروگرام میں تبدیلی کیوں کر ڈالی۔  
 ہمارے درمیان یہی ملے ہو اٹھنا، جب تم لاہور سے واپس آؤ  
 گے تو۔۔۔۔۔۔“  
 ”قطع کلائی کے لیے مفرت چاہتا ہوں منہاس  
 صاحب!“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ  
 دیا ”اب حالات بیکر بدل چکے ہیں اس لیے مجھے بھی اپنے  
 پروگرام کو تبدیل کرنا پڑا ہے۔“  
 ”حالات کی تبدیلی کی کچھ وضاحت کر دے؟“ اس نے  
 پوچھا۔  
 میں نے کہا ”ایک تو پولیس براہِ راست اس معاملے میں  
 کود پڑی۔ آپ کے یا میرے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہال کی  
 کمال اور کمال کے پالی ضرور نکالیں گے۔ نجیب اللہ اور سراج  
 احمد کے ہاتھوں موقع پر گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس والے اپنی  
 مخصوص تقبیل سے ان دونوں کے ”آباد اڈا“ کو بھی کھوج  
 نکالیں گے۔ اس کے بعد شیعہ غوری اور اس کی شیطانی تنظیم  
 ”سی ایف کے“ کے خلاف قانونی کارروائی لازم ہو جائے  
 گی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جہاگیر کا سامی فواد سطر سے  
 غائب ہو گیا ہے۔ اس قسم کی انڈر گراؤڈ تنظیموں میں ہرگز  
 دوسرے پر گھرانہ ہوتا ہے۔ فواد کی موجودگی میں میرے اور  
 جہاگیر کے درمیان کچھ اس نوعیت کی گفتگو ہوتی تھی جس میں  
 ان کا کب پاس شیعہ غوری میرے سامنے ایک مجرم کی  
 حیثیت سے عیاں ہو گیا۔ وہ اب تک میری دوستی کا دم بھرتا رہا  
 ہے مگر اس کی اصلیت مجھ پر کھل جانے کے بعد میرا بدترین  
 دشمن بن جائے گا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ

میری مکمل ”صفائی“ کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ فواد کا  
 پراسرار غیاب ابھی ظاہر کرتا ہے کہ اس نے اپنے پاس کو  
 رپورٹ پیش کر دی ہوگی اور پھر طبعاً کا کرتا دھرتا نے شیعہ کو  
 سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ حالات کی یہ نئی کر دت بہت احتیاط کی  
 محتاطی ہے۔ ہمیں ایک ایک قدم چھوٹک چھوٹک کر اٹھنا ہو  
 گا۔ میں از خود شیعہ غوری سے ملوں گا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی  
 رابطہ رکھوں گا۔ اگر اس نے رابطہ کیا تو میں موقع محل کی  
 مناسبت سے اسے ٹریٹ کر دوں گا۔ فواد کی روپوشی نے بڑی  
 گڑبڑ پیدا کر دی ہے۔ آپ تو سمجھتے ہیں، ایسی تنظیموں میں راز  
 کی کتنی اہمیت ہوتی ہے!“  
 ”ہاں، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ منہاس باقر کی  
 جھمبیر آواز میری ساعت سے گھرائی ”تم نے حالات کا جو نقشہ  
 کھینچا ہے۔ وہ بہت توجہ طلب اور قابلِ فکر ہے۔ شیعہ غوری  
 اب واقعی تمہارا دشمن اول بن جائے گا۔ تمہیں حد سے زیادہ  
 احتیاط کی ضرورت ہے۔“  
 ”وہ میں کر لوں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا  
 ”آپ فوراً سی ایف کے کے خلاف ایکشن میں آ جائیں۔  
 بعد میں، میں بھی کراچی آ کر آپ کو جوائن کر لوں گا۔“  
 ”ایک بات کا خیال رکھیں منہاس صاحب!“ میں نے  
 سہمہ رہے ہوئے لہجے میں کہا ”کہیں بھی، کسی بھی مرحلے پر میرا  
 ذکر نہیں آنا چاہیے۔ آپ اپنے کرائم پر پورے شہزادہ کو سامنے رکھ  
 کر یہ کھیل بڑی خوبصورتی سے مکمل کیے ہیں۔ شہزاد ایک  
 بیدار مغز اور خاصا چلتا پھرتا پڑھ لکھتا ہے۔ مجھے امید  
 ہے، وہ ضرور کوئی بڑا کام کر دکھائے گا۔ ویسے میں بھی گا ہے یہ  
 گا ہے آپ سے رابطہ کرتا رہوں گا۔“  
 وہ جذباتی ہو گیا ”اوکے مائی سن۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“  
 ”منہاس کا ”مائی سن“ کہنا مجھے بہت اچھا لگا۔ سگ پور والا  
 انسپکٹر جیا تک شومبی مجھے اسی انداز میں پکارتا تھا جو سن کو بہت  
 بھلا لگتا تھا۔ اس انداز میں جوائنیت اور غلوص پنہاں ہے  
 اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔“  
 الفاظ چاہے کسی بھی زبان کے کیوں نہ ہوں۔ وہ انسانی  
 جذبات اور احساسات کی مکمل ترجمانی کا عکاس نہیں کر سکتے۔  
 الفاظ کو محض ایک وسیلے یا سہارے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا  
 ہے۔ وہ جذبات کا غیر البدل نہیں ہو سکتے۔ اپنے محبوب سے  
 بے نیاز ہونے کا اظہار ممکن نہیں، یہ کہہ کر کام چلایا جاتا ہے۔  
 جاس تم پر غدار کرنا ہوتا!  
 میری ساعت سے منہاس باقر کی اپنائیت آمیز آواز  
 گھرائی ”وجدان! تمہیں رقم وغیرہ کی ضرورت پڑے۔۔۔۔۔۔“



میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا ”منہاس صاحب! میرے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے۔ اگر مجھے مزید رقم کی ضرورت پڑی تو اس کے حصول کے لیے میرے پاس آن لائن بینکنگ کارڈز موجود ہیں۔ ان میں ایک سلور اور ایک گولڈ کارڈ ہے۔ انشاء اللہ ملک کے کسی بھی حصے میں اور ملک سے باہر پوری دنیا میں مجھے رقم وغیرہ کا مسئلہ بھی نہیں پیش آئے گا۔ آپ کی پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔“

”تم نے میری ایک بہت بڑی فکر ختم کر دی ہے۔“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔

ذائقہ کھانا معدے میں اترتا تو بدن میں سوئی ہوئی محسوس ہوگئی۔ لے کر بیدار ہوگئی۔ کوئی جاے فراہم یا گرمی بیڈ پر دراز ہوگیا اور آئندہ پانچ منٹ میں، میں نیند کی حسین اور کیف آور دوا دلی میں قدم رکھ چکا تھا۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں ملے ہوئے دیوار گیر کلاک پر ٹکا ڈالی۔ کلاک تین کا وقت بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں بشکل ڈیڑھ گھنٹا سو یا ہو گا۔ مجھے سونے سے قبل ہوئی والوں کو یہ ہدایت کر دینا چاہیے تھی کہ نیند کے دوران میں وہ کوئی کال نہ دیں۔ اسی بھول کا خمیازہ تھا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو!“ میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

دوسری جانب ہونٹ کا پتھر تھا۔ اس نے جلدی سے کہا ”سرا! آپ کے لیے کراچی سے کال ہے۔“

شعیب غوری کے نام نے مجھے چونکا دیا اور میں ایک منٹ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”ٹھیک ہے، لائن قلم کر دو۔“ میں نے تھکمانہ لہجے میں آ پتھر سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے شعیب کی قہر خراتی ہوئی آواز میری سماعت سے گھرائی ”ہیلو وجدان!“

”ہاں شعیب، کیا ہوا؟ تم خامسے گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو!“ میں نے حتی الامکان معتدل لہجے میں کہا

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے ایک مطمئن سانس لیتے ہوئے بولا ”شکر ہے، تم ہوئی میں مل گئے ورنہ میں ڈر رہا تھا، کہیں تم لاہور پہنچنے پر رکھاں والی روانہ نہ ہو گئے ہو!“

میں نے اپنے دلی جذبات اور احساسات کو چھپانے ہوئے پوچھا ”یار! اس میں ڈرنے والی کون سی بات ہے۔ اگر میں رکھاں والی روانہ ہو چکا ہوتا تو کون سی قیامت آ جاتی؟“

”تم نے برعکس لفظ بلکہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ اس کے اندر سے اضطراب اور عدم اطمینان جھلکتا تھا۔ بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اگر اس وقت میں تم سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو سمجھو، واقعی ایک قیامت ٹوٹ پڑتی۔“

آج شعیب غوری کا لب و لہجہ اور انداز بہت بدلا ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پرسکون اور تحمل مزاج پایا تھا لیکن

اسے ٹی ایم کارڈ (آٹومیٹڈ ٹیلر مشین کارڈ) موجود دور کی ایک حیرت انگیز اور بہت بھلائی بخش ایجاد ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے جس تیز رفتاری سے ہماری زندگی میں جگہ بنائی ہے اور مزید جگہ بنا رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے ہلار تو دکھا جاسکتا ہے، مغربی کمپیوٹر انسانوں پر حکمران ہو جائے گا۔ ہم اب بھی خاصی حد تک کمپیوٹر کے محتاج ہو چکے ہیں۔ اس غیریت کی مکمل حکمرانی میں زیادہ عرصہ باقی نہیں۔ آنے والے وقت میں یہ جن انسانوں کو اپنے اشاروں پر نچائے گا۔

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل اور تکلیف دہ ہے کہ آیا مشین نے اپنی ترقی کر لی ہے یا حضرت انسان بتدریج اپنے مقام و مرتبے سے گرتا چلا جا رہا ہے یا پھر یہ تیز آسان مخلوق خداوندی اپنا ذہن اور صلاحیت دیدہ و دانستہ مشین کے حوالے کر کے جین کی پائرسی بجانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہے۔!

بہر حال، ATM Card خاصے کی چیز ہے۔ کمپیوٹر کے ماہرین نے Automated Teller Machine بنا کر اکاؤنٹ ہولڈرز کے لیے بہت آسانیاں پیدا کر دیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ بعض عقل کل جسم کے لوگ اسے ٹی ایم کارڈ کو آل ٹائم ٹیم کہہ کر اپنی طبیعت جھانڑتے رہتے ہیں!

منہاس باقر نے حسرت آمیز لہجے میں کہا ”وجدان! کتنا ہی اچھا ہوتا کہ تم شانہ کی شادی کے موقع پر میرے پاس ہوتے۔ اس کی رخصتی میں اب چند روز باقی ہیں۔“

”مجھے اس غیر حاضری کا سخت افسوس ہے جنتا۔“ میں نے تہہ دل سے کہا ”میری دلی دعا ہے، آپ خوش اسلوبی سے اپنا فریضہ ادا کر سکیں۔ آپ میری مجبور یوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

الوداعی کلمات کے بعد میں نے ریسیور کو کرپل کر دیا۔ صبح کراچی ائیر پورٹ پر میں نے ہلکا جھکا ہوا ناشتا کیا تھا۔ اب مجھے ٹھک ٹھاک جھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے روم سروس کو کہہ کر اپنے کمرے میں ہی بیچ منگوایا۔ گرما گرم خوش

اس وقت کی محنت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا، وہ بڑی حد تک شکر اور نروس ہے۔ محوم پھر کر میرا دھیان نواد کی طرف جاتا تھا۔ بے یقین امکان اس بات کا تھا کہ شعیب غوری کو حقیقت حال کی خبر ہو چکی ہوگی۔ اس باخبری کے بعد اس کا خاموش بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے بات چیت کو نابل رکھتے ہوئے کہا۔ ”شعیب! میں تمہاری پریشانی کو کچھ نہیں پارہا ہوں ذرا مکمل کر بتاؤ، آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”میں پریشان نہیں بلکہ حذب بظ ہوں۔“ وہ بڑی سرعت سے بولا۔

میں نے پوچھا ”اس تذبذب کا سبب کیا ہے؟“

”تم فوراً کراچی چلے آؤ، پھر تفصیل سے بات ہوگی۔“

گو یا بلی تیلے سے باہر آگئی۔ میں سمجھ گیا، وہ جلد از جلد مجھے کراچی کیوں بلوا چاہتا ہے۔ میں گزشتہ رات جن حالات سے گزرا تھا ان کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا بہت آسان تھا کہ شعیب غوری پہلی فرصت میں مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں پلک جھپکتے میں ریڈارٹ ہو گیا۔

میں نے معتدل اور محتاط انداز میں کہا ”تم جانتے ہو شعیب! میں کتنے اہم اور حساس مشن پر کراچی سے لاہور پہنچا ہوں اور..... اب تم مجھے فوراً واپس بلارہے ہو!“

”یار بات ہی کچھ ایسی ہے کہ جنہیں پہلی فرصت میں کراچی آ جانا چاہیے۔“

”آؤ اسکی کیا بات ہوگئی؟“

”وجدان! تمہارے لیے میرے پاس دو نہایت ہی اہم اور سنی خبریں ہیں۔“ اس کا لب و لہجہ ابس لوٹ آیا۔ اس کا مطلب یہی تھا، وہ اب تک اپنے تئیں بھرپور اداکاری کر رہا تھا۔ اگر میں حقیقت حال سے آگاہ نہ ہوتا تو اس کی ایکٹنگ کو بچان لیتا۔ میں نے کہا۔

”شعیب، وہ دو خبریں جلدی سے مجھے سنا دو۔“

”ایک خبر خوشی کی ہے اور دوسری افسوس ناک۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ”تم جانتے ہو، میں کوئی کمزور انسان نہیں ہوں۔ بری سے بری خبر کو بھی نہایت تحمل سے سن سکتا ہوں۔ تم بے فکر ہو مجھے کوئی بھی اچھی بری خبر سناسکتے ہو۔“

”میں نے سن رکھا ہے، جب آپ کے پاس کسی لیے یہ ایک خوشی اور کمی کی خبریں موجود ہوں تو پھر پہلے خوشی کی خبر سنانا چاہیے اور بعد میں ہی کی۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا ”پہلی خبر ذہن پر جو تاثر قائم کرے گی اس کے عمل کو ہوتے پر دوسری خبر

سے نمٹا جاسکتا ہے اس لیے میں جنہیں فون پر صرف خوشی کی خبر سناؤں گا، دوسری خبر کراچی آنے پر تم تک پہنچانی جائے گی۔“

میں نے اس مکمل میں اپنی شرکت جاری رکھتے ہوئے کہا ”کیا خوشی کی خبر اتنی ہی زیادہ اہم ہے کہ میں اپنا مشن نامکمل چھوڑ کر فوراً کراچی آ جاؤں؟“

”اس خبر کا تعلق براہ راست تمہارے مشن ہی سے ہے؟“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں اچھل کر رہ گیا۔

وہ بولا ”میں نے تمہاری ساتھی ساحل کو ٹریس کر لیا ہے۔ وہ ادھر کراچی ہی میں ہے۔ جہنم مکانی میاں زاہد حسین نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔“

”کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں بے ساختہ کہا۔

وہ تسمی لہجے میں بولا ”یہ ہو چکا ہے وجدان۔ میں بھلا کیا تم سے جھوٹ بولاں گا۔ تم یہاں آ کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو۔ آج رات کو میں تمہاری ساتھی کو بحفاظت اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ تمہاری سی پلاننگ کے بعد میں ساحل کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم سیدھے ساؤتھ چلے آؤ۔ میں نے کبیر شاہ کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔“

میں سیکنڈ کے ہزاروں برس سے میں سمجھ گیا کہ شعیب مجھے گھبرنے کے لیے ایک گہری سازش کے تانے بانے بن رہا تھا۔ وہ مجھے جلد از جلد اپنے ”ہاتھ“ میں لینا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے شکار کرنے کے لیے ساحل سب سے زیادہ دلکش چارہ ثابت ہوگی۔ اس نے جہاں گیر اور نواد کو پیش آنے والے واقعات کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی ساؤتھ کے ناکامیاب مشن کا کوئی تذکرہ کیا تھا۔ اس کی سوچ تمام تر اس نقطہ پر فوسس تھی کہ کسی طرح مجھے اپنے قابو میں کر لے۔ اس کے ارادے اس کی بدیہی کی چٹلی کھاتے تھے۔

میں نے..... لوہا لوہے کو کاٹنے کے مصداق شعیب سے کہا ”یار! یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔ تم اتنے یقین سے بتا رہے ہو تو مجھے بھی مان لینا چاہیے۔ تم نے متعدد مواقع پر میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ میں تم جیسے خلص دوست پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں لیکن.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا وہ جلدی سے بولا ”لیکن کیا وجدان؟“

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا ”لیکن پتا نہیں، فوری طور پر کراچی کے لیے کوئی فلائٹ مل سکے گی یا نہیں اور اس ہونٹ



کھل کر تمہاری سماعت سے رسائی حاصل نہیں کرے گی۔  
 ”اتنا تو بتا سکتے ہو، اس خبر کا تعلق کس چیز سے ہے؟  
 وہ گھبرا آواز میں بولا ”متروک کنوئیں سے برآمد  
 والے سونے سے۔“  
 ”سونے کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے تشویش ناک لہجے  
 کہا۔

”جو بھی ہوا ہے، میں سنیاں لوں گا۔“ وہ گہری دم  
 سے بولا ”تم اس خوشی کے موقع پر اپنے ذہن پر کوئی  
 ڈالو۔ میں ہوں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اوکے! دل  
 لگ دو جان!“  
 پھر اس سے قبل کہ میں کوئی اور سوال کرتا، اس نے  
 فونک رابطہ منقطع کر دیا۔ بے اعتبار میرے منہ سے  
 غوری کے لیے خامے سخت الفاظ نکل گئے۔ اس کی ہم  
 احوال اب پوری طرح مجھ پر عیاں ہو چکا تھا۔ میں نے تو  
 دیر پہلے جن معاملات میں تو نے فائدہ اندازہ قائم کیا،  
 شرح اب مد فائدہ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

شعب غوری نے جلد از جلد مجھے قایم کرنے کے  
 ساحل کا شوشہ چھڑ دیا تھا۔ وہ یہ بات بخونی جانتا تھا،  
 میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے، اس کی حیثیت ہم  
 لیے ایک الٹ انگ ایسی ہے، اس کے بارے میں سننا  
 میں آنکھیں بند کیے دوڑا آؤں گا لیکن میں اب اس  
 فریب میں آنے والا نہیں تھا بلکہ اسے فریب دینے کا فیہ  
 چکا تھا۔ ساحل کے خوالے سے میں میاں زاہد حسین کے آ  
 بیان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ موت کے سامنے کڑے  
 بھی شخص سے دروغ کوئی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میاں  
 حسین کی شرک میرے جنم کے دھار تلے دنی تھی۔ وہ ان  
 لمحات میں کسی بھی قیمت پر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس  
 بالکل سچ بتایا تھا، میری ساحل کو چوہدری نوازش علی کی ط  
 روانہ کر دیا گیا تھا، اور مجھے اسی سمیت میں سز کرنا تھا،  
 میری ساحل مٹی تھی۔ شعب غوری اپنی چال بازی سے  
 راستہ کھنکھاتا کرنا چاہتا تھا مگر میں اب اس کی چال میں آنے  
 نہیں تھا۔

دوستی کی آؤ میں انسان اپنی گردن بھی کنوا دیتا ہے۔  
 ہیں، اگر آپ کسی کا سر قلم کرنا چاہتے ہیں تو ایک ہاتھ مٹا  
 اور دوسرے میں پھولوں کا ہار لے کر اس کی طرف بڑھو۔  
 کی گردن میں پھول پہنانے کے لیے ہار والا ہاتھ آ  
 بڑھاؤ۔ جب سامنے والا ہار پہننے کے لیے اپنی گردن جھکا  
 تو بجلی کی سرعت سے اس کی گردن مارلو۔

میں بھی دودن کی بنگ تھی پھر.....“  
 ”ہوئی کی بنگ کو جہنم میں ڈالو وجدان۔“ وہ قطع کلامی  
 کرتے ہوئے بولا ”اور فلائٹ وغیرہ کے لیے تمہیں فکر مند  
 ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہاری واپسی کا بندوبست  
 کر دیا ہے۔“  
 ”وہ کیسے شعیب؟“ میں نے حیرت کی اداکاری کرتے  
 ہوئے کہا۔

شعیب غوری جیسے با اثر شخص کے لیے یہ چنداں مشکل  
 نہیں تھا کہ کراچی میں رہتے ہوئے لاہور سے میری بنگ کروا  
 دے مگر میں حیرت کا اظہار کر کے اس ڈرامے میں حقیقت کا  
 رنگ بھر رہا تھا۔ ہمارے درمیان جو مکمل شروع ہو چکا تھا۔  
 اس میں اعتماد اور اداکاری کی بہت اہمیت تھی۔ اعتماد اپنی  
 ذات پر اور اداکاری دوسرے کے سامنے آتا ہے کہ ہم مکمل کر  
 ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے۔ شعیب جب تک بند رہ کر  
 کھیلتا رہتا، میں بھی اس کے سامنے کھلنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا ”وجدان!  
 جہیں فون کرنے سے پہلے میں نے تمہارے لیے ٹکٹ اور پہلی  
 ممکنہ فلائٹ میں کراچی آنے کا انتظام کر دیا ہے۔ جہیں صرف  
 اتنی زحمت کرنا ہو گی کہ اپنے کمرے سے نکل کر ہوٹل کے  
 گراؤنڈ فلور پر پہنچو۔ وہاں مختلف ٹریول ایجنسیز والے ایک  
 قطار سے آؤں گے بیٹھے ہیں۔ جہیں صدر ٹریولر میں جانا  
 ہے۔ وہاں صدر بخاری صاحب سے میرا ریفرنس استعمال کر  
 کے ملو۔ وہ تمہیں ٹکٹ دے دیں گے۔“ ایک لمحے کے توقف  
 سے اس نے اضافہ کیا ”تمہاری فلائٹ میں لگ بھگ ڈھائی  
 گھنٹا باقی ہے۔ اب تم وہاں کمرے میں ایک سیکنڈ ضائع نہیں  
 کرو گے اوکے!“

”اوکے مائی ڈیر!“ میں نے منافقت آمیز لہجے میں کہا  
 ”میں نکل رہا ہوں۔“ پھر میں نے پوچھا ”کیا میں باقاعدہ  
 چیک آؤٹ ہو جاؤں یا.....“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”سب  
 سے اہم یہ ہے کہ تمہیں ہوٹل سے نکلتا ہے۔ بس اسی پر توجہ  
 دو۔“

”اور وہ بری خبر!“ میں نے اچانک پوچھا ”اس کے  
 بارے میں کوئی کلیئر نہیں دو گے؟“

”میں چاہتا ہوں، خوش خبری تمہارے ذہن پر اپنا تاثر  
 پختہ کرے تو میں تمہیں اس بری خبر سے آگاہ کر دوں۔“ اس  
 نے دوستانہ انداز میں کہا ”جب تک میں تمہاری سماجی ساحل  
 کو تمہارے پاس نہیں پہنچا دیتا، وہ بری خبر میرے ہونٹوں سے

دستی پھولوں کے ہار ایسی ہوتی ہے۔ شعیب خوری نے کثیر المالتی سونے تک پہنچنے کے لیے مجھ سے دوستی کی اور بہت کم عرصے میں میرا اعتماد حاصل کر لیا پھر جیسے ہی اسے پتا چلا، میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہوں، اس نے بتیرا بدل لیا۔ چند روز قبل وہ بڑی شدت سے سونے کی بازیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کل رات ہی اس نے مجھے بتایا تھا، مسٹر نیل آرمر نے اپنی کم کم مدد سے وہ سونا حاصل کر لیا تھا اور اب مجھے اسی سونے سے متعلق کوئی بری خبر سنانے والا تھا۔ اگر میں نے اس کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ ممکن ہے، اس سلسلے میں واقعی کوئی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہوگی مگر اب تو اس کی ہر بات مجھے غریب دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کر لیا کہ سونے والے معاملے میں اس کی نیت غراب ہو چکی ہے حالانکہ ابھی تک اس نے مجھے کسی تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا تاہم کسی بد نیت اور دھرتی دشمن شخص پر آنکھیں کھول کر بھی ایک لمحے کے لیے مجھ پر سنا نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے اس کی دوستی پر ہر دوسرا کہ سونے والا راز اس تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے دوستی کا جائز فائدہ اٹھایا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا، وجدان دوستی میں اگر جان دے سکتا ہے تو دشمنی میں جان لے بھی سکتا ہے۔ شعیب خوری کی تمام تر دوستی کا بھانڈا اچھوٹ چکا تھا۔ اب میں اس کا دشمن تھا، کھلا دشمن اور دوستی کو یاد نہ بھی رکھا جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا مگر دشمنی کو ہر حال میں یاد رکھنا پڑتا ہے..... اپنی ہٹا کے لیے..... دشمن کی فٹا کے لیے!

شعیب خوری اگر یہ سمجھ رہا تھا کہ چھل فریب یا پکر بازی سے وہ سارا سونا ہزپ کر جائے گا تو یہ اس کی بھول تھی۔ پہلے تو میں ایک مخصوص حصے پر آمادہ تھا لیکن اب، شعیب کی نیت بدل جانے کے بعد مجھے اس سے سارا سونا حاصل کرنا تھا۔ وہ ایک بکٹ بھی ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کے جڑ سے چر کر مطلق میں ہاتھ ڈال دیتا اور مدد سے سمیت اس کی آنتیں کھینچ کر باہر لے آتا۔ وجدان کی دشمنی دارا، تارا اور مایاں زاہد کو بکواس آئی تھی جو شعیب بچ کر کھل جاتا۔ میں اس کی بیہودیت کو نوازی اور سی ایف کے کوتاہ کے راستے نکالنے کا پختہ عزم کر چکا تھا۔

یہی سب سوچتے ہوئے میں نے اپنا بیگ ریڈی کیا۔ اس دوران میں ڈارلنگ یک تک مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے سوچا تھا، ذرا فرصت ملے گی تو میں ڈارلنگ کا راز جاننے کے لیے ریسرچ کروں گا۔ ڈارلنگ پر کام کرنے کے لیے ارتکاز کی ضرورت تھی۔ میں اپنی "جینی" کی قوت کو استعمال کر کے

اس کے اندر راتر سکنا تھا اور اس کے اندر پوشیدہ اس سر بستہ راز کو افشا کر سکتا تھا جس نے پچھلے کچھ عرصے سے مجھے حیرت آمیز الجھن میں ڈال رکھا تھا "جینی" کی ایڈوانس مشق میں ہاتھ باندھ کر رہا تھا جس کے نتیجے میں، اس قوت میں بڑا خوشگوار اضافہ بھی ہوا تھا۔

میں نے ڈارلنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے بڑے باؤں میں پکر ہے۔ میرے ساتھیوں کو اس پکر میں درد کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ رفتہ رفتہ تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔" "میاؤں!" اس کی مخصوص آواز میری سماعت تک پہنچی۔

شعیب خوری سے رابطہ کے بعد میں جلد از جلد اس ہوئی کو خیر باد کہہ کر شہر کے ہنگاموں میں گم ہو جانا چاہتا تھا تا کہ وہ کہیں بھی میرا سراغ نہ پا سکے۔ میں نے بیک کی زپ بند کر تے ہوئے حیرت انگیز پراسرار لبی لے لیا۔ "ڈارلنگ! ہم اس ہوئی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آریو ریڈی؟"

اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، کہاں جا رہے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی ادا سے آواز نکالی "میاؤں!"

میں نے کہا "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ باہر نکل کر فیصلہ کروں گا۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر "میاؤں" کیا اور ایک طویل الجھائی لے کر جسم کو کھینچنے کے بعد تیار ہو گئی۔ یہ سچ ہے، اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا کہ میری اگلی منزل کیا اور کہاں ہو گی۔ بہر حال، اس ہوئی کو چھوڑنا تا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شعیب کو فریب میں مبتلا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا، میں مہر ٹریوٹر سے اپنا ٹکٹ حاصل کر لوں تا کہ شعیب آئندہ تین چار گھنٹوں کے لیے میری جانب سے بے فکر ہو جائے۔

صد بخاری کے پاس میں نے صرف دس منٹ گزارے اور اپنا ٹکٹ لے کر اس کی انجینی سے باہر آ گیا۔ مہر ٹریوٹر میں مختصر وقت میں مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ شعیب خوری بری طرح پوکھلا ہوا تھا۔ اسی پوکھا ہٹ اور جلد بازی میں اس سے سنگین جسم کی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ میں نے صد بخاری کے سامنے اپنی کسی انجین کا مظاہرہ نہیں کیا اور خاموشی سے باہر آ گیا۔

چکا حالانکہ جدیدی کے تمام مراحل اس کے ہاتھوں ملے ہوئے تھے، دوسرے وہ میری ڈارلنگ کی جنگ کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ شعیب سے میں اس قسم کی غلطیوں کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سامنے ایک نیا شعیب ظاہر ہو رہا تھا جو کل والے شعیب سے بہت مختلف تھا۔ یہ تمام حقائق ایک ہی طرف اشارہ کرتے تھے کہ حالات کی اس تیزی کی روٹ نے اس کے دماغ کی چولیس ہلا کر رکھ دی تھیں۔

میرے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس نے ڈارلنگ کی جنگ کیوں نہیں کروائی تھی یا یہ کہ میرا ٹکٹ بڑھاتے ہوئے اس نے وجہ کے بجائے وجدان کیوں نکھو دیا تھا۔ مجھے تو کسی بھی قیمت پر بی الجال داپس کراچی نہیں جانا تھا، میں انہی سوچوں میں مگھلتے ہوئے مین مال روڈ (شاہراہ قائد اعظم) پر پہنچ گیا اور اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔ میرے قریب ہی سے ایک نیلی شیر ڈھنیز سے مڑ کر ہوئی کے مین گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔ وہ گاڑی بالکل بند براعظمی، میری نیلی شیر ڈھنیز کی طرح مگر میرے چوکنے کا سبب وہ نیلی شیر ڈھنیز بلکہ اس میں موجود ہستی تھی۔

یقیناً اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ تاڑوں کی جڑا ہٹ فضا میں ضرور بلند ہوئی۔ اس گاڑی میں دو لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک نے اسٹرنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسری لہجوزیٹ پر براجمان تھی اور میں اسی چہرے کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ صدف تھی!

صدف قدم قدم پر مجھے اچھبے میں ڈال رہی تھی۔ لگ بھگ پانچ گھنٹے پہلے میں نے اسے شادمان کالونی کے چائنا چوک پر ڈراپ کیا تھا۔ یہ الفاظ دیگر میں نے بشکل اس سے جان چھڑائی تھی لیکن یہ میری خام خیالی تھی، وہ تو اب بھی میرے پیچھے بڑی نظر آتی تھی۔ اس ہوئی تک اس کی آمد خالی اڑتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اتنی جلدی اس نے میرا سراغ کیوں کر لگا لیا!

ایک لمحے کو میرے جی میں آئی، میں چپ چاپ تے وہاں سے ٹھک لوں۔ صدف نے مجھے وہاں کھڑے نہیں دیکھا تھا اور دوبارہ ہوئی جانے کا میرا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ صدف سے جان چھڑانے کا اس سے موزوں موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میرے ذہن نے اس کی نفی کر دی۔ میں نے سوچا، اس طرح بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ پھر کی نہ کی راستے مجھ تک پہنچ جائے گی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ

اس کا براہم معلوم کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اس براہم کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کی آنکھ بھولی کو فروغ دینے سے کوئی خطرہ کہ صورت حالات جنم لے سکتی تھی۔ بعض اوقات محتاط کا تعاقب کرنے سے بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ میں وہیں کھڑے ہو کر نیلی شیر ڈھنیز کا انتظار کرنے لگا چندرہ منٹ بعد میرا انتظار رنگ لے آیا۔ وہ ہوئی میں اپنی "نکیتش" کے بعد واپس آ رہی تھی۔ میں نے شیر ڈھنیز کے، اپنے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھ کے اشارے سے صدف کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

میرا اشارہ اس تک پہنچا تو اس کے چہرے پر ایک خوشگوار چمک نمودار ہوئی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اپنی سامی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ بھی دلچسپ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ صدف کی آواز تو مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی البتہ اگلے ہی لمحے نیلی شیر ڈھنیز میرے پہلو میں آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔

صدف نے شیشہ گر کر بڑی سرعت سے سر باہر نکالا اور اضطراری لچکے میں بولی "مسٹر اچھرہوی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس کے طنز میں شرارت پنہاں تھی۔ میں نے ایک بھر پور نظر ڈرائیونگ سیٹ والی بڑی ابھر صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔ چائنا چوک والی اس ہوئی میں کیا کرنے آئی تھی؟" اس کے ساتھ ہی میں نے مذکورہ عظیم الشان ہوئی کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

صدف نے گاڑی کے پچھلے دروازے کا لاک ہٹا دیا پھر زبردست مسکراتے ہوئے بولی "وجدان! اندر آ جاؤ۔ یوں لب سڑک گھڑے ہو کر سوال و جواب کرنا اچھا نہیں لگتا!"

میں دروازہ کھول کر شیر ڈھنیز کی عقبی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈارلنگ کو بھی میں نے اپنے ساتھ بٹھایا۔ سڑی بیک میرے قدموں میں پڑا تھا۔ میں ڈرائیور کے پیچھے اور ڈارلنگ صدف کے عقب میں تھی۔ دوسرے ہی لمحے نیلی شیر ڈھنیز ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شاہراہ قائد اعظم کے سبیل آب ٹریک میں شامل ہو گئی۔

صدف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "وجدان! یہ میری کرن ناد یہ ہے۔ میرے ساموں کی اکلونی جی جیسے میں اکلونی ہوں۔ ہم میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس لیے ہم میں بڑی اثر راسینڈنگ تک بھی ہے۔"

"ماشا اللہ!" میں نے جواباً اس اتنا ہی کہا۔ اس کا بے دریغ مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کرنا ظاہر کر رہا

تھا کہ وہ اپنی دمن کی بجلی تھی۔ وہ اپنی کزن سے کہہ رہی تھی  
”نادیہ! میں نہیں دھدھان اور اس کی ڈارنگ کے بارے میں  
تو قصیدہ بتا چکی ہوں۔ دیکھ لو، میں انہیں ڈھونڈ نکالنے میں  
کامیاب ہو گئی۔“

نادیہ ڈرائیوگ کو جاری رکھتے ہوئے بولی ”دھونڈنے  
سے تو خدا بھی مل جاتا ہے صدف۔ یہ تو ایک انسان اور ایک  
چالور کا کیس تھا۔“

”تم نے میرا سراغ کس طرح لگایا صدف؟“ میں نے  
دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔  
”وہ بولی“ یہ کہانی بہت طویل ہے مختصر اُتارنا جان لو کہ میں  
نے اس کیس کی نمبر اپنے ذہن میں لوٹ کر لیا تھا جو میں  
ایئر پورٹ سے لے کر آئی تھی اور..... یہ کہ نادیہ کے ڈیڑی  
اورنگ زیب خان، میرے ماموں ڈی ایس پی ٹریٹک ہیں۔  
اب اس سے زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیسی کا سراغ  
لگانے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ تم اس ہوٹل پہنچے تھے۔ میں  
نادیہ کے ساتھ یہاں آگئی پھر ہوٹل کے اندر تو نہیں البتہ ہوٹل  
کے باہر تم سے ملاقات ہو گئی۔“

”ہوٹل والوں نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا  
ہے؟“

”انہوں نے کہا، مسٹر وجیہ پیر و قترج کے لیے ہوٹل سے  
باہر گئے ہیں۔ جیسے ہی وہاں آئیں گے، انہیں میرے بارے  
میں بتا دیا جائے گا۔“ وہ ایک سی سانس میں بولتی چلی گئی۔ ”تم  
اس ہوٹل کے سوئٹ نمبر دو سو آٹھ میں ٹھہرے ہوئے ہو اور  
مذکورہ سوئٹ میں تمہارا قیام دو روز کا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی  
ہوں؟“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ لڑکی شرک ہو کر  
کی خال ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا ”اس کا  
مطلب ہے کہ تم نے مجھے تلاش نہیں کیا بلکہ میں خود تمہارے  
ہاتھ آیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ میری طرف گردن گھماتے ہوئے  
بولی ”کیا تم اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرے ہوئے؟ کیا ہوٹل  
والوں نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے؟“

میں نے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں۔ ہوٹل والوں نے  
تمہیں مس کاغذ نہیں کیا۔ ان کی فراہم کردہ معلومات بالکل  
درست ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔“  
”حالات میں کیا تبدیلی آئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
”یہی کہ میں نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے ٹھہری  
ہوئی آواز میں کہا ”اور اگر میں تمہیں از خود اشارہ نہ کرتا تو تم

میری گردن نہیں پاسکتی تھیں۔“  
”مم..... تم ہوٹل والے تمہارے چیک آؤٹ کے  
بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“  
”میں نے کہا نا، ان کی معلومات اب پرانی ہو چکی  
ہیں۔“

وہ ہنسی ب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”کہیں تم  
مجھے ایک مرتبہ پھر الوبانے کے پکڑ میں تو نہیں؟“  
”اللہ نے تمہیں ایک پرکشش اور حسین لڑکی بنایا ہے۔“  
میں نے فرخدا کی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ”میں  
تمہیں الوبانے والا کون ہوتا ہوں؟“  
”اب تک تم متھہر رہا مجھے بے وقوف بنا چکے ہو۔“ وہ  
شکایتی لہجے میں بولی ”وجیہ، اجہرہ، جیولری کی دکان، انارکلی،  
غیرہ وغیرہ..... یہ سب کیا ہے دھدھان؟“

میں نے گھبر آواز میں کہا ”اس سے پہلے کہ ہم اپنی منگو  
کو آگے بڑھا میں، تم مجھے بتا دو کہ اس ملک کے اور کون کون  
سے بڑے لوگوں سے تمہاری رشتے داری یا تمہارے ڈیڑی کی  
شاسانی ہے۔ کراچی ایئر پورٹ پر ڈیڑی الفکار ڈیڑی نے تمہاری  
سفارش نمائندگی دی اور یہاں پہنچتے ہی ڈی ایس پی ٹریٹک  
تمہارے ماموں کھل آئے؟“

”کل نہیں آئے۔“ نادیہ نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں  
حصہ لیتے ہوئے کہا ”میرے ڈیڑی پہلے صدف کے ماموں  
ہیں اور بعد میں ڈی ایس پی ٹریٹک۔ صدف نے تم سے کوئی  
غلط بیانی نہیں کی۔“

میں نے نادیہ سے کہا ”تم تو مجھے خاصی معقول لڑکی  
دکھائی دیتی ہو۔ یہ تمہاری کزن کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ہاتھ دھو کر  
میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟ اسے تو اپنی میڈیکل کی موٹی  
سوئی کتابوں میں سرگھسا چاہیے۔ اس نے خواہ مخواہ کے ”لٹی  
ایچ ڈی“ کے لیے مجھے کیوں تنگ کر لیا۔ آخر میں نے اس کا  
کیا کیا؟“

”میں دجیہ ہوں یاد دھان اس سے مطلب؟“  
”کسی نے کسی کا کچھ نہیں پکا ڈالا۔“ صدف نے سنجیدگی  
سے کہا ”تم خود کو دھان تسلیم کر لو، میں تمہارا اچھا چھوڑ دوں  
گی۔“

”اگر تمہارا مطالبہ یہیں تک ہے تو چلو، میں دھدھان  
ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”اتنی آسانی سے جانا  
چھوٹ سکتی ہے تو ایک جھوٹ بولنے میں کوئی قناعت نہیں۔  
میں دجیہ ہوں، وجیہ ہی رہوں گا۔ ایک جھوٹ سے دھدھان  
نہیں بن جاؤں گا۔“ صدف کی گردن میری ہی جانب مڑی  
ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں کی گہرائی ناچنے ہوئے کہا

”کہو، اب تمہاری تسلی ہو گئی؟“  
”صدف! تنقیش نظر سے مجھے ٹوٹتی رہی۔ نادیہ نے کہا  
”مسٹر دھدھان! بات دراصل یہ ہے کہ صدف بہت ہی شخص  
لوکی واضح ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے، اس نے زندگی میں کبھی بار  
کا منہ نہیں دیکھا۔ اسے اپنے مشاہدے پر اندھا اعتماد ہے۔  
اس نے کچھ عرصہ پہلے تمہیں بے پور (اغریا) میں دیکھا تھا۔ یعنی  
اخبارات میں تمہاری تصاویر دیکھی تھی اور تمہارے کارناموں  
کے تذکرے پڑھے تھے۔ اسے سو فیصد یقین ہے کہ تم دھدھان  
ہو لیکن تمہارا مسئلہ انکار اس کے مشاہدے کی نئی کر رہا ہے جو  
صدف کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک یہ  
تمہیں دھدھان ثابت نہیں کر لے گا، جہن سے نہیں بیٹھے گی۔  
میں نے اس کی قوت مشاہدہ کے بہت سے نمونے دیکھے  
ہیں۔“

”لیکن یہ تو بلاوجہ کی خند ہوئی۔“ میں نے چڑکھا ”اس  
کا مشاہدہ کیا ہوا، کوئی حدیث شریف ہو گئی جو کسی بھی صورت  
غلط نہیں ہوسکتی۔ میرے خیال میں تو اسے میڈیکل جھوڑ کر  
پولیس کے الو-سی جیٹن ڈیپارٹمنٹ میں چلے جانا چاہیے۔  
یہی شخص اسے سوٹ کر سکتا ہے۔ اگر یہ ڈاکٹر بن گئی تو صحت  
مند افراد کے اندر وہ بیماریاں بھی ڈھونڈ نکالے گی جو تاحال  
وریات نہیں ہوئیں۔“

نادیہ نے کہا ”وہ اپنے شک میں بڑی حد تک حق بجانب  
بھی ہے۔ تمہارے متحد جھوٹ اور پھر اس لگوری ہوٹل کے  
عالی شان سوئٹ میں قیام سے ثابت ہوتا ہے، تم اجہرہ جیسے  
مستوطانے میں رہنے والے دجیہ نہیں ہو سکتے۔ وہاں رہنے  
والے بیشتر افراد کی پائنت آمدنی اس ہوٹل کے دور دراز قیام  
کے اخراجات سے بھی کم ہوتی ہے!“

وہ دونوں مجھے بری طرح گھیر چکی تھیں۔ میں نے صدف  
کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اب تو میں خود کو دھدھان تسلیم کر  
چکا ہوں۔ تمہارے جس کی تسکین ہو گئی؟“

وہ مجھے کھینچتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی ”دھدھان!  
تم بہت پر اسرار ہو۔ تمہاری طرح تمہاری ڈارنگ بھی عجوبہ  
روزگار ہے۔ میں اس کے چھکار کی گواہ ہوں۔ کراچی  
ایئر پورٹ پر آنا اس نے جس نوعیت کا ہنگامہ کھڑا کیا تھا، وہ اپنی  
مثال آپ ہے۔ میرے اندر سے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے، تم  
دھنیں ہو، جو نظر آتے ہو!“

”اس نے فرق کیا پڑتا ہے؟“ میں نے کہا۔  
”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہو گا لیکن مجھے پڑتا ہے۔“ وہ  
بنوڑ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ میں تمہارے

اسرار کو کھول کر رہوں گی۔ میرے اندر تجس کا مادہ کوٹ کوٹ  
کر کھرا ہوا ہے۔“

آخری جملہ اس نے ایک ادا سے ادا کیا تو میرے جی  
میں آئی کہہ دوں، تمہارے اندر تو بارد کوٹ کوٹ کر بھری  
ہوئی ہے۔ کہیں سے ڈاکٹر نہیں لگتی ہو۔ ڈاکٹر تو ایک سمجھا ہوتا  
ہے، وہ کہہ دو کہ دو کہتا ہے۔ تم تو اپنے آتش فشانی انداز سے  
ہوش و خرد پر بجلیاں گرانی ہو اور دل و دماغ کو تہ بالا کر کے  
رکھ دیتی ہو..... لیکن یہ خیالات میری سوچ تک محدود رہے،  
میں انہیں الفاظ کے قالب میں نہ ڈھال سکا۔ صرف اتنا کہہ کر  
رہ گیا۔

”مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اب میں اجازت  
چاہوں گا..... پلیز!“

صدف نے مستی خیز لہجے میں کہا ”تم نے نیم دلی یا بدلی  
سے خود کو تسلیم کیا ہے۔ دھدھان کی حیثیت سے اتر کر کرنے کا  
مطلب یہی ہے کہ تم کچھ عرصہ مکمل پنک سٹی (بے پور) میں  
موجود تھے اور اپنے دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ کی مدد سے تم  
نے وہاں کے پنڈتوں اور پجاریوں کی اینٹ سے اینٹ بجا  
رکھی تھی۔ کیا تم اس دشمنی پر کچھ روشنی ڈالو گے؟“

”میں تمہاری ہر فرمائش پوری کرنے کا پابند نہیں ہوں۔“  
میں نے معنوی رکھائی سے کہا۔

وہ بولی ”چلو اتنا ہی بتا دو، پاکستان میں کس مشن پر آئے  
ہو؟“

”میں نے کہا نا، میں اب تمہارے کسی سوال کا جواب  
نہیں دوں گا۔“

”چلو، سوال کا جواب نہ دو مگر اتنا تو کرو، جب تک میں  
لاہور میں ہوں، تم مجھ سے راجیلے میں رہو۔“ وہ مٹا مٹا انداز  
میں بولی۔

میں نے پوچھا ”تم مجھ سے بچ میں کیوں رہنا چاہتی  
ہو؟“

”تمہارے بارے میں جاننے کے لیے میرے اندر بے  
پناہ تجسس ہے۔“

”تم اپنے تجسس کو اسٹری میں استعمال کرو تو تمہارے  
لیے مفید رہے گا۔“ میں نے مشورہ کہا ”میڈیکل کی ایک  
اسٹوڈنٹ کو اس قسم کے فضول کاموں میں اپنا وقت برباد نہیں  
کرنا چاہیے اور وہ بھی ایسی اسٹوڈنٹ کہ جس کا فائنل ایر چل  
رہا ہو۔ ایک سال بعد تم ڈاکٹر بننے والی ہو۔ تمہیں اپنے  
پروفیشن پر توجہ دینا چاہیے۔“

وہ بے پروائی سے بولی ”میڈیکل میں تو مجھے پاپا نے

پھنسا دیا ہے۔ ہاتھیں، میں ہر سال کس طرح پاس ہو جاتی ہوں۔ ویسے میں نے فیصلہ کر لیا ہے، ڈاکٹر بننے کے بعد پریکٹس نہیں کروں گی۔“

”کچھ کر دو گی؟“ میں نے حیران لہجہ میں دریافت کیا۔ وہ بولی ”گھوموں پھر دوں گی، میرا سنا تا کروں گی۔ مجھے ہم جوتی سے بھر پور زندگی پسند ہے جسکی زندگی تم گزار رہے ہو۔“

”تم نے تو کھوتی ہی کھوتی میں ڈال دیا۔“ میں نے انھیں ناک انداز میں کہا ”تمہارے ڈیڑی نے تو تمہیں ڈاکٹر بنانے کے لیے لاکھوں روپیا خرچ کیا ہی ہے۔ کیا تم جانتی ہو، ایک ڈاکٹر کی تیاری پر گورنمنٹ کتنا خرچ کرتی ہے؟“

”ہاں، مجھے سب معلوم ہے۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”اگر ڈاکٹر بننے کے بعد تم نے اس پروفیشن کو خیر باد کہہ دیا یا باقاعدہ اختیار نہ کیا تو ایک طرح سے تم بہت بڑی زیادتی کی کر رہی ہو گی۔“

”کیسی زیادتی؟“ اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا ”اگر تم میڈیکل کالج کے لیے امیٹ نہ کرتیں تو آج تمہاری جگہ کوئی اور ڈاکٹر بن رہا ہوتا۔ کوئی ایسا اسٹوڈنٹ جو چند نمبروں کی کمی کے باعث میڈیکل کالج نہیں پہنچ سکا۔ تم نے ایک اسٹوڈنٹ کا راستہ روکا ہے یعنی اس کے مستقبل کو بہت بڑی چوٹ پہنچائی ہے۔“

پوری بات سننے کے بعد وہ بولی ”کیا تم کسی تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی کام کر چکے ہو؟“

میں نے صدف کو نظر انداز کرتے ہوئے نادیہ سے پوچھا ”تم کیا اسٹڈی کر رہی ہو؟“

”میں انگلش میں ماسٹر ذکر رہی ہوں۔“

”سہا علیہم کمل کرنے کے بعد تم بھی کوئی سلائی کوڑھائی کا اسکول کھولنے والی ہو؟ یا پھر تم نے بھی عملی زندگی کو سیر و تفریح کی نذر کرنا ہے؟“ میں نے خاصے جیسے لہجہ میں دریافت کیا ”صدف نے بتایا ہے کہ تم دونوں بہت ہم خیال اور ہم مزاج ہو!“

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”آگے چل کر میرا اسی ایس کرے گا کہ پروگرام ہے۔ میرے ڈیڑی بہت سخت ہیں۔ میں صدف کی طرح لالہ لالی پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ ڈیڑی قیامت کھڑی کر دیں گے۔“

”اپنی کزن کو بھی ایسی ہی کسی قیامت کا خوف دلاؤ۔“

میں نے کہا ”اور اگر وہ سیکے تو اپنے پوپا کے بھی کان ضرور دھیر

دو۔ ممکن ہے، تمہاری بات سرحد بخاری کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اپنی چیچی بنی کو سمجھائے میں کا صاحب ہو جائے!“

میری اس بات پر صدف نے گھور کر دیکھا، میں نے نادیہ سے کہا ”اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو گاڑی ایک سائینل روک دو۔ میں آپ لوگوں کو مزید وقت نہیں دے سکتا۔“

اس وقت نادیہ کی نیلی شیر ڈیوٹر تنگ کر اس سے گزرا۔ ریگیل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک بات کی وضاحت کہ چلوں کہ میں اپنے ہوش میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور یہاں کی عمارتوں مزدوں اور دیگر مقامات کے بارے میں کچھ سمجھ جانتا تھا البتہ ازاں بعد تھوڑے ہی عرصے میں، میں نے لاہور کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کر لی تھیں لہذا اپنے اس داستانِ حیات میں خود کو لاہور سے شناسا ظاہر کروں گا، اگرچہ شناسائی رفتہ رفتہ ہوئی تھی۔“

نادیہ نے گاڑی روک کر غصہ کیا ”یہاں ریگیل کے نزدیک ہی ایک بہت عمدہ ریسٹورنٹ ہے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے ہیں کچھ کھاتے پیتے ہیں پھر جہاں تمہارا دل چاہے، چلے جانا۔“

نادیہ کا آغیزا مجھے پسند آیا۔ میں اس وقت چائے کی شے طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے خوش دلی سے کہ ”اوکے، ڈن!“

چند منٹ بعد ہم تینوں پرسکون ماحول کے حامل ایک معیاری ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ میری فرمائش پر چائے آرڈر دیا گیا۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی ضرور تھے، وہ بھی منگو لیے گئے۔ اس دوران میں ہمارے درمیان گہ چٹکی کھٹکھٹ بھی جاری رہی۔

کچھ دیر بعد ریسٹورنٹ میں چار افراد داخل ہوئے۔ ہال کے کونے میں ایک میز سنہال کر بیٹھ گئے۔ میں سرزد انداز میں ان پر ایک نظر ڈال کر اپنی ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان چاروں نے ہماری جانب توجہ نہ دی۔ میری طرف نادیہ اور صدف نے بھی نو اور ادراغ نہ کیا لہذا وہاں نادیہ نے ان آدے سے کچھ بے یقینی ہی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی بے یقینی خاص طور پر نوٹ کی اور کہا۔

”کیا بات ہے نادیہ؟ تم اتنی زبردستی کیوں ہو رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ کئی گھنٹیوں سے ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

صدف نے کہا ”کچھ تو ہے نادیہ۔ میں نے محسوس ہے، تم اچانک مضطرب اور گھبرائی ہوئی لگتی ہو؟“

بات ختم کرتے ہی صدف نے بھی اس میز کی طرف دیکھا جہاں وہ چاروں بیٹھے تھے۔ نادیہ کی بے یقینی کا مطلق

انہی لوگوں سے تھا۔ میں نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نادیہ سے پوچھا ”کیا تم ان چاروں کی وجہ سے پریشان ہو گئی ہو؟“

”صرف ایک کی وجہ سے۔“

”چاروں نہیں؟“ صدف نے استفسار کیا۔

”کون ایک؟“

وہ بولی ”سکندر..... ان چاروں میں سکندر بھی موجود ہے۔“

”اوہ!“ صدف نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”وہی سکندر نا، جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا، وہ ایک ایم بی اے لالہ بشر کا بچہ ہوا بیٹا ہے اور تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر بڑا ہوا ہے؟“

نادیہ نے انہماک میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

صدف نے پوچھا ”ان چاروں میں سکندر کون ہے؟“

”وہ جس نے سرخ نی شرت پہن رکھی ہے۔“

”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں نادیہ۔“ صدف نے گھبر آواز میں کہا ”آج ہم اس لالہ کے بچے کو چھٹی کا دودھ یاد دلوا کر رہیں گے۔“ پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے نادیہ سے بولی ”میں تمہیں وجدان کے کارناموں سے آگاہ کر چکی ہوں۔ بے پور کے اخبارات اس کی خبروں کے ساتھ اس کی مصلحتوں کا ذکر وہ بھی بطور خاص کرتے رہے ہیں اور تم تو جانتی ہو کہ میرا حافظہ کس بلا کا ہے۔ میں ان خبروں کی جزئیات کو بھی ابھی بھول نہیں پائی ہوں۔ وجدان مارشل آرٹس اور یوگا کا بہت بڑا ماہر ہے۔ یوگا کی مشقیں کرتے ہوئے تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔“

میرے ذہن میں فوراً وہ صبح تازہ ہو گئی جب ساؤتھ کے قریب ایک خوبصورت پارک میں، میں نے یوگا کی چند مشقیں کی تھیں۔ میں اور کیر شاہہ دینیش کے ایک جنگل میں زبردست مارا مار کی بعد واپس ساؤتھ پہنچے تھے۔ جنگل غریبی قحری اینٹ سے میاں زاہد حسین ہمیں جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہم جمال اور بھولا ساتھ اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے تھے۔

یہ خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ میں صدف کی حاضر دماغی، مشاہدے اور حافظے کو مان گیا۔ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور ملاقات بھی چند لمحوں کی مگر اس ملاقات کا ایک ایک اسٹیپ اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں نے ایک اور بات خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ نادیہ سکندر کی آمد سے خاصی ڈسٹرب بلکہ خوفزدہ ہو گئی تھیں لیکن صدف پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح ہشاش

ہشاش اور چاق و چوبند تھی بلکہ تھوڑی دیر قبل اس کو جس سنجیدگی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا وہ اب بھی کھین نہیں آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں شوخی سی در آئی تھی۔ یا تو وہ اتنی ہی باحوصلہ اور براہِ اعتماد تھی یا پھر وہ میری موجودی میں وہ ہر خوف اور جھٹکا سے بے نیاز ہو گئی تھی۔

شاہد ہماری اس سختی خیز اور گھبر کھٹکی تا حیران کی میز تک پہنچ گئی۔ میں نے سکندر نامی اس آوارہ لوحوان کو دہاں سے اٹھ کر ہماری جانب آتے دیکھا۔ اس نے جینز پر سرخ نی شرت پہن رکھی تھی۔ مجھے فٹ قد اور صحت قابل رشک تھی۔ اس کے بازوؤں کی پھلیوں کو دیکھ کر پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا، وہ باقاعدگی سے ہاڈی بلڈنگ کرتا ہوگا۔

ہمارے قریب آ کر اس نے باری باری ہم تینوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر نادیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے باہر تمہاری گاڑی کھڑی دیکھی تو تمہیں دیکھنے اندر چلا آیا۔ بھی، تم نے اپنی گاڑی کا ایسا نمبر لیا ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان چونک اٹھتا ہے۔“ پھر اس نے بڑے بھروسے انداز میں نیلی شیر ڈاکٹر دہرایا ”ناٹن دن دن۔ ایٹش میں ٹائٹ ڈبل دن ایمر جنسی پولیس کالنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے تم بھی کسی ایمر جنسی سے کم نہیں ہو!“

بات ختم کرتے ہی اس نے بے ہودہ انداز میں ایک نیچا قہقہہ لگایا۔

یہاں تک اس کی بات درست تھی کہ ”ناٹن ڈبل دن“ فون نمبر امریکا میں فوری مدد کے حصول کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اس بات میں سچائی ہوتی تو وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کے بعد سیدھا ہماری طرف آتا۔ وہ چاروں بڑی بے پروائی سے اندر آ کر ایک میز کے گرد بیٹھ گئے تھے۔ وہ میز چونک میری نظر کے بالکل سامنے تھی اس لیے میں نے ان کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر لیا۔ ابھی چند لمحے پہلے سکندر چانک نادیہ کی جانب دیکھ کر چونکا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اٹھ کر ہماری طرف بڑھا تھا۔ نیلی شیر ڈاکٹر ناٹن ڈبل دن کا حوالہ اس نے فلک (Fluke) میں دیا تھا جو اتفاق سے بالکل درست تھا۔ مذکورہ گاڑی ریسٹورنٹ سے باہر موجود تھی۔

نادیہ جڑ بڑھتے ہوئے بولی ”میں اس وقت اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ ہوں۔ تم یہ بے ہودگی بند کرو اور یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔“

”معزز مہمان!“ وہ استہزاء انداز میں بولا ”پھر میری جانب اشارہ کر کے نادیہ سے پوچھنے لگا ”یہ بھی کہاں سے پکڑا ہے تم نے؟“

صدف کی لک کھانے کے بعد سکندر ایک قدم پیچھے ہٹا  
پھر اس نے بڑے دھشیا نہ انداز میں صدف کو راؤنڈ ہاؤس  
لک ماری۔ صدف نے ایک اسٹیپ اندر آ کر لک کو بلاک

سکندر جلدی ہے اٹھ کر صدف کے برعکس کھڑا ہو گا  
پھر اس نے نفرت انگیز انداز میں صدف کو ایک ناقابل  
اشاعت گالی دی۔ صدف کے ہاتھ پاؤں بیکانگی انداز میں  
حرکت میں آ گئے۔ وہ کسی بھڑکی کی مانند اپنے جسم کو حرکت  
دیتے ہوئے سکندر پر لات کے بے سارنے لگی۔ اس کے اگلے  
(Steps) سے ظاہر ہوا تھا، مارشل آرٹس کے ساتھ ساتھ  
جمناسٹک میں بھی اسے خاصی مہارت حاصل ہے۔ اپنے اپنے  
پاؤں کی نیچی ٹھریوں سے اس نے حریف کا کمر باز کر دیا  
اس کے سامنیوں کو جوش آ گیا۔

مجھ سے بچنے والا بھی اٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ سکندر دھڑام سے اس کے اوپر آ کر گر ا۔ صدف نے بھی تھمر لی کا کاٹی انڈاز استعمال کرتے ہوئے سکندر کو یہاں پہنچایا تھا اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی لپک کر ”جائے قوعہ“ پہنچ گئی۔ میں نے کہا ”صدف! حریفوں کا تبادلہ فائٹ کے لطف کو دو بالا کر دیتا ہے۔ تم سکندر کو میرے لیے چھوڑ دو اور الہ دلوں کی طرف چلی جاؤ۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے میز

وکیل کلک (Wheel Kick) بڑی خطرناک گم ہے۔ یہ کارڈر ہو یا فلائنگ، ہر صورت میں اپنے ٹائر گٹ کا ساوا ستیاناس مار کر رکھ دیتی ہے اور خاص طور پر سر میں گرنے والی کلک تو یہ مقابل کو زمین پر چاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

مجھ سے پہلے ہی پر کلک کھانے والا اتھوڑا اجوا مار لڑکھڑایا اور اتاج کی پوری کماندو دھپ سے زمین پر جا کر مارا، اس کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، وہ کچھ عرصے کے لیے فرش نشین رہا ہے گا۔ میں سکندر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ بڑے خوشخوار انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ پے در پے پیچھے

والی چٹوں نے اس کے مارشل آرٹس کی ٹیم کر دی تھی۔ اس کے چار ماہ انداز میں کہیں بھی مارشل آرٹس کی جھلک نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے کو اپنے کے کانٹا نہ بنانا چاہا، میں نے نیک جھک (Neck Jerk) سے چہرے کو بچایا، اس نے دوسرا مکا میرے سینے پر مارا پھر دونوں بازوؤں کے گھیرے میں مجھے متحیر کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کا گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ہی بڑی سرعت سے اس کی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیا پھر ایک جھکے سے باہر کمر وڑ دیا۔ اس عمل میں سکندر کا سینہ مکمل گیا۔ ابھی وہ کلائیوں مڑنے کی تکلیف کو پوری طرح محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس کے کھلے ہوئے سینے پر میں نے فرنٹ ٹرسٹ گنگ ماری۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کلائیوں کو آزاد کر دیا۔

ٹرسٹ گنگ (Thrust Kick) میں ایک خوفناک دھکا پوشیدہ تھا پھر سکندر کی کلائیوں آزاد ہوتے ہیں۔ اس دھکے کے اثرات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ ہوا میں پھپھاتے ہوئے صدف کے نزدیک پہنچ گیا۔ اسی لمحے مجھے صدف کی طرف دھیان دینے کا موقع ملا۔ اس نے پتہ قائم اسٹریٹ فائٹر کو لپکا لٹا دیا تھا اور دروازہ دھکے دینے حریف سے نہر آ رہی تھی۔ یہ شخص پہلے ہی میز سے ٹکرا کر اپنی کمر پر شدید جھٹ کھائے بیٹھا تھا۔ اس سے ٹپکنے میں صدف کو زیادہ مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔

صدف کو اپنے نزدیک دیکھ کر سکندر بچوٹن سوار ہو گیا۔ وہ اس کے لیے دشمن اول کا درجہ رکھتی تھی۔ صدف ہی نے اس گرم جنگ کا آغاز کیا تھا۔ سکندر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک کرسی اٹھائی اور اسے بڑے دھشیا نہ انداز میں صدف کے سر پر دے مارا۔

اسی لمحے نادیدہ کے طعن سے ایک دہشت ناک جھج خارج ہوئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی دانست میں سکندر کے ہاتھ میں موجود کرسی نے صدف کی کھوپڑی چٹھا دی تھی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

صدف کی پھرتی..... بدوقت پھرتی نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی ساکت کر دیا۔ جیسے ہی سکندر نے کرسی کو فضا میں بلند کیا، صدف فرنٹ رول (Front Roll) کرتے ہوئے میز کے اوپر سے گزر گئی۔ کرسی صدف کی کھوپڑی کے بجائے میز پر لگی اور اس کے اعصاب چاروں جانب پھٹ گئے۔

سکندر نے اپنی ناکامیابی پر جھنجھلا کر صدف کو ایک غیر اخلاقی لقب سے نوازا اور غرا کر اس کی جانب بڑھا۔ صدف رولنگ کے بعد اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس نے اندر سے ٹل کے مانند اپنی جانب بڑھے ہوئے سکندر کو ڈانچ دیا۔ وہ کلائیوں جھونک میں آگے بڑھ گیا۔ صدف نے بڑی جھلکیک سے اپنے ہاتھوں کو اس کے پاؤں میں اپنی ناک جھنسا دی۔ صدف کی ہاف سوپ (Half Sweep) نے بڑا عمدہ کام دکھایا۔ سکندر طوفانی رفتار سے منہ کے بل ریٹورنٹ کے پختہ فرش پر گر کر اسی وقت سکندر کے دھکے پٹے سامنے نے اپنے لہار میں سے ایک خطرناک ہٹل نکال کر صدف کو ٹٹا سے پکڑ لیا اور دھشت ناک انداز میں غرایا۔

”ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

صدف اصل (Still) ہو گئی۔ ریٹورنٹ میں موجود ہر شخص کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ بڑی دھچکی سے یہ ناکا فائی دیکھ رہے تھے لیکن ہٹل کی روٹھائی کے بعد ان کے چہرے سرایتی کی لپیٹ میں آ گئے۔

میں نے ہٹل بردار پر ایک تجزیاتی نگاہ ڈالی اور پلک جھپکنے میں مہمان لیا کہ وہ فائرنگ کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غرا کر اس کی خواہش بھڑکے ہوئے رہی تھی۔ شاید صدف کو دھکا کر دہاں سے رو پکھ ہونے کے پلک میں تھا۔ صدف نے اپنے چہرے سے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس دھچکی میں آگئی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے وہ حرکت کی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ یقیناً اس نے سبب شخص کے مزاج اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا ورنہ وہ اتنا بڑا رسک نہ لیتی۔ سبب کر بڑے بڑے دھکے انداز میں ایک قدم پیچھے سر کی پھر اس نے اپنے دائیں پاؤں کے نزدیک بڑی ہولی ایک کرسی پڑا دیا ٹھوکر ماری۔

کرسی فٹ بال کے مانند ٹھوکر کھا کر ہوا میں اچھلا اور سیدی پستول بردار کی جانب پرواز کر گئی۔ اگلے ہی لمحے صدف چپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

ایک نرم نازک پانچ فٹ کی حسین و جمیل لڑکی سے اس قسم کی مردانہ حرکت کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

صدف نے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر اس کے پیٹ، سینے اور چہرے پر گولی کی برسات کر دی۔ کرسی کے خوفناک ٹکراؤ کے سبب ہٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا، صدف کے پے در پے حملوں نے چند لمحوں میں اسے آدھا موار کر دیا۔ اس کی کمر پہلے ہی شدید زخمی تھی۔ وہ دیکھتی ہی دیکھتی زمین یوں ہو گیا۔

اسی وقت ریٹورنٹ کے باہر پولیس کے مخصوص سائرن کی آواز ابھری۔ اگلے ہی لمحے ریٹورنٹ کے دروازے کے قریب کسی بھاری گاڑی کے رکنے کی آواز آئی پھر چار رکن بردار پولیس والے ریٹورنٹ میں داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی دہاں موجود ہر شخص کو ”ہینڈ ز اپ“ کر دیا۔

ان چاروں میں ایک عہدے کے لحاظ سے سب انسپٹر تھا۔ باقی تین کا نشیبل رینک کے تھے۔ سب انسپٹر کے ہاتھ میں پولیوڈ ہتھیار تھے۔ باقی تین پولیس اہلکاروں نے کاسٹوفز اٹھارہ تھیں۔ وہ کسی اتفاق سے ادھر نہیں آئے تھے بلکہ انہیں باقاعدہ فون کر کے ریٹورنٹ میں پیش آنے والے حالات سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اور یہ حرکت ریٹورنٹ کے منیجر کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ پولیس کی آمد کے بعد وہی بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ہماری ”مصرفیت“ کے دوران میں اسے پولیس کو بلانے کا موقع مل گیا تھا۔

پولیس والوں نے جائے فساد کا تفصیلی جائزہ لیا اور ریٹورنٹ کے منیجر سمیت ہم سب کو پولیس اسٹیشن چلنے کے احکام صادر کر دیے۔

میں نے سب انسپٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”آفیسر! ریٹورنٹ کا منیجر اس واقعے کا مینی شاہد ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں، ہم قصور دار نہیں۔ انہی بدعاشوں نے ہمیں ہاتھ اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔“

”کون بدعاش ہے اور کون شریف، اس کا فیصلہ تو تمہارے چل کر ہی کیا جائے گا۔“ ایس آئی نے سخت لہجے میں کہا ”ہم منیجر کو بھی تم لوگوں کے ساتھ ہی لے کر جا رہے ہیں۔ جو بھی بیان دیتا ہے، وہیں چل کر دیتا۔“

سکندر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”سب انسپٹر

صاحب! میرا نام سکندر ہے۔ میں لالہ بشیر کا بیٹا ہوں۔ ہمیں تمہارے لے جانا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ میرے یہ تینوں ساتھی بھی معمولی نہیں ہیں۔ باہر معروف صنعت کار فرقان خان کا بیٹا ہے، توصیف کے باپ حبیب راضیہ کو کون نہیں جانتا۔ یہ سیاست کے میدان کا ایک جانا پہچانا نام ہے اور سلیم کے والد ایک تھانے میں ایس ایچ او ہیں۔ ملک برکت علی کا نام، آپ نے ضرور سنا ہوگا؟“ وہ ایک لمحے کو رک کر بڑے طنز سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اگر آپ کو تمہارے لے جانے کا زیادہ ہی شوق ہے تو ان تینوں کو لے جائیں۔“ پھر اس نے بے ہوش پڑے اپنے ساتھیوں کی جانب اشارہ کیا ”تھکانا ہمارا ہوا ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ان تینوں میں سے کسی کو کچھ ہو گیا تو آپ کے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔“

سکندر بڑے واضح الفاظ میں سب انسپٹر کو دھکا رہا تھا اور میں نے دیکھا ”ایس آئی اس کی دھونس میں آچکا تھا۔ وہ بہت شکر نظر آنے لگا۔ اس وقت وہ تمام قانون کو فراموش کر کے صاحب رسوخ افراد سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔

اس نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے کاسٹیف کو حکم دیا ”اؤئے، ان تینوں کو پکڑ کر سوبائل میں ڈالو..... اور منیجر کو بھی اٹھا لو۔ ہم انہی مٹی خنڈا کر دی نہیں ہونے دیں گے۔“ میں نے آفیسر سے کہا ”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ آپ قانون کے محافظ ہیں۔ اگر آپ ہی قانون کھنٹی کریں گے تو یہ ملک کیسے چلے گا؟“

”اؤئے، تم مجھے قانون سکھاؤ گے؟“ سب انسپٹر نے آنکھیں ٹکالتے ہوئے کہا ”یہ ملک چل رہا ہے اور بہت خوبصورتی سے چل رہا ہے۔ تمہارے مشوروں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔“

”یہ ملک چل نہیں رہا، چل رہا ہے۔“ میں نے زہر خنڈ لہجے میں کہا ”اور اس کو جلانے والے تمہارے ہی جیسے قانون شکن ہیں جو طاقتور افراد سے مرعوب ہو کر مجرموں اور جرائم کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔“

سب انسپٹر نے یقینی سے مجھے ٹکٹے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے ایسی زبان درازی بھی کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے کھا جانے والی نظر سے گھورا اور سکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”لگتا ہے تمہارا کبھی کسی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا۔“ ”بہت بڑا ہے۔“ میں نے جواب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”صرف یہاں ہی کی نہیں بلکہ دنیا کے کئی



ممالک کی پولیس کو میں بھگت چکا ہوں مگر یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔  
وہ طرہ بے انداز میں ہنسا۔ ”یہی باوا آدم تمہیں تھانے لے کر جائے گا اور قانون سے گھٹکھو کرنے کے آداب بھی سکھائے گا۔“

”تھانے جانا ہے تو سب جائیں گے۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”تم ان امیر اور وزیر زادوں سے خصوصی برتاؤ نہیں کر سکتے۔“ میرا لہجہ خود بخود ترش ہو گیا۔ میں نے نازیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لالہ بشر کے سپوت سکندر نے میری اس ساسی سے ہند پزیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا، اپنی حفاظت میں کیا ہے۔ اس واقعے کے یہاں کئی گواہ ہیں۔“ پولیس کی آمد کے بعد وہاں موجود افراد کو نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھا دیا۔ ”آپ یہاں موجود افراد کا بیان لے سکتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے منیجر کا بیان بھی ہمارے حق میں جائے گا۔“ میں نے تھوڑا سا توقف کیا پھر غصے لہجے میں کہا۔ ”آفسیر! آپ میری ساسی نادیاہ کو کوئی معمولی لڑکی نہ سمجھیں۔ یہ ایک حاضر دلی بی بی ہیں۔“

سب انسپلر نے چونک کر مجھ دیکھا۔ ”ڈی ایس پی؟“  
”ہاں، ڈی ایس پی ٹریفک اور رنگ زیب خان۔“ نادیاہ نے فخریہ انداز میں بتایا۔

نادیاہ کے بھلے نے سب انسپلر کا چہرہ خنجر کر دیا۔ وہ بے چارہ اچانک پائین کے میں آ گیا تھا۔ اگر وہ ڈی ایس پی کی بنی یا اس کے ساتھیوں کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا تو یہ آئینل مجھے بار دلی بات ہوتی۔ دوسری طرف وہ سکندر کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس صورت میں کم از کم زیادہ نقصان بھی سکندر اور اس کے ساتھیوں کو ہی پہنچتا تھا۔

موقع پرست سب انسپلر نے ایک چال چلی اور وہاں موجود افراد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ لوگ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟“

وہ سب ہماری حمایت میں بولنے لگے۔ جب وہ اپنا غبار نکال چکے تو سب انسپلر نے ان کے نام بتے نوٹ کیے اور تھکاتہ انداز میں کہا۔ ”اب آپ لوگ جانتے ہیں۔ اگر کسی مرتلے پر آپ کی ضرورت پڑی تو بلا لیا جائے گا۔ میں دونوں پارٹیوں کو اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔ ان کے بیانات دیں چل کر ہوں گے۔“

عام شہریوں میں پولیس کا تصور یہی ہے کہ وہ عوام کو خواہ خواہ پریشان کرتی رہتی ہے اور بے قصور کو بھی گھر گھر کرا لے

سیدھے کیس میں الجھا دیتی ہے۔ اس وقت پولیس کا یہ سب انسپلر انہیں بڑی نرمی اور شرافت سے جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ انہوں نے اسے موقع قیمت جانا اور خاموشی سے کھٹک لیے۔

اس دوران میں سب انسپلر کے ساتھی کاٹھیلو نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے ہلا جلا کر باہر تو صیف اور سلیم کو بلا دیا تھا۔ دبلے پتلے، دراز قامت تو صف کے پہلے لوگ پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ معروف سیاست دان میر رائٹور کے بگڑے ہوئے اس نے گواہی خاصا سب مل چکا تو وہ بڑی کینڈو نظر سے صدف کو گھور رہا تھا۔ باہر اور سکندر چہرے سے بھی ہمارے لیے بے پناہ نفرت جھلک رہی تھی۔ انہوں نے اپنے اس حشر کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا!

سب انسپلر مجھے اور سکندر کو ایک طرف لے گیا اور نہایت ہی راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ لوگ ایک دوسرے کا بہنو کچھ بگاڑ سکتے ہیں لیکن میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تھانے پہنچتے ہی دونوں پارٹیوں کے گواہین کی طرف سے ٹیلی فونز تاننا بندھ جائے گا۔ حاصل وصول کچھ نہیں، یہ بات تم لوگ بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آج میں تصفیہ کر لو۔ منیجر کو مطمئن کرنے کے لیے میں تم سب سوبال میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس طرح قانونی کارروائی بھی چل میں آ جائے گی۔ تھانے پہنچتے تک لوگ کوئی فیصلہ کر لو۔“

”تصفیہ تو میں کسی صورت نہیں کروں گا۔“ سکندر نے ہجڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا اور میرے ساتھیوں کا بہن نقصان ہوا ہے۔ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

میں نے سکندر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرا ساتھی نادیاہ کی نہ صرف انسلٹ کی ہے بلکہ اسے درجن ہزار افراد کے سامنے قمار شامی بنایا ہے۔ اس کا رتا ہے“ پچھلیوں کو بہت بڑا ”انعام“ ملنا چاہیے۔ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کو تعویذ بہت مرمت تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی، تم اس سے کہیں زیادہ کے حق ہو مگر..... میں نے جملہ ادھر اچھوڑ کر سب انسپلر کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے باوجود بھی میں تصفیہ کے لیے تیار ہوں۔“ میں خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

”تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔“ وہ نفرت آمیز نظر مجھے گھور کر بولا۔ ”تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں لالہ بشر کا بہنو ہوں۔ ایم پی لالہ بشر۔“

میں نے اسے حربہ لگانے کے لیے کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہوتا اگر تمہارے پاس اپنی کوئی شناخت ہوتی۔ میں مانتا ہوں، تمہارا باپ ایم پی اے ہو گا مگر تم کیا ہو، یہ حقیقت مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ میں نے تو ابھی ابھی تم سے دو دو ہاتھ کیے ہیں!“

وہ مجھ سے بری طرح درگت ہوائے بیٹھا تھا۔ اپنی طرح یہ الفاظ نے تنک پائی کا کام کیا، وہ تڑپ کر بولا۔ ”تمہیں تو میں دیکھوں گا رستم خان کے پتر..... اور تمہاری اس ساتھی کو بھی۔“ اس نے صدف کی جانب اشارہ کیا پھر نادیاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم کب تک مجھ سے بچو گی!“ بات ختم کرتے ہی اس نے نادیاہ کے لیے چند نازیا الفاظ ادا کیے۔ وہ پولیس کو خاطر میں ہی نہیں لارہا تھا۔

صدف اچھل کر آگے بڑھی لیکن وہ بھلے کے ارادے سے نہیں بڑھی تھی۔ سکندر بھی سمجھا کہ وہ اس پر وار کرنے والی ہے۔ وہ ہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”اب اگر تم نے کوئی نبھو اس کی تو.....!“

صدف نے سختی خیز انداز میں جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ میں نے کہا۔ ”صدف! میں آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ایک سب انسپلر کے سامنے لالہ بشر کا صاحب زادہ تم سے گت ہوتا کیا اچھا لگے گا۔ زندگی رہی تو پھر سامنا ہو گا اور..... جب سامنا ہو گا تو تم پر ہے ارمان بھی نکال لینا۔“

سکندر نے اپنی رسوائی ہوتے دیکھی تو کھسپائی ملی کے مانند کھپا لوپنے لگا۔ وہ سب انسپلر کو مخاطب کرتے ہوئے جھجکا ہٹ اچھوڑا۔ ”میں کہنے لگا۔“

”ان دونوں کو لے جا کر تھانے میں بند کر دیں۔“ اس کا اشارہ صدف اور میری جانب تھا۔ ”انہی کی وجہ سے ساری گزب ہوئی ہے۔ پچھلیں، نادیاہ نے یہ مصیبتیں کہاں سے اٹھا لی ہیں؟“

صدف نے تفریح لیے ہوئے کہا۔ ”میں نادیاہ کی سگی کزن ہوں۔ اس کی سگی چھوٹی سگی بیٹی صدف۔“ پھر اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ وجدان ہے، میرا کلاس فلور۔ ہم کراچی سے آئے ہیں۔ اتنے اہم لوگوں کو مصیبتیں کتے ہوئے ہمیں شرم نہیں آتی؟“

بات کے اختتام پر صدف کا لہجہ بڑا زہر ملا ہو گیا تھا۔ جذبات مگرے مکالمات کے دوران میں وہ ایک سنگین غلطی کر چکی تھی۔ اس نے مجھے وجدان کے طور پر پیش کیا تھا۔ وہ تو قیمت تھا، وہاں وجدان یعنی میرا کوئی شاسائیں تھا ورنہ کوئی نئی افتاد ٹوٹ پڑتی۔ میں نے صدف کی اس حماقت پر اپنے

چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلے ہوئے تیر واپس نہیں آ سکتے۔

صدف کے طفرے کے جواب میں سکندر بھی بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ نتیجاً سب انسپلر ہمیں تھانے لے جانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بے چارہ ہمارے درمیان سینڈ وچ بن کر رہ گیا تھا۔

اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کبھی مناسب سمجھا کہ دونوں پارٹیوں کو اپنے تھانا انچارج کے رو برو پہنچا دے۔ تاہم اتنا ہوا کہ ہم لوگ پولیس کی سوبال کے بجائے اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ سکندر اور اس کے بیٹوں ساتھیوں کے پاس ایک نئے ماڈل کی مکلی جیب تھی جسے موٹے پائیس اور گرین لائٹس کی مدد سے ڈیکوریت کیا گیا تھا۔ ایک ایک کاشکوف بردار کاٹھیل دووں گاڑیوں میں سوار ہو گیا۔

میں نیلی شیر ڈی عقبی نشست پر پہنچا تو ڈارلنگ اچھل کر میری کود میں چڑھ گئی۔ میں ریسٹورنٹ میں جاتے ہوئے اپنا سگری بیگ اور ڈارلنگ کو گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ مگر بردار کاٹھیل عقبی نشست پر میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ڈارلنگ سے دلداری کو بھی چھل گیا لیکن کاٹھیل کی موجودگی میں خاموش رہنا زیادہ بہتر تھا لہذا میں دھڑا اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ڈارلنگ کی پشت کو سہلانے لگا۔

تھانے میں کوئی ایسی کارروائی نہیں ہوئی جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے۔ کارکنین بخوبی واقف ہیں کہ جب ہا اختیار اور با اختیار افراد کی اولاد میں ان کے مجھے جتنی جتن ہیں تو وہ ان سے کس طرح ”پچھا“ چھڑاتے ہیں۔ دونوں جانب سے سوس کا بھر پور استعمال ہوا اور شام چھ بجے ہمیں پندرہ منٹ کے وقفے سے یکے بعد دیگرے تھانے سے ”رخصت“ کر دیا گیا۔

واپسی میں ڈی ایس پی نے بدصدا ار مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ ”رات کا کھانا کھا لے بغیر میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم نے میری بیٹی اور بھانجی کی بہت مدد کی ہے۔“

نادیاہ نے کہا۔ ”ڈیڈی! وہ لوگ ہم سے پندرہ منٹ پہلے نکلے ہیں۔ راستے میں، ہمیں گھیرنے کی کوشش تو نہیں کریں گے!“

”اس بات کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں۔“ صدف نے کہا۔ ”بالفرض محال، اگر انہوں نے ایسی غلطی کی تو اس کا خیزا وہی بنتی ہے۔“

ڈی ایس پی غصے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بیٹی! تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے پہلے ہی مجھے اس



لنگھنے کے بارے میں بتا دیا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہیں آتی۔ اب تو میں لالہ بشر کے اس گندے خون کو ایسا فکروں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گا اور بھول کر بھی تہار کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جھک نہیں ماری۔ میرے مراسم کی بلندی بھی کچھ کم نہیں۔“

میں نہیں جانتا تھا، صدف نے اپنے ماموں کو میرے بارے میں کیا بتا رکھا تھا۔ اس نے اورنگ زیب خان ہی کی مدد سے میرا سراغ لگایا تھا اس لیے یہ تو ممکن نہیں تھا، کچھ بھی نہ بتایا ہو۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ اگر ڈی ایس بی نے براہ راست مجھ سے گفتگو شروع کر دی تو میں کس حیثیت میں اس سے بات چیت کروں گا۔ وچدان یا وجیہ؟ ڈی ایس بی اورنگ زیب ایک ٹھکانا گاہ پولیس والا تھا۔ وہ سوال کر کے میرا ہاتھ بند کر دیتا۔

شاید ڈی ایس بی نے غیر محسوس انداز میں میرے خیالات پڑھ لیے تھے یا کوئی اور بات تھی کہ اس نے میرا ہی موضوع چھیڑا۔ اپنی بھانجی صدف سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”صدف! مسٹر وجیہ تک پہنچنے میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ صدف نے یہ پھنک دی دکھائی تھی کہ مجھے وجیہ کے طور پر اپنے ماموں سے حصار فرمایا تھا۔

وہ بولی ”نہیں ماموں جان! ہم سیدھے اس کے ہوٹل پہنچے تھے جہاں وجیہ سے ملاقات ہو گئی۔ اور اسے ہار ماننا پڑی یعنی اس نے تسلیم کر لیا کہ میں اپنی دھن کی بچی ہوں۔“

یہ ایک گول مول جواب تھا۔ صدف خاصی موع شاس اور بات پر تیار ہوتی تھی۔

”مسٹر وجیہ! میری بھانجی بہت خدی ہے۔“ ڈی ایس بی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”اس سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ اس نے یہاں پہنچنے ہی مجھے تہارے بارے میں بتایا، تم اس کے کلاس فیلو ہو۔ اتفاق سے تم دونوں ایک ہی فلائٹ سے لاہور پہنچے ہو لیکن صدف کو تنگ کرنے کے لیے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ تم مسٹر وجیہ ہو۔ یہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تہارے پیچھے پڑی بھر میری مدد سے اس نے تہاراکو ج لگایا۔“ ایک لمحے کو روک کر اس نے سنجیدگی سے پوچھا ”تم ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو۔ کیا لاہور میں تہاراکوئی عزیز رشتے دار یا دوست نہیں ہے؟“

صدف نے بڑی ذہانت اور چالاکي سے اپنے ماموں کو

میرے بارے میں ایک فرضی کہانی سنائی تھی تاکہ اس کے جذبہ تجسس کی تسکین بھی ہو جائے اور میرا بھیجیدگی نہ ہو جائے۔ وہ اپنے ایک انتہائی قریبی رشتے دار کے سامنے میری طرف داری کیوں کر رہی تھی، اس بات نے میرے ذہن کی بری طرح الجھا دیا۔ اس نے میرا پردہ رکھنے کے لیے اپنے ماموں سے غلط بیانی کی تھی۔ میں نے سوچا، موقع ملے ہی اسے صدف سے اس بارے میں استفسار کروں گا۔ البتہ یہ بات واضح تھی کہ اس نے اپنی کزن نادیہ کو میرے بارے میں سر کچھ بتا دیا تھا۔ نادیہ بے پور کے حوالے سے مجھ سے گفتگو پہلی تھی اور متعدد بار اس نے مجھے وچدان کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہ خیالات بجلی کی سی سرعت سے میرے ذہن سے گزرے اور میں نے ڈی ایس بی اورنگ زیب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”میں اس ہوٹل میں اپنے ایک پرانے شناسا سے ملنے گیا تھا۔ اس کے رشتے دار کارپچی میں رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے لیے کچھ پیٹنا اور تحائف بھیجے تھے۔ وہ اس تک پہنچانا ضروری تھے، مجھے یہ سمجھتے ہوئے خدمت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، بعد میں مناسب موقع پر میں ڈی ایس بی کے سامنے اس کی وضاحت پیش کروں گا۔“

اس نے پوچھا ”لاہور میں کتنے دن کا قیام ہے اور کہاں ٹھہر رہے؟“

”یہاں جھگرگ میں میرے ایک دوست رہتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر جان چھڑانے کے لیے فریڈ پاشا کا حوالہ دے دیا۔“ وہ درحقیقت میرے والد کے دوست ہیں اور ایک فلم پروڈیوسر ہیں۔ آپ نے شاید ان کا نام سنا ہو؟“ جھگرگ نے فریڈ پاشا کا نام لے دیا۔

ڈی ایس بی نے کہا ”سوری مسٹر وجیہ! مجھے فلم اورم والوں سے زیادہ دلچسپی نہیں اس لیے پروڈیوسر فریڈ پاشا کے بارے میں نہیں جانتا۔“

میں نے کہا ”میں فریڈ پاشا کے پاس ہفتہ بھر ٹھہر رہا ہوں۔ مجھے فلم کی شوٹنگ دیکھنے کا بہت شوق ہے پھر فریڈ پاشا کا کھانا ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ میں اس کے گاؤں جا کر دیہاتی زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔“ اس بات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”لاہور میں تمہیں کوئی مسئلہ یا کبھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو کسی قسم کا شکایہ مظاہرہ نہیں کرنا۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے جناب! اگر ایسا کوئی موقع آتا

میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔“

”بھئی! آج تم نے ان بچیوں کی مدد کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ اس نے کہا ”میں تمہارے اس سلوک کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

میں نے کہا ”جناب! میں نے ان کی کیا مدد کی ہے۔ یہ سارا کرٹ تو صدف کو جاتا ہے۔ اس نے جتنا تنگ اور مارشل آرتس کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ میں دنگ رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، یہ اپنی بڑی مارشل آرٹس ہو گئی۔“ میں نے بات کے اختتام پر حقیقی حیرت سے صدف کی طرف دیکھا۔

”تم اس کے کلاس فیلو ہو اور تمہیں اس کی اس صلاحیت کی خبر نہیں؟“ ڈی ایس بی نے مجھ سے پوچھا۔

”اس نے بھی اپنی اس جنگجو بانہ صلاحیت کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔“ میں نے اپنی کئی ہوئی بات کو بھاتے ہوئے کہا ”میں کیا، کلاس میں کسی اور کو بھی یہ بات معلوم نہیں۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لمحے میں بولا ”مجھے بھی صرف اتنا پتا ہے، صدف نے کچھ جوڈو کرانے اور سیلف ڈیفنس سیکھ رکھا ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے بھی عملی مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے کارناموں کا تذکرہ سننے میں آیا۔ آج یہ پہلا موقع ہے۔“

اسی نوعیت کی گفتگو کرتے ہوئے ہم چلتا چوک کے نزدیک واقع ڈی ایس بی اورنگ زیب کی گھر کی پہنچ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ڈی ایس بی نے کہا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

”مجھے چند ضروری کام نشانا ہیں اس لیے دو تین گھنٹوں کے لیے جاؤں گا۔ انشا اللہ ڈنر پر پھر ملاقات ہوگی۔“ پھر وہ صدف اور نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”آپ لوگوں کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“

میں لالہ بشر کے بیٹے سکندر ہی کے سلسلے میں کوئی مناسب بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ جب تک سانپ کا زہر نہ نکال لیا جائے، اس کی طرف سے ڈنٹے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ میں پہلی فرصت میں اس موڈی کے دانت توڑ دیتا چاہتا ہوں۔“

ڈی ایس بی رخصت ہو گیا تو موقع ملے ہی میں نے صدف کو گھیر لیا۔ اس گھر میں ڈی ایس بی اورنگ زیب خان، اس کی بیوی شائستہ بیگم، نادیہ کی نانی زہرہ بیگم کے علاوہ صرف ملازمین تھے۔ زہرہ بیگم ستر سے ستواڑھی، زہرہ بیگم کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ بلڈ پریشر اور شوگر کی سرلیفٹیں اور اس قسم کی خبروں سے انہیں دور رکھا جاتا تھا۔ شائستہ بیگم اپنی بیٹی نادیہ کے ساتھ باہر گئے تھے

چنانچہ مجھے تنہائی میں صدف سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

”تم نے وہ کیا حماقت کی تھی؟“ میں نے برہمی سے کہا۔ وہ چوک کر بولی ”کون سی حماقت؟“

”ایک پولیس آفیسر سب انسپکٹر اور لالہ بشر کے تعلقے بیٹے کے سامنے میرا تعارف کروانے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے مجھے وچدان کی حیثیت سے حصار کر ڈالا!“

وہ جلدی سے بولی ”میں جوش میں آ گئی تھی۔ سچ کہتے ہیں، جوش میں ہوش نہیں رہتا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ بہر حال، سوری۔“

”کس کس بات کی سوری کرو گی؟“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیوں؟ کیا اور کوئی غلطی بھی ہو گئی؟“

”تم نے ڈی ایس بی صاحب کو میرے بارے میں کیا الٹی سیدھی کہانی سنا ڈالی۔ مجھے اپنا کلاس فیلو بتا کر تم نے میرے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔“

میں نے کہا ”اپنوں سے جھوٹ اور غیروں سے سچ بولنا کہاں کا دستور ہے۔ تمہیں دوست اور دشمن کا فرق نہیں معلوم؟“

وہ بڑی رसान سے بولی ”اگر میں ماموں کو تہاری ہشتری سنانے کے بعد اپنا ”عزم“ ظاہر کرتی تو وہ بھی مجھے اس کی اجازت نہ دیتے بلکہ وہ الٹا ہاتھ دھو کر تہارے پیچھے پڑ جاتے۔ تم جانتے ہو، وہ پولیس والے ہیں اور تم بھی ہنگامہ خیز اور دولہا انگیز شخصیت ان کے لیے گہری دلچسپی کا باعث ہوئی، تمہیں جان چھڑانا مشکل ہو جاتی اور جہاں تک وچدان کی حیثیت سے تمہارے تعارف کی بات ہے تو میں اس کے لیے سوری کر چکی ہوں لہذا زیادہ بکڑنے کی ضرورت نہیں!“

اس کی باتوں میں وزن تھا۔ وہ دونوں اور چار چاند انداز میں بات کرتی تھی۔ ایسی مدلل باتوں کو در نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بوجھل سانس خارج کی تو اس نے واضح الفاظ میں کہا۔

”وچدان! ایک بات کو اپنے ذہن میں نقش کر لو اور وہ یہ کہ مجھے دوست اور دشمن کی خوب پہچان ہے۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور وہ کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

اس بارے میں، میں نے اپنا کوئی خیال ظاہر کرنے کے بجائے اس سے پوچھا ”نادیہ کی باتوں سے میں نے محسوس کیا ہے کہ تم اسے میرے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا چکی ہو۔“

اگر اس نے اپنے ڈیڑی کو میری اصلیت سے آگاہ کر دیا تو تمہیں اپنے ماموں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔“

”ایسا بھی نہیں ہوگا۔“ وہ یقین سے بولی ”نادیہ میری کزن عی نہیں بلکہ ایک راز دار گہری دوست بھی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ہر قسم کی بات شیئر کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے، وہ تمہارے سلسلے میں احتیاط برتے گی۔ بہر حال، میں اسے خاص طور پر سمجھا دوں گی۔“

میں نے ڈی ایس بی کی فیملی کو خاصا آزاد خیال اور مارڈن پایا۔ صدف کی بے باکی میں پہلے ہی مشاہدہ کر چکا تھا۔ یہ بے باکی اور آزاد خیالی درحقیقت ایک اعتبار تھا۔ جو ان لوگوں کو اپنی ذات پر تھا۔ وہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت لوگ تھے۔ علم، دولت اور اعتبار انسان کو بے پناہ اعتماد بخشتا ہے اور یہ تینوں خوبیاں اس فیملی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ صدف کے سامنے ”وجدان اور دینیہ“ کا مسئلہ اٹھانا فضول ہے۔ اب تک کا تجربہ یہ بھی تھا کہ اس نے میری کسی وضاحت کو مان کر نہیں دیا ہے۔ دیکھو وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس پر مجھ دوسرا کرنے میں کوئی قیادت بھی نہیں تھی لہذا میں نے اسے اور اس کی سوچ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آگے جو ہوتا، میں اسے بھی بھگت ہی لیتا! مجھے خاموش باکر اس نے کہا ”کیا سوچ رہے ہو؟ ایک دم سنجیدہ کیوں ہو گئے؟“

”میں سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں؟“ میں نے کہا۔

”میرے بارے میں کون سی بات تمہیں سوچنے پر مجبور کر رہی ہے؟“

”تمہارا مارشل آرٹس اور فائٹ کا انداز۔“

”اوہ۔“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے ”یہ کوئی خاص بات نہیں۔“

”تم تو چھپی رستم نگل ہوا“ میں نے کہا ”کیا تم ہمیشہ ایسے ہی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہو؟“

وہ لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”نہیں، اس کا موقع کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ اب تو میں ان فنون کو بھولتی جا رہی ہوں۔ کانی عربی سے باقاعدہ انیکس سائز نہیں کی۔“

”انیکس سائز نہ کرنے پر یہ عالم ہے!“ میں نے سراپنے والے انداز میں مسکرا کر کہا۔

وہ بولی ”میں نے آٹھویں کلاس میں ایک کرائے کلب جواں کیا تھا۔ انٹرنس تک یہ شوق بڑے ذوق سے جاری رہا۔ جوڈو کرائے کے ساتھ ساتھ میں نے جتنا سنک بھی سیکھا ہے مگر

میڈیکل کالج میں جانے کے بعد سب شوق ایک طرف رکھ رکھے۔ میڈیکل میں اتنا اٹھڑی کرنا پڑتا ہے کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ شوق کیسے پورے کیے جائیں اور پھر مارشل آرٹس یا کونئی بھی اسپورٹس ایک فنل ٹائم جاب ہے۔ اسے لولائنگز اور پارٹ ٹائم جاری رکھنے میں مزہ نہیں آتا۔ میرا یہ شوق بھی مجھ سے چھین گیا۔ بس بھی کبھار ہاتھ پاؤں سیدھا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔“

اس وقت وہ نہایت ہی سنجیدگی اور مدبرانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا، وہ پہلے والی ایک چلیلی لڑکی ہے۔ اس کا سارا اہالیان پن رخصت ہو چکا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہوا کہ مارشل آرٹس سے اسے دلی لگاؤ رہا تھا۔ مارشل آرٹس ایسی ہی شے ہے۔ پوری توجہ، لگاؤ اور انوومنٹ کا ہے۔ یہ شوقیہ فنکاروں کے قابو میں آنے والے جن جن ہیں! صدف اپنی پست کاغذی کے باوجود بھی دور مارا فیک کرتی تھی۔ میں نے صدف کے چٹکی لیے ہوئے کہا ”تم نے بتا دیا تھا، میڈیکل میں تمہیں زبردستی دھکلا دیا ہے اور یہ کہ برحالی میں تمہارا کوئی خاص دل نہیں لگتا۔ تمہیں خود معلوم نہیں کہ کب سال کس طرح پاس ہو جاتی ہو۔“ میں ایک لمحے کو سانس لیے کی خاطر کا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس صورت میں تو تمہارے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ تم جی جان سے مارشل آرٹس اور جتنا سنک کی پریکٹس جاری رکھ سکتی ہو۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔“ وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی ”میڈیکل میں چاہے کتنا ہی کم کیوں نہ پڑھو، آگے بڑھنے کے لیے اتنا وقت دینا ہی پڑتا ہے کہ کسی اور چوتھائی گھنٹا لکنا ممکن نہیں رہتا بہر حال۔“ اس نے ایک مرتبہ خالصتاً امریکی انداز میں کندھے اچکائے اور خاموش ہو گئی۔

”تم نے ووڈ بریکنگ (Wood Breaking) کیا کی ہے؟“

”ہاں کی ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ووڈ بریکنگ کے ساتھ ساتھ میں نے ٹائل بریکنگ (Tile Breaking) بھی کی ہے مگر تم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا؟“

میں نے کہا ”تم نے جس بے خوفی سے کرسی کو کھار کر پتول بردار تو صیف کی طرف اچھالا تھا میں اس منظر کو بھول نہیں سکتا۔ یہ اعتماد کافی عرصے کی محنت اور ریاضت ہی حاصل ہوتا ہے۔“

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی ”تمہارا فائنل اسٹائل بالکل جدا گانہ ہے۔ لگتا ہے، تم سگنا

میں بہت اور پریکٹس کئے ہو۔ میں تو کرائے (Kung-Fu) میں بلیک بیلٹ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔“

”بھی بہت ہے۔“ میں نے کہا ”ایک ڈاکٹر کو شاید ہی زندگی میں ایسی مارشل آرٹس کی ضرورت پیش آتی ہو۔ جب تم تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنا کلینک کھولو گی تو تمہیں یہ سب کچھ قصہ پارینہ لگے گا۔“

”منضبط لہجے میں بولی ”مگر میں اسے قصہ ماضی نہیں بننے دوں گی بلکہ اپنے فن کو آگے بڑھاؤں گی۔“ پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھڑلے سے پوچھا ”کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟“

”میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میرے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔

وہ پوری سنجیدگی سے بولی ”تم مجھے تنگ فو اور یوگا کے گرو سکھاتے ہو۔ میں تمہیں گرو دیتا جا رہی ہوں۔“

”میں تو کوئی گرو ہوں اور نہ ہی مجھے چیلنجیاں پالنے کا شوق ہے۔“ میں نے رکھائی سے کہا ”ایک کو ہاتھ پاؤں چلانا سکھایا تو وہ۔۔۔۔۔!“

ہاتوں ہی ہاتوں میں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا اور میں اپنا جملہ عمل نہ کر سکا وہ تو ہر وقت میرے دھیان میں براجمان رہتی تھی۔ میں نے محاورتا یہ بات بھی ہے، ورنہ ساحل تو میرے دل پر کنڈہ تھی اور میری روح میں کسی خوش بو کے مانند نفوذ ہو چکی تھی۔ میں اسی کی فضا میں سانس لیتا تھا۔ اس وقت صدف کے سامنے ساحل کا ذکر کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا لیکن میرے اس طرح اچانک خاموش ہو جانے نے اس تجسس کی ماری کو پھڑکا دیا، میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بڑے سنسنی خیز انداز میں پوچھنے لگی۔

”تو وہ۔۔۔ کیا؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”کچھ نہ کچھ ضرور ہے وجدان!“ وہ کرپہ نے والے انداز میں بولی ”خاطر تمہیں اپنے کسی شاگرد کے بارے میں بتانے جارہے تھے جو تمہیں دھوکا دے کر چلا گیا یا جلی گئی؟“

اس نے اپنے طور پر تجزیہ کر کے ایک اندازہ قائم کر لیا تھا جو کہ حقیقت سے بہت دور تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”ایسی کوئی بات نہیں صدف۔“

”پھر کس بات ہے؟“ اس کی تشویش جاری رہی۔

میں نے کہا ”دراصل بات کرتے کرتے مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس لیے میرا جملہ ادھر ادھر گیا۔ تم خواہ خواہ کے

تجاربہ اخذ کر کے اپنی توانائی ضائع نہ کرو۔“ پھر میں نے بات کو سمجھا دیا اور مزاح کے رنگ میں کہا ”تمہیں اپنی توانائی کی ایک ایک کیلوری بچا کر رکھنا ہے۔ میڈیکل کے فائل انکیز امرز تمہارے سر پر ہنڈلارے ہیں۔“

وہ سمجھ گئی کہ میں دانستہ اسے ٹال رہا ہوں۔ اس نے بھی زیادہ زور نہیں دیا اور خلافِ عادت موضوع گفتگو بدل دیا، سنجیدگی سے بولی۔

”تم نے اپنے والد کے جس پروڈیوسر دوست کا ذکر کیا ہے، اس کہانی میں کس حد تک سچائی ہے؟“

صدف کو میں نے اب تک ایک خضری اور اولو العزم لڑکی پایا تھا۔ وہ انجی ہٹ سے بننے والی نہیں تھی۔ اس نے اگر موضوع بدلا تھا تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا، اس میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہو رہی تھی یا پھر یہی اس کی کوئی چال تھی، وہ مجھے کسی اور ذراپے سے گھبراہٹ مچاتی تھی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”فریڈ یا شا دانی ایک فلم پروڈیوسر ہے اور اس کی شاندار لگوئی یہاں گھبرگ میں واقع ہے۔“

”اور تم اس کے پاس ہفتہ بھر کر گئے؟“ وہ سوالیہ انداز میں بولی ”اسٹوڈیو جا کر کٹفلوں کی شوٹنگ دیکھو گے اور اس بعد اس کے گاؤں جا کر دیہاتی زندگی کا نظارہ بھی کر دے گے؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”فرض کرو۔“ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ”اگر یہی دونوں شوق مجھے بھی شدت سے ہوں تو تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے؟“

”میں فرض نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا ”یہ میٹھ نہیں ہے کہ میں ”ایکس“ وغیرہ سے کام چلاتا ہوں۔“

وہ جھٹ سے بولی ”چلو فرض نہ کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، یہ حقیقت ہے۔ اب یو لو؟“

وہ میرا سایہ بننے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا ”تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہو؟“

”میں آٹھ دس دن لاہور ہی میں ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”ایک آدھ دن کے لیے مجھے بھی اپنی کمپنی دے دو۔ اسی بہانے میں فلم اسٹوڈیو اور دیہاتی زندگی کو دیکھ لوں گی۔“ اس نے ذرا رک کر دروازہ کھاتے ہوئے کہا ”تم تو جانتے ہی ہو، ماموں کو کٹفلوں اور فلم انڈسٹری سے کوئی لگاؤ یا دلچسپی نہیں اور انجی پشہ دراندہ زندگی سے وہ اتنا وقت نہیں نکال سکتے کہ مجھے گاؤں دیہات تمہا سے بھریں۔ ابھی تو میں اتفاق سے لاہور آئی ہوئی ہوں۔ نہ تپانیں پھر کب گھر سے لکٹا ہوا!“

اس کے بعد وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی ”وہیے بھی قبول تمہارا میرے سر پر میڈیکل کانسل منڈلا رہا ہے!“

اگر میں اس سے یہ کہتا کہ تمہارے ڈی ایس بی ماموں کے ایک اشارے پر درجن بھر افراد تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے دن رات ایک کر سکتے ہیں تو بحث کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا اور میں کھلے ہوئے دروازوں کو بند کرنے کے موڈ میں تھا۔ ڈر نہیں چونکا اچھا خاصہ صدمت بانی تھا اس لیے میں وقت گزاری کے لیے صرف صدمے سے بات چیت کر رہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اسے خود پر سوار کر لوں۔ صدمے کے غم، غم، غم! کچھ اسی نوعیت کے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا ”دیکھو صدمہ! میں اس حوالے سے کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا۔ میں پہلے فریڈ پاشا سے پوچھ لوں پھر تمہیں بتاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ مٹا ہوا انداز میں بولی پھر پوچھا ”فریڈ پاشا کی کوئی گجبرگ میں کس طرف ہے؟“

میں اس کے تجر بہانہ پر گیا اور کہا ”کوئی گجبرگ کا پتا معلوم کرنے کے بعد تم وہاں کا فون نمبر جاننا چاہو گی اس لیے.....“

میں نے جملہ ادھر اور اچھوڑ کر اپنی جیب میں سے ایک شدہ کاغذ نکالا اور اسے سکول کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”..... لوٹ کر لو دونوں چیزیں۔ فریڈ پاشا کی کوئی گجبرگ کا ایڈریس اور فون نمبر۔ وہ ایک مشہور و معروف فلم پروڈیوسر ہے۔ تم پوچھتے پوچھتے بھی وہاں تک پہنچ سکتی ہو!“

وہ اس کاغذ پر ایک بھر پور کمرہ نظر ڈالنے کی بعد بولی ”اس کی ضرورت نہیں۔ تم خورد فریڈ پاشا سے بات کر کے مجھے فون نمبر بتا دینا۔ میں نے تمہیں ماموں کی کوئی گجبرگ ہی لکھوا دیا تھا۔“

میں سمجھ گیا، وہ کاغذ کے مندرجات کو ذہن میں نقش کر چکی تھی۔ صرف مجھے مطمئن کرنے کے لیے بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اس کی جالوں کو سمجھنے لگا تھا۔

میں نے اسی کے انداز میں کہا ”جیسے تمہاری مرضی!“

پھر نادیدہ بھی وہیں چلی آئی اور ہمارے درمیان ریسیورٹ میں پیش آنے والے واقعے پر تبادلہٴ خیالات ہونے لگا۔ تجویز دیر بعد میں نے کہا ”میں ایک دونوں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا یہاں سے یہ ممکن ہے؟“

”کیوں نہیں۔“ نادیدہ جلدی سے بولی۔

پھر وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے آئی جو اپنی وضع قطع اور فیکس کے اعتبار سے بیڈروم نظر آ رہا تھا۔ اس کے بیڈ سائڈ پر رکھے ہوئے ایک انڈر ویک کی فون سیٹ کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”تم اطمینان سے یہاں بیٹھ کر فون کر سکتے ہو۔  
 ضرورت محسوس کرو تو بیڈروم کا دروازہ بھی بند کر لو۔“  
 ”تھیک یو۔“ میں نے ناشکی سے کہا ”تم جانتے ہو  
 خود ہی دروازہ بند کر دو ورنہ تمہاری کرن کو اچانک دیکھ  
 آگیا تو وہ وجہ یہ کہیں برسی پکڑ کر وہ جان نام کے اسٹاپ پڑ  
 جائے گی۔  
 وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی ”صدفنا  
 کر بیڑی ہے، ایک دم پاگل..... اور تم گریزی ہو، ایک  
 جملہ!“  
 پھر وہ دروازہ بند کر کے بیڈروم سے نکل گئی۔ ہادیہ  
 ابھی جس ذہانت اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا اس کی خاطر  
 بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس نے اردو اور انگریزی کو  
 خوبصورتی سے ہم آہنگ کیا تھا۔ گریزی اور گریزی کا بڑے  
 استعمال مجھے لطف دے گیا۔  
 نادیہ کی عمر بائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن  
 قد ساڑھے پانچ فٹ تھا۔ موزوں قامت اور متناہی  
 نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ اس پر بڑی بڑی آنکھیں  
 اسے دلکش اور جاذب نظر بنانے کے لیے ہر وقت چہرہ  
 موجود تھیں۔ نادیہ کے دامن گلاب پر، ہونٹوں سے ٹھوڑا  
 مسور کے برابر گہرے بھورے رنگ کا ایک حل بھی تھا، ذکر  
 محتاط سے کم پر کشش نہیں تھا۔  
 میں نے نادیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے فریڈ پاشا  
 نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ نئے  
 امید نہیں تھی کہ وہ گھر پر ہوگا۔ شو بزنس کے لوگ سرشام کو گھر  
 سے نکل جاتے ہیں اور رات گئے تک ان کی واپسی کے بھنا  
 میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض اوقات تو وہ دوسری جگہ ہی  
 ہیں۔ فلم اسٹوڈیو ایک ایسی جگہ ہے جہاں کے دن سو گھنٹہ  
 راتیں جاتی ہیں!  
 دوسری ٹھنی پر فون ریسو کر لیا گیا۔ میں نے اپنا حوالہ  
 کروانے کے بعد فریڈ پاشا کے بارے میں استفسار کیا تو فریڈ  
 حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دوسری طرف فریڈ پاشا موجود تھا۔  
 ملک سلیک کے بعد اس نے خوش دلی سے کہا۔  
 ”یار! تم لوگ کراچی والے بڑا انتظار کروا رہے ہو۔  
 منہاس نے مج فون کر کے مجھے تمہارے بارے میں بتایا  
 اور تم اب رابطہ کر رہے ہو۔ میں تو تمہاری خاطر آج اسٹوڈیو  
 بھی نہیں گیا۔ گھر میں جمنا بیٹھا ہوں۔ منہاس نے تمہارا پتہ  
 تعارف کچھ اس اعجاز سے کرایا ہے کہ تم سے ملنے اور چہرہ

دیکھ کر بے چین ہو گیا ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

فریہ پاشا کے انداز اور لب و لہجہ میں زندہ دلی اور دوستانہ چٹن پایا جاتا تھا۔ میں نے کہا ”پاشا صاحب! اس انتظار اور کوفت کے لیے میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں، بس میں پورے ایسے مسائل میں الجھتا چلا گیا کہ آپ سے رابطہ کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔“

”اس معذرت و عذرت کی ضرورت نہیں یار۔“ وہ بڑی محنت سے بولا ”تم تنہا اس کے پیچھے ہوئے ہو اس لیے ہماری آنکھوں کے تارے ہو۔ سارے مسائل کو لینا اور اپنے ساتھ لے کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں ان مسائل کو خود حل کر لوں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”غصہ اور تنہیں اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے لیے گاڑی بھیج رہا ہوں۔ تم مجھے اپنا پتا بتاؤ۔“

میں نے کہا ”میں اس وقت چائنا چوک، شادمان کالونی کے ایک گوشے میں ہوں۔“ پھر میں نے گوشے کا نمبر دہراتے ہوئے کہا ”یہاں ڈی ایس ٹریک اور گنگ نریب خان کی رہائش ہے مگر میں فوری طور پر آپ کے پاس نہیں آ سکتا۔“

”اس کی وجہ؟“ وہ جلدی سے بولا ”کیا وہاں بھی تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ وسط ہے؟ چائنا چوک گھبرگ سے زیادہ دور نہیں۔ میں فوراً وہاں پہنچ سکتا ہوں۔“

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ”کوئی مسئلہ نہیں پاشا صاحب! میں اس وقت اپنے خیر خواہوں کے درمیان ہوں۔ بات اتنی سی ہے کہ میں میان پان کی خواہش پر ڈر کے بعد یہاں سے رخصت ہو سکوں گا۔ لگ بھگ دس بجے رات۔“

”دس بجے میں تو ابھی پورے دو گھنٹے باقی ہیں۔“ فریہ پاشا نے کہا ”ٹھیک ہے، تم وہاں خود ڈر ڈر کر دھر نہیں میرے ساتھ بھی ڈرنا نہ ہوگا، یہ بات ذہن میں رکھنا۔“ پھر اس نے ایک جلد ایک جگہ ٹھہر گیا اور بولا ”تم درحقیقت میرے مہمان ہو۔ ڈی ایس ٹریک میں صاحب تو تمہیں درمیان سے لے اڑے۔ میرے پاس صبح ہی سے تمہاری ایڈوائس بیک ہو چکی ہے۔“

وہ ظلم اضطری سے وابستہ ہونے کے ناتے سنیا اضطری کی شرط (Terms) پورے فراموشی سے استعمال کر رہا تھا۔ زندہ دلان لاہور کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ میں نے بھی جواباً خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے پاشا صاحب! میں اپنے محلے میں

مچائیں رکھوں گا۔“

”شاباش! اس نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا ”میں ٹھیک دس بجے جہیں لانے کے لیے گاڑی بھیج دوں گا۔“

فرید پاشا سے رابطہ قائم کرنے کے بعد میں نے منہاس باقر کے نمبر ڈائل کیے۔ حال احوال کے بعد میں نے اس سے جہانگیر کے بارے میں پوچھا ”سی ایف کے کے ڈال سے ٹونا ہوا یہ بات آپ تک پہنچ گیا منہاس صاحب؟“

اس کے جواب نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ”نہیں وجدان! اتنا جا جانگیر کی کوئی خبر نہیں۔“

”اس کا ایک ہی مطلب ہے۔“ میں نے تعبیر لہجے میں کہا ”دھنگار ہو گیا۔“

”میں تمہاری ہی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“ منہاس نے کہا ”جہانگیر یا تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا یا پھر سی ایف کے والوں کے ہتھے چڑھ کر کسی عقوبت خانے میں بند کیا ہے۔ فواد کی پر اسرار روپوشی نے کوئی نہ کوئی رنگ تو دکھانا ہی تھا۔“

میں نے کہا ”نی الحال جہانگیر کے تھے کوہنس پشت ڈال کر ہم نازہ ترین صورت حال پر بات کرتے ہیں۔“

”کیا کوئی نئی بات ہوگی؟“ منہاس نے پوچھا ”تم فرید پاشا کے پاس پہنچ گئے یا.....“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”میں آپ کے دوست کے پاس پہنچنے ہی والا ہوں اس سلسلے میں تو آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ اپنی تمام تر توجہ سی ایف کے اور شعیب غوری پر مرکوز کر دیں۔“

”یہ بات تو تم پہلے ہی کہہ چکے ہو اور میں نے اس سلسلے میں کو ششیں شروع بھی کر دی ہیں۔“ وہ انجمن زدہ لہجے میں بولا ”مگر تمہاری آواز سے لگتا ہے، صورت حال نے اچانک کوئی نئی کروٹ لے لی ہے۔“

میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا ”ایسی ہی بات ہے منہاس صاحب۔ دوپہر میں آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد شعیب غوری سے بھی میں نے رابطہ کیا تھا..... بلکہ یوں کہیں، شعیب نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے مجھے ہوٹل فون کیا تھا۔ ذکر وہ ہوئی کی بلکہ اسی کے توسط سے ہوئی تھی اس لیے رابطہ کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شعیب سے ہونے والی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ ہمیری طرف سے صرف محتاط ہو گیا ہے بلکہ فوری طور پر مجھے اپنے قابو میں بھی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً کراچی بلا دیا ہے۔“

پھر میں نے منہاس باقر کو شعیب غوری کی ان تجلیات

پردازیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا جو میرے گھٹ اور ڈارنگ کی جنگ کے سلسلے میں اس کے کھاتے میں آئی تھیں پوری بات سننے کے بعد منہاس نے کہا۔  
 ”تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔ تم نے شعیب کو بہت بڑی معصیت میں ڈال دیا ہے۔ وہ تمہاری طرف سے بری طرح ہراساں اور غارتا ہو گیا ہے اور اسی پھلکا بہت میں اس سے اس نوعیت کی سنگین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر حیرت آمیز لہجے میں بولا ”اس نے تمہیں کراچی کیوں بلایا ہے؟“  
 ”تاکہ مجھے ساحل سے ملو اسکے۔“

”مگر.....“ منہاس کچھ کہتے کہتے رکا پھر بولا ”وجدان! تمہاری ساحل کو تو خوا کے بعد تمہارے ایک دشمن دیرینہ چوہدری لادڑ علی کے پاس پہنچایا جانے والا تھا جس کی بازیابی کے لیے تم نے کراچی سے لاہور تک کا سفر کیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔  
 ”پھر شعیب غوری کی بات کیا معنی رکھتی ہے؟“  
 ”جہاں معنی!“ میں نے حذارت آمیز لہجے میں کہا۔  
 وہ میری بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے بولا ”اوہ اوہ تمہیں دھوکے سے کراچی بلانا چاہتا ہے؟“  
 ”ہاں۔“ میں نے کہا ”تاکہ مجھے اپنی دوستی اور ہوردی کی بیعت چڑھا سکے۔“

منہاس نے پوچھا ”وہ تمہیں کب اور کہاں ساحل سے ملوانے والا ہے؟“

”اس نے مجھے ساؤتھ بلایا ہے۔“ میں نے جواب دیا  
 ”اس کا کہنا ہے، ساحل کو کراچی میں دیکھا گیا ہے۔ میں جیسے ہی اس کے اڈے ساؤتھ پر پہنچوں گا، وہ ساحل کو مجھ تک پہنچا دے گا۔ میں جانتا ہوں، وہ اس گہری سازش کے ذریعے مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے لیکن میں اب اس کے دام میں آنے والا نہیں ہوں۔ ایک بار حور کا کافی ہے۔ آ زمانے ہوئے کو آ زمانا حیات کے زمرے میں آتا ہے اور میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اس کی فرمائش پر دودھ اور دودھ ڈال کر اپنی چلا آؤں۔“  
 ”پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“ میری بات کے اختتام پر اس نے استفسار کیا۔

میں نے پر عزم لہجے میں کہا ”میں اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے ہرگز کراچی کا رخ نہیں کروں گا۔ اس وقت تک کراچی کے معاملات کو آپ ہی دیکھیں گے۔“  
 ”مجھے فوری طور پر کیا کرنا ہوگا؟“ وہ یک دم سنجیدہ ہو

گیا۔

”میں آپ کو سی ایف کے کے ساؤتھ والے لفٹا سٹار بارے میں پوری تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ وہاں کا نظام شہر کا اسٹنٹ کبیر شاہ چلاتا ہے جسے ”شاہ جی“ بھی کہا ہے۔ میں نے ساؤتھ کی لوکیشن اور اس کی اندرونی مافیا کے بارے میں بھی آپ کو بتایا تھا۔ جم براؤن کو گھر پر کرنے والا پر جیکٹ ساؤتھ ہی کی زیر نگرانی تکمیل تک پہنچانے والا تھا جسے ہم نے..... بلکہ آپ نے اپنی حرکت سے ناکامیاب بنا دیا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد منہاس بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”آپ نہایت ہی رازدارانہ ساؤتھ کی نگرانی کروائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو اس اڈے سے اندرونی حالات سے بھی باخبر ہونے کی کوشش کریں۔“  
 ”پچانے کے لیے جو بھی چال بچھایا جا رہا ہے اس کا تعلق ساؤتھ اور کبیر شاہ سے ہے۔ آپ اپنے کرائم رپورٹر شہزاد علی کو کام کی نگرانی سونپ سکتے ہیں۔ وہ خاصا مستعد اور جواں آدمی بندہ ہے۔ مجھے امید ہے، کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔“  
 میں دشمن کی چالوں کو اسی پر لوانے کا عادی ہوں۔ جبکہ شعیب کو میں اپنا دوست سمجھتا تھا، اس کی طرف سے میں آہٹیں بند کر رہی تھیں لیکن اب میں چار آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے، وہ مجھے فریب کرنے کے لیے فنی ساحل کا سہارا لینے کی کوشش کرے گا؟“  
 ”فنی ساحل!“ منہاس باقر کی زبان سے بے مازہ نکلا۔

”وہ کسی اور لڑکی کو ساحل کے گھٹ اب اور میرکاب میں سامنے لا سکتا ہے۔“ میں نے کہا ”وہ مجھے اپنے فتنے کتنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے منہاس صاحب۔ اگر کسی ساحل کا پھر ملنے کا امکان ہوا تو ایسی لڑکی نگرانی کرنے والا کی نگاہ میں فوراً آجائے گی۔ آپ نے ساحل کو دیکھ کر کہا ہے شہزاد علی کو اس کے قد کاٹھ اور طبع کی تفصیل بتائی جا چکی ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے شعیب کے باب میں بات کرتے ہوئے کہا ”تمہوڑی دیر جیسے تک تو وہ لگا رہا ہوگا کہ میں کراچی پہنچنے والا ہوں۔ میں ممکن ہے، اگرچہ پرہیزی اس نے اپنے بندے لگا رکھے ہوں۔ جب میں حذ فلائٹ سے کراچی نہیں پہنچوں گا تو وہ زیادہ شدومد سے تلاش میں لگ جائے گا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟“  
 وہ مضبوط لہجے میں بولا ”میں تمہاری بات اور اپنا سمجھ رہا ہوں۔ تم کراچی کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر دشمن پر دھیان دو۔ میں تمہیں بہت جلد سرخ رو دے دوں گا۔“

دیکھا جاتا ہوں۔“

”ان شاء اللہ! آپ کی زبان مبارک ثابت ہوگی۔“  
 ”میری ٹیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔“ وہ دل کی مہربانی سے بولا۔  
 میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”منہاس صاحب! آپ نے اپنے دوست فریڈ پاشا کو میرے بارے میں کیا پتی پڑھا دی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے کا مشتاق ہو گیا ہے؟“  
 ”وہ کچھ کہہ رہا تھا؟“ منہاس نے سرسری انداز میں کہا۔

”ابھی تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ شدت سے میرا انتظار کر رہا ہے۔“ میں نے کہا ”تمہوڑی دیر پہلے اس سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ وہاں جاؤں گا تو اس کی بے تابی کی تفصیل معلوم ہوگی۔“  
 منہاس نے کہا ”میں نے تمہاری صلاحیتوں کی تمہوڑی تعریف اس سے کر دی تھی اور میں۔ یا پھر یہ کہا تھا کہ تم ایک بے بنائے بہرہ دو۔“  
 ”مروادیا منہاس صاحب!“ بے ساختہ میرے ہونٹوں سے یہ جملہ ادا ہوا۔

اس نے کہا ”فریڈ پاشا ایک کامیاب فلم پروڈیوسر ہے اور..... اور میں نے کوئی تمہاری جھوٹی تعریف بھی نہیں کی۔“  
 اب میں منہاس باقر کو کیا بتا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا پتہ اس..... شوق نہیں ہے۔ میں کسی اور ہی دنیا اور کسی اور ہی راہ کا مسافر ہوں۔ ہر مسافر کی کوئی منزل بھی ہوتی ہے میں کوئی تو ایک ایسا مسافر تھا کہ جس کی منزل کا تعین کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہر منزل میرے لیے کسی نئی منزل کی تلاش کا پتہ نام لے کر آتی تھی!

☆ ☆ ☆  
 چند ضروری باتوں کے بعد میں نے ٹیلی فونک رابطہ ختم کر دیا۔  
 فلم پروڈیوسر فریڈ پاشا کی کوئی گہرگ قہری میں واقع تھی۔ یہ ایک شاندار اور پوش علاقہ تھا۔ فریڈ پاشا نے حسب وعدہ ٹھیک دس بجے میرے لیے گاڑی بھیج دی تھی جس نے چند منٹ میں مجھے جانا چوک سے گہرگ پہنچا دیا۔

ڈی ایس پی اورنگ زیب نے میری شان میں بڑا مہر پور خریدا تھا۔ نہایت ہی کم وقت میں درجنوں ڈشوں کا بندوبست کر لیا گیا۔ میں نے تقریباً ہر ڈش کو کچھ کیا مگر ہاتھ روک کر کیوں کہ فریڈ پاشا کی ”دھمکی“ میرے ذہن میں نقش

ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ بھی دوبارہ ڈنر کرنا تھا۔ اورنگ زیب نے ٹیک خواہشات کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ اس موقع پر نادی کی آنکھوں میں تشکرانہ تاثرات تھے جب کہ صدف کے چہرے سے کسی خفیہ دھمکی کا اعلان ہو رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو، چھوڑ دو گی نہیں! میں نے مسکرا کر سب کو الوداع کہا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

فریڈ پاشا نے میرا پر تپاک استقبال کیا اور ہیردنی گھٹ سے اپنے ساتھ کوٹھی کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ وہ دہری ازدواجی زندگی گزار رہا تھا لیکن اس نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ ایک شہری بیوی اس کے ساتھ کوٹھی میں رہتی تھی جب کہ پہلی بیوی کی رہائش گاؤں میں تھی۔ وہ دونوں بیویوں سے پوری طرح انصاف کرتا تھا۔

تمہوڑی ہی دیر میں ہمارے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم ہو گئی۔ پاشا ایک زندہ دل اور خلص انسان تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی تاہم صحت کے اعتبار سے وہ تیس سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے فٹ سے لگتے ہوئے قد نے اس کی شخصیت کے تاثر کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس نے میرے لیے ایک پر تکلف ڈنر کا انتظام کر لیا تھا۔ اس کی ڈاننگ تکمیل خاص طویل دیر لیں تھی۔

میں نے کہا ”پاشا صاحب! میں تو بس آپ کا ساتھ دوں گا۔ کھانا تو آپ ہی کھائیں گے۔ میں وہاں بھی اچھا خاصا کھا کر آیا ہوں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے یار۔“ وہ خوش دلی سے بولا ”وہاں کھا آئے ہو، یہاں بھی کھاؤ۔ شاید یہیں تمہیں پتا نہیں.....“  
 اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور ایک پلیٹ میں میرے لیے کوئی خاص شے نکالنے لگا پھر بولا ”اللہ نے انسانوں کے لیے جتنی نعمتیں پیدا کی ہیں، محد سے میں اتنے ہی خانے بھی بنائے ہیں۔ ہر نعمت کے لیے ایک الگ خاندان موجود ہے اس لیے تمہوڑا تمہوڑا سب کچھ کھانا چاہیے۔ جو ڈشیں وہاں موجود نہیں تھیں، تم ان کے ساتھ یہاں انصاف کر سکتے ہو۔“

”آپ کا فلسفہ عجیب اور دلچسپ ہے پاشا صاحب۔“ میں نے کہا۔

”اس فلسفے پر عمل کرنے سے یہ اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔“ پاشا نے زور دیتے ہوئے کہا ”آزمائش شرط ہے۔“  
 پہلی پھلکی تشنگو کے دوران میں کھانا چٹا رہا۔ پاشا کی شہری بیوی تاکہ بھی ہمارے ساتھ ڈاننگ تکمیل پر موجود تھی۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ تاکہ نہایت ہی حسین و جمیل اور طرح دار عورت تھی بلکہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی

شادی ہو چکی ہے، تو وہ ایک لڑکی ہی لگتی ہے۔ اس کے بارے میں جلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک بچی بنائی بھر دین ہے لیکن پاشا نے مجھے بتایا ”نائلہ ایک مہربان لڑکی تھی اس کے سامنے نہیں گئی، باقاعدہ شائستہ دینا تو دور کی بات ہے۔“

”پاشا صاحب! یہ تو زیادتی نہیں کیا؟“ میں نے چیخنے کی خاطر کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا ”میں نے بڑی مشکل سے نائلہ کو حاصل کیا ہے۔ اب کیا اسے کمرے کے حوالے کر دوں! پھر وہ ٹہنی میں سر ملاتے ہوئے بولا ”نہ پاشا! نائلہ صرف اور صرف میرے لیے مخصوص ہے۔ اسنو ڈیو کے سیٹ پر جانے کے بعد بھر دیا بھر دین، کسی کام کا نہیں رہتا۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ نائلہ گھر کے سیٹ پر ہی سیٹ ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پایا ہے۔“

نائلہ کو حاصل کرنے والی بات کو اس نے دہرایا تھا، میں پوچھنے بہانہ نہ کر سکا ”پاشا صاحب! آپ نے ان کو کہاں سے حاصل کیا ہے؟“ بات ختم کرتے ہی میں نے کن انھیں سے نائلہ کی جانب دیکھا۔ وہ خاصی جڑبڑ موری تھی۔ اس کیفیت میں اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔

”بہت لمبی اور سنسنی خیز داستان ہے۔“ وہ خیال انگیز لہجے میں بولا ”فرصت میں بیٹھ کر سناؤں گا یار۔ ایسے جلدی میں کیا خاک مزہ آئے گا۔“

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ نائلہ نے اس دور میں اس حد تک ہمارا ساتھ دیا کہ چائے کی پیالی خالی ہونے تک وہاں بیٹھی رہی۔ جیسے ہی اس نے پیالی میز پر رکھی، پاشا نے کہا۔

”نائلہ تم چا کر آرام کرو۔“ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یار! آج صبح ہی سے اس کے سر میں درد ہے۔“

”کیا اس درد کی وجہ یہ تو نہیں کہ آج آپ گھر ہیں؟“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

میرے اس مذاق کو دونوں نے انجوائے کیا، خاص طور پر نائلہ کا چہرہ میری بات سنتے ہی مسکرا اٹھا تھا۔ جس سے پتا چلا اس کا ذوق بھی اعلیٰ ہے۔

فریڈ پاشا مجھے ایک عالی شان بینڈروم میں لے آیا۔ مذکورہ بینڈروم کو کچی کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں باہر کو کھلتی تھیں اور کچی کا سامنے والا حصہ دور دور تک نظر آتا تھا۔ ڈارلنگ بھی میرے ساتھ بالائی منزل پر پہنچ گئی تھی۔

”تم اس بینڈروم میں آرام کرو گے۔“ فریڈ پاشا نے کہا

”کل جہیں پوری کچی کا معائنہ کراؤں گا۔ میں نے یہ کچی بڑے چاؤ سے خوائی ہے۔ اس کی تکمیل میں کروڑوں روپے اور ایک سال کا عمر خرچ ہوا ہے۔“

وہ میرے پاس ایک گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ ادھر ادھر باتوں کے بعد وہ اصل موضوع پر آگیا ”یار! یہ باتیں تو بڑی رہیں گی۔“ اس نے کہا ”تم مجھے اپنے مشن کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ تاکہ میرے ذہن کا پوجہ ہو سکا ہو۔“

”آپ کے ذہنی پوجہ کا تعلق میرے مشن سے ہے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا ”ہاں یار! منہاس نے تمہارے بارے میں مجھے اتنی تاکیدیں کی ہیں کہ میں ذہن پر دباؤ محسوس کر رہا ہوں۔ جب تک میں تمہارے کام نہیں آ جاؤں گا، چچن سے نہیں بیٹھوں گا۔ منہاس باقر نے مجھے بہت کم کام کہے ہوں گے۔ اور اتنی تاکید پہلے کبھی نہیں کی۔ گلتا ہے، تم کسی خاص کام پر ہو؟“

”آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے یار صاحب!“ میں نے کہا ”میرا مشن واقعی بہت خاص ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو سمجھوں گا، میں نے زندگی میں سب کچھ پایا۔“ ساحل کے تصور نے میری آواز کو غامد و رنجیدہ کر دیا۔

فریڈ پاشا ایک مردم شناس شخص تھا، میرے چہرے کے تاثرات اور آواز کے جوصل بہن سے اس نے پہچان لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، راز دارانہ لہجے میں بولا۔

”مجھے تو کوئی دل کا معاملہ معلوم ہوتا ہے؟“

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے صاف کئی! مظاہرہ کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں فریڈ پاشا مجھے اپنا اپنا سامعہ ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ملی بھگت میں دل میں آ جاتے ہیں۔ پاشا کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ منہاس کا گہرا دوست تھا اور منہاس سے ساحل دالے والے اور ساحل سے پوری طرح آگاہ تھا اس لیے فریڈ پاشا کوئی بات چھپاتا مناسب نہیں تھا۔ وہ اس مشن میں بہ معاون بھی بننے والا تھا اس کے استفسار پر میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے چوہدری نواز علی سے اپنی دشمنی ساحل سے گہری وابستگی کے بارے میں بتایا اور یہ کہ ساحل کراچی سے آٹھوا کر کے نواز علی کے پاس رکھاں والی پہنچ گیا ہے۔ میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے ہی ادھر کا کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ شعیب غوری کا تذکرہ میں نے

واحد گول کر دیا تھا۔

چوہدری نواز علی اور رکھاں دالی سے بخوبی واقف ہوں دجوان۔ میرا کام رکھاں دالی سے صرف پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے بلکہ یوں سمجھو کہ اگر لاہور سے چائیں تو ہمارے گاؤں سید پور سے گزر کر رکھاں دالی جانا پڑتا ہے۔ ہمارا گاؤں راستے میں پڑتا ہے۔“

پھر اس نے مجھے چوہدری نواز علی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ چوہدری نواز علی سے ان لوگوں کی بگلی بگلی دشمنی چلتی رہتی تھی۔ فریڈ پاشا کا پاپا پانا سیاست داں تھا اور چوہدری نواز علی کا نہیں مگر بھی سیاسی تھا۔ وہ دونوں آپس میں حریف بھی تھے کیوں کہ وہ دو مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔

”یار! تم مجھے صرف ایک دن کی مہلت دے دو۔“ فریڈ پاشا دونوں باتوں کو ملتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا ”میں کل شام سے پہلے پہلے تمہاری تمام مطلوبہ اور تازہ ترین معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔ پہلے پتا لگایا جائے کہ تمہاری ساتھی رکھاں دالی کبھی بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ چوہدری نواز علی کی حوصلی میں پہنچ چکی ہے تو پھر باقاعدہ پلاننگ کر کے اسے وہاں سے نکالنا ہوگا۔ جلد بازی میں اٹھایا ہوا کوئی قدم ہمارے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر تک بولا ”اور تمہاری ساحل کے لیے بھی!“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ساحل کے معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“ میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔ ”وہ میرے لیے بہت قیمتی ہے، میری جان سے بھی زیادہ۔“

وہ پروج انداز میں بولا ”میں ابھی نوید کو فون کرتا ہوں۔ نوید پاشا میرا چھوٹا بھائی ہے اور آئندہ انکسٹن میں کھڑا ہونے والا ہے۔ سیاست میں رہے ہوئے آنکھیں، کان اور زبان نیوں کو کھلا کر گنتا پڑتا ہے۔ مجھے تو اس شے سے زیادہ دشمنی نہیں مگر نوید ابھی کا سچا عاشق ثابت ہو رہا ہے۔ اس نے بہت ہی کم عمر سے بہت زیادہ سیاسی ترقی کر لی ہے اسی لیے ابھی اب بھی پردہ در پردہ کر نوید کے ذریعے چوہدری نواز علی کو بیٹھا چاہتے ہیں۔ اس وقت چوہدری نواز علی کی پارٹی کی گورنمنٹ ہے۔ لیکن ان کی پارٹی کی حکومت ہے لیکن عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے اور ہوا کار خیز تبدیل ہو چکا ہے۔ انشا اللہ آنے والے انکسٹن میں چوہدری کو ہار کا منہ دیکھنا

## کیا

آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟

آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کیلئے ٹیلی پیٹھی اور ہینڈ ٹولز کی طرح مشینیں نہیں کرنا پڑتیں۔

جدید ایرو سائنٹیفک اصولوں کی جیوت ایگری کتاب

## مقناطیسیت

آپ کی شخصیت میں انوکھا کھار پیدا کر دی

آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

اس کتاب کا مطالعہ کیجئے

اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجئے!

قیمت 50 روپے ڈاک خرچ 23 روپے



63-C، 11، پنشن روڈ، ایچ۔ بی۔ ٹرانس۔ 11، لاہور۔ 75500

ڈاکٹر کمالی، سب سائپ کے سامنے، کراچی۔ 75500





**Suggestions (ترغیبات)** کام دکھا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں تخلیق پانے والے خیالات کی لہریں ڈارلنگ کے دماغ پر اثر انداز ہونے لگیں۔ میں نے خاموشی کی زبان میں سوچا۔

”تمہاری آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں..... تمہیں نیند آ رہی ہے۔“

عام پینازم میں آواز کی بڑی اہمیت ہے۔ سمجھیں آواز کی محتاج ہوتی ہے مگر اس وقت ڈارلنگ ایک مخصوص قسم کے پینازم کے تجربے سے گزر رہی تھی جس میں شخص کے لیے آواز کی ضرورت نہیں تھی، صرف سوچنا ہی کافی تھا۔ ”جی“۔ یہ زبان خامشی اپنا کام کر رہی تھی اور بہت خوب کر رہی تھی!

میں نے ترغیبات کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج اس اسرار سے پردہ اٹھ جانا چاہیے تھا جو سایہ بن کر میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کوئی بچہ آپ کی اگلی پکڑ کر چلا رہے اور آپ یہ نہ

جانتے ہوں..... وہ بچہ کس کا بچہ ہے؟ تو عجیب سی بے سکونی دماغ کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ ڈارلنگ کے حوالے سے میں اپنے دماغ کو ہر حصار سے نکالنا چاہتا تھا۔

وہ ایک نیک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری طرح اس کا وجود بھی ایک دم ساکت تھا۔ ہمارے جیسوں کے اندر دل دھڑک رہے تھے یا پھر بیڈروم میں ہمارے سانس لینے کی مخصوص آواز پیدا ہو رہی تھی، باقی ہر طرف سکون ہی سکون اور خاموشی ہی خاموشی تھی۔

”نیند نے تمہاری آنکھوں کو بھگان زدہ اور تمہارے پچھوں کو بوجھل بنا دیا ہے۔“ میں خاموشی کی زبان میں پورے اعتماد سے سوچ رہا تھا۔ میرے چٹائی خیالات کی لہروں (Thought Waves) کو ”جی“ کی قوت نے مہینز کیا اور ڈارلنگ کی آنکھوں میں، میں نے سرخ ڈورے نمودار ہوتے دیکھے۔

پچھلے چند روز سے میں یوگا کی پریکٹس کے ساتھ ساتھ جی کی ایڈولس مشقیں بھی کر رہا تھا جس سے میری باطنی قوتوں اور حواس میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ ان تجربات کا احساس بڑا نیا، لوکا اور ذرا اٹھا تھا۔

ڈارلنگ کی آنکھوں میں نمودار ہونے والے سرخ ڈورے بھیجنے لگے، گویا اس کی آنکھوں میں پانی اترنے لگا تھا۔ میں نے ترغیبات میں شدت پیدا کرتے ہوئے سوچا۔

”ان بوجھل آنکھوں اور بھاری پچھوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔“

ڈارلنگ کی پلکیں بے اختیار جھپک گئیں۔

”اور وہ علاج ہے..... نیند۔ گہری نیند۔“ میں نے کوشش جاری رکھتے ہوئے سوچا۔ ”تمہیں اپنی تکلیف اور سزا سے نجات پانے کے لیے سونا ہوگا..... گہری نیند سونا ہوگا۔ اور تم سونے جا رہی ہو۔“ اس کی پلکیں دوبارہ جھپکیں اور میرے آدھے آنکھیں بند کر لیں۔ ”..... تم سو رہی ہو تمہاری نیند گہری ہو رہی ہے اور گہری..... اور گہری..... سمندر سے بھی زیادہ گہری..... گہری گہری..... اور گہری.....

میں نے نتیجہ خیز نظر سے ڈارلنگ کا جائزہ لیا۔ وہ فرش پر جس وقت حرکت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں اور وہ رابلی می منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی ترغیبات کے دماغ نے براہ راست میرے دماغ میں وصول کی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈارلنگ کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ دیکھتے میں وہ بے جان نظر آئی۔ اس کی

سانس اتنی مدہم چل رہی تھی کہ میں نے بڑی مشکل سے اس کی زندگی کا سراغ لگایا۔ اسے زندہ پا کر مجھے خوشی ہوئی۔ یہ خوشی اس بات کی تھی کہ اس کا اسرار مجھ پر عیاں ہونے میں اب چر لکھات کی دیر تھی۔

میں نے بے سادہ ڈارلنگ کو بڑی حفاظت سے اٹھایا اور لے جا کر ایک میز پر رکھ دیا پھر آہستہ آہستہ ایک کرسی کھینچ کر اس سے تین فٹ کی دوری پر بیٹھ گیا۔ مجھے ”جی“ کی قوت بڑے کارلاتے ہوئے اس کے اسرار کے بندھکھولنا تھے۔ یہ کی قوت سے کام لینے کا یہی فائدہ ہے کہ ذہنی رابطہ منتقل ہونے کے بعد دوبارہ قائم کیا جاسکتا ہے چاہے آپ کا معمول ہوش میں ہو یا بے ہوش۔

میں نے ایک طویل سانس کھینچ کر پھیپھڑوں کو تازہ سے بھرا، جی کو جسم کے زیریں حصے میں مرکوز کیا اور نظر ڈارلنگ کے سانس کے خیم پر گاڑ دی۔

اسی وقت میری ساعت سے ایک دلخراش جھجھکائی میرے ارٹھکاز کو پاش پاش کر گئی۔ وہ ایک نسوانی جھجھکی کوئی کی زیریں منزل سے ابھری تھی۔

میرے اعصاب تن گئے۔ ڈارلنگ پر سے میری ہٹ گئی۔ زیریں منزل پر صرف ایک عورت تھی، فریڈ پاشا بیوی نائلہ۔ کیا میری آواز میں دوسو سو سے بھر گیا۔ میں ایک جھجھکے سے کرسی چھوڑ دی۔ وہ کئی فوری فیصلہ کا وقت تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا، کوئی زیریں حصہ ساعت شکن فائرنگ سے کوچ اٹھا!

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں بیڈروم سے نکل آیا۔ بالائی اور زیریں منازل کے درمیان ایک خوبصورت اور طرح دار زینہ حائل تھا، یہی زینہ انہیں آپس میں ملانے کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ میں تیز قدموں سے اس زینے کو پائے لگا سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جو بھی قدم اٹھاتا تھا، فی الفور اور آن واحد میں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ وہ دل خراش نسوانی جھجھکاؤ نائلہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ نائلہ کے سوا اس کوئی میں اور کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ برست فائز کی ساعت جمن آواز سے میں نے اندازہ لگایا، نیچے کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

دو دو انیس پھیلا جگہ کر میں چند سیکنڈ میں زیریں منزل پر پہنچا۔ کوئی کے اندر دنی سے میں داخل ہونے سے قبل بے ساختہ میری آنکھیں گیت کی جانب اٹھ گئی۔ گیت کے ساتھ ہی سیکورٹی گارڈ کا کمر اٹھا ہوا تھا۔ کمر اپنی جگہ موجود تھا مگر سیکورٹی گارڈ نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ گارڈ فائرنگ کی آواز سن کر مصورت حال جاننے کے لیے کوئی کے اندر پہنچا ہوگا۔ میں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔

اسی لمحے اندرونی حصے میں کچھ اس قسم کی آوازیں ابھریں جیسے اندر اٹھانے کی جاری ہو۔ میں نے جست بھر کر ایک دروازے کے چنڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ دھماکے کی آواز پیدا کرتے ہوئے ایک جھجھکے سے کھل گیا۔

کلے ہوئے دروازے میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ان کی حرکات و سکنات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انسان ہیں اور نہ اپنی حالت سے وہ کالی بلائیں نظر آتے تھے۔ دونوں نے سیاہ جست لباس پہن رکھے تھے جو ان کے اجسام پر چپک کر رہ گئے تھے اور لباس سے تپا تھے۔ یوں لگتا تھا، کپڑے کو ان کے بدن پر رکھ کر سلائی کی گئی ہو، صرف آنکھوں کے سامنے سے دیکھنے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی ورنہ بدن کا کوئی حصہ نکلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماسی کی ایک انگلیش فلم ”گولڈ مین“ میں فلم کے ہیرو ڈیوڈ نیبلوگ نے اسی قسم کا جست سیاہ لباس زیب تن کر کے کئی قیمت گینتوں سے مزین ایک تاریخی ٹیکس کو چرایا تھا۔

دروازہ ایک جھجھکے سے کھلا تھا لہذا مجھے چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ دونوں کالی آنکھ کے مانند اندر سے برآمد ہوئے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک ٹھٹکا۔ دوسرے کی گردن جھکی ہوئی تھی اور اس جھکاؤ کا سبب اس کے کندھے پر لٹا ہوا ایک بوجھ تھا۔ وہ بوجھ ایک بیڈیٹ میں لپٹا ہوا تھا اور

پہلی ہی نگاہ میں اپنی حقیقت کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک انسانی جسم تھا جسے بیڈیٹ میں لپیٹ کر وہاں سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔ کندھے پر لدے ہوئے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی جس کا مطلب تھا، وہ بے ہوش ہے!

میرے ذہن میں جو پہلا خیال چمکا وہ یہی تھا کہ فریڈ پاشا کی خوب روپیہ کی نائلہ کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ اس کو بھی میں فریڈ پاشا اور نائلہ کے علاوہ صرف سیکورٹی گارڈ تھا۔ میں نے چادر میں لپٹے ہوئے جسم کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ کوئی عورت ہی ہو سکتی تھی۔

یہ تمام خیالات اور اندازے بڑی سرعت سے پائے پھیل کو پہنچے تھے اور خود اگلے خیال نے جیسے میرے ہاتھ پاؤں کو ”آن“ کر دیا۔ نگاہ اٹلے پر ٹھٹکے والے شخص کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ میری رائٹ فرٹ پش لک چلی۔ میرے پاؤں کے ٹکڑے نے مذکورہ سیاہ لباس شخص کے سینے پر بوسہ دیا۔ وہ پیچھے کوالٹ کر دوسرے شخص سے ٹکرایا۔

اس ٹکڑے کے نتیجے میں اس شخص کے کندھے پر لدی ہوئی نائلہ (موتی) ہوا میں اچھلی اور چادر میں لپٹے لپٹے کسی بوری کی مانند دھپ سے زمین پر جا گری۔ پتہ فرش سے تصادم پر چادر کے اندر سے ایک نسوانی کراہ بلند ہوئی اور پوشیدہ جسم میں کچھ حرکت دیکھنے میں آئی۔ اگر اس چادر کے اندر نائلہ تھی تو خدا کا شکر ہے، وہ حال زندہ تھی۔

اس دوران میں وہ دونوں چھلادے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور بڑی خوفناک نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی آنکھوں میں مجھے شناسائی کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے وہ آنکھیں ماضی قریب میں کھیں دیکھی ہوں۔ یہ وہی شخص تھا جس سے دروازہ کھلنے کے بعد میری آنکھیں چار ہوئی تھیں اور وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ وہ ایک دروازہ قامت اور صحت مند شخص تھا۔

اچانک وہ دونوں بے یک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دروازہ قامت ’مجبی شناسا‘ نے مجھ پر راؤٹر پاؤں چلائی، دوسرا عقب سے مجھ پر پل پڑا۔ میں نے جس اثنا میں راؤٹر پاؤں کو بلاک کیا، دوسرے نے سائیکل گھڑی پیلوں سے ٹکرا چکی تھی۔ میں ٹھوڑا سا لڑکھاتو عقب میں موجود شخص نے مجھے اٹھا کر پٹنے کی کوشش کی۔

میں نے، گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھے ہوئے اس کے بازوؤں کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دروازہ قامت کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ وہ



دولوں مجھ سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ اسی وقت دراز قامت نے جانے اپنے لباس کے کون سے حصے میں ہاتھ ڈالا، اگلے لمحے مجھے اس کی ہاتھ میں ایک خطرناک بمثل نظر آیا۔ اسی دوران میں دوسرا دوبارہ چادر میں پٹن ہوئی نالکہ کی جانب پیش قدمی کر چکا تھا۔ پتول بردار نے اسے اشارہ کیا کہ وہ نالکہ کو پہلی فرمت میں کندھے پر ڈال کر وہاں سے نکل جائے۔

میں سمجھ گیا، وہ در صورت میں نالکہ کو وہاں سے لے کر جانا چاہتے تھے۔ اگر میں انہیں روکنے کی کوشش کرتا تو مارنے مرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ میں نے بمثل کو دیکھ کر یوں ظاہر کیا جیسے میں ڈر گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پہاڑی کے انداز میں ایک قدم اٹھایا۔ پتول بردار سمجھا، میں وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن میری وہ حرکت محض ایک جھانسی تھی۔ وہ میرے جھانسنے میں آگیا۔

مجھ پر سے گناہ ہٹا کر وہ اپنے ساتھی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کی یہ توجہ لمحے بھر کی تھی اور میرے لیے وہ لمحہ صدیوں کے برابر تھا۔ میں نے مہیا اس لمحے کے دسویں حصے میں حرکت کی۔ میرا جسم ہوا میں بلند ہوا۔ بے ایک ہائی جیب تھی۔ پتول بردار دراز قامت شخص مجھ سے پانچ فٹ کی دوری پر تھا۔ ہوا میں بلند ہوتے ہی میں نے ایک زوردار سائیز فلائنگ کلک اس کے بمثل والے ہاتھ پر رسید کی۔ بمثل اس کی ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ بمثل نے جس سمت پر داز کی، ادھر اچھا خاصہ انداز تھا۔ اس لیے اس کی لویشن کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

سائیز فلائنگ کلک کھانے والے دراز قامت شخص نے بمثل کے طور پر بمثل کی جانب دوڑ لگا دی مگر میں اب اسے کوئی مہلت یا سہولت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے دوڑتے ہوئے قدموں پر میں نے بڑی سرعت سے ایک بیک سوئپ ماری۔ نتیجے کے طور پر وہ منہ کے بل پختہ فرش پر گر گیا۔ اس کے قتل سے ایک درد انگیز آواز خارج ہوئی۔

میں نے زمین سے کھڑا ہوتے ہی دراز قامت کے ساتھی کی حراج پر سی کی۔ وہ اس وقت تک متوجہ نالکہ کو دوبارہ اپنے کندھے پر ڈال چکا تھا۔ چادر کے اندر لپٹی ہوئی نالکہ نے احتجاجی انداز میں ہاتھ پاؤں کو حرکت دی تھی۔ یہ ایک خوش آئند علامت تھی۔ نالکہ کی زندگی کے آثار مضبوط اور یقینی ہوتے جا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص اپنے عقب میں میری موجودگی سے آگاہ ہوتا، میں نے زنن جھٹکا ڈال دیا۔ وہ بوکھلاہٹ آمیز

انداز میں میری گرفت سے نکلنے کے لیے زور مارنے لگا۔ زور آزمائی میں، چادر میں لپٹی ہوئی نالکہ پر سے اس کی پٹلی پھیل گئی۔ میں نے اسے دائیں بائیں اس طرح جھکا جیسے کسی تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں اپنی اس چال میں کامیاب رہا۔ نالکہ کا لپٹا ہوا بدن اس کے ہاتھوں سے آزاد ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نالکہ کو تھاتے ہوئے اس شخص کی "تشریف" پر ایک ضرب (Thrust) لگ کر رسید کر دی۔

وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کی مانند نالکہ کی سیدھ میں "دوانہ" ہو گیا۔ چادر میں لپٹا ہوا بدن میرے بازوؤں میں آیا تو اس کے خال و خطے نہ تھد تھک کر رہی۔ نالکہ ہی تھی۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے اس کے چہرے سے چادر کھینچ کر دیکھا اور اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ خبیث کالی بلیاں نالکہ کو اغوا کر کے لے رہی تھیں۔

میں نالکہ کو آپ بستی فرش پر رکھنے کے بعد ان کی طرز متوجہ ہونے کے لیے سیدھا ہوا ہی تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ پہلے میری سمجھ میں بھی آیا کہ وہ دولوں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنا خیال رد کرنا پڑا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز کا رخ کوئی کے پیرونی حصے سے ہماری جانب تھا۔ اگلے ہی لمحے میری نگاہ میں ایک کالی بلیا کا اضافہ ہو گیا۔ نوادار انہی کا ساتھی تھا۔ اس نے بھی بالکل انہی جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اندھیرے میں اس کی دھیمی مگر خوش آواز آواز ابھری۔ وہ اپنے ساتھیوں سے استفسار کر رہا تھا۔

"قتی دیر کیوں ہوگئی۔ تم لوگ ابھی تک....." اچانک اس کی آواز میں تجر شامل ہو گیا۔ "نالکہ کہاں ہے۔ تم دولوں خالی ہاتھ کیوں ہو؟"

وہ تینوں مجھے نظر آ رہے تھے مگر میں نالکہ کو فرش پر رکے ہی ایک ستون کی آڑ میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اپنے سیاہ لباس کے سبب اندھیرے کا ایک محرک حصہ ہی نکلتے تھے۔ اس شخص کے سوال کے جواب میں دراز قامت نے سر کوئی کے انداز میں بتایا۔

"ادھر بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ نالکہ کو ہم سے جھین لیا گیا ہے۔"

"کس نے جھینا ہے؟" اس شخص نے مختار انداز میں دریافت کیا۔

دراز قامت کے ساتھی نے بتایا "چانہیں، وہ شیطا

نہاں ہے اور اچانک کہاں سے آن نکلا۔" ایک لمحے کا توقف کون ہے وہ میری سمت دیکھتے ہوئے بولا "چانہیں، کہاں چلا کر کے وہ میری دیر پہلے تو وہ وہاں تھا۔ وہ دیکھو، نالکہ چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔"

"اس شیطا کو ڈالو جنم میں۔" نوادار نے غصیلے لہجے میں کہا "ہم نالکہ کو اٹھانے آئے ہیں۔ وہ سامنے پڑی ہے۔ فوراً اسے اٹھا لو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں، ساجد باہر گاڑی میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ تم نے گاڑی اور پاشا کا بندوبست تو کر دیا ہے نا؟"

"ہاں، وہ دولوں اس وقت اغنا فیل ہیں۔" دراز قامت نے بتایا۔

"بھر دیکھو بات کی ہے۔ فوراً نالکہ کو اٹھا لو۔" "مکرہ شیطان....." دراز قامت نے متذبذب انداز میں کچھ کہا تھا۔

"اس شیطا کی تو میں ایسی کم تھی کرتا ہوں۔" نوادار چیخ کر نے والے انداز میں بولا "تم دولوں میرے ساتھ آؤ۔"

میں سمجھ گیا، وہ نالکہ کو ساتھ لے جائے بغیر نہیں ٹھیں گے اور میں انہیں کسی بھی قیمت پر اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نوادار کے پاس مجھے آتشیں اسلحے کے نام پر کسی ہتھیار کی جھلک نظر نہ آئی۔ اگر اس کے پاس ایسی کوئی شے موجود تھی تو وہ اس نے اپنے سیاہ پیرا سر اور لباس میں چھپا رکھی ہوگی۔ میں ستون کے پیچھے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ان چنے گئے محلات میں درجنوں فوری فیصلے کرنے کی ضرورت تھی اور میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

سب سے آگے نوادار تھا اس لیے پہلے وہی میرا نشانہ بنا۔ ستون کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے جیسے ہی نالکہ کی سمت قدم اٹھایا، میں اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ ابھی پوری طرح ٹھک تھی نہیں پایا تھا کہ میں نے ایک دھواں دھارچ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ حلق سے "اوہ" کی آواز نکالتے ہوئے پیچھے کو الٹا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مستحیل گیا اور پھٹنے ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں اس حملے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ اس کا حملہ بڑا دھمکی کم تھا۔ اس نے پہلوؤں کے انداز میں مجھے اپنے بازوؤں میں بکڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ہینک کے انداز میں غوطہ لگاتا اور کھڑے ہوتے ہی اس کے چہرے پر ایک اور بچ کر دیا۔

اس دوران میں دوسرے دولوں بھی مجھ پر پھل پڑے۔

دراز قامت نے سامنے سے مجھے کلک کا نشانہ بنانا چاہا، میں نے بیک فٹ پر جا کر اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کی تو عقب سے دوسرے نے مجھے دیوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زور لگنا شروع کر دیا۔ وہ شاید میری کمر کو توڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی گرفت میں بڑی تھی۔

میں نے اپنے جسم کے زیریں حصے کو ہوا میں اٹھایا اور دولوں پاؤں پٹاں اشٹال میں دراز قامت کے سینے پر رسید کر دیے۔ میری اس حرکت سے دودھری نتیجے پر آمادہ ہوئے۔ دراز قامت میری زبردست ڈیل کلک کھا کر پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ مگر جب کہ مجھے دیوچنے والے کے بازوؤں کو زبردست جھکا لگا اور میری کمر اس کی گرفت سے آزاد ہوئی۔ میں نے گردن کو فوجی کے ایک دھانسوٹم کی بیک کلک اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دی۔

وہ دولوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھاتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے لیفٹ، رائٹ رائڈر پاؤں ککس سے نہلا دیا۔ میری ٹانگیں اس رفتار سے چل رہی تھیں کہ اسے ہلاک کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے حتی فیصلہ کیا اور میری فرنت پٹاں لگ نے اسے چاروں خانے جت کر دیا۔

اسی وقت مجھے اپنے عقب میں دھمکی آمیز آواز سنائی دی "ہینڈ زاپ۔" اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو بھیجا اڑا دوں گا۔"

مجھ پر اڑا دوں گا کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ دھمکی دینے والا مسلح تھا۔ آواز سے میں نے پہچان لیا، وہ ان لوگوں کا تیسرا ساتھی نوادار تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنے جسم کو کھٹا کر سیدھا کر لیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ نوادار کے ہاتھ میں ایک خطرناک بمثل نظر آ رہا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ دراز قامت کا کھویا ہوا بمثل ہی تھا یا کوئی دوسرا۔

پتول بردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا "نالکہ کو اٹھاؤ اور فوراً باہر لے جا کر گاڑی میں ڈال دو۔ میں اس بد معاش کو دیکھتا ہوں۔"

وہ دولوں پتول بردار کی بات ختم ہوتے ہی آگے بڑھے۔ میں نے اپنے اور پتول بردار کے درمیانی فاصلے کو نگاہ میں نہایا۔ ہم دولوں لگ بھگ بارہ فٹ کی دوری پر تھے اور وہ ستون جس کے پیچھے ٹھوڑی دیر پہلے میں چھپا تھا، وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ میں کسی اسپرنگ کی مانند اچھل کر ستون کے پیچھے پہنچ گیا۔

پھینک دیا۔

یہ ایک فوری اور خطرناک حرکت تھی اور اس کی خطرناکی فوراً ظاہر ہو گئی۔ ہسپتال بردار نے میری سمت فائر کر دیا۔ میں نشے پر نہیں رہا تھا، گولی سٹون کے ایک کنارے کو توڑتے ہوئے نکل گئی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں نے بڑی سرعت سے بیک فلیک لگا لی۔ بیک فلیک کی تکمیل پر میں ہوا میں اچھلا اور بیک سرسالت لگاتے ہوئے ہسپتال بردار کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ میری ان حرکات پر ہولکا کر رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھے گولی سے نشانہ بنائے گی کوئی کوشش کرتا، میں نے زمین پر آتے ہی اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ میرے تابوتوں ٹوکوں نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ میں نے اس کے ہسپتال والے ہاتھ پر ایک بھر پور شوکر مار کر اسے غیر مسلح کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک سائیڈنگ گنگ مار کر اسے دور پھینک دیا۔

دوسرے دونوں اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر تذبذب میں پڑ گئے۔ وہ چاروں میں پہلی نائلہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں غرا کر ان کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے کھلے ہوئے دروازے میں مجھے فرید پاشا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو قہقہہ لگاتے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا۔

”نائلہ! تم کہاں ہو؟..... نائلہ! تم کہاں ہو؟“

تھوڑی دیر پہلے ان تینوں کالی بلاؤں کی گفتگو سے مجھے پتا چلا تھا، فرید پاشا اور سیکورٹی گارڈ خادم حسین کو انہوں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ فرید پاشا کی حالت سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ بے ہوشی سے نکل کر آیا ہے۔ اس کی متلاشی نظر اندھیرے میں نائلہ کو تلاش کر رہی تھی۔

میں نے با آواز بلند فرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”پاشا صاحب! آپ کی بیوی نائلہ ادھر فرش پر بے ہوش پڑی ہے۔“ پھر میں نے اس کی جانب اشارہ بھی کر دیا ”آپ اسے سنبھالیں۔ میں ان کالی بلاؤں کو جہنم کی راہ دکھا کر آتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نائلہ کو وہاں سے اٹھا کر لے جانے والے دونوں افراد ایک ساتھ میری جانب پلٹے۔ میں ان کے وار کے لیے تیار تھا۔ دروازہ قامت کا بیج بڑی تیزی سے میرے چہرے کی طرف آیا۔ میں نے آڈٹر ہلاک کے بعد اسے چند پیش سے دور دھکیل دیا۔ دوسرے کی ایک نیچے فرنٹنگ گنگ میری کمر میں لگی۔ میں نے بڑی سرعت سے محوم کر اس کا باؤں گٹھے کے مقام سے گرفت میں لیا اور خوفناک ٹوئسٹ دے کر اسے ایک طرف رہے۔

جب جھگڑوں نے جتنی دیوار پھلانگنے کے لیے دیوار پر چڑھا شروع کیا تو پاشا نے ایک مرتبہ پھر انہیں گولی کا نشانہ بنانا چاہا مگر اس کے ریولور سے گولی کے بجائے ’کھٹ‘ کی آواز برآمد ہوئی۔ وہ اپنے ریولور کے چیمبرز کی تمام گولیاں تازہ کر چکا تھا۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں دوڑ کر انہیں دیوار پھلانگنے سے نہیں روک سکتا تھا اس کے باوجود بھی میں نے یہ کوشش ضرور کی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں دیوار کے قریب پہنچا تو وہ دونوں دوسری طرف کو بچ گئے تھے۔

میں نے دیوار پر چڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ عقب سے پاشا کی آواز آئی ”رک جاؤ وجدان۔ اب وہ ہاتھ نہیں آئیں گے۔ تعاقب کا کوئی فائدہ نہیں۔“ فرید پاشا کی بات ختم ہوتی ہی کوشی کے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ سڑک پر تازوں کی مخصوص جڑ جڑا ہٹ ابھری اور گاڑی کا انجن شور مچاتا ہوا ہماری سماعت سے دور جانے لگا۔

”ہمارے گئے کم بخت۔ کسی بزدل کی اولاد۔“ فرید پاشا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے قریب آ کر پوچھا ”پاشا صاحب! یہ کون لوگ تھے اور آپ کی بیوی کو کیوں اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟“

”تمہارے تمام سوالوں کا جواب میں بعد میں دوں گا۔“ وہ اظہاری لہجے میں بولا ”پہلے اندر چلو، نائلہ کو اس وقت میری اندر ضرورت ہے۔“

”آپ کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے، آپ حملہ آوروں کو شاکست کر چکے ہیں؟“

”تمہارا انداز درست ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”فلکیک ہے، آپ اندر جائیں۔“ میں نے مضطرب لہجے سے اجتناب برتا ”میں ذرا سیکورٹی گارڈ کی خبر لے لوں۔“ مگر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”آپ نے گارڈ خادم حسین کو کہاں دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے حیرت زدہ انداز میں گردن کوئی میں ہلکا ”میں خود سوچ رہا ہوں، گارڈ کے ہوتے ہوئے یہ لوگ اندر کیسے آ گئے! پھر وہ وہیں سے پکارنے لگا ”خادم حسین! خادم حسین!“

میں نے کہا ”پاشا صاحب! آپ نائلہ کے پاس جائیں۔ میں خادم حسین کو دیکھتا ہوں۔ وہ یہیں کہیں ہے ہوش پڑا ہوگا۔“

”بے ہوش!“ فرید پاشا بڑبڑاتے ہوئے کوشی کے اندر نئی جگہ میں غائب ہو گیا۔

میں سیکورٹی گارڈ خادم حسین کی تلاش میں ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس تیسرے شخص کی بھی تلاش تھی جو پہلے دو کی مدد کرنے وہاں پہنچا تھا۔ اس ہسپتال بردار کی میں نے اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک ٹھیک ٹھاک سائیڈنگ گنگ مار کر اسے اندھیرے میں اچھال دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا۔ ہم نے صرف دو افراد کو دیوار پھلانگ کر فرار ہوتے دیکھا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد سیکورٹی گارڈ مجھے نظر آ گیا۔ وہ اس وقت دنیا دانیہا ہے بے خبر ایک دیوار کے ساتھ، مورچک کے پودے کے پیچھے پڑا تھا۔ مورچک کے پودے کے قریب ہی مختلف پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے اور بے سندھ گارڈ ان پودوں کے پیچھے چھپ کر رہ گیا تھا۔ میں نے گارڈ کے بدن کو ٹوٹل کر دیکھا اور چند گھنٹوں میں مجھے اندازہ ہو گیا، اسے بے ہوش کرنے کے لیے نیپلی پر کسی فوس شے سے وار کیا گیا تھا۔ اس کی کلاشوف بھی تھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔

میں نے بڑے مابہراندہ انداز میں گارڈ کو ہلایا جلا یا اور اس کی گردن پر موجود ایک مخصوص نرس پر ہلکا سا مساج کیا۔ میرے ہاتھ کی حرارت اس کی زندگی کی حرارت میں شامل ہوتی تو چند لمحات کے بعد اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول لیں۔

میں نے شانہ چھینچا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا اور اس جانب بڑھ گیا جہر میں نے گنگ مار کر ہسپتال بردار کو پھینکا تھا۔ اس سے پہلے دروازہ قامت سیاہ پوش کا بطل بھی ادھر اندھیرے ہی میں کہیں غائب ہوا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد، وہ دونوں مجھے ہسپتال مل گئے لیکن جھگڑوں کے سماجی کا نام نہ مل سکا، اس سے میں نے یہی اندازہ قائم کیا کہ وہ شخص ان سے پہلے ہی کوشی سے رفو چکر ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی ایسی دھولائی کی تھی کہ اس نے وہاں رکے پھر افراتفریت دی۔ اسی شخص کی زبانی مجھے پتا چلا کہ ساجد نامی کوئی شخص باہر گاڑی میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ گویا، نائلہ کو اغوا کرنے کے لیے چار افراد اس کوشی میں پہنچے تھے۔

میں اور سیکورٹی گارڈ ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ فوراً ہی فرید پاشا تک ہماری رسائی ہو گئی میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں فرید پاشا کو ان حالات سے آگاہ کیا جو خادم حسین کو دیکھ کر میری ذہن میں آئے تھے۔ اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وجدان! تم اندر چلو۔۔۔۔۔ اندر کرے میں۔ تم سے میں

بعد میں بات کروں گا۔ پہلے خادم حسین سے پوچھ کر رکھ لوں۔“

میں سمجھ گیا، وہ خادم حسین سے کس قسم کی پوچھنا کرنا چاہتا تھا۔ سیکورٹی کارڈ کا مطلب ہوتا ہے، جان و مال کی حفاظت کرنے والا۔ خادم حسین کے ہوتے ہوئے تین خطرناک افراد کو بھی کے اندر رکھ آئے تھے۔ نہ صرف وہ اندر داخل ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس کو بھی کی نہایت اہم شخصیت نالہ کو اغوا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگر میں بروقت وہاں پہنچ کر ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بننا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔

اس کو بھی میں بالکان اور سیکورٹی کارڈ کے علاوہ صرف دو افراد کا آنا جانا تھا۔ ان میں ایک تو گھر پر ملازمہ اللہ رکھی تھی اور دوسری اللہ کی بیٹی آمنہ۔ یہ دونوں دن بھر کو بھی میں کام کرنے کے بعد کچھ گھر چلی جاتی تھیں۔ ان کا مجموعی نما گھر ایک نزدیکی بیٹی آبادی میں تھا۔ کوئی کے اندر ایک اور شخص بھی رہتا تھا اور وہ تھا خاں بابا اللہ دتا۔ اس بے چارے کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اسی لیے کوئی کے سرورٹ کو اس میں اس نے مستقل ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ پاشا کے مطابق اللہ دتا، پاکستانی اور انگلش کھانے پانے کا ماسٹر تھا۔ میں فرید پاشا کے کہنے پر اندرونی کمرے میں آ بیٹھا۔

لگ بھگ دس منٹ بعد پاشا میرے پاس آیا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرہ اپنی ترتیب کے اعتبار سے ڈرائنگ روم کم پیڑوم نظر آتا تھا۔ مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

”وہ جان! تم اطمینان سے یہاں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

”پاشا صاحب، آپ کی اہلیہ۔۔۔“

میں نے نالہ کی خیریت دریافت کرنا چاہی تو اس نے جلدی سے کہا ”نالہ ہوش میں آ چکی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ مجھے توڑی سی مہلت دے دو پھر میں تم سے تفصیلی بات کروں گا۔“

وہ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تو میں نالہ اور ناکامیاب اغوا کنندگان کے بارے میں سوچنے لگا۔ گھوم پھر کر میرا خیال پاشا کی ایک بات کی طرف چلا جاتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد پاشا نے گفتگو کے دوران میں دو تین مرتبہ کہا تھا کہ نالہ کو اس نے بڑی مشکوک سے حاصل کیا تھا۔ حاصل کیا تھا کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ جن لوگوں سے نالہ، پاشا کے

پاس پہنچتی تھی، اب وہ اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش رہے تھے۔ ممکن ہے، یہ ادھر اغوا بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہو!

تھوڑی دیر بعد فرید پاشا میرے پاس آ گیا اور دونوں بازو کھول کر میری جانب بڑھا اس کے معافانہ انداز کو دیکھ کر میں کھڑا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے مجھ سے گفتگو ہونے ہوئے پوری قوت سے سمجھنا پھر میری پشت کو کھٹک کر بولا۔

”وہ جان! آج تم نے مجھ پر حوا حسن کیا ہے، میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”پاشا صاحب! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بھارتی ہوئی آواز میں بولا

”تم نے کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کیا ہے۔ تم جانتے تو یہ ہے کہ اگر تم ان خبیثوں کی راہ میں بروقت رکاوٹ نہ ڈالتے تو وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جاتے۔ تم نے میری نالہ کو اغوا ہونے سے بچایا ہے۔ گویا، میرے جسم کو روح سے خالی ہونے سے بچایا ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ تھیں جن کی مدد سے میں تمہارا شکر یہ ادا کر سکوں۔“

”آپ مجھے شرمندہ نہ کریں پاشا صاحب!“ میں نے کہا

”آپ میرے محسن میزبان ہیں۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ میں نے اپنی عزت کو بچانے کی کوشش کی ہے اور۔۔۔“

تو میرا فرض تھا۔

وہ منونیت آ میز لچے میں بولا ”تم جتنے خوب ہو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت باتیں کرتے ہو۔ تمہاری میرٹ صورت پر حاوی ہے۔ تم نے مجھے خرید لیا ہے وہ جان! تم اندازہ نہیں لگا سکتے، اس وقت میرے دل میں تمہارے بچے کون سے جذبات ہیں!“

میں نے زبردست مسکراتے ہوئے کہا ”میں آپ کے جذبات سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے اور میں آپ کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا ہوں اس لیے آپ کے دل کا حال مجھ سے پوشیدہ نہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا ”ہائی! دے، یہ کون لوگ تھے! آپ ان سے شناسائی کا اثر اور کچے ہیں۔“

”یہ میرے تازہ ترین دشمن ہیں۔“ فرید پاشا نے بتایا۔

میں نے کہا ”نالہ کو اغوا کرنے کے حوالے سے میرا دھیان آپ کی اس بات کی طرف جاتا ہے کہ آپ نے نالہ بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ کیا میں غلط سوچ رہا ہوں۔“

”تمہاری سوچ کا رخ بالکل درست ہے۔“ وہ تصدیقی انداز میں بولا ”ان لوگوں سے میری دشمنی کی وجہ نالہ ہی ہے۔ میں نے نالہ سے شادی کر کے ان کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔ رانا عفت نالہ کو اپنی جاگیر سمجھتا تھا۔ وہ کسی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نالہ اس کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دے گی۔ اس کا خیال ہے، میں نے نالہ کو غلام کیا ہے۔ اسے رانا عفت کے خلاف کر کے حاصل کر لیا ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں۔ یہ تو دونوں کے سودے ہیں یا۔ اس میں زور زبردستی توڑی چلتی ہے۔“

وہ چہرہ کھات کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہمارے درمیان الٹی پھٹکی جھڑپیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس قسم کا اوچھا دار رانا عفت نے پہلی مرتبہ کیا ہے۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”پاشا صاحب! وہ جیوں تو سرتاپا سیاہ لباس میں چپے ہوئے تھے پھر آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ رانا عفت کی طرف سے آئے تھے؟“

اس نے بتایا ”میں نے اندر آنے والے افراد میں سے ایک کو پہچان لیا تھا۔ وہ جو قدمی خاں صاحب تھا۔“

پاشا کی بات سننے پر میرے ذہن میں دروازہ قامت سیاہ پوش کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ آنکھیں، مجھ پر نگاہ پڑنے کی ٹھٹھکی تھیں۔ مجھے بھی ان آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نظر آئی تھی لیکن بہتر اسوچے کے باوجود یہ یاد نہیں آ سکا تھا کہ میں نے ان آنکھوں اور ان آنکھوں کے حامل شخص کو پہلے کہاں دیکھا تھا!

میں نے اضطرابی انداز میں کہا ”پاشا صاحب! عجیب بات ہے، جس دروازہ قامت کا آپ کا ذکر کر رہے ہیں، مجھے لگتا ہے میں پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھنے کی ٹھٹھکی تھا۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ تعلیمت سے بولا ”تم آج پہلی مرتبہ آ رہے ہو۔ اس لیے اس شخص سے تمہاری شناسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔“

میری یادداشت اور مشاہدے نے بھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ اس لیے میں فرید پاشا کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”پاشا صاحب! آپ مذکورہ شخص کے خزانے اور تاریخ و دیگر کے بارے میں کچھ بتائیں۔ میری یادداشت نے بھی گڑبڑ نہیں کی۔ میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ مجھے

کوئی دھوکا نہیں ہوا۔“

وہ بولا ”میں نے جس دروازہ قامت شخص کا ذکر کیا ہے۔ وہ رانا عفت کا بیٹھیا ہے اور اس کا نام ہے، سکندر!“

سکندر کا نام سننے ہی میں اچھل پڑا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ”وہی سکندر، جس کی ایم پی اے لالہ بشیر کا بھرا ہوا بیٹا ہے؟“

”نہی لالہ بشیر اور سکندر کو کس طرح جانتے ہو؟“ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن لما حیرت کے پیش نظر مختصر الفاظ میں اسے ریسروٹ میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ میں نے اور صدف نے جس دھواں دھارا انداز میں سکندر اور اس کے ساتھیوں کی پٹائی کی بھی اس کا احوال سن کر فرید پاشا کو بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ ان واقعات کے ذیل میں ڈی ایس ٹی ٹریفک اورنگ زیب خان اور اس کی اگلوٹی بیٹی نادیہ کا ذکر بھی آیا۔ پوری بات سننے کے بعد فرید پاشا نے کہا۔

”وہ جان! سکندر اور اس کا خاندان تو ہمارا مشترک دشمن نکل آیا۔ اب ان سے دودھ دھکھ کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔“

”ہاں، اگر ایسے کسی معرکے کا موقع آیا تو واقعی بہت مزہ آئے گا۔“ میں نے کہا ”آپ نے ابھی تک مجھے رانا عفت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

وہ بولا ”نالہ کے حصول اور رانا عفت سے دشمنی کا قصہ تو بہت دلچسپ اور فرصت سے سننے سنانے کا ہے۔ فی الحال میں تمہیں اتنا بتا دوں کہ رانا عفت میری طرح ایک فلم پروڈیوسر ہے اور ایم پی اے لالہ بشیر کا چھوٹا بھائی ہے۔ جب سے لالہ بشیر دیر بنا ہے، رانا عفت کی بدعاشیوں اور غریب کاریوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ وہ بڑے بھائی کی طاقت اور اختیار کے بل بوتے پر پتا نہیں کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ ہم پیشہ ہونے کے باوجود بھی میرے اور رانا کے درمیان کبھی نسل بازی نہیں ہوتی کیوں کہ ہم دونوں کے پروڈیوسر ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں فلم انڈسٹری اور تماشائیوں کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اصلاحی اور تفریحی فلمیں بناتا ہوں کہ جب رانا عفت اول تو فلم بناتا ہی نہیں اور اگر کبھی کبھار اس کی کوئی فلم ریلیز ہو بھی جاتی ہے تو سمرعیاتی اور فاشی کے سبب توڑی بہت چل جاتی ہے۔ وہ اپنی ذہنیت کی

عکاس فلمیں بناتا ہے لیکن کچھ بات تو یہ ہے کہ کسی فلم کی کامیابی میں سب سے زیادہ ہاتھ اسٹوری اور گانوں کا ہوتا ہے۔ اگر فلم کی اسٹوری جاندار اور اس کے گانے سمجھ کر نہ سمجھ سکیں تو قابل فرائض ہوں تو وہ فلم بہت کم عمر سے کامیابی کے جھنڈے کا ڈوبتی ہے۔ دوسرے نمبر پر اداکاری آتی ہے مگر رانا عکمت کی پروڈیوسر کی ہوئی فلموں میں نہ اسٹوری ہوتی ہے نہ یادگار گانے اور نہ ہی ڈھنگ کی اداکاری۔ پھر جن اور فحش ڈانسر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مکالمے بھی انتہائی گھٹیا اور عامیاندہ رنگ لیے ہوئے ہیں اس لیے نیچے کے طور پر فلم چند مدتوں میں بیٹھ جاتی ہے۔

”اس کے باوجود بھی رانا عکمت فلم انڈسٹری میں موجود ہے۔“ میں نے تعجب انداز میں پاشا کی طرف دیکھا۔ ”پہلے پے نقصانات اٹھانے کے بعد اسے اس کام سے توبہ کر لینا چاہیے۔ میرا خیال ہے، ایک فلم کی تیاری پر کروڑوں روپیہ خرچ آتا ہے!“

”ہاں۔“ پاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”معقول قسم کی ٹیم اور معروف کاسٹ کے ساتھ فلم بنائی جائے تو واقعی فلم کا بجٹ کروڑوں میں پہنچ جاتا ہے لیکن رانا بہت کائیاں اور بد معاش شخص ہے، وہ ایک ڈھاپا فلم بھی فائدے میں رہتا ہے۔“

میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”وہ کس طرح پاشا صاحب؟ اور یہ ڈھاپا فلم کیا ہوتی ہے؟“

”وہ محض انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ڈھاپا فلم انڈسٹری کی اصطلاح میں ایسی فلم کو کہا جاتا ہے جو نمائش کے چند روز بعد ہی طرح فلاپ ہو کر واپس ڈبے میں بند ہو جائے یعنی ایک انتہائی نا کامیاب فلم۔“

”ایسی فلاپ فلمیں بنا کر رانا فائدے میں کس طرح رہتا ہے؟“ میری حیرت دو چند ہو گئی۔

”اس طرح کہ“ فریڈ پاشا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ غیر معروف کاسٹ اور ایکسٹراز سے کام چلا لیتا ہے اپنے جسم کی نمائش کرنے والی ڈانسرز اور شوقیہ اداکاری کے بارے ہوئے اداکارانہ پونے پر راضی ہو جاتے ہیں اور اس طرح چند لاکھ میں فلم تیار ہو کر نمائش کے لیے پیش کر دی جاتی ہے۔“

”لیکن فلم فلاپ ہونے کی صورت میں یہ چند لاکھ کا نقصان تو ہوتا ہوگا!“

”ہاں، ہوتا ہے۔“ وہ تعجب لہتی انداز میں بولا۔ ”مگر یہ نقصان رانا کا نہیں بلکہ اس پارٹی کا ہوتا ہے جیسے گیم کھاد کر رانا فلم میں سرمایہ کاری کے لیے پھانس لیتا ہے اور اگر گہرائی میں

چائیں تو اس پارٹی کا بھی کچھ نہیں جاتا۔ سب فائدہ سہا رہتے ہیں۔“

”آپ کی وضاحت میں بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ صاحب!“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے، میں آپ کی بات کو پوری طرح سمجھ نہ پا رہا ہوں۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”وہاں روشنیوں کی یہ مگر بڑی زبانی ہے۔ سلور اسکرین پر نظر والے ہیروز کی اکثریت حقیقی زندگی میں کسی دھن سے نہیں۔ اسی طرح فلم میں جن اداکاروں کو دلین کے رول میں جاتے ہیں ان میں سے زیادہ تر تخی اور معاشرتی زندگی میں ہیرو سے کم نہیں ہیں۔ سب دھوکا ہے، ایک کھلا دھوکا۔ دھوکا جانے والے بھی کھاتے ہیں اور انجان بھی۔“

بولتے بولتے اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ میں اس حریف کلام کے انتظار میں خاموش بیٹھا بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہا۔ چند لمحے خیالات میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے یہ شروع کیا۔

”میں بھی ہیرو اور ویلن کی کیا کہانیاں لے بیٹھا ہوں۔“ وہ اصل میں تمہیں رانا عکمت اور اس کی فلم کے بارے میں بتا رہا تھا۔“ اس پر پھر تھوڑا سا توقف بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم یوں سمجھ لو کہ شہناز

ایک ٹولا ہے جس کا سرخند رانا عکمت ہے۔ یہ لوگ فلم نہیں کرتے بلکہ اپنی ہوس کی تسکین کے لیے اس پیشے استعمال کرتے ہیں۔ شو بڑی کشش سے ہر شخص کو اپنے رانا عکمت کا فلم ساز ادارہ کسی پھندے سے کم نہیں۔ فلم کام کرنے کی شائق لڑکیوں اور عورتوں کو بہلا چکا ہے۔ اونچے خواب دکھا کر یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ٹولا خیالات

دھندے میں بھی ملوث ہے۔ اب میں تمہیں کیا کہنا چاہتا ہوں؟“ اس کے لہجے میں بے چارگی اتر آئی۔ ”تمہیں نا کہ جیسی ہیرا لڑکی کو بڑی کوششوں کے بعد رانا عکمت چنگل سے نکال کر اپنا بیا ہے۔ اس واقعے کی تفصیل میں پھر کبھی بتاؤں گا۔“

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز میں مہووم سا کرب شامل ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا، نا کہ اس کے پاس پہنچنے کے درمیان بہت سے بیچ و خم ہیں، بہت اور نا خوشگوار یادیں ہیں جن کا ذکر پاشا کو بول اور انداز دیتا ہے۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا، آئندہ میں پاشا سامنے نا کہ اس حوالے سے ذکر نہیں پھینڈوں گا۔

اگر از خود کچھ بتایا تو دوسری بات ہے۔ میں اتنا اندازہ لگا چکا تھا وہ نا کہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنی محبت کو کس طرح حاصل کیا تھا، یہ تفصیل جاننے کی کیا ضرورت تھی!

پاشا کی محبت کے بارے میں سوچتے ہوئے آپوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں اپنی رگ جاں سے جدا کر دیا تھا۔ اس کی قربت میں نزار ہوا ایک ایک لمحہ مجھے دنیا کا قہار یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سینہ اعضاءے ریشہ سے خالی ہو گیا ہو۔ محبوب کے چھڑنے کا دم وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو کسی محبت کے ملبے کی خبر ہے سے گزرے ہوں۔

ساحل کے بارے میں اگر میں زیادہ سوچتا تو شاید باوجود کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سوچ کا اہم جب اپنی قریب کے کس دکھاتا ہے تو جبر و فراق میں بڑی تندی آ جاتی ہے۔ ساحل تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے

میں اپنے دل و دماغ کو حاضر و ناظر اور نابل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر میں اس کے تصور میں نکل جاتا تو یادوں کا طوفان ریلٹا مجھے اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ میں کسی ریلے میں بہتا نہیں چاہتا تھا کسی میلے میں کھوتا نہیں چاہتا تھا اس لیے ضروری تھا، میں اپنے جذبات پر کنٹرول رکھوں۔ یہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے مجھے ساحل کی یاد سے جتنی الامکان دور رہنا تھا اور میں اسی قسم کی کوششیں کر رہا تھا، گویا خود کو دھوکا دے رہا تھا!

ساحل تو میرے جسم کے ایک ایک سوت پر کندہ تھی۔ اس کے فطرتی لمس نے میرے تصور کو گود رکھا تھا۔ میں اس کو اور اس کے خیال کو اپنے اندر سے کیسے نکالتا۔ یہ تو بالکل ایسا ہوتا جیسے کوئی شخص اپنا دل و دماغ، گردے پیچھے بڑے نکال کر جسم سے باہر پھینک دے اور پھر بھی زندہ رہے۔ میں صرف خود کو بہلا رہا تھا۔ بہلاؤ اور امید بھی عجیب چیزیں ہیں۔ دھوکے کے دو۔

خوبصورت نام جن کے سہارے زینت قدرے آسان محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور میں بھی انہی سہاروں سے کام چلا رہا تھا۔ میری زندگی میں بے پناہ جذباتی موڑ آئے ہیں لیکن میں نے خود کو اتارے بس اور بے قرار بھی محسوس نہیں کیا جو حال، ساحل کی جدائی نے کیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میرے لیے ساحل کے بغیر زندگی کا تصور محال تھا۔

فریڈ پاشا کے جذباتی کلمات نے مجھے خاصا دلگیر کر دیا تھا۔ میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لیے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

”پاشا صاحب! آپ نے سیکورٹی گارڈ سے پوچھ چکے کہ اس کے پاس واقعے کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

فریڈ پاشا نے مجھے بتایا کہ سیکورٹی گارڈ کے مطابق، وہ حسب معمول اپنے کیمپ میں موجود تھا کہ اسے کوئی کے محسوس ہونے کی گڑبگڑ کا احساس ہوا۔ وہ صورت حال جاننے کے لیے اس طرف بڑھا تو دیوار کے نزدیک مورچک کے پودوں کے پاس اسے دو ہیوے نظر آئے۔ اس نے انہیں لٹکا کر رکھنے کو کہا لیکن وہ رکے بغیر کوئی کے اندر دھکی دے کے لیے ہوائی فائرنگ کی۔ اسی لمحے عقب سے کسی نے اس کی کپڑی پر وار کر دیا۔ وہ کسے ہوئے کسی شاہ تیر کی مانند زمین پر جا گرا۔ اڑاں بعد میرے ہوش دلانے پر اس نے آنکھ کھولی تھی۔

”سیکورٹی گارڈ کے بیان میں مجھے دردغ کوئی نظر نہ آئی۔ میں نے اپنے شک کی تصدیق کے لیے پاشا سے پوچھا۔“ اور کوئی کے اندر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”میں اس وقت داش روم میں تھا جو وہ دونوں چم ناقدین ہمارے بیڑم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی نا کہ کو قہا بوس کر لیا۔ میں نا کہ کی حراحت کی آواز سن کر داش روم سے نکلا تو ایک عجیب منظر نے میری نگاہ کا سامنا کیا۔ دروازہ قامت یعنی سکندر کی مدد سے دوسرا شخص نا کہ کو بیڑ

شیٹ میں لپیٹ کر کندھے پر ڈال رہا تھا۔ مجھے بیڑم میں موجود پاشا کو سکندر میری جانب بڑھا۔ میں نے اس کی آواز اور آنکھوں سے اسے پہچان لیا۔ جب میں نے اس کا نام لے کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو سکندر مجھ سے ٹھٹھکا ہوا گیا۔ ایک نا کہ موقع پر، وہ مجھ پر غالب آ رہا تھا کہ سکندر کے سامنے نے نا کہ کو بیڑ پر ڈال کر میرا رخ کیا اور میرے سر پر کسی دھڑکی آہنی شے سے بھر پور ضرب لگائی۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ اس دوران میں نا کہ چادر میں سے اپنا منہ باہر نکال چکی تھی۔ اس نے مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت دیکھی تو اس کے مطلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔

میری ساعت سے ٹکرانے والی وہ آخری آواز تھی، اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ سر پر لگنے والی قیامت خیز چوٹ نے مجھے دنیا و بائیں سے بے خبر کر دیا۔“ اس نے ایک جھرجھری لی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں جانتا، میرے بے ہوش ہونے کے بعد انہوں نے نا کہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اٹھک شیخ کی آوازوں سے جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنا ریوالتور لے کر بیڑم سے باہر آ گیا۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات تمہارے سامنے ہیں وجدان!“ اس کے لہجے میں حد درجہ شکرگزاری بھری ہوئی تھی۔ ”تم نے بد وقت مداخلت کر کے نا کہ کو خواہونے سے بچایا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا، کس زبان

آتش فشاں 73 حصہ 9

آتش فشاں 73 حصہ 9

آتش فشاں 73 حصہ 9

آتش فشاں 73 حصہ 9

آتش فشاں 73 حصہ 9

آتش فشاں 73 حصہ 9

آتش فشاں 73 حصہ 9

سے اور کن الفاظ میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔“

”آپ کو یہ سمجھنے اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں پاشا صاحب!“ میں نے کبریٰ بخیدگی سے کہا ”اور وعدہ کریں، آئندہ آپ اس حوالے سے کوئی ذکر کر کے مجھے نادم نہیں کریں گے۔ میں آپ کو اپنا محسن سمجھتا ہوں اور محسنوں پر احسان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے کام آکر اپنا فرض ادا کیا جاتا ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، میں نے کچھ بھی نہیں کیا، صرف اپنا فرض نبھایا ہے۔“

وہ بے حد جذباتی ہو گیا ”میں بھی پھر اپنا فرض نبھانے کا اور اس طرح نبھانے کا کہ جو بدری نوازش علی کی سات پشتیں کانوں کو ہاتھ لگا کر یاد کریں گی اور آنسو بہا بہا کر فریاد کریں گی۔ میں کل شام سے پہلے پہلے تیاری مکمل کر لوں گا۔ انشاء اللہ برسوں میں ہم سید پور روانہ ہو جائیں گے۔ سید پور میں رہے ہوئے ہم جو بدری نوازش علی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“ وہ ذرا توقف کرنے کے بعد بیچان خیر لہجے میں بولا ”وہ جان! تم میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لانا۔ میں خلوص دل سے کہہ رہا ہوں اور یہ کوئی بدلہ چکانے والی بات نہیں۔ تم نے میری نالائکہ بجاہا ہے، میں تمہاری ساحل کو صبح سلامت جو بدری کے قبضے سے نکل کر تمہارے حوالے کروں گا۔ اس لیے کہ چاہے مجھے کسی بھی انتہا سے کیوں نہ گزرا پڑے۔ تم دیکھ لیتا۔ تم دیکھنا وہ جان! میں کیا کر دکھاتا ہوں۔“

وہ اس وقت انتہائی جذباتی ہو رہا تھا اس لیے میں نے اس کا دھیان مٹانے کی خاطر کہا ”پاشا صاحب! برسوں کی محبت ابھی خاصی دور ہے۔ اس سے پہلے ہمیں یہاں بہت سے ضروری کام نشا ناہیں۔“

”شاید کون سے ضروری کام؟“ وہ استعجاب نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”رانا عظمت اور اس کے شیطان خیر خواہوں کا بندوبست میں کر دوں گا، کہیں تمہارا اشارہ اس طرف تو نہیں!“

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میرا اشارہ سیکھو رنی گاڑو خادم حسین کی طرف ہے۔“

”کیا مطلب وہ جان!“ وہ چونکا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”مجھے یقین ہے خادم حسین نے اپنے بیان میں دروغ کوئی سے کام لیا ہے۔ وہ حقیقت کو سچ کر کے پیش کر رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یا تو آپ کے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یا ان کا خیر خواہ

بنا ہوا ہے۔“

”وہ جان! تم ناقابل یقین بات کر رہے ہو۔“ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا ”خادم حسین میرا برسوں کا دوست ہوا ہے۔ یہ بناؤ فوجی ہے۔ میں نے اسے بہت سے چوبند اور فرض شناس پایا ہے۔ تمہاری باتیں مجھے ابھی ڈال رہی ہیں۔“

میں نے ٹھہرے آواز سے کہا ”پاشا صاحب! وہ آپ برسوں کا آزما ہوا ہو گا لیکن وہ ایک ہی واقعے میں میرا آزمائش پر پورا نہیں اترتا۔ اس کی باقی خصوصیات کوئی بھی نہیں رکھتیں۔ انسان عجیب و غریب مخلوق ہے۔ اسے بڑے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ کل کے با اعتماد آج بے اعتماد دیکھ سکتے ہیں۔“

”تم جتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہو اس سے کہہ رہے تمہارے ذہن میں کوئی خاص نکتہ ہے۔“ وہ اظہار لہجے میں بولا ”کیا تم مجھے اس بارے میں کچھ بتاؤ گے؟“ میں نے کہا ”ضرور بتاؤں گا۔“ پھر چند لمحوں کے بعد میں نے سنجیدہ لہجے میں بتایا ”مجھے اچھی طرح یاد ہے، نے پہلے ایک دھڑاں سوانی چیخ سنی تھی۔ اس کے کچھ دور زیریں منزل پر فائرنگ کی آواز گونجی تھی۔ اس تناظر میں سیکھو رنی گاڑو کا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔“

”ذرا وضاحت کرو!“ وہ دھچکی لیتے ہوئے بولا۔ میں نے کہا ”آپ کے مطابق آپ کے سر پر گولی شے سے ضرب لگائی گئی تو اس منظر نے نالائکہ کو جیتنے پر مجبور کیا جب کہ گاڑو کا کہنا ہے کہ دو سیاہ پوش افراد کو روکے۔ اس نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ان دونوں بیانوں میں بہت تضاد ہے۔ میں آپ کو جھٹلا نہیں سکتا اس لیے سیکھو رنی گاڑو مشکوک نظر آتا ہے۔ اگر سیکھو رنی گاڑو کی بات کو درست لیا جائے تو پھر پہلے فائرنگ کی آواز اور بعد میں چیخ کی آواز چاہیے کیوں کہ ان لوگوں نے گولی کے اندر داخل ہو کر بعد نالائکہ کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب کہ ایسا ہے۔ چیخ کی آواز پہلے بلند ہوئی اور فائرنگ کی آواز بعد ابھری ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے، آپ کے کہنے ہوئے کے بعد فائرنگ کی گئی ہے۔“

اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہوئی۔

سے بولا ”وہ جان! کیا تمہیں یقین ہے، تم نے فائرنگ آواز نالائکہ کی چیخ کے بعد سنی تھی؟“

”مجھے اس بات کا ایک سو ایک فیصد یقین ہے۔“ صاحب! میں نے تین سے کہا۔

”سوچ انداز میں بولا ”اگر تمہاری بات کو سچ مان لیا وہ پھر سیکھو رنی گاڑو کی بے ہوشی کس کھاتے میں جائے گی۔ تم نے خود اسے پودوں کے عقب سے برآمد کیا ہے اور اس کی کٹنگ پر کسی دزدنی شے سے لگائی جانے والی ضرب کا نشان بھی موجود تھا جس سے عینی ظاہر ہوتا ہے اسے بے خبری میں ضرب پہنچا کر بے ہوش کیا گیا تھا!“

”آپ کا اعتراض بہ جا ہے۔“ میں نے معلومت آمیز لہجے میں کہا ”مگر سیکھو رنی گاڑو سچا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو سیاہ پوش انخوا کنندہ آپ کے بیڈروم تک با آسانی کے پہنچ گئے۔ کیا آپ اپنی گولی کے اندر دینی حصے میں موجود تمام گولوں کے دروازے سے گئے چھوڑ کر سوتے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا ”میں سونے سے پہلے تمام دروازے چیک کرتا ہوں، خاص طور پر ہمارا بیڈروم تو ضرور لاک کیا جاتا ہے۔ گولی کے اندر دینی حصے میں کسی سے رابطہ کرنے کے لیے انٹر کام سسٹم موجود ہے۔ کسی ہنگامی صورت حال میں مجھے بیڈروم میں بھی کال کیا جا سکتا ہے۔“

”جب کہ سیکھو رنی گاڑو نے انتہائی ہنگامی صورت حال میں بھی آپ کو مطلع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ انخوا کنندگان نے آپ کے بیڈروم تک کس طرح رسائی حاصل کی۔“

وہ توشیوں ناک لہجے میں بولا ”اس تناظر میں تو خادم حسین کی ہی طرف شک جاتا ہے۔ میں ابھی اسے ہلا کر تمہارے سامنے۔“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”آپ ابھی اسے نہ مجھڑیں۔ اس پر بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ واقعی آپ کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے تو کیا ہاتھ ڈالنے سے وہ قحط ہو جائے گا۔ آپ اسے میرے لیے چھوڑ دیں۔ میں کل رات اس پر کام کروں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ایک بات کا خیال رہے، خادم حسین کو اس بات کا شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس کی طرف سے قحط ہو چکے ہیں۔“

”تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس کے ساتھ نارل رو یہ رکھوں گا۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ”پاشا صاحب! کیا آپ کا دوسرا ہی اللہ خدا کوئی نسخہ وغیرہ بھی کرتا ہے؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟“

میں نے کہا ”یہاں کوٹھی میں کھٹنے، ڈیڑھ کھٹنے سے مارا ماری ہو رہی ہے اور وہ ہمیں نہیں نظر آ رہا۔ آپ نے تو بتایا تھا، وہ ہمیں ایک سرونٹ کو اثر میں رہتا ہے۔“

”میں نے تمہیں غلط نہیں بتایا تھا۔“ فرید پاشا نے کہا ”آج جھرات ہے بلکہ اب تو جھڑ شروع ہو چکا ہے۔ جھرات اور جھڑ کی درمیانی شب وہ کوٹھی سے غیر حاضر رہتا ہے۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

فرید پاشا نے بتایا ”یہاں لاہور میں ایک بہت بڑے روحانی بزرگ اور ولی اللہ کا مزار ہے جو داتا دربار کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر جھرات کی رات مغل سارح ہوتی ہے۔ اللہ داتا دربار پر گزرتا رہا ہے۔ یہ اس کا برسوں کا معمول ہے۔ میں نے بھی کبھی اسے متح نہیں کیا۔ جہاں سے ولی سکون اور آنکھوں کو خشک ملتی ہو، اس راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔“

”یہ اللہ تو بہت ہی دلچسپ شخصیت ہے۔“ میں نے کہا ”مگر مجھے بھی فرصت ملی تو اس سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔“

فرید پاشا نے کہا ”اللہ داد دیکھنے میں کھسکا ہوا لگتا ہے مگر کبھی کبھی بڑی معرفت کی بات کرتا ہے۔ تم اس سے بات چیت کر کے حیران رہ جاؤ گے۔“

میں نے گفتگو کے موضوع کو تھوڑا اجاڑ کر دیا ”میں نے کہا ”پاشا صاحب! آپ نے سیاہ پوشوں کے تعاقب میں پوری دیکھ کر کہاں فائرنگ کر لیں مگر اس پاس سے کسی نے یہاں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کی فائرنگ سے پہلے سیکھو رنی گاڑو کی کلاشکوف بھی گرتی تھی۔ آپ کے پڑوسی اپنے ماحول سے اسنے نا اعلق ہیں؟“

”پہلی بات تو یہ ہے وہ جان کہ میرے پڑوس کی دونوں کھڑیاں آج کل خالی ہیں۔“ فرید پاشا نے بتایا ”ایک کے مالکان پچھلے دو مہینوں سے ایٹلیس گئے ہوئے ہیں اور دوسری کوٹھی ”برائے فردخت“ کے ذیل میں خالی پڑی ہے۔ دوسرے یہ صاحب ثروت لوگوں کی رہائش کا علاقہ ہے۔ گلیبرگ قحری اور دوسرے پوش علاقوں میں بسنے والے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور دوسروں کے معاملات میں خواہ خواہ ناگاہک اڑانے کی کوشش نہیں کرتے۔“ پھر پاشا نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی اور ایک طویل جماعی لیتے ہوئے بولا ”ویسے بھی اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں!“

وقت گزرنے پر مجھے یاد آیا کہ رات ڈیڑھ بجے میں

ڈارلنگ کی اصلیت جاننے کے لیے چچی کی قوت کو آزمانے میں مصروف تھا۔ زیریں منزل پر تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال نے مجھے نیچے آنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس بات کو لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ تک چکا تھا۔ کیا ڈارلنگ اب تک بے ہوش کی حالت میں ٹیبل پر پڑی ہوگی؟

اس سوال نے مجھے یک لخت کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ فرید پاشا میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا ہوا جدان؟" اس کے استفسار میں گہری تشویش تھی۔

"میں ذرا اوپر چارہا ہوں۔" میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے، ایسی کیا بات ہوگئی؟"

"ابھی آکر بتاتا ہوں۔"

میں کوشی کے اندرونی حصے سے نکل کر خوش نما اور طرح دار زینے کی جانب بڑھ گیا۔ بالائی منزل پر قدم رکھنے سے پہلے مجھے معلوم ہو گیا، فرید پاشا بھی میرے تعاقب میں چلا آیا تھا۔ میں نے اس کی جانب توجہ دیے بغیر اس کمرے میں قدم رکھ دیا جو شب بصری کے لیے مجھے دیا گیا تھا۔

بیزروم میں قدموں سے پہلے میری نگاہ داخل ہو چکی تھی اور یہ نگاہ کمرے میں موجود ہر شے کو فراموش کر کے سیدھی اس میز تک جا پہنچی جہاں کچھ دیر میں نے ڈارلنگ کو بے ہوش کی حالت میں چھوڑا تھا۔

وہ میز خالی تھا۔ ڈارلنگ کا وجود اس پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس منظر نے میری نگاہ کو دھچکا پہنچایا۔ ایک بے نام سے اضطراب نے میرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ میں حلاشی نظر سے بیزروم کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لینے لگا۔ چند لمحات کی تلاش سے مجھے اندازہ ہو گیا، ڈارلنگ اس میز پر تو کیا، اس کمرے ہی میں کہیں موجود نہیں تھی۔ میرے ذہن نے تشویش کے عالم میں سوچا "پر اسرار ملی کہاں چلی گئی؟"

اپنے اس خیال پر مجھے کسی بھی آئی۔ اگر میں ڈارلنگ کو ایک پر اسرار ملی تسلیم کر رہا تھا پھر "کہاں چلی گئی؟" کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی تھی۔ جو چیز اسرار سے بھری ہو، وہ ہمیں بھی، کسی بھی وقت جا سکتی ہے۔

اپنے عقب میں مجھے فرید پاشا کی آواز سنائی دی "وجدان! تم مجھے خاصے پریشان نظر آ رہے ہو۔ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟"

"ڈارلنگ کی۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"ڈارلنگ!" اس نے حیرت سے دہرایا پھر اسے فوراً یاد

آ گیا، میں کس ڈارلنگ کا تذکرہ کر رہا ہوں، جلدی سے بولا

"اچھا اچھا، تم اپنی ملی کو ڈھونڈ رہے ہو۔ کہاں چلی گئی تھی وہ چینی ملی؟"

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا، ڈارلنگ کہاں تھی ہے تو میرے اوپن ہاؤس میں ہوتا، ڈارلنگ کہاں تھی ہے تو میرے اوپن ہاؤس میں ہوتا۔"

اس نے میری اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ڈارلنگ کی تلاش میں میرا ساتھ دینے لگا۔ اگلے چندہ منٹ میں نے کوشی کی ہر اس جگہ کو دیکھ لیا جہاں ڈارلنگ کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے تھے مگر وہ ہمیں کہیں ملی اور نہ ہی اس کی کوئی سراغ ہاتھ آیا۔ اسی تلاش میں ٹھٹھکتے ہوئے ہم گارڈ کے پاس بھی گئے۔ اس سے ڈارلنگ کے بارے میں استفسار کیا۔ اس کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی۔ اس نے ڈارلنگ کو کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے سیکورٹی گارڈ خادم حسین کی آنکھوں میں دیکھ کر ہونے کہا "تم تو ڈی دیر پہلے ایک سنگین حادثے سے گزر چکے ہو۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے۔ تم آرام سے سو جاؤ۔"

"میں ٹھیک ہوں سر۔" وہ میری جانب دیکھتے ہوئے "بس ڈراسر میں درد ہو رہا ہے۔ یہ تکلیف قابل برداشت ہے۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں اس سے کہیں زیادہ بڑی بڑی چوٹیں آئی ہیں۔ میں اگر سو گیا تو یہ فرائض کوتاہی ہوگی۔"

اس کے لہجے میں مجھے مکاری کی بو آئی۔ فرید پاشا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم اسی کہیں میں رہ کر توڑاؤ سا آ کر لو اور چونکا نظر سے گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتے رہو۔ سو کے لیے کل کا دن پڑا ہے۔" پاشا کے لہجے میں رکھائی واضح تھی۔

ہم گیٹ کے پاس سے واپس کوشی کے اندرونی حصے آ گئے۔ میرے ذہن میں ایک ہی جملے کی گردان تھی ڈارلنگ کہاں غائب ہوگئی؟

ڈارلنگ کے غیاب سے مجھے وہ رات یاد آ گئی تھی سرخ رگت والی ملی نے مجھے تھیر کیا تھا۔ میں نے ڈیڑھ ایکس کے اس پنکٹ میں گزاری ہوئی رات کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ پر اسرار خلتوں کی مالک ہیلگری نے رات ملی کے جلو میں مجھے پھانسا تھا اور ڈارلنگ آج طرح غائب ہو گئی تھی۔ تو کیا ہیلگری پھر کوئی چکارہ رکھنے والی تھی؟

اس سوال نے مجھے جھرمجری لینے پر مجبور کر دیا۔ میں تجربے کو کسی بھی قیمت پر دہرانے کے حق میں نہیں تھا۔



خوشگوار تجربات ایسے ہوتے ہیں جن کے باہر اثرات میں  
تغیوں اور سکینوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس رات تو لکلی نے  
جام امید نائی کندلی شروپ کی مدد سے مجھے ہوش و خرد سے  
ہٹا کر کے کرور بنا دیا تھا اس لیے ہلکری بہ آسانی مجھے شکار  
کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اب ایسی کوئی صورت حال پیش  
نہیں آ سکتی تھی۔ دودھ کا جلا جما بھی چھوٹک بھوک کر پیتا  
ہے، میں ایک ایک قدم سنبھل کر اٹھانا چاہتا تھا۔ تاکہ بلندی  
اور ہستی میں امتیاز باقی رہے۔

اچانک فرید پاشا کی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل  
توڑ دیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا ”وہ جان! تم کی گہری سوچ  
میں ڈوبے ہوئے ہو۔ کیا تم پریشان ہو؟“  
”ہاں، میں تھوڑا سا پریشان ہوں۔“ میں نے صاف  
گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”ڈارلنگ کی اچانک روپوشی  
نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔“

میں فرید پاشا کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈارلنگ کوئی عام بلی  
نہیں بلکہ اسرار و رموز میں لپٹا ہوا ایک سلی تھان ہے جس کی  
ایک ایک تہ میں ناز و ادائیگی بھول بھلیاں ہیں ان سچ در سچ  
بھول بھلیوں میں انسان کو تھان نہیں بلکہ جھلستا ہے اور بھٹک کر اس  
طرح چاروں خانے جت ہوتا ہے کہ چشم شکرا اشتی ہے۔  
اس حیرت آفرین اور دلنشین بلی کا اسرار مجھ پر کھلنے ہی والا تھا  
کہ وہ منظر سے غائب ہوئی۔ میں یہ تفصیل پاشا کے سامنے لا  
سکتا تھا اور نہ ہی لانا چاہتا تھا۔

وہ مجھے خاموش یا کر تمبیر آواز میں بولا ”یار ویدان!  
تمہاری حالت دیکھ کر تو لگتا ہے، ڈارلنگ کی روپوشی نے تمہیں  
گہرے صدمے سے دوچار کر دیا ہے۔“  
”ڈارلنگ کی جدائی ایسا ہی قسم ڈھاتی ہے۔“ میں نے  
معتی خیر لہجے میں کہا۔

”اس سلسلے میں، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“  
”کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“ میں نے ایک طویل سانس  
خارج کرتے ہوئے کہا ”وہ جس طرح مٹی ہے ویسے ہی واپس  
بھی آ جائے گی۔“

”کیا پہلے ہی وہ اس قسم کی حرکت کر چکی ہے؟“  
میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔  
وہ بولا ”پھر تو زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ تم اوپر جا کر  
آرام سے سو جاؤ۔ رات تو اب ختم ہونے والی ہے۔ تم کل  
رات دیر تک سونا کر فریٹ ہو کر دشمنوں کا سامنا کر سکو۔ اب  
کئی حوالوں سے ہمارے دشمن مشترک ہو گئے ہیں، خاص طور  
پر سکندر اور اس کا ایم بی اے بلا کہ شیر سب!“

اچانک میرا دھیان صدف کی طرف چلا گیا۔ میں نے  
پاشا کے پاس اور صدف ناویہ کی کوٹھی میں ٹھہری ہوئی نظر  
میں ہاتھیں بندھ کر دیکھی۔ صدف کی آنکھیں جا رہی تھیں۔  
مجھے سوچ میں نہیں سکتا تھا، فرید کی کوٹھی پر مجھ سے سامنا ہو  
جائے گا مگر صدف کو وہ کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ صدف  
ہی نے ریفرنٹ میں اسے سب سے زیادہ رسوا کیا تھا۔  
اپنی رسوائی کے بدلے میں کوئی بھی اچھا جھکنڈا آزار نہ  
تھا۔ اگرچہ وہ ڈی ایس بی اورنگ زیب خان کی کوٹھی میں  
داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا تاہم ایسے ممکن فرائض  
لوگوں سے کچھ بچہ نہیں ہوتا اور اب تو وہ مجھے فرید پاشا کی کوٹھی  
میں نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اچھی خاصی درگت بھی خواہر  
تھا۔ اس کی جانب سے بہت زیادہ جھٹکار بنے کی ضرورت تھی۔  
میں نے فرید پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کیا میں  
آپ کا خون استمال کر سکتا ہوں؟“

”اس کوٹھی کی کوئی بھی شے استعمال کرنے کے لیے مجھ  
مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ یار۔ یو آر ایل  
پر میڈ۔“ فرید پاشا گفتگو کے دوران میں بھی بھرا کوئی انگلی  
کا جملہ بھی ناک دیا کر تھا۔ اس نے پوچھا ”ویسے رات کے  
آخری پہر تم کسے فون کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“  
”میں ذرا صدف اور ناویہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا  
ہوں۔“ میں نے کہا۔

سکندر کے حوالے سے میں نے فرید پاشا کو ناویہ صدف  
اور ڈی ایس بی اورنگ زیب خان کے بارے میں سب کچھ  
دیا تھا۔

اس نے کہا ”ٹھیک ہے، تم ان کی خیریت معلوم کر لو کہ  
مطمئن ہونے کے بعد تم گہری اور پرسکون نیند سو سکو۔“  
ایک لمحے کو میرے ذہن میں آیا کہ رات کے اس پہر  
فون کر کے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ اگر میں نے صدف  
کسی اور سے سکندر کے تازہ ترین کامیاب مشن کے بارے  
میں کوئی بات کی تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے اور ان  
کا باقی حصہ آنکھوں میں کٹ جائے گا مگر ان لوگوں کی خبر نہ  
معلوم ہونا بھی ضروری تھا۔

میں نے فرید پاشا سے کہا ”پاشا صاحب! میں اورنگ  
زیب خان کی کوٹھی کا تبصرہ ملاتا ہوں بات آپ کریں۔ اگر  
میں سے کسی نے میری آواز سن لی تو گفتگو کا ایک دھڑکن  
جائے گا اور وہ ہے جارے الجھن میں پڑ جائیں گے۔“  
”میں کیا بات کروں گا؟“ فرید پاشا نے پوچھا۔  
میں نے کہا ”جو بھی شخص ریسیور کرے اس پر آپ“

میں نے فون اس نے کیا ہے۔ ظاہر ہے، فون اس نے  
ظاہر کیا ہوگا اس لیے آپ کو دوسری جانب سے جھجکا ہٹ  
نہیں کیا ہوگا۔ اس نے کم از کم یہ تو اندازہ ہو جائے  
آج کل کی صورت حال ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں  
کا دھڑکن سمجھ رہا تھا۔ ”یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے خدشہ ہے  
نے اضافہ کیا۔“ آواز پہچان لیں گے۔“  
کہہ لوگ میری آواز پہچان لیں گے۔“  
میری بات فرید پاشا کی سمجھ میں آئی اور اگلے دو منٹ  
میں اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت ہی صفائی  
سے یہ معلوم کر لیا کہ چاہتا چوک والی کوٹھی میں سب خیریت  
ہے، میں مطمئن ہو کر وہاں سے اٹھا اور کوٹھی کی بالائی منزل پر  
آ گیا۔ بیدار میں قدم رکھنے ہی میں چوک اٹھا۔

وہ آفت کی پرکالہ، شیر کی خالہ بڑے خطرناک سے بیڑ پر  
براجمان تھی۔ مجھ سے نگاہ ملنے سے وہ بڑی اداسے مسکرائی اور  
اس نے اپنے سٹن سے بڑی کراری آواز نکالی ”میاؤں!“  
مجھے پورا محسوس ہوا جیسے وہ چرنے کے لیے مسکرائی ہو۔  
میں اسے گہری نیند میں پہنچا کر اس کے اسرار کے بندھ کو لے  
والا تھا لیکن نہ پرین منزل والی ہنگامی صورت حال نے مجھے اس  
کا موقع نہ دیا بلکہ ہاتھ آئے ہوئے اچھے خاصے موقع کو ضائع  
کر دیا تھا۔ اگر مجھے ڈارلنگ پر کام کرنے کے لیے چدرہ میں  
منٹ اوپر مل جاتے تو میں اس کی حقیقت کو پایتا۔

میں بیڑ کی جانب بڑھا تو وہ یہ بھی کر میں اسے پکڑنے کا  
ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے ایک زبردستی میری میز پر  
چاہی تھی۔ وہ یہی میز جہاں میں نے دو گھنٹے قبل اسے لٹایا  
تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ اس کی گہری نیند کیسے ٹوٹی تھی  
اور ازاں بعد تلاش کرنے پر وہ مجھے کیوں نہیں کی۔  
”تم کہاں غائب ہوئی تھیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں  
میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نگاہ چراتے ہوئے آواز نکالی ”میاؤں!“  
میں نے واضح طور پر محسوس کیا، ڈارلنگ مجھ سے نگاہ نہیں  
ٹاڑتی تھی شاید اس لیے کہ وہ مجھ سے نگاہی ملاپ کے نتائج  
دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے اسرار تک پہنچ  
پاؤں۔ دو گھنٹے قبل جب میں نے اسے اپنے ٹرائس میں لانے  
کا آغاز کیا تھا تو ڈارلنگ نے حتی المقدور مزاحمت کا مظاہرہ کیا  
تھا۔ وہ تو ”جی“ کی قوت نے میرا ساتھ دیا اور میں اسے اپنے  
دام میں لانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا اور نہ ڈارلنگ  
ملاش کے کسی کی نہیں تھی۔

میں نے اسے پکارتے ہوئے زبان سے کہا ”ادھر آؤ  
میرے پاس!“

وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرائی اور میز پر سے اچھل کر  
بیڈروم کے دور افتادہ کونے میں پہنچ گئی اور میری سماعت سے  
اس کی مائوس آواز نکالی ”میاؤں!“

آج وہ مجھ سے دور بھاگ رہی تھی، میری پکار پر دودڑی  
چلی آئے والی کٹر اکرا فاصلہ بڑھا رہی تھی مگر اس کے فرار اور  
گریز میں تاخر مانی یا سرکشی کا شائبہ کچھ نہیں تھا بلکہ اس کی ان  
انگلیوں میں مزاحمت میں شوشی تھی جیسے وہ ناز و عشوہ دکھا کر اپنا  
بھاد بڑھا رہی ہو۔ اس وقت وہ کی شریر اور دل پذیر بیوی سے  
کم نظر نہیں آتی تھی۔

میرا پورا بدن محسوس اور نیند سے چور ہو چکا تھا۔ پچھلے  
اڑتالیس گھنٹوں میں مجھے آرام کرنے کا کوئی منقول موقع نہیں  
ملا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو نیند کی دیوی کے حوالے کر  
دیتا، ڈارلنگ نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

میں اس کی ”میاؤں“ پر انھر کر بیٹھا تو وہ فلتانیں بھرتی  
ہوئی ایک پردے کے پیچھے چھپ چکی اس کے انداز میں ایک کھلا  
چٹخ تھا کہ کچھ کی، اف یو مین! ڈارلنگ اس وقت مجھے مشہور  
انگریز شاعر رابرٹ براؤننگ (Robert Browning)  
کی محبہ بن گئی۔ موصوف کا اپنی محبہ سے عشق کا بیڑ حصہ بردوں  
کی ادب پر مشتمل ہے۔ پردے کے پیچھے کچھ کی ڈارلنگ کو  
چھین نہ آیا اور وقفہ وقفے سے اس کی ”میاؤں، میاؤں“  
جاری رہی مگر میں اس کی چال میں نہ آیا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے  
دوڑانے کے موڈ میں تھی۔ میں اس قسم کی خواری کے بعد اسے  
پکڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ بلی کو زبردستی پکڑنے والوں  
کے انجام سے میں واقف ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا، جج فرید  
پاشا کے سامنے مجھے جواب دہ ہونا پڑے۔ وہ میرے طبعے اور  
حشر کو دیکھ کر پوچھ سکتا تھا ”وہ جان! یہ تو بتاؤ، تم نے بلی پکڑی  
کیسے؟“

میں نے ڈارلنگ اور اس کی ”میاؤں، میاؤں“ کو  
نظر انداز کر دیا۔ یہ بات یقین کی طرح میرے دل میں بیٹھ گئی  
تھی کہ وہ مجھے جھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ جب اسے میرے  
قریب یا آس پاس ہی رہنا تھا تو پھر کسی اور مناسب موقع پر  
اسے ٹرائی کیا جا سکتا تھا۔ فی الحال نیند پوری کرنا اور محسوس اتارنا  
زیادہ ضروری تھا۔

میں نے چند گہری سانس لے کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا  
پھر اپنے دماغ کو ہدایت دی۔ ”میں نہایت ہی پرسکون، مٹی  
اور گہری نیند سوؤں گا اور جب تک میں ذہنی و جسمانی طور پر  
فریش نہیں ہو جاؤں، سو تا رہوں گا البت اگر اس بیڈروم اور اس  
کوٹھی میں، میری نیند کے دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش



آنے کے اسباب نمودار ہوئے تو میری آنکھ فوراً کھل جائے گی۔“

میں سونے سے قبل اپنے دماغ کو مخصوص قسم کی ہدایات دینے کا عادی تھا اور میرے دماغ نے بھی نا فرمانی نہیں کی۔ دماغ اور جسم کے مختلف حصوں کو ترغیبات (Suggestions) اور ہدایات (Instructions) دینے کا طریقہ کار مجھے ماسٹر بینک پائی نے سکھایا تھا۔ ماسٹر بینک پائی لوگا اور مارشل آئرس کا تہمتی تھا۔ میں نے اس شخص سے جو کچھ سیکھا وہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

محکم اور نیند کے خزانے میرے جسم اور دماغ کو سونے کے لیے پہلے ہی ہموار کر رکھا تھا اس لیے ”ہدایات“ کے اختتام پر میں نیند کی حسین و پرکشف داوی میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن قبل از دو پہر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک طویل انگڑائی لے کر بدن کو کھینچا پھر آہستہ آہستہ تاذم کرتے ہوئے نارمل حالت میں آ گیا۔ اسی وقت دیوار گیر کلاک پر میری نظر پڑی۔ کلاک کے ڈائل پر ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے کم از کم آٹھ گھنٹے کی نیند لی تھی۔ اگرچہ یہ صبح شہ نیند کا ازرا تو نہیں تھا تاہم اس بھر نیند کے بعد میں خود کو ہلکا چھلکا اور فریض محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور بیڈ سے اترنے لگا تو مجھے اپنے پاؤں کے قریب پھیلے سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ سیکڑے کے برادر میں مجھے ایسے اندازہ ہو گیا کہ نیچے فرش پر میرے پاؤں کے پاس ڈارلنگ موجود تھی۔ وہ گویا سبیر ز سے لگی تھی میرے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے گداز لسنے میرے وجود میں گدگد کی جگہ دی۔ میں نے جبکہ کر ڈارلنگ کو بازوؤں میں اٹھایا پھر گود میں لے کر پیار کیا۔ میرا شفقت بھرا ہاتھ اس کے بدن پر مخصوص حرکت کرنے لگا تو وہ آنکھیں موند کر شانت ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے فرش پر چھوڑ دیا۔

وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے بیڈروم کے داخلی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے اس کی فطری ضروریات کا احساس کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا، وہ بچپاک سے باہر نکل گئی۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ کر دوش روم میں گھس گیا۔

آدمے کھٹے بعد جب میں فریش اپ ہو کر دوش روم سے نکلا تو فرید باشا بیڈروم میں موجود تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ فراخ دلی سے مسکرایا اور دوستانہ انداز میں بولا۔

”ودھان! اگر چہ صبح کو کڑے ہوئے کافی وقت بیت

کیا ہے مگر مجھ بھی میں بھی کہوں گا، گنڈارنگ!“

”مارنگ پاشا صاحب!“ میں نے جواں کہا۔

”تمہارے چہرے سے لگتا ہے، نیند اور محکم کو تم کبھی دور دھکیل آئے ہو۔“

”کوشش تو یہی کی ہے۔“ میں نے کہا پھر وہی اعلا میں پوچھا ”کیا خبریں ہیں؟“

”خبریں خاصی گرما گرم ہیں۔“ وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”آپ کا انداز بتا رہا ہے، آپ کے پاس میرے لیے کوئی خاص خبر ہے۔“

”خبر نہیں، خبریں ہیں۔“ وہ بے یقینان خیر لہجے میں بولا ”م تم بچے چلو، پھر پتا چلے گا، کسی کسی خبر تمہاری خطرہ نشینی ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے جلدی سے اضافہ کیا ”اور ہاں، وہ تمہاری لاڈلی بی بی بھی مجھے تھوڑی دیر پہلے نظر آئی تھی۔ میں نے اسے دیوار پھلانگ کر باہر جاتے دیکھا ہے۔“

”ڈارلنگ نے رات میرے ساتھ بیڈروم میں گزاری ہے۔“ میں نے شوز پہنتے ہوئے سرسری انداز میں کہا ”وہ رات جیسے اچانک غائب ہوئی تھی دیے ہی ظاہر ہو گئی۔“

”ودھان! تمہاری ڈالنگ بڑی حیرت انگیز بی بی ہے!“ فرید پاشا نے کہا۔

میں نے اس کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پوچھا ”پاشا صاحب! آپ کی دانف کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”ایک دم نارمل۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا ”نالکہ بڑی بہت دالی ہے۔ بحرانی صورت حال نے اسے وقتی طور پر زدن کر دیا تھا مگر اب سب ٹھیک ہے۔ وہ تمہاری بے حد شکر گزار ہے اور ڈاننگ ٹیمبل پر تمہارا انتظار کرنے والوں میں وہ بھی شامل ہے۔“

”تمہا مطلب!“ میں اس کی بات سن کر چونکا ”کیا کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود ہیں؟“

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ منہ سے کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا۔

میں نے پوچھا ”وہاں اور کون کون ہے؟“

”نیچے چل کر خود ہی دیکھ لو یا۔“ وہ بے تکلفی سے بولا

”اب کیا میں ساری ”اسٹوریوں“ تمہیں سنیں سادوں۔ کچھ باتیں لوکیشن اور سیٹ کے لیے بھی رہنے دو۔“

میں سمجھ گیا وہ مجھے کس قسم کا سربراہ بنا چاہتا تھا اسی لیے کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے گریہ نامناسب نہ سمجھا اور اس کی معیت میں زینہ اترتے ہوئے پوچھا ”کیا

آپ لوگوں نے بھی ابھی تک ناشائیں کیا؟“

”یار ودھان! تم بھی بعض اوقات عجیب سوال کرتے ہو۔“ پاشا نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”میں میرا بن ہوں، یہاں سے پہلے کیسے کہانی کہتے ہیں؟“

میں نے اس کے مذاق کو مذاق ہی سمجھا اور زیریں منزل پر چلا آیا۔ ڈاننگ روم میں طویل دیر بیٹھ میز پر الواع و اشام کی کھینچ موجود تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پاشا کی بیوی نالکہ بھی وہاں پہنچی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی رات والے دانف پر اس نے میرا شکر یہ ادا کیا۔

میں نے کہا ”بھائی! آپ کے یہ شو بہرام نام دار پہلے ہی مجھے اس قدر شرمندہ کر چکے ہیں کہ اب حریف شکر بے کی کھینچنا کٹ

ہانی نہیں۔“ ”آپ کو معاش کھانا ہو گی۔“ وہ قطعیت سے بولی

”میں آپ کا شکر یہ ادا کیے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ یہ شکر یہ اپنے دل سے قبول کر لیں۔ دل میں معاش ہو تو دنیا جہاں کی چیز ہیں اس میں سانس نہیں۔ میرا یہ چھوٹا سا شکر یہ کیا معنی رکھتا ہے۔“

”آپ نے مجھے لا جواب کر دیا بھائی!“ میں نے ددل سے کہا ”میرے دل میں بے پناہ وسعت ہے۔ میں آپ کے لاکھوں کروڑوں شکر یہ وصول کرنے کو تیار ہوں۔“

فرید پاشا نے کہا ”ایسی باتیں کرنے میں نالکہ کا جواب نہیں۔ یہ بڑی حاضر جواب ہے۔“

”میری نظر میں یہ خود بھی لا جواب ہیں!“ میں نے نالکہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ پتا نہیں، میری تعریف نے کس طور اس پر اثر کیا تھا۔ میں نے فرید پاشا کی طرف رخ پھرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

”آپ تو کہہ رہے تھے، ڈاننگ ٹیمبل پر کچھ اور لوگ بھی میرے ختہر ہیں۔“ میں نے استفسار یہ انداز میں کہا ”مگر یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا۔“

”ابھی نظر آ جائے گا۔ تم ذرا۔۔۔۔۔“

فرید پاشا کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ گھر کیلے ملازمہ اللہ رکھی دو جانی بچی مستیوں کو لے کر ڈاننگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ صدف اور نادہ تھیں۔ میں انہیں وہاں دیکھ کر چونکا ضرور مگر اس پر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ صدف ایسی سنہ زور اور تر لڑکی تھی کہ وہ ہمیں بھی کھینچ سکتی تھی۔ اللہ رکھی انہیں وہاں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

ممارے درمیان ”ہیلو ہائے“ کا تبادلہ ہوا اور وہ دونوں

کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ فرید پاشا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ودھان! یہ تمہاری دوست صدف سے تین مرتبہ فون کر چکی ہے۔“ اس کا اشارہ صدف کی طرف تھا ”میں نے ہر بار اسے یہی بتایا کہ تم سو رہے ہو اور یہ واقعہ بھی ہے پھر تھوڑی دیر پہلے یہ اپنی کرن کے ساتھ خود یہاں چلی آئی۔ میں نے انہیں ڈارلنگ روم میں بٹھا کر انتظار کرنے کو کہا کیوں کہ تم اس وقت دوش روم میں تھے اور اب۔“ اس نے ذرا توقف کر کے ان کی طرف دیکھا اور بولا ”تمہارا انتظار کرنے والیاں تمہارے سامنے ہیں لہذا ہمیں ناشائیں مانچ مانچ ناشائیں شروع کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔“

”انکل! ہم بھر پور ناشائیں کر کے آئے ہیں۔“ صدف نے فرید پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس لیے آپ کے ساتھ صرف جائے چلی۔“

میں اس وقت بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فرید پاشا نے تھوڑی دیر پہلے مجھے ودھان کے نام سے مخاطب کیا تھا گویا، صدف کے یقین کو حریف چیلنج حاصل ہو گئی تھی۔ پھر پاشا نے صدف کو میری دوست کہا تھا۔ یہ بی بی یقیناً صدف ہی نے پاشا کو پڑھائی ہو گی۔ پتا نہیں، اس دوران میں اس قیامت ٹوڑی نے کیا کیا حشر برپا کیے ہوں گے۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پاشا نے کہا۔

”ودھان! تم کہاں گم ہو گئے۔ کھانا شروع کر دو۔ کیا بچ

کودڑ کے ساتھ ملانے کا پروگرام ہے!“

آدمے کھٹے بعد ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو جائے کا دور چلا۔ اس دور کے لیے ہمیں نالکہ کے مشورے پر عمل کرنا پڑا۔ اس کی خواہش تھی، ہم سب ڈارلنگ روم میں بیٹھ کر

چائے پیئیں۔ اس طرح وہ یہ چاہتی ہو گی، میں آنے والیوں سے زیادہ کل کر بات کر سکوں گا۔ اس کا ثبوت اس نے اس طرح دیا کہ خود کسی کام کے بہانے غائب ہو گئی۔

چائے کی پیالی خالی کرتے ہی پاشا بھی اٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا ”ودھان! تم لوگ کب شب لگاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ مجھے چند ضروری فون کرنا ہیں۔“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ ہمیں بات چیت کا موقع دینے کے لیے وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ اس کے جانے ہی صدف میری طرف متوجہ ہو گئی۔

”ودھان! گزشتہ رات اس کوئی میں اتنا بڑا واقعہ پیش

آ گیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں جب کہ اس دانفے کے

کرداروں میں سکندر بھی شامل تھا؟“

میرے سینے سے ایک بوجھل سانس خارج ہوئی ”تو  
 جنہیں سب پتا چل گیا!“

”مجھے فریڈ اگل نے اس افسوس ناک واقعے کے  
 بارے میں مختصر بتایا ہے۔“

”انہوں نے تمہیں اور کیا کیا بتایا ہے؟“ میرے انداز  
 میں بیزاری تھی۔

”وہ چٹکی لیتے ہوئے بولی ”میں نے جو پوچھا، انہوں نے  
 بتا دیا۔“

”یہ خاصی خطرناک صورت حال تھی۔ صدف سے مزید  
 گفتگو کرنے سے پہلے پاشا کو بچ کرنا ضروری تھا۔ میں نے  
 صدف کو اپنی سوچ سے آگاہ نہیں ہونے دیا اور اسے باتوں  
 میں لگاتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ سوچنے لگا۔“

”ہاں صدف، یہ ایک اتفاق ہی ہے۔“ میں نے کہا  
 ”سکندر، فریڈ پاشا کا دشمن نکل آیا۔ سکندر کے چچا رانا عظمت  
 سے پاشا کا کوئی تنازع چل رہا ہے۔ نالہ کا نا کامیاب اغوا  
 اسی تنازعہ کی ایک کڑی تھی۔“

پھر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا  
 جیسے اچانک مجھے کوئی نہایت ہی اہم بات یاد آگئی ہو۔ میں  
 نے بڑی سرعت سے اٹھتے ہوئے کہا ”ایسکیو زی! میں ابھی  
 آیا۔“

پھر اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھ سے  
 سوال کرتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، میں ڈرائنگ روم سے نکل  
 آیا۔ چند لمحات بعد میں فریڈ پاشا کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے  
 حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”کیا ہوا وجدان! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے  
 ہو؟“

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے مبہم انداز میں  
 کہا ”آپ نے صدف کو میرے بارے میں کیا بتا دیا ہے؟“

میں نے اس سے پوچھا۔  
 ”ہمارے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ میری  
 کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولا ”تم کل تھے، یہاں آنے سے  
 پہلے فون پر مجھے بتایا تھا کہ اپنے خیر خواہ ڈی ایس پی اورنگ  
 زیب خان کی کوٹھی پر ہوا روڈز کے بعد آؤ گے پھر رات والے  
 واقعے کے بعد تمہاری زبانی مجھے پتا چلا کہ کل جب تم صدف  
 اور نادیہ کے ساتھ مال روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے  
 تو سکندر سے تمہاری خوب باراماری ہوئی تھی۔ میں تو یہی سمجھا  
 کہ صدف وغیرہ تمہارے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔“ وہ  
 ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رک پھر بات جاری رکھتے

ہوئے بولا۔

”تمہاری نیند کے دوران میں جب دو تین مرتبہ  
 تمہارے لیے صدف کا فون آیا اور اس نے اپنے قہار  
 کے ذیل میں بتایا کہ وہ تمہاری دوست ہے تو میں نے اسے  
 تمہاری دوست ہی سمجھا اور اسی حوالے سے، اس کی یہاں آؤ  
 پر میں نے انہیں فریڈ کیا ہے۔ یہ تو ان سے بات چیت کے  
 بعد مجھے معلوم ہوا کہ نادیہ، صدف کی کرن اور ڈی ایس پی کی  
 بیٹی ہے۔ ہمارے درمیان اب تک نارمل انداز میں گفتگو ہو  
 رہی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ کیا کوئی بڑا بد  
 گئی ہے۔“

”ابھی تک تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی پاشا صاحب! ہم  
 نے تامل کرتے ہوئے کہا ”لیکن کوئی بھی بڑی گڑبڑ ہو  
 ہے۔ آپ یہ بتائیں، نارمل انداز میں آپ لوگوں کے  
 درمیان کس قسم کی باتیں ہوئی ہیں؟ خاص طور پر صدف نے  
 آپ سے اور آپ نے صدف سے کیا کہا ہے؟“

”کچھ بات تو یہ ہے کہ مجھ سے صدف ہی نے گفتگو  
 ہے۔“ وہ فہمیری ہوئی آواز میں بولا ”نادیہ نے تو مجھے اپنے  
 ہونٹوں پر خاموشی سجا رہی ہے۔ اس کی حیثیت مجھے شامل ہوا  
 سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔“ ایک لمحے کا توقف کرنے کے  
 بعد وہ دوبارہ گویا ہوا ”صدف سے بھی کوئی خاص بات نہیں  
 ہوئی۔ اس نے فلم انڈسٹری اور گاؤں کا ماحول دیکھنے کی  
 خواہش ظاہر کی۔ وہ فلم کی شوٹنگ اور دیہات کے فطری ماحول  
 کو دیکھنے کی شائق ہے اور مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس  
 سلسلے میں اس سے تعاون کروں۔“

”پھر آپ نے کیا کیا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے پاشا کو  
 دیکھا۔

”وہ جزیب ہوتے ہوئے بولا ”میں کیا کہتا وجدان! ظاہر  
 ہے فلم انڈسٹری اور گاؤں دیہات کی سیر میری رہائی تھی  
 ہے۔ میں تمہاری دوست کو کیسے انکار کر سکتا تھا۔ میں نے  
 صدف سے وعدہ کیا ہے، اس کی خواہش پوری کرنے کی ضرور  
 کوشش کروں گا۔ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا  
 ”آپ نے اسے یہ تو نہیں بتایا کہ میں کل ”رکھال دالی“ روڈ  
 ہونے والا ہوں، میرا مطلب ہے، میں آپ کے گاؤں سے  
 پور جانے والا ہوں؟“

”نہیں، ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔“  
 قطعیت سے بولا پھر پوچھا ”وجدان! میں ابھی تک تمہاری  
 صدف کی دوستی کو کسی مروجہ خانے میں فٹ نہیں کر پایا ہوں۔“

تمہاری حالت پوچھنا تھا۔ تم اندازہ ہوتا ہے، تم صدف پر زیادہ  
 بھروسہ نہیں کرتے؟“

”پاشا صاحب! کچھ بات تو یہ ہے کہ میں خود ابھی تک  
 صدف نے بارے میں کتنی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔“ میں  
 نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”اس کی حیثیت  
 میرے ایک دوست کی سی ہے لیکن میں اپنے نجی معاملات اس  
 سے شریک نہیں کر سکتا۔ ہماری ملاقات کو چند روز سے زیادہ عرصہ  
 نہیں ہوا۔ میں نہیں چاہتا، اسے ساحل یا ”رکھال دالی“ کے  
 معاملات کی ہچک چڑی ہے۔“

”تم اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ وجدان!“ پاشا نے تسلی  
 آہ لے لے کر کہا ”تم ان دونوں سے نمٹ کر فارغ ہو جاؤ پھر  
 تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

میں نے ”ضروری باتوں“ کے ذکر پر چونک کر فریڈ پاشا  
 کو دیکھا، وہ میری سوالیہ نظر کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔  
 ”ان باتوں کا تعلق سیکورٹی گارڈ خادم حسین اور  
 چوہدری نواز علی سے ہے۔“

”سیکورٹی گارڈ اور چوہدری میں کیا تعلق ہو سکتا ہے!“  
 ”ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔“ وہ وضاحت کرتے  
 ہوئے بولا ”میرے پاس، تمہارے لیے ان دونوں سے متعلق  
 کچھ اہم اطلاعات ہیں۔“

میں فریڈ پاشا کے پاس سے دوبارہ ڈرائنگ روم میں  
 آئے گا تو ایک خیال کے تحت میں نے پاشا سے کہا ”اگر کل  
 میرا یہاں سے روانہ ہونا یقینی ہو جاتا ہے تو میرے جانے کے  
 بعد صدف آپ کے کان اور دماغ کھائے گی لیکن آپ کسی  
 بھی صورت سے میرے پروگرام اور عزائم کے بارے میں  
 نہیں بتائیں گے البتہ اگر ممکن ہو تو اسے ایک آدھ فلم کی شوٹنگ  
 دکھانے ضرور ملے گا میں۔“

”میں نے کہا نا، حیران معاملات کو مجھ پر چھوڑ دو۔ میں  
 صدف سے ہونے والی مختصر گفتگو اس کے ”منصوبہ جات“  
 کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ یار! میں ایک کامیاب فلم  
 پروڈیوسر ہوں۔ اعلیٰ کو آئی کے اداکاروں سے دن رات میرا  
 واسطہ رہتا ہے۔ میں نے فن کاروں کے کون کون سے رنگ  
 ڈھنگ نہیں دیکھے۔ طرح طرح کی کہانیاں اور ان کہانیوں  
 میں آنے والے عجیب و غریب موڈز پر میری نگاہ رکتی ہے۔  
 میں ایک چاول کو دیکھ کر دیکھ کر حال پتا کر سکتا ہوں۔ تمہاری  
 کہانی کے تمام گوشے مجھے پراشکار ہو چکے ہیں۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے معنی خیز انداز میں مجھے  
 دیکھا۔ اس کے دیکھنے میں بڑی خطرناکی پنہاں تھی۔ مجھے یوں

محسوس ہوا جیسے وہ اپنی نظر سے میرے دل و دماغ کی اسکیٹنگ  
 کر رہا ہو۔

میں نے محتاط انداز میں دریافت کیا ”مثلاً کون سے  
 گوشے؟“

”گھر اگے!“ وہ میری حالت کے پیش نظر ایک نیچا  
 قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”یار! تمہارا معاملہ تو کھلی کتاب کے  
 مانند ہے۔ یہ ایک ہیرو اور دو ہیروئن کی کہانی ہے۔ ہیرو ایک  
 ہیروئن کی تلاش میں دنیا جہاں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے جب  
 کہ دوسری ہیروئن اس کی توجہ حاصل کرنے اور اس کے دل  
 تک رسائی پانے کے لیے اس کا سایہ بننے کی کوشش میں ہے۔

ہیرو جیسے چاہتا ہے، وہ اس سے دور ہے اور جو ہیرو کو چاہتی  
 ہے، ہیرو اس سے دور بھاگتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“  
 اس کے سوال میں بڑی شدت تھی۔ میں کھلے طور پر انکار  
 نہ کر سکا اس لیے صرف اتنا کہا۔ ”پاشا صاحب! آپ کا خیال  
 بڑی حد تک درست ہے مگر میں کسی فلمی پچوٹیشن میں نہیں پڑنا  
 چاہتا میرے پاس اتنی فرصت نہیں۔“

”مگر لگتا ہے، صدف کے پاس بہت فرصت ہے۔“  
 ”یہ اس کا پاگل پن ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا ”وہ  
 ایک بے وقوف اور سرکشی ہوئی لڑکی ہے۔ پتا نہیں کیوں، میں  
 صدف کے لیے اس وقت خاصے سخت الفاظ استعمال کر بیٹھا  
 تھا۔ میں نے پاشا کو بتایا ”صدف میڈیکل کے فاضل انیر کی  
 اسٹوڈنٹ ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کے امتحانات ہونے  
 والے ہیں اور اس جنونی لڑکی کو اس نازک موقع پر ہم جوئی کی  
 سوجھی ہے۔“

پاشا زبردست مسکراتے ہوئے بولا ”وجدان! دل کے  
 معاملات میں انسان کو بہت دور کی سوجھی ہے۔ اہم اور غیر  
 اہم کے لیے اس کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل  
 کرنے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کر سکتا  
 ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد حتمی انداز میں بولا  
 ”نوٹ کرو وجدان! آگے چل کر یہ لڑکی تمہاری زندگی میں  
 بہت اہم کردار ادا کرے گی!“

”کیا آپ نے اس کا زائچہ کھینچا ہے یا اس کے ستاروں  
 کی چالیں تاپ کر بتا رہے ہیں؟“ میں نے نیم مزاحیہ انداز  
 میں کہا۔

وہ بڑے پر معنی انداز میں نفی میں گردن ہلاتے ہوئے  
 بولا ”وجدان! میں کوئی نجومی یا دست شناس نہیں بلکہ میں تو  
 صرف مردم شناس ہوں اور یہ بات میں اپنے تجربے اور  
 صدف کے تصور دیکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ اگر مجھے موقع ملا تو

میں اس کہانی پر ایک پرمٹ ضرور بناؤں گا۔  
”آپ تو ہر بات میں فلم کو لے کر آتے ہیں!“ میں نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا ”یار! میں فلم والا ہوں۔ میرے دن رات اسٹوڈیو میں گزرتے ہیں۔ میں اپنے پروفیشن سے باہر کیسے آ سکتا ہوں۔ یہ تو میرا دھننا چھوٹا ہے۔“ تھوڑی دیر تک کردہ بڑے غلیظانہ انداز میں بولا ”تم دیکھ لینا دھن! میرا تجربہ اور مشاہدہ سچ ہو کر رہے گا۔“

میں فریڈ پاشا کے پاس سے اٹھ کر صدف اور نادیہ کے پاس آ گیا۔ صدف جھٹ سے بولی ”تم ابھی شریف آدمی ہو۔ ہم یہاں تمہارے انتظار میں سو کر رہے ہیں اور تمہاری کچھ خبر نہیں۔ تم تو“ میں ابھی ”آپ“ کہہ کر گئے تھے اور پورے بیس منٹ بعد لوٹے ہو۔ کیا کوئی سے باہر کہیں چلے گئے تھے؟“

”ایسا ہی سمجھو۔“ میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا ”خیر، تم بتاؤ۔ کیسے آنا ہوا؟“  
”کیا تم سے ملنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

نادیہ نے کہا ”وہ جان! یہ سچ ہی ہے ادھر آنے کی ضد کر رہی تھی۔ میرے مشورے پر اس نے پہلے تمہیں فون کرنے کی کوشش کی۔ جب دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد تم سے رابطہ نہ ہو سکا تو ہم یہاں چلے آئے۔ اب تم خود ہی اس سے پوچھو، یہ تم سے کیا چاہتی ہے؟“

نادیہ کا آخری جملہ بڑا خطرناک تھا۔ میں صدف سے یہ پوچھنے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اس نے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک مجھے قدم قدم پر گڑبڑ اٹھاتا اور..... فریڈ پاشا کی پیش گوئی نے تو میرے کان تک پہنچ کر کھڑے کر دیے تھے۔

میں نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا ”یہ اپنی زبان ہی سے بتا دے تو اچھا ہے۔ میں نے اگر کچھ کہا تو پھر وجہ اور دھن! کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔“

”وہ جھگڑا تو ختم کیا دھن! اور“ صدف نے بڑے قفاخر سے کہا ”تمہارے دھن! ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ دھن! دھن! جو پنکشنی واقع ہے پور (انڈیا) میں پنڈتوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا رہا ہے۔“

”پھر کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے جلدی سے کہا ”وہ وجہ اور دھن! پر تمہارا تھیس مکمل ہو گیا۔ تائیں تائیں نش۔ اب میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟“

وہ جواب دینے کے بجائے بڑی لگاؤ سے بھری نظر سے دیکھ رہی۔ اس کے انداز نے مجھے ایک بے نامی جھجکاؤ پیدا کر دیا۔ نادیہ نے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

”وہ جان! بات دراصل یہ ہے کہ جب سے صدف فریڈ اگل کے بارے میں سنا ہے، اسے ایک ضدی ہو کر اور تم کو جاننے ہو، یہ قطعی ضدی ہے!“

میں نے حیرت آمیز نظر سے صدف کو دیکھا ”کس قسم کی ضد؟“ وہ اب بھی خاموش رہی، نادیہ نے کہا ”بات اس قدر کہ یہ فلم کی شوٹنگ اور خاص طور پر دیکھنے والے تجربہ کار اپنی نہیں چاہئے گی۔“

”یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے اتنی بے جا مظاہرہ کیا جائے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”میں صاحب سے سفارش کر دوں گا۔ وہ اسے کسی سین پر لے آئے گا۔“

”فلم کی شوٹنگ دکھا دیں گے، اسی طرح ان کے گاؤں جانے پر وگراں بھی بنایا جا سکتا ہے۔“

صدف بڑی مکاری اور خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مرتبہ نادیہ نے بولنے میں کچھ تاخیر کی تو صدف کو لب کرنا پڑی۔

”وہ جان! میں نے تو فلم کی شوٹنگ اور دیہاتی ماحول دیکھنے کا ارادہ تمہاری وجہ سے بنا دیا تھا۔ اب تم یہ کیا بے جا مظاہرہ کر رہے ہو۔ تم نے تو کہا تھا، تم اسی مقصد سے لاہور فریڈ اگل کے پاس آئے ہو۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ بولی ”اگر واقعی تم نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو ہم اپنے یہ دونوں شوق پورے کرنے کے لیے کوئی مشترکہ پروگرام بنا سکتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کا توقف کر کے ٹھانڈے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگی ”مگر تمہاری باتوں سے تو پتہ ہو رہا ہے جیسے تم مجھے دودھ کی گھی سمجھ رہے ہو اور فریڈ سے سفارش کر کے مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔ تم میرا ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتے۔“

میں نے اس کی شرارت آمیز جگہ شرانگیز باتوں کو سے سنا اور نہایت ہی غصے سے مجھے لہجے میں کہا ”وہ صدف! میں تمہیں دودھ کی گھی سمجھتا ہوں اور نہ کہاب بڑی۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا، کیا ساتھ بھی کوئی مشترکہ پروگرام نہیں بنا سکتا۔ مجھے اپنے ساتھ کچھ پتا نہیں ہوتا۔ میرے شام و دھرب، کہاں اور کس

اگر تم خواہ خواہ کی ضد سے باز آ جاؤ۔ اگر تم میں بس یہی فلم کی شوٹنگ دیکھنا چاہتی ہو یا کسی دیہات میں جا کر غریب ماحول کا نظارہ کرنا چاہتی ہو تو میں اس کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ یو، کیا کہتی ہو؟“

میں نے مجھے گہری اور دالہا نہ نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ مجھ کو بھی! پھر زبان سے شکست خوردگی کی اداکاری ہو، مجھ کو بھی! ”ٹھیک ہے دھن! تم میری ان دو کرتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے دھن! تم میری ان دو خواہشات کی تکمیل کے لیے فریڈ اگل سے سفارش کر دو، میں اس سلسلے میں تمہیں شک نہیں کروں گی البتہ!“

اس سلسلے میں تمہیں شک نہیں کروں گی البتہ!“

اس نے رک رک کر بڑی مٹی خیر نظر سے مجھے دیکھا۔ میں کچھ عرصہ کسی خاص قسم کی عیاری کے لیے پر تول رہی تھی۔ تھوڑے وقف کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”البتہ، ایک معاملے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہو گا۔“

”خاص تعاون!“ میں نے چونک کر اسے دیکھا ”یہ کس قسم کا تعاون ہوتا ہے؟“

اس نے مدبرانہ انداز میں بتایا ”خاص تعاون سے میری مراد ہے، ذاتی تعاون۔ میں ایک معاملے میں تم سے ذاتی طور پر مدد چاہتی ہوں۔ تمہاری الوالونٹ کے بغیر وہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

”جہیں ایسا کون سا مسئلہ پیش ہے؟“ میں نے ابھینا۔

زود انداز میں روپ کیا۔

وہ بولی ”میں تم سے کنگ فو (Kung-Fu) کی کچھ ٹیکنیکس سیکھنا چاہتی ہوں۔ تم خود ہی بتاؤ، گہری الوالونٹ کے بغیر یہ ممکن ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا۔ ”ابھی تو میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیا ہے لہذا کسی قسم کی انکسار ساز یا مشق کرنا مناسب نہیں۔ ایسا کرو، تم شام میں آ جاؤ۔ تم جو سیکھنا چاہو گی، میں تمہیں پرفیکٹ کر دوں گا۔ اور کوئی بات؟“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ”ایسا کیوں نہ کریں کہ تم ہماری طرف آ جاؤ۔ ماموں کے گھر کے نزدیک ہی ایک خوبصورت پارک ہے۔ میں جب بھی لاہور آتی ہوں، جا ملنگ اور ڈانک کے لیے اس پارک میں ضرور جاتی ہوں“ ریس کو رس پارک“ کا نظارہ تمہارے لیے یادگار ثابت ہوگا۔“

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا ”ٹھیک ہے، میں شام میں فون کر کے تمہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کر دوں گا۔“

اگر اور کوئی مصروفیت نہ ہوگی تو ہم پارک میں ملیں گے۔“ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گئی۔ میں اٹھ کر فریڈ پاشا کے پاس آ گیا۔

ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو صدف کے بارے میں ہوئی پھر میں نے پاشا کو یاد دلایا کہ وہ مجھے چند اہم باتیں بتانے والا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ملے ہوئے کہا۔

”ہاں یار! پہلی بات تو میں تمہیں خامد حسین کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔“

میں کوئی سوال کیے بغیر انتظار یہ نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ خامد حسین میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ میں نے گزشتہ رات کے واقعے پر بہت غور کیا ہے۔ تمہارا کہنا بالکل درست ہے آج میں اس کی چھٹی کر رہا ہوں۔ میں نے خامد حسین کی جگہ ایک دوسرے سیکرٹری گاڑ ڈالنا چاہتا ہوں۔“

”کیا خامد حسین کو یونی سوکھا سوکھا جانے دیں گے؟“

”کیا مطلب دھن!؟“

میں نے کہا ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پاشا صاحب! ایک شخص کی غداری اور نمک حرامی کے سبب آپ بہت بڑا نقصان اٹھانے والے تھے۔ اگر میں بر وقت مداخلت نہ کرتا تو وہ کچھ ہو جاتا جس کے لیے آپ کسی دوسرے کو تو کیا، شاید خود کو بھی کبھی معاف نہ کرتے۔ اس کا کامیاب واردات کی راہ ہموار کرنے والے کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں خامد حسین کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملنا چاہیے مگر انرا جرم کے بعد!“

وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر مشورہ طلب انداز میں بولا ”اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”یہ سلسلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“ میں نے کہا ”میں چٹکی بجاتے ہیں اس کی زبان کھولوں گا۔ آپ یہ بتائیں، اس کوئی میں کوئی نہ خانہ و غیرہ بھی ہے؟ کوئی ایسی جگہ جہاں پیدا ہونے والا شور شرابا ایک سمجھ دو اور خصوص جگہ سے باہر نہ آ سکے؟“

اس نے ابھینا زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ”دھن! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”آپ فکر مند نہ ہوں پاشا صاحب!“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ صرف یہ بتائیں، آپ مجھے میرا مطلقہ مقام مہیا کر سکتے ہیں؟“

”ہاں، ایسی جگہ کا بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا ”مگر.....“

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ”پاشا صاحب! اس سلسلے میں آپ اپنے ذہن کو نہ الجھائیں۔ اللہ آج کی رات خادم حسین کا مجید آپ پر عیاں ہو جائے گا۔“

وہ متذبذب نظر سے مجھ سے دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا ”رات آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی کو یہ پاشا سے فون پر بات کریں گے۔“

افرنٹری میں، میں تو اس بارے میں آپ سے پوچھنا ہی بھول گیا۔ جب تک مجھے ”رکھاں والی“ کی خبر نہیں مل جاتی، میں آئندہ کالاکل نہیں بنا سکتا۔ کل ”سید پور“ روانگی بھی اس سے مشروط ہے؟“

”یار! اصل میں تو میں جہیں نوید ہی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔“ فرید پاشا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ”خادم حسین کا ذکر ضناً آ گیا۔ میں نے رات جہیں ”شب بخیر“ کہنے کے بعد سید پور فون کیا تھا۔ نوید سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آج دو بجے کے بعد وہ مجھے فون کر کے تازہ ترین اطلاعات فراہم کرے گا۔ اس کے بعد ہم کوئی عملی اقدام اٹھانے کے بارے میں شیڈول بنائیں گے۔“

میں نے اپنی رستہ واضح پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”مسوودہ تو ج رہے ہیں۔“

”نوید نے دو درجن کے درمیان فون کرنے کو کہا تھا۔“ فرید پاشا کی بات ختم ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تیسری گھنٹی پر پاشا نے ریسیور اٹھالیا ”ہیلو“ کے جواب اور تبادلے کے بعد تھوڑی سی رکی ٹلیک سلیک ہوئی پھر پاشا نے باؤتھ میں ہر ہاتھ رکھ کر مجھے بتایا ”نوید کا فون ہے۔“ اس کے بعد وہ دوسری جانب گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

میں پاشا کے سامنے بیٹھا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف نہ گفتگو بھی میری ساعت تک پہنچتی رہی۔ چند لمحات کے بعد پاشا نے ایک مرتبہ پھر باؤتھ میں ہر ہاتھ سے ڈھانپا اور مجھ سے انتظار کیا۔ ”وعدان! اکل دوپہر کو رکھاں والی، چوہدری نواز علی کی حویلی میں ایک غیر ملکی لڑکی کو پہنچایا گیا ہے۔ چوہدری کا بیٹا فیصل بھی اس کے ساتھ ہی پہنچا ہے۔ نوید کی اطلاعات کے مطابق، اس لڑکی کا تعلق چائینائی تھائی لینڈ سے ہو سکتا ہے۔ مگر تم تو کہہ رہے تھے، تمہاری ساسی کا نام ساحل ہے۔ کیا ساحل

کو.....“

میں نے اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اصرار انداز میں کہا ”ہاں، وہی لڑکی میری ساحل ہے۔“

پاشا نے پوچھا ”کیا ساحل کا تعلق پاکستان سے نہیں ہے؟“

”اس کا تعلق درحقیقت نیپال کے ایک گاؤں سے ہے۔“ میں نے بتایا ”مجھ سے وابستہ ہونے سے قبل اس کا نام دھوتھا۔ میں نے اس کا نام تبدیل کر کے دھوتھ سے ساحل دیا۔ وہ اپنے نقش و نگار سے تھائی لائی جتنی لگتی ہے۔“

ساحل کے سراغ نے مجھے یکدم بے گل کر دیا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا، ساحل کو چوہدری نواز علی کی حویلی میں پہنچایا جائے گا۔ اب نوید کی فراہم کردہ اطلاع کے بعد میں عین افسوس کے درجے کو پہنچ گیا تھا۔ میرا بس چلنا تو میں کمال فرصت میں اڑ کر ساحل تک پہنچ جاتا۔

مجھ سے تصدیق کے بعد پاشا اپنے چھوٹے بھائی سے ٹیلی فونک بات چیت میں مصروف ہو گیا تھا۔ لگ بھگ پانچ منٹ کی مزید گفت و شنید کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے کہا۔

”وعدان! نوید آج رات کسی وقت یہاں پہنچ رہا ہے۔ کل صبح تم اس کے ساتھ سید پور روانہ ہو جانا۔ آج رات یہ تینوں ٹی کر بمبر پور میننگ کریں گے۔ اگر میری ضرورت ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

میں نے کہا ”ساحل چوہدری کی حویلی میں پہنچ گئی ہے۔ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس تصدیق کے بعد میری حیرت کا قہقہہ ہو گیا۔ میرا خیال ہے، آپ کو ہمارے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں آئے گی۔ ویسے بھی آپ کی بہانیاں موجود زیادہ ضروری ہے۔ تاہم بھائی ذاتی طور پر منتشر ہو گئی ہے۔ گزشتہ رات والے واقعے نے اسے اچھا خاصا متاثر کیا ہے۔ اگرچہ وہ خود کو بہت سنبھلا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پوری طرف سنبھلنے میں بھائی کو کچھ وقت لگے گا۔“

”ہاں، وعدان! میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”دیے آگئے تمہارے ساتھ سید پور جانا پڑا تو میں تاہم کبھی اپنے ہمراہ نہ کر جاؤں گا۔ اسے کسی بھی قیمت پر یہاں اکیلا نہیں چھوڑا سکتا۔“

پھر ہمارے درمیان موجود صورت حال پر بات چیت ہونے لگی۔ اسی گفتگو کے دوران میں پاشا نے مجھ سے ”وعدان! تم چوہدری نواز علی کے بیٹے فیصل کے بارے

میں نے جواب دیا ”پچھلے دنوں

کراچی میں اس کا ذکر نہ سننے میں آیا تھا۔ وہ چوہدری کے ایک خاص کارندے میاں زاہد حسین سے ملنے وہاں گیا تھا۔“

فیصل کے بارے میں مجھے سب سے پہلے ڈیفنس سوسائٹی کے بنگلے ”بی تھری ایٹ“ میں پتا چلا تھا۔ گھر سے پیارو والے یعقوب عرف قہار کی مرمت کے دوران میں اس نے انکشاف کیا تھا کہ ان دنوں، رکھاں والی سے چوہدری نواز علی کا بیٹا فیصل کراچی آیا ہوا ہے۔ ازاں بعد، جب ساحل اور میناز کو بہادر آباد چوری سے اغوا کیا گیا تو مجھے خبر ملی، اغوا کے بعد خواہش گان کو نیپا چوری کے نزدیک ایک بنگلے میں پہنچایا جائے گا۔ میں نے جب اس بنگلے کا حدود وار بصرہ ”ناپے“ کی کوشش کی تو انکشاف ہوا، وہ لوگ کشمیر روڈ والے ایک بنگلے میں محفل ہو گئے تھے۔ وہیں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا، فیصل اور اس کے حواریوں نے فٹن والے بنگلے میں رات گزاری تھی۔ اس سے زیادہ میں فیصل کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ میاں زاہد حسین کو جنم رسید کرتے وقت میں یہ نہ پوچھ سکا کہ ساحل کو کن لوگوں کے ہمراہ کراچی سے رکھاں والی روانہ کیا گیا تھا۔ میرا اپنا قیاس تھا، یہ مشین فیصل کی عمرانی میں انجام دیا گیا ہوگا..... اور اب نوید کے فون سے میرے اس قیاس کی تصدیق کر دی تھی۔ فیصل کا ساحل کے ساتھ رکھاں والی پہنچایا ظاہر کرتا ہے، ساحل کو مجھ سے جدا کرنے کی تمام تر ذمہ داری فیصل پر آتی تھی۔

مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر فرید پاشا نے کہا ”اس کا مطلب ہے، تم فیصل کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے جس طرف میرا اشارہ ہے۔“

”آپ کا اشارہ کس طرف ہے پاشا صاحب؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تمہارے اس سوال کا جواب میں ضرور دوں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا!“ فرید پاشا نے سختی سے منظر سے مجھے دیکھا۔

”کیا وعدہ؟“ میرے لہجے میں الجھن تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، تاہم نکلنے وہاں آ کر کہا ”اگر آپ لوگ پسند کریں تو چائے کا ایک اور دور چلایا جائے؟“

میں نے کہا ”بھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو چائے پی ہے۔“

فی الحال اس کی طلب نہیں۔“

”یار! تم بھی کمال کرتے ہو۔“ پاشا اپنے مخصوص یار

پاشا انداز میں بولا ”چائے تو ہم نے آدھا گھنٹا پہلے ہی پی چکی۔ کیا وہ اب تک پیٹ میں رکھی ہو گی۔ پانی اور دیگر مشروبات دس پندرہ منٹ بعد معدے سے رخصت ہو جاتے ہیں اس لیے چائے کا دور چلانے میں کوئی حرج نہیں۔“

میں نے زیادہ ضد نہیں کی اور جب نائلہ زہرا لب مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تو میں نے اپنی تمام تر توجہ پاشا کی جانب مبذول کر دی۔ وہ میری نگاہ میں پوشیدہ سوال کو سمجھتے ہوئے بولا۔

”دیکھو وعدان! ہمارے درمیان قائم ہونے والی رفاقت کو لگ بھگ سترہ گھنٹے گزر گئے ہیں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں، تم ابھی تک کثف سے کام لے رہے ہو!“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا پاشا صاحب!“

”ہات بے وعدان! کہ تمہارے منہ سے بار بار ”پاشا صاحب“ کا نکلنہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ فرید پاشا دوستانہ انداز میں بولا ”جب میں تمہیں بے تکلفی سے وعدان کہتا ہوں تو تم بھی مجھے فرید یا فرید پاشا کہتے ہو۔ یہ ”صاحب“ کا دم چھلا لگانا کیا ضروری ہے؟“

”اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“

”ہاں ناپار!“ وہ خوش دلی سے بولا ”ہمارے درمیان اعتماد اور دوستی کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ اگر ہم بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو مخاطب کریں تو زیادہ مزہ آئے گا۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے شرارت آمیز انداز میں اضافہ کیا ”اس انداز سے مجھے ایک بڑا فائدہ بھی حاصل ہوگا۔“

میں نے جب اس سے حاصل ہونے والے فائدے کے بارے میں استفسار کیا تو وہ خود ہی بتانے لگا۔

”یار! جب تم مجھے پاشا یا فرید کہہ کر مخاطب کرو گے تو میں سمجھوں گا، تمہارے ہی بیج کا ہوں۔ اس بیج (Badge) میں آتے ہی میری عمر کم از کم آدھی ہو جائے گی۔ خود کو یک مین محسوس کرنا بڑا مسرور کن ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے مسٹر پاشا!“ میں نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا ”میں آئندہ تمہیں خوشی دینے کا کوئی موقع ضائع نہیں کروں گا۔“

”یہ ہوئی ناپات!“ وہ غرور لگاتے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”اب واپس تم وہیں آ جاؤ جہاں سے ہماری گفتگو نے رخ موڑا تھا۔ تم مجھے فیصل کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے!“

”ہاں فیصل۔“ وہ پڑھتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا  
”شاید تمہیں نہیں معلوم، فیصل بھی تمہاری طرح مارشل آرٹس  
”ہے۔“

”مجھے واقعی یہ بات معلوم نہیں۔“ میں نے کہا ”میرے  
لپے تو یہ خوشی کا مقام ہے کہ میرے دیرینہ دشمن کا بیٹا مارشل  
آرٹس سے واقف ہے۔ فیصل سے دودو ہاتھ کرنے میں خوب  
لطف آئے گا۔“

فرید پاشا نے بتایا ”چوہدری نواز علی کی صرف دو  
اولاد دیں ہیں۔ سولہ سالہ صاعقہ اور اٹھارہ سالہ فیصل۔ فیصل  
نے یہاں لاہور ہی کے ایک مارشل آرٹ کلب سے یہ فن سیکھا  
ہے۔ اور بیرون ملک بھی جا چکا ہے۔ میری معلومات کے  
مطابق وہ بلیک بیلٹ سیکنڈ ڈان ہے۔“

”وہ ڈرٹل!“ میں نے اپنے وجود میں سنبھل کر کہنے  
ہوئے کہا ”فیصل سے سامنا یقیناً یادگار کی حیثیت حاصل کر  
لے گا۔ پاشا! تمہارے بیان سے میں نے دو اندازے لگائے  
ہیں۔ نمبر ایک، تمہارے شہر میں اچھے مارشل آرٹ سینٹرز  
موجود ہیں۔ نمبر دو، چوہدری نواز علی کا نہایت درگاہی یہاں بھی  
خاسا فعال ہے!“

بات فہم کرتے ہی مجھے احساس ہو گیا، پاشا کے سامنے  
نہایت درگاہی کا ذکر کرنا مناسب نہیں تھا۔ ابھی تک ہمارے  
درمیان چوہدری نواز علی کی اسٹیلنگ زیر بحث نہیں آئی  
تھی۔ میری بات کے جواب میں وہ بڑے سنجیدگی سے خیر انداز میں  
مسکرایا۔ اور بہت ہی مختصر لہجے میں صرف اتنا کہا۔  
”تمہارے دونوں انداز درست ہیں۔“

ہمارے درمیان حربہ تھوڑی دیر تک تازہ ترین حالات  
پر تبادلہ خیال ہوتا رہا پھر پاشا نے مجھ سے کہا ”میں آج رات  
بھی اسٹوڈیو نہیں جاسکوں گا۔ اس لیے بھرے ہوئے کام کا  
کوئی بندوبست کرنا ہو گا تاکہ سیٹ پر موجود فلموں کی شوٹنگ  
متاثر نہ ہو۔ اس لیے میں تم سے دو تین گھنٹے کی رخصت چاہوں  
گا۔ پھر اس نے رک رک کر مجھ سے پوچھا ”تمہارا کیا پروگرام  
ہے وہ جان!“

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ”میں تھوڑی دیر حربہ  
سونا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں ایک بھر پور فینڈ لے چکا ہوں مگر  
ابھی کسرا پاتی ہے۔ چنانچہ، پھر کب سونے کا موقع ملے!“  
”ابھی بات ہے۔ تم بالائی منزل والے بیڑم میں  
آرام کرو۔“ پاشا نے کہا ”جب تک میں ٹیلی فونک راجیلے پر  
اپنے کام نہ ٹھاتا ہوں۔ تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو  
بلاتر دواور بلا تکلف کوٹھی کے ملازمین کو کہہ دینا۔“

میں پاشا کے پاس سے اٹھ کر اوپری خواب گاہ میں  
آ گیا۔ میں عام طور پر دن میں سونے کا عادی نہیں ہوں۔ پاشا  
سے میں نے سونے کی بات اس لیے کی تھی کہ کوئی مجھے کوٹھے پر  
نہ کرے۔ میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر غور کرنا چاہتا  
تھا۔ فرید پاشا اور نوید پاشا کا عقائد اپنی جگہ لیکن مجھے اپنے  
لیے ایک لائن آف ایکشن تیار کرنا بھی جو صرف اور صرف نو  
تک محدود رہتی۔ میں اپنی ناواقفیت اور ابھری ماحول سے  
آشنائی کے ذیل میں پاشا پر دبران سے ضرور بعد لیڈ مگر مارشل  
کو چوہدری نواز علی کے چنگل سے چھڑانا خالصتا میرا مشن  
تھا۔ میں اس پر دجیکٹ میں کسی اور کا حصہ شامل نہیں کرنا چاہتا  
تھا۔ اور مجھے اپنے زور بازو پر کامل بھروسہ تھا!

میں نے بیڑم میں داخل ہونے کے بعد دروازہ اندر  
سے بند کر دیا پھر میں جیسے ہی چلا، بیڑ پر آوازوں کی دیوی  
ڈانرنگ کو برا بھان پایا۔ جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو  
تو وہاں موجود نہیں تھی کبھی تو کسی ایسے زاویے سے گردش  
تھی کہ میری نظر اس تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔ بہر حال، مجھ  
سے گناہ ملے ہی وہ مخصوص انداز میں مسکرائی اور ”میاؤں!“ کی  
آواز نکالتے ہوئے ایک کبھی جپ کے ساتھ بیڑ سے نیچے اتر  
گئی۔

میں نے دانستہ اسے نظر انداز کیا اور بیڑ کے بجائے ٹیبل  
چیمبر کی جانب تدم بڑھا دیے۔ وہ بھی، میں اسے دوپٹے کے  
لیے آگے بڑھا ہوں۔ وہ ابھی کیوں کے انداز میں اچھل کر  
چلتے ہوئے مجھ سے دور چلی گئی۔ میں نے آرام دو کر کہا کہ  
خود کو گرایا اور نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

بند آنکھوں کے پیچھے ساحل کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس  
وقت ساحل کے چہرے سے واقعی ایک نور سا چھوٹ رہا تھا۔  
مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اس شدت سے کسی کو نہیں پایا  
ہو گا جتنا میں ساحل کے لیے بے قرار تھا۔ وہ میری رگ جال  
کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور اس نازک ترین رگ پر ایک  
خون آ شام صغیریت چوہدری نواز علی نے اپنے ٹکلیے دانستہ  
گاڑ رکھے تھے۔ مجھے ان سفاک دانتوں کو توڑنا تھا، انہیں بڑے  
سے اکھاڑنا تھا اور اپنی ساحل کو رہائی دلانا تھی۔ ساحل کی ہائی  
میں میری بھانسی۔ چنانچہ کیوں، میں نہیں جانتا کیوں! ساحل  
کے بغیر مجھے زندگی کا تصور محال اور احمور لگتا تھا۔ ہر انسان  
اپنی تکمیل کا چاہتا ہے۔ میں بھی ساحل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکا  
تھا۔ وہ مجھے اتنی شدت سے یاد آ رہی تھی کہ دل کی نازک رگیں  
ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں!

چوہدری نواز علی بہت ہی کانیاں اور دشمن کینہہات

آتش فشاں 99 حصہ 9

اپنے اس اچھوتے احساس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ”جی“  
کی ایڈوائس مشقوں نے میرے باطنی حواس کو بڑی تیزی سے  
بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور آئے روز مجھے نئے تجربات  
ہو رہے تھے مگر ان تجربات کو رقم کرنے کی مجھے مہلت نہیں مل  
رہی تھی۔ زندگی اس قدر مصروف ہو کر رہ گئی کہ اپنے ہارے  
میں سوچنے کے لیے بھی بڑی مشکل سے فرصت ملتی تھی۔

دو بار مجھے وہی احساس ہوا تو میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا  
ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔  
اس جانب دیوار میں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی جس پر دبیز  
پردے کھینچے تھے۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ ڈارلنگ مجھے جیغ کرنے  
کے لیے کسی کارروائی میں مصروف ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے

مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا۔ میں نے اس پردہ دار کھڑکی کے  
پیچھے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی وہاں سے ہٹ رہا تھا، دور جا  
رہا تھا۔ وہ انسانی قدموں کی چاپ بھی لہذا اس آواز کو ڈارلنگ  
کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ میرا احساس غلط نہیں ہو  
سکتا تھا، جس دوران میں۔ میں آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھا  
رہا، کوئی کھڑکی کے پیچھے چھپ کر مجھے دیکھتا رہا تھا۔ میں کھڑکی  
کے نزدیک آیا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ کھڑکی کے کونے  
سے ذرا سا پردہ سرکا ہوا تھا جو پہلی نظر میں، دیکھنے میں نہیں آتا  
تھا۔ اور..... وہ پردہ دانستہ سرکا گیا تھا تاکہ کمرے کے اندر  
مجھے دھجک دیا جائے اور یہ حرکت کسی بیرونی شخص کی نہیں ہو سکتی  
تھی!

اس آخری خیال نے مجھے ریڈ الرٹ کر دیا۔ میں تیزی  
سے سوچنے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ بولٹ کو میں نے  
آواز پیدا کیے بغیر گرایا اور بے آنکھی دروازہ کھول کر باہر  
جھانکا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دروازے کے دروازے میں کھڑے ہو کر  
کھڑکی کا وہ بیرونی حصہ نظر آ رہا تھا، جہاں چند لمبے پہلے میں  
نے گڑبڑ محسوس کی تھی۔ مگر اب وہاں کسی گڑبڑ تو کیا، گڑبڑ  
کرنے والے کے بھی آثار موجود نہیں تھے۔ میں دروازہ بند کر  
کے بیڑم میں ٹھٹھنے لگا اور ٹھٹھنے ٹھٹھنے سوچنے لگا، میری خفیہ  
نگہرائی کی ضرورت کے پیش آ سکتی ہے؟

فرید پاشا اور اس کی بیوی نازک کو میں نے فوراً ذہن سے  
جھٹک دیا۔ ان دونوں سے اس قسم کی حرکت کی کوئی توقع نہیں  
کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کمریلو ملازمین کی طرف دھیان  
جاتا تھا جس کے بارے میں سوچنے ہوئے میں سیکورٹی گارڈ  
خادم حسین پر انک کر رہا تھا۔ گزشتہ رات ہونے والے واقعے  
کے بعد خادم حسین بہت لست پر تھا اور آئے والی رات میں اس  
کا تپا بچا ہونے والا تھا۔ میں خادم حسین پر توجہ مرکوز کر کے

رہا تھا۔ میں نے اسے جتنا خبیث اسٹیٹ کیا تھا وہ ہزار گنا  
اس سے بڑھ کر تھا۔ پاکستان میں آمد کے بعد مجھے اس کی  
ماتحت اور احتیاطی طور پر اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے تو اس نے  
سگ اور اور تھا لیڈ میں بھی مجھے سکون کا احساس نہیں لینے دیا  
تھا۔ خود پردہ رکھ کر اپنے مہر کی یاد سے اس نے میری  
زندگی کو مشکل سے مشکل تر بنانے کی کوشش کی تھی اور میں نے  
بہت بڑی چابک دستی سے اس کے مہر کو چپکا تھا۔ مگر میرے  
پاکستان میں آنے کے بعد وہ اچانک حد سے زیادہ گرم ہو گیا  
تھا۔ تاہم یہاں بھی میں نے اسے اتنی چوٹیں دی تھیں کہ اسے  
زخم چاٹنے کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا، خاص طور پر میاں  
زاہد حسین کا حشر کی عبرت نگاہ سے کم نہیں تھا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ پاکستان  
میں میری آمد کے بعد اس کی یہی کوشش رہی کہ میں اس تک نہ  
پہنچ سکوں۔ وہ میرے دشمن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا رہا اور  
میں ایک ایک کر کے ان رکاوٹوں کو صاف کرتے ہوئے اس  
کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چوہدری کے اس طرز عمل یا پالیسی سے  
یہ بات صاف واضح ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے خوف زدہ ہے، بے  
حد خوف زدہ! ایک طرف وہ مجھے خود سے دور رکھنا چاہتا تھا اور  
دوسری جانب اسے اس دینے کی بھی تلاش تھی جس کی تکمیل  
میرے پاس تھی۔ وہ دیندہ تو اب اس کے ہاتھ آئے والا نہیں  
تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق، مرکز کنوئیں کا ”جیتی  
راز“ بیہوشی افسل مسٹر نیل آرمز کی نگرانی میں حاصل کر لیا گیا  
تھا جو بہت جلد شعیب غوری تک پہنچنے والا تھا۔ اور اب تک  
پہنچا جا چکا تھا۔ اس خزانے کا ایک حصہ دار میں بھی تھا۔ یہ  
حصہ مجھے ایک ایسے شخص سے وصول کرنا تھا جو دوسری کی آڑ میں  
دشمن کا باہر تھا۔ اس ماہر کی مہارت کو میں ہر ممکنہ خرچ سے  
خارج کرنے کا تہہ کیے بیٹھا تھا۔

ساحل اور چوہدری نواز علی کے بارے میں سوچتے  
ہوئے اچانک رخش خیال شعیب غوری کی طرف مڑ گیا تھا۔  
اس کے ساتھ ہی مجھے آئینہ کے اس صائب کی  
جس کافر بایاں“ یاد آئے لیکن۔ شعیب کا چہرہ میری نظر میں  
جس قدر دکر و دل اختیار کر چکا تھا اس کے بعد اس کے ساتھ  
جتنا بھی سفاک سلوک کیا جا تا، کم تھا۔ وہ صرف میرا ہی نہیں،  
اس قوم، اس ملک اور اس سرزمین کا بھی مجرم تھا۔ ایسے  
مجرموں کا بواہر ایک انجام ہونا چاہیے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھ پر گناہ گاڑے  
بیٹھا ہو۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں  
کوئی بھی نہیں تھا۔ کسی گڑبڑ اور لنگ بھی مجھے نہیں نظر نہ آئی۔ میں

آتش فشاں 99 حصہ 9

آتش فشاں 99 حصہ 9

مگر تمہاری صورت کسی اندرونی بے آرامی کی نشان دہی کر رہی ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟

میں نے غصہ آغلاظ میں اسے خادم حسین کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور پوچھا ”وہ جگہ کہاں ہے؟ تمہارا بندوبست کرنے کا تم نے یقین دلایا تھا۔ میں فوری طور پر بندوبست کرنے کو دہاں لے جانا چاہتا ہوں۔ اس بندے کو مزید مل دینا مناسب نہیں ہوگا۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان۔“ وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”لیکن میری سمجھ میں یہ بات کھٹا رہی کہ یہ تمہارے پیچھے کیوں لگ گیا ہے؟“

میں نے کہا ”اس کی بہت ہی خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ میں نے دوسرے سکندر کا مشن مکمل کیا ہے۔ وہ میری طرف سے بہت ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ حالات سے یہی ظاہر ہوتا ہے خادم حسین تمہارے دشمنوں کے ہاتھوں کا کھلونا بننا ہوا ہے اور سکندر بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہ عین ممکن ہے، سکندر نے خادم حسین کو میری نگرانی اور تھوڑے کے سلسلے میں کچھ خصوصی ہدایات جاری کی ہوں!“

”ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔“ وہ ہر سوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اب میں خادم حسین کو ایک لمحے کے لیے کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو پہلی فرصت میں کر ڈالو۔“

میں نے کہا ”یہ اسی لمحے سے میرے حوالے سمجھو۔ تم نے بتایا تھا، دوسرے سیکورٹی گارڈ کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں خادم حسین کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، تم دوسرے گارڈ کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا کہہ دو۔“ میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا ”اس کے ساتھ ہی چند روز کے لیے اپنی حفاظت کے نظام پر گہری نظر رکھو۔ دشمنوں کو اپنی طرف سے کوئی موقع نہ دو۔“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھے اس مقام کا نام سمجھانے لگا جہاں میں خادم حسین کو ”ٹریٹ“ کرنے کے لیے جانے والا تھا۔ وہ ایک خالی کوئی بھی جہاں کچھ عرصہ پہلے فریڈ پاشا کی رہائش ہو کر رہی تھی۔ گلبرگ قمری والی کوئی بھی جگہ ہونے کے بعد مذکورہ کوئی میں تالا لگا دیا گیا تھا۔ پاشا اس کو کو فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس کوئی میں ایک خفیہ خانہ موجود تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد پاشانے کہا ”میں تمہیں اس کو کچھ کی چابیاں دے دیتا ہوں۔ کیا تم اکیلے وہاں پہنچ جاؤ گے؟“ میں نے کہا ”کیا خادم حسین نے وہ کوئی دیکھ رکھی ہے؟“

ہوئے، بیڈروم کی بیرونی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس آگیا۔ اس کھڑکی سے کوئی کا سامنے والا حصہ دوسرے نظر آتا تھا۔ میں نے ذرا سا پردہ ہٹایا اور کوئی کے داخلی گیٹ پر نظر ڈالی۔ میری سوچ میں چوں کہ خادم حسین تھا اس لیے غیر ارادی طور پر اسے دیکھ رہا تھا۔

گارڈ روم خالی تھا۔ میں مختلط نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا اور جلد ہی میری مراد برآئی۔ میں نے سیکورٹی گارڈ کو کوئی کے گیٹ پر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ یقیناً کوئی کے اندر سے آیا تھا۔ مستقل طور پر، گیٹ پر متعین رہنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ گیٹ کو چھوڑ کر اگر بنیلائے کہیں گیا تھا تو یہ بات اس کے ذہنی طور کی نشان دہی کرتی تھی پھر جلد ہی اس فٹور کی تصدیق بھی ہوگئی۔

سیکورٹی گارڈ نے گیٹ سے ملحق، اپنے چھوٹے سے کمرے میں داخل ہونے کے بعد چوکنا نظر سے بالائی منزل کی جانب دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ براہ راست مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں پردے کی اوٹ میں تھا اس لیے اس کی نظر مجھ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی البتہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے تردد اور الجھن کے آثار دکھائی دیے۔ دو تین مرتبہ اس نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا پھر لگا بھالی۔

میں خادم حسین کی دروغ گوئی سے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ نمک حرامی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ پاشا کے دشمنوں سے مل گیا تھا۔ گزشتہ رات والے واقعہ اس کی زدہ مثال تھی۔ پاشا کے دشمنوں کی ناکامی کا سبب میں بننا تھا اور اب خادم حسین چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا، رانا عظمت کی طرف سے اسے میرے لیے کوئی تازہ حکم ملا تھا۔

رانا عظمت کا خیال آتے ہی میں سکندر کے بارے میں سوچنے لگا۔ دوسرے میرا اس سے سامنا ہو چکا تھا اور دونوں ہی بارے میں منہ کی کھانا پڑی تھی۔ وہ یقیناً میرے بارے میں سخت ترین اقدامات کی منصوبہ بندی کر رہا ہوگا۔ وہ ایک طاقتور پی ایم اے لالہ بشیر کا بگڑا ہوا بیٹا تھا، اس سے کسی بھی اوجھی حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک مرتبہ پھر فریڈ پاشا کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر بھانپ گیا، کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”وجدان! تم تو آرام کرنے کی غرض سے اوپر گئے تھے



”ہاں، یہ ایک دوسرے وہاں کیا ہے۔“ پاشا نے کہا  
 ”پارٹیوں کو کوئی دکھانے کے لیے میں اسے اپنے ساتھ لے  
 گیا تھا۔“

”بس تو چمک رہا ہے، بات بن گئی۔“ میں نے پر خیال  
 انداز میں کہا۔  
 پاشا نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے بات اس کے بچے  
 نہ پڑی ہو۔ میں نے وضاحتی انداز میں کہا ”تم نے خادم حسین  
 کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے، میرا مطلب ہے، وہ میرے  
 بارے میں کیا جانتا ہے، خصوصاً میری یہاں آمد اور تم سے  
 ملاقات کے حوالے سے؟“

”اس کے علم میں میں ہی ہے کہ تم میرے دوست ہو اور  
 کراچی سے آئے ہو۔“ پاشا نے بتایا ”چند روز تک یہاں  
 قیام کرو گے پھر واپس چلے جاؤ گے۔“  
 میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا ”تم خادم حسین کو یہاں  
 بلاؤ۔ اب تمہارا یہ دوست یعنی میں تمہاری سائین کوئی کو  
 خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہوں اور خادم حسین مجھے وہ کوئی  
 دکھانے اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

”گڈ آئیڈیا!“ وہ تو صلی انداز میں بولا ”وہدان!  
 جنہیں تو اسپاٹ رائٹر ہونا چاہیے بخیر! اتنی تیزی سے کسی رائٹر کا  
 دماغ ہی سوچ سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”دماغ کا تو کام ہی سوچنا ہے۔ یہ مسلسل  
 سوچتا رہتا ہے، اس کی سوچ سے فائدہ اٹھانا ہنرمندی ہے۔  
 لکھاری حضرات اپنے خیال کے زور پر اس سوچ کو کاغذ پر منتقل  
 کر دیتے ہیں اور عمل کی ذمہ داری دوسری کے کندھوں پر  
 ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں مگر میں ایک عملی انسان ہوں اس  
 لیے مجھے تم اسپاٹ رائٹر (Spy Writer) نہ ہی بتاؤ تو اچھا  
 ہے پاشا! میں سوچ بچار کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں، فوراً  
 اسے اپنے عمل میں لے آتا ہوں۔“

”بہت اچھا کرتے ہو یار۔“ وہ تبسم ریز لہجے میں بولا  
 ”میں ابھی اس مردود خادم حسین کو بلا کر تمہارے ساتھ روانہ  
 کرتا ہوں۔“

خادم حسین کو اپنے پاس بلانے سے قبل فرید پاشا نے مجھے  
 اس د خانے کا مکمل دعوہ اور اس میں داخلے کے راستے سے  
 تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلانے پر  
 اکتفا کیا۔

وہ بولا ”میرے گیاراج میں اس وقت تین گاڑیاں کھڑی  
 ہیں۔ تم جو بھی لے جانا چاہو لے جاسکتے ہو۔“  
 ”میں نے وہ گاڑیاں دیکھی ہیں۔“ میں نے کہا ”وہ

تینوں جدید اور قیمتی گاڑیاں ہیں لیکن ایک بات کی مجھے حیرت  
 ہے۔ تم نے ان گاڑیوں کو ڈرائیو کرنے کے لیے کوئی ڈرائیو  
 وشر نہ رکھا ہوا۔“

وہ زبردست مسکراتے ہوئے بولا ”ڈرائیو ہے لیکن آج  
 کل وہ اپنے گاؤں چٹنی پر گیا ہوا ہے۔ دو تین دن میں واپس  
 آنے والا ہے۔ مشتاق ڈرائیو کی بجائے شادی ہے۔ وہ  
 تینوں گاڑیوں کو بڑی مہارت سے چلاتا ہے۔ نالکھ کا خیال  
 تھا، ہم دس دن کے لیے کسی اور ڈرائیو کو رائج کر لیتے ہیں  
 لیکن میں نے یہ مناسب نہ سمجھا، کبھی کبھار خادم حسین بھی  
 ڈرائیو کے فرائض سرانجام دے لیتا ہے مگر اب تو میں اسے  
 کسی گاڑی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔“

”وہ آج آخری مرتبہ تمہاری گاڑی کو ڈرائیو کرے گا  
 فرید۔“ میں نے متنی خیر انداز میں کہا ”اس کے بعد تو اسے  
 نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ بتاؤ، اس دفعہ خادم حسین سے  
 کون سی گاڑی کی ڈرائیوری کرانی چاہئے؟“  
 ”میرا خیال ہے، تم نسان لے جاؤ۔“ فرید پاشا نے کہا  
 ”نسان پٹرول عام طور پر میرے استعمال میں رہتی ہے۔ یہ  
 بڑی قابل اعتماد جگہ ہے۔“

نسان پٹرول (Nissan Patrol) کے علاوہ پاشا کے  
 گیاراج میں ہونڈا کارڈ اور نیوٹا کارڈاں موجود تھیں۔  
 ان قیمتی گاڑیوں اور عالی شان کوئی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا،  
 فرید پاشا اپنے شےبے میں کسی کلک کی طرح ہے۔ ہم اس کے  
 پہلی بیگ گراؤنڈ پر بھی اس کی ثروت کو آٹھ چاند لگا کر لے  
 گئے۔ وہ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھا جو منہ میں سونے کا بچہ  
 لے کر پیدا ہوتے ہیں اور ساری زندگی سونے کا تاج پہن کر  
 گزر اوردیتے ہیں!

☆☆☆  
 دو کوئی فاضلیہ کالونی اور شاہ جمال کے عظیم پروجیکٹ  
 کوئی میں داخل ہونے کے بعد میں ایسی اداکاری کرتا رہا جیسے  
 کوئی خریدار ہوں۔ تھوڑی دیر تک میں کوئی کی ایک ایک چیز کا  
 تنقیدی جائزہ لیتا رہا پھر کھما کھما کر میں خادم حسین کو اس خانہ  
 پر لے آیا جہاں خفیہ خانے کا راستہ تھا۔ ویسے تو وہ پوری کوئی  
 ہی میرے مشن کے لیے موزوں تھی۔  
 ”اب ہم اس کے اندر جائیں گے۔“ میں نے خام  
 حسین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا ”اس کے اندر  
 ہے؟“  
 میں نے کہا ”یادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ال

دو خانے کے پیچھے ایک خفیہ خانے کا راستہ ہے۔ دراصل میں  
 وہاں خانے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی د خانے کی وجہ سے میں  
 یہاں فرید میں نے دیکھی لے رہا ہوں۔ مجھے کی ایسی ہی کوئی  
 نالی تھی جس میں ایک خفیہ خانہ موجود ہو!“

وہ چلے گئے یعنی اور تذبذب کے انداز میں مجھے نکتا  
 پر ابھرا لیکن زندہ لہجے میں بولا ”جنتاب! میں اس کو بھی پر بھی  
 بخیر مراد ڈیوٹی دے چکا ہوں۔ آپ جس د خانے کا ذکر کر  
 رہے ہیں، میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“  
 ”ضروری نہیں کہ پاشا جنہیں اپنی ہر بات سے آگاہ  
 کرے۔“

”آپ پاشا صاحب کے دوست ہیں اس لیے میں آپ  
 کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔“ وہ بھی انداز میں گردن ہلاتے  
 ہوئے بولا ”ورنہ تمہی بات تو یہ ہے کہ یہ د خانہ میرے لیے کسی  
 اہمیت سے کم نہیں۔“  
 ”چلو اسے انکشاف ہی سمجھ لو۔“ میں نے قدرے  
 نرم لہجے میں کہا ”مگر سوال و جواب میں وقت ضائع نہ  
 کرے۔“

”مگر جنتاب!“ وہ سوال کرنے سے باز نہ آیا ”ہم اس  
 د خانے کے اندر جا نہیں گئے کیسے؟ کیا پاشا صاحب نے آپ  
 کو یہ د خانے تک رسائی کا طریقہ بتا دیا ہے۔“

”ہاں، بتا دیا ہے۔“ میں نے ہاتھ لہجے میں کہا۔  
 ”وہ ایک مرتبہ جنتاب کا قابل یقین نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔  
 اگلے پانچ منٹ میں ہم اس خفیہ خانے کے اندر پہنچے  
 پچھتے۔ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں لائٹ اور آواز کا حصول  
 بغیر بات سے پہلے مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔  
 ال د خانے میں پہنچنے کے بعد خادم حسین یوکلھا ہٹ کا شکار نظر  
 آنے لگا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ کچھ بدکا ہوا لگ  
 رہا تھا جیسے لاشوری طور پر اس نے کسی خطرے کی بو سونگھ لی  
 ہو۔“

اس نے بغور د خانے کا جائزہ لینے کے بعد سرماتی ہوئی  
 آواز میں کہا ”ہم اس د خانے کے اندر کیوں آئے ہیں؟“  
 ”اس لیے آئے ہیں!“

مطلوع کر کے ہی میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور  
 بلک کر بڑی سرعت سے د خانے کا دروازہ کو اندر سے  
 پلٹ کر دیا۔

”وہ میرا غیر متوقع دھکا کھانے کے بعد منہ کے بل د  
 خانے کے پینڈ فرس پر گر ا اور اس کے مقل سے ایک وحشت  
 ناک کراہٹ اڑ ہوئی لیکن اس کی آدہ کا اور جیج دیکھا د خانے

سے باہر جانے والی نہیں تھی، اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑ  
 ہوتا، میں اس سے ایک قدم کی دوری پر پہنچ گیا۔  
 خادم حسین نے فرش پر پڑے پڑے سر اسدہ نظر سے  
 مجھے دیکھا۔ میرے تازہ ترین سلوک سے وہ ہمانپ چکا تھا کہ  
 گڑبڑ ہو گئی ہے، وہ چونکا نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اٹھ کر  
 کھڑا ہو گیا اور ابھمن زندہ لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

”آپ نے مجھے دھکا کیوں دیا؟“  
 ”اس لیے.....!“

میرے بھاری یوٹ کی طوفانی ضرب اس کے چہرے پر  
 پڑی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ میں  
 نے پھر اسے پھیلنے کا موقع نہیں دیا اور آگے بڑھ کر ٹھوکروں  
 میں رکھ لیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں مشینی انداز میں حرکت کر  
 رہے تھے، وہ مجھ سے بری طرح پٹنے لگا تو اس کے ذہن میں  
 مدافعت اور جوابی حملے کا خیال آیا۔ شاید صورت حال بہت دیر  
 سے اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

اچانک وہ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک  
 نچی راؤ ڈھکڑاؤں سچائی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بچا اور مجھے  
 اپنے بازوؤں میں جکڑنے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھا  
 دیے میں اس کی ہاتھوں میں جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا  
 تھا چنانچہ اسے اپنی پھیلی ہوئی ہاتھوں کے ساتھ پیچھے کھٹکا پڑا۔  
 میں نے ہچکائی دے کر ایک زبردست سوپ ماری تھی۔

خادم حسین کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ وہ ریانڈر فوجی  
 تھا اس لیے اس کا بدن اور توئی تسلی بخش تھے۔ وہ اپنے تئیں  
 ڈٹ کر میرا مقابلہ کر رہا تھا مگر اس کے ڈننے کی میرے سامنے  
 پیش نہیں چلی رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ منہ کے بل د خانے کے  
 پینڈ فرس سے ٹکرایا تھا لہذا جب وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس  
 کی ناک سے خون جاری ہو چکا تھا۔

میں نے تنقیدی آئینہ انداز میں کہا ”خادم حسین! سیکورٹی و  
 کیورٹی کا کام چھوڑ کر چوڑیاں پہن لو۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو  
 عذاب میں کیوں ڈالتے ہو۔ تم تو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے،  
 پاشا اور اس کی کوئی کی خاک حفاظت کر دے گے؟“

اس نے نفرت آمیز انداز میں مجھے دیکھا اور بولا ”تمہارا  
 بڑا امرت ناک حشر ہونے والا ہے وہدان۔ تم کچھ نہیں  
 جانتے، کچھ نہیں جانتے!“

اس کے متنی خیر الفاظ نے مجھے کچھ زیادہ نہیں چونکا دیا۔  
 میں نے زہر پرے لہجے میں کہا ”میں یہی سب کچھ جاننے کے  
 لیے تو تمہیں یہاں لا رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے، تمہارے  
 پاس مفید معلومات کا ایک ذخیرہ جمع ہے۔“



بات ختم کرتے ہی میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اس وقت ہاتھ کی پشت سے، ناک سے پہنے والے خون کو صاف کر رہا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے گلک چلائی، وہ تھوڑا سا لٹکڑیا مگر میں نے اسے تھیلے کا موقع نہیں دیا اور ایک زور دار سائیکل مار کر در پیچک دیا۔

وہ کسی فطری کے مانند ہوا میں پرواز کرتے ہوئے دیوار سے جا گرا۔ میں جست بھر کر اس کے سر پر کچھ کیا اور لالت کے سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ میرے دعوں و دھار پھرنے اس کے چہرے کی کمال کو جا بجا دھیر کر رکھ دیا تھا اور وہ ابولہان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے کریان کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا اور دو دشت ناک لکچھے میں در یافت کیا۔

”اتنا کافی ہے یا میں تمہاری زبان کھلانے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں کو اور زحمت دوں؟“

”قت..... تم..... مجھ سے..... کیا چاہتے ہو؟“ وہ ہلکا ہٹ آ میز لکچھے میں بولا۔

”میں تمہاری زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔“

”کون سا کچھ؟“

”کل رات کو پاشا کی کوشی میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی حقیقت کیا ہے؟“

اس نے گھسا پٹا جواب دیا ”چند فٹنٹے کوشی میں محسوس آئے تھے اور انہوں نے نالکہ بی بی کو خوا کرنے کی کوشش.....“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک قیامت خیز چائنا اس کے گال پر جڑو یا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے کریان سے پکڑ کر اسے معجزوڑا اور دشت ناک انداز میں پوچھا۔

”تم مجھے فرید پاشا نہ سمجھنا جو تمہارے اس بوگس جواب سے مطمئن ہو جائے گا۔ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے، تم اس حقیقت سے باخبر ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس کی آنکھوں میں مجھے خوف کے سایے لہراتے ہوئے نظر آئے۔ جواب دینے سے پہلے وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر اس کی خوفزدگی میں اضافہ کرتے ہوئے تھوڑی سی اور مرمت کر ڈالی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کسی بھی صورت میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں تو وہ ”تقادن“ کے لیے آمادہ ہو گیا۔ کچھ بولنے کی صورت میں، میں نے اس سے جان بخشی کا وعدہ کر لیا۔

خادم حسین نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ رانا عظمت کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے بیان سے مجھے شکوک کی تعداد بڑھ گئی تو میں نے پوچھا ”تھیک ہے، میں نے مانا اس وقت تم دو افراد کا تنگ کھار ہے ہو۔ ایک کانگ مال کر رہے ہو اور دوسرے کا حرام۔ ہر دو صورت میں میری فکر میں تم تنگ حرام ہی ہو، بہر حال!“ میں ایک لمبے کھانسی کے لیے رکاوٹ پر خوشوار لکچھے میں دریافت کیا ”تم کسی دوست ہو اور کس کے دشمن، مجھے اس سے غرض نہیں تم مجھے بتاؤ کہ میں تمہارا کیا کام کر رہا ہوں۔ تم میری ٹوہ میں کیوں لگے ہوئے ہو؟ مجھے پاشا کی کوشی میں آئے ابھی چوبیس گھنٹے نہیں گزرے؟“

وہ سمجھ گیا، میرا اشارہ کس طرف تھا تاہم انجان بنے ہوئے بولا ”میں نے تمہاری ٹوہ کو بلی ہے؟“

”یہاں آنے سے تھوڑی دیر پہلے“ میں نے سفاک لکچھے میں کہا ”جب میں پاشا کی کوشی کی بالائی منزل کے ایک بیڈروم میں آرام کر رہا تھا تو تم کھڑکی کے ایک کونے سے مجھے جھانک رہے تھے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور اندر میرے میں تیر چھوڑنا ضروری سمجھا ”میں نے خود تمہیں اوپر سے نیچے جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر اپنے گارا روم میں پہنچنے کے بعد بھی تم نے کن آنکھوں سے بیڈروم کی کھڑکی کی طرف دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ کیا تم میری باتوں کو جھٹکا کرتے ہو؟“

کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ”جب تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”جو نہیں معلوم، وہ جانتا چاہتا ہوں۔“ میں نے اتے گھورتے ہوئے کہا ”تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، یہ بات تو ہی بتاؤ گے؟“

وہ شکست خوردہ انداز میں بولا ”مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں، تمہارا اصل دشمن رانا عظمت کا بھتیجا ہے۔ لالہ خیر اللہ بی اے کا بیٹا سکندر“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”تم نے پچھلے ایک دو دن میں اسے خود اپنا دشمن بنا لیا ہے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے تمام جذبات صبح ثابت ہوئے تھے۔ گزشتہ روز میں نے اور صرف نے سکندر کو خاص ذلت اور رسوائی سے دوچار کیا تھا۔ رات بھی وہ میرے ہاتھوں بری طرح پٹا تھا لیکن اس رات میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سکندر ہے البتہ وہ مجھے اسی طرح پہچان

رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، پاشا کی کوشی سے فرار ہونے کے بعد سکندر نے خادم حسین کو میری نگرانی کا فریضہ سونپا تھا۔ یہ ہے، اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں فرید پاشا کے پاس ایک مہمان دوست کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں! اسی خاطر میں نے خادم حسین سے استفسار کیا۔

”کیا آج دن میں کسی وقت سکندر سے تمہاری بات یا ملاقات ہوئی تھی؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں جواب دیا ”ملاقات یا بات تو نہیں ہوئی لیکن اس کا بیٹا مجھ تک پہنچا تھا۔ تمہارے بارے میں مجھے خصوصی ہدایات دی گئی تھیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں، تم دینے ہی ثابت ہو رہے ہو۔“

میں نے پوچھا ”میرے بارے میں تمہیں کس قسم کی ہدایات دی گئی ہیں؟“

”یہی کہ تم ایک خطرناک قسم کے مجرم ہو۔ مسلمانوں والا ہم رکھ کارفروں کے لیے کام کرتے ہو۔ تم چند روز پہلے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے افغانیا سے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ افغانیا کی بدنام زمانہ ”را“ سے تمہارا تعلق ہے۔ تم پاشا کے پاس پناہ لے کر کسی خطرناک منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس لیے مجھے تم پر کڑی نظر رکھنا چاہیے، اس وقت تک، جب تک تم کوشی کے اندر ہو۔ میری تم کو کوشی سے باہر نکلنے دو، وہ لوگ تمہیں اپنی نگرانی میں لے لیں گے اور میرا خیال ہے، اس کوشی سے نکل کر اس کوشی تک آنے کے دوران میں تمہارا تعاقب کیا گیا ہے۔“

خادم حسین یہ خوفناک معلومات میری سماعت میں داخل کرنا خوش ہوا تو میں حیرت اور تشویش کے سمندر میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔ سکندر کو میں نے اور مجھے سکندر نے کل زندگی میں ہلکا مرتبہ اس ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے اور نہ ہی پہچانتے تھے، دوسری ”ملاقات“، گزشتہ شب سرسری انداز میں ہوئی تھی مگر خادم حسین نے جو تشویش ناک انکشاف کیا تھا وہ مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میرے خلاف اسی قسم کا پروپیگنڈا اس وقت کیا گیا تھا جب میں اندرون سندھ سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچا تھا تو مجھے ”را“ کا ایجنٹ اور ایک خطرناک مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کا کوشش کے پیچھے جنہم مکانی میاں زاہد حسین کا ہاتھ تھا۔ تو کیا..... سکندر بھی کسی طور چوہدری نواز شریف کی میزبانی کا کوئی پڑھ ہے؟

یہ سوال بڑی سرعت سے میرے ذہن میں ابھرا تو میری

تشویش سوچ رہی ہوگی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا، ایک موقع پر کل صدف نے میرا تعارف کروا دیا تھا۔ وہ سکندر کے سامنے کہا تھا..... یہ وجدان ہے، میرا کلاس فیلو۔ ہم کراچی سے آئے ہیں۔ اتنے اہم لوگوں کو متنبہ نہیں کیے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی!

صدف نے جوش جذبات میں وجدان کی حیثیت سے میرا تعارف تو کر دیا تھا لیکن اس کی یہ حماقت مجھے پسند نہیں آتی تھی۔ بعد میں جب میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے حل مشکلات ایک انکشاف لفظ ”سوری“ سے کام چلا لیا تھا لیکن موجودہ صورت حال بتا رہی تھی، کام چلا نہیں، بلکہ بری طرح بکڑ رہ گیا ہے۔

اس موقع پر سکندر کے علاوہ پولیس آفیسر سب انسپکٹر، مجبور اور کڑوا پٹا تو صدف، فرقان خان کا سپوٹ باہر اور مقامی ایس ایچ او کا لڑکا سلیم بھی ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ وجدان کی حیثیت سے میرا تعارف کوئی بھی قیامت ڈھاسکا تھا۔ یہ تمام افراد سیاسی، مالی اور قانونی طور پر مضبوط پارٹیاں تھیں۔ تازہ ترین حالات کے مطابق، سکندر کا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانا یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ چوہدری نواز شریف یا اس کے گماشتوں سے متعلق تھا اور میرے لیے یہ نہایت ہی حساسی خبر اطلاع تھی۔ حالات کی سنگینی سے اندازہ ہو رہا تھا، چوہدری تک پہنچنے سے پہلے مجھے چوہدری کے بہت سے تنگ خواروں کی لاشیں گرنا ہوں گی۔

ایک بات کی مجھے حیرت تھی کہ فرید پاشا سکندر کے اس روپ سے واقف کیوں نہیں تھا۔ اگر وہ چوہدری نواز شریف اور سکندر کے کسی تعلق سے آگاہ ہوتا تو مجھے ضرور بتاتا۔ یہی بات سمجھ میں آتی تھی، ان دو اہمیت حالات سے سکندر کی دانشمندی تازہ بہ تازہ تھی!

بالکل یہی بات تھی درنہ فرید پاشا اس سلسلے میں ضرور مجھے کچھ بتاتا۔ سکندر کل ریسٹورنٹ میں مجھ سے متعارف ہوا اور آج کچھ دیر بعد دشمن کے مانند میرے تعاقب میں لگ گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا، چوہدری نواز شریف علی کے گروپ سے وہ ناپائیدار تھا۔ خادم حسین نے میری جن خطرناک خصوصیات کو گنوا یا تھا ان کے پیش نظر مجھے ایک ایک قدم چوک چوک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ میں دوبارہ سکیورٹی گارڈ خادم حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”خادم حسین! میں تمہاری فراہم کردہ اطلاعات پر یقین کر لیتا ہوں لیکن بعد میں اگر ان میں سے کوئی بھی بات غلط ثابت ہوئی تو تمہارا وہ حشر کروں گا جو دیکھنے والوں کے رونگٹے

بکڑے کر دے گا۔“

وہ ساٹ آواز میں بولا ”میں نے ایک ایک لفظ جھپٹ جیتا ہے۔ یقین کرنا یا نہ کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“

میں نے کہا ”ٹھوڑی دیر پہلے تم نے بڑے دھوکے سے کہا ہے، پاشا کی کوٹھی سے نکلنے کے بعد سے یہاں پہنچنے تک ہمارا تعاقب کیا گیا ہے۔ کیا تم تعاقب کرنے والوں کو جانتے ہو؟“

”نہیں، میں انہیں جانتا ہوں اور نہ ہی پہچانتا ہوں۔“ وہ قلعیت سے بولا ”لیکن میرا خیال ہے، وہ سکندر کے آدمی ہو سکتے ہیں۔“

خادم حسین کے بیان سے ظاہر ہوتا تھا، تعاقب کرنے والوں میں سکندر شامل نہیں تھا۔ یہاں تک آتے ہوئے نان پیرول کو خادم حسین نے ڈرائو کیا تھا اور وہ اس وقت اس ”برائے فردخت کوٹھی“ کے اندر کھڑی تھی۔ میں تعاقب افراد کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ میں نے خادم حسین سے پوچھا۔

”ہمارا تعاقب کرنے والوں کی تعداد کیا ہے اور انہوں نے ہمارے تعاقب کے لیے کون سی سواری استعمال کی ہے؟“

خادم حسین نے بتایا ”وہ تین افراد ہیں۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دو پیچھے ان کے پاس سفید ہائی روف ہے۔ وہ ہمارے پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہوئے ہی پیچھے لگ گئے تھے اور یہاں تک پیچھے ہماری دم سے بندھے چلے آئے ہیں۔ میں نے اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت بھی ان کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے اپنی ہائی روف کو شاہ جمال روڈ پر ایک ایسی جگہ رکھ دیا تھا جہاں سے اس کوٹھی کا گیٹ نظر آتا رہے۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کو رکھا پھر مزید کہا ”مجھے یقین ہے، وہ اس وقت بھی وہاں موجود ہوں گے۔“

اس کا یقین میرے لیے تشویش کا پیغام بر تھا۔ میں نے گہری نظر سے اسے گھور کر دیکھا اور سخت کچھ میں سوال کیا

”جب پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہوئے ہی تمہیں اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔“ وہ سادگی سے بولا۔

میں نے کہا ”اور اگر میں تمہارا یہ ”حال“ نہ کرتا تو تم اب بھی زبان نہ کھولتے؟“

”ظاہر ہے۔“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے درشت کچھ میں کہا ”جانتے ہو، اس نمک حرامی کے بدلے میں، میں اور پاشا تمہارا کیا حشر کرنے والے ہیں؟“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا

”میدان جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ کسی ایک پارٹی کا ساتھ دینا دوسری سے دشمنی کرنا پڑتی ہے۔۔۔۔۔ اور کسی کا حشر کیا ہوگا۔ قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تم اپنے حشر کے بارے میں پوچھو، مجھے نہیں لگتا کہ تم زندہ بچ سکو، سکندر اور رانا طاقت بہت خطرناک لوگ ہیں۔ لالہ بشیر کی طاقت اور اختیار نے ان کی خطرناکی کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ہمیں اندازہ نہیں، وہ تمہاری تلاش اور حصول میں کہاں تک جاسکتے ہیں۔“

میں نے دانت پیستے ہوئے اس کی آنکھوں میں مچھانک اور کہا ”تم اپنے آقاؤں سے مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ اس قسم کے طاقتور غیور عناصر میرے بیٹوں کے کسموں سے بندھے رہتے ہیں۔ میں ان کی ساری بد معاشی اور انوکھوں تک کے راستے نکال دوں گا۔“

اس نے میری اس دھمکی کے جواب میں کچھ نہ کہا اور بڑی کینڈ تو نظر سے مجھے ٹکٹا رہا۔ وہ جنگست خوردگی کی حالت میں دھانے کے پختہ اور سین زردہ فرش پر بیٹھا تھا اور مجھے ہر ممکن تعاون کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ سکندر اور رانا طاقت کے حوالے سے اس نے مجھے جتنی بھی معلومات فراہم کی تھیں ان سے میں نے اپنے طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ رانا طاقت کی دشمنی سراسر فریب پاشا سے تھی اور وہ نہ زراعت تانے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔ گزشتہ رات پاشا کی کوٹھی پر پیش آنے والا واقعہ بھی اسی جانب اشارہ کرتا تھا اور سکندر خرم ٹھوک کر خالی میرے مقابلے میں میدان میں اتر آیا تھا اور اس دشمن کے تعاقب میں اگر بہت دور تک جھانکا جاتا تو اس کی کیل کے ڈاڑھے چوہدری نوازش علی سے ملتے نظر آتے تھے۔ سکندر حال ہی میں یا پہلے سے چوہدری نوازش علی سے منسلک رہا تھا۔ میرے لیے یہ بات جانتا بہت ضروری تھا کہ سکندر چوہدری سے کس قسم کا تعلق تھا۔ ویسے میرا خیال یہ تھا کہ سکندر کل ریسٹورنٹ میں ہونے والی ”ملاقات“ سے پہلے مجھے واقف نہیں تھا ورنہ صدف کی زبانی میرا نام سننے ہی وہ چونک اٹھتا۔ اس سے ایک بات واضح ہو گئی کہ وہ تازہ تازہ میرا مہمانی زندگی میں وارد ہوا تھا۔

اتمام حجت کے طور پر میں نے خادم حسین سے پوچھا ”کیا تم چوہدری نوازش علی کو جانتے ہو؟“

”کون چوہدری نوازش علی؟“ اس نے اناجھ سے سوال کر ڈالا۔

اس کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ چوہدری نوازش علی سے واقف نہیں تھا۔ میں تلاشی نظر سے دھانے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ خادم حسین سے مزید معلومات حاصل نہیں

تھی۔ جس اور جب تک میں اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کرنا، اس کا قید و بند میں رہنا ضروری تھا۔ خادم حسین کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے فریب پاشا سے مشورہ کرنا بھی اہم تھا۔

ٹھوڑی سی کوشش اور تلاش کے بعد وہیں دھانے کی ایک الماری میں مجھے اپنی مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ ایک مضبوط ٹائیلوں کی موٹی ڈوری تھی۔ میں ڈوری کے ٹکڑے کو کھولنے ہوئے خادم حسین کی طرف بڑھا تو اس کی آنکھوں میں ابھرنی لگی۔ وہ مراسیمہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

”ختم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ کیا کرتا جا چکے ہو؟“

”تمہارا شاہی بندوبست۔“ میں نے سفاکی سے کہا۔

وہ ہلکا ”مم۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ تم نے وعدہ کیا تھا، اگر میں تمہارے سوالوں کے ٹھیک ٹھاک جواب دے دوں تو تم میری جان کے دشمن نہیں بنو گے!“

”میں زبان کا دشمن ہوں خادم حسین!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں نے تعاون کی صورت میں تمہیں جان بخشی کا یقین دلایا تھا۔ میں تمہیں جان سے نہیں گزاردوں گا بلکہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اسی دھانے میں چھوڑ جاؤں گا۔ یہاں دھانے میں ہوا اور روٹی کا مناسب گڑ ہے، تمہیں کسی قسم کی محنت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور جو کچھ تم چاہو اس وقت تک زندہ رہ سکتے ہو جب تک کاغذی تقدیر نے تمہاری زندگی رکھ رکھی ہے۔“ میں نے خود اس اذیت کرنے کے بعد اضافہ کیا ”ویسے، تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد پاشا سے بات کر کے تمہارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ لوں گا۔ ہمیں زیادہ دنوں تک اس دھانے میں بھوکا پیاسا نہیں رہنا پڑے گا۔“

وہ دھشت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے میرے اعزاز کو اچھی طرح مہاب لیا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کسی بھی قیمت پر اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا تاہم حرامت کرنا اس کا حق تھا میں نے جب اسے ٹائیلوں کی مضبوط ڈوری سے بکڑنے کی کوشش کی تو اس نے بری طرح ہاتھ پاؤں پکڑ کائے۔ اسے قابو کرنے کے لیے مجھے کچھ تباہی اور موثر حربے استعمال کرنا پڑے۔ مزید ٹھوڑی سی ٹھوکا غما کے بعد وہ ”نارمل“ ہو گیا۔

میں مذکورہ ڈوری کو کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اسے اگر چلا یا تیز دھارا لے کر مدد سے نہ کاٹا جاتا تو وہ دروازائی کے نتیجے میں ٹوٹنے یا کھٹنے والی نہیں تھی۔ اگر اس کی ہوں کو کھولنے یا ڈھکیلا کرنے کے لیے زور لگایا جاتا تو

وہ مزید بندش ہو جاتیں۔ گویا ان کی عذاب ناک میں سترگنا اضافہ ہو جاتا۔

میں نے خادم حسین کو اندھا حشر پر گرا دیا اور اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ پہلے میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو عقبی جانب موڑ کر کلائی پر کلائی کرکس کیا اور دونوں کلائیوں کے منہ کو ٹائیلوں کی ڈوری سے کس کر باندھ دیا۔ اس کے بعد، میں نے اپنا رخ تبدیل کر کے اس کی دونوں ٹانگوں کو گھٹنوں کے جوڑوں سے موڑ لیا اور دونوں پاؤں کو اس کے کپلوں کے نزدیک کرکس کر کے گھٹنوں کو بھی اسی طرح مضبوطی سے باندھ دیا جیسے کلائیوں کو باندھا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کی پشت سے اتر آیا اور دونوں بندھے ہوئے مقامات کو ڈوری کے کئی پھیرے دے کر اسٹریٹنگ کر دیا۔ جس طرح کھنک کی ٹوکری کو اٹھانے کے لیے ہینڈل ہوتا ہے، بالکل اسی شکل کی ایک ٹائیلوں کی گرفت تیار ہو گئی تھی۔ کوئی بھی طاقت ور آدمی اس ہینڈل نما گرفت سے سیکورٹی گارڈ خادم حسین کو اوپر اٹھا سکتا تھا لیکن میرا آئیڈیا ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کی گرفت کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ٹائیلوں کی ڈوری کو پانچ مرتبہ اس کی کمر اور گرفت میں سے گزرا کر پیچیدہ گرہیں لگا لیں۔ بچی ہوئی ڈوری کو میں نے دہرا تہرا کر کے قدرے موٹی ڈوری تیار کر لی اور اس موٹی ڈوری کے ایک سرے کو پہلے سے تیار شدہ ”گرفت“ سے تسلی بخش انداز میں منسلک کرنے کے بعد مجھے کسی کرسی یا میز کی تلاش ہوئی جس پر، خادم حسین کے بکڑے ہوئے جسم کو رکھ کر میں موٹی ڈوری کے دوسرے سرے کو کچھت میں نصب کئے میں باندھ سکتا۔

ٹھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے ایک بوسیدہ میز مل گئی۔ میں نے اس میز کو دھانے میں لانے کے بعد عین کنڈھے کے نیچے رکھ دیا۔ مذکورہ میز کی چاروں ٹانگوں میں بے حد سختی و نزاری پائی جاتی تھی۔ مجھے ایک لمحے کو غصہ شعوس ہوا کہ میں جیسے ہی خادم حسین کے بندش بدن کو اس پر رکھوں گا، یہ چاروں پاؤں جت جت ہو جائے گی مگر عملاً اس میز نے میرے غصے کی نفی کر دی۔ پرانے زمانے کی چیزیں اور انسان بے پناہ قوت برداشت کے مالک ہوتے ہیں۔ انسانوں کی خالص اشیا سے کھلائی پائی ہوئی تھی اور چیزوں کی تیاری میں خالص مال لگایا جاتا تھا۔ وہ بظاہر مخدوش نظر آنے والی میز بہت تسلی بخش اور قابل اعتماد ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف خادم حسین کو بلکہ میرے بوجھ کو بھی نہایت خاموشی سے برداشت کر لیا۔ میں نے نہایت مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موٹی ڈوری کے

آخر الذکر سرے کو کھٹ والے کنڈے میں مضبوطی سے باندھ دیا۔

میر سے نیچے اترنے کے بعد میں نے خادم حسین کی گردن کو اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اللہ حافظ سیکورٹی گارڈ صاحب! مجھے امید ہے، تم پاشا کے یہاں پہنچنے تک زندہ رہو گے۔ اگر تمہارا پٹا بہت گزردہ ہے تو زیادہ سے زیادہ تم بے ہوش ہو سکتے ہو۔ اس خیال کو بھی اپنے ذہن سے نہ گزرنے دینا کہ تمہارا کوئی خیر خواہ یہاں آئے گا اور تمہیں بچا کر لے جائے گا۔ اس نہ خانے کا راز صرف دو افراد جانتے ہیں۔ ایک فرید پاشا اور دوسرا میں! میں تمہیں نشانِ عبرت بنا کر یہاں چھوڑے جا رہا ہوں، فرید پاشا جلد یا بدیر تمہاری خیر و عافیت دریافت کرنے آئے گا۔“

میں نے اس کی زبان بندی کرنے کے لیے منہ میں کپڑا وغیرہ ٹھونسے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کیوں کہ اس زیر زمین کمرے میں پیدا ہونے والی آوازیں باہر کوئی میں یا کوئی سے باہر کہیں سنائی نہیں دے سکتی تھیں۔ اپنے منہ کو آزاد پارک خادم سینکس مغلظات پر اتر آیا۔ پہلے وہ مجھے مادر پدر آزاد گالیوں میں تو تار پھردھمکیاں دینے لگا۔

”وہ جان! اچھی طرح سن لو۔ تم اچھا نہیں کر رہے۔ میرے حمایتی مجھے یہاں سے آزاد کر لے جائیں گے مگر تم ان کے بہیمانہ سلوک کا نشانہ بنو گے۔ سکندر اور رانا عظمت کی سفاکی اور درندگی سے تم واقف نہیں ہو، وہ تمہارا شہر خراب کر دیں گے۔“

”نہ تو سن تیل ہوگا، نہ روادحانا ہے گی“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا ”تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟ شاید تم نے میری بات کو توجہ سے نہیں سنا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہا ہے، تمہارے حمایتی اس نہ خانے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔“ میں نے اس کی دھمکی آمیز آواز میں ایک خاص قسم کی جبر جبرہٹ محسوس کی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی سرخی اتر آئی تھی۔ میں نے طنز سے انداز میں کہا ”ابھی تک تو تم رن دے پر کھڑے ہو۔ تمہاری آواز اور آنکھوں میں خوف و دہشت نے جو تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ٹیک آف کر دے گے تو تمہاری ٹی ٹی ہم ہو جائے گی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بے پناہ سراسیمہ نظر آنے لگا ”اب تم اس سے زیادہ میرے ساتھ اور کیا کرنا چاہتے ہو؟“

میں نے مسکندہ خیر انداز میں اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا اور سلسلی خیر لہجے میں کہا ”مشر خادم حسین عرف خدمت گار! کاش، تم نے اپنے نام ہی کی لاج

رکھی ہوتی۔ خادم حسین کا مطلب ہے، حسین کا خادم مگر تم رسوائے زمانہ رانا عظمت کے خادم نکلے۔ اس کا نمک حلال کرنے کے لیے تم پاشا سے نمک حرامی پر تیار ہو گے۔ تم جرائم قابل معافی ہے اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو..... میں نے اس سے زیادہ تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟ یہ تو مجھ کی نہیں ہے۔ ابھی تو تمہاری پرداز یہاں سے روانہ ہو چکی جو اس نہ خانے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک سفر کرے گی پھر تمہیں پتا چلے گا، کہ کنوں میں کتنا تیل ہے؟“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے قوت صرف کے خادم حسین کے نیچے دبی ہوئی میز کو کھینچا۔ وہ میرا نیکی گنہگار اور مضبوطی کا ثبوت دیتے ہوئے، مختلف قسم کی آوازیں پیدا کرنے کے بعد اس کے بدن کے نیچے سے سرک گئی۔ میرے نیچے ہی خادم حسین کا مسکندہ خیر انداز میں بندھا ہوا بدن ہوا میں جمولنے لگا۔ میں نے پاؤں کی شوکر مار کر میز کو دور دھکیک دیا۔ خادم حسین بڑی سیمپری کی حالت میں سچت سے لٹکا ہوا میں جمول رہا تھا۔ میں نے اسے ”الوداع“ کہتے ہوئے ایک زوردار دھکا دیا اور نہ خانے کے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

نہ خانے کو چھوڑنے سے پہلے میں نے پلٹ کر خادم حسین کو دیکھا۔ وہ سوز و دافر پارک لاہور کے ایک جمولے کا حشر پیش کر رہا تھا۔ اس فلک یوس جمولے میں، تاریخی لباس والا ایک جن، اسی طرح اپنے پاؤں کو پکڑے دوسرے دوسرے ادرہ جمول رہتا ہے جس کی پشت میں تفریح کرنے والوں کے بیچنے کے لیے جگہ ہوتی ہے۔ اسی قسم کی حرکت والا ایک جمولا خوشی کی صورت کلفٹن کے ساحل پر بھی موجود ہے لیکن سوز (Sozo) دافر پارک والے جمولے کی اپنی ایک شان ہے۔

جب میں نہ خانے سے نکل کر کوئی کے بیرونی حصے میں پہنچا تو میرا دماغ بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ خادم سینکس کے مطابق ایک سفید ہائی روف ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچی تھی اور شاہ جمال روڈ پر ایک ایسی جگہ روک گئی تھی جہاں سے اس کوئی کے گیٹ پر گناہ رکھی جا سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جیسے ہی کوئی کے گیٹ سے باہر نکلا، تعاقب کرنے والوں کی نظر میں آ جاتا۔ ابھی تک کوئی کی اندرونی فضا میں امن و امان قائم تھا اس کا یہ قصد نہیں تھا کہ امن ہمیشہ قائم رہے گا۔ وہ لوگ زیادہ انتظار سے اس کوئی کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت وقت میں کرنا تھا۔

میں نے اپنی کارروائی کے لیے چندرہ منٹ کا وقت لے

لاہور بے قدموں چلتے ہوئے کوئی کے عقبی حصے میں آ گیا۔ کوئی کی چار دیواری گنگ جگہ پانچ فٹ تھی۔ میں نے ایک کوئی کے عقبی دیوار کو چھلانگ اور کوئی سے باہر آ گیا۔ یہ مناسب جگہ سے عقبی دیوار کو چھلانگ اور کوئی سے باہر کودنے ایک دریاں تھی جی ٹی۔ کسی نے مجھے کوئی سے باہر کودنے سے نہیں دیکھا کیوں کہ کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں چند قدموں سے چلتے ہوئے گلی کے سرے پر پہنچا اور محکم کر سامنے دالی سڑک پر آ گیا۔ یہاں سے کوئی کا بیرونی سرور شاہ جمال روڈ واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی نظر میں اس سفید ہائی روف کو دیکھا جو خادم حسین کے جہاز، ہمارے تعاقب میں وہاں پہنچی تھی۔ میں اس وقت ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں سے وہ سوز دی ہائی روف تو مجھے دکھائی دے رہی تھی مگر میں ان لوگوں کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تینوں ابھی ہائی روف کے اندر ہی اطمینان سے بیٹھے تھے جس سے لگتا تھا، فی الحال ان کا راید (Raid) کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

مجھے اسی موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں خطاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ایک کولڈ ڈرنکس کی دکان پر پہنچ گیا۔ میں نے دور سے اسی دکان پر پبلک کال آفس کا مخصوص پورڈ رکھا دیکھا تھا۔ کولڈ ڈرنکس کی مذکورہ دکان سفید سوز کی ہائی روف سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور اتفاق سے یہ اس کے عقب میں واقع تھی۔

میں جب کولڈ ڈرنکس کی دکان پر پہنچا تو اس وقت ایک شخص نوٹ بند کر کے دکان سے نکل رہا تھا۔ یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا۔ میں نے دکان کے مالک کی اجازت سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور فرید پاشا کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس دوران میں، میں نے خود کو ایک ایسے رن پر پھیر لیا جہاں سے مجھے سفید ہائی روف اور اس میں موجود تینوں افراد واضح طور پر نظر آتے رہیں۔

تیسری کھٹی پر فون ریسیور لیا گیا۔ میری ساعت سے ایک نسواں آواز غرائی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اس کی آواز کو پکڑ لیا۔ وہ فرید پاشا کی بیوی نالکھی۔ میں نے شائستہ لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو بہالی! کیسی ہیں آپ؟“

”وہ چمکی“ اپنے دیویری دعاؤں کے طفلِ خیریت ہوں، تم کہاں پر ہو؟“

میرے پاس چہکاروں کے تاج کے کا وقت نہیں تھا۔ لہذا میں نے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے سوال کیا ”پاشا کہاں ہے؟“

نالکھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی تھی کہ فرید پاشا مجھ سے کس نوعیت کا بے تکلف کلمہ چاہتا ہے اس لیے وہ میرے طرزِ خطاب کا برا نہیں مانتی تھی۔ پاشا اسے اپنے چھوٹے چھوٹے محلات سے آگاہ رکھتا تھا۔ نالکھی کو میری موجودگی میں اس نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کی بے تکلفی کا خواہاں ہے، جواب میں، میں نے پاشا پر واضح کر دیا تھا کہ میں نالکھی کو آپ جناب ہی سے مخاطب کروں گا۔ میرے اس رویے نے نالکھی کو بہت متاثر کیا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

”وہ داش روم میں ہیں۔ تم ذرا ہولڈ کرو۔ میں..... شہرہ، ہولڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی ”وہ داش روم سے نکل آئے ہیں اور اسی طرف آرہے ہیں۔“ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں میں مجھے فرید پاشا کی آواز سنائی دی ”ہاں وجدان! ادھر کیا رہی؟“

اس نے براہِ راست مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا فون کا ریسیور تمہارے سے قبل نالکھی سے میرے بارے میں اشارے دے چکی تھی۔ میں نے پاشا کے سوال کے جواب میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے یہاں کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔

پوری بات سننے کے بعد اس نے تشویش ناک لہجے میں کہا ”خادم حسین کے ساتھ تو تم نے بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ ایسے نمک حرام اس سے بھی زیادہ بدترین سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ دو چار دن تک اسے وہیں نہ خانے میں اٹھانکا رہے دو، پھر اس کی خبر لیں گے۔ وہاں پکڑانے والی چھگا دوڑوں کو بھی تو معلوم ہو کر اللہ نے کیسے کیسے جانور پیدا کیے ہیں“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا ”تم نے تعاقب کرنے والے جن افراد کا ذکر کیا ہے وہ خاص فرائض پر موجود ہیں۔ ان حالات میں تمہیں میری مدد کی ضرورت تو ہو گی؟“

”فی الحال مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔“ میں نے سنجی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں سفید ہائی روف کو بھی لگاہ میں رکھے ہوئے تھا ”پاشا! میں نے ان تین افراد سے مختلف کے لیے ایک شارٹ ٹیبل لائٹ ایکٹ اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے۔ میں ان لوگوں کو کسی طرح غیر گما کر کوئی میں داخل ہونے پر مجبور کروں گا پھر ان کی اسلیٹ اور مجھ سے دشمنی کا بخار اچھوٹ جائے گا۔“

پاشا نے دوستانہ انداز میں کہا ”مجھے یقین ہے، تم ان تینوں پر بھاری ہڈو کے لیکن پھر بھی میں یہی مشورہ دوں گا کہ

”پاشا! تم نے مجھے بتایا تھا، خادم حسین ایک دوسرے تمہارا ساتھ اس کوٹھی پر آیا تھا مگر اس کا کہنا ہے، وہ یہاں باقاعدہ بونی کر چکا ہے!“

”اس کا دعویٰ درست ہے۔“ یاشا نے تصدیقاً انظار میں کہا ”خادم حسین کو میں نے اس کوٹھی میں قیام کے بالکل آخری دنوں میں ملازم رکھا تھا پھر ہم گلبرگ خمری والی کوٹھی میں شفٹ ہو گئے تھے۔“

”کیا نیاسکیو رنی کارڈ یوٹی پر آ گیا؟“

”ہاں، میں نے تمہارے جاتے ہی اسے کال کیا تھا۔“  
پاشتا نے بتایا ”وہ آدھے بجنے کے اندر یہاں موجود تھا۔ اور  
اس وقت وہ باقاعدہ ڈیوٹی پر ہے۔ عمر دین نامی اس گاڑی  
میں نے ایک پانچویں سٹیج رتی گاڑی بھیجی ہے حاصل کیا ہے  
جو اپنے ملازمین کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتی ہے۔ خادم حسین کی  
ریفرنس کے بغیر میرے پاس آیا تھا، اس کا کہیں کوئی ریکارڈ  
موجود نہیں۔ میں نے عمر دین کو بھی بتایا ہے کہ سابق گاڑی کو  
ڈسے دارانہ روپے پر میں نے لو کر لی ہے نکال دیا ہے۔“

”تھیک ہے، اس طرح نیا گاڑو زیادہ فرض شناسی کا مظاہرہ کرے گا۔“ میں نے کہا، ”اس کے علاوہ بھی تمہیں اپنی حفاظت کے نظام کو زیادہ مضبوط اور فعال بنانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ یاد رکھو، آپ تہار اواسط بہت ہی خطرناک لوگوں بلکہ مجرموں سے ہے جو سفاکی میں اپنی مثال آپ ہیں۔“

”میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے تم کو میری ایک بات نوٹ کر لو وجدان!“ وہ اپنے مخصوص اسٹائل میں بولا۔

اسی وقت پی ای سی او میں دو افراد داخل ہوئے اور مجھے دُعا کے ساتھ مصروف دیکھ کر ایک جانب خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھ گیا، وہ میرے ریسپورڈر کئے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس پی ای سی او میں صرف ایک ہی فون سیٹ رکھا تھا، میں نے پاشا سے بات کے جواب میں کہا۔  
”ہاں بھولو، میں نوٹ کر رہا ہوں۔“ اس مرتبہ تم قدرے بلند آواز سے بولا تھا۔

اس نے کہا ”اگر خطرناک ناچر محموں سے میرا پاپا ناچے  
 تم جیسا ایک جگہری دوست بھی میری فہرست میں شامل  
 ہے۔ میں آج ہی منہاس باقر کوفوں کر کے تمہیں یہاں بھیجے  
 اس کا شکریہ ادا کروں گا۔“

اس سے پہلے کہ وہ اس رومیں مزید قدم آگے بڑھا  
 میں نے گفتگو کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے کہا ”جی ہاں،

قدرت کے کارخانے میں ہر کام کا ایک ایک وقت مقرر ہے۔ کوئی کام اس قدر وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا، اسی طرح کسی کام میں تاخیر بھی ممکن نہیں۔ بعض عمل کے اندھے، بزمِ

میں بھی اس وقت ایک دلچسپ حیرت سے دد چا رہا تھا۔  
 میرے ہی میں نے فون پر پاشا سے کہا، وہ لوگ باہر روف سے  
 باہر آ رہے ہیں..... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسی لمحے  
 اُن روف کا دروازہ کھلا اور پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد باہر  
 نکل آئے۔ ڈر انیورسٹی اپنی سیٹ پر موجود رہا۔ میں ان سے  
 تینے فیصلے پر تھا کہ ان کی باتوں کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی  
 تھی۔ جیسا کہ بات ہے، انہوں نے گاڑی سے باہر آنے سے  
 پہلے انہیں کسی کو کوئی بات چیت بھی کی ہوگی۔ بہر حال، جیسے ہی  
 میرے ذہن میں ان کے بارے میں خیال ابھرا، وہ گاڑی  
 سے باہر آ گئے تھے۔

آتش فشان ۱۵

چکی (Chil) بہت ہی پر اسرار اور حیرت انگیز قوت کا نام ہے۔ یہ پیٹ کے زیرِ حصے میں، ناف اور پڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کے درمیان خوابیدہ حالت میں موجود ہوتی ہے۔ اس سے کام لینے کے لیے مخصوص مشقوں کے ذریعے اسے بیدار کیا جاتا ہے اور بڑی مہارت سے اسے قابو میں لاکر بہت سے مفید کام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ قوت انسانی جسم میں کسی بزرگ کے طور پر کام کرتی ہے اور اس کی مدد سے جسم کے تمام نظاموں کو فعال اور زود حوس بنایا جاسکتا ہے۔ بعض لوگ چکی کا تلفظ ”ش“ بھی کرتے ہیں۔

میں یہی سب سوچتے ہوئے پبلک کال اس سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک ہائی روف سے باہر آنے والے افراد کو بھی کی جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔ وہ کوئی جو ابھی تک فریڈ پاشا کی ملکیت تھی اور اس کے ایک خفیہ خانے میں سیکورٹی گاڑو کی دھاتی پنڈولم کے مانند ٹوائپڈ فرو (To Fro) حرکت کر رہا تھا۔ ٹائیلوں کی مضبوط ڈوریوں میں جکڑے ہوئے اس کے بدن کی یہ ”آگے پیچھے“ حرکت کسی نشانِ عبرت سے کم نہیں تھی۔

حَصَّه 9

میں موجود رہا اور نے سلیو لیس سوئچ پہن رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا، انہوں نے اپنے لباسوں میں کسی قسم کے آئینے بٹھایا دیوں کو چھپانے کے لیے وہ سواگ بھرا تھا۔ کوئی کی جانب بڑھتے ہوئے وہ اندر کے قدموں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ میری خبر گیری کے لیے اس طرف جا رہے تھے۔

وہ دونوں کو بھی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے اور چونکا نظر سے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ ان کے انداز میں پڑی پراسراریت باقی جاتی تھی۔ وہ کوئی میں داخل ہونے سے قبل اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں اس دوران میں بتانا قدموں سے چلتے ہوئے سفید ہائی روف کے نزدیک پہنچ گیا۔ گاڑی کے اندر موجود رہا اور کی نظر بھی اٹھی پر کسی بھی اس لیے اسے وہاں میری موجودگی کا احساس نہ ہوسکا۔

اس وقت لگ بھگ شام کے پانچ بجے تھے اور شام، رات سے گلے لٹنے کی تیاری میں تھی۔ سفید ہائی روف، شاہ جمال روڈ کے جس سے میں کھڑی تھی وہاں ایک گاڑی گاڑیوں کے گزرنے کے سوا کسی قسم کا رش وغیرہ نہیں تھا۔

میں نے دیکھا، کوئی کے گیٹ پر پہنچنے والے وہ دونوں افراد کیے بعد دیکھے اندر کود گئے۔ گیٹ کو ہم نے اندر سے بند کر رکھا تھا اس لیے انہیں پھلانگ کر اندر جانا پڑا تھا۔ جب ہمارا قابض کر کے وہاں پہنچنے والے افراد کو بھی کے اندر غائب ہو گئے تو میں بے ہوشی ہائی روف کے ڈرائیور کی سمت بڑھ گیا۔ اس وقت میں چرنوئیت کی کارروائی کے لیے تیار تھا۔ مجھے کوئی کے اندر جا کر کسی قسم کی دھماکتا صورت حال سے سابقہ پڑ سکتا تھا اس لیے ضروری تھا، کسی بیرونی مداخلت کو روکنے کا بندوبست کر لیا جائے۔ اس وقت میری نظر میں ڈرائیور سے زیادہ بڑا مداخلت کارروائی نہیں ہوسکتا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے پہلو سے رہ چک گیا۔

”بھائی صاحب!“ میں نے اچانک بھرائی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ وہ چونکا اس لیے کہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے میرا خیال باطل ثابت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے شناسائی کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ اس کے چوتھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ پورے انہماک سے کوئی کی سمت دیکھ رہا تھا اور میرے اچانک مخاطب کرنے نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

میں نے اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں پوچھا ”بھائی صاحب! شاہ جمال کا مزار کس طرف ہے؟“

وہ مجھے کوئی ہسکا ہوا رانگہر سمجھا۔ سر سے پاؤں تک کیونکہ کے بعد اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میرے چلے جاؤ، تمہوڑے ہی فاصلے پر تمہیں مزار نظر آ جائے گا۔“ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ مجھے پہچان نہیں تھا، بصورت دیگر مجھے میرے پاس اس کا شانی علاج موجود تھا۔ فریڈ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں ایک روحانی بزرگ حضرت شاہ جمال کا مزار بھی واقع ہے۔ یہ معلومات اس وقت کام آئی تھیں۔

میرے پاس بہت کم مہلت تھی۔ کوئی کے اندر داخل ہونے والے اگر باہر نکل آئے تو ان سے منٹوں میں قدرے مشکلات پیش آتیں۔ کوئی کے اندر وہ بے آسانی ٹریٹ کے ہاں کھتے تھے۔ میں نے ڈرائیور پر چند کلمات صرف کے اور چلنے کی سی سرعت سے اس کی گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رنگ کو کھل کر میں نے اسے تمہوڑی دیر کے لیے اٹھنا غفلت کر دیا۔ اس کے سر کو میں نے گاڑی کے اسٹیرنگ پر اس طرح ٹکادیا کہ دور سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہی سمجھے کہ وہ اونگہا رہا ہے۔ اگلے چند سیکنڈ میں، میں آواز پیدا کیے بغیر کوئی کے اندر پہنچ چکا تھا۔

جب میں سکیورٹی گاؤڈ خادم حسین کے ہمراہ کوئی میں داخل ہوا تھا تو میری حیثیت ایک خریدار ایسی تھی اس لیے مختلف کرے دکھاتے وقت خادم حسین ان کی لائسنس آن کا رہا تھا جن میں سے بیشتر کردوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے امید تھی، نو واردان پہلے روشن کردوں ہی میں جھانکتے۔ ان روشن کردوں کی بدولت کوئی کے پانی حصوں میں اندر اعموس ہو رہا تھا۔ میں اندر میرے کی آڑ لیتے ہوئے قدم قدم چٹا انداز سے آگے بڑھانے لگا۔

بمجرد مجھے دکھائی دے گئے۔ وہ ایک ایسے کرے میں داخل ہو رہے تھے جس کی حیثیت ہال ایسی تھی اور اس کی ایک دیوار میں خفیہ خانے کا چور راستہ بھی نہایت ہی پراسرار انداز میں موجود تھا۔ مجھے اپنی کارروائی کے لیے وہ ہال نما بڑا کرا نہایت ہی مناسب اور موزوں نظر آیا۔

وہ دونوں جیسے ہی ہال میں داخل ہو کر میری نگاہ سے اجمل ہوئے، میں بڑی تیزی سے ان کی جانب ہلکا۔ انہوں نے ہال کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کرے میں ان ہوتے ہی دروازہ بند کر کے پلوٹڑا حادیا۔

وہ پلٹ کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے دونوں ہاتھ جھانٹے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا ”تم لوگ مجھے کمال تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ میں تو یہاں ہوں۔“

انہوں نے ایک لمحے کے لیے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے ان کا نگاہی منہموم پڑھ لیا۔ وہ مجھے وہاں کی حیثیت سے پہچان گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے انہیں اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر یقین نہ آیا ہو۔

چادر کی ہل والے شخص نے اچانک ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اپنے بدن سے چادر کھینچ کر میری جانب اچھال دی۔ میں نے ہاتھ کے دھکے سے اپنی سمت آنے والی چادر کو ایک طرف ہسکا، اس دوران میں وہ شخص اپنے لباس سے ریوالبور آمڈ کر چکا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ رہا ہوگا۔ بگٹ والے پتہ قامت گینڈا انما شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اچھا ہوا، تم خود ہمارے سامنے آگئے ورنہ ہمیں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر سامنے لانا پڑتا۔“

”پلو، کوئی بات نہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”یہ صرت اب نکال لو۔ میں بھی یہاں موجود ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں بھی سلامت ہیں۔“

میں یہ جملے ادا کرتے ہوئے بڑی جیٹ تلی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ریوالبور بردار شخص کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میرا اصل ہارنگ وہی تھا اور میں مناسب موقع ہاتھ آتے ہی اسے نشانہ بنا چکا تھا۔

پتہ قامت جگت پوش شخص نے خطرے پہلے میں کہا ”تمہارے ہاتھ پاؤں تو ہم ضرور توڑیں گے مگر تمہیں زندہ سلامت رکھنا ہماری مجبوری ہے۔ تم کسی ہاتھی کے برعکس ہو۔ تمہاری زندہ دلیجیوری ہمارے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔ مرنے کے بعد تو تم لکھ (لاکھ) کے کیا، لکھ (لکھ) کے بھی ٹھیکر ہو گے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور غیر محسوس پیش قدمی کرتے ہوئے اس سے سوال کیا ”تم مجھے پکڑ کر کے ڈیجیور کرنا چاہتے ہو۔ تم نے ابھی کسی ڈیجیوری کا ذکر کیا ہے؟“

میری ”حرکت“ کو ریوالبور بردار نے محسوس کر لیا، اس سے پہلے کہ اس کا گینڈا انما سامنے میرے سوال کا جواب دیتا، اس نے ریوالبور کو ارننگ کے انداز میں ملہراتے ہوئے کہا۔

”وہاں! کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔“

”اگر میں جان سے چلا گیا تو تمہارے لیے بے کار ہو کرکھا گا۔“ میں نے ریوالبور بردار کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ لیں۔ ”تمہارا اس گینڈے سامنے ہی بتایا ہے کہ میں کوئی ہاتھی نہیں ہوں مجھ زندہ ایک لاکھ کا اور مرنا سو لاکھ کا ہوتا ہے۔“

ذکرہ شخص تنہیں انداز میں مجھ سے گویا ہوا ”تم زیادہ باتیں نہ بناؤ اور خاموشی سے خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اگر ہمیں مجبور کرو گے تو ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ شاہ ہے، تم نے کراچی میں بڑی قرضگی عیالی ہوئی تھی لیکن بچا! ایک بات ذہن میں رکھنا، یہاں ہور ہے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک اقرار پڑا ہے۔ تم کسی غلطی کا شکار نہ رہنا۔ اور ہر بندہ گزارتے ہوئے ڈرائیور نہیں لگاتے۔“

اس کی بکواس کے دوران میں، میں نے ہم تینوں کے درمیان قدمی فاصلے کو ذہن نشین کر لیا تھا لہذا ایکشن میں کوئی قناعت نہیں تھی۔ میرے ذہن نے ایک ایک ٹوٹ کا حساب کر لیا تھا۔

میں نے دھکی دینے والے گینڈا مصورت شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے بھولے پن سے کہا ”یارا ناراض کیوں ہوتے ہو۔ مجھے پکڑنے آئے ہو، لو پکڑ لو۔ میں کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے دونوں ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ یہی سمجھا، میں اس کی طرف قدم بڑھانے والا ہوں۔ وہ بڑی تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرح اس نے مجھے میرا مظلوم بے زادی فرام کر دیا تھا۔ اب میں بہ آسانی ان دونوں کو شکار کر سکتا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کرتے، ایک بجلی سی پٹکی۔ میں نے پلک جھپکتے میں ایک بیک فلیک (Back Flick) لگائی اور پتہ قامت جگت پوش کے سامنے پہنچ گیا، اس طرح کہ اس گینڈے کی آڑ بھی مجھے میسر تھی۔ اگر ریوالبور بردار مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتا تو گولی گینڈے کی موٹی پشت میں پیوست ہو جاتی۔

میری اس غیر متوقع حرکت پر ریوالبور بردار ہلکا گیا۔ اس کی ہولکھا ہٹ سے فائدہ نہ اٹھانا تنظیم ترین حماقت ہوئی۔ میں نے گینڈا انما شخص کی ٹھوڑی پر ایک فولادی شیج رسید کیا اور فرخت رول کرتے ہوئے ریوالبور بردار کے پاس پہنچ گیا پھر میں نے اسے فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کا ریوالبور والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں حرکت میں آ چکا تھا۔

میں نے بڑی سرعت سے اس کے بازو کو ہلاک کیا اور ہٹس لاک لگاتے ہوئے سرو وڈاے کر اس کی پشت پر ایک زور دار لگ کر رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے سامنے کی جانب گیا اور اس سے ٹکرا کر زمین یوس ہو گیا۔ اس تصادم کے نتیجے میں ریوالبور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا کر اٹھا۔ یہ تمام عمل بیان کرنے میں خاصا طویل اور پیچیدہ نظر آتا

ہے لیکن میں نے اس کی کھیل میں صرف پانچ سیکنڈ صرف کیے تھے اس سے اندازہ لگا پا سکتا ہے، میرے ایکشن میں کس قدر برقی رفتار پائی جاتی تھی۔ یہ سب مرتبہ کئی بینک کھیل تھا۔ ایک فلیک، بچہ غنیمت رول، بلاک، پش کک اور کک ایک نیا کھانی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

سمرات لگاتے ہوئے محل والے گیندے کے نزدیکی گیا۔ اس دوران میں اس نے مجھے فائرنگ کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پتول سے فائر ہونے والی گیندیں چھت اور دیواروں کے بلاستر کو دھڑکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں۔ اس فائرنگ سے مجھے ایک فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ اس کے پتول کا کلپ خالی ہو گیا۔ میں نے اس کے سامنے ”ایڈیٹنگ“ کی تو اس کے محل سے ”ٹھک ٹھک“ کی آواز خارج ہوئی۔

نہ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ریلوے کوئی سے اتارا اور اسے اپنی جیب میں ٹھونسنے کی بجائے دشمن کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میں! میں دوسرے دشمن یعنی گینڈا نما حملہ آور کو بے ہوشی میں پہنچانے کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے ان لوگوں سے بہت سی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اگر گینڈا ابھی بے ہوش ہو کر کسی بے زبان شخص کی صورت دھار لیتا تو پھر سوال کس سے کرتا؟

“دوں؟“



”تم لوگوں تک ہاس کے احکام کس طرح پہنچے ہیں؟“  
میں نے پوچھا۔

خانے تک پہنچنے کا راستہ تھا!

ہاں معلوم نہیں کہ آج تمہارے ولی نعمت کی محبوبہ کی شادی باہر فریڈ پاشا کی برات آئی ہے۔ یہ سب شور شرابا اسی طے میں ہے مگر لڑکی کا بھائی مارے شرم کے منہ چھپائے ادھر

مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا!“  
میرے لہجے میں پوشیدہ سفاکی نے اسے مہر بہ لب کر دیا۔



میں فرش پر پڑے ہوئے گینڈا انما شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ خادم حسین کو ہلکے خیر انداز میں جھپٹ سے لٹکے دیکھ کر اپنی رہی سہی سمیت بھی بار بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی موٹی کھال والے لوتے کو تانا جو دھیں نمایاں کر دیا محسوس کی۔ اس کی دہشت میں مزید اضافہ کرنے کی خاطر میں نے کہا۔

”رانا عظمت اور سکندر کے اس خبر کو تم نے ابھی طرح پہچان لیا ہوگا!“ میرا اشارہ خادم حسین کی جانب تھا ”یہ اپنے آقاؤں سے وفاداری کا مزہ چکھ رہا ہے۔ کان کھول کر سن لو، اگر تم نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو مجبوراً مجھے تمہارے لیے اسی جھپٹ سے ایک ایکٹیشن باندھنا ہوگی۔ کیا تم خادم حسین کی طرح جھنجھو جھوٹے کرنا پسند کرو گے؟“

”نہیں..... تم..... مجھ سے کس طرح کا..... تعاون چاہتے ہو؟“ گینڈا امریل سی آواز میں ہلکایا۔

”یہ اول درجے کا جھوٹا اور مارکا ہے۔ یہ سب کچھ اگوانے کے بوجھ میں نہیں چھوڑے گا۔ میرا حشر دیکھ لو! میں نے اس شیطان کے ہر سوال کا جواب دیا تھا لیکن اس نے.....“

”تمہارا کیس دوسرا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”تم دراصل فرید پاشا کے مجرم ہو۔ تمہارا فیصلہ پاشا کی عدالت میں ہوگا۔ میں نے تمہیں صرف جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں لٹکا یا ہے۔“

وہ گینڈا انما شخص کو درغلانے سے باز نہ آیا تو مجھے مجبوراً اس کی یونٹی کو کنٹرول کرنا پڑا۔ میں نے اپنی پاکٹ سے بیبی رومال نکالا اور اسے خادم حسین کے ڈاؤن ورڈ منہ پر اچھی طرح کس کے باندھ دیا۔ رومال کی موٹی پٹی نمائندہ اس کے منہ کو دبا کر پوری طرح ڈھانپ لیا۔ اب اگر وہ داد فریاد کی کوشش بھی کرتا تو بمشکل تمام اس کے طلق سے ”غوغا“ کی آواز ہی خارج ہوتی۔ مزید احتیاط کے لیے میں نے خانے کے اٹھوتے مختصر سے روشن دان کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے پہلے میں نے گینڈے کے بدن سے چمڑے کی جیکٹ اتار دی تھی۔

”تمہارے بدن میں در در جہاں کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے۔“ میں نے اسے خفارت سے ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا ”کس نام نے کبھی رینو (گینڈے) یا ہائپو (دورانی گھوڑے) کو کبھی گرم جیکٹ میں دیکھا ہے؟“

اس نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ جہی جیکٹ میرے حوالے کر دی، منہ سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ میں

نہ کورہ روشن دان کے قریب آ گیا۔ وہ روشن دان نہ خانے کی ایک دیوار میں، چھت کے نزدیک بنا ہوا تھا۔ اس کا سناہ آدھا ضرب تین فٹ تھا اور اس پر مینن جالی لگی ہوئی تھی۔ اس روشن دان کا بیرونی حصہ پائیں باغ میں کھلتا تھا مگر باہر سے دیکھنے میں نظر نہیں آتا تھا کیوں کہ باغ کے اس حصے میں کائنات دار چھائیاں موجود تھیں جن سے سورج کی جڑی روشن دور اور تو چمن کر دے خانے میں پہنچ سکتی تھی مگر اندر کی مدد مگر باغ سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے دے خانے میں بہت کم کپڑا بلب لگایا گیا تھا۔

میں نے احتیاطاً گینڈے کی جیکٹ کو روشن دان کے سامنے پھیلا کر اس کی آستینوں کو گرل کے کولوں میں پھیر دیا۔ اس سلی بخش انتظام کے بعد میں واپس اپنے غار کی طرف آ گیا۔ پہلے بھی، اور اس وقت بھی میرے ذہن میں ایک سوال شدت سے سر اٹھا رہا تھا اور وہ یہ کہ فرید پاشا نے کیوں اور کس مقصد سے وہ دے خانہ بنوایا تھا؟ اس خطرناک سوال کا اطمینان بخش جواب صرف پاشا ہی دے سکتا تھا۔

میں گینڈے کے قریب پہنچا تو کوشی کے اندر پیدہ ہونے والی آوازوں میں اضافہ ہو گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ اٹھانچ کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کھلے، بند ہونے کی مخصوص آوازیں، جھنجھوٹے جھنجھٹ سے مشابہ انسانوں کے آپس میں باتیں کرنے کی گواہی۔ الغرض، اوپر کوشی میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ میں نے اس عرصے کے دوران میں، اوپر ہونے والی کچھ سے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ وہ لوگ وہاں کسی کو تلاش کرتے تھے جو ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب جگہ سے آ رہی تلاش کے سلسلے میں تھی۔

وہ مخصوص آوازیں کچھ دیر تک تو اتار سے پیدا ہوتی رہیں لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے مزید فائرنگ نہ کی۔ ان کی کوشی میں آدھ کے ساتھ اور چند لمبے جھم۔ شہید فائرنگ کی آوازیں سنیں اور اس دور فائرنگ۔ دوران میں ٹیلی فون کی کھنٹی سنائی دی اور نہ ہی کسی گن۔ دہانے نے سیبا اگلا۔ وہ لوگ فائرنگ کا خیال دل سے کا کر بڑی شدت سے اس ہستی کی تلاش میں لگ گئے تھے جن کا قبضہ کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچتے تھے۔

یہ میرا قیاس تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ پہلی فائرنگ۔ نتیجے میں خادم حسین کی طرح میرے ذہن میں بھی نمایاں آیا تھا کہ وہ سکندر یا رانا عظمت کے آدمی ہو سکتے ہیں، جو سرکوبی اور اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے وہاں پہنچتے تھے

مجھے لگے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیوں کہ وہ مراجم کے ساتھ کوشی میں داخل ہونے والوں کو یوں کہہ رہا تھا کہ فائرنگ نہیں کرنا چاہیے گی۔

میں نے اس دہانے میں موجود تھے۔ خادم حسین کی سپریم عروج پر تھی اور گینڈا انما شخص کا دھشت سے برا مال تھا۔ میں مطمئن غامض بیٹھا کسی نادیہ آکھ سے کوشی کے اندر ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگا۔ میری خاطرہ آکھیں محروم گینڈا انما شخص پر لگی تھیں اور میں اپنے باطنی دوسوں سے باہر کی صورت حال کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی کیفیت میں لگ بھگ آدھا گھنٹا گزر گیا پھر میں نے محسوس کیا، میری جلد آدھ دہانے جا رہے تھے۔ اٹھانچ کی آوازیں تم سے کم ہونے لگیں اور انسانی قدموں کی مخصوص چاب بھی دائرہ ساعت سے دور ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد کوشی کی اندر دئی نفا میں سنا چھا گیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، سناہ تلاش ٹولا نا کام وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی کہ وہ لوگ میری یا رانا عظمت کے آدمیوں کی تلاش میں وہاں نہیں آئے تھے۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا اور خدا جانے، کیا چکر تھا؟

جب اس دن کو پوری طرح قائم ہو گیا تو میں گینڈا انما تلاش کی طرف متوجہ ہوا ”اودھرتی کے بوجھ! تم نے ابھی تک پتہ نہ لگایا نہیں بتایا؟“

وہ خداوند امیر لکھے میں بولا ”میرا نام قادر بخش ہے۔“

”اور تمہارے اس دشمنی سامنے کیا کیا نام ہے جو اوپر بے ہوش ہے؟“

”فیصل احمد!“ اس نے بتایا ”اور اب تم ڈرامیور کے بارے میں سوال کرو گے اس لیے میں تمہیں خود ہی بتا دیتا ہوں۔“

میں نے سراپنے والے انداز میں کہا ”نیک کام میں تاخیر مناسب نہیں ہوئی۔ تم میری مرضی کے مطابق عمل کر رہے ہو۔“

قادر بخش نامی اس گینڈے نے اپنے تیسرے ساتھی کا نام ریا علی بتایا جو کوشی سے باہر شاہ جمال روڈ پر ایک سفید بالی روف کے اسٹریٹک پر کھائے دنیا دافیا سے غافل بیٹھا تھا۔ یہ بات میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈرامیور ریا علی اس ”مفلکت“ میں کس کا ہاتھ تھا۔

”میں نے اپنے سامنے فرش پر موجود گینڈے سے کہا۔“ قادر بخش! میں دہانے سے پوچھتا چھ شریعت کرنا ہوں جہاں

سلسلہ ٹوٹا تھا اور.....“ میں نے ذرا توقف دینے کے بعد کہا ”یہ بات تمہیں ذہن میں نقش کر لینا چاہیے کہ غلط بیانی اور ہیر پھیر کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ میں اس سلسلے میں کسی رو رعایت کا قائل نہیں ہوں۔ تم اس ”مثال“ کو دیکھ سکتے ہو!“ بات کے اختتام پر میں نے چھت سے لٹکے ہوئے سیکورٹی گارڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

قادر بخش نے ایک ٹھوکر جھرجھری لی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی بل ڈاگ نے اپنے شریا اور بدن کو جھرجھرا کر پانی جھٹکنے کی کوشش کی ہو۔ اس منجھکے خیر اور دھشت انگیز حرکت کے بعد اس نے بڑے ذدیانہ انداز میں کہا ”پوچھو، میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“

میں نے پوچھا ”تم سکندر کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے لیکن تمہاری بات اودھرتی رو گئی۔ تم نے کہا تھا، یہ ساری آگ اس نامراد کی لگائی ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا تھا، سکندر کا تمہارے پاس چوہدری دلدار سے کیا تعلق ہے؟“

وہ آنکھیں جھپٹکے ہوئے بولا ”دراصل سکندر کی دوستی فضا سے ہے جو اس کا خاص آدمی ہے۔ ہم تینوں (قادر + فیض + ریا علی) فضا کے لیے کام کرتے ہیں۔ سکندر نے تمہارے بارے میں فضا کو کوئی خاص پٹی پڑھائی ہے۔ ہم تمہیں پکڑ کر فضا کے حوالے کرنے والے تھے مگر.....“

اس نے دانستہ جملہ اودھرتی چھوڑ دیا اور رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے طرے لکھے میں کہا ”تم مجھے فضا تک ڈیلیور کرتے اور وہ مجھے چوہدری دلدار کے پاس پہنچا دیتا۔ میرا اصل طلب گار چوہدری دلدار ہے جو ڈیلیفٹ سوسائٹی میں رہتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ اثبات میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا ”سکندر کا براہ راست چوہدری دلدار سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے پتا نہیں، اپنے دوست فضا کو تمہارے بارے میں کیا بتایا ہے کہ وہ لوگ تمہارے لیے انتہائی فعال ہو گئے ہیں۔ میری مصلوات کے مطابق، فضا نے پاس سے تمہارا ذکر کیا تو وہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس نے تمہارے ”حصول“ کا مشن فضا کے سپرد کر دیا۔ ہم تینوں فضا کے حکم پر تمہیں پکڑ کر یہاں سے لے جانے والے تھے اور پھر.....“

”ایک منٹ!“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”ادھر ہال نام کرے میں تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ تمہیں معلوم نہیں، پاس کے احکام تم لوگوں تک

کس طرح پہنچے ہیں کیوں کہ تم ان لوگوں میں ابھی نئے ہو مگر تمہارے حالیہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے، ہاس اور تمہارے درمیان فضا نامی کوئی شخص بھی موجود ہے جو تمہارے ہاس چوہدری دلدرا کے بہت قریب ہے۔ میں تمہارے کون سے بیان کو درست سمجھوں؟

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے ریو الور برآمد کیا اور بڑی بے پروائی سے اس کے چیمبرز کو چیک کرنے لگا۔ یہ ریو الور میں نے فیض احمد سے چھینا تھا۔ فیض اوپر ہال نما کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ قادر بخش کا ناکام خالی بھل بھی اسی ہال میں کہیں موجود تھا۔ فیض احمد والا ریو الور پوری طرح بھر ہوا تھا۔ اس ریو الور کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر قادر بخش گیڈنا کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھل پھل گئیں، گویا میرا مقصد پورا ہو گیا۔

میں نے سنسنی خیز سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ کھٹکھٹانے والے انداز میں بولا ”وہاں، یقین، جاؤ، میں نے تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ اس وقت میں تمہیں فضا کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا۔ دراصل، تمہارے رویے نے میری مت مار دی تھی۔“

”تم اپنی مت کو قابو میں رکھو قادر بخش!“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر اب تم نے جواب میں کوئی گزبڑ کی تو میں تمہیں مارنے میں بھی کسی خیل و جھت سے کام نہیں لوں گا۔“

جواب میں وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس سبکی ہوئی نظر سے مجھے بکتا رہا۔

میں نے سوال کیا ”تم لوگ مجھے پکڑ کر اپنے بڑے، فضا کے پاس پہنچانے والے تھے۔ یہ فضا کہاں رہتا ہے؟“

”فضا کا ٹھکانا مسلم ٹاؤن میں ہے، آب پارہ مارکیٹ کے نزدیک۔“ اس نے جواب دیا پھر میرے استفسار پر اس ٹھکانے کا مکمل ایڈریس بھی بتا دیا۔

”تم نے چوہدری نواز علی اور رانا عظمت سے اپنی لاطینی کا اکتھار کیا ہے۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا ”جب کہ میری اور میرے دوست پاشا کی دشمنی انہی دو افراد سے ہے۔ ہم کسی فضا یا چوہدری دلدرا کو نہیں جانتے پھر تمہارے بڑے مجھ میں دیکھی کیوں لے رہے ہیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی؟“

”تمہارے اس سوال کا جواب سکندر ہی دے سکتا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”اسی نے تمہارے بارے میں فضا کو کچھ پوچھا تھا۔ ویسے میں نے اتنا اندازہ ضرور لگایا

ہے کہ تم ہاس کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہو۔ وہ جس میں کام کرنے کے لیے فوراً سرگرم ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا ”اور جب تم لوگ مجھے فضا کے پاس پہنچاؤ گے تو تمہارے پاس چوہدری دلدرا کا کیا حال ہوگا؟“ وہ تمہاری اور ہماری تلاش میں پورے لاہور کو اٹھا

رکھ دے گا۔“ قادر بخش نے بڑے اعتماد سے یہ جملہ بولا تھا۔ ویسے تو ہر شخص اپنے ہاس کی طاقت کے بارے میں اتنا پر اعتماد ہوتا ہے لیکن قادر بخش کی بات میں یابی جاننے والا سنجیدگی نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

نے اس سے پوچھا۔

”کیا تمہارا چوہدری دلدرا اتنا ہی با اختیار ہے؟“

”تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”تم تنہا ہائی روف میں ہمارا تعاقب کرتے ہوئے اس کو کسی تک پہنچاؤ اور مجھے یقین ہے، اس تعاقب کا آغاز گلبرگ قریبی والی گلی سے ہوا تھا۔ اگر تم رانا عظمت اور فرید پاشا کے بارے میں نہیں جانتے تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا، میں اس کوئی شہا ہوا ہوں؟“

”تمہارے بارے میں ہر قسم کی معلومات سکندر نے تک پہنچائی تھیں۔“ قادر بخش نے حمل لہجے میں جواب ”کل تو صرف تمہارا سرسری ذکر ہوا تھا جس پر چوہدری دلدرا تمہارے لیے بے قرار ہو گیا اور آج صبح سکندر نے تمہارا قیام گاہ کے بارے میں فضا کو بتا دیا۔ اس کے بعد ہی تمہاری عمرانی کے لیے گلبرگ والی کوٹھی کے آس پاس ہوتے پھر جیسے ہی تم سیکورٹی گارڈ کے ساتھ کوٹھی سے نکلے تمہارا تعاقب شروع کر دیا مگر یہاں آ کر صورت یہ بالکل بدل گئی۔ تم نے اپنی جالاکا سے ہم پر غلبہ پالیا۔“

ابھی ہوئی صورت حال بڑی حد تک مجھ پر واضح ہو چکی تھی یقین ہو گیا، چوہدری دلدرا کسی نہ کسی حوالے سے مجھے نواز علی سے منسلک ہے ورنہ وہ میرے نام پر اپنی فضا سے عملی اقدام نہ کرتا۔ سکندر نے سرسری انداز میں دوست فضا سے میرا تذکرہ کیا تو اس نے یہ خبر چوہدری تک پہنچا دی۔ اگر چوہدری دلدرا مجھ سے واقف تھا تو فضا آگاہی بھی لازمی بات تھی۔ دشمنوں میں اس وقت وہ جب طلب گار صرف اور صرف چوہدری نواز علی ہی تھا۔ چوہدری دلدرا مجھے پکڑنا چاہتا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ وہ مجھے چوہدری نواز علی تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ تمام ایک ہی سلسلے کی تھیں۔ سب سے زیادہ نشوونما

کہ چوہدری نواز علی لاہور میں میری موجودگی سے آگاہ ہو گیا تھا۔ چوہدری دلدار نے کل رات ہی یہ اطلاع رکھاس والی پہنچادی ہوگی۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ سب امکانات اور خدشات بائیں ٹھیس اور میرے خدشات ہمیشہ سچے ثابت ہوئے تھے۔ میرے اور چوہدری نواز علی کے درمیان کوئی نیکیاں شروع ہونے والا تھا اور اس کھیل میں مجھے ہر قدم چھوک کر رکھنا تھا۔ میری محبوبہ اس کے قبضے میں جا چکی تھی اور وہ مجھ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ آزما سکتا تھا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں پہلی فرصت میں اس دخانے کو خیر با کہہ دوں!

فریاد پاشا کی کوٹھی سے، ہمارا تاقب کر کے یہاں تک پہنچنے والے، خشت کے تین آدمیوں میں سے ایک قادر بخش ہے دست و پا میرے سامنے موجود تھا، فیض نواز بندہ اوپر والے ہال میں بے ہوش پڑا تھا اور تیسرا ڈرائیور ریاض دہانت ہائی روف میں موجود تھا۔ قادر بخش اور فیض احمد تو کسی ”حرکت“ کے قابل نہیں تھے البتہ ریاض علی کی جانب سے کوئی بھی شرارت سامنے آ سکتی تھی۔ خصوصاً تھوڑی دیر پہلے اس کوٹھی میں جو عرواں دھار فارنگ ہوئی تھی وہ ریاض کی ”غفلت“ کو توڑ سکتی تھی اور..... دیگر افراد، خاص طور پر قانوں کے محافظوں کو اس کوٹھی کی جانب متوجہ کرنے کا باعث بھی بن سکتی تھی چنانچہ اس کوٹھی سے نکلنا از حد ضروری ہو گیا تھا۔ دونوں تک اس خفیہ دخانے میں چھپ کر بیٹھے رہنا یہی مناسب نہیں تھا۔ میں نے گینڈے نما قادر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میرے سارے ارادے اور فیصلے تو تم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔“ وہ برہمی سے بولا ”میں تو یہی چاہوں گا، تم پہلی فرصت میں مجھے یہاں سے جانے دو۔“ ”تا کہ تم باہر جا کر کوئی بڑی گزیر کر سکو!“ میں نے زہر لیے لہجے میں کہا ”اس سے تو کہیں بہتر ہوگا، میں تمہارے سامیوں کوٹھی سمجھ جان کر اسی دخانے میں لے آؤں تا کہ تم شبیوں کا خاندان ایک ہی جگہ آباد ہو جائے۔“ میری بات کے جواب میں قادر بخش تو کچھ نہیں بولا لیکن چگاڈز کے مانند جھپٹ سے لٹکے ہوئے خادم سین کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ قادر بخش سے یہ کہنا چاہ رہا ہو..... بے وقوف! یہ فیض جہیں بھی نہیں چھوڑے گا! اس کا منہ بندھا ہوا تھا اس لیے وہ کوئی بھی صلاحیت سے محروم ہو کر رہ گیا تھا ورنہ وہ اس موقع پر بہت شور مچا دیتا چاہتا تھا۔ میں نے قادر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں تھوڑی دیر کے لیے دخانے سے باہر جا رہا ہوں۔ اگر تم شرافت کا ثبوت دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تو میں تمہیں ہاتھ پاؤں سے ”معذور“ بنا دیتا ہوں۔“ دینے لہجہ میری اطلاع کے لیے میں بتا دوں کہ باوجود ہر کوشش کے بھی تم میری مرضی کے بغیر اس دخانے سے باہر نہیں نکل سکو گے اس لیے اب کوئی رحمت نہ ہی کر دو تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔“ شاید میری بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اثباتی تاثرات کو ابھرتے دیکھا۔ آئندہ چہرے میں مخصوص تنہیک استعمال کرتے ہوئے میں دخانے سے باہر آ گیا۔

ہال نما کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چوک اٹھا۔ اس کمرے کا داخلی دروازہ کھلا پڑا تھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پلٹ لیا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں نے اس کمرے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس طرح دروازہ کھول لیا تھا۔ ہال کی ظاہرہ حالت بھی یہی تھی جتنی وہاں ”خلاش“ کا کام پڑی شدہ رہے ہوا تھا۔ جب میں نے ہال سے، دخانے کی طرف کوچ کیا تو وہاں کی لائٹ جل رہی تھی۔ اسی روشنی نے حملہ آوروں کو اس جانب متوجہ کیا ہوگا۔ گینڈے قادر بخش کے سامنے فیض احمد کا بے حس و حرکت جسم ابھی تک دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔

اس صورت حال نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔ ہنگامی انداز میں کوٹھی کے اندر کودنے والے مسلح افراد تعلق سکندر بابا را غفلت سے تھا اور نہ ہی منشا چوہدری دلدار سے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو فیض احمد کو یہی نظر انداز کر کے چپ چپاتے غائب نہ ہو جائے!

نامعلوم قتلہ پر در افراد کے بارے میں سوچے ہوئے میں عجبیہ سمت میں کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ بے ہوش فیکل احمد کو خانے میں منتقل کرنے سے قبل ان کے تیسرے سامی کی کمرہ گیری ضروری تھی۔ میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے ان مقام تک آیا جہاں سے سفید ہائی روف بہ آسانی نظر آتی تھی۔ رات کی جزوی تاریکی کے باوجود بھی مجھے ہائی روف ڈرائیونگ سیٹ پر ریاض علی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ہنوز اسٹیرنگ پر سر رکھے خاموش بیٹھا تھا جس کا ایک ہر مطلب تھا، میں نے اسے اٹھا اٹھل بتانے میں کچھ زیادہ سے کام لے لیا تھا یا پھر وہی کم بہت اور بودا ثابت ہوا۔ اس کی مستقل غفلت خطرناک نتائج لا سکتی تھی! ریاض کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں کوٹھی دے دیوار بھلا تک کر ایک مرتبہ پھر اندر پہنچ گیا پھر اس

پلے کمرے میں ہال نما کمرے کی طرف قدم اٹھاتا، مجھے چونکنا پڑا۔ بائیں باغ میں ایک پراسرار حرکت دیکھی تھی۔ میری نگاہ نے بائیں باغ میں ایک پراسرار حرکت دیکھی تھی۔ میں تنگ کرک گیا۔ وہ کوئی انسان تھا جو آڑوں سے چلتے ہوئے ان جھانپوں کی طرف چلا گیا جس کے پیچھے دخانے کا روشن دان تھا۔ چائیں، وہ کون تھا اور اس وقت وہاں کیا کر رہا تھا۔ ٹوری طور پر میرا ذہن نامعلوم مسلح حملہ آوروں کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے کسی کی تلاش میں کوٹھی کے اندر بڑی آواز مچائی تھی۔ تو کیا وہ اس شخص کی تلاش میں تھے؟ اس سوال نے مجھے بے حد محتاط بنا دیا۔ میں بڑی احتیاط سے وہ قدموں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، جھانپوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا۔ میں نہایت مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ میری طرف سے بے خبر اس جالی دار روشن دان کی سمت بڑھ رہا تھا جس کے پیچھے دخانے میں کم باور کا بلب روشن تھا۔ اندر سے جب تک کے چلاؤ کے باوجود بھی کبھی سی روشنی باہر سے نظر آ رہی تھی کین کہ میں اس وقت روشن دان کے انتہائی قریب کھڑا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ باہوگا۔ تاہم زاویے قفٹ تھے۔

پہلے چلے یوں محسوس ہوا جیسے وہ روشن دان سے آگے لگا کر اندر چھانکنا چاہتا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ شاید وہ اپنے آس پاس میری موجودگی کا احساس کر چکا تھا اس نے بڑی سرعت سے پلٹ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں ایسی ہی صورت حال کے لیے تیار ہو کر تیار کھڑا تھا، حملہ آور اس طرح میری جانب لپکا جیسے اپنے وجود سے اذان پ کر نیچے گرنا چاہتا ہو۔ اگر میں پہلے سے محتاط نہ ہوتا تو وہ اپنی جال میں کا ماب ہو جاتا۔ اس کی بد قسمتی کہ میں اس کے ٹاکو میں نہ آ سکا، جیسے ہی وہ میری جانب لپکا، میں نے پہلو سے کل جک کر اسے سائیڈ خورد مار دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتے ہوئے جھانپوں کے چار گرا۔ بائیں باغ کی زمین سے گرنے کے نتیجے میں اس کے منہ سے ایک فیض کراہ برآمد ہوئی جس نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ وہ خالصتاً ایک نسوانی آواز تھی۔

میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ زچہ لپک کر کھینچنے لگا۔ اس نے مردانہ ظلمات فیض زیب تن کر رکھی تھی۔ سر کے بالوں کو بڑی صفائی سے سمیٹ کر فیض کے کنارے اندر چھپایا گیا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک عورت تھی۔ اور نہایت ہی حسین و جمیل تھی!

میں اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کی جانب انگلی نہیں ہوں۔“

اٹھاتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا ”کون ہو تم۔“ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور زمین پر ہاتھ ٹیک کر دھیرے دھیرے کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت میری نگاہ اس کے کندھے کی جانب گئی اور ایک لمحے میں، میں نے اندازہ لگا لیا، اس کا دایاں شانہ جوڑ کے مقام سے شدید زخمی تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور دایاں شانے سے اس کی فیض خون آلود ہو رہی تھی۔ میرے سامنے کھڑی اس جس مخالف کی عمر بچپن کے قریب ہوگی۔ اس کے حسن میں ایک خاص قسم کی تازگی پائی جاتی تھی۔ میں دوثق سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ کوئی لڑکی ہے یا عورت! بہر حال، اسے عورت کہنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ جب وہ منہ سے کچھ نہ بولی تو میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”کون ہو تم..... جہیں کس نے زخمی کر دیا؟“ ”میرے دشمنوں نے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ میرے ذہن میں، گھٹنا بھر پہلے ہونے والی شدید فائرنگ تازہ ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا، مسلح حملہ آوری عورت کی تلاش میں کوٹھی میں کودے تھے۔ میں نے اپنے یقین کو آزمانے کے لیے اس سے پوچھا۔

”تمہارے دشمن ناکام ہو کر اس کوٹھی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی فائرنگ کے نتیجے میں صرف تمہارا شانہ زخمی ہوا ہے۔ تم کہاں چھپ گئی تھیں جو وہ جہیں تلاش نہیں کر سکے؟“ ”میں اپنی جان بچانے کے لیے ان جھانپوں میں دھک مچ گئی تھی۔“ وہ بہت صاف اردو بول رہی تھی تاہم اس کے لہجے میں سردی رنگ نمایاں تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا، اس کا تعلق کسی پشتون قبیلے سے تھا۔ اس کی رنگت اور خال و خط بھی اسی جانب اشارہ کرتے تھے۔

میں نے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے اور ان لوگوں کی تم سے کیا دشمنی ہے؟“ ”میں اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے تمہارے بارے میں جانتا چاہوں گی۔“ اس نے زخمی بازو دکھاتے ہوئے کہا ”میں جہیں اپنا خیر خواہ سمجھوں یا دشمن؟“

اس کے سوال میں بڑی قوت تھی جس سے مجھے یہ بھی بتا چلا کہ وہ ایک عورت تھی۔ زخمی بازو کے سبب اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات ظاہر ہو رہے تھے تاہم وہ ہونٹوں کو کھینچ کر مضطرب مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں نے کہا ”میں اس کوٹھی کا مالک ہوں اور تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے، میرے دوست ہوا“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
وہ ایک بلند حوصلہ اور پراختیاد عورت تھی۔ حسن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے بے غوثی کی دولت سے بھی نوازا تھا۔  
میں نے اس کا جواب دینے سے گریز کیا۔  
”نی الحال تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھتی تھی۔ دوئی کا فیصلہ بعد میں ہو جائے گا۔“  
اس نے مسرتی خیر انداز میں سر ہاتھ پیرا چاڑھ لیا اور پھر ہری ہوئی آواز میں بولی ”اگر تم میرے خیر خواہ ہونے کا دعوے دار ہو تو پھر خیر خواہی کا ثبوت بھی دو۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔  
”نی الحال صرف اتنا کہ تم مجھے یہ رات اپنی کوئی کسی کوئے کھدوے میں گزارنے دو۔“ اس نے سادگی سے کہا  
”میرے دشمن یہاں تلاش میں ناکام ہونے کے بعد چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہی نتیجہ نکالا ہوگا کہ میں اس کوئی سے نکل گئی ہوں لہذا وہ اپنی کراہ کر رخ نہیں کریں گے۔ یہ کوئی میرے لیے محفوظ مسکن ثابت ہوگی۔ تم مجھے یہ رات یہاں گزارنے کی اجازت دے دو۔ میں صبح ہوتے ہی یہیں چلی جاؤں گی۔ بھلا ہواں جھاڑیوں کا!“ اس نے دیوار کے ساتھ ایک قطار میں موجود جھاڑیوں کی جانب اشارہ کیا ”اس آڑ کے سبب میں اپنے دشمنوں کی نظر میں نہ آسکی۔ اور یہیں پر مختصر روڈوں کے دوران میں، میری نگاہ میں آگیا کہ اس کوئی کے اندر کوئی نہ خاندان بھی موجود ہے۔ میں نے ایک فیسے سے روشن دان کے پیچھے ہلکی روشنی دیکھی تھی پھر اندر کسی نے روشن دان کے آگے کوئی کپڑا اتار دیا۔ روشنی کا اخراج پوری طرح بند تو نہیں ہوا تاہم اب اندر دیکھنا ممکن نہیں رہا۔“

”تو ابھی ابھی تم اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں؟“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا ”تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟“  
”زرگل!“ اس نے دو لفظی جواب دیا۔

اس کے جواب نے اس بات کی مزید تصدیق کر دی کہ وہ کسی پشتون خلی سے تھی۔

”اور تمہارا دشمن کون ہے؟“ میں نے پوچھا ”جو اس بری طرح ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے تو محوڑی دیر پہلے اس کوئی میں ہونے والی فائرنگ کو معمولی نہیں کہا جا سکتا!“

وہ بولی ”میرے دشمن کا نام حکمت یار ہے۔ یہ سب اسی کے بندے تھے جو مجھے شکار کرنے کے لیے تمہاری کوئی میں

کھس آئے تھے۔“  
”حکمت یار سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟“  
”میں اس کی دشمن نہیں بلکہ وہ میرا دشمن ہے۔“  
”ایک ہی بات ہے۔“ میں نے کہا ”تم حکمت یار کے بارے میں بتاؤ؟“

”حکمت یار رشتے میں میرا چاچا ہے۔“ اس نے بتایا  
”اس خاندانی دشمنی کی کہانی بہت طویل ہے۔ کبھی فرصت اور موقع ملا تو تمہیں ضرور سناؤں گی۔ نی الحال تو تم مجھے رات گزارنے دو۔ میرے بازو میں بھی شدید تکلیف ہے۔“  
میں اس کی تکلیف کو سمجھ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے زرگل سے کہا ”تم میرے ساتھ آؤ۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے ہال نما کمرے کی جانب دروازہ کھولا۔ وہ بھی میرے پیچھے آئے گی۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے زرگل کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ زرگی کی رات اس کوئی میں گزارنا چاہتی تھی۔ اس سے یہ بات کھینچ آئی کہ وہ مجھ پر بھروسہ کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ پریشان اثرات ضروری تھا تاہم اس نے نہ خانے کے بارے میں انکشاف کر کے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر اس نے اندر جھانک کر ”دوچپ“ نہ مانتا تو دیکھ لیتے تھے تو وہ میرے اس کوئی کے بارے میں جاننے کی اسوج رہی ہوگی۔ اس لیے امکان اس بات کا تھا کہ وہ ابھی تک نہ خانے کے اندر اس کے ”حالات“ سے آگاہ نہیں ہوگی۔ اگر اس نے نہ خانے کے اندر خادم حسین، قادر بخش اور مجھے دیکھ لیا ہوتا تو اس کوئی میں رات گزارنے کا فیصلہ ہرگز ہرگز نہ کرتی۔

میں نے تصدیق کی خاطر اس سے سوال کیا ”تم نے اس کوئی میں نہ خانہ تو دریافت کر لیا۔ کیا تمہیں اس کے جھانکنے کا موقع بھی ملا؟“

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی ”جب اندر کا ممکن تھا تو میں نے کوشش نہیں کی۔ اس وقت میری پوری حوصلہ آوروں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ میرے تمام حواس صرف اور صرف حکمت یار کے بندوں کی طرف متوجہ تھے۔ جب مصیبت ٹل گئی اور وہ لوگ یہاں تلاشی میں ناکامی کے بعد ہو گئے تو مجھے سکون کی سانس لینا نصیب ہوئی۔ میرے ذہن نازل انداز میں فعال ہوئے تو مجھے روشن دان کا خیال آیا۔ وقت تک روشن دان کے اندر کوئی پردہ تان دیا گیا تھا۔ میں نے اندر جھانکنے کے لیے روشن دان کی طرف قدم بڑھایا تو

میرے جیسے سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔  
میں نے نہ خانے کے اندر دنی حالات سے آگاہی حاصل نہیں کر سکی۔ ہم اسی کرتے ہوئے ہال نما کمرے کے دروازے پر پہنچے۔  
میں نے نہ خانے کے اندر دنی حالات سے آگاہی حاصل نہیں کر سکی۔ ہم اسی کرتے ہوئے ہال نما کمرے کے دروازے پر پہنچے۔

”ہاں، میں نے وہ جیب دیکھی ہے۔“ اس نے اپنی لائیو بیلوں کو اطمینان بخش دہی اور کہا ”مگر تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تم تو اس کوئی کے مالک ہو۔“ وہ کھوجے والے انداز میں چند لمبے خاموشی سے مجھے سختی رہی پھر بڑے چٹکی لکچے میں بولی ”تم چاہے کچھ بھی کہو لیکن میں کبھی طور تمہیں اس کوئی کا مالک تسلیم کرنے کو تیار نہیں یقیناً تم بھی میری طرح کسی مصیبت سے دوچار ہو کر یہاں پہنچے ہو۔ میں نہیں جانتی، تمہارے عزائم کیا ہیں؟ تاہم تم بہت ہی پراسرار اور گہرے آدمی ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟“

وہ اسے اتنا دے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی کہ مجھے دل میں ماننا پڑا، وہ خاصی جہاں دیدہ اور تجربہ نگا عورت تھی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے میرے بارے میں اندازے قائم کیے تھے۔ میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔  
حسن اور ذہانت خال خال ہی بیکٹانچا آتے ہیں!

میں نے بڑی گہری نظر سے زرگل کی آنکھوں میں جھانکا اور نہایت ہی صبر سے لکچے میں کہا ”میرا نام وہجہ ہے۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ جاننے کے پتہ میں نہ پڑو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ ہاں، اگر مناسب سمجھو تو یہ ضرور بتا دو، تم نے کس بنا پر اسے وثوق سے کہا ہے کہ میں اس کوئی کا مالک نہیں ہوں؟“

”اس بنا پر کہ کوئی کا مالک، کوئی میں آمد شد کے لیے حق میں دیوار پر گودا بھلائی نہیں کرتا۔“ وہ سناتے ہوئے لکچے میں بولی ”میں نے جھاڑیوں کے عقب میں چھپ کر تمہاری وہ حرکت دیکھ لی تھی۔ تم نے نہایت ہی محتاط انداز میں دیوار بھلائی اور باہر چلے گئے۔ میں یہ بھی کہ تم اب واپس نہیں آؤ گے یا کچھ دیر بعد آؤ گے۔ یہی سوچتے ہوئے میں روشن دان کی طرف بڑھی مگر تم میری توقع سے بہت پہلے نہ صرف واپس آ گئے بلکہ بڑے غیر محسوس انداز میں میرے سر پر بھی ہتھی گئے۔“ وہ خود اعتمادی سے مجھے دیکھ رہی تھی ”البتہ، میں اس بات کا اعتراف کروں گی کہ تمہاری، کوئی میں واپس کا مجھے مطلق احساس نہیں ہوا۔“ اچانک رک کر اس نے مجھ سے استفسار کیا ”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

وہ چٹکی طور پر غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے اندازے اور معاملہ فہمی بہت مضبوط تھی۔ میں اس کے سوال کا جواب دینے لگا۔  
”آتش فشانی“  
”آتش فشانی“  
”آتش فشانی“

کے بجائے ہوش فیض کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے نزدیک ہی وہ گرم چادر بھی موجود تھی جس کی بکلی مار کر وہ اس کو بھی میں ”دار“ ہوا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کر کے، اس چادر میں سے تین اچھ چوڑی کوئی گز بھر کی پٹی چھاڑ لی اور زرگل کے قریب آ گیا۔

”کون کیا غلط کہہ رہا ہے اور کیا درست، اس کا فیصلہ بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا ”تمہارے ذہنی بازو دے رنے والے خون کو رد کننا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر تم اپنا بازو مجھے دے دو تو میں اس کا معائنہ کر کے پٹی باندھ دیتا ہوں۔“

”میرے خیال میں ذہن زیادہ گہرا تشریش تک نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولی ”شاید کوئی کوئی گز کرتے ہوئے میرے بازو کی مزاج پر ہی کر گئی ہے۔“

وہ بڑی روانی اور صفائی سے اردو بول رہی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا، سرحدی لوگ خصوصاً عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں کو اسکول کالج بھیجے کا رواج نہیں ہوتا۔ بس وہ اپنی بادرہ زبان ہی سے آشنا ہوتی ہیں یا پھر بیٹوں کیلئے میں کوئی پھولی اردو بول کر گزارہ چلا سکتی ہیں لیکن زرگل کی بات چیت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس سے میرے ذہن میں یہ بھی نقش ہو گیا کہ وہ فارمولا درست نہیں، سرحدی لوگ بھی تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں اور حتیٰ الوسع تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، چاہے دوسروں کی نسبت یہ تناسب کم ہی کیوں نہیں ہو! زرگل نے پائیں باغ میں مجھے بتایا تھا، اس کے ذہنی شانے میں شدید تکلیف ہے لیکن اب وہ قہاں بازو کی طرف سے بے پروائی برت رہی تھی۔ اس موقع پر بحث مباحثہ مناسب نہیں تھا۔

میں نے زرگل کی بات کے جواب میں کہا ”ذہن کی گہرائی یا تشریش تاکی کے بارے میں معائنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اگر تم اپنے بازو میں تکلیف محسوس نہیں کر رہی تو دوسری بات ہے۔“

اس نے بے دھڑک اپنا بازو میرے سامنے کر دیا اور کف کا بن کھول کر آئینہ اٹھنے لگی۔ اگلے ہی لمحے اس کا رنگی دودھیا بازو میری نگاہ میں پھینکے گا۔ بعض تجربہ کار لوگ عورت کے ہاتھ اور پاؤں کو دیکھ کر اس کے حسن کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ میں زرگل کا چہرہ دیکھتے ہی اسے ایک حسین و جمیل عورت قرار دے چکا تھا اور اب اس کا ایک بازو میری نظر کے سامنے کھلا ہوا تھا جو بے زبان غموں اس کے سراپا بازو ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

زرگل کا اندازہ بالکل درست تھا۔ کوئی اس کے کندھے کی کھال کو چھیلنے ہوئے گز رہی تھی اور خون کے نئے کندھے کے مقام سے اس کی قہیں کو کھلوایا تھا۔ وہ تین بیچوں کی مار تھا۔ میں نے چادر سے چھاڑی ہوئی نہایت مہارت کے ساتھ زرگل کے زخمی کندھے پر ہاتھ دی۔ اس نے آستین گر کر کف کا بن لگا دیا۔

میں نے پوچھا ”زرگل! تم نے یہ مردانہ لباس کیوں رکھا ہے؟“

”اس کا تعلق بھی میری اسی طویل کہانی سے ہے۔“ وہ فکراً آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”آسانی کے لیے یہ سمجھ لو کہ میں نے خود دشمنوں سے چھپانے کے لیے عارضی طور پر یہ ہونے لگا ہے۔“ وہ ذرا توقف کرنے کے بعد مجھ سے متحضر ہوئی۔

اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ وجہ۔ یہ نہ کہنا کہ تم اس کو مالک ہو اور.....“

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بڑے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ایک بات غلط پر محسوس کی کہ میں جیسے ہی اس سے کوئی ذاتی سوال کر پلٹ کر میری ذات کے بارے میں پوچھنے لگتی۔ میں نے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

”تمہاری طرح میری داستان بھی بہت طویل ہے۔ فرصت ہی سے سنی اور سنا کی جاسکتی ہے۔“ ایک نئے توقف سے میں نے اس سے پوچھا ”تم نے کہاں تک حاصل کی ہے؟“

”میں گرجو بیٹ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”دیر کی گز۔“ میں نے اختیار سرائے والے انداز کہا ”اسی لیے تمہاری اردو صاف شفاف ہے۔ تعلیم انانے سنوارنے میں بہت مدد دیتی ہے۔“

اس نے میری رائے پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور ہانپا سے اپنے کھال دا میں کندھے کو دبائے لگی۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”زرگل! تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

اس نے انجمن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میری بات سمجھ نہیں پائی تھی۔

میں نے کہا ”کیا تم یہ بات اسی کو بھی میں گزرا رہا ہوں؟“

”تم اپنے بیان کے مطابق تھوڑی دیر بعد بیان چلے جاؤ گے۔“ اس نے بہ دستور اچھے ہوئے لہجے

میں محسوس کر رہی ہوں، اس کو بھی میں اور کوئی ذہنی فیض میں نہیں۔ میں اس ذہنی بے ہوش کے ساتھ تو اس کو بھی میں بات نہیں کر سکتی۔“

”بات نہیں کرتے ہی اس نے فیض کی طرف اشارہ کیا۔“

”اس کا بندوبست تو میں ابھی کر دیتا ہوں۔“

”اس کے بازو بھی میں یہاں سے جاتا چاہوں گی۔“

”نہج ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی ”اگر تم میں نے پوچھا ”زرگل! تم نے یہ مردانہ لباس کیوں رکھا ہے؟“

”اس کا تعلق بھی میری اسی طویل کہانی سے ہے۔“ وہ فکراً آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”آسانی کے لیے یہ سمجھ لو کہ میں نے خود دشمنوں سے چھپانے کے لیے عارضی طور پر یہ ہونے لگا ہے۔“ وہ ذرا توقف کرنے کے بعد مجھ سے متحضر ہوئی۔

اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ وجہ۔ یہ نہ کہنا کہ تم اس کو مالک ہو اور.....“

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بڑے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ایک بات غلط پر محسوس کی کہ میں جیسے ہی اس سے کوئی ذاتی سوال کر پلٹ کر میری ذات کے بارے میں پوچھنے لگتی۔ میں نے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

”تمہاری طرح میری داستان بھی بہت طویل ہے۔ فرصت ہی سے سنی اور سنا کی جاسکتی ہے۔“ ایک نئے توقف سے میں نے اس سے پوچھا ”تم نے کہاں تک حاصل کی ہے؟“

”میں گرجو بیٹ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”دیر کی گز۔“ میں نے اختیار سرائے والے انداز کہا ”اسی لیے تمہاری اردو صاف شفاف ہے۔ تعلیم انانے سنوارنے میں بہت مدد دیتی ہے۔“

اس نے میری رائے پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور ہانپا سے اپنے کھال دا میں کندھے کو دبائے لگی۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”زرگل! تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

اس نے انجمن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میری بات سمجھ نہیں پائی تھی۔

میں نے کہا ”کیا تم یہ بات اسی کو بھی میں گزرا رہا ہوں؟“

”تم اپنے بیان کے مطابق تھوڑی دیر بعد بیان چلے جاؤ گے۔“ اس نے بہ دستور اچھے ہوئے لہجے

زرگل کو کچھ معلوم نہیں تھا، اب میں فیض کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔ اس نے بڑے دھڑکنے سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے، اس بندے کا تعلق تمہارے مخالفین سے ہے؟“

”جہیں درست لگتا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا ”یہ کوئی میرے دوست فرید پاشا کی ملکیت ہے۔ وہ اس دقت یہاں موجود نہیں..... اور باقی جو بھی موجود ہیں وہ میرے دشمنوں ہی میں شمار ہوتے ہیں۔“

”کیا میں بھی؟“ اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

اس کے سوال نے مجھے بوکھلا دیا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ بدستور گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”میں نے تو ابھی تک تمہارے خلاف کسی دشمنی کا ثبوت نہیں دیا۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے سنبھل کر کہا ”تم نے مجھ سے کوئی دشمنی کی ہے اور نہ ہی کسی دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ تمہارے بارے میں، میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔“

”خالی تم خود کو ٹیڑھ نہ بھجو۔“

وہ غیر مطمئن انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”اچھی بات ہے۔“ پھر اس نے فیض کی طرف اشارہ کیا ”اب اس بندے کا کیا کرنا ہے؟“

”اس کو تہ خانے میں پہنچانا ہے۔“ میں نے برسوج انداز میں کہا ”یہ یہاں اچھا نہیں لگ رہا، وہاں اس کے دو ساتھی پہلے سے موجود ہیں۔ یہ اپنے قبیلے میں کچھ کرنا۔“

وہ لانی جلیں جھپکاتے ہوئے بولی ”پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ سب کچھ کہیں تم مذاق میں تو نہیں کر رہے ہو وجہ؟“

اس کو بھی کہ خفیہ تہ خانے کا راز فرید پاشا اور مجھ سے آگے بڑھ کر خادم حسین اور قادر بخش تک پہنچ چکا تھا۔ اس راز میں فیض کی شمولیت بھی ہونے والی تھی چنانچہ زرگل بھی اس تہ خانے کی جھلک دیکھ لیتی تو اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اس تہ خانے میں آمد و شد کی تکنیک صرف فرید پاشا اور مجھ تک ہی محدود تھی۔

”میرا تمہارا کوئی مذاق نہیں ہے زرگل!“ میں نے اس حسین صورت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اس ہال نما کمرے کے نیچے دو تہی ایک تہ خانہ موجود ہے جسے ابھی تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔ تم اس تہ خانے کے نیم روشن، روشن دان کو دیکھ چکی ہو۔“

اس نے سر ہلانے پر اکٹھا کیا تاہم اس کی حناطیسی آنکھوں میں حیرت نما آنکھیں بدستور ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ خاصی متذبذب نظر آتی تھی۔

اگلے دو منٹ کے اندر میں نے مخصوص جھٹک کا استعمال کر کے فیصلہ کر دیا کہ زردگی کی مدد سے کھیت کا قدرتش کے قریب لاپھوڑا۔ خانے کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازے کو بند کر دیا تھا۔ زردگی کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی وقت نہیں ہوئی کہ اس نے اسی خانے کے مختصر روشن دان سے بلب کی لمبی روشنی بچھونے دیکھی تھی۔

میرے ساتھ ایک سراپا حسن عورت کو دیکھ کر گینڈا نما قادر بخش کے دیدے حیرت سے جھل جگے۔ خادم حسین کی سرخ آنکھوں میں بھی تجب کی سیاہ پر چھائیاں لہرائیں۔ میں نے ان کے تاثرات سے فوراً اندازہ لگایا کہ وہ زردگی سے آشنا نہیں تھے اور زردگی کی بھی کچھ ایسی ہی پوزیشن تھی۔ یہ ایک اطمینان بخش بات تھی۔ وہ دونوں زردگی کو میری ساتھی سمجھے تھے۔

خادم حسین کو سمجھت کی ”زینت“ بنانے سے پہلے میں نے اس کی نفسیاتی جامعہ تلاش لے لی تھی اس کی ضروری اور غیر ضروری اشیاء کے ساتھ کوئی اور گاڑی کی چابیاں میرے قبضے میں آچکی تھیں۔ لہذا میں نے اسے ان جہازات کو سیکورٹی کارڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے قادر بخش سے کہا۔

”میں تم تینوں کو اس خانے میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہارا فیصلہ فریڈ پاشا خود کل صبح آ کر کرے گا۔ خادم، فریڈ کا مجرم ہے لیکن تم دونوں بھی بلا اجازت غیر قانونی طور پر اس کی کوئی میں داخل ہوئے ہو۔ نہ صرف داخل ہوئے ہو بلکہ تم نے یہاں خاصی افراتفری بھی مچائی ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ کر لیا۔ باقی کا اثر دیو پاشا کرے گا۔“

”تم اب بھی خود کو بچا سکتے ہو دھند ان“ گینڈے قادر بخش نے سیکھتے ہوئے لہجے میں کہا ”خفا اور چوہری دلدار بہت خفہ ناک لوگ ہیں۔ تم ان کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکو گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو ہمیں شرافت سے، یہاں سے جانے دو۔“

مجھے اس نامستول شخص پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اپنی جیب سے دیو اور لولا نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے ہوئے کہا ”میں انتہائی شرافت کا مجتوب ہی دے رہا ہوں جو تم لوگوں کو زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں ورنہ تم خبیثوں کے اعمال تو ایسے ہی ہیں کہ کہیں فرصت نکالے بغیر کوئیوں سے بھون دینا چاہیے۔“ میں نے دیو اور لولا کی نال کو اس کی پیشانی کی طرف کر

دیا۔

وہ غرت آئینہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ منہ سے یہ لفظ نہ بولا۔

میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا ”تم آئینہ اور چوہری دلدار کی خطرناکی دیکھی ہوگی، ابھی میرے سفر اور سفاکی سے تم واقف نہیں ہو۔ اگر تمہاری زندگی کے ساتھ تو اس خانے سے باہر آ کر خفا اور چوہری دلدار کا سہارا لیتا۔ میرے آئینہ دار گت دی ہیں۔ تم لوگوں نے یہاں عذاب ناک جگہ میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔“

وہ کینہ تو زائدہ انداز میں مجھے کھینکے لگا۔ اگر وہ اس درجہ میرے سامنے بے بس نہ ہوتا تو پتا نہیں کیا کر گزرتا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھمکی آئینہ لہجے میں کہا ”میں تمہیں پہلے بھی پتا چکا ہوں اور اب آخری تمہیں کمر ہا ہوں کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کر تمہاری ایسی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی، خواہ خود کو اور اپنے ساتھی کو ہلاکت میں ڈالو گے۔ اگر اب میری بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو تم لوگ اپنی جالوں پر لگا سکتے ہو۔“

اس وارننگ کے بعد میں زردگی کے ساتھ خانے نکل آیا۔ دروازہ ایک مرتبہ پھر بند ہو گیا جسے مخصوص کے بغیر کسی صورت کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ہا کمرے میں آتے ہی زردگی سے کہا۔

”اس کمرے کے فرش سے ہمیں زخمی فیصل کا خون نہ کرنا ہے۔ اس مسئلے میں تم میری مدد کرو گی۔“

اس نے تعاون آئینہ انداز میں سرکاشانی پیش دی۔ میں نے فیصل کی باقی ماندہ چادر کو چھڑ کر دو حصوں تقسیم کیا۔ ہم کپڑے کے دو ٹکڑے پانی میں جھگو کر اپنے سے جت گئے۔ اگر وہ کوئی میرے دوست کی ملکیت نہ ہو تو اس تکلف میں نہ پڑتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس ہا کمرے کو نسلی بخش بنا چکے تھے۔

جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو رات کے آدھے رہے تھے۔ زردگی کو میں نے احتیاطاً جیب کی عقبی نشست دیا تا کہ باہر سے دیکھنے والوں کو وہ دکھائی نہ دے۔ اس کو خارج از امکان نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کے دشمن سے کوئی ایک آدھاب بھی کوئی کے باہر گھمٹا لگے! انتظار کر رہا ہو۔ دشمن کو کبھی کمزور اور بے خوف نہیں چاہیے!

☆☆☆

احتیاط کا اثر ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جو مختصر طور پر اختیار اور کارآمد کہلاتی ہیں۔ محتاط شخص، کسی غیر محتاط آدمی کی بہ نسبت کم سے کم نقصان اٹھاتا ہے۔ میری احتیاط نے کوئی سے نکلنے ہی کام دکھانا شروع کر دیا۔

دو تین سڑکوں پر جیب دوڑانے کے بعد میں شادمان کالونی کی طرف نکل آیا اور اسی وقت مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ وہ ایک سرخ جیب کی جیب میں جیب کی جیب کی جیب سے بچے آ رہی تھی۔ اس سرخ جیب کی ذرا نیچے سینٹ پر کسی انسان کا بیولا نظر آ رہا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ جیب میں مزید کتنے افراد موجود تھے، اس بارے میں روٹی سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان ”سگڑے“ زیادہ کا قافلہ تھا۔ اس قافلے سے جیب والے اندر زردگی کو غشیی نشست پر لیٹے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں ڈوٹی سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سرخ جیب میں کون لوگ ہیں، کسی بھدک کی خاطر وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں اور اس تعاقب کا آغاز کہاں سے ہوا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا، ان لوگوں کا تعلق میرے دشمنوں سے ہے یا زردگی کے۔ اگر سفید ہائی روڈ میں خیریت ختم ہو جائے تو کہا جا سکتا تھا، وہ لوگ اس سرخ جیب پر کر رہے ہیں۔ جس وقت میں زردگی کے ساتھ کوئی نہ نکلا تھا، سفید ہائی روڈ ہنوز اپنی جگہ کھڑی تھی اور گاڑی کا ڈرائیور ریاض بھی اسی پوزیشن میں اسٹیرنگ پر ”موجود“ تھا۔ ریاض کی یہ طویل ”موجودی“ خاصی تشویش ناک تھی۔ مجھے خدشہ ہونے لگا تھا، کہیں وہ اللہ نہ ہو گیا ہو!

میں نے ڈرائیور پر توجہ مرکوز کر رکھتے ہوئے زردگی سے کہا ”جہاں لیٹی ہو، خاموشی سے لیٹی رہو۔ اٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جو کچھ کہوں، اس پر فوراً عمل کرنا۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ ایک سرخ جیب کو تمہاں اپنی دم سے بندھا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے، یہ جیب کون لوگوں کی ہے؟“

میرے سوال کے جواب میں عقبی نشست پر خاموشی طاری رہی۔

میں نے اپنا سوال دہرایا اور پوچھا ”زردگی! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”یوہی! تم نے خود ہی تو کہا ہے، خاموشی لیٹی ہوں۔ صرف تمہارے کہنے پر عمل کروں اگر میں تمہارے کسی سوال کا جواب دوں گی تو خاموشی ٹوٹ جائے گی۔“ وہ ایک لمبے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے جمید کی سے یوہی ”مجھے اڑے، اگر میں نے تمہاری بات نہ مانی تو تم ناراض ہو جاؤ

گے اور ناراضی میں تم مجھے اپنی گاڑی سے اتار بھی سکتے ہو۔ میں گاڑی سے نکلنے ہی غیر محتاط ہو جاؤں گا۔ چاروں طرف میرے دشمن میری تلاش میں پھرتے پھرتے ہیں۔“

زردگی کی دہشت اور خوف پوری طرح زائل ہو چکے تھے اور اس وقت وہ خامی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس حاضر جواب انجینی حسیہ نے اپنے جواب سے مجھے تھوڑا سا گڑبڑا دیا تاہم میں نے بغیر لہجے میں کہا۔

”میں تمہاری خاموشی کو دیکھ رہا ہوں۔ تم میری بات کا جواب دے سکتی ہو۔ ہماری آواز سرخ جیب میں موجود لوگوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ کیا تم ان لوگوں کو جانتی ہو؟“ وہ تعلیمیت سے یوہی ”میں سرخ جیب سے متعلق کچھ نہیں جانتی۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے ڈرائیور پر اپنی توجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا ”میں مختلف سڑکوں پر جیب دوڑاتے ہوئے تعاقب کرنے والوں کو اپنے قریب آنے کا موقع دوں گا پھر ان کے عزائم کا پتا چل جائے گا لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔“

”کیسا کام؟“ اس نے لیٹے لیٹے استفسار کیا۔ میں نے کہا ”تم نہایت ہی صفائی اور اہنگنی کے ساتھ اپنے وجود کو سینٹ سے لڑکا کر نیچے کرادو۔ اس طرح تم دو سینٹوں کے درمیان آ جاؤ گی۔ گویا، ایک طرح سے تم باہر سے دیکھنے والوں کی نظر میں پوشیدہ ہو جاؤ گی۔ تعاقب کرنے والے تمہیں اس جیب میں دیکھ نہیں پائیں گے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، تمہیں غیر موجود پاکر وہ کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا، وہ تمہاری تلاش میں ہیں یا میری؟ اگر وہ تمہاری وجہ سے تعاقب کر رہے ہیں تو پھر ہماری جیب کو اور ٹھیک کرنے کے بعد وہ اس تعاقب کو ختم کر کے کہیں اور نکل جائیں گے۔“

”یہ میں بہت آسانی سے کروں گی۔“ زردگی کی ہر عزم آواز میری ساعت سے ٹکرائی ”میں دو سینٹوں کے درمیان چپکے ہی اپنے وجود کو ٹھیکری بتالوں گی۔ اگر سرخ جیب میں حرکت پارتے بندے ہوئے تو وہ مجھے دیکھ یا پہچان نہیں پائیں گے۔ تمہاری تجویز قابل عمل اور موثر ہے۔“

میں نے جیب کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، تم ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں انہیں اپنے قریب آنے کا موقع دیتا ہوں۔“

اور میری بات ختم ہوئی، اور زردگی معمولی سی آواز پیدا کرتے ہوئے دو سینٹوں کے درمیان جیب کے قائلین پوش



فرش پر پہنچ گئی۔ اس نے میری توقع سے زیادہ تیز رفتار حرکت کی تھی۔ اس کے محل نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ کوئی چھوٹی موٹی لڑکی یا عورت نہیں، بلکہ سنگین رویت کی صورت حال سے نمٹنے کا اسے وسیع تجربہ تھا۔ اس کی زندہ مثال تو وہ واقعہ تھا جب درجن بھر افراد کو کسی کے اندر اسے نشانہ بنانے کے لیے برست فائرنگ کر رہے تھے۔ مجھے یقین تھا، زرگل کو پیش آمدہ حالات بڑے سستی خیز ہوں گے!

میں شادمان کالونی سے نکل آیا۔ چائنا چوک سے گزرتے ہوئے ایک لمبے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ صدف کے ماموں ڈی ایس ایس کی اورنگ زیب خان کی طرف نکل جاؤں۔ اس کی کوئی چائنا چوک سے زیادہ دور نہیں تھی لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اس وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے سوڈ میں تھا۔

میں غیر ارادی طور پر جیب کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ مسجد جمعی کعبہ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) پر آگیا پھر میری گاڑی بے درجے مختلف سڑکوں پر مڑتی رہی۔ مال روڈ، ریس کورس روڈ، لارنس روڈ اور گھبرگ روڈ سے گھوم کر میں کینال بینک روڈ پر آگیا۔ یہ روڈ نہر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ فریڈ پاشا کی کوئی تک جانے کے لیے اصولی طور پر مجھے گھبرگ روڈ کو گھومنا چاہیے تھا اور نہر کا پلی کر اس کر کے گھبرگ کی طرف بڑھ جانا چاہیے تھا لیکن حنا جیب کا راز افشا کرنا بہت ضروری تھا۔ میں اس قسم کی کسی مصیبت کو اپنے پیچھے لگا کر پاشا کی کوئی کی راہ نہیں دکھانا چاہتا تھا اور جیب میں موجود وحیت افراد میری توقع کے خلاف عمل کر رہے تھے۔ میں ان کی تعداد اور رنگ و نسل کے بارے میں حتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

انہوں نے اس دوران میں وہ محدود فاصلہ قائم رکھا تھا جو ابتدا سے دونوں چھپوں کے درمیان موجود تھا۔ ان کی پالیسی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف اور صرف ہماری منزل کا سراغ لگانا چاہتے ہیں، راستے میں ہم سے پچھڑ چھاڑ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ایسے خیال رکھنے والے ”خیر خواہوں“ کو بے نقاب کرنا تو اور بھی اہم تھا۔

میں نہر کے ساتھ ساتھ کینال بینک روڈ پر آگے بڑھتا رہا۔ گھبرگ خاصا پیچھے رہ گیا تھا اور انسان پٹرول کا رخ منٹل پورہ کی جانب تھا۔ رات کے وقت کینال بینک روڈ پر زیادہ رش نہیں ہوتا۔ ایک قطار میں بنی ہوئی نرسریز اور نہر کے کنارے استادہ بلند و پست درختوں کے باعث فضا میں ٹھنکی در

آئی تھی۔ میں نے ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر نشان پڑا دیا۔ سڑک کے کنارے روک دی پھر زرگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں جیب سے باہر جا رہا ہوں۔ ظاہر یہی کہوں گا مجھے گاڑی میں کوئی خرابی ہوگئی ہے جس نے ہمیں یہاں روکنے پر مجبور کر دیا۔ میں جب تک تم سے نہ کہوں، گاڑی سے نکلنے کو شش نہ کرنا۔“ پھر میں نے اپنی جیب سے روپو والوں کی اس کی طرف پھینک دیا اور کہا ”میں نے اگرچہ نہیں عادی پناہ دی ہے لیکن تمہاری حفاظت کی ذمہ داری بھی فی الحال میرے ہی کندھوں پر آتی ہے۔ مجھے امید تو نہیں کہ مارا داری کی کوئی صورت حال پیش آئے بہر حال، تم یہ روپو والوں کی نازک موقع کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ وقت کا کچھ بھروسہ نہیں، یہ کسی سے صلاح مشورے کے بعد کرو ت نہیں بدلتا۔“

میں زرگل کا جواب سنے بغیر جیب سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ میں نے کھلا رہنے دیا اور جیب کے اگلے حصے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے حفاظت جیب کی طرف کن انھیں سے دیکھا، میرے اندازے کے عین مطابق وہ سرخ جیب بھی سڑک کے کنارے روک بیٹھی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ ابھی کم و بیش دو سو گز ہی تو تھا۔ میں نے اپنی جیب کا یونٹ اٹھالیا اور حنا جیب پر اسرار جپ کے بارے میں سوچنے لگا۔

ہم کینال بینک روڈ کے ایک ایسے حصے میں رکنے کے ہمارے دشمنوں کی کسی خطرناک سرگرمی کے لیے بہترین مقام تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی کہ سرخ جیب میں اسے کوئی برآمدہ ہوا اور نہ ہی کسی قسم کی پیش رفت کی گئی۔ مزہ دومن انتظار کے بعد میں نے ایک جی فیملر کر لیا۔

میں سرخ جیب کی مسٹری کو اپنے ذہن میں لے کر ہٹا کے بیٹھ گیا۔ میں نہیں جانتا چاہتا تھا، جب جیب والوں کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ ہوئی تو میں نے از خود اندیشہ کنج کرنے کا عزم کیا اور یونٹ گرا کر میں ڈرائیونگ سائیڈ میں آگیا۔ میں نے قائلین پوش فرش پر موجود زرگل سے کہا۔

”جیب والوں کی ڈھٹائی کو تانا ضروری ہے۔ دو ٹوٹا ہے، جیسے پاؤں میں مہندی لگائے بیٹھے ہیں۔“ زرگل نے اپنی جگہ پر موجود رچے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہاری بات سے اندازہ ہوتا ہے، تم از خود ان کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ کیا جیب والوں میں سے کوئی باہر نکل آیا؟“

”اگر ادھر سے کوئی باہر نکلتا تو سنسن ٹوٹنے کے

امکانات روشن ہوجاتے۔“ میں نے کہا ”میں اس سنسن کو ختم کے طور پر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا اس لیے جیب والوں کی ”خبریت“ کو سمجھنے اور چارہ پار ہوں۔“

وہ تشویش ناک کچھ میں بولی ”یہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”رہے لیے بغیر اس شخص کو نہیں توڑا جا سکتا۔ تم گاڑی کے اندر ہوشیار اور محتاط رہنا۔ ادھر کے مخاطبات کو میں دیکھ لوں گا۔ تم اپنی حفاظت کا خیال رکھ لو تو یہ بھی کافی ہوگا۔ ویسے ایک بات کاٹنے پورا یقین ہے!“

”کس بات کا؟“ زرگل نے پوچھا۔

میں نے پر سوچ انداز میں کہا ”وہ جو کوئی بھی ہیں، ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ دشمن ایسے ڈھیلے رویے کا مظاہرہ نہیں کرتے۔“

”یہ ان کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے وجہ!“ زرگل محتاط لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ”یہ ممکن ہے۔ اس صورت میں بھی میں یقین کے ساتھ یہ کہوں گا کہ وہ چال باز ذہن ہماری جان کے طلب گار نہیں ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں دشمنوں اور ان کے ٹیکوں انداز کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے۔ جان کے ذہن یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھے نہیں رہتے۔ میرے تجربے میں چونکہ ایسے دشمنوں کا اندراج نہیں ملتا اس لیے بھی میں سرخ جیب والوں کو ضرور چک کر دوں گا۔“

اس کے بعد زرگل نے مجھ سے کوئی بحث نہ کی اور میں تمام قدموں سے مذکورہ جیب کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے درمیان بتدریج فاصلہ کم ہونے لگا۔ سرخ جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کا ہولہا آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا۔ اگرچہ اس وقت کینال بینک روڈ پر اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ تاہم نزدیک جانے کے سبب اس شخص کے خال و خصل مجھ پر ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے وجود میں ایک سنگین کی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ میری چٹنی کی سار بار مجھے خبردار کر رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ میں سردست اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا، پھر جب ہمارے درمیان چھوٹے کا فاصلہ رہ گیا تو ابی رہ بڑھ کی ہڈی میں مجھے ایک سردلہر کی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیا ایک بے اختیار میرے قدم رک گئے۔

میں حیرت اور بے چینی سے، سرخ جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ رہا تھا۔ دگر اسکرین کے پار اب وہ

مجھے واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص نے کسی انڈے کے مانند سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بے داغ پینٹ کوٹ میں تھا اور اسٹریٹنگ پر ہاتھ جمائے کسی بت کی طرح خاموش جامد بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔

میں یک ننگ اسے نگے جا رہا تھا۔ اس کے چلنے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میرے ذہن میں جو تصویر اجاگر ہو، وہ بڑا ہولناک اور ناقابل تسلیم تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟ کیا میرا ذہن میری غلط راہنمائی کر رہا ہے؟ یا میں مشاہدے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں؟ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں؟ کسی لاشعوری خیال نے مجسم صورت تو اختیار نہیں کر لی؟

اس نوعیت کے متحدہ سوالات میرے دماغ میں چکر رہے تھے اور ہر بار میں ایک ہی نتیجے پر پہنچ رہا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ چٹکیں جھپکائیں کہ کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اپنی آنکھوں کو ل کر دیکھا کہ کہیں میری بصارت تو متاثر نہیں ہوئی۔ دو ایک بار اپنے سر کو جھٹکا کہ ایسا نہ ہو، میری بصیرت میں کوئی خلل واضح ہو گیا ہو۔ مگر صورت حال ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میرے مشاہدے کے نتیجے میں سر مورفون نہ آیا۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، سب وہیاد تھا اور یہ سب..... نہایت ہی سستی خیز تھا۔ میں گویا اس وقت کسی آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ سرخ جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں بیٹھا تھا..... یعنی وہ بے ہودہ جان علی ابن عابدلی!

کیا آنکھوں دیکھی یہ حقیقت دماغ گھما دینے کے لیے کافی نہیں تھی؟ میں سفید چھت والی اس سرخ جیب سے چند قدموں کی دوری پر کھڑا استغیابہ انداز میں یہ سب سوچ رہا تھا اور اسی فور و فیمیل ڈرائیو، ٹوٹوٹا لینڈ کروزر سرخ جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی میں موجود تھا۔ وہ جیب جس کا نمبر فور سیون تھری سیون تھا..... اور اس کی پشت پر ایک اسٹیرٹائر سفید کر میا اپنے مخصوص اسٹینڈ پر ٹکس تھا۔

میں جتنی دیر اس ناقابل یقین کیفیت میں جٹلا رہا، سرخ جیب والے ”وعدان“ نے ذرا سی پیش نہ کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جادو کے زور پر کسی نے اسے ساکت کر دیا ہو۔ میں حیرت کے جھٹکے سے سنبھلا تو اس اسرار کو حل کرنے کی خواہش ہوئی۔

وہ اگرچہ بتا دیا وعدان تھا مگر میں کسی بھی صورت اسے وعدان تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وعدان..... یعنی میں اپنے والدین کی اگلی اولاد تھا اور..... کسی ہم شکل والی فلمی کہانی کے لیے میرے ذہن میں کوئی نمونہ نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی



تھا، ایک سراب تھا، کوئی گہری چال ہو سکتی تھی اور امکان اس بات کا تھا کہ یہ خطرناک چال میرے دشمنوں کی طرف سے تھی۔ وہ میرے پیچھے کسی کردار کو سامنے لاکر کوئی بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے ابھی میں اس فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ چال میرے کس دشمن کی طرف سے ہے اور اس چال سے اس کے کیا عزائم وابستہ ہیں یہ سب کچھ جاننے کے لیے آگے بڑھنا ضروری تھا۔ اسی سوچ کے زیر اثر میں نے سرخ لینڈ کرور کی سمت قدم اٹھا دیئے۔

میری اس پیش قدمی کے جواب میں دوسری طرف سے حیران کن رد عمل ظاہر کیا گیا۔ وہ جیب اگرچہ مرکز کے کنارے کھڑی تھی۔ تاہم ہماری نیاں پٹرول کی طرح اس کا انجن بھی بیدار تھا۔ میں نے اس نقلی وجدان کی جانب ابھی ایک قدم ہی بڑھایا ہوگا کہ سرخ جیب اچانک حرکت میں آگئی اور..... یہ حرکت بیک ورڈ تھی۔

یوں محسوس ہوا، وہ پہلے ہی گاڑی کو بیک گیز میں ڈالے بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیب کو الٹا چلاتے ہوئے پیچھے لے گیا..... اور پیچھے..... اتنا پیچھے کہ رات کے اندھیرے نے گاڑی کے وجود کو گھل لیا۔ سرخ جیب مجھ سے اتنے فاصلے پر چلی گئی کہ میرے لیے اس کو دیکھنا ممکن نہ رہا۔ میں سڑک کے کنارے ہٹا ہٹا کھڑا، جیب نشین کی اس عجیب و غریب حرکت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری وہ بے ہوشی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں چند لمحوں میں کھڑا اس کی داہمی کا انتظار کرتا رہا۔ اسے رات کے اندھیرے نے اس طرح اپنی گود میں سمیٹا کہ پھر اس کی ایک جھلک دیکھنے کو نہ ملی۔ فوری طور پر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ پہلی ملاقات میں نقلی وجدان کو اتنی ہی ہدایت ملی ہوئی کہ وہ مجھ سے آتنا سامنا ہونے کے بعد بھوٹ لے۔ صرف مجھے یہ یاد کرانا مقصود ہوگا کہ میری نقل تیار کر لی گئی ہے۔ کیوں؟ ایک ایسی تضحی تھی جسے فی الوقت سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال، میں اس واقعے کو غیر معمولی سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔

اپنی جیب کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں سوچنے لگا، جس دشمن نے بھی میری نقل تیار کی ہے اسے بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر وہ اتنی با بزدل ہوتا تو چپ کر دار کرتا، اپنی "برڈ کٹ" کو یوں میرے سامنے نہ لاتا۔ تو یہ ایک کھلا چیلنج تھا میرے لیے میرے پردہ نہیں پر اسرار دشمن نے سچے سچ پر پھیلا کر کھیل کا آغاز کیا تھا اور اتنا بہادر چوہدری لوازش ملی بہر حال نہیں ہو سکتا تھا۔

میں اپنی بساط پر غور کرتے ہوئے گاڑی کے پاس

آگیا پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد زرگل سے "اب تم آرام سے اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ سکتے ہو۔ خطرناک ہے۔"

"تم یہ بات اتنی آسانی سے کہہ رہے ہو مجھے اندھیرے گری ہوئی کھلی کو نکال باہر کیا ہو۔" وہ حیرت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے ابھی اور نشست سنبھالنے سے قبل اس نے سرخ شیشے کے پار دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے "وجہ! سرخ جیب کہاں چلی گئی؟"

"جہاں سے آئی تھی وہیں چلی گئی۔" میں نے جہاں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ نلنے والی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اسے ہلکے کے عینی حصے کا منظر دکھانے والے آئینے میں تک رہا تھا۔ کاچہرہ الجھن کے چال میں جکڑا نظر آتا تھا اور اس کی یہ کچھ حالات کے عین مطابق تھی۔ بالآخر اس نے تھذیب دار میں دریافت کیا۔

"وجہ! میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی ہوں۔ سرخ زرگل والوں نے اتنی دیر تک ہمارا تعاقب کیا اور پھر اچانک ہٹا ہو گئے۔ ایسے تعاقب دشمن پہلے میں نے کبھی دیکھے ہیں؟"

میں نے کہا "میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ بہرہ میں نے کدو سے اچکا گئے" کیا کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ہر بات

زرگل کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات نمودار ہو۔ اس نے شک آمیز لہجے میں استفسار کیا "وجہ! تم کو جیب والوں کا حال احوال معلوم کرنے کے لیے گاڑی نکلے تھے۔ اس کا کیا رہا؟"

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر اسے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر غائب ہے، ہماری جیب کے فو میں دور دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہا "میں جس مقصد کے لیے اپنی جیب سے قنادہ پورا ہونے کی نوبت نہیں آئی اور میرے وہاں پہلے ہی سرخ جیب الٹے قدموں فرار ہو گئی۔"

اس کی آنکھوں میں موجود بے چینی میں کوئی فرنی تھا پھر یہی کیفیت الفاظ کا لبادہ اوڑھ کر اس کی زبان سے نکلا "کہیں تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟"

وجہ! "میں ایسی کوئی کوشش کیوں کرنے لگا؟" میں نے پورہ کے بل پر سے جیب کو گزرتے ہوئے کہا "اس سے"

کہا "نہ ہونے کا؟" "فائدے اور نقصان کا تو مجھے پتا نہیں۔" وہ بدستور "لیکن کچھ تاؤ، کیا واقعی کوئی سرخ الجھن زدہ انداز میں بولی؟"

"جیب ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی؟" وہ اس سوال میں حق بجانب تھی۔ فاضلہ کا لونی والی کوشی سے روانہ ہوتے وقت میں نے اسے عینی نشست پر لینے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے اپنے تعاقب کا احساس شادمان کا لونی سے ہوا تو میں نے اسے نشست سے لڑھک کر جیب کے فرش پر پھینک دیا جہاں سے تھوڑی دیر قبل وہ اٹھی تھی۔ اس پھینکنے کا حکم دے دیا جہاں سے تھوڑی دیر قبل وہ اٹھی تھی۔ اس دوران میں اسے ایک لمبے کے لیے موقع نہ مل سکا کہ وہ تعاقب جیب کی ایک جھلک بھی دیکھ پائی۔ وہ اب تک جیب کے پتے سے ہوتے پر یقین کرنی آئی تھی لہذا اسے یہ شک ہو سکتا تھا کہ میں نے اسے بے وقوف بنانے کے لیے تو کبھی سرخ جیب کا پتہ نہیں چلایا تھا۔

"یہ کچھ بے زرگل؟" میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

"پھر وہ کچھ کیے کرانے بغیر واپس کیوں چلے گئے؟"

"میں بھی ان کے اس رویے پر حیران ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی لیکن کوجئی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنا جاری رکھا۔

میں نے اپنی جیب کو منہ کے بل کے اوپر سے گزارنے کے بعد واپس کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اب ہمارا رخ منٹل پورہ سے گھر کی جانب تھا۔ میں نے منہ کے کنارے سفر جاری رکھے ہوئے زرگل سے پوچھا۔

"کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟"

وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی "بات یقین اور بے چینی کی نہیں وجہ!"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ بولی "مجھے منافقت سے شدید نفرت ہے۔"

"میں منافقت کا ذکر کہاں سے آگیا؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"تمہاری ہوں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا "اب تک تم نے میرے ساتھ دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا ہے اس لیے میں تم سے کسی قسم کی منافقت نہیں برت سکتی۔ تمہارے لیے میرے دل اور ذہن میں جو کچھ ہے، وہ تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ بالکل صاف صاف؟"

میں نے عجیبی سے کہا "میں بھی صاف کوئی کو پسند کرتا ہوں۔ تم جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو، بے دھڑک کہہ ڈالو۔"

"وجہ!" اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا "کچھ بات تو یہ ہے کہ تم بہت پر اسرار ہو۔ میں تمہارے بیان کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ رہی۔ لہذا کسی سرخ جیب نے ہمارا تعاقب کیا ہوگا مجھ پر وہم سے کوئی زبانی یا مکتبہ کا کہہ کیے بغیر واپس چلے گئے، یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔ تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہوا ہوگا اور..... یہ تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہوگا۔ تعاقب جیب والوں کو تمہیں نے فرار ہونے پر مجبور کیا ہوگا!"

میں نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا "تم بھی عجیب بات کر رہی ہو زرگل!"

"ہاں، بات تو عجیب ہے مگر تمہاری پر اسراریت کی دلیل ہے۔"

"یہ تم مجھے پر اسرار بات کرنے پر کیوں تلی پٹھی ہو؟"

"اس لیے کہ تم جو نظر آ رہے ہو، وہ نہیں ہوا!"

زرگل کی اس بات نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا پھر اس چونکنے میں تشویش بھی شامل ہو گئی۔ ایک لمبے کے لیے میں نے سوچا، کیا زرگل میری اصلیت جان گئی ہے؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ہماری ملاقات کو لگ بھگ دو گھنٹے گزرے تھے۔ اس مختصر مدت میں وہ میری حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ مجھے پر اسرار کیوں سمجھ رہی ہے، میں نے اس سے سوال کیا۔

"زرگل! میرے اندر جنہیں ایسی کوئی پر اسرار بات نظر آئی ہے؟"

وہ عجیب آواز میں بولی "تم نے مجھے اپنا نام دجیہ بتایا ہے جبکہ تم خانے کے اندر، اس گینڈے نے تمہیں وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا جس پر تم نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ غالباً اس نے جنہیں کسی منٹا اور چوہدری دلدار نامی خطرناک افراد سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی دھمکی کو تم خاطر میں نہیں لائے اور ان تینوں کو تم خانے میں بند کر کے چلے آئے ہو۔ میں تمہیں وجہ! سمجھوں یا وجدان؟"

اس کے سوال میں بڑی طاقت تھی۔ اس سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ بہت ہی موقع شناس اور بہتر بین قوت مشاہدہ کا مالک تھی۔ اس کی یادداشت بھی بڑی تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"زرگل! میں دراصل دہری زندگی گزار رہا ہوں۔ کہیں وجہ! بن کر اور کہیں وجدان کی حیثیت سے۔ تم نے تم خانے میں میرے تین دشمنوں کو دیکھا ہے، وہ مجھے وجدان کے نام سے جانتے ہیں۔ اس میں راز یا اسرار والی کوئی بات نہیں۔"

اس نے کہا ”یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اپنے تین خطرناک دشمنوں کو ایک ایسے تہ خانے میں چھوڑ آئے ہو جس کا روشن دان پائیں باغ میں کھلتا ہے۔ کیا وہ لوگ روشن دان کے راستے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ تم شکل سے اتنے بے احتیاط تو نظر نہیں آتے!“ وہ بڑے کانٹے کے سوال پوچھ رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا ”پہلی بات تو یہ کہ اس روشن دان سے فرار کی کوشش کامیاب ہونا ممکن نہیں۔ اگر وہ کسی طرح اس پر نصب گرل کو اکھاڑ بھی لیں، تب بھی تین ضرب آدھانٹ خلا میں سے کسی انسان کا گزرتا ممکن نظر نہیں آتا۔ البتہ اگر وہ دیوار توڑنے کی مہم میں لگ جائیں تو بات دوسری ہے۔ اس کوشش میں بھی ان کی کامیابی کے امکانات اس لیے نظر نہیں آتے کہ ادا ل تو تہ خانے میں ایسی کوئی شے دستیاب نہیں جس کی مدد سے وہ تہ خانے کی مضبوط دیوار میں توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر سکیں۔ یہ فرض محال، وہ لوگ یہ کام شروع کر بھی دیتے ہیں تو کٹر گریٹ بھری اس دیوار کو کاٹنے کا نئے بیج ہو جائے گی جبکہ میں انہیں اتنی سہلت دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ میری بات ختم ہوئی تو اس نے جلدی سے پوچھا ”کیا تم اس طرف واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

میں نے کہا ”فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے اس دوست کی کوٹھی پر پہنچنے والا ہوں جس کی سابق کوٹھی میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔“ میں نے ذرا توقف کرنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے زرمل کو بتایا ”میں پہلی فرصت میں فریڈ پاشا کو تہ خانے کا احوال سناؤں گا۔ وہ خود ہی ان تینوں کا کوئی مقتول بندو بست کر دے گا اور کوئی سوال؟“

”اور سرخ جیب والوں کے بارے میں کیا وضاحت کرو گے؟“

”میں ابھی خود ان کے رویے کو سمجھ نہیں پایا ہوں۔“ میں نے صاف کوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اپنے ہم شکل فعلی وجدان کے سلسلے میں زرمل کے سامنے میں لب کشائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے کوئی پراسرار شخصیت قرار دینے کی ہم پر نظر آتی تھی۔ سرخ لینڈ کرورڈ فورسین تھری سیون میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا اگر اس کا ذکر کر بیٹھتا تو زرمل سوالات کر کے میری جان کھا جاتی۔ اسی لیے میں نے گول مول جواب دیا ”جب میری سمجھ میں کچھ آجائے گا تو تمہیں بھی

بتا دوں گا۔ ویسے تم خواہ مخواہ اپنے ذہن کو مت کھاد۔ خدا شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔“

وہ مجھ پر نگاہ گاڑے خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے گھر روڈ کو کراس کرنے کے بعد جیب کو اقبال روڈ پر ڈال دیا۔ سڑک گلبرگ کے وسط سے گزرتی ہے۔ اس دوران میں، یہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بیک دیوہ میں بھی جھانکتا رہا۔ لیکن سرخ یا کسی بھی اور رنگ کی کوئی گاڑی مجھے تقاتیم دکھائی نہ دی۔ فریڈ پاشا کی جانب سے پہلے میں نے غور اور احتیاط برتی اور گلبرگ مارکیٹ دمرات علی روڈ سے گھر پھرتے ہوئے ایک لمبا پتھر کاٹ کر نسان پٹرول کو ”گلبرگ تھری“ کی طرف موڑ لیا۔ اب اس جیب کو فریڈ پاشا کی کوٹھی کے سامنے ہی جا کر رکنا تھا، بلکہ اس کوٹھی کے اندر جا کر ”زرمل!“ تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا، تمہیں کہا ڈراپ کرو؟“ میں نے اپنی سامی مسافر سے پوچھا ”میرا منزل تو اب بہت قریب ہے۔“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ”تم نے اب تک میری مدد کی ہے، میں اس کے لیے جتنا بھی شکر یہ ادا کروں رہے۔ جاتے جاتے ایک اور احسان بھی کر جاؤ۔“

”کیسا احسان زرمل؟“

اس نے کہا ”رات کا باقی حصہ اگر میں تمہاری منزل گزراؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ میں علی الصبا روانہ ہو جاؤں گی۔“

”میں اعتراض کا حق نہیں رکھتا۔“ میں نے وضاح کرتے ہوئے کہا ”میری منزل دراصل میرے دوست کوٹھی ہے۔ یہ حق اسے حاصل ہے۔ اس سلسلے میں فریڈ پاشا اجازت ضروری ہے۔“

”اگر وہ تمہارا دوست ہے تو تمہارے ساتھ چل والے کے لیے بھی اس کی کوٹھی میں ضرور گنجائش لگے گی۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی ”دو گھنٹے پہلے تم اپنے دوست کی ایک کوٹھی میں میری بھرپور مدد کر چکے ہو اور اب بھی..... اس کی اجازت کے بغیر!“ تھوڑے توقف کے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے، فریڈ پاشا اعتراض نہیں کرے گا۔“

وہ بڑے منطقی انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ میں ایک لمحہ سے لا جواب ہو گیا۔ میں نے کہا ”چلو ٹھیک ہے، اس لمحہ مجھے تمہاری کہانی سننے کا موقع بھی مل جائے گا۔ تم بھی

”اچھا!“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا  
 ”لیکن تمہارے ہاتھ میں تو مجھے ایک ریو اور نظر آرہا ہے۔“  
 ”تو!“ زرگل نے اچانک نظر سے پہلے ریو اور کو اور پھر  
 مجھے دیکھا۔ ”یہ ریو اور خدات کے خیال سے تم نے ہی مجھے دیا  
 تھا۔ کیا اسے میرے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے؟“  
 ”کم از کم اس وقت نہیں!“ میں نے چمچیر چھاڑ جاری  
 رکھی۔  
 اس نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا ”اس وقت کیوں  
 نہیں؟“  
 ”کیونکہ اس وقت تم میری گہرائی ناپ رہی ہو۔“ میں  
 نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”میں تو بے کر ہاتھ  
 تمہارے ہاتھ میں فیٹھ (FATHOM) ہوگا۔“  
 وہ اب بھی کچھ نہ سمجھی۔ مجھے یقین ہو گیا، وہ اس شے سے  
 واقف نہیں تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن کے  
 سائے لہراتے دیکھے۔ بالآخر وہ پوچھ بیٹھی۔  
 ”یہ فیٹھ کیا ہوتا ہے؟“  
 ”گہرائی ناپنے کا پیمانہ۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے  
 بتایا ”جس کی لمبائی چھ فٹ ہوتی ہے۔“  
 ”خود ہے اختیار کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا  
 جیسے انسان پٹرول میں جگنو سے جگنو کا اٹھے ہوں۔ اس کی ہنسی  
 بڑی روشن اور مستحکم تھی۔ اب وہ پہلے سے کہیں مختلف زرگل نظر  
 آ رہی تھی۔ وہ زرگل جو زندگی بچانے کے لیے پریشان نہ ہو  
 بلکہ پکی ہوئی زندگی کو گزار کر خوش ہو۔ اس کی بدلتی ہوئی  
 کیفیت کو دیکھ کر اس بات پر میرا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ  
 انسان کی راحت اور گفت حالات اور ماحول کی ریزن منت  
 ہیں۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہا ہوتا ہے، اس کی  
 سوچ مزاج اور رویے پر ایسی نوعیت کے اثرات مرتب ہوتے  
 چلے جاتے ہیں۔“  
 زرگل کی ہنسی نے مسکراہٹ کا روپ دھار اور وہ بڑی  
 زندہ دلی سے بولی ”تم صرف گہرے ہی نہیں بلکہ شریہ بھی ہو۔  
 تمہاری شرارت نے مجھے پسینے پر مجبور کر دیا۔“  
 ”مجھ میں شرارت سے زیادہ حماقت بھری ہوئی ہے۔“  
 میں بھی اس وقت شوخی پر اتر آیا تھا۔  
 ”حماقت!“ زرگل کے لہجے میں حیرت در آئی ”مجھے تو  
 کہیں نظر نہیں آ رہی؟“  
 ”یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے جو میں تمہارے ہاتھ میں  
 پیانہ ڈھونڈ رہا ہوں!“ میں نے بے دھڑک کہہ دیا ”پیانے تو  
 تمہاری آنکھوں میں فٹ ہیں۔“

اس کو چپ سی لگ گئی۔ نظر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھومنے  
 لگی۔  
 میں نے کہا ”بے چارہ مجھے فیٹھ ان کے سامنے کیا پچھتا  
 ہے۔ تمہارے پناؤں کی رینگ تو پتا نہیں۔“  
 بے ساختہ میں نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ مجھے یوں محسوس  
 ہوا جیسے کسی نے میری زبان کو پکڑ لیا ہو۔ شاید میرے اندر کوئی  
 بیٹھا ہوا تھا جس نے ہاتھ بڑھا کر میری بولی بند کر دی تھی، اس  
 کے ساتھ ہی مجھے لگا، میں کوئی جرم کرنے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے  
 عمل پر پشیمانی کا احساس ہوا۔ کسی کے حسن کی تحریف کرنا ہی  
 بات نہیں لیکن میں اپنے اندرون سے مجبور تھا۔ جب سے  
 ساحل مجھ سے جدا ہوئی تھی، گویا خوشیاں مجھ سے روک لی  
 تھیں۔ شاید اسی سبب میں اپنے کھل پر برداشت محسوس کر رہا  
 تھا۔ میں نے اپنے اندر ساحل کو اس گہرائی میں سپکھیا کر کہاں  
 کا احساس میرے وجود کا حصہ نہ کر رہا تھا۔ میری ہر سانس  
 اس کی یاد سے لپکتی تھی، اس کے تصور نے میری ذات کو اپنے  
 حصار میں لے رکھا تھا۔ میری اپنی زندگی ختم ہوئی تھی۔ اب  
 میں صرف اور صرف اسی کے لیے زندہ تھا۔  
 میرے نامکمل جملے نے زرگل کو خاموشی توڑنے پر مجبور  
 کر دیا ”تم کچھ کہتے کہتے رک رک کیوں گئے؟“  
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”تموڑی دیر پہلے تو بہت کچھ تھا۔ اچانک سب کیسے خ  
 ہو گیا؟“  
 ”جو انسان کے اختیار میں نہیں ہو، اس پر ہانکا“  
 جملہ آدر ہو جاتا ہے۔“  
 ”تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“  
 ”تم اپنی سمجھ کو گھٹا کر نہ کرو۔“  
 ”پھر کس کو کر دوں؟“  
 ”مجھے نہیں معلوم!“ میں نے جان چھڑانے والے انداز  
 میں کہا اور وہ اسکرین کے پار ساہمہ مرک کو گھومنے لگا۔  
 اس کے بعد زرگل نے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ ہم دونوں  
 کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ اس نے خاموشی اختیار کر کے  
 داری کا ثبوت دیا تھا اور نہ میں ساحل کے تصور میں غل غل پانت  
 کوئی التماسید حاسا جواب بھی دے سکتا تھا۔  
 محبوب کی یاد کا بھی ایک عجیب سا نشہ ہوتا ہے۔ یہ کبھی بک  
 آج دیتی ہے۔ اس کیف آگئیں کیفیت کو وہی لوگ سمجھ  
 کر سکتے ہیں جنہوں نے زندگی میں محبت کی ہو، کسی کو نہ  
 چاہا ہو۔ چاہت کے اپنے آداب ہیں۔ یہ آگم کا ایک  
 دریا ہے جس میں ڈوب کر پار اترنا پڑتا ہے۔ سن میں

کی شورش نہ ہو یہ دریا تپن پر آبلے ڈال دیتا ہے!  
 ☆☆☆  
 فریڈ ہاشا کے بیٹے پر ایک اور حیرت مبری خنجر تھی!  
 فریڈ کی زبانی مجھے تو معلوم ہو چکا تھا، ہمدین نامی نئے  
 بیگرونی گاڑنے ڈیوٹی سنہال لی تھی۔ ہم دونوں ایک  
 دوسرے کے صورت آشنا نہیں تھے چنانچہ گیٹ پر جب ہمارا  
 سامنا ہوا تو تعارف کے باوجود بھی اس نے مجھے بیٹلے میں  
 داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ اس کے رویے نے مجھے الجھا  
 دیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔  
 ”میں ہاشا کا بہت ہی قریبی دوست ہوں۔ کیا انہوں  
 نے میرے بارے میں تمہیں بتایا نہیں؟“  
 وہ لنگ زدہ نظر سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا  
 ”سب کچھ بتایا تھا مگر میں۔“ وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر زرگل  
 کی طرف دیکھنے لگا۔  
 ”یہ میری دوست ہے۔“ میں نے گاڑی کی الجھن کے  
 پٹی نظر کھپا ”کیا تم اس کی وجہ سے پریشان ہو؟“  
 وہ کئی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”میں آپ کو دیکھ کر  
 الجھ گیا ہوں کیونکہ آپ تموڑی دیر پہلے بھی یہاں آئے  
 تھے۔“ وہ اپنی بات کو نامکمل چھوڑ کر جلدی سے بولا  
 ”مظہر میں اللہ خدا کو بلاتا ہوں۔“  
 یہ کہتے ہی وہ یقین سے کھل کر کوشی کے اندر غائب  
 ہو گیا۔ میں اس وقت عجیب و غریب صورت حالات سے دو  
 چار تھا۔ گاڑی کا کہنا کہ میں تموڑی دیر پہلے بھی وہاں آیا تھا  
 ناقابل یقین اور سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ زرگل بھی  
 سوالیہ نظر سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ تامل کرتے ہوئے بولی۔  
 ”یہ کیا ماجرا ہے وجہ۔ تم تو لگ بھگ ڈھائی گھنٹے سے  
 میرے ساتھ ہو؟“  
 میں نے کہا ”ماجرہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔ اللہ خدا  
 کو آجانے دو پھر ہی کچھ چلے گا۔“  
 ”یہ اللہ خدا کون ہے؟“ زرگل نے پوچھا۔  
 ”فریڈ ہاشا کا لازم ہے۔ باورچی کے فرائض انجام دیتا  
 ہے۔“  
 ”کمال ہے، گاڑی ایک خانانا کو بلانے گیا ہے۔ کیا  
 تمہارا دوست فریڈ ہاشا کو بھی میں موجود نہیں۔“  
 ”اسے کوئی میں ہی موجود ہونا چاہیے۔“ میں نے کچھ  
 سوچتے ہوئے کہا ”فون پر میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ اگر  
 اسے مل جائے تو مجھے ضرور بتاتا!“  
 تاملی بات چیت کے دوران میں گاڑی، اللہ خدا کے

ساتھ گیٹ پر ہمدین ہوا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اللہ خدا جو کچا پھر  
 نسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولا  
 ”جناب! یہ گاڑی اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہوگئی۔ اور یہ آپ  
 کے ساتھ کون ہے؟“ بات ختم کرتے ہی اس نے زرگل کی  
 طرف اشارہ کیا۔  
 ”یہ سب کیا ہو رہا ہے اللہ خدا؟“ میں نے ڈانٹنے والے  
 انداز میں کہا ”کوئی گاڑی کھولنے کے بجائے تم لوگ میرا  
 انتظار یوں کیوں کر رہے ہو؟ ہاشا کہاں ہے۔؟“ اور جب شراب  
 ہونے کا کیا قصہ ہے۔ تم نے اس کے ٹھیک ہونے کی بات  
 کیوں کی؟“  
 ”آپ نے بہت زیادہ سوالات کر ڈالے ہیں۔“ اللہ  
 خدا تلوٹی ہوئی نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولا ”کیا آپ تموڑی  
 دیر پہلے یہاں نہیں آئے تھے؟“  
 ”یہ کیا بکواس ہے!“ میں نے تقریباً چاچ کر کہا ”ہاشا کو  
 فوراً یہاں بلاؤ۔“  
 وہ میرے چار حانہ انداز سے کم گیا پھر میرے استفسار  
 پر اس نے جو بتا دیا ”یا الہی، یہ باجرا کیا ہے!“ والی بات  
 تھی۔ اس کے شروع ہوتے ہی میرا دھیان آپوں آپ ایک  
 ناقابل حل مسئلے کی طرف چلا گیا۔ اللہ خدا کے بیان کے مطابق،  
 میں ایک سرخ لینڈ کرورز میں تموڑی دیر پہلے اس کو کھڑی پر آیا  
 تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ انسان پٹرول اچانک خراب ہو گئی تھی  
 اور میں اسے ایک گیراج میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے کوشی میں  
 چندہ میں منٹ گزارے اور ڈارنگ کو لے کر پھر کہیں نکل  
 گیا۔  
 ڈارنگ والی بات نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ یہ تو میں سمجھ  
 گیا تھا، سرخ جب میں یہاں آنے والا دھی بہر دیا تھا جو  
 شادمان کالونی سے میرا تعاقب کرتے ہوئے نہر کے کنارے  
 پہنچا تھا اور مجھ سے کلام کے بغیر رو پکڑ ہو گیا تھا۔ یقیناً اس کے  
 بعد اس نے ادھر ہی کار رخ کیا تھا۔ یہ کم بخت کٹی و ددان بہت  
 ہی خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ ڈارنگ کوہ اگر اپنے ساتھ لے  
 گیا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ شاطر ملی تھی اس سے  
 دھوکا کھا گئی۔ یہ تو بہت ہی تشویش ناک صورت حال تھی۔  
 ڈارنگ کا دھوکے میں آ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔  
 ”وہ کس طرف گیا ہے اور کب واپس آئے گا؟“ میں  
 نے ہنظر اری لہجے میں پوچھا حالانکہ مجھے یقین تھا، وہ واپسی  
 کے ارادے سے نہیں گیا ہوگا۔  
 اللہ خدا گمیر آواز میں بولا ”جناب! آخر معاملہ کیا ہے۔  
 آپ دونوں میں اصلی کون ہے۔ یہ تو میں نے محسوس کر لیا ہے،

کوئی بڑی گزب ہو چکی ہے۔“

اللہ دتا ایک معاملہ تم اور دور اندیش شخص ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی شہرہ ہوئے لکچ میں کہا ”وہ ایک بہرہ دینا ہے۔ بہت ہی خطرناک انسان۔ میں اسکی وجدان ہوں۔ تم جلدی سے گیٹ کھلاؤ اور پاشا کو بتاؤ، میں واپس آ گیا ہوں۔“

اللہ دتا نے موقع مل دیکھتے ہوئے گارڈ کو اشارہ کیا کہ وہ ہمارے لیے کوشی کا گیٹ کھول دے۔ میں جب کو اندر لے گیا پھر ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اللہ دتا ہمارے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک اور انکشاف کیا۔

”صاحب! پاشا صاحب تو اس وقت کوشی میں موجود نہیں ہیں۔“

”وہ کہاں چلے گئے ہیں؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

اللہ دتا نے بتایا ”انہیں اچانک سید پور جانا پڑ گیا ہے۔ بڑے پاشا صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ فریڈ صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ادھر گئے ہیں۔“

بڑے پاشا سے اس کی مراد فریڈ کا باپ کمال پاشا تھی۔ یہ خبر بڑی ہولناک اور سنسنی خیز تھی۔ میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ لوگ یہاں سے کتنے بجے روانہ ہوئے ہیں؟“

”سات بجے۔“ اللہ دتا نے بتایا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا، پاشا کو گئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ یہ لگ بھگ وہی وقت تھا جب میں گینڈا امانا قادر بخش کا انٹرویو کر رہا تھا۔ حالات نے اچانک سنگین صورت حال اختیار کر لی تھی۔

میں نے اللہ دتا سے پوچھا ”مجھی طرح سوچ کر بتاؤ، وہ شاطر بہرہ دینا کتنی دیر پہلے یہاں سے گیا ہے اور اس نے اپنی واپسی کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

”میرے خیال میں اسے گئے ہوئے ہیں منٹ ہوئے ہوں گے۔“ اس نے بتایا ”اس نے جاتے ہوئے یہی کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس آ جائے گا۔“

”وہ اپنے ساتھ میری جیتی ملی کو بھی لے گیا۔“ میں نے ترش لکچ میں کہا ”اور تم لوگوں نے اسے روکا تک نہیں؟ یہ کیسی غیر ذمہ داری ہے۔ کیا میں اسے خیانت سمجھوں؟“ وہ افسوس ناک انداز میں بولا ”ہم کیا کر کے جتا! ہم تو بھی سمجھے، آپ ہیں۔ آپ کو ہم کس طرح متح کر سکتے ہیں کہ

ڈارلنگ کو اپنے ساتھ نہ لے کر جائیں۔“

وہ بے چارہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”پیارے گاڑی کے حوالے سے تو اس نے یہ جواز پیش کر دیا کہ وہ خراب ہو گئی ہے۔ تم لوگوں نے اس کے لباس پر بھی دھیان نہیں دیا۔ اس نے سفید پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور۔۔۔ میرا لباس تم دیکھ رہے ہو؟“

ہم بائیں کرتے ہوئے کوشی کے اندر ڈارلنگ روم میں آ بیٹھے تو اللہ دتا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ”صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اسے دہنی طور پر چکر دیا تھا۔ وہاں ہی سمجھ رہے تھے اس لیے اس کے لباس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آ رہا ہے، اس چکر باز نے واقعی سفید کوٹ پہن رکھا تھا جس کی کراس کے پاؤں میں جو تھے بھی سفید ہی تھے۔ اود میرے خدا! ایڑہ بہت قصب ہو گیا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ”ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ واقعی، آپ تو اسی لباس میں کوشی سے روانہ ہوئے تھے۔ آپ ہی اسکی وجدان ہیں۔“ پھر اس کا انداز متوجیانہ ہو گیا ”صاحب! میں آپ سے سوالی چاہتا ہوں۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے ہوئے کہا ”مجھ سے ایک تنگنیں خطا ہو گئی۔ اب اگر وہ بہرہ دینا مجھے نظر آ گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”انتہا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے قدرے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ”غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور اس غلطی میں تم بہت زیادہ قصور دار نہیں ہو۔ جو معاملات حالات کی ستم ظریفی نے بگاڑ دیئے ہیں ان سے میں منٹ لوں گا۔ تم اپنے ہاتھوں کو کنٹرول میں رکھو۔“ آخری جملہ میں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ شرمندہ صورت بنا کر بولا۔

”اگر پاشا صاحب کو میری اس حماقت کا پتا چل گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔“

میں نے کہا ”یہ واقعہ پاشا سے چھپا نہیں رہ سکا اور میں ممکن ہے، وہ تم سے سخت خفا بھی ہو بہر حال، گئے ہوئے دن کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔“

وہ غماص آمیز انداز میں گردن کو جھٹکتے لگا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھا ”تم نے غلطی وجدان کو پاشا کی، سید پور روانگی کے بارے میں بتایا تھا؟“ ”ہاں، بتایا تھا جناب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

بولا ”اس پر اس نے پوچھا تھا، وہ واپس کب آئیں گے۔ ظاہر ہے، میرے لیے وہ وجدان تھا اس لیے میں نے اسے ایک تک بات ٹھیک بتا دی۔ پاشا صاحب سید پور کس وجہ سے مجھے ہیں اور یہ کھل سے پہلے ان کی واپسی ممکن ہے۔ میں پاشا صاحب کے عزیز دوست وجدان سے کیونکر بھوت ہوتا!“

اللہ دتا اپنی جگہ درست کہہ رہا تھا لیکن اس کی فراہم کردہ اطلاع میرے لیے قیامت در قیامت تھی۔ وہ چالہاز بہرہ دینا میری ڈارلنگ کے ”خو“ کے ساتھ اس کوشی سے یہ معلومات بھی حاصل کر کے لے گیا تھا کہ صاحب خانہ آج کی رات کوشی پر نہیں۔ وجدان اور دو ملازم اس رات کوشی میں ہوں گے۔ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کا کوئی خاص بندوبست کر لے گا لیکن کوشی کے اندر ہی الوت مجھے ایسے آثار نہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ خاناماں اللہ دتا اور بکپوری گارڈ عمر دین کے علاوہ کوشی میں یا تو میں تھا یا پھر زنگ۔

اس بات میں کسی شبک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ میرا ہو بہرہ دینا میرے والدہ غلطی وجدان کی بھی طور میرا دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے مکالمہ کے بغیر دم کا مروج سے فرار نہ ہو جاتا۔ وہ دھننا میرے دشنوں کا بھیجا ہوا تھا جو میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ڈارلنگ کو بڑی صفائی سے کوشی سے نکال لے گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک کھلا پیچھا تھا، گویا اس نے شر کے جبروں میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کامیاب کوشش! ازاں بعد غی کی مگر مجھے اس جی دار باز دو کو اپنے دناؤں تلے پیٹنا تھا جو میری ڈارلنگ کو مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔

اس وقت میرے لیے توشیح کی بات یہ تھی کہ میرے دناؤں اس بات سے آگاہ ہو گئے تھے کہ اس رات میں کوشی میں با آسانی کھار کیا جا سکتا ہوں۔ کسی بڑے بہرہ دینا کے لیے تو یہ کی جاسکتی تھی۔ میں بے اختیار سنسنی خیز نظر سے اللہ دتا کو دیکھنے لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر غماص سے نگاہ جھانکی۔ میں نے اسے قاطب کرتے ہوئے پوچھا ”پاشا صاحب نے میرے لیے کیا پیغام چھوڑا ہے؟“

میں نے وجدان کی شرانگیز حرکت سے اس قدر کبیدہ خاطر ہوا تھا کہ پاشا کے باپ کا معاملہ نادانستہ طور پر ہی پشت چا گیا۔ پاشا کو میں دل سے دوست تسلیم کر چکا تھا۔ اس کے باپ کو ہارت ایک ہوا تھا، یعنی طور پر یہ میرے لیے بھی کسی لمحے سے کم نہیں تھا۔ دوست کی معصیت کو نظر انداز کرنا غلطی

در ہے کی کم عمری کہلاتی ہے۔

اللہ دتا نے مجھے بتایا ”پاشا صاحب کو جیسے ہی فون پر جتا چلا کہ بڑے پاشا صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے تو انہوں نے سب سے پہلے آپ ہی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے آپ کو فاضلیہ کالونی والی کوشی پر فون کیا تھا لیکن آپ نے فون انیڈ نہیں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ریاض سے بات کی۔ ریاض صاحب دل کے ڈاکٹر ہیں اور بڑے پاشا صاحب کے معاملات کو ابھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ پاشا صاحب کے ساتھ ہی سید پور گئے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”آپ کے لیے انہوں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ جب آپ واپس آ جائیں تو پھر تمام وقت کوشی کے اندر ہی موجود رہیں۔ وہ سید پور پہنچنے کے بعد کسی بھی وقت آپ کو فون کریں گے؟“

میرے سینے سے ایک طویل اور گہری سانس خارج ہوئی۔ فون کے ذکر پر وہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جب فاضلیہ کالونی والی خالی کوشی فائرنگ کی آواز سے کوئٹھ اٹھی تھی۔ میں نے دو فائرنگ برست کے دوران میں کوشی کے کسی حصے میں فون کی کھنٹی کی آواز واضح طور پر سنی تھی۔ ازاں بعد کی افراتفری اور الجھل نے میرا دھیان اس طرف سے ہٹا دیا تھا۔ اگر اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ پاشا مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو میں کسی طرح فون انیڈ کرنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا لیکن افسوس کہ میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

کمان سے نکلا ہوا تیر اور پتا ہوا لحد لوٹ کر واپس نہیں آتا اس لیے بیچتا نے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اللہ دتا سے کہا۔

”کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں تم نے کوئی بندوبست کیا ہے؟“

وہ دھیمی آواز میں بولا ”پاشا صاحب جس افراتفری کے عالم میں یہاں سے رخصت ہوئے ہیں اس واقعے نے مجھے بہت دل شکستہ کر دیا ہے۔ باقاعدہ کھانے کا اہتمام تو نہیں کیا گیا لیکن میں چندہ میں منٹ میں تیار کر لوں گا۔“

گجی بات تو یہ ہے کہ خود میرا کھانے پینے کو بھی نہیں جاہ رہا تھا۔ کھانے والا سوال میں سے ٹھٹھ زور لگ کر بچے سے کیا تھا۔ جن حالات میں ہماری ملاقات ہوئی تھی اس سے لگتا تھا، بچیلے کئی گھنٹوں سے، زندگی بچانے کی سعی نے اسے کھانا کھانے کی مہلت نہیں دی ہوگی۔ دل بوجھل اور ذہن پرانگندہ ہی کسی مگر

زندگی کے تھکے بھانپ پڑے ہیں جن میں اولین قصہ خایہ ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا چاہیے، چاہے وہ کھانا زہر مار ہی کیوں نہ کیا جائے۔

میرے اشارے پر اللہ داتا اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگا تو میں نے تاکید کی لہجے میں کہا ”کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس تھوڑا سا سیدھا سادہ کھانا تیار کرلو۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا ”اور کچن میں مصروف ہونے سے پہلے ذرا سیکورٹی گارڈ کی طرف بھی پتھر لگالو۔ وہ نیا بندہ ہے۔ شروع ہی سے تانت کر کے رکھو گے تو بعد میں پریشانی نہیں ہوگی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دو، اپنی آنکھیں ملکی اور اس بیدار رکے۔“

اللہ داتا ثابت میں سر ہلاتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ اللہ داتا سے ہونے والی گفتگو کے دوران میں زرگل بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی لیکن مجھے ہی اس نے دیکھا، ہمیں تنہائی میسر آگئی ہے، اس کی زبان مٹی گئی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

”وجہ! یہ نقلی وجدان یا بہرہ دے کا کیا پتھر ہے؟“ میں نے جواب دیا ”یہ پتھر! ابھی پوری طرح میری بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ میرا خیال ہے، یہ میرے ذہنوں کی کوئی گہری چال ہے لیکن.....“ میں نے جملہ اور اچھوڑ کر زرگل کو دیکھا اور کہا ”مجھے امید ہے، میں اس سازش کو بہت جلد بے نقاب کر دوں گا۔“

”وہ تو اس کوٹھی سے تمہاری ڈارلنگ کو بھی لے گیا۔“ زرگل نے مزید کہا ”اس ڈارلنگ کے بارے میں کچھ متاؤ۔ یہ کردار میری میرے ذہن کو اچھا خاصا ابھار رہا ہے!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”ڈارلنگ دراصل میری ملی کا نام ہے۔ وہ بہت ہی کیوٹ پالتو بی ہے مگر اس بہرہ دے کے جھانے میں آگئی۔ وہ اسے وجدان ہی سمجھتی ہوگی۔“

”میں اسی پہلو سے الجھ رہی ہوں وجہ۔“ وہ خمیدگی سے بولی ”چالور اور خاص طور پر پالتو چالور تو بہت ہی سمجھ دار اور مالک شاس ہوتے ہیں۔ ان کی حس نہایت ہی تیز ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے آقا کے قدموں کی چاپ سے اس کی موجودگی کا اندازہ لگ لیتے ہیں۔ ان کی حسایت جسم کی مخصوص بو کو بھی الگ الگ شناخت کر لیتی ہے۔ تمہاری ڈارلنگ بھنپتا تمہارے لس اور جسم کی مخصوص مہک سے آشنا ہوگی۔ تمہارا سوا ایک بھرنے والا کوئی بہرہ دیا اسے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ ان لوگوں کے بیان کے مطابق ڈارلنگ بڑی شرافت سے اس نقلی

وجدان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ یہ واقعہ مجھے تو غم نہیں ہوا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

زرگل نے بہت ہی اہم سوال اٹھایا تھا۔ واقعی ڈارلنگ ایک جانور ہونے کے باوجود مجھے اس پر سے کس کو بہت اچھی طرح جانتی اور پہچانتی تھی۔ وہ نقلی اور اصلی وجدان میں بخوبی تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور پھر ڈارلنگ کوئی عام جانور بھی نہیں تھی۔ اب تک اس ملی کے جتنے روپ اور کارنامے میرے سامنے آچکے تھے وہ حیران کن اور بعض ناقابل یقین تھے۔ اسے دھوکا دینا، ہراسنا دینا، ہاتھ کے کسی کی بات نہیں تھی۔ وہ بہرہ دیا اگر اس کوٹھی سے ڈارلنگ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا تو بھنپتا اس نے کوئی بہت بڑا چکر دکھایا ہوگا۔ اب رفتہ رفتہ اس نقلی وجدان کی کارکردگیاں مجھ پر مکمل رہی تھیں۔ وہ میری کامیاب ڈی کا بھرپور رول ادا کر رہا تھا۔

زرگل ڈارلنگ کے کارناموں سے واقف نہیں تھی اس لیے اس کے ذہن میں ڈارلنگ کا تصور کسی عام ملی ایسا ہوگا۔ میں سردست اسے ڈارلنگ کے بارے میں کسی تفصیل میں لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اسی لیے بہم انداز میں کہا۔

”تم نے بات تو بہت سچے کی کی ہے۔ لگتا ہے، وہ بہرہ دیا کوئی جانور دہرہ بھی جانتا ہے!“ ”گو یا نقلی بھلائی اصل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ وہ سختی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”تم بھی کون سے کئی ہو۔ میں نے تمہیں پر اسرار ایسے ہی تو نہیں کہہ دیا۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”تمہارے کندھے کا درد اب کیسا ہے؟“ ”کوئی خاص نہیں۔“ وہ گھٹاٹھانے کو اچکاتے ہوئے بولی ”میں تو اسے بھول ہی گئی تھی۔“

میں نے کہا ”کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تم لباس تبدیل کر لیتا۔ میں جنہیں ڈھنگ کا کوئی زائد لباس نکلوا دوں گا۔ اسی وقت تمہارے کندھے کا معائنہ بھی کر لوں گا۔ میرا خیال ہے، پاشا کی کوٹھی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہوگا۔ تمہاری معقول سی ڈریسنگ ہو جائے تو آرام سے سو جائے۔ نا نہیں، بلکہ کی صبح تمہارے لیے کن چنگاموں کا تختہ لے کر آئے گی۔“

اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا، وہ اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ میں نے گفتگو کا موضوع کیوں بدلا ہے۔ ”دل کی بات کو زبان پر نہ لاتے ہوئے بولی“ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو وجہ! کل کی صبح کا کوئی بہرہ دیا نہیں۔ آج کی رات نا

خبریت سے مگر جانے تو قیمت ہوگا۔“ ”میں نے تسلی آمیز انتظار اللہ خبریت رہے گی۔“ میں نے تسلی آمیز

لہجے میں کہا۔ ”اگرچہ حالات ایسے نظر نہیں آ رہے۔“ وہ خیال افروز انداز میں بولی ”مجھے خدشہ ہے، وہ بہرہ دیا ضرور کوئی نیا مگل لگائے گا۔ اس کی حرکت کو میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔“ ”کون سی حرکت؟“ میں نے پوچھا۔

”میری ڈارلنگ کے خواہاں حرکت۔“ اس نے لفظ خواہاں بڑبڑاتے ہوئے کہا ”وہ یہاں آیا، اس کوٹھی کے ملازمین کی آنکھوں میں دخول جھونکی اور صرف ایک پالتو ملی پر قناعت کر کے خاموشی سے چلا گیا۔ اگر وہ واقعی تمہارا دشمن ہے تو بڑا چب دشمن ہے۔ اور اگر وہ واقعی صرف تمہاری ملی حاصل کرنے یہاں آیا تھا تو پھر تمہاری ملی نہایت ہی غیر معمولی ہوگی۔“

”بہت مہارت سے حالات کا تجزیہ کر رہی تھی۔ میں اس کے دلائل کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی کہ وہ مگر صرف ڈارلنگ پر ہی انکشاف کر کے کیوں چلا گیا؟“ ”میرے اس کا جو جواب ذہن میں آ رہا تھا وہ یہی تھا کہ وہ شخص یا اس کے پیچھے کام کرنے والا دماغ ڈارلنگ کی پارادائٹ والا راز ضرور جانتا ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں.....“

”اپنا کہ میرے ذہن میں ایک خیال چکا۔“ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈارلنگ کو کسی خاص مقصد کے تحت آخو کیا گیا ہو۔ اس کو مائل کرنے کے لیے میری ڈی سے کام لیا گیا تھا۔ میں ممکن تھا، یکام میرے پاؤں ڈارلنگ کے کسی سنے دشمن نے کر دیا ہو؟

یہ سوال یکایک مختلف النوعیت سوالات کو جنم دیتا تھا جن کے جوابات کے بارے میں فی الوقت کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ بہر حال، میری زندگی میں نقلی وجدان والا ایک نیا سلسلہ چل نکلتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، آگے چل کر یہ اونٹن کس کردن بنے گا؟ صورت حالات اچانک ہی کمبیر اور الجھن زدہ ہو گئی تھی۔

اس دوران میں زرگل ٹھنکی باندھے مجھے دیکھے چلے جاتی تھی۔ اس نے عموماً در پہلے جو نکات اٹھائے تھے میں نے ان کے جواب میں ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ”ان تمام پہلوؤں پر فرصت سے غور کروں گا۔“

چہرے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا ”اس کوٹھی میں آئے کے بعد تم نے ملازمین سے جوابات چیت کی ہے اس سے میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ ہمارا حلقہ کرنے والی سرخ

لیڈ کرورز میں بھی بہرہ دیا موجود تھا لیکن وہاں نہر کے کنارے تم نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“ ”اس وقت اس بارے میں تمہیں کچھ بتانا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔“

”بتانا تو اب بھی نہیں، میں نے خود اندازہ لگایا ہے۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ ”تم نے اپنی ذہانت کا اظہار کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بہتر اہل لگتے ہوئے بولی ”یہاں سب دوست اور دشمن جنہیں وجدان کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں، اس سے میں الجھن محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے اس بات کی کڑی نہیں کہ تم وجدان ہو یا وجہ! میں اپنی آسانی کے لیے اگر جنہیں وجدان ہی سمجھوں تو جنہیں اس پر اعتراض تو نہیں ہوگا؟“ ”ہرگز نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا ”اپنے ذہن کو الجھانے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ تم مجھے وجدان سمجھتی اور پکارتی رہو۔“

ہمارے درمیان اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی باتیں جاری تھیں کہ اللہ داتا نے ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگنے کی نوید سنائی۔ ہم ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اس جانب بڑھ گئے۔

کھانے کے بعد میں نے اللہ داتا کے توسط سے نائیک کا ایک دھلا ہوا لباس حاصل کر کے زرگل کو تمنا دیا۔ اللہ داتا کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ ایک طویل عرصے سے پاشا کی کوٹھی میں کام اور آرام کر رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کی حیثیت گھریلو ملازم کے ساتھ ساتھ ایک نقلی ممبر ایسی تھی۔ اللہ داتا اس کی اپنی آسنا ختم کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔

زرگل لباس تبدیل کر کے داش روم سے نکلی تو میں نے اس کے ڈھکی باز دکا جائزہ لیا۔ میرے استفسار پر اللہ داتا فرسٹ ایڈ باکس اٹھالیا۔ کندھے کا زخم نشوونما تک نہیں تھا۔ میں نے متاثرہ حصے کو ایک اسٹینل سپرنگ کونٹن سے صاف کیا اور واؤڈر ہینڈل کریم لگا کر پٹی باندھ دی۔ مذکورہ واؤڈر ہینڈلنگ (WOUND HEALING) کریم کسی غیر ملکی کمپنی کی بنی ہوئی تھی جو زخم کی مزاح پر سی کے لیے بڑی مستعد سمجھی جاتی تھی۔

اس ضروری کام سے نمٹنے کے بعد میں زرگل کو اپنے ساتھ بالائی منزل والے بیڈروم میں لے گیا اور کہا ”آج کل میں کوٹھی کے اس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تم آرام سے یہاں ایک محفوظ اور گہری نیند لے سکتی ہو، کوئی جنہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ میں اپنی منزل کے کسی کمرے میں رات گزار لوں گا، تم چاہو تو دروازے کو اندر سے بند بھی کر سکتی ہو۔“

وہ کمرے کے دروازے پر اور کھڑکیوں پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے، تم کہہ رہے ہو تو میں یقین کر لیتی ہوں۔ تم نے اب تک میری حفاظت کی ہے اس لیے میں تمہاری باتوں کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتی۔“

”دے تو اس بیڑم میں ضروری چیز موجود ہے۔“ میں نے زرگل کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ”اگر پھر بھی تمہیں کچھ چاہے ہو تو بلا تکلف بتا دینا۔“

”بتا دوں گی۔“ اس نے مختصر کوئی پرانگنا کیا۔ اس وقت زرگل کے بدن پر نالکہ کا گلابی لباس تھا جو بڑھ چڑھ کر چھب رہا تھا۔ زرگل کی رنگت میں پہلے ہی دودھ اور گلاب کی آمیزش تھی، اس گلابی پہنا دے نے اس کے حسن بے داغ میں چاندنی بھردی۔ وہ اس وقت بلاشبہ گلاب بدن نظر آ رہی تھی۔ میرے پاس خوش چینی کی گنجائش تھی اور نہ ہی مجبور کاری کا وقت تھا اس اجنبی اور مصیبت زدہ لڑکی پر ایک بھر پور نظر ڈال کر میں بیڑم سے نکل آیا۔

زیریں منزل تک پہنچانے والے ذیعے طے کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، کہیں زرگل کو یہاں لا کر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ اگر یہ غلطی تھی بھی تو بہر حال اب وہ جی بھی پھر میرا خیال اپنے سامان کی طرف چلا گیا۔ میں چونکہ بالائی منزل کے اسی بیڑم میں ٹھہرا ہوا تھا اس لیے میرا ستری بیگ اسی کمرے کی ایک الماری میں رکھا ہوا اور وہ الماری لاک تھی۔ اولیٰ تو زرگل اس بیگ تک پہنچ سکتی تھی اور بالقرض پہنچ بھی جاتی تو وہاں اس کے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔

میں زیریں منزل پر واقع ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ فرید پاشا کے فون کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک بڑی مصیبت سے نہرواڑائی کے لیے گیا تھا۔ اسے کسی بھی وقت میری مدد کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ اگر ان ناکہ ترین حالات میں، میں اس کے کام نہ آتا تو ایسی دوستی اچا رہا ہوا ڈالنے کے سوا کس کام کی تھی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ میرے پاس آ بیٹھا۔ کھانے کے بعد چائے کا ایک دور چل چکا تھا پھر بھی وہ میرے لیے عمدہ قسم کی کافی بنا لایا۔ کافی اور چائے وغیرہ مجھ پر مشکوس اثرات مرتب کرتی ہیں۔ عام طور پر ان مشروب سے نیند آ جاتی ہے اور بھوک مر جاتی ہے لیکن چائے کافی کے استعمال کے بعد میں واضح طور پر بھوک محسوس کرنے لگتا ہوں، گویا میرے لیے یہ دونوں اشتہا انگیزی کا کردار ادا کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی سلیپنگ پلو کے طور پر بھی کام کرتی ہیں۔

اللہ داتا نے اتنی محبت سے کافی پیش کی کہ میں انکار نہ

کر سکا۔ ہمارے درمیان ہلکی چٹکی بات چیت ہونے لگی تو موضوع گفتگو کوئی وجہ ان کی طرف لے گیا۔ اس حوالے سے اس کا ذہن کسی کمرے کے مجسم کی لپٹ میں تھا اور ایسا ہوتا تھا جیسے تھا۔ میں خود اس بد معاش کی ”شیطانی“ کے سبب مدی طرح الجھا ہوا تھا۔

اس نے پہلے کہ ہمارے درمیان گفتگو دراز ہو جائی، فون کی کھنٹی بج آئی۔ اللہ داتا کے منہ سے بے اختیار نکلا ”یہاں لڑکی کا فون ہوگا!“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا ”کون لڑکی؟“ ”وہ اپنا نام صدف بتاتی ہے۔“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس لی اور فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

ریسیور اٹھانے سے قبل میں نے دوسری کھنٹی بچے انتظار کیا۔ پہلی کھنٹی پر فون اٹینڈ کرنے پر عموماً لائن کٹ جاتی ہے۔ میرا انتظار طویل کھنچ گیا مگر دوسری کھنٹی نہ بجی۔ ایک منٹ کے بعد ٹیلی فون سیٹ خاموش ہو گیا تھا۔

میں نے اللہ داتا سے پوچھا ”کیا صدف نے پہلی ہی فون کیا تھا؟“

”کم از کم دس مرتبہ۔“ اس نے جواب دیا ”پاشا صاحب کی رودادگی کے فوراً بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور آپ کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے اس نے آخری فون کیا تھا۔ اور ہر مرتبہ اس نے آپ کا پوچھا۔ لگتا ہے، اسے آپ سے کوئی بہت ہی ضروری کام ہے لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہو رہی ہے کہ جب سے آپ آئے ہیں، اس کا فون نہیں آیا۔ نا نہیں، اس کا کیا مسئلہ ہے؟“

میں نے پرسوج انداز میں کہا ”اس کا مسئلہ تمہاری نگہ میں آئے وہ انیلاں۔“

وہ انجمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

صدف کو میں کافی دیر سے بھولا ہوا تھا۔ دوپہر میں اپنی کزن نادیا کے ساتھ مجھ سے ملنے یہاں آئی تھی اور فون رخصت میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام میں اسے فون کروں گا۔ وہ مجھ سے کنگ فو (KUNG-FU) کے چند داؤ پتیرے سیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے رہیں کون پارک میں آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن جس شام کو میں ان پارک میں ملنا تھا وہ شام تو میں نے ایک خفیہ خانہ میں ”بتا“ دی تھی۔ میری طرف سے رابطہ نہ ہونے پر وہ فیض پریشان ہوئی ہوگی اور ٹیلی فون کا تانا سنا سبب تھا۔ بعض اوقات انسان عجیب و غریب حالات سے گزر

ہے۔ اسے جہاں جانا ہوتا ہے وہ اس مقام کے قریب سے گزرتا ہے لیکن بے بسی اسے کچھ یاد نہیں آنے دیتی۔ وہ اپنے مسائل کے چکر میں ایسا کھنچ کر بنتا ہے کہ اپنا مطلوبہ دھماکا ہی نہیں دیتا اگر نظر آتا ہے تو اس تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

اس کے اٹھ میں نہیں ہوتی۔ اس کے پہلے حصے میں شادمان میں گزرتے شام اور رات کے پہلے حصے میں شادمان ہلائی اور ریس کورس پارک کے پاس سے گزرا تھا۔ کالونی میں صدف کا قیام تھا اور پارک میں وہ مجھ سے استفادہ کرنا چاہتی تھی مگر ان دونوں مقامات پر اس سے رابطے میں نہ آ سکا۔ سرخ لینڈ کر دزد والے ٹکڑی دیدان نے مجھے مہلت نہ دی اور میں اسے چکر دینے کے لیے سڑکوں پر سڑکیں بدلتا ہوا تک چلا آ تھا۔

سب کچھ سوچتے ہوئے میں ایک تک ٹیلی فون سیٹ کو دیکھ کر ہاتھ پر پکڑ لی کھنٹی کی تکمیل کے بعد وہ ایسا خاموش ہوا تھا جیسے زبان پر مہر لگوا لی ہو۔ میں اللہ داتا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”صدف نے پاشا کی موجودگی میں بھی فون کیا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

وہ محضرت آمیز لہجے میں بولا ”کیا ہو تو مجھے معلوم نہیں کیونکہ وہ فون پاشا صاحب نے اٹینڈ کیا ہوگا۔ میں تو ان کے جانے کے بعد فون سن رہا ہوں۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا ”صدف نامی یہ لڑکی بہت باتونی ہے، سوالات کر کر کے مغز پچی کر دیتی ہے۔ اس نے تمہاری جان تو بہت کھائی ہوگی؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں دیدان صاحب۔“ وہ نامی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اس نے ہر مرتبہ مجھ سے چند مخصوص سوال پوچھے ہیں اور سب آپ سے متعلق۔ مثلاً آپ کہاں گئے ہیں؟ کب گئے ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ اور انہیں کب آئیں گے؟“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر کا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں بھلا ان سوالات کے کیا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے آپ کے بارے میں کچھ یاد ہی نہیں تھا لہذا ہر مرتبہ محضرت کر دی، البتہ۔“ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو پھر جلدی سے بولا ”ایک مرتبہ اس نے پاشا صاحب کے بارے میں بھی پوچھا تھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ پاشا صاحب کے والد صاحب کو ہارٹ ایٹک ہوا ہے اس لیے وہ اپنی بیوی کے ساتھ ٹرک سے لے کر آیا ہوا ہے۔“

”میں اپنی طرف سے کیوں کروں گا جی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”پاشا صاحب نے واضح الفاظ میں کہا تھا، وہ صبح آپ کو بھی بلائیں گے۔ شاید آپ پہلے ہی سید پور جانے والے تھے اور آپ نے کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ چھوٹے پاشا صاحب آپ کو لینے والے تھے لیکن ان کی آمد سے پہلے ان کا فون آ گیا۔ نوید پاشا صاحب ہی نے والد کے ہارٹ ایٹک کی خبر فون پر دی تھی۔“ میں سمجھا انداز میں اسے سن رہا تھا۔ اس نے مزید کہا ”صدف آپ کے لیے بہت پریشان تھی اس لیے میں نے اسے آپ کے بارے میں بتا دیا کہ آپ کل صبح سید پور جانے والے ہیں۔“ ”یہ سن کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی ہوگی۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”خیر، اب اس کا فون آیا تو میں خود بات کر لوں گا۔“

وہ خاموش ہو کر استغفار یہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں چونکہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے کہہ دیا ”میں نہیں جانتا۔ یہ بات بھی تم ہی بتا دو!“

اس نے بتایا ”وہ پوچھنے لگی، دیدان تو پاشا اکل کا بہت گہرا دوست ہے۔ اگر پاشا صاحب کے والد کی طبیعت اتنی خراب ہے تو بھلا وہ بھی انہیں دیکھنے جائے گا؟ میں صدف کو بتا چکا تھا کہ پاشا صاحب آپ سے ملے بغیر یہاں سے گئے ہیں، شاید اسی حوالے سے اس نے یہ بات کی تھی۔ میں نے اس کے استغفار کے جواب میں کہا کہ پاشا صاحب سید پور سے فون کر کے وہاں کے حالات سے آگاہ کریں گے اور اگر ضرورت محسوس کریں گے تو دیدان کو اپنے پاس بلا لیں گے۔ اس نے پوچھا، دیدان کی رودادگی جلدی سے جلدی کب تک ممکن ہے؟ میں نے بتا دیا، وہ کل صبح ہی جا چکیں گے۔ اس کے بعد بھی اس نے دو تین مرتبہ فون کیا اور آپ ہی کے بارے میں پوچھا کہ آپ وہاں آ گئے یا نہیں!“

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ”میری سید پور جانے والی بات تم نے اپنی طرف سے کی تھی یا پاشا نے ایسا کوئی اظہار کیا تھا؟“

”میں اپنی طرف سے کیوں کروں گا جی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”پاشا صاحب نے واضح الفاظ میں کہا تھا، وہ صبح آپ کو بھی بلا لیں گے۔ شاید آپ پہلے ہی سید پور جانے والے تھے اور آپ نے کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ چھوٹے پاشا صاحب آپ کو لینے والے تھے لیکن ان کی آمد سے پہلے ان کا فون آ گیا۔ نوید پاشا صاحب ہی نے والد کے ہارٹ ایٹک کی خبر فون پر دی تھی۔“ میں سمجھا انداز میں اسے سن رہا تھا۔ اس نے مزید کہا ”صدف آپ کے لیے بہت پریشان تھی اس لیے میں نے اسے آپ کے بارے میں بتا دیا کہ آپ کل صبح سید پور جانے والے ہیں۔“ ”یہ سن کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی ہوگی۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”خیر، اب اس کا فون آیا تو میں خود بات کر لوں گا۔“

اللہ داتا ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے صدف کے بارے میں، میں نے کوئی عجیب بات کر دی ہو۔ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ میرے سید پور جانے سے صدف کی پریشانی کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ اس نے اچانک کچھ یاد آ جانے کے انداز میں پوچھا ”دیدان صاحب! صدف بی بی وی لڑکی تو میں جو آج دن میں آپ سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ماموں زاد



بھی تھی؟“

”بالکل وہی ہے۔ کیا آج دن میں تم نے اسے دیکھا تھا؟“

”دیکھ تو نہیں سکا جناب۔“ وہ بتانے لگا ”بس اتنا ہی پتا چلا تھا، دو لڑکیاں آپ سے ملنے آئی تھیں۔ صدف کے بارے میں تو میں نے خود ہی اندازہ لگایا ہے۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ میں نے کہا پھر فون کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا ”یہ تو جیسے بولتا ہی بھول گیا ہے!“

وہ بھی الجھن بھری نظر سے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگا۔ میں نے کہا ”اللہ! اعلیٰ وجدان کی طرف سے ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم ایک مرتبہ پھر سکیورٹی گارڈ کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرو۔ اس سے کہو کہ وہ چونکا نظر سے گھٹی کا سامنے والا حصہ راج کرتا رہے اور ایک لمبے کے لیے بھی اپنے سینکڑوں سے نہ ہلے۔ یہ رات جاگ کر گزارنے کی ہے۔ وہ کل دن میں اپنی نیند پوری کر سکتا ہے اور ہاں.....“ میں نے ذرا توقف کیا پھر کہا ”گارڈ کو یہ تاکید بھی کر دیتا کہ اگر وہ کوئی غیر معمولی حرکت نہ کرے تو فوراً انٹر کام پر مجھے اطلاع دے۔ میری ہدایات کے بغیر اسے کوئی قدم نہیں اٹھانا۔ میں سینکڑوں ڈرائنگ روم میں موجود رہوں گا۔“

یہ فیصلہ میں نے اس لیے بھی کیا تھا کہ ڈرائنگ روم سے بالائی منزل کا زینہ اور بیرونی گیٹ بہت نزدیک تھے۔ کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے یہ جگہ نہایت ہی موزوں اور مناسب تھی۔ میں بہت آسانی سے سو کر سکتا تھا۔ اللہ دتا نے پوچھا ”گنگا ہے، آپ کا سونے کا ارادہ نہیں!“

میں نے ہمہ انداز میں جواب دیا ”کم از کم پاشا کے فون آنے تک تو مجھے جاگنا ہے۔ سونے کے بارے میں بعد میں سوچوں گا۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”جو آپ کا حکم ہو۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ میں نے کہا ”ابھی تین چار گھنٹے تک تو میرا سونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس دوران میں تم ایک نیند لے لو۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا ”بہتر ہوگا، تم کسی ایسی جگہ پر نیند لو جو کوئی کے غمی سے قریب ہو نہ کہ اگر اس طرف کسی گڑبڑ کے آثار پیدا ہوں تو تمہاری آنکھ کھل جائے۔ کوئی کے سامنے والے حصے کی نگرانی تو سکیورٹی گارڈ کر رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر

سو جاتا ہوں۔“ اللہ دتا نے کہا ”یہ کمر اکٹھی کے قریب ہے۔ میں بتا ہوا ہے۔“

پانچ منٹ بعد وہ مجھے ڈرائنگ روم میں تنہا چھوڑ کر وہ اصل ہو گیا۔ میں نے صدف کے بارے میں اللہ دتا سے زیادہ بات نہیں کی تھی لیکن میں اس کی فون کا نمبر اس کے ہاتھ میں رکھ کر اس کے علم میں یہ بات آج بھی گئی کہ میں کل صبح پور جانے والا ہوں وہ خود بھی د یہاں زندگی کا مشاہدہ کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا، گاؤں کی سیر اور ٹنگ فو کی ٹینک سیکسٹا محض ایک ہی رات تھا۔ وہ حقیقت ہے میرے قریب آنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی اور میں اس سے آپ سے اتنی دور جا چکا تھا کہ بعض اوقات خود کو تلاش کر رہا تھا۔

نقلی وجدان کی کارستانی نے مجھے ذہنی طور پر بری کر لیا تھا۔ اب صدف کی جانب سے بھی چند شرطیں امکان تھا۔ وہ آج رات کے کسی حصے میں یا کل رات یہاں پہنچ والی تھی اور اس سے پہلے اس کا فون آنے والا تھا۔ فون والے خیال پر میں نے کن آنکھوں سے غلطی نہ کر دینا چاہی۔ میں نے اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ تیری گھنٹی میں نے ریسپونڈ کر لیا اور میرے ”ہیلو“ کے جواب میں آپ شناسا آواز میری ساخت سے گرائی۔ اس آواز میں دیا ہوا کا درجہ ابھرا تھا۔

میرا ہاتھ ٹھنکا اور میں نے دھڑکنے ہوئے دل سے ”پاشا! میں وجدان بول رہا ہوں۔ اباجی کی طبیعت کس ہے؟“

”وجدان!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”الہامی سے روٹھ گئے ہیں۔“

میں سنائے میں رہ گیا۔ بڑے پاشا کے لیے دل کا جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ یہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں دیکھ کر مارنے بیٹھ جاتا۔ میں نے پاشا کو یہاں کے حالات بے خبر کر کے ہوئے چند تعزیت بھرے جملوں میں تسلی دلایا۔

”میں ابھی آ رہا ہوں۔ تم مجھے راتے اور گاؤں لویشن کے بارے میں کچھ بتاؤ میں کسی نہ کسی طرح جانوں گا۔“

وہ شکستہ لہجے میں بولا ”میں تمہارے غلوں اور جہاز اچھی طرح سمجھ رہا ہوں وجدان! رات میں سڑک پر ٹھیک ہو گا۔ تم کل صبح اللہ دتا کے ساتھ آ جاؤ۔ سید پور کا رات دیکھا بھلا ہے۔ یہ جنہیں یہاں پہنچا کر ابیں چلا جائے۔“

میں اس کے ساتھ یہاں سے چند قابل اعتماد اور ٹنگ حلال قسم کے افراد کو بھی کوٹھی پر پہنچا دوں گا۔ وہاں کی حفاظت کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ میں نے غلوں بھرے لہجے میں کہا ”تم سید پور کے معاملات کو دیکھو۔ یہاں سب خیریت ہے۔“

میں نے فون رابطہ ختم ہو گیا۔ میرا دل اچانک ہی کسی بہت بڑے بوجھ سے دب گیا۔ فریڈ پاشا آج پھر اندر سامنے سے غم ہو گیا تھا۔ میری نگاہ میں وہ مٹھرا گھوم گیا جب میرے والدین کو میری صفائی بصارت نے خاک و خون میں لوٹنے دیکھا تھا۔ اس وقت میں پختہ سوچ کا حامل نہیں تھا لیکن وہ ذہن میں مٹھرا گھوم گیا میری یادداشت میں گڑ گیا تھا۔ میں اپنے والدین کی حسرت ناک موت کو بھی نہیں بھول سکتا۔ اس غم کی اس زباں اور اس داغی جہاں کی کوئی لوگ محسوس کر کے ہیں جو اس حجرے سے علی طور پر گزر رہے ہوں۔

میں کافی دیر تک سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہا۔ فریڈ پاشا اور دیگر لوگ اس وقت جس صدمہ کا شکار تھے گزر رہے تھے اس کے تصور غم زدہ اور اس کر دینے والا تھا۔ میں صوفے سے اٹھا اور ڈرائنگ روم میں چلنے لگا۔ اچانک ایک اظہار نے مجھے اپنی گرفت میں بکڑ لیا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے اللہ دتا سے ہونے والی گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہو چکا تھا، بڑے پاشا صاحب کو دل کا یہ تیرا درد پڑا تھا۔ اس سے پہلے دو دماغ ایک ہو چکے تھے۔ دل کا تو ایک ہی دردہاں زبانی ہوتا ہے اور تیسرے دورے کے بارے میں تو کہا جاتا ہے، یہ موت کا دوسرا نام ہے۔ قمر ڈائیک سے فکا جانا کی بجائے سے گم نہیں۔ چونکہ مجھے عموماً رونما نہیں ہوتے اس لیے کمال پاشا زندگی ہار گیا۔

فریڈ پاشا کا باپ کمال پاشا تو اپنی زندگی کی پینٹھ ہار گیا تھا۔ یہ پاشا اور گزشتہ چند سال سے وہ حاضر قلب میں بھی تھا۔ موت نے اسے خالص طبعی انداز میں زندگی سے جکھن لیا لیکن میرے والد اور والدہ کا کیا تصور تھا؟ وہ تو پھر پور جانی میں اس دنیا سے اٹھ گئے۔ ان دونوں نے کیا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ نہ ہی کسی بیماری سے ان کی تعلق داری تھی بے رحم قانون نے ایک سفاک اور ظالم شخص کے اشارے پر انہیں سب روٹی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میں اظہار کی قدموں سے دو دو پواروں کے درمیان ٹھل رہا تھا اور میرے تصور کی نگاہ میں چند چہرے جل بجھ رہے تھے۔ وہی القاب انسان تھا جو لوگوں کے چہرے تھے۔ ان

چہروں کو دیکھ کر جنہوں نے سر شرم سے جھک جاتے تھے۔ دارا، اچھی فاک اور کم کے چہرے۔ ان درندوں نے میرے والدین کو مجھ سے چھین لیا تھا پھر آپوں آپ میرا دھیان چوہدری نواز شہلی کی طرف چلا گیا۔ میرے والدین کا کل اسی چوہدری کے ایما اور اشارے پر ہوا تھا اور..... اب میری رگ چاں، میری سانس ساحل بھی اسی شیطان صفت کے چنگل میں تھی۔

ساحل کے تصور اور خیال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے اس وقت خود کو کسی دیکھتے ہوئے طور میں پایا۔ وہ تو جیسے چوہدری نواز شہ کے ظلم نواز ابدیہن نے دھپکا تھا۔ اس کی دیک اور پیش نے میرے احساسات، جذبات اور سوچ کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میں جوں جوں سوچ رہا تھا، میری بیجانی کیفیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے بدن کا سارا خون دماغ کی طرف رواں ہو کر کن پٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اب جب میں میرے دماغ کی کوئی تس پٹ جائے گی۔ میں اپنی اس بدلتی ہوئی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں چلتے چلتے اچانک رکا اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر قلعے کے بل چلایا ”اللہ دتا.....!“

میری اس پکار نے فوری اثر دکھایا۔ اگلے ہی لمحے اللہ دتا میرے سامنے موجود تھا ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد اس نے دشت زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پریشانی سے بولا۔ ”کیا ہوا صاحب! آپ چیخ کیوں رہے تھے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے اپنی کیفیت کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا ”پینہ جاؤ۔“ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور پوچھا ”کوئی بات ضرور ہے۔ آپ چہرے سے بہت پریشان نظر آ رہے ہیں؟“

میں اسے اپنی دلی کیفیت سے روشناس نہیں کر سکتا تھا لہذا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ”تم تو سونے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلے گئے تھے لیکن تمہاری فوری آمد بتا رہی ہے، تم یہیں کیوں آس پاس ہی تھے؟“ اس نے بخور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ”میں نے سونے کی تھوڑی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ دل بہت بوجھل ہے وجدان صاحب۔ میں نے سوچا، جب نیند نہیں آ رہی تو کوارٹر میں پڑا کیا کروں گا۔ میں آپ کی طرف ہی آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم سے دو قدم کے فاصلے پر تھا کہ آپ کی چیخ سن کر اندر لپ آیا۔“ اتنا کہہ کر وہ کچھ تلاش کرنے والے انداز میں میری آنکھوں میں دیکھنے لگا ”وجدان صاحب! بتائیں، کیا مسئلہ ہے۔ آپ کی چیخ



”بیٹھ جاؤ اللہ دے گا“ میں نے نرمی سے کہا پھر اپنے دونوں پاؤں ٹھنڈے پانی والے ٹب میں ڈال دئے ”زیادہ

”اللہ دتا! تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔“

صاحب کا انتقال ہو گیا!

”اس کا جھنڈا بہت جلد بھی کر دیا ہے۔“

پاشا مجھے تحسین کی مالی حیثیت کے بارے میں بتا چکا تھا۔  
سمن آباد کے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہنے  
والے شخص کے پاس اپنی گاڑی کی توفع کرنا بیکار ہی تھا۔ میں

”ہیکٹر رٹی مار ڈنیا ہے اس لیے اسے.....!“

”اوہ، تینکس گاڈ!“ اس نے ایک طویل سانس  
چھوڑتے ہوئے کہا ”میں پریشانی میں تمہاری آواز پہچان نہیں  
سکتی۔“

میں نے پوچھا "صرف! تمہیں ایسی کون سی پریشانی لاحق ہوگئی۔ مجھے پتا چلا ہے، تم پہلے بھی متعدد دنوں تک مری ہو۔"

"تمہیں بالکل درست بتایا گیا ہے۔" وہ جلدی سے کہنے لگی۔

"اب کہیں اور ادھر ادھر نہ جوجانا۔ میں پچیس ٹیمکس مفت میں تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔"

اس نے جب کہیں تیس منٹ احتیاطاً تائے ہوں گے اور نہ چائنا چوک سے گھبر کر قہری میں آنے کے لیے اس سے کہیں کہ وقت لگتا ہے۔ میں نے اس کے اٹھے ہوئے انداز کے چہرے پر نظر کیا۔

”آخر مسئلہ کیا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی؟“  
 ”وہیں آ کر بتاؤں گی۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے  
 رابطہ موقوف کر دیا۔  
 میں ہکا بکا اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بے جاں رہبر  
 کو کھینچنے لگا۔

منہاس ہاتھ کوفن کرنے کا ارادہ میں نے بھگدڑ سے لیے ہتھوڑی کر دی۔ حسین اور صدف آگے پیچھے ہی اس کی پیٹھ سے پیچھے والے تھے۔ میں پہلے ان سے نمٹ لیتا کیونکہ منہاس سے ہتھکڑوں کا سلسلہ طویل بھی چڑ سکتا تھا۔ میں شیب غوری اور اس کی تنظیم ”سی ایف کے“ کے بارے میں بھی تفصیل معلومات حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لاہور آتے ہی میں پے در پے مسائل میں اس قدر الجھا تھا کہ کراچی والے شو سے میرا وہاں وقتی طور پر ہٹ گیا تھا۔ آج رات اگر جاگ کر گزارا ہی نصیب میں رہتا تو بھر اس معاملے کو دیکھ لینے میں کوئی قیاحت نہیں تھی۔ جمہور انیس میں گرفتار شدگان کے بارے میں مجھے بہت خوشی تھی۔

میں نے پوچھا کیا وہ بھی ایک مرتبہ پھر سیکورٹی گارڈ  
جا کر بتایا کہ ایک اور مہمان لڑکی بھی وہاں پہنچنے والی ہے۔  
نے پوچھا، کیا وہ بھی انہی ددلوں کے ساتھ آئے گی؟ میں نے  
بتایا، نہیں۔ وہ ان ددلوں سے الگ ہے اور اپنی گاڑی  
آئے گی پھر میں نے گاڑی کو صفحہ کے لیے آگاہ کر  
میں واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو اللہ خدا میرے  
آگیا۔ ہاشا کے اسٹینڈ تخمین اور اس کی بیوی کی آمد  
ہارے میں، میں نے اللہ دعا کو بتایا تو اس نے کہا۔  
”میں تخمین کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہاں ۱۲۵۰

الحقبة 9

”جیسا کہ یہ لوگ رات یہیں گزاریں گے؟“ اس نے

مطلب یہ ہوا کہ ان کی پراسیاریاں نکالیں رکھا جائے۔ میں نے  
 بی بیہ روم کو کھولا ہوں۔ یہ کمرہ عموماً مہمانوں کے قیام کے  
 لیے استعمال ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم جا کر اس کمرے کو سیٹ کرو۔ نوپیا ہوتا  
 ہے۔“

لکھنؤ کی مٹھی نے مجھے خیالات سے چوکایا۔ میں  
دروغ کے تصور کو ذہن سے جھٹک کر فون کی جانب متوجہ ہوا  
اور اتھ بڑھا کر۔ ریسور اٹھایا ”ہیلو۔“ کے جواب میں جو  
دراڑ میری ساعت سے گھرائی، میں نے اس کے حامل کو  
پکارتے میں ڈر غلطی نہ کی۔

”سری جانب خاموشی چھا گئی پھر منہاس نے تشویش

آتش فشاں ۱۴۱

منہاس باقر کی بات فتم ہوئی تو میں نے کہا ”اگرچہ یہ تمہیں اچھا ہمارا کامیابی ہی میں شمار ہوگا لیکن میرا خیال ہے، تم عجیب غوری کو بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے!“

قصه 9

”انشا اللہ! بہت زیادہ نقصان بھی پہنچا نہیں گئے۔“ اس نے دلولہ انگیز لہجے میں کہا ”شعیب غوری ہمارا خصوصی ٹارگٹ ہے۔ ساؤتھ پر جو کچھ بھی ہوا، وہ پولیس والوں کی ایک معمول کی کارروائی تھی۔ پورے سفیر کے قتل کی سازش میں شریک دو اہم افراد ہمارے ہتھے چڑھ گئے اور ہم نے ان سے حاصل شدہ معلومات کے بل پر ساؤتھ کو نشانہ بنایا۔ شعیب غوری کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آسکے گا کہ اس مشن میں ہمارا بھی کوئی ہاتھ تھا، یعنی وجدان کا کوئی ہاتھ!“

میں نے پوچھا ”کیا اس مشن میں پولیس کے علاوہ آپ کا کوئی بندہ بھی شامل تھا؟“

”صرف دو افراد۔“ اس نے جواب دیا ”شہزاد علی اور احمد۔ شہزاد نے پولیس کی بہت مدد کی ہے۔ اس کے تعاون کے بغیر نیپلے کی اندرونی کارروائی مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ مختلف نوعیت کی جتنی نشیات اور اسلحہ پولیس کے ہتھے چڑھا ہے وہ ان لوگوں کے خلاف کیس کو بہت مضبوط بنا دے گا۔ دہشت گردی، ناجائز اسلحے کی ذخیرہ اندوزی اور خطرناک نشیات کا اسٹاک کوئی کم سنگین جرائم نہیں ہیں پھر جم براؤن کے طفیل حکومت پاکستان بھی اس معاملے میں ملوث ہو گئی ہے۔ وہ لوگ بچ نہیں سکیں گے۔“

”آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں منہاس صاحب!“ میں نے استفسار کیا ”کبیر شاہ تو صاف بچ نکلا۔ شعیب غوری ابھی ٹیچ میں نہیں آیا۔ نجیب اور سراج نے کبیر شاہ تک راجہائی کر دی۔“

منہاس نے کہا ”وجدان! تم پولیس والوں کو جانتے ہو۔ یہ کھال کے بال اور بال کی کھال نکالنا خوب جانتے ہیں۔ کبیر شاہ کوئی طور پر فرار ہوا ہے۔ پولیس بہت جلد اس تک پہنچ جائے گی۔ خاص طور پر حکومتی دباؤ کے زیر اثر یہ لوگ بہت فعال ہو جاتے ہیں۔ نجیب اور سراج تو پولیس کی تحویل میں آ ہی چکے ہیں، ساؤتھ والے آپریشن میں کبیر شاہ کے تین مزید ساتھیوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ ان سے پوچھنا چھ جاری ہے۔ صابر علی، وحید خان اور منظور الہی نامی یہ تین بندے بھی بہت انکشافات کریں گے۔ جلد یا بدیر، پولیس کبیر شاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی اور..... کبیر شاہ کے بعد نام آتا ہے شعیب غوری کا۔ اس یہودی ازم پر پند شخص کا بہت برا وقت شروع ہو چکا ہے۔ وجدان! تم میری یہ بات لوٹ کر لو!“

ایک جھوٹی سی کامیابی کے باعث منہاس باقر خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا، کبیر شاہ اور شعیب کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ حاصل تھا۔ کبیر شاہ کی حیثیت

”سی ایف کے“ میں لگ بھگ امتیاز علی کے برابر تھی۔ شعیب غوری نے جس طرح صفحہ ہستی سے مٹایا یہ مجھ سے سن اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ شعیب جیسے شقی القلب باس باس اپنی بٹاکے لیے کسی کو بھی قربان کر سکتے ہیں، چاہے وہ ان کا بہترین دوست ہی کیوں نہ رہا ہو! شعیب کے ایک اشارے پر بہترین ساتھی الٹناک موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے میں امتیاز علی، میر بخش اور ردی کی جدائی کو بھی بھول نہیں سکتا تھا۔

میں نے منہاس باقر کی خوشی میں شامل ہوتے ہوئے ”جناب! یہ ہمارا پہلا قدم تھا، سی ایف کے کے خلاف آئندہ کوئی چال چلنے کے لیے ہمیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

وہ جوش بھرے لہجے میں بولا ”وجدان! میرا آپ ٹارگٹ ”ایسٹ“ ہوگا۔ مل پارک کے نزدیک واقع ٹیم کے اس ٹھکانے سے ممکن ہے، ہمیں مفید اشیاء اور ثبوت ہوا ہو جائیں۔ تم نے اس ٹھکانے کے قائم مقام کا نام ہا الدین بتایا تھا نا!“

”مجھے ایک دو مرتبہ ”ایسٹ“ جانے کا اتفاق ہے۔“ میں نے کہا ”وہاں کے کرتا دھرتا کا نام سراج علیا ہے۔ شعیب غوری نے کراچی کے ہر ڈسٹرکٹ میں ان کا نام سے ایک اڈا بنارکھا ہے۔ ”ساؤتھ“ کے قائم مقام کچھ کو آپ نے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ”ایسٹ“ کا نظام سراج الدین کے ہاتھ میں ہے۔ لاپتہ جگہ کی رہائی ان کے پاس کا نام تسلیم واسطی معلوم ہوا۔ ”سینٹرل“ اور ”ڈیپا“ سے ابھی میرا واسطی نہیں پڑا۔ ویسے ہر ٹھکانے کا ”اسٹاک“ الگ ہے اور وہ لوگ بوقت ضرورت ہی ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں۔ ان پانچوں باسز کا بگ باس شعیب ایک کمانڈر کی حیثیت سے ”سی ایف کے“ کا نظام چلاتا ہے اس کا اصل ٹھکانہ کہاں ہے؟ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا وہ حسب حال کہیں بھی پہنچ کر احکامات صادر کر دیتا۔ لیکن.....“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا منہاس باقر سے پوچھا ”آپ نے مفید اشیاء اور ثبوت کا ذکر ہے، اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

اس نے کہا ”وجدان! یہ بات تم مجھ سے زیادہ طرح جانتے ہو کہ شعیب غوری ایک دہشت گرد تنظیم کا باس ہے۔ اس دنیا میں ہر بگ باس کسی اپنے سے بڑے کا آلہ کار ہوتا ہے۔ شعیب بھی یہودی لابی کے اشاروں پر تاج رہا ہے۔ یہودی لابی پاکستان کو دہشت گرد بنو رہی

ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا، ایک یہودی افسل برطانوی پرنس میں مسٹر نٹل آرمز کے شعیب سے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں شعیب کے لٹکالوں سے کچھ ایسے ثبوت حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا کر اسے یہودی لابی کا آلہ کار ثابت کیا جاسکے۔ اب تو تم میری بات سمجھ گئے ہوں؟

”اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اسی وقت اللہ دتا میرے پاس آ گیا۔ مجھے فون پر مصروف دیکھ کر وہ ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔ میں نے منہاس صاحب سے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا پھر ماتھمیں پر ہاتھ رکھ کر اللہ دتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس نے کہا ”جناب! اصفد بی بی آ گئی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اسے کسی دوسرے کمرے میں آرام سے بٹھاؤ۔“ میں نے کہا ”میں فون سے فارغ ہونے کے بعد خود اس سے ملوں گا۔“

اگر صدف فوری طور پر میرے پاس آ جاتی تو میں منہاس باقر سے کام کی کوئی بات نہیں کر پاتا۔ ویسے بھی میں ”سی ایف کے“ سے متعلق کوئی بھی معاملہ صدف کے سامنے ڈکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جس کی ماری پہلے ہی میری جان کا عذاب بنی ہوئی تھی۔

اللہ دتا جانے لگا تو میں نے اسے حرید ہدایت دی ”اگر اس دوران میں پاشا صاحب کا اسٹنٹ حسین اپنی نئی ٹوپی وہن کے ساتھ یہاں پہنچ جائے تو اسے سیدھا اسی کمرے میں لے جانا جو تم نے ان دونوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں اس وقت فون پر نہایت ہی اہم گفتگو کر رہا ہوں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہی میں کسی سے مل سکوں گا لہذا مجھے خواہ خواہ ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

اللہ دتا فرماں برداری سے گردن جھکا کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

میں نے ماتھمیں سے ہاتھ ہٹایا اور کہا ”جی منہاس صاحب!“

وہ بولا ”میں نے تو تمہیں اپنے فون کرنے کا مقصد تفصیلاً بتا دیا ہے۔ اب تم جی بتا دو تمہارے پاس میرے لیے کون سی بری خبر ہے؟“

بری خبر آخر بری شے ہی ہوتی ہے اور اسے سنانا ناگزیر۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں منہاس باقر کو اس کے دوست فرید پاشا کے والد کے انتقال کی خبر سنائی۔

”اوہ!“ ایک افسوس ناک آواز میری ہاتھوں کرائی ”یہ کب ہوا؟“

میں نے بتایا ”آج ہی۔ کوئی دو تین گھنٹے پہلے۔“

کمال پاشا کو ہارٹ ایک ہوا ہے۔ فرید سات بیٹے پروردانہ ہو گیا تھا، اپنی بیگم کے ساتھ۔

”وہدان! تمہیں بھی جانا چاہیے تھا۔“ منہاس نے آواز میں کہا۔

میں نے کہا ”میں صبح سید پروردانہ ہو جاؤں گا۔“

جس وقت فرید کو یہ اندہناک اطلاع ملی کہ کمال پاشا کا ہارٹ ایک ہوا ہے، میں گوشی میں موجود نہیں تھا۔ فرید ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کو اپنے ساتھ لے کر فوراً سید پروردانہ ہو گیا۔ بچے یہاں پہنچا ہوں۔ دس بجے پاشا نے فون پر مجھے بتایا کہ کمال پاشا دل کے دورے میں چل بسا۔ فرید نے اطلاع دینے کے لیے ٹرائی کیا مگر آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ پھر اس نے میری ڈیوٹی لگادی کہ میں آپ کو فون کر کے سامنے سے آگاہ کر دوں۔“

منہاس باقر نے کہا ”بڑے پاشا کو پہلے ہی ڈا ہو چکے تھے۔ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر ریاض کے ذریعہ فرید نے بہت کوشش کی کہ اس کا باپ لاہور ہو جائے تاکہ مناسب انداز میں اس کی دیکھ بھال کام لیکن کمال پاشا نے دل کی بیماری کو بھی سنجیدگی سے لگنا پرہیز کے معاملے میں بھی وہ خاصا بے پروا دماغ تھیرے ایک نے اس کی جان لے لی۔“

”فرید اس مرتبہ بھی ڈاکٹر ریاض ہی کو اپنے ساتھ گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہدان! موت بڑی سفاک اور ظالم حقیقت ہے۔“ منہاس نے گنہگار آواز میں کہا ”اے صرف ایک موٹا بھانہ چاہیے ہوتا ہے۔ اور یہ بھانہ ڈھونڈنے کی حقیقت بڑی مشاق اور بخر ہے کار ہے۔ بہر حال ایک طویل پوجنل سانس خارج کرنے کے بعد بھرنا آواز میں بولا ”کمال پاشا کی موت کا مجھے بہت دکھ۔“

”کیا آپ بڑے پاشا صاحب کے جنازہ شرکت کے لیے سید پروردانہ آئیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا ”آنا تو چاہیے، بہر حال میں اپنی رابطہ کر کے تعزیت کرتا ہوں۔“

”اگر آپ وہاں آئے تو پھر مجھ سے بھی لا ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

منہاس بولا ”اس ملاقات کا انحصار فیصلہ دیکھ

رہزدار ہے۔ میں فرید سے جب تک تفصیلی بات نہ کر لوں، کئی طور پر کچھ کہ نہیں سکتا۔ تم تو جانتے ہی ہو، کراچی سے سید پروردانہ لاہور اور پھر سید پور سے کراچی بہ راستہ لاہور آمدرفت کے لیے دو دن درکار ہیں۔ جیسے کا دن اس وقت احتیاطاً بند ہے۔ کل ہفتہ ہے۔ میں اگر کل بھی کراچی سے روانہ ہوں تو اتوار شام سے پہلے واپس اپنے گھر نہیں پہنچ سکتا۔ اور اتوار کو میری بیٹی شبنم کی رخصتی ہے۔ یعنی ہوں۔“

شبنم کی شادی والی بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ واقعی، یہ تو بہت ہی اہم معاملہ تھا۔ اس شادی میں شرکت کے لیے نی پور سے قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز بھی منہاس باقر کے گھر پہنچ گئی اور اس کی شادی کی شاپنگ کے دوران میں ممتاز اور ساحل کو میاں زاد حسین کے گمن بردار غنڈوں نے اغوا کیا تھا۔ ان اہل بعد ممتاز کو تو عمر کوٹ سے برآمد کر لیا گیا لیکن میری ساحل جو میرا ساحل بھی تھی، ہنوز مجھ سے دودھی۔ میں مطمئن تھا کہ اس کا اتنا پتا مجھے معلوم ہو گیا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ میں اپنی محنت کو چوہدری نواز شملی کے بے رحم چنگل سے بہت جلد آزاد کرالوں گا۔ میں کل سید پور میں ہوتا اور موضع رکھان والی سید پور سے صرف پانچ کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ میں فوراً سے جیٹس ترکھان والی پہنچ کر وہاں کے مطلق العنان شیطان مفت حاکم چوہدری نواز شملی کی ”مزان چرسی“ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ساحل کی یاد میں آگے بڑھتا، انٹر

پلی میں منہاس باقر کی آواز سنائی دی ”وہدان! تم تو جانتے ہو، بیٹیوں کے معاملات کتنے نازک ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں تو پہلے ہی ممتاز اور ساحل کے اغوا والا افسوس ناک واقعہ پیش آچکا ہے۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں۔ میرا کل کراچی میں رہنا ضروری ہے اور اب تو شعیب غوری جیسے بدنام نافرمان شریف بد معاشرے تمہیں گئی ہے۔“

”مگر انخائل ہے، آپ فون پر ہی فرید پاشا سے پھر پور تعزیت کر لیں۔ وہ آپ کی مجبوری کو سمجھ جائے گا۔ شبنم، ساحل اور ممتاز والا واقعہ اس سے پوشیدہ نہیں۔“ میں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق اسے مشورہ دیا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہدان۔ شاید قسمت کو بھی بخیر ہو۔ میں پاشا کی کسی شے اور وہ میری خوشی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنے دل کی جذبات کے اظہار کے لیے کئی فون کو ہی وسیلہ بنانا پڑے گا۔“

”مجبوری میں یہ سب تو کرنا اور سہنا پڑے گا منہاس پوجھا۔“

صاحب! ”تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔“ وہ موضوع گفتگو کو بدلتے ہوئے بولا ”میں نے تمہیں فرید پاشا کے پاس بھیج کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ میرا مطلب ہے، وہ تمہارے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟“

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”منہاس صاحب! آپ نے مجھے بالکل ٹھیک ہندے کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے، میں فرید پاشا کے تعاون سے پہلے جلد ساحل کو حاصل کرلوں گا۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے وہدان۔“ وہ غلوں دل سے بولا ”میں تمہیں بہت جلد کراچی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں جو حورہ آئے گا وہ اکیلے میں باپولیس کے سنگ کہاں!“

میں نے کہا ”یہ تو ایک اتفاق ہے کہ کمال پاشا کا انتقال ہو گیا۔ بصورت دیگر فرید کے چھوٹے بھائی نوے آج یہاں آنا تھا اور میں صبح اس کے ساتھ سید پروردانہ ہو جاتا۔ میں اپنے مشن، میں لیٹ نہیں ہوں اور..... میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا وقفہ کچھ باقی رہا ہے۔“

”جب سے میں یہاں آیا ہوں، نہایت ہی مصروف اور بے سر پیکار رہا ہوں۔“

پھر میں نے منہاس باقر کو اپنی اب تک کی لاہوری ”مصروفیات“ کے بارے میں آگاہ کیا۔ سکندر، لالہ بشیر ایم پی اے، ڈی ایس پی اورنگ زیب خان، نادیہ، صدف، فرید پاشا کی بیوی نازک کے اغوا کا واقعہ اور دتہ خانے کے اندر اور باہر پیش آنے والے تازہ ترین واقعات کو کن کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

”وہدان! تم جہاں بھی جاتے ہو، اپنے ساتھ ہنگاموں کا میل بھی لے کر جاتے ہو۔ نازک والا واقعہ بہت افسوس ناک ہے۔ شکر ہے، تمہاری دجہ سے رانا عظمت اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بہر حال، سب سے زیادہ دلچسپ کردار صدف اور کئی وہدان کا ہے۔ ان کا تذکرہ سنشی خیر اور حیرت آئیز ہے۔“

میں نے کہا ”فعلی وہدان اور اس کی پھیلائی ہوئی شر انگیزیوں سے تو میں کسی نہ کسی طور منت ہی لوں گا لیکن صدف والا معاملہ خاصا نریمانہ ہے۔ وہ اس وقت بھی یہاں آئی بیٹھی ہے۔“

”وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟“ منہاس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ مجھ سے کچھ نہیں چاہتی بلکہ میرے توسط سے چاہتی ہے۔“ میں نے انہیں زدہ کچھ میں کہا۔  
”ویری انٹر سٹنگ! کچھ تفصیل بتاؤ؟“

میں نے بھونچلا ہٹ بھرے انداز میں کہا ”وہ چاہتی ہے، میں کچھ وقت نکال کر اسے مارشل آرٹس کی چینی ٹیکنیکس سکھاؤں۔ وہ چاہتی ہے، میرے ساتھ فلم اسٹوڈیوز جا کر فلموں کی شوٹنگ دیکھے اور فریڈ پاشا کے گاؤں سپر پور جا کر فطری زندگی کا مشاہدہ کرے۔ یہ اس کی سب سے ”چاہتیں“ ہیں جو اب تک میرے علم میں آئی ہیں۔ تازہ ترین وہ کون سا منصوبہ اپنے ساتھ لائی ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ بڑے ہنگامی انداز میں یہاں پہنچی ہے۔“

”میں نے صدف کے روپے سے صرف ایک بات اخذ کی ہے۔“ منہاس باقر نے کہا ”وہ ہر حال میں تمہارے قریب رہنا چاہتی ہے اور..... کوئی لڑکی ایسا کب اور کیوں چاہتی ہے، اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ ماشاء اللہ، تم خاصے سمجھدار ہو!“

ہمارے درمیان صدف کے بارے میں تھوڑی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے منہاس کو بتایا کہ وہ ایک معروف صنعت کار سرمد بخاری کی بیٹی ہے۔ سرمد بخاری جو تاسازی کی صنعت سے وابستہ ہے اور اس کی رہائش ڈیفنس سوسائٹی کے ایک ایسے بنگلے میں ہے جو ”ساؤتھ“ کے بہت قریب واقع ہے۔ منہاس باقر، سرمد بخاری سے بخوبی واقف تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنے اخبار میں، سرمد بخاری کی فیکٹری کا ایک سپلیمنٹ شائع کیا تھا۔

☆☆☆

اللہ و تانے میری ہدایت کے مابین مطابق اسٹنٹن حسین اور اس کی بیوی کو ان کے لیے کھولے گئے بیڈروم میں پہنچا دیا تھا۔ حسین کی بیوی کا نام عہد معلوم ہوا۔ میں نے اسی بیڈروم میں جا کر ان سے سرسری ملاقات کی۔ سرسری اس لیے کہ وہ ایک لوبہا ہوتا ہوا تھا اور رات لگ بھگ آدھی بیت چکی تھی۔ صدف خاصی تیزی سے مجھے نلے آئی تھی۔ چست بلبہ جنر پر اس نے لوز ہائی ٹیک، نیڈ سوٹر پکمن رکھا تھا۔ پاؤں میں جوکرز تھے۔ صدف کا بھرا بھرا جسم پستہ قاحتی پر سرست قیامت ڈھاتا تھا۔ وہ اپنے سر پر اس میں شاعرانہ محبوبیت کا پورا سامان رکھتی تھی۔ وہ..... دم بدمرغہ میرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل، اتنے سے قدر پر بھی قیامت شریرو..... کی جاگتی جیتی مثال تھی۔

سزئی بیک کی ہر ای نے اس کے عزائم کو میرے ذہن میں اور بھی پختہ کر دیا۔ وہ میرے اشارے پر ایک

صوفے پر بیٹھ چکی تو بولی۔ اس کے لہجے میں شکایت ناکہ نمایاں تھا۔  
”تمہیں بڑی فرصت سے فرصت ملی ہے و جدان کیا لاہور والے اپنے مہمانوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟“

میں اس کی چوٹ کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ابتدا میں، میر نے اسے بتایا تھا کہ میرا تعلق لاہور سے ہے۔ یہ بات کوئی اثر زیادہ غلط بھی نہیں تھی، تاہم پیش آمدہ حالات کی روشنی میں اس کا شمار غلط بیانی کے زمرے میں آتا۔

میں نے گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”سوزی! صدف! تمہیں میرا انتظار کرنا پڑا۔ بہر حال بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ مجھے پتا چلا ہے، تم نے پہلے بھی اس کو کئی متحذوون کیے تھے!“

”تمہیں بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے بولی ”میں تمہاری وجہ سے خاصی پریشان تھی۔ تم نے شام میں مجھے فون کرتا تھا۔ ہم ریس کو کس پارک میں ملنے والے تھے۔“

”چلو اب تو تمہاری تسلی ہوگئی۔“ میں نے سادہ الفاظ میں کہا ”تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے فون پر بات کی اور اپنی آنکھوں سے مجھے زندہ سلامت دیکھ رہی ہو۔“

وہ میری وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی ”تم نے شام میں مجھے رنگ کیوں نہیں کیا؟“

”ایک مسئلہ میں پھنس گیا تھا۔“ میں نے گول مارا جواب دیا۔  
”ہوں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بھرا بھرا اور بولی ”مجھے پتا چلا ہے، تم صبح سپر پور جا رہے۔ پاشا انکل کے گاؤں۔ پاشا صاحب کے والد کو ہارٹ ایکٹ ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے جا چکے ہیں۔“

میں نے سنجیدگی سے کہا ”اگر میں سپر پور جانے ہوں تو؟“  
”تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ وہ اپنے سزئی بیک کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

میں نے برہنہ سے کہا ”تمہارا دامخ خراب ہو گیا کیا؟“  
”کہہ سکتے ہو۔“ وہ بے پروائی سے کندھے اٹھا کر بولی ”سب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے تو کیا فرق پڑے گا؟“

میں نے چڑ کر کہا ”تمہارے روپے اور دل کو بچاؤ، لوگ ایسا سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تم کیوں کرنی ہو؟“

چنے کی حرکتیں؟“  
”میں نے کیا کیا ہے؟“ اس کی شوٹی کو اچانک مصویت نے اپنے آنکھ میں چھپایا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ”کیا بے وقوفی نہیں کہ تمہارے قائل اخیر کے امتحانات سر پر کھڑے ہیں اور تمہیں ہیر تفرق کی سوجھ رہی ہے اور وہ بھی ایک ایسے میزبان کے پاس جس کے والد کو ہارٹ ایکٹ ہوا تھا اور.....“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے پوچھ بیٹھی۔  
”اور کیا و جدان؟“

”اور یہ کہ ہارٹ ایکٹ کو کامیابی مل گئی!“ میں اپنے لہجے کے بوجھل پن کو چھپانے لگا۔  
”اوہ..... ویری سید!“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”و جدان! مجھے پاشا انکل کے والد کی وجہ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ آئی ایم ریلنگ سوری۔ مجھے اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”سوری!“  
میں اس کی ”سوری“ کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا اور خاموشی نظر سے اس کے سزئی بیک کو دیکھتا رہا۔  
”تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا“ و جدان! تم صبح سپر پور جا رہے ہو؟“

”بھٹیا جاؤں گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔  
وہ بیک دم سنجیدہ ہو چکی تھی، سمجیر آواز میں بولی ”میں تمہارے ساتھ سپر پور جانے کا پروگرام بنا کر یہاں آئی تھی۔ دائمی میرا ارادہ سر تفرق کا تھا لیکن دائمی فضا میں کسی تفرق کا تصور نہیں کیا جاسکتا اللہ، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں قریب کی عرض سے تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔“ ایک لمبے کوک کر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی ”میں نے سپر پور روانگی کے سلسلے میں پایا سے بھی بات کر لی تھی اور ماموں کو بھی آدہ کر لیا تھا۔ میں تو ماموں کے گھر سے پوری تیاری کے ساتھ یہاں آئی ہوں و جدان!“

اس کی انکشاف انگیز اطلاع نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”تم نے اپنے پاپا سرمد بخاری سے کیا کہا ہے؟“  
”میں پایا سے کوئی بات نہیں چھپائی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”میں نے انہیں بتایا کہ اتفاق سے ایک کلاس فلیر مجھے یہاں مل گیا ہے۔ وہ دودن کے لیے سپر پور نائی کوئی گاؤں جا رہا ہے، میں اس کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور مجھ پر اندھا اعتماد رکھتے ہیں۔ انہوں نے بخوبی مجھے اجازت دے دی۔ ازاں بعد

ماموں کو منانا چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا۔ نادی جیسی لڑکی میری سپور تھی، ناکام یا بلی کیسے ہوتی و جدان!“  
بات ختم کر کے اس نے فخریہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔

”صدف! ایک طرف تمہارا دعویٰ ہے، تم اپنے پایا سے کچھ نہیں چھپاتی ہو اور دوسری جانب تم ان سے غلط بیانی کرتی ہو۔ یہ کس قسم کی محبت اور اعتماد ہے؟“  
وہ حیرت سے پلٹیں جھپکا کر بولی ”میں نے کون سی غلط بیانی کی ہے؟“

”کیا یہ دروغ گوئی نہیں کہ تم نے مجھے اپنے ایک کلاس فلور کی حیثیت سے غائبانہ طور پر سرمد بخاری سے متعارف کروایا ہے؟“ میں نے ترش لہجے میں کہا ”بھٹیا تم نے میرا نام وجیہ بتایا ہوگا۔ اس سے پہلے تم اپنے ڈی ایس بی ماموں اور بیک زیب خان سے بھی کچھ ایسی قسم کا میرا متعارف کر دیا ہوگا؟“

وہ چند لمحوں کے لئے والے انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی ”و جدان! اگر تم دوستانہ فضا میں مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو تو میرا جواب ہوگا، ہارا ایسی چھوٹی موٹی چیکنگ تو چلتی ہے۔ میری اس غلط بیانی سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”چیکنگ چھوٹی ہو یا بڑی، بہر حال یہ بے ایمانی ہی کہلائے گی۔“

”اس کا مطلب ہے، تم دوستانہ فضا قائم نہیں کرنا چاہتے؟“

”میں نے تو تم سے دشمنوں والی کوئی بات نہیں کی صدف!“  
وہ ہنگلی سے بولی ”اور دوستوں والی بات بھی نہ کرنے کی قسم کھاتی ہے تم نے۔“  
”یہ تمہارا باکل پن ہے؟“ میں نے چڑ کر کہا ”تم ہر بات کا الٹا مطلب نکالتی ہو۔“

وہ بے اختیار فحش پڑی ”اٹس اڈے!“  
صدف کی کبھی بڑی دل آویز پڑی، ہواں موتوں ایسے دانت جب جلوہ افروز ہوئے تو یوں محسوس ہوا، اس کے دہانے سے نور پھوٹ پڑا ہو۔ اس کی چٹنی ہنسی میں بڑی مٹھاس اور خندنگ تھی، وہ ٹھہرے ہوئے جو اس اور تھے ہوئے اعصاب کو بڑی شائستی سے سمیٹ لیتی تھی۔ میں نے اپنے احساسات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اس وقت میں جس نوعیت کے کشیدہ حالات سے گزر رہا تھا، انہوں نے مجھے خاصا چوکنا اور اضطرابی بنادیا تھا۔ ایسے میں صدف کی بیزنم

ہنسی نے مجھے بہت کچھ پہنچایا۔

میں نے کہا ”صدف“ مجھے ابھی طرح یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ تم کتنی سختی ہو۔ کس کاوش سے تم نے وہیہ کے اندر سے وجدان برآمد کیا ہے لیکن میں تم سے یہی درخواست کروں گا کہ تم مجھ سے ملتی ہو، ادھر وہاں چلی جاؤ۔ تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں اس وقت کتنے سنگین حالات سے گزر رہا ہوں۔ موت میرے ہم رکاب ہے اور کسی بھی وقت اس کو گھسی پر زبردست حملہ ہو سکتا ہے۔ تم اپنی جان کو جانے بوجھے کیوں ہلاکت میں ڈالتی ہو؟“

”ہاؤ انٹر سٹنگ!“ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولی ”کیا سنسنس ہے، کیا تھرمل ہے، کیا ایڈوچر ہے؟ میں ایسی کسی صورت حال ہی کی تو تلاش میں تھی۔“ پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے اس نے پوچھا ”ہائی داوے وجدان! تم مجھے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں تو مزید بریف کر دو گے؟“

”صرف بریف ہی نہیں بلکہ پورا بریف کیس تمہاری نذر کرنے کو تیار ہوں۔“ میں نے ہنسی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اس انکار میں یہ تاثر عیاں تھا کہ تم نہیں سدرہ صدی صدف! تمہارا علاج صرف یہی ہے کہ تمہیں، تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

اسی وقت اللہ دتا ہمارے لیے کافی بنا کر لے آیا۔ ساتھ ہی موسم کی مناسبت سے کچھ خشک میوہ جات بھی تھے جن میں پیٹ، چٹوڑے اور نمکین کا جو شامل تھے۔ میں نے اللہ دتا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”جی! میں تو مزید کافی نہیں چوں گا۔ میرے لیے یہ ڈرائی فروٹ ہی کافی ہے۔ میں پہلے ہی ابھی خاصی نیند محسوس کر رہا ہوں۔ میرے جسمے کا کافی والاگ تم لے جاؤ اور خود پی لو۔“

اللہ دتا ”جی صاحب“ کہتے ہوئے، کافی کاگ اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

میں اسے حالات حاضرہ کی طرف لے آیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا ”وجدان! تم مجھے اپنے ساتھ سید پور لے کر جاؤ انہیں، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے لیکن میں محسوس کر رہی ہوں، یہ رات مجھے اسی کوگی میں گزارنا چاہیے۔ ایک سے دو بجے اور ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ میں مانتی ہوں، میرا مارشل آرٹ بس ایویں سا ہی ہے لیکن اگر آج رات کسی قسم کا کوئی بیرونی ایک ہو جاتا ہے تو میں تمہاری بھرپور مدد کر سکتی ہوں۔“

اس کی تجویز میں کافی وزن تھا۔ میں نے کہا ”میں۔ تمہارے مارشل آرٹ کا عملی مظاہرہ مال روڈ وارڈ ریٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ تم جیسے ایویں کہہ رہی ہو وہی اچھوں سے زیادہ اچھا ہے۔ تم یہ رات اس کوگی پر گزارو۔“

”تمہارے منہ سے اپنے فن کی تعریف ہی کی بہت! لگ رہا ہے۔“ وہ ہر جوش انداز میں کافی کا سب لیتے ہوئے بولی ”یقیناً جالو وجدان! اگر کوئی مجھے ڈاکٹر کہہ کر پکارتا تو اس اتنی خوشی نہ ہوتی۔“

”میں نے یقین جان لیا ہے۔“ میں نے معنی خیر! میں کہا۔

وہ جلدی سے بولی ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شاید میرے چہرے کے تاثرات نے جھٹی کھائی جیسی وہ فوراً ہوشیار ہوئی تھی۔ میں نے نہایت ہی غیر معمولی اور دو ٹوک لہجے میں کہا ”مجھے ایک سو ایک نمبر ہے کہ تم اپنے پاپا کے لاکھوں روپے برباد کر کے چھوڑ کر اڑیں علاوہ ان کے اربابوں کا جو خون ہوگا، سو الگ کا ہے۔“

وہ شکایتی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ منہ سے کچھ بولی میں نے کہا ”اللہ کی بندی! لوگ میڈیکل کان، داخلے کے لیے ترے ہیں اور ایک تم ہو کہ قائل ایئر میں جانے کے باوجود بھی سنجیدہ نہیں ہو۔ ڈاکٹری کے پیشے پر کر ایک طرف رکھنے کے بعد ہم جوئی پر ٹھکنے کا ارادہ کرتے اس سے بڑا مذاق اور کیا ہوگا!“

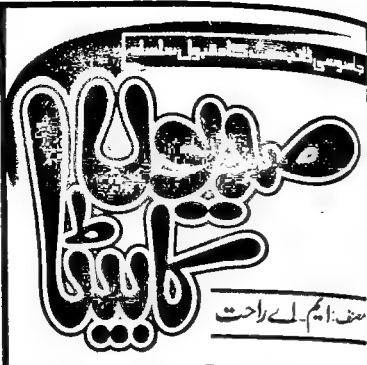
”یہ مذاق نہیں ہے وجدان! میں بالکل سنجیدہ ہوں، وہ غمیری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”میں جیسا کہ بھی بتا چکی ہوں، میڈیکل میں نے پاپا کی خواہش پر کیا۔“

”اور اپنی ضد پر اسے ترک کر دو گی؟“

”مجھے اس میں دھچکی نہیں ہے۔“

”اس کے باوجود بھی تم قائل ایئر میں بیٹھ گئی ہو میرے لہجے میں کاث تھی۔“

وہ مغلوبات افزا انداز میں بولی ”وجدان! شاید تمہارے جاننے کہ میڈیکل کان میں فرسٹ اور قائل ایئر میں سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں جن کو کبھی کرنے کے لیے زمین ایک کرنا پڑتے ہیں۔ بہت بڑھنا پڑتا ہے وجدان! فرسٹ ایئر میں تو بہت جوش میں تھی اس لیے مجھے سب سے پہلے ہی اس کے بعد کے سال قدم قدم آگے بڑھنے“



انسان کی کہانی جو سب سے زیادہ  
اور عجیب و غریب ہے

انسان کی ترقی اور تنزلی کے حیات الموز واقعات اس شخص کی زبانی جو ہر دور میں موجود رہا ہے۔ اس نے جو کچھ اپنی بیتی میں دیکھا اور جو کچھ اس پر غیر ہنسنا دیا، وہ داستان کو انتہائی سنسنی دہشتناک بھی ہیں اور عشق کی کارفرمیاں بھی۔ خونیں جنگیں بھی ہیں اور بادشاہت کے جبر سے بھی۔ وہ شخص جس عہد میں بھی رہا اپنے پیچھے ہزاروں داستانیں چھوڑ گیا۔ جب وہ تھک جاتا تو سمندر اسکو اپنی آغوش میں لے لیتا۔



کتابیات پبلی کیشنز  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313  
5802551  
کتابیات1970@yahoo.com  
ایڈریس: 63-C III بینشینل ڈسکالے میں روڈ کوئی روڈ کراچی

اور اب قائل مرحلہ آ گیا ہے۔ دیکھو، کیا ہوتا ہے!“

”تمہارے چور سے تو کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔

”اللہ مالک ہے!“ وہ بے پردائی سے بولی۔

”وہ تو سب کا مالک ہے۔“ میں نے بھی بے پردائی سے کہا ”چاہے کوئی سائنس بڑے یا آرس۔ میڈیکل میں جائے یا انجینئرنگ میں یا پھر بزنس میں!“

اس نے تمویزی دیر تک مجھے یک ٹک دیکھا پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”وجدان! اچھی بات تو یہ ہے کہ میں اس میڈیکل وڈیکل سے سخت بور ہوئی ہوں اور جب سے تم سے ملاقات ہوئی ہے، میرے ہم جوگی کے جراثیم کچھ زیادہ ہی فعال ہو گئے ہیں۔ میں تمہاری طرح ایڈوچر جتنا چاہتی ہوں، کچھ عرصہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔“ پھر اس نے دونوں ہاتھوں کو ایک مخصوص حرکت دی اور رشک آجیز انداز میں بولی ”وجدان! کیا سنسنی خیزی ہے تمہاری زندگی میں!“

میں تصور میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی بڑی لڑکی کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ اس کے ساتھ دماغ سوزی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایسی کوئی کوشش وقت کی بربادی کے مترادف ہوتی۔ وہ اداں آخر کچھ سنبھلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتی تھی۔ اسی لئے میرے تصور میں دو مہربان چہرے ملتے جلتے گئے۔ یکے بعد دیگرے فرید پاشا اور منہاس باقر کی کچی ہوئی ہاتھیں مجھے یاد آئے گیئیں۔ انہوں نے صدف کے حوالے سے کم و بیش ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ اظہار بہت ہی سنگین اور خطرناک تھا۔ وہ قیامت قدر کی میری زندگی کے بکھیروں کا حصہ بننے والی تھی۔

☆☆☆

اس رات کو اگر ”ٹیلی فون ٹائنٹ“ کا ٹائٹل دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے ایک مرتبہ بھرفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ صدف کو میں نے ڈرائنگ روم سے ملحقہ ایک بیڈ روم میں آرام کی غرض سے بیچ دیا تھا اور خود بھی کمر سیدھی کرنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ٹیلی فون نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

دوسری گھنٹی پر میں نے فون ریسو کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والے نے استفسار کیا ”کیا میں سٹر پاشا سے بات کر رہا ہوں؟“

اس آواز اور دلچپے لہجے نے میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑادی۔ فرید پاشا کے بارے میں استفسار کرنے والا

شعیب غوری تھا۔ میں اس وقت حیرت اور تعجب کی آخری حد دو کچھو رہا تھا۔ شعیب کو میرے موجودہ ٹھکانے کا کس طرح پتا چلا؟ یہ سوال بہت دہشت انگیز تھا اور میرے دماغ پر کسی تھوڑے کے مانند ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نے کسی ڈرامے بازی کے بجائے کھل کر کہنے کا فیصلہ کیا۔ شعیب نے اگر کسی طور پر میرا سراغ لگا ہی لیا تھا تو پھر کسی پردہ داری۔

مجھے خاموش یا کر اس نے دوبارہ پوچھا ”ہیلو! کیا یہ فلم پر ڈیوٹر فریڈ پاشا کا گھر ہے؟“

”تم پاشا کے توسط سے وجدان تک پہنچنا چاہتے ہو نا شعیب!“ میں نے غصہ سے ہوئی آواز میں کہا ”اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ پھر اس نے میری آواز پہچان لی تھی ”تم کہاں عائب ہو گئے تھے وجدان؟“ وہ دوستانہ لہجے میں متعجب ہوا۔

”میں نے کہا نا، کسی تکلف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی منافقت کی۔“ میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”بولو تمہیں یہاں کا فون نمبر کس نے دیا اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تم نے آدھی رات کو مجھے فون کیوں کیا؟“

وہ سجدہ آواز میں بولا ”وجدان! گلٹا ہے، جہیں میرے بارے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے اور۔۔۔۔۔“

”کیواس بند کر دو غلطی کی اولاد۔“ میں نے تقریباً چیخ کر کہا ”تمہارا مکروہ چہرہ میرے سامنے کھل چکا ہے لیکن تمہاری کوئی مکاری مجھے متاثر نہیں کر سکے گی۔ تم نے دوستی کی آڑ میں مجھے ناقابل حلانی نقصان پہنچایا ہے۔ نہ صرف مجھے، بلکہ اس ملک کو عالمی سطح پر بدنامی اور رسوائی دلوانے میں بھی تم پیش پیش ہو!“

میں نے مال روڈ والے ہوٹل کو چھوڑتے ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ از خود شعیب غوری سے رابطہ نہیں کروں۔ ہاں، اگر وہ تک نہ پہنچے میں کامیاب ہو گیا تو موقع مل کی مناسبت سے اسے ٹریٹ کروں گا۔ میں اپنے فیصلہ پر قائم دوام تھا۔

اس نے آخری مرتبہ مجھے غماز دینے کی کوشش کی اور اپنی مخصوص معتدل آواز میں بولا ”وجدان! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“

”زیادہ بگلا بھگت بننے کی کوشش نہ کرو شعیب۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا ”اب تمہاری کوئی چال کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ میں تمہاری اصل وصل سے واقف ہو چکا ہوں۔ تمہارا بہرہ وچہ پر کھل چکا ہے۔ تم اور تمہاری ”سی ایف کے“ ایک ڈراما ہے۔ تم اصلاحی کاموں کی آڑ میں

اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔ تم یہودیوں کے ہونے انہی اپنے اصلی باپوں کے اشاروں پر چلتے ہو۔ دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے سوا کچھ نہیں آگے۔“

”بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔“ وہ گونگناتے ہوئے بولا ”شاید اس طرح تمہارے دل کا غبار ہلکا ہو جائے وہ اب بھی منافقانہ چال چل کر بازی کو کھیلے گی۔“

میں نظر آتا تھا لیکن اب میں اس کے کسی فریب میں نہیں تھا۔ دوستی کی آڑ میں، میں پہلے ہی بہت نقصان اٹھا رہا تھا۔ میں نے اس کے کالوں کے کٹزے سمجھائے ہوئے ”شعیب! تم نہایت ہی گھٹیا اور کینے شخص ہو۔“

خاصہ جذبہ جاتی ہو رہا تھا مگر اس جذبہ باتیت میں غصے کا عنصر تھا ”تم نے امتیاز دہلی، روہی اور میرٹھ کی بڑی سیلوا موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان تینوں کا کیا تصور تھا میرے نا کہ امتیاز میرے بہت قریب ہو گیا تھا اور تمہیں ڈھکا

وہ مجھ پر ”سی ایف کے“ کی اصلیت نہ ظاہر کر دے۔ اور میرٹھ گندم کے ساتھ کھن کی طرح پس کے گھر، واقعے کو لے لو، پوری سیفر جم براؤن کے قتل کی سازش تمہارا ”سازتھ“ پوری طرح ملوث تھا۔ عجیب اور سزا گرفتاری نے تمہارے سی ایف کے کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک دہشت گرد ملک دشمن عنصر کے طور پر سامنے آئے۔“

وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بولا ”میں نہیں، کیمرٹا ”اوہ، تو تم نے حقیقت کا اعتراف کر لیا۔“

میں نے ایک اطمینان بخش سانس خارج ہوئی ”اب تم سے دو ہاتھ کرنے میں مزہ آئے گا شعیب! تم یہ مت سمجھو کہ کے فرار کے بعد پولیس خاموش ہو کر بیٹھ جائے گی۔ مجھ کا معاملہ حکومتی سطح کا ہے۔ سازتھ سے صابر علی، جوجہ منظور الہی پولیس کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ پولیس بہت شاہ کا سراغ لگا لے گی اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا وہاں طرح جائے گا۔“

وہ سمیر آواز میں بولا ”وہ تین گرفتار شدگان بولے بیکار ثابت ہوں گے۔ شعیب تک پہنچنا ناممکن ہے۔“

”میں نے ان کے ہتھے رہ جائیں گے۔ میں ان کے ہتھے اور نہ ہی میرے خلاف کوئی ثبوت وہ حاصل کر سکیں گی۔“

”میں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے وہ لوگ تم سے بغیر انفرادی کوئی“ برائے استعمال یک وقت“ شے کے ہاتھ اپنے کام میں لاتے ہیں اور کام مکمل جانے کے بعد بڑی خات سے ”ڈیپوزیشن“ کہہ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتے ہیں۔“

”میں ایک لمحے کو رکا اور زہریلے لہجے میں اضافہ کیا۔“ شعیب تمہارا انجام بہت حسرت ناک ہوگا۔“

”تم اپنے انجام کی فکر کرو وجدان جو میرے ہاتھوں ہونے والا ہے۔“ وہ ہنسنے سے مشابہ آواز میں بولا ”تم نے گزشتہ رات سازتھ میں جو کچھ کر دیا ہے، میں اسے بھولنے والا نہیں۔“

میری باتوں کی آواز سن کر صرف دوبارہ ڈرائنگ روم میں آٹھنی گئی اور خاموشی سے مجھے دیکھنے پلے جاری تھی۔ میں نے شعیب غوری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”سازتھ میں جو کچھ ہوا وہ پولیس کی چھاپا مار کارروائی تھی۔ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ البتہ اس واقعے نے میرے لیے دلی طمانیت کا سامان کیا ہے۔“

”تم صرف اپنے ہاتھ کے نہ ہونے کی بات کر رہے ہو۔“ وہ غصا ”جبکہ میں تمہارے سر تا پا ملوث ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ پولیس نے وہ کارروائی تمہاری نگرانی میں کی ہے۔“

”تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔“

”میں نے خواب نہیں دیکھا بلکہ تمہیں سازتھ کے آس پاس دیکھا گیا ہے۔“

میں حیرت اور بے یقینی سے اچھل پڑا ”شعیب، کیا یہ کوئی تمہاری نئی چال ہے؟“

میں نے اس کے جواب میں شعیب غوری کے اوڑھے سازتھ کے پولیس نے ایک نئی رات ڈیز ہا اور دو بجے کے درمیان، ان گھاٹ میں، میں لاہور میں پاشا کی کوشی میں چند قندہ پرور افراد سے نبرد آزما تھا۔ رانا عکشت کا بیٹھیا سکندر اپنے ہاتھوں کے ہمراہ پاشا کی بیوی نالک کو اغوا کرنے کوشی میں

خرابی کے باعث وجود پاتے ہیں۔ تم کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کراؤ۔“

وہ دہاڑ کر بولا ”چیک اپ تو میں عن قریب تمہارا کرانے والا ہوں۔ اس مقدمہ کے لیے میں نے مجھے ہوئے قسائیس کا بندوبست کر لیا ہے۔ بہر حال، تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں، سازتھ کے باہر بھی میرے چند نمک خوار نگرانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ پولیس کے ریڈ کی اطلاع مجھے فوراً مل گئی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی انکشاف ہوا کہ موقع پر تم بہ نفس نفیس موجود ہو۔ ایک لینڈ کرڈز میں جس کا رنگ سرخ ہے اور چھت سفید۔ چوڑے بازوؤں والی ہے جب بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ تم جس چھوٹی جیب میں دیکھے گئے، اس کا نمبر ہے، فور سیون ٹری سیون۔ تم نے دہانت بے داغ پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر سیاہ اندھا چشمہ۔ کیا میں غلط

کہہ رہا ہوں؟“

وہ اسر غلط کہہ رہا تھا۔ یہ نقلی وجدان کی کارستانی تھی۔ میں نے نمبر کے کنارے، اس آفٹ زائے کو اسی لباس، اسی طے اور اسی سرخ جیب میں دیکھا تھا اور جیب کا نمبر بھی وہی تھا جو ابھی شعیب نے بتایا تھا۔ تو کیا گزشتہ رات نقلی وجدان کراچی میں تھا؟ یہ سوال بڑا ہولناک تھا۔ سازتھ کے آس پاس اس کی موجودگی کے بارے میں منہاس باقر نے مجھ سے

گوئی تہ کہ نہیں کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہوا، وہ بہرہ وچہ صرف شعیب کے بندوں کو نظر آتا تھا مگر کیوں؟ وہ موقع پر نظر آ کر کیا ظاہر کرنا چاہتا تھا؟ سیدھا اور واضح جواب تو یہی تھا کہ وہ اس کارروائی کو میرے سہرے میں ٹانگنا چاہتا تھا اور اس مقدمہ میں

وہ کامیاب بھی رہا تھا۔ شعیب غوری جیسا تجربے کا رکھنے بھی یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں اس جگہ پر موجود تھا۔ میرا یہ نیا دشمن بڑے نرالے ڈھنگ سے دشمنی فرما رہا تھا۔

”تمہیں چپ کیوں لگ گئی وجدان!“ شعیب کی سرسراہٹ آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا ”ایک ہی انکشاف نے تمہاری سٹی گم کردی۔ ابھی تو اور بہت کچھ باقی ہے۔ تمہیں میری دانائی اور بینائی کا یقین آ جانا چاہیے کہ میں اس وقت تم تک کیسے پہنچ گیا؟ یہ نہیں پوچھو گے، میں نے تمہارا سراغ کیسے لگایا؟“

”خود ہی بتا دو۔“ میں نے آکٹا ہٹ آئیز لہجے میں کہا۔ وہ بولا ”میرے جن آدمیوں نے تمہیں سازتھ کے قریب سرخ لینڈ کرڈز میں دیکھا، انہوں نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ پولیس کے علاوہ دو سو ملین بھی اس کارروائی میں شریک تھے۔ ایک کا نام شہزاد علی اور دوسرے کا نام احمد معلوم

”خود ہی بتا دو۔“ میں نے آکٹا ہٹ آئیز لہجے میں کہا۔ وہ بولا ”میرے جن آدمیوں نے تمہیں سازتھ کے قریب سرخ لینڈ کرڈز میں دیکھا، انہوں نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ پولیس کے علاوہ دو سو ملین بھی اس کارروائی میں شریک تھے۔ ایک کا نام شہزاد علی اور دوسرے کا نام احمد معلوم

”خود ہی بتا دو۔“ میں نے آکٹا ہٹ آئیز لہجے میں کہا۔ وہ بولا ”میرے جن آدمیوں نے تمہیں سازتھ کے قریب سرخ لینڈ کرڈز میں دیکھا، انہوں نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ پولیس کے علاوہ دو سو ملین بھی اس کارروائی میں شریک تھے۔ ایک کا نام شہزاد علی اور دوسرے کا نام احمد معلوم



ہوا ہے۔ یہ دونوں افراد منہاس باقر کے لیے کام کرتے ہیں جو شام کے ایک اخبار کا ایڈیٹر و پبلشر ہے۔ شہر اعلیٰ تو خاصاً تیر بندہ ہے، وہ ہمارے ہاتھ نہ آ سکا البتہ آج دن میں میرے آدی اچھو کا اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس نے ذرا وقت کیا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "تم مجھے دہشت گرد اور پتا نہیں، کیا کیا کچھ کہہ چکے ہو وجدان۔ یہ بات تم سے چھپی نہیں ہو سکتی کہ میرے پاس جہت اثر نار چرسل بھی ہوں گے۔ شام سے ذرا پہلے اچھو نامی اس شخص نے خاصے اہم انکشاف کیے ہیں۔ وہ سادھو میں تمہاری موجودگی سے تو آگاہ نہیں تھا البتہ موت کے منہ میں جانے سے پہلے اس نے جو کچھ بتایا میں اسی کے سہارے تم تک پہنچا ہوں۔"

"تو..... کیا تم نے..... اچھو کی جان لے لی؟" میں نے قہر خراقی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک اچھو کیا، میں اپنے ہزاروں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔" وہ سفاکی سے بولا "اس راہ میں ناموں کی تفصیل بھی نہیں۔ اس فہرست میں کسی وجدان کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم دنیا کے ذیل ترین انسان ہو شیب!" میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ ڈھٹائی سے بولا "یہی الفاظ میں تمہارے لیے اور تمہارے دوستوں کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ میرا موضوع نہیں، اس وقت تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ اچھو کی زبان کھلنے کے بعد میں تم کیسے تک پہنچاں!"

پھر اس نے بتایا کہ اچھو کی زبانی اسے معلوم ہو گیا کہ میں لاہور میں منہاس باقر کے ایک دیرینہ دوست کے پاس ٹھہروں گا جو فلم انڈسٹری میں ایک معروف پروڈیوسر ہے۔ فریڈ پاشا کا نام معلوم ہونے کے بعد اس کے گھر کا فون نمبر جان لینا چند مشکل نہیں تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے کہا "اب تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میں اپنے دشمن کو کھوجے کے لیے کہاں تک جا سکتا ہوں؟"

"میں تمہاری ہر تکنیکی برکتیں رکھتا ہوں شیب۔" میں نے خارت آمیز لہجے میں کہا "تمہاری زبان سے اپنے لیے دشمن کا لفظ سن کر مجھے خوشی ہوئی ورنہ میں تو اب تک تمہیں اپنا دوست سمجھ کر فریب کھاتا آیا تھا۔"

"میری دشمنی تمہاری زندگی کا آخری تجربہ ہوگی۔" وہ رجوعت سے بولا "تم اس تجربے سے گزر کر اپنے سابق دشمنوں کو بھول جاؤ گے کہ چوہدری نواز شعلی کو بھی۔ تمہارے ذہن

میں صرف ایک ہی نام کی گونج ہوگی۔ شیب خوری۔" وہ گونج تمہاری راتوں کی نیند اور دن کا آرام تم سے چھینے گی۔"

"ایسی گیدڑ بھیگیوں والے میں نے لاکھوں دیکھے ہیں۔" میں نے کہا "جب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالو گے تو تمہا پر شاب خطا ہو جائے گا۔"

وہ تھلا کر بولا "تم میری دہشت سے واقف نہیں، وجدان!"

"میں ایسی دہشت کو اپنے جوتے کی ٹوک پر رکھتا ہوں۔"

"بہت جلد تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔" منافقت کا اندازہ ہو چکا، اب طاقت بھی دیکھ لو گا۔

"میں نے ترکی بہ ترکی کہا "تم نے اپنی منافقت اور گھٹیا پن کی بدولت مجھ سے دھوکا کیا۔ میں نے تمہاری دوا

میں فریب کھایا۔ تمہیں کثیر المالیات سونے کا کاروبار بتا دیا۔ تم مسٹر نیل آرمر کے توسط سے وہ خفیہ دفینہ حاصل کر لیا لیکن میں وہ دوست نہیں رہا جسے تم دوستی کی آڑ میں مسلسل فریب دیتے آئے ہو۔ دشمنی ظاہر ہو جانے کے بعد تم میرا مال نہیں کر سکو گے۔ میں اپنا حصہ تم سے وصول کر کے رہوں گا

چاہے اس کے لیے مجھے تمہاری آستین ہی کیوں نہ پھینکنا پڑے۔ کسی بھی طرح، کسی بھی راستے! میں تمہیں آج بے ایمانی نہیں کرنے دوں گا۔"

وہ ہمیشہ آواز میں بولا "میں دوستی اور دشمنی اپنے طریقے سے نبھاتا ہوں اور تمہاری معلومات کے لیے بتانا چلوں گا میں بے انصاف نہیں ہوں۔ تمہارا طے شدہ حصہ میں نے آگ نکال کر رکھ لیا ہے۔ اسے میں تمہاری فلاح و بہبود پر غور کروں گا!"

اس کے لہجے میں پوشیدہ سنگین دھمکی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"فلاح و بہبود کا مطلب نہیں سمجھتے وجدان!؟" استہزاء میں بولا "حکومت نے یہودی آبادی کے لیے جگہ جگہ کھول رکھے ہیں۔ میں نے تمہاری فلاح و بہبود کے لیے ایک مستند اور کثرت مشق قسائی سے رابطہ کر لیا ہے۔ وہ تمہاری ایسی نئی بندی کرے گا کہ پھر تم ساری زندگی صاف بھلا قابل نہیں رہو گے۔"

وہ یقینی طور پر مجھے فخر دلا نا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر میں پوشیدہ دھمکیوں کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے بارے میں کوئی خطرناک قسم کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں

لہجے کوئی الہامی مکان معتدل رکھنے کی کوشش کی اور کہا۔

"تمہاری بکواس اگر ختم ہو چکی ہو تو میں ریسیور رکھ دوں۔"

جواب میں اس لہجی کی اولاد نے ایک لفظ کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے جھپٹا ہٹ میں ریسیور کو کرڈیل پر پٹخ دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ریسیور نہ ہو، میرا فولا دی مکا ہو..... اور میں نے وہ مکا کرڈیل پر نہیں بلکہ شیب خوری کے محسوس باب چرے پر رسید کیا ہوا۔

صدف نے تشویش ناک لہجے میں کہا "وجدان! لگتا ہے، محاطات کچھ زیادہ ہی گر بڑ ہیں۔ یہ کال کراچی سے تھی

اس سے پہلے کہ میں صدف کے سوال کا جواب دیتا، ان کا کام کا پربخشا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا کام کا ریسیور اٹھالیا، دوسری طرف سیکورٹی کارڈ مردین تھا۔ اس نے دہشت زدہ لہجے میں بتایا۔

"وجدان صاحب! سرخ چپ والا وہ نقلی وجدان رہا ہے۔"

"کہاں ہے وہ شیطان؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"اس نے گاڑی کھڑی کی ہے اور کل کر میری طرف آ رہا ہے۔" گاڑی نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا "اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ہاسک ہے۔"

میں نے کہا "میں آ رہا ہوں۔ تم اسے روکنے کی کوشش کرو۔ اسے باتوں میں لگا دیا جو بھی کرو۔ زبردستی کی ضرورت نہیں آئے تو بھی دریغ نہ کرو۔ اوکے!"

"لوکے!" سیکورٹی گاڑی نے فرماں برداری سے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

صدف میرے عزائم کو بھاپ چکی تھی۔ میں نے دیگر باتوں کے ساتھ ہی اسے نقلی وجدان کی کہانی بھی سنادی تھی

"تم کہاں جا رہے ہو وجدان؟" اس نے تشویش ناک نظر سے سمجھ لیا۔

"اس بھڑے نقلی وجدان سے منسنے! میں نے کہا وہ اس وقت کوئی کے باہر گٹ پر موجود ہے۔"

اس کے بعد میں صدف کی بات سے بغیر باہر کی جانب بھاگ گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر میں راہداری میں آ گیا پھر دروازے سے ہوتے ہوئے کوئی کے من میں پہنچ گیا۔ من کا حصہ میں نے دھڑک دیا اور گیت پر پہنچ گیا۔



اردو میں پہلی بار

تحریر شاعی کے فن پر ایک نادر اور رہنما کتاب

## تحریر اور شخصیت

یہ کتاب آپ کو بنائے گی کہ

- یہ شخص کس کام کے لئے موزوں ہے؟
- کیا یہ حالات سے لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟
- کیا اسے جلد غصہ آتا ہے؟
- کیا یہ جھوٹ بولنے کا عادی ہے؟
- کیا اس کے ساتھ شادی کی جاسکتی ہے؟
- کیا اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟
- کیا یہ ایماندار اور ہمدرد ہے؟
- اس کا شخصی رویہ کیسا ہے؟
- اس میں برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟
- اور ایسی دوسری بہت سی باتیں۔

ہر شخص کیلئے یکساں طور پر کارآمد کتاب

قیمت 30 روپے ڈاک خرچ 23 روپے



اسی وقت میں نے کوشی کے باہر کسی گاڑی کو ایک جھکے سے آگے بڑھتے ہوئے سنا۔ انجن کی مخصوص غراہٹ اور برج اسٹون ٹائروں کی فلک شکاف آواز نے مجھے سمجھنے کے لیے کافی سمجھا کہ وہ شیطان بہرہ دہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ میں سیکورٹی گاڑی کی طرف گھوم گیا۔

”دوہار ہو گیا سر!“ اس نے ہاپوسی سے بتایا۔

میں نے گیت سے باہر لپک کر سڑک کا جائزہ لیا۔ سوزر دور مجھے سرخ چپ کی پشت دکھائی دی۔ وہاں سفید کور میں اسپرٹازر مخصوص انداز میں ہنگا ہوا تھا۔ سرخ لینڈ کروزر میری پہنچنے سے نکل چکی تھی۔ میں دوڑ کر اسے نہیں پکڑ سکتا تھا اور جب تک گاڑی نکال کر اس کا تعاقب کرتا، وہ دو دو گیارہ ہو جاتی۔

میں واپس آ کر سیکورٹی گاڑی پر برس پڑا ”اے روکا کیوں نہیں؟ میں نے کہا تھا، ہر صورت اسے جانے نہیں دیتا۔ چاہے زبردستی کرنا پڑے، تم کمن کے زور پر اس کا راستہ کھٹا کر رکھتے تھے۔ جیپ کے ٹائروں پر ایک برسٹ ہی مار دیتے!“

سیکورٹی گاڑی میری ڈانٹ ڈھپٹ سے سہم گیا پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا ”سر! آپ جس وقت مجھے یہ ہدایت دے رہے تھے، وہ محسوس، بائس کو ایک طرف رکھ کر دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا تھا، پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتا، اس نے طوفانی رفتار سے جیپ آگے بڑھادی۔“

گاڑی نے انٹرکام پر بھی کسی بائس کا ذکر کیا تھا۔ میں نے غلٹ آمیز لہجے میں دریافت کیا ”کہاں ہے وہ بائس؟“ ”وہ ادھر رکھا ہے سر!“ گاڑی نے سڑک کے ایک کنارے کی طرف اشارہ کیا۔

اس دوران میں صدف اور اللہ دتا بھی باہر لپک آئے تھے۔ ہم چاروں ایک ساتھ مذکورہ بائس کی جانب بڑھے۔ وہ کسی کوریئرسرس کا جبو بائس تھا اور اس کے اوپر ایک چٹ لگی تھی۔ میں نے چٹ کی تحریر پڑھی۔ وہاں صرف یہ درج تھا..... ”وہ جان علی ابن عابد علی۔“

واضح طور پر وہ بائس میرے لیے تھا اور مجھے کے انداز میں اسے ہیک کیا گیا تھا۔ اس پر مخصوص گفٹ پیپر بھی لپٹا ہوا تھا۔ صدف نے کہا ”وہ جان! یہ دشمن کی کوئی خطرناک چال بھی ہو سکتی ہے۔ تم اس بائس کو ہاتھ نہ لگانا۔ خود تھو تو نہیں پہنچا جاتا!“

میں نے کہا ”میں اس چال کو بے نقاب کرتا ہوں۔“ پھر میں نے گاڑی کی جانب ہاتھ بڑھا دیا ”کہا ”ذرا اپنی کمن مجھے دیتا۔“

گاڑی نے کلاشکوف میرے حوالے کر دی۔ اللہ دتا خوف زدہ لہجے میں کہا ”وہ جان صاحب! اگر اس میں آتش گیر مادہ یا کسی قسم کا بم وغیرہ ہوا تو بہت خطرناک ہو سکتا ہے!“ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس کا اندازہ درست تھا۔

میں نے کلاشکوف کو سنگل شاٹ پریسٹ کیا اور پھر گاڑی سے کہا ”دفعی وہ جان نے یہ تو ثابت کر دیا کہ اس بائس اٹھانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ لہذا تم اسے اٹھا کر فاصلے پر رکھ دو۔ وہاں اس کوشی کے سامنے جس کے ہاتھ اسٹیشن کھٹے ہوئے ہیں۔ میں جو جبر پکڑتا ہوں، اس کی کسی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔“

گاڑی نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے ان تینوں پاشا کی کوشی کے اندر کھڑا ہونے کی ہدایت کی پھر ایک فاصلے سے نشانہ لے کر بائس پر فائر کر دیا۔ میں اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر کسی قسم کا بلاسٹ ہوا تو میں کمر لڑاؤں گا۔

مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ بائس کوئی کھانے کے بعد ہوا اچھلا اور کچھ دور جا کر۔ ہم چاروں دوڑ کر اس گھاٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔ اور حیرت کے ایک شدید جھکے ہمیں بیک وقت متاثر کیا۔ ہم ہونٹوں کے مانند ایک دوسرے کی صورت کھینچنے لگے۔

دشمنی بائس کی ایک دیوار میں شکاف بن گیا تھا۔ ہماری حیرت کا سبب یہ تھا کہ اس شکاف میں سے کوئی سفید ٹائلیں جھانک رہی تھیں۔ میں نے سیکڑ کے پڑاؤں سے میں پہچان لیا۔ وہ میری ڈارلنگ کی حتمی ٹائلیں تھیں!

میں لپک کر اس بائس کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے چاند جانب گھپ اندھیرا چھا گیا۔ شاید کوئی بوہر ایک ڈانٹا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھانجی نہ دینے والی تاریکی میں صدف اپنے مجھ سے ٹکرانی اور پوری شدت سے اس نے مجھے اپنی ہاتھ میں سمیٹ لیا۔

میں نے اپنی پشت پر اس کے دل کو دھسے محسوس کیا۔ پھر اس سے قبل کہ تاریکی میں میری آنکھ کچھ دیکھنے کے ہوئی، کوشی کی بالائی منزل سے ایک دھشت ناک گاڑی ہوئی۔

میری نگاہ بے اختیار بالائی منزل کے اس پتھر کی طرف اٹھ گئی جس میں زرگل گہری نیند سو رہی تھی۔ ایک ضائع کے بغیر میں صدف کے ہاتھ کو گرفت میں لیا۔ کہ گیت کی طرف دوڑ لگا دی!

کوشی گہری تاریکی کی لپیٹ میں تھی!

میں اندازے کی بنا پر صدف کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس زمین کی جانب بڑھا جو زیریں اور بالائی منزل کے درمیان رابطہ کا وسیلہ تھا۔ اچانک لائٹ چلے جانے کے سبب یوں محسوس ہو رہا تھا، کسی ویز سیاہ چادر نے کوئی اور اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ آغوش میں سمیٹ لیا ہوں۔

زمین پکڑتے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ دیے رکھنا ممکن نہیں تھا چنانچہ ہم آگے پیچھے بالائی منزل پر پہنچے۔ بے ساختہ میری نگاہ اس دروازے کی جانب اٹھ گئی جس کے پیچھے میں نے زرگل کو آرام کرنے کی غرض سے پہنچایا تھا۔ ٹھوڑی دیر پہلے کوشی کے باہر میں نے جو دھشت ناک نسوانی چیخ سنی تھی وہ یہنا اسی بیڈروم سے ابھر رہی تھی۔

بیڈروم کا دروازہ نیم دھتا۔ ہم دونوں نے معنی خیز اور غلط نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا اور بے یک وقت آگے بڑھے۔

اسی لمحے اندھیرے میں سے ایک شخص لپک کر سامنے آگیا۔ اس کا رخ بھی بیڈروم کے ادھ کھلے دروازے کی جانب تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ تاریکی کے باوجود بھی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ ویسے بھی اب تک ہماری آنکھیں اندھیرے میں اندازے لگانے کے قابل ہو گئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو سیاہ بیٹوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

وہ شخص ہمارے اور بیڈروم کے دروازے کے درمیان رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا پھر ایک ہاتھ کو قدرے بلند کرتے ہوئے ہمیں آمیز لہجے میں بولا ”خبردار! ایک انچ بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

بیڈروم کے اندر سے کچھ اس قسم کی آوازیں ابھر رہی تھیں جیسے کچھ شخص کی دوسرے شخص کو دلوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کمرے میں زرگل بھی ایذا صورت حال خاصی تشویش ناک بلکہ لائٹ نہ ہونے کے فعل خطرناک تھی۔ یقیناً وہ اس وقت کی شکل سے دو چار تھی۔

ہمارے سامنے کمرے سے ہونے شخص کی دھمکی اور اٹھا ہوا ہاتھ یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ اس نے کوئی ریوالتور یا پستول وغیرہ قائم رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود ہتھیار سے نکلنے والی کوئی اندھ کوئی ہماری زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی۔

صدف سے ہمت کرتے ہوئے اس موقع سے شخص سے پوچھا ”کون ہو تم اور ہماری کوشی میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“ جملہ ختم ہوتے ہی اس نے مجھے ایک زور کا دھکا دیا۔ میں

فوری طور پر صدف کی اس حرکت کو سمجھ نہ سکا۔ اس کا بھرپور ہٹنے کے سرائیڈ میں لڑاکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مجھے ایک جانب دھکیلنے کے بعد صدف کا جسم ہوا میں بلند ہوا پھر وہ فضا میں رہے ہوئے کسی پھرکی کی مانند گھوم گئی۔ اگلے ہی لمحے ایک طوفانی فرنٹ وہیل فلائنگ اسلحہ بردار کی کینیا پر پڑی۔

صدف کی یہ حرکت اتنی سربلند اور بے وقت تھی کہ مجھے یوں لگا، اندھیرے میں کوئی برقی کوند گئی ہو۔ اس نے ایک نہایت ہی رکشا اسٹیپ لیا تھا لیکن اس نے جس اعتماد سے کلک چلائی تھی اس سے یہ ثابت ہو گیا، صدف کا نچا اور نشانہ پکا ہے۔ صدف کی کلک کھانے کے بعد متقابل بری طرح لڑاکو یا پھر تورا کر زمین یوں ہو گیا۔ اس کے ہماری بدن نے زمین سے ٹکر کر ایک مخصوص آواز پیدا کی۔ دراصل، اس کے زمین پر گرتے ہی دو مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ ایک تو اس کے ہماری بدن اور پینٹ فرش کے ٹکراؤ کی ”دھب“ لہنا آواز تھی اور دوسری آواز کی دھانی شے کے زمین سے ٹکرانے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس شخص کے ہاتھ کا ریوالتور یا پستول تھا جو پیش وگرد میں کہیں اندھیرے کی نذر ہو گیا۔ اس ہتھیار کو تلاش کرنا ایسا ہی مشکل تھا گویا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنا!

اسی وقت بیڈروم کے اندر سے کسی نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا ”عمران! باہر کیا ہو رہا ہے۔ یہ آوازیں کیسی ہیں۔ تم کسے دھمکی دے رہے تھے؟“

اس سے پہلے کہ عمران نامی وہ شخص اپنے ساتھی کے سوالات کا جواب دیتا، صدف ایک جست بھر کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ اس وقت کل فارم میں نظر آتی تھی۔ وہ اندھیرے میں کسی بجلی کے مانند چمک کر آگے بڑھی اور لپک لپک کر زمین یوں شخص کی حراغ پر پڑی کہ گئی۔ اس بد بخت کو اپنے بچاؤ میں ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع نہیں مل رہا تھا، زبان کیا چلاتا۔ یہ میرے لیے ایک تسلی بخش صورت حال تھی۔ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور پٹنے والے شخص کو صدف کے رحم و کرم پر چھوڑا پھر تیزی سے بیڈروم کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے کمرے میں پہلا محتاط قدم رکھا تھا کہ لائٹ آگئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا وقت نہ ہوئی کہ یہ واڈا کی فراہم کردہ لائٹ نہیں تھی۔ زیریں منزل پر کسی انجن سے ملتی جلتی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ غالباً اللہ دتا نے یا سیکورٹی گاڑی نے کوئی جیزر آن کیا تھا۔ میری نگاہ نے روشن کمرے کے اندر جو پہلا منظر دیکھا اس نے میری رگوں میں

شرار سے بھر دیا۔

زرگل مجھے بڑی مشکل میں نظر آئی۔ ایک دروازہ قامت بٹے کے فحش نے اسے اپنے بازو کی گرفت میں دبوچ رکھا تھا۔ میں سمجھا، زرگل خطرناک نیک لاک (Neck Lock) کی زد میں تھی۔ اس پشتون حینہ کی آنکھیں مفلوج سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ ایک وحشت ناک بیچ مارنے کے بعد زرگل نے خاموشی کیوں اختیار کر لی تھی۔ وہ بے چاری اس وقت جس مصیبت میں مبتلا تھی اس میں چپٹا تو درکنار، یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اب تک سانس کی آمد و شد کا سلسلہ برقرار رکھے ہوئے تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ میاد چوٹکا اور اس نے میری توقع کے خلاف ایک حرکت کی۔ اس نے زرگل کی گردن کو اپنے بازو کی گرفت سے آزاد کر دیا پھر اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے غرا کر میری جانب بڑھا۔ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔

میں نے اس فحش پر نگاہ رکھتے ہوئے زرگل کا جائزہ لیا۔ وہ دھکا کھانے کے بعد ہتھ پر گری تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو سہارا رہی تھی۔ اس کا یہ شکل خطر کی اور دقت کی عین ضرورت تھا۔ اسی لمحے میری ساعت پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے دستک دی۔ کوٹھی کی زیریں منزل پر خاصی پھل کے آثار محسوس ہوئے۔ گارڈ اور اللہ دتہ وغیرہ شاید بالائی منزل کی خبر گیری کے لیے زینے طے کر رہے تھے۔ ان کے قدموں کی آواز میں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں صدف کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر بیڈروم میں حاضر ہو گیا۔

میری لمبائی غفلت سے تہ مقابل نے بھر پور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں اس کے تیور اور انداز سے سمجھ گیا، وہ مارشل آرٹس سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے ہوا میں اچھل کر ایک فرنٹ فلائنگ کک چلائی۔ اس کے وار میں بھجلا ہٹ پائی جاتی تھی۔ شاید بیڈروم سے باہر تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال نے اسے یوگلا ہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے نیک جھک (Neck Jerk) سے اپنے چہرے کو بچایا پھر بیک فٹ پر جاتے ہوئے ٹی اسٹانس (T-Stance) بنا کر کھڑا ہو گیا۔

اپنے پہلے ہی دار کی ناکامیابی پر وہ تھلا اٹھا اور یکے بعد دیگرے اس نے مجھ پر دو دروازے ہاؤس گس چلائیں۔ میں بیک فٹ پر بلا ٹک کرتے ہوئے چار فٹ مزید پیچھے ہٹ گیا۔ اس سلسل ناکامیابی نے اسے بھجلا ہٹ میں مبتلا کر دیا اور اس

نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے مجھے سائیز فلائنگ کک چاہی۔ اس کے ایک میں کھیلتے ہوئے دوسری میں بھری ہوئی تھی۔ میں نے پہلو پر جھک کر آؤٹر بلاک کیا پھر ایک دوسرے کے ساتھ ڈبل جینڈل اس کی تشریف پر رسید کیا۔ دوسرے جھمبے فٹ کی دوری پر ایک چوٹی یز کی ٹاپ سے ٹکرایا پھر دو سے لڑھک کر قاتلین پر آن گرا۔ ایسے درجنوں چکا

دشمنوں کو میں مزہ چکھا چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو جھماڑتے ہوئے مزہ تہ مقابل کو دیکھا۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر زمین سے اٹھ تھا۔ میں نے بے آنکھی دروازے کو بند کر کے بولٹ چڑھا۔ اب میری مرضی کے بغیر کوئی فحش باہر سے اندر آ سکتا تھا۔

میں پیچھے ہی اپنے دشمن کی طرف پلٹا، زرگل کی دم گزلب ریز آواز میری ساعت سے ٹکرانی "خبردار! وہاں ہاتھ نہ لگانا، ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔"

زرگل کے ہاتھ میں مجھے دھریو اور نظر آ جا تو میں ضرر کے کنارے، حفاظت کے پیش نظر اسے دیا تھا۔ پھر اوہ اور ریو اور اس سے وابستہ نہیں لیا تھا۔ غالباً سونے قبل زرگل نے وہ ریو اور دھکے کے نیچے رکھ دیا تھا اور اب اسے ملے ہی وہ ہتھیار نکال کر حملہ آور کو دھکا رہی تھی۔ زرگل جس انداز میں حملہ آور کو دھکا دیتی تھی اس سے میرا ہجر آپوں آپ حکمت باری کی طرف چلا گیا۔ زرگل کا چاچا کھ یار اس کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ممکن تھا، حکمت ہا بندوں نے زرگل کا سر اٹھ لگایا ہو۔

مجھ سے بٹنے والا دروازہ قامت فحش آہستہ آہستہ سے اٹھنے لگا۔ میں نے دشمن پر نگاہ رکھتے ہوئے زرگل سے استفسار کیا "کیا تم اس فحش کو چاہتی ہو؟"

زرگل نے نفی میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا "تم حکمت باری کا بیٹھا ہوا تو نہیں؟"

"نہیں وہ جان! وہ قلعیت سے بولی" میں نے فحش کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

اس دوران میں دروازہ قامت فحش اٹھ کر پوری طرح ہو گیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "کسی زرگل باہر یار سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تو تم سے کچھ حساب کرنے آیا ہوں وہ جان۔ ہماری اطلاعات کے مطابق خواب گاہ میں تمہیں ہونا چاہیے تھا لیکن تمہارے بجائے بھجان دوشیزہ سے ٹکراؤ ہو گیا، اس پر لائٹ چلے جانے میں مزید الجھ گیا۔ بہر حال۔" وہ اس بنا کر کھڑا ہوا

ہے، تم نے بہت مارشل آرٹس سیکھ رکھا ہے۔ تم سے دو دو ہاتھ کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔"

میں نے زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم بے شک اس غیبت کو ریو اور کے نشانے پر رکھو لیکن اس وقت تک کوئی نہ چلا نا جب تک تاگزیر نہ ہو جائے۔ یہ سراسر امیر افکار ہے، میری طرف اس کا حساب نکلتا ہے۔ اس نے فرض کی دھمکی کے لیے ہاتھ پاؤں چلا کر دکھائے ہیں۔ اسے میں ہی دو چار ہاتھ دکھاؤں گا۔ تم خود کوشاں نہ رکھو۔"

میری بات ختم ہوئی تھی کہ اس فحش نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اس کی طرف سے چنداں غافل نہیں تھا لہذا میں نے فوراً اس کی خاطر داری شروع کر دی۔ وہ جیسے ہی ہوا میں اچھلا، میں نے ہائی جپ کی۔ ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو سائیز فلائنگ ککس مارنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ ہمارے پاؤں کے بلیڈ ایک دوسرے سے ٹکرائے اور زور عمل کے طور پر ہم دونوں ہوا میں رہے ہوئے پیچھے کی جانب ٹھکے اور زمین پر آتے ہی اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی پھر اللہ دتہ نے چلا کر پوچھا "صاحب جی! آپ تحریریت سے تو ہیں۔ آپ کی ساتھی کا کیا حال ہے؟" اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی "اندر کی صورت حال یہی ہے۔"

"تم اندر کی فکر نہ کرو۔" میں نے تیز آواز میں کہا "باہر کے حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔"

"اس سائز کو ہم نے پوری طرح قابو کر لیا ہے۔" اس کا اشارہ عمران کی طرف تھا جسے میں تھوڑی دیر پہلے صدف کے خالے کر آیا تھا۔ اللہ دتہ بتا رہا تھا "صدف بی بی نے اس شخص کو گھبراہٹ کر دیا ہے۔"

میں نے ٹھکانا لہجے میں کہا "تم گارڈ کے ساتھ گردو لوار کا جائزہ لو۔ تحسین کو بھی ساتھ لے لو۔ دشمن کا جو بھی ساٹھی نظر آئے اسے فوراً بے بس کرنے کی کوشش کرو۔ میں اندر والے سے نمنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"صاحب جی! آپ نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے، ہمیں آپ کی بڑی فکر ہے۔"

"اندر پردے والا کام ہو رہا ہے۔" میں نے جان بھرائے والے انداز میں کہا۔

"دو! "صدف بی بی آپ کے پاس آنا چاہتی ہیں۔" "تم صدف کو اپنے ساتھ رکھو۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا "مگر صدف سے باہر، کوٹھی میں اس کی زیادہ ضرورت

ہے۔"

میں اللہ دتہ سے مزید گفتگو جاری نہ رکھ سکا۔ اسی وقت دروازہ قامت فحش نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کی فرنٹ کک سے بچنے کے لیے پہلو پھینکی۔ وہ واؤٹر ہاؤس آزماتے ہوئے مجھ پر چڑھ دوڑا۔ میں نے ہوا میں اٹھی ہوئی اس کی ٹانگ کو اپر بلاک کی مدد سے مزید اٹھا دیا۔ زمین پر موجود اس کا پاؤں تھوڑا ڈھنگا ہوا، اسی لمحے میں نے اسے پیچھے دھکا دے دیا۔ وہ پشت کے بل زمین پر گر گیا۔

اس مرتبہ میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اچھل کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے میری ٹانگوں پر ایک خطرناک فرنٹ سوپ (Front Sweep) مارنا چاہی، میں نے ہوا میں ہائی جپ کی۔ اس نے کمر کو مرکز مان کر اپنے بدن کو ہوا میں کھمایا اور بھرتی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہوتے ہی اسے میرے پاؤں کا ایک شاندار تحفہ وصول کرنا پڑا۔ میں نے زمین پر آتے ہی ایک پاؤں پر محسوس کر اسے جھک دلی ایک بلیک مارڈ کی تھی۔

یہ دھواں دھار کک اس کے قہو پڑے پر پڑی۔ وہ کراہ کر پیچھے گیا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اسے زوردار سائیز کک مارڈی۔ وہ لڑکھائے قدموں سے پیچھے ہٹے ہوئے دیوار سے جا لگا۔

اسے توقع ہو گی کہ دو چار ہاتھ مار کر مجھے زیر کر لے گا لیکن یہاں معاملہ اس کی توقع کے خلاف پیش آ رہا تھا۔ ابھی تک میں یہ جان نہیں سکا تھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کا حساب چکانے آیا تھا۔ پتا نہیں، اس کا تعلق میرے دیرینہ دشمنوں سے تھا یا تازہ ترین دشمنوں سے۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ فٹا کا آدمی ہوگا۔

میرے ان خیالات کے دوران میں اس شخص نے ایک نئی حرکت کی۔ وہ بلیو جینز پر کاڈیوائے جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خالی ہاتھ وہ مجھے زیر نہیں کر پا رہا تو اس نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک ہتھیار برآمد کر لیا۔ مجھے اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چمکا ہوا نچو نظر آیا (نن چکو)۔ مارشل آرٹس کا ایک مخصوص ہتھیار ہے جو کم دیش فٹ بھر لمبائی کے دو ڈھنڈوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ دونوں ڈھنڈے ایک مضبوط آہنی زنجیر سے منسلک ہوتے ہیں۔ دونوں ڈھنڈے ٹکڑی، ربر یا کسی بھی دھات کے ہو سکتے ہیں) میں نے شاؤلن ٹیمپل میں قیام کے دوران میں سیلف ڈیفنس کی تربیت لیتے ہوئے نوے تیس اور تھری بیس نچو نہ صرف چلانا سیکھا تھا بلکہ اس سے بچاؤ کی ٹریننگ بھی لی تھی۔ شاؤلن ٹیمپل

(Shaolin Temple) دنیا میں مارشل آرٹس کی سب سے بڑی تربیت گاہ ہے جہاں پر شاؤلن مارشل آرٹس کے نام پر ایک جہانِ حیرت سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

اس مرتبہ میرے مقابل نے فوراً حملہ نہیں کیا۔ وہ نہ چوکو اپنے ہالا کی بدن کے مختلف حصوں سے گزارنے کے بعد ایک دائرے میں قدم اٹھانے لگا۔ نہ چوکو کا ایک ڈٹرا (اسٹک) اس کی بغل میں دیا تھا جب کہ دوسری اسٹک کو اس نے منبوطی سے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اسے حملہ کرنے کی جلدی نہیں تھی لہذا میں نے اس پر نگاہ رکھتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”تم کون ہو، مجھ سے کیا دشمنی ہے، تمہیں یہاں کس نے بھیجا اور کیوں بھیجا ہے؟“

وہ غرایا ”تم کسی اسکول یا سڑک کی طرح مجھ سے سوال نہ کرو مجھے بتاؤ، تم نے قادر بخش اور فیض احمد کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”میرا تو اندازہ درست تھا۔ تم فٹا کے آدمی ہو؟“

”مجھے تمہاری خیال آرائی یا اندازوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ دائرے میں پیش قدمی کرتے ہوئے باہمی فاصلہ بتدریج کم کرتے ہوئے بولا ”ریاض علی نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر تم نے قادر بخش اور فیض کے بارے میں مجھ سے بتایا تو میں تمہارا روبرو حشر کروں گا۔“

ریاض علی وہی شخص تھا جسے میں نے وہاٹ بائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر مخصوص داؤ آزما تے ہوئے انکسٹیل کر دیا تھا۔ اس شخص کی بات سے ظاہر ہوا کہ ریاض ہوش میں آنے کے بعد اپنے کیمپ میں پہنچ چکا تھا۔

میں نے نہ چوکو بردار دشمن کی اسٹینگ پر نگاہ رکھتے ہوئے پوچھا ”ریاض نے آکھ کھولنے میں بہت دیر لگا دی کیا تمہارے پاس محمد فٹا کے پاس اس قسم کے بودے آکھ کار ہیں؟“

”تم اس قسم کی اشتعال انگیز باتیں کر کے مجھے غصہ دلانے کی کوشش نہ کرو ورنہ!“ وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم سیدھی طرح میرے ساتھیوں کے بارے میں بتاتے ہو یا میں کوئی ناظر طریقہ استعمال کروں۔“

”مجھے ناظر طریقہ زیادہ راس آتا ہے۔“ میں نے فحوس لہجے میں کہا ”بہتر یہی ہو گا کہ اپنے ارادے پر عمل کر ڈالو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ تمہارے مطلوبہ دونوں بندے اس کوٹھی میں موجود نہیں ہیں۔“

”پھر کہاں ہیں؟“ اس نے ہار حاشہ انداز میں پوچھا ”وہ وہاں ہیں جہاں کی تمہیں خبر نہیں۔“ میں نے اسٹینگ کی مناسبت سے موافق اسٹینگ اٹھاتے ہوئے وہ ہیشٹائے ہوئے لہجے میں بولا ”میں وہی تو جاننا چاہتا ہوں، وہ اس وقت کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں فاضلہ کالونی والی اس کوٹھی میں ہیں؟ انہوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ وہ درشت لہجے میں ”یہاں آنے سے پہلے ہم وہاں گئے تھے۔ ہم نے اس کو کوٹنا جھان مارا لیکن قادر بخش اور فیض احمد کا کوئی نہیں ملا۔“

”میں نے انہیں وہاں بڑی حفاظت سے رکھا ہے میں نے ظہرے ہوئے لہجے میں کہا ”انہیں پانے کے تمہیں میرے ساتھ فاضلہ کالونی والی اس کوٹھی پر جانا لیکن ایک مسئلہ ہے!“

”کیا مسئلہ ہے؟“ وہ میری باتوں میں آتے ہو سنجیدگی سے بولا۔

”تم اس حالت میں جیتے جاگتے وہاں نہیں جاتے میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”تمہیں اس مقام میں داخلہ شرائط پر پورا اترنا ہو گا یعنی بدست دیا ہونا پڑے گا۔“ وہ بھٹاتے ہوئے لہجے میں بولا ”کے کیا بکواس ہے؟“

”اگر میری بات کا یقین نہیں تو زرگل سے پوچھ لو۔“ میں نے زرگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس۔۔۔ تمہارے دونوں ساتھیوں کی حالت کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ کیفیت میں ہیں کہ میری مرضی سے جیتے ہیں، میری مرضی سے مرتے ہیں۔“ پھر میں نے زرگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تم کب تک ریوالور کو اس مردود پر تانے بیٹھی رہو گے اس کے ساتھ کسی ساتھیوں پر باہر قابو پایا گیا ہے اور یہ بھی بخش اور فیض احمد کے پاس جانے کا کتنی ہے۔ میں جب اس کے ہاتھ پاؤں توڑوں، تم باہر جا کر صورت حال کا جائزہ لو۔“

”وہ کتنے تو اپنے آدمیوں کی مدد بھی کرو۔ اس ریوالور کو پاس ہی رکھو کسی بھی لمحے اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ”ویسے مجھے نہیں کہ صدف کے ہوتے ہوئے کسی اور کو ہاتھ پاؤں لگوان دیا پڑے۔“

زرگل میری ہدایت پر بستر سے نیچے اتر کر اور اگلے لمحے وہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ میں نے زرگل کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مجھے

ہر اس نظر آیا۔ اس کمرے سے باہر کی صورت حال اس کی مخالفت میں ہموار ہو چکی تھی اور بیڈروم کے اندر میں اس کے ہاتھ پاؤں توڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔

اس نے چونکا نظر سے بیڈروم کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا اور لپک کر میرے سر پر تن چکوا کر کھڑا اور کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نے چوک کی اسٹاک پر لگا رکھے ہوئے فوراً اندر آیا، ہم دونوں کے جسم ایک دوسرے سے ٹکرائے اور تن چوک کی اسٹاک میرے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے پشت کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت میں نے اس کے سینے پر ہینڈ پش (Hand Push) آزمایا۔ وہ تن چوکسیت دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنے قدموں پر جم کر اس ہتھار کو ہوا میں گھمانے لگا۔ وہ تن چوک کی آزاد اسٹاک سے ہوا میں اٹھنے کا آٹھ بار ہاتھا۔ یہ تن چوک کی خود ساختہ منتی میں استعمال ہونے والی ایک مخصوص حرکت ہوتی ہے۔

میں نے اس کی کمر پر لگا رکھے ہوئے شیخ مارنے کا جھانسا دیا۔ وہ میرے جھانسنے میں آگیا۔ اس نے تن چوک کی آزاد اسٹاک سے میرے بازو پر لاک لگانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ میں نے تن چوک کی اسٹاک کو اپنے ہاتھ میں قابو کیا پھر دوسرے ہاتھ کا ایک زوردار شیخ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

اس دھواں دھار کے اس کے ہاتھ سے تن چوک چھڑا دیا جو جیتے کے طور پر اب میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ میرا شیخ اپنے چہرے پر کھا کر وہ بری طرح ڈر گیا اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی جانب گیا۔ میں نے ایک اسٹیپ لے کر فرنٹ میل کلک چلائی اور اسے چاروں خانے چت کر دیا۔

وہ چند تانے تک فرش پر پڑا حیران نظر سے بیڈروم کی صحت کو دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھ فرش پر مارے ہوئے ہینڈ اسپرنگ (Hand Spring) کے سے انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے تن چوک کو ہاتھ میں لینے کے بعد ایک لمحے کے لیے کہیں ٹھہرے نہیں دیا۔ یہ وہی ڈیٹل (Wind Mill) کے پیچھے کے مانند میرے ہاتھوں میں گردش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بدوس لی سے زیادہ تن چوک کا باہر اور کوئی نہیں دیکھا تھا۔ شافٹن نیپل میں، میں نے بدوس لی کے ہر ہر اسٹاک کی ڈیوڈیسی بھی اور اس کے بہت سے اسٹیپ کو اپنے فن میں شامل کر لیا تھا۔ اس وقت بھی میں تن چوک کے جو گردشی کمالات دکھا رہا تھا انہوں نے بتدریج کو دروازہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تن چوک میرے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں

جاتے ہوئے خوبصورت فارمیشن پیش کر رہا تھا۔ دونوں اسٹاک باری باری ہوا کو چیرتیں تو ایک مخصوص قسم کی "شام شامیں" کی آواز پیدا ہوئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی غلام اور چابک دست شخص ہوا پر گوزاری کر رہا ہو۔

میں چند لحظات کا یہ برق رفتار مظاہرہ کر کے حیران تھا تو یہ معاملہ کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ پلٹیں چھپا کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس سے پہلے کہ میں اس پر کوئی ایک کرتا، اس نے ایک انتہائی بزدلانہ حرکت کی۔ اس نے ایک لمحے کو ٹھیک کر مجھے دیکھا اور بیڈروم کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

یہ اس کی ایک اضطرابی حرکت تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس کو کبھی میں داخل ہو کر بری طرح پھنس چکا تھا۔ اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو فرار ہی میں غایت تھی میں اپنی آسانی سے اسے نکل بھاگنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے ایک تپتی پرواز کی اور کسی جیتے کے مانند جست بھر کر اس کی جانب لپکا۔ اسی وقت مجھے بیڈروم کے کھلے دروازے میں صدف کی جھلک نظر آئی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس پرواز کے نتیجے میں، میں فرار ہونے والے شخص کو چھاپنے میں کامیاب ہو گیا اور ہم دونوں سامنے سے آتی ہوئی صدف سے جا ٹکرائے۔ ہمارا تصادم بیڈروم سے باہر ہوا تھا۔

سب سے پہلے صدف فرش سے اٹھی اور کسی بھری ہوئی شیرنی کے مانند وہ مغرور پروٹ پڑی۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ قدرت نے صدف کو ڈاکٹر بننے کے لیے پیدا نہیں کیا تھا۔ میں اس کے خیالات سے متفق ہو گیا کہ وہ اپنے باپ کی فریادی خواہش پر ایک غلط فیصلہ میں چلی گئی تھی۔ اس وقت وہ کسی بلبل مارشل سے کم نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس شخص کی اتنے شاندار طریقے سے درگت بنا رہی تھی کہ مجھے خاموش تماشا کی کا کردار ادا کرنا پڑا۔

صدف کے سامنے ایک مارشل آرٹسٹ تھا اس لیے بھی اسے اپنے فن کے جوہر دکھانے کا ہر پور موقع مل رہا تھا۔ میں نے دیکھا، صدف کے انہک میں مارشل آرٹ سے زیادہ جتنا سنسک شامل تھی۔ وہ ہوا میں ایسی سی سی قلاب بازیوں کا دشمن کا۔ سو استیاس مار رہی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں منتانہ اس تک خوار نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ زمین پر پڑے پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ غصہ تھا کہ وہ بے ہوش نہیں تھا جب کہ عمران نامی اس کے پہلو انما ساسی کو صدف لہو لہان کر کے گہری بے ہوشی میں پہنچا دیا تھا۔

صدف ہاتھ جھڑتے ہوئے ایک طرف ہٹی تو میں نے اس شخص کے نزدیک پہنچ کر کہا "نیا کام ہے تمہارا؟" "جسید!" اس نے غمازت آمیز لہجے میں بتایا۔

"صرف جسید یا جام جسید؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "بہر حال، اب تم اس کنڈیشن میں آچکے ہو کہ تمہیں تمہارے ساتھ نیا ساسی کے ہر وہاں پہنچا دیا جائے جہاں تمہارے مطلوبے دو بندے قادر بخش اور فیض احمد پہلے سے موجود ہیں۔"

"تم اچھا نہیں کر رہے وعدان!" وہ تنبیہ والے انداز میں بولا "نشا صاحب سے دشمنی تمہیں بہت بھیگی پڑے گی۔" میں نے کہا "میں دوستی اور دشمنی کا کاروبار کرتا ہوں اور اس میں ہنگامہ سنا نہیں دیکتا۔ یہ سوچنا تمہارے پاس نشا کام ہے کہ اس نے مجھے جیگر کر گھاتے کا سودا کیا ہے یا پھر مارکیٹ لوٹ لی ہے۔"

"تم ہمارے ساتھی واپس کر دو، ہم اپنی راہ بدل لیں گے۔" اس نے کہا۔

میں نے کہا "تم اس راہ پر اپنی مرضی سے آئے ہو، میری مرضی کے بغیر تم راہیں بدل سکو گے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ پروام آئے ہوئے کسی بھی شخص کو مٹا لے یا تجویز کا حق نہیں ہوتا تمہارے اور تمہارے پاس نشا کے بارے میں جو بھی فیصلہ کروں گا وہ میں ہی کروں گا اس لیے اب تم اپنی چوچ بندھ کر رکھو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ میں تم جیسے شخص پر بندے کے زوردار ہجند کی چوچ کاٹنے اور جڑے اکھاڑنے کے ایک سواکھ طریقے جانتا ہوں۔"

وہ کم کر مجھے دیکھنے لگا۔ اسی وقت زرگل اللہ دتا کے ساتھ بالائی منزل پر آگئی۔ صدف نے اللہ دتا سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا "شکار کیا حال ہے؟"

میں نے چونک کر صدف کو دیکھا اور اللہ دتا کے جواب دینے سے پہلے ہی پوچھا۔ "کون سا شکار صدف؟ عمران اور جسید تو یہ پڑے ہیں؟" پھر میں نے حیرت منی حملہ آوروں کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

صدف نے بتایا "وعدان! ان کا تیسرا ساتھی بھی ہمارے ساتھ چڑھ گیا ہے۔ وہ کوئی کے عقب میں ایک گرے ہائی روف میں موجود تھا میں نے سیکورٹی گاؤڑ کی مدد سے جمال نامی اس شخص پر قابو پا کر کوئی کے اندر پہنچا دیا ہے۔ جمال کے قبضے سے ہمیں ایک کلاشکوف بھی ملی ہے۔"

صدف کی اس کامیابی پر مجھے جس درجہ خوشی ملی، اس سے کہیں بلند درجہ درخ جسد کو ہوا۔ اس کی رعبی سعی امید بھی ختم ہو

گئی ورنہ شاید وہ جلال کی طرف سے کسی مدد کی امید کر رہا ہو گا۔ اس نے کسی ہارے ہوئے جرنیل کے مانند گردن جھکا دی۔

اللہ دتا نے صدف کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا "بی بی جی! جلال پوری طرح قابو میں ہے۔ خمین نے اسے گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جلال سے جیتی ہوئی کلاشکوف اسے حدود میں رکھنے کے لیے ہی استعمال ہو رہی تھی۔ میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "کیا ان لوگوں کی گرے ہائی روف ابھی تک غلبی سڑک پر ہی کھڑی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اللہ دتا سے کہا "اس گاڑی کو فوراً کوئی کے اندر لے آؤ جب تک میں ان لوگوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرتا، ہائی روف کوئی میں رہے گی۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے سوال کیا "کیا چالی وغیرہ گاڑی میں لگی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں، چالی انٹین میں موجود ہے۔" اللہ دتا نے بتایا۔

"تب فوراً میری ہدایت پر عمل کیا جائے۔" میں نے جھکنا لہجے میں کہا۔

آئندہ پندرہ منٹ میں ہم سب فریڈ ہاشا کی کوئی کی زیریں منزل پر پہنچ چکے تھے اور عمران کی آمد کا ذریعہ وہ گرے ہائی روف بھی کوئی کے اندر اپنی جگہ بنا چکا تھی۔ میں نے سیکورٹی گاؤڑ کو گیٹ پر چوس کر رہنے کی تاکید کی اور نشا کے پیچھے ہوئے تینوں افراد کو ایک ہاتھ روم میں بند کر دیا۔ انہیں اس ضروری کمرے میں پہنچانے سے پہلے میں نے خمین اور اللہ دتا کی مدد سے ان کے ہاتھ پشت پر اچھی طرح کس کر باندھ دیے تھے۔ ان میں سے عمران ہنوز بے ہوش تھا جب کہ جسید اور جمال بھی کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ لیکن احتیاطی لاٹھی میں اس لیے میں نے ان کے ہاتھوں کو تالیوں کی بندشوں کے سپرد کر دیا تھا۔

وہ تینوں نسلی بخش انداز میں، واٹس روم تین ہو چکے تو میں نے خمین سے کہا "تم یہ گن زرگل کے حوالے کر دو۔۔۔۔۔ اور خود جا کر آرام کر دو۔ تم ہماری خاطر اپنا اپنی مون خراب نہ کرو۔ وہاں بیڈروم میں آؤ تمہارے لیے کمرہ مند ہوگی۔ تو بیا بتاؤ کہ کوانتار اور شوشلیں ان منزلوں سے گزرا تا ٹھیک نہیں۔"

"وعدان صاحب! آؤ داتنی اس دانے سے بہت خوفزدہ ہے۔" خمین نے کہا "ایک مرتبہ تو اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا، خمین! کیا تمہارے سر کے گھر پر کسی فلم کی شوٹنگ ہو

رہی ہے۔“

تحسین فرید پاشا کا اسسٹنٹ تھا اور ظاہر ہے قلم لائن کا بندہ ہونے کے سبب اس کی گفتگو میں فلی چوٹی کا آجانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

میں نے اس سے کہا ”تم اپنی بیوی کو جا کر سمجھاؤ کہ زندگی کی فلمے مانتا ہے۔“

”سرا“ وہ منوں نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”ان حالات میں آپ کچھ بڑے بیروں میں جانا چکھا چھائیں لگتا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ آدمی کو بھی یہیں بلا لیتا ہوں۔“

”اور اگر یہاں پھر کسی حقیقی منظر کی شوٹنگ شروع ہوگئی تو.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کا شانہ چھپتاتے ہوئے کہا ”تحسین! تم نے متھہ فلموں کے سیٹ پر فائنٹ کے سین دیکھے اور شوٹ کروائے ہوں گے لیکن میں فلمی دنیا کا بندہ نہیں۔ میری حقیقی زندگی میں فلموں سے کہیں زیادہ مار دھاڑ اور قفل موجود ہے۔ اور میں ہر قسم کی بیوقوفی سے نمٹتا جاتا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو اور اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ۔ اگر تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئی تو میں تمہیں فوراً بلا دوں گا۔“

وہ نہ چاہے ہوئے بھی میرے مشورے پر اس بیڑہ دم کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی نو بیا ہوا بہن اس کے لیے نشوونما بھرے اندیشے اپنے ذہن میں سامنے بیٹھی تھی۔ ویسے تینوں حملہ آور ہمارے قابو میں آچکے تھے اس لیے زیادہ فکر مندی کی بات نہیں تھی۔ اس وقت میرا ذہن ان تینوں کو فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے خانے میں منتقل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہیں پاشا کی اس کوٹھی میں رکھنا مناسب نہیں تھا۔

اس دوران میں واڈا کی مہربانی سے لائٹ آگئی اور اللہ دتا نے جزیئر آف کرڈیا۔ لائٹ آنے سے آپوں آپ میرا دھیان ڈارلنگ کی طرف چلا گیا پھر وہ منظر میری نگاہ میں محکم گیا جب میں نے ایک ڈی باکس میں سے اس کی عکس نکالیں جھانکتے دیکھی تھی اس کے بعد لائٹ چلی گئی تھی اور زرگل کی دھشت ناک جج نے ہمیں سب کچھ چھوڑ کر اس کی جانب دوڑ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اللہ دتا خاصا مردم شناس واقع ہوا۔ اس نے میرے چہرے سے میری سوچ کا اندازہ لگا لیا اور پھر میری آواز میں بولا ”صاحب جی! وہ ڈبا اندر لے آیا ہوں جس پر آپ نے فائر کیا تھا۔“

”کہاں ہے وہ باکس؟“ میں نے سہ تابی سے پوچھا۔ اس نے بتایا ”ادھر ڈارلنگ روم میں رکھا ہے جہاں آج رات آپ نے ڈیرا جمار رکھا ہے۔“

میں اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ صدف کھڑی ہوگئی۔ میں نے زرگل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”مکن سمیت یہیں موجود رہو۔ اللہ دتا تمہارے ساتھ ہے۔“ تینوں غیبت داش روم کے اندر کسی قسم کا اوجھڑا نہ ہو کر کوشش کر گئے تو فوراً مجھے اطلاع دیا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میری پریشانی پیدا کریں۔

”تم ادھر سے بے فکر ہو کر ادھر جاؤ۔“ وہ کاکھوڑا مخصوص انداز میں چھپتاتے ہوئے بولی ”میں یہاں کی صورت حال سے نمٹ لوں گی۔“

اس چٹون دو شیزہ کے ہاتھ میں مکن بہت چھب رہی تھی۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اس جھگڑا بخوئی استعمال کر رہی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔ پہلو نما عمران نے مجھے اور صدف کو جس پہل سے دھماکے کی کوشش کی تھی، لائٹ آنے پر اسے تلاش کر لیا گیا تھا اور نے اسے اللہ دتا کے حوالے کر دیا تھا۔ فیصل احمد سے چھبنا لوڈ ریو اور میں نے خفاحت کی غرض سے زرگل کو باجھ اسے تحسین کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح میرے تمام سامی مسلح ہو گئے سوائے میرے اور صدف کے..... اور میں اپنے معاملات سے نمٹنے کے لیے آنکھیں اسلئے کی ضرورت محسوس تھی۔ ویسے جشیہ کا فن پیکوری قبول تھا لیکن میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس قسم کے جھگڑا میرے لیے اہمیت کے حامل نہیں رہے تھے۔ مارشل آرٹس کے فائٹرز، فائٹنگ کے دوران میں گامے بے گامے جتنا سنگ کی فیکٹس کا استعمال کرتا جانتے ہیں۔ انہیں سن چکے۔ اس کے علاوہ اور عجیب اشارے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

میں نے ڈارلنگ روم میں قدم رکھا تو بے اختیار میرا نگاہ اس باکس کی طرف اٹھ گئی جو سینٹرل ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہ دیر پہلے میں نے اس جو باکس پر فائر کیا تھا جس کے نتیجے میں اس میں پیدا ہونے والے شگاف نے مجھے ڈارلنگ کی ٹانگوں کی جھلک دکھائی تھی۔ اس منظر نے میرے دل کو دھڑکنے کو دھج بڑھا دیا تھا۔

میں اور صدف آنے سے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ باکس ہمارے درمیان ٹیبل پر موجود تھا۔ اور میری فائرنگ اس میں بننے والے شگاف میں سے ڈارلنگ کی ٹانگیں بھی جھانک رہی تھیں اللہ دتا نے بہت ہی احتیاط اور خف

اسے اس باکس کو یہاں پہنچایا تھا۔

فائرنگ نے صدف اور اللہ دتا کے خدشے کی تردید کر دی تھی کہ کہیں اس باکس میں کوئی بم یا آتش گیر مادہ نہ ہو لہذا اسے اٹھ لگانے میں کسی قسم کا رسک پوشیدہ نہیں تھا۔ میں نے اس پر چپاں چٹ کو ایک مرتبہ پڑھا اور پھر بے دھڑک وہ باکس گھول ڈالا۔

باکس کے اندر ڈارلنگ کی گردن کی لاش رکھی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس منظر نے مجھے سر تا پا لرز دیا تھا۔ وہ میری محبوبہ کی حیثیت میں جلوہ گر ہونے لگی تھی اور بعض بازگشت میں اس نے ایک مکن کی طرح میری بھر پور مدد بھی کی تھی۔ کسی عزیز ہستی کی مٹی ہوئی گردن کو دیکھنا کس قدر تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے اس کا اندازہ بخوئی لگایا جاسکتا ہے۔ باکس کے اندر خون کی زیادہ مقدار نظر نہیں آ رہی تھی۔

اس کا بھی مطلب تھا، ڈارلنگ کو کہیں اور قفل کیا گیا تھا اور بعد میں اس کی گردن کی لاش کو اس کنگ سائز ڈبے میں پیک کر کے دھان علی ابن عبد علی کو پیش کیا گیا۔ میں ٹکلی دھان کی اس بھانہ نہ حرکت پر تھلا کر رہ گیا۔ میری ڈارلنگ کا قاتل وہی تھا۔ اسی شیطان نے اسے پاشا کے بنگلے سے اخوا کیا تھا۔ وہ ڈارلنگ سمیت اللہ دتا اور سیکورٹی گارڈ کو قتل دینے میں کامیاب رہا تھا۔

اچانک صدف کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے گر گئی ”وہاں! ڈارلنگ کے نیچے بھی مجھے کچھ نظر آ رہا ہے۔“

ڈارلنگ کی اس حالت نے صدف کو بھی گہرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ میں نے اس کی آواز میں غم کی پرچھائیں کو لہرائے محسوس کیا۔ اس کی توجہ دلانے پر میں نے بھی ڈارلنگ کے نیچے کی دھاتی شے کو دکھایا۔ میں نے اس باکس کو پہلو سے مل جھانکا تو خود گھر شے مل کر سامنے آ گئی۔

میں اس وفادار خنجر کو پھینچنے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے مرحوم دوست امتیاز علی کی یادگار تھا اور میں نے اس کی پیاد دھار کی دو سے میاں زائد حسین سمیت بہت سے مجرموں کی شرک کی حراج پر کی تھی۔ لیکن یہ خنجر یہاں کیسے پہنچ گیا۔ میں تو شعیب غوری کے مشورے پر اس خنجر کو کرانی میں چھوڑ آیا تھا۔ ڈارلنگ کی لاش کے ساتھ اس خنجر کو جھٹک پہنچانے کا ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ مجھے بتایا جا رہا تھا، وہ میرے ہاتھوں میری گردن بھی کاٹ سکتا تھا۔ یہ ٹکلی دھان تو بہت ہی کمینہ واقع ہو رہا تھا۔

پھر میرا دھیان شعیب غوری کی طرف چلا گیا۔ ٹیلی فون

پر ہونے والی گفتگو میں وہ بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا اور اس نے بے انکشاف بھی کیا تھا بلکہ مجھ پر الزام لگایا تھا کہ میں گزشتہ رات گراچی میں موجود تھا اور اس کے اڑے ساؤتھ پر میں نے ہی اپنی گراچی میں کارروائی کروائی تھی۔ اس نے جس حوالے سے میرا ذکر کیا وہ ٹکلی دھان پر فٹ بیٹھا تھا۔ اور اب گراچی میں چھوڑا ہوا خنجر بھی یہاں پہنچ گیا تھا۔ ٹکلی دھان نے اگر واقعی اس خنجر سے ڈارلنگ کی گردن کاٹی تھی تو پھر اس کی سفاکی اور پختگی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

میں نے اس باکس کو قہوڑا بلایا جلا یا تو ایک دہ شدہ کاغذ پر نظر پڑی۔ مذکورہ کاغذ ڈارلنگ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ صدف نے بھی وہ کاغذ دیکھ لیا اور بے اختیار اٹھی سے اس جانب اشارہ بھی کر دیا۔ میں نے خنجر اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی نوک سے وہ دہ شدہ کاغذ ڈارلنگ کے مردہ وجود کے نیچے سے بچھ لیا۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر صدف اپنے صونے سے اٹھی اور میرے پہلو میں جڑ کر بیٹھی۔ اس دوران میں، میں وہ دہ شدہ کاغذ گھول چکا تھا۔ کاغذ کی تحریر پڑھتے ہی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ وہ بہت ہی حیرت انگیز تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے لکھے کو پڑھ رہا ہوں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں کس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ٹکلی دھان نہ صرف کمال کا بہرہ دیتا تھا بلکہ وہ بہترین نقل بھی ثابت ہو رہا تھا۔ میں حیرت اور تجسس کے طے چلے تاثرات کے ساتھ وہ تحریر پڑھنے لگا۔ وہاں میری چند رائٹنگ میں لکھا تھا۔

”وہاں! ڈارلنگ نامی بے بی اب تمہارے لیے بہت خطرناک ثابت ہونے والی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے ختم کر دیا۔ شاید تمہیں میری بات کا یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پچھلے چند گھنٹوں سے اس کے اندر ایک بری طاقت نے بسیرا کر لیا تھا۔ بدی کی وہ طاقت آگے چلی کر تمہیں ناقابل حلانی نقصان پہنچانے والی تھی لہذا میں نے تمہیں محفوظ رکھنے کے لیے ڈارلنگ کا قصہ تمام کر دیا۔ بدی کی وہ قوت ایک ملی سمیت اپنے انجام کو پہنچی گئی اور تمہارا خنجر تمہارے پاس۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے!“

میں نے اس عجیب و غریب تحریر کو بار بار پڑھا اور بار بار ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا اور وہ یہ کہ ٹکلی دھان میرا دشمن نہیں بلکہ دوست ہے۔ لیکن یہ بات مجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس قسم کی دوستی تمہارا ہوا تھا اور کیوں؟ وہ کون ہے جو میرے بہرہ پر



میں کبھی لاہور میں موجود ہے تو کبھی کراچی میں نظر آتا ہے۔ ان حرکات سے وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ مجھے دوست تو کھل کر سامنے آتے ہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر دوستی کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ یہ بہرہ دینا تو عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس کا انداز چوروں والا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال ابھرا..... کہیں یہ میرے دشمنوں کی کوئی نہایت ہی گہری چال تو نہیں وہ دوستی کی آڑ میں مجھے گھبرانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟

صدف نے پیرے سے خیالات پڑھ لیے۔ ظاہر ہے، وہ ٹیلی بیٹھی نہیں جانتی تھی۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات اور موجودہ صورت حال سے وہ اندازہ لگایا ہوگا جو الفاظ کا رد پد حصار کر اس کی زبان سے پھسل گیا۔ میں نے اس کی آواز میں بڑی واضح فحشراہٹ محسوس کی۔

”وہ جان! یہ دوستی کوئی خطرناک چال بھی ہو سکتی ہے۔ جس کے ذریعے دشمن تمہیں ٹریپ کرنا چاہتا ہو!“

”میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے تشریح ناک لہجے میں کہا۔

اسی وقت اللہ داتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور یہاں کی صورت حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی تاہم ٹیلی وڈھان کے خط کو میں نے اس سے چھپاتا مناسب سمجھا اور پوچھا ”تم خبریت سے آئے ہو؟“

”جی صاحب!“ وہ ڈرائنگ کے مردہ وجود کو حسرت ناک انداز میں دیکھتے ہوئے بولا ”میں یہ پوچھنے آیا تھا، آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، کوئی چائے یا کافی وغیرہ؟“

میں نے صدف کا عندیہ لیے بغیر دھوکا انداز میں کہا ”فی الحال نہیں ہم فوری طور پر ان تین شیطانوں کو ٹھکانے لگانے جارہے ہیں جو دواش روم میں بند ہیں۔ اتنی دیر میں تم ڈرائنگ کو ٹھکانے لگا دو۔ ہمیں اب اس سے جدا ہونا ہی پڑے گا۔“

حقیقت کو تسلیم کر لیں تو بڑے سے بڑے سامنے کا فہم بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن عموماً انسان غیر حقیقت پسند واقع ہوا ہے اسی لیے زندگی بھر دکھ اور پریشانیوں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں جن میں سے زیادہ تر خود اس کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ ڈرائنگ کو واپس نہیں لایا جاسکتا تھا۔ ٹیلی وڈھان کے تحریری پیغام میں کس حد تک صداقت تھی اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کر سکتا تھا۔ وقت..... جو بہت ظالم ہے۔ اس کا ظلم نظر نہیں آتا الزام انسان ہی کے سر جاتا ہے۔ یہ ظالم اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

اللہ داتا چند لمحے خاموش رہا پھر تشریح ناک لہجے میں پوچھنے لگا ”صاحب جی! یہ ٹیلی تو مر چکی ہے۔ میں اسے کبھی بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔ کیا آپ بھی ان تینوں کو ٹھکانے لگانے.....“

اس نے جملہ مکمل چھوڑا اور کبھی ہوئی نظر سے مجھے نیچے لگا۔ میں اس کے ادھورے ہنسل کا مفہوم سمجھ گیا تھا، میں نے جلدی سے کہا ”نہیں اللہ داتا! تم جیسا سمجھ رہے ہو میرا کیا دل ارادہ نہیں۔ میں انہیں ایسی جگہ پہنچانے جا رہا ہوں جہاں یہ زندہ رہیں لیکن کسی سے ضرر نہ پہنچے کی طرح۔ فریڈ پاشا کے آنے تک انہیں زندہ رکھنا ضروری ہے۔ پاشا ہی ان کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرے گا۔“

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

میں نے کہا ”ہم واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ تم اچھی سی چائے بنا کر بلا دینا، اس رات کی ساری گفتہ ہو جائے گی۔“

پھر میں صدف کے ساتھ اس کمرے میں آیا جس کے محققہ دواش روم میں تینوں جملہ آدرتقیہ تھے۔ زرگ نے ٹو سے پوچھا ”وہ جان! ان کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

وہ کلاشکوف تھا بڑی چاقی و چوندر اور مستعد دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کہا ”فی الحال تو میں انہیں اسی خفیہ مقام پر پہنچانے جا رہا ہوں جو تمہارا دیکھا ہوا ہے۔ اور جہاں ان کے دو ساتھی پہلے سے موجود ہیں۔ یہ انہی کو ڈھونڈنے ڈھانڈنے تو یہاں پہنچے ہیں۔ کسی مجبورے ہنگامے مسافر گوارہ دکھانا تو ثواب کا کام ہے۔“

اس نے مسنی خیر انداز میں گردن ہلائی اور خاموش ہو گئی۔

میں نے اللہ داتا سے کہا ”تم نسان پٹرول (Nissan Patrol) کو کیریج سے باہر نکالو۔ میں آ رہا ہوں۔“

اس کے بعد میں نے تحمین اور زرگ کو چند ضروری ہدایات دیں پھر تحمین اور اللہ داتا کی مدد سے ہم نے ڈرائنگ کے اندر پہنچا۔ اس موقع پر سکیورٹی گارڈز مرد دین نے بہت تعاون کیا۔ ہم نے کوئی سے دھتھت ہونے سے پہلے اسے چوکتا رہنے تلقین کی۔ مرد دین خاصا سمجھ دار گارڈ تھا۔ اس کے ساتھ زیادہ دماغ نہیں کھپاتا پڑتا تھا۔ جب ہماری جیب کو کسی سے دھتھت ہوئی تو رات کے دو بج رہے تھے، گویا ہفتے کا دن شروع ہوا تھا!

☆☆☆

سر شام جس خشکی نے لاہور کی گھاٹیں اپنی آہ کا اعلان کیا تھا، وہ رات کے تیسرے پہر اچھی خاصی خشک میں بدل چکی تھی۔ میرے ساتھ گری سر دی کا زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ میری زہت اس انداز میں ہوئی تھی کہ سوئی تختیاں مجھے زیادہ پریشان نہیں کرتی تھیں البتہ صدف کو میں نے سٹوکر بیٹھے دیکھا ”ڈھکا! اچھا ہوتا، تم کوئی سے روانہ ہوتے وقت کوئی گرم شال دھیرے لٹائیں!“

”میں کسی گرم کپڑے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی۔“

”مقبوضہ لہجے میں بولی۔“ یہ سٹوکر کا ہے۔“

صدف نے چست ہنجر پر سفید ہائی ٹیک لوز سوئٹر پہن رکھا تھا۔ میں نے کہا ”تم گھر میں سردی نہیں لگ رہی تو یوں سٹوکر سن کر کیوں بیٹھی ہو؟“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ جلدی سے اپنے بدن کے زواہر تبدیل کرتے ہوئے بولی۔

میں سمجھ گیا، وہ عورت کی مخصوص نفسیات کے زیر اثر اس انداز میں بیٹھی تھی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی ”کیا ہمیں بہت زیادہ دور چاہیے؟“

صدف نے اپنے سوال میں بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا اور مطلب مقام کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اسے خیال تھا کہ جیسے میں تحمین دشمن بھی موجود ہیں۔ یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ میں مجیدہ داتا کی راز قامت مقص کو بتا چکا ہوں کہ ان کے دیگر دو ساتھی کہاں ہیں۔ بہر حال، صدف کا محتاط انداز موقع محل کی مناسبت سے بہت موزوں تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”کچھ زیادہ دور نہیں۔ تم یوں سمجھ لو کہ پاشا کی اس کوئی اور اس کی کوئی کے درمیان تمہارے ماموں اور نگ زیب خان کی باہل گاہ ہے۔“

”اوہ!“ اس نے دغراسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی ”اس کا مطلب ہے، ہم پاشا اہل کی کسی دور کی کوئی میں جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہم دس منٹ بعد وہاں ہوں گے۔“

”تمہارا خیال درست ہے،“ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے صدف کو مختصر اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا تاہم خانے کا راز اس پر عیاں نہیں کیا تھا اور اب یہ بات اس سے چھپن نہ رہتی۔ میرے خیال میں، اس میں کوئی حرج بھی

نہیں تھا۔ صدف کو مجھ سے ملے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن دو تین مواقع پر اس نے جس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی میں اسے فراموش یا نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر فاضلیہ کالونی والی کوئی سے خانے کا راز اس پر کھل جاتا تو اس میں کوئی قحاح نہیں تھی۔ وہ اب میرے دوستوں میں شمار ہوئی تھی، اچھے دوستوں میں!

اس کے بعد صدف نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم شادمان کالونی کو پیچھے چھوڑ کر شاہ جہاں روڈ آ گئے۔ ہماری منزل وہ گلی شاہ جہاں اور فاضلیہ کالونی کے سنگم پر واقع تھی تاہم اس کا شمار فاضلیہ کالونی میں ہی ہوتا تھا فریڈ پاشا نے مجھے بتایا تھا، کسی زمانے میں اس کے علاوہ دیگر چند عرف آرشٹ بھی فاضلیہ کالونی میں رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ گہرگ اور ڈینس سوسائٹی کا رخ کرنے لگے بعض ماؤں ٹاؤن میں جا بیٹھے تھے اور فلم دالوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی اس لئے میں نے پاشا کی فراہم کردہ معلومات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری جیب مطلقہ ہو گئی کہ قریب پہنچ گئی اور اسی لمحے ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا کیا انسان پٹرول کے انجن نے احتجاجی آواز خارج کی اور بڑی نفاست سے خاموش ہو گیا۔ میں نے مجبوراً جیب کو روڈ سے ہٹا کر لیا مجھے اس دوران میں اتنا موقع مل گیا تھا کہ اسٹیئرنگ گھما کر جیب کو ایک جانب کرلوں وہ بڑی داہیات صورت حال تھی۔ مجھے اس دوران میں اتنا موقع مل گیا تھا کہ اسٹیئرنگ گھما کر جیب کو ایک جانب کرلوں۔

میں نے ڈرائیونگ میں مہارت تو حاصل کر لی تھی لیکن گاڑی کے تکنیکی معاملات کا مجھے زیادہ علم نہیں تھا۔ دراصل مکینیکل باتیں میرے لئے غیر دلچسپ اور برباد ہوتی تھیں اس لئے میں نے گاڑی اور انجن کے بارے میں جاننے کے سلسلے میں کسی بھی سنجیدگی نہیں دکھائی۔

میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جیب کو اشارت کرنے کی کوشش کی لیکن کام بائی نہ ہوئی۔ صدف نے تشریح بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہ جان! اس کے انجن سے کچھ بھیڑ جھاڑ کر و شاہ بات بن جائے۔“ وہ یہ مشورہ دیتے ہوئے میری جانب اتنا زیادہ جھک آئی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود سے بھیڑ جھاڑ کر پیش کش کر رہی ہو۔ میں نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر راتے ہوئے کہا۔

”میں اس معاملے میں اتنا ڈری ہوں صدف!“

”کیا واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں



دیکھا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں

دیکھا۔

میں نے کہا ”ہاں، واقعی۔ میں صرف ڈرائیونگ جانتا ہوں، مکینک نہیں ہوں۔“

اس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا، بولی ”میرے استعمال میں بھی اسی موٹر کپنی کی گاڑی ہے لیکن تمہاری طرح میں بھی ڈرائیونگ تک محدود ہوں۔“

صدف کے پاس ایک چھپاتی ہوئی وحاشت سنی میں نے دیکھی تھی یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت بھی ہم نسان کپنی کی ایک جیب میں بیٹھے تھے جس نے لب بام ہمیں دھوکا دے دیا تھا۔ میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، ہم دونوں ہی اس معاملے میں اناڑی ہیں!“

میرا جملہ ذمہ دہی تھا اور اس وقت میں براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ پتا نہیں، میری اس بات کا کیا مطلب بھی کر ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئے ہوئے بولی۔

”مجھے تو اپنی گاڑی میں جب بھی کوئی پرابلم پیش آتی ہے، میں گیراج والوں کو نوں کر دیتی ہوں۔ پایا ڈیٹس کے ایک معروف گیراج سے اپنی گاڑیوں کا کام کراتے ہیں“

میں نے اس کی بوجھلہٹ کو انجوائے کرتے ہوئے کہا ”تمہارے پایا اور وہ معروف گیراج کراچی میں ہے ہم انہیں فون کر کے کسی قسم کی مدد حاصل نہیں کر سکتے“

”پھر کیا کریں؟“ وہ ہونٹ سیکتے ہوئے بولی ”ان تین لفٹوں کے ساتھ سرراہ کھڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔“

پولیس کی کوئی سوبائل اس طرف آ سکتی ہے۔ اگر ان تینوں کو انہوں نے اس حالت میں دیکھ لیا تو ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ ہم اس وقت ایک نازک صورت حال سے دوچار تھے میں نے کہا ”ہمیں دھکا لگا کر جیب کو کٹھنی تک لے جانا ہوگا۔ اور کوئی صورت فی الحال ممکن نہیں“

صدف نے پوچھا ”وہ کونسی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے جہاں تم جانا چاہتے ہو؟“

میں نے انگلی سے فاضلیہ کا لوٹی والی کونٹھی کی جانب اشارہ کیا اور کہا ”میرے خیال میں یہ فاصلہ سو گز کے لگ بھگ ہوگا!“

”یہ تو اچھا خاصا فاصلہ ہے وجدان!“ وہ پریشان لہجے میں بولی ”ہمارے پاس ایک ہیوی ڈیوٹی جیب ہے پیش دے

کرد ہاں تک اسے لے جانا آسان نہیں ہوگا“

”میری زندگی میں کچھ بھی آسان نہیں صدف!“ میرا لہجہ اچانک قدرے سخت ہو گیا ”دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم ان تینوں کو اپنے کندھوں پر ڈھو کر کونٹھی کے اندر لے جائیں“

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پرسوج انداز میں بولی ”یہ صورت تو پہلی شکل سے بھی زیادہ مشکل ہے“

”تب ہم پہلی صورت کو ہی اپنا لیں گے“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”تم ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔ میں نیچے جا کر جیب کو پیش دیتا ہوں“

پھر نکل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، میں ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر جیب سے باہر نکل آیا میں نے جیب کو دھکا لگانے سے پہلے پچھلے حصے میں فرش پر پڑے ان تینوں کا جائزہ لیا۔ وہ بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیب چاب دہاں

موجود تھے۔ ان میں پہلو ان نما سائڈ عمران نامی شخص تو ہنوز بے ہوش تھا۔ جشید کا شمار بھی نیم بے ہوش میں کرنا چاہئے البتہ گرے ہائی روف سے اچھے چڑھنے والا جلال اپنے حواس میں نظر آتا تھا لیکن بے بسی دے کسی کی کسی تصویر کو شمار ہا تھا۔

میں نے جیب کو دھکا لگانا شروع کیا تو ایک احساس نے بری طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ سچ ہے نسان بڑول جیسی بھاری جیب کو دھکیلنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی اور میں اس کام کے لئے جی سے مدد لے رہا تھا لیکن میں نے جس عجیب احساس کا ذکر کیا ہے وہ یہ تھا کہ میرے ساتھ کلا

... اور شخص بھی اس جیب کو دھکیل رہا ہے اس احساس نے میرے رگ دپے میں سنگینی دوڑا دی۔

میں نے بہ دستور جیب کو پیش کرتے ہوئے سر کو ہٹا لیا۔ اس احساس سے نجات نہ ملی۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ احساس میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے اپنے

کام میں مصروف رہتے ہوئے پیش و گرو کا جائزہ لیا چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ رات کے اس پہر سنا

بھال روڈ سنان پڑی تھی اور دور دور تک کسی جان دار کے آواز نظر نہیں آتے تھے اس کے باوجود بھی میں اپنے احسان

سے ہچکرا رہا نہیں پاسکا۔

جب میں اپنی کیفیت کی کوئی وضاحت نہ کر سکا تو نے نے ایک تجربہ کرنا چاہا۔ میں نے جیب کو پیش دینے سے انہ

روک لیے اور ساتھ ساتھ دوڑنا رہا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت

مگر میں دیکھ رہا تھا کہ جب کی رفتار میں کوئی کی واقع نہیں ہوئی تھی گویا اسے مسلسل دھکیلا جا رہا تھا۔ ایسا کوئی شخص تھا جو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جب کو پیش دے رہا تھا پہلے میں اسے اپنے احساس کا دھوکا سمجھا تھا کہ کوئی میرے ساتھ موجود ہے مگر اس عملی تجربے نے ثابت کر دیا کہ میرے احساس کو دھوکا نہیں ہوا، کوئی پراسرار قوت میرے آس پاس موجود تھی جو جب کو دھکیل کر فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے گیٹ کی سمت بڑھا رہی تھی۔

پراسرار قوت کے خیال نے مجھے لا محالہ جی کی جانب متوجہ کر دیا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ میں نے جب کو دھکیلنے کے لئے جی کی قوت سے مدد لی تھی۔ میرا پیش ہٹا دینے کے بعد بھی اگر جب کی رفتار میں کی نہیں آئی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، میں جی کی لا محدود دیت کے تجربے سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں نہایت ہی پابندی کے ساتھ میں جی کی ایڈوائس مشقیں کر رہا تھا۔ یہ ممکن تھا، میرے اندر بیدار جی کی قوت کی کوئی ارتعاشی شکل تک میری رسائی ہو سکتی ہو۔ پراسرار قوتوں کا کوئی آخر نہیں ہوتا۔ ان کی حدود کا تعین کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ کوئی بھی عامل ان کا متنبی نہیں ہو سکتا۔ یہ لا محدود (INFINITE) ہوتی ہیں۔

جی بھی ایک پراسرار اور حیرت انگیز قوت ہے۔ شاید ان ٹیبل میں تربیت کے دوران میں، میں نے اس قوت کے ایسے ایسے کمالات دیکھے تھے کہ آنکھیں خیرہ اور ذہن دنگ ہو کر رہ گیا۔ میرا دادا استاد ماسٹر ہینگ پائی اس قوت کا باہر تھا۔ میں نے اس کی شاگردی میں رہتے ہوئے عجب عجب نظارے دیکھے جن کا تصور بھی محال ہے ماسٹر ہینگ پائی ہی نے مجھے جی کی ایڈوائس مشقوں کے بارے میں بتایا تھا۔

جی (CHI) کو چاٹا والے اپنے قہقہے کے لحاظ سے (QI) کہتے ہیں اور اس کا پورا نام جی گونگ (QIGONG) ہے۔ جہت کے بعض لا با اس قوت کو کھی کا قہقہہ دیتے ہیں۔ یہ ہر حال یہ وہ قوت ہے جو پیٹ کے ذریعے حصے میں پھیلی جانب ناف کے مقام پر خواہیدہ حالت میں موجود ہے۔ ناف کے مقام سے اگر پیٹ کے پچھلے حصے کی طرف سفر کیا جائے تو بڑھ کر ہڈی کے نزدیک اس حیرت انگیز قوت کا ممکن واقع ہے۔ جو لوگ مخصوص مشقوں کے ذریعے اس خواہیدہ قوت کو بیدار کر لیتے ہیں وہ پھر اس کی مدد سے بڑے کمال دکھاتے ہیں جی جی رو حاکمیت کی یہ قوت ہندو یوگ میں کنڈلینی شکتی کے نام سے موجود ہے۔ مسلم صوفیا اسی قوت کو تصرف کا نام دیتے ہیں۔ کان کہیں سے بھی پڑا جائے

کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہم اپنی مطلوبہ کوٹھی تک پہنچ گئے اور اس دوران میں، میں جس حیرت انگیز تجربے سے گزرا تھا اور گزر رہا تھا اس نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میری سوچ میں حیرت اور انجمن کا تناسب یک سا تھا۔ اگر میں جب کو بغیر دھکیلے ہوئے تک پہنچنے والے معاملے کو جی کے کھاتے میں ڈال دیتا تو پھر اس احساس کو کیا نام دیتا جواب تک موجود تھا میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا، کوئی میرے آس پاس موجود ہے۔ موجود ہے مگر مجھے نظر نہیں آ رہا۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تو اس کا یہ مطلب تھا، کسی اور کو بھی نظر نہیں آ رہا۔ آخر وہ کون تھا۔ کون تھا وہ؟ یہ سوال بڑی شدت سے میرے دماغ پر بھونکنے لگا رہا تھا۔ شاید میں اس سوال کا جواب دھونڈنے بہت دور تک خیالی سفر طے کر لیتا کہ صدف کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پوچھ رہی تھی۔ ”ودھان! کیا ساری رات یہیں کھڑے رہو گے یا کوٹھی کے اندر بھی جانا ہے؟“

میں نے اپنے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور صدف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ جب سے باہر نکل آئی تھی اور حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جلدی سے آگے گئی گئی کھول دیا۔ جھگڑے والی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کی چابیاں ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے صدف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تھیں اچی کی مدد کے بغیر تھوڑی سی ڈرائیونگ اور کرنا ہوگی۔ تم جیسے ٹیمو، میں پیش دیتا ہوں، گاڑی کو کوٹھی کے اندر لے جانا ضروری ہے“

وہ اپنی جگہ کھڑی یک تک مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی لاہ تیار ہی تھی، وہ مجھے نہیں، کسی جو بے کو دیکھ رہی ہے۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم جب کے اندر کیوں نہیں بیٹھ رہی ہو؟“ وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے سرسراہٹ آ رہی تھی۔ ”میں گاڑی میں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ تم جس قوت سے جب کو دھکیل کر یہاں تک لائے ہو اسی کے ذریعے اسے اندر بھی پہنچاؤ“

”تم کہا کیا چاہتی ہو؟“ میں نے چور لہجے میں کہا۔ ”ودھان!“ وہ چٹائی لہجے میں بولی ”میں کسی سوچا نہیں کتنی تھی تم اس دور پر پراسرار ہو گے!“ ”اب سوچ لو۔۔۔ اور اس سوچ میں وقت ضائع کرنا کی ضرورت نہیں“ میں نے کہا ”میں فوراً کوٹھی کے اندر ہی“

میں نے جب کو پیش دیا اور ہم کوٹھی کے اندر پہنچ گئے۔ جس دوران میں، میں نے گیٹ کو اندر سے بند کیا۔ صدف جب سے باہر آ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی کارروائی کا آغاز کرتے، صدف نے نہایت ہی مختصر سے ہونے لہجے میں کہا۔

”ودھان! اہی الحال میں تھیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ ہم ضروری کام نمٹائیں تو پھر تھیں میرے بہت سے سوالوں کے جواب دیتا ہوں گے“ اس کی آواز میں جھٹس کا سندرم موج تھا۔

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، وہ مجھ سے کس قسم کے سوالات پوچھنے گی۔ ابھی تک میرے لئے بہت سے معاملات جواب طلب تھے، میں اسے کیا بتاتا۔ بہر حال، کوٹھی کے اندر پہنچ جانے کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا کہ اب کسی بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ اس دوران میں صدف بڑی کوڑے والی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے ٹالنے کیلئے کہا ”دیا“ ٹھیک ہے، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال یہ کام زیادہ ضروری ہے“

اس نے پوچھا ”تم نے ان تینوں کو کہاں اور کس طرح لٹکانے لگائے کے بارے میں سوچا ہے؟“ ”میں کوٹھی کے اندر ایک ہال نما کمرے میں لے جانا ہوا“ میں نے جواب دیا۔ پھر تھوڑا وقف کرنے کے بعد کہا۔ ”جب تو ہال نما کمرے میں جا نہیں سکتے گی۔ تم میری مدد کرو تو ہم انہیں سمجھیں کہ وہاں پہنچا سکتے ہیں“

”مجھے ہونے لہجے میں بولی“ ”ودھان! اگر تم چاہو تو یہ جب تک کہ کسی جا سکتی ہے بلکہ تمہاری اچھی کے اشارے پر تو یہ خیال ہوا میں تیرے ہوئے بھی ہال نما کمرے میں پہنچ سکتے ہیں!“

صدف کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا، اس نے ڈرائیونگ کے دوران میں بیک دیو سر میں سارا مشاہدہ کیا تھا۔ میں جب سے داخل اس کے پیچھے پیچھے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس منظر نے اسے بہت جلد حیران کیا ہو گیا۔ وہ وہ حالت کسی بات کی وضاحت کیلئے مناسب نہیں تھی۔ جب تک میں جب میں ڈرائیونگ میں تھا تو ان افراد کو ان کے ساتھیوں کے پاس نہ پہنچا دیتا، مجھے گویا میں انہیں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے صدف کی بات پر توجہ دینے پر تیار نہیں تھا۔

”تم ہال نما کمرے تک جانے کیلئے راستہ بگڑ کر دو جب تک میں انہیں جب سے باہر نکالوں ہوں۔ تھیں صرف دو کراؤں کے دوران سے کھولنا ہوں گے“

”موضوع سے پہلو تھی تھیں مزید پراسرار بنا رہی ہے“ وہ سنسنائی ہوئی آواز میں بولی ”میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، اگر کسی کی زبانی سنا ہوتا تو ہرگز ہرگز یقین نہ کرتی“ ایک لمحے کے وقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ودھان!“ اگر تم نے اس واقعے کی وضاحت نہ کی تو میرا دماغ پھٹ جائے گا“

مجھ پر دھڑکتی ہوئی کوٹھی کے اندر دنی جیسے کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے ان تینوں کو یکے بعد دیگرے کھینچ کر نشان سے باہر ڈھیر کر دیا۔ عمران اور جمشید تو کسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت کے قابل نہیں تھے البتہ جلال نے نجف سی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”تم ہمارے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟“ ”کمال ہے، تھیں اتنا ہی معلوم نہیں کہ ہم نے تم لوگوں کے لئے کتنی مصیبت کیوں اٹھائی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”وہ سراسیمہ لہجے میں بولا“ واقعی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا“

”تم باہر پائی روف میں تھے شاید اس لئے تھیں پتا نہیں“ میں نے اس کی آنکھوں پر جھانکتے ہوئے لہجہ جمشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا ”اس شخص نے مجھے بتایا تھا کہ تم لوگ قادر بخش اور فیض احمد کی تلاش میں ہم تک پہنچے تھے۔ میں تھیں تمہارے پچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملانے لایا ہوں“

”کھگ۔۔۔ کیا فیض اور قادر بخش اس کوٹھی میں ہیں؟“ وہ بے یقینی سے بولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”مم۔۔۔ جگر۔۔۔“ حیرت نے اس کی زبان میں نکت پیدا کر دی تھی ”ہم تو اس کوٹھی کی تلاشی لینے کے بعد اصرار گئے تھے۔ فیض اور قادر بخش تو اس کوٹھی میں نہیں ہیں۔“

میں نے سنسنائی انداز میں کہا ”پہلے تم بغیر اجازت اس کوٹھی میں داخل ہوئے تھے جسے کوئی شخص چھپتے چھپاتے غیر قانونی طور پر میرے پار کر کے کسی دوسرے ملک میں داخل ہوتا ہے اسی لئے تھیں وہ یہاں نہیں ملے لیکن اب تم ہماری مرضی سے یہاں پہنچے ہو اور وہ بھی ملن ایکسپریس میں بیٹھ کر اس لئے تمہارے پچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملن ضرور ہوگا۔“

”ملن ایکسپریس؟“ اس کے لہجے سے شدید لومیت کی حیرت لگتی تھی۔ میں نے خاموش نشان پٹرول کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا ”وہ ریگن ایکسپریس افسوس کہ یہ راستے ہی میں جواب دے گئی اور نہیں دیکھتے نہایت ہوئے اسے یہاں پہنچانا پڑا۔ گاڑی مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ لیکن ابھی ٹریفک مسافروں کو انجام دینا پڑتا ہے۔ ہوتا ہے بھائی، سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔“

اسی وقت صدف میرے پاس کھینچی گئی بھر ہم دونوں نہایت ہی اہم کام میں مصروف ہو گئے۔ اس رات کے پہلے صدف میں زرگل نے بھی مجھ سے اسی قسم کا تعاون کیا تھا جیسا اب صدف کر رہی تھی۔ میں نے زرگل کی مدد سے ہال نما کمرے سے فیض احمد کو گھسیٹ کر خفیہ خانے میں پہنچایا تھا اور اب صدف کی مدد حاصل کر رہا تھا۔ ہم نے پہلے جلال پر کام کیا اس کے بعد باقی دونوں افراد کو ہال نما کمرے میں پہنچادیا۔

اس مشقت کے نتیجے میں صدف واضح طور پر ہانپنے لگی، میں نے اس سے کہا ”تم تھوڑی دیر بیچہ کراچی سانس ہوا کرلو۔ باقی کام بعد میں کریں گے“

”تم ٹھیک ہوں“ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی ”تاؤ، اب ان تینوں کا کیا کرنا ہے۔ تمہارے لہجے سے اندازہ ہوتا ہے، انہیں اس کمرے تک پہنچانا کافی نہیں!“

”تم نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے“ میں دانستہ اسے باتوں میں لگا کر تھوڑا ریست دینا چاہتا تھا۔ ”ان کے ساتھ ابھی مزید بہت کچھ کرنا ہے۔ تم جا کر جیب میں سے رسی کا کچھا نکال لاؤ“

پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں نے نائیکوں کی مضبوط ڈوری کا ایک ٹکچا بھی ساتھ لے لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صدف ڈوری لے کر آئی۔ اب اس کی سانس بڑی حد تک ہموار ہو چکی تھی۔ اس دوران میں، میں نے مخصوص ٹیکنیک کو استعمال کر کے خانے کا راستہ داکر دیا تھا۔ صدف پر جب وہ خانے کا راز کھلا تو اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ ”میں جب ڈوری لینے باہر گئی تو اس ہال کی چاروں دیواروں کو دیکھ کر گئی تھی“ اس نے خانے کے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”لیکن یہ۔۔“

میں اس کے نامکمل جملے کو سمجھ گیا اور کہا ”اس طرف ایک خفیہ خانہ ہے۔ ان تینوں کے پیچھے سے ہوئے سامنے وہاں آرام فرما رہے ہیں۔ انہیں بھی دہیں پہنچانا ہوگا۔ تمہیں ایک مرتبہ پھر میری مدد کرنا ہوگی“

”تمہارے ایک دفعہ کہنے پر میں ہزار بار تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں“ وہ غصے سے لہجے میں بولی بھر ہائی ٹیک کی آستینیں چڑھاتے ہوئے میری جانب بڑھی۔

صدف کا یہ انداز خاصا متاثر کن تھا۔ ہم ایک مرتبہ بے ہوش افراد کو گھسیٹنے لگے البتہ جلال کے لئے ہاتھ کا زیادہ مناسب ہوگا۔ کچھ دیر بعد ہم خانے کے اندر داخل ہوئے۔

خانے کے اندر دینی مناظر نے صدف کو چونکے رہ کر دیا۔ خاص طور پر سابق سیکوریٹ گاڑی خادما حسین کو دیکھ کر صدف کافی دیر تک بیٹھی مگر دھکتی رہی پھر بولی۔

”یہ سب کیا ہے وجدان؟“

رفتہ رفتہ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ ذہن پر زیادہ زور دو“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”یہ تمہارا کارنامہ ہے؟“

”ایسا ہی سمجھو“ میں نے بہم انداز میں کہا ”باقی بات بعد میں کریں گے، پہلے ضروری کام نکالیں“

گینڈا نما قاتل زرخش صدف کو میرے ساتھ دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ اس سے پہلے زرگل کی موجودگی نے اسے ہلکا کر دیا تھا۔ حیران، حیران، حیران اور جلال کو بے بسی کی حالت میں دیکھ کر زرخش خاموش نہ رہ سکا، اس نے سچ لے کر کہا ”وجدان! میں ایک مرتبہ بھر بھی کہوں گا تم جانتے ہو“

”میں اچھوں کے ساتھ اچھا اور بدوں کے ساتھ برا ہوں“ میں نے سفاکی سے کہا ”اب تم خود اندازہ لگا لو کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہوں“

وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا ”تم اپنے انجام سے بے تار یک کنوئیں کی جانب بڑھ رہے ہو۔“

”میں نے کہا“ تم صرف اپنے انجام پر غور کرو۔ میں اپنے کہے، سننے اور کئے کا خود ذمہ دار ہوں“

”تمہیں ایک دن بری طرح چھچھتا پڑے گا“ وہ دہینے والے انداز میں بولا۔

”وہ دن بھی نہیں آئے گا“ میں نے کہا ”تم اس گرنہ خود کو ہلا نہ کرو“

وہ اپنے تازہ ترین مہمان ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بولا ”تم انہیں کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟“

”یہ لوگ تمہاری تلاش میں بیگم رہے تھے“ میں نے کہا ”میں نے انہیں سیدھا راستہ دکھا دیا۔“

وہ بے بسی اور غصے کی شدت سے سچکپانے لگا ”خود اور چوہدری دلدار کے۔۔۔“

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ کا ایک ڈنڈا مار دیا۔

رسید کر کے اس کا جملہ نامکمل جملہ دیا اور غصہ ٹھنک دیا۔

”کسی جائز وقت کی ناجائز اولاد! تم پہلے بھی مجھے خفا اور چوہدری دلدار کے نام سے دھمکا چکے ہو لیکن یاد رکھو، تمہارے وہ داد پر دادا تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

میں نے انہوں نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو وہ نہیں سمجھیں نظر آئیں گے۔ اسی خانے میں، اسی سنگین اور غصے سے زرخش پر پھر آقا اور غلام ایک ہی فرش پر بچھ جائیں گے۔ ذکی خادم رہے گا اور نہ ہی کوئی متحدہ دم۔“

میرے لیے میں اس قدر سختی اور تعلیمات تھی کہ قاتل زرخش کو چپ گئی تاہم وہ بھی ہوئی معاذاتہ نظر سے مجھے دیکھا رہا۔

میں نے خانے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کمرے کے واحد روشن دان کا جائزہ لیا تھا وہ یہ دیکھ کر مجھے ہلکا کر دیا تھا۔ وہاں روشن دان کے ساتھ کسی قسم کی چھتر چھتر نہیں کی گئی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

کیں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قاتل زرخش کوئی نہایت ہی شریف انسان اور فرماں بردار شخص تھا، دراصل، زرگل کے ساتھ اس خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی غلطی کر لی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ تھا۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی

اس کے بعد میں جلال کی طرف متوجہ ہوا ”تمہیں میں اس لیے ہوش و حواس میں چھوڑے جا رہا ہوں کہ قاتل زرخش کو سمجھا سکوں۔ اگر یہ کسی نادانی کا ارادہ کرے تو اسے ٹوک دیتا۔ تم تینوں مل کر ایکسپریس میں بیٹھ کر یہاں پہنچے ہو۔ اپنے حالات سے تمہیں سمجھوتا کرنا ہوگا۔ ورنہ مل کر ایکسپریس ابدی جدائی کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے!“

وہ بے اختیار رانبات میں سر ہلانے لگا۔ اس کی ان جنبشوں میں بے پناہ خوف اور دہشت سم آتی تھی۔ میں نے خانے میں موجود ہر شے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور صدف کے ساتھ باہر آ گیا۔ واپسی پر میں نے اسی مخصوص ٹیکنیک سے دروازہ بند کیا اور ہم ہال نما کمرے میں پہنچ گئے۔

صدف کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ بہت بڑے کوٹھی میں اگر اس کو نہ ستا تو جانے اس پر کیا قیامت مگرز جاتی۔

”کیسا لگ رہا ہے صدف؟“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے معتدل لہجے میں دریافت کیا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”خدا کی پناہ! یہ سب بہت سنگین خیر ہے!“

”تمہیں ایسی سنگینی ہی کی تلاش تھی؟“

”وہ کچھ کچھ بولی اور شوشیں میری نظر سے مجھے نکلنے لگی۔“

”کیا ہوا صدف، تم خاموش کیوں ہو؟“

”وجدان!“ وہ سرسراہٹ آواز میں بولی ”تمہیں لاہور میں قدم رکھنے ابھی چند روز ہوئے ہیں اور تم نے اتنی زیادہ دشمنی بڑھا لی؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”یہ میرے اور پاشا کے مجموعی دشمن ہیں۔ اب تمہارے پاشا انکل تو یہاں ہیں نہیں۔ ان کی کشت میں مجھے ہی چلنا پڑ رہا ہے۔ اس وقت میں ڈبل ڈیوٹی پر ہوں۔“

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے کوئی منہدم یا معنی نہ پہنچا سکے۔ اس نگاہ میں حیرت بھی تھی اور دلچسپی بھی، آخر بھی تمہارا ستائش بھی، محبت بھی تھی اور فرمائش بھی۔ میں نے اس کی ہزار معنی نگاہ سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

”صدف تمہیں تو ان حالات میں بہت مزہ آرہا ہوگا۔ تم بدقول خود، خود، خامی ہم جودائع ہوئی ہو!“

اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں موضوع بدل دیا ”اگر اس کوٹھی کی ہم جوتی نہت چکی ہو تو ہمیں فوراً یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ ادھر پاشا انکل کی دوسری کوٹھی پر بھی ہماری اشتر ضرورت ہے۔ وہاں کے حالات کو کوئی نہیں کھا سکتا۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے کہا  
”لیکن فوری طور پر رد ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں!“  
”کیوں ممکن نہیں۔“ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے  
دیکھا۔

میں نے کہا: ”شاید تم بھول گئی ہو کہ ہم جس جیب کے  
ذریعے یہاں پہنچے تھے وہ ہینڈ زاپ ہو چکی ہے۔ اب یہ تو ہو  
نہیں سکتا کہ میں فاصلہ کالونی سے گلیبرگ تھری تک گاڑی کو  
دھکا لگاؤں۔“

دھکا لگانے کے ذکر پر اس نے استغابہ نظر سے مجھے  
دیکھا پھر تشریش ناک انداز میں بولی ”پھر ہم واپس کیسے  
جائیں گے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ”اگر کچھ تو  
میں اپنے ماموں کو فون کر دیتی ہوں۔“

فون کے ذکر پر میں چونک اٹھا اور مجھے یاد آ گیا کہ جب  
آج شام کے وقت میں اس کو گلی میں برسرِ بے کار تھا تو کسی  
حصے میں فون کی گھنٹی بجی تھی۔ ازاں بعد اللہ دتہ نے مجھے بتایا کہ  
فریڈ پاشا نے فون کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی  
تھی۔ اس کو گلی میں فون کی موجودگی ہی خوش کن تھی۔

میں نے صدف سے کہا ”ان معاملات میں تمہارے  
ماموں کو انوالو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ ویسے بھی پولیس  
والے ہیں۔ ایک بات کے سومطال اور ایک مطلب کے  
ہزار منہبوم نکالیں گے۔ میں اللہ دتہ سے رابطہ کرتا ہوں۔“

”کیا اس دیران کو گلی میں فون موجود ہے؟“  
”ہے تو۔۔۔ لیکن تلاش کرنا پڑے گا۔ آؤ میرے  
ساتھ۔“ میں نے کہا۔

صدف میرے ہم قدم ہو گئی۔

تھوڑی سی دیر بعد ہم ایک ایسے ڈرائنگ روم نما کمرے  
میں پہنچے جہاں فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے فریڈ پاشا کی گلی  
کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی پر فون اللہ دتہ نے ریسیو کر لیا۔  
میں نے مختصر الفاظ میں اس سے وہاں کی خبر و عافیت دریافت  
کیا۔ جواب اس نے کہا۔

”صاحب جی! یہاں تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ اپنے  
بارے میں بتائیے؟“

”ہمارے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا  
”ہمیں فوری طور پر ایک گاڑی کی ضرورت ہے تاکہ ہم یہاں  
سے نکل کر تمہارے پاس پہنچ سکیں۔ جیب میں کچھ ایسی خرابی  
ہو گئی ہے کہ وہ دارا کہنا ماننے سے انکاری ہے۔“  
”آپ جس مشن پر گئے تھے اس کا کیا بار؟“  
”مشن کامیاب رہا ہے۔“

اللہ دتہ نے کہا ”وہ جان صاحب! اس وقت گلی میں  
ٹویوتا کروڈا اور ہائی روف کھڑی ہیں۔ آپ کے لیے کن کون  
گاڑی مناسب رہے گی؟“

میں نے کہا ”دشمنوں سے چھٹی ہوئی ہائی روف کوئی  
الہال باہر نکالنا ٹھیک نہیں ہوگا اس لیے ٹویوتا چلی کی کیا تقریر  
گاڑی لے کر آؤ گے؟“

”جو آپ کا حکم۔“ وہ فرمایا بروادری سے ”لا“  
”تحصین نے بھی پاشا صاحب کی وہ کوئی دیکھی ہوئی ہے۔“

”تحصین کو ڈسٹرپ نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔“ میں نے کہا  
”وہ بے چارہ اس کو گلی میں آرام و آسائش کے لحاظ  
مگر ارنے آتا تھا۔ یہاں پر قیام کی پہلی رات اس پر ہمارا  
گھٹی۔“ تھوڑا وقت دے کر میں نے پوچھا ”وہ اٹھتا ہے یا  
پاس ہی ہے نا؟“

”نہیں جناب! وہ اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے۔“  
اللہ دتہ نے بتایا ”میں نے زرگل کو آرام کرنے کے لیے  
کے پاس بھیج دیا ہے۔ تحصین کا کہنا ہے، جب تک آپ مجھ  
سے واپس نہیں آ جاتے، وہ بھی میرے ساتھ کاٹا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے، پھر تم دونوں آپس میں صلاح کر کے  
کرو۔ میں نے کہا ”جیسے بھی ہماری طرف آتا ہے، فوراً  
پڑے۔ میں یہاں برا انتظار کر رہا ہوں۔“

رابطہ ختم ہوا تو صدف نے استفسار کیا ”وہ جان!  
خیال ہے، چندہ منٹ میں ان میں سے کوئی یہاں آگیا  
گا۔ رات کے اسے اس پر تمام سڑکیں خالی ملیں گی۔ کیا ہم  
پہنچ کر انتظار کر سکیں یا گیت پر چلیں؟“

میں نے کہا ”میرے خیال میں ہم انسان میں جا کر  
ہیں۔ وہ فی الحال سفر کے قابل نہیں رہی تو کیا ہوا، ایک  
نشت گاہ وہ اب بھی ہے۔“

صدف نے میری بات سے اتفاق کیا اور ہم عقد  
کمرے کے دروازے بند کرنے کے بعد کو گلی کے کنارے  
میں آ گئے۔ گیٹ کے نزدیک ہی وہ جیب کھڑی تھی جہاں  
پہنچ کر سواری کا انتظار کرنا تھا۔ رات غنڈہ اور سٹائٹ میں  
ہوئی تھی۔ آسان پر آخری تاریخوں کا چاند اپنی مخصوص  
تاب دکھا رہا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر آسان کی طرف  
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چاند مجھے دیکھ رہا ہو۔

یہ چاند بھی اللہ نے خوب تخلیق کیا ہے۔ جو کسی  
طرف دیکھتا ہے۔ یہ اسی کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسا  
ہے جو کسی سے مجلس نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو سد میں  
ہے۔ بعض لوگوں کو تو چاند میں اپنے محبوب کا چہرہ نظر

ہے۔ مغرب میں تو باقاعدگی کے ساتھ اس نسبت سے ایک  
مختص تہوار بھی منایا جاتا ہے۔ جسے روزِ محبوب (St.  
Valentine's Day) کہا جاتا ہے۔ ہر سال چودہ فروری  
کو منائے جانے والے دن اس لوگ اپنے محبوب کا انتخاب  
کرتے ہیں اور اس محبوب ہستی کے ساتھ وہ دن گزارتے  
ہیں۔

میں غیر ارادی طور پر چاند اور محبوب کے بارے میں  
سوچ رہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیسرا شخص بھی  
ہمارے پیچھے آ رہا ہو۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر عقب میں  
دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی کے سخن میں ہر جانب  
خاموشی اور چاندنی کا سیر تھا۔

صدف نے پوچھا ”وہ جان! کیا ہوا؟“  
”کچھ نہیں۔“ میں نے انھیں زدہ نظر سے اسے دیکھا  
اور ایک مرتبہ پھر اپنے عقب میں نگاہ دوڑائی۔

وہ بولی ”تم جا چک اس طرح پلٹے تھے جیسے پیچھے سے  
جہیں کی نے آواز دی ہو۔“

”مجھے یوں لگا تھا، کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔“ میں  
نے صاف کوئی کا مظاہرہ کیا۔

”لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں۔“ وہ دوبارہ میرے ساتھ  
جیب کی طرف قدم بڑھانے لگی ”وہ تمہارا وہم ہوگا۔ بعض  
اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں، وہ میرا وہم ہی ہو سکتا ہے۔“  
”مجھے حیرت ہے وہ جان! وہ ایک دم گہری سنجیدگی  
سے بولی ”تم جیسا پر اسرار اور جو پہ شخص بھی بدتم میں جھلا ہو سکتا  
ہے۔“

میں سمجھ گیا، وہ مجھے گھبرانے کی کوشش کر رہی تھی ”تم نے  
مجھ میں ایسی کون سی براسرار اور عجیب بات دیکھی ہے؟“ جب  
بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں نے اسی سے استفسار کر  
ڈالا۔

دو تھوڑی سی بھری بیٹی تھی۔ میرے استفسار نے اس کے  
منہ کے بندھن کھول دیے۔ اس نے جیب کے بیک دیوڑھی میں  
جھرت ناک مناظر دیکھے تھے انہیں دہرایا تھا پھر ایک لمحے کو  
راس لے لینے کے لیے رکی اور پوچھا ”میں ان واقعات کو کیا  
سمجھوں وہ جان! اب یہ نہ کہہ دینا کہ وہ سب میری نظر کا دھوکا  
تھا۔“

”وہ تمہاری نظر کا دھوکا نہیں تھا صدف۔“ میں نے  
گھر سے ہوئے لمحے میں کہا ”چلو، آرام سے گاڑی میں بیٹھ کر  
بات کرتے ہیں۔“

ہم دونوں، خاموش کھڑی انسان پٹرول میں آ کر بیٹھ  
گئے۔

میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں صدف کو شاولن ٹیمپل  
میں اپنی مارشل آرٹس کی تربیت کے بارے میں بتایا۔ وہ  
حیرت اور دلچسپی سے میری کہانی سنتی رہی۔ وہ خود بھی مارشل  
آرٹس کی ماہر تھی اس لیے بھی یہ موضوع اسے زیادہ دلچسپ  
کر رہا تھا۔ دنیا کا ایک کوئی اسٹوڈنٹ یا ماسٹر نہیں، جو شاولن  
ٹیمپل سے واقف ہو، ہر مارشل آرٹسٹ کا یہ خواب ہے کہ  
اسے شاولن ٹیمپل نامی اس سب سے بڑی مستند تربیت گاہ سے  
فیض اٹھانے کا موقع ملے لیکن یہ سعادت خوش قسمتی ہی سے  
ہاتھ آتی ہے۔

”تو تم نے چینی کنگ فو شاولن ٹیمپل سے سیکھا ہے!“  
وہ حیرت بھری آواز میں بولی ”جیسی میں کہوں، تمہاری  
مودتیں میں اس پر شک نہیں کیوں ہے۔“

میں نے کہا ”شاولن ٹیمپل میں سکھا جانے والا کنگ فو  
(Kung-Fu) درحقیقت شاولن کنگ فو (Shaolin Kung-Fu)  
کہلاتا ہے جس کی بنیاد چالو اور کی لڑائی کے  
انداز پر رکھی گئی ہے۔ شاولن کنگ فو کی تربیت صرف قابل  
اتحاد اور اہل اسٹوڈنٹ ہی کو دی جاتی ہے۔“

”تم تو وہاں بھی اپنے ماسٹرز کی آنکھ کا تار رہے ہو!“  
صدف نے کہا ”تمہاری داستان کے خلاصے سے تو میں نے  
بھی نتیجہ اخذ کیا ہے۔“

میں نے کہا ”تم ایسا نتیجہ اخذ کرنے میں حق بہ جانب  
ہو۔ شاولن ٹیمپل میں مجھے دو وجوہات کی بنا پر بہت اہمیت دی  
گئی تھی اور ازاں بعد میں نے خود کو اس سلوک کا حق دار بھی  
جانت کیا۔“

”اور وہ دو وجوہ کون سی ہیں؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”پہلی  
وجہ تو یہی کہ میرے استاد محترم مہاراج وانگ وانگ دنگ یانے نے  
مجھے بنگاک سے شاولن ٹیمپل بھیجے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ میں  
بنگاک میں مہاراج کے جمنائزیم میں رہتے ہوئے عام  
بانگک، کلک بانگک اور موئے تھا کی بانگک کی تربیت لے چکا  
تھا۔ موئے تھا کی بانگک تھا کی لینڈ کا معروف مارشل آرٹ  
ہے۔ مہاراج نے مجھ میں کوئی خاص بات نوٹ کی اور فیصلہ کیا  
کہ وہ مجھے اپنے استاد ماسٹر دنگ پائی کے پاس شاولن ٹیمپل  
بھیجیں گے۔ بنگ پائی اس وقت شاولن ٹیمپل کا سب سے بڑا  
ماسٹر تھا اور وہاں انتظام و انصرام اسی کے اشارے پر چلتا تھا۔  
اسی حوالے سے وہ میرا ادا استاد تھا۔“

آتش فشان ۱۷۰ حصہ ۹

ابھی باہر کھڑی گاڑی تک پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ عقب میں انسان کے اشارت ہونے کی خصوص آواز ابھری۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جب واقعی اشارت ہو چکی تھی۔ صدف نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ”یہ تو واقعی موٹر مینٹیک لکلا۔ اس نے اپنی مہارت سے جیب کا انجن بیدار کر دیا۔“

ہم چلتے چلتے رک چکے تھے۔ خمیں جیب سے کلک کر ہمارے پاس آیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کس گاڑی میں چلیں گے؟ کروڑ لاکھ پڑوں؟“

”تم نے جیب کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ”اس میں کون سی ایسی خرابی پیدا ہوئی تھی جو تم نے پلک جھپکے میں ٹھیک کر دی؟“

وہ موٹی د والے گھاس کے پیچھے سے آکھیں سیڑھ تے ہوئے بولا ”یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑی تھی۔ میں نے اسے اشارت کرنے کی شرفیافہ کوشش کی اور اس نے کسی فرماں بردار بیوی کی طرح فوراً بات مان لی!“

اس کے بیان پر مجھے حیرت ہوئی تاہم میں نے اپنی سوچ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا ”تمہاری شادی کو تو ابھی صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔ یہ فرماں بردار اور نافرمان بیویوں کا تجربہ تمہیں کہاں سے ہو گیا؟“

وہ ایک دم جھنجھپ گیا پھر کہیں ہاں ہو کر بولا ”وہ جی تجربہ تو نہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی ایک سنی سنائی بات کہہ دی تھی۔“

”تم نہیں جانتے کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”اس سے اکثر دھوکا ہو جاتا ہے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔“

میں نے شخص اس سے تفریح لینے کی غرض سے وہ انداز اپنایا تھا۔ فریہ پاشا کا دوست ہونے کے ناتہ وہ مجھ سے اس قدر مرعوب تھا کہ فوراً عاجزی سے بولا ”میں آئندہ خیال رکھوں گا کتاب!“

میں نے کہا ”جب تمہاری شادی کو دو چار سال گزر جائیں اور آئندہ بھی ہماری ملاقات ہو تو پھر میں تم سے بیویوں کے تجربہ بات کے بارے میں سوال کروں گا۔ تم اس وقت جو بھی جواب دو گے، اس میں وزن ہوگا۔ بیوی اور شوہر کے بارے میں تجربہ کیے بغیر جو بھی رائے دی جائے گی، اس کی صحت مشکوک ہوگی۔“

وہ خاموشی سے اثباتی انداز میں سر کو جھکا دیتے ہوئے بولا ”آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ہم واپس کس گاڑی میں جائیں گے؟“

میں نے کہا ”نسان پڑوں کو تم ڈرائیو کرو۔ ہم کر میں جائیں گے لیکن اس سے پہلے سلی کر لو کہ جیب رائے تم جھنجھیں پریشان نہیں کرے گی۔ اگر یہ پھر کسی مقام پر بند ہوئی ہم تمہاری کوئی دیکھیں کر سکیں گے تم کیا تو رات کا باقی رہی بیوی سے دور اسی جیب کے اندر گزاردو گے یا پھر دھکا لگا کر اسے گلبرگ قمری تک پہنچانا ہوگا۔ اگر تم کسی طرح دھکے والے مشن میں کامیاب ہو سکیں گے جو کہ ایک ناکام ہے، تو پھر بھی تمہاری رات کالی ہو جائے گی۔ انجلی طرح صدف سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا کتاب۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا ”میں اسی جیب میں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے، یہ کسی طرح گڑبڑ نہیں کرے گی۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کہا۔

”مجھے تو ایک بات کی حیرت ہے کہ آپ..... آپ.....“ اس نے گنجگاہت آمیز انداز میں جملہ اور جملہ پڑا۔

میں نے کہا ”تم رک کیوں گئے، کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ ”بالکل نہیں، آئندہ پانچ منٹ میں تم جو کچھ بھی کرو گے میں اس پر ناراض نہیں ہوں گا۔“ میں نے فریہ پاشا سے اسسٹنٹ سے مزید تفریح لینے ہوئے کہا ”اس کے بعد کچھ گارٹی نہیں لیتا ہوں اور..... تمہارے وہ پانچ منٹ خراب ہوتے ہیں۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے ایک کٹنگی بھائی۔

صدف میری شرارت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ لے لے وہ خاموش کھڑی تھی۔ خمیں نے حدود مدت سے قلم اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دی ”میں اس بات حیران ہوں و جدان صاحب کہ جب تو بالکل ٹھیک ہے۔ کہ آپ نے میرا مذاق اڑانے کے لیے تو نہیں بلایا!“

مجھے اس کی سوچ پر ہلکی آگئی لیکن اس نے ہلکی ہلکی ایک تشویش بھی مجھے لاحق ہو گئی۔ خمیں اگر یہ کہہ رہا ہے جب میں کوئی خرابی سوچوں تو وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا پھر میری ڈرائیو تک کے دوران میں وہ اچانک بند ہو گئی تھی؟ یہ ایک غور طلب اور سنسنی خیز سوال تھا۔ اس خیزی کو بے پناہ قوت سے اس واقعے سے ملتی تھی کہ کبھی میں گاڑی کو دھکیل کر کوشی تک لے آیا تھا۔ اس احساس ساتھ کوئی دوسرا بھی میرے قدم بہ قدم جیب کو کھینچ رہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے نظر نہیں آیا تھا تاہم میں اس احساس کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے ہاتھ چسپے کوئی شخص میرے پیچھے آ رہا ہو۔ صدف نے اسے دہم فرار دیا تھا اور میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے

کی تباہی بھی کر دی تھی لیکن میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا..... وہاں! کوئی اور ہی چکر ہے۔ کیا پھر ہے، یہ مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب کوئی بات واضح نہ ہو تو انسان کا ذہن الجھتا ہے اور میں واقعی اس وقت بہت الجھا ہوا تھا اور یہ یقین اس وقت تک برقرار رہتی جب تک وہ ناپید نہیں میرے سامنے نہ آتا۔ چاہیں، وہ کوئی شخص تھا یا کوئی ناپید تھی یا پھر، یہی کوئی کارفرما کی؟ فی الحال، میں اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

خمیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد میرے چہرہ کا کھنکھارہ اور اسے تسلی بخش جواب دینا میرے ہاتھں ہاتھ کا مکمل تھا۔ اس نے واقعی ایک استعانہ بات کی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”خمیں! تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔ اول تو میرا تم سے کوئی مذاق نہیں اس لیے میں ایسی کوئی حرکت نہیں.....“ ”یہ تو میں جانتا ہوں۔“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”اسی لیے تو میں پریشان ہو رہا ہوں۔“

”تمہاری پریشانی خود ساختہ ہے۔“ میں نے کہا ”اگر تم کا میں مداخلت نہ کرو تو میں اپنی بات پوری کر لوں!“

”ہی۔ ہی۔ آپ کہیں۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔“ میں نے کہا ”تمہاری سلی کے لیے اتنا ہی بتا دینا کافی ہو گا تو میں نے براہ راست تم سے یہاں آئے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے فون پر اللہ تبارک کو اپنی مجبوری بتائی تھی۔ تم یا تو اس کے کہنے پر آئے یا پھر اپنی مرضی سے اس لیے تمہارا خیال وہم سے زیادہ گھٹنیں۔ بات آئی مجھ میں؟“

”سوری سر۔“ وہ غامت آمیز لہجے میں بولا ”دراصل ٹھیک ٹھاک جیب نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

”پھر تم اسی جیب میں جا کر بیٹھو جو ایسے غلط قسم کے خیالات تمہارے ذہن میں پیدا کر رہی ہے۔“ میں نے نرمی سے لے کر کہتا ہوں ”اب ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“

گوئی کو بند کرنے کے بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ایک لمحے میرے ذہن میں ایک خیال نے سر اٹھار۔ میں نے خمیں کو اپنے پاس بلایا اور استفسار کیا۔

”کیا تم لاہور سے کر رہے والے ہو؟“ ”نہی ہاں، باپ دادا کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں۔“ اس نے فریہ پاشا میں بتایا ”میں بھی یہیں کی پیدائش ہوں۔“

”پھر تو تم اس شہر سے اچھی طرح واقف ہو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”جیتے جیتے سے واقف ہوں کتاب۔“ اس نے کہا ”بے کاری اور بے روزگاری کے دلوں میں، میں نے بہت ستر کیا ہے۔ اردو کا بھی انگریزی کا بھی!“

میں نے پوچھا ”یہ انگریزی کا ستر کیا ہوتا ہے بھی؟“ ”وہاں صاحب! میں دراصل ایس یو ڈبل ایف ای آر، والے (Suffer) کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ”میں گلبرگ قمری جانے سے پہلے ذرا مسلم ٹاؤن کی طرف ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک کوشی کی جھلک دیکھنا ہے۔“

یہ خیال اچانک ہی میرے ذہن میں چکا تھا۔ آج شام سے اب تک میں کسی طرم خان محمد فٹا کے بچوں سے خبر آ رہا تھا۔ اتفاق سے گینڈا فٹا کا بچہ جس نے اپنے باپ فٹا کا پاگل اکل دیا تھا لہذا میں نے سوچا، کیوں نہ اس نے ذہن کا ٹھکانا بھی دیکھ لوں۔ کسی وقت بھی ان معلومات کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

خمیں نے پوچھا ”آپ مسلم ٹاؤن میں کسی خاص جگہ جانا چاہتے ہیں یا بس ایسے ہی چکر لگنا ہے؟“

”میں نے بتایا ہے نا، مجھے ایک کوشی کی جھلک دیکھنا ہے۔“

”اس کوشی کا پتا کیا ہے؟“

میں نے خمیں کو نشان کی آب پارہ مارکیٹ والی کوشی کا پتا سمجھا دیا۔

وہ بولا ”میری معلومات کے مطابق یہ کوشی آب پارہ کے قریب ہی بڑے گی۔ وہاں تک جانے کے لیے ہمیں وحدت روڈ پکڑنا ہوگی۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”تم پہلی فرصت میں وحدت روڈ پکڑ لو۔ جب تم میری مطلوبہ کوشی کے سامنے پہنچو تو اٹری کیڑ دینا۔ ہم جیب کے پیچھے تھوڑا فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔ مجھے معلوم ہو جائے گا، وہ کوئی کون سی ہے اور کہاں پر واقع ہے۔ رکنا بالکل نہیں۔“

”ٹھیک ہے و جدان صاحب! میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔“ خمیں نے کہا ”مگر آپ کی بتائی ہوئی کوشی دائیں طرف پڑی تو میں دایاں اور بائیں طرف پڑی تو میں بائیں اٹری کیڑ دوں گا۔“

پھر ہم آگے پیچھے فاضلیہ کالونی والی پاشا کی کوشی سے روانہ ہو گئے۔ ہم شاہ جمال روڈ پر آنے کے بعد شدادمان



کالونی کی طرف نہیں گئے بلکہ ہمارا رخ اس وقت فیروز پور روڈ کی جانب تھا۔ تحسین جیب میں ہم سے آگے تھا اور ہم لگ بھگ سو گز کا فاصلہ رکھ کر اس کے عقب میں جا رہے تھے۔ گاڑیوں کی رفتار معتدل تھی۔

میں فیروز پور روڈ خاصی کشادہ سڑک ہے پھر وہ رات کا آخری پہر تھا اس لیے مجھے وہ نہیں خالی ملی۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ٹیکسی اور درحمان پورہ سے گزرے پھر آئندہ سٹیشن سے تحسین نے جیب کو دائیں طرف موڑ لیا۔ رات کے اس وقت سٹنگل کی پابندی ضروری نہیں رہتی۔ اس لیے تمام سٹنگل کو فوری کر دیا جاتا ہے سرخ اور ہزرتیاں لگی اڈھ کر سو جاتی ہیں۔ صرف بجلی لائٹ نائٹ وائج میں کار کردار ادا کرتی ہے اور مسلسل چل بجھ میں مصروف رہتی ہے۔

میں نے بھی تحسین کی تقلید میں کر دیا کہ وہ دائیں جانب ٹرن کیا۔ اب ہم وحدت روڈ پر تھے۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد آپ بارہ مارکیٹ آگئی پھر تحسین رہائشی علاقے میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد اس کی گاڑی کا اڑی کیئر اپنا ٹنکشن کرنے لگا۔ میں نے اس اشارے پر اپنی مطلقہ کو کھینک لیا۔ وہ ایک چھوٹی دو منزلہ سفید رنگ کی گلی تھی۔ میں نے مذکورہ گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے نیم پلیٹ پر لگا دوڑائی۔ وہاں کسی ششاد علی ایڈوکیٹ کا نام لکھا تھا۔ پتا تھا جو قادر بخش کی زبانی میری یادداشت میں محفوظ ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں خفا نامی اس شخص کی جالاکاری کی داد دے بغیر نہ رہ سکا۔ دلیل والی آڑ اس نے خوب لی تھی۔ یہ تو مجھے تو قحطی کی گلی کی نیم پلیٹ پر مجھے غر خفا کا نام نظر نہیں آئے گا لیکن کسی "ایڈوکیٹ" کا بھی ملنے تصور نہیں کیا تھا!

چند گلیوں میں محکمہ تحسین ہمیں نہر کے کنارے لے آیا پھر ایک جگہ اس نے جیب روک دی۔ میں نے اس کے برابر کر دیا روکی اور سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے پوچھا "وجدان صاحب! آپ کا مقصد پورا ہو گیا یا نہیں؟"

"تم نے اس گلی کی پھر پور نشان دہی کر دی ہے۔" میں نے جوابا کہا "میں نے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی اذہر کر لیا ہے۔ اب ہمیں فوری طور پر واپس چلنا چاہیے۔" تحسین نے سفید گلی اور اس کے مین کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور یوں "ٹھیک ہے، آپ میرے پیچھے آئیں۔ اب ہم دوسرے راستے سے گھر جائیں گے جو شارٹ کٹ بھی ہے۔"

ایک مرتبہ پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ نہر کے کنارے

چلتے ہوئے ہم نے فیروز پور روڈ کو عبور کیا پھر ایف کی گلی کی پاس سے گزرتے ہوئے ہم ٹھوڑا آگے جا کر گھبرگ میں داخل ہو گئے۔ لاہور کے قلب سے گزرنے والی یہ نہر درحقیقت ایک برانچ کینال ہے جو ایک بڑی نہر اپ باری دو آب سے نکلتی ہے۔ یہ برانچ کینال لاہور میں شامل شرق کی طرف سے داخل ہو کر جنوب شرق کی سمت چلی جاتی ہے۔ اس کے اطراف میں، سڑک کے ساتھ ساتھ سبز و شاداب "نہر بر" کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس کے بعد صاحب ثروت افراد رہائشی علاقہ ہے۔ یہ نہر اور اس کے کناروں پر استاد بزرگ بہت درخت ہوا سے اٹھیلیاں کرتے ہوئے جنت نظیر مناظر تخلیق کرتے ہیں۔

ہم آگے پیچھے سفر کرتے ہوئے فرید پاشا کی گلی پر پہنچ گئے۔

گلی پر امنی دامن کی صورت حال نے ہمارا استقبال کیا۔ مستند سکھ پوری گاؤں میں دین الہی ڈیوٹی پر مخصوص کنبہن میں موجود تھا۔ اس نے ہمیں "سب ٹھیک ہے" کا سٹیل ڈی-ام گاڑیوں کو گیرانج میں پہنچا کر گلی کے اندر آگئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بجے تھے۔ ہمارے پاس ڈھائی گھنٹے کا وقت تھا۔ اسی دوران میں ہمیں نیند لینا بھی اسی آرام کرنا تھا۔

میں نے اللہ دتا سے پوچھا "زرنگ سو گئی یا ابھی تک جاگ رہی ہے؟" "صاحب جی! ان حالات میں سو کوں سکتا ہے۔" سنجیدگی سے یوں "وہ دونوں جاگ رہی ہیں۔" میں نے تحسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم اپنی پہلی کے پاس چلے جاؤ اور زرنگ کو باہر بھیج دو۔ مجھے امید ہے، یہاں مزید ڈسٹرب نہیں ہونا پڑے گا۔"

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ زرنگ ہمارے ہاتھ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اللہ دتا نے پوچھا "وجدان صاحب! اب تو چائے چلے گی نا؟"

میں نے کہا "رہے دو۔ تم بھی ٹھوڑا آرام کرو۔ لوگ! نہیں، کیا حالات پیش آئیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ بیٹھ کر چلنا ہے۔ میں بھی ایک گلی کی نیند لینا چاہتا ہوں۔" اللہ دتا سمجھدار کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگا تو اس نے "آپ لوگ جہاں اور جس طرح چاہیں آرام کریں۔" بیدارم زیریں منزل پر بالکل تیار حالت میں خالی ہیں اور نہ ہالائی منزل پر ہے۔ میں نے آپ کی غیر موجودگی میں کرن

کی ہر شے ضرورت کے مطابق سیٹ کر دی ہے۔" اللہ دتا رخصت ہوا تو میں صدف اور زرنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے باری باری انہیں دیکھا اور کہا "میں تو یہیں ڈرائنگ روم کے صوفے پر کرسی سیدھی کر لوں گا۔ تم دونوں کا ارادہ ہے؟"

"مجھے تو بالکل نیند نہیں آ رہی۔" صدف نے کہا "دراصل میں نے دن میں، یہاں سے جانے کے بعد ایک گھر پر نیند لے لی تھی۔"

زرنگ نے کہا "وجدان! تم جانتے ہو، میں کس قسم کے حالات سے گزر رہی ہوں۔ میری نیند بھی اچانک ہو گئی ہے لہذا آج تک جاگتا ہی ہوگا۔"

میں نے محسوس کیا وہ دونوں سونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"نیند نہ بھی آئے پھر بھی آرام بہت ضروری ہے۔" میں نے غصے سے بولے "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ زریں منزل والے دونوں بیدارم تم سنبھال لو۔ میں یہاں ڈرائنگ روم میں موجود ہوں۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس دفعہ انہوں نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اور کچھ بعد دیگرے ڈرائنگ روم سے اندر کرکروں کی طرف چلی گئی۔ زرنگ کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں اس وقت قہقہے لگانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی داستان صبح بھی سنی جا سکتی تھی۔ کل کے حالات کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ پوری طرح چاق و چوبند رہنے کے لیے ٹھوڑی نیند از حد ضروری تھی!

میں ایک آرام دہ صوفے پر دراز ہو گیا اور آٹھ گھنٹے بند کر لیں۔ اگرچہ مجھے کوئی خاص نیند نہیں آ رہی تھی پھر بھی مجھے سونا تھا۔ آٹھ گھنٹے نہ کرتے ہی میرا دھیان فرید پاشا کی طرف چلا گیا۔ فرید ایک شخص اور سچا جاں نثار دوست ثابت ہو رہا تھا۔ میری عمری وجہ سے وہ بے چارہ اچانک مشکلات میں گھر گیا تھا۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باپ کے انتقال میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن اس کی دیگر معیتیں پھر سے عیب سے محسوس۔ سکندر اور رانا عفت کی دشمنی ہی کیا کم تو بات فضا کا سلسلہ بھی نکل آیا۔ یہ سلسلہ اگر دراز ہو جاتا میری موجودگی کی وجہ سے تھا۔ اگر میں پاشا کا مہمان نہ ہوتا تو

وہ اس قسم کے ممکن حالات سے دو چار نہ ہوتا۔ اس تاخیر میں سوچتے ہوئے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے پہلی فرصت میں فرید پاشا سے دور ہو جانا چاہیے۔ دوئی دورہ کر بھی تو بھائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کی دوستی، دوست کے لیے مشکلات کمزوری کر رہی ہو تو ایک فاصلہ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میں تو ایسا شخص تھا کہ ہر پہل دشمن میرے ہم رکاب رہے تھے۔ مجھے ان کی عادت ہو گئی تھی اور ان سے منٹنے میں مجھے محروم آتا تھا۔ میں کچھ دشمن پیشہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک اہل فیصلہ کر لیا کہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا اور ساحل کو حاصل کرنے کے بعد میں فرید پاشا سے فاصلہ برحالوں گا۔ ویسے بھی یہ گلی اب میرے لیے زیادہ محفوظ پناہ گاہ نہیں رہی تھی۔ شیب غوری میرے اس ٹھکانے سے واقف ہو چکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اس نے اب تک کوئی اونچھی حرکت نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں چوہدری نواز شعلی کے بعد وہ محض میرا دشمن اول تھا۔ میں اسے اور وہ مجھے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ شیب یا اس کے بندے سچے جہاز کر اس گلی کا پیچھا کرتے، مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔

پھر مجھے شیب غوری کی دھمکی یاد آگئی۔ اس نے ٹیلی فون پر رابطے کے دوران میں بڑے سنگین الفاظ میں کہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے تمہاری فلاح و بہبود کے لیے ایک مستند اور کھنہ مشق قتالی سے رابطہ کر لیا ہے۔ وہ تمہاری ایسی لیس بندی کرے گا کہ ہر تم ساری زندگی صف بندی کے قائل نہ رہو گے!

شیب غوری کوئی غیر سنجیدہ یا کٹر شخص نہیں تھا کہ میں اس کی وارننگ کو کوئی خالی خولی دھمکی سمجھتا۔ وہ ایک فعال تنظیم "سی ایف کے" کا پاس تھا اور یہودی لابی اس کی پیچھے ٹھوک رہی تھی۔ وہ بہت ہی خطرناک اور خفاک شخص جو کسی لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی سفاکی کا مظاہرہ اپنے تین ساتھیوں کی بجائے ایک موت کی صورت دیکھا تھا۔ شیب غوری کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خیال فضا کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ فضا ہی وہ فضا کی تو نہیں جس کا ذکر غوری نے کیا تھا۔ شیب کالاہور میں منیت درک نہیں تھا لیکن یہ عین ممکن تھا، اس نے میری سرکوبی کے لیے فضا جیسے شخص سے ٹک جوڑ کر لیا ہو! سکندر اور فضا کا رابطہ ضبط بھی یہی ظاہر کرتا تھا کہ انہیں میری تلاش تھی۔ کیا یہ تلاش شیب غوری کی فرمائش پر شروع کی گئی تھی؟

میں اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ فضا اور چوہدری دلدار کا تعلق چوہدری نواز شعلی سے ہوگا۔ اب نظر آ رہا تھا کہ یہ سارا



کھیل شعیب غوری کا بھی ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں فریہ  
پاشا کو کسی وبال سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ میں غوری  
طور پر اس سے کنارہ کش ہو جاؤں، چاہے عارضی طور پر ہی  
سہی! اس کی کوئی کاراستہ میرے اتنے دشمنوں نے دیکھ لیا تھا  
کہ اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی۔ انہی دشمنوں میں وہ  
بہر پیا بھی شامل تھا..... علی و دہان!

میں اس شخص کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں  
کر پایا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ میرا دشمن ہے یا  
دوست! اگرچہ ڈارلنگ والے باکس میں سے جو تہ شدہ پرچہ  
برآمد ہوا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ میرا خیر خواہ ہے۔  
ڈارلنگ کے شر سے مجھے بچانے کے لیے اس نے اس بلی کو  
فرق کر ڈالا تھا۔ اس کا خیال تھا، کوئی بدروح ڈارلنگ کے اندر  
گھس آئی تھی جو مجھے شدید قسم کا نقصان پہنچانے والی تھی۔  
ماضی میں، پدی کی قوتوں سے مجھے قدم قدم پر واسطہ پڑتا رہا  
ہے۔ یہ بھی ممکن تھا، تعاقب کا سلسلہ ابھی موقوف نہ ہوا ہو اور  
میری دشمنی پر اسرار قوتوں کی باقیات ڈارلنگ کو وسیلہ بنا کر مجھ  
تک پہنچ گئی ہو۔ ڈارلنگ نے متعدد مواقع پر میری مدد کی تھی  
اس لیے اس کی موت کا مجھے بہت زیادہ غم تھا۔ اگر بہرہ دے  
وہ دہان کا کہا درست تھا تو پھر میں یہی کہوں گا کہ ڈارلنگ نے  
اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے مجھے ایک مرتبہ بچر محفوظ کر دیا  
تھا۔ افسوس صرف اس بات کا تھا کہ میں ڈارلنگ کے لیے کچھ  
نہیں کر پایا تھا۔

پھر اس رات کا منظر میری نگاہ میں محوم گیا جب میں نے  
اس کی اصلیت جاننے کے لیے اس پر تنویدی عمل کیا تھا اس  
تنویدی عمل میں جی کا بگھار بھی شامل تھا لیکن عین آخری لمحات  
میں، جب کہ میں ڈارلنگ کا راز بانے ہی والا تھا کہ فریہ پاشا  
کی بیوی نائلہ کی دلخراش چیخ نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔  
میں انگش فلم ”گولڈ مین“ کے ہیرو ڈنجر ڈیولک سے مشابہ  
تین افراد سے منٹنے کے لیے ہر شے کو فراموش کر کے نائلہ کی  
طرف دوڑ پڑا تھا۔

اگر اس وقت مجھے چند لمحات کی مہلت مل گئی ہوتی تو ممکن  
ہے میں ڈارلنگ کی اصلیت کو پالیتا۔ وہ کسی پدی کی قوت کے  
زیر اثر بھی یا نیکی کی قوت اس کے اندر کا فرما بھی اس کا فیصلہ ہو  
جاتا۔ بہر حال، اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی  
کہ ڈارلنگ ایک حیرت انگیز اور براسرار بلی تھی۔ میں اپنی  
زندگی میں آنے والے اس کردار کو بھی فراموش نہیں کر سکتا  
تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے میرے دل و دماغ میں ایک محسن کی  
حیثیت سے نقش ہو کر رہ گئی تھی!

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ کسی نے میرا نام سنا  
پکارا۔ آواز سرگوشیانہ اور واضح تھی۔ میں نے بے احتیاطی  
آنکھیں کھول دیں اور ڈارلنگ روم میں نظر دوڑانے لگا  
میری متلاشی نظر کو ناکامی ہوئی۔ ڈارلنگ روم میں کسی گیم  
موجود نہیں تھا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی۔ کیا میری سماعت  
دھوکا ہوا تھا؟

میں بے یقین ہو گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ میرے  
ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ میں نے بڑے کھلے اور واضح الفاظ میں اپنا  
نام سنا تھا۔ کسی نے مجھے پکارا تھا لیکن یہاں کسی شخص کے  
آواز دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرنا  
سے پہلے ڈارلنگ روم کی لائٹ آف نہیں کی تھی۔ یہ بھی محو  
نہیں تھا کہ مجھے پکارنے والا آواز دے کر چھپ گیا ہو۔ مگر  
نے اپنا نام سننے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔

میں تشویش ناک انداز میں بڑی سرعت سے سوچنے لگا  
میری سماعت کو بار بار دھوکا کیوں ہو رہا تھا؟ فاصلہ کالونی اور  
کوئی کے مگن میں بھی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی ہمارے  
پیچھے آ رہا ہو۔ میں نے قدموں کی باقاعدہ آواز سن لی تھی  
صدف نے اسے میرا وہم قرار دے کر بات ختم کر دی۔ اب  
سے قبل نسان پٹرول کو پیش دیتے وقت بھی میں نے جبکہ  
محسوس کیا، وہ ناقابل فہم اور حیرت انگیز تھا۔ تو کیا کوئی قوت  
میری ہم سفر بن چکی تھی۔ یہ قوت نیکی کی بھی یا پدی کی، انہما  
فیصلہ کرنا ناممکن نہیں تھا کیوں کہ اس نے ابھی تک ذاتی طور  
مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی فائدہ! اللہ ایک بات  
پورے وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ میرے ساتھ کوئی ہمارا  
معاملہ شروع ہو چکا تھا جسے میں فی الحال سمجھ نہیں پا رہا تھا۔  
پر اسراریت کے حوالے سے میرا دھیان ایک لمحے  
لیے میگلری کی طرف بھی گیا جو چھپکلی کی روز سے غائب تھی۔  
آخری خواب ناک ملاقات میں اس نے بڑے فراریت  
دعویٰ کیا تھا کہ اب وہ کبھی بھی میری طرف نہیں آئے گی کہ  
مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی..... مجھے ہالہ کی  
میں اس کے مسکن تک جانا ہوگا اور ہر حال میں جانا ہوگا۔ مگر  
ممکن تھا، میگلری نے اپنی کسی پر اسرار کارروائی کا آثار کار  
ہو۔

میگلری کی دو خواہشیں میں نے نوٹ کی تھیں۔ ایک وہ  
حصول اور دوسرے مجھے ساحل سے دور رکھنا۔ وہ اپنے تہ  
میں جزدی طور پر کامیاب رہی تھی۔ ساحل کا آغوا اور نے  
اے انیسیم کے بنگلے میں پیش آنے والے واقعات اسی لیے  
کڑیاں تھے۔ سرمہ بدن لیلیٰ کے جلو میں اس نے جو کچھ

دکھائی، میں ابھی تک اس کے عمر میں تھا!

دیوار گیر لاکھ لاکھ نے صبح کے چار بجے کا اعلان کیا تو میں ان نے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کے لیے خود کو ہدایات دینے لگا۔ میں نہایت ہی پرسکون بیٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک سات بجے میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن میری اس نیند کے دوران میں اگر اس کوئی کی حدود میں کوئی غیر معمولی یا سنگین واقعہ پیش آنے کی توقع یا آج ناموراد ہوئے تو وقت مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ فوراً کھل جائے گی۔

آئندہ چند لمحوں میں، میں نیند کی مہربان آغوش میں سر رکھ چکا تھا۔

☆☆☆

عملی لوگ بہت کم خواب دیکھتے ہیں، انہیں عمل ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ تھک ہار کر سونے کے لیے اگر کچھ وقت میسر آتا ہے تو وہ ایسا خبر سوئے ہیں کہ بھر اگلے دن ہی کی خبر لاتے ہیں۔ میری ساری زندگی پر یکپل گزری تھی اس لیے مجھے بہت کم خواب دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے جو بھی خواب دیکھا وہ لالچینی اور بے معنی بھی نہیں رہا۔

اس رات میں لگ بھگ چار بجے سویا تھا۔ یہ رات نہیں بلکہ صبح ہی تھی۔ میں نے صبح سات بجے تک سونے کے لیے ذہن کو ہدایت دی تھی لیکن ساڑھے پانچ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں پورے دن سے بیٹے میں نہایا ہوا ہوں۔ یہ سحر جیرت کی بات تھی۔ ایک ششدری غار رات میں بیٹنا! ہدایت کے خلاف بل از وقت آنکھ کھل جانا یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اس کوئی غیر معمولی واقعہ ہو چکا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔

پھر مجھے یاد آیا کہ میں ایک انوکھا خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ میں نے بے آہستگی صوفہ چھوڑا اور ڈرائنگ روم کا تنہیدی جائزہ لیا۔ ہر شے معمول کے مطابق اور اپنی جگہ پر تھی۔ میں اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ محتاط قدموں سے چلتے ہوئے میں نے کوئی کے اندرونی حصے کو ہر طرف جھانک کر دیکھ لیا۔ ہر جانب امن و امان کی صورت حال تھی۔ کوئی کے عقبی حصے میں سکون تھا۔ گیٹ پر چوکیدار عمر دین المعروف بے سیکورٹی گارڈ مستعد کھڑا تھا۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا تو پھر میری آنکھ خلاف معمول کیوں کھل گئی؟ کیا میرے دماغ نے مجھے دھوکا دیا تھا؟

یہ میرے لیے ایک ناقابل یقین بات تھی اس لیے میرا پوچھا۔

آتش فشانی حصہ 9

دھیان لامحالہ اس انوکھے خواب ہی کی طرف چلا گیا۔ واپس ڈرائنگ روم میں آیا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر خواب کے بارے میں سوچنے لگا۔ نیند کا اب سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جو خواب دیکھا وہ اپنی نوعیت کا خواب تھا۔ میں نے خواب میں خود کو دیکھا تھا۔ اپنے آپ کو وہ ہو رہا تھا۔ وہاں! میں اور وہاں! ایک رات مختلف مناظر کے کردار رہتے ہوئے تھے اور اس بات پر ابھن یا حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ میں خواب میں ایک لے لیے بھی نہیں چونکا کہ جب وہاں میں ہوں تو پھر وہاں کیا سستی رکھتا ہے۔ میرے علاوہ کوئی اور وہاں کی ہے؟ اس قسم کا کوئی سوال یا اعتراض میرے ذہن میں نہیں ہوا۔ خواب کے دوران میں دوسرا وہاں میرے اندر داخل ہو کر میرے وجود کا حصہ کیا تو اسی لمحے آنکھ کھل گئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، خواب دیکھتے وقت ایک لے لیے مجھے عملی وہاں کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ میرے خواب میں داخل نہیں ہوا لیکن اب میرا خیال اس طرف چار ہوا تھا۔ میں نے جب بچپن کی سے اپنا جو کچھ یاد تیرے پر پہنچا کر پچھلے آٹھ دس گھنٹے میں اس ہر پورے کے سوا سے جو واقعات پیش آچکے تھے۔ شاید انہی کی خیالی بارش نے مجھے وہ خواب دکھا دیا تھا۔ میں نے ان تمام خیالات ذہن سے جھٹک دیا۔

اسی وقت ڈرائنگ روم کے نیم وادروازے پر صرف صورت نظر آئی۔ وہ کسی بلی کی مانند بے قدموں وہاں آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے اس سے کہا "تم کیوں سوئی نہیں ہو؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی۔ وہ میرے متقابل دوسرے صوفے پر بیٹھے ہوئے بول رہی تھی۔" ابھی تو وہی دیر پہلے تم میرے بیچروم کے سامنے سے گزر رہے تھے؟

"ہاں گزرا تھا۔" میں نے تائیدی انداز میں بولا "تم نے کہا؟" "کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

"دیکھا تو نہیں، بس یوں محسوس ہوا جیسے وہاں سے گزر رہا ہو!"

مجھے اس کے بیان پر شک ہوا۔ دیکھتے بغیر وہ اسے سے کس طرح کہہ سکتی تھی کہ گزرنے والا میں ہی ہوں۔ میرے علاوہ بھی تو کوئی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے متنبہ کیا۔

"اسی جہیں کوئی پراسرار کشتی حاصل ہو گئی ہے۔ جو تم بغیر مجھے اندرست اندازہ لگا سکتی ہو؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بات بتاتے ہوئے بولی "میں نے ایک اندازہ لگا لیا جو اتفاق سے کچھ لگا، اس میں کسی شے کا کوئی دخل نہیں، تم خواہ مخواہ کی وہم میں مبتلا نہ ہو۔"

میں نے اس سلسلے میں صدف سے زیادہ جرح نہیں کی۔ پڑنے یقین تھا کہ اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے دیکھ لیا ہوگا اور اب بات مجھ سے چھپا رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"آج تو وہم ڈے ہے۔ فاضلیہ کالونی والی کوٹھی میں مجھے وہم ہوا کہ ہمارے پیچھے کبھی کوئی آ رہا ہے اور اب بھی تم مجھے کیوں نہیں جھٹلاتے ہوئے کا مشورہ دے رہی ہو۔"

وہ چانک بات بدلتے ہوئے بولی "کیا تم کسی خاص نام سے آئے تھے؟"

"نہیں، کوئی خاص کام نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "تم نے تو ہی بہت نیند لے لی یا میری طرح ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"میں نے ذیادہ گھنٹے کی نیند لے لی ہے۔" میں نے بولا۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی۔ وہ میرے متقابل دوسرے صوفے پر بیٹھے ہوئے بول رہی تھی۔" ابھی تو وہی دیر پہلے تم میرے بیچروم کے سامنے سے گزر رہے تھے؟

"ہاں گزرا تھا۔" میں نے تائیدی انداز میں بولا "تم نے کہا؟" "کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

"دیکھا تو نہیں، بس یوں محسوس ہوا جیسے وہاں سے گزر رہا ہو!"

مجھے اس کے بیان پر شک ہوا۔ دیکھتے بغیر وہ اسے سے کس طرح کہہ سکتی تھی کہ گزرنے والا میں ہی ہوں۔ میرے علاوہ بھی تو کوئی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے متنبہ کیا۔

آتش فشانی حصہ 9

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تمہارا جائے کام وہ تو میں بتا لاتی ہوں۔ میں تو اس وقت خواہش محسوس کر رہی ہوں۔ دراصل، میں بیڈنی پیلے کی عادی ہوں۔"

میں نے کہا "اگر تمہیں خواہش ہو رہی ہے اور یہ تمہاری عادت بھی ہے تو تم ضرور چائے بنا کر پی لو۔ میرا تو اس وقت سو نہیں ہو رہا۔"

"اگر تم نہیں پی رہے ہو تو پھر کیا فائدہ۔" وہ بے پروائی سے بولی "میں نے سو چا تھا، اگر تم ساتھ دو تو پھر ہمت کی جا سکتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ ہمت کی نہیں بلکہ عادت کی بات ہے۔ میرے ساتھ دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بیڈنی کی عادی ہو تو تمہیں ضرور چائے لینا چاہیے۔"

"تمہیں فرق نہیں پڑتا ہوگا لیکن مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔" "چائے پینے سے یا نہ پینے سے؟" میں نے مصومیت سے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ دینے یا نہ دینے سے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے دھڑک انداز میں بولی۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی۔ وہ میرے متقابل دوسرے صوفے پر بیٹھے ہوئے بول رہی تھی۔" ابھی تو وہی دیر پہلے تم میرے بیچروم کے سامنے سے گزر رہے تھے؟

"ہاں گزرا تھا۔" میں نے تائیدی انداز میں بولا "تم نے کہا؟" "کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

"دیکھا تو نہیں، بس یوں محسوس ہوا جیسے وہاں سے گزر رہا ہو!"

مجھے اس کے بیان پر شک ہوا۔ دیکھتے بغیر وہ اسے سے کس طرح کہہ سکتی تھی کہ گزرنے والا میں ہی ہوں۔ میرے علاوہ بھی تو کوئی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے متنبہ کیا۔

آتش فشانی حصہ 9

# انکا اقبال غلام رحیم

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
 فون: 5802551 5802552 5895313  
 kkitablat1970@yahoo.com  
 رابطہ کیلئے: C-63/2 II سیکشن، نزدیکی سمن راولپنڈی

اس کے انداز نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجادی۔ میں نے پوچھا ”کیا ایسی ہی بات ہے؟“

”بالکل ایسی ہی بات ہے!“ وہ طبیعت سے بولی پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی اور کہا ”میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

ہمارے درمیان بڑے ہم انداز میں بات چیت ہوئی تھی لیکن صدف کے طور مجھے بہت دور تک پہنچنے پر مجبور کر رہے تھے اور اسی دوری میں فریڈ یا شاید منہاس ہانڈر کے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت بھی شامل تھی۔ ان دو مرد شناس افراد نے فتویٰ دیا تھا کہ صدف آگے چل کر میری زندگی کا ایک حصہ بن جائے گی۔ ان حضرات کی پیش گوئی کے پورا ہونے کے آثار دکھائی دینا شروع ہو گئے تھے۔

صدف ہلاکی پر اعتماد اور بے باکی لڑی تھی۔ اسے کوئی بات کہنے میں دو بلخ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہ اس کی مارشل آرٹس کی ٹریننگ کا نتیجہ تھا۔ سخت اور مشقت دار اسکیم سائز نے اس کی سوانحیت میں قدرے کمی کر کے اس کے اندر مردانیت کا سا انداز پیدا کر دیا تھا۔ وہ بڑے دھڑلے سے بات کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی فریڈ بھی موجود تھی جس میں چائے کی دو پیالیاں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ٹرے کو میز پر میرے سامنے رکھا اور ایک پیالی اٹھالی۔ مطلب یہی تھا کہ دوسری پیالی میرے لیے ہے۔

”میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔“ میں نے چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”مجھے اس وقت چائے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ اگر میں نے یہ پیالی معدے کے اندر اتار لی تو مجھے فوراً نیند آنا شروع ہو جائے گی۔ چائے اور کافی میرے لیے کسی ایسی نازر (Appetizer) یا سلیپنگ پائل (Sleeping Pills) سے کم نہیں ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ وہ بڑی لگاوت سے بولی ”میں اتنی محنت سے تیار کر کے لائی ہوں۔ اپنے معمول کو ایک دن کے لیے تو زود کے تو کوئی قیامت آ جائے گی؟“

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ واقعی اگر میں ایک روز بیڈنگ لے لیتا تو اس سے کسی قسم کی قیامت مٹتی یا کبھی نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور میر پر رہی ٹرے میں سے چائے اٹھا لی۔

”شکر یہ وہ جان۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”تم نے میرا مان رکھ لیا۔“

میں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

صدف نے استفسار کیا ”وہ جان! دے دیجئے تمہارا روزنامہ معمول ہے۔ تم صبح اٹھ کر، ناشتے سے پہلے کیا کرتے ہو؟“

”میں صبحی الصبح اٹھتا ہوں اور سب سے پہلے روزنامہ چند مشقیں کرتا ہوں جن میں جی کی اینڈوائس مشقیں شامل ہیں۔“ میں نے بتایا ”اس کے تھوڑی دیر بعد ناشتا کرتا ہوں۔“

وہ جلدی سے بولی ”جی کے حوالے سے یاد آ کر مجھے ہم فاضلیہ کالونی والی کوٹھی میں تھے اور میں نے اس وقت حاصل کرنے کے لیے تمہاری راہ نمائی والی بات کی تھی۔“

بے ساختہ چونک کر کہا تھا۔۔۔۔۔ اسے بھی یہ سب کچھ کچھ یاد تھا۔ میں نے جب ”اے“ کے بارے میں پوچھا تو تم نے مجھے مہلانے کی کوشش کی۔ اس وقت تو میں نے تم پر زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن اب ضرور پوچھوں گی، وہ کون ہے اور اب کہاں ہے؟“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر میرے چہرے پر ہنس جاتے ہوئے بولی ”تمہارے لہجے کی اداسی نے مجھے اتنا دیا ہے کہ وہ ہستی اب تمہارے ساتھ نہیں۔ کیا وہ بیچہ بیز کے لیے تم سے جدا ہوئی ہے یا۔۔۔۔۔“

”صدف!“ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

میری آواز ابھی خاصی بلند تھی اور اس میں ایک ناخوش کا چار حانہ بین پایا جاتا تھا۔ اسے دیوانگی بھی کہا جاسکتا ہے۔ صدف نے بات کے اختتام پر مڑت کھانچا استہلال کر کے تو بات کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہی ہے لیکن اس کے الفاظ ”ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے جدا“ میرے اندرون کو سمجھوڑ کر رکھ دیا اور غیر ارادی طور پر دیا گئی کے سے انداز میں غرایا تھا۔ صدف کو اتنے جذباتی اور دھشیا نہ انداز میں پکار کر میں نے اس کے خیال پر مہربان لگا دی تھی۔

وہ بے دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غماز آمیز لہجے میں بولی ”وہ جان سوری! خدا ناخواستہ، میں مجھ کسی جذباتی یا روحانی صدمے سے دوچار نہیں کرتا چاہوں۔ بس ایک بات روانی میں میری زبان سے پھسل گئی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”دوبارہ چائے کے ساتھ صرف وہ ہو گیا۔“

صدف نے پھر اس سلسلے میں کوئی مزید کچھ نہیں کہا۔ سمجھ گئی تھی کہ اس ہستی سے میرا کوئی جذباتی تعلق ہے جس نے مجھے بے اختیار کر دیا۔ صدف نے حالانکہ ایک عام کامیاب

فیوژن ساحل کا معاملہ میرے لیے اتنا نازک تھا کہ میں نے اسے خالص لیا اور بے ساختہ روٹل کا اظہار کر دیا۔ میں بھی بولے سے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ساحل مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔۔ الفاظ بہت ہی سنگین تھے اور اپنے اندر موت کی سفاکی لیے ہوئے تھے۔ موت ایک اہل حقیقت ہے۔ کوئی ذی روح اس سے انکار نہیں کر سکتا اور ہر انسان کا اس کا آئندہ چمکانا ہے لیکن اپنی عزیز ترین ہستی کی موت کا تصور یاد کر کس طرح قلب دروہ پر آبلے ڈال دیتا ہے اس بات کا اندازہ دو ہی لگا سکتا ہے جس نے کسی کو چاہا ہو، کسی نے نہیں کیا ہو۔ ساحل میری چاہت تھی، میری محبت تھی۔ میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ خیالی کی تمہائیوں اور وقت کی گتھائیوں سے گزر کر اس سے محبت کی تھی۔

میں اس کی ایسی جدائی کا تصور کبھی کر سکتا تھا۔ میں تو اس کی عارضی اور وقتی جدائی میں آبلہ پا اس کے سراغ کی جانب متوجہ تھا۔

ہمارے درمیان آج کا چمک خاموشی نے ایک دبیر چادر تان دی۔ صدف منہ سے بولی اور نہ ہی میں نے زبان سے ایک لفظ ادا کیا۔ ہم اپنے اپنے خیالوں میں کم سر جھکائے وقفے وقفے سے چائے کی گتھائی خیرینی سے اپنے لب سیکنے رہے اور تصور میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھتے رہے۔

مجھے اور سات بجے کے درمیان گھر کے دیگر افراد بھی بکے بعد دیکھے بیدار ہو گئے۔ موسم کی مناسبت سے سات بجے کے وقت کو صبحی الصبح کہا جاسکتا تھا۔ ساڑھے سات بجے ہم سب ناشتے کی میز پر تھے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں بوسہ زد کر کے ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ ابھی تک اس کے گلے کر بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مصیبت زدہ چشموں دو شیزہ مجھے اپنی طویل داستان سنا چاہتی تھی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا، میں جتنی جلدی ممکن ہو، وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ ناشکیا کی طرف سے پھر کسی ادھیسی اور ناخوشگوار حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ، وہ اب تک دم سادھے کیوں بیٹھا تھا۔ مجید، عمران اور جلال کی دایبھی کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر اسے فوراً ایکشن میں آ جانا چاہیے تھا۔ اس کا پہلا اور آخری نشانہ فریڈ یا شکی کوٹھی ہی ہوئی!

میں نے زرنگ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”اب تک تم نے بات ابھی طرح جان بچلی ہو کہ چند لمحات کے بعد مجھے اپنے دوست فریڈ یا شکی کے گاؤں سید پور روانہ ہونا ہے۔ فی الحال مجھ سے پاس تم سے تفصیلی گفتگو کا وقت نہیں۔ اگر تم ایسا

چاہتی ہو تو چند روز کے لیے اسی کوٹھی میں رک جاؤ۔ میں دو تین روز میں واپس آ جاؤں گا۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ”دے دیجئے تو تمہارے لیے صرف ایک رات گزارنے کا مسئلہ تھا۔ تم نے کہا تھا کہ صبح تم اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاؤ گی۔ تم جہاں بھی جانا چاہو، تمہیں بے حفاظت پہنچا دیا جائے گا۔ بولو، کیا کہتی ہو؟“

جس طرح یہ طے تھا کہ صدف میرے ساتھ سید پور جائے گی بالکل اسی طرح میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ زرنگ کو اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔ وہ چند لمحے در دیدہ نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔

”فی الحال تو میرے سامنے کوئی حقیقتی منزل نہیں ہے۔ حکمت یار کے بندوں سے میری جان محفوظ ہو چکی ہے۔ آئندہ بالاحتمال بہت سوچ سمجھ کر بنانے کی ضرورت ہے۔ ابھی تک میں وہی طور پر اس قدر ابھی ہوئی ہوں کہ اس بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی سوچ نہیں سکتی۔“

میں نے حقیقی انداز میں کہا ”ٹھیک ہے تم جب تکسپا ہو، اس کوٹھی کی پناہ میں آرام کر سکتی ہو۔ اس دوران میں تمہیں سکون سے سوچنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ میری دایبھی سے قتل اگر تم یہاں سے رخصت ہونا چاہو تو تمہیں کوئی نہیں روکے گا بلکہ تمہیں تمہارے بتائے ہوئے مقام پر بے حفاظت پہنچا دیا جائے گا۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گی وہ جان!“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور سرسری انداز میں کہا ”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ چلو اسی بہانے مجھے تمہاری سسٹنی خیر کھانی سننے کا موقع مل جائے گا۔“

”اور مجھے بھی!“ وہ جلدی سے بولی ”میں بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ جانا چاہتی ہوں۔ تم نے وعدہ کیا تھا، مجھے اپنی کہانی سناؤ گے۔“

میں نے کہا ”تم بھول رہی ہو۔ میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، صرف اتنا کہا تھا، اگر کسی فرصت ملی تو میں تمہیں اپنے بارے میں تفصیل بتاؤں گا۔“

وہ بولی ”تم سید پور کے معاملات ختم آؤ تو پھر فرصت کے لمحات بھی میرا چاہیں گے۔“

”اس بارے میں صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ میں نے اپنے سابق تجربے کی روشنی میں کہا ”یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ثابت ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے، میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو جاؤں۔“

”اللہ مالک ہے!“ میری صاف گوئی کے نتیجے میں اس نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہوئی۔

اس کے بعد میں نے سیکورٹی گارڈز مردین اور پاشا کے اسٹنٹ تحمین کو باری باری اپنے پاس بلا کر ضروری ہدایات دیں پھر اللہ دتا سے معلوماتی گفتگو کرنے لگا۔

”اللہ دتا!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”میں اپنے ہوش و حواس میں پہلی مرتبہ ابور آیا ہوں اس لیے اس شہر اور اس کے گرد و نواح میں واضح گاؤں دیہات سے واقف نہیں۔“ تم مختصر الفاظ میں ہمیں بتاؤ کہ یہاں سے سید پور جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے گا؟“

اس وقت صدف بھی میرے پاس بیٹھی تھی۔ اللہ دتا نے کہا ”صاحب جی! میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں پھر آپ کو راستوں کے لیے گہر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

اس نے بد وقت اور اہم سوال کیا تو مجھے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا پڑا۔ وہ فیصلہ جس کے بارے میں، میں نے ابھی صدف کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اللہ دتا کو ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کو بھی پر اس کا موجود رہنا زیادہ ضروری تھا۔ تحمین، ناہید اور زرگل کا درحقیقت اس کو بھی سے کوئی تعلق نہیں تھا جب کہ اللہ دتا سال ہا سال سے اس کو بھی کا ایک حصہ رہا تھا۔ وہ وہاں نمودار ہونے والی ناخوشگوار اور ہنگامی صورت حال سے زیادہ بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا۔ میں اور صدف اس کے بغیر سید پور جا سکتے تھے۔ میں نے اللہ دتا کے سوال کے جواب میں کہا۔

”میں چاہتا ہوں، تم نہیں کوئی پر موجود ہو۔“

”پاشا صاحب تو ناراض نہیں ہوں گے!“ اس نے ایک امکانی بات کی ”انہوں نے آپ کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔“

میں نے کہا ”میں پاشا کو سمجھا دوں گا۔ اگر آج رات والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو میں تمہیں ساتھ لے کر جاتا لیکن موجودہ صورت حال میں تمہارا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔“

”آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں صاحب جی۔“

”بس تو پھر تم سید پور جانے والے راستے کے بارے میں تفصیلاً بتا دو۔“

وہ بتانے لگا ”وہ جان صاحب! گہرگ سے نکل کر آپ کو پہلے تو نہر کے ساتھ ساتھ سڑک سڑک ہوگا۔ میاں میر، دھرم پورہ اور منٹ پورہ سے ہوتے ہوئے آپ فتح گڑھ پہنچ جائیں گے۔“

میں نے پوچھا ”نہر کے ساتھ سے تمہاری مراد ہے

کینال بینک روڈ پر؟“

”جی ہاں، میں کینال بینک روڈ کی ہی بات کر رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اس سڑک پر چلتے ہوئے آپ نہر کی مخالف سمت میں سڑک پر گئے پھر جدھر سے نہر آ رہی ہے آپ ادھر جائیں گے۔ فتح گڑھ سے بعد راستہ تھوڑا پیچیدہ ہے۔ اس راستے پر بہت اعتیاد سے ڈرائیونگ کرنا ہوگی۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو، میں پیچیدہ راستے سے نمٹ لوں گا۔“ میں نے کہا ”آگے بتاؤ۔“

اللہ دتا نے مجھے فتح گڑھ سے سید پور کے راستے کی تفصیل بتائی پھر کہا ”سید پور سے آگے لگ بھگ پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر موضع رکھان والی ہے۔ اس کے بعد باک بھارت سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ سرحد کے اس پار امرتسر ہے۔“

اللہ دتا نے تو یہ معلومات عام انداز میں مجھ تک پہنچا تحمین لیکن رکھان والی کے ذکر پر آپوں آپ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ساحل کی یاد نے میرے سینے میں ایک خوفناک آنکوائی لی تھی۔ میری محبوبہ رکھان والی کے ہاں چوہدری نوازش علی کی قید میں تھی اور میں نے یہ سارا کھن راگ ساحل کے حصول کے لیے ہی پھیلا یا تھا، اس کے ماتو ہی میں اس خالم چوہدری سے برسوں پہلے کا حساب بھی کیا چاہتا تھا۔ اس قرض کی چند گھنٹاں میرے شانوں پر بھی گھری تھیں۔ سب سے بڑی شہری ساحل کی تھی جو مجھے پہلی خدمت میں اتار بیٹھا تھی!

ہمارے درمیان مزید چند منٹ تک ضروری بات چت ہوتی رہی پھر اللہ دتا نے پوچھا ”آپ کون سی گاڑی لےنا پسند کریں گے؟“

نسان پٹرول ایک مرتبہ دھوکا دے چکی تھی۔ میں اسے لے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا حالانکہ ازاں بعد یہ بات ہو گیا تھا کہ اس جیب میں کسی جسم کی کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے کہا ”میں یہاں سے لوہوٹا کرولا میں جائیے گا۔“

”صاحب جی! ویسے تو آپ کی مرضی ہے، لیکن میں ضرور کہوں گا، گاؤں دیہات کے راستے کے لیے جیب بڑا موزوں رہے گی۔“ اللہ دتا نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

اس کی تجویز میں اگرچہ وزن تھا تاہم میں نے اسے

پہنچا ”کیا سید پور کا راستہ کار کے لیے مناسب نہیں؟“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”پاشا صاحب خود اپنی دوسری کار میں گئے ہیں۔ میں تو اس حوالے سے کہہ رہا تھا کہ جیب کا ایک اپنا رقبہ درجہ ہوتا ہے، راستے کا ذکر تو بس ایسے ہی نکل آیا۔“

مجھے یہ بات معلوم تھی کہ پاشا کل شام اپنی موٹر اکاؤڈ میں سید پور گیا تھا جس کا یہی مطلب تھا کہ کار کے لیے وہ راستہ برکھان سے محفوظ ہے۔ میں نے اللہ دتا سے کہا کہ میں کرولا میں جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو بس اسی میں جاؤں گا۔ ظاہر میں جانے کا فیصلہ کرنا تو بس اس فیصلے کو نال نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے ایک ضروری امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھا۔

”اور گھر سے ہائی روٹ کا کیا کرنا ہے؟“

مذکورہ گاڑی اس وقت کو بھی کے گہرگ میں کھڑی تھی۔ میں نے کہا ”اس گاڑی سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ضروری ہے۔“ پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا ”تم ایسا کرو اللہ دتا! جا کر ہائی روٹ کے کاغذات وغیرہ چیک کرو۔“

”میں اس گاڑی کی مکمل تلاشی لے چکا ہوں۔“ اللہ دتا نے بتایا ”اس گاڑی کے کاغذات پورے ہیں اور ڈیش بورڈ کے اندر رکھے ہیں۔“ بات ختم کر کے اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟

میں نے اس کی نگاہ کے جواب میں کہا ”میں نے رات دہائیں پر، نہر کے مسلم ٹاؤن والے پل کے نزدیک مضانی کی ایک دکان دیکھی تھی تم اس گاڑی کو لے جا کر اس دکان کے سامنے کھڑا کرو اور خود کسی نیکی میں بیٹھ کر وہاں آ جاؤ۔“

”آپ غالباً عربین ڈیپلائٹ کا ذکر کر رہے ہیں!“ اللہ دتا نے کہا۔

میں نے کہا ”ہاں اس مضانی کی دکان کا کچھ ایسا ہی نام تھا۔“

اللہ دتا نے پوچھا ”بس ہائی روٹ کو عربین ڈیپلائٹ کے سامنے چھوڑ کر وہاں آ جاؤ؟“

”تم ہائی روٹ کو وہاں کھڑا کر دو گے اور اس کا دروازہ لاک کیے بغیر دکان کے اندر جاؤ گے۔“ میں نے وضاحتی لہجے میں کہا

حاضری لگ جائے گی!“ ”یہ سب ٹھیک ہے۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”لیکن گاڑی کو نکھلا چھوڑ کر آنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی؟“

میں نے کہا ”تم جب وہاں آ جاؤ گے تو ہر بات واضح طور پر سمجھ میں آ جائے گی۔“

صدف استعجاب سے نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میں نے اس کا استعجاب دور کرنے کے لیے کوئی وضاحت نہ کی اور نہ ہی اللہ دتا نے مجھ سے مزید کوئی سوال کیا۔ ہم لگ بھگ آٹھ بجے کو بھی سے سید پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں نے اور صدف نے اپنا اپنا ٹیک کرولا میں رکھ لیا۔ میرے بیک میں شاختی کارڈ، پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ کرولا کے کاغذات وغیرہ میں نے چیک کر لیے تھے تاکہ راستے میں کسی بھی مرحلے پر ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اللہ دتا ہم سے چند لمبے پہلے نکلا تھا اور مجھے امید تھی، وہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں وہاں کو بھی پہنچ جائے گا۔ میں نے کرولا کو جب گہرگ قہری سے نکالنے کے بعد بائیں جانب موڑا تو صدف نے کہا۔

”وہ جان! میرے خیال میں تم غلط رخ پر جا رہے ہو۔ اس راستے پر چل کر تو ہم شادمان کالونی کی طرف پہنچ جائیں گے۔“ تحمین گاڑی کو دائیں طرف موڑ کر کینال بینک روڈ پر لینا چاہیے۔“

میں نے اطمینان سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہم شادمان کالونی ہی کی طرف جا رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس وقت وہ میرے برابر میں پمپرز سبٹ پر بیٹھی تھی ”کیا نام ہاوں کی طرف جا رہے ہیں؟“ اس نے استفسار کیا۔

میں نے تعلیمیت سے کہا ”بالکل نہیں!“

”پھر؟“ اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

میں نے کہا ”ہم قاضیہ کالونی والی کو بھی میں جا رہے ہیں۔“

”وہاں کیوں جا رہے ہیں؟“

”بس ایسے ہی۔“ کیا تمہیں وہاں جانے میں کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔“ وہ کہہ اچکاتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوئے کہا ”دراصل

میں ایک نظر اس کو بھی کا تنقیدی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی میں سید پور جاؤں گا۔ چنانہیں، پھر کبھی اس طرف آنے کا موقع ملے گی یا نہ ملے گا۔“  
”تم آج صبح ہی سے خاصی کھوئی کھوئی باتیں کر رہے ہو۔“ وہ ڈاکٹر اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی ”تھوڑی دیر پہلے تم نے اللہ تبارے ہی کرے ہائی روف کے حوالے سے جو کچھ ڈسکس کیا ہے، اس میں سے میرے لیے کچھ بھی نہیں پڑا۔“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”پلے بڑھی کیسے سکتا ہے۔ تم نے میری باتوں کو ”کھوئی کھوئی“ کا نشان دیا ہے کھوئی ہوئی چیز کو پانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔“  
”جہیں اگر میری بات کا جواب نہیں دینا تو نہ دو لیکن فلسفیانہ وضاحتوں کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ غلطی آ میرے لہجے میں بولی

”ایسی بات نہیں ہے صدف!“ میں نے غصہ سے ہوئے انداز میں کہا ”فاضلہ کالونی والی کو بھی میں جانے کا سبب میں جھہیں بتا چکا ہوں۔ ہائی روف کو مٹھائی کی دکان کے سامنے میں اس لیے جھڑونا چاہتا ہوں کہ وہاں سے اس گاڑی میں ہم سفر کریں گے۔“

”تم کب رہے ہو وجدان؟“ وہ ایسے اُچھلی جیسے سیٹ میں اچانک کوئی اسیر کھمبہ مودار ہو گیا ہو۔  
میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا ”میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم نے سنا۔“

”گرے ہائی روف ہمارے دشمنوں کی ملکیت ہے۔“ صدف نے دلیل دی ”اس گاڑی میں سفر کرنا ہمارے لیے کوئی بڑی مصیبت بھی کھڑی کر سکتا ہے۔“

”مجھے امید ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”کوئی انتہائی خطرناک مجرم جس کی پورے شہر میں تلاش جاری ہو، اگر وہ تھانے کے سامنے داغ بلڈنگ میں پناہ گزین ہو جائے تو پولیس کا ہاپ بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکتا کیوں کہ اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ پولیس سے چھپتا پھرنے والا مجرم اسی کے سامنے میں قیام کرے گا۔ بعض معاملات میں عمومی سوچ اور عوامی نفسیات (Mob Psychology) بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔“ میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے، ہم گرے ہائی روف میں زیادہ حفاظت کے ساتھ سفر کریں گے۔ گاڑی کے کاغذات مکمل ہیں، میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس موجود ہے

اس لیے قانون کی طرف سے مجھے مکمل بے فکر ہی بہاؤ چہاں تک دشمنوں کا سوال ہے تو مجھے، دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔ روز آدمی رات کو دوبارہ پھانسی لگائی گھر میں کس آتا ہے۔ دشمنوں سے منہنا مجھے خوب آتا ہے۔“

وہ پوری توجہ سے میری بات سنی رہی پھر بولی ”اگر تم جہاڑی بات سے مکمل اتفاق کر بھی لوں تو مجھے یہ بتاؤ کہ مقصد کے لیے اتنا سلا چوڑا ڈراما راجانے کے لیے کیا ضرورت تھی؟ ہم پاشا اکل کی کوئی سے اسی ہائی روف میں بیٹھ کر جاتے!“

”ایسا کیا جا سکتا تھا۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”لیکن میں نے دانستہ نہیں کیا۔“

”اب خود ہی یہ بھی بتا دو، تم نے ایسا کیوں کیا؟“  
”اس لیے۔“ میں نے کروڑا گوشہ جمال روڈ پر ڈالنے ہوئے کہا ”میں چاہتا ہوں، اللہ دتا وغیرہ ہائی روف کے حوالے سے بالکل مطمئن رہیں۔ وہ یہی سمجھیں کہ دشمنوں کی گاڑی سے نجات مل گئی اس طرح انہیں واقعی سکون حاصل رہے گا۔ میں اپنی پوری زندگی غیر یقینی حالات سے گزار رہا ہوں اور گزر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، سید پور کے راستے تم کس وقت، کس قسم کی صورت حال سے میرا واسطہ پڑ جائے۔“ میں چند لحات کے لیے رکھ رکھاؤ کا ”صدف! ایک بات میں تمہیں واضح طور پر بتا دوں کہ میں اب داکٹر زید پاشا کے پاس نہیں آؤں گا۔ میری وجہ سے اس نے بڑی مصیبت اٹھائی اور آئندہ بھی اس کے دشمنوں میں مزید اضافہ ہونے والا ہے۔ میں ایک دشمن دارمخص ہوں، مجھے اپنے نفس اور خیر خواہ دوستوں سے فاصلہ رکھنا چاہیے، کہیں وہ لوگ میرے پاؤں سے بندھے بھولوں کے چکر میں نہ آجائیں۔ میں تو دیکھتے ہوئے الاؤ کی لپٹوں پر چڑھتا ہوں۔ میرے داخل کی پیش کسی بھی شخص کو بری طرح جھلسا سکتی ہے۔“  
”تو تم سید پور شخص اس لیے جا رہے ہو کہ پاشا اکل نا چھینرو جھینرو میں شرکت کر سکو۔“ صدف نے کھیر آواز میں کہا ”اس کے بعد تم اپنا راستہ الگ کر لو گے؟“

”ہاں، فی الحال تو یہی سوچا ہے۔“ میں نے گول بول جواب دیا ”میں اس سے فاصلہ رکھ کر اس کی جرم کی مدد کرنا گا۔ اس سے مکمل ملاپ بھی رکھوں گا لیکن اس کے یہاں سخت ڈیر انہیں ڈالوں گا۔ بڑے پاشا کی موت تو ایک بہانہ بن رہا ہے۔ درحقیقت میں دیے آج ضروری کام سے سید پور چلاؤں والا تھا۔“

”اس ضروری کام کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ۔“

دھمکات آمیز لہجے میں بولی۔

میں ساحل کے بارے میں صدف کو کچھ بتانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا لہذا میں نے اسے ٹال دیا ”تم تو میرے ساتھ ہی جا رہی ہو۔ کوئی بھی ضروری اور غیر ضروری کام تم سے پاشا نہیں رہے گا۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔“  
”اس گاڑی کا کیا کرو گے؟“ اس نے ڈیٹس پورڈ پر ہاتھ مار کھینچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں ٹو پونا کر دلا کوئی ایسا فاضلہ کالونی والی کو بھی کے کارپوریشن میں کھڑا کر دوں گا۔“ میں نے کہا ”وہاں سے ہم ٹیسی میں چھتر کمرہ کے بل تک پہنچ جائیں گے۔ بعد میں سید پور پہنچنے کے بعد میں پاشا کو گاڑی کے بارے میں بتا دوں گا۔“

”جہاڑی پلاننگ اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے داغ کی چولیس مل گئی ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے بولی ”تم جانو اور تمہارے کام چائیں۔ اب میں اس سلسلے میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔“  
میں نے کروڑا کو بھی کے سامنے روکتے ہوئے کہا ”یہ تم میرے اور اپنے دونوں کے حق میں بہت بہتر کر دے گی!“

اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ میں نے کو بھی کا گیٹ کھولا اور گاڑی کو اس کے جائز مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ صدف نے پچھلے چند روز سے مجھے بہت زچ کیا تھا۔ وہ وجہ اور وجہان کے چکر کا اتنی سنجیدگی سے لے کر میرے پیچھے پڑ گئی تھی کہ میں ایک طرح کی کوفت محسوس کرنے لگا تھا۔ اب اسے زچ دیکھ کر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

آئندہ چند روز صدف، میں نے کو بھی کے ہاتھیں باغ میں تھما کر دیکھا۔ جھانپوں کے پیچھے نہ خانے کا روٹن دان اپنا جگہ پر بیچ و سالم حالت میں موجود تھا۔ میں نے کو بھی کا ایک چکر لگا دیا اور صدف کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شاہ جمال روڈ پر آنے کے بعد میں تھوڑی دیر تک ٹیسی کا انتظار کرنا پڑا پھر ہم الٹا منزل کی جانب چل پڑے۔

میں نے عین فیاضی کے سامنے دیگر گاڑیوں کے ساتھ گرے ہائی روف موجود تھی۔ ہم اتحاد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ میں نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اسٹرکٹ سنہالایا۔ صدف کے لیے میں نے دوسری جانب کے دروازے کا لاک ہٹا دیا۔ وہ بھی گاڑی کے اندر داخل ہو کر پیمز سیزٹ پر آ بیٹھی۔ اپنے سر کی بیگز کو ہم نے غشی۔  
نفس پر ڈال دیا۔

میں نے گاڑی کو اشارت کیا اور گھما کر اسے کینال بینک

روڈ کی طرف لانے کا ارادہ.... کر ہی رہا تھا کہ مجھے بڑی شدت سے چونک جانا پڑا اور میرے چوتھے کاسب ایک سرخ لینڈ کرورڈر تھی۔ وہ ٹو پونا فور وکیل ڈرائیو جیب جس کی پوری ہاڈی سرخ اور صحت سفید تھی۔ اتنی دور سے میں اس کی نمبر پلیٹ نہ پڑھ سکا۔ وہ جیب فیروز پور روڈ پر نہر کے بل کو عبور کر رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہلے عبور کیا اور وحدت روڈ پر مڑ گئی۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنی گاڑی کو سرخ لینڈ کرورڈر کے پیچھے دوڑا دیا۔

صدف بھی اس جیب کو دیکھ چکی تھی، سسٹنی خیر لہجے میں بولی ”وجدان! تم نے مجھے جس بہروپ سے کہا کہانی سنائی ہے، کہیں اس گاڑی میں وہی تو نہیں۔ تمہاری اضطراری حالت بھی اس کی نشان دہی کر رہی ہے؟“

”ننانوے فی صد امکان تو اسی بات کا ہے۔“ میں نے بیجا بی انداز میں کہا ”میں ڈرائس اس کی سرپلیٹ دیکھ لوں، پھر صدف فی صد بات کر سکوں گا۔ اگر یہ وہی بدمشا ہے تو آج میرے ہاتھوں سے حق کر نہیں جاسکے گا۔“

میں نے وحدت روڈ پر اپنی گاڑی کی اسپینڈ بڑھا دی۔ سرخ لینڈ کرورڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی پشت مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شخص سفید سوٹ میں لبوس تھا۔ میں نے اسے وحدت روڈ پر مڑنا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سوچا تھا کہ کہیں اس مکار کا تعلق خٹا ہے نہ ہوا خٹا کی چھوٹی دومنزلہ سفید کو بھی اسی علاقے میں تھی لیکن جب آ ب بارہ مارکیٹ بہت پیچھے رہ گئی اور سرخ لینڈ کرورڈر سیدھی آگے نکلی چلی گئی تو مجھے اپنی سوچ کی لٹی کرنا پڑی۔

میں نے کوشش کر کے گاڑی کی رفتار بڑھا کر جیب کی نمبر پلیٹ پڑھ لی اور میرے سینے سے ایک اطمینان سانس خارج ہوئی۔ وہ غلطی وجدان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مذکورہ سرخ جیب کا نمبر فور سیون تھی سیون ہی تھا۔ میں نے صدف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”صدف! یہ وہی بہروپ ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔“

صدف نے ہمزعم انداز میں کہا ”وجدان! تم گاڑی کی رفتار کو اور بڑھاؤ اور اسے گھیر کر روکنے کی کوشش کرو آج ہم دونوں مل کر اسے ایسا سبق سکھائیں گے کہ اس کا سارا بہروپ ناک کے راستے نکل جائے گا۔ یہ مت بھولو کہ یہی ضیبت تمہاری ڈرائنگ کا قاتل بھی ہے۔“

”میری یادداشت بہت اچھی ہے صدف۔“ میں نے برج اسٹون ٹائزوں والی اس سرخ جیب کا تعاقب جاری رکھتے ہوئے کہا ”اگرچہ اس بہروپ سے اپنی تحریر کے

# ذاتی ہینائزم

مصنف: ڈاکٹر اے ایم جینس ایم ڈی



- ہینائزم کی تاریخ
- ہینائٹک نیند پیدا کرنے کے طریقے
- ظہورات ہینائزم
- مشورات
- ہینائزم کی مختلف تھیوریاں
- ذاتی مشورات
- طبی علاج

اپنے آپ کو پناہ دینا  
گھر کے اپنی گھر دریاں  
اور  
گھر گریں

قیمت:- 25/- روپے

ڈاک خرچ:- 23/- روپے

کتابیات پبلی کیشنز  
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802552-5895313  
کتابیات1970@yahoo.com  
رابطہ کیلئے: C-63، ٹیڑھی منی، ایچ اے میں روڈوں کی روڈ لکڑی

”مجھے یہ کچھ خوشی ہو رہی ہے کہ تم حوصلہ اور جرأت کی بات کر رہی ہو۔“ میں نے کہا ”ورنہ تمہوڑی دیر پہلے تم بہت بڑبڑا کر رہی تھیں۔“

”لو! انسانی جذبات و احساسات موقع محل کی بات سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ ہمارے قابو میں نہیں آ رہا تھا اس لیے بددلی نے مجھے گھیر لیا تھا لیکن اب تو ہم راز کی کوشش کر کے اسے اپنے دام میں لاسکتے ہیں۔“ پھر وہ چلے گئے میں بولی ”اور تم یہاں باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ اگر اس اسٹور سے نکل کر کہیں اور چلا گیا تو میں انتظار میں سوچی رہوں گی اور تمہیں بھی خاصی درپوری ہوگی۔ میں گڑی کی طرف جارہی ہوں۔“

”لو کے!“ میں نے انہماک میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر اسٹور کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک شبہ جانی (ڈیپارٹ منٹل) اسٹور تھا جس کی ٹالہ دے زیادہ منزل میں تھیں۔ میں کسی جگہ یا بدحواسی کا مظاہرہ کیے بغیر اپنی کاپی کو تلاش کرنے لگا۔ میرے انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا، میں شاندار شوکیز میں سے آٹمز کو دیکھ رہا ہوں لیکن درحقیقت میں غلطی و جدان کو کھوج رہا تھا۔ جو ایک ٹھکڑا دکھا کر اصل ہو گیا تھا۔

میں اس تلاش کے دوران میں داخل دروازے کو بھی نظر نہ کیا کرتے ہوئے تھا کہ کہیں وہ بد بخت نگاہ بجا کر اسٹور سے نہ نکل جائے۔ میں نے نہایت ہی چابک دہشتی سے اسٹور کی دلوں میں دیکھ لیں لیکن اس کی صورت کہیں نظر نہ آئی۔ پتا نہیں وہ کج بخت کہاں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں اس خیال نے بھی سر اٹھایا کہ کہیں وہ کسی اور دروازے سے باہر نہ چلا گیا ہو!

ایسا سوچے ہی میں نے سیکورٹی کے ایک جوان سے دریافت کیا ”کیا اس اسٹور میں آمد و شد کا صرف ایک ہی دروازہ ہے یا اس کے علاوہ بھی ہے؟“

اس نے جواب دیا ”جناب! اسٹور میں آنے جانے کے لیے تین دروازے ہیں۔ ایک وہ جو سامنے کی طرف ہے جس میں سے آپ اندر داخل ہوئے تھے۔ باقی دو دروازے بائیں اور دائیں طرف ہیں۔“

وہ سیکورٹی والا خاصا مستعد اور عقاب نگاہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اسٹور میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

”ایک نوکی خال کے تحت میں نے اس سے پوچھا ”میں یہاں کہاں کی قسم خریداری کے لیے نہیں آیا ہوں۔“

”پھر؟“ اس نے غماز نظر سے مجھے دیکھا جیسے اس کا

اس بند کھلنے کے لیے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔“ اسی وقت کھل کھل گیا۔ میں نے ایک جھپٹے سے ہائی روف آگے بڑھا دی۔ میری تلاش نظر دور دور تک ٹھہرا۔ قائد اعظم (مال روڈ) کا جائزہ لے رہی تھی پھر وہ سرخ جیسے مجھے ایک جانب کھڑی نظر آگئی۔ وہ ایک بہت بڑا ڈیپارٹ منٹل اسٹور تھا۔ جس کی پارکنگ میں جیب کھڑی تھی۔ جیب کے اندر بہر دیا موجود نہیں تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ ڈیپارٹ منٹل اسٹور کے داخلی دروازے کی طرف اٹھ گئی اور میرے وجود میں سننا ہٹ سی مگر۔

اٹھ کے کی طرح سفید سوٹ میں لمبوس وہ دروازہ قامت نکل و جدان دروازے سے اسٹور کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی لیکن میں حلیہ، شکل اور جسامت میں وہ بہت اپنی کاپی کو کیسٹنڈ کے جزا رو میں مجھے میں پہچان گیا۔ میں ہائی روف کو روکنے کے بعد باہر آیا اور صدف کے ساتھ ڈیپارٹ منٹل اسٹور کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

صدف نے کہا ”وہ جان! اسٹور کے اندر سے گھر مناسب نہیں ہوگا۔ اس سے سامنا ہوتے ہی ہنگامہ آرائی ہو سکتی ہے جو ہماری راہ کو تنی کر دے گی، ہم سید پور جانے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“

”ہمیں اس کے باہر آنے کا انتظار کرنا چاہیے، اس کی جیب کے قریب رہ کر۔“ اس نے کہا ”وہ آخر کتنی دیر انداز ہو سکتا ہے۔ کبھی نہ بھی تو اسے باہر آنا ہی پڑے گا۔“

میں نے کہا ”تمہاری تجویز تو معقول ہے لیکن اس شیطان نے مجھے جتنا پریشان کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ میں اس کے تعاقب میں اندر جاؤں۔ ویسے میں اسٹور کے اندر کی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں کروں گا، صرف غلطی و جدان نظر رکھوں گا۔ گھر میں گئے ہم اسے باہر نکلنے کے بعد ہی اور۔“

”تمہوڑا تو قف کیا اور کہا“ ”میرا تو خیال ہے کہ ہم باہر روف سے اندر جا کر بیٹھیں، میں اسٹور کے اندر جاتا ہوں۔ اگر وہ میری کاپی بجا کر باہر نکل آتا تو تم اسے چھاپنے کی کوشش کرنا۔“ پھر نے استفسار سے نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”اس کا نام ہے تم کسی قسم کا ڈر خوف تو محسوس نہیں کر رہی ہو؟“

”ڈر اور خوف!“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے تھا۔

”تمہارے جیسا مارشل آرٹس اور جی کا باہر میرے ساتھ تو کسی پریشانی۔ تم مطمئن ہو کر جاؤ۔ میں اس کی ایک نگاہوں کی کہ زندگی بھر بھر اسے بہرہ دے رہا ہوں۔“

آگے۔

ڈر لیے ڈارلنگ کی موت کو بڑے جائداد انداز میں جائزہ جانت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جب تک میں اس معاملے کی نہ تک نہیں پہنچ جاتا، کب بات پر یقین نہیں کر سکتا۔“

ہم آگے پیچھے وحدت روڈ پر گاڑیاں دوڑاتے ہوئے پینک اسٹاپ، پانک ہائی اسکول اور موڑ چکے وال سے گزرے لیکن حیرت مجھے اس بات کی تھی کہ میں اپنی گاڑی کی جتنی رفتار بڑھا رہا تھا، وہ بھی جواب میں جیب کو اتنا ہی تیز کر دیتا اور اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ جیٹر مڑ کر عقب میں دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میں دو ٹوک سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے اپنے تعاقب کاظم ہو چکا ہے یا نہیں البتہ ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار تھا۔

تمہوڑا آگے جا کر بہرہ دے نے اپنی جیب اسکیم موڑ کی طرف جانے والی مڑک پر موڑ لی۔ میں نے بھی وحدت روڈ کو چھوڑ دیا۔ کچھ سڑک طے کرنے کے بعد ہم ملتان روڈ پر آگئے۔ میں باوجود کوشش کے بھی درمیان حائل فاصلے کو کم نہیں کر پاتا تھا۔ پتا نہیں، وہ محسوس کس طرح میرے ارادے سے واقف ہو جاتا تھا اور اپنی جیب کی اسپید بھی بڑھا کر مجھے پریشان کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں نہیں بلکہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہو!

چوبی جی پر پہنچ کر اس نے جیب کو بہاول پور روڈ پر موڑ لیا۔ اس روڈ کے دونوں اطراف میانی صاحب قبرستان کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سڑک تنگ ہونے کے باعث بے پناہ رش رہتا ہے لہذا مجھے یہاں فاصلہ کم کرنے میں تمہوڑی کامیابی حاصل ہو گئی لیکن مزید چوکی پر آ کر اس نے پھر وہ سابق فاصلہ برقرار کر لیا۔ اب اس کی سرخ جیب فاطمہ جناح روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ ہم پلازہ اسنیما کے پاس سے گزر کر مال روڈ پر پہنچے اور آگے پیچھے بائیں جانب مڑ گئے۔ اب ہمارا رخ ریگن سنیمیا کی طرف تھا۔ یہاں ایک ٹریفک سگنل نے ہمارا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا اور بہرہ دے کو میری پہنچ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

صدف نے جھنجھلائے ہوئے لیے میں کہا ”بے کار ہے و جدان! یہ جھلا دے تمہارے قابو میں نہیں آئے گا۔ اس کا تعاقب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”تم اتنی جلدی حوصلہ ہار نہیں۔“ میں نے کہا ”بڑی بازیاں اتنی کم بہتی سے تو نہیں جیتی جاسکتیں۔“

وہ بولی ”انسان کا مقابلہ انسان سے ہوتا ہمت اور جرأت دکھانے کا مزہ آتا ہے مگر میں تو دیکھ رہی ہوں اس بہرہ دے میں جتنی قوت مگر ہے۔ یہ شیطان کی طرح مگر کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں مسلسل جل دے رہا ہے اور اب تو

خیال ہو کہ اگر میں خریداری کے لیے نہیں آیا تو پھر کیا چوری یا ڈکیتی کے لیے آیا ہوں۔  
میں نے اس کی انجمن دور کرنے کی خاطر کہا ”میں نے ایک دوست کو اس اسٹور میں داخل ہوتے دیکھا تھا تو ادھر چلا آیا۔ اس سے ملے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔“  
”تو؟“ مسکیرتی گاڑی کے استفسار میں تشویش دور آئی۔  
میں نے کہا ”کیا تم نے میرے اس دوست کو کہیں دیکھا ہے۔ اس نے بے داغ سفید چٹون کوٹ پہن رکھا ہے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہے، اس نے جو تے بھی سفید ہی پہن رکھے ہیں۔ میں نے اسے اوپر پیچے تلاش کر لیا لیکن مجھے وہ کہیں ملا نہیں!“  
”سکیورٹی گاڑی نے ٹک زدہ انداز میں مجھے سر تا پا دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”نہیں سر، میں نے ایسے کسی شخص کو یہاں نہیں دیکھا۔“  
”کیا تمہاری ڈیوٹی صرف بالائی منزل تک ہی محدود ہے؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔  
میں نے سوچا، ممکن ہے نفی وجدان اس منزل پر آیا ہی نہ ہو اور نیچے ہی سے کہیں غائب ہو گیا ہو۔ میں نے فی الفور نیچے کا رخ کیا، تیزی سے زینے طے کرتے ہوئے میں دوبارہ زیریں منزل پر پہنچا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے تنقیدی نگاہ سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور قدرے پائوس ہو کر بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ بہرہ دیا ایک مرتبہ پھر مجھے چکر دینے میں کامیاب رہا تھا۔ اس خیال سے ذرا انتہیت لی کہ اس کی گاڑی، صدف کی گمرانی میں تھی۔ وہ کہیں بھی جاتا، اپنی سرخ لینڈ کروزر ہی میں بیٹھ کر جاتا اور ایسا کرتے وقت وہ فوراً صدف کی نگاہ میں آ جاتا۔۔۔۔۔۔  
اس کے بعد یقینی طور پر ایک طویل فائنٹ شروع ہو جاتی۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس جدید ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے باہر آیا اور جیسے ہی پارکنگ کی جانب قدم بڑھائے، ایک جھٹکے سے رک گیا۔ میری نگاہ نے ایک ایسا منظر دیکھا جس کے لیے میں ذہنی طور پر قطعاً تیار نہیں تھا۔ پارکنگ میں نفی وجدان کی لینڈ کروزر تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن ہماری گرے ہائی روف کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے ہائی روف کو فورڈ بیڈوی لینڈ کروزر کے پیچھے پارک کیا تھا تا کہ وہ بہرہ دیا کسی بھی طور پر نکلنے میں کامیاب نہ ہو لیکن ہائی روف کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب ہماری گاڑی وہاں موجود نہیں تھی تو پھر صدف کی موجودگی بھی کیا معنی رکھتی تھی۔ میرا ذہن لاکھوں قسم کے خطرناک اندیشوں میں گم رہا۔ صدف کہاں گئی؟ اس نے گرے ہائی روف کو کہاں پہنچا دیا؟ میرا انتظار کے بغیر ہوا چاک وہاں سے کیوں بھی جیکبہ وہاں وجدان کے ”انتظار“ کے لیے وہاں انتظار کر رہی تھی؟ کہیں اسے کوئی حادثہ فریبہ نہیں پیش آ گیا؟  
آخری سوال بہت ہی سنگین تھا۔ میں تپ کر رہ گیا۔ ویسے ایک خوش امید یہ بھی کہ نفی وجدان کی لینڈ کروزر بہت پارکنگ میں نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ وہاں بھی وہاں سے روانہ نہیں ہوا۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر کہیں ادھر اُدھر ہو گیا ہے۔ میں بے چینی سے چلتے ہوئے چلے آ رہے صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران میں میری سوچ صرف ایک ہی نقطے پر مرکوز تھی کہ صدف کہاں غائب ہو گئی اور وہ بھی ہائی روف سمیت؟ میں اسے تلاش بھی کر رہا تھا کہاں؟

اسی سوچ کے دوران میں میرے ذہن میں ایک نیا ہی خطرناک سوال نے سر اٹھایا اور میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ خیال بہت ہی سنگین اور دلچسپ کھڑے کر دینے والا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہیں صدف نفی وجدان کے جھانے میں آ کر اس کی سازش کا شکار نہیں ہو گئی!  
ایسا سوچتے ہوئے خود بخود میرا دھیان ڈارلنگ کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ شام میری غیر موجودگی میں وہ عیار نفسی پاشا کی گولی پر پہنچا تھا اور وہاں میرا پھر پور کر دار ادا کر کے ڈارلنگ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب رہا۔ لیکن وجدان نے پھر وہی چال یہاں بھی تو نہیں چل دی؟ میں نے سوچا، وہ میری حیثیت میں صدف کے پاس آیا ہو اور اسے اپنے ساتھ لے کر گرے ہائی روف میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نفی وجدان نے مغوی ڈارلنگ کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی روشنی میں صدف کے بارے میں سوچے ہوئے دل ہولنے لگا، کیا مغرب صدف بھی کسی باکس میں اس سے آگے نہ سوچ سکا، میرے ذہن نے فوراً وہامیات خیال کی تردید کر دی۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ صدف کو بے وقوف بنا کر اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ نے جو مخصوص لباس پہن رکھا تھا اسے دیکھ کر صدف کو یہ کہ وہ نہیں بلکہ میری نقل ہے۔ وہ اس کے ساتھ ایک قاصد ملے نہ کرتی۔ ڈارلنگ کو جھانسا دینا دوسری بات تھی۔

مدف کی جانب سے میرا دل قدرے مطمئن ہو گیا لیکن ہڈی سمیت اس کا منظر سے ہٹ جانا مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں وہ جگہ چھوڑ کر کہیں آ جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہاں سے ہٹا تو عین ممکن تھا وہ سرخ لینڈ کروزر کو نکال لے جاتا۔ اسی جیب کی موجودگی میں اطمینان بخش امکان اس بات کا تھا کہ وہ وہاں ضرور آئے گا، جلد یا بدیر!  
میں بے قراری سے چلتے ہوئے لینڈ کروزر کے پاس پہنچا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی ٹریلر کو دیکھا کہ کہیں مجھے کوئی دھوکا نہ ہو۔ میں غلطی پر نہیں تھا۔ یہ وہی جیب تھی جسے شعیب غوری کے بندوں نے اپنی ”سناؤتھ“ کے قریب دیکھا تھا۔ فورسین فوری بیان کردہ ہائی روف جیب کل رات مجھے بھی نہر کے کنارے لڑائی تھی اور اسی شخص جیب نے شادمان کالونی سے نہر تک ہمارا تعاقب بھی کیا تھا۔

اسی انداز میں تیزی سے سوچتے ہوئے میرا دھیان گزشتہ رات کے اس واقعے کی طرف چلا گیا۔ جب شاہ جمال روڈ پر نشان پھولنے کے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں تحسین کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جیب میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں تھی۔ اسی جیب کے خراب ہونے کے حوالے سے نفی وجدان نے اللہ کا کچھ کر دیا تھا۔ جب وہ ڈارلنگ کو اغوا کرنے فریڈ پاشا کی گولی پر پہنچا تو اللہ کے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا، نشان میں اس چاک کی خرابی پیدا ہو گئی اور وہ اسے کی گمرانی میں ٹھک ہونے کے لیے چھوڑ آیا ہے۔ نشان پھول کی خرابی کا حوالہ مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مسلم ٹاؤن سے یہاں تک میں سرخ لینڈ کروزر کا تعاقب کرتے ہوئے جن خبر بات سے گزرا، وہ نفی وجدان کو افسانہ برسرِ اربابیت کر رہے تھے۔ میں باوجود انتہائی کوشش کے بھی اسے چیز (CHASE) نہیں کر پایا تھا۔ میں ہائی روف کی جس قدر اسپینڈ بڑھا تا، وہ ضیبت بھی اپنی جیب کو اتار کر تیر کر دیتا۔ ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار رہا اور اس دوران میں اس شخص نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر نہیں دیکھا حالانکہ وحدت روڈ سے جب وہ سکیم موڑ کی طرف بڑھا تو سڑک کے اس کھوے پر ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا، اسے اپنے تعاقب کا احساس نہ ہو۔ اس کی بے بسی اور افسانہ برسرِ اربابیت، وہ ہر شے سے باخبر ہے۔ یہ بات میری برسرِ اربابیت پر دلالت کرتی تھی۔ میں لاعلمی سے سوچنے لگا کہ مجھے پیش آنے والے پر اسرار واقعات کا تعلق کیا تھا؟ وجدان ہی سے تو نہیں؟

اسی وقت میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا، کسی نے مجھے پکارا تھا۔ میں نے واضح طور پر اپنا نام سنا تھا لیکن جس سمت سے وہ آواز ابھری تھی وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے حیرت ہوئی کہ میری سماعت نے یہ دھوکا کیوں دیا۔ میں نے اس واقعے کو موجودہ صورت حال کی افراطی فری کے کھاتے میں ڈال دیا۔ میرا ذہن اس وقت صدف کے لیے خاصا پریشان تھا۔ اس کیفیت میں انسان کے حواس اکثر دھوکا دینے لگتے ہیں۔ جب حریف باجی منٹ تک صدف اور نفی وجدان کے آثار نظر نہ آئے تو میری پریشانی اتنا کچھ بڑھی۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے سید پور جانا تھا یا یہ ایک عجیب مصیبت میرے راستے کی رکاوٹ بن گئی تھی۔ میں اس لمحے کو سننے لگا جب میں نے فیروز پور روڈ پر سرخ لینڈ کروزر کو دیکھ کر اس کے تعاقب کا فیصلہ کیا تھا۔ اس محسوس کے سبب میری راہ کھولی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس بہرہ دے کو اسٹور کے اندر جا کر چیک کرنے کے بارے میں سوچا اور خود بخود میرے قدم ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں کسی سے صدف، ہائی روف یا نفی وجدان کے بارے میں کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں پوچھتا تو کیا پوچھتا؟ کوئی مجھے کچھ بتاتا تو کیا بتاتا؟  
ایک مرتبہ پھر مجھے ناکامیاب و نامراد اسٹور سے لوٹنا پڑا لیکن جب میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو ایک اور حیرت میری خاطر تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پارکنگ میں سرخ لینڈ کروزر کے عقب میں گرے ہائی روف ٹھکڑی تھی اور اس میں صدف بھی موجود تھی۔  
میں تیزی سے چلتے ہوئے صدف کے پاس پہنچا اور اضطرابی لمحے میں کہا ”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“  
”میں کہاں چلی گئی تھی؟“ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ”میں تو تمہارے انتظار میں یہاں سوکھ رہی ہوں تم نے اسٹور کے اندر اتنی دیر کیوں لگادی؟ اس بد معاش کا کوئی سراغ ملا؟“  
صدف کے بے درپے سوالات نے میرا دماغ جھنجھکا کر رکھ دیا۔ وہ اس وقت انتہائی سنجیدہ اور کوفت زدہ دکھائی دیتی تھی لیکن وہ جو کچھ بیان کر رہی تھی وہ ناقابل یقین تھا۔ اگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ نہ دیکھا ہوتا تو ممکن تھا، میں صدف کی بات کا یقین کر لیتا۔  
میں نے ایک جھٹکے سے ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھولا پھر ہائی روف کا اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے صدف سے



کہا ”دیکھو صدف! میں اس وقت کسی تفریح یا مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں۔ میرا ذہن ہی طرح الجھا ہوا ہے۔ تم بھی جی متاؤ، کہاں گئی تمہیں؟“

صدف سے بات کرنے کے دوران میں، میں وقفے وقفے سے سرخ لینڈ کروزر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ میری عینید کی دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”ودھان! میں ایک لمحے کے لیے بھی اس جگہ سے نہیں ہٹی۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں تمہارا اور ملی وودھان کا انتظار کر رہی تھی۔“

”تھوڑی دیر پہلے تم یہاں تھیں اور نہ ہی یہ ہائی روف!“

”تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو وودھان۔“ اس مرتبہ صدف کے لہجے میں احتجاج در آیا تھا ”کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں۔ میں تم سے جھوٹ بولوں گی۔۔۔۔۔ میں؟“

صدف کے لہجے کی شدت نے مجھے گڑبڑا دیا تاہم میں اپنے تجربہ بات کی بھی فی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کبھی آواز میں اس سے کہا ”صدف، میں کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا اور تمہیں گاڑی سمیت غیر موجود پاکر میری جو حالت ہوئی ہوگی اس کا تم اندازہ لگا سکتی ہو۔“

”میں بخوبی اندازہ لگا رہی ہوں کہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہے۔“ وہ ٹھکی آئیز لہجے میں بولی ”اگر یہ کوئی سنجیدہ مذاق ہے تو پلیز اسے ختم کر دو۔ میں بہت الجھن محسوس کر رہی ہوں۔“

میں چند لمحے اسے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر مختصر الفاظ میں اسے تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے اور اپنی پریشانی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ توجہ سے پوری بات سننے کے بعد بولی۔

”ودھان! اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو پھر میں یہی کہوں گی، تمہارے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ان واقعات کو نارمل نہیں کہا جاسکتا۔ ایک چیز تم دیکھتے ہو لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ ایک منظر تمہیں دکھائی دیتا ہے مگر میں اس سے محروم رہتی ہوں۔ اسی طرح تم جو آواز سننے ہو وہ میری سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرتی کیوں؟“ اس نے ذرا توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس وقت وہ ایک ڈاکٹر نظر آتی تھی ”کیا پہلے بھی تمہارے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے؟“

”نہیں، اس نوعیت کے یہ ابتدائی اور انوکھے تجربات ہیں۔“

”جہیں پہلی فرمت میں کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔“ اس نے مشورہ دیا۔

میں کسی اور ہی سوچ میں کھو گیا۔ میرے اندر سے کوئی

آواز اٹھی تھی، وودھان! پر اسرار محاطات اور واقعات کا یہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ پر اسرار واقعات کا خیال آٹھ دھیان ٹیکری کی طرف چلا گیا پھر اس کی سرنگیز ذات وابستہ ہوش ربا اور موزوں یادیں مجھے ہموکرا سائے آگے میں خیالات کی جادوگرگی میں جانے اور تھوڑی دیر تک رکتی رہی تھی۔

”ودھان! کیا آج کا دن یہیں کھڑے کھڑے گزرے گا؟“

میں ہائی روف میں حاضر ہو گیا اور سرخ لینڈ کروزر جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس کا ڈراپ کیا ہے دیکھو گی؟“

”ابھی تو اس کا ٹائٹل شروع ہوا ہے۔“ وہ بولی ”میں بولی“ اگر اس کہانی کے اختتام تک ہم گاڑی میں رہے تو سید پور پہنچنے کے امکانات ناممکن میں چلے گئے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہے۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”آج ظہر اور صبح درمیان بڑے پاشا صاحب کی تدفین ہے۔ ہمیں الائن پہلے سید پور میں ہونا چاہیے۔“

”اور اس کے لیے ہمیں یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔ وہ بولی ”ودھان! میں تو کہتی ہوں، گاڑی کو فوراً یہاں نہ نکالو۔ اگر پھر بھی یہ بہرہ دینا ہماری راہ میں آیا تو اس بڑے تسلی بخش طریقے سے نمٹ لیں گے۔“

صدف کی تجویز معقول اور بروقت تھی لہذا میں ہائی روف کو اسٹارٹ کر کے مال روڈ پر لے آیا۔ اگلے کٹ سے ملانے گاڑی کو موڑا اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ مال روڈ کا پانچ منہر کے قریب پہنچ کر کینال پینک روڈ تک لے جاتا تھا۔ کے ساتھ ساتھ یہ سفر جاری رکھتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔

میں ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے حالیہ حالت اور تا قاتل یقین واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ صدف دعویٰ تھا کہ وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی وہاں سے اوپر نہیں ہوئی تھی۔ اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی تمنا کوئی نہیں تھی اور میں اپنے تجربے کو کہیں جھٹکا تھا۔ میں نے جھگ آٹھ منٹ پریشانی کی حالت میں چلنے ہوئے گزارے تھے۔ یہ واقعہ میری یادداشت میں نقش ہو رہا تھا۔ اور میں ابھی تک اس کی کوئی تفسیر تو جیبہ نہیں کر پاتا تھا۔

پیرنگ کر اس کا سٹیکل کر اس کیا تو صدف مجھ سے ہاپ ہوتے ہوئے بولی ”ودھان! تمہیں کیوں چپ لگ گئی۔ کیا میری بات کا تم نے برا متایا ہے؟“

”کیا تم نے ایسی کوئی بات کی ہے؟“ میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

”سوچتے ہوئے بولی“ اپنی دانست میں تو نہیں کی۔“

”تب میری دانست میں بھی نہیں کی۔“

”پھر تم خاموش کیوں ہو؟“

”میں بہرہ دے تھی وودھان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے صاف کوئی سے کام لیا۔

”دوہرے چنے کی“ کیوں اس فنسول کے پکر میں پھنس کر اپنی روح کو برا لگتے کرتے ہو؟“

”جوابات مجھے ہنسنے میں اس کے بارے میں اس بے تک سوچنا اور کھوجنا رہتا ہوں جب تک اس کی تہ تک نہ پہنچاؤں۔ یہ شخص آسانی سے جان نہیں چھڑا سکے گا، نہ میری توقع سے اور نہ ہی نظر سے۔“

اس نے اختصار کیا ”پھر اس کے سلسلے میں کوئی بات سمجھ لیا آئی؟“

”ہاں، میں تمہاری بات سے متفق ہو گیا ہوں۔“

”میری کون سی بات سے؟“

”تم نے کہا تھا، ملی وودھان انسان نہیں، شیطان ہے۔ چاہا چلاک اور مکار ہے۔ اس کے پاس بہت سی قوتیں ہیں۔“ میں نے کہا ”میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بہرہ دینا وودھان واقعی کسی پر اسرار قوت کا مالک ہے اور غالب امکان لگتا ہے کہ وہ نظر بندی کا علم جانتا ہے۔“

”نظر بندی کے بارے میں، میں نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہے۔“ صدف نے سنسنی خیز لہجے میں کہا ”ودھان، تمہاری عقل سے واسطہ پڑا تو وہ بھی پر اسرار اور باہر نکل آیا۔“

”میں نے کہا“ اس شخص سے سنسنے میں بہت لطف آئے

صدف نے پوچھا ”تم نے نظر بندی کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے سے بہرہ دے کا کون سا کمال تمہارے سامنے آیا ہے؟“

”میں کیا کام ہے کہ میں نے اسٹور سے باہر آ کر دیکھا تو میں اور نہ ہی یہ گھر سے ہائی روف۔“ میں نے بتایا ”میں نے شروع کو نہیں سمجھا تھا تمہارا کہنا ہے، ایک لمحے کے لیے تم کو اور گاڑی موقع سے نہیں ہٹی۔ اس سے یہی ثابت

ہوتا ہے کہ نقلی وودھان نے نظر بندی کے عمل سے مجھے وہ منظر دکھایا ہوگا۔“

”ایسے شخص سے دودھ ہاتھ کرنے کے لیے تمہیں جی کی قوت آزمانا ہوگی۔“

”وہ میرے دائرہ کار میں تو آئے!“ میں نے ہم انداز میں کہا۔

اسی وقت صدف نے سنسنی خیز انداز میں ایک جانب اشارہ کیا اور بھجانی لہجے میں بولی ”دوہرہ!“

”کیا رہا بھجی؟“ میں نے اس کے اشارے پر دائیں جانب گردن گھما کر دیکھا۔

صدف نے کہا ”جس شیطان کا ہم ذکر کر رہے تھے۔“

سرخ لینڈ کروزر میری نگاہ میں آ گئی۔ مذکورہ جیب چڑیا گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہمیں ڈیڑھا منٹ انتظار سے روانہ ہونے جتنا وقت ہوا تھا اس میں ممکن نہیں تھا کہ بہرہ دینا چڑیا گھر تک پہنچ جاتا۔ بال روڈ لاہور کی سب سے زیادہ صاف ستھری اور ”سچی“ ہوئی سڑک ہے۔ ٹریفک قوانین کی سب سے کم پابندی اور خلاف ورزی یہاں نظر آتی ہے۔ دو طرفہ ٹریفک نہایت ہی طریقے سے رواں دواں رہتا ہے اور وہ سرخ جیب تو سامنے سے آ کر چڑیا گھر کی طرف مڑی تھی گویا نقلی وودھان کی سی کی طرف سے آ رہا تھا۔ ایک دوسری باتیں ہو سکتی تھیں یا تو وہ واقعی پر اسرار اور ماورائی علوم کا ماہر تھا کہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا تھا یا پھر چڑیا گھر کے گیٹ سے داخل ہونے والی لینڈ کروزر میں کوئی اور تھا۔ میں سڑک کی دوسری طرف سے جیب میں بیٹھے ہوئے شخص کی جھلک نہیں دیکھ پایا تھا۔

صدف نے کہا ”یہ واقعی کسی شیطان سے کم نہیں۔ ابھی یاد کیا، ابھی حاضر۔“

میں نے اگلے کٹ سے ہائی روف کو موڑا اور داہنی کی سڑک پر ڈال دیا۔

صدف نے تشویش ناک انداز میں کہا ”ودھان! اس مرد در پلعت بھیجو۔“

”وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نقلی وودھان کے تعاقب میں چڑیا گھر کی طرف جا رہا ہوں۔“

میں نے کہا ”میں صرف اپنے تجسس اور شک کی تصدیق چاہتا ہوں۔ ہم نے سرخ جیب کو دیکھا ہے۔ یہ بات یقینی نہیں کہ اس میں ہمارا مطلوبہ بندہ ہی ہو۔ وہ کوئی اور جیب بھی ہو سکتی ہے۔ میں نمبر پلیٹ دیکھ کر بغیر مطمئن نہیں ہوں گا۔“

”اور اب اس لینڈ کروزر کا نمبر فریو سیون تھری سیون ہی

ہو تو؟“

”تو ہم بھی اس کے پیچھے چڑیا گھر میں داخل ہوں گے۔“

”میں تمہارے نظری تجسس سے انکار نہیں کرتی۔“ وہ معتدل انداز میں بولی ”میں خود بھی بہت تجسس و تامل ہوں لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا وجدان! کہیں ہم اس بہرہ دہی کے چکر میں الجھ کر بڑے پاشا کے جنازے میں شرکت سے نہ رہ جائیں!“

میں نے کہا ”اللہ دتے مجھے بتایا تھا، لاہور سے سید پور ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔ اس وقت تو بجے ہیں۔ اگر ہم بارہ بجے بھی لاہور سے نکلیں تو بہ آسانی وقت پر وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مزید کی بیشی تیر رفتار ڈرائیو تک سے پوری کی جا سکتی ہے۔“ میں نے ڈرائیو کے بعد اضافہ کیا ”ہمارے پاس تین گھنٹے کا وقت ہے۔ اس عرصے میں ہم نکلے و جدان پر اچھی خاصی ریسرچ کر سکتے ہیں۔“

”مجھے نہیں امید، وہ ہمارے ہاتھ آ سکے۔“ صدف نے کہا ”اگر وہ واقعی نظر بندی کا علم جانتا ہے تو اس مرتبہ بھی وہی ہوگا جو توڑی دی پہیلے ڈیپارٹمنٹ اسٹور پر تمہارے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ نظر بندی کا علم بہت کثرت سے دکھاتا ہے۔“

میں نے کہا ”بندش کسی بھی قسم کی ہو اس کا تو زبھی موجود ہوتا ہے!“

میری اس دلیل کے بعد صدف نے کچھ نہ کہا اور ہم چڑیا گھر میں داخل ہو گئے۔ لینڈ کروڈز کی نمبر پلیٹ کا جائزہ لیا گیا تو وہ اسی بہرہ دہی کی جیب ثابت ہوئی۔ اس انکشاف نے میرے رگ و دیے میں ایک سنسنی سی دوڑ اڑی۔ چند لمحات بعد ہم دو گت حاصل کر کے چڑیا گھر کے اندر وہی حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ اس مرتبہ صدف نے باہر رک کر بہرہ دہی کا انتظار کرنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تجربے میں ناکامی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

ہم چدرہ میں منت تک مختلف جانوروں کے بنجروں کے پاس پکراتے رہے لیکن اس بندہ پر اسرار کی ایک جھلک دکھائی نہ دی۔ میں وہاں سے واپسی کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ وہ اچانک مجھے نظر آ گیا۔ وہ ایک بچے کی انگلی تھا جسے اس شہر میں دیکھا جا تھا۔ صدف کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”یہ اس کے ساتھ بچہ کیسا ہے، تمہوڑی دیر پہلے تو یہ اکیلا تھا!“

میں نے کہا ”میں خود حیران ہوں۔ میڈیکل سائنس نے

ابھی اتنی زیادہ ترقی بھی نہیں کی۔“

صدف میڈیکل فائل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ میری بات کو بڑی وضاحت سے سمجھتے ہوئے بولی ”ہاں، یہ تو کئی نامکانات میں سے ہے۔“

”جلو، اسی سے جا کر پوچھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور بہرہ دہی کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ہم اس وقت پہلے لینڈ کے پاس کھڑے تھے۔ باہر سے شہر کے بنجرے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن شاید اس نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ وہ بنجرے سے ہٹ گیا اور بچے کی انگلی کو تھامے ایک دھڑلانی راستے کی ادھنچائی چڑھنے لگا۔

میں نے صدف کے ساتھ اپنی پیش قدمی میں تیز لاتے ہوئے کہا ”کتنی عجیب سی بات ہے۔ عام طور پر ایسے مواقع پر بچے بدوں کی انگلی کھاتے ہیں۔ اس بہرہ دہی اگر کوئی بچہ پایا بھی ہے تو اس کی انگلی پکڑے محسوس رہا ہے۔“ صدف نے گہری سنجیدگی سے کہا ”ان عجیب و غریب باتوں کو تو رکھو ایک طرف۔ میں کسی اور سی کتے پر غور کرنا ہوں۔“

”وہ کتہ کون سا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تک ہم نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔“ صدف نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ”صرف پشت ہی ہمارے سامنے آئی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے، وہ نکلے و جدان کے کھائے کوئی اور شخص ہو!“

صدف کی بات میں وزن تھا۔ واقعی مسلم ڈاؤن والے بیل سے لے کر اب تک ہم اس کی پشت ہی دیکھتے آئے تھے مگر میں مخصوص جیب اور ڈریسنگ کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو کل رات شہر کے کنارے میرے سامنے آیا تھا۔ وہاں میں نے اس کی شکل و صورت دیکھی تھی۔ وہ بہو میں تھا۔ ہم دونوں کے قد کاٹھ، نقش و نگار اور انداز و خیال سب سرفورٹ نہیں تھا پھر اس کی پراسراریت بھی اسے نکلے و جدان ثابت کر رہی تھی۔

میں نے کہا ”اس وقت ہم اس کے بہت قریب پہنچے ہیں، تم اس کی شکل بہ آسانی دیکھ سکو گی۔“

جب تک ہم معنوی و دھن والے فوارے کے پانی سے گزر کر اس دھڑلانی راستے کی جانب بڑھتے، بہرہ دہی کے نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے دھڑلانی چڑھنے لگے۔ اس راستے کے اختتام پر معلوم ہوا اس طرف مختلف رنگ و نسل کے ناگزیر کے بنجرے ہیں۔ ایک بچہ ناچا بیٹھے بنجرے سے ہوتے تھے جن میں خوش نما جلد اور

ہاتھ و پاؤں کے مالک شیر چیتے بند تھے۔

چڑیا گھر کے اس حصے میں لوگوں کا بہت رش تھا۔ مرد و زن اور ہر عمر کے بچے بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ میں تلاش نظر سے بہرہ دہی کو ڈھونڈنے لگا۔ صدف کا حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔

”عجیب مصیبت ہے۔ یہ شخص بھی!“ صدف کی جھنجھالی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں بھی حیران تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ وہاں موجود افراد میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے سراسر سفید لباس پہن رکھا ہو۔ ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس حصے کے آخری حصے میں پہنچ گئے۔ آگے راستہ بند تھا۔ اس راستے کو چڑیا گھر کی انتظامیہ نے عارضی طور پر بند کر رکھا تھا۔ وہاں کوئی تحیری کام ہو رہا تھا۔ شیروں والا آخری بنجرہ بھی خالی تھا۔ ایک چھوٹے سے پورڈ پر وارنٹ نماد ایت بھی درج تھی کہ کوئی بھی شخص اس طرف آنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اپنے نقصان کا فوڈزے دار ہوگا۔

”وہ تو یہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا وجدان!“ صدف نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”کہیں ادھر تو نہیں کو دیا!“

اس کا اشارہ اسی خطرناک حصے کی جانب تھا جہاں جانے سے عام الناس کو منع کیا گیا تھا۔

میں نے کہا ”بظاہر تو یہی لگتا ہے ورنہ اگر وہ یہاں ہوتا تو ہم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔“

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

میں نے ممنوعہ حصے کی دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جلو، واپسی کے راستے سے ہو کر ادھر جاتے ہیں۔“

اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور ہم واپسی کے لیے پلٹ گئے۔ اسی وقت ہم دونوں کو ایک ساتھ حیرت کا شہید ہوا۔ وہ کینہہ شخص دھڑلانی راستے پر آ کر اس حصے سے نکل رہا تھا۔ میں نے صدف سے کہا ”بھاگو اور نہ دھک ل جائے گا۔“

میں نے دوڑنے والے انداز میں قدم اٹھائے ہی تھے کہ عقب میں آوازیں ابھریں ”پکڑو..... جانے نہ پائیں دوڑو..... دھک ل رہے ہیں.....“

پھر اس سے پہلے کہ ہم رک کر صورت حال کا جائزہ لے لے، ہمیں درجن بھر افراد نے گھیرے میں لے لیا۔ صدف کو تو کسی نے چھوئے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی البتہ مجھے بازوؤں سے تھام لیا گیا۔

میں نے غصے سے جھک کر اپنے بازو پھڑائے اور سخت لہجے میں کہا ”یہ کیا بدتمیزی ہے، مجھے اس طرح کیوں پکڑ رہے ہو۔ میں نے تمہارا کیا لگا ڈالا ہے؟“

”اس طرح نہ پکڑیں تو پھر کس طرح پکڑیں۔“ ایک نوجوان نے جو شیلے لہجے میں کہا ”تم نے ہمارا نہیں بلکہ اس عورت کا کچھ لگا ڈالا ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک خوش لباس خاتون کی جانب اشارہ کر دیا۔ اسی وقت انکشاف ہوا کہ مجھے ایک جیب کھترے کی حیثیت سے دبوچنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مذکورہ عورت کا دعویٰ تھا کہ میں نے اس کے پرس میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میں نے برہمی سے کہا۔

”کیا آپ نے مجھے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالتے دیکھا تھا؟“

”ہاں دیکھا تھا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولی ”تم نے میرے پرس میں سے چھوٹا ہوا اڑایا ہے۔ یہ دیکھو، پرس کی زپ کھلی ہوئی ہے۔“

پھر اس نے مجھے اپنا کھلا ہوا پرس دکھایا۔ اس وقت تک چڑیا گھر کے سیکورٹی اسٹاف کے دو افراد بھی اس ہنگامہ آرائی کی بے سوچہ کر ہمارے نزدیک آ گئے۔ وہ دونوں بڑی خوشنوا رنگ ہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”محترمہ ملتا ہے، آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر واقعی آپ کا بونا نکلا ہے تو پھر آپ راستہ پیٹ رہی ہیں، میرے خیال میں سب کچھ نکل چکا ہے۔“

”تم تلاش دو۔“ سیکورٹی کے ایک شخص نے مجھ سے کہا۔

اس صورت حال سے منہنے کا ایک ہی آسان طریقہ تھا کہ میں جامہ تلاش میں رکاوٹ نہ بنتا۔ میں نے کوئی ہوا نہیں مارا تھا اس لیے گہرے مندی کی کوئی بات نہیں تھی۔

”آپ خوشی سے میری تلاش لے سکتے ہیں۔“ میں نے سیکورٹی والے سے کہا۔

وہ آگے بڑھا اور مجھے نڈولے اور پرکھنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا ”بونا تو اس کے پاس نہیں ہے۔“

مجمع میں موجود ایک شخص نے خیال آرائی کی ”اس نے بونا اپنی ساتھی کو دے دیا ہوگا۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ میں نے چیخ کر کہا ”میں تم لوگوں کے چیخ سے بات کرتا ہوں۔“

”صاحب! اس میں غصہ کرنے کی کون سی بات ہے۔“

سیکھو رنی والا قدرے نرمی سے بولا ”ہو! آپ کے پاس سے  
نبردہ نہیں ہوا۔ اگر آپ لوگوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق  
نہیں تو آپ کی ساسھی کے پاس بھی وہ ہونا نہیں ملے گا۔ آپ  
فکر نہ کریں۔ ہمارا لیڈر اسٹاف ان کی تلاش لے گا۔ ویسے  
آپ چاہیں تو ہمارے چیف سے بات کر سکتے ہیں۔“  
اس کی بات مقبول تھی۔ جب ایک عورت دوڑے دار تھی  
کہ میں نے اس کے پرس میں سے ہوا نکالا ہے تو سیکھو رنی والا  
میری اور صدف کی تلاش پیلے میں حق بجانب تھا۔ اس مصیبت  
سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کے لیے یہ از حد ضروری تھا۔  
میں نے سیکھو رنی والے کی بات مان لی۔ ایک کمرے میں ایک  
لیڈی سیکھو رنی گاڑنے صدف کی تلاش کی اور نتیجہ یہ برآمد ہوا  
کہ مذکورہ ہوا اس کے پاس بھی نہیں ہے۔ اب سیکھو رنی والوں  
کے پاس ہمیں روکنے یا ہمارے خلاف کسی قسم کی کارروائی  
کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، لہذا محضرت کے بعد ہمیں فارغ  
کردیا گیا۔

ہم چڑیا گھر سے نکل کر گرے ہائی روٹ کی طرف آئے تو  
صدف نے پوچھا ”وہ جان ایہ سب کیا تھا؟“  
”مہم جوئی۔“ میں نے نیم طرزے لکچے میں کہا ”تمہاری  
تفریح طبع کے لیے قدرت نے کچھ سامان کر دیا تھا۔ تمہیں  
ایڈوجر بہت پسند ہے نا!“  
وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی ”قدرت نے یا اس کام  
بجٹ بہروپے نے؟“

”جب اس کے بارے میں ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ نظر بندی کے ساتھ ساتھ کچھ پراسرار علوم سے بھی واقف ہے تو پھر کیوں، کون، کیا اور کیسے جیسے الفاظ سے متنبی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تمہاری طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ عملی وجدان نے ہم سے جان چھڑانے کے لیے کسی بھی طرح وہ ناکر رچایا ہے۔ وہ ہمیں اس معاملے میں ابھار کر ہماری توجہ خود سے ہٹوانا چاہتا تھا۔ اس سے ایک بے بات بھی ثابت ہو گئی کہ وہ یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ ہو گیا تھا۔“

”بھارت میں گیا وہ بھروسہ دینا اور اس کے برسرِ اہم علوم۔“  
 صدف نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہنسی سے کہا ”خواہ مخواہ  
 بار بار ہمیں بریٹان کرنے چلا آتا ہے۔“

میں نے ہائی روف اشارت کی اور چڑھا کر سے باہر نکل کر اسے مال روڈ پر لے آیا۔ اب ہمارا رخ ریگیل کی جانب تھا۔ میں نے صدف کو چھپنے کی غرض سے کہا ”اگر ہو رہا ہے تو چھپ جا۔“

وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "تمہاری  
جگہ ہے۔ میں اس سے نہیں ڈرتی۔ اگر اس میں جنت ہے تو  
میرے آ کر مقابلہ کرے۔ وہ تو ابھی تک ایک بیگمونس کا  
کردار ادا کر رہا ہے۔" وہ ایک لمبے کوری بھرا خازنہ کرتے  
ہوئے بولی "دیکھو! تمہاری یہ نقل بالکل تمہاری ہی  
طرح پیچیدہ ہے!"

”مجھ میں ایسی کیا چیز ہے؟“ وہ ایک تہقہہ لگاتے ہوئے بولی  
 ”خیر، تمہارے سوال کا میں کسی مناسب موقع پر جواب دوں  
 گی۔“

”گواہ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ یہ موقع مناسب نہیں؟“  
 ”خیر، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“  
 ”پھر کیسی بات ہے؟“  
 ”کچھ نہیں۔“

اس کے گریز اور ہچکچاہٹ نے مجھے اُکسایا۔ نقلی دھماکے نے اپنے روٹے سے خاصی کوفت میں جلا کیا تھا، میں نے صدف سے تفریق لیتے ہوئے کہا ”میں نے تمہاری بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تم دل میں بہروپ سے ڈر رہی ہو اسی لیے اب کشائی میں ہچکچا رہی ہو ورنہ میرے سوالات اتنے پیچیدہ یا مشکل نہیں ہیں کہ ان کے جواب دینے کے لیے کسی خالص موقع کا انتظار کرنا پڑے۔“

میری بات ختم ہوئی تو وہ ترخ کر بولی ”وہداں! اے  
بھگوڑے سے ڈرتی ہے میری جوتی۔“

جناح روڈ پر مہموتے ہوئے کہا ”میں سے گاڑی کو بائیں جانب قافلہ  
جان ہیں اس لیے یہ کسی سے نہیں دوڑیں بلکہ حضرت انسان  
دوسرے انسانوں کو ڈرانے کے لیے بعض اوقات ان سے کام  
لیتا ہے“

وہ چلے گئے انداز میں بولی ”وہ خبیث مجھے کہیں سے بھی  
انسان نہیں لگتا، حضرت انسان تو بہت دور کی بات ہے۔ چاہے  
اگر وہ میرے سامنے آتا تو میں اس کا منہ لوجھ لوں گی۔“

”بہت خوب!“ میں نے زرباب مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ جان! کمال ہو گیا!“ صدف کی سرسراتی ہوئی آواز۔  
 میری سماعت تک پہنچی ”شاید اس بہرہ دہ نے ہماری بات

میں نے صدف کے اشارے کی تقلید میں نگاہ دوڑائی اور مجھے لینڈ کرڈر نظر آگئی۔ وہ پلازا سینما سے ذرا آگے گاؤں

کہ ایک شوروم سے باہر آ رہا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں  
میں اس کی جیب کی کسر پلینٹ وکیمل۔ وہ واقعی نقلی وجدان  
فانا۔ اس مرتبہ بھی ہماری نگاہیں اس کی پشت تک ہی محدود  
رہیں۔ دونوں گاڑیوں میں ایک مخصوص فاصلہ برقرار تھا۔ اس  
وقت ہم قافلہ جناح میڈیکل کالج کے سامنے سے گزر رہے  
تھے جب صدف نے شیشائے ہوئے لچھ میں مجھ سے استفسار  
کیا۔ ”جس شخص سے بات کرنا ہے؟“

”آفریں ہم سے چاہنا لیا ہے۔“ میں نے ہنسنے لگا۔  
 ”ہم سے نہیں بلکہ صرف مجھ سے۔“ میں نے ہنسنے لگا۔  
 ”اس کی دوستی اور دشمنی صرف اور صرف مجھ تک  
 محدود ہے۔ اب تک میں فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ اسے دوست  
 سمجھوں یا دشمن!“

مدف نے اکٹھا ہٹ آ میر لہجہ میں کہا "ایسے شخص سے  
دوئی کیسے ہو سکتی ہے جو دم قدم ہر تکلیف کا باعث ہو؟"  
میں نے کہا "ابھی تک اس نے مجھے واضح طور پر کوئی  
نشان نہیں پہنچایا ہے اور نہ ہی فائدہ!" میں ایک لمبے گور کا  
بھربھات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور جہاں تک اس کے  
موجودہ رویے کی بات ہے تو اس میں اسے تصور و ار نہیں ٹھہرایا  
ہاں تک ہم اپنی مرضی سے اس کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں  
اور..... کوئی اٹھارہ ہیں۔"

”یہ اچھی منطق ہے۔“ وہ غلغلے سے بولی ”وہ جان! تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے، تم غلطی وہ جان کی غمور کر رہے ہو۔ کہیں اس نے کچھ پڑھ کر کم پر پھونک تو نہیں دیا؟“

میں نے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ٹھنڈے دل و  
 داغ سے حالات کا تجزیہ کر دو تو ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں جہاں  
 میں پہنچ چکا ہوں۔“

”میں ایسے فضول تجزیوں کے چکر میں نہیں پڑتا جاتی۔“ وہ لاشعری کارویہ اپناتے ہوئے بولی ”تم مجھے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بتاؤ؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”ہم سید پور جا رہے ہیں۔“

”کیا اس کے ساتھ ساتھ۔“ وہ بھجوس سیکھتے ہوئے  
بولی ”اس کی راہ نمائی میں؟“

”مجھے سید پروتک جانے کے لیے کسی کی راہ نمائی کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا، ”اللہ دتہ نے راستے کی تفصیل بتائی۔“

وہ شک آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی ”گلتا ہے، تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو اسی لیے غل و جدان کو اہمیت نہیں دے رہے ہو؟“

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں، تم خواہ مخواہ ہم میں نہ پڑو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں یا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟“  
 ”واقعی ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا

”اور اگر میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو سب سے پہلے میں تمہیں ہی آگاہ کروں گا۔ یہ میرا اہم سے وعدہ ہے۔“

وہ مطمئن ہو کر وڈ اسکرین کے پار سرخ لینڈ کروزر کو  
بکنے لگی۔

میں نے صدف سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا تاہم میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ بہر پرچامیرے ساتھ رہیں گے تو ہاتھ میں بھی بی الحال اسے فراموش کر دوں۔ مجھے سب سے پہلے سید پور اور رکھال والی مشن دیکھنا تھا پھر نئی وجدان سے جی نمٹ لیا جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اگر از خود میری راہ کی رکاوٹ بننا تو میں اسے بھی دیکھ لیتا۔

مزمک چونکی پر میں نے فاطمہ جناح روڈ کو چھوڑ دیا اور  
ہائی روڈ کو گلیبرگ روڈ پر ڈال دیا۔ یہ مزمک الپو اکاکی کہہ اس



سے گزر کر کینال بینک روڈ سے جاتی پھر ہمارا راستہ سیدھا ہو جاتا۔ سرخ لینڈر دوز مخصوص فاصلے سے ہمارے آگے جاری تھی لیکن کینال بینک روڈ پر آنے کے بعد اس نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور مال روڈ کی کراسنگ پر وہ بائیں جانب مڑ کر مال روڈ پر رزواں دواں ٹریفک کا حصہ بن گیا۔

صدف نے اطمینان کا سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”شکر ہے، اس مصیبت سے نوحان چھوٹی۔“ میں نے عملی وجدان کی ”رضعتی“ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کینال بینک روڈ پر گاڑی کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم فتح گڑھ کو پہنچے چھوڑ کر سید پور کی جانب گامزن تھے۔ دو تین کلومیٹر آگے آنے کے بعد سڑک اتنی ہموار نہ رہی جتنی پہلے تھی۔ مجھے ہائی روڈ کی رفتار قدرے کم کرنا پڑی۔ اس کے ساتھ ہی سڑک بھی کچی ہوئے کے سبب مھول مٹی بھی اڑا رہی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ اس دوران میں ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہ کہہ کر یہ کہہ کر میری گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ اس کا یہ استفسار یہ بارشل آرٹس اور ”جی“ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ معاشی اور معاشرتی ٹوہ میں بھی لگی ہوئی تھی۔

ہم بات چیت کرتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ سید پور کے نزدیک پہنچ رہے تھے کہ دھڑا اسکرین کے پار دوسرے سڑک پر میں نے گردوغبار کا ایک طوفان اٹھتے دیکھا۔ یہ منظر صدف کی نگاہ سے بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ وہ خیال آرائی کرتے ہوئے بولی۔

”میرے خیال میں کوئی گاڑی تیز رفتاری سے ہماری جانب آرہی ہے۔“

”میں تمہارا ہم خیال ہوں۔“ میں نے کہا۔ اسی وقت فضا میں ایک مخصوص قسم کے سائرن کی صدا گونج اٹھی۔ ایسا ہارن یا تو پولیس موبائل پر نصب ہوتا ہے یا پھر ایبولنس پر۔ صدف چونکے ہوئے لہجے میں بولی ”یہ کوئی ایبولنس ہو سکتی ہے۔ کسی ایمرجنسی میں سائرن کو اپنا استعمال پہنچانے کے لیے وہ اس تیز رفتاری پر مجبور ہیں۔“

”ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے گمبیر آواز میں کہا۔ ”اور اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟“ وہ پوچھے باندھ رہی تھی۔

عجب نہیں، یہ پولیس موبائل ہو!“

صدف نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا۔ اس دوران میں متذکرہ گاڑی کل کر سامنے آ چکی تھی۔ وہ گرد کی لپیٹ میں تو اب بھی تھی تاہم ہمارے درمیان فاصلہ چل کر ہندونج کم ہو رہا تھا اس لیے اسے دیکھنا ممکن ہو گیا تھا۔

میں نے محدود فاصلے سے اسے پہچان لیا۔ وہ سفید رنگ کی ایک ٹویوٹا ہائی ایس تھی جس کے ہاتھے پر مخصوص سرخ جی اینی گردش حرکت جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس گردش کا ساتھ دینے کے لیے ہارن کی آواز بھی مسلسل فضا کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب ہمارے درمیان انتہائی کم فاصلہ رہ گیا۔ چند لمحوں بعد ہم ایک دوسرے کے پہلو سے گزرنے والے تھے اور اسی وقت میری نگاہ ایبولنس کی پہنچا سیٹ پر لگی اور..... وہ وہیں چپک کر رہ گئی۔ پنجرہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر مجھے اپنے دلچسپ مزاج کے آثار محسوس ہوئے۔ میں نے اسے سینکڑے

لاکھ دیکھے میں پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ شعیب نورانی کا قابل اعتماد نائب کبیر شاہ عرف شاہ جی تھا۔

مجھے اپنے بدن پر چھوٹیاں سی رہتی محسوس ہوئیں۔ شاہ جی کا لاہور کے گرد و نواح سے دور کا بھی تعلق، واسطہ تھا اور وہ ایک ایبولنس کی پنجرہ سیٹ پر بیٹھ کر سید پور سے لاہور کی جانب آ رہا تھا! یہ حیرت انگیز کے ساتھ ساتھ ایک ناقابل یقین بات بھی تھی۔

”وہ سید پور سے نہیں بلکہ رکھان والی سے آ رہا ہے!“ میرے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ میں نے چھٹی حس کی اس بات پر فوراً سے چشتر سمجھ لیا۔

اسی وقت دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو آ گئیں اور بے ساختہ میری نگاہ ایبولنس کے پچھلے حصے کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں اسٹریچر پر کوئی لیٹا تھا۔ بیٹنی طور پر یہ وہی شخص تھا جسے ایمرجنسی میں اپنا ہسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ میرے بدن کا سارا خون دل میں جمع ہو گیا اور دل نے پوری شدت سے دھڑک کر کہا ”یہ میری رنگ جاں سال ہے۔۔۔۔۔۔!“

میں نے ہر قسم کی احتیاط اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر جسم و جان کی ساری توانائی صرف کر کے بریک پڈل کر دی۔

ہائی روڈ میں زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ ایک ہوائی جہاز کا کرک ٹکھی۔ ریڈیل پلائی (RADIAL-PLY) تیار کی گئی ایسی ہی مضبوط ہوتی ہے، گاڑی کو روڈ پر بانٹھ رکھ دیتی ہے۔ ان نازک لمحات میں صدف نے خاموش ہوش علی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ میں نے جیسے ہی میکا کی

ڈول میں بریک لگائے، اس نے بے اختیار اپنے دونوں بازو ہاتھ پچھلائے اور ڈیش بورڈ کا سپارلے کر خود کو کسی بڑے ٹھکان سے بچا لیا۔ ممکن ہے، یہ اس کا غیر ارادی عمل ہو۔ ہر حال وہ شدید زخمی ہوئے سے محفوظ رہی۔ اس کی احتیاطی پہلی نے مفید کام دکھایا۔

ہائی روڈ آٹا قانہ کی رو اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ مٹی اور پورے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انجن کو دوبارہ بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ دوسری تیسری کوشش میں ناکامیاب دینے کے بعد میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بالکل آیا۔ اس وقت مجھ پر ایک وحشت سی سوار تھی۔ برے اندر کوئی بھی کچ کر کہہ رہا تھا، ساحل لمحہ بہ لمحہ مجھ سے

میں اپنے اندر... کی اس آواز پر دھیان دینے کے لیے بڑھتا۔ میں گاڑی سے نیچے اترا تو صدف نے جھجھکائے ”مجھے شک ہے کہ اس کا تعلق ہمارے ساتھ ہے ہوا؟“

”وہ ساحل کو لے گئے۔“ میں نے بے خودی کے عالم میں کہا۔

صدف اپنی سائیکل کا دروازہ کھول کر ہائی روڈ سے نیچے آئی اور حیرت مہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”تم کس ساحل کا ذکر کر رہے ہو؟“

”وہ ہائی ایس میں اسٹریچر پر تھی۔“ میرے لہجے میں ابھرنے لگی تھی ”کبیر شاہ اسے کہیں لے جا رہا ہے۔“

ایٹمی بات ختم کرتے ہی میں نے ہائی روڈ کی باڈی پر بڑبڑاؤ اور غصہ اٹھایا ”تم نے بھی اسی وقت دھوکا دینا تھا!“

میں نے زبردستی انداز میں کہا اور اچانک پلٹ کر اس سمت دوڑ لگا دی۔ میرا ایک ہاتھ اسی لمحہ تھا۔ ساحل کے خیال نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔ میں جا بے جتنی تیز رفتاری سے کیوں نہ ہو، ہائی ایس کو نہیں چکڑ سکتا تھا۔ میں ان جونی لمحات میں جو تو ان کے ہاتھ وہ میرے پس میں نہیں تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تیرے موت مجھے اپنی انگلی کے اشارے پر پتہ چار ہی ہو۔

میں ہر صورت میں ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے عقب میں صدف کی سرسراہٹ ہوئی آواز سنانی دی ”وجدان! تمہارا بائیں پن میری کچھ سے باہر ہے۔ پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“

اپنی باتوں کی اقسام گنوانے اور بتانے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں صدف کی سنی، ان کی کرتے ہوئے اندھا دھند دوڑنا چلا گیا۔ اس وقت میری سوچ ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی اور وہ نقطہ تھا۔ ساحل!

صدف کی طرح بعض لوگ میری ان حرکات کو بائیں پن کے کھاتے میں ڈال رہے ہوں گے لیکن میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا تھا، افسر اری انداز میں مجھ سے جو بھی سرزد ہو رہا تھا اس میں میرا کوئی تصور نہیں تھا۔ میرا کوئی مضبوط جذبہ مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں ساحل کا تعاقب کروں۔ اگر آج مجھے تاخیر ہوگئی تو پھر میں زندگی میں بھی اسے حاصل نہیں کر سکتا گا، وہ مجھ سے اتنی دور چلی جائے گی جہاں شاید میری سوچ بھی نہ پہنچ سکے!

بعض اوقات انسان کے اندر اتنا طاقت ور جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو اپنے تابع کر لیتا ہے۔ اس جذبے کے زیر اثر انسان بڑی سے بڑی قوت سے بھی ٹکرا جاتا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، سچ کر رہا ہے۔ ایبولنس کے عقبی حصے میں، میں نے ایک اسٹریچر رکھا دیکھا تھا جو سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسٹریچر پر لیٹا ہوا شخص چادر کے نیچے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میرے دل کی دھڑکن بار بار مجھے یقین دلا رہی تھی کہ اس اسٹریچر پر ساحل ہے۔ ساحل کے سوا اور کوئی نہیں!

سفید ایبولنس گردوغبار کے طوفان میں میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے مخصوص سائرن کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔ اس کا مطلب یہی تھا، وہ بہت دور نکل گئی تھی۔ اس احساس نے مجھے حد درجہ تکلیف پہنچائی کہ میں دوڑ کر اس ایبولنس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو کیا، میں ساحل کو نہیں پاسکتا؟

اس سوال نے مجھے مرتا پا لرزادیا۔ میں نے ساحل کی چوٹی میں پہلے ہی بہت تکلیف اٹھائی تھی۔ لاتعداد نامہربان لمحات ہمارے درمیان حائل ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے کئی بے قرار شاہیں اور بے کیف صمیمیں اس کے بغیر گزاری تھیں۔ میرے قدم یک بیک رک گئے اور میں حقیقت پسندانہ انداز میں ایک عملی انسان کی طرح ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے ایبولیس کی پنجر سیٹ پر کیر شاہ کو بیٹھے دیکھا تھا اور میرے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ وہ ”رکشا والی“ سے آ رہا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ایبولیس والوں نے ایک لمحے کے لیے بھی گاڑی رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ کیر شاہ عرف شاہ جی نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ یعنی طور پر اس نے مجھے دیکھا نہیں ہوا۔

نے ہر ایک لگا دیئے تھے۔

اچھے لمبے پور کی جانب سے اٹھنے والا گرد و غبار کا ایک  
 اچھا بھلا نمونہ نظر میں آ گیا۔ کوئی ہوی گاڑی بڑی تیزی سے  
 ہل رہی تھی۔ آج ہی صبح وہ گاڑی میرے لیے کسی امید کی  
 علامت کے مانند تھی۔ مسئلہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے،  
 اسے روک کر کوشش کروں گا اور ہر ممکن طور پر اسے لاہور کی  
 روڑوں پر لے کر جاؤں گا۔

”میں تمہاری ہر الجھن کی تسلیمن پیش کر دوں گا۔“ میں نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا ”نی الحال تو مجھے پہلی فرمت میں ساحل تک پہنچنا ہے۔“ وہ خاموش ہو کر دم در دم روانہ لگاؤ سے مجھے نکلے گی۔



اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور ضمیر سے ہوئے لہجے میں بولی ”وہ جان! انہیں اپنی ساحل تک پہنچنا ہے اور ہمارے پاس دقت بہت کم ہے، جلدی سے گاڑی میں آجاؤ، ہری اپ!“

صدف کے اس لب دلچے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ اس وقت ایک بدلی ہوئی صدف نظر آ رہی تھی جس کے انداز میں صرف اور صرف میرا ہی خیال تھا۔ وہ سرتاپا پیری ہر درد کھائی دیتی تھی۔ میں نے ایک لفظ اور اکیے بغیر اس کی بات مان لی۔

آئندہ دس سیکنڈ کے اندر ہم نے اٹھو والی بیٹیوں کو ڈرائیونگ سیکین سے باہر پھینکا۔ صدف کی کارروائی نے بیشتر اٹھو والی کاربازا کر دیا تھا۔ اس حوالے سے میں نے صدف سے کوئی سوال نہ کیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ صدف نے جو کچھ بھی کیا اس کے لیے موٹے حریص ڈرائیور ہی نے اسے مجبور کیا ہوگا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ جب ہائی گیس اپنے باقاعدہ ڈرائیور کے پاس سے گزری تو اس تو نہ دلیے شخص نے اٹھ کر ہماری جانب دوڑ لگا دی۔ اس کوشش میں اس کا تہ بند ایک مرتبہ بھر دغا دینے لگا۔ وہ اس فریبی پوشاک کو دو دلوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے برآواز بلند ہمیں صلواتیں سناتے لگا۔

وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔ ہم اس کی پہنچ سے دور نکلے جا رہے تھے۔ وہ اپنی چربی تو نہ کوئی سنبھالتا ہندوک۔ وہ بڑے معطلہ نیز انداز میں دوڑنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن بے بسی نے اس کی ہر کوشش نا کامیاب بنا دی۔ اپنی نا کامیابی کے ماتم کے طور پر وہ ہمیں مغلظات میں قول رہا تھا۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد اس کی خرافات ہماری ساعت کی پہنچ سے بہت پیچھے رہ گئی۔ ٹویو ہائی گیس نے اچھی خاصی رفتار بکڑی تھی۔

صدف نے ایک طویل سانس خارج کی اور زہر لے لہجے میں کہا ”اس بد تیز کی یہی سزا تھی۔“

صدف کے اس جملے نے میرے خیالات کی تعداد بڑی کر دی۔ یہ تو سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس سوئے فوجی طور سے صدف کے ساتھ کیا بد تیز کی ہوگی۔ صدف ایک درجن آدمیوں سے تہا نہٹ سکتی تھی۔ میں نے سڑک پر گناہ جمانی اور گاڑی کی رفتار کو بتدریج بڑھا تا چلا گیا۔

ٹویو ہائی گیس میں بہت ہی طاقت ور انجن نصب ہوتا ہے جس کے تیل بوتے پر گاڑی کو نہایت ہی تیز رفتاری سے دوڑایا جاسکتا ہے۔ اس گاڑی کی مستندی اور فعالیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے پولیس والے خاص طور

پر مو بائیل کی صورت میں استعمال کرتے ہیں۔ گاڑی کے ڈرائیونگ سیکین میں خاموشی طاری تھی۔ ہر ہی ہم نے فتح گڑھ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارے درمیان حال خاموشی کو صدف نے توڑا۔ وہ دھڑا اسکرین کے پار دیکھ ہوئے بولی۔

”وہ جان! ہمارے درمیان اچھا خاصا فاصلہ قائم ہو چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم چاہے جتنی بھی رفتار بڑھاؤ، ایبونیٹس کو نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں دیکھ اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ نظر آ رہا تھا۔ وہ طوفانی رفتار سے ہوا میں اڑی جا رہی تھی۔ تم کس توقع پر اس کا تعاقب کر رہے ہو؟“

میں نے صدف کی بات پر غور کیا تو اس کے الفاظ کی صداقت کو ماننا پڑا۔ تاہم میں نے اپنی دھشت کے زہر جواب دیا ”میں اسی توقع پر ساحل کا تعاقب کر رہا ہوں جنہر دنیا قائم ہے۔“ پھر ایک لمحے کا وقفہ کر کے میں نے مزید کہا ”میرے نزدیک تو تم اور امید میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔“ صدف نے سفید ایبونیٹس کے تعاقب کی بات کی تھی لیکن میں نے اسے جواب ساحل کے حوالے سے دیا تھا۔ اس وقت ساحل میری سوچ کا محیط بنی ہوئی تھی۔ میرے تمام خیالات اس کی ذات کے اندر گردش کر رہے تھے۔

صدف نے بتدریج اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا ”خدا کرے! وہ لوگ اسی سڑک پر سیدھے سڑک کریں۔ اگر ایبونیٹس راستے میں کہیں سڑکی تو پھر اس تک پہنچنے کے امکانات صفر کے برابر ہو جائیں گے۔“

”وہ اسی سڑک پر سڑک کریں گے۔“ میں نے تین سے کہا ”اور سیدھے نیو کیپس کے علاقے میں پہنچیں گے۔ تم گرنہ کرو صدف! اگر ہم راستے میں انہیں نہ بھی پکڑ سکے تو منزل پہنچ کر ان کی گردن تاپ لیں گے۔“

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی ”وہ جان! یہ بات اتنے دھوکے سے کیسے کہہ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں جانتا ہوں، اس سفید ایبونیٹس کا تعاقب کسی پرائیویٹ اسپتال سے ہے۔“ میں نے فتح گڑھ اور منزل پر وہ کے درمیان گاڑی دوڑاتے ہوئے کہا ”مذکورہ اسپتال نیو کیپس کے علاقے میں واقع ہے۔“

پھر میں نے اسے ایبونیٹس پر موجود مخصوص لوگو (LOGO) کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ میں اس پرائیویٹ اسپتال کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری باتوں سے خاصی متاثر ہوئی کہ میں نے چند روز کے اندر

لاہور کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ”اللہ کرے، وہ لوگ سیدھے اسپتال ہی جائیں۔“

صدف نے صدف دل سے کہا۔ میں نے دل میں اس کی نیک خواہشات پر ”آمین!“ کا اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی۔ ہم محل پر وہ کے قریب پہنچ رہے تھے۔ نہر کے کنارے کنارے یہ سفر ہمیں سیدھا نیو کیپس پہنچا دیتا۔ شہری حدود میں داخل ہونے کے بعد سڑک نہایت ہی ہموار ہوئی تھی جس کے سبب رفتار بڑھانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تک اس سفید ایبونیٹس کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس وقت نیو کیپس میں داخل ہو چکی ہوگی یا داخل ہونے ہی والی ہوگی۔ جس نہر کے کنارے ہم موجود تھے، وہ نیو کیپس کے علاقے کے قلب سے گزرتی تھی۔ اگر میں اسی رفتار سے ہائی گیس بھارتا رہتا تو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں مذکورہ اسپتال کے گیٹ کے سامنے کھڑا ہوتا۔

صدف کی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ساحل کے بارے میں بہت محتاط روی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کے دوران میں ایک دو مرتبہ گناہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری جانب توجہ ہو گئی۔

”وہ جان! تم نے کسی کبیر شاہ کا ذکر کیا تھا؟“ اس نے ہر گز لہجے میں پوچھا ”اسے تم سے کیا دشمنی ہے جو وہ ساحل کو گھنٹا لے جا رہا ہے؟“

میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا ”دوستی اور دشمنی پر بعد میں تفصیلی بات ہوگی۔ فی الحال اتنا جان لو کہ کبیر شاہ میرے ایک خطرناک دشمن کا دست راست ہے جس کا اڈا تمہارے کاروبار والے بنگلے سے زیادہ دور نہیں۔ اسی پارک کے پاس جس میں ایک خوب صورت مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔“

”جہاں پر ہماری جنگی باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی؟“ صدف کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”دقت بدلتے ہوئے دیکھیں گئی۔ ان دنوں یہ کبیر شاہ اور اس کا پاس شعیب غوری میرے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور میں انہی کے ٹھکانے پر غمراہ ہوا تھا۔ آج میں اور شعیب ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔“

”تم مجھے کبیر شاہ کے اڈے کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ بڑبڑاتے انداز میں بولی ”میں اپنے پاپا کے ذریعے اس کا بندوبست کروا دوں گی۔ تم نہیں جانتے۔ میرے پاپا کے نقلات کتنے اوپر تک ہیں کہ پولیس آفیسر ز سے۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے بڑے سخت انداز میں کہا ”تم اپنے پاپا کو اس جنگ میں نہ جھگو۔ یہ بہت ہی خطرناک کھیل ہے۔ میں جانتا ہوں، یہ کھیل مجھے کس طرح کھیلتا ہے۔“

”میں اس کھیل میں تمہارے قدم بہ قدم رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ دھڑا اسکرین کے پار سڑک کو گھورتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے اسی جتنی سے کہا ”صدف! اب بھی دقت ہے۔ تم اپنا راستہ الگ کرلو۔ تم نہیں جانتی ہو۔۔۔۔۔ خدا کی قسم نہیں جانتی ہو۔۔۔۔۔ میں آتش دغون کے کس کھیل کا حصہ بنا ہوا ہوں۔ میرے ساتھ رہو تو تمہارا سکہ جین چمن جائے گا۔ ساحل کو بھی میری دجہی سے سزا مل رہی ہے۔ تم میرے دشمنوں کو شہر کرنے بھگو تو کتنی قسم ہو جائے گی۔“

”تم مجھے اتنے دشمنوں سے ڈرانے کی کوشش نہ کرو وہ جان!“ اس کے لہجے میں چٹان ایسی تھی تھی ”اور جہاں تک راستہ الگ کرنے کا تعلق ہے تو اس کا دقت گزر چکا۔ میں اس سڑک پر تمہارے ساتھ آتا آگے بڑھ چکی ہوں کہ وہاں ہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے میری آنکھوں میں جھانک اور ٹولادی لہجے میں بولی ”نہیں چاہے اس کا احساس ہو یا نہ ہو!“

اس کے آخری جملے نے میرے دل پر ایک زوردار گھونسا مارا۔ مجھے اپنے تن بدن میں جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی۔ صدف نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بہت گہری بات کہہ دی تھی۔ میں ایسا بھی نادان نہیں تھا کہ اس کی بات کو سمجھ نہ پاتا۔ میں تو اس کے کچھ کے بغیر بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ فریڈ ہائٹ اور منہاس باقر جیسے تجربہ کار جو پیش کوئی کر چکے تھے وہ کیونکر غلط ثابت ہو سکتی تھی۔ صدف کے انداز و اطوار مجھ سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ میں نے بہت پہلے اس کے عزائم کو بھانپ لیا تھا۔ اس کے جذبات قابل قدر تھے لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ صدف ایک اچھی اور چائٹا ساتھی تھی جس کی خاطر میں خود کو بڑے سے بڑے خطرے میں ڈال سکتا تھا لیکن کسی بھی صورت وہ ساحل کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔

حقیقت پسندی بہت مشکل کام ہے اور حقیقت دہی تھی جو میں نے بیان کر دی لیکن صدف سے کھل کر یہ سب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ آنے والے حالات اسے سمجھا دیے۔ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کن آنکھوں سے صدف کو دیکھا۔ وہ گہری تنہائی سے اپنے سامنے چلی ہوئی سڑک کو ٹک رہی تھی۔ میں اندازہ نہ کر سکا کہ وہ اس وقت کیا سوچ



رہی تھی؟ بہر حال، وہ جس قسم کے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی وہ اس کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ میں گبرگ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے کبیر شاہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

میری چھٹی حس نے آج تک مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ کبیر شاہ کو ایبویئیس میں دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ وہ رکھال والی سے آ رہا تھا۔ کبیر شاہ "ساؤتھ" کا نگران اور شعیب خوری سے بہت قریب تھا۔ لاہور کے مضامات میں شاہ جی کا پایا جانا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا پھر مجھے شعیب خوری کی دھمکی یاد آگئی۔ اس نے فرید پاشا کے بیٹے پرفون کر کے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں قریب دو گئے بہت بڑا نقصان پہنچانے والا تھا۔ جب میں نے متروک کنویں سے برآمد ہونے والے سونے کے بارے میں اسے باور کرایا کہ میں اسے اپنا حصہ بھٹم نہیں کرنے دوں گا تو شعیب نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس نے میرے حصے کو استعمال کر کے میرے لیے کوئی بہت بڑی مصیبت خریدی ہے اور جلد ہی وہ مصیبت میری سامنے کھڑی ہوگی۔

شعیب خوری جیسا طاقت ور شخص کھول کھول کر نہیں کر سکتا تھا۔ متروک کنویں سے برآمد ہونے والا سونا کم از کم بیچیں کر دوڑ پے بابت کا تھا اور معاہدے کی رو سے میرا حصہ دس کروڑ پے ہوا تھا۔ کہیں دس کروڑ کی یہ رقم خرچ کر کے شعیب نے میرے دشمن اول چوہدری نواز علی سے الحاق تو نہیں کر لیا تھا؟

اس سوال نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا کیونکہ اس سوال میں واقعی صداقت موجود تھی۔ میں ممکن تھا، شعیب خوری نے دس کروڑ روپے کے بجائے آدھا سونا چوہدری کے حوالے کر دیا ہو اور اس کے بدلے ساحل کو حاصل کر لیا ہو.....!

میرا دماغ تپتے ہوئے تھوڑا نقشہ پیش کرنے لگا۔ میری سانسوں میں ایک ہنپکڑی آئی۔ یہ بات صدف سے چھپی نہ رہ سکی اور وہ تشویش ناک نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے وجدان تہا ہی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟"

"کچھ نہیں۔ تھوڑا ذہنی ہذا ہے۔"

"اس دباؤ کو ذہن پر سے ہٹانے کی کوشش کرو۔" وہ کسی اتالیق کے انداز میں بولی۔ "تم ایک بہت بڑا امر کر کے جا رہے ہو۔"

میں نے گہری ایک سانس لیتے ہوئے کہا "مغورے کا

شکریہ۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہر حال، ایک مرتبہ پھر شکریہ۔"

وہ ٹھکی آئینہ لکچے میں بولی "تمہارا یہ بچہ کبھی کا انداز مجھے بہت دکھ پہنچا رہا ہے۔ اس طرح بار بار شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"سوری! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔" میں نے سہاگ لکچے میں کہا۔

وہ دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میری سوچ دوبارہ چوہدری نواز علی اور شعیب خوری کی طرف مڑی۔ یہ دونوں میری زندگی کے اہم کردار ثابت ہو رہے تھے۔

چوہدری نواز علی مدفن سونے کے لیے باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ سونے کے راز والی ڈائری حاصل کرنے کے لیے اس نے قدم قدم پر میرے لیے مشکلات کھڑی کی تھیں۔ ایک موقع پر اسے اپنی شکست واضح نظر آنے لگی۔ میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے بہت خائف تھا۔ میں نے اندرون سندھ اور پھر کراچی میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو قافلہ خانی نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے اپنے ہمک خواروں کو دائمی احکام دے رکھے تھے کہ مجھے رکھال والی تک پہنچنے سے پہلے ختم کر دیا جائے۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ اب بچتا چلا آیا تھا اور نہ دارا جیسے بد قماش اور بد نام باندو کو گولے بچپن ہی سے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس طویل اعصابی اور جسمانی جنگ نے چوہدری نواز علی کو یہ باور کرایا تھا کہ اگر میں اس تک پہنچ گیا تو پھر اس کی خیر نہیں ہوگی۔ اس نے مجھے ہمیشہ خود سے دور رکھ کر الجھانے کی کوشش کی تھی اور اس کی خواہش رہی تھی کہ کسی طرح سونے کے راز والی ڈائری اس تک پہنچ جائے۔

اب مکمل دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے دوستی کا فریب کھا کر وہ ڈائری بلکہ ڈائری کے "مفید صفحات" شعیب خوری کے حوالے کر دیے تھے۔ ڈائری کا غیر مفید حصہ ایک ڈرامے سے گزرا کہ چوہدری نواز علی تک پہنچنا حاصل کر اس نے اپنا سر بیٹھ لیا تھا۔ مجھ سے کارآمد صفحات حاصل کرنے کے لیے اس بد بخت نے ساحل کو غوا کروا دیا۔ جانتا تھا کہ میں ساحل کے پیچھے موضع رکھال والی پہنچوں گا۔ وہ مجھے ٹپ کر لے گا۔

میں چوہدری کی خواہش اور اپنے مشن کے مطابق ساحل کو حاصل کرنے کے لیے رکھال والی کی جانب رواں دواں تھا کہ سفید ایبویئیس والا واقعہ پیش آ گیا۔ میری چھٹی حس باؤلا مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ شعیب خوری اور چوہدری نواز علی

کے درمیان کوئی بہت بڑی ڈیل ہوئی ہے اور اب وہ دونوں مل کر میرا جینا حرام کر دیں گے۔ میں نے گزشتہ دو تین ماہ میں شعیب خوری کو کبھی بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ بہت بڑی لابی کا آڑ کار بنا ہوا تھا اور پاکستان خصوصاً کراچی کو دہشت گرد خطہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ شعیب خوری میری صلاحیت سے آگاہ تھا اس لیے وہ ہر حال میں مجھے مرہہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ میری کمزوری سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا، اگر ساحل اس کے قبضے میں آگئی تو مجھے چھاپا بہت آسان ہو جائے گا۔ ساحل اور ساؤتھ کے حوالے سے مجھے وہ جھانسا دینے کی کوشش بھی کر چکا تھا لیکن میں اس کی چال میں نہیں آیا تھا۔

میں نے مدفن سونے کا راز منتقل کرتے ہوئے شعیب خوری کو چوہدری نواز علی اور اپنی دشمنی کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔ شعیب مجھے تابو کرنے کے لیے چوہدری کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا تھا اور فون پر ہونے والی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا، شعیب نے اس دوستی کی خاطر میرے حصے کا سونا یا پھر دس کروڑ روپے چوہدری کی نذر کر دیے ہوں گے۔

ان دونوں شیطانوں کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا پھر سفید چادر سے ڈھکا ہوا اسٹریچر میرے تصور میں محسوس کیا۔ میرے دل کی گواہی تو یہ تھی کہ اس اسٹریچر پر ساحل کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس سے ایک فی نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ میرے دشمنوں نے کندھے سے کندھا کھار کر مجھ سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور میری ساحل اب چوہدری کی کورٹ سے نکل کر شعیب کی کورٹ میں پہنچ چکی تھی یا پھر چھپنے والی تھی۔

مجھے بیک وقت دو فرخندہ برلا تھا اور اس طرح لڑنا تھا کر لائی کا حق ادا ہو جاتا۔ ساحل..... میری جان تنہا میرے لیے بہت اہم تھی۔ میں اسے حاصل کرنے کے لیے ہر جہد سے گزرتا تھا، چاہے وہ میری زندگی کی حدی کیوں نہ ہوئی!

☆☆☆

میں نے ہائی گس کو اسپتال کے سامنے سے گزرا اور دو سوڑ کے قافلے پر ایک سوڑ کے کنارے روک دیا۔ دودھ کے ڈبے سے لدی چمندی گاڑی کو اسپتال کے اندر لے جانا مجھے بھی طور مناسب نہیں تھا۔ صدف میرے اشارے کی خاطر جی۔ ایم دونوں ٹویوٹا ہائی گس سے نیچے اتر آئے۔ چند لمحات کے بعد وہ مذکورہ پرائیویٹ اسپتال کے اندر تھے۔

نیکو کہیں کا علاقہ بہت صاف ستھرا اور سرسبز و شاداب

ہے۔ بعض لوگ اسے جنت نظیر بھی کہتے ہیں۔ پتھر سچ بہتی ہوئی براہ کینال نے علاقے کے حسن اور خوب صورتی میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی جیسی عظیم الشان درس گاہ نیکو کہیں کی پہچان ہے۔

ہم دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ میں نے چاروں جانب ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور پھر میری نظر اس پارکنگ پر گر گئی جہاں تین چار ایبویئیس گاڑیاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ میں نے مذکورہ پارکنگ کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ صدف نے میری تقلید کی۔ ہم نے اپنا اپنا بیک کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔

میں نے پارکنگ میں پہنچ کر تمام ایبویئیس کو دو تین مرتبہ چیک کیا۔ ان سب پر اسپتال کا مخصوص لوگو بنا ہوا تھا مگر وہ ٹویوٹا ہائی ایبیس مجھے کہیں دکھائی نہ دی جس کی تلاش نے مجھے جینان میں جھٹکا کر رکھا تھا۔

"وہ ان میں نہیں ہے۔" میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "مجھے تو تمام ایبویئیس ایک جیسی لگ رہی ہیں۔ تم نے کیسے جانا، ہماری مطلوبہ گاڑی یہاں موجود نہیں۔"

"جس سفید ایبویئیس کا قحاقب کرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے ہیں، میں نے اسی وقت اس کا نمبر ذہن نشین کر لیا تھا۔" میں نے اضطرابی انداز میں کہا "کیا تمہیں دن بھر کی سکس ناٹن نمبر کی کوئی ایبویئیس یہاں نظر آ رہی ہے؟"

صدف نے وہاں کھڑی ایبویئیس کی نمبر پلیٹس پر نگاہ دوڑائی اور باپوسی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے، وہ ایبویئیس ابھی تک یہاں نہیں پہنچی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے وجدان؟" صدف نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا "وہ تو لگ بھگ آدھا گھنٹہ سے آگے تھی۔"

میں نے کہا "ممکن ہے، انہوں نے ادھر کار رخ نہ کیا ہو۔ وہ لوگ کسی اور منزل کی جانب بڑھ گئے ہوں۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا، وہ سیدھے اسپتال ہی پہنچیں گے۔" وہ مزید الجھتی "اس کے علاوہ وہ لوگ اور کہاں جاسکتے ہیں؟"

صدف بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ ساحل کو اسپتال پہنچایا جائے گا لیکن "شعیب چوہدری" تعلق کے بارے میں سوچنے کے بعد میرے خیال میں بہت نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اس صورت میں ممکن نہیں تھا کہ

وہ ایبولینس سیدھی اسپتال آتی۔ پہلے وہ ساحل کو ان کی مطلوبہ منزل تک پہنچاتی، پھر اسپتال کا رخ کرتی۔ موجودہ صورت حالات اور دن تھری سکس نان نمر دہالی ایبولینس کی غیر موجودگی بھی اسی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ لیکن طور پر اس ایبولینس کو "استعمال" کیا گیا تھا۔ یہ حالات خاصے تشویش ناک تھے۔ اگر میں جلد از جلد ساحل کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوتا تو پتا نہیں، اسے کہاں سے کہاں پہنچایا جاتا۔ میں نے صدف کی بات کے جواب میں کہا "میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا، وہ یہاں پہنچ کر غلط ثابت ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے، حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔" وہ بولی "ہم کسی اور جگہ رک کر انتظار کر لیتے ہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں سے پارکنگ ایریا ہمیں دکھائی دیتا رہے لیکن ہم کسی کی نظر میں نہ آئیں۔ ممکن ہے، اگلے چند گھنٹوں میں ہماری مطلوبہ ایبولینس اسپتال میں داخل ہوا۔" اس کی تجویز معقول تھی لہذا میں اس کے ساتھ چلے ہوئے ایک ایسے گوشے میں آن کھڑا ہوا جہاں سے اسپتال کا مین گیٹ اور پارکنگ پر گہری نظر رکھی جاسکتی تھی۔ ہم لگ بھگ دوپہر ایک بجے اسپتال پہنچے تھے، مزید چندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ جب برآمد نہ ہوا تو میری بے قراری آسان کوجھونے لگی۔

میں نے صدف سے کہا "مزید انتظار وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ساحل کو اسپتال میں لایا جائے گا۔ میرے خیال میں اسے ہمیں اور پہنچایا جا چکا ہے۔"

"مگر کہاں؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا "ہم ساحل تک کیسے پہنچیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا، اسے کہاں پہنچایا گیا ہے؟"

میں نے اس کا ہاتھ تمام کر ایک جانب بڑھتے ہوئے کہا "آؤ، اسپتال کے معلوماتی کاؤنٹر سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساحل کا نہ کسی ایبولینس ہی کا کوئی سراغ مل جائے تو میں اس سراغ کو تمام کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔"

ہم دونوں چلے ہوئے ایک ایسے کاؤنٹر پر پہنچے جہاں سے ہماری مطلوبہ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ وہ جدید سہولیات سے لیس ایک مہنگا پرائیویٹ اسپتال تھا جہاں کا ہر شعبہ کمپیوٹر کے ذریعے آپس میں منسلک تھا۔ وہاں کی صفائی اور نظام نے مجھے خاصا متاثر کیا۔

میں نے کاؤنٹر کے پیچھے موجود خوش شکل لڑکی سے استفسار کیا "نیچے! نیچے! اپنی ایک عزیزہ کے بارے میں معلوم

کرنا ہے؟"

"آپ کی عزیزہ کا نام کیا ہے۔" اس لڑکی نے پوچھا "کوئی پھنٹ آؤ تیشی ہو تو وہ بھی بتا دیں۔"

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "مریضہ کا نام ساحل ہے۔ میں اس کی کسی آؤ تیشی سے واقف نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں، اسے ابھی ابھی اسپتال لایا جا چکا ہے لایا جانے والا ہے۔"

کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھا "آپ بھی عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ خیر، میں دیکھتی ہوں، ساحل نام کی کوئی پھنٹ ہماری اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی ہے یا نہیں۔"

بات کرنے کے دوران میں وہ کمپیوٹر اسکرین کو بھی دیکھتی رہی اور کی بورڈ پر اس کی انگلیاں بھی حرکت میں رہیں۔ آدھے منٹ کی کوشش کے بعد اس نے اعلان فرماتے ہوئے کہا۔

"سوری! ساحل نام کی کوئی مریضہ ہمارے اسپتال میں داخل نہیں۔"

"ممکن ہے، ابھی اس کا ریکارڈ میں اندراج نہ ہوا ہو۔" میں نے ایک موموم امید کی انگلی تھامتے ہوئے کہا "اسے اسپتال میں آئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا۔" اس نے میری تضحیی کے لیے فون کا ریسپونڈر اٹھا لیا اور دوسری طرف کسی سے بات کرنے لگی۔ وہ اسپتال میں آنے والے سنے مریضوں کے بارے میں دریافت کر رہی تھی۔ ال گھنٹوں میں دو تین مرتبہ ساحل کا نام بھی آیا پھر اس نے مجھے پوچھا۔

"آپ کی عزیزہ کہاں سے آنے والی تھی؟"

"موضع رکھاں والی۔" میں نے بے ساختہ کہا "پایک سرحدی گاؤں ہے۔ اسے آپ کی بیٹی ہوئی ایبولینس نمر دن تھری سکس نان نمر اسپتال لایا جانے والا تھا۔"

اس نے پھر دوسری طرف کسی سے بات کی اور ریسپونڈر رکھنے کے بعد بولی "سہ! آپ کی مریضہ ابھی تک اس اسپتال میں نہیں پہنچی۔ میں ایبولینس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ تو تیشی صاحب سے معلوم کر لیں۔"

"یہ تو تیشی صاحب کہاں ملیں گے؟" میں نے احتیاط کیا۔

اس نے گورڈو کی جانب اشارہ کیا اور توشی ہی اسی محض کے دفتر کی نوٹیشن بتا دی۔ ہم دونوں فوراً بے چارہ توشی کے پاس پہنچ گئے۔ اس کا تعلق اسپتال کی انتظامیہ سے تھا۔

اس دوران میں، میں نے اپنے ذہن میں ایک نیا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔ میں توشی سے ساحل کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا بلکہ مطلوبہ ایبولینس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا۔ ایک بات کا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ساحل کو اس اسپتال میں لایا گیا تھا اور نہ ہی لایا جانے والا تھا پھر میں اس کا ذکر پھر کر خواہ مخواہ خود کو کیوں محکوک کرتا۔ اگر مجھے مطلوبہ ایبولینس کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں تو میں ساحل تک پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

توشی سے مختصر گفتگو کے بعد پتا چلا کہ ہماری مطلوبہ ایبولینس صبح سے گئی ہوئی ہے اور ابھی ٹھوڑی دیر میں وہاں سے آنے والی ہے پھر اس نے اپنی رست واپس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "کریم کو اب تک آ جانا چاہیے۔"

عبدالکریم اس ایبولینس کے ڈرائیور کا نام تھا۔ میں نے پوچھا "ایبولینس صبح سے کہاں گئی ہوئی ہے؟"

توشی کے انکشاف نے میرے دل کی دھڑکن کو حد درجہ بڑھا دیا تھا۔ وہ جواب میں بتاتے لگا "ایک ڈیڑھ باڈی کو احمد نگر پہنچا تھا۔ چوہدری نظام دین بجیلے ایک ہفتے سے ہمارے اسپتال میں داخل تھے۔ گزشتہ رات ان کا انتقال ہو گیا۔ انہی کی میت کو احمد نگر پہنچانے کے لیے کریم ایبولینس لے کر گیا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ اب آنے ہی والا ہوگا۔"

میں نے توشی سے یہی پتا نہ کیا تھا کہ میں ایبولینس کے ڈرائیور سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے وہ مجھے تسلی دے رہا تھا کہ کریم اسپتال پہنچنے ہی والا ہے۔ میں نے توشی سے مزید کوئی بات نہ کی اور ہم اس کے گھر سے نکل آئے۔ میں نے توشی سے عبدالکریم کی رہائش گاہ کا پتا معلوم کر لیا تھا۔

توشی کے انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ احمد نگر رکھاں والی کے شمال میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں چوہدری نظام دین کے نام سے بھی واقف تھا اس کی زمینیں چوہدری نواز شعلی کی زمینوں سے ملی ہوئی تھیں۔ جب میں شعیب غوری کے ساتھ، مزدک کوئیوں والے سونے کو بازیاں کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو چوہدری نظام دین کی اراضی بھی زیر بحث آئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کی زمین استعمال کر کے ہم کوئیوں کی تک پہنچنے کی کوشش کریں لیکن کوئیوں اور چوہدری نظام دین کی زمین میں نام پر کراس لگانے کے بعد رام داس کی زمین کا انتخاب کیا تھا۔ رام داس کی زمین سرحد کی دوسری طرف واقع تھی جہاں سے مزدک کوئیوں چند گز کے فاصلے پر تھا پھر یہ کہ رام داس اور

چوہدری نواز شعلی علی مل جی بھی چل رہی تھی، چنانچہ ازاں بعد یہودی انسل برٹالوی برنس مین مسٹر نیل آرمے نے رام داس اور اس کی زمین کو استعمال کر کے برسوں سے دفن مزدک کوئیوں کا راز پالیا تھا۔

توشی کے انکشاف کے بعد یہ تمام باتیں میرے دماغ میں چکرار ہی تھیں۔ اگر وہ ایبولینس چوہدری نظام دین کی ڈیڑھ باڈی کو احمد نگر چھوڑنے گئی تھی تو پھر کبیر شاہ کے ہتھے کیسے چڑھ گئی، ساحل تو رکھاں والی میں چوہدری نواز شعلی کی قید میں تھی، وہ ایبولینس میں کس طرح پہنچی؟ یہ اور اسی نوعیت کے دیگر درجنوں سوالات کے جواب صرف اور صرف ایبولینس کا ڈرائیور عبدالکریم ہی دے سکتا تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو میں اس کی زبان کھولتا پھر ساحل تک پہنچتا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ صدف کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وہ جان! آجیہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے۔ کیا ہم اسپتال میں رک کر عبدالکریم کا انتظار کریں یا کسی اور طرف چلتا ہے؟"

میں نے کہا "میں مزید آدھا گھنٹا انتظار کروں گا اس کے بعد کوئی اور قدم اٹھاؤں گا۔"

ہم چلے ہوئے اسی مقام پر آگئے جہاں سے گیٹ اور پارکنگ کی گھرائی تھی۔ صدف نے کہا "اگر ہم پر دو گرام کے مطابق سڑک کرتے رہتے تو اس وقت سید پور میں فریڈ اکل کے پاس ہوتے لیکن تازہ ترین صورت حالات میں مجھے نہیں لگتا کہ آجیہ چند روز تک ہم سید پور کا رخ کر سکیں۔ تم کم از کم ایک فون کر کے اکل کو اس واقعے کی اطلاع تو دے دو۔"

میں نے سانسٹی نظر سے صدف کو دیکھا اور کہا "تم یہیں رک کر نگرانی جاری رکھو۔ میں اور فون کی طرف جاتا ہوں۔ ابھی واپس آ جاؤں گا۔"

اسپتال میں آنے والوں کی سہولت کے لیے کئی مقامات پر پبلک کال کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ میں ایسے ہی ایک کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے سید پور میں فون ٹولایا۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد فریڈ پاشا لائن پر آ گیا۔

"یار وہ جان! تم کہاں غائب ہو؟" میری آواز سننے ہی وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا "میں اس وقت نیوکیپس لاہور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں کھڑا ہوں۔" پھر میں نے اسپتال کا نام بھی بتا دیا۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کی آواز میں تشویش اور

آئی ”خیریت تو ہے نا“

میں نے کہا تھی ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں فرید پاشا کو بتایا کہ میں مذکورہ اسپتال میں کیا کر رہا ہوں اور یہ کہ خیریت بالکل نہیں ہے۔

وہ کھیر آواز میں بولا ”وہدان! تم نے جو حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں، میں کہہ سکتا ہوں، ساحل کو اسپتال میں نہیں لایا جائے گا۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہو رہا ہے۔ تم وہاں وقت ضائع نہ کرو۔“

”پھر کیا کروں؟“ بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا۔ ان الفاظ میں اچھی خاصی کڑواہٹ تھی۔

وہ کھل آ میز لہجے میں بولا ”تم اس وقت بہت زیادہ پریشان ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی فرصت میں اس ایسولینس باس کے ڈرائیور کو بلیس کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تمہاری یہ کوشش کامیاب ہوگی تو ساحل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔“

”میں اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔“ میں نے کہا۔

فرید پاشا نے بتایا ”چوہدری نظام دین کی موت کی خبر سید پور پہنچ چکی ہے۔ کسی اتفاق کی بات ہے کہ آج ابھی کی تدفین بھی ہے اور چوہدری نظام دین کی بھی۔ وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔“ بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرائی۔

”مجھے افسوس ہے پاشا کہ میں تمہارے والد کے جنازے میں شرکت نہیں کر سکتا گا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”ساحل کا معاملہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”میں تمہاری مجبوری کو سمجھ رہا ہوں۔“ وہ برامنائے بغیر بولا ”اس لیے تمہیں پریشان یا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم فکر نہ کرو، ان نازک ترین حالات میں بھی میں تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔“

”تم مجھے تادم کر رہے ہو فرید۔“ میں نے جلدی سے کہا ”تم ہر جوگز رہی ہے، مجھے اس کا احساس ہے۔“

فرید پاشا نے ایک ہلکا سا تھپہ لگا دیا۔ تاہم اس تھپے میں وہ مخصوص رنگ موجزن نہیں تھی جو پاشا کا خاصا صی بہر حال، اس کی زندہ دلی کسی چیلنج کی محتاج نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کن آہنی اعصاب کا مالک ہے۔ تھپے کے اختتام پر اس نے کہا۔

”وہدان! مجھ پر تو مگر زبردستی لیکن تم پر مگر زبردستی ہے اس لیے میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ پاشا ہر حال میں دوستی بھانا جانتا ہے۔“ اس کی آواز جذبات سے لبریز تھی۔

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے کہا ”ابا جی کی تدفین صحر اور مغرب کے درمیان ہوگی۔ تم ایک گھنٹے بعد مجھے فون کرنے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ رکھاں والی میں کی پوزیشن ہے۔ اگر ساحل وہاں سے رخصت ہو چکی ہے تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ میں نے رکھاں والی میں موجود اپنے آدمیوں کو خاصا نکتہ کر رکھا ہے۔ میں ابھی ان سے رپورٹ لیتا ہوں۔“

باد جو دو کوشش کے بھی میں پاشا سے یہ نہ کہہ سکا کہ وہ فون کو اس تکبیرے میں نہ ڈالے اور پوری توجہ سے اپنے معاملات نمٹائے۔ انسان بنیادی طور پر بہت ہی خود غرض وادع ہوا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ فرید پاشا خود ایک بہت بڑے امتحان میں مبتلا تھا لیکن مجھے اپنی چٹا کی پڑی تھی۔ ساحل کے معاملے میں، میں بے اختیار سا ہو کر رہ گیا تھا، اس کے سوا مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اور اب تو وہ بھی کئی دنوں سے دکھائی نہیں دی تھی، صرف اس کی یاد زندگی کا کھر بنی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گھنٹے بعد پاشا کو فون کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اس نے پوچھا ”گھبرگ اور فاضلیہ کالونی والی کوششوں کیا حال ہے؟“

میں نے اس کی پریشانیاں کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور کہا ”تم ادھر سے بے فکر ہو، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔“ حالانکہ بہت کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں تھا۔ پاشا کے بچے آنے کے بعد وہاں جو حالات پیش آئے تھے وہ عامہ ممکن اور غیر معمولی تھے۔ اگر میں اس تفصیل میں پڑ جاتا تو پاشا کی ذہنی الجھن میں اضافہ ہی ہوتا۔ ساحل والا معاملہ تو کچھ آگیا تھا۔ میں تو صرف اسے اپنے سید پور نہ پہنچنے کی وجہ بتاتا چاہتا تھا۔

مزید چند باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور اپنے قدموں سے چلتے ہوئے صدف کے پاس آ گیا۔ وہاں مطلوبہ ایسولینس ابھی تک وہاں نہیں پہنچی تھی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی محتاجش باقی نہیں رہی تھی کہ ساحل کو کہاں ہی صفائی کے ساتھ کہیں ادھر ادھر کر دیا گیا تھا۔

صدف نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا ”کہیں ایسا نہیں کہ ایسولینس کا ڈرائیور عبدالکریم تمہارے دشمن ہے ساتھ ل گیا ہو اور انہیں ان کے حسبِ خشا کہیں پہنچانے چاہے ہو۔“

”اس بات کے امکانات کم از کم ہیں۔“ میں نے

میں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”اگر ڈرائیور اپنی مرضی پیر شاہ کا ساتھ دے رہا ہوتا تو اب تک اسے اسپتال میں پہنچاتا۔ تاخیر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اسے گن پوائنٹ پر پہنچا گیا ہے۔“ ویسے..... میں نے جملہ ادھر اچھوڑ کر خلیا کیا تھا۔ لیکن اس کی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”قل از مری ساس لی اور بات جاری رکھیں۔ میں ممکن ہے، عبدالکریم نے کئی کئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ میں ممکن ہے، عبدالکریم ہر شے سے کھیر شاہ کے ساتھ ہو اور ساحل کو کسی خفیہ ٹھکانے پہنچانے کے بعد ادھر کا رخ کرے۔“

صدف نے کہا ”اس واقعے نے تمہارے ذہن پر بہت برا کیا ہے۔ تم پہلے ایک بات کہتے ہو پھر خود ہی مکرور کی کہ اس کی نفی کر دیتے ہو۔ تم ایسے تو نہیں تھے

”ہاں، میں ایسا نہیں تھا!“ میں نے غراہٹ سے مشابہہ

”وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی ”پاشا اکل نے کیا کہا

”اس نے ایک گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا ہے۔“ میں نے

”ہاں، بالکل وہی ہے۔“ میں نے خواب ناک لہجے میں کہا ”تم عبدالکریم کے پیچھے لگ جاؤ۔ تموزا فاصلہ رکھ کر میں بھی آ رہا ہوں۔ اسپتال کے اندر کسی قسم کی جارحانہ کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔ ہم اس کی طرح گھبر کر باہر لے چلتے ہیں پھر اس کی زبان کھولیں گے۔“

صدف نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ہم یکے بعد دیگرے اس کے تعاقب میں لگ گئے، ٹھیک دس منٹ بعد وہ ہمارے ساتھ اسپتال سے باہر آ رہا تھا۔ توفیق کی زبانی مجھے عبدالکریم کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ میں ان سے کام چلا کر مزید بہت کچھ اگھوا سکتا تھا۔ وہ راولپنڈی کے علاقے ڈھوک کہا کرانے والا تھا اور لاہور میں کوٹ لکھت میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ وہ عموماً یہاں اکیلا ہی رہتا تھا، اس کے بیوی بچے ڈھوک کہا (راولپنڈی) میں رہتے تھے لیکن سال میں ایک دو ماہ کے لیے وہ انہیں اپنے پاس لاہور بلا لیتا تھا۔ اس طرح ایک آدھ مرتبہ وہ آٹھ دس دن کے لیے راولپنڈی چلا جاتا۔ ان دنوں عبدالکریم کی پہلی لاہور، کوٹ لکھت آئی ہوئی تھی جہاں وہ کرائے کے کوارٹر میں رہتا تھا۔

توفیق نے مجھے اس کے کوارٹر کا انڈریس سمجھا دیا تھا۔ میں نے عبدالکریم کو ہائی لکس کی جانب لاتے ہوئے کہا ”راولپنڈی سے تمہارے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں جو ہمارے گھر میں ٹھہرے ہیں۔ تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا ”کیا

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے صدف۔ میں سید پور کے رکھاں والی“ کے معاملات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ فرید کے واسطے میری بھرپور مدد کرنے والا تھا۔“ ایک لمحے کا فون کرنے کے بعد میں نے مزید بتایا ”میں کراچی سے یہی فون کر لیا ہو چکا تھا اور آگے سید پور جانے والا تھا۔“

وہ اثبات میں اس طرح سے ہلانے لگی جیسے میری باتوں کی تک پہنچ رہی ہو پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی بات کرنی یا مجھ سے کوئی اور سوال پوچھتی، مجھے چونکا پڑا۔ میں مسلسل اسپتال کے میں گیٹ کو دیکھ رہا تھا اور میرے چوتھے کاسپیہ یہ تھا کہ وہاں سے ایک سفید یوٹاہائی ایس اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہی ایسولینس جس کا نمبر دس تھری سکس تھی تھا اور جو میری ساحل کو رکھاں والی سے لے کر لاہور پہنچی تھی۔

صدف نے میرے چہرے کے بدلنے ہوئے تاثرات کو نوٹ کر لیا اور میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی نظر بھی ایسولینس تک چاہنچی۔ ایسولینس گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد آہستہ رومی سے پارنگ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس میں سوائے ڈرائیور کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے مطلوبہ افراد کو وہ کسی خاص مقام پر پہنچا دیتا تھا۔

صدف نے سرسرائی ہوئی آواز میں کہا ”وہدان! یہ تو وہی ایسولینس ہے!“

”ہاں، بالکل وہی ہے۔“ میں نے خواب ناک لہجے میں کہا ”تم عبدالکریم کے پیچھے لگ جاؤ۔ تموزا فاصلہ رکھ کر میں بھی آ رہا ہوں۔ اسپتال کے اندر کسی قسم کی جارحانہ کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔ ہم اس کی طرح گھبر کر باہر لے چلتے ہیں پھر اس کی زبان کھولیں گے۔“

صدف نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ہم یکے بعد دیگرے اس کے تعاقب میں لگ گئے، ٹھیک دس منٹ بعد وہ ہمارے ساتھ اسپتال سے باہر آ رہا تھا۔ توفیق کی زبانی مجھے عبدالکریم کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ میں ان سے کام چلا کر مزید بہت کچھ اگھوا سکتا تھا۔ وہ راولپنڈی کے علاقے ڈھوک کہا کرانے والا تھا اور لاہور میں کوٹ لکھت میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ وہ عموماً یہاں اکیلا ہی رہتا تھا، اس کے بیوی بچے ڈھوک کہا (راولپنڈی) میں رہتے تھے لیکن سال میں ایک دو ماہ کے لیے وہ انہیں اپنے پاس لاہور بلا لیتا تھا۔ اس طرح ایک آدھ مرتبہ وہ آٹھ دس دن کے لیے راولپنڈی چلا جاتا۔ ان دنوں عبدالکریم کی پہلی لاہور، کوٹ لکھت آئی ہوئی تھی جہاں وہ کرائے کے کوارٹر میں رہتا تھا۔

توفیق نے مجھے اس کے کوارٹر کا انڈریس سمجھا دیا تھا۔ میں نے عبدالکریم کو ہائی لکس کی جانب لاتے ہوئے کہا ”راولپنڈی سے تمہارے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں جو ہمارے گھر میں ٹھہرے ہیں۔ تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا ”کیا

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے صدف۔ میں سید پور کے رکھاں والی“ کے معاملات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ فرید کے واسطے میری بھرپور مدد کرنے والا تھا۔“ ایک لمحے کا فون کرنے کے بعد میں نے مزید بتایا ”میں کراچی سے یہی فون کر لیا ہو چکا تھا اور آگے سید پور جانے والا تھا۔“

”اس بات کے امکانات کم از کم ہیں۔“ میں نے

تھوڑی دیر پہلے آپ ہی اسپتال میں مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

”تمہیں بالکل صحیح بتایا گیا ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا ”اب تم فوراً ہمارے ساتھ چلو۔“

”کیا آپ لوگ مجھے اپنے کمرے کر جاؤ گے؟“

”اور کہاں لے کر جائیں۔“ صدف نے کہا ”جہاں تمہارے مہمان انتظار کر رہے ہیں تمہیں وہیں جانا ہوگا۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے جب آئینہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اگر میرے ساتھ صدف نہ ہوتی تو شاید وہ میری بات براعتیار نہ کرتا لیکن صدف کی موجودگی میں وہ زیادہ پس و پیش نہ کر سکا، صرف اتنا پوچھا ”میں تو آپ لوگوں کو نہیں جانتا۔ میرے مہمان آپ کے کمرے میں کیسے پہنچ گئے؟“

”وہ ہمارے کمرے میں خود نہیں پہنچے بلکہ ہم ازاراہ ہمدروئی انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“ میں نے اسے چکر دیا ”وہ پہلی مرتبہ بلا ہوئے ہیں۔ تمہارا پتا ڈھونڈتے پھر رہے تھے، ہم سے ملاقات ہوگئی۔ ہمیں ایک مریض کو دیکھنے اس طرف آنا تھا۔ سوچا، جاتے ہوئے تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ہم کافی دیر سے ادھر تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

وہ میری باتوں میں آگیا اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے اس کی حریف کشی کے لیے کہا ”تم راولپنڈی میں، ڈھوک کہا کے علاقے میں رہتے ہو، وہ ادھر ہی سے آئے ہیں۔“

توفیق سے حاصل شدہ معلومات نے کام دکھایا اور وہ مطمئن ہو کر ہمارے ساتھ ٹویٹا ہائی کس میں بیٹھ گیا۔ میں فی الحال اس گاڑی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہائی کس کیس کے علاقے سے نکلنے کی تو صدف نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں سمجھ گیا، وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے، وہ آج یہ منزل کے بارے میں جانتا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے عبدالکریم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فاصلہ کافی زیادہ ہے، زیادہ دور نہیں۔ ہم تمہیں بہت جلد فارغ کر دیں گے۔“

صدف کے ہونٹوں سے ایک اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ عبدالکریم سے پوچھا تو چمکے لیے پاشا کی اس گولی سے زیادہ موزوں اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کوشی پچھلے کچھ عرصے سے خالی پڑی تھی لیکن میری لاہور میں آمد کے ساتھ ہی جیسے خدا نے اس کی بن کی تھی۔ اب صبح شام وہاں اچھی خاصی ”روتھ“ رہنے لگی تھی۔ وہ گولی میرے لیے ایک نقیشتی

نقل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ عبدالکریم بھی چلنے کے لیے چند منٹوں بعد وہیں پہنچنے والا تھا۔

میں نے فیروز پور روڈ پر آنے کے بعد گاڑی کی اچانک بڑھا دی۔ ہمارے درمیان گاہے بے گاہے ہم نظر دو کاٹا رہے اور ہمارے سے مراد میرے اور عبدالکریم۔ عبدالکریم خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ تو چلا آیا تھا لیکن گاڑی میں بیٹھ کر وہ کسی الجھن کا شکار نظر آنے لگا تھا جیسے وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نے ہمارے ساتھ آکر اچھا کیا تھا یا اس نے غلطی سرزد ہوگئی تھی۔

خاموشی کے طویل وقفے کے دوران میں اس نے مرتبہ مجھ سے پوچھا ”میں اسپتال سے صرف ایک کئی لے کر آیا ہوں۔ مجھے تم سے بچے سے پہلے واپس لوٹنا ہوگا۔ مجھے امید ہے، آپ لوگ ہمیں اپنے کمرے میں کوشش نہیں کریں گے۔“

”تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔“ میں نے کہا ”تمہاری مجبوری ہے تو ہم تمہیں کیوں روکیں۔ تمہیں کراہ کرنا ہے۔ ٹھیک دس منٹ بعد ہم اپنے کمرے میں ہوں گے۔ میرے اطمینان دلانے سے اس کے چہرے پر آئندہ نمودار ہوئے اور اس نے ہمت کر کے پوچھا ”آپ لوگ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں؟“

ہماری شخصیت، لباس اور حلیہ کسی بھی طور دودھ کرنے والوں جیسا نہیں تھا اس لیے عبدالکریم کا جواب تھا۔ دودھ کے دھڑ سے لدی پھندی ٹویٹا ہائی کس کے ہم کہیں بھی نہ گھٹ نہیں ہوتے تھے۔ جو اس میں اب تھا، اسے ہم کہیں اور بھیج کر آئے تھے۔

میں نے عبدالکریم کے انتشار کے جواب میں کہا ”ہم مختلف قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ ہمارا کاروبار ہے۔ دودھ، دہی، پنکھ اور کریم۔“

”ہم نے جس کی کہ ہمارے پاس ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ کریم کی کریم بھی نکال سکتے ہیں۔“

”کریم کی کریم؟“ اس نے چونک کر سوالیہ نظر سے دیکھا۔

”ہاں!“ میں نے سفاکی سے کہا ”نہایت ہی عمدہ کریم۔“

عبدالکریم خوش انداز میں مجھے سمجھنے لگا۔ میں چمکی بیٹھنی کو شاید اس نے عموں کو لیا تھا، میں بولا ”مگر آپ لوگوں کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ

جاتے ہوں گے!“

”میں نے دیکھ کر تمہیں کیا اندازہ ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے، آپ تو بڑے اور بڑا کیا؟“

”دودھ کا کاروبار تو میں نے بات کاٹنے ہوئے کہا۔“ عبدالکریم اکیلا بڑے اصرار سے نظر آنے والے لوگ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ غدا امت آئینہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا، میں نے کہا ”دو تین ماہ کا تو ہم ڈیری فارم کے مالک بن چکے ہیں۔ کام ہمارے درجنوں ملازم کرتے ہیں۔“

”نہایت سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔“

”نہایت سب کچھ آپ لوگ مجھے اپنے ڈیری فارم پر لے کر آئیے۔“

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اثبات میں نہ ہلا دی۔

”دودھ زیادہ الجھ گیا اور شیشے ہوئے لہجے میں بولا ”مگر ناش تو آپ نے بتایا تھا کہ میرے مہمان آپ کے کمرے پر سے ہوتے ہیں؟“

”میں نے تمہیں غلط نہیں بتایا تھا۔“ میں نے گاڑی کی بار بڑھاتے ہوئے کہا ”دو اصل ہمارا ڈیری فارم کمرے کے سامنے ہے۔ مجھے پانچ منٹ کا ایک ضروری کام ہے۔ اپنے ڈیری فارم کو کچھ کرتے ہوئے گھر کی طرف جائیں گے۔“

میری اس مبہم وضاحت سے وہ حریف الجھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی آمیزش تھی۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی بیٹھانی کو سستے ہوئے کہا ”آپ نے اپنا نام کیا؟“

”ابھی اس سوال کا جواب دینا انتظار تھا کیونکہ میں نے ابھی اسے اپنے نام وغیرہ نہیں بتائے تھے۔ اس کی پریشانی کا اظہار ہونے میں نے کہا۔“

”عبدالکریم! لگتا ہے، تمہاری یادداشت خاصی کمزور ہے۔ اسے پہلے بتائے ہوئے ہمارے نام بھی تم بھول گئے۔“

”اس دوران میں صدف بالکل خاموش رہی۔ وہ سے اندازہ نہ کر سکتی تھی کہ میں نے عبدالکریم سے کہا کہ اس کی بات نہیں۔ انسان خلاف معمول کوئی بہت بڑا شخص ہوتا ہے۔ اور بے پروائی کا سب سے زیادہ اثر اس پر ہوتا ہے۔“

وہ سبھی ہوئی نظر سے مجھے سمجھنے لگا ”خلاف معمول کوئی بڑا کارنامہ؟“ اس کی زبان سے صرف اتنا ادا ہوا۔

میں نے کہا ”تم نے آج صبح ہی صبح بہت طویل سفر کیا ہے۔ تیز رفتاری سے کچے کچے راستے پر ایبٹن دوزانہ کوئی عام یا آسان کام تو نہیں۔“

اس کی سبھی ہوئی آنکھوں میں سراب جیسی اتر آئی، خوف میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا ”آپ..... وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ہم..... میں نے آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر سخت غلطی کی ہے۔“

”اب تو یہ غلطی ہو چکی عبدالکریم۔“ میں نے چونکا کرے مشابہ انداز میں کہا پھر اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے معتدل انداز میں کہا ”تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ ہم دہی ہیں جو تمہیں بتایا تھا۔ تم نے ہمارے نام بھولنے کی غلطی کی ہے۔ چلو کوئی بات نہیں، میں دوبارہ بتا دیتا ہوں۔“ میں نے فیروز پور روڈ کو الوداع کہتے ہوئے شاہ جمال روڈ پر گاڑی موڑ لی پھر عبدالکریم سے کہا ”میرا نام وجیہ ہے اور یہ میری بزنس پارٹنر صدف ہے۔“ میں نے صدف کی جانب اشارہ بھی کر دیا ”اور یہ تو تمہیں یاد ہے نا، ہمارا دودھ کا بزنس ہے۔ یعنی ڈیری فارم!“

میری اس طعنے آمیز وضاحت سے اس کی الجھن میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی، اس نے متذبذب انداز میں پوچھا ”لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں نے آج ایک طویل سفر طے کیا ہے؟“

”تمہاری صرف یادداشت ہی کمزور نہیں بلکہ تم حق بھی ہو۔“ میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”تم ایبٹن دوزانہ پر تیز رفتاری سے آئے ہو۔ اسپتال سے مجھے تمہارے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ تم آج صبح ایک ڈیڈ باڈی احمد عمر چھوڑنے گئے ہو۔ احمد عمر دور دراز کا ایک گاؤں ہے۔ کیا میں ان معلومات کی روشنی میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تم نے طویل اور پر مشقت سفر کیا ہے!“

”اوہ!“ اس نے اطمینان بخش سانس خارج کی ”میں کچھ اور سمجھا تھا!“

آخری الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ خاصا ریٹیکس دکھائی دینے لگا۔ میں ”میں کچھ اور سمجھا تھا“ کا منہموم اور تشریح جانتا تھا۔ وہ یہ جان کر مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کے واپسی کے سفر کی تفصیلات سے میں آگاہ نہیں تھا۔ چوہدری نظام دین کی ڈیڈ باڈی کو اسپتال سے احمد عمر پہنچانا ایک نصابی کارروائی تھی لیکن ساحل کو رکھاں والی سے لے کر انور کسی خفیہ مقام تک پہنچانا

سراسر غیر نصابی سرگرمی تھی۔ عبدالکریم کی دانست میں، میں اس کے کچے خنجر سے واقف تھا۔ میں نے اسے اسی خوش فہمی میں رہنے دیا اور پوچھا۔

”دھوکہ کتنا میں تم کہاں کے رہنے والے یعنی تمہارا گھر کس طرف ہے؟“

اس نے جواب دیا ”کینے ٹار کے نزدیک۔“

”آج کل تمہارے بیوی بچے یہیں آئے ہوئے ہیں!“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا ”تم اُدھر کوٹ لکھتے میں کراپے کے کوارٹر میں رہتے ہو؟“

اس کی حیرت سوا ہو گئی ”آپ تو میرے ہارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“

”تمہارے مہمانوں نے چند باتیں بتائی ہیں۔“ میں نے غصے لہجے میں کہا ”وہ تمہارے سسرالی رشتے دار ہیں۔“

”شاید تمہاری بیوی انہیں جانتی ہو۔ وہ بتا رہے تھے، تم سے پہلے بھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ تم ان سے مل کر حیران رہ جاؤ گے۔“

”ابھی تو میں آپ سے مل کر حیران ہوں۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے فریڈ پاشا کی کوشی کے سامنے پہنچ کر پائی کس روک دی۔ کوشی کے بند گیت کو دیکھ کر عبدالکریم کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر انجمن تیرگئی اور جب کسی ملازم نے آکر گیت کو نہیں کھولا بلکہ یہ کام میں نے انجام دیا تو وہ دھچکے بغیر نہ رہ سکا۔

”وجہ صاحب! کیا آپ کا ڈیری فارم بھی ہے؟“

تھوڑی دیر پہلے اس کا جو خوف قدرے زائل ہو گیا تھا اس میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ میں نے پائی کس کو کوشی کے اندر پہنچایا پھر گیت کو بند کرنے کے بعد عبدالکریم کے سوال کا جواب دیا۔

”ہاں، یہ ہمارے ڈیری فارم کا ایک حصہ ہے۔ کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟“

”یہ بات نہیں جناب۔“ وہ کوشی کے اندر چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد حجب انداز میں بولا ”یہاں تو خاموشی اور سناٹا ہے۔ کوئی بھی در نظر نہیں آ رہا۔ یہ کس قسم کا ڈیری فارم ہے، میری تو کچھ سمجھ بھی نہیں آ رہا۔“

”تم اپنے ذہن پر زیادہ زور ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔“

صدف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”ابھی اس

نے بہت مفید معلومات اگلی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تم سے گھون بولا۔ یہ کوشی ہمارے ڈیری فارم کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے صرف کریم نکالنے والی دو مشینیں نصب ہیں۔ ہم ان سے دیکھا میں گئے، ہم نے پچھلے دو دنوں میں کوشی کریم نکالنے سارا مال ایک تہ خانے میں رکھا ہے، سنہال کر۔“

میں نے کوشی کے ہال نما کمرے کی جانب قدم بڑھا دیا۔

”صدف! تم اس سے چارے کو آدمی بات کر رہی ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ یہ دو مشینیں کریم نکالنے لگاتی ہیں۔“

عبدالکریم ٹھٹک کر دک گیا پھر خوف زدہ لہجے میں، ”آپ لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں نے آپ کی بات کا یقین کر کے سخت غلطی کی ہے۔ یہ کوئی ڈیری فارم ہے اور نہ ہی یہاں پر میرے مہمان موجود ہیں۔ آپ کو بہت متنی خیر اور خوفناک باتیں کر رہے ہو۔ مجھے جانے دو۔“

اس کی بات فتم ہوتے ہی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ کا پتھر رسید کیا اور سفاکی سے کہا ”جب تمہیں اپنی اس احساس ہوتی ہو گیا ہے تو پھر اس غلطی کی سزا بھی ضرور ملے گی۔“

”یہ تم سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔ تمہارے مہمان ڈیری فارم پر نہیں بلکہ ہمارے گھر پر موجود ہیں۔ یہ ضروری کام سے ٹھٹھنے کے بعد ہم کمر کی طرف جا رہے ہیں۔“

اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا کر اس کی مصیبت میں گرفتار ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔

اس کے اختتام پر اس نے کچپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”خت۔۔۔۔۔ تم لوگ۔۔۔۔۔ میرا کیا۔۔۔۔۔ امتحان لوگ۔“

میں اسے دھکیلنے ہوئے ہال نما کمرے میں لے آیا۔ وہی وسیع و عریض کمرہ تھا جہاں دو روز قبل میں نے غلط آدمیوں کی ٹھکانی کی تھی۔ فیض احمد اور گینڈا اٹھا دھڑکتی وقت خیریت خانے میں موجود تھے۔ مذکورہ تہ خانے کا رخ راستہ بھی اسی ہال کی ایک دیوار میں تھا۔

میں نے عبدالکریم کی آنکھوں میں آنکھیں داغ ہوئے کہا ”امتحان بہت سادہ اور آسان ہے۔ ہم دونوں نے نکالنے والی مشینیں ہیں اور تم ہو کریم۔ ہم کریم کی طرف سے آ رہے ہیں۔ اگر تم نے تعاون کیا تو تمہارا دشمن بھی خیریت خانے میں جہاں تمہارے جیسے چند افراد آرام فرما رہے ہیں۔“

”تم لوگ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟“

میں نے سکین لہجے میں پوچھا ”سائل کو تم نے کہاں پہنچایا ہے؟“

”وہ ہونٹوں کی طرح میرا چہرہ دیکھ لے گا۔“

میں نے ایک زنا تے دار چائے سے اس کا گال مسکا دیا۔

پھر کہا ”میں اس سائل نالی لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے تم اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

میں نے سکین لہجے میں پوچھا ”سائل کو تم نے کہاں پہنچایا ہے؟“

”وہ ہونٹوں کی طرح میرا چہرہ دیکھ لے گا۔“

میں نے ایک زنا تے دار چائے سے اس کا گال مسکا دیا۔

پھر کہا ”میں اس سائل نالی لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے تم اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ کڑی اپنی ایجنسی میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ

کرنے کے لیے کمر تھا۔ وہ مجھے خاصا ”سٹار“ نظر آیا۔ میں نے کہا ”عبدالکریم! زندگی ایک بار ملتی ہے۔ کیوں اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی کو عذاب میں ڈالتے ہو۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو ادھر تم جان سے جاؤ گے، ادھر تمہارے بیوی بچوں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ یولو، کیا کہتے ہیں؟ میری بات مانو گے یا میں اپنے ساتھیوں کو کوٹ لکھتے فون کروں؟“

اس کی مزاحمت جواب دے گئی۔ اپنے پیاروں کی زندگی کا سوال بہت ہی آزار دہی ہوتا ہے۔ میں نے مجبوراً ایک جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ تھوڑی مارتھ کے بعد بھی اس کی زبان کھلوانی جاسکتی تھی لیکن اس کا روروائی میں وقت ضائع ہوتا اور عبدالکریم کا شدید زخمی ہو جانا بھی لازمی بات تھی۔ وہ بے جا روروائی مجزائی کے معاملات میں کیا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے آداری کے تاثرات نظر آتے تو میں نے اس کے سینے سے پاؤں ہٹا دیے۔

وہ ڈرے ڈرے اٹھا اور کپڑے جھانک کر کھڑا ہو گیا۔ کزوری آواز میں اس نے سوال کیا ”آپ لوگوں کی مجھ سے اور میرے بیوی بچوں سے کیا دشمنی ہے؟“

”کوئی نہیں۔“ میں نے سادگی سے کہا ”لیکن اگر تم نے میری بات کا جواب نہ دیا تو تم ہی میرے دشمن اول ہو گے۔ میں تمہیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں اور یہ مہلت میرے خاموش ہوتے ہی شروع ہو جائے گی۔ یولو، میری سائل کو تم نے کیر شاہ کے ایما پر کہاں پہنچایا ہے؟“

”میں کسی کیر شاہ کو نہیں جانتا۔“ وہ ٹھٹھکیا ”میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ وحید صاحب کے کہنے پر کیا ہے۔“

”تو کیا تم اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ تم نے سائل کو رکھاں والی سے لاہور پہنچایا ہے؟“

”مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس لڑکی کا نام سائل ہے جو میری ایجنسی میں یہاں پہنچی ہے۔“ اس نے بھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ”آپ میری بات کا یقین کریں، میں سائل یا کیر شاہ سے واقف نہیں۔ وحید صاحب نے کہا کہ ایک لڑکی کو لانا ہے۔ میں نے ان کا کہاں لایا، کیونکہ میں ان کا کہاں نال ہی نہیں سکتا۔“

میں نے سائل اور کیر شاہ کا حلیہ بیان کیا تو عبدالکریم نے تعجب ق کر دی۔ میرے سینے سے ایک طویل اور اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ گویا اپنی چھٹی حس کی پکار پر کان دھر کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ سفید چادر سے ڈھکے ہوئے اسٹریچر پر سائل کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے اپنے تن بدن

میں ایک راحت ہی اتنی محسوس ہوئی۔ ساحل کا سراغ مل گیا تھا تاہم وہ ابھی تک میری پہنچ سے دور تھی اور اس تک مجھے صرف عبدالکریم ہی پہنچا سکتا تھا۔

میں نے کہا ”تم نے زبان کھول کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے ورنہ تم اور تمہارے بیوی بچے آج جان ہار جاتے۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ اب ساحل کا پتا بھی جلدی سے بتا دو تاکہ تمہاری جان چھوٹ جائے۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا ”اور یہ تمہارے وحید صاحب کون ہیں، کیا بیچتے ہیں؟ تم ان کا کہا ناں کیوں نہیں کہتے؟“

وہ بولا ”وحید صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ اس اسپتال میں انہوں نے ہی مجھے ملازمت دلائی تھی ورنہ اس سے پہلے میں چار نمبر روٹ کی دیکھن چلاتا تھا۔ کام زیادہ اور آمدن کم تھی لیکن اب اللہ کا شکر ہے، گزرا وہ بہت اچھا ہو جاتا ہے۔ میں وحید صاحب کو دعا میں دیتا ہوں۔“

میں وحید صاحب کا میری ساحل میں دلچسپی لینا میرے لیے نہایت ہی اچھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا تعلق کبیر شاہ ہی سے ہوگا لیکن..... شیب غوری سے۔ کبیر شاہ اپنے اڈے سے غائب ہو گیا تھا۔ جھڑت اور جھک کی درمیانی شب پولیس نے ”سادھ“ پر بھرپور کارروائی کی تو کبیر شاہ کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ شیب غوری نے اپنے دست راست کے فرار اور روپوشی سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ گزشتہ رات فون پر اس سے میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ اس گفتگو میں ہم دو کھلے دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے اور شیب نے بڑے واضح الفاظ میں، مجھے دھمکی دی تھی کہ اس نے میرا بندوبست کرانے کے لیے نہایت ہی خطرناک لوگوں سے کھلے جواز لیا ہے۔ شیب کی دھمکی کا نتیجہ بھی مجھے فوراً ہی دیکھنے کو مل گیا تھا۔ کبیر شاہ کا ساحل کے ساتھ رکھاں والی سے لاہور پہنچنا ثابت کرنا تھا کہ شیب غوری اور چوہدری نواز علی میں کوئی نہایت ہی اہم ڈیل ہوئی ہے۔ میرے خدشات صد فیصد درست ثابت ہو رہے تھے۔ میرے دو دشمنوں نے آپس میں الحاق کر لیا تھا۔

عبدالکریم کے جواب نے اگرچہ میری الجھن کو بڑی حد تک دور کر دیا تھا۔ تاہم ابھی بھی بہت سے گوشے جواب طلب تھے۔ میں نے اس سے پوچھا ”تم تو آج صبح چوہدری نظام دین کی لاش کے ساتھ اسپتال سے احمد گروانہ ہوئے تھے پھر رکھاں والی کیسے پہنچ گئے؟“

وہ تھوک لگتے ہوئے بولا ”بات دراصل یہ ہے جناب کہ کل رات گئے وحید صاحب نے مجھ سے رابطہ کر کے کہا تھا کہ

انہیں چند گھنٹوں کے لیے اسپتال کی ایبویٹس چاہیے۔ ایک مرینہ کو کسی گاؤں سے لاہور پہنچانا ہے اور یہ کام آف دل ریکارڈ ہوگا۔ میں نے کہا، میں کوٹھل کرتا ہوں۔ معلومات کرنے پر مجھے پتا چلا کہ اسپتال میں داخل ایک مرینہ کا انتقال ہو گیا ہے اور صبح اس کی لاش احمد گرو پھانچائی جائے گی۔ احمد گرو جانے والے ایبویٹس ڈرائیور سے میں نے بات چیت کی اور اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس کی جگہ میں گاؤں گا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی جگہ ڈیوٹی کر لیتے ہیں، یہ کوئی خاص بات نہیں۔ وحید صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ مرینہ کو رکھاں والی سے لانا ہوگا۔ احمد گرو رکھاں والی کے شٹل میں دو ڈھائی کلومیٹر دور واقع ہے اس لیے بھی یہ کام آسانی سے ہو گیا۔“

عبدالکریم کی بات ختم ہوئی تو مجھے اپنے دل سے ایک نہیں اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے دو مرتبہ ساحل کے لیے مرینہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے تڑپ کر پوچھا ”کیا ساحل بیمار ہے؟“

”آگروہ بیمار ہوتی تو اسے اسپتال میں داخل کیا جاتا۔“ وہ بولا ”میں نے اسے وحید صاحب کی کوٹھی پر پہنچایا ہے۔ میں نہیں جانتا، اس لڑکی کا کیا قصہ ہے جناب۔ وہ آؤسٹر کے دوران میں بالکل بے ہوش پڑی رہی ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ”آپ کے روپے سے تو لگتا ہے، وہ آپ کی کوئی قریبی رشتہ دار ہے۔“

میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ ساحل کی تصدیق ہوجانے کے بعد ایک ایک بل مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے عبدالکریم کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بھراہی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”وحید کی کوٹھی کس طرف ہے؟“

وہ ایک لمحے کے لیے مجھے متال نظر آیا۔ میں نے ہلکا کر کہا۔

”عبدالکریم! اگر اس مرحلے پر تم نے کسی گاؤں کی کوٹھی کی تو میں تمہارا زخرا کاٹنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ اس کے بعد تمہارے بیوی بچوں کا کیا حسرت ناک انجام ہوگا؟“

میرے لہجے کی دھشت نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ وہ ہنسی بھنی آواز میں بولا ”وحید صاحب..... اوسر مسلم ناؤں میں رہتے ہیں..... ہم..... مگر خدا کے واسطے..... آپ مجھے اس پر سے الگ کر دیں۔ میں نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔“

”ساحل میرے لیے سب کچھ ہے۔“ میں نے گرجی

آواز میں کہا ”تم نے میرا سب کچھ بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ تم خود اس چکر میں کودے ہو..... خود!“ میرے لہجے کی غائی بڑی جلیبی تھی ”اب تم کس طرح الگ ہونا چاہتے ہو؟ مسلم ناؤں کا بیڑا علاقہ ہے۔ وحید کی کوٹھی کا ٹھیک ٹھیک پتا بتاؤ۔“

بات ختم کرتے ہی میں دونوں ہانڈو پھیلا کر اس کی باج بڑھا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میں اس کی گردن دبوچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ دھشت زدہ ہو کر کئی میں گردن جھٹکنے لگا پھر قہقراہی ہوئی آواز میں بولا۔

”ب..... بتاتا ہوں..... ابھی بتاتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے جان سے مارنا۔“ وحید صاحب آب پارہ مارکٹ کے کفریہ رہتے ہیں۔“

پھر اس نے کوٹھی کا جو نمبر اور لوکیشن بتائی اس نے مجھے چوتھے رجبو کر دیا۔ صدف بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ عبدالکریم خٹا کی کوٹھی کا ایڈریس بتا رہا تھا۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”یہ سفید رنگ کی ایک چھوٹی دو منزلہ کوٹھی ہے نا؟“

”جی جی، وہی۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”لیکن یہاں پر تو محمد خٹا نامی کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا ہے۔“ میں نے کہا ”کوٹھی کے گیٹ پر کسی ششاد علی ایڈووکیٹ کے نام کی تختی لگی ہے؟“

عبدالکریم نے کہا ”جی، میں نے اس لڑکی کو اسی کوٹھی میں پہنچایا ہے۔ ششاد علی وحید صاحب کے بڑے بھائی ہیں لیکن خٹا نامی کوئی بھی جرائم پیشہ شخص وہاں نہیں رہتا۔“

”ایک بے ہوش لڑکی کو ایبویٹس میں ڈال کر کسی دور دراز گاؤں سے لاہور جیسے شہر لایا گیا پھر اسے کسی اسپتال پہنچانے کے بجائے ایک کوٹھی میں لے جایا گیا!“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”جرم اور کس کو کہتے ہیں؟ تمہارے وحید صاحب اور اس کا بڑا بھائی ششاد علی کوئی شریف لوگ نہیں ہو سکتے۔ میں ایسے شریف بد معاش قسم کے معاشرتی ناسوروں سے نمٹنا ابھی طرح جانتا ہوں۔“

پھر میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہم نے بہت دقت خالص کر دیا۔“ میری آواز میں بھراہٹ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔

”وہ بولی“ جو دقت ہاتھ سے نکل گیا، اس کا ماتم کیا کرنا۔ اب میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ خٹا کی کوٹھی ہم کچھ رات دیکھ چکے ہیں۔ ایڈریس مشکل نہیں۔ وہ راستہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔“ پھر وہ عبدالکریم کی طرف

دیکھتے ہوئے بولی ”اس کا کیا کرنا ہے۔ کیا اسے بھی وہیں پہنچا دیں؟“

صدف کا اشارہ واضح تھا۔ ”وہیں پہنچا دیں“ سے اس کی مراد خفیہ تہ خانہ تھا جہاں ہمارے چند دشمن پہلے ہی پہنچائے جا چکے تھے۔ انہی میں سے ایک شخص کا درختل کی زبانی مجھے خٹا کے بارے میں پتا چلا تھا۔ محمد خٹا ان لوگوں کا پاس تھا جو کسی چوہدری ولداری کے لیے کام کرتا تھا، گویا خٹا کا پاس چوہدری ولداری تھا۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جاتا تو خٹا اور چوہدری ولداری کے ڈاڑھے رے رکھاں والی کے چوہدری نواز علی سے جا ملتے تھے کیونکہ ساحل کو رکھاں والی سے خٹا کی کوٹھی پر پہنچایا گیا تھا۔ اب یہ مکمل واضح ہوتا جا رہا تھا۔ خٹا کے جیسے ہوئے آدمیوں کی دشمنی کچھ میں آنے لگی تھی۔ وہ لوگ اگر میری تلاش میں تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، چوہدری نواز علی کو میری تلاش تھی! گویا، وہ اب تک ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

سینکڑ کے دوسروں میں سے یہ تمام باتیں میرے ذہن سے گزر گئیں۔ صدف نے استفسار تو مجھ سے کیا تھا لیکن میرے جواب سے پہلے ہی عبدالکریم نے منت آمیز لہجے میں کہا ”میں نے آپ سے تعاون کیا ہے، آپ کے ہر سوال کا جواب دیا ہے۔ اب آپ مجھے جانے دیں۔ مجھے تین بجے اسپتال پہنچنا ہے!“

”اسپتال کوئی ایال بھول جاؤ۔“ میں نے رکھاں سے کہا ”اور یہ بتاؤ، آج تمہیں گھر کتنے بجے پہنچنا تھا؟ اگر زندگی نے وفا کی تو تم صبح سلامت گھر ضرور پہنچو گے۔“

”آپ..... لوگ وعدہ خلافی کر رہے ہو۔“ وہ خٹکی آمیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”عبدالکریم! میں آنکھیں بند کر کے تمہاری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ تمہارے بیان کی تصدیق ضروری ہے اور میں اس تصدیق کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ جب تک تم ہمارے مہمان نہ ہو گے۔ میں تمہیں خفیہ مہمان خانے میں پہنچا دیتا ہوں جہاں ہمارے چند اور بھی خیر خواہ موجود ہیں۔“

ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا ”اگر تمہارا کہا ہوا درست ثابت ہوا تو تم زندہ سلامت اپنے بیوی بچوں کے پاس جانے کے لیے آزاد ہو گے۔“

وہ گھٹکیا کر منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اس کی ایک ذہنی اور خفیہ راستہ استعمال کر کے اسے کوٹھی کے خانے میں پہنچا دیا۔ وہاں کا نظارہ دیکھ کر اس کے ہوش خطا ہو گئے۔ وہ بھٹی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کا چہرہ کتنے کا پھر اس کی



نگاہ چھت سے جھولتے ہوئے سابق سیکورٹی گارڈ خادم حسین پر چار تکب گئی۔ میں نے اسے رنج کر حیران ہونے کا موقع فراہم کیا اور نہ خانے کی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں مطمئن ہو کر نہ خانے سے باہر نکل آیا۔ وہاں پر موجود افراد نے خاصی شرافت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ایسے شریف تو نہیں تھے، حالات نے انہیں بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ وقت بڑا ستم طریف ہے۔ یہ بڑے سے بڑے فتنہ پرور کو بھی شرافت کے مظاہرے پر مجبور کر دیتا ہے۔

میں نہ خانے سے باہر آنے سے پہلے ایک فیصلہ کر چکا تھا اور وہ فیصلہ تھا، اپنی جگہ آپ لڑنے کا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ دوسروں کو اس جگہ کا ایندھن بنادوں۔ صدف ہال نما کرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس آ کر کہا ”چلیں۔“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”فورا چلیں۔ ایک لمحے کی تاخیر نامناسب نہیں۔“

”صدف!“ میں نے اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کہا ”تم یہاں سے سیدی فرید پاشا کی گھبرگ والی کو بھی جاؤ گی یا تم چاہو تو اپنے ماموں کے گھر بھی جا سکتی ہو۔ میں تمہیں چیکس میں بٹھا دیتا ہوں۔“

وہ یک دم رک گئی۔ میں نے بات ہی ایسی کی تھی کہ اسے ٹھکانا پڑا ”وہ جان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں بے حد عجیبہ تھا ”سائل تک پہنچنا اور اسے حاصل کرنا میرا مسئلہ ہے۔ تم خواخواہ خود کو کسی مصیبت میں نہ ڈالو۔“

”یہ تم اچانک بے رشتی کا ہاتھ کیوں کرنے لگے؟“

”ہاں، میں ایسا ہی بے رنج ہوں۔“ میں نے سفاکی سے کہا۔

”میں ان حالات میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“ وہ چٹائی لیجے میں بولی ”تم اگر چاہو بھی تو مجھے روک نہیں سکو گے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ایک طرح سے مجھے چیلنج کر رہی تھی۔ اس کا جذبہ بڑا طاقت ور اور سچا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی راہ بند کرنے کی کوشش کی تو وہ باقاعدہ مجھ سے بھڑ جائے گی۔ اس کے تیر میں جارحانہ پن جھلک رہا تھا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”مجھے کچھ نہیں ہوگا صدف! تم بلاوجہ ضد نہ کرو۔ میں گھنٹے بھر میں واپس آ جاؤں گا۔“

”تم ایک گھنٹے کی بات کر رہے ہو۔“ وہ ہونٹ بھینچے ہوئے بولی ”میں ایک لمحے کے لیے تم سے الگ نہیں ہوں گی اور۔۔۔ میری یہ ضد بلاوجہ نہیں ہے۔ سائل تمہارے لیے بہت۔۔۔ بہت اہم ہوگی لیکن تم میرے لیے کچھ کم اہم نہیں ہو!“

صدف نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ میرے پاؤں میں گویا ایک زنجیری پڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ اکل ہے۔ اس کا عزم اور ارادہ مائونٹ ایورسٹ کو شرماتا رہا تھا۔ اس ضدی لڑکی کی تنبیہ کرنے کے لیے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ صدف کی ضد میں اتنی اپنائیت اور اہل ثاری تھی کہ میں نے تمہارا پیچہ دینے۔

☆☆☆

فرید پاشا نے ایک گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا تھا اور اب اس بات کو لگ بھگ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری رست راج چار بج رہی تھی۔ میں نے کوئی سے روانہ ہونے سے پہلے پاشا کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں گمان تھا، کوئی چونکا دینے والے اہم بات چٹا چل جاتی۔ میں جس اہم کے لیے نکلتا جا رہا تھا اس کے انجام کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں صدف کو لے کر اس کمرے میں پہنچا جہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ ہم نے گزشتہ رات یہیں سے فون کر کے اپنے لیے فون پنا کر لا سکا تھا۔ میں اس وقت کار پوٹا میں خاموش کھڑی تھی۔ میں نے رکھاں والی میں پاشا کی کوئی کانبر طایا۔ اب یہ فون نمبر مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اہم چیزوں کو یاد رکھنے کے لیے کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تیسری گھنٹی پر فون ریسپونڈ کر لیا گیا۔ ریسپونڈ پاشا کے جھوٹے بھائی نوید نے اٹھایا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد اس سے بھرپور تعزیت کی اس نے فرید پاشا سے میری بات کر دادی۔ فرید نے آن لائن ہوتے ہی پوچھا۔

”یار! میں ایک گھنٹے سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

میں نے اسے اپنی ”مصروفیات“ سے مختصر آگاہ کیا اور پوچھا ”کیا رکھاں والی سے کوئی خاص خبر آئی ہے؟“

”بہت ہی خاص خبر ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”وہ جان! تمہارے وہ جان نے بہت ٹھیک کام کیا ہے۔ سائل کو آج صبح رکھاں والی سے ایک سفید ایبویس میں روانہ کیا گیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے، گزشتہ رات کراچی سے بندے رکھاں والی پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ دونوں بھی ایبویس میں

سائل کے ساتھ گئے ہیں اور چوہدری نواز شعلی کا بیٹا فیصل بھی ان کے ہمراہ ہے۔ وہی جس نے مارشل آرٹس وغیرہ بھی سیکھ رکھا ہے۔“

یہ اطلاع چونکا دینے والی تھی۔ میری معلومات کے مطابق، جب میاں زاہد حسین (حالیہ منیم فرسٹ ڈگری روزنگ) نے سائل کو کراچی سے بائی روڈ لاہور روانہ کیا تھا تو فیصل اس وقت بھی اس قافلے کے ساتھ تھا۔ چھوٹی داڑھی والے جس آدمی کا پاشا نے ذکر کیا، وہ کبیر شاہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے ایبویس کے پچھلے حصے میں جو دو افراد کھینچے تھے، ان میں ایک فیصل اور دوسرا کبیر شاہ کا ساتھی تھا۔ ایبویس اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزری تھی کہ میں ان کی شکل یا چہرے پر غور نہیں کر سکا تھا۔

میں نے فرید پاشا سے کہا ”چھوٹی داڑھی والے شخص کا ہم کبیر شاہ ہے اور یہ میرے ایک تازہ بہ تازہ دشمن کا خاص بندہ ہے۔“

میں نے فرید پاشا کو شب غوری اور اس کی تنظیم سی ایف کے بارے میں کوئی خاص بات ابھی تک نہیں بتائی تھی لیکن اب بھی ہم اندازہ ہی اختیار کیا۔ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

”وہ جان! لگتا ہے، چوہدری نواز شعلی اور کراچی سے آنے والے بندوں میں کوئی خاص ڈیل ہوئی ہے جس کے نتیجے میں سائل کو یہاں سے روانہ کیا گیا ہے۔“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے پاشا۔“ میں نے تندی انداز میں کہا ”یہ لگ بھگ دس کروڑ روپے کی ڈیل ہے۔ میرے دوست جن آپس میں مل گئے ہیں اور اب مجھے ان دونوں ہی سے ان کی اوقات کے مطابق منتنا ہے۔“

وہ میرے لہجے کی عین کومحسوس کرتے ہوئے بولا ”تم نے خود ہی دیر پہلے کی گھڑشا کا ذکر کیا ہے جہاں سائل کو پہنچایا گیا ہے۔ شفا کا چوہدری نواز شعلی اور کبیر شاہ سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی بہت ہی گہرا تعلق ہوگا جیسا تو سائل کو اس کی کوئی پہچان ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا ”وہیے اتنا بتا دوں کہ شفا کا تعلق جرائم کی دنیاء سے ہے۔ میں پچھلے کی گھنٹوں سے اس کے اٹکاؤں سے خوفزدہ ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو وہ جان۔“ وہ چکے ہوئے لہجے میں بولا ”کیا وہاں لاہور میں کوئی گڑبڑ ہے؟“

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں پاشا کو یہاں کے حالات سے بارے میں مختصر آگاہوں۔ اس کے غیاب میں، میں جن

سرگرمیوں میں مصروف رہا تھا اس سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے کہا ”پاشا! تم اس طرف سے بالکل بے فکر ہو۔ میں سنبھال لوں گا۔ میرے خیال میں تمہارے والد کی تدفین میں اب زیادہ وقت نہیں۔ تم وہاں کے معاملات پر دھیان دو۔ میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ قسمت کو یہ منظور نہیں کہ ان صبر آزمائحات میں، میں تمہارے ساتھ ہوتا۔“

اسی وقت کسی نے فرید کو پکارا اور اس نے ”خدا حافظ“ کہہ کر فون بند کر دیا۔

ہم ٹیلی فون والے کمرے سے نکلے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیسرا شخص بھی وہاں سے ہمارے پیچھے آیا ہو۔ اس احساس نے بے اختیار مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔

صدف نے پوچھا ”کیا ہوا وہ جان؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس کے ساتھ قدم بڑھانے لگا۔

میں اپنے احساس کے بارے میں مکمل کر اسے بتانا نہیں چاہتا تھا وہ مجھے پہلے بھی اس حوالے سے۔۔۔ کسی باہر نفسیات سے ملنے کا مشورہ دے چکی تھی۔ اس نے میرے احساس کو دہم اور دماغ کے خلل کا نام دیا تھا۔ ہم دونوں کو بھی کے ہر دلی حصے میں آگے لیکن وہ احساس بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ میں نے اس کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ احساس میرے قریب سے قریب تر آتا جا رہا ہے، پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ احساس اپنا اپنی نزدیکی پہنچنے کے بعد میرے وجود میں داخل ہو گیا ہو، پلک جھپکنے میں وہ میرے جسم، میری ذات کا حصہ بن گیا۔

میں شائے میں رہ گیا۔ یہ میرے لیے ایک انوکھا اور حیرت انگیز تجربہ تھا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں مجھے بہت سے عسکری واقعات سے واسطہ پڑا تھا، پھر نیپال اور شیش کش میں بھی بہت سے سفلی اور علوی نظارے دیکھنے کو ملے تھے لیکن تھوڑی دیر پہلے میں جس احساس سے گزرا، وہ ان سب سے منفرد اور زلالا تھا۔

گزشتہ رات جب میں صدف کے ساتھ اس کوٹھی پر آ رہا تھا تو بھی مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اگر اس نوعیت کے واقعات صرف کوٹھی کے اندر ہی پیش آئے ہوتے تو میں سمجھتا کہ اس کوٹھی کے ساتھ کوئی پراسرار یا مادرائی چکر ہے۔ پچھلی رات جب ہم کوٹھی کی طرف آ رہے تھے تو ہماری جیب اچانک ”ناراض“ ہوئی تھی پھر جیب کو پش دینے وقت میں جن شخصیں خیر خیر بات سے گزرا انہیں نظر انداز نہیں کیا



افعال کے خود سے دار ہیں۔

میں ان خیالات میں جانے کہاں بہہ جاتا کہ صرف آواز نے مجھے چونکا دیا ”وہ جان! کیا ہم اسی دودھ والی گاڑی میں یہاں سے روانہ ہوں گے؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے ہم زاد اور اپنے انوکھے احساس کے بارے میں سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا بلکہ چلنے کے دوران میں وہ خیالات بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن پر چمک گئے تھے۔ انسانی ذہن بھی حرمت کا کارخانہ ہے۔ اس کی رفتار کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پلک جھپکتے میں صدیوں معاملات کو فضا سکتی ہے۔ میں نے صدف کی طرف متوجہ ہونے ہوئے کہا۔

”ہائی کس کو تو یہاں سے نکالنا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہم کر دلا کو بھی لے جائیں گے۔“

اس نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں؟ میں نے ٹوپوٹا ہائی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور صدف کر دلا میں چڑھ کر دونوں گاڑیاں اونگھی سے باہر آئیں۔ میں نے یک کر دلا متقل کر دیا پھر صدف کے نزدیک آ کر کہا۔

”تم کر دلا لے کر آگے چلو۔ میں تمہارے پیچے آ جاؤں۔ شاہ جمال روڈ کے اختتام پر ایک ٹھکانے پر پارک کر دلا شریف پارک کہا جاتا ہے۔ میں دودھ والی گاڑی کو اس پارک کے کنارے چھوڑ دوں گا۔ تم فیروز پور روڈ پر چڑھنے کے بعد پیٹرول پمپ میں داخل ہو جانا۔ کر دلا کی منشی فل کر دلا ضروری ہے۔ جب تک تم ایڈمن بھرواؤ گی، میں تمہارا پاس بچھ جاؤں گا پھر ہم ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔“

اس نے اثبات میں سر کو جھٹک دیا اور کر دلا کو بڑھانے پر اس گز کے فاصلے سے میں اس کے پیچھے جانے لگا۔ شریف پارک ایک اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پارک میں زیادہ تر کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ دو تین سینٹ کی ٹیمیں موجود ہیں۔ ایک غریب کھرانے کا لڑکا اسی پارک میں چھ پچ پر بیٹ پر کیٹس کرنے کے بعد قومی ٹیم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ برسوں پہلے کا واقعہ ہے فرید پاشا ایک باتونی، قصہ گو اور دلچسپ انسان تھا۔ وہ واقعات کے ساتھ اسی نے مجھے غریب کرکٹ کی روایت بتائی تھی۔ وہ لڑکا زیادہ عرصے تک ٹیم میں شامل نہ رہ سکا۔ وہ اپنے ایسا اشارہ تھا جس کی چمک بہت جلدی ماند پڑ گئی۔ کرکٹ اٹل سے دس طرح غروب ہوا، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں نے ٹوپوٹا ہائی کس کو سرک کے کنارے کھڑا کر دلا پیٹرول پمپ کی جانب بڑھ گیا۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد ہم

جاسکتا تھا۔ ازیں علاوہ، گھر گھر والی کوشی میں بھی مجھے اس سے ملتے جلتے تجربات ہوئے تھے۔ میں نے اپنا نام لے کر پکارا جانا تو بہت ہی واضح سنا تھا اور پھر وہ خواب..... جس میں، میں نے اپنے علاوہ خود کو دیکھا تھا۔ یعنی بیک وقت دو وجدان!

یا الہی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ میں ان دنوں چونکہ ”جی“ کی ایڈوائس مشقیں بھی باقاعدگی سے کر رہا تھا اس لیے اپنی ان کیفیات کے بارے میں، میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شاید میری کوئی باطنی قوت بیدار ہو رہی ہے۔ اس موقع پر..... استاد محترم آں جہانی ماسٹر ہینگ (HANG PAI) بہت شدت سے یاد آیا۔ اگر آج وہ نہ ہوتا اور میں اس سے واسطے میں ہوتا تو وہ ان پراسرار واقعات کی توجیہ کر سکتا تھا۔ یہ سچ ہے، دنیا کا کوئی بھی علم ہو، وہ استاد کی نگرانی اور انہماکی کے بغیر صحیح طور پر سیکھا نہیں جاسکتا۔ میں نے اس لیے فیصلہ کیا کہ ذرا حرمت نصیب ہو تو میں کس ماسٹر روحانیت سے ضرور رابطہ کروں گا تاکہ معاملات کی اس غمگی کو سنبھالایا جاسکے۔ ”جی“ کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا، اپنی بے خبری میں کوئی نقصان اٹھا بیٹھوں۔ اس بات کے امکانات بہر حال تھے کہ کہیں جی کی ایڈوائس مشقوں میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو گئی ہو۔ کوئی بھی انسان ہر لحاظ سے عمل نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف تو اس نظر نہ آنے والے احساس کا معاملہ تھا اور دوسری جانب اس نقلی وجدان نے مجھے ذہنی طور پر الجھا رکھا تھا۔ اس کی کرشمہ کاریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ابتدا میں، ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ کہیں میرے اور (AURA) کا کمال نہ ہو! انسانی جسم سے چند انچ کے فاصلے پر دکھائی نہ دینے والی روشنیوں کا ایک پیچہ لطیف بھی موجود ہوتا ہے، جسے نسمہ یا ہمزاد بھی کہا جاتا ہے لیکن جب میں نے غور کیا تو میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ جس بہرہ ور نے پچھلے کئی گھنٹوں سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پریشان کر رکھا تھا، وہ ”ادرا“ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ ماسٹر ہینگ پائی نے شاید ذہن نمیل میں ہمزاد (AURA) پر مجھے جو لکچر دیا تھا وہ ابھی تک من و عن میرے ذہن میں نقش تھا۔ نقلی وجدان یا وہ بہرہ ور ہمزاد کی حقیقت پر پورا نہیں اترتا تھا۔ دینے تو قصے کہانیوں اور مسالے دار واقعات میں ہمزاد کو بہت ہی مجبوزے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اپنا کاروبار چکانے کے لیے بعض عاملین کا ملین اس سے بڑے بڑے مادی کام لینے کے دعوے دار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اعمال و

کردلا میں سوار مسلم تاون کی جانب اڑنے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ پر صدف موجود تھی۔ گزشتہ رات کے آخری حصے میں یہی گاڑی میں چلا رہا تھا۔ اس وقت فرید پاشا کا اسسٹنٹ تھیں نشان پٹرول میں ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔ فٹا کی سفید کوئی تک جانے والا راستہ مجھے اذہر تھا۔

گزشتہ رات اس طرف آتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے خیال نہیں آیا کہ میری ساحل کو آج اسی کوئی میں پہنچایا جائے گا۔ بظاہر اس بات کے امکانات نہیں تھے، اس لیے میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تقدیر اور تدبیر کی جنگ ازل سے جاری ہے اور اب تک رہے گی۔ اکثر تقدیر کی جیت ہوتی ہے لیکن با تدبیر انسان ہمت نہیں ہارتا اور اپنی پلاننگ سے تقدیر کو بدلنے یا جیت کرنے کی کوشش میں جتا رہتا ہے۔ فیض احمد، قادر بخشل، ریاض علی، جشیہ، عمران اور جلال کے کروتوں سے میں یہ اندازہ تو لگا چکا تھا کہ فٹا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کیوں؟ یہ واضح نہیں ہو سکا تھا۔ لالہ بشیر ایم بی اے کے سپہت سکندر کے ڈانے بھی فٹا سے ملتے نظر آ رہے تھے اور یہ سب بدعاش فٹے کسی نہ کسی طور چوہدری دلدار سے وابستہ تھے جو ڈینٹس سوسائٹی کی ایک مالیات کو بھی میں متیم تھا۔ میں نے ان حالات میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کیا تھا کہ ساحل کو فٹا کے پاس پہنچا دیا جائے گا اور وہ بھی چوہدری نواز علی کی مرضی اور خوشی سے! میں اب چوہدری نواز علی کے لاہور ہینٹ ورک سے ٹکرانے والا تھا۔ میں نے اس کا کراچی ہینٹ ورک بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میاں زاہد حسین جیسے شخص کا خاتمہ چوہدری کے لیے بہت بڑا زیاں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کراچی میں سی ایف کے کی مدد مجھے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا۔ اور سفاک شخص میرے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا۔

پچھلے تین چار گھنٹوں سے میں مسلسل ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس دوران میں، میں نے جو کچھ بھی کیا، وہ صرف اور صرف اسی کا سراغ لگانے کے لیے تھا اور میں اس مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں فٹا کی سفید کوئی کے سامنے ہوتا جہاں ایبویلیس ڈرائیور عبدالکریم کے بقول، ساحل کو پہنچایا گیا تھا۔

اس نے گاڑی کو وحدت روڈ پر ڈالا تو مجھ سے پوچھا ”وہ جان! تم نے کارروائی کے لیے کوئی منصوبہ سوچا ہے یا اندھا دھن کوئی کے اندر داخل ہونا ہے؟“

”یہ وقت اندھا دھن عمل کا نہیں۔“ میں نے گہری جھنجھکی سے کہا ”منزل پر پہنچ کر میں نشان منزل کو ہٹا نہیں چاہتا۔ میں

بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ اس مرتبہ اگر ساحل ہاتھ لگ گئی تو۔۔۔۔۔“

میں اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکا۔ غیر ارادی طور پر ہاتھ نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چائیں، کیا تھی کہ ساحل کے حوالے سے میرا ذہن غدشات کی آماجگاہ تھا اور خاص طور پر یہ اندیشہ تو بار بار سراٹھار ہاتھ کر رہا تھا۔ میں نے ساحل کا سراغ کھودیا تو پھر اسے دیکھنے کی بجائے آنکھیں ترس جائیں گی یا برس جائیں گی۔ میں اس واقعہ کو جیتہ کرنے سے قاصر ہوں۔

صدف نے میرے ادھورے محلے پر چوٹ کر کہا ”تو۔۔۔۔۔ کیا؟“

”تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ بڑی مشکل ہو جائے گی۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ پیری دلی کیفیت اور ذہنی حالت کو بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی لہذا اس حوالے سے اس نے زیادہ کہہ نہ سکی۔ تسلی آمیز لہجے میں یوں ”کچھ نہیں ہوگا وہ جان۔ تم غور و ہم میں نہ پڑو۔“

”کیا کروں، پچھلے چند گھنٹوں سے میں کچھ دماغی ساہوکار ہوں۔“ میرے لہجے کی جھنجھکی برقرار تھی۔

وہ یوں ”میرے موجودہ حالات کے اثرات ہیں۔ تمہارا اعصاب بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ اللہ اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اللہ کرے، سب ٹھیک ہو جائے!“ میں نے بات آواز میں کہا اور صدف نے آب پارہ مارکیت کے نزدیک سے کردلا اندر موڑ لی۔

میں اس وقت خود اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں خود کو نہایت ہی مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتا ہوں اور میں نے ہر امتحان میں خود کو ایسا ثابت بھی کیا ہے لیکن ساحل نے معاملے نے مجھے ذہنی اور اعصابی طور پر بھرت و شکست کا طعنے کر کے رکھ دیا تھا۔ ساحل کا معاملہ خالصتاً دل کا معاملہ تھا۔ اس سے پہلے مجھے اس نوعیت کے معاملے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ شاید اس لیے بھی میں نے کبھی خود کو اتنا جذباتی اور بے رحم نہیں محسوس کیا تھا۔

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ چوہدری نواز علی نے شعیب خوری کے ساتھ کوئی پکٹ کر لیا تھا، میری رائے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر کسی ذیل کے نتیجے میں ساحل کو شاہ کے حوالے کیا گیا تھا تو یہ بھی ظاہر تھا کہ اسے جلد ہی کراچی پہنچایا جائے گا۔ شعیب خوری کے پاس!

دوسری جانب فٹا کی دشمنی بھی بہت واضح ہو گئی تھی۔ گیلانا کا درجنش نے مجھے بتایا تھا کہ سکندر فٹا کا دوست تھا جس نے اسے میرے بارے میں بتایا تھا۔ فٹا اپنے پاس چوہدری دلدار کی خوش نوودی کی خاطر مجھے چھاپنے کی کوشش میں تھا۔ ساحل کو فٹا کی کوئی بھی پہچانے جانے کے بعد یہی بات ہو گیا کہ فٹا اور چوہدری دلدار، چوہدری نواز علی کے بدلے تھے۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ صدف نے کردلا کو اس گلی میں داخل کیا جس میں پچاس گز آگے فٹا کا گھر تھا۔ گزشتہ رات میں نے اس سفید کوئی کو بغور دیکھا تھا۔ میں نے صدف سے کہا۔

”تم فٹا کی کوئی کے سامنے رکنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ گاڑی کو آگے نکال لے جاؤ۔“

اس نے میری بات پر عمل کیا۔ جب کردلا گلی کے ٹکڑے پر پہنچا تو میں نے صدف سے کہا کہ وہ گاڑی کو فٹا کی گلی میں داخل کر کے روک دے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میری ہدایت پر عمل کیا اور گاڑی کو میرے مطلوب مقام پر روک دیا۔ یہ جگہ فٹا کی کوئی سے نظر نہیں آتی تھی۔ تاہم وہاں خاصی خاموشی اور شائیت تھا۔ یہ مقام کوئی کی عینی گلی سے ملتی تھا جہاں ہماری گاڑی کی دشمن کی نظر میں آئے بغیر محفوظ رہ سکتی تھی۔

میں نے گاڑی سے باہر آنے سے پہلے صدف سے کہا ”ہم دوطرف سے کوئی میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ دونوں کا طریقہ کار مختلف ہوگا لیکن مقصد ایک ہی ہوگا۔“ وہ پوری توجہ اور سوا لہ نگاہ سے مجھے سنتی رہی۔ میں نے مزید کہا ”ہم اپنا اپنا بیگ ساتھ لے کر جائیں گے۔ تم خود کو گھریلو استعمال کی اشیا کی سیز گرل ظاہر کر دو گی اور چوکیدار کو باتوں میں لا کر کوئی کے گیت سے اندر داخل ہونے کی کوشش کر دو گی۔ جب چوکیدار تمہاری لہجے دار باتوں میں الجھا ہوا ہوگا، میں کوئی کی عینی دیوار چھانڈ کر اندر داخل ہو جاؤں گا۔ کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟“

میرا آخری جملہ کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ وہ محسوس لہجے میں یوں ”جیسا کرلوں گی۔ تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ لیکن کیا ضروری ہے کہ میں سیز گرل کا رول ہی ادا کروں۔ میں ایک ڈانکر کی حیثیت سے بھی تو یہ کام نکال سکتی ہوں۔ ایک ایک ڈانکر جو کسی خطرناک مرض سے آگاہی اور اس کے علاج کے سلسلے میں لوگوں کو مفید معلومات فراہم کر رہی ہو۔ میڈیکل پراجیکٹس سے اس حوالے سے میں زیادہ اچھی اداکاری کر سکتی کی۔ کیا خیال ہے؟“

”گھڑ آئیڈیا!“ میں نے عقیدہ الفاظ میں اس کی تجویز کو سراہا ”تم ایک ڈانکر کا ناک بھری کرو۔“

”وہ جان! اس طرف آتے ہوئے کوئی کے گیت پر کوئی چوکیدار وغیرہ نظر نہیں آیا۔“ اس نے سرسری لہجے میں کہا ”اور خاصی خاموشی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یوں لگتا ہے، کوئی کے اندر کوئی موجود نہ ہو۔“

میں نے کہا ”یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے لہذا ہمیں کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔“ ”اوکے۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں یوں ”میں ہر قدم پر محتاط رہوں گی۔“

پھر ہم دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ ہم نے خاصی گرجوئی سے ہاتھ ملانے اور اپنی اپنی سمت کو روانہ ہو گئے۔ میں سفید کوئی کے عینی حصے میں پہنچا ہی تھا کہ کوئی کے اندر کہیں کوئی کی آواز سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ڈرا دیر نہ لگی کہ صدف نے ڈور بتیل پر ہنگامی رکھ دی تھی۔

وہ دن کا وقت تھا۔ اگرچہ عینی گلی میں کوئی بندہ پٹر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم پھر بھی احتیاط کی ضرورت تھی۔ کوئی ڈرائی کو تاحی کام بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے چونکا نظر سے کوئی کی بالائی منزل کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ اس دوران میں صدف نے دوسری مرتبہ مجھے بتادی۔ میں کان لگا کر اندر پیدا ہونے والی آوازیں سننے لگا۔ اگلے ہی لمحے میری امید بر آئی۔

میں نے کوئی کا گیت کھلنے کی آواز سنی۔ صدف کی ہتھنی نے کام کر دکھایا تھا۔ میں نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اچھل کر عینی دیوار کی منڈ پر پکڑی اور ایک کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا پھر اگلے ہی لمحے میں کوئی کے اندر کود چکا تھا۔

میرے قدموں کو نرم اور دیر گھاس نے بوسے دیے۔ وہ عینی لان تھا۔ میں اٹھ کر پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ کوئی کے سامنے والے حصے میں مجھے غیر معمولی شور سنائی دیا۔ اس شور میں مار پیٹ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ میں ایک لمحے میں سمجھا گیا، وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی مخصوص دھمک کے سچ میں نے صدف کی مخصوص چیخ سنی۔ یہ چیخ ہر مارشل آرٹسٹ کا خاصہ ہوتی ہے جو (YELLING) کہلاتی ہے۔ مارشل آرٹسٹ اپنے مد مقابل پر ہر ہر حملہ کرتے وقت تیز آواز میں (YELL) کرتا ہے۔ صدف کے عمل نے مجھے ہلک جھپٹے میں باور کرا دیا کہ وہ خطرناک سے میدان عمل میں کود پڑی تھی۔ انتظار کے لمحات گزر چکے تھے۔ میں نے ایک ہل خالص کیے بغیر صدف

سمت دوڑ لگا دی۔

کوشی کے سامنے والے حصے میں پہنچ ہی میری نگاہ نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ صدف دھبے تلے اور دروازے قامت افراد سے نبرد آزما تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی مشین کے مانند حرکت کر رہے تھے۔ میں لپک کر اس کی مدد کو آیا اور ایک شخص کے کارل میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا پھر میری جانب ہوا، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ خفا کا دوست اور ایم بی اے لالہ بشیر کا بھڑا بیٹا سکندر تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک دھانسو قسم کا کچا مارا۔ اس نے سر کو پیچھے جھٹکا تو میں نے اس کے فراخ سینے پر ایک زوردار فرنٹ کلک جڑ دی۔ وہ الٹ کر عقب میں گرا۔

اسی وقت صدف نے اپنے تہ مقابل کو ایک سائیڈ کلک مار کر دوڑ اچھال دیا پھر میری طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولی ”میں ان دونوں سے بخوبی نمٹ لوں گی۔ تم یہاں کی گھر نہ کرو اور کوشی کے اندر پہنچو۔“ وہ اس وقت ایک بھری ہوئی شیرنی نظر آ رہی تھی۔

صدف نے جس شخص کو دور پیچھا کیا تھا، وہ کوشی کا چوکیدار تھا۔ گویا وہاں کی صورت حال پوری طرح صدف کے کنٹرول میں تھی۔ میں مطمئن ہو کر اندر کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے سکندر ایک مستعد ٹائیگر جیسے لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس پر حشرات کی نگاہ ڈالی اور اپنی راہ ہولیا۔

سکندر اس سے پہلے دوسرے میرے راستے میں آیا تھا اور دونوں ہی مرتبہ اس نے بڑی ذلت اٹھائی تھی۔ بال روڈ والے ریسٹورنٹ میں تو صدف نے اس کی عظیم الشان گت بتائی تھی اور فریڈ پاشا کے گھر پر میں نے اسے ناکوں سے چھو ڈالے تھے حالانکہ اس وقت سکندر نے جوباس پہن رکھا تھا اس میں اس کی ناک کو تلاش کرنا خاصا مشکل تھا۔ ڈیجیٹر ڈیولک جیسے لباس میں وہ اور اس کے ساتھی بڑے معتمد خیز نظر آ رہے تھے۔ ”گولڈ مین“ کا تھڑکرا ہوا لائبر داگر انہیں اس طبقے میں دیکھ لیتا تو ہنسی ضبط کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔

میں تیز قدموں سے دوڑتے ہوئے کوشی کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ صدف کی طرف سے اطمینان نے میری مستعدی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے برآمدے کو عبور کر کے جیسے ہی ایک راہداری میں قدم رکھا، سامنے سے ریاض علی آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ریو اور بکڑ رکھا تھا۔ اس کی صورت میرے لیے ابھی نہیں تھی۔ میں نے وہانت ہائی روف کی ڈرائیوگ سیٹ پر اسے اٹھا اٹھل کیا تھا۔ ازاں بعد اسی نے خفا کو میرے بارے میں اطلاع فراہم کی تھی۔

ریاض علی نے بھی مجھے فوراً پہچان لیا۔ اس تلے ریاض والا ہاتھ سیدھا کیا اور مجھ پر گولی چلا دی۔ راہداری کا رخ مخصوص آواز سے گونج اٹھی۔

ریاض نے راہداری میں دوڑتے ہوئے میرا نشانہ بننے کی کوشش کی تھی لہذا میں اس کے دام میں نہ آ سکا۔ ایک بڑے ہدف زیادہ فاصلے پر تھا، دوسرے میں نے اس کا ہاتھ پڑھ لیا تھا۔ وہاں سے فریڈ رول کر دیا۔ یہ قال اور رول کا ایک سرسری کھیل تھا چنانچہ میں گولی تلنے سے محفوظ رہا۔ اب میں ریاض کے بہت قریب آ گیا تھا۔

اسی دوران میں اس نے دوبارہ مجھ پر فائر کرنا چاہا لیکن اب میں اسے کوئی موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی زمین سے کھڑے ہو کر ایک چکر دار بیک کلک چلائی۔ میری ایڈز اس کے ریو اور دالے ہاتھ پر پڑی۔ وہ لاٹکڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹا، میں نے آگے بڑھ کر اسے ایک نیپ ٹلی راؤڈر ہاؤس کلک مار دی۔ وہ کلینڈ کی شدت سے چلا اٹھا۔

یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ اٹھ لیاں کر دوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا، اس کوشی میں اور کتنے دشمنوں سے واسطہ پڑے گا۔ ایک لمحہ خفا کے بغیر میں ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے ریاض کو پھیلنے کا موقع نہ دیا اور وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں نے اس کے بلند ہونے کو ریو اور دالے ہاؤس کی گرت سے نکل کر راہداری کے آخری سرے پہنچ گیا۔

نہتا ہوتے ہی اس نے کوشی کے اندرونی حصے کی جانب دوڑ لگا دی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور ایک کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے چالیا۔ وہ میری دوسری میں آیا تو میں نے تاہو تو ڈھونے پر سارے اس کا چہرہ ابھولیا۔ وہ لاٹکڑا ہوا بھڑائی کا زیادہ باہر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے اس کی کینٹی پر ڈبل چوب رسید کیا۔ یہ ایک ایسی ضرب تھی جس کے نتیجے میں گھٹنا، دو گھٹنا کے لیے وہ دنیا دانی سے کٹ جاتا۔ میرے عمل کے اگلے ہی لمحے وہ کسی تلے ہونے مہتر کے مانند میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے راہداری کے پتھر فرش پر پھینکا اور ریو اور کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد میں نے کوشی کے اندرونی حصے کا رخ کیا۔ کیے بعد دیکھ کر میں نے کئی کمرے دیکھے ڈالے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ میں بے باقی سے

دوڑتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے زینے کے اختتام پر پہنچ کر ایک کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک پست قامت سیاہ ریشم نمودار ہوا۔ مجھ سے نگاہی تو وہ ٹھٹکا پھر اس نے ایک میز کی طرف متناظر طور سے دیکھا۔

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ایک کلاشکوف تک بھری رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پست قامت کی جگت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاتھ روم کے اندر رہتے ہوئے اسے بیرونی گڑبڑ کا فوراً احساس ہو گیا تھا، پھر زبریں منزل پر ریاض نے ایک فائر بھی کیا تھا لہذا اس کا متحش اور چونکا ہوا نا لازمی امر تھا۔

میں نے اس سیاہ ریشم شخص کے ارادے کو بھانپ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کلاشکوف تک پہنچتا، میں نے ہوا میں پرواز کی اور اس میز تک رسائی حاصل کر لی جس پر کلاشکوف رکھی تھی۔ ہم دونوں کے بعد دیکھ کر کلاشکوف پر جھپٹا مارا اور وہ تھکرا ہم دونوں کی مشترکہ گرفت میں آ گیا۔

اسی وقت مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے ستارے سے جھلکتے نظر آئے اور میرے سر میں ایک دھماکا سا ہوا۔ تہ مقابل نے ایک زوردار ٹکر مجھے رسید کی تھی۔ اس کی ٹکر میں فوڈا کی بجائی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے پکڑا پھر سنبھل گیا۔ میری جگہ اگر یہ ٹکر کسی اور شخص کے پڑی ہوتی تو وہ فوراً بے ہوش ہو جاتا۔ پست قامت شخص نے وار کرتے ہوئے بہت بھری کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے بھی ادھار چکانے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا اور اگلے ہی لمحے اس کی ناک پر ایک طوفانی مکا جڑ دیا۔ اس عمل کے لیے مجھے کلاشکوف کو چھوڑنا پڑا تھا۔ تہ مقابل پیچ کھانے کے بعد پیچھے الٹ گیا پھر اس نے بڑی سرعت سے کلاشکوف میری جانب سیدی کر دی۔

میں کسی چیتے کے مانند جست بھر کر اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اسے مجھ پر نشانہ لینے کے لیے پوزیشن بدلنا پڑی۔ اس میں متناظر وقت صرف ہوا، میں نے اس دوران میں اس کے کلاشکوف والے ہاتھ پر ایک دھواں دھار ٹھوک مار دی۔ کن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ گن کی طرف بڑھا تو میں نے اس کی پشت پر ایک زوردار سائیڈ کلک لگا دی۔

پست قامت شخص جو تھکے تیز میں پچی پرواز کرتے ہوئے سامنے والی دیوار سے جا کھرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے چہرے کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ جب وہ میری جانب کھوتا تو میں نے دیکھا، اس کے ناک اور منہ سے خون

جاری تھا۔ اس کا چہرہ بہت ہمایا تک منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

مجھے یہ ماننا پڑا کہ اس شخص میں کسی ساڑھی کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ میں اپنے داؤ پیچ سے اسے زیر کر رہا تھا اور نہ طاقت کے مظاہرے میں وہ کسی سے کم نہیں تھا۔ آئندہ پندرہ سیکنڈ میں اس نے حراحت ترک کر دی اور زمین پر گر کر بری طرح ہلپنے لگا۔

اسی وقت مجھے زبریں منزل پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے متناظر سے اپنے تہ مقابل کو دیکھا پھر اس کی گن اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں نے بالائی منزل کا کونا کونا جانک لیا لیکن ساحل کہیں دکھائی نہ دی۔ اس دو منزلہ کوشی میں ان چار افراد کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ میں تو قیاس کر رہا تھا کہ وہاں سخت ترین حراحت کا سامنا کرنا پڑے گا اور ساحل کو چھڑانے کے لیے مجھے ہتھوڑوں پسینہ چھڑانے کا آزار پائی گئی تھی اور نہ ہی دانتوں پسینہ چھڑانے کا آزار

میں نے ایک مرتبہ پھر بالائی منزل کے ہر کمرے کو چیک کیا اور دوبارہ اس کمرے میں آ گیا جہاں پست قامت سیاہ ریشم شخص کو چھوڑا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ وہ بد بخت اب وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے چاروں جانب تلاشی لگا دی لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ زبریں منزل کی طرف فرار ہو گیا ہوگا۔

میں نے پیچھے جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر بالائی منزل کے کمروں میں جھانکا اور زینہ طے کر کے نچے آ گیا۔ پچی منزل پر بھی وہ پست قامت شخص مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں کلاشکوف تھا سے راہداری میں نکل آیا جہاں میں نے ریاض علی کو بے ہوش چھوڑا تھا۔ اب کوشی کے اس حصے میں صدف مہتر کے آرا تھی۔ وہ اپنے تہ مقابل کو چوکیدار کی بری طرح ٹھوکروں میں اڑا رہی تھی۔ سکندر اس کے آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی صدف نے ہاتھ روک دیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

”وہ جان! وہ مردود ہماگ کیا۔“

اس کا واضح اشارہ سکندر کی جانب تھا۔ میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا ”کہاں کیا وہ بھگڑے کی اولاد؟“ ”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ سرسری انداز میں بولی ”میں چوکیدار سے نمٹ رہی تھی کہ سکندر کو موقع مل گیا اور وہ کوشی کا گیت کھول کر کھٹک لیا۔ ویسے میں نے اس کا علیہ اس بری

طرح بگاڑا ہے کہ وہ کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ پھر اس نے پوچھا ”سائل کا کوئی سراغ ملا؟“

”میرے خیال میں، وہ اس کو بھی میں موجود نہیں۔“ میں نے کہا۔

اسی لمحے میں نے صدف کے عقب میں چوکیدار کو متحرک پایا۔ وہ بری طرح ہنسنے کے بعد زمین بوس ہو گیا تھا اور اب صدف کو باتوں میں لگا دیکر اس نے طالع آزمائی کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے فوراً کاشف کو کارخ چوکیدار کی جانب کر دیا۔ صدف نے میری اس جنبش کو بہت وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا اور برق رفتاری سے اس کی ٹانگ چلی۔ ایک زوردار کلک چوکیدار کے سینے پر پڑی اور وہ چاروں خانے چت ہو گیا۔ اس کے نزدیک ہی تھوڑے فاصلے پر ریاض علی بے ہوش پڑا تھا۔ صدف اچھل کر چوکیدار کے پاس پہنچی اور اس کے چہرے کو اپنے گورگزی ٹھوکروں سے بگاڑنے لگی۔ اس دوران میں اس کی ٹھو پڑی پر کوئی ایسی ضرب پڑی کہ وہ گردن ایک طرف ڈال کر بے ہوش ہو گیا۔

صدف نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا تو میں نے کہا ”تم نے کسی پست قامت شخص کو اس جانب آتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا ”کیا کوئی اور شخص بھی یہاں موجود ہے؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے بے ہوش ریاض علی کی طرف دیکھا۔

میں نے اسے بالائی منزل والے واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوئی، جلدی سے بولی ”وہ جان! وہ بزدل کی نسل تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“ اس کا اشارہ سکندر کی جانب تھا ”اور یہ دونوں یہاں بے ہوش پڑے ہیں۔ اگر کوئی اور شخص بھی اس کو بھی میں موجود ہے تو ہمیں فوری طور پر اسے دھوڑنا چاہیے تاکہ ساحل کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔“

صدف کی تجویز معقول تھی۔ اس نے پست قامت شخص کو نیچے آتے نہیں دیکھا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا، وہ بالائی منزل پر ہی کہیں چھپا ہوگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب وہ شخص بڑے افراتفری کے عالم میں ہاتھ روم سے برآمد ہوا تھا۔ عین ممکن تھا، اس نے اپنی بچت کے لیے دوبارہ اسی گوشہ عافیت میں پناہ لی ہو۔

میں صدف کے ساتھ زینہ طے کرتے ہوئے تیزی سے ادھر پہنچا۔ صدف نے پوچھا ”فشا کے بارے میں کچھ بتا

چلا؟“

”ابھی تک تو وہ سو رہا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔“ میں نے کہا۔ لیکن ہوسکتا ہے، میں نے جس پست قامت، ساہوکار شخص کے بارے میں تم سے استفسار کیا وہی فشا ہے۔ میں نے اسے زندگی میں بھی نہیں دیکھا اس لیے اس کی صورت سے واقف نہیں ہوں۔“

ہم بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ میں تقریباً دوڑتے ہوئے اسی کمرے میں آیا جہاں پست قامت شخص سے پہلی ”ملاقات“ ہوئی تھی۔ میرا رخ ہاتھ روم کی طرف تھا۔ ایک خیال ذہن میں جرم کیا تھا تو سوچا، پہلے اسی کی تصدیق کر لوں۔

میں نے ہاتھ روم کے دروازے پر دباؤ ڈالا تو چونک پڑا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، کوئی ہاتھ روم کے اندر بند ہے۔ میں نے گمن کی نال سے دروازے پر دھک دی۔ اسی لمحے اندر کسی چیز کے گرنے کی آواز ابھری۔ اس آواز نے تصدیق کر دی کہ اندر کوئی موجود تھا۔

میں نے دھکی آئینہ لہجے میں کہا ”ہم نے کوئی اور یہاں کے حالات پر پوری طرح قابو پایا ہے اس لیے اگر زندگی چاہتے ہو تو خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“

اندر سناٹا طاری تھا، شاید میری دھکی نے اس شخص کو سناٹے میں پہنچا دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اندر سے آنے والی آواز نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ عیث ہاتھ روم میں موجود ہے۔ بتائیں، وہ کس خیال کے تحت خاموش ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے کان کے نزدیک صدف کی سرگوشی سنانی دی ”وہ جان! جو بھی کرتا ہے، جلدی کر گزر دو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ سکندر کے فرار نے حالات کو خنجر دھنسا دیا ہے۔ کہیں کوئی بڑی گزبوند ہو جائے۔“

ذہنی سکندر کے فرار نے مجھے بھی تشویش میں جکڑ دیا تھا۔ میں خود جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے دوبارہ ہاتھ روم کے دروازے پر زوردار دھک دی اور تھکمانہ انداز میں کہا۔

”میں تمہیں صرف دس سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں اور تم مہلت میری بات ختم ہوتے ہی شروع ہو جائے گی۔ اگر زندگی کو مزید ابھانے کا چاہتے ہو تو فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آؤ۔ وقت گزرنے کے بعد میں دروازے پر بے اندھا دھنہ فائرنگ کر دوں گا۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا، تم اس کا تصور کر سکتے ہو۔ پہلے یہ دروازہ کھلی ہوگا اور پھر تمہارا جسم۔ دس سیکنڈ کو شمار کرنا شروع کر دو۔“

میں نے خاموش ہو کر صدف کو دیکھا۔ وہ ابھمن زدہ نظر سے ہاتھ روم کے دروازے کو تنک رہی تھی۔ میں ہاتھ روم کے دروازے پر گولیاں برسائے گا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ نہ دروازے کو زبردستی توڑنا میرے ہا میں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ”اے! یہ ہر پورقت کے ساتھ میرے کندھے کی ایک ضرب پڑے گی۔“ کوچھٹ سے اکھاڑ دیتی۔ خواخوہا فائرنگ کر کے دونوں کو اس جانب متوجہ کرنا حجت میں شمار ہوتا۔ ریاض کی چال ہوئی ایک کوئی ہی کا تھی۔ اس بات کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا، کوئی کسی بھی وقت حالات کی بوسگت ہوا اس طرف آنکلتے گا۔

ہاتھ روم کے اندر موجود شخص نے اس نازک موقع پر عقل برتی کا ثبوت دیا۔ زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے اور جرائم شخص کو تو کچھ زیادہ ہی پیاری ہوتی ہے۔ گناہ کی لذت بڑا ناکھنجر ہے۔ اس سے انسان کی نیت بھی نہیں بھرتی۔ وہ ہی نجر ہے ہا ہر گزرنے کے لیے طویل عرصے تک بیٹا ہاتا ہے۔

میری دی ہوئی مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی ہاتھ روم کا دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں مجھے وہی شخص کھڑا دکھائی دیا جس کی کاشف اس وقت میرے قبضے میں تھی۔ اس نے نہایت شرافت کے ساتھ دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ اس کا مکرہ چہرہ لبوہمان ہونے کے بعد خاصی بجا مک صورت اختیار کر چکا تھا۔ یہ میری پٹائی اور دیوار سے گزرا کا نتیجہ۔

میں نے گمن کو ایک خطرناک جنبش دی اور تھکمانہ انداز میں کہا ”باہر نکلو!“

”وہ پینڈر آپ!“ پوزیشن میں رہتے ہوئے ہاتھ روم سے نکل آیا۔ میں نے جس میز پر وہ کاشف رکھی دھکی تھی، اس کے قریب ہی ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے نہایت سنگین الفاظ میں استفسار کیا۔

”زندہ رہنا چاہتے ہو؟“

اس نے انبات میں گردن ہلائی۔ اس شخص کے انداز و اطوار سے میں نے بھابھ لیا تھا کہ وہ شخص کی صورت نہیں ہوسکتا تھا۔ فشا درجنوں افراد کا پاس تھا اس طرح دم دہا کر ہاتھ روم میں چھپ کر بیٹھنا اس جیسے آدمی کو زیب نہیں دیتا تھا۔ وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتا یا پھر سکندر کی طرح موقع سے فرار ہو جاتا۔

میں نے پست قامت کی آنکھوں میں بہت دور تک

جھانکتے ہوئے سوال کیا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”آفتاب خان۔“ اس نے سہجے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”فشا کہاں ہے؟“

”فشا!“ اس نے خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”یہاں تو کوئی فشا نہیں رہتا۔ یہ تو شمشاد صاحب کی گمشدگی ہے۔ وہ امریکا گئے ہوئے ہیں۔“

اگر میں اس گمشدگی میں سکندر اور ریاض کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اس کی بات کا اعتبار کر لیتا لیکن اب میں اس کے کسی پکڑ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ مجھے کسی شمشاد علی ایڈووکیٹ کی فرسٹی کہاں بنا کر بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے پونکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔

”تم اسی شمشاد کا ذکر کر رہے ہونا جس کے چھوٹے بھائی کا نام وحید ہے؟“

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا ”جی، جی۔ وہی شمشاد صاحب۔“ وحید صاحب آج کل راولپنڈی گئے ہیں۔“ ایبویلیس کے ڈرائیور عبدالکریم نے مجھے بتایا تھا، اس نے کسی وحید کے ایما پر ساحل کو رکھاں والی سے لاہور پہنچایا تھا اور اب آفتاب نامی یہ پست قامت شخص مجھے کوئی اور ہی کہانی سنارہا تھا۔ گویا وہ مجھ سے گائیڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اچانک اس کے سینے پر ایک زوردار فرنٹ کلک جڑی۔ میری یہ حرکت اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ میں اچھل کر اس کے سر پر پہنچا اور گمن کی نال کا رخ اس کی پیشانی کی جانب کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

”تم اپنی باتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں۔“

وہ میری آواز میں موجود سنگینی کو محسوس کر کے خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سخت لہجے میں پوچھا ”بتاؤ، فشا کہاں گیا ہے؟ اور وہ ملا کہاں ہے جسے آج دوپہر یہاں پہنچایا گیا تھا؟“

اس کے خوف میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس نے میری باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ میں نے اس پر کیا ہاتھ نہیں ڈالا اور یہ کہ میں اس سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، پوچھ کر ہی جان چھوڑوں گا۔ میں نے اس کی دہشت کو بڑھانے کے لیے مزید کہا۔

”آج دوپہر لگ بھگ ایک بجے میری ایک ساتھی کو

سفید ایبولیس میں یہاں لایا گیا ہے۔ اس لڑکی کا نام ساحل ہے جو رکھال والی کے چوہدری نواز علی کی تحویل میں تھی۔ اسی ایبولیس میں ڈرائیور کے علاوہ دو اور افراد بھی موجود تھے جن کا تعلق کراچی سے ہے۔ ان میں سے داؤد علی والے ایک شخص کا نام کبیر شاہ ہے۔ انہیں علاوہ رکھال والی سے چوہدری نواز علی کا بیٹا فیصل بھی ان کے ساتھ آیا ہے۔ میں نے جس سفید ایبولیس کا ذکر کیا ہے اس کا ڈرائیور عبدالکریم میری قید میں ہے۔ میں اسی کی نشان دہی پر یہاں آیا ہوں۔

میں نے محسوس کیا، آفتاب خان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ یکے بخت برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ میں نے دھکیل آمیز انداز میں کہا ”اگر تم نے اب بھی زبان نہ کھولی تو کسی پچھتاوے کو محسوس کرنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ میں تمہاری کوہ پڑی میں اتنی گولیاں اتار دوں گا کہ پیسے کو اٹھانا ممکن نہیں رہے گا۔ بولو، کیا کہتے ہو؟“ میں نے گن کی نال کو اس کی پیشانی کے وسط میں ٹکادیا ”مجھے خفا، ساحل فیصل اور کبیر شاہ وغیرہ کے بارے میں بتاتے ہو یا میں اپنی دھکیل پر عمل کر ڈالوں؟“

میرے الفاظ میں پوشیدہ وحشت اور سفاکی نے اس کے اعصاب کا پتھر نکال دیا۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ”بب..... بتانا..... ہوں..... تم گن کو ادھر سے ہٹاؤ۔“

میں نے کلاشکوف کی نال کو اس کی پیشانی میں گھسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”یہ نال اسی وقت یہاں سے بچے گی جب تم میرے سوالات کے جواب دے دو گے، ورنہ نہیں!“

میرے دو ٹوک اور متکین انداز..... نے اس کی زبان کھول دی۔ اس نے سراپہ سلجھ میں مجھے بتایا کہ دو بجے کے قریب وہ لوگ یہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔ ایک گھنٹے تک صرف اس لیے ساحل کو روکا گیا تھا کہ اگر کوئی تعاقب میں ہو تو اس کا سراغ لگایا جاسکے۔ مطمئن ہونے کے بعد ساحل کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کبیر شاہ، اس کا ساسی، چوہدری نواز علی کا بیٹا فیصل اور خفا بھی ساحل کے ساتھ ہی گئے تھے۔ میں نے جب آفتاب سے پوچھا کہ وہ کہاں گئے ہیں تو اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔

میں نے غرا کر کہا ”مجھے کوئی چلانے پر مجبور نہ کرو۔ اگر ایک مرتبہ فریڈ ب گیا تو پھر جب تک تم ریٹائریشن نہیں ہو جاؤ گے، میرا ہاتھ نہیں گھمے گا۔“ انہیں تمہارا لباس اور اس کا باپ بھی نہیں بچا سکے گا!“

وہ ہچکچایا ”سب لوگ چوہدری صاحب کی کوشی پر گئے

ہیں..... چوہدری صاحب نے اپنی خصوصی گاڑی بھیجی تھی وہ اسی گاڑی میں گئے ہیں۔“

اس کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”چوہدری دلدار کی بات کر رہے ہوتا؟“

اس نے سر کو اٹھاتی جھنجھٹ دینے پر انکشاف کیا۔ وہ اس وقت بہت زیادہ مصیبت میں نظر آ رہا تھا۔ خوف اور دہشت نے اسے پوری طرح اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے سے حقارت نکلتی تھی۔

”تم چوہدری دلدار کے سامنے دم ہلانے اور اس کے ٹکڑے چاٹنے والا ایک ادنیٰ سادو پایہ ہو۔ وہ تمہارے ہاں بھی باس ہے، یعنی تمہارے باپ کا باپ ہے۔ تم اپنے دلہا جان کے ٹکڑے کاٹنے سے ضرور واقف ہو گے۔ مجھے چوہدری کی کوشی کا پتا بتاؤ؟“

”تم یقین جانو، میں چوہدری صاحب کی کوشی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا“ وہ ملتھیانہ انداز میں بولا ”مجھے صرف اتنا معلوم ہے، دو ڈیفنس سوسائٹی کی کسی تعلیم یافتہ لڑکی میں رہتے ہیں۔ میں بھی وہاں نہیں گیا، صرف سٹاف میں ہے۔“

”قدر بخش نے بھی صرف سٹاف میں تھا“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”اس لیے میں نے اسے ایسی جگہ پتھار دیا جہاں وہ سب کی سنے گا، کوئی اس کی نہیں سنے گا۔“

انہیں بھی قدر بخش کے پاس ہی پہنچانا ہوگا۔ تم دونوں مل کر ایک ہی ہجرے میں اچھے لگو گے۔“

قدر بخش کے ذکر پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”تو قدر بخش تمہاری قید میں ہے؟“

”صرف وہی نہیں بلکہ تمہارے گم شدہ مقام ساتھی میں نے گھیر آواؤں میں ایک کھمبہ میں نے اسے حریفوں سے ڈھکیا اور ان سب کا بھی قصور ہے کہ انہوں نے چوہدری دلدار کی کوشی دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا پتا جانتے ہیں۔“

وہ تیز آواز میں چیخا ”یہ سچ ہے..... بولنا کے بجائے صرف خفا صاحب ہی چوہدری صاحب کی کوشی میں آئے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی وہاں نہیں گیا۔“

”آج تک نہیں دیکھا۔ اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو میں سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”قسم کھانے یا زہر پینے سے بات نہیں بنے گی، میں ایک فوری اور اچھوتے خیال کے تحت اسے دوسرے زانچ سے گھسا“ میں تمہاری زبان پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ اب

میں کی طرح مجھے صرف اتنا بتا دو، چوہدری دلدار نے ان لوگوں کے لیے کون سی خصوصی گاڑی بھیجی تھی اور اس گاڑی کا پتہ کیا ہے؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے دھکیل آمیز لہجے میں انکشاف کیا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ تم نے گاڑی دیکھی ہے اور نہ ہی اس کا نمبر تمہیں یاد ہے۔“

”وہ سنے ماڈل کی کنگ سائز لیڈ کر دز تھی۔“ اس نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا ”ہاڈی بھی سیاہ اور شیشے کی ان شیشوں کے پیچھے دیکھا نہیں جاسکتا جبکہ گاڑی کے اندر موجود افراد باہر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس سیاہ چپ کا نمبر ہے، سیون ٹان تھری ٹانج۔“

”گن جہادری بتائی ہوئی باتیں غلط ثابت ہوئیں تو میں تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دوں گا“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ آفتاب خان نے جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”میں نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ جتنا میں جانتا تھا، وہ تمہیں بتا دیا۔ اب ایک درخواست تم سے بھی ہے۔“ اس نے التجا آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔

”ہاں، ہاں۔ جلدی بولو“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”دو بولو“ مجھ پر صرف اتنا احسان کرنا کہ کہیں میرا نام نہ آئے۔ میں نے جنہیں کی قسم کی معلومات فراہم نہیں کیں۔ تم بولنا بات سمجھ رہے ہوتا؟“

”ابھی طرح سمجھ رہا ہوں“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے میں تمہیں ہاتھ روم میں بلا کر کے جا رہا ہوں۔“ پھر میں نے اسے گن کی نال سے ٹپو کا ”یہاں پتھر، تمہیں ہاتھ روم پکارا ہے۔“ پہلے تم اپنی مرضی سے اس میں رو پوش ہوئے تھے، اب میرے حکم پر وہاں بند ہو گے اور..... اس بار دو واڑہ اندر سے نہیں بلکہ باہر سے ان کی کھانے گا۔ ویسے تم اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اندر سے ہی کوشی لگائے ہو۔“

وہ کڑخیز غلام کی طرح گن کے اشارے پر اٹھا اور خود میں گھس گیا۔ میں نے ہاتھ روم کے دروازے کو اچھی نظر رکھا۔ ہاتھ روم کے اندر وہ اپنی خواہش پر ہاتھ روم سے نہیں آسکتا تھا۔ باہر سے کھولنے کے لیے اس کوشی میں کوئی غلطی نہ ہو جو وہ نہیں تھا۔

اس کوشی میں ایک ہل حریف رکن وقت ضائع کرنے کے خلاف تھا لہذا ہم دونوں وہاں سے نکل آئے۔ آفتاب کی

کلاشکوف کو میں نے کوشی کی بالائی منزل پر ہی پھینک دیا تھا۔ البتہ ریاض علی کا رپوٹور میں اپنے ساتھ لے آیا۔ یہ چھوٹا سا ہتھیار لباس کے اندر بہ آسانی چھپایا جاسکتا تھا اور کسی نازک موقع پر کام میں بھی لایا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

سکندر کے بزدلانہ فرار نے حالات کی پیچیدگی کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ مجھے اور صرف کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور یہ بات بھی اسے معلوم ہو چکی تھی کہ چوہدری دلدار میرا طلب گار ہے۔ سکندر کی خفا کی کوشی پر موجودی سے ظاہر ہوتا تھا، وہ ساحل والے معاملے سے باخبر ہو چکا ہے لہذا کہا جاسکتا ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہونے کے بعد سیدھا ڈیفنس سوسائٹی پہنچا ہوگا تاکہ چوہدری دلدار اور خفا کو ان تازہ ترین حالات سے باخبر کر سکے۔

ایک موبہوم سا امکان یہ بھی تھا کہ دیگر افراد کی طرح سکندر بھی چوہدری دلدار کی کوشی سے واقف نہ ہو لیکن اس صورت میں وہ کسی بھی طرح خفا تک ہماری اطلاع ضرور پہنچاتا۔ حالات نے اچانک ایسا ایسا کھپا تھا کہ میں ساحل کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ میرا ذہن اس وقت بہت تیزی سے چوہدری دلدار تک پہنچنے کی پلاننگ کر رہا تھا اور اس سلسلے میں، میں ایک نہایت ہی اہم ٹیم حاصل کر چکا تھا۔

میں نے آفتاب خان سے چوہدری دلدار کی بھیجی ہوئی گاڑی اور اس کے نمبر کے بارے میں خواہ مخواہ نہیں پوچھا تھا۔ بلکہ اس کے ذریعے میں چوہدری دلدار کا سراغ لگا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، جب میں لاہور آنے کے بعد صدف سے الگ ہوا تھا تو اس ضدی لڑکی نے کس طرح میرا سراغ لگایا تھا۔ میں بھی اسی کی ترکیب آزمائے جانتا تھا اور اس سلسلے میں صدف کے ماموں اور گن زیب خان کا نام میرے ذہن میں جمل بھر رہا تھا۔ وہی اور گن زیب جو ڈی ایس پی ٹریک تھا۔

خفا کی کوشی سے واپسی کے وقت بھی صدف ہی گاڑی کو ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ نو کپیس کے علاقے سے ہو کر آیا گا۔ تھی۔ اس کی کزن نادیہ کا یہاں آنا جانا لگتا تھا کیونکہ وہ پنجاب یونیورسٹی نو کپیس سے انکس میں باسٹرڈ کر رہی تھی۔

نو کپیس اور مسلم ٹاؤن کے درمیان نو مسلم ٹاؤن کا علاقہ تھا اور پتا نہیں کیوں، صدف وحدت روڈ کی طرف جانے کے بجائے اس طرف نکل آئی تھی۔ اس نے ڈرائیو تک کے دوران میں مجھ سے پوچھا۔

”وہ جان! اب کیا ارادہ ہے؟“ اس کے لہجے میں حد درجہ تنبیہ کی تھی ”آپہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے صاف کوئی سے کام لینے ہوئے کہا ”میں تمہارے ڈی ایس پی ماموں سے مدد لینا چاہتا ہوں۔ وہ سیاہ لینڈ کروزر کے نمبر سے پتا چلا سکتے ہیں کہ اس جگہ کا مالک ڈیٹس سوسائٹی میں کہاں رہتا ہے۔ تم نے بھی انہی کے تعاون سے میرے ہوٹل تک رسائی حاصل کی تھی۔“

”اچھا آئیڈیا ہے“ اس نے سر ہا ”لیکن اس کے لیے ہمیں ان کے پاس جانا ہوگا اور وہ پوچھیں گے کہ ہم تو سید پور چلے گئے تھے پھر سیاہ لینڈ کروزر درمیان میں کہاں سے آگئی؟“

اس پولیس والے سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو بہت سادہ ضائع ہوتا اور اسے مطمئن بھی کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے کہا ”اس سلسلے میں نادیہ کو کچھ میں ڈالا جاسکتا ہے۔ تم اسے اعتماد میں لے کر بتا سکتی ہو کہ ہم ناگزیر وجوہ کی بنا پر سید پور نہیں جاسکے اور یہ سیاہ لینڈ کروزر کا سراغ لگانا بہت اہم ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے ڈیڑی سے کوئی پتھر چلا کر ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دے۔“

”ٹھیک ہے، میں نادیہ سے رابطہ کرتی ہوں“ وہ مضبوط لہجے میں بولی ”یہیں کیسپس ہی سے میں اسے فون کرتی ہوں۔“

میں نے کہا ”تم فون کرنے کے بجائے اگر براہ راست اس سے جا کر مل لیں تو زیادہ اچھا تھا۔“

”ناک ہمارے سید پور نہ جانے کی خبر عام ہو جائے اور ماموں مجھے گھر میں بٹھا دیں“ وہ روانی میں بولتی چلی گئی ”وہ جان! میں ان حالات میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اکٹھا نہیں چھوڑوں گی۔ یہ بات تم اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ نادیہ سے میں کس طرح کام لگوانی ہوں، تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

میں نے ایک گہری اور طویل سانس خارج کی۔ اگرچہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ صدف گھر جا بیٹھے لیکن وہ عجیب لڑکی اس حوالے سے خاصی بدک ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ بات خارج نہیں ہوئی تھی کہ میں اسے علیحدہ سے خود سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔ شام کے پانچ بجنے والے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شام اور پھر رات ہو جائے گی۔ یہ رات مجھ پر بہت ستم ڈھائے گی صدف!“

آخری جملہ میں نے اتنی شدت سے ادا کیا کہ مجھے اپنی

آواز اور لہجے پر خود حیرت ہوئی۔ اس وقت میری دلی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ صدف میری حالت سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے نادیہ کو فون کیا۔ میں اس دوران میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ تین منٹ بعد وہ واپس آگئی پھر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بولی۔

”نادیہ سے میری بات ہوگئی ہے۔ اس نے آدھے گئے بعد فون کرنے کو کہا ہے۔“

میں نے پوچھا ”اس نے کام ہونے کی امید دلائی ہے؟“

”بالکل دلائی ہے“ وہ قطعیت سے بولی۔

میں نے پوچھا ”وہ اپنے ڈیڑی کو کیا کہانی سنانے لگی؟“

”وہ ماموں جان کو کچھ نہیں کرے گی۔“

”یہ ابھی بات ہے“ میں نے مطمئن انداز میں کہا۔

وہ بولی ”لیکن نادیہ نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے“ میں نے چونک کر اسے دیکھا، اس نے حریف بنایا ”اس کا کہنا ہے میں گاہے بہ گاہے رابطہ کر کے اسے اپنے حالات سے باخبر رکھوں، چاہے دن میں صرف ایک بار ہی رابطہ کروں۔“

”تو کیا تم نے اسے ان حالات کے بارے میں بتا دیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے کہا ”میں نے واضح طور پر اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ساحل کا کہیں ذکر نہیں کیا، بس اتنا کہا ہے، وہ جان کے ایک خاص مشن میں، میں اس کے ساتھ ہوں۔ یہ اتنا ہی معاملہ ہے کہ ہمیں سید پور کا پروگرام پینسل کرنا پڑا۔“

”تمہارا دماغ خوب چلتا ہے جبکہ.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولی ”جبکہ..... کیا مطلب؟“

”جبکہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ تمہاری صرف زبان چلی ہے“ میں نے دغ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا ”پھر تمہارے ہاتھ پاؤں چلتے ہوئے دیکھے ہیں میں نے۔“

وہ ممتی خیر لہجے میں بولی ”تمہارے لیے اچھا ہے۔“

”کیا اچھا ہے؟“ میں بدستور دغ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولی ”میں نے بات ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں۔ تم اسے ایک ہی مشورہ بھی سمجھ سکتے ہو۔ یہ کسی ناک سے کم نہیں۔“

صدف کی ان بے ربط اور بے محل باتوں نے مجھے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ڈرائیو تک کرتے ہوئے زبردستی مسکرا رہی تھی۔ اس کا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے مسکرائے یا قہقہہ لگانے والے حالات سے نہیں گزر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں، اسے تفریح کی سوجھ بوجھ تھی۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا ”صدف! یہ سب کیا ہے۔ تمہاری ایک بات بھی میرے لیے نہیں پڑی۔“

وہ مجھے انتہائی سنجیدہ اور الجھا ہوا دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی ”تم نے میرے دماغ، زبان اور ہاتھ پاؤں کے چیلنے کی جو بات کی تھی، اس سے شکستھی پھرتی ہے جبکہ تم انتہائی یقین اور ناقابل یقین حالات سے گزر رہے ہو۔ یہ تہذیبی امید افزا ہے۔ دشوار ترین حالات میں بھی اگر انسان کی جس حیرت زدہ رہے تو وہ تمام مشکلوں کو پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا سکتا ہے۔ میں نے اسی حوالے سے تمہاری بات کو سراہا تھا“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے بے نیازی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”کیا کروں، ڈاکٹر ہوں نا۔ تم میری ڈاکٹری کو تسلیم کرو یا نہ کرو لیکن میں تمہیں طبی مشورے دینے سے باز نہیں آسکتی“ بات کے اختتام پر اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

میں اس میں ایک حیرت کو حیرت بھری نظر سے دیکھنے لگا۔ اسے کتنا خیال تھا میرا۔ صدف میڈیکل کے فائلز میں بھی ادراک تھا میں ڈاکٹر بننے ہی والی تھی۔ اگر وہ واقعی ڈاکٹر بن جاتی تو میرے نزدیک یہ کسی معجزے سے کم نہ ہوتا۔ میں نے پچھلے چند روز سے اس کی جو سرگرمیاں نوٹ کی تھیں اور اس کے مضمون نام سے مجھے آگاہی ہوئی تھی، وہ بہت ہی تشویش ناک اور سنگین تھے۔

وہ ابھی طرح جانتی تھی کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں لیکن وہ میری طرف سے انجان بنی گاڑی چلا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میں اس کے سراپا میں کھوکھو کر گیا۔ اس بے خودی کا سبب صدف کے وہ جذبات تھے جن کا اظہار اس نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔ کسی بھی مرد کے لیے یہ بات بڑی اہم اور قابل غور ہوتی ہے کہ کسی متضاد خائف کو اس کا خیال ہے۔ صدف کی زندگی کے جو کلمات میرے ساتھ گزرے، ان میں اس نے بار بار اس حقیقت کو ثابت کیا۔ میں اس مہربان دوست کے غلوں کی کھوس کر رہا تھا، اس کے جذبات قابل ستائش تھے لیکن خیال کی دنیا بڑی زریں ہے۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ میں کی اور کا خیال ہوں، وہ میرے خیال میں لگی ہوئی تھی!

میں چند کلمات تک اس باکست سائز زرخیز بدن و شیرہ کی جانب بے ساختہ دیکھ رہا پھر میری نگاہ جھک گئی۔ میں زانو پر گئے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اسی لمحے صدف کی مٹنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”وہ جان! تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا ”میں تو ابھی خاصی بھوک محسوس کر رہی ہوں۔ ناشتے کے بعد سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا۔“

کھانا تو میں نے بھی کچھ نہیں تھا۔ حالات میں اتنی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ میں کھانے کا خیال ہی نہ آیا۔ اب صدف نے تذکرہ کیا تو مجھے بھی بھوک محسوس ہونے لگی۔ میں نے کہا ”کوئی ریسٹورنٹ تلاش کرو۔ ہمارے پاس آدھا گھنٹا ہے۔ اس وقت سے مہلت حاصل کر کے کھانا ہی کھا لینے ہیں، پھر پتا نہیں کب اس کا موقع ملے۔“

”میں ریسٹورنٹ ہی کی طرف جا رہی ہوں“ صدف نے کہا۔

میں نے پوچھا ”مسلم ٹاؤن سے نکلنے کے بعد تم نیو کیسپس کی طرف کیوں آگئی ہو؟ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟“

”کوئی سبب نہیں“ وہ سادگی سے بولی ”بس بے دھیانی میں، میں اس طرف نکل آئی ہوں۔“ پھر ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ”چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ادھر نزدیک ہی ایک بہت عمدہ ریسٹورنٹ ہے۔ ہم وہیں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہم مذکورہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ باقاعدہ کھانے کا وقت تو نہیں تھا لیکن صدف کے اصرار پر ہم نے ڈش کرکھا۔ پھر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی کہ نادیہ کو فون کر کے آتی ہے۔ پہلے فون کو آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔

صدف کے جانے کے بعد میں خود کو پیش آمدہ حالات پر غور کرنے لگا۔ اب تک کی تحقیق یہی ظاہر کرتی تھی کہ ساحل کو چوہدری دلداد کی کوٹھی پر پہنچایا گیا ہے۔ اگر مجھے اس چوہدری کا پتا معلوم ہو جاتا تو میں اسے اگر اپنی ساحل تک پہنچا جاتا۔ پتا نہیں، وہ کس حال میں تھی؟ اس کے ساتھ آدہ کیا حالات واقعات پیش آنے والے تھے۔ کبیر شاہ اسے رکھاں والی سے اپنے ساتھ لایا تھا تو آگے اس کا کیا پروگرام تھا؟ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے کہ ساحل کو کرکھا اپنی پہنچایا جائے گا، شعیب خوری کے پاس..... جس نے مجھ سے نئی دشمنی اور چوہدری نواز شمس سے دوستی کاغذی تھی۔ اگر ساحل، شعیب خوری کی تحویل میں چلی جاتی تو یہ ایسا ہی تھا جیسے میری شرک اس کے خیر ختم آجائے۔ چوہدری نواز علی نے میری بہت بڑی کمزوری کا سودا کر دیا تھا۔

ساحل کو کرکھا جانے سے روکنا تھا..... ہر صورت روکنا تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اور سنگین امتحان تھا اور ہر



قیمت پر مجھے یہ امتحان پاس کرنا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مسائل کے تصور میں کھو گیا۔ پھر جیسے وقت ختم کیا ہو..... بالکی صدیاں ایک ساتھ گزری گئی ہوں۔

اس حسین اور دل نشین تصور کو ایک بالوس آواز نے توڑ دیا۔ میں نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ صدف ابھی تک فون کر کے واپس نہیں آئی تھی۔ میری تلاش میں نگاہ غیر ارادی طور پر اس آواز کے حامل شخص کو کھینچنے لگی جس کی پکار نے مسائل کا تصور توڑا تھا۔ ریسٹورنٹ میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد میری نگاہ خود پر مرکوز ہو گئی۔ میں نے مطلوبہ شخص کو تلاش کر لیا تھا۔

اس وقت میرے عجیب و غریب احساسات تھے۔ میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے، ساحل کے تصور کے دوران میں، میں نے خود اپنی آواز سنی تھی۔ یعنی میں نے خود کو پکارا تھا۔ میں اپنی آواز کے سلسلے میں بھلا کس طرح دھوکا کھا سکتا تھا۔

یہ جو کچھ بھی تھا، بہت ہی پر اسرار اور حیران کن تھا۔ اس قسم کا ایک آدھ تجربہ مجھے گزشتہ روز بھی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ غیر مرئی احساسات مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا تھا۔ میری زندگی کو کوئی نیا رخ ملنے والا تھا۔ کسی نئے افق کی جلوہ گری میری منتظر تھی۔ میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ یہ ناقابل یقین اور حیرت انگیز واقعات کس طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔

صدف کو اپنی جانب آنے دیکھ کر میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آڑا نیڑا حلقہ میں پہلے بھی نہیں بیٹھا ہوا تھا، بس وہی انتشار نے مجھے تھوڑا لگا دیا تھا۔ صدف کے وہاں پہنچنے سے پہلے میں نے خود کو سنبھال لیا۔

”ابھی کچھ دیر اور گھمے گی“ وہ کرسی سنبھالتے ہوئے بولی۔

”کتنی دیر؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔  
”لگ بھگ آدھا گھنٹا“ صدف وضاحت کرتے ہوئے بولی ”رجسٹریشن آفس کے جس شخص سے ہماری مطلوبہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، اس نے آدھا گھنٹا مانگا ہے۔ کام انشاء اللہ ہو جائے گا۔“

میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، آدھا گھنٹا اور کبھی لیکن اس دوران میں ہم ایک اور کام کر لیتے ہیں“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔  
”کون سا کام وجدان؟“ صدف انجمن زدہ نظر سے

مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”ہم نے ایمریکس کے ڈرائیور عبدالکریم کو فاضلہ کا لوٹی والی کوشی کے تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ عادی مجرم معلوم نہیں ہوتا، بس ساحل والے معاملے میں اسے آکر لہا بنایا گیا ہے۔ اس کے بھائی بچے کوٹ لکھتے ہیں انتظار کر رہے ہوں گے۔ آئندہ حالات کا کچھ پتا نہیں، ہمیں اس طرف آنے کی کب مہلت ملے۔ اس نے ہماری درست راہنمائی کی ہے۔ میرا خیال ہے، اسے رہا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

صدف نے میری تائید کی اور ہم مل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ اس مرتبہ کروا کی ڈرائیونگ سیر میں نے سنبھال لی۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میری سوچ کا مرکز ساحل تھی اور وہ تازہ ترین گٹھ جوڑ جو شیعہ غوری اور چوہدری نواز شی علی کے درمیان ہوا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس گٹھ جوڑ کی حتمی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم ساحل کالا اور پہنچایا جانا بھی ظاہر کرنا کہ اسے مزید آگے کراچی پہنچایا جائے گا۔

میرے پاس (ATM-CARDS) موجود تھے۔ نہ کیسپس سے فاضلہ کا لوٹی کی طرف جاتے ہوئے میں نے اپنے سلور اور گولڈ کارڈز کا استعمال کیا اور زیادہ سے زیادہ شی رقم حاصل کر سکتا تھا، وہ میں نے ڈرا کر لی۔ میرے اکاؤنٹ میں ایک کثیر رقم موجود تھی لیکن کارڈ کی مدد سے ایک مخصوص اماؤنٹ سے زیادہ ڈرا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ویسے میرے پاس پہلے سے بھی کچھ رقم موجود تھی۔ صدف نے میری اس کارروائی پر کسی حیرت کا اظہار کیا اور نہ ہی کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔

ہم فاضلہ کا لوٹی پہنچے، عبدالکریم کو تھانے سے نکالا۔ باہر ہال نما کرے میں لانے کے بعد میں نے اس سے کہا ”عبدالکریم! تم نے ہم سے غلط بیانی نہیں کی لہذا ہم جہیں آزاد کر رہے ہیں لیکن تم اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھانا ورنہ بہت کھانا میں رہو گے۔“

وہ روہاسی آواز میں بولا ”جناب! آپ ناجائز فائدے کی بات کرتے ہیں، میں تو اس آزادی سے کوئی جائز فائدہ بھی نہیں اٹھاؤں گا۔ میں نے یہ دو ڈھائی گھنٹے بڑے عذاب میں گزارے ہیں۔“

”اور تمہیں اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تم تھے خطرناک ہیں!“ میں نے سفاکی سے کہا۔  
وہ بڑی شدت سے اثبات میں گردن ہلانے لگا پھر بولا ”تھانے کے حالات آپ کی طاقت اور پیچھے کو کھینچنے کے

کاٹی ہیں۔“  
”اس کا مطلب ہے، تم باہر جا کر اپنی زبان بند رکھو گے؟“

”جی، میں نے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے۔“ وہ کچھ راہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ”آپ فکری کریں، میں کسی کو آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“  
میں نے اس کے ذہن میں بیٹھے ہوئے خوف کو پختہ کرتے ہوئے کہا ”اگر تمہارے دل میں، ہمارے بارے میں کسی کو بتانے کا شوق پیدا ہو تو تم اپنا شوق پورا کر کے دیکھ لینا۔ اگلے ہی لمحے تمہارے بھائی بچے تم سے ہمیشہ کے لیے بھڑک جائیں گے۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا ”میں نے اپنے جن ساتھیوں کو کوٹ لکھتے رہا وہ کیا تھا، وہ مسلسل تمہارے گھر کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ ادھر تم نے کوئی غلطی کی، اُھر ان کا کام تمام۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

وہ سب سے پہلے میں بولا ”بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب!“  
”کیا تم تھانے میں موجود افراد میں سے کسی کو جانتے ہو؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے مطمئن ہونے کے بعد اسے جاننے کی اجازت دے دی۔  
نادیہ نے جو مزید آدھے گھنٹے کی مہلت لی تھی اس میں سے میں منٹ گزر چکے تھے۔ دس منٹ بعد اس سے دوبارہ رابطہ کیا جاتا۔ میں نے یہ دس منٹ کوشی ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس کمرے میں آ بیٹھا جس میں فون تھا۔  
صدف نے کہا ”کیا تم یہیں سے نادیا کو فون کر دانا چاہتے ہو؟“

”ہاں، ارادہ تو یہی ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس سے پہلے میں ایک ضروری کال کراچی کر دوں گا۔“

سوال نہیں کیا۔ میں منہاس باقر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ آج بھرتھار دیون تقریباً گزری چکا تھا۔ یعنی اتوار کو منہاس باقر کی بیٹی شائد کی برات آنا تھی۔ وہ اس وقت بے پناہ محروم ہو گیا۔ شادی اور پھر بیٹی کی شادی والدین کے لیے کی امتحان سے کم نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی ننگا کاپ یا ہاں ہونا ضروری ہے!

میں نے اس کی مصروفیات کے پیش نظر گھر پر فون کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس سے رابطہ ہو گیا۔ ریسپور سے میری آواز

سننے ہی اس نے سوال کیا ”وجدان خبریت تو ہے۔ اس وقت تو تمہیں پاشا کے گاؤں تیر پور میں ہونا چاہیے۔“

”میں لاہور میں ہوں جناب۔“ میں نے بتایا ”تیر پور جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔“

”اس کا مطلب ہے، تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ وہ اپنی مخصوص تنبیہ آواز میں بولا۔

میں نے جواباً اسے مختصراً تازہ ترین ممکن حالات بتائے۔ وہ لگائی تجزیہ کرنے کے بعد تشویش ناک لہجے میں بولا ”میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارے دو دشمنوں میں کوئی خفیہ ڈیل ہوئی ہے اور وہ ڈیل ساحل کے حوالے سے ہے۔ دشمنی اور دوستی کی دنیا میں ایک اور ایک دونوں بلکہ گیارہ ہوتے ہیں، اس حساب سے اب تمہیں گیارہ خطرناک اور طاقت ور دشمنوں سے نمٹنا ہوگا۔“

”میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔“ میں نے دانت کچکاتے ہوئے کہا ”قوی امکان اس بات کا ہے کہ ساحل کو بہت جلد لاہور سے کراچی پہنچایا جائے گا۔ میں لاہور میں اس کے ٹھکانے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ہر ممکن طریقے سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کر دوں گا۔ اگر کسی طور چوہدری دلدار مجھے جمل دینے میں کامیاب ہو گیا یا کبیر شاہ میرے ایسے نہ چلے گا تو آپ کو کراچی میں ان کے اڈوں کی نگرانی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ میں نے آپ کو شیعہ غوری کے ”ساؤتھ“ اور ”ایسٹ“ والے ٹھکانے کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساحل کو ساؤتھ یا ایسٹ ہی پہنچایا جائے۔ ممکن ہے، وہ ملیر، ویسٹ یا پھر سینٹرل پہنچا دی جائے!“

منہاس باقر نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”ساؤتھ کو اس سلسلے میں خارج از امکان ہی سمجھو۔ اچھی برسوں رات ہی تو وہاں پولیس نے ریڈ (RAID) کیا تھا۔ شیعہ غوری اس سلسلے میں ضرور احتیاط برتے گا۔ ساؤتھ کا قائم مقام کبیر شاہ مفرد اور پولیس کو مطلوب ہے۔ وہ ساؤتھ کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ البتہ میں ”ایسٹ“ کی کڑی نگرانی کا انتظام کر دیتا ہوں۔ تم اس حوالے سے بے فکر ہو جاؤ۔“

منہاس باقر کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ پولیس نے جس انداز میں ساؤتھ پر کارروائی کی تھی اس کے پیش نظر کبیر شاہ کو بھولے سے بھی ادھر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس تناظر میں تو ایسٹ کو بھی نظر انداز کیا جاسکتا تھا کیونکہ میں وہاں ایک دو مرتبہ جا چکا تھا۔ شیعہ غوری میری صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا، پھر اس کا دعویٰ تھا کہ ساؤتھ والا آپریشن میری نگرانی میں



کراچی کی طرح لاہور کی ڈینس سوسائٹی بھی حوالہ لوگوں کا رہائشی علاقہ ہے۔ میں صدف کی راہنمائی میں وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے اگرچہ خاصا طویل راستہ اختیار کیا تھا تاہم یہ بالکل سیدھا وار آسان تھا۔ جب ہم اس علاقے میں داخل ہوئے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

میں نے گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھمانے کے بعد وہ کوٹھی تلاش کر لی جس کی تلاش میں، میں ادھر آیا تھا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر چوہدری دلدار کے نام کی تختی دیکھ کر مجھے دلی سکون محسوس ہوا۔ اس وقت میں کچھ اس قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا جو اپنی نگاہ کے سامنے منزل دیکھ لینے والے کسی مسافر کی ہوتی ہے۔

چوہدری دلدار کی کوٹھی خاصی وسیع و عریض اور شان دار تھی۔ ڈینس فیلڈ میں قدرے بڑی کونٹھیاں تھیں۔ ہمارا ٹارگٹ کوٹھی کا دروازہ دایعہ تھی۔ میں رے کے بغیر اس کوٹھی کے سامنے سے گاڑی نکال لے گیا۔ ایک اچھٹی ہوئی نظر نے مجھے بتا دیا کہ کوٹھی کے احاطے میں، لان پر شامیانے لگے ہوئے تھے جیسے وہاں کسی تقریب کی آمد آدھ ہو۔ کوٹھی کے باہر دونوں گلیوں میں چند گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں۔ کارز کوٹھی ہونے کے باعث اسے دو گلیاں لگتی تھیں۔ کچھ آگے آنے کے بعد میں نے گاڑی روک دی۔ یہ جگہ اس کوٹھی سے نظر نہیں آتی تھی۔

صدف نے کہا ”گلتا ہے، وہاں کسی تقریب کا آغاز ہونے والا ہے!“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا ”ہمیں کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے تھوڑا سا ہوم ورک کر لینا چاہیے۔ کہیں اندازے کی کوئی غلطی ہمیں کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار نہ کر دے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ صدف نے استفسار کیا۔

”کسی طرح یہ معلوم کر لیا جائے کہ وہاں کس قسم کی تقریب ہونے والی ہے۔“ میں نے کہا ”کوٹھی کے باہر نصف درجن کھڑی گاڑیاں تو یہی ظاہر کرتی ہیں کہ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔“

صدف نے کہا ”لاہور میں موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے اور اس وقت رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، اگر وہاں رات کی تقریب ہے تو لو بجے تک اسے عرصہ پر ہوگی۔ کراچی کے بالکل لاہور والے جلدی سونے کے عادی ہیں۔ یہاں پر نیا دن شروع ہونے سے پہلے ہی تقریب اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔“

میں نے چند لمحوں کا بھر پھر فیصلہ کر لیا۔ ”میرے اہل گازی سے اتر رہا ہوں۔ تم اسے ڈرائیو کر کے چوہدری کی کوٹھی تک لاؤ اور اس پہلو میں کھڑی کرو جو دروازہ آگے گاڑی رکھی ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد گاڑیاں ہماری گاڑی کے بعد آکر کھڑی ہو جائیں گی اس طرح یہ گروہ مہمانوں کی گاڑیوں میں شامل ہو جائے گی اور کسی کو ہماری گاڑی پر شک نہیں گزرے گا۔ ہمیں جب بھی وہاں سے نکلتا ہوگا، اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو جائیں گے۔“

میں نے صدف کو جس جگہ کروا کھڑی کرنے کا دستور دیا، اس طرف قدرے اندر ہوا تھا۔ اس گلی میں بھی کوٹھی کا ایک گیٹ دایعہ تھا لیکن وہ بند تھا۔ آدھ دھند کے لیے کوٹھی کا مین گیٹ ہی استعمال میں نظر آ رہا تھا جو کہ اس وقت پوری طرح کھلا تھا۔

صدف نے پوچھا ”میں وہاں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد کیا کروں؟“

”تم گاڑی کو پارک کرنا پھر کوٹھی کے اندر جانے کے بجائے دوسری جانب نکل جانا“ میں نے کہا ”تم غلطی گئے کنارے پر رک کر میرا انتظار کرنا۔ تمہاری کسی حرکت سے بے چینی یا اضطراب نہیں جھلکتا چاہیے۔“

وہ احماد سے بولی ”یہ تو میں کر لوں گی۔ تم اس دوران میں کیا کرو گے؟“

”میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ تقریب کس سلسلے میں منعقد ہو رہی ہے“ میں نے کہا ”اگر ممکن ہو تو کوٹھی کے اندر دوئی حالات کے بارے میں بھی کچھ جاننے کا چاہئے کی کوشش کروں گا۔“

”اچھی بات ہے“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دینے ہوئے بولا ”پھر پوچھا“ کیا ہمارے بیگز گاڑی کے اندر ہی رہیں گے؟“

میں نے کہا ”بالکل گاڑی کے اندر ہی رہیں گے۔ گاڑی کے اندر جانے کی حالات پیش آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے ہمارے لیے خود کو اٹھائے رکھنا بھی دشوار ہو جائے۔“

وہ معاملہ آگے ہے۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھتے میں گردن ہلاتی دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے ایک گلی کا قافلہ دیکھ کر اس سے ملے کیا حال ان کے اس وقت دلی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح آؤ کر کوٹھی کے اندر پہنچ جاؤں۔ مگر احتیاط اور حالات کا ہونا یہی تھا کہ میں ایک ایک قدم بھوک کر اٹھاؤں۔ آخری لمحے میں مس فیلڈ تک ٹھکستے سے ہم کنارہ کر دیتی ہے۔

میں چوہدری دلدار کی کوٹھی سے لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ اس کا آخری سرا تھا۔ اس گلی کے دوسرے سرے پر اس نے صدف کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت میں اس کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا اس کے گیٹ پر ایک ملازم اس کی تحویل میں موجود تھا۔

میں نے قریب جا کر اسے سلام کیا۔ اس نے میرے ہم کا جواب دیا۔ میں نے دو گلیاں بعد کا ایڈریس بتا کر اس کو پوچھا ”تمہاری صاحبہ ایہ کوٹھی کس طرف ہے؟“

اس نے چند لمحوں کے بعد میرے بتائے ہوئے ایڈریس پر غور کیا ”لا“ آپ تو بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اس طرف دو یاں چلے جائیں۔ یہ کوٹھی ادھر ہی ملے گی آپ کو۔“

میں نے غمون نظر سے اسے دیکھا اور چوہدری دلدار کی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں تو اس شامیانے کے اوپر سے دھوکا کھا کر ادھر نکل آیا ہوں۔ دراصل میں نے اس کوٹھی میں جانا ہے وہاں بھی ایک تقریب ہے۔ بہر حال، رات بہت شگرت ہے۔“

”اس قسم کا دھوکا ہو جاتا ہے جناب!“ وہ فلسفیانہ انداز بولا۔

میں نے پوچھا ”کیا یہاں کوئی شادی کی تقریب ہو رہی ہے؟“

میرا اشارہ چوہدری دلدار کی کوٹھی کی جانب تھا۔ اس نے جواب دیا ”جی نہیں۔ یہاں کوئی میوزک کی محفل ہے۔ اللہ کا تبارک تھا، اس کے صاحب کے کوئی خاص مہمان آئے اسے ہیں جن کے لیے محفل موسیقی سجاویں جاری ہے۔“

ادری صاحب نے اپنے دوستوں کو بھی اس پر دو گرام میں لگا کر کہا ہے۔“

وہ شخص خاصا بات توئی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی کٹر دوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ”اللہ رکھا کون ہے بھی؟“

”اپنا رہا ہے جی، ادھر چوہدری دلدار کی کوٹھی میں جا رہی ہے“ اس شخص نے بتایا ”ہمارے درمیان حالات ماضیہ پرک شپ ہوئی رہتی ہے۔ میں بھی اس کوٹھی میں نہ سنا ہوں“ بات ختم کرتے ہی اس نے اس کوٹھی کی جانب اشارہ کیا جس کے سامنے وہ کھڑا تھا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“ میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”دوڑ دلی سے بولا“ مجھے نیاز احمد کہتے ہیں جی۔“

”تم نے مل کر بہت خوشی ہوئی نیاز احمد!“ میں نے اس سے معاملہ کرتے ہوئے کہا ”وہی یہ چوہدری دلدار بھی

عجیب آدمی ہے۔ اتنی سردی میں کوٹھی کے باہر لان میں شامیانے لگا دیا۔ بھی، اگر اپنے مہمانوں کا اتنا ہی خیال تھا تو کوٹھی کے اندر توئی جسے میں انتظام کرتا۔“

میرے اس خواہ مخواہ کے تبصرے پر اس نے چٹکنا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے جس مقصد کی خاطر وہ تبرجوز اٹھا، وہ پورا ہو گیا۔ میرا تیرنٹا سے پر جا کر لگا۔ وہ بات توئی نیاز احمد بے نیازی سے بولا ”بس صاحب جی! کیا کہیں، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ یہ لوگ جی چاہیں، جہاں چاہیں کر سکتے ہیں۔ دیے انہیں سردی کہاں لگتی ہوگی۔ اللہ رکھا تبارک تھا، اس محفل کے مہمانوں کا تعلق کراچی سے ہے جہاں سردی آتی ہی نہیں..... لاہور کی سردی بھی انہیں محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ان کے اندر گرمی کوٹ کوٹ کر بکھری ہوئی ہے۔“

اپنی نادانگہی میں وہ میرے لیے ایک بہت بڑی تصدیق کر بیٹھا تھا۔ کراچی کے مہمانوں کا حوالہ ہی یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ کبیر شاہ اور اس کا سماجی کوٹھی میں موجود ہیں۔ اگر وہ اس محفل موسیقی کے مہمان خصوصی تھے تو پھر ان کی وہ رات چوہدری دلدار کی کوٹھی پر ہی گزرنے والی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا، ساحل بھی اسی کوٹھی میں موجود تھی۔

میں نے کالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”بھائی نیاز علی! میں جن لوگوں کی تقریب میں جا رہا ہوں، وہ تو شراب اور شراب سے بہت دور رہتے ہیں۔ تم نے تو چوہدری دلدار کے ہاؤس میں جانا کر دیا ہے۔ کیا پولیس والے شراب اور شراب کی ایسی محفلوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتے؟“

نیاز علی نے سرتاپا مجھے بے یقینی سے دیکھا اور بولا ”گلتا ہے، آپ بہت ہی سیدھے سادے اور ناواقف آدمی ہو۔ اللہ کے بندے! یہ طاقت ور لوگوں کا رہائشی علاقہ ہے۔ پولیس والوں کا ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے پیشاب خطا ہوتا ہے۔ میرا صاحب بھی بڑی پہنچ والا ہے۔ تم نہیں جانتے ان لوگوں کو۔“

”نہ ہی جانوں تو اچھا ہے بھائی، تو بہت بڑا!“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے کالوں کو چھوا اور نیاز علی کا شکر یہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ اپنی بے خبری میں میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔

ایک گلی کا پتھر لگانے کے بعد میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں صدف کو آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ وہاں موجود تھی۔ میں نے نیاز علی سے حاصل ہونے والی معلومات اس کے گوش گزار

کیں تو وہ ہر سوچ انداز میں بولی۔

”وہ جان! میرا خیال ہے، ہمیں دس بجے سے پہلے کوٹھی کے اندر داخل نہیں ہونا چاہئے۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے استفسار کیا۔ وہ کوئی بھی بات خوشنود نہیں کہتی تھی۔

وہ بولی ”دس بجے یہ محفل موسیقی اپنے جوہن پر ہوگی یعنی میزبان اور مہمان تمام اس شامیانے کے نیچے ہوں گے جو چوہدری کے لان میں کھڑا نظر آ رہا ہے۔ کوٹھی کے بیشتر ملازمین بھی اب صاحب لوگوں کی خدمت کے لیے آس پاس ہی موجود ہوں گے۔ اس بات کے امکانات صفر کے برابر ہیں کہ تمہاری ساحل کو وہاں لایا جائے۔ وہ کوٹھی کے کسی دور افتادہ حصے میں کڑی نگرانی میں ہوگی چنانچہ اس موقع پر اگر ہم کوٹھی کے اندر داخل ہوں تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوں گے۔“

اس کی تجویز انتہائی معقول اور بردت تھی۔ میں نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا ”چوہدری ولداری کوٹھی دو منزلہ ہے اور یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی ہے۔ کوٹھی کا لان ہی اتنا بڑا دکھائی دے رہا ہے کہ وہاں لگ بھگ سو افراد کے بیٹھنے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس صورت حالات میں، میں سمجھتا ہوں کہ ساحل کو ہالائی منزل کے کسی کمرے میں رکھا گیا ہوگا۔“

”یہ ضروری نہیں ہے وہ جان!“ وہ شدت سے بولی ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے زیریں منزل ہی کے کسی محفوظ ترین کمرے میں رکھا گیا ہو۔ ہم کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ کوٹھی میں خفیہ طور پر داخل ہونے کے بعد پہلے ہم زیریں منزل کو چیک کریں گے۔ اس کے بعد ہی ہالائی منزل کا رخ کیا جائے گا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”ہم کوٹھی کے عقبی حصے سے آہٹگی اندر داخل ہوں گے اور سب سے پہلے کوٹھی والوں کی نظر بھا کر وہ گیٹ کھول دیں گے جو باہر سے بند نظر آیا تھا۔ ہم اس گٹھی کو گرا کر ایسا کر دیں گے کہ بہ وقت ضرورت اسے استعمال میں لایا جاسکے۔ ہماری گاڑی اسی گیٹ کے نزدیک کوٹھی سے باہر کھڑی ہے۔“

”اور اگر اس گیٹ پر اندر سے کوئی تالا وغیرہ لگا ہوا ملا تو؟“

”صدف نے ایک حد سے کام لیا تھا۔“

میں نے سمجھ کر انداز میں کہا ”تو میں اس موقع پر ”جی“ کی قوت کو بروئے کار لاؤں گا۔“

میں نے جیسے ہی بات ختم کی، مجھے یوں محسوس ہوا، کوئی

اور بھی ہمارے علاوہ وہاں موجود ہو۔ یہ احساس پچھلے دنوں سے اتنی مرتبہ ہو چکا تھا کہ اب میں نے اس پر چٹکنا چھوڑ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا، وہ احساس میرا سایہ بن گیا ہے۔ چائیس، کون سی پر اسرار اور غیر مرئی قوت میری نگرانی پر مامور ہوئی تھی۔ اگر یہ ”جی“ کی قوت کا کوئی کرشمہ تھا تو پھر جلد از جلد اس کی حقیقت جان لینا ضروری تھا۔ وہ احساس میرے لیے ایک پتھری کی حیثیت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا۔

صدف کو اس مرتبہ میں نے باور نہیں ہونے دیا۔ کئی اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں۔ وہ میری بات کے ختم ہونے پر بولی ”کیا جی کی قوت سے کوئی بند تالا کھولا جاسکتا ہے؟“

”بالکل کھولا جاسکتا ہے“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر موضوع گفتگو کو ٹھوڑا موڑتے ہوئے صدف سے پوچھا ”کیا تمہیں باپ کے ذریعے زیریں منزل سے ہالائی منزل کی طرف سفر کرنا آتا ہے، میرا مطلب ہے اوپر چڑھنا؟“

”بھئی علی تجھ پرے سے تو نہیں گزرا پڑا لیکن مجھے یقین ہے، میں ایسا کر لوں گی“ وہ مضبوط لہجے میں بولی پھر پوچھا ”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

میں نے وضاحت کی ”کوٹھی کے اندر پہنچنے کے بعد جب ہم چلی منزل چیک کر لیں گے تو میں ممکن ہے زینے کے ذریعے وہیں نہیں اوپر جانے کا موقع مل سکے۔ اس صورت میں ہمیں باپ لائن کو وسیلہ بنانا ہوگا۔“

”ہوں“ وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی ”ایک ترکیب اور بھی ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

وہ بولی ”تم نے بتایا ہے کہ چوہدری ولداری کا ہالائی اندر رکھا ہمارے مجھے چڑھ جائے تو اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے ساحل کو کوٹھی کے کون سے حصے میں رکھا گیا ہے۔ اس طرف ہمارا بہت سا وقت بچ جائے گا اور ہم نہایت ہی کم وقت میں اپنا کام منٹا لیں گے۔“

”آئیڈیا اچھا ہے“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ رکھا کو کس طرح کاٹھا لایا جائے؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی ”ایک کام ہوتا ہے وہ جان! میں نیاز احمد سے جا کر ملتی ہوں۔ وہ مجھے مل سے نہیں جانتا، اسی طرح اللہ رکھا بھی مجھے نہیں جانتا۔ میں کوئی چکر چلا کر نیاز احمد کو اس بات کے لیے تیار کروں گی کہ تمہاری قوت دیر کے لیے اللہ رکھا کو بلا دے۔ ایک مرتبہ اللہ رکھا

پتھری میں تو میں اسے باتوں میں لگا کر دوسری طرف لے جانے لگی۔ اوپر اچھا خاصا اندھیرا ہے۔ دو تین خالی پلاٹ ہیں، میں نے اس سے اشارہ بھی کر دیا اور بولی ”تم آج سے وہاں پہنچ جاؤ۔ تاریکی کے باعث تم اسے نظر نہیں دے سکتے۔ میں جیسے ہی اللہ رکھا کو وہاں لے کر آؤں، تم اسے بائیں طرف میں لے لینا۔ جب اس کی گردن تمہارے چنگل میں ہوگی تو پھر اس کی زبان تمہاری مرضی کی بولی بولے گی۔ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا طریقہ ہے؟“

میں تشریف لے گا کہ اس پانچ فٹ کی مہ جیسے کو کھینچے گا۔ صدف کی حیرت کا عنصر غالب تھا۔ پتہ قاضی براس کا براہر ابدان قیامت صغریٰ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ وہ اہل حسن نہیں، اہل عقل تھی۔ اس کا منصوبہ میرے دل کو لگا۔ میں نے غلغلہ کن لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، میں اس تاریک گوشے کی طرف جا رہا ہوں۔ تم اپنے حسن کا جادو چگانے کی کوشش کرو۔“

بات ختم کرتے ہی میں محل میں آ گیا۔ اسی لمحے مجھے محسوس ہوا، کوئی اور بھی میرے ساتھ ہی حرکت میں آیا ہے۔ میں اپنے نادیہ احساس کی معیت میں مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا۔ اس خالی احاطے میں چاہے آدم قد چھوٹا یاں آگ آئی۔ میں ایک جھڑکی کے عقب میں کھڑا ہو کر صدف کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار پانچ منٹ سے زیادہ طوالت اختیار کر گیا تو میں نے اپنے احساس کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت کھڑکی کے پیچھے کھڑا محسوس کر رہا تھا کہ کوئی میرے قریب ہو رہا ہے۔ میں نے سر کو شیانہ انداز میں اسے پکارا۔

”ہیلو!“

مجھے سر کو شیانہ انداز ہی میں جواب ملا ”ہیلو!“

پتھری میں کی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ میرے

وہ سب کچھ عجیب سا تو لگ رہا تھا لیکن اس میں ڈروالی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے سوچا، جب تک صدف اللہ رکھا کو لے کر یہاں آئی، مجھے اس نادیہ ہستی سے کلام کرنا چاہئے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ میری ہی آواز میں بولتا، بولتی تھی۔ بولتا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کا بولچہ میری طرح مردانہ تھا اور بولتی اس کا مکان اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ ممکن ہے، وہ ہستی کوئی ہی میل ہو۔ ابھی تک میں اس کے بارے میں کتنی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

پھر کل اس کے کہ میں اس ہستی سے باقاعدہ مکالمہ کرتا، نزدیک آتے ہوئے قدموں کی آواز مجھ تک پہنچی۔ اس کے ساتھ ہی صدف کے کسی کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز بھی ابھر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا، صدف ہمارے مطلوبہ شکار کو گھیر لائی تھی۔ میں نے نادیہ ہستی سے گفتگو کوئی الحال پس پشت ڈالا اور پوری توجہ سے صدف کا انتظار کرنے لگا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک آ رہی تھی۔

میں نے نادیہ ہر اسرار قوت کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں بھولی۔ اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے معائنہ صغریٰ لہروں سے بنا ہوا کوئی جسم میرے اندر داخل ہو رہا ہو۔ میں نے واضح طور پر اس قوت کو اپنے بدن کا حصہ بننے ہوئے محسوس کیا۔ یہ ایک انوکھا احساس تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

میں نے اپنی توجہ صدف اور اللہ رکھا کی جانب مبذول کر دی۔ اس وقت میں کسی چاق چوہند چیتے کے مانند الارٹ کھڑا تھا پھر جیسے ہی شکار میری رنچ میں آیا، میں نے ایک طویل جست بھر کر اسے دو بوج لیا۔ اگلے ہی لمحے میں اسے کھینچ کر جھڑکی کے پیچھے لچکا تھا۔ اللہ رکھا کی گردن میرے بازو کے کھینچنے میں اس طرح کس کچلی تھی کہ وہ کسی قسم کی حرکت کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ ایک نہایت ہی خطرناک قسم کا نیک لاک (NECK LOCK) تھا۔

اللہ رکھا کی عمر بچپن کے قریب رہی ہوگی۔ اس کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی اسی لیے اس نے کسی خاص محاربت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے اس کی گردن پر بازو کا دباؤ قدرے کم کرتے ہی دھمکی آخیر لہجے میں کہا۔

”اللہ رکھا! تمہیں اللہ نے صرف اس لیے رکھا ہوا ہے کہ تم بھولے بھٹکے لوگوں کی راہ نمائی کر سکو۔ اگر تم نے مجھ سے تعاون نہیں کیا تو سمجھ لینا، آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

آتش فشاں 240 حصہ 9

میں نے پوری سفاکی سے کہا "ہمارے بارے میں کوئی سوال نہ کرو۔ بس اتنا جان لو کہ ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اگر تم نے میرے سوالات کے بالکل درست جواب نہ دیے۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ مجھے اس کمزور پارہی پر طاقت آزمانے کا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ اپنے اس عمل سے مجھے انفس بھی ہورہا تھا لیکن یہ وقت کی مجبوری تھی۔ اگر وہ پوری طرح میری دہشت کے خراس میں نہ آتا تو یقین ممکن تھا، وہ میرے سوالات کا جواب دینے کے بجائے چپٹا چلانا شروع کر دیتا یا پھر اچانک دوڑ بھی لگا سکتا تھا۔ اس موقع پر میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تعاون پر تیار ہو گیا۔ مجھے اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے جب اس سے ساحل کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا "رکھال والی سے لائی جانے والی لڑکی اوپر ہی منزل کے کسی کمرے میں ہے۔" میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا "بالائی منزل کے کس کمرے میں؟" "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!" وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔

"بالائی منزل پر ادو کون کون موجود ہے؟"

"اس لڑکی کے علاوہ دوسرا شخص محفوظ ہیں" اس نے بتایا "جو اسے لڑکی نگرانی میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک آدی کراچی سے آیا ہے، دوسرا چوہدری صاحب کا ملازم ہے۔"

میں نے پوچھا "اس لڑکی کو چوہدری دلدار نے اپنی کوشی میں کیوں قید رکھا ہے؟"

"میں اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا "جب سے وہ اس کوشی میں آئی ہے، کسی کو بالائی منزل پر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے سنا ہے، وہ لڑکی انتہائی خطرناک ہے، جس کا تعلق بڑے چوہدری صاحب کے کسی دشمن سے ہے۔"

"بڑے چوہدری سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ منتایا "رکھال والی کے چوہدری نوازش علی بڑے چوہدری ہیں اور چوہدری دلدار کو چھوٹے چوہدری صاحب کہا جاتا ہے۔ چوہدری دلدار صاحب ہی جانتے ہیں کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟"

ہر بات روزی روٹی کے مانند عیاں ہو گئی۔ چوہدری نوازش علی اور چوہدری دلدار کا تعلق ثابت ہونے کے بعد سارا

کھیل میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اللہ رکھا سے پوچھا "رکھال والی سے بڑے چوہدری کا بیٹا فیصل بھی یہاں پہنچا ہے۔ وہ کہاں ہے؟"

"فیصل صاحب، کمرہ کی مہمان کبیر شاہ اور دوسرے سارے افراد کوشی کے نیچے حصے میں ہیں۔ اس نے جواب دیا "کبیر شاہ کے ساتھ کراچی سے جو دوسرا شخص یہاں پہنچا ہے، وہ چوہدری دلدار کے ملازم کے ساتھ بالائی منزل پر اس لڑکی کی حفاظت اور نگرانی کر رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "کوشی کے ان میں شامل دو دھرمہ کیوں تانا کیا ہے؟"

اللہ رکھا نے بھی اس شامیانے کی وہی توجیہ پیش کی جو اس سے پہلے اس کا بیلی نیاز احمد پیش کر چکا تھا۔ میں نے ان سے مزید دو سوالات کیے۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ مجھے مزید مفید معلومات فراہم نہیں کر سکتا تو میں نے اس کی گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو دبا کر اسے دباؤ مانیہا سے لاحق کر دیا۔ اب وہ کم از کم تین گھنٹے تک ہوش حواس میں نہیں آ سکتا تھا۔ اللہ رکھا کے بدن پر گرم کپڑے کا شلوار ٹھیک تھا اور قیص کے اوپر اس نے گرم کوٹ بھی مکن رکھا تھا لہذا موسم کی سختی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے ایک دور افتادہ جھاڑی کے پیچھے لٹا لٹایا اور صدف کے ساتھ اس خالی احاطے سے باہر آ گیا۔

ہم چوہدری دلدار کی کوشی کی حفاظت سمٹ چلے گئے۔ صدف نے کہا "اللہ رکھا تو بہت کام کا بندہ ثابت ہوا ہے۔ اب ہم با آسانی اپنا پروگرام ترتیب دے سکتے ہیں۔ اس وقت لگ بھگ نو بج رہے ہیں۔ تم نے آجہدہ کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟"

میں نے کہا "کوشی کے اندر ہم دس بجے ہی داخل ہوں گے تاکہ ہمیں اپنے کام میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چلو کہیں بیٹھ کر چائے پیئیں۔" میں ایک اچھی چائے کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔

"میرا اچھی جگہ حال ہے دھدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولی "اس طرف آتے وقت میں نے دو تین گھیاں بھی ایک ریٹورنٹ دیکھا تھا۔ ہماری ضرورت وہاں پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن....." وہ ایک لذت خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ تاہم اتنا کہ قدم نہیں رکھے۔

"لیکن کیا؟" میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھانے ہوئے پوچھا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی "میں اللہ رکھا کی طرف سے فکر مند ہوں۔ اگر اسے جلدی ہوش آ گیا تو کوئی بڑی تڑپ

بجائے گی۔ وہ ایک طرح سے اس جھاڑی میں آدھری پڑا ہے۔ اس میں اس کی نگرانی کرنے والا کوئی بھی نہیں۔"

"تم کیا سمجھ رہی ہو صدف۔" میں نے اس سے پوچھا "اللہ رکھا کب تک ہوش میں آ جائے گا؟"

"میں تو توں سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔

"جب تم اللہ رکھا کی طرف سے پوری طرح مطمئن رہو۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "وہ کم از کم تین گھنٹے تک ہوش و حواس میں نہیں آ سکتا۔ اس سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ اس کی جب آکھ کھلے گی تو نئی بات شروع ہو چکی ہوگی۔"

"جب تو ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن انداز میں بولی "اتنی ہمت ہمارے لیے کافی ہوگی۔"

میں نے کہا "فوری طور پر میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے، میں اس سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہوں۔ یہ بات تو ہمیں ظہم ہو ہی چکی ہے کہ بالائی منزل پر صرف دو بج پھرے دار مال کی نگرانی پر مامور ہیں۔ زیریں منزل کے پیش تر افراد اپنی دقت لان میں یا اس کے آس پاس موجود ہوں گے لہذا کوئی ایسی کوشش نہیں ہوگی کہ با آسانی اندر چھنچھن سکتے ہیں۔"

میں ایک لمبے کوسانس لینے کی خاطر کچھ لمبا بات جاری رکھے ہوئے تھا "اندرا جانے کے بعد تم زیریں منزل پر ہی کسی گوشے میں رک جاؤ گی جہاں پر تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے مگر تم بالائی منزل کی جانب جانے والے راستے پر ٹکا رکھو۔ اوپر ٹکا لٹائی جاؤ گا۔ تم نیچے رہ کر مجھے کور دو گی۔"

"لیکن اوپر نگرانی کرنے والے دونوں افراد مسلح ہیں۔" صدف نے ایک بار کب تک اٹھایا "تمہیں کوئی خطرناک صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے۔"

میں نے کہا "ہم کسی وجوہ شیراز میں شرکت کرنے نہیں رہے۔ کسی قسم کی مشکل پیش آنے کا امکان نہ ہو۔ یہ ایک انتہائی خطرناک مشن ہے۔ انسان نما درندوں سے ہمارا ساتھ ہے۔ کسی بھی خون ریزی کی نوبت آ سکتی ہے۔ تم میری نگرانی کرو۔ میں متعدد افراد سے نہتا ہجر سکتا ہوں۔ یہاں تو صرف دو سے بالا بڑنے والا ہے۔ دیکھو میں ایک خاص وجہ سے یہاں خود سے آگے رکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے ہوئے کہا "ہمارے ہمارے جو بھی موت ہے اسے ایک جگہ مرکز نہیں رہنا چاہیے۔ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ جس طرح سفر کے دوران میں تمام تباہی کوئی ایک جگہ میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ مختلف جگہوں

پر بانٹ کر رقم کو محفوظ کرنا چاہیے تاکہ جب کتنے یا کسی قسم کی چوری کے سبب انسان بالکل ہی خالی ہاتھ نہ ہو جائے۔ بالکل اسی طرح خطرناک قسم کے مشن میں اپنی طاقت کو ایک جگہ جمع نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ساتھ ہوں گے تو کسی نازک موقع پر دونوں ہی دشمن کی گرفت میں آ سکتے ہیں بصورت دیگر ہم تھوڑے فاصلے پر کر زیادہ بہتر انداز میں ایک دوسرے کی مدد کر کے اس کام کو سر کھٹے ہیں۔"

"تم بالکل درست کہہ رہے ہو دھدان!" وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے مذکورہ ریٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ تین چار گھنٹے پہلے ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا تھا اس لیے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی صرف چائے کا موڈ تھا، لہذا اسی کا آرڈر دیا گیا۔ یہ بات صدف بھی جانتی تھی کہ چائے کافی مجھ پر الٹا اثر کرتی ہے۔ اسی حوالے سے اس نے پوچھا۔

"دھدان! تمہیں تو ان حالات میں چائے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کہیں اس کے اثر سے تمہیں نیند نہ آنے لگے؟"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ایسا نہیں ہوگا صدف! چائے کافی میرے لیے اپنی تاثر اور سلیپنگ بلو ضرور ہے لیکن میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا ہوں ان میں چائے میرے ذہن پر ہلکا اثر کرے گی۔ میں تھوڑا سا موڈ میں آنا چاہتا ہوں اور اس سے مددے کا پلو بھی کم ہوگا۔ میں نے اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ کھانا کھالیا ہے۔ ایک پلے سے سرور کی مجھے ضرورت ہے۔ جیسے ایک آدھ جام سے انسان موڈ میں آ جاتا ہے، میں اسی کیفیت میں آنا چاہتا ہوں اور....."

وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "تم بہت زیادہ ڈسٹرب ہو دھدان!"

"جیسی تو..... جیسی تو....." میں بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

چائے پینے کے دوران میں صدف خاموش رہی اور گہری نظر سے مجھے دیکھنے پر اکتفا کرتی رہی۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ چائے ختم کرنے کے بعد ہم تھوڑی دیر تک ریٹورنٹ میں بیٹھے رہے پھر اٹھ گئے۔ باہر آنے کے بعد میں نے کہا۔

"ہم سیدھے چوہدری دلدار کی کوشی کے عقب میں جائیں گے۔ اب ایکشن میں آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا تم ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو اس کے لیے تیار محسوس کر رہی ہو؟"

"ایک دم تیار!" وہ جی لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "دیری گڈ مائی فرینڈ!"

اس نے میرے الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے اس موڑ تک آ گئے جہاں سے چوہدری دلدار کی کوٹھی والی گلی شروع ہوتی ہے اور اسی لمحے ہم دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ گلی دور دور تک گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی جو یقیناً چوہدری دلدار کے مدعوین کی گاڑیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا، دعوت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہمارے ٹھٹکنے اور رکنے کا سبب وہ جیب تھی جو گاڑیوں کی قطار کے آخری سرے پر کھڑی تھی اور..... اس جیب کا فاصلہ ہم سے صرف اتنا تھا کہ ہم آسانی اس کی نمبر پلیٹ پڑھ سکتے تھے۔

”فورسیوں تھری سیون“ صدف کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”یہ تو دہی شیطان ہے..... بہرہ و پیادہ جان!“

میں بھی اس سفید چھت والی سرخ لینڈ کروزر کو دیکھ رہا تھا جس کے سیاہ چوڑے نائز اس بد بخت گلی و جدان کے کسی سیاہ کروت کی اطلاع دے رہے تھے۔ جیب اس وقت خالی تھی۔ وہ بہرہ و پیادہ اس کے اندر موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ چوہدری دلدار کی کوٹھی میں موجود ہوگا۔ اس کی ٹوپیا نوراڈ بلیوڈی مہمانوں کی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی تھی، جس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ بھی چوہدری کی دعوت میں مدعو ہے..... تو کیا یہ گلی و جدان چوہدری دلدار کی تخلیق ہے؟

یہ سوال کسی زہر پیلے ناگ کے مانند میرے ذہن میں بھونکا اور میں نے صدف کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندھیرے میں گھسیٹ لیا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے غبی گلی میں پہنچے۔ وہاں ہم تار پکی تھی۔ صدف نے ابھمن زدہ لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے، وہ مردود اس وقت چوہدری کی کوٹھی کے اندر ہے۔“

”ہوا کرے!“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ میرا لہجہ اچانک سنگین ہو گیا تھا۔

صدف نے میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”کیا ان حالات میں بھی ہم اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل کریں گے یا کسی تبدیلی کا امکان ہے؟“

”کسی تبدیلی کا امکان ہے اور نہ ہی وقت“ میں بھڑائی ہوئی آواز میں بولا ”آج ہر ابھمن سلجھن میں بدل جائے گی۔ اگر گلی و جدان چوہدری دلدار کا مہرہ ہے تو اس کے پنچے کا وقت آ گیا ہے۔ اصل کے سامنے نقل کا چراغ نہیں جلے گا۔ چوہدری دلدار کو شہ مات ہو کر رہے گی۔“

میرے تہہ دیکھتے ہوئے صدف نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم جلدی سے چوہدری دلدار کی کوٹھی کے عین عقب

میں پہنچ گئے۔ یہاں محل اندھیرا تھا۔ گلی کی عمود پر چٹا داسہ بلب کی روشنی یہاں تک نہیں پہنچ پاری تھی۔ یہ ہمارے قریب اچھا ہی تھا۔ ہم جس قسم کی کارروائی کرنے جا رہے تھے، اس کے لیے مکمل تاریکی زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

صدف میرے ساتھ جڑ کھڑی تھی۔ میں نے اسے چہرے سے قریب اپنا منہ لے جاتے ہوئے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا ”میں تمہیں ادھر اٹھاتا ہوں۔ تم دیوار کے اوپر سے جھانک کر اندر دیکھو۔ اگر اس جانب کوئی موجود نہ ہو تو دیوار پر چڑھ جانا۔ تم نے جو گزر پھن کر رکے ہیں۔ اندر کو اسے میں تمہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”اور تم؟“ اس کی آواز نے میری سماعت پر سرسراہٹ پیدا کی۔ میں نے اپنے گال پر اس کی سانسوں کی پش بہت واضح طور پر محسوس کی۔

میں نے غصے لہجے میں کہا ”میں تمہارے بعد اندر کو دل گاہ، کیا تم ایکشن کے لیے تیار ہو؟“

اس نے کسی مستحکم کاغذ کی طرح اثبات میں سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میں نے اس پاکٹ سائزر سے رائے حسن واد کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا، اس کا چہرہ دیوار کی جانب تھا۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھایا جیسے ویٹ لفٹر ایک جگہ سے ویٹ اٹھاتے ہیں۔ اس کا گداز بدن ہوا میں اٹھ گیا۔ میں نے اس کے گلوں کو سہارا دے کر مزید بلند کر دیا۔ وہ دیوار کا کنارہ پکڑ کر اوپر اٹھ گئی۔ اب وہ میرے سہارے کے بغیر دیوار پر کھڑی ہوئی تھی۔

میں اس کی جانب سے کسی اشارے کا منتظر تھا۔ اگلے لمحے اس نے ”سب ٹھیک ہے“ کا اشارہ دیا اور میری تانبہ پا کر کوٹھی کے اندر کود گئی۔ میرے سینے سے اطمینان بھری

سانس خارج ہوئی۔

اس اطمینان کی عمر ایک لمحے سے بھی کم ثابت ہوئی کیونکہ اسی لمحے کے آخری حصے میں کوٹھی فائرنگ کی آواز سے گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ فائرنگ کوٹھی کے اندر سے ہو رہی تھی جسے حد درجہ شامیانہ لگا ہوا تھا۔ گویا تقریباً کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کرتا، کوٹھی کے اندر کو دل گاہ نہیں، ایک رخ بستہ آہنی نال میری گدی سے آ کر ٹکرائی۔ ایک غراتی ہوئی آواز نے حکمانہ انداز میں کہا۔

”پینڈر اپ!“

بے ساختہ میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیے۔



ہر کمزور طاقت ور سے ڈرتا ہے اس کے آگے جھکا ہے۔ اپنی سالمیت اور بقا کی خاطر اسے زبردستی کی بات ماننا پڑتی ہے ورنہ وہ اپنی طاقت اور اختیار کے بل پر زبردستی کو کچل کر رکھ دیتا ہے لیکن بعض اوقات میر کو سوا میر پرست کو حاصل ہو جاتی ہے۔ کمزور کا کوئی داؤ چل جاتا ہے اور وہ طاقتور کو مجبور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

میں نے دینی مجبوری کے تحت دونوں ہاتھ اٹھا دیے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اسے زبردستی تسلیم بھی کر لیتا۔ اس کے احکام کی تعمیل کرنا میرا ایک جھانسا تھا۔ کسی کو زبردستی لانے کے لیے فرماں برداری سے بڑا اہم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے مگر برداری غرابت سے لب ریز دھمکی پر خود کو پنڈز اب کر لیا تھا۔ وہ بھی سمجھا، مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے مگر یہ اس کی بھول تھی اور..... وقت کے ایسے سنگین لمحات کسی کی سمجھی ہوئی کو بھی معاف نہیں کرتے! میں نے ہلک جھپٹتے میں اپنی گدی پر کنگی سفاک اٹھنی نال کے لیس سے اندازہ لگایا کہ مجھے ”پنڈز اب“ ایسے احکام دینے والے کے ہاتھ میں ایک خطرناک ”کے“ کے موجود ہے۔ مجھے ہوا میں ہاتھ بلند کرتے دیکھ کر اس کے طلق سے ایک غرابت خارج ہوئی۔

”خاموشی سے گھوم جاؤ!“ اور میں واقعی خاموشی سے گھوم گیا۔ میری زبان سے ایک لفظ ادا نہ ہوا! البتہ میرے ہاتھ پاؤں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر خاموش زبان درازی پر اتر آئے۔ میں جیسے ہی گھوما اس شخص نے اپنی کلاشکوف کو میری گردن سے ہٹایا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے ایک طویل جست بھری پھر میں نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دشمن کے کندھوں پر ٹکا کر بجلی کی سی سرعت سے ایک پنڈز اسپرنگ لگا دیا۔ اس کے شانوں نے میرے ہاتھوں کے لیے پیش بڑک کا کام کیا، اگلے ہی لمحے میں اس کے اوپر سے گزر کر پشت پر پہنچ گیا۔ اتنے بلند اور متحرک تارگٹ سے پیش لینا آسان کام نہیں رومانیائی کو مونیکا اس فن میں طاق ہے۔ یہ جتنا سبک کا ایک مشکل اسٹیپ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں ڈرامائی کوتاہی خطرناک چوٹ دے سکتی ہے۔

میں نے پرداز کے دوران میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ مگر بردار شخص مجھے نشانہ بنا کر فائرنگ نہ کر سکے۔ مجھے اپنے مقصد میں مددنی صدا کا بیانی حاصل ہوئی۔ وہ شخص بوکھلاہٹ اور حیرت کے لے جلتے تاثرات کے ساتھ میری جانب پلٹا لیکن اب میں اس سے اتنے فاصلے پر

پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنی جانب مگر سیدھی کرنے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔

اس شخص نے جیسے ہی مجھے نشانہ بنانے کے لیے ہاتھوں کی حرکت دی، میں نے تیزی سے ایک خطرناک کریٹینٹ کلک اس کے چہرے پر چڑی بے ساختہ اس کے مگر بردار ہاتھ اوپر کو اٹھ گئے اسی لمحے میں نے نیچے جھپٹتے ہوئے اسے بیک سوئپ ماری۔ وہ پہلے ہی اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔ اس سوئپ نے اسے زمین پر گر دیا۔

اسی لمحے کوئی کے سامنے والے حصے میں دوبارہ فائرنگ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخوں پر مشتمل شور مچا بلند ہوا۔ ان چیخوں میں بعض لوگوں کی احکام بردار آوازیں بھی شامل تھیں وہ نہایت ہی تشویش ناک لمحات تھے اور ان لمحات کی سنگینی اس صورت میں اور بھی بڑھ چکی تھی کی میری جاں نثار سامی صدف کوئی کے اندر پہنچ چکی تھی۔ مجھے بھی کچل فرسٹ میں اندر جانا تھا اور اس اقدام سے کل مگر بردار سے فکری بخش نماؤں بھی ضروری تھا۔

زمین پر پڑے ہوئے وقت کلاشکوف اس کے ہاتھ سے کل کر دور جا کر پڑی تھی۔ وہ زمین سے اٹھنے کے بعد اسی سمت بڑھا جہاں کلاشکوف پڑی تھی لیکن میں نے اس کی یہ کوشش نا کامیاب بنا دی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے کار سے دیو جا اور ایک جھکے سے پیچھے کھینچ لیا۔ ہمارے درمیان فاصلہ کم ہوا تو اسے طالع آزمائی کا شوق چرایا۔ اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے کار کو آزاد کیے بغیر اس کے ”اپنی جانب بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا اور دوسرا ہاتھ اس کی کھلی جھل میں سے کر ایک پٹی کی جرک کے ساتھ اسے فضا میں بلند کر دیا پھر میں نے اسے ہاتھ پاؤں جھپٹنے کا موقع نہیں دیا اور قہر کے انداز میں اسے دور اچھال دیا۔ وہ کمر کے بل پنڈے دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے طلق سے ایک دھشت ناک چیخ بلند ہوئی اور ٹکرائے کے بعد وہیں قہقہے کی کڑ زمین پر ڈیر ہو گیا۔

وہ کوئی کی گمرانی پر مامور چوہدری دلدار کا آدمی تھا جس نے نظر پچا کر ہماری ”سرگرمی“ کوشش کر لی تھی اور روک تھام کے لیے ہماری جانب آ گیا تھا۔ اور یہ روک تھام اسے خاصی پہنچی پڑی تھی۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ مجھے خاصا کسمپرسی کی حالت میں نظر آیا۔ دیوار کے ٹکرائے کمر کے علاوہ اس کی کھوپڑی کو بھی شدید نقصان پہنچایا تھا اور اس کے سچے ہوئے ناریل سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس سے

پنے کا انتظار کرتا۔ کوئی کے اندر کی صورت حالات خامی ٹھن ہو چکی تھی۔ ویسے اس زخمی شخص کی کنڈیشن بتا رہی تھی کہ خود اپنے پاؤں پر چل کر وہاں سے جائیں گے گا وہ فوری طور پر ہمارے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے اس پر اور اس کی کلاشکوف پر بحث بھیجی اور بڑی مہارت سے کوئی کی فکری دیوار پھانگ کر اندر پہنچ گیا۔

صدف ایک آڑ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میری نگاہ نے بہت جلد اس شیر دل حسینہ تک رسائی حاصل کر لی۔ میں ڈراے پیش تر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے میری ہاتھ میں سر کوئی کی۔

”وہاں! کوئی کے اگلے حصے میں زبردستی گزربڑ ٹھن ہو رہی ہے۔ لگتا ہے وہاں کوئی ہنگامہ وغیرہ ہو گیا ہے۔ میں نے دوسرے فائرنگ کی آزمائشی ہے اور مسلسل انفرانٹری کی آزمائشی بھی کر رہی ہیں۔“

”فائرنگ کی آزمائش میں نے بھی سنی ہے“ جواب میں نے گیسر کو نشانہ انداز اختیار کر لیا۔ ہماری کارروائی کے لیے اس سے زیادہ موزوں موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کی توجہ بڑکھ کر ہوئی۔

تم ٹھیک کہتے ہو“ وہ اثباتی انداز میں اپنے سر کو حرکت اپنے ہوئے بولی پھر چمچا۔ ”تمہیں اندر آنے میں اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ میں تمہارے بارے میں پریشان ہو رہی تھی۔“ ”میں صحت سلامت اور زندہ تمہارے سامنے موجود ہوں“ میں نے کہا۔ ”تمہیں اطمینان ہو جانا چاہئے بعد میں اپنی تاخیر کا سبب بھی بتا دوں گا“

ہمارے درمیان اس مشن کے لیے منصوبہ بندی پہلے سے طے ہو چکی تھی۔ صدف نے کوئی کی زیریں منزل پر رک کر مجھے اور ہاتھ پاؤں مجھے بالائی منزل پر ساحل کی طرف جانا تھا۔ دوہرہ مستعد اور سگ پیرے دار ساحل کی گمرانی پر مامور تھے۔ اس وقت میرے پاس اسی کے نام پر صرف ایک ریوالتور تھا جو جنگ کی مسلم تاؤں والی کوئی میں نے ڈرائیور پر باض علی سے سمجھا تھا۔ ریاض علی اس وقت چٹانیں کس حال میں ہوگا۔

میں نے نگاہوں کی نگاہوں میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا اشارہ دیا پھر اس سے پہلے کہ ہم اپنی اپنی راہ پکڑے، چند فرادہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ چند جانب بازی انفرانٹری کے عالم میں کوئی کے پیرونی حصے کی رخنہ خور کوشے میں کھڑے تھے۔ ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی

تھی۔

اس اچانک ہونے والی فائرنگ نے بڑی گڑبڑ پھیلادی تھی۔ ابھی تک ہمیں فائرنگ کا سبب معلوم نہیں ہو سکا تھا تاہم اس افتاد نے وقتی طور پر ہمارے پرگرام میں رخنہ ضرور ڈال دیا۔ میں خاموش کھڑا چوکنا نظر سے اندرونی حصے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جگہ ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

پھر ان دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ چند انسانی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ چڑھی ہوئی سانس ظاہر کرتی تھیں وہ آوازیں دوڑنے والوں کی ہیں۔ کسی کی بھاری بھرکم جھجھکاہٹ میری سماعت تک پہنچی۔ اس آواز میں ایک مخصوص قسم کی گونج اور عرب پایا جاتا تھا۔

”یار! فعل! اتمہارے ابائی نے خواہ خواہ اس شخص کا ہوتا بنا دیا ہے۔ مجھے تو یہ بہت ہی ڈر پوک لگا ہے۔ دیکھا کس طرح دم دبا کر بھاگ گیا!“

میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ میرے تمام ظاہرہ اور باطنی حواس ایک نقطے پر جمع ہو گئے۔ فیصل بوے چوہدری نوازش علی کا بیٹا تھا۔ ابھی تک میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا تاہم اس کے بارے میں میں نے ابھی خاصی معلومات جمع کر لی تھیں۔ اسے مخاطب کرنے والے انسانی طور پر چھوٹا چوہدری دلدار تھا۔ میں نے فیصل کا جواب بھی سنا۔ اس کے انداز میں جھجھکاہٹ تھی۔

”چوہدری صاحب! اس شخص نے ابائی کو ایک طویل عرصے سے مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے“ فیصل کے لہجے میں حقارت درآئی لیکن میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ یہ شخص بڑول یا کمزور نہیں۔ میں نے کراچی میں اس کے کارناموں کے بارے میں بہت سنا ہے۔ اس نے ہمارے خاص آدمی میاں زاہد حسین کو کچھ کا بیچ بھار کھا تھا۔ میں خود بھی اس سے ددو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہوں مگر میں نے جب بھی ابائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، انہوں نے یہ کہہ کر سختی سے منہ کر دیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا میرے بجائے وہ اپنے ہر کاروں دار اور تارے کام لیتے رہے۔“

وہ لوگ میرے بارے میں گنگو کر رہے تھے اور میرے ڈر پوک یا بڑول ہونے کو کبھی زیر بحث لا رہے تھے۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کوئی میں نے اپنے والدی موجودہ دل چل سے میرا کیا تعلق تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے میری انجمن کی سلیجبل گئی۔

ایک مالوس آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی ”کراچی میں وہ اس لیے بھی شیر ہو گیا تھا کہ ہم اس کی

پشت پر موجود تھے۔ یہ کبیر شاہ عرف شاہ جی تھا۔ میں اس کے لب و لہجہ کو کیلڑوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ اسی ایف کے کے پلیٹ فارم پر ودھان نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان میں ہمارا تعاون شامل تھا۔ ویسے ایک بات میری کچھ میں نہیں آئی! کبیر شاہ کی آواز میں تذبذب کی جھلک تھی۔ اگر ودھان کو اس کو کبھی پر کوئی کارروائی کرنی ہی تو وہ کھلم کھلا اندر کیوں چلا آیا۔ انتہا کو چھوڑا ہوا یہ اعتماد دے دینے کے زمرے میں آتا ہے اور میرے خیال میں ودھان اتنا احمق نہیں ہو سکتا!

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت چوہدری ولددار کے الفاظ سمجھ تک پہنچے۔ ”اس حماقت کا سرہ بھی پھلے لیا اس نے۔ اپنی سرخ لینڈ کرڈز کے ساتھ ہی اسے سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہونا پڑا۔ میرے آدمیوں کی فائرنگ نے اس کے چنگے چھڑا دیے ہیں اور.....“ وہ ذرا متوقف ہونے کے بعد بولا ”میں نے اپنے جو خطرناک آدمی اس کے تعاقب میں روانہ کیے ہیں وہ اس کی جان کا عذاب ہو جائیں گے۔ تم دیکھ لیتا شاہ جی“ ودھان اور اس کی سرخ جپ بہت جلد ہمارے سامنے ہوئی۔ کبیر شاہ نے کہا ”یہ شخص اسی سرخ جپ کے ساتھ ”ساؤتھ“ کے قریب بھی دیکھا گیا تھا۔ میں اس واقعے کی تفصیل آپ کو بتا چکا ہوں“

وہ تینوں زیریں منزل کے ایسے حصے میں رک گئے تھے جہاں سے ان کی آوازیں یہ آسانی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ آنے والے لوگ تسلی کے لیے کڑوں کی چیکنگ میں لگ گئے ہوں خصوصاً بالائی منزل کی چیکنگ جہاں میری کمزوری ساحل کو کھٹا گیا تھا۔

اب ساری بات مجھ پر مکمل تھی۔ میں جب صدف کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف آ رہا تھا تو کوٹھی کے باہر کھڑی گاڑیوں میں میں نے نفلی ودھان کی سرخ لینڈ کرڈز بھی دیکھی تھی۔ کبیر شاہ اور چوہدری ولددار کی باہمی گفتگو بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت بہرہ پر ہی کو اعلیٰ ودھان سمجھ رہے تھے۔ یہ بہرہ دیا تو میرے لیے بڑی آسانیاں فراہم کر رہا تھا۔ پہلے اس نے لاہور کی سڑکوں پر مجھے الجھا کر کافی وقت پر باد کیا۔ اگر میں اس کے چکر میں نہ پھنستا تو بہرہ وقت سپرد نہ ہوتا۔ اس صورت میں میں ٹوپیٹا ہوا ایسی کا نظارہ دیکھنے سے محروم رہ جاتا اور ایجوینس میں موجود کبیر شاہ میری نظر سے اوجھل رہتا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ کی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہو۔ بہرہ دے نے مجھے ساحل تک پہنچانے کے لیے ساری تک دود کی ہوا!

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ نفلی ودھان کی ہر حرکت میری غور میں جاری تھی۔ اس لمحے ڈارلنگ والا واقعہ بھی میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ بہرہ دے ودھان نے اپنی تحریروں میں دعویٰ کیا تھا کہ اس نے ڈارلنگ کا قصہ تمام کر کے مجھے اس کے شر سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں کوئی بدروح ان دونوں ڈارلنگ برقاغیں ہو گئی تھی جو مجھے کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والی تھی۔

میں نے سرودست اس کے دعوے کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن موجودہ واقعے نے میری توجہ پھر اس کی جانب مبذول کر دی تھی۔ اس نے چوہدری ولددار کی کوٹھی پر اپنی موجودگی ظاہر کر کے ان لوگوں کا دھیان میری طرف سے ہٹا دیا تھا۔ اس کا ایک دوستانہ اقدام تھا اس طرح وہ مجھے ساحل کو حاصل کرنے کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی چوہدری ولددار کے پیچھے ہوئے بندے اسے پکڑنا تو دور کنارہ اس کی گرد کوٹھی نہیں پاسکتے تھے۔ نفلی ودھان کا مجھے اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ کسی چھلاوے سے کم نہیں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ بہرہ دیا درحقیقت کون کون..... اور وہ میری مدد پر کیوں کمر بستہ تھا۔ اس محل میں اس کا کیا مفاد پوشیدہ تھا۔ کوئی کسی کے لیے خواہ مخواہ کچھ نہیں کرتا اور وہ بھی اس کے روپ میں آکر! میرے سوال کا جواب صرف اور صرف نفلی ودھان ہی دے سکتا تھا اگر وہ میرے ہاتھ آجاتا تو!

کوٹھی کے اندر دنی حصے سے آوازیں آتا بند ہو چکی تھیں۔ نہ تو دوڑتے ہوئے قدموں کی اور نہ ہی چوہدری ولددار نفلی اور کبیر شاہ کے ہاتھ کرنے کی بھر خیال ہے وہ یہ تسل کرنے اندر آئے ہوں گے کہ ساحل تو اپنے ”ٹھکانے“ پر محفوظ اور موجود ہے اور اطمینان ہونے کے بعد واپس چلے گئے ہوں گے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میں نے ان کی باتیں سن لیں اور مجھ پر حقیقت مکمل کی۔

کوٹھی کے سامنے والے حصے سے اب بھی لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ راگ رنگ کی محفل تو بہرہ دے ہی تاہم اس واقعے پر تبصرے جاری تھے۔ ان لوگوں کی ہنگامی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میری طرح صدف نے بھی چوہدری ولددار گفتگو سن لی تھی۔ وہ بھی معاملے کی تکلف تھی۔

اس نے میرے ہاتھ کو دبا تے ہوئے سرکشانہ انداز میں کہا ”ودھان! یہاں کی صورت حال تو ہمارے حق میں ہمارا ہوتی ہے۔ نفلی ودھان کا رویہ تو دوستوں جیسا نظر

آ رہا ہے“ میں ابھی اس آفت زاوے کی طرف سے کئی طور پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میں نے تنجید کی ہے کہا۔ ”جو بچے دوست جاتے ہیں وہ یوں سات پردوں کے پیچھے چھپ کر دوتی نہیں جاتے“ روہرڈا کر مصافحہ اور معافہ کرتے ہیں اور کدھر سے کدھر لگا کر دشمن کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں“ وہ بولی ”ممکن ہے اس کی کوئی مجبوری آئے آ رہی ہو“

”دوتی میں کوئی مجبوری اور محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی“ میں نے کہا۔ صدف نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا لیکن دوستی کی بات اور نفلی ودھان کے معاملے میں اس نے مجھ سے اچھے کی کوٹھی نہیں کی بلکہ موضوع بدلے ہوئے تنجید کی سے بولی۔

”اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“ وہ پوری طرح مستعد نظر آ رہی تھی۔

”وہی جو کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے طے کیا تھا“ میں نے تعلیمت سے کہا۔ ”ٹھیک ہے“ اس نے تائیدی انداز میں کہا ”میں یہیں رک کر تمہارا انتظام کروں یا تمہاری نظر میں کوئی اور جگہ زیادہ آوازوں ہے؟“ اس کا انداز مشورہ طلب کرنے والا تھا۔

”کی لگال میں جگہ زیادہ مناسب ہے“ میں نے کچھ اسیے ہوئے کہا ”یہاں سے کوٹھی کا وہ پہلو والا گیٹ زیادہ دور نہیں جس کے باہر ہماری ٹوپیٹا کر دلا کھڑی ہے اور“ میں زوردار کے لیے رک کر باہر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”تم یہیں ٹھہرنا میں مذکورہ گیٹ کا جائزہ لے کر آتا ہوں“

وہ مجھ کی کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ ہمارے درمیان لے ہوا تھا کہ اس گیٹ کو ”استعمال“ کے قابل بنایا جائے گا اور ہم اس کام کی تکمیل کے لیے اس طرف گیا تھا۔ مذکورہ گیٹ کے پاس نیم تاریکی تھی مجھے اس کے نزدیک جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے عمدہ دفاعی سے دیکھ لیا کہ اس گیٹ پر تالا موجود نہیں تھا صرف اس کی اندرونی کڑی چمکی ہوئی تھی۔ یہ وقت ضرورت ہم اس کڑی کو کھول کے وہاں سے روانہ ہو سکتے تھے۔ بیرونی جانب سے اس گیٹ کے پاس ہی ہماری گاڑی موجود تھی۔ گاڑی کی پارکنگ کے سلسلے میں میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔

میں دسبے قدموں واپس اس تاریک کوٹھے میں آ گیا ہر طرف کھڑی تھی۔ نفلی گیٹ کا جائزہ لینے وقت میں نے اس طرف کی نگاہ دوڑائی تھی جہاں شامیانہ تھا کہ کوٹھی کے

اس حصے میں مجھے خاصی افراتفری نظر آئی۔ محفل موسیقی درہم برہم ہو چکی تھی اور مدعوین میں سے اکثر واپسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ یہ صورت حال ہمارے لیے ذرا مشکل تھی۔ اگر وہ لوگ راگ رنگ میں مصروف رہتے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ نفلی ودھان نے ان لوگوں کی سوچ کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ اب ہمیں اسی رخ کو استعمال کر کے موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ چوہدری ولددار اور اس کے مہمان وغیرہ سب یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ انہوں نے ودھان کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا باپ اعلیٰ ودھان اس وقت ان سے چند قدموں کے فاصلے پر کوٹھی میں موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ اس نے چوہدری ولددار کے ایک مسلح پہرے دار کو چند گتھوں کے لیے اتنا نفیقل بھی کر دیا تھا۔ جو کوٹھی کی عقبی گلی میں دنیا دانیہا سے بے خبر ہم دونوں اس کوٹھی کے بائیں باغ میں موجود تھے۔

صدف نے جس تاریک کوٹھے میں پناہ لے رکھی تھی وہ درحقیقت ایک چھوٹا سا شیڈ تھا جس کے نیچے پانی والی دو موٹریں نصب تھیں۔ ہماری طرف کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا ہم حسب ضرورت وہاں رک کر وقت گزار سکتے تھے۔ میں صدف کے پاس آیا تو اس نے پوچھا۔

”ودھان! اور کیا صورت حال ہے؟“ ”اطمینان بخش سمجھو“ میں نے کہا ”گیٹ پر صرف کڑی چمکی ہے ہم اسے آسانی سے اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں اور دوسری جانب شامیانہ بھی کئی اجڑی بجڑی ہوہ کا منظر پیش کر رہا ہے مجھے امید ہے عریض آدمے گھٹنے کے بعد تمام مہمان رخصت ہو جائیں گے“

”اور دنی ہمارا ایکشن کا وقت ہوگا“ صدف نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک بھر پور نگاہ ڈال کر اپنی رست و اراج میں وقت دیکھا اس کے لیے مجھے وادج کی لائٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ صدف کے مطابق ہمیں گیارہ بجے ریڈ کرنا چاہیے تھا۔ موسم کی خشکی میں بہ ترنخ اضافہ ہو رہا تھا میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے ہم وروانہ لہجے میں استفسار کیا۔

”تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟“ ”میرے کچھ میں پوشیدہ اپنائیت نے اسے چونکے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایک بھر پور نظر پھر ڈالی اور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”نہیں میں ٹھیک ہوں“

اس کے انداز سے نکلی جھلکتی تھی۔ میں نے پوچھا ”کیا تم مجھے نہ ناراض ہو؟“  
 ”وہ ایک جھکے سے ہلٹی“ وہدھان! ایسا خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟  
 ”تمہارے انداز کو دیکھتے ہوئے“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں میرے انداز کو کیا ہوا ہے؟“  
 ”میں نے پوچھا، تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی اور تم جواب دے رہی ہو میں تمک ہوں“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”یہ تو وہی بات ہوگئی اینٹ کا جواب پتھر“  
 وہ میرے نزدیک کھٹکتے ہوئے بولی ”ابھی کوئی بات نہیں یہ سب تمہارے ذہنی دباؤ کا اثر ہے۔ اس پریشانی کی کیفیت میں تم میری بات کا کچھ اور مطلب لے گئے ورنہ میں تو یہی کہہ رہی تھی کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی۔ بھلا کسی آتش فشاں کی قربت میں سردی کا جو دائم رہ سکتا ہے۔“  
 وہ بڑی خوبصورتی سے ایک گہری بات کہہ رہی تھی۔ اس نے کسی آتش فشاں کی قربت کا ذکر کیا تھا اور میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا وہ ”کسی“ کون ہے۔

میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ”آتش فشاں سے بعد سے بڑھی ہوئی قربت نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ تمہیں آتش فشاں کی خصوصیات تو معلوم ہی ہوں گی؟“

”اچھی طرح معلوم ہیں“ وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”میں نے جاپان اور ہوائی کے خوف ناک آتش فشاں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا ہے اور ان کی ہلاکت خیزی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں لیکن میں آج کل جس آتش فشاں کی قربت میں ہوں اس کا شاری الحال خاموش آتش فشاںوں میں ہوتا ہے اس لیے خطرے والی کوئی بات نہیں اور ویسے بھی“ وہ جملہ نامکلم چھوڑ کر چند لمحات کے لیے خاموش ہوگئی پھر بڑے سستی خیر انداز میں بولی۔

”وہدھان! تم جانتے ہو..... اور اگر نہیں جانتے تو جان لو“ میں نفع نقصان کے شمار کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ اگر یہ خاموش آتش فشاں بیدار ہو کر کسی قسم کی جاہ کاری پر اتر بھی آیا تو مجھے پر دانی نہیں ہوگی۔ میں اس کی ذات سے خود کو بچنے والے ہر نقصان کو اپنا فائدہ سمجھوں گی۔“

میں حیرت زدہ انداز میں صدف کو تنکا چلا گیا۔ تمہائی کے ان لمحات میں وہ مجھے بہت پیاری لگی۔ پیاری لگنے والے شے کو پیار کیا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں شدت سے یہ خیال

اُبھرا کہ صدف کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر مجھ پر کر سکتی لیکن اگلے ہی لمحے کی قوی جذبے نے اس خیال کو کچھ دیا اور میں بے ساختہ لٹی میں سر جھک کر رہ گیا۔  
 ”کیا ہوا وہدھان؟“ صدف نے تشریف لے کر لکچر دریافت کیا۔

ہمارے درمیان سرگوشیوں میں بات چیت ہو رہی تھی ”کچھ نہیں“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس کی طرف جانب دیکھنے لگا جو ہمارے فرار کا وسیلہ بننے والا تھا۔

”شاید تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو“ اس کا انداز صدفی صدورست تھا لیکن اس کی تائید نہیں کر سکتا تھا اس طرح میری سوچ اس پر عیاں ہو جاتی اور اس کا پتا چھٹکے لگتا۔ انسان بنیادی طور پر بہت ہی چال باز اور پکڑا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ذہن کسی کے سامنے کھل جائے۔ میں بھی انسان ہوں اس لیے یہ انسانی ”خوبی“ مجھ میں بھی موجود ہے۔ ساحل والا معاملہ خالصتاً دل کا تھا اس لیے میں بعض اوقات بے اختیار ہو جاتا تھا!

میرا ذہن ایک لمحے کے لیے صدف کی جانب ہلکے طرح ہانک ہو گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے دل نے میرے خیال کی پیمائش میں روڑا اٹکا دیا۔ میرا دل تو کہیں اور اٹکا ہوا تھا وہ مجھے سمجھنے کا موقع کیوں کر دیتا۔ ساحل کی محبت نے بروقت میرے باقی خیال کے پاؤں میں احساس کی زنجیرال دی تھی لیکن صدف نے میری کیفیت کو سمجھ لیا۔ وہ دلدردم سراپا قامت لڑکی ایسی ہی تھی دھڑکی!

”اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی!“ میری طویل خاموشی کے جواب میں اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں ناراضی نہیں تھی۔

میں نے تنگسو کے اس انداز کو بد لنے کے لیے دو بار دست و پاچ پر نگاہ ڈالی اور وقت دیکھنے کے بعد کہا ”میرا خیال ہے اب مجھے بالائی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ گیارہ بجتے ہی والے ہیں اور کوئی بھی میں سکون محسوس ہو رہا ہے۔“ اس سکون سے مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے“ صدف نے کہا ”یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔ نقلی وہدھان والے واقفے کے بعد ساحل کی حفاظت کا انتظام اور سخت کردہ گیا ہوگا۔ مجھے تو خطرہ ہے اگر عقیقی گلی والے سب میرے والد کی حقیقت کھل گئی تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں“

تموڑی دیر پہلے ہونے والی سرگوشیاں تنگسو میں نہیں صدف کو اس شخص کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میرے انداز کے مطابق وہ کم از کم دیکھنے تک کسی قابل نہیں ہو سکتا تھا۔

مدف کے خدشات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر وہ بے ہمتی دباؤ شخص کی توجہ حاصل کر لیتا تو کوئی نئی مصیبت کھڑی ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ میں نے ریاض علی والا ریو اور ایچ ایس کے نکال کر صدف کے حوالے کر دیا۔ اس نے ذرا سے تال کے بعد ریو اور میرے ہاتھ سے لے لیا۔ مذکورہ ریو اور میں پانچ گولیاں اب بھی لوڈ تھیں۔

”میں تمہارے اندیشوں کی تائید کرتا ہوں“ میں نے کہا ”اس لیے مجھے فوراً ایکشن میں آ جانا چاہئے“ ایک لمحے کے وقفے میں نے اضافہ کیا ”تم اپنی جگہ پر چوکننا اور ہوشیار رہنا“

وہ سیدھ کھینکتے ہوئے بولی ”تم میری طرف سے بے فکر ہو کر جاؤ“  
 اور میں واقعی بے فکر ہو گیا!

☆☆☆☆

دو دھم کے پائیس تھے جو کبھی کے عقیقی حصے میں عمارت کے ساتھ ساتھ زمین سے بالائی منزل کی جانب چلے گئے تھے۔ ان کی ساخت اور سائز کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بڑی موری والا پائپ سیورج کا تھا جب کہ دوسرا اپنی پائپ پانی کے لیے تھا۔ میں نے بالائی منزل تک رسائی کے لیے سیورج پائپ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور مختلاً قدموں سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے پائپ پر دووں ہاتھ جما کر اس کی مضبوطی اور نصب کا اندازہ لگانا چاہا تو ہاشی کا ایک منظر میرے تصور میں نمودار کیا۔ پلک جھپکتے میں دقت کی اڑان مجھے آٹھ سال پیچھے لے گئی۔ اس وقت میری عمر لگ بھگ بارہ سال تھی۔ میرے والدین کو بے دردی سے قتل کیا جا چکا تھا اور ان کا قاتل دلازمہ سے تعاقب میں تھا۔ میں اس شیطان صفت انسان سے بچنے چاہتے ایک اسکول کی عمارت میں جا چکا تھا اور خطرہ بڑھ جانے کے بعد میں نے ایک سیورج پائپ کے سہارے اسکول کی بالائی حصے سے نیچے تنگ ”سنز“ کیا تھا۔ فرق صرف ست اور مقامات کا تھا۔ پانچ حالات کا بھی۔

وہ تنگ گور کے ایک اسکول کی عمارت تھی اور میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر اوپر سے نیچے سڑک کیا تھا اور اب میں لاہور (پاکستان) میں تھا، اس وقت میں اپنی عزیز ترین ہستی ساحل تنگ رہائی حاصل کرنے کے نیچے سے اوپر جا رہا تھا۔

انہی خیالات کے دوران میں ”میں بہ حفاظت اس کو کبھی کی بالائی منزل تک پہنچ گیا۔ ایک روشن دان کے نزدیک میں نے تنگ رہائی پائپ کو الوداع کہا اور اچک کر اس روشن دان کے

مجھے ہر چہ گیا۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ روشن دان مجھے کھلا نظر آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کھلے ہوئے روشن دان سے جھانک کر اس کمرے کے اندرونی حالات سے واقف ہو سکتا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن میں جتنے اہم اور سستی خیز مشن پر تھا اس میں موسموں کی سختی بے اثر ہو جاتی ہے اور میں تو اس حوالے سے پہلے ہی بہت سخت جان تھا۔

میں روشن دان کے مجھے پر بیٹھا تھا اور میرا ایک ہاتھ چھت کی منڈ پر رکھا تھا۔ اس مجھے اور چھت میں بہ مشکل ایک فٹ کی بلندی حاصل تھی۔ ابھی تک کوئی ایسے آثار نظر نہیں آئے تھے کہ وہاں ہماری موجودی کا راز کھل گیا ہو۔ یہ ہمارے لیے ایک ثبوت اور مفید بات تھی۔

میں نے یہ دستور چھت کی منڈ پر کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اوپر دی دھڑ کو نیچے جھکایا۔ یہ ایک مشکل عمل تھا جس میں کمر کی جگہ نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میں اس پوزیشن میں آ گیا کہ کمرے کے اندر جھانک سکوں۔ روشن دان سے ابلی روشنی پھوٹنے میں پہلے دیکھ چکا تھا اور جب میں نے باقاعدہ اندر کا جائزہ لیا تو مجھ پر عیاں ہوا کہ وہ روشنی اس کمرے سے خارج نہیں ہو رہی تھی۔ اس کمرے کی تمام لائٹس آف تھیں اور اس کا داخلی دروازہ آدھا کھلا تھا۔ وہ روشنی اس آدھ کھلے دروازے سے کمرے کے اندر پہنچ رہی تھی۔

میں نے یہ غور وہاں کا جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ کمرے کے سامنے راہ داری میں لائٹ آن تھی۔ یہ روشنی اسی راہ داری سے آرہی تھی۔ میں نے اسی پوزیشن سے مجھے تنگ راہ داری میں مکینہ دیکھ دیکھنے کی کوشش کی اور اور میری یہ کوشش خاصی سودمند ثابت ہوئی۔ میری نگاہ کے اختتام پر راہ داری کی دوسری جانب ایک بند دروازہ موجود تھا جو پھینکا مخالفت سمت میں پائے جانے والے کسی کمرے کا تھا۔ میں اس کمرے اور بند دروازے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ راہ داری میں کسی کی موجودی کے آثار پیدا ہوں گے پھر ایک سب کا رڈ میری نظر میں آ گیا۔ میرے بدن کا ایک ایک گوشہ پوری طرح الارٹ ہو گیا۔

درازا قامت سب کا رڈ کے ہاتھ میں ایک نئی ٹولبی کلاشکوف اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ گن کا سپورٹنگ بیٹ کا رڈ کے کندھے پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی دائرگی بے ترتیب اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ وہ بڑے مستعد قدموں سے چلتے

ہوئے اس کمرے میں داخل ہوا جس کے روشن دان پر میں نے اپنی دوہری آنکھیں فٹ کر رکھی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے کمرے میں سے دو کرسیاں اٹھائیں اور باہر نکل گیا۔ اس عمل کے دوران اس نے کلاشن کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ مضبوط کاغذی کا مالک ایک ہنسکا شخص تھا۔

میں بڑی باریک بینی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے چونک جانا پڑا۔ اس شخص نے ایک کرسی راہ داری کی مخالف سمت میں پائے جانے والے بند دروازے کے قریب رکھی اور دوسری کرسی سمیت میری نگاہ کے فریم سے نکل گیا۔ دوسری کرسی وہ کہیں اور رکھے گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس کے علاوہ بھی وہاں کوئی موجود تھا۔ میری معلومات کے مطابق کوئی کب بالائی منزل پر ساحل کی نگرانی کے لیے چوہدری دلدار نے دو بج گھڑ کو تھینک کر رکھا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے جس کا شکوفہ بردار کی جھلک دیکھی وہ بھینا انہی گاڑوں میں سے ایک تھا۔

میں راہ داری کے باز بند دروازے والے کمرے اور وہاں رکھی خالی کرسی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دوسرا پھر سے دار بھی مجھے نظر آگیا۔ وہ ایک دہلا پٹا اور تناسب اللہ شخص تھا اور اس نے بھی ایک خوف ناک کا شکوفہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ وہ اس بند دروازے کے پاس پہنچ کر رکا۔ اس نے کھلے ہوئے کمرے میں سرسری انداز میں جھانکا اور پھر بڑے چاق و چوبند انداز میں کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور بند دروازے کی مشرکی جھ پر جہاں ہو گئی۔

اس کمرے میں بھینا ساحل کو رکھا گیا تھا اور یہ دونوں مسلح گاڑوں اس کی نگرانی پر مامور تھے۔ دروازے کا قاتل گاڑا وہاں نہ پلٹا تو مجھے یقین ہو گیا۔ وہ بالائی منزل کی طرف آنے والے راستے کی نگرانی کر رہا ہوگا، ممکن ہے اس نے زینے کے ساتھ ہی اپنی کرسی ڈال لی ہو۔

اس احساس نے میرے رگ و پے میں بجلیاں سی بھر دیں کہ اس بند دروازے کے پیچھے میری ساحل موجود تھی۔ وہ ایک فٹس ڈور تھا اور اس میں ہتھیار نکل نصب تھا جو بھینا لاک ہوگا۔ میرے جی میں آئی کہ پرواز کرتے ہوئے اس دروازے تک پہنچ جاؤں اور اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر شے کو تباہ کر کے رکھ دوں اور میرے لیے یہ سب کچھ ممکن تھا۔ دو مسلح گاڑوں کو میں پلک جھپکتے میں چٹکیوں میں اڑا سکتا تھا۔

میں نے روشن دان کے فریم کے وسط میں نصب اپنی راڈ

پر ہاتھ ڈالا تو مجھے یوں محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے لامحالہ میری نگاہ کرسی پر بیٹھے مسلح گاڑ کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ میں ساکت ہو کر رہ گیا۔ اگر اس سوچ پر وہاں میری موجودی مکمل جانی تو پڑی کہ بڑ ہو جاتی لیکن خبریت گزری گاڑ نے چند لمحے اس سمت دیکھنے کے بعد اپنی توجہ جٹائی اور بند دروازے کے لاک کھولنے لگا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں ایک زوردار خیال چلا اڑا۔ میں جھپٹ کے اوپر سے ہوتے ہوئے دوسری سمت چلا جاتا ہوں اس روشن دان میں جھانکنا ممکن ہو سکتا تھا جس کمرے میں ساحل کی موجودی یقینی نظر آتی تھی۔ اس طرح مجھے فوری طور پر مسلح گاڑ سے بھی نہ اٹھنا پڑتا اور میں اس کی رگ پر جا کر تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا!

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے جسم کو سیدھا کیا اور کوئی آزاد پیدائے بغیر ایک کمرے پر پہنچ گیا۔ پھر میں اپنے اندازے کی بنا پر دیے قدموں پر ہوئے اپنی مطلوبہ سمت میں آگیا۔ اگر میں ایک مہرچہ کی طرح ساحل والے کمرے میں داخل ہو جاتا تو پھر بند دروازہ والے کمرے میں بے غیر اہم ہو جاتا۔

مکمل جھپٹ پر چاروں جانب اندھیرے کا راج تھا۔ وہ یہ میری کارروائی کے لیے خاصا مفید ثابت ہو رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے سر دی کا احساس ہوا لیکن میں نے اس احساس کو جوتے کی ٹوک پر رکھا اور جھپٹ کی دوسری سمت آگیا۔ میں نے منڈیر کے پاس بیٹھ کر مجھے جھانکا اور ساحل والے خونی کمرے کی دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ حیرت انگیز طور پر اس دیوار میں مجھے کوئی روشن دان دکھائی نہ دیا۔ خاصی نیچے ایک کونے کی نظر آ رہی تھی جس کا قاصد جھپٹ سے لگ بھگ چار فٹ با ہوگا۔ یہ ایک تشویش ناک صورت حال تھی۔

میں نے منڈیر پر بیٹھے بیٹھے گرد و پیش کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس حصے سے میں بآسانی تیرس پر اڑ سکتا تھا۔ تیرس سے ہوتے ہوئے اس سمت بڑھتا آسان تھا جہاں سے بالائی منزل کے کوری ڈور (راہ داری) تک رسائی حاصل ہو سکتی۔ اگر میں اس راستے کو استعمال کرتا تو کہیں نہ کہیں دروازے کا گاڑ سے سامنا ضرور ہوتا۔ یہ تو وہی بات ہوتی کہ میں زینے کے راستے زبردستی سے بالائی منزل کی طرف جا رہا ہوں اس صورت میں بھی مجھے اس قسم کی پھونچ پھونچ کرنی پڑے گی۔ بالائی منزل کی جھپٹ پر منڈیر کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کہیں تک نصب تھے۔ یہ ایک ایسا بندوبست

تھا کہ یہ وقت ضرورت جھپٹ پر شامیانہ لگایا جاسکتا تھا۔ میں نے ساحل والے کمرے کی کھڑکی تک پہنچنے کے لیے انہی پس کازمانے کا فیصلہ کیا۔ دو کمرے کے درمیان تقریباً دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے منڈیر پر بیٹھے ہوئے اپنے دونوں پاؤں کو دھکیں میں پھنسا دیا۔ آہستہ آہستہ کھینچ کر ایک جانب الٹا دیا۔ یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔ اگر میرا پاؤں تک سے نکل جاتا یا پل ہو جاتا تو میں سر کے بل تیریں پر جا کر تباہ لیکن خبریت گزری اور میں اگلے لگے لگے اس کھڑکی تک پہنچ گیا جس کے راستے میں ساحل والے کمرے تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ کھڑکی اندر سے بند تھی مکمل بند۔ اس کے ذریعے اندر پہنچنا تو درکنار کمرے کے اندر جھانکنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسی لمحے اس کھڑکی پر ”دور آگائی“ نہ کی جاتی۔ اندر نصف شب کو زور زبانی کا ایک ہی مطلب ہوتا کہ سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا جائے۔

اب ساحل والے کمرے میں تک پہنچنے کا ایک ہی خاموش وسیلہ باقی رہ گیا تھا۔ میں روشن دان کے ذریعے پہلے اس کمرے میں پہنچتا جہاں سے مسلح گاڑ نے دو کرسیاں اٹھائی تھیں۔ پھر کی طرح دونوں گاڑوں پر قابو پا دیتا اور اس کے بعد ساحل والے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا۔

میں نے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور اوپریں جھپٹ پر حاضر ہو گیا۔ دیے پاؤں چلے ہوئے میں نے تاریک جھپٹ کو عبور کیا اور اوپریں روشن دان والے شیڈ پر پہنچ گیا۔ میں نے سابق طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس روشن دان سے کمرے کے اندر جھانکا اور مسلح گاڑ کی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ دہلا پٹا گاڑ کرسی پر موجود تھا تاہم اس وقت اس کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بآسانی کمرے کے اندر پہنچ گیا تھا۔

میں نے روشن دان کے شیڈ (جھجکے) پر جھپٹے ہوئے فریم میں نصب اپنی راڈ پر ہاتھ ڈالا اور اسے ایک طرف سے پکڑ کر پٹائی زور آزمائی کرنے لگا۔ راڈ کا سر انگوڑی کے فریم میں جکڑا ہوا تھا۔ میں نے ”جھجکے“ کی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی توجہ اس نقطے پر مرکوز کر دی کہ وہ راڈ درحقیقت لپسے کی نہیں بلکہ کسی ایسے میٹرل کی بنی ہوئی ہے جس پر تھوڑی سی طاقت صرف کر کے اسے چوٹی فریم سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔

پٹائی میں دو عوامل سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک آپ کا ارتکاز اور دوسرے آپ کا یقین یعنی آپ کی

طاقتور سوچ۔ میں اس وقت اتنے اٹھاک کے ساتھ راڈ پر طاقت صرف کر رہا تھا کہ مجھے ایک سواک فیصد یقین تھا کہ میں اسے چوٹی فریم سے باہر لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ جی کی قوت نے کام دکھایا اور میرے ہاتھ میں موجود اپنی راڈ مڑنے لگی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن میں ان چھوٹی موٹی حیرتوں سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے ہاتھ میں دی ہوئی راڈ کو ایک جھک دیا اور وہ فریم میں سے باہر آگئی۔ راڈ کے سرے نے فریم کو چھوڑا تو اسے مکمل موڑنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اگلے ہی لمحے میں اس راڈ کو دوسرے نصب سرے پر موڑ کر روشن دان کے فریم سے پٹا چکا تھا۔ اس کے بعد روشن دان کے پٹ کو الگ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں نے شیشہ جڑے لکڑی کے اس مشتبہل تختے کو جھپٹ پر ڈال دیا۔

اب میرے سامنے روشن دان کے نام پر ایک شکاف تھا جس کا سائز پڑھ ہائی دو فٹ رہا ہوگا۔ اس مناسب خلا سے جسم کو گزرا چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے اپنے اطمینان کے لیے ایک نظر مسلح گاڑ پر ڈالی پھر اس کھلے ہوئے روشن دان میں سے ہوتے ہوئے کمرے کے اندر کود گیا۔

روشن دان سے کمرے کا فرش دس بار فٹ کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ اس بلندی کا فال (Fall) میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ میں بچوں کے بل جیسے ہی کمرے کے فرش پر پہنچا، میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ فرنٹ رول کرتے ہوئے خود کو ایک تاریک گوشے میں پہنچا دیا۔ میرا عمل اتنا میکانیکی اور سوکھٹ تھا کہ اس میں بہ مشکل ایک سیکنڈ صرف ہوا ہوگا۔ کمرے کے اندر کودنے سے لے کر اندھیرے میں پہنچنے تک میں نے سانس روک کر فال اینڈ رول کے اصول پر پوری طرح عمل کیا تھا۔

میں اس وقت کمرے کے جس تاریک گوشے میں موجود تھا وہاں سے ساحل والے کمرے کا دروازہ اور اس کے پاس کرسی پر موجود مسلح گاڑ واضح طور پر مجھے دکھائی دے رہا تھا لیکن گاڑ اگر کوشش بھی کرتا تو میں اسے نظر نہ آتا۔ میں اندھیرے کی آڑ لے کر بآسانی اس کا شکار کر سکتا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلانے کے لیے اپنی آواز کو چارے کے طور پر استعمال کیا اور اپنے حلق سے ایک دھیمی ”میاؤں“ خارج کی۔

لمبی کی معنوی آواز نے گاڑ کی سماعت تک رسائی حاصل کی تو وہ چونک کر کمرے کے اندر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موجود تشویش کو واضح طور پر پڑھ لیا۔

سننے نہیں آیا تھا۔

میں نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے ہاتھ ہوئے سفاک لہجہ میں دریافت کیا ”جس کمرے کے سامنے تم پہرا دے رہے ہو ساحل اس کے اندر ہی ہے نا؟“

میری اس سرکشی میں ہزار ہا دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔ میں نے اس گارڈ کو پشت کے بل اپنے سینے کے ساتھ دھار کھاتھا لہذا وہ مجھے اور میرے چہرے کو دیکھ نہیں سکتا تھا حالانکہ اس کی پہلی کوشش یہی تھی کہ میرا پیادہ ارک لے۔ اس نے ایک مرتبہ لب دار کرنا چاہے لیکن میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کے طعنے سے برآمد ہونے والی ہلکی سی آواز بھی ان نازک لمحات میں کوئی بہت بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنا منہ اس کی ساعت کی ریٹھ میں لے گیا اور غرا کر دیکھ انداز میں کہا ”جواب دینے کے لیے تمہاری ناپاک زبان کا کھانا ضرور دینی نہیں۔ تم گردن کو ہاں باند میں ہلکی جنبش دے سکتے ہو۔ بتاؤ میری ساحل اسی کمرے میں موجود ہے نا؟“

اس کے کسی جنبش جواب سے پہلے ہی کمرے کے باہر آواز دی میں اس کے سامنے کے قدموں کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ایک استفسار یہ جملہ بھی اندر پہنچا۔

”پردیز! تم نے اتنی دیر لگادی کیا واقعی اندر کوئی ملی موجود ہے؟“ وہ دیکھنا اس کا سامنے گارڈ تھا۔ اس کی بات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ملی کی مصنوعی آواز اس دروازے قامت ٹٹے کے ٹھٹھک بھی پہنچی تھی۔ میں مزید انتظار کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ گرفت میں آئے ہوئے سفاک گارڈ کا نام میں جان چکا تھا اس لیے میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”گڈ بائے مسٹر پردیز!“ میرے لہجے میں دنیا جان کی سفاکی سمٹ آئی ”میں اب اپنے سوال کا جواب تمہارے سامنے سے پوچھوں گا۔ تم نے موقع ضائع کر دیا۔“

پھر میں نے ایک مخصوص تکنیک سے اس کی گردن کی ”حراج پرسی“ کی۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی بڑبڑاتے ہوئے کی مانند میرے بازو میں بھول گیا۔ میں نے یہ آہستگی اسے کمرے کے پینڈ فرش پر ڈال دیا۔ وہ دو تین گھنٹے کے لیے زندگی کے جھیلوں سے دور چلا گیا تھا۔

اسی دوران میں دوسرے گارڈ کی تشویش بھری آواز ابھری ”پردیز! تم خاموش کیوں ہو۔ کیا اندر کوئی گڑبڑ ہے؟“

پردیز نامی وہ شخص فی الحال کسی سوال کا جواب دینے کے

بڑے چوکنا انداز میں کمرے میں دیکھنے کے بعد وہ راہ داری کی دوسری سمت نکلتے لگا میں سمجھ گیا اس کی توجہ اپنے سامنے گارڈ کی طرف پلٹ گئی تھی۔ اسی دوران میں ”میں نے نیچے سروں میں ایک اور مصنوعی ”میاؤں“ خارج کی اور آدھ کھلے دروازے کی آڑ میں پہنچ گیا۔ یہ بات خارج از امکان تھی کہ ان میں سے کوئی ایک یا دونوں کمرے کے اندر دینی صورت حالات جاننے کے لیے ادھر کا رخ نہ کرے!

میں سانس روکے ان کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحات کے بعد مجھے دروازے کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں پوری طرح الرٹ ہو گیا۔ آنے والے نے کمرے کے اندر قدم رکھے سے پہلے ہی متوقع جلی کو ہٹکا کر ”میں.....!“

وہاں کوئی ملی موجود ہوتی تو اس کے محل کار بھل پیش کرتی لیکن اس شخص نے بڑے واضح طور پر ملی کو دو مرتبہ ”میاؤں“ کرتے سنا تھا لہذا وہ صرف ایک ”میں“ پر اکتفا کر کے واپس نہیں جاسکتا تھا چنانچہ اگلے ہی لمحے اس نے آدھ کھلے دروازے کو پوری طرح دوا کیا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ گارڈ کی نفسیات کے زیر اثر اس نے ہاتھوں میں دلی کلاشن کو تیار انداز میں تان رکھا تھا جیسی کمرے کے اندر کوئی ملی نہ ہو بلکہ شیر بھر چھپا بیٹھا ہو!

میں اسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس شخص کی پشت جیسے ہی میری نگاہ کے سامنے آئی، میں نے ایک جست بھر کر اسے گردن سے دیوچ لیا پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، میں نے زہر میں بھینے ہوئے دانت کی طرح اسے ایک جھٹکے سے تار یک گوشتے میں پھنچ لیا۔

یہ وہی دہلا پتلا مناسب قد و قامت کا مالک گارڈ تھا جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے ساحل والے کمرے کے سامنے کرسی پر بیٹھ دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بری طرح میرے بازو کی گرفت میں پھل رہا تھا۔ میں نے اپنا مضبوط بازو اس کی گردن کے گرد بڑے باہر انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ نیک لاک نامی یہ گرفت بڑی عذاب جاں ہوتی ہے۔ گرفتار شدہ شخص آزادی کی خاطر زیادہ زور آزمائی کا رسک نہیں لے سکتا ورنہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ ہر لمحے موجود ہوتا ہے۔

میرے بازو میں دبا ہوا گارڈ گرفت سے نکلنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی ہر کوشش کا کامیاب بتادی حتیٰ کہ اسے گن استعمال کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ”ملی“ کسی طرح اس کی جان نہیں چھوڑے گی تو اس کے اعصاب کو قدرے قرار آ گیا۔ میں نے محسوس کیا، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں وہاں اس کی

قابل نہیں رہا تھا۔ اسی لمحے مجھے ایک خطرناک احساس نے  
 مجھ کو ڈالا۔ اگر پرویز کی جانب مکمل خاموشی طاری رہتی تو  
 اس کا سامھی اندر کی صورت حال کی جانے کے بجائے کوئی اور  
 قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ اس بات کے نفسی نفسی امکانات تھے کہ  
 وہ ہماگ کر دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش  
 کرتا۔

ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا! میرے ذہن نے ایک اہل  
فیصلہ صادر کیا..... ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اور یہ سوچتے ہی میں  
تاریک کوٹے سے نکل کر اچانک اس شخص کے سامنے آ گیا۔  
وہ مسخ گاڑو اپنے سامھی پرویز کی یا اس کی آواز کی توقع  
کر رہا تھا، مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔  
اور اسی گڑبڑا ہٹ میں اس نے اپنے ہاتھ میں دہلا ش  
کارخ گیری کی جانب کرنے کی کوشش کی۔

کوشش کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ میں نے اس کے ارادے کو عملی جامہ پہننے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ ہمارے درمیان یہ مشکل تین فنٹ کا فاصلہ تھا، میں نے کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے دلوں بازو میرے جیسے میں آگئے۔ مگرن کے استعمال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور میں نے زبان کے استعمال پر بھی کامل باندھی "عائد" کر دی۔

میں نے ایک دھواں دھار نگر اس کے چہرے پر پسپا کیا۔  
اس نگر کا خصوصاً ہدف اس کی ناک اور ہونٹ ہے لیکن  
میں نے اسے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ اس تصادم کے نتیجے میں  
پہنچنے والی تکلیف بردہ کوئی احتجاج بلند کر سکے۔ میں نے یکے  
بعد دیگرے اس کے چہرے پر چار پانچ نگر کر دیں برسا میں تو اس  
کی بوکھلاہٹ ساتویں آسمان کو چھوئے گی۔ اسی لمحے میں نے  
اپنے سر کو اس کی پیشانی سے ٹکرایا۔ یہ نگر اتنی شدید اور زوردار  
تھی کہ اس کے قدم ڈھلکا گئے۔

وہ بڑے خطرناک انداز میں لڑکھانے لگا میں کسی آفت کی طرح سے چٹا ہوا تھا۔ اگر وہ زمین پر ہوجاتا تو مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا اور اس طرح فرش سے ہمارے مشترکہ کمرائے کے نیچے میں ایک عظیم الشان دھک پیدا ہوتی جو زیریں منزل والوں کو اس طرف متوجہ کر سکتی تھی لہذا میں نے اس کے گرنے سے پہلے ہی اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور ایک بازو سے پکڑ کر کمرے کے اندر بھاگ لیا۔

اندر پہنچتے ہی کن اس کے ہاتھ سے جھوٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے زخمی چہرے کو تھام لیا۔ میں نے اس کی کس مہر کی کی پروا کیے بغیر اسے کمرے کے فرش پر

اس کا یہ رد عمل میرے عمل کا نتیجہ تھا۔ انتہائی بے بسی کے  
اہم اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اس بات کی تصدیق کی  
کہ میں ساحل کو نظر بند کر دیا گیا ہے۔

”مجھے بتا چلا ہے تم دونوں میں سے ایک چوہدری دلدار کا بندہ ہے اور دوسرا نکبیر شاہ کے ساتھ کراچی سے آیا ہے“

”نہ نے پوچھا“ تم کس کے بندے ہو نکبیر شاہ یا چوہدری دلدار کے؟“

میں نے سہہ سار کیا ”اس وقت تم دونوں کے علاوہ بالائی منزل پر اور کون کون ہے۔ میرا مطلب ہے ساحل کو چھوڑ کر؟“

”کوئی نہیں“ اس نے تعاون آمیز انداز میں بتایا۔

”زیریں منزل پر کتنے افراد موجود ہیں؟“  
اس نے بتایا ”چوہدری صاحب کے علاوہ کبیر شاہ، فیصل  
صاحب دو حافظ اور دو عورتیں ہیں“

”تم نے جن دعوو توں کا ذکر کیا ہے، کیا ان کا تعلق چوہدری کی فیملی سے ہے؟“

اس نے غمی میں گردن کو جھٹکے کی کوشش کی۔ نا کا میاں پڑ کے بعد اس کی زبان سے ادا ہوا ”وہ دلوں پیشہ دعوو میں ہیں“

”مٹا صاحب اپنے تین آدمیوں کے ساتھ دھواں لے کر  
خواب“ وہ بولنے بولنے اپنا رک گیا جیسے اسے کچھ  
دبا آگیا ہو پھر تھوڑا بھبھک لے کر بولا ”میں نے صرف تمہاری  
ایک جھلک دیکھی ہے اور مجھے یاد آ رہا ہے تم دھواں سے گہری  
مشابہت رکھتے ہو کہیں تم.....“ اس نے دوبارہ جملہ ادھورا  
چھوڑ دیا۔

موقع ملا ہے، وہ ابھن زدہ لہجے میں بولا ”میں نے سنا ہے  
وہ جڈان بہت ہی سفاک اور خطرناک انسان ہے“

”ت..... تو میرا اندازہ صحیح ہے“ وہ ہلکایا ”تم دھدھانے ہو؟“

”کما تمہیں کسی قسم کا شک و شبہ ہے؟“

”اگر تم وہ جان ہو تو پھر تمہاری دلیری کو سلام کرنے کوئی جانتا ہے۔ ابھی تو سوزی دیر پہلے شدید فائرنگ کے نتیجے میں تمہیں یہاں سے اپنی جیب میں فرار ہونا پڑا تھا اور اب تم دوبارہ یہاں نظر آ رہے ہو۔“



”میرا مطلب ہے تم نے بتایا ہے کہ تم ہی وجدان ہو!“ وہ گڑبڑا گیا۔

”تو تم نے میرے کہے کا یقین کر لیا ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ساتھ سوال و جواب میں زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس کی ”گلو خلاصی“ کرنے سے پہلے ”سائل“ والے کمرے کو یقینی طور پر لاک کیا کیا ہوگا؟“

اس نے ہاں میں جواب دیا۔ میں نے جانتا چاہا ”اس کمرے کی چابی کس کے پاس ہے؟“

”چوہدری صاحب کے پاس“

”تم مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟“

”تم چاہو تو مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لو“ وہ مٹکیا ہٹ سے مشابہ آواز میں بولا ”میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ چابی واقعی چوہدری صاحب کے پاس ہے۔ ہمیں صرف اس کمرے کی نگرانی کا حکم ہے۔ ہم تو اس کمرے کے دروازے کو چھو بھی نہیں سکتے۔ چوہدری صاحب نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ اس لیے تو خود افاصلہ رکھ کر ہم یہاں پہرا دے رہے ہیں۔“

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا ”اس ممانعت کی وجہ کیا ہے۔ کیا اس کمرے کے دروازے کے ساتھ کوئی مخصوص قسم کا بم خشک ہے جو اسے چھوتے ہی بلاست ہو جائے گا؟“

”ہاں نہیں، ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں“ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا ”ہم چوہدری صاحب سے کسی قسم کا سوال نہیں کر سکتے۔ بس گردن جھکا کر ان کا حکم سننے ہیں اور اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔“

میں نے ہم اور بلاسٹنگ کی بات خواہ مخواہ ہی کر دی تھی۔ دراصل سلیم کی بات نے مجھے جھجھلا دیا تھا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ دروازے کو چھونا تک نہیں۔ اس معاملے کی وضاحت تو صرف اور صرف چوہدری دلدار ہی کر سکتا تھا۔

میں نے سلیم نامی اس مسلح محافظ جواب غیر مسلح ہو چکا تھا۔ اسے الوداعی انداز میں کہا ”تم نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے اس لیے تمہیں اس کا انعام ملنا چاہئے میں تمہیں جان سے نہیں گراؤں ہاں البتہ دو تین گھنٹوں کے لیے تمہارا ناتا اس دنیا سے کٹ جائے گا۔“

پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا میں نے بڑی سرعت کے ساتھ اسے بھی اسی سلوک کا حقیقی نمونہ چھوڑ دیا جس کا اس کے ساتھی چوہدری کے ساتھ کر چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس

نے نیند کے مارے کی فرماں بردار بیچ کی طرح گردن اڑا کر طرف ڈال دی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس کی پشت سے نیچے اتر آیا۔ اب میرا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ بالائی منزل پر میرے اور سائل کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ سلیم اور چوہدری سردست موجودات میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں کہ انہیں محض خبر نہیں تھی وہ اس وقت کہاں ہیں..... اور جہاں بھی ہیں وہاں مزید کئی دیر تک رہیں گے۔

اس احساس نے میری دھڑکن کو بے طرح بڑھا دیا کہ اب میرے اور سائل کے درمیان کوئی بھی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جانا تھا اور اپنی سائل سے جا لگتا تھا۔ ایک مہر آواز انتظار اور زبردست مار مار مار کے بعد وہ گھات گرفت میں آئے تھے۔

اس وقت میرا دل شوریدہ ہر سجدات سے لب پر ہوا۔ میں اپنی کیفیت کی حقیقت کو بیان سے کرنے سے قاصر ہوں۔ شاید کوئی بھی ان لحاظات کی تفصیل کو بیان نہیں کر سکتا۔ میرا دل وجود سمٹ کر ایک طوفان کی شکل اختیار کر چکا تھا جس کی موجوں میں بڑی تڑپ تھی۔ یہ موجیں بڑی شدت سے اپنے سائل تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ نے پہلے میرا دل سینے کا بنجرہ توڑ کر بند کمرے میں پھینک دیا تھا!

میں نے کارروائی زودہ کر کے کوچھوڑنے سے پہلے سلیم اور چوہدری کی کلاشکوف کو اپنے قبضے میں کیا۔ ان دونوں کے ہاتھ مضبوط پیلٹ بھی خشک تھے اور انہیں یہ آسانی ملنے لڑ پڑا جاسکتا تھا۔ میں نے پراہمری اسکول کے کسی بچے کی طرح ایک کلاشن کے پیلٹ میں سے گردن کو گزرا اور اسے کھدے پر سنبھال لیا دوسری گن میں سے ہاتھ میں لے لی۔ وہ دونوں ناگور اور پوری طرح لوڈڈ خطرناک گتھیں تھیں جن کی ضرورت کسی بھی موقع پر پیش آسکتی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا سائل کس حال میں ہوگی۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق اسے بے ہوشی کی حالت میں رکھاں والی سے لاہور پہنچایا گیا تھا۔ چاہیں ہی کسی خواب آہ دو کا اثر تھا یا خود اختہ وہ بیمار تھی! بہر حال واپسی کے راتے میں کسی بھی ممکن ترین صورت حال سے سامنا ہو سکتا تھا۔

میں نے کمرے سے باہر آکر راہ داری میں دونوں جانب حفاظت نظر سے دیکھا اور اپنے مطلوبہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ زیریں منزل سے کسی قسم کی آواز نہیں ابھر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہاں موجود لوگ پر سکون اور آرام سے

تھے۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ وہ وجدان کو پہچاننے میں پیادہ رہے ہیں اور اب فکر مند یا خطرے والی کوئی بات نہیں دینے بھی منتظر اپنے تئیں حواریوں کے ساتھ ”وجدان“ کے قاتل میں گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ یا نا کامیاب ہونا برداشت نہ کرتا چاہیے اس کے لیے اسے یہ رات کو کھٹی سے بڑھ کر اپنی زندگی کا خطرہ تھا۔ بہت ادھار کھائے بچا تھا جس کی وجہ سے چوہدری دلدار کی نظر میں اس کی سابقہ زندگی کا اثر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی صفائی میں کس بھی حد سے گزر سکتا تھا۔

اس بات کی امید کہ میری رات اس کو کھٹی میں کوئی سوکے۔ میری دہشت سے وہ انکار نہیں کر سکتے تھے اور ہاں طور پر نکلے وجدان نے وہاں انٹری دے کر صورت حالات کو بہت سنسنی خیز بنادیا تھا۔ جب تک منتظر اور اس کے ساتھ جانے والے واپس نہ آجاتے یا ان کی طرف سے کوئی خبر یہاں موصول نہ ہو جاتی ”کوئی کے کہیں چوہدری دلدار اینڈ کمپنی“ کو گتھیں لگا سکتے تھے۔ اور ویسے بھی ان لوگوں نے جانے اور چگانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دو پیشہ ور عورتیں وہاں نیند پوری تو نہیں کرنے آتی تھیں!

میری اس طویل داستان کو بڑھنے والے چند کارکن کا خیال ہے بعض اوقات میں کسی واقعے کی تفصیل میں بہت دور چلا جاتا ہوں جس سے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ غایت اگرچہ درست ہے لیکن بیان کردہ تفصیل کا تعلق میری سوجھ بوجھ سے نہ کہ کسی حالیہ منظر کی جزئیات سے۔ انسانی دماغ کے سوچنے کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک لمحے میں جانے کتنے واقعات دماغ سے اسکرین پر چل بچھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

بہر حال راہ داری کی صورت حال سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے بند دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا تا کہ وہ بند دروازہ کھولنے یا کھولوانے کا فیصلہ ہوتا لیکن میں نے جیسے ہی پینڈل کے لو کو کھینے کوشش کی ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

چوہدری راہ داری ایک مخصوص قسم کے سائرن سے گونجنے لگی۔ سائرن کا انداز ایسا تھا جیسے کوکھی کے کینوں کو کسی خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہو۔ عام طور پر ایسی برنگری سائرن اسی انداز میں شور مچاتی ہے جس۔

میں اس غیر متوقع صورتحال سے بوکھلا گیا۔ یہ ممکن نہیں تھا اس سائرن کی آواز چوہدری دلدار اور دیگر افراد تک نہ پہنچے۔ یہ سائرن تو اسی آگاہی کے مقصد سے نصب کیا گیا تھا۔ دروازے کے پینڈل کے ساتھ کوئی ایسی ”کاری غری“ کی گئی

تھی کہ چوہدری دلدار کے علاوہ اگر کوئی شخص اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتا تو فوراً بجڑ میں آجاتا۔ شاید اس لیے وہاں منتھیں گارڈز کو دروازہ چھوٹے سے منع کیا گیا تھا۔ وہ دونوں اس دروازے کی حقیقت سے ناواقف تھے یا یہ بھی ہو سکتا تھا سلیم کو اس سائرن کی اچھی طرح خبر ہو اور اس نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے یہ نکتہ مجھ سے چھپایا ہو۔ بہر حال سائل کو بڑے انتظامی انداز میں اس کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ وہ لوگ سائل کی اہمیت کو اچھی طرح جانتے تھے۔

جو کچھ میں نے بھولانے میں صرف کیا اس کے اختتام پر زیریں منزل بیدار ہو گئی اور بھگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ آوازیں بہ تدریج بالائی منزل کی طرف آ رہی تھیں۔ اب تک سب ٹھیک تھا مگر اس بد معاش سائرن نے بالکل آخری مرحلے پر گڑبڑ کر دی اور گڑبڑ بھی ایسی جس کی کوئی پوری کو کھٹی میں سنا ہی دے رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھ تک پہنچ پاتے میں نے زبردستی کمرے میں گھسنے کا فیصلہ کر لیا یہ فیصلہ سینڈز کے ہزاروں حصے کا کرشمہ تھا میں نے ہاتھ میں دہلی کلاشکوف کو کھٹی گردن پر سے گزرا کر گلے میں لٹکا یا پھر ایک طویل سانس کھینچی اور ”چی“ کی قوت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کیا پھر میں نے دروازے کے پینڈل کے نزدیک ہی ایک جھٹکے سے سانس چھوڑتے ہوئے ڈبل پینڈل پر آزمایا۔

میری ہتھیلیوں کی مربوط ٹھوک میں اس ہلاکتی قوت پوشیدہ تھی کہ دروازے کا لاک آن واحد میں ٹوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی فلش ڈور کا سنگل پٹ اس طرح کھلا جیسے کسی خونخاک سمندری طوفان کی زد میں آئے ہوئے بحری جہاز کا کوئی تختہ جدا ہوتا ہے۔ میں لپک کر کمرے کے اندر پہنچا اور بڑی سرعت سے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

دروازے کی پشت پر ایک مضبوط کنڈی نصب تھی جس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو بولٹ کر دیا۔

اسی وقت باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اب وہ لوگ دروازہ توڑنے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے اور اگر وہ واقعی ایسا کر گزرتے تو میں انہیں بھون کر رکھ دیتا۔ میرے بدن پر دو بھری ہوئی ہلاکت خیز کلاشکوف ہتھوں کی طرح بچھ رہیں جن کے استعمال میں کسی قسم کی مصلحت یا درپے کا وقت گزرا چکا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے سائل کی طرف بڑھ گیا لیکن..... میری جان تقنا اس کمرے میں موجود نہیں تھی!

یا ایسی! یہ کیا ہوا تھا؟ میں اس مایوس کن صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے چند سینڈز کے اندر اس کمرے کا

کہ ہونا چھان مارا لیکن وہ کمراسا مل کے وجود سے خالی تھا۔ اس کے درود یوار اور اس کے اندر موجودات سے ماحصل خوش ہوئیں۔ ”تی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے کسی خیر جگہ پہنچا کر رکھا گیا ہو۔ وہاں چھپنے اور چھپانے والا کوئی قصہ ہی نہیں تھا۔

اس کمرے کے اندر بڑائے نام سامان تھا۔ ایک اسٹینڈ پر دیوار کے ساتھ بڑے اسکرین والی دی رکھا تھا۔ اس کے سامنے والی دوسری دیوار کے نزدیک ایک صوفہ سیٹ نظر آ رہا تھا۔ ورنہ اس کمرے کے اندر مناسب روکنی کا بندوبست تھا۔ ان مختصر ترین لوازمات میں ”میں اپنی ماحول کو کہاں تلاش کرتا۔ وہ کوئی کبھی سوئی نہیں تھی کہ اسے کہیں بھی رکھ کر نظروں سے اوجھل کر دیا جاتا۔ میرا داغ اس صورت حال پر کھوم کر رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا، دروازے کو پشیمانہ سر دیا گیا تھا تو وہ لوگ واپس چلے گئے تھے یا پھر نا کامیاب ہو کر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور دروازے کے باہر تین موجود تھے۔ بے مہار شور بلند کرنے والا وہ بد معاش ساڑن بھی خاموش ہو چکا تھا۔ یقینی طور پر اسے آف کیا گیا ہوگا! اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاؤں، اسٹینڈ پر رکھے گی کی اسکرین روشن ہو گیا پھر اس روشن مستطیل پر ایک انسانی چہرہ نمودار ہوا۔

وہ بڑے جاہد جلال اور کزدر والا چہرہ تھا۔ کلوز اپ میں وہ شخص بڑا باعرب نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ نہیں کیے قریب لگایا۔ اس کے گیٹ اپ اور چلنے کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو نام چکا وہ چوہدری دلدار کا تھا۔ ازاں بعد اس کی تصدیق بھی ہوئی۔ چوہدری دلدار بڑی حد تک انٹرین فلموں کے ایک معروف ویلن سے مشابہ تھا۔

میں یک تک اسے دیکھنے چلا جا رہا تھا کہ وہ ڈیرلر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے بتادیا کہ اس وقت ہمیں بیضا وہ بھی مجھے دیکھ رہا ہے اور میری حیرت آمیز جھنجھلاہٹ سے محفوظ طبعی ہو رہا ہے۔ اچانک اس نے مجھے مخاطب کیا۔

”ویلن کم مسرودھان!“ اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی روایتی قسم کا ان پڑھ اور جاہل چوہدری نہیں جو صرف قلم کرنا جانتا ہے بلکہ وہ مجھے تعلیم یافتہ محسوس ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا ”اس طرح جو ہے دان میں چھپنے پر چھپیں اُس تو ہو رہا ہوگا لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔ فکار اور فکاری کا نہ تحلیل ایسے ہی قماشے دکھاتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رک کر پھر سگانے والے انداز میں بولا ”ڈیرہ وہ دھکے پہلے تم جھک دکھا رہا خائب ہو گئے تھے۔“ اس کا اشارہ یقینی قلمی وجدان کی

طرف تھا۔ میں تو کبھی سمجھا تھا کہ اب تم ادھر کا رخ نہیں کرنا۔ اسی لیے میں نے تمہاری تاش میں اپنے بندے دوڑائے ہیں۔

وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر سٹائیٹش نظر سے مجھے دیکھنے لگا اور بولا ”تم نے جس جی دارنی کا ایسی مظاہرہ کیا تھا، میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میرے دوسرے گارڈز کو تم نے پہلے سے اتنا غصیل کر دیا اور اس کمرے میں پہنچ گئے۔ چوہدری دلدار تم جیسے بہادر شخص سے مل کر خوش ہوا حالانکہ اس والے سے پہلے میرا خیال تھا، تم بہت ہی بزدل اور ڈرپوک ہو کر بھی، تم بھی کیا کرنا۔“ وہ ڈرپوک چپ سا لہجہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے تمہارے لیے چارہ ہی اتنا زبردست لگایا ہے کہ تم اس کی دوسو گیتے ہوئے ایک بار کیا، اور مرتبہ کیا، ہزار دفعہ ادا کر آؤ گے۔“

چارے سے اس کی مراد سامل تھی۔ میں سامل کے لیے اس قسم کی گھٹیا تنبیہ سے سلف اٹھا بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

”چوہدری دلدار! اگر تمہاری بکواس تم ہو چکی ہو تو مجھے بتاؤ، میری سامل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”فصیح کے بہت تیز اور زبان دراز بھی ہو۔“ وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا ”خوشن دی جی ہو اور غصہ ورنہ تو اس نے دو دو ہاتھ کرنے میں بڑا حیر آتا ہے۔ تم نہ کرو، میں تمہارے ہاتھ پاؤں بڑے سلی آمیز انداز میں توڑوں گا۔“

وہ ہینا مجھے غصہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے چہرے کے تاثرات کو بھی بخوبی ملاحظہ کر رہا تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ اس وقت کبیر شاہ اور فیصل بھی اس کے آس پاس موجود ہوں گے اور مجھے کسی ٹی وی اسکرین پر جھنجھلاتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔ میں جس کمرے میں کھڑا تھا اسے کلوز سرک ٹی وی نظام کی بدولت ہمیں اور دیکھا جا رہا تھا۔ چوہدری دلدار نے اس کمرے کو چوہے دان کا نام دیا تھا اس کا بھی مطلب تھا، وہ کمر خاص طور پر ایسی مقصد کے لیے ”تیار“ کیا گیا تھا۔ چوہدری دلدار نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے، معلومات افزا لہجے میں بولا ”میں نے یہ بکرا اپنے دھنوں کی بے خبری میں انہیں واضح کرنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کر دیا ہے اور یقیناً ضرورت میں ان سے رابطہ بھی کر لیا ہوگا جیسا کہ اس وقت تم سے بات ہو رہی ہے۔ اگر میں خود تم پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تو ٹی وی اسکرین روشن نہ ہوتا اور تم کوئی خراب ٹی وی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے مگر میں تمہاری

کوشش کرتا رہتا۔ اس کمرے اور کمرے میں نے وہ دیکھنے کے لیے میں نے چار مختلف مقامات پر انہیں نصب کر دیا بھی ہیں جو میری مرضی کے لیے وہاں کی تنصیل دکھائی ہیں۔“ وہ اس کمرے میں اپنی کمر کا ڈر کر رہا تھا جس کی بدولت یہاں کے یاد دہانے جات تھے ”میں نے ایک بہت بڑے خدمات حاصل کر کے یہ نظام نصب کروایا ہے۔ اس نے ٹی وی (ٹیلی کیوٹییشن) کے شعبے میں بہت انجام دیے ہیں۔“

قریب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔“ میں نے چڑ میں تاثر کٹ ٹی وی نظام اور اس کی کارکردگی سے نف ہوں۔

برہنات کو کسی ان سنی کرتے ہوئے بولا ”فرق ہے کہ آج سے پہلے میں اپنے فکار کو خود اس کمرے پر رکھتا تھا۔ تم پہلی مرتبہ از خود اس میں داخل ہوئے رفت داخل ہوئے ہو بلکہ تم نے اندر سے درازہ بھی ہے۔ میں چاہوں تو دروازہ بڑا کر کمرے کے اندر پہنچ جائوں میں خواہ اکی تو بڑا چھوڑا کا قائل نہیں۔ تمہیں اس سے باہر لانے کے میرے پاس ایک سو ایک طریقے ہیں اور میں خاموش رہا پھر تنبیہ کرنے والے انداز میں بہت ذہن میں رکھنا وجدان! از خود یہاں سے فرار نہ کرنا کہ نہ درندہ جان سے جاؤ گے۔ کمرے کے اپنے مقصد کن برداروں کو تنہا کر دیا ہے اور انہیں حکم دیا کہ انہیں دروازے سے باہر آنا دیکھتے ہی گولیوں کے طعنہ ذراں بردار ہوتے ہیں؟“

میں نے کمرے کے کمرے کے کمرے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی گیدڑ جھکیوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں ان گولیوں میں آنکھیں ڈالنے ہوئے کہا۔

جاؤ، ہوں، میری کے نیچے آیا ہوا فکار اس قسم کی ادھی اچھل کوا۔ ناہ۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہیں ہر نوعیت کی زور آزمائی کا مستحق ہوں گا۔“

مجھے اس وقت دو ہستیوں کی فکر نے گھیرے رکھا تھا۔ اول، سامل کہاں تھی؟ دوئم، صدف کیا کر رہی تھی؟ سامل اس کمرے میں نہیں پائی گئی تو اس کا بھی مطلب تھا، وہ ڈیریں منزل پر کہیں موجودگی اور صدف..... اس نے بھی کوئی میں کو نیچے والے خطرناک ساڑن کی آواز سنی ہوگی اور اس کے بعد وہاں چھنے والی انفارتی بھی اس سے پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک خاموش کیوں ہے! اس قسم کی صورت حالات میں تو اسے فوراً امید ان میں کودنا چاہیے تھا۔ میں اس کی طرف سے تشریش میں جھٹا ہوا۔

سامل کے لیے میری تشریش بھی اچھا کو چھنی ہوئی تھی۔ اس کو بھی کے بارہی اللہ رکھا ہے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق سامل کو کوئی کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا۔ سلیم کا بھی یہی بیان تھا لیکن سامل اس کمرے میں نہیں پائی گئی تو اس سے واضح ہو گیا، چوہدری دلدار بہت ہی گہرا آدمی ہے۔ وہ بعض حساس اور نازک معاملات کے بارے میں اپنے قریبی لوگوں کو بھی کچھ نہیں بتاتا۔ سلیم اور پرویز بڑی ترقی سے اس کمرے کے باہر پہرہ رے رہتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہیں دروازے کو کچھونے سے بھی منع کر دیا گیا۔ درحقیقت اس دروازے کے چینل کے ساتھ کوئی ایسا میکانیسم کا۔ کر رہا تھا جو ساڑن کو آہریت کرتا تھا۔ یہ فریکوئنسی اور الیکٹرکس کا دور ہے۔ اس قسم کے مکمل قماشے عام بات ہے۔

ایک مرتبہ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چوہدری دلدار میری سوچ تک پہنچ گیا ہو۔ اس نے معتدل انداز میں کہا ”اس کمرے کی مسٹری میں اچھنے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ، پھر بات کرتے ہیں۔“

دراصل وہ کسی دوسرے کمرے میں بیٹھا میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا اور چہرہ دل داغ کی کتاب کھلاتا ہے۔ وہ میری سوچ اور خیالات کو نہیں بلکہ میرے چہرے کو پڑھ رہا تھا اور تجویزیشن کے مطابق بالکل درست انداز سے لگا رہا تھا۔

میں نے کمرے کے کمرے کے کمرے کی تنقیدی جائزہ لیا۔ ٹیلی کیمراز مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ ظاہر ہے، وہ کیمراز اس لیے نصب نہیں کیے گئے تھے کہ ہر خاص و عام کی نظر ان پر پڑے۔ چوہدری دلدار کی آواز میری سماعت سے نکل رہی۔

”سلیم اور پرویز کی حالت تو میرے علم میں آ چکی ہے۔

تم نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن ابھی تک میرے خاندان اللہ رکھا کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس بے چارے بوڑھے کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا ہے؟“

میں نے زہر خنجر لہجے میں کہا ”چوہدری! تم ابھی تک اپنے اس آدمی کو بھولے بیٹھے ہو جو تمہاری گولی کے عقب میں گمرانی پر مامور تھا۔ وہ ہاں گندی گلی میں بے ہوش پڑا ہے۔ ذرا اس کی کیفیت بھی معلوم کرلو۔ میں نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا ہے، اسی سے ملتا جلتا سلوک اللہ رکھا کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔“

مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ عقبی گلی میں پڑے ہوئے، میرا نشانہ بننے والے شخص کا راز مل جانے کے بعد کیا ہوگا۔ میری سوچ ٹھوم پھر کر سامل کی طرف آ جاتی تھی۔

”تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی شاندار سلوک کیا جائے گا۔“ چوہدری اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے زہر لیے لہجے میں بولا ”میں ابھی رکھاں والی میں بڑے چوہدری صاحب سے فون پر بات کر دوں گا۔ تمہیں کل صبح یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر۔۔۔۔۔ کسی ایجو بیٹس میں ڈال کر۔۔۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ میں بڑے تلی بخش طریقے سے بے ہوش کیا جائے گا تاکہ تم کسی قسم کی گڑبڑ نہ پھیلانے۔ چوہدری نوازش علی صاحب تم سے برسوں کا حساب کتاب کریں گے۔ تم دراصل ان کے شکار ہو۔ ہم تو شخص ہانکا کر رہے ہیں۔“

بات کے اختتام پر وہ بڑے بے ہودہ انداز میں مسکرایا۔ میں نے ترکی بترکی جواب دیا ”تمہارا وہ بڑا چوہدری مجھ سے خائف ہے۔ میرا نام سن کر اس کا پیشاب خطا ہوتا ہے اسی لیے اپنے مہر دل کو آگے بڑھاتا رہتا ہے تاکہ میں اس سے دور رہوں اور اس کی گردن محفوظ رہے۔“

”چلو کوئی بات نہیں، اس بار تمہارا یہ شکوہ بھی دور ہو جائے گا۔“ وہ کمال ضبط بہ الفاظ دیگر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ”میرا خود تمہیں چوہدری صاحب کے پاس، ان کی خدمت میں پہنچا دیں گے۔ ویسے عجیب اتفاق ہے!“ وہ اپنے چہرے پر کمرہ تاثرات سجاتے ہوئے بولا ”تمہاری محبوب آج صبح تک چوہدری صاحب کی تحویل میں تھی۔ وہ چند دن وہاں رہی اور اچھے دامنوں لکھ گئی۔ ابھی، یہ اشاک۔۔۔۔۔ اور وہ بھی لائیو اشاک کا کاروبار بہت منافع بخش ہے۔ دس کروڑ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ تم بھی کچھ دن ان کے ”گودام“ میں رہو گے تو کروڑوں کا بڑس دے جاؤ گے۔ تمہارا ابھی کوئی نہ کوئی گاہک مل ہی جائے گا جیسے تمہاری محبوب

کے طلبہ ر سامنے آ گئے۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا۔ میرے جذبات کو کند جھری کے حوالے کرتے ہوئے بولا ”تو چوہدری صاحب کو کشورہ دوں گا، وہ اپنے دشمنوں کا سے ختم نہ کریں بلکہ ان کے گاہک تلاش کر کے تم کو کر دیں۔“

چوہدری دلدرا نے جتنی بک بک کر لی، میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کے اشاروں، کچھ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میرے اندر بیٹے صمد فیصلہ دور ثابت ہو رہے تھے۔ چوہدری نوازش علی نے میرے غصے دس کروڑ کی رقم حاصل کر کے سامل کو شیب غوری کے دور کیا تھا اور ایک نئی دوستی کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی۔ میں نے ٹی دی کے روشن اسکرین پر چوہدری دلدرا نفرت آمیز نظر سے گھورا اور بڑے ہی چار جانہ لہجے دریافت کیا ”میری سامل کہاں ہے؟“

”بھئی، جب رقم وصول کر لی جائے تو ڈیجیٹری ہو جاتی ہے۔“ وہ میرے زخمی کلیجے پر نمک پاٹی کرتے ہوئے بولا ”تمہاری محبوبہ کو کراچی روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا دار ہم نے تمہیں فریب کرنے کے لیے رچا ہوا تھا اور ہم اس میں کامیاب رہے۔ تم اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔“ ”تم کو اس کرتے ہو رحم و کرم کے بچے“ میں نے کہا ”سامل کہیں نہیں گئی۔ وہ اسی گولی میں موجود ہے۔ میں بہت جلد اسے تمہارے پیچھے سے نکال لوں گا۔“ جذبات کے جوش میں، میں خاصاً آؤٹ ہو رہا تھا۔ چوہدری دلدرا نے مجھ کو سیکڑتے ہوئے مجھ سے روکا۔

”کیا۔۔۔۔۔“

اسی گولی میں موجود ہے؟“ ”اس لیے کہ وہ تمہاری ماں کا عصم کبیر شاہ تھا۔ تمہارے آس پاس ہی کہیں بیٹھا ہے۔“ میرا دماغ اس کے مانند دھک رہا تھا۔ ”وہ کسی حرامی کی اولاد میری سام رکھاں والی سے لے کر لاہور پہنچا ہے اور یہاں سے خود اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔ تمہارے بڑے چوہدری بڑا پلانٹ جگر فیمل بھی ان کے ساتھ یہاں آجائے۔“ ”کے ساتھی پر دو کو تو میں نے لہا لٹا دیا ہے۔ اب تمہیں میری یقین کی وجہ مجھ میں آگئی ہوگی؟“

”تم نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ معلومات کر لی ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ”لیکن اس میں سے بعض معلومات ناقص اور بدستور

ہی ہے جو میں نے تمہیں بتادی۔ تمہاری محبوبہ کو آج تاجے یہاں سے روانہ کیا گیا ہے۔ تمہیں میری بات نہ پونہ شیب غوری سے رابطہ کرلو۔“

”میرا یہ نقد تا نقد بین کبیر شاہ تمہاری بغل میں بیٹھا ہے؟“ میں نے عمارت سے لبر لبر لہجے میں کہا ”کیا ہے؟“

”میں نے چھپانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ ”پکارنے والے انداز میں بولا ”میں نے کہا نا، یہ اندازے اور معلومات بعض مقامات پر بہت رومی رہتی ہے کل چار افراد یہاں پہنچے تھے۔ کبیر شاہ اور کام رکھاں والی اور لاہور کے درمیان مال کی ترسیل برقرار رہتی دو افراد ”مال“ کو لاہور سے کراچی لے کر کراچی کی تیز رفتار زندگی کا مارا ہوا شاہ جی کچھ عرصہ باقیام کر کے اپنے اعصاب کو سکون پہنچانا چاہتا ہے۔“

کی بات ہے؟“ ”مجھے کیا وہ مجھے سیدھی بات کہی نہیں بتائے گا اور میں کام رکھاہر معلومات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لمحے دلدرا نے فیصلہ دیا کہ جیسے بھی ممکن ہو مجھے چوہدری رن سے باہر آنا ہے اور اس کا پھیلاؤ زریعہ یہ تھا کہ درمیان میں کیونٹی کشن کا سلسلہ متوقف ہو جاتا۔ زہری طور پر ان میں کبیر شاہ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا جن مانگے اور اس کمرے کو کسی دوسری جگہ نشتر کیا جا رہا تھا۔ ہر حال یہ میرے اختیار میں تھا کہ اس کمرے میں گھپ کر کے کبیر شاہ کی آنکھوں کو ”پھوڑا“ دوں۔ دنیا کی کوئی گولہ باز وہ دیکھنے کے لیے روشنی کی محتاج ہوتی ہے۔ اگر ہر کسے کی لائٹ بجھا دیتا تو چوہدری دلدرا بے بسی کے سہم ڈوب جاتا۔

”یاد رہے یہاں میں نے ہوا میں پرواز کی اور روشنی کے گاہک کیا۔ اس لائٹ کا جن کمرے میں موجود نہیں تھا۔“ ”نہ ایک زور دار جھپٹا زور رسید کر کے اسے فارغ کر کے ساتھ ہی چوہدری دلدرا کے چودہ بلتی گل

گہرائی سے ہوئے لہجے میں بولا ”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا ہے؟“

”تمہاری ماں کا سر کر رہا ہوں۔“ میں نے ٹی دی کے کمرے پر جو جو اس کے فرعون کی چہرے پر تھکتے ہوئے میرے جڑی تار کی چھانے کے بعد وہ مجھے واضح کر دی ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ”لیکن اس میں سے بعض معلومات ناقص اور بدستور

تھا۔ وہ دھمکی آمیز انداز میں غزایا ”تم بہت برا کر رہے ہو دجہان!“

”اس برائی میں کچھ اور بھی شامل کرلو۔“ میں نے تمسخرانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی اور بکواس کرتا، میں نے اپنی جگہ سے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور میری طوفانی سائیڈ کلک نے ٹی دی کے روشن اسکرین کو چمکا چور کر دیا۔ میری کلک میں لا محدود دم و غصہ شامل تھا اور میں نے وہ کلک بٹنا چوہدری دلدرا کے خبیث چہرے پر رسید کی تھی۔

چھانے کے ایک تیز آواز کے ساتھ کرا گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆ ☆ ☆

یہ وہی کھڑکی تھی جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے اس کمرے میں آنے سے روک دیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کھڑکی اندر سے بندھی اور میں باہر سے اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھا لیکن اب صورت حال یکسر مختلف تھی۔ میں کمرے کے اندر بند تھا اور با آسانی کھڑکی کھول کر باہر جا سکتا تھا۔

باہر جانے کے لیے تو میں کمرے کا دروازہ بھی استعمال کر سکتا تھا لیکن اس دروازے کی دوسری طرف موت اپنے خوفناک جبرے کو لے کر میرا انتظار کر رہی تھی۔ خواہ مخواہ خود کو ہلاکت میں ڈالنا بے وقوفی ہوتی۔ دوپہری ہوئی کلا شکوہ زہر میرا قبضہ تھا لیکن اگر فیس نو فیس گنو کے دہانے مل جاتے تو دونوں پارٹیز کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں اس کمرے میں زیادہ دیر رک کر اپنے لیے کوئی نئی مصیبت نہیں خرید سکتا تھا۔ اس صورت حال میں وہ تاریک کرا میرے لیے دائمی ایک چوہے دان ثابت ہوتا۔

میں نے اندھیرے میں اندازے کی انگلی پکڑی اور سبک قدمی سے اس دیوار کی طرف بڑھ گیا جس میں مذکورہ کھڑکی موجود تھی۔ مجھے اس کام میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ روشن کمرے میں، میں نے کھڑکی کی لکھن کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں وہ کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ چھت کے اوپر سے لٹک کر میں یہ اندازہ کر چکا تھا کہ کھڑکی اور چھت کی مڈر میں صرف چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے کھڑکی کا ایک پٹ دیکھا اور اپنے بدن کو بڑی مہارت سے، کھلی ہوئی کھڑکی میں سے گزار کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں عمارت سے باہر تھا۔ اس وقت میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں چھت کی مڈر پر کھڑک اور پہنچ جاتا، یا پھر

بچے کو کہ میرے نک رسائی حاصل کر لیتا۔ میں نے دوسری راہ کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔

میں کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ میں بیٹھ گیا پھر فریم پر ہاتھ جھا کر میں نے اپنے جسم کو نیچے گرا دیا اس طرح کھڑکی میں لٹکے سے میرے اور میرے قدموں کے بیچ فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ جھٹ سے لٹکتا ہوا تو میرا قد ہی تھا اور لٹکتے وقت بازوؤں کی لمبائی بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ مجھ پر کسی کی نظر پڑتی، میں با آسانی میرے پر ہاتھ کیا۔ اسی لمحے مجھے کھڑکی کے عقبی حصے میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ پائین باغ کی طرف سے کچھ اس قسم کی آوازیں ابھری تھیں جیسے دو افراد آپس میں جھگڑ رہے ہوں۔ صدف کو میں موڑنے والے ایک شینڈ کے نیچے چھوڑ آیا تھا اور وہ شینڈ اسی پائین باغ میں تھا۔ لگتا تھا، ایک طویل انتظار کے بعد وہ شہر کی بنی میدانِ حرب و ضرب میں اتر آئی تھی۔

اس کھڑکی میں لڑائی بھڑائی کے ماہر شیطان صفت انسانوں کی کمی نہیں تھی۔ صدف کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں تیرہ قدموں سے دوڑتے ہوئے صدف کی جانب بڑھا۔ میرے خاصا وسیع و عریض تھا اور بالائی منزل کو زیریں منزل سے ملانے والا زینہ بھی اسی طرف کھٹکتا تھا آٹھ بجوئی کا وقت گزر چکا تھا لہذا میں نے نیچے جانے کے لیے زینے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ایک کلاشکوف کو میں نے تیار حالت میں اپنے ہاتھوں میں کر لیا تھا۔

میں جیسے ہی زینے کے قریب پہنچا، دو افراد سے سامنا ہو گیا۔ وہ دونوں ملازم صورت اور مسخ تھے۔ سلیم نے شاید انکی دو محافظ افراد کو ذکر کیا تھا۔ وہ دونوں میرے ہاتھوں میں دلی کلاش کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے پھر ایک نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ زیر میری جانب سیدھا کیا۔

اس کا اندازہ ایسا ہی تھا کہ فوراً مجھے شوٹ کر دے گا مگر میں نے اس کے ارادے کو ناکامیاب بنادیا۔ اس نے جیسے ہی فائر کرنا یاہا، میں ایک بیک فائر روئل کرتے ہوئے دھڑام سے فرش پر گر ا۔ کوئی میرے بدن کے اوپر سے گزر گئی۔ میں جس انداز سے چٹ کر اٹھا، وہ بھی سمجھا کہ اس نے مجھے ہجر کا دیا ہے۔ اس کے اس خیال کو تار بیک نے تقویت پہنچائی اور وہ بے خوفی سے میرے نزدیک آ گیا۔

پھر اسے اس نعلی کا بڑا بھیا کھیا خیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ میرے پاس آ کر مجھے دیکھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ میں نے کسی اہم رنگ کے مانند اپنے جسم کو میرے فرش سے اٹھایا اور اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے دوسری طرف بچھ گیا۔

وہ اس صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا ایک چت پڑا مردہ (اس کی دانست میں) کسی صورت طرح اس کے اوپر سے پرداز کرتے ہوئے گزرنے کی بڑی سرعت سے چلتا اور بے دریغ مجھ پر فائرنگ کر رہا تھا اس نے کئی فائرنگ کی لپیٹ میں اس کا سامنے آ گیا۔ اس نے اسے اور بھی وحشت زدہ کر دیا کیونکہ اس کا فائرنگ ہاتھ کھلے ہوئے شمشیر کے مانند زمین پر بوس ہو گیا تھا۔

میں نے اس کی وحشت سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے اسے کہہ میری جانب متوجہ ہوتا، میں نے اپنے ہاتھ میں کلاشکوف کا ہٹ اس کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ وہ اس پر ضرب کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ اپنے سر کو تمام کر لے کر زمین پر ایک پیش لگ مار کر اسے دور پھینک دیا۔ اس کا درد میں مشکل سے میں سیکند صرف ہوتے ہوئے تھے۔ ان دونوں محافظوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اس سحر کے میں، میں نے دشمن کے دو افراد ناکارہ بنادیا تھا۔ میں ممکن تھا کہ فائرنگ کی زد میں آئے، ریلوے بردار شخص دینائے دیگر میں بچھ چکا ہو۔ وہ دینا چا جا کر کوئی دوا نہیں آتا۔

کھڑکی کی زیریں منزل پر خاص افراتفری کے آثار ہورہے تھے۔ میری معلومات کے مطابق وہاں اب چار دلدرا، کیر شاہ، فیصل اور دو پیشہ ور بوٹوں کے سوا کوئی اور نہیں بچا تھا یا پھر میری سامنے صدف بھی جو کہ قلم اٹھ معرکہ آرائی میں مصروف تھی۔

میں نے زیریں منزل پر قدم رکھا تو عورتوں کے بیچے آوازیں میری سماعت تک پہنچیں۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھری۔ کوئی اس سمت آ رہا تھا۔ ایک کر ایک ستون کی آڑ میں بچھ گیا۔

اسی وقت فائر کی آواز کوئی اور ستون کا بلا طبع میرے سر پر گر ا۔ اس کا مطلب یہی تھا، مجھے وہاں پہنچنے دیکھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ میں کو ستون کی آڑ میں سینے ہوئے آہستہ آہستہ چھپ گیا۔ کیا اس دوران میں دھتکہ مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرے گی جس کے نتیجے میں دوسری طرف کا بلا طبع کھڑکی پر ہونے کیونکہ اس وقت تک میں مکمل جھک چکا تھا اور میرے بردار ہاتھ فرش کے قریب بچھ چکے تھے۔ فائرنگ کرنے کے زاویے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری ہی طرف سے واقف نہیں تھا اور نہ وہ میرے سر کی بلندی پر فائرنگ کر رہا تھا۔ میں ساری عمر اس ستون کی آڑ میں چھپ کر رہا۔

تھا اس لیے جوانی کا ردوائی ضروری ہو گئی۔ آگے بڑھنے کے لیے ایٹ کا جواب پھر سے دینا ضروری تھا۔ میں نے اسی جگہ ہوئی پوزیشن میں رہتے ہوئے کلاشکوف کی نال کار گھمایا اور اپنے عقب میں ایک طویل برست فائر کر دیا۔

اسی لمحے فضا کرناک چٹخوں سے کوئی اٹھی پھر ان چٹخوں میں گالیوں بھی شامل ہوئیں وہ گالیاں میری طرف ارسال کی جارہی تھیں اور جیسے والے کی بھجلاہٹ آ میرا آواز بھی میں نے پہچان لی۔ وہ کیر شاہ تھا جو میری فائرنگ سے شدید زخمی ہو گیا تھا۔

میں ستون کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے کسپری کی حالت میں نظر آیا۔ اس کے جسم کا زیریں حصہ بری طرح زخمی تھا اور وہ وہاں سے خون جاری ہو چکا تھا۔ وہ انفس ناک حالت میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اس کی نال کار رخ اس کے سینے کی جانب رکھا اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے ٹھوڑے فاصلے پر مجھے وہ مدلل بھی نظر آ گیا جس کی مدد سے اس نے دو بار مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے مذکورہ مدلل کو اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور کیر شاہ کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ از خود فرش سے اٹھنے کی پوزیشن میں پہلے بھی نہیں تھا، میرے پاؤں کی دھتکے نے اسے جڑ سے پھینک دیا۔ اس کی آڑ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے نفرت کی چند ریاں دکھائی دیں۔

میں نے اس کی منحوس صورت پر تھوک دیا پھر زہرے انداز میں کہا "کیر شاہ! تم اپنے پرائیویٹ باپ چوہدری دلدرا کے پاس چند دنوں کے لیے آرام کرنے آئے تھے۔ اب پاپا ہو کر آئے آرام کے لیے ادھر ہی پڑے ہو۔ تم دو چار ماہ میں ٹھیک ہونے والے نہیں ہو۔ اگر تم زندہ بچ گئے تو میں کراچی پولیس کو تمہارے اسی سیاسی ٹھکانے پر بھیج دوں گا۔ وہ لوگ ساؤتھ والے چھاپے کے بعد بڑی شدت سے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔"

"تمہیں پاس کی طاقت کا اندازہ نہیں دیا۔" وہ دانتوں بردانت جھانکتے ہوئے بولا "تم کسی عمل میں چھپ چکے ہو، وہ تمہیں شکار کر لے گا۔"

میں نے نفرت سے اسے گھورا اور پوچھا "تم کس پاس کی بات کر رہے ہو۔ شیب غوری یا چوہدری دلدرا... یا پھر چوہدری نواز علی؟"

اس نے جواب نہیں دیا، برہمی سے بولا "تم یہاں سے زندہ نہیں جاسکو گے۔"

"کیر شاہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تمہارے کالے کروتوں کی فہرست تو اتنی طویل ہے کہ "انعام" کے طور پر تمہیں دیکھنے ہی کیوں ہے چھٹی کروڑ پانچ سو تین میں تمہیں اس طرح جہنم واصل کروں گا کہ تم زندہ رہو اور پھر عذاب رہو۔ دیکھنے والوں کے لیے تم عبرت کا نمونہ بن جاؤ۔"

پھر میں نے اس کے ٹھنوں اور نختوں پر فائرنگ کی اور بڑوں کا چکر کھال دیا۔ کو لمبے کے جوڑے۔ ساتھ ہی میں نے کچھ اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ کلاشکوف کا میٹرین خالی ہو گیا۔ میں نے بھری ہوئی گن اپنے ہاتھ میں کر لی اور بیکار گن کو اتار پھینکا، پھر میں کیر شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب وہ بڑی زندگی اپنے قدموں پر چلنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا اور نہیں ممکن تھا، ہر نوعیت کے آپریشن میں ناکامیاب ہو کر ڈاکٹر زاس کی دونوں ٹانگیں باقی جسم سے علیحدہ کر دیتے۔ وہ شہر کی زندگی بنانے کے لیے ڈاکٹر زکون بعض اوقات ایسے سنگین فیصلے بھی کرنا پڑتے ہیں۔

کیر شاہ درد کی شدت اور وحشت کی انتہا کے باعث بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس کے سینے پر سے اپنا پاؤں ہٹایا اور اس کے سر پر ایک ٹھوک رسید کرتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"اگر تمہاری سماعت میں زندگی کی ایک رمت بھی باقی ہے تو سن لو اور آنکھوں میں ایک جھلک دیکھنے کی سکت موجود ہے تو دیکھو، میں یہاں سے زندہ سلامت جا رہا ہوں۔"

میں نے اس کی بات سنی ہوئی تھی کہ سامنے سے دوڑتے ہوئے قریب کی آواز ابھری۔ میں نے ایک جھلکے سے کلاشکوف کو اس سمت اٹھا دیا لیکن فائرنگ کی نوبت نہیں آئی۔

وہ دو عورتیں تھیں جن کے جسم پر ناکانی لباس نظر آ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، انہوں نے ہنگامی حالات میں خود کو ڈھانکنے کی کوشش کی تھی۔ کلاشکوف کی خطرناک نال اپنی جانب اٹھے دیکھ کر وہ ہسم گئیں۔ ایک نے دھت آ میرا آواز میں کہا۔

"خت... تم دونوں جو کوئی بھی ہو، ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہمیں جانے دو۔"

اس پیشہ ور عورت نے لفظ "دونوں" استعمال کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ صدف کی وہاں موجودگی سے آگاہ تھی۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ہم دونوں تمہاری کیا مراد ہے؟"

اس مرتبہ دوسری عورت نے جواب دیا "تمہاری سامنے"

لو کی اس طرف ایک شخص سے مقابلہ کر رہی ہے۔ ہم نے بھی اندازہ لگایا ہے، تم دونوں کی اس کوٹھی کے کینوں سے کوئی زبردستی کا معاملہ ہے۔ تم لوگ ہمیں اس آگ میں نہ جھونکو۔ ہم فوری طور پر اس کوٹھی سے نکلنا چاہتے ہیں۔“

اس کی سامنے سے بھی جانے کی بات کی تھی۔ میں نے پوچھا ”تم دونوں آدمی رات کو کہاں جاؤ گی؟“

”ہم آدھی رات کو پوری رات کا حساب نہیں کرتے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولنے لگی ”ساری رات آنا چانا لگ رہا ہے۔ دے دیے اس وقت ہم سیدھے اپنے اڈے پر جا میں گے۔“

”اس حالت میں؟“ میں نے سر تاپان کا جائزہ لیا۔

”یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔“ اس نے مخصوص انداز میں آٹھ دپائی ”لفٹ دینے کے لیے کوئی نہ کوئی مہربان مل ہی جائے گا۔ دیے ہمارا ڈاکٹر ایسا ہی زبردادہ نہیں۔“

اندھیرا گناہ کو جنم دیتا ہے اور برائی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ وہ دونوں اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس کوٹھی پر رات جگانے اور کچھ پیسے کمانے آئی تھیں۔ مجھے ان سے اور ان کے پیسے سے کوئی مطلب نہیں تھا اس لیے انہیں روکنا یا کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچانا مناسب نہ سمجھا تاہم ان کے جانے سے پہلے یہ ضرور پوچھا۔

”تم لوگوں کا میزبان کہاں ہے۔ اسے چاہیے تھا، جہیں چھڑانے کا بندوبست کرتا۔“

وہ طنز سے لہجے میں بولی ”چہ بدری دلدرا اس وقت اپنی جان چھڑانے کے بندوبست میں لگا ہوا ہے۔ تمہاری سامنے نے چہ بدری اور اس کے نوجوان مہمان کوٹھی کا ناچ نچا رکھا ہے۔“

دوسری نے کہا ”جب کوئی مصیبت آتی ہے تو انسان سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے یا پھر اپنے پیاروں کے بارے میں۔ ہم نہ تو چہ بدری کے اپنے ہیں اور نہ ہی پیارے!“

میں نے انہیں دہانے سے جانے کی اجازت دے دی۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا، صدف چہ بدری اور فیصل سے نبرد آزما تھی۔ اب ویسے بھی وہی دونوں اس کوٹھی میں باقی بچے تھے۔ کبیر شاہ عالم جو اس سے خاصے فاصلے پر جا چکا تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی کہ چہ بدری نوازش علی کے بیٹے فیصل نے مارشل آرٹس میں بہت محنت کر رکھی تھی لیکن صدف کی سابق کارکردگی بھی میری یادداشت میں محفوظ تھی لہذا میں چہ بدری دلدرا اور فیصل کو صدف کے رحم و سہلو پر چھوڑ کر ساحل کی تلاش میں زیریں منزل کی ہمدردی تلاش لینے لگا۔ اس

دوران میں کوٹھی کے کسی قریبی حصے سے بیگ اور اٹھانچ کی آوازیں آتی رہیں۔

کوئی مارشل آرٹس جب کسی پر ایک کرتا ہے تو وطن سے ایک تاثر انگیز آواز نکالتا ہے۔ اس مخصوص آواز کو YELL کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ اتنی ہیبت ناک ہوتی ہے کہ مد مقابل کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ ایک سپارٹس مارشل آرٹس بیگ کر کے فضا میں خود پرواز کی پرندے کو خاک چاٹنے پر مجبور کر سکتا ہے!

میں نے اس کوٹھی کا ایک ایک کمرہ اور کمرہ کا ایک ایک گوشہ جھانک لیا لیکن کہیں بھی میری ساحل نظر نہ آئی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں کینٹن عظیم چہ بدری دلدرا کی منوس بات روشن ہو گئی کہ آج سہ پہر تین بجے ساحل کو کراچی روانہ کر دیا گیا تھا۔ میں اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ لوگ پانی روڈ گئے ہیں یا پانی اڑا! بہر حال، اس وقت یہ سوچنے ہوئے میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اگر ساحل کو واقعی آج تین بجے سہ پہر یہاں سے رخصت کر دیا گیا تھا تو پھر وہ مجھ سے لگ بھگ نو گھنٹے کے فاصلے پر جا چکی تھی اور..... اگر انہوں نے پانی اڑ سزا کرتا تھا تو اس وقت میری شرگ شیب غوری کے خنجر کی دھارت سے پہنچ چکی تھی!

اس احساس نے میرے رگ دے میں چنگاریاں سی بھردیں۔ میں ایک مرتبہ پھر ساحل کے قریب پہنچ کر اسے کھوپکا تھا۔ درد کی شدت نے میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ تو وہی بات تھی کہ منزل پر پہنچ کر انسان منزل کا نشان کھودے۔ میں ان شکست خوردہ لحاظ میں جس اذیت سے گزر رہا تھا اسے بیان کرنا ممکن نہیں۔

اسی وقت دیوار کی دوسری جانب مجھے کسی عظیم الشان معرکے کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی بھاری بھر کم شے اس دیوار سے آ کر ٹکرائی تھی۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، اس طرف صدف معرکہ آرا تھی۔ ساحل کی تلاش میں بس وہی ایک کمرہ بچا تھا۔ ورنہ میں نے ہر طرف دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنے اور دروازے کے درمیان حائل فاصلے کو دوڑ کر طے کیا اور دروازے کے قریب پہنچ کر خود کو وہاں میں بند کر لیا پھر اگلے ہی لمحے میری رائٹ سائیڈ فلائنگ کلک نے چولی دروازے پر دھواں دھار ”دنگ“ دی۔ اس دنگ کے نتیجے میں وہ دروازہ جھٹ سے کھلا اور میں کمرے کے اندر پہنچ کر پٹ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا گیا۔

وہ ایک وسیع دھریض ہال نما کمرہ تھا۔ اس کشادہ کمرے کے ایک عظیم منظر نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ صدف

کمرے کے وسط میں کھڑی بری طرح تھپ رہی تھی۔ اس کے بازو ایک جگہ سے سفید سونے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ زخمی تھی۔

میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند اس کی جانب لپکا۔ اس کے زخمی بازو نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔ اس وفا شعار لڑکی نے وہ ساری مار مار میری خاطر کی تھی۔ اپنی جان کو دہانے میں ڈال کر وہ میرا ساتھ دے رہی تھی اور اس طرح دہائی بھاری تھی کہ کوئی کیا نہ بھائے گا!

مجھے اپنی جانب ہڑتاد کچھ کر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بڑی دھڑکی کے عالم میں میرے گلے آ گئی۔ اس کی اس جذباتی خواہش کی تکمیل کے لیے مجھے تھوڑا سا جھٹکانا پڑا۔ اس نے مجھے اتنی مضبوطی سے دبوچ لیا کہ جیسے خطرہ ہو، اگر اس کی گرفت دھکیلی پڑی تو میں بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔

میں اس کی دلی کیفیت سے بخولی آ گا تھا لہذا اس جاں نثار ساتھی کے لیے مجھے خود کو فراموش کرنا پڑا۔ میں بھول گیا، کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر آیا ہوں اور کس مقصد کے لیے آیا ہوں؟ اس ہال نما کمرے میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے اور وقت جیسے ٹھم کر رہ گیا تھا۔

اگر وقت آگے نہ بڑھے تو تاریخ رقم نہیں ہوتی، کوئی واقعہ کوئی ساختہ تاریخ کے ریکارڈ میں نہیں آتا شاید اسی لیے یہ ظالم اپنی مخصوص رفتار سے دھیرے دھیرے آگے ہڑتاد رہتا ہے اور ہماری یہ خبری میں یہ ہمارا اچھا برا ریکارڈ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم جا رہے ہیں اسے تسلیم کریں یا نہ کریں!

اگر چہ ہمیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وقت ٹھم گیا ہے لیکن یہ ہماری بے خودی اور خود فراموشی کا شمر تھا ورنہ یہ شرط تو لمحہ بہ لمحہ اپنا راستہ پا رہا تھا اور اس دوران میں یہ ہماری تاریخ بھی رقم کر رہا تھا کہ ہم نے..... ہم دونوں نے اپنی زندگی سے چھڑائے ہوئے کتنے لحاظ کن حالات میں گزارا ہے، کس نے کس کو کس کیفیت سے گزارا اور کون کون احسانات سے آشنا ہوا؟ حال کا گزرا ہوا ہر لمحہ۔ شے میں بدل رہا تھا۔ ایک دوسرے کی قربت میں بتائی ہوئی یہ ساتھی امر ہو رہی تھیں۔ ماضی کو بدلتا کس کے اختیار میں نہیں!

آتشائی اور آگاہی کی صفات رکھنے والے خود فراموشی کے دھمکتے دیر پا ثابت نہ ہوئے اور ہم دونوں واپس آ گئے۔ صدف کا بدن جذبات کی شدت سے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی پر ایک سجاوہ شبت کیا اور تھپکنے والے انداز میں اس کے کندھوں کو سہلانا لگا، وہ بکھری ہوئی

آواز میں بولی۔

”وہ جان! میں نے مار ڈالا..... تمہارے دودھنوں کا صفایا کر دیا۔“

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا، پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے دوسرے کمرے میں اس کے کارنامے کی آوازیں سنی تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اس ہال نما کمرے میں نظر دوڑائی۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے صدف کے سوا کسی شے پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ایک دیوار کے نزدیک مجھے چہ بدری دلدرا بے سادہ پڑا دکھائی دیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک نوجوان بھی زہیں یوں تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ چہ بدری نوازش علی کا سپوت فیصل تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں صدف کے الفاظ گونجنے لگے.....

وہ جان، میں نے مار ڈالا..... تمہارے دودھنوں کا صفایا کر دیا۔ تو کیا چہ بدری دلدرا اور فیصل جنم مکانی ہو چکے تھے؟ اس تیشی خیز سوال سے میرے قدموں میں جنبش پیدا ہوئی اور میں لپک کر چہ بدری دلدرا کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے بغور اس کا معائنہ کیا لیکن کوئی بھی داخل ساکن میری پکڑ میں نہ آ سکا۔ میں کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھا کہ اس کی موت کا تشکیلات جاری کر دیتا تاہم مجھے نالوے فیصل یقین تھا کہ چہ بدری دلدرا اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔

میں جلدی سے فیصل کے قریب آیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ میں نے اس کے جسم میں زندگی کو تلاش کر لیا۔ فیصل کا سر شدید زخمی تھا اور وہاں سے خون بھی نکل رہا تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں جس بھاری بھر کم شے کو دیوار کے ساتھ ٹکراتے تھا، وہ فیصل ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے صدف کی طرف مڑتے ہوئے کہا ”فیصل زندہ ہے لیکن چہ بدری کی زندگی کے امکانات معدوم ہیں۔“

پھر میرا دھیان صدف کے زخمی بازو کی طرف چلا گیا۔ اس کے ہاتھیں بازو پر کہنی سے ذرا اوپر والا سونے کا حصہ خون آلود نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے زخمی بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”یہاں کیا ہوا ہے صدف؟“

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ”کیا ساحل کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“ میں نے دھکی دل کے ساتھ نفی میں گردن ہلائی ”کم از کم اس کوٹھی کے اندر تو وہ مجھے کہیں نہیں ملی۔ میں نے زیریں اور بالائی دونوں منزلیں چھان لی ہیں۔“

وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی ”وہ مجھے بھی کہیں دکھائی نہیں دی۔“

”لیکن تم تو اسے شکل و صورت سے نہیں پہچانتی ہو؟“  
”جہیں تو پہچانتی ہوں!“ وہ بے ساختہ بولی۔

اس نے ذہنی جواب دیا تو میں ٹڑکایا پھر دوبارہ اس کے بڑے بازو کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا، فیصل نے خنجر کا وارڈ کر کے اسے زخمی کر دیا تھا۔ ازاں بعد صدف نے وہ خنجر فیصل سے چھین کر پائیں باغ کی تاریکی میں نہیں پھینک دیا تھا۔

”میرا خیال ہے، کوئی سیریس زخم نہیں ہوگا۔“ وہ زخمی بازو کو دہاتے ہوئے بولی ”ورنہ میں تکلیف کی شدت سے بے مال ہو جاتی۔“

ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔ اس کا مطلب تھا، وہ ”سب ٹھیک ہے“ کی ادا کا یہی کر رہی تھی ورنہ اس کے بازو میں ابھی خاصی تکلیف موجود تھی۔ خون کا پھیلاؤ دیکھی یہی ظاہر کرتا تھا۔

میں نے کہا ”تم اپنے بڑے بازو پر سے سونکر کو پار اٹھاؤ۔ میں زخم کا جائزہ لیتا ہوں۔“

میرے انداز میں حکم کی اجازت تھی۔ صدف نے ایک لمحہ متاملانہ نظر سے مجھے دیکھا پھر وہ آہستگی سونکر آستین کو اوپر اٹھانے لگی۔ اگلے ہی لمحے اس کا موی بازو میری نگاہ میں چمکا مگر میں اس بازو کی حیاتیات صفات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ بازو کے خطرناک کٹ نے میری تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔

”اوہ! یہ تو خاصا گہرا کٹ ہے!“ میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

وہ جڑے پھینٹے ہوئے بولی ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
”خود بے خود کچھ نہیں ہوتا۔“ میں نے اس کے زخم کو سمجھا پھر اسے دیکھا ”تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“  
”ظہر د!“ میں اسے چودڑ کر کے میں کچھ تلاش کرنے لگا ”فنی“  
الحال اگر تمہارے زخم کو کسی کپڑے سے باندھ بھی دیا جائے تو کام چل جائے گا۔ ٹریسٹ بعد میں ہوتا رہے گا۔“

جلد ہی مجھے چادر نما ایک کپڑا مل گیا۔ میں نے اس کپڑے میں سے مناسب لمبائی کی ایک پٹی چھادی اور اس کے اسے صدف کے زخمی بازو پر باندھ دیا۔ اس طرح کم از کم خون کا اخراج تو بند ہو جاتا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ایک مرتبہ سبھی ساحل کو اس کوئی میں تلاش کیا لیکن اس تلاش کا نتیجہ بھی صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ چوہدری دلدار نے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ یہی ساحل کوہ

میرے زباں پہنچنے سے پہلے ہی بنادیا گیا تھا۔

اس کوئی میں اب ہماری دیکھی کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرا دل یہاں پسپ تھا جب وہ ہی نہ تو کیا فائدہ۔ کوئی میں اوپر بیٹے کو بھی شخص ایسا نہیں تھا جو ہماری راز داری کا کٹ بتا۔ ”سب اپنی اپنی“ ”خیز“ میں تھے!

صدف نے پوچھا ”مجھ میں نہیں آ رہا، ان لوگوں نے ساحل کو کہاں بھیج دیا؟“

”میری سمجھ میں آ رہا ہے۔“ میں نے عجیب آواز میں کہا۔

اس وقت ہم دوبارہ اس ہال نما کمرے میں آ چکے تھے جہاں چوہدری دلدار اور فیصل مذکورہ حالتوں میں پڑے تھے۔

”تمہاری سمجھ میں کیا آ رہا ہے؟“ ”صدف نے پوچھا۔

”وہ اب تک میرے، ساحل، شیب خوری، چوہدری نوازش علی اور دو دیگر افراد کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں وہ حقیقت بیان کر دی جو چوہدری دلدار کی زبانی مجھے پہنچ چکی تھی۔

”اوہ!“ اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا ”یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔“ پھر وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی ”ساحل کو باہر روڈ بھیجا گیا ہے یا باہر؟“

”مجھے یہ جاننے کا موقع نہیں مل سکا۔“ میں نے صاف کوئی سے کام لیا۔

وہ بے تابی سے بولی ”تب ہمیں فوری طور پر کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ تم نے تو صبح کے کٹ بھی بخوار کئے ہیں۔ انہیں اور پیچھے کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اس سے بھی مسئلہ حل نہیں نظر نہیں آ رہا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

”مطلب یہ کہ اگر ساحل کو باہر روڈ کراچی بھیجا گیا ہے تو وہ کل دو پہر تک یا اس کے بعد وہاں پہنچے گی۔ ہم جہاں سے روانہ ہوں تو اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہم کراچی میں ہوں گے لہذا فوری طور پر روانہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں ایک لمحے کو کراچی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اور اگر وہ باہر آ گئی ہے تو اس وقت تک وہ شیب خوری کے قبضے میں جا چکی ہوگی۔ ہم جہاں سے پہلے کراچی پہنچیں یا دو پہر سے پہلے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ حیرت سے بولی ”کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ رکے اس کوئی میں بیٹھے رہیں گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے بے سددہ بڑے فیصل کی طرف دیکھا اور سفاکی سے کہا ”میرے یہ دینے دشمن کی ایک نازک کمزوری اس وقت میری دسترس میں ہے۔ میں اسے اپنے

بھٹے جاؤں گا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ خود بخود میری نوازش کا یہ ہم میرے ساتھ چڑھا ہے۔“ اسے اختیار نہیں دواؤں میں بھی جڑا ہے۔“ اب میں دیکھوں گا، خود بخود کیا رہا ہے۔“

”اب میں دیکھوں گا، خود بخود کیا رہا ہے۔“ میں نے پھر وہی بات کہی۔ ”میں نے پھر وہی بات کہی۔“ میں نے پھر وہی بات کہی۔ ”میں نے پھر وہی بات کہی۔“ میں نے پھر وہی بات کہی۔

”تو اب تم میری دوڑا کر جوتے مارو گے۔“ وہ غصہ بھرا کرتے ہوئے بولی۔

”سبس سو رہی!“ مجھے احساس ہو گیا کہ احسان دالی بات اسے ناگوار گزری تھی۔ میں نے کہا ”اپنی بڑی کامیابی کے بعد میں تم کو آکر جوتے ماروں گے۔“ وہ غصہ بھرا کرتے ہوئے بولی۔

”کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔“ وہ میرے ہونٹوں پر ہاتھ پڑاتے ہوئے بولی ”ہمیں پہلی فرصت میں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے ورنہ شاید اس کے حواری کسی بھی وقت اسے قتل کر دیں۔“ میں نے دلدان کی تلاش میں گئے دیکھنے کی بات کہی۔

میں نے اس وقت میں وقت دیکر رات کے گھڑے پر ہاتھ رکھے۔ خداوند غیور کو گئے ہوئے واقعی لگ لگ ڈھائی گھنٹے بیت چکے تھے۔ یہ سب کچھ میں آنے والی بات نہیں تھی لیکن صدف نے جس پہلو کی طرف توجہ دلائی وہ میری سمجھ میں آ گیا۔

اگلے پانچ چھ منٹ کے اندر، نے پیسے تیسے کر کے فیصل کو لپٹا کر لڑائی ڈکی میں پہنچایا اس سے پہلے ہم نے وہاں سے اپنے بیکر نکال لیے تھے۔ اگلے ہی لمحے ہماری گاڑی دفتر کے باہر نکلی۔ اس کوئی سے رخصت ہو رہی تھی۔ ڈرائیو گ۔ میں ہمیں قابض تھا۔

جب ہم اس گلی میں سے نکل کر میں روڈ پر آئے تو اسی وقت ایک جیب فرانسے سے گلی میں داخل ہوئی۔ اس جیب میں ایک پارافرنس اور تھے۔ میں خدا کو صورت سے نہیں پہچانتا تھا۔ کوئی امیدی نہ تھی۔ کوئی دلدان کی تلاش میں ناکامیاب نہ تھے۔ اگلے ہی لمحے میں نے دیکر کر دیکھنے کی بات کہی۔ اس کوئی سے رخصت ہو رہی تھی۔ ڈرائیو گ۔ میں ہمیں قابض تھا۔

نان اسٹاپ فلائی رہا ہے، دائیں۔ میں دیکھے اخبار ناک کی سیدہ میں سڑک رہا ہے۔

نئے ماڈل کی وہ ٹویٹا کروا کو سائیکل ہارس سے نہیں تھی۔

گھبرگ تھری والی وہ کوئی تاریکی اور سائے میں ڈوبی ہوئی تھی!

اس وقت رات کا ایک بجھا تھا۔ میں اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ فرید پاشا کی کوئی ایسا ویران مسٹر پیش کرنے لگے۔ کم از کم گیت پر سب گارڈ کو تو نظر آتا ہے تھا۔ کوئی کھٹے کسی اندرونی خیمے میں کوئی لائٹ آف، ہر دو ہو گیت اور سائے کا حصہ اندر میرے کی لپٹ میں دکھائی دے رہا تھا۔ میری طرح صدف نے بھی صورت حالات کی کٹینی کو محسوس کر لیا، تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

”دلدان اس کوئی میں کٹ کر بڑھ چکی ہے!“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کوئی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ”ہم جب صبح یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا!“

”سب کچھ ہمیشہ ٹھیک ٹھاک میں رہتا صدف۔“ مجھے خود اپنی آواز اچھی سی لگی ”آؤ دیکھ، میں اس کوئی پر کیا بیٹہ چکی ہے!“

فرید پاشا کے بڑی ویسے بھی ان دنوں اپنی کٹھنوں میں موجود نہیں تھے۔ دائیں جانب دار کوئی کے لیکن کچھ عرصے کے لیے اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ رات میں طرف والی کوئی برائے فروخت ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی کو گیت کے سائے روکا اور صدف سے گاڑی کے اندر ہی رہنے کو کہا۔

”میں جہیں اسکیے کوئی کے اندر نہیں جانے دوں گی۔“

وہ چٹائی لہجے میں بولی۔

”خندہ کر صدف اترو ڈی!“ میں نے کہا ”میں ذرا لڑا کا جائزہ لے آؤں پھر تین گھنٹے بالوں۔“

وہ جلدی سے بولی ”کچھ بگ ہے۔ میں تمہارے اتھر جاؤں گی۔“

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑا۔ کیونکہ باہر وہ میری بات نہیں مان رہی تھی۔ میں نے اپنے گاڑی کو کوئی کے اندر پہنچایا۔ گیت کو کھلانے کے لیے کہے کہ کتنا نہیں پڑا کیونکہ وہ آل ریڈی کی کھلا ہوا تھا۔ جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہاں کی لائٹس کو کس طرح ”آف“ کیا گیا۔ میں نے جلد ہی نگاہ



اٹھائی، لائٹ کوٹوٹا یا اور..... یہ فائرنگ کا نتیجہ تھا۔

سب سے پہلے میں نے سیکورٹی گارڈ عردین کے کہیں نما کرے میں جھانکا۔ وہاں کا منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میں نے دیکھ لیا، گاؤڑ بکین کے فرش پر آڑا نیزہ جا پڑا تھا۔ قریب ہی اس کی کن بھی موجود تھی۔ میں نے گاؤڑ کو چمور دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا، وہ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا ”صدف! ہماری غیر موجودگی میں یہاں برکونی ٹیکن کارروائی ہو چکی ہے اور میرا خیال ہے، اس دانتے کو زیادہ وقت نہیں گزرا۔“

بکین میں اگرچہ اندھیرا تھا۔ تاہم باہر سے آنے والی ناکانی لائٹ نے وہاں دیکھنے کی آسانی پیدا کر دی تھی۔ صدف بھی سیکورٹی گارڈ کو ملاحظہ کر چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ”وہ جان! ہمیں ذوری طور پر اپنے ساتھیوں کی خبر لینا چاہیے۔“

پھر ہم آٹاٹا نا کوشی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ اندر کا جائزہ لینے کے لیے لائٹس کا ہونا بہت ضروری تھا کیونکہ باہر والی جیسی جیسی روشنی وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے بڑی سرعت سے سوچ بورت تلاش کر کر کے وہاں موجود تمام بنی آن کرنا شروع کر دیے۔ اس وقت مجھ پر ایک وحشت سی سوار تھی۔

میری یہ کوشش جلدی طور پر بار آور ہو سکی۔ میں چند لائٹس کو آن کرنے میں کامیاب رہا۔ ان لائٹس کی بدولت دوسرے کمروں میں دیکھنا بھی ممکن ہو گیا۔ اس کا مطلب یہی تھا، کچھ لائٹس کو تو زیا دیا گیا تھا۔ اسلئے کے نام پر ہمارے پاس ایک کلاشکوف اور ایک پٹل موجود تھا۔ میں نے صدف کو جو ریو اور دیوا تھا وہ اس نے چوہدری دلدار ہی کی کوشی میں کہیں پھینک دیا تھا چنانچہ کچھ شہادہ والا پٹل میں نے اس کے حوالے کر دیا اور ہم بے فکر اور رجوں کے مانند کوشی کے مختلف کمروں میں چکر اٹنے لگے۔

یہ چکر ہمارے جی کا آزار بن گئے۔ ہماری بے قرار رو میں ایک کرناک عذاب سے دو چار ہو گئیں۔ ہم نے اس کوشی کا جو معائنہ کیا اس کی تفصیل بڑی لڑخیز تھی۔ وہاں پر بڑے وحشت ناک انداز میں خونی کارروائی کی گئی تھی۔ کمروں کے مختلف حصوں سے شدید فائرنگ کے آچار مل رہے تھے اور سب سے بڑا ”آٹار“ وہ ہلاکتیں تھیں جو اس فائرنگ کے نتیجے میں ہوئیں۔

اللہ دتا، سیکورٹی گارڈ عردین، فرید پاشا کا اسسٹنٹ

تحسین اور اس کی نوبیا بتا دی تاہم اب اس نے نامیں موجود نہیں رہے تھے۔ وہ ہمارا ساتھ چمور کر بہت دور جا چکے تھے۔ اتنی دور کہ جہاں سے ان کی خبریت ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے ساتھیوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور..... اس کارروائی کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لائٹیں نکال رہی تھیں، ان میں سے خارج ہونے والے لوہاں بات کی گواہی دے رہا تھا کہ گھٹنا دو گھٹنا پیلے وہ لوگ ”اے“ تھے، اس دنیا کے دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی جس بول سکتے تھے اور دوسروں کو بھی بننے بولنے پر مجبور کر سکتے تھے لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا، سب ملیا میٹ ہو گیا تھا..... خا ہو کر تھا سب کچھ!

میں نے اس خونی کارروائی کے ذمے داروں کے بارے میں سوچا تو میرے ذہن میں فٹا کا نام چمک اٹھا۔ پچھلے دو دنوں میں، میں نے اسے بہت ڈک پہنچائی تھی۔ اس کے بندے۔ بے در پے منظر سے غائب ہو کر فاضلہ کالونی والی کوشی کے خانے میں پہنچ رہے تھے۔ وہ ان کے ”قیام“ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا البتہ اس بات کا اسے یقین تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ وہ میرے اس اٹھانے سے خوشی آگاہ تھا اور آج رات کے پہلے چوہدری دلدار نے اسے وہ جان کی تلاش میں بھی روانہ کیا تھا۔

میں جیسے جیسے چمکتا گیا، حالات کے ڈاٹے آجہاں میں ملنے لگے۔ جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ وحشت ناک ”کارنامہ“ فٹا کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے صدف نے چوتھے ہوئے کچھ میں پوچھا۔

”وہ جان! زرگل نہیں نظر نہیں آ رہی!“

”زرگل!“ میں اچھل پڑا اور یہ اچھلنا بے اختیار تھا۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں اب تک اس چشموں دوپٹے کو کیوں بھولا ہوا تھا۔ زرگل کا خیال آتے ہی اس کے ذہن کا چاٹا حکمت یار کا نام بھی میرے ذہن تازہ ہو گیا اور میں نے ایک لمحے کے لیے یہ بھی سوچا کہ کہیں یہ کارروائی حکمت یاری کی تو نہیں! ممکن ہے، اس نے زرگل کا سراغ لگایا ہو اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ خون ریزی کی ہو۔

ہم نے ایک مرتبہ پھر کوشی کی دونوں منزلیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ کوشی زرگل کے وجود سے خالی ہی رہی۔ صدف نے ابھن زدہ کچھ میں کہا ”کہاں چلی گئی؟“ میں خود بھی بہت اچھا ہوا تھا۔ میں نے کہا ”اس کوشی میں تو موجود نہیں اس کا بھی مطلب ہے، وہ کہیں چلی گئی ہے!“ پھر اسے اپنے ساتھ زبردستی لے گیا گیا ہے۔“

زبردستی ساتھ لے جانے والا خیال میرے ذہن میں حکمت یار کے حوالے سے آیا تھا لیکن صدف اس کہانی سے واقف نہیں تھی اس لیے اس کی ابھن بڑھ گئی۔

”وہ جان! جہاں تک میں اندازہ لگائی ہوں، یہ تمہارے دشمن فٹا کی کارروائی ہو سکتی ہے۔“ صدف نے فطریہ ہوئے کچھ میں کہا ”مگر وہ زرگل کو اپنے ساتھ لے جاتا تو وہ ہمیں جپ کے اندر کہیں نظر آ جاتی۔ تمہاری طرح میں نے بھی اس جپ میں چار مردوں کی عود دیکھا تھا۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں نے کہا ”تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہم نے جس جپ کو بڑی تیزی سے چوہدری دلدار والی گلی میں مڑتے دیکھا تھا، اگر اس جپ میں فٹا اور اس کے تین ساتھی ہی تھے تو پھر دو تھوٹے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ زرگل کو اپنے ساتھ نہیں لے کر گئے۔“ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا ”ابھی تک تو یہ بھی ملے نہیں کہ اس کوشی پر ہونے والی کارروائی کا ذمے دار نشانہ ہے۔“

”مگر یہ لڑخیز کارروائی فٹا نے کی ہے تو اسے بھی وہاں پہنچ کر اینٹ کا جواب پتھر سے ہی ملے گا۔“ صدف نے کہا ”ہم نے بھی چوہدری دلدار کی کوشی پر کچھ کم ”ہنگامہ آرائی“ نہیں کی۔“

وہ ایک لمحے کو رک کر چمک چکی ہوئی آواز میں بولی ”وہ کیا ہے!“

اس جملے کی ادائیگی کے بعد وہ ایک دیوار کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے اس کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو ذکرہ دیوار پر مجھے ایک پرچہ چسپاں نظر آیا۔ میں بھی صدف کی تقلید میں آگے بڑھ گیا اور دیوار کے قریب پہنچ کر صورت حال واضح ہوئی۔ اس پرچے کی تحریر نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔ وہ ایک وارنٹ تھی، ایک پیغام تھا جو کہ میرے نام تھا۔

”وہ جان! تم نے بھینا اب تک اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ لیا ہوگا۔ ذرا تصور کرو، اگر تم بھی ان کے ساتھ کوشی کے اندر موجود ہو تو کیا ہوتا؟ تم نہیں جواب دے سکتے۔ کیونکہ جواب دینے کے لیے تم زندہ ہی نہ ہو تے بلکہ اپنے انہی جاں نثار بہت غامضوں سے ساتھ اس وقت خاک و خون میں لوٹ آتے ہو تے۔ وہ جان! میں فٹا تمہارا اصلی باپ تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم واقعی بہت خوش قسمت ہو، ہاتھ میں آتے آتے نکل جاتے ہو لیکن اس خوش قسمتی میں نہ۔ ہٹنا کہ ہمیشہ قیمت تمہارا ساتھ دے گی۔ یقین جانو، میں بہت جلد تمہاری شہرگ تک

پہنچ جاؤں گا۔ تم نے اب تک مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جس کی وجہ سے باس کے سامنے میری بہت سکی ہو چکی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا وہ جان!“

وہ جان سے شروع ہونے والا یہ ”اطلاع نامہ“ وہ جان پر ہی ختم ہو گیا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور زیر لب بڑبڑایا ”حرام زادے! یہ تو ہمیں اپنے باس کی کوشی میں داخل ہونے کے بعد پتا چلے گا کہ کون کس کا اصلی باپ ہے۔“ صدف نے کہا ”زرگل کو، ہم کہاں تلاش کر سکتے ہیں؟“

میں نے اس کے ادا کردہ الفاظ میں تکلیف کو محسوس کر لیا۔ یعنی طور پر بازو کا زخم اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہاں اتنا گہرا کٹ تو نہیں آیا تھا کہ اسٹینچنگ کی ضرورت پیش آتی، بہر حال نوری مرہم پی ضروری تھی۔ میں نے ہنگامی پٹی باندھ کر خون کے خراج کو وقتی طور پر روک دیا تھا لیکن باقاعدہ ٹریٹ منٹ ہونا چاہیے تھا۔

اس کوشی میں فرسٹ ایڈ باکس موجود تھا۔ میں نے زرگل کے زخمی بازو کی ”تتا دراری“ بھی خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میرے نزدیک رہنے والی دونوں خواتین کے بازو زخمی ہو گئے تھے۔ زرگل کا دایاں شانہ گھائل تھا اور صدف کا بایاں بازو زخمی ہو گیا تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد میں فرسٹ ایڈ باکس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے صدف کا بانی ٹیک لوز سوٹر اترا دیا۔ اس نے سوٹر کے نیچے گرے کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر ”GUESS“ کے نام کی چھاپ تھی۔ یہ ایک بہت بڑی غیر ملکی گارمنٹ کمپنی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے بہت سے کاروبار ہیں۔

میں نے بار ایک بنی سے صدف کے زخم کا معائنہ کیا۔ وہ کٹ لگ بھگ دو انچ کا تھا۔ میں نے اسٹی پنک لٹن سے زخم کو صاف کیا اور بیزنین کو (BENZENE CO) کی پٹی کر دی۔ یہ دو خون روکنے کے ساتھ ساتھ زخم کو بھی ٹھیک کر دیتی ہے۔ یہ ایک قسم کا پتھر ہے اور بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔

صدف کی ڈرائنگ ہو چکی تو اس نے کہا ”وہ جان! تمہارا شکار فیصل بھی شہید ڈی ہے۔ اگر اس کو استعمال کر کے تم نے چوہدری نواز علی کو جھکا نا ہے تو پھر اس کی دیکھ بھال ضروری ہے۔“

وہ ایک اہم بات کی طرف میری توجہ دلارہی تھی۔ واقعی اس سہو لیے کو دودھ پلانا بہت ضروری تھا۔ میں نے صدف

سہرام کرنے کو کہا اور خود باہر کھڑی گاڑی کی طرف چلی۔ یونیورسٹی کے نزدیک ہی کونجی کے اندر کھڑی تھی اور فیصل کو ہم اسی گاڑی کی ڈکی میں ڈال کر یہاں تک لائے تھے۔

میں نے فیصل کو ڈکی سے نکالا اور کھینچ کر اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا پھر میں اپنا اور صدف کا سفری بیگ بھی اٹھا لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں فیصل کو ضروری ٹینٹ منٹ دے چکا تھا۔ اس کے زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔ میں نے اس سے فارغ ہونے کے بعد صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری دہشت سے بے ہوش ہوا ہے۔“

”میری دہشت سے“ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”اس نے مارشل آئرس کے بہت سے میدان دیکھے ہوں۔“ لیکن تم جیسی جنگ جولوکی سے پہلی مرتبہ اس کا واسطہ پڑا۔“ تم دونی چھان کر دیتی ہو، مارشل آئرس کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کر کے بد مقابل کو درپے حیرت میں ڈال دیتی ہو۔ ماضی طور پر جب مارشل آئرس کے ساتھ جیٹا سنگ جی شامل ہو جائے تو یہ کالٹف دو بالا ہو جاتا ہے۔ یہ بے چارہ حیرت، شدت سے اپنے ہوش دھواں ہو بیٹھا ہے۔

”کیا میں تمہارے سامیان کو اپنی تعریف سمجھوں؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے اوپر دیکھا، رے نیازی سے کہا ”تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا ہے۔“

وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ان ڈائریکٹ دے میں ہی کی تعریف کی تھی صدف کے رد عمل کو دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ اسے شرمنا بھی آتا ہے۔ اس کی شرمناہٹ اور نچاہہ۔ میں بڑا اٹوٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن کی بے ترتیب جھبھوڑ نے کمرے کی فضا میں ایک سوندھا سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ سوہا ارتعاش دیکھتے اور سننے کی نہیں بلکہ محسوس کرنے کی شے ہے۔ جو لطیف احساسات کو جھکا کر رکھ دیتی ہے۔

صدف کا وہ ناقابل فراموش ریشمی رد عمل لحاظی ثابت ہوا، دوسرے ہی لمحہ ہل گئی اور گہری سنجیدگی سے بولی۔

”ودھان! ہمیں اس کی بھی نہیں خبر نا چاہیے۔ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے۔ اسے بھگانا ہمارے بس میں نہیں اور نہ ہی ہمارے پاس اتحاد ہے۔ میں تو کہتی ہوں، تم فوراً پاشا انگل کو نوں کر کے یہاں کے حالات سے باخبر کرو اور میرے

ساتھ ماموں کے گھر چلو۔“

”یعنی ڈی ایس پی اور گزب خان کے گھر؟“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ اور میرا ماموں کون ہے یہاں؟“

”اور اس زخمی مغوی کو بھی اپنے ساتھ لے جائو۔“

میں نے فرش پر بے ہوش پڑے فیصل کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سمجھانے والے انداز میں بولی ”ودھان! اس وقت ہم بہت ہی نازک حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں کسی ذکی طرح ماموں کو مطمئن کر دوں گی۔ تم میری بات مان لو۔“

”میں پولیس والوں کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“ میں نے اہل لہجے میں کہا ”ہم اس کو بھی میں تو مزید نہیں رہیں گے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ہم تمہارے ماموں کے پاس شادمان کالونی میں پہنچ جائیں گے۔“

اس نے سمجھ لیا کہ میں اس کی بات نہیں مانوں گا، لہذا بحث کا دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے مصلحت کی راہ

اپنائی اور پوچھنے لگی۔

”تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کہاں جائیں گے؟“

”فی الحال میری نظر میں فاضلہ کالونی والی کونجی سے زیادہ موزوں جگہ اور ڈکی نہیں ہو سکتی۔“ میں نے پرسش انداز میں کہا ”بعد کی جگہ پر ہم جہیں گے۔“

”اور یہ شادمان کالونی جی تو ہیں سے گزرتی۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا ”پاشا کے علاوہ مجھے کراچی میں منہاس باقر سے بھی ضروری چاہیں کرتا ہیں۔ میرا خیال ہے

فاضلہ کالونی والی کونجی ہی ان کاموں کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔“

صدف نے مجھ سے کوئی اختلاف نہ کیا اور ہم وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم دونوں نے کونجی چھوڑنے سے پہلے لباس تبدیل کر لیے کیونکہ دلداری کونجی پر ہم جن حالات سے گزر رہے تھے انہوں نے ہمارے پہنارے کا سہارا کر دیا تھا۔ خاص طور پر صدف کا سفید سونٹو کریم گل میں بدل چکا تھا اور گہنی کے اوپر سے سرخ بھی ہو رہا تھا۔

میں نے فیصل کے ساتھ ساتھ فرسٹ ایڈ باکس کو بھی

گاڑی کی ڈکی میں پہنچایا۔ اس زمیں کی کسی بھی وقت ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ ہم ٹوٹوٹا کر دلا میں بیٹھ چکے تو صدف نے

آواز میں استفسار کیا ”ودھان! انسان پیٹرول پمپ پر

آ رہی؟“

میں نے اختیار و گردن گھما کر اس سمت دوڑائی۔

میں نے اس وقت تک ہم شاہ جمال روڈ پر ہی تھے۔ صدف نے

اس سے پوچھا۔

ٹوٹوٹا کر دلا چند گز آگے جا کر سڑک کے کنارے رک گئی۔ اس وقت تک ہم شاہ جمال روڈ پر ہی تھے۔ صدف نے

چھڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ مجھے وہاں فرید شاہ کی عظیم انشاں جب کھڑی نظر نہ آئی۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے اس نے ہمیں جب کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ کونجی میں داخل ہوتے ہی ہم اندرونی سنگینوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ بہر حال انسان پیٹرول اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔

”ہو سکتا ہے جب کو زرگل اپنے ساتھ لے گئی ہو“ میں نے ایک امکانی بات کی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو وودھان“ صدف میری تائید کرتے ہوئے بولی ”وہ دونوں ہی غائب ہیں تو اس سے یہی اندازہ

لگایا جا سکتا ہے وہ جہاں بھی ہوں گے ایک ساتھ ہوں گے۔“

میں نے کہا ”وہ جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔“

”آمین!“ صدف نے صدف دل سے کہا۔

میں نے ٹوٹوٹا کر دلا کونجی سے نکال کر فاضلہ کالونی کی جانب دوڑانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

یہ دنیا ایک حیرت کدہ ہے اور قدم قدم پر ایسے واقعات سے ساتھ پڑتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چوں کہ یہ دنیا

اور اس کا ہر کاروبار انسانوں کے دم قدم سے ہے اس لیے ہر انسان اپنی جگہ کسی حیرت سے کم نہیں۔ ہم جیسے ہی فاضلہ کالونی والی کونجی کے نزدیک پہنچے ایک نئی حیرت سے سامنا

ہو گیا۔

انسان پیٹرول مذکورہ کونجی کے سامنے کھڑی تھی۔ صدف نے بھی دوسری سے جب کو دیکھ لیا تھا۔ بے اختیار اس کی

زبان سے نکل گیا ”اے یہ جب یہاں کیسے پہنچ گئی؟“

میں نے گاڑی کی رفتار انتہائی کم کر دی اور کہا ”ایک بات تو طے ہے کہ گاڑی خود بہ خود یہاں نہیں پہنچی ہوگی۔ کوئی

انسان ہی اسے ڈرائیو کر کے یہاں لایا ہوگا۔“ میں نے ذرا

توقف دینے کے بعد کہا ”زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ زرگل اس جگہ میں یہاں پہنچی ہوگی۔ ہمیں فریب جا کر دیکھنا

ہائے۔“ پتا نہیں چلی کس حال میں ہوگی۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے کر دلا کی اسپینڈر بڑھانا چاہی تو

صدف نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور گہری سنجیدگی سے

بولی ”ودھان! اپنی گاڑی کو تینوں روک دو!“

”کیوں؟“ میں نے بریک پیدل کو دباتے ہوئے

اس سے پوچھا۔

میرے سوال کے جواب میں کہا۔

”ودھان! اس وقت ہم انسانیات پر چل رہے ہیں۔ تمہاری اس بات سے جزوی طور اتفاق کرتی ہوں کہ انسان اپنے دل میں زرگل یہاں پہنچی ہوگی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے ہمارا کوئی دشمن اسے یہاں لایا ہو۔ ہم اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“

میں نے اس کی ہاں میں ساماتے ہوئے کہا ”چلو ٹھیک ہے نہیں کرتے نظر انداز۔“

”پھر یہ کہ ہمیں ہر قدم سے سمجھ کر احتیاط سے اٹھانا

ہوگا“ صدف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”الذنا حدھدہ جب کی طرف جانا ٹھیک ہیں ہمیں پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے

کہ اس وقت وہ جب خان سے پاس ہے۔ نہ کوئی سوہوہو ہے۔“

”تجویر معقول ہے“ میں نے اتفاق رائے سے کام لیتے ہوئے کہا ”یہ جاننے کے لیے جس تو جب سے نزدیک جانا

ضروری ہے!“

”ہاں یہ تو ہے“ وہ متحفظانہ انداز میں بولی ”ایسا کرتے

ہیں تم نہیں گاڑی کے اندر موجود رہیں جا کر صورت حال کا جائزہ لیتی ہوں۔“

”تمہارے لیے بھی میرا یہ مشورہ ہوگا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ”کیوں کہ تم زخمی بھی ہو۔“

وہ ہلکتے خوردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میری دلیل کے آگے بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ میں کوئی بات کہنے

بغیر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

کونجی کا گیٹ کر دلا سے لگ بھگ دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے تھکے قدم اٹھاتے ہوئے اس سمت بڑھنے لگا۔

اس وقت میرے لباس میں کبیر شاہ والا ماسٹل موجود تھا۔

کلاشکوف کر دلا کے اندر تھی۔ اس اسٹیک کو فلیگرٹ خمری دلی کونجی میں چھوڑنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

چند لمحات کے بعد میں انسان پیٹرول کے پاس پہنچ گیا۔

اتفاق یہ کہ اس کے اندر کا جائزہ لے سکوں۔ میں نے جب

کے اندر جھانکا تو میری نگاہ کو چونک جانا پڑا۔ جب کی

ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود تھا اور اس طرح موجود تھا کہ اس

کا سر نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ گاڑی کا اسٹیرنگ سر کے اوپر نظر آ رہا

تھا۔ میں نے اس کھڑی نما انسان کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ

زرگل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

تھا۔ یہ انکشاف ہوتے ہی کہ جب کے اندر زرگل موجود ہے اور خاصی تکلیف دہ حالت میں ہے، میں لپک کر جب کے پاس آگیا۔

میں نے ڈرائیونگ سائیڈ والے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں بے اختیار دروازے کو بجائے لگا، توڑی سی کوشش کے بعد مجھے اسے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ زرگل نے کسسا کر آکھیں کھول دیں، پھر مجھ پر نظر پڑے ہی وہ کھل اٹھی۔

میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا، ”زرگل! دروازہ کھولو“

وہ اس وقت تک سیدھی ہو کر بیٹھ چکی تھی۔ میرے اشارے کو اس نے وصول کر لیا اور اگلے ہی لمحے اس نے لاک اٹھا کر دروازہ کھول دیا پھر تیزی سے باہر آنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کے ہونٹوں سے ایک سکاری برآمد ہوئی اور بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنی ٹانگ کی طرف چلا گیا، میں سمجھ گیا اس کی ٹانگ کے ساتھ کچھ لڑ بڑ ہے۔

”رک جاؤ“ میں نے منع کرنے والے انداز میں کہا، ”گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہو۔ میں خود تمہیں باہر نکالوں گا۔ ذرا میں صدف کو یہاں لے آؤں“

میں نے نشان پٹیروں کا دروازہ بند کیا اور دوڑتے ہوئے قدموں کے فٹیل کروا کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں صدف کو صورت حال سے آگاہ کیا پھر کروا کو ڈرائیونر کے پاشا کی کوشش کی طرف آگیا۔ زرگل والی جب کوشی کے سامنے کھڑی تھی لیکن اس کی وجہ سے کوشی کے اندر جانے والے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

میں نے ٹویپا نو کروا کو گیٹ کے قریب پہنچایا پھر گاڑی سے باہر آگیا۔ صدف زرگل کے مسائل سے واقف ہو چکی تھی۔ ہم دونوں نے کوشش کر کے زرگل کو نشان پٹیروں کی ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھا کر بیچر سیٹ پر منتقل کیا۔ اس کے بعد میں نے کوشی کی گیٹ کھول دیا۔ توڑی دیر بعد یکے بعد دیگرے دونوں گاڑیاں کوشی کے اندر پہنچ کر اپنے جائز مقامات پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ کوشی کے گیٹ کو میں نے اندر سے لاک کرنے کے بجائے باہر سے تالا لگایا۔ یہ میں نے احتیاط کے پیش نظر کیا تھا۔ باہر سے گزرنے والا جو بھی شخص کوشی کے گیٹ کو دیکھتا تو وہاں جموتے ہوئے تالے کی وجہ سے وہ یہی سمجھتا کہ کوشی کے اندر کوئی موجود نہیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کوشی کی باؤڈری وال عبور کی اور اندر پہنچ گیا۔ آئندہ پانچ منٹ میں

میں نے اور صدف نے زرگل کو سہارا دے کر کوشی کے اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں ٹیلی فون موجود تھا۔ پاشا نے وہ کوشی فروخت کرنے کا اعلان کر رکھا تھا اور آن ریکارڈ وہاں کی رہائش نہیں تھی لیکن اب بھی اچھا خاصا فریجروہاں موجود تھا۔ ٹیلی فون والے کمرے میں بیٹھے اٹھنے کی مکمل سہولت تھی۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ یعنی اتوار کا رات آغاز ہو چکا تھا۔ اتوار کو سنڈے کہا جاتا ہے یعنی ”سورج کا دن“۔ سورج اس کائنات کو روشنی اور حرارت بخشتا ہے لیکن اس وقت فضا میں اچھی خاصی غنڈک اتری ہوئی تھی۔ یہ میری رات کا مکالم تھا۔ کیوں کہ رات میں آسمان پر چاند کی عکس رانی تصور کی جاتی ہے۔ چاندنی ہمیشہ غنڈک ہی پہنچاتی ہے۔ شاید اسی صدف کی بنا پر چاند کو محبوب کا درجہ دیا جاتا ہے!

زرگل اندر کمرے میں پہنچی تو اس کی حالت قدرے بے حال نظر آنے لگی۔ میں گھبرگ والی کوشی پر پیش آنے والے واقعات جاننے کے لیے اسے جہین ہو رہا تھا لیکن پہلے زرگل کی کیفیت معلوم نہ کرنا خود غرضی اور غیر اخلاقی حرکت ہوتی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے بائیں پاؤں میں موج آگئی تھی اور غنڈک کے باعث یہ تکلیف آتی پڑھ گئی کہ وہ پاؤں کو حرکت دیتے ہی سبک اٹھی تھی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا، ”یہ موج کوئی کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ میں جلد جیکٹ میں تمہارا پاؤں ٹھیک کر دوں گا“

”تکلیف تو نہیں ہوگی؟“ زرگل نے بڑی مصویت سے پوچھا، ”میں نے سن رکھا ہے ہڈی اور جوڑ بھانے والے بڑا ظالمانہ انداز اختیار کرتے ہیں“

میں نے اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا، ”نہیں! یہی! ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں کوئی اعصابہ بند نہیں ہوں، میں تو بالکل سائنسی بنیاد پر ایک مخصوص تکنیک کے ذریعے موج وغیرہ کا علاج کرتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے ہاتھ میں ایک ہیر ہے، جس میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، جس میں پاشا نہیں چلے گا، کب تمہارے پاؤں کی موج رخصت ہوگی۔ میں اتنی نزاکت اور آہستگی سے کام کروں گا جیسے چھری کھن میں اترتی ہے“

”تم کہہ رہے ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا“ وہ سادگی سے بولی، ”پاؤں کی تکلیف سے تو مجھے پوئی محسوس ہو رہا ہے جیسے غلے کی ہڈی میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہو“

میں نے صاف کوئی سے کام لینے ہوئے کہا، ”تمہی تشویش کی کوئی بات نہیں میں نے بڑی توجہ سے تمہارے پاؤں کا معائنہ کیا ہے، فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں“

وہ میری وضاحت اور صدف کی تائید سے خاصی مطمئن دکھائی دینے لگی۔ اسی دوران میں صدف بڑی گہری اور خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ میری ذات کا یہ جیسی پہلو پہلے میرے اس کے سامنے آ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ اس وجہ سے اتنی عجیب ہو!

”تم لوگ آپس میں کپ شپ کرو“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا، ”میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں“

زرگل نے پوچھا، ”تم کہاں جا رہے ہو وجدان؟“

”اس کوشی کے ایک خفیہ گوشے کا جائزہ لینے جا رہا ہوں“ میں نے اگرچہ واضح طور پر خفیہ نہ جانے کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں میرا اشارہ سمجھ گئیں۔ وہ میری حیثیت میں اس ”شائنداز“ کمرے کا دورہ کر چکی تھیں۔

صدف نے کہا، ”ٹھیک ہے وجدان! تم حکومتی کوشی کا جائزہ لو۔ میں اتنی دیر میں ٹویپا نو ایئر گرم کر کے لے آتی ہوں۔ زرگل کے پاؤں کو کھور کی ضرورت ہوگی۔ کچھ میں بھی تو اپنی ڈاکٹری دکھاؤں“

زرگل نے ممنون نظر سے صدف کو دیکھا میں نے کہا، ”زرگل! تم کہیں نہ سمجھنا کہ صدف نے ڈاکٹری والی بات ایسے ہی کہی ہے۔ یہ واقعی ایک ایلو پیتھک ڈاکٹر ہے“

”بہت خوب!“ چٹوٹن دوشیزہ نے حیرت اور تپائش کی ٹی جلی نظر سے صدف کو دیکھا، ”میں تو واقعی دہی بھی تھی جو تم کہہ رہے ہو۔۔۔ یعنی“

زرگل نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر تعریف آمیز انداز میں صدف کو دیکھا۔ میں نے کہا، ”صدف اس وقت میڈیکل فائل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو یہ بہت جلد ڈاکٹری ڈگری بھی حاصل کر لے گی“ ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے متنی خیر انداز میں اضافہ کیا، ”میں نے خدا سے کہا، پھر وہ اس لیے دیا ہے کہ یہ خود تو ہرگز ہرگز ایسا نہیں جانتی“

”کیوں بھی؟“ زرگل نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور صدف کی طرف دیکھنے لگی۔

صدف نے مجھے گھور کر دیکھا اور زیر لب مسکرا دی۔ گھورنے کا انداز تنبیہی تھا جبکہ خفیف سی مسکراہٹ میں بے نیازی اور درگزر کے اشارے ملتے تھے۔ صدف اندر باہر سے بڑی عجیب لڑکی تھی۔ میں اسے جتنا سمجھتا ہوں اس سے آگے بڑھ کر نہیں آتی۔ یہ پسند قامت قیامت پتا نہیں میرے انداز سے کو کہاں تک دوڑانا پڑتی تھی۔ اب تک میں نے اس کے جتنے رنگ دیکھے تھے وہ عام رنگوں سے بہت مختلف تھے۔

وہ زندگی کے ست سے اپنی مرضی کا موسم تخلیق کرنے اور اپنی خواہش کی فضا بنانے میں ماہر تھی جس طرح کوئی مکمل آرٹسٹ یا بنیادی رنگوں کی مدد سے ہزاروں لاکھوں نئے رنگ اور رنگوں کے شیعہ تخلیق کر لیتا ہے! میں نے اس مختلف لڑکی پر ایک متنی خیر نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے نہ خانے کے اندر جانے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ پائیں باغ کی جانب کا علاقہ اچھی طرح دیکھ لیا اور جھاڑیوں کی عقب میں اس روشن دان کو سج سلامت پایا جو نہ خانے کا واحد روزن تھا۔ پتا نہیں اسے روزن کہا کتنا حد تک درست تھا۔ بہر حال وہ نہ خانے کے اندر قدرتی روشنی پہنچانے کا تھوڑا بہتر ذریعہ ضرور تھا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے باؤڈری وال کے ساتھ کسی کے اندر ایک چکر لگایا سب کچھ معمول کے مطابق اور خیریت سے تھا۔ میں واپس اسی کمرے میں آگیا جہاں زرگل اور صدف کو چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے وہاں زرگل کی اچھی نظر آئی۔ صدف شاید پانی گرم کرنے کے چکن کی طرف نکل گئی تھی اور ابھی تک لونی نہیں تھی۔

میں زرگل کے پاس پہنچا تو اس نے شیک بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا، ”کیا تمہاری یہ سانس واقعی ڈاکٹری پڑھ رہی ہے؟“

”بالکل! میں نے مختصر جواب دینے پر استغفاریا۔“

”اس نے پوچھا، ”کس میڈیکل کالج میں؟“

اس کا انداز بتا رہا تھا وہ صدف کے حوالے سے اندر سے مطمئن نہیں تھی۔ میں نے بتایا، ”صدف ڈاکٹر میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے“

”یہ کب تو کراچی میں ہے!“

وہ شیک زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا، ”تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ کیا میں تم سے غلط بتائی کروں گا؟“

”یہ بات نہیں وجدان!“ وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

میں نے اصرار کیا، ”پھر کیا بات ہے زرگل؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولی، ”وجدان! اس مختصر سے عرصے میں میں تمہیں جس حد تک سمجھ پائی ہوں اس کے مطابق تم ایک دکن دار انسان ہو اور تمہاری زندگی کا بیش تر حصہ ہنگامہ خیزی اور مار دھاڑ میں گزارنے کی یا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تم بالکل درست کہہ رہی ہو“ میں نے تائیدی انداز میں کہا، ”لیکن تمہاری ان باتوں سے اس شیک کی وضاحت

نہیں ہو سکی جو صدف کی ذات کے واسطے سے نہیں ہے ہمیں  
کئے ہوئے ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی ”دراصل میں یہ کہنا  
چاہتی ہوں یاؤں کچھ دیر بات مجھے نظم نہیں ہو رہی کہ  
میلڈیکل کی ایک اسٹوڈنٹ اس بنگلہ مخمری میں تمہارے  
ساتھ ساتھ نظر آ رہی ہے۔ اور اسٹوڈنٹ بھی ایسی جس کا  
فیشن پیرا ہو گا۔“

”اس سوار کا بوا۔ تمہاری ہی کئی ہوئی ایک بات کے  
انداز پر پشیدہ ہے۔ میں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے  
کہا۔“

”کون سی بات؟“ وہ پوری طرح میری جانب متوجہ  
تھی۔

”نہ تو یہ کہ سب۔ یہ بڑا اچھا ہے یہ تھا کہ وہ ان لحاظ  
میں بھی تکیہ نہ کرے۔“

”تو تو یہ کہ۔“

میں نے کہا ”تو یہ کہ سب صدف میری ساتھی ہے تو  
اسے میرے ساتھ بھی دھانی دینا چاہئے۔ چاہئے میں زمین دار  
ہوں یا دوست دار۔ اور صدف چاہئے میلڈیکل کی  
اسٹوڈنٹ ہو یا سوری خانہ داری سیکھ رہی ہو میں غلط نہیں کہہ  
رہا۔“ بات کے اختتام پر میں نے اپنے چہرے کو معصومیت  
کے انداز میں چھپایا۔ بعض اوقات اداکاری ضروری  
ہو جاتی ہے۔

”اس نے سنجیدی سے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے  
چہرے کے تاثرات سے رہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ  
اسے میری وضاحت کا یقین آ گیا ہے لیکن اس کی آنکھیں چٹکی  
کھڑی رہی۔ وہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے بھرپور ایکٹ  
کر رہی تھی ورنہ اس کے۔“

جہاں تک چہرے کے تاثرات کا ذکر ہے تو میں نے بھی  
اسے نہ تو رد دینے کی کوشش کی تھی جو میری دل و دماغ میں نہیں  
تھا۔ لیکن اس نے بھی میری چوری چوری ہنسی کو مجھ پر ظاہر  
نہ کیا جو جیسا کہ میں اپنے خیالات اس سے پھیلا رہا تھا۔ اگر  
میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا تو اس کا بھی مطلب تھا وہ  
بھی میری آنکھوں میں تھوڑی سی۔ اگر انسان میں ذرا سی بھی  
مردم شناسی ہو تو۔۔۔ بتا دیتی ہے کہ اس دماغ میں کیا  
ہو رہا ہے۔ چہرے کو سارے دل و دماغ کی کھلی کتاب کہا

جی۔ کہ چہرے پر یہ دوپ بڑی بہت کے ساتھ دیکھ  
رہے ہیں۔ میں نے۔۔۔ والی روشنی سمیت اور بھارت  
سے ماہر ہل ہوئی ہے۔

”اس کے بعد یہ ان اسی قسم کے۔۔۔ میں صدف جس کو صدف  
کمرے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک عین میں دی گئی تھی کہ  
فرسٹ ایڈ ماسٹر کمرہ سے نکال کر اسے کیا تھا۔  
باکس میں ابتدائی طبی مدد کا کارڈ۔۔۔ ان موجود تھا کہ  
سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ میں نے انہی خصوصیات کی بنا پر اسے  
زمین کا خطاب دیا تھا۔

میں نے زرگیل کے متاثرہ پاؤں کو پھنسے گرم پانی سے  
اچھی طرح دھویا۔ اس سختی گھورنے اسے خاصا آرام پہنچایا۔  
میں نے باکس میں سے ایک آخت منٹ نکالا اور اسے زرگیل  
کے تختے پر لگا کر پکے ہاتھ سے مالش کرنے لگا۔ یہ پیرا پیرا  
سے ملتا جلتا آخت منٹ تھا اور اپنے اندر۔۔۔ کے علاوہ  
لہری لکیشن کی صفات بھی رکھتا تھا۔ میں نے زرگیل کو پانی  
میں لگا دیا اور اس کا دھیان پاؤں کی طرف۔۔۔ دیا۔  
میری گفتگو کے فرائض میں آگئی تو میں نے ایک ہلکا سا  
کر اس کے پاؤں کی موج نکال دی۔ ایک شگنی بولا  
تھا اور آرمودہ کا بھی!

اس کے ہونٹوں سے ایک طویل ”سی“ خارج ہوئی اور  
وہ پلٹ کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے فری سے کہا ”تیرا  
چہری لیکن کی کیا میں اتر گئی کیا نہیں کچھ محسوس ہوا۔“

اس نے جو کہ کچھ بھی محسوس کیا تھا اس کے ہونٹوں نے اس  
کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن اس ”سی“ کے بعد وہ نازل ہو گیا۔  
گو یا میں نے اس کی موج نکال دی تھی۔

اس کے بعد کے مراحل بہت مادہ اور آسان تھے۔  
صدف نے اس کے پاؤں کے متاثرہ حصے کو ایک گرم پانی میں  
اچھی طرح لپیٹ کر باندھ دیا۔ وہ خاصا ریلیکس محسوس کرنے  
لگی۔

میں نے فریڈ پاشا کی کوئی پرچہ لڑھ خیز مناظر دیکھے تھے  
وہ کسی بھی نازل انسان کے ہوش گنوانے کے لیے کافی تھے لیکن  
زرگیل نے مردانہ داران حالات کے اثرات کو جھٹلایا اور اس  
کوئی سے نکل کر اس کو بھی تک آگئی تھی۔ جب میں نے نشان  
پیڑوں کی ڈرائیوٹ سیٹ پر اسے دیکھا تو وہ مدد پر خوف زدہ  
تھی۔ اسے ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ وہ واقعات بہت غیر  
معمولی اور ناقابل فراموش تھے لیکن اب بڑی حد تک اس کا  
خوف زائل ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے ان واقعات کے  
بارے میں استفسار کیا تو وہ گہری سانس لے کر مجھے اس کی

تفصیل۔۔۔ گئی جس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

رات کیا رہ گئے کے قریب ایک جیپ اس کو بھی پر تھیں  
اور اس میں سے برآمد ہونے والے پار افراد نے بے دردی  
کوئی پر پاؤں دی پھر وہاں نشست خون نظر آنے لگا۔ فائرنگ  
کی آواز سے عادی کوئی آواز کان نہیں بڑی تھی۔ زرگیل اس  
وقت کوئی سیالائی منزل پر تھی۔۔۔ تھری سے بیچے کی طرف  
بھاٹی اور اس کی تیزی میں اس کا پاؤں رنٹ گیا اور وہ منہ کے  
بل فرش پر آ رہی۔ جتنی دیر میں وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، کوئی بھی  
زیریں منزل کو دیران کر دیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ آٹاٹا ہوا تھا  
جب دوزخ سے ہونے قدموں کی آوازوں نے بالائی منزل  
کارخ کیا تو زرگیل نے خود کو ایک جگہ چھپایا۔ اگر وہ سانسے  
ہوئی تو ان واحد میں اس کے جسم میں اتنے سوراخ نمودار  
ہو جاتے جنہیں شمار کرنا ناممکن ہوتا کیوں کہ اوپر آنے  
والوں سے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی گنوں کے  
دبانے کھول دیے تھے اور وہاں سے پگھلا ہوا سیارہ روشنی کی  
دفتر سے خارج ہو رہا تھا۔ زرگیل نے خود کو چھپا کر دانش مندی  
کا ثبوت دیا تھا۔

”تھوڑی دیر بعد وہاں سامان چھپا گیا۔“ زرگیل نے ایک  
جھرجھری سے ہونے بتایا۔ میں کافی دیر تک چھپی بیٹھی رہی  
وہ میری قسمت اچھی تھی کہ میں تم کو گوندہ سلامت نظر  
آ رہی ہوں ورنہ اگر ان لوگوں کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ اس  
کمرے میں کوئی موجود ہے تو وہ لوگوں کی بوجھار سے میرے  
بدن کو تار تار کر دیتے۔“

”کیا تمہیں حملہ آوروں کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟“  
۔۔۔ میں نے پوچھا حالانکہ اس سلسلے میں میں حقیقت جان چکا  
تھا۔

”ہوئی“ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی، بس  
انتہا جان پاتی ہوں کہ وہ بہت ہی۔۔۔ خاک اور درندہ صفت لوگ  
تھے۔ میں نے ان کی زندگی اور۔۔۔ خاک کی کا ثبوت کو بھی ان پر  
میں نے دیکھ لیا۔ سیکورٹی گاؤں محمد علی اللہ دھرمین اور  
نہرو۔۔۔ وہ اسی کے آگے کچھ نہ کہ سکی اور ایک جھرجھری  
جس کا شوش ہوئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر سراسیمہ نظر آنے لگی  
تھی۔

”کچھ گمراہ اس واقعے کے بارے میں زیادہ گفت و شنید  
نہیں کی گئی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے حملہ آوروں کی  
کارروائی کی جو وقت بتا رہی تھی اس سے ایک گھنٹہ پہلے وہ لوگ  
چھوڑ کر دور کی کوئی سے گئی ورنہ ان کو کھوٹے ملے تھے۔  
واقعات سے اندازہ ہو رہا تھا تلاش میں نہ کامیابی کے جد

نہوں نے ادھر کارخ کیا تھا اور گہرگ دانی کو بھی کی اینٹ سے  
اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ وہ لوگ مجھے تو نہ پاسکے لیکن میرے  
ساتھیوں کو خون میں نہلا کر چلے گئے۔ وہ پاروں میری دج  
سے موت کے منہ میں چلے گئے اس خیالی نے مجھے بہت غمزدہ  
کر دیا۔ میں ان کی برپادی کا ذمے دار بڑی حد تک خود کو  
محسوس کر رہا تھا۔

دشمن کی دنیا میں یہی سب کچھ ہوتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا  
اصل دشمنی کس شخص سے تھی کہ فرد واحد سے انتقام لینے کی  
خاطر پورے پورے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔  
بعض اوقات ایسے افراد بھی اس انتقام کی بھینٹ چڑھ جاتے  
جس میں ان کا کوئی قصور ہوتا ہے اور نہ ہی دشمنی میں حصہ لیں گے  
ساتھ لیکن کا یہاں اس حوالے سے مشہور ہے۔

بہر حال ”نشا ایڈ جینی نے اپنی شکست کا بدلہ لینے اور  
کھاسا بہت ملانے کے لیے پاشا کی کوئی میں کشت خون کا  
بازار گرم کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے شیطان صفت اور فرعون  
مزان انسان کی خوشنودی حاصل کرنے میں درندہ بن گیا تھا  
جو ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا۔ یہ نہ امکان اسی  
بات کا تھا کہ چودری دلدار نے دھڑی مان کے بیٹے سے اچھا  
خاصا بوجھ اتار دیا ہوگا۔ اس کے بیٹے کی امید بہت تھی۔

کچھ لوگ دھڑی کا بوجھ اٹھانے کا فرج حاصل کرتے ہیں  
اور کچھ اس کے لیے بوجھ ہوتے ہیں جیسے ان کی ذات باعث  
ندامت و دلا مت ہوئی ہے۔ چودری دلدار کا شمار آخر الذکر  
افراد میں ہوتا تھا۔۔۔ اور یہ فرج کا نہیں بلکہ ڈوب مرنے کا قیام  
تھا!

اپنی داستان غم کے آخر میں زرگیل نے بتا دیا کہ وہ کس  
طرح نشان چٹروں میں بیٹھ کر اس کو بھی ہے۔ اس کو بھی میں بیٹی  
تھی۔ ”وہ جان بوجھتی سرور۔“ ان دنوں نے اس کو بھی میں  
وہ سخت ناک مناظر کھینچے یہ ہیں کہ کوئی ایک سانس کے بھی  
دون نہیں رک سکتا۔“

”میں جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔“ میں نے سنی سے  
نہرو پر انداز میں کہا۔ کیوں کہ یہاں سے سے نازل ہمارا  
سے ہو کر آئے ہیں۔ میں نے خود اپنے آنکھوں سے وہاں کی  
صورت حالات کو خلاصہ کیا ہے۔“

وہ ایک ٹک مجھے۔۔۔ جاری تھی۔ اس کے بیان سے  
واضح تھا کہ اس نے کتنا کٹر کر دہ کوئٹہ نہیں بڑھا تھا۔ دیوار  
پر جہاں اس اطلاع ٹاٹے پر اس کی کھربکڑ پائی تھی ورنہ وہ  
اس کا ذکر ضرور کرتی۔

وہ بتانے لگی۔ ”میں نہ اس جیپ میں کس طرح یہاں پہنچی

ہوں یہ میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے میں جانتی تھی تم سے ملاقات صرف دو چہلوں پر ہی ہو سکتی ہے ایک اس کو بھی میں اور دوسرے اس کو بھی میں۔ میں اس کو بھی میں تو ایک لہر کے کی ہمت نہیں کر رہی تھی اس لیے ادھر لگی حالانکہ مجھے معلوم تھا تم تو سید پور چاہتے ہو مگر کیا کروں اس وقت جو میری سمجھ میں آیا میں نے کہا "وہ چند لوگوں کے لیے خاموش ہو گئی اس کی باتوں میں بھی تو تسلسل نظر آتا اور بھی بے ترتیبی جھلکتی تھی۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی "میں اس پہنچ کر مجھے کوئی کامیٹ بند ملا۔ اگر یہ صرف بند ہوتا تو میں اسے باہر سے یا اندر جا کر کھول لیتی لیکن اس پر موجود ہونے نے مجھے بے بس کر دیا اور میں گاڑی میں رہتے ہوئے تمہارا انتظار کرنے لگی۔ جب کہ تم سید پور روانہ ہو چکے تھے" وہ پھر کی اور دیوانوں کی طرح گردن کو جھٹکتے ہوئے بولی "پتا نہیں ان لمحات میں میں باہر کی ہو گئی تھی۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کب میری آنکھ لگی تھی پھر دروازے پر تمہاری زوردار دستک ہی نے مجھے بیدار کیا تھا"

میں نے اس کی حالت کے پیش نظر دل جوئی ضروری سمجھی "زرنگ! جن لوگوں نے ہمارے آشیانے کو سپرد عذاب کیا ہے اور ہمارے ساتھیوں کی ہلاکت کے ذمے دار بنے ہیں ہم نے انہیں بھی شدید نقصان پہنچایا ہے تم فکر نہ کرو ہم آئندہ بھی ان کا جین و سکون غارت کرتے رہیں گے"

وہ میری بات سنتے سنتے اچانک چونگی پھر پوچھنے لگی "وجدان! تم تو سید پور جا چکے تھے وہاں تمہارے دوست فرید پاشا کے والد کی تدفین ہونے والی تھی پھر یہاں واپس کیسے آ گئے۔ تمہاری واپسی تو ایک دو روز بعد میں ہونے والی تھی؟"

"ہاں پروگرام تو یہی تھا" میں نے اثبات میں سر ہلایا "لیکن حالات کی سبب سے ہمیں سید پور پہنچنے ہی نہیں دیا اور ہم مجبور ہو کر واپس لاہور آ گئے اور..... یہاں آتے ہی ایسی معرکہ آرائیاں مکمل گئیں کہ آدھی رات ہی کو گلیبرگ دالی کو بھی کی طرف پلٹ سکے۔ بہر حال" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بھی سناؤں گا۔ فی الحال مجھے ایک دوسرے فون کرنا ہے"

صدف نے میری توجہ ایک نہایت ہی اہم امور کی طرف موڑ دی۔ وہ بولی "وجدان! ہمارے معرکوں کا شمار ابھی تک کروڑوں کی ڈکی میں رکھا ہے" وہ بہت مختاط الفاظ استعمال کر رہی تھی "اس کی نگاہداشت بہت ضروری ہے وہ ہمارے لیے تڑپ کا پتا ہے۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ میں نہ رہا تو بازی مارنا

بہت مشکل ہو جائے گی"

"ٹھیک ہے" میں نے بھی ڈھکا چھپا انداز اختیار کیا۔ "میں اس جتنی تجھے کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ ڈکی سے نکال کر اندر پہنچاتا ہوں تاکہ اس کی نگرانی اور نگاہداشت سوز انداز میں ہو سکے"

میں نے فون کے ارادے کو چند منٹ موقوف کر دیا اور باہر جا کر فیصل کو ڈکی سے نکال لایا میں نے اسے اپنے کندھوں پر لا کر اسی کمرے میں پہنچایا تھا" فیصل ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ وہ کال زندہ تھا اور اسے زندہ ہی رہنا چاہیے تھا" کم از کم اس وقت تک جب تک میں اسے استعمال کر کے جو بددی نواوش علی کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب نہ ہو جاتا..... اور اپنی زندگی ساحل تک رسائی حاصل نہ کر لیتا۔

میں نے کوئی کہ اندر ہی سے ایک مضبوط سی تلاش کی اب اس کو بھی کے اندرونی راستوں اور کمروں کے بارے میں ابھی طرح جان چکا تھا اور کون سی چیز کہاں پڑی ہے یہ بھی مجھے معلوم ہو گیا تھا حالانکہ وہاں بہت ہی کم اشیائی تھیں کیوں کہ وہ کوئی ان دونوں "فاریل" کا تنہا سجانے لگی تھی اور اتفاقی ایسا تھا کہ جب سے پاشا کی زندگی میں میری انٹری ہوئی تھی وہاں "روفتیں" سی لگ گئی تھیں اور ان روفتوں کا مرکز و محور وہ خانہ تھا جہاں تک رسائی کے لیے ایک مخصوص تکنیک کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے فیصل کے ہاتھ پاؤں کو رسی کی مدد سے اس طرح جکڑ ڈالا کہ وہ اپنی مرضی سے انہیں استعمال میں نہ لائے کوئی دوسرے صورت تو اس کے جوش کرنے کی امید بھی نہیں تھی لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے بھی نہ کسی تو ہوش آتا ہی تھا..... اور جب بھی ہوش آتا تھا تو اس نے رج کر ہنگامہ آرائی بھی کرنا تھی وہ ایک مارشل آرٹسٹ تھا۔ اس کے من کا تھا ضابطہ کہ وہ اپنی جون میں آنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہ بیٹھا رہے حالانکہ میں نے رسی کی نہ کھٹنے والی بندھنوں سے اسے پاؤں پر ہاتھ رکھے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ دشمنوں کو باندھنے کی ایک مخصوص تکنیک ہوتی ہے جس سے وہ بے

دست ہو کر رہ جاتا ہے!

سب سے پہلے میں نے کراچی میں منہاس باقر سے رابطہ کیا۔ آج اس کی اکلوتی بیٹی شائے کی شادی تھی اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے یعنی اتوار کا دن شروع ہو گیا تھا۔ تیسری صفی پرفون اینڈنگ کر لیا گیا۔ میں نے منہاس باقر کے بچے پرفون کیا تھا۔

ایرپیس میں مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی "ہیلو! کون ہے" میں نے استفسار کرنے والی کو پلک جھپکے میں پہچان لیا۔ وہ ممتاز تھی مجھے اس کی وہاں موجودی پر حیرت بھی ہوئی کیوں کہ چند روز قبل اس کے ساتھ جو اندھنا کہ واقعہ پیش آچکا تھا اس کے بعد تو اسے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ تاحضی سلطان نے پتا نہیں اپنی بیٹی کو دوبارہ کیسے کراچی بھیج دیا تھا۔

شائے کے گھر میں موجود ممتاز کے "ہیلو! کون ہے؟" کے جواب میں میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا "ممتاز! تم کہاں؟"

"اوہ! تو تم وجدان بات کر رہے ہو!" وہ بھی لب دلہجے سے مجھے پہچان گئی تھی۔ بتانے لگی "میں بابا سے خد کر کے دوبارہ آ گئی ہوں تم تو جانتے ہی ہوؤہ آسانی سے میری بات ٹال نہیں سکتے۔ میں شائے کی شادی میں شرکت کیے بارہ نہیں سکتی اور....."

میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا "اچھا ہوا تم کراچی آ گئیں" یہ جملہ میں نے صرف اس لیے ادا کیا تھا تاکہ قطع کلائی کو وہ براہموس نہ کرے "میں بعد میں تم سے تفصیلی گفتگو کروں گا۔ اس وقت میں نے منہاس صاحب سے ایک ضروری بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ ذرا ان سے بات کروادو"

"ٹھیک ہے" میں انہیں بلوا دیتی ہوں "وہ جلدی سے بولی "جب تک اگل یہاں آئیں" تم مجھ سے بات کرلو۔ میں نے سامنے تم آج کل لاہور بلکہ اس سے بھی آگے ایک گاؤں سید پور گئے ہوئے ہو؟"

"تم نے بالکل درست سنا ہے۔" میں نے کہا اور اسے مصروف رکھنے کی خاطر اپنی مرضی کی گفتگو کرنے لگا "تم اتنی رات کو جاگ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہم دونوں ہی جاگ رہے ہیں۔" اس نے بتایا "میرے ساتھ شائے بھی ہے۔ میں نے اسے اگل منہاس کو اطلاع دینے بھیجا ہے۔"

میں نے کرپہنے والے انداز میں سوال کیا "دونوں

دوستوں میں کیا راز و نیاز ہو رہے تھے؟"

"بس، ہماری آپس کی باتیں ہیں۔" وہ خوشی سے بولی "تمہیں ایسی نسوانی باتوں کے بارے میں نہیں جانتا چاہیے۔" میں نے کہا "ٹھیک ہے، تم مجھے اپنے بابا اور اماں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ دونوں کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں اور تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ خاص طور پر بابا تو تہلے گردیدہ ہو گئے ہیں۔ تم نے دمر تہ مجھے بچایا ہے۔ وہ تم سے ملنے اور تمہارا شکر یہ ادا کرنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔" پھر وہ ایک سخت خاموش ہو گئی جیسے اسے کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔

میں نے پوچھا "کیا ہوا ممتاز؟"

"سوری وجدان! میں ایک غیر اخلاقی حرکت کر بیٹھی ہوں۔" بابا، کچھ بتاؤ تو سہی؟" میں نے اس کے کچھ کے لہجے میں پوچھا "ایسی کون سی غیر اخلاقی حرکت تم سے سرزد ہو گئی؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "میں اور تمہاری ساتھی ساحل ایک ساتھ اٹھا ہوئے تھے۔ مجھے سب سے پہلے ساحل کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا اور میں کوئی دوسرے ہی قصے لے بیٹھی ہوں۔ میں ایک مرتبہ پھر تم سے معذرت چاہتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "اگر تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں آج کل سید پور نامی گاؤں کی طرف گیا ہوں تو یہ بات بھی تمہارے علم میں آگئی ہوگی کہ ساحل کو کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ کیا اگل منہاس نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"ہاں، مجھے تمہارے اور ساحل کے بارے میں کافی کچھ بتایا گیا ہے۔" وہ اقراری لہجے میں بولی پھر جلدی سے کہا "لو، اگل آ گئے ہیں۔ تم ان سے بات کر دو۔"

تھوڑی دیر بعد میں منہاس باقر سے ہم کلام تھا۔ اس نے پہلے میری خیریت دریافت کی کیونکہ رات کے ابتدائی حصے میں بھی میں اسے کال کر چکا تھا اور یہاں کی صورت حال کے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔ میں نے دوبارہ سے تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حالات سے آگاہ کیا تو اس نے پوچھا۔ "ساحل کو بائی انز کراچی بھیج کیا۔ بی بیائی روڈ؟"

یہ وہ سوال تھا جو صدف نے بھی مجھ سے کیا تھا لیکن افسوس کہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا "منہاس صاحب! میں صرف اتنا جان سکا ہوں کہ اسے سہ پہر تین بجے کے قریب لاہور سے کراچی روانہ کیا گیا ہے۔ کس

ذریعے سے، یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔

”یہ ایک ایسی اندھیری گلی ہے کہ ہم فوری طور پر کوئی اقدام اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ منہاس باقر نے متا-فانہ انداز میں کہا ”بہر حال، تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی نہ کوئی بند دست تو کروں گا ہی اور آنے والی رات سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ تمہیں تو معلوم ہے۔۔۔“

”اچھی طرح جانتا ہوں جناب۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا ”کل رات آپ کی صاحب زادی کی برات آنے والی ہے۔ اب تو میں بھی اس شادی میں شرکت کر سکوں گا۔“

”میرے لیے یہ بے حد خوشی کی بات ہے۔“ وہ غلوں دل سے بولا ”تم کل کتنے بچے تک کراچی پہنچ جاؤ گے؟“

”دو پہرے سے پہلے۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ بولا ”ودھان! تم نے کبیر شاہ اور چوہدری ولداری کے ساتھ جو شان دار سلوک کیا ہے، اس سے میرے کیچے میں ٹھنڈ سی اتر گئی۔ چلو، تمہارے دشمنوں کے ساتھ کچھ تو حساب کتاب ہوا۔ میں پہلی فرصت میں اپنے ڈی ایس بی دوست کو اس مردود کے پیچھے لگاتا ہوں۔ ساڑھے دالے آریٹھن کے حوالے سے کبیر شاہ زندہ یا مردہ بڑی شدت سے کراچی پولیس کو مطلوب ہے۔“

میں نے دانش منہاس باقر سے یہ بات چھپالی کہ چوہدری ولداری کی زندگی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس دردغ کوئی سے میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ اسے مصلحت کا ایک تھا ضابطہ لیں۔ بعض اوقات ایسا بھی کرنا پڑتا ہے!

میں نے کہا ”منہاس صاحب! آپ کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے میں شرمندہ ہوں کہ بار بار آپ کو زحمت دیتا ہوں لیکن یہ سب اضطروری تھا۔“

”ایسی بات نہ کہو کہ مجھے تا دم ہوتا پڑے۔“ وہ اہمیت سے بولا ”میں تمہارے یہ ہر وقت فرصت نکال سکتا ہوں۔“ پھر اس نے استفسار کیا ”کیا تم نے اپنے تازہ ترین حالات سے فریڈ پاشا کو آگاہ کر دیا ہے؟“

”آپ کے بعد میں پاشا صاحب ہی کو فون کرنے والا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس نے پوچھا ”چوہدری نواز علی کے بیٹے فیصل کا کیا کردہ گے؟“

”اپنے ہاتھ میں دیوبچ کر رکھوں گا۔“ میں نے سفاکی سے کہا ”یہ چوہدری نواز کی ایک ایسی رگ ہے جسے دبانے

سے وہ خبیث انگاریوں پر لوٹے گئے گا۔ اب ہی تو دشمنی کے اس کھیل کا مزہ آئے گا۔“

منہاس باقر نے کہا ”ودھان! تمہاری دوست ساحل کو کراچی پہنچایا جا رہا ہے یا پہنچایا جا چکا ہے اور تم بھی کل یہیں آ جاؤ گے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا، تم فیصل کو بھی کسی طرح کراچی ہی میں منتقل کرلو۔ یہاں بیٹھ کر چوہدری نواز سے ٹاکرے کا لطف دو دہلا ہو جائے گا۔“

”ہاں، میری کوشش تو یہی ہوگی۔“

”اس سلسلے میں تم فریڈ پاشا سے مدد لے سکتے ہو۔“ اس نے کہا ”وہ بہت اثر و رسوخ والا بندہ ہے۔“

میں نے غصے سے ہوئے لہجے میں کہا ”میرے ذہن میں بھی یہی نام ہے۔“

”تمہیں یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ ممتاز یہاں پہنچ چکی ہے؟“ اریٹھن میں منہاس باقر کی مخصوص آواز ابھری ”بڑی خمدی لڑکی ہے یار۔“

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا ”قاضی سلطان صاحب کو بہر حال سوچنا چاہیے تھا۔ کراچی میں اس کے لیے خطرات کی کمی نہیں۔ میان زہد حسین تو جنم واصل ہو چکا۔ اب اس کی جگہ کوئی اور آ گیا ہوگا۔ قاضی صاحب کا ازلی دشمن وزیر اکبر سومر کو کسی نے قتل سے بھی گھبرا کر مٹا ہے۔ وہ عمر کوٹ کا طاقت ور آدمی ہے اور چوہدری نواز علی سے اس کے دوستانہ مراسم بھی ہیں۔“

”میں تمہاری بات کو جھٹلاؤں گا اور نہ ہی تمہاری تشویش کو نظر انداز کروں گا۔“ منہاس نے غصے سے ہوئے لہجے میں کہا ”خطرات بہر حال موجود ہیں لیکن یار! قاضی اپنی بیٹی کی خمد کے آگے مجبور ہو جاتا ہے۔ ممتاز چل گئی تھی کہ وہ ہر قیمت پر شہانہ کی شادی میں شرکت کرے گی۔“

”اس کی خمد اپنی جگہ لیکن ایسے حالات میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔“ میں نے کہا ”اگر انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہو تو یہی ضروری نہیں کہ اس کی خمد سے مجبور ہو کر خطرات مول لے لے۔ یہ تو اولاد سے دشمنی والی بات ہوگی!“

”تم نہیں جانتے۔۔۔ بالکل نہیں جانتے ودھان!“ منہاس نے احساس کی شدت میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا ”بیٹیوں کی خمد کیا ہوتی ہے اور کسی اکلوتی بیٹی کے ہا اختیار باپ کو کن کن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔“

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور صرف اتنا کہا ”آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں جناب کیونکہ آپ کی بھی

ایک ہی بیٹی ہے۔“

”قاضی سلطان نے اس مرتبہ بیٹی کے ساتھ دو دو بولے گاؤں بھی بھیجے ہیں اور میں نے بھی ممتاز کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ آگے اللہ کو جو منظور

”بالکل! اس کی منظوری کی بڑی اہمیت ہے۔“ میں نے

لہجہ میں نے پوچھا ”اس لڑکی کا کیا حال ہے؟“

”یہ ابھی تک سوال تھا کہ میں نے بے ساختہ پوچھا ”میں لڑکی؟“

”جی ہاں، جو آج کل تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔“

”ممتاز کی بات کر رہا ہوں۔“

”وہ بڑی ثابت قدمی سے میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔“

”اسے قریب قریبی فیصلی صدف کی طرف معنی خیز انداز میں بلادور ڈھکے ہیں میں منہاس سے کہا ”اور میرے ساتھ ہی

لڑکی آ رہی ہے۔“

”خدا خیر کرے!“ اس نے ذمہ داری لے لی۔

”تم!“ اس نے بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”ممتاز کے بعد پھر باتوں کے بعد ٹیلی فونک سلسلہ موقوف

میں نے ریسپورڈ کر لیا تو زرگل کے چہرے پر مجھے

”اللہ تعالیٰ کی دعا کی۔ وہ بڑے انتہاک سے میری گفتگو

”نہایت کی خاموشی نہ ہو۔“

”ودھان! کیا تم دونوں کل صبح کراچی جا رہے ہو؟“

”ارادہ تو یہی ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے

جواب دیا ”تم نے ماش کے دوران میں جانتا نہیں، کیا جاو دیکھا ہے۔“ لگتا ہے، تمہارے رخصت ہونے سے پہلے میں بجلی چٹکی ہو جاؤں گی۔“

میں نے اس کے پاؤں پر آٹھ منٹ کا مساج کرتے ہوئے کسی حد تک ”جی“ کی قوت کو بھی آ زما یا تھا۔ یہ سب اسی کے شرارت تھے کہ زرگل کو کافی افادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں یہ تجربہ ساحل کے پاؤں پر بھی کر چکا تھا لیکن اس وقت ساحل دھنوا کر رہی تھی اور۔۔۔ میرے بہت قریب بھی!

ساحل کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے قدرے اطمینان بھی تھا۔ جب سے فیصل میرے ہاتھ چڑھا تھا، مجھے ساحل کا حصول آسان نظر آنے لگا تھا۔ اگر میں اس کا رڈ کو مناسب طریقے سے کھینچا تو چوہدری نواز علی کیا، اس کا باپ ملک رمضان بھی قبر سے نکل کر کھینچنے پر مجبور ہو جاتا۔۔۔ اور اس کے اریب قریب ہی وہ گھوڑی بھی سرنگوں نظر آتی، رکھان والی کے کھینچوں میں فیصل کا دادا جس کی پشت سے گر کر جہنم مکالی ہوا تھا۔ کیا عجیب اتفاق تھا۔

فیصل کا دادا ملک رمضان، میرے دادا چوہدری حاکم علی کا دشمن تھا۔ پھر یہ دشمنی ایک نسل آگے بڑھی اور فیصل کا باپ چوہدری نواز علی، میرے والدہ عابد علی سے مکمل دشمنی پر اتر آیا اور

میرے والدین اسی دشمنی کی بیعت چڑھ گئے اور اب تیری پودا آئے سانسے کی۔ ہماری خاندانی دشمنی کسی موروثی مرض کے مانند نسل در نسل آگے بڑھتے ہوئے فیصل اور مجھ تک آ پہنچی تھی۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا، اس دیرینہ دشمنی کا

ادونت آگے چل کر کس کر دت بیٹھے گا!

میں انہی سوچوں میں ڈوبنے ابھرنے کے دوران میں

زرگل کی طرف بھی متوجہ رہا اور اس سے پوچھا ”تم مجھے اپنے

چاچا جاکت پار کے بارے میں بہت کچھ بتانے والی تھیں کہ

اس کی تم سے کیا دشمنی ہے۔ میں ایک ضروری فون کرلوں پھر

تمہاری داستان بھی سننے ہیں۔“

اس نے گہری جھنجھکی سے کہا ”ہاں ہاں، تم ایک چھوڑ

دس فون کرو۔ میری داستان سننے کے لیے چاہے تمہارے پاس کتنا ہی کم وقت کیوں نہ بچے مجھے یقین ہے، میں تمہارے

رخصت ہونے سے پہلے اپنی داستان مکمل کرلوں گی۔“

میں نے چونک کر زرگل کو دیکھا۔ چونکے کا سبب اس کا



میں بھلی جنگی ہوجاؤں گی اور مجھے یقین ہے، میں تمہارے رخصت ہونے سے پہلے اپنی داستان مکمل کرلوں گی۔

سارا زور میرے رخصت ہونے پر تھا۔ وہ دلکش دول نشین پشتون دوشیزہ اپنے سمندر دل میں پتا نہیں، کیا ٹھانے بیٹھی تھی!

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے۔ کوئی شریف انسان جو کسی دور دراز گاؤں میں ہو، ٹھنڈی ٹھار رات کے اس پہر اسے نیند سے جگانا کہیں کی بھی شرافت نہیں تھی، کجا یہ کہ وہ محض چند گھنٹے قبل ایک ایسی ہستی کو حوالہ دے بھی کر کے آیا ہو، دنیا میں جس کا کوئی نعم البدل نہ ہو لیکن بعض اوقات اشد ضرورت ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے، دوست وہ جو مصیبت کے وقت کام آئے کیونکہ مصیبت میں کسی سچے دوست ہی کی طرف دیکھا جاتا ہے!

فرید پاشا ایک کمر اور مٹائی دوست تھا۔ وہ رات کے آخری پہر بھی فون اٹھنے کرنے میں کسی کوتاہی یا سستی کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس کی مخصوص ”ہیلو“ میری سماعت سے گھرائی تو میں نے کہا۔

”میں وجدان بات کر رہا ہوں۔“

”یاد خیریت تو ہے۔“ وہ توشیح ناک لہجے میں متعطر ہوا۔ ”اتنی رات گئے فون؟“

میں نے کھیر آواز میں کہا ”پاشا! میرے پاس تمہارے لیے خوشی اور غمی کی جلی خبریں ہیں اور یہ خبریں ایسی سنسنی خیز ہیں کہ میں صبح ہونے کا انتظار نہ کر سکا اسی لیے اس وقت تمہیں پریشان کرنے چلا آیا ہوں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”کواس بند کر دو!“ ایرپیس میں پاشا کی ننگی آمیز آواز ابھری۔ اس آواز میں پکار نہیں بلکہ اپنائیت تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے بے تکلف دوستوں کو کوئی بات سمجھانے کے لیے بعض اوقات بلی پھسکی گالی بھی دے دی جاتی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ”تمہیں شرم نہیں آتی یہ پریشان“ اور شرمندہ“ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہو؟“

اس کی دوستی کے اسٹائل نے میرے دل کے ایک ایک گوشے کو ایک خاص قسم کی مسرت سے معمور کر دیا۔ اس مسرت میں غم کا احساس بھی شامل تھا۔ میں جذبات سے مغلوب بیٹھ گیا ہوں آواز میں بولا ”اب میں واقعی شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ تم نے شرم دلائی اور مجھے آگئی!“

”فضول تمہید میں وقت برباد نہ کرو اور پہلے مجھے ہی خبر سناؤ۔ تمہارے یار کے پاس بہت بڑا دل ہے۔“ وہ زندہ دلی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ”خوشی کی خبر بعد میں سن لو گی۔“

”میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں کہہ دیا کہ اس کی پیدا گلبرگ قمری والی کوئی پریشانی آنے والے واقعات سے بارے میں بتایا۔ بات گہری توشیح کی تھی لہذا وہ چہرے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”وجدان! میرے آدمی کل کسی وقت آئے گا۔“

”چارچ“ استقبال لیں گے۔ وہاں کے حالات اس قدر سنگین کرنا ہے، یہ میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ اس نے مجھے بروقت اطلاع دے دی۔ بہر حال، یہ ایک ناک واقعہ ہے۔“

”جو کہ سراسر میری وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے۔“

”تمہید کی ہے کہا۔“

وہ بولا ”تم پھر پڑی سے اترنے لگے۔ میں تمہیں ہلکا بزرگ دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ اپنا زخم دھو کر دیکھو۔ تم اس کو بھی سے دور ہوجاؤ۔“

”وہ تو میں ہو چکا۔“ میں نے کہا ”اس وقت میں تمہاری فاضلیہ کالونی والی کوئی سے بات کر رہا ہوں جس کی خدمت خانے میں خشاک کئی وفادار میری مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں۔“ ایک لمحے کے توقف کے سے میں نے اٹھا دیا

”میرے ساتھ صدف اور زرگل بھی ہیں۔“

صدف کے بارے میں وہ اچھو خاصی واقف تھا۔

کر چکا تھا اور گزشتہ ٹیلی فونک رابطے پر میں نے اسے زرگل کے بارے میں بھی مختصر آیتا دیا تھا۔ اس نے کہا ”تو اس کا مطلب ہے، میری پیش گوئی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں!“

میں نے کہا ”یہ پیش گوئی فرید اور منہاس جیسے دو بڑے فلکیات دافضیات نے کی ہے جو کسی طور ستاروں سے رابطہ میں رہتے ہیں، چاہے وہ ستارے لی دی ہو، مگر میں نے ان کے ستارے، آسمانی ستاروں سے کہیں زیادہ ہوشیار ہیں کیونکہ اشرف المخلوقات ہیں جو کلکی ستاروں پر کند ڈالنے کے سبب سمجھے جاتے ہیں۔ میں بھلا آپ بزرگوں کی پیش گوئی کو رد کرنے کی جرات کیسے کر سکتا ہوں!“

اس نے ہلکا پھلکا قہقہہ لگایا اور بولا ”اب خوشی کا خبری سناؤ۔“

اس کے قہقہے سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اسے اپنے کی موت کا غم نہیں تھا۔ فرید پاشا بہت ہی زندہ دل اور ہنس مچھل تھا اور اپنے دوستوں کی دل داری کے جواز دیکھ کر

اس نے کہا ”یار! میں نالکہ کی بات کر رہا ہوں۔ تم نے اس کے انگوٹے کا کارروائی کرنا کامیاب بنایا تھا نا وہ تمہارے

کا ٹریٹ شروع کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے۔ اور لی الفور پہلا ڈوز اسے مل جانا چاہئے۔ جو چوری سے رابلے کے لیے مجھے اس کا فون نمبر چاہئے۔“

”یہ کیوں اتنا مشکل کام نہیں؟“ وہ بے پروائی سے بولا ”ابا جی کی ڈائری میں جو چوری نوازش کا فون نمبر موجود ہے۔ میں ابھی دیکھ کر تمہیں بتا دیتا ہوں تم دوسرا کام بتاؤ؟“

میں نے کہاں ”دوسرا کام یہ ہے کہ فیصل کو کسی بھی طرح کراچی پہنچانا ہے چاہے اس میں کچھ وقت بھی لگ جائے۔ میں تو کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے ایک دور دراز بعد وہاں پہنچا دیا جائے۔ اس وقت وہ بے ہوش بھی ہے۔ یہ کام مجھے خاصا دشوار نظر آ رہا ہے۔“

”دشوار تو نہیں مگر مزید حاضر رہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”فیصل کو پانی روٹی اور کراچی کے جاننا زیادہ مناسب رہے گا اور اس سلسلے میں۔۔۔۔۔ خیر! اس کچھ سوچتا ہوں کچھ کرتا ہوں۔“

تم جب تک جو چوری نوازش کی نیند ازاد۔ میں نے تم سے گفتگو کے دوران میں تمہارا نمبر تلاش کر لیا ہے۔ تم بھی لوٹ کر لو اپنے پاس بہت کام آئے گا۔“

میں وہ نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کر چکا تو فرید پاشا نے کہا ”جب تک تم جو چوری کو فرسٹ ڈوز دے کر فارغ ہوتے میں فیصل کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔ اس سلسلے میں تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تمہارے یار کی بات مانی جاتی ہے۔“

میں فیصل والے مسئلے سے بے فکر ہو گیا۔ فرید پاشا واقعی ایک ایسا آدمی تھا کہ زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اس کا کہنا ٹالا نہیں جاتا تھا۔ فلم پروڈیوسر ہونے کے ناتے اس کی پہلی دور تک بھی اور حلقہ احباب بھی کافی وسیع و عریض تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ مجھے اس کی ڈانٹ نہ سننا پڑے فون بند کرنے سے پہلے اس نے کہا ”تمہاری بھابی دو تین مرتبہ تمہارے بارے میں پوچھ چکے ہیں یار۔“

”کون سی بھابی؟“ میں نے کہا ”شہری یاد بیاتی؟“

فرید پاشا نے دو شاہیاں کر رکھی تھیں۔ اس کی ایک بیوی لاہور میں اس کے ساتھ گلبرگ قمری والی کوئی میں رہتی تھی جب کہ پہلی بیوی سید پور والی حویلی میں رہتی تھی۔ شاہین نامی اس عورت سے فرید کی تین اولاد ہیں جس میں جب کہ شہری بیوی نالکہ کی گودا بھی بری نہیں ہوئی تھی۔

اس نے کہا ”یار! میں نالکہ کی بات کر رہا ہوں۔ تم نے اس کے انگوٹے کا کارروائی کرنا کامیاب بنایا تھا نا وہ تمہارے



آتش، فشار، 286

چیت گر لی ہے۔ تم مج سات بجے اس شخص سے جا کر ملو۔

بات ماننے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔  
نئی نوک سلسلہ ختم ہوا تو صبح کے حارج رے تھے۔

رابطہ کے لئے 63-C فز ۱۱۱ یکمشتون ڈی جی ایچ اسٹریٹ کراچی 75500

آتش فشاں (286) حصہ 9

ایک پولیس اہل کار کے اشارے پر مجبوراً مجھے بھی ٹوہڑ  
کر دلا رکھا پڑی۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ تاکے کو توڑ  
کر فرار ہونا سراسر نقصان دہ ثابت ہوا۔ پولیس کی دو دستاوت  
موبائل بھی وہاں دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ میرا ذہن برقی رفتار سے  
کام میں مصروف ہو گیا۔ چیکنگ کے مناظر مجھے بہت دور تک  
سوچنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ اس خطرناک خیال نے  
مجھے ہلا کر رکھ دیا کہ اگر پولیس والوں نے ہماری گاڑی کی  
تلاشی کے دوران میں ڈکی کو کھول کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

اس ڈکی میں رکھا ۱۰ الی کے فروعون صفت چوہدری  
نوازش علی کا تخت جگر بے سدھ پڑا تھا۔ اس حالت میں کسی  
فحص کو ڈکی میں ڈال کر کہیں لے جانے کا کوئی جواب یا جواز  
ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم قانون کی نظر میں سراسر مجرم  
نظر آتے۔

میں ان مہلک خیالات کو اپنے ذہن سے گزاری رہا تھا  
کہ ایک بادرونی پولیس اہل کار تیزی سے ہماری گاڑی کی  
جانب بڑھنے لگا۔

تپائیں، اس نازک موقع پر تقدیر کون سا سنگین خالق  
کرنے چاہی تھی!

نہ کہانی میں بڑی سنسنی خیزی ہوگی۔ میں نے اس کے بارے  
میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور..... فیصلہ تو اسی کو کرنا تھا۔  
جس نے سوچا، بادامی باغ والے معاملے سے منٹ لوں پھر  
کہیں بیچہ کرنا شکار کریں گے اسی دوران میں اس مسئلے پر بھی  
ڈسکس ہو جائے گی۔

مزنگ چونکی، جناز گاہ اور بھائی سے ہوتے ہوئے ہم کی  
شاہ پہنچ گئے۔ ابھی تک اچال نہیں پھوٹا تھا۔ زرگل نے بتایا کہ  
آزادی چوک سے ہمیں دائیں جانب مڑنا ہوگا پھر بادامی باغ  
کا راستہ آسان اور سیدھا ہو جائے گا۔

میں نے تھوڑا آگے جا کر کر دلا کو رائٹ ٹرن دیا اور  
گاڑی کو بینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے درمیان سے  
گزارتا چلا گیا لیکن پچاس گز آگے جانے کے بعد مجھے چونکنا  
پڑا۔ ایک تشویش ناک صورت حال سے سامنا ہو گیا تھا۔

وہاں پولیس نے ناک لگا رکھا تھا اور ادھر سے گزرنے

والی گاڑیوں کی باقاعدہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ حالات کی اس  
دہلیز صورت نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ ایک درجن کے  
قریب پولیس والوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، وہاں کوئی  
زبردست قسم کی کارروائی ہو رہی تھی۔



اس داستان کا 10 واں حصہ  
مئی 2005ء میں شائع ہوگا

سوی و انجمن کاتولیک خیرات

# آتش فشان

1412.10

13



صرف کاشانوک کی کال کا انتظار کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ سیل فارغ ہو جائے گا۔ بعد میں ہم کاشانوک کے سیل سے تمہیں اپنے رابطے میں آئیں گے۔ کھڑکیا آئیڈیا ہے؟“

اس نے چوں نہ کی تاہم چہرے کا اتار چڑھاؤ یہی بتا رہا تھا کہ مجبوری کا نام شکر یہ کہ صدقاً وہ ہم۔۔۔۔۔ سے اتفاق کرنے پر تیار ہوئی ہے۔ بہر حال آئندہ پانچ منٹ میں ہم نے یقینی میں نے اور کاشانوک نے آدمے ڈانکا مات پینڈر گریڈ اور ٹائم بم کو بڑی مہارت سے اپنے لباس میں چھپالیا۔ اس خطرناک اسلحے کا کچھ ذخیرہ ہم نے بیگ کے اندر ہی رہنے دیا تاکہ واپسی میں وقت ضرورت کام میں لایا جاسکے۔ اس ہلاکت خیز اسلحے میں زیادہ تعداد پینڈر گریڈ کی جی جینیں ہم اپنی جیسی کے اندر رہے ہو تعاقب میں آنے والوں پر استعمال کر سکتے تھے۔ ٹائم بم اور ڈانکا مات کی زیادہ مقدار ہم اپنے ساتھ بٹنگے کے اندر لے کر جاتے۔

جب آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے ہو گیا تو کاشانوک ہم سے رخصت ہو کر بٹنگے کی سامنے والی سٹ چلا گیا۔ لی یان نے تہائی میسر آتے ہی گلوں اور کلکوس کا پنڈورا باکس کھول کر رکھ دیا۔ مجھے چونکہ اس کی کوئی بات ماننا نہیں تھی لہذا پوری توجہ سے اس کی شکایات سن رہا اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”تم خود کو اس مشن سے الگ کیوں سمجھ رہی ہو۔ جیسی میں پینڈر گریڈ جو ڈتے داری پوری کرو گی وہ بھی بہت اہم ہے۔“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”میں خود کو اس مشن سے نہیں بلکہ تم سے الگ محسوس کر رہی ہوں۔“

میں اس کے نزدیک چلا گیا اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”میں تمہیں اتنا کمزور تو نہیں سمجھتا تھا۔ ان لحاظ میں تم خاصی جذباتی ہو رہی ہو۔“

ہم اس وقت جس مقام پر کھڑے تھے وہاں ہمارے علاوہ صرف تاریکی ہی تاریکی تھی لہذا اس بات کا ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا کہ کوئی ہمیں دیکھ لے گا۔ کاشانوک کے جانے کے بعد ہم اس تاریک گوشے میں آگئے تھے۔ ورنہ پہلے جہاں کھڑے تھے وہاں ٹنگا اجالا موجود تھا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں لی یان سے بات کی تو وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔

میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند لہرایا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لی یان! تم ادھر جیسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر بیٹھو۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی بٹنگے سے نکلے گلیں گے تمہیں فون کر دیں گے۔ تم جیسی کو فوراً ادھر لے آنا۔ اس طرح اس مشن میں تمہاری شمولیت بھی ہو جائے گی اور ہمیں بھی زیادہ کٹ راگ نہیں پھیلانا پڑے گا۔“ پھر میں نے لی یان کی ہاں پاند دیکھے بغیر کاشانوک سے کہا۔

”یار! جیسی کی چابیاں تم لی یان کے حوالے کر دو۔“

یہ اسکیم کاشانوک کو بھی بہت پسند آئی تھی لہذا لی یان کو طوعاً و کرہاً ہم سے اتفاق کرنا پڑا۔ کاشانوک نے جیہو کی جیب۔۔۔۔۔ میں سے چابیوں والا چمچ نکال کر لی یان کی طرف پڑھا دیا اور اسے بتانے لگا کہ مذکورہ جیسی کس لوکیشن پر کھڑی تھی۔

میں نے کہا ”تم جیسی میں ہمارے فون کا انتظار کرنے کے دوران میں اندرونی لائٹ کو آف ہی رکھنا تاکہ باہر سے گزرنے والا کوئی بھی شخص براہ راست تمہارے چہرے کو نہ دیکھ سکے۔ ویسے تمہارے پاس لیڈی بٹل موجود ہے۔ ضرورت پڑنے پر تم اسے استعمال کر سکتی ہو اور اگر کسی ہنگامی صورت حال میں تمہیں ہماری آمد سے پہلے وہاں سے کھسکنا پڑے تو تم فون کر کے ہمیں بتا دینا۔“ میں ایک لمبے کھنکھناتے ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ویسے مجھے امید نہیں ہے کہ ایسا کوئی آپ سیٹ ہو۔ میں نے احتیاطاً تمہیں یہ سب کچھ بتایا ہے۔“

لی یان کے چہرے کے تاثرات یہی بتاتے تھے کہ دل سے اسے ہماری پلاننگ پسند نہیں آئی۔ تاہم اس نے کھل کر ہماری مخالفت نہیں کی۔ وہ درحقیقت ہمارے کندھوں سے کندھا ملا کر اس کا ردوائی میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر جب اس نے زبان کھولی تو لہجے سے برہمی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”وہ جان! تم دو تین مرتبہ مجھے فون استعمال کرنے کی ہدایت دے چکے ہو حالانکہ تم جانتے ہو میرے والا سیل تو دہیں گھر پر رکھا ہے!“

اس کے جھنجھلاہٹ میرے اعتراض پر مجھے بہت پیار آیا۔ وہ اپنی بے بسی کیوں ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے لگاؤت میرے لہجے میں کہا ”چندرا! غم کیوں کرتی ہو۔ میں اپنا سیل تمہیں دے کر ہی جیسی کی جانب روانہ کروں گا۔ مجھے تو



”تم کہہ رہے ہو تو غلط نہیں ہوگا لیکن مجھے کم زور بھی تو تم نے بنایا ہے۔“

میں گہری تاریکی کے باوجود بھی اس کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے میں کامیاب رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے درمیان اس وقت نہ ہونے کے برابر فاصلہ حائل تھا۔ میں نے اس قربت میں لیان کے ہونٹوں کی قرقرہاٹ محسوس کرلی۔ اس کا پورا بدن غیر محسوس انداز میں لرز رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ کوئی کمزور یا بزدل لڑکی نہیں تھی۔ یہ اس نفسیاتی برتری کا اثر تھا جو مجھے اس پر حاصل تھی۔ وہ جن حالات سے گزر کر مجھ تک پہنچی تھی اور پھر میرے ساتھ رہتے ہوئے اسے مزید جن اعصاب شکن حالات سے گزرنا پڑا تھا۔ اس نے لیان کو خفا صابر دل کر رکھا تھا۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔ خاص طور پر شون کی موت کے بعد وہ بالکل تنہا ہوگئی تھی لیکن میری دل چوٹی اور پُر خلوص ہمدردانہ رویے نے اس کی تنہائی اور آرزو کی گایاٹ ڈالا تھا۔ وہ بہت کم وقت میں میری بہت زیادہ عادی ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کے شانوں سے اٹھا کر رخساروں تک پہنچا دیا اور حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا ”میں جانتا ہوں تم بہت ہادرد لڑکی ہو۔ اس وقت جذباتی اہال نے تمہیں ایسا کر دیا ہے لیکن فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ خاموش رہی۔ زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ تاہم اس کے وجود کے اندر پھیلا ہوا اضطراب میرے ہاتھوں کے راستے مجھ تک پہنچتا رہا۔ میں دھیرے دھیرے اس اضطراب کو اپنے ہاتھوں سے کشید کرتا رہا تاکہ اس کے اندر چھلنے والا طوفان ختم جائے وہ پُر سکون ہو جائے مگر میری اس کوشش نے الٹا اثر دکھایا۔

وہ شانت ہونے کے بجائے بھگم گئی۔ ہاتھوں سے اسے سنبھالنا ممکن نہ رہا تو مجھے مجبوراً آدھ آگے بڑھنا پڑا۔ اس سنبھالنے اور سنبھالنے پر تاریک رات نے رضا کارانہ طور پر آنکھیں بند کر لیں۔

میری ران پر ہونے والی قہر قہر اہٹ نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سیل کی جلد گھنٹیاں بند کر کے اسے سائیکل الٹ بڑا ل رکھا تھا۔ یہ بھینا کاشانوک کی کال تھی۔ میں نے جینز کی جیب میں سے سیل نکالا تو میرے انداز سے کی تصدیق ہوگئی۔

میں نے سیل کو کان سے لگایا تو کاشانوک کی مانوس

آواز میری سماعت سے گھرائی ”وہدان! میں نے ادھر کا میدان صاف کر دیا ہے۔ پانچ منٹ سے پہلے پہلے تم اندر پہنچ جاؤ۔“

میں نے سیل کو رابطہ ختم ہونے کے بعد لیان کے حوالے کر دیا اور تاکید کی کہ میں ”جاؤ“ ادھر لپکی میں بیٹھ کر میری کال کا انتظار کرو۔ میں بہت جلد تم سے رابطہ کروں گا۔“

اس نے سیل کو جیب میں ٹھونسا ہینڈر پیڈ والے بیگ کو اٹھایا اور ”گڈ بائے“ کا عملی مظاہرہ کرنے کے بعد لپکی کی جانب بڑھ گئی۔

کاشانوک نے پانچ منٹ کے اندر مجھے عملی قدم اٹھانے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے بیٹنگ کی عقی دیوار کو اپنی ٹاٹھ میں تاپ تول کر اندازہ لگایا پھر اس کے اوپر چڑھنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ بیٹنگ کے پھوڑے گہری تاریکی کا راج تھا۔ ادھر سے کسی بندے بٹر کے گزرنے کے امکانات نہیں تھے اسی لیے بھی میں نے بڑے مطمئن انداز میں دیوار کی بلندی تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کے بعد میں نے ایک نظر اندر کا جائزہ لیا اور کاشانوک کو دریافت کر لیا۔

بیٹنگ کے عقی حصے میں ایک وسیع و عریض لان تھا اور کاشانوک اسی لان میں کھڑا نظر ٹاٹھ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیوار پر موجود یا کر اس نے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا اور میں اس کا اشارہ پا کر آہستہ بیٹنگ کے اندر کود گیا۔

نرم اور دبیز گھاس سے میرے قدم ٹکرائے تو ایک موہمی آواز پیدا ہوئی لیکن اس سبک آواز نے اس وسیع و کشادہ لان سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ میں اطمینان سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور سیدھا کاشانوک کی سمت بڑھ گیا۔

کاشانوک مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک کونے میں چلا گیا۔ ادھر قدرے تاریکی تھی۔ ہم اس تاریک گوشے میں پہنچے تو اس نے ایک گرم جیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔

”اسے اپنے لباس کے اوپر پہن لو۔“

میں نے جیکٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ ویسی ہی جیکٹ کاشانوک نے بھی اپنے لباس کے اوپر زیب تن کر رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا اس جیکٹ کا نقل سیکورٹی گارڈز سے تھا۔ پتا نہیں کاشانوک نے وہ فاصل جیکٹ میرے لیے کہاں سے اور کیسے حاصل کی تھی۔ میں نے جیکٹ پہننے

ہوئے جب اس بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا۔

”پہلے جیکٹ پہن لو پھر تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں۔“

میں جیکٹ کو اپنے لباس کے اوپر بھرا کر فارغ ہوا تو وہ مجھے لان کے ایک دور افتادہ کونے میں لے گیا۔ اس طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہوا تھا جس میں ناکارہ سامان بھرا ہوا تھا۔ وہیں مجھے ایک ہٹا کھٹا شخص بے سادہ پڑا ہوا نظر آیا۔ میرے سینے سے ایک گہری اور متاثرانہ سانس خارج ہوئی۔ یہ سمجھے میں نے ایک لمبے کی دیر نہ لگی کہ وہ بے ہوش نظر آنے والا شخص اس بیٹنگ کا سیکورٹی گارڈ تھا جسے کاشانوک نے اپنے کسی کمالی سے اثنا نقل کر دیا تھا۔ اس نے مجھے جو جیکٹ پہننے کو ڈی ٹی وہ اسی گارڈ کی تھی۔ بے سادہ پڑے ہوئے گارڈ کے نزدیک ہی مجھے ایک آنو جیکٹ مگن بھی رکھی دکھائی دی۔ کاشانوک نے وہ مگن اٹھا کر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

”یہ رکھ لو۔ کسی برے موقع پر کام آئے گی۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

ویسی ہی ایک مگن کاشانوک نے بھی اٹھا رکھی تھی۔ جب موہاں فون پر اس نے مجھے اس بیٹنگ میں کسی ہنگامی بیٹنگ کی اطلاع دی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا اس کی ڈیوٹی جو گنڈر پال نے بیٹنگ کے عقی لان والے حصے میں لگائی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گارڈ بھی وہیں ڈیوٹی دے رہا تھا لیکن اس گارڈ کی بہ نسبت کاشانوک کو یہ سہولت اور آسانی حاصل تھی کہ وہ بیٹنگ کے اندرونی حصے میں بھی آ جا سکتا تھا۔ اب اس دوسرے گارڈ کی جگہ میں وہاں آ گیا تھا اور وہ بے چارہ دو تین گھنٹے کے لیے دنیا دہا لیا ہے بے خبر ہو کر اسٹوروم میں آرام فرما رہا تھا۔

میں نے کاشانوک سے پوچھا ”اندرونی کیا صورت حال ہے؟“

”صورت حال اطمینان بخش ہے۔“ اس نے بتایا ”جو گنڈر پال اندر موجود ہے لیکن اسرائیلی مہمان ابھی تک نہیں پہنچے۔ ان کا بڑی شدت سے انتظار ہو رہا ہے۔ دلچسپ سننے میں آ رہا ہے وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ اصولاً اس کی آمد میں چھوڑ منٹ ابھی باقی ہیں۔“

”ہمیں ابھی چھوڑ منٹ میں اپنے کام مکمل کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بالکل۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھمے لہجے

میں بولا ”میں یہ کام پہ آسانی کروں گا۔“

”میں.....“ میں نے اس کے جملے کا ایک لفظ پکڑ کر دہرایا اور حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا ”کیا تم اکیلے یہ کام کرو گے۔“

”ہاں وہدان! اسے تم ہماری مجبوری سمجھ لو۔“ وہ آہستگی سے بولا ”تم بیٹنگ کے اندر نہیں جاؤ گے۔ میں نے اس سیکورٹی گارڈ کو اسی لیے آرام کی نیند سلایا ہے کہ تم یہاں لان میں اس کی پوزیشن سنبھال سکو تاکہ میں اطمینان سے ڈائنامیٹ کی تنصیب اور ٹائم بم کی پلیٹنگ کا کام مکمل کر سکوں۔“

”اوہ!“ میں ایک حشدری سانس لے کر رہ گیا تو کیا میں اس کھیل میں تمہارا سلیپرنگ پارٹنر ہوں۔“

”ایسی بات نہیں وہدان۔“ وہ جلدی سے بولا ”تم اس گیم میں اپنا بھرپور متحرک پارٹ ادا کرو گے۔ ڈائنامیٹ

لیٹا کر شون میں شال شون کے گریو  
تھیں کی لپٹیں اسٹورون

خفا خفا انی خفا

تصویر و تحقیق  
ڈاکٹر سراجد امجد  
صفحات  
400 سے زائد

محبت الی محبت الی الی  
محبت الی محبت الی الی  
محبت الی محبت الی الی  
محبت الی محبت الی الی

ان کتابوں میں سے ایک تمہیں ہر گز نہیں ہونا چاہیے

کتابت پبلی کیشنز کراچی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 021-5804300  
kitabiat1970@yahoo.com  
263-C 111 بکس پش زئی کجاس میں کنگی راز (ڈاکٹر کالونی کسٹاپ کے سامنے)

مانع اور تاہم ہم ان لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے استعمال ہوں گے۔ اس بلا سنگ کے نتیجے میں اگر ان کو کوئی شدید جانی نقصان پہنچتا ہے تو یہ ہمارے لیے بولس ہوگا ورنہ میرا منصوبہ یہ ہے کہ انہیں دہشت میں مبتلا کر کے جنگ کے بینک ہال سے باہر لایا جائے اور جب وہ افراتفری کے عالم میں باہر نمودار ہوں گے تو ہم انہیں اپنی نونوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔

”آئیڈیا بہت عمدہ ہے۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا پھر پوچھا ”ہمیں اس جنگ میں زیادہ سے زیادہ کتنے افراد سے نمٹنا ہوگا؟“

”ایک سے تو میں منٹ چکا ہوں۔“ اس نے اسٹوروم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”دوسرا جہت پر پیرا دے رہا ہے۔ میں کسی خلیہ دے لیے سے اسے تہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ میری طرح اس سے تم منٹ لیتا۔ ہائی صرف دو سیکورٹی گارڈ بھیجیں گے یعنی ہم دونوں۔ اس کے علاوہ ایک مسلح چوکیدار گیت پر تھین ہے۔ اس سے کسی بھی وقت نمٹا جاسکتا ہے۔“

وہ لمبے بھروسے لپٹے کے لیے تمہارا پیرا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا ”جنگلے کے اندر دو لائین اور ہائی مہمان ہوں گے جن کی تعداد تین سے پانچ ہو سکتی ہے۔ ویسے وہ تین سے پانچ درجن بھی ہوں تو پروا نہیں ہے۔ وہ جس کسپری کے عالم میں جان بچانے کے لیے جنگلے کے اندر دھنچے سے نکلیں گے انہیں شکار کرنا ہمارے لیے چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو بتاؤ۔“

”کوئی الجھن نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اس ہنگامی بینک کی زندہ کارروائی کا نظارہ کر سکیں؟“

”ایسا کرنا انتہائی خطرناک ہوگا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”ہمیں صرف اپنے مطلب سے غرض رکھنا چاہیے۔ تم نے ڈین ہاروے اور گارڈیا کو مار کر اپنے دشمنوں کے دلوں پر ایک دہشت سی بٹھا رکھی ہے۔ اس واقعے کے بعد ان کا پتا پانی ہو جائے گا۔ جب ہم یہاں سے کامیاب واپس جائیں گے تو تم رہی سے اکثر بات کر سکتے ہو۔“

اس نے میرے دشمنوں اور رہی کا ذکر روانی میں کیا تو ہمیں یہ سمجھے بنا نہ رہ سکا کہ ڈاکٹر مونگ نے اسے میرے معاملات سے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی پائی جوت کو پہنچ جاتی تھی کہ کاشانوک ڈاکٹر مونگ کے لیے واقعی بھروسے کا آدمی تھا اور میں نے بھی اب تک

اسے ایسا ہی پایا تھا۔

”ٹھیک ہے کاشانوک میں تمہارے منصوبے سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے کہا ”جیسے جی سکی چلیں میں اپنے بھائی دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان تو پہنچا سکوں گا۔“

”اسی طرح جو گندر پال کے نامہ اعمال کا حساب بھی ہو جائے گا۔“ کاشانوک نے کہا ”اس نے ان جتنی چڑی والوں کو اس دھرتی میں قدم جمائے گا موت دیا ہے۔ وہ غدار وطن ہے اور خدا چاہے کسی بھی شے کا ہو، اس کی کم از کم سزا عبرت ناک موت ہوتی ہے۔“

بات کے اختتام پر اس کا لہجہ بے انتہا کڑوا ہو گیا۔ میں نے اس کا کندھا چپکتے ہوئے تسلی دی ”فگر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ اٹل لہجے میں بولا ”اچھا“ میں چلتا ہوں۔ پہلے میں جہت والے سیکورٹی گارڈ کو تہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اس کے بعد دھماکا خیز مواد کو تحویل کروں گا۔“

”یہ کام تمہیں بہت احتیاط سے کرنا ہوگا۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”میں نے جہرم کے ایجنٹوں کے استعمال کی خصوصی ٹریننگ لے رکھی ہے۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا ”تم فگر نہ کرو میں ڈانٹا مانت کی تحویل اور تاہم ہم کی پلیننگ میں خاص احتیاط برتوں گا اس طرح کہ کسی کا میری طرف یا ان خطرناک اشیاء کی طرف دھیان نہ جائے۔“

بھروسہ مجھ سے گرم جوش معافیہ کر کے جنگلے کے پہلو میں نکل گیا۔

کاشانوک نے چندہ منٹ کی جو مہلت بتائی تھی اس میں سے تین منٹ گزر گئے تھے۔ میں ان اسرائیلیوں کے بارے میں سوچنے لگا جو ابھی اس جنگلے میں نہیں پہنچے تھے اور اگر یہاں پہنچ جاتے تو پھر میں انہیں کبھی اور بھیجنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ وہاں..... جہاں سے وہ پھر بھی واپس نہ آتے۔

دو منٹ بعد کاشانوک کی محنت رنگ لے آئی۔ میں نے ایک باوری سیکورٹی گارڈ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً یہ وہی گارڈ تھا جو جنگلے کی جہت کی نگرانی پر مامور تھا۔ وہ مجھ سے دس قدم کی دوری پر تھا کہ اس نے مجھے پکارا۔

”منگ! کیا بات ہے۔ تم نے مجھے کیا دکھانے کے لیے بلایا ہے؟“

کاشانوک نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ میں نے جس گارڈ

کی پوزیشن سنبھالی تھی اس کا نام منگ تھا جیسا وہ گارڈ مجھے اس نام سے مخاطب کر رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس گارڈ کا نام تھا پاتا۔

میں نے پراسرار انداز میں اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے کہا ”تھا پاتا جی دور سے تمہیں کیا دکھاؤں۔“ قریب آؤ تو کوئی بات بھی بنے۔“

میں دانستہ ایک ایسا تاریک اوٹ میں کھڑا تھا جہاں تھا پاتا میرا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کاشانوک نے مجھے تھا پاتا کی ایک کمروری بھی بتادی تھی۔ وہ ڈپٹی آوارگی کا شوقین تھا۔ پر بند عورتوں کی تصاویر دیکھنا اور اپنے پاس رکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا جس کی اس نے اپنے موہل فون کے ایم ایچ سی (ملٹی میڈیا کارڈ) کی ساری میموری ایسی ہی تصاویر اور محرک ٹیکس سے بھر رکھی تھی۔

لنگ کسی بھی شے کی ہو رہی ہوتی ہے۔ جب انسان کی طلب و رسد میں توازن قائم نہ رہے تو پھر وہ جنونی ہو جاتی ہے۔ ہر وقت اس کے ذہن پر ایک سنگ سی سوار رہتی ہے جو اسے ڈپٹی اور جسمانی طور پر پچھڑ کر رکھ دیتی ہے۔

تھا پاتا ایک حد تک نفسیاتی مریض ہو چکا تھا۔ وہ ڈپٹی آوارگی کی تمام حدود کو چھٹا چکا تھا۔ میں نے اس کے کاتش شوق کو ہوا دینے کے لیے اپنی جیب کو بدستور ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں کہاں رکھ دی ہیں۔ پتا تازہ اور کارآمد لایا ہے میرے پاس۔“

وہ کسی بھوکے پیارے کی طرح رال بکا پکا ہوا ایسے میری جانب بڑھا جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے۔ میں اسے سنبھالنے کے لیے پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ وہ جیسے ہی مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر پہنچا میں نے اسے شکار کر لیا۔

میری ایک حیرت انگیز سائیکلنگ اس کے سینے پر پڑی۔ میں نے اچانک ہی ایک لمبا اسٹیپ لے کر اسے خطرناک لنگ چڑی تھی۔ وہ میری طرف سے کسی ایسے رد عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا اسی لیے مارا گیا۔ وہ اپنی آنکھوں کو کھٹکے کے لیے میری طرف بڑے اشتیاق سے بڑھا تھا۔ اس کی ہوس تو تسکین نہ پا سکی البتہ سینے پر ایک زبردست لنگ کا جھنجھاک گیا۔

اس کے حلق سے ”اوں“ کی ایک ہمہ می صدا خارج ہوئی اور وہ پہلو میں لڑکھڑاتے ہوئے پختہ دیوار سے جا کھرایا۔ اس ٹکڑاؤ کے نتیجے میں شاید اس کی کھوپڑی کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئی تھی کیونکہ دیوار سے تصادم کے بعد وہ

وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کا تنہیدی جائزہ لینے لگا۔ وہ اپنے جذبہ کی تسکین کے لیے ایسا اندھا ہو گیا تھا کہ ہر شے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس کی کھوپڑی میں صرف ایک ہی تصویر قائم تھا..... اور اس روشن تصویر نے اس کی کھوپڑی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

اس کے سرسری معائنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کم از کم دو گھنٹے تک ہوش میں نہیں آسکتا تھا تاہم میں نے احتیاطاً پھر بھی اس کی گردن پر موجود مخصوص رگ کو مہارت سے مل دیا۔ اب اس کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت کی توقع نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد میں اسے گھسیٹ کر اسی اسٹوروم میں لے آیا جس میں اس کا بھائی بندہ ہر شے سے بے گانہ پڑا تھا۔ میں نے تھا پاتا کو اصلی منگ کے اوپر ڈالا اور اسٹوروم کے دروازے کو پکڑا۔ ہنگلی بند کر کے وہاں سے مہٹ گیا۔

تھا پاتا! اندھیرے کے باعث میری صورت نہیں دیکھ سکا تھا ورنہ وہ چونک جاتا اور کوئی بھی گڑبڑ پیدا ہو سکتی تھی۔ بہر حال وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے منگ کے پاس آیا تھا اور میں نے ایک گائیڈ کا کردار ادا کرتے ہوئے اسے اصلی منگ تک پہنچا دیا تھا۔ اب وہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔

میں بڑے اعتماد سے جنگلے کے عقبی لان پر ”پیرا“ دینے لگا۔ پانچ منٹ بعد میں نے جنگلے کا مین گیت کھٹکے کی آواز سنی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ گیت کھٹکے کا ایک ہی مطلب تھا کہ کوئی گاڑی یا تو اندر آ رہی تھی یا پھر باہر جا رہی تھی۔ اس وقت معزز اسرائیلی مہمانوں کا بڑی شدت سے انتظار ہو رہا تھا لہذا اس بات کے امکانات زیادہ روشن تھے کہ کوئی گاڑی آ رہی ہوگی۔

میں ایک دیوار کی اوٹ لے کر گیت کو دیکھنے لگا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا جب کہ میں بیرونی گیت کا منظر بڑی وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔

گیت پوری طرح مکمل چکا تو میں دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں کسی گاڑی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی لمبا چوڑا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چونکہ انے اگر گیت کھٹکا تھا تو کسی گاڑی کو دیکھ کر یہی ”حرکت“ فرمائی تھی۔ اگلے ہی لمحے کے بعد دیکھ کر دو عالی شان گاڑیاں گیت میں سے جنگلے کے اندر داخل ہو گئیں۔ ان گاڑیوں کی آب و تاب اور لمبائی چوڑائی کو دیکھ کر

ایک لمحے میں یہ فیصلہ سنایا جاسکتا تھا کہ ان میں دی دی آئی  
نی شخصیات تشریف فرما ہوں گی۔ میرے دل نے گواہی دی  
کہ..... تھا جن کا انتظار وہ شاید کر آگئے۔ دوسرے ہی لمحے  
میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔  
مجھے ڈرا نیو دے کا ایک بڑا حصہ یہ خرابی نظر آ رہا تھا۔  
دونوں گاڑیاں آگے پیچھے رکیں۔ اسی دوران میں  
جو گندہ پال بھی بنگلے کے اندر سے نکل کر ان کے استقبال  
کے لیے ڈرائیو سے میں بچھ گیا۔ پھر وہ معزز زہمان گاڑیوں  
سے باہر آ گئے۔

وہ کل پانچ افراد تھے اور رنگ و روپ سے سفید قام  
دکھائی دیتے تھے۔ یہ وہی پانچ اسرائیلی یہودی تھے جو میری  
مگر قہاری اور سرکوبی کے لیے وہاں کوئی ہنگامی میننگ کرنے  
آئے تھے۔ میرے دل و دماغ میں غصے کی ایک شہ بھر اٹھی  
اور دیکھتے ہی دیکھتے ماؤنٹ اور یسٹ کی بلندی کو چھونے  
لگی۔ اس لمحے کے اندر غصے کے ساتھ ہی نفرت کی بھی وافر  
مقدار شامل تھی۔

میرے دل میں آئی کہ ابھی اپنی کہیں گاہ سے نکلوں اور  
جو گندہ پال سمیت ان پانچ یہودیوں کو ان ہی کے گندے  
خون میں غسل دلا کر خضدے غدار فرش پر لہا لٹا دوں لیکن میں  
نے اپنی اس خواہش کو زبردستی دالیا۔

ایسا کرنے سے بتایا تھیل بگڑ جاتا۔ ہم جو منصوبہ لے  
کر اس بنگلے میں گھسے تھے وہ یہودیوں اور ان کے میر بانوں  
کو دہشت زدہ کرنے کے لیے زیادہ مؤثر اور کامل تھا۔ ابھی  
تھوڑی دیر بعد ہی یہ بنگلا دھماکوں اور چیخ پکاری عالمی منڈی  
بننے والا تھا۔ وہ لرزہ خیز مناظر زیادہ جان دار ہوتے۔

میں نے خود تریشی کے ذریعے اپنے ذہن کی تیش کو  
خضدہ کیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ اس دوران میں ڈرائیو  
وے خالی ہو چکا تھا۔ معزز زہمان بنگلے کے اندر داخل ہو گئے  
تھے اور دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور انہیں باقاعدہ پارک  
کرنے کے بعد اندر چلے گئے تھے۔ گیت پر تھیں جو کیدار  
نے دوبارہ گیت بند کر دیا اور اپنے مخصوص چھوٹے سے گارڈ  
زوم میں بیٹھ گیا۔

میں اپنی جگہ سے نکلا اور ایک مرتبہ پھر مہلتے ہوئے عقبی  
حصے میں ”پہرہ“ دینے لگا۔ اب مجھے کاشانوک کا انتظار تھا۔  
وہ دس منٹ کے بعد مجھے دکھائی دیا۔ وہ سیدھا میرے پاس  
چلا آیا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی میں نے پوچھا۔

”کیا تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں؟“  
”ہاں میں نے تو نے فی صد کام کر لیا ہے۔“ اس نے

جواب دیا۔

”اس سے ہماری ضرورت تو پوری ہو جائے گی نا؟“

میں نے پوچھا۔

”ہاں کل۔“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”تم دیکھنا وجدان!

تھوڑی دیر بعد اس بنگلے میں کسی قیامت برپا ہوئی ہے۔“

”میں نے ان افراد کو گاڑیوں میں سے نکل کر بنگلے کے

اندر داخل ہونے دیکھا ہے جن پر یہ قیامت نازل ہونے

والی ہے وہ کل پانچ تھے۔“

”پانچ وہ..... اور دو ان کے ڈرائیور۔“ کاشانوک۔

”ہم کرتے ہوئے بولا۔ بہت مزہ آئے گا وجدان! جب یہ

تمام لوگ زندگی کی تلاش میں دوڑتے ہوئے اندر سے

ممدار ہوں گے لیکن بنگلے کے بیرونی حصے میں موت اپنے

خوف ناک جڑے کو لے ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی!“

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا

”میں اب اسی وقت تمہارے پاس آؤں گا جب دھماکے

آغاز ہونے میں چند سیکنڈز جا میں گے۔ اب تم فیصلہ کرلو

کہ تمہیں کون سے محاذ کو سنبھالنا ہے؟ بنگلے کا عقبی حصہ یا

سامنے والا حصہ؟“

میں نے کہا ”اس بات کے امکانات برابر ہیں کہ وہ

لوگ بنگلے کے سامنے والے حصے سے ممدار ہوں گے یا عقبی

حصے سے۔ ہم جگہ جگہ بننے کے بجائے شکار کو تقسیم کر لیتے

ہیں۔“

”کیا مطلب ہے؟“ کاشانوک نے حیرت سے میری

طرف دیکھا۔

میں نے کہا ”تم بنگلے کے اندر چوکتا رہو۔ میں ادھر

باہر ہوشیار رہتا ہوں۔ میں نے اپنے شکار مارک کر لیے

ہیں۔ یعنی پانچ اسرائیلی معزز یہودی۔ یہ مجھے جلد سے بھی

آتے یا جاتے دکھائی دیں گے! انہیں روک کر کے رکھ

دوں گا۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے تھوڑا وقفہ پھر کہا

”باقی تمام دشمن تمہارے شکار ہیں۔ بالخصوص یہ؟“

”منظور ہے؟“ وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھتے ہوئے

پُر عزم لہجے میں بولا ”لیکن فائرنگ والی کارروائی ہم ان

کے افراتفری میں جکلا ہونے کے بعد شروع کریں گے۔“

”اوکے ڈن!“ میں نے نفوس لیجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے میں اب چلتا ہوں۔“ وہ جانے کے لیے

مڑا پھر معنی خیز انداز میں پوچھ بیٹھا ”وجدان تم نے تمہا پاکو

شاہکار تصاویر دکھادی ہیں؟“

”کوئی ایسی ویڈیو دکھائی ہیں۔“ میں نے بھی تفریح

لینے والے انداز میں کہا ”وہ ان فن پاروں کی تاب نہیں

لا سکا اور ادھر اپنے ساتھی تنگ کے پاس بے ہوش دھواں

پڑا ہے۔“

وہ معنی خیز انداز میں سر کو ہلاتے ہوئے وہاں سے

رخصت ہو گیا۔

میں آنے والے سنگین اور منفی خبر لکھات کا تصور کر کے

محفوظ ہونے لگا۔ انسانوں کو لاشوں میں بدلنے دیکھنا کوئی

خوش کن نظارہ نہیں ہوتا لیکن رتی اور اس کے درندہ مفت

آلٹکار یہودیوں نے انسانی خون کو جتنا رازاں کر دیا تھا اس

کے پیش نظر یہ لوگ کسی رو رعایت کے قابل نہیں رہے تھے۔

جو گندہ پال ان کے آگے پیچھے دم لانے والا خوشامدی بنا ہوا

تھا لہذا وہ بھی حیرت ناک سزا کا مستحق ٹھہرتا تھا۔

اس کہنے نے جانوس کے ساتھ مل کر مجھے پھانسنے کے

لیے جو منصوبہ بندی کی تھی، اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو اس

وقت میں رتی کا قیدی ہوتا۔ کلاڈیا اپنے کسی سربراہی عمل

سے مجھے قاپو کر کے یہاں سے لے جاتی اور لے جا کر رتی

کے قدموں میں ڈال دیتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ جسے اللہ

رکھے اسے کون بچھے۔

میں زندہ سلامت تھا۔ جانوس ڈین ہاروے اور کلاڈیا

مجھے پھانسنے پھانسنے موت کے حصار میں بند ہو چکے تھے۔

میں زندگی کی حقیقت ہے۔ یہ بڑی اچھلی کودتی ہے۔ ازاتی

اخلاقی ہے اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی لیکن موت

ایک ہی جگہ میں اس کی تکی تمام شدہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

کلاڈیا کے بارے میں سوچتے ہوئے آپوں آپ میرا

تصور بگڑا ہے۔ دوسو میں بچ گیا۔ اس بنگلے کے ایک

کمرے میں اس حسین ساحرہ نے مجھے زیر کرنے کی کوشش کی

تھی لیکن میں اس کے پھیلانے ہوئے دام میں نہ آ سکا لیکن

اسی بنگلے کے بڑے ہال میں وہ مجھ سے زیر ہو گئی تھی۔ اسی

زیر و زبر کے حوالے سے لی یان مجھ سے بڑے جھگڑے انداز میں

چھیڑتی تھی۔ پتا نہیں اسے میری اس کارروائی کی کیسے ہنک

مل گئی تھی؟

لی یان میں اچانک بہت زیادہ تہہ بلی پیدا ہو گئی تھی۔

مجھے اس کے نئے انداز کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ پتا نہیں

آگے چل کر وہ مجھ پر جبروتوں کے کون کون سے پہاڑ گرانے

والی تھی!

اچانک مجھے ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے سوچا مجھے

جو گندہ پال کی خبر لینا چاہیے۔ وہ اس وقت میرے خلاف

ایک اہم ترین سازشی میننگ میں مصروف تھا۔ میں پہلے بھی

تھوڑا آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں رسائی حاصل

کر چکا تھا۔ اگرچہ اس میننگ میں ہونے والی گھٹکوں جھٹک

نہ پہنچتی لیکن میں وہاں کے گرم ماحول میں چند سانسوں تو

لے سکتا تھا اور وہ منظر یادگار کی حیثیت کا حامل ہوتا جب

بنگلے کے اندر پہلے دھماکے کی کوچ سنائی دیتی۔ اس دہشت

ناک آواز پر ان چھ افراد کا کیا رد عمل ہوتا یہ ان کے چہروں کو

جھانک کر ہی دیکھا جاسکتا تھا۔

میں نے ایک محفوظ دیوار کے ساتھ ٹپک لگا کر آنکھیں

بند کر لیں۔ تیسری آنکھ کے سامنے میں نے جیسے ہی جو گندہ

پال کے خدو خال کو ابھارا مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے

گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ جھٹکا دراصل اس خوفناک دھماکے کے سبب تھا جو

میں اسی لمحے بنگلے کے اندر ہوا تھا۔ میں تھوڑا آئی کے استعمال

کو یکسر ترک کر کے اپنی جگہ پر حاضر ہو گیا۔ اب کوئی لمحہ جاتا

تھا کہ میرے دکھار دہشت زدہ مجسمہ بریوں کے مانند بنگلے

سے باہر نکلے والے تھے۔

میں ہر مصلحت کو ہالائے طاق رکھ کر بنگلے کے سامنے

والے حصے کی جانب دوڑ گیا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا

کہ میرے مطلوبہ شکار اسی طرف ابھر رہے گے۔ انہیں غروب

کرنے کے لیے مجھے وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔

جتنی دیر میں میں اپنے مطلوبہ حصے میں پہنچتا کیے بعد

دیگرے دو اور لرزہ خیز دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی

انسانی چیخیں بھی فضا میں بلند ہوئیں پھر میں نے افراتفری

کے عالم میں جتنی چڑی والے اسرائیلیوں کو بنگلے سے باہر

نکلے ہوئے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی گن کو خوفناک برسٹ کے

لیے زحمت دیتا، بنگلے کا گیت کل گیا..... اور کھلے ہوئے گیت

میں سے مجھے ایک ٹیکسی بنگلے کے سامنے رکتی ہوئی نظر آئی۔

میں نے پلک جھپکتے میں اس ٹیکسی کو پہچان لیا۔

وہ کاشانوک والی ٹیکسی تھی اور ٹیکسی کی ڈرائیو جگ سیٹ

پر لی یان بھی موجود تھی۔ میں اس منظر کو دیکھ کر الجھ گیا۔

لی یان کو تو ہمارے جلادے برادر ادھر آتا تھا پھر وہ وقت

سے پہلے کیسے وہاں پہنچ گئی۔ میں نے اسی ادھیڑ میں بن ایک

سیکنڈ ضائع کیا۔ اگلے ہی لمحے کاشانوک کی چٹنی ہوئی آواز

میری ساعت سے ٹکرائی۔

”وجدان! پلٹ کر دیکھو..... ورنہ بازی پلٹ جائے

گی!“

کا شانوک کی جج سے مشابہتیں ہی پکار میں ہلا کی قوت شامل تھی۔ میں نے ایک جھگے سے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے بالکل درست کہا تھا۔ واقعی، اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو یہ بازی پلٹ گئی تھی، پھر میں اپنی داستان سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتا!

وہ انسانوں کا ایک پورا گردہ تھا۔ میرے ہاتھوں نے بجلی ایسی سرعت دکھائی۔ وہ بڑے دہشت زدہ انداز میں اندر سے باہر نکلے تھے۔ میری گمن نے جی جان سے ان کا "استقبال" کیا۔ میرے ہاتھوں کی میکانیکی حرکت نے ان کے سامنے موت کا دہانہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے جینگے کی فضا ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھی۔

اسی لمحے دوسری جانب سے کا شانوک نے بھی محاذ کھول دیا۔ دو طرفہ فائرنگ نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ میں نے لگ بھگ دس افراد کو موت کی سوغات وصول کرتے اور زمین بوس ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان کی فلک شگاف چیخوں اور خوف ناک فائرنگ کے پس منظر میں ڈائنامائٹ اور ٹائم بم وغیرہ بھی اپنی "کارکردگی" دکھانے میں پیش پیش تھے۔

میں نے پہلی نظر میں جب انہیں جینگے کے اندرونی حصے سے نمودار ہوتے دیکھا تھا تو ان کی تعداد پر توجہ نہیں دے سکا تھا لیکن اب وہ اور ان کی عبرت ناک موت کا لرزہ خیز منظر میری نگاہ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس شیطانی ٹولے میں پانچ اسرائیلیوں کے علاوہ ان کے ڈرائیورز، جو گنڈر پال اور اس کے ملازمین سب ہی شامل تھے۔ جو گنڈر پال اور اس کے ملازموں نے معزز مہمانوں کو روک کر رکھا تھا اور جس لمحے کا شانوک نے جج کر مجھے ان کی طرف متوجہ کیا، وہ اپنی گنو سے مجھے نشانہ بنانے والے تھے۔ میری گمن کی آٹھویں جینشن نے انہیں فریگز دبانے کا موقع نہ دیا اور دو طرفہ ہلاکت خیز فائرنگ نے پلک جھپکتے میں ان کے اجسام کو پچھلی میں بدل دیا۔

میں نے اور کا شانوک نے اپنے اپنے شکار مار کر کر لیے تھے لیکن ان کی بدقسمتی کہ اتفاق سے وہ ایک ہی جگہ پر "جمع" ہو گئے تھے لہذا اہم دونوں کو بیک وقت شکار کیا تھا۔ جب وہ سب فنا کے گھاٹ اتر چکے تو میں نے ان کی لاشوں کے عقب سے کا شانوک کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ان کا جائزہ لینے کے لیے بڑی تیزی سے اس طرف بڑھ رہا تھا۔ میں لی یان کی جانب مڑ گیا۔

وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ یہ بات ذہن کو الجھا دینے والی تھی۔ چند لمحے پہلے میں نے اسے ٹیکسی سمیت جینگے کے

کھلے ہوئے گیٹ میں سے دیکھا تھا۔ میرے لیے تو یہ بھی حیران کن تھا کہ ان قیامت خیز لحظات میں گیٹ کس نے اور کیوں کھولا تھا۔ پھر میرا دھیان مسلح گارڈ کی طرف چلا گیا جو اس جینگے کی چوکی داری پر مامور تھا۔ ایک مختلط انداز سے کے مطابق صرف وہی شخص باقی بچتا تھا جو کسی نوعیت کی مزاحمت کا رد دانی کی اہلیت رکھتا ہو۔ دیگر دو گارڈز، منگ اور تھا پیا جینگے کے عقبی حصے میں بے ہوش ہوئے ایک چھوٹے سے اسٹور روم میں دنیا دماغیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ ان کی اس "خبرجری" میں میرا اور کا شانوک کا ہاتھ تھا۔

میں لپک کر گارڈ روم کے قریب پہنچ گیا۔ گارڈ روم خالی تھا۔ کھلے ہوئے گیٹ کے باہر کا شانوک دانی ٹیکسی اب بھی نظر آ رہی تھی لیکن وہ لی یان کے وجود سے خالی تھی۔ میں گارڈ اور لی یان کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ گیٹ کے باہر ایک ہوی جیپ آ کر رکی۔ میں ایک کر ایک اوٹ میں ہو گیا۔ یہ اوٹ گارڈ روم کی ایک دیوار کے قریب تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، اس جیپ میں کتنے افراد ہوں گے لیکن یہ بات مجھے بھی تھی کہ ان کا تعلق ہمارے دشمنوں سے ہوگا۔ بھلا نمبر آر۔ ٹو کئی میں جو کچھ پیش آیا تھا ان حالات میں وہاں پہنچنے والے جو گنڈر پال اور اس کے اسرائیلی مہمانوں کے خیر خواہ ہی ہو سکتے تھے۔

جیپ کے دروازے دھڑا دھڑا کھلے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ انہوں نے جیپ کو جینگے کے اندر لانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ لوگ انتہائی ایمر جینی میں وہاں پہنچے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جینگے کا گیٹ ان جیپ والوں کے لیے نہیں کھولا گیا تھا۔

فوری طور پر گیٹ کے بارے میں میرا ذہن یہی اندازہ لگا پایا تھا کہ اس کے کھولنے میں گارڈ کے سوا کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا، عین ممکن ہے، جب خوف ناک دھماکوں نے جینگے کے اندر قیامت منفری برپا کی تو جو گنڈر پال نے ان کا کام پر چوکی دار کو حکم دیا ہو کہ وہ جینگے کا گیٹ کھول دے تاکہ انہیں وہاں سے فرار ہوئے میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ وہ لوگ جس افراتفری کی کیفیت میں جینگے کے اندرونی حصے سے برآمد ہوئے تھے اس سے تو یہی لگتا تھا، وہ پہلی فرصت میں جینگے کو چھوڑنا چاہیں گے۔۔۔۔۔۔ وہ بھلا جس کے درد دیوار ایک ہلاکت خیز زلزلے کی لہٹ میں تھے۔ اگر وہ لوگ جینگے سے لپکے رہتے تو وہ ان کے لیے عظیم الشان مدفن ثابت ہوتا! اور ایسا تو ہو چکا تھا۔ موت سے فرار، دراصل زندگی

سے فرار ہے۔ جو لوگ موت سے بچنا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت اسے اپنے پیچھے لگالیتے ہیں اس طرح وہ زندگی ہار جاتے ہیں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہی زندہ رہنا ہادری ہے۔ وہ دس افراد زندگی بچانے کے لیے بے دروغ بیٹھے سے ٹکے لیکن موت نے انہیں ایسا دیو چاکر زندگی سے باہر نکال دیا.....!

دیکھ رہا تھا کہ وہ آتشیں ہتھیاروں سے زیادہ ہاتھ پاؤں کے استعمال میں مہارت رکھتا تھا۔ اب تک میرے مشاہدے اور تجربے میں یہی آیا تھا کہ کسی فیصد بدھ مت مرد مارشل آرٹس اور دیگر فنون حرب و ضرب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے مذہب میں اگرچہ زندگی زندہ شے کو ذرا سا بھی ضرر پہنچانا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے مگر اس قسم کے فنون وہ حفاظت خود اختیاری اور امداد باہمی کے لیے سیکھتے ہیں۔ انہیں کم زور کم مدد اور حفاظت کا درس دیا جاتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس کے مارشل آرٹ کا مظاہرہ ضرور دیکھتا لیکن ان سنگین لمحات میں اس تفریق کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹایا اور آئندہ چند سیکنڈ میں وہ دونوں افراد زمین چاٹ کر ”سکون“ کی نیند سوچے گئے تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کاشالوک سے پوچھا ”میری کتنی کے مطابق چار افراد باہر سے اس جگہ میں داخل ہوئے تھے۔ باقی دو کیا ہوا؟“

”یہ ادھر اور ادھر برابر ہو گئے ہیں“ کاشالوک نے اپنے ہاتھ کو ایسے جھنڈ دی جیسے اس نے انصاف کی ترازو اٹھا رکھی ہو ”دو طے میں دے ہیں دیہاں پڑے ہیں!“

”اوہ!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اب ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ ان چار کی تلاش میں مزید چالیس افراد یہاں پہنچ جائیں۔“

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی اور میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولا ”تم تو ٹھیک ہوتا؟“

”ہم دونوں بالکل خیریت سے ہیں“ میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”دونوں؟“ وہ ٹھٹھک کر ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس نے بھینا ابھی تک لی یان کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ایک طرف اشارہ کر دیا ”وہ دیکھو۔“

”اوہ!“ وہ پریشان لہجے میں بولا ”یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“

”یہ سوال تم اسی سے پوچھنا، پہلے یہاں سے کھلو“ میں نے اس کا ہاتھ تمام کر کھینچتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں لی یان بھی ہمارے قریب آگئی تھی۔ ہم تینوں ممکنہ تیزی سے جگہ کے گیت کی جانب بڑھ گئے۔ کاشالوک نے، لی یان سے استفسارات کا سلسلہ شروع نہ کر کے عقل مند کی کاٹھوت دیا تھا۔ اس وقت ہماری پہلی ترجیح جگہ سے نکلتا تھا، وہ بگلا جواب ایک کھنڈر کی صورت اختیار

کر چکا تھا۔ باقی ہاتھیں تو ہم اطمینان سے کہیں بیٹھ کر بھی کر سکتے تھے۔

ہم بہ حفاظت جگہ سے نکل آئے۔ ہماری ٹیکسی اور وہ بیوی جیب آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ جب پر لنگھ پڑتے ہی لی یان نے حیرت میرے لہجے میں کہا۔

”وہاں ایسے تو ہی جیب ہے!“

میں سمجھا گیا، وہ کسی خاص جیب کا ذکر کر رہی تھی، کوئی ایسی جیب جو اس نے پہلے ہی دیکھ رکھی ہو۔ اس کے انکشاف کو کاشالوک سن نہیں سکا تھا کیونکہ اس دوران میں وہ ٹیکسی کے قریب پہنچ چکا تھا پھر اس کی آواز بھی خاصی دھیمی تھی۔ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ گاڑی کے حوالے سے میں وہاں اس کا انٹرویو شروع کر دیتا میں نے ہاتھ سے تمام کر اسے ٹیکسی کی جانب بھیج لیا۔ اگلے ہی لمحے ہم نے اس جیب اور اس کے چار سواروں پر لخت بھیجی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پتا نہیں، اس جیب نے ہمارا بھیجا ہوا ”تھ“ وصول کیا یا نہیں البتہ اس میں بیٹھ کر وہاں پہنچنے والے چاروں افراد پوری طرح اس ”عنایت“ سے مستفید ہو چکے تھے۔

کاشالوک کی ڈرائیوری میں مجھے پہلے بھی سڑ کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک مشتاق ڈرائیور تھا۔ ہم جیسے ہی اسٹریٹ سے نکل کر مین روڈ پر چڑھے، پولیس کے مخصوص سائرن کی آواز میری ساعت سے لگائی۔ پھر یہ مخصوص آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی گئی۔ اغلب امکان یہی تھا، وہ اردوڑا کالج کے نزدیک واقع بگلا نمبر آر..... ٹوٹنی کی جانب بڑھنے والی کوئی پولیس گاڑی تھی۔ نیپالی کی پولیس اس معاملے میں اسرائیلیوں کی بھرپور مدد کر رہی تھی..... اور یہ تمام تر کارروائی ڈھڑے کے زور پر ہو رہی تھی۔

”پولیس اس اسٹریٹ میں دوسری سمت سے داخل ہو رہی ہے“ کاشالوک کی ٹھہری ہوئی آواز نے ٹیکسی کی اندرونی فضا پر طاری خاموشی کو توڑ دیا۔ ”سائرن کی چیخ بیکار سے تو یہی محسوس ہوتا ہے، وہ لوگ متاثرہ جگہ کے نزدیک پہنچنے ہی والے ہیں“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔

”اچھا ہوا میں نے دوسرے رخ سے ٹیکسی نکالی ہے۔“ کاشالوک کی بات سن کر میں نے فوراً کیا تو پتا چلا، ہم جنوب سے شمال کی سمت سڑ کر رہے تھے۔ میں لی یان کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر بودھ ناتھ دیلی سے دلی بازار تک پہنچا تھا اور یہ تمام تر سفر ہم نے تقریباً مشرق سے مغرب کی جانب طے کیا تھا۔

میں نے کاشالوک سے پوچھا ”کیا ہم کہیں اور جا رہے

ہیں؟“

”کہیں اور..... کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولا۔

”ہمارا رخ بودھ ناتھ دیلی کی طرف تو نہیں!“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میں خواہ خواہ چند سڑکیں بدل کر یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ کہیں ہمارا انتخاب تو نہیں کیا جا رہا۔ جب سبلی ہو جائے گی تو پھر میں بے فکر رہے بودھ ناتھ دیلی کا رخ کروں گا“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا ”گتہ ہے“ نیپالی پولیس نے اسرائیلی سہانوں کے ساتھ خاصا مضبوط گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

”میں تمہیں اس بارے میں تفصیلاً بتا چکا ہوں“ کاشالوک مہارت سے ڈرائیوگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”تم آج کے اخبارات میں اپنے بارے میں گہرا مگر خبریں بھی پڑھ چکے ہو۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ تمہیں کتنی شدید اور سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔“

”ہاں، مجھے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے“ میں نے جُر سوچ انداز میں کہا ”مجھے ٹھہرنے اور قاپو کرنے کے لیے ہی تو آر۔ ٹوٹنی میں ہنگامی بینک رکھی گئی تھی۔ میں سمجھ سکتا ہوں، رہی کو میری کتنی ضرورت ہے“

”اس ہنگامی بینک کا انجام بھی خاصا ہنگامہ خیز ہوا ہے!“ لی یان نے بھرپور لہجے میں کہا۔ ”میں نے کسی کھنڈر پر بھی ایسی وحشت برتے ہوئے نہیں دیکھی جیسی اس جگہ پر برسرِ رہی ہے۔“

کاشالوک نے براہِ راست لی یان کو مخاطب کر لیا اور ابھمن زدہ لہجے میں پوچھنے لگا ”میں تو تمہیں اس جگہ کی طرف آنے کے لیے فون نہیں کیا تھا پھر تم کیسے ادھر چلی آئیں؟“

یہ سوال کافی دیر سے میرے ذہن میں بھی کلپا رہا تھا اور میں نے ایک موقع پر لی یان سے پوچھا بھی تھا مگر اس کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ خوف ناک دھماکا ہو گیا جس نے بگلا نمبر آر۔ ٹوٹنی کو تہ دالا کر کے رکھ دیا تھا۔ کاشالوک کا سوال سن کر میں بھی لی یان سے مستعثر ہوا۔

”تم نے جگہ کے باہر کھڑی جیب کو پہچان لیا ہے۔ یہ سب کیا چکر ہے؟“

”بتاتی ہوں بتاتی ہوں“ وہ اضطرابی انداز میں بولی۔

”مجھے تم لوگوں نے جہاں انتظار کرنے کو کہا تھا میں نے وہاں سے اس جیب کو گزر رہے ہوئے دیکھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے ٹیکسی کی اندرونی لائٹ آف کر رکھی تھی اس

لیے بھی مطمئن تھی کہ کوئی مجھے ٹیکسی کے اندر بیٹھے دیکھ کر پہچان نہیں سکے گا لیکن جب دو منٹ کے بعد وہ بارہا یہ جیب میرے قریب سے گزری تو میری چمٹی حس نے بتایا کہ کوئی ٹر بڑ ہے۔ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی ”میں الٹ ہو گئی چند منٹ کے وقفے سے اس جیب نے ایک اور چکر لگایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خصوصی گشت پر ہو۔ میں توشیش میں جھلا ہو گئی۔ ہم جتنے اہم مشن پر تھے اس کے پیشِ نظر مجھے یہی لگا کہ اس جیب کا تعلق ہمارے دشمنوں ہی سے ہو سکتا ہے جو بگلا نمبر آر..... ٹوٹنی کے آس پاس کی اسٹریٹس کی گمرانی کر رہے ہیں۔“

”ظاہر ہے“ یہ خیال بہت ہی خطرناک تھا اور کسی فوری عمل کا تقاضا بھی کرتا تھا۔ میرے ہی میں یہی آئی کہ تمہارے فون کا انتظار کرنے کے بجائے میں ہی تم سے رابطہ کر کے تمہیں یہاں کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کروں۔ میں نے سبل نکالنے کے لیے جنوں میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ مذکورہ جیب ایک مرتبہ پھر نمودار ہوئی۔ میں نے اپنا ارادہ ترک کر کے ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔

”اس مرتبہ جیب دالوں میں سے ایک حصے نے عجیب حرکت کی۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ”ہائے“ کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلاتا اور آگے بڑھ گئے مجھے اس بات کا تو اطمینان تھا، وہ میرا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکے ہوں گے لیکن ایک بھر دسا، اگلی مرتبہ وہ لوگ جیب روک کر میری طرف بڑھا آئیں؟

”اس خیال نے مجھے ٹھوڑا سا درس کر دیا۔ مجھے اس جیب اور جیب دالوں سے کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس سے اگلے کے بعد کہیں ہمارے مشن میں کوئی رخ نہ پڑ جائے۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا لیکن اس مرتبہ انہوں نے دہائی میں تاخیر کا مظاہرہ کیا، پتا نہیں کسی لیے وائرڈ پر نکل گئے تھے۔ مجھے اس سہلت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے سبل نکالا اور اس کے کی پڈ پر کاشالوک کو نمبر بیچ کرنے ہی دالی تھی کہ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں سمجھ گئی کہ تم لوگوں نے کارروائی آغاز کر دی ہے۔ ان لمحات میں تمہیں ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے میں ٹیکسی کو لے کر جگہ کی طرف آگئی۔“

وہ چند لمحات کے لیے رکی پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے بولی ”اس کے بعد جگہ کے گیت پر جو واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“

آخری جملہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تو



میں جان گیا، اس کا اشارہ چوکی دار سے غصے کی طرف تھا۔ جب میں سوار بن چا اور افراد کو میں نے اور کاشانوک نے آر ٹوٹی میں فٹ کیا وہ وہی لوگ تھے جو اس جنگی کی نگرانی پر مامور تھے۔ اب وہ کسی بھی قسم کی نگرانی سے مجبور ہو چکے تھے۔ باہر پڑے دو کے بارے میں تو کہا جا سکتا تھا، شاید وہ جنگ جانی لیکن عمارت کے بلے کے نیچے دب جانے والوں کے خوالے سے کوئی بھی بات دھوٹوں سے نہیں کہی جا سکتی تھی۔ بہر حال، یہ لی یان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جب والوں سے اچھے بغیر جنگ کے ٹکٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور مسخ چوکی دار کی بد قسمتی کہ وہ نادانی میں لی یان سے الجھ بیٹھا تھا.....!

لی یان کے خاموش ہونے پر میں نے قدرے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "اللہ کا شکر ہے کہ ہم اپنے دشمن میں کامیاب رہے۔ ہمارے خلاف سازش کرنے والا اسرائیلی ٹولا اور ان کے سامنے دم ہلانے والے جو کھنڈر پال جیسے لوگوں کا صفایا ہو گیا۔ جو بھی ہوا، اچھا ہی ہوا!"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں وچدان!" کاشانوک کی کھیر آواز ٹھیکسی کے اندر کوئی تو میں جو کچھ بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کہہ رہا تھا "اب تک تو جو بھی ہوا، اچھا ہی ہوا مگر..... اب اچھا نہیں ہو رہا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

وہ بولا "ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے!"

"اوہ!" میں نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا اور

دیکھ رہ گیا۔

حیرت اس بات پر نہیں ہو رہی تھی کہ کوئی ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا بلکہ میرے اچھلنے کا سبب یہ تھا کہ تعاقب کرنے والی وہی جیب تھی جسے میں بگڑا نمبر آر ٹوٹی کے سامنے کھڑا چھوڑ آیا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو وہ جیب خالی تھی۔ اس پر سوار ہو کر وہاں پہنچنے والوں کو ہم نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کرنے کی "جرات" فرماتے پھر یہ کیا پکڑا تھا۔ ہماری ٹھیکسی اور اس جیب کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں اس کے اندر موجود افراد کی تعداد کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ممکن ہے، یہ ایسی جیبی کوئی دوسری جیب ہو!

مگر دوسرے ہی لمحے لی یان نے اس خوش گمانی کی..... بکسر تردید کر دی۔ کاشانوک کی بات پر وہ بھی مڑ کر میری طرف عقب میں دیکھ رہی تھی۔ وہ سرسراہٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے! وچدان! یہ تو وہی جیب ہے۔" لی یان ٹھیکسی میں بیٹھے رہنے کے دوران میں اس حشری جیب پر مشابہاتی "لی ایچ ڈی" کر رکھا تھا لہذا مستند تھا اس کا فرمایا ہوا۔ اس کی طرح حیرت مجھے بھی تھی کہ اتنی جلدی وہ خالی جیب ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں کیسے کیسے چلی آئی تھی۔ بہر حال، یہ جیسے تیسے اور کیسے بھی ہوا تھا..... ہو چکا تھا۔ میں نے کاشانوک کو کھٹک کر کہتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں کہا "اس جیب سے جلد از جلد پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔"

"یہی کوشش کر رہا ہوں ہاس!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں ٹھیکسی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس وقت ہم دلی بازار اور مکمل پوکھاری کے درمیان جنوب سے شمال کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے ساڑھے دو بج چکے تھے۔ موسم انتہائی سرد تھا جس کی وجہ سے اس سڑک پر شبنم ہونے کے برابر نظر آ رہا تھا۔ اس صورت حال میں جیب والے رفتار بڑھا کر آنا پانا میں ہمارے سر پر پہنچ سکتے تھے اور میں نے عقبنی کا تھما جی کے دوران میں یہ خرابی پر اندازہ لگایا تھا کہ وہ لوگ بدترج اپنی رفتار میں اضافہ کر رہے تھے۔ نتیجے کے طور پر ہمارے درمیان حائل فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

ہوٹل لہاتے گزرنے کے بعد کاشانوک نے ٹھیکسی کو دائیں جانب موڑ لیا اور بولا "وچدان! میں انہیں ڈانچ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم پوری طرح تیار رہنا۔"

اس نے لفظ "تیار" پر خامخا زور دیا تھا اور میں اس زور کا مطلب جانتا تھا۔ بلکہ نمبر آر ٹوٹی سے نکلنے وقت ہم نے وہ خطرناک گلو بھی اپنے ساتھ رکھ لی تھیں جن کے بل بوتے پر اس جنگی کے "کینوں" کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ازیں علاوہ ہمارے پاس بینڈر گینڈ کا بھی اچھا خاصا نشانک موجود تھا۔ میں نے کاشانوک سے پوچھا۔

"گن یا گینڈ؟"

"فی الحال گن کا استعمال زیادہ مناسب رہے گا۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ "تم فائرنگ کر کے انہیں تعاقب سے روکو گے، میں ڈانچ کر دوں گا۔ اگر یہ حکمت عملی کامیاب رہی تو کام چل جائے گا ورنہ پھر ہم دوسرا طریقہ اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"اوکے! آئی ایم ریڈی!" میں نے گن پر گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ میں کہا پھر لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے تاکید کی۔

"میں جیسے ہی فائرنگ کروں، تم خود کو سیٹ پر گرالینا۔" ٹھیک ہے، تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔" اس دوران میں حنا جب ہم سے اور فریب آ گئی۔ اب وہ بڑی تیزی سے رفتار میں اضافہ کر رہے تھے۔ یہ سڑک قدرے دران اور کم معروف تھی۔ شاید وہ ہمیں یہیں گھیرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر فاصلہ کم ہوجانے کے باعث میں جیب کے اندر دنی ماحول کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ اس جیب میں صرف دو افراد موجود تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا عقبی نشست پر۔ عقبی نشست والے نے زورہ نقص کے ہاتھوں تک میری نگاہ نے رسائی حاصل کی تو مجھے چونک جانا پڑا۔

وہ ہاتھ ایک گن کو تھامے آہستہ آہستہ بلند ہو رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ شخص ہماری ٹھیکسی پر فائرنگ کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاید وہ اس موقع کے انتظار میں تھا کہ ان کی جیب ہماری ٹھیکسی کے متوازی آجائے۔ میں اسے یہ موقع کیوں کر دیتا.....!

"ڈاؤن..... ڈاؤن!" میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے اضطرابی انداز میں کہا اور اپنی سائیڈ کے شیشے کو گرا کر گن سیٹ اپنے بالائی دھڑ کو ٹھیکسی سے باہر نکال لیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ دونوں جانب سے بیک وقت فائرنگ ہوئی۔

فضا میں مخصوص ہولناک "ٹرنز ایتھ" گونج اٹھی۔ میں نے جیب کے اگلے ٹائرڈ کو نشانہ بناتے ہوئے ایک مختصر برسٹ فائر کیا تھا تا کہ انہیں تعاقب سے روکا جاسکے۔ اس کے برعکس جیب میں موجود گن بردار نے ٹھیکسی کو روکنے کے لیے اس کے عقبی ٹائرڈ کو پھانسی کی کوشش کی تھی۔

دونوں گاڑیاں بری طرح ڈگڈگائیں تاہم ہر دوسری کے تذکرہ ناز محفوظ رہے، اس ڈگڈگاہٹ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ میری فائرنگ کے نتیجے میں جیب کی رفتار میں کمی واقع ہوئی تھی جب کہ کاشانوک نے ٹھیکسی کی رفتار کو خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا۔

لی یان نے خود کو سیٹ پر گر رکھا تھا، وہیں بڑے بڑے بولی "یہ کم بخت ایسے نہیں ہائیں گے۔ انہیں بینڈر گینڈ سے اڑا دو وچدان!"

"وہ باز نہیں آئے تو مجھے یہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

کاشانوک کی کھیر آواز ابھری "وچدان! آگے تھوڑے فاصلے پر ہوٹل ریڈ ہاؤس ہے۔ میں وہاں سے ٹھیکسی کو ہائیں

جانب موڑوں گا۔ وہاں سے آگے نہایت زیادہ سنسان علاقہ ہے۔ وہاں خاموشی اور خانے کا راج ہو گا۔ تم جج کرلو۔ اگر فائرنگ سے کام نہ چل سکے تو بینڈر گینڈ کو زابا جا سکتا ہے لیکن جو بھی کرنا ہے، فوراً ہی کر ڈالو! وہ لمحے بھر کے متوقف ہوا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"دور نہ ہونے والی فائرنگ نے قانون کے محافظوں کو اس طرف متوجہ کر دیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے، جلدی ہی ہمارا کسی پڑونگ کار سے واسطہ پڑ جائے!"

میں نے چٹائی لہجے میں کہا "انشا اللہ! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ پولیس کی توجہ سے پہلے ہی ہم اس کا صفایا کر دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے عقبی منظر کا جائزہ لیا۔ حنا جب خاصی مشتعل نظر آئی۔ میری فائرنگ نے شاید اسے آتش زیر ناز کر دیا تھا۔ وہ طوفانی رفتار سے ہم پر چڑھ دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اس بار میں نے دور طرزا ٹیک کا فیصلہ کیا۔ بینڈر گینڈ زابا دالا جب عقبی نشست پر رکھا تھا۔ میں نے لی یان کے تھان سے ایک گینڈ کو ہاتھ میں لیا، بڑی مہارت اور احتیاط سے اس کی پن کو کھینچا اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے حنا جب پر اچھال دیا۔

اگلے ہی لمحے ایک قیامت خیز دھماکا سنائی دیا۔ گینڈ اپنی منزل پر پہنچ کر پھٹ گیا تھا۔ اس کی کارکردگی کو چپک کرنے کے لیے میں نے گن تھامے، اپنے بالائی دھڑ کو کھڑکی سے باہر نکالا۔ میں اس گن سے سونے پر سہاگہ کے صدائق..... جب پر ایک خطرناک برسٹ فائر کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں ٹریگر پر بھی انگلی کو زحمت دیتا، ایک خوں چکان مٹھرنے میری قوت حرکت سلب کر لی۔

وہ حنا جب کا تباہ کاری کا خوف ناک منظر تھا۔ میرے پیچھے ہوئے بینڈر گینڈ نے جیب کے پر ٹپنے اڑا دیے۔ اس کے دھوکا بچا کچھا حصہ جو اس وقت سڑک پر دکھائی دے رہا تھا اس نے آگ کے کسی بھڑکتے ہوئے گولے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یقین سے کہنا مشکل تھا کہ ہمارے دشمنوں کے پر ٹپنے اڑ گئے تھے یا وہ آگ کے اس گولے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے؟

کچھ بھی تھا، وہ اصل جہنم ہو چکے تھے۔ نار جہنم میں جلیں یا خار جہنم میں تر پیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خس کم، جہاں پاک!

ان لحاظ میں، میں ایک عجیب سی تسکین محسوس کر رہا تھا۔ یہ تسکین اس شدید ترین نفرت کا نتیجہ تھی جو میں..... اپنے

المش فشاب 18 حصه 13

خونی ٹرک کی طرف دیکھا۔ وہ چند ”قدم“ پیچھے ہٹنے کے بعد بڑے دشت ناک انداز میں ہماری سمت آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک دیوانگی پائی جاتی تھی۔ میں نے سیکنڈ کے لاکھ دس جیسے میں محسوس کر لیا کہ وہ اپنی ایک خوف ناک فکر کے نتیجے میں ہمیں بڑے حسرت ناک اسٹائل میں دریا پر دکرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے بجلی ایسی سرعت سے اس طوفانی ٹرک پر ایک طویل برست مارا اس قاتل ٹرک کی ہیڈ لائٹس پکنا چور ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اگلے ٹائرز بھی پھٹ گئے۔ دھڑا اسکرین کا بھی کھازا ہو گیا۔ اس اسکرین کے پیچھے موجود افراد پر کیا ہوتی ہوئی۔ یہ دیکھنے کی میرے پاس مہلت نہیں تھی میں نے آؤ دیکھنا تاؤ اور اپنی سائینڈ کار وادھ مکول کر باہر لڑھک گیا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔

میں ٹیکسی سے باہر آنے کے بعد روٹنگ کرتے ہوئے، فٹ پاتھ پر دروٹنگ لڑھکا چلا گیا اور اسی ”لڑھکن“ کے دوران میں، میں نے ایک خوف ناک دھماکے کی آواز سنی۔ یہ ایسی ہی دل دوز آواز تھی جیسے کوئی عظیم الجثہ پہاڑ کسی ”رائی“ سے ٹکرا گیا ہو اگلے ہی لمحے نشیب میں، ایک چھپا کے کی مخصوص آواز ابھری۔ یہ مجھے میں مجھے دریا کی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ یہ مخصوص آواز ہماری ٹیکسی کے، دریا کی رخ سے ٹکرانے کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میری بے دروغ فائرنگ کے باوجود بھی وہ ٹرک رکنا نہیں تھا۔ حرکت کرنے والا جسم جس قدر بھاری ہو، اس کا موئیٹم اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ ٹائر برست ہو جانے کے باوجود بھی وہ ٹرک اپنے موئیٹم کے زور پر چلتا چلتا رہا تھا آگے بڑھا تھا اور ہماری ٹیکسی کو ایک خوف ناک ٹکرا کر اس نے دریا میں پھینک دیا تھا..... اور اس ٹیکسی میں لی یان دکاٹانوک بھی موجود تھے!

اس تشویش ناک صورت حالات نے مجھے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں نے اضطراری انداز میں گردن اٹھا کر دیکھا۔ میں روٹنگ کرتے ہوئے جانے دوڑے دس بارہ فٹ شرق کی سمت نکل آیا تھا۔ میری نگاہ نے ایک دشت ناک منظر دیکھا۔ ہماری ٹیکسی کا دہاں نام دشتاں نہیں تھا۔ ہمیں کھینے اور روندنے والا ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھا رہا تھا۔

میں نے بے ساختگی یان اور کاشاٹوک کی تلاش میں

اگر اصرار نظر دوڑائی لیکن وہ دونوں مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ پول لائٹس کے سبب ہم پر مناسب روشنی ہو رہی تھی۔ اگر انہوں نے میری طرح دریا پر دوہونے والی ٹیکسی میں کودنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ کہیں نہ کہیں ضرور نظر آ جاتے۔ تو کیا وہ دونوں بھی ٹیکسی کے ساتھ ہی دریا میں چلے گئے؟

اس ہولناک خیال نے مجھے دھلا کر رکھ دیا۔ دریا نے دھولی کھولا میں ان دنوں بہت زیادہ پانی تو نہیں تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ ایک ٹیکسی کیا، کوئی ڈبل ڈیکر بس بھی۔ آسانی اس کی نہ میں بیٹھ کر دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی تھی۔

میں نے خطرناک آٹو بیک کن کو مضبوطی سے سنبھالا اور محتاط قدموں سے ٹرک کی جانب بڑھنے لگا۔ ٹرک والے دشتوں کا رویہ مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ ان کی پراسرار خاموشی مجھ میں آنے والی ٹیکسی تھی۔ یا تو وہ سب میری خوف ناک فائرنگ کے نتیجے میں جہنم واصل ہو چکے تھے یا پھر اس قاتل نہیں رہے تھے کہ ٹرک میں سے باہر نکلنے کی سکت رکھتے ہوں!

میں ٹرک سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ یہ آواز ٹرک کی دوسری جانب یعنی ہل کی مغربی سمت سنائی دی تھی۔ اس طرف ہل کا ابتدائی حصہ تھا۔ برست فار کے جواب میں لٹائی خاموشی کا وقت آ یا پھر سنگل شاٹ فائر کی آواز گونجی۔ اس فائر کے ساتھ ہی ایک دروٹنگ انسانی چیخ بھی بلند ہوئی۔ مجھے یہ جاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ چیخ کسی مرد کے قتل سے خارج ہوئی تھی کیونکہ چیخ کے فوراً بعد اس شخص نے اپنے منہ پر گڑا ڈھکنا اٹھا دیا تھا اور وہاں سے ناقابل تخریر اور ناقابل اشاعت گالیاں ابل ابل کر باہر آئی تھیں۔

اس صورت حال سے مجھے خاصی تقویت محسوس ہوئی۔ باور پر آؤ گالیاں دینے والی آواز ہرگز ہرگز کاشاٹوک کی نہیں تھی اور سنگل شاٹ فائر کسی ہلکی گن سے کیا گیا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً اس سین کا نتیجہ اخذ کر لیا اور یہ نتیجہ بڑا حوصلہ افزا تھا۔ کوئی میرے اندر پکار پکار کر اطلاع دے رہا تھا کہ لی یان نے اپنے غصے سے لیڈی ہٹل سے فائر کر کے کسی دشمن کو گھائل کر دیا ہے۔

میں نے محتاط روی کو بالائے طاق رکھا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے ٹرک کی دوسری جانب پہنچ گیا۔ اس لمحے نشیب میں مجھے قدموں کی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی کسی کا قاتل کر رہا ہو۔ صورت حال سے یہ ظاہر ہو رہا تھا

کاشاٹوک نے میری ہدایت کے مطابق ڈرائیو بیک جاری رکھی اور جلد ہی ہم دریا نے دھولی کھولا دالے ہل پر پہنچ گئے۔ پھر جیسے ہی ہماری ٹیکسی نے ہل پر ”قدم“ رکھے ایک بڑی گڑبڑ میں ہمیں چوکنے پر مجبور کر دیا۔

ہل کے دوسرے کنارے پر دو گاڑیاں ایک دوسرے سے منہ بونڈے ایسے کھڑی تھیں کہ آگے بڑھنے کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ دھنیا یہ بندوبست ہمارے فرار کو نا کامیاب بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس بات میں کس شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ ہمارے دشمن ہمیں گھیرنے کے لیے خاصے دستاویز پر سرگرم ہو چکے تھے۔ میں نے اس صورت حال میں کاشاٹوک کو ہدایت جاری کی۔

”ٹیکسی کو اہلپس موزلو۔ آگے بڑھنا ممکن نہیں رہا!“ پیش آمدہ پوزیشن میں کاشاٹوک نے ٹیکسی کو روک لیا تھا۔ میری ہدایت پاتے ہی اس نے آٹا فٹا میں بیک گیر لگایا اور بڑی تیزی سے ٹیکسی کو پیچھے لانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں ہماری راہ کو ہلی کرنے والے بھی نمودار ہو گئے۔ پانچھیں، وہ گاڑیوں کے اندر سے بڑا آمد ہوئے تھے یا ان کے عقب میں ”نشست“ سنبھالے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ گل چار افراد تھے اور چاروں ہی سناٹا!

یہ بڑی نازک صورت حال تھی۔ ہل کی لمبائی زیادہ نہیں تھی اور وہ چاروں سناٹا افراد بھاگتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ اگر وہ اپنی گنوں کے دہانے کھول دیتے تو ہماری ٹیکسی کو پھینک میں بدلتے ہوئے ڈراپر نہ لگتی اور میں انہیں فائرنگ کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے ایمونیشن والے بیگ میں سے ایک اور بیٹھ کر بیٹھ نکالا اور اس کی پین نکالنے کے بعد اسے دشتوں کی سمت اچھال دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک دل دوز دھماکا ہوا اور رات کی تاریکی میں جیسے بھڑکنا ہوا آواز روشن ہو گیا۔

میں نے گریٹنگ کو جھٹکنے میں کچھ زیادہ ہی قوت صرف کر دی تھی۔ وہ سناٹا افراد کوشناٹا بنانے کے بجائے ان کی ”سٹول“ گاڑیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ خوف ناک دھماکا انہی گاڑیوں کے پھٹنے اور پڑہ پڑہ ہو کر فضا میں بکھرنے کے سبب تھا۔ ان گاڑیوں کے جو پینچے مجھے جیسے ہل پر رہ گئے تھے انہوں نے آگ پکڑ کر وہاں ایک آواز روشن کر دیا تھا۔

اس قیامت خیز منظر کو ”انجوائے“ کرنے کا موقع تھا اور نہ ہی مہلت! میں نے بڑی سرعت سے گن سنبھالی اور قاتل قاتل آنے والوں پر فائر کھول دیا۔

وہ اپنے عقب میں برپا ہونے والی قیامت سے بوکھلا

گئے تھے لہذا میری فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ انہیں اپنی گن استعمال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے ان واحد میں انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ہلاکت خیز فائرنگ کی خوف ناک ”تڑ تڑاہٹ“ نے رات کے رخ بستہ سناٹے کو تار تار کر دیا۔ یہ اس سناٹے پر دوسرا حملہ تھا۔ ازین قبل، چند گریٹنگ کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکت نے اسے بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ اچانک مجھے ایک شدید جھٹکا اور خطرناک گن ہاتھوں سے نکل کر باہر جا گری۔ ٹیکسی سے نکل کر تاریکی میں گن تلاش کرنے کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی ایک اور جھٹکا محسوس ہوا۔ اس جھٹکے نے ہماری ٹیکسی کو بری طرح لہر دیا اور وہ ہل کی ریلنگ سے جا کر گئی۔

میں نے گردن اٹھا کر عقب میں دیکھا تو صورت حال مجھ پر کھل گئی۔ کاشاٹوک ٹیکسی کو ریورس گیر میں پیچھے لے جا رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی کو ہل سے اتار کر واپس سڑک پر لے جاتا، اس کی کوشش کو نا کامیاب بنا دیا گیا اور ایسا کرنے والا ایک چھوٹا ٹرک تھا۔

ہم ایک ادھیات مویت مال میں پھنس کر رہ گئے۔ عقب سے آنے والے اس چھوٹے ٹرک نے دیدہ و دانستہ ہماری ٹیکسی کو ”خو کروں“ پر رکھ لیا تھا جس سے، اس کے دشمن ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔ بے در پے پیچھے والے دو خطرناک جھٹکوں نے مجھے بتا دیا کہ اگر کوئی طور پر اس ٹرک کی پیش قدمی کو نہ روکا گیا تو وہ ہماری ٹیکسی کی ایسی کم تیشی کر کے رکھ دے گا۔

ہماری ٹیکسی ہل کی ریلنگ سے ٹکرانے کے بعد آڑی ہو کر مختصری فٹ پاتھ پر چڑھ ”بیٹھی“ تھی۔ ریلنگ کے ساتھ ساتھ ہل کی دونوں جانب تین فٹ چوڑی فٹ پاتھ بنی ہوئی تھی اور ہماری ٹیکسی اس ٹرک سے ٹکرانے کے بعد اس فٹ پاتھ پر نکل آئی تھی۔

وہ بڑے نازک اور فیصلہ طلب لمحات تھے۔ ٹیکسی کو ریورس کر کے پیچھے لانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا اگلا حصہ ریلنگ سے جڑا ہوا تھا۔ کاشاٹوک نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

”وہ جان! اسے روکو ورنہ.....“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لی یان چلائی ”ہمیں فوراً ٹیکسی سے باہر نکل جانا چاہیے ورنہ یہ ظالم ٹرک ہمیں ٹیکسی سمیت دریا میں پھینک دے گا!“

لی یان کا خدشہ برحق تھا۔ اس نے موقع کی سیٹھی کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا۔ میں نے کرکوتھی المتقدور موز کر اس

کہ میری طرح لی یان نے بھی ٹیسی کا دروازہ کھول کر دو لنگ کی تھی اور اب دھن اسے چھاپنے کی تھک دو دو میں تھے۔ میں نے بے دردی نشتیب کی جانب دوڑ لگادی۔

دریائے دھوئی کھولا کھنڈر شہر میں نشانہ بننا تھا اور جس پل پر یہ مارماری ہو رہی تھی وہ دریابھر چکا غریبا استادہ تھا۔ پل کے اوپر تو پول لائش نصب کر کے روکنی کا مقول بندوبست کر دیا گیا تھا لیکن اس طرف نشتیب میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میں پتھر لیے راستے پر، نیچے کی جانب بھاگتے ہوئے دریائے کنارے پہنچ گیا اور اسی لمحے ایک شخص پر میری نگاہ پڑی۔

وہ چاروں خانے چت، پتھر لی زمین پر پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود بھی میں نے انتہا ضرور دیکھ لیا کہ اس شخص نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا رکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ متوقع طور پر لی یان نے اسی نامراد کو نشانہ بنایا تھا جس کے نتیجے میں اس کے منہ سے مغفلات کا طوفان اٹھ پڑا تھا مگر اس وقت وہ بد بخت بڑی حد تک شانت ہو چکا تھا۔ اس کی تمام تر کوشش محض کراہنے تک محدود تھی، ان دشمنوں نے میری خاطر بہت ”کالیف“ اٹھائی تھیں لہذا اس کڑے وقت پر میرا بھی فرض بنتا تھا کہ ان کی ”مدد“ کروں۔ میں اسی ”نیک“ مقصد کی خاطر جب تک کراس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گرم سوٹ میں بیوس ایک سفید قام تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ اسرا نیکی یا پھر کم از کم یہودی ضرور ہوگا۔ لکائی معائنے نے مجھے بتادیا، لی یان کی چھائی ہوئی گولی نے اس کا پیٹ چھید ڈالا تھا، تاریکی کے باعث دھوکے سے تو نہیں کہا جاسکتا تھا تاہم میرا اندازہ یہی تھا کہ گولی اس کے دائیں گردے کے آ رہی ہوگی تھی۔

وہ آ رہی جیسی کیفیت میں اپنی زندگی کی آخری تکلیف وہ سانس لے رہا تھا۔ اسے اس اذیت سے نجات دلانا مجھ پر لازم ہو گیا۔ میں نے آکڑوں جیسے ہوئے ایک ہاتھ کی پٹیلی کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے جمایا اور دوسرا ”شفقت بھرا“ ہاتھ اس کے سر کے اوپر رکھتے ہوئے ایک جڑک کے ساتھ کلک دائر (گھڑی وار) جھکادیا۔

اس کم بخت کی گردن میرے ہاتھوں میں یوں جھولنے لگی جیسے کسی پڑمردہ تیل پر مردہ ترنی جھوٹی ہے۔ میں نے نفرت انگیز انداز میں اسے پرے پھینکا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دریابا کنارہ نکلا اور پتھر لیا تھا جس پر پہاڑی درختوں کی بہتات تھی اور انہی بلند و بالا درختوں کے درمیان چلتے ہوئے

میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے خاموشی اور سناٹے کی وہ بڑت میں اتر رہا ہوں۔ ٹھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ کے بعد اچانک سکوت کی ہی فضا قائم ہو گئی تھی۔ کوئی گولی چلی اور نہ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دیں۔ میں لی یان کی فائرنگ کا شکار ہونے والے شخص کو دیکھ چکا تھا۔ سر درست تو یہی نتیجہ سامنے آ رہا تھا کہ خونی ٹرک میں سے صرف ایک دشمن ہی نکل کر لی یان کی طرف لپکا تھا جسے لی یان نے موت کی نیند سلا دیا۔ اس کا مطلب تھا، اس ٹرک میں سوار دیگر دشمنوں کو میری فائرنگ نے سپرد جہنم کر دیا تھا۔

دانش رو رہے کہ میں لی یان کا ذکر اپنے مضبوط انداز سے کی بنا کر رہا ہوں۔ میں نے ابھی تک اس کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ سنگل شاٹ فائر کرنے والی لی یان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا اس یقین کی ”سرمدست کوئی وضاحت نہیں کر سکتا۔

میں اپنی جنگامہ خیز خیالات کے ہمراہ جتنا قدم اٹھاتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ سب سے زیادہ تشویش مجھے لی یان کی طرف سے تھی۔ قرآن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہ حفاظت ٹیسی میں سے باہر نکل آئی تھی۔ گولی کی آواز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی لہڑی بسٹل سے فائرنگ کی تھی لیکن لی یان اچانک کہاں غائب ہو گئی، یہ مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی تک کا شٹل نوک کی موجودگی کے کوئی آثار سننے یا دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اسے ٹیسی میں سے باہر کونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ٹرک کی پہلی خوف ناک مگر نے ٹیسی کو پل کی ریلنگ کے ساتھ بری طرح ٹکرایا تھا جس کے نتیجے میں اس کا سامنے والا حصہ بڑے بھیاںک انداز میں متاثر ہوا تھا۔ اگر کا شٹل نوک ٹیسی کے اندر ہی اندر دریائی تہ میں پہنچ گیا تھا تو یہ بھی کچھ کم تشویش ناک صورت حال نہیں تھی۔

میں نے دیکھتے ہوئے دل کے ساتھ، پہلو میں بیتے ہوئے، دریائے دھوئی کھولا کی سطح کو دیکھا۔ سناٹے بھری تاریکی میں دریائی سطح بڑی ہیبت ناک دکھائی دی۔ میں کا ایک دم کہہ بیٹے پانی کی اس ہیبت ناک اور بھول سطح کو گھورنے لگا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کا شٹل نوک ختم ہو گیا۔ اس کی موت کا تصور میری سوچ کے لیے ناقابل قبول تھا۔ شاید یہ اس جذباتی و انتہائی اور انیسیت کا نتیجہ تھا جو بہت ہی کم وقت میں ہمارے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ اس مختصر سی میل ملاقات میں کا شٹل نوک مجھے اپنا اپنا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں دریائی سطح پر نگاہ جمائے کا شٹل نوک کے بارے میں مگر یہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے جو تک جانا پڑا۔ پانی کی سطح پر میں نے ایک غیر معمولی حرکت دیکھی تھی۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا کہ کوئی حیران کن کر رہا ہے۔ میں نے تمام تر توجہ اس منظر پر مرکوز کر دی جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، کوئی شخص باقاعدہ تیرتے ہوئے کنارے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس صبح بستہ اور گرمیوں میں خون محمد کر دینے والے موسم میں، نصف شب کے قریب کسی خوشین تیراک کے، دریائے دھوئی کھولا میں شوق پورا کرنے کے بارے میں سوچتا ہی حماقت ہوتا وہ جو کوئی مجھے تھا، مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ تھا..... اور اس وقت کا شٹل نوک سے زیادہ اور کوئی شخص مشکل میں نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہ قول کے، سانس روک کر اس کے کنارے تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک میری خوبت ٹوٹ گئی۔ میں کا شٹل نوک کا پانی کی سطح پر براہمیرے اور کنارے لگتے ہوئے نہ دیکھ سکا کیونکہ اس سے پہلے ہی مجھ پر ایک ناگہانی آن پڑی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا انتظار کر رہا تھا اور مذکورہ ناگہانی اسی درخت پر سے نازل ہوئی تھی۔

گرم لہاوے میں بیوس وہ کوئی بہت ہی دھواں دھار آفت تھی اور اس نے مجھ پر دار دہوتے ہی مجھے اپنے مضبوط چیمے میں جکڑ لیا۔ اس افراتفری میں کن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ادھر ادھر ہو گئی۔ وہ جو کوئی مجھے تھا اس کے جسم میں کسی بھڑے ہوئے ساغرمیسی طاقت بھری ہوئی تھی میں نے اس کے قوی دھواں بازوں کی گرفت میں خود کو بھجور پایا۔

یہ بھجوری لکائی ثابت ہوئی کیونکہ میں نے چشم زدن میں اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔ وہ شخص میرے عقب میں موجود رہ کر، دائیں بائیں جھنکے دیتے ہوئے مجھے پیچھے کرانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اچانک اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میری حماقت کو دیکھتے ہوئے وہ مقابل میری طرف سے ایسے کسی رد عمل کی توقع نہیں رکھتا تھا لہذا وہ بڑی آسانی سے میری چال میں آ گیا۔ میں نے بدن کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے آگے کو گر پڑا تھا۔ وہ بھی طاقت کی جھوک میں میرے اوپر ہی گر پڑا تھا۔ اس کا یہ عمل غیر ارادی تھا جب کہ میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ حرکت کی تھی چنانچہ وہ مار کھا گیا۔

میں نے زمین کی طرف آتے ہوئے اپنے ذہن کو پوری طرح بیدار رکھا اور میرے ذہن نے سیکڑتے ہزاروں حصے

کو بھی شمار کیا۔ ہم دونوں اوپر تلے زمین کی جانب جھکے تھے میں نے جیسے ہی محسوس کیا، مجھ پر لہرا ہوا محسوس اپنا توازن کھو بیٹھا ہے، میں نے سوچا سمجھا داؤ آڑا ڈالا۔

ہم زمین سے چند انچ کی دوری پر تھے کہ میں نے کھلی ایسی سرعت سے اپنی ہاڈی کو سائیڈ رول کیا۔ وہ شخص مجھ پر گرفت کو چھوڑ گیا تھا لہذا اس کے نیچے سے نکلنے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ میں رول کرتے ہوئے ایک سمت نکل گیا اور وہ ”دھب“ کی مخصوص آواز کے ساتھ منہ کے بل پتھر لی زمین پر جا کر۔

اس کے قتل سے ایسی دردناک آواز خارج ہوئی جیسے کسی جانور کی گردن پر چھری چلا دی گئی ہو۔ میں فوراً سے پیش تر سنبھلا اور تیزی سے اس کے قریب آ گیا۔

ہم دریائے کنارے، درختوں کے بیچ جس مقام پر ایک دوسرے کو قتلنے کی کوشش میں مصروف تھے وہاں اچھی خاصی تاریکی تھی تاہم قرب کے باعث ہم بیوسوں کے مانند بہ آسانی ایک دوسرے کو دیکھ پا رہے تھے۔ دریائی دوسری جانب شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اھر موجود کوئی شخص ہمیں اس تاریکی میں نہیں دیکھ سکتا تھا مگر ہم ان روشنیوں کی خیرات میں اپنے ارد گرد کے ماحول کو کسی حد تک سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

وہ شخص جلد ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پہلے سے اس کے انتظار میں تھا تاہم فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے محسوس کر لیا اور مجھ پر ایک جارحانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کوشش کی مگر توڑ ڈالی۔ اس کے ہاتھ خود تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اس کے کشادہ سینے پر ایک بھر پور فرنٹ کلک رسید کر دی۔

وہ اپنے سینے پر میرے جوتے کی مہر لگوانے کے بعد تھوڑا سا لڑکھڑایا اور دو قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے اس کی ڈگمگاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے پیٹ میں ایک جڑکی سائیڈ کلک جڑ دی۔

میری یہ فحش بردار کلک انگوٹھی میں ٹھپنے کے مانند ثابت ہوئی۔ وہ بڑے بڑے انداز میں پیچھے کھولا اور ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔

اس شخص کے وجود میں لہریں لہی ہوئی طاقت اور توانائی سے انکار ممکن نہیں تھا لیکن میں نے چند سیکڑتے محسوس کر لیا کہ وہ لڑائی بھڑائی کے صرف دیسی طور طریقے جانتا تھا۔ ہنگامی فائنٹ میں طاقت سے زیادہ تھیک تھیک موثر ثابت ہوئی ہے اور اگر تھیک تھیک کو طاقت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ

سوتے پر سہاگے کا اثر رکھتی ہے۔ اس حوالے سے مجھے اپنے  
تجربہ کار پر ایک خوش گوار برتری حاصل تھی۔

وہ درخت کے تنے کا سہارا لے کر اٹھا اور دونوں بازو  
پھیلاتے ہوئے میری جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ میں اس  
کے، خود سے ایک مخصوص فاصلے پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ  
جیسے ہی اس مقام پر پہنچا جہاں سے وہ دوبارہ چبھنا ڈال کر مجھے  
اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا، میں نے اپنے قدموں پر  
کھڑے کھڑے ایک ہائی جپ لگا لی۔

وہ مجھ سے ایسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اپنے  
اوپر سے پرواز کرتے دیکھا تو وہ بری طرح یوٹھلا گیا اور اس  
انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہہ اے جیسے اپنے سر کے  
اوپر اڑنے والے کسی پرندے کو جکڑنا چاہتا ہوں!  
میری اڑان اس کی پکڑ سے بالاتر تھی لہذا میں اس کی  
گرفت میں آئے بغیر اس کے عقب میں بچھ گیا۔ قدم زمین  
پر لگتے ہی میں نے ہاڈی کو آگے جھکایا اور ایک جھکے دار ریز  
لنگ اس کی پشت پر رسید کر دی۔

وہ میری پرواز سے پہلے ہی سٹ پٹا ہوا تھا، کمر پر جو  
ریز (بیک) لنگ تھی وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ  
پھر منہ کے بل پھرتی زمین سے جا اٹرایا۔ اس بار کراہوں  
کے ساتھ ہی اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا دریا بھی بہہ نکلا۔  
وہ مقامی زبان اور انگلش کے کچھ میں مجھے بڑی تکی لگتی  
سنارہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ انتہائی عجیب دلانے والا تھا۔  
میں بڑی حد تک نیپالی زبان بھول گیا تھا۔ میں تو پہلے ہی ان  
لوگوں کی طرف سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا، یہ لاف  
گزار میری سہاقت سے نگرانی تو میں نے بھی اپنا غبار  
ٹھالنے کے لیے اسے دو چار چھپ چھپ کر دینے تاہم میرے۔  
”مراسلات“ میں کوئی ریک جملہ شامل نہیں تھا۔

اچانک ایک مالوس آواز سن کر میں چونک اٹھا اور بے  
اختیار میری گردن اوپر کو اٹھ گئی کیوں کہ وہ آواز ایک قریبی  
درخت کی بلندی سے آئی تھی۔  
”وہ جان! کیا یہ تم ہو؟“

میں نے بولنے والی کو پلک جھپکتے میں پہچان لیا۔ وہ لی  
یان تھی۔ میں نے جب اپنے مد مقابل گینڈے کو گھری گھری  
سنائیں تو لی یان نے میرے لب و لہجے کو شناخت کر لیا تھا۔ وہ  
قریب ہی کسی درخت پر چھپی تھی، ہمارے درمیان ہونے  
والے سر کے کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے زندہ سلامت  
پاکر مجھے ہی مسرت ہوئی۔ میں نے اس کی آواز کے باعث کی  
مسرت گردن موڑ کر جواب دیا۔

”ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ تم بے خوف و خطر نیچے آؤ۔۔۔!“  
میرا جملہ نامکمل رہ گیا کیوں کہ اسی لمحے میرے وجود کو  
ایک زبردست دھکا لگا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میری  
لمبائی غفلت سے فائدہ اٹھا کر، مجھ سے بچنے والا تحریک ہو گیا  
تھا۔ میں لوکڑا تے ہوئے قدموں سے چوٹ آگے گیا پھر  
سنبھل کر پلٹ پڑا۔

وہ مجھ سے ددفٹ کی دوری پر ”نظر“ آیا۔ میں نے برق  
رفتاری سے اسے ہلکے کس پر رکھ لیا۔ میں اس کی کمروری  
اور طاقت سے یک سادہ اذیت حاصل کر چکا تھا لہذا اسے دام  
میں لانے کے لیے مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں  
اس کے انتہائی قریب آئے بغیر ہاتھ پاؤں کی خطرناک  
ٹھوکروں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ وہ گرفت میں لے کر  
دبوتے، بچوتے، جھپکتے اور کھینچنے کا مہر تھا۔ میں نے اسے ایسا  
کوئی موقع فراہم نہ کیا اور چند منٹ میں ”کاسک سوڈا“  
اس کی دھلائی کر کے پھرتی زمین پر لہا لٹا دیا۔

وہ میری ”فاطر داری“ سے ایسا مستفید ہوا کہ مجھے امید نہیں  
تھی، دو گھنٹے سے پہلے آٹھ کھل کر اس جہان رنگ دیو کو دیکھ  
بھی سکے گا اور ان دو گھنٹوں میں غنیمت کا قیامت خیز موسم  
اس کی ہڈیوں کے ساتھ جو سلوک کرتا، اس کا تصور ہی کیا  
جاسکتا ہے۔

اس دوران میں لی یان درخت سے نیچے اتر آئی تھی۔ وہ  
میرے قریب آتے ہوئے بولی ”میں اسی شیطان سے چھپ  
کر ادھر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے دو ساتھیوں کو خوشخبرہ کر دیا  
ہے۔ یہی شخص قابو نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں، کس ساڈنی نے  
اسے ختم دیا ہے۔“

آخری جملہ اس نے بڑی تکی سے ادا کیا تھا لیکن میں اس  
کے ابتدائی جملوں میں الجھا ہوا تھا میں نے اسے اپنے حربے  
قریب کرتے ہوئے انتظار کیا۔ میرا اشارہ بے ہوش ہونے  
والے گینڈے کی جانب تھا۔

”اس کے ایک ساتھی کو تو میں نے اس طرف آتے  
ہوئے راستے میں ڈھکی پڑے دیکھا ہے۔ تم کی تیسرے  
بندے کا ذکر کر رہی ہو؟“

”وہ چند گز اوپر اٹھ چلا پڑا ہے“ اس نے اندھیرے  
میں ایک سمت اشارہ کیا۔ ”میں نے مارشل آئرس کے دو چار  
کاری ہاتھ دکھا کر اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔“  
”اوہ!“ میں نے ایک گھبراہٹ سانس خارج کی اور کہا۔  
”اس کا مطلب ہے، ٹرک میں سے صرف تین افراد کل کر

تہارے تعاقب میں دوڑے تھے!“ پھر میں نے اس کے  
بدن کو ٹھونکنے ہوئے پوچھا۔ ”تم خیریت سے تو ہونا؟“  
وہ جڑبوڑے ہوئے بولی ”ہم۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“  
”اس طرف ہونے والی فائرنگ کی آواز سن کر تو میں  
گھبرا گیا تھا!“ میں نے کہا۔

وہ کسمکساتے ہوئے بولی ”وہ جو ادھر بڑا ہے اس نے  
مجھے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی“ اس کا اشارہ  
اپنے اس فکار کی طرف تھا جس کا تھوڑی دیر پہلے اس نے ذکر  
کیا تھا ”میری زندگی بانی تھی کہ بچ گئی“ وہ ایک اطمینان بھری  
سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”جواب میں میں نے بدل  
سے فائر کیا تو اس کا تیسرا ساتھی میری گولی کا نشانہ بن گیا۔  
میں نے اس کی درد میں ڈوبی ہوئی جی باندھتے ہوئے کسی  
تھی۔ پتا نہیں، وہ اب کس حال میں ہوگا!“

لی یان اس شخص کا تذکرہ کر رہی تھی جسے ”دور گردہ“ سے  
نجات دلانے کے لیے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جھکے  
دار حرکت کرنے کی زحمت دی تھی۔ میں نے لی یان کو اس  
شخص کے بارے میں مختصر بتایا اور کہا۔

”وہ بے چارہ اب بڑے اچھے حال میں ہے۔ ایسا حال  
جس کا ماضی اور مستقبل منہ پھاڑ پھاڑنا جائز تھا نہ کر  
رہا ہوتا ہے!“

پتا نہیں وہ میری بات کی سنگینی کو سمجھ کر نہیں، ایک طویل و  
عریض جھجھکیا لیتے ہوئے بولی ”مجھے تو یہ سب کسی خواب و  
خیال کے مانند محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میں نے کوئی  
زبردست ایکشن مووی دیکھی ہو!“

اس کا اشارہ ان واقعات کی طرف تھا جو بھلا نہیں آ۔  
ٹوٹی سے لے کر یہاں پہنچنے تک دروغ ہوئے تھے۔ واقعی یہ  
تمام تر مناظر کسی فلم کا حصہ ہی معلوم ہوتے تھے، خاص طور پر  
پل پر چیش آنے والے خوشی مناظر تو شوق کرنے کے قابل  
تھے۔ اس نوعیت کے تاثر انگیز اور اور جھل سین تو باقاعدہ  
پروڈکشن اور ڈائریکشن کی مدد سے ہی فٹائے جاسکتے ہیں۔  
پھر حال، یہاں جو کچھ پیش آیا تھا وہ کسی فلم کا سین نہیں بلکہ حقیقی  
زندگی کا ایک رخ تھا اور میری زندگی ایسے رخوں سے بھری  
ہوئی تھی۔

”لی یان۔۔۔ یہ خواب و خیال نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔“  
میں نے اس کا نشانہ جھپکتے ہوئے کہا ”تم جانتی ہو حقیقت بڑی  
تج ہوئی ہے اسی لیے زندگی کو ٹروڈا کر۔ دیتی ہے۔ ذہن میں  
رکھو کہ یہ ایکشن مووی ابھی ”دی ایڈ“ نہیں ہوئی“ میں نے  
ایک لمحے توقف کرنے کے بعد اضافہ کیا۔

”اس سٹنی خیز فلم کا ایک کردار اس وقت منظر سے  
غائب ہے۔ میں تو یہی طور پر کاشالوک کی خبر لینا چاہیے!“  
”کاشالوک!“ اس نے یہ الفاظ ایسے دہرائے جیسے  
اسے کوئی بھولی بھری کہانی یاد آگئی ہو۔ پھر غیر یقینی اور  
سراسیمہ لہجے میں بولی ”کاشالوک تو کیسی سیت دی یا میں چلا  
گیا۔۔۔“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”چلا گیا تھا“ میں نے کھیر آواز میں کہا ”لیکن میرا  
خیال ہے، اب وہ دریا سے باہر آچکا ہے!“  
وہ الجھ کر رہ گئی ”ت۔۔۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“  
میں نے کہا ”تم تھوڑی دیر تک دوسری طرف رخ پھیر  
کر کھڑی ہو جاؤ۔ مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے؟“  
”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اندرونی تجسس کے  
باعث وہ پوچھنے پر تیار نہ تھی۔

”میں اس ساڈنی کی اولاد کے کپڑے اتارنا چاہتا ہوں“  
میں نے کہا۔

وہ حیران لہجہ لگی ”وہاں! جہاں! اس جوبین میں بھی  
ذائقہ سوچ رہا ہے؟“ وہاں پر اتنی تاریکی تھی کہ میں۔۔۔ لی یان  
کو ایسی ہدایت دیے بغیر بھی یہ کام کر سکتا تھا، وہ کچھ بھی دیکھ نہ  
پاتی لیکن اگر ذہن میں کپڑے اترنے کا تصور موجود ہو تو کچھ  
نظر نہ آنے کے باوجود بھی بہت کچھ دکھائی دیتے لگتا ہے۔  
تصور بہر حال، ابسارت سے کم طاقت ور نہیں ہوتا!

”یہ مذاق نہیں بلکہ میں انتہائی سنجیدہ ہوں!“ میں نے  
کہا۔  
”بعض اوقات تم بہت مشکل ہو جاتے ہو!“ اس کے  
لہجے میں ایک گھو اپہاں تھا۔

”اس کے بدلے میں پھر آسان بھی تو ہو جاتا ہوں!“  
میں نے ذوق منی انداز میں کہا۔  
وہ لی یان گردن ہلاتے ہوئے بولی ”وہ جان!۔۔۔ تم  
میری سمجھ سے باہر ہو۔“

”میں چند منٹ بعد تمہاری سمجھ دانی میں سا جاؤں گا۔“  
میں نے غصے سے لہجے میں کہا ”نی الحال“ میں جو کہہ رہا  
ہوں، وہ سنو اور میری بات مان لو۔“

مان جانے میں اکثر لوگوں کا مان جاتا ہے لیکن لی یان  
مجھے جانتی تھی اس لیے مان گئی۔ ایک سوال بھی مزید پوچھنے بغیر  
وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ میں زمین بوس گینڈے کے ساتھ  
مصروف ہو گیا۔

میں اس کا لباس ایک خاص مقصد کے تحت اتارنا چاہتا  
تھا۔ میں نے کاشالوک کو تیزی سے تیر کر دریا کے اسی

کنارے کی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ تو اس ساڑھے نوے اچانک مجھ پر وارد ہو کر منظر کی ایسی کم تپتی کردی تھی ورنہ میں کشادہ بازوؤں کے ساتھ کاشانوک کو دبل کر کہتا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ وہ جب دریا سے باہر نکلے گا تو اس کا لباس ٹھنڈے ٹھار پانی میں بھیک ہوا ہوگا۔ اسے فوری طور پر ایک گرم اور خشک لباس کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ اور میں اس وقت کاشانوک کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے بندوبست میں لگا ہوا تھا۔

تھوڑی آسانی، تھوڑی مشکل کے بعد میں نے، دنیا و مافیہا سے بے خبر گینڈے کو بے لباس کر دیا۔ موسم پہلے ہی کچھ کم شدہ نہیں تھا۔ اس پر لباس سے عاری اس کا بدن دہری قیامت سے گزرتا۔ اب ہڈیوں کے اندر گودا جھنے کے امکانات مدنی مد سے بھی تجاوز کر چکے تھے۔ میں نے اس تک دھڑک بائیں نما انسان پر حقارت بھری نگاہ ڈالی اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آؤ جلیں!“

وہ میرے ساتھ ہوئی۔

میں مانتا ہوں کہ میں نے اس ساڑھے نوے کے ساتھ کوئی زیبا سلوک نہیں کیا تھا لیکن میں ان تپش انگیز لحاظات میں ایک عجیب سی وحشت میں مبتلا تھا۔ ربی موٹے ہاتھن اور اس کے دیکھی، پردہ کی چھون کے لیے میرے دل و دماغ میں جنون ہی جنون بھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور یہ جنون و وحشت بھرنے والے بھی یہی لوگ تھے۔ بل پر ان کے ٹرک نے جس وحشیانہ انداز میں ہماری ٹیکسی کو ”ٹھوکر دیا“ میں اڑاتے ہوئے سپر وور دیا کیا تھا وہ ان کی سفاکی اور بربریت کا کھلا مظاہرہ تھا، جواب میں وہ بھی کسی ایسے ہی شان دار سلوک کے مستحق تھے۔ میں نے تو اس ساڑھے نوے کے استحقاق کا پاس کیا تھا۔ اس طرح تو ہوتا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں۔۔۔۔۔!

اگر شوگر مل لگانے کا ارادہ ہو تو ساتھ ہی گتہ فیکٹری بھی قائم کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح کھی کا کارخانہ چلانے والا، صابن کی انڈسٹری بھی کھولنا ہے۔ اس طریقے سے پانی پر اڈکٹ کو کھپانا مفید اور آسان ہو جاتا ہے۔ ظلم و زیادتی کی راہ اپنانے والوں کو بھی اپنے پانی پر اڈکٹس کا ”خیال“ رکھنا چاہیے۔ ایسے پر اڈکٹس اینڈ پانی پر اڈکٹس قائمہ پہنچانے کے بجائے ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔۔۔۔۔!

میں لی یان کا ہاتھ تھامے تیزی سے دریا کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ”وہ دان! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”کاشانوک کے پاس!“ میں کہا۔

اس نے میرے ہاتھ میں تھامے ہوئے ”گینڈے“ کے لباس پر ایک نظر ڈالی اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”اوہ! میں اب بھی“

”شکر ہے“ سمجھ تو نہیں میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”ورنہ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھے پہنکے نقیس تمہاری سمجھ دانی میں اتارنا ہوگا“

اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ جلد ہی ہم کاشانوک کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ دریا میں سے نکلنے کے بعد ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔ اسے وہاں ہماری موجودگی کا علم نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کو تلاش کرنے میں زیادہ خوار نہیں اٹھنا پڑی۔

دوسرے باؤں تک شربور تھا اور یہ شربوری کچھ طاری کر دینے والی تھی مگر کاشانوک ہلاکتی قوت برداشت کا مالک تھا۔ اس کے تاثرات سے بالکل بی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندر سے کانپ رہا ہے۔ لگتا تھا، اس نے مارشل آرٹس کے میدان میں کافی ریاضت کر رکھی تھی!

کسی قسم کی بحث یا تفصیل میں پڑے بغیر کاشانوک نے میری ہدایت پر فوراً لباس تبدیل کر لیا۔ اس دوران میں، میں اور لی یان موجودہ حالات پر باتیں کرتے ہوئے مسلسل دریا سے دھوپ کھلا کے اس پل کی سمت دیکھتے رہے جہاں ایک خون ریز محرکہ آرائی کے بعد ہم یہاں پہنچے تھے۔

وہاں پل پر اب خاصی گہما گہما تھی اور روشنی نظر آرہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا، ہمارے دشمنوں اور پولیس کی ہماری حمایت وہاں کھینچ چکی ہے۔ ان لوگوں کے پاس فلڈ لائٹ کا بھی بندوبست تھا۔ تیز روشنی کا باز اسادائرہ دریا کی سطح پر ادھر ادھر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً انہیں اسی ٹیکسی کی تلاش تھی جس پر سوار ہو کر ہم لوگ اس پل تک پہنچے تھے۔ اور قرآن کے مطابق، وہ ٹیکسی دریا برد ہو چکی تھی۔

ٹیکسی اتنی اہم نہیں تھی جتنے ہم ان کے لیے اہم تھے۔ ہم نے بلاشبہ انہیں عظیم الشان نقصان سے دوچار کیا تھا۔ وہ ٹیکسی کی آڑ میں دراصل ہماری تلاش میں تھے اور بہت جلد وہ ادھر کا رخ بھی کرنے والے تھے۔ ہمیں جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔

کاشانوک نے لباس تبدیل کر لیا تو ہم خود کو سمجھنے درختوں کی اوٹ میں رکھتے ہوئے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کی سمت قدم بڑھانے لگے۔ دریا نے



دھوپ کھولا ہر دوسرا مل وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا اور ہم مذکورہ دریا کو عبور کیے بغیر بڑھنا تھا۔ دہلی میں نہیں پہنچ سکتے تھے، جہاں پہنچنا ہمارے لیے از حد ضروری تھا۔

کاشانوک کے حوالے سے میرے ذہن میں کئی سوالات کلبلا رہے تھے۔ اگر کوئی ہند گاڑی کسی حادثے کے نتیجے میں، گہرے پانیوں میں اتر جائے تو اس کے اندر موجود افراد موت سے پہلے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ چاروں طرف سے پانی کا پریشر اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ گاڑی کے دروازے ٹھوٹنا تقریباً ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے اور کاشانوک یہ ناممکن کام سرانجام دے کر بہ حفاظت باہر آچکا تھا۔

میں نے اس بارے میں اس سے سوال کیا تو وہ بولا ”جب کسی کو آخری دھکا ملا اس وقت تم لوگوں کی طرح میں بھی اپنی سائیکہ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ میں دروازہ کھولنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن اس قیاسی پیش نے مجھے جیسی سے باہر قدم رکھنے کی مہلت نہ دی اور میں کھلے ہوئے دروازے کو تھامے تھامے، جیسی سمیت دریا میں پہنچ گیا۔“

وہ ایک لمبے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھا تے ہوئے گہری تنبیہ کی ”بھئی خوش قسمتی کہ ان لمحات میں لاؤ بھدا چھ پر مہربان ہو گیا اور جیسے ہی جیسی نے پانی کی سطح کو بوسہ دیا، کھلا ہو اور دروازہ اپنے قبضوں سے جدا ہو کر جیسی سے الگ ہو گیا۔ اس طرح مجھے جیسی سے باہر آنے میں کئی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے بعد تیراکی کی صلاحیت نے کام دکھایا اور دیکھ لو.....“ وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔

”اس وقت میں تم لوگوں کے سامنے صحیح سلامت موجود ہوں۔“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور تمغیر آواز میں کہا ”کاشانوک.....! تمہاری سلامتی میں سب سے بڑا ہاتھ تمہاری ٹوٹ ارادی اور برداشت کا ہے ورنہ اس شخصے شمار موسم میں بدن کی تلقین تو بعد میں جتنی ہے، انسان کی ہمت پہلے ہی جواب دے جاتی ہے۔ بہر حال.....“

میں نے نامکمل پہلے پر اپنی بات ختم کر دی۔ وہ کچھ نہیں بولا خاموشی سے ہمارے ساتھ قدم اٹھاتا رہا۔ کچھ دیر تک ہم اسی اونچی چٹنی پتھر کی راہ پر پہنچے جاتے چلتے رہے اور بالآخر دریا کے دوسرے مل کے قریب پہنچ گئے۔

لی یان نے تجویز پیش کی ”ہمیں فوری طور پر کوئی جیسی

پکڑ کر دہلی میں پہنچ جانا چاہیے۔“

میرے اور کاشانوک کی طرح اس نے بھی اچھی خاصی مارا ماری کی تھی۔ ہم تینوں ہی کا کھنسنے سے برا حال تھا۔ ٹھنڈو ایک زندہ اور ہستا ہستا شہر ہے۔ موسم سرما میں اتنی رات کو اگرچہ کسی وغیرہ کم ہوجاتی ہیں تاہم ان کا کال نہیں پڑ جاتا۔ تھوڑی سی کوشش اور انتظار کے بعد بہر حال سواری مل ہی جاتی ہے۔

”پہلے ہم اس مل پر سے دریائے دھوپ کھولا کو عبور کر لیں“ میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ”دوسری طرف پہنچنے کے بعد کوئی سواری دیکھ لیں گے۔“

دونوں نے میرے شور سے کوراست جانا اور ہم نے نہایت ہی محتاط قدموں سے مل پر چلنا شروع کر دیا۔ دریا کی مغربی سمت ہمارے لیے نہایت ہی حساس اور رنگی ہو چکی تھی۔ اگر ہم مل کو پار کر کے مشرقی سمت میں پہنچ جاتے تو ہماری ”پوزیشن“ بہ نسبت زیادہ محفوظ ہوجاتی۔

میں نے کاشانوک سے کہا ”ہمیں اس خوش قسمتی میں نہیں رہنا چاہیے کہ دشمنوں نے جیسی کے نمبر کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ جیسی تو کئی دھوپ کھولا کی تہ میں لیکن اس کے نمبر کی مدد سے وہ تمہارے دوست تک ضرور پہنچ جائیں گے اور یہ تمہارے دوست کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“

”میں تمہاری بات کی گہرائی کو سمجھ رہا ہوں وچہدان“ وہ تمغیر آواز میں بولا ”لی یان نے جب دالوں کی ”آٹھ پیلوں“ کا جو قصہ ہمیں سنایا ہے اس کی روشنی میں وہ جیسی صدنی مدد انہیں فیڈ ہے۔ وہ جیسی کے نمبر کی مدد سے مہندر کا سراغ نکالیں گے۔“

جس جیسی میں ہم نے اب تک ستر کے دشمنوں کے دانتوں پر کیوں چھڑا تھا وہ کاشانوک کے ایک دوست کی ملکیت تھی۔ اس نے اپنے اس دوست کا نام پہلی مرتبہ ہمارے سامنے لیا تھا۔

”پھر تم نے مہندر کے بارے میں کیا سوچا ہے کاشانوک؟“ میں نے استفسار کیا۔

”مل کی دوسری جانب چند گز کے فاصلے پر ایک فلنگ اسٹیشن ہے“ وہ گہری تنبیہ کی سے بولا ”وہاں فون کی بھولت موجود ہے۔ میں مہندر کو فون کر کے ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اپنی جیسی کی چوری کی رپورٹ درج کر دے۔ اس طرح ایک طرف تو اس کی پوزیشن صاف ہوجائے گی اور دوسری جانب کسی کو یہ بتا بھی نہیں چل سکے گا کہ مہندر نے وہ جیسی مجھے دے رکھی تھی۔“

اس کے ذہن میں بروقت ایک مفید بات آئی تھی۔ مہاشانوک نے بتایا کہ مہندر نامی وہ شخص اس کاے لوٹ دوست تھا۔ کسی مشکل وقت میں وہ اس پر آج بھی نہیں آنے دے گا۔ مہندر کی رہائش مہاراج کالج کے علاقے میں تھی۔ ہم مل کو عبور کر کے فلنگ اسٹیشن (پینڈرول پب) پر پہنچ گئے۔ کاشانوک اپنے دوست کو فون کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ ہمیں ایک خالی جیسی مل گئی۔ کاشانوک نے نیالی میں اس سے ”مذاکرات“ کیے اور اگلے ہی لمحے ہم اس جیسی کے اندر پہنچے تھے۔

مغرب کی سمت سفر کرتے ہوئے تھوڑی دیر بعد ہم گورسالا پہنچے پھر کاشانوک کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور نے جیسی کو رنگ روڈ پر ڈال دیا۔ رنگ روڈ کے ذریعے ہم دریائے بھاگ متی کے اوپر سے گزرے اور بائیں سمت مڑ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد، ہم شمال میں سفر کرتے ہوئے پشوپتی ناتھ ٹیمپل پہنچ گئے۔ کاشانوک دانستہ جیسی والے کو ادھر ادھر گھما رہا تھا تا کہ اگر ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہو تو چل سکے لیکن سوئے اتفاق، اس وقت ہم بالکل محفوظ انداز میں سفر کر رہے تھے۔

پشوپتی ناتھ ٹیمپل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم دیوچن پہنچے اور پھر ایک ہی سڑک کو پکڑ کر ہم سیدھے بڑھنا دہلی کی جانب بڑھ گئے۔ کاشانوک نے جیسی میں سفر کے دوران میں محل مندی کا ایک کام بھی کیا کہ باہمی گفتگو سے پرہیز کرتا۔ میں نے ادنیٰ لیان نے بھی خاموشی رہنے پر ہی اتفاق کیا۔ جیسی کو ہم نے بڑھنا دہلی سے تھوڑا پہلے ہی فارغ کر دیا اور پیدل چلتے ہوئے دہلی میں داخل ہو گئے۔ جب ہم گھر پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

کاشانوک نے ہمیں ہمارے کمرے میں پہنچایا اور ”ایک منٹ ابھی آیا!“ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے آرام خیز پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ لی یان بستر پر دراز ہو گئی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ہمیں ایک فرحت کا احساس ہوا تھا۔ فلوچی نے ہمارے جانے کے بعد کمرے کا ہینک سسٹم آف نہیں کیا تھا۔ اگرچہ سسٹم پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا لیکن ٹھنڈو کی کھلی فضا کی بہ نسبت، کمرے کا ماحول کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ ہم نے اچھا خاصہ وقت کھلے میں گزارا تھا اس لیے بھی وہ کمرہ اس وقت ہمارے لیے ایک مہربان، نرم اور گرم آغوش کی حیثیت رکھتا تھا۔

”وچہدان! میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی!“ لی یان کی

سرسراہی ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس کا اشارہ گزشتہ دو گھنٹے میں پیش آنے والے واقعات کی جانب تھا۔ اس کے اظہار اور انداز سے میں محسوس کر سکتا تھا۔ اس نوعیت کی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور پکڑیشن سے زندگی میں اس کا پہلے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

میں نے وقت کی گھنٹ کو دور کرنے کے لیے اذراہ مذاق کہہ دیا ”اپنے گال پر جھکی بھر کر دیکھو!“

”اس سے کیا ہوگا؟“ وہ ہجرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”خواب اور حقیقت کا فرق واضح ہو جائے گا!“

”کیا میں یہ تجربہ تمہارے ساتھ دہرا سکتی ہوں؟“ وہ شوخی سے بولی۔

میں نے تمغیر انداز میں کہا ”میرا خواب تو ایک عرصے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں.....!“

اس سے پہلے کہ لی یان مزید کچھ کہتی، کاشانوک ہمارے پاس آ گیا لہذا اسے خیر گفتگو کو بریک لگ گئے۔ میں کاشانوک کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ دیکھ کر متعجب ہوا۔ وہ شیونگ کٹ سے ملتا جلتا ایک بیگ تھا۔ میں نے اس بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کاشانوک! یہ تم کہاں سے لائے ہو..... اور اس میں کیا ہے؟“

اس نے غصے سے لہجے میں جواب دیا ”یہ فلوچی کی شیونگ کٹ ہے۔ ایک شیونگ کٹ میں کیا کچھ ہو سکتا ہے، اس سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو!“

لی یان، کاشانوک کی آمد کے بعد اٹھ کر بیٹھ بیٹھ گئی تھی، وہ قصہ دیتے ہوئے بولی ”اور اس بات سے میں بہ خوبی آگاہ ہوں کہ تم اس کٹ کو کس استعمال میں لاؤ گے!“ اس کا مخاطب کاشانوک تھا۔

لی یان کے لہجے میں پوشیدہ شرارت کو میں نے ہلکے جھپٹے میں محسوس کر لیا، چونکہ کراس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا ”تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟“

”ہم..... ہم.....! وہ جتنی خیر لہجے میں بولی۔

”وہاں؟“ میں نے انھیں زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک ہاتھ سے سر کی جانب اشارہ کیا اور اسی ہاتھ کی دو انگلیوں کو کسی گینے کے مانند حرکت دیتے ہوئے شوخی سے بولی۔ ”آئی مین..... ہم کچھ کم!“

بات سمجھ میں آئی تو میں نے سرزنش کے انداز میں اسے گھورا۔ کاشانوک کا منصوبہ تھا کہ بودھ تاجھ دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ایک سوئٹ کا روپ دھارنا ہوگا۔ اگر میں اپنی وضع قطع اور طے سے کوئی بدھ بکشتو دکھائی دوں گا تو یہ ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس تباری کے لیے لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی مجھے بدھ راہبوں کی طرح اپنا سر بھی منڈوانا تھا۔ لی یان نے اس حوالے سے پہلے بھی میرا اچھا خاصہ مذاق اڑایا تھا اور اب بھی وہ اسی قسم کی حرکت کر رہی تھی۔

کاشانوک گہری سنجیدگی سے بولا "میں نے آگے روانگی کے سلسلے میں پوری تیار کر لی تھی۔ تم دونوں کے روایتی لباس اور اشیاء ضرورت کو ایک بڑے بیگ میں بھر کر میں نے فیس کی ڈکی میں رکھ چھوڑا تھا جو اس فیس کے ساتھ ہی دریا برد ہو گیا۔"

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "فلو جی کو میں نے تمہارے لباس کے بندوبست کے لیے بھیجا ہے اور اس کی شیڈنگ کٹ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ اب تم میرے ساتھ واٹس روم کی طرف چلو۔ میں دس چدرہ منٹ میں تمہارا سر منڈاؤں گا لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ضروری کام کرنا ہوگا" اس نے چونکنے والے انداز میں توقف کیا اور اضافہ کرتے ہوئے مستطفر ہوا۔

"وہ ان! آزادہ بیک نکالو جس میں میک اپ وغیرہ کا سامان رکھا ہے؟"

"کیا تم سروسٹھ نے کے ساتھ ساتھ میرے چہرے پر بھی کام کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا، فی الحال تو مجھے میئر ڈرائنگ کی ضرورت ہے!"

میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا

"میئر ڈرائنگ کیا کرے گا کاشانوک؟"

"تم کو لٹو کرسی، ابھی بتاتا ہوں" وہ اپنی جیبوں کو نولتے ہوئے بولا۔

آج صبح..... یعنی کل صبح کاشانوک ہمارے لیے جو شاپنگ کر کے لایا تھا اس میں کپڑوں کے علاوہ میک اپ کا ضروری سامان بھی موجود تھا۔ چینی دیر میں، میں بیگ میں سے میئر ڈرائنگ نکالتا، وہ اپنی جیب میں سے موبائل فون برآمد کر چکا تھا۔ دریاے دھوبی کھول کے کنارے لباس تبدیل کرتے وقت کاشانوک نے اپنی جیبوں کا سارا سامان خشک لباس کی جیبوں میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل

فون دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دیگر چینی اشیاء کے ساتھ ہی وہ سیل بھی خشکے شمار پانی میں شراور ہو گیا تھا۔

کاشانوک نے سیل کو کھول لیا۔ اس کی بیٹری اور سیم کارڈ کو سیل سے جدا کیا اور میئر ڈرائنگ کو آن کرنے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ سیل کے تمام "اعضا" جب اچھی طرح سوکھ گئے تو اس نے انہیں آسٹل کرنے کے بعد سیٹ کو آن کرنے کی کوشش کی "کوشش" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ متعدد بار ایسا کرنے کے بعد بھی اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ سیل "زمین جہد نہ جہد گل محمد" کی عملی تفسیر پیش کرتا رہا تو کاشانوک مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اس کی چھٹی ہو گئی۔ تائیں تائیں فٹس!" لی یان نے کہا "اب تو کافی دیر گزر گئی۔ اگر بھیجتے کے ساتھ ہی اسے کھول کر خشک کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس بات کے امکانات تھے کہ بدودا بہ "زندہ" ہو جاتا۔"

"مگر وہاں ہمیں کوئی ڈرائنگ میئر نہیں تھا" کاشانوک نے کہا "ہمیں اپنی زندگی بچانے کے لالے پڑے تھے، سیل کے بارے میں کب اور کیا سوچے!"

میں نے پوچھا "کاشانوک! کیا یہ چھتر نہیں ہو سکتا؟"

"اس میں رجھریگ والا ہوتا ہی کیا ہے!" وہ سادگی سے بولا "یہ سسٹم آئی سی کے تحت کام کرتا ہے۔ یا تو خراب ہی نہیں ہوتا اور اگر ہو جاتا ہے تو پھر اسے ٹھیک نہیں کیا جاسکتا۔"

اب یہ ایک بے جان پھر ایسی حیثیت کا مالک ہو گیا ہے۔

کاشانوک اور لی یان..... اور انہی کی طرح کے دیگر لوگ جو موبائل فون، دسی گھڑی اور الیکٹرونک اینڈز الیکٹرانکس کی ایسی ہی روزمرہ استعمال کی اشیاء کو سپرویزر سمجھتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ہمارے وطن عزیز کی الیکٹرانکس مارکیٹس میں کیسے کیسے جیتے بیٹھے ہیں جو ایسے ہی اچانک "خاموش" ہو جانے والے آلات میں زندگی دوڑا دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ٹیکنالوجی بعد میں آتی ہے، جو گاہے پہلے تیار کر لی جاتی ہے۔ اس پاک دھرتی کی زرخیز فضا میں سانس لے کر یہ وہان جڑے والوں کو اگر اپنے جوہر آزمانے کے پھر پور مواقع ملیں تو یہ زندگی کے ہر شے میں دیگر اقوام عالم کو سراسر پاس کرتے ہوئے اپنے تباہ و درخشندہ ماضی کی یاد تازہ کر دیں گے۔

مغرب، خصوصاً امریکا کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو پھلتے پھولنے نہ دے۔ ایسی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں کہ انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے دور رکھا جائے اور

انہیں سیکھنے کے صرف اتنے ہی مواقع فراہم کیے جائیں کہ یہ ان کے سامنے سر اٹھا کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کر سکیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے پاکستانی طالب علموں کو یورپ اور امریکا ہی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں؟ اور جو لوگ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر کے وہاں کی تربیت کامیابی میں سائنس، ٹیکنالوجی اور زندگی کے دیگر اہم شعبوں میں بدولتی حاصل کر لیتے ہیں ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو واپس لوٹ کر ملک و قوم کی بہتری اور ترقی کے لیے کام کرتے ہیں؟ ایسے بہترینوں کو تو ناقابل تصور ہماری معاذوں پر ایک گہری سازش کے تحت دھپ روک لیا جاتا ہے کہ بچہ اب تم نے کہاں جانا ہے۔ یہی رہو اور ہماری ترقی کے لیے کام کرو۔ امریکا اور یورپ آج ترقی کے جس ذہن پر کھڑے نظر آتے ہیں اس میں زیادہ ہاتھ غیر امریکی اور غیر یورپی افراد کا ہے جن میں غالب تعداد پاکستانیوں اور بھارتیوں کی ہے۔ یہ دونوں ملک ایک ساتھ کم و بیش ایک جیسا مقررے کر آزاد ہوئے تھے اور اب تک لگ بھگ ایک ہی جیسے مسائل کا شکار ہیں۔

کسی بھی قوم کی انفرادی کوتاہیوں سے انکار ممکن نہیں لیکن آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں۔ اس کا ذمہ دار، بے حس و مفاد پرست سیاست دانوں اور یورپ و امریکا کی خوش نودی کو ملک و قوم پر فوقیت دینے والے حکمرانوں کے سوا اور کوئی نہیں!

میں نے کاشانوک سے کہا "ہمارے پاس ایک اور جی ایس ایم موبائل اسپتھر میں رکھا ہوا ہے۔ تم اپنا سیم کارڈ اس میں لوڈ کرلو" میرا اشارہ لی یان والے موبائل کی طرف تھا۔

"کوشش کر کے دیکھتا ہوں" اس نے کہا "اگر سیم کارڈ میں زندگی باقی ہے تو کام چل جائے گا"

آئندہ پانچ منٹ میں اس کی کوشش بار آور ثابت ہوئی اگرچہ اس کا سیم کارڈ بھی سیل کے ساتھ ہی بیگ کیا تھا تاہم وہ شارٹ سرکٹ جیسے نقص سے محفوظ رہا تھا، یعنی ابھی اس میں زندگی باقی تھی۔ اس طرح کاشانوک کی ایک سیم میرے سیل میں اور دوسری لی یان والے سیل میں کام کرنے لگی۔ میں نے لی یان والا سیل اس کی طرف بڑھا دیا۔

"کاشانوک! یہ تم اپنے پاس رکھو"

"اوچھ کیا کر دی؟" اس نے لی یان سے پوچھا۔

"میں دونوں ایک ہی سیل سے گزارہ کر لیں گے!" لی یان نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، پھر میرے والے سیل کو چار بج پر لگا

دو" کاشانوک نے کہا "اس دوران میں ہم ایک ضروری کام نمٹائیں"

"ضروری کام" کے الفاظ پر لی یان زہربا مسکرا کر رہ گئی۔ میں اس کی مسکراہٹ کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ جب سے اس نے یہ سنا تھا، سروسٹھ مجھے مٹھا کر دیا جائے گا۔ وہ گلہ یہاں ہے مجھے اس حوالے سے چھینڑ رہی تھی۔ میں اس پر ایک گہری نظر ڈال کر کاشانوک کے ساتھ دانش روم میں مٹ گیا۔

ٹھیک چدرہ منٹ کے بعد جب میں دانش روم سے برآمد ہوا تو میری "کایا" پلٹ چکی تھی اور اس "لوٹ پلٹ" کو میں نے دانش روم کے آئینے میں ملاحظہ کر لیا تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ لی یان کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑے گی، اس کی فکری جھوٹ جائے گی لیکن اس نے میری توقع کو ٹھیک نہ کر دیا۔ وہ چند لمحے گہری اور سنجیدہ نگاہ سے میرا اور میرے سر کا جائزہ لیتی رہی پھر بے پروائی سے کندھے پر ہاتھ پکڑا دیے۔ شاید وہ کاشانوک کی موجودی کا لحاظ کر رہی تھی۔ اگر واقعی یہی بات تھی تو پھر اس کا مطلب تھا، اس کے جاتے ہی وہ مکمل کیلے گی۔

تھوڑی دیر بعد فلو جی لوٹ آیا۔ وہ ہمارے لیے مناسب لباس کا انتظام کر لایا تھا۔ میری بدلی ہوئی دنیا کو دیکھا تو وہ چونکا، اور نہ ہی کسی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ بہت ہی جہاں دیدہ اور گہرا شخص تھا اور مجھے یقین تھا، کاشانوک نے اسے ہمارے بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ بریف کر رکھا تھا۔

"کھانے کی کیا صورتحال ہے؟" کاشانوک نے فلو جی سے پوچھا۔

"کھانا موجود ہے۔ آپ کہو تو لگا دیتا ہوں"

ہم رات کا کھانا بڑے ٹھیک ٹھاک انداز میں کھا کر گھر سے نکلے تھے لیکن سرد ترین موسم میں اچھا خاصہ صاف کتزارنے کے بعد ہمیں ہلکی ہلکی بوک محسوس ہو رہی تھی، ویسے بھی کھانا کھانے ہوئے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزر گئے تھے۔ موسم سرما میں جسم کو اپنا درجہ حرارت برقرار رکھنے کے لیے بہ نسبت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ توانائی ظاہر ہے، خوراک ہی سے حاصل ہوتی ہے لہذا نتیجے کے طور پر نظام انہضام کی رفتار کمی کتنا بڑھ جاتی ہے۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا پھر ہم ایک مرتبہ پھر کمرے میں آ بیٹھے اور ہمارے درمیان، بچھلے چار پانچ گھنٹوں میں رونما ہونے والے واقعات پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ

ان سنگین واقعات کے بعد کھنڈو کی فضا ہمارے لیے انتہائی مہلک ہوئی تھی۔ اگر ہمیں کھنڈو میں رہنا تھا تو روپوشی بہت ضروری تھی اور میں پردہ نشین لی بیوں کی طرح منہ چھپا کر زندگی گزارنے کا عادی نہیں تھا لہذا انہیں اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے صبح بدھ بکھشوں کے ہمیں میں کھنڈو سے نکل جاتا ہے، آگے جوگی ہوتا، اللہ مالک تھا!

اٹھنے سے پہلے کا شالوک نے تاکید کی انداز میں کہا ”تم لوگوں کو ایک مختصر سی نیند لینا ہوگی“ اس وقت رات کے دو بجتے والے تھے ”صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے بیدار ہو جانا۔ ناشتا ہم گھر سے باہر کریں گے، کسی ایسے چھوٹے سے ہوٹل میں جہاں زیادہ تر بکھشوئی کھاتے چیتے دکھائی دیتے ہیں ہم انہی بکھشوں میں شامل ہو کر ادھر ادھر سے ہوتے ہوئے تھاچو کے گرد پتک بچھ جائیں گے۔“

”کیا تم نے تھاچو کے ساتھ سفر کرنے والے تمام بکھشوں کو ہمارے بارے میں بتادیا ہے؟“ میں نے ایک ضروری سوال کیا۔

وہ لٹی میں سر ہلاتے ہوئے یوں ”نہیں وجدان! ہمارے راز سے صرف تھاچو واقف ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس سانس سے اطمینان جھلکتا تھا۔

لیان کا شالوک سے دریافت کیا ”ہم کھنڈو سے تبت تک کس ذریعے سے پہنچیں گے؟“

”یا تریوں والے قافلے... میں شامل ہو کر ہم مقامی بس کے ذریعے کھنڈو کے ایک معروف مقام سندھارا جا سکیں گے“ کا شالوک نے بتایا ”سندھارا سے سو کس مٹی ایکسپریس کوچ چلتی ہے۔ یہ کوچ ہمیں کوادری تک پہنچائے گی۔ اس سرحدی قصبے سے آگے پیدل سفر کر کے ہم تبت میں داخل ہو جائیں گے۔“

”مگر تم نے تو بتایا تھا، یہ بدھ یا تری راستے میں بھی ایک دو مقام پر رک کر کچھ تیز گزرا رہیں گے!“ لیان نے پوچھا ”کیا سوکس مٹی ایکسپریس انہیں یہ سہولت فراہم کرے گی؟“

”اس کوچ میں زیادہ تعداد ایسے ہی بدھ پیرداروں کی ہوگی جو مختلف بدھ اسٹوپا کی باترا لٹکے ہوئے ہیں۔ تھاچو کا قافلہ بھی تبت سے اسی مقصد کی خاطر کھنڈو تک آیا ہوا ہے لہذا ٹرائس پورٹ والے ان کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم جس کوچ سے روانہ ہونے والے ہیں وہ کھنڈو سے نکل کر

شمال کی سمت میں سفر کرتے ہوئے“ نوکلو میٹر کے بعد بدھانکا نکلا تھا پیچھے کی تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ بدھانکا تھا سے حریہ آگے شمال کی طرف بڑھے گی اور چارکلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے سندری جل جا پیچھے کی۔ سندری جل کھنڈو سے تیرہ کلو میٹر شمال میں واقع ہے۔ سندری جل میں مختصر قیام کے بعد ہم آگے کوادری کی طرف بڑھ جائیں گے“ کا شالوک نے اس سفر کا ایک نقشہ سنا سنا دیا ”ذہن میں رہے کہ یہ تمام تر سفر ہم شمال میں بلندی کی طرف طے کریں گے۔ تبت کو دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ یہ اوسطاً گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ تبت کے بعض مقامات پر یہ بلندی ساڑھے تیرہ ہزار فٹ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے“

”تبت میں قدم رکھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوگا کہ ہم چائنا میں داخل ہو گئے!“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔

کا شالوک یک دم افسردہ دکھائی دینے لگا پھر آہستہ سے بولا ”بالکل، بالکل!“

میں اس کی افسردگی کا سبب جانتا تھا۔ کا شالوک بدھت تھا اور بدھ کے پیروکاروں کے لیے تبت کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک طرح سے ان کا مکہ مدینہ ہے۔ کسی زمانے میں تبت ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا۔ پھر انیس سو اسیھ سو میں، چودھویں دلائی لاما کے دور میں کیونٹ چینی فوج نے اس پر لشکر کشی کی اور ایک بڑی خون ریزی کے بعد اس ارضی جنت کو بربط کر لیا۔ تبت اب چین کے ایک صوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صوبے کا صدر مقام لہاسا ہے۔ اس خطے کو اپنے ملک کا حصہ بنانے کے بعد چین نے اس کا نام بھی تبدیل کر دیا تھا۔ سرکاری کاغذات میں اب تبت، ی زانگ xizang کے نام سے موجود ہے لیکن تبت کے باسیوں اور بدھ کے پیروکاروں کے لیے یہ اب بھی تبت ہی ہے۔ ”سی زانگ“ کا لفظ ان کی یادداشت میں بیضیائی نہیں۔ اس تاریخی زیادتی کے حوالے سے قحطی عوام فلسطینیوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ موجود ہو تو!

کا شالوک بھی تبت کو تبت ہی سمجھتا تھا لہذا سی زانگ، چین کے ایک صوبے کے ذکر پر اس کا غم زدہ ہو جانا عین فطری بات تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہم سے رخصت ہو گیا اور جاتے جاتے یہ ہدایت بھی کر گیا کہ صبح ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا لہذا ہمیں پیکنگ وغیرہ کر کے سونا چاہیے!

ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے آئندہ پندرہ منٹ میں پیکنگ کر لی۔ اس دوران میں لیان بار بار میرے

منڈے ہوئے سر کی طرف دیکھتی اور معنی خیز انداز میں متکرا دیتی۔ اس کا انداز مضحکہ اڑانے والا نہیں تھا بلکہ وہ شرارت کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ ہم پیکنگ سے فارغ ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔

”شاید تم نے کا شالوک کی بات کو غور سے نہیں سنا۔ ہمیں صبح جلدی اٹھنا ہے!“

”جلدی اٹھنا ہے... تو؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تو یہ کہ جلدی بیدار ہونے کے لیے جلدی سونا بھی ضروری ہے!“ میں نے اس کی شوخی بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”ارلی تو بیڈ اینڈ ارلی تو راتز... کے بارے میں تو تم نے سن رکھا ہوگا؟“

”ہاں، سنا بھی ہے اور پڑھ بھی رکھا ہے“ وہ بڑی معصومیت سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”لیکن یہاں پر ان دانش بھری باتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ رات کے سوا دو بج رہے ہیں۔ اس وقت کواری تو بیڈ تو نہیں کہا جاسکتا نا؟“

”نہیں کہا جاسکتا، میں بھی مانتا ہوں“ میں نے تائیدی لہجے میں کہا ”لیکن بیدار ہونے کے لیے سونا ضروری ہے!“

”ضروری تو ہے مگر کیا کروں، مجھے نیند نہیں آ رہی“ اس نے کہا ”کالی نے نیند اڑادی ہے۔“

”اس سلسلے میں کوشش تو کر سکتی ہو“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

وہ میری بات پر غور کرنے کے بجائے چونک کر مستفسر ہوئی ”وجدان! انہیں تو مجاہدوں پر بھائیوں آنا چاہیں لیکن تمہاری آنکھوں میں تو نیند کا شائبہ تک نہیں؟“

”مجھے اتنی جمابیاں کیوں آنا چاہئیں؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”کیا تم اپنا دعویٰ بول گئے ہو؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”تنبہی نے تو بتایا تھا کہ چائے کافی وغیرہ پینے کے بعد ہم پر الٹا اثر ہوتا ہے؟“

میں ہلکے جھپکے میں لیان کی بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ چائے، کالی اور اسی ہی دیگر اشیاء مجھ پر الٹا اثر کرتی ہیں۔ عام طور پر لوگ ان اشیاء کو نیند بھگانے اور اعضا کو مستعد رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن میں چائے کافی پینے کے بعد نیند اور آرام کی طلب محسوس کرنے لگتا ہوں۔ لیان نے اس طرف توجہ دلائی تو مجھے خود بھی حیرت ہوئی اور پھر فوراً ہی دج بھی سمجھ میں آ گئی۔ حالات اور

واقعات کی یقینی کے بارے میں غور و فکر کرنے کے دوران میں شاید میرے ذہن نے کافی کے مذکورہ اثرات کو کوئی خاص لطف نہیں کرا لی تھی۔

لیان کو بات کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا ”اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس وقت نیند کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں لیکن سونے سے پہلے مجھے ایک نہایت ہی اہم کام کرنا ہے۔“

”کون سا اہم کام؟“ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی۔

میں نے غصہ سے ہونے لہجے میں کہا ”رہی کو ”مکڈ نائٹ“ کہنا ہے۔“

”ادہ!“ وہ ایک طویل، پوجمل سانس خارج کر کے رہ گئی۔

اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہوتا تھا، میں نے اس کی توقع کے خلاف جواب دیا تھا۔ بہر حال، وہ موہاٹل کے کمرے سے پاس آ گئی۔ اس دوران میں وہ موہاٹل پوری طرح چارج ہو چکا تھا۔ وہ بیل کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز یاد دہانی کرائے والا تھا۔

”ایک بات کو ذہن میں رکھنا وجدان! رہی کے اشارے پر ہمارے دو دم کا ڈر پہلے ہی ناکارہ ہو چکے ہیں۔ تیسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہو سکتا ہے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں“ میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا ”ایسے بھی اس فون کے بعد میں اس سے رابطہ نہیں کروں گا۔ بیل میرے کام کا رہے یا بے کار ہو جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب میں اسی وقت رہی کی خبر لوں گا جب ہمارے درمیان چند فٹ یا چند گز یا چند میل کا فاصلہ باقی رہ جائے گا“ میں لمبے لمبر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

”میں اسرائیل میں قدم رکھنے سے پہلے اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک وہ بھی میرے انتظار کا ”معرہ“ چمکے۔ میں روپوش اور گم نام رہ کر اسے تڑپاؤں گا“ اذیت کی سوا ہی چڑھاؤں گا۔ وہ مجھے دیکھنے، مجھ سے رابطہ کرنے اور مجھے چھاپنے کی خواہش کی چھائی پر لٹکا رہے گا مگر میں اس کے ہاتھ اڈں گا، نہ نگاہ میں ساؤں گا اور نہ ہی سماعت تک رسائی پاؤں گا۔ ڈر اس کو بھی پتا چلنا چاہیے کہ نارسائی کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس کیفیت میں اپنا سینہ جہنم بنارکھا ہے، کچھ دن وہ بھی تو انہی انگاروں کی تیش کا لطف اٹھائے۔“

رہی موٹے ہاتھن نے ساحل کو مجھ سے دور کر کے بلکہ ناقابل کھینچ بنا کر جتنا براستم ڈھایا تھا، وہ میرے سابق ریکارڈ کو توڑنے کا باعث تھا۔ میری زندگی میں آنے والے تمام دشمنوں نے مجھ کی طرح پر بھی مجھے اتنی اذیت نہیں پہنچائی ہوگی جتنی اس ایک شخص کے ہاتھوں، مختصر سی رات میں، میں نے اٹھائی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ ربنی میرا ایک ایسے حریف ثابت ہو رہا تھا جس سے منسنے کے لیے مجھے دائیں دینے آ رہا تھا، دوسری طرف میں بھی اس کے لیے لوہے کا چٹا ثابت ہو رہا تھا جو اس کے دائیں کی راب میں آنے کے بتائے ناک میں مٹس بیٹھا تھا اور میری کوشش کی کہ اس کا بھی وہی حشر ہو جو باضی بعد میں مردود کا ہوا تھا!

رہی کے بارے میں بات کرتے ہوئے خود بہ خود میرا لہجہ تلخ ہو جاتا تھا، الفاظ زہر میں جھج جاتے اور میں خود کو نفرت کے ایک اتھاہ سمندر میں پاتا۔ ظلم و جبر کا ایک ایسا سمندر جو تاحہ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ آنکھیں بونہ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی ساحل کی صورت دکھائی نہ دیتی اور میں اپنے آپ کو اس بھیاں تک موت کے ظلم پر اور سمندر کے سچ بے پار وندگار..... ایک خونی شادک کے رحم و کرم پر پاتا جو جڑے کھولے، اپنے تیر دھار نوکیلے دائوں کی ماسٹ کرتے ہوئے بڑے خوں خوار انداز میں مجھ پر جھٹ رہی ہوئی۔ اس خون آشام شادک کا تصور کرتے ہوئے میرے ذہن میں ربنی کی صورت اجاگر ہو جاتی تھی..... او یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا!

مجھے اس وحشی شادک کے اندر اترنا تھا اور پھر، پیٹ پھاڑ کر باہر نکلتا تھا۔ اس کو ہلاک کیے بغیر میں اپنی ساحل تک نہیں کھینچ سکتا تھا۔ اس ایک کی ہلاکت، بیہود کی سلاستی کی ضمانت بن جاتی، یا یہ ایک کا رٹو تھا، ایک ایسا عمل جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے مفید ثابت ہوتا۔ لی یان مجھے ”سینچ“ کا تہا کر داں روم میں داخل ہوئی تو میں سیل پر رہی موٹے ہاتھن کے نمبر بچ کرنے لگا۔ پرنمبر مجھے بالکل ایسے ہی یاد ہو گئے تھے جیسے اپنا نام ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ میں نے پچھلے پانچ چھٹنوں میں اسے جتنا نقصان پہنچایا تھا، اس کی اطلاعات اس تک پہنچائی جا چکی ہوں گی۔ خاص طور پر، بگلا نمبر آروٹکی میں عبرت نامک انجام سے دو چار ہونے والے اسرائیلیوں کی ”خبر“ نے تو اسے اذیت ناک چر کے لگائے ہوں گے۔ وہ اس وقت انگادوں پر لوٹ رہا ہوگا۔ ان لمحات میں اس کی ”عیادت“ نہ کرنا سخت بے بسی ہوئی چنانچہ میں نے تصور میں، ایک کھٹی میں نمک بھرا اور دوسرے ہاتھ میں پیٹرول کی بوتل تھامی پھر سیلور ٹریک کی

انگلی کے اشارے پر ربنی کی ”تہاداری“ کے لیے کھنڈو سے اسراٹیل کھینچ گیا۔ یہ نمک پانی اور آتش زنی کا ایک مناسب موقع تھا۔ اسے گواہ میں پچھتاوے سے کیوں کر دو چار ہوتا! اسراٹیل کے مقامی وقت کے مطابق، اس وقت رات کے گیارہ بجتے ہیں چند منٹ باقی تھے۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ کال اس ہی نے ریسپونڈ کی۔ ان سنسنی خیز حالات میں اس کے سکون کی تیز سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہی لمحے ربنی کی پچھکار سے مشابہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے ”ییلو“ سی سے مجھے پھان لیا تھا۔ ”تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو دھند!“

”میں تو تم سے محبت کرتا ہوں ربنی!“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا ”تم خواہ مخواہ میری نیت پر شک نہ کیا کرو۔ اب تو میں نے تمہاری بات ماننے کا فیصلہ بھی.....“

”کومت!“ وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دمازا ”تم وہاں کھنڈو میں جو کچھ کرتے پھر رہے ہو، وہ کھنڈی کی بدترین مثال ہے۔ میں تمہاری نیت پر شک نہ کروں تو اور کیا کروں؟ یہ تمہاری محبت ہے یا شہد بدترین نفرت؟“

میں بالکل انجان بن گیا ”کھنڈو میں کیا ہوتا پھر رہا ہے؟“

”زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو دھند!“

”میں نے بتایا تھا، کھنڈو کو چھوڑ چکا ہوں۔“

”تم جھوٹ پر جھوٹ بول کر اپنی پوزیشن کو مزید خراب کرتے جا رہے ہو؟“ وہ ختم انداز میں بولا ”تم ابھی تک کھنڈو وہی کے کسی تل میں چپے بیٹھے ہو لیکن یاد رکھو، میں بہت جلد تمہیں کسی مردہ جو ہے کے مانند اس تل سے نکال لوں گا۔“

میں نے اس کے چلے ہوئے ذہن پر پیٹرول کا جھڑکا ڈرتے ہوئے کہا ”دھمکیاں ہی دیتے رہو گے یا یہ بھی بتاؤ گے، ادھر کھنڈو میں کس نے تمہاری دم پر پاؤں رکھ دیا ہے جو تم یوں ناچے ناچے پھر رہے ہو۔ میں تو تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے والا تھا لیکن تم نے میرے خیر سگالی کے جذبات کی ایسی کٹی تھی کہ رے رکھ دی ہے۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد متحضر ہوا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے میں قدرے اعتدال تھا ”ہاں ہاں، بتاؤ..... تم نے میری بات ماننے کے سلسلے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

گھاگ بڑھا ہوا عیار تھا۔ اس کا حافظہ ہلاکا تھا۔ اس نے شہد بدترین فحشے میں بھی میرے جملے کی کنٹرول کر دیا رکھا

تھا۔ میں نے اس کے براہینتہ جذبات سے کھینچے ہوئے کہا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم سے جیت نہیں سکتا اس لیے یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ پانچ اصول تمہارے حوالے کر کے اپنی ساحل کو وصول کرلوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”تم اتنے سیدھے تو نہیں ہو دھند!“ وہ تمکیر لہجے میں بولا۔

میں نے رہی سے کہا ”یہی تو مصیبت ہے، جب بھی میں تمہارے قریب ہونے کے بارے میں سوچتا ہوں، تم فوراً بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہو۔ اس طرح تو یہ تل بھی مجھے منڈ سے نہیں چڑھ سکے گی۔“

”میں تمہاری بات کا کیسے یقین کرلوں؟“ وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

”تم میری بات کا یقین کرو یا اس سہ کو بھی ہلاک کرنے کے احکام صادر کر دو، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“ میں نے معنوی بھینچا ہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”کھنڈو میں مجھے تمہارے وسیع اختیارات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ نیپالی پولیس آج کل تمہارے اشاروں پر ناچ رہی ہے اور وہاں کے ہر ادارے میں تمہیں دغل کی آسانی فراہم ہے.....“

وہ قلع کھائی کرتے ہوئے بولا ”کیا تم واقعی کھنڈو سے نکل چکے ہو؟“

”میں تمہیں یقین دلانے کے لیے کوئی قسم نہیں کھا سکتا۔“

”اچھا، یہ بتاؤ کہ وہ پھر کیسے تمھک پہنچا رہے ہو؟“

”پہلے تم مجھے کھنڈو میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتاؤ“ میں نے اس کے چرے سے ہوئے زخموں میں نمک بھرتے ہوئے کہا ”ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ تم کون کی قیامت کو مجھ سے منسوب کر رہے ہو؟“

مجھے امید نہیں تھی، وہ میری فرمائش پوری کرے گا لیکن لگتا تھا، عبادت گاہ کے خانے میں پوشیدہ وہ ہشتی پھر اس کی سب سے بڑی کردہ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ وہ ان کے حصول کی خاطر بھی مدد سے گزرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس کے دست راست جنم مکانی برنارڈ لیو اور میرے خیر خواہ..... آنجنابی محترم ساگ نو کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ قدم عبرانی کتابوں میں ان پانچ پتھروں کے حوالے سے ایک طویل باب رقم ہے جس کی رو سے یہ پتھر جس بھی شخص کے قبضے میں ہوں گے، وہ پوری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے کی قدرت کا مالک بن جائے گا۔ ربنی موٹے ہاتھن، زمینی خدا بننے کی خواہش میں ان پتھروں کے حصول کے لیے پاؤں ہوا جا رہا

تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے اسی لیے رعایت دینے پر تیار ہو جاتا تھا کہ ان پتھروں تک صرف اور صرف میں ہی رسائی حاصل کر سکتا تھا لہذا اس نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتا دیا کہ اردو کا کوچ والے جنگلے آروٹکی میں کون سے قیامت خیز واقعات پیش آئے ہیں اور بعد ازاں جیب اور مٹی ٹرک پر گزرنے والی چٹا کے بارے میں بھی بتا دیا۔ آخر میں اس نے متلا نہ انداز میں کہا۔

”دھند! آ جا رہے ہیں پتا چلتا ہے کہ ان واقعات میں سراسر تمہارا ہاتھ ہے۔ اگر تم وہ پانچ پتھر میرے حوالے کرنے پر تیار ہو جاؤ تو میں تمہاری اس نادانی کو بھی معاف کر دوں گا۔“

”معافی کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا اگر میں ان واقعات کی ذمہ داری قبول کرلوں گا“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر بڑے بیٹھے انداز میں اسے کاٹنے کی کوشش جاری رکھی اور اضافہ کیا ”مجھے تو یہ کیوں اور یہی چکر دکھائی دے رہا ہے۔“

آخری جملہ میں نے اتنے پراسرار انداز میں ادا کیا کہ وہ تڑپ کر بولا۔ ”تم کسی چکر کی بات کر رہے ہو؟“

”پہلے یہ بتاؤ، کیا تمہیں یقین ہے کہ کھنڈو والے واقعات میں میرا ہی ہاتھ ہے؟“

”تمہیں ہاں یا قاعدہ وہاں دیکھا گیا ہے دھند!“ وہ دھوکے سے بولا۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ”پھر تو میرا اندازہ بالکل درست ہے۔“

”تم نے ابھی تک اپنے اندازے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”میرا خیال ہے، میرا پتھر تمہارے خلاف اس قسم کی انتقامی کارروائی کر رہا ہے“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو وہ شینا گیا، بھینچا ہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

”یہ نہیں ہو سکتا، نقلی دھند کو تو تم نے منہ میٹھن (نیو یارک) کے سب دے میں ہلاک کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ کس طرح متحرک ہو سکتا ہے؟“

”وہ نہ سہی، کوئی دوسرا تو متحرک ہو سکتا ہے؟“ میں نے چپیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ چونک اٹھا ”کوئی دوسرا..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا ”ربنی! نیو یارک میں نیست و نابود ہونے والا نقلی دھند میری انڈوائس خشتوں کے طیل تشکیل پاکر متحرک ہوا تھا۔ اس

میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا لیکن اب میں نے اس "جینالوئی" پر تصرف حاصل کر لیا ہے۔ میں اپنی مرضی سے جتنے چاہوں، نقلی دھواں تخلیق کر سکتا ہوں۔"

یہ بات میں نے محض اسے ڈرانے کے لیے کی تھی، حقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ مجھے شوق تھا اور نہ ہی اتنی فرمت مجھے میسر تھی کہ اس قسم کی مشقوں اور مراعات کو انورڈ کر سکوں۔ میں میٹن کے اظہار کو ڈھریلو سے فریک پر میں نے ایک طویل معرکے کے بعد اپنے ٹیکلے سے نجات حاصل کر لی تھی تو یہی بہت تھا۔

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ میں اتنی دیر سے اسے الوداع بنا رہا تھا۔ اس کا سنجیدہ اور معتدل انداز یکدم چارہ چاند ہو گیا، پھر سے ہونے لگے میں بولا۔

"تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ اس لوگس کہانی کو رہنے دو۔"

وہ ایک ایسی حقیقت سے انکار کر رہا تھا جو واقعتاً پیش آ چکی تھی۔ بے وقوف بنانے کے بعد ہی تو میں دیدہ و دانستہ اس سے کھیل رہا تھا اور وہ اتنی دیر سے، بڑی شرافت کے ساتھ میرے باتوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ اس وقت میرے دل میں شدت سے یہ خواہش چاکی کہ کاش..... ان لحاظ میں، میں رہی کے رو بہ رو ہوتا اور اس کے چہرے پر برسنے والی غالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ فی الحال ایسا ممکن نہیں تھا لہذا میں اس کی سنی ان کی کرتے ہوئے اپنی ہی ذہن میں کہتا چلا گیا۔

"اس لاٹ میں، میں نے ایک درجن نقلی دھواں تیار کیے ہیں جن میں سے گیارہ اس دنیا کے مختلف محاذوں پر تمہاری مٹی پلید کرتے رہیں گے اور ہار حواس نقلی دھواں، اصلی پھروں کے ساتھ تمہارے پاس اسرائیل پہنچے گا۔ مجھے امید ہے، تم میرے اس نمائندہ کے کافید المثال استقبال کرو گے۔" اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو،" اصول کے مطابق، تم میری ساحل کو اس نمائندہ کے حوالے کر دینا....."

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود ہی سے باتیں کیے جا رہا ہوں، مجھے کوئی سامع میسر نہیں تھا۔ میں اسے "ہیلو رہی۔ ہیلو رہی!" پکارنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ مجھے احساس ہو گیا، دوسری طرف وہ لائن پر موجود نہیں۔ میں ایسے جذب کے عالم میں اسے جے کے نگار ہاتھ کے پتا ہی نہ چلا، کب وہ فون بند کر کے غدار ہو گیا تھا۔

میں نے سیل کو ایک طرف ڈال دیا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے لیان کی طرف دیکھنے لگا۔ رہی

سے ہونے والی گفتگو کے دوران میں وہ "چینج" کے مراحل سے گزر کر دوبارہ میرے پاس آگئی تھی۔ اس نے کانٹے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اب تو یہ سیم کارڈ بھی کیا کام سے۔ رہی اس نکشن کو بھی منسوخ کر دے گا۔"

"میرا خیال تم سے قطعی مختلف ہے" میں نے کہا۔

"کیا مختلف ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا "اس وقت ہی فون ہی وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے وہ مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے۔ وہ اس لائن کو کاٹنے یا کنوائے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"تم بھول رہے ہو، وہ پہلے بھی ہمارے دو کلکشنر ختم کر دیا تھا۔" وہ بولی "اور توڑی دیر پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ اب رہی سے رابطہ نہیں رکھو گے، اسرائیل پہنچنے کے بعد ہی اس کی خبر لو گے؟"

میں نے کہا "پہلے کی بات دوسری تھی۔ اب حالات میں خاصی بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ اسے یقین ہو گیا ہے، وہ مجھے اپنی منافقانہ دوستی کے فریب میں نہیں جکڑ سکے گا، اس کا کوئی داؤد مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ میں نے اسے جن کانٹوں پر کھیٹا ہے، وہاں وہ کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس کر سکتا ہے" میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا "حقیقت یہی ہے کہ میں از خود اس سے رابطہ نہیں کروں گا، وہ مجھے فون کر بیٹھے تو دوسری بات ہے۔"

لیان نے اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور سرسری انداز میں بولی "دھمکن ہے، تمہارا انداز درست ہو لیکن میرا نہیں خیال، یہ نکشن زیادہ دیر تک تمہارے لیے کارآمد رہ سکے گا۔"

اس کی اس پیش گوئی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"ہم چند کھٹے کے بعد یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں" اس نے کہا "نیپال کی حدود سے نکلتے ہی یہ نکشن بے کار ہو جائے گا کیونکہ روٹنگ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ میں نہیں جانتی، اس سروس کی روٹنگ سے بھی یا نہیں، بہر حال، وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"اگر یہ سچائی اپنے یوزرز کو بیرون ملک روٹنگ فراہم کرتی بھی ہے تو پھر نینٹ ورک والوں سے رابطہ کر کے تمہیں روٹنگ کھلوانا ہوگی اور میں سمجھتی ہوں، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے، پھر ایک دوسرا مسئلہ نکشن کی نوعیت کا بھی ہے۔

میری معلومات کے مطابق، پری پڈ نکشن پر روٹنگ کی سہولت فراہم نہیں کی جاتی۔ اس کے لیے پوسٹ پیڈ لائن لینا ضروری ہے۔ بہر حال، میں نیپال کی موبائل سروس کمپنیز کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی!"

وہ جتنا بھی جانتی تھی، وہ علم اس میدان میں مجھ سے یقیناً زیادہ ہی تھا۔ وہ مجھے پری پڈ، پوسٹ پیڈ، روٹنگ اور جی ایس ایم کے بارے میں بتانے لگی۔ مجھے اس ٹیکنیکل گفتگو سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی لہذا اسے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے میں نے اسکا ہٹ بھرے لہجے میں کہہ دیا۔

"بھائز میں جائے یہ موبائل نکشن اور رہی موٹے ہائیں!"

وہ چند لمحات تک ٹٹوتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگی "وہ جان! تمہارا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں" میں نے کہا "بس سر میں تھوڑا درد محسوس ہو رہا ہے۔"

"کہیں تمہارے اس سر کو ٹھنڈ تو نہیں لگ گئی؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ فارغ الہال ہوا ہے، فارغ الحال نہیں۔ اس بیڈروم کا موسم ایسا سرد بھی نہیں کہ اسے ٹھنڈ لگ جائے۔"

"پھر یہ موجودہ حالات کا اثر ہوگا" وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بولی "لاؤ، میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔" اس نے بے چیش کش اسٹے غلوں اور لگاوٹ سے کی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ اس وقت میں واقعی اس کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا۔

میرے چہرے پر آدگی کے تاثرات دیکھتے ہی وہ پیڈ پر چلی گئی۔ اس نے بیڈ کی پشت گاہ سے ٹپک لگا کر آلتی بائتی ماری پھر میرے منڈے ہوئے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر مجھے چٹ لینے کی ہدایت کی۔ میں نے بلاوجہ دھرا اس کی ہدایت پر عمل کر ڈالا۔ سر منڈاتے ہی اوٹے پڑنے کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن میرے ساتھ اس کے بالکس صورت حال پیش آرہی تھی۔ لیان اپنی مہربان انگلیوں کی جنبشوں سے میرے ذہن پر چھائے ہوئے غبار کو دھونے لگی۔

مجھے دوسروں سے خدمت لینے کا شوق نہیں لیکن کوئی خود ہی محبت ہماری پیش کش کر بیٹھے تو اس کا دل تو زنجباری اچھا نہیں لگتا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسے لمحے میرے ذہن

میں ایک گورا چٹا پشتون چہرہ ابھر آیا۔ انسان کی یادداشت بھی بعض اوقات عجیب و غریب کرشمے دکھاتی ہے۔ میں لیان سے سر کا مساج کر رہا تھا اور یادداشت کے اہم نے اپنے کئی صفحے پلٹ کر مجھے ماضی میں، پشتون دوشیزہ زرگل کے پاس پہنچا دیا۔

میں کراچی میں، طارق روڈ والے فلیٹ پر گزار رہی ہوئی اس رات کو یاد کرنے لگا جب زرگل بھی میرے ساتھ تھی۔ اس نے بھی میری ذہنی محسن اور حالات کی تپکن کو زائل کرنے کے لیے کوکونٹ آکل سے میرے سر کا مساج کیا تھا اور میں اسی کی مہربان آغوش میں سو گیا تھا۔

زرگل ایک جی دار دار حالات کی ماری ہوئی لڑکی تھی جسے لاہور میں، ایک اتفاقی کے تحت میرا ساتھ حاصل ہو گیا تھا۔ کراچی میں میرا ایک جگہری دوست شہزاد علی جب بڑی سنجیدگی سے اس میں دلچسپی لینے لگا تو میں نے ان کے طنز کے لیے راہ ہوا کر دی تھی۔

کراچی کا ذکر ہو اور صدف کی یاد نہ آئے، یہ کیسے ممکن تھا۔ میری زندگی میں بے شمار لڑکیاں آئیں لیکن صدف جیسی فراخ دل اور کھلے ذہن کی مالک کوئی اور نہیں تھی۔ اس کا نام ذہن میں آیا تو دل میں کھد بونے لگی کہ اس کی خبر لوں۔ میں صدف کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لیان نے مجھے مخاطب کر لیا۔

"کن سوچو میں کم ہوجو ہوں!"

"سوئے کی کوشش کر رہا ہوں" میں نے مخمور لہجے میں کہا۔

وہ بولی "میں محسوس کر رہی ہوں، تم یہاں نہیں..... بہت دور پہنچے ہوئے ہو۔"

"ابھی پہنچا تو نہیں البتہ پہنچنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں" میں نے گول مول انداز میں کہا۔

وہ چونک کر پوچھنے لگی "کہاں؟"

"نیڈ کی آغوش میں" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ!" وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔ اس معنی خیز سانس کی تپش کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ مجھے اپنے وجود میں ایک جلیبی سی حرارت دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیان کی "اوہ!" سے ظاہر ہوتا تھا، اسے میرے جواب سے ملایو ہوئی تھی۔ پتا نہیں، وہ مجھ سے کس جواب کی توقع کر رہی تھی۔ وہ سکتا ہے، وہ میرے منہ سے یہ سنتا چاہتی ہو کہ میں ساحل تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ اب بڑی حد تک مجھے لگی تھی کہ جب میں آنکھیں بند کر کے

خاموش ہوتا ہوں تو پھر جائے وقوعہ سے کہیں اور چلا جاتا ہوں۔

”دیکھو، میں نے تمہاری بے خبری میں کیا چکر چلایا ہے؟“ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا، آنکھیں کھولنے ہوئے میں نے جلدی سے پوچھا ”کیسا چکر لیان!“

وہ اپنی شرارت کو سنجیدہ الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے بولی ”اگر میں تم سے کہتی کہ ذرا اپنے سر کو چھوئے دو تو تم خفا ہو جاتے لیکن دیکھو، میں کسی منٹ سے ایسا کر رہی ہوں اور تم نے کوئی تنگی ظاہر کی ہے اور نہ ہی کوئی اعتراض اٹھایا ہے!“

”لیان لیان! یہ مذاق کا نہیں، سونے کا وقت ہے“ میں نے میٹھی ناراضی سے کہا۔

وہ یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”پہلے تم سو جاؤ، پھر میں بھی سو جاؤں گی۔ کافی کے اثرات زائل ہونے میں تھوڑی دیر لگے گی۔“

”میں تو گہری نیند میں قدم رکھنے ہی والا تھا“ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے شکوہ بھرے انداز میں کہا

”اگر تم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھے یوں مخاطب کرنی رہو گی تو مجھ کو پکا میں۔“

”ٹھیک ہے، میں اب جھیمیں ڈسٹرب نہیں کروں گی“ وعدہ! ”اس نے کہا۔

میں نے اس کے وعدے کا اعتبار کر لیا اور واقعی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے بات ختم کرتے ہی اپنی وہ ٹانگ بچھلایا جس پر میرا سر نہیں رکھا ہوا تھا، پھر ہاتھ بڑھا کر گرم کیبل مچھلیا۔

اس نے مجھے اور خود کو یہ آہستگی وہ کیبل اوڑھا دیا پھر باقی وجود کو ساکت رکھتے ہوئے اپنی مشاق اگلیوں کو متحرک کر دیا۔

زرسنگ اور ٹینک دو ایسے شے ہیں کہ جن سے تعلق رکھنے والوں کو نرم خوادہ گداز دل ہونا چاہیے۔ لیان نے بھی

زرسنگ کو رس کر رکھا تھا۔ وہ اس کو رس کے ست کو اپنی اگلیوں کے گداز میں ملا کر میرے سر میں اتارنے لگی۔ میں گہری نیند

کی وادی میں اترا چلا گیا پھر پتا نہیں، کس سے وہ بھی چپکے سے کیبل کے اندر آئی!

اگلی بڑی روشن اور فرحت بخش تھی!

اگرچہ گزشتہ رات کو سونے کے لیے بہت کم وقت ملا تھا لیکن اس صبح دو وقت سے بچھلی رات ہونے والی بار بار میری کی

ساری گفت کو نہج ذکر رکھ دیا تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور

ریٹیکس محسوس کر رہا تھا۔ لیان کے چہرے سے بھی آسودگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے گرم شاور لے کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ کاشانوک ہمارے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے بدھ راہیوں والا مخصوص لباس پہن لیا تھا۔

”کیا تم دونوں چلنے کے لیے تیار ہو؟“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا ”بس تمہاری طرح سوئچ بننا پاتی ہے۔“

”ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ کا وقت ہے۔“ گہری سوجھ بیک سے بولا ”کیا تم لوگ بجکھنوں والے لباس خود ہی نہیں لو گے؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میں نے بہت کم عمری میں ایسا لباس پہنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا اور یہ طریقہ میرے ذہن میں محفوظ بھی ہے۔ تم فکر نہ کرو میں اپنے ساتھ ساتھ لیان کا لباس بھی بدلوا دوں گا۔“

”لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا چاہیے!“

”اوکے!“ اس سے پہلے ہی ہم فارغ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

وہ مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تو میں لیان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

کاشانوک کی دی ہوئی ہیلٹ سے پہلے ہی ہم تیار ہو کر بیڈ روم سے نکل آئے۔ بدھ بجکھنوں کی طرح اپنے ضروری سامان کو ہم نے مخصوص پتیلوں کی صورت میں باندھ لیا تھا۔

کاشانوک تو تھا ہی بالکل اصلی بدھ صفت، ہم بھی کسی سے کم نظر نہیں آ رہے تھے۔

سورج کی پہلی کرن نے ابھی کھنڈوں کی زمین کو نہیں چھوا تھا کہ ہم اس گھر سے روانہ ہو گئے۔ بوقت رخصت قلوبی مجھے

گھر میں کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس کے بارے میں جب کاشانوک سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ قلوبی کو کسی نے کسی ضروری کام سے کہیں بھیجا تھا۔ میں نے ضروری کام کی تفصیل پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

گھر سے نکلنے وقت اس نے دروازے کو کھل سمجھ دیا تھا، تالا وغیرہ لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں

کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ قلوبی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔

ناشتے کے لیے واپس کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے کاشانوک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے

کہا ”وہ جان! تم دونوں روپ بدل کر بدھ بجکھن بن گئے ہو لہذا تمہارے نام بھی بدل جانا چاہئیں۔ میں نے تمہارے لیے نام سوچ لیے ہیں۔ جب تک ہم کسی محفوظ نفاذ میں نہیں

پہنچ جائیں گے تم ٹینک اور لیان بھجوری ہو۔ تم دونوں اپنے ہاتھوں کو ابھی طرح ذہن نشین کر لو۔“

”یہ ابھی ترکیب ہے۔“ میں نے سر اٹھنے والے انداز میں کہا ”کیا تم حسب معمول کاشانوک ہی رہو گے؟“

”نہیں میں اب کام ہوں۔“ وہ ٹپٹی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تم مجھے کام کے نام ہی سے مخاطب کرو گے۔“

”اوکے!“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے باشا کر رہے تھے۔ بدھ بجکھن نہایت ہی سادہ خوراک پر گزارہ کرتے ہیں اور اس خوراک میں بھی زیادہ تر تاج ہی شامل ہوتا ہے۔ کاشانوک نے ایک مناسب سے ناشتے کا آرڈر دیا اور ہم دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔

اس ہوٹل میں زیادہ رش نہیں تھا۔ میں نے اندر قدم رکھنے ہی تنہدی نگاہ سے وہاں کا جائزہ لے لیا تھا۔ ہم سے پہلے وہاں لگ بھگ دس افراد مختلف میزوں پر بیٹھے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔

کاشانوک نے لیان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم اس بھاری اور گرم لباس میں حرکت کرتے ہوئے وقت تو محسوس نہیں کر رہی ہو؟“

”مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔“ لیان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”بہر حال، بھجوری کا نام شکر یہ ہے۔ تم فکر نہ کرو میں کا چلاؤں گی۔“

کاشانوک نے لباس کے سلسلے میں مجھ سے قطعی کوئی استفسار نہ کیا شاید اس لیے کہ اس نے میری حرکات و سکنات میں کوئی الجھن نوٹ نہیں کی تھی۔ لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی

کاشانوک نے ہمارے چہروں پر بھی ٹھوڑا کام کیا تھا۔ یہ انتہائی معمولی نوعیت کا میک اپ تھا مگر اس نے ہماری صورتوں کو ایسی لک دے دی کہ پہلی نظر میں یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ہم بدھ بجکھن ہیں!

ناشتا کر کے دوران میں لیان نے کاشانوک سے سوال کیا ”ہمارے کاغذات کا کیا ہوگا۔ ہم ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں داخل ہونے چاہے ہیں؟“

لیان کا سوال بہت اہم تھا۔ کاشانوک نے جواب دیا ”میرا خیال ہے، ہمیں کسی قسم کی دستاویزات کی ضرورت نہیں نہیں آئے گی۔ شاید ہمیں نہیں معلوم کہ بدھ بجکھنوں کو کتنی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ ان کی خدمت کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ انہیں قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے لہذا قانون کے محافظان کے ساتھ زیادہ پیچھے چھوڑ نہیں کرتے۔“

وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم (بدھ بجکھن) کسی بات پر ان سے خفا ہو گئے تو انہیں بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا مگر نہایت ہی راز دار انداز میں بولا۔

”عام طور پر جو لوگ اپنی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات کے باعث مذہب سے دور ہو جاتے ہیں۔ لازمی عبادت اور ریاضت کے لیے وقت نہیں نکال پاتے وہ بدھ راہیوں کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے ہیں۔ اپنی دالت میں وہ اس طرح معاملات کو بنائیں کر رہے ہوتے ہیں۔ ان پر فرض مجھے امید ہے کہ ہم جس بجکھن میں سفر پر روانہ ہونے والے ہیں اس میں ہمیں کسی بڑی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بدھ یا تریوں کے لیے سب کے دلوں میں ایک نرم گوشہ موجود ہوتا ہے۔ ویسے بھی.....“ وہ سانس لینے کے لیے رکا

پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا ”کوداری تک تو ہم نیال ہی کی حدود میں ہیں لہذا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ آگے کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال تو ہمیں کھنڈوں سے لکھنا ہے۔ اگر ہم نے یہ خبریت کھنڈوں کی حدود سے باہر قدم نکال لیا تو پھر لارڈ بھاکا کی مدد سے ہم بڑی سہولت سے تبت میں بھی داخل ہو جائیں گے۔“

اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پوری توجہ سے ہماری گفتگو کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ بڑا ناقابل یقین احساس تھا کیونکہ ہم نہایت ہی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا اور چونک گیا۔

ہم سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک میز پر کوئی بدھ بجکھن بیٹھا ناشتا کر رہا تھا لیکن میرے چوتھنے کا سبب یہ تھا کہ وہ اس وقت سیدھا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں چار ہوئیں تو اس نے اضطرابی انداز میں نگاہ چرائی اور کیبل پر موجود ناشتے کے لوازمات کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میرا احساس یک سرغلط نہیں تھا۔ اگر کوئی ہماری گفتگو نہیں سن رہا تھا تو کم از کم ہمیں دیکھ ضرور رہا تھا۔ پتا نہیں، کیا بات تھی کہ میرا دل اس بجکھن کی طرف سے کلک گیا۔ اس نے جس انداز میں نگاہ چرائی تھی وہ شک میں جھلا کر دینے والا تھا۔

میں چند لمحات تک یک ٹک اسے دیکھا رہا وہ گردن جھکائے ناشتا کرنے میں مصروف رہا، میں نے نوٹ کیا کہ اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی ہولکا ہٹ پائی جاتی تھی۔ میں نے اسے چپک کرنے کے لیے اپنی نگاہ کا زاویہ تبدیل کر لیا تا کہ وہ یہ محسوس نہ کرے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس پر نگاہ رکھتے ہوئے میں اپنے



ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کاشا لوک لی یان سے کہہ رہا تھا۔

”جس کا احترام کیا جائے اس میں بیڑے سے ٹکالنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا اس لیے بدھ راہبوں سے زیادہ پوچھ پتال نہیں کی جاتی بلکہ سچ معنوں میں تو انہیں اس دنیا کا پاس ہی نہیں سمجھا جاتا۔ بہر حال“ وہ توقف ہونے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تھا چو کو صورت حال سے قبیضہ آگاہ کر دیا ہے۔ وہ ہمارے معاملات کو سنہال لے گا۔ ہم اس کی سالاری میں تبت جا رہے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے کوشش کر کے.....“

اس کے بعد کاشا لوک نے کہا کہ اب کہا، میں اس پر دھیان نہ دے سکا کیوں کہ زیر مشاہدہ بھکشو کٹر نے ایک مرتبہ پھر کن اٹھکیوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ میں اس کی طرف سے چوک ہو گیا اور دانستہ ایک ایسے رخ پر گردن کو موڑ لیا کہ اسے احساس نہ ہونے پائے، میں اسے واضح کر رہا ہوں، میری یہ اسٹیم خاصی کامیاب رہی اور وہ شخص زیادہ آزادی اور بے فکری سے ہنسنا تازہ لگا۔

لی یان اور کاشا لوک اس شخص کی ”سرگرمی“ کی خبر نہیں تھی کیونکہ اس کی میزان ادوں کے عقب میں واقع تھی لیکن میں برابر اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ خاص طور پر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ہماری نگرانی کیوں کر رہا تھا؟ اس سوال کا جواب تو وہی دے سکتا تھا۔ میر نے اسے ”جھپٹنے“ کا فیصلہ کر لیا۔

کاشا لوک او۔ لی یان کو میر کی نئی مصروفیت کا علم نہیں تھا۔ میں ناشتا کرنے کے دوران میں، ان کی گفتگو میں بھی شریک رہا اور اشارے سے دیگر کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ دونوں چمک جاتے۔ انہوں نے سوچا ہوگا، شاید میں کوئی اور آئٹم منگوانا چاہتا ہوں۔ میں دراصل دیگر کے توسط سے اس بدھ بھکشو کو ”ذمہ سرف“ کرنا چاہتا تھا۔

دیگر جیسے ہی میرا اشارہ پا کر ہماری میز کی جانب بڑھا، میرا منصوبہ پگھل سے پگھل ہی ناکامیاب ہو گیا۔ زیر مشاہدہ بھکشو نے شاید میری حرکت کو لوٹ کر لیا تھا۔ میں نے اس کی حرکات و سکنات میں ایک بے چینی سے بھپکتی محسوس کی اور اس انفرافری کے عالم میں وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر کھڑا ہوا۔

پھر تیزی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ میری نگاہ بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے کاؤنٹر تک پہنچ گئی۔

اس لمحے دیگر ہماری میز کے قریب آ گیا۔ میں نے

اشارے سے اسے بلایا تھا تو کچھ کہنا بھی ضروری تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں جو آیا وہ میں نے کہہ دیا۔

”ہمارے ناشتے کا کل کتنا تھا؟“

وہ گردن کو تنظیم دینے والے انداز میں جھکاتے ہوئے بولا، ”ابھی بتاتا ہوں جناب!“

اسکے ساتھ ہی وہ پلٹ کر ہوٹل کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

کاشا لوک ادوری یان سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگے مگر میں تو کسی اور ہی شخص کو دیکھ رہا تھا جس نے کاؤنٹر سے فارغ ہونے کے بعد باہر کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لی یان نے کہا ”وہ جان! ایسی جلدی کیا ہے۔ تم نے دیگر کو بول دیا ہے نا۔ وہ ملے آئے گا۔“

”مجھے تو یہ کسی اور ہی جگر میں نظر آ رہا ہے!“ کاشا لوک نے لی یان سے کہا۔

میں نے ان کی باتوں پر دھیان دیے بغیر کہا ”تم لوگ ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں.....“

”تم کہاں جا رہے ہوں وہ جان؟“ لی یان نے آواز دبا کر استفسار کیا۔

”واپس آکر بتاتا ہوں۔“

میں انہیں تنجب اور حامل چھوڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

باہر آ کر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن وہ شخص مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ چنانچہ، وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ جب اس بھکشو کے آثار نظر نہ آئے تو میں واپس ہوٹل کے اندر آ گیا۔ وہ دونوں اسی میز پر بیٹھے خطرہ مچا رہے تھے۔

کاشا لوک نے اٹھتے ہوئے لہجے میں پوچھا ”مسئلہ کیا ہے وہ جان! تم یوں اچانک ہی اٹھ کر کہاں چل دیے تھے؟“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں ”مسئلے“ سے آگاہ کیا۔ لی یان نے فوراً گردن موڑ کر اس میز کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ بدھ بھکشو بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ وہ پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”لیکن جب ہم ہوٹل کے اندر آئے تھے تو وہ میز خالی تھی!“

کاشا لوک نے بھی اس بات کی تصدیق کی تو میری تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا بھی مطلب تھا۔ وہ شخص ہمارے بعد ہوٹل میں داخل ہوا تھا..... لیکن ہمارا تعاقب

کرتے ہوئے! یہ صورت حال اس شخص کو اور بھی خطرناک ظاہر کرتی تھی۔

”کیا تم اس کی صورت دیکھ کر پہچان لو گے؟“ کاشا لوک نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ابھمن زدہ انداز میں کہا ”ہاں پہچان لوں گا مگر تمام بدھ بھکشو پہلی نظر میں ایک ہی جیسے دکھائی دیتے ہیں!“

کاشا لوک ہنسنے لگے میں بولا ”میںں چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے!“

اس کے بعد ہم نے مل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

میں نے حالات کا تقاضا سمجھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس بھکشو کی تلاش میں اپنی نگاہ کو دوڑایا لیکن اس بار بھی وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر تک پیدل چلتے کے بعد ہم کاشا لوک کی معیت میں تھا چو کے پاس پہنچ گئے۔

تھا چو سادہ طبیعت کا ایک ایک مہر بان موک تھا۔ اس نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم اصل نہیں بلکہ بے ہوشے بھکشو ہیں۔ تھا چو اور اس کے قافلے والے روانگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوں۔ تھا چو نے قافلے کے دیگر افراد سے اس طرح ہمارا تعارف کرایا جیسے وہ پہلے سے ہم سے واقف ہو۔ جب اس نے ہمارے اختیار کیے ہوئے نام ہم نام لے کر مجھے لے بیٹھے میں دیرنگی کہ کاشا لوک نے نہیں بلکہ ہمارے فریضی ہائوں کا انتخاب تھا چو ہی نے کیا ہوگا۔ تھا چو بہت ہی بردبار اور گہرا شخص تھا۔ اس کے روپے سے ظاہر ہوتا تھا، کاشا لوک نے اسے ہمارے بارے میں اچھی طرح بریف کر رکھا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم بدھ راہبوں کے روانہ ہو گئے۔

جب ہم لوگ سدا حارا پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس کی روشنی دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ بس اسٹینڈ پر سوکس نئی ایکسپریس موجود تھی۔ ہم نے گٹ حاصل کیے اور کوچ میں آ بیٹھے۔ ٹھنڈے سے کوادری تک کا کرایہ لی سواری ایک سو بیس روپے تھا جب ہم کوچ میں سوار ہوئے تو پہلے سے بھی کچھ مسافر اس میں موجود تھے۔ ہمارے بیٹھے کے چندہ منٹ بعد کوچ بھر گئی۔

کاشا لوک نے بالکل ٹھیک کہا تھا، ان مسافروں میں زیادہ تعداد بدھ بھکشوؤں کی تھی جو اپنی عبادت گاہوں کی یا ترائے کے لیے ادھر سے ادھر سفر جاری رکھتے تھے۔

موسم خاصا سرد تھا اور ٹھنڈی ٹھانڈی ٹھانڈی ہوائے موسم کی شدت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اگر ہمارے جسموں پر مخصوص گرم لباس نہ ہوتا تو اب تک ہماری کلیجہ جم چکی ہوتی۔ ہمارے بدن کے جو حصے کھلے تھے وہ موسم کی بے رحمی کو یوں ہی محسوس کر رہے تھے جیسے

ہم کسی وسیع و عریض فریئر میں آن کھڑے ہوئے ہوں! جب تک ہماری کوچ (سوکس می، ایکسپریس) سدا حارا کے بس اسٹینڈ سے روانہ نہیں ہوئی، میں غیر متعین صورت حال سے دو جا رہا۔ ہر لمحے دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ چاک کھیں سے نیپالی پولیس والے برآمد ہوں گے اور چینگ کے نام پر اپنی کارروائی شروع کر دیں گے لیکن خیریت میری گزری اور کوچ نے بڑے اسن دھان سے سفر کا آغاز کر دیا۔

ہم جس نوعیت کے حالات سے دو جا رہے ان میں ہر ساعت چوکتا رہنے کی ضرورت تھی۔ رہی موٹے ہاتھن کوئی معمولی شخص نہیں تھا اور اس کی پشت پر امریکا بھاد کا ہاتھ بھی تھا بلکہ سچ معنوں میں رہی کا ہاتھ امریکا کے سر پر تھا۔ پوری یہودی لائی اس کی اٹھکیوں کے اشاروں پر جانتی تھی اور اب تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ امریکا کی خارجہ اور داخلہ پالیسی میں یہودی کس حد تک دخیل ہیں۔

میں نے رہی اور اس کے یہودی چیلوں کو ناقابل حلانی نقصان پہنچایا تھا۔ نیپال میں اسرائیل ایکسی اور یہودی لائی کی طاقت بھی دیکھنے میں آ چکی تھی۔ رہی پورے مصلحت اور دسائل کے ساتھ مجھے تلاش کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں جب تک ہماری کوچ ٹھنڈے شہر کی حدود سے نہ نکل جاتی، سکون کی سانس نہیں لی جاسکتی تھی۔

کوچ مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے رنگ روڈ پر آئی پھر بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے ٹھنڈے کے آخری شاہی کنارے پہنچ گئی۔ میں ادوری یان ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دو مسافروں کے لیے بنائی گئی ایک آرام دہ سیٹ تھی۔ لی یان کھڑکی کی جانب بیٹھے سے لگی بیٹھی تھی۔ ہمارے آگے واقع ایک ہی ایک سیٹ پر کاشا لوک تھا چو کے پہلو میں براجمان تھا۔ کوچ کا بیٹنگ سسٹم بڑے موثر انداز میں کام کر رہا تھا جس کی مہربانی سے باہر کا موسم ہم پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک مکمل انرکنڈیشنز کوچ تھی۔

شہر کے اختتام پر پہنچ کر ہمیں رکنا پڑا۔ وہاں سڑک پر ان گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی جو کلی الصبار ٹھنڈے شہر کو چھوڑ کر باہر جا رہی تھیں۔ شاید کوئی چینگ وغیرہ کا معاملہ تھا اور اس وقت ٹھنڈے کے جو حالات چل رہے تھے ان میں سب سے زیادہ چینگ تو ہماری تلاش کے سلسلے ہی کی کڑی ہو سکتی تھی۔

لی یان نے بھی صورت حال کو بھانت بھانت لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیاں انداز میں بولی ”چینگ! مجھے تو کوئی کڑبو محسوس ہوتی ہے۔“

اس نے احتیاط کا تقاضا پورا کرتے ہوئے مجھے اختیاری نام



سے مخاطب کیا تو میں نے باہر دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا ”ہاں“ مجھے بھی یہی نظر آ رہا ہے۔“  
”ہمارے لیے کوئی مشکل تو نہیں کھڑی ہو جائے گی؟“ اس نے بدستور مجھے لکھے میں استفسار کیا۔  
”میں نے سادگی سے کہا“ اگر کھڑی ہو جائے گی تو دو تھپڑ مار کر بھادس گئے۔“  
”جہیں تو ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے؟“ وہ ہونٹ ہنسنے ہوئے بولی۔

”میرا خدا تمہارا یسوع مسیح اور کھام کالا رڈ بدھا ہمارا مد کرے گا۔“ میں نے چہرے کو سنجیدہ رکھتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی ”کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟“  
وہ پورے اعتماد سے بولی ”ہاں یقین ہے۔“  
”پھر اطمینان سے بیٹھی رہو۔“ میں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”ہم اس وقت بدھا بھگتو ہیں جن کے حالات میں کوئی ہنگام اور افراتفری نہیں ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہو کوچ میں سوار بانی بدھا رہا ہے کس سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں جیسے انہیں دنیا میں اپنے سوا کسی کی خبر ہی نہ ہو!“  
وہ ادھر ادھر لگا دوڑا کرتے ہوئے بولی ”ان میں بعض تو ایسے ہیں جنہیں خود اپنی بھی خبر نہیں۔“  
”بس تو جرح تم بھی ویسی ہی نظر آنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔  
اندرا اور باہر کے موسم میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس تضاد و تقاد نے کھڑکی کے شیشے کو حدنلایا تھا جس کے سبب باہر کے مناظر کو واضح طور پر دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ قدرتی اور مصنوعی موسم میں اچھی خاصی ”گمری سردی“ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہی اپنے اپنے محاذ پر ٹکرائے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

ہماری کوچ رکتی اور آگے بڑھتی گئی۔ یہ بڑھنا، ٹھکنے کے مترادف تھا۔ بالآخر ہماری کوچ کی باری آ گئی۔ اب ہمیں اور اس کوچ کو چیکنگ کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ میں پوری طرح ”تیار“ ہو کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں کاشالوک نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر ہماری جانب نہیں دیکھا اور یہاں تک کہ ہم اپنا کام کیا تھا۔ اچانک نیپالی پولیس کے دو مسلح اہلکار کوچ کے اندر داخل ہوئے اور ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ایک مسافر کے چہرے کو بخوبری دیکھنے لگے۔ میں اور لی یان داخل انداز میں بیٹھے رہے جیسا کہ دوسرے بھگتو بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والے مطمئن ہو کر کوچ سے نیچے اتر گئے۔ لی یان نے ایک

طویل سانس خارج کی۔

یہ ایک معمولی اور سرسری نوعیت کی چیکنگ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کوچ کے مسافروں میں غالب تعداد بدھا بھگتوؤں کی تھی چنانچہ انہوں نے ہمیں ”توجہ“ کے قابل نہ سمجھا۔ دیگر چار پانچ افراد جو بھگتوؤں کے ہمیں میں نہیں تھے پولیس والوں نے باقاعدہ صرف ایک ایک دیکھا اور مطمئن ہو کر چلے گئے کیونکہ ان افراد میں کوئی بھی وہ جان بانی پالی نہیں تھا۔

دس منٹ کے بعد سوسنی ایکسپریس دوبارہ گزارا رہتے پر شمال کی سمت بڑھنے لگی۔ یہ پہاڑی سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ہم چونکہ مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے اس لیے کوچ کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ چڑھائی کی جانب سڑک کرتے ہوئے کوچ کے انجن کو پوری طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی۔

مٹھنڈو کی حدود سے یہ طاقت باہر نکل آنے کے بعد میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ لی یان مجھے کسی گفتگو میں الجھا دیتا میں نے انہیں بند کر دیں۔ میری بند آنکھوں کو دیکھ کر وہ سمجھ جاتی کہ میں اس وقت کہیں اور مصروف ہوں۔ اور میں نے واقعی کہیں مصروف ہونے کے لیے ہی انہیں بند کی تھیں۔

ساحل کی خبر گیری کیے کا فیصلہ دیر ہو گئی تھی۔ رہی نے پتا نہیں کیا سوچ کر مجھ پر اتنی مہربانی کر دی تھی کہ میں اب یہ آسانی ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اپنی جان تنہا کا تصور کیا اور اس کے ماحول کو چھونے کے لیے تھوڑا سی گواڑ بایا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے مایوسی کا دھکا لگا۔ میں ساحل کے ماحول تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔

یہ صورت حال میرے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک مرتبہ جہاز پر آ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین چار مرتبہ ساحل کے ماحول میں کودنے کی کوشش کی مگر ہر بار نتائج ایک ہی جیسے برآمد ہوئے۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ رہی نے دوبارہ میری راہ کوئی کرنے کے لیے ساحل کو کسی ایسے عمل سے گزرا تھا کہ وہ میری تیسری آنکھ کی رسائی میں نہیں رہی تھی۔ وہ ایک ماہر عامل تھا اور اس سے پہلے بھی میرے راستے میں ایسی ہی ناہیدہ روکاوٹ کھڑی کر چکا تھا۔ میں نے پچھلے دو دن میں بے درجہ اسے جتنے نقصانات پہنچائے تھے اس کے بعد بھی ہوتا تھا پھر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو بھی اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرنے والی ہی تھی۔ جب میں اپنی ساحل کے ماحول میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا تو دل ہی دل میں رہی

موتے ہاتھوں کو کھڑکی پر رکھ کر کہتا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولنے کا ارادہ کیا تھا کہ میرے منتقوں سے ایک فرحت بخش جاں نثاریاں خوشبو کھرائی۔ اس منفرد خوشبو کو میں نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ وہ بیلگری کے بدن سے اٹھنے والی مخصوص تنہا انگیز محبت کی۔ اس وقت میرے پہلو میں کھڑکی کے ساتھ لی یان بیٹھی ہوئی تھی۔ بیلگری کی شناخت وہ بھیجی یعنی خوشبو ظاہر کرتی تھی کہ ہر جنوں کی ملکہ پہلے نہیں اس کوچ میں موجود ہے۔

میں بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے اسے محسوس کرنے لگا۔ وہ مجھے اپنی ذات کا حصہ ہی لگتی۔ مجھے احساس ہوا جیسے میں اس کے ماحول میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔

”بیلگری.....!“

اس کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ وہ بیکر خاموش تھی لیکن اس کے ہنسنے کی مخصوص محبت سانس کے راستے میرے وجود میں اتر رہی تھی۔ اس خوشبو نے میرے تن بدن کو ہکا کر رکھ دیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر بہ زبان خاموشی اسے آواز دی۔

”تم خاموش کیوں ہو بیلگری؟ کچھ کہو! میرے کان میں دس گھونٹو میری سماعت میں کوئی دل نہیں سرگوشی کرو۔ میں محسوس کر رہا ہوں تم میرے پاس..... بہت قریب موجود ہو۔ میں تمہاری سانسوں کی خوشبو اٹھائیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہوں۔ یوں تم کوئی کیوں نہیں ہو؟“

جواب میں پراسرار خاموشی کا تسلسل قائم رہا۔ میں ایک بے نامی بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ اگر آپ کے کون کی کھنٹی بجے اور آپ ریسیور اٹھا کر ”ہیلو“ کہیں لیکن دوسری جانب ایک سناٹا طاری ہو اور آپ کے بار بار ”ہیلو“ کہتے پر بھی وہ سناٹا برقرار رہے تو آپ بھینچا ہوا محسوس کریں گے۔

مجھ پر بھی ایسی ہی قسم کی کیفیت طاری تھی۔ جب بار بار پکارنے پر بھی بیلگری کی جوابی سرگوشی میری سماعت سے نہ نکلتی تو مجھے کوفت ہونے لگی اور میں نے اس سے کہہ دیا۔  
”ٹھیک ہے تم میرے پاس آ کر کوئی ہو گئی ہو لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں ابھی تمہارے پاس آ کر تمہارے گونگے پن کا علاج کرتا ہوں۔“

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ وہ مخصوص ہوش رہا خوشبو غائب ہو گئی۔ وہ جس طرح ”چمکم“ سے میرے ماحول میں سرایت کر گئی تھی اسی طرح جھٹ جھٹ پٹ رخصت بھی ہو گئی۔ میرا

ماحول اس کے بدن سے اٹھنے والی بدبوؤں کن محبت سے خالی ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں بیلگری کو پکڑنے لگا۔

دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد میں محبت ہار کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پتا نہیں اس نے میری تیسری آنکھ کے سامنے کیسی طعنی بندش لگا رکھی تھی۔ اس کے طعنی کا ٹیٹا لی احوال میرے پاس نہیں تھی۔ میں بے اختیار اس سین سارہ کے بارے میں سوچنے لگا جو نرسار اور ناہیدہ بھگتوں کی ہاک تھی۔ بیلگری بلاشبہ میری داستان حیات کا ایک اٹھکا کر دار تھی۔ اس نے میری زندگی میں ڈبل رول پلے کیا تھا۔ اس کا کردار حقیقی اعتبار سے دو حصوں پر مشتمل تھا۔

پہلے حصے میں وہ براہ راست مجھ سے رابطہ کرتی تھی۔ وہ حد سے زیادہ مجھ پر مہربان دکھائی دیتی تھی لیکن میں اسے وہ مقام نہ دے سکا جس کی وہ تنہا تھی اور اسے اس بات کا شدید قلق بھی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ زندگی بھر میری کنیز بن کر رہے۔ مجھے کنیزیں اور غلام پالنے کا بھی شوق نہیں رہا تاہم بیلگری کا قرب میرے لیے فرحت کا باعث تھا مگر اس قربت کے لیے اس نے بڑی کڑی شرط لگا دی تھی جو میں ایک مسلمان ہونے کے ماتے بھی نہیں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا ”وہ جان اتم زندگی میں ایک مرتبہ ضرور بھگو گئے۔ اس وقت تمہاری تمام قوتیں تم سے چھن جائیں گی۔ اگر اس وقت تک تم اپنا جاب مکمل کر لو گے تو میں تمہاری کنیز بن جاؤں گی۔“ اس نے مجھے انمول پھروں والی ایک مالا بھیجی تھی میں دی گئی۔ وہ مالا اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور نایاب مالا تھی جس میں سیاہ چھپے پھر پودے لگے تھے۔ یہ چھپے سیاہ پھر تعداد میں اکیس تھے۔ میں چھوٹے والے اور ایک بہ نسبت بڑے پھر۔ دونوں جانب دس دس پھر اور پچھلے میں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کے ساتھ کا بڑا سیاہ پھر موجود تھا۔ بیلگری نے مجھے بتایا تھا اگر میں اس بڑے سیاہ پھر کو چوسوں گا تو وہ میرے پاس حاضر ہو جائے گی۔ بیلگری کو پوچھ کر تم ہوش کے شیطانی چکر سے نجات دلانے کے بعد جب تھک جھیل سے میری داہنی ہونٹ تھمتی میں نے اپنے ٹپک آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ غار کا بھالوت سنگھ کے توسط سے جب میں غیر قانونی طور پر پاک بھارت سرحد پار کر رہا تھا تو سرحدی محافظوں سے ہماری ڈھبھی ہو گئی اور اسی افراتفری میں بیلگری کی دی ہوئی نایاب مالا ریگڑار کی نذر ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں اس مالا کو تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ بعد ازاں... جب مگر پارک کے ایک حقانے میں میں بند تھا تو بیلگری مجھ سے ملنے..... حوالات میں بھی چلی آئی تھی۔ وہ مالا کھوجانے پر مجھ سے شاک تھی اور اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ میں اس کے

حسب فضا جاب مکمل نہیں کروں گا۔ ان حالات میں مجھے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنا ایک خطرناک منصوبہ بھی بیان کیا تھا۔ تاہم میں نے کوشش کی کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کر سکے۔ پاکستان میں قیام کے دوران میں وہ بہت دفعہ میرے پاس آئی۔ اسے لہجہ بولہ بدلتے ہوئے منشی حالات کے پیش نظر جب میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا تو اسے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ میں کراچی کے ایک پوش علاقے کے ڈی اے اسکیم دن کے ایک جنگلے میں گزاری ہوئی اس رات کو بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب بیلگری، علی کا رب و حار کر مجھے زیر کرنے آئی تھی۔ اور اس رات وہ اپنی خواہش کی تکمیل میں کامیاب رہی تھی۔ پھر وہ مجھ سے بچ گئی۔ یہ بچکر نا اس کی مرضی کے تابع تھا۔ کراچی میں جب میں فلکشن کے ایک فلیٹ میں قیام پزیر تھا تو وہ بڑے دھم انداز میں مجھ سے الوداعی ملاقات کرنے آئی تھی اور اس وقت بیلگری نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ از خود وہ بھی میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی۔ بیلگری کو ہمارا ملکی مسکھی۔ اس کا فکشن ہالیوڈ کی گود میں واقع تھا۔ تلو جھیل سے آگے کل جھ چوٹیاں ایک خاص ترتیب سے موجود تھیں جو بیلگری کا تھ اور بیلگری ساؤتھ کے نام سے موسوم تھیں۔ ان چوٹیوں کی بلندی چوبیس سے پچیس ہزار فٹ تک تھی۔ انہی برف پوش پہاڑی چوٹیوں میں سے کسی ایک میں بیلگری کا قیام تھا۔ بیلگری نے آخری ملاقات میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی۔ اس کا دعویٰ کسی حد تک درست بھی ثابت ہو رہا تھا۔ میں اس وقت نیپال سے تبت کی طرف جا رہا تھا اور ہالیوڈ رینج کا بڑا حصہ نیپال کے شمال میں پایا جاتا تھا۔ دنیا کا بلند ترین پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ بھی نیپال کی شمالی سرحد پر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ میں کراچی سے امریکا اور پھر امریکا سے نیپال جن حالات کے تحت پہنچا تھا اور اب نیپال سے تبت کی طرف جا رہا تھا اس میں میرے ارادے اور پروگرام کو کوئی دخل نہیں تھا۔ گویا بیلگری کی پیش گوئی کے صحت مطابقت میں مجبور اس سبب سے بڑھ رہا تھا۔ یہ مجبوری آگے جا کر کیا رنگ دکھانے والی تھی اس کے بارے میں فی الحال میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

بیلگری کے کردار کا دوسرا رخ امریکا میں سامنے آیا۔ اب وہ غیر محسوس انداز میں جا رہا ہے۔ میرے قریب آنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور نہ ہی میری پکار کا جواب دیتی تھی۔ میں اس کے بدن کی مخصوص مہک سے اسے اپنے ماحول میں محسوس کر لیتا تھا۔ جیسے تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اپنا احساس دلا کر گئی تھی۔ اس کی آمد شد یقینی تھی۔ کسی بھی قیمت پر میں اسے اپنے محسوسات کا دھوکا نہیں سکتا تھا۔ وہ واقعی میرے پاس آ رہی تھی

مگر یہ انداز دہرا!

سایک طرح کی وعدہ خلافی تھی۔ وہ اتنے بڑا سر انداز میں اس عہد شکنی کی مرکب کیوں ہو رہی تھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کی یہ حرکات بے مقصد اور بلا وجہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مجھ سے تکمل رہی تھی۔ میں ایک طرح سے اس کے ہاتھ کا کھلونا بنا ہوا تھا لیکن اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ فیصلہ تو بہر حال وقت ہی نے کرنا تھا کہ اس تکمیل کا انجام دل خوش کن ہو گا یا دردناک؟

میں آنکھیں کھول کر اپنے ماحول میں حاضر ہو گیا۔ سب سے پہلے لیان کے چہرے پر نگاہ مٹی۔ وہ اس وقت براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا جب میں نے آنکھیں بند کر دی تھیں تو وہ میرے چہرے پر نظر ٹکائے بغلی تھی۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ منشی خیر انداز میں مسکرائی۔

مجھے ان لمحات میں اس کی آنکھیں پوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بہ زبان خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھیں ”وہ جان اتم نہیں جانتا چاہے مت تاؤ لیکن مجھ کو کہ میں بہت کچھ جانتی ہوں“

میں لیان سے نظر چرا کر کوچ کے دیگر مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ کوچ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک امن و امان اور سکون کی صورت حال تھی۔ کاشانوک تھا جو کے ساتھ ہمارے سامنے والی سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں لیان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے دھجے لہجے میں سرگوشی کی۔

”لیان! کیا سوچ رہی ہو؟“

”جی..... کہ مجھے کیا سوچنا چاہیے؟“

”کیا مذاں کا موڈ ہو رہا ہے؟“ میں نے نٹو لے والے انداز میں کہا۔

وہ اسی تنجیدی سے بولی ”انسان کو سب کے لیے ایک ہی اصول بنانا چاہیے..... خود اپنے لیے بھی وہی!“

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا ”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”بیدگی سی بات ہے۔“ وہ اپنی تنجیدی کو برقرار رکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی ”تم جیسی بھی بہیم اور ماسر پاؤں کی باتیں کرتے رہو تو وہ مذاں نہیں ہے میں نے اس قسم کا ایک جملہ بول دیا تو تم پوچھ رہے ہو کیا مذاں کا موڈ ہو رہا ہے؟“ وہ لہجے بھر کو کہی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی ”یہ کہاں کا انصاف ہے وہ جان؟“

”یہ اندر مگر کی کا انصاف ہے؟“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی چہیتا ہوا جواب دیتی کوچ کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ رفتار میں واقع ہونے والی یہی اتنی زیادہ اور واضح تھی کہ ہم چونک کر شیشے کے باہر دیکھنے لگے۔ اس وقت تک سورج کچھ اوپر اٹھا آ رہا تھا اور کھڑکی کے شیشے پر صبح جو دھند دکھائی دیتی تھی وہ چھٹ گئی تھی۔ کھڑکی کے باہر تھکا ہوا برف پوش پہاڑی چوٹیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ کوچ کی رفتار کم ہونے کا سبب بھی فوراً سمجھ میں آ گیا۔ بیرونی مناظر کے زاویوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت ہماری کوچ تنگ سی سڑک پر چکا رہی آگے بڑھ رہی تھی جیسے کوئی اسپاڈرڈریوار پر چڑھتا ہے۔ بلندی کی طرف ہمارے سڑک زاویہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے کوچ کے انجن کو بے پناہ قوت صرف کرنا پڑ رہی تھی۔

لیان نے کہا ”وہ جان! مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی کوچ میں سڑک پر سفر نہیں کر رہی بلکہ ایک ایلی وینر (لفٹ) کے ذریعے نیچے سے اوپر جا رہی ہوں۔“

اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی تشویش پائی جاتی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے میں نے ایک خاص نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی۔

”اگرچہ ہم نہایت ہی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے ہیں لیکن ایک غلط فہمی دونوں سے بہر حال سرزد ہو رہی ہے۔“ میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا ”میں کسی بھی صورت لوگوں کے سامنے ایک دوسرے کو اصلی ناموں سے مخاطب نہیں کرنا ہے۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں جنش دیتے ہوئے بولی ”ہاں ہاں“ پھر کہا ”لیکن اب تو ہم مکلف ہو چکے ہیں کہ خطرناک فضا سے بہت دور نکل آئے ہیں!“

”مگر ابھی تک نیپال کی غیر یقینی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔“ میں نے تنبیہی انداز میں کہا ”تبت پہنچنے تک ہمیں اس بات کا خیال کرنا چاہیے۔“

”اوکے چیپک!“ وہ مجھے میرے اختیاری نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی ”آئندہ میں اس پوائنٹ کو یاد رکھوں گی۔“ میں نے کہا ”مجبوری! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے احساس کا ذکر کیا ہے۔ اگر اسی نوعیت کا سفر تم کسی جانور کی پشت پر بیٹھ کر تو تھوڑے اور زیادہ منشی خیر اور خطرناک ثابت ہوگا۔“

وہ کالوں کا ہاتھ لگاتے ہوئے بولی ”تو ٹھیک ہے کہ میں ایڈوچر پند ہوں لیکن اس قسم کے جان لیوا تجربات کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں چیپک۔“

”پھر میں یہی کہوں گا، تمہیں ہم بولی کا کوئی شوق نہیں۔“ میں نے اسے پھینکنے کی غرض سے کہا ”ایڈوچر تو نام سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا۔ وہ سامنے دیکھ رہی ہو؟“

میں نے کھڑکی سے باہر عظیم المرتبت پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بھی میرے اشارے کی سمت دیکھنے لگی۔ میں نے مزید کہا۔

”یہ دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے جس کی بلندی انتیس ہزار اٹھائیس فٹ بتائی جاتی ہے۔ اس فلک بوس پہاڑ کو سر کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں لیکن موت سے ٹکرانے والے ہم جو اس کی خوفناک بلندی اور خطرناک راستوں کو خاطر میں نہیں لاتے!“

وہ تیزی سے اثبات میں سر ہلانے لگی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی کیونکہ اس دوران میں کوچ کی رفتار مزید کم ہونے کے ساتھ ہی ادنیٰ کی جانب اس کا زاویہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس وقت تو واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی مٹل کاک میں بیٹھ کر زمین سے آسمان کی طرف چارے ہوئے۔

بلندی کی طرف جاری یہ سفر ایک پہاڑی وادی میں جا کر ختم ہوا۔ یہ وادی ”بدھا نکا تھا“ تھی۔ بدھا نکا تھا مکلفندو سے متصل نو گلو میز شمال میں واقع ہے لیکن یہ مختصر سا سفر ہم نے بڑی مشکل سے طے کیا تھا۔ یہاں تھوڑی دیر کا قیام تھا۔ سوکھی اکیس برس ایک قدرے سطح جگہ پر کی تو مسافر نیچے اترنے لگے۔ اپنی باری پر ہم بھی کوچ سے باہر نکل آئے۔

بدھا نکا تھا کا علاقہ شیو پوری ہل کے قصبوں میں واقع ہے۔ شیو پوری ہل کی بلندی بھی دیکھنے سے تعجب رکھتی ہے۔ بدھا نکا تھا میں نارائن (دشنو) کا ایک بہت بڑا سنگی مجسمہ بھی موجود ہے جو ایک بیل پر کسی پیش ناگ کے مانند کھڑی بارے بیٹھا ہے۔ بدھا مکلفندو کی تمام تر دلچسپی وہاں پائے جانے والے اسٹوپا تک محدود تھی لہذا ہم تینوں اپنے قافلے کے ساتھ تھم بدھا اسٹوپا کی طرف چلے گئے۔

کاشانوک تو بدصفت تھا۔ لہذا وہ دیگر مکلفندو کے ساتھ باترا میں صرف ہو گیا۔ میرے اور لیان کے لیے اس باترا میں کوئی چارم نہیں تھا مگر تھوڑی دیر تک ہم حالات کے تقاضے نبھاتے رہے پھر اسٹوپا کے وسیع و عریض صحن کی طرف نکل آئے۔ ہم چونکہ بدھا مکلفندو کے صحن میں تھے اس لیے قافلے سے بالکل ہی کٹ کر ہمارا دوسروں کو ہمارے حوالے سے شک میں ڈال سکتا تھا چنانچہ اندھا کھواسے کے لیے یہی سبکی ہم نے بھی اس بدھا اسٹوپا کی تھوڑی بہت باترا ہی ڈالی تھی۔ اسٹوپا کا صحن خاصا کشادہ تھا اور بڑے بڑے سنگی تختوں کو۔

باہم جواز کرتا کیا گیا تھا۔ ہم نکلے فرش پر ہی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس طرف بیٹھنے کا میرا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ اسنو پا کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لیے لوگ ادھر ہی سے گزر کر بیرونی درزیوں کی جانب بڑھتے تھے۔ میں اسنو پا کی اندرونی عمارت سے نکلنے وقت کاٹالوک کے کان میں یہ پھونک کر آیا تھا کہ ہم اس کے طرف ملیں گے۔

لی یان نے اسنو پا کے مخصوص گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بدست اپنی عبادت گاہ کی قبر و زمین میں بڑی دل جمعی سے کام لیتے ہیں۔ جیکو ڈاٹر زکی یہ بلند بالا عمارتیں کھڑی کرنا کوئی آسان کام تو نہیں پھر اسنو پا کے کلس وغیرہ کی تیاری میں بھی دافر مقدار میں مونا استعمال کیا جاتا ہے۔“

مجھے مندر ”کلیسا“ سنا گاگ اور بدھ اسنو پا میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا تھا۔ خاص طور پر مندر اور اسنو پا کے دروازوں میں میں نے مختلف حوالوں سے سونے کا بے دریغ استعمال دیکھا تھا۔ خاص طور پر صورتوں کی صورت میں۔ لی یان کی بات سن کر بدھ مثل کنڈ والی عبادت گاہ کے خانے کا منظر میری نگاہ میں محو م گیا جہاں ایک صے میں بدھ کا طائلی مجسمہ نصب تھا۔

ہم ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔ اسنو پا کی عمارت کے اندرونی حصے میں سے ایک جواز باہر نکلا تھا۔ ان دونوں نے بدھ راہوں والے مخصوص لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ دونوں تقریباً بزرگ چل رہے تھے اور میرے چونکنے کا سبب مرد بکشتو تھا۔ اس کے چہرے پر نگاہ جاتے ہی میں نے پلک جھپکنے میں اسے پہچان لیا۔

یہ وہی بدھ بکشتو تھا جو بدھ تھو دھ کی کے ہوئی میں بیضا مچ ہمیں تازہ رہا تھا۔

اس شخص کو ایک عورت کے ساتھ یہاں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھکا۔ وہ دونوں اب کشادہ محسن میں قدم اٹھا رہے تھے لیکن ان کا رخ اور زاویہ قدرے مختلف تھا۔ قبل اس کے کہ وہ ایک مرتبہ پھر میری نگاہ سے اوچھل جاتا، میں نے اس کی خبر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

”لی یان! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور غصے کی کوشش کی۔

”میں نے کہا ہے نا نہیں بیٹھی رہو۔“ میں نے اس کا شانہ دہاتے ہوئے کہا ”اگر میری دایسی سے پہلے کاٹالوک لوٹ آئے تو اس سے کہا مجھے تیل پر رنگ کر لے۔“

دیکھ کر وہی سامان کے ساتھ ہی ہم اپنے موہاں لون بھی

لے آئے تھے۔ لی یان واپس بیٹھ گئی اور میں اپنے نارگٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس بدھ بکشتو کو یہاں دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ میری سوچ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

اس وقت ان دونوں کی پشت میری جانب مٹی لہذا وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں دے پاؤں احتیاط کے ساتھ ان کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ اسنو پا کی حدود سے باہر جانے والے پتھر لیے زینے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ عبادت گاہ کے اندران پر ہاتھ ڈالنا ٹھیک نہ ہوتا۔ اگر وہ اس اسنو پا سے باہر نکل جاتے تو میرا کام آسان ہو جاتا اور محسوس یونہی ہو رہا تھا ”وہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ اسنو پا کے زینے طے کر کے عبادت گاہ سے باہر نکل آئے۔ میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کا پیچھا کرتا رہا۔ جب سے میں نے اس بکشتو کو دیکھا تھا میرے ذہن میں باہر بارہا یہ خدشہ اٹھا رہا تھا کہ وہ ضرور کسی مشن پر ہے۔ کس مشن پر؟ میں فی الحال اس بارے میں دو ٹوٹی سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ مشن ہمارے ہی خلاف ہوگا۔ اگر مجھ وہ ہوئی سے نکل کر اچانک غائب نہ ہو جاتا تو میں اس کے منہ سے سب کچھ اٹھوا چکا ہوتا!

بدھ اسنو پا سے کچھ فاصلے پر وہ موٹس مٹی ایکسپریس کھڑی تھی جس میں بیٹھ کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ جب میرا نارگٹ اس کوچ کی جانب بڑھنے لگا تو میں چونک اٹھا اور اس وقت تو میں حیرت کے ایک شدید جھٹکے سے گزرا جب وہ بدھ بکشتو اپنی ساتھی کے ہمراہ غورہ کوچ میں سوار ہو گیا۔ وہ کوچ کے اندر بیٹھے اور اطمینان سے ایک سیٹ پر جا بیٹھے۔ یہ وہ سیٹ ہی جو کاٹالوک کی سیٹ کے آگے واقع تھی۔

میرے لیے یہ ایک اور حیرت ناک بات تھی۔ ان کے اسٹائل سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا ”وہ اسی کوچ میں سفر کرتے ہوئے کھنڈو سے یہاں تک پہنچے تھے اور آگے بھی جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس وقت تک کوچ میں اڑکا ڈاکٹر انفرام بیٹھ چکے تھے اور باقی کا انتظار ہو رہا تھا۔ ہمارے قافلے والوں میں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ ہینا وہ سب تھو کے ساتھ ہی واپس آتے۔

میں کوچ کے عقب میں کھڑا ہو کر حالات حاضرہ کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ ہماری ہی کوچ میں بیٹھ کر یہاں تک چلا آیا تھا اور مجھے اس کا احساس تک نہ ہوسکا۔ ہینا اس کی بجی وہ ہوئی کہ وہ ہمارے کوچ میں بیٹھنے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اس لیے میں اسے سوار ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ یہ اور بھی زیادہ تشویش ناک بات تھی۔ اس کا صاف صاف یہی مطلب نکلتا تھا کہ اگر وہ واقعی ہمارے خلاف

کسی خاص مشن پر تھا تو پھر اسے یہ بھی معلوم تھا ہم اس کوچ میں سفر کرنے والے ہیں!

میں نے اپنے تیل پر دایریٹر کی مخصوص قمر قراہٹ محسوس کی تو چونک اٹھا۔ تیل پر کوئی کال آ رہی تھی۔ میں نے تیل کی ریج ٹوٹ کر آف کر کے اسے سائینک الارٹ پر ڈال رکھا تھا۔ میں نے موہاں نکال کر کال ریسیو کی۔ اگلے ہی لمحے مجھے کاٹالوک کی آواز سنائی دی۔

”ہاں چیگ! تم اس وقت کہاں پر ہو؟“ اس نے احتیاطاً مجھے اختیاری نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا ”وہ اس وقت دوسرے لوگوں کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا“ ہم یہیں رک کر تمہارا انتظار کریں یا.....؟“

”سیدھے کوچ کی طرف چلے آؤ۔“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”میں تم کو ادھر ہی لوں گا۔“ کاٹالوک نے یہ نہیں پوچھا کہ میں وہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے سیلور رابطہ موقوف کر دیا ”اوکے“ ہم آ رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد لی یان اور کاٹالوک بدھ بکشتوؤں کے قافلے کے ساتھ مجھے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو کاٹالوک نے دردی سے ہاتھ ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اس کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لی یان نے بھی اس کی تقلید میں قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ ان کی کوشش تھی کہ قافلے کے دیگر افراد سے پہلے وہ مجھ تک پہنچ جائیں۔ وہ اس کوشش میں کامیاب رہے اور جب تک باقی لوگ کوچ تک رسائی حاصل کرتے، ہمیں وہاں نہیں کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کے چہرے اندرونی تشویش کا حکم کھلا اظہار کر رہے تھے۔

کاٹالوک نے سستی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے استفسار کیا ”کوئی گزربو؟“

”میں نے سچ“ ہوئی میں جس بکشتو کو دیکھا تھا وہ ہمارے ساتھ ہی یہاں بھی پہنچ گیا ہے!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

ان دونوں نے چونک کر حلائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کاٹالوک نے دھیمے لہجے میں پوچھا ”یہاں کہاں؟“

”وہ کوچ میں“ تنہا دی والی سیٹ سے اگلی سیٹ پر ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ہے۔“ میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا ”اور وہ دونوں اسی کوچ میں سفر کرتے ہوئے کھنڈو سے یہاں تک پہنچے ہیں۔“ یہ حیرت انگیز انداز تھا۔

”اوہ! یہ تو بڑی تشویش ناک صورت حال ہے۔“ وہ ہونٹ نکلتے ہوئے بولا ”انہیں یہاں پہنچنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ

کوچ کے اندر جا بیٹھے ہیں تو اس کا بھی مطلب ہے ہمارے ساتھ ہی آگے بھی جا بیٹھے آؤ دیکھتے ہیں کہ وہ کس موڈ میں ہیں!“

ہم یہ باتیں اس انداز میں کر رہے تھے کہ دیکھنے والوں کو ”مینگ“ کا احساس نہ ہو۔ کوچ کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے لی یان نے سرگوشیاں لہجے میں مجھ سے پوچھا ”اس بکشتو نے ہمیں دیکھ تو نہیں لیا؟“

”کمال کی بات کرتی ہو تم بھی!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ تو ہم پر نظر رکھ کر کھنڈو سے یہاں تک پہنچا ہے تم دیکھنے کی بات کر رہی ہو؟“

ہم کوچ کے اندر آ کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوچ کے دیگر مسافر بھی آگے توڑا پھرنے آگے کے سفر کا آغاز کیا۔ ہماری اگلی منزل سندرلی جبل تھی جو یہاں سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔

میرے اندر ایک کھلی کھلی کی بجی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس کی پکار بے مٹی نہیں تھی۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ بدھ بکشتو ہمارے ہی تعاقب میں لگا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک چیز بری طرح میرے ذہن میں ٹھک رہی تھی۔ سچ ہوئی میں نے اسے تازے والے انداز میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ جب میں اس کے پیچھے پکا تو وہ ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ مجھے بدھ کاٹالوک تھا والے اسنو پا میں دکھائی دیا اور اس وقت بھی وہ مجھے نظر انداز کر کے کوچ کی طرف چلا آیا تھا حتیٰ کہ کوچ میں بھی اس کی سیٹ مجھ سے آگے تھی۔ گھبراہٹ اور تعاقب کرنے والے شخص کے لیے لازم تھا کہ وہ مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے میرے پیچھے لگا رہا۔ اس بدھ بکشتو اب تک کی کارکردگی تو یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہمارے بارے میں بڑا اعتماد ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمیں اس کوچ کے ذریعے کہاں تک جانا ہے لہذا وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر ہمیں گھبرائے گا۔

اور میں..... اسے ہرگز ایسا کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ایک نام ہم کو اپنے ساتھ ساتھ باندھے پھرنا اور مسلسل اس کی ”تک تک“ سماعت کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ سندرلی جبل میں پروگرام کے مطابق ہمیں کم و بیش اڑکا کھانا قیام کرنا تھا۔ میں نے اسے اسی مقام پر ”چیک“ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے کے بعد میں نے لی یان کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی ”میری باتوں کو بڑے غور سے سننا۔ میں سندرلی جبل میں اپنے ہاتھ پاؤں کو تھوڑی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی ”تم کیا کرنے کا

ارادہ رکھے ہو؟

میں نے مختصر اور جامع الفاظ میں اسے بتایا ”جب ہماری کوچ سندی جل میں رکے تو تم کا شانوک کے ساتھ کوچ میں سے نکل جانا۔ میں بدستور اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوں گا۔ اگر یہ بدھ بکشو میرے تعاقب میں ہے تو یہ بھی کوچ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ میں اسے سندی جل ہی میں گھیر کر اس کی زبان سکھانا چاہتا ہوں۔“

لیان نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بولی ”اگر یہ بکشو کوچ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس صورت میں تم کیا کرو گے؟“

”پھر میں اس کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ کسی بھی صورت میں اسے سندی جل سے آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”بس بہت کر لیا اس نے ہمارا تعاقب اور نگرانی!“

اس نے پوچھا ”کا شانوک سے کیا کہنا ہوگا۔ وہ تمہارے اس پروگرام سے تو آگاہ نہیں ہے؟“

”تم کوچ سے باہر نکلے کے بعد اسے میرے پروگرام کے بارے میں بریف کر دینا۔“ میں نے جواب دیا ”آدھا کھٹنا چھا خاصا وقت ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے میں اس پندرہ منٹ ہی میں اسے ”نمنا“ دوں گا اور جب تم لوگ واپس آؤ گے تو میں تمہیں کوچ کے پاس ہی ملوں گا۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس دوران میں اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے تو ہم آپس میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ میرے اور کا شانوک کے پاس موبائل فون موجود ہیں۔“

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور بولی ”اگر میں بھی تمہارے ساتھ یہاں رک جاؤں تو؟“

میں سمجھ گیا ”بکشو سے ”نمنا“ والے مشن میں وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کے عزائم سے آگاہی حاصل ہوتے ہی کہا ”اگر تم میرے ساتھ کوچ میں ٹھہر گئی تو کا شانوک کو میرے پروگرام کے بارے میں کون بتائے گا؟“

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا ”تمہاری ہدایت کے مطابق کوچ سے اتر کر جاؤں گی لیکن اس قافلے کے ہمراہ کسی اسنو پا وغیرہ کی طرف نہیں جاؤں گی بلکہ کا شانوک کو تمہارے پروگرام سے آگاہ کرنے کے بعد میں کوچ کے قریب ہی کسی آڑ میں کھڑی ہو جاؤں گی پھر تم جیسے ہی حرکت میں آؤ گے میں تمہیں جوائن کر لوں گی۔“

اس کی تجویز خاصی صحت مند اور میرے لیے قابل قبول تھی۔ میں نے اس کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا

”کا شانوک نے بہت جھانک کر تمہارا نام رکھا ہے!“

”کیا مطلب؟“ وہ حذب مذاہب انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”اپنی کنٹرولیشن کے اعتبار سے تمہارا نام چینی زبان کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا چینی زبان میں اس لفظ کے کیا معنی ہیں البتہ ہماری قومی زبان اردو میں یہ لفظ بڑے رومانٹک معنی رکھتا ہے۔“

”کیا..... مثلاً کیا؟“ وہ گہری دلچسپی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

”میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”من چوری..... یعنی من چوری کرنے والی!“

”اوہ!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی ”یو مین ہارٹ صیغہ؟“

”نہیں آئی مینٹ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آریوسر ٹیٹالی؟“ اس نے پوچھا۔

”آئی ایم سیلف کالی!“

میرے اس بے ساختہ جملے پر وہ قدرے جڑبڑ ہوئی پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

دوپہر کے وقت ہم سندی جل میں داخل ہو گئے۔ ہر ہیبت شان و شوکت کا حامل پہاڑ ہمارے پیش نظر ساتھ ساتھ جل رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ماؤنٹ ایورسٹ کے قدموں میں کھیل رہے ہوں۔ ماؤنٹ ایورسٹ نامی دنیا کا یہ بلند ترین پہاڑ نیپال اور تبت کی سرحد پر واقع ہے اور دونوں ہی ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔

سندی جل کی وچ شہرت وہاں پائے جانے والے خوب صورت آبشار ہیں جو اپنے دلکش اور محفوظ کن نظاروں کے ساتھ دیکھنے والوں کو لکھاتے ہیں۔ ہنگام کے لیے یہ ایک عمدہ مقام ہے۔ خاص طور پر یون سوئٹن کے نور بعد تو اس وادی کی دلکشی اور حسن میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ آبشاروں کی اسی خوب صورتی کے باعث اس وادی کا نام سندی جل رکھا گیا ہے۔

ہماری کوچ ایک بدھ اسنو پا کے قریب رکی تو ہم نے پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔

کا شانوک اور تھاچو دروازے کے قریب والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لہذا وہ ہم سے پہلے باہر نکلے۔ میں نے ٹانگیں کھینچ کر لیان کو راستہ دیا اور خود کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اندازاً ایسا ہی تھا کہ میں بھی کوچ سے نیچے اتروں گا لیکن نہایت ہی اطمینان کے ساتھ۔ کا شانوک اور تھاچو کے بعد وہ بدھ بکشو اور اس کی ساتھی بھی کوچ کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ لیان ان کے پیچھے

تھی۔ میں نے دانستہ کھڑکی سے باہر دیکھا شروع کر دیا تاکہ اگر بکشو سے نظر مل جائے تو وہ دیکھ کر چونک اٹھے۔ میں اسے صورت سے پہچانتا تھا۔

بدھ بکشو کا یہ رویہ بہت قدیم قدم پر مجھے حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اس نے لیان پر بھی کوئی دھیان نہ دیا اور کا شانوک وغیرہ کے بعد کوچ سے اتر گیا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب باہر جانے کے بعد وہ اپنی ساتھی کے ہمراہ انتہائی لائق اور بے پروائی سے ایک ست کو چل پڑا۔ یہ ست اسنو پا والی نہیں تھی! ایک لمحے کے لیے میرے ذہن سے یہ سوال بھی گزرا کہ میں خواہ مخواہ کیوں اس کی طرف سے ٹک بلکہ دھم میں جلا ہورہا ہوں؟ یہ بھی تو ممکن ہے وہ بھی میرے تعاقب میں نہ رہا ہو!

لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں اس بکشو کے حوالے سے کسی ٹک یا دھم میں جلا نہیں تھا۔ میری چمنی جس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا اور مذکورہ جس بار بار مجھے وارن کر رہی تھی کہ وہ بکشو میرے خلاف کسی مشن میں مصروف ہے۔ میں چمنی حس کی اس وارننگ کو نظر انداز کر کے کوئی نقصان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ میرے لیے ایک عطیہ خداوندی تھا جس کی وجہ سے میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کا شانوک اور لیان آپس میں کھسک پھسک کر رہے تھے پھر کا شانوک تھاچو کے قافلے کے ساتھ بدھ اسنو پا کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا لیان اسے اپنی بات سمجھانے میں کامیاب رہی تھی۔ لیان نے میری سمت نگاہ اٹھا کر لکھا تو میں بڑی سرعت کے ساتھ سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب حذر کوچ کے اندر بیٹھے رہنا میرے لیے بیکار تھا۔ میں نے جس بدھ بکشو کو اپنا ناگٹ بنایا ہوا تھا وہ اپنی ساتھی کے ہمراہ اپنے تعلق قدموں سے ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ جبہ میں کوچ سے نیچے اترتا تو اس وقت بھی تین چار مسافر اندر موجود تھے۔ میں نہیں جانتا تھا میرے بعد وہ بھی اتر جائیں گے یا کوچ ہی میں بیٹھے رہیں گے۔ اس کوچ میں سترے سے اتنی فیصد تک بدھ باتری سوار تھے تین روزمرہ کے عام مسافر تھے۔ ایک دو مسافر پیچھے بھاگتا تھا میں بھی اترے تھے اور ان کی جگہ وہاں سے سوار ہونے والے نئے مسافروں نے لے لی تھی۔ یہ تو سفر کا ایک مروجہ اصول ہے۔ سواری وہی رہتی ہے اور مسافر بدلتے رہتے ہیں!

میں کوچ سے باہر آنے کے بعد تیزی سے لیان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی میرے ناگٹ کی جانب قدم اٹھا چکی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اٹھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”وچ..... چینگ! مجھے تو لگتا ہے کہ میں کوئی دھوکا ہوا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی کہ اگر یہ بکشو واقعی ہمارے تعاقب میں ہے تو پھر ہم سے اتنا لائق کیوں دکھائی دیتا ہے۔ ہماری نگرانی کے لیے تو اسے ہمارے آس پاس رہنا چاہیے مگر وہ ہمیں نظر انداز کر کے کیوں جا رہا ہے؟“

میں نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بظاہر تو مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے لیکن میں اپنے اندر کی آواز کو غلط نہیں سمجھ سکتا!“

”اندر کی آواز؟“ اس کے استفسار میں بے پناہ حیرت شامل تھی۔

میں نے بدستور آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا ”میری چمنی حس چیخ چیخ کر مجھے بتا رہی ہے کہ یہ شخص ہمارے خلاف کسی سازش میں ملوث ہے۔“

”اگر یہ کسی سازش میں ملوث ہے تو پھر ادھر پہاڑیوں میں کیا لینے جا رہا ہے؟“ لیان نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اچانک انداز میں کہا ”تم تو ادھر ہیں!“

وہ منطقی طور پر بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن میں اپنے محسوسات سے مجبور تھا ”سرسری انداز میں“ میں نے اس سے کہا ”آؤ چل کر دیکھتے ہیں وہ اس طرف کیوں جا رہا ہے!“

اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اس بات پر مجھے بھی حیرت تھی کہ وہ بدھ بکشو آدھی سے منہ موڑ کر اپنی ساتھی کے ہمراہ ان دیوان پہاڑیوں کی طرف کیوں جا رہا تھا۔ اس کا انداز قدم قدم پر ٹک میں ڈالنے والا تھا۔ ویسے اس کی تازہ ترین حرکت میرے لیے خاصے اطمینان کا باعث تھی۔ وہ جس سمت بڑھ رہا تھا ادھر خاموشی اور ویرانی تھی۔ گویا اس سے ٹھنسنے میں مجھے کسی بیرونی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں ایسی ہی کسی چوٹین کی خواہش کر رہا تھا۔

ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار نے شاید اسے چونکا کر دیا تھا۔ تعاقب کو محسوس کرتے ہوئے اس نے یکایک پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ٹھٹکا پھرا لگنے ہی گئے وہ آندھی طوفان کی رفتار سے پہاڑیوں کی سمت دوڑتا چلا گیا۔

میں نے لیان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”منجوری! میری بات کا یقین آیا کہ نہیں؟“

”چینگ! میں فوری طور پر ان کا پیچھا کرتا چاہیے۔“ وہ تشویشک لہجے میں بولی۔

”ان کا نہیں صرف اس کا!“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا۔ ”تم اس عورت کو سنبھالو میں اس بکشو کی خبر لیتا ہوں۔“ بات ختم



کری اور فوراً شرمسار ہوا کہ بارے میں اطلاع دے دی۔ شرما نے اسے مزید ہدایت کی کہ وہ ہمارا پیچھا چکے۔ نارائن نے اپنے تعلقات اور بدی استعمال کر کے یہ معلوم کر لیا کہ ہم تینوں بدھ بھکشوؤں کے ایک قافلے کے ساتھ کھنڈ سے باہر جا رہے ہیں۔ کوچ کے اسٹینڈ سے اسے ہماری منزل کا پتا بھی چل گیا۔ اس نے یہ معلومات شرما تک پہنچائی تو اسے تازہ احکام ملے ہمارے ساتھ ہی "سوس مٹی ایک پھر لیں" میں سوار ہو جائے اور ہمیں پیچھے رہے بغیر وہ ہماری نگرانی کرتا رہے۔ بدھ بھکشوؤں والا روپ بھی اس نے شرما کی ہدایت پر ہی دھارنا تھا۔ شرما نے اسے بتایا تھا کہ ایک نہایت ہی خطرناک مجرم بدھ بھکشوؤں کے قافلے میں شامل ہو کر کھنڈ سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور نارائن نے اس کی نگرانی کے لیے سرورہ کی بازی لگا نا تھی۔

نارائن کے امکشافات نے میرے اندر سسٹی سی دوڑا دی۔ یہ شرما کوئی بہت ہی چیتا چال باز شخص کا بندہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ راز صرف چار افراد تک محدود تھا کہ ہم آج صبح بھکشوؤں کے قافلے میں شامل ہو کر کھنڈ سے نکلیں گے۔ شرما کا شاؤک اور لیان تو اس راز کو کسی اور سینے میں منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ آچا کر میرا دھیان تھا جو کی طرف جارہا تھا۔ کہیں اس نے ہمارے خلاف مجبری تو نہیں کردی تھی؟

تھا چوتھی اس قافلے کا رہنما کا شاؤک کی نظر میں انتہائی قابل اعتماد شخص تھا۔ اس نے ہمارے خلاف کوئی مذموم قدم اٹھایا تھا یا نہیں اس بارے میں فوری طور پر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ شرماتی شخص میرے دشمنوں سے ضرور تعلق رکھتا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ شرما اس وقت اس بات سے آگاہ تھا کہ ہم کھنڈ سے کوادری کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ گویا یہ اور اس کے اشاروں پر ناپنے والے شیاطین میرے فرار سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔

مجھے اپنے وجود میں بے پناہ اضطراب پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ تو منزل پر پہنچ کر منزل کا نشان کھود دینے والی صورت حال ہو گئی تھی۔ میں نے نارائن سے پوچھا "تمہارے ساتھ وہ بھکشو عورت کون ہے؟"

"اس کا میرے من سے کوئی تعلق نہیں۔" اس نے نجف سی آواز میں بتایا "اس سے میری ملاقات ادھر کھنڈ میں کوچ کے اسٹینڈ پر ہوئی تھی۔ پھر ہمارے درمیان دوستی ہو گئی۔ بدھانکا نہایت کم بختیہ پہنچنے پر دوستی بہت گہری ہو گئی۔ اس کا نام دھکی ہے۔ یہ سندری جل کی رہنے والی ہے۔ اسے تو یہاں اترا نا ہی تھا لیکن میں نے بھی نہیں رکھنے کے لیے ایک چکر چلا دیا اور اس

میں کامیاب بھی رہا مگر تم نے چھ میں کوادری سب کچھ خراب کر دیا ہے۔"

اس کی بات نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے پوچھا "تم تو کسی شرما کے حکم پر ہماری نگرانی کرتے ہوئے کوادری تک جانے والے تھے پھر بھی اس کی خاطر یہاں رکھنے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"میں تو بتا رہا ہوں میں نے اپنے پاس شرما کو ایک چکر دیا ہے۔" نارائن نے غجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا "دھکی کی دوستی نے مجھے اپنے فرض سے غافل کر دیا تھا شاید مجھے اسی کی سزا مل رہی ہے۔ جب پاس کو میری اس حرکت کا پتا چلے گا تو وہ میری کھال اتار کر پورے بدن پر سرچوں کا لپ کر دے گا۔"

"شرما تو بدھ میں تمہارے ساتھ کچھ ہمارا کرے گا۔" میں نے سننا نہ ہوئے لہجے میں کہا "میں ابھی تمہارا جو حشر کرنے والا ہوں اس کے تصور ہی سے تمہاری روح بے ہوا جائے گی۔"

"ت۔۔۔۔۔ تم نے مجھے زندہ۔۔۔۔۔ چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے۔۔۔۔۔" وہ کسی بھکاری کے مانند ٹھکرایا۔

"جھپٹے زندگی کی بھوک مانگتے دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ تم واقعی کوئی بھکشو ہو مگر تم بدھ بھکشو نہیں بلکہ ہندو بھکاری ہو۔" ایک لمبے کورک کر میں نے زہر لیے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"مناؤ۔۔۔۔۔ تم نے اپنے پاس شرما سے کون سا جھوٹ بولا ہے؟"

میں شرما کے بارے میں نارائن کو اس لیے بھی کرید رہا تھا تاکہ یہ جاننے کی کوشش کر سکوں کہ اس کے ڈاڑھے میرے دشمنوں سے کس طور سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ شرما ایک نئے قہقے کے روپ میں میرے سامنے ابھر رہا تھا۔ مجھ میں اس کی دلچسپی تو یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی میرے دشمنوں کا رشتہ دار ہے!

نارائن نے بتایا "میں نے بدھانکا تھا کہ میں شرما سے رابطہ کر کے اسے بتایا ہے کہ مجھے شک ہے میں تم لوگوں کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ میں نے شرما سے یہ جھوٹ بھی بولا کہ اس وقت میں بدھانکا تھا اور سندری جل کے درمیان سفر کر رہا ہوں۔ شرما نے مجھے حکم دیا کہ میں سندری جل میں کوچ سے اتر جاؤں۔ وہاں سے دو نئے افراد تم لوگوں کے تعاقب میں لگ جائیں گے اور اسی کوچ میں سفر کرتے ہوئے کوادری تک پہنچیں گے۔ میں نے جھوٹ بول کر سندری جل میں رکھنے کا جواز تو پیدا کر لیا تھا مگر تم نے بازی ہی ہلٹ دی۔"

"تم دھکی کے ساتھ ان ویران پہاڑیوں کی طرف کیا کرنے آرہے تھے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں پوچھا "کیا اس نئی نوئی دوستی کو ایک ہی ملاقات میں چھوڑنے کا ارادہ تھا؟"

وہ میرے الفاظ میں جھپی ہوئی تلخ حقیقت تک پہنچ گیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے غدا سے نظر جھکا لیا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لہذا اس کے "عزائم" کے قہقے کو گول کرتے ہوئے میں نے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"سندری جل سے تمہارے کون سے دو آدمی کوچ میں سوار ہوں گے؟"

"میں ان سے واقف نہیں ہوں۔" اس نے جواب دیا "شرما کو میں نے تم تینوں کے حلیوں اور وضع قطع کے بارے میں تعینا بتا دیا ہے۔ یہ معلومات ان دو افراد تک پہنچا دی گئی ہیں۔ عین ممکن ہے وہ اس وقت کوچ میں بیٹھے تم لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان دونوں افراد کا تعلق سندری جل ہی سے ہے۔"

"ادھ" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایک پورا لیٹ درک ہمارے خلاف متحرک ہو چکا تھا۔ میں نے نارائن سے دریافت کیا "تم اپنے پاس شرما کے کس طرح رابطہ کرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی موبائل فون وغیرہ موجود ہے؟"

میں نے اس سے جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا اور ان لحاظات میں وہ رقیبت پر زندہ رہنا چاہتا تھا لہذا وہ چپ چاپ شرافت سے تھکان کرتا چلا گیا۔ اس نے اپنے لباس میں ہاتھ ٹھکایا اور ایک موبائل فون نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے وہ تیل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بھکاری سے مخاطب لہجے میں کہا "ہمارے ساتھ تو تم نے جو کیا سو کیا مگر اپنے پاس شرما سے تم نے کی غدا دی کی ہے اور تم جانتے ہو غدا کی سزا کیا ہوگی؟"

"مم۔۔۔۔۔ مگر تم نے مجھے چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے۔" اس کے چہرے پر زردی کھنڈی۔

میں نے اس کے گرد بیان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا، تمہیں جان سے نہیں اداں گا لیکن اس نئے دشمن شرما کا خیال رکھنا میری ضروری ہے۔" اس نے مجھ سے نئی نئی دشمنی کی ہے اور اس دشمنی کے پہلے ہی لاؤڈ میں اس نے اچھے خاصے پوائنٹ حاصل کر لیے ہیں۔ پتا لگے وہ جھپٹے کوئی سزا دے پائے گا یا نہیں سوچنا ہوں کہ میں ہی اس کا تھوڑا ہاتھ ملا دوں!"

"ت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟" وہ وحشت زدہ انداز میں بھلایا۔

میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے سفاکی سے کہا "دیکھتے جاؤ میں کچھ چھپا کر توڑی کر رہا ہوں!" پھر میں نے دوست کے اندر اس کا بالائی لباس کھینچ کر جسم

سے الگ کر لیا۔ وہ جھٹکا میری غلامانہ کارروائی کو دیکھتا رہا۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ آلی ہوئی ایک چادر کو گنجر کی مدد سے لمبائی کے رخ دو حصوں میں تقسیم کیا اور ان دو حصوں کا عمل استعمال کرنے لگا۔

نارائن کے "نہ نہ" کرتے ہوئے میں نے ایک کپڑے سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر خوب کس کے ہاتھ دیے۔ دوسرے کپڑے سے اس کے ایک مریخ پاؤں الگ کیا اور باقی ماندہ مستطیل پارچے سے اس کی دونوں ٹانگیں ٹخنوں پر سے باندھ دیں۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ میں اس کے ساتھ یہ دیشیانہ سلوک کیوں کر رہا ہوں۔ دشمنوں کی بے درجے کیسے حرکتوں نے مجھے واقعی وحشی بنا دیا تھا۔ ایک وحشی سے یہ پوچھنا فضول بات ہے کہ وہ وحشیانہ انداز کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے!

میں نے ایسا فضول سوال کرنے والے دواہیات نارائن کو گھنیت کر چٹان کی چوٹی پر پہنچایا۔ وہ پہلے ہی میرے ہاتھوں بڑی تر کٹکٹ "تواضع" کرا چکا تھا۔ پتھر کی زمین پر گھنیت "تھچ" نے اس کی جسمانی اذیت میں لگ بھگ سولہ چاند لگا دیے۔ اس چٹان کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے مجھے یہ مشکل پچیس فٹ تک اس کے لرزے کا بچنے و جدوجہد کھینچنا پڑا ہو گا لیکن چٹان کی دوسری طرف کم از کم دو سو فٹ گہری ڈھلوان تھی اور وہ بھی عمودی! اس ڈھلوان کے اختتام پر کوئی اندھی کھائی واقع تھی۔ اس گڑھے کو میں نے اندھی کھائی اس لیے کہا کہ مجھے اس کی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے مریخ پارچے کا گولہ سا بنا کر نارائن کے منہ میں ڈھونسا تاکہ وہ کسی قسم کی فریادی کھواس نہ کر سکے اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا "دیکھو! میں اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے تمہیں جان سے نہیں مار رہا ہوں صرف تمہیں تمہارے بھگوان کے حوالے کر رہا ہوں۔ اگر تمہاری زندگی ابھی باقی ہے تو تم تھچ جاؤ گے اور اگر تمہاری سانسیں پوری ہو چکی ہیں تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ دس یویری دیری بیڈلگ نارائن!"

بات ختم کرتے ہی میں نے پاؤں کا ایک فصیلیا اٹھا اس کی تعریف پر رسید کیا۔ وہ کسی بھاری پتھر کے مانند ٹاپ گیز میں گہرے شیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اس "روپوشی" کے تین سیکنڈ بعد میں نے اس کے کھائی کی تہ میں پہنچنے کی مخصوص آواز سنی۔ پھر میں ہاتھ بھجارتے ہوئے بوے مطمئن انداز میں چٹان سے نیچے اتر آیا۔ بلندی سے پستی کی جابجبا سفر بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔



اس الٹی راہ کا مسافر بہت چلتا چلتا ہے۔ نارائن نے بھی ملحق مجاز کرداد چلا جانے کی کوشش کی ہوگی مگر میں نے اس کی گویائی پر جو ڈاٹ لگا دی تھی وہ اس بندش کے سامنے مجبور رہے جس ہو کر رہ گیا ہوگا۔ اس کی آواز کہیں سے ابھری اور نہ ہی کہیں سنائی دی۔

میں نے چٹان کی اس سمت قدیم بڑھادیے جدھر لی یان اس بدھ بکشو عورت سے نہر آتا تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے لی یان کی صورت دکھائی دی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی مجھے اکیلا دیکھ کر حیرت بھرے انداز میں مستغرق ہوئی۔

”کیا وہ بکشو ایک مرتبہ پھر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا؟“

میں نے کہا ”ہاں..... لیکن ہو سکتا ہے یہ فرار اس کی زندگی کا آخری فرار ثابت ہو“

وہ میرے سچے سے چلتی چلتی سچی سچی سمجھ گئی کہ میں نے اس بکشو کو کسی اور میں دنیا کا وہ بدلایا ہے۔ اس نے سرسری انداز میں کہا ”اس طرف میں نے بھی بکشو کے ایک ساتھی کو لہا لٹا یا ہے۔“

”بکشو کے ساتھی کو؟“ اس کی بات سن کر میں چل۔

اٹھا ”مگر تم کو تو میں نے بکشو عورت کے پاس چھوڑا تھا؟“ اس نے انہات میں سر ہلایا اور بولی ”وہ تو کوئی پہنچ ہی بے چاری عورت ہے ادھر پہنچی دور رہی ہے۔ میں جس شخص کی بات کر رہی ہوں وہ تو آج تک ہی عقب سے نمودار ہو کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا تھا۔“

میرا دھیان فوراً شرما کے ان دو بندوں کی طرف چلا گیا جن کے بارے میں نارائن نے مجھے بتایا تھا۔ وہ دونوں سندری جل سے کوادری تک ہمارے ساتھ جانے والے تھے۔ ممکن ہے ان میں سے ایک نے ہمارا تعاقب کیا ہو اور دوسرا وہاں کوچ کے آس پاس ہماری واہی کا شہر ہو!

میں لی یان کے ساتھ چلتے ہوئے فٹکی نامی اس بدھ راہبہ کے پاس آیا اور ڈوانٹ سے مشابہ لہجے میں اس سے کہا۔ ”انسان اپنی فطری خواہشات اور جبلتی تقاضوں کو کھل کر بھی داخل معاشرتی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر کس پر کنٹرول نہ ہو تو راہبائیت کی طرف نہیں آتا چاہے۔“

وہ اٹھ کر میرے قدموں میں گر گئی، پھر زار و قطار روٹے ہوئے بولی ”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہونے والی تھی۔ لاڑ بڈھا مجھے معاف کرے!“ شاید وہ مجھے بھی کوئی موک و غیرہ بھیجی تھی! میں نے شانوں سے تھام کر اسے کھڑا کیا۔ کسی لمبے چوڑے لہجے کا میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے مختصر اور دونوں الفاظ میں اس سے کہا۔

”فٹکی! میں جانتا ہوں تم سندری جل ہی کی رہنے والی ہو۔ اطمینان سے اپنے ٹھکانے پر چلی جاؤ اور جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ بھوکہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ لاڑ بڈھا تمہیں سکون دے گا۔“

پھر میں لی یان کا ہاتھ پکڑ کر واپس ہولیا۔ وہ تازہ ترین حالات جاننے کے لیے خاصی تجسس تھی۔ میں نے نارائن سے جو سنسنی خیز معلومات حاصل کی تھیں، مختصر الفاظ میں وہ لی یان کے گوش گزار کر دیں۔ وہ گہری تشویش سے بولی۔

”میں نے جس شخص کو ادھر لہا لٹا یا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ انہی دو افراد میں سے ایک ہو۔“

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ ان دو کا کوئی تیسرا ساتھی ہو؟“

”بہر حال ہمیں فوراً کاٹھانوک تک پہنچنا چاہیے۔“ ادھر لی یان کی بات ختم ہوئی ادھر میرے موبائل فون میں سائیکل الارٹ کی مخصوص نگرانی پید ہوئی۔ میں نے اپنے لہادے میں سے تل نکال کر کان سے لگالیا۔ دوسری طرف کاٹھانوک تھا۔

میرے ”ہیلو“ کے جواب میں اس نے کہا۔

”تم دونوں کہاں رہ گئے۔ ہم ادھر کوچ میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟“

”بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔“ میں نے تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے مختصر انداز میں پوچھا ”خیریت تو ہے نا پیچ؟“

”خیریت بالکل نہیں ہے کھام!“ میں نے واہی کا سسر جاری رکھتے ہوئے کاٹھانوک کو اس کے اختیاری نام سے پکارا، پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے سنگین صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”اوہ!“ میں نے کاٹھانوک کی تشویش سے لبریز مختصری آواز سنی۔

میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی ”مجھے تھا چو پر شک ہے کھام!“

”اس شخص کا نام زبان پر لائے بغیر جواب دینا کیوں کہ میں نے جن دو نئے حقائق کا ذکر کیا ہے وہ اسی شرما کے حکم کے غلام ہیں کہ سندری جل سے کوادری تک ہمارے ساتھ جا رہے گے۔ ممکن ہے، ان میں سے کوئی اس وقت تمہیں تاڑ رہا ہو اور تمہاری زبان سے شرما کا نام سن کر قہقہا ہو جائے۔“

”میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں چیٹک!“ اس نے کہا ”میرا جواب ”ہاں“ میں ہے۔ تم دونوں جلدی سے آ جاؤ۔ کوچ روانہ ہونے ہی والی ہے، ان حقائق سے بھی منٹ لیجے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی کاٹھانوک نے سیلر رابطہ موقوف کر دیا۔ اس نے بڑے واضح انداز میں مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ شرما کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے لی یان کو بھی کاٹھانوک کی معلومات کے بارے میں بتا دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم کوچ تک پہنچ گئے۔

کاٹھانوک کوچ کے داخلی دروازے کے پاس ہی ہمارا منتظر تھا۔ ہم اس کے ساتھ ہی کوچ پر سوار ہو گئے۔ نارائن اور فٹکی سندری جل میں اتر گئے تھے۔ ان کی سیٹ پر میں نے ایک کرخت صورت شخص کو بیٹھے پایا، وہ ہمارے آگے کوچ پر سوار ہوا تھا۔ اس نے تنقیدی نظر سے ہم تینوں کا جائزہ لیا اور بے چینی سے کھڑکی کے باہر نگاہ دوڑانے لگا۔ اس کی بے تاب نظر کسی خاص شے کو تلاش کر رہی تھی۔ جب داخل انداز میں ہم اپنی مختلف سیٹوں پر بیٹھ چکے کوچ حرکت میں آگئی۔ اسی وقت وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ڈرائیور سے مخاطب ہوتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

”گازی روکو! ابھی میرا ساتھی نہیں آیا ہے!“

”تم تو یہیں سے کوچ میں سوار ہوئے ہو“ ایک مسافر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہارا ساتھی کہاں سے آ گیا؟“ اس شخص پر نظر پڑے ہی ہم تینوں پر غوطی بھگے گئے کہ وہ ان دو افراد میں سے ایک ہے جو سندری جل سے کوادری تک ہمارے ساتھ جانے والے تھے۔ اسے اکیلے دیکھ کر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے جس ساتھی کا انتظار کر رہا تھا، وہ فوری طور پر لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا، لی یان نے اسے ادھر پہاڑیوں میں اٹنا ٹھیل کر دیا تھا۔

اس شخص نے بھگے ہوئے لہجے میں، سوال کرنے والے سے کہا ”میں نے کوادری تک سسر کرنے کے لیے دو گھنٹہ خریدے ہیں۔ اگر میرا کوئی ساتھی نہیں تو کیا میں تمہیں پانچ نظر آتا ہو جو دو گھنٹہ خرید کر اکیلا سسر کروں گا؟“

کوچ کے ڈرائیور نے بریک لگا دیے اور اس کی تائید

کرتے ہوئے کہا ”بے شک تم نے مجھے سے دو گھنٹہ حاصل کیے ہیں لیکن تمہارا ساتھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا!“ پھر اس نے اپنی رست و اوج پر نگاہ ڈالی اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں صرف پانچ منٹ تک یہاں رک سکتا ہوں۔ اس کے بعد اگر ہم یہاں سے روانہ نہ ہوتے تو پھر دن ڈھلنے سے پہلے کوادری نہیں پہنچ سکتے گے۔ میں رات ہو جانے کے بعد اس خطرناک راستے پر ڈرائیو تک مار کر ہرگز نہیں لے سکتا۔“

دوسرے مسافر بھی شور کرنے لگے کہ ایک مسافر کے لیے ان کی راہ کیوں کھولی کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے، کوئی بھی یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا کہ رات کی تاریکی میں سسر کرتے ہوئے وہ موت کے منہ میں چلا جائے! ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

”گر تمہارا ساتھی نہیں پہنچا تو تم بھی پیچھا چڑھاؤ۔ تم دونوں کسی اور بس سے آ جاؤ۔“

اس شخص نے خوں خوار نظر سے مشورہ دینے والے کو گھورا اور جب سے موبائل فون نکال کر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ ڈرائیور چونکہ اسے پانچ منٹ کی مہلت دے چکا تھا ہذا فی الحال کوچ کے آگے بڑھنے کا امکان نہیں تھا۔ سب بھی سمجھ گئے کہ وہ اپنے پھڑے ہوئے ساتھی کو فون کر رہا ہے

ہم سب کی نگاہیں اسی پر متمرکز ہوئی تھیں۔ اس نے فہرلنے کے بعد دھیمی آواز میں ایک دوسرے ”ہیلو“..... ہیلو مکمل آئند“ کے الفاظ توہرائے اور پھر رابطہ منقطع کر کے وہ موبائل کے کی پیڈ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ جب اس نے کافی دیر تک سیل کو کان سے نہیں لگایا تو میں سمجھ گیا، اس نے کسی کو شارت بھیج کیا تھا۔ اس بھیج کے جواب میں اسے بھی پیغام موصول ہوا اور وہ سیل کو جیب میں رکھتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔

”تم گازی آگے بڑھا سکتے ہو۔ میرے ساتھی نے سسر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ اطمینان کے ساتھ سیٹ پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ کوچ دوبارہ حرکت میں آئی اور جیسے ہی وہ سندری جل کی حدود سے نکلی تو لی یان نے تشویش بھرے انداز میں سرگوشی کی ”کیا اس نے اپنے ساتھی ہی سے رابطہ کیا ہوگا؟“

”پہلے اس نے اپنے ساتھی مکمل آئند کو فون کرنے کی کوشش کی تھی“ میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا ”لیکن مکمل آئند کو تو تم نے بڑی گہری فینڈ سلا دیا ہے۔ مکمل کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد اس نے جیتنا اپنے پاس سسر کرنا بھیج کیا ہے اور وہاں سے نئی ہدایات پانے کے بعد ہی یہ شانت ہو کر بیٹھا ہے۔“

”کیا ہم کوادری تک اسے اپنے ساتھ لے کر جا سکتے

دشمن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے فوری طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ اسے کوچ سے باہر پھینک کر ہم آگے بڑھ جائیں گے۔ میں نے اس شخص کا جائزہ لیا تو اس کی کیفیت کو خاصا تشویش ناک پایا۔ جڑے پر بڑنے والے میرے طوفانی بیج نے اس کے دہانے کو مکمل طور پر پھینکنے مانا دیا تھا اور کن بیجوں کا حراج پوچھنے والے چوبیس نے اسے اس قابل نہیں سمجھو اتھا کہ وہ ہاتھ کیا، مجھ پر انگلی بھی اٹھا سکے۔

میں نے اپنے ارادے پر عمل کرنے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے تھے کہ اس کے لباس میں کہیں موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ٹوٹ کر وہ موبائل دریافت کر لیا پھر ”میں“ کا بیج پر لیس کرنے کے بعد اسے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے بولنے والے نے جھکنا نہ لیجے میں کہا ”سوریا! تم ٹھیک دس منٹ کے بعد گاڑی کو روک دیتا۔ ہم پہنچ رہے ہیں!“

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ حکم دینے والے نے سوریا نامی اس شخص کی زبان سے ایک لفظ بھی سننا کوار نہیں کیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ اس کا لباس شرما ہوگا۔ میرے پاس عمل کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ آج وہ دو منٹ میں، میں نے گاٹاٹوک کی مدد سے سوریا کو کھینچ کر کوچ سے باہر پھینک دیا پھر دروازہ بند کرتے ہوئے چیخ کر ڈرائیور سے کہا۔ ”گاڑی کو آگے بڑھاؤ..... فوراً!“

ڈرائیور نے میرے احکام کی تعمیل میں کوچ کو آگے بڑھا دیا۔

میں واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک مخصوص آواز سن کر چونک اٹھا۔ میری طرح لی یان اور گاٹاٹوک نے بھی وہ آواز سماعت کر لی تھی اور وہ بھی کوچ کی کھڑکیوں سے باہر نظریں دوڑا رہے تھے۔ ہم سب کی نگاہوں کا ٹارگٹ بننا جلد والی آسمان تھا کیونکہ وہ مخصوص آواز اسی سمت سے آرہی تھی۔ پھر وہ آواز بدتر تیز ہوتی چلی گئی۔

ہم تینوں نے بے یک وقت سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمارے ذہنوں میں اس وقت ایک ہی سوچ تھی۔ وہ مخصوص آواز کسی ہیلی کاپٹر کی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے ہم نے دھلی دھلائی نفا میں ایک سیاہ نقطہ کو نمودار ہوتے دیکھا جو آنا تھا۔۔۔ اپنا سائز بڑھاتا چلا گیا۔ اس سیاہ دھبے نے چند سیکنڈ میں ہیلی کاپٹر کی شکل اختیار کر لی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دشمن ہیلی کاپٹر ہمارے سر پہنچ گیا!

”اس کی تشریح میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے حتیٰ الجحیم میں کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کو داری میں ہمارے ”استقبال“ کا خاطر خواہ بندوبست کر دیا گیا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ راستے ہی میں اس ”مہربان“ کی کھوڑی خاطر داری کردی جائے۔“

”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ وہ میرے الفاظ کی یقینی کو محسوس کرتے ہوئے متحضر ہوئی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر گاٹاٹوک کے کندھے پر ”دھتک“ دی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو میں نے نگاہ کے اشارے سے اسے کچھ پوچھا۔ اس کی آنکھوں نے تاہیہ جھنک کی۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور اس شخص کے سامنے آ کر جھکنا نہ انداز میں کہا ”کیٹ اپ!“

وہ مجھے اپنے مقابل پا کر ایک لمحے کو غصا بھرا اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ نے بڑی سرعت سے حرکت کی۔ میرے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے وہ اپنی جیب کو نکل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا، وہ گن نکالے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آتا، میں نے اس کے چوڑے جڑے پر ایک دھانسوٹوم کا بیج چڑھ دیا۔

میرا خطرناک بیج کھا کر وہ بوکھلا گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے مجھے دھواں دھار کر مارنے کی کوشش کی۔ میں پہلے سے اس کے ردعمل کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میں نے اس کے اٹھنے ہوئے سر پر ایک بے یک دو طرفہ چوہ رسید کر دیے۔ میرے کھلے ہاتھوں کی خطرناک ضربات نے اس کی کن بیجوں کا حراج پوچھ لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو کھاتے ہوئے سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ ڈرائیور نے اسی لمحے کوچ روک دی۔ ہم سب سدری محل سے کافی آگے نکل آئے تھے اور کوچ جس مقام پر ٹھہری تھی، وہاں سے چاروں جانب تاحہ رنگہ پہاڑ ہی پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ اس کوچ کے مسافروں میں بدھ بھکشوؤں کی اکثریت تھی اور وہ سب میری اس جرأت رندانہ پراختیہ پر تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

بدھ مت کے پیروکار ایک چوٹی کو مارا بھی منانہ عظیم سمجھتے ہیں۔ ان کی حیرت اور تشویش کا سبب یہ تھا کہ میں اس وقت ایک بدھ بھکشو کے روپ میں ان کا ہم سفر تھا!

وہ سب سبھی ہوئی نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی بے حس و حرکت پڑے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ اس وحشت ناک منظر نے ان پر شائنا طاری کر دیا تھا۔ میں انہیں نظر انداز کر کے اپنے

وہ بڑے سستی خیرگمات تھے۔ وقت کی ایک نامہربان کروت نے ہمیں موت کے ہانپے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بس ایک بے رحم تجزیہ کے کی کسرباتی تھی، اس کے بعد ہم ڈھ دیگی میں پڑے نظر آتے۔ ہمارے سر دس پرمٹھ لانے والا سیاہ بلی کا پتھر بڑے خطرناک موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس ہوائی رتھ پر سوار ہو کر آنے والے موت کے بیوہاری تھے۔ اور خاص طور پر ہمارے لیے وہاں بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی جاں لیا کارروائی کا آغاز کرے ہمیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے، میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر کوچ کے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے جیج کر کہا۔ ”کاشا لوک، لی یان..... کم آن، ہری اپ..... تو نیک“

وہ ایسی صورت حال نہیں تھی کہ میں مصلحت کے قانع نہاتے ہوئے انہیں اختیاری ناموں سے پکارتا۔ ہم نے جن سے جیسے کے لیے وہ نام اپنائے تھے، ہماری روپوشی ان کے سامنے چل چکی تھی۔ دروازے کے قریب کچھ کر میں ڈرائیور پر چلایا ”گاڑی کو فوراً روک دو!“

میں نے تھوڑی دیر پہلے جس قسم کے رویے کا مظاہرہ کر کے سوچا کہ کون سا آؤٹ کیا تھا، وہ تمام مسافروں کے دلوں میں میری دہشت بٹھانے کے لیے کا تھا۔ خاص طور پر کوچ کا ڈرائیور مجھ سے کچھ زیادہ ہی ”متاثر“ دکھائی دیتا تھا جیسے اس نے پہلے، میرے حکم پر کوچ کو فوراً آگے بڑھا دیا تھا، بالکل ایسے ہی اس نے اس بار بھی میرے حکم کی نیکل کر دی۔ اگلے ہی لمحے سوکس مٹی ایکسپریس سڑک کے کنارے رک گئی۔ اس دوران میں ہمیں ہیلی کاپٹر ہم سے سوگڑ آگے اس مشکل اور دشوار مرکز پر لینڈ کر چکا تھا۔ اس محفوظ لینڈنگ سے پائلٹ کی مہارت کا پتا چلتا تھا۔۔۔۔۔ میں جانتا تھا، اس بلی کاپٹر پر سوار ہو کر کتنے لوگ ہم پر ہلہ بولنے آئے ہیں۔ البتہ، یہ بات یقینی تھی کہ وہ فوری طور پر کوئی خوں ریز کارروائی نہیں کریں گے۔ میرے اس یقین کی ٹھوس وجوہات تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ سب اس کے پاس کے احکام کو خود سنا تھا۔ سوچا کہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ٹھیک دس منٹ بعد کوچ روکا دے اور اب وہ کوچ سڑک کے کنارے رک چکی تھی، یہ الگ بات کہ کوچ کو سوراہے میں نہیں بلکہ میں نے رکھنا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ بلی کاپٹر والے یہی سمجھیں گے، سوچا یا ایکشن میں آ چکا ہے۔ وہ سوچا یہ رابطہ کیے بغیر کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اگر مجھے فوری طور پر موت کے

گھاٹ اتارنے کا منصوبہ ہوتا تو وہیں کھینڈ میں نارائن (نفل بدھ بیکشو) سے یہ کام لیا جاسکتا تھا۔ میرے دشمن مجھے زندہ پکڑ کر زیادہ خوش محسوس کرتے۔۔۔۔۔ اور میرا یہ فرض جتنا تھا کہ انہیں ایک عظیم خوش فہمی میں جلا کر کھوں!

جب تک میں کوچ کے دروازے تک پہنچتا، کاشا لوک اور لی یان نے بھی سیٹ چھوڑ دی۔ تھا چو بھی ان کی تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تاہم قافلے میں شامل دیگر بیکشو اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے۔ میں نے بدھانکا تھا سے روانہ ہوتے وقت کاشا لوک کو ٹپکی بدھ بیکشو نارائن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور سندری عمل والے واقعات سے بھی وہ آگاہ تھا۔ تھا چو اور کاشا لوک کوچ کی ایک ہی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے لہذا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے درمیان موجود صورت حال پر بات نہ ہوئی ہو۔ تھا چو کے دیگر ساتھیوں کی پراسن خاموشی سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس نے انہیں خصوصی ہدایات دے دی تھیں اسی لیے وہ کوچ سے نکلنے کے سلسلے میں تھا چو کی تقلید نہیں کر رہے تھے۔

میں نے دروازہ کھولنے کے لیے جیسے ہی ہینڈل پر ہاتھ رکھا، میرے لباس میں موجود سواہل کا پیرنٹ اٹھا۔ کھٹکی کی مخصوص ٹون سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ سوچا یا والا سواہل تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ اس کا پاس شرما، اس سے رابطہ کر کے موجودہ صورت حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ سوچا یا کوچ سے ”بے دخل“ کرتے وقت میں نے اس کے تیل کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

میں نے تیل کو لباس سے برآمد کیا اور کان سے لگا کر بدلی ہوئی آواز میں ”ہیلو“ کہا۔

سوچا یا جب کوچ کے ڈرائیور اور دیگر مسافروں سے ہم کلام ہوا تھا تو میں نے لب و لہجہ کو بغور سنا تھا اور اس وقت میں نے آواز بدل کر اسی کے لب و لہجہ کی تقلید کرنے کی کوشش کی تھی اور میری یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔ میرے ”ہیلو“ کے جواب میں ٹھکانہ انداز میں پوچھا گیا۔ ”سوچا یا! اندر کی کیا صورت حال ہے؟“

میں نے بولنے والے کی آواز کو فوراً شناخت کر لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے سوچا یا کو ہدایت دی تھی کہ وہ ٹھیک دس منٹ بعد کوچ روکا دے۔۔۔۔۔ اور میرے قیاس کے مطابق وہ سوچا یا کے پاس شرما کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اس وقت یہ نفسیاتی بلی کاپٹر میں موجود ہوگا۔ اس کے لیے کے اہتمام سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ مذکورہ کوچ، اس

کے حکم پر سوچا یا نے رکوائی ہے، اس بے چارے کو کیا مظلوم کہ میں اس کے مہرے سوچا یا کو کین سوکر پیچھے پیچھا آیا تھا! میں نے سوچا یا کی آواز کی تقلید جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور بدلے ہوئے لہجے میں کہا ”پاس! یہاں کی صورت حال مکمل طور پر میرے کنٹرول میں ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں ان لوگوں کو کین پوائنٹ پر رکھ کر کوچ سے نیچے اتاروں۔“

دوسری جانب کاشا لوک نے تذبذب اور تاثر سے کام لیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ مختصر سا تردد میری آواز کے سلسلے میں تھا یا اس فیصلے کے بارے میں جو جوڑ میں نے آگے بڑھا لی تھی۔ موجودہ صورت حال میں سب کچھ ممکن تھا۔ اگلے ہی لمحے متوقع شرمانے جو جواب دیا اس سے مجھے خاصا اطمینان۔۔۔۔۔

وسکون محسوس ہوا۔ ”ٹھیک ہے، تم انہیں کین پوائنٹ پر گاڑی سے باہر لاؤ۔“ مجھ سے کہا گیا ”میں بلی کاپٹر میں موجود ہوں اور دو مسلح افراد کو تھماری مدد کے لیے نیچے اتار رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور سوالیہ نظر سے کاشا لوک کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے جادو کا ہاتھ بٹھا دیا اور اپنے دو میلے ڈھالے لباس میں سے ایک خطرناک کن کٹال کر میری سمت بڑھا دی۔ وہ اوزی تھی۔ آٹھیں اسلحہ سے واقفیت رکھنے والے اوزی کی ہلاکت خیزی کے بارے میں بخوبی جانتے ہیں۔ یہ ایک کم وزن اور زیادہ مار کرنے والی آٹو بیگ کین ہے۔ کاشا لوک نے ایمونیشن کے استعمال کی خصوصی ٹریننگ لے رکھی تھی اور اس کے ذخیرے میں، میں نے ہر نوعیت کا آٹھیں اسلحہ دیکھا تھا۔ یہ اوزی کین اس ذخیرے کا ایک دانہ تھی۔

لگتا تھا، ان گمات میں حالات اور ستارے اچانک ہماری موافقت میں چلنے لگے ہوں، ورنہ شرما بھی کہہ سکتا تھا، سوچا یا! تم ادر کوچ میں ہی روک۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ اگر تقدیر نے ہمیں ایک موقع فراہم کر دیا تھا تو اس سے فائدہ اٹھانا ہم پر فرض تھا۔ میں نے اوزی کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد کوچ کے شیشے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ایک بے حد گہری ڈھلوان دکھائی دی۔ میں نے ایک فوری فیصلے پر پہنچے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تم سب کین پوائنٹ پر میرے آگے آگے کوچ سے باہر نکلو گے اور سڑک کے کنارے پہنچے ہی تم جی اٹھا مکان تیزی سے ڈھلوان میں اترتے چلے جاؤ گے۔ مگر مند ہونے

میرے لہجے میں موت کی سرسراہٹ تھی۔

کی ضرورت نہیں، عقب میں، میں کور دینے کے لیے موجود رہوں گا!“

سب نے میکا کی انداز میں اپنے اپنے سر کو جنبش دی۔ کوچ میں موجود تمام مسافروں کو چھپے کی سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ کسی نے ہماری ہنگامی کارروائی کی مداخلت کی اور نہ ہی ایک لفظ زبان سے ادا کیا۔ میں نے خاص طور پر کوچ کے ڈرائیور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”اسنے دشمنوں سے نمٹ کر ہم جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ تم اپنی کوچ کے ساتھ ہمیں ہمارا انتظار کرنا!“

میرا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ وہ انہماک میں سر جھکانے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے کوچ کے ڈرائیور کو احتیاطاً اس قسم کی ہدایت دی تھی۔ اس طرح یہ سمجھتا تھا کہ اگر ہم واقعی اپنے دشمنوں سے جلدی نمٹ لیتے تو آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ سوکس مٹی ایکسپریس ہمارے سفر کے تمام مسائل حل کر دیتی۔

میں نے تنقیدی نگاہ سے دھڑا کر کے پار سڑک کا جائزہ لیا۔ وہ سیاہ بلی کاپٹر کوچ سے لگ بھگ سوگڑ کے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس دوران میں دو مسلح افراد بلی کاپٹر میں سے برآمد ہو کر ہماری جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔ اب ایک ایک سینکڑہا ہتھیار تھیں اور سستی خیرگمات۔

میری آنکھ کے اشارے پر کاشا لوک نے کوچ کا دروازہ کھول دیا۔ سب سے آگے وہی تھا۔ وہ ”ہینڈلر اپ“ کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے کوچ سے نیچے اتر گیا۔ اس کے پیچھے لی یان اور تھا چو نے کوچ کو خیر باد کہا۔ سب سے آخر میں، میں خطرناک اوزی تھا سے باہر آ گیا۔ پلک جھپکتے

میں، ہم سڑک کے کنارے کھٹکے گئے۔ ”کو!“ میں نے بلند آواز میں کہا اور تیزی سے پلٹ گیا۔

اب میری کین کا منہ ان دو افراد کی طرف اٹھا ہوا تھا جو مسلح ہو کر ہماری جانب آرہے تھے۔ میں اپنے عقب میں نہیں دیکھ سکتا تھا، میرے ساتھیوں نے کس انداز میں نشیب کی سمت دوڑ لگائی ہوگی، البتہ مسلح افراد کے چوٹنے نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ انہوں نے نشیب کی طرف دیکھتے ہوئے فائرنگ شروع کر دی۔

پرسکون اور خاموش فضا کو یوں کی تڑتڑاہٹ سے کوخ اٹھی۔ یہ ان کین بردار افراد کا ایک خطرناک ریزل تھا کہ انہوں نے ہمارے دلوں کو کٹنا نہ بتانے کی کوشش کی ورنہ

نارنگ کے اعتبار سے میں ان کے زیادہ قریب تھا۔ ان کی برست فارنگ بے سود ثابت ہوئی تو انہوں نے میری جانب رخ پھیر لیا۔

میں تو ان کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ اوزی کے ایک مختصر اور سریلے برست نے انہیں گولیاں کھا کر زمین بوس ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اس اثنا میں وہ کوچ اور بلی کا پڑے درمیان بچنے لگے تھے۔ لہذا میری فارنگ نہایت ہی موثر ثابت ہوئی۔

میں نے ان کے ٹھنڈا ہوتے ہی بلی کا پڑے کی سمت نگاہ دوڑائی اور یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ: ہاں سے دو افراد کل کر نشیب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں پوری طرح مسلح تھے اور ان کی چال و رفتار سے مستعدی بخشتی تھی۔ وہ دونوں فارنگ رخ سے باہر تھے۔ لہذا میں نے راؤڈر ضائع کرنے کی غلطی نہ کی اور ایک محفوظ زاویے سے اپنے ساتھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔

میں نے نشیب میں تھوڑا آگے آنے کے بعد پلٹ کر دیکھا تو چیچے سڑک پر ایک شخص کو ٹھکانا انداز میں چلاتے ہوئے پایا۔ وہ کاشا لوک، لی یان اور تھاچو کی طرف جانے والے اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کر ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے رعب اور اسٹائل نے مجھے سمجھا دیا، وہ مسٹر شرما کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں اُدھے نیچے پھردن کی آڈیلیے ہوئے تیزی سے نشیب میں اترتا چلا گیا۔

بلی کا پڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچنے والوں میں سے دو افراد کو میں نے سڑک پر بھون ڈالا تھا، دو ہمارے تعاقب میں تھے، شرما ادھر سڑک پر ہی کھڑا ہو کر اپنے مہروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ پتا نہیں، بلی کا پڑے کے اندر ہمارے اور کتنے دشمن موجود تھے۔ اگر ہم جلد از جلد کی پناہ گاہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو جاتے تو موجودہ صورت حال ہمارے لیے بڑی تشویش ناک ہو جاتی۔

میں نے رگ نیک بھاگتے ہوئے، نشیب میں اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے دکھائی نہ دیا۔ اس خطرناک لکھنیا راتے پر جا بجا چھوٹی بڑی پتھر بلی چٹائیں جھیلی ہوئی تھیں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ کاشا لوک وغیرہ اس وقت کسی بڑی چٹان کے عقب میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں اپنے مخصوص زاویے پر محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس دوران میں دو قلعے دو قلعے سے میں سڑک بھیجے بھی دیکھ لیتا تاکہ ہمارے تعاقب میں آنے والے دشمنوں کی پوزیشن کا

اندازہ ہو سکے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد حیرت انگیز طور پر وہ بھی میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ وہ دونوں مسلح افراد لی یان، کاشا لوک اور تھاچو کے تعاقب میں لگے تھے اور میری پیش قدمی کا زاویہ قدرے مختلف تھا، شاید اسی لیے بھی میں انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔ آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہذا میں نے ایک لمحے بھی رک کر انہیں تلاش کرنے کا رسک نہ لیا۔

لگ بھگ دو منٹ بعد یکا یک مجھے رک جانا پڑا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے گویا ہاتھ بڑھا کر میرے قدم پکڑ لیے ہوں۔ اس غمراؤ کا سبب عقب میں ابھرنے والی شدید ترین فارنگ کی آواز تھی۔ میں نے میکا کی انداز میں پلٹ کر دیکھا۔ وہاں سے سڑک واضح طور پر نظر نہیں آتی تھی جہاں ہم کوچ اور بلی کا پڑے کو کھڑا... چھوڑ آئے تھے۔ تاہم فارنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخصوص آوازوں نے مجھے بتا دیا کہ وہ فارنگ کوچ کے ٹارو کو نشانہ بناتے ہوئے کی گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے تازہ بخنے کی آوازیں ابھریں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ فوری طور پر یہی بات سمجھ میں آئی کہ شرما یا اس کے کسی ساتھی نے کوچ کے قریب پہنچ کر اس کے ٹاروؤں پر بے دریغ فارنگ کی تھی تاکہ کسی بھی صورت وہ کوچ آگے سفر جاری نہ رکھ سکے۔

ایک بات سے مجھے قلبی اطمینان حاصل ہوا کہ اس فارنگ نے بس کے کسی مسافر کو زدگی کی آخری چیخ مارنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ شرما نے فارنگ سے قبل کوچ کے اندر جھانک کر ضرور دیکھ لیا ہوگا۔ اپنے شکار کو ہاں موجود نہ پا کر وہ بے طرح بھلا یا ہوگا اور اسی بھلاہٹ میں اس نے کوچ کے ٹاروؤں کو برست کر کے اسے ناکارہ بنادیا تھا۔ میں نے شرما، بلی کا پڑے اور کوچ کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور نشیب کی سمت قدم بڑھا دیا۔

اب میں نے پیش قدمی کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کر دیا۔ اس زاویے پر سفر کرتے ہوئے میں کچھ آگے جا کر اپنے ساتھیوں سے مل سکتا تھا۔ اس رخ پر تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ سڑک پھر دکھائی دینے لگی جہاں سے ہم نے نشیبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بجنا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا تاہم اس کی فراہم کردہ حرارت، نقصان رچی کی خنکی کو پوری طرح زائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت حرارت اور خنکی کے درمیان زبردست مقابلہ جاری تھا اور آرائی سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ بالآخر خیریت خنکی کے حصے میں آئے گی۔ کوئی لمحہ

پانا تھا کہ حرارت کا منہج، عظیم الجثہ اور چربیت بھاڑ کی اوٹ میں چہرہ چھپانے والا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ اپنی تمام تر شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ استاد تھا۔ اس کی بلندی اور جامت کے آگے ہر شے بہت ہی چھوٹی۔۔۔۔۔ بہت ہی مختصر دکھائی دیتی تھی۔ اس کی برف پوش چٹائیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے سفید اور اعلیٰ اون کی ٹوپیاں پہن رکھی ہوں۔ یہ ایک دل کش اور نظر فریب نظارہ تھا۔۔۔۔۔ مبہوت کر دینے والا!

میں نشیب میں کافی نیچے اتر آیا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے دشمنوں یا دوستوں میں سے کسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ دن کا وقت تھا اور جاگے لے ہر منظر کو واضح کر رکھا تھا، پھر وہ مجھے کیوں دکھائی نہیں دے رہے تھے؟ اس صورت حال نے مجھے اچھا دیا۔ میں رک گیا اور پلٹ کر بلندی کی طرف نگاہ دوڑائی۔

ایک شخص کو میں نے سڑک سے اتر کر اس طرف آتے ہوئے پایا۔ میرے اور سڑک کے درمیان اب اس قدر فاصلہ مائل ہو چکا تھا کہ فوری طور پر میں یہ انداز قائم نہ کر سکا کہ وہ دشمن کا کوئی آدمی تھا یا کوچ کا کوئی مسافر! اس شخص کے بارے میں، میں غور ہی کر رہا تھا کہ یک لخت مجھے چونک جانا پڑا۔ میری ہائیں جانب، ایک چٹان کے عقب سے فارنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ میں ایک محفوظ آڈے کر کھڑا ہوا گیا۔ وہ ایک سنگل شاٹ تھا۔ اس فارنگ کا جواب فوری طور پر دیا گیا۔ فضا ایک خوف ناک برست سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کی دردناک آواز ابھری۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ ہوئی کہ موت کا فرشتہ میرے آس پاس ہی نہیں منزل لا رہا تھا۔ اس فارنگ کے نتیجے میں کون کتنے اہل ہاتھ اس کے بارے میں، میں دو شک سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کوئی دشمن بھی ہو سکتا تھا اور دوست بھی!

میرے پورے وجود میں سننا نہایت دوڑنے لگی۔ صورت حال بڑی تشویش ناک ہو گئی تھی۔ ایسی غیر یقینی بھگتوں میں نے بھی رات کی تاریکی میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہجرون دہائے چٹائی آ رہی تھی۔ پہاڑوں کے دامن میں واقع اس چٹائی اور چیخ نے نگاہ کے زاویے کو بڑبڑ کر کے رکھ دیا تھا۔ میدانی علاقے کی بہ نسبت پہاڑی علاقے میں کسی کا تعاقب جاری رکھنا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میں اس محفوظ آڈے میں محتاط قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ چٹان کے آخری سرے پر پہنچ کر میں نے گردن نکال کر دیکھا۔ دوسری طرف میں گز کے فاصلے پر مجھے ایک شخص کی

خون چکان لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ انہیں مسلح دو افراد میں سے ایک تھا جو میرے ساتھیوں کے تعاقب میں بلی کا پڑے سے یہاں تک پہنچے تھے۔ اگلے ہی لمحے اس لاش کو وہیں چھوڑ کر میری نگاہ آگے کو اٹھ گئی۔ میں نے ہلاک ہونے والے دشمن کے ساتھی کو بڑی تیزی سے بلندی کی جانب دوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دوڑنے کا زاویہ بالائی سڑک کی سمت نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ فرار نہیں ہو رہا تھا بلکہ کاشا لوک وغیرہ کے تعاقب میں اس طرف جا رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ میں نے ابھی جس دشمن کی لاش کو خون میں لت پت پڑے دیکھا تھا، وہ میرے ساتھیوں میں سے کسی کے ہاتھوں ختم ہوا تھا۔

میں اوزی تھاے اپنے دشمن کے تعاقب میں لگ گیا۔ یہ گن مجھے کاشا لوک نے فراہم کی تھی۔ اس بات کے قوی امکان تھے کہ اس نے اپنے لباس میں اور بھی خطرناک ہتھیار چھپا رکھے ہوں گے۔ کاشا لوک ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے حراج کا مالک ایک گہرا شخص تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے مجھے بہت کم وقت ملا تھا اور اس قلیل مدت میں، میں اسے اچھا خاصا سمجھ گیا تھا۔

انہی خیالات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جب تک میں اس شخص کے قریب پہنچتا، وہ ایک بڑی چٹان کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے فضا ایک مرتبہ پھر فارنگ کی مخصوص تڑتار میں سے گونج اٹھی۔ میں نہیں جانتا تھا، کس نے کس پر گولیاں برسائی ہوں گی۔ وہ یک طرفہ فارنگ کی آواز تھی اور اس آواز کے نتیجے میں کرب ناک انسانی چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے گن کو تیار حالت میں تھاے تھاے مکنت تیزی سے چٹان کی جانب دوڑ لگا دی۔ ان سنگین لحات میں میرے ساتھیوں کو میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔

میں مذکورہ چٹان تک گیا، پھر جیسے ہی محسوس میں نے دوسری طرف جانا چاہا، میں نے اپنے عقب میں کوئی گڑبڑ محسوس کی۔ میری چپٹی حس نے مجھے خبردار کیا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے بلی کی سی سرعت سے پلٹ کر چیچے دیکھا اور ایک دشمن میری نگاہ میں آ گیا۔

یہ دیکھنا وہی شخص تھا جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے سڑک سے اتر کر، اس سمت بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جس قسم کی حرکت کرنے جا رہا تھا اس سے واضح ہو گیا کہ وہ بھی شرما کے گردہ ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں قہمی ہوئی گن کو میرے قدموں کی جانب جھکا رکھا تھا اور اس میں

کے کہ وہ فریکر پر انگلی دباتا، میں نے ایک ہائی جپ لگاتے ہوئے اس پر فائرنگ کر دی۔

میری اچھلنے والی احتیاط بروقت کام آگئی۔ دو طرفہ فائرنگ نے ایک مرتبہ پھر کو ہستانی فضا کو پاش پاش کر دیا۔ اگر میں اپنے جسم کو وہاں بلند نہ کرتا تو وہ شخص میرے پاؤں کا قیہ بنا چکا ہوتا۔ میں نے اسے ارادہ بدلنے کی سہلت ہی نہیں دی تھی۔ وہ میرے قدموں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا لہذا میرے ہوا میں اچھلنے کے ساتھ وہ گن کی نال کو ادھر نہ اٹھا سکا۔ میں نے اس کی توقع کے برعکس یکا یک پیچھے مڑ کر، جپ لگاتے ہوئے اس پر فائرنگ کر دی تھی۔ میں تو اس کی فائرنگ سے محفوظ رہا۔ مگر اوزی کے دہانے سے نکلنے والی گولیوں نے اس کے جسم کو چھلنی میں بدل دیا۔ اس کا بے جان بدن ایک ٹکلیے پتھر پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے پاس جا کر تفصیلی معائنہ کرتا۔ میں تیزی سے اپنی راہ کو ہولیا۔ ایک لاش کے بجائے اپنے دوستوں کی خبر گیری زیادہ ضروری تھی۔

میں دوڑتے۔۔۔۔۔ قدموں کے ساتھ اس چٹان کی دوسری سمت پہنچ گیا۔ میری آنکھ نے سب سے پہلے ایک لاش کا منظر دیکھا۔ یہ اسی مردہ شخص کا جسم تھا جس کے تعاقب میں، میں اس طرف آیا تھا۔ میری حلاشی نگاہ قرب و جوار کا جائزہ لینے لگی مگر جن کی مجھے تلاش تھی وہ کہیں دکھائی نہ دیے۔ اس صورت حال نے میری انجمن کو بڑھا دیا۔ میں گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تاجد نگاہ چھوٹی بڑی چٹانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دُشمنوں کی ہلاکت اور خوفناک فائرنگ سے یہ تو ثابت تھا کہ میرے سامنے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ کسی بڑی چٹان کی اوٹ میں ہوں گے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور پلک جھپٹے میں نے اس خیال کو کھلی جامہ پہنا ڈالا۔

میں نے لباس میں سے اپنا سیل نکالا اور پھر اس کے کی پڈ پر کاشا لوک کے نمبرز بیچ کرنے لگا۔ ان کی لوکیشن اور وقوع پذیری جاننے کے لیے یہی سیلورسلہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ ڈانگ کی تکمیل پر دوسری جانب سے گھنی بیجنگ لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کاشا لوک کا سیل ان تھا، بصورت دیگر رابلے کا یہ ذریعہ بھی جا تار ہوتا۔ آٹھویں گھنٹی پر کال انیڈ کر لی گئی۔ میں نے اپنے سیل کے اسپیکر میں لی یان کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنی۔ اس نے بڑے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔

”ہاں، وجدان! تم کہاں ہو؟“

میں لی یان کی آواز چونک اٹھا کیوں کہ میری توقع کے مطابق کاشا لوک کو کال انیڈ کرنا چاہیے تھی، پھر اس کی آواز میں شامل گھبراہٹ بھی مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

”یہی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں، تم لوگ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟ میرے اندازے کے مطابق، ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ تم تینوں کہاں چپے ہوئے ہو؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو، ہم ایک دوسرے کے قریب ہی ہیں۔“ لی یان نے بتایا ”میں نے تمہیں نشیب میں اتر کر، اس طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ابھی ابھی جو فائرنگ ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے، تم نے کسی دُشمن کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اوزی کی فائرنگ اپنی مخصوص آواز سے پہچانی جاتی ہے۔“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے تصدیق لہجے میں کہا ”دُشمنوں کے حوالے سے میں نے عقبی میدان صاف کر دیا ہے۔ اب تم مجھے اپنی درست لوکیشن بتاؤ تاکہ میں تمہارے پاس پہنچ سکوں۔ ان خطرناک چٹانوں نے تو بہت مشکل میں ڈال رکھا ہے۔“

”اوکے!“ وہ سرسری انداز میں بولی پھر مجھے اپنے بارے میں بتانے لگی ”نشیب میں تمہیں مجھ سے رنگ کی ایک گھوٹی چٹان دکھائی دے رہی ہے؟“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ پچاس گز کے فاصلے پر وہ مجھ کی چٹان موجود تھی جس کا حوالہ لی یان نے دیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ”ہاں، دکھائی دے رہی ہے!“

”ہم لوگ اسی چٹان کے عقب میں موجود ہیں۔“ لی یان نے بتایا۔

”اچانک میری زبان سے پھسل گیا “کاشا لوک کہاں ہے؟“

”وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہے۔“ وہ مبہم انداز میں بولی۔

”میری اس سے بات کرو!“ لی یان کے انداز نے مجھے نامعلوم تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”تم یہاں آؤ جاؤ، پھر سب سے بات کر لیتا!“ وہ ڈٹکے چپے لہجے میں بولی۔

”لی یان! تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی

ہو؟“

”کاشا لوک شدید زخمی ہے۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اوکے! میں آ رہا ہوں!“ یہ کہتے ہوئے میں نے سیلور رابلے منقطع کر دیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد میں مذکورہ مجھوری چٹان کے عقب میں ان تینوں کے پاس موجود تھا۔ لی یان نے غلط نہیں کہا تھا، کاشا لوک واقعی شدید زخمی تھا۔ اس کے پیٹ میں گولیاں لگی تھیں۔ گھٹنوں کے مقامات سے بھی مدھ بھٹنوں والا لباس سرخ ہو رہا تھا، مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جن دودشمنوں کی لاشوں کو میں نے دیکھا تھا، انہی میں سے کسی کی فائرنگ نے کاشا لوک کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ اس وقت ملل بے ہوش میں تھا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ سب کیسے ہوا؟“

جواب میں لی جان نے مجھے جو کہہ بتایا اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ میں نے کاشا لوک کی حالت کے پیش نظر پوچھا ”یہ وہاں سے یہاں تک کیسے پہنچا ہے؟“ لی یان نے خاموشی سے تھاچو کی جانب اشارہ کر دیا۔

میں نے چونک کر تھاچو کو دیکھا۔ اس کا لباس کندھے سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ تھاچو نے کاشا لوک کو اپنے کندھے پر اٹھا کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اس کی عمر کے پیش نظر یہ ایک بڑا کارنامہ تھا اور کیوں نہ ہوتا! تھاچو کا تعلق بہشت ارضی ”نبیت“ سے تھا جہاں کے باسی طویل العمر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم الصحت بھی ہوتے ہیں۔

مجھ سے نگاہ لی تو تھاچو نے مہربان انداز میں اپنے سر کو اٹھائی جنبش دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ہمیں فوراً کوئی محفوظ پناہ گاہ تلاش کر لینا چاہیے۔“

کاشا لوک نے تھاچو کے بارے میں مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں ان کے مطابق تھاچو کو سختی اور جینی زبان پر مجبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ گراہ چلاؤ انگلش بھی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ ابھی اس نے مجھ سے جو کہہ کہا اس کے لیے اس نے انگلش کا سہارا لیا مگر جینی لب و لہجے میں۔ اس کی تشویش بجا تھی، میں نے اسی سے پوچھا۔

”یہاں آس پاس ہمیں کوئی محفوظ پناہ گاہ کہاں مل سکتی ہے؟“

لی یان نے کہا ”وجدان! جو بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کا اشارہ کاشا لوک کی جانب تھا جسے پتھر ملی دھلوں پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں گردن ہلاتی پھر تھاچو کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”ہم اس وقت ایک محفوظ چٹان کی آڑ میں کھڑے ہیں لیکن ہمیشہ یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔“ اگر اسی آڑ میں ہم چٹان کے ساتھ ساتھ بڑھتے جائیں تو ممکن ہے، کوئی پناہ گاہ نظر آ جائے۔“ وہ لمبے لمبے کھڑکے ہوئے ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ہمارے عقب میں کافی دیر سے خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، کوئی اور دُشمن ہمارے تعاقب میں اس طرف نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ پہلی کا پٹر کے ذریعے ہمیں تلاش کیا جائے، ہمیں کہیں پناہ کریں ہو جانا چاہیے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے نگاہ اٹھا کر آسان کی طرف دیکھا جیسے مذکورہ پہلی کا پٹر کوشا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے بے سدھ پڑے گھائل کاشا لوک کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! اب میں اسے اپنے کندھے پر اٹھاؤں گا۔“

تھاچو نے میرے شانے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور بولا ”میں اتنا بھی ضعیف اور کمزور نہیں ہوں جتنا دکھائی دیتا ہوں۔ یہ کام تم میرے لیے ہی رہے دو۔ ویسے بھی میرا لباس کو آلودہ ہو ہی چکا ہے، تم کیوں خواہ مخواہ اپنے لباس کو داغ دار کرتے ہو؟“

تھاچو کی آنکھوں میں ایسی مہربان ہمدردی تھی کہ میں اس سلسلے میں کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔ وہ اہتات میں سہلے ہوتے بے ہوش کاشا لوک کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

”ایک منٹ۔۔۔۔۔ آپ لوگ یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

ان دہائیوں نے کچھ بعد دیگرے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا لیکن کوئی استفسار نہ کیا۔ میں اپنے فوری خیال کی تکمیل کے لیے چٹان کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہاں ہمارے ایک دُشمن کی لاش پڑی تھی۔ ایسے ہی دو دُشمنوں کی لاشیں دوسری جانب بھی بے غور و کفن کھلے آسمان کے نیچے پڑی تھیں جن

میں سے ایک بد بخت میرے ہاتھوں جہنم داخل ہوا تھا۔ میں نے بجلی ایسی سرعت کے ساتھ ان لاشوں کا تنقید کیا جازہ لیا۔ ان میں سے دو کے لباس ایسے تھے کہ انہیں دو بارہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔

میں نے قوی سی کوشش کر کے آٹا ٹافا... مذکورہ لباس ”حاصل“ کر لیے۔ ہم اپنے ساتھ پٹلیوں کی صورت میں، سکھنڈو سے جو سامان لے کر چلے تھے اس میں دیگر ضروری اشیاء کے علاوہ ہمارے فاضل لباس بھی تھے۔ اپنے دشمنوں کا لباس میں نے اس لیے بھی حاصل کر لیا کہ بد وقت ضرورت دشمن کو دھوکا دیا جاسکے۔

میں واپس لی یان اور تھاجو کے پاس پہنچا تو وہ میرے ہاتھوں میں دشمنوں کے لباس کو دیکھ کر صورت حال کی تہ میں پہنچ گئے۔ کسی سوال و جواب کے بغیر ہم نے خاموشی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا، اس طرح کہ بے سدھ کا شالوک ایک مرتبہ پھر تھاجو کے کندھے پر لدا ہوا تھا۔ میں سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ لی یان آگے بھی جبکہ تھاجو، کا شالوک کو اٹھائے ہوئے ہمارے پیچ میں تھا۔ میں چونکا انداز میں قدم بڑھاتے ہوئے پیش آمدہ صورت حال پر بھی غور کر رہا تھا۔

ہمارا سفر کھونا کرنے کی تمام تر ذلت داری شرماء کے سر جاتی تھی۔ میں نے سندری جل کی پہاڑیوں میں تلی بدھ بھکشو نارائن کی ٹھکانا کر کے اس کی زبان سے ان کے پاس شرماء کا نام اگھوا لیا تھا پھر جب میں نے کا شالوک سے شرماء کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے تصدیق کر دی کہ وہ شرمائی اس شخص کو بہ خوبی جانتا ہے۔ میں شرماء کے حوالے سے بہت متحس تھا۔ سوچا تھا، ذرا سکون ہو تو کا شالوک سے اس نئے دشمن کے بارے میں تفصیل معلوم کروں گا لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔ سندری جل سے روانہ ہوتے وقت ہم جس افراتفری کا شکار رہے وہ آگے چل کر ہنگامہ خیزی میں بدل گیا اور مجھے کا شالوک سے بات کرنے کی مہلت میسر نہ آسکی اور اب... کا شالوک اس حالت میں تھا کہ فی الحال اس سے کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

میں کا شالوک کی طرف سے گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میری تجربہ کار نگاہ نے اس کی حالت کا اندازہ لگالیا تھا، خصوصاً اس کے پیٹ میں لگنے والی گولیاں کوئی بھی بے موسم گل کھلا سکتی تھیں۔ تھاجو نے سلان خون روکنے کے لیے اس کے پیٹ پر ایک کپڑا لٹا کر باندھ دیا تھا لیکن میرے خیال میں اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی جو اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک ہم کسی چرسکون اور محفوظ مقام پر ٹھہر نہ

جاتے۔

دو چہرہ رفتہ رفتہ دھل رہی تھی۔ بلند بالا پہاڑی علاقوں میں دو چہرہ دھلنے کا مطلب ہوتا ہے، شام بلکہ رات کی آمد۔ سورج اگر طلوع ہو جائے تو چار یا پانچ گھنٹوں سے زیادہ درشن نہیں دیتا۔ اس کی چمک اور خوش گوار رنگ پانچ بجے جلد ہی سا میر دار پر ٹپکی فضا میں سرور ڈال دیتی ہے۔ میدانِ علاقے کی بہ نسبت پہاڑی علاقے کی تنہیں اور شامیں زیادہ فعال و چمکیل ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں کسی محفوظ جگہ ٹھہرنا تھا ورنہ دشمن کی کی اور سردی کی زیادتی اس پہاڑی سلسلے کو ہمارے لیے سر جہنم میں بدل دیتی!

اس وقت ہم جس رخ پر سفر کر رہے تھے وہاں سے ساگر ماتا (ماؤنٹ ایوریسٹ) دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک طرح سے ہم اس طویل چٹان کی آغوش میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم رخ سمندر سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر گامزن تھے اور اس بلندی میں دھیرے دھیرے اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

اچانک ہم تینوں چونک اٹھے اور اس چونکنے کا سبب وہ مخصوص آواز تھی جو ہماری ساعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ بے ساختہ ہماری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ ہماری نظر دو کوئی بجلی کا پٹر کی تلاش تھی جو فوری طور پر ہمیں کہیں دکھائی نہ دیا۔ ہماری تشویش تک گاہیں واپس پٹیں اور ایک دوسرے کے چہرے کو سوالیہ انداز سے گھورنے لگیں۔ اس وقت ہم تینوں کے ذہنوں میں ایک جیسے خیالات تھے یعنی... شرماء بجلی کا پٹر کی مدد سے ہمیں تلاش کرنے اس طرف آ رہا ہے!

یہ بڑی ہنگامہ خیز صورت حال تھی۔ بجلی کا پٹر میں سوار دشمنوں کو، بہر حال، یہ ایڈوانسج حاصل تھا کہ بلندی پر ہونے کے باعث وہ بہ نسبت زیادہ آسانی سے ہمیں شکار کر سکتے تھے۔ لی یان نے متحس لہجے میں کہا۔

”دجدان! وہ ہماری تلاش میں ادھر آ رہے ہیں۔“

”آئے دو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”ہمیں فوری طور پر کہیں چھپ جانا چاہیے!“ اس کی تجویز میں خوف کی جھلک شامل تھی ”تم لوگ رک کیوں گئے ہو، آگے بڑھو۔“

بلندی کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ میں نے اور لی یان نے سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تھاجو کا رویہ ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ پتا نہیں، وہ ہمیں کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی بیرونی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لہذا ہم بھی اس کی تقلید میں اوپر چڑھنے لگے۔ یہ پیش قدمی ایسی ہی تھی جیسے ہم کسی عمودی دیوار پر چڑھ رہے ہوں۔ تھاجو کے اطمینان اور توازن کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ بڑے اعتماد اور ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہا تھا حالانکہ اس نے اپنے کندھے پر کا شالوک کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

دس منٹ کے بعد یہ تھکا اور پانیا دینے والا سفر اختتام پذیر ہوا اور تھاجو ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ میری اور لی یان کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ اس وقت ہمارے سینوں کا ذہر و دم کسی لوہار کی دھنکی کا خطر پیش کر رہا تھا۔ اس ”ایکسپریس“ کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ موسم کی شدت کی کمر ٹوٹ گئی۔ پیسے میں نہاے ہوئے ہماری بدن، فضا میں رچی بسی ٹھنڈک کا بڑا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا، یہ عارضی اطمینان ہے۔ اگر ہم چند منٹ تک یوں ہی کھلے میں کھڑے رہے تو ہماری قلبی جم جائے گی۔

تھاجو قدم قدم پر مجھے حیران کر رہا تھا۔ وہ عمر میں ہم سے کم از کم تین گنا ہو گا لیکن اس جبری مشقت سے اس کی سانس پھولی تھی اور نہ ہی چہرے پر محسوس کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ میری جانب اٹکی اٹھاتے ہوئے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”دجدان! اس چتر کو تم ہٹاؤ گے... جلدی!“

”کون سا چتر؟“ میں سٹ پنا کر رہ گیا۔

”یہ!“ اس نے پہاڑی کوجھوا۔

اس کی گہری غمخیزی دیکھتے ہوئے میں نے یہ غور اس مقام کا جائزہ لیا جہر اس نے اشارہ کیا تھا اور اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ وہ چتر میری نگاہ میں آ گیا جس کو ہٹانے کی بات تھا چتر کر رہا تھا۔ بادی انظر میں وہ چتر اس طویل القامت پہاڑ کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا جس کے سامنے میں اس وقت ہم کھڑے تھے، اسی لیے میں پہلے اس چتر کو گھٹن نہیں کر سکا تھا۔ وہ دھڑب تین فٹ کا ایک مختصلاً چتر تھا جو کسی دروازے کی صورت اس پہاڑ میں ”نصب“ تھا۔

تھاجو کا اعتماد اور لہجے کا ٹھہراؤ ایسی ظاہر کرتا تھا، وہ اس چتر کے پیچھے کسی محفوظ پناہ گاہ کے بارے میں یقین ہے۔ اس کے یقین کا سبب کیا تھا؟ وہ کس سراغ کا سراغ پکڑ کر یہاں تک آیا تھا؟ اس قسم کے سوالات پوچھنے کا موقع نہیں تھا کیوں

کہ بجلی کا پٹر کی آواز میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کا مطلب تھا، وہ لوگ ہمارے قریب سے قریب تر پہنچ رہے تھے۔ ان لمحات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ پہلے خود کو محفوظ کیا جاتا، باقی مسائل پر بعد میں غور کیا جاسکتا تھا۔

اس دوران تھاجو نے ایک لمحے کے لیے بھی کا شالوک کو اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ بجلی کا پٹر کی مخصوص آواز سے یوں محسوس ہوتا تھا، وہ آن واحد میں نمودار ہوگا اور ہم پر گولیاں برساتا شروع کر دے گا۔ میں اور گرد کے ماحول کو نظر انداز کر کے اس چتر کی جانب متوجہ ہو گیا جو اس پہاڑی میں دروازے کا کردار ادا کر رہا تھا... ایک چادری خفیہ دروازہ! وہ چتر دروازہ اس انداز میں پہاڑ کا حصہ بنا ہوا تھا کہ اسے کھینچ کر باہر کی جانب ”کھولنا“ ممکن نہیں تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ اس چتر کو اندر کی طرف دھکیل دوں۔ میں مذکورہ چتر کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اگرچہ اس پہاڑ کے مقابلے میں ایک ذرے کی حیثیت کا حامل تھا لیکن اس کا وزن منوں میں تھا۔ میں جس طریقہ کار کے سہارے اسے دھکیلنے والا تھا اس میں وزن بے اہمیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مخصوص طریقہ کار کو بار بار آکر میں فائدہ اٹھا چکا تھا۔

میں نے ہارس اسٹائل اپنایا اور بازوؤں کی مخصوص حرکات کے ساتھ اپنے سینے کو صاف و شفاف ہوا سے بھر لیا۔ اب میرے ہاتھ پہلوؤں میں لٹکے ہوئے تھے۔ اگلے ہی لمحے میں نے سانس خارج کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو چتر کی سمت کھول دیا۔ یہ بڑ بڑگ کا ایک مخصوص انداز ہے جس میں اگر، جی کی قوت بھی شامل کر لی جائے تو اس کی اثر پذیرگی میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے... اور مجھے بھی پتا تھا!

میں نے دو تین مرتبہ اس انداز میں، اٹھیل اور اٹگر ہیل کر کے جی کی قوت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کیا پھر ایک اٹگر ہیل کے ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کا جتنی پٹ پٹ چتر پر آزمایا۔ یہ پٹ پٹ نتیجہ خیز ثابت ہوا اور وہ چتر اپنی جگہ سے سرک کر اندر کو ہو گیا۔ میں نے داخلے کا راستہ بنانے کے لیے پھر ہر ایک اور چتر پر پٹ آزمایا اور پٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

لی یان حیرت اور دل چسپی کے لیے جلتے تاثرات سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پہلے ہی ای نوعیت کا کارنامہ انجام دیتے ہوئے مجھے دیکھ چکی تھی، جب ہم دونوں ڈاکٹر موگ ریفوٹے کے ساتھ سکھنڈو سے بدھ ٹیل کنڈوالی



عبادت گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں، میں نے اس سے بھی بڑے ایک پتھر کو سڑک سے ہٹایا تھا۔ میری نگاہ لی یان کے چہرے سے ہو کر تھا چو کی طرف لی گئی۔ اس کے چہرے پر مجھے گہری سنجیدگی نظر آئی۔ مجھ سے آنکھ لی تو اس نے کھیر انداز میں کہا۔

”وہ جان! باہر کھڑے ہو کر وقت برباد نہ کرو۔ فوراً اندر چلے جاؤ!“

اور ہم دونوں فی الفور اندر چلے گئے۔

ازال بعد، تھا چو ہماری مدد سے کاشانوک کو لے کر اندر آ گیا۔ پھر تھا چو ہی کی ہدایت پر میں نے اس پتھر کو دھکیل کر داخلی راستے پر ”فٹ“ کر دیا۔ اب باہر سے دیکھنے والے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے مطلوبہ افراد اس پہاڑ کے اندر بند ہیں!

پہاڑ کے اندر نیم تاریکی کا راج تھا۔ میں ڈوٹوں سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم اس وقت کئی کئی چوڑی کھوہ میں موجود ہیں۔ جہاں تک نگاہ جانی تھی ایک غاری غار دکھائی دیتا تھا۔ وہ نیم تاریکی بہ الفاظِ دہرہ لگتا اجالا یہ ظاہر کرتا تھا کہ دور..... کہیں اس غار کا کوئی حصہ فضا میں کھلا ہوا ہے جہاں سے یہ روشنی داخل ہو کر یہاں تک پہنچ رہی ہے۔ باہر کی نسبت اندر کا موسم خاصا خوش گوار تھا۔ اس غار میں پانی جانے والی خشکی کو بہ آسانی برداشت کیا جاسکتا تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد پہلا جملہ لی یان کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سرسراہٹ آواز میں بولی۔

”وہ جان! کاشانوک کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے!“

لی یان کی تشویش میں شدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ زرسنگ کے چپے سے بھی وابستہ تھی اپنے ایک فریبی ساتھی کو زخموں سے چور دیکھ کر اس کی پیشہ ورانہ تمام تر حسیات یک پہ یک بیدار ہو گئی تھیں۔ کاشانوک کے لیے میں بھی بہت مگر مند تھا۔ وہ ایک طرح سے ہمارا راہ نما تھا۔ اسے شدید زخمی حالت میں دیکھ کر پریشان ہونا ایک فطری بات تھی، میں نے اضطراری انداز میں تھا چو کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”ہم ہنگامی بنیادوں پر کاشانوک کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

اس غار میں محض اتنا اجالا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ہیولوں کی صورت دیکھ سکتے تھے۔ تھا چو نے میری جانب رخ پھیرتے ہوئے جواب دیا ”میں اسی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم مگر نہ کرو، لا رہا ہوں دھانے چاہا تو سب

ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہم دونوں خاموش رہ کر تھا چو کی حرکات کا ”جائزہ“ لینے لگے۔

اس نے اپنی پوٹلی میں سے ایک نارنج نکالی۔ اور اسے روشن کر کے غار کی سنگلاخ دیواروں کا جائزہ لینے لگا۔ پہاڑ سے باہر چوں کر دن کا سماں تھا اس لیے نارنج کی روشنی کو ادھر دیکھ لیے جانے کے امکانات مفر کے برابر تھے۔ جلد ہی تھا چو کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ ایک دیوار پر مشعل سے مشابہ کسی شے کو پیوست دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس مشعل کو روشنی کر چکا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی وہ چالوروں کی چربی کے بل بوتے پر چلنے والی ایک مشعل تھی۔ غار میں مناسب روشنی پھیلی تو ہم ایک دوسرے کو واضح طور پر دیکھنے کے قابل ہو گئے۔

لی یان نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے دامن اس روشنی کی طرف متوجہ ہو کر ادھر تو نہیں آ جائیں گے؟“

تھا چو نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا ”مگر مند ہونے کی ضرورت نہیں، یہ روشنی باہر سے دکھائی نہیں دے گی۔“

”کیا تم پہلے بھی اس غار میں آچکے ہو؟“ لی یان کے لہجے میں بے پناہ تجسس تھا۔

تھا چو نے قطعی سے کہا ”نہیں!“

”پھر تم بے بات اسنے ڈوٹوں سے کیسے کہہ رہے ہو؟“

”اپنے تجربے کی بنا پر“ اس کے جواب دیا۔

لی یان سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ تھا چو اپنے ہاتھوں کو پوٹلی کے ساتھ مصروف رکھتے ہوئے بولا ”ہم بدھ بھکشو انہی پہاڑی علاقوں میں ستر کرتے رہتے ہیں اور ہمیں مختلف غاروں میں قیام بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں کسی بھی غار کی بناوٹ دیکھ کر فوراً اس کے بارے میں اندازہ قائم کر لیتا ہوں۔“

اس کے آخری جملے نے میرے ذہن میں سوال پیدا کیا۔ میں نے اس سے پوچھا ”اس پہاڑی غار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں نا، یہاں ہونے والی روشنی کو باہر سے دیکھا نہیں جاسکتا۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”جب تم پہلے کسی اس غار میں نہیں آئے تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس پتھر کے چپے ہمیں چھپنے کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ميسر آسکتی ہے؟“

ذہن آدی سوچتا ہے اور سوچنے والے افراد کے ذہنوں

میں سوالات ضرور ابھرتے ہیں۔ ان نازک لمحات میں میرا اور لی یان کا ذہن ایک کے بعد ایک سوال اٹھا رہا تھا۔ تھا چو نے پوٹلی نما اس خلیے میں سے ایک چھوٹا سا باکس برآمد کیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”دراصل، بات یہ ہے کہ میں نے نیچے کسی پہاڑی چالور کا فضلہ پڑا دیکھا تھا۔ میری تجربہ کار نگاہوں نے فوراً اندازہ قائم کر لیا کہ کچھ گول کو یہاں آس پاس ہی ہمیں قیام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ان آثار کو ایک سراغ جانا پھر میں اسی سراغ کے سہارے چلے ہوئے اس غار کے سامنے آ پہنچا۔ تمہارا کہنا درست ہے کہ پہاڑ کو باہر سے دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ ایک مخصوص پتھر کو ہٹانے کے بعد کسی محفوظ غار کا راستہ کھل جائے گا۔“ وہ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”بس یہی سمجھو کہ یہ بھی میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کے مکمل جان لیا تھا۔ شاید تم نے غور نہیں کیا کہ وہ فضلہ ایک خاص مقام پر پناہ دے ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں آس پاس پڑاؤ کی کوئی محفوظ جگہ موجود ہے۔ بہر حال!“ وہ سانس لینے کو رکھا پھر بولا ”یہ باتیں ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں!“ اس کا انداز جان چھڑانے اور کئی کانٹے والا تھا۔

لی یان نے اس پہاڑی غار کے دروازے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا ”اس طرف کچھ روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ تمہارا تجربہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ کیا ادھر سے بھی اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ موجود ہوگا؟“

”ایسا ہو سکتا ہے!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تم لوگ ایسا کرو، جب تک میں اس طرف مصروف ہوں، تم ادھر کا جائزہ لے کر آ جاؤ۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا، ہماری یہ پناہ گاہ کس قدر طویل مدتی ہے!“

میں اس کا مشورہ سن کر چونک اٹھا۔ مجھے حیرت اس کی تجویز پر نہیں تھی بلکہ اس نے اپنی مصروفیت کا جو تذکرہ کیا تھا اس نے مجھے الجھا دیا تھا۔ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”تھا چو! تم ہمیں ادھر بھیج کر یہاں کس کام میں مصروف ہونا چاہتے ہو؟“

”میں کاشانوک کو دیکھوں گا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”اس کا فوری آپریشن بہت ضروری ہے۔“

”آپریشن؟“ میں نے متذہب لہجے میں پوچھا۔

وہ کھیر انداز میں بولا ”کاشانوک کی حالت لی الحال خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اگر اس کے جسم سے گولیاں باہر

نہیں نکالی گئیں تو پیٹ کے اندر زہر پھیلنے کا اندیشہ ہے، پھر اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔“

وہ ایک سفاک حقیقت بیان کر رہا تھا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح سے کاشانوک کا آپریشن کرے گا؟ ہم اس وقت کسی پرائیویٹ اسپتال میں نہیں بلکہ میڈیکل کی سہولیات سے ملبوں دور ایک پہاڑی غار میں پناہ گزین تھے۔ لی یان نے شاید میرا دماغ بڑھایا۔ اس نے تھا چو سے، میری سوچ میں ابھرنے والا سوال پوچھ لیا۔

”آپریشن کے پیٹ کے اندر پیوست گولیاں نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا چو!“ وہ اٹھے ہوئے لہجے میں بولی ”تم بہت بڑا رسک لینے جا رہے ہو!“

”میں جانتا ہوں، آپریشن بچوں کا کھیل نہیں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا ”شاید تم جتنی طب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہو۔ جتنی طب میں علاج کے چار طریقے مردج ہیں۔ نمبر ایک، خوراک کے ذریعے علاج۔ نمبر دو، ادویات کے ذریعے علاج۔ نمبر تیس، حرارت کے ذریعے علاج، اور نمبر چار، جراحت کے ذریعے علاج۔ یہ آخری طریقہ علاج انتہائی ناگزیر حالت میں اپنایا جاتا ہے اور میں.....“ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہاسک کو کھولنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا ”اور میں اس وقت کاشانوک کی جراحت پر مجبور ہوں۔ آپریشن کے سوا اس کی زندگی بچانے کا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا!“

ہم حیران و پریشان کھڑے ایک ٹک اسے دیکھ رہے تھے، وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا ”جہاں تک رسک لینے کا تعلق ہے تو اس وقت کاشانوک کی زندگی انتہائی رسک پر ہے۔“ لہذا ہلوے کو کاٹتا ہے۔ کے صدق، یہ رسک لینا ہی ہوگا۔ تم دونوں بے فکر ہو کر غار کے دوسرے حصوں کا جائزہ لو۔ میں اپنا کام خوش اسلوبی سے کر لوں گا۔ اگر لا رہا کرو اس کی زندگی منظور ہے تو کاشانوک کو کچھ بھی نہیں ہوگا!“

بدھ مت، ہندو مت کے بہت قریب ہے۔ بدھ مت میں آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ یہ انسانی اعمال کو مستقبل کی بنیاد گردانتا ہے۔ یعنی ہر عمل کا ایک ردعمل۔ نیکی کے بدلے نیکی اور برائی کے بدلے برائی۔ اس مذہب کے پیروکار خدا جیسی کسی مادیاتی ہستی پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہندوؤں کی طرح آراگون کے عقیدے کو اپنی زندگی کی اساس سمجھتے ہیں، یعنی انسان مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے، پھر مرنے، پھر پیدا ہوتا ہے۔ ایک نیک انسان اگلے جنم میں بھی انسان ہی رہے گا

آتش فشان (68) حصہ 13

ہو سکے گی۔

میرے اس دادا نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ سوچے سمجھے بغیر وہ بے تابی سے پوچھ بیٹھا ”کیوں چار بجے کے بعد تم کہاں جانے والے ہو؟“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہہ دیا ”ٹھیک پانچ بجے شام میں کھنڈو سے شے ٹھکانا جارہا ہوں۔ مجھے ”تری بھون“ انر پورٹ سے ”سی اے اے سی“ کی فلائٹ پکڑنا ہے اور.....“

”کواس بند کرو۔“ وہ ایک مرتبہ پھر میری بات کا نٹے ہوئے بولا ”اکرم اور کھنڈو میں بیٹھے ہو تو پھر ادھر سندری جل کی پہاڑیوں میں کس نے تھکے پیا رکھا ہے؟“

”میرے لومولڈ شیر خوار دکن!“ میں نے مذاق اڑانے والے رنگ میں کہا ”جن لوگوں نے مجھے پکڑنے کے لیے تمہیں اس کار پر مامور کیا ہے شاید انہوں نے میرا فضلی کی تعارف نہیں کرایا۔“ میں نے لمبی وقف کے بعد سستی خیر لکچے میں کہا ”چلو کوئی بات نہیں۔ میں بتا دیتا ہوں۔ برخوردار شربا! دراصل میں بلیک بلیک جانتا ہوں۔ یہاں کھنڈو میں بیٹھ کر میں دنیا کے کسی بھی حصے میں ایسے کیبل قماشے پیش کر سکتا ہوں۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو بار تارن مکمل آئند اور سوریاداس کا حشر دیکھ لو۔ ان کے علاوہ اپنے پانچ ان چھو کی خوش چکان لاشیں بھی ملا حشر کرو جو سندری جل کی پہاڑیوں میں موت کو گلے لگائے جہن کی ہنسی بجا رہے ہیں۔“

ایک لمحے کے سکوت کے بعد اس کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی ”لیکن..... سوریاداس کا کیل تمہارے پاس کیسے پہنچ گیا؟“

”بتایا ہے نا“ میں بلیک بلیک جانتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”جادو کے زور پر میں اپنے دشمنوں کو کتنی کا ناچ نچا کرتا رہتا ہوں۔ تم سے نیا نیا رشتہ خالفت استوار ہوا ہے۔ کہو ایک چھوٹا سا انکم پیش کروں؟“

میں نے نیم الفاظ میں اپنے خطرناک مزاج کا اظہار کیا تو وہ ہراساں لکچے میں پوچھ بیٹھا ”تنت..... تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”کچھ نہیں بس چھوٹا سا آئٹم۔ میری طرف سے اس دشمنی کا براہ راست پہلا تھرا۔“ میں نے اس کے خوف میں اضافہ کرنے کی غرض سے ابھمن زدہ انداز جاری رکھا ”اس وقت تم ایک سیاہ بلیک کاپر میں بیٹھ کر میری تلاش میں سرگرداں ہو۔ سوچنا ہوں تمہیں اس خورانی سے بچالوں۔ تم

کہاں کہاں بھٹکتے بھڑدے۔ میں ہی موت کے روپ میں آگے بڑھ کر تمہیں گلے لگالیتا ہوں۔ بس ایک دل دوز دھکا اور..... سب کچھ ختم!“

اس نے گھبرا کر سیلور رابطہ منقطع کر دیا۔ لی یان اس دوران میں یہ منگھوٹے ہوئے مسلسل میری جانب دیکھ رہی تھی۔ رابطہ ختم ہونے پر میں نے چونک کر اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو وہ بھونپن کو بھاپتے ہوئے فوراً مستفسر ہوئی۔

”خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا کیا؟“

میں نے اٹھاتے میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ بولی ”اب وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔“ اس کی بات ختم ہوئی تھی کہ دوسرے سیل کا ڈائبریز بیدار ہو گیا۔ میں نے چونک کر لی یان کی طرف دیکھا اور پوچھا ”کاشا لوک والا کیل کہاں ہے؟“

”ادھر تھا جو کے پاس ہی ہے۔“ اس نے بتایا ”میں نے تم سے بات کرنے کے بعد وہ سیل تھا جو کوڑے دیا تھا۔ کیوں کیا بات ہے؟“

اس دوران میں میں نے مذکورہ سیل کو جنوری جب سے برآمد کر لیا اور کہا ”شاید تھا جو ہمیں کال کر رہا ہے۔“ پھر فون اینڈ کرتے ہوئے میں نے ٹھہرے ہوئے لکچے میں کہا ”ہیلو!“

جواب میں تھا جو کی مخصوص آواز میری ساعت سے گھرائی ”ودھان! کیا تم لوگ کہیں دور نکل گئے ہو۔ میں نے تھوڑا آگے جا کر تمہیں دیکھا تھا لیکن تم کہیں نظر نہیں آئے۔ کاشا لوک کو اکیلے چھوڑنا ٹھیک نہیں اس لیے میں نے موبائل فون کا سہارا لیا ہے۔“

”کاشا لوک کیسا ہے؟“ میں نے اضطراری لکچے میں دریافت کیا۔

”تمہیں یاد کر رہا ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لکچے میں انکشاف کیا ”وہ اس وقت ہوش میں ہے۔“

تھا جو کے اطمینان نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”کیا تم نے ابھی تک اس کا آپریشن شروع نہیں کیا؟“

میں تھا جو کے پاس سے آئے ہوئے اب اتنی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک شخص کے پیٹ کا آپریشن کر کے اندر سے گولیاں نکال لی جاتیں اور وہ باقاعدہ ہوش میں بھی آ جاتا۔ پتا نہیں تھا جو نے حتیٰ طلب کا کون سا چکر رکھا ڈالا تھا۔ میں اس کے کمال کو سمجھنے سے قاصر تھا اسی لیے وہ سوال

میری زبان سے پھل گیا تھا مگر اس کے جواب نے میری چرتوں میں کتنا اضافہ کر دیا۔

وہ نہایت ہی سادگی سے بتا رہا تھا ”آپریشن تو کب کا ہو چکا۔ یہ تو آپریشن کے بعد والی بیداری ہے۔ تم اسے پوسٹ آپریٹو دیکھ نہیں کہہ سکتے ہو!“

نئی بات تو یہ ہے کہ مجھے تھا جو کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ ایک نامکین اور ناقابل یقین سی بات کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”کاشا لوک سے میری بات کراؤ۔“

”وہ خاص تھابت محسوس کر رہا ہے۔“ تھا جو نے کہا ”تم لوگ فوراً یہاں آ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔“

”ٹھیک ہے“ ہم آ رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

لی یان نے اگرچہ ایک طرف نہ گفتگو ساعت کی تھی لیکن وہ لیس بات چیت بخوبی سمجھتی۔ ری سی کسروا پس کے سر میں میں نے پوری کردی۔ تھا جو سے ہونے والی باتوں کا خلاصہ میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ بے حد اچھے ہوئے لکچے میں بولی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے ودھان! ہائی گاڈ! ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”مگر ایسا ہو چکا ہے“ تھا جو ہم سے جھوٹ کیوں بولے گا؟“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ وہ فنی میں گردن جھٹکتی گئی۔

”دوہیں چل کر دیکھتے ہیں کیا ہوا ہے اور کیا نہیں ہوا!“

تھوڑی دیر کے بعد ہم غار کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں تھا جو اور کاشا لوک کو چھوڑ کر گئے تھے۔ سب سے پہلے ہماری نگاہیں کاشا لوک کی جانب اٹھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل خاموش چت لیٹا ہوا تھا۔ تھا جو نے ایک پوائنٹ ٹیکہ بنا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا تھا۔ کاشا لوک کی حالت کو دیکھ کر فوری طور پر ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا وہ پڑھن اور گہری نیند سو رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر اس کے پیٹ کا معائنہ کیا۔ مذکورہ خطرناک گھاؤ اب ایک تازہ ترین پٹی کے پیچھے کھجوا چھپا چکا تھا۔ یعنی بات تھی کہ تھا جو نے آپریشن کے بعد ڈریسنگ کی ہوگی۔ ابھی تک ہم نے زبان سے ایک لفظ ادائیگیں کیا تھا۔

میں نے سوائے نظر سے تھا جو کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں ایک جانب آنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھوٹا سا ہاس (سرجیکل گٹ) بھی اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے سوائے نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس

کے پیچھے چل دیئے۔

میں چالیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ پر رک گیا۔ اس کی تقلید میں ہمیں بھی رکتا ہوا۔ وہ اپنا پراسرار ہاس کھولتے ہوئے بولا۔ انداز سرگوشیا نہ تھا۔

”جب میں نے تمہیں فون کیا اس وقت وہ جاگ رہا تھا اور تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نیند میں چلا گیا۔ تین چار گھنٹے تک وقفے وقفے سے سونے اور جاگنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا پھر وہ مکمل طور پر ہوش میں آ جائے گا۔ میں نے محسوس کیا ہے وہ تم سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔“

میں تھا جو کی بات سن کر خاموش رہا لیکن لی یان اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی ”آپریشن کا کیا رہا؟“ اس کے لکچے سے بے یقینی مچاں تھی۔

”بدحا کی مرضی سے آپریشن کامیاب رہا ہے۔“ وہ سب بات آواز میں بولا ”میں نے کاشا لوک کے پیٹ اور پنڈلی سے گولیاں نکال لی ہیں اور متاثرہ حصوں پر مخصوص مرہم لگا کر ڈریسنگ بھی کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ ایک آدھ دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔“

”کیا.....؟“ لی یان اور میں بیک وقت چلا اٹھے۔

تھا جو نے بات ہی ایسی کی تھی کہ ہمیں اپنے دلیم پر کنٹرول نہ رہا۔ وہ ہماری حیرت استعجاب اور بے یقینی کو ایک سر نظر انداز کرتے ہوئے دھمکے لکچے میں بولا ”کاشا لوک کے پیٹ میں سے تین اور بائیں پنڈلی میں سے ایک گولی برآمد ہوئی ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے ہاس میں سے وہ چاروں گولیاں نکال کر ہمیں دکھائیں۔ ہم مذکورہ گولیوں سے زیادہ اس کے چہرے کو کمر رہے تھے جہاں بلا کا ٹھہراؤ موجود تھا۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ اس وقت تھا جو کے چہرے پر کوئی تاثرات تھے یا نہیں..... اور اگر تھے تو ان کی نوعیت کیا تھی؟

”کیا تمہیں یقین ہے یہ ایک آدھ دن میں اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے گا؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

اسی لمحے لی یان نے بھی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ”تم قدموں پر کھڑا ہونے کی بات کر رہے ہو۔ تھا جو تو یہ دعویٰ کر چکا ہے کہ کاشا لوک ایک آدھ دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا؟“

”ہاں ہاں بالکل ایسا ہی ہوگا!“ تھا جو باری باری ہمارے چہروں پر سرخس حیرت کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”یہ تو

میڈیکل کے شعبے سے وابستہ رہی ہوں اور اس سلسلے میں میری معلومات بھی وسیع ہیں۔ تمہاجے جو دعوے کیے ہیں وہ میری سمجھ سے بالاتر ہیں!“

وہ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ جو بھی غیر یقینی ایسی باتیں سننا وہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ جیت کو دنیا کی سمجھت کہا جاتا ہے۔ انسانوں کے بسنے کا دنیا کا یہ بلند ترین خطہ اراضی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں سر کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسی طرح جیت کو بھی اس دنیا کا سر سمجھا جاتا ہے۔ سر کے اندر دماغ ہوتا ہے اور دنیا کے اس سر یعنی جیت کے اندر دماغ والے بالکل لوگ بسنے ہیں۔ صدیوں سے یہ سر زمین ”خطہ اسرار“ کے طور پر مشہور ہے۔ وہاں کے مراسر اسرار لاواؤں، چادگروں، طبیعوں اور بعض ایسے علاقوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو عام آدمی کی نگاہ میں نہیں آتے۔ یہ ان کی آنکھ کا دھوکا ہوتا ہے یا کوئی اور ظلم! بہر حال سننے میں یہ آیا ہے کہ وہاں ایسے مقامات موجود ہیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک شہر شیم ہالا (شکر پلا) بھی ہے۔ جیت کے اکثر لا خود پر معنوی موت طاری کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہ مراقبے کا نام دیتے ہیں۔ مونکس کا فلسفہ یہ ہے کہ موت کا خوف انسان میں دنیا کے لذائذ کو بد مزہ کر دیتا ہے اسی لیے خود پر معنوی موت طاری کر کے موت سے پہلے موت کا مزہ چمکتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں طبی نقطہ نظر سے ان کی موت واضح ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن اور سانس باقاعدہ رک جاتی ہے اور دیگر کوئی واضح سائن بھی پکڑ میں نہیں آتا لیکن بہر حال وہ مراقبے کی اس کیفیت سے نکلنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک تبت اور اس سے منسوب اسرار درموز موضوع گفتگو بنے رہے۔ لگ بھگ آٹھ بجے رات تھا جو ہمارے پاس آیا اور اس نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا۔

”اب وہ کھل ہوش میں ہے۔“ اس کا اشارہ کاشانوک کی طرف تھا ”وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس سے لمبی چوڑی گفتگو شروع نہ کر دیتا۔ اس کی دوا چار باٹمیں سن لو تاکہ وہ مطمئن ہو جائے۔ میرا خیال ہے اسے رات بھر آرام کرنا چاہیے۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی لی یان بھی کھڑی ہوئی۔ اس کی اس تقلیدی حرکت کا بھی مطلب تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ کاشانوک کو

تحتی طب کا ایک چھوٹا سا شعبہ ہے۔ اگر تمہیں تبت میں طویل قیام کا موقع ملا تو قدم قدم پر جہتوں کے پہاڑ تہاری نگاہوں کے سامنے آن کھڑے ہوں گے۔۔۔۔۔ اور ان میں سے ہر پہاڑ تمہیں ماؤنٹ ایورسٹ سے نکلتا ہوا نظر آئے گا۔“

اس کے بعد لگ بھگ پندرہ منٹ تک تھا جو ہمیں تختی طب وہاں کے لامادوں اور دیگر اسرار کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس میں سے بیشتر باتیں میرے علم میں اضافے کا باعث تھیں۔ اس گفتگو کے اختتام پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”احتیاط اور کاشانوک کی صحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ دن اور آنے والی رات اسی غار میں بسر کریں گے۔ آج وہ روز آگے کا پروگرام بنائیں گے اور وہ بھی حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے۔ کیا تم دونوں میری بات سے متفق ہو؟“

تھا جو کا فیصلہ بروقت اور راست تھا۔ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا۔ ہم نے اس کی بات سے اتفاق کیا پھر ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔

اس غار کے اندر رہتے ہوئے ہم دس گھنٹوں ہی سے وقت کا اندازہ کر سکتے تھے اور اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ میں بھوک محسوس کر رہا تھا۔ لی یان کا بھی یہی حال تھا۔ ہم کھینڈو سے نکتے وقت اپنی اپنی پوٹی میں ہر قسم کا زائوارہ لے کر چلے تھے جس میں خور و نوش کا سامان بھی موجود تھا۔ کھانے کی اشیاء میں زیادہ تر خشک آٹھور اور ڈرائی فروٹس شامل تھے۔ ہم نے مناسب سی پیٹ پوجا کرنے کے بعد پانی پیا اور ایک مرتبہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تھا جو نے نام کرنے کو دو چار لقمے لیے تھے۔

اس بار تھا جو ہماری گفتگو میں شریک نہیں تھا۔ وہ تیار داری کی غرض سے کاشانوک کے قریب چلا گیا تھا اور ہم دونوں ذرا مٹ کے غار کی ایک سنگلاخ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ مشعل کی ہلکی ہلکی روشنی ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس وقت ہمارے درمیان دھیمے لہجے میں گفتگو ہورہی تھی۔ لی یان نے غار کے دوسرے حصے میں کاشانوک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ جان! یہ تھا جو مجھے کوئی چادگر معلوم ہوتا ہے!“

”اگر کاشانوک واقعی کل اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو مجھے اسے چادگر ماننا ہی ہوگا۔“

وہ بولی ”میں ڈاکٹر نہ سہی لیکن ایک طویل عرصے تک

دیکھنے جانا چاہتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے تھاجو نے اسے روک دیا اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بولا۔

”صرف وجدان کو جانے دو ورنہ خواہو وہ باتوں میں لگ جائے گا اور اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھے گا۔ میں نے اسے اعصاب کو پرسکون رکھنے والی دوا کھلائی ہے۔“ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم بھی نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس سے بات کرنا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

اس میں نہ سمجھنے والی کوئی بات نہیں تھی لہذا میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں تھاجو!“

وہ مڑا اور خاموشی کے ساتھ غار کے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں کاشانوک موجود تھا۔ میں نے تسلی آمیز نظر سے لی یا ان کو دیکھا اور تھاجو کے پیچھے ہو گیا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے غار کے اس حصے میں پہنچے جہاں تھوڑی دیر پہلے تھاجو نے پراسرار انداز میں کاشانوک کا آپریشن کر کے اس کے جسم میں سے گولیوں کو نکال باہر کیا تھا۔ تھاجو لگ بھگ دس منٹ پیچھے رک گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ شعل کی روشنی اگرچہ اس غار کو پوری طرح اجالنے میں ناکام تھی تاہم ہم ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

میں نے تھاجو کی آنکھوں میں موجود تاثراتی اشارے کا مفہوم پایا۔ وہ مجھے کاشانوک کی طرف جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس کے منہ پر جانے کا یہی مطلب تھا کہ وہ چاہتا تھا میں کاشانوک سے علیحدگی میں بات کر دوں۔ میں نے اس کی خواہش پر صاف کیا اور خاموشی سے کاشانوک کی طرف بڑھ گیا۔

کاشانوک چت لیٹا غار کی سنگلاخ چھت کو گھور رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس نے گردن مٹھا کمرہری جانب دیکھا۔ اس دوران میں میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مجھ پر لگا پڑتے ہی اس کا چہرہ کل اٹھا۔ تاہم اس کی مسکراہٹ میں خراسیدگی چھلکتی تھی۔ میں اس کے پاس ہی پہلو میں زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”کاشانوک! کیا محسوس کر رہے ہو؟“  
”ٹھیک ہوں۔“ وہ فحاشہ بھری آواز میں بولا ”پہلے سے بہت بہتر ہوں۔“  
میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”تم اپنے ذہن پر زیادہ

دباؤ نہ ڈالو۔ انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“  
”درست کہتے ہو وجدان!“ وہ خفیف اور عجیب سے لہجے میں بولا ”میرے ٹھیک ہونے کا وقت دور نہیں۔ لاڈ بڑھانے چاہتا ہوں میری تمام کایف اور پریشانیوں کو ختم ہو جائیں گی میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ نردوان کی تلاش کا یہ سفر.....!“ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ کاشانوک کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا وہ اپنی زندگی کے لیے پریقین نہیں۔ یہ اس کی فطری اور برکل سوچ تھی۔ وہ جن خوں چکان حالات سے گزر کر اس غارتگ پہنچا تھا! میں انسان اسی طرح مایوسی سے سوچنے لگتا ہے۔ اس میں کاشانوک کا زیادہ تصور نہیں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے کہا ”کاشانوک! تمہاری زبان سے ایسی کم ہمتی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تھاجو نے ایک کامیاب آپریشن کر کے تمہارے جسم میں بیوست گولیاں نکال دی ہیں۔ تم ایک آدھ دن میں بھلے جگے ہو جاؤ گے۔“

میں اس موقع پر ایسی ہی تسلی بخشی کی باتوں سے اسے حوصلہ دلا سکتا تھا۔ اس نے میری باتوں کو غور سے سنا اور کبیر لہجے میں بولا ”وجدان! میری زیادہ فکر نہ کرو۔ میں تمہاری باتوں اور تھاجو کے تجربے کو جھٹکا نہیں رہا بلکہ.....“ اس نے ایک مرتبہ پھر جملہ نامک چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ یہ سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ سانس لینے میں اسے خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے زوار سے لہجے میں اپنی بات پوری کر دی۔

”بلکہ میں تو نہیں یہ بتا رہا ہوں نردوان کی تلاش کا یہ سفر اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو گیا ہے مجھے کئی حاصل ہونے والی ہے۔ زندگی کے چکر میں یہی سب ہوتا ہے۔“  
میں سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی زندگی کے خاتمے کا اعلان کر رہا تھا۔ میں نے اتنی مایوسی اس کے الفاظ میں پہلے ہی نہیں پائی تھی لیکن نہیں..... یہ مایوسی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا اطمینان تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی اور سرخ روئی تھی تھی۔ وہ درحقیقت اپنے مذہبی عقائد بیان کر رہا تھا۔ بدھ ازم میں زندگی کے چکر کی بڑی اہمیت ہے جسے ”کرم“ کہا جاتا ہے۔

کرم (KARMA) یعنی ”زندگی کا چکر“ آدھ کون کے نظریے پر قائم ہے۔ اسی لیے بدھ ازم ہندو ازم کے بہت

قریب تصور کیا جاتا ہے۔ ”کرم“ کے مطابق انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ ایک نیک انسان اگلے جنم میں بھی انسان ہی کے روپ میں پیدا ہوتا ہے جب کہ ایک بُرا انسان کسی جانور یا شیطان کی شکل میں جنم لے سکتا ہے۔ جو شخص ہر جنم میں نیک اعمال و افعال کو اپنائے رکھتا ہے وہ بالآخر نیک کی معراج پالیتا ہے جو کہ حقیقی خوشی اور بدھ مت کی اصل منزل بھی ہے۔ یہی حقیقی منزل نردوان کہلاتی ہے۔ اس منزل کے حصول کے بعد جنموں کا چکر ختم ہو جاتا ہے۔

میں یک ٹک کاشانوک کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں بند اور چہرے پر گہرے اطمینان کی جھلک تھی۔ جھجی تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنے ذمے کا تمام کام کر لیا ہو۔ اب جسے کسی بات کی فکر نہ ہو۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”کاشانوک! موجودہ حالات میں تم ایسا سوچنے پر مجبور ہو لیکن دیکھ لیتا! ایک آدھ دن میں جب تم زندگی کے تمام معاملات میں بھرپور حصہ لینے لگو گے تو تمہاری یہ دینی کیفیت جاتی رہے گی۔ تم پہلے والے کاشانوک نظر آؤ گے۔ یاد رکھو مصیبت کے بعد راحت ضرور آتی ہے!“

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں اور نونٹنی ہوئی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”میں لاڈ بڑھا کا ہے سب کچھ نہیں بھولا کہ ہر مصیبت کے پیچھے ایک راحت اور ہر تاریکی کے عقب میں ایک نئی روشنی موجود ہوتی ہے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا وجدان! راحت آنے والی ہے۔“ خیر!“

وہ ”خیر“ پر جملہ ادھورا چھوڑ کر یکا یک انتہائی سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے وہ کوئی نہایت ہی اہم بات کرنے والا ہے۔ غار کے اس حصے میں بڑی دھشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مشعل کی ناکانی روشنی نے وہاں کے ماحول کو کدے سے زیادہ پراسرار بنادیا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی ظلم کدے میں موجود ہوں۔

جب کاشانوک کی چپ طول پکڑنے لگی تو میں نے مڑ کر اپنے عقب میں نگاہ ڈالی۔ میں تھوڑی دیر پہلے تھاجو کو چند قدم پیچھے چھوڑ کر آیا تھا لیکن اب وہ مجھے نہیں دکھائی نہ دیا۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں تھاجو کے ہارے میں سوچ رہی رہا تھا کہ کاشانوک کی تحفہ مگر کبیر آواز نے مجھے بالکل طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”وجدان! میری بات کو دھیان سے سنو اور ایک ایک لفظ کو ذہن نشین کرلو۔ سچ میں کوئی سوال نہ کرنا۔“ وہ کچھ بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم ایک اتفاق کے تحت تھاجو کے قافلے کا حصہ بن گئے تھے بلکہ.....“

”پھر؟“ میں نے چونک کر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا ہے نا سچ میں سوال نہیں کرنا!“ اس نے کمر درسی تنبیہ کی ”اس مداخلت کے سبب ہو سکتا ہے کام کی بات رہ جائے!“ وہ ذرا دیر کو خاموش ہوا پھر اپنے خفیف بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تھاجو ایک نہایت ہی ذہین دار شخص ہے۔ یہ خاص الخاص تمہارے لیے ایک طویل اور کٹھن سفر ہے کر کے جیت سے کھینڈ دینا چاہتا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ جو دیگر بدھ بھکشو دیکھے ہیں ان کا اصل مشن سے کوئی تعلق نہیں اور وہ تمام کے تمام کھینڈ دے گا اس کی ہر اہی میں آئے تھے۔“

وہ کچھ بھر کو رک کر تو میں سوچے ہانا نہ رہ سکا کہ وہ کس مشن کا ذکر کر رہا تھا۔ تاہم اس بار میں نے کوئی سوال نہ کیا اور گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تھاجو کا تعلق لہاسا کی سب سے معروف بدھ عبادت گاہ ”جو کھا ٹنگ نیپل“ سے ہے۔ اسے یہ مشن سونپا گیا ہے کہ یہ جہیں اپنے ساتھ لے کر کھینڈ دے جت پیچھے گا۔ میں نے اس سلسلے میں جو بھی کردار ادا کیا ہے..... اور کر رہا ہوں اس کا مجھے حکم تھا۔ تم درحقیقت تھاجو کی نگرانی اور مہربانی میں جیت کے صدر مقام لہاسا پہنچنے والے ہو۔“  
اس نے چونکہ مجھے سچے سچے سوال کرنے سے منع کر دیا تھا لہذا اس دفعہ جب وہ متوقف ہوا تو میں جب چاہ بیٹھا احتیاطیہ نظر سے اسے دیکھتا رہا البتہ اس کے انکشافات نے میرے اندر کھلی سی مچادی۔ اگر مجھے بری پلان جیت پہنچا جا رہا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا اس سے آگے کی پلاننگ بھی کی جا چکی ہوگی۔ ان خیالات نے میرے ذہن کو قدرے الجھا دیا۔ اپنی دانست میں تو میں فوری طور پر اسرا نیل جا رہا تھا۔ چونکہ میں کھینڈ دے براہ راست اسرا نیل کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا لہذا میں جیت کو بلور بریک لینڈ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر دوسری طرف یہی کام ایک خاص منصوبے کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔ پتا نہیں آنے والا وقت مجھے کیا دکھانے والا تھا!

کاشانوک نے شاید میری سوچ پڑھ لی اپنے انکشافات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”وہ جانے! آنے والا وقت تمہیں بہت سے معجزے دکھائے گا۔ یہ سب تمہاری ضرورت اور خواہش کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ تم اپنی سامی ساحل کے حصول کے لیے اسرائیل جانا چاہتے ہو۔ تم ضرور اسرائیل پہنچو گے اور اس سلسلے میں چنگ فورن پوٹی تمہاری مدد کرے گا۔“

”کون چنگ فورن پوٹی؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

اس مرتبہ کاشانوک نے میرے سوال پر کوئی اعتراض یا تبصرہ نہیں کیا۔ لمبے بھر کے لیے اس کے ہونٹوں پر چمکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

”میں نے تھوڑی دیر پہلے ہلسا کے جوکھا نگ ٹیمپل کا ذکر کیا ہے۔ اس بدھ عبادت گاہ کو ہلسا کا دل اور روح ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ تھاچو تمہیں بحفاظت اپنی عمر گرائی میں جوکھا نگ ٹیمپل (JOKHANG TEMPLE) تک پہنچائے گا۔ جوکھا نگ ٹیمپل کا روح رواں چنگ فورن پوٹی ہے۔ جوکھا نگ ٹیمپل کا چیف لاما چنگ فورن پوٹی تمہاری راہنمائی اور مدد کرے گا۔“

میں حیرت اور دلچسپی سے کاشانوک کو دیکھتا چلا گیا۔ جھپٹے کچھ عرصے سے میں بدھ مت افراد کے زیادہ نزدیک رہا تھا جس کے سبب مجھے بدھ ازم اور اس کے سیٹ اپ کے بارے میں جاننے کا خاصا موقع ملا تھا۔ چنگ فورن پوٹی اس شخص کے نام کے ساتھ ”رن پوٹی“ کا اضافہ اس کی قدرومنزلت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔ رن پوٹی (RINPOCHE) کے معنی اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی پروفیسر کے ہیں۔ اس پرستار یہ کدوہ جوکھا نگ ٹیمپل کا چیف لاما بھی تھا۔ ان لمحات میں یکایک میرے دل میں یہ احساس جاگا کہ مجھے اس نادر روزگار شخص سے ضرور ملنا چاہیے۔

میں نے محسوس کیا کاشانوک کو بولنے میں اچھی خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آواز میں رچی بسی تھابت اور نزاری اس کی مجموعی حالت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی۔ چنگ فورن پوٹی کا ذکر کرنے کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

میں تھاچو کی ہدایت کو نہیں بھولا تھا۔ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں کاشانوک سے بات کروں۔ اس کی زبانی مجھے بتا چلا تھا کاشانوک مجھ سے کوئی ضروری بات کہنا چاہتا تھا۔ اس وقت کاشانوک کی خاموشی

اور اطمینان سے یہی ظاہر ہوتا تھا اسے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ کہہ چکا لیکن میں بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا جس میں سب سے زیادہ اہم معاملہ شرما کا تھا۔ کاشانوک شرما کو جاننے کا اقرار کر چکا تھا۔

میں چند لمحات تک متذبذب نظر سے کاشانوک کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر نہایت ہی دھیمی آواز میں اسے پکارا ”کاشانوک!“

”ہوں!“ اس نے آنکھیں کھولے بغیر میری پکار کا جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”تم مسٹر شرما سے واقفیت کا اقرار کر چکے ہو مگر ابھی تک تم نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

وہ کمزوری آواز میں بولا ”شرما کا تعلق کمینڈو کی انڈر ورلڈ سے ہے۔ وہ نہایت ہی خطرناک اور چمٹا ہوا ہیکلسٹر ہے۔ میں نے ایک دوسرے سے نہایت ہی خفیہ طور پر جالوس سے ملاقات کرتے دیکھا ہے۔“ وہ اپنی آنکھوں کو بدستور بند رکھتے ہوئے حیرت انگیز انکشاف کر رہا تھا ”شرما کا شمار جالوس کے گہرے دوستوں میں ہوتا ہے۔“

”اوہ!“ میں ایک طویل اور بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کھڑکھانے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں نے بڑی سرعت سے پلٹ کر دیکھا تو تھاچو پر نگاہ پڑ گئی۔ پتا نہیں وہ کب اور کس وقت وہاں آن موجود ہوا تھا۔ مجھے سے نظر ملتے ہی اس نے ہاتھ سے مجھے اپنی جانب آنے کا اشارہ کر دیا۔ اس کے اشارے کے جواب میں میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کاشانوک کے شانے پر میں نے ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”کاشانوک! تمہیں اس وقت آرام کی اشد ضرورت ہے۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔ کل بات کریں گے۔“

پھر میں اس کے پاس سے اٹھ کر تھاچو کی طرف چلا گیا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے قدرے شکایتی لہجے میں کہا ”تم نے کافی دیر لگا دی حالانکہ میں نے تمہیں تاکید بھی کی تھی کہ۔۔۔۔۔“

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ”کاشانوک کو اپنی بات کہنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی اس لیے تاخیر ہو گئی!“

وہ چند لمحات تک یک یک مجھے دیکھتا رہا پھر گہرے انداز میں بولا ”تو اس کی بات تمہاری سمجھ میں آگئی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ بھرے ہوئے لہجے میں بولا ”تم اپنی سامی کے پاس جاؤ۔ تمہیں جیسے ہی اسی غار میں رات گزارنا ہے“ ٹھیک ہے؟“

اس کا جملہ سوالیہ انداز میں ختم ہوا تو میں نے پوچھ لیا ”اور تم؟“

”میں کاشانوک کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس جا رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا ”وہ خالص دل شکستہ دکھائی دیتا ہے۔ بڑی باوقی کی باتیں کر رہا تھا۔“

تھاچو نے مجھ سے ان مایوس باتوں کی تفصیل نہیں پوچھی اور گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سرسری انداز میں بولا ”وہ جن حالات سے گزر رہا ہے ان میں ذاتی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی ہے لیکن تم پریشان نہ ہو لارڈ بدھانے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ایک لمبے کو متوقف ہونے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اسے ایک پرسکون گہری اور بھرپور نیند کی ضرورت ہے۔ صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اس نے کچھ کہنا یا بھیجے یا ابھی تک۔۔۔۔۔؟“ میں جملہ امور اچھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

تھاچو نے معتدل لہجے میں کہا ”اس کیفیت میں محسوس غذا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ میں نے غلول کی ضرورت میں اسے رقیق مادہ ملا دیا ہے جو غذا کے علاوہ ایک موثر دوا بھی ہے۔ یہ غلول اس کی متاثرہ آنکھوں کو بھی بھلا چکا کر دے گا۔“ وہ ایک لمبے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ”وہ ایسے کاشانوک کو اس وقت جس شے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے نیند! مجھے امید ہے وہ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے تھاچو سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور لی یان کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اس وقت میرا ذہن مسلسل مسٹر شرما کی قسمی سلجھانے میں مصروف تھا۔ کاشانوک کے مطابق وہ جالوس کا گہرا دوست تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ جو گنڈر بال کا بھی دوست تھا۔ دوست کا دوست ہمیشہ دوستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو گنڈر بال اور جالوس اپنے ہمسایک اور عبرت ناک انجام کو پہنچ گئے تھے۔ ان کی موت کے بعد شرما کا اچانک میرے خلاف متحرک ہو جانا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ اس کی پشت بھی میرے وہی اسرائیلی یہودی دشمن

ٹھوک رہے تھے جو اس سے پہلے اول الذکر دونوں آں جہانی دشمنوں کی پشت پھینکتے چلے آئے تھے۔ یہ دراصل ربی موٹے ہاتھن کے مختلف روپ تھے جو ایک کے بعد ایک میری مخالفت میں میدان میں اتر رہے تھے۔۔۔۔۔ اور اللہ کا شکر ہے میں اپنے ان دشمنوں کو بے پناہ ہزیمت پہنچا رہا تھا۔ سندری جمل کی چڑا سر اور پہاڑیوں میں نہایت ہی مختصر وقت میں نے مسٹر شرما کو اتنے زخمی ڈالے تھے کہ ان کو چاہئے چاہئے اس کی زبان کھس جاتی۔ یہ الگ بات کہ اس معرکہ آرائی میں کاشانوک کی صورت میں ہمیں بھی ایک کڑی آزمائش سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

شرما کے بعد میرا دھیان جوکھا نگ ٹیمپل کی طرف چلا گیا جو ہلسا کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے قبل زندگی میں شاؤ لن ٹیمپل سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ شاؤ لن جانا میں واقع مارشل آرٹس کی اس عظیم الشان تربیت گاہ میں مجھے مختلف فنون حرب و ضرب سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ماسٹر بینگ پائی نے ”جی“ کا پہلا سبق بھی مجھے شاؤ لن ٹیمپل ہی میں دیا تھا اور اب۔۔۔۔۔ میں تبت کے جوکھا نگ ٹیمپل کی طرف جا رہا تھا۔ پتا نہیں کاپتہ تقدیر نے میری زندگی میں اور کیا کچھ سیکھنا لکھ رکھا تھا۔

چیف لاما چنگ فورن پوٹی کے تصور سے میرا خیال محترم سانگ فو کی طرف چلا گیا جس سے میری پہلی اور آخری ملاقات سیٹل (واشنگٹن) میں ہوئی تھی۔ اس مختصر اور انتہائی پرائیویٹ ملاقات میں آنجہانی نے اپنے وسیع تجربے کی روشنی میں مجھے عملی زندگی کے راز ہائے سربستہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس ملاقات کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں محسوس کر رہا تھا جتنی علوم کا پروفیسر (رن پوٹی) چنگ فو مجھے کچھ آگے کا سبق پڑھانے والا تھا۔

میں انہی خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا لی یان کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی خطر نگاہ سے نگاہ لی تو اس نے پوچھا ”وہ جان! کاشانوک کا کیا حال ہے؟“

اس کے لہجے سے بے پناہ تشویش جھلکتی تھی۔ میں نے ایک لمحے تک اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ہم سے انداز میں کہا ”بظاہر تو سب کچھ ٹھیک نظر آ رہا ہے لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل مطمئن نہیں۔“

”مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ اس کی تشویش سوا ہو گئی۔

میں ابھی کاشانوک کو جیسا دیکھ کر آیا تھا مختصر الفاظ میں لی یان کے گوش گزار کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا ”تھاچو کیا کہتا ہے اس سلسلے میں؟“



”وہ تو بہت پر امید ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”گاڈ بلیس ہم!“ اس نے کہا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے دریافت کیا ”تھاچو نے بتایا تھا“ کا شانوک تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کچھ بتایا؟“

تھاچو اور چنگ فورن پوشی کے بارے میں مجھے کا شانوک کی زبان پر کچھ معلوم ہوا تھا وہ میں نے لیان کو بتا دیا اور آخر میں کہا ”پتا نہیں“ تب... پہنچ کر کون سا پراسرار چکر چلنے والا ہے!“

وہ بڑی خوبصورت میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”میں جانتی ہوں! ہاں اس کے جو کھا تک ٹیکل میں جو کچھ بھی ہوگا وہ انتہائی خیر اور پراسرار ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس تمام تر چکر کی جڑ ہم ہی ہو!“

”میں..... وہ کیسے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔  
”وہ ایسے کہ تم خود اسرار و رموز میں لینے ہوئے ہو!“  
وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ”کیا کسی عام آدمی کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو تمہارے ساتھ پیش آ رہے ہیں؟“

بالفاظ دیگر وہ مجھے ایک خاص آدمی ثابت کرنے کی جگہ درد میں تھی مجھے اس موضوع پر بحث کا کوئی دروازہ نہیں کھولا تھا لہذا کوئی سوال کرنے کے بجائے میں نے عام سے لہجے میں کہہ دیا ”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ دیکھتے ہیں آگے آگے کیا ہوتا ہے!“

”جو بھی ہوگا“ بڑا انٹرنٹنگ اور ایڈڈ پچرس ہوگا۔“ وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے موضوع کا ذرا ہی تبدیل کرنے کے لیے اپنی رست واپس پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ پہاڑی علاقے میں رات بہ نسبت جلدی ہوجاتی ہے۔ اس اعتبار سے اس وقت رات کم و بیش نصف سترے کر چکی تھی۔ میں نے لیان سے کہا۔

”کیا خیال ہے“ تھوڑی دیر میں لے لی جائے۔ آج کی رات تو اتنی ہی ہے۔ پتا نہیں پھر کس سوئے کا موقع ملے!“  
اس نے غار کی چھری زمین کی طرف دیکھا۔ مشکل کی بلکی بلکی روشنی اس مقام تک پہنچ رہی تھی۔ جہاں اس وقت ہم بیٹھے بائیں کر رہے تھے۔ اس کی نظر خائبہ کرتے ہوئے میری نگاہ بھی سنگار زمین کی جانب اٹھ گئی۔ اسی لمحے لیان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”سنا ہے“ نیند بڑی ظالم ہے۔ یہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ مجھے تو اس وقت نیند نہیں آ رہی۔ کیا تم اس کی ضرورت محسوس کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”مجھے بھی کوئی خاص نیند نہیں آ رہی۔ سونے والی بات میں نے حفظ مانتقم کے طور پر لی تھی۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔“ میں نے سنگ ریز زمین کی سمت انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ”یہاں سولی اور نیند والے حالات پیش نہیں آئیں گے۔ میں تمہارے آرام کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیان نے پوچھا ”کہاں جا رہے ہو؟“  
”اپنے“ سفری بیگ“ لینے جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم گھنٹوں سے پوٹلی نما سفری بیگ لے کر چلے تھے۔ یہ بیگ تھے یا پوٹلیاں اس سے قطع نظر ان میں ہماری سفری ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ اضافی کپڑوں کے علاوہ میں نے دشمنوں کے وہ دو لباس بھی اپنی پوٹلی (بیگ) میں ڈال لیے تھے جو بوقت ضرورت استعمال میں لائے جاسکتے تھے۔ ہمارے سفری بیگ غار کے اس حصے میں رکھے تھے جہاں اس وقت کا شانوک اور تھاچو موجود تھے۔

میں نے مذکورہ حصے کی جانب قدم اٹھایا ہی تھا کہ ادھر سے تھاچو آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنی پوٹلیاں دیکھ کر میرا تھا شگ۔ پتا نہیں یہ ایک اتفاق تھا یا تھاچو نے ہماری ضرورت کو محسوس کر لیا تھا بہر حال وہ بروقت پوٹلیاں لے کر ہمارے پاس آ گیا تھا۔

اس نے مذکورہ سامان میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ رکھ لو۔ تمہارے اوڑھنے بچھونے کے کام آئیں گے۔ ان پوٹلیوں میں لباس کی صورت میں کچھ کپڑے موجود ہیں۔ مجبوری کے کلمات میں ایسے ہی گزارہ چلایا جاتا ہے۔“

”تم ہماری فکر نہ کرو تھاچو۔ ہم بہت اچھی طرح گزارہ کر لیں گے۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ سامان لینے ہوئے معتدل لہجے میں کہا ”تم پوری توجہ سے کا شانوک کا خیال رکھنا۔ اسے ہم سب سے زیادہ نگہداشت کی ضرورت ہے!“

”میں اپنے فرائض کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا ”کا شانوک والا موبائل تمہارے پاس ہی ہے؟“

”ہاں کسی ہنگامی رابطے کے لیے وہ میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔  
میں نے کہا ”یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ اگر میری ضرورت پیش آئے تو بتا دینا۔“  
”ضرور بتاؤں گا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔

میں نے دونوں پوٹلیاں کھول لیں اور ان میں موجود کپڑوں کا جائزہ لینے لگا۔ لیان کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”وہ جان! یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تھاچو نے ہماری گفتگو سن لی ہو!“

”تم کس حوالے سے یہ بات کہہ رہی ہو؟“ میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔  
”ہم نے ادھر اوڑھنے بچھونے کا ذکر کیا“ ادھر وہ یہ سامان لے کر آ گیا۔“

”یہ محض ایک اتفاق ہے۔ تم اس سلسلے میں اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔“ لیکن میں ہر بات کو اتفاق کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتی وہ جان!“

”تو پھر یہ اتفاق نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا ”تھاچو نے واقعی ہماری گفتگو سن لی ہوگی۔“  
میرا انداز ایسا تھا کہ لیان نے سختی سے کہا ”وہ جان!“

میں بھی یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“ کام سے ہاتھ روک کر میں نے اس کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تھاچو ایک سینئر اور قابل مجروح و ساموئیک ہے۔ جو کھا تک ٹیکل میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنگ فورن پوشی نے کچھ دیکھ کر ہی اسے یہ مشن سونپا ہے۔ دیکھنا تھاچو بھی پراسرار صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔“

وہ یقین اور بے غمی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ میری بات سنتی رہی پھر جھجھکا ہٹ آمیز لہجے میں بولی ”وہ جان! میں جب سے تمہارے ساتھ ہوں ایک سے ایک پراسرار ہستی سے ملنے کا اتفاق ہو رہا ہے اور..... یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گی کہ اس تمام تر پراسراریت کی جڑ ہمیں ہو۔“

میں نے اس کی بات کا جواب دیا اور نہ ہی اس پر کوئی توجہ کیا۔ اس دوران میں ”میں“ دونوں پوٹلیوں میں موجود کپڑوں کا محاسبہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کا حیران بنانے کی

غرض سے کہا۔

”میرا خیال ہے“ ہم بدھ بھکشوؤں والے یہ ڈھیلے ڈھالے لباس اتار کر دشمنوں کے لباس پہن لیتے ہیں۔ یہ ایک محسن اتفاق ہے کہ ہمیں ایک بہت قامت شخص کا لباس بھی میسر آ گیا ہے جو تمہارے ناپ پر پورا اترے گا۔“

مذکورہ دونوں لباس عمدہ جینو اور گرم نفل ٹریش پر مشتمل تھے۔ اس کے علاوہ گرم ٹیکلس بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اگر ہم ان کپڑوں کو زیب تن کر لیتے تو اپنے استعمال شدہ بدھ بھکشوؤں والے لباسوں کو بچھونا بنا کر غار کے فرش کی سختی کو سختی الامکان کم کر سکتے تھے۔ دیگر غیر استعمال شدہ کپڑوں کو اوڑھ کر گزارہ چلایا جاسکتا تھا۔

لیان نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ”کسی کے بدن سے اترے ہوئے لباس کو پہننا عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجبوری کی بات دوسری سے لیکن شخص رات بسر کرنے کے لیے میں وہ کپڑے نہیں پہنوں گی۔“

اس کی بات میں وزن تھا لہذا میں نے اس سے اتفاق کر لیا۔ دشمنوں کے کپڑوں کا استعمال میں نے یہ نکالا کہ اسے بچھونے کے طور پر غار کے فرش پر پھیلا لیا۔ ہم بدستور بدھ بھکشوؤں والے لباس پہن رہے تھے اور فاضل لباس کو اپنے اوپر اوڑھ کر نیم دراز ہو گئے۔ ہم نے غار کی ایک دیوار سے ٹیک لگا لی تھی۔

اس غار سے باہر اس وقت تاریکی کا راج تھا اور تاریکی بھی وہ جو برف کو شرمادے۔ سورج ”غروب“ ہوئے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اگرچہ غار کے اندر کا درجہ حرارت باہر کی بہ نسبت زیادہ تھا لیکن اسے خوشگوار حرارت والا ماحول ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ہم اپنی قوت اداوی قوت برداشت اور ذرا کی فردش پر مشتمل کھانے سے حاصل ہونے والی توانائی سے موسم کی شدت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تو میں ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔

میری دیکھا دیکھی لیان بھی سرک کر میرے قریب آ گئی۔ موسم کی سختی کو قرب کی نرمی سے ٹھکرتی جاسکتی تھی۔ اس قربت نے غار کے اندر دنی ماحول کو خاصا حرارت بخش اور خوشگوار بنا دیا۔ میں نے سور یا داس والے موبائل کو ہاتھ میں لیا اور لیان کے کان میں سرگوشی کی۔

”میں ڈراما کے کچل لینا چاہتا ہوں۔“  
”تم اس سے کیا کہو گے؟“ وہ میرے ہاتھ میں موبائل دیکھتے ہوئے بولی۔

”کہنا کیا ہے اس کے تازہ تازہ ذہنوں پر تھوڑی جھک پاشی ہی کرلوں گا۔“ میں نے کہا۔  
 لی یاں مٹی خیر لکچہ میں بولی ”تم اسے شاید یہ بتانا چاہتے ہو کہ اس کا بیچا آسانی سے نہیں چھوڑو گے؟“  
 ”یہی سمجھ لو!“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور موبائل سے پیچھے ہٹ کر نکلا۔

کال ریسپونڈ میں شرما کا سیل نمبر موجود تھا۔ میں نے آپت میں جاکر اس نمبر کو استعمال کیا اور سینڈ کا بین پریس کر دیا۔ دوسری جانب شرما کی آواز سنائی دینے کے بجائے ایک ریکارڈ شدہ مخصوص آواز ابھرے گی جس کا مفہوم کچھ یوں بننا تھا ”میرا مطلوبہ نمبر فی الحال کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ تین چار مرتبہ کی کوشش کے بعد میں نے موبائل کو ایک طرف رکھ دیا۔“

لی یاں نے شرارت بھرے لہجے میں سرکشی کی ”وہ جان! تم نے شرما کے کس جگہ چنکی لی؟“  
 میں نے جس انداز میں سیل کو رکھا تھا اس سے وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ شرما سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اگر میں اس سے کوئی بات کرتا تو وہ لی یاں سے ڈھکی چھپی نہ دیتی اس کے باوجود بھی وہ مجھے پیچھے نہ دینی کی غرض سے شریر سوال کر رہی تھی۔ اس کی شرارت بھری پیش قدمی کو میں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

شرارت کا جواب شرارت سے ہی دینا ضروری تھا۔ میری ہلکی حرکت سے وہ بدک کر چند اونچ دور ہو گئی پھر مٹی چنکی سے بولی ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں!“

”اس طرح؟“ اس کی چٹکی منھاس بٹائی رہی۔  
 میں نے کہا ”تم نے پوچھا“ میں نے شرما کے کس جگہ چنکی لی۔ میں نے عملاً بتا دیا۔ شرما شرما ہوتے ہوئے بھی ڈرا نہیں شرما یا اور تم لی یاں ہو کر خوفناک پریشان ہو رہی ہو!“  
 ”تم بڑے چکر باز ہو وہ جان!“ اس نے ہم انداز میں کہا۔

”بہانے باز تو نہیں ہوں نا!“ میں نے اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ کسی پس و پیش کے بغیر سمجھتی چلی آئی پھر میرے بازو کو تکیہ بناتے ہوئے بولی ”وہ جان! انہیں ہماری باتیں تھا جو تک تو نہیں پہنچ رہی ہوں گی؟“

”امید تو نہیں ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

اس نے ایک اور خدشے کا اظہار کیا ”وہ غار کے اس

حصے میں بیٹھا ہمیں دیکھ تو نہیں رہا؟“  
 اور اس کی بات ختم ہوئی اور غار میں گھپ اندھیرا بھر گیا بے ساختہ لی یاں مجھ سے پیوست ہو گئی۔ میں نے اس کے بائیں کان پر ہونٹ رکھ کر سرکشی کی ”چلو تمہارا یہ اندیشہ تو جاتا رہا کہ تھا چاہو اور بیٹھا ہمیں دیکھ تو نہیں رہا؟“

وہ میری گرفت میں تھوڑا سا سسپا۔ انداز الگ ہونے والا نہیں تھا۔ اس کے بدن کی اضطرابی جنبشوں نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ مجھ سے پیوستہ رہ کر آہ بہار کی منتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے فطری تجسس کے ہاتھوں بھی مجبوراً تشویش ناک لہجے میں مجھ سے متفسر ہوئی۔

”کاشا نوک تو ٹھیک ہو گا نا؟“  
 ”ابھی معلوم کر لیتے ہیں!“

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا سیل ہاتھ میں لے لیا پھر کاشا نوک والے سیل کا نمبر ڈیج کرنے لگا۔ ڈیپلے کی مخصوص لائٹ میں یہ کام بہ آسانی ہو گیا۔ کاشا نوک والی سیل تھا جو کے پاس تھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے سیل کے اسپیکر میں تھا جو کی ”ہیلو“ سنائی دی۔

میں نے پوچھا ”تھا چاہو! تمہاری طرف خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں! ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”مشغل کو تم نے خود بھجایا ہے یا۔۔۔۔۔؟“

”یہ اپنی مرضی سے بھیجی ہے۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ”کہتا ہے اس کا“ ”ایڈرمن“ ختم ہو گیا۔ بہر حال فکر والی کوئی بات نہیں۔“

تھوڑی دیر پہلے تک جس مشغل نے اس غار کو کسی حد تک روشن کر رکھا تھا اس کے بارے میں میری معلومات اس حد تک تھیں کہ وہ جانوروں کی چربی سے جلتے والی ایک مشعل تھی۔ مشعل کا ایڈرمن ختم ہوجانے والی بات کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے تھا جو سے کہا۔

”تمہارے پاس ایک تاریج بھی تھی۔ اسے سنہال کر رکھا ہوا ہے نا؟“

جب ہم آج سہ پہر اس غار میں داخل ہوئے تھے تو غار کے اندرون کا جائزہ لینے کے لیے تھا جو نے اپنی پوٹی میں سے ایک تاریج نکال کر روشن کی تھی۔ میرا اشارہ مذکورہ تاریج کی جانب ہی تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”تم گھر نہ کرؤ میں نے اپنی ہر شے کو سنہال کر رکھا ہوا

ہے۔“  
 ”کاشا نوک کیا ہے؟“ یہ سوال بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا تھا۔

تھا جو نے بتایا ”اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔ تم لوگ بھی سوئے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے کل کا دن آج سے بھی زیادہ لمب ہو۔ ہو سکتا ہے ہمیں ایک لمحے کو بھی آرام کرنے کا موقع نہ ملے۔“

”او کے“ گڈ نائٹ!“ میں نے یہ کہتے ہوئے سیلور رابطہ موقوف کر دیا۔

لی یاں سیل سے کان لگائے لیٹی تھی اس لیے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس نے سن لیا۔ وہ سیل ہمارے پیچ سینڈ وچ بن گیا تھا۔ میں نے سیل کو کان سے جدا کر کے ایک طرف رکھا تو وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کر کے ہوئے بولی۔

”سینکس گاڈ! میں کاشا نوک کے لیے بہت ٹینس تھی۔“

”اب تو تمہاری ٹینشن دور ہو گئی ہوگی؟“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”ہاں! کافی حد تک!“ اس نے جواب دیا پھر میرے پہلو میں سرسراتے ہوئے بولی ”میری دعا ہے کہ وہ کل اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے!“

قدرت نے عورت کی فطرت میں تجسس اور تشویش کا مادہ بہ نسبت زیادہ رکھا ہے اور اپنے ان جذبات کے اظہار میں وہ بیکر فراموش کر جیتی ہے وہ کہاں اور کس باخول میں سانس لے رہی ہے۔ لی یاں میرے پہلو میں لیٹی تھی لیکن اس کا ذہن غار کے دوسرے حصے میں موجود کاشا نوک کے لیے متحرک تھا۔ میں نے کاشا نوک سے جو مختصر سی گفتگو کی تھی اس نے میری سوچ کو ٹپک کر رکھا تھا لی یاں کی سلی کے لیے میں نے کہہ دیا۔

”انشاء اللہ! ایسا ہی ہو گا۔“

لی یاں باتوں کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ باتوں کے لیے ایک عمر پڑی تھی۔ میں نے اس کے موڈ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی گردن کو جھکایا اور بیک جنبش لب اس کا ہاتھ بند کر دیا۔ اس نے ایک نشاط انگیز جھرجھری لی اور میرے وجود میں پیوست ہوئی چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک دوسرے کو اوڑھ کر سونے کی کوشش کر رہے تھے۔

انگلجی بہت جلدی میری آنکھ کل گئی۔ میں نے ایک بھر پوز آ سوڈ کی بخش انگڑائی لے کر خود کھنے دن کے لیے تیار کیا۔ اس انگڑائی نے میرے بدن کے ایک ایک حصے کو بیدار کر دیا۔ میں نے اور اور نگاہ گھما کر اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن غار میں چھائی ہوئی تاریکی نے میری کوشش کو نا کامیاب بنادیا۔ میں محسوس کر رہا تھا اس پہاڑی کے باہر کہیں سورج طلوع ہو چکا ہے مگر طلوع آفتاب کے آثار بھی اس طرف نہیں پہنچے پائے تھے۔ میں نے اپنے پہلو میں لی یاں کو ٹٹولا لیکن وہ مجھے ”محسوس“ نہ ہوئی۔ میرا یہ پہلو رات بھر اس کے وجود سے آباد رہا تھا پھر وہ کہاں چلی گئی؟

میں یکا یک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لی یاں کو اپنے قریب نہ پا کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں غار کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں موبائل فون کا خیال آیا۔ اس کے ڈیپلے کی روشنی میں ”ہی! آسانی لی یاں کا سراغ لگا سکتا تھا۔ میں نے سیل کو آن کیا تو اس کی اسکرین روشن ہو گئی۔ ڈیپلے پر نمودار ہونے والی معلومات سے مجھے پتا چلا کہ اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ گویا میرے احساسات میری درست راہنمائی کر رہے تھے۔ پہاڑی سے باہر کہیں سورج واقعی طلوع ہو چکا تھا“ یہ ایک بات کہ اس کی روشنی پہاڑی غار کے اندر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ میں نے کلاک سے نگاہ ہٹائی اور ڈیپلے کی مجدد روشنی میں لی یاں کو تلاش کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ مجھے نظر آ گئی۔

اسے چرسکون آ سوڈ کی کی نیند سوتے دیکھ کر مجھے حیرت کا بھی ایک جھٹکا لگا۔ یہ حیرت اس کی نیند کے سبب نہیں تھی بلکہ میں اس بات پر حیران تھا کہ وہ مجھ سے دور کیسے چلی گئی؟ وہ اس وقت مجھے چارنٹ کی دوری پر دکھائی دے رہی تھی اور دھک کی بات یہ تھی کہ وہ بھونکنے کے بجائے پھر چلی زمین پر پڑی تھی۔

میں موبائل فون کی روشنی میں بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور اگلے ہی لمحے اس کے قریب پہنچ گیا پھر میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اٹھایا اور اندازے کی بنا پر لا کر بھونکنے پر لٹا دیا۔ اس حالت میں ڈیپلے کی روشنی سے استفادہ ممکن نہیں تھا۔ بھونکنے پر ڈالتے ہی میں نے موبائل کو اس کی طرف کرتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس نے سوتے ہوئے کسی بچے کے مانند ”نی جگہ پر پہنچتے ہی اپنے ہاتھ پاؤں کو بے معنی حرکت دی اور کروٹ کے بل لیٹ کر چرسکون ہو گئی۔ میں نے وہاں موجود تمام کپڑوں کو دتہ اس پر ڈال دیا پھر

ڈپلے کی روشنی میں بخور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے نیند کے تسلسل کو ٹوٹے نہیں دیا تھا، اس کے لیے موسم جیسے بے اثر ہو کر رہ گیا تھا!

لی یان نیند کی حالت میں اور بھی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس خوابیدہ حسن کی مصویت کو میں چند لمحات تک نظر نہیں اکر دیکھتا رہا پھر غار کے اس حصے کی سمت قدم بڑھا دیئے جو آگے جاتے ہوئے بتدریج تنگ ہوتا چلا گیا تھا۔ میں لی یان کے ساتھ شام سے تھوڑی دیر پہلے بھی اس طرف آیا تھا لیکن کسی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی نہیں واپس تھا جو کے پاس جانا پڑا تھا۔

اس وقت مجھے فرمت ہی فرمت تھی۔ لی یان گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ تھا جو کی طرف چھائی خاموشی سے ظاہر ہوتا تھا، ادھر سب خیریت ہوگی۔ یہ اچھا موقع تھا۔ جب تک وہ لوگ بیدار ہوتے اور سورج کی ناکاکی روشنی اس غار کی تاریکی میں سیندھ لگانے کی کوشش کرتی، میں غار کے دوسرے سرے کا سراغ لگا سکتا تھا۔ تھا جو کے تہوڑی بی بتاتے تھے وہ آگے بڑھنے کے لیے غار کے اسی حصے کا استقبال کرے گا۔

میں تار کی می میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ موبائل فون کو میں نے لباس میں محفوظ کر لیا تھا۔ ان اندھے غار میں مجھے اندازے کی بنا پر قدم اٹھانا پڑ رہے تھے۔ اگرچہ وہ تاریکی 'ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیئے' والی نہیں تھی۔ تاہم غار کا اندرونی منظر ایسا واضح بھی نہیں تھا کہ میں بے دھڑک آگے بڑھتا چلا جاؤں۔

دس منٹ کے بعد میری مشکل آسان ہو گئی۔ غار کے اس حصے میں، مہربان اچالا بڑی نرمی سے قدم رکھ رہا تھا۔ موہومی روشنی میں میرے لیے آسانیاں فراہم کرنے لگی۔ میں اس دل گداز مہمان کے توسط سے کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ غار کے اس حصے میں ارضی سطح کے باوجود بھی فرحت اور کھٹکتی کا احساس تھا۔ شاید قریب ہی کہیں اس پہاڑی کا کوئی حصہ فضا میں کھلا ہوا تھا جہاں سے تازہ حیات بخش ہوا غار کے اندر پہنچ رہی تھی۔

میں مزید آگے بڑھ گیا۔ اب اس غار نے ایک تنگ سی سرنگ کی صورت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سرنگ اتنی کشادہ ضرور تھی کہ دو افراد پہلو بہ پہلو آسانی آگے بڑھ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تنگ سا پہاڑ دو در راست ایک خاص زاویے سے مڑ رہا تھا۔ میں اس راستے پر سفر کرتے ہوئے اسی سمت میں مڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر

کے بعد میں ایک کشادہ جگہ پر کھڑا تھا۔ وہ مقام متشکل شکل کا تھا جس کی پیمائش میرے اندازے کے مطابق لگ بھگ پارہ ہائی پندرہ فٹ رہی ہوگی۔ اس جگہ سے آگے وہ راستہ ایک مرتبہ پھر بتدریج تنگ ہوتے ہوئے ایک طرف مڑتا چلا گیا تھا۔ میں اس مقام پر ٹھہر کر سوچنے لگا کہ منزل کی تلاش میں آگے کا سفر جاری رکھوں یا واپسی کی راہ اختیار کروں؟

میرے ذہن نے فوری طور پر ایک متوازن فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا تعلق آگے بڑھنے سے تھا اور نہ ہی پیچھے پلٹنے سے۔ اس 'قطعہ زمین' کو دیکھ کر میرے دل میں خواہش جاگی کہ مجھے کچھ وقت یہاں گزارنا چاہیے۔ کیوں.....؟ ذہن نے اس بارے میں بھی سوچ لیا۔ ذہن کی اس سوچ میں اعصاب کی بے قراری کو بھی دخل تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا ایک سرسبز پتھر پر چل رہے تھے۔ یہ میرے جسم کی ایک فطری خواہش تھی۔ پچھلے دنوں سے میں مارشل آرٹس کی ایک سرسبز اور یوگا کی مخصوص مشقوں سے بہت دور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم، دماغ اور روح کو تھوڑی 'توجہ' دینے کے فیصلے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

بدھ بھکشوؤں والے مخصوص ڈھیلے ڈھالے لباس کے نیچے میں نے انڈر ویئر پہن رکھا تھا۔ میں نے اس لباس کو اتار کر ایک طرف پتھریلی زمین پر رکھ دیا اور محض انڈر ویئر بدن پر سجائے ایک سرسبز میں مصروف ہو گیا۔ یوگا، جمناسٹک اور مارشل آرٹس کی ایک سرسبز ذہنی عجیب و غریب اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ موسم چاہے کتنا بھی سرد کیوں نہ ہو یہ پسینہ نکال کر رکھ دیتی ہیں۔

میں نے دارم اپ ہونے کے لیے تھوڑی جھپٹک کی پھر لیگ اسٹریچنگ کرنے لگا۔ اسٹریچنگ چاہے بدن کے کسی بھی حصے کی ہو اگر صحیح طور پر کی جائے تو لگ پتا جاتا ہے۔ پھر پور اسٹریچنگ کے بعد میں نے چھوٹی بڑی ہر نوعیت کی کلنگ کی۔ اس کے بعد چنگ اور بلا لگ کر نمبر آیا۔ میں نے کرائے کے زمین زے ٹی لوگ اور ہوما گاچی کا تاز کے ساتھ ساتھ کنگ فو کے چند فارمز کی ریکٹس بھی کی۔ خاص طور پر 'لو بک شو' فارم کی ٹیکسٹ کے دوران میں میرے بدن کا ایک ایک سام پسینہ اگلنے لگا تھا۔ یہ نہایت ہی محدود جگہ پر کیا جانے والا ایک مشکل ترین فارم تھا جس کی تربیت میں نے شاؤلن ٹیمپل میں حاصل کی تھی۔

مارشل آرٹس کو خیر یاد کہہ کر میں یوگا کی طرف آ گیا۔ چھ یوگ اور راج یوگ کے مسائل سے اگلے بغیر میں نے پرانا

نیم (PRANAYAM) کی مشق کی۔ پرانا نیم کا تلفظ ”پرانا یام“ بھی کیا جاتا ہے۔ یوگا کا یہ شعبہ سانس کی مشقوں یعنی بریدنگ سے مشفق ہے۔ میں دس منٹ تک اسٹروک بریدنگ سے اپنے جسم و جان کوئی تندرستی اور تازگی بخشتا رہا۔ مشق کے اختتام پر میں نے خود کو چاق و چوبند پایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے اندر نئی توانائی اتر آئی ہو۔

میں آنکھیں کھول کر اپنے ماحول میں حاضر ہوا تو میری ساعت ایک نئے انکشاف سے آشنا ہوئی۔ قریب ہی کہیں پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میں نے وہاں ایک سرساز کا آغا زیا تو ایسی کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ ایک سرساز کے دوران میں بھی ایسا کوئی احساس نہ ہوا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا ”پرانا نیم کی مشق کے دوران ہی میں پیش آیا تھا۔ بریدنگ..... خاص طور پر اسٹروک بریدنگ کرتے ہوئے انسان اپنے ماحول سے غافل ہو جاتا ہے۔ پانی گرنے کی یہ مخصوص آواز شاید اسی عرصے میں آغا ہوئی تھی۔

میں نے پوری توجہ اس آواز پر مرکوز کر دی۔ جلد ہی میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ آواز اس سمت سے آرہی تھی جہر اس غار کا دوسرا سرا متوجہ تھا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں آگے بڑھنے لگا۔ ایک پہاڑی غار کے اندر پانی گرنے کی مترنم آواز بڑی پرکشش اور سرسلی ہوتی ہے۔ میں اس کشش میں کھینچ کر ٹھوڑا اور آگے بڑھا تو صورت حال مجھ پر عیاں ہوئی۔

میں اس غار کے اندر پانی کے ایک چھوٹے سے تالاب کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس تالاب کی پینٹل کم دیش چھ ضرب چھنٹ رہی ہوگی۔ گہرائی کا اندازہ میں نے دو فٹ کے قریب لگایا۔ مذکورہ تالاب پر کوئی مندر وغیرہ نہیں بنی ہوئی تھی بلکہ وہ سارا سیت اب قدرتی دکھائی دیتا تھا۔ اس میں انسانی ہاتھ کی کوئی کشش نہیں نظر نہیں آتی تھی۔ میں کشش کشاں اس تالاب کے قریب چلا گیا۔

تالاب میں جمع ہونے والا پانی اتنا صاف اور شفاف تھا کہ تکی پتھر جلی زمین آسینے کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ یہ پانی غار کی چھت سے کسی چھلکی کے مانند تالاب کے اندر سے ٹپک رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا چھت میں بڑے سوراخوں والا کوئی تنگ سائز شاور نصب ہو۔ تالاب لباب پانی سے بھرا ہوا تھا اور کناروں کے اوپر سے بہنے والا پانی اپنا راستہ خود بناتے ہوئے پتھر جلی زمین میں جذب ہو کر پتھانیں کہاں جا رہا تھا۔ جس طرح اس پانی کے بارے میں میں دتوں سے

کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پہاڑی کے اندر ہی اندر ستر کرتے ہوئے کہاں سے آرہا ہے بالکل ویسے ہی یہ بتانا بھی ناممکن تھا کہ تالاب سے رخصت ہونے والا پانی کہاں جائے گا۔

میں محویت کے عالم میں کھڑا چند لمحات تک دست قدرت کے اس کرشمے کو دیکھتا رہا۔ وہ بہت ہی خوش ساعت اور نظر فریب منظر تھا۔ اس منظر کی دلکشی اور حسن سے محظوظ ہونے کے لیے جتنا دقت بھی میسر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے دل میں اس تالاب کے پانی کو ”چپک“ کرنے کی خواہش جاگی۔ یہ ایک فطری اور بے اختیار خواہش تھی۔

میں نے کنارے پر اکڑوں بیٹھ کر تالاب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے میں ایک خوشگوار تجربے سے گزرا۔ تالاب کا پانی اچھا خاصا حرارت بخش تھا۔ اسے گنگنا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں نے سن رکھا تھا ”پہاڑوں کے اندر مختلف اقسام کی دھاتیں اور معدنیات پائی جاتی ہیں جن میں چونے اور گندھک کے ذخائر بھی شامل ہیں۔ ان ذخائر کے آس پاس سے گزرنے والا پانی غیر معمولی حرارت حاصل کر لیتا ہے اور اگر یہ پانی ان ذخائر کا قاعدہ چھو کر آ رہا ہو تو ان کے طبعی اور کیمیائی خواص کو کبھی اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ ایسا پانی خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نے تالاب کے پانی کی ”خطرناکی“ کو بھی چپک کے نامزدوری سمجھا۔

میں نے جبکہ کر ایک چلو میں پانی بھرا پھر اسے ناک کے قریب لا کر ٹھکا۔ اس پانی میں سلفر یا فوسفیم کی مخصوص بو نہیں تھی۔ میں نے ٹھوڑا سا پانی زبانی پر ڈال کر اسے چکھا اور ایک مرتبہ پھر جرہاں رہ گیا۔ وہ گنگنا پانی انتہائی خوش ذائقہ تھا۔ عمدہ قسم کا پھوپھ پانی پیئے والے صاحبِ ثروت حضرات اگر اس تالاب سے دو گھنٹ پانی پی لیتے تو فرانس اور ناروے کا رخ کرنا بھول جاتے۔

میرے دل میں مسلسل کی خواہش چل اٹھی۔ میں نے اپنی اس خواہش پر عمل کرنے میں ذرا سی تاخیر بھی مناسب نہ تھی اور اس تالاب میں اگر تکیا پھر چندہ منٹ تک میں اس فرحت بخش پانی سے آنکھیں پھاڑ کر رہتا ہوں۔ میرے اپنے بدن کے متحمل حصوں کو ٹپا آنکھیں لہروں سے سیراب کرتا رہا۔ جب میں نے دوبارہ مدھمکندوں والا لباس پہنا تو خود کو دوئی کے گالوں کے مانند ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس آدمی ہاتھ نے جسم و جان کی ساری ممکنہ کچوس کر مجھے ایک دم فریش کر دیا تھا۔

میں واپس غار کے اس حصے میں آیا جہاں میں نے بھرپور ایکسر سائز کی تھی۔ میں اس گراںما جگہ کے ایک کونے

میں کنول آسن کی صورت زمین پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے ساحل کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت میرا ذہن تروتازہ تھا۔ غابرہ آنکھیں بند ہوتے ہی تھوڑے آئی نے کام شروع کر دیا لیکن اس کی کارکردگی کا نتیجہ مفر کے برابر برآمد ہوا۔

میں نے دوبارہ تیارہ ٹرائی کی لیکن رلی مونے بائیں نے تیسری آنکھ کی راہ میں اتنی بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی کہ مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس وقت اسرائیل میں صبح کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ رلی اور ساحل یقیناً نیند میں ہوں گے۔ میں نے مزید ایک دو کوشش کے بعد آنکھیں کھول دیں۔

اسی لمحے موہا بل فون کی تھن کی آواز میری ساعت تک پہنچی۔ سیل کو جیب سے نکال کر باہر رکھنے کی ضرورت پیش آرہی تھی لہذا میں نے اس کی جملہ تھنیاں آن کر دی تھیں۔ جسم سے دور ہونے کی صورت میں وائبر میٹر جیسے کال سے آگاہ نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے سیل کو لباس میں سے برآمد کیا اور کال انشینڈ کرنے کے لیے کال سے لگایا۔ دوسرے ہی لمحے لی یان کی گھبراہٹ ہوئی آواز سننے کوئی۔ وہ کاشا لوک والے سیل سے بات کر رہی تھی۔

”وہ جان! تم کہاں ہو۔ فوراً یہاں آ جاؤ۔“  
”یہ سیل تو تھا جو کے پاس تھا۔ تم وہاں؟“  
”وہ قلعہ کلائی کرتے ہوئے جلدی سے بولی“ میں اس وقت تھا جو کے پاس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ۔“  
”آ خر مسئلہ کیا ہے؟“ میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔  
”وہ ابھری ہوئی آواز میں بولی ”وہ..... وہ کاشا لوک.....!“

”کیا ہوا.....“ میں نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔ ”کاشا لوک کو کیا ہوا؟“

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ لی یان نے بات ادھوری چھوڑ کر سیل پر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ میرے اندر ایک نامعلوم سا اضطراب پھیلنا چلا گیا۔ میں کاشا لوک کی طرف سے پہلے ہی گہری تشویش میں مبتلا تھا۔ اگرچہ تھا جو نے اس کی صحت بانی کا مجھے یقین دلایا تھا لیکن میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ کاشا لوک کی والدہ کی تھن کو مجھے آگے کے حالات سے بہ خوبی آگاہی دے گئی تھی۔ لی یان کی گھبراہٹ ہوئی ادھوری کال مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اگر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تھا جو کے پاس پہنچی ہوئی تھی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا

یعنی وہاں کوئی ایمر جنسی پیش آگئی تھی! میں ممکنہ تیزی سے بھاگتے ہوئے غار کے اس حصے میں پہنچا جہاں تھا جو کاشا لوک کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ تھا چو اور لی یان کی صورتوں کو دیکھتے ہی میں سب کچھ سمجھ گیا۔ کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں تھی تاہم بے اختیار میری زبان سے یہ استفسار پھیل ہی گیا۔

”تھا جو! کاشا لوک کو کیا ہو گیا ہے؟“  
”جواب دینے کے بجائے اس نے خاموشی سے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہایت ہی تمیز آواز میں بولا“ اس جنم میں اس کی سانسیں پوری ہو گئیں۔ لاڑو بدھا اسے سکون دے!“

”مم..... مگر تم نے تو اس کا کامیاب آپریشن کیا تھا!“  
میری آواز نہ چاچے ہوئے بھی بلند ہوئی اس آواز میں ایک احتجاج بھی شامل تھا“ اور..... اور اس کی بحالی صحت کا یقین بھی دلایا تھا؟“

”وہ میرے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا“ میں نے تم سے کوئی بھی غلط بیانی نہیں کی تھی وہ جان مگر لاڑو بدھا کی مرضی.....!“

وہ جملہ مکمل چھوڑ کر مسلسل میرا شانہ چمکتا چلا گیا۔ میں بیک تک خاموش لیٹے کاشا لوک کو دیکھتا چلا گیا۔ تھا جو نے پتا نہیں۔ دیوار میں نصب مشعل پر کون سا تسلیم چھوٹا تھا، بہر حال وہ اس وقت روشن تھی اور اپنی لمبی روشنی سے وہاں کے ماحول کو کچی الامکان اجالنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، کسی مصلحت کی بنا پر تھا جو نے رات مشعل کو خود ہی بجھا دیا ہو! یہ مصلحت مشعل کا ”ایڈمن“ بچانا بھی ہو سکتی تھی۔

میری نگاہ کاشا لوک کی لاش پر جمی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہو۔ ایک لمحے کے لیے بھی دل یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ آن جہانی ہو چکا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ تھا جو کو پیش آمدہ حالات سے پیش آگاہی تھی۔ اس نے اب تک جو کچھ بھی کیا، اپنا فرض جان کر کیا تھا۔ وہ چاہے کاشا لوک کا آپریشن ہو یا ہمیں اس کی صحت یابی کے بارے میں تسلی بخشی دینا!

کاشا لوک کی موت سے مجھے ذہنی اور قلبی دھچکا لگا تھا۔ وہ نہایت ہی کم وقت میں میرے بہت زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ میرے بہت سے قریبی افراد کی اموات ہوئی تھیں لیکن امتیاز علی کے بعد کاشا لوک وہ شخص تھا جس کے زیاں نے مجھے اندر

سے مجبور کر رکھ دیا تھا۔ انہوں کی جدائی کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بے یقینی صدمے کی انتہا ہوتی ہے۔ اختیار ملے اور کا شالوک میرے ایسے ہی انہوں کی فہرست میں تھے۔ آہ تھی!

لیان بھی ایک جانب سر جھکا کر کھڑی تھی۔ میں نے پچھلے کئی گھنٹوں سے اسے کا شالوک کے لیے گہری تشریف میں جلا دیکھا تھا۔ اس کے غم کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر تک بونہی مافی فضا میں خاموش کھڑے رہے پھر تھا چو کی بھرائی ہوئی آواز نے ہمیں چوک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”تم دونوں ادھر چلے جاؤ۔ میں کا شالوک کے آخری فرض کو نبھا کر تمہارے پاس آتا ہوں۔“ اس نے اس جانب اشارہ کیا جہاں ہم نے رات بسر کی تھی۔ ”اب ہمیں کا شالوک کے بغیر ہی آگے بڑھنا ہوگا۔“

تھا چو کے آخری جھلے پر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا، بدھ کے پیروکار آں جہانی ہو جانے والوں کے آخری معاملات کو کیسے نبھاتے ہیں لیکن تھا چو کی بات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ غار کے اس حصے میں کا شالوک کی لاش کے ساتھ جو کچھ ہی کرنے جا رہا تھا کہ اس کا تعلق کا شالوک کی آخری رسومات ہی سے تھا۔

میں نے غم زدہ اور بوجھل آواز میں کہا ”ہم دونوں اپنے سامان کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ تم اپنے فرض سے منہ منے کے بعد ادھر ہی آ جانا۔ ویسے اندازاً انہیں کتنا وقت لگے گا؟“

”گنگ بھگ ایک گھنٹا!“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا ”اس غار کے دوسرے سرے کی جانب میں نے صاف شفاف پانی کا ایک قدرتی تالاب دریافت کر لیا ہے۔ ہم اس تالاب پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ پھر میں نے اپنی تسلی کے لیے اس سے پوچھ لیا ”ہمیں واپسی کی راہ اختیار کرنے کے لیے غار کے اسی سرے کی طرف جانا ہے نا؟“

”بالکل، ہم اسی جانب سے اسی پہاڑی سے باہر نکلیں گے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”اوکے!“ ہم جا رہے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

سے بوجھل تھا۔ لیان کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ جن لوگوں کے محسوسات کام کرتے ہیں، انہیں زبان سے ایک لفظ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی!

پینلنگ کے دوران میں میرا ذہن مسلسل کا شالوک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی ادائیں، اس کی باتیں وہ وہ کر یا داری تھیں۔ میں نے اس کی زندگی میں بو اتوازن، بڑی پرنیکشن پائی تھی۔ وہ ایک سچا بدھ تھا۔ ہمارا ساتھ نہایت ہی مختصر دور رہے کا تھا لیکن اس قلیل مدت میں اس نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ اور یہ متاثر پن اس کی جدائی کے بعد کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ انسان جس کے جتنا قریب ہوتا ہے، اس کی جدائی اس قریب تو اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کیفیت کی لذت سے صرف وہی لوگ آشنا ہیں جو کسی اپنے کی فرقت کو قربت کے پتے پر قدم کیے بیٹھے ہوں!

کا شالوک کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ صرف تھا چو ہی کو نہیں بلکہ کا شالوک کو بھی یہ احساس تھا کہ ہمارا ساتھ طویل نہیں ہے۔ اسے یقین تھا، وہ ہمارے ساتھ تبت کی سر زمین پر قدم نہیں رکھ سکے گا اور اس یقین کا غیر ارادی اظہار اس کی زبان سے اس وقت ہوا تھا جب ہم کھنڈو سے نگل کر تبت جانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ تھا چو کے قافلے کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا، میں نے تم لوگوں کے یہ حفاظت کھنڈو سے نگل کر تبت پہنچنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ کل صبح سات افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ بدھ تاتھ اسٹوپا سے روانہ ہوگا۔ اس قافلے میں پانچ مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ تم دونوں کی شویت کے بعد یہ تعداد بڑھ کر نو ہو جائے گی یعنی، چھ مرد اور دو عورتیں۔ میں نے اس قافلے کے سردار بدھ بکشو تھا چو کو اعتماد میں لے کر ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔

کا شالوک کے اظہار سے واضح تھا کہ وہ ہمارے ساتھ تبت نہیں جا رہا۔ یہ بات محسوس کرتے ہی جب میں نے اس بارے میں اس سے استفسار کیا تو وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا، ادوسری! میں خود کٹار کرنا بھول گیا تھا۔

وہ کچھ بھی نہیں بھولا تھا بلکہ جب میں نے اس کی ”چوری“ بکڑی تو وہ اپنی حمایت میں جواز پیش کرنے لگا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے، اسے اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ ہمارا ساتھ عارضی ہے، وہ چھ راہ میں ہمیں داغ و خراش

دے جائے گا!

انسان چلا جاتا ہے اور اس کی باتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ کا شالوک کے بعد ہم محض اس کی باتوں ہی کو یاد کر سکتے تھے۔ اسے واپس لانا تو کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ بدھ مت کو ماننے والے آدراگون (Reincarnation) کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں تاہم ان کا آدراگون ہندو مت کے آدراگون سے تھوڑا مختلف ہے۔ بہر حال معنوی اعتبار سے ایک ہی بات ہے یعنی انسان مرنے کے بعد پھر جنم لیتا ہے، پھر مرتا ہے، پھر پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بدھ کا یہ پروکاروں کو چونکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ پیدا ہوں گے اس لیے کسی کی موت پر وہ زیادہ دل گرفتہ اور ملول نہیں ہوتے۔

پینلنگ کے بعد ہم غار کے اسی حصے کی جانب چل پڑے جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نے غسل کیا تھا۔ ہمارے درمیان کا شالوک کے انجام کے بارے میں نہایت ہی مختصر بات چیت ہوئی پھر لیان نے مجھ سے پوچھ لیا۔

”وہ جان! تم نے اس غار کے اندر کسی قدرتی تالاب کا ذکر کیا تھا؟“

”ہاں، ایک حیرت انگیز تالاب واقعی یہاں موجود ہے۔“

”حیرت انگیز کیوں؟“ اس نے سوال کیا۔

”دیکھو کی تو خود ہی بتا چکا ہے۔“

وہ ڈونٹی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”گتا ہے تم نے بتا چکا ہے؟“

”میں نے اس قدرتی تالاب میں ایک حیات آفرین اور فرحت بخش باتھ لیا ہے!“ میں نے بتایا۔

”باتھ!“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی ”اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں تو تالاب کا پانی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہوگا۔ تمہاری ٹانگی نہیں جھی؟“

میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا ”میں نے اس تالاب کو حیرت انگیز کہا ہے اور باتھ کے حوالے سے فرحت بخش اور حیات آفرین جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر قطعی بننے والی صورت حال سے مت کر آ رہا ہوتا تو میرے بیان میں جھپٹا لیا اطمینان نظر نہ آتا۔“

”پھر؟“ وہ یکا یک رک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کے ذہن کو زیادہ الجھانا مناسب نہ سمجھا اور اس تالاب کے خواص کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ پوری دلچسپی سے میری بات سننے کے بعد اس نے

کہا۔

”واقعی! یہ سب تو انتہائی حیرت انگیز ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا!“

”جب اپنی آنکھوں سے دیکھو گی اور ہاتھ سے تالاب کے پانی کو چھوؤ گی تو یقین بھی آ جائے گا۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے اس کمرانا جگہ پر پہنچ گئے جہاں میں نے بھر پور ایکسپریس سائیکل کی گئی۔ مذکورہ تالاب یہاں سے چند قدم آگے موجود تھا۔ میں لیان کو اس تالاب پر لے آیا۔ جب وہ بھی اس تالاب کے پانی کو ”چیک“ کرنے کے تجربے سے گزری تو حیرت زدہ رہ گئی۔ میری جانب دیکھتے ہوئے بھائی لہجے میں بولی۔

”وہ جان! تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا!“

”میں نے غلط کہہ کیا ہے؟“

”میں بھی غسل کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ سادے سے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ”بالکل ضرور، بدن کو صاف سترا رکھنا صحت کا پیغام ہے۔ اس سے پہلے کہ تھا چو یہاں پہنچ جائے، تم ایک گنگنا تاتھ لے کر فریض ہو جاؤ۔“

وہ تذبذب بھری سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی نگاہ میں موجود ابھمن کو بھانپ لیا اور اس کے اطمینان کی خاطر کہا ”تم بے فکر ہو کر لباس اتار دو اور تالاب میں اتر جاؤ میں ادھر کمرے میں بیٹھا ہوں۔ اس دوران میں اگر تھا چو یہاں پہنچ گیا تو میں اسے ادھر ہی روک لوں گا۔ جب تک تم لباس پہن کر ہمارے پاس نہیں آ جاتیں، ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔“

وہ مطمئن ہو کر اپنے لباس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ میں گردن جھکا کر غار کے اس کمرانہ حصے کی جانب چل پڑا جہاں میں نے یوگا اور مارشل آرٹس کی بھر پور ایکسپریس سائیکل کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لیان تروتازہ ہو کر میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ شبنم میں دھلے ہوئے کسی گلاب کے مانند گل گئی تھی۔ میں اس رنگا گل میں نہایت ہی اجماع کی صورت کو شایان شان نظر سے نہ دیکھ سکا۔ وہ نظر اس کا حسن جس کا متقاضی تھا کیوں کہ اس وقت میرے قلب و نظر کا شالوک کی جدائی نے دھندلا رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تھا چو اپنا سامان اٹھائے ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ حد سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ سامان کی فہرست کو اس نے مخصوص انداز میں کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ اس نے باری باری سوالیہ نظر سے ہم دونوں کو دیکھا اور یک لفظی

استفسار کیا۔  
”جلیں؟“

ہم خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیے۔

اب ہم غار کے اس حصے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں سے ہمیں اس پہاڑی سے باہر نکلتا تھا۔ تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم غار کے بہ نسبت تنگ حصے کی جانب قدم اٹھانے لگے۔ ہمارے درمیان ایک بے نام سی خاموشی حاوی تھی۔ ہم بہ خوبی جانتے تھے، اس اداس خاموشی کا سبب کیا ہے لیکن ہم اسے کوئی معنی پہنانے، کوئی نام دینے سے قاصر تھے۔ کاشانوک کے غم نے ہماری زبانوں پر برداشت کا قفل ڈال رکھا تھا۔

ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، اس غار کا راستہ زیادہ چکر دار ہوتا جا رہا تھا۔ غم دار سوز کے ساتھ ساتھ سفر جاری رکھتے ہوئے بڑے واضح انداز میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم آگے بڑھنے کے ساتھ ہی شیب میں بھی اتر رہے ہیں، یعنی ہماری یہ مسافت بلندی سے پستی کی جانب تھی۔ کچھ آگے جا کر ڈھلوان کا زاویہ اتنا بڑھ گیا کہ مجھے اس اندیشے نے آنکھیں اٹھ کر خدا خداستہ ہوئی چلتے چلتے ہم کہیں پاتال میں نہ اتر جائیں!

اس دوران میں تھاچو نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں یک سر فراموش کر بیٹھا ہو۔ اس تنگ غار میں ہم تین افراد کا پہلو پہلو چلتا چلتا نہیں تھا لہذا ہم تھاچو کی تقلید میں اس طرح اس کے پیچھے چل رہے تھے کہ کھوے سے کھو اچھلنے والی صورت حال تھی۔ تموز آگے آنے کے بعد ڈھلوانی سفر میں خاطر خواہ تبدیلی آئی۔ اب ہم بالکل ہموار چل رہے تھے۔ چندہ میں منٹ کے بعد وہ تنگ سارا راستہ بلندی کی طرف ہولیا۔ یہ سفر پچھلے سفر سے بہ نسبت کمشن اور دشوار گزر رہا تھا۔ تھاچو کی گھیر خاموشی بتاتی تھی کہ وہ اپنے اندر کوئی خطرناک طوفان چھپائے ہوئے ہے۔ ابھی تک اس نے کاشانوک کے ”آخری معاملات“ کے بارے میں ہمیں کچھ بتایا تھا اور نہ ہی ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی سوال کیا تھا۔ یہ ایسا موضوع تھا کہ فی الحال اس پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اس پراسرار پہاڑی کے اچھٹک غار میں لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے تک ہمارا سفر جاری رہا اور بالآخر ہم اس مقام تک پہنچے میں کامیاب ہو گئے جسے ہماری عارضی منزل کہا جاسکتا تھا یعنی ہم نے غار کے دوسرے سرے تک رسائی حاصل کر لی۔

ہم تینوں نے اطمینان بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کیے بعد دیکرے پہاڑی کے اندر سے نکل کر ایک سطح چٹان پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنے عقب میں اس مقام کو دیکھا جہاں سے ہم باہر نکلے تھے پہلی نظر میں، میں اندازہ نہ کر سکا کہ کیا واقعی اس جگہ سے پہاڑی کے اندر اتر جاسکتا ہے۔ وہ پہاڑی خلا ایسے زاویے پر واقع تھا کہ ہادی انظر میں اس کی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔ بلاشبہ، وہ پہاڑی اندر باہر سے ایک ظلم دکھائی۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ جو بھی ہو، ہم اس پہاڑی سے باہر آ گئے تھے۔ اسی لمحے لی یان کی متلاطم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔  
”وہ جان! میں دیکھ رہی ہوں۔ ہم کسی اور علاقے میں نکل آئے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے بے ساختہ کہا اور گہری نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔  
لی یان واقعی درست کہہ رہی تھی۔ یہ وہ علاقہ نہیں تھا جہاں سے ہم اس پہاڑی کے اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے اس لوکیشن کو ذہن میں نقش کر لیا تھا۔ اس وقت ہم ایک بالکل مختلف لوکیشن میں کھڑے تھے۔ میں نے تھاچو سے استفسار کیا۔

”یہ کیا جرابہ تھاچو؟“  
”ماجرا کچھ نہیں!“ وہ نگاہ کے سامنے پھلے ہوئے سلسلہ کوہ پر ایک ششاسا نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”در اصل ہم اس عظیم الجثہ پہاڑی کے اندر ہی ستر کرتے ہوئے اس کے عقب میں نکل آئے ہیں۔ اسی لیے جہیں یہ ماحول بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دیکھو!“ اس نے شمال کے رخ پر اشارہ کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”یہاں سے ساگر مانتا نکلتا ہے نظر آرہا ہے!“ ساگر مانتا یعنی ماؤنٹ ایورسٹ واقعی اس زاویے سے زیادہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ سورج آسمان پر سو جود تھا اور شمسی حرارت والی گداز دھوپ سے قرب وجوار میں خیمے ڈال رکھے تھے۔ موسم انتہائی خوش گو اور ”نوری“ تھا۔ دھوپ میں تمازت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے اس کی نرم و ملائم حرارت بدن کے ایک ایک حصے کی بڑی آسودگی بخش سکا کی کر رہی تھی۔ اس اعلیٰ اور دھلی دھلائی فضا میں ماؤنٹ ایورسٹ کا پُر ہیبت کر دل کش نظارہ مہجوت کر دیے والا تھا۔ میں نے اس عظیم المرتبت پہاڑ کی جانب دیکھا تو دیکھا ہی چلا گیا۔

اس کردار پر قدرت کی ایسی ایسی نشانیاں موجود ہیں جو انسان کو اپنا غرور اور حوصلہ آزمانے پر اکساتی ہیں۔ خدا کا یہ نائب ملائحتوں اور ہمت و استقلال میں دوسری تمام مخلوقات پر بھاری ہے۔ قدرت نے اپنے خلیفہ یعنی حضرت انسان کو اعلیٰ و افضل بنا کر اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز بخشا ہے لہذا یہ ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا ہنر جانتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ وہ واقعی انسان ہو!

ماؤنٹ ایورسٹ حضرت انسان کے لیے کسی وقت بہت بڑا پہنچ تھا۔ اس پہنچ کو سب سے پہلے اس اشرف مخلوق کے دو نمائندوں سرائیہ منٹ بھلری اور تنگ رنگ نارگے نے قبول کیا اور اپنی سر توڑ جان لیو کوشش کے بعد بالآخر انیس سو تریچن بیسوی میں اس آئینہ ہزار اٹھاس فٹ بلند دیوڑا کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کارنامہ انجام دینے سے قبل انہوں نے کئی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ یہ اعزاز ان کے حصے میں آئے گا۔ بہر حال، قدرت کسی کی جنت کو ضائع نہیں جانے دیتی۔ کئی لگن سے کوشش کرنے والے کو اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ قدرت کے نواز نے کا اپنا ایک انداز اور معیار ہے جس میں کسی گورے کا لے یا عربی کسی کی کوئی تفریق نہیں!

اب ہمارے سامنے آگے بڑھنے کا مسئلہ تھا۔ دن کا نصف اول تقریباً گزر چکا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں دن کا نصف ثانی زیادہ تیزی سے گزرتا ہے۔ میں نے تھاچو کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔  
”تمہارے اطمینان کو دیکھتے ہوئے میں محسوس کر رہا ہوں، تم اس علاقے سے ناواقف نہیں ہو۔ ہمیں اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے کدھر کا رخ کرنا ہوگا؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”یہ گویا میرے سوال کے پہلے حصے کا جواب تھا۔ اس کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”تم سوچ سکتی ہو کہ میں نے اس پہاڑی کے اندر چھوچکر درافا حاصل کیا ہے یا نہ؟ ہمارے سفر جاری رکھنے کے لیے یہاں سے گزرنے کی ضرورت ہے، آدھے گھنٹے بعد ہم ڈولوگھاٹ پہنچ جائیں گے۔“

”ڈولوگھاٹ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”ڈولوگھاٹ ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے اور یہ سن کر جہیں حیرت ہوگی یہ قصبہ کمینڈو سے لگ بھگ ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔“

”کیا واقعی؟“ میں ایک لذت اچھل پڑا۔  
”میں نے کہا تھا، تم حیرت زدہ رہ جاؤ گے!“ وہ گھمبیر آواز میں بولا۔

میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا ”تھاچو! تم نے بات ہی ایسی ناقابل یقین ہی کی ہے۔ ہم نے کمینڈو سمدری جہل تک پہنچنے کے لیے تیرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس سے آگے جہاں ہم نے کوچ کو چھوڑا اگر اس کو زیادہ سے زیادہ سات کلومیٹر بھی شمار کر لیں تو یہ کل فاصلہ کلومیٹر ہو جائے گا۔ کہاں ہیں اور کہاں ستر۔ کیا ہم نے اس پہاڑی کے اندر پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا ہے؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”در اصل پہاڑی اور زمینی راستے کا حساب ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ زمین پر جو مقام دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقے میں بعض اوقات، اتنے ہی فاصلے پر موجود مقام تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں دشوار گزرتی ہیں۔ چالیس کلومیٹر طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ناک کی سیدھ میں آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا لہذا پہاڑی کی بنیاد اور زاویوں کو دیکھتے ہوئے راستہ بتایا جاتا ہے۔“

اس کی وضاحت نے مجھے مطمئن کر دیا۔ اس اطمینان میں غالب باتھ اس خوش خبری کا تھا کہ ہم کمینڈو سے لگ بھگ ستر کلومیٹر دور نکل آئے تھے۔ لی یان اپنے خدشے کا اظہار کیے بغیر نہ تھی۔ وہ تھاچو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔  
”تھاچو! تمہارا کیا خیال ہے، اس طرف نکل آنے کے بعد ہمیں پہلی کا پڑ والے دشمنوں کی جانب سے کوئی خطرہ تو ہانی نہیں رہا؟“

ہم نے ابھی تک تھاچو کو مسٹر شرما اور اس کے ٹیگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اسی لیے لی یان دشمنوں کا ذکر کرتے ہوئے پہلی کا پڑ کا حوالہ دے رہی تھی۔  
تھاچو بے پروائی سے بولا ”وہ لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے، اس وقت ہم کہاں ہیں؟“

”ٹھہرو، میں چپک کر رہا ہوں“ میں نے اپنی جیب میں سے سو ریاداس والا موبائل برآمد کرتے ہوئے کہا ”ابھی پتا چل جائے گا وہ یہ شرمشما کہاں جھک مار رہا ہے!“

میں سیل پر اپنی انگلی کو تھک کرنے ہی والا تھا کہ ڈیپلے پر سنکڑ والے کالم کو دیکھ کر چپک اٹھا۔ وہاں سنکڑ نہیں آرہے تھے۔ میں نے اس حقیقت کا انکشاف کیا تو لی یان نے کاشانوک والے سیل کو چپک کیا۔ وہ لہجے میں سنکڑ سے بخردی



خاہر کر رہا تھا۔ گویا، خیال والا میت ورک یہاں کام نہیں کر رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد کوئی ایسا انشیا موجود نہیں تھا جو سکنز کی فراہمی کا سبب بنتا۔

میں نے سوالیہ نظر سے لی یان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ اس دوران میں تھا جو بڑی دلچسپی سے باری باری ہمارے چہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ ہمیں انہیں میں گرفتار پا کر اس نے پوچھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟ تم دونوں کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو!“

ہم نے بیک زبان ہو کر کہا ”مسئلہ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ موہاٹل فونز کے ساتھ ہے!“

اس نے استفسار سے نظر سے ہمیں دیکھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

وہ بولا ”جدید سائنس کی یہ ایجاد اب تمہارے لیے بے کار ہو چکی ہے۔ بہتر ہوگا، اپنے موہاٹل فونز کو لباس میں محفوظ کر لو۔ یہ اس وقت چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور کھلونے بھی بے جان جن سے کھیلنا بھی بے مزہ!“

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ”اب ہمیں فوراً آگے بڑھ جانا چاہیے۔“

اس کی تجویز انتہائی معقول تھی لہذا ہم نے باہمی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ڈولو گھاٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ یہ سترہ خیر و عافیت لے ہو اور ہم دو پہر بارہ بجے سے پہلے ڈولو گھاٹ میں تھے۔

قسمت بھی اپنی مرضی سے مہربان اور نامہربان ہوتی ہے۔ کہاں تو ہماری زندگی، موت کی دھار پر تھی اور کہاں ہمارے قدموں میں پتھر کا ایک ایک خار چن لیا گیا تھا۔ ہم جیسے ہی ڈولو گھاٹ پہنچے، کوداری کی جانب جانے والی ایک دکن تیار کھڑی تھی جیسے ہمارا ہی انتظار ہو رہا ہو!

ہم اس دکن میں سوار ہو کر تبت کے سرحدی قصبے کوداری کی جانب روانہ ہو گئے۔

ڈولو گھاٹ سے کوداری تک سفر کے دوران میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور ہم خیریت کے ساتھ شام ساڑھے چار بجے کوداری پہنچ گئے۔ یہ قصبہ تبت کی سرحد کے قریب چائنا روڈ پر واقع ہے۔ کھٹنڈو سے کوداری کا فاصلہ لگ بھگ ڈھائی سو کلومیٹر ہے اور یہ سڑک بھی طویل چھ گھنٹے سے پہلے سے نہیں کیا جاسکتا لیکن سندری محل کی پہاڑی کے اندر دلی ستر نے ہمارے بہت سے کام آسان کر دیئے تھے

جس کے نتیجے میں فاصلے گھٹ کر رہ گئے تھے۔

میں اور لی یان تھا جو کی راہنمائی میں اس قصبے کے ایک چھوٹے سے گھر میں پہنچے۔ تھا جو نے بتایا کہ وہ اس کے کئی شناسا کا گھر تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں پہنچا کر تھا جو اپنے اس شناسا کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہو گیا۔ اس کمرے میں پاک کی کھال کا فرش بستر بچھا ہوا تھا۔ پہاڑی مسافرت نے ہمارا جوڑ جوڑ ڈھول کر رکھ دیا تھا۔ ہم آرام کی غرض سے اس بستر پر دراز ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا بڑی سی ٹرے میں ہمارے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس کی آمد پر ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جب وہ کھانے کے برتن رکھ کر جانے لگا تو میں نے اس سے تھا جو کے بارے میں استفسار کیا۔ وہ حیران و پریشان مجھے دیکھتا چلا گیا۔ واضح طور پر محسوس ہوتا تھا وہ میری بات سمجھ نہیں پایا۔ میں نے انگلی کی ناکامی کے بعد نیپالی کو آڑیا مگر کچھ بھی اس کے لیے کچھ نہ پڑا۔ وہ لڑکا مقامی کوداری زبان کے سوا اور کسی زبان سے واقف نہیں تھا۔ میرے سوالات کے جوابات میں اس نے کوداری میں جو کچھ کہا، میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ حتیٰ وہ بہر حال نہیں بول رہا تھا۔ ان حالات میں مجبوراً مجھے کوگوں کے مانند اشاروں کی زبان استعمال کرنا پڑی۔

وہ بڑی دلچسپی سے میرے ہاتھ ہونٹ اور گردن کو ہلٹے ہوئے دیکھتا رہا پھر اپنے ہاتھوں سے کچھ مخصوص اشارے کرنے کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ اس کے اشاروں کا مطلب بہت واضح تھا۔ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ تھا جو کو میرے پاس بیٹھ رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ میرے اشاروں سے سمجھا تھا میں تھا جو کو اپنے پاس بلارہا ہوں۔

لی یان نے کہا ”یہ عجیب قسم کا گولٹا تھا۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا!“

”وہ گولٹا نہیں، بلکہ ہماری زبان سے ناپلڈ تھا!“

”چائیں، اور کسی کس سے واسطہ پڑے گا؟“

”لی الخال تو اس سے پڑا ہے!“

اس بات پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے فرش پر پڑی کھانے کی ٹرے کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہ ایک طویل سائنس خارج کرتے ہوئے بولی ”میرا کھانے کوئی نہیں چاہ رہا حالانکہ میں اس وقت شدید بھوک محسوس کر رہی ہوں۔“

لی یان کی طرح میں بھی اچھی خاصی بھوک محسوس کر رہا

چار گز شہ رات ہم نے پہاڑی غار کے اندر ڈرائی فردس پر مشتمل کھانا اپنے معدوں میں اتارا تھا۔ اس کے بعد سے اب بھی ایک کھیل اڑ کر ہمارے منہ میں نہیں گئی تھی۔ بے درپے ایسے حالات پیش آئے کہ ہمیں کھانے پینے کا ہوش ہی نہ رہا۔ ہمیں باقاعدہ کچھ کھائے پے لگ بھگ تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ کاشا لوک کی موت نے ابھی تک دل دوباغ کو باہمی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کھانے کو تو میرا موڈ بھی نہیں ہو رہا تھا لیکن بہر حال اس میں کھانے بے چارے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے ٹرے کو اپنے سامنے رکھ لیا۔ ٹرے میں موجود کھانا ایک فرانسرینٹ نیپکن سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے وہ فرانسرینٹ نیپکن بنانا دیا تو کھانے کی تفصیل سامنے آئی۔ اور یہ بھی بتا چلا کہ وہ کھانا ہمارا گھر تھا۔ اس کھانے میں پاک کے گوشت کی ایک سائنٹ فرائڈز ”اے“ بے ہوئے چاول، مٹی کی روٹی اور چائے شامل تھی۔ کھانے سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔

میں نے اپنی ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”لی یان! یہ ٹھیک ہے کہ ہم کاشا لوک کی البیہ دہائی سے بہت دل گرفتہ اور طول ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرنے والے کے ساتھ مرنا نہیں جاسکتا۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری ہے۔ ہمارا ہم اپنی جگہ مگر اللہ کی نعمتوں سے رنج پھرنا مناسب نہیں!“

میری بات اس کی سمجھ میں آئی اور ہم دونوں نے بیک وقت کھانے والی ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھا دیے۔ سادگی کا علم ہوا کہ وہ کھانا لہذا اور خوش ذائقہ تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی۔ تبت اور اس کے مشافعات میں چائے بے حد ذوق و شوق سے پی جاتی ہے مگر اس میں دودھ اور چینی استعمال نہیں کی جاتی بلکہ توبے کے اندر کھنڈ ڈال کر یہ گرم مشروب پیا جاتا ہے جو توانائی بخش ہونے کے ساتھ ساتھ لذت سے بھی معمور ہوتا ہے۔ چائیں کیونچنی لوگ بہت کم چینی استعمال کرتے ہیں۔

بھوک بہت کڑا کے کی تھی لہذا ہم ہاتھ نہ روک سکے اور زہر مار کرتے کرتے بھی خوب شکر ہو کر کھانا کھایا۔ اس ”ڈنڈ“ کے اختتام پر لی یان نے کہا۔

”چائیں! تھا جو نے بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ وہ تو یہاں آتے ہی تم سا ہو کر رہ گیا ہے۔“

”حالانکہ کھانا لانے والے لڑکے نے تو اشاراتی زبان میں مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ تھا جو کو یہاں بھیج رہا ہے۔“ میں نے قدرے انہیں زندہ لہجے میں کہا۔

اسی لمحے تھا جو بہ نفس نفیس کمرے میں حاضر ہو گیا۔ اس

نے سب سے پہلے کھانے والی ٹرے کی جانب دیکھا۔ کھانے کے تمام برتن تقریباً خالی ہو چکے تھے۔ اس نے سرکواٹھائی جنبش دی پھر مطمئن انداز میں ہماری صورت پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

”یہ میرے ایک حقیقت مند کا گھر ہے۔ ہم اس کے توسط سے ”نیپال تبت“ سرحد کو عبور کریں گے لیکن ابھی نہیں نصف شب کے بعد کسی دقت بھی۔“

میں نے کہا ”نصف شب کے بعد سے طلوع صبح تک تو رات ہی ہوتی ہے۔ کچھ تو اندازہ ہوگا، ہم یہاں سے کب تک رخصت ہوں گے؟“

”میرا اپنا خیال ہے، ہم رات کے آخری حصے میں یا پھر علی الصباح اس گھر سے روانہ ہو سکیں گے۔“ تھا جو پرسوج انداز میں بولا ”دیئے صحیح صورت حال کے بارے میں کانگ ہی بتا سکتا ہے۔“ کانگ اس کے میزبان شناسا کا نام تھا۔ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ اگر چاہو تو تھوڑی دیر لے لو۔ میں رخصت کے وقت سے پہلے تمہیں چگا دیں گا۔“

تھا جو کی تجویز خاصی معقول تھی۔ لگ بھگ تیس گھنٹے کے بعد ہمارے حکم میں اناج پہنچا تھا۔ اس کا ذخیرہ اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ میں نیند کی اندر ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس میں غالب ہاتھ محسن والی اس خوش ذائقہ توانائی بخش چائے کا بھی تھا۔ ایک تو دیے بھی نیند اڑانے والی اشیاء تھیں مجھے زیادہ نیند آتی تھی اس پر وہ چائے خاصی معقولی الاصلہ بھی تھی۔ انسان کے بدن کو طاقت و توانائی پہنچانے والی ہر غذا یا ایمر سائز بالآخر نیند کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ انسان نہ سونا چاہے یا نہ سوئے یا یہ الگ بات ہے مگر سونے آرام کرنے کو جی بہت چاہتا ہے۔

لی یان نے تھا جو سے پوچھا ”تم نے کھانا کھالیا؟“

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب براکتھا کیا۔

”ہماری نیند کے دوران میں تم کیا کر رہے؟“ میں نے

استفسار کیا۔

”اگر موقع ملا تو میں بھی کچھ وقت کے لیے آنکھ لگانے کی کوشش کروں گا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

اس کے بعد وہ کھانے کے خالی برتنوں والی ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کمرے کا داخلی دروازہ اس طرح میچھڑ دیا تھا کہ تازہ ہوا کی آمد و شد کے لیے جبری موجود رہے۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا بھی اظہار تھا کہ اب ہمیں خوشخوار و منسوب کرنے کے لیے اس

طرف کوئی نہیں آئے گا۔

”کیا تمہیں واقعی نیند آ رہی ہے وجدان؟“ تنہائی میں ہوتے ہی لیان نے مجھ سے پوچھا۔  
”ہاں نیند تو آ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”کیوں“ کوئی خاص بات ہے؟“

وہ جزبہ جوتے ہوئے بولی ”ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے!“  
”کون سی بات“ مجھے بھی تو تاؤ؟“ میں نے عجیدگی سے کہا۔

”میں مسٹر مارکے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“  
”مثلاً کیا سوچ رہی ہو؟“

اس نے جواب دیا ”نئی بدھ بکھشونارائن کے بیان مشکل آئندہ سو ریاداس کی کارکردگی اور مسٹر مارکے کے مذہم عزائم کو دیکھتے ہوئے تو یہی لگتا تھا وہ لوگ یعنی ہمارے دشمن اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہم کھنڈو سے کوداری جا رہے ہیں۔ اس تناظر میں توقع کی جا رہی تھی کہ یہاں کوداری میں ہمارے ”استقبال“ کا خاطر خواہ بندوبست ہوگا“ خاص طور پر اس صورت میں کہ ہم بچ راہ میں مسٹر مارکے کو بچا دے کر ان چھو ہو گئے تھے کیسے.....“

وہ لمبے لمبر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی ”لیکن یہاں کوداری میں ہمارے ساتھ جتنے داخل حالات پیش آ رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی محسوس ہو رہا ہے ہمارے دشمنوں نے ہماری طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ یہ کچھ عجیب سی اور ناقابل یقین بات نہیں ہے؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے تاہی انداز میں کہا ”اس غیر معمولی اور ذہن کو الجھانے والی بات کو میں نے بھی محسوس کیا ہے اور فوری طور پر یہی وجہ سمجھ میں آ رہی ہے کہ شاید شرما نے میری بات کا یقین کر لیا ہے۔“  
”کون سی بات کا؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میں نے پکڑ دینے کے لیے فون پر اسے بتایا تھا تا کہ آج شام کو پانچ بجے میں ”سی اے اے سی“ کی فلائٹ سے کھنڈو سے شگھائی جا رہا ہوں۔“

”میں نہیں سمجھتی شرما اتنا ہی احمق ہے کہ اس نے تمہاری ایسی بے سود بات پر یقین کر لیا ہو!“ وہ مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”جب گیم انتہائی اونچے لیول کا ہو رہا ہو تو

بعض بظاہر انتہائی فضول نظر آنے والی باتوں کو بھی اہمیت دینا پڑتی ہے۔ میں نے اپنے دشمنوں کو ایسے ایسے جکے دے کر کہہ میری کوئی احمقانہ بات بھی نظر انداز کرنے کی غلطی نہ کر سکتے۔ جو جیسی سے کھنڈو طرح کی طرح پہنچے تھے یہ کارنامہ تمہارے سامنے ہے۔“

اس نے اس موضوع پر بحث میں الجھنے کے بجائے محکم کا زور یہ تبدیل کر دیا اور کا شالوک کے بارے میں بات کرنے لگی۔ ہم کافی دیر تک اس مختصر ساٹھ کے ہر ای کی خوبیوں اور ایثار کو یاد کرتے رہے پھر پرسکون نیند کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ دل و دماغ کا شالوک کی جدائی کے غم سے بوجھل تھے اس پر مستزاد خوراک نے خالی معدے میں پہنچنے کا کام شروع کر دیا لہذا تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم مہربان نیند کے گداز آغوش میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔

اگلی صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی تھا جو نے ہمیں جگا دیا۔ ہم نے ہلکا جھکناٹا کیا تھا جو کے شناسا سیربان کا نگہ کی راہنمائی میں گھر سے نکل پڑے۔ ایک گھنٹے بعد جب سپر مارٹنودار ہو رہا تھا تو ہم نے چین کے نئے صوبے سی زانگ (XIZANG) المعروف ”بہتبت“ کی سر زمین پر قدم رکھ دیا۔

کانگ ہم سب سے الوداعی ملاقات کر کے واپس چلا گیا۔  
”لاڈر بڑھا کا لاڈ لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں یہ حفاظت تم لوگوں کو اپنی دھرتی تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں!“ تھا جو نے غم سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں بہتبت میں داخل ہونے کے بعد اپنے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ اس جنت نظیر گوشوارش کے بارے میں اب تک صرف سنا ہی سنا تھا دیکھنے کا موقع پہلی مرتبہ مل رہا تھا۔ ہم کھنڈو سے جس نوعیت کی چڑھائی لے کر کے یہاں تک پہنچے تھے اس کو دیکھ کر ذہن فوری طور پر تسلیم کر لیتا تھا اگر بہتبت کو دنیا کی چھت کہا گیا ہے تو یہ بات ایک سو ایک فیصد درست ہے۔ ان لمحات میں اچانک آپ بڑھ پرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ اس وقت وہ دھن ہو کر ٹپ ٹپ میں نے نام بدل کر اسے ساحل نہیں بتایا تھا۔

ساحل کے والدین تو بچی اور بھیر جانی کا تعلق اسی سر زمین سے تھا لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ اس نے اپنے آبائی وطن کو کسی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ پاکستان پہنچا تو ایک موقع پر میں نے اس سے سوال کیا تھا ”کیا بہتبت کی طرف جانے کو تمہارا دل نہیں چاہتا؟“ جواب میں اس نے کہا ”بہتبت دل چاہتا ہے کہ میں اس حیرت آفرین تخت ارض کو دیکھوں۔“ میں نے تو بس وہاں کی پراسرار اور تھیر آ میز کہانیاں ہی سنی

ہیں۔ اس پر میں نے کہا تھا ”میں نے بھی بہتبت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور میں اسراروں کی اس سر زمین کو دیکھنے جاؤں گا۔ میرے اس ارادے کو دیکھتے ہوئے ساحل جھلکی گئی تھی۔ اس نے بڑی بے ساختگی سے کہا تھا ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی وجدان.....“ اور میں نے پتا نہیں کس رو میں کہہ دیا تھا بشرطیکہ اس وقت تم میرے ساتھ ہو۔“ وہ فرط جذبات سے مغلوب لہجے میں بولی ”کی“ لاڈر بڑھا مجھے زندگی بھر تمہارے ساتھ رہے گا۔“

اس کا انداز دعائیہ تھا۔ گویا ان لمحات میں وہ اپنے لاڈر بڑھا سے یہ درخواست کر رہی تھی کہ ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ہو جائے۔ شاید اس کے لاڈر نے یہ درخواست قبول کر لی تھی۔ ہم زندگی کے ساتھ توین گئے تھے مگر بہ اندازہ انداز۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے ایک دوسرے کے پاس پاس تھے اور دھڑکن بن کر ایک دوسرے کے دل میں دھڑکنے تھے لیکن وقت کی نامہربان کروٹوں نے مختلف مواقع پر جو بڑی نوازش ملی شیعہ غوری اور ربی موٹے ہاتھوں کی صورت اختیار کر کے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر رکھا تھا۔ آج میں ساحل کے بغیر ہی اس کے آبائی ملک میں داخل ہو چکا تھا لیکن مجھے یقین تھا ”میں اب زیادہ دیر سے تک اس کے بغیر نہیں رہوں گا۔ یہ ملک ہمارے دل میں کوئی اہم کردار ادا کرے گا۔“

مجھے یہ یقین کیوں تھا ”میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ ایک آواز میرے اندر بڑے جوتی انداز میں سر پہنچتی تھی اور پھر پھر کہہ رہی تھی۔ وجدان! تم نے اپنی منزل پانے کے لیے بہت مصوبہیں اٹھالیں۔۔۔۔۔ قلب دروہ کا کوئی مقام ایسا نہیں بچا جہاں تم نے حالات کی تم طرہی کو مہمان نہ ٹھہرایا ہو۔ تم جس ساحل کی تربت میں بے ساحل زمینوں کو کھوج رہے ہو وہ اب تمہاری نگاہ میں ابھرنے ہی والا ہے۔ بہت جلد تم اپنی منزل اچھی ساحل کے آثار دیکھ پاؤ گے اسی لیے..... اپنی سانس کو ٹھونسنے نہ دو“ غلطیوں کے اس اتھاہ ساگر میں تیرتے جاؤ۔ تیرتے پہلے جاؤ!

میں اپنے اندرون کی اس امید افزا حوصلہ بردار آواز کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس میں یقین کی بڑی توانا قوت جھلکتی تھی اور اس کا نکتہ میں یقین سے بڑی اور کوئی طاقت نہیں۔ یہ بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق بھی اسی ڈور سے بندھا ہوا ہے۔

بہتبت میں داخل ہونے کے بعد ایک دین کے ڈر لیے سر پہر میں بچے بہتبت کے صدر مقام لہاسا (LHASA) پہنچ گئے۔

تھا جو ہمیں جو کھا گیمپل میں پہنچا کر اس طرح غائب ہو گیا جیسے ہم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

جو کھا گیمپل لہاسا کے قلب میں واقع ہے اور اسے بہتبت کی آن بان شان سمجھا جاتا ہے۔ یہ پورے بہتبت میں روایت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ”اسپریمپل سینٹر“ کہلاتا ہے۔ یہ ٹیکل سات دس صدی میں شیشہ سا گم سین گامپو (SONGTSEN GAMPO) نے تعمیر کروایا تھا۔ سا گم سین گامپو بہت کامیاب بادشاہ گزرا ہے۔ ملک کو متحد کرنے کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے صدر مقام کو بہتبت کے دوسرے علاقے سے لہاسا میں منتقل کیا۔ گامپو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بہتبت میں بدھ مت کو متعارف کرایا۔ اس سے پہلے وہاں کے باسی بدھ ازم سے آشنا نہیں تھے اور اس کام کے لیے اس نے بڑا اونگھ کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ گنگ سا گم سین گامپو نے بدھ مت غوروں سے شادی کر لی جن میں سے ایک پرس ٹرائی سن کا تعلق نیپال سے تھا جبکہ دوسری ”پرنس دین چینگ“ چین سے تعلق رکھتی تھی۔ واضح رہے کہ گامپو کی اس سے پہلے تین بیویاں بھی موجود تھیں۔ گنگ سا گم سین گامپو اور اس کی دونوں بدھ مت بیویوں ٹرائی سن (TRITSUN) اور دین چینگ (WEN CHENG) کے مجسمے بہتبت کے ہر ٹیکل اور منسٹری میں ملیں گے۔ منسٹری (MONASTERY) مذہبی تعلیم کی درس گاہ کو کہا جاتا ہے۔ یہ ایک کیونٹی سینٹر ایسا کردار ادا کرتی ہے۔ لہاسا میں دو عظیم الشان منسٹریز موجود ہیں جو چندرہ دس صدی میں تعمیر کی گئیں۔ اب ان کی عظمت گہنا بچی ہے۔ سیرا (SERA) اور ڈری پنک (DREPUNG) نامی ان دو قدیم منسٹریز کو دیکھ کر انفس ہوتا ہے۔ ان کا رنگ دروپ اجڑ چکا ہے اور دور سے دیکھ کر پہچاننے میں نہیں آتیں۔ کسی زمانے میں سیرا منسٹری میں آٹھ ہزار موٹس بدھ ازم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے آج یہ تعداد گھٹ کر ڈیڑھ سو دو سو تک رہ گئی ہے۔ بڑی منسٹری ڈری پنک میں لگ بھگ چندرہ ہزار موٹس بیک وقت درس دے تدریس کے مراحل سے گزرا کرتے تھے۔ ان دنوں اس درس گاہ میں محض تین سو طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ نیرنگی زمانہ شاید اسی کو کہا جاتا ہے۔ اس تمام تر تباہی و بربادی کا ذمہ دار بدھ مت اور بتی حوام کی نظر میں صرف اور صرف کیونٹ چین ہے۔ جس نے اپنی فوجی قوت کے ذریعے اس جنت مثال قلعہ ارض پر غاصبانہ قبضہ کر کے اسے اپنے ملک کا ایک صوبہ بنالیا ہے۔ اسی عظیم خوں ریزی اور دستانہ لشکر کشی کے نتیجے میں چودھویں ولایتی لامحترم مہا سو تھوپ کو انیس سو

انسلط عیسوی میں جلا وطنی اختیار کر کے پڑی ملک ہندوستان میں پناہ گزین ہونا پڑا تھا۔

ہمیں جو کھا تک ٹیکل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ٹیکل کے سامنے والے حصے میں ایک بہت بڑا مکن سے جو بدھ کے پیرداروں سے ہر وقت بھرا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں عبادت بھی کرتے ہیں اور فرست کے وقت میں جادوئے خیالات بھی ہوتا ہے۔ یہاں پر ہمہ تن بدھ کا ایک عظیم الجذہ طلالی مجسمہ بھی موجود ہے۔ تھا جو ہمیں ٹیکل کے جس کمرے میں پہنچا کر غائب ہوا تھا اس کی دو کھڑکیاں دو مختلف سمتوں میں کھلتی تھیں۔ ایک کھڑکی سے ٹیکل کا مرکزی حصہ دکھائی دیتا تھا جبکہ دوسری کھڑکی سے لہاسا کا معروف بازار ”برکھور“ نظر آتا تھا۔ (برکھور بازار BARKHOR) ایک بازار کے دائرے کی شکل میں جو کھا تک ٹیکل کو اپنے گھرے میں لیے ہوئے ہے۔ مذکورہ بازار ایک جہانِ حیرت ہے۔ شاید یہ کوئی ایسی شے ہو جو اس بازار میں دستیاب نہ ہو سکتی ہو۔ یہ تمام تر معلومات مجھے یہاں قیام کے بعد حاصل ہوئی تھیں مگر میں اسے ترتیب دار بیان کر رہا ہوں۔

ہمیں ٹیکل کے اس کمرے میں میہان ہوئے بمشکل چندہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک تہیٰ سنجیدہ چہرے والا شخص ہمارے پاس آیا۔ اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا جس کے مطابق اس کا نام جن سیان (QINXIAN) تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس کے قریب لگا یا بعد میں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ جن سیان بیسٹھ برس کا تھا۔ عام موٹکس کے بالکل اس کے سر پر بال موجود تھے جو کچھڑی کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ جن سیان کی آنکھوں سے ذہانت اور تجربہ بھٹکتا تھا۔ وہ بڑی روانی سے انگلیں بول اور کچھ لیتا تھا۔ اسے سوچ سمجھ کر ہمارے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

جن سیان نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ہماری خیر خیریت دریافت کی پھر ہمیں خوش ذائقہ تازہ اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مجھیں اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

”بے ساختہ میرے منہ سے نکلا، کہاں؟“

”چنگ فورن پوٹی کے پاس!“

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ چنگ فورن جو کھا تک ٹیکل کا چیف لانا تھا اور کھٹنڈو سے یہاں تک میرا پہنچنا اس کے کسی منصوبے کا حصہ تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے لی یان کو دیکھا۔

جن سیان نے میری نگاہ میں پوشیدہ معنی کو سمجھ لیا۔ بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

”صرف تم..... تمہاری سامگی بڑے آرام سے یہاں رہے گی۔ تم اس کی نگہ نہ کرو۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے چنگ فورن پوٹی اور اس کے دیگر عملے پر پورا بھروسہ تھا۔ اگر گنڈاپیشہ والی کوئی بات ہوتی تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ میرا دل کہتا تھا یہ سب کچھ میرے فائدے کے لیے ہو رہا ہے۔ لی یان کو اس کمرے میں چھوڑ کر میں اپنے گائیڈ جن سیان کے ساتھ چل پڑا۔

وہ مجھے مختلف راہداریوں میں چلاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ جوتا بہت پہلے اتر چکا تھا میں ٹھکے پاؤں جن سیان کی خلیلہ میں خاموشی کے ساتھ جو کھا تک ٹیکل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک جگہ رک گیا۔ یہ ٹھہراؤ جن سیان کی وجہ سے تھا۔ اس کے رکنے کے بعد ہی میں نے قدم روکے تھے۔ اس وقت ہم ایک چوٹی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس ٹیکل کی تعمیر میں کھڑی کا بڑی فراوانی سے استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے جن سیان کو دیکھا تو وہ مذکورہ دروازے کی طرف اٹکی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”اندروں چلے جاؤ۔ چنگ فورن سے یہیں پر ملاقات ہوگی۔“ میں ایک لمحے کے تامل کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ دس ضرب دس فٹ کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواریں اور چھت زرد رنگ کی تھیں۔ اس کمرے میں کھڑی کا کام بھی ہوا تھا اور چھت سے فرش تک دو موٹے چوبی ستون بھی استادہ دکھائی دیتے تھے۔ تاہم ان پر بھی زرد رنگ بھیر دیا گیا تھا۔ گنتا تھا اس کمرے کی ہر شے کو انڈے کی زردی سے بنایا گیا ہے حتیٰ کہ فرش پر بچھا ہوا قالین بھی ہم رنگ درو دیوار ہی تھا البتہ وہاں پر دو اشیاء ایسی تھیں جو اس ”زرد رنگ“ سے میل نہیں کھاتی تھیں اور وہ تھیں اونچی چٹائیاں۔ ان میں سے ایک نیلی اور دوسری سفید رنگ کی تھی۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی میں نے سمجھ لیا وہ چٹائیاں پاک کی اون سے تیار کی گئی تھیں۔ وہ دونوں ہم ساخت و بناؤ تھیں جس کا اندازہ میں نے تین ضرب پاچ فٹ لگایا۔ مذکورہ دونوں چٹائیاں ایک دوسرے کے سامنے فرش پر پھٹی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان بمشکل دو فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی جن سیان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں زرد قالین پر کھڑا اس کمرے کا بغور جائزہ لے رہا

تھا کہ سامنے والی دیوار میں موجود دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک پرتا شخصیت کا بالک ٹھنڈا داخل ہوا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ لگائے کی کوشش نہیں کی کیونکہ جیت والوں کے چہل چل میں یہ اندازہ اکثر غلط ہو جاتا ہے۔ چنانچہیں وہ کتنی ذویل عمر اور کتنی محفوظ صحت لے کر اس دنیا میں آتے تھے۔

کمرے میں وارد ہونے والے شخص کا سر اور چہرہ پوری طرح منڈا ہوا تھا۔ موچیں واڑھی سر کے بال سب صاف ہوئے البتہ آنکھوں کے اوپر موجود تھیں۔ چہرہ بیضی اور جڑات میں ہلا کا ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔ کان نسبتاً بڑے طویل البصری کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ رنگت جیسے تانبے کو دودھ میں دھو کر بنایا گیا ہوا۔ اس نے میری طرف (سرخنی مائل گہرے) بھورے رنگ کا گڈون (زیب تن کر) رکھا تھا جس میں ’کھنوں‘ سے آگے بازوصاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے حیات سے معمور باتوں کی رنگیں بڑے دلکش انداز میں پھولی ہوئی تھیں۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی مجھے کسی تعارف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میرے دل نے کواہی دی وہ جگہ فورن پوٹی ہے!

چنگ فورن نے سر کی خفیف جھٹک سے مجھے دمل کہہ مار اور سفید چٹائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سلیس انگریزی میں کہا ”بیٹھ جاؤ!“

وہ بولا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے منہ سے سوئی جھلے ہوں۔ اس کی آواز میں بڑی نرمی اور لب و لہجے میں ایک خاص قسم کا گداز پایا جاتا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر بڑی جاغدار مسکراہٹ کو جسم پایا۔

مجھے سفید چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود نیلی چٹائی کی جانب بڑھ گیا تھا۔ تاہم میں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک چنگ فورن نیلی چٹائی پر بیٹھ نہیں گیا۔ وہ جو کھا تک ٹیکل کا چیف لانا تھا۔ میں اس کے شایان شان احترام کو خود بردواجب سمجھتا تھا۔ میرے جسم پر سیلو رب (زرد گڈون) سجا تھا۔

چنگ فورن کے منہ سے ششہ انگریزی سن کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ تاہم بعد میں معلومات میں اضافے کے ساتھ یہ حیرت لاؤر ہو گئی۔ وہاں قیام کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ چیف لانا کے عہدے تک پہنچنے کے لیے چھ ماہ اور چھ عمومی طمانین پر مشتمل نصاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک کوئی نوکے ان بارہ شبیوں میں دسترس اور ہجارت حاصل نہ کر لے اسے چیف لانا کا اعزاز حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بارہ شبے کچھ اس طرح ہیں۔ اہم مضامین میں فلسفہ، بدھ فلسفہ، تہی ثقافت، لہجیات، شکرکرت اور انگلیش جبکہ عمومی مضامین میں آسٹریلوی

آسٹریلوی شاعری، موسیقی، مختلف زبانوں کی مگر امر اور تحریر نویسی شامل ہے۔ بدھ مت کی تعلیمات میں بیان کی گئی جسم، دماغ اور روح کو سمجھتے مندر رکھنے والی مخصوص مشقیں اس کے علاوہ ہیں۔

چنگ فورن نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں میری خیر و عافیت دریافت کی۔ ہم دونوں متعلقہ چٹائیوں پر رو بہ رو بیٹھ گئے تو وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی غلام لہجے میں گویا ہوا۔

”دھیان! میں سمجھتا ہوں تم ان سارے معاملات کو بخوبی سمجھ رہے ہو اس لیے مجھے امید ہے تم سے کم سوالات کروں گے۔“

اس کی آواز میں ایسی سادگی اور پُرکاری تھی کہ میں خاموش بیٹھا اسے سنتا رہا اور اسی لمحے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ میں اس سے ایک سوال بھی نہیں پوچھوں گا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اسی نرم خوشی سے بولا۔

”ہماری صرف تین ملاقاتیں ہونی ہیں۔ ایک ملاقات اس وقت ہو رہی ہے دوسری ملاقات ٹھیک دس دن کے بعد ہوگی اور تیسری ملاقات کا دارودہار صرف اور صرف تمہاری کارکردگی پر ہے کیونکہ اس آخری ملاقات میں تم اکیلے نہیں ہو گے بلکہ تمہارے ساتھ وہ بھی ہوگی جس کے حصول کی خاطر تم نے اپنی زندگی کو سپردِ غدا کر رکھا ہے!“

اس کا اشارہ سیدھا سیدھا میری جان تنہا ساحل کی طرف تھا۔ چنگ فورن کی باتیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ مغربی میں ساحل کو حاصل کر لوں گا۔ سیشل والے محترم سامگی نوکی باتوں سے بھی اسی قسم کا تاثر ابھرتا تھا۔ ساحل کو پانے کے خیال نے میرے رگ دے میں بجلی کی دوڑ ڈالی۔ میں تن بدن میں سنسنی سی محسوس کرتے لگا۔ یہ ایسی وارنٹی تھی کہ میں اپنے دلی جذبات کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چنگ فورن کی مگر گداز نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”اس وقت تم جیت میں ہو اور کچھ لو کہ یہیں کے رہائشی ہو۔ ٹھیک دس دن کے بعد تم لہاسا سے لندن روانہ ہو جاؤ گے۔ لندن میں مسٹر ہیرالڈ تھامس کے پاس ایک دن گزارنے کے بعد تم برطانیہ سے سیدھے مصر پہنچو گے۔ وہاں قاہرہ میں جنہیں السید مبارک اسمٰعیلی سے ملنا ہوگا جو الباقری اسٹریٹ پر رہتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”مبارک اسمٰعیلی تمہارے ساتھ بحرِ پرتقاؤں کرے گا اور اس کے انتظام سے تم جوڑڈن سے ہوتے ہوئے اسرائیل میں

داخل ہوا جاوے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا اس سلسلے میں تجھیں سوچنے اور ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک دس دن کے بعد تجھیں تفصیل بتادی جائے گی۔ دراصل میں چاہتا ہوں تمہارے سر پر اس قدر ہال نکل آئیں کہ تم باقاعدہ رسمی کر سکو۔“

بدھ بکھو بننے کے لیے دور دراز جلیں میرا سر موٹا دیا تھا۔ چنگ پو شخص دس دن کی بات کر رہا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ایک مہل استرے سے منظرے ہونے سر پر صرف پلہ دن کے اندر اتنے ہال آئیں کہ ان میں باقاعدہ رسمی بھی کی جاسکتی ہو۔ میں انجمن زدہ سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے مخصوص مہربان انداز میں بولا۔

”میں نے سوال کرنے سے منع نہیں کیا۔“ اس نے میری ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ ”بہت زیادہ سوالات سے اجتناب برتنے کو کہا تھا۔ تم پوچھ سکتے ہو اتنے کم عرصے میں کچھ کیسے جانے کے قابل ہال اس طرح پیدا ہوا جائے گا۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری سوچ کو پڑھ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں دل و دماغ کے آریار دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں۔ میں نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا۔

”آپ خود ہی بتا دیں میرے محترم؟“ وہ چند لمحات تک خاموش ٹھہری ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتا رہا پھر زرب ب مسکراہٹ کی معیت میں بولا ”جست اسرار و رموز کی سرزمین ہے اسے طلسم کردہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں البتہ اپنے جسم و دماغ اور روح کو ہر وقت مصروف رکھتے ہیں۔ ہماری ذات کی یہی مصروفیت ہمیں لغزات سے دور رکھتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ ہر وقت مصروف رہنے والے لوگ فکر اور اندیشوں سے دور رہتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے انسان کی تو بے فیصد ہمارا یں لغزات کے نیچے میں پیدا ہوتی ہیں۔ بہر حال! وہ ہم کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ہم نے جہاں غور و فکر اور مسلسل کوشش سے ناقابل علاج امراض کا علاج دریافت کیا ہے وہیں ایسی ادویات بھی تیار کی ہیں جو حیرت انگیز اثرات کی حامل ہیں۔ میں ایک خاص تیل ”لومار“ کا ذکر کروں گا۔ یہ تیل ”لومار“ نامی ایک نایاب جڑی سے تیار کیا جاتا ہے جو جنت کے سوا دنیا میں اور جہنم میں بھی نہیں پائی جاتی۔ لوہار تیل کی یہ خاصیت ہے کہ اگر دس روز تک باقاعدگی کے ساتھ سر میں اس کی مالش کی جائے تو اسے بال نکل آتے ہیں جس کا میں نے تمہوڑی دیر پہلے تم سے

ذکر کیا ہے۔ تمہاری دنیا میں بالوں کی مذکورہ لمبائی ڈیڑھ ماہ سے پہلے ممکن نہیں۔ ویسے جنت میں ”لومار“ کے نام سے ایک تہوار بھی منایا جاتا ہے جسے ہم نئے سال کا جشن کہتے ہیں۔ تہی پکی بنو انیرا! وہ ایک لمبے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”نئے سال کا یہ جشن جولین کیلنڈر کے مطابق مارچ کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ جشن آدھ ہمارا ہوتا ہے۔ کسی کچے سر پر بڑی تیزی سے ہال آگ آنا ہمارا ہی علامت ہے اس مناسبت سے اس تیل کا نام ”لومار“ بہت ہی موزوں ہے۔“

چنگ فورن پو کی کی انکشاف انگیز باتیں مجھے حیرت زدہ کر رہی تھیں۔ میں اس کے رد پر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اچانک اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمیں اور چلا گیا ہو۔ جی لاماروں کے دھیان گیان کے بے شمار قصبے میں سن رکھے تھے۔ چنگ پو بھی شاید اس وقت اپنے ہی کسی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میرون دوب (سرخ مائل گھبرا ہوا گاؤں) اس کی شخصیت کے تاثر کو اور بھی بڑھا دے رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جھنسا کر ایک پیالہ بنا لیا تھا اور یہ ”دتی پالہ“ اس وقت اس کی گود میں رکھا تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے لوٹس پوچر (کنول آسن) میں بیٹھا بہت ترسکون نظر آتا تھا۔ یوگا کے لوٹس پوچر یعنی کنول آسن کو ہندو یوگی پدم آسن یا سکھ آسن بھی کہتے ہیں۔ یہ آسن (انداز نشست) یوگا میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ”راج یوگ“ کی نوے فیصد مشقیں اسی آسن میں کی جاتی ہیں۔

اس وقت میرے جسم پر میلو روپ (زر دگاون) تھا جبکہ چنگ فو نے میرون دوب پہن رکھا تھا۔ عام بدھ بکھو زیادہ تر زرد گاون ہی پہنتے ہیں مگر آدھ لاما کے درجے کی طرف بڑھنے والے یا اس درجے پر فائز بدھ میرون گاؤں کا استعمال کرتے ہیں جبکہ ہالی لاما زور دلائی لاما ایک خاص شیزا میرون گاؤں زیب تن کرتے ہیں۔ ازس علاوہ انتہائی مخصوص مذہبی تقریبات کے موقع پر دلائی لاما سکھ کا سنہری گاؤں پہن کر تقریب میں روٹن افروز ہوتا ہے۔ اس تمام درجہ بندی میں ”ہالی لاما“ کی حیثیت ماہر روحانیات اور ایک استاد کی سی ہوتی ہے۔

چنگ فورن پو نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور نہایت ہی گھبرائے ہوئے ہوئے بولا ”اب میں تجھیں درویش سب سے ہم مسئلہ کا ذکر کروں گا۔ تم ایک صلاحیت رکھنے کے باوجود

بھی اسے پوری طرح“ پھر پورا انداز میں استعمال نہیں کر پارے ہو۔ میرا اشارہ تمہاری بائیں آنکھ کی کارکردگی کی جانب ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو میں بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ واقعی اس وقت میرے لیے یہ انتہائی عکین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ میں نے گہری دلچسپی سے چنگ فو کو دیکھا تو وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولا۔

”تم اپنی اس ناکامیابی کا الزام اپنے سب سے بڑے دشمن کو دیتے ہو کہ اس نے تم کو روحانی عمل سے تمہاری تیسری آنکھ کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کر دی ہے جبکہ تمہاری یہ سوچ پوری طرح درست نہیں ہے۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن وہ خود ہوتا ہے۔“

وہ تمہوڑی دیر کے لیے معنی خیز انداز میں خاموش ہوا تو میرے پورے وجود میں ایک سنسنی خیز بے چینی ہی پھیل گئی۔ پتا نہیں وہ آگے کیا کہنے والا تھا۔ میں ایک تک اسے دیکھتا چلا گیا۔ چند چروچ لحات گزارنے کے بعد اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”وہ جان! یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا دشمن پھر اسرار ملاحیتوں کا مالک ہے وہ عملیات پر بھی ٹھہری وحس رکھتا ہے اور اس نے تمہاری تیسری آنکھ پر ”پٹی“ باندھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن تمہاری تمام تر ناکامیابی اس کے کھاتے میں نہیں ڈالی جاسکتی بلکہ اپنے پاؤں پر کھانڈی مارنے میں تمہارا اپنا ہاتھ بھی شامل ہے۔“

”میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ بے ساختہ یہ سوال میری زبان سے پھیل گیا۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ”میں کو ہسار کی نگہ نیلگی کو زبردست بحث نہیں لانا چاہتا تھا۔ تاہم تمہارا ذہن صاف کرنے کے لیے محض ایک حوالہ دینا ضروری ہے۔“ چنگ فو کی زبان سے نیلگی کا نام نہ کر میں چونک اٹھا۔ پتا نہیں یہ نا دور روزگار شخص کہاں کہاں کی خبر رکھتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”نیلگی نے تم سے کہا تھا۔ تم زندگی میں ایک موقع پر غور و فکر کو۔ اس وقت تمہاری تمام کلیکیاں (تو تیں) چھین جائیں گی۔ میں نے بتایا ہے تاہم نیلگی کے معاملات پر مکمل کنٹرول بول سکا۔ بہر حال زندگی کی شاہراہ پر تمہارے قدم اٹانے ضرور ہیں۔ تم میرا اشارہ بخوبی سمجھ رہے ہو؟“

میرے سامنے اس وقت اگرچہ چنگ فو لاپٹنگ فورن پو کی کھجائے کوئی اور دنیا دار شخص بیٹھا ہوا تو میں سوال پوچھ پچھ کر اس کا ہاتھ بند کر دیتا مگر اس علم کے سمندر کے سامنے

اتمام جست یا بے مقصد اب کشائی بد تہذیبی اور بد تیزی کے زمرے میں آتی۔ وہ اپنے نام کے معنوی اعتبار سے بھی نہایت ہی پائے کی شخصیت تھا۔ چنگ پو معنی چنیدہ فو پو معنی بدھا رن پو پو معنی پروفیسر اور لاما پو معنی معلم گرد۔ مجھے ان لحات میں یوں محسوس ہوا تھا جیسے اونٹ پہاڑ تلے آ گیا ہو۔

چنگ فو نے نیلگی کا حوالہ دے کر ایک حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس اشارے سے متعلق واقعات کسی فلم کے مانند میرے تصور کے پردے پر ابھرنے لگے۔ کراچی میں کے ڈی اے اسکیم دن کے ایک بجنے کے اندر لپکی کے ساتھ گزاری ہوئی ایک رات زونارا آئی لینڈ کے ایک ساحل کا کچ میں راکھل اینڈ رن کی قربت میں بتائے ہوئے لحات اور اب بودھ تاتھ دلی ٹھنڈو سے یہاں تک لی یان کی معیت میں گزارا ہوا وقت.....!

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا کیونکہ اسی وقت چنگ فو نے بولنا شروع کر دیا تھا ”انسان خیر و شر کی آمیزش سے بنا ہے اور یہ دونوں تو ہمیں ہر وقت اس کے اندر موجود رہتی ہیں۔ کون سی قوت کس قوت پر حاوی ہو جائے اسی سے انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ تم اکثر خیر کی قوت سے شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے ہو۔ کراچی میں ایک بجنے کے آئینہ خانے میں صدف کے ساتھ گزارے ہوئے کڑے استحقاق لحات تمہاری اس مفت کے گواہ ہیں۔“

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میرا دماغ پڑھ رہا تھا کیونکہ ان لحات میں ”میں صدف ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ منظر میری نگاہ کے سامنے کھوم رہا تھا جب شیش غوری نے مجھے صدف کے ساتھ ایک مشکل نمیش سے گزارا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان بے بس اور لاچار لحات میں ”میں قعرِ غزلت میں گرنے سے باز رہا تھا۔ یہ بال بال نیچے سے بھی زیادہ ٹھن منور حال تھی۔“

چنگ فو کی ٹھہری ہوئی ملائم آواز میری سماعت سے نکرانی ”تمہارے اندر چونکہ خیر کا پہلو زیادہ اشراک ہے تم مثبت سوچ اور طرز عمل کے حامل ہو اس لیے تمہاری لغزشوں نے اتنا خراب نہیں کیا جتنا کسی اور شخص کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ تمہاری قرڈ آئی کے سلسلے میں جو قفل اور گز بڑا پیدا ہو رہی ہے یہ عارضی ہے۔ مجھے یقین ہے ان دس دنوں میں یہاں محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے تمہاری ایسی تربیت ہو جائے گی کہ تیسری آنکھ کی راہ میں کھڑی ہونے والی رکاوٹ خود بخود ہٹ جائے گی۔ تم بائیں آنکھ کے توسط سے بڑے واضح اور صاف مناظر دیکھنے لگے گے تم اسے ایک طرح کا مکمل نظیر سمجھ

لو۔

چنگ فو کی اس خوش خبری نے میرے دل و دماغ پر خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ میں خاموش بیٹھا چیف لاما کو سنتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ہماری دوسری ملاقات لارڈ بدھا کی مرضی سے دس روز بعد ہوئی۔ اس دوران میں جن سیان تمہارے ساتھ رہے گا۔ وہ تمہیں تبت کی خوب سیر کرائے گا۔ تم ذہن اور آنکھیں کھلی رکھنے والے شخص ہو۔ اس دس روزہ پہلے قیام کے دوران میں تمہیں بہت کچھ دیکھنے، سمجھنے، سیکھنے اور سکھانے کو ملے گا۔“

”پہلے قیام“ اور ”سکھانے“ کے الفاظ نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں دوبارہ بھی تبت آؤں گا اور ایک شاگرد کے علاوہ مجھے ایک استاد کی حیثیت سے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

”میں نے جن سیان کو تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ وہ ایک جہاں ویدہ اور تجربہ کار شخص ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اور اسے کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔“ وہ دروازہ پر کھڑا ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ”ان دس دنوں میں ہر رات نہایت پابندی کے ساتھ جن سیان لو مار آئل سے تمہارے سر کا مساج بھی کیا کرے گا۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے احترام میں مجھے بھی اس کی تقلید کرنا پڑی ”میں اب چلوں گا۔“ اس نے بڑی رسائی سے کہا ”تم ایک بات کو اپنی طرح ذہن نشین کرلو۔“ وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کو اپنی نگاہ سے ٹٹولنے لگا۔

میں نے اپنی پیشانی پر ایک خوشگوار سی پیش محسوس کی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی مہر اسرار و انانی چیف لاما کی آنکھوں سے خارج ہو کر میرے دماغ میں اتر ہی ہو۔ میں اس کیف آگئیں تجربے کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔ وہ انبساط سے لب رہا ہوا ہے جسے ہی نشاط انگیز محال تھا۔ شاید وہ کوئی خاص بات مجھے ذہن نشین کر رہا تھا پھر اس نے وہی بات زبان سے بھی کہہ دی۔

”وہ جان! تم تبت کے داماد ہو۔ تمہارے اندر آتش فشاں اسی برف پوش خطاؤں پر سکون حاصل کر سکتا ہے۔“

وہ ایک نہایت ہی گہری بات کو آسانی سے کہہ کر اس مختصر سے کمرے سے رخصت ہو گیا اور میں حیرت و حیرت لڑا اس خواب ناک ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا جو ہوئی تھی اور نہیں ہوئی تھی جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا میں نے وہ وقت کسی طلسم کدے میں گزارا ہو۔ میں محرز وہی کیفیت میں تھا۔

پانچس چنگ فو رن پوشی مجھ پر کون سا حیرت انگیز کرچلا گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور میں جن سیان کی صورت دیکھ کر چونکا اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جلا تھا۔ وہ ہڈیاں خاموشی مجھے کمرے سے باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اعتماد سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دروازہ اس کے لیے ٹرانسپیرنٹ وال کی حیثیت رکھتا ہو۔ اور اس نے کمرے میں ہونے والی اس اہم ملاقات کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا ہو!

میں کمرے سے نکلا اور خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس پر چل کر ہم چنگ فو کے پاس پہنچتے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ جن سیان مجھے ٹیبل کے دوسرے حصے دکھا رہا ہے لیکن جب مختلف چکر دار راہ داریوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک دروازے کے سامنے روک کر تو میرا اندازہ یکسر غلط ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے اندر آنے کو کہا۔ میں خاموشی سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں میں لی یان کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ وہ کمرہ لی یان کے وجود سے خالی تھا!

میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے جن سیان کو دیکھا۔ وہ میری آنکھوں سے جھپٹکے استفسار کو بہ خوبی سمجھ گیا لیکن کسی اور ہی میٹر بیٹز سے بولنے لگا۔

”بدھ ازم انسان کی فطری خواہشات اور جسمانی تقاضوں پر پابندی عائد کرتا ہے اور نہ ہی تجر و یا راہنیت پر زور دیتا ہے مگر ضبط نفس کی تلقین ضرور کرتا ہے۔ بھوک، پیاس اور نیند کی طرح جنس کی خواہش بھی انسان کے اندر سے ابھرتی ہے۔ بگے نام جنسی خواہشات اور کسی بھی شے کی ہوس غلط ہے۔ ہمارے عقائد میں ہر بدھ مت کی بھی مخصوص عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔“

گویا دس دن تو دور تھے اس نے پہلا قدم اٹھاتے ہی میری تربیت آغاز کر دی تھی۔ میں اس کی باتوں کا مطلب بہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن وہ میرے خاموش استفسار سے قحطی لگا نہیں کھاتی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”میں تو بدھ مت نہیں ہوں۔ یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“

”تم تبت کے داماد بننے والے ہو!“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں بدھ مت تھی۔ جن سیان کا اشارہ سیدھا سیدھا

ہی کی طرف تھا۔ اس کی بات سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ چنگ فو کا پہلی اعتماد بندہ تھا۔ اسے بہت سے اہم معاملات کی بڑی گہری اور وسیع معلومات حاصل تھیں، مگر یادہ جو کھا تک ٹیبل کے داخلی اور خارجی امور میں پوری طرح شامل تھا۔

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور قدرے جرحے میں استفسار کیا ”میری ساسی لی یان کہاں ہے؟“

”وہ دس چدرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائے گی۔“ جن سیان نے جواب دیا۔

اس نے مجھے انسانی نفسیات اور خواہش و ضرورت پر بدھ مت کا جو مختصر سا لکچر پلایا تھا، میں چاہتا تو اس پر پلٹ کر اس سے پوچھ سکتا تھا۔ عظیم المرتبت کنگ ساگ سین گاچو کے بارے میں اس کے کیا چار ہیں؟ یہ شخص تو بدھ مت کو تبت میں متعارف کرانے کا اعزاز رکھتا تھا اور اس نے تین تہی بیویوں کی موجودی میں دو بدھ مت شہزادیوں سے شادی کر کے اپنی بیویوں کی تعداد کو پانچ تک پہنچا دیا تھا۔ بدھ ازم کے گہا پر چارک ”کنگ گاچو“ کے سلسلے میں کسی ایک مخصوص

نور سے ہمیں خواہش پوری کرنے کا فلسفہ کیا ہوا؟ ظاہر ہے یہ ایک اختلائی موضوع ہوتا اور مجھے خواہ خواہ کے اختلافات میں اچھ کر اپنی راہ کو نہیں کرنا چاہی لہذا میں جن سیان اور اس کے بیان کردہ فلسفے کو نظر انداز کر کے کمرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میرے قیام اندازے کے مطابق وہ لمبوتر اکرا دس قریب میں فٹ پائس کا حامل تھا جس میں تین چھوٹے بیڑوں کی رت ترتیب وار لگے ہوئے تھے۔ بیڑوں کی پرانے والی لمبی دیوار میں دو کرسیاں موجود تھیں اور پانچویں طرف اتنی جگہ تھی کہ بآسانی وہاں سے گزر جا سکے۔ پانچویں والی میں فٹی دیوار میں کپڑوں والی ایک بڑی لٹری بھی نصب تھی۔ وہ کمرہ کسی اسپتال کے چھوٹے سے لارڈ کا نقشہ پیش کر رہا تھا جی کہ تینوں بیڑوں کے ”چ“ پالائی بائیں دو چھوٹی سائڈ ٹیبل بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس کمرے میں داخل و خروج کے لیے صرف ایک ہی دروازہ تھا جہاں سے ہم اندر آئے تھے۔

جن سیان نے کمرے کے آخری سرے کی جانب اشارہ کیا اور بولا ”تمہاری ساسی ابھی یہاں پہنچنے والی ہے۔ وہ بیڑوں کے لیے ہے۔“ پھر اس کی انگلی درمیانی بیڑی کی سمت اٹھی اور

”لگنے کہا“ اس بیڑے پر تم سو یا کرو گے۔“

”اور یہ بیڑا؟“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ میرا اشارہ دروازے سے قریب ترین بیچے

تیسرے بیڑی کی طرف تھا۔ جن سیان نے جواب دیا ”یہ بیڑے میرے لیے ہے۔ آنے والے دس دن تک میں آپ لوگوں کے ساتھ رہی ہوں گا!“

میں ایک طویل گہری اور بوجھل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ”دادا ایو“ کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ظاہر ہے یہ ہدایات سے دن پوشی چنگ فو نے دی ہوں گی۔ جب کسی شخص کی شادی کی تاریخ طے ہو جائے تو خطہ یا مقدم کے طور پر اس پر ایک شخص نگران مقرر کر دیا جاتا ہے جو اس کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ بننے والے دلہا میاں کسی ایسی دیکھی سرگرمی میں لوث نہ ہو جائیں۔ میری متوقع سسرال والے بھی میرے ساتھ کچھ اہم کام کا سلوک کر رہے تھے۔ آگے کہا ہونے والا تھا، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کیونکہ بعض اوقات تقدیر انسان کی بے بسی کا مذاق اڑانے کی غرض سے اس کی ساری تدبیروں کی ایسی کم تہی کر کے رکھ دیتی ہے۔ بہر حال یہ نگرانی مجھے ابھی نہیں لگی تھی۔

آئندہ روز سے جن سیان کے ڈسپوزل پر ہماری سیر و تفریح کا آغاز ہو گیا۔ ہم دن بھر جو کھا تک ٹیبل سے باہر رچے اور رات کو وہاں آجاتے۔ رات کے کھانے سے پہلے جن سیان ہمیں ایک جنازہ میں لے جاتا جو ٹیبل کے گرد و فلوڑ پر ایک دور افتادہ ہال میں واقع تھا۔ وہاں پر میں نے بڑے بڑے ہنرمند موسکس کی فائض دیکھیں۔ لی یان کے لیے یہ سب کچھ نہایت ہی سنسنی خیز اور حیرت انگیز تھا۔ میں نے تو شاولین ٹیبل میں ایسے کھیل تماشے بہت دیکھے تھے لیکن مارشل آرٹس کے حوالے سے لی یان کے لیے یہ ایک بالکل نیا اور الوکھا تجربہ تھا۔ اس جنازہ میں فائض کے ساتھ ساتھ تجربہ کار اور ماہر موسکس ”ڈوجینگ“ اور ”سل جینگ“ کی پیکٹس بھی کرتے تھے۔ ڈوجینگ (DOJANG) میں روحانی مشقیں اور سل جینگ (SULJANG) میں جسمانی مشقیں کی جاتی ہیں۔ ان دونوں شعبہ ہائے کے لیے جنازہ کے ساتھ ہی دو چھوٹے ہالز بھی مخصوص تھے۔

رات کو سونے سے پہلے جن سیان میرے سر میں ”لو مار آئل“ ڈال کر خوب اچھی طرح مالش بھی کرتا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ میں اس کرشماتی تیل کے اثرات دیکھ کر دنگ تھا۔ کسی ٹنگ و شے کے بغیر بڑی تیز رفتاری سے میرے سر کے بال بڑھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

میں اور لی یان رات دس بجے تک عموماً سو جاتے تھے۔

جن سیان بھی یہی ظاہر کرتا تھا جیسے وہ ہم سے پہلے ہی سوچا ہے لیکن مجھے یقین تھا وہ محض سوتا بن کر رات بھر بستر پر بڑا جاگتا رہتا ہے۔ میں نے اس دوران میں اس کی ”نگرائی“ کو ”چنگ“ کرنے کو کوئی ”رسک“ نہ لیا۔ لیان کی میں مونی ملے ہی جن سیان کے عزائم کے بارے میں بتا چکا تھا لہذا کوئی پیچیدگی یا کنفیژن پیدا نہیں ہوا۔

تبت میں اس مختصر قیام کے دوران میں ہم نے وہاں کے تمام قابل ذہن و مقامات کی سیر کر لی۔ سب سے پہلے جن سیان لہاسا سے باہر دوسرے شہروں میں لے گیا۔ ان میں ایک یارلنگ ولی (YARLUNG VALLEY) اور دوسرا قابل ذکر شہر شگیتسی (SHIGATSE) ہے۔ لہاسا حکومتی معاملات، طبیکی شہر زراعت اور یارلنگ ولی تاریخی اعتبار سے اپنی خاص شہرت رکھتے ہیں۔

شگیتسی اول آخر ایک زری علاقہ ہے جہاں پاک کی جوتیوں کی مدد سے مل چلا کر کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ تبت میں پاک کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لیے بالوں والا یہ تیل نما جانور ہر طرح سے قیمتی لوگوں کے کام آتا ہے۔ شگیتسی میں تاحہ نگاہ چھوٹی بڑی برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں کھیتوں کا سلسلہ دیکھنے کو ملے گا۔ کہیں مل چلا یا جا رہا ہے اور کہیں فصل کھڑی لہلہا رہی ہے۔ شگیتسی لہاسا شہر سے تین سو مائیل کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ رخ سمندر سے اس کی بلندی چار ہزار آٹھ سو میٹر یعنی تقریباً پندرہ ہزار سات سو فٹ ہے۔ یہ دنیا کا بلند ترین خطہ ارض ہے جہاں بود بائش پائی جاتی ہے۔ پینشن میں ہی چین لاما (PANCHEN LAMA) کا بھی قیام ہے۔ چین لاما کو دلائی لاما کے بعد سب سے بڑی مذہبی شخصیت سمجھا جاتا ہے یعنی رہنے کے اعتبار سے چین لاما کو دلائی لاما کا نائب سمجھ لیں۔

یارلنگ ولی تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں شرقا غربا اپنے والے دریائے یارلنگ سینگ پو (YARLUNG TSANGPO) کو دنیا کا بلند ترین دریا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یارلنگ ولی لہاسا سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع ہے۔ یہاں پر ایک عظیم الشان زری ڈیمک (SEDANG) دی ہوئی ہے جس میں پانچ سو افراد کے بیک وقت قیام کی سہولت موجود ہے۔ زری ڈیمک ہوٹل میں تمام پائیز ڈشز دستیاب ہیں۔ جن میں پاک کے گوشت کی مٹھی ڈس خاصے کی چیز ہے۔ شہر سے سولہ کلو میٹر کے فاصلے پر کاسل آف ”بیولا گنگ“ واقع ہے ”بیولا گنگ کا سلسلہ“ تبت میں قدیم ترین کاسلو میں سے باقی بچ رہنے والا ایک

ہے۔ زری ڈیمک سے چند کلو میٹر دور ”چینگ چونگ“ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ چینگ چو (CHANG ZHU) کیبل سائز کی صدی میں کنگ ساک سین کا بیوے تعمیر کرایا تھا۔ زری ڈیمک ہی سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر ”وولی آف ٹکٹر“ واقع ہے جہاں کنگ ساک سین کا چھوٹا بیو (TU BO) سلطنت کے دیگر سات شہنشاہ دفن ہیں۔ کسی زمانے میں ”تیو سلطنت“ کا بڑا رعب و دبدبہ ہوا کرتا تھا۔

سب سے زیادہ لطف لہاسا کی سیر میں محسوس ہوا۔ چینیوں نے تبت کو ”سی زانگ“ بنانے کے بعد تعمیر وترقی کے ذریعے پوری کوشش کی کہ یہ سب سے خاصا لہاسا شہر باگ باگ کنگ نظر آنے لگے مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی! ”لہاسا ہوٹل“ انہی تعمیرات کی ایک مثال ہے۔ پانچ سو کمروں پر مشتمل یہ گھوڑی ہوٹل شہر کے چینی آبادی والے حصے میں خوبصورت ادھوا کے نزدیک واقع ہے۔ یہ لہاسا کا پہلا ہوٹل ہے جہاں لٹف کی سہولت بھی موجود ہے۔ ”لہاسا ہوٹل“ کا انتظام و انصرام ہائیڈرو ان کے عملے کے ہاتھ میں ہے۔

دریائے لہاسا کے کنارے پر واقع پوٹالا محل (POTALA PALACE) دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ”وٹر پیلس“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل دلائی لاما کی رہائش گاہ ہے۔ ہر دور کا دلائی لاما موسم سرما ہی محل میں گزارتا تھا لیکن تبت پر چینی قبضے کے بعد اب اس محل کی حیثیت ایک عجائب گھر ایسی ہوئی ہے۔ یہ محل پانچویں دلائی لاما نے سولہویں صدی عیسویں میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ ایک سرخ پٹاڑی پر واقع ہے اور لہاسا ولی سے تین سو میٹر بلندی پر ہے۔ اس محل میں ایک ہزار کمرے ہیں جن کی دیواروں کی مونا کی کم و بیش پانچ میٹر تک ہے۔ کمروں کی چھتوں پر پینٹل کی جہیں چڑھائی گئی ہیں۔ زیادہ تر دلائی لاما ز بیٹھیں پر دفن ہیں۔ تیرھویں دلائی لاما کا مقبرہ نہایت ہی شان دار ہے۔ چودہ میٹر اونچا یہ طلائی استوپا دیکھ کر آنکھ خیرہ ہو جاتی ہے۔ دلائی لاما کے بیڈروم کو محل کے استقبالیہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس کشادہ کمرے کی دیواروں پر سابق دلائی لاما ز کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں جن میں سے اکثر کئی تصاویر ہیں۔ اس محل کی چھت کے قریب ایک عجیبے رنگ طلائی ڈریگون کا عظیم الجثہ مجسمہ استاد ہے اس ڈریگون کے گلے میں ایک بڑی سی طلائی تختی بھی لٹک رہی ہے۔ بدھ مت کا یقین ہے کہ یہ طلائی ڈریگون پوٹالا پیلس کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھتا ہے۔ کسی زمانے میں پوٹالا پیلس کے اندر ایک نہایت ہی بلند درجے کی مونی بھی ہوا کرتی تھی جہاں لگ بھگ دوسو مونکس ہر وقت تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے مگر اب یہ

سب کچھ تھک پارید ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ انیس سو اسی عیسوی میں جب چودھویں دلائی لاما کو یہ حالت مجبوری جلا وطنی اختیار کرنا پڑی تو اس وقت لہاسا شہر میں مونشیریز کی تعداد ہزاروں میں تھی لیکن اب یہیں سے زیادہ نہیں ہوں گی جن میں سے اہم مونشیریز سیرالورڈری ہنگ ہیں۔

لہاسا ہوٹل سے چند قدموں کے فاصلے پر نور بلینگکا محل (NORBULINGKA PALACE) واقع ہے جو سر پیلس کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی دلائی لاما کی رہائش گاہ ہی ہے۔ ہر دور کا دلائی لاما موسم سرما ہی محل میں گزارتا تھا۔ یہ محل ایک بہت بڑے پارک میں واقع ہے۔ یہ چینی طرز تعمیر کا حال ہے اس محل کی عظیم الشان زرد عمارت چاروں جانب سے باغات میں گھری ہوئی ہے۔ یہ محل انیس سو پچاس عیسوی کی ابتدا میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس محل کا دلائی لاما کے لیے مخصوص رہائشی حصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وائس روجر حدید مغربی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ چودھویں جلاوطن دلائی لاما کے بیڈروم میں اس کا فلیس مٹنی کا تیار کردہ ریڈ کارڈ پیئرز یادگار کے طور پر موجود ہے۔

ہم نور بلینگکا پیلس کی سیر سے فارغ ہوئے تو ہمارے گائیڈ جن سیان نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ”اب میں تمہیں ایک ایسی جگہ دکھا رہا ہوں جو تمہارے لیے مخصوص کردی گئی ہے!“

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پوچھا ”میں وہاں کیا کروں گا؟“

”یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے۔“ وہ بتاتے لگا ”زیریں منزل پر ایک تربیت گاہ واقع ہے جب کہ بالائی منزل رہائش کے لیے مخصوص ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا تو میں نے استفسار کیا۔

”لیکن یہ تو بتاؤ اس دو منزلہ عمارت کو میرے لیے کیوں مخصوص کیا گیا ہے؟“

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ”اس عمارت کی بالائی منزل تمہاری قیام گاہ ہوگی جب کہ زیریں منزل پر تم اپنی کوئنگ کی کوئنگ ای کوئنگ اور شیم کوئنگ کی تربیت دو گے!“ میں جی کنگ (QI GONG) سے بد خوئی واقف تھا کیونکہ یہ پراسرار قوت میرے اندر بیدار ہو چکی تھی لیکن دیگر تین کوئنگ کے بارے میں مجھے پتا نہیں تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو ابھانے کے بجائے اسی سے پوچھ لیا۔

جن سیان نے بتایا ”نی کوئنگ (NEA GONG) باطنی قوت سے متعلق ہے ای کوئنگ (OE GONG) خارجی قوت کی

نمائندگی کرتی ہے جب کہ شیم کوئنگ (SHIM GONG) روحانی قوت سے تعلق رکھتی ہے۔“

”لیکن.....؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے روک دیا اور اپنی بات کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے جی کوئنگ“ تھروڈ آئی ”یوگا“ شاذ بن مارشل آئرس یعنی دو شنگو فو کے میدان میں اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تمہیں اس تربیت گاہ کا استاد ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ رہی کسی کچھ فورن پوٹی کی نظر پوری کر دے گی۔“ اس نے لفظ ”نظر“ پر خاصا دباؤ ڈالا تھا۔ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ چیف لاما نے مستقبل میں مجھے تبت ہی میں آباد کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں پیش گوئی کرنا اور اس پیش گوئی کی روشنی میں پلاننگ کرنا ایک الگ بات ہے لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ آنے والے وقت کے بارے میں صرف اور صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے!

میں خاموشی سے جن سیان کے ہمراہ چلا رہا۔ لیان نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ جن سیان کا ساتھ میرا آنے کے بعد میں اور لیان ایک دوسرے کے لیے ”بیگانہ“ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ جن سیان نے میرے مستقبل کے بارے میں ابھی جو اظہار خیال کیا تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ساحل کا حصول میری زندگی کا نصب العین بن کر رہ گیا تھا۔ اسے پانے کے بعد میں کہاں جاتا ہوں اور کس قسم کی زندگی گزارتا ہوں اس کے بارے میں میں قبل از وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میری زندگی کا بھی کچھ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ حالات کی ستم ظریف شوگر کریں مجھے کھد پڑتے ہوئے جدھر لے جاتیں میں چل پڑتا تھا۔ آئندہ کے بارے میں بھی خدا ہی بہتر جانتا تھا۔

جن سیان کی معیت میں ہمارے سفر کا اختتام ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر ہوا۔ مذکورہ عمارت نور بلینگکا پیلس کے قریب بیٹے والے دریائے ”کائے جو“ کے کنارے پر واقع تھی۔ جن سیان نے عمارت کے داخلی دروازے پر دستک دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

”وہ جان! تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب تم اپنے مشن سے کامیاب لوٹنے کے بعد اس تربیت گاہ کا انتظام سنبھالو گے تو تمہیں اپنے کام کا آغاز صرف ایک اسٹوڈنٹ سے کرنا ہوگا۔ میں تمہیں اسی اسٹوڈنٹ سے ملوانے یہاں لایا ہوں..... اور مجھے یقین ہے تم اپنے اس اکلوتے اسٹوڈنٹ کو



چن سیان نے آخری جیلے میں مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ تبت کی سرزمین پر قدم رکھا تھا پھر وہاں کے کسی پاسی سے کھینکھو واقف ہو سکتا تھا اس سے پہلے کہ میں اپنی ابھمن کو دودھ کرنے کے لیے جو سیان سے کوئی سوال کرتا، عمارت کا دروازہ کھل گیا۔

کھلے ہوئے دروازے میں ایک مضموم اور خوب صورت بچہ کود کھیر کر میں ٹھک گیا۔ اس بچے کی عمر کچھ چار سال ہی ہوگی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں سانگ فو کا نام چکا۔ اس بچے نے بھی نظر نہ ہی مجھے پھان لیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا بھرا۔ زبانی زبان میں پوچھا۔ میں جتنی زبان سے آشنا نہیں تھا۔ تاہم اس کے انداز اظہار نے اور گردن کی جھنجھٹ نے مجھے بتادیا کہ وہ مجھے وہاں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میں خبر کا تبتا اس بچے کو نکلے چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں محترم سانگ فو سے ہونے والی پہلی اور آخری ملاقات کا منظر روشن تھا۔ سینٹل (دانشن) امریکا میں محترم سانگ فو نے آن جہانی ہونے سے پہلے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہماری اگلی ملاقات تبت میں ہوگی اور میں اسے چار سالہ سانگ فو کے روپ میں دیکھتے ہی پھان لوں گا اور واقعی اُور اسی ہوا تھا۔

میری محویت کو بچہ نیاں کی بھرائی ہوئی آواز نے توڑ دیا۔ وہ مجھ سے غماض سے ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا: ”وعدہ! انتہا سا گنگو تمہیں دیر م کہہ رہا ہے اور...“ تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے جس اگلاتے اسٹوڈنٹ کا ذکر کیا تھا، وہ اسٹوڈنٹ یہی سٹیف فوے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے قدرے تحکاسہ انداز میں کہا: ”اب ہم واپس جو کھا گئے چیل چیل گئے۔“

جن سیان کے این الفاظ پر نئے ساگ فونے گردن جھکا  
کر ایک مرتبہ پھر مجھے تعظیم دی اور دروازہ بند کر کے میری نگاہ  
سے اوچھل ہو گیا۔

واپس کے سفر میں، میں حیران سے زیادہ پریشان رہا۔ میں آدھ گون اور جہنم درجہ کے فلسفے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا ایمان ہے انسان اس دنیا میں ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی مرتبہ مرتا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا، نیشنل والے انجیائی محترم ساگک نو اور تب والے اس معصوم ساگک نو میں درحقیقت کیا تعلق تھا بہر حال اسرار میں لپٹی ہوئی کوئی ایسی حقیقت ضرور وجود رکھتی تھی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ جو چیز کچھ میں نہ آئے اس سے ذہن

الجمہا ہے اسی لیے ان لحاا میں میں شدید و جی خلفشار کا شکار تھا۔

رات کے کھانے سے پہلے جو کھا مک ٹیپل کے اندر واقع  
جنازہ ہم میں حاضری کا سلسلہ ہا قاعدہ گی سے جاری تھا۔ چکر  
فورن پوشی سے دوسری ملاقات سے ایک روز قبل میں اور لی  
بان جن سیان کے ساتھ جنازہ ہم میں موجود تھے کہ ایک حیرت  
انگیز واقعہ پیش آیا۔

میں جمنائزم میں مختلف موکس کو مارشل آرٹس خصوصاً کنگ فو کی پریکٹس کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ ان فائزر میں چونگ (ZHONG) نامی ایک نوجوان موکس کمال کا ہنر تھا۔ میں نے اب تک چونگ کو کسی اور فائزر سے زیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس روز بھی مختلف موکس کے مابین مقابلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں چونگ اکیلا میدان میں رہ گیا۔ وہ فائٹنگ کے لیے مخصوص جگہ کے وسط میں خاموش کھڑا تھا۔ باقی موکس ایک بڑا سادارہ بنائے پہلو پہ پہلو کنول آرٹس میں بیٹھے تھے۔ میں لی یان اور جن سیان بھی اسی دائرے کی تین کڑیاں تھے۔ ہال میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس مہیب خاموشی کو جن سیان کی گھبرائی ہوئی آواز نے توڑ دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”وہ جان! تم جوگ سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ!“  
یہ ایک کھلا اعلان تھا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے جوگ کے  
فائننگ اسٹائل اور اس آرٹ میں اس کی اسکل کو بڑی ہار یک  
بٹی سے دیکھ رہا تھا۔ جوگ کی مہارت اور کارکردگی نے مجھے  
گہرا متاثر بھی کیا تھا۔ میں نے اس پائے کا ماحصل آرٹ  
صرف شاؤ لن ٹینیل کے ماسٹرز کے پاس دیکھا تھا۔ میں جوگ  
سے متاثر تھا، خائف نہیں لہذا جی سیان کی بات ختم ہونے ہی  
میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد میں اور جوگ  
اپنے اپنے اسٹاپس میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے  
ہوئے۔

جن سیان نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ریفری کے فرائض کا آغاز کر دیا۔ اس کی اجازت کے بعد ہمارے درمیان فائٹ شروع ہو گئی۔

یہ میری زندگی کی سب سے اعلوٰی فائنٹ تھی۔ وہ چارنا اور چونگ کی شکل میں دو حقیقت شاذ و نادر نیپیل اور جو کھاگ نیپیل ایک دوسرے کے مقابل آن کمرے ہوئے تھے۔ یہ جین اور تبت کی ایک دوستا۔ خونی جنگ تھی۔ اسی جتنا زہم میں موجود ہر ذی روح کو جیسے کسی سانپ نے سوجھا لیا تھا۔ دلوں کو دلا دینے والے سنانے میں صرف ہم دونوں کے ہاتھ باڈن

ی کامل حرکات کے سبب پیدا ہونے والی مخصوص آوازیں غی  
ابہر غی تھیں۔

چنگ نے ایک مرتبہ بھی مجھ پر حملہ کیا۔ تاہم اس کی ایک ادا اس کے والی محی جس کے ریڈل میں بڑھ چڑھ کر اس پر ہر پورا ایک کر رہا تھیں مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ دس منٹ کی مسلسل فائٹ کے دوران میں میں چنگ کو مجھ پر بھی نہیں پایا تھا۔ پول محسوس ہوتا جیسے میں ہوا سے نبرد آزما ہوں۔ میرا ہر ایک پر فیکشن کا اعلیٰ نمونہ ہوتا مگر ہاتھ پاؤں مار گت تک پہنچنے سے پہلے ہی چنگ اپنی پوزیشن بدل دیتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا ذہن کس غیر فطری سے فیصلے کر رہا تھا۔

بھرا ایک مونیچ چڑھ چکا ہے چوک ہوئی۔ وہ میری ایک نظر تک سانس نہ لے سکا۔ میرے دائیں پاؤں کا بالیڈ ایک دھواں دھار پیش کے ساتھ اس کے سینے سے ٹکرایا۔ یہ زوردار دھکا کھا کر چوک کا جسم ہوا میں بلند ہوا اور وہ عکس والے دائرے کے اوپر سے پرداز کرتے ہوئے ہال کے فرش پر جا گرا۔

فرش سے کھڑاتے ہی وہ اس بات ہو گیا۔ پیری بھی مجھ سے نہ  
 آ سکا کون سی قوت نے اسے یوں اٹھا کر در در پینک دیا تھا۔  
 میں فانگ سرکل کے اندر خاموش کھڑا ایک تک چوٹ کو دیکھتا  
 چلا گیا۔ اس کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھ کر یونی لگتا تھا  
 جیسے زندگی اس کے اندر سے رخصت ہو گئی ہو۔ ان لمحات میں  
 ہجرت اور استحباب کی آخری منزل پر کھڑا تھا۔

جلد ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ میں اکیلا ہی چوگک کے ماکت جسم کو کھورے جارہا ہوں۔ سرکل میں موجود تمام موٹکس محمول جیسی سیان خاموش اور پرسکون بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اٹھ کر جا بھاگ کر چوگک پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ان کا یہ رویہ میرے لیے الجھا دینے والا تھا۔ میں چوگک پر سے نگاہ اٹھا کر باری باری موٹکس کے چوں کا جائزہ لیتے لگا۔

اسی لمحے چن سیان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس وقت براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی چمکناہٹ کسی بڑے طوفان کی خبر دیتی تھی۔ پتا نہیں، وہ کون سا عازا فشا کرنے جا رہا تھا؟ وہ بڑے ہی ناقابل یقین اور تشویش ناک لمحات تھے۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے لب داہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں جو سچے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان سے اس کی عظمت و شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریک بر غلظم کے پراسرار ماحول میں غم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے دادو اور غلّی کے مقابلے برپا ہوتے تھے۔ دھنی تھاک اور ان کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابل یقین سرگزشت..... ان تاریک اور گم گم جزیروں کی کہانی..... جہاں تہذیب کا کوئی دخل نہیں تھا..... غلوں کی خاطر معصوم اور شیرخوار بچوں کو نیزوں پر اچھالا جاتا تھا عجیب الخلق اور خوفناک دیوتاؤں کے محسوس کوتاہ روخوں سے غلّی دیا جاتا تھا..... نوخیز حسناؤں کی ہیبت پیش کی جاتی تھی

اقابلا

وچنی تھیلوں کی ایک کرش سینیہ جس کا حسن لازوال تھا۔  
جس کے حصول کیلئے موت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا۔..... خون  
کی بولی کھیل جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز  
واقعات جسے سمندر کی کرش موجوں نے اٹھارے اقبالہ کے  
دیس میں اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

عقلمانی عمل میں پہلی بار مہر مام پر آئی ہے

قیمت فی حصہ (60) روپے ••••• واک فریج (23) روپے

**کتابیات پبلی کیشنز**  
 74200 پوسٹ بکس 23 کراچی  
 5802551 فون 5802551-5895313  
 kitabiat1970@yahoo.com  
 رابطہ کے لئے: C-63/1/11، بخشش ڈی ایچ اے، کراچی 75500

میری نگاہ جن سیان کے چہرے پر جمی تھی۔ وہ بھی بڑی گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور ساہت تھا۔ پتا نہیں، وہ کس کسنی خیز انکشاف کا ارادہ نہ کر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چمکتی کبیر سنجیدگی کسی بہت بڑے طوفان کی خبر دیتی تھی۔ وہ بڑے جبرت آمیز اور تاریک لوت تھے۔ میں ہب دک اس کی آنکھوں میں دیکھتا چلا گیا۔ میں نے جیسے ہی اس صورت حالات کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی، جن سیان لب کشا ہوا۔ اس کی سرسراتی آواز میری ساعت تک پہنچی۔

”وہ جان! چونک کو کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں!“

میری نگاہ جن سیان سے ہٹ کر چونک کی طرف چلی گئی۔

”یہ ابھی تمہارے سامنے، انڈر کرکٹر اہو جائے گا“ جن سیان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

ادھر جن سیان کی مات کھلی ہوئی ادھر چونک صحیح سلامت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کسی کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی، کسی معمول کی طرح گردن جھکائے خاموش سے وہ اس ہال سے باہر نکل گیا۔

”یہ..... یہ سب کچھ ہے؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے جن سیان کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے، لہجے میں بولا ”تم نے ابھی اوریکل کا مظاہرہ دیکھا ہے۔؟“

”اوریکل؟“ میرے لہجے میں بدستور الجھن موجود تھی۔

جن سیان نے اس ہال میں موجود موکس پر ایک خاموش اور متنی خیز نظر ڈالی۔ اس نظر کے نتیجے میں وہ موکس خاموش سے اٹھے اور یکے بعد دیگرے اس ہال سے رخصت ہو گئے۔ میں لی یان اور جن سیان جب ہال میں باقی رہ گئے تو جن سیان یہ آہستگی ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم راز مجھ پر کھولنے والا ہے۔ اوریکل کا لفظ میرے لیے بالکل نیا تھا تاہم میں نے دوبارہ اس حوالے سے سوال نہیں کیا اور اس کے بولنے کا انتظار کر لیا۔

چند لمحات کے بعد وہ بڑے گھبرانداز میں گویا ہوا۔ اس کا مخاطب میں تھا ”تم اوریکل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”کچھ بھی نہیں!“

”تمہاری جدید اور ترقی یافتہ دنیا میں یہ لفظ نامالوس نہیں“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولنا چلا گیا ”لگتا ہے تمہیں کمپیوٹر کے شعبے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے!“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی ”میں نے کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا صرف نام ہی نام سنا ہے، عملاً میں اس شعبے سے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ شاید تم یقین نہ کر سکو میں نے ابھی تک کسی کمپیوٹر کے کی بورڈ کو چھو کر نہیں دیکھا!“

”میں واقعی یقین نہیں کر سکتا“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا ”میری معلومات کے مطابق، تم پچھلے کچھ عرصے سے ہائی فائی ٹرائی بیڑ جی ایس ایم سیل فون استعمال کر رہے ہو۔ سیل فون کمپیوٹر کی ایک شکل ہے جو کی پیڈیا کی بورڈ کے بغیر ایک بے جان کا جسم ہے۔“

”ہاں میں سیل فون تو استعمال کر رہا ہوں“ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا تم سچ کہتے ہو، سیل فون ایک چھوٹا کمپیوٹر ہی ہے۔“

”بہر حال!“ وہ آنکھیں جھپکائے بغیر معتدل لہجے میں بولا ”میں تمہیں اوریکل اور اس کے مظاہرے کے بارے میں بتا رہا تھا“ اس نے ایک گہری سانس چھوڑی اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تمہاری دنیا کی جدید کمپیوٹر سائنس میں ”اوریکل“ کی فہم قدرے مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ قدیم ترین تہذیبی روحانی اور پراسرار علوم کی دنیا میں اوریکل (ORACLE) ایک بہت ہی پیچھے ہوئے روحانی عامل کو کہا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہرو.....“ وہ کلمے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں پہلے اوریکل کے حوالے سے تمہیں تعویذی تفصیل بتا دوں۔“

وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مختلف خیالات کو اپنے ذہن میں مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہم دونوں اس کے رد و رد بیٹھے تھے اور چپ رہ کر اس کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ لی یان کمپیوٹر کی دنیا سے بہ خوبی واقف تھی، کوئی شخص امریکا میں رہ رہا ہو اور کمپیوٹر کا استعمال نہ کرتا ہو، یہ اس دور کا سب سے بڑا لطیف ہوگا کیونکہ اس دنیا کے اندر ”امریکا“ بہ ذات خود ایک الگ تھلک اور انوکھی دنیا ہے جہاں کمپیوٹر کے استعمال کے بغیر انسان سانس بھی نہیں تھک سکتا لیکن اس موقع پر لی یان نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا اور جن سیان کے استفسارات کے جواب میں، اپنی

زبان سے ایک لفظ جدا نہیں ہونے دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت جن سیان براہ راست مجھ سے متضرر تھا اور لی یان کا اس معاملے میں بولنا مناسب نہ ہوتا۔

جن سیان کی ٹھہری ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچنے لگی۔ اس کا انداز کی دغلا تھا ”تبت اور لا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ”لا با“ کے معنی..... ”زندہ بچا“ کے ہیں۔ جو لوگ گوتم بدھ کی تعلیمات کی روح کو زندہ رکھتے ہیں وہ لا با کہلاتے ہیں۔ ان میں بھی درجے مقرر ہیں جیسے لا با، چیف لا با، مچن لا با، دلائی لا با، ہائی لا با۔ درجے کے اعتبار سے ان کی ذمے داریاں مخصوص ہیں۔ لا با اور چیف لا با ٹیمپل اور منسٹری وغیرہ کا انتظام و انصرام چلاتے ہیں۔ مچن لا با اور دلائی لا با کا تعلق حکومتی امور سے ہے۔ عیسائیت میں جو حیثیت پوپ کی ہے، بدھ ازم میں دلائی لا با وہی مقام و مرتبہ رکھتا ہے۔ عظیم مذہبی اور روحانی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ دلائی لا با ملک گیری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ مچن لا با کا درجہ اس سے نیچے ہوتا ہے۔ اگر دلائی لا با کو صدر مملکت مان لیں تو مچن لا با کا درجہ ایک وزیر کا سا ہوتا ہے۔ بہر حال، میں تمہیں ہائی لا با کے بارے میں بتانے جا رہا تھا۔“

وہ لمبے بھر کو خاموش ہوا تو ہال میں گویا ساٹا سا چھا گیا۔ وہ اکیلا ہی بول رہا تھا، ہم تو دیسے جی چپ سا دمے، خاموش بیٹھے اس کا بچہ گرس رہے تھے۔ وہ جو کچھ بیان کر رہا تھا، اس میں سے بہت سی باتیں مجھے پہلے سے معلوم تھیں تاہم اس وقت پوری توجہ سے جن سیان کو سننا میری مجبوری تھی۔ وہ کمالی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”بدھ بکھشو، موک، لا با..... اس تمام تر زنجیر کا تعلق روحانیت سے ہے۔ دلائی لا با، مچن لا با، چیف لا با کی پراسرار صلاحیتوں اور اختیارات سے انکار ممکن نہیں لیکن میں اس وقت تمہیں صرف اور صرف ہائی لا با کے بارے میں بتاؤں گا۔ لا با کا یہ طبقہ صرف اور صرف پراسرار تہذیبی روحانی علوم سے متعلق ہے۔ یہ لوگ دیگر حکومتی انتظامی امور سے دور رہتے ہیں البتہ اپنے علوم کی مدد سے یہ مچن لا با اور دلائی لا با سے بعض اوریکل بھی ہوتے ہیں۔ وہ ہائی لا با جو اوریکل بھی ہو اسے دوسروں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ ابھی تم نے اوریکل کا جو مظاہرہ دیکھا ہے وہ ہائی لا با گوانگ چی (GUANG-QI) کا کمال تھا۔ چونک نے تو محض ایک میڈیم کا کردار ادا کیا ہے!“

وہ خاموش ہوا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں نے تعویذی درجے پہلے چونک سے ایک انتہائی غیر معمولی فائنٹ کی تھی۔ لگ بھگ دس منٹ کے اس مقابلے میں، میں چونک کو جھجھکی نہیں سکا تھا۔ اس دوران میں مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں محض ہوا سے خبردار زار رہا تھا۔ چونک ایک مرتبہ بھی مجھ پر حملہ آور نہیں ہوا تھا اور میرے ہر حملے کے جواب میں وہ اس طرح صاف فک نکلتا جیسے ہم حقیقی نہیں بلکہ شوافٹ کر رہے ہوں۔ فلم کے سیٹ پر مختلف اداکار مارشل آرٹس کا جو بھی مظاہرہ کرتے ہیں، وہ ”شوافٹ“ کہلاتی ہے۔ شوافٹ (SHOW FIGHT) کی فلم بندی کے لیے بھی پہلے باقاعدہ ریہرسل کرنا پڑتی ہے مگر میں محسوس کر رہا تھا، چونک نے جو فن پیش کیا تھا وہ کسی شوافٹر کے بس کی بات نہیں تھی۔ جن سیان کے مطابق، اس نے ایک معمول کا رول پلے کیا تھا۔ مارشل آرٹس کی کس فائنٹ کے حوالے سے عامل اور معمول کا استعمال میرے لیے ایک نیا موضوع تھا لہذا میں پوری دلچسپی اور توجہ سے جن سیان کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”گوانگ چی ایک مستند اور ماہر اوریکل ہے“ جن سیان سلسلہ معلومات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”اوریکل ہائی لا با میں اسے ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ تم جب اپنے مشن سے کامیاب لوٹ آؤ گے تو میں تمہیں گوانگ چی سے ملواؤں گا۔ تمہیں اس عامل کا ملخص سے بہت کچھ کہنا ہے۔ کسی زمانے میں اوریکل اپنے فن کے مظاہرے کے لیے بڑے بڑے چیدہ طریقہ کار اختیار کرتے تھے اور ان کا یہ عمل محض مستقبل بینی تک ہی محدود تھا۔ اوریکل یعنی ہائی لا با ایک مخصوص قسم کا دوزی لباس پہن کر مختلف قسم کے جنگی آلات سے مسلح ہو جاتا۔

ان آلات اور لباس کا وزن بعض اوقات اتنی پاؤنڈز تک جا پہنچتا اوریکل ایک مخصوص ہکل بجا کر تقریب کا آغاز کرتا۔ تماشاخیوں کے سامنے وہ اپنے معمول یعنی میڈیم کی کوئی عمل سے گزار کر گہری نیند سلا دیتا، اس کے بعد وہ میڈیم کے سر پر ایک آہنی ہیلمٹ پہنا دیتا جس کے باعث میڈیم کا چہرہ ہر قسم کے جذبات اور اثرات سے عاری ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہو۔ ہیلمٹ پہننے کے دس منٹ بعد میڈیم اٹھ کر بیٹھ جاتا تاہم وہ اپنی آنکھوں کو بند ہی رکھتا تھا۔ اس کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا جیسے وہ ڈرائس کی سی کیفیت میں بیٹھا ہو۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اوریکل اپنے میڈیم سے مستقبل کے بارے میں جو بھی سوال کرتا، میڈیم اس کا جواب ضرور دیتا۔ جبرت انگیز طور پر، بعد میں

میڈیم کے یہ تمام جواب درست ثابت ہوتے۔ یہ الگ بات کہ ان میں سے بعض جوابات بہت مبہم، غیر واضح اور عام فہم نہیں ہوتے، بہر حال ہائی لاما اور نیکل انہیں بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ جاتا۔ جدید سائنس اس بات کو مانتی ہے کہ مستقبل میں جھانکنا ممکن ہے لیکن اس ذیل میں وہ "اور نیکل" کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ یہ ایک "فن" ہے یا بعض "انمازہ" مگر ہم تبت والے ہائی لاما کے اس عملی مظاہرے کو سونی صد ایک پراسرار روحانی عمل سمجھتے ہیں۔ تم اپنی آسانی کے لیے یوں سمجھ لو کہ اور نیکل ہائی لاما ایک ساحر، ایک چٹانٹ ہوتا ہے جو اپنے میڈیم کو مکمل توہم کے ذریعے مگر مگر نیند سلا کر اس کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں کو ٹوٹاتا ہے اور وہاں پر موجود مخصوص خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتا ہے جس کے بعد میڈیم مستقبل کے بارے میں جوابات دینے کا اہل ہو جاتا ہے۔ ایک ہائی لاما اور نیکل کی مدد سے میڈیم انسانی حواس خمسہ کے دائرہ کار سے باہر نکل کر مستقبل کا مشاہدہ کرتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رک پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ درحقیقت فطرت اور مابعد فطرت کا رابطہ ہے۔ انسان کا شعور، کائناتی شعور سے نکلک ہو جاتا ہے۔ انسان کے اندر باقی ظاہرہ حیات کے علاوہ بہت سی باطنی حسیں بھی موجود ہوتی ہیں جن میں سے چھٹی حس کا تجربہ بعض لوگوں کو کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ حس کسی طرح خود متحرک ہو جائے یا اپنی کوشش آپ کے تحت اسے متحرک کر لیا جائے تو انسان کے اندر مستقبل بنی کی صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے۔ چھٹی حس اور دیگر باطنی حیات کی بیداری کے بعد انسان خلاف فطرت کام کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی جادوگری نہیں بلکہ نیم، دماغ اور روح کے مابین توازن قائم ہونے کا نام ہے۔ اگر یہ تینوں کی طرح ہم آہنگ ہو جائیں تو انسان کو کائنات کے بہت سے "معاملات" پر تصرف اور قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ کہیں تم میری ان باتوں سے یوریت تو محسوس نہیں کر رہے؟"

جن سیان نے سوالیہ نبطے پر اپنے بیان کو رد کیا تو میں نے جلدی سے نگی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، ہرگز نہیں!"

وہ بتانے لگا "ہائی لاما گوانگ چی نے اور نیکل کے عمل کو جدت اور آسانی دی ہے۔ یہ اپنے عمل کے ذریعے کسی نوجوان موک (میڈیم) کو تونگی نیند میں پہنچا کر اس کے ذہن میں جو بھی ہدایات نقش کرتا ہے بیدار ہونے کے بعد

میڈیم ان ہدایات کو نہ صرف یاد رکھتا ہے بلکہ احکام کی قیام بھی کرتا ہے۔"

"یہ تو سیدھا سیدھا چٹانٹم ہوا!" میں نے غصے سے بولے لیجے میں کہا۔

وہ بولا "ایک حد تک تم کہہ سکتے ہو لیکن اور نیکل کسی چٹانٹ سے بہت آگے کی چیز ہے۔" وہ لمحے بھر کو خاموش رہنے کے بعد دوبارہ بولا۔

"ایک چٹانٹ اپنے شعور کو مخصوص چیزوں کے ذریعے معمول یعنی میڈیم کے شعور سے جوڑ کر اس کی میموری تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور وہاں اپنی ہدایات کو نقش کر کے واپس آ جاتا ہے۔ چٹانٹ کا یہ رابطہ میڈیم کی شارٹ ٹرم میموری تک محدود ہوتا ہے اسی لیے میڈیم، چٹانٹ کی ہدایات کو ایک خاص عرصے تک ہی یاد رکھ پاتا ہے مگر ایک اور نیکل ہائی لاما اپنے میڈیم کے باطنی حواس کے علاوہ لاگ ٹرم اور شارٹ ٹرم میموری کو بھی بے آسانی کنٹرول کر لیتا ہے۔ تم جب اپنے مشن سے واپس لوٹ کر یہاں قیام کر دے تو جتنی پراسرار علوم کے وہ وہ مظاہر دیکھو گے کہ عقل دنگ رہ جائے گی تمہاری۔ چونکہ والی فائنٹ تو اور نیکل کا ایک معمولی سا کارنامہ ہے۔۔۔۔۔"

"گویا میں نے ایک مارشل آرٹس سے نہیں بلکہ کسی روہٹ سے مقابلہ کیا ہے؟" میرے لیجے میں خفیف سی گئی در آئی۔

وہ بڑے اطمینان سے بولا "تم چونگ کو کسی روہٹ سے تشبیہ نہیں دے سکتے۔ یہ درست ہے کہ چونگ نے اپنے اور نیکل کی ہدایات پر عمل کیا ہے لیکن تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ چونگ بہ ذات خود بھی ایک اعلیٰ درجے کا فائزر ہے۔ تم پچھلے ہی دنوں سے اس کی فائش دیکھتے آ رہے ہو۔ وہ تمام تر اور نیکل فائش تھیں!"

میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ واقعی، میں نے چونگ کو مختلف فائزر سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ایک منفرد اور ناقابل شکست فائزر تھا۔ میں نے ابھی تک اسے کسی مارشل آرٹس سے ذرا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ نی الحال میں جن سیان کی اس بات پر یقین کرنے کے لیے مجبور تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ چونگ نے بالکل اور نیکل فائش کی تھیں۔ صرف میرے معاملے میں وہ ہائی لاما گوانگ چی کے لیے ایک میڈیم بن گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اور نیکل کے مظاہرے نے مجھے حیران کیا تھا۔ یہ انتہائی قابل غور مظاہرہ تھا!

"میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے، جن سیان اٹھ کر کھڑا ہو گیا "رات کا کھانا شروع ہونے والا ہے۔"

جو کھا گنگ نیپل میں رات کا کھانا جلدی کھالیا جاتا تھا۔ میں اور لیان جن سیان کی تقلید میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر اس کی معیت میں چلتے ہوئے جنازیم والے ہال سے باہر آئے اور مختلف راہ داریوں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔

اس کمرے کے بارے میں، میں پہلے ہی خاصی تفصیل چاہ کر چکا ہوں۔ درحقیقت وہ لیوٹر اس کمرہ ہارے لیے کسی قد خانے کی حیثیت کا حامل تھا جس میں جن سیان ایک شاطر فرمان کے طور پر ہمارے ساتھ ہی قیام پذیر تھا۔ چیف لاما چنگ فورن پوٹی نے اسے خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں کہ وہ مجھے اور لیان کو کونہائی میسر نہ آنے دے اور جن سیان ابھی تک اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب تھا۔ چنانہیں، وہ اللہ کا بندہ کس وقت اپنی نیند پوری کرتا تھا۔ میں نے رات کے کسی بھی پہر جب اسے چپک کرنے کی کوشش کی تو وہ چاق و چوبند اور ہوشیار ہی ملا، یہ الگ بات کہ وہ آنکھیں بند کیے ہوتا ہوا پڑا کھائی دیتا لیکن میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا وہ محسوس نے کی ادا کا کر رہا ہوتا۔ اس کا انداز اسکا دینے والا ہوتا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس کی "نیند" کے دوران میں لیان کے پاس کچھ جاؤں یا اسے اپنے پاس کچھ لوں مگر میں عملاً یہ بہت نہ کر سکا۔ اس سوچ کے ساتھ میں نے جب بھی جن سیان کی جانب دیکھا تو مجھے یہی محسوس ہوا کہ ادھر میں نے کوئی "حرکت" کی، ادھر وہ آنکھ کھول دے گا!

دن پوٹی چنگ فونے مجھے لیان سے دور رکھنے کے لیے براہ راست مداخلت اختیار کیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو لیان کو میری نگاہ سے دور کسی دوسرے کمرے میں بھی ٹھہرا سکتا تھا لیکن یہ تو "صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" والی تریا دینے صورت حال تھی۔ شاید چیف لاما میرے ضبط کا امتحان لے رہا تھا!

میں نے دل میں سوچا، کوئی بات نہیں۔ تبت میں دس روزہ قیام کی مدت تو پوری ہوئی آئندہ روز میں اسرائیل روانہ ہونے والا تھا اور ظاہر ہے، لیان بھی میرے ساتھ ہی ہوتی، پھر چنگ فوکس طرح ہمارے ملاپ پر پہرے بٹھاتا، یہ سمجھ گیا کہ میں آ رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، جن سیان بھی ظالم سماج کی صورت ہمارے ساتھ ہی تبت سے اسرائیل پہنچتا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ کسی نہ کسی طور میں اس فرمان کی آنکھوں میں ضرور دھول جھونک کر ہوں گا۔

ہم رات کے کھانے سے فارغ ہو گئے تو میں نے جن سیان سے پوچھا "تم نے تبت کے لازا اور ہائی لازا کی بہت کھانیاں سنا دیں لیکن ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

میرے اس سوال میں ٹیکھا پن تھا، وہ مگر مہرے سنجیدگی سے بولا "تم میرے بارے میں کیا جانتا چاہتے ہو؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے انسا سوال کر ڈالا تو میں نے بڑے واضح الفاظ میں استفسار کیا "یہاں جو کھا گنگ نیپل میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟"

"میں محترم دن پوٹی کا ایک معمولی سا خدمت گار ہوں۔" وہ سادگی سے بولا "چنگ فو جو بھی حکم دیں، میں بجا لاتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم کس نفسی سے کام لے رہے ہو!"

وہ ابھمن زدہ نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "میں سمجھ نہیں، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس وقت ہمارے درمیان پورا انگش میں گنگٹو ہوری تھی۔ جن سیان بڑی روانی سے انگش بول رہے تھے لیکن میں نے اپنا مانی انصیر واضح کرنے کے لیے انتہائی سلیس انگش استعمال کی تھی اور میں نے بھی جانتا تھا، وہ میری بات کو بد خوئی سمجھ گیا تھا۔ ابھمن پوٹی اس کا استفسار ایک چالاک کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ بہر حال، میں نے اس کی فرمائش پر وضاحت کر دی۔

"میں نے پچھلے دس دنوں میں بڑی اچھی طرح یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ چنگ فورن پوٹی تم پر بے پناہ اعتماد کرتا ہے۔ جو کھا گنگ کے دیگر مونس اور لازا ابھی تمہارے اشاروں کی تعمیل کرتے ہیں۔ تم یقیناً کوئی توپ قسم کی چیز ہو۔ چنگ فوکس معمولی آدمی پر تو اندھا اعتماد نہیں کر سکتا؟"

"محترم دن پوٹی اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو ان کی مہربانی ہے۔"

وہ کھلے کو تیار نظر نہ آیا تو میں نے اپنے انداز سے کی روشنی میں براہ راست کہہ دیا "جن سیان! میں محسوس کر سکتا ہوں، جو کھا گنگ نیپل میں تم چنگ فوکے دست راست ہو۔۔۔۔۔"

یعنی نائب چیف لاما! اس کی آنکھوں میں ایک ساہی ساہلرا گیا۔ میں نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا "اور مستقبل میں جھانکتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو کھا گنگ نیپل کا آئندہ روح رواں چیف لاما تم ہی ہو گے؟ جواب دینے کے بجائے وہ نگاہ چکر کر کے باہر راہ داری میں دیکھنے لگا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے راہ داری میں کسی کی موجودی کو

محسوس کر لیا ہو۔ لامحالہ میں نے بھی اس کی نگاہ کے تعاقب میں، راہ داری میں نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں یہی سمجھا، جن سیان میرے سوال کا جواب دینے سے کتر ہا بہ لہذا میں نے قدرے پراسرار لہجے میں کہا۔

”جن سیان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

اسی لمحے راہ داری میں ایک عمر رسیدہ جتنی نمودار ہوا۔ جن سیان کے چہرے کے تاثرات نے بتا دیا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے اسی بوڑھے کی آمد سے ”آگاہ“ ہوا تھا۔ وہ پوری طرح بوڑھے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”آؤ آؤ فنگ چو..... اندر آ جاؤ!“

بوڑھا فنگ چو (Fang Zhou) ایک بریف کیس نما بیگ تھامے کمرے میں داخل ہوا۔ جن سیان نے اس کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”وہ جان! فنگ چو ایک عمدہ فوٹو گرافر ہے۔ تمہاری مدد اور تعاون سے یہ یہاں ایک خاص کام کرنے آیا ہے۔ کیا تم اس کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہو؟“

جتنی افراد کی عمروں کا شمار کرتے ہوئے مجھ سے ہمیشہ غلطی ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنے اندازے سے کچھ بڑھا کر جواب دیا ”میرے خیال میں فنگ چو اس وقت اسی کے پچیس میں ہوگا!“

”بالکل غلط“ جن سیان نے حسب توقع میرے اندازے کی ایسی کم نسی کر تے ہوئے کہا ”فنگ چو اس وقت اپنی زندگی کے ایک سو چالیس دیں سال میں ہے۔“

میں نہیں جانتا، دنیا میں طویل ترین عمر کا حامل کون شخص گزرا ہے تاہم مجھے یقین تھا کہ ایسے کسی ریکارڈ ہولڈر شخص کا تعلق تبت ہی سے ہونا چاہیے۔ ویسے میرا یہ یقین اس حوالے سے غلط ہو سکتا تھا کہ تبت والوں کو شاید اس مقابلے میں شریک نہ کیا جاتا ہو۔ تبت، دنیا کے ہائی ٹیکوں سے کٹا ہوا ایک خطراتر ہے۔ اس نوعیت کے مقابلوں کے لیے انہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال، جن سیان کا انکشاف دلچسپ اور جرت انگیز تھا۔ ایک سو چالیس سالہ فنگ چو میری طرف دیکھتے ہوئے مسلسل زرب مسکرا رہا تھا۔ جن سیان نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کا فوٹو گرافر ہے اور ایک ضروری کام سے وہاں آیا ہے۔

ایک ایسا کام جو میرے تعاون اور مدد سے ہونے والا تھا۔ یقیناً طور پر فوٹو گرائی کے لیے ہی آیا ہوگا۔

میں نے جن سیان سے پوچھ لیا ”میں کسی کام کے سلسلے میں فنگ چو سے کیا تعاون کر سکتا ہوں؟“

جواب دینے کے بجائے اس نے معنی خیز نظر سے غریب فوٹو گرافر فنگ چو کی طرف دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بیگ کو کھولنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ بیگ میں سے کیمرا برآمد کرے گا اور دوسرا دوسرا ہماری تصاویر اتارنے لگے گا مگر اس مرتبہ بھی میری توقع پوری نہ ہو سکی!

فنگ چو نے بیگ کے اندر سے ایک کلپ بورڈ نکالا جس پر سفید رنگ کا کارڈ لگے ہوئے تھے۔ وہ لگ بھگ دس کارڈز ہوں گے جو کلپ کی گرفت میں جھکی سے دبے ہوئے تھے۔ اس کلپ بورڈ کے علاوہ فنگ چو نے بیگ میں سے ایک چین باکس بھی برآمد کیا اور اس کے اندر سے لمبے نکلے والی ایک موٹی پینسل نکال کر جن سیان کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ جن سیان کچھ بولتا، میں نے اس سے پوچھ لیا ”تم نے تو بتایا ہے کہ فنگ چو ایک فوٹو گرافر.....!“

”میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ”فنگ چو واقعی غضب کا فوٹو گرافر ہے لیکن یہ کیمرا استعمال نہیں کرتا بلکہ کھلی تصاویر بناتا ہے۔“

”پھر تو یہ ایک مصور ہونا!“ میں نے لہجہ دیا۔

”تم کچھ بھی کہہ لو“ وہ قطعیت سے بولا ”ہم یہاں تبت میں تصویریں بنانے والے شخص کو فوٹو گرافر ہی کہتے ہیں۔“

میں نے پوچھا ”میں اس سلسلے میں فنگ چو کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”یہ تمہارے تعاون سے تمہاری اس ساتھی کی فلمی تصویر تیار کرے گا جس کے حصول کے لیے تم ایک مشن سر کرنے والے ہو۔ تم اپنے ساتھی کے خال و خط کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

میں نے گہری نظر سے فنگ چو کو دیکھا وہ بڑی توجہ اور اہتمام سے جن سیان کو سوالیہ نظر سے نک رہا تھا۔ ابھی تک میرے اور فنگ چو کے درمیان ایک جملے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ انگریزی سے ناخدا تھا۔ جن سیان نے اس کے ساتھ جتنی زبان میں کوئی کھرب پھسکی تھی جو میرے لیے نہ بڑبکی۔ جن سیان نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”وہ جان! تم اپنی ساتھی کے حلیے کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔ فنگ چو اس کی فلمی تصویر بنائے گا۔“

”کیا یہ میری بات سمجھ جائے گا؟“ میں نے چیک کرنے کی خاطر پوچھ لیا۔

”میں اسے جتنی میں سمجھا دوں گا“ اس نے کہا ”تم انگلش میں مجھے بتا دو۔“

میں نے ساحل کے نقش و نگار کو بیان کرتا شروع کر دیا ”ہر جتنی بڑی بڑی آنکھیں، صورت سے جھلکتی معصومیت، خد خال خالص جتنی، گوری جتنی، رعیت گلابی، ناک ستواں، گردن عزوجلی، ہونٹ گداز، شوخ، چنچل.....“

پھر اس حلیے میں دیگر تفصیل بھی شامل ہوئی چلی گئی ”عمر لگ بھگ اسی سال، قد دراز کم دیش پانچ فٹ دس انچ وغیرہ وغیرہ.....“

جن سیان نے اس تفصیل کو جتنی میں بدل کر فنگ چو کے گوش گزار کر دیا۔

فنگ چو اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے پوری توجہ سے سنتا رہا۔ میں جتنی زبان سے آشنا نہیں تھا تاہم یہ بات میں نے فوراً محسوس کر لی کہ جن سیان نے اس جیگر کو دہرایا بھی تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی فنگ چو گردن جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں ٹی بان اور جن سیان خاموش بیٹھے فنگ چو کی کارگزاری دیکھتے رہے۔ ڈرائنگ شیٹ پر پینسل کھینچنے کی مخصوص آواز دس منٹ تک ابھرتی رہی، پھر فنگ چو نے وہ کلپ بورڈ جن سیان کی طرف بڑھا دیا۔

جن سیان نے اسے شابکار پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور کلپ بورڈ مجھے تھما دیا۔ میں نے پھر اس فلمی تصویر کا جائزہ لیا جو فنگ چو نے بنائی تھی۔ وہ وہ بے ہوشاں کا خاکہ تو نہیں تھا تاہم وہ بڑی حد تک میری جان تو تناس سے مماثلت رکھتا تھا۔

میں نے نظر اٹھا کر جن سیان کی جانب دیکھا ”اس نے پوچھا“ ”کیسے کہتے ہو؟“

”یہ اچھا کالی حد تک میری ساتھی سے مشابہ ہے!“

”تم اسے پردہ سمجھو“ اس نے کہا۔

”پھر؟“ میں نے کہا۔

جن سیان نے جتنی زبان میں فنگ چو سے کچھ کہا فنگ چو نے باکس میں سے ایک عام سی پینسل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی مقامی زبان میں کچھ کہا بھی۔ جن سیان مذکورہ پینسل کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”فنگ چو کہہ رہا ہے، یہ اس کے جہاں جہاں سے تمہاری ساتھی کی صورت سے مکمل نہیں لکھتا ان مقامات کی نشان دہی کر دو۔ فنگ چو تمہاری مرضی کے مطابق اس فلمی تصویر کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے

ہو نا؟“

میں اس کی بات کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا لہذا یہ ”کام“ کر دیا۔

جن سیان نے میری ہدایات کو جتنی زبان میں فنگ چو تک پہنچایا تو وہ ایک مرتبہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ٹھیک چدرہ منٹ کے بعد وہ اچھا ایسا ہو گیا کہ ساحل کی صورت سے نوے فی صد مماثلت رکھتا تھا۔ میں نے فلمی تصویر کو دیکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

”یہ خاکہ میری ساتھی سے نوے فی صد مکمل لکھتا ہے۔“

”بس، ہمیں اتنا ہی چاہیے“ جن سیان نے جتنی لہجے میں کہا اور فنگ چو کی جانب متوجہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک ان دونوں کے درمیان جتنی زبان میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا پھر فنگ چو اپنا ”سامان“ سیٹ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے جن سیان کو دیکھا اور پوچھا ”یہ تصویر کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے؟“ فنگ چو اپنا شابکار وہ فلمی تصویر جن سیان کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ جن سیان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں نے یہ کام محترم رن پوشی کی ہدایت کے مطابق کر لیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے“ میں نے قدرے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں آخر اس فلمی تصویر کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”میں صرف محترم چنگ فو کے احکام کی تعمیل کرتا ہوں“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”ان سے سوال کرنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔“

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ صورت حال سے بہ خوبی باخبر ہے لیکن دانستہ میرے سوال کا جواب نہیں دیتا چاہتا۔ میں نے بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کیا اور بڑی سادگی سے کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے، کل چنگ فو سے میری ملاقات تو ہونا ہی ہے۔ یہ سوال میں اسی سے کروں گا“ جن سیان نے میرے اظہار خیال پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔

جن سیان کے روپے نے مجھے ڈاکٹر سوگ ریلوے کی یاد دلادی۔ اسے بھی جو بات بتانا نہیں ہوئی تھی اس سلسلے میں ایسا ہی مبہم سامنے والا رویہ ظاہر کرتا تھا۔ میں نے اس رویے کا جواب یہ نکالا کہ کرید سے اجتناب برتنے لگا۔ یہی فارمولا میں نے یہاں جن سیان پر بھی آزمایا اور تصویر کے معاملے

میں چپ سادہ لی۔

میں سونے کے لیے اپنے مخصوص بستر پر دراز ہوا تو ذہن میں مختلف قسم کی سوچوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ تبت واقعی سر زمین حیرت ثابت ہو رہا تھا۔ آپوں آپ میرا دھیان نیچے سا تک فو کی طرف چلا گیا۔ سٹیل (امریکا) میں محترم سا کنگ فونے جو بیٹن گولی کی بھی وہ یہاں تبت میں سن دین پوری بھی ہوگی۔ نور بٹنگا جیسے کے نزدیک دریائے ”کائے چو“ کے کنارے پر واقع اس دمنزل عمارت میں چار سال سا کنگ فو کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ جن سیان کے مطابق اسرائیل سے واپسی پر مجھے اسی دمنزل عمارت میں رہائش اختیار کرنا تھی..... اور وہاں پر مجھے جن علوم فنون کی تربیت دینا تھی۔ وہ سب کے سب انتہائی اہم تھے۔ اس سلسلے میں خفا سا کنگ فو میرا پہلا اسٹوڈنٹ ہوتا۔ پتا نہیں، وہ چھوٹا سا بچہ اتنی بڑی عمارت میں کس کے ساتھ رہتا تھا؟

اس سرزمین پر ایک سے بڑھ کر ایک حیرت میرے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ اور نیگل گواک جی اور اس کے میڈیم چوئک والا واقعہ بھی ذہن کو گھما رہا تھا۔ پھر لو مار آئل کی کارکردگی بھی حیرت انگیز تھی۔ جن سیان لگ بھگ دس دن سے میرے سر میں ایک کرکٹائی ٹیل کی مائل کر رہا تھا۔ میں نے جب تبت کی زمین پر قدم رکھا تو میرا سر منڈا ہوا تھا اور اب جادو کی ٹیل کے سیکنج نے وہاں اسے ہال آگادے تھے کہ میں ان میں بہ آسانی کھسک سکتا تھا۔ عام حالات میں اس سائز کے ہال کم از کم ڈیڑھ ماہ میں نکلتے ہیں۔ اس حوالے سے ”لو مار آئل“ واقعی طلسمانی خواص کا حامل تھا!

میں نہیں جانتا تھا، آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ جو بھی ہوتا، یقیناً حیرت انگیز اور چونکا دینے والا ہی ہوتا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا کافی دیر تک اپنے حالات پر غور کرتا رہا۔ اس دوران میں لی یان اور جن سیان سو گئے۔ لی یان کے بارے میں تو مجھے یقین تھا، وہ وادی ینڈ میں اتر چکی ہے لیکن جن سیان کا معاملہ مشکوک تھا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس بندہ خدا کو چیک کرنا چاہیے۔

جن سیان کو میں نے ”بندہ خدا“ اس لیے کہا ہے کہ میرے عقیدے کے مطابق تمام انسان خدا ہی کی مخلوق ہیں۔ اگر اپنے تئیں جن سیان ”بندہ خدا“ تھا تو میں کیا کروں! شرارت کا خیال آتے ہی میں نے جن سیان کی جانب کروٹ لی اور آنکھیں کھول کر بڑی گہری نظر سے اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ میرے اس عمل نے جلد ہی رنگ دکھایا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے آنکھیں بند

ہونے کے باوجود اس نے میری ”توجہ“ کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق آنکھیں بند کیے جاگ رہا تھا، گویا میری کڑی نگرانی جاری تھی۔

میں نے جن سیان کو مزید آزمانے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اس نے اپنی کہنی پر کھجائے ہوئے بڑے فطری انداز میں کروٹ بدل دی۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو یہی سمجھتا کہ جن سیان نے گہری ینڈ میں کروٹ بدلی تھی لیکن میں ہرگز ایسا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں گزشتہ کئی روز سے اس کے انداز و اطوار کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا جیسا یہ ظاہر دکھائی دیتا تھا۔

میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور بائیں اس طرف لنگا دیں جدھر ایک بیڈ پر لی یان کے خیر سورہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنے بیڈ سے اتر کر لی یان کے بیڈ پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے یہ حرکت جس خاص مقصد کے تحت کی تھی، اگلے ہی لمحے وہ مقصد پورا ہو گیا۔

جن سیان ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر میری جانب رخ پھیرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں مستفسر ہوا ”وجدان! کوئی پر اہم ہے؟“

میں نے اس کی چال اسی پر لوٹا دی اور ایک بازو کی کہنی کو بڑے نادل انداز میں کھجاتے ہوئے کہا ”شاید کسی ٹھمرنے کا ٹا ہے، سوتے سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے معنی خیز نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ کھسیان سا ہو گیا پھر اپنی جھینپ کو مٹاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بھی ایسی شے نے کاٹ لیا تھا، بہر حال، اس کمرے میں تمہاری آخری رات ہے۔ جب تم اسرائیل سے کامیاب لوگوں کو تمہیں دریائے کائے چو والی رہائش گاہ پر منتھرایا جائے گا۔ تمہاری آمد سے پہلے میں وہاں ایسے انتظامات کروا دوں گا کہ تمہاری جھینپ کی شکل تک نہیں دیکھیں گی۔ میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں چوٹ کی۔

”جن سیان! تم واقعی میرا بہت خیال رکھتے ہوئے ہو!“ وہ نگاہ جراتے ہوئے بولا ”سوتے کی کوشش کرو۔ کل تمہیں محترم چنگ فو سے ایک اہم ملاقات کرنی ہے۔ اس موقع کے لیے تمہارے دماغ کو ٹھکن سے پاک اور تروتازہ ہونا چاہیے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ میری جانب رخ کر کے لیٹ گیا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں چند لمحات تک اس گانٹھ کے پورے کو دیکھتا رہا پھر اس کی ہدایت کے مطابق، اپنے دماغ کو فریئر کرنے کے لیے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

ہم اسی چھوٹے سے کمرے میں ایک مرتبہ چکر پڑے رو بیٹھے تھے۔ یہ چنگ فورن پوٹی سے میری دوسری ملاقات تھی۔ دس روز قبل، پہلی ملاقات میں ہماری درمیان مختلف موضوعات پر تفصیلی بات ہوئی تھی۔ چنگ فو کے مطابق، ہماری صرف تین ملاقاتیں تھیں۔ ایک ہوئی تھی، دوسری ہوئی تھی اور تیسری اس وقت ہوئی جب میں ساحل کو رہی مونسے ہائمن کے چنگل سے چھڑا کر بہ خیر و خوبی اسرائیل سے تبت پہنچ جاتا۔

میں حسب دستور سفید چٹائی پر بیٹھا تھا اور چنگ فو نیلی چٹائی پر کتول آسن میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے آج بھی میروان روپ (سرخی مائل کمرے سمورے رنگ کا گادون) زیب تن کر رکھا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تار نہیں کہ میں چنگ فورن پوٹی کی شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس کی ذات بھی سرزمین تبت کے مانند اسرار اور تحیر کی کئی پرتوں میں لپی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا، وہ اپنے سامنے موجود شخص کے آرا پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے چنگ فورن پوٹی نے اپنے پاس بلایا تھا۔ ہم چند لمحات تک ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے پھر اس خاموشی کو چنگ فو کی مخصوص آواز نے توڑ دیا۔

”وجدان! تبت تمہیں کیسا لگا؟“ اس نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

”اچھا..... بہت اچھا!“ میں نے جواب دیا۔ وہ اپنے مخصوص نرم ذہنی گھیر انداز میں بولا ”تم نے دس دن تک تبت کی خوب سیر کی ہے۔ اگرچہ یہ مدت میرے خیال میں بہت کم ہے۔ تبت کے اسرار و رموز کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے لیکن پھر بھی مجھے امید ہے، جن سیان نے تمہیں بہت کچھ دکھا دیا ہوگا؟“

میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا ”جی..... جی ہاں۔“

”اور نیگل کا تجربہ تمہیں کیسا محسوس ہوا؟“

”بہت ہی حیران کر دینے والا۔“

تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جب تم اپنی سامی کو آزاد کر دینے کے بعد واپس لوٹو گے تو تمہیں یہ فیصلہ بھی سکھایا جائے گا۔ میرے خیال میں، تمہیں اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ بنیاد تمہارے اندر موجود ہے۔ تم جی اور تھوڑا آئی کی ملا جیتوں سے مالا مال ہو۔ تھوڑی سی پریکٹس کے بعد تم اور نیگل سے مہارت حاصل کر لو گے۔“

میں نے اس سے سا کنگ فو کے بارے میں پوچھا۔ ساتھ ہی محترم سا کنگ فو کی پیش گوئی کا تذکرہ بھی کر دیا۔ وہ بڑے لب مسکراتا رہا۔ جب میں نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس نے کہا۔

”سٹیل والے سا کنگ فو نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ تم نے جس چار سالہ بچے کو دیکھا ہے، وہ دراصل سٹیل والے سا کنگ فو کا اگلا جسم ہے۔ جب ہماری تیسری ملاقات ہوگی تو میں تمہیں جنہوں کے اس چکر کے بارے میں تفصیل بتاؤں گا۔“

چنگ فو نے ”دوسرا جنم“ کے بجائے ”اگلا جنم“ کے الفاظ استعمال کیے تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہا کہ سٹیل والا سا کنگ فو مجھ سے اپنے پہلے جنم میں نہیں ملتا تھا۔ ہو سکتا ہے، بدھ ازم کے مطابق وہ اس کا دوسرا تیسرا جنم ہو!

”میں نے کہا ہے نا، تم جنہوں کے اس سلسلے میں اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔“ چنگ فو نے نونٹی ہوئی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ اس وقت میری سوچ بڑھ رہا تھا۔ میں نے چوئک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مزید بولا۔

”تم اس وقت ایک اہم مشن پر روانہ ہو رہے ہو اس لیے ادھر ادھر کی باتوں کو ذہن سے نکال کر صرف اور صرف اپنے مقصد پر دھیان دو۔ تمہاری واپسی پر جب ہماری تیسری ملاقات ہوگی تو میں تمہاری ساری الجھنوں کو بکھاد دوں گا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”محترم چنگ فو! کیا آپ کو یقین ہے کہ میں اپنے مقصد کو حاصل کر کے کامیاب لوں گا؟“

یہ سوال خواہ مخواہ ہی میری زبان سے بھسل گیا تھا۔ شاید اس کی کوئی لا شعوری وجہ ہو۔ میں نے اب تک ساحل کے حصول کے لیے جو بھی کوششیں کیں ان میں عین وقت پر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ کوئی نہ کوئی ایسی رکاوٹ اور خرابی سامنے آجاتی کہ میں ہاتھ متارہ جاتا۔ ایک لمحے کو محسوس ہوتا کہ میں ہاتھ بڑھا کر ساحل کو پکڑنے ہی والا ہوں لیکن اگلے ہی لمحے وہ میری پہنچ سے کوسوں دور ہو جاتی تھی۔ اس

مسلسل نارسانی نے شاید میرے اندر خدشات اور اندیشوں کا ایک بلند دھارا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا! اسی سبب اس لمحے میری زبان سے باوجود بھروسہ سوال نکل گیا تھا۔ اس سوال سے بڑی واضح ہے۔ جتنی جھلکتی تھی۔

چنگ فون پر پٹی نے ایک لمحے کا توقف کر کے میری آنکھوں میں جھانک کر پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”ہاں، مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ کامیابی ضرور تمہارے قدم چومے گی لیکن۔“

”لیکن کیا؟“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑا تو میں نے تڑپ کر پوچھا۔

چنگ فون نے جواب دیا۔ ”یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اپنے دشمن سے منہ نہ ہوئے تمہیں دانتوں پسینہ آجائے گا۔ تمہارا دشمن اسرائیل کی سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت ہے۔ اس کے قبضہ قدرت سے کسی نے کو نکال کر لانا کوئی معمولی بات نہیں۔ تمہیں بہترین حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔“

میں نے پہلی ملاقات میں بھی اور اب بھی یہ محسوس کیا تھا کہ چنگ فون پر پٹی رلی موٹے بائسن کا نام زبان پر لانے سے پرہیز کر رہا تھا۔ وہ رلی کا ذکر کرتے ہوئے ”میرا دشمن“ جیسے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ چنانچہ اس انداز کے پیچھے اس کی کون سے مصلحت پوشیدہ تھی۔ بہر حال میں اس کا اشارہ بڑے واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔ اس کی رائے کے جواب میں، میں نے کہا۔

”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں میرے محترم! کہ رلی موٹے بائسن سے ہونے والا یہ آخری معرکہ بڑا کائنات دار ثابت ہوگا۔ اگر میری پشت پر آپ کی نیک خواہشات موجود رہیں تو میں اللہ العالیٰ کی ساری کو حاصل کر کے ہی رہوں گا!“ وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر دعائیہ انداز میں بولا۔ ”لا اڑ بدھا تمہارا مدد کرے گا!“

ہم دونوں اپنے اپنے عقائد سے مجبور تھے لہذا ہمارے بات کرنے کا انداز بھی جدا جدا تھا۔ میں خاموش رہا تو اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے“ آخری معرکہ“ کے الفاظ بالکل بجا استعمال کیے ہیں۔ وجدان! ایک کتنے کو ذہن میں رکھنا۔ یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ اگر تم نے اس موقع کو ضائع۔“

”میں اس موقع کا پاس کر دوں گا“ چنگ فون کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ میرے لہجے میں اضطراب کا عنصر نمایاں تھا۔ ”آپ فکر نہ کریں میں اس بار اپنے مقصد کو حاصل کر کے رہوں گا!“

میرے اہل انداز پر وہ اثبات میں سر ہلانے لگا پھر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”میں اس سلسلے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہوں اسی لیے پریقین ہوں کہ تم کامیاب واپس لوٹو گے۔“ میں ایک مطمئنانہ بھری گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چنگ فون نے کہا۔ ”تمہاری ساتھی فلپائی لڑکی کا کیا حال ہے؟“

اس کا اشارہ لی یان کی طرف تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”میری طرح وہ بھی ٹھیک ہی ہے۔۔۔۔۔!“

میرے اس جواب میں پہلے فزکی آمیزش تھی۔ وہ چند لمحات تک معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”وجدان! شاید تمہیں نہیں معلوم کہ پراسرار قوتوں کو حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ ترک لڈاز ہے۔ یہ ایک طرح سے اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ انسان جن اشیاء کے ذائقے سے واقف ہو، اس نے زندگی کی جن نعمتوں کا مزہ چکھ رکھا ہو، ان کی لذت سے آشنا ہو اگر ان میں سے انتہائی مرغوب چند اشیاء کو وہ ترک کر دے تو کچھ ہی عرصے کے بعد اس کے اندر پراسرار قوتیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ اگر انسان ثابت قدمی سے اپنے مقصد کے ساتھ چکا رہے تو بہت جلد اسے کامیاب حاصل ہو جاتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”بالکل سمجھ رہا ہوں میرے محترم!“ میں نے رسائی سے کہا۔ ”لیکن یہاں میں ایک حوالے سے آپ سے شفق نہیں ہوں۔“

”کس حوالے سے؟“ اس نے بڑے مہربان انداز میں پوچھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ترک لڈاز کو پراسرار قوتیں حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ بتایا ہے لیکن میرے خیال میں یہ بڑا کھن عمل ہے۔ انسان جن چیزوں کی لذت سے آشنا ہو، انہیں یک سر ترک کر دینا کوئی آسان کام نہیں!“

چنگ فون نے جو طریقہ بیان کیا تھا، وہ راہبانیت کی طرف لے جاتا تھا۔ عیسائیت ہندو ازم اور بدھ ازم میں بعض لوگ یہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن میں ذاتی طور پر اس کا حیا نہیں ہوں۔ میرے خیال میں یہ غیر فزکی طرز زندگی ہے جو ایسے نتائج کا حامل نہیں۔ اس سلسلے میں بڑی سستی خیر اور خیر آمیز کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ بہر حال، میں کوئی دینی مبلغ نہیں ہوں کہ اس پر سیر حاصل گفتگو کروں۔ میں نے بریگیڈیئر کے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

چنگ فون نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر تم نے یہ مشکل کام کر دکھایا ہے!“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بچھلے دس دن سے تم ایک آزمائش میں ڈال دیے گئے تھے۔ اس کڑے امتحان میں تم کامیاب ہو گئے ہو!“ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ اس کی بات کے جواب میں میں کوئی سوال اٹھاؤں گا لیکن جب میں خاموش رہا تو وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اگر کسی بھوکے شخص کے سامنے کھانا رکھ دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ ایک نوالہ بھی نہیں لے گا۔۔۔۔۔ اور وہ شخص واقعتاً ایسا کر بھی دکھائے تو یہ بڑے کمال کی بات ہوتی ہے۔ خطیف نفس اسی کو کہا جاتا ہے۔“

اس کا ہر اشارہ میری اور لی یان کی طرف تھا۔ میں اس کے اشاروں کو یہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن اس سے اچھے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لہذا کسی اختلافی موضوع کو اٹھانے کے بجائے میں براہ راست اس سے پوچھ بیٹھا۔

”محترم چنگ فون! اگر یہ کمال کی بات ہے تو پھر میں نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے لیکن اس کڑی آزمائش میں ڈالنے سے پہلے آپ نے اس کے جن سودمند نتائج کا ذکر کیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہے؟“

پہلی ملاقات میں چنگ فون نے مجھ پر واضح کیا تھا کہ اگر تھرو ڈاکی کے سلسلے میں مجھے دشواریوں کا سامنا ہے تو اس میں رلی موٹے بائسن کے عمل کی سب سے زیادہ خود میری لغزشوں کا ہاتھ ہے۔ اس حوالے سے اس نے کئی، راکیل اینڈرسن اور لی یان کا خصوصی ذکر بھی کیا تھا مگر ششہ دس دنوں میں لی یان کو مجھ سے دور رکھنے کا یہی مقصد تھا کہ میری باطنی آنکھ کے سامنے جو کالا سا آگیا ہے، وہ دھل کر صاف ہو جائے لیکن اس ذیل میں، میں نے کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں کیا تھا۔ اس دوران میں، میں نے جب بھی ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، مجھے بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

چنگ فون نے ثنوی نظریے سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا تم نے اس سلسلے میں ٹرائی کی؟“

”کئی بار“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر ہر دفعہ نتیجہ مفر کے برابر رہا۔“

”اوہ!“ وہ بہ دستور مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دراصل اس میں ایک ہار یک ساکت ہے۔ تم میری نگرانی میں ٹرائی کرو۔ لاڈ بدھا نے چاہا تو تم اپنی ساتھی کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے لیکن

فعل اس کے ایک نہایت ہی اہم بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ ایک طرح سے اس کے بولنے کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے والے انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”اس کا ایک ایک لفظ نپا تلا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ کوئی گیمبر پکڑ رہا ہو!“

”جنت کے اکثر لاماموت سے پہلے موت کا مزہ چکھنے کا تجربہ کرتے ہیں۔ وہ ایک خاص ٹیکنیک سے خود پر مصنوعی موت طاری کر لیتے ہیں۔ مصنوعی موت ان مسنون میں کہ وہ بعد میں دوبارہ زندگی سے ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ خود اختیاری مصنوعی موت ایک عظیم راز ہے جو صرف خفیہ لا باز تک ہی محدود ہے۔ تمہاری ترقی یافتہ دنیا کی جلد ہی میڈیکل سائنس اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتی۔ اگر ایسے کسی لاماکو مختلف میڈیکل ٹیسٹ سے گزرا آجائے تو ماہرین اس کی سموت کا سٹوکیٹ پہلی فرصت میں جاری کر دیں گے۔“

”کیا اس صورت حال میں لاماکو بائیس کیفیت میں پہنچ جاتے ہیں؟“ چنگ فون نے مجھ کو سانس لینے کے لیے توقف ہوا تو میں نے فوراً سوالیہ داغ دیا۔

اس نے بڑے اعتماد سے کئی میں گردن ہلائی اور رساں سے بولا۔ ”کومار لاماکا مصنوعی موت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے بتایا ہے نا۔ مصنوعی موت جیسے الفاظ کا استعمال میں محض تمہیں سمجھانے کی غرض سے کر رہا ہوں ورنہ تمہاری ترقی یافتہ دنیا کا ہر ٹیسٹ مصنوعی موت کا شکار لاماکو مردہ ثابت کر دے گا جب کہ کومامیں جانے والے شخص کو مردوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اسے رکھنے کے بجائے فوراً اٹھانے لگا دیا جاتا۔ کومامیں جانے والے شخص میں ایسا کچھ ضرور ہوتا ہے جو اس کے اندر زندگی کی امید دلاتا۔ کوئی زندگی والے اس امر کی نشان دہی ضرور کرتا ہے کہ وہ شخص ابھی زندہ ہے مگر خود پر مصنوعی موت طاری کرنے والا لاماکا معاملہ بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس پراسرار عمل سے گزرنے کے لیے لاماکا خاص پرسکون جگہ کا انتخاب کرتا ہے۔ کوئی بھی ایسا مقام جہاں اس کیفیت کے دوران میں کسی بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے لاماکا عام طور پر پہاڑی گیمیں، دریاؤں اور غار وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔“

وہ لمحے مجھ کو رکا، کھینچنے والی نظر سے میرے آ پار دیکھا اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک خاص



آپریشن کے لیے دروازہ نہیں کھولتا لیکن.....“  
 وہ جملہ مکمل چھوڑ کر دروازے کو متوقف ہوا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”لیکن اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک دماغ موجود ہے۔ کمپیوٹر ورلڈ میں ایسے شاطر بھی ہیں جو ہر قسم کا پاس ورڈ توڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی سسٹم لاک نہیں رہ سکتا۔ ایسے ماہرین کو کمپیوٹر کے میدان میں ”ہیکرز“ کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی ہیکر بہت خطرناک شخص ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا نقب زن ہوتا ہے تالے جس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ماسٹر کی کارول پلے کرتا ہے“  
 چنگ فو نے تھوڑا تو وقف کیا تو میں حیرت اور استحباب سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ ترقی یافتہ تحقیقاتی دنیا سے دور تبت میں بیٹھا ہوا وہ شخص جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا، اس نے مطالعے کا مکمل مسئلہ جاری رکھا ہوا تھا۔

”تمہاری دنیا کا تو یہی بچہ آج کل کمپیوٹر سے کھیل رہا ہے لہذا چھوٹی موٹی ٹیکنیک تو سمجھی کو آتی ہے“ وہ سادہ سے لہجے میں گویا ہوا ”میں یہاں پر صرف پاس ورڈ کو توڑنے کی اس سادہ سی ٹیکنیک کا ذکر کروں گا جس کا تعلق پاور پلائی سے ہے۔ اگر کسی سسٹم پر پاس ورڈ لگا ہوا ہے تو اس کی پاور پلائی کو منقطع کر کے دوبارہ بحال کرنے پر وہ پاس ورڈ ٹوٹ جائے گا۔ یہی عمل سیل فون پر بھی آزمایا جاسکتا ہے۔ اگر کسی سیل فون کا کی پیڈ یا ڈیسے مخصوص پاس ورڈ سے منحصر ہوتا ہے تو آپ اس سیل فون کی بیٹری کو نکال کر دوبارہ لگائیں تو پاس ورڈ ٹوٹ جائے گا۔ تمہارے مسئلے کا معاملہ بھی پاس ورڈ جیسا ہی ہے۔“

وہ ایک ایسے سنسنی خیز جملے پر متوقف ہوا کہ میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ میرا معاملہ ٹھوڑا سی کے راستے میں کھڑی ہونے والی رکاوٹ سے متعلق تھا اور چنگ فو کھمبا بھرا کر بڑی خوب صورتی سے مجھے کمپیوٹر پاس ورڈ تک لے آیا تھا۔ پتا نہیں، وہ آگے کیا انکشاف کرنے والا تھا۔ یہی ہے خبری میسجے اضطراب اور بے چینی کو بڑھاد رہا ہی تھی۔ وہ دوبارہ گویا ہوا تو میں پوری توجہ سے اسے سننے لگا۔

”دوہدان! میں نے بتایا تھا تمہاری تیسری آنکھ کے راستے میں جو رکاوٹ آ جاتی ہے اس کے دوا سہا ب ہیں۔ نمبر ایک، تمہارا بھکتا! نمبر دو تمہارے دشمن کا کوئی طعنائی عمل! جہاں تک تمہارے بھگنے کا تعلق ہے تو یہ معاملہ سراسر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ البتہ، تمہاری ہانسی آنکھ کی رسائی کے راستے میں، کسی دوسرے شخص کے عمل کے نتیجے میں کھڑی ہونے والی

ٹیکنیک کا ذکر کر رہا تھا جس کے استعمال کے بعد لازماً دل کی دھڑکن کو روک کر خود پر مصنوعی موت طاری کر لیتے ہیں۔ اس ٹیکنیک کا تعلق ”پرائیٹم“ یعنی سانس کی مخصوص مشق سے ہے۔ سانس کو روکنے کے دو طریقے مروج ہیں۔ نمبر ایک، جسم کے اندر سانس روکنا۔ جسم کے اندر یا تو پھیپھڑوں سے سانس روکی جاسکتی ہے اور یا پھر پیٹ میں۔ دوسرا مروج طریقہ جسم سے باہر سانس روکنے کا ہے۔ یہ قدرے مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ اگر کوئی شخص جسم سے باہر سانس روکنے پر قادر ہو جائے تو کچھ لاوہ خود پر مصنوعی موت طاری کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔ تمام تر سانس کو خارج کر کے اگر روک لیا جائے تو دل کی دھڑکن بند رہتی رہے گی۔ مہم ہوتے ہوتے ایک مرحلے پر بالکل ختم ہو جاتی ہے یوں سمجھو کہ دل اتنی سست رفتاری سے دھڑکتا ہے کہ انسان کی زندگی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ دل کو چپک کرنے والا ہر آلہ یہی بتائے گا کہ دل نے اپنا کام بند کر دیا ہے۔ سادہ الفاظ میں اس کیفیت کو ”ہارٹ فیئر“ یعنی موت کا نام دیا جائے گا۔“

”کیا مجھے خود پر مصنوعی موت طاری کرنے کے طریقے بھی سکھائے جائیں گے؟“ میں نے روادری میں پوچھ لیا۔  
 ”اگر تمہاری خواہش ہوگی تو ضرور سکھائے جائیں گے“ چنگ فو نے معتدل لہجے میں کہا ”دیے اس وقت میں تمہیں کسی اور سبب سے مصنوعی موت کے بارے میں تفصیلاً بتا رہا ہوں۔ اس موضوع کا تعلق تمہارے موجودہ معاملے سے ہے..... یعنی ٹھوڑا سی کی کارکردگی سے!“

وہ لمبے بھر کو متوقف ہوا تو میں اضطرابی نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ تیسری آنکھ کا استعمال اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹ واقعی میرے لیے اس وقت سب سے اہم اور نازک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس نارسائی نے مجھے جھجکا ہٹ میں جٹا کر رکھا تھا۔ میں مضطرب خاموشی کے ساتھ چنگ فو کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ گویا ضرور ہوا مگر کسی اور طرف نکل گیا تاہم جلد ہی وہ اصل معاملے کی طرف لوٹ آیا۔

”دوہدان.....!“ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”آج کل جدید اور ترقی یافتہ دنیا میں کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنالوجی کا بڑا شہرہ ہے۔ اسی شعبے میں ایک ٹرم ”پاس ورڈ“ استعمال ہوتی ہے۔ پاس ورڈ درحقیقت ایک ایسی جالی ہے جس کی مدد سے ہم اس سسٹم کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کو استعمال کرنے والا ہر شخص اپنے سسٹم کو پاس ورڈ سے روشناس کراتا ہے۔ اس طرح وہ سسٹم صرف اسی کے لیے مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تک سسٹم کو پاس ورڈ نہ دیا جائے وہ

چند لحات کے بعد چنگ قوت درے بھرا کی ہوئی آواز میں بولا "ودھان! مجھے تسلیم ہے، تم ایک ثابت قدم شخص ہو، تمہاری قوت ارادی بڑی مضبوط ہے۔ اس وقت اگر تمہاری جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو پہلی ہی سانس میں اس فینک کے بارے میں سوال کرتا جس کا ٹھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے اندر بھی بے چینی و بے قراری نے ایک انتشار کی سی کیفیت پیدا کر رکھی ہے لیکن جنہیں اپنی زبان پر کنٹرول حاصل ہے۔ انسان خیر و شر بقدر تحریک کی آمیزش سے تیار کر گیا ہے اور یہ دونوں قوتیں ہر لمحے اس کے اندر بسر پیکار رکتی ہیں۔ انسان کی شناخت کی کوئی یہ ہے کہ کس وقت اس کے اندر کس قوت پر کون سی قوت غالب آگئی۔ جن لوگوں کو اپنے نفس پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے وہ برائی کی طاقت کو اچائی کی طاقت تلے دبائے رکھتے ہیں۔ خیر میں جنہیں اس مخصوص فینک کے بارے میں

میں تیار سے بھی زیادہ تیار تھا لہذا فوراً اثبات میں گرون  
ادی۔ اس نے مجھے تھرڈ آئی کے استعمال کے لیے اشارہ کیا،

ماحول سے اس خوش گوار بے گانگی نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں ساحل کے ماحول پر لگے ہوئے پاس درو کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے خود کو ایک بندر میں پایا۔

”دراصل، جب تک میں نے تمہاری سانس کی انگلی  
تھامے رکھی۔ تم اپنی سانس کے ماحول میں موجود رہے“  
”لیکن“ برنامہ لڑ رہا جانے والے میرے جملے کے جواب  
میں بولا ”تمہیں جسم سے باہر سانس روکنے کی ابھی سے  
پرکینش شروع کر دینا چاہیے۔ تمہارے اسراٹکل میں داخل  
ہونے میں تین چار دن باقی ہیں۔ مجھے امید ہے، اگر تم نے  
میری ہدایت کے مطابق یہ مشق جاری رکھی تو ان تین چار  
دلوں میں تم دونوں کے لیے سانس روکنے پر قادر ہو جاؤ  
گے۔ اس وقت سے تمہارا کام یہ بخوبی چل جائے گا۔ ویسے  
جیت کے لاماتوفکھوں، بلکہ کئی دلوں تک سانس روکنے میں  
تمہارت رکھے ہیں۔ تم لوگ سے متعلق رہے ہو ”جی“ کے سلسلے  
میں تم نے سانس کی کئی داخلی اور خارجی مشقیں کر رکھی ہیں اس  
لیے تمہیں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ورنہ جسم  
سے زیادہ دوڑنا تک سانس روکنے کے لکچریم، عام لوگوں کے

کافی دن لگ جاتے ہیں۔“

وہ لمبے بھر کو توقف ہو پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا، ”تم صرف اتنا جانتے ہو کہ تمہارے دشمن نے تمہاری ساسی کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں ایب میں قید کر رکھا ہے لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہاری ساسی تل ایب کے کس مقام، کس گھر اور اس گھر کے کس بیڈروم میں نظر بند ہے۔ ایک بات کو ابھی طرح ذہن نشین کر لو..... اور وہ یہ کہ ساحل کا سراغ تمہیں ساحل ہی سے ملے گا۔ تم اس کے ماحول میں رہتے ہوئے ہی یہ جان سکو گے کہ وہ تل ایب میں کہاں پر موجود ہے اس لیے.....“

وہ سانس لینے کو رکھا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا، ”اس لیے سانس روکنے کی پریکٹس کے ساتھ ساتھ اپنی ساسی کے ماحول میں جھانکنے کا سلسلہ بھی جاری رکھو۔ اسی ماحول میں تمہیں کسی وقت کوئی بھی اہم اشارہ مل سکتا ہے جو تمہیں اس کے ”قید خانے“ کے محل وقوع کے بارے میں بتا دے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”جی میرے محترم! میں ابھی طرح سمجھ رہا ہوں“ میں نے نہایت ہی ادب سے جواب دیا، ”میں آپ کی ہدایت کے مطابق آج ہی سے یہ کام شروع کر دیتا ہوں۔“

اس کے بعد چنگ فو مجھے سانس روکنے کے مختلف طریقوں اور ان کی افادیت کے بارے میں تفصیلاً بتاتا رہا، جسم سے باہر سانس روکنے کا میں ایک چھوٹا سا تجربہ کر چکا تھا اور میں نے چند سیکنڈ میں ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جسم کے باہر سانس روکنا کتنا مشکل کام ہے۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے جان جاری ہو۔ وہ تو اگر چنگ فو میری سانس کو ماردانی سپاراندہ دیتا تو میرا دم اکڑ چکا ہوتا یا پھر دم گھٹنے کی کیفیت سے گھبرا کر میں اس ”تجربے“ سے باہر آ جاتا۔

جسم کے اندر سانس روکنا نسبتاً آسان کام ہے۔ آپ ایک طویل اور گہرے انہیل (INHALE) کے بعد اپنے پیچھڑوں یا پیٹ کو ہوا سے بھر لیتے ہیں۔ اس کے بعد سانس روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہی عمل ہے جیسے آپ اپنے فرنیچ کو خوردلوش کے سامان سے بھر کر بھوک بڑتال کا اعلان کر دیں۔ آپ بڑے دعوے سے کہیں کہ ایک ماہ تک آپ کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ وہ کمرہ جو انجینڈ واش روم کی سہولت کا حامل ہے اور اس کمرے میں فرنیچ کے اندر مینے بھر کے لیے کھائے پینے کا ہر قسم کا سامان بھرا ہوا ہے لیکن جسم سے باہر سانس روکنے کا عمل اس کے برعکس اور انتہائی مشکل ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص کسی

ایسے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جائے جس میں ایک قطرہ پانی کا میسر نہ ہو اور نہ ہی ایک کیل اڑ کر اس کمرے کے اندر پہنچ سکتی ہو۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ شخص ایک ماہ بعد اس کمرے میں سے زندہ سلامت برآمد ہو تو واقعی کمال کی بات ہوگی!

چنگ فو نے مجھے بتایا کہ میں اتنے پیچھے ہونے پر پیکٹس کر سکتے ہوں، بس یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ معدہ خالی ہو یا پھر زیادہ بھرا ہوا نہ ہو۔ کم از کم ایسی صورت ہو کہ معدے کے اندر موجود خوراک میں ڈائجشن (DIGESION) کا عمل یعنی عمل انہضام مکمل ہو چکا ہو ورنہ معدے کا کام رک جائے گا اور وہ تمام تر خون جو خوراک کو ہضم کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا وہ کسی دوسرے محاذ پر مصروف ہو جائے گا۔ سانس روکنے کے عمل کے ساتھ ہی خون کا ارتکاز معدے سے ہٹ کر پیچھڑوں، دل اور دماغ کی طرف ہو جائے گا جس کے نتیجے میں بد ہمتی جیسے بد اثرات نمودار ہو سکتے ہیں۔ چنگ فو نے مجھے تاکید کی کہ یا تو میں خالی معدے کے ساتھ یہ پریکٹس کروں اور یا پھر اس وقت جب کھانا کھائے ہوئے لگ بھگ چار گھنٹے گزر چکے ہوں۔ میں نے چیف لاما کی ان ہدایات کو ذہن نشین کر لیا۔

چنگ فورن پوٹی کی مدد سے میں جس انوکھے تجربے سے گزرا تھا۔ اس نے میرے ذہن میں ایک نظریے، ایک فکری بنیاد رکھ دی یعنی کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کسی بھی عمل کو بروئے کار لانے کے لیے اس کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان تقاضوں کو پورا کر دے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ سیدھی سیدھی ایک ٹینا لو جی ہے۔ ایسے تمام مظاہر جن کے فارمولے، مساوات اور ٹیکنیک سے ہم واقف نہیں ہوتے، انہیں ہم ماردانی اور جاوونی کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر ہم جانتے ہوں کہ ”یہ یہ یہ برابر ہے یہ یہ یہ“ تو بھر کو بھی ”عمل“ کوئی بھی منظر ہمارے لیے اچھا نہیں رہتا ”جاننے“ دالوں کی آنکھوں کے سامنے کوئی پردہ حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑا کر دیکھ سکتے ہیں بلکہ اگر ان کی مرضی ہو تو دوسروں کو بھی دکھا سکتے ہیں!

”میرا خیال ہے، ایک چائے ہو جائے!“ رن پوٹی کی آواز نے مجھے خیالات سے نکال دیا۔ وہ کہہ رہا تھا، ”ہم کافی دیر سے صرف باتیں ہی باتیں کیے جا رہے ہیں۔“ میں اس پیش کش کو بھلا کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ یہ تو میرے لیے ایک اعزاز کی بات تھی کہ جو کھا نگ ٹیمیل کا چیف لاما میری تواضع کا بندوبست کر رہا تھا۔ جس طرح عیسائیت میں

چرچ، مسیحیت میں مسائنا گام، ہندوؤں میں مندر کی بڑی اہمیت ہے بالکل اسی طرح بدھ مت میں ٹیمپل، مونسٹری اور واٹ کو بہت کچھ سمجھا جاتا ہے۔ جو کھا نگ ٹیمیل جیت میں ریزہ کی ہڈی ایسی اہمیت کا حامل تھا اور چنگ فورن پوٹی وہاں کا چیف لاما تھا۔

پانچ منٹ کے بعد چائے اس چھوٹے سے کمرے میں ”حاضر“ ہو گئی۔ تبت دالوں کا چائے پینے کا اپنا ایک انداز ہے جو انتہائی سادہ، مقوی اور فرحت بخش ہے۔ قبوے کے اندر پاک کھن ڈال کر چٹا چائے نوشی کھلاتا ہے۔ یہ چائے چینی کے بغیر بھی انتہائی خوش ذائقہ ہوتی ہے۔ پاک (YAK) نامی لمبے بالوں والے تیل نما جانور کی طاقت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو چکی ہوگا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کا واحد جانور ہے جو چارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی نہ صرف یہ کہ زندہ رہتا ہے بلکہ زندگی کے مختلف امور میں یہ انسانوں کا سب سے بڑا معاون بھی ہے۔ تبت میں تمام تر بار برداری اور کھیتی باڑی پاک ہی کی مرہون منت ہے۔ میں نے ٹیمپل کے کچھ بچوں میں اس جانور کو اپنی آنکھوں سے انسانوں کے احکام کی تعمیل کرتے دیکھا تھا۔ پاک کی فرماں برداری اور کارکردگی لا جواب تھی۔ کسی مرہل سے جانور کے دودھ سے حاصل ہونے والا کھن بھی توانائی کے کسی ذخیرے سے کم نہیں ہوتا، کیا یہ کہ وہ کھن پاک کے دودھ سے تیار کیا گیا ہو! اس سے آپ بھی چائے کی طاقت اور توانائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں!

چائے کے بعد گفتگو کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور کا تعلق میرے تبت سے اسرائیل جانے سے تھا۔ چنگ فو نے مجھے آواز میں یوں شروع کیا۔ اس نے اسرائیل اور یہودیوں کے ذکر سے تمہید باندھی۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”دو جدان! تم ایک عجیب و غریب اور انوکھے ملک میں قدم رکھنے جا رہے ہو۔ اس ملک کا نام ہے، اسرائیل! میں نے اسے انوکھا اور عجیب اس لیے کہا ہے کہ یہ ”ملک“ کی تعریف پر کہیں سے بھی پورا نہیں اترتا۔ انٹرنیشنل فارمولہ تو یہ ہے کہ کسی بھی ملک کو چار امور پر پورا اترنا چاہیے۔ اول، اپنی حدود میں کامل آزادی۔ دوم، آبادی، سوم، قبضہ اور چارم، تین جغرافیائی حد بندی۔ اسرائیل میں یہ چاروں چیزیں نہیں پائی جاتیں لہذا اس خطے کو پر اسے تسلیم کرنے کا جواز نہیں ملتا۔ اس کے باوجود مجی اب تک سو سے زیادہ تان مسلم اور بارہ مسلم ممالک اس کے وجود کو تسلیم کر چکے ہیں اور اس کے

ساتھ باقاعدہ تجارت اور آمد و شد بھی جاری ہے۔ تمہارے ملک (اس کا اشارہ پاکستان کی طرف تھا) نے ابھی تک سرکاری سطح پر اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا مگر مختلف ادوار میں تمہارے ملک کے بعض سرکردہ افراد نے اسرائیل کے خفیہ دورے کیے ہیں اور چند ایک نے تو عوام کو یہودیوں کے حق میں ہموار کرنے کے لیے عملی کوششیں بھی کی ہیں جو بری طرح کا مایاب رہیں۔ تمہارے ملک کی عوام اسرائیل کو تسلیم کرنے کے خوالے سے بھی کسی حکومتی خفیہ یا ظاہر دہاؤ میں نہیں آئی۔ عوام کی طاقت کے سامنے بھی حکم کھلا ”یہودی دوستی“ اور اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے چارہ جونی نہیں کی گئی لیکن میں دیکھ رہا ہوں، مستقبل قریب میں تمہارا ملک.....“

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مستقبل قریب میں پاکستان، اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لے گا؟“ میں نے ابھمن زدہ انداز میں سوال کیا۔ اس نے ایک تکلیف دہ اور ناقابل قبول پہلو کو پھیرا تھا۔

وہ چند لمحات تک بڑی گہری اور غمگین ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا، ”مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ دراصل، میں تو تمہیں اسرائیل کے بارے میں مختصر بتا رہا تھا۔“

میں نے صاف محسوس کیا، وہ کئی کاٹ کر دوسری سمت نکل گیا تھا۔ اس کے انداز سے تو یہی لگتا تھا، وہ پیش گوئی کرنا چاہتا ہے، آگے چل کر پاکستان بھی ان اسلامی ملکوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا جو اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر چکے ہیں۔ بہر حال، مجھے یقین تھا، ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ میری طرح پاکستان کی چندہ کردعوام کو بھی اتنا ہی پختہ یقین ہے۔ بالخصوص طبقہ خواص میں سے کچھ لوگ اگر ایسا چاہتے رہے ہیں یا آئندہ چاہیں گے تو انشاء اللہ! انہیں ایسے عزائم میں بھی کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ یہ عملاً اتنا آسان نہیں، یہ ظاہر جتنا دکھائی دیتا ہے!

چنگ فو کے خاموش ہونے پر میں نے غصہ سے ہونے لپچے میں کہا، ”محترم! میری فہم و فراست کے مطابق، اسرائیل نے سرزمین فلسطین پر ناجائز اور جائیداد قبضہ جمار کھا ہے۔ ماضی میں، اسرائیل نے اپنے پڑوسی ممالک مصر، اردن، شام اور لبنان سے کئی جنگیں کی ہیں۔ انہی جنگوں کے نتیجے میں غزہ کی پٹی، گولان کی پہاڑیاں اور بیت المقدس پر اس نے غاصبانہ قبضہ جمایا تھا لیکن جب کب پوڈ میں یہ معاہدہ طے پایا کہ دریائے اردن کا مغربی کنارہ واپس اردن کو دے دیا

آتش فشاں (120) حصہ 13

”یہ سب تو مجھے کرنا ہی ہوگا وہدان!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آخر کو تم جنت کے دہار بننے والے ہو!“

میں اک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”قاہرہ پہنچے ہمارے منصوبے کے مطابق“ صوفیہ چل جائے گی تم اسے جوڑوں (اردن) اور اسرائیل کی سیر کرواؤ۔ تم اس کی فرمائش کو رد نہیں کرو گے اور اس سلسلے میں تم اپنے ایک دوست السید مبارک امینی کی خدمات حاصل کرو گے۔ مبارک امینی ایک ”ٹور ایجنٹ“ ہیں۔ میں کام کرتا ہے۔ کامیابی (CONTIKI) نامی یہی ٹریول کمپنی دنیا کی ایک معروف اور قابل اعتماد کمپنی ہے۔ قاہرہ میں ”کامیابی“ کے ایجنٹ کا دفتر الباتری اسٹریٹ پر ”اسپرنگ ٹورز کیرو“ کے نام سے واقع ہے۔ تم (یوسف الظاہری) اپنی فریڈ صوفیہ کے ساتھ اسپرنگ ٹورز کیرو (CAIRO) پہنچو گے اور السید مبارک امینی تمہارے لیے قاہرہ سے جوڑوں اور اسرائیل تک کے سفر کا بندوبست کر دے گا۔ سولہ دن کا ٹور باقی روڈ ہوگا۔ تم صوفیہ کے ساتھ ”کامیابی“ کی سپر ٹکٹری کوچ میں بیٹھ کر قاہرہ (CAIRO) سے تل ابیب (اسرائیل) پہنچو گے۔ تل ابیب سے پتیرا (جوڑوں) جاؤ گے پتیرا (PETRA) سے واپس ایلات (اسرائیل) آؤ گے ایلات (EILAT) سے یرشلیم اور یرشلیم سے واپس قاہرہ (مصر) لوٹ آؤ گے۔“

اس نے سانس لینے کی خاطر تھوڑا وقفہ کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں نے جس روٹ کی تفصیل تمہیں بتائی ہے وہ کامیابی ٹور ایجنٹ ٹریول کمپنی کا باقاعدہ اسکیم ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تم اس اسکیم کی پیروی بھی کرو۔ جو ٹورسٹ کسی ایک مقام پر زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہوں، وہ قافلے سے جدا بھی ہو جاتے ہیں۔ واپسی میں کامیابی کی کوچ انہیں اٹھا لیتی ہے۔ کامیابی کا ایجنٹ قاہرہ اور تل ابیب میں موجود ہے البتہ، اردن میں ان کا کوئی دفتر نہیں۔ قاہرہ کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تل ابیب میں کامیابی کا ایجنٹ آفس بیورو اسٹریٹ (HANOAR STREET) پر واقع ہے۔ ”اسرام اسرائیل“ نامی اس آفس کو رابن یعقوبی دیکھتے ہے۔“

وہ تھوڑی دیر کے خاموش ہوا تو میں حیرت بھری نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ ترنی یافتہ دنیا کی چھت پر، جو کھانگ پھیل میں بیٹھا ہوا چیف لانا چنگ فونون پوٹی کٹی گہری اور وسیع معلومات رکھتا تھا۔ جدید دنیا کے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ

جنت والے معلومات اور اختیارات کے شعبے میں اس حد تک بھی مستعدی دکھائیں تھے!

چنگ فونون پر ہونے لہجے میں ایک مرتبہ پھر گویا ہوا ”وہدان! سولہ دن کے اس تقریبی دورے میں تمہیں آٹھ دن مصر میں، تین دن اسرائیل میں، ایک دن جوڑوں میں اور پھر دوبارہ چار دن اسرائیل میں گزارنے کا موقع ملے گا۔ اسرائیل میں پہلے تین دن یا آخری چار دن میں سے تمہیں اپنے لیے کسی ایک قیام کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں پہلے تین دن کا انتخاب زیادہ مناسب رہے گا۔ جب کامیابی کی کوچ تل ابیب سے پتیرا کی طرف جانے لگے تو تم مزید قیام کا بہانہ کر کے تل ابیب میں رک سکتے ہو کیونکہ واپسی پر کوئی تل ابیب نہیں آئے گی بلکہ ایلات سے یرشلیم اور یرشلیم سے مصر چل جائے گی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ٹور کے چند ممبروں دن یرشلیم میں قافلے کو دوبارہ جوائن کر لو گے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ اس ترکیب پر عمل کرتے ہوئے تمہیں کارکردگی دکھانے کے لیے پورے تین دن مل جائیں گے۔ تمہارے ساتھی کو تل ابیب میں رکھا گیا ہے تم اسے اپنے ملاقات و دشمن کے چنگل سے کس طرح چھڑاتے ہو، اس سلسلے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس آپریشن کی ذمہ داری صرف اور صرف تم پر ہے۔ تم اپنے حالات اہل موقع محل کو دیکھتے ہوئے پلاننگ کر سکتے ہو البتہ۔“

وہ لمبے لمبے موقوف ہوئے پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”جب تم اپنی ساتھی کو حاصل کر لو گے تو صوفیہ تم سے جدا ہو جائے گی۔ تم اپنی ساتھی کے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسے صوفیہ بنا سکتے ہو۔ صوفیہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ تمہاری ساتھی تہی نقوش کی حامل ہے لہذا انہذا دلی صوفیہ بڑی آسانی سے اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ تم اپنی ساتھی کو آزاد کرانے کے بعد صوفیہ کی حیثیت میں، تل ابیب سے یرشلیم پہنچو گے اور نہایت ہی خوش سلیکی سے اپنی ٹور کوچ کو جوائن کر لو گے۔ کسی کو اتنی بڑی تبدیلی کا مطلق احساس نہیں ہوگا۔ اس کے بعد سب کچھ نازل انداز میں ہوگا۔ تم اسرائیل سے مصر، مصر سے انگینڈ اور انگینڈ سے واپس جنت تک جاؤ گے۔ مصر سے انگینڈ تک تم یوسف الظاہری اور تمہاری ساتھی صوفیہ کی حیثیت سے سفر کرو گے۔ لندن سے لہا سا تک تم چارلس اور تمہاری ساتھی کوئی بھی تہی لڑکی بن جائے گی لیکن دھن (ساحل) نہیں۔“

وہ ذرا کا تو میں نے سنیں خیر لہجے میں استفسار کیا ”لہا اصلی صوفیہ کا کیا ہوگا؟“

”تمہیں صوفیہ کے سلسلے میں اپنے ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں بولا ”جب تم اپنی ساتھی کو حاصل کرنے کی پلاننگ کر لو گے تو تل ابیب ہی میں صوفیہ تم سے الگ ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہیں تنہا اپنے مشن کو سر کرنا ہے۔ یہ سراسر جان بوجھ کا کام ہے۔ تم صوفیہ کو یک سرگرمی موش کر کے اپنے کام پر دھیان دو گے۔ صوفیہ کو اسرائیل سے مصر اور مصر سے انگینڈ پہنچانے کی ذمہ داری کسی اور شخص کو سونپی جا چکی ہے۔“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس لی اور ساریہ نظر سے چنگ فونون دیکھنے لگا۔ وہ بولا ”اسرائیل میں ایک ایک قدم بھونک کر رکھنا۔ مجھے امید ہے، اگر تم نے سانس کی مخصوص مشق جاری رکھی تو اس وقت تک اس قابل ہو جاؤ گے کہ تھوڑی سی ہر محاذ پر یہ آسانی استعمال کر سکو گے۔ اپنے دشمن کے مقابل تھوڑی سی تمہاری مدد کرے گی اور مجھے یقین ہے، تم اپنے اس مشن میں کامیاب لو گے!“

”آمین!“ بے اختیار میری زبان سے ادا ہوا۔ چنگ فونون پوٹی نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر تک مرا تہی کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ میں منتظر اور سوا لید نظر سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور نہایت ہی کھیر آواز میں لب کشا ہوا۔ ”وہدان! پہلی ملاقات میں، میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ ہماری صرف تین ملاقاتیں ہونا ہیں۔ آج دوسری ملاقات بھی ہوئی۔ تیسری اور آخری ملاقات اس وقت ہوگی جب تم اپنے مشن سے کامیاب لو گے“ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور پھر سے ہونے لہجے میں دوسری ملاقات کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

”اب تم اپنے کمرے میں جا سکتے ہو!“ میں اس سے پوچھنے لگا کہ تیسری ملاقات آخری کیوں ثابت ہوگی؟ وہ مجھ سے تیسری بار ملنے کے بعد کہاں چلا جائے گا؟ اس نے ایسے تمام تر سوالات کے دروازے بند کر کے آنکھیں موند لی تھیں۔ میں اٹھا اور خاموشی کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

یو زھا فانگ جو (FANG ZHOU) علی در بے کا فونون فری نہیں بلکہ وہ ایک مشتاق بیوشن بھی تھا۔ فانگ جو کہ فن کا مظاہرہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب اس نے بحری راہ نمائی میں ساحل کی قلمی تصویر بنائی تھی۔ وہ پینٹل

اچھا فانگ جو کے بچے فن کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں جن سیان کے ساتھ چیف لانا کے پاس سے واپس کمرے میں آیا ہی تھا کہ فانگ جو ایک مرتبہ پھر نازل ہو گیا۔ اس بار وہ قلمی تصویر بنائے نہیں، بلکہ میرے حلیے میں مناسب تبدیلی کرنے آیا تھا۔

سب سے پہلے اس نے میرے بالوں کو نیا انداز دیا۔ لوہار آئل کی باقاعدہ مائل شینے میرے سر پر اتنے بال اگادے تھے کہ ان میں باقاعدہ کٹھنسی کی جا سکے۔ فانگ جو نے اس وقت چونکہ مجھے مسٹر چارلس بنانا تھا اس لیے میرے بالوں میں گھونگر ڈالے گئے۔ بالوں کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد اس نے میرے چہرے پر کام کیا اور لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ اب میں اپنے حلیے سے کوئی مسٹر چارلس بن گیا تھا۔

یہ ساری کارروائی کی بان کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ وہ سمجھ تو تھی تھی کہ مجھے کہیں اور روانہ کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ کہاں؟ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ اس زاویے سے بھی گہرے تجسس میں جھٹکی کہ میں نے جو کھانگ پھیل کے چیف لانا کے ساتھ جو خفیہ ملاقات کی ہے، اس میں ہمارے درمیان کیا کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔ چونکہ اس دوران میں جن سیان مسلسل ہمارے پاس موجود رہا تھا لہذا اس موضوع پر بات کرنے کا اسے موقع نہیں مل سکا تھا۔ جن سیان، فانگ جو کو رخصت کرنے کے لیے کمرے سے نکلا تو لی بان پیر سے قریب آگئی۔ وہ کافی دیر سے اس موقع کی تاک میں تھی۔

”یہ سب کیا چکر چل رہا ہے وہدان؟“ وہ تیز اور تشویش ناک لہجے میں مستفسر ہوئی۔

میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لی بان! میں آج شام لہا سا سے لندن جا رہا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تم اور جن سیان مجھے ائر پورٹ چھوڑنے جاؤ گے۔ میں لندن سے ایک نہایت بے چیدہ روٹ اختیار کر کے اسرائیل پہنچوں گا اور اپنی ساتھی گوربی موٹے ہاتھن کے چنگل سے آزاد کرانے کے بعد واپس لہا سا (جنت) آ جاؤں گا اور۔۔۔“

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی ”اور میں؟“

اس کے سوال میں بے پناہ حیرت پائی جاتی تھی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”میں تمہارے بارے میں تو بتانے جا رہا تھا، تم نے خواہ مخواہ میری بات کاٹ دی،

خیر..... میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”تم اس دوران میں یہیں لہا سائی میں رہو گی۔ تمہیں  
 یہاں کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔  
 چنگ نو کے حکم اور ہدایت پر تمہارا ہر طرح کا خیال رکھا جائے  
 گا۔ چنگ نو کی پلاننگ کے مطابق ہی تو تمہیں یہاں روکا جا رہا  
 ہے۔ انشا اللہ! میں جلد ہی اپنے مشن سے کامیاب لوٹ آؤں  
 گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی ”لیکن  
 میں تمہارے ساتھ کیوں نہیں جاسکتی؟“  
 میں نے کہا ”میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں  
 چنگ نو کی کوئی مصلحت ہوگی۔ وہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ اس  
 نے کچھ سوچتے ہوئے ہی تمہیں یہاں روکنے کی بات کی ہے  
 نا!“

”میں چیف لاما کی نیت پر شک نہیں کر رہی ہوں۔“ وہ  
 جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ”اس نے ابھی تک ہمارے  
 فائدے کے لیے ہی سوچا ہے لیکن پھر بھی.....“  
 ”لیکن پھر بھی کیا؟“ اس کی الجھن کے پیش نظر میں  
 نے کہا۔

”تمہیں رن پوش سے پوچھنا چاہیے تھا۔“ وہ اصراری  
 لہجے میں بولی۔  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ آئندہ ملاقات ہوگی تو ضرور پوچھوں  
 گا۔“

میرے اس جواب پر وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس  
 کی سٹ پٹا ہٹ سے محظوظ ہوئے بتانہ نہ سکا۔ لی یان نے  
 اس وقت انتہائی بی یوں والے انداز کا مظاہرہ کیا تھا۔

لی یان جب سے میرے ”قریب“ ہوئی تھی، اس کے  
 انداز و اطوار میں ایک تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اس کی بے تکلفی  
 میں قدرے جارحانہ پن آ گیا تھا تاہم یہ خوش گواری جارحیت  
 بد تیزی کے زمرے میں نہیں آتی تھی بلکہ اس سے گہری  
 اپنائیت نکلتی تھی۔ وہ ایک ایک ادا سے مجھ پر احتجاج جتانے  
 کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ بہت پیاری تھی  
 اور اس کی ان تازہ ترین اداؤں نے اسے اور بھی دل رہا بنا  
 دیا تھا۔ بہر حال، یہ سب کچھ انفس ناک صورت حال میں  
 بدل جاتا جب جن سیان کی پہریداری کا خیال آتا۔ اس شخص  
 نے اپنے گرد کی ہدایت پر ہمارے سچ ایک نیا دیدہ و بار اور کھڑی  
 کر رکھی تھی۔ اور اب جب کہ اس دیوار کے گرنے کا امکان  
 پیدا ہوا بھی تھا تو ہم دونوں کو میں بچیں دن کے لیے ایک  
 دوسرے سے دور کیا جا رہا تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ

سکتا تھا کہ جہاں کی یہ مدت اتنی ہی رہے گی یا اس میں کی بیڑی  
 واقع ہو جائے گی!

یہ تمام تر خیالات ایک لمحے کے اندر میرے ذہن سے  
 گزرے اور اگلے ہی لمحے میں دوبارہ لی یان کی طرف متوجہ  
 ہو گیا۔ آج وہ مجھے کچھ زیادہ ہی گہری گہری اور جاذبہ نظر  
 لگی۔ دل چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے پھولوں اور چھو کر.....  
 میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ چنگ نو کی ہدایات  
 میرے ذہن میں روشن ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک خاص مقصد  
 کی خاطر مجھے لی یان سے دور کر رکھا تھا۔ میں اس مقصد میں  
 تقریباً کامیاب ہو چکا تھا، اس آخری مرحلے میں، کوئی معمولی  
 سی گڑبڑ بھی میری راہ کوٹھنی کر سکتی تھی لہذا میں نے لی یان کے  
 حصول کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور نہایت ہی مستقل  
 انداز میں کہا۔

”لی یان! چند دن کی تو بات ہے۔ ہم جلد ہی دوبارہ  
 ملیں گے۔“  
 ”اگر تم ایسا چاہو گے تو؟“ وہ روٹھے والے انداز میں  
 بولی۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں روٹھنے والی کو منانے کا جن  
 کر سکتا تھا لیکن جن سیان جس طرح موت کے فرشتے کے  
 مانند ہم پر مسلط تھا اس صورت حال میں کسی قسم کا رسک لینا  
 حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ میں نے لی یان کو راضی کرنے کی  
 کسی عملی کوشش کے بجائے غم سے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں ایسا کیوں نہیں چاہوں گا؟“

وہ خاموش رہی۔ اس کی شبیر خاموشی بھی داستان گوئی کا  
 اعلیٰ معیار پیش کر رہی تھی۔ لب اگرچہ ہم کنار تھے، زبان  
 گہرے کنوئیں میں پناہ گزین تھی لیکن اس کا آنگ آنگ اور  
 سنگ سنگ بڑی اسکا نے اور کچھ گزر رنے والی ہم جوئی میں  
 مصروف تھا۔ میں ایک ایک اور غصہ نڈی سانس لے کر رہ گیا۔  
 فی الحال، میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا!

اسی لمحے جن سیان کمرے میں آ گیا۔ اس نے انٹری تو  
 اس انداز میں دی تھی جیسے فائیک چوکر رخصت کرتے ہوئے  
 تھوڑی دیر ہو گئی ہو لیکن میں اس کی شاطر گری کو اچھی طرح  
 سمجھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، اس نے واپسی  
 میں دانستہ تاخیر کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں  
 ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اسے ہمیں رتھے  
 ہاتھوں پکڑنے کا موقع مل سکے اور مجھے اور لی یان کو میسر آنے  
 والی تہائی کے یہ چند لمحات ایسے ہی تھے۔ تاہم ”خیریت“  
 گزری اور وہ شاطر اپنی ناک کی پر صاف ہاتھ ملتا رہ گیا!

کمرے میں داخل ہونے کے بعد جن سیان نے نئی  
 ہوئی نظر سے باری باری ہم دونوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔  
 اس ”جائزہ“ کا مطلب میں بہ خوبی سمجھتا تھا۔ جب اسے  
 ہمارے چہروں پر کچھ بھی لکھا دکھائی نہ آیا تو وہ مجھ سے مخاطب  
 ہوتے ہوئے بولا۔

”مسٹر چارلس!“ میں اس وقت جیولوجسٹ بہر اللہ  
 فاس کے اسسٹنٹ مسٹر چارلس کے بہروپ میں تھا اس لیے  
 وہ مجھے اس انداز میں مخاطب کر رہا تھا ”ہم دوپہر کے کھانے  
 سے فارغ ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ہمیں  
 ٹھیک چار بجے چنگ آنا ہونا ہے۔ اتر پورٹ، لہا سا شہر سے  
 کافی فاصلے پر واقع ہے۔“

میں نے پوچھا ”جن سیان! علیہ تبدیلی کر کے مجھے  
 چارلس تو بتا دیا گیا ہے۔ اصلی چارلس کے کاغذات وغیرہ  
 کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے، پاس پورٹ.....“  
 وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے بول اٹھا ”پاس  
 پورٹ، ویرا اور ملائیشیا ائر لائنز کا کنفرم ٹکٹ، سب ضروری  
 دستاویزات میرے پاس بچھ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں تمہیں  
 کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

گہنی بات تو یہ ہے کہ چنگ نورن پوش کی قسلی کے بعد مجھے  
 فکر پریشانی نہیں رہی تھی۔ میں تو جن سیان کو کس کراس کے  
 منہ سے کچھ اگھوانا چاہتا تھا میں نے اس سے استفسار کیا۔  
 ”اس دوران میں اصلی چارلس یہاں کیا کرے گا؟“

”وہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوا ہے اس کام میں  
 مصروف رہے گا۔“ وہ غم سے ہوئے لہجے میں بولا ”اس کی  
 طرف سے کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں۔“

جن سیان میرے ہر سوال کا پورا پورا جواب دے رہا  
 تھا۔ یہ احتیاط روی کسی خاص پروگرام کے تحت نہیں تھی بلکہ  
 میں نے ان دس دنوں میں۔۔۔ روز و شب اس کے ساتھ  
 رہتے ہوئے یہ انداز لگایا تھا کہ وہ موقع کی مناسبت سے  
 اپنے انداز کو سبٹ کرتا تھا تاہم ہر قسم کی صورت حال میں وہ  
 احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹے نہیں دیتا تھا۔

ہمارے درمیان لگ بھگ آدھے گھنٹے تک مختلف  
 موضوعات پر گفتگو ہوئی رہی پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔ میں  
 نے ہاتھ روک کر کھانا کھایا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی  
 ہے کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں اپنے معدے کو بھرنے  
 کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کھانے کا موقع ہو تو بس برائے نام ہی  
 چرتے لے لیتا ہوں۔ اس روز کھانے کی میز پر ہم تینوں ہی  
 موجود تھے۔ میں نے تو اپنے کم کھانے کا سبب بیان کر دیا ہے

لیکن میں نے محسوس کیا کہ لی یان بھی بس خاندان بری کے لیے  
 ہی ہاتھ چلا رہی تھی۔ وہ خاصی بھیجی اور خاموش تھی۔

میں اس کی خاموشی! اور پرمردگی کی وجہ سے واقف تھا  
 لیکن ہم جس نوعیت کے حالات میں ”جکڑے“ ہوئے تھے  
 ان میں لی یان کی دل داری میرے بس میں نہیں تھی۔ جن  
 سیان کی پہرے داری میں، میں اس کی پرمردگی کو شکستہ  
 بدل سکتا تھا اور نہ ہی اس کی جب کو توڑنے کی کوئی سبیل کر سکتا  
 تھا..... اور اس موت کے فرشتے کے نکلنے کے امکانات نہ  
 ہونے کے برابر تھے!

ٹھیک دو بجے ہم تینوں جو کھا گئے ٹیمپل سے باہر نکل  
 آئے۔ میرے ہاتھ میں چارلس کا سفری بیگ موجود تھا تاہم  
 زیادہ سامان نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیگ وزن میں خاصا ہلکا  
 تھا۔ مجھے لہا سا سے لندن تک مسٹر چارلس کا رول چلے کرنا تھا  
 اس لیے میں نے خود کو ابھی سے چارلس سمجھنا شروع کر دیا  
 تھا۔ جن سیان نے ہمیں ایک چھوٹی دیکھن میں بخایا اور ہمارا  
 سفر آغاز ہو گیا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ دیکھن ہمیں جو کھا گئے ٹیمپل  
 سے سیدھا اتر پورٹ پہنچانے کی لیکن دس منٹ کے بعد جب  
 دیکھن ”لہا سا ہوئی“ کے سامنے جا کر رکی اور جن سیان نے  
 ہمیں دیکھن میں سے باہر نکلنے کو کہا تو میرے اندازے کی  
 تردید ہو گئی۔ جن سیان خود ہم سے پہلے دیکھن کو چھوڑ چکا تھا۔  
 میں نے باہر آتے ہی اس سے پوچھا۔

”تم نے تو بتایا تھا، اتر پورٹ لہا سا شہر سے کافی فاصلے  
 پر ہے؟“

”میں نے غلط نہیں بتایا تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے  
 بولا ”ہم دس پندرہ منٹ تک اس ہوٹل کی لابی میں انتظار  
 کریں گے۔ یہاں سے اتر پورٹ کی مخصوص دین ہمیں لے  
 کر جائے گی۔ دے دیے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں، لہا سا  
 شہر سے گاگرا اتر پورٹ کا فاصلہ لگ بھگ ایک کلومیٹر ہے۔ مجھے  
 پتا چلا تھا، اتر پورٹ کی دین ہوٹل سے چند سافروں کو لینے  
 کے لیے آ رہی ہے۔ میں نے مذکورہ دین کے ذریعے اتر  
 پورٹ تک جانے کا بندوبست کیا ہے۔“

جن سیان کی وضاحت کے بعد ہم لہا سا ہوٹل کی لابی  
 میں بیٹھے۔ مذکورہ ہوٹل لہا سا شہر کے چائیز کیشن میں واقع  
 ہے۔ ہوٹل کو ”ہالینڈ“ ان کی انتظامیہ چلا رہی ہے۔ اس  
 ہوٹل کے پانچ سو کمرے ہیں لہا سا ہوٹل کے نزدیک ہی ”نیو  
 تھیمز“ ہے جہاں ادیب اور مختلف کھیل پر گرام پیش کیے  
 جاتے ہیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد، ہم تینوں اتر پورٹ کی مخصوص دین



میں سوار ہو کر ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔ وہ دین "میڈان جاپان" تھی۔ راستے بھر میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور ہم ٹھیک پونے چار بجے لہاسا کے گھر (GONGGAR) اتر پورٹ پہنچ گئے۔ مجھے چار بجے چیک ان ہونا تھا لہذا کپ شپ کے لیے ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔

اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں رحم ڈالنا جانتا ہے۔ جن سیان اپنی دانست میں اگرچہ بدھ کا بندہ تھا لیکن میری نگاہ میں وہ اسی قادر مطلق کا بندہ تھا، کل کائنات کا جو مالک و مختار ہے، وہ اہم ہاتھ لے کر مجھے سے کہنے لگا۔

"مسٹر چارلس! آپ دونوں باتیں کرو۔ میں ذرا دواش روم سے ہو کر آتا ہوں۔"

پھر میرا جواب سنے بغیر وہ ایک جانب بڑھ گیا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "فیض انتہائی مکار اور چالاک ہے۔ اپنی دانست میں یہ ہم پر احسان عظیم کر کے دواش روم کی طرف گیا ہے۔"

وہ میری بات کا مطلب بے غولی سمجھ رہی تھی، معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "وہ جان! کتنا ہی اچھا ہوتا، اس مشن میں، میں بھی قدم سے قدم ملا کر تمہارا ساتھ دیتی!"

اس نے اتنے دھیمے لہجے میں مجھے دھجان کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ پاس کھڑا ہوا شخص بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس وقت ہم دونوں اتر پورٹ کی لابی میں بیٹھے تھے۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"جاتا تو میں بھی یہی تھا لیکن چنگ فو کی پلاننگ کے تحت یہ ممکن نہیں ہو سکا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا، میں یہاں تمہارے بغیر اتنے دن کس طرح گزاروں گی؟" اس کے لہجے میں مایوسی آمیز اداسی کی جھلک تھی "نخت بوریت ہوگی وہ جان!"

"میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں لی یان!..."

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ فی من سر ہلاتے ہوئے بولی "اگر سمجھتے تو یوں اکیلے اٹھ کر نہ چل دیتے!"

میں واقعی اس کے احساسات اور جذبات کو سمجھ رہا تھا، اس لیے اس کا شکلی بھرا شکوہ مجھے ذرا بھی برا نہ لگا۔ میں ٹھنکو کے زادی کو بدلتے کی خاطر ادھر ادھر کا گھر دوڑاتے ہوئے

بولی۔

"یہ جن سیان پتا نہیں، کب آئے گا؟"

ادھر میں نے یہ جملہ ادا کیا، ادھر وہ کسی چراغی جن کے مانند حاضر ہو گیا۔ اس نے اضطرابی انداز میں ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، ہم اٹھے اور اس کی تقلید میں چلے ہوئے لابی سے ڈیپارچمنٹس کی طرف بڑھ گئے۔ وہ کسی خاموش روڈوں کے مانند ہمارے آگے چل رہا تھا۔

اس گیٹ سے مجھے اکیلے ہی اندر داخل ہونا تھا۔ چر سیان نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنی نیک خواہشات کو مختصر الفاظ میں میری ساعت تک پہنچا دیا۔ مجھ سے الگ ہوا تو میں نے الوداعی نظر سے لی یان کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے فی تیری تیر کی دکھائی دی۔ مجھے لگا کہ لی تو اسے خود پر اختیار نہ رہا۔ وہ مکان میں سے نکلے ہوئے کسی تیر کے مانند میری جانب بڑی اور ایک عالی شان تحفے کی طرح میرے سینے پر پڑ گئی۔ میں نے غلط جذبات سے اسے تمام لیا۔ لی یان کا پورا وجود کسی خزاں رسیدہ بچے کی مثل کانپ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس ایک لمحے کی غلطی میں وہ صدیوں کا سفر کر کے مجھ تک پہنچی ہوا

ڈیپارچمنٹ میں بعض گیری کے ایسے مناظر ایک عام سی بات سے لیکن ہمارے معاملے میں یہ عام بات جن سیان کے لیے بہت خاص ہو گئی تھی۔ دنیا کا کوئی بھی ملک لوگ اپنے پیاروں کو رخصت کرنے کے لیے اتر پورٹ تک آتے ہی ہیں اور اپنے اپنے گھر کے مطابق، محبت کا مظاہرہ کر کے انہیں الوداع کہتے ہیں، اس حوالے سے ہمارا معاملہ وہاں موجود افراد کی توجہ کا طالب نہیں تھا۔ میں نے اپنے آنکھوں سے بعض شرعی جوڑوں کو باقاعدہ بوس و کنار کرنے دیکھا تھا، میں تو پھر بھی پوری مسٹر چارلس تھا!

جب یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تو مجھے اپنے عقب میں کسی کے کھانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ساعت تک یہ الفاظ بھی پہنچے۔

"چارلس! جہیں دیر ہو رہی ہے۔" میں نے سیٹھ کے ہزاروں حصے میں پہچان لیا، وہ جن سیان تھا "چیک ہاؤس ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے لی یان سے الگ ہو کر الوداعی مصافحہ کیا اور ان کی سیان کی "فرمائش" کے مطابق جلدی سے چیک ان ہو گیا۔ پھر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد میں ملائیمیا اتر لائیمیا اس طیارے میں آ بیٹھا جو مجھے لہاسا سے لندن لے جانے کا تھا۔

پورڈنگ میں مجھے کافی وقت گزارنا پڑا تھا اور وہیں

ہم نے سانس کی اس مشق کی پریکٹس بھی کی تھی جو چنگ فو نے میرے لیے تجویز کی تھی، یہ جسم سے باہر سانس روکنے کی ایک تکنیک تھی۔ اس نوعیت کی بریڈنگ مہابو کی اور ہائی لاما اپنے معمولات میں رکھتے ہیں۔ مجھے بھی یہی طریقہ اپنانا تھا ورنہ زندگی کی بے سمت اور بے ہنگم دوڑ مجھے کسی ایک جگہ پر رکھنے کی سہلت نہیں دیتی تھی کہ میں باقاعدہ کوئی مشق یا ایگر سائز کر سکوں۔

میں نے پورڈنگ میں بیٹھے بیٹھے وقفے وقفے سے لگ بھگ آدھا گھنٹا پریکٹس کی جس کے نتیجے میں مجھے اپنے بدن کا چھکا محسوس ہونے لگا۔ روح میں تازگی سی بھری اور یوں گاہے میرے دماغ کو کسی قلعی گر کے ہاتھوں نے ایک نیا ک (رے دیا ہو۔ سانس روکنے کا یہ طریقہ مشکل ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ ہی بے پناہ سودمند بھی تھا۔ اس سے گزرنے کے بعد حاصل ہونے والی آسودگی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں!

ٹھیک چھ بجے شام طیارے کے ٹیک آف کا اعلان کیا گیا۔ گھر اتر پورٹ شاید دنیا کا سادہ ترین اتر پورٹ ہے۔ ایک ٹھگ سی نارنگ اسٹریٹ..... اور رہی!

ٹیک آف کے بعد مجھے ہی فلائٹ ہموار ہوئی، میں نے ہٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ظاہرہ آنکھیں بند ہوتے ہی میں نے اپنی باطنی آنکھیں کھلیں تو آبی کودا کیا اور اس کے سامنے اپنی رگہ جان کے نقوش کو ابھارا۔ اٹھے ہی تھے میں نے ساحل کے ماحول میں جست لگانے کی کوشش کی۔

یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے تاریکی میں کسی پتھر کی دیوار سے سر ٹکرایا ہو۔ اسی وقت میں نے جھکا ٹھگ ٹھیل کے چپ لایا چنگ فورن پوٹی کی ہدایت کے مطابق، جسم سے باہر سانس روک لی اور ایک مرتبہ پھر ساحل کے ماحول کے بندر دروازے پر دستک دی۔

دوسری ناکامی کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوٹی..... اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں جسم سے باہر سانس روک کر کوشش کرتا رہا اور اس لمحے جب میرا دم اکٹھے ہونے ہی والا تھا، میں ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامران ہو گیا۔

یہ کامرانی نہایت ہی مختصر ثابت ہوئی اور ساحل کا ماحول کل کے مانند میری تیسری آنکھ کے سامنے جل کر بچھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ٹھگ سا لگا اور میں مسلسل کھانٹ چلا گیا۔ یہ ٹھگ اور کھانسی دم کھٹنے کے سبب تھی۔ میں نے ٹھگرا کر

آنکھیں کھول دیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اسی وقت ایک اتر ہوٹس میرے لیے پانی کا گلاس لے کر آگئی۔ وہ مذکورہ گلاس میری سمت بڑھاتے ہوئے بولی۔

"پلیز سر!" اس کے اس مختصر سے جملے میں گہرا غلوص اور ہمدردی شامل تھی۔

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیکس!" "سرا! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" وہ کچھ زیادہ ہی نرس بن رہی تھی۔

اگر مجھے پانی کی ضرورت محسوس ہوتی تو دو چار گھونٹ ضرور لے لیتا۔ ایسی کوئی بات تھی اور نہ ہی میری طبیعت کو کچھ ہوا تھا لہذا میں نے دو ٹوک انداز میں اتر ہوٹس سے کہہ دیا۔

"کی ایم او کے!" وہ گلاس لے کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میں اپنی کھانسی اور ٹھگے کی وجہ جانتا تھا۔ میں کافی دیر تک جسم سے باہر سانس روک رہا تھا۔ میں اسے شے میں ابھی نیا تھا۔ پہلے جو کھا ٹھگ ٹھیل میں ایسی کوشش کے دوران میں چپ لایا مارن پوٹی نے میرا "ہاتھ" بنایا تھا اسی لیے میں ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا لیکن جب میں نے اپنی مدد آپ کے تحت یہی کوشش کی تو کھانسی کا مہابی طے ہوا میری سانس اکٹھے تھی جہاں حال میرے لیے یہ تجربہ خاصا حوصلہ افزا ثابت ہوا تھا۔

اس بات کا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں ساحل کے ماحول کو چھو سکتا ہوں۔ اگر میں سانس روکنے کی پریکٹس جاری رکھوں تو اس شے میں اپنی استعداد کو بڑھا سکتا تھا۔ یہ ہوائی سفر کی ٹھنکوں پر محیط تھا۔ میں نے اپنے دل میں اٹل فیصلہ کر لیا کہ لندن کے اتر پورٹ پر اترنے سے پہلے میں جسم کے باہر اتنی دیر کے لیے سانس روکنے کی پریکٹس کروں گا جو ساحل کے ماحول میں پوری طرح اترنے کے لیے ضروری ہے۔

انسان اگر غلوص نیت سے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کر لے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے محنت بھی کرے تو مثبت سودمند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ میں "پتی" کی بیداری کے سلسلے میں "برانام" کی اسٹروک بریڈنگ ایگر سائز کرتا رہا تھا اس لیے بھی مجھے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تین گھنٹے کی وقفے دار پریکٹس کے بعد میں حیرت انگیز طور پر لگ بھگ پانچ منٹ تک سانس روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وقفہ ہر مرتبہ مختلف ہوتا اور میں نے نوٹ کیا کہ میں تین منٹ تک بے آسانی اور جھٹکے منٹ تک بے وقت تمام سانس روک پارہا تھا۔ یہ ایک حوصلہ افزا اور خوشی کی بات

تھی۔

اس خوش گوار کامیابی کے بعد میں آنکھیں بند کیے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ جب سینے کا تنفس توازن اور قابو میں آیا تو میں ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے کام میں جت گیا۔

کہتے ہیں ناپوی اور کامیابی کے درمیان ایک ہال کے برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ ہال سے اس طرف کھڑا آدمی مایوس ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں وہ ٹل ہو گیا لیکن جو عزم اور سختی افراد اپنا قدم نکال کر اس ہال کو پھیلا تک جاتے ہیں دوسری جانب قدم پڑتے ہی کامیابی ان کی بابوی کے لیے سر بخود ہو جاتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کسی بھی مرحلے پر حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اگر آپ متعقد سے چپک کر سرتوڑ کوشش کرتے رہیں تو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔

میں بھی دھن کا ٹکا اور گن کا سچا تھا۔ جب تک ٹیکنالوجی میرے ہاتھ نہیں آئی تھی میں بے سمت اپنی ہی کوشش کر رہا تھا لیکن چپک فورن پوٹی نے مجھے کام کا جو کتنے سمجھایا تھا اس نے میری مشکل کو آسان بنا دیا تھا۔

میں نے بھر پور عزم اور پختہ ارادے کے ساتھ ایک مرتبہ بھر ساحل کو ٹرائی کیا اور اس دفعہ بڑے والہانہ انداز میں کامیابی نے میرا استقبال کیا۔ ساحل کے نقش و نگار کو ذہن میں اجاگر کرنے سے پہلے ہی میں نے سانس کو جسم کے باہر روک لیا تھا۔ اس بار پہلی ہی کوشش میں میں اس کے ماحول میں ٹپک گیا۔

وہ اسی بیڑوم میں موجود تھی جہاں میں نے آخری کامیاب کوشش کے نتیجے میں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جاگ رہی تھی تاہم بیڑ پر چت لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں مٹی ہوئی تھیں اور وہ بیڑوم کی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اسراٹکل کی مقامی گھڑیوں میں سے بہر کے پانچ بجے تھے۔ میں ساحل کے ماحول پر غور کر رہا تھا کہ مجھے اپنے دماغ میں غن کا احساس ہوا۔ میرے زیادہ سے زیادہ جسم سے باہر سانس روکنے کی مدت پوری ہو رہی تھی۔ اس موقع پر اچانک مجھے ایک نیا تجربہ کرنے کی سوجھی۔

میں نے ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ سانس لینے کی کوشش کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لینڈنگ سے پہلے کسی بھی ہوائی جہاز کے مسافروں کو محسوس ہوتا ہے۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ میں اس وقت جس طیارے میں سفر کر رہا تھا اس نے ڈیسینڈنگ

شروع کر دی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ہڑباز آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلتے ہی میری پریشانی دور ہو گئی۔ طیارے کی پرواز متوازن اور ہموار تھی۔ اکثر مسافر سونے کی تاہلی گر رہے تھے۔ گویا وہ طیارہ اس وقت لینڈنگ کر رہا تھا کہ نہ ہی دور دور تک اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ میں ان لحاظات میں جس نئے تجربے سے گزر رہا تھا ڈراغور کیا تو اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

دم گھٹنے کی کیفیت کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے میں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش کے نتیجے میں وہ ساری گڑبڑ بجلی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا میرا تجربہ ابھی پختہ نہیں ہوا تھا۔ میرے لیے مزید اور حریف پریشانی ضروری تھی تاہم اس حقیقت نے میرے ذہن و دل کو صدمہ سے بھر دیا کہ چپک فو کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں اپنی ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا اور اس سے بھی کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

سانس روک کر کسی کے ماحول میں پہنچنے کا معاملہ صرف ساحل تک محدود تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں پرانا بیم کی زیادہ سے زیادہ پریکٹس کر سکتا تھا۔ لی یان کے ساتھ چونکہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں اس کے خلاف خط و کذب میں لا رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہیں اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

لہا سا (جنت) کے مقامی وقت کے مطابق وہاں رات کے نو بج رہے ہوں گے۔ میں نے تصور کی آنکھ سے لی یان ایک بالکل مختلف کمرے میں پایا۔ یہ کمرہ مربع شکل کا ایک قدرے چھوٹا کمرہ تھا جس میں دو بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک بستر پر فلپائی جینس لی یان لیٹی تھی اور دوسرے بستر پر کوئی نوجوان عورت موجود تھی۔ وہ دونوں خاموش آنکھیں بند کیے اپنے بستر پر پڑی تھیں۔ صاف نظر آتا تھا وہ سونے کی کوڑ میں ہیں یا سوئیں ہیں۔ جن سیان کا دور دور تک کوئی نشانہ نہیں تھا۔ میں توڑی دیر تک اس کمرے کے سمیر اور خانہ دار ماحول میں موجود رہا پھر آنکھیں کھول کر تھوڑی سی آواز کر دیا۔ اسی لمحے ایک خیال بڑی سرعت کے ساتھ میرا ذہن سے گزرا۔

مجھے جن سیان کی خبر لینا چاہی! یہ خیال آتے ہی میں نے تیسری آنکھ کی چھلانگ لگا دی اور پلک جھپکتے میں جن سیان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اگلے لمحے مجھے واپسی کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ جن سیان اس وقت

مجھ جس حالت میں دکھائی دیا اسے دیکھنا اور بیان کرنا افلاقیات کے معانی ہے۔ لگتا تھا چپک فو نے میری نگرانی کا بیڑوم سب کر جن سیان کو بھی عارضی جبری آزمائش سے گزارا تھا۔ روزگار کی غرض سے بیرون ملک قیام پذیر افراد دو بار سال بعد جب چند روز کی چھٹی پر اپنے ملک واپس آتے ہیں تو ان کے روپے میں بھی ایسی ہی تندی اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے جوش اور محبت سے پیش آتے ہیں!

جن سیان کے ماحول سے نکلا تو مجھے چپک فو کی یاد آئی۔ دل میں خواہش بجلی کی اگر میں اس وقت تھوڑی سی فٹل چوکھا تک نیپل میں محوم پھر رہا ہوں تو کیوں نہ وہاں کرنا دھڑا چیف لاما چپک فورن پوٹی کو بھی ایک نگاہ جھانک لوں!

میں نے آنکھیں بند کر کے چپک فو کے ماحول میں چھلانگ لگا لی لیکن اگلے ہی لمحے تصور کا پرندہ پھر اڑا میں ہوں ہو گیا۔ میں نے تھوڑے وقت سے ایک مرتبہ پھر فرانی کی اور نتیجہ صفر کے برابر آد ہوا۔ اس کے بعد میں نے چپک فو کی بتائی ہوئی ترکیب اسی پر آزمانے کا ارادہ کیا اور جسم سے باہر سانس روک کر اس کے ماحول کو اپنی دسترس میں لینے کی کوشش کی۔

سانس ٹپ ہو گئی لیکن رگن پوٹی کا ماحول میری تھوڑی سی گرفت میں نہ آ سکا۔ اس نا کامیابی سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ دماغی تھری کی استانی خالہ ہوتی ہے۔ وہ اسے ہزار ہر مکانے کے باوجود بھی یہ نہیں سمجھتا کہ درخت پر کیسے چڑھا جاتا ہے۔ چپک فو نے مجھے ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کا گرتو سمجھا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اس کے ماحول کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ یا دشواری محسوس کروں تو اسے کیوں رکھ دوں کر سکتا ہوں!

اچانک میرا ذہن سوچنے لگا۔ یہ میں کس قسم کی باتوں میں پڑ کر اپنے ذہن کو الجھا رہا ہوں۔ میں جتنے خاص نشن کے لیے لگتا ہوں اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں ہر طرف سے مہیاں بنا کر صرف اور صرف اپنے ”کاز“ پر توجہ دوں۔ میرا کاز نہ صرف تمام معاملات سے زیادہ اہم ہے۔

میں یہ محسوس کیے بتاؤ کہ سا کہ یہ خیالات میری مرضی سے ذہن میں نہیں آتے بلکہ ان کی تحریک کسی اور سمت سے ہے۔ اور اس سمت کا تعین کرنے میں بھی مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اور کھانگ نیپل کا چیف لاما اس وقت میرے ذہن سے جھپٹ کر رہا تھا۔ میں ایک خاص

زاویے سے چونک اس کے بارے میں سوچ رہا تھا لہذا وہ نہیں چاہتا تھا میں اس ڈگر پر سوچنا چلا جاؤں۔ ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ چپک فو دیگر ماورائی علوم کے علاوہ نیلی بیٹھی بھی جانتا تھا!

میرے ذہن میں ڈالے جانے والے خیالات اگرچہ چپک فو کے رہن منت تھے لیکن ذاتی طور پر میں بھی ان سے اتفاق کرتا تھا اس لیے ذہن سے ہر قسم کی سوچ کو جھٹک کر میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پانچ گھنٹے طیارے سے نکلنے کے بعد زندگی کے کون کون سے ہنگاموں سے میرا واسطہ پڑتا اس لیے عقل مند کی کا تقاضا یہی تھا کہ جتنا بھی وقت ہاتھ آ رہا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ نیند پوری کر لی جائے۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے چند لمحات بعد میں گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

ملانیشیا ازلانٹر کے طیارے نے مقررہ وقت پر لینڈنگ کی۔

مسٹر ہیرالڈ تھامس میرے استقبال کے لیے ائر پورٹ پر موجود تھا۔ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک اپارٹمنٹ میں لے آیا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ لندن کے ٹرسکون اور پوٹ علاقے میں واقع تھا۔ اس اپارٹمنٹ میں پہلے سے کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر آنے کے بعد ہیرالڈ تھامس نے مجھے شنگ روم میں بٹھایا اور فون پر کسی سے رابطہ کر کے اسے مختلف قسم کی ہدایات دیتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

”مسٹر ویدان!“ اس نے مجھے میرے اصل نام سے پکارا۔ اس اپارٹمنٹ میں تمہیں سات سے آٹھ گھنٹے گزارنا ہیں۔ اس دوران میں تمہیں بہت سے کام کرنا ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد اصلی یوسف الظاہری اپنی گھر فریڈمونیہ کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔ تم ان دونوں سے کپ شپ کر کے اپنے ذہن میں موجود الجھنوں اور سوالات کو حل کر سکتے ہو۔ اس کے بعد میک اپ کا ماہر ایک شخص تمہیں یوسف الظاہری بنائے گا۔ وہ شخص میرے لیے انتہائی قابل اعتماد ہے۔ تمہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ تمہارے اور اصلی یوسف الظاہری کے جوش میں تھوڑا فرق ہے لیکن خیر اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیا جائے گا۔ وہ ایک لمحے کو توقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں بہت مصروف رہتا ہوں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ البتہ جب تم ائر پورٹ کے لیے روانہ ہونے

والے ہو گئے تو میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں خود تم دونوں کو سی آف کرنے جاؤں گا۔ تمہارے ذہن میں اگر کوئی الجھن ہو تو بتاؤ؟“

”مسٹر تھامس! الجھن تو کوئی نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”صرف اتنا بتا دیں کہ میرے اس مشن کے دوران میں یوسف الظاہری کہاں رہے گا کیسی اصلی یوسف الظاہری؟“

”شاید تمہیں چیف لاما نے بتایا ہو کہ یوسف الظاہری سے میرے گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔“ وہ بڑے رसान سے بولا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔

”میں یوسف الظاہری سے جو بھی کہہ دوں گا وہ انکار نہیں کرے گا۔ تمہارے مشن کے دوران میں وہ یہیں لندن ہی میں قیام کرے گا البتہ میری کوشش یہ ہوگی کہ وہ منظر عام پر آنے کی کم سے کم کوشش کرے۔ اسے زیادہ وقت گھر کے اندر گزارنا ہوگا۔ میں تمہارے ذہن میں موجود شدات کو سمجھ رہا ہوں اسی لیے یہ وضاحت کر دی ہے۔ اب تو تم مطمئن ہو گئے ہو گے؟“

میں نے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ متعلقہ معاملات کے بارے میں مجھے چھوٹی بڑی اہم باتیں بتانے لگا۔ ان میں سے زیادہ تر سکتے میرے لیے نہایت ہی مفید تھے۔

ہیرالڈ تھامس کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی چلت پاتی جاتی تھی اور انداز پر دیکھ کر جیسا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ ایک نفیس اور وضع دار شخص تھا۔ اس کی شخصیت اور دراز قامتی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ ہالی ووڈ کے اداکار شان کوکری سے بڑی گہری مشابہت رکھتا تھا۔

میں ایک طرف تو ہیرالڈ تھامس کی باتوں کے جواب میں ”ہو ہاں“ کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی دوسری جانب جسم سے باہر سانس روکنے کی پریکٹس بھی جاری تھی۔ چنگ فو نے مجھے ایسا مفید نکتہ بتایا تھا کہ مجھے اچھے پیچھے کی ایک تفریحی مصروفیت تھامس آگئی تھی اور شغل شغل کے اس کام میں میں بہت انجوائے کر رہا تھا۔

ہم باتوں میں مصروف ہی تھے کہ ایک شخص اس اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ وہ ایک پتہ قامت اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ ہیرالڈ تھامس نے اس کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ مسٹر جوزف تھا اور مجھے وہ جان سکتا تھا۔ یوسف الظاہری بتانے آیا تھا۔ میک اپ کا باہر جوزف ایک خاموش طبع اور

سنجیدہ شخص تھا۔

جوزف کی آمد پر ہیرالڈ تھامس سنگ روم سے اٹھ کر اپارٹمنٹ کے کسی اندرونی کمرے کی جانب چلا گیا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ ایک چھوٹا سا بریف کیس نما ہاسک ہاتھوں میں اٹھائے دوبارہ سنگ روم میں نمودار ہوا۔ اس دوران میں میرے اور جوزف کے درمیان ایک جملے کا تبادلہ بھی نہ ہوا۔ ہم دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ میں نہیں جانتا تھا جوزف اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا البتہ میرا کام ایسے مواقع پر صرف اور صرف اتنا رہ گیا تھا کہ سانس روکنے کی زیادہ سے زیادہ پریکٹس کروں۔

دیسے یہ بندہ جوزف مجھے بڑا عجیب لگا تھا۔ جب تھامس اس کا تعارف کر رہا تھا تو اس وقت بھی اس بندہ خدا نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا کرنے کی زحمت کرنا نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہیں وہ گنگناہوا! ہیرالڈ تھامس نے وہ چھوٹا سا بریف کیس کھول لیا اور اس میں سے چند تصاویر باہر نکالیں۔ وہ بڑے سائز میں بنی ہوئی ایک ہی شخص کی تصویریں تھیں۔ تھامس نے وہ تصاویر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ جوزف کی موجودگی کے باعث اس نے مجھے نام سے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”یہ یوسف الظاہری کے فوٹو گراف ہیں!“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان فوٹو گراف کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ تمام تصاویر کھوپڑی میں اور مختلف زاویوں سے بنائی گئی تھیں۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ یوسف الظاہری کے چہرے کی ہڈیوں کی ساخت بڑی حد تک مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ مسٹر ہیرالڈ تھامس نے بہت سوچ سمجھ کر یوسف الظاہری کا انتخاب کیا تھا۔ جوزف کو مجھے یوسف الظاہری بناتے ہوئے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھ سے وہ فوٹو گراف لے کر تھامس نے جوزف کو دے دیے اور کہا ”تم ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے اپنی تیاری شروع کر دو۔ تموزی ہی دیر میں یہ شخص یہاں پہنچنے والا ہے۔“

جوزف نے چٹا یک بھر کی زبان کو حرکت دینے کے بجائے تین سیر کے سر کو اثبات میں جنبش دی اور واقعی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی اس ”ادا“ نے میرے اس یقین کو اور بھی پختہ کر دیا کہ وہ قوت کیانی سے محروم ہے! تموزی دیر کے بعد اصلی یوسف الظاہری بھی اس اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا اور اس بات نے مجھے چونکا دیا۔ ہیرالڈ تھامس مجھے بتا چکا تھا وہ اپنی گرل فرینڈ

مورف کے ساتھ آنے والا ہے۔ میں نے سوالیہ نظر سے تھامس کو دیکھا لیکن کسی قسم کا کوئی استفسار نہ کیا۔ وہ میرے ذہن کی الجھن کو فوراً سمجھ گیا میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے سلی انداز میں گردن ہلائی اور یوسف الظاہری سے گھر پھر کرنے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد تھامس نے انکشاف انجینر لہجے میں مجھے بتایا ”مورف کو یہاں پہنچنے میں دس تین گھنٹے لگیں گے۔ اس دوران میں جوزف تمہارے چہرے پر کام مکمل کر لے گا۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے“ میں اس حوالے سے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔“

تھامس نے مجھے اور یوسف الظاہری کو الگ کمرے میں بلایا اور ہم سے نہایت ہی اہم امور پر گفتگو کی۔ اس نے مجھے یوسف کی عادات و اطوار نشست و برخاست اور دیگر رویوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور آخر میں کہا۔

”وہ جان! میں تمہیں یوسف کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تم اس سے کپ شپ لگاؤ اور تمہارے ذہن میں اگر کسی بھی قسم کا سوال ابھرے تو اس سے ضرور پوچھو۔ یوسف میرا قابل اعتماد دوست ہے۔ یہ تمہیں کسی بھی حوالے سے مایوس نہیں کرے گا۔ میں اسی وقت لوٹوں گا جب تمہاری یہاں سے رخصتی میں چند منٹ باقی رہ جائیں گے۔ اوکے!“

”اوکے!“ میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا ”لیکن میرے ذہن میں بعض ایسے سوال ہیں جن کے جوابات صرف آپ صرف تم ہی دے سکتے ہو! بعد میں اتنا وقت نہیں مل سکے گا۔“

”ہاں ہاں پوچھو۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”میں تمہاری سلی کرنے کے بعد ہی روانہ ہوں گا۔“ میں نے پوچھا ”کیا مورف کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا گیا ہے؟“

”میں تمہارے سوال کی تک پہنچ گیا ہوں۔“ تھامس نے آہستگی سے سر کو اثباتی جنبش دی ”مورف اور یوسف میرے لیے اتنے ہی قابل بھروسہ ہیں جیسے تم چنگ فو کے لیے لڑا نہیں کسی بھی حوالے سے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ میرے گھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”مورف کو میں نے اس سلسلے میں مکمل بریفنگ دے دی ہے کہ اسے ایک ڈی یوسف الظاہری کے ہمراہ لندن سے مصر اور مصر سے اسرائیل تک کون سا رول ملے گا۔ وہ بہت ہی حساس لڑکی ہے۔ مجھے امید ہے وہ اپنے کردار کو بڑی

خوبی سے نبھالے گی۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہی بتا دوں کہ مورف جیسا خاص امر دو بول اور سمجھتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کیا واقعی؟“ میں نے شدت حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

وہ بولا ”ہاں واقعی۔۔۔ لیکن یوسف الظاہری کی حیثیت میں تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ اردو زبان سے نااہل ہے۔ ہنزہ بولی سے مطلق طور پر ناواقف ہے۔ مورف اردو کا استعمال جانتی ہے۔ لہذا جب بھی تمہیں مورف سے اردو میں بات کرنا ہو تو یہ ضرور دیکھ لینا کہ یوسف الظاہری کا کوئی جاننے والا آس پاس نہ ہو۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تم یوسف سے تبادلہ خیالات کرو۔ یہ تمہیں اپنے اور مورف کے بارے میں تفصیلاً بتا دے گا۔“

”تبادلہ خیالات تو میں کروں گا ہی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”ابھی تم نے یوسف کے جاننے والوں کا ذکر کیا ہے اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا ہے۔“

میں نے گھر کو متوقف ہوا تو ہیرالڈ تھامس گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں کہا ”چنگ فو نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر چنگ فو کا قہرہ میں مجھے یوسف کے ایک دوست السید مبارک الحسنی سے ملنا ہوگا جو کسی فور ایڈ ٹرپ ٹرپول پٹی میں کام کرتا ہے۔ غالباً مذکورہ ٹرپول پٹی کا نام ”کامنٹی“ ہے!“

”ہاں۔ اس پٹی کا نام کامنٹی ہی ہے۔“ تھامس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا ”کیا السید مبارک الحسنی یہ بات جانتا ہے کہ یوسف الظاہری کے روپ میں کوئی اور شخص اس سے ملنے آئے گا؟“

”نہیں!“ تھامس نے دو ٹوک انداز میں اپنے سر کو جنبش دی ”مبارک الحسنی سے ذیل کرتے ہوئے تمہیں پورے اعتماد کے ساتھ یوسف کی کاپی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں یوسف تمہیں ضروری بریفنگ دے گا۔ میرے خیال میں تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا!“

یوسف الظاہری نے کہا ”تھامس! تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں وہ جان کو تمام ضروری باتیں سمجھا دوں گا۔“

”ایک آخری سوال!“ میں نے ہاتھ کھڑا کر کے ہوئے

ڈراما، انداز میں کہا۔ یوسف اور تھامس متوجہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے تھامس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا، ”کیا یہ جوزف فوت کو پائی سے محروم ہے؟“ تھامس نے زرب لب مسکرائے لگا پھر بولا، ”جوزف ایک سچا ن کار ہے ابھی جب وہ تمہارے چہرے پر کام کرے گا تو تمہیں اس کے فن کا بے غولی اندازہ ہو جائے گا اور..... یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہوئی کہ ایک اور جیل آرٹسٹ لازماً موڈی ہوتا ہے۔ وہ خود کو فن کا خدا سمجھتا ہے یہی معاملہ جوزف کا بھی ہے۔ اکثر فن کار بد مزاج ہوتے ہیں اور یہ بد مزاجی مختلف زاویوں سے ممکن ہے۔ ہر آرٹسٹ کا اپنا منفرد زاویہ ہوتا ہے۔ جوزف کا موڈ دھجرجھج اور بد مزاجی ”چپ“ میں وصل مئی..... ایک مسلسل چپ بہت ہی کم لوگوں نے اسے بولتے ہوئے سنا ہوگا۔“ وہ تھوڑا متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جوزف کچھ وقت تمہارے ساتھ بھی گزارے گا۔ ممکن ہے تم بھی ان خوش قسمت افراد کی فہرست میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے جوزف کی زبان کو زحمت فرماتے دیکھا ہے!“

”مجھے اس بات کی کوئی امید تو دکھائی نہیں دے رہی!“

میں نے سچے دل سے کہا۔

اس کے بعد ہیرالڈ تھامس مجھے یوسف الظاہری کے حوالے کر کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہو گیا۔

یوسف الظاہری قریب دو قعات میں مجھ سے آدھ پون اچھ کم ہوگا البتہ اس کا وزن مجھ سے کم از کم پندرہ پاؤنڈ زیادہ تھا۔ اس کا جسم قدرے مائل برفری تھا لیکن یہ ریتا نما یاں فرق نہیں تھا تو پہلی نظر میں آکھ میں کلک جائے۔ اس کی عمر مجھ سے آٹھ دس سال زیادہ ہی تھی لیکن ظاہر ہے یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔

ہم دونوں میک اپ ماسٹر جوزف کے پاس پہنچ گئے اور اس نے یوسف الظاہری کی موجودی میں مجھے یوسف الظاہری بنانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس کے ہاتھ مسلسل مصروف عمل رہے مگر اس بندۂ خدا نے منہ سے ایک لفظ ادا کرنے نہیں دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا اس نے منہ میں ابھی خاصی مہکتیاں بھر کر چپ سا دھ لی ہو۔ بہت زیادہ پان کھانے والوں کے ساتھ کبھی کم دیش ایسی ہی صورت حال پیش آتی ہے ان کا منہ ہمہ وقت پان کے مٹو بے سے بھر رہا ہوتا ہے لیکن انہیں ضرور ہے کہ وہ دوسروں کے سوالات کے جواب میں بے شکم ”اوں آں“ ضرور کرتے رہتے ہیں۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کاری محنت کے بعد جوزف نے مجھے

یوسف الظاہری بنادیا۔ آنکھوں کا رنگ نیچے کرنے کے لیے کافیٹ لیس استعمال کیے گئے اور میرے بالوں کے کھڑکھڑ کر کے اسے نئے اسٹائل سے روشناس کرایا گیا۔ اصل یوسف الظاہری کے بال ”اسپاگ اسٹائل“ میں سیٹ تھے۔ میرا مختصر بالوں میں نیل لگا کر انہیں بھی مذکورہ اسٹائل میں سیٹ کیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد جوزف خاموشی سے اٹھا اور ہمیں ”ٹانگا“ کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں یوسف الظاہری کے ساتھ سٹنگ روم میں بیٹھ کر ان امور پر گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بڑی وضاحت سے مجھے بتایا کہ مصر (قاہرہ) میں یوسف الظاہری کی حیثیت سے مجھے کن کن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا۔ اس دوران میں میں اس کے بعد دیکھے انداز و اطوار اور چہرے کے اہر چڑھاؤ کا بخور چاڑھ لینے کے بعد انہیں ذہن نشین کر چلا گیا۔ مجھے اس کے روپ میں ایک اہم کردار ادا کرنا تھا اس لیے بھی کبھی مشاہدے کی ضرورت تھی۔ یوسف نے مجھے ہر حوالے سے مطمئن کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہیرالڈ تھامس لوٹ آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے قبل از وقت اپنی آمد کی وضاحت کر دی، ”میں جس ضروری کام سے گیا تھا وہ کچھ جلدی ٹا نمٹ گیا اس لیے سوچا تم کو لوگوں کے پاس آجاتا ہوں۔“

وہ ہمارے اوپر سے اپارٹمنٹ میں لگا دوڑاتے ہوئے تشویش ناک انداز میں متحضر ہوا۔

”صوفیہ دکھائی نہیں دے رہی۔ کیا وہ ابھی تک پہنچی نہیں؟“

ہم نے اسے بتایا کہ وہ واقعی نہیں پہنچی اور ہم بھی بڑی شدت سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

”بتائیں یہ کہاں رہ گئی؟“ وہ اپنی جیب میں سے تل فون برآمد کرتے ہوئے بولا، ”میں اسے موبائل پر چیک کرنا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد تھامس کا صوفیہ سے رابطہ ہو گیا۔ مختصر مگھٹگو کے بعد تھامس نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا اور ہادی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ”وہیں منٹ میں پہنچ رہی ہے۔“

ہم نے..... خصوصاً میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صوفیہ کو میرے ساتھ لندن سے قاہرہ اور قاہرہ سے اسرائیل تک سفر کرتا تھا اور ہماری دعا کی میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔

یوسف الظاہری نے کہا، ”مجھے ایک شرارت سوچ رہی ہے۔ اگر آپ دونوں میرا ساتھ دینے کو تیار ہو تو صوفیہ کو بے

وقت بنایا جا سکتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا، ”یہ دراصل اس کے لیے ایک امتحان بھی ہوگا!“

”کیونکر تمہارے ذہن میں ایسا کون سا آئیڈیا آیا ہے؟“

تھامس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا، ”اس وقت دھدان بھی یوسف الظاہری بنا بیٹھا ہے۔ صوفیہ کے سامنے یہ سوال رکھا جائے کہ ان..... یعنی ہم میں سے اسکی یوسف الظاہری کون ہے!“

”آئیڈیا اچھا اور خاصا تفریحی ہے۔“ میں نے سراپے والے انداز میں کہا۔ اس دوران میں ہمارے درمیان ابھی خاصی بے تکلفی قائم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی بات کو دراز کرتے ہوئے کہا، ”لیکن تمہارے خیال میں وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو جائے گا یا نا کام؟“

”مجھے پورا یقین ہے مجھے تو وہ فوراً ہی شناخت کر لے گی۔“ وہ پُر توفیق لہجے میں بولا۔

میں نے کہا، ”یوسف! میرے ذہن میں تمہارے آئیڈیا سے بھی کہیں اور نیا آئیڈیا آیا ہے۔ اگر تم لوگ میرے آئیڈیا کو آزمانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو صوفیہ کے ساتھ ساتھ میری کارکردگی کا بھی امتحان ہو جائے گا۔ آپ اسے ایک ٹیسٹ کیس سمجھ لو۔“

”تمہارے ذہن میں ایسا کون سا اچھا آئیڈیا لکھایا ہے؟“ یوسف نے مجھ سے پوچھا۔

ہیرالڈ تھامس بڑی دلچسپی سے ہمارے باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اضطرابی لہجے میں کہا، ”تم کو لوگوں کو جو کچھ بھی کرنا ہے فوراً کر ڈالو۔ صوفیہ کے یہاں پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔“

میں یوسف کی جانب متوجہ ہو گیا اور پوچھا، ”کیا صوفیہ جانتی ہے کہ تم نے یہ لباس پہن رکھا ہے؟“ بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے پہناوے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

”نہیں!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی، ”ہمیں ایک ساتھ آنا ضرور تھا لیکن صوفیہ میرے ڈریس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میرے پاس آنے سے پہلے سے اس کے اکچھیل میں تل تھوڑی تبدیلی آچکی تھی۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا، ”جب صوفیہ اس اپارٹمنٹ کی کھنک بجائے گی تو میں اسے ریسیو کرنے کے لیے دروازے تک جاؤں گا۔“ میں نے اپنے آئیڈیا کی تفصیل سے انہیں آگاہ کیا، ”میں اس کے سامنے پہنچ کر یہی ظاہر کروں گا کہ اصلی

یوسف الظاہری ہوں ہمارے پاس امتحان سے گزرنے کے لیے صرف اتنی مہلت ہوگی جب تک ہم داخلی دروازے سے اس سٹنگ روم تک پہنچیں۔ مجھے خود کو یوسف الظاہری ثابت کرنے کے لیے اپنی ادا کارانہ صلاحیتوں کو آزمانا ہوگا اور صوفیہ کی محنت کا امتحان ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک اپنے ہوائے فریڈ کو پہچانتی ہے!“

”تم بہت عمدہ آئیڈیا لالے ہو دھدان!“ تھامس نے کہا، ”میں نے بھی ڈریس کے فرق ہی سے تم دونوں کو الگ الگ شناخت کیا ہے ورنہ..... جوزف بڑے کمال کا میک اپ کر کے گیا ہے۔“

میں نے جلدی سے انداز میں کہا، ”جوزف بڑے کمال کا چپ شاہ ہے..... واقعی!“

تھامس نے یوسف الظاہری سے پوچھا، ”کیوں یوسف! کیا تم اس آئیڈیا پر عمل کرنے کو تیار ہو؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا، ”دھدان کا آئیڈیا تو بلاشبہ نہایت ہی عمدہ ہے لیکن اس میں ایک ٹیکنیکل خرابی موجود ہے۔“

”مثلاً کون سی خرابی؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے بتایا، ”اس امتحان میں حصہ لینے والے کنفیسنٹ توازن میں نہیں ہیں۔“

”توازن میں نہیں ہیں کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا، ”صوفیہ نہیں جانتی..... یا یوں سمجھ لیں اسے یہ بات نہیں بتائی گئی کہ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اسے ایک آزمائش سے دوچار ہونا ہے جب کہ دھدان کو امتحان والی بات پہلے سے معلوم ہے لہذا توازن برابر نہیں۔ کامیابی کے حوالے سے دھدان کا پلڑا پہلے سے جھکا ہوا ہے۔“

”تم نے ذہانت سے معمولتہ اٹھایا ہے۔“ میں نے سانس کی نظر سے یوسف الظاہری کو دیکھا، ”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی یہ مقابلہ برابری کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔“

”تو اس کا مطلب ہے اب یہ ٹیسٹ نہیں ہو رہا؟“ تھامس نے ہم دونوں سے پوچھا۔

”ٹیسٹ تو ضرور ہوگا لیکن ذرا مختلف انداز میں!“ میں نے کہا۔

”مختلف انداز کی وضاحت تم کن الفاظ میں کرو گے؟“

تھامس متحضر ہوا۔

میں نے وضاحت کردی "صوفیہ کے آنے پر دروازہ کھولنے میں ہی جاؤں گا اور اس کے سامنے خود کو یوسف الظاہری کی حیثیت سے پیش کروں گا۔ وہ مجھے پہچان پائی ہے یا نہیں مگر میں یہ دیکھنے کی کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی اداکاری میں کس حد تک کامیاب ہوں!"

ان دونوں نے بیک زبان ہو کر کہا "ہاں..... یہ ٹھیک ہے!"

اسی وقت اطلاحی کھنٹی بجنے لگی۔

میں نے سوالیہ نظر سے تھمس اور یوسف الظاہری کی طرف دیکھا۔ تھمس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "وہ جان لگتا ہے، تمہاری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ اٹھو..... اور جا کر صوفیہ کے لیے دروازہ کھول دو"۔

میں خاموشی سے اٹھا اور پورا اعتماد قدموں سے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

اس دوران میں ڈور بیل دوسری مرتبہ کسی کی آمد کی اطلاع دے چکی تھی ان لمحات میں ہم تینوں اپارٹمنٹ میں بیٹھے صوفیہ کی آمد کے منتظر تھے لہذا کانٹول نے فی صدامکان اس بات کا تھا کہ دروازہ کھولنے پر صوفیہ ہی سے لگا ہیں چارہوں گی۔ میں نے ہینڈل کھاکر دروازہ کھول دیا۔ میری نگاہ جس چہرے پر پڑی، اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا لیکن میں نے چہرے کے تاثرات سے اپنی اندرونی کیفیت کو آشکار نہیں ہونے دیا اور یسین یوسف الظاہری کے انداز میں اپنی "گرل فرینڈ" کو بل کر کہا۔

وہ بڑے والہانہ انداز میں زرب مسکرائی اور مکان میں سے نکلے ہوئے تیر کے مانند آکر میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے عقب میں ہاتھ بڑھا کر بیرونی دروازہ بند کر دیا پھر پروٹوکول کے مطابق، دونوں ہاتھوں سے اسے تمام لیا۔ مغربی روایت کے تحت ہم نے ایک "بھر پور" معائنہ کیا پھر وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے ہوئی۔

"کیا مسٹر تھمس اپارٹمنٹ میں موجود ہیں؟"

"سب موجود ہیں.....!" میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

وہ استفساریہ نظر سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی "سب..... یعنی وہ بھی؟"

میں نے اس نازک موقع پر حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور کہا "ہاں۔ شینگ روم میں ہیرالڈ تھمس و جہان کے ساتھ ہی بیٹھا ہے۔ بس، ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے" میں اپنے بارے میں اس کا اشارہ کچھ کیا تھا۔

اس نے اطمینان بھرے انداز میں سرگوشیاں جتنی دی اور قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "سوری! میں یہاں پہنچنے میں کافی لیٹ ہو گئی ہوں" اس کی معذرت سے خانہ پر کی کھنٹی سنی۔

بات ختم کرتے ہی وہ شینگ روم کی سمت قدم اٹھانے لگی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا اور اس کے پیچھے خاموشی سے چل دیا۔ میں گویا، اس کڑے امتحان کے پہلے پرچے میں پوری طرح کامیاب ہو گیا تھا!

صوفیہ پر گناہ بڑے ہی مجھے شدید حیرت اس لیے ہوئی تھی کہ یہاں بھی تھمس نے انتخاب میں اپنی ذہانت کا بھرپور ثبوت مہیا کیا تھا۔ وہ "بنی بانی" ساحل تھی۔ میرے چونکنے کا سبب یہ تھا کہ میں اسے دیکھتے ہی یہ سمجھا کہ وہ ساحل کی بہن ہے۔ بلا ملاقات صوفیہ اور ساحل میں مختلف حوالوں سے گہری مماثلت پائی جاتی تھی۔ قدم قامت، رنگ روپ، وزن، عمر، جسمانی ساخت وغیرہ کے حوالے سے وہ دونوں بہت قریب تھیں۔ اگر تعویذ بہت فرق تھا تو وہ نقش و نگار کا تھا۔ اس زاویے سے صوفیہ لگ جھگ اسی ہی صدر ساحل سے ملتی جلتی تھی۔ اس بنی بنی صمد قنات کو میک اپ کے ذریعے ملا کر صوفیہ کو ساحل یا ساحل کو صوفیہ بنایا جاسکتا تھا۔ صوفیہ کے خدوخال چونکہ کتنی لوگوں سے بہت مماثل تھے لہذا مجھے میک اپ میں زیادہ محنت نہ کرنا پڑی۔ میں تعویذ ہی کی کوشش کر کے، پہ آسانی ساحل کو صوفیہ کا "لک" دے سکتا تھا۔ قاہرہ سے مل ایبب جاتے ہوئے صوفیہ میری ہم نشین ہوتی لیکن جب میں تل ایبب سے یروشلم اور یروشلم سے واپس قاہرہ آتا تو صوفیہ کے روپ میں ساحل میرے ساتھ ہوتی۔ ساحل کی ہمراہی کے تصور نے میرے رگ و پے میں خوش گوار اور نشاط انگیز سستی دوڑا دی۔ میرے وجود کا ایک ایک حصہ ساحل کی خوش بو سے مہک اٹھا۔ وہ ایک ایسا لگی بھاری جو موسم خزاں میں بھی تروتازہ اور شکستہ رہتا ہے!

داخلی دروازے سے شینگ روم اگر چہ دکھائی نہیں دیتا تھا تاہم وہاں تک برائے نام فاصلہ تھا لہذا ہم آگے پیچھے شینگ روم میں پہنچے جہاں اصلی یوسف الظاہری ہیرالڈ تھمس کے ساتھ ایک صوفیہ پر بیٹھا تھا۔ چند لمحات پیش تر میں صوفیہ کو تا چکا تھا کہ شینگ روم میں، میں یعنی و جہان تھمس کے ساتھ موجود ہے لہذا اس کا ٹھکانا لازمی بات تھی۔ وہ استفساریہ نظر سے باری باری تھمس اور اصلی یوسف الظاہری کو دیکھنے لگی پھر اس سے قبل کہ اس کا استعجاب الفاظ کی شکل اختیار کر کے اس کی زبان سے بھل جاتا، میں نے پہ آواز بلند اور دوش کپکپ۔

"صوفیہ! تم نقلی یوسف الظاہری سے تو مل چکی ہو۔ اب اصلی سے بھی علیک سلک کر لو!" بات ختم کرتے ہی میں نے تھمس کے ساتھ بیٹھے ہوئے یوسف الظاہری کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

وہ ایک جھگ سے پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میرے الفاظ نے گویا اس کی سماعت میں ایک خوف ناک دھماکا کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید یسین اور چہرے پر زلزلے ایسے تاثرات تھے۔ وہ کچا بکا مجھے دیکھتی چلی گئی۔

وہ چند لمحات قبل مجھے اپنا ہوا نے فریڈ یوسف الظاہری سمجھ کر بڑے جذباتی انداز میں غصے کیر ہوئی تھی اور وہ نرم و گرم تمام تر تقاضے جمائے تھے جن کی خواہش اور ضرورت وہ اپنے اندر، یوسف الظاہری کے حوالے سے رکھتی تھی لیکن اب اچانک اس پر آشکار ہو رہا تھا، اس نے یوسف الظاہری کے روپ میں کسی انجساز کو گرم جوش پریشان دیا تھا! میری زبان سے اردو کے الفاظ سن کر وہ بہ خوبی سمجھ گئی تھی کہ اسے یوسف الظاہری کے حوالے سے دھوکا ہوا ہے۔ اس کا دھوکا کھا جانا میری کامیابی کا ثبوت تھا لہذا میں نے صوفیہ کو حیران و ابھین زدہ چھوڑ کر یوسف الظاہری سے کہا۔

"یوسف! تمہاری فریڈ صوفیہ کے سامنے تو میری اداکاری بڑی بھرپور اور کامیاب رہی ہے۔ مجھے یقین ہے، دوسری جگہوں پر بھی میں مار نہیں کھادوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے فخریہ انداز میں اپنی بات مکمل کی تو یوسف الظاہری نے سوالیہ نظر سے صوفیہ کو دیکھا اور پوچھا "کیا تم واقعی و جہان کو نہیں پہچان پائی تھیں؟"

"اوہ مائی گاڈ!" اس نے شدت حیرت سے غزالی آنکھیں پھیلانیں پھر قدرے کھسپاٹ آمیز لہجے میں بولی "میں و جہان کو دیکھ کر یہی سمجھی کہ تم ہو" اس کا اشارہ یوسف الظاہری کی طرف تھا۔ "اسی لیے.....!"

صوفیہ نے جھنجپ سے مشابہتامل کے ساتھ جملہ اور حورا چھوڑا تو یوسف الظاہری اس کی ان کی تک پہنچے ہوئے بڑی فراخ دلی سے بولا "اٹ ڈزٹ میٹر۔ و جہان ہمارے مشترک دوست کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ تم اس سے اردو زبان میں بھی کپ شپ لگا سکتی ہو!"

"اوکے!" صوفیہ نے ایک گہری سانس لی اور میری طرف دیکھ کر سستی خیز انداز میں مسکرائے گی۔

جواب میں، میں بھی مسکرا اٹھا۔

یوسف الظاہری سے میں تفصیلی ملاقات کر چکا تھا۔ اس

نے اور ہیرالڈ تھمس نے مجھے تمام اہم امور کے بارے میں بڑی باریک بینی سے سمجھا دیا تھا۔ صوفیہ کی آمد پر مجھے اس سے میٹنگ کا موقع فراہم کیا گیا تاہم کم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ صوفیہ نے شینگ روم اور یوسف الظاہری کا لب و لہجہ گلگت اور جزال کے لوگوں ایسا تھا لہذا وقت کی کمی کے باعث، آسانی کی خاطر میں نے انکسش کی کہ صوفیہ اداکار بنایا کیوں کہ اردو بولتے ہوئے بعض الفاظ اس کے لیے نہ پڑتے اور وہ "سوری" بول کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی اسی طرح جب وہ اردو کے کسی جملے میں ہنزدہ بولی کے تحت الفاظ شامل کر دیتی تو میں اس کا منہ دیکھتا رہتا تھا!

آدمے کھننے کی اسے لی جلی گفت گو میں ہم دونوں نے اس حد تک ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا، اس سستی خیز ڈرامے میں ہمارا ایک ساتھ جتنا رہا تھا۔ ہیرالڈ تھمس نے اسے یہ کردار اچھی خاصی محنت سے ادا کر رکھا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس مشن میں صوفیہ بڑے بھرپور انداز میں میرا ساتھ دینے کی پوزیشن میں ہے۔ وہ خامی مستعد اور ولولہ انگیز لڑکی تھی!

اس یقین نے مجھے ایک سر مطمئن کر دیا کہ صوفیہ اچھی ساتھی ثابت ہوگی۔

☆☆☆

"ایس آئی اے" کے میگا ٹاپ سپیون فورسینوں نے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا۔ سٹاک پور انٹرنیشنل ائیر لائنز کا مذکورہ طیارہ جدید ترین سہولیات سے مزین تھا اور مسافروں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے میں اپنی مثال آپ! مختلف فلکی نشیب و فراز طے کرنے کے بعد پرواز، مموار ہوئی اور طیارے نے جنوب مشرقی کارخ کرتے ہوئے لندن سے قاہرہ کا سفر آغاز کیا تو میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔ میرے مشن کا دوسرا مرحلہ بھی بہ خیر و خوبی گزر گیا تھا۔

میگا ٹاپ کے پیٹ کے اندر، میں اور صوفیہ پہلو بہ پہلو دو سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ ہم دونوں گہرے دوست تھے۔ صوفیہ میرے، یعنی یوسف الظاہری کے ساتھ اس لیے لندن سے قاہرہ جا رہی تھی کہ وہ مصر، اسرائیل اور اردن کی سیر کرنا چاہتی تھی اور میں نے اس کے لیے کامیابی نورا بنڈرپ ٹریول ایجنسی کے تعاون سے اس تقریبی دورے کا بندوبست کرنا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے رول کو ذہنی نشین کر لیا تھا اور تنہائی کے علاوہ صوفیہ نے ہر وقت مجھے یوسف الظاہری یا یوسف کہہ کر مخاطب کرنا تھا، اسی طرح میں اسے صوفیہ یا صوفی کے نام سے پکارتا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”یوسف! میں تمہاری دیر کے لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو تم مجھے جگا دیتا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ”اس کا مطلب ہے، تم سو کر آرام کرنا چاہتی ہو؟“

”میں آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی ”اس دوران میں آنکھ لگ جائے، کیا کہا جاسکتا ہے!“

اس نے آرام وہ نشست کو ایزی بنایا اور اس کی پشت کے سہارے نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اطمینان سے معمور سانس لی۔ اس کا ٹیک ارادہ میرے لیے خاصا مفید ثابت ہونے والا تھا۔ میں خود بھی آنکھیں موند کر مخصوص سرگرمیوں میں مصروف ہونا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اگر صوفیہ جاگ رہی ہوتی تو اس کی جانب سے کسی بھی وقت مداخلت کا خدشہ ہر حال موجود رہتا!

میں لہا سا سے لندن تک ملائی انٹرلائن کے جس طیارے سے سفر کر کے پہنچا تھا اس نے خاصا لمبا اور بے چیدہ روٹ اختیار کر کے مجھے منزل تک پہنچایا تھا۔ راستے میں روس کے اوپر سے گزرتے ہوئے اس نے مین کیوسٹ ممالک میں مختصر قیام بھی کیا تھا جس کے باعث وہ سفر خاصا طویل ہو گیا تھا لیکن سنگا پور انٹرلائن کی موجودہ پرواز براہ راست تھی اور اس طیارے نے جنوب مشرق کی سمت سفر کرتے ہوئے یورپ کے اوپر سے گزر کر لندن سے قاہرہ پہنچا تھا۔ میرے پاس اچھا خاصا وقت تھا۔ اس دوران میں، میں اپنی خفیہ سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکتا تھا۔

میں نے ظاہرہ آنکھیں بند کرتے ہوئے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور دھیرے دھیرے سانس کھینچنے چھوڑنے لگا۔ یہ ایک طرح کی اسوتھ بریدنگ تھی۔ میرے ہاتھ کی اہمیل اور انگریز ہیل کرنے لگا۔ اس عمل نے تن بدن کو فرحت سے بھر دیا۔ چنگ فورن پوشی سے دوسری ملاقات کے بعد سے اب تک میں آٹھ بیٹے سانس کی مشق کرتا چلا آ رہا تھا۔ میری بنیاد یوگا کے حوالے سے چونکہ خاصی مضبوطی لہذا اس میدان میں چیف لاما کی ہدایت پر عمل کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور مسلسل کوشش نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا کہ میں اپنے جسم سے باہر کم دہش دس منٹ تک سانس روکھنے کے قابل ہو گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز اور سرت آمیز کامیابی تھی۔

اس دل خوش کن احساس کے ساتھ میں نے تیسری آنکھ کو زحمت دی اور تصور میں اپنی دوست لی یان کے خدو خال کو

اجاگر کیا۔ لی یان کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سانس روکنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ لی یان لہا سا کے کانگرا پورٹ پر مجھے الوداع کہنے آئی تھی۔ میں اس سے چند روز کے لیے پھنزر رہا تھا لیکن اس کی حالت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے یہ جدائی خدا خواستہ ابدی جدائی ہو۔ ان لحاظ میں لی یان کا دل طول، آنکھیں نم اور جذبات کی ندی باڑ پر آئی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے والہانہ اور دل ربا نہ انداز میں مجھے رخصت کیا تھا۔ اس کی وہ رخصتی وارنگی میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

میں لی یان کے جذبات اور خواہشات کی تک پہنچ چکا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ مجھ سے کس بات کی متقاضی ہے۔ میں اس کے ارمانوں کو بے خونی سمجھتا تھا لیکن اپنی جگہ میں بھی مجبور تھا۔ میری منزل کوئی اور تھی، میں لی یان کی منزل نہیں بن سکتا تھا۔ ہاں البتہ، اس کا خیال رکھنا مجھ پر فرض تھا۔ اور میں نے اب تک بڑے بھرپور انداز میں اس کا خیال رکھا تھا۔ آئندہ بھی میرا ارادہ یہی تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دوں گا، مجھ سے جو بن پڑا، اس کے لیے ضرور کروں گا!

میں نے لہا سے روانہ ہونے کے بعد، طیارے کے اندر رہتے ہوئے تھڑکی کے توسط سے اس کی خبر گیری کی تھی اور وہ مجھے کسی تنگ کمرے میں، ایک بستر پر سولی ہوئی نظر آئی تھی۔ اس مرتبہ جو میں نے اس کے ماحول میں انٹری دی تو وہ مجھے گہری نیند میں ملی۔ اس کے برابر بچے ہوئے دوسرے بستر پر وہ جتنی عورت بھی موجود تھی جسے میں نے پہلے بھی اس کمرے میں دیکھا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ جتنی عورت درحقیقت لی یان کی نگران تھی جیسے چند روز پہلے تک جن سیان میرا اور لی یان کا نگران تھا!

تبت کے مقامی وقت کے مطابق، ان لحاظ میں رات کے کم دہش دس بج رہے تھے۔ جو کھانگ ٹیمپل میں شام دھڑ کا ”آغاز“ قدرے جلدی ہو جاتا تھا اس لیے کہا گیا جاسکتا تھا، لی یان اس وقت گہری نیند میں ہوگی۔ یہاں شام دھڑ کے آغاز سے مردان اوقات سے متعلق معمولات سے ہے۔ میں نے ایک بھر پور نظری یان پر ڈالی اور اس کے ماحول سے نکل آیا۔

اس کے بعد میں نے کچھ بعد دیگرے جن سیان اور چنگ فو کے ماحول میں جھانکنے کی سعی کی۔ چنگ فو کے سلسلے میں اس مرتبہ بھی مجھے حسب معمول ناکامیابی ہوئی البتہ، جن سیان کی مراقبہ کی سی کیفیت میں پایا گیا۔ وہ ٹیمپل کی خاموشی



اور تنہائی میں کوئی نہایت ہی خاص الخاص مشق میں مصروف تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اس کے ماحول سے باہر آگیا۔

میں نے یہ دستور آکھیں بند رکھتے ہوئے گہری گہری چند سانسیں لیں اور اپنی رگ جال کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری اس سب سے بڑی کمزوری کو ربی موٹے ہاتھن نے اپنے خون آشام پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اب تک میری دسترس سے دور رہی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا، وہ دن دور نہیں جب میں ربی کا وہ عالم اور سفاک پنجہ توڑ کر اپنی سائل کو اس کی نخوس گرفت میں سے آزاد کرالوں گا۔ ربی نے میری سائل کو تل ایپ کے کسی گھر میں مقید کر رکھا تھا اور مجھے اسی قید خانے تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ اور اس رسائی کے لیے میں ہر دھڑکی بازی لگانے کو تیار بیٹھا تھا۔ چیف لامانے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتا دیا تھا کہ یہ آخری موقع ہے! میں اس آخری موقع کو اپنی جان کی قیمت پر بھی گوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس موقع کو ضائع کرنا زندگی بھر کے لیے سائل سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا اور میں اس عظیم زیاں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ربی موٹے ہاتھن کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا حلق سوکھنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے کانٹوں بھری جھاڑی کو میرے حلق میں زبردستی غولس دیا ہو۔ وہ شخص میرے لیے اتنا ہی قابلِ نفرت نہیں تھا۔ اس سفاک شخص نے میری روح پر اتنے چرے لگائے تھے کہ میں شرمگاہی بھول بیٹھا تھا۔ ربی نے مجھ پر ان گنت "احسان" کر رکھے تھے۔ میں اس کا لاکھوں، کروڑوں کا "مقروض" تھا۔ یہ قرض سکہ رائج الوقت کی شکل میں نہیں بلکہ میرے احساس پر برائے جانے والے ظلم و ستم کے کوڑوں کی صورت میں تھا اور..... مجھے اس قرض کی ایک ایک "بائی" سودور و سودول کرنا تھی!

ربی موٹے ہاتھن کی تل یاد نے میرے ذہن ہرے کر دیے اور اس کی ایک ایک دردندگی مجھے ستانے لگی۔ میں نے اس شخص کے ہاتھوں جتنا نقصان اٹھایا تھا اس کا تصور بھی مجھے بے چین کر کے رکھ دیتا تھا۔ یہ بے چینی اسی وقت ختم ہو سکتی تھی جب اس سودی کی گردن میرے ہاتھ میں ہوتی اور میں اس کی گردن پر ہاتھوں کا شنبہ کس کر اس سے ایک ایک زیادتی کا حساب لیتا، وہ حساب جو طوالت کے اعتبار سے میرے سابق تمام دشمنوں کا ریکارڈ توڑ چکا تھا۔

ربی کے بارے میں، نفرت انگیز انداز میں سوچتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ ذرا اس کے ماحول میں بھی

جھانک کر دیکھوں۔ وہ ایک شاطر عامل تھا۔ پتا نہیں، اس نے اپنے اور میرے بیچ میں ایسی کون سی رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی کہ میں کوشش کے باوجود بھی اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں ناکامیاب رہتا تھا۔ اس مسلسل ناکامی سے تنگ آ کر پچھلے کچھ عرصے سے میں نے ادھر "دیکھنا" بھی ترک کر دیا تھا۔

لیکن اب چیف لامانچنگ فورن پوشی نے مجھے ایک ایسی ٹیکنیک بتا دی تھی جو سائل کے سلسلے میں بڑی حد تک سودور ثابت ہوئی تھی۔ میں اس ٹیکنیک کو اگر ربی پر آزما تو خاکسار حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے موٹے ہاتھن کے غول لگا کر اپنے تصور میں ابھارا۔ اس کا حلیہ میری تیسری آنکھ کے سامنے روشن ہو گیا۔ میں نے اس کے تصورانی چہرے پر لگا گاڑ کر ربی کے ماحول میں اترنے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش رائگاں گئی۔

میں نے سانس کو جسم کے باہر روکا اور ربی کے ماحول پر دستک دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر یہ سلسلہ دروازہ ہوتا چلا گیا۔ ایک ایسا وقت آیا کہ مجھے اپنے سینے میں ٹھنکن کا احساس ہونے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اگر میں مزید چند سیکنڈ تک سانس نہیں لوں گا تو میرا دل بند ہو جائے گا۔ میرے پیچھے ہڈی کو تازہ آکسیجن کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میری اس تکلیف وہ کیفیت کو وہ لوگ بہ آسانی سمجھ اور محسوس کر سکتے ہیں جو سانس کے مریض ہیں۔ وہ جانے ہیں، آکسیجن کی کمی کے باعث کس طور دم اکھڑتا ہے!

جب یہ تکلیف میری برداشت سے تجاوز ہونے لگی تو میں نے شکست خوردہ انداز میں سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ جان میں جان آئی تو میں نے گردن ہموار کر طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے یہ دستور ایذا پوزیشن میں غم زد رہا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور پیچھے سے بھر کر خوب گہری گہری سانسیں لیتے لگا۔

چنگ فورن پوشی کی بتائی ہوئی ترکیب جب نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی تو یہی سمجھ میں آیا کہ ربی نے اپنے ماحول کے دروازے پر ایک خصوصی لاک لگا رکھا ہے۔ وہ مضبوط لاک میری کوشش سے فی الحال ٹوٹنے والا نہیں، آئندہ کے بارے میں میں نکل دقت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ویسے اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ ربی موٹے ہاتھن دنیا بھر کے یہودیوں کے لیے ایک محترم شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی عملیات کا بھی بہت بڑا ماہر تھا۔ اس شعبے میں اس

پر بھی بے حد نہیں تھا!

میرے سینے کی دنیا میں جب ایک غمزدہ پیدا ہوا تو میں نے اپنی جان تنہا کی جانب تخیلاتی پرداز کا قصد کیا۔ گزشتہ کوشش میں، میں نے اس کے ماحول تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اب تو میں پہلے سے کہیں زیادہ "تیار" تھا۔ سائل کے نفوس، خال و خطا جیسے کو اپنی تھوڑائی کے سامنے ابھارنے کے لیے مجھے باقاعدہ کوشش نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس کا ایک ایک نقش میری یادداشت میں کندہ تھا۔ ادھر اس کا نام ذہن میں چمکتا، ادھر اس کا سراپا روشن ہو جاتا۔ میں نے احتیاط کے تقاضے سمجھتے ہوئے پہلے ہی سانس روک لی اور اس کا چہرہ تصویر کی نگاہ میں اجاگر ہوتے ہی میں نے اس کے ماحول میں چھلانگ لگا دی۔

ملائش انزلائن کے حلیارے میں سے بھی میں نے ایسی ایک کوشش کی تھی جو بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اس مرتبہ کامیابی فوراً ہی میرے ہاتھ آگئی۔ میری ہاتھی آنکھ نے مجھے اسی بیروم میں پہنچا دیا جہاں میں نے پہلی بار سے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی بیروم میں تھی تاہم ایک تبدیلی دیکھنے میں ہی آئی کہ وہ بید کے بجائے ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی تھی۔ پہلے اکثر میرے ساتھ آیا ہوا تھا کہ میں نے جب بھی اس کے ماحول میں جھانکا، وہ مجھے بید پر بیٹھی ہوئی نظر آتی۔ یہی حالت نیند میں اور بھی جت لپٹے جاتے ہوئے دکھائی دی۔ اس خوش گوار تبدیلی نے مجھے ایک نئی فرحت سے روشناس کرایا۔

کوئی شخص مسلسل کسی ہتھ پر پڑا دکھائی دے تو اس کے حوالے سے ذہن میں مقدوری اور بیماری کا تصور قائم ہونے لگتا ہے، چاہے وہ بھلا چکا ہی کیوں نہ ہو۔ پچھلے دنوں اگرچہ سائل کی طبیعت خاصی خراب رہی تھی لیکن اب وہ صورت حال نہیں تھی تاہم اسے مسلسل بید پر دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا میں چاہتا تھا، وہ چلے بھرے اور زندگی کے ہنگاموں میں اسی طرح حصہ لے جیسے ہر نارمل انسان حصہ لیتا ہے مگر میری یہ خواہش پوری ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ سائل سفاک سمجھتیے ہوئے ہاتھن کے قبضے میں تھی اور میری دہاں تک رسائی نہیں تھی اسی لیے جب میں نے اسے ڈریسنگ کے سامنے بیٹھے دیکھا تو مجھے ایک ان جالی سی حسرت کا احساس ہوا۔ میں ایک نکاسے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت ڈریسنگ کے آگے بیٹھی اپنی زلفوں کو سنوار رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور دیگر اعضا کو حرکت کرتے دیکھ کر مجھے جو خوشی حاصل ہوئی میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان لحاظ میں سائل تازہ وادھت اور صحت مند نظر آ رہی تھی۔ میں

ڈریسنگ کے آگے میں اس کا جائزہ لے رہا تھا اور خواہ خواہ اس آگے سے مجھے حسد سامعوس ہو رہا تھا۔ مجھ سے تو۔ آئینہ ہی اچھا تھا جس نے پوری طرح سائل کو اپنی "آغوش" میں سمیٹ رکھا تھا۔

سائل اس وقت پوری تیار نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ کہیں جانے والی ہو۔ اس کے، بیروم سے نکلنے کا تصور بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ربی نے اسے ہر سہولت، ہر آسائش کمرے میں مہیا کر رکھی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر نہیں بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ سائل ایک دی دی آئی پی قیدی کی حیثیت رکھتی تھی۔

میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگتی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں۔ اگر تصوری کا باقاعدہ انگلیاں ہو میں تو میں پہلی فرصت میں یہ کوشش کر چکا ہوتا۔ ان لحاظ میں وہ مجھے بہت پیاری لگ رہی تھی، لامحالہ دل اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ کوئی طاقت ور مہمان ہو اور میں لوہے کا ایک ڈرہ! ہمارے درمیان پیدا ہونے والی کشش کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

بے اختیار میری زبان سے پھسل گیا "سائل!" "....." میں نے اپنی جان جگر کو پکارنے کی کوشش کی تھی تاہم اس کوشش میں میرا انداز سرگوشیا نہ تھا جیسے اس کے کان میرے ہونٹوں کے قریب ہی ہوں حالانکہ میں ابھی طرح جانتا تھا، میری یہ سرگوشی اس کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ میں آواز کی ترسیل کا بہتر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی جاننے کی کوشش کر سکتا تھا، اس کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تھی۔ پہلے سانگ فو نے مشیل میں، اس سلسلے میں مجھے خصوصی ہدایات دی تھیں اور اب جو کھاگ ٹیمپل میں چنگ فو نے بھی کچھ ایسی قسم کی تاکید کی تھی۔ مجھے ٹیمپل گینڈ کے توسط سے تھوڑا ہی ہی کو استعمال میں لانا تھا جس کا حلق صرف اور صرف دیکھنے سے تھا۔ مجھے اپنے ان محترم خیر خواہوں کی خواہش کا احترام کرنا تھا اور بھول کر بھی مچھوڑی گینڈ کی مشق نہیں کرنا تھی۔ پتا نہیں، اس ممانعت میں ان مقرر یوں کی کون سے حکمت پوشیدہ تھی، بہر حال مجھے اپنے وعدے کا پاس کرنا تھا، میرے نزدیک وعدے کی بڑی اہمیت ہے۔

اگر میں، سر کے عقبی حصے میں واقع مچھوڑی گینڈ پر توجہ مرکوز کر کے کوئی خاص مشق کرنا تو کامیابی کی صورت میں وہ گینڈ متحرک ہو جاتا اور اگر میں اس کے تحریک پر کنٹرول بھی حاصل کر لیتا تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ میں نے ہاتھی کان کو جگا دیا۔ جس طرح میں تھوڑا ہی کے توسط سے کسی بھی چیز کا ماحول تک

رسائی حاصل کر لیتا تھا بالکل اسی طرح یہ تھوڑا سا (باطنی کان) مجھے اس چنیدہ ماحول میں پیدا ہونے والی آواز میں بھی سنا سکتا تھا اور اگر میں اس سے ایک ہاتھ آگے بڑھ کر ٹائیل اور پیچہ فری کو ہم آہنگ کر لیتا تو یہ بھی ممکن ہو جاتا کہ میں اپنی آواز کو اس خاص ماحول میں پہنچا سکوں۔

چنگ فو اور انجمنیائی سانگ فو میرے لیے جید اساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے اور کسی استاد کے کہے کو حرف آخر ماننے ہی میں کامیابی ہے۔ جب تک انسان اپنے اندر فرماں برداری اور اطاعت گزار کی کو پیدا نہ کر دے وہ کسی سے کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا۔ یہ ایک جھوٹا سا گم ہے۔ جو شاگرد اس کو اپنے دامن میں سمیٹ لے، گوہر مقصود اس کے ہاتھ آ جاتا ہے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ساحل کو آجینے میں دیکھتے ہوئے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے ہوں۔ میں نے جسم سے باہر سانس روک کر ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کی تھی اور میرے سانس روکنے کی حد ختم ہو گئی تھی۔ اصولی طور پر مجھے اس وقت دم گھٹنے کا احساس ہونا چاہیے تھا لیکن میں بالکل نارمل تھا اور یہی بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ کیا میرے سانس روکنے کا دورانیہ خود بہ خود بڑھ گیا تھا؟

اس سوال نے مجھے اپنا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے خود پر غور کیا تو ایک اور حیرت سے سامنا ہوا..... میں بالکل، صبور، نارمل انداز میں سانس لے رہا تھا۔ پتا نہیں، کب رکی ہوئی سانس کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ میں ساحل کو دیکھنے میں اس قدر غرق تھا کہ مجھے اس تبدیلی کا احساس تک نہ ہوا ورنہ اس سے پہلے جب میں نے جسم سے باہر سانس روک کر اس سے تصوراتی رابطہ قائم کیا تھا تو سانس روکنے کی مدت ختم ہوتے ہی میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے جہاز لینڈنگ کر رہا ہوں۔ ایسی گریز سے گھبرا کر میں نے بڑبڑاہٹ میں آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اس مرتبہ میں ایک مختلف اور خوش گوار تجربے سے گزرا۔ اس سے بھی ثابت ہو گیا کہ سانس روک کر تصوراتی رابطہ قائم کرنے کی مشق میں، میں پختہ ہو گیا تھا..... اور یہ ایک سلسلہ بخش خوش آئند بات تھی۔ میں کامیابی کے انتہائی قریب آن کھڑا تھا۔

ساحل نے اچانک پلٹ کر دیکھا تو میں چونک اٹھا۔ اس بیڑوم میں ساحل کے سوا اور کوئی نہیں تھا، پھر اس نے کس کو دیکھنے کی کوشش کی تھی، یہی جاننے کے تجسس میں میں نے بھی اس سمت نگاہ دوڑائی مگر صبر ساحل نے دیکھا تھا وہاں مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اس لمحے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔

میں نے اپنی توجہ واپس ساحل پر مبذول کی تو اس

دوران میں وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ میں بہ غور اس سے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سوائیل نظر سے بیڑوم کے دروازے کو دیکھ رہی تھی پھر جب اس نے مذکورہ دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس ہوئی کہ ساحل کے چوکنے کا سبب وہ دستک تھی جو اس نے بیڑوم کے دروازے پر ابھرتے کسی تھی۔ میں چونکہ اس اجازت میں پیدا ہونے والی کسی آواز کو سننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا اس لیے ساحل کے چوکنے اور دروازے کی جانب بڑھنے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔

وہ دروازے کے قریب پہنچی تو میں بھی دھڑکنے سے بولے دل کے ساتھ تصوراتی انگلی پکڑ کر وہاں تک چلا گیا پھر اگلے لمحے اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ ساحل نے دروازے کے پینڈل کو مخصوص انداز میں کھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

کلے ہوئے دروازے میں مجھے ایک دروازہ قامت محسوس کھڑا دکھائی دیا۔ مذکورہ شخص کے سر پر گھٹے بال تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس نے کوئی ٹیل یا ٹیل لگا کر اپنے بالوں کا خوب اچھی طرح جوار کھا ہو۔ اس کا سر قدرے جھکا ہوا تھا۔ میں اس کے چہرے کو مکمل طور پر دیکھ نہ سکا۔

اس شخص نے بیٹھا ساحل سے کچھ کہا تھا۔ میں اس کے الفاظ تو نہ سن سکا تاہم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ ساحل تک کوئی پیغام پہنچانے آیا تھا۔ ساحل نے اس کی بات کے جواب میں سر کو انتہائی جنبش دی اور دروازہ بند کرتے ہوئے اپنا بیڈ کی طرف چلی گئی۔

میں ساحل کو چھوڑ کر بیڑوم کے باہر گئے بالوں والا اس شخص کے پاس پہنچ گیا۔ ساحل کے بیڑوم تک رسائی حاصل کرنا اب میرے لیے چنداں مشکل نہیں رہا تھا، بیڑوم کے باہر ماحول میرے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ ساحل اس بیڑوم سے نکالنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ کس کمر میں رکھا گیا ہے اور وہ کمر اسرائیل کے کس علاقے یعنی تل ابیب تکس جس میں واقع ہے!

میں نے بیڑوم کے کلے ہوئے دروازے میں اس شخص کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ کسی کوری ڈور ٹاپ جگہ کھڑا تھا۔ میں دھوکے سے نہیں کہہ سکتا تھا وہ کوئی برآمدہ شخص کوری ڈور تھا۔ جب میں مذکورہ شخص کے ماحول میں پہنچا تو صورت حال واضح ہو گئی۔ اس شخص اور اس کے پس منظر تازہ تازہ جھلک میرے ذہن میں محفوظ تھی اس لیے تصور نگاہ کو زیادہ تر دوڑ نہ ہوا اور میں ایک ہی تخیلاتی جست میں

روم سے باہر پہنچ گیا۔

وہ شخص سر جھکائے باادب باطلا حلقہ ہوشیار کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ماحول میں "قدم" رکھتے ہی یہ جان لیا کہ وہ ایک مختصر سے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس برآمدے سے آگے مجھے کھلا آسمان دکھائی دے رہا تھا اور لوکیشن کے پیش نظر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ ساحل کو جس بیڑوم میں رکھا گیا تھا وہ اس عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھا۔

اس شخص کے انداز سے صاف جھٹکتا تھا، وہ دروازے کے باہر کھڑا ہو کر ساحل کا انتظار کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، ساحل اس شخص کے ساتھ کہیں جانے والی ہے یعنی وہ شخص ساحل کو لینے کے لیے آیا ہے۔ ساحل کا رویہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس شخص کی آمد نے اسے حیران یا پریشان نہیں کیا تھا جس سے واضح ہوتا تھا، وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ جاری تھی..... کہاں؟ یہ سوال بڑا ہی تجسس آمیز اور مستحقِ خبر تھا۔ میں اس شخص کو اس کے حال پر کھڑا چھوڑ کر بیڑوم کے اندر پہنچ گیا۔

اس دوران میں ساحل نے ایک جتنی سینڈل پہن لی تھی۔ اس سے پہلے، ڈیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے میں نے اسے سلیمہ زین دیکھا تھا۔ اب اس کی تیاری مجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے عمدہ تراش کا لباس زیب تن کر کے مختصر سا بناؤ سنگار بھی کیا تھا، بالوں میں برش کر کے انہیں سنوارا تھا جیسا عام طور پر خواتین گھر سے باہر نکلنے وقت کرتی ہیں۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت بیڑوم سے نکل رہی تھی۔ اس نے کندھے پر ایک خوب صورت جھوٹا سا سر بھی لٹکا رکھا تھا۔ وہ سب قدموں سے چلتے ہوئے بیڑوم کے دروازے کی سمت بڑھی تو میں ایک مرتبہ پھر باہر کھڑے شخص کے پاس پہنچ گیا۔

میرے لیے یہ ظاہر یا یاں انتہائی مستحقِ خبر بات ہو رہی تھی۔ ساحل تیار ہو کر ایک فرماں بردار شخص کے ساتھ کہیں جانے والی تھی۔ یہ صورت حال میرے اندر اضطراب کو بگڑا رہی تھی۔ میں اس وقت انتہائی غیر یقینی کنارے پر کھڑا تھا۔ آگے کیا چٹن آنے والا ہے اس کے بارے میں، میں دھوکے سے کہہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ دروازے کے باہر کھڑا شخص میری ساحل کو لے کر کہاں جائے گا؟ وہ شخص ساحل کے لیے دوست ثابت ہوگا یا دشمن؟ اس بارے میں کل اس وقت کوئی اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میں یہ بات بہ خوبی جانتا تھا، میری ساحل، رلی موٹے ہاتھ

کی قید میں ہے۔ قفس چاہے کتنی لمبی آرام دہ اور خوش نما کیوں نہ ہو وہ آزادی کی جھوپڑی سے زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ رہی نے میری ساحل کو ہر قسم کی آسائش اور سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ وہ ایک طرح سے سونے کی تیلیوں والے پیجرے میں بندھی۔ اٹلس و کم خواب پہنچی تھی، نعل و جواہر کھائی تھی اور پرسکون نیند سوتی تھی لیکن یہ تمام تشریش و آرام اسے قید خانے کے اندر میسر تھا بلکہ اس کی اہمیت دو کوڑی سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا جسم دیکھنے میں آزاد تھا لیکن اس آزاد جسم کے اندر قید روح دکھائی نہیں دیتی تھی۔

بیڑوم کا دروازہ کھلا اور ساحل ایک شان بے نیازی سے چلتے ہوئے باہر آ گئی۔ اس شخص نے نگاہ اٹھا کر ساحل کی طرف دیکھا اور برآمدے میں ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ ساحل آگے بڑھی تو اس شخص نے بیڑوم کے دروازے کو لاک کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود بھی ساحل کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا احترام پایا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ ساحل کی چاکری پر مامور ہو۔

دروازے کو لاک کرنے والے، اس شخص کے عمل نے مجھے ایک خاص زاویے پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ میری یہ کمزوری تھی کہ میں باطنی آنکھ کے توسط سے جس ماحول میں داخل ہوتا، وہاں ابھرتے والی آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ جب ساحل ڈیرنگ کے سامنے بیٹھی خود کو سنوارنے میں مصروف تھی اور اچانک اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تھا تو میں فوری طور پر یہی تھا، دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے متوجہ کیا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ اس شخص نے دستک دے کر باہر اپنی آمد کی اطلاع دی ہوگی لیکن یہ خیال کہ ساحل نے دستک کے جواب میں دروازہ کھولا تھا، قطعی درست نہیں تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دروازے کو اپنی مرضی سے کھولنا یا بند کرنا ساحل کے اختیار میں گر نہیں تھا۔ اسی شخص نے دروازے کا لاک کھولنے کے بعد دستک دی ہوگی اور جیسے ہی ساحل بیڑوم سے باہر نکلی، اس شخص نے دوبارہ دروازہ لاک کر دیا۔

اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ ساحل وہاں ایک محض زنجیری کی حیثیت سے رکھی گئی تھی اور جس شخص کے ساتھ وہ جاری ہو رہی تھی اس کے لیے انتہائی قابلِ مہربور و مہربور نہ ساحل کو یوں بیڑوم سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جاتی..... اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر حل ابیب کی وہ عمارت محفوظ ہوگی۔ جس کی بالائی منزل کے ایک بیڑوم میں

ساحل کو رکھا گیا تھا۔

اچھرنے والی آوازوں کو اگرچہ سماعت نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے پختہ یقین تھا، اس عجیب و غریب جگہ میں مہیب نانا طاری ہوگا!

میں ان کے ماحول میں بھی تھا اور میری تیسری آنکھ کی سرچ لائٹ کے مانند گرد و پیش کا تنقیدی جائزہ بھی لے رہی تھی اور اسی جائزے کے دوران میں، میں نے ایک نہایت ہی اہم شے دریافت کر لی۔

وہ اس جگہ کا ماحولی گیت تھا۔ نیلے رنگ کا وہ گیت نہ تو بڑا تھا اور نہ ہی چھوٹا، بس اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ایک کسی بھی ساز کی گاڑی پر آسانی سے جگہ کے اندر داخل ہو سکے۔ گیت تک نگاہ تھی تو باؤ ڈھری وال بھی بڑی وضاحت سے نظر میں آگئی۔ اس دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی اور اس کے اوپر خاردار تاریک مخصوص باز بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس باز کی پٹاٹ اور لوکیشن کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ حسب ضرورت مہلک بنانے کے لیے اس کے اندر کرنٹ بھی چھوڑ دیا جاتا ہوگا۔ نگاہ اس خطرناک باؤ ڈھری وال سے واپس آئی تو نیلے گیت پر جم گئی۔

گیت اس وقت بند تھا اور اس کی اندرونی جانب کوئی مسلح یا غیر مسلح چونکا دار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیرونی طرف اگر کوئی ایسا شخص موجود تھا تو میں اس کے بارے میں وثوق سے کہہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے توڑی بہت اس بات کی امید تھی کہ وہ شخص ساحل کو اپنے ساتھ لے کر جگہ کے بیرونی گیت کی سمت جائے گا لیکن جب اس نے ایسا قدم نہیں اٹھایا تو مجبوراً مجھے تعاقب کا زاویہ درست کرتے ہوئے ان کے ماحول کا حصہ بننا پڑا۔

وہ دونوں نے تلے قدم اٹھاتے ہوئے گیت کی مخالف سمت میں، عمارت کی قطعی جانب بڑھنے لگے۔ ساحل کے انداز میں ایک احتیاط شامل تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، یہ اس کا پہلا تجربہ نہ ہو بلکہ وہ پہلے بھی اس شخص کی محبت میں ادھر آ چکی ہو۔ میں بے قول کسے، سانس روکے اپنے مقصد سے چپکا رہا۔ یہ دم سہادر کہ منزل تک پہنچنے کا طریقہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ایک خوش نما پارک دکھائی دیا۔ یہ پارک عمارت کی قطعی سمت میں واقع تھا۔ پارک کے اندر مختلف قسم کے پودے لگے ہوئے تھے جن میں زیادہ تعداد پھول دار پودوں کی تھی اور دل خوش کن بات یہ تھی کہ ان پودوں میں نونہل نوع اور رنگ پر رنگ پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ وہ پارک کسی گاڑوں کا منظر پیش کرتا تھا جس کی نفاذ کو پھولوں کی خوش بو نے گھٹینا معطر کر رکھا ہوگا۔ میں ان خوش نما اور دل نش

میں یہ سب سوچتے ہوئے ان کے ماحول کی اگلی پکڑ چلا رہا اور تصورات کا یہ تعاقب ایک چکر دار زینے پر جا کر ٹھہرا۔ مذکورہ زینہ بالائی منزل کو زیریں منزل سے ملاتا تھا۔ اس زینے کے قریب میں نے دو مسلح افراد کو اٹھین شین پایا۔ وہ اپنے لباس اور انداز و اطوار سے مستعد سیاح رتنی گاڑوں دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یقین تھا، اگر اس زینے کے علاوہ بھی کوئی راست بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہوگا تو وہاں بھی اسی نوعیت کا سخت حفاظتی نظام موجود ہوگا!

دونوں گاڑوں نے ایک اچھتی سی نگاہ ساحل اور اس کے ہم راہی پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ شخص پہلے زینے میں داخل ہوا، اس کے بعد ساحل نے چکر دار زینے کے اسٹیپ پر قدم رکھا۔ یہ سوچنا اس مرحلے پر تھا کہ ساحل کے آگے آنے سے زینہ اترنے والا شخص غیر مسلح ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں زیریں منزل پر پہنچ گئے۔ اس دوران میں زینے کے اوپر ہی صے پر تینوں دونوں گاڑوں انتہائی مستعد اور محتاط رہے تھے۔ میں بھی چونکہ ان کے ماحول کا حصہ بن کر زیریں منزل تک چلا آیا تھا اس لیے میری باطنی آنکھ کو بہت دور تک دیکھنے کا موقع ملا اور میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ دونوں مختصر عمارت ایک وسیع و عریض احاطے کے عین وسط میں بنی ہوئی تھی۔ تعمیر شدہ حصے اور باؤ ڈھری وال کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ موجود تھا۔

میں نے ساحل اور اس شخص کے ماحول میں رجبے ہوئے حتی الامکان دوری تک نگاہ دوڑائی اور یہاں سے وہاں تک مجھے کسی بندے بشر کی شکل نظر نہ آئی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ میری ساحل کو شخص شین افراد کی نگرانی میں، اس عمارت کی بالائی منزل پر قید کیا گیا تھا۔

بات چونکہ عجیب تھی اس لیے یقین کرنے کو دل نہیں چاہا اور میں سوچے بنانہ رہ سکا کہ عمارت کے زیریں حصے میں بھی کچھ لوگ خفیہ نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہوں گے۔ ذہن میں مختلف جوڑ توڑ کرتے ہوئے میں ان کے تعاقب میں جتا رہا۔ میرے اندر بڑی شدت سے یہ سوال ابھر رہا تھا کہ وہ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟

اس وقت اسرائیل میں لگ بھگ شام کے چھ بجے تھے۔ یہ سہ پہر اور شام کے درمیان کا وقت تھا۔ چیزوں کے سایے خاصے طویل ہو چکے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک اداس، بے مہرات تن قریب اس احاطے میں اتر کر اس دوزخ عمارت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے گی۔ میں وہاں

پھولوں سے اٹھنے والی مہک کو سونگھ نہیں سکتا تھا لیکن مشاہداتی نگاہ مجھے بتا رہی تھی کہ اس کا رُزن نما پارک کی فضا جتنی بھی خوش بو سے مہک رہی ہوگی۔

ساحل اس دل نشیں فضا والے پارک میں داخل ہو گئی۔ اس کا سامنی چونکہ اس روز مینک ماحول میں اس کی ہم نشینی کا اہل نہیں تھا اس لیے وہ پارک کے باہر ہی رک گیا۔ ساحل ایسی نازنین کی ہم نشینی کوئی آسان بات نہیں تھی۔ وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے پارک کے ایک گوشے میں پہنچی اور وہاں موجود ایک بچہ پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ بڑے دل آویز انداز میں مینکے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگی۔

اس پارک میں ٹھوڑے ٹھوڑے فاصلے پر بڑی آرام دہ بیٹھیں بھی نصب تھیں جن کی تیاری اور تنصیب سے شاعرانہ رنگ جھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کام کے لیے باقاعدہ کسی آرٹسٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہوں گی۔ ان لمحات میں، ساحل مجھے بہت معصوم اور بھولی بھالی لگی۔ اس کے حسن میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کاش! میں بھی اس وقت ساحل کے پہلو میں بیٹھا ہوتا۔

میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ ٹھوڑا اور انتظار کرے۔ وہ دن دور نہیں جب ساحل میری دست دس میں ہوگی۔ میں چند دن بعد صبح ایسے پہنچنے والا تھا اور جہاں ساحل کو رکھا گیا تھا اس عمارت کا ایک ایک گوشہ میں نے اپنی یادداشت میں کندہ کر لیا تھا۔ بس، اب صرف اتنا معلوم کرنا تھا کہ مذکورہ عمارت کل ایسے میں کہاں پر واقع ہے، پھر مجھے ساحل تک پہنچنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی!

ساحل پہنچ پر پہنچی، پھولوں کو دیکھنے میں غرق تھی۔ میں اس شخص کی خبر گیری کے لیے پارک سے باہر نکل آیا جو ساحل کو یہاں تک پہنچانے کے بعد پارک سے باہر ہی رک گیا تھا۔ وہ اب بھی وہیں موجود تھا اور ایک ایسے زاویے پر چپا چو بند کھڑا تھا جہاں سے ساحل کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ گویا وہ بڑی ہوشیاری سے ساحل پر نگاہ رکھتے ہوئے تھا۔ ساحل کو اس نگرانی کا مطلق احساس نہیں تھا یا اگر وہ اس بارے میں جانتی بھی تھی تو اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے، یہ اس کا روز کا معمول ہو!

میں چند لمحات اس شخص کے قرب و جوار میں گزار کر واپس اپنی ساحل کے پاس آ گیا۔ ساحل پہنچ سے اٹھ کر اب ٹہل رہی تھی۔ اس کے انداز میں بڑی سبک خرابی پائی جاتی تھی۔ اس کے ٹھٹھکے کا طریقہ سیر

کرنے والا تھا۔ وہ چلتے چلتے کبھی کسی پھول دار پودے کے قریب رک جاتی۔ کسی پھول کو چھو کر دیکھتی، یوں محسوس ہوتا، وہ بیڑہاں غاشمی پھول سے باتیں کر رہی ہے۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ ایک ادائے ناز سے آگے بڑھ جاتی۔ وہ بڑے بھرپور انداز میں ایوننگ واک کا لطف اٹھا رہی تھی۔

دیے رنی کی ایک بات تعریف کے قابل تھی اور وہ یہ کہ اس نے ساحل کو اپنے تئیں کافی آرام دہ ماحول میں رکھا ہوا تھا۔ کھانے پینے سے پہلے اوڑھنے تک اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ کہنے کو وہ اپنے ذہن کی قید میں تھی لیکن اسی قید میں اسے ایوننگ واک کی شاہانہ سہولت بھی حاصل تھی۔ یا اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ رنی کوئی اچھا اور بااخلاق آدمی تھا، اس کی وضع داری اور دشمنی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ میں اس شخص کی اصلیت کو جانتا تھا، اس کے اندر راز کر میں نے اس کی حقیقت کو پایا تھا۔ وہ اوپر سے جتنا عالی مرتبت، وضع دار اور مجسمہ اخلاق دکھائی دیتا تھا، باطن میں وہ اسی قدر گھٹاؤنا اور سفاک تھا۔ ساحل کے ساتھ وہ اگر اب تک نرمی کا برتاؤ کر رہا تھا تو اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

یہ بات زورزدن کی طرح حیاں سے کہ ساحل سے اس کی براہ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ مجھے شکار کرنے کے لیے وہ مختلف پھندوں اور جھروں میں ساحل کو چارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس کی اصل دشمنی مجھ سے تھی۔ وہ جانتا تھا، ساحل میری زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں اس کے پیچھے دوڑا چلا آؤں گا۔

اس کی یہ سوچ بڑی حد تک درست تھی۔ میں دروردی خاک چھانٹتے ہوئے بالآخر ساحل کو حاصل کرنے کے لیے اسرائیل میں داخل ہونے ہی والا تھا۔

ہماری دشمنی بھی عجیب تھی۔ وہ تو مجھے دوست بنا کر رکھنا چاہتا تھا، میرا ہی دماغ خراب ہو گیا تھا جو میں نے اس کی دوستی کی قدر نہیں کی اور میرے دماغ کی خرابی کا باعث بھی وہی شیطان تھا۔ میں نے اس کی منافقت اور شیطانی چالوں کو کچھ لیا تھا اور نتیجے میں، اس کا دوست بننے کے بجائے اللادمن بن کر اسے مونیج سے مونیج شدہ نقصان پہنچاتا چلا آ رہا تھا۔ جس طرح مجھے یقین تھا، میں ایک روز ساحل کو اس کے کچھل سے نکال لوں گا، بالکل دیے ہی وہ بھی یہ امید لگائے بیٹھا تھا، اسی ساحل کو چارہ بنا کر وہ مجھے چھاپ لے گا۔ ساحل پر ساری نواز شات محض اس لیے تھیں کہ اگر بازی پلٹ جائے اور زندگی کے کسی موڑ پر میں اس کی دوستی کا ہاتھ تھانے کا فیصلہ کر لوں تو وہ ساحل کے ساتھ کیے گئے سلوک کی بنا پر مجھے شرمندہ کر سکے۔

اس کے نرم رویے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ وہ اپنے اخلاق اور رواداری کے ذریعے ساحل کو سناٹا کرنے کے لیے بھی کوشاں تھا۔ اسے امید ہوگی، ممکن ہے کہ ساحل اس سلوک کے نتیجے میں اس کی طرف جھک جائے جس کے ذریعے مجھے جتنا اس کے لیے آسان ہو جائے! اور جو یہودی ایسی حکمت عملی اختیار کرتے رہتے ہیں!

کچھ بھی ہو، میں رنی موٹے ہاتھن سے خیر اور بھلائی کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے مختلف مواقع پر اس کی زندگی اور سفاکی کے جو مظاہرے دیکھے تھے ان کے پیش نظر اس کے بارے میں میری ایک حسنی رائے قائم ہو چکی تھی جس میں کسی قسم کی تردید بھی ممکن نہیں تھی۔ میں تو اس کی طرف سے اس تکنیکی کی توقع بھی رکھتا تھا کہ اگر کبھی ہمارے درمیان لین دین کے سلسلے میں حساب کتاب کا رجسٹر مل گیا تو وہ بڑی ڈھٹائی سے ان اخراجات کا تحقیر لگا کر ایک بل کی صورت میرے ہاتھ میں تھما دے گا جو اس نے ساحل کو "اکو موڈینٹ" کرنے پر اٹھائے تھے!

میرا ذہن اتنی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ تیسری آنکھ سے میں ساحل کو واضح کر رہا تھا۔ وہ ایوننگ واک کو موقوف کر کے پارک سے باہر نکلتے ہوئے رخسار خیال کی لگام کو کھینچنے لگا۔ جب تک وہ چمن میں ٹھہل قدمی کر رہی تھی تو دوسری بات تھی، میں خیالات کی ندی میں بہہ کر کہیں کا کہیں نکل جاتا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی۔

ساحل پارک میں تھی تو پھولوں کے درمیان وہ بھی ایک مہلکا ہوا گل ہی نظر آ رہی تھی مگر چمن سے قدم نکال کر وہ سیدھی اس شخص کے قریب پہنچی جس کے ساتھ عمارت کی بالائی منزل سے چل کر وہ پارک تک آئی تھی۔ وہ شخص ساحل کے نزدیک مجھے یوں دکھائی دیتا جیسے پھول کے ساتھ خار ہوتا ہے۔ اب میں اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ چکا تھا۔ اس کے نقش و نگار خالصتاً یہودیوں والے تھے۔ اس حوالے سے وہ ساحل کے ساتھ کسی خار سے کم نہیں تھا۔

ساحل نے اس عکاس شخص کے ساتھ واپسی کی راہ لی تو میں بھی ان کے ماحول میں شامل ہو کر عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔ اب میں سوچنے سے زیادہ غور و فکر کر رہا تھا۔ میں نے اپنی مشاہداتی نگاہ کو وہ سے زیادہ کھول رکھا تھا اور مجھے کسی ایسے کلیہ کی تلاش تھی جو اس جینگے کے عمل و فروع کے بارے میں میری راہ نمائی کرتا اور مجھے قومی امید تھی، میں اس تلاش میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔

اس نامعلوم اور بے نام شخص نے ساحل کو بالائی منزل والے بیڑہم میں پہنچا کر دروازے کو باہر سے لاک کر دیا، گویا مختصری آزادی کے بعد وہ دوبارہ اسے قفس میں پھنچ گئی تھی۔ میرے اس اندازے کی بھی توثیق ہوئی کہ اس بیڑہم کے دروازے کو کھولنا اور بند کرنا جتنی مشکل اور غیر متعلق کرنا ساحل کے اختیار میں نہیں تھا!

ساحل ایک مرتبہ پھر اسی ماڈرن بنجرے میں ڈال دی گئی جہاں وہ ایوننگ واک سے قبل قید تھی۔ اب وہاں تک رسائی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا لہذا میں اس شخص کے پیچھے لگ گیا جو ٹھوڑی دیر پہلے ساحل کو سیر کرانے لے کر گیا تھا۔ میں اس یہودی کے ذریعے جینگے کے ماحول سے باہر نکل کر گرد و لوار کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس بات کی سہر حال توقع کی جا سکتی تھی کہ جلد یا بدیر وہ شخص مذکورہ جینگے سے باہر قدم رکھے گا۔

میں تذکرہ شخص کے ماحول میں پہنچا تو وہ زینے کے قریب کھڑے دو مسلح گارڈز سے گفتگو کر رہا تھا۔ واپسی پر ان گارڈز نے ساحل کو اس شخص کے ساتھ دیکھا ضرور تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اب ان کو بات چیت کرتے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تینوں آپس میں بڑے گہرے اور بے تکلف دوست ہوں۔ افسوس! میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن نہیں سکتا تھا، محض انہیں ہونٹ ہلاتے دیکھنے پر مجبور تھا۔

یہ مشکل باجی منٹ تک ان کے مابین مذاکرات ہوئے ہوں گے، اس کے بعد میرا مطلوبہ شخص پھر دروازہ زینہ اترنے لگا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا، وہ ذریعہ میں منزل کی طرف جا رہا ہے۔ اور ذریعہ میں منزل کا رخ اختیار کرنے کا ایک مطلب یہ بھی نکلا جا سکتا تھا کہ وہ جینگے سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے!

میں دم سادھے مذکورہ یہودی کے ماحول سے چپاں رہا۔

وہ دن شاید میرے لیے کامیابیوں کا دن تھا۔ میں سنگا پورائر لائنز کے طیارے میگانا پ سیون فور سیون میں بیٹھا اپنی زندگی کا اہم ترین کام کر رہا تھا۔ یہ پرواز گھنٹا بھر پہلے لندن کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے اڑی تھی اور چند گھنٹے بعد اسے قاہرہ کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اترنا تھا۔ یہ ایک نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ شاید یہ اس فلائٹ کی انفرادیت کا اثر تھا کہ مجھے اپنے مقصد میں نان اسٹاپ کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ میں ٹھوڑا آئی کے توسط سے اپنے مطلوبہ شخص کے ماحول

تک محدود تھا۔ اگر رلی کی کسی مداخلت کے بغیر وہ مجھے حاصل ہو جاتی تو میں کسی بھی قسم کی باراناری میں پڑے بغیر اسے اپنے ساتھ لے کر فو پکڑ ہوا تاکہ یہ سب پیش آتا آسان نہیں تھا جتنا سوچتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا، ساحل کا معاملہ ہوا اور رلی بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نہ ٹکرائے!

یہ ٹکراؤ تو ہونا تھا اور نہایت ہی خون ریز ہونا تھا۔ رلی موٹے ہاتھن کے چنگل سے اگر ساحل کو آزاد کرانا اتنا ہی آسان ہوتا تو یہ کام میں بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور سیدھا سادہ نظر آ رہا تھا لیکن کیا پتا، رلی نے ساحل کے سلسلے میں کون کون سے نا دیدہ اور خفیہ انتظامات کر رکھے تھے۔ یہ تو اس وقت معلوم ہوتا جب میں بہ نفس نفیس اسرائیل میں داخل ہو کر اپنی جان تمنا کی جانب پیش قدمی کرتا اور میں..... اس بار ساحل کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا۔

میرے ”ڈرائیور“ اس یہودی نے پتا نہیں، ذہن میں کیا سوچ رکھا تھا۔ وہ ہمیں رکے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بنگلے کے درمیان واقع مختلف گلیوں میں سے ہوتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اچانک چابی سے چلنے والا کھلوتا بن گیا ہو جو خود کار انداز میں اپنے فنکشن کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے پر مجبور تھا۔

جب وہ بنگلوں والے رہائشی علاقے سے نکل کر قدرے چوڑی سڑک پر آیا تو میں نے سکھ کی سانس لی۔ اس وقت تک رات کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی اور تمام لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ وہ جس سڑک پر پہنچا اس کا نام شیرون اسٹریٹ تھا۔ یہاں تک تو وہ پیدل ہی آیا تھا لیکن شیرون اسٹریٹ خاصی کشادہ سڑک تھی جس پر ٹریفک بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے امید تھی، وہ شیرون اسٹریٹ سے کوئی ٹیکسی یا بس پکڑ کر آگے کی طرف روانہ ہوگا لیکن وہ یہودی ہی کیا، جو مسلم کی توقع پر پورا اتر جائے؟ اس قوم نے تو ہمیشہ مسلمانوں کو دھوکے دیے ہیں۔ ان سے کسی بھی موقع پر خیر خواہی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ پتا نہیں، یہ باریک سا سکھ بعض مسلمانوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا!

میرے ڈرائیور نے شیرون اسٹریٹ پر سانس لینے کے لیے لمبائی تو قف کیا پھر ایک جانب قدم اٹھانے لگا۔ توڑا آگے آنے کے بعد وہ ہرکن اسٹریٹ پر مڑ گیا۔ ہرکن اسٹریٹ شیرون اسٹریٹ کے مقابلے میں قدرے کم کشادہ تھی۔ اس اسٹریٹ پر ٹریفک کی رونق بھی زیادہ نہیں تھی مگر میرے

میں شامل رہا۔ وہ جتنا مگر با اعتماد قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے بیرونی گیٹ پر پہنچا تو میں تصور کی نگاہ سے اس کے ساتھ تھا۔ نیلے رنگ کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے مخصوص انداز میں تین مرتبہ دستک دی۔ توڑی دیر کے بعد وہ گیٹ کھل گیا۔ وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں بھی باہر آ گیا۔ آزادی کی اس فضا میں، میں نے گہری ”سانس“ لی!

اس وقت تک رات نے اپنے سیاہ پر پھیلاتا شروع کر دیے تھے۔ دن کا اجالا مل گیا ہو گا تھا اور آج رات سے یہی نظر آتا تھا، دس پندرہ منٹ کے بعد چاروں طرف گہری تاریکی چھا جائے گی۔ گیٹ کی بیرونی طرف دو صبح گاڑ بڑے چوکننا انداز میں پہرا دے رہے تھے۔ میرے ”ڈرائیور“ نے ان پہریداروں کے ساتھ مختصر نظام کیا اور خاموشی سے ایک جانب پیدل ہی چل دیا۔ میں بھی اس کے ہمراہ ہولیا۔

وہ علاقہ خاموش اور پرسکون تھا۔ ہر طرف بنگلے دکھائی دیتے تھے۔ وہ سب بنگلے انتہائی شاندار اور وسیع و عریض تھے۔ وہاں کے ماحول میں میرے اندازے کے مطابق شامل سناٹا ایک انعطافی اور بے اعتنائی کو ظاہر کرتا تھا۔ ان بنگلوں میں یقیناً صاحب ثروت لوگ رہتے تھے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کا پوش رہائشی علاقہ ہو، وہاں بقول ٹھٹھے، ایسی ہی دیرانی اور بے رونق دکھائی دیتی ہے۔

”ڈرائیور“ مجھے جس طرف لے جا رہا تھا، میں اس کی تقلید پر مجبور تھا۔ میں اسے مس کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میں ابھی اسرائیل سے کافی دور تھا میں ”برواز“ کر رہا تھا لیکن تیسری آنکھ کے طفیل اس وقت تل ابیب کے ایک ماڈرن رہائشی علاقے میں بھی موجود تھا لہذا اس شخص کے ماحول کو تھا سے رکھنا کامیابی کی دلیل تھا۔

وہ یہودی جس انداز میں پیدل چلتے ہوئے ایک طرف جا رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا وہ غریب ہی کے کسی بنگلے میں جانے کا راہ رکھتا ہے۔ یہ توقع کی جاسکتی تھی، وہ جس بنگلے میں پہنچے وہاں رلی موٹے ہاتھن بھی موجود ہو۔ وہ اپنی دن بھر کی کارگزاری کی رپورٹ رلی کو دے اور واپس ساحل والے بنگلے پر آ جائے۔

اگر ایسا ہو جاتا تو میرا کام اور بھی آسانی ہو جاتا تھا۔ میں ساحل کے ٹھکانے کے محل وقوع کو اپنے ذہن میں نقش کر چکا تھا۔ رلی کے ٹھکانے کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو جاتیں تو مجھے اسے ہینڈل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ اس صورت میں، میں قدرے بہتر طور پر پلاننگ کر سکتا تھا۔ اس وقت میرا مشن صرف اور صرف ساحل کی حصول پابی

ڈرائیور کو کسی بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپنی دانست میں شاید پیدل چلنے کا کوئی ریکارڈ قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس دیوانے کا پچھانا چھوڑا اور تھوڑا آئی کے توسط سے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہرمن اسٹریٹ نے جب شالوم اسٹریٹ کو کراس کیا تو اس بندہ خدا کے قدموں میں مجھے کچھ سستی سی پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ ہرمن اسٹریٹ کو چھوڑ کر شالوم اسٹریٹ پر آگیا اور قدرے ٹھکے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس کی حالیہ رفتار سے اندازہ ہوتا تھا، وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس خیال نے میرے اندر اطمینان کی لہر دوڑادی۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے شالوم اسٹریٹ کو چھوڑ کر ایک ڈیلی ٹی میں شرمیکا اور پھر اس وقت میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی جب ”بہائی گارڈن اپارٹمنٹس“ کے سامنے اس کے قدموں کو بریک لگ گئے۔ ”بہائی گارڈن“ ایک دس منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ وہ مذکورہ بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ میں چونک کر اس کے ماحول کا حصہ تھا اس لیے میں بھی بہائی گارڈن کے اندر پہنچ گیا پھر ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں داخل ہو گئے۔

ستائیس۔ سی میں قدم رکھتے ہی مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہاں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔ میری حیرت کے دو بڑے اسباب تھے۔ نمبر ”ن“ میرا ”ڈرائیور“ اپارٹمنٹ کا لالک کھول کر اندر آیا تھا۔ یہ بندہ اپارٹمنٹ میں ایک شخص کا موجود ہونا نارمل بات نہیں تھی۔ نمبر نو، اپارٹمنٹ میں پہلے سے موجود شخص میرے ڈرائیور سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک شخص کو دو جگہ دیکھ رہا ہوں!

میں خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات کو نوٹ کرنے لگا۔ وہ دونوں بڑی عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پہلے کو دوسرے کی آمد کا شدت سے انتظار ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے، میرے ساتھ آنے والے نے دونوں ہاتھ اپنے سر کی جانب اٹھائے اور بالوں کی ایک چھوٹی سی پوٹی کو سر سے جدا کر دیا۔ درحقیقت اس نے دگ اتاری تھی۔ اب مجھے اس کے گھنے بالوں کا راز معلوم ہو گیا۔ دگ ہٹ جانے کے بعد اس کا اصل سر دوسرے کے اصل بال سامنے آ گئے۔ اس کی چند یا سامنے سے لٹل آئی تھی اور وہاں پر واضح ”ایم“ بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

دوسرے شخص کی کیفیت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس نے میرے ”ڈرائیور“ سے دگ لے کر اپنے سر پر

جھائی تو وہ ہو بہو میرا ڈرائیور بن گیا۔ اس کے بعد انہوں نے لباس تبدیل کیے اور میرے ڈرائیور کی آنکھوں سے نکلنے والے کامیٹ ٹینس جب دوسرے نے اپنی آنکھوں میں لگائے تو وہی سہمی کمر بھی پوری ہوئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی شخصیت کو اتنی تیزی سے اپنایا کہ میں چکا بکا نہیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے یقیناً اس کا کوئی خاص مقصد تھا لیکن میں ان کے مقصد سے واقف نہیں تھا اس لیے حیرت اور دہش سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ اس تیار کے دوران میں، آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن سخت سخت آغوش ہے، میں ان کی گفتگو کو سن سکتا تھا اور نہ ہی مجھے کی اہلیت رکھتا تھا ورنہ میں اب تک جان چکا ہوتا کہ وہ کس ٹاپ مشن پر ہیں۔ مجھے اپنی مجبوری کو دیکھتے ہوئے ان کے اگلے اقدام کا انتظار کرنا تھا۔ ان میں سے جو بھی اپارٹمنٹ سے باہر نکلتا، میں اس کا ماحول پکڑ کر تعاقب میں لگ جاتا، پھر ان کا مقصد مجھ سے چھپا نہ پتا۔

میں تو فتح کر رہا تھا، ان میں سے ایک اپارٹمنٹ کے اندر موجود رہے گا اور دوسرا باہر نکلے گا لیکن انہوں نے اس وقت میری توقع کی ایسی کم تھی پھر دی جب وہ ایک ساتھ دروازے کی جانب بڑھے۔ وہ چند سیکنڈ کے وقفے سے اپارٹمنٹ سے نکلے اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے شالوم اسٹریٹ پر نکل آئے۔ ان کے انداز میں ایک خاص قسم کی بے گامگی اور اجنبیت پائی جاتی تھی۔ شالوم اسٹریٹ کے انتہام پر وہ لمبے بھڑکے پھر انہوں نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں چکر کر رہ گیا۔

میرا ڈرائیور تو شالوم اسٹریٹ سے ہائیں جانب مڑ گیا جب کہ دوسرے شخص نے دائیں طرف ہرمن اسٹریٹ کو پکڑ لیا۔ یہ بڑی ادبیات صورت حال تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کس کو چھوڑوں اور کس کا تعاقب کروں! وہ دونوں ہی اچانک بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ پانچویں وہ کس خفیہ مشن کے تحت حرکت کر رہے تھے۔ دونوں نے بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں جس طرح ایک دوسرے کی شخصیت کو اپنایا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا ہرمن اسٹریٹ کا رخ کرنے والا شخص سیدھا اس بنگلے میں پہنچے گا جہاں بالائی منزل پر میری ساحل کو رکھا گیا تھا۔ اس بنگلی کی تبدیلی اور روانگی سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا ساحل والے بنگلے میں موجود دیگر افراد کو بھی بہت سی باتوں سے خبر رکھا گیا ہے۔ میں نے ایک امکان ظاہر کیا ہے تو یہ جس طرح حیرت انگیز طور پر تیزی سے حالات تبدیل ہو رہے تھے اس کے چٹائی نظر کوئی تھی رائے

میں نہ ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہرمن اسٹریٹ پر مڑنے والا شخص اگر واقعی،، مل والے بنگلی کی طرف جا رہا تھا تو میں اسے بعد میں بھی نہیں کر سکتا۔ اس بنگلے کے ماحول تک رسائی اب میرے لیے مشکل بن رہی تھی۔ درست میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس شخص کا چا پکڑوں جو مجھے ساحل کے پاس سے یہاں تک لے کر آیا۔ اس نے اگر اپنی پہلے والی شخصیت میں کوئی تبدیلی کر لی تھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے تو یہی اسے آٹار تو یہی بتاتے تھے بہائی گارڈن اپارٹمنٹس سے نکلنے سے پہلے وہ اپنی اصلی شخصیت میں آیا تھا۔

ایک بات مسلسل میرے ذہن کو الجھا رہی تھی کہ آخر میں یہ پکڑ چلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا مستقبل زب میں ساحل کسی نئے ہنگامے کا مندر دیکھنے والی تھی؟ اگر یہ ب پکڑ لی تو میں ہائمن کے اشارے پر نہیں ہو رہا تھا تو پھر اسٹریٹ اپ کی ڈور یاں ہلانے والا شخص کون تھا؟

میں نے ان تمام تر پریشان کن سوالات کو ذہن سے جھٹکا اور ایک جگہ میں اپنے ڈرائیور کے ماحول میں پہنچ گیا۔ میں اس شخص کا نام نہیں جانتا تھا چنانچہ شناخت کی خاطر میں اسے ابراہم ”ڈرائیور“ کہہ رہا ہوں۔ ویسے یہ ناکل اس پرفٹ بیٹھتا تھا میں نے اس کی ڈرائیوری میں پڑاؤ نہیں خیر سفر کیا تھا۔

میں ڈرائیور کے ماحول میں اترا تو وہ ایک نئی اسٹریٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ جلد ہی میں اس اسٹریٹ کا نام جاننے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ انفرام اسٹریٹ تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا انفرام اسٹریٹ محل ایبیب کی ایک معروف سڑک ہے ڈرائیور اس اسٹریٹ پر آئے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ پیدل کیوں جا رہا تھا۔ اس کے قریب سے میں نے ٹیکسیوں اور دیگر پبلک ٹرانسپورٹ کو گزرتے دیکھا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو کوئی گاڑی پکڑ کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا اور مستحیث بھی نہ تھی لیکن اس کی حرکات و سکنات یہ ظاہر کرتی تھیں کہ اسے بل بل مارچ کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے!

پانچویں یہ اس کے پروگرام کا حصہ تھا یا اس نے میری بہتریت کو ”بھانپ“ لیا تھا۔ جلد ہی وہ انفرام اسٹریٹ کو چھوڑ کر شالوم اسٹریٹ پر آ گیا۔ بن بیہودہ اسٹریٹ پر زیادہ تر ٹریفک بلڈنگز اور ہوٹل استادہ تھے۔ ڈرائیور کی سست ہوتی حالت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسی اسٹریٹ کی کسی گلی میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

وہ بن بیہودہ اسٹریٹ کی عمارتوں کو بے غور دیکھتے ہوئے

آگے بڑھتا گیا۔ میں چونکہ اس کے ماحول میں موجود تھا لہذا وہ سب کچھ مجھے بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے تھوڑا آئی کے توسط سے پہلے ہی کئی مناظر دیکھنے سے لیکن آج اس باطنی آنکھ کے استعمال میں جو حلف آ رہا تھا وہ پہلے ہی حاصل نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ان لمحات میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ قریب یا رکا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے!

ڈرائیور بن بیہودہ اسٹریٹ پر ہوٹل ٹاپ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ ”ہوٹل ٹاپ“ اس اسٹریٹ کی دوسری جانب استادہ تھا۔ وہ ہوٹل ٹاپ کو ایسی نظر سے دیکھ رہا تھا کہ میں سوچے باندھ رہا کہ اسے اسی ہوٹل میں جانا ہے لیکن اگلے ہی لمحے ایک مرتبہ پھر اس نے میری توقع پر پانی پھیر دیا۔

وہ ٹھکے ہوئے قدموں سے چلتے ہوئے تھوڑا اور آگے بڑھ آیا اور بن بیہودہ اسٹریٹ کے کنارے ایک جگہ رک گیا۔ مجھے یہ جاننے میں مدد نہ تھی کہ وہ مقام ”بیس اسٹاپ“ تھا۔ اب اس بات میں شک کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ کسی بس پر سوار ہو کر کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ کہاں؟ اس سوال کا جواب بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا! میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈرائیور کی مطلوبہ بس اسٹاپ پر آ کر رکی۔ میں اس بس کا نمبر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ روٹ نمبر دو سو بائیس کی بس تھی۔ میں نہیں جانتا تھا ٹریفک فورورٹ کی یہ بس ڈرائیور کو لے کر کہاں جائے گی۔ البتہ بن بیہودہ اسٹریٹ کی روٹ کو چکا چونے سے میں نے اندازہ لگایا۔ وہ علاقہ قتل ایبیب کا مرکز کی حد یعنی ”سٹی سینٹر“ تھا۔

تھوڑا آئی کے ذریعے سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کہیں بھی آنے جانے کے لیے کوئی ٹکٹ وغیرہ نہیں لینا پڑتا اور نہ ہی مسافر کو پیسے کے لیے کسی سیٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ڈرائیور کے پیچھے پیچھے میں بھی بس نمبر ”222“ پر سوار ہو گیا۔ اس سفر کا انتہام میں کو رین اٹر پورٹ پر ہوا۔

ڈرائیور کے ساتھ ہی میں بھی، بس سے نیچے اترا آیا۔ بن گورین“ محل ایبیب کا انٹرینشل اٹر پورٹ ہے۔ وہ شخص اگر اٹر پورٹ پہنچا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا وہ محل ایبیب سے باہر کہیں جانا چاہتا تھا۔

انسان کو جو شے حاصل نہیں ہوتی وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اس کی محرومی کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان لمحات میں مجھے اس بات کا آغوش ہو رہا تھا کہ میں تھوڑا آئی کے ساتھ ساتھ تھوڑا راکو استعمال کرنا کیوں نہیں جانتا۔ اگر میں تیسرے کان (تھوڑا راکو) کے استعمال پر قدرت رکھتا تو معلوم



# ٹیلی ویژن

## کی جدید تحقیقات

(باتصویر)

پیش کشی کے ذریعہ پوری دنیا کی کتاب  
عزیز ترین علمی و ادبی کتاب

کتاب کے چھ موضوعات  
ٹیلی ویژن ایک علم، ایک سائنس  
ٹیلی ویژن کا ماضی اور حال  
ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی  
مختلف مشقیں  
ٹیلی ویژن میں یوگا کا استعمال  
غیر معمولی حس اور ادراک اور روحانی قوتیں  
مستقبل کی پیش گوئی

قیمت :- 45 روپے / ڈاک خرچ :- 23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون: 5802551 5802552-5895313  
kitabiat1970@yahoo.com  
رہیلہ کیلئے C-63 فیز 111 سیکشن ٹی ایچ اے مین روڈ کراچی

اس کوشش کے سلسلے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اور انیول لاؤنچ کے جس منظر کو صوفیہ کی ”تجلی“ نے زیر کر دیا تھا اس ماحول میں داخل ہونے کے لیے میں ایک کھڑکی کھلی چھوڑ آیا تھا اور اس کھڑکی کا علاقہ نام تھا۔ ڈرائیور!

میں نہیں جانتا تھا رنی موٹے ہاتھ کہاں سے آ رہا تھا یہ بھی ممکن تھا وہ اسرائیل کے کسی دوسرے شہر سے جل ایب پہنچا ہو اور یہ بھی ناممکن نہیں تھا وہ کسی اور ملک سے واپس اسرائیل آ رہا ہو۔ بہر حال میں رنی کا وسیلہ استعمال نہیں کرنا تھا چنانچہ اپنے ”ڈرائیور“ پر تکیہ کیا اور اس کے خال و خال کا قہر ڈالنے کے سامنے ابھارنے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر گورین انٹر پورٹ کے اور انیول لاؤنچ میں پہنچ گیا۔

اس بار اور انیول لاؤنچ کے منظر میں مجھے تھوڑی تہی دکھائی دی۔ ڈرائیور رنی کے ساتھ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا وہ نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں رہا۔ کو کوئی اہم رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ افسوس! میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ سماعت نہیں کر سکا تھا۔ میننگ جلد ہی ختم ہو گئی۔ رنی نے سر کو خفیف سی اٹھائی جتنی دی اور اسی پُرکار انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائیور کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے ڈرائیور کے ماحول میں رہتے ہوئے دیکھا اسی لمحے ڈرائیور نے میں ایک چم چمائی ہوئی لمبی سیاہ گاڑی... آ کر رکھی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ رنی نے اس گاڑی کی آمد پر ہی ڈرائیور سے میننگ ختم کی تھی۔ یہ گاڑی یقیناً رنی کو انٹر پورٹ سے ریسپونڈ کرنے آئی تھی۔ مذکورہ گاڑی پیش قیمت اور ڈیڈ ویکس کی حامل تھی۔ ان کی کھڑکیوں میں نصب سیاہ شیشوں کے اس پار میں گاڑی کے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اندھے شیشے دیکھنے والی آنکھوں میں تاریک رات بن کر کھڑے ہو جاتے، گویا دیکھنے والے اندھا کر کے رکھ دیتے تھے۔

رنی گاڑی کے نزدیک پہنچا تو اس کی عقبی نشست وہ دروازہ خود کار نظام کے تحت کھل گیا۔ دیکھا اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے کوئی جن دبا کر یہ سہل فراہم کی تھی۔ رنی بہ آہستگی گاڑی کے اندر بیٹھ چکا تو میری باطنی نگاہ کو واپسی کی راہ لیتا پڑی۔ رنی نے مجھے ہی گاڑی کے دروازہ بند کیا وہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اب میں اپنے ڈرائیور کے توسط سے محض ایک چم چمائی ہوئی سیاہ گاڑی دیکھ رہا تھا جو رنی کے اندر کھینچے ہی تیزی سے حرکت میں آ رہی تھی۔

کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا کہ ڈرائیور اس وقت کہاں اور کیوں جا رہا تھا؟ بھائی گاڑوں اپارٹمنٹس کے اپارٹمنٹ نمبر ”ستائیس سی“ میں ان دونوں افراد نے چدرہ میں منٹ تک جادو نہ خیاں کیا تھا۔ یقیناً اس گفتگو میں یہ امور بھی ڈسکس ہوئے ہوں گے۔

جلد ہی میں یہ جانے میں کامیاب ہو گیا کہ ڈرائیور جل ایب سے باہر نہیں نکلیں جا رہا تھا بلکہ وہ کسی کوریسیو کرنے کے لیے انٹر پورٹ پہنچا تھا۔ اب اس کے ساتھ ہی مجھے بھی اور انیول لاؤنچ میں انتظار کرنا تھا۔ اس نازک موقع پر میں اسے چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاسکتا تھا۔

اس انتظار نے زیادہ اہمیت نہیں سمجھی اور مسافر کے بعد دیگرے باہر آنے لگے۔ ڈرائیور بڑے حساب کتاب سے انٹر پورٹ پہنچا تھا۔ وہ ایک ایک مسافر کے چہرے کو بغور گہری تجسیدی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کسی مخصوص چہرے کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔

پھر یہ انتظار بھی اختتام پذیر ہوا۔ ڈرائیور کے مطلوبہ مسافر کا چہرہ نمودار ہوا تو وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ میں نے بھی اس مسافر کو دیکھ لیا تھا اور یہ دیکھنا بڑا استغنیٰ خیز تھا۔ میری نگاہ نے سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں ہی سچاؤ کے تمام مراحل طے کر لیے۔ شش ساچرے والا وہ شخص پُر وقار انداز میں چلتے ہوئے ڈرائیور کے قریب پہنچا۔ میں اس وقت ڈرائیور کا ساتھ بنا ہوا تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ میرے نزدیک پہنچا۔ دوسرے ہی لمحے ہم ایک دوسرے کے رو بہ رو کھڑے تھے۔

اسی لمحے سب کچھ ختم ہو گیا۔ میری قہر ڈالنے کے سامنے پھیلا ہوا اور انیول لاؤنچ کا منظر کسی تجلی ہوئی شمع کی لو کے مانند پھل پھڑپھڑا اور میری تاریکی چھا گئی۔ جلد ہی اس گڑبڑ کا سبب بھی میری سمجھ میں آ گیا۔

صوفیہ کندہ چھتپتے ہوئے مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے اس عمل میں خاصی شدت تھی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور گردن موڑ کر ابھمن زدہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ اس نے کہا ”یوسف! کیا تم ساری زندگی کی نیند جہاز ہی میں پوری کر لو گے؟“

”ابھی آتا ہوں!“ میں نے تمکیر لے کر کہا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے ہی لمحے میں رنی موٹے ہاتھ کے ماحول کو چھونے کی کوشش کرنے لگا!

اسی لمحے مجھے اس شخص کا خیال آ گیا، بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں جس نے دگ اور لٹس وغیرہ لگا کر میرے ڈرائیور کا روپ اختیار کیا تھا جب وہ شالوم سے ہرگز

ربیٰ سالہ والے بچکے میں پہنچا تھا تو اس کا یہی مطلب  
 'وہ جلد یا بدیر سال کے پاس بھی جائے گا۔ میں سال  
 کے ماحول میں رہتے ہوئے ربیٰ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھ  
 رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ٹھوڑا آئی کوڑھت دی اور اس  
 کے لیے بالائی منزل پر واقع سال کے بیڑہ میں پہنچ گیا۔  
 میں نے سال کو کھانے کے ساتھ معروف محل دیکھا  
 وقت کرے میں اکیلی ہی تھی اور بڑے شوع و خصوصاً  
 ذہن بے رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور  
 ہمدردی جھلکتی تھی۔ لگتا تھا وہ اس سیٹ اپ میں بڑی پرسکون  
 لیکن میں جانتا تھا اس کا یہ ٹھہراؤ اور طمانیت حالات سے  
 عارضی مصالحت تھی..... وہ حالات جو موٹے بائسن کے  
 نے اس کے سامنے پھلار رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا وہ  
 دل بھی ربیٰ کی قید میں گھرا رہنے کی راہ راہیں ہوگی۔  
 نے اسے جس خوبصورت اور راحت بخش فیسر میں ڈال

ڈوراجور کارول ادا کرنے والا شخص کھانے کے سبب سے  
 بہتر کچن میں پہنچا کر باہر نکلا تو میں نے چند لمحات وہیں  
 گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں باورچی کے خال و خلو کو اچھی  
 طرح ذہن نشین کرنا چاہتا تھا۔ بچکے کے سیٹ اپ میں وہ  
 سب سے زیادہ غیر اہم دکھائی دیتا تھا لیکن ایسے افراد ہی بعض  
 لوگ تھے سب سے زیادہ اہم اور سفید ثابت ہوتے ہیں لہذا اس  
 کے طے اور نقش و نگار کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا بہت  
 ضروری تھا۔ جب تک اس عمارت میں کوئی ایک شخص ہی قائم  
 بن رہا تھا کھانا بہر حال پکنا تھا مگر اس باورچی کو وہاں موجود  
 رہنا تھا۔ اگر میں بچکے کے اس "گیمٹ" کو اپنی حوصلہ آئی میں

وہ ہولناپ کے اسٹاف روم میں پہنچا اور اس نے ایک جگہ درجن میں دخل کیے۔ اس سے ایک بات واضح ہو گئی اور یہ کہ وہ شخص اس ہول کے باقاعدہ اسٹاف میں شامل تھا۔ جب وہ درجن کے ایک صنف پر اپنے نام کے سامنے دخل کر رہا تھا تو میں ایک نہایت ہی اہم بات جاننے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اس کے ماحول میں رہتے ہوئے اسی کی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے کسی ”سلوان“ کے سامنے چڑیا

بٹھائی تھی۔ گویا وہ سلوان کی حیثیت سے اس ہوٹل میں کام کرتا تھا۔

وہیے کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ سلوان اس شخص کا نام بھی ہو سکتا تھا جو اس وقت ساحل والے بنگلے میں ڈرائیور کی جگہ ”ڈیوٹی“ بھارتیہ صاحب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ کون کس کی اداکاری میں مصروف ہے کوئی شخص رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا دونوں ہی ایک دوسرے کی ڈیوٹی بھارتیہ ہوں اور یہ بھی ممکن تھا وہ دونوں اپنے اپنے کام سے لگے ہوئے ہوں۔

یہ ایک ذہن کو ابھار دینے والی صورت حال تھی اور فی الحال مجھے اپنے ذہن کو بالکل نہیں ابھانا تھا۔ میں نے اس ڈرائیور کا نام سلوان فرض کر لیا اور اس کے ساتھ چپک کر ہوٹل کے کچن میں پہنچ گیا پھر جب وہ لباس تبدیل کر کے کچن میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کام میں مصروف ہو گیا تو میں نے اس کے ماحول کو خیر باد کہہ دیا۔ میں جس کم بخت کو ڈرائیور کہتا آیا تھا وہ آخر کو باور پچی نکلا!

سلوان نے رات نو بجے (اسرائیل کے مقامی وقت کے مطابق) ڈیوٹی جو اس کی تھی اس کا بھی مطلب تھا وہ صبح سے پہلے ہوٹل سے آف نہیں ہوگا۔ مجھے کھانا پکینے ہوئے اور باورچیوں کو کھانا پکاتے ہوئے دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لیے ہوٹل ٹاپ کے کچن میں وقت برباد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ابگلے ہی لمحے میں اس شخص کے ماحول میں پہنچ گیا جسے دو سیکورٹی گارڈز کے ساتھ خوش بکپوں میں مصروف چھوڑ کر گیا تھا۔

وہ اب بھی اسی طرح ماحول بنائے بیٹھے تھے۔ میں دس پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ ان میں سے کوئی زیریں منزل تک جائے تاکہ میں رلی کی کوئی تازہ بہ تازہ خبر لے سکوں مگر انہوں نے میری توقع کو پورا کرنے والی کوئی حرکت نہیں کی اور نہ زیریں منزل سے کوئی اوپر آیا۔ لگتا تھا دونوں منزلوں کا اسٹاف بھی علیحدہ علیحدہ ہے۔ رلی تک رسائی کا کوئی وسیلہ نظر نہ آیا تو میں نے براہ راست اسے ٹرائی کرنے کی ٹھانی۔

موٹے ہاتھن کے خد و خال اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ مجھے از برتے لیکن میری تیسری آنکھ کی یہ کوشش بار آور نہ ہوئی۔ میں نے جھجکا کر کوشش ترک کر دی۔ رلی نے کسی روحانی عمل سے خود کو ایک نادیہ حصار میں بند کر رکھا تھا مگر یہ نادیہ بندش میری قمر ڈاکی کو نظر آ جاتی تھی اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا رلی نے اس سلسلے میں

کون سی ٹیکنیک اپنارکھی ہے۔ ہزاروں دشمنی اور ناپسندیدگی کے باوجود بھی میں اس شخص کی عملیت اور طبعیت سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں رلی موٹے ہاتھن کو برا بھلا کہا اور قمر ڈاکی کی چھلانگ لگا کر اپنی جان تنہا کے ماحول میں پہنچ گیا۔ ساحل اس وقت تک بند پڑا اور ہوجی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا وہ سونے کی کوشش میں ہے۔ بندہ روم میں ٹرائی پڑا ایک بڑے اسکرین والا ٹی وی موجود تھا۔ اگر اس کا جائزہ لیا جاتا تو وہ ٹی وی کو ضرور آن کرتی۔

میں چند لمحات تک بڑی لگاتار سے اسے ”دیکھتا“ رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے سونے کی غرض ہی سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے وہ اب تک سو گئی ہوگی۔ تو میں نے ایک ہوجمل سانس خارج کی اور اس کے ماحول کو خدا حافظ کہہ کر سنگاپور انٹر لائنز کے ”میگا ٹاپ سیون فور سیون“ میں حاضر ہو گیا۔

میں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں صوفیہ سے نظر پیر چار ہوئیں۔ وہ پتا نہیں کب سے میری صورت تک رہی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولنے دیکھا تو اس کے سر میں یوں پڑی معنی خیز سکراہٹ پھیل گئی۔ وہ طنز آمیز شکایتی لہجے میں بولی۔ ”یوسف! انتہار!“ (ابھی آتا ہوں) تو خاصا لمبا ہے۔ ”کیا مطلب؟“ میں نے ابھن زدہ انداز میں پچس جھپکا میں۔

ہمارے درمیان یہ گفتگو سرگوشیوں کی صورت ہو رہی تھی۔ ویسے جہاز کے مسافروں کو ہم سے کوئی غرض نہیں تھی۔ سب اپنی اپنی مصروفیت میں مشغول تھے لیکن احتیاط کا تقاضا تھا نا بھی ضروری تھا اسی سبب وہ مجھے یوسف کہہ کر ہی خطاب بھی کر رہی تھی۔ میرے جواب کے بدلے میں اس نے کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے شانے سے جھبھوڑ کر جھیں بیدار کیا تھا۔ تم نے کہا تھا ابھی آتا ہوں! میں جب سے تمہاری آمد کا انتظار کر رہی تھی؟“

میں نے کہا ”نہیں دوبارہ آنکھ لگ گئی تھی۔“ ”آنکھ لگ گئی تھی؟“ وہ متعجب انداز میں بولی ”تم تو پہلے بھی طویل بیند لے چکے تھے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے تم پچھلے ہی سالوں سے سوتے نہیں ہو!“

صوفیہ ایک ذہین اور بے باک لڑکی تھی۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا ”تم ایسا بھی سمجھ سکتی ہو۔ ویسے اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔“

”کیا وجہ ہے؟“ اس کا استفسار خالی از دلچسپی نہیں تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور اس کی جاذب آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”میں دراصل تم سے مقابلہ کر رہا تھا۔“

اس کی ابھن زدہ چہرہ ہو گئی ”کیسا مقابلہ؟“ ”اس جہاز میں بیٹھنے کے بعد تم نے مجھ سے کہا تھا۔۔۔۔۔ یوسف میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے آنکھ بھی لگ جائے۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو تم مجھے بگاڑ دینا۔“ میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ کو لٹا دیے ”میں کافی دیر تک ادا ہونا بیٹھا تھیں دیکھتا رہا۔ پھر میں نے تمہارا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہی سمجھا کہ تم سو گئی ہو۔۔۔۔۔ اور دیکھ لا میں جیت گیا۔ میں تم سے زیادہ صوبیا ہوں اور اگر تم مجھے بگاڑ نہیں تو میں کتنے مزے ہو سکتا تھا۔“

”وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔“ وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ذہنی لہجے میں بولی ”ویسے تم نے“ اپنے منہ میں ”مٹھ“ والی بات کی ہے۔ ”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

دو وضاحت کرتے ہوئے بولی ”تم نے کہا ہے الوبے بیٹے مجھے دیکھتے رہے تھے۔ اس طرح گویا تم نے خود کو بڑا عقل مند ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغرب میں الو کو دانش کی علامت سمجھا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”میں جانتا ہوں تمہارے مغرب میں الو اور خیر کو بڑا دانہ دینا خیال کیا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک الو دائمی الو اور خیر نرا لکھنا ہے لہذا تم یقین کر لو کہ میں نے تمہاری بیان کردہ کوشش ہرگز ہرگز نہیں کی جو حقیقت ہے وہ تھلائی ہے۔“

وہ چند لمحات تک خاموش مگر کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”وہ جان! تم بہت گہرے ہو!“

وہ جان کا لفظ اس نے اتنے دھیمے انداز میں ادا کیا کہ میرے سوا کوئی نہ سن سکا۔ میں نے جواباً گہری خمیدگی سے کہا۔

”ہم اس وقت ہزاروں فنٹ کی ادنیٰ چالی پڑیں اور ہمیں گہرائی کی سوچ رہی ہے!“

”تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو!“ وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”یہ شعبہ سراسر خواتین سے متعلق ہے۔“

”لیکن بعض مرد خواتین سے چار ہاتھ آگے دکھائی دیتے ہیں!“

اس کا واضح اشارہ میری جانب تھا۔ میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا ”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے بعض مرد پیشہ ور باتیں کرنے والے ہوتے ہیں اور انہی باتوں کی کمائی کھاتے ہیں لیکن میرا اس پیشے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”تم تمہارا بھی جانتے ہو“ وہ چوٹ کرنے والے انداز میں بولی ”مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بھی اپنی ہی بات کہہ ڈالی؟“

”فی الحال تو وہ ہمیں گھمانے آرہی ہیں“ میں نے سیٹوں کے درمیان واقع کسی گزرگاہ کے آخری سرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”کیا تم گھومنے کے لیے تیار ہو؟“

صوفیہ نے میری نگاہ کا تعاقب کیا تو وہ اٹھ ہوئیں اسے نظر آنکھیں جو کھانے کی ٹرائی کو بڑی سبک خراہی سے چلاتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جہاز کے مسافروں کو ڈر دیا جارہا تھا۔ مذکورہ ٹرائی ابھی اتنے فاصلے پر تھی کہ اسے ہمارے پاس پہنچنے میں دس سے پندرہ منٹ لگ سکتے تھے۔ میں اپنی بات کہہ کر بڑی خمیدگی سے خاموش ہو گیا تو صورت حال کو بھانپنے کے بعد صوفیہ نے کہا۔

”تم جتنے تسلسل سے مجھے گھما رہے ہو اسے دیکھتے ہوئے مجھے نہیں امید کہ ان بے چاروں کا بھی کبھی نمبر آئے گا؟“ بے چاریوں سے اس کی مراد اٹھ ہوئیں سے تھی۔ میں نے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا اور خاموشی اختیار کیے رکھی لیکن صوفیہ خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ میری پڑ اسرار چپ اور بے سر ہوا گویائی نے اسے مضطرب کر کے رکھ دیا تھا۔ میں اس وقت کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے محض ”ہوں ہاں“ پر اکتفا کیا۔

میرے روتل سے زچ ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے پہلے بھی کسی کس کا رد کیا ہے؟“ ”ہاں“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی ”ایسا موقع مجھے اکثر ملتا رہا ہے۔“

”جب ہی تو۔۔۔ میں بھی دھوکا کھا گئی تھی!“ وہ زہر لرب مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی مسکراہٹ سے جھلکتی معنی خیزی کو مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس گرم جوش اور خوشگوار ”استقبالیہ“ کا ذکر کر رہی تھی جو ہیرا لڈ تھا اس کے لندن والے اہل غمٹ میں

اس نے مجھے اپنا ہواے فریڈ یوسف الظاہری سمجھتے ہوئے پیش کیا تھا۔ بقول صوفیہ کے ”وہ مجھ سے دھوکا کھا نہ سکی۔ اگر واقعی وہ کوئی دھوکا تھا تو بڑا ہی خوب صورت اور دالہا نہ دھوکا تھا!“

میں نے یہ سب سوچتے ہوئے اس سے پوچھ لیا ”دھوکا کھانا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے محسوسات جان سکتا ہوں؟“

”میں یوسف کی رائے سے متفق ہوں!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”یومین..... اٹ ڈنٹ میٹر؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں آئی مین اٹ!“ وہ قطعیت سے بولی۔

ہیرالڈ تھامس کے اپارٹمنٹ میں جب صوفیہ نے کھیلا ہٹ بھرے انداز میں یوسف الظاہری کو بتایا تھا کہ وہ مجھے یوسف سمجھ کر لگے گی تو اس کی جھپٹ کے جواب میں یوسف نے کہا تھا..... اٹ ڈنٹ میٹر۔ وجدان ہمارے مشترک دوست کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس تناظر میں صوفیہ کا موجودہ جواب خاصا بولڈ تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ اس بڑے اور بے ہاک لڑکی کے ساتھ مجھے چند روز گزارنا تھے۔ اگر ہمارا ساتھ طویل ہوتا تو پتا نہیں کون کون سے موسیٰ اور بے موسیٰ گل گل جاتا تھے!

میں نے صوفیہ کے قطعیت بھرے جملے کے جواب میں غصہ بھرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم ایک بے مثال ساتھی ہو۔ میں یوسف الظاہری کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ انسان کو ایسا ہی زندہ دل اور خوش باش ہونا چاہیے۔“

یہ جملے میں نے صوفیہ کے اطمینان اور خوشی کی خاطر ادا کیے تھے۔ وہ بولی ”زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے اس لیے اسے زندہ ولی سے گزارنا چاہیے۔“

میں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا کیوں کہ کھانے والی ٹرائل ٹھیکے جیسے ہمارے سیٹوں کے قریب کچھ کچی تھیں۔ مجھے جواب نہ دینے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ دیے میں اس کے جواب میں کہا تھا ”کیا؟“ وہ چند جملے تو میں نے محض اس لیے کہہ ڈالے تھے کہ اسے آکر ڈھکوسل نہ ہو ورنہ چنگ فورن پوٹی سے دوسری ملاقات کے بعد میں نے پختہ تیر کر لیا تھا کہ خود کو کئی الامکان اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کروں گا۔

چیف لاما چنگ فو نے سائل کے حوالے سے مجھے ”تبت کا داماد“ کہا تھا۔ جو کھا کھک ٹیپل کے چیف لاما کی حیثیت

ملک کے سربراہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ براہ راست دلائی لاما کے رابطے میں ہوتا ہے بلکہ بعض معاملات میں وہ دلائی لاما کی تربیت اور راہ نمائی بھی کرتا ہے۔ ملک میں وزیراعظم کا انتخاب اس کی مرضی اور منشا سے ہوتا ہے۔ اس بات سے چیف لاما کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مجھے اگر تبت کا داماد سمجھا جا رہا تھا تو اس رشتے سے چنگ فو تبت کا باپ تھا یعنی میرا سسر!

ہر سسر کی اس بات پر گہری نظر ہوتی ہے کہ اس کی فرزندگی میں آنے والا بندہ کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس ناتے سے چنگ فو ساحل کے باپ کا کردار ادا کرنے والا تھا جب بھی پہلی ملاقات میں اس نے میری لغزشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مجھے ”سیدی راہ“ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میری قرقر آئی کی راہ میں جو مسئلہ پیدا ہوا ہے اس کا سبب میری لغزشیں ہیں۔ اگر میں خود پر کنٹرول حاصل کروں تو اس عارضی رکاوٹ کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ”دس روزہ عہدے“ سے بھی گزارا گیا تھا جس کے بعد دوسری ملاقات میں چنگ فو نے اپنے کہے کو سچا کر دکھایا تھا۔ میرے کال پر ہیز اور چنگ فو کے تعاون نے میری قرقر کے صنف کو دور کر کے مجھے ساحل کے ماحول میں پہنچا دیا تھا۔ اس کامیابی نے میرے اندر ایک نئے دلوں سے اور جوش کو ابھارا جس کے نتیجے میں میں چیف لاما کی بتائی ہوئی سائنس روکنے کی مخصوص مشق کر کے اس قابل ہو گیا تھا کہ تیسری آنکھ کی بازی گری اب مجھے جوں کا کھیل محسوس ہونے لگا تھا۔ میں قدم قدم پر کامیابی حاصل کرتے ہوئے اپنی منزل کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

جب کسی گرو کے بتائے ہوئے گم کے نتائج حسب ضرورت نمودار ہونے لگیں تو اس گرو کی کاملیت پر یقین اور بھی پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنگ فو میرے لیے ایک ایسا ہی گرو ثابت ہو رہا تھا لہذا اس کی ہدایات کا پاس اور متناظمی اختیار مجھ پر لازم ہو کر رہ گئی تھی۔

اگر ہوئیں نے ہمارے سامنے ڈنر جن دیا تو میں نے مذاق کے رنگ میں صوفیہ سے کہا ”کسی سے دھوکا کھانا اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کھانا کھانا۔ میرا خیال ہے ہمیں پہلی فرصت میں اس کھانے پر توجہ دینا چاہیے۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے ڈنر کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

صوفیہ میری بات کی تکیہ کچھ لگتی تھی۔ اس نے ڈنر لینا تو شروع کر دیا لیکن میرے مذاق کے جواب میں شرارت سے

ڈنر آئی۔ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔  
”میں تمہارے اسٹینٹ منٹ میں تھوڑا اضافہ کرنا چاہتی ہوں اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لہذا خاموش رہا۔ وہ اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔  
”کسی کو دھوکا دینا اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کھانا دینا۔“

میرا خیال ہے یہ ایتر ہوئیں تم سے زیادہ اہم کام کر رہی ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد انسان اور زیادہ بڑھ چڑھ کر دھوکا دینے کے معاملات پر غور کرنے لگتا ہے۔

میں اگر صوفیہ کی بات کا جواب دیتا تو بات بہت دور تک لگ جاتی مگر میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس موضوع کو لپیٹ کر شکم میری میں مصروف ہو گیا۔ صوفیہ نے حکم دیا کہ جن نتائج کی نشاندہی کی گئی ان سے انکار ممکن نہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ اقرار کا اظہار بھی کر لیا جائے۔ بعض اہم ان کی ہوتی ہیں انہیں سمجھنے اور سمجھانے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے!

☆☆☆

رات کے آخری پہریم کا چھٹا بج گئے۔  
صوفیہ یوسف الظاہری سے ملنے پہلے بھی مصر آ چکی تھی لہذا ہمیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہم نے قاہرہ انٹرویو سے ایک پرائیویٹ ٹیکسی بکری اور اس انٹرنیٹ تک چلے آئے جہاں یوسف کی ہدایات کے مطابق ہمیں ٹھہرنا تھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ قاہرہ کے عین قلب میں مسجد سلطان حسن کے نزدیک واقع تھا۔ یوسف الظاہری نے ہمیں اس اپارٹمنٹ کی چابیاں دے دی تھیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کے بارے میں زیادہ لوگوں کو معلوم نہیں لہذا ہمارے لیے کسی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ اپارٹمنٹ یوسف کے خفیہ محاکموں میں سے ایک تھا۔

ہم تیرہ عافیت سے اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گئے تو صوفیہ نے ایک طویل سائنس خارج کرتے ہوئے کہا ”میں اس اپارٹمنٹ میں صرف ایک مرتبہ یوسف کے ساتھ ٹھہری ہوں۔“

میں نے استفسار کیا ”میری معلومات کے مطابق تم کئی بار مصر آ چکی ہو۔ کیا یوسف تمہیں کہیں اور بھی ٹھہراتا رہا ہے؟“

”زیادہ تر وہ میرے لیے ہوئی اؤکسس (OASIS) میں ہوئے کب کر دیتا تھا۔“ اس نے جواب دیا ”یوسف اس محل کا سلیپنگ پارٹنر بھی ہے لہذا یہ اس کے لیے چلنے بجانے

کے جیسا کام ہے۔“  
میں نے اپنی یادداشت کو تازہ کرنے کی غرض سے کہا ”ہوئی اؤکسس غالباً کیرڈ الیکٹرونک ریا ڈیڈ رٹ روڈ پر واقع ہے؟“

”غالباً نہیں لہذا“ وہ زور دے ہوئے بولی ”لگتا ہے تم قاہرہ (کیرو) اور اسکندریہ (الیکٹرک ریا) کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟“

”تم سے زیادہ نہیں“ میں نے عام سے لہجے میں کہا ”میں نے پہلی مرتبہ مصر کی سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ اس بارے میں میری معلومات محدود ہیں۔“

وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”مصر ایک محسوس اور ناقابل تغیر سرزمین کا نام ہے جہاں قدیم قدم پر محض دھگ ذہن ماؤف اور سوچ مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔“

میں نے مصر اور اس سے متعلق اسرار و رموز کی بہت سی طلسمانی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ تاریخی اعتبار سے اس سرزمین کی جو اہمیت اور قدر و منزلت ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ میں نے صوفیہ کی بات کے جواب میں کہا۔

”اچھا ہے تمہاری شکل میں مجھے ایک ایسا ساتھی میسر آ گیا ہے جس نے پہلے بھی کئی بار اس جادوگری کی سیر کر رکھی ہے۔ میں تمہاری محبت میں اس طلسم کدے میں اترا ہوں۔ تم اگلی بکڑ کر اس کے ایک ایک اسرار کو کھولتی جانا۔ ہو سکتا ہے تغیر کی چند منازل میں بھی ملے کروں!“ میں نے ہجر کو متوقف ہوا پھر اپنے انداز کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس بحر التحول نگری کی سیاحت کے دوران میں تم ایک لمحے کے لیے بھی میری اگلی نہ چھوڑنا کہیں اس دھرتی کا کوئی ساحر محروم ہو کہ مجھے پتھر کا بت نہ بنادے۔ میں اپنی عقل کو دنگ کرنا تو افرودہ کر سکتا ہوں لیکن ذہن کو ماؤف اور سوچ کو مفلوج کرنا مجھے کوار نہیں! میں ایک خاص الفاظ اور اپنی زندگی کے سب سے اہم مشن پر لگا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی یہ چیزیں بہت عزیز ہیں۔“

وہ میرے بولنے کے دوران میں گہری دلچسپی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

”وجدان! کیا تمہیں شاعری بھی آتی ہے؟“  
یہ جملہ اس نے گمراہ چلاؤ اردو میں ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اردو میں فوراً جواب دیا۔  
”میں شاعر تو نہیں۔ مگر شاید یہ مصرعی پراسرار زمین کا

اثر ہے۔“ پھر میں اس کے انتہائی قریب چلا گیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا، ”ذرا دھیان سے میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ، کبھی میری عقل دنگ، ذہن ماؤف اور سوچ منطوق تو نہیں ہوتی؟ میں یہ کس قسم کی ہنسکی ہنسکی باتیں کر رہا ہوں!“

وہ چند لمحات تک دماغی یک نغہ سنجیدگی سے میری آنکھوں اور چہرے کو تشدید نظر سے غور کر رہی، پھر یک لخت کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ اس کی بے ساختہ ہنسی بڑی دلکش و دل نشیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اچانک جل کر تھک جانا تھا۔ اس پر بے خودی کی کیفیت طاری کی۔

وہ مجھ پر شاعری کا ”الزام“ لگا رہی تھی اور خود اس کا عملی مظاہرہ پیش کر رہی تھی۔ میں اس کے صوتوں ایسے آدب و اہم وارداتوں اور پوری طرح مکمل ہونے تکاب چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ وہ ان لمحات میں کھٹکتی اور رعنائی کا منہ بولا شاہکار بن گئی تھی۔ حسن اور فن کو خراج تحسین پیش نہ کرنا بد ذوقی کے زمرے میں آتا ہے۔ میں مبہوت کھڑا انہی تحریریں لکھتا کو دل میں دہرا رہا تھا۔

صوفیہ کے دل آویز قہقہوں کا تسلسل کسی بھی طور ٹوٹنا دکھائی نہ دیا تو مجبوراً مجھے کندھوں سے جھنجھوڑ کر اسے ”ہوش“ میں لانا پڑا۔ اس کی حالت نارمل ہوئی تو میں نے قدرے تینہی لکچس میں کہا۔

”صوفیہ! یہ کیا دیوانگی ہے؟“

”مجھے تمہاری بات سن کر بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔“ وہ اپنی آنکھوں کے نم ہو جانے والے گوشوں کو مخروعلی الکیوں سے صاف کرتے ہوئے بولی ”پھر پوچھتے ہو یہ کیا دیوانگی ہے!“

اس کے جواب نے مجھے ابھمن میں ڈال دیا۔ میں نے جملہ مانہ لکچس میں دریافت کیا، ”میں نے ایسی کون سی بات کر دی ہے؟“

”تم نے کہا نہیں کہ میں تمہاری اٹھکی کو احتیاط سے پکڑے رکھوں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لکچس میں کہا۔ ”یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ تم یہاں پہلی مرتبہ آئے ہو۔ میرے جن میں کراؤں گی یا مجھے کراؤ گے؟ تم میری اٹھکی پکڑ چلو گے یا مجھے تمہاری اٹھکی پکڑنا ہوگی؟“

اس نے خاصی سنجیدگی سے سوال اٹھاے تو میں عاجزاً سر پکڑ کر رہ گیا۔ اس نے ایک مینیکل پوائنٹ اٹھا یا تھا پیش آمد صورت حالات میں اصولاً مجھے اس کی اٹھکی تھمتنا چاہیے تھی، لیکن اتنی معمولی سی تیلیفنی خامی پر یوں نان اسٹاپ ہنسنے چلے جانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے غمی میں

گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”صوفیہ! بس اتنی سی بات کے لیے تم نے۔۔۔۔۔؟“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی ”دراصل“ دو باتیں ایک ساتھ میرے ذہن میں ابھر آئی تھیں۔“ اس کا انداز وضاحت پیش کرنے والا تھا۔ ”میں پہلے یہ سوچ رہی تھی کہ ایک یوسف الظاہری نے مجھے مصر کی سیر کرانی تھی اور اب میں ایک دوسرے یوسف الظاہری کو مصر کی سیر کرانے والی تھی۔ یہ تم ظہری بلکہ تم ضعیفی نہیں تو اور کہا ہے۔ اس پر تم نے وہ اٹھکی پکڑنے والا شکوہ چھوڑ دیا۔ بتاؤ میں ہنسی نہیں تو کیا بیچہ کر دنا شروع کر دیتی؟ کوئی لطیف سن کر انسان رو دیتا ہے کیا؟“

اس نے بات کے اختتام پر دو سوالات داغ دیے لیکن میں نے کسی وضاحت کی ضرورت کو محسوس نہ کیا اور اس لئے شتم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے درحقیقت اپنے ذہن میں دو یوسف الظاہری کو الگ الگ بٹھا رکھا ہے اس لیے سوچ کی یہ پیچیدگی پیش آ رہی ہے۔ تم اپنی یادداشت میں یوسف الظاہری کو تسبیح کرنے کے کوشش کرو۔ اصلی یوسف الظاہری کو چند دنوں کے لیے فراموش کر دو، صرف اس یوسف الظاہری کو یاد رکھو جو۔ اصلی کے ہمیں میں لگتی ہے اور تمہارے ساتھ اسے مصر سے اسرائیل جانا ہے۔“

”تمہارا مشورہ تو دل کو لگ رہا ہے“ وہ کچھ سوچے ہوئے بولی ”لیکن اگر میں نے نہایت ہی چنگلی سے چھینا یوسف بھٹنا شروع کر دیا تو پیچیدگی اور بھی بڑھ جائے گی۔ تھ۔۔۔۔۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

اس نے ہم انداز میں بات کو سمیٹا تو میں اس کے مطلب کو بخوبی سمجھ گیا۔ جان چڑانے والے انداز میں میں نے اس سے کہہ دیا، ”اٹ ڈنٹ میٹر۔“ اسی لمحے فون کی تختی بجنے لگی۔ ہم دونوں نے حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صوفیہ نے سوالیہ انداز میں کہا، ”کس کا فون ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو اینڈ کرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔“ میں نے سرسری لکچس میں کہا۔

ہم اس وقت اپنا رمنٹ کے جس کمرے میں بیٹھے تھے فون سیٹ بھی وہیں ایک اشیئرز پر رکھا تھا۔ میری تائید پر صوفیہ فون کی جانب لپک گئی۔ یہ فون میرے لیے ایک طرما ہے۔ باعث رحمت ثابت ہوا تھا۔ مختصری سننے ہی صوفیہ اپنے

کو بھول گئی تھی ورنہ پتا نہیں اسے الطیمان دلانے کے لیے بچے کون کون سے جوابات دینا پڑتے۔ وہ ایک باتوں اور پیچھے پڑ جانے والی لڑکی تھی!

صوفیہ نے فون اینڈ کیا۔ ”ہیلو“ کے جواب میں دوسری طرف کی بات سنی اور میری طرف دیکھتے ہوئے مطمئن لکچس میں بولی۔

”وہ جان! ہیرا اللہ تھامس تم سے بات کرنا چاہتا ہے!“ ہیرا اللہ تھامس کا نام سننے ہی میں فون کے قریب پہنچ گیا۔ تھامس کا تعلق انگلینڈ کے ”جیالو جیکل ڈیپارٹمنٹ“ سے تھا اور وہ اس مشن کے سلسلے میں میری بھرپور مدد کر رہا تھا۔ صوفیہ اور یوسف الظاہری اس کی ”دریافت“ تھے۔ رکی علیک ملک کے بعد اس نے ہمارے سفر کے بارے میں دریافت کیا پھر اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”یوسف الظاہری نے تمہارے روانہ ہوتے ہی لندن سے براہ راست اپنے دوست السید مبارک اکسینی سے بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ قاہرہ پہنچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوست بھی ہے جو اسرائیل، مصر اور اردن کی سیر کرنا چاہتی ہے۔“

وہ ہم کو سانس لینے کے لیے توقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا، ”یوسف نے مبارک اکسینی کو اپنی دوست صوفیہ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا ہے۔ جنہیں معلوم ہے مبارک اکسینی، ”کامینکی ٹورائیز ٹرپ ریول کینی“ کا نمائندہ ہے جس کے توسط سے یوسف اور صوفیہ کے دورے کا بندوبست ہوتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”ہاں بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ لمحے بھر کا تو میں نے تسلی بخش لکچس میں کہا، ”آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔“

وہ بولا، ”کامینکی (CONTIKI) والے عموماً سفر کے آغاز سے بیٹھائیس دن پہلے بنگ کرتے ہیں لیکن مبارک اکسینی یوسف الظاہری کا سچا دوست ہے لہذا اس نے یوسف اور صوفیہ کے لیے کئی نشان نکال لی ہے۔ جنہیں ضرورت میں کل دونوں پاسپورٹس مبارک اکسینی کے آفس پہنچانا ہوں گے۔ ہاؤس میں چوبیس اپرل کو ان میں کلون کے دورے والا ایک ٹرپ روانہ ہونے والا ہے جو مصر، اسرائیل، اردن سے ہوتے ہوئے سولہ دن کے بعد یعنی نو مئی کو واپس مصر پہنچ جائے گا۔ اگر ٹرپ کس ہو گیا تو پھر ہمیں کم از کم چندہ دن تک انتظار کرنا ہوگا کیوں کہ اس سال کا دوسرا ٹرپ آٹھ مئی کو روانہ ہوگا۔ یوسف نے مبارک سے بے منت کا معاملہ بھی طے کر لیا ہے لہذا جنہیں کامینکی کے آفس میں کسی قسم کی ادائیگی نہیں کرنا

ہوگی۔ تم اپنے ساتھ جو رقم لے کر گئے ہو اسے دیگر معاملات کے لیے بچا کر رکھو جنہیں کسی وقت کوئی بھی ہنگامی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔“

ہیرا اللہ تھامس نے مجھے اور صوفیہ کو امریکی ڈالر کی صورت میں اچھی خاصی رقم بطور ”زاوردہ“ تھما دی تھی۔ میں نے کہا، ”ٹھیک ہے میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ ذرا یہ تو بتائیں اس ٹور کے لیے کسی کمپنی والے کتنی رقم وصول کرتے ہیں؟“

”مصر، اسرائیل اور اردن کے اس سولہ روزہ دورے کے لیے کامینکی والے فی مسافر ایک ہزار نو سو پچانوے امریکی ڈالر وصول کرتے ہیں۔“

”یعنی پورے آئیس سو پچانوے ڈالر؟“ میں نے حیرت بھرے لکچس میں کہا، ”یہ تو بہت بڑی رقم ہے؟“

”زم بڑی ہے یا چھوٹی اس کی تم فکر نہ کرو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لکچس میں بولا، ”مجھے لویوسف الظاہری اور صوفیہ کے کل تین ہزار نو سو نوے ڈالر کمپنی کو ادا کر دیے گئے ہیں۔ چوبیس اپریل کی صبح سے تم کامینکی کے ڈسپوزل پر ہو گے۔ اس ٹرپ کے دوران میں جنہیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ کمپنی اگر ہماری رقم وصول کرتی ہے تو اس کے بدلے میں آرام وہ تفریح بھی مہیا کرتی ہے۔“

”ٹھیک ہے مسز تھامس! میں آپ کی ہدایات کو یاد رکھوں گا۔“ میں نے مضبوط لکچس میں کہا۔

اس نے دعا یہ انداز میں لمبی ٹونک رابطہ موقوف کر دیا، ”بیٹ آف لک!“

میں نے ریسپورڈ رکھا تو صوفیہ نے کہا، ”یوسف الظاہری تمہارے لیے قدم قدم پر آسانیاں فراہم کر رہا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ جنہیں اس مشن میں زیادہ محنت کرنا پڑے۔“ ”اگر تم ایسا خیال نہیں کرتی ہو تو میں یہی کہوں گا، تم غلط سوچ رہی ہو“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ”میں بہت مشکل پسند ہوں اور محنت کرنے سے نہیں گھبراتا۔ جنہیں اس چند روزہ ”ساتھ“ میں بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ مجھے یقین ہے جب اسرائیل میں تم مجھ سے جدا ہو گی تو میرے بارے میں تمہاری رائے بدل چکی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ وہ ایک ادانے ناز سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا، ”ہائی دی دے“ تم اسرائیل سے واپس لندن کیسے پہنچو گی؟“

چیف لانا چنگ فورن پوشی نے اس سلسلے میں کوئی واضح

بات نہیں کی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا جب اسرائیل میں میں ساحل کو حاصل کرلوں گا تو صوفیہ مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ میں نے سوال کیا تھا کہ اصلی صوفیہ کا کیا ہوگا تو اس نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا مجھے صوفیہ کے سلسلے میں ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں اسے اسرائیل سے مصر اور مصر سے انگلینڈ پہنچانے کی دتے داری کسی اور شخص کو سونپی جا چکی ہے! چنگ فو کے اس دو ٹوک جواب کے بعد میں مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اسی لیے اب صوفیہ سے پوچھ رہا تھا۔ اگر صوفیہ کو کسی اور شخص کے ساتھ سفر کرنا تھا تو یقیناً وہ اس شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہوگی۔

وہ میرے سوال کے جواب میں بولی "اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ کرتی۔" "کیا مطلب!" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا واقعی تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو؟" "ہاں واقعی!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "تمہیں میری بات کا یقین کر لینا چاہیے۔" "میں یقین کر رہا ہوں لیکن..... یہ سب کیسے ممکن ہے کہ.....؟"

میں نے جملہ نامکلم جھوڑا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "مسٹر تھامس نے مجھ سے کہا تھا تم جیسے ہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرو گے میں تم سے الگ ہو جاؤں اور فوراً تھامس سے رابطہ کروں۔ اس وقت وہ مجھے بتانے گا میں کیا کروں اور کیسے کروں!"

"اوہ!" بے ساختہ میرے لبوں سے ایک خشکی سانس خارج ہوئی۔ میں نے سمجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے موجودہ سیٹ اپ کی انجینی خاصی ڈوریاں مسٹر ہیرالڈ تھامس نے اپنے ہاتھوں میں تمام رکھی ہیں۔"

صوفیہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور نہ ہی صاف انکار کیا بلکہ خاموشی سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اس سے قبل کہ میں کچھ بولتا اس نے منہ کھول کر ایک کشادہ جماعی لی۔ میں نے موقع مل کر مناسب سے فوراً کہہ دیا۔

"میرا خیال ہے رات کا جو تھوڑا بہت وقت باقی بچا ہے اس کو سو کر گزارنا چاہیے تاکہ کل صبح فریش حالت میں حالات کا مقابلہ کر سکیں۔"

"سونے کی بات کرتے ہوئے تم تو ابھی نہیں لگتے وجدان!" اس نے ایک اور جماعی لی۔

میں نے کہا "کیا تم چاہتی ہو میں چاندی کی باتیں کروں؟"

وہ گڑبگڑائی جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی تم نے جہاز کے اندر کم از کم تین گھنٹے کی نیند لی ہے!" "تمہیک ہے اب میں نہیں لوں گا۔" میں نے صلح معافی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "تم اطمینان سے لو۔ میں خاموشی سے تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ تم چاہو تو جہاز والی کمر اس اپارٹمنٹ میں پوری کر سکتی ہو!" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"دو ایسے ایک بات کی وضاحت کر دوں جہاز میں تم بارگزی تھیں یہاں بھی میں ہی جیتوں گا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے ایک خاص ادا سے بولی "یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ انسان اپنی طلب پوری کر چکا ہو تو اسے ایسے ہی مطالبوں کی سوچتی ہے۔ تم خاموشی سے مجھے دیکھو یا چیخا باجے کے ساتھ مجھے تو شدید نیند آ رہی ہے..... اور میں واقعی سو رہی ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ ایک بید پر دراز ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہی سمجھا کہ وہ کوئی خوشی یا اطمینان دکھا رہی ہے لیکن چند منٹ بعد جب اس بیدار ہونے میں اس کے سر لیے خزانے ابھرنے لگے تو مجھے یقین کرنا پڑا صوفیہ من کی ہے!

نیند نے مجھے بھی خاصا ستا رکھا تھا۔ صوفیہ کا یہ انداز بالکل غلط تھا کہ میں نے دوران سفر میں انجینی خاص نیند لے لی تھی۔ وہ میری مسلسل بند آنکھوں کو دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ میں آرام سے سو رہا ہوں۔ اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی خیال کرتا۔ کون جانتا تھا میں آنکھیں بند کیسے جاگ رہا تھا اور اسی دل چسپ سرگرمیوں میں مشغول تھا کہ بیان سے باہر ہے۔

میں چند لمحات تک صوفیہ کو بے نظری سے سوتے ہوئے دیکھتا رہا پھر دوسرے بید پر دراز ہو کر میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ سونے سے قبل میں نے تھوڑی سی تصوراتی آوازاں کر دی ضروری بھی اور ساحل کو سوچ کر اس کے ماحول میں بکھینچ گیا۔

مصر اسرائیل اور اردن کے مقامی وقت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ یہ تینوں ہی ملک "جی ایم ٹی" سے دو گھنٹے آگے ہیں۔ جی ایم ٹی (گرین وچ میں ٹائم) زبردستی پر پابند ہے وقت تسلیم کیا جاتا ہے۔ لندن سے مشرقی سمت میں واپس ہونے کے باعث ان ممالک کا وقت دو گھنٹے آگے ہے۔ پاکستان اور جی ایم ٹی میں لگ بھگ پانچ گھنٹے کا فرق مانا جاتا ہے۔

ساحل اس وقت گہری نیند میں تھی۔ بیداروں میں زیرو پارڈبل کی مدد م روشنی بجلی ہوئی تھی۔ میں چند لمحات تک اس بیداروں میں موجود رہا پھر اس کے ماحول سے نکل آیا۔ اگلی کوشش میں نے ربی موٹے ہاتھن کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں کی لیکن نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ بار بار کی ناکامیابی کے بعد بھی میں ہمت نہیں ہارا تھا۔ مجھے مایوسی ضرور ہوئی تھی لیکن میرا عزم مایوسی کے بادلوں کو ہلکے جھپکے میں منتشر کر دیتا اور میں دوبارہ اس کوشش میں لگ جاتا۔ مجھے یقین تھا میں چیف لاما کی بتائی ہوئی ٹیکسٹ پر عمل کرتے ہوئے ایک روز ضرور ربی کے ماحول کو چھوؤں گا..... اور یقین سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہو سکتی!

میں نے دوسرا دوسرا دیکر تصوراتی مزاحمت میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور دماغ کو ہدایت دینے لگا "میں یعنی وجدان علی ابن عابدی نہایت ہی نرسکون شخص اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک آٹھ بجے صبح میری آنکھ ہش ہش اش آنکھیں کھلی کھلی جائے گی لیکن اس نیند کے دوران میں اگر اس اپارٹمنٹ کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کا امکان پیدا ہو گیا تو وقت مقررہ سے پہلے ہی فوراً میری آنکھ کھلی جائے گی!"

اس ہدایت کے ساتھ ہی آنکھیں بند رکھتے ہوئے میں سونے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ میں نے جسم کو بالکل ڈھیلا جھوڑ کر نیند کے حوالے کر دیا۔ مجھے اس کوشش میں جلد ہی کامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے نیند کی مہربان اور خوش آمدید وادی میں اترتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

آئندہ روز ناشتے کے بعد ہم اپارٹمنٹ سے نکل آئے۔ مذکورہ اپارٹمنٹ جمیل القدر مسجد سلطان حسن کے قریب ہی واقع تھا۔ میری یہ کوشش تھی کہ اپارٹمنٹ سے باہر کم سے کم وقت گزاروں۔ میں اس وقت یوسف الظاہری کے جلسے میں تھا۔ اگر زیادہ دیر تک باہر گھومتا پھرنا تو یوسف کا کوئی بھی ہانسنے والا مجھ سے غرا سکتا تھا اور مجھے اس سے بچنا تھا۔ کم از کم اتنا وقت تک یہ احتیاط نہایت ہی ضروری تھی جب تک ہم اپنے دورے کا آغاز نہیں کر دیتے۔

جولوگ دوسروں کا حلیہ اپنا کر سوسائٹی میں مود کرتے ہیں ان میں ایک ایک قدم بھونک کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر یہ ناک زیادہ دنوں تک چلانا ہو تو میک اپ اور گھٹ اپ کی مکمل رینج اپنے ساتھ رکھنا پڑتی ہے۔ کسی بھی وقت کسی

شے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ کافی نیوٹی کے تقاضوں کو نبھانے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

میرے پاس میک اپ کا مکمل سامان موجود تھا اور اب تک میں نے اس فن میں انجینی مہارت بھی حاصل کر لی تھی۔ مجھے ساحل کو صوفیہ کا روپ دے کر اسرائیل سے نکالنا تھا اور یہ کام گویا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ساحل کو صوفیہ بنانے میں مجھے زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ وہ ایک مرتبہ میری دسترس میں آ جاتی تو زیادہ محنت کیا میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا!

ہم تھوڑی دور تک پیدل ہی چلتے رہے پھر ایک ٹیکسی کھڑی۔ ٹیکسی والے نے ہمیں "خان الخلیلی بازار" کے پاس سے گزرا کر مختلف سڑکوں پر گھمایا اور کچھ دیر بعد الباقری اسٹریٹ پر واقع کالمنی کے آفس کے سامنے پہنچا دیا۔ آفس کے باہر "اسپرنگ ٹورز کیر" کا بورڈ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔ ظاہرہ انٹرپرائٹ سے باہر آنے سے پہلے میں نے ایک مٹی بیچر ایجنٹ کے دفتر سے چند ڈالر کو مصری کرنسی میں تبدیل کر لیا تھا۔ مصر کا سکہ رائج الوقت "مصری پائونڈ" ہے جو اس وقت ایک امریکی ڈالر کے مقابلے میں تقریباً پوائنٹ سیون ٹائیو کی حیثیت رکھتا تھا یعنی ایک امریکی ڈالر میں لگ بھگ پونے چار مصری پائونڈ بٹل جاتے تھے۔ میں نے ٹیکسی والے کو مقامی کرنسی میں ادائیگی کی اور ہم "اسپرنگ ٹورز کیر" کے دفتر میں داخل ہو گئے۔

السید مبارک اسٹینی کا حلیہ یوسف الظاہری نے مجھے ازب کر دیا تھا لہذا اس تک رسائی میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ یہ میری اداکاری کا سب سے کڑا امتحان تھا۔ میں یوسف کے ایک بے تکلف دوست سے مل رہا تھا لیکن سب غیریت رہی۔ میری کامل ایکٹنگ اور قدرتی روپے نے مبارک اسٹینی کو میرے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہیں کیا اور یہ مختصر ملاقات انتہائی کامیاب رہی۔ میں نے اپنا یعنی یوسف الظاہری اور صوفیہ کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات مبارک اسٹینی کو تھما دیے اور مصروفیت کا بہانہ کر کے اس کے دفتر سے اٹھ آیا۔

مبارک اسٹینی کی ہدایت کے مطابق آئندہ روز یعنی چوبیس اپریل کو صبح نو بجے سے پہلے ہمیں اوسس ہوٹل پہنچنا تھا۔ "کالمنی" کے اس تین مٹی ٹرپ کا ڈیپارچر اوسس ہوٹل سے ہوتا تھا اور یہ بات "مجھ" سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ "میں" تو اس ہوٹل کا سلیپنگ پارٹنر بھی تھا۔ مبارک اسٹینی نے جو کچھ کہا وہ اس کے پیشہ ورانہ فرائض کا حصہ تھا۔ اب مجھے



اپنے ”فرائض“ سے عہدہ براہوتا تھا! ہم اسپرگ نورز کیرہ کے آفس سے باہر نکلے تو صوفیہ نے تو مٹی انداز میں کہا ”ایکسیلنٹ! تم نے بڑی بھرپور اداکاری کی ہے۔ مبارک امیسی کو ایک لمبے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ یوسف لظاہری کے بجائے کسی بہرہ دہ سے ملاقات کر رہا ہے۔“

میں نے گہری چوٹ کی ”کیا تمہیں شبہ ہوا تھا؟“

”نہیں..... نہیں!“ وہ گڑبڑا کر کہی۔

میرا اشارہ اس خوشگوار دلفن کی جانب تھا جسے تھامس کے اپارٹمنٹ میں صوفیہ نے مجھے گرجوٹی سے استقبالیہ دیا تھا اور وہ مجھ والرائی میرا اشارہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔

ہمارے درمیان چند لمحات خاموشی کے گزرے۔ مبارک امیسی کے دفتر سے ٹھوڑی دور آنے کے بعد ہم نے الباقری اسٹریٹ کے کونے سے ایک کسیسی بڑی اور دلچسپی کے سفر بردار ہو گئے۔ مصر میں چلنے والی ٹیکسی کو عموماً ”پینجر کار“ بھی کہا جاتا ہے۔ میں احتیاط کے دامن کو ایک لمبے کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرا یوں کھلے عام زیادہ گھومنا پھرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اب تک اس شہن کے تمام مراحل بخیر و عافیت طے ہو گئے تھے۔ اگر میں اسی خطا روی کا اپنا نہ رکھتا تو کامیابی یقینی تھی۔ صوفیہ کے پاس برطانیہ کی شہریت تھی اور اس کا پاسپورٹ ”ای ٹی ای“ لٹا ہوا بھی تھا۔ ای ٹی ای (ایکسٹرا ٹیکز پر ٹولی اتھارٹی) ایک انٹرنیشنل ادارہ ہے جو دنیا کے تینتیس ممالک سے متعلق افراد کے پاس پورس کو اپنے پاس رجسٹریشن کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ ان تینتیس ممالک میں جاپان، کینیڈا، امریکا، علاوہ چند جنوبی ایشیا کے ملک اور زیادہ تر یورپی ممالک شامل ہیں۔ ای ٹی ای لیسٹنڈ پاسپورٹ کے حامل شخص کو دہرائے حصول کے لیے ایک بھی پابندی نہیں بیلنا پڑتا۔ بیگ لٹی ہے اور نہ ہی پچھری رنگ چوکھا بھی بعد میں آتا ہے البتہ ڈیزا پبلک جاتا ہے!

پتا نہیں یہ کوئی الیہ ہے یا حالات کا جبر اور یا پھر ہماری بد قسمتی کہ بین الاقوامی سطح پر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے جو بھی منصوبہ بندیاں کی جاتی ہیں اور جو بھی قوانین و قواعد وضع کیے جاتے ہیں ان میں یہ کوشش بہر حال ضرور کی جاتی ہے کہ مسلمان کم سے کم فیض یاب ہو سکیں یا پھر سرے سے محروم ہی رہ جائیں!

وہ پورا دن ہم نے اپارٹمنٹ کے اندر بند رہ کر گزارا۔ اسپرگ نورز کی دہرائے دہرائے سے وہاں ہی رہنے لچ کا بندوبست کر لیا تھا

لہذا دوپہر کے کھانے کے لیے بھی ہمیں باہر نہیں نکلنا پڑا۔ جب ہم اپارٹمنٹ سے نکلے تھے تو خان اعلیٰ بازار میں نے کھانے کا ایک میٹاری مرکز دیکھا تھا۔ دن تو جیسے جیسے گزر گیا۔ رات چمکنے لگی تو صوفیہ نے میں نے استفسار کیا۔ ”تمہیں گھر کے اندر بند ہو کر بیٹھے رہنا کیسا لگ رہا ہے؟“

”اتہائی بورنگ!“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی

”لیکن تمہاری وجہ سے مجھ پر یہ نا“

”تمہاری وجہ سے تو کوئی مجبور نہیں ہے نا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ قطعیت سے بولی ”بالکل نہیں“ میں نے کون سا روپ بدل رکھا ہے!“

”سارا مسئلہ میرے روپ کا ہے“ میں نے کہا ”ٹھیک ہے“ میں ہی اس میں کوئی رد بدل کر لیتا ہوں۔ تمہاری یوریت کا کچھ نہ کچھ دوا تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”کیا تمہیں یوریت محسوس نہیں ہو رہی؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی ہاں تو ہے کہ میں بھی اتنا محسوس کر رہا ہوں“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”میں زیادہ عرصے کے لیے یوں کسی گھر کے اندر بند ہو کر کبھی نہیں بیٹھا ہوں۔“

وہ پرمعنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”تم نے ابھی یوسف کے بہرہ دہ میں رد بدل کی بات کی ہے۔ تمہارے ذہن میں کیا آئینہ ہے؟“

”مکمل طور پر اس طے کو تبدیل کرنا تو مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”اگر میں اپنی آنکھوں پر سے کالکٹ لینس ہٹا دوں اور اس کی اسٹائل بالوں پر کوئی ٹوپی وغیرہ لگا دوں تو دیکھنے والوں کو پہلی نظر میں یوسف لظاہری دکھائی نہیں دوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

وہ اٹھتے میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتی ہوں۔“

”ویسے ہمارے پاس میک اپ کی مکمل ریج ہے۔ اس کے علاوہ تمام لوازمات بھی موجود ہیں جو حلیہ تبدیل کرنے میں خاصے معاون ثابت ہوتے ہیں“ میں نے اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”اگر میں زپرنگا بلی پچھلی موچیں چسپاں کر لوں تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہو جائیں گے۔“

اس نوعیت کی باہمی گفتگو کے بعد ہم اس فیصلے پر پہنچ گئے

کہ ذرے کے لیے ہم اپارٹمنٹ سے باہر جائیں گے۔ میں نے اپنے حلیے میں حسب ضرورت مناسب سی تبدیلی کی اور ہم اپارٹمنٹ سے نکل کر خان اعلیٰ بازار کی طرف چل پڑے۔

دنیا کا کوئی بھی ملک اور ملک کا کوئی بھی حصہ ہو وہاں پاکستانی اور افریقیں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ نہ صرف پہنچ جاتے ہیں بلکہ ذاتی کاروبار بھی شروع کر دیتے ہیں۔ ٹھوڑی سی تلاش کے بعد خان اعلیٰ بازار میں ہمیں ایک ویسی ہوٹل مل گیا۔ دو حقیقت ۱۰ ایک ریسٹورنٹ تھا جہاں افریقیں اور پاکستانی دونوں طبقہ کی معروف ڈشز دستیاب تھیں۔ ویسی کھانے کھانے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا لہذا میں نے صوفیہ سے صاف لفظ میں کہہ دیا۔

”میں تو اس ریسٹورنٹ کا ڈائننگ چکھوں گا۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”جب صبح ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر اس ریسٹورنٹ کے پاس سے گزرے تھے تو تم نے جن نظروں سے ادھر دیکھا تھا“ میں سمجھ گئی تھی تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہوگا اور اب تم نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں اور کہا ”تم تو بڑی سمجھ دار ہو..... بلکہ کچھ زیادہ ہی زود سمجھ ہو!“

اس نے میرے اظہار خیال پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور بولی ”اگر زیادہ تیز مرقع سالانہ ہو تو بھی تمہیں پڑنے والے لوں گی۔“

اس اتفاق رائے کے بعد ہم ”خان اعلیٰ“ کے مذکورہ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ مینو دیکھا تو پتا چلا کہ ہمارے مطلب کی خاصی ڈشز موجود تھیں۔ میں نے ویسے مرقع سالے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا وہ ہمارے حسب فضا تیار کر دے گا۔ ہم نے اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آرڈر لکھوا دیا۔ صوفیہ نے اپنے لیے فریڈز رائس اور چکن کی ایک سادہ سی ڈش منگوائی۔ میں نے برائی چپائی اور فریڈز دینی منگوائی۔ ان تمام ڈشز کو کینٹر کر کے ہم نے ایک بھر پور ڈنر یا اور بل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔

میں جانتا تھا اپارٹمنٹ میں پہنچ کر ”بے حرکت“ ہونا پڑے گا لہذا ٹھوڑی سی ٹائٹ واک ضروری تھی۔ ہم پیدل ہی نکلے ہوئے خان اعلیٰ بازار سے نکل آئے اور اس جانب بڑھنے لگے جس پر مسجد سلطان سن واقع تھی۔ ایک بھر پور چمیل قدی کے دوران میں باتیں کرتے ہوئے بالآخر ہم

اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔ مذکورہ اپارٹمنٹ دو بیڈروم ایک سنگ روم اور ایک ڈائننگ پر مشتمل تھا۔ دونوں بیڈروم میں سے ایک چھوٹا اور دوسرا قدرے کشادہ تھا۔ چھوٹے بیڈروم میں ایک ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا جب کہ بڑے بیڈروم میں دو مختلف دیواروں کے ساتھ دو چھوٹے بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ہم نے گزشتہ رات اسی بیڈروم میں دو مختلف بیڈز پر سو کر گزاری تھی۔ گزشتہ رات سے مراد رات کا وہ مختصر سا حصہ جو اتفاق سے ہمارے حصے لگ گیا تھا۔

میں نے صوفیہ سے کہا ”تم نے بتایا ہے کہ پہلے بھی ایک مرتبہ اس اپارٹمنٹ میں قیام کر چکی ہو۔ اس بار تم کس بیڈروم میں ٹھہری تھیں؟“

اس نے جواب دیا ”ڈبل بیڈ والے بیڈروم میں۔“ ”اگر تم یہاں ان ایڑی ہو تو اسی بیڈروم میں چلی جاؤ“ میں نے تجویز پیش کرنے والے انداز میں کہا ”وہاں رات گزارنے سے بھولی برسی بہت سی یادیں بھی تازہ ہو جائیں گی!“

میرے الفاظ میں اچھی خاصی معنی خیزی پنہاں تھی۔ وہ میری بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے قدرے جھینپ گئی۔ میں اپنے اس عمل سے خود بخود استاء سے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں بلی پچھلی چیمپیر جھار کے موڈ میں تھا۔ ویسے میں جانتا ہی تھا کہ وہ دوسرے بیڈروم میں چلی جائے۔ مجھے اچھی بالکل نیند نہیں آ رہی تھی اور میں جاگ کر ٹھہر ڈالی کی کہ جب بازیوں میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اگر صوفیہ میرے ارباب قریب موجود رہتی تو مداخلت کا ایک سو ایک فیصد امکان تھا۔

میری تجویز کے جواب میں اس نے کہا ”میں محسوس کر رہی ہوں میری وجہ سے تم کچھ زیادہ ہی ایڑی ہو رہے ہو۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں دوسرے بیڈروم میں چلی جاتی ہوں۔ دیسے فی الحال تو میں پہنچ کر رہنے جا رہی ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ واش روم میں خس گئی۔ پندرہ منٹ بعد جب وہ دوبارہ نمودار ہوئی تو ابھی خاصی پہنچ ہو چکی تھی۔ اب اس کے بدن پر لوز ٹراؤزر اور لی شرٹ نظر آ رہی تھی۔ میرے پاس پہنچتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں کہا۔

”میں سو نے سے پہلے بلی پچھلی ایکسرسائز کی عادی ہوں۔ گزشتہ رات تو سو میں زور لگی لیکن آج کوئی مجبور نہیں ہے لہذا میں کامن روم میں جا رہی ہوں۔“

”تم کاس میں جاؤ یا ریزرو میں اس سے کوئی فرق نہیں



جنس نے حقیقت حال مجھ پر واضح کر دی۔ ربی ۱۰  
دودھ کے بارے میں استفسار کیا تھا اور دراز قامت  
اس دودھ کے کسی بھی حوالے سے معصیت نہ ہو  
میں یقیناً ایک جنس گردن جاری کر دیا تھا۔

آٹھ مئی کی صبح تک۔ ٹریول کمپنی کی بس پانچ سے آٹھ مئی تک بہت شین سے بیڑا۔ پینر اسے ایلٹات اور ایلٹات سے یوٹلم پہنچ جاتی۔ میں اسرائیل میں مزید قیام کا بہانہ کر کے صوفیہ کے ساتھ قافلے سے الگ ہو جاتا اور اپنا ”کام کر کے“ دوبارہ آٹھ مئی کو یوٹلم میں قافلے سے جا ملتا۔ اس مرتبہ میرے ہمراہ صوفیہ کے روپ میں ساحل ہوئی۔

میرے اندر سے کوئی بار بار مجھے اکساتا تھا، میں تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنی جان تمنا تک پہنچ جاؤں لیکن میں چیف لاما کی ہدایات کو کسی قیمت پر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ ساحل کو حاصل کرنے کا یہ آخری موقع تھا۔ میں اس سنہری موقع کو کیوں کر گنوا دیتا۔ میری کیفیت اس بھوکے شخص کی تھی جس کے سامنے اچانک سورج بے نور و خوش ذائقہ بھاپ اڑاتے ہوئے کھانوں کی کئی ڈشز سجادی جا رہی تھیں۔ اس صورت حال میں، میں کسی بے صبری یا بیچنے پن کا مظاہرہ کر کے اپنی منزل کو کھنٹا نہیں کر سکتا تھا۔ گرم گرم نوالہ منہ میں رکھنے سے زبان جل جاپا کرتی ہے، میں اس قسم کا کوئی ریسک لینے کا تیار نہیں تھا۔ چیف لاما کی ہدایت میرے لیے مشکل راہ تھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے علاوہ کوئی اور بھی اس کمرے میں موجود ہو۔ یہ احساس خاصا سنسنی خیز تھا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا اور آنکھیں بند کیے بستر پر ڈال تھا۔ کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی میں نے یک لخت آنکھیں کھول دیں۔

میں نے صوفیہ کو بیڈ کے قریب کھڑے پایا۔ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بیڈ روم کے دروازے کو نیم وا چھوڑ دیا تھا لیکن اب وہ پورا کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں صوفیہ سے کوئی سوال کرتا، وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اچھا تو ہم خود ہی جاگ گئے۔ میں تذبذب میں تھی، جنہیں اٹھاؤں کر نہیں!“

”صوفیہ! تم اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟“ میں نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا ”تم ابھی تک سوئی کیوں نہیں ہو سب خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے دھدان!“ وہ گھبراہٹ میں مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی ”ساتھ والے بیڈ روم میں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ اس کے ہم انداز نے مجھے گہری تشویش میں ڈال دیا، میں نے بستر چھوڑتے ہوئے پوچھا ”تم کس گڑبڑ کی بات

کر رہی ہو؟“

”اس بیڈ روم میں کروکڈ اکل محسوس کیا ہے!“ اس نے متحوش لہجے میں بتایا۔

”کروکڈ اکل..... یعنی مگر چھ؟“ میری تشویش میں اضافہ ہو گیا۔

”ہاں ہاں“ وہ اہانت میں سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

صوفیہ کی بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنا غصہ پوری طرح پیک تھا۔ کروکڈ اکل تو بہت دور کی بات ہے چڑا کا ایک بچہ بھی ہم سے اجازت حاصل کے بغیر اس اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے داخلی دروازے کو کھرا اپنے ہاتھوں سے ڈبل لاک لگا لیا تھا۔ علاوہ ازیں، قاہرہ کے اس باروق علاقے میں کسی مگر چھ کا کیا کام!

میں نے ایک فوری خیال کی تصدیق کی خاطر اس سے پوچھا ”تھیں تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا صوفیہ؟“

”یہ خواب نہیں، ایک حقیقت ہے“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر روم سے باہر لاتے ہوئے بولی ”آؤ، اس حقیقت کو تم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھو!“

میں اچھے ہوئے ذہن کے ساتھ، صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ میری ستلائی نظر نے ایک لمبی لمبی اس کمرے کا تنقیدی جائزہ لے لیا۔ مجھے وہاں پر کوئی مگر چھ! مگر چھ کا پتہ تک دکھائی نہ دیا۔ یہ صورت حال خاصی حیران کن تھی۔ میری سوالیہ نگاہ صوفیہ کے چہرے پر جم گئی۔

”کہاں ہے وہ کروکڈ اکل؟“ میں نے حیرت بھرا لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

”وہاں!“ اس نے پکڑوں والی بڑی چوٹی الماری کا جانب اشارہ کیا ”اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔“

مجھے صوفیہ کی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔ اس نے جس قدر آدم چوٹی الماری کی جانب اشارہ کیا تھا ویسی ہی ایک الماری اس بیڈ روم میں بھی رکھی تھی جہاں سے صوفیہ مجھے اٹھ کر لائی تھی۔ یہ دونوں الماریاں دیوار کی گہرائی میں ملنے والی تھیں۔ یہ انداز میں دیوار کے ساتھ اٹا دھکیں۔ ان کی پشت سے دیوار کے درمیان اتنا فاصلہ ہرگز نہیں تھا کہ وہاں کوئی کروکڈ اکل یا بے بی کروکڈ اکل گناہ گزیر ہو سکے۔ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ اور کہا۔

”صوفیہ! لگتا ہے تمہارے دماغ کا کوئی اسکرین ہو گیا ہے۔“

”تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟“ اس نے گہری خجیدگی سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

”یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے!“ میں نے قدرے برہمی سے کہا ”کوئی مگر مجھے اس الماری کے پیچھے کیسے چھپ سکتا ہے؟ وہاں اتنی گنجائش کہاں ہے؟“

”وہ کوئی جوان کروکڈ اکل نہیں۔“ اس کی خجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا ”مجھے وہ کسی کروکڈ اکل کا بچہ لگا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے بیڈ کے نیچے سے نکل کر الماری کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا ہے۔“

”کروکڈ اکل کا بچہ بھی کوئی چوہا نہیں ہوتا!“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”تم میری بات کا اعتبار نہیں کر رہے۔ مجھے اس کا سخت انوس ہے۔“ اس کے لہجے سے یہ محسوس ہونے لگا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی حالت اور ذہنی کیفیت پر ماتم کیا اور یہ ظاہر عجیبہ ہوتے ہوئے اس سے پوچھا ”کیا تم نے کروکڈ اکل کے اس بچے کو الماری کے پیچھے سے نکالنے کی کوشش نہیں کی؟“

”میری ہمت نہیں پڑی“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی ”اسی لیے تمہیں بلانے دوسرے بیڈ روم میں بھیجی گئی تھی۔“

میں نے محسوس کیا، وہ کسی نادیدہ مگر چھ کے سبب اچھی خاصی خوف زدہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ شاید اسے دہم ہو گیا ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو۔ بہر حال، اس کی فکر مندی اور ہراس بالکل جینوں تھا۔ میں سمجھ گیا، اسے نفسیاتی اور عملی دونوں قسم کے علاج کی ضرورت تھی۔ اس کے ذہن پر چھائے ہوئے خوف دہراں کو فوری طور پر زائل کرنا ضروری تھا۔ ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے خجیدگی سے کہا۔

”تم فکر نہ کرو صوفیہ! میں ابھی دیکھ لیتا ہوں، کون سا کروکڈ اکل اس الماری کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے!“

بات ختم کرتے ہی میں آگے بڑھا اور چوٹی الماری کو ایک زوردار ٹھٹھا مارا۔ اس ضرب کے نتیجے میں الماری کے پیچھے سے ”کھڑکھڑاہٹ“ ایسی آواز پیدا ہوئی۔ وہاں واقعی کوئی گڑبڑ موجود تھی۔

”دیکھا..... دیکھا.....“ وہ بیچانی انداز میں بولی ”میں نے کہا تھا نا.....“ وہ جملہ نامک چھوڑ کر متحوش نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”جیسا بات تو یہ ہے کہ اس ”کھڑکھڑاہٹ“ سے میں یہی

سمجھا تھا“ الماری کے پیچھے کوئی چوہا چھپا بیٹھا ہے۔ میں ممکن ہے، وہ چوہا معمول کی کسی کارروائی میں مصروف ہو! میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، میں تمہارے سامنے ہی اسے چپ کر رہا ہوں۔“

”وہ جان! ذرا سنبھل کر“ وہ قاطع لہجے میں بولی ”غصہ نہ کرو! میں تمہیں کچھ لاکر دیتی ہوں۔ میں نے اودھراش روم میں ایک چیز رکھی دیکھی ہے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ مجھے بیڈ روم میں چھوڑ کر کاسن روم والے داش روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کی مٹی برصاقت وشت زدگی پر سر جھٹک کر رہ گیا۔ مجھے یقین تھا، اس چوٹی الماری کے عقب سے ایسا کچھ برآمد نہیں ہوگا جسے مگر چھ یا کھڑیاں وغیرہ کے خانے میں دفن کیا جاسکے لیکن صوفیہ کے اطمینان اور تسلی کی خاطر ایک ڈراما کرنا ضروری تھا۔ جب تک وہ داش روم سے واپس آتی، میں نے اس چوٹی الماری کو ”چپک“ کر لیا۔ وہ ایک بھاری بھر کم الماری تھی جسے اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے تین چار افراد کی ضرورت تھی، ہاں البتہ ”جی“ کی مدد سے میں تنہا اسے کھسکا کر جہاں جاتا، پہنچا سکتا تھا مگر کسی بھی قسم کی کارروائی صوفیہ کے سامنے کرنا ضروری تھا تاکہ تسلی ہو جائے۔

وہ دوبارہ بیڈ روم میں نمودار ہوئی تو اس کے ایک ہاتھ میں مجھے اٹنی راڈ نظر آئی۔ وہ مذکورہ راڈ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی ”یہ لے لو۔ میں جب پہنچ کرنے ادر گئی تھی تو میں نے اسے وہاں پڑے دیکھا تھا۔“

میں نے وہ راڈ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس اٹنی راڈ کی لمبائی تین فٹ کے قریب اور مٹائی لگ بھگ آدھی انچ تھی۔ وہ ایک مضبوط اور خطرناک راڈ تھی۔ میں نے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

”تم اس بیڈ کے اوپر بیٹھ جاؤ“ میرا اشارہ جس بیڈ کی جانب تھا وہ چوٹی الماری کی مخالف سمت میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا ”میں اس کروکڈ اکل کو الماری کے پیچھے سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں“

”ذرا احتیاط سے دھدان!“ وہ مذکورہ بیڈ کے اوپر چڑھتے ہوئے بولی ”تمہیں وہ پلٹ کر تم پر حملہ آور نہ ہو جائے!“

میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہہ دیا ”تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے ایسے خوں خوار جانوروں سے سنسنے کا وسیع تجربہ ہے“ پھر اس کی مزید تسلی کے لیے کہا ”شاید تمہیں معلوم نہیں، میں دریائے ایمیزون میں ایک طویل عرصے تک کروکڈ

ڈائل اور ایلی گیلر کا شکار کرتا رہا ہوں!“

”کیا تم جنوبی امریکا میں بھی رہے ہو؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

دریائے امیزون (AMAZON) جنوبی امریکا کے سب سے بڑے ملک برازیل میں بہتا ہے، بلکہ بہتا ہوا کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ امیزون کی کل لمبائی چار ہزار میل ہے جس میں سے دو ہزار ترانوے میل برازیل میں واقع ہے۔ امیزون دنیا کا دوسرا بڑا دریا ہے۔ نمبرون کا اعزاز مصر میں بننے والے دریائے نیل کو حاصل ہے جس کی کل لمبائی چار ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔ میں نے صوفیہ کا دھیان بنانے اور خوف کم کرنے کے لیے یہ چکر چلایا تھا..... اور وہ میرے چکر میں آ بھی گئی تھی۔

میں نے اس کی حیرت کے جواب میں کہا ”تم اس چکر میں نہ بڑو کہ میں کون کون سے امریکا میں رہا ہوں، صرف یہ دیکھو کہ ایک اہنی سلاح کی مدد سے کسی وحشی مگر چھ کا شکار کس طرح کیا جاتا ہے!“ وہ بے یقینی اور الجھن کی ملی جلی کیفیت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے سلاح کے استعمال سے پہلے چوبی الماری پر اپنے پاؤں سے ایک اور ٹھوکر لگائی۔ اس ٹھوکر کے جواب میں بھی وہی مخصوص کھڑکھڑاہٹ ابھری جو اس سے پہلے سنا دی گئی۔ یہ تو طے ہو گیا، اس الماری کے عقب میں کوئی جان دار موجود تھا۔ میں سلاح تھا، تو خورچیچھے ہٹ کر اس جان دار کے برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ نکل کر نہ دیا تو میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا ”یہ ایسے نہیں مانے گا!“

میں دیوار کے قریب آیا اور فرش پر اکڑوں بیٹھ کر میں نے اہنی سلاح کو چوبی الماری کی پشت کے ساتھ واقعی خلا میں گھمایا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں دیوار الماری کے درمیان مختصر سے خلا میں کوئی شے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میرا ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آیا کہ میں نے محسوس کیا، اہنی سلاح کا آدرا اس مختصر خلا میں موجود میدان جان دار کے وجود سے ٹکرایا ہو۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک وحشت ناک ہلپا ہٹ ابھری۔ یقینی طور پر سلاح کا دوسرا سرا وہاں موجود جانور کے جسم میں خاصی شدت سے چبھا تھا۔

میں نے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کوئی ہے تو کئی۔ تم نے غلط نہیں کہا تھا!“

”ہاتھ پاؤں بجا کر ویدان! وہ خطر ناک بھی ثابت ہو سکتا ہے“ وہ بھی ہولی آواز میں بولی۔

میں کھد پڑنے والے انداز میں الماری کے پیچھے اس اہنی سلاح کو حرکت دینے لگا۔ وہ مخصوص وحشت ناک ہلپا ہٹ ایک مرتبہ پھر ابھری، اس کے بعد وہ خود بھی نمودار ہو گیا۔ میں الماری کے عقب سے اسے گولی کی رفتار سے نکل کر ایک طرف فرار ہوتے ہوئے پایا..... وہ ملی کے سائز کا ایک صحت مند اور ہلپا ہٹا تھا!

میں نے اس جسامت کی جھپکی یا جھپکا زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بڑھ اور سن رکھا تھا کہ اس نوعیت کے زہریلے پھپکے صحرائی ملکوں خصوصاً افریقہ کے بعض ممالک میں پائے جاتے ہیں اور اتفاق سے اس وقت ہم مصر یعنی افریقہ ہی میں تھے۔ صوفیہ نے کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ اس پھپکے کی صورت بڑی حد تک کسی کرکٹ ڈائل (مگر جھ) یا ایلی گیلر (گھڑیاں) سے ملتی جلتی تھی۔

میں اس زہریلے پھپکے کو فرار ہوتے دیکھ رہا تھا میری سماعت سے صوفیہ کی آواز گرائی ”ویدان! ابھی ہے وہ موڈی۔ اس کو شتم کر دو..... جانے نہ پائے.....“

میں اہنی سلاح تھا اسے اس مضروب ”مغفور“ کی جانب بڑھا۔ الماری کے عقب میں اہنی راڈ لے اسے اچھا خاصا فوجی کر دیا تھا۔ اس کے بدن سے نپکتے ہوئے خون کو دیکھ کر اس کی وحشت ناک ہلپا ہٹ کا سب کچھ میں آگیا جو تھوڑی دیر پہلے دوسرے اس بیڑوم میں سنا دی گئی تھی۔ اس کی جان بچانے کی کوشش میں کمرے کا قالین جگہ جگہ سے داغ دار ہو رہا تھا۔ میری اندھا دھند حرکت نے اس کے جسم پر کوئی خطر ناک گھاؤ ڈال دیا تھا۔

مگر ویدان ایک منٹ تک ہمارے درمیان آنکھ پجولی اور بچ بچاؤ کا کھیل جاری رہا وہ خود کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور بھی ہو رہا تھا تاہم میں نے اس کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ یہ بے قاعدہ مقابلہ چند لمحات تک جاری رہا۔ اس دوران میں صوفیہ کی مدد اور بلند چلا ہٹ وقفے وقفے سے بلند ہوتی رہی۔ پھپکا جلد ہی میرے داؤ میں آگیا پھر میں نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ اہنی سلاح کی ایک بھر پو وضرب اس کے سر میں ایسی لگی کہ وہ زمین بوس ہو کر تڑپنے لگا۔ اسی لوٹ پوٹ کے دوران میں اس کے طلق سے بڑی درد ناک اور دہشت انگیز آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحات تک جان کنی کے عالم میں اذیت میں جتنا رہا پھر یہ حس و حرکت ہو۔ یہ بے حس و بے حرکتی اس کی حسرت ناک موت کا کھلا اعلان تھی!

اس پھپکے کو تائیں تائیں فیش ہوتے دیکھا تو صوفیہ کی

جان میں جان آئی۔ اس نے ایک طویل اطمینان بھری سانس خارج کی اور بیڈ سے اتر کر میرے قریب آگئی پھر مردہ جھپکے کی طرف اٹھک اٹھاتے ہوئے بولی۔

”اب اس کا کیا کر دو گے وجدان؟“ اس کے لہجے کی وحشت پوری طرح زائل نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے مذاق کا رنگ اختیار کیا اور گفتگو لہجے میں کہاں ”تم سمجھتے ہو کہ بخت کو شکار کرنے کے بعد پکا کر کھایا بھی نہیں جاسکتا اور اس کا چار مرہ بھانکر مرتبانوں میں بھرتا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے۔ اسے ”ضائع“ ہی کرنا پڑے گا۔“

میں نے لفظ ضائع پر اچھا خاصا زور دیا تو وہ پوچھنے لگی ”میں تو میں بھی جانتا جانتی ہوں تم اس محسوس کی لاش کو کس طرح ضائع..... میرا مطلب ہے تمھارے لگاؤ گے؟“

”گارنچ شوٹ کے ذریعے“ میں نے کہا ”آخرو کیسے کس مرض کی دوا ہے؟“

”اوہ! میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔“ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ”اس لیے تمہارا دھیان پوری طرح کہیں اور لگا ہوا تھا!“

بات کے اختتام پر میں نے مردہ جھپکے کی طرف دیکھا تو وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گئی۔

گٹھڑی اپارٹمنٹس میں گارنچ شوٹ کی سہولت مہیا ہوتی ہے جس کے ذریعے آپ اپنے اپارٹمنٹ کا کچرا براہ راست پکڑا کنڈی تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ گارنچ (GARBAGE) یعنی پکڑے کے شوٹ میں ڈال دیں۔ مخصوص پائپ فوراً اسے پکڑے کے ذخیرے تک پہنچا دے گا۔ آئندہ دس منٹ کے اندر میں واپس اور اسی اہنی سلاح کو استعمال کر کے جھپکے کی خوں چکان لاش سے ”نجات“ حاصل کر لی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ گارنچ شوٹ کتنے کام کی شے ہے!

اس کام سے فارغ ہوا میں تھا، صوفیہ نے حتیٰ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا ”میں اس بیڈروم میں بالکل نہیں سوؤں گی!“

اس کا اشارہ اس بڑے بیڈروم کی طرف تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک خوں ریز مقالے کے بعد موڈی جھپکے کو جہنم واصل کیا تھا۔ یہ خوف دہراں پھیلانے والا اتنا بڑا

واقعہ تھا کہ صوفیہ کا مطالبہ مجھے بالکل درست لگا۔ بیڈروم کے فرش پر بچھا ہوا قالین بھی جا پھونک اُلوہ ہو چکا تھا۔ یہ ایسے آثار تھے کہ وہاں رات بسر کرنے والے کو تھپہ پر لٹھ..... اس ”وائف“ کی یاد دلاتے رہتے۔ آدمی رات کو یہ تو ممکن

نہیں تھا کہ میں قالین کو کسی ڈرائی کلینر کے پاس بھجوا دیتا خود پیٹھ کر اس کے دھبے دور کرنے میں لگ جاتا، ہاں البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں وہ رات اس بیڈروم میں سو کر گزار لیتا۔ اگلی صبح ہمیں ویسے بھی اسی اپارٹمنٹ سے رخصت ہو جانا تھا۔

اسی خیال کے تحت میں نے صوفیہ سے کہا ”ٹھیک ہے! اس بیڈروم میں“ میں سو جاتا ہوں۔ تم چھوٹے بیڈروم کے ڈبل بیڈ پر چلی جاؤ۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے میری تجویز پر غور کیا پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولی ”اگر وہاں بھی کوئی ایسا ہی کرد کو ڈائل..... آئی مین، جھپکا نکل آیا تو؟“

”ہوئے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”تم یہاں سونے کو تیار نہیں ہو، وہاں بھی تمہیں خدشات ڈرا رہے ہیں۔ بتاؤ، میں اس صورت حال میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ اگر تم کہو تو گزشتہ رات کی طرح میں اسی بیڈروم میں تمہارے ساتھ سو جاتا ہوں۔“

وہ خون آلود قالین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اے دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر مجھے متلی سی محسوس ہو رہی ہے..... اس کے علاوہ میں بے پناہ خوف زدہ بھی ہوں۔“

”بتاؤ!“ میں نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا ”تمہارا خوف دور کرنے کے لیے فوری طور پر کیا کروں؟“

وہ سادگی سے بولی ”ساتھ رات گزارنے کی تمہاری تجویز خاصی مناسب ہے، اگر اس تجویز پر عمل درآمد کے لیے بڑے بیڈ والا چھوٹا بیڈروم استعمال کیا جائے تو۔ ہم بڑی آسانی سے ڈبل بیڈ پر نیند پوری کر سکتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس کا خیال خاصا پرکشش تھا لہذا میں فوراً اس کا ہم خیال بن گیا۔

ہم واپس ڈبل بیڈ والے بیڈروم میں آئے۔ رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اصولی طور پر ہمیں سو جانا چاہیے تھا۔ نیند پوری کر کے کل کے لیے تروتازہ ہونا ضروری تھا۔ آئندہ روز میری زندگی کا ایک انوکھا اور سنسنی خیز ٹرپ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے خیالات سے صوفیہ کو آگاہ کیا تو اس نے کہا۔

”وجدان! جھپکے والے واقعے نے مجھے بری طرح اب سیٹ کر کے رکھ دیا۔ میں سونے کی کوشش میں جیسے ہی آنکھیں بند کرتی ہوں، وہ بد تمیز غیبیت جھپکا کر کسی کرد کو ڈائل کے مانند آنکھیں نکال کر مجھے گھورنے لگتا ہے۔“ ایک لمحے کا



توقف کر کے اس نے جھنجھری لی اور بڑی بے بسی بولی "پتا نہیں میں آج کی رات سو بھی سکوں گی کہ نہیں؟" "سو نہ بہت ضروری ہے صوفیہ!" میں نے قطعیت سے کہا "اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" "کیا مدد؟" وہ ابھمن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی "کیا تم مجھے لوری سنا کر نیند کی دوا دی میں اتار دو گے؟" "لوری میں نہیں بلکہ تم مجھے سناؤ گی" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ وہ مزید الجھ گئی "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں نے اپنے مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں تمہارا سر میں اپنی اگلیوں سے ہلکا ہلکا مساج کرتا ہوں۔ تم اپنے جسم کو ویسا سمجھو کہ مجھے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دو۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات۔ ربط اور ضبط کی ضرورت نہیں، بس تم نہایت ہی آہستگی سے دیکھ لے مجھے اپنی داستان حیات بیان کرنی جاؤ مجھے یقین ہے۔ یہ کہانی اتنی تم ہونے سے پہلے تم گہری نیند میں کچل جاتی گی"

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور سوال کیا "کیا یہ بھی پتا نہ ہو کہ کونسی قسم ہے؟" "تم آہ کھانا چاہتی ہو یا جھپٹیں پیر شہار کرنے سے مطلب ہے؟"

"مجھے شہاریات کا معنوں ہمیشہ بورنگ لگا ہے!" "پھر صرف آم پر نظر رکھو"

اس نے اپنے سر کو میری گود میں رکھ دیا۔ "میری اگلیوں نے مساج کی ابتدا ہی تھی کہ وہ شروع ہو گئی۔ چند لمحات کے بعد اس کی آواز بوجھل ہونے لگی۔ یہ نیند کا شمار تھا جو اس کے الفاظ کو اتنی خود پہنا کر دڑنی بنا رہا تھا۔ وہ جس خوف کے باعث آنکھیں بند کرنے سے گریزاں تھی، میری آغوش میں بیٹھنے ہی وہ خوف زائل ہو گیا۔ اس کی کہانی سننا تو ایک نفسیاتی بہانہ تھا۔ درحقیقت، میں اسے ایک تنہا کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ دنیا کی کوئی بھی عورت، مرد کی پانہوں میں خود کو سب سے زیادہ محفوظ سمجھتی ہے۔ میں نے اسے یہی محسوس کرانے کے لیے یہ نفسیاتی پتھر مارا تھا۔ اور میری یہ کوشش صدی کا سیلاب رہی۔"

میں نے احساس کی پہلی دے کر صوفیہ کو گہری نیند میں بہنچا دیا۔ بعد میں مجھے اپنے جذبات کو سمجھنے میں کافی محنت کرنا پڑی۔ اس رات میں اپنے دماغ کو نیند کی روایت دیتے ہوئے۔ سو بار گڑ بایا توجہ کے سامنے وہ کسی رگی تھان کے

مانند کھلی پڑی تھی۔ خیال کو جھپٹنے سے بچانا تو نتیجے میں میری سوچ لٹکھڑا کر اس کی طرف چلا جاتی تھی شاید جنگ فون پوٹی ان لمحات میں براہ راست مجھ پر ناظر تھا۔ میرے پاس استقامت میں ایک ذرا سی ڈمگھا ہٹ نہ آئی۔ میں نے اپنے احساسات اور جذبات پر قابو رکھا اور جبلی خواہش کو اس طرح تھک تھک کر سلا دیا جیسے محووی دیر پہلے اس خواہش کی ڈے دار گوسلا یا تھا۔

دوسرے کو الزام دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ ان لمحات میں شاید میں یہی کر رہا تھا!

☆☆☆

"کاشمیری" نور انڈیٹ ٹریڈ کمپنی کی سرگوری اڑ کٹھینڈ کوچ ایجی مثال آپ تھی۔ میں نے اتنی آرام دہ اور سہولیات سے بھر پور کوچ میں پہلے بھی سفر نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ کسی اڑبسی کی "پرنس کلاس" کے برابر اس میں سہولیات فراہم کی گئی تھیں۔ کوچ کے پہلوؤں میں کمپنی کا مخصوص مولو گرام بنا ہوا تھا جس میں لفظ "کاشمیری" میں ایک ابھرے ہوئے سورج کو دکھایا گیا تھا۔ اس کے نیچے سرخ، پیلے، ہبز، لکائی اور نیلے رنگ کی پانچ پٹیاں بڑے دلکش انداز میں نیچے سے اوپر تک پھیلی ہوئی تھی۔ مخصوص مولو گرام کوچ کی پشت پر بھی موجود تھا۔

کوچ پر سوار ہونے سے پہلے، ہوٹل اؤکسس میں کاشمیری کے عملے سے تمام مسافروں کو متعارف کرایا گیا۔ ان میں سب سے اہم شخص نور میجر بن ہال تھا۔ بن ہال کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ بہت سختی شخص تھا۔ اس نے پہلی جوائن کرنے کے بعد جاں فشانی سے کام کیا اور انیس سو پچانوے میں نور میجر بن گیا۔ اب وہ پچھلے چند سال سے اسی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ یہ کم وقت میں کی جانے والی بڑی ترقی تھی۔ بن ہال فٹ بال کا بہت شوقین تھا۔ اسے جب بھی صحت میسر آتی، کھیل کے میدان میں نکل جاتا۔ وہ ایک ہنس کھ، خنیاہ اور متھان پیشہ درخص تھا۔ میں نے اسے اچھا خاصا باتونی پایا۔

امیت کے لحاظ سے بن ہال کے بعد کوچ کے ڈرائیور دارن ڈکسن کا نمبر آتا تھا۔ دارن ڈکسن نیوزی لینڈ کا رہنے والا تھا۔ کاشمیری جوائن کرنے سے پہلے وہ ایک تعمیراتی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ انیس سو ستاسی میں ڈرائیور بن گیا پھر انیس سو نوے میں اس نے "کاشمیری یورپ" میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کوچ کی ڈرائیوری سے پہلے وہ روس اور ایکٹھ سے نیو یارک میں بھی نور ٹریپ کی بیس چلا چکا تھا۔ بن ہال

کی یہ نسبت وہ ایک کم گو، سنجیدہ اور موڈی شخص تھا۔ ان تمام تر خصوصیات کے پیش نظر مجھے محسوس ہوا کہ کاشمیری کمپنی کے توسط سے انیس سو پچانوے امریکی ڈالرز میں تین ملوں کا سولہ روزہ سیاحتی دورہ زیادہ مہنگا نہیں تھا۔ بعد میں میرا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ اس کمپنی نے آرام، سہولت اور تفریح فراہم کرنے کا ریکارڈ تو زود کیا تھا۔

چوبیس اپریل کو ہم کاشمیری کی کوچ میں بیٹھ کر قاہرہ کے ہوٹل اؤکسس سے روانہ ہو گئے۔ نور میجر بن ہال ایک گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا اور راہ میں بڑے دلی ہر قابل ذکر جگہ یا مقام کے بارے میں وہ تمام مسافروں کو تفصیلاً بتاتا بھی جاتا تھا۔ میں اس تفصیل سے بچتے ہوئے محض اہم مقامات کا مختصر ذکر کروں گا کیوں کہ میری داستان حیات میں اس سیاحت کی پہلی اہمیت نہیں، میں جس مقصد کی خاطر اس کٹ راگ میں ابھرا تھا، وہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھا لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں چپ چاپ اسے ذکر کروں کر کے آگے بڑھ جاؤں۔ جن قارئین کو یہ بیان طولانی اور بورنگ محسوس ہو، ان سے بھی اور جو اسے پڑھ کر تنگی محسوس کریں، ان سے بھی میں پیشگی معذرت خواہ ہوں!

پچیس اپریل کی صبح ہمیں ایکشن میوزیم (مصری عجائب گھر) کی سیر کرائی گئی۔ ہمارا گائیڈ بن ہال اپنے متاثر کن زور بیان سے ہمیں قدیم مصری تہذیب کے دور میں لے گیا۔ ہم خود کو ہزاروں سال پہلے کے مصری بادشاہوں کے عہد میں محسوس کرنے لگے۔ یہ ایک سنسنی خیز اور ناقابل فراموش محسوساتی تجربہ تھا۔ اڑیس علاوہ ہم نے بہت سے بادشاہوں کے مجسمے اور عظیم الشان اہرام بھی دیکھے۔ شام کے وقت کوچ کے تمام مسافروں کو بے ڈریوٹر ٹرین اسوان کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ اس ٹرین کو رات بھر سفر کر کے قاہرہ سے اسوان پہنچنا تھا۔

پچیس اپریل کو اسوان کی سیر کی گئی۔ دیگر چھوٹے موٹے اہم مقامات کا نظارہ کرنے کے بعد ہمارا ٹور بھر ہمیں اسوان ہائی ڈیم دکھانے لے گیا۔ یہ ڈیم دنیا کا ایک بڑا آبی ذخیرہ مانا جاتا ہے جس کی دیواروں کے اندر ایک سو بائیس ارب کعب میٹر پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔ ایک مختاطہ انداز سے کے مطابق یہ ایک سو بائیس ارب کعب میٹر پانی ڈیم طین ایکڑ زمین کو بے آسانی سیراب کر سکتا ہے۔ اسوان ہائی ڈیم انیس سو اکتھ میں مکمل ہوا تھا۔ یہ بڑی دیکھنے کی چیز ہے۔ ڈیم سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے یونیسکو کل گارڈنز دیکھے اور یوں دن کا اختتام ہو گیا۔

ستائیس اپریل کو ہم "نائل کرڈز" میں بیٹھ کر اسوان سے ایٹو فی کی جانب روانہ ہو گئے۔ نائل کرڈز ایک عالی شان اور آرام دہ شپ ہے۔ اڈے کے بامند سفید رنگ کے اس بحری جہاز کی باڈی پر نیلی، ہنز اور پیلی طویل پٹیاں بہت حسین اور خوب صورت دکھائی دیتی ہیں۔ "نائل کرڈز" پر بنے ہوئے تمام پراجیوٹ کمپن فریم کی سہولت سے لیس ہیں۔ ٹی دی سینٹ اور اڑنڈ شٹر تو لازمی شے ہے۔ اس کے علاوہ، سونگ پول، بن تاجھڈ ایک، ریٹورنٹ، ٹائٹ کلب اور مختلف نوعیت کی گفٹ شاہیں سب کچھ شپ پر موجود ہے۔ نائل کرڈز NILE CRUISE پانی میں حیرتے ہوئے کسی جہان حیرت سے کم نہیں!

ایٹو فی تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم نے یہاں مصری آرکیولوجک کے عظیم الشان شاہ پارے دیکھے جو ساڑھے تین ہزار سال قبل ریمیس دم کے عہد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی دوران میں "نیمیل نامر" کا نظارہ بھی کیا گیا۔ کچ کے بعد ہم "کوم ادبو" پہنچے اور ہم نے ایک ایسا نیمیل دیکھا جو منفر د اور باعث حیرت ہے "کوم ادبو نیمیل" کو بیک وقت دد مصری خداؤں (دیوتاؤں) کی مشترک عبادت گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آنے والی رات ہم نے نائل کرڈز میں بسر کی۔

اٹھائیس اپریل کا نائل کرڈز ہمیں ایٹو فی سے لگڑ لے گیا۔ لگڑز میں ہمیں ایک ایسا نیمیل دیکھنے کو ملا جو مصر کا سب سے زیادہ "محفوظ" نیمیل کہلاتا ہے۔ محفوظ ان معنوں میں کہ یہ ابھی تک کم دیش اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ یہ نیمیل فالگن دیوتا "ہورس" سے منسوب ہے۔ لگڑز ہی میں ہم نے ٹھیس کا قدیم شہر بھی دیکھا۔ یہ رات بھی نائل کرڈز پر ہی بتائی گئی۔

انیس اپریل کو لگڑز میں ہی واقع مشہور معروف وادی "وہلی آف دی کنگز" دیکھی گئی۔ اس وادی میں مشہور زمانہ کنگ طوط آسن بھی دفن ہے۔ ڈیم نے لگڑز کی سیر کا سلسلہ جاری رکھا اور سرے پھر کے وقت کاشمیری کے مخصوص ہوٹل میں چیک ان ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی نائل کرڈز کا سفر تمام ہوا۔ ہم نے ہوٹل کے سونگ پول میں ایک فرحت بخش خیرا کی کی اور آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں ٹھہر گئے۔ تیس اپریل کی صبح، لگڑز سے قاہرہ جانے سے پہلے ہم نے "نیمیل آف لگڑز" کی بھی سیر کی۔ اڑیس علاوہ اونٹ کی سواری بھی کی گئی۔ یہ دن بھی سیر و تفریح میں گزر گیا اور ہم بالی اڑ قاہرہ کی جانب پرواز کر گئے۔

کیم کی کو قاہرہ کی تفصیلی سیر کی گئی۔ دیکھنے کی قابل ذکر جگہیں جو رہ گئی ہیں انہیں نشانیا گیا۔ ان مقامات میں بازار خان الکلی، مختلف قدیم اہرام اور دیگر مساجد کے ساتھ ساتھ مسجد سلطان حسن بھی شامل تھی۔ خان الکلی بازار اور مسجد سلطان حسن پہلے سے دیکھے ہوئے مقامات تھے۔ اس رات ہوٹل اؤٹس میں ایک "گیت نوکیر" پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ مصر کا آٹھ روزہ سیر مکمل ہو گئی تھی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ان آٹھ دنوں میں کوئی بھی ناخوش کو وارد واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

الحق یہ یعنی دو مئی کو ہم مصر سے اسرائیل روانہ ہو گئے۔ یہ سفر قاہرہ سے تل ابیب تک کا تھا۔ تل ابیب کی فضا میں داخل ہوتے ہی میری کمر بے سی حالت ہونے لگی۔ میں نے خود کو جذباتی کش مکش میں مبتلا پایا۔ رہی موٹے ہاتھن نے اسی شہر کے "پوش علاقے" کے ایک بنگلے کی بالائی منزل پر میری جان تنہا کو ایک طویل عرصے سے قید کر رکھا تھا۔ ساحل تک مکمل رسائی کا ایک راستہ مجھے انداز ہو گیا تھا

اس وقت میرا بی چارہ ہوا تھا، میں کاٹھنی کے قافلے سے چھڑ جاؤں اور کمان میں سے نکلے ہوئے کسی تیر کے مانند سیدھا اپنے حاصل زندگی تک پہنچ جاؤں۔ ہر مصلحت، ہر احتیاط کا دائرہ جھک کر میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاؤں اور اپنی ساحل کو حاصل کرنے کے بعد کسی ایسی پرسکون وادی کی طرف نکل جاؤں جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ صرف وصال کے رات و دن ہوں، جگر کی ایک گھڑی ہمارے نزدیک نہ چھٹے ہم نے بہت جدائی اور فراق سہہ لیا تھا، اذیت ناک لمحات کا زہر اپنے حلق میں پکا تھا، آبلہ بار بار پرخار پر ایک طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس وقت ہم ایک ہی شہر میں تھے اور ہمارے سچ صرف چند کلو میٹر کا فاصلہ حاصل تھا۔ یہ فاصلہ میں آن واحد میں پات سلکتا تھا اور.....!

یہ فاصلہ مجھے پائتا تھا لیکن..... جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں بلکہ مکمل ہوش مندی اور اعتماد میں رہ کر، اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے مجھے ایک منسوب پلاننگ سے آگے بڑھنا تھا کیونکہ یہ آخری موقع تھا۔ اس مرحلے پر ایک ذرا سی غلطی، کوئی جذباتی لغزش یا غلط سمت میں اٹھنے والا ایک بھی قدم مجھے میرے مقصد، میری زندگی سے بہت دور دھکیل سکتا تھا۔

میں نے ساحل سے دور رہ کر بہت مہر کیا تھا، بہت برداشت کیا تھا۔ میں مایہ ہے آب کی طرح تڑپا تھا اور سچ میں پردے ہوئے کباب کے مانند سا تھا..... محض اس

دن، اس گھڑی اور اس لمحے کے انتظار میں کہ میں جب اپنی ساحل کو حاصل کروں اور اب..... وہ دن، وہ گھڑی اور وہ لمحہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے کرب ناک انتظار کے صرف تین دن باقی رہ گئے تھے جس کے بعد مجھے فری ہینڈ ملے والا تھا۔ اس مدت ہی میں مجھے اپنا کام دکھانا تھا اور اصل مندی کا تقاضا بھی تھا، میں اپنی آزمائش کے آخری مراحل کو پوری ثابت قدمی سے طے کروں اور جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے مقصد پر کڑی نظر رکھوں۔

اس توانا اور مثبت سوچ کے ساتھ ہی میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا عزم جوان ہو گیا ہو۔ مجھے اپنے رگ دے میں ایک نیا جوش اور ایک نئی سنسنی سی ارتعاش محسوس ہوئی۔ اس دل سرور کن کیفیت نے میرے اندرون کو باغ کر دیا۔

گزشتہ آٹھ دنوں میں، میں گا بہ گا بہ ساحل اور موٹے ہاتھن کی "خبر" لینا رہا تھا اور اصرار کے حالات کو اطمینان بخش پاکر میں بھی مطمئن ہو گیا تھا اور اب تو میں بھی ادھر ہی تھا لہذا تیسری آنکھ کو زیادہ سے زیادہ کھلا رکھنا اور کبھی ضروری ہو گیا تھا۔ پچھلے آٹھ دنوں میں، میں فور میجر اور گائیڈ مسٹر بن ہال سے خاصا مکمل مل گیا تھا۔ مجھے اس شخص سے ایک کام لینا تھا۔ جب یہ قافلہ بیت شین (اسرائیل) سے بیڑا (اردن) کی طرف روانہ ہوتا تو مجھے بن ہال کے تعاون سے "اسٹائگر" کا معاملہ نشانا تھا۔ اس سلسلے میں بن ہال سے میری بات ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ مجھے کام یابی کی بڑی امید تھی یہ اس فور کا ایک اہم "معاملہ" تھا!

قاہرہ سے تل ابیب کی طرف آتے ہوئے ہم نہر سوز اور وادی سینا کی سیر کرتے ہوئے آئے تھے اس شام تل ابیب میں، ہمیں دینا کے قدیم ترین سٹی پورٹ جا فاکو دیکھنے کا موقع ملا۔ جا فاکو اپنی ایک آبنائ اور شان ہے۔ اس کے علاوہ تل ابیب کے قابل ذکر مقامات کی سیر بھی کی گئی۔

تین مئی کی صبح ہم تل ابیب سے روانہ ہوئے اور نظارت کے راستے سیدھے بیت شین پہنچ گئے تل ابیب سے نکلنے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جسم سے روح نکل رہی ہو، میری روح اسی شہر میں قید تھی، بہر حال پر گرام پر عمل ضروری تھا۔ قیصریہ کی طرف رخ کرنے سے پہلے ہم نے بیت شین شہر کو خوب اچھی طرح دیکھا۔ قیصریہ میں ہمیں قدیم رومن عجیئر اور ویلیبی قلعے دیکھنے کو ملے۔ یہاں سے ہم نے شمال میں سفر

جاری رکھا اور جیسے پہنچ گئے۔ جیسے ایلات اور اشدود اسرائیل کی تین اہم بندرگاہیں ہیں۔ جیسے ہم نے مشہور زمانہ بانات "بہائی گاؤز" کی سیر کی اور آکو کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاریخ کے حوالے سے آکو میں بھی دیکھنے کے لائق بہت کچھ ہے۔ اس رات ہم آکو، جیسے اور نظارت سے ہوتے ہوئے پہنچ گئے۔

چار مئی کو کیلیبی کی سیر کی گئی۔ کیمبر نام میں سینٹ پیٹر کی جنم بھوی دیکھی۔ دیگر مقامات مقدسہ کے علاوہ "ماؤنٹ آف دی بیٹی نیوڈز" کا نظارہ بھی کیا گیا۔ یہ پہاڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی خدا کی رحمتوں سے منسوب ہے۔ اس کے بعد ہم ایک کشمی پر سوار ہو کر بحر کیلیبی دیکھنے نکل گئے۔ اس سیر سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم واپس بیت شین لوٹ آئے۔

پانچ مئی کی صبح میرے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس روز فرپ کو بیت شین سے پیٹر کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کوچ شیخ حسین بارڈو کو سمجھ کر کے اسرائیل سے اردن میں داخل ہو جانی۔ پھر "مادایا" نامی ایک مقام پر مختصر پڑاؤ کے بعد آگے بڑھ جانی۔ صحرائے اردن کے اندر سفر کرتے ہوئے وہ بالآخر پیٹر شہر پہنچ جاتی۔ مادایا اور پیٹر میں دیکھنے کے لیے کافی کچھ تھا۔ بن ہال نے مجھے اس بارے میں تفصیلاً بتادیا تھا۔ خاص طور پر جب پیٹر اسے ایلات کی طرف سفر کیا جاتا تو ایلات سے تھوڑا پہلے وادی رم سے گزر رہا ہوتا جو لارنس آف عربیہ کا گھربانی جاتی ہے۔

یہ تمام تاریخی مقامات دیکھنے کی خواہش تو دل میں اٹھرائی تھی لیکن اس خواہش کو دبا کر کتنا ضروری تھا کیونکہ اس عرصے کے دوران میں مجھے کوئی اور اہم فریضہ انجام دینا تھا۔ میرے پاس صرف تین دن کی مہلت تھی۔ ان تین دنوں میں ہمارا قافلہ بیت شین سے بیڑا، پیٹر اسے ایلات اور ایلات سے یردلم پہنچ جاتا۔ میں اس عرصے میں "اپنا کام" کر کے آٹھ مئی کو یردلم میں اس سے جا ملے۔ نو مئی کو ہمیں یردلم (اسرائیل) سے واپس قاہرہ (مصر) آنا تھا اور اس مرتبہ ساحل میرے ساتھ ہوئی! ساحل کی ہر اسی کے تصور نے مجھے شاد کر دیا۔

بن ہال نے حسب وعدہ میرا کام کر دیا۔ بہ وقت رخصت اس نے کہا "اب ہم آٹھ مئی کو یردلم میں ملیں گے۔ تمہیں تل ابیب میں کسی مشکل کا سامنا ہوتا تو کاٹھنی کے ایجنٹ سے مل لینا۔"

"تمہارا مطلب ہے، رابن ییتوبی سے؟" میں نے

تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "اسرام اسرائیل نامی کاٹھنی کا یہ ایجنٹ آفس مکمل طور پر رابن ییتوبی کے کنٹرول میں ہے۔ میں تل ابیب میں رابن کوتم دونوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر جب تم اس سے رابطہ کرو گے تو وہ تمہارے ہر مسئلہ کا حل بتا دے گا۔ چاہو تو اس کے توسط سے یا تم خود ہوٹل کا بندوبست بھی کر سکتے ہو۔ ویسے اس سلسلے میں، میں تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔"

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا "تل ابیب میں قیام کے لیے 'ہوٹل ٹاپ' تمہارے لیے زیادہ موزوں رہے گا۔"

"یہ وہی ہوٹل ٹاپ ہے نا جو بن یہودہ اسٹریٹ پر واقع ہے؟"

"بالکل میں اسی ہوٹل ٹاپ کی بات کر رہا ہوں" اس نے مجھے حسب توقع جواب دیا تو مجھے اپنا پورا وجود سنسنی کی لپیٹ میں محسوس ہوا۔ اسی ہوٹل کے کچن میں سلوان رات بھر مختلف کھانے پکانے میں مصروف رہتا تھا۔ مذکورہ ہوٹل میں قیام مجھے اپنے کام میں بہت ساری آسانیاں فراہم کر دیتا۔

بن ہال کی آواز پر میں خیالات سے چونکا اور پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا "میں ہوٹل ٹاپ کو فوجیت دینے کے لیے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ ہوٹل ہماری کھپنی کے پینل پر ہے، لہذا انہیں وہاں قیام کے دوران میں زیادہ سے زیادہ سہولیات قدرے کم ادائی میں حاصل ہو جائیں گی۔ ہوٹل والے کھپنی کے مسافروں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں نے تم دونوں کو "اسٹائگر" کے سلسلے میں کاٹھنی کا "ابن ادسی" دے دیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا!"

میں نے ایک اہم سوال کیا "کیا ان تین روز کے دوران میں مجھے یعنی ہمیں صرف تل ابیب تک ہی محدود رہنا ہوگا؟"

"ایسی کوئی قید نہیں ہے، وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "تم دونوں کے پاسپورٹس پر اسرائیل کا ویلڈیز انکا ہوا ہے۔ تم اس ویلڈیز کی مدت کے دوران میں پورے اسرائیل کی سیر کر سکتے ہو۔ اگر کسی یہ سوال سامنے آئے کہ تم دونوں اپنے فرپ کے ساتھ کیوں نہیں ہو تو تم پوچھنے والے کو اسٹائگر کا ابن ادسی دکھا سکتے ہو۔"

اسرائیل کی کرنسی نیو شیکل کہلاتی ہے۔ ان دنوں ایک امریکی ڈالر ساڑھے تین نیو شیکل کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس حساب سے ہم نے تین راتوں کے قیام کے لیے مقامی کرنسی میں ایک ہزار، دوسو ساٹھ نیو شیکل ادا کیے تھے۔

ہم جب اپنے کمرے میں پہنچے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ لچ ہم نے باہر کر لیا تھا اس لیے کھانے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ صوفیہ نے فیصلہ کن لچے میں کہا۔

”ہم بہت تھک گئی ہوں اس لیے توڑی نیند لوں گی۔“  
شام کو ہم باہر نکلیں گے۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولی ”تمہارے ذہن میں کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے؟“

”نی الحال تو کوئی پروگرام نہیں“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”لیکن تمہارے لیے ایک خاص تجویز ہے!“  
”وہ کیا؟“ وہ پوری دل چسپی سے میری طرف متوجہ ہو گئی۔

میں نے کہا ”تم اگر چاہو تو کسی وقت بھی مسٹر بلوٹھاس کو فون کر سکتی ہو!“  
”کیا مطلب؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”تم نے بتایا تھا نا آئندہ کے پروگرام سے تمہیں مسٹر تھاس آگاہ کرے گا“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”وہ تمہیں بتائے گا کہ تم اسرائیل سے کیسے واپس لندن پہنچو گی؟“

”کیا تم میری محبت سے اتنا گلے ہو؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔  
”میں گڑبڑا گیا“ نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں!“  
”پھر مجھ سے جان چھڑانے کی پلاننگ کیوں کر رہے ہو؟“

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند لمحات تک ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر نہایت ہی غصہ سے ہوئے لچے میں بولی ”میں مسٹر تھاس کو لندن فون کر کے اپنے لیے ہدایت ضرور لوں گی لیکن اس وقت جب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ابھی تو تمہارے مشن کے آخری مرحلے کا آغاز ہوا ہے۔ تم اپنی سامی کو حاصل کرنے کے بعد اسے میرا روپ دے دو گے پھر میں تم سے جدا ہو جاؤں گی، یوں سمجھ لو کہ اس وقت ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔ میں مسٹر تھاس کے احکام کی پابند ہوں اور

بن ہال کی وضاحت نے میرے ذہن کا بہت سا بوجھ اتار پھینکا۔ میں نے کہا ”ٹھیک ہے سسر ہال! ہم آٹھ مئی کو بروٹھم میں دوبارہ ملیں گے..... اور اگر کسی وجہ سے تاخیر ہوئی تو ہم لوگوں کو صبح پہنچی کو جوائن کر لیں گے۔“

یہ بات میں نے احتیاطاً اس کے ذہن میں ڈال دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، مجھے اپنے مقصد کے حصول میں کتنا وقت لگے گا۔ یہ بھی ممکن تھا، میں وقت سے پہلے ہی فارغ ہو جاتا۔ غیر یقینی حالات میں کوئی بھی حتمی بات کہنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے گنجائش کا دروازہ کھلا رکھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھا تو بن ہال نے کہا ”مجھے نہیں امید کہ تل ابیب میں تمہارا زیادہ دل لگ سکے۔ تل ابیب کے مقابلے میں بروٹھم زیادہ تاریخی اور تہذیبی شہر ہے۔ وہاں دیکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ مکمل سیر کے لیے ایک ماہ بھی ناکافی ہوگا۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”تل ابیب جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ایک ماڈرن شہر ہے جہاں تہذیبی اور ثقافتی نشانیاں تلاش کرتے ہوئے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم نے تل ابیب میں حریہ قیام کا فیصلہ کرتے ہوئے کیا سوچا ہے؟“

میں نے دل ہی دل میں کہا ”یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہمارا سٹے لاگرتھامی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پھر زبان سے کہا ”بس مسٹر ہال! اپنے اپنے چوائس کی بات ہے!“

”یو آر رائٹ!“ اس نے خوش دلی سے کہا ”بہر حال اگر زمینان میں جی گھبرا جائے تو ہماری طرف چلے آنا۔ کبھی کا اسکیوٹل ڈے بائی ڈے تمہیں معلوم ہے۔ کا شکیں ہر وقت اپنے مسافر کو دل کم کہنے کے لیے تیار رہتی ہے۔“  
”اوہ شیور!“ میں نے مسکراتے ہوئے انہات میں گردن ہلا دی۔

پھر ہم دونوں عارضی طور پر اپنے ٹرپ سے جدا ہو گئے۔

☆☆☆

”ہوٹل ٹاپ“ میں کمرہ حاصل کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کا شکیں کا حوالہ کام آیا اور ہم ایک ٹوئن شیئر روم حاصل کر کے چیک ان ہو گئے۔ ٹوئن شیئر روم کافی کس فی رات کر ایہ ساٹھ امریکی ڈالرز تھا یعنی ہم دونوں کو ہاں ایک رات گزارنے کے ایک سو بیس ڈالرز دینا تھے۔ میں نے کل تین سو ساٹھ ڈالرز ادا کر کے تین راتوں کے لیے وہ کمرہ ایک کر دیا۔ اب ہمیں آٹھ مئی کی صبح چیک آؤٹ ہونا تھا۔ ہمارے کمرے کا نمبر پانچ سو آٹھ تھا۔

میر خیال ہے، جنہیں بھی اس کے مفید مشوروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ہاں البتہ.....“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لے بھر کر متوقف ہوئی پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی ”اگر تم ابھی فوراً سے پیش تر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دکھا دو تو میں لندن میں سترخصاس سے ٹکڑاؤں تک رابطہ کرتی ہوں۔“

”اوکے!“ میں نے اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے کہا

”میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد از جلد اپنے مقصد کو حاصل کر لوں لیکن تم اتنا تو کر سکتی ہو.....“

میں نے بات نامکمل چھوڑی تو وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”کتنا..... کیا؟“

”تم جانتی ہو، میری ساتھی ساحل اسرائیل بلکہ یہودی قوم کے ایک طاقت ور شخص کے قبضے میں ہے“ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ”اسے وہاں سے چھڑانے کے لیے مجھے دانتوں پینہ آجائے گا۔ بے اختیار خون ریزی کا امکان بھی ہے جس میں میری جان ہر لمحہ داؤ پر لگی رہے گی۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ خون اور بارود کے اس خطرناک میل میں تم مجھ سے تھوڑے فاصلے پر رہو۔ میں تمہیں ایک جیتے جانتے جنم میں نہیں دھکیلتا چاہتا۔ صوفی! تم نے اب تک میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ تم بڑی پیاری، بڑی ڈسینٹ لڑکی ہو۔“

یہ حقیقت ہے کہ میں صوفیہ کو کسی اندھی مصیبت سے دوچار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اب تک ساحل کے حصول کے لیے تھوڑا کی کر مدد سے اچھا خاصا ”ہوم ورک“ کر لیا تھا لیکن میں جانتا تھا، ساحل کو ری موسٹے ہاٹن کے جڑوں سے نکالنا اتنا سہل ثابت نہیں ہوگا جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، کس وقت کون سی غیر یقینی اور مہلک صورتحال پیش آجائے۔ میرے لیے یہ اپنی زندگی کی سب سے اہم اور ترن بازی تھی۔ میں تو اپنے کاز کی خاطر کسی بھی حد تک جاسکتا تھا لیکن وہ کیوں خواہ مخواہ میری وجہ سے متاثر ہوئی!

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم مجھے کوئی ڈر پوک بزدل اور کم ذہن کی لڑکی سمجھ رہے ہو؟“

”ایسا نہیں ہے صوفی!“ میں نے کبھی انداز میں کہا۔

”حالات کی سنگینی کو محسوس کرنے کی کوشش کرو۔“

”حالات سنگین کب نہیں تھے؟“ وہ محسوس لہجے میں بولی

”لندن سے اسرائیل تک ہم نے ایک ایک قدم بھوک کر

رکھا ہے۔“

میں نے اصراری لہجے میں کہا ”پہلے کی بات اور تھی صوفی! اب حالات دوسرے انداز میں پیش آئیں گے۔ یوں سمجھو، اس کہانی کا کلانیس شروع ہونے والا ہے۔ ابھی تک تو سب کچھ اسوئٹل چل رہا تھا ساری بار دھاڑ، خون ریزی اور چہینا چہینا اسی جیسے میں ہوتا ہے!“

”اوکے!“ وہ ہاتھ بلند کرتے ہوئے مصالحت آمیز لہجے میں بولی ”میں تمہاری بات پر بعد میں غور کروں گی۔ پہلے بتاؤ تم نے اپنی ساتھی کو دشمن کے چنگل سے نکالنے کے لیے کیا لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔ ہو سکتا ہے، میں تمہارے شانہ بہ شانہ نہ کبھی پیچھے کی صف میں رہ کر تمہاری بھرپور مدد کر سکوں۔“

”ہاں“ یہ بالکل مناسب ہے“ میں نے طمانیت بھری سانس خارج کی ”تم ایک معقول اور ذہین لڑکی ہو۔ اگر ایسی کوئی راہ نکل آئے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“

میں نے بھرپور کامیابی پر بات پوری کرتے ہوئے کہا ”میں کل صبح تک اپنا پروگرام فائل کر لوں گا۔ پھر اس پروگرام اور پیش آمدہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی اپنی ڈیوٹی کا تعین کر لیں گے۔ تم اگر پچھل صف میں رہو تو میں زیادہ اطمینان اور یکسوئی سے اپنی ڈیوٹی نبھاسکوں گا۔“

اچانک اس نے ایک غیر متعلق سوال کر ڈالا ”وہدا..... یوسف! کیا تمہیں کرکٹ سے کچھ دلچسپی ہے؟“ وہدا اور یوسف کے خوالے سے اب وہ ریڈارٹ ہو گئی تھی۔

”ہاں..... کسی حد تک!“ میں نے متذبذب اور حجب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ غمبیرے ہوئے لہجے میں بولی ”تم نے ابھی مجھے پچھل صف میں رہنے کو کہا ہے۔ یہ ایک طرف ہے۔ بیک فٹ پر کھیلنے والی بات ہے۔ جتنا تمہیں معلوم ہوگا، بیک فٹ کا بیٹ مخالف ٹیم کے لیے کسی قدر بھاری ثابت ہوتا ہے اور اگر وہ بیٹ لیفٹ پنڈر ہو تو خدا کی پناہ.....؟“

میں اس کے ادھورے جملے کو پکڑ کر بات کی تھک چکی گیا۔ صوفی لیفٹ پنڈر تھی۔

میں نے تو سچی نظر سے اسے دیکھا اور کہا ”تم مثال تو بہت خوبصورت ڈھونڈ کر لائی ہو۔ جنہیں اب تو خوش ہو جانا چاہیے کہ میں تمہیں بیک فٹ پر کھیلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔“

اور وہ واقعی خوش ہو گئی!

اس ہوٹل کے کمرے میں قدم رکھتے ہی صوفیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ بری طرح تھک چکی ہے لہذا تھوڑا آرام

کرے گی۔ میں نے اسے آرام کر کے محسن اتارنے کا موقع فراہم کیا تو وہ بیڈ پر دراز ہو کر میرے مشورے پر عمل کرنے لگی۔

ٹوئن شیئر روم میں ہم دونوں کے لیے الگ الگ دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ میں نے دوسرے بیڈ پر لیٹ کر اکھیں بند کر لیں۔ میں اپنے انداز سے یہی خابہ کر رہا تھا جیسے سورہا ہوں لیکن یہ اداکاری محض صوفیہ کو مطمئن کرنے کے لیے تھی۔ درحقیقت میرا سونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں تھوڑا کی تو سوسے نا دیہ دنیا کی سیر کا ارادہ رکھتا تھا۔

سب سے پہلے میں نے سلوان اور اس کے ڈیوٹی کیٹ کی خبر لی۔ بہائی گاؤں اپارٹمنٹ میں جس شخص نے سلوان کا روپ دھار کر ساحل کے بنگلے کا رخ کیا تھا اور ازاں بعد رات میں وہ مجھے وہاں دکھائی بھی دیا تھا، میں ابھی تک اس کے نام سے واقف نہیں ہو سکا تھا لہذا آسانی کے لیے میں نے اس کا نام ڈیوٹی کیٹ رکھا تھا۔ میں پچھلے آٹھ دس روز سے ان دونوں افراد کی مصروفیات کو گاہے بے گاہے نوٹ کرتا آیا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رہتی رہے انہیں کس کام پر لگا رکھا ہے! وہ ساحل والے بنگلے میں جو ڈیوٹی نبھا رہے تھے اس کی نوعیت ایک جیسی تھی، پھر طبعی کی تبدیلی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بھی قطعاً ضروری نہیں تھا کہ وہ افراد ہی یہ ڈیوٹی انجام دیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شخص مستقل بنگلے میں رہتے ہوئے یہ کام کرتا تو اس سلسلے میں کسی قسم کی دشواری کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے ایک بات ہے، رہتی رہتی کوئی بھی پالیسی خالی از معطلت نہیں ہو سکتی تھی۔ ان دونوں کو مختلف اوقات میں روپ بدل کر ایک ہی کام کرنے کے احکام کا کوئی خاص مقصد ہو سکتا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں ابھی تک اس مقصد تک نہیں پہنچا پاتا تھا۔

رہتی کا چاہے کوئی بھی مقصد ہو لیکن ان دونوں کی سرگرمیوں نے مجھے ایک مفید تیز یاد دیا تھا، میں بہائی گاؤں والے اپارٹمنٹ نمبر ”ستائیس سی“ کو ایک خاص زاویے سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ مجھے ایسی ہی ایک خفیہ اور محفوظ جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں ساحل کو بہ آسانی صوفیہ کا روپ دے سکوں۔ میں نہیں جانتا تھا، جب میں ساحل کو بنگلے سے نکال لوں گا تو اس وقت پیش آمدہ حالات کیا ہوں گے؟ یہ بھی ہو سکتا تھا، میرے قناب میں جنم کی پلاٹنگ لگی ہوں۔ اس صورت میں ہوٹل ٹاپ کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ بہائی گاؤں اپارٹمنٹس کا وہ اپارٹمنٹ ہر لحاظ سے میرے مقصد اور ضرورت پر پورا اترتا تھا

کیوں کہ وہ گھر کچھ عرصے کے لیے سلوان اور اس کے ڈیوٹی کیٹ کے وجود سے خالی رہتا تھا۔

میں نے بڑی محنت اور توجہ سے ان دونوں کے معمولات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈیوٹی کیٹ صبح ساڑھے نو بجے ساحل والے بنگلے سے نکلتا تھا اور نو بجاس پر وہ بہائی گاؤں اپارٹمنٹس میں پہنچ جاتا۔ اس وقت تک سلوان بیدار ہو کر تیار ہو چکا ہوتا۔ ان دونوں میں طبعی کے ساتھ ساتھ وہاں پندرہ میں منٹ بعد سلوان ساحل والے بنگلے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے بنگلے میں ڈیوٹی شروع کر دیتا، پھر شام ساڑھے چھ بجے وہ بنگلے میں سے نکل کر بہائی گاؤں اپارٹمنٹس کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس دوران میں ڈیوٹی کیٹ اپارٹمنٹ کے اندر ہی موجود رہتا۔ ایک آدھ بار وہ اپارٹمنٹ سے باہر بھی نکلتا اور ضروری اشیاء کی خریداری کے بعد واپس آ جاتا۔ اس کے سونے کا وقت دوپہر ایک بجے سے شام چھ بجے تک کا تھا۔ سات بجے تک سلوان اس کے پاس پہنچ جاتا اسی وقت ان میں طبعی کی تبدیلی کے مراحل طے ہوتے اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ڈیوٹی کیٹ ساحل والے بنگلے کی طرف سے سلوان ہوٹل ٹاپ کی جانب روانہ ہو جاتا۔ ان کی سرگرمیاں اگرچہ نہایت ہی مشکوک اور پر اسرار تھیں لیکن اتنے دن کے گہرے ”مشاہدے“ کے بعد مجھے اپنے کام..... کے تین اہم پہلو مل گئے تھے۔ ان ہی میں سے کسی ایک پہلو کا استعمال کر کے میں اپنے لیے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس سی کو حاصل کر سکتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ساحل کو ری موسٹے ہاٹن کے چنگل سے چھڑانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے کسی ایسی محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھنا ضروری تھا۔ جہاں مناسب میک اپ کے بعد میں اسے ساحل سے صوفیہ بنا سکتا۔ اس مقصد کے لیے میری نظر میں اپارٹمنٹ نمبر ”ستائیس سی“ نہایت ہی موزوں تھا یعنی اس اپارٹمنٹ کے تین پہلو! نمبر ایک، جب ڈیوٹی کیٹ اور سلوان بواسات بجے رات اس اپارٹمنٹ سے نکل کر اپنی اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہوتے۔ رات آٹھ بجے سے صبح تین بجے تک وہ اپارٹمنٹ ہر صورت خالی رہتا تھا۔

نمبر دو، دن کے دس بجے ڈیوٹی کیٹ کو اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر سلوان ساحل والے بنگلے کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔ دس سے رات سات بجے تک ڈیوٹی کیٹ اس اپارٹمنٹ میں قیعد جمائے رکھتا۔

نمبر تین، صبح کے تین بجے سے دن کے دس بجے تک سلوان اس اپارٹمنٹ پر قابض رہتا۔

اب مجھے اپنی پلاننگ کے مطابق، حالات و واقعات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے مقصد کی خاطر متذکرہ پلانٹیں پہلوؤں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ مجھے امید تھی، دیگر امور کا جائزہ لینے کے بعد میں بہتر طور پر کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس مشن کے سلسلے میں ایک ایک چیز کو ذہن میں رکھنا ضروری تھا۔

جن قارئین کو میری منصوبہ بندی کی طوالت الجھاری ہے، ان سے معذرت خواہ ہونے کے ساتھ ہی میں یہ عرض بھی کرنا چاہوں گا کہ دنیا کے تمام بڑے کام مضبوط پلاننگ کے بعد ہی ہوئے ہیں۔ حالی شہرت یافتہ بانی دوو کی فلم ”سکیناز گولڈ“ کی منصوبہ بندی کئی سال تک ہوئی رہی اور جب شوٹنگ کا وقت آیا تو ایک عظیم الشان میز پر سیٹ لگا کر چند فنون میں فلم بندی کا کام مکمل کر لیا گیا۔ اس زمانے میں، فلم انڈسٹری میں کمپیوٹر کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ گرافکس اور ایڈیٹنگ ایڈیٹنگ سسٹمز کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور جیکل لوکیشنز کو شٹ کرنے کے بعد تمام تر عملی کام مکمل ہو جاتا تھا۔ ازاں بعد، ان ڈور اور آؤٹ ڈور فلم بندی کو مہارت سے آپس میں کس کر دیا جاتا تھا۔ یہ ممکنہ اتنی خوب صورتی سے کی جاتی کہ فلم بین یہ بھی سمجھتا، اس کے پسند یہ اور نا پسند یہ تمام کردار اور جیکل لوکیشنز پر کارنا سے انجام دے رہے ہیں!

اس وقت اسرائیل میں سہ پہر کے ساڑھے چار بجے تھے۔ یہ سلوان کی، ساحل والے بنگلے پر ڈیوٹی کا وقت تھا۔ میں تھرڈ آئی کے توسط سے ساحل کے پاس پہنچا تو وہ اسی بیڈ روم میں موجود تھی جہاں پچھلے کچھ عرصے سے میں اسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی سوکر ابھی تھی اور فریش ہونے کے لیے واش روم کی طرف جا رہی تھی۔ یہ اندازہ میں نے اس کی حرکات و سکنات کو ”دیکھتے“ ہوئے لگایا جب وہ واش روم کے اندر داخل ہوئی تو میں اسے چھوڑ کر سلوان کے پاس پہنچ گیا۔

سلوان اس وقت کچن میں موجود تھا۔ وہ گلگ سے کسی موضوع پر باتیں بھی کر رہا تھا لیکن میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن نہیں سکتا تھا، البتہ، پاور جی کی سرگرمی سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ چائے بنانے میں مصروف تھا۔

تھوڑی دیر بعد چائے تیار ہوئی۔ میں ”خاموشی“ کے ساتھ کچن میں موجود رہا۔ پاور جی نے چائے اور چائے کے برتنوں کو ایک فرے میں سجایا اور سلوان کی سمت بڑھا دیا۔ سلوان وہ فرے لے کر کچن سے نکلا اور ساحل والے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں سمجھا، وہ ساحل کو شام کی چائے سرد

کرنے جا رہا ہے، اس کا روز کا معمول تھا اور میں کافی دنوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ساحل والے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو میں اس کے ماحول سے نکل آیا۔

اب میرا ٹارگٹ ربنی کا معتد خاص تھا۔ وہ دروازہ قامت سنہری بالوں کا سوئیڈ بوئیڈ شخص اس وقت ایک ایڑی پیچتر پر غم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں انداز لگانے سے قاصر رہا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اس کے ماحول سے میں نے جانچ لیا کہ وہ اسی جھولے کمرے میں موجود تھا جہاں اس نے ربنی کو دیے جانے والے دودھ کی اسکریننگ کی تھی۔ جب تک معتد خاص ربنی والے کمرے میں داخل نہ ہوتا میں ربنی کے ماحول تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ربنی تک رسائی کی خواہش نے ایک مرتبہ پھر مجھے براہ راست کوشش پر اکسایا۔ میں نے حسب معمول یہ کوشش کر ڈالی اور اس بار بھی نتیجہ حسب سابق ہی برآمد ہوا۔ میں تصوراتی چھلانگ لگا کر وہاں معتد خاص کے ”پاس“ آ گیا۔ وہ چھوڑ آنکھیں موندے ایڑی پیچتر پر غم دراز تھا۔ چند لمحات تک میں اس کے متحرک ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر مایوس ہو کر واپس اپنی ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔

”اے“ بیڈ روم میں بیٹی شام یا سہ پہر کی چائے پی رہی تھی۔ یہ اس کے معمول میں شامل تھا۔ میں جانتا تھا جب وہ چائے پی کر فارغ ہو جائے گی تو برتن اٹھانے کے بعد سلوان کچن میں پہنچے گا۔ برتن وہاں چھوڑ کر وہ واپس آئے گا اور اسے لے جائے گا۔ میری ساحل سلوان کی معیت میں ایوننگ واک کرے گی۔ اس بنگلے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے خوبصورت پارک کو میں متحدہ پارٹیری آنکھ کے توسط سے دیکھ چکا تھا اور ساحل کو وہاں سیر کرتے ہوئے بھی!

اس سیر سے فارغ ہونے کے بعد سلوان اپنی نگرانی میں ساحل کو اس کے بیڈ روم تک پہنچاتا۔ اس کے بعد آج کی اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی۔ وہ بنگلے سے نکل کر ”بہائی کارڈن اپارٹمنٹس“ پہنچ جاتا۔ اس کے اور ڈیوٹی کیٹ کے درمیان حلیوں کی تبدیلی کا مرحلہ طے ہوتا مجرہ اپارٹمنٹ سے نکل کر اپنے نئے فرائض ادا کرنے کے لیے دو مختلف ستوں میں روانہ ہو جاتا۔ سلوان کے اس اپارٹمنٹ میں بیٹھے ہیں ابھی خاصا وقت تھا لہذا میں اس کے ماحول سے نکل کر ہونٹ کے کمرے میں حاضر ہو گیا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دوسرے بیڈ کی طرف نگاہ دوڑائی۔ صوفیہ بیڈ پر موجود تھی اور جاگ رہی تھی۔ اس کا رخ

میری ہی جانب تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کافی دیر سے مجھے ہی دیکھ رہی ہو۔ میں نے ایک مصنوعی جمائی لیے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم سوئی نہیں ہو ابھی تک؟ حالانکہ تم تو بہت زیادہ تھکی ہوئی تھیں؟“

وہ سوکر محسوس اتارنے کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر خود بھی سونے کی اداکاری شروع کر دی تھی۔ اس دوران میں میری آنکھیں چونکہ بند رہی تھیں لہذا میں دو ٹوک سے نہیں کہہ سکتا تھا! وہ سوئی تھی یا میری طرح وہ بھی آنکھیں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ہر سیر کے لیے اللہ نے سوا سیر پیدا کر رکھا ہے!

اس نے ایک لمحے کو مجھے والی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا ”کیا تم سو گئے تھے؟“

”میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تم نے الٹا سوال کر دیا ہے؟“

”میں تو بالکل نہیں سوئی“ وہ جلدی سے بولی ”یہ تمہارے سوال کا جواب ہوا۔ اب تم بھی میرے سوال کا جواب دے دو؟“

صوفیہ بہت تیز طرار لڑکی تھی۔ میں نے اس کی تیزی کو بریک دکھاتے ہوئے کہا ”میں تو گہری نیند سو گیا تھا بلکہ اب بھی مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے ایک اور مصنوعی جمائی لی۔

وہ الجھ کر بولی ”تم گہری نیند سو گئے تھے اور ابھی تک تمہیں نیند آ رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا پھر تم اٹھ کر سونے اور..... اتنے اکیلو کیسے دکھائی دے رہے ہو؟“

”میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذہنی لہجے میں کہا۔

”کمال ہے نیند تمہاری ہے۔ تمہاری سمجھ میں تو آ جانا چاہیے!“

”میں اپنی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں!“

”میری بات..... کیا بات؟“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”یہ بات کہ تم شدید تھکن کا شکار تھیں اور آرام بھی کرنا چاہتی تھیں۔“ میں نے بڑی سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”پھر تم بالکل کیوں نہیں سو گئی؟“

”اوہ.....!“ اس نے ایک طویل سانس خارج کی ”تم بات کو اس طرح سمجھا دیتے ہو کہ سچا کہہ رہا ہوں۔“

”اور تم ایسا چکر چلاتی ہو کہ میں محسوس کر رہا ہوں!“

میں نے ترکی پر تکی کہا۔

وہ سرتھکتے ہوئے بولی ”شاید ہم دونوں پاگل ہونے جا رہے ہیں!“

”مجھے لفظ ”دونوں“ پر سخت اعتراض ہے صوفیہ!“

وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے چمیل چھاڑ کے سلسلے کو تھوڑا دراز کرتے ہوئے کہا ”میں تو جانتا ہوں کہ شدید نیند آنے کے باوجود بھی میری آنکھ کیوں کھل گئی ہے۔ لیکن حیرت ہے، تمہیں اپنے نیند نہ آنے کا سبب معلوم نہیں!“

”اچھا بابا! یہی سمجھ لو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔“ وہ زچ ہوتے ہوئے بولی ”اب تم اپنی کہہ دیجئے والو؟“

میں نے کہا ”میں اپنی تو بعد میں کہوں گا۔ پہلے وہ بتا دوں جو تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں معلوم!“

وہ ایک مرتبہ پھر متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے لہجے کو کھاتیت ہی سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔

”صوفیہ! تمہیں خوف کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ تم ڈر رہی تھیں کہ ادھر تم نے آنکھ بند کی ادھر کوئی خوں خوار پھینکا برآمد ہوا!“

”میں تو اس چھیلے کو قابو دالے اپارٹمنٹ ہی میں چھوڑ آئی تھی۔“ وہ بیٹھی ناراضی سے بولی ”تم اس منٹوں کم بحث کو اپنے ذہن میں ساتھ ساتھ لیے محسوس رہے ہو اور موقع بہ موقع اس کے حوالے سے مجھے پھرتے رہے ہو۔ کب تک چلے گی یہ ڈرامے بازی؟“

”یہ اس ڈرامے کا آخری سین تھا۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”آج کے بعد میں اس ریفرنس سے تمہیں بھی نیند نہیں کر دوں گا۔ میری زبان پر چھیلے کا نام آئے گا نہ کرو کوڈ اٹل کا اور نہ ہی کسی ایلی ٹیگر کا!“

میری مصنوعی سنجیدگی کو اس کی سمجھتے ہوئے دتشلش ناک لہجے میں بولی۔ ”کیا ناراض ہو گئے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”تمہارے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا ”نیند کے باعث میرے انداز میں کچھ رکھا نہیں آگیا ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔“

اس میں فکر مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔“

”ٹھیک ہے میں فکر مند نہیں ہوتی۔“ وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔ ”اب جلدی سے بتاؤ شدید نیند کے باوجود

بھی تمہاری آنکھ کیوں کھل گئی تھی؟

میں نے جواب دیا ”دراصل نیند کی حالت میں مجھے ایک اہم بات یاد آگئی تھی۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔ سوچا پہلے پوچھ لوں! باقی پلانک بعد میں کروں گا۔ اچھا ہوا تم جاگتی ہوئی لگتی ہیں درختوں جیسے سوئے سے اٹھنا پڑتا۔“ وہ چند لمحات تک ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انداز قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں کہیں اسے کوئی اور چکر تو نہیں دے رہا ہوں! تھوڑے سوچ بچار کے بعد اس نے کہا ”تم مجھ سے ایسی کون سی اہم بات پوچھنا چاہتے تھے جس کے بغیر تمہاری پلانک کو بریک لگ گئے تھے؟“ وہ لمحے بھر کو توقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”اور یہ بھی بتاؤ تم گہری نیند کے دوران میں کس طرح پلانک کرتے رہتے ہو؟“

”اگر میں تمہارے دوسرے سوال کی وضاحت کرنے بیٹھ گیا تو یہ دن اور آنے والی رات گئی ہاتھ سے“ میں نے سنجیدگی کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس لیے تم اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ میں تمہاری گہری نیند میں کچھ کر سکتی ہوں اس کا جواب دے دوں گا۔“ میں سانس لینے کے لیے رکا تو وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”تم نے بتایا تھا ہیرا لڈ تھا کس سے تمہارا ملے ہے؟ میں جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا تو تم تمہاس سے رابطہ کر دوں گے۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کس طرح حل ایب سے لندن پہنچو گی۔ پوچھنا مجھے یہ ہے کہ تمہاس نے رابطے کے لیے تمہیں کوئی خاص وقت بتایا تھا؟“

”اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں جو ہیں گھنٹے میں کسی بھی وقت اس سے رابطہ کر سکتی ہوں۔“ صوفیہ نے جواب دیا۔ ”راؤڈی لڈاکہ وہ میرے فون کا منتظر رہے گا۔ خاص طور پر مجھے سات آٹھ اور نوں کو۔ وہ انہی دنوں میں تمہاری کامیابی کی توقع رکھتا ہے۔ وہ اگر سو بھی رہا ہوگا تو اس بندوبست کے ساتھ کہ ادھر میں سے فون کیا ادھر اس کی آنکھ کھل گئی۔“

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب میں زیادہ آسانی سے پلانک کر سکوں گا۔ میں اس لمحے میں تھا کہ اگر میرا مشن رات کے آخری حصے میں تکمیل کو پہنچے تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہ پیدا

ہو جائے۔“

”میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا۔“ وہ ہر اعتماد لہجے میں بولی۔ ”تم اپنی سہولت اور آسانی کو دیکھتے ہوئے منصوبہ بندی کرو۔“

میں نے کہا ”پانچ منٹ تو سمجھ لو گزر رہی گیا۔ کل میں جہیں اپنے فائل پروگرام سے آگاہ کروں گا۔ مجھے یا سات منٹ کو پیش قدمی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھ کر بے یقینی سے بولی۔ ”تمہیں ہشاش بشاش باتیں کرتے دیکھ کر گمان بھی نہیں ہوتا کہ تم گہری نیند سے اٹھے ہو اور..... دوبارہ سونے والے ہو؟“

”تم گمان کی بات کرتی ہو لو میں جہیں ابھی یقین دلاتا ہوں میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی گہری نیند کا سلسلہ جوڑنے جا رہا ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ چگانے کی کوشش نہ کرنا۔ مجبوری یا ایما جیسی کی بات دوسری ہے۔ رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔ اس وقت تک میں خود ہی بیدار ہو جاؤں گا۔ گڈ آفٹرنون..... گڈ نیٹنگ!“

بات ختم کرتے ہی میں نے تھوڑا آئی کے توسط سے صوفیہ کے ماحول میں جھانکا۔ وہ ”ہوٹل ٹاپ“ کے ٹوئن شیئر کمر انمبر پانچ سو آٹھ کے ایک بیڈ روم میں بیٹھا دوسرے بیڈ کو دیکھ رہی تھی۔ دوسرے بیڈ پر میں کھینچی وچان علی بصورت یوسف الظاہری آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ تیسری آنکھ کی مدد سے خود کو سوتے ہوئے دیکھنا ایک دلچسپ اور خوشگوار تجربہ تھا۔ میں نے اپنا دھیان صوفیہ کی طرف موڑ دیا۔

چند لمحات تک میں یو کی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ پھر ڈبلی کیٹ کے ماحول میں داخل ہو گیا۔ وہ ”بہائی گارڈن“ کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس سی میں موجود تھا۔ اس کی حالت سے لگتا تھا وہ ابھی ابھی سوکے اٹھا ہے۔ اس کی ڈبلی میں زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سلوان بچھ جاتا اور ان کے درمیان حلیوں کی تبدیلی کا مکمل شروع ہو جاتا۔ ڈبلی کیٹ اس وقت چن میں چائے بنا رہا تھا۔ چائے تیار کرنے کے بعد وہ چن سے کھل کر سٹیک روم میں آ گیا اور ایک صوفیہ پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

میں نے ڈبلی کیٹ کے توسط سے اس اپارٹمنٹ کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ پچھلے آٹھ دس روز میں میں کئی مرتبہ وہاں آیا گیا تھا۔ اس اپارٹمنٹ کی مکانات میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس اپارٹمنٹ کو اپنے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا لہذا وہاں کے ہر ایک پہلو کو نگاہ

میں رکھنا نہایت ہی اہم تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش اور سو مند بات یہ تھی کہ ڈبلی کیٹ کی روانگی اور سلوان کی آمد کے دوران میں کتنی رات ساڑھے سات بجے سے لے کر سب بجے کے ساڑھے تین بجے تک وہ اپارٹمنٹ بالکل فارغ یعنی خالی رہتا تھا۔ اگر اس وقت کو اور بھی محفوظ کر لیا جاتا تو رات آٹھ بجے اور سب بجے کے درمیان کا سات گھنٹے کا وقفہ انتہائی مفید اور موزوں تھا۔ اگر میں اس دوران میں اس اپارٹمنٹ کو استعمال کرتا تو مجھے اپنے مقصد میں صدفی کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ کے ”استعمال“ کو اپنے ذہن میں اپر دو کر لیا!

میں بہائی گارڈن کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس سی میں موجود ہی تھا کہ سلوان وہاں پہنچ گیا تھا۔ ڈبلی کیٹ نے گئے بندھے انداز میں اس کا استقبال کیا۔ ان کے درمیان لباس اور حلیوں کی تبدیلی کے مراحل طے ہونے لگے۔ ابھی تک میں اس حکمت کو سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ دونوں باری باری ساحل والے بنگلے میں یہ کس نوعیت کی ڈبلی کیٹ دے رہے ہیں؟ بنگلے کے دیگر اضافہ کو دھوکے میں رکھنا کیوں ضروری ہے؟ ربی اس قسم کی حکمت عملی سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟

یہ اور..... اسی طرح کے دیگر متعدد سوالات جب میرے ذہن کو الجھانے لگے تو میں نے تصور میں سر جھٹک کر اپنے دماغ کو صاف کر دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسی وقت وہ دونوں اپارٹمنٹ سے نکل آئے تھے۔ میں بھی ان کا تصوراتی تعاقب کرتے ہوئے ڈبلی اسٹریٹ سے کھل کر شالوم اسٹریٹ تک آ گیا۔ یہاں سے ان دونوں کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ میں کئی مرتبہ سلوان کے ساتھ ”سنز“ کرتے ہوئے ہوٹل ٹاپ تک آیا تھا لیکن ڈبلی کیٹ کے پیچھے کبھی نہیں گیا تھا۔ آج میں نے اس کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔

شالوم اسٹریٹ سے سلوان بائیں جانب مڑ گیا۔ یہ اسٹریٹ کچھ آگے جا کر افرام اسٹریٹ سے مل جاتی۔ میں دائیں طرف مڑنے والے ڈبلی کیٹ کے ساتھ ہوا۔ وہ جب شالوم سے ہرمن ہرمن سے شالوم اسٹریٹ پر پہنچا تو میں بائیں آنکھ کے توسط سے اس کے ساتھ تھا پھر جب وہ افرام گاڑن رہائشی علاقے کی چند اسٹریٹس میں گھومنے پھرنے کے بعد ساحل والے بنگلے کے عین سامنے پہنچا تو میں اس وقت بھی ڈبلی کیٹ کے ہمراہ تھا۔ بنگلے کے نیچے گیٹ پر چستین مسک میکوری گاڑ ڈنے سے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ان کی دانست میں وہ (سلوان) گھنٹا بھر پہلے ہی تو بنگلے سے

نکلا تھا۔ صلیب کی تبدیلی کے بعد ڈبلی کیٹ سلوان کے روپ میں آ گیا تھا لہذا وہ لوگ اول آخر اسے سلوان ہی سمجھ رہے تھے۔

آپ کے ذہن کو الجھنے سے بچانے کے لیے ایک بات کی وضاحت کرنا چلوں گے میں نے ہوٹل ٹاپ کے اسٹاف کے رجسٹر میں اس شخص کا نام ”سلوان“ دیکھا تھا جو ہوٹل کے کچن میں شینڈل بوٹی انجام دیتا تھا۔ یہ اس کا اصلی نام تھا یا اختیاری میں کسی طور پر اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ابھی جو شخص میرے ساتھ ساحل والے بنگلے پر پہنچا تھا اس نے چونکہ سلوان کا حلیہ اپنا رکھا تھا اس لیے میں اسے ڈبلی کیٹ کا نام دے رہا ہوں۔ ان کی ڈبلی کیٹ کی پراسرار تبدیلی میں ظاہر کرتی تھی کہ اس بنگلے کا تمام اسٹاف ڈبلی کیٹ کو سلوان ہی سمجھتا ہوگا۔

میں ڈبلی کیٹ کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بنگلے کے اندر ”دیکھ“ چکا تھا لیکن اس کے ساتھ اندر داخل ہونے کا یہ پہلا موقع تھا لہذا میں اس کے ماحول کے ساتھ چکا رہا اور اسی وقت مجھ پر ایک حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشاف ہوا۔

ڈبلی کیٹ نے عمارت والے حصے کا رخ کیا اور سیدھا بالائی منزل پر واقع کچن میں پہنچ گیا۔ میں چونکہ اس کے ماحول میں شامل تھا لہذا کچن میں داخلے کے سلسلے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اور میرا مدد رچی سے ڈبلی کیٹ نے مختصر بات چیت کی۔ ظاہر ہے میں اس گفتگو کا ایک لفظ نہ سنا۔ اس مکالمے کے بعد باورچی نے اسے فریج میں سے کچھ نکال کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہ گوشت کے پارچے تھے جو ایک قاتل نابرت میں رکھے تھے۔

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ڈبلی کیٹ کچے گوشت کے ان پارچہ جات کا کیا کرے گا۔ میں خاموشی سے اس کے ماحول کے ساتھ چکا رہا۔ اس نے کچے گوشت والے قاتل کو ایک کپڑے سے ڈھک دیا اور قاتل اٹھاے کچن سے کھل کر زبیری منزل کی طرف آئے لگا۔ میرے اندر شدت سے یہ تجسس جاگا کہ وہ مذکورہ گوشت کو کہاں اور کس کے لیے لے کر جا رہا ہے؟

میں ڈبلی کیٹ کے ”ہمراہ“ زبیری منزل پر پہنچا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اس قاتل کو سنہری بالوں والے دروازے قامت مستعد خاص تک پہنچائے گا یا پھر درمیانہ قدر پر اسٹیشن کے حوالے کر کے واپس جائے گا لیکن جب اس نے رہائشی حصے کا رخ نہ کیا تو میرے تجسس میں گہری تشویش بھی شامل ہو گئی۔ چنانچہ اس گوشت کی مدد سے وہ کون سا گل



کھلانے جارہا تھا!

اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ کسی خلیے ویلے سے رہی ہوئے بائیں کی "خیرگیری" کروں گا لیکن ڈبلی کیٹ کی سمجھ میں نہ آنے والی پرچس تازہ ترین سرگرمی نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا نہ ہونے دیا۔ اس کے توسط سے میرے سامنے کوئی نیا راز کھلنے والا تھا اس لیے میں اسے چھوڑ کر کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ڈبلی کیٹ گوشت والے قہال سمیت بنے تھے قدم اٹھاتے ہوئے رہا ہنسی سے دور جانے لگا۔ اس کا رخ نیلے گیٹ کی سمت نہیں تھا بلکہ وہ عمارت کی عکسی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس پارک کی طرف جارہا تھا جہاں ساحل روزانہ اونٹنک واک کیا کرتی تھی۔ یہ اور بھی حیران کن تھا کہ وہ بندۂ خدا کچے گوشت سے بھر اہوا قہال لے کر چھٹی کی طرف جارہا تھا!

میری اب تک کی تحقیق کے مطابق وہ بنگا نام ویش دو ہزار گز کے رتبے پر بنا ہوا تھا۔ جس کے عین وسط میں تعمیر شدہ دو منزلہ رہائشی حصہ تک بھگ دو سو گز رتبے کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس تناسب سے بنگلے کے کورڈ اور ان کورڈ ایریا کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ رخ کے اعتبار سے نیلا گیٹ جنوبی سمت والی دیوار میں واقع تھا۔ دیوار سے مراد اس فٹ بلند وہ باؤڈری وال ہے جو اس بنگلے کی چوحدی کا کام دیتی تھی۔ اسی باؤڈری وال کے اوپر زندگی کو موت میں بدل دینے والی خطرناک خاردار پانڈ بھی تھی۔ ساحل روزانہ شام کو جس پارک میں چھل قدمی کرتی "وہ عمارت کے قطعی حصے میں بنگلے کی شمالی دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ ڈبلی کیٹ اسی پارک کی طرف جارہا تھا۔

پارک کے قریب پہنچ کر اندر داخل ہونے کے بجائے جب وہ دائیں جانب مڑا تو میرے تجسس کو اور ہوا ملی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کو نے میں پہنچا جو شمالی اور شرقی دیوار کے ملاپ سے بنا تھا۔ کونے کے نزدیک وہ ایک مقام پر رک گیا۔ گوشت والے قہال کو اس نے زمین پر رکھا اور اس پر ڈھکے ہوئے کپڑے کو ہٹا دیا پھر وہ اپنی جیب میں کچھ نٹو لے لگا۔ میں بڑی توجہ سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے دیکھا توڑی سی کوشش کر کے اس نے اپنی جیب میں سے چابو کا ایک گچھا برآمد کیا اور زمین پر اکڑو پیٹھ کر وہ کسی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ گوشت والا

قہال اس سے دو فٹ کے فاصلے پر رکھا تھا۔ رات نے پوری طرح اپنے پر پھیلا لیے تھے لیکن بنگلے کے اس حصے میں تاریکی نہیں تھی۔ جلد ہی مجھے ڈبلی کیٹ کے عزائم کا اندازہ ہو گیا۔

دراصل وہ چابی کی مدد سے ایک تالے کو کھول رہا تھا۔ مذکورہ تالا ایک جالی دار ڈھکن پر لگا ہوا تھا۔ وہ ڈھکن مربع شکل میں تھا تاہم اس کے چوکھٹے کے اندر مضبوط آہنی راڈ کی مدد سے جالی سی بنادی گئی تھی۔ آہنی راڈز ایک دوسرے کے اوپر سے "کرس کراس" بناتے ہوئے ایک مربع جال کی صورت میں ویلڈ ٹیگ کے ذریعے ڈھکن کے فریم سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اس ڈھکن کی پیناٹل میرے اندازے کے مطابق تین ضرب تین فٹ رہی ہوگی۔ ڈبلی کیٹ نے تالا کھولنے کے بعد اس جالی دار ڈھکن کو کسی نہ خانے کے داخلی ڈھکن کے مانند اٹھا لیا اور ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا اندازہ ایسا تھا جیسے کسی کی آمد کا خیر ہو۔ میں بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس خلا میں سے کسی کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ بڑی سستی خیز صورت حال تھی۔ پول لائٹ جس حد تک اس خلا کے اندر کے منظر کو اجاگر کر رہی تھی اس میں مجھے وہاں ایک پختہ زینہ دکھائی دیا۔ ایسا زینہ جو زمین کی سطح سے کسی نہ خانے تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا ہو۔ تاہم نہیں اس پر اسرار ہے پر قدم رکھ کر کون وہاں جلوہ افروز ہونے والا تھا!

مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ جلوہ افروز ہے قبل اس شاہکار کی مخصوص خوف ناک غراہٹ ضرور گونجی ہوگی۔ میں چونکہ تصوراتی سماعت کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے محض اندازہ قائم کرنے تک ہی محدود رہا ہوا۔ جب میں نے اس شخصیت کا دیدار کیا تو پتا چلا وہ شخصیت نہیں بلکہ "شخصیات" تھے۔ میں جس شاہکار کا انتظار کر رہا تھا وہ شاہکار ثابت ہوئے! وہ شاہکار نہ خانے والے زینے پر نمودار ہوئے اور اس خلا میں سے باہر نکل کر تیزی سے گوشت والے قہال کی جانب لپک گئے۔

وہ دو خطرناک بل ڈاگ تھے۔ میں ان کے خوفناک چہروں اور توہی ایڈجسٹ جسامت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جس تیزی سے گوشت والے قہال کی طرف لپکے تھے اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ یہ ان کے ڈنر کا وقت تھا۔ ان کی اضطرابی حرکات سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت شدید بھوک محسوس کر رہے تھے۔ گوشت کے پار چہ جات پر وہ اس تیزی سے منہ مار رہے تھے

جیسے کافی دیر سے وہ اس ڈنر کا انتظار کر رہے ہوں!

ان بل ڈاگ کی "انٹری" نے میرے رگ و پے میں ایک سستی سی دوڑا دی۔ اس سستی میں کوئی خوف شامل نہیں تھا بلکہ یہ ایک انکشاف انگیز سنسناہٹ تھی۔ ان کتوں جالی دار ڈھکن اور ڈھکن کے نیچے دکھائی دینے والے زینے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس جوزی کو زینہ پر ہائش فراہم کی گئی تھی۔ وہ نہ خانہ ان بل ڈاگ کی اقامت گاہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ سمجھنے میں بھی کوئی دقت نہ ہوئی کہ ان بل ڈاگ کو اس بنگلے میں کس مقصد کی خاطر رکھا گیا تھا۔ ان کی "کارکردگی اور ڈبلی" کا تصور رد کھٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ یقیناً انہیں رات میں اس بنگلے کی رکھوالی کے لیے رکھا گیا تھا کہ اگر رات کی تاریکی میں کوئی شخص "غیر قانونی" طور پر اس بنگلے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ اسے پلک بچھٹے میں بھجھوڑ کر رکھ دیں۔

میں ان دو دہشت ناک شکاری کتوں کو گوشت والے قہال کے ساتھ "مصرف کارڈ" دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ کا شکر بھی ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے تیسری آنکھ کی روشنی عطا فرمائی تھی۔ میں اس باطنی آنکھ کے ظہور ہی ان بل ڈاگ اور ان کے مصرف کو دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔ اس حوالے سے قرقر آئی میرے لیے ایک حلقہ خداوندی تھی! مجھے قریب اس بنگلے میں داخل ہونا تھا جس کی رکھوالی پر وہ خنوار کتے مامور تھے۔ قرقر آئی کے توسط سے میں ان کے وجود اور خطرناکی سے آگاہ ہو گیا تھا۔

اس بنگلے کی حفاظت کے سلسلے میں کیے جانے والے تمام انتظامات یقیناً رلی کے احکام کا نتیجہ تھے۔ میں یہ دیکھ اور سوچ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ساحل کے حوالے سے رلی کی کس قدر محتاط تھا۔ اس کی اس بندوبستی احتیاط سے ایک طرح کا خوف جھلکتا تھا اور..... یہ خوف میری وجہ سے تھا۔ اس نے ساحل کو جتنے کڑے پیرے میں قید کر رکھا تھا اس سے بھی ظاہر تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی صورت میں تک رسائی حاصل کر سکوں۔ وہ مجھے عبرتناک سزا دینا چاہتا تھا مگر گرفت میں لانے بغیر کسی قسم کی سزا دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ کائیاں محسوس یہ بات بخوبی سمجھتا تھا کہ میں جب بھی اس کی پکڑ میں آؤں گا تو ساحل ہی کے حوالے سے آؤں گا اسی لیے اس نے میری کڑوری کو اپنی ٹانگی میں "قہام" رکھا تھا۔

ہمارے درمیان براہ راست آخری رابطہ ہوئے کافی دن گزر گئے تھے۔ ان دنوں میں نیپال میں تھا۔ میں بخوبی جانتا تھا رلی اس وقت تل ابیب میں میری جان تنہا کے بہت

قریب ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا وہ میرے بارے میں مطلق نہیں جانتا ہوگا کہ میں کہاں ہوں۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تل ابیب میں میری موجودی سے آگاہ ہوؤرنہ اب تک وہ مجھ تک رسائی حاصل کر چکا ہوتا۔ میں اس کے لیے کئی حوالوں سے "سوسٹ ڈانڈی" کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے پلک بچھٹے میں مجھے چھاپ لیتا۔ وہ مذہبی اور سیاسی لحاظ سے اسرائیل کی ایک طاقتور شخصیت تھا۔ اس کے اشارۂ اہم پر پوری حکومتی مشینری بل کر رہ جاتی۔ اس نے اگر اب تک مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا تھا کہ وہ تل ابیب میں میری موجودی سے بے خبر ہے..... اور مجھے اس کی خبر جی ہی میں اسے چونا لگانا تھا!

اس سرت آسمانی خیال نے مجھے شاکر دیا کہ میں رلی اور اس کی انتہائی فعال مشینری کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسرائیل میں داخل ہو چکا ہوں۔ اسرائیل میں داخلے کی منصوبہ بندی اگرچہ خاصی سبب آ زما در طویل ثابت ہوئی تاہم یہ اتنی ہی محفوظ رہی۔ رلی بتائیں! کس کس ذرائع سے مجھے یقیناً یہ دکان کو تلاش کر دیا ہوگا۔ اس کے دہم دکان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں کسی مصری باشندے یوسف الظاہری کے روپ میں اس کی شردگ پر انگوٹھا گاڑ کر اپنی رگب جاں کو چھڑانے آ گیا ہوں۔

مصر اسرائیل کو تسلیم کرنے والے مسلمان ممالک میں برہنہ سبب سمجھا جاتا ہے۔ اس تسلیم رخا کے سلسلے میں مصر کے جو بھی ملکی اغراض و مقاصد رہے ہوں اس سے کوئی جھٹ نہیں۔ اس وقت دونوں ممالک میں ہر قسم کی تجارت اور لین دین جاری ہے اور باہمی خوشگوار اقتصادی تعلقات کی نوعیت برادرانہ سے بھی نہیں آگے بڑھ کر دوستانہ ہے۔

میں..... من کہ کسی یوسف الظاہری..... ایک مصری باشندہ اسرائیلی رہی ہوئے بائیں سے دوستی بنانے کے لیے ہی تو تل ابیب میں وارد ہوا تھا اور یہ ثابت کر دکھانا چاہتا تھا..... دوستوں سے میں دوست کر کے لیے ہاتھ! شتم سیر ہونے کے بعد دونوں کتے آپس میں جھلیں کرنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے سرمئی چمکتی تھی۔ ان کے رد میںک انداز و اطوار سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان میں سے ایک نر اور دوسری مادہ تھی۔ پیٹ میں پہنچنے والی غروب خدائے انہیں بے خود کر دیا تھا۔ شاید وہ "پہرے داری" کی تیاری کر رہے تھے۔

جوزا چاہے انسانوں کا ہو یا جانوروں کا ان کی پرائیویسی

میں جھانکنا اخلاقی جرم ہے۔ میں انہیں ان کے حال میں خوش چھوڑ کر ہوٹل ٹاپ کے گمرانمبر قایم زید وراثت میں حاضر ہو گیا۔ اس حاضری کے ساتھ ہر باطنی آنکھ کا شہر بند ہو گیا کیونکہ ظاہرہ آنکھوں نے اپنے دروازے بند کر دیے تھے۔

میں نے کھلی ہوئی آنکھوں سے صوفیہ والے بیڈ کی طرف دیکھا۔ مذکورہ بیڈ مجھے خالی نظر آیا۔ صوفیہ بیڈ پر موجود نہیں تھی حالانکہ جب میں اس باجول سے رخصت ہوا تھا تو وہ اسی بیڈ پر بیٹھی بیٹھا مجھے دیکھ رہی تھی۔

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ دوش روم میں ہے۔ پانی گرنے کی مخصوص آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ یہ اسی روم میں نصب شاور کی آواز تھی۔ اس ٹوئن ٹینر روم میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ میں اگر دوش روم سے باہر تھا تو اندر بیٹھنا صوفیہ ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ وہاں رات کے آٹھ کا دت ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً بیڈ چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد صوفیہ دوش روم میں سے برآمد ہوئی۔ وہ دھلی دھلائی دکھائی دی۔ اس کا نکھار یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ بھرپور شاور لے کر آ رہی ہے۔ ہنسیکے ہوئے بال گنگ ساز ناول میں ایک خاص انداز سے لپٹے ہوئے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو چپک کر بولی۔

”واپسی! تم تو میرے گمان سے بھی آگے کی چیز ہو۔ کہا“ سو نے جارہا ہوں اور یہ کہتے ہی سو بھی گئے۔ ہاتھیں اتنی نیند تم نے لیڑ ہے۔ رگھی ہے یا نہیں ورٹے میں کی ہے؟“

بات ختم کرتے ہی اس نے شوخ نظر سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ خاصے خوشگوار اور مذاق کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ کوئی حینہ مذاق کے موڈ میں ہوا اور آپ اس کا خاطر خواہ ساتھ نہ دیں تو اس نے بڑی اور کوئی بدزدنی ہو نہیں سکتی۔ کوئی جواب دینے سے پہلے میں یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے نکھار میں ایک خاص قسم کی تازگی اور کھٹکی پائی جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی وہ کوئی اسودہ پنہاں دیکھ کر فارغ ہوئی ہو۔

”یوں کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ میری نگاہ کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا؟“

”میں جواب دوں گا تو تم برا مان جاؤ گی!“ میں نے اسے گھورنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔ ”میں تمہاری بات کا برا کیوں مانوں گی؟“

میں نے سنجیدہ مذاق کو آگے بڑھاتے ہوئے وضاحت کی ”تم نے مجھے گمان سے بھی آگے کی چیز (CHEESE) کہا ہے۔ اگر جواب میں میں تمہیں وہم سے بھی آگے کا بٹر کہوں تو.....؟“

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ ابھرنے زدہ لہجے میں جلدی سے بولی ”میں غیر والی چیز کی بات نہیں کر رہی تھی۔ تم تو خواہ مخواہ بات کو گھما دیتے ہو!“

”اس فن میں تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔“ میں نے اس کی ابھرنے کی پروا کے بغیر ترکیب سے کہا ”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے میں بھی کھن والے بٹر کی بات نہیں کر رہا ہوں!“

”اوہ!“ وہ جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولی ”تم سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے بڑی اداسے کہا ”میں تمہاری نیند کی بات کر رہی تھی۔“

”اچھا ہوا“ اس نے کھن کے حوالے سے بٹر (BUTTER) کی وضاحت نہیں چاہی ورنہ مجھے بٹر فالتی بٹر پف اور جانے کون کون سے بٹر کی مثالیں دینا پڑتیں!

”اوہ..... اچھا نیند!“ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ”ہاں ہاں مجھے یاد آ رہا ہے تم نے لیڑ اور ورٹے کی بات کی تھی۔“ میں نے تھوڑا وقف کیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

”لیڑ اور ہائر پریچر کی تو کیا بات ہے اگر نیند کتنے بھی مہینے داسو بازار میں دستیاب ہوئی تو پھر کوئی بھی دولت مند اپنی بے خوابی سے نجات کے لیے سلیپنگ پلو اور فریکو لائزر نہ لے رہا ہوتا۔ حسب ضرورت مارکیٹ سے نیند خرید کر وہ اپنا مسئلہ حل کر لیتا اور..... یہ لغت ورٹے وغیرہ میں بھی مشکل ہونے والی نہیں ہے۔“

وہ بات کو ختم کرنے والے انداز میں بولی ”اس بحث کو چھوڑ دو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ تم نے کہا تھا رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔“ میں نے واقعی ایسا کیا تھا لہذا میں نہایت ہی فرمانبرداری سے اٹھا اور دوش روم میں مہس گیا۔ یہ فرمانبرداری اطاعت گزار شوہروں یا خدمت گار شوہروں والی نہیں تھی بلکہ یہ ایک طرح کا مردانہ اقرار تھا اس بات کا اعتراف تھا کہ میں نے جو کہا ہے وہ ایک مرد کا وعدہ ہے..... اور مرد اپنا وعدہ نبھانا بخوبی جانتا ہے!

تھیک رات نو بجے ہم ”ہوٹل ٹاپ“ سے نکل کر بن بھوہ اسٹریٹ پر آ گئے۔ میں نے ایک نئی ٹیلی فون کی روک اور

اس کے ڈرائیور سے ”مذاکرات“ کرنے لگا۔ اس نے پوچھا ”کہاں جانا ہے؟ میں نے جواب میں کہا۔“ تم ہمیں اپنی ٹیکسی میں بھٹا کر مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے کل ایبک کی سیر کرو۔ ہم ٹورسٹ ہیں۔“ ”ٹورسٹ!“ اس کی ہاتھیں اور آنکھیں ایک ساتھ کل گئیں۔

مجھے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ پوری دنیا کی طرح اسرائیل میں بھی ٹیکسی ڈرائیور یا حوں کی کھال اتارنے کے لیے اپنی چھری کا استعمال کرتے ہوں گے۔

میرے منہ سے ”ٹورسٹ“ کا لفظ نہ کر اس کے چہرے پر ایک روٹھی سی آگئی تھی۔ اس روٹھی میں میری پائی کی خوشی نہیں بلکہ چروں اور اٹھائی کیروں والی ہوس شامل تھی!

اس نے بڑی عبت سے کہا ”بیٹھ جائیں میں آپ کو سیر کر دیتا ہوں۔“

”پہلے کرائے بھاڑے کا حاملہ ملے کرلو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ”کل ایبک خاصا بڑا شہر ہے۔ آپ سے میں دو سو لے لوں گا۔“

دوسرے اس کی مراد دوسرا ”نیو شیکل“ تھی۔ میں اس کی بددیانتی اور مکاری کو فوراً سمجھ گیا۔ اس نے کل ایبک کے حوالے سے بڑا شہر کہتے ہوئے اس طرح آنکھیں پھیلایں جیسے وہ نیو یارک یا کیلے فوریا کا ذکر کر رہا ہو۔

ایبک تو ہر اپنی جگہ پورا ملک اسرائیل اتنا بڑا سا ہے کہ دنیا کے نقشے پر اسے ظاہر کرنے کے لیے صرف نام لکھ دیا جاتا ہے کوئی باقاعدہ جگہ دینے کی نوبت پیش نہیں آتی۔ وہ رات دہانے ہمیں الوہانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”ہم ٹورسٹ ہیں مگر کادھ کے الو یا اللہ میاں کی گائے نہیں ہیں یہ جانتے ہیں کل ایبک کتنا طویل و عریض شہر ہے لہذا تم کرائے کی رقم پر نظر ثانی کر لو تو اچھا ہے۔“

”گائے“ یہودیوں کا بڑا نازک پہلو ہے۔ میں نے اپنے حوالے سے ”اللہ میاں کی گائے“ کا ذکر کیا تو اس یہودی ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

بڑی سرمدہری سے اس نے کہا۔

”میں بس ایک سواری سے کم نہیں لوں گا۔“

”چلو اس کیرو۔“ میں نے ایک اور تجویز پیش کی۔ ”تم اپنی ٹیکسی کے ماسچین سے ہمیں صرف دس میل تک کل ایبک کی سڑکوں پر گھماتے رہو۔ اس کام کا کتنا کرایہ آگے؟“

مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ بن گورین ازپورٹ سے سٹی بیٹرنیک آنے والی ٹیکسی ہمیں امریکی ڈالر زکریا وصول کرتی تھی۔ نیو شیکل میں بدلنے کے لیے اگر اس رقم کو ساڑھے تین سے ضرب دیں تو یہ رقم ساڑھے ستاسی نیو شیکل بن جائے گی۔ ازپورٹ سے شہر کا مرکز صرف بارہ میل (انٹرنیشنل) کے فاصلے پر تھا۔ اگر چہ ازپورٹ سے لانے اور لے جانے والی ٹیکسیوں کا کرایہ بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے مگر اس حساب سے بھی دیکھا جاتا تو دس میل کی سیر کے لیے اس ٹیکسی ڈرائیور کو ہم سے زیادہ سے زیادہ اسی نیو شیکل کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا جب کہ وہ منہ پھاڑ کر ایک سو نیو شیکل زیادہ مانگ رہا تھا۔

میری تجویز کے جواب میں اس نے چند لمحے سوچا اور بولا ”چلیں آپ لوگ ڈیڑھ سو دے دینا۔“

اس کے بعد اس نے ایک ایسا جملہ ادا کیا جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا..... اس سے کم میں وارا نہیں ہے! یہ بھی قیمت تھا اس نے پیڑوں اور ٹیکسی کی گرائی کا دکھڑا ہمیں نہیں سنایا تھا۔

میں اس کے ”دارے“ کے چکر میں آنے والا نہیں تھا لہذا کرایہ جات کی حقیقت اس پر کھول دی۔ میری معلومات سے متاثر ہو کر وہ تھوڑا سا شرمندہ ہوا لیکن اس ندامت کے باوجود بھی وہ ایک سو نیو شیکل سے کم پر راضی نہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مین الاقوامی شہرت یافتہ ”یہودی عیاری“ سے کام لیتے ہوئے اس نے کہا۔

”میں اس دس میل کی سیر میں ایک گاڑی کے فرائض انجام دیتے ہوئے آپ لوگوں کو مفید معلومات بھی بہم پہنچاؤں گا۔“

ہم نے اس کی تمام تر یہودی چال بازی پر لعنت بھیجی اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں کل ایبک کو ذرا تفصیل سے دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی بھی بہانے سبب میرا یہ مقصد پورا ہو رہا تھا لہذا میں نے تقریباً آنتیس امریکی ڈالر (سو نیو شیکل) کی قربانی دینا گوارا کر لی۔ آنتیس ڈالر کی ادائیگی ٹیکسی خاصی پیچیدہ تھی لہذا اسے ایک سو نیو شیکل ہی ادا کیے گئے۔ ہوٹل ٹاپ کے گراؤڈ فلور پر ایک مٹی پتھر کا آفس بھی کھلا ہوا تھا۔ چپک ان ہونے سے پہلے میں نے ایک ہزار ڈالر کو نیو شیکل میں بدلوا لیا تھا۔ واضح رہے کہ ٹیکسی ڈرائیور کو یہ کرایہ سفر کے اختام پر ادا کیا گیا تھا۔

ہم جب ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو اس نے ٹیکسی آگے بڑھانے کے ساتھ ہی زبان بھی بڑھادی۔ راستے میں پڑنے

والی مختلف عمارتوں کے بارے میں اس کا رواں تمبر شروع ہو گیا۔ بن یہودہ اسٹریٹ سے نکل کر ہم نے مغرب کی سمت سفر کیا اور جلد ہی "اسرائیل نیس سینٹر" پہنچ گئے۔ اس سے آگے تل ابیب کا ساحل شروع ہو جاتا ہے۔ ساحل کے قریب سے اس نے ٹیکسی کو شمال کی جانب گھمایا اور "تل ابیب۔ یافو" کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم "عطاکم" پہنچ گئے۔ اس سے آگے تل ابیب کا "آرٹ میوزیم" تھا۔ میوزیم وغیرہ کو اندر سے دیکھنے کا ہمارے پاس وقت نہیں تھا لہذا ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے آگے بڑھ گئے۔ یہاں سے یہودی ڈرائیور نے ٹیکسی کو واپس موڑا اور تھوڑا پیچھے آنے کے بعد مشرق کی جانب ایک سڑک پر ڈال دیا۔ چند منٹ بعد ہم ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس دوران میں ڈرائیور نے ایک لمبے کے لیے ٹیکسی روکی اور نہ ہی اس کی زبان کو کھانی قرار آیا۔ وہ انتہائی باتونی یہودی تھا۔ مجھے تو یہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ وہ سوئیڈشکل کو حوالہ کرنے کے لیے ضروری کے علاوہ غیر ضروری بکواس بھی کیے جا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے اس نے ایک صاف ستھری اسٹریٹ میں گاڑی روک دی اور بڑے عاتق طائی کے سے انداز میں بولا "میں نے آپ لوگوں کو دس میل سے کچھ زیادہ ہی سیر کرا دی ہے۔ اگر تعین نہ ہو تو آپ ٹیکسی کا ماتچ میٹر چیک کر سکتے ہیں!"

میں نے اس کی پیشکش کے رد عمل کے طور پر ماتچ میٹر پر نگاہ ڈالی تو اس یہودی کی شاطرانہ ذہنیت پر سبک کر رہ گیا۔ ٹیکسی کا مسافت بتانے والا ڈائل اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ ہم نے اب تک اس ٹیکسی میں بیٹھ کر دس اعشاریہ دو میل سفر طے کیا تھا۔ جی میں تو آئی کہ اسے چند چنیدہ "تخائف" سے نوازوں لیکن صوفیہ کی محبت کا خیال کرتے ہوئے میں نے زبان اور دماغ کو قابو میں رکھا۔ انتہائی سچ لہجے میں صرف اتنا کہا۔

"تمہارے اس احسان کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا اور کبھی اگر مصر میں تم سے ملاقات ہوئی تو میں پہلی فرصت میں اس قرض نما احسان کو اتارنے کی کوشش ضرور کروں گا" پھر میں نے ایک سوئیڈشکل اس کے حوالے کر دیے۔

مجموعہ بخت اعشاریہ دو میل کے فاصلے کے لیے ہم پر احسان عظیم بن جا رہا تھا۔ کاردار میں ڈیڑھ ہوشیار کی کار انداز بنو دو یہود کے لیے مخصوص ہے اور اس سلسلے میں وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

وہ میرے طنز کو شاید سمجھ نہ سکا اور بڑے غدیہ سے ہن

سے اس نے وہ رقم مجھے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں ٹھونس لی۔ میں نے اسی جیب سے دوبارہ استخراج کیا۔

"تھوڑی سی مہربانی فرما کر یہ بھی بتاؤ اس وقت ہم تل ابیب کے کس مقام پر کھڑے ہیں؟"

"یہ یزور اسٹریٹ ہے" اس نے جواب دیا۔

"کیا یہیں آس پاس کوئی اچھا ریستورنٹ بھی ہے؟"

"تھوڑے فاصلے پر "زائن گیٹ" ریستورنٹ موجود ہے۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے تمہارا بہت شکریہ۔" میں یہ کہہ کر ٹیکسی سے اترنے لگا تو وہ جلدی سے بولا۔

"بیٹھے رہو۔ میں تمہیں زائن گیٹ کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔"

"ارے نہیں یار!" میں نے جوتا کاری والی بے تکلفی سے کہا "میری گردن میں پہلے ہی دھن ہو رہی ہے۔ تم نے میرے احسان شناس کندھوں پر پورے "اعشاریہ دو میل" کا ماؤنٹ ایوریٹ لا دیا ہے!"

وہ میرے اس گہرے طنز کو فوراً سے پیشتر سمجھ گیا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ ٹیکسی سے نیچے اتر اور ہمارے اخلا کے لیے بڑی شرافت سے ٹیکسی کے دروازے کھول دیے۔ ہم نے اس کی ٹیکسی سے باہر نکلنے میں ایک لمبے کا خیر مناسب نہ سمجھی۔ ڈر محسوس ہو رہا تھا کہیں وہ دروازہ کھولنے پر بھی کچھ مانگ نہ بیٹھے!

زائن گیٹ (ZION GATE) نامی وہ ریستورنٹ بے شکل سگز کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم چند منٹ کے اندر وہاں پہنچ گئے۔ ایک میز پر براجمان ہونے کے بعد میز پر کا معائنہ کیا تو پتا چلا اس ریستورنٹ میں قدیم اور جدید دونوں قسم کی ڈشز کی خاصی وسیع رینج موجود تھی۔ جس میں زیادہ تر ڈشز گوشت کی تھیں۔

اسرائیل میں اور اسرائیل سے باہر کی دنیا میں وہ ریستورنٹس جن کے مالکان یہودی ہیں وہاں گوشت کی ڈشز کو بے دھڑک کھایا جاسکتا ہے کیوں کہ ایسے تمام مقامات پر باقاعدہ ذبح شدہ گوشت فراہم کیا جاتا ہے جسے گوشت (KOSHER) کہا جاتا ہے۔ یہودی جانور کو جیج طریقے سے حلال کرتے ہیں۔ زائن ریستورنٹ میں ہم نے خوب ڈش کرڈز کیا اور باہر نکل آئے۔

صوفیہ نے پوچھا "کیا پروگرام ہے۔ اب ہوٹل چلیں گے نا؟"

"ہوٹل تو جانا ہی ہے لیکن اس سے پہلے میں بہائی

گارڈن اپارٹمنٹس کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔" میں نے ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"وہاں کیا ہے؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"بہائی گارڈن اپارٹمنٹس کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔" ی میں وکٹ کا دوسرا اینڈ ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"سچ ہے پہلے اس کا معائنہ کرنا ضروری ہے؟"

"تم سیدھی بات نہیں کر سکتے؟" وہ ابھن زدہ انداز میں بولی۔

"تم کرکٹ کی مثال دو تو جائز ہے۔" میں نے سنجیدگی پر قرار رکھتے ہوئے کہا "اور یہی حرکت میں کروں تو یہ اتنی بات ہوگئی۔ یہ کہاں کا دستور ہے؟"

"کرکٹ کی بات..... میں سمجھی نہیں!" اس کی الجھن برقرار رہی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "تم نے بیک فٹ پر کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ کرکٹ پیلنگ کے لیے اس وکٹ کے کسی اینڈ پر کھڑے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ میں تو فرنٹ فٹ پر کھیلنے کے لیے دوسرے اینڈ یعنی اس پیلنگ میں داخل ہوں گا جہاں میری ساتھی کو کھڑا کیا ہے اور تم بیک فٹ پر کھیلنے ہوئے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں اس وکٹ کا دوسرا اینڈ سنبھالو۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟"

"سمجھ تو رہی ہوں" وہ آنکھیں پھیلائے۔ ہوئے بولی "لیکن مذکورہ اپارٹمنٹ میں کون رہتا ہے؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتحال سے آگاہ کیا اور کہا "پہلے ہم اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی کا سروے کریں گے اس کے بعد ہوٹل ٹاپ کا رخ کریں گے۔"

اسی وقت ایک ٹیکسی نظر آگئی اور ہم اس میں بیٹھ کر شالوم اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ "بہائی گارڈن اپارٹمنٹس" شالوم اسٹریٹ کے نزدیک ڈبلی گلی میں واقع ایک دس منزلہ رہائشی عمارت تھی۔ جلد ہی ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

عمارت کے انٹریس کے نزدیک ہی ایک ویل ڈیکور ٹیڈ ریپیشن بنا ہوا تھا۔ ریپیشنٹ کی نگاہ بجا کر رہائشی کھے کی جانب قدم بڑھانا ممکن نہیں تھا۔ ریپیشنٹ ایک طرح دار اور خوبصورت یہود تھی۔ بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں رہنے والوں کو اور ان کے ریکولر ملاقاتیوں کے چہروں سے تو وہ ابھی طرح واقف تھی لہذا انہیں روکے یا کوئی استخراج کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ہمیں وہ آسانی سے جانے نہ دیتا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی سوال کرتی، میں خود ہی اعتماد

سے چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔ صوفیہ میری ہم قدم تھی۔

ریپیشنٹ نے استفسار بے نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے مضبوط لہجے میں کہا "ہم اپارٹمنٹ نمبر نوکسی سیون۔ سی میں جائیں گے۔"

ریپیشنٹ کے سامنے کاؤنٹر پر مکمل کمپیوٹر سیٹ اپ موجود تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کی حرکات سے سمجھ گیا کہ وہ انٹرکام سسٹم سے کھیلنے والی ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

"مسنجین اس وقت اپارٹمنٹ میں موجود نہیں ہے۔" "اوہ! مگر اس نے تو مجھے ملاقات کے لیے یہی وقت دیا تھا!" میں نے قدرے پریشانی سے رسٹ داچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ریپیشنٹ کی رہائی کم از کم مجھے ڈبلی گیٹ کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے لیے بھی یکن ہی تھا۔ میری معنوی پریشانی کو اصلیت سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، مسجین نے آپ کو ملاقات کے لیے یہ وقت کیوں دیا؟" ریپیشنٹ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی "وہ تو رات کی ڈیوٹی پر نہیں جاتا ہے۔ میں حاتی تھی وہ اپارٹمنٹ میں موجود نہیں لیکن آپ لوگوں کی تسلی کے لیے میں نے انٹرکام پر چیک بھی کر لیا ہے۔"

میں نے معاملات کو نبھانے کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا "ہماری ملاقات خاصی پرانی ہے اور یہ بات مجھے معلوم ہے کہ وہ سات سو سات بجے ڈیوٹی کے لیے نکل جاتا ہے۔ میں دن میں کئی مرتبہ اس سے ملنے کے لیے یہاں آ چکا ہوں" پھر میں نے اچانک توقف کر کے چونکی ہوئی نظر سے ریپیشنٹ کو دیکھا اور کہا۔

"میں نے آپ کو پہلی مرتبہ ریپیشنٹ دیکھا ہے۔ دن میں کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی ہے!"

وہ جلدی سے بولی "دن میں یہاں روٹین ہوتی ہے۔ میرا نام اینڈ اے۔ میری ڈیوٹی رات کی ہے۔"

اس طرح اینڈ اے کی مہربانی سے نہ صرف اس کا بلکہ دن والی ریپیشنٹ روٹین کا نام بھی مجھے معلوم ہو گیا۔ خوب اعتماد کی ساتھ کھایا کھلوک ہمیشہ اچھے نتائج لاتا ہے جیسا کہ ابھی ہوا تھا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا "مسجین نے مجھ سے کہا تھا وہ آج چھٹی کرے گا اسی لیے میں رات میں آ گیا۔ چلا کوئی بات نہیں" میں کل دن میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔ دے

تھوڑی دیر بعد میری سلوان سے بھی ملاقات ہونے والی ہے۔ میں اسے بریف کر دوں گا!"

آخری دو بجے میں نے بڑبڑانے والے انداز میں ادا کیے تھے جیسے خود کلامی کی ہو۔ دراصل میں سلوان کے ذکر پر ریپنٹسٹ ایڈز کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ سلوان ابھی اس بلڈنگ کا ایک رہائشی تھا اور راست کی ڈیوٹی پر ہونے کے باعث ایڈز اسے ضرور جانتی ہوگی۔

مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی وہ خاصے پڑ جوش انداز میں بولی "یہ دونوں عجیب و غریب روم میٹ ہیں۔ ڈیوٹی بھی دونوں کو قسمت سے رات ہی کی ملی ہے۔ اپارٹمنٹ میں پڑے دن میں سوتے رہتے ہیں یا بھر جھگڑتے بھرنے کے لیے باہر نکل جاتے ہیں!"

ساحل والے بنگلے کے اسٹاف کی طرح ایڈز ابھی سلوان اور بیکین کی بد معاشی نمائی بھگت سے واقف نہیں تھی۔ اسی لیے اس کے بیان میں کسی ناشناس کے لیے کوئی ربط نہیں تھا۔ میں نے ربط پیدا کر دنا ضروری نہ سمجھا۔ ایڈز اس وقت حقیقی اور افسانوی دنیا کے جس ٹرائس میں تھی وہ حرید چند روز تک وہیں رہتی تو اچھا تھا۔ میں اپنا کام کر کے چلا جاتا تو بعد میں یہاں جو بھی ہوتا رہتا، مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ ایڈز نے سلوان کو بیکین کا روم میٹ کہہ کر مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی تھیں اگرچہ اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کیونکہ وہ مجھے ان دونوں کا کوئی قریبی تعلق واریا دوست سمجھ رہی تھی۔ وہ میری اصلیت سے آگاہ نہیں تھی اس لیے وہ اس معاملے کو بڑا ایزی لے رہی تھی۔ جب میں دن میں روٹین کے ساتھ "کھیلتا" تو بتایا وہ بھی اسی قسم کا ردعمل ظاہر کرتی جو میرے منصوبے کی تکمیل میں بہت مددگار ثابت ہوتا۔

میں نے اس سے انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرنے کی خاطر دوستانہ لہجے میں کہا "ایڈز! تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بیکین اور سلوان واقعی بڑے عجیب و غریب ہیں۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ میں تو انہیں ایک عرصے سے بھگت رہا ہوں۔ خیر" میں نے تھوڑا وقف کیا پھر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم سے ملاقات ہوئی رہے گی ایڈز!"

وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی "شیور سزا"

ہم بھائی گارڈن اپارٹمنٹس سے نکل کر شالوم اسٹریٹ پر آگئے تو صوفیہ نے پوچھا۔

"بس" کر لیا سروے تم نے؟"

میں نے اسے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی سلوان ڈیوٹی کیٹ اور اپنے منصوبے کے بارے میں ایک حد تک آگاہ کر دیا تھا، مگر بے ہوشے لہجے میں جواب دیا "نی الحال اتنی ہی کافی ہے۔ اس ملاقات کے توسط سے میں دراصل ایڈز سے شناسائی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ایک آدھ روز میں جب ہم اس اپارٹمنٹ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کریں گے تو ہمیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ہم کبھی ریگولر ملاقاتوں کی فہرست میں آگئے ہیں۔"

"لیکن اصل مسئلہ تو بیکین کی ٹائٹ ڈیوٹی کا ہے۔"

متذبذب لہجے میں بولی "جب وہ رات بھر اپارٹمنٹ سے باہر رہے گا تو پھر اس سے ملاقات کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟"

مجھے بھرپور کی بھر کہا "سلوان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے" میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا "جس رات ہم اپنے مشن کے لیے اسے اپارٹمنٹ کو استعمال میں لائیں گے، بیکین ناگزیر موجود کی بنا پر ڈیوٹی پر نہیں جاسکے گا!"

وہ میرے لہجے میں شامل تکنیکی محسوس کرتے ہوئے بولی "اس کا مطلب ہے تم نے بیکین کے حوالے سے اپنے ذہن میں کچھ خاص پلان کر رکھا ہے۔ دیری ویری ڈیجیٹر پلان؟"

"ایسی ہی بات ہے!" میں نے پوری سفاکی سے کہا۔ وہ سبھی ہوئی نظر سے مجھے ہنسنے لگی۔ اس کے لوں سے آواز نکلا "اوہ۔۔۔۔۔"

یہ بات نہیں تھی کہ صوفیہ کوئی ڈرپوک لڑکی ہو۔ اسے میرے لہجے میں تکنیکی اور سفاکی نے دلکڑ رکھ دیا تھا۔ ان لمحات میں مجھے خود بھی اپنی آواز ابھنی محسوس ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی وحشی درندہ غرا ہوا!

جلد ہی میں نے اپنی داخلی کیفیت پر قابو پایا اور نہایت ہی غصہ سے ہونے لہجے میں صوفیہ سے کہا "بس، آج رات کی بات ہے، کل میں تمہیں اپنی پلاننگ سے مکمل طور پر آگاہ کر دوں گا پھر مشن کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی الجھن نہیں رہے گی۔"

"اسی اوکے!" اس نے گھبراہٹ میں کہا اور خاموش ہو گئی۔

ہم لگ بھگ آدمی رات کو اپنے ہونٹ واپس آگئے۔ سونے سے پہلے میں نے تمام اہم محاذوں کا "حصہ" کیا، تھوڑا آئی کے چسکا کرنے مجھے یقین دلایا کہ ہر طرف خیر و عافیت ہے، رہی کو جھانکنے کا موقع نہیں مل سکا، البتہ اس کے

مختصر خاص کو چھوٹے کمرے میں دیکھ کر میری تسلی ہو گئی کہ رہی بنے کمرے میں موجود ہوگا۔ سنہری بالوں والا وہ سوئیڈ بوئیڈ تھا اس طور رہی کا سایہ بنا ہوا تھا کہ مجھے شک ہونے لگا، بن گورین اسٹریٹ پر سے رہی جس سیاہ لنگوری گاڑی میں سوار ہو کر اس بنگلے تک پہنچا تھا، اس میں مستحق خاص بھی موجود ہوگا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر۔۔۔۔۔ یا پھر پیئر سیٹ پر!

نیندی کی آغوش میں سر رکھتے سے کل میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی "میں نہایت ہی پرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک سات بجے میری آنکھ کھل جائے گی لیکن میری اس نیند کے دوران میں اگر صل ایب میں صوفیہ، میرے، ساحل یا رہی موٹے ہائمن کے حوالے سے کوئی غیر معمولی یا میرے خلاف توقع واقعہ پیش آنے کا امکان پیدا ہوا تو میری آنکھ وقت مقررہ سے پہلے ہی آرا کل جائے گی۔"

اس ہدایت کے چند لمحات بعد، میں گہری نیند کی گداز ہائوں میں پناہ گزین ہو چکا تھا۔

ایسا بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے دماغ نے کسی مرحلے پر مجھے دھوکا دیا ہو۔ نیند کے سلسلے میں، میں نے جب بھی اسے جو ہدایت دی اس نے عین ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ چھ بجے کی ٹاساڑھے چھ بجے میری آنکھ اچانک کھل گئی تو مجھے حیرت کے ساتھ ہی تشویش بھی ہوئی۔ میں نے اپنے دماغ کو ٹھیک سات بجے بیدار کرنے کا حکم دیا تھا۔ وقت مقررہ سے آدھا گھنٹہ پہلے آنکھ کھل جانے کا بھی مطلب تھا، کوئی گڑبڑ ہے!

میں نے کسی غیر متوقع اور غیر معمولی گڑبڑ کو صوفیہ، ساحل، رہی اور خود اپنے آپ سے منسوب کر کے دماغ کو ہدایت دی تھی۔ قبل از وقت آنکھ کھل جانا ظاہر کرتا تھا، انہی بارخیزا میں سے کسی کے ساتھ کچھ غیر متوقع ہونے والا تھا۔ میں نے اضطرابی انداز میں، دوسرے بیڈ کی طرف دیکھا۔

سب سے پہلے اپنے قریب کو چپک کر حاضر ہو گیا تھا۔

وہاں صوفیہ موجود تھی۔ وہ اس وقت گہری نیند میں تھی۔ میں بھی بخیر سلامت تھا۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیں اور باطنی آنکھ کے وسیلے سے اپنی جان تناسل کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ اسی بیڈ روم میں تھی جہاں کچھ عرصے سے وہ مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خیر و عافیت پر سکون نیند سو رہی تھی۔ اب صرف رہی موٹے ہائمن کی طرف جھانکنا رہ گیا تھا۔

رہی تک براہ راست میری رسائی ابھی تک ممکن نہیں ہوئی تھی لہذا میں سوئیڈ بوئیڈ مستحق خاص کے ماحول میں پہنچ

گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میری تیسری آنکھ نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی غیر معمولی اور غلاب توقع تھا۔ سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں، میں سمجھ گیا کہ میری آنکھ مقررہ وقت سے پہلے کیوں کھل گئی تھی۔

میں نے سونے سے پہلے اس سوئیڈ اور بوئیڈ سنہری بالوں والے مستحق خاص کے ماحول میں جھانکا تھا اور اسے اسی جھوٹے سے کمرے میں پایا تھا جہاں اس نے رہی کو بلائے جانے والے دودھ کی اسکریننگ کی تھی، لیکن اب وہ اس کمرے میں نہیں تھا بلکہ ان لمحات میں وہ مجھے ایک بندوبست میں دکھائی دیا۔ میرے اب تک کے مشاہدے کے مطابق، وہ رہی کا سایہ بن کر زندگی گزار رہا تھا، اس کا مطلب تھا، رہی بھی اسی دین کے اندر موجود ہوگا!

اس چونکا دینے والے خیال نے مجھے اس ماحول سے چپکا کر رکھ دیا پھر گویا مجھ پر انکشافات کی بارش ہو گئی۔ اسی بندوبست میں مجھے رہی موٹے ہائمن اور مستحق خاص کے علاوہ سلوان بھی نظر آگیا، سلوان نے دین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی جب کہ مستحق خاص پیئر سیٹ پر براجمان تھا۔ رہی دین کے عقبی حصے میں ایک نرم اور آرام دہ کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا۔

اس دین کا عقبی حصہ ایک جھوٹے سے سٹنگ روم سے مشابہ تھا۔ آپ اسے ایک مینٹنگ روم بھی کہہ سکتے ہیں۔ رہی آنکھیں بند کیے جس کاؤچ پر لیٹا تھا۔ وہ اپنی نوعیت اور آرام دہی کے حوالے سے منفرد اہمیت اور حیثیت کا حامل تھا۔ اسی جھوٹے "مینٹنگ روم" میں مجھے رہی کی وکیل جینر بھی نظر آئی۔ اس وکیل جینر کو مکمل فائدہ تک نہ رکھا گیا تھا۔ میں نے اسے اس کے مخصوص حصوں کے سبب پہچان لیا۔ اس سے پہلے میں اس وکیل جینر کو ساحل والے بنگلے کی زیریں منزل کے ایک بیڈ روم میں دیکھ چکا تھا۔۔۔۔۔ اور رہی کو اس وکیل جینر پر بیٹھے دیکھ کر مجھے شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔ یہی وکیل جینر بندوبست میں اب اس کے ساتھ کہیں جاری تھی۔ پتا نہیں، اچانک بیٹھے بٹھانے وہ کس صنف کا شکار ہو گیا تھا!

اس کے صنف اور وکیل جینر سے بھی زیادہ اہم بات میری نظر میں اس وقت یہ تھی کہ رہی اپنے پہلے جانوں کے ساتھ اتنی سچ جاکھاں رہا تھا اور وہ بھی ساحل کو اس بنگلے میں اکیلے چھوڑ کر! دیکھنا وہ کسی نہایت ہی اہم اور امیر جنسی مشن پر تھا۔ میں بھی تھوڑا آئی کے مکمل اس بندوبست میں موجود رہا۔

اس وقت میرے پورے بدن میں ایک عجیب سی سنسنی

دور رہی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے بکار بکار اطلاع دے رہی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے رہی کے ماحول کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ جو کچھ بھی کرنے جا رہا تھا۔ وہ میرے لیے انتہائی اہم ہو سکتا تھا۔ میں معتبر خاص اور سلطان کے پاس رہ کر حالات کا جائزہ لیتے گا۔

اس بندوین کو میں نے جب دیکھا تو وہ بندوین اسٹریٹ سے گزر رہی تھی اور اب وہ ہائی وے پر دوڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی وقت کا سامنا نہ ہوا کہ اس وین میں بیٹھنے والے کس نصب تھے۔ وین کے اندر موجود افراد تو بآسانی باہر دیکھ سکتے تھے لیکن باہر والے باوجود کوشش کے بھی اندر جھانکنے کی "بھت" نہیں کر سکتے تھے۔

ہائی وے پر دوڑتی ہوئی وین کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلی بات آئی وہ یہ تھی کہ رہی اس وقت کل ایبپ سے باہر کہیں جا رہا تھا کیوں کہ وہ ہائی وے سیدھی بن کر وین اتر پورٹ تک پہنچائی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا، وہ اسراٹیل سے کسی دوسرے ملک کی جانب پرواز کرنے والا ہو۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میرے لیے ساحل کا حصول قدرے آسان ہو جاتا۔ رہی کی اسراٹیل میں موجودگی کے باعث مجھے بہ نسبت زیادہ مشکلات سے گزرنا پڑتا لیکن جلد ہی اس بندوین نے میری توقعات پر پانی بھیر دیا۔

میں نے وین کو ہائی وے پر اتر پورٹ سے آگے بڑھتے دیکھا تو الجھ کر رہ گیا۔ بن کر وین اتر پورٹ کی طرف جانے کے لیے اسے ہائی وے کو چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پر مڑنا چاہیے تھا لیکن وہ مسلسل جنوب کی سمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا، وہ کل ایبپ سے نکل کر اسراٹیل ہی کے کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ میں اس ماحول سے چپکا ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔

جلد ہی وہ بندوین الی آڈر کو پیچھے چھوڑ کر کل ایبپ کی حدود سے نکل گئی۔ الی آڈر کا علاقہ کل ایبپ کی جنوبی سرحد پر واقع ہے۔ وہ لوگ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، میری تشریش اور دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ذہن میں ایک خیال یہ بھی آ رہا تھا کہ شاید وہ رہی کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہے ہیں۔ دیکھ کر جیتھر بار بار یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ کوئی میڈیکل پراہم ہے۔ اس کی یہ پراہم چون کہ اچانک ہی میرے سامنے آئی تھی لہذا میرا ذہن بہ یک وقت کی محاذوں پر الجھا ہوا تھا۔ جب تک ملی تھیلے سے باہر نہ آ جاتی، اس انجین کو رہتا تھا۔ رہتا تھا تو لازمی بات ہے، دماغ کو الجھنا بھی تھا۔

الی آڈر سے نکلنے کے بعد وین نے اپنی سمت میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور جنوب مشرق کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی ہائی اسپید کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان لوگوں کو کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ وین نے جنوب مشرق میں ہی اپنا سفر جاری رکھا اور راجہ، شاعر بیگے سے گزرتے ہوئے قریات انام کے راستے پر دھلم میں داخل ہو گئی۔ پر دھلم کا لفظ ذہن میں چکا تو مجھے اپنے چاروں طرف روشنی کی جھلکی محسوس ہوئی۔ یہ روشنی اتنی تیز تھی کہ میں نے گھبراہٹ میں آنکھیں کھول دیں۔ ظاہرہ آنکھیں کھلتے ہی باطنی آنکھ کا شہر بند ہو گیا۔ میں نے اپنی سانس کو غیر ہموار پایا۔ میں اس وقت ہوٹل ٹاپ کے اسی کمرے میں موجود تھا جہاں رات کو سویا تھا۔ میری نظر صوفیہ والے بیڈ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ ہنوز گہری نیند میں تھی۔ میں نے رستہ واقع میں وقت دیکھا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے بیدار ہوا تھا اور یہ آدھا گھنٹہ میں نے رہی اینڈ کینی کی "میت" میں گزارا تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے دوران میں وہ لوگ کل ایبپ سے پر دھلم پہنچ گئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق، انہوں نے لگ بھگ چالیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ میرے اس اندازے میں دو چار میل کا فرق ہو سکتا ہے، وہ ایسے ٹی سینٹرل ایبپ سے ٹی سینٹر پر دھلم کے مابین اوسط فاصلہ بتاتیں میل تصور کیا جاتا ہے۔

پر دھلم کے خیال نے ایک مرتبہ پھر مجھے ان جانی مسرت سے نہال کر دیا۔ اس وقت میں اپنے ان محسوسات کو کوئی نام نہ دے سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے میں تھوڑی سی کٹھن سے بندوین کے اندر پہنچ گیا۔

وہ وین رہی موٹے ہاتھوں اور اس کے دو جیپوں کو لے کر "دوا" سے گزری، پھر ان کے راستے میں ٹومب آف ہزل آیا۔ یہاں سے وہ اسراٹیل میں مزیم پہنچے۔ یہ تمام تر سفر جنوب مشرق کی سمت میں ہو رہا تھا۔ اسراٹیل میں مزیم کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ان کی سواری پر دھلم پر وین کے اسٹیشن کے پاس سے گزری تو ان کی سمت بھی تبدیل ہو گئی۔ پرانی روش کو چھوڑ کر اب وہ شمال کی جانب، مشرق کی طرف بڑھنے لگے۔ مسلسل شمال کی طرف سڑک کرتے ہوئے انہوں نے مشرق کی طرف اس چڑیا گھر کے پاس سے وہ وین مشرق کی طرف مڑی اور سیدھی، ماؤنٹ اسکولس کے قریب واقع "ہیمبر" دیوٹی روٹ پر آ گئی۔ پر دھلم، پہنچ گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا۔ یہی وہی وین تھی ان کی منزل تھی۔ وین یہی وہی وین تھی کے اندر داخل ہو گئی۔

پر دھلم میں، دیگر مقامات مقدسہ کی طرح ماؤنٹ اسکولس کی بڑی اہمیت ہے اور ہیمبر وین وین وین کو یہودیوں کا اماں یاد رکھ لیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ رہی موٹے ہاتھوں کو علی الصباح کل ایبپ سے پر دھلم آنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی اور وہ بھی ہیمبر دیوٹی روٹ میں۔ کیا وہ اس وین وین میں کوئی اہم شخص ہوئے آیا تھا۔

رہی ہیمبر (عبرانی) زبان کا بہت بڑا عالم تھا۔ جس طرح ہندوؤں نے اپنے تمام تر پراسرار علم و فنون کو سنسکرت میں چھپا رکھا ہے جہاں تک بڑے بڑے پنڈتوں اور جوگیوں کی رسائی ممکن ہے کیونکہ وہ سنسکرت بھی نہایت ہی بے پندہ کسم کی ہے۔ ہندی جاننے والا ایک عام ہندو ان اسرار و رموز تک بھی نہیں پہنچ سکتا، بالکل اسی طرح یہودیوں نے بھی اپنے خفیہ معاملات کو عبرانی زبان کی بھول بھلیوں میں گم کر رکھا ہے تاکہ دوسرے لوگ ان کے راز ہائے رستہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔ اس مخصوص ذہنی مماثلت کی بنا پر ہی شاید ان دونوں اقوام کا ذکر ایک ساتھ "ہنود یہود" کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ہنود یہود بھی ان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ کاش، یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آجائے!

سب سے پہلے سلوان اور معتبر خاص وین سے باہر آئے پھر انہوں نے وین کے عقبی حصے میں سے دیکل جیپز کو باہر نکال کر اسے "سیٹ" کیا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا، وہ رہی کو سہارا دے کر اس دیکل جیپز پر بٹھائیں گے لیکن رہی نے انہیں یہ زحمت نہیں دی بلکہ اپنی بدآپ کے تحت وہ وین سے نکلا اور بڑی آہستگی کے ساتھ دیکل جیپز پر بیٹھ گیا۔ رہی کی تازہ ترین حرکت کو دیکھ کر میں بھی اندازہ قائم کر سکا کہ وہ شخص زیادہ چلنے سے عاری ہے مگر اس عادت کا سبب میری سمجھ سے باہر تھا کیونکہ میں اسے تو جوانوں کی طرح بڑے طعنائی سے چلتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ اچانک پتا نہیں، کون سا انقلاب برپا ہو گیا تھا!

وہ وین یونیورسٹی کے اندر، عمارت کے ساتھ آ کر رک گئی۔ جب رہی دیکل جیپز پر بیٹھ چکا تو میں بے خیالی میں اپنے دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ سلوان یا معتبر خاص میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ اندر ضرور جائے تاکہ میں رہی کے ماحول میں موجودہ کراس کے مقاصد کو سمجھ سکوں۔

میری یہ لاشعوری دعا فوراً قبول ہو گئی۔ سلوان تو دین کے اندر پہنچ کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور معتبر خاص دیکل جیپز کو دھکیلے ہوئے عمارت کے اندر وین حصے میں داخل

ہو گیا۔ اس وقت یونیورسٹی میں آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ سلوان نے وین کو دہاں سے ہٹا کر پارکنگ وغیرہ میں لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا، رہی یونیورسٹی میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔ میں سلوان پر مسلماً خوشی سمجھ کر معتبر خاص کے پاس آ گیا۔ میری تمام تر امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔

امید اور دھندلے کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ زندگی کی ریل میں دو پٹریوں کے مانند ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہر پٹر امید محسوس کو شعوری یا لاشعوری طور پر یہ خدشہ ضرور ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنے مقصد میں ناکامیاب نہ ہو جائے، اسی طرح چاروں جانب سے خدشات میں گھرے ہوئے ہر شخص کو بھی سو سو سی امید بہر حال ہوتی ہے کہ شاید کوئی معجزہ نمودار ہو جائے اور اس کی مجزی بن جائے!

ان لمحات میں، میں بھی شدید تذبذب کا شکار تھا۔ یہ ظاہر دکھائی تو یہی دیکھا، معتبر خاص رہی کا سایہ بن کر جگہ اس کے ساتھ جائے گا لیکن اس کے باوجود بھی یہ دھڑکاہٹ جگہ موجود تھا کہ کہیں شفاک ڈائریکٹر رہی موٹے ہاتھوں اچانک اپنے معتبر خاص کو "کٹ" نہ کر دے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ میری، رہی کے ماحول تک رسائی اسی معتبر خاص کی رہی منت تھی۔ اگر رہی اچانک اس دروازے کا قلم، سہری ہالوں والے سونیڈ ہونڈ کو چھوڑ کر کسی دروازے کے پیچھے اوجھل ہو جاتا تو میں بے بسی کے ہاتھوں اپنا منہ پینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن خیریت گزری اور میرے تمام تر اندیشے خدشات باطل ہو گئے۔ میں نے اگر اس شخص کا نام معتبر خاص رکھا تھا تو یہ نام اس کی شخصیت اور کردار پر بڑا سوزوں بیٹھا تھا۔ وہ رہی کے ساتھ کسی سائے کا ہی رول ادا کر رہا تھا۔ وہ رہی والی دیکل جیپز کو آہستگی چلاتے ہوئے مختلف راہداریوں سے گزرا اور بالآخر ایک منٹش چوٹی دروازے کے سامنے اس سڑک کا اختتام ہوا۔ معتبر خاص جب رہی کے ساتھ بیٹھ بیٹھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو میرے سینے سے ایک تسلی بخش اور اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ کمرے میں ان کے دخول کے بعد، وہ ہماری بھرمار دروازہ کی خود کار نظام کے تحت بند ہو گیا۔

وہ دروازہ سائے ساز کے میننگ روم سے مشابہ تھا لیکن اس میں پنجرہ روم کی جھلک بھی بہت نمایاں تھی۔ اس کمرے میں ایک تہیہ ہے چار کرسیاں میز بنی ہوئی تھیں۔ یہ مخصوص قسم کی میز تھیں۔ ان نشستوں سے آگے سامنے والی

ایک دیوار کے قریب چبوترہ نما چھوٹا سا انتیج بنا دیا تھا۔ اس چبوترے پر بھی ایک کرسی اور میز دکھائی دے رہے تھے۔ صاف نظر آتا تھا، وہ نمایاں سیٹ کسی بحریہ یا سٹیل کے لیے ہے۔

مذکورہ کمرے میں تین افراد پہلے سے موجود تھے جنہوں نے چار مخصوص نشستوں میں سے تینیں سنبھال رکھی تھیں۔ رہی اور معتبر خاص کو دیکھ کر وہ تینوں اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے انداز میں ایک خاص قسم کا احترام اور عقیدت پائی جاتی تھی اور یہ سب کچھ یقیناً رہی کے لیے تھا۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد سے لے کر اس مینٹنگ روم تک پہنچنے کے دوران میں رہی جہاں جہاں سے بھی گزرا تھا، میں نے لوگ کے چہرے اور انداز میں اس کے لیے بھی احترام اور عقیدت دیکھی تھی۔ وہ اس یونیورسٹی اور وہاں کے لوگوں کے لیے کسی حوالہ سے محترم تھا۔ یہودی قوم رہی موٹے ہاتھوں کو کتاب بلند مرتبہ تھی، یہ مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔

رہی دیکھ کر حیرت میں سے نکلا اور چبوترے کی بیڑھی چڑھ کر اس نمایاں کرسی پر جا بیٹھا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کے برعکس ہونے کے بعد معتبر خاص اس سیٹ پر آگیا جو چار کی ترتیب میں خانہ۔ اس دوران میں وہ تینوں افراد بیٹھے تھے۔ ان تینوں نے اپنے سامنے بھی میزوں پر لیپ ٹاپ رکھ رکھے تھے۔ معتبر خاص نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا پھر وہ سب سوالیہ نظروں سے رہی موٹے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگے۔ یوں پھر جس ہو رہا تھا، وہ رہی کے بولنے کا انتظار کرتے رہے ہوں!

میں معتبر خاص کے توسط سے اس باحول میں موجود رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد رہی نے بولنا شروع کیا۔ ان لحاظ میں مجھے اپنی محرومی کا کچھ زیادہ ہی شدت سے احساس ہوا۔ کاش، باقی آٹھ کی طرح میرا باقی کان بھی بند ہوا ہو چکا ہوتا تو میں ٹھوڑا آئی اور ٹھوڑا ایر کا پک وقت استعمال کر کے اس خفیہ مینٹنگ کا ایک ایک لفظ سن سکتا لیکن یہ ”کاش“ کاش کاش ہی رہا رہی موٹے ہاتھوں کو صرف بولتے ہوئے دیکھنے تک محدود رہا۔ اپنی محرومی کا کافی الحال میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور میں معتبر خاص کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس سمیت وہ تینوں افراد رہی کا لیکن کمرے کے ساتھ ساتھ اپنے لیپ ٹاپ پر بھی مصروف تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے پیچھے میں سے اہم

نکات کو اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کرتے جا رہے ہوں۔ مذکورہ تینوں افراد کے لیپ ٹاپ کا ڈیپلے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، البتہ، معتبر خاص کے لیپ ٹاپ تک مجھے تصوراتی رسائی حاصل تھی لہذا میں نے اس کے لیپ ٹاپ کے ڈیپلے پر نگاہ جمادی۔

یہودیوں کی محتضمانہ مکاری کو دیکھ کر میں ”اش! اش!“ کر اٹھا۔ معتبر خاص کے لیپ ٹاپ کے اسکرین پر ابھرنے والی تحریر خالص ہিবرو (عبرانی) زبان میں تھی اور وہ بھی انتہائی پے پیچیدہ۔ اس اہم نکاتی تحریر کا ایک لفظ مجھے میرے پہلے نہ پڑ سکا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں اس وقت ایک انتہائی سنسنی خیز مینٹنگ میں موجود تھا لیکن نہیں جانتا تھا، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ دل میں افسوس کرتے ہوئے میں وہاں موجود رہا اور کسی موقع کی تلاش میں رہا، اس یقین کے ساتھ کہ قدرت کسی کی محنت کو ضائع یا بے کار نہیں جانے دیتی!

چند روز بعد رہی کا لیکن جاری رہا۔ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے ان لوگوں کے ہاتھ منہ کی حرکات و سکنات سے اس سوالیاتی سیشن کا اندازہ قائم کیا۔ یہ سوال و جواب رہی اور ان تین افراد کے درمیان ہو رہے تھے جو پہلے سے اس مینٹنگ روم میں رہی کی آمد کے منتظر تھے۔ اس دوران میں معتبر خاص اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف رہا۔ رہی اور اس کمرے میں پہلے سے موجود تین افراد کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی لہذا میں معتبر خاص کے ساتھ چپک گیا اور اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

محنت اور ضرورت درنگ لاتے ہیں۔ انسان منہ بولا تو ارادی اور پختہ عزم کے ساتھ کی مہم میں جتا رہے تو بالآخر وہ اپنے مقصد کو حاصل کر کے ہی رہتا ہے۔ یہی گمن تجربہ خیر ثابت ہوتی ہے۔ میری خوشی کا سبب معتبر خاص کی وہ حرکات تھیں جو اس کے لیے ایک روٹین کا کام تھا مگر اس کی یہ روٹین میرے لیے پروٹین سے بھر پور ثابت ہوئی!

اس نے لیپ ٹاپ پر رہی کے لیکن کے جواب، نکات محفوظ کیے ان کے آخر میں کوئی نام بھی نہ لیا۔ لیکن لیکن کنورشن کے آپشن میں جا کر اپنے لیپ ٹاپ کو مختلف کمانڈز دینے لگا۔ میں کیپشور اور اس کے استعمال سے کوئی زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا، بس میں یہی سمجھ سکا کہ وہ سروائیول ڈکشنری کے پورٹن کو آزار رہا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ ان خفیہ اہم نکات کو ہیبرو سے دوسری زبانوں میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ

درست ثابت ہوا۔ معتبر خاص نے لیکن کنورشن کے عمل سے گزرتے ہوئے سوس لیکن کنورج کے کالم میں ہیبرو کو رکھا اور ٹارگٹ لیکن کنورج کے کالم میں جرمن، فرنیچ، اسپینش، اٹالین، پرتگیزی اور انگریز ٹائپ کر کے انٹرکال کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیبرو د HEBREW زبان میں تحریر وہ اہم نکات دنیا کی چھ اہم زبانوں میں منتقل ہو گئے۔

معتبر خاص باری باری ایک ایک چچ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسکرین پر کھلے ہوئے پیج پر غور کرتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ اس تحریر کی کاپیاں مختلف لوگوں کو میسل کرے گا جب وہ انگلش پیج پر پہنچا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ کوئی طویل وعریض تحریر نہیں تھی کہ مجھے اسے پڑھنے میں بہت زیادہ وقت لگتا۔ ٹھوڑا آئی کے توسط سے جو کچھ پڑھا وہ دماغ کی چولیس ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ایک سائے کے عالم میں، میں اس خطرناک اہم نکاتی تحریر کا ایک ایک لفظ اپنی یادداشت کے نشہ ترش خانے میں محفوظ کرتا چلا گیا۔ رہی موٹے ہاتھوں نے اس خفیہ مینٹنگ میں فرمایا تھا۔

اسرائیل کو اب تک بائیس فی صد مسلمان رہائشیں تسلیم کر چکی ہیں۔ یہ تعداد میں کل بارہ ملک بنتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہماری ایک بڑی کامیابی ہے لیکن ہمیں اسی پر خوش ہو کر نہیں بیٹھ جانا۔ مسلمان ممالک میں ہمارا سب سے بڑا ٹارگٹ پاکستان ہے۔ اگر ہم نے اسلام کے غلطے کو کھج کر لیا تو سمجھ لو، ہماری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے اب تک اس ملک کو بڑا دام لانے کے لیے کئی حربے آزمائے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، ہمارے ان آزمودہ کار حریوں کو وہاں کامیاب نہیں ہونے دیا گیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہاں کی عوام ہے۔ پاکستانی عوام یہ حیثیت مجموعی، اسرائیل اور یہودی قوم سے سخت نفرت کرتی ہے لیکن آپ لوگ فکر نہ کریں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ہم نے وہاں کی عوامی رائے اور لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے کے لیے ایک نہایت ہی زود اثر پلان تیار کیا ہے اور ہمیں یقین ہے، بہت جلد اس ملک میں ”اسرائیل پاکستان دوستی“ اور ”یہودی مسلم بھائی بھائی“ کے نعرے گونجنے لگیں گے۔ بس ہمیں اس موقع کی تلاش بلکہ انتظار سے، پھر ہم ان مسلوں کو بتائیں گے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی حاکم کو جڑ پکڑنے کے لیے کسی طرح اس کی گردن پھجری چلاتا ہے۔ فتح خیر سے ملے کر آج تک مسلمان ہمیں

مختلف حیلوں بہانوں سے نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ یہ سارا نقصان سود و سود ہمیں وصول کرتا ہے۔ کسی زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے ہمارے بارے میں یہ احکام آئے تھے، یہودیوں کو جزیرہ عرب سے نکال باہر کر دو۔ من قریب ہم مسلمانوں کو اس دنیا سے نکال باہر کریں گے۔ یہ ہمارا مشن ہے۔ ہم اپنے مشن کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ آج کی مینٹنگ کے اہم نکات کو نوٹ کر لو۔

ہمیں اسرائیل کی سرحدوں کو عراق سے مصر تک اور دوسری جانب شام سے مدینہ تک پہنچانا ہے۔ مسجد اقصیٰ کو گرا کر وہاں بیکل سلبانی تعمیر کیا جائے گا۔ بیت المقدس کی ہر اس عمارت کو سہار کر دیا جائے گا جو ہمارے نزدیک غیر متحرک ہو۔

فلطین ریڈ یو کو دارنگ دی جائے کہ وہ سورۃ البقرہ کی تلاوت نشتر نہ کرے اور نہ ہی وہاں سے کوئی ایسا اشتعال انگیز پروگرام پیش کیا جائے جو مسلمانوں کو بیت المقدس کی واپسی پر اکساتا ہو..... ایک مہینے کے بعد ہم پھر میں سے اور میں آپ لوگوں کو اپنے اس خفیہ منصوبے کی تفصیل بتاؤں گا جس پر عمل کر کے ہم مسلمانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں! مذموم عزائم پر مبنی اس خرافاتی لیکن خطرناک اپنی جگہ لیکن اس تحریر کو آخری لفظ تک پڑھنے کے لیے اختیار میرے دل سے نکلا۔ ”ایسا کیا نہیں ہو سکتا گا..... کبھی نہیں!“ اس اشتعال اور انتشار انگیز تحریر کے آخر میں لکھا تھا.....

بیکری رہی موٹے ہاتھوں ہر شل حنان! مجھے یہ اندازہ لگانے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگی کہ بیکری رہی موٹے ہاتھوں سے مراد وہی دراز قامت سونڈ بوٹڈ شخص تھا جسے میں نے رہی کے ”معتبر خاص“ کا ٹائٹل دے رکھا تھا۔ اب تو اس کا نام بھی سامنے آ گیا تھا۔ ہر شل حنان کے لیے معتبر خاص کا ٹائٹل کسی بھی لحاظ سے غیر موزوں یا مسم فٹ نہیں تھا۔

مینٹنگ کے اختتام پر وہ تینوں افراد ایک مرتبہ پھر رہی کے احترام میں باادب یا ملاحظہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں رہی کے سیٹ اپ میں نہایت ہی اہم افراد معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ، وہ ایک ماہ بعد، آئیڈہ مینٹنگ میں ان کے سامنے مسلمانوں کے خلاف کون سا منصوبہ کھولنا چاہتا تھا۔ اس خیال نے میرے ذہن میں کھلی سی چادی لیکن ظاہر ہے، میں فی الحال کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان یہودی اکابرین کی طرح مجھے بھی ایک مہینے تک انتظار کرنا تھا۔ ویسے اسی لمحے میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ



ایک ماہ بعد، میری یونیورسٹی آف یروشلم میں ہونے والی اس خفیہ میٹنگ میں، میں ضرور "شریک" ہوں گا۔ یہ بات پائین ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ربنی جہاں بھی جائے گا، ہرشل اس کی دم بن کر وہاں پہنچ جائے گا اور۔۔۔ یہی سنہری باتوں والا ہرشل مجھے ربنی کے قریب رکھ سکتا تھا۔ اگر ایک مرتبہ میں ربنی کے۔۔۔ خطرناک منصوبے سے آگاہ ہو جاتا تو پھر میں اپنا تین سو دھن داؤ پر لگا کر اسے بھی بھی اس کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیتا۔ ایسا سوچتے ہوئے میرے رگ دپے میں ایک دولہ انگلی سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے پورے محسوس ہوا، زنگ کی اصل مقصد اب کھل کر میرے سامنے آیا ہو۔ اپنے ملک کی سلامتی اور عالم اسلام کی بھلائی کے لیے میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ بھی قربان کر سکتا تھا۔ اس میری اور۔۔۔ حب الوطنی کی سوچ نے میری روح کو سرشار کر دیا۔

ربنی موٹے ہاتھن اپنے سیکرٹری ہرشل تھان کے ساتھ یونیورسٹی سے نکلتا تو مجھے کچھ بچتے والے تھے۔ یہ خفیہ میٹنگ انہوں نے طلبہ و ملاقاتی کی آمد سے قبل ہی مٹا ڈالی تھی۔ ہندوین کی ڈرائیونگ سیٹ پر سلوان قابض تھا۔ جب وہ لوگ ہانسیکل زور، دشمن ٹھیک، مسلم کوادڑ، سلطان پول، یروشلم ریلوے اسٹیشن اور اسرائیل میوزیم تک آئے تو مجھے اندازہ ہو گیا، انہوں نے وہاں کی راہ لی تھی۔ اس حساب سے وہ لوگ ساڑھے آٹھ، پونے نو بجے کل ایب میں ہوتے لیکن اگلے ہی لمحے انہوں نے میرے اندازے کی ایسی کم تپسی کر دی۔

اسرائیل میوزیم سے سلوان نے دین کو جنوب میں موڑ لیا۔ یہ ایک نیا روہ تھا۔ وہ لوگ شمال مغرب کی جانب بڑھنے کے بجائے غولی سمت گھوم گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا۔ ابھی میری تپری آنکھ کو ادھر بہت کچھ بھی دیکھنا تھا۔ وہ لوگ "بیت سافانا" اور "مشرافت کلیو" کے درمیان سے گزر کر نوب آف رائیل پہنچ گئے۔ پرانے شہر میں دیہن دال (دیوار گریہ) کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ دین بیت لحم میں داخل ہو گئی۔ "بیت لحم" یروشلم کا ایک اہم مقام ہے جہاں چرچ آف نیٹیو دینی کی بڑی قدر و قیمت ہے، چرچ آف دی نیٹیو دینی (Church Of The Nativity) کو جیزو (JESUS) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا برتھ پلیس مانا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ربنی یہ کن دھندوں میں مصروف ہے اور یہی جاننے کے لیے میں اس کے ماحول کے ساتھ چپکار ہا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے، ہندوین بیت لحم کو عقب میں

چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر جنوب مشرق کی سمت تیزی سے بڑھ گئی۔ وہ لوگ یروشلم گیا، اسرائیل کی جنوب مشرقی سرحد کی طرف جا رہے تھے۔ اگر، جانب تھوڑا آگے جا کر شیخ حسین بارڈر آ جاتا تھا۔ یہ بارڈر اردن اور اسرائیل کے درمیان ایک چوڑی سرحدی پٹی کے مانند موجود ہے۔ وہ جس جانب بڑھ رہے تھے اس رخ پر بحر مردار یعنی "ڈیڈی" واقع تھا۔ مردار سمندر (DEAD SEA) اردن اور اسرائیل کی سرحد پر اس طرح واقع ہے کہ اردن اور اردن میں اور اردن اسرائیل میں شام ہوتا ہے۔

بحر مردار میں نمکیات کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ اس میں ڈوبنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ڈیڈی میں کود کر خودکشی کرنا چاہے تو اسے اس مقصد میں ہرگز ہرگز کامیاب حاصل نہیں ہو سکتی۔ بحر مردار سمندر سے ایک ہزار، تین سو بارہ فٹ نیچے دنیا کا پست ترین مقام ہے۔ یہ کیسا حسین باغیچا! اتفاق تھا کہ میں اپنی تیسری بیٹی باغیچہ آنکھ سے بحر مردار کو دیکھنے جا رہا تھا جب کہ ظاہر دونوں آنکھوں سے چند روز قبل میں نے فیکٹری کو دیکھا تھا۔ کیلکٹی تبت میں واقع ہے اور سطح سمندر سے چند ہزار، سات سو اڑتالیس فٹ بلند ہے، فیکٹری کو دنیا کا بلند ترین مقام ہونے کا اعزاز حاصل ہے جہاں انسانی زندگی کا وجود پایا جاتا ہو۔ بتائیں، میری "تین آنکھیں" کیسی بلندی کیسی پستی کا کھیل کھیل رہی تھیں! ربنی کی ہندوین ڈیڈی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آئے ہوں گے۔

یہ تفریح کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا "ان سک اہیل سویم" کے بھی وہ شائق دکھائی نہیں دیتے تھے ورنہ محض تفریح کی غرض سے اس طرف رخ کرنے والے بحر مردار میں ان سک اہیل سویم (Unsinkable Swim) سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ربنی موٹے ہاتھن اور اس کے چیلے جانے اچھے بھی حساس اور رحمت دار نہیں تھے کہ ان کا غیر ملاطمت پر اثر آیا ہو، مسلمانوں کے خلاف ایک خوف ناک اور گہری سازش کے تانے بانے بننے کے بعد وہ زبردست احساسِ مذمت میں مبتلا ہو گئے ہوں اور یہ سوچا ہو، چلو بارادروں کے دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے خودکشی ہی کر لیں؟

بالفرض محال، اگر انہوں نے ایسا کوئی ارادہ پاندھ بھی لیا تھا تو بہر حال بحر مردار میں اتنی عزت ضرور موجود تھی کہ وہ ان کی ناپاک رجحان کو قبول کرنے کے لیے کسی بھی صورت تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بحرے جان تھا، بحرے میر نہیں!

میری ان تلخ و ترش مٹوچوں کے دوران ہی میں ہندوین

کے دروازے کھلے اور سلوان دہرشل دین سے باہر آ گئے۔ ان کا انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ربنی اور اس کی مکمل پیچھے کبھی باہر لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں سانس روک کر ان کے ماحول سے چپکار ہا کہ اب کچھ پیش آتا ہے، جب کچھ پیش آتا ہے۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں دین کے قطعی حصے کی جانب بڑھے، میری خرد آئی کے سامنے پھیلا ہوا منظر ایک جگہ کے سے زیرِ ذمہ ہو گیا۔ ایک تیز نسوانی چیخ نے سب کچھ دہم دہم کر دیا۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں نے خود کو ہولناک ٹاپ کے کونٹینٹر روم نمبر فائونٹ اینٹ میں اپنے بستر پر پایا، بے ساختہ میری نگاہ دوسرے بیڈ کی طرف اٹھی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس بیڈ پر صوفیہ گہری نیند سو رہی تھی مگر اب وہ بیڈ خالی نظر آ رہا تھا۔ میں نے نظر کھما کر کمرے میں جہاں تک ممکن تھا دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ میں صوفیہ کے حوالے سے گہری تئوٹیشن میں مبتلا ہو گیا۔

میں جس دل خراش نسوانی چیخ کے سبب تصوراتی ماحول سے حقیقی ماحول میں پلٹا تھا اس کا مزاج نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا، وہ اذیت ناک چیخ صوفیہ کے سو آگے اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ تو کیا صوفیہ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا؟

اس ہول ناک سوال نے مجھے آن دامن میں بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اٹھا اور اضطراری انداز میں بے ساختہ اسے پکارا "صوفیہ۔۔۔!" میری یہ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اسی لمحے میرا دھیان واپس روم کے بند دروازے کی طرف چلا گیا۔ دروازے کو بند دیکھ کر مجھے اپنی ہولکھاٹ پر غصہ آیا۔ میں افراتفری میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ دامن روم میں بھی تو ہو سکتی ہے!

میں ایک لمحے کو مطمئن ہوا مگر اگلے ہی لمحے اس سوچ نے مارے اطمینان کو کافور کر دیا کہ اگر صوفیہ دامن روم میں بھی تو بگڑہ بگڑا ہوا چیخ کیا مچا رکھتی تھی؟

"صوفیہ۔۔۔ صوفیہ۔۔۔!" میں دیوانہ وار اسے پکارتے ہوئے دامن روم کے دروازے کی سمت بڑھا۔

میں دامن روم کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا لیکن اندر سے کوئی جواب موصول ہوا اور نہ ہی کوئی دھمک دیکھنے یا سننے کو ملا۔ اس صورتِ حال نے میری تئوٹیشن کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ اگر صوفیہ دامن روم کے اندر موجود تھی اور

وہ رگی روگیاں گئے لئے

ایک ڈاکٹر نے ان کو گھر پر لے گیا

ان کے لئے جن کے سینے دھواں دیتے ہیں

آنسوؤں آہوں امنگوں اور حوصلوں کی داستان

عبرت اثر حیرت انگیز و ناقابل فراموش

بازارِ زلزلانِ خان کی آپ بیتی، جگ بیتی

اُس جوان رعنا سے زندگی کا رویہ مختلف تھا

دل فکاؤں کے لئے سب رنگ کا مقبول سلسلہ

بازاری گری

وہ تحریر جو دلوں کی دھڑکن ہے

قیمت فی حصہ - 60 روپے \* ڈاک خرچ فی حصہ - 23 روپے

7

عائیت حاصل کرنے کے لئے قلم بزدلیوں کی آواز بھی گونجنے لگے

7



کتابتِ بیکس

پوسٹ بیکس 23 کراچی 74200

فون: 021-5804300

kitabiat1970@yahoo.com

سول ڈسٹریکٹ، جلال آباد، اسلام آباد، فون: 021-7766751

بہ خیر و عافیت تھی تو پھر میری پکار اس کی سماعت تک کیوں نہیں پہنچ رہی تھی؟

جب میرا بیٹا منبر لبریز ہونے لگا تو میں نے داش روم کے دروازے کو دھڑ دھڑا کر کھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی پچانی انداز میں میرا انتشار بھی جاری رہا۔

”صوفیہ! تم ٹھیک تو ہو؟ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ میں سخت پریشان ہوں۔ بولو، تم داش روم کے اندر موجود ہو؟“

میرے اس رویتے کے جواب میں بھی جب داش روم کے اندر خاموشی طاری رہی تو میں نے دروازے کے پینڈل کو گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا، دروازے کو اندر سے کڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ اندر موجود ہے!

اس سنگین صورت حال نے میرے ذہن کو بڑی طرح الجھا کر رکھ دیا۔ اگر وہ داش روم میں تھی تو پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی؟ میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر اسے ایک مہرہ چہرہ پکارا۔

”صوفیہ! میری بات غور سے سنو۔ اگر تم نے چند سیکنڈ میں۔ مجھے، داش روم کے اندر اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلا یا تو میں اس دروازے کو توڑ کر اندر دھس آؤں گا۔“

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ داش روم کے اندر کچھ ہلچل ہوئی پھر ایک آواز ابھرے گی۔ وہ آواز صوفیہ کی نہیں بلکہ شادری کی آواز تھی۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور تدر سے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”خدا کا شکر ہے صوفیہ! تم خیریت سے تو ہو ورنہ میں تو تمہاری وجہ سے پریشان ہو.....!“

میرا جملہ ابھی مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ داش روم کے اندر سے پانی گرنے کی آواز آتا بند ہو گئی۔ شاید صوفیہ نے شاور بند کر دیا تھا۔ میں نے دروازے کے قریب منہ لے جا کر غصہ سے ہونے لہجے میں کہا۔

”صوفیہ! میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ اچھا ہوا، تم نے شاور کھول بند کر کے مجھے داش روم کے اندر اپنی موجودگی اور خیریت کا یقین دلادیا تھا۔ تم جب باہر آؤ گی تو میں پوچھوں گا کہ تم ایسے بھانک انداز میں کیوں نہیں آؤ گی؟“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر داش روم کے اندر ایک نفرتی قہقہہ بلند ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوئی کے اس کمرے میں جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔ میں اس شیریں آواز کی چمک اور کھنک کو لاکھوں، کروڑوں آوازوں کے درمیان

شناخت کر سکتا تھا۔ اس آواز کا ایک ایک ٹرادر اس ٹر میں بھرے رس کا میں ذائقہ شناس تھا۔ ایسی کیف آور اور لذت آفرین آواز میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی اور کی نہیں سنی تھی۔ وہ طلسمانی آواز مجھے اپنے سحر میں گرفتار کرنے لگی، میں اس محمور آواز کی جھنپی گداز پر توں میں خود کو لپٹا ہوا محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنے حواس کو حتی الامکان قابو میں رکھنے ہوئے اسے آواز دی۔

”اے پرہیزوں کی شہزادی! تم اس داش روم میں کیا کر رہی ہو؟“

میں نے محسوس کیا، جیسے میری آواز کسی اندھے کو نہیں میں سے ابھر رہی ہو۔ مجھے خود اپنی آواز ان جانی اور ناشناس کسی لگی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ محسوس نفرتی قہقہہ لگانے والی کو ہسار کی ملکہ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے داش روم کا دروازہ کھلا اور وہ میرے سامنے آ گئی۔

میری نگاہ نیلنگری کے سراپا پر جم کر رہ گئی۔ وہ..... ہاتھ گاؤں میں لپٹی ہوئی دکھائی دی لیکن وہ گاؤں اتنے ہمیں کپڑے سے بنا ہوا تھا کہ اس کے اندر نیلنگری کے جھللاتے بدن پر نگاہ ٹکانا مشکل نظر آتا تھا۔ اسے اپنے سامنے اس حالت میں کھڑے دیکھ کر میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ اس کا سلکونی حسن ایسے ہی رعب و اب والا تھا۔ میں نے بدقت تمام اس کے کندھ بدن سے نظر چرائی اور اس کے عقب میں، داش روم کے اندر مٹلاشی نگاہ دوڑانے لگا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے میری مٹلاشی نگاہ کا کام و نامور اداس لوٹ آئی۔ میں نے بے ساختہ سوالیہ انداز میں نیلنگری کے چہرے کی طرف دیکھا پھر پھر مٹلاشی آواز میں پوچھا۔

”صوفیہ کہاں ہے؟“

جواب میں نیلنگری کے یا تو قی لب داہوے، ان ادھ کھلے گلابوں پر مٹنی خیز مسکراہٹ ابھری اور وہ اپنے پچلتے پچلتے سراپا کے ساتھ میری جانب بڑھنے لگی۔ میں غیر ارادی طور پر پیپا ہونے لگا۔ ٹر اسرار توں کی مالک وہ خود مختار حسینہ اپنے جوہن کے تمام تر ذخیرے کے ساتھ پتا نہیں، مجھے کون سا آزمائش سے دوچار کرنے آئی تھی؟

ان سنگین لمحات میں، مجھے اپنی سانس بغاوت پر آمادہ نظر آئی!

یہ بڑی درخی صورت حال تھی!

میں نے ان نازک لمحات میں خود کو ایک دورا ہے پر کھڑے پایا۔ اس رنگین و سنگین دو شائے کی ہر ڈال حسن سے شروع ہو کر جوانی پر ختم ہو جاتی۔ ایک طرف نیلنگری کا پُرکار ہر جانب شباب حالات میں رنگین مہر ہاتھ تو دوسری جانب موزیک کا پُرکار اسرا ہے حباب غیاب معاملات کو سنگینی کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں صبح ستوں میں ایک تشویش ناک آزمائش سے دوچار تھا اور اس چوٹی میں اگر میں نے اپنی سانس کو بغاوت پر آمادہ محسوس کیا تھا تو یہ قطعاً غلط نہیں تھا۔

نیلنگری شاہ گل کے مانند بڑے دل کش انداز میں لپکتے ہوئے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے گداز مسکرائی ہوئے ہر ایک دل آویز، مٹنی خیز مسکراہٹ تھی تھی۔ اس سلکونی جسم نے اس کے ریشیلوں میں بڑی کیف آور زندگی بھر دی تھی۔ نیلنگری بے پناہ ہر اسرار توں کی مالک تھی..... اگر نہیں بھی ہوتی تو اسے کوئی فرقی پڑنے والا نہیں تھا۔ اس کا حسن جادو ایسی کس طلم کدے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے سراپا کا جادو بگائی تھی اور انگ انگ سحر چھوٹ کر سامنے والے کو پتھر میں بدل دیتی تھی۔

اس کی پیش قدمی کے جواب میں میں پیپا ہو رہا تھا لیکن یہ کوئی اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ایک فوری فیصلے کے تحت میں نے ہسار کی روک دی اور مضبوطی سے قدموں پر جم کر قدرے تخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

”صوفیہ کہاں ہے؟“

اس کی پیش قدمی کو بھی ہر ایک لگ گئے۔ وہ سوچتی ہوئی نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے تہور بڑے خطرناک تھے۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے میں سر دست سمجھنے سے قاصر تھا۔ ادھر یہی ”ناہنجی“ میرے روکتے کھڑے کر رہی تھی۔ اس کے گلاب داہوے تو ہلکے سا کمرامور کن خوش بو سے بھک اٹھا۔ وہ مکمل روکا فوجی طعراں کی مثال تھی۔

”میں نظر نہیں آ رہی ہوں جو تم صوفیہ کا پوچھ رہے ہو؟“

”تم اپنی جگہ ہوا!“ میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے بتاؤ، تم نے صوفیہ کے ساتھ کیا کیا ہے۔ وہ مجھے کہیں دکھائی کیوں نہیں دے رہی۔ میں نے اس کی دشت ناک چیخ سنی تھی؟“

جواب دینے کے بجائے وہ بڑے دل ربا انداز میں مسکرائی۔ وہ مسکرانے کی نیت کرتی تھی تو اس کے چہرے کا ایک ایک خط مسکرا اٹھتا تھا۔ بدن کے خطوط بھی اس بیدری

میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ مسکرانے کے بعد لب کشا ہو گی لیکن اس نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ اتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ وہ اسی دل خوش کن انداز میں پلتے ہوئے جیگر کے پاس پہنچی پھر اس جیگر پر بڑی شان سے راجہاں ہو گئی۔ اس شان سے بے نیازی اور بے احتیاطی جھلکتی تھی۔ اس نے بڑے واضح انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تھی۔ مجبوراً مجھے اسی کی طرف کھنکھوتا پڑا۔ میں سوالیہ نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ چند لمحات تک میری کیفیت کا جائزہ لیتی رہی پھر بڑی ملاحت سے بولی۔ ”وجدان! تم کھڑے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ اگر کھڑے کھڑے ہی بات کرنے کا سوڈو تہو میں بھی کھڑی ہو جاتی ہوں، نہیں تو تم بھی بیٹھ جاؤ۔“

اس کی بات مقبولیت سے بھر پور تھی لہذا میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان لمحات میں میری نگاہ نیلنگری کے دھن دھن ایمان سراپا پر پھری ہوئی تھی لیکن ذہن میں صوفیہ کی تشویش نے خیمے ڈال رکھے تھے۔ میں نے داش روم کے اندر ایک کرب ناک چیخ سنی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا، وہ دل خراش چیخ صوفیہ کے حلق سے خارج ہوئی ہو گی مگر جب نیلنگری داش روم سے برآمد ہوئی تو صوفیہ اندر نہیں مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے سو فیصد یقین تھا، صوفیہ کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آیا ہے اس میں نیلنگری کے سوا کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا!

میں نے اس غارت گر ہوش کی آنکھوں میں جھانکا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انتشار کیا۔ ”نیلنگری! تم سے اس وقت تک کوئی بات نہیں ہو سکتی جب تک تم صوفیہ کے حوالے سے مجھے اطمینان نہیں دلا دیتیں۔“

”میں تمہیں اطمینان، سنگین اور آسودگی فراہم کرنے کے لیے ہی تو یہاں پہنچی ہوں۔“ اس نے مخصوص نشست میں ناگوں کی پوزیشن کو اداں بدل کرتے ہوئے کہا۔ ”وجدان! اس وقت میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں تم سے ایک بہت ہی ضروری مینٹک کرنے آئی ہوں۔ تم صرف مجھے اینڈ کرو۔ صوفیہ کو تم فی الحال بھول جاؤ۔ اس پر بعد میں بھی بات ہو سکتی ہے۔“

”نہیں!“ مجھ پر بھی جیسے ضدی سوار ہو گئی تھی شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میں نے کہا۔ ”جب تک مجھے صوفیہ کی خبریت سے آگاہ نہیں کرو گی دنیا کے کسی موضوع پر تم سے بات نہیں ہو سکتی۔“

”وہ جان! میں تم سے ایک نہایت ہی اہم معاملہ سنسک کرنے آئی ہوں!“

”چاہے کچھ بھی ہو!“ میں ثابت قدمی سے اپنے موقف پر جم رہا۔

”اس معاملے کا تعلق تمہارے مستقبل سے ہے۔“ وہ گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”تمہاری منزل..... ساحل سے ہے!“ اس نے ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”ییلگری! میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ دنیا کی کوئی حالت اب مجھے ساحل کو حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔“

خود مجھے اپنی آواز پر ہلکی سی ہنسی محسوس ہوئی۔ ان لحاظ میں میرا عزم بلندی اور پختگی میں ڈاؤن اپورسٹ کو شربا رہا تھا۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”یہ بات بھی میں جانتی ہوں تم اس بار اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے چند اہم باتیں کرنے آئی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو!“

ییلگری نے آخری جملہ اتنی دل شکستگی سے ادا کیا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کسی حوالے سے بہت ہی آرزو اور متشکر تھی۔ پہلے وہ جب بھی پریشان ہوتی تو میں فوراً سے پیش تر اس کی خاطر سر دھڑکی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جاتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں ان لحاظ میں میرے اندر کوئی بھڑکی نہیں چمکائی، دل میں کوئی آرزو نہیں جاگی اور تن بدن میں کوئی مہمانی بگولہ نہیں اٹھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ان دنوں میں نے ساحل کے حصول کو اپنا اڈھنا چھوٹا بتا رکھا تھا، میں پل پل اسی کے بارے میں سوچتا تھا اور میں نے اس مشن کو کچھ اس انداز میں خود پر طاری کر رکھا تھا کہ اور کسی کام کے لیے کوئی اہنگ نہیں ابھرتی تھی..... ہاں یہی وجہ تھی۔ ییلگری مجھے کامیابی کی بشارت دے رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی آخری ملاقات کا خدشہ بھی ظاہر کر رہی تھی لیکن میں اس پر بھی چونکا اور نہ ہی مضطرب ہوا کیوں کہ مجھے اس سے بھی زیادہ پختہ یقین تھا کہ میری آنکھوں خواہشوں امیدوں اور چاہتوں کا سفینہ ساحل سے نکلنے ہی والا ہے۔ ییلگری آج مجھ سے پہلی مرتبہ ملنے آئی تھی یا آخری بار..... اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ساحل سے ملنے کے بعد مجھے اور کسی کی حاجت نہیں تھی!

”ییلگری!“ میں نے حریری لہجہ سے اس سے جھپٹتے اس

کے جسمانی خطوط سے نگاہ چکر کر برادر است اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ”تمہیں ہر صورت پہلے میری بات کا جواب دینا ہوگا، ضروری اور غیر ضروری باتیں اس کے بعد..... بس!“

میرا اہل انداز دیکھتے ہوئے وہ کسمائی۔ فرانسیز نڈ نڈل میں پلٹا سنا اس کا ان مول سنگ مرمر بدن جزبہ ہو کر رہ گیا۔ اس قیامت بدین کی ایک ایک جنبش سانس روک کر دیکھنے کا قہقہہ کرتی تھی مگر میں نے بڑی ”محنت“ سے اپنے حواس پر قابو رکھا اور اس حشر خیز نظارے کو نظر انداز کر کے میں بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”وہ جان! تم بہت ضدی ہو۔ تم نے اپنی اس ضد سے قدم قدم پر مجھے شکست دی ہے۔ تمہارا گریز ہر بار مجھے تمہاری طرف کھینچ لاتا ہے، حالانکہ کراچی میں آخری ملاقات کے دوران میں نے تمہیں ایک طرح کا چیلنج دیا تھا کہ اب میں بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی بلکہ تمہیں اپنے پاس ہمالیہ کی گود میں آنے پر مجبور کر دوں گی لیکن میں ہار گئی..... تمہاری ضدی سرشت کے آگے ہار گئی وہ جان!“ اس کی آواز بھرا گئی۔ لیکن شاید تمہیں یہ بات معلوم نہ ہو کہ عورت کی جیت ہار میں ہی چھپی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے میں تمہاری ضد سے ہار کر اپنی جیت میں جیت گئی ہوں۔“

پتا نہیں ییلگری مجھے محنت کا کون سا فلسفہ پڑھانے آئی تھی۔ میں نے باطن میں بار بار محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس حصول کے لیے اس نے مختلف حربے آزمائے تھے بلکہ ایک موقع پر تو وہ ساحل کی دشمن بھی بن گئی تھی لیکن میں نے بھی اسے حصول کی منزل تک نہیں پہنچنے دیا۔ ہمارے تعلق کا آغاز بڑے حیرت انگیز اور پراسرار انداز میں ہوا تھا۔ میں نے گوتم بھوش کے عمل سے اسے محفوظ کر کے اس پر اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ وہ عمر بھر میری کنیز بن کر رہنا چاہتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس چاہت کے انداز و اطوار اور زاویے بدلے رہے اور بالآخر خراب کردہ وہ مجھ سے مایوس..... بلکہ خفا ہو کر غائب ہو گئی تھی اس دعوے کے ساتھ کہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی۔ اس کی یہ دھوکا نہیں چس چس کوئی ایک حد تک پوری ہوئی تھی کہ میں جہاں نور دی کرتے ہوئے خیال تک پہنچ گیا تھا لیکن ییلگری کا یقین تو اس سے بھی آگے ہمالیہ کی گود میں تھا۔ ادھر کا رخ کرنے کے بجائے میری مسافرت کا زاد بے بدل گیا اور میں ملکوں ملکوں ہوتے ہوئے اب اسرائیل کے شہر تل ابیب میں تھا اور.....

ییلگری میرے پاس آ کر باطنی کے قصوں کو کھول بیٹھی تھی لیکن میرے پاس اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے کوئی وقت تھا اور نہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی لیکن ایک لمحے میں یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد میں نے صاف صاف الفاظ میں اس سے کہہ دیا۔

”ییلگری! میرا خیال ہے تم اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔ گزرے ہوئے لحاظ کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہاری بار آور جیت کی کہانی میں صرف ایک ہی شرط پر سن سکتا ہوں اور میری شرط وہی.....!“

”ٹھیک ہے میں تمہاری شرط پوری کئے دیتی ہوں۔“ قطع کلائی کرتے ہوئے وہ شکست خوردہ انداز میں بولی پھر ہوش رہا حرکات سے پہلو بدل کر کہنے لگی۔ ”وہ جان! میں تمہیں یقین دلاتی ہوں تمہاری سادگی صوفیہ بالکل خیریت سے ہے اور اگر ہمارے درمیان کوئی معاملہ طے نہ ہو سکا تو میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گی۔“

”اس کا مطلب ہے صوفیہ اس وقت تمہارے قبضے میں ہے؟“

اس نے اپنی لائمی ٹمپلیں جھپک کر اثبات میں جواب دیا۔ میں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس لی اور یقین کر لیا کہ صوفیہ اس کی پراسرار تحویل ہی میں ہوگی۔ میں نے ییلگری کی گفتگو کے درجنوں چکر دیکھ رکھے تھے۔ وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے صوفیہ کی طرف سے سکون محسوس کرتے ہی غصہ سے ہونے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

”اب بتاؤ ییلگری! تم مجھ سے کون سی اہم مینٹگ کرنے آئی ہو؟“

”تم پہلے ہی کچھ تم تصور نہیں تھے۔“ وہ ٹٹولنے والی نظر سے میرے جسم کا ایتھر سے ہوتے ہوئے بولی۔ ”تبت کے لامادوں نے تمہیں اور بھی پتھر کا بنا دیا ہے۔ میں موم ہوں..... اور اس موم کو تم جیسے پتھر کی ضرورت ہے۔ میں.....“

”تم موضوع سے ہٹ رہی ہو ییلگری!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر تنبیہی لہجے میں کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”نہیں وہ جان! میں تو اصل موضوع ہی کی طرف آ رہی ہوں۔ آج تمہیں انصاف کرنا ہوگا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیسا انصاف؟“

”محبت کے حصول کا انصاف!“ وہ غصے سے لہجے میں

بولی۔

”میں اب بھی نہیں سمجھ سکتی ییلگری!“

وہ یکدم گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا حسن و شہاب کا شاداب ذخیرہ میرے سامنے کرسی پر ڈھیر ہو لیکن اس ستارے کے بہا کی روح کہیں اور چلی گئی ہو۔ ییلگری کا شغاف بدن ہلے ہوئے ہلے لرز رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ لرز اسٹ شدہ قسم کی جذباتی کشش کا نتیجہ تھی۔ اس کے سر میں وجود میں کوئی طوفانی جنگ جاری تھی۔ یہ عین ممکن تھا اسے اپنے جسم کی انتہا پر تھر تھراہٹ کا احساس بھی نہ ہو۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے خود کو جس آزار میں مبتلا پایا تھا ایسی ہی کسی کیفیت سے وہ بھی دوچار تھی۔

”وہ جان!“ وہ تو بہ ممکن انداز میں ناگوں کی پوزیشن تبدیل کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی۔ ”جب تک ساحل کا حصول ممکن نظر نہیں آ رہا تھا میرے سوچنے کا ڈھب کچھ اور تھا۔ میں مطمئن تھی کہ تم میری پیش گوئی کے مطابق میرے ٹھکانے تک ضرور آؤ گے۔ تم پاکستان کے طرح امریکا پہنچنے امریکا سے زندہ آ کر لینڈ اور دہلی سے واپس امریکا آئے یہ سب میرے علم میں ہے۔ امریکا کی ریاستوں اور اسکا دانشمنان نیویارک اور نیوجرسی میں تم نے رہی ہوئے ہاں میں اس کی نیچے کے خلاف جو بھی کارنامے انجام دیے وہ مجھ سے جیسے ہوئے نہیں بھر جب تم نیوجرسی سے نیپال پہنچے تو میں نے تجھ کو ”میری پیش گوئی پوری ہونے والی تھی۔ میرا مسکن نیپال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی اطمینان نے مجھے خوش کر دیا اور شہنشاہ کے رتتا باریک میں ساحل کے حوالے سے میں نے تمہاری راہ نمائی بھی کی تھی لیکن.....“

میں اب تک پہنچ کر ییلگری نے بڑے دل شکستہ انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس مرتبہ میں نے اسے ٹوکا اور نہ ہی رد کا بلکہ خاموش سوالیہ نظر سے اس کی خواب ناک طلسمانی آنکھوں میں ایک ٹک دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوچا اچھا ہے وہ اپنے سن کو بکا کر لے۔ اس طرح اس کا غبار بھی نکل جاتا اور ممکن ہے مجھے بھی کام کی کوئی بات پتا چل جاتی۔ دے دے بھی ییلگری نے صوفیہ کی خیریت کا یقین دلا کر میری بے گئی دور کر دی تھی۔ نشاط افروز کھاتی تو تفت کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”لیکن..... میں پھر شکست کے سامنے بے بس ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بے پناہ پراسرار گفتگوں کی مالک ہوں اور ہمالیہ کا علاقہ میری مکمل داری میں آتا ہے مگر پھر ادھر میرے ہی جیسی دوسری گفتگوں پر ایک اور بھی شکی حکراں ہے جس

ہے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ اس پھر ہتھی کی پلاٹنگ کو سمجھنا کسی عام یا خاص شخص کے اختیار میں نہیں۔ پھر ہتھی نے اپنا ایک مربوط راہ بے داغ سسٹم رائج کر رکھا ہے۔ وہ خود کسی کے تجربے میں نہیں آتی مگر باقی سب کو اسے تجربات سے گزارتی رہتی ہے۔ میری اور مجھ جیسی دوسری ہتھیوں کی ایک حد ہے لیکن پھر ہتھی کے اختیارات لا محدود ہیں۔ وہ کسی وقت کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کوئی اس کے سامنے دم مار سکتا ہے اور نہ ہی سوال کر سکتا ہے۔ میں اسی پھر ہتھی کے سامنے ہے بس ہوگی ہوں وجدان!“

وہ لمبے بھر کو سانس لینے کے لیے رکی اور بڑی پوسٹ نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے کندھ بدن پر لپٹا ہوا تو لیا کسی بدحرام محافظ کا کردار ادا کر رہا تھا۔ ایسا بے پروا محافظ جسے اپنی روزی حال کرنے کا بھی احساس نہ ہو۔ جو منافقین سے گٹھ جوڑ کر اپنے آقا کا سواستیاناس کرے۔ وہ ٹرانسپیرنٹ مینٹن تو لیا بھی آوارہ نگاہ کو روکنے کے بجائے اس کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ یہ تو شکر ہے اس وقت کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اور میں نے اپنے حواس و نفس کو پوری طرح قابو میں کر رکھا تھا۔

ٹیلگری نے اپنے بیان شیریں کلام میں کئی مرتبہ لفظ ”پھر ہتھی“ کا استعمال کیا تھا۔ اگر حفاظت انداز میں اس لفظ کے مفہوم کو مناسب معنی دینے جاتے تو ٹیلگری کا اشارہ سیدھا سیدھا قادر مطلق کی طرف تھا۔ وہ اپنے اظہار اور انداز میں ہی سبکی خدا کی مطلقیت اور کاملیت کا اعتراف کر رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کا نجات کے تمام موجودات اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے ڈھنگ سے اسی خالق حقیقی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ کو وہ کسی بھی رنگ میں نظر آ سکتا ہے۔

”وجدان!“ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔ ”تم ٹھنڈو سے میری طرف آنے کے بجائے تبت کی جانب چلے گئے تو میرا تھا ٹھنڈا۔ مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ حالات میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ بالکل ویسا نہیں ہے جیسا میں سمجھ رہی تھی۔ پھر ہتھی نے کسی خاص مقصد کے تحت تمہیں جو کھا تک ٹیپل میں پہنچایا تھا اور وہ بھی..... چیف لاما چنگ نورن پوٹی کے ہاتھوں میں!“

”بلشبہ“ چنگ فورن پوٹی روحانیت اور مادراہیت کا بہت بڑا عالم ہے۔ اس نے جو کھا تک ٹیپل میں قیام کے دوران میں غیر محسوس انداز میں تم پر اکاام کیا ہے۔ اسی کی محبت اور کوشش کے طویل تم یہاں تک پہنچے ہو۔ میں محسوس کر رہی ہوں اس وقت بھی تم چیف لاما کے سامنے اور مگرانی

میں ہو۔ وہ تم پر گہری ”نظر“ رکھے ہوئے ہے لیکن وہ بھی کب تک رہے گا.....“

ٹیلگری نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے رن پوٹی کے حوالے سے جس انداز میں بات کی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے مستقبل قریب میں کچھ ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال پوچھتا وہ کہنے لگی۔

”تمہارے تبت میں قیام کے دوران ہی میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اپنی منزل کی تلاش میں اب تمہیں زیادہ بھٹکا نہیں پڑے گا۔ رن پوٹی کی ہدایت پر عمل کر کے تم اپنے مقصد کو حاصل کر لو گے۔ چیف لاما جو کھا تک ٹیپل کی آمد ہے۔ اس جیسا نادر الوجود شخص شاید ایک دہائی تک جو کھا تک ٹیپل جیسی عظیم المرتبت تربیت گاہ کو میسر نہیں آ سکے گا۔ ویسے بھی مادہ پرستی کے اس دور میں بدھ ازم کی ترقی اور ترویج کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ اس کے مستقبل کے بارے میں حتی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال.....“

وہ لمبے بھر کو رکی پھر اخاذ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بتا رہی تھی جب سے مجھے یہ یقین ہوا کہ تم اپنی محبت کو پانے والے ہو میں نے بھی اپنی محبت کے حصول کی پالیسی تبدیل کر دی ہے۔ اب مزید انتظار کرنا اپنے پاؤں پر کھانڈی مارنے کے مترادف ہوگا۔ میں یہ نقصان کبھی نہیں اٹھاؤں گی لہذا اصول کی بات ہے یہ کہ اگر تمہیں تمہاری محبت مل رہی ہے تو میں اپنے اس حق سے کیوں محروم رہوں۔ تم نے جتنی شدت سے معاملہ کو چاہا ہو سکتا ہے میں نے اپنے مطلوب کو اس سے بھی زیادہ چاہا ہو۔ میرے ساتھ نا انصافی اور زیادتی کیوں ہو؟ بس تمہیں یہی انصاف کرنا ہے..... محبت کے حصول کا انصاف!“

اس کی بات بڑی وضاحت سے میری سمجھ میں آ گئی لیکن پھر بھی سلی کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ”ٹیلگری! تم کس سے محبت کرتی ہو؟“

اس نے الفت بھری مگر شکی نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وجدان! کیا یہ بھی مجھے ہی بتانا ہوگا؟“

”ظاہر ہے“ محبت تم نے کی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس سوال کا جواب بھی جیسی کو دینا ہوگا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تم غلط نہیں کہہ رہے لیکن تمہارا یہ فرمایا ہوا ”صحیح“ بڑا ہی عفاک اور بے مروت ہے۔“ وہ اداس لہجے میں بولی۔

”میں“ اس“ کے سوا اور کسی کو بھی چاہتی تو فوراً حاصل کر سکتی تھی! میرے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ شخص خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص تصور کرتا لیکن میرا محبوب بڑا ہی تصور اور مرضی کا مالک ہے اس پر میرا بس نہیں چلا۔ وہ کبھی بھی میرے قابو میں نہیں رہا..... اسی لیے تو میں آج ایک انگریز سینٹ کرنے آئی ہوں!“

میں نے کھیر لہجے میں کہا۔ ”ٹیلگری! محبوب ہوا کے مانند ہوتا ہے۔ ہوا کو کبھی کوئی ٹھکی میں بند کر سکا ہے؟ نہیں! کبھی نہیں!“ میں لمبے بھر کو متوقف ہوا پھر کہا۔ ”محبوب کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس پر اختیار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ قابو میں آتا ہے اور..... جو قابو میں ہو جس تک رسائی اور جس پر دسترس حاصل ہو وہ وہ محبوب نہیں ہو سکتا!“ میں نے اتنا کہہ کر اس کی مدھ بھری آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ”تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا..... اس جواب کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دو تم مجھ سے کس نوعیت کا انگریز سینٹ کرنے کیوں آئی ہو۔ تمہارے کسی محبوب سے میرا کیا تعلق؟“

”میں انگریز سینٹ کرنے اس لیے تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم ہی وہ مذکورہ شخص ہو۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اب تو مل گئے نا تمہیں دونوں سوالوں کے جوابات؟“

میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ اس نے بڑے کلمے انداز میں میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔ اس حوالے سے کسی جرح بحث کی گنجائش اور ضرورت باقی نہیں رہی تھی لہذا میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو ٹیلگری؟“

”دہی جو تم معاملے سے چاہتے ہو!“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”باہل پن کی باتیں نہ کرو!“ میں نے صخباً ہٹ آمیز انداز میں کہا۔

”یہ اچھا انصاف ہے۔“ وہ طنز لہجے میں بولی۔ ”ایک کام تم کر دو وہ جائز اور مناسب ہے لیکن اگر دہی کام میں کروں تو تمہاری نظر میں یہ میرا باہل پن ہوگا۔ اگر کوئی معاملہ وجدان کو حاصل ہو سکتی ہے تو پھر وجدان کی ٹیلگری کو حاصل کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں تم دونوں کے سنگم میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال رہی ہوں! تم بھی ہمارے ملاپ کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ وہ ایک لمبے کے لیے رکی پھر دونوں الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”وجدان! میں ہر قیمت پر تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔ یہ حصول عارضی یا محدود بھی ہو سکتا ہے اور مستقل یا لا محدود بھی۔ اسی حصول کے سلسلے میں تم سے ایک معاہدہ کرنے آئی ہوں۔ میں تمہارے سامنے دو راہیں رکھ رہی ہوں۔ کسی ایک راہ کا انتخاب کرنے کے لیے تم آزاد ہو۔ اگر تم ایک راہ کا انتخاب کر دو گے تو دوسری راہ خود بخود بند ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر تم پہلی راہ کو مسترد کر دو گے تو دوسری راہ پر چلنے کے لیے میں تمہیں مجبور کر دوں گی اور تم جانتے ہو میں ایسا کر سکتی ہوں۔ ایک بات ذہن میں رکھنا کہ تمہارے سامنے کوئی تیسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔“

ٹیلگری نے کسی انگریز سینٹ کا تذکرہ اتنے سنسنی خیز اور دلچسپ انداز میں کیا کہ میرے اندر ایک محسوس سا جاگ اٹھا۔ ٹیلگری ملکہ کو ہسپار ایک پراسرار ہستی تھی۔ اس کا انگریز سینٹ بھی یقیناً اسی کی طرح اسرار اور رموز کے حریری پردوں میں لپٹا ہوگا۔ میں نے اس کی بات سننے کا فیصلہ کر لیا اور گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بتاؤ کہ تم کون سا منصوبہ لے کر میرے پاس آئی ہو؟“

وہ چند لمحات تک ٹٹوٹی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر نہایت ہی برتاؤ انداز میں گویا ہوئی۔ ”وجدان! آج مجھے سنی ہے۔ مجھے یقین ہے تم آٹھ مئی کی صبح تک تل ابیب میں ہو۔ اس کے بعد بروٹھم روانہ ہو جاؤ گے..... اپنی ساحل کے ساتھ!“ وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے لمبے بھر کو متوقف ہوئی پھر اپنے منصوبے کی تفصیل کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میں یہ چاہتی ہوں جب تک تم تل ابیب میں ہو میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ رہوں اور..... ہر لمحہ تمہیں حاصل کر لی ہوں لیکن یہ اصولاً اور عملاً ممکن اور مناسب نظر نہیں آتا کیونکہ اسی عرصے کے دوران میں تمہیں ساحل کو حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کرنا ہے۔ میں تمہاری مجبوری کو سمجھتی ہوں لہذا میں نے اپنی خواہش کو تھوڑا محدود کر دیا ہے یعنی اگر تم اس بات کے لیے تیار ہو جاؤ کہ آنے والی دورانی میں تم مکمل طور پر میرے ڈسپوزل پر ہو گے تو میں مصالحت کے لیے تیار ہوں لیکن ان راتوں کا ایک ایک لمحہ تمہیں خود سپردگی کی کیفیت میں گزارنا ہوگا۔ میں تمہیں اس قدر حاصل کرنا چاہتی ہوں کہ دل سے تمہاری تنہا رخصت ہو جائے۔ وجدان! تم میری محبت کی شدت کا تصور نہیں کر سکتے۔“

جذبات کی شدت اور احساسات کی حدت کے باعث

اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور سانسوں کے تلاطم سے ظاہر ہوتا تھا وہ صدیوں کا سفر بھاگ کر طے کرنے کے بعد میری قربت میں پہنچی ہے۔ اس کے خطرناک عزائم کو سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اگر زبان کو زحمت نہ بھی دیتی تو اس کا ایک ایک انگ اتنی تھانے کا امین اور پیامبر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں منزل پر پہنچ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سے گزر رہا ہوں۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "میں نیلگری کے کسی دام میں قدم نہ رکھوں۔ وہ میرے ارادوں کو آزمانے اور میری نیت کو جانچنے کے لیے اتنی حسین دلکش اور خوفناک پیشکش ہے کہ اگر تم اپنے اور خود کو اس نے اس دلفریب پیشکش کا چپٹا چمکاڑا بنا ہوا اشتہار بنا رکھا ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی ڈانواں ڈول نہیں ہونا چاہیے۔ اس تہنیتی سوچ کے متوازی ایک اور سوچ کی لہر میں بھی بہہ رہی تھیں "کوئی چپکے چپکے میرے ذہن کی ساعت میں یہ الفاظ بٹکار رہا تھا۔ "وہ جان! تم ناہید حسن کے خزانے اور لازوال جوین کے دینے سے منہ موڑ کر خود کو دنیا کا احق ترین ناشکرا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

میرا ذہن انہی متضاد سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ نیلگری نے دوبارہ پولٹنا شروع کیا۔ وہ اس دوران میں کافی حد تک اپنے جذبات پر قابو پا چکی تھی۔ منہ پر ہونے لگے میں اس نے کہا شروع کیا۔ اس کا ایک ایک لفظ فیصلہ کن اور اہل تھا جیسے یہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔

"وہ جان! اگر تم یہ دردا میں میرے نام کر دو حصول کی راہ میں کسی رکاوٹ کو نہ آنے دو اور کسی گنجا پھاٹ یا گرہ سے کام نہ لو تو میں سمجھوں گی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوگئی۔ میں وعدہ کرتی ہوں اس خواہش کی تکمیل کے بعد میں ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔"

"نہیں..... قطعاً نہیں!" میں یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں جانتی ہوں وہ جان! یہ تم نہیں بول رہے ہو بلکہ تمہارے اندر کوئی اور بول رہا ہے۔" اس کا انداز خواب ناک ہو گیا۔ "وہ جو تم سے ہزاروں میل دور دنیا کی چھت پر بیٹھا ہے اور تمہارا ہونے والا سر بھی ہے۔ وہی نہیں چاہتا کہ اس کی فرزندگی میں آنے والا..... خیر چھوڑو۔ میں تم سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔"

اتنا کہہ کر وہ متوقف ہوئی تو مجھے یہ سمجھنے میں ڈرا بھی

دشواری پیش نہ آئی کہ اس کا سیدھا سیدھا اشارہ چھپ لانا چنگ نورن پوشی کی جانب تھا۔ عین ممکن تھا وہ صد فیصد درست کہہ رہی ہو۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"وہ جان! میں نے جن دور راہوں کا تم سے تعویذی دیر پہلے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک یعنی پہلی راہ کھول کر میں نے تمہارے قدموں میں بچا دی کی لیکن تم نے بڑی قنطیبت سے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔ میں نے کہا تھا نا اگر تم پہلی راہ کو ستر در دو گے تو میں تمہیں دوسری راہ پر چلنے کے لیے مجبور کر دوں گی۔ میں تو پیار محبت سے یہ مسئلہ حل کرنے آئی تھی لیکن تمہیں زور زبردستی ہی اچھی لگتی ہے تو ٹھیک ہے اب کسی موقع پر مجھے کوئی الزام نہ دینا وہ جان!"

اس کے پہنچ کرنے والے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پتا نہیں وہ کسی خطرناک دھمکی دے رہی تھی۔ کرسی سے تو وہ اٹھ کر کھڑی ہی ہو چکی تھی۔ جب اس نے قدم اٹھایا تو ایک جھس میرے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ میری اضطرابی نگاہ اس کے تحلیل میں سراپا پر سے پھسل کر نشی آنکھوں تک جا پہنچی۔ میں نے سمجھا آواز میں اشتہار کیا۔

"نیلگری! تم اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر جا رہی ہو۔ دوسری راہ کے بارے میں تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ یہ تو سراسر نا انصافی ہے۔"

"انصاف طلب منصف! تمہارے تھانے پر مجھے شدید جرات ہو رہی ہے۔" وہ سچی بولی۔ "جہاں تک دوسری راہ کا تعلق ہے تو یہ میں نے کافی عرصہ پہلے تمہیں بتا دی تھی جب تم نے نئے نئے ساحل کے قریب آئے تھے۔ تمہاری یادداشت اتنی کمزور کہ ہے ہوئی وہ جان؟"

اس نے ایک لمحے کا توقف کر کے بڑی شوخ نگاہ سے مجھے دیکھا اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے اپنی مرضی سے پہلی راہ کو بند کر کے میری خواہش کی تکمیل کے لیے دوسری راہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ میں تمہارے حصول سے دستبردار نہیں ہو سکتی وہ جان!" اس کی آواز شدت جذبات سے بھر گئی۔ "آج کے بعد جو بھی عورت تمہاری تنہائی میں پہنچ کر حصول اور وصول کی حدود کو چھوئے گی اس کے اندر تم مجھے پاؤ گے..... مجھے نیلگری کو!"

میں ایک دم نہانے میں آ گیا۔ اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی کہ دماغ گھوم کر رہ جائے۔ اور واقعی اس وقت میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ وہ میری اٹھل پھل کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک شان بے نیازی سے میرے پاس سے

گزری اور سبک خرازی سے داش روم کی سمت قدم اٹھانے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا شلیل کا کوئی تھان مناسب جنبشوں کے ساتھ جھٹکتے چلتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہو۔ وہ متوازن اور دلکش چال کا عمدہ نمونہ پیش کر رہی تھی۔

میں نے منہ پوٹ لے لیا۔ "نیلگری! تم اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہاری کسی چال کا کامیاب ہونے دوں گا۔ تم ہمیشہ مجھے آج ہی کی طرح ثابت قدم پاؤ گی۔"

"تمہاری آج کی ثابت قدمی میں تو کسی اور کا ہاتھ ہے۔" وہ میری جانب رخ پھیرے بغیر بولی۔ "آئندہ کے لیے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان اپنے مقامات بدلتا رہتا ہے اور یہی "دقت" فیصلہ کرے گا کہ مستقبل میں کون کس کو خیر کرتا ہے۔ گڈ بائے!"

اس نے الوداع کہتے ہوئے بھی میری جانب دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے انداز میں ایک اعتماد اور یقین جھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا اس نے جو کہا ہے وہ کر گزرے گی۔ اس کی یہ دعویٰ انتہائی تشویش ناک، فکر انگیز اور رو گئے کھڑے کر دینے والا تھا لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں تو لیے میں لپٹا سنا ہوا وہ رشتی سراپا اسی ہوش رہا انداز میں داش روم میں داخل ہو گیا جیسے کچھ دیر پہلے وہاں سے نمودار ہوا تھا۔

ایسا شہابی طلوع وغروب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

☆.....☆

پانی گرنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے بے ساختہ داش روم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پانی گرنے کی آواز داش روم کے اندر سے ابھر رہی تھی۔ نیلگری نے داش روم میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جھانک کر داش روم کے اندر دیکھا تھا۔ داش روم صوفیہ کے وجود سے خالی نظر آیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا اس پانی گرنے کا تعلق نیلگری سے ہے۔

لیکن مجھے یقین تھا ایسا یہاں نہیں ہوگا۔ نیلگری اسرار کے ایک مجموعے کا نام تھا۔ وہ چلتی پھرتی حسن کی جادوگری تھی جوین کا طلسم کردہ تھا۔ مجھے یقین تھا اس مرتبہ جب داش روم کا دروازہ کھلے گا تو وہاں سے صوفیہ نمودار ہوگی..... اور پھر ایسا ہی ہوا۔

پانی گرنے کی آواز اچانک رک گئی۔ چند لمحات تک داش روم میں خاموشی چھائی رہی۔ یوں لگا جیسے اندر موجود

فحص لباس پہن رہا ہو۔ پھر اس خاموشی کا دورانیہ ختم ہو گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے اپنے یقین کو عملی صورت اختیار کرتے دیکھا۔ صوفیہ نے داش روم کا دروازہ کھولا اور بڑے نارمل انداز میں باہر نکل آئی۔

میں یک تک اس کی شکل دیکھتا چلا گیا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو وہ جان؟" صوفیہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کک..... کچھ نہیں!" میں نے جلدی سے کہا۔

"کچھ تو ہے۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ "پندرہ میں منٹ پہلے جب میں شاد لینے کے لیے داش روم میں گئی تو تم بے خبر سو رہے تھے اور اب....." اس نے جملہ ادھر اچھوڑا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متوحش لہجے میں بولی۔ "..... یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم آئن اسٹائن سے بھی بڑا کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے فکر مند ہو۔ کیا کوئی ڈراڈنا خواب دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں صوفیہ!" فرار کا راستہ نظر آتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ "تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ واقعی میں ایک دہشت ناک خواب ہی سے بیدار ہوا ہوں۔"

وہ میرے چہرے کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "جادو شاد نے کر اپنے ذہن کو فریض کر لو۔ مجھے یقین ہے رات کو سوتے وقت تم سلوان اور بینک سے متعلق کوئی خطرناک پلاننگ کرتے رہے ہو۔ تمہارا یہ دہشت ناک خواب اسکا پلاننگ کا عکس ہو سکتا ہے۔"

میں کسی بحث میں پڑنے کے بجائے داش روم میں گھس گیا۔

صوفیہ باہر رہ گئی لیکن اس کی ایک بات میرے ذہن سے چپک کر داش روم کے اندر چلی آئی۔ اس نے کہا تھا "پندرہ میں منٹ پہلے وہ مجھے سوتا ہوا چھوڑ کر شاد کی غرض سے داش روم میں داخل ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق نیلگری نے کم از کم آدھا گھنٹا بولنے کے اس کرے میں سستی خیر گفتگو میں مصروف رہ کر گزارا تھا۔ جب صوفیہ نے پندرہ میں منٹ کا ذکر کیا تو میں نے بے ساختہ دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ کلاک آٹھ میں کا دقت بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے صوفیہ نے ٹھیک آٹھ بجے بستر چھوڑ دیا ہوگا۔ آٹھ بجے ہی ربی موٹے ہاتھن اپنے بیکٹری ہرشل تھان کے ساتھ یونیورسٹی سے نکلا تھا۔ میں اس وقت چونکہ آنکھیں بند کر کے ماحول میں موجود تھا لہذا صوفیہ نے مجھے خبر نہ سنا ہوا تصور کر لیا پھر جب ربی اینڈ پینی ڈیڈی

(بحر مدار) کے قریب پہنچے تو لگ بھگ آٹھ بیس کا وقت تھا اور اسی وقت صوفیہ کی دل خراش بیچ نے مجھے تھوڑا آبی کا شکر گرانے پر مجبور کیا تھا۔ میں نے دونوں ظاہر آٹھ نکلیں کھول کر کمرے میں اسے بڑی تشویش سے تلاش کیا تھا اور ایک آدھ منٹ کے بعد صوفیہ کے بجائے نیلگہری بڑے طعرات کے ساتھ داش روم سے برآمد ہوئی تھی۔ اگر وہ بھیک آٹھ بیس پر بھی میری نگاہ میں آئی تھی تو پھر وہ آدھا گھٹنا کہاں چلا گیا جس میں اس نے مجھ سے ہوشیار آواز مٹی میٹنگ کی تھی کیونکہ اس کے جانے کے بعد جب صوفیہ شاور لے کر نکلتی تو دیوار گیر کلاک آٹھ بیس کا وقت بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا نیلگہری نے کائنات کے کونے میں سے آدھا گھٹنا وقت چرا کر مجھ سے ”ملاقات“ کی تھی۔

اس خیال نے میرے اندر ایک سنسناہٹ سی دوڑادی اور میں شاور لینے کے دوران میں مستقل اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور پھر سوچنا ہی چلا گیا۔

نیلگہری کا یہ ایک بہت ہی مختلف اور انوکھا انداز سامنے آیا تھا۔ میں اس پر جتنا بھی حیران ہوتا، کم تھا بلکہ میرا خیال ہے میں حیران سے زیادہ پریشان تھا۔ اس نے ایک عجیب و غریب دھمکی نما چیلنج کر کے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں اسی نیلگہری سے ملا ہوں جو کرشل کے ٹوٹے ہوئے جسم کی صورت میں پہلی مرتبہ مجھے رتنا پارک کھنڈوں میں ”دھکائی“ دی تھی۔ وہ تو ایک دوسری ہی نوعیت کی نیلگہری تھی۔ سبھی کبھی ہوتی ہے بس اور لاچار۔ میں نے اس کا بیچ نیپ کی مدد سے اس کرشل کے جسم کو بڑی محنت کے بعد جوڑ دیا تھا۔ اس کام کے لیے نیلگہری میری احسان مند تھی۔ جب ہم میں تھوڑی بے لنگنی پیدا ہوگئی تو اس نے مجھے اپنے مصائب اور مجبور یوں سے آگاہ کر دیا۔ گوتم بھوش نامی ایک یوگی مخصوص چاپ کر کے اس کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا اور نیلگہری اسی بات سے خوفزدہ تھی کیونکہ گوتم بھوش نفی سوچ رکھنے والا ایک بد عنوان یوگی تھا۔ نیلگہری اپنی آزادی سے محروم ہو کر گوتم بھوش کے ہاتھوں کھلونا بننے کو قطعاً تیار نہیں تھی۔ وہ بد باطن اور غصیت یوگی نیلگہری کی پراسرار ہلکتوں پر قابض ہو کر پتا نہیں کون کون سے فتنے کھڑے کرتا اسی لیے نیلگہری نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں گوتم بھوش کو اس خطرناک چاپ کی تکمیل سے روک دوں اور میں نے اپنی جان جو حکم میں ڈال کر یہ مشکل کام بھی کر ڈالا تھا۔ گوتم بھوش کے عبرت نام انجام کے بعد نیلگہری کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ میرے اسی کارنامے سے متاثر

ہو کر اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر میں اس کا بتایا ہوا ایک مخصوص چاپ مکمل کر لوں تو وہ میرے قبضے میں آجائے گی۔ اس کی آرزو تھی کینز بن کر ساری عمر میرے قدموں میں گزار دے۔

ایک مسلمان ہونے کے ناتے میں چاپ جیسی کسی خرافات میں نہیں پڑ سکتا تھا اور نہ ہی مجھے کینز یا غلابان پالنے کا کوئی شوق تھا۔ نیلگہری حسن و خوب صورتی کا مرقع تھی۔ اس پر اس کی پراسرار ہلکتیاں سونے پر سہاگا کا اثر رکھتی تھیں۔ میں اس سے اچھے اور اچانک نارودستوں والے مراسم تو رکھ سکتا تھا لیکن اس کی خواہش کو پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی ضد پر ڈٹی رہی۔ اس طرح ہمارے درمیان فاصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔ یہ ٹھیک ہے ساحل اور میری تنہائی میں آنے والی دیگر عورتوں کے حوالے سے وہ مجھے پہلے بھی اسی قسم کی دھمکی دے چکی تھی جیسے خطرناک عزائم کا اظہار اس نے آج کیا تھا۔ اس وقت میں نے نیلگہری کے اس دعوے کو ذرا زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب صورت حال خاصی سنگین نظر آرہی تھی۔ یہ بات وہ پہلے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بتا چکی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھے صرف اور صرف اپنی پراپرٹی بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ وہ کسی دوسری عورت کو میری قربت سے فیض یاب ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔

پھر جب وہ اس پیش گوئی کے بعد اچانک غائب ہوگئی کہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی تو میں بھی سمجھا کہ وہ مجھ سے واپس ہوگئی ہے چنانچہ آئندہ میری طرف کارخ نہیں کرے گی۔ ازاں بعد میں منسنی خیز حالات کی چکر پھریوں میں۔ اس طرح اب مجھ کی نیلگہری کے بارے میں سوچنے کا موعنہ نہ مل سکا۔ جب نیویارک میں اس نے خفیہ انٹری دینا شروع کی تو میں چونکا۔ اس کے بعد سے وہ گاہے بے گاہے اسی خفیہ اور پراسرار انداز میں میرے باحول میں آتی جاتی رہی اور اب..... وہ..... نفس نہیں ایک رنگین اور سنگین معاہدہ کرنے میرے پاس چلی آئی تھی۔

آج کی ملاقات میں اس نے بڑے واضح و شگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے میرے حصول کی تمنا میں وہ کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے برا خطرناک راستہ نکالا تھا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا وہ اپنی آرزو میں کامیابی حاصل کر پاتی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں نے اس کی ایک ایک اور اور انداز میں بغاوت کو جھٹکتے دیکھا تھا۔ میرے حصول کی شدت نے اس کی

سوچ کو نفی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس کے خیالات کو معقول اور صحت مند قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کرنے جاری تھی اپنی دانست میں اسے اپنا حق سمجھتی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ کسی دوسرے کا حق چھیننے کی منصوبہ سازی میں مصروف تھی۔

ان نامراد اور نا آسودہ لمحات میں شاید وہ اس فلسفے کی حامی بن گئی تھی کہ محبت اور جنگ میں سب جانتا ہوتا ہے۔ نیلگہری کی مثبت اور نفی سوچوں کے ساتھ الجھتے ہوئے میں نے ایک بھر پر شاور لیا اور ٹھیک نو بجے داش روم سے باہر نکل آیا۔ اس شاور نے ذہن کے غبار کو بڑی حد تک دھو کر میری سوچ کو فریش اور بدن کو تازہ کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا تیار ہو کر کمرے سے نکل آئے۔ اس ”تیار“ میں میرے چہرے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ میں اس وقت مصری با شہنشاہ یوسف الظاہری کی آئی ڈی استعمال کر رہا تھا لہذا چہرے کی کٹنی نیونی کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ میں خود بھی میک اپ کے حوالے سے وسیع معلومات رکھتا تھا اور صوفیہ بھی اس سلسلے میں ایک مثاق معاون کا کردار ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔

نیچے آنے کے لیے ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو صوفیہ نے پوچھا۔ ”ناشائے اسی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں کیا جائے یا باہر جانے کا ارادہ ہے؟“ ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو ٹھیک ٹھاک بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”باہر چلنا زیادہ مناسب ہے۔ ذرا آؤنگ بھی رہے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ”لیکن کسی قریبی ریسٹورنٹ کا رخ کرو۔ مجھے بھوک.....“

”زائن گیٹ ریسٹورنٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ٹھیک خیال ہے۔ زائن گیٹ کی کوئی اور آئیڈے کو ہم پہلے بھی چیک کر چکے ہیں اور یہ ریسٹورنٹ ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور بھی نہیں۔“

اتفاق رائے کے بعد ہم نے زائن گیٹ ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ زائن گیٹ (ZION GATE) بیئورا سٹریٹ پر واقع تھا۔ گزشتہ رات ہم نے اسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا تھا۔ وہاں کے کھانوں کو ہم نے خوش ذائقہ اور صاف تھراپایا تھا۔

ایک ”صحت مند“ اور صحت بخش ناشائے سرد کیا گیا تو صوفیہ نے چھری کاٹنے کا استعمال کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ”چپ چپ کیوں ہو؟“

”آں..... نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہوں.....!“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”اگر ایسی بات نہیں ہے یعنی تم چپ چپ نہیں ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم حلق کے بل چلا رہے ہو۔ اپنے شور سے تم نے یہ ریسٹورنٹ سر پر اٹھا رکھا ہے ہوں؟“

”نہیں..... اب ایسی کبھی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر کیسی بات ہے؟“ وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

میں سمجھ گیا، وہ خفیہ ہر رات کے موڈ میں ہے۔ اگر میں نے اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تو وہ بات میں سے بات نکال کر یونہی میرا ناٹھ بند کیے رکھے گی۔ ویسے اس کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ میں قدرے خاموش اور چپ چپ تو تھا اور میری یہ کیفیت نیلگہری سے ہونے والی ہوشربا اور تو بہ جمن ”ملاقات“ کے سبب تھی۔ میں لاشعوری طور پر شاید اسی کے اور اس کی دھمکی کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن ظاہر ہے، صوفیہ کو میں نیلگہری کا قصہ تو نہیں سنا سکتا تھا لہذا اکتانے ہوئے لکچ میں کہہ دیا۔

”ہوسکتا ہے تم نے ایسا محسوس کیا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید نیند پوری نہ ہونے کے سبب میں کچھ ڈل سا ہو گیا ہوں۔ بہر حال ناشتے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ ہاتھ روک کر براہ راست میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ تاہم آواز اتنی دھیمی تھی جو ہمارے سوا کسی اور کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کرتی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

”تم بھی لا جواب بھی ہوئے ہو؟“ اس نے استفسار کیا۔

”ہاں“ کیوں نہیں۔ حسن اور ہنر کے نہانے لا جواب ہونے میں مجھے برا معرہ آتا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

وہ بولی۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو میں حسین ہوں اور نہ ہی ہنرمند؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”تم بلاشبہ ایک حسین و جمیل اور ہنرمند لڑکی ہو۔“

”اگر تم یہ بات تسلیم کرتے ہو تو پھر میں بھی کہوں گی کہ تم



حسن اور ہنر کے سامنے بھی لا جواب نہیں ہوتے۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”بلکہ اپنی لا جوابی کو تم اپنی تو بہن سمجھتے ہو۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں الجھ کر رہ گیا۔ ”کیا تم نے مجھے لا جواب کرنے کی کوشش کی تھی؟“

”تو اور کیا کر رہی ہوں؟“ وہ شیشے ہوئے انداز میں بولی۔

میں نے بدستور انھیں زدہ انداز میں کہا۔ ”میں اب بھی نہیں سمجھا“ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

وہ چند لمحات تک ٹوٹتی ہوئی نگاہ سے میرے دل کا حال جاننے کی کوشش کرتی رہی پھر دوبارہ چھری کاٹنے کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے دھیسے لہجے میں بتانے لگی۔

”میں جب نہادھو کر دشاں روم سے نکلتی تھی تو تمہیں شدید انھن میں کھڑے دیکھا تھا۔ میں نے جب اس انھن کا سبب دریافت کیا تو تم نے بتایا کہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھے ہو۔ ابھی ناشتا کرتے ہوئے مجھے ایک شرارت سوچھی اور میں نے ایک منصوبے کے تحت تم سے پوچھ لیا۔ چپ چپ کیوں ہو؟“ وہ لمبے لمبے سانس لینے کے لیے رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا“ تم کہو گے کہ یہ اسی ڈراؤنے خواب کا اثر ہے لیکن تم نے میرے منصوبے کی ایسی تیسری کر رکھ دی۔ اگر تم میرے حسب توقع جواب دیتے تو میں اس ڈراؤنے خواب کی تفصیل پوچھتی۔ اس طرح مجھے تمہیں لا جواب کرنے کا موقع مل جاتا۔“

”صوفیہ! تم فسطوں میں بات کر کے خواہ مخواہ سسٹنس پیدا کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟“ میں نے بے زاری سے کہا۔ ”اس تفصیل سے میرے لا جواب ہونے کا کیا تعلق ہے؟“

وہ بڑے رسان سے بولی۔ ”مجھے یہ امید تھی کہ ڈراؤنے خواب کے ذیل میں تم کہتے ایک خوفناک صورت والے غیبیٹ جھبیلے کو دیکھ کر تم پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ تم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اسی لمحے میں تمہیں یاد دلائی کرتے مجھ سے وعدہ کیا تھا آئندہ بھی تمہاری زبان پر کسی جھبیلے کا نام آئے گا۔ نہ کرو کو ذرا اٹل کا اور نہ ہی ایلی ٹھہر کا۔ بتاؤ میری اس بات سے تم لا جواب ہوتے کہ نہیں؟“

تخت اٹھتے ہی وہ شخص جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ عورت کو سمجھ گیا ہے۔ صدیوں سے عورت ایک پہیلی ہے اور پتا نہیں کب تک یہ پہیلی ہی رہے گی۔ اس کو بوجھنے میں تو اتنی صرف

کرنے کے بجائے اس کی قدر کرنا چاہیے کیونکہ اگر یہ سمجھ میں آسکتی تو پھر پہیلی کیوں ہوتی۔ یہ پہیلی ہے تو پھر سمجھ میں کیونکر آسکتی ہے؟

میں ایک نیک صوفیہ کے چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کے حسن اور خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ رعنائی اور دلربائی بھی کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ وہ خود اپنا اندر تو کھینچ کر رکھتا تھا۔ وہ ایک دلکش اور دلچسپ پہیلی ہے جسے سمجھنا ممکن نہیں لہذا میں نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی حالانکہ اس نے مجھے لا جواب کرنے کے لیے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کوزیاں جمع کی تھیں اور اس مقصد کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ کار اختیار کیا تھا کہ میں جواب میں کم از کم سو اٹھارے سیدھے استفسارات پر مثل ایک طویل سوال نامہ اس کی خدمت میں پیش کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا صرف اتنا کہا۔

”صوفیہ! تم تو اتنی اسرار اور ڈنک ہو کہ اگر مجھے پکا سا اشارہ بھی کر دیتیں تو میں اسی لمحے لا جواب ہو جاتا۔ ایسے معمولی سے کام کے لیے تم نے خواہ مخواہ اتنی زیادہ ذہنی مشقت کی؟“

وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم اتنے سیدھے نظر تو نہیں آتے؟“

اس کے استفسار میں ایک خاص نوعیت کی سناٹاٹ جھلکی تھی، لہذا میں نے جواب میں اس کا جواب دے دیا تھا۔ ”جی ہاں! اگر تم میری خاطر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔“

”ضرور آ زماؤں گی۔“ وہ بدستور میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

صوفیہ کے اس جملے نے میرے رگ و پے میں ایک اضطراب سا بھر دیا۔ اس نے پچھلے ایسے انداز میں یہ جملہ ادا کیا تھا جیسے مجھے کوئی بہت بڑا چیلنج کر رہی ہو۔ میں صوفیہ کی بات پر غور کر رہی رہا تھا کہ سوچ کے کسی کھلے در سے بچنے سے نیلگہ کی وارڈ ہو گئی۔ اس کے تصور کے ساتھ ہی میں نے اپنے وجود میں ایک سرور کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی ابھرا کہ کہیں نیلگہ اس وقت صوفیہ کے اندر تو موجود نہیں؟

یہ خیال ایک خطرناک اور سنسنی خیز سوال تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے تشویش میں مبتلا ہوا۔ اس تشویش میں گہرا غور بھی شامل تھا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے احساسات پر قابو پا لیا۔ اگر نیلگہ صوفیہ کے اندر موجود بھی تھی تو مجھے کسی خدشے یا اندیشے میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میرے اور صوفیہ کے درمیان ایک میز حائل تھی اس کے علاوہ زائن گیسٹ ریسٹورنٹ میں اس وقت ہمارے علاوہ بھی آٹھ دس افراد موجود تھے۔ نیلگہ نے اپنی واردات کے لیے تنہائی اور قربت کا جو معیار قائم کر دیا تھا وہ یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا لہذا نیلگہ کی کا خطرہ اس وقت مجھ پر ”لاگو“ نہیں ہوتا تھا۔

اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا۔۔۔۔۔ آج کے بعد جو بھی عورت تمہاری تنہائی میں پہنچ کر حصول اور وصول کی حد دو کچھوئے گی اس کے اندر تم مجھے پاؤ گے۔۔۔۔۔ مجھے نیلگہ کی کوا!

اسی سوچ کے ساتھ میں گہری نگاہ سے صوفیہ کو گھورتا چلا گیا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا نیلگہ کے حوالے سے پیرائٹک بے بنیاد تھا۔ وہ یہاں آس پاس کہیں موجود نہیں تھی اس احساس سے مجھے خاصی تقویت محسوس ہوئی اور یہ بھی پتا چلا کہ نیلگہ کی خوفناک دھمکی کے نتیجے میں میرے اعصاب پر اچھا خاصا دباؤ ہے ورنہ صوفیہ کی معنی خیزی کے نتیجے میں میرا دھیان فوراً نیلگہ کی طرف نہ جاتا۔ اس اعصابی دباؤ سے چونکا کر حاصل کرنے کے لیے یوگا کی مشقیں بہت ضروری تھیں خصوصاً سانس کی مشق اور وہ بھی پرانایم۔۔۔۔۔ (PRANYAM) پچھلے کچھ دنوں سے چیف ایما کی ہدایت کے مطابق سانس روکنے کی پریکٹس کر رہا تھا لیکن اسرائیل میں داخل ہونے کے بعد میری ظاہری اور باطنی تیوں آنکھیں اس قدر مصروف رہی تھیں کہ میں خاطر خواہ سانس کی مشق نہیں کر پایا تھا۔

”تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟“ صوفیہ کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔

مجھ بولنا یعنی نیلگہ کی کا ذکر کرنا سوال و جواب کا ایک کشادہ در کھولنے کے مترادف ہوتا لہذا میں نے اسے گھما دیا۔ ”میں گھور نہیں رہا صوفیہ بلکہ ”غور“ کر رہا ہوں۔ اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ اگر تم اسی رفتار سے ناشتا کرتی رہیں تو پھر ریسٹورنٹ کا کل ادا کرنے کے لیے مجھے ورلڈ بینک سے قرضہ لینا پڑے گا۔ گتا ہے تم ریسٹورنٹ کا بکن صاف کیے بغیر یہاں سے نہیں اٹھو گی۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی اور صوفیہ کو اچھو ہو گیا۔ وہ بری طرح کھانے لگی۔ میں نے پانی کا گلاس پیش کر دیا۔ چند لمحات کے بعد اس کی کھانسی ختم ہو گئی۔ وہ بولنے کے قابل ہوئی تو بولی۔

”گدا دی ناظر!“

”اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے صوفیہ!“

”وہاں!“ وہ بیٹھی ناراضی سے بولی۔ ”تمہاری زبان بڑی کالی ہے۔“

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”میری نظر خراب اور زبان کالی ہے۔ نظر لگی تو تمہیں اچھو ہو گیا۔ اگر غلطی سے زبان لگ گئی تو کیا ہو گا؟“

اس نے مجھے ایسی چرمخی نگاہ سے دیکھا جیسے یہ زبان خاموشی کہہ رہی ہو ان تلوں میں تیل کہاں؟ اگلے ہی لمحے کندھے اچکا کر اس نے باؤ لیکن کون سے یہ جواب دیا۔۔۔۔۔ آئی ڈونٹ کیر۔ اٹ ڈونٹ میرا!

تھوڑی دیر بعد ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ وہ دن میں سے کھوم پھر کر محل ایبب دیکھنے کے لیے مختص کر دیا۔ ساحل کو رلی ہوئے بائیں کی کسٹری سے نکالنے کا منصوبہ میرے ذہن میں پک کر پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ تیاری کرنا تھی۔ میں نے صوفیہ کو سلاٹ اور بینک کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ بھائی گارڈن اپارٹمنٹس میں واقع اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی مجھے چند گھنٹوں کے لیے اپنے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ میں ساحل کو آزاد کروانے کے بعد سیدھا اس اپارٹمنٹ پر لے آتا۔ یہ رات آٹھ بجے سے لے کر صبح تین بجے کے درمیان کوئی سے بھی چند گھنٹے ہو سکتے تھے کیونکہ اس دوران میں وہ اپارٹمنٹ بالکل خالی رہتا تھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ پر ساحل کو میک اپ کی جدید ہنرمندی سے صوفیہ بنا دیا جاتا۔ پھر ہمارے راستے چدرا ہوتے۔ صوفیہ اپنے بڑے ہیرا لڈھاس کی ہدایت پر عمل کرتی اور میں ساحل کے ساتھ ہی روٹھم کا رخ کرتا۔۔۔۔۔ جو اس وقت صوفیہ کے روپ میں ہوتی۔

گزشتہ رات ہم نے بھائی گارڈن اپارٹمنٹ کا ایک دورہ کر دیا تھا اور وہاں کے بارے میں ہمیں اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اپنی انہی معلومات کو پڑھانے کی خاطر ہم ایک مرتبہ پھر شالوم اسٹریٹ پر واقع مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پہنچے۔ اس مرتبہ ہم ایک ساتھ نہیں تھے بلکہ ہم نے اپنی آمد میں پانچ منٹ کا وقفہ کر رکھا تھا تا کہ دونوں والی رہ پھسٹ رولین کو یہ پتا نہ چل سکے کہ ہم کسی خاص مشن پر کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اس طرف آتے ہوئے میں نے صوفیہ کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں۔

بھائی گارڈن اپارٹمنٹس بلڈنگ ایک جتنائی رہائشی منصوبہ تھا۔ دس منزلہ یہ عظیم الشان عمارت خاصے لمبے چوڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی جس میں پورے نوے

اپارٹمنٹس تھے۔ ہر منزل پر نو اپارٹمنٹس واقع تھے جن میں چھوٹے بڑے ہر ٹیکڑی کے اپارٹمنٹس شامل تھے۔ اس طرح دس منزلوں میں کل نوے اپارٹمنٹس تھے۔ منزل کی شناخت انگریزی حروف تہجی سے کی گئی تھی۔ یعنی پہلی منزل کے لیے اے (A) استعمال ہوتا تھا اور دوسری منزل کے لیے بی (B) اس ترتیب کے تحت سلوان اور بینک کا اپارٹمنٹ ستائیس۔ سی دراصل تیسری منزل کا آخری اپارٹمنٹ تھا۔ اٹھائیس نمبر سے چوتھی منزل یعنی ڈی (D) شروع ہو جاتی تھی۔ عمارت میں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آنے جانے کے لیے تیز رفتار چارٹلس جو بیس کھینے خدمت کے لیے تیار رہتی تھیں۔ حل ایب کو جدید مغربی طرز پر آباد کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے لہذا جہاں جو بھی خود کا نظام منسوب کیا گیا تھا وہ انتہائی نسل بخش حالت میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق دو چاروں نفیس بھی کبھی کسی رہائشی کو خراب نہیں لیں تھیں یا اگر وہ بھی کسی ”موسمی بیماری“ میں مبتلا ہو بھی جاتیں تو ”ڈاکٹر“ فوراً انہیں ”انٹینڈ“ کر کے ”بھلا چکا“ کر دیتا تھا۔

اس نے بڑے شیریں انداز میں میری صبح کی تو میں نے  
 کہا: ”تھنک یو! آئی مین اٹ۔ میں مرزا ڈیوڈ  
 ملنے آیا ہوں۔“

میں نے رسولین کو اس کے نام سے بھی پکارا تھا جس سے  
تاکانو ہوئی تھی۔ ویسے بھی جس مخالف سے اگر نرمی اور  
نارے بات کی جائے تو ادھا کام دیے ہی ہو جاتا ہے۔  
صوفیہ مجھ سے باجی منٹ پہلے بلڈنگ میں داخل ہوئی  
اے۔ ابھی اسی طریقہ کار پر عمل کر کے اوپر جانا تھا۔ وہ  
ریسپشن اور لا لابی میں مجھے نہیں نظر نہ آئی تو میں نے سمجھ  
ہری طرح وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔

اس وقت بہائی چارڈن اپارٹمنٹس کا دورہ کرنے کے لیے دو مقاصد تھے۔ نمبر ایک میں اس عمارت کو اپنی ظاہری دیواروں سے اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا، خصوصاً تیسری منزل ’سی‘ کو۔ ستائیسویں سی کو میں نے باطنی آنکھ کی مدد سے اچھی طرح اندر سے دیکھا اور دوسری نشین کر لیا تھا۔ باہر سے اس واقعہ کو جاننا باقی تھا۔ نمبر دو، روڈ سپیشل والی دیوار پر

”ہیلور و سلین! ڈی۔تھرٹی فور۔“

آویزاں لوڈ پر لکھے ناموں سے ہمیں مزید دو ناموں کا انتخاب کرنا تھا تاکہ آئندہ انہیں کام میں لایا جاسکے۔ ہم نے آئندہ چند رہ میں منٹ میں یہ دونوں کام بخیر و خوبی انجام دے لیے۔ میں نے ”ایٹی فور“ میں رہنے والی سیدہ اردوزیہ کو اپنے ذہن میں سرکل کیا اور صوفیہ نے ”فورٹی ٹائن۔ ایف“ کے رہائشی سیمول ڈکنز کو ایٹی یادداشت میں محفوظ کر لیا پھر ہم دس منٹ کا توقف رکھ کر بھائی گارڈن اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ رخصت کے وقت میں خود روڈ لین کو پرجوش ”ہائے ہائے“ کرتی نہیں بھولا تھا۔

ہم نیکے والے اعزاز میں شالوم اسٹریٹ سے نکل کر  
بزمِ اسٹریٹ پر آئے، پھر آگے بڑھتے ہوئے شیردن  
اسٹریٹ میں داخل ہو گئے۔ اس اسٹریٹ نے بالآخر ہمیں اس  
پوش رہائشی علاقے میں پہنچا دیا جہاں وہ بگاڑا واقع تھا جس پر  
مجھے دھاوا لایا تھا۔ اس وقت وہ پہرہ ہونے کو چلی تھی۔ دنیا  
کے دیگر پوش علاقوں کے مانند وہاں بھی خاموشی اور سناٹے کا  
راج تھا۔ وہاں کے کیمین ماحول سے بے خبر صرف اور صرف  
اپنے مکانوں سے واسطہ رکھتے تھے۔

تھیکہ دو بجے دوپہر ہم "رما مارا فیل اسٹرٹ" سے گزر رہے تھے۔ وہ سن لایب کی سیر و تفریح کے لیے مخصوص تھا اس لیے مقصد سے اور بلا مقصد ہم ادھر سے ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ رما مارا فیل اسٹرٹ میں ہمیں ایک ریسٹورنٹ پسند آگیا۔ ہم نے جیسی بس کے علاوہ اچھا خاصا پیڈل سفر

بھی کیا تھا۔ ناشا کیے اب گل بھگ چار کھنڈے مزار مئے تھے لہذا ہم دونوں بھوک غمخس کر رہے تھے۔ ہم شہباز مہر دن (SHEBA HEBRON) نامی اس ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

شام کے وقت ہم ”رمارائیٹون“ کی طرف نکل گئے۔  
 رمارائیٹون کا علاقہ زیادہ تر شاہجہاں آباد پر مشتمل ہے۔ یہیں  
 ایک بہت بڑی سپر مارکیٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس  
 سپر مارکیٹ کا نام ہیروڈ (HEROD) تھا۔ ”ہیروڈ“ کو  
 آپ کراچی کی امپیریس مارکیٹ یا بھمرا لہوری کی نوٹنٹس مارکیٹ  
 تصور کر لیں۔ ایک ہی جگہ پر روزمرہ ضروریات کی تمام اشیاء  
 دستیاب تھیں۔ میں نے ہیروڈ سے اپنے مطلب کی اچھی  
 خاصی خریداری کر ڈالی جس میں نارنجی ٹائیٹون کی مضبوط رسی  
 کا کرویچ اسپرے چند بجلی کے کم وزنی آلات، ایک  
 خوبصورت خنجر جس کا پھل دودھاری اور چھانچ لہا تھا۔  
 دستے کی لمبائی کم و بیش چار انچ تھی۔ خنجر اپنے خوشنما کوڑے  
 ساتھ تھا۔ ایک ٹولڈر بیگ جسے بوقت ضرورت بیٹھ بیگ بھی  
 بنایا جاسکتا تھا اور اس نوعیت کی مزید چند چھوٹی موٹی اشیاء۔ ان  
 تمام چیزوں کو بیگ میں بھرنے کے بعد ہم ایک کیسٹ کے  
 پاس پہنچ گئے۔

میں نے سن رکھا تھا مصر میں گلگ سناڑ چوہے پائے جاتے ہیں اور ان کا سناڑ کم دیش ملی کے بیچ کے برابر ہوتا ہے اور بعض تو نوجوان ملی کے برابر بھی جامت رکھتے ہیں۔ ان جیسے چوہوں کے خوف نے ماہی اپنے نوزائیدہ اور شیرخوار بچوں کو کھر میں اکیلا نہیں چھوڑتیں ورنہ بیچ کے ”فوا“ کا کم از کم شدید زخمی ہونے کا خطرہ ہر وقت موجود

رہتا ہے۔ اسرائیل اور اردن بھی چونکہ مصری جیسی ارضی اور جغرافیائی کیفیات کے حامل تھے اس لیے مجھے امید تھی کہ اس کی سیٹ کے پاس ان دیوتاؤں کی قیامت چوہوں کا کوئی شکاری علاج ضرور موجود ہوگا۔

شاؤل کیفر کے سلازمین نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اچھی دودن پہلے ہی ایک زبردست ”ماؤس کلر“ مارکیٹ میں آئی ہے۔ آپ اس کو ضرور ڈرائی کریں۔ یہ ایک بے باور بے ذائقہ سفید سفوف ہے۔ چوتھے نمائندہ ہری مرغ کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ آپ کے گھر میں جن مقامات پر چوہوں کی زیادہ آمدورفت ہو وہاں ان کی مرغوب غذا کو سفوف لگا کر رکھ دیں۔ بے باور بے ذائقہ ہونے کے سبب چوہے بڑی آسانی سے دام میں آجائیں گے۔ اس طرح آپ انہیں کامیابی سے شکار کر لیں گے۔ اس دوا کی ایک حیرت انگیز خاصیت بھی بتا دوں۔“ وہ لمبے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”عام دواؤں کو کھانے کے بعد چوہے گھر بھر میں دوڑتے پھرتے ہیں اور جہاں قصداً کسی موہاں یا لگوں اور دیوانوں کی طرح گر کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ کسی بھاری سامان کے پیچھے موت کو گھسنے لگیں تو ان کو وہاں سے نکالنا ایک مصیبت ہے۔ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ کہ ان کی ڈیٹھ باڈی سے بڑی ناگوار بدبو اٹھ کر پورے گھر میں پھیلنے لگتی ہے جبکہ ”زونا“ ماؤس کلر ایک مفرد انداز میں کام کرتا ہے۔ اس میں زہک اور نائزورجن کے ساتھ ایک مخصوص بازن کو شامل کیا گیا ہے۔ جیسے ہی یہ سفوف چوہے کے پیٹ میں جاتا ہے وہ وہیں پر چند سیکنڈ کے اندر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ڈیٹھ باڈی میں ایک خاص انداز کی ڈی کیویشن شروع ہو جاتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مردہ چوہے کا جسم راکھ کے ڈھیر میں بدل جاتا ہے۔ نہ کوئی ناگوار بدبو اور نہ ہی ڈیٹھ باڈی کی تلاش کا مجتھ۔ ہے نا جڑے کی بات؟“

کیسٹ کے سلازمین نے بات ختم کر کے سوالیہ نظریے میری جانب دیکھا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”واقعی زونا ماؤس کلر ایک حیرت انگیز اور ناقابل تخریب سفوف ہے۔“

”پھر کتنی ڈیٹھ آپ کو دے دوں؟“ سلازمین نے پوچھا۔

میں نے احتیاطاً استفسار کیا۔ ”ایک ڈیٹھ کی کیا قیمت ہے؟“

مجھے خدشہ تھا وہ شخص معلومات کی فراہمی کو بھی بل میں

کہیں شامل نہ کر دے لیکن خیریت گزری اور یہ ثابت ہو گیا تمام یہودی ایک ہی درجے کے پاپاز اور مکار نہیں ہوتے۔ وہ بھی ہاتھ کی انگلیوں کے مانند ہی ہوتے ہیں۔ سلازمین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”ایک ڈیٹھ تین نیوٹن شیکل کی ہے اور یہ کم از کم دس تندرست چوہوں کی موت کا بندوبست کر سکتی ہے۔“

میں نے چھ نیوٹن شیکل ادا کر کے زونا (ZONA) ماؤس کلر کی دو ڈیٹھ خرید لیں۔ یہ دو مجموعی طور پر بیس چوہوں کی ہلاکت کے لیے کافی تھی۔ میرا چوہوں کے شکار کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے وہ مہلک اور زود اثر دوا کسی اور ہی مقصد کے لیے حاصل کی تھی۔ شاؤل کیفر کیسٹ اینڈ ڈاکٹ سے کلر کریم کو سیرینفر کی طرف بڑھ گئے۔

کو سیرینفر ہیروڈ سپر مارکیٹ کے اندر ہی واقع ہے۔ آپ اسے حال جانوروں کے گوشت کا مرکز سمجھ لیں۔ ”کو سیرینفر“ میں چڑیا سے لے کر اونٹ تک ہر حال پرندے اور جانور کا گوشت دستیاب ہوتا ہے۔ میں نے ایک کلوگرام بینف پارسل کر دیا۔ یہ بینف انجیر بڑی کے دو بڑے پارچہ جات پر مشتمل تھا جن میں سے ہر پارچہ کم و بیش آدھے کلوگرام وزن کا تھا۔ قصاب نے دونوں پارچوں کو بڑی مہارت سے صاف کر کے دو الگ الگ سیلوئین بیگ میں پیک کر دیا پھر یہ فرانسیسی بیٹش ایک براؤن کاغذی پیٹھ گیری میں رکھ کر مجھے تھما دیے۔ ہم ”ہیروڈ“ سے باہر نکلے تو رات کے نو بج رہے تھے۔

اب واپسی کا مسئلہ درپیش تھا۔ ہوٹل ٹاپ میں قدم رکھنے سے پہلے ہمیں ڈنر سے بھی نمٹنا تھا کیونکہ پھر باہر نکلنے کا موڈ نہ ہوتا۔ ہوٹل ٹاپ کے ڈائننگ ہال اور ریسٹورنٹ میں اعلیٰ قسم کا کھانا دستیاب تھا لیکن ہم دانستہ باہر کھانے کو قوت دے رہے تھے تاکہ خود کو کھنڈرے اور بے پروا قسم کے فورسٹ ثابت کر سکیں جو کسی ہوٹل کو محض ایک سرمائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ڈنر کے لیے ہم نے ”دی ٹیٹ“ کا انتخاب کیا۔ یہ ریسٹورنٹ بیت نہام کے علاقے میں واقع ہے۔ دی ٹیٹ اسم باسکی ثابت ہوا۔ ہم نے وہاں شکر بھر ہو کر کھانا کھایا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔

ٹھیک گیارہ بجے رات ہم ”بیت نہام“ کے علاقے سے واپس بن یہودہ اسٹریٹ پہنچ گئے جہاں ہوٹل ٹاپ استادہ تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرانمبر ”فائیو زیرو اینٹ۔ نوٹن ٹینر“ میں ہمارا راضی قیام تھا۔

آج دن بھر ہم اردو میں سفر میں رہے تھے اور اچھا خاصا انگلش والا سفر بھی کیا تھا۔ مرگشت اور روڈ ماسٹری نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ میں نے ہوٹل کے کمرے کو اندر سے لاک کیا اور فریٹ اپ ہونے کے بعد ہم اپنے اپنے بیڈ پر پہنچ گئے۔

میں نے آنکھیں بند کر کے یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے سوئے جا رہا ہوں۔ یہ شخص اس لیے تھا کہ صوفیہ مجھے ”ڈسٹرب“ نہ کرے۔ میں سوئے سے پہلے مختلف محاذوں پر جھانکنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مکمل یکسوئی کی ضرورت تھی۔ پر اردن ظاہر آنکھیں استعمال ہوئی آئی تھیں۔ اب تیسری لپٹی باطنی آنکھ کے استعمال کا وقت تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنی جان چکر کا تصور کیا۔ نام آتے ہی اس کے خدوخال میری نگاہ میں حل جاتے تھے۔ اس کا حسین کھنڈا میری قمر ڈاکی کے سامنے چکا تو میں اس روشنی کی انگلی پکڑ کر اس کے ماحول میں اتر گیا۔

”ساحل“ حسب دستور ”بیزروم“ نامی سونے کے آرام دہ بنجرے میں موجود تھی۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ پر دراز تھی اور بند آنکھیں ظاہر کرتی تھیں وہ یا تو سو چکی ہے اور یا پھر سونے ہی والی ہے۔ بیزروم میں زبرد پادر بلب کی مخصوص نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چند لمحات تک ایک تک خوابیدہ حسن کا نظارہ کرتا رہا۔ ساحل کے سینے کا زبردست اس کی خیریت اور تندرستی کا پتا دیتا تھا۔ میں مطمئن ہو کر اس کے بیزروم سے ”نکل“ آیا۔

دوسرا اہم آدمی ریلی موٹے ہاتھن تھا۔ اس تک براہ راست میری رسائی ممکن نہیں تھی لہذا میں نے ہرشل تنان کے نقش و نگار کو اپنے تصور میں اجاگر کیا اور قمر ڈاکی کے توسط سے اس کے ماحول کا حصہ بن گیا۔

ہرشل بڑا پڑھا کو اور خدمت گزار پر چرچا ثابت ہو رہا تھا۔ میں جب بھی اس کے ماحول میں پہنچتا اسے یا تو ریلی کی ”مٹھی جالی“ میں مصروف پایا تھا اور یا پھر کسی کتاب کے مطالعے میں لڑن پایا تھا۔ پتا نہیں وہ کس امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک ضخیم کتاب کھولے اسے اچھوٹے سے کمرے میں ایڑی چیر کر بیٹھا تھا جہاں اس نے ریلی کو بلائے جانے والے دودھ کے اسکریننگ کی تھی۔ میں نے آج صبح ان تینوں کو اسرائیل اردن کی سرحد ”شیخ حسین پارڈ“ پر بحرمداد کے قریب چھوڑا تھا۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا تھا وہ ڈیٹھ کی کٹارے کو نہ سا ڈیٹھ کی ہم مہینے گئے تھے۔ ایک تیز اور دل فراس سوانی چیخ نے مجھے ڈیٹھ کی قرب سے اٹھا کر ہوٹل ٹاپ کے کمرے میں لا کھڑا کیا تھا۔

ہرشل کی اپنی مخصوص کمرے میں موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ ریلی موٹے ہاتھن بھی اس وقت اسی بیٹھے ہیں اپنے بیزروم میں ہوگا۔ ہرشل ریلی کا سیکرٹری تھا اور ڈم کے مانند ریلی کے ساتھ بندھ کر وہیں پہنچ جاتا تھا جہاں ریلی کو جانا مقصود ہوتا تھا۔ اور یہ میرے لیے تقویت کا باعث تھا۔ دیئے وہاں کے سیٹ اپ سے یہی لگتا تھا وہ بنگا ریلی کی آج بنگا تھا اور میری ساحل کو اس نے اپنے یہاں ”اکا موڈیٹ“ کر رکھا تھا۔

ہرشل کے انتہا کو دیکھ کر میرے ذہن میں تجسس جاگا کہ دیکھوں تو وہ اتنی دلچسپی سے کون سی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر کر مذکورہ ضخیم کتاب تک پہنچ گیا۔ شکر ہے وہ اس وقت کوئی انگلش تحریر پڑھ رہا تھا۔ میں نے چند سطریں مطالعہ کیں تو میرے پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ کوئی نہایت ہی مٹھا ڈالا ناول تھا۔ بس یہی کیفیت تھا کہ وہ با تصویر نہیں تھا تاہم اس کے ہاتھ پر ہونے نے بھی کوئی کسرتانی نہیں چھوڑی تھی۔ میں تھوڑی سی کوشش کے بعد اس ناول کے فائنل تک نگاہ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں پر موجود راز کا نام دیکھ کر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ جیکب کولنز کا ایک ہوشیار اور تحریرچی ناول تھا۔ میں ہرشل تنان کو اس کے شوق میں مشغول چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے بینک کی خبر لی۔ وہ بالائی منزل والے ددوں سیکورٹی گاڑڈ کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ میں ان کے ماحول سے نکل کر سلوان کے پاس پہنچا۔ وہ میرے قدموں تلے یعنی ہوٹل ٹاپ کے کچن میں اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ میں نے اس کے ماحول کو بھی خبر یاد کیا اور اپنے کمرے میں حاضر ہو گیا۔

اسی لمحے مجھے ہنگری کا خیال آ گیا۔ وہ ایک مرتبہ بھی میری قمر ڈاکی کے تجربے میں نہیں آ سکی تھی۔ میرے دل میں ایک اور کوشش کی خواہش ہوئی۔ وہ جس نوعیت کی دھمکی دے کر گئی تھی اس کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ گاہے بے گاہے اس کی خبر رکھی جائے لیکن انفس کہ میں اس کے ماحول کو چھونے میں ناکام رہا۔ اس سے مجھے قدرے مایوسی بھی ہوئی۔

انسان کی خواہش بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ اس جذبے کو کسی خانے میں فٹ کر کے اس کے لیے کوئی مسادات یا فارغی وضع نہیں کیا جاسکتا۔ آج صبح ہوٹل کے اسی کمرے میں ہنگری سراپا بنی میری کمر نوآزی کی منتظر تھی۔ حریری تو لیے میں سے اس کے بدن کی ایک ایک اٹھان بہ زبان

خاموشی مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن میں اس کے جسم سے نگاہ چرا کر طویل خشک مکالموں میں مصروف رہا اور اب..... محض اتنی ہی بات کے لیے مایوس ہو رہا تھا کہ میری تھڑ آئی کی بے قرار انگلی اس کے ماحول کو چھونے میں ناکام ہو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ گریز اور طلب کا کون سا احتجاج تھا۔ میں ان لحاظات میں ایک ایسے جڑے کے لیے الجھ رہا تھا جس کے کل کوئی نظر انداز کر چکا تھا۔

نیلگری کا خیال کسی بگولے کے مانند میرے ذہن میں پکراتا رہا اور اس جکراہٹ کے دوران میں مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سوچا کیا نیلگری کو دھوکا دیا جاسکتا ہے؟ وہ مجھے ایک سنگین دھمکی دے کر گئی تھی۔ یہ چیک کرنا چاہئے تھا وہ اپنے دعوے میں کس حد تک راجح ہے۔ اس کے عزائم وہی ہیں جن کا وہ اظہار کر کے تھی مگر یا پھر وہ اموشنل بلک میٹنگ کے ذریعے اپنے کام نکالنے اپنی بات منوانے میرے پاس آئی تھی۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں ہوٹل کے کمرانہر پانچ سو آٹھ میں بند تھے۔ یہ ایک طرح سے نیلگری کی "داردرا" کے لیے موزوں ترین سیٹھ تھی۔ اگر میں اپنے اور صوفیہ کے درمیان موجود فاصلے کو کسی طرح ختم کر دیتا تو اصولی طور پر نیلگری کو اپنا دھوکا پورا کرنے کے لیے صوفیہ کے اندر آ جانا چاہیے تھا۔ میں جو تجربہ کرنے جا رہا تھا وہ انتہائی خطرناک تھا لیکن اگر میں اپنی اداکاری میں ثابت قدم رہتا اور اسے ایک رول لے سمجھ کر لے کر تا تو نیلگری کے دعوے کی صداقت اور خطرناکی کو پرکھا جاسکتا تھا۔ دے دیے مجھے خود پر اتنا اعتماد تھا کہ نیلگری مجھے فریب نہیں کر سکتی گی۔ اگر اس نے واقعی مجھ کو رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکے گی اور پھر اسے منہ کی کھانا پڑے گی۔

اگر کسی شخص کے بدن کے کسی حصے میں کوئی گولی پیوست ہو جائے تو آریٹھن کے ذریعے اس گولی کو نکالنا ناگزیر ہو جاتا ہے ورنہ ہر پھیلنے کے بعد زندگی کو موت کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ میں نے نیلگری کا کاٹنا نکالنے کے لیے خود کو ایک چھوٹے سے سرجیکل ٹیم کے لیے تیار کر لیا۔

صوفیہ سونے کی کوشش میں بے کیف کر دیں بدل رہی تھی۔ سپین ناٹکی کے اندر اس کے اعصاب کی اضطرابی جنبشیں بے ڈھنگ کی طرح نمودار ہو رہی تھیں۔ میں بڑی محویت سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ وقفے وقفے سے اس کے بدن کا اضطراب

بے ڈھنگی پر ٹکٹوں کی صورت اختیار کرتا رہا لیکن جب اس سے کوئی اطمینان بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا تو وہ ریشمیں نیچے کو اپنے سینے میں دیوچ کر نیم اذغی ہو گئی۔ اس کی گرفت میں آیا ہوا تکیہ مجھے بڑی مشکل میں دکھائی دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب تب میں اس کی سانس رک جائے گی۔ وہ مقابلہ نگار سے دستبردار ہونے کے لیے سخت بے چین تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے آواز دی۔  
"صوفیہ.....!"

"اوں۔" اس نے اوندھے پڑے پڑے مخمور آواز میں ایک لفظی جواب دیا۔

میں نے پوچھا "تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟"  
"سوتے ہی کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

میں نے کہا "لیکن تمہیں اس کوشش میں کامیابی نہیں ہو رہی اور میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں۔"

"کیا وجہ ہے؟" اس نے اپنی پوزیشن میں کوئی تبدیلی لائے بغیر پوچھ لیا۔

"بزرگوں نے کہا ہے آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے گہری تنگی کی سے کہا۔ "تم سے ہی بھول مرز دھوری ہے۔ تمہیں نیند آنے کا سبب بھی یہی ہے۔"  
"دہات ڈوبو یا؟" اس نے بڑی ادا۔۔۔ سے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں اس کے چہرے کو پوری طرح دیکھ نہ سکا۔ سیاہ ناگوں نے صوفیہ کے دلکش خدوخال کو اپنی آغوش میں سیٹھ رکھا تھا۔ میں نے ایک لمحے تک گہری نگاہ سے اسے دیکھا اور کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا رات کو میں تمہیں اپنے فاصلے منسوئے سے آگاہ کروں گا لیکن تم میری سب سے بڑی دراز ہو گئیں۔ آج کا کام تو آج ہی مکمل ہونا چاہیے نا!"

"اوہ! میں تو واقعی اس بارے میں تم سے پوچھنا بھول گئی۔" وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی پھر قدرے ہوشیار آواز میں کہا "میں سن رہی ہوں۔ تاؤ تم نے کیا فاصلے کیا ہے؟"

میں سمجھ رہا تھا وہ بات ختم کرتے ہی اٹھ کر بیٹھ جائے گا اور پوری توجہ سے میری طرف دیکھنے لگے گی لیکن اس نے میری توقع پوری نہیں کی۔ وہ نیچے کو گرفت میں رکھے ہوئے بستر پر لیٹے لیٹے ہی میری بات سننا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "اتنی دور سے کیسے بتاؤں۔ میرے پاس

آ جاؤ۔"

اس نے یلکھت گردن اٹھا کر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں اور چہرے پر بے یقینی کو انجمن کے ساتھ محکم گھما پایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اعتبار نہ ہو میں اسے اپنے پاس بلاتا رہا ہوں۔ وہ میرے بلادے کو شاید اپنی ساعت کا دھوکا بھی مسمی۔

وہ چند لحاظات تک متعجب انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس مسکراہٹ میں دلکش آزمائش بھی شامل تھی۔ اس نے بڑی لگاوت سے کہا۔

"تم آ جاؤ نا۔"  
میں خاموشی سے اٹھا اور صوفیہ کے بستر پر پہنچ گیا۔ آئندہ ایک کھٹے تک ہم ایک دوسرے کو منسوبے کی بارکیاں سمجھاتے رہے۔

اس دوران میں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہ ہوا کہ نیلگری ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اس نے مجھے اپنے دباؤ میں لانے کے لیے وہ سنگین دھمکی دی کہ ورنہ اسے دعوے کے مطابق فرادیاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ نہیں پہنچتی تاہم اس کی آمد کا دھڑکاٹھی کھلوا رہا بن کر ہر لمحہ میرے حواس پر لگتا رہا۔ میں اس وقت دو کاڈوں پر مصروف تھا۔ یہ مصروفیت قدرے کم ہوئی تو میں نے ایک بے آواز جھلنے کے ساتھ نیلگری کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا "جل جھولی.....!"

پرچوں کی شہزادی نیلگری نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ میں بھی شاید یہی کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

سات مئی کی صبح بڑی شفاف اور نکھری نکھری سی تھی۔ ماحول میں ایک خاص قسم کی فرحت اور تروتازگی پھیلی محسوس ہوئی۔ فضا میں آسودگی ہی آسودگی پرچی میں نظر آتی تھی۔ ہم دونوں خود کو مطمئن اور فریض پارہے تھے۔ ذہن کا غبار دھل چکا تھا۔ اس کی جگہ ایک خمار نے لے لی تھی۔ جسم دھال پر ایک سرور بخش کیفیت طاری تھی۔

اس روز ناشتا ہم نے کمرے ہی میں منگوا کر کیا۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ دیے بھی اس ہوٹل میں وہ میرا آخری دن تھا۔ میں نے سات اور آٹھ مئی کی درمیانی رات یعنی آنے والی رات کو ساحل والے بیٹنگے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں مجھے کچھ ضروری تیاری بھی کرنا

تھی۔ میں پورے ہندوستان کے ساتھ ہی ہوٹل سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ رات کو مجھے واپس یہاں نہیں آنا تھا۔ جب میں ساحل کو حاصل کر لیتا تو پھر ہمارا رخ حل ایب سے یوٹلشم کی طرف ہو جاتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے تو صوفیہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنے منصوبے کا ایک حصہ تو مجھ سے چھپا ہی لیا؟"

"کون سا حصہ؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ "گوشت والا حصہ!"

"جو حصہ چھپ گیا ہے اسے اب ظاہر کر دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھا اور پیڈر فرنیچ کے پاس آ گیا۔ گزشتہ روز میں کوثر سینٹر سے ایک ٹوکرام بیف دوپارچوں کی صورت میں بیک کر دیا تھا۔ یہ گوشت فرنیچ میں رکھا تھا۔ صوفیہ نے اسی گوشت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے سیلوٹین بیک میں بیک گوشت کے دو پارچے نکال لیے پھر صوفیہ سے کہا۔ "آ جاؤ تمہیں گوشت والا حصہ دکھانا ہوں۔" وہ میرے قریب لپک آئی۔ میں نے تھڑ آئی کے توسط سے ساحل والے بیٹنگے میں رات کی تاریکی میں دو خطرناک بل ڈاکڑ کو "پہرے داری" کی تیاری کرتے دیکھا تھا۔ لیکن نے انہیں ڈاک بھڑاس سے باہر نکالنے کے بعد گوشت کے پارچہ جات سے تواضع کی تھی۔ بل ڈاکڑ کے اس کھلنے کے بڑے ذوق و شوق سے بیف کی وہ پارچہ جاتی ضایف اڑائی تھی جس کے بعد وہ دونوں مخصوص قسم کی پھلوں میں مصروف ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں ان کی پرائیویسی کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس ماحول کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

مجھے بھی آج رات ہی کسی وقت اس بیٹنگے میں داخل ہونا تھا اور اس امر کے امکانات کو نظر انداز کر دینا میرا سرمقامت ہوتی کہ کسی بھی مرحلے میں ان خطرناک چوکیدار کتوں سے "واسطہ" پرستک ہے۔ میں نے بیف کے دو کنگ سائز پارچے اور چوہے بار دوا بل ڈاکڑ کی اسی جوڑی کے لئے حاصل کیے تھے۔ لیکن تھاں میں سجا کر ان کے لیے جو گوشت لایا تھا وہ اس نے بالائی منزل والے کچن سے لیا تھا۔ میں نے خود اپنی باطنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ ادا میر باروچی نے وہ گوشت فرنیچ میں سے نکال کر بینک کے حوالے کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا بل ڈاکڑ کی اس جوڑی کو اپنے جسم میں حرارت اور توانائی بھرنے کے لیے خشک گوشت بہت مرغوب تھا۔

میں نے گوشت کے دونوں پارچوں کو سیلوٹین بیگز میں

سے باہر نکال لیا پھر خنجر کی مدد سے مخصوص قاصد رکھ کر ان پر گہرے ”کت“ لگائے۔ صوفیہ بڑی حیرت اور دلچسپی سے مجھے ”کام“ کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے گوشت کے برکٹوں سے پردہ گہرے کٹ لگائے پھر ”زوناؤس کلر“ کی ڈیبا کھول لیں۔ کیسٹ نے بتایا تھا ایک ڈیبا کا صوف کم از کم دس صحت مند چوہوں کی ہلاکت کے لیے انتہائی کافی ہے۔ دونوں ڈیبا والا صوف اگر گوشت کے ساتھ شامل ہو کر ان بل ڈاگز کے معدوں میں اتر جاتا تو ان پر بڑا ”شانی“ اثر ہو سکتا تھا۔ بالفرض محال وہ قسم بھی نہیں ہوتے تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ میری راہ میں کسی قسم کی مزاحمت..... کرنے کے قابل نہ رہتے۔ وہ اثنا فقیل ہو جاتے یا پھر کہیں کوئے میں پڑے خاموشی اور شرافت کے ساتھ اپنی اس کیفیت پر غور فرما رہے ہوتے۔ ان کے طلق سے کوئی آواز برآ جہنہ ہوتی..... اور میں بس چاہتا بھی اتنا ہی تھا۔

میں نے ایک ڈیبا کے سفید صوف کو ایک پارچے کے ”زغموں“ میں اچھی طرح بھر دیا۔ یہی عمل دوسرے پارچے کے ساتھ بھی دہرایا۔ اس کے بعد میں نے بیگ میں سے سوئی دھا کا برآمد کر لیا۔ دیگر ضروری اشیاء کے ساتھ ہی میں نے یہ سوئی دھا کا بھی بھر دیا سپر مارکیٹ سے خریدی تھا۔ خاص طور پر دھاگے کے سلسلے میں ”سرخ رنگ کا استعمال کیا تھا۔ اگرچہ وہ گوشت رات کی تاریکی میں بل ڈاگز کے معدوں میں اترتا لیکن میں کسی معمولی سے معمولی معاملے میں بھی بے احتیاطی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے بڑی مہارت سے سوئی دھاگے کا استعمال کرتے ہوئے پارچہ جات کے زغموں کو سی دیا۔ وہ صوف اگرچہ بے بو اور بے ذائقہ تھا لیکن کتے کو سونگھنے کی مخصوص حس کو تیز نظر دیکھتے ہوئے میں نے یہ احتیاط برتی تھی۔ اب ان پارچہ جات کو اوپر سے دیکھنے سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی کڑی گری کی گئی ہوگی۔ ہم رنگ گوشت اور دھاگے نے میری ”رفوگری“ کے جملہ میوب پر دبیز پردہ ڈال دیا تھا۔

صوفیہ کو میں نے دیگر تفصیلات کے ساتھ ہی بٹنگے میں پھرا دینے والے محافظ توتوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ گوشت کے ساتھ اگلی میں نے جو کارروائی کی تھی اس کو دیکھنے کے بعد وہ جو شیشے لکچے میں بولی۔

”ایک سیلنٹ! اب تمہارے منصوبے کا چھپا ہوا گوشت والا حصہ سامنے آ گیا ہے۔“

”اس حصے کو بھی گرود کیے لو۔“ میں نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ لیکن ہے آج رات کو یہ بل ڈاگز کے معدوں میں جا چھے۔“ وہ مجھے غور کر دیکھنے لگی۔

میں نے ان ”تیار شدہ“ پارچہ جات کو دو بار لباس پہنا دیے۔ وہ سیلوین بیکز کے اندر بٹنگے کے توتوں نے ایک مرتبہ پھر فرخ میں رکھ دیا۔ اب انہیں اسی وقت باہر آنا تھا جب ہم اپنے مشن پر روانہ ہونے کے لیے ہوں گے۔ اس روز بچ کے لیے ہم کہیں نہیں گئے بلکہ ہوٹل ٹاپ کے ڈانک ہال کو عزت بخشی اور واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ صوفیہ نے مجھ سے استفسار کیا۔

”کتے بچے تک نکلنے کا ارادہ ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم کمرہ چھوڑ دیں گے۔“

”کیا چیک آؤٹ ہونے کا ارادہ ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھ سے دیکھا۔

”ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم شام میں نکلیں تو دوبارہ اس ہوٹل میں قدم رکھنے کی نوبت نہ آئے۔“ میں نے صوف میں ڈوبے ہوئے لکچے میں کہا۔ ”لیکن ہوٹل والوں کو ہم اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں بتاؤں گے۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔“

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آئیڈیا؟“

”ہم ہوٹل سے نکلنے وقت اپنا ضروری سامان ساتھ لے لیں گے۔“ میں نے بتایا۔ ”میں اس ہوٹل کے ڈوٹے داروں کو بتاؤں گا کہ ہمیں حل ایبیل میں ایک درینہ شناسا مل گیا ہے۔ آج رات اس نے ہماری دعوت کی ہے۔ اگر اس دعوت سے جلدی فارغ ہو گئے تو جلد واپس ہوئے آ جائیں گے اور اگر وہ دعوت ایک حسین رت جگا ثابت ہوئی تو ہم صبح کے وقت وہیں پر سو جائیں گے۔ اس صورت میں ہمیں اس ہوٹل سے چیک آؤٹ ہی سمجھا جائے۔ انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ میں نے کل شام تک کا کرایہ ادا کیا ہوا ہے۔ یہ کم از کم ہم نے تین راتوں کے لیے یک کر کیا تھا جن میں سے دو گزر گئیں اور آنے والی رات باقی ہے۔ اصولی طور پر ہمیں کل رات سے پہلے چیک آؤٹ ہونا ہے لہذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم آنے والی رات کہاں گزارتے ہیں۔ وقت مقررہ تک یہ کم از کم ہمارے نام ہی رہے گا۔“

”یہ آئیڈیا بہت ہی مناسب ہے۔“ صوفیہ نے سر اٹھنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”آنے والی رات کو لیکن ہے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ لگانے کا موقع نہ ملے اس لیے تم باہر تھوڑی دیر نہ لو۔“

”تم نہیں لو گے؟“ وہ ایک حشر انگیز انگڑائی لیتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

”کیوں نہیں لوں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”رات کو نیند پوری نہیں ہو سکتی۔ میں بھی کم از کم ایک دو گھنٹے ضرور سوؤں گا۔“ بات ختم کرتے ہی میں نے بڑی سہل مندی سے ایک طویل مصنوعی جھالی لی۔

ہم دونوں اپنے اپنے بندے آ گئے۔

اس وقت مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ ڈھونڈ دو جوہ کی بنا پر چاہا تھا۔ نبر ایک میں آنکھیں بند کر کے ”تھوڑی“ تھوڑی ”کھلینا چاہتا تھا۔ نبر دو میں چاہتا تھا مجھے سوتا دیکھ کر صوفیہ تھوڑی بہت نیند ضرور لے لے۔ آنے والی رات میں چھپ چھپ ہو سکتا ہے۔ صوفیہ اس مشن میں ہرے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ چنانچہ میرا یہ ساتھ اسے کہاں کہاں لیے پھرتا۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی آرام کا موقع ملتا نہیں۔ اگر ابھی وہ تھوڑا سوجھی تو زیادہ ایسے انداز میں حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکتی تھی۔

میں نے بیڈ پر لیٹنے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ ظاہرہ آنکھوں کے شر بند ہونے تو باطنی آنکھ کا درد ابھو گیا۔ میں نے تھوڑی آنکھ کوڑھت دی اور سب سے پہلے اپنی جان تنہا کے ماحول میں بٹنگے کیا۔ اب میری اس تصوراتی کارروائی کے دائرے میں وہی لوگ رہ گئے تھے جو اس بٹنگے میں موجود تھے ان میں سب سے اہم ساحل تھی۔

ساحل اپنے مخصوص پیرائے میں تھیں۔ وہ بچے سے فارغ ہو چکی تھی اور بہتر پریم دراز ہو کر لی دی دیکھ رہی تھی۔ لی دی پر اس وقت کوئی ٹاک شو آ رہا تھا۔ ساحل کی تحویت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا وہ خاصا دلچسپ ہو گا۔ میرے دل میں اس خواہش نے انگڑائی لی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اپنی آنکھوں کو ساحل کی آنکھوں کے سامنے لہراؤں اور پوچھوں..... کہاں کھولی ہوئی ہو؟

لیکن انہوں نے تصوراتی آنکھ کی انگلیاں ہوتی ہیں نہ ہاتھ اور نہ ہی میں اپنی آواز کو ساحل کے ماحول تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے اپنی اس محرومی کا ثبوت سے احساس ہوا اور میں نے اسی وقت تہہ کر لیا کہ اس سلسلے میں چیف لاما چنگ فورن پوٹی سے ضرورت بات کروں گا۔ اگر میں تھوڑی آنکھ کو استعمال کر رہا تھا تو تھوڑا سا استعمال

کرنے کی ممانعت کیوں تھی؟

میں تھوڑی دیر تک ایک جذب کے عالم میں ساحل کو۔ لی دی دیکھتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس کے ماحول میں ایک طویل اور پرمز تصوراتی سرکشی کرتے ہوئے وہاں سے لوٹ آیا۔ ”ساحل! تم نے اپنی قید کی آخری رات بھی گزار لی۔“

آج تھوڑی دیر رہی کا دن ہے۔ تمہیں جن ناکردہ جرائم کی سزا دی گئی تھی اس کا ذمے دار سر اس میں ہوں۔ رہی نے میری دشمنی میں تمہیں اسے کھٹے میں جکڑ رکھا ہے۔ ہندی خانہ چاہے سونے چاندی سے کیوں نہ بنا ہوا ہو اور اسے آرام دہ بنانے کے لیے چاہے اس میں دنیا بھر کا ریشم کیوں نہ بچھا دیا جائے..... وہ قید خانہ ہی رہتا ہے۔ آزاد دنیا میں لی گئی ایک سانس ایسے تعیشی کرے میں گزارے گئے سو سال پر بھاری ہوتی ہے۔ میں آ رہا ہوں ساحل! تم میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی ہو۔ میں ہی تمہیں اس عذاب سے نکالوں گا۔ آج سونا نہیں..... میرا انتظار کرتا۔ میں ضرور آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

میں نے تیسری آنکھ کا زوہ یہ بلا اور یکے بعد دیگرے لیکن سلوان اور جیمز بارڈرچی اور ہرشل کی خبر لے لی۔ لیکن ابارشٹ نبر ستائیں۔ سی میں موجود تھا۔ سلوان ساحل والے بٹنگے کی زیریں منزل پر اس فریب نفس کے ساتھ بیٹھا تھا جو میری نظر میں ہرشل کے اسٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ بارڈرچی بالائی منزل والے لیکن میں جھوٹے برتنوں کے ساتھ نبرد آزما تھا اور ہرشل اس وقت رہی کے پاس اس کے مخصوص بیڈروم میں تھا۔ میں اس بیڈروم کے ماحول سے چپک گیا۔

رہی بونٹے ہائمن ڈبیل چیئر کے بجائے بیڈ پر دراز تھا۔ ہرشل کے علاوہ ایک اور شخص بھی مجھے اس ماحول میں نظر آیا۔ ایک لمحے میں میں نے اندازہ قائم کر لیا کہ وہ کوئی ڈاکٹر تھا۔ وہ شخص بڑی توجہ اور انہماک سے رہی کو چپک کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک بیٹھے بٹھے رہی کو یہ ہو گیا کیا ہے۔ پہلے میں نے اسے ڈبیل چیئر سے ہٹا لیتے ہوئے دیکھا تھا اور اب یہ عجیبہ چپک اپ کسی عجیبہ مسئلے کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ وہ اپنی عمر کی ایک سچری مکمل کر چکا تھا۔ اس عمر میں انسان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میری تشویش اور ارجحان کا باعث یہ تھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا میرے سب سے طاقتور دشمن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر نے مکمل چپک اپ کے بعد رہی کے بازو میں ایک انجکشن دیا اور ہرشل کو ضروری ہدایات دینے کے بعد







والی جگہ پر رکھوں گا اور وہ بھی ایک ایسے اپارٹمنٹ میں جو رپی کے خاص آدمیوں کے استعمال میں ہو۔ بعض اوقات چیزوں کا اثر اور افادیت ایک دم برعکس ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی ایک ایسا ہی وقت تھا۔

اسنے دنوں میں میں تھراؤ آئی کے توسط سے اس اپارٹمنٹ میں متعدد بار آ چکا تھا۔ اس کی مکانیت اور دیگر ضروری معاملات مجھے اچھی طرح ذہن نشین تھے۔ وہ دودھ، ایک سنگ اور ایک کاسن پر مشتمل خوبصورت اپارٹمنٹ تھا۔ دیکھنے میں یہ آتا تھا کہ شام کو رخصت ہوتے وقت وہ لوگ کاسن کی لائٹ علی چھوڑ جاتے تھے اور یہ ہمارے حق میں مفید ہی تھا۔ ہم نے باہر کی جانب کھلنے والی تمام سلیڈز کھل گئیں اور ڈروڑ کے پردے کھینچ کر اس کی کشادہ کاسن کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مذکورہ کاسن میں ایک دیوار کے ساتھ مکمل صوفیہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ہم نے اپنے سامان کو ایک کونے میں رکھا اور اس صوفیہ پر بیٹھ کر لیا۔

میں نے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میری غیر موجودگی میں تمہیں یہاں کسی قسم کا خوف تو محسوس نہیں ہوگا؟“

”اگر میرے ذہن میں ایسا کوئی خدشہ موجود ہوتا تو میں اتنی دور سے تمہارے ساتھ آئی ہی نہیں۔“ وہ بڑی ادا سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دیے بھی یہ اپارٹمنٹ آباد ہے لہذا یہاں۔۔۔۔۔“

وہ بولتے بولتے اچانک رگ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس نے کون سی بات کو زبان سے بھٹکتے سے روکا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ”دیکھو اب مجھے کوئی الزام نہ دینا۔ تم نے خود ذکر نکالا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”میرا مطلب نہیں بلکہ تمہارا مطلب ہے۔“ کہ یہ اپارٹمنٹ قاہرہ والے اپارٹمنٹ کی طرح غیر آباد نہیں جہاں کسی ایسی دیسی مخلوق کے اچانک نمودار ہونے کا اندیشہ ہوا۔۔۔۔۔“

”تمہیں تو اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے بس بہانہ چاہئے ہوتا ہے۔“ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”ہر شخص یہی کرتا ہے۔ جسے بہانہ مل جاتا ہے وہ اپنا مطلب پورا کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ ”واقعی تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”تم دوسرے کے کندھے پر ہندوق رکھ کر اپنا مطلب

کالنا بخوبی جانتے ہو۔“

”میں پھر یہی کہوں گا کہ ہر شخص یہی کرتا ہے۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی کسی کے کندھے پر ہندوق رکھ چلاتا ہے اور کوئی کسی کی لپٹی پر گن رکھ کر دھکا مارتا ہے لیکن۔۔۔۔۔ میں نے جملہ اجورا چھوڑ کر لمبے عرصہ کو وقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن صوفیہ! میں نے تم پر تو ان میں سے کوئی بھی طریقہ اپنایا نہیں کیا۔“ ”نہیں کیا۔۔۔۔۔ پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

”میری ہر گز کے پیچھے تمہارا ہی ہاتھ ہے صوفیہ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے مگر شریر لہجے میں کہا۔ ”اگر تم میرا ساتھ دیتیں تو میں یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ افسوس کہ ہمارا ساتھ بہت مختصر رہا۔“ چند گھنٹوں کے بعد ہم بچھڑ جائیں گے۔ اگر تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملتا تو یقیناً چالو میں فوجات کے ”انبار“ لگا دیتا۔“

”دنیا بہت چھوٹی ہے وجدان!“ وہ کھٹک کر میرے نزدیک آ گئی۔ ”اگر تم چاہو گے تو ہم بعد میں بھی مل سکتے ہیں۔“

وہ دنیا کے چھوٹے ہونے کو ثابت کرنے کی خواہاں تھی۔ میں نے اس کی خواہش کا احترام کیا اور رہے رہے مانگی فاسے کو بھی مناتے ہوئے کہا۔ ”تم بالکل ٹھیک کہتی ہو صوفیہ یہ دنیا واقعی بہت چھوٹی ہے۔“

ہمارے درمیان چند لمحات تک خاموشی اور شائستگی گہرائی بن کر گونجتی رہے پھر صوفیہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی۔ ”تم سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”میری ایک دوست کا دعویٰ ہے کہ عورت کی جیت مرد کے سامنے ہارنے میں ہے۔ جو ہارنا نہیں چاہتا جیت اس کے قریب آنے سے سکتا رہتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس نے اپنا خیال ظاہر کرنے کے بجائے عورت کی مخصوص نفسیات کا مظاہرہ کیا۔ ”جس آئینہ مجھے میں پوچھ گئی۔“ یہ تمہاری کس دوست کا فرمان ہے؟“

میں نے ہار جیت والی وہ بات نیلگہری کے حوالے کی تھی۔ مجھے تو یقین نہیں تھا کہ وہ اچانک اس کے بارے میں استفسار کر بیٹھے گی۔ اس نے پوچھ لیا تھا تو اس کے سوال کا جواب دینا مجھے ضروری تھا۔ میں نیلگہری کو تو زیر بحث نہیں لانا

چاہتا تھا لیکن صوفیہ کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ میں تذبذب کی کیفیت ہی میں تھا کہ میری مشکل آسان ہو گئی۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

ہم دونوں نے باہمی کیفیت سے باہر آتے ہوئے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہماری نگاہیں سنگ روم کی جانب اٹھ گئیں۔ ٹیلی فون سنگ روم میں رکھا ہوا تھا۔ صوفیہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”کیس کا فون ہو سکتا ہے؟“ ”کس خون تو کر سکتی ہے فون نہیں۔“ میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ کسی کس کا فون ہو۔ آؤ دیکھتے ہیں۔“

ہم جس نوعیت کے اعصاب شکن حالات سے گزر رہے تھے ان میں اپنے حواس پر قابو رکھنا بہت ضروری تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے زندہ دلی سے زیادہ مؤثر اور کوئی شے ہو نہیں سکتی تھی۔

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم فون اینڈ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ مگر شخص نظر سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ریسیور اٹھا کر“ ”ہیلو“ کہنے والی کسی حاققت کی جھ سے فوننگ نہ رکھا۔ اس وقت یہ اپارٹمنٹ بند ہے۔ اور اس کے اندر کوئی بھی موجود نہیں۔“

اس دوران میں فون کی گھنٹی دو تین مرتبہ بج چکی تھی۔ ہم کاسن سے اٹھے اور سنگ میں پہنچ گئے۔ ٹیلی فون سیٹ میں ”کار آئی ڈی“ کی سہولت موجود تھی۔ وہاں پر فلیش ہونے والے نمبر پر نگاہ پڑی تو میں چونک اٹھا۔

”ذیر و قری۔“ فانیون سینور ڈیر و نائن فورون۔“ میں زرب لب بڑبڑایا۔ ”اوہ! یہ تو ہولناک ٹاپ کا نمبر ہے۔“

”ہولناک ٹاپ!“ صوفیہ اٹھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”کیا ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم یہاں چھپے بیٹھے ہیں؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے قطعیت سے کہا۔ ”یہ کوئی دوسرا ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔“

”تم کس چکر کی بات کر رہے ہو وجدان!“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ”آؤ معلوم کرتے ہیں اس چکر کے بارے میں۔“

ہم فون کو بجنا چھوڑ کر دوبارہ کاسن روم میں پہنچے۔ میں نے صوفیہ پر بیٹھے کے بعد کہا۔ ”صوفیہ! مجھے ڈسٹر ب نہ کرنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے بس نے محسوس کیا کہ صوفیہ بھی اسی صوفیہ پر بیٹھ گئی تھی۔ ایدہ تو یہی تھی کہ میری ہدایت کے مطابق وہ مجھے ڈسٹر ب نہیں کرے گی۔ میں نے تیسری آنکھ کو ذمہ داری اور پلک پلک پیچھے میں ہولناک ٹاپ کے چکن میں پہنچا گیا۔ میرا نارگٹ سلوان تھا۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور سلوان بکن میں ایک دیوار گیر فون کے ساتھ مصروف تھا۔ اس نے مخصوص شیٹ کیپ لگا رکھی تھی اور چہرے سے گہرا نظر جھلکتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس اپارٹمنٹ میں بیٹنے والی فون کی گھنٹی سلوان ہی کا کارنامہ تھا پھر اگلے ہی لمحے اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سلوان نے جیسے ہی ریسیور کو یاد گیر کر کیڈل پر نگاہ کیا اپارٹمنٹ کے فون کی گھنٹی بجنا بند ہو گئی۔

میں اس بات پر اچھ کر رہ گیا کہ سلوان کو اپارٹمنٹ پر فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ وہ یقین کے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوا تھا اور جانتا تھا کہ اس وقت اپارٹمنٹ میں کوئی نہیں ہوگا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کوئی گزبہ واقع ہو چکی ہے۔ کیا گزبہ؟ اس بارے میں سر دست کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کچھ مزید جاننے کے لیے میں سلوان کے ساتھ چپکار رہا۔

وہ چپن سے نکلا اور ایک الگ تھلک کمرے میں پہنچ گیا پھر پتلون کی جیب میں سے ایک سیل فون نکال کر اس کے کی پیڈ پر کسی کا نمبر ڈیال کرنے لگا۔ میں سیل فون کے نٹسے سے ڈیپلے پر نگاہ جمائے رہا۔ ڈاننگ مکمل ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ وہ رپی کے پرسل سیل پر فون کر رہا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کوئی اونچے نیچے کی گزبہ ہو چکی ہے۔ ذہن میں حسب حال خدشے نے بھی سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔۔۔ کہیں میرا پلان چاک آؤٹ تو نہیں ہو گیا؟

یہ سوال جتنا سنگین تھا اتنی ہی سفاکی سے میرے ذہن نے اس کی تردید کر دی۔ ”نہیں! یہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ بھی نہیں۔“

رپی کا پرسل سیل نمبر میرے حافظے میں نقش تھا۔ میں اسی نمبر پر کئی مرتبہ اس سے بات بھی کر چکا تھا لیکن افسوس کہ میں رپی کے ماحول میں اتر سکتا تھا اور نہ ہی سلوان گی تا میں سن سکتا تھا۔ جب کچھ مجھ میں نہ آیا تو میں ہر شے حیران کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے فربہ اسٹینٹ سے کسی گیمبر مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر چھائی ہوئی گیمبرتا نے

مجھے بتایا کہ میں جس گڑبڑ کے بارے میں سوچ رہا ہوں اس کا تعلق ساحل والے جنگل سے ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں ساحل کے بیڑوم میں پہنچ گیا۔ ان لہجے میں تھوڑی آہی بڑی فرماں برداری سے میرے کام آ رہی تھی۔

ساحل اپنے کمرے میں بالکل خیریت سے تھی۔ میرا وہاں محوم پھر کرینک کی طرف چلا گیا۔ سلوان اگر اپارٹمنٹ پر فون کر رہا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے اسے امید کی شائبہ نہیں واپس اپارٹمنٹ میں آ گیا ہو۔ یعنی وہ ساحل والے جنگل پر نہیں پہنچا تھا۔ اس تجربے کے ساتھ ہی میں نے تھوڑی آہی کا اسٹیرنگ بینک کی جانب مہمادیا۔

وہ کم بجٹ ساؤتھ اشار ہاسٹل کے شعبہ حادثات میں بڑا تھا۔ میں اس کے باحول میں پہنچا اور چند لمحات ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی سنگین نوعیت کے حادثے کا شکار ہو کر ہی ”ساؤتھ اشار“ اسپتال پہنچا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اب اسے دو چار دن کے لیے اسپتال ہی میں رہنا تھا۔ بینک کو پیش آمدہ حالات کو دیکھ کر ساری کہانی محل کر سامنے آ گئی۔ وہ وقت مقررہ پر اپنی ڈیوٹی پر نہیں پہنچ سکا ہوگا چنانچہ جنگل والوں کو تشویش ہوئی اور انہوں نے اپنی تشویش دور کرنے کے لیے سلوان سے رابطہ کیا جس کے نتیجے میں سلوان بینک کو اپارٹمنٹ پر ”چیک“ کر رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اگلے لمحے صوفیہ سے ٹکا ہوا چار ہوئیں۔ وہ سوالیہ نظر سے میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ تشویشناک لہجے میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے فون کا کوئی جواب نہ پا کر سلوان سیدھا یہاں آئے گا۔“

”ایک لھکان یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔

”اس کے علاوہ اور کون کون سے امکانات ہیں؟“ میں نے بتایا۔ ”وہ ساحل والے جنگل کا رخ بھی کر سکتا ہے اور بینک کو دیکھنے بھی جا سکتا ہے۔“

”ساحل والے جنگل کا رخ کرنے کے لیے اسے اپنے حلیے میں مناسب تبدیلی کرنا ہوگی۔“ وہ مطلق انداز میں بولی۔ ”تم از کم سر پر دگ اور آنکھوں میں کالہٹ لٹین لگانا ہوں گے اور.....“ وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”بینک کو دیکھنے وہ اسی صورت میں جا سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ

پیش آیا ہے اور وہ اس وقت کون سے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔“

”تم موجودہ حالات کا بالکل درست تجزیہ کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ ”وہ جان! اگر وہ اپارٹمنٹ کی طرف آ گیا تو کیا ہوگا؟“

اس کے لہجے سے گہری تشویش جھلکتی تھی۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”مجھے تو نہیں امید کہ وہ ادھر کا رخ کرے گا کیونکہ فون کا جواب نہ پا کر وہ سمجھ گیا ہوگا کہ بینک اپارٹمنٹ میں موجود نہیں اور بالفرض بحال وہ ادھر آ بھی جاتا ہے تو آ جائے۔ اس کا حشر بینک سے بھی زیادہ عبرتناک ہوگا۔ میں اسے کسی ساؤتھ نارٹھ یا ایسٹ ویسٹ اشار اسپتال میں نہیں جانے دوں گا بلکہ وہ نامراد ”بھائی گاڑن“ اسپتال کے انجیل وارڈ نمبر ”ستائیں۔ سی“ ہی میں رہے گا جہاں صوفیہ نامی ایک خوبصورت چنڈم ”نرس“ اسے اینڈ کرے گی۔“

وہ ابھمن زدہ سرسیدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے سرسری انداز میں یہ کہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ”ابھی آتا ہوں۔“

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے تھوڑی آہی کو زحمت دی اور سیدھا سلوان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہولناک سے نکل آیا تھا اور اپنی گرے گاڑی میں بینک رکھیں چار ہاتھ۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رخ اس پوٹ رہائی علاقے کی جانب ہے جہاں ساحل والا بنگلا واقع تھا۔ سلوان اس وقت اپنے اصلی حلیے میں تھا۔ میں اسے پہلے ہی ایک مرتبہ اسی حلیے میں جنگل میں جاتے دیکھ چکا تھا۔ جب وہ رلی موٹے ہاتھن کو بن گورین ائر پورٹ پر ریسیور کرنے آیا تھا۔ وگ اور کالہٹ لینس لگا کر حلیہ بدلنے والی کہانی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی اور میرے پاس اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ میں ایسے غیر متعلقہ معاملات میں سرکھپتا۔ ایک مرتبہ میری ساحل ان خبیثوں کے جنگل سے نکل آئی تو پھر میں فرصت سے ایک ایک کو دیکھ لیتا۔

سلوان ساحل والے جنگل پر پہنچ گیا۔ جلد ہی وہ ہرشل سے مینگ کر رہا تھا۔ اس مینگ میں ہرشل کا فریہ اسٹنٹ بھی شامل تھا۔ یہ مینگ نتیجہ خیر ثابت ہوئی اور فریہ اسٹنٹ ایک گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ سلوان والی گرے گاڑی میں گیا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ سلوان اسی جنگل پر ٹھہرے گا۔ میں فریہ اسٹنٹ کے ساتھ ہولیا۔ جب گرے گاڑی ساؤتھ اشار ہاسٹل کے سامنے پہنچی تو میں

واپس آ گیا۔ یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ بینک کو پیش آنے والے حادثے کی خبر ساحل والے جنگل تک پہنچ گئی تھی جس کی فریہ اسٹنٹ کو اس طرف روانہ کیا گیا تھا۔ میرے محتاط انداز کے مطابق کم از کم دو دن تک تو بینک کو اسی اسپتال میں رہنا تھا۔ یہ ایک نسلی بخش صورت حال تھی لہذا میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

صوفیہ نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”ہو آئے؟ کیا رہا؟“

میں نے مناسب الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے جرمکون انداز میں ایک نسلی بخش سانس لی اور بولی۔ ”اللہ کا شکر ہے معاملہ تسخیل کیا ورنہ میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔ اگر سلوان واقعی یہاں آ جاتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔“

”تم اتنی جلد گھبرا یا مت کہو اللہ بڑا کارساز ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ یوں چونکی جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”ایک بات تو بچوں و دھان! جنگل بچاؤ ہوگا؟“ اس کے انداز میں مخصوص ٹول شامل تھی۔

”ہاں پوچھو ضرور بتاؤں گا۔“ میں نے فراخ دلی سے کہا۔

”کیا جھپٹا بی بیجی آتی ہے؟“

”جھپٹا مجھے ٹپ بیجی جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کبھی تو سنجیدہ ہو جاوے گا کہ وہ دھان! وہ جھپٹا گئی۔“

”لو ہو گیا سنجیدہ.....“

آئندہ دس منٹ تک اسے میری سنجیدگی کا مزہ چکھنا پڑا۔

اس نسلی سی قربانی نے اس کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ میں نے گول مول انداز میں اسے اپنی صلاحیت کے بارے میں بتا دیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ بیجان خیر لہجے میں بولی۔

”وہ جان! تم یہ سب کس طرح کر لیتے ہو؟“

”ایسے.....“

میں نے اسے اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے ایک لفظ ادا کرنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں پھر تھوڑی آہی کے توسط سے تمام اہم محاذوں کے معائنے کو مکمل کیا۔ سب طرف خیریت ہی خیریت تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”ہاؤ میزنگ!“ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں

بولی۔

میں نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

اس نے سرسری آواز میں پوچھا۔ ”ابھی تم کہاں گئے تھے؟“

میں نے بتایا۔ ”میں دوستوں اور دشمنوں کو جھانکنے گیا تھا۔ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہمارے لیے کسی قسم کی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ حالات بتاتے ہیں ہمارا کوئی دشمن اس اپارٹمنٹ کا رخ نہیں کرے گا۔ تم اطمینان سے یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کر سکتی ہو۔“

”اوہ!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”وہ جان! تمہاری تھوڑی آہی کی صلاحیت تو بڑی خوفناک اور حیرت انگیز ہے۔ کھل سے تو نہیں لگتا کہ تم اتنے خطرناک ہو گے۔“

”مورتیں اکثر دھوکا دے جاتی ہیں صوفیہ!“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”مورت سے میں نہیں کیسا لگتا ہوں؟“

”یوسف اللہ ہری!“ وہ بڑی لگاؤٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”یعنی تمہارا دوست یوسف اللہ ہری؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تم نے بالکل ٹھیک کہا وہ جان! مورتیں اکثر دھوکا دے جاتی ہیں۔ تم یوسف اللہ ہری نہیں ہو لیکن یوسف اللہ ہری دکھائی دیتے ہو۔ اگر تم یہ میک اپ اتار بھی دو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تم وہ جان نظر آنے لگو گے۔ کوئی اس وہ جان کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ وہ کتنی تھلک خیز صلاحیت کا مالک ہے۔“

اس کا لہجہ خواب ناک سا ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے تو میرے اندر اور باہر جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ تمہیں یہ تجربہ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“

”مجھے انفسوس ہو رہا ہے وہ جان!“ وہ کسمسائی۔

”کس بات کا انفسوس؟“

”اس بات کا کہ ہمارے ساتھ کے چند گھنٹے باقی ہیں۔“ وہ ہل آواز میں بولی۔

”اوہ!“ میں نے ایک طویل سانس لینے پر اکتفا کیا۔ وہ اسی خرائس کی کیفیت میں بولی۔ ”وہ جان! تمہاری تھوڑی آہی کی صلاحیت نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اگر ہمیں کچھ عرصے تک ساتھ رہنے کا موقع ملتا تو میں تم سے اس سلسلے میں ضرور کچھ سیکھتی۔“ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے

آتش فشان (226) حصہ 13

سے بات کر رہا تھا۔ وہاں سے میرے مختلف سوالات کے جواب میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

”بلوم اشارہ“ کی کوئی ریڈیو یک حاصل کرنے کے لیے ضرورت کے وقت سے آدھا گھنٹا پہلے ”آرڈر“ لوٹ کر وانا پڑا تھا۔ خاص طور پر بیرون شہر جانے کے لیے بنگ کی شرط لازمی تھی۔ میں نے کرائے وغیرہ کے لیے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح کے چھ بجے سے رات کے بارہ بجے کل ایب سے پرڈم پہنچانے کے لیے ریڈیو یک کا ڈیزل سو امریکی ڈالر یعنی پانچ سو پچیس نیو شیکل تھا اور رات بارہ بجے سے صبح کے چھ بجے تک یہی کرایہ دو سو امریکی ڈالر بہ الفاظ دیگر سات سو نیو شیکل تھا۔ میں نے بلوم اشارہ والوں سے کہہ دیا کہ اگر مجھے ریڈیو یک کی ضرورت ہوگی تو میں فون کر کے انہیں مطلع کر دوں گا۔

اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے دس منٹ تک تھروڈ آئی کے توسط سے کل ایب کے مختلف علاقوں کی سیر کی۔ ساحل اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے بیڈ پر دروازہ کھلی تھی۔ رہی بھی لمبی چوڑی تانے سوراہا تھا۔ میں اس کی تازہ ترین ”طبیعت“ کا احوال نہ لے سکا کیونکہ جب میں نے اس بنگلے میں کھنچ کر ہرشل کے ماحول کو چھوا تو وہ رہی کے مخصوص کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ میں ہر محاذ کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو گیا کہ ان میں سے کوئی آج رات اس اپارٹمنٹ کی طرف آنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اگر ان کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو اب تک ادھر کا چکر لگا چکے ہوتے۔

اپارٹمنٹ کو چھوڑنے سے پہلے میں نے تھوڑا سا وقت صوفیہ کو بھی دیا۔ اس کے بعد ان ہدایات کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

میری غیر موجودگی میں وہ اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کو اندر سے لاک رکھے گی۔ کسی کال تیل کی آواز پر وہ کوئی توجہ نہیں دے گی نہ ہی کسی دستک کو خاطر میں لائے گی۔ وہ کسی فون کال کو بھی انیڈ نہیں کرے گی ماسوائے میری کال کے۔

میں اگر اسے کال کر دوں گا تو اس کی پہچان یہ ہوگی۔ میں ایک کے بعد رابطہ منقطع کر دوں گا۔ پھر ٹھیک ایک منٹ پر دوبارہ کال کر دوں گا لیکن حسب معمول ایک تیل کے بعد لائن کاٹ دوں گا اور اس کے فوراً ہی بعد سہ بارہ فون کر دوں گا۔

اگر ایسی صورت حال اس کے سامنے نمودار ہو تو وہ بے دھڑک فون انیڈ کر سکتی ہے۔ ریسیور کو کان سے لگانے کے بعد وہ خاموش رہے گی۔ جو کچھ بھی کہنا ہوگا میں ہی کہوں گا۔

واپسی..... کامیاب واپسی پر بھی میں ایک خاص انداز میں دروازے پر دستک دوں تو وہ بے خوف ہو کر ہمارے لیے دروازہ کھول سکتی ہے۔

اس نے پوری توجہ سے میری احکام نامہ ہدایات کو سنا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اوکے!“ میں اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

وہ میری زندگی کی سب سے سنسنی خیز رات تھی۔

میں نے جس منزل کو پانے کے لیے دہنی اور جسمانی اذیتیں برداشت کیں وہ منزل آج مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ مجھے یہ چند قدم بڑھا کر آگے آنا تھا اور ہاتھ بڑھا کر اس منزل کو قحطام لینا تھا۔ ساحل کا حصول میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے جاں کنی کے عالم میں کسی شخص کو زندگی کی نوید سادی جائے۔ میں ان سرور کن خیالات اور طمانیت بخش احساسات کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ آج کی رات ہمارے لیے شب وصال ثابت ہوگی۔ ہمیں جدا ہونے کی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن محسوس ہوتا تھا صدیاں بیت گئی ہوں۔

میں شالوم اسٹریٹ پہ نکل کر پیدل ہی ہرمین اسٹریٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے لیکن محسوس یہی ہوتا تھا ”تھوڑی دیر پہلے ہی شام ڈھل چکی ہو۔ کل ایب کی رونق آدھی رات کو بھی عروج پر تھی۔ رنگ دھور کا ایک سیلاب تھا جو رواں دواں سڑکوں پر دوڑ رہا تھا۔ مجھے یہ رونق اور چکا چوند بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دل میں اگر کوئی خوشی یا کسی خوشی کا احساس جاگزیں ہو تو ہر شے خوبصورت اور دلکش دکھائی دیتے تھے۔ وصال عجب کا امکان دیرانے میں بھارا تا رہتا ہے۔

نفا میں اب وہ دن والی حدت اور شدت باقی نہیں رہی تھی۔ کل ایب ایک ساحلی شہر ہے۔ دنیا کے دیگر ساحلی شہروں کی طرح یہاں کا موسم عموماً دن میں گرم مرطوب اور رات میں قدرے خشک مگر ہوا دار ہوا جاتا ہے۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس نے نفا میں ایک قسم کی خشکی بھری تھی۔ میڈی ٹرینیٹین MEDITERRANEAN کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے کل ایب کے موسم کو خاصا خوشگوار کر دیا تھا اور موسم کی یہ خوشگواریت کچھ کرگزرنے کو اکسانی تھی۔ میں تو پہلے ہی بے حد اکسایا ہوا تھا۔ ”میڈی“

ٹرینیٹین کی مہربان ہواؤں نے اس اکسانٹ میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ میں خراماں خراماں ایک خاص موڈ کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔

ہرمین اسٹریٹ پر ستر ختم ہوا تو میں نے آگے کی مسافرت کے لیے شیردن اسٹریٹ بکڑی۔ شیردن اسٹریٹ سیدھی مجھے اس علاقے میں پہنچا دیتی جہاں ساحل والا وسیع و عریض بنگا واقع تھا۔ یہ ایک پوش اور خاموش رہائشی علاقہ تھا۔ دنیا کے دوسرے پوش رہائشی علاقوں کے مانند اس علاقے کے طور پر یہ بھی اپنے ہی تھے۔ یہاں بسنے والے اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کسی دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ ہر شخص کی اپنی زندگی تھی اور اس سے کسی دوسرے شخص کی زندگی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ یہ خصوصیات اگرچہ خوش اطواری میں آتی ہیں لیکن اپنے پیڑوسیوں اور محلے داروں سے اس قدر بے گامگی اور لاتعلقی بھی ابھی نہیں لگتی۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہ انسانوں کی کوئی ہستی یا نگری نہ ہو بلکہ صاحبِ ثروت خواتین و حضرات کا ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہو جس کے ہر ڈیپارٹمنٹ میں ایک الگ ہی آئٹم جاکو ہو۔

شیردن اسٹریٹ کے اختتام پر قریات عظام کا علاقہ ہے جہاں کھانے پینے کے اچھے اور معیاری ریسٹورنٹ واقع ہیں۔ رات کا کھانا ہم نے بہت جلدی یعنی اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں پہنچنے سے پہلے کھالیا تھا۔ مجھے اس وقت بھوک تو محسوس نہیں ہو رہی تھی تاہم میں چند منٹ کی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر گزارنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے قریات عظام کا علاقہ انتہائی موزوں تھا۔

میں ایک کافی ہاؤس میں آ بیٹھا۔ میں ان لحات میں کافی یا چائے پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دونوں اشیاء مجھ پر اتنا اثر کرتی تھیں یعنی نیند بھگانے کے بجائے میرے اعصاب کی مائل کرنے لگتیں اور دل چاہتا کہ تھوڑا آرام کر لیا جائے۔ مجھے تو چند منٹ کے لیے بیٹھنے کا بہانہ چاہئے تھا۔ ویسے اس کافی ہاؤس کے نئون سائن نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ کافی ہاؤس کا نام ”ہاٹ۔ این۔ کولڈ“ تھا۔ اس کے نئون سائن میں آرنلک بچ تھا۔ ”ہاٹ“ اور ”کولڈ“ کے الفاظ کے درمیان این (N) خیمپ میں ایک ڈانس کرتی ہوئی حسینہ دکھائی گئی تھی جو رقص کرتے ہوئے بھی ہاٹ کی طرف اشارہ کرتی اور کسی کولڈ کی جانب۔ مطلب یہ تھا یہاں گرم اور ٹھنڈا دونوں طرح کا مشروب دستیاب ہے۔ اس ہاٹ این کولڈ کے نیچے بڑے اسٹالٹش انداز میں ”کافی ہاؤس“ کے الفاظ روشن تھے۔ کسی حد تک اسی سے ملتا جلتا ایک نئون سائن

کراچی کے بمبئی سینما پر بھی کسی زمانے میں دکھائی دیتا تھا۔ اچھا کاروبار بھی شخص لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے پبلیٹی کا سہارا ضرور لیتا ہے اور پبلیٹی میں ”اسٹنٹ“ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہودیوں سے زیادہ کاروبار کے بارے میں میں اور کوئی نہیں جانتا۔ مجھے چاہئے یا کافی کی حاجت نہیں تھی اس کے باوجود بھی میں ”ہاٹ۔ این۔ کولڈ“ کے پبلیٹی اسٹنٹ سے متاثر ہو کر کافی ہاؤس میں جا بیٹھا تھا۔

میں نے آرڈر دیا اور آٹھیس بند کر لیں۔ بنگلے سے اب میں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں اس کافی ہاؤس سے اٹھتا اور بنگلے پانچ منٹ میں پوش رہائشی علاقے میں داخل ہو جاتا۔ دو چار گلیاں گھوم کر ساحل والے بنگلے تک پہنچنے میں حرید پانچ منٹ لگ جاتے۔ اس سے پہلے مجھے تھروڈ آئی کے توسط سے فائل راؤڈ کھینا تھا اور اسی کھیل کے لیے میں نے آٹھیس بند کی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ ویر پانچ منٹ سے پہلے کافی سرور نہیں کرے گا۔ میرے لیے یہ ہمت کافی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنی جان تنہا کے بیڈروم میں جھانکا۔ آخری بار جب میں ساحل کے ماحول میں داخل ہوا تو وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ اب جو دیکھا وہ سوچا بھی۔ بیڈروم میں زبرد پاور کا بلب روشن تھا جس کی نیلگوں روشنی بڑے روٹینک انداز میں خواب گاہ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ میں چند لمحات تک ساحل کو سوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے سینے کا ہوا زبرد پورم ظاہر کرتا تھا وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔ گہری اور پرسکون نیند!

ساحل کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ آج اس خوبصورت تجربے سائنس قید خانے میں اس کی آخری رات ہے اور وہ بھی آدھی رات۔ چند منٹ بعد تو میں اس کے پاس ہوتا پھر وہ میرے پاس ہوتی..... گویا ہم ایک دوسرے کے پاس ہوتے۔ اس نیکیابی کے تصور نے میرے رگ دپے میں ایک سنسنی سی جگادی۔ میں نے ساحل کے ماحول میں سرکشی مگی اور وہاں سے چلا آیا۔

”ساحل! تمہارے انتظار اور ہمارے وصال کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔ میں آ رہا ہوں.....“ حالانکہ میں ابھی طرح جانتا تھا میری آواز اس کے ماحول تک نہیں پہنچی ہوگی لیکن میں نے یہ جملہ ادا کر کے بہت اطمینان اور سکون محسوس کیا تھا۔ بعض لوگ تو دیوار کو اپنا احوال سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ میں نے تو ایک جیتے جاگتے ماحول میں سرکشی کی تھی۔

ساحل کے بعد رہی موٹے ہاشم کا نمبر آتا تھا لیکن اس

تک میں براہ راست رسائی حاصل نہیں کر پاتا تھا۔ پتا نہیں اس ساحر نے میری قرڑ آئی کی راہ میں کون سا سنہری جال بن رکھا تھا کہ میرے تصور کی پرواز اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نا دیہ سنہری جال میں پھنس کر رہ جاتی تھی۔ اس روئے زمین پر ابھی تک دو ایسی ہستیاں میرے تجربے میں آئی تھیں جن تک میری رسائی ممکن نہیں ہو سکی تھی۔ ایک ہستی تھی ربی موٹے ہاتھن اور دوسری نیلگری!

نیلگری کا نام ذہن میں آئے ہی نگاہ کے سامنے اس کا ہوشربا سراپا محسوس کیا۔ پھر اس سراپا کے تقاضے یاد آنے لگے۔ اس یاد نے میرے رگ دپے میں ایک سنہا تہ سی بھردی۔ نیلگری کا ایک نیا روپ کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ مجھے اپنا محبوب بھی تسلیم کرتی تھی اور دھونس دھاندلی سے مجھ پر تسلط بھی جہاں کر رکھتا تھا۔ ایسا بھلا نہیں ہوا ہے۔ محبوب نہ ہوا گھڑے کی پھلی ہوئی چب جی جاپا ہاتھ ڈال کر کھڑی۔

میں نے نیلگری کے رنگین و مگن تصور کو ذہن سے جھٹکا اور ربی تک رسائی کے لیے سنہری بالوں والے سونڈ پونڈ دروازہ قامت ہرشل حنان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ ربی کا سیکریٹری ہرشل اس وقت اسی چھوٹے سے کمرے میں موجود تھا جو ربی کے بیڑوم سے ملحق تھا۔ اس کمرے میں میں نے سب سے پہلے ہرشل کو دودھ کی اسکریننگ کرتے دیکھا تھا اور اب اس اسکریننگ کا سبب واضح ہو چکا تھا۔ ربی ایک کارڈ بالوسٹ کے زپر علاج تھا لہذا اسے شفاف اور چمکانی سے پاک دودھ پینے کو دیا جا رہا تھا۔ اس کو... ڈاکٹر بھی پسند آیا تھا تو منام! جو بے چارہ بروٹم سے چل کر اسے اینڈو کرنے مل ایبب آیا کرتا۔ ربی کی بیماری اب پوری طرح میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی دل کا معاملہ ہو گیا تھا۔ ممکن ہے یہ مجھ سے ”دل“ لگانے کا نتیجہ ہو۔ میں اپنے دشمنوں سے کچھ ایسی قسم کی ”دل لگی“ کرتا ہوں۔

ہرشل اس وقت بھی ایک ایزی چیئر میں دبکا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب میں نے اس کے ماحول میں جھانکا تھا تو وہ جیسی کونز کے ایک مادر پدر آزاد ناول کے مطالعے میں غرق تھا۔ اس وقت بھی اس کا انتہا کسی غرقابی ہی سے مشابہ تھا۔ میرے دل میں تجسس جاگا کہ معلوم کروں وہ کون سا ناول پڑھ رہا ہے۔ یہ بات تو سنی گئی کہ وہ جیسی کونز کا ناول نہیں تھا۔ میرے تجسس نے تھوڑی جتنو کے بعد پتا چلا لیا کہ ہرشل کے ہاتھوں میں اس وقت اماڈالیز کا ایک بیسٹ سیر ناول ”بینک بائی وانف“ تھا۔ اماڈالیز جیسی کونز سے بھی دو چار ہاتھ آگے کی شے ہے۔ ہرشل حنان کے

مطالعائی ذوق کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ پڑھا کو برسوں کا بکڑا ہوا ہے۔

ہرشل ربی کا پرنسپل سیکریٹری تھا اور کسی دم کے مانند اس کے ساتھ سیر کرتا تھا۔ اس جنگل میں ہرشل کی موجودگی یہی ظاہر کرتی تھی ربی بھی اپنے بیڑوم میں بوجھ استراحت ہوگا۔ میں نے ہرشل کو اس کے حال پر چھوڑا اور سلوان کے ماحول کی جانب چھلانگ لگادی۔

سلوان ہرشل کے فریہ اسٹنٹ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ ایک بیڑوم تھا اور وہ دونوں اپنے اپنے بستر پر بیٹھے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ فریہ اسٹنٹ کی وہاں موجودگی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ ساتھ اشارہ ہاتھل کے معاملے کو نیکل کر لیا گیا ہے اور فریہ اسٹنٹ بینک کو اسپتال میں محفوظ رکھ کر واپس آ گیا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ اس وقت سلوان کو وہاں کی رپورٹ پیش کر رہا ہو۔ ان کے بیڈ تک پہنچ جانے کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں نے ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد باور پچی بالائی منزل والا سگ گارڈز بیرونی گینٹ پر متین گارڈز اور بینک کی خبر لی۔

سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ بینک کی حالت خاصی تشویش کا شکار تھی۔ اس کا منہ سرفیدہ جیوں میں چپا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ اور بازو پر بھی لمبی چوڑی بینڈیج نظر آ رہی تھی۔ اسے اس حادثے میں شدید نقصان پہنچا تھا۔ مجھے حادثے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا البتہ یہ بات یقینی تھی کہ وہ دو تین روز تک اس اسپتال کا مہمان رہے گا۔ اس وقت وہ بے ہوش تھا۔

ویٹر کی آمد کو محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میز پر کانی کے برتن چن رہا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ واپس جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

”کیا مجھے ایک کاغذ اور قلم مل سکتا ہے؟“

اس نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ ”ایک منٹ سہرا ابھی لاتا ہوں۔“

وہ ایک منٹ سے بھی پہلے واپس آ گیا پھر کاغذ قلم مجھے حتما کر پٹ گیا۔ میں نے اس کے دینے ہوئے رف پیڈ میں سے ایک صفحہ بھرا کر الگ کر لیا۔ پھر اس صفحے پر ”بگلا نمبر بی۔ ایک سو تین“ لکھ دیا۔ اس مختصر تحریر شدہ کاغذ کو کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کاغذ کو پیڈ سے الگ کر کے میں نے اس لیے استعمال کیا تھا کہ پیڈ پر میری لکھائی کا عکس نہ آ جائے۔ یہ

احتیاط بہت ضروری تھی جو بعد میں میرے لیے مفید ثابت ہوئی۔ جس جنگل میں ساحل کو رکھا گیا تھا اس کا نمبر ڈی۔ ایک سو تینس تھا۔ میں نے اس پر ”ڈی۔ ایک سو تینس“ کے بجائے اس سے ملتا جلتا نمبر ”بی۔ ایک سو تینس“ اس لیے لکھا تھا کہ جنگل کے گینٹ پر متین گارڈز کو دھوکا دیا جاسکے۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص پلان تھا۔ میں نے صوفیہ کے ساتھ دن کے وقت جب اس علاقے کی سیر کی تھی تو یہ انوکھا آئینہ میرے ذہن میں آ گیا تھا اور اب اس آئینے پر گیل کا وقت تھا۔

مجھے کبھی بھی صورت وہ نہ دیکھی تھی لیکن یہ ظاہر کرنا بھی ضروری تھا کہ میں کافی ربا ہوں لہذا انسانی ایکٹنگ سے کام چلا یا جاسکتا تھا۔ ویٹر نے سیر بیٹ کا کافی سڑکی تھی۔ اچھے ریٹورنس کی ایک اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اشیائے خورد و نوش کو بڑے اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ بعد میں مل بھی اچھا خاصا وصول کرتے ہیں جو ان کا حق بھی ہوتا ہے۔

کانی پاٹ میں کم از کم دو افراد کے لیے کافی موجود تھی۔ اگر میں چاہتا تو اسے ریفیل بھی کروا سکتا تھا لیکن ریفیل تو بہت دور کی بات ہے مجھے تو اس کانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لینا تھا۔ میں جس مقصد کے لیے اس کانی ہاؤس میں آ کر بیٹھا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ تنگ اسٹروک کھیلنے سے پہلے میں نے قرڑ آئی کے توسط سے اچھی طرح فیلڈ کا جائزہ لے لیا تھا۔ ربی کے مہروں کی پلیننگ میری یادداشت میں نقش ہوئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے ”کانی کانی“ کھیلا شروع کر دیا۔

کانی پاٹ میں سے ایک اسپون کانی نکال کر میں نے کپ میں ڈالی پھر اس میں اتنی کریم ملائی کہ وہ تیار شدہ کانی کارنگ دینے لگے۔ اس کے بعد میں نے کپ کو اٹھالیا اور اسے مختلف زاویوں سے اپنے ہاتھوں میں حرکت دینے لگا۔ اس طرح دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا کہ میں کانی پی رہا ہوں لیکن درحقیقت میں اس کپ کو اندرونی جانب سے ایسا ہمارا تھا کہ کپان نظر میں یوں لگے جیسے اس کپ میں کانی پی گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کپ کو میز پر رکھا کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک ہماری ٹپ کے ساتھ کانی کا ٹل ادا کیا اور ”ہاٹ این کولڈ“ کانی ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ چند منٹ بعد میں اس گلی میں داخل ہو رہا تھا جہاں ساحل والا بگلا نمبر ڈی۔ ایک سو تینس واقع تھا۔ جنگل کے گینٹ پر دو سو پھرے دار مجھے دور ہی سے نظر

آگئے۔ میں نے اپنی جیب میں سے وہ شد کاغذ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا جس پر کانی ہاؤس میں بیٹھ کر میں نے بگلا نمبر بی۔ ایک سو تینس لکھا تھا۔ میں متلاشی نظر سے ایک ایک جنگل کی ٹیم پلیٹ کو دیکھنے ہوئے آگے بڑھتا رہا پھر جب سڑک پہرے داروں کے نزدیک پہنچا تو جنگل کے گینٹ کا نیلا رنگ میری نگاہ میں آ گیا۔ میں بڑے بے فکرے انداز میں ٹپلے ہوئے ان کے قریب پہنچ گیا۔

وہ مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ریڈ الرٹ ہو گئے تھے۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پچہ ان میں سے ایک کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ اسی جنگل کا ایڈریس ہے؟“

میں نے جس پہرے دار کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اس نے میرے ہاتھ سے پچہ لینے وقت سرتاپا تنقیدی نظر سے مجھے گھورا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میرے جسم کا انٹرے کر رہا ہو۔ میں نے اپنے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نمودار نہ ہونے دیا جس سے وہ لوگ کسی قسم کے شبہ میں مبتلا ہو جائیں تاہم اس دوران میں میں بڑی بے پروائی سے ان کی پوزیشن اور ان کے پاس اسلحے کے زاویوں کو دواج کرتا رہا۔ انہیں گفتگو میں الجھا کر مجھے اپنا ”کام“ نکالنا تھا۔

اس شخص نے میرے تنقیدی جائزے سے مطمئن ہونے کے بعد پچہ پر نگاہ ڈالی اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ”بی۔ ایک سو تینس تو تم غلط جگہ پر آ گئے ہو پاس۔“ ”غلط جگہ!“ میں نے گہر مندی سے کہا۔ ”کیا یہ اسی جنگل کا ایڈریس نہیں ہے؟“

اس دوران میں دوسرا گارڈز بھی اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے پہلے والے سے پوچھا۔ ”یہ شخص کس کا پتا پوچھ رہا ہے؟“

میں نے براہ راست دوسرے کو جواب دیا۔ ”بھائی! میں یہاں پر ابھی ہوں۔ قہارہ سے آیا ہوں۔ مجھے بگلا نمبر بی۔ ایک سو تینس میں جانا ہے۔ میڈم شارٹ اس جنگل میں رہتی ہیں۔ ان کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ میں وہی پہنچانے آیا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے نیل گینٹ والے جنگل کی ٹیم پلیٹ پر نگاہ دوڑائی جہاں صرف جنگل کا نمبر درج تھا اس کے ساتھ کوئی نام وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے شخص نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تم واقعی ایک غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ بگلا نمبر بی۔ ایک سو تینس۔“ ”بی۔ ایک سو تینس۔“ میں نے گہر مندی سے کہا۔ ”کیا یہ اسی جنگل کا ایڈریس نہیں ہے؟“



گھٹیاں پیچھے جانا ہو گا لیکن..... وہ لمبے بھڑکے ایک ہاتھ سے سوچنے والے انداز میں اپنی ٹھوڑی کو مسلا اور اٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میری معلومات کے مطابق تم جس بنگلے کا ایڈریس پوچھ رہے ہو وہاں کرنل دلیان رہتا ہے۔ کہیں یہ میڈم شارلٹ کرنل کی بیوی تو نہیں؟“

آخری جملہ اس نے اپنے ساتھی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا۔ وہ بولا۔ ”نہیں فلوس! کرنل دلیان کی بیوی کا نام تو نینسی ہے۔“

ان کی باہمی گفتگو سے مجھے ان کے نام معلوم ہو گئے۔ دراز قد دہلا پٹلا گاڑی جم تھا اور بٹے کتے ٹومند پست قد گاڑی کا نام فلوس تھا۔ جم کا جواب سننے کے بعد فلوس نے مجھ سے کہا۔

”بہر حال مسٹر! اگر تمہیں بگلا نمبر دی۔ وہ قریبی ٹو میں جانا ہے تو اس بنگلے کے عقب میں دو گھٹیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارا مطلوبہ بگلا اسی گلی میں واقع ہے۔ ان ملے جلے نمبروں سے تمہیں مفاد ہو گیا ہے۔“

”اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”جنرل ہارن!“ فلوس نے بڑی رعوت سے جواب دیا۔

میں نے اس دوران میں ان دونوں کو اپنی نگاہ میں اچھی طرح تول لیا تھا اور حملہ آور ہونے کے لیے اپنے ذہن میں ایک اکتھ پیس تیار کر لیا تھا۔ وہ مجھے کوئی بھلا بھلا مسافر سمجھ کر میری طرف سے خامے بے پروا اور غیر محتاط ہو گئے تھے اور یہی میری کامیابی تھی۔ میرے ایکشن میں آنے کا لمحہ سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔

”آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے منونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں ادھر ہی جا کر میڈم شارلٹ کے بنگلے کو تلاش کرتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں اس انداز سے مزاحیہ وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ ہو لیکن میری یہ بین نظری حرکت ایک سوچا بچھا دھوکا تھا۔ میں نے نازک گت کو اپنے ذہن میں جما کر بڑی سرعت سے ایک تیز رفتار وہیل تک چلا دی۔

انہیں میری جانب سے کسی ایسے جارحانہ فوری رد عمل کی توقع نہیں ہو سکتی تھی لہذا وہ میرے چلائے ہوئے داؤ میں آ گئے۔ میری وہیل تک فلوس کی کنٹی پر لگی۔ وہ لہرا کر جم پر گرا۔ جم اس سے محض ذدف کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ ہماری بھرم فلوس کا غیر متوجہ دھکا کھا کر زمین بوس ہو گیا۔ پھر میں

نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

میں تیزی سے گھوما اور زمین بوس جم کی کھوپڑی پر ایک زوردار شہدائید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے زمین پر بیٹھتے ہوئے بیک سوئپ چلائی۔ فلوس سنبھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری چلائی ہوئی سوئپ اس کی پٹلی پر لگی اور وہ پشت کے بل گر کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں ان نازک لمحات میں اس ہڑائی کو طول دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ ابھی تک کسی شخص کا اس گلی میں گزرنے ہوا تھا اور نہ ہی بنگلے کے اندر سے کوئی پھرے داروں کی خبریت دریافت کرنے آیا تھا لیکن ”امن و امان“ کی یہ صورت حال سدا برقرار نہیں رہ سکتی تھی اس لیے جو بھی کرنا تھا فوراً سے جیستری کرنا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھا اور چاروں خانے فرش فلوس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اس کی ٹومند گردن کو اپنے بازو کے گلچے میں کسا اور گردن پر پانی چانے والی ایک مخصوص رگ کو مسل کر اسے ایک جانب پھینک دیا۔ جھٹکے سے قبل وہ کسی مردہ تر کی کے مانند میری ہاتھوں میں جمبول گیا تھا۔ مجھے قوی امید تھی وہ کم از کم تین گھنٹے سے پہلے اس اثنا غفیلی کیفیت سے باہر نہیں آئے گا۔ فلوس سے ”فارغ“ ہونے کے بعد میں جم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جم اپنی کھوپڑی پر پیرا شہد کھانے کے بعد پیچھے کو الٹا تھا اور جس دوران میں میں فلوس کو دینا دیا تھا وہ بے خبر کرنے میں مصروف تھا۔ جم نے سنبھل کر اپنی کن کی جانب جست لگا دی تھی۔ میرے ناکہانی حملوں نے چشم زدن میں ان کے ہاتھوں سے گنو چھڑا دی تھیں۔ فلوس تو اب کوئی ہتھیار اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا لیکن جم نے اس نوعیت کی جرات کر ڈالی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ میں جم کو اس جرأت پر محاف کر دیتا۔ یہ میری زندگی کا ٹاپ مشن تھا جس کا ایک ایک لمحہ گناچا اور انتہائی قیمتی تھا۔ جم کی جست کے ساتھ ہی میں نے بھی چھلانگ لگا دی۔ اس کا ہاتھ اور میرا پاؤں ایک ساتھ کن تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ اس طرح کہ سب سے نیچے کن زمین پر پڑی تھی اس کے دستانے پر جم کا ہاتھ اور جم کے ہاتھ پر میرا پاؤں جما ہوا تھا۔ اس غار میں کے نتیجے میں جم کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہونا ایک لازمی بات تھی۔ اس صورت حال کے سدباب کے لیے میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا۔

میرا ایک ہاتھ بڑی سرعت سے اس کے منہ پر آیا اور دوسرے بازو کو میں نے ایک موٹی رسی کے مانند اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور مارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلانے کے موڈ میں بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کے موڈ کی ایسی تیزی کر دی۔ میں نے بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو میکا کی انداز میں حرکت دی۔

اس کے منہ پر موجود ہاتھ ایک جھٹکے سے بائیں جانب گھوما۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پر گرفت کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ گناٹوں سے مشابہ ایک مخصوص دھیمی آواز ابھری۔ اگلے ہی لمحے جم کی گردن میرے بازو کی گرفت میں ڈھلک گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ نہ لگا کہ وہ دو تین گھنٹے کیا آنے والی دو تین صدیوں تک بھی اٹھنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی کو موت نے وجود کی قید سے رہائی دلا دی تھی۔

اللہ کا شکر تھا کہ ابھی تک بنگلے کے اندر موجود افراد کو میری اس ہڈی کا درد والی کاظم نہیں ہوسکا تھا۔ اگر انہیں ذرا سی بھی بھلک جاتی کہ گیت کے باہر کیا واقعات پیش آرہے ہیں تو اب تک وہ شہد کی مٹیوں کے مانند مجھ سے چٹ چٹے ہوتے۔

میں نے طوفانی رفتار سے جم اور فلوس کی جامہ تلاشی لی۔ ان کے لباس میں سے کوئی قابل ذکر شے برآمد نہ ہوئی سوائے چابیوں کے ایک گچھے کے۔ میں نے اس گچھے کو اپنے قبضے میں کیا اور ان کے بے سدھ جسموں کو کمینٹ کرکھن بازو کے عقب میں چھپا دیا۔ مذکورہ بازو بنگلے کے سامنے والے بیرونی حصے میں دیوار سے آٹھ فٹ دور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس بازو کی موٹائی دو فٹ اور اونچائی لگ بھگ تین فٹ تھی۔ میں نے اثنا فیصل فلوس اور جنم رسید جم کو اس طرح اس بازو میں فٹ کیا کہ اندر سے اور باہر سے ”دھ“ کی سی نگاہ میں نہیں آ سکتے تھے۔

ان کے غیر متحرک اور ”الاقفل“ ہوتے ہی دو گنو پر میرا قید ہو گیا۔ میں نے ایک لوڈ گن کو گیت کی بیرونی جانب گھاس میں چھپا دیا اور دوسری کو اٹھا کر اپنے بیک میں رکھ لیا۔ وہ بیک جس میں انواع و اقسام کی کارآمد اشیائے پہلے سے موجود تھیں۔ میں نے اس بیک کی اسٹریپ کی لمبائی کو سینٹ کر کے گردن کے اوپر سے گزرا کر اپنے بائیں پہلو میں لٹکا رکھا تھا۔ یہ ایک ایسی پوزیشن میں جمبول رہا تھا کہ میں یوتھو ضرورت اپنا دایاں ہاتھ اس میں ڈال کر اپنے مطلب

کی شے برآمد کر سکتا تھا۔ مجھے ایسے ہی بیک کی ضرورت تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے چونکا نظریے کے رد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سکون اور سکوت کا راج تھا۔ میں دے قدموں نیلے گیت کی جانب بڑھ گیا۔

گیت کچھوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دھلاک تھا۔ اسی لمحے وہ چابیوں کا گچھا میرے تصور میں گھوم گیا جو میں نے اثنا فیصل فلوس کے لباس میں سے برآمد کیا تھا۔ میں سانس روک کر بڑی احتیاط سے گچھے میں موجود چابیوں کو اس گیت کے تالے پر آزمائے لگا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے کامیابی حاصل ہو گئی۔ ایک چابی بڑی شرافت سے تالے کے سوراخ میں گھوم گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ چابی اس سوراخ کی اندرونی دنیا سے اچھی طرح شناسا ہو۔ وہ وہاں ڈھنکی ابھرتی رہی ہو۔ اس کی آمد و شد کو کوئی نئی بات نہیں تھی۔

چابی نے مختلف انداز میں گرد میں بدل کر ایک چکر مکمل ہی کیا تھا کہ ”کلیک“ کی مخصوص آواز کے ساتھ گیت کا تالا کھل گیا۔ میں ایک گہری سانس خارج کر رہے گیا۔

گیت کے راستے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے اب مجھے کوئی دشواری نہیں پیش آ سکتی تھی لیکن اندر قدم رکھنے سے پہلے چند باتوں کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری تھا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی رات کی تاریکی میں خطرناک بل ڈانکر کی ایک جوڑی بنگلے کے احاطے میں پہرا پڑی ہے جو کسی بھی ایسی کو دیکھتے ہی چیر بھاڑ کر رکھ دیتے۔ لیکن اپنی ڈیوٹی سنبھالتے ہی انہیں ”ڈز“ کراتا تھا لیکن آج وہ بنگلے پر پہنچنے سے پہلے ساتھ اشارہ پھیل چکی گیا تھا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا بل ڈانکر کی اس جوڑی نے آج ڈز نہ کیا ہو۔ کسی اور شخص نے لیکن کی جگہ یہ فریضہ انجام دے دیا ہوگا۔ ویسے بغیر ہڈی والے ہیٹ کے پارچہ جات اس وقت میرے بیک میں موجود تھے جنہیں میں نے زونا (ZONA) ماؤس ٹر سنوف کی مدد سے ”تیار“ کیا تھا۔ بل ڈانکر کو کنٹرول میں لانے کے لیے میں ان پارچہ جات کو کسی بھی وقت چارے کے طور پر آگے بڑھا سکتا تھا۔ بہر حال ان خونخوار گتوں کو نظر انداز کر کے بنگلے کے اندر قدم رکھنا موت کے دہانے میں کودنے کے مترادف تھا۔

دوسرا بڑا خطرہ رہی موٹے ہاتھن کی طرف سے قتل میں نے ہرشل حتان کے توسط سے کچھ وقت رہی والے بندروں میں گزرا تھا جس کی ایک دیوار میں بہت بڑی سلائیڈنگ وڈو نصب تھی۔ اس وڈو میں اندھا شیش لگا ہوا تھا جس کی مدد سے اس کمرے میں موجود کوئی بھی شخص بنگلے کے بیرونی گیت



سائل کے حصول کے سلسلے میں مجھے اتنی بار دھوکا ہوا تھا کہ اس کے انتہائی قریب پہنچ جانے کے باوجود بھی میرا ذہن ہزار قسم کے خدشات میں گمراہ ہوا تھا۔ میں منزل پر پہنچنے پہنچنے کسی سیٹ بیک کے سبب تشویش رہ جاتا۔ وہ بار بار مجھے حاصل ہونے سے رہ جاتی اور میں ہر دفعہ ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے حصول کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا لیکن یہ تلاش کے اس سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ چند دیواروں کے اس پار میری سائل موجود تھی اور اب میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے رہتا۔

میں رہائشی عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ یہ اس بنگلے کی شمالی سمت تھی۔ مین گیٹ سے لے کر یہاں تک میں ٹیلی فون کے تاریک تلاش میں رہا تھا لیکن وہ مجھے کبھی نظر نہیں آئے۔ مین گھنٹا ٹیلی فون کیبل انٹر گراؤنڈ رہائشی عمارت تک پہنچتے ہوں۔ بیرونی چار دیواری اور اس رہائشی حصے میں اچھا خاصا فاصلہ واقع تھا۔ اگر مذکورہ کیبل مجھے دکھائی دے جاتے تو میں سب سے پہلے انہی کو قطع کرتا۔ میں چند کلمات تک چونکا نظر سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر پیش قدمی کے لیے مطمئن ہو گیا۔ مجھے کسی بھی طرح بالائی منزل پر پہنچنا تھا جہاں ایک بیڈروم میں میری سائل جو خواب تھی۔ میں تھوڑی آگے کے توسط سے اتنی مرتبہ اس بنگلے میں آ جا چکا تھا کہ اس کی تقریباً تمام لوکیشنز اور مکانتیت مجھے ازبہ ہو چکی تھی۔ میں نے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ایک لمحہ رک کر حالات کا جائزہ لیا۔

مجھے اس بنگلے میں جن افراد کی طرف سے حراحت کا خدشہ تھا ان میں سے نیلے گیٹ پر متحین دو مسلح پہرے دار مسلح رہتے تھے اور نہ ہی کسی حراحت کے قابل۔ جم کو میں نے جہنم مکانی کر دیا تھا اور فلوس کم از کم تین گھنٹے سے پہلے ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹنے والا نہیں تھا۔ اب اس بلڈنگ میں صرف آٹھ افراد بچے تھے۔ چار زیریں منزل پر اور چار ہی بالائی منزل پر۔ نیچے رہی ہوئے تھے انہیں اس کا سیکورٹی ہرشل حنا ہرشل کا فریڈ اسٹینٹ اور سلوان جبکہ اوپر سائل 'ادجیو' عمر باروچی اور دو مسلح سیکورٹی گارڈز تھے۔ ناگہانی آفت زادلوں کو زور و ماسوں مگر کی کامل ڈونز نے "شعاع" بخش دی تھی۔ میری داہنی کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ بس یہاں کے لوگوں سے نمٹنا تھا اور سائل کو اپنے ہاتھ میں کرنا تھا۔ اس کے بعد میری کامیابی اپنے آخری مرحلے سے گزر جاتی۔ میں نے بالائی منزل تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے

میدان جنگ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ عمارت کے عقبی حصے میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر میں نے ظاہرہ دونوں آنکھیں بند کر لیں پھر تیسری باطنی آنکھ پر توجہ مرکوز کی۔ تھوڑی جتنی پہل گینڈ (PINEAL GLAND) فوراً سے چپتر متحرک ہو گیا۔ میں نے تیسری آنکھ کے سامنے سائل کے خال و خلو کا اہلکار کیا اور پلک چمکتے میں نے اس کے ماحول کو چھو لیا۔

وہ اپنے مخصوص بیڈروم میں گہری نیند کے حرے لوٹ رہی تھی۔ میں وہاں سے سیکورٹی گارڈز کے پاس چلا گیا۔ وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھے تاش کے چوں سے جی بہلا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اٹھا جہاں سے سائل والے بیڈروم کا دروازہ بڑے واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ ان دونوں نے باطنی گھنٹہ کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ تاش کی بازی کے دوران میں گا بے گا بے گناہ اٹھا کر کوریڈر کے پار سائل والے بیڈروم کے دروازے کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے آن ڈیوٹی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ میں انہیں ان کے حال میں "مست" سمجھ کر ادجیو عمر باروچی کے ماحول میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ اس کے سینے کا تنوع اس جانب اشارہ کرتا تھا کہ وہ اس وقت بلند آہنگ خراٹے لے رہا ہو گا لیکن انہیں اس میں ان بیماریاں آوازوں کو سننے کی صلاحیت سے محروم تھا لہذا میں بالائی منزل سے اتر کر نیچے آ گیا۔

سلوان اور ہرشل کا قرب اندام اسٹینٹ ایک ہی کمرے میں دو مختلف بیڈز پر دراز تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ یا تو وہ سو چکے تھے یا پھر سونے کی کوشش میں تھے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے انہیں انہی بیڈز پر بیٹھ کر ہاتھیں کرتے دیکھا تھا۔

میں نے تھوڑی آگے کے استعمال سے بخوبی اندازہ لگایا تھا کہ سائل والے کمرے کی چابی سلوان کے پاس ہوتی تھی یا پھر مین وہاں آ جاتا تھا۔ یہ دونوں حضرات ایک ہی روپ میں مختلف اوقات میں اس بنگلے پر ڈیوٹی دیتے تھے اور سائل کو اینڈ کرنا انہی دونوں کی ذمہ داری تھی۔ حرے کی بات یہ تھی کہ بنگلے کے دیگر ملازم انہیں ایک ہی سمجھتے تھے۔ کسے؟ یہ تفصیل میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس بنگلے کے دیگر ملازمین کی نظر میں سلوان کی ایک الگ حیثیت تھی جس کی اور اس وقت وہ اپنی اسی اصلی حیثیت کے ساتھ اس بنگلے میں موجود تھا۔ لیکن ایک سنگین حادثے کا شکار ہو کر ساتھ ساتھ اپنا ہتھیار بھی گھسیٹ گیا تھا لہذا ایک سو ایک فیصد امکان اس بات کا تھا کہ

سائل والے بیڈروم کی چابی سلوان کے پاس ہوگی۔ میں ایک لمحے کے لیے تذبذب میں رہا کہ پہلے سلوان سے نفٹ کر چابی حاصل کروں یا پھر بالائی منزل کا راستہ "سانف" کرنے کے بعد ادھر کا رخ کروں۔ جیسا کہ میں نے بیرونی گیٹ پر اپنی راہ میں بکھرے ہوئے کالج اور کانٹے جن دیے تھے۔ ذہن نے آخر الذکر سوچ کے حق میں ووٹ دیا۔

چابی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بوقت ضرورت میں دروازے کے لاک کو قازق سے بھی اڑا سکتا تھا۔ ویسے اگر حالات مہلت دیتے تو میں اس تالے کو کھول بھی سکتا تھا جیسے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی کا تالا کھول کر ہم نے وہاں قبضہ کر لیا تھا۔ فی الحال اس بنگلے میں اپنی راہ کو سیدھا کرنا زیادہ اہم تھا۔ بالائی منزل کی جانب موڑ کرنے سے پہلے میں نے ہرشل کے ماحول میں بھی جھانک لیا۔

ہرشل حنا، سنہری بالوں والا سوئینڈ بوئینڈ جوان دھن کا بڑا بچا تھا۔ اس نے عزم کر رکھا تھا کہ جب تک "بنگ مانی" وائٹ" کا آخری صفحہ نہیں پڑھ چکے گا، کرسی سے نکلے گا اور نہ ہی آنکھ سے آنکھ لگے گا۔ میں اس پر بار لفظ بھیج کر اپنے ماحول میں حاضر ہو گیا۔

میں نے بیک کھول کر اس میں سے ٹائیلوں کی مضبوطی رس نکال لی۔ رسی کی لمبائی اتنی تھی کہ یہ آسانی کی مدد سے بالائی منزل تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ دوسری منزل کے اوپر میں نے پانی کی ایک بیگی بنی دیکھی تھی جس میں سے پانی والے تین مضبوط پائپ نکلے ہوئے تھے۔ یہ پائپ پانی کو بیگی میں پہنچاتے تھے اور پھر بیگی میں سے پانی انہی پائپ کے راستے عمارت میں استعمال کے لیے نیچے آ جاتا تھا۔ ان پائپس میں سے ایک پانی کی آہ کے لیے تھا اور دوسرا شہ کے لیے جبکہ تیسرا پائپ سیدھا اوپر نکلتا ہوا تھا۔ اس کا سر انہی سے خاصا اوپر اٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا اس آزاد پائپ کا بنگلے میں کیا مصرف ہے البتہ میں نے اپنے ذہن میں اس کا موثر استعمال نکال لیا تھا۔ اس وقت اس پائپ کا آڈر اسری میرا تار گت تھا۔

میں نے ٹائیلوں کی مضبوطی کے ایک سرے پر چھنڈا مٹایا۔ اس چھنڈے کو کھینچ کر اس کی مضبوطی اور استحکام کا اندازہ لگایا اور اللہ کا نام لے کر اسے بالائی منزل پر پرتی ہوئی بیگی کی جانب اچھال دیا۔ یہ ایک مشکل اور وقت طلب کام تھا لیکن میں نے تیسری کوشش میں کامیابی حاصل کر لی۔ وہ چھنڈا بیگی کے اوپر نکلے ہوئے آزاد پائپ میں جا پھنسا۔ میں

نے رسی کو دو دو جھکے دیے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس رسی کی مدد سے بآسانی نیچے سے اوپر جا سکتا ہوں۔ ٹھیک دو منٹ بعد میں عمارت کی چھت پر تھا۔ اب میرے مشن کا سب سے خیزر طر شروع ہو گیا تھا۔ میں لمبی کے مانند بے پاؤں چلتے ہوئے چھت سے نیچے اتر آیا۔ سب سے پہلے مین سے میری "ملاقات" ہوئی۔ مین کا دروازہ بند تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی کہ باورچی کا کمرہ انہی سے ملحق تھا۔ میں کوئی آٹھ پیدائشی بچہ اس کمرے میں پہنچ گیا۔

ادجیو عمر باروچی بڑے حرے سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے تھوڑی آگے کے توسط سے اس کے سینے کے تنوع کو دیکھ کر بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ باورچی غفلت کی نیند میں تھا لہذا میں بے دھڑک اس کے پاس پہنچ گیا پھر اس پر کام کرنے لگا۔

میں صرف اتنا جانتا تھا کہ اگر بنگلے میں طوفان بھی آجائے تو باورچی کی آنکھ اسی طرح کھلی رہے۔ میں نے گردن پر واقع مخصوص رگ کو مسل کر اسے دو گھنٹے کے لیے دنیاو مافیاسے بے خبر کر دیا۔ پھر اس کے کمرے سے خاموشی کے ساتھ نکل آیا۔

باورچی کے کمرے اور سائل والے بیڈروم کے درمیان ایک کوریڈر تھا اور اسی کوریڈر میں سیکورٹی گارڈز والا کمرہ بھی واقع تھا۔ کوریڈر کے اختتام پر وہ چکر دار زینہ تھا جو بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا وسیلہ بنا ہوا تھا۔ میں گارڈز والے کمرے کے سامنے سے گزرے بغیر سائل والے بیڈروم تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس منزل پر ٹھننے کے لیے یہی دو افراد بچے تھے۔

میں جتنا اندازہ سے آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک خلاف توقع بات ہوگی۔ اس کوریڈر میں دائیں بائیں کی دیواروں پر فریم شدہ تصاویر اور خوبصورت مناظر آویزاں تھے۔ تانہیں میرا کندھا لگا یا خود ہی ایک فریم شدہ تصویر نیچے گرئی۔ ایک زوردار چھتا کے کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ فریم کا شیش ٹوٹنے کی مخصوص آواز تھی۔ میں کوئی قدم اٹھانے کے باے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سیکورٹی گارڈز والے کمرے میں سے کسی نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سچم! لگتا ہے اس خبیث بڈھے نے آج پھر بکن کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی لمبی ادھر اپنی کارروائی دکھا رہی ہے۔"

اس شخص کا اشارہ واضح طور پر ادجیو عمر باروچی کی طرف تھا جسے سچم کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں تمہاری

بات سے اتفاق کرتا ہوں! رونالڈ! اسمتھ کو اب ریٹائرمنٹ لے لینا چاہئے۔ ہم سیکورٹی کے معاملات کو دیکھیں یا پھر کلک اسمتھ کی اسٹیشن کرتے پھر ہیں۔ اب بتاؤ بھلا کچن کا دروازہ کھولنا بند کرنا بھی کسی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ایک ایسا بگڑا جہاں کوئی انسان مجھے نہ قصور نہیں کر سکتا وہاں ایک عیار ملی ہے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب اگر یہ مجھے نہیں نظر آئی تو میں پہلی فرمت میں اسے شوٹ کر دوں گا۔

”نچم نامی یہ سیکورٹی گارڈ خاصا باتوں کی گنتا تھا۔ رونالڈ نے کہا۔ ”نچم! تمہیں سیکورٹی پہنی جانے کے بجائے سیاست میں جانا چاہئے تھا۔ تم اچھی خاصی جذباتی تقریر کر لیتے ہو۔“

”نچم کی ہنگامی بھری آواز ابھری۔ ”رونالڈ! تم کچن کو دیکھنے جا رہے ہو یا میں جاؤں؟“

”تم ہی جاؤ تو اچھا ہے۔“ رونالڈ نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس وقت تم اس شخص ملی کا اچھا خاصا ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ مگر میں ساتھ لیتے جاؤ۔ کیا تباہ نظری آ جائے۔ اس صورت میں تمہیں اپنے ارادے کی تکمیل کرنے میں آسانی رہے گی لیکن.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لمبے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن..... شوٹنگ والا شوق صرف ملی تک ہی محدود رہنے دیتا۔ نہیں بے چارے اسمتھ کو بھی نہ اڑاؤ الٹا۔“

”ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔“ نچم نے بیزار سے کہا۔ ”لاؤ میری گن پکڑو۔ میں کچن کی طرف ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔“

میں ریڈ الارٹ ہو گیا۔ نچم اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جانے والا تھا اور راستے میں میں کھڑا تھا۔ میں نے چشم زدن میں فیصلہ کیا اور اس سے پہلے کہ نچم کو ریڈور میں قدم رکھتا، میں اگلے پاؤں کچن تک پہنچا۔ اس کا دروازہ کھولا اور فوراً سے چشمز اسمتھ والے کمرے میں گھس گیا۔ اسی لمحے کو ریڈور میں ہماری بوٹوں کی آواز ابھرنے لگی۔ نچم نامی وہ سیکورٹی گارڈ کمرے سے نکل آیا تھا۔ میں سانس روک کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ دروازے کو میں نے نیم وار ہنے دیا تھا۔ نچم کو فکڑا کرنے کا منصوبہ اچانک ہی میرے ذہن میں ترتیب پا گیا تھا۔

یہ ممکن نہیں تھا۔ کو ریڈور کے فرش پر گرا ہوا فریم اور اس فریم کا ٹوٹا ہوا شیشہ نچم کی نگاہ میں نہ آئے۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور تھڑا آئی کا شکر کھول کر نچم کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اسی ٹوٹے ہوئے فریم کا محاسبہ کر رہا

تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے ساتھی گارڈ کو غلط کرتے ہوئے کہا۔

”رونالڈ! یہ شیشہ ٹوٹنے کی آواز تھی۔ ایک فریم دیوار سے نیچے گر گیا ہے۔“

”اوہ!“ رونالڈ کی دھیمی آواز جھک جی تھی۔ ”بکھرے ہوئے کالج کو اچھی طرح سنبا ل کر سینا اور ہاں..... کچن کا کیا حال ہے؟“

وہ دونوں مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی ہا بھی گفتگو کو سننے کے لیے کسی تھڑا بیز یعنی باطنی کان کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ظاہر وہ دونوں کان اس کام کے لیے بہت کافی تھے۔ رونالڈ کے سوال کے جواب میں نچم نے کہا۔ اس کی آواز میں آکٹا بہت نمایاں تھی۔

”ارے یار! کچن کی طرف ابھی میں گیا ہی کہاں ہوں۔“

”مگر نہیں گئے تو پہلے ادھر ہی جاؤ۔“ رونالڈ نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”کالج سینے کے لیے تمہیں کچن ہی سے کچھ ملے گا اور ممکن ہے اس طرح اس بد بخت ملی سے بھی ملاقات ہو جائے جسے شوٹ کرنے کی تمنا تم اپنے دل میں رکھتے ہو۔“

”اس ملی کے حوالے سے تو تم میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہو رونالڈ!“

”تم ملی کے پیچھے پڑ جاؤ۔ میں تمہارا اچھا چھوڑ دوں گا۔“

رونالڈ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے نچم کو ریڈور میں چھوڑ کر رونالڈ کے ماحول میں جھانگ لگا دی تاکہ یہ تو معلوم ہووے کمرے کے اندر بیٹھا اس قسم کا فلسفہ کیوں بھارتا رہا ہے۔ وہاں پہنچے ہی مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ یہ حیرت رونالڈ کی عیاری کے سبب تھی۔

میں نے دیکھا وہ تاش کے کیم میں ”چینگ“ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ فریم ٹوٹنے سے پہلے وہ دونوں بازی جمائے بیٹھے تھے۔ نچم اپنے ہاتھ کے کارڈز ہیں بھیل پر چھوڑ کر ملی کو حیرت ناک سزا دینے کے لیے کمرے سے نکلا تھا۔ اگرچہ اس نے کارڈز کو الٹا کر رکھا تھا لیکن اس کی غیر موجودگی میں رونالڈ بڑی صفائی سے باہمی بات چیت کے دوران میں اس کے پتے تبدیل کر رہا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا۔ کیم میں نچم کی پوزیشن اس سے زیادہ مضبوط ہے اور وہ بازی بیٹنے کے لیے ”یہ ہیرا ابھیری“ کر رہا ہے۔ میں نے رونالڈ اور اس کی دیبا بازی پر ہنست بھینچی اور اپنے ماحول میں لوٹ آیا۔

نچم کے ہماری قدموں کی آواز اس کمرے سے تک پہنچی پھر

کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے دانستہ کچن کا دروازہ کھول دیا تھا تاکہ ان میں سے جو کوئی بھی ادھر کارخ کرنے میں اسے آسانی شکار کر سکوں۔ نچم نے کچن میں سے کچھ لے کر کالج کے کلوں کو سمیٹا پھر ملی کو کھڑی کھڑی سناتے ہوئے کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کھڑی کھڑی میں ملی کے علاوہ ایک بلا بھی شامل تھا جو اسمتھ کے نام سے اس وقت میرے قریب ہی دنیا دانیسا ہے۔ خبر پڑا تھا۔

نچم جب اپنے کمرے کی طرف واپس جانے لگا اور اسمتھ کے کمرے کے دروازے کے پاس سے گزرا تو میں نے ملی ہی کے انداز میں مخصوص آواز نکالی۔ ”میاؤں.....!“

اس کے ساتھ ہی میں آنکھیں بند کر کے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ ملی کی ”میاؤں“ سن کر کھٹکا اور پلٹ کر نیم دروازے کی طرف دیکھنے لگا پھر اس کے لبوں سے ایک آہن زود بڑا ہاتھ خارج ہوئی۔ اس کا انداز خودکامی کا سا تھا۔

”یہ گدھے کی بچی یہاں کیا کر رہی ہے؟“

نچم بڑی ہی بے ہودہ بات کر رہا تھا۔ وہ شیر کی خال کو گدھے کے خاندان سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ کرنے کے لیے میں نے پھر وہی مخصوص آواز نکالی۔ ”میاؤں۔“

اس ”میاؤں“ نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ دھچکا انداز میں نیم اور دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا وہ بڑی راہزاداری سے ملی پکڑنے کی خواہش رکھتا ہے۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا، ملی پکڑنے کا فن ہر ایرے ہر کمرے کو نہیں آتا۔ اگر کوئی اتنا بڑی شوقین ذکاوت اس کام میں ہاتھ ڈال دے تو اسے اپنے ہاتھوں اور چہرے کا حشر بھونا پڑتا ہے پھر وہ کافی عرصے تک کسی کو اپنا چھلپا ہوا چہرہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

نچم نیم اور دروازے کے قریب پہنچا اور ہماری بوٹ کی مدد سے دروازے کو پورا کھول دیا۔ میں ایسی جگہ پوزیشن لیے کھڑا تھا کہ دروازہ کھلنے سے مجھے ایک محفوظ اوٹ میسر آگئی۔ پھر مجھے ہی نچم نے کمرے میں قدم رکھا، میں نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

میرا ایک ہاتھ بڑی سرعت سے اس کے منہ پر آیا تاکہ وہ کوئی عجیب و امیر یا تھیم و سمیر آواز خارج نہ کر سکے۔ دوسرے ہاتھ نے اس کی گن پر جھینٹا مارا اور گن اس کے قابو سے نکل کر دور جا گری۔ وہ اس ناگہانی آفتاد سے اس قدر بوکھلا گیا کہ اس نے میرے ہاتھ پر کانٹے کی کوشش کی۔

یہ ایک خالصتاً زنانہ حرکت تھی۔ میں نے اس کا بھرپور

مردانہ جواب دیا۔ گن کی طرف مصروف کار ہاتھ فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے اس بازو کو نچم کی گردن میں ڈال کر اپنی جانب جھٹکا دیا پھر منہ پر تھے ہوئے ہاتھ کو ہاں سے ہٹا لیا۔ کم سخت نے بڑی بے دردی سے میرے ہاتھوں کا ہاتھ کی ہتھیلی پر کٹ لیا تھا۔ میں نے متاثرہ ہاتھ میں جلن محسوس کی۔ وہ میری گرفت میں بری طرح بھل رہا تھا۔ اس کی پہلی اور آخری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح خود کو آزاد کرالے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آج اس کی..... کسی کی کوئی کوشش کا سیاب ہوںے دیتا۔

میں نے حالات پر کنٹرول رکھتے ہوئے گرفت کو تھوڑا ڈھیلا کیا اور غراہٹ بھری آواز میں اس کے کان کے نزدیک سر گھسی کی۔

”ساحل والے بیڈروم کی چابی کس کے پاس ہے؟“

”کون ساحل؟“ وہ پتھری پتھری دھتت زدہ آواز میں بولا۔

”میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو اسی منزل کے ایک بیڈروم میں شانہ بیداری ایسی زندگی گزار رہی ہے۔“

میرے لہجے کی فحاشی کچھ لمبہ پڑتی تھی۔ ”اور جس کی گمرانی پر تم دونوں مامور ہو۔“

میں نے اپنی آواز کو اتنا دھیمار کھا تھا کہ اس کمرے سے باہر کوئی شخص ہمارے درمیان ہونے والی مکالمے بازی کو نہ سن سکے اور..... جو شخص اس کمرے میں موجود تھا وہی الحال سننے اور سنانے کی منزل سے بہت دور پہنچا ہوا تھا۔

میرے انداز کو دیکھتے ہوئے نچم کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ اس کی گردن کچھ اس طور میری گرفت میں جکڑی ہوئی تھی کہ اگر وہ بجائے کے لیے اور میں منہ آ کے لیے ذرا سی کوشش بھی کرتا تو اس کی گردن کا کڑا کا نکل جاتا..... اور یہ فحاش حقیقت کسی سنگین چوبیس کے مانند اس کے ذہن نے قبول کر لی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی سلامتی کے لیے کسی قسم کی ہم جوتی کارسک نہیں لے سکتا تھا۔

اس کی خفرائی ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی۔ اس خوفزدہ آواز میں ایک معصوم سا استدھار تھا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں نچم اور رونالڈ دو ماحولوں کا معقول واحد پرائیویٹ باپ ہوں۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”یہ تمہارا پہلا اور آخری سوال ہے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اگر اب لب کشائی کی کوشش کی تو ب رہیں گے اور نہ ہی آئے گی کیا۔“

اتنا کہہ کر میں نے بازو کے ٹھیکے کو ٹانگ کیا اور سنگین الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”میں نے پوچھا ہے ساحل والے بیڑہوم کی چابی کس کے پاس ہے؟“

اس کا جواب سننے کے لیے میں نے اس کی گردن کو ڈرا سی ”آسانی“ فراہم کی تو وہ دہشت بھری آواز میں بڑبڑایا۔

”سلوان.....“

”تم اسی سلوان کی بات کر رہے ہو نا جو زیریں منزل کے ایک بیڑہوم میں سویا ہوا ہے۔“ میں نے تصدیق کی خاطر سفاک لہجے میں دریافت کیا۔ ”جس کے سر کے بالوں میں ایم (M) نمودار ہو چکا ہے اور اگرے رنگ کی ایک گاڑی میں سوار ہو کر یہاں آتا جاتا ہے؟“

میری فراہم عنکبن معلومات نے اس کی دہشت کو ہزار گنا بڑھا دیا۔ دوسرا سہ لہجے میں گویا ہوا۔ ”آں..... ہاں۔ اسی سلوان..... کی بات کر رہا ہوں۔“

”اچھا پیارے! تم سے پھر بھی ملاقات ہوگی۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے بازو کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنادیا۔

میری اس حرکت سے سمجھ کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ اس کی حالت ایسی ہوئی جیسے کسی زندہ شخص کو قبر میں دفن کر دیا جائے۔ آسکین کی عدم فراہمی کے باعث وہ بری طرح ہاتھ پاؤں جھٹکتے لگا۔ میں نے چند سیکنڈ تک اسے اسی حالت میں دبوچے رکھا۔ جب اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی تو میں سمجھ گیا وہ اب گیا کہ تب گیا۔

میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے مجھے نہایت ہی اہم معلومات فراہم کی تھیں۔ میں اس کی جان کا دشمن کیوں بن بیٹھتا؟ اس کی جان نہ لینے کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں اسے اپنے خلاف کوئی مذموم کارروائی کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ گرفت ڈھیلی ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔ سانس قدرے سنبھلی تو میں نے گردن کی مخصوص رگ کو سہلا کر کچم کو بھی اسمتھ کے پاس پہنچا دیا۔

وہ دونوں پہلو پہ پہلو اتنے اتفاق سے لیے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ تعویذی دیر پہلے ان میں سے ایک دوسرے کے خلاف کسی تیسرے کے سامنے نہ ہرا گل رہا تھا۔

کچم کو بہر خود فراموشی کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب اس منزل پر صرف ایک ہی شخص بچا تھا جس سے منٹنے کے بعد مجھے زیریں منزل کا رخ کرنا تھا۔ یا پھر براہ راست ساحل والے بیڑہوم کی طرف بڑھنا تھا۔ میں

باقی ماندہ رونا لٹا کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

میں نے کوئی ڈر کا ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ رونا لٹا اپنے کمرے سے نکل کر اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اگر میں اس کے ماحول میں ہوتا تو اس کے انخلا سے قبل از وقت آگاہ ہو سکتا تھا لیکن اب اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ نکل ہی آتا تھا تو کیا ہو سکتا تھا۔ جہاں انہوں سے نمٹنا تھا ایک رونا لٹا بھی تھی۔

رونا لٹا مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بری طرح ٹھک گیا۔ مگر اس کے ہاتھ میں نظر آرہی تھی۔ وہ نہایت ہی عنکبن اور نازک لمحات تھے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ فائرنگ کر کے مجھے گولیوں کی بوچھاڑ سے زخمی کر دیتا۔ وہ لٹکا کر مجھ سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا..... کون ہو تم؟ کہاں سے اور کیسے آئے ہو؟ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں نے سیکنڈ کے لاکھوں حصے میں مابقی فاصلے کو نا اوار ایک ہنگامی فیصلے کے تحت جیش قدی کے لیے تیار ہو گیا لیکن اسی وقت رونا لٹا نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں بیٹھا کر رہ گیا۔ وہ جو..... بہت کچھ کر سکتا تھا اس نے کچھ کیا بھی تو انتہائی شرمناک۔ وہ اپنے قدموں پر چلتا اور کمرے کی جانب دوڑ لگا دی۔

وہ اس وقت کمرے کے سامنے ہی کھڑا تھا لہذا ایک سیکنڈ میں وہ اس کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپک گیا۔

میں نے جب اس کمرے میں قدم رکھا تو رونا لٹا ایک انتہائی خطرناک چال چلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے سائرن کی مخصوص آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ آواز عمارت کی زیریں منزل کی طرف سے آرہی تھی۔ بھینا رونا لٹا نے اپنے کمرے میں نصب کوئی ایئر جیسی مین داکر زیریں منزل والوں کو بالائی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

میں نے خوخنو از نظر سے رونا لٹا کو گھورا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے مجھے مگرے کے نشانے پر رکھ لیا اور نہایت ہی سرد لہجے میں بولا۔ ”پینڈر زاپ!“

”پینڈر زاپ“ کے اس حکم کے پیچھے سائرن کی مخصوص آواز گونج رہی تھی پھر اس آواز میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ نیچے سے کوئی اوپر کی خبر گیری کے لیے آ رہا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادری تن گئی۔

بہت سوچا تھا..... میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ یہ مشن بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے یا پے ٹیمیل کو پہنچ جائے لیکن ایسا ہو سکا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ میں دشمنوں کی صفوں میں قدم رکھوں اور وہاں امن و امان کی صورت حال قائم رہے۔ ہنگامہ تو ہونا تھا اور بڑھ چڑھ کر ہونا تھا۔ سائرن کی مخصوص آواز کسی فحارے کے مانند ایک خون ریز ہنگامہ آرائی کا اعلان کر رہی تھی۔

میں اس داہیات صورت حالات سے منٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔ میرے فعال ذہن نے سیکنڈ کے لاکھوں حصے میں ایک لانچر مل بنالیا تھا۔ میں نے رونا لٹا کے حکم پر ”پینڈر زاپ“ ہو کر بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر تیسری آنکھ کے در پیچے سے سلوان کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ ایسے بے فکرے لمحات نہیں تھے کہ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر غرر آئی کی بازی گری میں مصروف ہو جاتا۔ وہ میری زندگی کے عنکبن ترین لمحات تھے لیکن میرے اطمینان کا بھی ایک غوس سبب تھا۔ مجھے ایک سواک کی فی مدیقین تھا کہ رونا لٹا مجھ پر فائر نہیں کرے گا۔ چند لمحے پہلے اس نے بڑی فراخ دلی سے جس بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا وہ میری یادداشت میں نقش تھا۔

ہم دونوں راہ داری میں ایک دوسرے کے رو بہ رو تھے۔ میں نہتا تھا اور وہ مگر پردار۔ اگر وہ چاہتا تو ایک برست فائر کر کے میرے وجود کو جھٹلی میں بدلنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن وہ کوری ڈور سے اس طرح دم دبا کر بھاگا تھا جیسے اس نے اچانک اپنے سامنے کسی خوف ناک عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

اس نے کمرے میں پہنچنے ہی کوئی خفیہ مین داکر زیریں منزل والوں کو بالائی منزل پر موجود خطرے سے آگاہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں سائرن کی مخصوص آوازیں کر نیچے سے کچھ لوگ اوپر کی طرف آرہے تھے، یہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں انہی کی تھیں۔ رونا لٹا نے مجھے مگرے پوائنٹ پر رکھ کر یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ مجھے شوٹ نہیں کرے گا بلکہ وہ ان لوگوں کا انتظار کرے گا جن کو ادا مرتوجہ کرنے کے لیے اس نے سائرن کو بیدار کیا تھا۔

میری تیسری آنکھ نے سلوان کے ماحول میں قدم رکھا تو وہ مجھے چکر دار بنے پر نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہرشل حنان کا فریبا سنسٹن بھی تھا۔ وہ دونوں بڑی سرعت کے ساتھ نیچے سے اوپر پہنچنے کی کوشش میں دکھائی دیے، گویا رونا لٹا کی بری پکار پر انہوں نے لبیک کہہ دیا تھا۔

جب انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ مگر اس کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ ڈرانے اور دھکانے کے لیے اٹھائی گئی ہے تو وہ ایک لحاظ سے اندر سے شیر ہو جاتا ہے۔ میں تو اس وقت آنکھیں بند کیے شیر بن رہا ہوا تھا۔ رونا لٹا میرے اس استحکام اور اطمینان کو دیکھ کر بھینسا حیرت زدہ ہو رہا ہو گا لیکن میرے پاس اس کا استغاب دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں باطنی آنکھ کی انگلی تھا سے چکر دار بنے میں چکر رہا تھا۔

سلوان آندھی اور طوفان کی رفتار سے بالائی منزل پر پہنچا پھر کوری ڈور میں قدم رکھتے ہی وہ ساحل والے بیڑہوم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس ہنگامی صورت حال میں سب سے پہلی فیت ساحل کوری تھی، میری جان تنہا اس بیٹلے میں دی وی آئی پی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی بھی ایئر جیسی کی صورت میں سب سے پہلے اسی کو چپک کیا جاتا اور..... ایسا ہی ہو رہا تھا!

فریہ فحس دوڑتے ہوئے سیکورٹی گارڈز والے کمرے کی جانب آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک پھل واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ میں اس وقت کمرے کے اندر رونا لٹا کے سامنے ”پینڈر زاپ“ کھڑا تھا لہذا وہ فریہ فحس کوری ڈور میں مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے جیسے ہی مذکورہ کمرے میں قدم رکھا..... اور کچھ دیکھنے کے قابل ہوا میں نے اسے کسی قابل نہ چھوڑا۔

میں غرر آئی کے توسط سے لمحہ بے لمحہ اسے مانٹر کر رہا تھا۔ وہ کمرے میں پہنچ کر جیسے ہی میری ریخ میں آیا میں برق رفتاری سے مڑا اور فضا میں بلند ہوتے ہوئے میں نے ایک خطرناک فرنٹ فلائنگ کلک چلا دی۔

اس غیر متوقع صورت حال نے فریہ فحس کو دہرے خطرے سے دوچار کر دیا۔ وہ میری دھواں دھار کلک کا متفاہینے سے چاکر پیچھے کو الٹا۔ میں کلک کی ٹیمیل کے ساتھ ہی زمین پر گر کر اور روٹنگ کرتے ہوئے ایک سمت کو نکل گیا۔ مجھے اس کام میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اسی لمحے رونا لٹا کی مگرے نے اپنا دماندہ کھول دیا۔ میری اچانک سرگرمی نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ میں جس شرافت سے آنکھیں بند کیے پینڈر زاپ کھڑا تھا شاید اس سے رونا لٹا اس غلطی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی مگرے کے سامنے شکست تسلیم کرتے ہوئے بے بسی سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ میں نے دفعتاً فریہ فحس پر ایک کیا تو اس کی غلطی کا فور ہو گئی اور اسی بوکھاٹ میں اس کی مگرے چل گئی۔ فریہ فحس پر ایک قیامت کی ٹوٹ پڑی۔ فائرنگ کی مخصوص آواز نے ہر سکوت فضا کا سینہ چیر کر

دکھ دیا اس کے ساتھ ہی رونالڈ کی گن سے نکلنے والی گولیوں نے فربہ اندام شخص کے بدن میں متعدد جھنڈ پنا دیے۔ رونالڈ نے بے ساختہ مجھے نشانہ بنانے کی غلطی کی تھی۔ میں سرخ رو لنگ کے سبب اس کے نشانے میں نہ آسکا جس کا خمیازہ فربہ شخص کو بھگتنا پڑا۔ یہ فیاضہ اتنا ہماری تھا کہ اغلب امکان یہی تھا وہ زندگی کی بازی ہار گیا ہوگا۔ اسٹریٹ فائرنگ بہت خطرناک ہوتی ہے۔

میں رونالڈ کی جانب سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا، اب تو وہ خاص طور پر مجھے ڈھونڈ کر فائرنگ کا نشانہ بنائے گا۔ میں نے ایک خاص لائن آف ایکشن کے تحت اس چیز کی سمت رو لنگ کی تھی تو خودی دیر پہلے جہاں رونالڈ اور نجم بیٹھے تاش کے چوں سے دل بہلا رہے تھے۔ میری عقاب نگاہ نے سینکڑوں دس ویں حصے میں تازیانہ کی میزروالی دیوار پر ایک سوچ بورڈ ڈھونڈا تھا۔ شاید اسی بورڈ پر موجود کسی سوچ کوڈ ہا کر رونالڈ نے چلی منزل والے سائرن کو بیدار کیا تھا۔ سائرن کی مخصوص منوس آواز مسلسل ایک سارخ خراش ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اسی بے ہودہ آلے کا ”گلابا نا“ ضروری تھا ورنہ اس پوش رہائی علاقے کے ایک ایک کین کو پتا چل جاتا کہ جزل ہائرل کے بنگلے میں کوئی خطرناک حادثہ کل گیا ہے۔

اس بنگلے کے گیٹ پر تین مسلح سپاہیوں سے داروں میں سے ایک نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جزل ہائرل کی رہائش گاہ ہے اور یہ معلومات فراہم کرتے ہوئے فلوں نامی اس سکیورٹی گارڈ کی گردن روغت سے اڑ گئی تھی۔ جیسے وہ خودی جزل ہائرل ہو۔ یقیناً جزل ہائرل کوئی توپ قسم کی چیز ہوگا جس کا بنگالان دلوں کی موتیے ہاتھن کے تصرف میں تھا یہ کوئی فرضی کردار بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال جزل ہائرل کے ذکر پر گردن اکرانے اور سینہ پھلانے والا فلوں اس وقت دنیا دہانہا ہے بے خبر بنگلے سے باہر حفاظتی بارہ میں اپنے جہنم مکانی ساتھی جم کے ساتھ بڑا تھا۔

میرے عقب میں پہنچنے ہی میں نے سوچ بورڈ کو ایک زوردار جھانپڑ کر دیکھا۔ میری یہ کوشش خاصی کامیاب رہی۔ سائرن کی مکرہ آواز یک لخت بند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کمرے میں بھی تاریکی چھا گئی۔ میرے اضطرابی جھانپڑ نے اس کمرے کی لائٹ بھی آف کر دی تھی۔

میرے لیے یہ بڑی اطمینان بخش صورت حال تھی۔ اب رونالڈ مجھے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ لگ کر ایک طرف کھٹکنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی

آنکھیں بند کر کے رونالڈ کے ماحول میں پہنچ گیا۔ یہ ماحول تاریکی سے نکل کر نیم تاریکی میں آ گیا تھا۔ کوری ڈور کی لائٹ ایک خاص زاویے سے کمرے کے اندر پہنچ رہی تھی جس نے وہاں کچھ اجالے کا سا ساں پیدا کر دیا تھا۔

رونالڈ کو میں نے اپنی تلاش میں ادھر ادھر گردن گھماتے ہوئے پایا۔ میں غیر محسوس انداز میں کھینکے ہوئے تقریباً اس کے عقب میں پہنچ گیا تھا لہذا اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے امید تھی اب وہ پہلے کی طرح بے دریغ فائرنگ نہیں کرے گا البتہ، اگر میں اس کے سامنے موجود ہوتا تو اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ رونالڈ نے پہلے بوکھا ہٹ میں فائرنگ کی تھی چنانچہ اس کی ایک اضطرابی غلطی نے ہرشل جنان کے اسٹنٹ کو کوری ڈور کے فرش پر لبا لبا دیا تھا۔ اس کی زندگی کے امکانات سفر کے برابر تھے۔ رونالڈ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں اور کمرے کے نیم تاریک ماحول میں حاضر ہو گیا۔

اسی لمحے باہر کوری ڈور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سلوان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ساحل والے بیڈروم کی طرف سے اطمینان باکرہ ادھر چلا آیا تھا۔ میرا بڑا بیچ چاہ رہا تھا ذرا جھانک کر تھڑائی کے توسط سے ساحل کی خبر لوں لیکن ان جھلکحات میں میں آنکھیں بند کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے اندازے کا ثبوت مل گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہی کوری ڈور میں سلوان کی آواز ابھری۔ یہ آواز میں نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ سلوان نے اس کمرے کے دروازے کے سامنے، کوری ڈور میں فربہ اسٹنٹ کی لاش تھینا دیکھی تھی اسی لیے وہ بھجھا ہٹ آئیز انداز میں چنچا تھا۔

”وہاٹ از گونگ آن؟“

یہ سوال اس نے رونالڈ اور نجم وغیرہ سے کیا تھا کیونکہ وہی دونوں بالائی منزل کی رکھوالی پر مامور تھے، نجم تو اس وقت ادھیڑ عر باورچی اسمتھ کے پہلو میں اثنا غفل پڑا تھا۔ وہ سلوان کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ رونالڈ اس کام کے لیے آ رہا تھا لیکن میں رونالڈ کی زبان کھلنے سے پہلے ہی متحرک ہو گیا۔ اس صورتِ حالات میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں اس وقت رونالڈ کی پشت پر لگ بھگ تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ میں نے کچلی کی سی سرعیت سے شارٹ

اسٹپ کے ساتھ ایک بھر پور سائیڈ کلک چلا دی۔ میرے دائیں پاؤں کا بلیڈ رونالڈ کی کمر پر دونوں بازوؤں کے جوڑ کے عین وسط میں لگا۔ اس ناگہانی افتاد نے اسے پاؤں سے نکال دیا۔ اس نے ایک طویل ”اون“ کی آواز خارج کی اور نفا میں پٹی پرواز کرتے ہوئے، کھلے ہوئے دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔

اس نے سلوان کے سوال کے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے پاؤں کی زوردار ضرب نے اس کے جواب کو ایک بہم لائینی طویل ”اون“ میں بدل دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے کے اندر کمرے کے فرش پر گرا پڑا فرش سے کمرے کے نیچے میں اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ برآمد ہوئی۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ اس کا چہرہ پڑا فرش سے متصادم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی پوزیشن بدلی اور بڑی پھرتی سے لپک کر ایک تاریک گوشے میں چلا گیا۔ یہ مقام دروازے کے فربہ ہی ایک پہلو میں دیوار کے ساتھ تھا۔ اوندھا پڑا رونالڈ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدم یک دم رک گئے۔ یہ رکاوٹ دروازے کے سامنے کوری ڈور میں ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور تیری آنکھ کے قفل رکنے والے کے ماحول میں پہنچ گیا۔ سلوان شش در کڑا کبھی اندر اور کبھی باہر دیکھ رہا تھا کہ کمرے کے اندر رونالڈ فرش پر اوندھا پڑا ہے کسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اور باہر کوری ڈور میں فربہ اسٹنٹ کی بے گوردن لاش بے کسی کا اشتہار بنی ہوئی تھی۔

سلوان کے حلق سے دشت زدہ سی آواز خارج ہوئی ”رونالڈ! وہ... یہ سب کیا ہے؟“

میں نے سلوان کی آواز پر اپنی سماعت کو مامور رکھتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ رونالڈ نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ”وہ... وہ اندر ہے!“

”وہ کون؟“ سلوان نے تھکسا نہ انداز میں احتضار کیا۔ ہرشل جنان کی طرح سلوان بھی اس بنگلے میں ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بھی رلی کے قابل اعتماد آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ دونوں سکیورٹی گارڈز سے جواب طلبی کا اسے اختیار حاصل تھا۔

گاڈ رونالڈ نے زمین پر پڑے پڑے پھنسی ہوئی آواز میں بتایا ”میں اس بندے کی بات کر رہا ہوں جو کمرے کی تاریکی میں کہیں چھپا ہوا ہے۔“

یہ بات وہ کھڑے ہو کر بھی کر سکتا تھا لیکن اچانک پیش آنے والے حالات نے اسے اس قدر بوکھا ہٹ میں جٹا کر دیا تھا کہ اسے اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے سہجے ہوئے انداز میں سلوان کو بتایا۔

”اسی کم بخت نے فائرنگ کر کے ابراہام کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس کمرے کی لائٹ اور سائرن کا سوچ بھی اسی نے آف کیا ہے۔ تم دھیان سے اندر قدم رکھنا، وہ بہت ہی خطرناک شخص ہے۔“ آخری جملہ اس نے مشورہ دینے والے انداز میں ادا کیا تھا۔

میں رونالڈ کی مکاری پر ایش کر اٹھا۔ وہ فربہ اندام اسٹنٹ کی ہلاکت کو میرے کھاتے میں ڈال رہا تھا حالانکہ ابراہام نامی اس فربہ شخص کو رونالڈ کی فائرنگ نے موت کی وادی میں پہنچایا تھا۔ وہ ایک جدی پشٹی دروغ گو اور فربہ کار شخص تھا۔ اس سے پہلے میں تھڑائی کی مہربانی سے اسے نجم کے چوں کے ساتھ چینگ کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ بہر حال، اس کی الزام تراشی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے اپنے ہاتھیں ہاتھ کو اسی پہلو میں لگے ہوئے بیگ کی جانب بڑھا دیا۔ وہ بیگ جس میں انواع و اقسام کی ”دھن نمٹ“ اشیاء بھری ہوئی تھیں۔ میری حتی الامکان یہی کوشش تھی کہ فائرنگ سے گریز کروں میں نے ہاتھیں ہاتھ کو بیگ کے اندر گھمایا اور اندازے کی مدد سے اسے کمرے کے کمرے کے باہر نکال لیا۔ یہ مقام تر شا جگہ... رہا ریشون کے علاقے میں واقع ایک بہت بڑے شاہک سینٹر ہیروڈ (HEROD) سے کی گئی۔

سلوان رونالڈ کے مشورے سے پہلے ہی قدم روک چکا تھا۔ اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”نجم کہاں ہے؟“

”وہ کچن کی طرف گیا تھا۔ ابھی تک وہاں نہیں آیا۔“ رونالڈ نے جواب دیا ”مجھے شک ہے اسی بدعاش نے نجم کے ساتھ بھی کوئی گڑبگ کر دی ہے۔ تو خودی دیر پہلے کوری ڈور کا ایک فریم ٹوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ اور اس بد تمیزی نے بھی ہمیں خاصا پریشان کر رکھا ہے۔“

”میں اس بدعاش کو دیکھ لوں گا!“ سلوان نے قطع کلای کرتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا ”تم کچن کی طرف جاؤ اور نجم کی خبر لو۔“

میں نے دیکھا سلوان کا حکم سن کر رونالڈ کمرے کے



فرش سے اٹھنے لگا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قلعہ کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ آنے والے لحاظ میں رونا لڈو کچن کی طرف جانا تھا اور سلوان کو ”مجھ بد معاش“ سے ٹھنسنے کے لیے کمرے کے اندر آنا تھا۔ میں سانس روک کر ریڈارٹ ہو گیا۔ کارڈ وچ کمرے کے استعمال کا وقت آ گیا تھا۔

ہائیں ہاتھ میں دھن کا احساس ہوتے ہی میں نے کارڈ وچ اپرے کو دائیں ہاتھ میں لیا۔ میرے ہائیں ہاتھ کی پھلی میں کچم نے بڑی بے دردی سے کاٹ ڈالا تھا جس میں ابھی تک دھن کے ساتھ ساتھ جلن بھی ہو رہی تھی۔ تاہم یہ تکلیف ان سنسنی خیز لحاظ میں کسی خاص توجہ کی طلب گار نہیں تھی۔

رونا لڈو نے اٹھنے کے بعد دھن سمجھائی اور کمرے سے نکل گیا۔ میں بغیر آواز پیدا کیے غیر محسوس انداز میں سرک کر دروازے کے قریب ہو گیا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ سلوان کے اندر قدم رکھ دیتا اور اسی لمحے مجھے تیزی سے حرکت میں آنا تھا لیکن چند سیکنڈ گزر جانے کے باوجود بھی جب سلوان کی انٹری نہ ہوئی تو مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش نے بھی گھیر لیا۔ میں نے ظاہر آنکھیں بندیں اور باطنی آنکھ کے توسط سے سلوان کے ماحول میں کھنکھایا۔ اگلے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔

بیہودی قوم میں عیاری اور مکاری قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان لوگوں کی ایک ایک ”اد“ کل کر میرے سامنے آ رہی تھی۔ میں جیسے ہی سلوان کے پاس پہنچا، اس کو۔۔۔ رونا لڈو کے ساتھ چر اسرار سرگوشیوں میں مصروف پایا۔ وہ دونوں اس وقت کچن اور کیمپورٹی روم کے درمیان گوری ڈور میں کھڑے تھے۔ انہیں ایک ساتھ وہاں موجود پا کر مجھے تعجب ہوا کیوں کہ سلوان نے رونا لڈو کچن کی طرف جانے کا حکم دے کر خود کمرے کے اندر داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس پر اسرار کا ناچوسی کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ سلوان مجھے ”شریف مزاجی“ سمجھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میری بھی کچھ ایسی ہی مرضی تھی۔ میں بھی اس شخص کو کسی بھی قیمت پر سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ ان لحاظ میں مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی محرومی کا شدت سے احساس ہوا۔ اگر تھڑ آئی (تیسری آنکھ) کی طرح میرا تھڑا (تیسرا کان) بھی بیدار ہوتا تو میں بہ آسانی سلوان اور رونا لڈو کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن سکتا تھا۔ انسان نے بھی عجیب فطرت پائی ہے۔ جو چیز اسے حاصل نہیں ہوتی وہ اسی کے لیے چھپتا ہے۔ اسی کی محرومی کا رونا روتا ہے اور اس ”روئے“ کے دوران

میں وہ اس حقیقت کو یک سر فراموش کر دیتا ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہے وہ محرومی سے کہیں بڑھ کر ہے!

میں جانتا تھا۔۔۔۔۔ اور چنگ فو سانگ فو جیسے جید ماہرین رو حیات نے بھی مجھے بتایا تھا کہ میرا تھڑا (تیسرا کان) بھی بیدار نہیں ہو سکے گا جتنا تجراس سلسلے میں مجھے بھی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے ٹری گینڈ (PITUITARY GLAND) کے ساتھ ارتکاز کی مشقیں کر کے میں محض انا وقت برآمد کروں گا۔ اس کے بالکس میں اگر یہ وقت ”یوگا“ اور ”جی“ کی ایڈوانس مشقوں کو دوں تو میری صلاحیتوں میں اور زیادہ بڑھ چکی آجائے گی۔ میں اور صاف الفاظ میں مجھے پھیل گینڈ (PINEAL GLAND) تک محدود کر دیا گیا تھا۔

چند سیکنڈ ہی میں سلوان اور رونا لڈو کی غصہ میننگ ختم ہو گئی جس کے نتیجے میں رونا لڈو کچن کی جانب بڑھ گیا اور سلوان کوری ڈور میں اس طرف آنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا، وہ کمرے میں داخل ہو گیا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کمرے میں داخل ہوا یا اپنی ہی دھن میں آگے بڑھتا چلا جائے میں اس کا روٹی کی اولاد کو ضرور اسیرے میں لٹھلکا کر تلف کر دوں گا۔ میں تھڑ آئی اس پر لگا کر کھلی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے ”قریب“ پہنچا پھر کوری ڈور میں ساحل والے بیڈروم کی طرف بڑھتا چلا گیا میں نے آنکھیں کھول دیں اور اگلے ہی لمحے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے سلوان کو اپنے آگے چار قدم کے فاصلے پر پایا۔ میں نے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے رعب دار آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”سلوان! میں یہاں ہوں۔“

وہ اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کو محسوس کر چکا تھا اور اس احساس نے اسے شکاک بھی دیا تھا۔ اس پر میری یہ راہ راست پکارنے سے اسے چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا میں بھی اسی موقع کی تاک میں تھا۔ وہ جیسے ہی میری سمت مڑا میں نے آگے بڑھ کر بڑی تیزی سے کارڈ وچ اپرے کو اس کے چہرے پر آزمایا۔

اس ناگہانی صورت حال نے اسے ہولکا دیا، بے ساختہ اس کے دونوں ہاتھ چہرے کی جانب اٹھ گئے۔ وہ اپنی آنکھوں کو پچانا چاہتا تھا لیکن بجاد کا ہر راستہ میں نے مسدود کر دیا تھا۔ میں نے اپرے کے شہن کو اتنی شدت سے پریس کر رکھا تھا کہ آنکھیں کیا اس کی ناک اور منہ بھی اس

خوش بودار زہر سے تر بہ تر ہو گئے۔ کچھ بھی اس کے اعتبار میں نہ رہا۔ وہ بے اختیار ہو کر کھانسا چلا گیا۔ اس کھانسی کے دورے کے دوران میں وہ بڑی سرعت اور بے دردی سے اپنی آنکھوں کو بھی مسلتا جا رہا تھا۔ اس پر ایک جوا قنادوٹ بڑی تیزی اس نے اس کے ہوش و حواس کم کر دیے تھے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ آنکھوں جیسی قدرت کی عظیم الشان نعمت کو لاپتہ جاتا ہے سلا نہیں جاتا!

میں نے کارڈ وچ اپرے کو بیک کے اندر پہنچا دیا۔ سلوان کوری ڈور کے اندر جس قسم کا مستحکم خیر ”ڈانس“ کر رہا تھا اسے انجوائے کرنے کا مجھے کوئی شوق تھا اور نہ ہی اتنی مہلت مجھے میسر تھی۔ میں اس وقت جس دروازے سے چند فٹ کی دوری پر کھڑا تھا اس کی دوسری جانب میری جان تنہا ساحل موجود تھی۔ فضول تقریبات کو نظر انداز کر کے مجھے ساحل تک پہنچنا تھا۔

مصدقہ طور پر ساحل والے بیڈروم کی چابی سلوان کے پاس تھی۔ میں نے اس حواس باختہ اور مصیبت زدہ شخص کی پشت پر ایک زوردار کک رسید کی۔ وہ لڑکھایا اور کوری ڈور کی ایک دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس تصادم کے نتیجے میں اس کے آفت زدہ چہرے نے اس دیوار پر ایک کامل ”بورس“ دیا۔ سلوان کے حلق سے بڑی دردناک آواز خارج ہوئی۔ اس گراؤ نے اس کے چہرے کا سوا ستیاناس مار دیا تھا۔ یہ سونے سے سہاگروالی صورت حال تھی۔

میں نے پلٹ کر کوری ڈور کے دوسرے سرے کی جانب نگاہ دوڑائی۔ رونا لڈو مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ جانتے ہیں وہ کچن میں تھا! سمجھ کے بیڈروم میں تھا یا کہیں اور کھل گیا تھا۔ یہ بات جتنی بھی کدوہ جہاں بھی گیا تھا سلوان کی ہدایت کے مطابق ہی گیا تھا۔ میں اس سلوان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ ناک منہ سے خون بہوت گیا تھا۔ کارڈ وچ اپرے نے اس کی آنکھوں میں زخمیں لگی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے زہر یلانی جاری ہو گیا تھا۔ اس سے ملتی جلتی کیفیت اس کی ناک کی بھی تھی۔ ناک کے راستے کا روٹی کھڑکی ایک بڑی مقدار اس کے بچھڑوں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ اسی حشرات الارض ہائز ہر نے اسے شدید کھانسی کے دورے میں جتا کر دیا تھا، اگرچہ وہ ہم دردی اور مدد کا مستحق نظر آ رہا تھا لیکن میں اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا اس میں مجھے اس غیبت پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔

میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آگے بڑھا اور اس کی موٹی گردن کو اپنے مضبوط بازو کی آہنی پلٹ میں لے لیا پھر منہ کو اس کے کان کے نزدیک لے جا کر گراہٹ آمیز لہجے میں استخار کیا۔

”چابی کس جیب میں ہے؟“

”کھنگ۔۔۔۔۔ کون سی چابی؟“ وہ کھانسی اور ہلکا ہٹ کی آمیزش سے بولا۔

میں نے کھنگ انداز میں کہا ”اس بیڈروم کے دروازے کی چابی جس میں ساحل کو قیدی بنا رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے!“

”قت۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔۔۔“ وہ متوحش انداز میں منہ بیا ”تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے میرے نام سے بھی مخاطب کیا تھا؟“

”میں تمہارے اس سوال کو پہلا اور آخری سوال جانتے ہوئے جواب دے رہا ہوں“ میں نے جارحانہ انداز میں اس کی سماعت میں سرگوشی کی ”میں ساحل کے سوا اس بنگلے میں پائے جانے والے ہر شخص کی موت ہوں۔ اب تاؤ! چابی کہاں ہے۔۔۔۔۔ کس جیب میں ہے؟“

سلوان سے استخار کے دوران میں نے کوری ڈور کے ایک ایک انچ کو اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔ سلوان کسی غیبت الاخبت نظرے کا نتیجہ تھا، میری سنگین دھمکی کے باوجود بھی وہ سوال کرنے سے باز نہ آیا۔

”قت۔۔۔۔۔ تم اس لڑکی کو کیسے جانتے ہو۔۔۔۔۔؟“

اس نے مختار روئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساحل کے لیے لڑکی کا لفظ استعمال کیا تھا۔

میں نے خوں خوار انداز میں جواب دیا۔

”ایسے۔۔۔۔۔!“

اس نیک نفعی جواب کے بعد میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کی فولادی گرفت کو شدید کر دیا۔ کھانسی کھانسی کر سلوان کا پہلے ہی برا حال ہو رہا تھا۔ اس کے متاثرہ پچھڑوں میں اتنی سخت کھانسی پائی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ ایک لمحے کا تنفس بھی سہا کر سکیں۔ وہ میرے بازو کی گرفت میں کسی بن جل کی پھلی کے مانند ہڑبڑا کر رہ گیا۔ دم گھٹ کی کیفیت نے اسے موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کی آنکھیں اٹلی کر حلقوں سے باہر آ رہی تھیں۔

یہ وہی نامور آدمی تھا جسے جو تھوڑی دیر پہلے کھانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ لڑکی کی آنکھوں میں پوری سفاکی سے جھانکا۔ وہ ”کھنگی“ ہوئی آنکھیں خون

رنگ ہو رہی تھیں۔ کاروچ کھرا سپرے نے ان دیدوں میں بڑی قیامت ڈھائی تھی۔ میں نے یہ دستور ان مشربار آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

”میں صرف ایک کینڈے کے لیے اپنی گرفت ڈھیلی کروں گا۔ مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ بس!“

ایک کینڈے کی مہلت کی بات میں نے محض اسے ڈرانے کے لیے کی تھی حالانکہ میں جانتا تھا، ادھر میں نے اسے بولنے کی آسانی فراہم کی ادھر اسے کھائی کا دورہ پڑا۔ وہ کھانے بغیر بول نہیں سکتا تھا اور بولے بغیر میرے سوال کا جواب دینا ممکن نہیں تھا۔ اس کی حالت اس قدر افسوس ناک ہو چکی تھی کہ اشاریاتی زبان کا سہارا لینا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

میرے اعزاز کے عین مطابق جب میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کی تو وہ تڑپنے والے انداز میں کھانے لگا پھر تھوڑا سنبھل کر مردہ سے لہجے میں بولا۔

”جا..... جانی میرے پاس نہیں ہے۔“  
”اس کمرے کی جانی تمہارے پاس رہتی ہے۔“  
”اس کمرے میں نے دھشت بھرے انداز میں کہا۔“ وہ ان کی اولاد دین تو اس وقت ساؤتھ اسٹار اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ایک سواک فی صدہ جانی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ مجھے مذکورہ جانی کے بارے میں بتانے ہو یا نہیں.....؟“

میں نے دھمکی آمیز انداز میں دانستہ جملہ ادھر اچھوڑا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ میری دہشت بھری کارروائی نے پہلے ہی اسے وحشت زدہ کر رکھا تھا۔ لیکن اور اس کے حوالے سے اس انکشاف نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، میں نے اس کی کسبیری آنکھوں میں موت کے سایے کو لہراتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے اس انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو آخری بار دیکھا جاتا ہے۔ ان بے وفا اور جھوٹے اداکات میں وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔ ”جانی..... جانی.....“  
”چپے والے کمرے میں ہیں۔ ڈورینگ کی پہلی دراز میں۔“

”جانی..... قمری.....“ میں نے گنتی پوری کر دی۔ اس کی تمام تر بے بسی کے باوجود بھی میں نے انتہائی نگین لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی سلوان کی گردن پر اپنے بازو کی جکڑ کو شدید کر دیا۔ ”تمہیں تو اس وقت بہت ادب..... چلے جانا چاہیے تھا۔“ میں اس پرواز میں تمہاری مدد کرتا ہوں..... گنو پائے!“

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے بازو کو مخصوص انداز میں ایک زوردار جھکا دیا۔ گنا ٹوٹنے سے مشابہ ایک آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی سلوان کی گردن کا جھک گئی۔ اس کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی تھی۔

میں سلوان کے مردہ جسم کو ایک جانب پھینکنے ہی والا تھا کہ یک..... یک..... ایک تاریکی جھانکی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے لائن چلی گئی ہو۔ اسی لمحے ساحل والے بیڈروم میں مجھے قدموں کی چاپ ابھرنی لگی دی اس کمرے میں ساحل کے سوا اور کوئی نہیں تھا لہذا یہ چاپ ایک سواک فی صدہ اسی کے قدموں کی ہو سکتی تھی۔ بالائی منزل پر ہونے والی ہنگامہ آرائی نے شاید اسے نیند سے بیدار کر دیا تھا اور اب تو لائن بھی چلی گئی تھی میرے اور سلوان کے درمیان یہ ساری دھجکا مشقی اسی بیڈروم کے دروازے کے سامنے ہوئی تھی۔ غائب ساحل بیڈ سے نیچے اترنے کے بعد دروازے کی طرف آ رہی تھی۔

میں نے سلوان کی لاش کو قلعہ انداز میں ایک طرف پھینک دیا۔ یہ ایک اتفاق تھا یا اعزاز کے کی غلطی کہ وہ محسوس مردار سپرہا اسی..... دروازے سے جا کر گھرا یا جس کی جانب ساحل پیش قدمی کر رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میری ساعت کی عید ہو گئی۔

”یہ باہر کیا ہو رہا ہے؟“ ساحل نے جھنجھلاہٹ آجیو انداز میں استفسار کیا۔ ”لائنٹ کس نے آف کی ہے؟ ایسا پہلے تو کہی نہیں ہوا!“

میں اس آواز کو سننے کے لیے ایک عرصے سے ترس رہا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے کانوں کی مراد برائی ہو۔ ساحل کے استفسار میں اگرچہ درجہ جھنجھلاہٹ شامل تھی لیکن میری ساعت نے اسے ایک جبرک کے طور پر قبول کیا۔ اپنی جان بھر کی آواز کو سن کر میرا تن سر فرزا ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے میں اندر سے جی اٹھا ہوں، میں ان کیف آور مسرود کلمات کی سیرابی اور فیض بابی کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میری جسمانی ذہنی اور روحانی کیفیت کو وہ لوگ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں جو بھی میرے ایسے حالات سے گزرے ہوں، جنہوں نے بھی کسی کو اپنے دل میں بسایا ہو اور آنکھوں سے گنویا ہو پھر ملن کی آس میں جدائی کی صدیاں بتائی ہوں اور ان صدیوں کا ایک ایک لمحہ انتظار..... ایک طویل انتظار کی نذر کیا ہو۔ ہرج..... یہ سوچ کر دن کو پانا ہو کہ یہ انتظار کا آخری روز ہو گا اور ہر شام..... یہ سوچ کر رات کو ناک ہو کہ یہ جبر کی آخری شب ثابت ہوگی۔

میرا ہجر فراق جدائی اور عذاب ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے

ملن میں اب کسی بات کی دیر نہیں تھی، ہمارے درمیان صرف ایک بند دروازہ تھا۔ اس دروازے کی دوسری جانب وہ موجود تھی جس کی تلاش میں میں درور کی خاک چھان کر یہاں پہنچا تھا۔ اب اس آخری چوٹی دیوار کو گرائانی تھا پھر ہمارے ملاپ کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ اٹھ جاتی۔ ہم ایک ہو جاتے۔

یہ تمام تر خیالات ایک کینڈے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں اگلے قدم کے لیے تیار ہو گیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ بیک کے اندر پہنچ گیا۔ میرے ہاتھیں پہلو میں لٹکے والے اس بیک میں دیگر اہم اشیاء کے ساتھ ہی ایک خطرناک گن بھی موجود تھی۔ یہ گن میں نے اس ہنگامے کے نیلے گیٹ پر متعین گاڑ ڈے ”حاصل“ کی تھی۔ ان میں سے جم تو..... جنم کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکا تھا جب کہ فلوں حفاظتی بازو میں منہ چھپانے مڑے کی ”نیند“ سورا تھا۔ ان کی گنو میں سے ایک کو میں نے اپنے بیک میں ڈال لیا تھا۔ جب کہ دوسری کو گیٹ کے باہر گھاس میں ایک جگہ چھپا دیا تھا تاکہ یہ وقت رخصت کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اس گن کو وہاں سے نکال کر استعمال کیا جاسکے۔

سلوان نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا تھا، ساحل والے بیڈروم کی چابی نیچے والے ایک کمرے میں پڑی ہے۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں نیچے جاتا اور اس کے بتائے ہوئے ڈورینگ میں سے وہ جانی نکال کر لاتا، میں ساحل کے اتنا قریب آچکا تھا کہ اسے حاصل کیے بغیر نہیں آنے جانے کا تصور بھی محال تھا۔

اس کے استفسار کو تین سیکنڈ گزر گئے تھے اور ابھی تک اسے باہر سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ میں اس کی کسی پریشانی یا تشویش کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور تھڑ آئی کے توسط سے ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ میں دراصل اس کی لوکیشن معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ میری فائرنگ کے نتیجے میں اس کا بال بھی پٹکا نہ ہوئے پائے۔

وہ چوٹی دروازے کے ساتھ گھٹی کڑی تھی کمرے میں اس وقت گھب اندھیرے کا راج تھا تاہم تھڑ آئی کے علاوہ میری تمام تر حیات بھی بیدار تھیں۔ میں نے ساحل کو تاریکی کے باوجود بھی اپنی دھڑکنوں کے قریب محسوس کر لیا، میں اس بیڈروم کے ایک ایک چپے سے ایسے ہی آشنا ہو چکا تھا جیسے اپنے ہاتھ کی لکڑیوں سے واقف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھولتا، ساحل کا تشویش بھرا استفسار میری ساعت تک

رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ”کوئی بولتا کیوں نہیں؟“ اس نے گھر مندی سے پوچھا۔ ”باہر میں نے یہ کیسی آوازیں سنی ہیں؟“

ساحل نے اس ہنگامے میں رہنے والوں سے سوال کیا تھا۔ اس کے وہم دگان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس سے چند انچ کے فاصلے پر کھڑا ہوں۔ مجھے بھی پکا میاں ایک خوش گوار خواب کے مانند محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ایسے ہی لگا جیسے وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہو اور پوچھ رہی ہو میں بولتا کیوں نہیں؟

میں بولا اور بڑی سنجیدگی سے بولا ”ساحل! دروازے کے پاس سے بہت کم درور چلی جاؤ۔ میں فائرنگ سے اس کے لاک کو اڑا رہا ہوں۔ تمہارے لیے سب سے زیادہ محفوظ مقام ڈورینگ کا کچھوڑا ہے۔ کم آن..... ہری اپ!“

میں اس وقت اپنی اصل آواز میں بولا تھا۔ میری اس آواز کو ساحل سے زیادہ اور کون پہچان سکتا تھا اور یقیناً اس نے پہچان لیا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب جھانک جانے والی گنبد خاموشی اس امر کا ثبوت تھی میرے پاس اس سکوت کو برداشت کرنے کی مہلت تھی اور نہ ہی بہت میں نے بلند مگر سرراہی ہوئی آواز میں کہا۔

”ساحل! میں صرف تین تک گنوں گا۔ اس کے بعد لاک کو اڑا دوں گا۔ تم تین چار کینڈے میں میری ہتائی ہوئی محفوظ جگہ پہنچ جاؤ۔“

اس کی جذبات سے لب ریخ آواز میری ساعت تک پہنچی ”وج..... وجہان.....!“

”ہاں! میں ہی ہوں“ میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ”اور میں گنتی شروع کر رہا ہوں ون!“

میں نے ٹول کر گن کی نال کو دروازے کے پینڈل کے قریب پہنچا دیا۔ اسی لمحے کوری ڈور روشنی سے بھر گیا۔ لائن آگئی تھی یا پھر اگر دانت لائن کو کسی خاص مقصد کے تحت آف کیا گیا تھا تو اب کسی خاص الخاص مقصد کی خاطر آن بھی کر دیا گیا تھا۔

”ٹو..... قمری.....“ میں نے گنتی پوری کر دی۔ میں نے دانستہ ٹھہر ٹھہر کر گنا تھا تاکہ ساحل یہ آسانی محفوظ مقام تک پہنچ جائے اور اب تو لائن بھی آگئی تھی، میں نے مطمئن ہونے کے بعد اس خطرناک گن کے مہلک دہانے کو لاک پر کھول دیا۔

پگھلا فائرنگ کی خوف ناک آواز سے کوئی غما۔ دروازے کا لاک کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیز رفتار تباہ کار کولیوں

نے اسے اس کے مقام سے ہٹا کر بتائیں کس کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ہر احتیاط کو بالا لے خالق رکھتے ہوئے دروازے پر ایک معمولی لکڑی رسید کی اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

ساحل جلدی سے ڈر بینک کے پیچھے سے نکلے اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھک گئی۔ میں توقع کر رہا تھا، وہ مکان میں سے نکلے ہوئے تیرے کا مانند ٹھک سے آکر میرے سینے میں جوست ہو جائے گی لیکن وہ ٹھک کر اشتیاق سے نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی چٹکا ہٹ، حیرت اور اشتیاق کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔

میں اس وقت یوسف لٹا پری کے میک اپ میں تھا۔ وہ اپنے وجدان کو دیکھنے کی توقع کر رہی ہوگی، ایک اجنبی چہرے کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح الجھ گئی تھی۔ میں نے تیز لپکے میں کہا۔

”ساحل! ایک ایک سیکنڈ بہت قیمتی ہے۔ ہمیں فوری طور پر اس بنگلے سے نکلتا ہے۔ اگر آج ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوگی تو پھر ہم زندگی بھر کسی مل نہ پائیں گے۔ آؤ..... میرے پاس آؤ..... میرے ساتھ آؤ یوسف لٹا پری کے چلیے کے باوجود بھی وہ مجھے پہچان گئی، سیکپائی ہوئی آواز میں بولی۔

”وجدان! تم میک اپ میں ہو؟“

”ہاں..... میں نے اپنا چہرہ بدل رکھا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

زیرو پاور کے بلب کی نیلیوں لائٹ میں میں نے ساحل کے چہرے پر دھک دیکھ کر تیرے دیکھے۔ یہ خوشی اور کامرانی کے رنگ تھے۔ اتنی بڑی کامیابی کہ چند لمحے پہلے جس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم نے بے ساختہ پیش قدمی کی اور ایک جان دو قاب کی مکملی تصویر پیش کرنے لگے۔

ان لمحات میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت ایک مقام پر ٹھہر گیا ہو۔ وقت کے اس ٹھہراؤ میں بڑی گہرائی، گیرائی اور بے پروائی تھی۔ یہ دو انتہاؤں کا احتجاج پیش کر رہا تھا۔ ایک سنگین ترین صورت حال میں ہم اپنے آپ سے اور اس ماحول سے یک سرے پر گناہ ہو گئے تھے۔ ہمارے دل اتنی شدت سے دھڑک رہے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن کو اپنے سینے پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ بڑے ہی مدہوش اور خوفزدہ اموش لمحات تھے۔ جی چاہتا تھا، وقت یونہی تھمارا ہے اور ہم ایک دوسرے میں اس شدت سے جوست ہو جائیں کہ دو کی کا احساس نہ جاتا رہے۔

یہ ایک غیر فطری خواہش تھی اس لیے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ وقت بڑا غلام ہے کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہماری بے گامگی نے ہمیں یہ احساس دلایا تھا کہ وقت ختم کیا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جلد ہی یہ سفاک حقیقت ہم پر آشکار ہو گئی۔ بیڈروم سے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

خطرناک گمن میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ساحل کو دروازے کی اوٹ میں کھڑا کرنے کو کہا اور گمن سونٹ کر بیڈروم سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ کون ہماری طرف دوڑا جا رہا ہے۔ ساحل کے سوا اس بنگلے میں پایا جانے والا ہر شخص میرے لیے دشمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور میں انہیں اب تک ان کے شایان شان ”اہمیت“ دیتا آیا تھا..... اور آجندہ بھی میرا ارادہ یہی تھا۔ ویسے میرے انٹرفیس کے مطابق بنگلے میں صرف تین افراد ایسے بچے تھے جو میری راہ میں حرام ہو سکتے تھے۔ ان میں سے دو پہلی منزل پر تھے یعنی ربی اور اس کا سیکریٹری اور تیسرا رونالڈ آئنگھائی سلوان کے اشارے پر کہیں نکل گیا تھا۔ زیادہ امکان اسی کی آمد کا تھا لہذا میں بلک بھینچتے میں آنکھیں بند کر کے اس کے ماحول میں بچنے لگا۔

اگلے ہی لمحے میں نے رونالڈ کو اپنے بہت قریب کوری ڈور میں دوڑتے ہوئے پایا۔ اس نے ایک ہاتھ میں ہلاکت بردار گمن بھی اٹھا رکھی تھی۔ یہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اسی کی تھی۔ وہ چکر دار زینے کی طرف سے سیدھا اس بیڈروم کی طرف آ رہا تھا جہاں اس وقت میں اپنے حصول کے ساتھ موجود تھا۔ رونالڈ کا اس سست سے آنے کا یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ زیریں منزل پر حاضری لگا کر آ رہا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے جتن کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا ادھر سے بھی کوئی خفیہ راستے زیریں منزل تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہو کر واپس اوپر آنا یہ ظاہر کرتا تھا اب تب میں ربی مونے ہاتھن کا سیکریٹری ہرشل جتان بھی اس طرف چڑھائی کرنے والا ہے۔ ربی دل کا سر بیٹھ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی جانب سے کوئی عملی پیش رفت کی امید نہیں تھی البتہ اس کے اشارے پر ہرشل ضرور کوئی قیامت ڈھا سکتا تھا۔ وہ اگر اوپر کارن نہ بھی کرتا تو نیچے وہ کبھی کوئی نہایت ہی جھلک دشمنانہ کارروائی کر سکتا تھا۔

انسان کا ذہن ایک اعلیٰ اور پیچیدہ مشین ہے۔ یہ تپتی زیادہ تیز رفتاری سے سوچ سکتا ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے یہ تمام باتیں محض دو تین سیکنڈ میں سوچی ہوں گی صرف اتنی کلیل مدت میں جب رونالڈ میری بائیں نگاہ میں آنے کے بعد اس بیڈروم کے دروازے تک پہنچا۔ وہ جیسے ہی کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھا میں آنکھیں کھول کر اس کے سامنے حاضر ہو گیا۔

یہ حاضری اسے بہت مہنگی پڑی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونکا پھر ایسے بدکا جیسے کسی خطرناک بچھو کو دیکھ لیا ہو۔ یہ بدکنا اس کی زندگی کا آخری سودا تھا کیوں بدکنے کے ساتھ ہی اس نے گمن میری جانب سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی۔

کوشش کی تھی..... ان مسنون میں کہ میں نے اس کی حسرت کو نکلنے نہیں دیا۔ گمن کا پیرل اپنی سمت اٹھنے سے پہلے ہی میں نے ایک مہلت برسٹ فائر کر دیا۔ بنگا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی مخصوص خوفناک ترزاٹھ سے کوئی اٹھا۔

میں نے رونالڈ کے بدن کو گولیاں کھا کر پھلتی میں برلے ہوئے دیکھا۔ اس کے نخوس وجود میں منھک خیز حرکت جاگ پھر دو کوری ڈور کے پینٹ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ اس سے میرا پہلا سامنا تھا جو اس کی زندگی کا چراغ گل کر گیا۔ اس سے پہلے میں نے گارڈروم کی تاریکی میں اس کی پشت پر وہ کر تھوڑی ”مرمت“ کی تھی۔

کوری ڈور کے فرش پر رونالڈ کا بدن جگے جگے جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے درجنوں بار زندگی کو موت کے سامنے سرگرم ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں جانتا تھا وہ زندگی ہار رہا ہے لیکن میرے پاس ہار جیت کے اس کھیل کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ساحل کا ہاتھ تھا ماور کوری ڈور میں نکل آیا۔

میں نے بنگلے کی بالائی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جو پیچیدہ اور ٹھنٹھ طریقہ کار اختیار کیا تھا واپس کے لیے اس پر عمل کرنا ممکن تھا اور نہ ہی موزوں۔ اس وقت میں اکیلا ہی تھا اور اپنی زندگی کو حاصل کرنے کے لیے میں نے تنگ دماغی سے لگا رہا تھا۔ اپنی جان کو جو قسم میں ڈال کر میں دباں تک پہنچا تھا مگر اب وہ ہستی میری جان تنہا میرے ساتھ تھی۔ میں اسے کسی قسم کی آزمائش یا مصیبت میں ڈالے بغیر اس بنگلے سے نکل جانا چاہتا تھا..... اور اس مقصد کے حصول کے لیے نہایت ہی سیدھا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ساحل کا ہاتھ تھا سے چکر دار

زینے کی جانب دوڑ لگا دی۔

ہم زینے کے قریب پہنچے تو نیچے سے ہرشل آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چکر دار زینے پر قدم رکھتے ہی والا تھا۔ میں نے اسے سنہری بالوں سا بڑا مانگ، دروازے قاضی اور سوئیڈ پوینڈ ہونے کے سبب پہچان لیا، اتنے فاصلے سے اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں نے قرعہ آتی کے توسط سے اتنی مرتبہ اس کے ماحول میں حاضری دی تھی کہ میں نے خصوصیات اور علامات کے پیش نظر اسے شناخت کرنے میں کوئی کوتاہی یا غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس بنگلے میں اب ربی اور ہرشل ہی دو ایسے افراد بچے تھے جو کسی نہ کسی حد تک ہمارے ”فراز“ کی راہ میں حرامت پیش کر سکتے تھے۔ ہرشل کے ہاتھوں میں ہسٹل دیکھ کر میں محتاط ہو گیا۔

میں نے ساحل کو اپنے جسم سے کور کیا اور ہرشل کے پاؤں میں فائرنگ کر دی۔ میں اس کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اس فائرنگ سے محض اسے خوف زدہ کرنا مقصود تھا۔ اگر میں چاہتا تو اسٹریٹ فائرنگ کر کے اس آوارہ خیال ”نائنٹ ریڈر“ کو صفیہ ہستی سے مٹا سکتا تھا مگر میں اسے ایک خاص مقصد کے تحت زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے پچھلے چند روز میں اپنے مستقبل کے بارے میں بہت سمجیدگی سے سوچا تھا اور اس سلسلے میں ایک ناممکن بھی میرے ذہن میں ترتیب پا چکا تھا۔ ہرشل جتان کا زندہ رہنا بھی اسی ذخیرہ کی ایک اہم گڑی تھا۔

ہرشل بھی سمجھا کہ میں نے اسے نشانہ بنانے کے لیے فائرنگ کی ہے۔ وہ تیزی سے نیچے کو جھکا پھر ایک پہلو میں روٹک کرتے ہوئے دوڑ نکلی گیا۔ اس نے بڑی پریکٹ اور ماہرانہ انداز میں روٹک کی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ مارشل آرٹس سے بدخوبی آشنا تھا۔ ہرشل کی زندگی کا یہ ایک نیا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

وہ روٹک کی تکمیل کے بعد کھٹک کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ دم دبا کر فرار ہو گیا ہوگا۔ اس بنگلے میں اب وہ اور ربی مونے ہاتھن ہی دو قابل حرکت افراد باقی بچے تھے۔ ہرشل ربی کا معتد خاص باڈی گارڈ اور پرسنل سیکریٹری..... سب کچھ ہی تھا۔ اس ساری باراماری میں اب تک ربی کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ بتائیں وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھے خبر سوچا رہا تھا یا کسی اور عین کارروائی کی ڈوریوں میں ملا رہا تھا۔ اس طاقت ور شخص کے ڈانڈے بہت دور تک ملتے تھے۔ اگر

وہ موجودہ صورت حال سے آگاہ ہو گیا تھا تو پھر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ایک لاکھ والا ہاتھی مرنے کے بعد سوالا لکھ کا ہوا جاتا ہے۔ رلی بھی اختیارات کا ہاتھی تھا۔ عارضہ قلب نے اسے اور بھی با اختیار کر دیا ہو گا جو بے اس کے بارے میں صمدہ خبر تو برسرِ حیات ہی دے سکتا تھا۔

میں نے پکڑ دار زینے کے بالائی سرے پر کھڑے رہ کر ایک لمبے کے لیے آنکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کی معرفت ہر شے کے ماحول میں اتر گیا۔ وہ زیریں منزل میں کمرادر کرا گھومتے ہوئے اپنے چھوٹے سے کمرے میں کھینچ گیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جو رلی موٹے ہاتھن کے بیڈروم سے الحاق رکھتا تھا۔ اسی کمرے میں نوڈ اسکیننگ اینڈ اسکریننگ مشین نصب تھی اور یہیں پر رلی ایک آرام کرسی میں دبک کر وہ تصوراتی عیاشی کا شائق ہر شے حیات جیسی کوئز اور انڈا لیزر کے مادر پدر آزادانہ کا مطالعہ فرماتا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کر ساحل کی طرف دیکھا اور اضطراری لہجے میں کہا ”آؤ..... خطرہ کچھ فاصلے پر چلا گیا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

وہ ایک لفظ ادا کیے بغیر میرے ساتھ ہوئی۔ میں اس کا ہاتھ تھامے تھامے بڑی تیزی سے وہ پکڑ دار زینہ اترنے لگا۔ میں نے تصدیق کی گاہے ہر شے کو اس کے مخصوص کمرے میں چھوڑا تھا۔ وہ چھوڑا سا کمرہ رلی موٹے ہاتھن کے بیڈروم سے ملحق تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ سیدھا اپنے رلی مرئی کے پاس پہنچے گا۔ میں اس پر نظر رکھنے کے لیے تیسری آنکھ کو مسلسل استعمال میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس مقصد کی خاطر مجھے ظاہر آنکھیں بند کرنا پڑیں اور..... فی الحال میں ایسا کرنا اور ڈر نہیں کر سکتا تھا۔

میں ساحل کی معیت میں زیریں منزل پر پہنچ گیا۔ یہ ایسے قیامت خیز اور حشر برپا کھاتے تھے کہ میں ساحل سے کوئی بات اطمینان سے نہیں کر سکتا تھا۔ کسی پرسکون مقام پر پہنچنے کے بعد ہی تسلی بخش انداز میں گفتگو ہو سکتی تھی۔

زینہ اترتے ہوئے میرے ذہن میں یہی تھا کہ میں ہر شے اور رلی پر علت و سبب کی سیدھا گیت کی طرف جاؤں گا اور جلد از جلد اس بیٹنگ سے نکلنے کی کوشش کروں گا، لیکن زیریں منزل پر قدم رکھتے ہی ایک نئی اور اچھوتی سوچ نے میرے ذہن میں گھر کر لیا۔ جس شخص نے اب تک ساحل کو مجھ سے دور کر کے مجھے ہر عذاب کر رکھا تھا اس کا دیدار کیے بغیر وہاں سے رخصت ہو جانا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی بھوکا کھانا کھانے بیٹھے اور پانی کا ایک ٹھونک بھر کر دستِ خوان سے اٹھ

جائے!

رلی کے رویے نے مجھے شدید الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ میں گزشتہ چندہ میں منٹ سے بڑے ”طعراتی“ کے ساتھ اس بیٹنگ میں سرگرم عمل تھا۔ ”میری یہ ”سرگرمی“ اتنی سنگین نوعیت کی تھی کہ اس بیٹنگ کا کوئی بھی ممکن دم سادھ کر اپنے کمرے میں نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ حیرت اور تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ ابھی تک کہیں رلی کی شکل دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کی یہ پھر اسرار اور طویل خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی ایک ایسا طوفان..... جو ہمارے لیے کسی بھی وقت کوئی مشکل گھڑی کر سکتا تھا۔ میں نے رلی کو کوچ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے زیریں منزل کی اندرونی سمت قدم بڑھا دیے۔

سب سے پہلے وہ کمرہ پڑا تھا جس میں تھوڑی دیر پہلے سلوان اور ہر شے کا فرہ اسسٹنٹ امہام آرام فرما رہے تھے۔ وہ دونوں کم بخت آرام تو اس وقت بھی فرما رہے تھے لیکن ان کے آرام کی منزل اور نوعیت یک سید بدل گئی تھی۔ اس سے پیش تر وہ یہ رات گزارنے کے لیے اپنی مرضی سے اس کمرے میں سوئے تھے اور اب وہ میرے حسبِ فضا بالائی منزل کے کوری ڈور میں زندگی گزار چکے تھے۔ میری اس فضا کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رونالڈ نے بھی اچھا خاصا تعاون کیا تھا!

سلوان نے اپنی موت سے چند سیکنڈ قبل معلومات فراہم کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ ساحل والے بیڈروم کی چابی..... بلکہ چابیاں زیریں منزل والے اس کمرے کی ڈریسنگ کی پہلی دراز میں رکھی ہیں۔ لفظ ”چابیاں“ کا یہی مطلب تھا ساحل والے بیڈروم کے علاوہ اس کی گرے کار کی چابی بھی انہی چابیوں میں شامل ہوگی۔ مجھے وہاں سے فرار ہونے کے لیے ایک گاڑی کی ضرورت تو تھی ہی۔ میں نے سلوان کی گرے کار سے استغناء کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کمرے تک رسائی حاصل کر لی۔

کمرے میں لائٹ روشن کی لہذا مجھے مذکورہ ڈریسنگ کی تلاشی لینے میں بہ مشکل پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ سلوان نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی عیاری دکھانے میں کسی گنجوی یا کل سے کام نہیں لیا تھا۔ لگتا تھا، دروغ کوئی اس کی حیات کا اول آخر مقصد رہا ہو۔ اس کی بتائی ہوئی ”چابیاں“ ڈریسنگ کی پہلی دراز کیا کسی دراز میں بھی موجود نہیں تھیں۔ میں نے دو آنکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کھول کر ہر شے حیات کے پاس پہنچ گیا۔ وہ چند قدم کی دوری پر اپنے

اسی چھوٹے سے مخصوص کمرے میں موجود تھا جہاں مختلف قسم کے بیٹنگ آلات کے علاوہ اسکریننگ اینڈ اسکیننگ کی مشینیں بھی نصب تھیں۔ وہ اس وقت ایک خطرناک آٹو بیٹنگ گن کو بڑی سرعت اور مہارت کے ساتھ لوڈ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے پکڑ دار زینے کے نیچے حصے میں اسے ایک ہٹل کے ساتھ دیکھا تھا لیکن میری فائرنگ نے اسے پہپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں دوڑتی سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس دوران میں ہر شے نے رلی کے پاس ”حاضری“ دی تھی یا نہیں لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ اس خطرناک لوڈ ڈرگن کے ساتھ ہماری طرف آنے والا تھا۔ میں بھی اس کے شایان شان استقبال کے لیے پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں سلوان اینڈ کمپنی المعروف ”یہ تازہ تازہ انجمنی“ کے کمرے سے نکلا اور فرہ امہام کے کمرے میں ہوتے ہوئے ہر شے والے چھوٹے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ ساحل کو میں نے امہام والے کمرے میں روک دیا تھا۔ ہر شے کے کمرے کا ایک دروازہ رلی والے بیڈروم میں کھتا تھا وہ دوسرے دروازے پر کھڑا میں اس کی نموداری کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ایک مختصر سا کوری ڈوری تھا جو مختلف زاویوں سے ان تین کمروں کو آپس میں ملاتا تھا۔

میں گن سونے ریڈارٹ کھڑا تھا کہ میرے ہاتھن پہلو آئے۔ آہستہ..... وہ دروازہ کھلا جہاں سے ہر شے کی آمد کی امید تھی۔ اس بیٹنگ میں اچھی خاصی فائرنگ ہو چکی تھی۔ میں حریہ و ترنہاٹ کو ابھار کر فضا کو بھرج کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لہذا اس سے پیش تر کہ ہر شے کمرے سے باہر آتا میں نے ہاڈی کو نوٹ کرتے ہوئے ایک دھواں دھار کھٹاس کے زیرِ ناف رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بائنگ کے انداز میں دونوں بازوؤں کے درمیان اپنے چہرے کو محفوظ رکھتے ہوئے میں نے اسے اندر کی جانب دھکیل دیا۔

میری یہ سرچ پہلے رشت ہر شے کی توقع کے بالکل عکس تھی۔ وہ تو مجھے زیر کر کے نکلا تھا۔ اسے امید نہیں تھی میں ہلک جھپٹے میں زہر ہو جاؤں گا۔ میرا حملہ چاک اور شدید تھا۔ وہ صلی سے ایک کرب ناک ”اؤں“ خارج کرتے ہوئے، ڈنگا تے قدموں کے ساتھ پیچھے کو گیا پھر میں نے اسے سینیلے کا موقع نہ دیا۔

میں اس کے پیچھے ہی بھرا مار کر کمرے میں داخل ہوا اور

بے در بے در تیز رفتار ڈانڈاؤں کس چلا دیں۔ وہ میرے ابتدائی انجک سے بری طرح بے توازن ہو چکا تھا لہذا اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ میری لیٹ اور رائٹ راڈز ہاؤس نے اس کے چہرے کی ہر پور حراج پر سی کی۔ اس کے ساتھ ہی..... ایک دھانسی قسم کی سائڈنگ چلا دی۔ وہ ایک مختصر سا کرا تھا۔ میری سائڈنگ کک کا تختہ وصول کرنے کے بعد ہر شے فضا میں ٹھوڑا بلند ہوا پھر صحرائی طوفان کی زد میں آئے ہوئے اونٹ کے کسی بچے کے مانند لڑھکتے ہوئے وہ اسکریننگ مشین سے جا گھرایا۔

اس کے حلق سے ایک مرتبہ پھر تکلیف بھری ”اؤں“ برآمد ہوئی۔ وہ خاصا سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو تکلیف کی شدت سے چلا چلا کر بیٹنگ کو سر زراٹھا لیتا لیکن افسوس کہ اس کی سخت جانی کو ”انجوائے“ کرنے کی میرے پاس مہلت نہیں تھی۔ میرا ایک ایک لمحہ انتہائی قیمتی تھا۔ شعوری اور لاشعوری طور پر مجھے اس حیرت انگیز تشویش نے گھیر رکھا تھا کہ اتنی بار دھاڑ اٹھاؤ اور فائرنگ کے باوجود بھی رلی موٹے ہاتھن اپنی آرام گاہ سے باہر کیوں نہیں نکلا تھا۔ اس قیامتی ہنگامے پر تو اسے ذخیرہ اندوز نہیں بلکہ جلوہ افروز ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ ٹھیک ہے وہ دل کا مریض ہو گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ انسان کھڑے گدھے چھ کر اور بیٹنگ کی کریوں بے خبر سوتا رہے۔

ایک لمحے کے لیے یہ خطرناک خیال بھی میرے ذہن سے گزرا کہ کہیں رلی چپ چپاتے ابدی سنر پر تو روانہ نہیں ہو گیا؟ اگلے ہی لمحے میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور ہر شے حیات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ ڈوڈا اسکریننگ مشین ہے اچھے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور تشویش کی بات یہ تھی کہ اس تمام تر مارا ماری کے دوران میں اس نے خطرناک لوڈ ڈرگن کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا تھا اگر میں اسے ایک لمحے کی مہلت بھی دے دیتا تو وہ گن کے بیروں کو میری سمت سیدھا کر کے زمین سے آسمان کی طرف روانہ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایسے کسی واپات ارادے پر عمل کرتا میں نے ایک پیچھے کے مانند جست بھری اور اس کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

وہ اسکریننگ اور اسکیننگ مشینوں کے درمیان پھیلی ہوئی مختلف ٹکلیوں اور ٹیوبز سے لہجا ہوا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا تھا، وہ دو چار سالے دار پہنچے کیے بعد دیگرے اس کے جڑوں پر رسید کر دیے۔ وہ خود کو میرے خونخوار حلقے سے

بچانے کے لیے گردن کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک عقاب جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے کن کو جھین لیا۔

نہتا ہوتے ہی وہ سر اسید دکھائی دینے لگا۔ میرے طوفانی کولن نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا تھا۔ اس کی سر اسید میں بے بسی بھی شامل ہوئی۔ اس نے چند لمبے پہلے چکر دار زینے کے قریب جھٹی تو نیک روٹنگ کی گئی اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا، وہ مارشل آرٹس سے گہری واقفیت رکھتا ہے لیکن شوقی قسمت کے میرے سامنے اسے اپنے فن کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس نے پیش تر کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتا میں نے پے در پے حملوں سے اسے کار زبرد پاتا تھا۔

میں نے اس کی گن کو ایک طرف پیچک دیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ شاید وہ اپنے طور پر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں کن جیتنے ہی اسے شوٹ کر دوں گا۔ اس کم بخت کو کیا معلوم کہ میں ایک خاص مقصد کے تحت اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ میں ہرشل کی تھوڑی اور خاطر تواضع کروں لیکن اپنے عقب میں ساحل کی موجودی کو محسوس کر کے میں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا وہ مجھے یہاں بند آزما پا کر پھینکے سے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس کے سامنے میں ہرشل پر تشدد آزما کر اسے کسی ذہنی کوفت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت زیادہ ذہنی اذیتوں کے بعد آج آزاد ہوئی تھی۔ میں ان خوشگیاں اور تکلیف دہ مناظر سے جلد از جلد اسے دور کر دینا چاہتا تھا لہذا اپنی گن کی نال کو ہرشل کے سینے کی جانب سیدھا کرتے ہوئے میں نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

”تمہارا وہ اہلی اور رلی مرلی موٹے ہاتھن کہاں ہے؟“ وہ چکر دار زینے کے آخری سرے پر ساحل کو میرے ساتھ دیکھ چکا تھا اور اب بھی وہ بے فکری سے وہاں نظر آ رہی تھی۔ اس خوفناک صورت حال نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ جس ہستی کو وہ لوگ سونے اور چم کے آرام و ہنجر سے میں قید کر کے اس کی کڑی نگرانی پر مامور تھے میں نے ان کی نگرانی اور نگہبانی کی ایسی کم تھی کرتے ہوئے، ان کی لاٹھوں کے اوپر سے گزر کر اسے ہستی کو آزاد کرالیا تھا۔ یہ سچ حقیقت ہرشل کو کسی صورت ہنسنے نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ میرے سوال کو فراموش کر کے الٹا مجھ ہی سے منتظر ہوا۔

”خت۔ تم کون ہو؟“

”میں فارج ہوں!“ میں نے گن کی ہلاکت پر دراز نال کو

اس کے سینے پر لگاتے ہوئے کہا ”سوال کرنے کا حق صرف فارج کو ہوتا ہے۔ مفتوح گردن جھکا کر جواب دینے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر تمہاری زبان سے اب کوئی سوال پھسلتا تو میں اپنے سوال کا جواب سننے بغیر تمہیں جہنم رسید کر دوں گا۔“ موت کو چنداں کی رودری پر..... اور جھٹی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی۔ میں نے اس کی دہشت کو بڑھانے کی غرض سے پوری فحاشی کے ساتھ کہا۔

”میری معلومات کے مطابق وہ اس کمرے میں ہونا چاہیے“ میں نے رلی کے بند روم کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ تم رلی کے ٹیکر بیڑی ہو۔ میری معلومات کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ خیف سی آواز میں منہنایا۔ ”محترم رلی بند روم میں سو رہے ہیں“ پھر وہ ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم کون ہو اور اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو؟“

”میں نے تمہیں سوال کرنے سے منع کیا تھا لیکن تم باز نہیں آئے“ میں نے گن کی نال کو اس کے سینے میں گڑاتے ہوئے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا ”اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں۔ موت کو گلے سے لگنے سے قتل اتنا تباہ دہکتا ہے کہ رلی نے کب سے نشہ کرنا شروع کیا ہے۔ اس بنگلے میں ہونے والی فارج کی آوازوں سے تو قبروں میں لیٹے ہوئے مردے بھی تپ کر اٹھ کھڑے ہوں گے پھر تمہارا رلی کیوں حرے سے پڑا سو رہا ہے؟“

ہرشل نے الجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھا پھر میرا سوال اس کی سمجھ میں آیا وضاحت کرتے ہوئے بولا ”محترم رلی والا بند روم مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔ باہر پیدا ہونے والی کوئی آواز اندر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ انتظام ان کی صحت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔“

”اچھا انتظام ہے“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ”اس کا مطلب ہے“ اگر میں ایک خطرناک برست فائر کر کے تمہارے سینے کے چھوڑے اڑا دوں تو اس پر کیا ہوگا۔ مگر با اختیار محض کو متعلق خبر نہیں ہوگی کہ اس کے مستند خاص ٹیکر بیڑی ہرشل حناں پر کیا ہوتی ہے؟“

میں نے رلی کے حوالے سے ”ہمارا“ کا لفظ استعمال کیا تھا اس پر ہرشل کو اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے پہلے رلی کی صحت کا ذکر کر چکا تھا لیکن جب میں نے اس کے مکمل نام اور عہدے کا تذکرہ کیا تو وہ کن کے ہیرل کے بچے اس

طرح ”اچھا“ جیسے کسی زہریلے کیڑے نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے سر زلزل کرنے والے انداز میں کہا۔

”نہیں..... بالکل نہیں..... میں تمہاری زبان سے یہ سوالات سننے کے موڈ میں قطعاً نہیں ہوں..... تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ میرا نام کس نے تمہیں بتایا ہے۔ وغیرہ وغیرہ“ میں نے ایک لمبے کا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیسے یہ ساؤنڈ پروف بند روم والا سیٹ اپ تمہارے لیے بھی خاص مفید ثابت ہو رہا ہے۔ رلی کو کچھ باتیں چنانچہ ہوگا تم اسے چار اڈھا کر آرام سے سنانے کے بعد کس قسم کی غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہو؟“ اس نے مطالعہ نہ مکر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے فوراً صبح کردی ”سوری ہرشل! میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ تم اپنے نسب نساب اور حسب حساب کے مطابق ہی آرام کریں میں تمہیں گھر، بڑی ”بے آرامی“ سے کسی منہنی خیر امتحان کی تیاری کر رہے ہوں۔ ایک بات کہ تمہارے نصاب میں امام الزیور اور جیکو کنز کی شہرہ آفاق تخلیقات شامل ہیں!“

ایک لمحے کے لیے اس کی خون آلود صورت پر ذرا مت کے رنگ ابھرے پھر وہ سہم کر متوش نظر سے مجھے دیکھنے لگا، میں نے تھوڑی ”محنت“ کر کے اس سے بندوبست کی چابی حاصل کر لی۔ یہ وہی وہی تھی جس میں رلی موٹے ہاتھن سلطان اور ہرشل کے ساتھ صل ایب سے بروٹلم کیا تھا۔

ہمارے فرار کے لیے یہ سب سے زیادہ موزوں سواری ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے سوچے سمجھے مقام تک پہنچانے سے پہلے میں نے اس سے آخری سوال کیا۔

”رلی کے بند روم میں داخل ہونے کا طریقہ کار کیا ہے؟“

یہاں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے بارے میں ابھی تک انہیں کچھ نہیں بتایا گیا۔ ہمارے نزدیک ان کی جان اور صحت سے زیادہ قیمتی کوئی اور شے نہیں ہو سکتی۔ ہم بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتے ہیں لیکن مہم رلی تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچا سکتے جس سے ان کے اعصاب پر کسی قسم کا دباؤ یا تباہی بڑھے۔ میں ان کا ٹیکر بیڑی ہوں۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہہ سکتے ہو!“

اس کی اس جذباتی ”تقریر“ کے درمیان میں نے محسوس کے کہ وہ بڑی شدت سے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کوئی ایسا موقع جس سے وہ ہاری ہوئی بازی کو جیت میں بدل سکے۔ ہزار قسم کی وحشت اور خوف زدگی کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں جھٹکنے والی مخصوص یہودی عیاری کو میں نے بلک جھپٹتے میں بھانپ لیا مگر میں اس نامراد کو کوئی ایسا موقع کیوں فراہم کر سکتا تھا؟

میں نے اس کی آنکھوں میں جھپٹتے ہوئے نہایت ہی سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا کہ تم رلی کے ٹیکر بیڑی یعنی راز بردار ہو لیکن سنو! جو راز و نیاز میں تمہارے رلی سے کرنے آیا ہوں وہ باتیں تم سے تو نہیں ہو سکتیں نا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کارڈ یا لو جٹ منا ہم صرف رلی کی خاطر بروٹلم سے اسے دیکھنے کے لیے صل ایب آتا ہے۔ منا ہم بارک لین ہوٹل کا ایک چوٹی کا پیر امراض قلب ہے جس کی رہائش بروٹلم کے ایک پوش رہائشی علاقے بیت سفافہ میں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو تو میں منا ہم کی گاڑی اور بنگلے کا نمبر بھی دہرا دیتا ہوں۔ بنگلا نمبر این..... ٹانگی فائیو..... نیوی بلیو گاڑی کا نمبر تائن..... ہے ایس..... ون نو زیرو.....“ میں نے دانستہ جملہ احوار چھوڑا اور الیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

میں یہ تمام تر معلومات محض اس مقصد کی خاطر اس کے گوش گزار کر رہا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات کسی بری طرح بارے ہوئے امیدواری کی طرح بیٹھ جائے کہ میں ”رلی“ ایڈ جینی“ کے بارے میں ان لوگوں سے کہیں زیادہ جانتا ہوں اور اگر چاہوں تو بلک جھپٹتے میں ان کا بھنا بھی بٹھا سکتا ہوں۔ میری اس نفسیاتی چال کا اس پر حد سے زیادہ اثر ہوا۔

کیکپائی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

”تم کوئی خطرناک قسم کے جادوگر ہو..... بہت ہی خطرناک!“

”میرے بچے!“ میں نے پھنکارنے والے انداز میں کہا یہ پھنکار بڑی عجیب و غریب تھی کیونکہ ہرشل عمر میں مجھ





بولنے کے دوران میں وہ ایک تک میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ رہی بے شمار چراسرار علوم کے علاوہ پتا خرم کا بھی ماہر تھا۔ عمر رسیدہ اور دل کا مرعش ہو جانے کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی متناہی قوت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے ہلکے جھپٹنے میں محسوس کر لیا وہ مجھے اپنی آنکھوں کی گرفت میں لینا چاہتا ہے لیکن آج میں اس کی کسی ایسی ویسی کوشش کو کامیاب کرانے کے سوڈ میں نہیں تھا۔ ان لمحات میں میں نے اپنے اندر ایک ترنیمی آواز کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ آواز جیسے جیسے میری باطنی ساعت میں یہ ہدایات اغڑ رہی تھی۔

”وہ جان اس شخص کی آنکھوں میں لگا تا رہ نہ دیکھو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، یہ میری دم اور پتا خرم کا بہت بڑا ماہر ہے کہیں یہ اپنی کچھ اسرار صلاحیت کو استعمال کر کے بازی نہ پلٹ دے۔ یہ کھل جہانی طور پر کمزور ہوا ہے۔ اس کے دماغ اور روح میں اب بھی بے پناہ توانائی بھری ہوئی ہے۔ تم اس کی نگاہ سے لگا ملانے کی کوشش نہ کرو۔ جتنی جلدی ممکن ہو تم اپنے کام کو نفاذ کر یہاں سے نکل جاؤ۔ بازی کے آخری مرحلے پر کھیل کو بڑا نہیں چاہیے۔“

مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ اس وقت میرے اندر کون بول رہا تھا۔ وہ عدم تشدد کے حامی، جو کما کما ٹیمپل کے چیف لاما چنگ فورن پوٹی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میری اس کامیابی میں بلاشبہ چنگ فو کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں اس کی ہدایت کو نظر انداز کرنے کی قطعی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“

وہ کوئی سوال کیے بغیر میرے قریب آگئی۔

رہی نے نظریے سے ہونے لگے میں استفسار کیا ”تم کیا کرنا چاہتے ہو وہ جان!“

”جو کچھ بھی ہوگا تمہارے سامنے ہی ہوگا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بڑا کہا ”لہذا کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ خاموش بیٹھے میری کارروائی اور کارکردگی دیکھتے رہو، اللہ نے ہماری توجہ تمہاری خاطر تواضع کا موقع دیا ہے۔ تمہاری ہی خدمت مجھے بھی کر لینے دو۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے خطرناک مگن ساحل کو حصار دی اور سنتا رہے ہوئے لگے میں اسے ہدایت دی ”تم اپنے قدر دان میرزا کو اس طرح اپنے نشانے پر لیے رکھو کہ یہ میری کسی کارروائی میں کوئی مداخلت نہ کرنے پائے۔ اس نے تمہارا بہت خیال رکھا ہے۔ اس محبت اور تواضع کا کچھ

حلقہ تم بھی دو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔“

میں نے ڈرامائی انداز میں جملہ اور چھوڑا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ”مجمول کر بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ شخص بہت بڑا نمونہ بازی ہے اپنی آنکھوں کی مدد سے نمونہ بازی کرتا ہے، پچھلے کچھ عرصے میں تم نے اس کی نمونہ بازی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے!“

ساحل نے بڑے اعتماد کے ساتھ مگن میرے ہاتھ سے لے لی اور پھر عزم لگے میں بولی ”تم فکر نہ کرو وہ جان! میں تمہاری مرضی کے خلاف اسے ایک سانس بھی نہیں لینے دوں گی۔“

ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے رہی کے تیل فون پر قبضہ کیا۔ ایک کثیر المایات موبائل فون کو آف کر کے میں نے اپنے بیگ میں پھنچا دیا پھر اسی بیگ میں سے چھ ”مغیر“ اشیاء برآمد کر لیں۔ مذکورہ اشیاء کو میں نے ایک تریب سے میز پر جن دیا پھر بڑی سرعت سے مصروف عمل ہو گیا۔ آئینہ ایک منٹ کے اندر میں اس بیڈروم تک آنے والی تیلی فون کی لینڈ لائن کو بھی منقطع کر چکا تھا۔ اس انتظام کے نتیجے میں اتنا ہو گیا کہ اب رہی اس جگہ سے باہر کسی سے رابطہ کر سکتا تھا اور نہ ہی باہر والے فون کے راستے اس سے کسی قسم کی بات چیت کے قابل رہتے تھے۔

رہی نے میری اس کارروائی کو بڑی برداشت سے دیکھا۔ اسے اپنے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ وہ ان لمحات میں بے بسی کی جن منازل سے گزر رہا تھا، اس سفر کا شائبہ تک اس کی صورت پر کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک طاقت ور اور با اختیار شخص تھا۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ کے تلی بولتے پر، مجھے خاصے طویل عرصے تک تار سائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیے رکھا تھا اور اب اس کی باری تھی۔

ساری بات داؤ چلنے کی ہوتی ہے۔ کبھی رہی کا داؤ چل گیا تھا اور اس نے میری رگ چان پر تسلط جما کر مجھے ہاتھ پاؤں سے معذور اور دل و دماغ سے مفلوج کر دیا تھا۔ اب وہ میرے داؤ پر آیا ہوا تھا۔ دیانت داری کا تقاضا تو یہی تھا کہ اس کا دیا ہوا قرض سود و سود لوٹایا جاتا مگر اس کے ”احسانات“ کا قراوردانی ”بدلہ“ چکانے کی میرے پاس مہلت نہیں تھی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا چند منٹ میں کر گزرونا

تھا جب کہ اس کے شایان شان ”سلوک“ کے لیے ایک عرصہ درکار تھا۔ یہ ایک مشقت نہیں بلکہ قسط دار اتارنے والا قرض تھا لیکن انفس کہ میرے پاس صرف ایک قسط کا کوٹا تھا۔ ایک آخری قسط کا کوٹا!

میں نے ٹائیکون کی باری لیکن انتہائی مضبوط ڈوری کی مدد سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھ دیے۔ وہ زبان اور جسم کی مختلف جنبشوں سے مزاحمت کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اس کی ایسی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ بعض مقامات پر مجھے قدرے سختی سے بھی کام لینا پڑا مگر بہر حال میں نے اپنا مقصد پورا کر لیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

یہی سلوک میں نے اس کے پاؤں کے ساتھ بھی کیا۔ میں نے ٹائیکون کی ڈوری سے بندشیں لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی از خود اس جگہ بندی سے آزاد نہ ہونے پائے۔ رہی نے موقع کی نزاکت اور صورت حال کی سنگین گواہی طرح بھانپ لیا تھا اس لیے بھی زیادہ چون و چرا نہیں کی۔ میرے خطرناک تیروں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اگر اس نے میری کارروائی میں مزاحم ہونے کی کوشش کی تو میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اس کی عزت ایک سنگین اخلاق کے سبب میرے ہاتھ لگ چکی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس نے ہیرو بننے کی کوئی سی دکھائی تو میں وہ دور عایت واپس لے لوں گا جو میں نے اس کے معاملے میں اب تک روا رکھی ہوئی تھی۔ وہ بے عزتی کے اس موقع پر حد سے گزرا اور ڈن نہیں کر سکتا تھا!

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے میز پر سے مخصوص قسم کا ایڈیسیو ٹیپ اٹھا لیا۔ ان لمحات میں میرے ہاتھ برقی رفتار سے کام کر رہے تھے۔ منٹوں کا کام سینکڑوں میں مکمل ہو رہا تھا۔ میں نے ٹیپ کے رول میں سے تین مناسب لمبائی کی پٹیاں کاٹ لیں پھر ایڈیسیو ٹیپ کی ان پٹیاں کو میں نے ایک خاص تریب کے ساتھ رہی موٹے ٹائمن کے ہونٹوں پر چسک دیا۔ اس ایڈیسیو ٹیپ میں قیامت کی جکڑ اور پکڑ تھی۔ وہ کی جیو سننے کے مانند چپک جاتا تھا اور کسی جو تک کی طرح چپکتے ہی چوسنے کا عمل شروع کر دیتا تھا۔ میرے چسکائے ہوئے اس خاموش ٹیپ نے رہی کی قوت گویائی چوس لی تھی۔ وہ با اختیار شخص اپنی بے اختیاری کی کھڑوں میں زبان ہلانے کے قابل نہیں رہا تھا اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ کیسے خارج ہوتا۔!

رہی کی بے بسی پر میں اس کا اٹھا جب کہ ان لمحات میں وہ ”غش غش“ کرنے کا تمنا کی نظر آیا۔ بے چارگی اور احساس ذلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے سچ لکھے ہیں کہا۔

”موتے ناٹمن۔۔۔۔۔ تم میری اس کارروائی پر حیران ضرور ہو رہے ہو گے کہ میں نے تمہارے ہونٹوں پر چپکے والا یہ ڈانر نقل کیوں ڈالا ہے! اس ساؤنڈ پر وف کرے میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہی کا تھا۔ تمہاری کوئی چیخ پکار یہاں سے باہر نہیں جاسکتی لیکن جان لو کہ میں نے یہ کام ایک خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ دراصل میں تمہیں ایک یاد گار اور ناقابل فراموش تھوڑا سا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تمہارے جیسا عالی مرتبت اور جلیل القدر شخص حقیر سے حقے کے لیے میرا شکر یہ ادا کرے۔ میں تمہاری زبان سے جھکومت کے الفاظ سننے کی گستاخی نہیں کر سکتا اسی لیے تمہاری ”قوت گویائی“ کو سلب کرنے کا یہ بندوبست کیا گیا ہے۔“ میں نے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ بھی میرا ایک خاص مقصد ہے۔ ہمارے درمیان ”پیادومبت“ کی متحدہ ضخیم جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں کہ میں اسی بھی کھاتے کو کھول کر کئی طواری حساب کتاب میں لگ جاؤں۔ میں صرف تم سے چند ضروری باتیں کروں گا اور یہ چاہوں گا کہ اس موقع پر میں بولوں اور تم سنو۔ تمہیں بولنے سے روکنے کے لیے ہی میں نے تمہاری گویائی کے راستے میں بند باندھا ہے۔“

اس کی بند آنکھوں کے پیچھے سے آنسو نکلنے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ یقین ہی نہیں آیا کہ وہ مضبوط شخص رد بھی سکتا ہے مگر سامنے کی حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ آنسو اس کے رونے کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تھے تاہم میں نے فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ وہ مگر مجھ کے آنسو تھے یا بے بسی اور ندامت کے، پشیمانی اور پچھتاوے کے یا فریب اور دکھلاوے کے اور یا پھر شرمندی اور بھلاوے کے!

میں نے کبھی انداز میں کہا ”موتے ناٹمن! منہ بند ہو جانے کے بعد تم مجھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے صرف سننے پر مجبور ہو۔ میرے جانے کے بعد تم اپنے آپ سے کبھی کچھ نہیں کہہ سکو گے۔ یہ تمہارے ہونٹوں پر چپکی ہوئی معیبت تمہیں ایک لفظ نہیں بولنے دے گی!“

اس نے یک لخت آنکھیں کھول دیں۔ میرے آخری

جیلے کا منہ اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ میں نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اسے زندہ چھوڑ کر جاؤں گا اور یہی بات اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔ وہ مجھ سے کسی قسم کی نرمی، چھوٹ یا دروغیت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اپنے کہے کی تصدیق اور اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا۔

”میں نے غلط نہیں کہا موٹے ہاتھ! میں تمہاری جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میری طرف سے تمہیں کبھی چھٹی ہے۔ تم اپنی طبیعت موت تک زندہ رہنے کی کوشش کر سکتے ہو۔ بہر حال“ میں سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس اس وقت صرف سننے کا اختیار ہے اس لیے پوری توجہ سے سنو میں کیا کہنے جا رہا ہوں۔“ اس نے دوبارہ بے اعتنائی آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے غصے سے بولے لیجے میں کہنا شروع کیا ”رہی! یہ ایک طویل داستان ہے کہ میں تمہارے ملک میں کس طرح داخل ہوا اور کس طرح اپنے دشمن میں کامیاب ہونے کے بعد واپس جا رہا ہوں۔ تمہاری معلومات کی خاطر اتنا ضرور ذہن نشین کراؤں گا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ہم سیدھے بن گورین ائر پورٹ جائیں گے۔ راستے ہی میں ساحل کے طے میں مناسب تبدیلی کر لی جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک طیارے میں بیٹھ کر اردن کی طرف پرواز کر جائیں گے۔“

میں رہی کو چکر دینے کے لیے یہ سن گھڑت کہانی سن رہا تھا۔ میں نے بات کو پھیلاتے ہوئے مزید بتایا ”میں آج صبح ہی جورڈن (اردن) سے اسرائیل آیا ہوں۔ میرے ساتھ رانیانا نامی ایک لڑکی بھی (امان (اردن) سے تل ابیب (اسرائیل) پہنچی ہے۔ ساحل رانیانا کے ہمیں میں یہاں سے جانے لگی۔ رانیانا بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے۔ وہ کب اور کس طرح اسرائیل سے نکل کر جورڈن پہنچے گی یہ میں جانتا ہوں اور نہ ہی تمہیں بتا سکتا ہوں۔ پھر حال تم یہ سنو کہ اردن سے ہم دونوں یعنی میں اور ساحل مصطفیٰ اور کلوم کی حیثیت سے جدہ (سعودی عرب) چلے جائیں گے۔ اس مقدس سر زمین پر پہنچنے کے بعد ہم اپنی پہلی شناخت میں آجائیں گے پھر عمرہ ادا کرنے کے بعد ہم کے ایس اے سے سیدھے کراچی (پاکستان) روانہ ہو جائیں گے۔“

میں نے لیجے بھر کر رک کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس نے اس مرتبہ آنکھیں تو نہیں کھولیں البتہ اس کے چہرے کی تیزی سے بدلتی ہوئی

کیفیت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شخص اندر ہی اندر زبردور ہو رہا تھا۔ جسمانی جنبشیں اس کے وجود میں اٹھنے والے طوفان کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔

میں نے ٹھنکھار کر گھاسا کیا اور قدرے بلند آواز میں کہا ”موٹے ہاتھ! تم ایک ہا اختیار شخص ہواتے طاقت ور کہ تمہارے اشارے اندر ہر امریکا کے ایوان صدر میں بڑی جد جلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری تفصیل سنا کر میں تمہیں ایک قسم کا کھانا پیش کر رہا ہوں۔ تم اپنے تمام وسائل کو استعمال کر کے بھی میرا راستہ نہیں روک سکو گے۔ میں نے آجندہ چند دنوں کا اپنا لائحہ عمل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ تم اپنے اختیار اور اقتدار کے گھوڑے دوڑا کر دیکھ لیتا“ مجھے یقین ہے کہ تم میرے پاؤں کی گرد کو بھی نہیں پاسکو گے۔ پھر نا اور پکار کر کسی قسم کا ”استحسان“ لینا تو بہت دور کی بات ہے۔“

وہ جڑ بڑھ کر رہ گیا لیکن ”خند“ سے کچھ نہ ”بولا“ بولا بھی کیسے؟ میں نے ایڈیسیو ٹیپ کی مدد سے اس کی بولتی بند کرنے کا پراثرانی بندہ بست کر دیا تھا!

”موٹے ہاتھ! میں جانتا ہوں“ تم دل کے مریض ہو گئے ہو۔“ میں نے اس کے قریب جا کر کھٹکی خیر لیجے میں کہا ”اس لیے میں تم پر بڑا اہولہاتھ رکھ رہا ہوں۔ بہر حال میں نے تم سے جس ختمے کا ذکر کیا ہے وہ دینا تو بہت ضروری ہے!“

ختمے والی بات سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں پتہ نہیں کیا تھا!

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کھیلے لیجے میں کہا ”ختمے کے ذکر سے تم کسی ایسی ویسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو جانا۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے مطلوبہ وہ پانچ قیمتی پتھر تمہاری نذر کرنے آیا ہوں تو اس سوچ کو حاققت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تالیاب و نادر ڈائمنڈ امیر اللہ زہری، سیٹھ رائے اور ٹوپا زخمیں بھی نہیں حاصل ہو سکتے۔ یہ پانچوں روحانی اہمیت کے حامل پتھر بدھ مت کی کٹہ والی عبادت گاہ کی امانت ہیں لہذا ہمیشہ اس عبادت گاہ کے خاندان میں محفوظ رہیں گے جو شخص بھی ان کے حصول کی تمنا اپنے دل میں جگائے گا، جلد یا بدیر وہ دل کا مریض ہو جائے گا جیسا کہ تمہارے ساتھ ہوا ہے؟“

میں نے مسمی خیر انداز میں توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”لہذا تم ان پانچ پتھروں کا خیال دل سے

نکال دو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ اگر تم پوری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھتے رہو تو بہت جلد عبرت ناک موت مارے جاؤ گے۔ خیر تو میں تمہیں ختمے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اب زبانی کلامی بھی کیا بتانا تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں وہ خود دکھائی دیتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں مڑا اور اپنے بیگ کے پاس آگیا۔ بیگ میں سے میں نے فرسٹ ایئر کا ضروری سامان نکالا اور دوبارہ رہی کے پاس آگیا۔ اس سامان کو میں نے بیڈ سائیز ٹیبل پر رکھا اور جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے خطرناک خنجر کو اس کے کور سے نکال لیا پھر وہ خنجر رہی کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوری سفاکی سے کہا۔

”اس خنجر کو دیکھ رہے ہو موٹے ہاتھ! میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب برتتے ہوئے کہا ”اس کی قاتل دھار پر تمہیں خون بڑے واضح طور پر نظر آرہا ہوگا۔ جانتے ہو؟ کس کا خون ہے؟“

وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہذا اپنی ہوتی آنکھوں سے اس قاتل خنجر کو دیکھتا چلا گیا۔ میں نے افسوس ناک لیجے میں کہا۔

”آئی ایم ریلی ویری سوری! میں بھول گیا تھا کہ تم نے تھوڑی دیر پہلے چاہے شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے اس لیے کسی بھی سوال کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکو گے۔ چلو کوئی بات نہیں“ میں ہی تمہیں بتاتے دیتا ہوں۔“

میں نے رک کر ایک گھمبیری سانس خارج کی اور نہایت ہی سنگین انداز میں کہا ”یہ آگہ نکل ہے۔ اس کے ہلکے بلیڈ پر تازہ تازہ متحول ہونے والے دو کتوں کا خون لگا ہوا ہے۔ میں کوئی امیرے غیرے تو خیرے کتوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ میں اعلیٰ نسل والے ان دو کتوں کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے تمہارے حکم پر اس جنگل میں ”ناخت داغ ڈاگ“ کی ڈیوٹی سنبھال رکھی تھی۔ میں نے اسی خنجر کی مدد سے تل ڈاگ کی اس جڑی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہے!“

میں نے ایک ایسے زاویے سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں سے ہماری نظریں براہ راست ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتی تھیں، یہ احتیاط بہت ہی ضروری تھی۔ رہی موٹے ہاتھ جسمانی طور پر میری گرفت میں آچکا تھا لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی پراسرار صلاحیتوں کو ذہن سے فراموش نہیں کیا تھا۔ میں جانتا تھا، رہی دیگر باطنی علوم کے ساتھ ساتھ ہی مسخریزم اور پٹانازم کا بھی ماہر تھا۔ اگر ایک مرتبہ اسے آنکھوں کے راستے سے میرے اندر اترنے کا

موقع مل جاتا تو کچھ بعد نہیں تھا وہ بازی کو پلٹ دیتا۔ اگرچہ مجھے مددنی مدد یقین تھا وہ جا ہے کچھ بھی کر لے، مجھے اپنے خرائس میں نہیں لے سکے گا لیکن اپنے دشمن کے اختتامی مرحلے میں کسی قسم کا سرک بیلنے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے ایک محفوظ ترجمے زاویے سے اس کی جہاں دیدہ آنکھوں میں سراپسکی کو بڑی تیز رفتاری سے تیرتے ہوئے پایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس خنجر کو دیکھ کر رہی نے یہ سوچ لیا ہو کہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا ہوں۔

میں نے اس کی سوچ کے آشکار ہوتے ہی جلدی سے کہا۔ ”دل چھوٹا اور داغ موٹا نہ کرو رہی!“ میرے لیجے میں گھرے طرکی کاٹ تھی۔ ”دل کے مریض تو تم ہو ہی چکے ہو، کیا داغ کا کھاڑا بھی کروا ہے؟ تسلی رکھو میں نے تم سے وعدہ کیا ہے ناکہ میں یہاں تمہیں زندہ چھوڑ کر جاؤں گا۔ یقین کر لو تمہارا خون میرے ہاتھوں پر نہیں لکھا ہوا۔ بس“ میں تو تمہاری خدمت میں ایک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے جا رہا ہوں۔ تم اسے میری نشانی سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھنا۔ جب جب تمہاری اس نذرانے“ ختمے اور نشانی پر نظر پڑے گی“ میں تمہیں یاد آؤں گا۔ اور بہت ٹوٹ کر یاد آؤں گا!“

میرے ان مکالمات کا اس کے چہرے پر پیا آنکھوں میں کیا تاثر قائم ہوا“ میں نے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بڑی بے رحمی سے پلٹ کر اسے اوندھا کر دیا۔ ان لمحات میں میں بہت سنگ دل اور سفاک ہو گیا تھا۔ رہی کے لیے میرے دل میں ڈراسی بھی نری موجود نہیں تھی۔ ٹھیک ہے میں اسے قتل نہیں کر رہا تھا لیکن میں جو کچھ کرنے جا رہا تھا وہ قتل سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اگر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا تو یہ یک مشت موت ہوتی۔ وہ پلک چمکتے میں سر کر سارے جمبیلوں سے آزاد ہو جاتا۔ اور میں یہی نہیں چاہتا تھا!

اس نے ”آئیل مجھے مارا“ والے انداز میں مجھے ایک عرصے تک اذیت ناک جمبیلوں میں ڈالے رکھا تھا“ میں کیوں کر اسے ”آزاد“ کر دیتا۔ میں اسے ایک ایسے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا تھا کہ وہ میرے دیے ہوئے ختمے کو دیکھ کر ہر روز بیکڑوں مرتبہ موت سے سناٹا کرے لیکن موت کی خود میں سر رکھنے کا اسے موقع نہ ملے۔ میں اسے ”ڈیڈی ڈیو“ کے اسکیل پر مارنا چاہتا تھا۔ وہ جب تک بھی زندہ رہتا“ اپنے لیے اور پوری بیودی قوم کے لیے نمونہ عبرت بن رہا تھا! میں نے موٹے ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر باندھا تھا جب وہ اوندھا ہوا تو بندھے ہوئے ہاتھ اس کے

کرانا چاہتا ہوں۔ اگر میری صحت کو ملے ہاندھ لو گے تو یہی کبھی زندگی کو آرام و سکون سے گزار لو گے۔ یہ صورت دیکر، تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آئے گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

میرے لہجے میں اس درجے کی یقینی بھری ہوئی تھی کہ وہ سبھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے نہایت ہی ظہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہیں اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ اس وقت تم پوری طرح میرے رحم و کرم پر ہو۔ اس ہنگامے کی دونوں منازل میں پائے جانے والے تمہارے تمام حمایتی اور خدمت گزار اس قابل نہیں رہے کہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی کبھی کوڑا سکیں وہ تمہاری مدد کو کیا خاک آئیں گے! میں چاہوں تو پلک جھپکتے میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر رہا..... میں ایسا کیوں نہیں کر رہا، اس کی دود جو بات ہیں۔ نمبر ایک، اپنی دونوں انگشت شہادت کٹوا کر تم اعضائی یعنی عضوی خوردی کا شکار ہو چکے ہو۔ علاوہ، ان دونوں تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات تو تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے یہاں بیمار اور عینی جانور کی قربانی قبول نہیں ہوتی!“

میں لمبے بھر کو توقف ہوا پھر اسی انداز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”نبرد“ تم اپنی قوم کے مذہبی اور روحانی پیشوا اور دنیا کے تمام مذاہب کے بارے میں تمہاری معلومات بہت وسیع ہیں۔ تمام تر فنی سوچ اور فخری سرگرمیوں کے باوجود بھی بلاشبہ تم علم کا ایک سمندر ہو۔ کسی عالم کی موت درحقیقت مرگہ علم ہے۔ میرا مذہب اس کی خدمت کرتا ہے۔ میں جس مذہب سے تعلق رکھتا ہوں وہ دیگر مذاہب اور مذہبی راہنماؤں کے احرام کا درس دیتا ہے۔

میں نے تمہارے دونوں ہاتھوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اسے ایک چھوٹی سی تادیبی کارروائی سمجھ لو۔ تمہیں مجھ پر اور میری قوم پر کسی بھی ہاتھ کی انگلی اٹھاتے ہوئے سو مرتبہ سنا پڑے گا کیونکہ اس مقصد کے لیے اٹھنے والی انگلیاں تو اپنا وجود کھو بیٹھی ہیں۔ اگر کبھی دوسری انگلیوں کی مدد سے تم نے کوئی بھونڈی کوشش کی تو تادیبی کے بعد توبیری کارروائی کا نمبر آئے گا!“

میں اس کے پاس سے ہٹا اور اپنے ضروری سامان کو سمیٹ کر بیک میں ڈالنے لگا۔ پھر میں ساحل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیڈروم کے دروازے پر پہنچا۔ اب ربی مونٹے

جسم کے اوپر آگئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی کلاہیوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر مضبوط بندش لگا لی تھیں۔ ان ہاتھوں کی انگلیاں حرکت کے لیے آزاد تھیں۔ میں ربی کے اوپر چمکا اور اپنے خنجر کی دھار کو اس کی انگشت شہادت پر آزمانے لگا۔

میں نے دو متوازن جھکے لگائے اور دونوں ہاتھوں کی انگشت شہادت کو جڑ سے کاٹ ڈالا۔ کئی ہوئی دونوں انگلیاں پنج کباب کی شکل میں بستر پر جا گریں۔ میں نے ربی کے ہاتھوں پر جس درجے کا ستم توڑا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ ان لمحات میں درد کے کس سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرا ہوگا اور ابھرا ابھر کر ڈوبا ہوگا۔ میں ربی کی کسمپرسی اور بے چاری کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ اپنے احساس کو آزما کر بہ خوبی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بہر حال ربی کی حالت سے میرے دل داغ نے گہرا سکون محسوس کیا۔

انگلی کٹے ہاتھوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں چونکہ ربی کو زندہ رکھنا چاہتا تھا لہذا سیلان خون کو فوری طور پر روکنا ضروری تھا۔ اس مقصد کی خاطر میں فرسٹ ایڈ کا سامان اپنے ساتھ لایا تھا۔ آئینہ پانچ منٹ کے اندر میں نے اس کے دونوں گھائل ہاتھوں پر شانی ڈریسنگ کردی پھر اس کے چہرے کو اپنی جانب موڑتے ہوئے تعمیر لہجے میں کہا۔

”مونٹے ہائمن! اب اس خنجر پر تمہارا خون بھی لگ چکا ہے۔“ میں نے مذکورہ خنجر کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا ”تمہیں بتا چکا ہوں، پہلے اس خنجر کی دھار پر کس کا خون موجود تھا۔ یوں سمجھ لو یہ ”بلڈ گراس پیچ ٹیسٹ“ ہو رہا ہے۔ بہت جلد اس ٹیسٹ کی رپورٹ بھی ”آجائے“ گی جس سے واضح طور پر پتا چل جائے گا، بس کے خون نے کس کے خون کو آلودہ کر دیا!“

جب انسان جسمانی تکلیف سے گزر رہا ہوتا ہے تو اس کے سونپنے سمجھنے کی صلاحیت بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے اور کسی ایک جانب وہ توجہ کو مبذول نہیں رکھ سکتا۔ اس تناظر میں ربی اب کسی بھی حوالے سے خطرناک نہیں رہا تھا۔ پناہنوم کے لیے جس ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے ربی کے لیے ان اذیت ناک لمحات میں اسے قائم رکھنا ممکن نہیں رہا تھا لہذا میں نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری تنبیہ کی کہ۔

”مونٹے ہائمن! میں اب یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں اور جاتے جاتے میں تمہیں چند اہم نکات ذہن نشین

باہن کی صورت مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی کروت دوسری جانب تھی۔ میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے الوداعی انداز میں کہا۔

”موتے باہن! میں مانتا ہوں تمہارے اندر حکمت، علم اور دانش کا ایک انمول خزانہ چھپا ہوا ہے لیکن تم نے اپنی متقی سوچ کے باعث اس صلاحیت کو بٹا کر رکھا ہے۔ پھر میں تمہارے علمی بجزیکراں کا پاس اور عمر کا لحاظ کرتے ہوئے تمہیں اصلاح کا ایک موقع دے رہا ہوں لیکن یاد رکھو یہ میری جانب سے ملنے والی پہلی اور آخری معافی ہے۔ آج کے بعد اگر تم نے میرے ملک اور قوم کی طرف مہلکی نظر سے بھی دیکھا یا کسی قسم کی دشمنانہ کارروائی میں ملوث پائے گئے تو..... انگلیوں کے بعد گردن کی باری بھی آسکتی ہے!“

بات ختم کرتے ہی میں نے ایک۔ جھکے سے بندرود کا دروازہ کھولا اور رلی کو اندر بند کر کے اس جھکے سے نکل آیا۔ آج میں نے دنیا کے ایک طاقت ور اور با اختیار شخص کو ایک سلسلی خیر انگیز سے شکست دی تھی۔

☆☆☆

آٹھ بج کر آٹھ بج چکا تھا!

اس وقت رات کے، وہ چالیس ہوئے تھے۔ میں نے بندوبست کی ڈرائیونگ سیدہ سنہالہ رکھی تھی۔ میرے پہلو میں پنچر سیٹ پر ساحل براجن تھی اور وہ بندوبست پر بے فرمائے بن گورین انر پورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔ ساحل نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی لگاؤ سے پوچھا۔

”تم اس وقت کی طرف جارہے ہو؟“

”ہمارا رخ آہیب کے بن گورین انر پورٹ کی جانب ہے۔“

”اوہ.....!“ اس نے چونکے والے انداز میں ایک گہری سانس خارج کی ”اس کا مطلب ہے تم نے اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا ہے جس کی تفصیل رلی کو بتائی تھی۔“

”کون سا پروگرام؟“ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ بولی“ یہی کہ ہم اسرائیل سے اردن جائیں گے۔ اردن سے سعودی عرب اور پھر سعودی عرب سے سیدھے پاکستان!“

”وہ تو میں نے رلی کو دھوکا دینے کے لیے ایک فرضی کہانی سنائی تھی“ میں نے کہا ”ایک بوس پلان..... جس کی روٹی میں وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے جہاں جہاں جی چاہے

جک مارتا پھرے۔“

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور احتضار کیا ”پھر تمہارا اصل پروگرام کیا ہے؟“

”ہم راتوں رات باہی روڈز ایلپ سے نکل کر یروخلم پہنچیں گے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ”یروخلم سے اگلے روز یعنی نو بج کو ہم مصر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد مصر سے انگلینڈ اور انگلینڈ سے سیدھے تبت پہنچ جائیں گے۔“

”تبت.....!“ اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”تم تبت کیوں جارہے ہیں؟“

یہ تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے مختصر الفاظ میں نے اسے بتایا۔ ”میں ایک خاص پروگرام کے تحت لہا سا (تبت) سے لندن (انگلینڈ) اور لندن سے قاہرہ (مصر) پہنچا تھا پھر مصر سے اسرائیل میں داخل ہوا ہوں۔ اسی خاص پروگرام کے بقیہ حصے پر عمل کر کے مجھے وہاں تبت پہنچنا ہے۔ تبت جانے کا سبب چنگ فورن پوٹی کا حکم ہے۔ چنگ فو لہا سا کے چونکا گیا ٹیبل کا چیف لانا ہے۔ اس پروگرام کی تفصیل میں تمہیں فرصت ملنے پر بتاؤں گا۔ فی الحال صرف اتنا سمجھو کہ ہمارا زندگی میں چنگ فو نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے مجھے تبت کا داماد قرار دیا ہے اور اسی کے حکم پر میں تمہیں رلی کے چنگل سے نکال کر تبت پہنچا رہا ہوں۔ اگر چنگ فو کی مشاورت اور تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو یہ کام اتنی آسانی سے ہونے والا نہیں تھا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو جہاں!“ وہ خواب ناک لہجے میں بولی ”واقعی مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ تم دونوں آپس میں مل چکے ہیں۔ اس منٹوں شخص رلی نے ہمارے درمیان جدائی کی فلک یوس دیوار کھڑی کر دی تھی۔“

میں نے کہا ”یقین کر لو کہ ہم ایک ہو چکے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت اب ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ رلی اور اس کی اٹھائی ہوئی آسمان تک بلند دیوار جدائی دیوار گرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی میں نے تمہاری نظر کے سامنے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ باقی کی عمر یہ شخص اسی خود ساختہ دیوار سے سرٹکا کر گرے دیواری میں گر ادرے گا۔“

دیوار گرے (WAILING WALL) یروخلم میں واقع ہے۔ یہودی قوم اس دیوار کو آہ و زاری کے لیے استعمال کرتی ہے۔ یہ دیوار ”دیویشن وال“ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ساحل نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”محترم

چک فونے اگر تمہیں تبت کا داماد قرار دیا ہے تو اس کی نظر میں میری کیا حیثیت ہے؟“

ساحل کے والدین بھیر جانی اور تھوچی کا تعلق تبت سے تھا۔ وہ حالات کے چکر میں چھٹ کر کھٹھڑ پہنچے اور پھر بدھ بنل کنڈ والی عبادت گاہ کی خدمات کا کام انہوں نے سنبھال لیا۔ ان دنوں ساحل دھون ہوا کرتی تھی۔ تیوا پاکستان میں داخل ہونے کے بعد میں نے اس کا نام دھون سے بدل کر ساحل رکھ دیا تھا جو اسے بے حد پسند بھی آیا تھا۔ ساحل کا باپ تھوچی کوئی بدھ بکٹو نہیں تھا بہر حال وہ بدھ بنل کنڈ والی عبادت گاہ میں کسی بدھ بکٹو سے زیادہ اہم کام کر رہا تھا۔ افسوس کہ اب تھوچی اور بھیر جانی آں جہانی ہو چکے تھے۔ ان تمام واقعات کی تفصیل میری داستان کے وسطی حصے میں بیان کی جا چکی ہے۔

ساحل کو تبت دیکھنے کا بڑا اشتیاق رہا تھا۔ اس نے اس جنت نظیر قطعہ ارض کی صرف تعریف ہی تعریف نہ کی تھی۔ جب ہم دونوں پاکستان میں تھے تو سوچا تھا ”کبھی فرصت ملی تو تبت کی سیر کو ضرور جائیں گے۔ اب ساحل نے جو میری زبان سے تبت جانے کا تذکرہ سنا تو وہ ایک سلسلی خیر جوش خروش سے سرشار ہو گئی۔ اسی جوش میں اس نے اپنی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے وہ اہم سوال کیا تھا۔

میں نے نہایت ہی سادگی سے جواب دیا۔ ”چیف لاما چنگ فورن پوٹی تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے..... یعنی تبت کی بیٹی!“

وہ تعجب کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں وہ تمام رنگ شامل تھے جو ان لڑکیوں کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں جو اپنی شادی کی بات سن کر بے ساختہ شرمناک بنیں۔ ساحل کا یہ رد عمل عین فطری تھا۔ میں نے بھی دراصل ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کی شادی کی بات ہی کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کی شادی کی بات میری شادی کی بات بھی تھی!

میں نے یہ دستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے پوچھا ”کیا ہم دونوں کی شادی کا ذکر تمہیں اچھا نہیں لگا جو رن سمجھو کیوں بے رخی سے دوسری طرف دیکھنے کی ہو؟“

”نہیں..... نہیں“ وہ گڑبڑا گئی ”ایسی تو کوئی بات نہیں!“

”پھر کسی بات ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

وہ موضوع سے کئی کانٹے ہوئے ایسے بولی جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آئی ہو پوچھ گئے تھے ”جب ہم لوگ باہی روڈز ایلپ سے یروخلم جائیں گے تو پھر تم انر پورٹ کیوں

جارہے ہو؟“

”میں کب انر پورٹ جارہا ہوں!“ میں نے اس کی الجھن سے غلط فہمی سے بڑے حیرت بھری لہجے میں کہا۔

”ابھی ابھی تو تم نے بتایا تھا ہمارا رخ تل ایلپ کے بن گورین انر پورٹ کی جانب ہے!“ وہ یاد دہانی کرانے والے انداز میں بولی۔

”میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ساحل!“ میری آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا ”اس دین کا رخ یقیناً انر پورٹ کی طرف ہی ہے لیکن باہی دے میں داخل ہونے کے بعد میں دین کو چھوڑ دوں گا۔ دراصل میں رلی اور اس کی ”ٹیم“ پر یہ تاثر قائم کرنا چاہتا ہوں کہ انر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے دین میں کوئی خرابی نمودار ہوئی اور ہم مجبور اسے ہائی دے پر چھوڑ کر کسی اور ڈر لے سے انر پورٹ کی سمت گئے ہیں۔“

”اوہ! پھر تو بندوبست کو چھوڑنے سے پہلے تمہیں اس میں کوئی خرابی بھی پیدا کرنا ہوگی!“ اس نے تشویش ناک لہجے میں اٹھارہ خیال کیا ”تا کہ یہ ڈراما بالکل حقیقت نظر آئے۔“

”وہ میں کر لوں گا“ بے ساختہ میرے زبان سے نکلا ”اس کے انجن کے ساتھ تھوڑی پچھڑ چھاڑ کر نے سے کام بن جائے گا۔“

”وہ جان..... تم ذرا بھی نہیں بد لے ہو!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تمہارا اشارہ خرابی پیدا کرنے کی طرف ہے یا چھیڑ چھاڑ کی جانب؟“

”میرا اشارہ صرف اور صرف تمہاری سمت ہے!“

”اوہ!“ میں نے بے ساختہ ایک گہری سانس خارج کی ”بتائیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ میرے نہ بدلنے سے تمہاری کیا مراد ہے حالانکہ میں اس وقت اپنی اصل شکل صورت میں نہیں ہوں۔ میں نے ایک مصری باشندے یوسف لظاہری کا بھیس بدل رکھا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی ”میں تو تمہارے مخصوص منصوبہ ساز انداز حراج اور فطرت کی بات کر رہی ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے میں تمہارے سامنے مل ہو گیا“

میں نے مقتدل لہجے میں کہا ”میری یوسف لظاہری والی اداکاری نا کام ہو گئی۔“

ساحل نے یہ بات بڑے واضح انداز میں محسوس کر لی تھی کہ میں دانستہ اس سے چھیڑ چھاڑ والے انداز میں دل لگی کر رہا ہوں۔ وہ میرے بہت قریب رہی تھی اس لیے بھی

میری عادات، مزاج اور فطرت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

”تمہارے ہاتھ میں کوئی تکلیف ہے وہ بدن؟“

میں ڈایونیک کے دوران میں غیر ارادی طور پر دھتے دھتے سے اپنے ہاتھ میں تھکی ہوئی بند کھول کر بائنا۔ یہ وہی گھماں تھا۔ جس کی تھیلی میں مجھ نے بے درلج کاٹ ڈالا تھا۔ زخم کی تکلیف شدید نوعیت کی نہیں تھی۔ مجھے ہلکی ہلکی جلن اور الجھن کا احساس ہو رہا تھا اور یہی احساس غیر ارادی انداز میں متاثرہ ہاتھ کی تھکی کو کھول بند کر رہا تھا۔

سائل کے سوال کے جواب میں میں نے اسے اس واقعے کی تفصیل سنائی پھر بتایا، ”کوئی خاص تکلیف نہیں۔ اپارٹمنٹ پر پہنچنے کے بعد میں اس کا ہاتھ لوں گا۔“

”اپارٹمنٹ!“ وہ الجھن زدہ لہجہ سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”کیا نہیں کسی اپارٹمنٹ میں جانا ہے؟“

میں نے جواباً اسے مختصر الفاظ میں ”بہائی گارڈن اپارٹمنٹس“ کے اپارٹمنٹ نمبر سترہ کی سی کے بارے میں بتا دیا۔ اس بیان میں صوفیہ کا ذکر بھی آیا۔ سائل صوفیہ کا نام سن کر بڑے متنی خیز انداز میں میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کی مخصوص تشویش دور کرنے کے لیے میں نے اسے بتا دیا کہ کس طرح میں صوفیہ سے، ساتھ ایک شیدول سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ اور کس طرح وہ یعنی.....

سائل صوفیہ کی آئی ڈی پر سرانگیں سے لندن کی ”میری ایک گہری دوست کی حیثیت سے سفر کرے گی پھر میں نے اس موضوع کو جلد بند کرنے کا خاطر کیا۔

”میں نے صوفیہ سے کہا تھا تم از کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ایک بجے تک میں واپس اپارٹمنٹ پر پہنچ جاؤں گا۔ ایک تو پہنچے ہی والا ہے۔ مجھے نہیں امید کہ میں ڈیڑھ بجے سے پہلے اپارٹمنٹ پہنچ سکوں لہذا مجھے صوفیہ کو فون کر کے اپنی بخیریت کامیابی سے آگاہ کرنا ہوگا۔“

سائل نے اس سلسلے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم اس دوران میں سفر کرتے ہوئے ان پورٹ کی طرف جانے والی ہائی وے پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے تھوڑا آگے آنے کے بعد ہندوین کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک کا وہ ازدحام دکھائی نہیں دیتا تھا جو دن اور خصوصاً شام کے وقت نظر آتا تھا۔ اس دین کو ”خراب“ کرنے کے بعد ہم پیدل ہی واپس چل پڑے پھر ایک پبلک کال سینٹر سے میں نے صوفیہ کو فون کیا۔

اپارٹمنٹ نمبر سترہ کی سی کا فون نمبر میرے ذہن میں

محفوظ تھا۔ میں نے فون مشین کے کی پیڈ پر ”فائیون سکس“ ڈبل سیون ڈبل قری“ کے نمبر پر کھینچ کر دیے۔ یہ ایک چونکہ لوکل نمبر تھا اس لیے ایریا کوڈ ”زیرو قری“ ماننے کی ضرورت نہیں تھی البتہ اپارٹمنٹ والے دن سینٹ کے کارڈ آئی ڈی اسکرین پر پی سی (پبلک کال سینٹر) کے لوکل نمبر سے پہلے محل ایبیب کا ایریا کوڈ ”زیرو قری“ ضرور فیلڈ کر رہا ہوگا۔

میں نے اپارٹمنٹ سنا نہیں۔ سی سے رخصت ہوتے وقت فون کے سلسلے میں صوفیہ کو چند اہم ہدایات دی تھیں، میں نے انہی ہدایات کی روشنی میں ایک بیل جانے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر ایک منٹ کے بعد دوبارہ رنگ کیا اور دوبارہ ایک کھٹی بجنے کے بعد لائن کاٹ دی۔ اس کے فوراً بعد ایک مرتبہ پھر وہی نمبر مایا۔ ہمارے درمیان یہی طریقہ کار طے ہوا تھا۔ اب وہ بے دھڑک فون انٹینڈ کر رہی تھی..... اور اس نے ایسا ہی کیا۔

میں نے نہایت ہی غمخیز ہوئے لمحے میں کہا ”صوفیہ! یہ میں ہوں۔ تم خیریت سے تو ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں“ اس کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”تم سناؤ اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ تم اس وقت کہاں ہو؟ مشن کس مرحلے میں ہے؟“

”ہمارا مشن بہ خیر و خوبی کامیابی سے ہمکنار ہو گیا ہے۔“ میں نے غمخیز ہوئے سرت انگیز لہجے میں کہا ”سائل اس وقت میرے ساتھ ہے۔ میں نے رلی اور اس کے بچنے کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ ہم تھوڑی سی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں۔“

”اوہ..... ٹھیکس گاڈ!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے پوچھا ”اپارٹمنٹ پر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی نا؟“

”نہیں یہاں پر امن و امان قائم ہے“ اس نے جواب دیا ”جلدی چلے آؤ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”میں آ رہا ہوں.....“

میں نے یہ کہتے ہوئے ٹیل فونک سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران میں سائل میرے قریب ہی رہی تھی بلکہ میں نے جب صوفیہ سے گفتگو آغاز کی تو وہ کچھ اور ہی نزدیک کھسک آئی تھی، اتنا پاس کہ ریسیور میں ابھرے والی صوفیہ کی آواز اس کی سماعت تک پہنچائی رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اس کا یہ عمل کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا یا پھر ایک بے ساختہ فعل، بہر حال اس حرکت کو خالص بیویوں والا انداز

کہا جاسکتا تھا۔

ہم پی سی سے باہر نکلے اور ایک ٹیکسی پکڑ کر بہائی گارڈن اپارٹمنٹس چلے آئے۔ میں نے احتیاطاً ٹیکسی کو ٹالوم اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس کے نزدیک چھوڑ دیا اور پیدل ہی چلتے ہوئے ہم اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف بڑھ گئے۔ اپارٹمنٹ نمبر سترہ کی سی کے دروازے تک پہنچنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نے اسی مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی جو صوفیہ سے طے ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں آنکھیں بند کر کے تھوڑا آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں اپارٹمنٹ کے اندر گھس گیا۔ وہ کامین میں موجود تھی اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے مطمئن ہونے کے بعد آنکھیں کھول دیں۔

اگلے ہی لمحے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا کھلے ہوئے دروازے میں صوفیہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے راہ داری میں دائیں بائیں چوکتا نگاہ دوڑائی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ ہم نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

ہم نے آج شام اس اپارٹمنٹ پر ”قبضہ“ جایا تھا اور صرف اس کے کشادہ کامین کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا جہاں ایک دیوار کے ساتھ مکمل صوفیہ موجود تھا۔ میں سنگ روم میں پہنچا اور وہاں سے دو تین آرام دہ کرسیاں بھی اٹھا لیا۔ آنے والے لمحوں میں ہم وہاں جس کارروائی کا آغاز کرنے والے تھے اس کے لیے کئی کئی شے کی ضرورت پیش آسکتی تھی!

رہی ملک سلیک کے بعد صوفیہ نے مجھے اس مشن کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ دروہی سوچی زبانی مبارک باد تک محدود نہ رہتی..... سائل کی موجودی نے اسے حد سے تجاوز کرنے سے روک رکھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی میں نے سائل کے حصول کے لیے دنیا بھر کی صوبتیں برداشت کی ہیں اور اس بات کا بھی اسے بخوبی اندازہ تھا کہ مغرب سائل سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اس خیال اور احساس نے اسے اندر سے اندرزدہ کر دیا تھا، وہ یہ ظاہر بھی خوشی محفل کر رہا تھا کہ میں کر رہی تھی لیکن میں جانتا تھا وہ اندر سے خوش نہیں۔ مجھ سے دور ہوجانے کا احساس اسے لول کر گیا تھا لیکن افسوس کہ میں اس کی اندرونی خوشی کی بحالی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو اس وقت خود جدائی کے زخموں سے چور چور تھا۔ ان زخموں پر

سائل کے حصول کا مرتبہ رکھ کر ایک طویل عرصے تک آرام کرنا چاہتا تھا۔ ان حالات میں میں صوفیہ کی دل جوئی کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی طور اس کے دکھ کا مداوا بن سکتا تھا۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی کہ انسان بنیادی طور پر بڑا ہی خود غرض واقع ہوا ہے۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو اسے دوسروں کا غم دکھائی نہیں دیتا۔ وہ یہی فرض کر لیتا ہے کہ وہ خوش ہے تو ساری دنیا ہی خوش ہوگی۔ میں بھی ان لحاظ میں کچھ اسی قسم کے رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سائل کو پانے کی خوشی نے صوفیہ کے دکھ کو یکموقع کر دیا تھا۔

میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”پاکیں تو ساتھ ساتھ ہوتی رہیں گی۔ یہ بتاؤ سائل کو صوفیہ بنانے میں تمہیں کتنا وقت لگے گا؟“

”آدھے سے پونہ گھنٹا!“ وہ سائل کا یہ غور جائزہ لیتے ہوئے بولی ”اس کے چہرے کی بناوٹ اور ہڈیوں کی ساخت ننانوے فی صد مجھ سے مشابہ ہے لہذا اس مقصد میں کامیابی بہت آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔ اگر میں خال و خط میں تھوڑی تبدیلی کر کے اس کا ہنر اسٹائل اپنے جیسا بنا دوں تو سو فی صد کام چل جائے گا۔ کاتیلی ٹورائڈ ٹرپ ٹریول مینی کے اسٹاف اور مسافروں کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ شک نہیں گزرے گا کہ تمہاری مسافر سہیلی بدل گئی ہے۔ وہ یہی سمجھیں گے جس صوفیہ کے ساتھ تم انہی کی مزید سیر کے لیے رک گئے تھے، اسی کے ہمراہ تم نے انہیں یہ وٹلم میں دوبارہ جوائن کر لیا ہے۔“

”دیری ناکی!“ میں نے رست واقع پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا ”اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے تم زیادہ سے زیادہ سواد بجے تک فارغ ہواؤ گی؟“

”شیر.....“ وہ پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔

میں نے کہا ”ٹھیک ہے۔ میں ڈھائی بجے کے لیے ریڈیو کیب والوں کو فون کر دیتا ہوں۔“

”ریڈیو کیب کے لیے تم دو بجے فون کرنا“ صوفیہ نے مشورہ کیا۔

میں نے اس کی بات مان لی۔

اپارٹمنٹ سے رلی والے بچنے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ”بلوم اسٹار“ ریڈیو کیب سروس والوں سے مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں۔ شہر سے باہر جانے کی صورت میں آدھا گھنٹا پہلے انہیں کال کرنا پڑتا تھا۔ نصف شب کے

بعد وہ لوگ محل ایب سے بروٹم تک پہنچانے کے دو سو امریکی ڈالر یعنی سات سو نچھیل وصول کرتے تھے۔ ان دنوں ایک پوائس ڈالر ساڑھے تین نیوٹھیل کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ نیوٹھیل اسرائیلی کی نقای کرئی ہے۔

صوفیہ نے ساحل کو ایک آرام کرسی پر بٹھایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میں بیگز کی تارکی میں لگ گیا۔ میں صوفیہ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے انگلینڈ سے یہاں پہنچا تھا اور ہمارا تمام تر سامان ایک ہی بیگ میں تھا۔ اسی بیگ کے اندر ایک خالی بیگ کو میں نے دکر کے رکھا ہوا تھا۔ اب ہمیں دو بیگ الگ الگ بنانے تھے۔ میں نے دشرہ خالی بیگ کو باہر نکالا اور اسی میں صوفیہ کے لیے ضرورت کی اشیاء بھر نے لگا۔ کتنی نیوٹی کا خیال رکھتے ہوئے مجھے اپنے پاس وہی بیگ رکھنا تھا جس کے ساتھ میں اب تک سفر کرتا آیا تھا۔ میں نے ”ہیروڈ“ سپر مارکیٹ سے ساحل کے لیے بھی ضروری شاپنگ کی تھی۔ دس منٹ کے اندر میں نے دونوں بیگز کو تیار کر لیے۔

ہم جب اس اپارٹمنٹ سے نکلے تو ہمیں یہاں اپنے مختصر قیام کے آٹار کو بھی ملنا تھا اور یہ کام بوقت رخصت ہی زیادہ مجھے انداز میں کیا جا سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ صوفیہ تموزی دیر بعد ہم سے جدا ہو جائے گی۔ اسے ہیرالڈ تھامس کی ہدایات کے مطابق کسی شخص سے جا کر ملنا تھا جو کسی نہ کسی طرح اسے اسرائیل سے نکال کر واپس لندن پہنچا دیتا۔ کس طرح؟ یہ ہیرالڈ تھامس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں صوفیہ کو ٹوٹا تو اس نے بھی کوئی حسی جواب نہیں دیا اور ساری فلم اسی شخص کے گلے میں ڈال دی جس نے اسے اسرائیل سے بھلاعت نکالنا تھا۔ اسی خاطر میں نے صوفیہ سے پوچھا۔

”تم ہیرالڈ تھامس سے کب رابطہ کرو گی؟“

پروگرام کے مطابق میرے مشن کی تکمیل کے بعد صوفیہ نے ہیرالڈ تھامس کو فون کرنا تھا۔ پھر وہ اسے بتاتا کہ اس نے کب اور کہاں، کس شخص سے جا کر ملنا ہے۔ میرا مشن نہایت ہی کامیاب رہا تھا لہذا وہ وقت آن پہنچا تھا جب صوفیہ نے اپنے بڑے ہیرالڈ تھامس کو خوشی اور کامیابی کی یہ خبر سنائی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں صوفیہ نے جو کچھ کہا، وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔

”میں ہیرالڈ تھامس سے رابطہ کر کے ہدایات لے چکی ہوں“ وہ پرمکون لکھے میں بولی۔

”کب؟“ بے ساختہ میری زبان سے یک لفظی سوال

پھسل گیا۔

اس نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بتایا ”جب تم نے فون کر کے مجھے اپنا کامیابی سے مطلع کیا تھا..... کوئی آدھا پونہ گھنٹا پہلے۔“

میں متنی خیز نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ اس دوران میں صوفیہ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپارٹمنٹ سے باہر نہیں جانا تھا۔ اگر اس نے اپارٹمنٹ کے اندر جے ہوئے لندن میں موجود ہیرالڈ تھامس سے رابطہ کیا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا..... اس نے اس مقصد کے لیے اپارٹمنٹ والا فون استعمال کیا تھا۔ میں نے اس امر کی تصدیق کے لیے اس سے پوچھ لیا۔

”کیا تم نے اسی فون سے لندن کال کی ہے؟“

وہ اپنا کام جاری رکھتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے بولی ”یہ فون اور ویز کال کے لیے ویلڈ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا“ میں پھر بھی اسے استعمال کرنے کی حماقت نہ کرتی۔“

”اس کا مطلب ہے تم کچھ دیر کے لیے اپارٹمنٹ سے باہر گئی تھیں؟“

”نہیں..... ایک لمحے کے لیے بھی نہیں!“ وہ قطعیت سے بولی۔

”پھر تم نے کس ذریعے سے لندن رابطہ کیا ہے؟“ میری حیرت اب الجھن میں بدل گئی تھی۔

”وہ جان!“ وہ ایک شہذی سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”تمہاری طرح میرے پاس قردآئی کی صلاحیت تو ہے نہیں کہ میں آنکھیں بند کر کے جہاں چاہوں کچھ جاؤں البتہ.....“ اس نے متنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر ایک لمحے کے وقت کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”البتہ اپنا کام چلانے کے لیے میں سانس کی ایک چھوٹی سی ایجاد کا سہارا لیتی ہوں۔“

”تم پمپلیوں میں کیوں بات کر رہی ہو؟“ میں نے کہا ”کھل کر کہو جو بھی کہنا چاہتی ہو.....“

اس نے کہا ”میرا اشارہ سب فون کی طرف ہے۔“ ”سب فون!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تمہارے پاس کوئی سب فون بھی موجود ہے؟“

”ہاں میرے پاس میں ایک نفا سائری بیڈ جی ایس ایم سب فون موجود ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ”یہ سب فون دراصل یوسف الظاہری کا ہے۔“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا پھر میرے

استفسار پر اس نے تفصیل بتائی کہ اس کے پاس یوسف الظاہری کا جو سب فون تھا، اس کا کنکشن پوسٹ پیڈ تھا۔ یوسف الظاہری چونکہ ایک سیلانی شخص تھا اور مصر کے پڑوسی ممالک میں اس کا آنا جانا لگ رہتا تھا اس لیے اس نے بوکے کے علاوہ اسرائیل، اردن، لبنان اور شام وغیرہ کی رومنگ بھی حاصل کر رکھی تھی۔ ہیرالڈ تھامس نے لندن سے روانہ ہوتے وقت یہ سب فون اسے دیتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ وہ اس سفر کی اہم رپورٹس اس تک پہنچاتی رہے کہ خاص طور پر مشن کے حوالے سے باہر خبریں اور اس دوران میں صوفیہ یہ سب کچھ کرتی بھی رہی تھی مگر اس نے تموزی دیر پہلے ہیرالڈ تھامس کو میرے مشن کی کامیابی سے مطلع کر کے آجہد کے لیے بھی ہدایات لے لی تھیں۔ صوفیہ بہت ہی گہری لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی ہوگی لیکن اس کے اسٹیٹ منٹ کے کسی پوائنٹ مجھے ہشمت نہیں ہو رہے تھے اس لیے اپنی ذہنی الجھن کو میں نے استفسار کا جامہ پہنانا ضروری سمجھا۔

”تم تو مجھے رسمی نکلیں۔ کمال ہے“ لگ بھگ دو ہفتے اس سفر میں میرے ساتھ رہی ہو اور مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ تم کسی سب فون کا استعمال کر رہی ہو۔ بھی واہ! تم تو بہت باصلاحیت ہو۔“

اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میں دراصل سب فون کو استعمال کرنے کے لیے زیادہ تر واش روم وغیرہ کا سہارا لیتی رہی ہوں۔ پانی والا لٹھول کر دھسے لکچ میں بے آسانی بات کی جا سکتی ہے۔ واش روم سے باہر موجود کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اندر کوئی سیلر رابٹل میں آیا ہوا ہے۔“

”اوہ.....!“ میں حیرت بھری نظر سے اسے دیکھتا رہ گیا پھر پوچھا ”ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ سولہ سترہ دن تک تم نے ایک ہی بیٹری سے کیسے کام چلایا میں نے کہیں سب فون کو چارج کرتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھا۔ اب یہ نہ کہنا کہ تم واش روم میں مجھ سے چمپا کر کسی ذریعے سے اپنا سب فون چارج کر لی رہی ہو!“

”نہیں کہوں گی..... تم نے منع کر دیا ہے تا اس لیے نہیں کہوں گی۔“ وہ زہر لب سکرناہتے ہوئے بولی ”لیکن تمہارے سوال کا جواب دیتا بھی ضروری ہے“ وہ لمبے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”دراصل لندن سے روانہ ہوتے وقت میں اس سب فون کی چار چار جڈ بیٹریز اپنے ساتھ لے کر آئی تھی جو ہر

وقت فون کے ساتھ میرے پاس میں موجود رہی ہیں۔ ان میں سے ابھی تک میں نے صرف دو بیٹریز استعمال کی ہیں، تیسری لوڈ ہے“ چوٹی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اس میں اس وقت کتنا چارج موجود ہوگا۔ ویسے میں نے نہایت ہی محتاط انداز میں سب فون کو استعمال کیا ہے..... اور اب تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ تموزی دیر کے بعد میں ہیرالڈ تھامس کے خاص بندے سے ملنے والی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے میں تم لوگوں سے پہلے ہی لندن پہنچ جاؤں۔“

اس نے تفصیل کے ساتھ ساری بات بتائی تو میری ذہنی الجھن ربح ہو گئی۔ میں نے طہرے ہوئے لکچے میں کہا ”میں یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ تم نے مجھے اپنے پاس سب فون کی موجودگی سے آگاہ کیوں نہیں کیا کیونکہ میرے اس سوال کا تمہارے پاس کھڑا گھڑا جواب بھی ہوگا۔“

”تم بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہو وہ جان!“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی ”اس سلسلے میں ہیرالڈ تھامس نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا۔“

”میرا اندازہ بھی یہی ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تم میری مجبوری کو سمجھ سکتے ہو وہ جان!“ وہ محذرت خواہانہ لکچے میں بولی۔

”بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”تم کسی قسم کے احساس میں مبتلا ہونے کے بجائے مجھے بتاؤ کہ ہیرالڈ تھامس نے آجہد کے لیے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں؟“

اس نے بتایا ”میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ سے نکلوں گی۔ ریڈیو بیگ میں بھی تمہارے ساتھ ہی بیٹریوں کی۔ ہیرالڈ تھامس نے مجھے بتایا ہے کہ محل ایب سے باہر روڈ اگر بروٹم جا میں تو آلی آڈر کے علاقے سے گزرتا پڑتا ہے۔ ابلی آڈر سے تموزا پہلے بیت زرقا کا علاقہ واقع ہے۔ مجھے بیت زرقا تک جانا ہوگا۔ بیت زرقا میں دن تھری ٹائمن ایریل اسٹریٹ پر مجھے اتار کر تم لوگ آگے بڑھ جانا۔“

”ایک سو تالیس ایریل اسٹریٹ پر کون رہتا ہے؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”مسٹر جوزف!“ صوفیہ نے جواب دیا ”ہیرالڈ تھامس نے مجھے جوزف سے ملنے کو کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے صوفیہ.....!“ میں نے مطمئن انداز میں کہا ”ہم تمہیں مسٹر جوزف کی رہائش پر ڈراپ کر دیں گے۔“



ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر صوفیہ نے ساحل سے کہا ”اب تم داش روم میں جا کر لباس تبدیل کرلو۔ تمہارے چہرے کی فائل ٹپک پیچ کے بعد ہوگی۔“

ساحل نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ میرا منتخب کیا ہوا ایک لباس اٹھا کر داش روم میں مٹس گئی۔

صوفیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تھوڑی دیر کے بعد تم پہنچ جائیں گے۔ وعدہ کرو اگر تم تین لوگوں سے پہلے لندن پہنچ گئی تو تم وہاں مجھ سے ایک بھر پور ملاقات کرو گے۔“

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے بھر پور ملاقات کی ہامی بھری حالاں کہ میرا اندازہ یہ تھا کہ جب تک ہم لندن سے تبت کے لیے روانہ نہیں ہو جاتے ہیر اللہ تھامس صوفیہ کو لندن میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ میں نے رہنمائی مذکرہ چاہی۔

”اور اگر تمہیں وہاں پہنچنے میں دیر ہو جائے تو میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم اتنے سیدھے سبب سے ہو گئے؟“ اس نے حیرت سے میری آنکھوں میں دیکھا ”کسی کا حکم ماننا تو شاید تمہاری سرشت میں ہی نہیں ہے۔“

”ایسا نہ کہو صوفیہ.....“ میں نے شاک کی لہجہ میں کہا ”ماہ جینیوں کی تو ہر بات کو میں حکم سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو کبھی آزماد رکھ لیوں۔“

ہمارے درمیان وہ گفتگو انتہائی دلچسپ لہجے میں ہو رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا، یہ باتیں ساحل کے کانوں تک پہنچیں اسی لیے بے حد محتاط تھا۔

صوفیہ نے کہا ”تم آزمانے کا موقع فراہم کرو گے تو آزمایا بھی لوں گی۔“

”تمہیں کس قسم کا موقع درکار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

میں اس وقت صوفیہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے قریب آگئی پھر داش روم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیاں انداز میں بولی۔ اس کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

”موقع تو یہ بھی مناسب ہے!“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں بوکھلا گیا ”تم جانتی ہو ساحل سے میرا کیا رشتہ ہے!“

”اسے کیا پتا چلے گا“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”صوفیہ! اگر اس نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔“ میں

بدک کر ایک طرف ہو گیا۔

”شادی ابھی ہوئی نہیں“ وہ میرے تعاقب میں آگے سرک آئی ”اور تم نے شوہروں کی طرح ڈرنا شروع کر دیا ہے۔ کیا مجھے ودائی نہیں دو گے، پوچھ کر روکے روکے رخصت کر دو گے۔“ وہ لمبے بھر کر دیکھ کر پھر بڑے اعتماد سے بولی ”ساحل پانچ منٹ سے پہلے داش روم سے باہر نہیں آئے گی، میں تم سے صرف کچھ پانچ منٹ تو مانگ رہی ہوں۔ کیا تم میری یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے؟“

بات ختم کرتے ہی وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے یوں محسوس ہوا ”کوئی لمبہ دم شخص میرے سامنے اپنی زندگی کی آخری خواہش بیان کر رہا ہو اور بڑے حسرت بھرے انداز میں کچھ ہو کہ میں اسے صرف ایک گھونٹ پانی پلا دوں۔ وہ تریلوں کے ساتھ زندگی کی آخری سانس لینا چاہتا ہے۔“

میں نے صوفیہ کی فرمائش کے سامنے حراحت ترک کر کے اس کی خواہش پوری کر دی۔ وہ ایک گھونٹ کی تنہائی تھی میں نے ضرورت کے سمندر سے اس کی طلب کو شکم سیر کر دیا۔ جب ساحل لباس تبدیل کر کے داش روم سے نکلی تو میں ریڈ یو کیب والوں کو فون کر رہا تھا۔

”فکھر گفتگو کے بعد میں نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ انہوں نے بتایا کہ میری ضرورت کے میں مطابق ایک ریڈ یو کیب ٹھیک ڈھائی بجے شالوم اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس کے سامنے پہنچ جائے گی۔ میں نے دانستہ کیب کو بھائی گارڈن اپارٹمنٹ پر نہیں بلایا تھا۔ مشن کے آخری مرحلے پر احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دینا ٹھیک نہیں تھا۔“

جب تک میں ریڈ یو کیب والوں سے معاملہ کرتا ”صوفیہ نے دوبارہ ساحل کے چہرے پر کام شروع کر دیا تھا۔ ٹھیک دو بج کر پانچ منٹ پر صوفیہ نے ساحل کو فارغ کر دیا۔ صوفیہ کی محنت نے ساحل کو ہوبو صوفیہ بنادیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ دان! تم اپنی دوست کو اچھی طرح گھما پھرا کر چپک کر لو۔ کوئی کی یہ سر نظر آئے تو ابھی تادو۔ بعد میں مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا!“

آخری جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس جملے کی معنی آفرینی پر بیٹھا غور کرتا رہتا۔ میں نے ساحل پر ایک بھر پور نگاہ ڈالی اور پھر صوفیہ کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

”اس اوکے!“

”اب پانچ منٹ میں بھی لوں گی“ صوفیہ نے کہا۔

”تم کیمرے کا کارڈہ رکھتی ہو؟“

”میں اپنے جیبے میں تھوڑی سی عارضی تبدیلی لانا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

”کیا دو صوفیہ کو ساتھ لے کر بلڈنک سے نکلو گے؟“

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوہ!“ میں نے بے ساختہ اپنے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔

ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ پتا نہیں اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا تھا۔ صوفیہ نے ساحل کو اپنا ہم شکل بنادیا تھا۔ واقعی اگر میں ایک جیسی شکل و صورت کی دو لڑکیوں کو پہلو میں دیکھ کر ہار لکھتا تو دیکھنے والی ہر آنکھ میں ایک سنسنی خیز تعجب اٹھائی کے کریدار ہو جاتا۔

دونوں کر میں منٹ پر ہم ہر کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہم نے باہمی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دونوں گر چیں منٹ کے بعد ہم ایک ایک منٹ کے وقفے سے اس اپارٹمنٹ سے نکلیں گے اور اپارٹمنٹس بلڈنک سے باہر آنے کے بعد ایک ساتھ مل کر شالوم اسٹریٹ کی جانب بڑھ جائیں گے جہاں میں نے ریڈ یو کیب کو پہنچنے کے لیے کہا تھا۔

ہمارے پاس اس حساب سے پانچ منٹ کا وقت تھا یعنی دو میں سے دو چیں تک کے پانچ منٹ۔ اچانک مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اپنے ارادے کے بارے میں صوفیہ اور ساحل کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

میں نے ریسپور اٹھا کر ”ون ڈنل زبرد“ ڈائل کیا اور دوسری جانب سے کسی کے پونے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلی گھنٹی پر ہی کال ریسپو کر لی گئی۔ ”ون ڈنل زبرد“ امیر جنسی پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ رابطہ ہونے پر میں نے نہایت ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں سلوان بول رہا ہوں۔ میرا ایک ساتھی جین بگلا نمبر ڈی..... ون نوٹری میں کام کرتا ہے۔ اس نے ابھی ابھی فون کر کے مجھے بتایا ہے کہ وہاں ایک سنگین واردات ہو گئی ہے۔ وہ پولیس کو مطلع کرنے کی یوزیشن میں نہیں۔ آپ فرمت میں بگلا نمبر ڈی..... ایک سو تیس میں پہنچنے کی کوشش کریں۔“

دوسری طرف سے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا گیا ”آپ چند سیکنڈ کے لیے فون بند کر دیں۔“

ٹیلی فوننگ کے کھیل کا ڈرامائی تیور کی جادو اور سرگرمی

48 واں حصہ شائع ہو گیا ہے

# کیونکہ

تین دنوں کے لیے صرف 60 روپے

قارئین سبسکرائب کرو

مسحور کر رکھا ہے

اسلوب: انداز بیان اور دلچسپی

کے اعتبار سے اب تک شائع ہونے والے

تمام سلسلوں میں سب سے زیادہ

منفرد اور مقبول سلسلہ

48 دنوں کے لیے صرف 60 روپے

میں دستیاب ہیں

دل لہاؤں کے لیے صرف 60 روپے

# پانچ

7 دنوں کے لیے صرف 60 روپے

میں دستیاب ہیں

بابر خان کی آب پتی جگہ ہیں

7 دنوں کے لیے صرف 60 روپے

میں دستیاب ہیں

کتابیات بیکاکس

فون: 021-5804300

kitabat1970@yahoo.com

74200

میں نے ریسیور کا بیل کر دیا۔  
اگلے ہی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور خاموش رہا۔ ”مسٹر سلوان!“ بھری ساعت سے وہی آواز گرجائی جس نے چند نیکینڈ پہلے مجھے فون بند کرنے کو کہا تھا۔ وہ مستعصر ہوا۔ ”بگلا نمبر ڈی..... ون نو ٹی“ تھری کس علاقے میں واقع ہے؟“  
میں نے اس پوش رہائش علاقے کا نام بتا دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دے کر آیا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا۔  
”اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟“  
”جنرل ہائرٹ!“ میں نے جواب دیا۔  
”اوہ!“ اس کی تاسف سے بھری ہوئی آواز میری ساعت تک پہنچی۔ ”آپ نے اپنے ساتھی کا کیا نام بتایا ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
”بین“ بین فون کرنے کی پوزیشن میں کیوں نہیں ہے؟“  
”یہ تو بنگلے پر پہنچ کر آپ اسی سے پوچھیں۔“ میں نے روکے انداز میں کہا۔  
”آپ اپنا ایڈریس نوٹ کرائیں۔“  
میں نے فوراً دہرایا۔ ”اپارٹمنٹ نمبر ستائیس..... سی“  
بہائی کارڈن اپارٹمنٹس شالوم اسٹریٹ۔“  
دوسری جانب ”کھٹک“ سے ریسیور دکھ دیا گیا۔  
میں نے مسکرا کر صوفیہ اور ساحل کی طرف دیکھا پھر فون پر ”ون زیرو ون“ ملانے لگا۔ ”ایک سو ایک“ نمبر ابھر جی میڈیکل اینڈ کے لیے مخصوص تھا۔ دوسری ہی گھنٹی پر فون اینڈ کر لیا گیا۔ ایک بھاری بھر کم آواز میری ساعت تک پہنچی۔  
”ہیلو!“  
میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں بگلا نمبر ڈی..... ون نو ٹی تھری سے بول رہا ہوں۔ یہاں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ دو تین ایبوی نیس بھی درکار ہیں۔ آپ لوگ فوراً یہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔“  
”آپ کون ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔  
میں نے بتایا۔ ”میں جنرل ہائرٹ کا ایک ملازم بینک بات کر رہا ہوں۔“  
”ذرا یہ بھی بتا دیں، بگلا نمبر ڈی..... ون نو تھری کہاں ہے؟“  
میں نے رلی والے رہائش علاقے کا نام بتایا۔

”ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔“  
دراصل جنرل ہائرٹ کا نام بہت کام دکھا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، یہ نام سننے ہی دوسری طرف موجود قفس انتہائی مؤذب اور سنجیدہ ہو جاتا۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ جنرل ہائرٹ کس توپ شے کا نام ہے۔ مجھ تک یہ نام قفس کے ذریعے پہنچا تھا۔ جب میں رلی والی بنگلے پر پہنچا تو گیت پر متعین سکپورٹی کارڈز سے میں نے ڈرامائی منگھوکی تھی۔ میں ان سے کسی میڈم شارٹ کا پتا پوچھ رہا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میڈم شارٹ اور کرنل داہان کا بگلا نمبر بی..... ایک سو تیس دو گھنٹاں چھوڑ کر تیسری گلی میں ہے۔ میں نے رلی والے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہاں کون رہتا ہے؟ میرے اس سوال کے جواب میں قفس نامی سکپورٹی کارڈز نے بڑی رعوت سے بتایا تھا، یہ جنرل ہائرٹ کا بگلا ہے۔ یہی قفس اپنے آں جہانی ساتھی جم کے ساتھ اس وقت انٹرفیلی کیفیت میں پڑا تھا۔  
تیسرا فون میں نے فارڈ ڈیپارٹمنٹ کو کیا۔ ”ون زیرو نو“ ڈائل کرتے ہی متعلقہ ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ ہو گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کر لیا پھر رلی والے بنگلے کا نمبر اور محل وقوع بتانے کے بعد کہا۔  
”یہاں پر انفرد کی کا ایک بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ آپ اپنے فارڈ فائزر کی ٹیم کو جلد از جلد ادھر بھیج دیں۔“  
میں اس ٹیلی فونک ”تغیر کاری“ سے فارغ ہوا تو صوفیہ نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ”وہ جان! یہ تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟“  
”چکر؟“ میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں“ چکر..... یہ ایک ایسا گھن چکر ہے جس میں گھن نہیں صرف گھبوں پیتا ہے اور ایسا پیتا ہے کہ کیا کوئی بادام پست بھی پیتا ہوگا!“ میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
”رلی موٹے ہائیں کسی گھن سے کم تو نہیں۔ دیکھ لو اس کے آس پاس پایا جانے والا گھبوں تو پس چکا اور وہ مردود ابھی تک زندہ سلامت ہے اور میں چاہتا ہوں وہ اپنی طبی زندگی گزار کر طبی موت ہی مرے اسی لیے..... اسی لیے میں نے اسرائیل کے تین انتہائی اہم جرنل نمبرز پر فون کر کے کچھ ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کی جائے اور مجھے یقین ہے اسے بچا لیا جائے گا۔“

میں نے اپارٹمنٹ پر آنے کے بعد صوفیہ کو ان تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا جو رلی والی بنگلے پر پیش آچکے تھے۔ وہ چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتی رہی پھر غم سے ہوئے لہجے میں بولی۔  
”ایک بات پوچھوں وہ جان؟“  
”ایک چھوڑ دس باتیں پوچھ لو“ میں نے فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تاہمیں زندگی میں پھر کب مل بیٹھنے کا موقع ملے یا نہ ملے!“  
”دس نہیں“ صرف ایک بات پوچھوں گی“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بشرط یہ کہ تم بالکل درست جواب دو!“  
”ہاں پوچھوں میں ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔“  
اس نے پوچھا۔ ”رلی موٹے ہائیں تمہارا دشمن نمبر ایک رہا ہے، پھر تم نے اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟“  
یہ ایک ایسا اہم سوال تھا کہ جس کے لیے میرے ذہن میں بہت سے جوابات موجود تھے لیکن وہ تمام جوابات میں ہر ایک کو نہیں دے سکتا تھا۔ صوفیہ سے میں چونکہ جواب دینے کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے اس کی تسلی کی خاطر کر دیا۔  
”رلی کے جہازم کی فہرست بہت طویل ہے لہذا اس کی سزا کو بھی مختصر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا تو اس کی شکل آسان ہو جاتی۔ وہ ایک دفعہ مرکز زندگی کے غلوں سے آزادی حاصل کر لیتا اور یہی میں نہیں چاہتا ہوں۔“  
میں نے سانس لینے کے لیے لمحے بھر کا توقف کیا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میری یہ خواہش ہے کہ رلی موٹے ہائیں اپنی طبی عریک زندہ رہے اور اس طرح زندہ رہے کہ اپنے زندہ رہنے پر شرمندہ رہے۔ میں اسے بچھڑاؤں، پشیمان، شرمندگی اور ندامت کی زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور میں نے اپنی خواہش پوری کرنے کا بڑا کمال بندوبست کر دیا ہے۔ میں نے اسے ایک ایسے روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ ہر رات سونے سے قبل یہ دعا مانگے گا کہ یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہو لیکن اگلی صبح وہ مجھ جی اٹھے گا..... یعنی زندہ بیدار ہوگا اور دن بھر میرے دیے ہوئے زخموں کو چاٹتا رہے گا۔ وہ ہر روز مرے گا اور ہر روز جیے گا۔ میں اسے قسط وار مارنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے، اللہ ایسا ہی ہوگا!“  
میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ وہ ریڈیو کیب کے ڈرائیور

کافون تھا۔ اس نے بتایا کہ ہماری منگھوکی ہوئی ریڈیو کیب پوسٹ آفس کے سامنے پہنچ چکی ہے۔ میں نے ان دونوں کو کیب کی آمد کے بارے میں بتایا، پھر صوفیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے پوچھے ہوئے سوال کا جواب تو دے دیا تھا۔

بتائیں، میری اس وضاحت سے اس کی تسلی ہوئی یا نہیں؟ بہر حال اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہماری روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے صوفیہ اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”صوفیہ! پہلے تم اپارٹمنٹ سے ٹکڑی پھر ساحل اور اس کے بعد میں۔ تم دونوں بلڈنگ سے باہر نکلنے کے بعد آپس میں مل جاؤ گی اور سب قیدی سے اس ریڈیو کیب کی جانب بڑھو گی جو اس وقت شالوم اسٹریٹ پر پوسٹ آفس کے سامنے کھڑی ہے۔ اذات کیئر؟“

دونوں نے میرے سوال کے جواب میں اپنے سر کا ثباتی جنبش دی۔ میں نے کہا۔ ”تمہارے پیچھے پیچھے میں سامان لے کر آ رہا ہوں۔ کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں

جاسوسی انجسٹس ہس سلسلہ و اشاعت ہونے والی مقبول ترین کتابی طبعیات خان کی سرپرستی

قیمت فی حصہ: 60 روپے  
ڈاک خرچ فی حصہ: 23 روپے

جاسوسی

قلمبندی کی جگہ آزادی میں شامل ایک پاکستانی جاں بانی باکلی فائرسٹریٹ جڑیدہ جب آنکھیں آہیں ہوش ہوئیں جب خون چکر برفاب ہوا

کتابیات ہلی کش۔ کراچی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200  
فون 021-5804300  
kitabiat1970@yahoo.com  
C-63/111 بکس پشیمانی گاہے میں کوئی روز (خبر کا کوئی بکس سٹاپ کے سامنے)

آتش فشاں 271 حصہ 13

☆☆☆

صوفیہ نے الوداعی کلمات سرگوشیاں انداز میں ادا کیے تھے اور اس کے آخری جملے میری یادداشت میں محفوظ ہو کر رہ گئے تھے۔ میں جب بھی صوفیہ اور اس کے ہمراہ گزارے ہوئے کئی کے روز و شب کا تصور کرتا ہوں جملے میری سماعت میں گونجنے لگتے۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔  
”وہ جان! میں جانتی ہوں تم سے رابطہ کرنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ چاہئیں! میں تمہیں یاد بھی رہتی ہوں کہ نہیں۔ تو سراسر تم پر منحصر ہے کہ مجھ سے، غمزدگی کے توسط سے رابطہ کرو یا نہ کرو۔ بہر حال! جنت باقی دنیا سے لینڈ لائن رابطے میں نہیں تو کیا ہوا؟ میں ڈرامہ لینڈ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“  
ہم قل ابیہ سے یرو دہلم پہنچے پھر یرو دہلم سے قاہرہ اور اس کے بعد قاہرہ سے لندن پہنچ گئے۔ لندن میں صوفیہ سے

میں نے بستر پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی ”آ جاؤ.....  
 دروازہ کھلا ہے“  
 اگلے ہی لمحے مجھے اس دروازے میں جن بیان کی  
 صورت دکھائی دی۔ جن بیان ایک طرح سے چنگ فو کے  
 دست راست کی حیثیت رکھتا تھا۔ امید کی جارہی تھی کہ جو  
 کھاگ ٹیبل کا آبدہ چیف لانا اس کو منتخب کیا جائے گا۔  
 جب میں لہسا سے لندن جا رہا تھا تو جن بیان لی یان کے  
 ساتھ مجھے کانگریز پورٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔ گزشتہ رات  
 بھی جن بیان ہی نے ہمیں ان پورٹ سے لے کر جو کھاگ  
 ٹیبل تک پہنچایا تھا لیکن اس مرتبہ لی یان اس کے ہمراہ نہیں  
 تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی لیکن اس وقت  
 تفصیلی بات چیت کرنے کا موقع بھی تھا۔ میں نے یہی سوچا  
 تھا ”آبدہ روز لی یان کی بھی خبریہ لوں گا۔“

جن سیان نے چگ فو کا ذکر کیا تو چیف لاما میرے  
تصور میں ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی چگ فو سے ہونے والی

یہ کتاب کس صہوت کا بیج پھیلتی ہے؟ اس کا بیج اوروں کے لئے کھسکے ہوئے ہے کہ ان کی دنیا بن جائے۔

مذہب نفسانی  
صفت

خود زوال کی نفسیات

یہ ایک خود زوال کا بیج ہے۔ یہ اپنے آپ کو ایک کس کس کو خود سے تعلق رکھنے کے لئے ایک کام کا بیج ہے۔ یہ ایک خود زوال کا بیج ہے۔ یہ اپنے آپ کو ایک کس کس کو خود سے تعلق رکھنے کے لئے ایک کام کا بیج ہے۔

نیت  
40  
46

نیک نیت  
25  
44

ان خوبیاں کے لیے جس پر اپنے آپ کو کھینچنا چاہتے ہیں۔  
اور ان خصلتوں کے لیے جو خود کو ان کو پسند نہیں آتے۔

یہ کتاب ان کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ یہ ان کے لئے ہے۔ یہ ان کے لئے ہے۔

مذہب نفسیات پرست محمد علی احمد کوٹلی



الہما کر رکھ دیا تھا۔ یہ تو کسی بھی صورت ممکن نہیں تھا کہ میں اپنا مذہب تبدیل کر لیتا۔ اس دوران میں چنگ فو مسلسل سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کے چہروں کو نکل رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری سوچ بڑھ رہا ہو۔ میں نے بولکھا بہت آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ بے یک وقت ہم دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا ”وہ جان! بتاؤ! کیا تم ساحل کو پانے کے لیے بدھ ازم میں آ رہے ہو؟“ پھر وہ ساحل کی جانب متوجہ ہوا ”جی! کیا تم اس بندھن کو انوث بنانے کے لیے مسلمان ہونے کو تیار ہو؟“

میں نے بھی سوالیہ نظر سے ساحل کی طرف دیکھا۔ میں نے تو ابھی تک چنگ فو کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اس سلسلے میں ساحل نے ایک لمحے کی تاخیر کو بھی گناہ عظیم تصور کیا اور اضطرابی لہجے میں بولی۔

”میرے محترم! آپ مذہب کی تبدیلی کے سلسلے میں وہ جان سے کوئی سوال نہ کریں۔ میں اپنا فیصلہ سناری ہی ہوں۔ میں اس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔ جب میں نے وہ جان کی خواہش پر اپنا نام دھنوں سے بدل کر ساحل رکھ لیا ہے تو میں مذہب تبدیل کرنے کی قربانی بھی دے سکتی ہوں۔“

میرے سینے سے ایک آسودہ اور اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ساحل نے اپنا اکل فیصلہ سنا کر مجھے ایک بہت بڑی آزما کش سے دو چار ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ واقعی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔

رن پوٹی نے گیمبر لہجے میں کہا ”عورت مرد کی بہ نسبت اپنے اندر کمزور زیادہ قربانی کا جذبہ رکھتی ہے۔ جی! تمہارے فیصلے نے مجھے خوش کر دیا۔ میں یہ بات ہر تفتیش سے بالاتر ہو کر بالکل غیر جانب دارانہ انداز میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے تمہیں زندگی میں بھی اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہیں پڑے گا۔ تم ہمیشہ شاد آباد اور خوش و خرم رہو گی“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”وہ جان! تم ایک خوش قسمت نوجوان ہو۔ مجھے امید ہے، تم ساحل کی قربانی کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھو گے۔ اس نے تمہاری خاطر جتنا بڑا فیصلہ کیا ہے تم اس کی لاج رکھو گے!“

”میں ساحل کو خوش رکھنے اور آپ کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے اپنی جان کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔“ ان لمحات میں میں نے بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں“ رن پوٹی نے ہنسنے لگا ”میں گردن ہلائی“ اور پچھلے کچھ عرصے سے دیکھ بھی رہا ہوں کہ تم نے ساحل کے حصول کی خاطر کس طرح اپنی جان کو جو حکم میں ڈال رکھا ہے۔ میں تمہارے ایک ایک لفظ کی سچائی کو جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے تمہیں جنت کے دام کا اعزاز عطا کیا ہے۔ وہ جان! یہ کوئی معمولی بات نہیں۔“

”جی میرے محترم! مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”ایک دلچسپ بات بتاؤں!“ وہ پراسرار انداز میں ہم دونوں سے مستفسر ہوا۔

ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ بولا ”ساحل نے مذہب کی تبدیلی کے سلسلے میں اپنا فیصلہ تو ابھی سنایا ہے لیکن مجھے اس بات کا پہلے سے یقین تھا اس لیے میں نے اس حوالے سے بھی بندوبست کر رکھا ہے۔“

وہ ایک لمحے کو توقف ہو کر ہمارے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب ہم نے اس سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا تو اس نے خودی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

”میں نے تم دونوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی ایک مسلمان عالم رن کو لکھا سا بلایا ہے۔ مذکورہ عالم کا نام عبد الکریم ہے۔ وہ کمینٹن سے یہاں آیا ہے۔ ساحل اس کے ہاتھوں نہ صرف اسلام قبول کرے گی بلکہ وہی تم دونوں کو شہ ازدواج میں بھی منسلک کرے گا۔ عبد الکریم تمہارا نکاح خواں بھی ہوگا۔“ وہ ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے دیکھنے لہجے میں بولا۔

”میں تم دونوں کی خوشی کی خاطر جتنا بڑا قدم اٹھا رہا ہوں اس کے لیے مجھے بعض لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے لیکن میری قوم مجھ پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں میرا ہر فیصلہ چاہے کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ بدھ ازم کے فائدے کے لیے ہوتا ہے۔ میں آج سے کئی سال بعد کے بارے میں سوچتا ہوں۔ تم دونوں کا نکاح اسی دو منزلہ عمارت میں ہوگا۔ شادی کے بعد جہاں تمہیں قیام کرنا ہے۔ جن سیان تمہیں اس عمارت کا وارث کرنا چاہیے۔ یہ سادہ سی تقریب جن سیان کی زیر نگرانی ہوگی۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا ”میرے محترم! کیا آپ ہماری شادی کی

تقریب اہنڈ نہیں کریں گے؟“

ایک حوالے سے میں مسلسل تشویش میں مبتلا تھا۔ چنگ فو نے پہلی ملاقات ہی میں مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ ہمارے درمیان صرف تین ملاقاتیں ہونی ہیں اور آج تیسری ملاقات ہو رہی تھی۔ میری چمکی حس بار بار مجھے خبردار کر رہی تھی کہ میں چنگ فو رن پوٹی کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ اسی تحریک کے سبب میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

چنگ فو نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ایک طرح کا فرار تھا جو میری تشویش کو کمبیز کر رہا تھا۔ لیکن کوئی ایسی بات تھی جو چنگ فو ہم سے چھپانا چاہ رہا تھا۔ میں اپنے سوال کا جواب آنے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔

”میں نے تم لوگوں کی شادی کے لیے چار روز بعد کی تاریخ یعنی انیس مئی مقرر کی ہے۔ اس دوران میں تم دونوں مل کر اپنے گھر کو سنوارنے کے سجانے کا کام کرو۔ میں نے اس سلسلے میں جن سیان کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ وہ تم لوگوں کی بھرپور مدد کرے گا۔ نکاح کے بعد مولانا عبد الکریم واپس کمینٹن چلا جائے گا۔“

کمینٹن (CANTON) کا نام کسی زمانے میں ”گوانگ چو“ ہو کرتا تھا۔ یہ ایک مشہور و معروف اور قدیم شہر ہے۔ گوانگ چو (GUANG ZHOU) کو چین کے جنوبی صوبے گوانگ ڈانگ (GUANG DONG) کا صدر مقام ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ صوبہ گوانگ ڈانگ کا شہر گوانگ چو یعنی کمینٹن گوانگ ڈانگ سے متصل ہے۔

گوانگ ڈانگ سے کمینٹن تک جانے کے لیے بڑی آسانی سے ویزا مل جاتا ہے۔ گوانگ ڈانگ کے معروف شہر کولون کے ریلوے اسٹیشن سے روزانہ چار ٹرینیں (ٹرینیں) کمینٹن کے لیے روانہ ہوتی ہیں جو پچھن مین کھننے کے سڑک کے بعد کولون ریلوے اسٹیشن سے کمینٹن ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دیتی ہیں۔ چین میں داخل ہونے کا یہ سب سے معروف اور آسان ذمہ راستہ ہے۔ کمینٹن کے بارے میں یہ ساری تفصیل بتانے کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابی وقاصؓ کا روضہ مبارک اسی شہر میں واقع ہے۔ آپ کو کبھی گوانگ ڈانگ جانے کا موقع ملے تو صحابی رسول کے روضہ مبارک کی

زیارت کا شرف ضرور حاصل کریں۔

میں اپنی خیالات میں کم تھا کہ چنگ فو کی ٹھہری ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں مگر اور براہ راست میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”وہ جان! تم شادی کے بعد مستقل رہائش کہاں اختیار کرنا چاہو گے؟“

یہ سوال سن کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ جنت میں میرے لیے ایسا سیٹ اپ بنایا جا رہا تھا کہ جیسے اب مجھے یہیں کا ہو کر رہنا ہو۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے چنگ فو نے جس دو منزلہ عمارت کو سنوارنے کے سجانے کی بات کی تھی۔ میں جن سیان کی راہنمائی میں اسے دیکھ چکا تھا۔ نور بنگ کا سیل یعنی سر پینس کے قریب اور دریائے کانے چو کے کنارے واقع اس دو منزلہ عمارت کے بارے میں بتاتے ہوئے جن سیان نے کہا تھا کہ وہ میرے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ اس عمارت کی بالائی منزل میری رہائش کے لیے مختص تھی جب کہ زیریں پر مجھے مختلف باطنی اور ظاہرہ علوم فنون کی تعلیم دینا تھی۔ ایک طرف سے یہ زیریں منزل ایک تربیت گاہ ہوتی جہاں میں داخلی اور خارجی فنون کی بیداری کے لیے وہاں آنے والے طالب علموں کی راہ نمائی کرتا۔ اس سلسلے میں جن سیان نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ جان! اپنے مشن سے کامیاب ہونے کے بعد جب تم اس تربیت گاہ کا انتظام سنبھالو گے تو تمہیں اپنے کام کا آغاز صرف ایک اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کرنا ہوگا۔ پھر اس نے مجھے مذکورہ اسٹوڈنٹ سے ملوا بھی دیا تھا۔ چار سالہ سا بچہ فو کو وہاں دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ امریکی ریاست واشنگٹن کے شہر سیٹل میں ڈاکٹر مونگ ریلوے کے بڑے محترم سا بچہ فو نے اپنے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی، وہ یہاں پوری ہو گئی تھی۔ میں آدھا گون کے نظریے پر تو یقین نہیں رکھتا لیکن سا بچہ فو کی پیش گوئی کے نتیجے نے مجھے حد درجہ حیرت زدہ ضرور کر دیا تھا۔

مجھے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر چنگ فو نے کہا ”وہ جان! تم اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔ میں جانتا ہوں تم ہوا کے مانند ہو۔ کسی ایک جگہ رک سکتے ہو اور نہ ہی تمہیں پائندہ کر رکھا جاسکتا ہے۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہیں مستقل طور پر جنت میں سٹیل ہونے کے لیے کہوں گا۔ یہ میری خواہش ہے کہ تم یہاں رہ کر اعلیٰ خدمات انجام دیتے رہو لیکن مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ میری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ بہت سی باتیں ناممکن ہوتی ہیں لیکن

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سلسلے میں کوشش کو ترک کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ یہ ایسا ہی ہوگا کہ اگر ہمیں کسی مریض کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی میں چند دن باقی بچے ہیں تو ہم اس کے علاج سے ہاتھ بچھ لیں۔ یہ یہی صحیح طور انسانی اور اخلاقی رویہ نہیں ہوگا۔ وہ لمحے بھر کر سانس لینے کی خاطر متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں نے جنہیں مستقل طور پر تبت میں روکنے کا مکمل بندوبست کر دیا ہے، گویا میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ فرض میں نے نبھادیا۔ باقی سب کچھ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ فیصلے کا حق بہر حال تم ہی کو ہے۔“

میں نے نہایت ہی مضبوط لہجے میں کہہ دیا ”میں شادی کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن پاکستان میں سیتھل ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے“ میں جنہیں اس سے روکوں گا نہیں۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا لیکن جنہیں میری ایک بات ماننا ہوگی۔ یہ میں تمہاری بھلائی اور فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“

”کون سی بات میرے محترم؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا ”میں چاہتا ہوں شادی کے بعد تم پورے نوے دن تک یہاں ضرور قیام کرو۔ مجھے امید ہے، مئی ماہ کی یہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی تمہارا یہاں دل لگ جائے گا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر تم دنیا کے کسی بھی خطے میں جا کر پرودہ باش اختیار کرنے کے لیے آزاد ہو گے!“

”ٹھیک ہے میرے محترم!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں، آپ نے نوے دن ہی کی شرط کیوں عائد کی ہے؟“

”یہ ایک ایسی مدت ہے جس میں تمہارے اوپر ایک نہایت ہی خاص کام کیا جائے گا۔ میں نے اس سلسلے میں جن سیان کو بڑی وضاحت سے سمجھا دیا ہے۔“

”وہ کل“ کی ہر بات کو اس انداز میں بیان کر رہا تھا کہ جیسے ”آج“ اس کی زندگی کا آخری دن ہو۔ میں کوئی سوال کیے بغیر خاموش نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا اور مجھ سے استفسار کیا۔

”وہ دن! اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی؟“

”کم و بیش تیس سال!“ میں نے جواب دیا۔  
”اور ساحل کی کتنی عمر ہے؟“ اس نے اپنے سوال کو تھوڑا دراز کیا۔

میں نے بتایا ”ساحل مجھ سے دو سال چھوٹی ہے۔ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو اس وقت یہ بخارہ اور میں تیس سال کا تھا اور اس بات کو اب لگ بھگ تین سال گزر چکے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے ساحل کی عمر اس وقت اکیس سال ہے۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔  
”ٹھیک ہے۔“ وہ سمجھ انداز میں بولا پھر براہ راست ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”مینی! تم جا کر آرام کرو۔ میں وہ دن اسے کچھ دوسری باتیں کروں گا۔“

ساحل کوئی تامل ظاہر کیے بغیر خاموشی سے اٹھی اور چنگ فو کو تنظیم دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا دروازے کے باہر جن سیان پوری طرح مستعد ہوگا۔ وہ ساحل کو اس کمرے میں پہنچا دے گا جہاں ہم نے گزشتہ رات گزارا تھا۔ میں یہ بھی محسوس کیے بنا نہ رہا کہ ساحل فو نے کسی خاص مقصد کی خاطر ساحل کو رخصت کیا تھا۔ بھینا اب وہ مجھ سے کوئی ایسی بات کرنے والا تھا جو ساحل کی موجودگی میں کرنا وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ نہایت ہی مستحکم اور تاثیر انگیز لہجے میں بولا ”وہ دن! بعض انتہائی نازک مواقع پر جنہیں اپنی ایک محرومی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ تم سوچتے ہو تو قرآنی کی طرح تمہارا تہذیب اور تہذیبیں اہم تیسری آنکھ کے توسط سے جس ماحول میں پہنچتے ہو وہاں کی آوازیں جنہیں سنا نہیں دیتیں کیونکہ تمہارا تہذیب کا کام نہیں کرتا۔ سیتھل میں ساک فو نے جنہیں بتایا تھا کہ باطنی کان کی صلاحیت جنہیں حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی جنہیں اس سلسلے میں کسی قسم کی عملی کوشش کرنا چاہیے ورنہ کوئی فائدہ حاصل کرنے کے بجائے الٹا نقصان اٹھا لو گے۔ میں بھی ساک فو کے خیال سے صد فی صد متفق ہوں۔ ہر شے ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی لیکن میں نے تمہاری اس محرومی کو ایڈجسٹ کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا ہے۔“

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں اضطرابی نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ بتائیں وہ کون سے پراسرار منصوبے کا انکشاف کرنے والا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ

اسی ”انکشاف“ کی وجہ سے اس نے ساحل کو وہاں سے ہٹایا تھا۔

وہ لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”وہ دن! میں نے اپنی طرف سے جنہیں شادی کا ایک انمول تحفہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ تحفہ جنہیں بے حد پسند آئے گا اور زندگی کی آخری سانس تک تمہارے ساتھ بھی رہے گا۔“

شادی کا تحفہ تو شادی کے موقع پر دیا جاتا ہے اور وہ ابھی دینے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی اس بات کے ڈانڈے بھی وہیں جا کر ملتے تھے کہ جو کھا کھج تھیل کے چیف لاما چنگ فورن پوشی کو میں آج آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ میری شادی کے وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہوگا اسی لیے مجھے والے معاملے کو قبل از وقت نشانی کی کوشش میں ہے۔

”اس تحفے کا نام ہے..... اسٹیل بیک!“ چنگ فو کی گھبر آواز میری ساعت سے ٹکرانی ”تبت میں نوے دن کے قیام کے دوران میں جنہیں مخصوص اور نایاب جڑی بوٹیوں کا عرفی پلایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ جن سیان جنہیں یوگا کی ایک خاص الخاص مشق بھی باقاعدگی کے ساتھ کرانے گا۔ میں نے نوے دن کے اس کورس کی تفصیلات سے جن سیان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ یہ کورس تم اسی کی نگرانی اور راجدھانی میں کرو گے جس کے نتیجے میں تم اسٹیل بیک (STILL YOUNG) کا اسٹیل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، اس وقت تمہاری عمر تیس سال ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا۔ اسٹاپ پورا آج کے اس پراسس میں تمہاری عمر آگے نہیں بڑھے گی۔ یہ تو ایک قدرتی عمل ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ تمہاری عمر کا ہندسہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا جائے گا مگر اسٹیل بیک کی رو سے تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک بالکل ایسے ہی رہو گے جیسے اس وقت نظر آ رہے ہو۔ تمہاری توانائیوں میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ آگے کی طرف بڑھتا ہوا عمر کا ہندسہ تمہاری جسمانی، ذہنی، جنسی اور روحانی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا!“

چنگ فو خاموش ہوا تو میں نے اپنے وجود کو ایک فلسفی خیر لپٹ میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔ واقعی چنگ فو کی طرف سے میرے لیے یہ ایک بے مثال اور انمول تحفہ ہوتا۔ ہر شخص ہمیشہ جوان اور صحت مندر ہوتا چاہتا ہے لیکن شاید ہی کسی کی یہ خواہش پوری ہوتی ہوگی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جن سیان کے دل میں اثر کر میں ان جڑی بوٹیوں کے

بارے میں ضرور معلوم کر لوں گا جن کا عرق وہ آئندہ تین ماہ تک مجھے پلانے والا تھا۔ باقی اس سلسلے میں میں یوگا کی جو مشقیں کرنے والا تھا وہ تو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتیں۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اسٹیل بیک کی ٹیکنالوجی ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔

چنگ فو نے اچانک موضوع بدل دیا اور مجھ سے پوچھنے لگا ”وہ دن! کیا یان سے بھی تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ بیٹھے بٹھائے اسے لی یان کا خیال کیوں آ گیا تھا۔ میں نے آج صبح جن سیان کی صورت دیکھتے ہی اس سے لی یان کے بارے میں استفسار کیا تھا اور اس نے میری توقع کے خلاف انتہائی روکے چپکے لہجے میں بتایا تھا کہ لی یان ٹھیک ہے اور مجھے اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں!

میں نے چنگ فو کے سوال کے جواب میں کہا ”میں نے ابھی تک لی یان کی شکل نہیں دیکھی۔ جن سیان نے بتایا ہے کہ وہ خیریت سے ہے۔“

ماہنامہ سٹیل بیک

جلد 150

ڈاکٹر خورشید 25 روپے

ماہنامہ سٹیل بیک کے نام سے کون کون سی چیزیں گھر تک آتی ہیں

اس سلسلے سے آج کل کے سائنس دانوں کی کتنی باتیں

میں سائنس دانوں کی کتنی باتیں

یورپ سے لے کر چین اور ہندوستان تک کی ہم جوتی، رومان اور پراسرار واقعات سے بھی ہوتی پھر پور تاریخی داستان، ایک تعلیم سیاح کے سفر کے شب و روز، جس میں ہر موڑ پر نئی کہانیاں اس کی منتظر تھیں

کتابیات سٹیل بیک

فون: 021-5804300

Kitabiat1970@yahoo.com

74200





تھا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں مسکرایا اور بولا "میں اب جاؤں گا!"

میں نے اس سے ایک ہر پور مصافحہ کیا اور اس معاملے کے اختتام پر میں نے پورے غلوس کے ساتھ اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔

چنگ فو نے میرا کندھا تھپتا کر تسلی دی پھر اس کمرے سے رخصت ہو گیا۔

یہ چنگ فو نون پوشی سے میری تیسری ملاقات تھی۔

☆☆☆

سولہ مئی کی صبح بڑی اداں اور دل گرفتہ تھی!

چنگ فو نون پوشی کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔ اس نے پہلی ملاقات کے وقت مجھ سے کہا تھا کہ ہماری صرف تین ملاقاتیں ہیں۔ گزشتہ روز ہم نے تیسری ملاقات کر لی تھی اور یہ تیسری ملاقات بالآخر آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ کل والی اس تیسری ملاقات میں چنگ فو نے آخری جملہ یہ بولا تھا..... میں اب جاؤں گا!

اور وہ چا گیا..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

اگلی صبح دس بج کی تیز آواز سے ہماری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے بستر چھوڑا اور جلدی سے جا کر دروازہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں جو کھاگنگ ٹیبل کے ایک سینئر مونس پر نگاہ پڑی۔ میں نے اس لا ما کو جن سیان کے بہت قریب دیکھا تھا۔ ایک طرف سے وہ جن سیان کے نائب کی حیثیت رکھتا یعنی جن سیان چنگ فو کا نائب تھا۔ اس سینئر مونس کا نام یولیان تھا۔

یولیان کا چہرہ سنجیدگی کے گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے تشویش بری سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے تعبیر لکھ میں چنگ فو کے انتقال کی اطلاع دی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ ہم جلدی سے تیار ہو کر ٹیبل کے مرکزی حصے میں پہنچ جائیں۔

میں نے یولیان سے پوچھا "جن سیان کہاں ہے؟" "وہ بہت مصروف ہیں۔" یولیان نے گہری سنجیدگی سے بولا "انہوں نے ہی مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے" مجرودہ مزید کوئی بات کیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

میری طرف سے ساحل بھی دس بج کی تیز آواز پر بیدار ہو گئی تھی تاہم یولیان کی "اطلاع" اس تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ میں دروازے سے واپس چلا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا ہوا جدان..... کون آیا تھا؟"

میں نے نہایت ہی محنت سے لکھ میں اسے بتایا "جو کھاگنگ ٹیبل کی آبرو چنگ فو نون پوشی رخصت ہو گیا!"

میرے الفاظ میں ایسی پابست اور افسردگی تھی کہ بات کی یہ تک پہنچنے میں اسے ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی۔ اس کا چہرہ ہم اور افسوس کی آماج گاہ بن گیا۔ ہم دونوں ہی، چنگ فو کی موت کی خبر سن کر دہمی اور ہول ہو گئے تھے۔ چنگ فو ہمارے لیے بہت کچھ تھا۔ ہم دونوں قیمتی وسیعہ تھے۔ ہم دونوں کی کہانی میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، خاص طور پر والدین سے محروم ہونے والے واقعات تو ایک دوسرے سے بہت ہی ملتے جلتے تھے۔ میرے والد محترم عابد علی اور والدہ ماجدہ شگفتہ کو غناک قاتلوں نے جس طرح میری نگاہ کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا تھا بالکل اسی طرح ساحل کی ماں بھیمر جانی اور باپ چوچکی کو بھی بدھ تل کندہ والی عبادت گاہ میں درندہ صفت بھیڑیوں نے بے دردی سے ہلاک کر ڈالا تھا اور چنگ فو..... تو ہم دونوں ہی کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ اس کی شفقت ہم دونوں پر چھاؤر تھی۔ ہمیں ملانے اور ساری زندگی کے لیے ایک کرنے کے سلسلے میں اس شخص نے نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھے تسلیم ہے..... اور یہ اقرار کرنے میں کوئی ہلک محسوس نہیں کرتا کہ اگر چنگ فو کی خصوصی نظر مجھ پر مرکوز نہ ہوتی تو شاید میں اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اسی کی کوشش نے ہم عمر سے چھڑے ہوؤں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ ہمارا باپ صرف اور صرف اسی کا کارنامہ تھا اور اس سلسلے میں چنگ فو نون پوشی نے ایک سچے اور ذمے دار سرپرست کا کردار ادا کیا تھا۔

زندگی اور موت کا ٹھیک بھی بڑا ہی عجیب اور نالا ہے۔ زندگی موت کی امانت ہے اور موت اس امانت کو وصول کرنے کے لیے ہر لمحہ زندگی کے تعاقب میں رہتی ہے اور جیسے ہی وہ اسے دبوچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے زندگی کی حقیقتیں بدل کر رہ جاتی ہیں۔ الفاظ اپنے معنی اور انداز اپنے منہبوم تبدیل کر لیتے ہیں۔ چنگ فو نے اپنی زندگی میں ساحل کو بیٹی اور مجھے داماد بنا کر ہمارے دل خوشی اور شادمانی سے معمور کر دیے تھے لیکن اس کی زندگی کے خاتمے نے یہی دل بھجا دیے تھے۔ ہم دہمی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے سخت غم زدہ اور غور تھے۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے جو کھاگنگ ٹیبل کا چیف لا مانہ چل بسا ہو ہمارے سر سے سایہ اٹھ گیا ہو۔ ہم اسی لمحے ختم ہو گئے ہوں!

وہ پورا دن ایک مخصوص افسردگی اور درماندگی میں

گزر رہا۔ کچھ کھانے پینے کو بھی چاہا اور نہ ہی کسی اور بات میں دل لگا۔ رات گئے ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ جو کھاگنگ ٹیبل کی ناجی فضا نے ہمارے دلوں کو دن بھر اپنی گرفت میں جکڑے رکھا تھا۔ چنگ فو کے وصال پر ہر دل مغموم اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ انسان کی زندگی میں اس کا جو بھی مرتبہ اور درجہ ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے لیکن موت کے بعد اس کی سچ قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مفید اور کارآمد انسانوں کی کمی ہمیشہ یاد آتی ہے اور ان کی یادخون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کامیاب انسان وہی ہے جس کی کمی کا خلا بھی بھر نہ سکے۔ چنگ فو بھی ایک ایسا ہی عظیم انسان تھا۔

اس رات ہم ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکے۔ ساری رات چنگ فو کا ذکر خیر ہوتا رہا اور رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

اس ایک کمرے میں ہم دونوں کا قیام بھی چنگ فو کی خصوصی ہدایت کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک طرح کا بے پناہ اعتماد تھا جو وہ ہم دونوں پر کرتا تھا۔ شادی سے پہلے عمو ملاز کی اور ملاز کے کو ایک دوسرے سے دور کر دیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو ان پر کوئی گہرائی بٹھائی جاتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنے اور بات کرنے تک کی اجازت نہیں ہوتی لیکن چنگ فو نے اس کے برعکس احکام صادر کیے تھے۔ وہ جدا کرنے والوں میں سے نہیں بلکہ ملانے والوں میں سے تھا۔ ہم اس آزادی کا غلط استعمال نہیں کریں گے۔ ہماری ذات پر چنگ فو کا یہ اندھا اعتماد ہمارے لیے کسی گولڈ میڈل سے کم نہیں تھا۔

اسی دوران میں ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے ہجرو فرما میں بیٹے ہوئے ایک ایک روزو شب کی تفصیل ایک دوسرے کو سنا ڈالی۔ جب پرانے قصے سن کر مجھے ساحل نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"جدان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

"کون سی بات؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"محترم چنگ فو نے اس روز مجھے رخصت کرنے کے بعد تم سے کافی دیر تک باتیں کی تھیں۔" وہ ابھن زدہ لکھ میں بولی "تھنا وہ کوئی خاص باتیں ہی ہوں گی۔ اس بارے میں تم مجھے کچھ بتاؤ گے۔"

میں اس سوال کی توقع اس لمحے سے کرنے لگا تھا جب اس ٹیبلنگ کے دوران میں چنگ فو نے ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے براہ راست کہا تھا..... بیٹی! تم اب جا کر آرام

کرو۔ میں وجدان سے کچھ دوسری باتیں کروں گا۔ ساحل کے ہانے کے بعد چنگ نے مجھ سے صرف دو اہم موضوعات پر گفتگو کی تھی یعنی لی یان کی جن سیان سے شادی اور "تھنا جو وہ مجھے دیتا چاہتا تھا۔ سدا بہار جوانی کا فارمولا! میں، "اسٹل بنگ" کے سلسلے میں ساحل کوئی الحال کچھ نہیں بتا رہا تھا کیونکہ اس اہمول شخص کی "وصولیائی" میں ابھی پورے نوے دن باقی تھے البتہ لی یان کی شادی کے بارے میں تفصیل بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس سے پہلے بھی ساحل لی یان کے حوالے سے کرید کرید کر مجھ سے بہت کچھ پوچھ چکی تھی۔ صرف ایک لی یان پر ہی کیا موقوف! ساحل سے چھڑنے کے بعد اب تک جن جن لڑکیوں کی میری زندگی میں آمد و شد رہی تھی وہ خالص بیویوں والے انداز میں ان کے بارے میں تشفیاتی سوالات کرتی رہی اور میں نے بھی انتہائی محفوظ انداز میں اسے بڑے تسلی بخش جوابات دیے تھے۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"زیادہ تر باتیں جن سیان اور لی یان کے بارے میں ہوئی تھیں۔ چنگ فو نے پوری تفصیل سے مجھے بتایا کہ لی یان نے کس طرح مذہب تبدیل کر کے جن سیان کی بیوی بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ وغیرہ....."

"اس کے علاوہ؟" اس نے معنی خیز سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"اس کے علاوہ چنگ فو نے ایک سرس ہونے کی حیثیت سے مجھے بڑی کڑی تڑی دی ہے کہ میں تمہارا بہت خیال رکھوں۔ تم اس کی بہت ہی لاڈلی بیٹی ہو۔ تمہارے پاؤں میں بھی ایک کاٹنا ٹیک نہیں چھننا چاہیے ورنہ....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ پوچھ بیٹھی "ورنہ کیا وجدان؟"

ساحل کے اس سوال میں ایک خاص نوعیت کی شرارت چھپی ہوئی تھی۔

میں نے گہری سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "ورنہ..... ورنہ کے بعد تو اس نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا!"

"اور اس "ورنہ" کے جواب میں تم نے کیا کہا تھا؟" وہ خوشی سے متفہم ہوئی۔

"میں کیا کہہ سکتا تھا" میں نے سادگی سے کہا "ظاہر ہے میں نے چنگ فو کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں زندگی بھر تمہارا بہت زیادہ خیال رکھوں گا۔"

”اس کا مطلب ہے اگر تم میرا خیال رکھو گے تو یہ چنگ فو سے کیے ہوئے عہد کی اٹھائی ہوگی؟“ وہ شری انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم بات کو خواہ مخواہ سمجھ کر شامل سے جواب میں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو؟“ میں نے قدرے جھجھکائے ہوئے لہجے میں کہا ”چنگ فو نے ہماری زندگی میں اتنا بڑا کردار ادا کیا ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر ہماری شادی کا تذکرہ پیکا اور ادھورا ہوگا ورنہ میں نے تمہیں محترم سا بگ فو اور اکر مو بگ ریٹو سے بارے میں بھی تفصیل بتایا ہے۔

یہ دونوں حضرات بھی تمہارے بچے خیر خواہ تھے اور مجھ پر حسبِ توقع انہوں نے زور بھی دیا تھا کہ میں کبھی کسی دکھ اور تکلیف کو تمہارے نزدیک سے بھی نہ گزرنے دوں“ حتیٰ کہ سا بگ فو نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔ میں دھن (سائل) کے سر پرست کی حیثیت سے اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں“ میں نے بھر کے لیے سانس لینے کو رکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

”یہ تمام لوگ تمہارے سکتے ہی ہمدرد اور بڑی خواہ کیوں نہ ہوں“ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تمہارا خیال کس طرح رکھا جاسکتا ہے یہ مجھ سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں جانتا۔ اور مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں! تم میری محبوب ذمے داری ہو۔ اور مجھے ذمے داری نبھانا آتا ہے!“

”بس۔۔۔۔۔!“ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی ”میں تمہاری زبان سے صرف یہی سننا چاہتی تھی۔“

☆☆☆

چنگ فو نے آں جہانی ہونے سے پہلے آخری ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ ساحل کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے اس نے لیئٹن سے مولانا عبدالکریم کو بلا لیا تھا لیکن ابھی تک ان مولانا صاحب سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہی حضرت ہمارے نکاح خواہ بھی ہوتے۔ میں نے جب اس سلسلے میں نئے چیف لاما آف جو کھاگ ٹیمپل جن سیان سے احتضار کیا تو اس نے بتایا کہ عبدالکریم صاحب سے انیس مئی کی صبح کو ملاقات ہوئی۔ سوچ کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے علی الصبح وہ ساحل کو دین اسلام میں داخل کریں گے پھر جب سورج جلوہ نما ہوجائے گا تو وہ ہمیں رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کا فریضہ انجام دیں گے۔ جن سیان ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا عبدالکریم تیرہ مئی کی شام لیئٹن سے لہا سانجی گئے تھے۔

چنگ فو سولہ مئی کی صبح اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا۔

صرف چوبیس گھنٹے تک اس کی جہادی کا سوگ باقاعدہ منایا گیا۔ اس کے بعد زندگی کے معاملات معمول پر آگئے۔ تاہم مذہبی حوالے سے مختلف نوعیت کی روحانی تقریبات روایت کے مطابق جاری رہیں لیکن ان کے سبب زندگی کے دوسرے امور متاثر نہیں ہو رہے تھے۔

سترہ مئی دو پہر کے بعد جن سیان نے مجھے ساحل کے ہمراہ اس دو منزلہ عمارت کی طرف روانہ کر دیا جہاں ہماری شادی ہونا قرار پائی تھی۔ وہ خود ہمارے ساتھ نہ جاسکا تاہم اپنے دو آدمیوں کو اس نے ہماری مدد کے لیے ساتھ کر دیا۔ مجھے اور ساحل کو مل کر اس گہری مناسب ترین و آرائش کرنا تھی تاکہ وہ گھر شادی کا گھر نظر آئے۔ یہ چنگ فو کا حکم تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہماری شادی انتہائی سادگی سے مگر طریقے پلٹتے سے ہو۔

وہ دو منزلہ عمارت دریائے ”کائے چو“ کے کنارے واقع تھی اور نو بلنگک پیل سے اس کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ نور بلنگک کو عام طور پر ”سربیل“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ محل دلائی لاما کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہر دور کا دلائی لاما موسم گرما کی محل میں گزارتا تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے سے یہ محل یہ شہر اور یہ ملک (تبت) دلائی لاما کے وجود سے محروم ہو چکا تھا۔ انیس سو انیس میں اس سلسلے میں چودھواں دلائی لاما بحالیت مجبوری جلا وطنی اختیار کر چکا تھا۔ لیئٹن نے نہ صرف یہ کہ لشکر کشی کر کے تبت کی اینٹ سے اینٹ بجادی بلکہ اس کا نام تبدیل کر کے اس جنت نظیر خطہ ارض کو اپنے ایک صوبے کی حیثیت بھی دے دی۔ آج کل تبت نامی دنیا کی یہ جنت جہنم کے صوبے ”سی زانگ“ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ انقلابات ہیں جہاں نے کے! انیس سو ساٹھ کی شگفتگی پلٹانے تو تبت کی شکل صورت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔

میں ساحل کو سا بگ فو سینئر اور سا بگ فو جونیئر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا چکا تھا۔ وہ میرے اس چار سالہ خن سے اکلوتے شاگرد سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ مجھے یہ بھی بتا چکا تھا کہ سا بگ فو کو شہ بالا لانے کا منصوبہ بھی ترتیب پا چکا ہے۔ ہم شام تک اس دو منزلہ عمارت میں موجود مختلف امور انجام دیتے رہے پھر واپس جو کھاگ ٹیمپل آگئے۔

آئندہ روز یعنی اٹھارہ مئی کا سارا دن بھی اسی گہری من گزرا جس کی بالائی منزل کا ایک کمرہ ہماری شب زفاف کے لیے سجایا گیا تھا۔ یہ بڑی منتوں اور مردوں والی رات تھی جو چند گھنٹوں کے فاصلے پر گہری ہماری راہ دیکھ رہی

تھی۔

اس روز شام کے وقت وہاں سے رخصت ہونے سے تھوڑی دیر پہلے لی یان سے تنہائی میں دو تہاں کرنے کا مجھے موقع مل گیا۔ اس گہری آرائش و زیبائش میں اس کا بڑا ہاتھ تھا لیکن یہ ایک اتفاق ہی تھا یا پھر جن سیان کی کوئی حکمت عملی کہ ابھی تک ہمارا سامنا نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے ہر احتیاط اور مصلحت کو بالا لے طاق رکھ کر اس سے پوچھ لیا۔

”لی یان! یہ تم نے کیا حماقت کر ڈالی؟“ اس وقت ساحل خننے سا بگ فو کے ساتھ زیریں منزل پر تھی۔ لی یان (موجودہ یان سیان) نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔

”کون سی حماقت؟“

”تم نے ایک بڑے کی بیوی بنا کیسے قبول کر لیا اور وہ بھی اپنا مذہب تبدیل کر کے۔“ میں نے قدرے غلطی آہیز لہجے میں کہا ”تمہارے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ تمہیں تو ایک سے ایک جوان مل سکتا تھا!“

وہ میری آنکھوں میں ڈوٹے ہوئے بڑی رمان سے بولی ”جہاں تک مذہب کی تبدیلی کا معاملہ ہے تو میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ ساحل بھی تو تمہاری خاطر مسلمان ہو رہی ہے“ وہ ایک لمحے کو رک کر تو میں اس کے چہرے سے جھلکتے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر دمک رہ گیا۔ وہ سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”اور جہاں تک جوان رشتوں کی حصول یا بی حاصلیت ہے تو میں اس سلسلے میں تمہاری بات سے اتفاق کرتی ہوں لیکن۔۔۔۔۔ وہ ایک سے ایک جوان“ اس نے میرے کہے ہوئے الفاظ کو بڑے مٹی خیر انداز میں دہرایا ”مجھے لے کر بہت دور بھی جاسکتا تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ میں شادی کے بعد بھی لہا سا ہی رہ سکوں گی۔ میں جس بھی جوان مرد سے شادی کرتی اس کی خواہش کا بھی احترام نہ کرتا پڑتا۔ وہ اگر مجھے تبت سے کہیں باہر لے جانا چاہتا تو مجھے یہ دھرتی چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑتا اور میں یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی!“

اس کی وضاحت میرے کچھ بھی پلنے نہ پڑی تو میں نے اصرار ہی لہجے میں پوچھا ”کیوں۔۔۔۔۔ لی یان! تم زندگی بھر تبت ہی میں کیوں رہنا چاہتی ہو؟“

”تمہاری خاطر!“ اس نے چٹائی لہجے میں جواب دیا۔ میں بوکھلا کر رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ”میری خاطر؟“

”ہاں وہ دان! میں نے تمہارے نزدیک رہنے کے لیے ایک بوڑھے سوک سے شادی کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ میں جانتی ہوں ساحل سے شادی کے بعد تم میرے لیے پرانے ہو جاؤ گے جیسے جن سیان سے شادی کے بعد میں تمہارے لیے پرانی ہو گئی ہوں لیکن۔۔۔۔۔“ وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بارہ قدرے سنبھلے ہوئے گویا ہوئی۔

”لیکن میں نے تمہاری معیت میں زندگی کے جوش و روز گزارے ہیں انہیں خوشگوار یادوں کے خانے میں سے کس طرح ڈیلیٹ کر سکتی ہوں۔ میری یادداشت میں خوشیوں کے لیے جو خانہ قفس ہے اس میں صرف اور صرف ایک ہی خوشی تو رہی ہے اور وہ بھی تمہاری یاد کی صورت میں۔ ٹھیک ہے میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتی لیکن گاہے گاہے جہیں دیکھ تو سکتی ہوں۔ تمہاری صورت دیکھ لینا ہی میرے فرار کے لیے کافی ہوگا۔ میں اپنے شوہر جن سیان کی وفادار ہوں اور ہمیشہ وفادار ہوں گی۔ وہ میرے خیم و جان کا مالک ہے لیکن میری بے چین روح کی پیاس صرف تمہاری دید سے بجھے گی۔ میں مینے دو مینے میں بھی تمہاری شکل دیکھ لوں گی توجی انھوں کی، میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہی ہوں وہ دان۔ اپنے دیدار کا حق تو تم مجھے دے ہی سکتے ہو!“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی پھر کھاتی توقف کے بعد گھبر لہجے میں بولی ”وہ دان! تم بہت سی پراسرار قوتوں کے مالک ہو۔ میں تمہارے علم کو تسلیم کرتی ہوں۔ ہر علم اپنی جگہ مسلم ہے لیکن افسوس کہ ایسا کوئی علم دیکھنے یا سننے میں نہیں جو عورت کے دل میں جھانکنے کا وسیلہ بن سکے۔ تم کچھ نہیں جانتے وہ دان۔۔۔۔۔ کچھ نہیں!“

بات ختم کرتے ہی وہ جانے کے لیے مڑی لیکن میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ”ظہر جاؤ لی یان! تم نے اپنی تو کہہ لی تھوڑی میری بھی سن لو۔“ وہ رک گئی تاہم اس نے پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے گھبراہٹ میں کہا ”ٹھیک ہے میں جب تک یہاں ہوں، تمہاری یہ معصوم اور پاکیزہ سی خواہش پوری کرنے کی ضرورت کوشش کروں گا لیکن تین ماہ کے بعد تو میں پاکستان جا رہا ہوں“ پھر تمہارا کیا ہوگا؟ تم نے تو بتایا ہے۔۔۔۔۔“ ”یہ تمہاری خوش فہمی ہو گئی کہ تم کبھی یہاں سے جاسکو گے!“ وہ میری طرف دیکھ کر بغیر قلع کلائی کرتے ہوئے بولی۔

میں الجھ کر رہ گیا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو لی یاں؟“ اس نے سرسراہٹ سے بولی آواز میں کہا۔ ”وہ جان! میں نے کہا ہے، تم کچھ نہیں جانتے۔ ان لوگوں نے تمہارے لیے بڑا مضبوط انتظام کیا ہے۔ ساحل کی صورت میں ایک ایسا کردار تمہاری زندگی میں داخل کیا ہے کہ تم راضی خوش اپنی ساری زندگی اسی سرزمین پر گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔ جن سیان سے شادی کر کے میں نے کوئی حفاظت نہیں کی وہ جان! تمہیں اب جیت ہی میں رہنا ہے!“

”یہ تو آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا۔۔۔۔۔!“ میں نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ ”کل از وقت اتنے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“

وہ مزید کوئی بات کے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ اس روز جب ہم واپس چوکھا تک ٹیکل پہنچے تو ساحل کو مجھ سے الگ کر دیا گیا، جن سیان نے مجھے بتایا کہ اب نکاح کے وقت ہی اس کی صورت دیکھ سکوں گا۔ میں نے پوچھا کہ آیا ساحل کو میری نظر کے سامنے مسلمان کیا جائے گا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ یہ دونوں معاملات یکے بعد دیگرے طے پائیں گے۔ علی الصبح، مولانا عبدالکریم ساحل کو دائرۂ اسلام میں داخل کریں گے اور سورج طلوع ہوتے ہی ہمارا نکاح کر دیا جائے گا۔

جیت میں شادیاں عموماً صبح کے وقت انجام پاتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ دوپہر تک شادی کا کھانا بچ کی صورت مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور سورج غروب ہونے سے پہلے لڑکی کو رخصت کر دیا جاتا ہے۔ ہماری شادی اگرچہ دو مسلمانوں کی شادی تھی لیکن اوقات کار میں کوئی تبدیلی کرنے یا وہاں کی روایات کو توڑنے کی کوشش نہیں کی گئی اور اس میں کوئی قیاس بھی نہیں تھی۔

وہ رات میں نے اس کمرے میں تنہا گزاری جہاں بچھلی دو تین راتوں سے ساحل کے ساتھ قیام پزیر تھا۔ وہ رات میری زندگی کی ایک عجیب و غریب رات تھی۔ میں متضاد احساسات کا شکار تھا۔ میں نے خود کو بیک وقت خوش اور افسوس کی کیفیت میں پایا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ میں نے اپنی جان تنہا کو پایا تھا۔ میری زندگی مکمل ہونے والی تھی۔ ساحل کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا تھا۔ جب تک وہ مجھ سے دور رہی مجھے یہی لگتا تھا جیسے میرے وجود کا ایک اہم جزو کہیں کھو گیا ہو۔ میری شخصیت اس کے بغیر نامکمل تھی۔ افسوس اور دکھ اس بات کا تھا کہ خوشی کے اتنے بڑے موقع پر کوئی اپنا میرے پاس نہیں تھا۔ ان لمحات میں ایک

ایک تعلق دار مجھے ٹوٹ ٹوٹ کر یاد آیا۔ وہ بھی جو اس دنیا میں زندہ تھے اور وہ بھی جو اب کسی اور دنیا میں زندہ تھے۔ گزر جانے والوں میں اسی بوکی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ ان کی یاد میں میری آنکھیں برسنے لگیں۔ میری ماں کی معصوم صورت نگاہوں میں گھونسنے لگی۔ یہ اس عظیم عورت کا چہرہ تھا جس نے تیس سال پہلے مجھے جنم دیا تھا۔ والد صاحب کی شکل بھی والدہ کے چہرے کے ساتھ ہی تصور کے پردے پر روشن تھی۔ میرا پاپ دنیا کا مشفق ترین باپ تھا لیکن افسوس کہ دشمنی کی آگ نے اس دنیا میں میری آمد سے قبل ہی میرے والدین کے پاؤں میں بکولے باندھ دیے تھے۔ میں ابھی صرف دو ماہ کا تھا کہ انہیں یہ حالت مجبوری میری زندگی کی خاطر اپنا گناؤں موضع رکھاں والی چھوڑنا پڑا۔ یہ بڑی ہی دل خراش ہجرت تھی۔ وہ مجھے بچا کر چیتے چیتے کسی طرح پاکستان سے منگوا کر پہنچے گئے لیکن باقی کی راکھ میں دبی ہوئی عداوت اور انتقام کی چنگاریاں ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ جاگ اٹھیں۔ جب میں بارہ سال کا ہوا تو درندہ صفت دشمنوں نے میری نگاہ کے سامنے میرے والدین کو انہی کے خون میں نہلا دیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ماں باپ کے لاشے گرے دیکھے لیکن میں اس وقت ان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کے بعد میں نے عمر طاعت اور تجربہ حاصل کر کے دشمنوں کے سارے قریبے ہزاروں فی صدور کے ساتھ تار دیے تھے۔ مجھے دشمنی اور قسبی طور پر یہ اطمینان حاصل تھا کہ میں نے اپنے والدین کی روحوں کو بے چین و بے قرار نہیں رہنے دیا تھا۔

میں لگ بھگ گیارہ سال سے والدین جیسی نعمت خداوندی سے محروم چلا آ رہا تھا لیکن اس موقع پر یہ محرومی کچھ زیادہ ہی ستا رہی تھی۔ اگر وہ دونوں زندہ ہوتے تو اپنا ایک ایک چاؤ پورا کرتے۔ ایک ایک اربان نکالتے لیکن موت و حیات کا قدرت کا ایک اپنا نظام ہے۔ اس سے منفر ممکن نہیں!

☆☆☆

انیس مئی کی صبح ہمیں ایک دوسرے کی زندگی میں داخل ہونے کا شرعی حق حاصل ہو گیا۔ اب ساحل میری بیوی اور میں اس کا شوہر تھا۔ نکاح سے پہلے مولانا عبدالکریم نے ساحل کو شرفِ اسلام کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہماری خوش و خرم زندگی کے لیے دھڑوں دعا بھی کیں۔ الغرض ہماری شادی کے تمام تہذیبی احکام اور فرائض بہ خیر و خوبی نہایت ہی خوش سلیکھی سے انجام پائے۔

وہ پورا دن مختلف قسم کے رسوم و رواج کی ادائیگی میں گزر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن شام میں بدلا اور شام رات میں ڈھل گئی پھر رات بھر کے لیے ہمیں دو منزلہ عمارت کی بلائی منزل پر بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا۔ نئے سا بنگہ فو کو بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ہماری ضرورت کی ہر شے کو سر شام ہی وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اب ہم سب معنوں میں ایک ہو گئے تھے۔

جلد عروسی میں رکی منگھو کے بعد ساحل ایک غیر متعلق موضوع پر تیشی۔ بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی ”وہ جان! جب تم بچک فونے تم سے یہ پوچھا تھا کہ شادی کے بعد مشکل رہائش کہاں اختیار کرنا چاہو گے تو تم نے یہ کیوں کہا، تمہارا پاکستان میں سہیل ہونے کا ارادہ ہے؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ”میں نے ایسا اس لیے کہا تھا کہ جیسا میرے مستقبل کا پروگرام ہے۔ میں اپنے وطن میں رہنا پسند کروں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم یہی رہ جاتے ہیں۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور لی یاں کے کہے ہوئے الفاظ روشن ہو گئے۔ وہ جان! تم کچھ نہیں جانتے۔ ان لوگوں نے تمہیں مستقل طور پر یہاں روکے گا بڑا مضبوط انتظام کر رکھا ہے۔ تم راضی خوشی یہاں زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤ گے۔

”کیا سوچ رہے ہو وہ جان؟“ وہ بڑی لگاوت سے بولی۔

میں نے کہا ”مستقل یہاں قیام کرنا تو بڑا مشکل ہے۔ جہیں پتا ہے میں کسی ایک جگہ زیادہ عرصے تک ٹھہر نہیں سکتا۔ تھوڑے وقفے کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”دیے میں کم از کم تین ماہ تک تو یہاں رک ہی رہا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ اچھا خاصا قیام ہوگا!“

وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی ”اب تمہاری اس سیلائی طبیعت کو قرا کر آ جانا چاہیے۔ تم گھر بار والے ہو گے ہو۔ ایک جگہ کر کہیں آجہدہ زندگی کی پلاننگ کرنا چاہیے اور میرا خیال ہے اس مقصد کے لیے جیت سے زیادہ اچھی جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“

ساحل کے سنجیدہ اصرار کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ لی یاں نے ہوا میں لٹھ نہیں ٹھکانی تھی۔ اس کی باتوں میں اچھا خاصا وزن محسوس ہونے لگا۔ میں ابھی تذبذب کا شکار ہی تھا کہ ساحل نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ جان! ہم دونوں کی زندگی تو جیسی عیش گزری اور آجہدہ بھی گزرتی رہے گی۔ میں آنے والی لسٹوں کے تحفظ کی خاطر یہاں مستقل قیام کی بات کر رہی ہوں۔ جیت میں ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ یہاں زندگی بڑے امن و سکون سے بسر ہوگی!“

عورت ایک معاملے میں بڑی دور اندیش ہوتی ہے۔ ادھر شادی سکڑم ہوئی، ادھر اس نے آنے والی لسٹوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ وہ بیوی بننے ہی نانی دادی بننے کا خواب بننے بیٹھ جاتی ہے۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا ”آنے والی لسٹوں کے بارے میں بعد میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔ فی الحال ہمیں پوری توجہ خود پر مرکوز رکھنا چاہیے۔ یہ مرداوں بھری رات زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ اسے مستقبل کی پلاننگ میں پڑ کر ضائع ہونے سے بچانا چاہیے۔“

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ چہرے پر ہلکی خشکی کے تاثرات بھی نمودار ہو گئے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ اسے میرا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے شائوں سے تمام ایسا اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیا ناراض ہو گئی ہو؟“

”تمہیں میری ناراضی سے کیا؟“ وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولی ”مجھے تو یہ مان تھا کہ تم میری بڑی سے بڑی بات کو بھی نہیں نالوے مگر تم نے تو میری اس چھوٹی سی خواہش کو بھی۔۔۔۔۔“ وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ پھر گردن جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

بیویاں محبت کرنے والے شوہروں کو اور اولاد مشفق والدین کو ایسی ہی دل رہا اداؤں سے ایموشنل بلیک میل کرتے ہیں۔ ساحل نے اپنی چھوٹی سی خواہش والی بات اتنی معصومیت اور شکست دلی سے کہی تھی کہ میرا جگر کٹ کر رہ گیا۔ میں اسے دل و جان سے جانتا تھا اور اس کے حصول کی خاطر اب تک خود کو سپردِ عذاب کر رکھا تھا۔ وہ میرے لیے کتنی اہم تھی اس ”حقیقت“ کے مقابلے میں اس کی ”فرمائش“ واقعی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہستی جس پر میں اپنی جان بھی بھجوا کر رکھتا تھا وہ مجھ سے ادنیٰ سی فرمائش کر رہی تھی۔

محبت جذبات کی سچائی اور پاکیزگی کا نام ہے اور پاکیزہ جذبات میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ سراسر خدا کی صفت ہے۔ میں ساحل سے جی محبت کرتا تھا۔ اس الوہی جذبے نے مجھے اس کی بات ماننے کے لیے مجبور کر دیا۔ جب کہ اس کی فرمائش نما خواہش کوئی ناچاز بات بھی نہیں

تھی۔ اس نے میری زندگی میں داخل ہونے کے لیے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ اتنی بڑی قربانی تھی کہ میں اس کی بات سے انکار کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مجھے سمندر سوئپ کر بدلے میں مجھ سے ایک قطرے کا تقاضا کیا ہو! اسے خالی ہاتھ لوٹانا کم ظرفی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ ہوتا۔

میں نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا ”سائل! میں تمہارا مان نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ تمہاری خوشی کی خاطر میں تمہاری فرمائش پوری کرنے کو تیار ہوں۔ اب مسکرا دو!“

وہ مسکرا دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی ہوشیاری سے میرا ہاتھ کھینچ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور چالاکی سے بولی ”ایسے نہیں وجدان! تمہیں میری قسم کھانا ہوگی!“ میں نے کہا ”تمہاری جان کی قسم! میں وعدہ کرتا ہوں اگر میرے اللہ نے چاہا تو میں تمہاری خوشی کے لیے جنت میں قیام پذیر ہوں گا۔ بس..... یا اور کچھ؟“

”تم اپنے ہر بیان کو مشروط کرنے سے باز نہیں آتے!“ وہ سر پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کی طرف لاتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں بولی ”تم سے جیتنا بہت مشکل ہے۔“

میں نے اس کی کوشش میں مزاحم ہوئے بغیر کہا ”اس وقت تو ہر جیت تمہارے ہی کھاتے میں لکھی جا رہی ہے۔ آں جہاں چمک فونے تو مجھے محض ”تبت کا داماد“ کا ٹائٹل دیا تھا۔ تم اس ٹائٹل میں ”کھر“ ٹانگنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اب اس ٹائٹل کو ”تبت کا کھر داماد“ پڑھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا“ میں لمبے بھر کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اور جہاں تک بات کو مشروط کرنے کا تعلق ہے تو ایک سچے مسلمان کو اپنے ہر معاملے میں اللہ کی مرضی کو ضرور شامل حال رکھنا چاہیے۔ بے شک! اس کی مرضی کے بغیر ایک معمولی سا تپا بھی حرکت نہیں کر سکتا..... اور یہ مت بھولو کہ تم بھی ایک مسلمان ہو!“

”اوہ!“ ندامت آمیز لہجے میں بولی ”آئی ایم سوری وجدان!“

میں نے اسے مزید قریب کرتے ہوئے اس کی ”سوری“ کو قبول کر لیا۔ چند لمحات خوش گوار خاموشی میں گزرے پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہمارے درمیان کوئی تیسرا بھی موجود ہو۔ یک لخت میرا دھیان نیلگہری کی طرف چلا گیا۔ اس نے آخری ملاقات میں مجھے

بڑی عین اور رنگین دھمکیاں دی تھیں۔ سہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ کہیں وہ اپنی سنسنی خیز دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے تو نہیں چلی آئی! اس نے تل ایب کے ”ہول ٹاپ“ میں میرے حصول میں ناکامیابی کے بعد بڑے زنجی لہجے میں کہا تھا ”تمہاری ثابت قدمی میں کسی اور کا ہاتھ ہے وجدان! لیکن یہ مددگار ہاتھ بھی کب تک رہے گا؟ میں تمہارے حصول سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ جو بھی عورت تمہاری تنہائی میں پہنچ کر حصول اور وصول کی حدود کو چھوئے گی اس کے اندر تم مجھے پاؤ گے..... مجھے نیلگہری کو؟“

مددگار ہاتھ سے اس کا واضح مطلب ”چمک فونے“ اور واقعی وہ اب باقی نہیں رہا تھا، یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی!

میں نے نیلگہری کی موجودگی کو جانچنے کے لیے سائل کو قریب سے قریب تر کر لیا حتیٰ کہ ہم دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ ہماری سانسیں ایک دوسرے کے چہرے کو ٹکورنے لگیں۔ ان لمحات میں اگر نیلگہری ہمارے درمیان موجود ہوتی تو اس کی قربت مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی، میری قوتِ شامہ اس کے کندھ بدن سے اٹھنے والی کپکپ آسوں ایسی سوندھی سوندھی خوش بو سے بخولی آشنا تھی۔ اس وقت میرے تمام تر محسوسات پوری طرح بیدار تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا ”وہ میری تنہائی میں شامل نہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں نے نیلگہری کے خیال کو دہم جاننے ہوئے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔“

بے ساختہ میری زبان سے نکلا ”جھوٹی کہیں کی.....!“ ”تم نے مجھے جھوٹی کیوں کہا؟“ سائل کی محو سرگوشی میری سماعت سے نگرانی۔ ”اس لیے.....!“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا، اس کے بعد شروع ہونے والے سفر میں وہ سوال پوچھ پوچھ کر میری راہ کھولی کر دے۔ ان لمحات میں وہ مجھ سے زیادہ تجھ دار ثابت ہوئی۔ وہ میری آغوش میں سمٹ کر گویا بولنا بھول گئی تھی۔ اس بے زبان پناہ گزینی میں خود پردہ کی پیش پیش تھی!

سائل میری شریکِ حیات بن گئی تھی۔ اس شرارت داری کا پہلا قدم ہی اتنا سیدھا پڑا تھا کہ میں بڑے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا تھا..... میری محبت کا سفینہ اپنے ساحل سے